# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی
جلد اوّل

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان      مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
مولانا محمد انور مگھالوی      مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور- کراچی ۞ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد اول) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

# ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 32630411-32212011-021۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

# عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے حبیب لبیب اور ہمارے آقا حضور پرنور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے طفیل اس کی توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز آپ کی خدمت میں ''الجامع لاحکام القرآن'' جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے پیش کر رہا ہے۔ یہ تفسیر امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 671ھ کی تالیف ہے۔ حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز نے تفسیر ضیاء القرآن کی تالیف کے دوران اس تفسیر سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ الفاظ قرآن کی لغوی اور بلاغی تعبیر ہو یا آیات کی ترکیبی توضیح، حکمت دین کا معاملہ ہو یا فلسفہ اسلام جا بجا اس کی تفسیر کی طرف رجوع ملتا ہے یہ امر تفسیر قرطبی کی عظمت شان کا پتہ دیتا ہے۔

دلی آرزو تھی کہ اس تفسیری کام کو اردو زبان میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے اس مشکل امر کو ادارہ ضیاء المصنفین کے علماء نے اپنے ذمہ لیا تقریباً ساڑھے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد ہم اس قابل ہوئے کہ یہ ارمغان محبت آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

اپنی بساط کے مطابق ہم نے اس کے ظاہری اور باطنی محاسن کو ملحوظ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ہم امید واثق رکھتے ہیں کہ ہماری یہ کاوش بھی آپ کی نظر التفات کی مستحق بنے گی اور آپ میرے، ادارہ کے جملہ اراکین اور ادارہ کے حق میں دعا کریں گے کہ خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رہے اور ہمارے لیے خصوصاً یہ بھی دعا فرمائیں گے کہ ہماری اس خدمت کو اللہ تعالیٰ توشہ آخرت بنا دے۔

آپ کا خادم
محمد حفیظ البرکات شاہ عفی عنہ

# حسن انتخاب کا سبب

تفسیر ضیاء القرآن کے مصادر کی تخریج کے مرحلہ سے جب ہم گزر رہے تھے تو یہ امر آشکارا ہوا کہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری ادب میں سے تقریباً چوبیس تفاسیر سے نکات اخذ کیے ہیں اور سب سے زیادہ تفسیر قرطبی اور تفسیر مظہری کی طرف رجوع کیا ہے۔

ادارہ ضیاء المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی حاجی حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر محمد ابراہیم شاہ کے توجہ دلانے سے تفسیر مظہری کا ترجمہ ہوا۔ درمیان میں دوسرے کام ہوتے رہے۔ آج جون 2012ء سے ساڑھے چھ سال پہلے ادارہ ضیاء المصنفین کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ العالی صدر ادارہ ضیاء المصنفین کی سربراہی میں ہوا اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے کا اردو ترجمہ کروایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کا سلسلہ شروع ہوا اس کام میں چار احباب نے حصہ لیا۔

1۔ جناب سید محمد اقبال شاہ صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ غوثیہ
2۔ جناب محمد انور مگھالوی
3۔ جناب شوکت علی چشتی
4۔ راقم الحروف محمد بوستان

تفسیر قرطبی علوم کا سمندر ہے۔ عربی ادب پر کامل گرفت، حکمت دین پر گہری نظر اور مسائل شرعیہ پر عبور، یہ حضرت مفسر کا خاصہ ہے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالتے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ قاری آسانی کے ساتھ مفاہیم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے مصادر کی تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

اس کے مصادر کو صفحہ قرطاس کی زینت بنانے اور پروف ریڈنگ کے مختلف مراحل میں علامہ شوکت علی چشتی صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔ ان کی عملی مدد حاصل نہ ہوتی تو اس کام کی تکمیل میں مزید کئی سال صرف ہو سکتے تھے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس فاضل نوجوان کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعاگو ہوں کہ وہ ان کی ذات کو ملت اسلامیہ کے لیے نافع بنائے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے قبول عام نصیب فرمائے اور ہمارے لیے توشہ آخرت بنائے۔

محمد بوستان عفی عنہ
مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

# امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

امام محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح ابوعبداللہ انصاری، خزرجی، قرطبی، اندلسی مالکی۔

آپ نے ابن رواج، ابن جمیزی، شیخ ابوالعباس احمد بن عمر قرطبی صاحب المفہم، ابوعلی حسن بن محمد بن محمد بکری حافظ اور ابو الحسن علی بن محمد بن علی بن حفص یحصبی وغیرہ سے اکتساب فیض کیا۔

آپ سے ان کے بیٹے شہاب الدین احمد وغیرہ نے اکتساب فیض کیا۔

امام ذہبی آپ کے بارے میں ذکر کرتے: آپ مختلف فنون میں نہایت نامہ رکھنے والے اور علم میں تبحر امام ہیں۔ آپ کی بڑی مفید تصانیف ہیں جو آپ کے کثرت علم اور زیادتی فضل پر دال ہیں۔ آپ کی تفسیر کو شہرت نصیب ہوئی یہ تفسیر اپنے معنی میں کامل ہے۔ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو آپ کی امامت، ذکاوت اور کثرت علم پر دال ہیں۔

ابن فرحون نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں، متقی عارف علماء، دنیا میں زہد اختیار کرنے والے اور ان افراد میں سے تھے جو امور آخرت میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے اوقات عبادت وتصنیف میں صرف ہوتے آپ نے تکلف کو دور پھینک رکھا تھا۔

ابن عماد نے شذرات الذہب میں کہا: آپ حدیث کے معانی میں غواصی کرنے والے اور عمدہ تصنیف کے حامل تھے۔

آپ کی مطبوعہ کتب یہ ہیں۔

1۔ الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی وصفاتہ

2۔ الاعلام بمافی دین النصاری من الاوہام

3۔ التذکار فی افضل الاذکار

4۔ التذکرہ فی احوال الموتی وامور الآخرۃ

5۔ قمع الحرص بالزہد والقناعۃ ورد ذل السوال بالکتب والشفاعۃ

6۔ الجامع لاحکام القرآن یہی تفسیر ہے۔

آپ کا وصال مصر میں منیۃ بنی خصیب میں پیر کی رات نو شوال کو 671ھ میں ہوا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

# الجامع لاحکام القرآن

الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے یہ تفاسیر میں سے جلیل الشان تفسیر ہے کیونکہ یہ معانی القرآن کی وضاحت اور احکام کی تفصیل پر مشتمل ہے پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس میں قراءات، اعراب، شعری شواہد، لغوی مباحث، نحوی اور صرفی نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

آپ کا اسلوب یہ ہے۔

☆ سورت کی فضیلت اور اس کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں ہے۔
☆ نزول کا سبب بیان کرتے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ایسی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو اس سے متعلق ہوں اور جو الفاظ جن لغوی معانی کا احتمال رکھتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ اس بارے میں اشعارِ عرب سے تائید لاتے ہیں۔
☆ آیت کے متعلقہ احکام فقیہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان میں ائمہ کا اختلاف ذکر کرتے ہیں اور ہر ایک کے دلائل لاتے ہیں۔
☆ لفظ کے اشتقاق، باب اور اعراب کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی بعض اوقات ائمہ لغت کے اقوال کو بیان کرتے ہیں۔
☆ قراءات متواترہ اور غیر متواترہ کا ذکر کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب علمی موسوعہ ہے۔ جس میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف علوم کو جمع کر دیا ہے احکام القرآن کی تفصیل کی طرف خصوصی توجہ دی ہے، اسی پر کتاب کی بنیاد رکھی ہے اور اسے اسم با مسمّٰی بنا دیا ہے۔

# اس تفسیر کے اہم مصادر

1۔ المحرر الوجیز۔ یہ ابن عطیہ کی تفسیر ہے متوفی 546ھ
2۔ النکت والعیون۔ یہ ماوردی کی تفسیر ہے۔ متوفی 450ھ
3۔ تفسیر ابی اللیث۔ یہ ابولیث سمرقندی کی تفسیر ہے۔ متوفی 375ھ
4۔ تفسیر بغوی یہی معالم التنزیل ہے۔ متوفی 516ھ
5۔ الوسیط۔ یہ الواحدی کی تفسیر ہے اسباب النزول بھی انہی کی علمی کاوش ہے۔ متوفی 468ھ
6۔ معانی القرآن۔ اعراب بالقرآن اور الناسخ والمنسوخ یہ ابوجعفر نحاس کی کتب ہیں۔ متوفی 338ھ
7۔ التمہید، الاستذکار، الکافی اور الدرر وغیرہا یہ ابوعمر بن ابن عبداللہ کی کتب ہیں۔ متوفی 463ھ
8۔ احکام القرآن۔ یہ ابوبکر بن العربی کی تفسیر ہے متوفی 543ھ
9۔ معانی القرآن اس نام کی کتب یہ اخفش سعید متوفی 211ھ، یحییٰ بن زیاد الفراء 207ھ اور ابی اسحاق زجاج متوفی 311ھ تالیفات ہیں۔
10۔ مجاز القرآن یہ ابوعبیدہ متوفی 210ھ کی تالیف ہے۔
11۔ احکام القرآن للکیاہراسی متوفی 504ھ کی تالیف ہے۔
12۔ المفہم یہ ابوالعباس قرطبی متوفی 656ھ کی تالیف ہے۔
13۔ کتب احادیث جو مشہور و معروف ہیں۔

# تفسیر قرطبی کے مصادر کی تخریج

☆ بنیادی طور پر یہ فریضہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے دورہ حدیث کے طلباء نے اساتذہ کی نگرانی میں انجام دیا۔

☆ صحاح ستہ کے بارے میں ابتداءً یہ ہدایت دی گئی تھی کہ حکومت پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم نے جو کتب شائع کی ہیں ان کو ہی بنیاد بنایا جائے اور کتاب، باب اور صفحہ کو درج کیا جائے۔ عموماً صحاح ستہ کی کتب کی تخریج اسی طرح موجود ہے۔

☆ قریب ہی عرصہ میں ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے صحاح ستہ (مترجم) کو شائع کیا تو تھوڑے وقت میں یہ کوشش کی گئی کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ صحاح ستہ کی یہ احادیث جن کے نمبر درج ہیں وہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتب کے نمبرز ہیں۔

☆ تفسیری اقوال کے حوالے سے یہ گزارش ہے کہ جس تفسیر کا ذکر ہے اس کی اسی آیت کے ضمن میں وہ قول دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کتب مختلف مکتبوں نے شائع کی ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ صفحہ میں کچھ فرق ہو۔

☆ مسند امام احمد بن حنبل کے دو مطبوعوں کے حوالہ جات ہیں۔

1۔ مسند کی وہ حدیث جس کا نمبر درج ہے وہ مکتبہ دارالحدیث قاہرہ کی شائع شدہ ہیں۔

2۔ جلد اور صفحہ والی حدیث یہ دار صادر المکتب الاسلامی بیروت کے مطبوعہ کی ہے۔

# کچھ فاضل مترجمین کے بارے میں

## علامہ ملک محمد بوستان صاحب

زمانے کی بساط پر کوئی تحریک اسی وقت ابھرتی ہے جب اسے قائد کے بعد مدبر اور صاحب بصیرت کارکن میسر آجائیں۔کوئی ادارہ اسی وقت اوج کمال کو چھوتا ہے جب اسے سربراہ کے بعد پرعزم اور وفا شعار رفیق نصیب ہوجائیں۔ بلاشبہ ایسے کارکن اور رفیق قائد کا مان اور تحریک کی جان اور ادارے کی شان ہوتے ہیں۔ان کی انگان اور رفتار انہی کے کردار سے ہوتی ہے ایسے بلند ہمت نفوس قیمتی سرمایہ اور اثاثہ ہوتے ہیں۔چمن کا کاروبار انہی کے دم سے چلتا ہے۔

حضرت مولانا ملک محمد بوستان مدظلہ مفکر اسلام، مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی تحریک دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے ایک ایسے ہی کارکن اور رفیق ہیں جن پر ادارے کو بجا طور پر ناز اور فخر ہے بلاشبہ آپ تحریک سے فکری اور علمی ناطہ بھی رکھتے ہیں اور جبی اور قلبی رشتہ بھی۔

حضرت قبلہ ملک صاحب چکوال کے قریب ایک گاؤں کھوکھر زیریں میں جناب محترم عبدالرحمٰن صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ابتدائی دینی وعصری تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی۔

پھر قسمت مہربان ہوئی، رب رحمٰن کے دست کرم نے تھاما اور دبستان کرم میں لا بٹھایا۔ جہاں آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ظاہری و باطنی، علمی و روحانی فیوضات و برکات کی خوب خوشہ چینی کی، اپنی شخصیت کو نکھارا اسے پروان چڑھایا اور مطلع حیات پر علم وعمل کا پیکر بن کر ظاہر ہوئے۔

مڈل پاس کرنے کے بعد 21 مئی 1971ء کو آپ نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور 21 مئی 1981ء کو مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ فاضل اور اجل اساتذہ سے استفادہ کیا اور مہارت اور کمال حاصل کیا۔زمانہ طالب علمی کچھ اس دلسوزی جاں سپاری اور سرشاری سے گزارا کہ خود کو حضرت ضیاء الامت اور اپنے اساتذہ کی نگاہ میں اپنی مادر علمی کی ہر طرح کی خدمت کے لیے اہل ثابت کر دیا۔ چنانچہ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کا حق ادا کیا یوں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

فن تدریس میں اپنی منفرد شان رکھتے ہیں۔سبق کی پہلے زبانی جامع تقریر فرماتے ہیں پھر ترجمہ کرتے ہیں جس سے سبق اور کتاب دونوں سے ربط قائم ہوجاتا ہے۔سبق بھی سمجھ آجاتا ہے اور عبارت بھی سلجھ جاتی ہے۔مطالعہ آپ کی عادت ہے۔ بغیر مطالعہ کوئی سبق نہیں پڑھاتے۔تقریر خوش بیانی اور نکتہ آفرینی کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔

مرکزی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہونا اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔آپ نے اپنی لگن، محنت، ذوق اور اخلاص سے نہ صرف اس میدان میں اپنی جگہ بنائی بلکہ خود کو اس منصب کا اہل باور کرایا اور اپنے شیخ کے انتخاب کو سچ کر دکھایا۔ بلاشبہ قدرت

نے آپ کے وجود میں بہت جوہر رکھے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ خوب کھلے۔ اپنے خداداد تدبر فہم اور بصیرت کی بدولت جلد ہی آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ادارے کے معتمد کارکن اور رفیق شمار ہونے لگے۔ کسی کی نگاہ میں اپنا مقام بنانا آسان کام نہیں لیکن آپ نے اپنے جذبہ اخلاص اور سرفروشی سے اوائل سفر میں یہ کمال حاصل کر لیا۔

تعلیمی مسائل ہوں یا انتظامی، تنظیمی معاملات ہوں یا تحریکی، نصابی سرگرمیاں ہوں یا غیر نصابی، تعلیم کا سلسلہ ہو یا تربیت کا، قبلہ ملک صاحب کی ذات ہمیں ہر میدان میں متحرک اور سرگرم نظر آتی ہے۔

دماغ تو ہر کوئی رکھتا ہے لیکن اسے برمحل اور بروقت برتنے کی خوبی کوئی کوئی رکھتا ہے۔ دماغ سے سوچنا، سمجھنا اور مسئلے کا حل نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ قبلہ ملک صاحب میں یہ خوبی بھی ہے کہ آپ اپنے دماغ سے کام لینا خوب جانتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ درپیش مسئلے کے ہر پہلو کو سوچنا، پوری گہرائی سے اسے سمجھنا اور پھر حل نکالنا آپ کا نمایاں اور امتیازی وصف ہے۔ آپ اجتہادی فکر اور تجدیدی سوچ کے مالک ہیں۔ تعلیم و تدریس اور انتظام و انصرام میں آپ نے کئی نئی جہات متعارف کرائیں۔

کئی اضافی فرائض نبھاتے ہیں۔ قبلہ عالم حضرت جانشین ضیاء الامت کے معتمد اور مشیر خاص ہیں۔ تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن بھی ہیں۔ مرحلہ وار لجنۃ الامتحانات کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ ادارہ ضیاء المصنفین اور الکرم ویلفیئر فنڈ کی نگرانی بھی فرماتے ہیں۔ نصابی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

جامع مسجد بازار دالی میں عرصہ سے خطبہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔ آواز گو دھیمی ہوتی ہے مگر گفتگو علم و حکمت سے بھری ہوتی ہے۔ فکر و نظر کے نئے نئے زاویوں اور پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ سامع محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وجیہ اور حسین قد و قامت کے مالک ہیں۔ بدن نحیف اور حس لطیف رکھتے ہیں۔ نازک طبع اور منتظم مزاج ہیں نکتہ سنج اور معاملہ فہم ہیں۔ نظم و ضبط کے پابند اور قواعد و ضوابط پر کاربند۔ ذوق نفیس رکھتے ہیں اس لیے خوش خوراکی اور خوش لباسی کے عادی اور بروقت اور مناسب کام کرنے کے خوگر ہیں۔ گہری سوچ، عمیق نظر اور دقیق فکر آپ کی پہچان ہے۔ برملا رائے کا اظہار کرنا، اسے صائب سمجھتے ہوئے اس پر قائم رہنا جو کام پسند آ جائے اس پر خوش ہونا اور حوصلہ افزائی کرنا اور جو معیار پر نہ ہو اترے اس کی اصلاح کرنا آپ کا وتیرہ ہے۔ اور جسم کے نزاری اور صحت کی کمزوری کے باوجود اپنی جملہ ذمہ داریوں سے مستقل مزاجی سے عہدہ برا ہونا آپ کا وظیفہ ہے۔

قلم کے برتنے کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔ جہاں آپ نے علم کی دنیا کے دوسرے کئی میدانوں میں اپنی لیاقت کا سکہ جمایا ہے وہاں تحریر کے میدان میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ تفسیر بیضاوی (پارہ ۲۹۔ ۳۰)، قصیدہ بردہ (بوصیری) اور قیدہ اطیب النغم (شاہ ولی اللہ) کا عربی میں جامع حاشیہ تحریر فرمایا۔ نیز تفسیر مظہری (4 جلد) تفسیر درمنثور (2 جلد)، النبی محمد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کا ترجمہ بھی فرمایا جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ تفسیر قرطبی (4 جلد) جو ابھی زیر طبع ہے۔ فتاوی شامی کے ترجمہ پر بھی کام جاری ہے یہ سب آپ کے میدان تحریر میں بھی لیاقت و قابلیت کا ثبوت ہیں۔

# شیخ الحدیث پیر سید محمد اقبال شاہ گیلانی

اگر حضور رحمت عالمیان ﷺ کے اہل بیت کے سلسلۃ الذہب کو دیکھا جائے تو اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے حسین اور زیبا تر ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فیضان جو آپ نے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو عطا فرمایا تھا وہ اس نسب پاک کے ہر ہر فرد میں پورے جوبن پر نظر آتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے دیگر انساب کو دیکھتے ہیں تو بمشکل ایک یا دو فرد ہی علم وعرفان کے امین نظر آتے ہیں۔ لیکن نثار جائیے اس عظیم سلسلہ پر جہاں ہر آفتاب دوسرے سے درخشندہ تر اور ہر ماہتاب دوسرے سے تابندہ تر نظر آتا ہے کہیں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ لب پہ تبسم سجائے جام شہادت نوش کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں رضائے الٰہی کے حصول کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ بہتر تن وار دیتے ہیں کہیں امام زین العابدین اہل عبادت وریاضت کے لیے مینارۂ نور نظر آتے ہیں۔ کہیں امام باقر علم وعرفان کا نیر تاباں دکھائی دیتے ہیں کہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بحر معرفت کے شناور دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ جیسے نابغہ روزگار شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ ہر ہر فرد آسمان علم وحکمت کا مہر منیر نظر آتا ہے حتیٰ کہ مرج البحران یلتقیان کی طرح یہ سارے اوصاف حمیدہ اور شمائل سنیہ حضور غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسینی رضی اللہ عنہ کی ذات ستودہ صفات میں جمع ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث پیر سید ۔ اقبال شاہ گیلانی صاحب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک حسین کڑی ہیں آپ اپنے اسلاف عظام کی طرح نہ صرف جدید اور قدیم علوم سے مزین ہیں بلکہ خدائے تعالیٰ نے عرفان ومعرفت کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا ہے حتیٰ کہ مجھے ایک بزرگ نے فرمایا قبلہ شاہ صاحب کی نہ صرف من موہنی صورت اپنے اسلاف سے ملتی ہے بلکہ چال ڈھال میں بھی کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ علم کی بے کرانی کا عالم یہ ہے کہ قبلہ شاہ صاحب دورہ حدیث شریف کو بخاری شریف جیسی اہم کتاب پڑھا رہے ہیں اور عرفان ومعرفت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی سر سجدہ میں رکھ کر اپنے رب تعالیٰ کو راضی کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی درود پاک کو اپنی زبان کی زینت بنا کر بارگاہِ رسالت مآب میں ہدیہ عقیدت پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ انتہائی ظریف ہونے کے باوجود نہ کبھی تدریس میں بددیانتی کی ہے اور نہ ہی عبادت میں کمی۔

آپ کا اسم گرامی ''سید محمد اقبال شاہ گیلانی'' ہے۔ والد گرامی کا نام نامی سید محمد حسین شاہ گیلانی ہے آپ حضور غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد پاک سے ہیں۔ میانوالی کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ آپ کی پیدائش کا ضلع بنا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم، بعد ازاں میٹرک تک تعلیم ضلع میانوالی میں ہی حاصل کی۔ ہر امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد 1979ء کو دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا دوران تعلیم ایک ذہین اور ہونہار طالب علم کی حیثیت سے بلند مقام حاصل کیا۔ محنت شاقہ سے علم کے زینے طے کئے۔ 1988ء میں دار العلوم محمدیہ غوثیہ سے تعلیم کی تکمیل کی اور شہادت عالمیہ اور سند حدیث حاصل کی۔ پھر اپنے مرشد کریم، مفسر قرآن، عظیم سیرت نگار، حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے دار العلوم ضیاء

القرآن فاضل ضلع بھکر میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ بلند پایہ مدرس ثابت ہوئے طلباء کے دلوں میں محبت الٰہیہ اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی جوت جگائی۔ اس کے بعد 1993ء سے تا حال مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں مسند تدریس پر فائز ہیں۔ آپ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آپ 2000ء سے بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ یہ امر کتنا پرلطف اور دلکش ہے کہ گلشن رسالت کے گلہائے زیبا اہل بیت کا ایک شہزادہ ہی امت مرحومہ میں تقسیم کر رہا ہو۔

2001ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور عمرہ کی سعادت حاصل کی جبکہ 2006ء میں مجاہد ختم نبوت، پیر طریقت محمد امین الحسنات شاہ صاحب مدظلہ العالی نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی خلافت سے نوازا۔ 2011ء کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

آپ کا کمال یہ ہے کہ بخاری اور بیضاوی شریف جیسے اہم مضامین پڑھانے کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ضیائے حرم میں مختلف عنوانات پر مضامین حوالہ قرطاس کئے اور کچھ عرصہ تک ضیائے حرم کا فقہی کالم بھی لکھا، اس کے علاوہ علوم نبوت، حقیقت استمداد، بیعت کی شرعی حیثیت کے نام سے کتب تالیف کیں۔ درود پاک کی فضیلت پر منفرد کتاب ''القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع'' کا ترجمہ کرنے کی سعادت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ دیگر شاہکار کتب درج ذیل ہیں جنہیں آپ نے اردو قالب میں ڈھالا۔

1۔ تفسیر مظہری، تین جلدیں۔ 2۔ تفسیر درمنثور، دو جلدیں۔ 3۔ تفسیر قرطبی تین جلدیں، 4۔ زجاجۃ المصابیح۔ 5۔ بخاری شریف۔ 6۔ فضائل مدینہ۔

آپ اٹھارہ سال سے ضلع خوشاب میں ایک قبضہ روڈہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے خلوص اور محنت ولگن سے وہاں کی عوام میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ آپ کے دلپذیر خطبات کی وجہ سے کئی بے ریش افراد کے چہروں پر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجی اور عوام نہ صرف دلجمعی سے عبادات کے خوگر بنے بلکہ وہ اپنے معاملات بھی احسن انداز سے دین اسلام کے سنہری اصول پر چلانے لگے ہیں۔ آپ نے وہاں طلباء کے لیے دار العلوم محمدیہ غوثیہ کے نام سے اور طالبات کے لیے غوثیہ گرلز کالج کے نام سے دو ادارے قائم کیے ہیں۔ وہاں کے کثیر لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں۔

ان چند سطور میں آپ کے علمی کمالات اور روحانی فیضان کو قلمبند نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی سعادت کے لیے چند پھول آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں اس نیت سے کہ

''شاہاں چہ عجب اگر بنوازند گدارا''

## علامہ محمد انور مگھالوی

ادیان عالم میں اللہ تعالیٰ نے جس دین کو اپنا دین قرار دیا جسے سند قبولیت سے نوازا اور جسے تمام ادیان پر غالب کیا وہ دین اسلام ہے۔ چنانچہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمہ کرم پر لی۔ اس کی سنت جاریہ ہے کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کا یہ کام اپنے منتخب بندوں سے لیتا ہے۔ اس نے اپنے کسی بندے کو خدمت دین کی سعادت ارزانی فرمانا ہوتی ہے اور اس کی ذات کو دوسروں کے لیے نفع بخش اور فیض رساں بنانا ہوتا ہے تو وہ اپنی خاص رحمت فرماتے ہوئے اسے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے جو پھر قرآن مجید کے حکم ''ولتکن منکم امۃ'' کی تعمیل کرتے ہوئے حفاظت دین کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہمارے ممدوح حضرت مولانا ابو العرفان محمد انور مگھالوی مدظلہ بھی انہی پاک نہاد اور بخت رسا نفوس میں سے ایک ہیں جنہیں دین کا فہم اور بصیرت عطا کر کے اس کی خدمت کی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت مولانا قبلہ 16 اپریل 1959ء کو ضلع چکوال کی تحصیل چواسیدن شاہ کے ایک معروف گاؤں وعولہ میں حضرت الحاج حافظ نور محمد صاحب کے علمی وروحانی گھر میں پیدا ہوئے۔

حضرت قبلہ حافظ صاحب علاقے کی مشہور دیندار، بارسوخ اور علم وفضل کی مالک شخصیت ہیں۔ آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف کے دیرینہ اور مخلص متوسلین میں سے ہیں۔ قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ چالیس سال قریبی گاؤں مگھال میں پوری تندہی سے امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیئے۔ ہزاروں کو قرآن مجید کی تعلیم سے بہرہ ور کیا اور قرآن کے نور سے ان کے قلوب واذہان کو جلا بخشی۔ یہ قرآن سے الفت، دین سے محبت اور آستانہ عالیہ سے عقیدت ہی ہے کہ اپنی تمام اولاد کو بھی حافظ قرآن اور عالم دین بنایا اور اپنے پوتوں اور نواسوں کو بھی خدمت دین پر مامور کیا۔

حضرت مولانا قبلہ نے جب شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید ناظرہ اپنے پدر بزرگوار سے پڑھا۔ پرائمری اور مڈل کی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی۔ قسمت نے یاوری کی قدرت نے مہربانی کی گورنمنٹ مڈل سکول ڈلوال میں ابھی ساتویں جماعت میں تھے کہ مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری مگھال تشریف لائے اور انہیں حافظ صاحب سے اپنے لیے مانگ لیا۔ پھر کیا تھا مراد بن کر دبستان کرم بھیرہ شریف میں آگئے اور یہیں ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دیئے۔

یکم مئی 1977ء کو مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور اپریل 1983ء مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔ چنانچہ حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کی علمی برکات سے بھی مستفید ہوئے اور روحانی فیوضات سے بھی مستفیض ہوئے۔ علاوہ ازیں شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الفقہ مولانا محمد فاضل، شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری، شیخ الادب مولانا الحاج ملک عطا محمد، مولانا محمد سعید اسعد، مولانا عبدالرزاق صدیقی، مولانا رب نواز اجمیری، مولانا محمد رفیق چشتی، پروفیسر حافظ احمد بخش اور پروفیسر محمد اسلم چوہدری جیسے فاضل اور اہل اساتذہ سے صرف، نحو، لغت، بلاغت ادب، انشا، تاریخ،

منطق، فلسفہ، فقہ واصول فقہ، حدیث واصول حدیث، تفسیر واصول تفسیر وغیرہ جیسے قدیم فنون اور انگریزی، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ جیسے جدید علوم میں درک حاصل کر کے ان میں کمال پیدا کیا۔

مقصد عظیم اور منزل ارفع ہو۔ ذہن میں کچھ کرنے کا سودا سمایا اور دل میں کچھ پانے کی لگن لگی ہو تو زندگی کا رنگ خود بدل جاتا ہے۔ حضرت مولانا اپنے مرشد کے حکم سے دین کی راہ پر نکلے تھے اس لیے اس راہ کی نزاکتوں اور تقاضوں کا ادراک کیا۔ حد درجہ محنتی، فرض شناس اور ذمہ دار طالب علم واقع ہوئے۔ زمانہ طالب علمی بڑی جاں سوزی، جگر کاوی اور عرق ریزی سے گزارا۔ نیز تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ اور اساتذہ کی خدمت کو بھی اپنی تعلیم وتربیت کا جزو بنایا جس کا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر اور عکس نظر آتا ہے۔ طبیعت میں سادگی، علم میں پختگی اور عمل میں پاکیزگی اسی خدمت کی برکت ہے۔

ستمبر 1983ء کو عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت کے حکم پر مرکزی دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ آپ کے لیے اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔ تاہم آپ نے پورے تدبر اور بصیرت سے اس کا پاس کیا۔ انتھک محنت اور اخلاص سے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے ادا کئے کہ خود کو بہت تھوڑی سی مدت میں کامیاب مدرسین کی صف میں لا کھڑا کیا بلکہ فن تدریس کو ایک نئی جہت دی صرف ونحو آپ کے خاص مضمون ٹھہرے۔ سبق کی جب تقریر فرماتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے لفظوں کی آبشار رواں ہوگئی ہو۔ کمزور ترین ذہن بھی خالی دامن نہیں اٹھتا۔ سبق کے جملہ پہلوؤں پر کامل دستگاہ، مطالعہ کی وسعت، لفظوں کے معانی کو ذہنوں میں اتار کر انہیں نقش کرنے پر قدرت آپ کی خاص پہچان ہے۔

تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن اور مرحلہ وار شعبہ امتحانات کے سکریٹری کے اضافی فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ فن تدریس کے ساتھ فن خطابت کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ خطاب میں زور بیان بھی ہوتا ہے اور معانی کا سیل رواں بھی۔ جامع ڈلوال میں 1979ء سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں جو اس فن میں آپ کی لیاقت اور قابلیت پر شاہد ہے۔

آپ نے ظاہری علوم کے ساتھ حضرت ضیاء الامت کے روحانی فیوضات سے بھی حظ وافر پایا ہے اس لیے عامل بھی ہیں اور روحانی بیماریوں کا مداوا اور علاج بھی کرتے ہیں۔ دبستان کرم کے پروردہ ہیں اس لیے قلم کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم کیا اور اسے اپنے ذوق سے پروان چڑھایا اور جلد ہی اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ علمی وتحقیقی کام کر چکے ہیں جو اس فن میں آپ کی مہارت اور دسترس کا ثبوت ہے۔ ''فقہ حنفی کے اساسی قواعد، الوصول الی الاصول فی اصول الفقہ، ضیاء علم الحدیث اور ایام قربانی اور اس کے مسائل'' تالیف فرمائیں۔ زبدۃ الاتقان، تفسیر مظہری، تفسیر درمنثور، تفسیر قرطبی، سنن ابی داؤد اور فضائل مدینہ کا ترجمہ بھی فرمایا۔ فتاویٰ شامی (ج 4) کے ترجمہ پر کام جاری ہے اس کے علاوہ ماہنامہ ضیائے حرم اور مجلہ جمال کرم کے لیے متعدد متنوع موضوعات پر مضامین تحریر فرمائے ہیں۔

عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بلاشبہ ان تمام اوصاف اور خواص کے بھی حامل ہیں جو ایک عالم دین کے ماتھے کا جھومر اور شان ہوتے ہیں۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ سنجیدہ، مہمان نواز اور ملنسار ہیں۔ سب سے محبت اور اپنائیت سے ملتے ہیں۔ کشادہ ذہن، فراخ دل مہربان اور مشفق ہیں۔ گفتگو خوب فرماتے ہیں جو خوش مزاجی اور لطافت سے لبریز ہوتی ہے۔

## علامہ شوکت علی چشتی

دین کی نعمت، خدمت اور اس کی تبلیغ کی سعادت سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے اور بڑا خوش بختی کا کام نہیں۔ یہ خوش بختی صرف اسے نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کے لیے پسند کر لیتا ہے۔ جس پر ذات باری خیر کے دروازے کھولنے کا ارادہ کرتی ہے۔ جسے دوسروں کے لیے نفع رساں بنانا مقصود ہوا سے وہ اپنے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

برادرم مولانا شوکت علی چشتی صاحب بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نعمت، اس کی خدمت اور تبلیغ کی توفیق اور سعادت ارزانی فرمائی۔

مولانا موصوف 22 جون 1976ء کو ضلع چکوال کی تحصیل تلہ گنگ کے ایک گاؤں سگھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ گورنمنٹ ہائی سکول سگھر سے پرائمری اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گھرانہ علم دوست اور روحانیت پسند تھا۔ چنانچہ علم کا شوق اور دین کا ذوق کشاں کشاں بھیرہ شریف لے آیا جہاں 1990ء میں عالم اسلام کی عظیم مثالی درسگاہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا۔ مفکر اسلام، مفسر قرآن، نباض عصر حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز اور مجاہد ملت امین حسن کرم قبلہ عالم، حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ کے زیر سایہ علوم اسلامیہ وعربیہ کی تکمیل کی اور جید اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔

شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا مفتی قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب الحاج ملک عطا محمد مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا ملک عبدالرزاق صدیقی مدظلہ، علامہ ملک محمد بوستان مدظلہ، علامہ محمد انور مگھالوی مدظلہ نمایاں اساتذہ میں سے ہیں۔

طلب دین کا جذبہ وافر پایا تھا اس لیے اکتساب اور تحصیل کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے۔ دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا جامعہ نظامیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا علی احمد سندیلوی سے حدیث مسلسلات کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت ضیاء الامت سے کلام اقبال پڑھنے کی سعادت بھی حصے میں آئی۔

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سے میٹرک، ایف اے، بی اے کے ساتھ ادیب عربی، عالم عربی، فاضل عربی اور الشہادۃ العالمیہ کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے۔ 2000ء میں فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں ماسٹر کیا۔ اس کے بعد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ جو بڑے اعزاز کی بات ہے۔ جلد ہی اپنی لگن اور محنت سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔ قابل اور لائق جونیئر سٹاف میں شمار ہوتے ہیں۔

تدریسی قابلیت کے ساتھ ساتھ قلمی صلاحیت بھی پائی ہے۔ قلم وقرطاس سے بھی گہرا والہانہ رشتہ رکھتے ہیں۔ ماہنامہ

ضیائے حرم، طلبہ کے ترجمان سیریل شاہین اور دیگر کئی رسائل میں مختلف علمی وفکری عنوانات پر لکھتے رہتے ہیں۔2000ء میں حضرت ضیاء الامت کے شہرہ آفاق ترجمہ ''جمال القرآن'' کے مفردات پر کام کیا جسے بیحد پذیرائی ملی۔ جمال القرآن کے ترجمہ کی ریکارڈنگ کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔مشہور قاری بزرگ شاہ الازہری کی تلاوت کے ساتھ اردو ترجمہ کی ڈبنگ کے لیے آپ ہی کی آواز کا انتخاب ہوا۔

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے عنوان سے ورکشاپ منعقد ہوئی۔دارالعلوم کی طرف سے نمائندگی کا اعزاز آپ کے حصے میں آیا۔ایسے سلسلوں میں آپ یہ اعزاز حاصل کرتے رہتے ہیں خطابت اور نقابت کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔سرگودھا شہر کی ایک مرکزی مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ جہاں ہزاروں اہل اسلام آپ کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ادارہ کی تقریبات کی نقابت بڑی خوبی سے سرانجام دیتے ہیں جسے سامعین بڑا سراہتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ سلسلہ ارادت بھی آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف سے رکھتے ہیں۔1993ء میں حضرت ضیاء الامت کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔یہ دوسرا اعزاز ہے جو نصیب ہوا۔

متحرک، سرگرم اور باہمت ہیں راہ وفا پہ گامزن ہیں، پرعزم ہیں۔اس لیے مشن کے فروغ کے لیے اپنے من تن دھن سے کوشاں رہتے ہیں اور سوئے منزل محو سفر رہتے ہیں۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر الجامع لاحکام القرآن کے ترجمہ کی بھی سعادت ارزانی ہوئی، یہ ادارہ ضیاء المصنفین کی آپ پر اعتماد کی دلیل اور ثبوت ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم کو اور بہتر کرے اور علمی، فکری ترقی عطا فرمائے۔آمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# مقدمہ

وَبِهٖ نَسْتَعِيْنُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا

شیخ فقیہ امام عالم عامل، علامہ محدث ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری خزرجی اندلسی ثم قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہر حمد کرنے والے سے پہلے خود اپنی تعریف کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو سب کو پالنے والا ہے، بے نیاز ہے، یکتا ہے، حیی و قیوم ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، صاحب عزت و اکرام ہے، بڑے بڑے عطیات کا مالک ہے، قرآن کے ساتھ کلام کرنے والا ہے، انسان کا خالق ہے، انسان پر ایمان کا انعام فرمانے والا ہے، بیان کے ساتھ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب تک رات اور دن کی گردش رہے اور جب تک صبح و شام کا تبادلہ ہوتا رہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایسی واضح کتاب کے ساتھ بھیجا جو شک اور یقین میں فرق کرنے والی ہے، جس کے چیلنج نے بڑے بڑے فصحاء کو عاجز کر دیا، جس کے مقابلہ نے بڑے زیرک لوگوں کو بے بس کر دیا، جس کی معارضت و مشاکلت نے بلغائے عرب کو گنگ کر دیا، وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال کو غور و فکر کرنے والے کے لئے عبرت بنایا، اس کے اوامر کو اس کے لیے ہدایت بنایا جس نے ان میں بصیرت سے دیکھا اور اس کتاب مبین میں احکام کے واجبات کو واضح فرمایا، اس میں حلال و حرام کو واضح کیا، اس میں سمجھنے کے لئے مواعظ اور قصص کا تکرار فرمایا، اس میں مثالیں بیان فرمائیں، غیب کی خبریں بیان کیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام:38) (نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو) اس کے ساتھ اپنے اولیاء (دوستوں) کو خطاب فرمایا، پس انہوں نے اس کو سمجھا اور ان کے لئے اس کی مراد کو بیان فرمایا۔ پس وہ جان گئے، پس قرآن کو پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کے خلفاء اور اس کے امین ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے قریبی، خاص، چیدہ اور منتخب لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ہم میں سے کچھ اللہ کے اہل ہیں۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: قرآن کے اہل، اللہ کے اہل اور اس کے خاص بندے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، ابو بکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ پس جس نے اللہ کی کتاب کا علم حاصل کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نواہی سے رکنے، جو اس میں وضاحت کی گئی ہے اس میں غور و فکر کرنے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کا خوف کرنے، اس کے احکامات کا خیال کرنے اور اس سے حیاء کرنے کا کتنا مستحق ہے، کیونکہ اس پر رسل کا بوجھ ڈالا گیا ہے، وہ قیامت کے روز دوسری ملتوں کے مخالفین پر گواہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ:143) (اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے

1۔ ابن ماجہ، باب فضل من تعلم القرآن و علمہ، حدیث نمبر 210، (مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز)

مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر)۔

خبردار! جس نے اس کا علم حاصل کیا پھر اس سے غافل ہوا اس پر یہ حجت ہے، اور جو اس سے کوتاہ ہوا اور جاہل ہوا اس پر اس حجت کو مؤکد کیا۔ جس کو علم قرآن عطا کیا گیا اور پھر اس نے نفع نہ اٹھایا، اس کے نواہی نے اسے جھڑکا اور وہ باز نہ آیا اور اس نے قبیح گناہوں کا ارتکاب کیا اور رسوا کن جرائم کا مرتکب ہوا، قرآن اس پر حجت ہوگا اور اس کا مدمقابل ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے'' (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، پس جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے خاص فرمایا اسے قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، اور اس کی عبارت کے حقائق میں غور وفکر کرے اور اس کے عجائب کو سمجھے اور اس کے غرائب کو بیان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (ص:29) (یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اس کی آیتوں میں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں سے بنائے جو اس کی پوری پوری رعایت کریں اور اس میں اچھی طرح غور وفکر کریں، اس کے حق کو ادا کریں اور اس کی شرائط کو پورا کریں اور اس کے علاوہ کسی سے ہدایت تلاش نہ کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ظاہری اعلام اور قطعی احکام سے ہدایت دے اور ہمارے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی کو اس کے ذریعے جمع فرمائے۔ وہ اہل التقویٰ اور اہل المغفرۃ ہے۔ پھر اس نے اس قرآن میں جو مجمل تھا اس کا بیان اور اس کے مشکل کی تفسیر، اس کے محتمل کی تحقیق اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپی تاکہ رسالت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اس اختصاص کا ظہور اور تفویض کا مرتبہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل:44) (اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے معانی پر جو تنبیہ فرمائی اور اس کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا اس کے استنباط کا فریضہ علماء کو بخشا تاکہ اس میں کوشش ومحنت کے ذریعے علم المراد تک پہنچیں اور وہ دوسروں سے ممتاز ہو جائیں اور اپنی کوشش کے ثواب سے مختص ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ:11) (اللہ تعالیٰ ان کے، جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا، درجات بلند فرمائے گا۔) پس کتاب اصل ہے اور سنت اس کا بیان ہے اور علماء کا استنباط اس کی وضاحت ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے ہمارے سینوں کو اپنی کتاب کے لئے ظرف بنایا، ہمارے کانوں کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا مورد بنایا اور ہماری ہمتوں کو ان کی تعلیم، ان کے معانی اور غرائب کے متعلق بحث کے لئے پھیر دیا۔

ہم اس کے ساتھ رب العالمین کی رضا کے طالب ہیں اور ملت اور دین کے علم تک اس کے ذریعے داخل ہونے والے ہیں۔

حمد وتعریف کے بعد! جب اللہ تعالیٰ کی کتاب جو تمام علوم شرعیہ کی کفیل ہے، جس نے سنت اور فرض کو قائم فرمایا، اس

1۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، جلد 1 صفحہ 119، مطبوعہ وفاقی وزارۃ تعلیم

کے ساتھ آسمان کا امین (جبرئیل امین) زمین کے امین (حضرت محمد ﷺ) کی طرف اترا تو میرا ارادہ ہوا کہ میں اپنی عمر اس میں مشغولیت کے ساتھ گزاروں اور اس میں اپنی ساری قوت وصلاحیت صرف کروں، اس طرح کہ میں اس کے متعلق مختصر سی تعلیق لکھوں، جو تفسیری، لغوی، ترکیبی اور قراءت کے نکات اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو، اس میں گمراہ اور کج رو لوگوں کا رد ہو اور ایسی احادیث کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو جو ان احکام اور نزول آیات کی دلیل ہوں جن کو ہم ذکر کریں اور قرآن وسنت کے معانی کی وہ تعلیق جامع ہو اور سلف وخلف کے اقوال کے ساتھ مشکل الفاظ کو بیان کرنے والی ہو۔ میں نے اپنے نفس کی نصیحت کے لئے یہ عمل کیا اور قبر کے دن کے لئے ذخیرہ اور اپنی موت کے بعد باقی رہنے والے علم صالح کے طور پر یہ عمل کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ (القیامہ) (آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) پیچھے چھوڑے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ (الانفطار) (اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے اور جو اثرات وہ پیچھے چھوڑ آیا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال سے اس کا ثواب منقطع نہیں ہوتا: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور نیک بیٹا جو اس کے لئے دعا کرتا ہے''۔(1)

اس کتاب میں میری شرط یہ ہے کہ اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب کروں گا اور احادیث کی ان کے مصنفین کی طرف نسبت کروں گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی برکت میں سے یہ ہے کہ قول کو اس کے قائل کی طرف مضاف کیا جائے۔ اکثر احادیث کتب فقہ اور تفسیر میں مبہم ہوتی ہیں اور جس نے اس کو نقل کیا ہوتا ہے اسے نہیں پہچانتا مگر جو کتب حدیث پر مطلع ہوتا ہے، پس پڑھنے والا حیران وپریشان رہتا ہے۔ نہ وہ صحیح وسقیم کو جانتا ہے حالانکہ اس کی معرفت ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس کی طرف سے اس کے ساتھ احتجاج کو اور استدلال کو قبول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ وہ اس کی طرف حدیث کو منسوب کرے جو ائمہ اعلام اور مشاہیر ثقہ لوگوں میں سے ہے جس نے اس کو نقل کیا ہے اور ہم اس کتاب میں ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ صحیح بات کی توفیق دینے والا ہے۔ اور میں مفسرین کے بہت سے قصص اور مؤرخین کی اخبار سے اجتناب کروں گا مگر جن کا ذکر ضروری ہوگا اور وضاحت کی خاطر ان کا چھوڑنا ممکن نہ ہوگا اور احکام کی آیات کو بیان کرنے کے لئے میں ایسے مسائل سے تائید دوں گا جن سے ان کا معنی واضح ہو جائے گا اور جو طالب کی ان احکام کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ ہر آیت کے ضمن میں ایک، دو یا زیادہ احکام ہوتے ہیں، اس میں ہم ہر آیت کے تحت اسباب نزول، تفسیر غریب اور حکم میں سے جو اس کے متعلق احکام ومسائل ہوں گے انہیں بیان کریں گے اور اگر کوئی حکم اپنے ضمن میں نہ رکھتی ہوگی تو میں اس میں تفسیر وتاویل ذکر کروں گا۔ اسی طرح آخر کتاب تک ہوگا۔

میں نے اس کتاب کا نام ''اَلْجَامِعُ لِاَحْكَامِ الْقُرْاٰنِ وَالْمُبَیِّنُ لِمَا تَضَمَّنَهٗ مِنَ السُّنَّةِ وَآيِ الْفُرْقَانِ'' رکھا۔ اللہ تعالیٰ اسے خاص اپنی رضا کے لئے کرے اور اس کے ذریعے مجھے اور میرے والدین کو نفع پہنچائے اور اللہ تعالیٰ دعا کو سننے والا ہے، قریب ہے، قبول فرمانے والا ہے۔ آمین

---

1۔ مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ، جلد 2 صفحہ 41

باب

# فضائل قرآن

## قرآن میں رغبت دلانا، اس کے طالب، قاری، سننے والے اور اس کے عامل کی فضیلت

جان لو کہ یہ باب بہت بڑا وسیع ہے۔ اس میں علماء نے کثرت سے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم ان میں سے چند نکات ذکر کریں گے جو اس کی فضیلت پر دلیل ہوں گے اور حاملین قرآن کے لئے الله تعالیٰ نے جو ثواب اور جزا تیار کر رکھی ہے اس پر دلالت کریں گے جب کہ ان کی طلب خالص الله تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ سب سے پہلے تو مومن اس کی فضیلت میں سے یہ سمجھے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے، کلام غیر مخلوق ہے، اس ذات کا کلام ہے جس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ اس کی صفت ہے جس کی نہ شبیہ ہے، نہ اس کا مدمقابل ہے، وہ اس کی ذات کا نور ہے، اور قراءت، قراء کی آوازیں اور ان کے نغمات یہ ان کے کسب ہیں جن کا بعض عبادات میں ایجابی حالت میں ان کو حکم دیا جاتا ہے اور اکثر اوقات میں استحبابی طور پر حکم دیا جاتا ہے اور ان کو اس سے جھڑکا جاتا ہے جب وہ اجتناب کرتے ہیں اور ان کے کرنے پر انہیں ثواب دیا جاتا ہے اور ان کے ترک پر انہیں سزا دی جاتی ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور آثار اس کے مطابق گواہ ہیں۔ اس پر مشہور اخبار دلیل ہیں اور ثواب وعقاب کا تعلق بندوں کے کسب کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اگر الله تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں اس کو اٹھانے کی وہ قوت نہ رکھتا جو اس نے ان میں رکھی تا کہ وہ اس میں غور وفکر کریں، عبرت حاصل کریں اور اس میں جو طاعت وعبادت، حقوق وفرائض کی ادائیگی ہے اس میں تذکیر کریں، تو اس کے بوجھ سے انسانوں کے دل کمزور پڑ جاتے اور لرز جاتے، انہیں اس کے اٹھانے کی کیسے طاقت ہوتی، خود الله تعالیٰ فرماتا ہے اور اس کا قول حق ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر: 21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا الله کے خوف سے) دلوں کی قوت کا پہاڑوں کی قوت سے کہاں مقابلہ ہے لیکن الله تعالیٰ نے بندوں کو خود اس کے اٹھانے کی قوت بخشی۔ یہ اس کا فضل اور رحمت ہے۔

## وہ آثار جو اس باب کے متعلق آئے ہیں

سب سے پہلا وہ جو امام ترمذی نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله تعالیٰ فرماتا ہے: ''جس کو قرآن اور میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھتا ہے میں اسے اس سے افضل دیتا ہوں جو میں مانگنے والوں کو دیتا ہوں۔ فرمایا: الله تعالیٰ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر اس طرح ہے جس طرح الله تعالیٰ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (1)۔ ابو محمد الدارمی السمرقندی نے اپنی مسند میں حضرت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفضائل، باب فضل کلام الله علی سائر الکلام، حدیث نمبر 2850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: (اس کی سورتوں میں سے) سبع طُوَل تورات کی مثل ہیں، المئون (سو آیات والی سورتیں) انجیل کی مثل ہیں اور مثانی سورتیں زبور کی مثل ہیں۔ اس کے بعد تمام قرآن زیادہ ہے۔ حارث نے حضرت علی سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ''تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ ان سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب جس میں پہلے لوگوں کے واقعات بھی ہیں اور تمہارے بعد کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے درمیان ہے اس کا حکم بھی ہے۔ یہ فصل (واضح حکم) ہے، مزاح نہیں ہے۔ جو جابر اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ دے گا اور جو اس کے علاوہ کسی کتاب سے ہدایت کی تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور واضح نور ہے۔ ذکر حکیم ہے، یہ صراط مستقیم ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ خواہشات ٹیڑھی نہیں ہوتیں، زبانیں اس کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتی، اس کے ساتھ آراء بکھرتی نہیں ہیں اور اس سے علماء سیر نہیں ہوتے ہیں۔ متقی لوگ اس سے اکتاتے نہیں ہیں، بار بار دہرانے کے باوجود یہ بوسیدہ نہیں ہوتا اور اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ کلام ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو انہوں نے اس کا انکار نہ کیا۔ انہوں نے کہا: ہم نے عجب قرآن سنا ہے۔ جس نے اس کا علم حاصل کیا وہ سبقت لے گیا، جس نے اس کے ساتھ بات کی اس نے سچ کہا، جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا اسے اجر ملا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کی۔ اے اعور! اس کو مضبوطی سے پکڑ لے'' (1)۔ شعبی نے حارث کو جھوٹا کہا ہے اور یہ کچھ نہیں ہے اور حارث سے جھوٹ ظاہر نہیں ہوا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت میں افراط کی وجہ سے اور دوسرے صحابہ پر حضرت علی کو فضیلت دینے کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ ناراضگی کی بات کی گئی۔ اسی بناء پر۔ واللہ اعلم۔ شعبی نے اسے جھوٹا کہا ہے کیونکہ شعبی کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور وہ سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت ابوعمر بن عبدالبر نے کہا: میرا گمان ہے، شعبی کو اپنے اس قول کی وجہ سے سزا دی گئی، جو انہوں نے حارث ہمدانی کے بارے میں کہا (نہ کہ حارث اعور کے بارے میں) کہ مجھے حارث نے بیان کیا اور وہ جھوٹوں میں سے ایک تھا۔

ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی لغوی نے اپنی کتاب ''الرد علی من خالف مصحف عثمان'' میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، پس تم اس سے اپنی طاقت کے مطابق سیکھو، یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، یہ نور مبین اور شفا نافع ہے، جس نے اس کو مضبوطی سے پکڑا اس کے لئے حفاظت ہے اور جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے نجات ہے، ٹیڑھے کو سیدھا کرتا ہے اور کج رو کو درست کرتا ہے، اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے اور بار بار پڑھے جانے کی وجہ سے بوسیدہ نہیں ہوتا، پس تم اس کی تلاوت کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تلاوت پر ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں کا اجر دے گا، میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے۔ میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ ایک پاؤں رکھے ہوئے سورۂ بقرہ کو پڑھنا چھوڑ دے کیونکہ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے اور خیر سے خالی گھروں میں سے وہ گھر ہے جو کتاب اللہ سے خالی ہے (1)۔ ابو عبید نے اپنی غریب میں حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، جو اس میں داخل ہوگا وہ امن میں ہوگا۔ فرمایا: حدیث کی تاویل یہ ہے کہ قرآن کو ایسے کام سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے کرتا ہے۔ اس میں ان کے لئے خیر اور منافع ہیں۔ پھر اس نے انہیں اس کی طرف بلایا۔ کہا جاتا ہے: مادُبة، و مادَبة۔ جس نے مادُبة کہا اس نے اس کام کا ارادہ کیا جو انسان کرتا ہے پھر اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور جس نے مأدَبة کہا وہ اس سے ادب کا مفہوم لیتا ہے اور الادب سے مَفْعَلَة بناتا ہے، ایک اور حدیث سے وہ حجت لیتا ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی ادب گاہ ہے اس کے اخلاق سے سیکھو۔ احمر، ان دونوں لغتوں کو ہم معنی بناتا تھا میں نے اس کے علاوہ کسی کو یہ کہتے نہیں سنا۔ فرمایا: پہلی تفسیر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

بخاری نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: "تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور قرآن سکھائے" (2)۔ مسلم نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے لیموں جیسے پھل (سنگترہ) کی ہے، جس کی خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی میٹھا ہوتا ہے اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال نیاز بو کی ہے جس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی سی ہے جس کی خوشبو بھی نہیں ہوتی اور ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے"۔ ایک روایت میں منافق کی مثال کی جگہ فاجر کی مثال کے الفاظ ہیں (3)۔ بخاری نے کہا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال لیموں جیسے پھل کی سی ہے جس کا ذائقہ اچھا ہوتا ہے اور خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا وہ کھجور کی مثل ہے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

ابوبکر الانباری نے ذکر کیا ہے: ہمیں احمد بن یحییٰ الحلوانی نے خبر دی، انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن عبدالحمید نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا۔ دوسری سند میں ہے: ہمیں ادریس نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا، انہوں نے العوام بن حوشب سے روایت کیا کہ ابو عبدالرحمن السلمی پر جب قرآن ختم کرنے والا قرآن ختم کرتا تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتے اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے اور اسے کہتے: اے فلاں! اللہ سے ڈر، میں تجھ سے بہتر کوئی شخص نہیں جانتا اگر تو اس کے مطابق عمل کرے جو تو نے جان لیا ہے۔ دارمی نے وہب الذماری سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ قرآن دیتا ہے اور وہ رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور اس

---

1۔ مستدرک حاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر 4639، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وقصرہا، باب فضیلۃ حافظ القرآن

4۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن علی سائر الکلام، حدیث نمبر 4671، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور اطاعت پر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن سفرہ اور احکام کے ساتھ اٹھائے گا۔ سعید نے کہا سفرہ سے مراد ملائکہ ہیں اور احکام سے مراد انبیاء ہیں۔

مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کا ماہر معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے اس کی زبان سے تع تع نکلتا ہے اور اس پر اس کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے تو اسے دو اجر ملیں گے (1)۔ ایک اجر تلاوت کا ملے گا اور ایک اجر مشقت کا ملے گا اور ماہر کے درجات اس سے بلند ہیں، کیونکہ اس پر پہلے قرآن کا پڑھنا مشکل تھا پھر وہ اس سے ترقی کر گیا اور فرشتوں کے مشابہ ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے اس کے بدلے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا بدلہ دس نیکیاں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے، لیکن الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے (2)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ ایک طریق سے یہ موقوف بھی روایت کی گئی۔ مسلم نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جبکہ ہم صفہ میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ روزانہ بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے دو بلند کوہانوں والی اونٹنیاں لے آئے جبکہ نہ اس میں گناہ ہو، نہ قطع رحمی۔ ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم سب یہ پسند کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم میں سے کوئی صبح کے وقت مسجد کی طرف جائے پھر علم حاصل کرے یا کتاب اللہ میں سے دو آیتیں پڑھے جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور تین آیتیں، تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں، چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور انہی کی تعداد میں اونٹوں سے بہتر ہیں۔ (3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور کرے گا۔ جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا، اور جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے اور جو ایسے راستہ پر چلتا ہے جس میں وہ علم کا متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہیں ہوئی (جس میں) وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں اس کا تکرار کرتے ہیں مگر ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان کے اندر کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور جو قرآن پر عمل میں سستی کرے گا اس کا نسب اسے جلدی (جنت میں)

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الماھر بالقرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن الخ، حدیث نمبر 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءۃ القرآن فی الصلاۃ

نہیں لے جائے گا''۔(1)

ابوداؤد، نسائی، داری اور ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: ''قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے والا، علانیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور آہستہ قرآن پڑھنے والا، خفیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے''۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے(2)۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''قیامت کے روز صاحب قرآن آئے گا اور کہے گا: یارب! کپڑوں کا جوڑا۔ تو صاحب قرآن کو کرامت کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یارب! اس میں اضافہ فرما۔ پھر صاحب قرآن کو کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یارب! تو اس بندے سے راضی ہو جا۔ تو اللہ تعالیٰ اس حامل قرآن سے راضی ہو جائے گا۔ اسے کہا جائے گا: تو پڑھ اور اوپر چڑھ، ہر آیت کے بدلے ایک نیکی کا اضافہ کیا جائے گا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے(3)۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا: پڑھ اور اوپر چڑھ اور قرآن اس طرح ترتیل سے پڑھ جس طرح دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا۔ بے شک تیری منزل اس آخری آیت کے پاس ہو گی جو تو تلاوت کرے گا(4)۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا جب وہ جنت میں داخل ہو گا: پڑھ اور اوپر چڑھ۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک درجہ اوپر چڑھتا جائے گا حتیٰ کہ وہ آخری آیت پڑھے گا جو اس کے پاس ہو گی۔

ابوبکر الانباری نے ابوامامہ الحمصی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کو قرآن کا تہائی دیا گیا اسے نبوت کا تہائی دیا گیا اور جسے قرآن کے دو ثلث دیے گئے اسے نبوت کے دو ثلث دیے گئے اور جس نے پورا قرآن پڑھا اسے پوری نبوت (کا فیضان) ملا مگر اس کی طرف وحی نہیں کی جاتی، اسے قیامت کے دن کہا جائے گا: قرآن پڑھ اور ترقی کر، وہ ایک آیت پڑھے گا اور ایک درجہ بلند ہو گا حتیٰ کہ وہ پورا قرآن پڑھ لے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: مٹھی بند کر۔ وہ مٹھی بند کرے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: کیا تو جانتا ہے تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو اس کے دائیں ہاتھ میں خلد ہو گا اور بائیں ہاتھ میں نعمتیں ہوں گی۔

ادریس بن خلف نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بتایا انہوں نے تمام سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن کا ثلث (۱/۳) حاصل کیا اور اس پر عمل کیا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن

3۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ، حدیث 1252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو اس نے نبوت کا تہائی حاصل کیا اور جس نے نصف قرآن حاصل کیا اور اس پر عمل کیا تو اس نے نبوت کے نصف امر سے حاصل کیا اور جس نے پورا قرآن حاصل کیا اس نے پوری نبوت حاصل کی''۔ فرمایا: محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں محمد نے خبر دی۔ یہ محمد بن سعدان ہیں۔ انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن محمد نے بتایا، انہوں نے حفص سے انہوں نے کثیر بن زاذان سے انہوں نے عاصم بن ضمرہ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تلاوت کی اور اسے یاد کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اس کی سفارش اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔ حضرت ام الدرداء نے کہا: میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی۔ میں نے انہیں کہا: قرآن پڑھنے والے کو، قرآن نہ پڑھنے والے پر کیا فضیلت ہوگی ان میں سے جو جنت میں داخل ہوں گے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: قرآن کی آیات کی تعداد، جنت کے درجوں کی تعداد کے برابر ہے، کوئی شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ قرآن پڑھنے والے سے افضل نہ ہوگا۔ یہ حدیث ابو محمد مکی نے ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کے احکامات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت دے گا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے برے حساب سے بچائے گا۔ یہ اس لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ (طٰہٰ) (تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو نہ وہ بھٹکے گا اور نہ بد نصیب ہوگا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے ضمانت دے گا جو قرآن کی پیروی کرے گا، دنیا میں گمراہ نہیں ہوگا اور آخرت میں بدبخت نہیں ہوگا۔ یہ بھی مکی نے ذکر کیا ہے۔ اللیث نے کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی کی طرف جو رحمت آتی ہے وہ قرآن سننے والے کی طرف آنے والی رحمت سے تیز نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿﴾ (الاعراف) اور لعل اللہ کی طرف سے وجوب کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

ابوداؤد الطیالسی کی مسند میں ہے، یہ پہلی مسند ہے جو اسلام میں تالیف کی گئی ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو دس آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ غافلین سے نہیں لکھا جائے گا اور جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ عبادت گزاروں سے لکھا جائے گا اور جو ہزار آیات سے قیام کرے گا تو وہ مقنطرین میں سے لکھا جائے گا۔

اس باب میں بہت سے آثار ہیں۔ جو ہم نے ذکر کر دیے ہیں کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

# کتاب اللہ کی تلاوت کی کیفیت اور اس میں سے جو مکروہ ہے اور جو حرام ہے اور اس کے متعلق لوگوں کا اختلاف

امام بخاری نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے بارے میں پوچھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ مد کے ساتھ پڑھتے تھے جب بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھتے تھے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ پر مد کرتے تھے، الرَّحۡمٰنِ پر مد کرتے تھے اور الرَّحِیۡمِ پر مد کرتے تھے''۔(1)

ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ علیحدہ کر کے قرأت کرتے تھے۔ آپ پڑھتے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ پھر ٹھہر جاتے، پھر الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھتے، پھر وقفہ کرتے، پھر مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ پڑھتے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے(2)۔ ابوداؤد نے اسی طرح روایت کی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں میں اچھی آواز والا وہ ہے جو قرآن پڑھے تو تو اس پر اللہ کی خشیت دیکھے''۔ زیاد النمیری سے مروی ہے، وہ قراء کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انہیں کہا گیا تو پڑھ۔ انہوں نے بلند آواز سے قرآن پڑھا اور غنا کے ساتھ پڑھا۔ وہ بڑے بلند آواز تھے۔ حضرت انس نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا حضرت انس کے چہرے پر کالا کپڑا تھا۔ حضرت انس نے کہا: اے فلاں وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت انس کوئی ایسی چیز دیکھتے جو ناپسند کرتے تو اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیتے تھے۔ قیس بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ذکر کے وقت بلند آواز کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور قرآن کی قراءت کے وقت بلند آواز کرنے کی کراہت جن علماء سے مروی ہے ان میں سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قاسم بن محمد، حسن، ابن سیرین اور نخعی وغیرہ ہیں۔ مالک بن انس اور احمد بن حنبل نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے۔ ان تمام نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا کی صورت پیدا کرنے کو مکروہ قرار دیا۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کو لوگوں کی امامت کراتے ہوئے سنا، وہ قراءت میں غنا پیدا کر رہے تھے۔ سعید نے انہیں پیغام بھیجا: اللہ تیری اصلاح کرے، ائمہ اس طرح نہیں پڑھتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کے بعد غنا کو ترک کر دیا۔ قاسم بن محمد سے مروی ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاوت کی اور اس نے گانے کی صورت میں پڑھا، تو قاسم نے اس پر انکار کیا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِنَّہٗ لَکِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ﴿ۙ﴾ لَّا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِہٖ (حم السجدہ) (بے شک یہ بڑی عزت (وحرمت) والی کتاب ہے، اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل، نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے)

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مد القراءۃ، حدیث نمبر 4658 مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءات، باب فاتحۃ الکتاب، حدیث 2877 مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک سے مروی ہے، ان سے نماز میں قرآن کی قراءت گویے کی طرز پر پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور سخت کراہت کا اظہار فرمایا۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ نماز میں ان سے الحان سے متعلق پوچھا گیا تو امام مالک نے فرمایا: مجھے یہ اچھا نہیں لگتا اور فرمایا: یہ غنا ہے جس کے ساتھ وہ گاتے ہیں تا کہ اس پر دراہم حاصل کریں۔
اور ایک طائفہ نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا پیدا کرنے کی اجازت دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ خوبصورت آواز میں قرآن پڑھے گا تو نفوس میں اس کا زیادہ اثر ہوگا اور دل زیادہ متوجہ ہوں گے۔ اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: ''قرآن کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو''، اس حدیث کو حضرت براء بن عازب سے روایت کیا گیا ہے(1)۔ ابوداؤد اور نسائی نے اس کو نقل کیا ہے اور اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہ کیا اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا: اگر میں جانتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کو انتہائی خوبصورت آواز میں پڑھتا اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال اپنے سفر میں سواری پر سورۂ فتح تلاوت کی اور قراءت میں ترجیع کی یعنی آواز کو اوپر نیچے کیا۔ اس نظریہ کے حامل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب ہیں اور امام شافعی، ابن مبارک، نضر بن شمیل ہیں اور یہی ابوجعفر الطبری، ابوالحسن بن بطال اور قاضی ابوبکر بن عربی وغیرہم کا مختار ہے۔
میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے۔ اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ مزید اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور دوسرے قول والوں نے پہلی حدیث جس سے انہوں نے حجت پکڑی ہے وہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ یہ مقلوب کے باب میں سے ہے یعنی قرآن کے ساتھ اپنی آوازوں کو مزین کرو۔ خطابی نے کہا: اور بہت سے محدثین نے اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے۔ یعنی اپنی آوازوں کو قرآن سے مزین کرو۔ اور انہوں نے فرمایا: یہ قلب کے باب سے ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں: میں نے حوض اونٹنی پر پیش کیا حالانکہ اس کا مطلب ہے: میں نے اونٹنی کو حوض پر پیش کیا۔ فرمایا: معمر نے منصور سے انہوں نے طلحہ سے یہ حدیث روایت کی ہے اور اصوات کو قرآن پر مقدم کیا ہے اور یہ صحیح ہے۔
خطابی نے کہا: یہ حدیث طلحہ نے عبدالرحمن بن عوسجہ سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زینوا القرآن باصواتکم یعنی قرآن کی قراءت کرو اور اپنی آوازوں کو اس کے ساتھ مشغول کرو اور اس کو شعار اور زینت بناؤ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی قرآن کے پڑھنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور اس پر کوشش اور مشقت کرنا ہے۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: زینوا اصواتکم بالقرآن، اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ مزین کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ حسین کرو۔
میں کہتا ہوں: اس معنی کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول راجع ہے۔ ہم میں سے وہ نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔ یعنی ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت نہیں کرتا، اسی طرح عبداللہ بن ابی ملیکہ نے اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القرائۃ، حدیث 1256، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تاویل کی ہے۔ عبدالجبار بن الورد نے کہا: میں نے ابن ابی ملیکہ کو یہ فرماتے سنا کہ عبداللہ بن ابی یزید نے کہا: ہمارے پاس سے ابولبابہ گزرے، ہم ان کے پیچھے چلے حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ بوسیدہ ہیئت شخص تھے۔ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: لیس منا من لم یتغن بالقرآن (1) ''وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہیں کیا''۔ فرمایا: میں نے ابن ابی ملیکہ سے کہا: اے ابو محمد! بتائیے جب کوئی شخص خوبصورت آواز والا نہ ہو تو؟ انہوں نے فرمایا: اپنی استطاعت کے مطابق خوبصورت بنائے۔ یہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنا کہ مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت کرتا اور اسے مزین کرتا اور ترتیل سے پڑھتا۔

یہ دلیل ہے کہ وہ فطری خوش الحان ہونے کے باوجود قراءت جلدی کرتے تھے، اگر انہیں علم ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت سن رہے ہیں تو وہ اپنی قراءت میں مد کرتے اور ترتیل سے پڑھتے جیسا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھتے تھے۔ پس یہ قراءت کے ساتھ حسن صوت میں زیادتی تھی۔ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کہنے کی تاویل کی جائے کہ قرآن کو اصوات کے ساتھ یا کسی اور چیز کے ساتھ مزین کیا جائے گا۔ جس نے یہ تاویل کی وہ ایک عظیم امر میں واقع ہوا کہ قرآن مزین کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ قرآن نور ہے، ضیاء اور زین ہے اس کے لئے جسے اس کی بہجت دی گئی اور وہ اس کی ضیاء سے روشن ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: تزئین کا حکم قراءت کا اکتساب ہے اور اسے آوازوں کے ساتھ مزین کرنا ہے۔ تقدیر یوں ہوگی قراءت کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو، اس صورت میں قرآن بمعنی قراءت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (الاسراء: 78) یعنی فجر کی قراءت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ (القیامہ) یعنی اس کی قراءت کی اتباع کرو۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: سمندر میں شیاطین میں سے جو قید کیے گئے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں باندھا ہے۔ قریب ہے کہ وہ نکلیں اور لوگوں پر قرآن پڑھیں یعنی قراءت کریں۔

شاعر نے حضرت عثمان کے بارے میں کہا:

ضَحُّوْا بِاَشْمَطَ عُنْوَانَ السُّجُوْدِ بِهٖ ... يُقَطِّعُ اللَّيْلَ تَسْبِيْحًا وَّ قُرْآنًا

اس شعر میں قرآن بمعنی قراءت ہے۔

پس اس تاویل پر یہ معنی صحیح ہوگا: مگر یہ کہ وہ قراءت اپنی حد سے نکل جائے تو پھر ممتنع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حدیث میں جو یتغنی بہ استعمال ہوا ہے اس کا معنی استغناء ہے جو فقر کی ضد ہے نہ کہ غنا مراد ہے۔ کہا جاتا ہے: تغنیت و تغانیت بمعنی استغنیت ...... صحاح میں ہے: تغنی الرجل، بمعنی استغنی الرجل، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے غنی کیا۔ و تغانوا یعنی بعض بعض سے مستغنی ہوئے۔ مغیرہ بن حبناء التمیمی نے کہا:

كِلَانَا غَنِيٌّ عَنْ اَخِيْهِ حَيَاتَهٗ ... وَ نَحْنُ اِذْ مِتْنَا اَشَدُّ تَغَانِيَا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید باب قولہ تعالیٰ: واسروا قولکم او اجھروا بہ، حدیث نمبر 6973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہم دونوں اپنے بھائی کی زندگی سے غنی ہیں اور ہم جب مریں گے تو زیادہ مستغنی ہو جائیں گے۔

اس تاویل کی طرف سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح گئے ہیں۔ سفیان نے سعد بن ابی وقاص سے یہ روایت کیا ہے۔ سفیان سے دوسری وجہ بھی مروی ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ نے ذکر کی ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے دوسری احادیث سے مستغنی ہوتا ہے۔ اس تاویل کی طرف محمد بن اسماعیل بخاری گئے ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ عنوان باندھا ہے اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت: 51) مراد یہ ہے کہ قرآن کی وجہ سے دوسری امتوں کی اخبار سے مستغنی ہونا۔ یہ اہل تاویل کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے قرآن کی وجہ سے وہ غمگین ہوتا ہے یعنی قاری پر وہ غم ظاہر ہوتا ہے جب وہ قرأت اور تلاوت کرتا ہے۔ غم، خوشی کی ضد ہے۔ یہ الغنية سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اگر یہ غنية سے ہوتا تو يتغانى به ہوتا، يتغنى به نہ ہوتا۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ بھی ہے، ان میں امام ابو محمد بن حبان البستی ہیں اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر عن ابیہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپ کے سینہ میں رونے کی وجہ سے ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز نکل رہی تھی۔ حدیث میں ابلنے کے لئے الازیز کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے کڑک کی آواز اور ہانڈی کے ابلنے کی آواز۔ علماء نے فرمایا: حدیث میں واضح بیان ہے کہ حدیث سے مراد غمگین ہونا ہے اور انہوں نے اپنی تائید اس حدیث سے لی ہے جس کو ائمہ حدیث نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر پڑھو، میں نے آپ پر سورۂ نساء پڑھی۔ جب میں فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء) پر پہنچا تو میں نے دیکھا آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ چار تاویلات ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو الحان کے ساتھ قراءت اور قراءت میں ترجیع پر دلالت کرتی ہو۔ ابو سعید بن الاعرابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لیس منا من لم يتغن بالقرآن کی شرح میں فرمایا: عرب غنا اور گانے کے زیادہ حریص تھے۔ جب قرآن نازل ہوا تو انہوں نے پسند کیا کہ قرآن بھی ان کی عادت پر غنا کے ساتھ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔

پانچویں تاویل: ترجیع (☆) اور تطریب پر استدلال اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عمر بن شبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے ابو عاصم النبیل سے ابن عیینہ کی يتغن کے قول میں يستغنى کی تاویل ذکر کی تو انہوں نے فرمایا: ابن عیینہ نے کچھ نہیں کیا۔ امام شافعی سے ابن عیینہ کی تاویل کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہم اس کو زیادہ جانتے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغنا مراد لیا ہوتا تو آپ من لم يستغن فرماتے۔ جب آپ نے يتغن فرمایا تو ہم جان گئے کہ آپ نے التغنی مراد لی۔ طبری نے کہا: ہمارے نزدیک کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ التغنی سے مراد وہ غنا ہے جو ترجیع کے ساتھ آواز کا خوبصورت ہونا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَغَنَّ بِالشِّعْرِ مَهْمَا كُنْتَ قَائِلَهُ ۔۔۔ اِنَّ الْغِنَاءَ بِهٰذَا الشِّعْرِ مِضْمَارُ

☆ ترجیع، گانے کی صورت میں آواز کو اوپر نیچے کر کے پڑھنا۔

شعر کو خوش الحانی سے گا جب تو اس کو کہنے والا ہے اس شعر کے ساتھ غنا پوشیدہ ہے۔ فرمایا: جنہوں نے تغنیت بمعنی استغنیت کا دعویٰ کیا ہے وہ عرب کلام میں اشعار میں استعمال نہیں ہوا ہے اور ہم کسی عالم کو نہیں جانتے جس نے یہ کہا ہو۔ اور رہا اعشی کے اس قول سے احتجاج

وَ كُنْتُ امْرَأً زَمَناً بِالْعِرَاقِ عَفِيْفَ الْمُنَاخِ طَوِيْلَ التَّغَنْ

انہوں نے کہا: اعشی نے تغن سے مراد استغناء لیا ہے۔ تو یہ غلط ہے۔ اعشی نے یہاں التغن سے مراد ٹھہرنا لیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: غَنِيَ فُلَانٌ بِمَكَانِ كَذَا۔ یعنی فلاں اس جگہ ٹھہرا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا (الاعراف:92) رہا و نحن اذا متنا اشد تغانیا۔ اس سے استشہاد بھی غفلت ہے کیونکہ التغانی دو نفسوں سے ہوتا ہے جب ہر ایک دوسرے سے مستغنی ہو جائے، جیسے کہا جاتا ہے تضارب الرجلان، جب ہر ایک دوسرے کو مارے اور جس نے یہ دو شخصوں کے فعل میں کہا اس نے اس کی مثل ایک میں کہنا جائز قرار نہیں دیا پس تغانی زید، تضارب عمرو کہنا جائز نہیں ہے اسی طرح تغنی بمعنی استغنی کہنا بھی جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: طبری کا یہ دعویٰ کہ کلام عرب میں تغنی بمعنی استغنی وارد نہیں ہوا۔ حالانکہ جوہری نے یہ ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور ہروی نے بھی یہ ذکر کیا ہے اور رہا اس کا قول کہ تفاعل کا صیغہ صرف دو شخصوں کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ بہت سے مقام پر ایک شخص کے لئے بھی یہ صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اسی سے حضرت ابن عمر کا قول ہے و انا یومئذ قد ناهزت الاحتلام (میں اس وقت قریب البلوغ تھا) عرب کہتے ہیں: طارقت النعل، عاقبت اللص، داویت العلیل۔ ان مثالوں میں تفاعل ایک شخص کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ پس تغانی بھی ان مثالوں میں سے ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یتغنی، الغناء اور الاستغناء دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے تو ایک معنی پر محمول کرنا دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے بلکہ الاستغناء پر اس کو محمول کرنا اولیٰ ہے اگرچہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی تاویل نہ ہو کیونکہ صحابی کبیر سے مروی ہے جیسا کہ سفیان نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے سفیان کے حق میں کہا: میں نے سفیان بن عیینہ سے زیادہ احادیث کی تاویل کو جاننے والا نہیں دیکھا اور یہ مسلم بات ہے کہ اس نے امام شافعی کو دیکھا اور وہ ان کا ہم عصر تھا۔

**چھٹی تاویل:** وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا: ما اذن اللہ لشیء ما اذن لنبی حسن الصوت یتغنی بالقرآن یجهر به (1)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنا کسی چیز سے راضی نہیں ہوتا جتنا کہ نبی کے خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنے سے راضی ہوتا ہے۔ طبری نے کہا اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح ابن عیینہ نے کہا ہے تو حسن الصوت اور الجهر به کے ذکر کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ ہم کہتے ہیں: یجهر به کے الفاظ یا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں یا حضرت ابو ہریرہ کے ہیں یا کسی اور کے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو اس میں بُعد ہے اور وہ تطریب و ترجیع کے نہ ہونے پر دلیل ہے کیونکہ یطرب بہ نہیں فرمایا بلکہ یجهر بہ فرمایا ہے، یعنی وہ خود سنے اور اس کے قریب والے سنیں۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن و ما یتعلق به، باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن، جلد 1، صفحہ 268

کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے بلند آواز سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والوں کو کہا: اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے (1) (الحدیث) اسی طرح اگر کسی صحابی سے ہو یا کسی اور سے ہو تو اس میں جو انہوں نے کہا ہے اس پر حجت نہیں ہے۔ اس تاویل کو بعض علماء نے اختیار فرمایا اور کہا: یہ اشبہ ہے کیونکہ عرب ہر بلند آواز کرنے والے کو غانی کہتے ہیں اور اس کا فعل غنا ہوتا ہے، اگرچہ وہ نغمہ کی طرز پر نہ گا رہا ہو اور کہا: یہ تفسیر صحابی نے کی ہے اور وہ کلام اور حال سے زیادہ آگاہ ہے۔

ابوالحسن بن بطال نے امام شافعی کے مذہب کے لئے حجت قائم کرتے ہوئے کہا: اس مسئلہ میں اشکال کو وہ حدیث دور کرتی ہے جو ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔ فرمایا: ہمیں زید بن الحباب نے بتایا، فرمایا: ہمیں موسیٰ بن علی بن رباح نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اور انہوں نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سیکھو اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو اور اس کو لکھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ مخاض (اونٹنی) سے بھی زیادہ رسی سے نکل جانے والا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اگرچہ اس کی سند صحیح ہے، پس اس کو رد کرتی ہے یہ بات جو قطعیت سے معلوم ہے کہ قرآن کی قراءت ہماری لغت کے ساتھ متواتر طور پر نسل در نسل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اور اس میں تلحین (☆) و تطریب نہیں ہے حالانکہ کثرت سے حروف کے مخارج، مد، ادغام، اظہار اور اس کے علاوہ قراءت کی کیفیت میں گہرائی سے غور کرنے والے موجود تھے پھر ترجیع اور تطریب میں وہ لفظ مہموز ہو جاتا ہے جو مہموز نہیں ہوتا، اس میں مد ہو جاتی ہے جو ممدود نہیں ہوتا، ایک الف کئی الف کی مقدار بن جاتا ہے، ایک واو کئی واو کی مقدار ہو جاتی ہے، ایک حرف کئی حروف کی مقدار بن جاتا ہے اور یہ چیز قرآن میں زیادتی تک پہنچا دیتی ہے اور یہ ممنوع ہے۔ اگر وہ ہمزہ کی جگہ کو اس طرح پڑھے گا تو بہت سے ہمزے بنا دے گا، حروف میں سے جہاں ہمزہ واقع ہوتا ہے وہ صرف ایک ہمزہ ہوتا ہے اور پھر وہ ممدودہ ہو گا یا مقصورہ ہو گا۔ اگر کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں سواری پر سورۂ فتح پڑھی تو قراءت کو اوپر نیچے کیا۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے اور اوپر نیچے کی صفت میں آ ءآ آ فرمایا۔

ہم کہتے ہیں یہ مد کے اشباع پر محمول ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سواری کی حرکت کے وقت کی آواز کی حکایت ہو، جیسا کہ بلند آواز کرنے والے کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے۔ جب وہ سوار ہو اس کی آواز سواری کی حرکت سے کٹ جاتی ہے اور رک جاتی ہے۔ جب اس میں یہ احتمال ہے تو اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ ابو محمد عبدالغنی بن سعید الحافظ نے حضرت قتادہ کی حدیث عبدالرحمٰن بن ابی بکر عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت مد بھی اس میں ترجیع نہیں تھی۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤذن آواز کو

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا علا عقبۃ، حدیث نمبر 5905، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث عقبہ بن عامر

☆ آیت کو گانے کی صورت میں پڑھنا

اوپر نیچے (غنا کی صورت میں) کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذان سہل اور بغیر غنا کے ہے۔ جب تیری اذان سہل اور بغیر غنا کے ہو تو فبہا ورنہ تو اذان نہ دے۔ یہ حدیث دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تطریب (غنا کی صورت) اذان میں منع فرمائی تو قرآن میں اس کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ہے جس کی حفاظت کا ذمہ الرحمٰن ذات نے اٹھایا ہے۔ اس نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) (بے شک ہم نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقینا ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حم السجدۃ) (اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے۔ یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے سب خوبیاں سراہے کی طرف سے)

میں کہتا ہوں: یہ اختلاف اس وقت ہے جب قرآن کا معنی اصوات کے لوٹانے اور ترجیعات کی کثرت کی وجہ سے نہ سمجھا جائے اور اگر یہ امر مزید بڑھ جائے حتیٰ کہ اس کا معنی بھی نہ سمجھا جائے تو یہ حرام ہے جیسا کہ مصر کے شہروں میں قراء کرتے ہیں جو بادشاہوں اور جنازوں کے سامنے قرآن پڑھتے ہیں اور اس پر اجرت اور تحائف لیتے ہیں۔ ان کی سعی گم ہوئی اور ان کا عمل ضائع ہوا۔ پس وہ اس کے ساتھ کتاب اللہ کی تبدیلی حلال سمجھتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنا اپنے نفسوں پر آسان سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن میں اضافہ کر دیں جو اس میں نہیں ہے۔ یہ ان کی دین سے جہالت، اپنے نبی کی سنت سے خروج اور سلف صالحین کی سیرت کو چھوڑنے اور شیطان کے مزین کردہ اعمال کی طرف رجحان کی وجہ سے ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اچھا عمل کر رہے ہیں۔ پس وہ گمراہی میں گردش کر رہے ہیں اور اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل رہے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ! لیکن مخبر صادق نے خبر دی تھی کہ ایسا ہوگا، پس ایسا ہوا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔

امام الحافظ ابو الحسین رزین اور ابو عبد اللہ الترمذی الحکیم نے نوادر الاصول میں حضرت حذیفہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کو پڑھو عربوں کی لحن اور ان کی آوازوں میں۔ اہل عشق کی آوازوں میں اور اہل کتاب کی آوازوں میں پڑھنے سے بچو میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کے ساتھ غنا اور نوحہ جیسی ترجیع (آواز کو اوپر نیچے کر کے گانے کی صورت میں پڑھنا) کریں گے۔ قرآن ان کے گلوں سے تجاوز نہیں کرے گا، ان کے دل اور ان لوگوں کے دل جو ان کو اچھا سمجھتے ہیں، فتنہ میں مبتلا کئے گئے ہیں (1)۔ اللحون جمع ہے لحن کی اس کا مطلب آواز کو اوپر نیچے کرنا اور قراءت، شعر اور گانے کے ساتھ آواز کو خوبصورت کرنا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا، ہمارے زمانہ کے قرأء جو واعظین کے سامنے اور مجالس میں عجمی لہجوں میں قرآن پڑھتے ہیں یہ اس کے مشابہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ قراءت میں ترجیع کا مطلب ہے حروف کو گھمانا جس طرح نصاریٰ کی قراءت ہے اور قراءت میں ترتیل کا مطلب ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور حروف و حرکات کو ظاہر کرنا۔ برابر دانتوں کے ساتھ اس کو تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کو گل بابونہ کی کلی سے تشبیہ دی ہے اور قراءت میں یہی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ

1۔ بیہقی شعب الایمان، فصل فی ترک التعمق فی القرآن الکریم

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل) (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کے بارے اور آپ کی نماز کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: تمہیں ان کی نماز سے کیا مناسبت، آپ نماز پڑھتے تھے اتنی مقدار سو جاتے تھے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی تھی پھر سونے کی مقدار نماز پڑھتے تھے پھر نماز کی مقدار سوتے تھے حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ پھر حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کو بیان کیا۔ آپ قراءت کو حرف حرف بیان کرتی تھیں۔ اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(1)۔

## اہل قرآن اور اہل علم کو ریا کاری وغیرہ سے ڈرانا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (النساء:36) (اور عبادت کرو اللہ کی اور نہ شریک ٹھہراؤ اس کا کسی چیز کو)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (الکہف) (پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو)۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ شخص شہید ہوگا، اسے لایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ سب نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کو کیسے استعمال کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیری رضا کی خاطر جہاد کیا حتیٰ کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو تو اس لئے لڑا تھا تاکہ جری کہا جائے، وہ تجھے کہا گیا پھر حکم ہوگا کہ اسے منہ کے بل اوندھا گھسیٹ کرلے جاؤ حتیٰ کہ وہ آگ میں ڈالا جائے گا اور وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر کی گئی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ انہیں پہچان لے گا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور علم سکھایا اور میں نے تیری رضا کے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے علم سیکھا تاکہ عالم کہا جائے تو نے قرآن پڑھا تاکہ قاری کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھسیٹ کرلے جاؤ اور آگ میں ڈال دو۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے وسعت دی اور اسے ہر قسم کا مال دیا پھر اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جس میں میں نے خرچ کرنے کو پسند کیا مگر میں نے اس میں تیرے لئے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، باب کیف کان قراءۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القرائۃ، حدیث نمبر 1254، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے یہ عمل کیا تا کہ جواد کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھسیٹ کر لے جایا جائے پھر آگ میں ڈالا جائے گا (1)۔ (امام ترمذی نے اس حدیث میں کہا) پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر مارا اور فرمایا: اے ابو ہریرہ! یہ تین پہلی اللہ کی مخلوق ہوگی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آگ کو بھڑکائے گا۔ ابو ہریرہ کا نام عبد اللہ ہے بعض نے فرمایا: عبد الرحمٰن ہے۔ فرمایا: مجھے ابو ہریرہ کی کنیت دی گئی کیونکہ میں اپنی آستین میں بلی اٹھائے ہوئے تھا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: بلی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ!۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو عمل اور علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں رکھتا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے اللہ کے علاوہ کیلئے علم حاصل کیا یا اللہ کی رضا کے علاوہ اس سے کوئی ارادہ کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے (2)۔

ابن مبارک نے ''رقائق'' میں حضرت عباس بن عبد المطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین غالب آئے گا حتیٰ کہ سمندر سے گزر جائے گا حتیٰ کہ گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں دریاؤں میں داخل کیا جائے گا۔ پھر ایک قوم آئے گی جو قرآن پڑھیں گے۔ جب قرآن پڑھیں گے تو کہیں گے ہم سے زیادہ قاری کون ہے ہم سے زیادہ علم والا کون ہے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں خیر دیکھتے ہو؟ صحابہ نے کہا: نہیں۔ فرمایا: یہ تم میں سے ہیں اور یہ اس امت سے ہیں اور یہ آگ کا ایندھن ہیں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے تا کہ دنیا کا کوئی سامان حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو محسوس نہیں کرے گا (3)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب الحزن کیا ہے؟ فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے جس سے جہنم ہر روز سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ فرمایا: قراء جو اعمال کیساتھ دکھاوا کرتے ہیں۔ (4)

امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اسد بن موسیٰ کی کتاب میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے، اس وادی کے شر سے جہنم ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اس وادی میں ایک کنواں ہے، جہنم اور وہ وادی اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار

2۔ جامع ترمذی، باب جاء فیمن یطلب بعلمہ الدنیا

ایضاً، ابن ماجہ، باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ، حدیث 253، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ، حدیث 3179، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ، حدیث 2305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کنویں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اس کنویں میں ایک سانپ ہے۔ جہنم، وادی اور کنواں اس سانپ سے سات مرتبہ اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان اشقیاء (بدبخت) کے لئے تیار کر رکھا ہے جو حاملین قرآن اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ پس حامل قرآن اور طالب علم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ کے لئے خاص عمل کرنا چاہئے۔ اگر پہلے کوئی ناپسندیدہ کام ہو چکا ہو تو اسے جلدی توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ طلب اور عمل میں اخلاص سے آغاز کرے۔ حافظ قرآن کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ تحفظ لازم ہے جیسا کہ اس کے لئے جو اجر ہے وہ دوسروں کے لئے نہیں۔ ترمذی نے حضرت ابو الدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض کتب میں اللہ نے نازل کیا یا بعض انبیاء کی طرف وحی کی گئی کہ تم ان لوگوں سے کہو جو غیر دین کے لئے فقہ حاصل کرتے ہیں اور غیر عمل کے لئے علم حاصل کرتے ہیں اور آخرت کے عمل کے ساتھ دنیا طلب کرتے ہیں انہیں مینڈھوں کی جلدیں پہنائی جائیں گی اور ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں جیسے ہوں گے، ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی ہوں گی اور دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے مجھے وہ دھوکا دیتے ہیں اور میرے ساتھ استہزاء کرتے ہیں میں ان کے لئے ایسی آزمائش تیار کروں گا جو ان میں حلیم کو حیران کر دے گی۔ (1)

طبری نے کتاب "آداب النفوس" (☆) میں نقل کیا ہے ہمیں ابو کریب محمد بن علاء نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں محاربی نے بتایا انہوں نے عمرو بن عامر بجلی سے انہوں نے ابن صدقہ سے انہوں نے ایک صحابی سے روایت کیا یا جس نے انہیں بتایا۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ کو دھوکا دیتا ہے اللہ اسے دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کو کیسے دھوکا دیتا ہے؟ فرمایا: تو اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس کا اس نے تجھے حکم دیا اور اس کے ذریعے کسی غیر کو طلب کرتا ہے، ریا سے بچو کیونکہ یہ شرک ہے اور ریا کار قیامت کے روز ان چار اسماء کے ساتھ اشہاد کے سروں پر بلایا جائے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جائیں گے یا کافر، یا خاسر، یا غادر، یا فاجر۔ تیرا عمل گم ہوا اور تیرا اجر باطل ہوا آج تیرے لئے کوئی حصہ نہیں ہے تو اپنا اجر اس سے طلب کر جس کے لئے تو عمل کرتا تھا۔ اے دھوکا باز! علقمہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم کیسے ہو گے جب تمہیں ایسا فتنہ لاحق ہو گا جس میں چھوٹا بڑا ہو جائے گا بڑا بوڑھا ہو جائے گا، سنت کو بدعت بنا دیا جائے گا لوگ اس بدعت پر چلیں گے جب اس بدعت میں کوئی تبدیلی ہو گی تو کہا جائے گا: سنت بدل دی گئی۔ پوچھا گیا اے ابو عبد الرحمن! یہ کب ہو گا؟ فرمایا: جب تمہارے قراء زیادہ ہوں گے اور فقہاء کم ہوں گے اور امراء زیادہ ہوں گے اور امین کم ہوں گے، دنیا کو آخرت کے عمل کے ذریعے تلاش کیا جائے گا اور دین کے علاوہ کے لئے فقہ حاصل کیا جائے گا (2)۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: ہمیں یہ حضرت ابن عباس سے خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر حاملین قرآن، قرآن کا حق ادا کرتے اور جو مناسب تھا تو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا لیکن انہوں نے اس کے ساتھ دنیا کو طلب کیا تو اللہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ماجاء فی الریاء والسمعة، حدیث 2328، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن داری، باب تغیر الزمان وما یحدث فیہ

☆ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا طبری کی ایک ترتیب العلماء جس کا یہ آغاز ہے اسے مکمل نہ فرمایا۔

نے ان سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور وہ لوگوں پر ذلیل ہو گئے۔ ابو جعفر محمد بن علی سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ (الشعراء) کے تحت مروی ہے، فرمایا: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے اپنی زبانوں کے ساتھ حق اور عدل کا وصف بیان کیا اور انہوں نے غیر کی طرف اس کی مخالفت کی۔ اس باب کا مزید بیان کتاب کے دوران ان شاء اللہ آئے گا۔

## صاحب قرآن کو چاہئے کہ وہ اس سے اپنے لئے حصہ بنائے اور غافل نہ ہو

سب سے پہلی بات صاحب قرآن کے لئے یہ ہے کہ وہ قرآن کا علم خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حاصل کرے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، دوسری یہ کہ وہ رات اور دن میں، نماز میں یا نماز کے علاوہ تلاوت کرے تا کہ اسے قرآن بھول نہ جائے۔ مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کی مثال باندھے گئے اونٹوں والے کی ہے کہ وہ ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے تو وہ انہیں روکے رکھتا ہے اور اگر وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے تو وہ چلے جاتے ہیں۔ جب صاحب قرآن، قرآن کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دن اور رات میں اس کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اسے یاد رہتا ہے جب وہ قرآن کے ساتھ قیام حفاظت کا اہتمام نہیں کرتا ہے تو وہ اسے بھول جاتا ہے(1)۔ پس صاحب قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، اس کی نعمت کا شکر ادا کرے، اس کا ذکر ہو اور اس پر توکل کرنے والا ہو اور اسی سے مدد طلب کرنے والا ہو، اسی کی طرف رغبت کرنے والا ہو، اس کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو، اپنی موت کو یاد کرنے والا ہو، اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے والا ہو، اسے چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے خوف کرنے والا ہو، اپنے رب کے عفو کا امیدوار ہو، صحت میں خوف اس پر غالب ہو کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کب ختم ہونے والی ہے اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے وقت اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھنے والا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنے والا ہو یعنی یہ گمان رکھے کہ وہ اس پر رحم فرمائے گا اور اسے بخش دے گا اور اسے چاہئے کہ وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو جاننے والا ہو، اس کے تسلط سے اپنی حفاظت کرنے والا ہو، اپنے نفس کی خلاصی اور اپنی روح کی نجات کے لئے کوشش کرنے والا ہو اور دنیا کا سامان جتنی قدرت رکھتا ہے آگے بھیجنے والا ہو اور حتی المقدور اپنے نفس سے جہاد کرنے والا ہو اور اس کو چاہئے کہ اس کے نزدیک اہم امر دین میں تقویٰ ہو اور جو اللہ نے حکم دیا اور جس سے اللہ نے منع فرمایا اس کا خیال کرنے والا ہو اور اس میں تقویٰ پر عمل کرنے والا ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قاری قرآن کو چاہئے کہ وہ رات کو جاگنے والا معروف ہو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اور دن کو بھی بیدار معروف ہو جب لوگ بیدار ہوں اور وہ رونے میں مصروف ہو جب لوگ ہنس رہے ہوں اور وہ خاموشی سے معروف ہو جب لوگ بری باتوں میں مشغول ہوں اور وہ خضوع و عجز کے ساتھ معروف ہو جب لوگ ایک دوسرے کو فریب دینے میں مصروف ہوں اور وہ حزن کے ساتھ معروف ہو جب لوگ خوش ہوں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق بہ، باب الامر بتعھد القرآن

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: حامل قرآن بری باتوں میں مشغول لوگوں کے ساتھ مشغول نہ ہو اور جاہلوں کے ساتھ جاہل نہ بنے، بلکہ قرآن کے حق کی وجہ سے معاف کر دے کیونکہ اس کے جوف میں اللہ کا کلام ہے۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ شبہات کے راستوں سے اپنے آپ کو بچائے، غیر مفید باتوں کے ساتھ مجالس قرآن میں کلام نہ کرے اور کم ہنسے، اپنے اوپر حلم اور وقار قائم رکھے اور اسے چاہئے کہ فقراء کے لئے تواضع اختیار کرے، تکبر اور اعجاب سے اجتناب کرے۔ اگر اپنے نفس پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو دنیا اور دنیا والوں سے جدا رہے، جنگ و جدل کو ترک کرے اور نرمی اور ادب کا مظاہرہ کرے اور اسے چاہئے کہ وہ ان افراد سے ہو جن کے شر سے امن ہوتا ہے، جن سے خیر کی امید کی جاتی ہے اور جن کے نقصان سے حفاظت سمجھی جاتی ہے اور اس کی بات نہ سنے جو اس کے پاس چغلی کھائے اور اس کے ساتھ سنگت اختیار کرے جو خیر پر معاون ہو اور صدق اور مکارم اخلاق پر رہنمائی کرنے والا ہو اور اسے زینت بخشنے والا ہو نہ کہ عیب دار کرنے والا ہو۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو سیکھے اور اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے اسے سمجھے اور جو اللہ نے فرض کیا اسے سیکھے، جو پڑھے اس سے نفع حاصل کرے اور جو تلاوت کرے اس پر عمل کرے۔ پس جو معنی نہیں سمجھے گا وہ عمل کیسے کرے گا اور کتنا برا ہے وہ جو تلاوت کرتا ہے اس کے مفہوم کے متعلق پوچھا جائے اور وہ نہ جانتا ہو۔ اس کی مثال گدھے کی مثل ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، اور اس کے مناسب ہے کہ وہ مکی، مدنی صورتوں کی پہچان کرے تاکہ وہ تفریق کر سکے جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء اسلام میں لوگوں سے خطاب فرمایا اور جو آخر میں خطاب فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ نے پہلے فرض کیا تھا اور اس کے آخر میں زائد فرض کیا۔ اکثر قرآن میں مکی کے لئے مدنی ناسخ ہے اور مکی حکم سے مدنی حکم کو منسوخ کرنا ممکن نہیں کیونکہ منسوخ نزول میں ناسخ سے مقدم ہوتا ہے اور اس کے کمال میں سے یہ ہے کہ وہ اعراب اور غریب کو جانتا ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے پڑھے جانے والے کے حصہ کی معرفت آسان ہو گی اور جو وہ تلاوت کرے گا اس سے شک دور ہو گا۔ ابو جعفر طبری نے کہا: میں نے جرمی کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں تیس سال سے فقہ میں سیبویہ کی کتاب سے فتویٰ دیتا رہا ہوں۔ محمد بن یزید نے کہا: ابو عمر جرمی صاحب حدیث تھے۔ جب انہوں نے سیبویہ کی کتاب کا علم حاصل کر لیا تو حدیث کا علم سیکھا کیونکہ سیبویہ کی کتاب سے نظر اور تفسیر سیکھتے تھے۔ پھر سنن ماثور جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت تھیں ان میں غور و فکر کرتے تھے۔ طالب، اللہ کی کتاب کے مراد تک پہنچنے کے لئے سنت کا وسیلہ پکڑے یہ اس کے لئے احکام قرآن کے مضمر راز کھولے گی۔ ضحاک نے وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ (آل عمران: 79) کے تحت فرمایا: ہر قرآن پڑھنے والے پر حق ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو۔

ابن ابی حواری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہم فضیل بن عیاض کے پاس سنہ ۱۸۵ ہجری میں آئے۔ ہم ایک پوری جماعت تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے رہے۔ انہوں نے ہمیں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کسی نے بتایا کہ اگر وہ نکلیں گے تو تلاوت قرآن کے لئے نکلیں گے۔ ہم نے ایک قاری کو تلاوت کرنے کو کہا۔ اس نے تلاوت کی تو فضیل نے ہماری طرف ایک کھڑکی سے جھانکا۔ ہم نے کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ انہوں نے کہا: وعلیکم السلام۔ ہم نے پوچھا: اے ابو علی! آپ کیسے ہیں آپ کا کیا حال ہے؟ فضیل نے کہا: میں اللہ کی طرف سے عافیت میں ہوں اور تمہاری وجہ سے اذیت میں ہوں اور تم نے

اسلام میں بدعتیں نکالی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ ہم اس لئے علم حاصل نہیں کرتے تھے لیکن ہم مشائخ کے پاس آتے تھے تو ہم ان کے پاس بیٹھنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ پس ہم ان سے دور بیٹھتے تھے جو چوری چھپے سنتے تھے جب وہ حدیث گزرتی تو ہم اس کو اعادہ کے لئے تلاش کرتے اور اسے ہم لکھ لیتے اور تم جہالت کے ساتھ علم حاصل کرتے ہو اور تم نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتاب اللہ کو طلب کرتے تو تم اس میں اپنی بیماری کی شفاء پاتے۔ ہم نے کہا: ہم نے قرآن سیکھا۔ فضیل نے کہا: تمہارے قرآن سیکھنے میں تمہاری عمروں اور تمہاری اولاد کی عمروں کی مشغولیت ہے۔ ہم نے کہا: اے ابوعلی! وہ کیسے؟ فضیل نے کہا: تم قرآن کو نہیں پہچانو گے حتیٰ کہ تم اس کا اعراب پہچان لو۔

متشابہ سے محکم اور منسوخ سے ناسخ کی پہچان کرلو۔ جب تم اس کی پہچان کرلو گے تو فضیل اور ابن عیینہ کے کلام سے مستغنی ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا: اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۞ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۞ (یونس) (اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آگئی ہے) شفاء ان بیماریوں کے لئے جو سینوں میں ہیں اور (آگئی ہے) ہدایت اور رحمت مومنین کے لئے (اے حبیب!) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے۔ پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ مراتب قاری قرآن کو حاصل ہوتے ہیں جب وہ قرآن کا ماہر ہو، فرقان کا عالم ہو اور وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو اسے اپنا قرب بخشتا ہے اور وہ مذکورہ چیزوں سے نفع حاصل نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کو طلب کرے اور طلب کے بعد اس کی نیت میں خلوص ہو اور طالب علم کبھی اس سے ابتدا میں مباہات اور دنیا میں شرف حاصل کرنے کی نیت کرتا ہے، وہ علم کا حصول اسی خاطر کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نظریہ میں خطا ہے اور اس سے توبہ کرتا ہے اور نیت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہے اور پھر اس سے نفع حاصل کرتا ہے اور اپنا حال درست کرتا ہے۔ حسن نے کہا: ہم دنیا کے لئے علم حاصل کرتے تھے پھر وہ ہمیں آخرت کی طرف لے گیا۔ یہ سفیان ثوری نے بھی کہا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم نے علم حاصل کیا اور اس میں ہماری نیت خالص نہ تھی پھر بعد میں ہماری نیت خالص ہوئی۔

## قرآن کے اعراب، قرآن کی تعلیم، قرآن پر ابھارنا اور اعراب کے ساتھ قرآن پڑھنے والے کا ثواب

ابوبکر بن انباری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے قرآن کے اعراب کی فضیلت، اس کی تعلیم پر ترغیب مروی ہے اور گانے کی طرز پر پڑھنے کی مذمت اور کراہیت مروی ہے اور قرآن کے قاریوں پر جو کوشش سے اس کی تعلیم حاصل کرنا واجب ہے وہ بھی مروی ہے۔

اس میں سے وہ روایت ہے جو ہمیں یحییٰ بن سلیمان ضبی نے بتائی۔ فرمایا: ہمیں محمد بن ابو سعید نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو معاویہ نے عبداللہ بن سعید مقبری سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کو فصیح انداز میں پڑھو اور اس کے غرائب تلاش کرو۔ مجھے میرے باپ نے بتایا فرمایا: ہمیں ابراہیم بن ہیثم نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں آدم یعنی ابن ابی ایاس نے بتایا۔ فرمایا: ہمیں ابو طیب مروزی نے بتایا فرمایا: ہمیں عبدالعزیز بن ابی رواد نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس میں غلطی نہ کی تو اس پر ایک فرشتہ متعین کیا جاتا ہے جو اس کے لئے لکھتا ہے، جیسا کہ اتارا گیا ہے، ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھتا ہے اور جو اس کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھتا ہے اس پر دو فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے بیس نیکیاں لکھتے ہیں پھر اگر وہ اسے فصیح عربی میں پڑھتا ہے تو اس پر چار فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے ستر نیکیاں لکھتے ہیں۔ جو یبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھو اور خوبصورت آوازوں کے ساتھ اس کو مزین کرو اور اس کو فصیح عربی میں پڑھو کیونکہ یہ عربی ہے اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اسے فصیح عربی میں پڑھا جائے۔ مجاہد سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن کو فصیح عربی میں پڑھو۔ محمد بن عبدالرحمن بن زید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھنا ہمارے نزدیک اس کے حروف یاد کرنے سے افضل ہے اور شعبی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے قرآن کو فصیح عربی میں پڑھا اس کے لئے دو اجر ہیں بنسبت اس کے جس نے فصیح عربی میں نہیں پڑھا۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عربوں کو تین وجوہ سے پسند کرتا ہوں کیونکہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کا کلام عربی ہے۔ سفیان نے ابو حمزہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حسن کو اس قوم کے متعلق بتایا گیا جو عربی سیکھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: وہ اچھا کرتے ہیں وہ اپنے نبی کی لغت سیکھتے ہیں اور حسن سے کہا گیا ہمارا ایک امام ہے جو گانے کی طرز پر قرآن پڑھتا ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا: اسے پیچھے ہٹا دو۔

ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا: ایک اعرابی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آیا اور کہا: مجھے وہ کون پڑھائے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا؟ فرمایا: ایک شخص نے اسے سورۂ برأت پڑھائی۔ اس نے جب پڑھا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ:3) اس پڑھانے والے نے رسولہ کو زیر کے ساتھ پڑھا تو اعرابی نے کہا: کیا اللہ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو میں اس سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعرابی کی بات پہنچی تو اسے بلایا اور کہا: اے اعرابی! کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بری ہے۔ اعرابی نے کہا: اے امیر المومنین! میں مدینہ آیا اور مجھے قرآن کے بارے کوئی علم نہ تھا۔ میں نے پوچھا: کون مجھے قرآن پڑھائے گا؟ پس اس نے مجھے سورۃ برأت پڑھائی اور کہا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ:3) میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری

ہے تو میں بھی اس سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اعرابی! بات اس طرح نہیں ہے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیسے ہے؟ حضرت عمر نے کہا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ:3) اعرابی نے کہا: میں اللہ کی قسم اس سے بری ہوں جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ لغت کا جاننے والا لوگوں کو قرآن پڑھائے۔ پھر آپ نے ابو اسود کو حکم دیا اور اس نے نحو کا علم وضع کیا۔

علی بن جعد سے مروی ہے، فرمایا: میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ صاحب حدیث جو عربی نہیں جانتا اس گدھے کی مثل ہے جس پر خورجی ہو جس میں چارہ نہ ہو۔ حماد بن سلمہ نے کہا: جس نے حدیث کو طلب کیا اور نحو کو نہیں سیکھا یا فرمایا عربی کو نہیں سیکھا وہ اس گدھے کی مانند ہے جس پر خورجی لٹکائی گئی ہے جس میں جو نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: قرآن کا اعراب شریعت میں سے ہے کیونکہ اس کے ساتھ وہ معانی قائم ہوئے ہیں جو شرع ہے۔

ابن انباری نے کہا(1): صحابہ کرام اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ قرآن کے غریب الفاظ اور مشکل الفاظ پر لغت اور شعر سے حجت پکڑتے تھے جو نحویوں کے مذہب کی صحت کو بیان کرتا اور اس کے مذہب کے فساد کو واضح کرتا جو ان پر انکار کرتا۔ اس سے یہ ہے جو ہمیں عبید بن عبدالواحد بن شریک البزاز نے بتایا۔ ہمیں ابن ابی مریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں ابن فروخ نے بتایا۔ فرمایا: مجھے اسامہ نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: مجھے عکرمہ نے خبر دی کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم مجھ سے غریب القرآن کے متعلق پوچھو تو اسے شعر میں تلاش کرو کیونکہ شعر عربوں کا دیوان ہے۔ ہمیں ادریس بن عبدالکریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں خلف نے بتایا فرمایا: ہمیں حماد بن زید نے بتایا انہوں نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کیا، فرمایا: میں نے حضرات سعید بن جبیر اور یوسف بن مہران کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا، ان سے قرآن کی کسی آیت کے بارے پوچھا جا رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا: اس میں ایسا ایسا ہے۔ کیا تم نے شاعر کو ایسا ایسا کہتے ہوئے نہیں سنا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، حضرت ابن عباس سے کسی شخص نے وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ (المدثر) کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: تو اپنے میلے کپڑے نہ پہن اور غیلان ثقفی کے قول سے مثال دی۔

فَاِنِّی بحمد اللہ لا ثوب غادر　　لبست ولا من سوأۃ اتقنع

ایک شخص نے عکرمہ سے الزنیم کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: وہ ولد الزنا ہے اور شعر کے اس بیت سے مثال بیان کی۔

زنیم لیس یعرف من ابوہ　　بَغِی الام ذو حسب لئیم

عکرمہ سے یہ بھی مروی ہے کہ الزنیم کا مطلب فاحش کمینہ شخص بھی ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

زنیم تداعاہ الرجال زیادۃ　　کما زید فی عرض الادیم الاکارع

عکرمہ سے ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ (الرحمن) کے ارشاد کے تحت مروی ہے، فرمایا: دونوں سائے اور ٹہنیوں والے اور فرمایا: کیا تم نے شاعر کا قول نہیں سنا۔

1۔ فی الوقف والابتداء، جلد 1، صفحہ 21

ماهاج شوقك من هديل حمامة تدعو على فنن الغصون حماما

تدعو ابا فرخين صادف طائراً ذا مخلبين من الصقور قطاما

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ۝ (النازعات) کے تحت فرمایا ہے: اس سے مراد زمین ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے امیہ بن ابی الصلت نے کہا: عندھم لحم بحر و لحم ساھرہ۔ ابن انباری نے کہا: راوی اس بیت کو اس طرح روایت کرتے ہیں۔

فيها لحم ساهرة و بحر و ما فاهوا به لهم مقيم

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس سے کہا لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (البقرہ: 255) کے بارے مجھے بتائیے۔ یہ السنۃ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اونگھ ہے۔ زہیر بن ابی سلمی نے کہا:

لا سنة فی طوال الليل تاخذه ولا ينام ولا فی امره فند

رات کی طوالت میں نہ اسے نیند آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے اور نہ اس کے امر میں رائے کی کمزوری ہوتی ہے۔

## قرآن کی تفسیر اور مفسرین کی فضیلت

ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ اور تابعین سے تفسیر کی فضیلت میں جو منقول ہے اس میں سے یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کا ذکر کیا اور ان کا علم کے ساتھ وصف بیان کیا۔ ایک شخص نے کہا: میں جناب پر قربان ہو جاؤں آپ جابر کا علم کے ساتھ وصف بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ تو (علم میں) آپ ہی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص: 85) کی تفسیر جانتے تھے۔ مجاہد نے کہا: اللہ کے نزدیک محبوب ترین شخص نازل شدہ کتاب کا عالم ہے۔ حسن نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت نازل نہیں فرمائی مگر اس نے پسند کیا کہ جس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جو اس سے مراد ہے وہ معلوم ہو۔ شعبی نے کہا: مسروق ☆ نے ایک آیت کی تفسیر کے لئے بصرہ کا سفر کیا۔ انہیں بتایا گیا جو اس آیت کی تفسیر بیان کرتا تھا وہ شام چلا گیا ہے۔ پس مسروق نے تیاری کی اور شام تک سفر کیا حتیٰ کہ اس آیت کی تفسیر جان لی۔ عکرمہ (☆☆) نے وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (النساء: 100) کی تفسیر میں فرمایا: میں چودہ سال اس شخص کا نام تلاش کرتا رہا جو گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلا تھا حتیٰ کہ میں نے اس کا نام پالیا۔ ابن عبدالبر نے کہا وہ ضمرہ بن حبیب ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں دو سال ٹھہرا رہا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات کہنے کا ارادہ کیا تھا۔ مجھے ان کی ہیبت مانع تھی میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ حفصہ اور

☆ مسروق بن اجدع یہ ابو عائشہ وادعی ہے ہمدانی، کوفی

☆☆ ابو عبداللہ قرشی یہ ان کے مولی تھے مدنی، بربری، حافظ، مفسر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے۔

عائشہ تھیں۔ ایاس بن معاویہ نے کہا: ان لوگوں کی مثال جو قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے، اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس ان کے بادشاہ کی کتاب رات کو آئی ہو اور ان کے پاس چراغ نہ ہو، انہیں خوف لاحق ہو اور وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ کتاب میں کیا ہے اور اس شخص کی مثال جو تفسیر جانتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو ان کے پاس چراغ لایا ہو پھر انہوں نے وہ پڑھا ہو جو کچھ کتاب میں تھا۔

## قرآن کا حامل، اور وہ کون ہے اور جس نے حامل قرآن سے دشمنی کی وہ کون ہے

ابو عمر نے کہا (☆): ایک ضعیف و کمزور حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین اشخاص کی عزت اللہ تعالیٰ کے جلال کی تعظیم میں سے ہے: عدل کرنے والا امام، بوڑھا مسلمان اور قرآن کا حامل جو نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ ہی قرآن سے انحراف کرنے والا ہو (1)۔ ابو عمر نے کہا: حملۃ القرآن سے مراد اس کے احکام اور اس کے حلال اور حرام کو جاننے والے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اس کو جاننے والے ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن ہر چیز سے افضل ہے جس نے قرآن کی عزت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی توقیر و عزت کی اور جس نے قرآن کو خفیف سمجھا، اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا قرآن کے حاملین اللہ کی رحمت سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں، اللہ کے کلام کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کا نور پہننے والے ہوتے ہیں۔ جس نے ان سے دوستی کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا۔

## حامل قرآن اور قاری قرآن کو قرآن کی تعظیم اور حرمت لازم ہے

ترمذی حکیم ابو عبد اللہ نے نوادر الاصول میں فرمایا: قرآن کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اسے بے وضو نہ چھوئے نیز اسے باوضو پڑھے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ تلاوت سے پہلے اپنے منہ کو پاک کرے اور مسواک اور خلال کرے کیونکہ یہ اس کا راستہ ہے۔ یزید بن ابی مالک نے کہا: تمہارے منہ قرآن کے راستوں میں سے ہیں پس تم انہیں پاک اور صاف کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے لئے ایسا لباس پہنے جیسے کسی امیر کے پاس جانے کے لئے پہنتا ہے کیونکہ وہ مناجات کرنے والا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قراءت کے وقت قبلہ رخ ہو۔ ابو العالیہ نے کہا: جب قرآن پڑھے تو عمامہ باندھے، لباس پہنے، چادر اوڑھے اور قبلہ کی طرف رخ کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب بھی اسے بلغم آئے کلی کرے۔ شعبہ نے ابو حمزہ (☆☆) سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، اس کے سامنے ایک برتن ہو جب بھی بلغم کرے تو کلی کرے پھر تلاوت میں شروع ہو، جب بھی بلغم آئے تو کلی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب اسے جمائی آئے تو قراءت سے رک جائے کیونکہ جب وہ تلاوت کر رہا ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تنزیل الناس منازلھم، حدیث نمبر 4203، تقدیم و تاخیر کے ساتھ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ ابو عمر سے مراد ابن عبد البر ہے

☆☆ ابو حمزہ سے مراد عمران بن عطاء الاسدی ہے۔

ہے تو اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے اور باتیں کر رہا ہوتا ہے اور جمائی شیطان کی طرف سے ہے۔ مجاہد نے کہا: جب تجھے جمائی آئے جبکہ تو قرآن پڑھ رہا ہو تو قرآن کی تعظیم کی خاطر قرآن کی تلاوت سے رک جا حتیٰ کہ جمائی ختم ہو جائے۔ یہ عکرمہ نے کہا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اس فعل میں قرآن کی عزت کر رہا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ تلاوت کی ابتدا میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے اگر اس کی قراءت سورت کے آغاز سے ہو یا جس جگہ پہنچا ہو۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت شروع کرے تو بغیر ضرورت آدمیوں سے کلام کرتے ہوئے اسے لحہ بہ لحہ قطع نہ کرے اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قراءت کے لئے تنہا بیٹھے تا کہ اس پر کلام کے ذریعے کوئی تلاوت کو قطع نہ کرے اور اس کے جواب کے ساتھ تلاوت کو ملا نہ دے کیونکہ جب وہ ایسا کرے گا تو اس سے استعاذہ کی سلطانی زائل ہو جائے گی جو اس نے ابتدا میں کہا تھا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ تلاوت کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے قرآن میں اپنے ذہن اور فہم کو استعمال کرے تا کہ مفہوم کو سمجھے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ آیت وعدہ پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے رغبت کرے اور اس کے فضل کا سوال کرے اور آیت وعید پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے اس سے پناہ مانگے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ قرآن کی امثال پر ٹھہرے اور ان کی پیروی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کے غرائب کو تلاش کرے۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ ہر حرف کو اس کی ادائیگی کا حق دے تا کہ کلام لفظ کے ساتھ مکمل ظاہر ہو کیونکہ ہر حرف کے بدلے اس کے لئے دس نیکیاں ہیں اور اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت کو ختم کرے تو اپنے رب کی تصدیق کرے یعنی صدق اللہ العظیم کہے اور رسول کریم کے پہنچانے کی شہادت دے اور یہ گواہی دے کہ یہ حق ہے۔ پس کہے صدقتَ ربّنا، و بلغتْ رسلُك و نحن علی ذلك من الشاهدين ۔ اللهم اجعلنا من شهداء الحق، القائمين بالقسط ۔ پھر دعائیں مانگے اور اس کی حرمت سے ہے کہ جب تلاوت کرے تو ہر سورت سے کچھ آیات چن کر نہ پڑھے کیونکہ ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا جبکہ وہ ہر سورت سے کچھ تلاوت کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پوری سورت تلاوت کرنے کا حکم فرمایا او کما قال علیہ السلام۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قرآن کو رکھے تو کھلا ہوا نہ چھوڑے اور کوئی کتاب قرآن کے اوپر نہ رکھے حتیٰ کہ ہمیشہ تمام کتب سے بلند ہو، وہ کتب علمی ہوں یا کوئی اور۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب تلاوت کرے تو قرآن کو اپنی گود میں رکھے یا سامنے کسی چیز پر رکھے، زمین پر نہ رکھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ تختی سے قرآن کو تھوک کے ساتھ صاف نہ کرے بلکہ پانی کے ساتھ دھوئے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ جب پانی کے ساتھ دھوئے اور پانی کو نجاست والی جگہ سے اور ایسی جگہوں سے بچائے جو روندی جاتی ہیں کیونکہ اس غسالہ کی بھی حرمت ہے۔ سلف صالحین قرآن کے دھوون سے شفاء طلب کرتے تھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قرآن کے اوراق بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں دوسری کتب کی حفاظت کے لئے استعمال نہ کرے کیونکہ یہ عظیم جفا ہے بلکہ پانی کے ساتھ اسے مٹا دے۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ کوئی دن بھی قرآن کی زیارت سے خالی نہ ہو اور حضرت ابوموسیٰ فرماتے تھے: میں حیا کرتا

ہوں کہ میں کسی دن ایک مرتبہ اپنے رب کے عہد کو نہ دیکھوں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ اپنی آنکھوں کو قرآن سے حصہ دے کیونکہ آنکھ نفس تک پہنچاتی ہے، نفس اور سینہ کے درمیان حجاب ہے اور قرآن سینہ میں ہوتا ہے جو زبانی تلاوت کرے گا تو اس کے کان سنیں گے پھر وہ نفس تک پہنچائیں گے اور جب وہ خط کو دیکھے گا تو آنکھ اور کان دونوں ادائیگی میں شریک ہوں گے اور یہ ادائیگی کے لیے زیادہ مناسب ہے کیونکہ آنکھ نے بھی کان کی طرح اپنا حصہ لیا۔ زید بن اسلم نے عطا بن یسار سے انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی آنکھوں کو عبادت سے حصہ دو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آنکھوں کا عبادت سے کیا حصہ ہے؟ فرمایا: قرآن کی طرف دیکھنا، اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائب کے وقت عبرت حاصل کرنا۔ مکحول نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی افضل عبادت دیکھ کر قرآن پڑھنا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے کے وقت قرآن کی تاویل نہ کرے۔ ہمیں عمرو بن زیاد حنظلی نے بتایا، فرمایا: ہمیں ہشیم بن بشیر نے بتایا انہوں نے حضرت مغیرہ سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا فرمایا: وہ دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے پر قرآن کی بطور حوالہ آیت پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ مثلاً جب کوئی شخص تیرے پاس آئے تو تو کہے: جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ۝ (طٰہٰ) کھانا سامنے آئے تو کہے: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَاۤ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ۝ (الحاقہ) اس طرح کی اور مثالیں ہیں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ یہ نہ کہے کہ فلاں سورت جیسے تو کہتا ہے سورۃ النحل، سورۃ البقرہ، سورہ النساء، بلکہ کہے: وہ سورت جس میں نحل کا ذکر ہے وغیرہ۔ میں کہتا ہوں: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الآیتان من آخر سورۃ البقرۃ من قرء بھما فی لیلۃ کفتاہ (سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں جو انہیں رات کو پڑھے گا یہ اس کی کفایت کریں گی۔) کے مخالف ہے(1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو الٹا تلاوت نہ کرے جیسے بچوں کے معلم کرتے ہیں وہ اپنے طور پر اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس میں مخالفت ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی قراءت گلے میں زور دے کر نہ نکالے جس طرح یہ ہمز مین مبتدعین تکلفاً اپنے بدبودار مونہوں سے کلام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے شیطان نے ان کی طرف اس کو ڈالا اور انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ گانے کی طرز پر قرآن نہ پڑھے جس طرح اہل فسق پڑھتے ہیں۔ نہ تو نصاریٰ کی ترجیع میں پڑھے اور نہ رہبانوں کے نوحہ میں پڑھے۔ یہ سب راہ حق سے ہٹنا ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن لکھے تو عظیم الفاظ میں لکھے۔ ابو حکیمہ سے مروی ہے کہ وہ کوفہ میں قرآن لکھتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گزرے تو آپ نے اس کی کتاب کی طرف دیکھا اور فرمایا: اپنی قلم کو موٹا کرو۔ میں نے قلم کو قط دیا ایک طرف سے پھر میں نے لکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے میری کتاب کو دیکھ رہے تھے۔ فرمایا: اس طرح اس کو روشن کر جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا۔ اس کی حرمت سے ہے کہ پڑھتے ہوئے ایک دوسرے سے بلند نہ پڑھیں تاکہ دوسرے پر فساد پیدا کر دے حتیٰ کہ سننے والا اس پر ناراض ہو اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کیفیت طاری ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب من شھود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3707، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے۔اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قراتوں میں جھگڑا نہ کرے اور اپنے ساتھی کو یہ نہ کہے کہ یہ اس طرح نہیں ہے، ہوسکتا ہے وہ صحیح ہو اور قرآن میں جائز ہو تو یہ کتاب کا انکار کرنا ہوگا۔اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ بازاروں میں شور وغل اور لغو جگہ میں اور بیوقوفوں کے مجمع میں نہ پڑھے۔کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ذکر کیا اور ان کی تعریف فرمائی کہ اذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً۔ یہ تو خود گزرنے پر ہے پھر تلاوت قرآن کرنے والے کا اہل لغو کے درمیان اور سفہاء کے مجمع سے گزرنا کتنا منع ہوگا۔اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو تکیہ نہ بنائے اور اس پر ٹیک نہ لگائے اور قرآن کسی کو دینے لگے تو قرآن کو پھینکے نہیں اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو بالکل چھوٹا نہ کرے۔اعمش نے ابراہیم سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مصحف کو چھوٹا نہ بنایا جائے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن دیکھا تو پوچھا: یہ کس نے لکھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے۔حضرت عمر نے اسے درے سے مارا اور فرمایا: قرآن کی تعظیم کرو۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے مسیجد یا مصیحف کہنے سے منع فرمایا۔اس کی حرمت سے یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ملائے جو اس میں سے نہ ہو۔اس کی حرمت میں سے ہے کہ وہ اسے نہ تو سونے سے مزین کرے اور نہ سونے سے لکھے تاکہ دنیا کی زینت ان کے ساتھ نہ ملے۔مغیرہ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے وہ مصحف کو سونے سے مزین کرنا اور لکھنا ناپسند سمجھتے تھے یا اس کی آیتوں کے سروں پر نشان لگانے اور قرآن کو چھوٹا بنانے کو ناپسند کرتے تھے۔حضرت ابو درداء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنی مساجد کو مزین کرو گے اور اپنے مصاحف کو زیور پہناؤ گے تو تم پر ہلاکت ہوگی (1)۔حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب انہوں نے قرآن کو چاندی سے مزین دیکھا، تم اس پر چوروں کو ابھارتے ہو حالانکہ زینت اس کے جوف میں ہے۔اس کی حرمت سے ہے کہ زمین پر اور دیوار پر نہ لکھے جیسا کہ جدید مساجد میں ہوتا ہے۔ہمیں محمد بن علی شقیقی نے اپنے باپ سے انہوں نے عبد اللہ بن مبارک سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے محمد بن زبیر سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر لکھی ہوئی ایک تحریر کے پاس سے گزرے، آپ نے ہذیل کے ایک نوجوان سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کے الفاظ ہیں جو یہودی نے لکھے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنے مقام پر رکھو۔محمد بن زبیر نے کہا: حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک لڑکے کو دیوار پر قرآن لکھتے ہوئے دیکھا تو اسے مارا۔اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب کسی مریض کی شفا کے لئے قرآن کی تحریر کو دھوئے تو اسے کوڑے پر اور نجاست کی جگہ پر اور روندی جانے والی جگہ پر نہ ڈالے، بلکہ زمین کے کسی ایسے کونے میں ڈالے جہاں لوگوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔یا کسی پاک جگہ پر گڑھا کھودے تاکہ پانی اس گڑھے میں گرے یا کسی بڑی نہر میں اسے بہائے تاکہ اس کے پانی کے ساتھ بہہ جائے۔اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن کو ختم کرے تو پھر سے شروع کرے تاکہ اسے چھوڑنے والے کی ہیئت پر نہ ہو اسی وجہ

1۔الزہد ابن مبارک، صفحہ 797۔فضائل القرآن، ابو عبید، صفحہ 242

سے رسول اللہ ﷺ جب ختم فرماتے تو ابتدا سے پانچ آیات کی مقدار پڑھتے تا کہ مھجور کی ہیئت پر نہ ہوں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ایک شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: علیك بالحال المرتحل۔(1) اس نے عرض کی: حضور! اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن اول سے آخر تک پڑھے پھر ابتداء سے شروع کرے جب بھی ختم کرے تو نئے سرے سے شروع کر دے۔

میں کہتا ہوں: مستحب ہے کہ جب قرآن ختم کرے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرے۔ ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں وکیع نے بتایا انہوں نے مسعر سے انہوں نے حضرت قتادہ سے روایت کیا کہ حضرت انس بن مالک جب قرآن ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرتے اور دعا کرتے۔ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے حکم سے روایت کیا فرمایا: مجاہد اور عبدہ بن ابی لبابہ اور لوگ قرآن حکیم کا دور کرتے۔ جب ختم کرنے کا ارادہ کرتے تو ہماری طرف متوجہ ہوتے اور ہمیں بلاتے کیونکہ قرآن کریم کے ختم کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے۔

ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا انہوں نے عوام سے اور انہوں نے ابراہیم تیمی سے روایت کیا، فرمایا: جس نے دن کی ابتدا میں قرآن ختم کیا اس کے لئے شام تک فرشتے دعا کرتے رہتے ہیں اور جس نے رات کے آغاز میں قرآن ختم کیا اس پر صبح تک فرشتے درود بھیجتے رہتے ہیں۔ فرمایا: لوگ دن کے اور رات کے آغاز میں قرآن ختم کرنا مستحب سمجھتے تھے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن سے تعویذ نہ بنایا جائے اور پھر اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہو مگر یہ کہ وہ چمڑے یا چاندی وغیرہ کے غلاف میں ہو۔ پھر وہ اس طرح ہو جائے گا جیسے تیرے سینہ میں ہے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب وہ قرآن لکھے اور اس کو پیئے تو ہر سانس پر اللہ کا نام لے اور اس میں بڑی نیت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیت کی مقدار ہی اسے عطا فرمائے گا۔ لیث نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تو قرآن لکھے اور پھر مریض کو پلائے۔ ابوجعفر سے مروی ہے، فرمایا: جو اپنے دل میں سختی پائے تو وہ زعفران کے ساتھ پیالے میں سورۂ یس لکھے پھر اسے پیئے۔

میں کہتا ہوں: اس کی حرمت سے ہے کہ چھوٹی سورت نہ کہا جائے۔ ابوالعالیہ نے چھوٹی یا بڑی سورت کہنا ناپسند کیا اور جس کو یہ کہتے ہوئے انہوں نے سنا اسے فرمایا: تو اس سے چھوٹا ہے قرآن سارا عظیم ہے۔ مکی نے یہ قول ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے جو روایت کیا ہے وہ اس کے معارض ہے۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: مفصل میں سے کوئی چھوٹی اور بڑی سورت نہیں ہے مگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کے ساتھ لوگوں کو امامت کراتے سنا ہے۔(2)

---

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف، حدیث نمبر 2872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب من رای التخفیف فیہا، حدیث 691، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے اور اس پر جرأت کرنے پر وعید اور مفسرین کے مراتب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتاب اللہ کی تفسیر فرماتے تھے مگر چند آیات کی جو جبریل آپ کو سکھاتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس حدیث کا مطلب ہے قرآن کے مغیبات کے بارے میں، مجمل کی تفسیر وغیرہ کے بارے میں حضور تفسیر فرماتے تھے جن تک اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر رسائی ممکن نہ تھی۔ جملہ مغیبات میں سے وہ ہے اللہ تعالیٰ نے جن کا علم نہیں دیا ہے جیسے قیامت کے قیام کا وقت وغیرہ، جو الفاظ سے تلاوت کی جاتی ہیں، صور میں نفخات کی تعداد، آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ترتیب۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو (وہ بیان کرو) جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے اور فرمایا: جو قرآن میں اپنی رائے کو دخل دے وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے(1)۔ حضرت جندب سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے دی اور صحیح بھی بیان کیا تو اس نے خطا کی (2)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور اس کے ایک راوی پر کلام کی گئی ہے۔ رزین نے یہ زائد بیان کیا ہے جس نے اپنی رائے دی اور غلطی کی تو اس نے کفر کیا۔ ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی، لغوی نے اپنی کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس کی حدیث کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں (ا) جس نے قرآن کے مشکل الفاظ کی ایسی تفسیر بیان کی جو صحابہ، تابعین اور پہلے لوگوں کے مذہب سے معروف نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے اور قول اثبت ہے اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ جس نے قرآن کے بارے میں کوئی قول کیا جبکہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے تو وہ دوزخ کے ٹھکانا میں اترے، یتبوا کا معنی ینزل و یحل (اترنا) ہے۔ شاعر نے کہا ؎

و بوئت فی صمیم معشرها فتم فی قومها مبوؤها

اور حضرت جندب کی حدیث میں فرمایا: بعض اہل علم نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ رائے سے مراد خواہش ہے یعنی جس نے قرآن کے بارے میں ایسا قول کیا جو اس کی خواہش کے موافق ہے اس نے ائمہ سلف سے نہیں لیا ہے پھر وہ ٹھیک بھی کہے گا تو خطا کرنے والا ہوگا کیونکہ اس نے قرآن پر ایسا حکم لگایا جس کی اصل معروف نہیں ہے اور وہ اہل اثر اور نقل کے مذاہب پر موقوف نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص سے کتاب اللہ کا کوئی معنی پوچھا گیا تو اس

---

1۔ مسند امام احمد، مسند عبداللہ بن عباس، جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی تفسیر القرآن برأیہ، حدیث نمبر 2875، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم، حدیث نمبر 3167، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے علماء کے قول میں غور وفکر کئے بغیر فوراً کوئی معنی بتا دیا جس کا تقاضا علم کے قوانین نحو اور اصول کرتے ہیں تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے کیونکہ لغوی علماء لغت کی وضاحت کرتے ہیں، نحوی علماء نحو کی وضاحت کرتے ہیں فقہاء اس کے معانی بیان کرتے ہیں اور ہر ایک علم ونظر کے قوانین پر مبنی اجتہاد سے کہتا ہے۔ اس صفت پر کہنے والا وہ اپنی رائے سے کہنے والا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اس قول کو بہت سے علماء نے اختیار کیا ہے۔ جس نے اپنے گمان اور دل کے خیال سے بات کی جبکہ اس نے اصول سے استدلال نہیں کیا تو وہ خطا کرنے والا ہے اور جس نے اس کا معنی مستنبط کیا محکم اور متفق اصول پر محمول کرتے ہوئے تو وہ ممدوح ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: تفسیر سماع پر موقوف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء:59) علماء کا یہ قول فاسد ہے کیونکہ قرآن کی تفسیر کے متعلق نہی ان باتوں سے خالی نہ ہوگی یا تو اس سے نقل مسموع اور استنباط کے ترک پر اکتفا کرنا مراد ہے یا کوئی دوسرا مفہوم مراد ہے اور یہ تو باطل ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ کوئی شخص قرآن کے متعلق کلام نہ کرے مگر جو اس نے سنا ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر کئی وجوہ سے کی۔ جو انہوں نے کہا وہ نبی کریم ﷺ سے سن کر نہیں کہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس کو بلایا اور دعا دی: اللھم فقھه في الدین و علمه التاویل۔ اے اللہ! دین میں اسے سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل سکھا۔ اگر تاویل پھر قرآن کی طرح مسموع ہوتی تو اس تخصیص کا کیا فائدہ تھا۔ یہ واضح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے مزید بیان سورۃ النساء میں ان شاء اللہ آئے گا۔ نہی کو دو وجہوں میں سے ایک پر محمول کیا جائے گا۔

## تفسیر بالرای کی صورت

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے کسی چیز میں رائے ہو اور اس کی طرف اس کا طبعی میلان اور خواہش ہو پھر وہ اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی تاویل کرے تاکہ وہ اپنی غرض کی صحت پر حجت پکڑے۔ اور اگر اس کی یہ رائے اور خواہش نہ ہوتی تو قرآن سے اس کے لئے یہ معنی ظاہر نہ ہوتا۔ یہ صورت کبھی تو علم کے ساتھ ہوتی ہے جیسے وہ شخص جو بعض آیات سے اپنی بدعت کی صحت پر حجت پکڑتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آیت سے مراد یہ نہیں ہے لیکن اس کا مقصود اپنے خصم (مقابل) پر مسئلہ کو ملتبس کرنا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ جہالت کی بنا پر ہوتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ آیت احتمال رکھتی ہے اس کا فہم اس وجہ کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے۔ وہ اپنی رائے اور خواہش سے اس جانب کو راجح کرتا ہے۔ پس وہ اپنی رائے سے تفسیر کرتا ہے یعنی اس کی رائے اسے اس تفسیر پر ابھارتی ہے اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو یہ وجہ اس کے نزدیک راجح نہ ہوتی۔ کبھی اس کے لئے صحیح غرض ہوتی ہے اس کے لئے وہ قرآن سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ اس پر ایسی بات سے استدلال کرتا ہے جو معلوم ہے کہ اس سے یہ ارادہ کیا گیا ہے جیسے سخت دل کو مجاہدہ کی طرف کوئی بلاتا ہے اور کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (طٰہٰ) اور اس کے دل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرعون سے یہی مراد ہے۔ یہ جنس بعض واعظین مقاصد صحیحہ میں کلام کی تحسین اور سامعین کی رغبت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہ ممنوع ہے

کیونکہ یہ لغت میں قیاس ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اور بھی باطنیہ، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اور اپنے باطل مذاہب کی طرف دعوت دینے کے لئے مقاصد فاسدہ میں استعمال کرتے ہیں اور قرآن کو اپنی رائے کے مطابق اتارتے ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن سے یہ مراد نہیں۔ یہ فنون تفسیر بالرائے سے منع کی ایک وجہ ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غرائب قرآن کے متعلق نقل اور سماع کے بغیر ظاہر عربی کے ساتھ جلدی سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا اور قرآن میں جو مبہم اور مبدل الفاظ ہیں اور جو قرآن میں اختصار، حذف، اضمار اور تقدیم و تاخیر ہے اس کے اظہار میں نقل و سماع کا اظہار نہ کر کے قرآن کی تفسیر کرنا۔ جو تفسیر کے ظاہر کو محکم نہیں کرتا اور صرف عربی جاننے پر معانی کے استنباط کی طرف جلدی کرتا ہے وہ اکثر غلطی کرتا ہے اور تفسیر القرآن بالرائے کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ابتدا ظاہر تفسیر میں نقل اور سماع کا اعتبار ضروری ہے تاکہ اس میں غلطیوں سے محفوظ رہے اس کے بعد فہم اور استنباط کو وسعت دے۔ غرائب وہ ہوتے ہیں جو صرف سماع سے سمجھے جا سکتے ہیں ظاہر احکام سے پہلے باطن تک پہنچنے کی کوئی امید نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا (الاسراء: 59) اس کا معنی ہے: آیۃ مبصرۃ فظلموا انفسهم بقتلها۔ پس ظاہر عربی کی طرف دیکھنے والا گمان کرے گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹنی روشن تھی اور اسے معلوم نہیں ہوگا کہ کس کے ساتھ انہوں نے ظلم کیا حالانکہ انہوں نے دوسروں سے اور اپنے آپ سے ظلم کیا۔ یہ حذف اور اضمار سے ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ ان دو وجہوں کے علاوہ کوئی لاحق نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ابن عطیہ نے کہا: بڑے سلف صالحین جیسے حضرات سعید بن مسیب، عامر شعبی وغیرہما تفسیر قرآن کو بڑا سمجھتے تھے اور ادراک اور تقدم کے باوجود احتیاط اور تقویٰ کی بنا پر تفسیر قرآن سے توقف کرتے تھے۔ ابوبکر انباری نے کہا: گزشتہ ائمہ کرام قرآن کے مشکل کی تفسیر سے بچتے تھے۔ بعض تو کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرے جو اللہ تعالیٰ کی مراد کے موافق نہ ہو پھر وہ اس قول سے پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بعض اس سے ڈرتے تھے کہ وہ تفسیر میں امام بنا دیا جائے اور اس کے مذہب پر بنیاد رکھی جائے اور اس کے طریقہ پر اکتفا کیا جائے۔ شاید بعد میں آنے والا کسی حرف کی اپنی رائے سے تفسیر بیان کرے اور اس میں خطا کرے اور کہے سلف میں سے فلاں امام تفسیر قرآن بالرائے میں میرا امام ہے۔ حضرت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کے ایک حرف کی تفسیر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور میں کہاں جاؤں گا اور میں کیسے کروں گا جب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ایک حرف کے بارے میں ایسی بات کہہ دوں گا جو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی۔ ابن عطیہ نے کہا: سلف صالحین میں بہت سی تعداد ہے جنہوں نے قرآن کی تفسیر کی وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر رحمت و مہربانی کرنے والے تھے۔ صدر المفسرین اور مفسرین کے مؤید حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس تھے، انہوں نے اس کام کے لیے تجرد اختیار کیا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ علماء نے ان کی پیروی کی جیسے حضرات مجاہد، سعید بن مسیب وغیرہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تفسیری نکات جو محفوظ ہیں ان کی نسبت حضرت عبد اللہ بن عباس سے زیادہ محفوظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

میں نے قرآن کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی تعریف کرتے تھے اور ان سے تفسیر لینے پر برانگیختہ کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: عبداللہ بن عباس کتنا بہترین ترجمان قرآن ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گویا باریک پردے سے غیب کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ان کے بعد حضرات عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ہیں جو صحابہ سے لیا گیا وہ عمدہ ہے کیونکہ وہ نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا۔ حضرت عامر بن واثلہ سے مروی ہے: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا وہ خطبہ دے رہے تھے میں نے ان کو خطبہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا: تم مجھ سے پوچھو اللہ کی قسم! تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھو گے جو قیامت تک ہونی ہے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بیان کروں گا۔ تم مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو اللہ کی قسم! کوئی آیت ایسی نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، ہموار زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر، ابن الکواء کھڑا ہوا اور کہا: اے امیر المومنین! الذاریات ذروا کیا ہے اور حدیث ذکر کی (1)۔ منہال بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر مجھے کسی کے بارے میں علم ہو کہ وہ مجھ سے کتاب اللہ زیادہ جانتا ہے مجھے اس تک سواریاں پہنچائیں گی تو میں اس کے پاس جاؤں گا۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا: کیا تم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نہیں ملے ہو؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں میں ان سے ملا ہوں (2)۔ مسروق سے مروی ہے، فرمایا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو علم میں بڑا چھوٹا پایا، ایک عالم اپنے سے بڑے عالم سے روایت کرتا ہے ایک عالم، دو عالموں سے روایت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک عالم اگر لوگوں پر وارد ہو تو ان سب کو کھینچ لائے اور حضرت عبداللہ بن مسعود ان علماء میں سے تھے۔ یہ مناقب ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیے ہیں اور فرمایا: اخاذ عربوں کے نزدیک وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پانی روکا جاتا ہے جیسے تالاب۔ ابوبکر نے کہا: ہمیں احمد بن ہیثم بن خالد نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن عبداللہ بن یونس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں سلام نے بتایا انہوں نے زید العمی سے روایت کیا، انہوں نے ابی الصدیق الناجی سے انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر زیادہ رحم کرنے والا ابوبکر ہے، اللہ کے دین میں سب سے مضبوط عمر ہے، حیا کے اعتبار سے سچا عثمان ہے اور سب سے بڑا قاضی علی ہے اور زید سب سے زیادہ علم وراثت کو جاننے والا ہے اور کتاب اللہ کا زیادہ قاری ابی بن کعب ہے، حلال وحرام کو زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے، اس امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے اور ابوہریرہ علم کا برتن ہے، سلمان ایک علم کا سمندر ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور زمین وآسمان میں ابوذر رضی اللہ عنہم سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔ (3)

ابن عطیہ نے کہا: تابعین میں سے مفسرین حضرات حسن بصری، مجاہد، سعید بن جبیر، علقمہ ہیں۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر قراءت کی ہر آیت پر وقوف کیا اور ہر آیت کو سمجھ کر پڑھا، ان کے بعد عکرمہ اور ضحاک ہیں۔ اگرچہ ضحاک

1۔ الجرح والتعدیل، تعارف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ　2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل عبداللہ بن مسعود وامہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل۔ ایضاً، 3، 2، 1، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 150-151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں ملا تھا انہوں نے ابن جبیر سے علم حاصل کیا ہے اور عامر شعبی سدی اس پر اور ابو صالح پر طعن کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں کوتاہ نظر سمجھتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یحییٰ بن معین نے کہا: کلبی کوئی شے نہیں ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان نے سفیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: کلبی نے کہا ابو صالح نے مجھے ایک مرتبہ کہا جو میں تجھے بتاؤں تو وہ جھوٹ ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم اسے جھوٹا کہتے تھے یعنی ابو صالح مولیٰ ام ہانی اور فارسی لغت میں زیادہ جھوٹ بولنے والے کو دروغ زن کہا جاتا ہے۔

پھر کتاب اللہ کی تفسیر کو ہر خلف سے عادل لوگوں نے حاصل کیا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس علم کو ہر خلف سے ان کے عادل لوگ حاصل کریں گے اور اس سے غالی لوگوں کی تحریف، مبطلین کے مذہب اختیار کرنے اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے۔ اس حدیث کو ابو عمرو وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ خطیب ابو بکر احمد بن علی بغدادی نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شہادت ہے کہ وہ دین کی پہچان، مسلمانوں کے ائمہ، تحریف سے شریعت کی حفاظت کریں گے، باطل سے بچائیں گے اور بیوقوفوں کی تاویل کا رد کریں گے، ان کی طرف رجوع واجب ہے اور دین کے معاملہ میں اعتماد ان پر ہوگا۔ رضی اللہ عنہم

ابن عطیہ نے کہا: تفسیر کے بارے میں علماء نے تالیفیں کیں جیسے عبد الرزاق، مفضل، علی بن ابی طلحہ بخاری وغیرہم۔ پھر محمد بن جریر نے لوگوں پر مختلف تفاسیر کو جمع کیا، ان سے بعید کو قریب کیا اور اسناد کے ذریعے شفا دی۔ متاخرین مفسرین میں ابو اسحاق الزجاج ابو علی فارسی ہیں۔ رہے ابو بکر نقاش، ابو جعفر نحاس، اکثر لوگوں نے ان کی غلطیاں نکالیں اور ان کے طریقے پر مکی بن ابی طالب تھے۔ ابو العباس المہدوی تالیف کو پختہ کرنے والے تھے۔ یہ سب مجتہد تھے اور ماجور تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور ان کے چہروں کو شاداب رکھے۔

## کتاب کی وضاحت سنت سے کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل:44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر، آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ (النور) (پس ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا انہیں دردناک عذاب نہ آلے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝ (الشوری:52) (بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف) اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں حضور علیہ السلام کی اطاعت کو فرض قرار دیا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)۔

ابن عبد البر نے کتاب العلم میں عبد الرحمن بن یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک محرم (احرام باندھنے والا) کو

دیکھا جس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے تو آپ نے محرم کو منع کیا۔ اس محرم نے کہا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کوئی آیت بطور دلیل پیش کرو تو میں اپنے کپڑے اتار دوں گا تو عبدالرحمن نے یہ آیت پڑھی: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) اور رسول کریم جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جن سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

ہشام بن حجیر سے مروی ہے، فرمایا: طاؤس عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ چھوڑ دو۔ طاؤس نے کہا: حضور نے انہیں سنت بنانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز سے منع فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا ان دو رکعتوں پر تجھے عذاب دیا جائے گا یا اجر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: 36) (نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرما دے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا، تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اپنے اس معاملہ میں۔

ابوداؤد نے مقداد بن معدیکرب سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ نے فرمایا: خبردار! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے۔ خبردار! قریب ہے کوئی شخص تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تمہیں اس قرآن کے بارے میں کہے جو تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال کرو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام کرو۔ خبردار! تمہارے لئے گھروں کے رہنے والے گدھے اور ذی ناب درندے اور معاہد کی گری پڑی چیز حلال نہیں ہے مگر یہ کہ اس چیز کا مالک اس چیز سے مستغنی ہو جائے۔ جو کسی قوم کے پاس آئے، اس قوم پر اس کی مہمان نوازی کرنا ہے اگر وہ مہمان نوازی نہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اپنی مہمان نوازی کی مثل ان سے لے لے۔ (1)

خطابی نے کہا اوتیتُ الکتاب و مثلہ معہ (2) کا ارشاد کئی احتمال رکھتا ہے: ایک یہ کہ اس کا معنی ہے مجھے وحی باطن عطا کی گئی ہے جو غیر متلو ہے جیسا کہ مجھے وحی ظاہر متلو عطا کی گئی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مجھے کتاب بطور وحی عطا کی گئی ہے جو تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی مثل بیان بھی عطا کیا گیا ہے یعنی آپ کو اجازت دی گئی ہے کہ آپ اسے بیان فرمائیں جو کتاب میں ہے۔ پس عام کریں، خاص کریں، اس میں زیادتی کریں اور کتاب میں جو کچھ ہے اسے شریعت بنائیں۔ پس اس پر عمل واجب ہوگا اور اس کا قبول کرنا لازم ہوگا جیسا کہ ظاہر جو قرآن سے تلاوت کیا جاتا ہے (اس کا قبول کرنا لازم ہے) اور یوشک رجلٌ شبعان اس ارشاد سے آپ ان سنن کی مخالفت سے ڈرا رہے ہیں جن کو آپ نے مقرر فرمایا جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے جیسا کہ خوارج اور روافض کا نظریہ ہے کہ وہ ظاہر قرآن کو پکڑتے ہیں اور ان سنن کو ترک کرتے ہیں جو کتاب کے بیان کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ فرمایا: وہ لوگ حیران ہوئے اور گمراہ ہوئے۔ فرمایا: الاریکۃ پلنگ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اریکہ نہیں بولا جاتا مگر جب وہ پالکی میں ہو۔ فرمایا: اریکۃ سے مراد مال و دولت والے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں کو لازم پکڑا اور علم حاصل نہ کیا۔ الا ان یستغنی عنھا صاحبھا کا مطلب یہ ہے کہ جس کی چیز گم ہوئی ہے وہ اس سے نہ لے جس

1۔ سنن ابی داؤد، باب لزوم السنۃ حدیث نمبر 3988، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ معالم السنن، جلد 4، صفحہ 298

نے وہ چیز اٹھائی ہے، اس سے عدم دلچسپی کی بنا پر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ (التغابن: 6) اس کا معنی ہے ان سے استغنا کی بناء پر اللہ نے انہیں فراموش کر دیا۔

اور فلہ ان یعقبھم مثل قراہ یہ اس کے لئے حکم ہے جو مضطر اور مجبور ہو اور کھانا نہ پائے اور اسے جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو۔ پس اس کے لئے جائز ہے کہ جس مہمان نوازی سے انہوں نے اسے محروم کیا اس کی مقدار ان کے مال سے لے لے۔ یعقبھم مشدد اور معاقبہ سے مخفف دونوں طرح مروی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ (النحل: 126) یعنی غلبہ تمہارے لئے ہو پھر تم ان سے مال غنیمت لو اسی طرح مہمان نوازی کی مقدار سے ان کے مال سے لے لو۔ فرمایا: حدیث کے اندر یہ دلیل ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ خود حجت ہے۔ فرمایا: جو بعض علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو اگر وہ اس کے موافق ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر موافق نہیں ہے تو اسے رد کر دو۔ یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کی دو قسمیں ہیں۔ کتاب میں جو مجمل ہے اس کا بیان جیسے پانچ نمازوں کے لئے ان کے اوقات، سجود، رکوع اور سارے احکام کا بیان اور زکوٰۃ کی مقدار، اس کا وقت، کس مال سے زکوٰۃ لی جائے گی ان سب چیزوں کا بیان، اسی طرح مناسک حج کا بیان۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حج فرمایا تو فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھ لو(1) اور فرمایا: تم نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا(2)۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ابن مبارک نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا: تو ایک احمق آدمی ہے کیا تو اللہ کی کتاب میں ظہر کی چار رکعتیں پاتا ہے جن میں جہری قراءت نہیں ہے۔ پھر اس پر نماز، زکوٰۃ وغیرہ کو شمار کیا پھر فرمایا: کیا تو یہ چیزیں کتاب اللہ میں تفسیر سے پاتا ہے۔ کتاب اللہ میں یہ چیزیں مبہم ہیں اور سنت اس کی مفسر ہے۔ امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی تھی اور جبریل سنت کے ساتھ آتے تھے جو اس کی تفسیر کرتی تھی۔ سعید بن منصور نے روایت کیا ہے، ہمیں عیسیٰ بن یونس نے اوزاعی سے روایت کر کے بتایا انہوں نے مکحول سے روایت کیا، فرمایا: قرآن کو سنت کی زیادہ ضرورت ہے بنسبت سنت کو قرآن کی ضرورت کے۔ اوزاعی سے یہی مروی ہے۔ فرمایا: یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: سنت کتاب پر فیصلہ کرنے والی ہے جب کہ کتاب سنت پر فیصلہ کرنے والی نہیں۔ فضل بن زیاد نے کہا: میں نے احمد بن حنبل کو سنا جبکہ اس حدیث کے بارے میں ان سے پوچھا گیا جس میں ہے کہ سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کرتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں تو کہتا ہوں: سنت کتاب کی تفسیر کرتی ہے اور اسے بیان کرتی ہے۔

دوسرا بیان: وہ کتاب کے حکم پر زیادتی کرنا ہے جیسے پھوپھی اور خالہ کے عقد میں ہوتے ہوئے ان کی بھتیجی اور بھانجی سے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین، حدیث نمبر 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح کرنا حرام ہے، پالتو گدھوں کا اور ذی ناب درندوں کا حرام کرنا اور ایک گواہ کے ساتھ قسم سے فیصلہ کرنا، اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

# کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو سمجھنے اور سیکھنے کی کیفیت اور جو وارد ہے کہ اس پر آسانی کی گئی جس نے اس پر عمل پر پیش قدمی کی اور حفظ نہ کیا

ابوعمرو الدانی نے کتاب ''البیان'' میں اپنی سند سے حضرات عثمان، ابن مسعود اور اُبی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں دس آیات پڑھاتے تھے اور دوسری دس آیات کی طرف تجاوز نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ جان لیتے تھے جو ان میں عمل ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں قرآن اور عمل اکٹھا سکھاتے تھے۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے عطا بن سائب سے انہوں نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم جب قرآن کی دس آیات سیکھتے تھے تو بعد والی دس آیات نہ سیکھتے تھے حتیٰ کہ ہم ان آیات کا حلال، حرام، امر اور نہی پہچان لیتے تھے۔ مؤطا امام مالک میں ہے، فرمایا: انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر آٹھ سال تک سورۂ بقرہ کو سیکھتے رہے۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الحافظ نے اپنی کتاب المسمی میں مرداس بن محمد ابوبلال اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عمر نے بارہ سال میں سورۂ بقرہ سیکھی جب اسے ختم کیا تو ایک اونٹ ذبح کیا (1)۔ ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے محمد بن شہریار نے بتایا ہمیں حسین بن اسود نے بتایا ہمیں عبیداللہ بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے زیاد بن ابومسلم ابوعمرو سے روایت کیا انہوں نے زیاد بن مخراق سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم پر قرآن کے الفاظ حفظ کرنا مشکل تھا اور ہم پر اس پر عمل کرنا آسان تھا اور ہمارے بعد والوں پر قرآن کا حفظ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ابراہیم بن موسیٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں فضل بن دکین نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: اس امت کی ابتدا میں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کوئی فاضل قرآن سے ایک سورت وغیرہ یاد کرتا تھا اور انہیں قرآن پر عمل بخشا گیا تھا اور اس امت کا آخر ان میں بچے، بوڑھے اور اندھے قرآن پڑھیں گے اور انہیں عمل کی توفیق نہ ہوگی۔ مجھے حسن بن وہاب، ابومحمد بن ابی عنبر نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابوبکر بن حماد مقری نے بتایا فرمایا: میں نے خلف بن ہشام البزار سے سنا وہ فرمارہے تھے: میں گمان کرتا ہوں ہمارے ہاتھوں میں قرآن خالی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے سورۂ بقرہ دس سے زائد سالوں میں یاد کی پھر جب حفظ کر لی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک اونٹ ذبح کیا اور ہمارے زمانہ میں ایک بچہ میرے سامنے بیٹھتا ہے اور تہائی قرآن تلاوت کر لیتا

1۔ شعب الایمان، بیہقی، 1957

ہے اس سے ایک حرف بھی نہیں چھوڑتا میرا خیال ہے ہمارے سامنے قرآن خالی ہے۔ محدثین نے کہا: طالب علم کے لئے مناسب نہیں کہ حدیث کو سمجھے بغیر صرف یاد کرے اور لکھے۔ ورنہ وہ لا حاصل کام میں اپنے نفس کو تھکانے والا ہوگا، اس کا حدیث کی حفاظت کرنا بتدریج تھوڑا تھوڑا اور دن اور رات میں ہو۔ یہ شعبہ، ابن علیہ اور معمر جیسے محدثین سے مروی ہے۔ معمر نے کہا: میں نے زہری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو اکٹھا علم حاصل کرے گا اکٹھا ہی ضائع کرے گا۔ علم کو ایک ایک دو دو حدیث یاد کر کے حاصل کیا جائے۔ واللہ اعلم۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا: تم جو چاہو علم حاصل کرو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے علم پر ہرگز اجر نہ دے گا حتیٰ کہ تم عمل کرو۔ ابن عبد البر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاذ کے قول کی مثل عباد بن عبد الصمد کی روایت سے مروی ہے اس میں یہ زیادتی ہے کہ علماء کی ہمت (ارادہ) درایت ہے اور سفہاء (بیوقوفوں) کا ارادہ رفوایت ہے۔ انہوں نے موقوف روایت کی ہے اور موقوف اس کی روایت سے اولیٰ ہے جنہوں نے مرفوع روایت کی ہے۔ عباد بن عبد الصمد ان لوگوں میں سے نہیں جن سے حجت پکڑی جائے۔ کتنا اچھا کہا ہے جس نے علم کی فضیلت، کتاب عزیز اور روشن سنت کے شرف کے بارے میں کہا ہے۔ عربی اشعار۔

ترجمہ: علوم اگرچہ ان کے محاسن عظیم ہیں ان سب کا تاج وہ ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کی حفاظت وہ خود کرتا ہے، اس کے بعد وہ علم ہے جس نے تکالیف کو دور کیا۔ وہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اس میں نبوت کا نور ہے، شریعت اور ادب ہے۔ اس کے بعد علوم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو اے علم کو ترجیح دینے والے! تو اپنے لئے اختیار کر اور علم خزانہ ہے تو اس کو معادن میں پائے گا اے طالب! تلاش کر اور کتب کا مطالعہ کر اور کتاب اللہ کو سمجھ کر پڑھ اس میں تمام علوم ہیں اس میں غور وفکر کرنے سے عجب چیزیں دیکھے گا۔ اور پڑھ، حدیث مصطفیٰ سے تجھے ہدایت کی گئی ہے اور اپنے مولا سے سوال کر جو تیری خواہش ہو وہ تیری ہر خواہش پوری کرے گا۔ جس نے دین کے علم کا ذائقہ چکھا وہ خوش ہوا، اس نے بیان کیا تو علم میں اضافہ ہوا اور خوش ہوا۔

## نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا جو آسان ہو وہ پڑھو

مسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی غفار کے غدیر کے پاس تھے۔ جبریل امین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر ایک حرف پر پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر دوبارہ جبرئیل امین آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ دو حرفوں پر تلاوت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین تیسری مرتبہ آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر تین حروف پر پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین چوتھی مرتبہ آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر قرآن سات

حروف پر پڑھیں۔ جس حرف پر پڑھیں گے، درست ہوگا(1)۔ ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین سے ملے اور کہا: اے جبریل! مجھے ایک امی امت کی طرف بھیجا گیا ہے، اس میں بوڑھے، شیخ کبیر، غلام، لونڈی اور وہ افراد ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔ جبریل نے کہا: اے محمد! قرآن سات حروف پر اتارا گیا ہے(2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری، مسلم، مؤطا، ابوداؤد، نسائی وغیرہ امہات الکتب جو مصنفات اور مسندات میں سے لکھی گئی ہیں ان میں حضرت ہشام بن حکیم کا واقعہ مذکور ہے (☆)، باب کے آخر میں مکمل طور پر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

''سات حروف پر نازل ہونے'' کے متعلق علماء کے پینتیس اقوال ہیں، ان کو ابو حاتم محمد بن حبان بستی نے ذکر کیا ہے۔ ہم ان میں سے اس کتاب میں صرف پانچ اقوال ذکر کریں گے۔

پہلا قول: یہ وہ قول ہے جس پر اکثر اہل علم ہیں مثلاً حضرات سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن وہب، طبری، طحاوی وغیرہم۔ اس سے مراد مختلف الفاظ کے ساتھ متقارب معانی کی سات وجوہ مراد ہیں مثلاً اقبل، تعال اور ھلم (ان سب کا معنی ہے آؤ)۔ طحاوی نے کہا: ابوبکرہ کی حدیث میں جو ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ فرمایا: جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ایک حرف پر پڑھو اور میکائیل نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید دو تو جبریل نے کہا: دو حروف پر پڑھو۔ میکائیل نے کہا: مزید دو حتیٰ کہ سات حروف تک پہنچے اور کہا: پڑھو، ہر ایک شافی اور کافی ہے مگر آیت رحمت، آیت عذاب سے یا آیت عذاب، آیت رحمت سے خلط ملط نہ ہو، جیسے ھلم، تعال، اقبل، اذھب، اسرع، عجل۔

ورقاء نے ابن ابی نجیح سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے وہ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا (الحدید:13) کو للذین آمنوا امھلونا، للذین آمنوا اخرونا، للذین آمنوا ارقبونا پڑھتے تھے۔ اسی سند کے ساتھ ابی سے مروی ہے کہ وہ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ (البقرہ:20) مروا فیه، سعوا فیه پڑھتے تھے۔ بخاری اور مسلم میں ہے زہری نے کہا: یہ حروف ایک امر میں حرام، حلال میں مختلف نہیں ہوتے۔ طحاوی نے کہا: حروف میں لوگوں کے لئے وسعت رکھی گئی کیونکہ وہ دوسروں کی لغت پر قرآن حاصل کرنے پر عاجز تھے کیونکہ وہ امی تھے لکھنا نہیں جانتے تھے مگر تھوڑے جب کسی ایک لغت والے پر گراں ہوتا کہ وہ دوسری لغت کی طرف پھرے، اگر وہ اس کا قصد کرتا تو اس کے لئے بہت عظیم مشقت ہوتی۔ پس ان کے لئے الفاظ کے اختلاف میں وسعت پیدا کی گئی جبکہ معنی ایک ہو۔ وہ اسی نہج پر تھے حتیٰ کہ ان میں سے لکھنے والے زیادہ ہو گئے اور ان کی لغات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت کی طرف پھر گئیں۔ پس وہ آپ کے الفاظ کی حفاظت پر قادر ہو گئے۔ پس اس وقت انہیں اس کے خلاف پڑھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ابن عبدالبر نے کہا: اس سے ظاہر ہوا کہ یہ سات حروف ایک خاص وقت میں ضرورت کے لئے تھے جن کا تقاضا موجود تھا۔ پھر یہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق بہ، باب بیان القرآن علی سبعة احرف

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءة، حدیث 2868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ صحابی بن صحابی یعنی حکیم بن حزام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں وصال فرمایا، السیر، جلد 3، صفحہ 51

ضرورت ختم ہوگئی اور سات حروف والا حکم بھی اٹھ گیا اور ایک حرف پر پڑھنا واپس آ گیا۔

ابوداؤد نے حضرت ابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے قرآن پڑھایا گیا، مجھے کہا گیا ایک یا دو حروف پر؟ فرشتہ جو میرے ساتھ تھا اس نے کہا: تم کہو دو حرفوں پر۔ پھر مجھے کہا گیا: دو حرفوں پر یا تین حروف پر؟ میرے ساتھی فرشتے نے کہا: تم کہو تین حروف پر حتیٰ کہ سات حروف پر معاملہ پہنچا۔ پھر کہا: اس میں سے کوئی حرف نہیں ہے مگر شافی و کافی ہے۔ اگر تو کہے: سمیعًا، علیمًا، عزیزًا، حکیمًا جب تک کہ آیت عذاب آیت رحمت سے یا آیت رحمت آیت عذاب سے خلط ملط نہ ہو(1)۔ ثابت بن قاسم نے اس حدیث کی مثل حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود کے کلام سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے کہا: جب یہ روایت (یعنی حدیث ابی) ثابت ہے تو یہ اس پر محمول ہوگا کہ پہلے حکم مطلق تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ پس لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ان کی جگہ سے بدلنا جائز نہیں خواہ ان کا معنی موافق ہو یا مخالف ہو۔

**دوسرا قول:** بعض علماء نے کہا: یہ سات لغات قرآن میں ہیں تمام عربوں کی لغات پر یعنی ان کے یمنی و نزار قبائل کی لغات۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ان لغات میں سے ہر ایک لغت جانتے تھے آپ کو جوامع الکلم کی شان دی گئی تھی۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ ایک حرف میں سات وجوہ ہیں لیکن یہ سات لغات قرآن میں متفرق ہیں۔ اس کا بعض لغت قریش پر ہے بعض لغت ہذیل پر ہے بعض لغت ہوازن پر ہے بعض لغت یمن پر ہے۔ خطابی نے کہا: قرآن میں جو الفاظ سات وجوہ پر پڑھے گئے وہ یہ ہیں وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ (المائدہ:60) اور مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ (یوسف:12) پھر خطابی نے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ گویا خطابی کا نظریہ ہے کہ بعض الفاظ سات حروف پر نازل کئے گئے ہیں نہ کہ تمام۔ اس قول کے مطابق قرآن سات حروف پر آیا ہے یعنی سات لغات پر اترا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام اور ابن عطیہ کا یہی نظریہ ہے۔ ابو عبید نے کہا: بعض قبائل نے بعض سے زیادہ حصہ پایا۔ ابن شہاب کی حدیث حضرت انس سے روایت کی گئی کہ حضرت عثمان نے جب انہیں قرآن کے نسخے لکھنے کا حکم دیا تو فرمایا: جب تم اور زید اختلاف کرو تو لغت قریش میں لکھو، کیونکہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا ہے(2)۔ یہ بخاری نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے۔ فرمایا: قرآن کعبین کی لغت میں نازل ہوا۔ کعب قریش اور کعب خزاعہ۔ بعض علماء نے کہا: یہ کیسے ہے؟ فرمایا: کیونکہ گھر ایک ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یعنی خزاعہ قریش کے پڑوسی ہیں انہوں نے ان کی لغت سے لیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: حضرت عثمان کے قول ''قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا'' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اکثر حصہ اور زیادہ حصہ ان کی زبان پر نازل ہوا اور کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ سارا قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا کیونکہ اس میں ایسے کلمات اور حروف ہیں جو قریش کی لغت کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف، حدیث نمبر 1262، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب نزل القرآن بلسان قریش، حدیث نمبر 3244، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الزخرف:3) یہ نہیں فرمایا کہ قرآنا قرشیا۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن عربوں کی تمام زبانوں پر نازل ہوا۔ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ عربوں میں سے دوسروں کو چھوڑ کر قریش کا ارادہ کرے جیسا کہ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عدنان کی لغت کا ارادہ فرمایا نہ کہ قحطان کا، یا ربیعہ کا ارادہ فرمایا نہ کہ مضر کا، کیونکہ عرب کا اسم تمام قبائل کو مکمل شامل ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: جس نے کہا قرآن لغت قریش کے مطابق نازل ہوا میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ زیادہ لغت قریش پر نازل ہوا کیونکہ لغت قریش کے علاوہ بھی صحیح قراءت میں موجود ہیں مثلاً ہمزات وغیرہ کا موجود ہونا اور قریش ہمزہ نہیں پڑھتے۔ ابن عطیہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ (قرآن سات حروف پر نازل ہوا) اس کا مطلب ہے سات قبائل، تمام کی لغت کے مطابق قرآن نازل ہوا، اس کے معنی کو کبھی قریش کی عبارت سے کبھی ہذیل کی عبارت سے کبھی دوسرے قبائل کی عبارت سے تعبیر فرمایا، لفظ میں جو افصح اور ایجاز کے مطابق تھا۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فَطَرَ کا معنی قریش کے علاوہ کے نزدیک ابتدا ہے اس نے چیز کو پیدا کیا اور کام پر لگایا پھر قرآن میں آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سمجھ نہ آیا حتیٰ کہ دو اعرابی ان کے پاس ایک کنویں کے بارے میں جھگڑا لے آئے تو ایک نے کہا: انا فطرتہا (میں نے اسے کھودا تھا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس وقت مجھے فاطر السموات والارض کا معنی سمجھ آیا۔ اسی طرح فرمایا میں رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (اعراف:89) کا معنی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ میں نے ذی یزن کی ایک عورت کو اپنے خاوند کو یہ کہتے ہوئے سنا تعال افاتحک یعنی میں تیرا فیصلہ کروں، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب نے کہا وہ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (النحل:47) کا معنی نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح قطبہ بن مالک کے لئے اتفاق ہوا جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ (ق:10) پڑھتے ہوئے سنا۔ یہ مسلم نے باب القراءۃ فی صلاۃ الفجر میں ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں۔

تیسرا قول: یہ سات لغات مضر قبیلہ میں تھیں۔ یہ ایک قوم کا خیال ہے اور انہوں نے حضرت عثمان کے اس قول سے حجت پکڑی ہے قرآن مضر کی لغت میں نازل ہوا اور انہوں نے کہا: یہ بھی جائز ہے اس میں سے قریش، کنانہ، اسد، ہذیل، تیم، ضبہ اور قیس کی لغات ہوں۔ وہ کہتے ہیں: یہ مضر کے قبائل ہیں وہ سات لغات کو ان مراتب پر گھیرے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود پسند کرتے تھے کہ مصاحف لکھنے والے مضر قبیلہ سے ہوں، دوسروں نے انکار کیا کہ تمام مضر قبیلہ سے ہوں اور انہوں نے کہا مضر قبیلہ میں شواذ ہیں ان کے ساتھ قرآن کو پڑھنا جائز نہیں مثلاً کشکشۃ، قیس، تمتمۃ تمیم، رہا کشکشۃ قیس تو وہ مؤنث کی کاف کو شین بنا دیتے ہیں اور وہ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ (مریم:24) کو جعل ربش تحتش سریا پڑھتے ہیں اور رہا تمتمۃ تمیم تو وہ الناس کو النات اور اکیاس کو اکیات پڑھتے ہیں۔ یہ لغات ہیں، ان کے ساتھ قرآن کا پڑھا جانا درست نہیں اور نہ سلف سے اس کے متعلق کوئی چیز محفوظ ہے۔

دوسرے کہتے ہیں: رہا ہمزہ کو عین سے بدلنا اور حروف حلقیہ کو ایک دوسرے سے بدلنا تو فصحاء سے مشہور ہے اور اس کے ساتھ بڑے بڑے قراء نے پڑھا ہے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت سے حجت پکڑی ہے۔ لیسجننہ عتی حین انہوں نے پڑھا ہے اور یہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور ان علماء نے ذی الرمہ کے قول سے حجت پکڑی ہے۔

فعيناك عيناها و جيدك جيدها ولونك الا عنها غير طائل

عنہا سے مراد انہا ہے۔

**چوتھا قول:** یہ صاحب الدلائل نے بعض علماء سے حکایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے اسی طرح حکایت کیا ہے۔ فرمایا: تو قرأت میں اختلاف کی وجوہ میں غور کرے گا تو انہیں سات ہی پائے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس میں حرکت تبدیل ہوتی ہے اور معنی زائل نہیں ہوتا اور صورت بھی نہیں بدلتی۔ مثلاً هن اطهرُلکم ، و اطهرَ ، و یضیقُ صدری ، و یضیقَ ، بعض میں صورت نہیں بدلتی، اعراب کے ساتھ معنی بدل جاتا ہے مثلاً ربنا باعِدبین اسفارنا ، و باعَدَ بعض میں صورت باقی رہتی ہے حروف کے اختلاف کے ساتھ معنی تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً ننشزها وننشرها، بعض میں صورت بدلتی ہے اور معنی باقی رہتا ہے جیسے کالعهن المنفوش و کالصوف المنفوش، بعض میں صورت اور معنی دونوں بدل جاتے ہیں مثلاً و طلح منضود و طلع منضود اس میں تقدیم و تاخیر ہے جیسے و جاءت سکرة الموت بالحق اور جاءت سکرة الحق بالموت۔ زیادہ اور کمی کے ساتھ جیسے تسع و تسعون نعجة انثی اور یہ قول اما الغلام فکان کافراً و کان ابواه مومنین۔ اور یہ قول فان الله من بعد اکراههن لهن غفور ، رحیم۔

**پانچواں قول:** سات حروف سے مراد کتاب اللہ کے معانی ہیں۔ یہ امر، نہی، وعدہ، وعید، قصص مجادلہ اور امثال ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ اس کو احرف سے تعبیر نہیں کیا جاتا اور اس پر اجماع ہے کہ حلال کی حلت میں اور معانی میں سے کسی معنی کو تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں۔ قاضی ابن طیب نے اس معنی میں ایک حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ پھر فرمایا لیکن یہ ایسی صورت نہیں جس کے ساتھ قراءت کی اجازت دی ہو۔ اس صورت میں حرف بمعنی جہت اور طریقہ ہوگا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج: 11) پس اسی طرح اس حدیث کا معنی ہو سات طریقے جیسے تحلیل، تحریم وغیرہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس ارشاد (سات حروف پر قرآن نازل ہوا) کا مطلب وہ سات قراءتیں ہیں جو سات قراء نے پڑھی ہیں کیونکہ وہ تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت سے مروی ہیں اور یہ قول بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کا بطلان ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**فصل:** بہت سے علماء مثلاً داؤدی، ابن ابی صفرہ وغیرہما نے فرمایا: یہ سات قراءتیں جو ان سات قراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہ وہ سات حروف ہیں جن کے ساتھ قرأت میں صحابہ کو رعایت دی گئی۔ یہ سات میں سے ایک حرف کی طرف راجع ہیں۔ یہ وہ ہے جس پر حضرت عثمان نے مصحف کو جمع فرمایا۔ یہ ابن نحاس وغیرہ نے ذکر فرمایا۔ یہ مشہور قراءتیں ان ائمہ قراء کے اختیارات ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اس کو اختیار فرمایا جو مروی تھا اور اس کی وجہ معلوم تھی اور اس کے نزدیک وہ احسن اور اولیٰ تھی۔ پس اس نے اس کا التزام کیا۔ پس اس نے اس کو روایت کیا اور اس کے ساتھ پڑھا اور اس سے وہ قرأت مشہور ہوئی، اس سے معروف ہوئی اور اس کی طرف منسوب ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: حرف نافع، حرف ابن کثیر۔ ان میں سے کسی نے دوسرے کے اختیار کو منع نہیں فرمایا اور نہ اس کا انکار کیا بلکہ اس کو جائز قرار دیا۔ ان ساتوں میں ہر ایک سے دو یا دو سے زیادہ اختیار بھی

مروی ہیں اور سب صحیح ہیں۔

مسلمانوں کا اس زمانہ میں ان ائمہ سے جو صحیح مروی ہے اس پر اعتماد کرنے میں اجماع ہے۔ جو کچھ انہوں نے روایت کیا اور جو انہوں نے قراءت میں سے جو رائے قائم کی اور انہوں نے اس کے متعلق تصانیف لکھیں اور درست بات پر اجماع قائم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو حفظ کتاب کا وعدہ فرمایا وہ پورا ہوا۔ یہی نظریہ متقدمین فضلاء محققین کا ہے جیسے قاضی ابوبکر بن طیب اور طبری وغیرہما۔ ابن عطیہ نے کہا سات قراءتوں پر زمانہ گزر چکا ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے، کیونکہ یہ اجماع سے ثابت ہیں اور رہی شاذ قراءتیں تو ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جاتی، کیونکہ لوگوں کا اس پر اجماع ہے اور ان شاذ قراءتوں میں سے جو صحابہ سے اور علماء تابعین سے مروی ہیں، ان میں اعتقاد نہیں کیا جاتا مگر انہوں نے اس کو روایت کیا ہے اور جو ابو السمال اور ان کے ہم عصر علماء سے مروی ہے اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مصاحف متواترہ سے شاذ قراءتیں قرآن میں ہیں ان کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا کہ یہ اس میں سے ہیں۔ اور اس کا بہترین محمل یہ ہے کہ وہ اس شخص کے مذہب کی تاویل کا بیان ہیں جن کی طرف وہ قراءت منسوب کی گئی ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت فصیام ثلاثة ایام متتابعات اگر راوی رسول اللہ ﷺ سے سماع کی صراحت کرے تو پھر بھی دو اقوال کے مطابق اس پر عمل میں اختلاف ہے یعنی ایک قول نفی میں ہے اور ایک قول اثبات میں ہے۔ نفی کی وجہ یہ ہے کہ راوی نے خبر کے مطابق روایت نہیں کیا بلکہ قرآن کے مطابق روایت کیا۔ وہ ثابت نہیں ہے تو قرآن ہونا ثابت نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن ہونا ثابت نہیں ہے تو سنت ہونا ثابت ہوا۔ اس پر عمل کرنا، دوسری اخبار احاد کی طرح ہوگا۔

## فصل: حضرت عمر اور ہشام کی حدیث کے معنی کا ذکر

ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ان سات حروف پر پڑھنا مباح فرمایا ہے۔ جبریل امین نے یہ سات حروف پیش کئے اور اس طریقہ پر پیش کئے جس میں اعجاز اور عمدگی تھی اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل:20) کے ارشاد سے یہ اباحت ثابت نہیں کہ ہر صحابی جب چاہے بعض الفاظ کو بعض سے بدلنا چاہے تو اپنی طرف سے بدل دے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا اعجاز ختم ہو جاتا اور ہر ایک حرف دوسرے سے بدل دیا جاتا اور قرآن وہ نہ رہتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ان سات حروف میں اباحت واقع ہوتی تھی تا کہ اس کے ساتھ اپنی امت پر وسعت پیدا کریں۔ کبھی تو آپ نے حضرت ابی کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے، کبھی حضرت ابن مسعود کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمر کی سورۂ فرقان کی قراءت اور ہشام بن حکیم کی قراءت واقع ہوئی ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ نبی کریم ﷺ ہر قراءت کے بارے فرماتے جو مختلف تھیں مجھے جبریل نے اسی طرح پڑھائی ہے، یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ نے کبھی اس طرح پڑھی ہو اور کبھی اس طرح پڑھی ہو۔ اس پر حضرت انس کا قول محمول ہوگا جب انہوں نے پڑھا ان ناشئة اللیل ھی اشد وطأ و اصوب قیلاً واھیأ۔ ان سے کہا گیا: ہم تو اقوم قیلاً پڑھتے ہیں۔ حضرت انس نے کہا: اصوب قیلاً اور اقوم قیلاً واھیأ ایک ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ ورنہ اگر لوگوں میں

سے کسی کے لئے ایسا کرنا درست ہوتا تو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) کا معنی باطل ہو جاتا۔ بخاری اور مسلم وغیرہما نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان اس انداز میں پڑھتے سنا جو میرے پڑھنے کے انداز سے مختلف تھا او۔ مجھے یہ سورت خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں ہشام پر جھپٹ پڑتا پھر میں نے اسے مہلت دی حتیٰ کہ اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کو چادر سے پکڑ لیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کو سورۂ فرقان اپنے سے مختلف انداز میں پڑھتے ہوئے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: پڑھو، اس نے اس طریقہ پر پڑھی جس پر پڑھتے ہوئے میں نے اسے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے فرمایا: تم پڑھو۔ میں نے پڑھی تو فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے، یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جو ان میں سے آسان ہو اس پر پڑھو (1)۔ میں کہتا ہوں: حضرت عمر کی اس حدیث کے معنی میں مسلم کی روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے، فرمایا: میں مسجد میں تھا۔ ایک شخص داخل ہوا اور نماز پڑھنا شروع کی۔ اس نے ایسی قراءت کی جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ پھر دوسرا شخص آیا اس نے پہلے ساتھی کے علاوہ طریقہ پر قراءت کی۔ جب ہم نے نماز مکمل کر لی تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: اس نے ایسی قراءت کی ہے جس کا میں نے انکار کیا ہے۔ دوسرا داخل ہوا اس نے اس قراءت سے مختلف قراءت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: پڑھو۔ ان دونوں نے پڑھا تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی تحسین فرمائی۔ میرے دل میں ہیبت وحیرت واقع ہوئی۔ تکذیب کی وجہ سے میں چونکہ زمانہ جاہلیت میں ایسا نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ میری کیفیت دیکھ کر پہچان گئے۔ انہوں نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا، تو میرا پسینہ نکل آیا گویا میں اللہ تعالیٰ کی طرف خوف سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے یہ پیغام بھیجا گیا ہے کہ میں ایک حرف پر قرآن پڑھوں۔ میں نے بات لوٹائی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ پھر دوبارہ پیغام آیا کہ دو حروف پر قراءت کرو۔ میں نے عرض کی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ تیسری دفعہ پیغام آیا کہ سات حروف پر قراءت کرو۔ پس تیرے لیے ہر بار لوٹانے کے بدلے میں ایک دعا کا موقع ہے جو آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کی: اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما، اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما اور تیسری مرتبہ کو میں نے اس دن کے لئے مؤخر کر دیا جس دن ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی (2)۔

**حضرت ابی کا قول: فسقط فی نفسی** کا معنی ہے مجھے حیرت اور دہشت لاحق ہوئی یعنی شیطان کا حملہ ہوا کہ اس پر ان کا حال مشوش کرے اور اس پر اس کا وقت مکدر کر دے کیونکہ شیطان نے قرآن کے اختلاف کو ان پر عظیم بنا دیا جو حقیقت میں ایک عظیم مسئلہ نہ تھا اور نہ اختلاف قراءت سے کون سا حال اور تکذیب لازم آتی ہے اور یہ چیز الحمد للہ نسخ میں بھی لازم نہ آتی جو اس

---

1۔ صحیح بخاری، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف، حدیث نمبر 4608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب بیان ان القرآن علی سبعۃ احرف

سے عظیم تھا تو قراءت میں یہ کیسے آسکتی تھی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیفیت بدلتی ہوئی دیکھی تو اس کے سینہ پر ہاتھ مار کر اسے تنبیہ فرمائی تو اس کے بعد حضرت ابی کا سینہ کھل گیا اور باطن روشن ہو گیا حتیٰ کہ کشف اور شرح معاینہ کی حالت کی طرف لوٹ گیا۔ جب دل کی قبح ان پر ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ سے حیا کی وجہ سے پسینہ میں ڈوب گئے۔ اس شخص کا دل بھی اسی قبیل سے تھا جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اپنے نفسوں میں ایسی کیفیت پاتے ہیں ہم میں سے کوئی اس کو بیان کرنا بھی برا سمجھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ایسی کیفیت پاتے ہو؟ صحابہ نے کہا: ہاں، فرمایا: یہ صریح ایمان ہے (1)۔ یہ حدیث مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ مزید کلام سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## قرآن جمع کرنے کا ذکر، حضرت عثمان کا قرآن کے نسخے لکھوانے کا سبب اور باقی نسخے جلانے کا ذکر، صحابہ میں سے حفاظ قرآن کا ذکر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مردوں کے سینوں میں متفرق تھا اور کچھ صحیفوں میں تھا۔ کچھ کھجور کے پتوں پر تھا، کچھ لخاف اور ظرر پر اور کچھ ٹھیکریوں وغیرہ پر تھا۔ اصمعی نے کہا: لخاف سفید باریک پتھر کو کہتے ہیں اور اس کا واحد لخفۃ ہے اور الظرر اس پتھر کو کہتے ہیں جس کی چھری کی طرح دھار ہوتی ہے اس کی جمع ظرار ہے جیسے رطب کی جمع رطاب ہے، ربع کی جمع رباع ہے اور اس کی جمع ظران بھی ہے جیسے صرد کی جمع صردان ہے۔ جب حضرت ابو بکر کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں قراء کی شہادت زیادہ ہوئی اس جنگ میں سات سو قراء شہید ہوئے۔ حضرت عمر نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کو قرآن جمع کرنے کا مشورہ دیا کہ بوڑھے قراء فوت نہ ہو جائیں جیسے حضرات ابی، ابن مسعود اور زید رضی اللہ عنہم تو ان دونوں حضرات نے حضرت زید بن ثابت کو اس کام کے لئے بلایا۔ انہوں نے بڑی مشقت کے بعد سورتوں کی ترتیب کے بغیر قرآن کو جمع کیا۔ بخاری نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنگ یمامہ کے موقع پر مجھے حضرت ابو بکر نے بلایا (میں پہنچا) تو حضرت عمر بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابو بکر نے کہا: حضرت عمر میرے پاس آئے اور کہا: جنگ یمامہ میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قراء بہت سے مواقع پر شہید ہو گئے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا مگر یہ کہ تم قرآن کو جمع کر لو۔ میرا خیال ہے کہ تم قرآن کو جمع کرو۔ حضرت ابو بکر نے کہا: میں نے حضرت عمر کو کہا: میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے۔ حضرت عمر مجھ پر یہ بات بار بار لوٹاتے رہے حتیٰ کہ اس کے لئے اللہ نے میرا سینہ کھول دیا۔ میں نے بھی وہ رائے قائم کر لی جو حضرت عمر کی تھی۔ حضرت زید نے کہا جبکہ حضرت عمر ان کے پاس خاموش بیٹھے تھے حضرت ابو بکر نے مجھے کہا: تو ایک نوجوان، عقلمند شخص ہے اور تجھ پر کوئی تہمت نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وحی لکھتا رہا ہے تم قرآن کو تلاش کرو اور جمع کرو۔ اللہ کی قسم! اگر حضرت ابو بکر مجھے پہاڑوں میں سے کوئی پہاڑ نقل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان

کرنے کا حکم دیتے تو مجھ پر وہ اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا کہ مجھے حضرت ابو بکر نے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے کہا: تم دونوں وہ کام کیسے کرتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا؟ حضرت ابو بکر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے میں بار بار یہ بات لوٹاتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا اس کام کے لئے جس کے لیے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا سینہ کھول دیا تھا، میں نے قرآن کو تلاش کیا اور میں کپڑوں سے، کندھوں کی ہڈیوں سے، کھجور کے پتوں سے اور مردوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کرنے لگا حتیٰ کہ میں نے سورۂ توبہ کی دو آیتیں صرف خزیمہ انصاری کے پاس پائیں جو میں نے کسی اور کے پاس نہ پائیں۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۞ (التوبہ)

وہ صحیفے جن میں قرآن جمع کیا گیا تھا وہ پہلے حضرت ابو بکر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت عمر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس رہے۔ لیث نے کہا: مجھے عبد الرحمٰن بن غالب نے ابن شہاب سے روایت کر کے بتایا کہ ابو خزیمہ انصاری کے پاس وہ آیات تھیں، ابو ثابت نے کہا: ہمیں ابراہیم نے بتایا وہ خزیمہ کے پاس یا ابو خزیمہ کے پاس تھیں: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۞ (توبہ) امام ترمذی نے اپنی حدیث میں، حضرت زید سے روایت کیا کہ میں نے سورہ برأت کی آخری آیات خزیمۃ بن ثابت کے پاس پائیں لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۞ (التوبہ) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

بخاری میں حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، فرمایا: جب ہم نے مصاحف میں صحیفوں کو نقل کیا تو میں نے سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ میں نے کسی کے پاس وہ آیت نہ پائی مگر خزیمہ انصاری کے پاس، جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی شہادت کے قائم مقام بنایا تھا۔ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب: 23) (2) امام ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنتا تھا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب: 23) میں نے اس کو تلاش کیا تو میں نے اسے خزیمہ انصاری یا ابو خزیمہ کے پاس پایا پھر میں نے اسے اس سورت سے لاحق کر دیا (3)۔ میں کہتا ہوں: پہلی آیت سورۂ برأت کے آخر سے پہلی مرتبہ جمع کرنے کے وقت ساقط تھی جیسا کہ بخاری اور ترمذی نے کہا اور دوسری مرتبہ جمع کرنے کے وقت سورۂ احزاب کی آیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب لقد جاء کم رسول من انفسکم، حدیث نمبر 4311، جامع ترمذی، حدیث 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، حدیث نمبر 4411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

موجود نہ تھی۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ آیت برأت آخری جمع کے وقت ساقط تھی۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم، اگر یہ کہا جائے کہ کیا وجہ تھی کہ حضرت عثمان نے اپنے مصحف پر لوگوں کو جمع کیا حالانکہ حضرت ابو بکر اس کام کو پہلے سرانجام دے چکے تھے اور وہ اس کام سے فارغ ہو چکے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان نے جو کیا ان سے ان کا مقصد مصحف کی تالیف پر لوگوں کو جمع کرنا نہ تھا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے کس طرح حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ ہماری طرف صحیفہ بھیجو ہم اس کو دوسرے مصاحف میں نقل کریں گے پھر تمہیں اپنا صحیفہ واپس کر دیں گے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔
حضرت عثمان نے یہ اس لئے کیا تھا کہ لوگ قراءتوں میں اختلاف کرنے لگ گئے تھے کیونکہ صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اس میں صورت حال گھمبیر ہو گئی تھی اور اختلاف وانتشار بڑھ گیا تھا اور اہل شام اور عراق کے درمیان وہ واقع ہوا جو حضرت حذیفہ نے ذکر فرمایا۔ یہ اس طرح ہوا کہ وہ غزوہ ارمینیہ میں جمع ہوئے تو ہر طائفہ نے اس کے مطابق قراءت کی جو اسے روایت کیا گیا تھا۔ آپس میں اختلاف کرنے لگے اور جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے اور ایک دوسرے سے برأت اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ نے یہ منظر دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ جب مدینہ طیبہ آئے تو اپنے گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان کے پاس آئے۔ عرض کی: اس امت کی چارہ سازی کیجئے اس سے پہلے کہ یہ ہلاک ہو جائے۔ حضرت عثمان نے پوچھا: کیا ہوا؟ حضرت حذیفہ نے کہا: اللہ کی کتاب کے بارے جھگڑا ہوا۔ میں اس غزوہ میں موجود تھا۔ لوگ اس غزوہ میں عراق، شام اور حجاز سے جمع ہوئے تھے پھر سارا واقعہ بیان کیا، اور فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کے بارے میں اس طرح اختلاف کریں گے جس طرح یہود ونصاریٰ نے اختلاف کیا تھا (1)۔
میں کہتا ہوں: یہ ان علماء کے قول کے بطلان پر بڑی واضح دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ سات حروف سے مراد سات قراء کی قراءتیں ہیں کیونکہ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔ حضرت سوید بن غفلہ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے، حضرت عثمان نے کہا: تم مصاحف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو کیونکہ لوگ قراءت میں اختلاف کر چکے ہیں حتیٰ کہ کوئی کہتا ہے میری قراءت تیری قراءت سے بہتر ہے اور یہ کفر کے مشابہ ہے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عثمان نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ لوگ ایک قراءت پر جمع ہو جائیں، کیونکہ آج اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد آنے والے مزید اختلاف کریں گے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی رائے درست ہے۔ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ تم ہماری طرف قرآن کا نسخہ بھیجو ہم اس سے مزید نسخے تیار کرائیں گے پھر تمہیں اپنا مصحف واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہ نے وہ حضرت عثمان کی طرف بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے حضرات زید بن ثابت، عبد اللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبد الرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ قرآنی نسخے نقل کریں۔ حضرت عثمان نے قریش کے گروہ کو کہا: جب تم اور زید بن ثابت قرآن کے متعلق کسی چیز کے بارے میں اختلاف کرو تو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے اس صحیفہ سے مزید مصاحف

---

1۔ جامع ترمذی، ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کر لئے تو حضرت عثمان نے وہ صحیفہ حضرت حفصہ کو واپس کر دیا۔ حضرت عثمان نے ہر علاقہ کی طرف ایک نسخہ بھیجا اور قرآن کے باقی جتنے صحیفے یا مصاحف موجود تھے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ یہ حضرت عثمان نے کام کیا جبکہ مہاجرین، انصار اور اجل اہل اسلام اس بات پر متفق ہو گئے ہیں اور حضرت عثمان نے ان سے مشورہ کر لیا تھا۔ پس وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو قرآن کی قراءت مشہورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے اس کو جمع کیا جائے اس کے علاوہ کو ترک کر دیا جائے۔ سب نے حضرت عثمان کی رائے کو درست کہا اور ان کی رائے پختہ اور صائب تھی۔ رضی اللہ عنہم۔ طبری نے اپنی روایت میں کہا: حضرت عثمان نے حضرت زید کے ساتھ ابان بن سعید بن العاص کو ملایا تھا یہ ضعیف ہے۔ بخاری، ترمذی وغیرہما نے جو کہا ہے وہی اصح ہے۔ طبری نے کہا: وہ صحیفہ جو حضرت حفصہ کے پاس تھا اسے اس آخری جمع میں امام و مقتداء بنایا گیا اور یہ صحیح ہے۔

ابن شہاب نے کہا: مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے کہا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے حضرت زید بن ثابت کے مصاحف نقل کرنے کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا: اے مسلمانوں کے گروہ! میں مصاحف کی نقل سے جدا ہوتا ہوں اس کام کا ایسا والی بنا ہے اللہ کی قسم! میں اسلام لا چکا تھا اور یہ ایک کافر شخص کی پیٹھ میں تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی مراد زید بن ثابت تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا تھا: اے اہل عراق! وہ مصاحف جو تمہارے پاس ہیں ان کو چھپا دو اور انہیں بند کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: 161) پس تم اللہ سے مصاحف کے ساتھ ملو۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اس پر مزید کلام سورۂ آل عمران میں ان شاء اللہ آئے گی (1)۔

ابوبکر انباری نے کہا: حضرت زید کو حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی طرف سے حضرت عبد اللہ بن مسعود پر جمع قرآن میں ترجیح نہ تھی۔ حضرت عبد اللہ، حضرت زید سے افضل تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے میں مقدم تھے اور زیادہ سبقت لے جانے والے تھے اور عظیم فضائل کے مالک تھے مگر حضرت زید حضرت عبد اللہ سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے کیونکہ انہوں نے سارا قرآن یاد کر لیا تھا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر حیات میں تھے اور حضرت عبد اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ستر سے زائد سورتیں آپ سے سیکھی تھیں پھر باقی سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سیکھی تھیں۔ پس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیات میں قرآن ختم کر چکا تھا اور یاد کر چکا تھا وہ مصحف کو جمع کرنے میں اولیٰ تھا اور ایثار و اختیار کے لئے زیادہ حقدار تھا، کسی جاہل کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ پر طعن ہے کیونکہ حضرت زید ان سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے۔ پس یہ ان کے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے تقدم کا موجب ہے کیونکہ حضرات ابوبکر و عمر سے بھی حضرت زید قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے حالانکہ حضرت زید ان دونوں حضرات سے بہتر نہیں بلکہ فضائل و مناقب میں ان کے مساوی بھی نہیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا: حضرت عبد اللہ کی طرف سے جو انکار وارد ہوا ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو غصہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس پر نہ عمل ہو گا نہ اس کو قبول کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد حضرت عثمان اور دوسرے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن اختیار کو پہچان لیا اور پھر ان کی موافقت پر باقی رہے اور اختلاف

1۔ جامع ترمذی، ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3028، حضرت عبد اللہ بن مسعود کے ان الفاظ کو جلیل القدر صحابہ نے سخت ناپسند کیا تھا۔

ترک کر دیا۔ اور یہ اہل نقل و روایت کے نزدیک مشہور و معروف اور جانا پہچانا مسئلہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بقیہ قرآن رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حاصل کیا۔ بعض ائمہ نے فرمایا: حضرت عبداللہ قرآن ختم کرنے سے پہلے وصال فرما گئے۔ یزید بن ہارون نے کہا۔ المعوذتان (سورہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) سورۂ بقرہ اور آل عمران کے متعلق جو کہتا ہے کہ یہ قرآن سے نہیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والا ہے۔ حضرت زید سے کہا گیا حضرت عبداللہ کا ان سورتوں کے متعلق قول کا کیا ہوگا؟ حضرت زید نے فرمایا: مسلمانوں کے درمیان اختلاف نہیں کہ حضرت عبداللہ کا وصال ہو گیا تھا جبکہ انہوں نے ابھی سارا قرآن یاد نہیں کیا تھا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، اس کی وضاحت آگے آئے گی، اسماعیل بن اسحاق وغیرہ نے کہا حضرت حماد نے کہا: میرا خیال ہے حضرت مالک بن انس سے انہوں نے روایت کیا ہے؟ فرمایا: لوگ ایک آیت کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے: فلاں بن فلاں کو یہ رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ پھر مدینہ طیبہ سے وہ تین راتوں کی مسافت پر ہوتا تو اسے لایا جاتا اور اسے کہا جاتا: تجھے فلاں فلاں آیت رسول اللہ ﷺ نے کیسے کیسے پڑھائی تھی۔ پس وہ جس طرح کہتا لوگ لکھ لیتے تھے۔ ابن شہاب نے کہا: اس دن تابوت میں اختلاف ہوا۔ حضرت زید نے کہا: یہ التابوہ ہے۔ حضرات ابن زبیر، سعید بن العاص نے کہا: التابوت ہے۔ یہ اختلاف حضرت عثمان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسے تاء کے ساتھ لکھو کیونکہ قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا۔ اس روایت کو بخاری اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت زید نے ھاء کے ساتھ پڑھا اور قریشیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا تو انہوں نے تاء کے ساتھ لکھا۔ مصاحف اسی طریقہ پر لکھے گئے تھے جس طرح پہلے تھے حضرت عثمان نے ان سے نقل کروائی۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ نئے نسخے جو تیار کئے گئے تھے وہ سات تھے۔ بعض نے کہا: چار تھے۔ یہ اکثر کا قول ہے اور یہ نسخے مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ عراق، شام اور مصر اصل نسخے بھیجے گئے۔ پس ان شہروں کو قراء نے اپنے اختیارات کا معتمد بنایا اور ان میں سے کسی نے مصحف کی مخالفت نہ کی جس طرح کہ انہیں وہ پہنچا۔ اور جو سات قراء میں حروف میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض زیادہ کرتے ہیں بعض کم کر دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس پر اعتماد کرتا تھا جو اسے پہنچا تھا اور انہوں نے جو روایت کیا تھا کیونکہ حضرت عثمان نے بعض نسخوں میں ان جگہوں کو لکھوایا اور بعض میں نہ لکھوایا یہ شعور دلاتے ہوئے کہ یہ سب صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے قراءت جائز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: پھر حضرت عثمان نے باقی مصاحف جلا دینے کا حکم دیا۔ ان تحرق اور ان تخرق دونوں طرح یہ لفظ مروی ہے خاء نقطہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا دفن کرنے کا حکم دیا اور بغیر نقطہ والی حاء کی روایت احسن ہے۔

ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں حضرت سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ فرماتے سنا، اے لوگوں کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور حضرت عثمان کے بارے میں غلو سے بچو۔ تم کہتے ہو حضرت عثمان قرآن کو جلانے والے تھے۔ اللہ کی قسم! انہوں نے ان نسخوں کو نہیں جلایا مگر ہم میں سے اصحاب محمد کے گروہ سے مشورہ کر کے ایسا کیا۔ عمیر بن سعید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: اگر حضرت عثمان کے وقت میں میں والی ہوتا تو میں

بھی مصاحف کے بارے میں وہی کرتا جو حضرت عثمان نے کیا تھا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا: حضرت عثمان کے مصاحف کو جمع قرآن کے وقت جلانے کے حکم سے، ان کتب کے جلانے کا جواز ثابت ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوتے ہیں اور یہ ان نسخوں کا اکرام تھا اور انہیں قدموں کے نیچے روندے جانے سے اور زمین میں ضائع ہونے سے بچانے کے لئے تھا۔ معمر نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ ان صحف کو جلا دیتے تھے جب ان کے پاس رسائل جمع ہو جاتے تھے جن میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے فقہ کی کتب جلائیں جو جنگ کے دن ان کے پاس تھیں۔ ابراہیم نے ان صحیفوں کو جلانے کو ناپسند کیا جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اور جلانے والے کا قول اولیٰ بالصواب ہے۔ حضرت عثمان نے ایسا کیا تھا۔ قاضی ابو بکر نے لسان الامہ میں کہا: امام کے لئے ان صحیفوں کو جلانا جائز ہے جن میں قرآن ہو جب اس کا اجتہاد ان کو جلانے تک پہنچے۔

**فصل**: ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل میں حلولیہ اور حشویہ فرقوں کا رد ہے جو حروف اور اصوات کو قدیم کہتے ہیں، اور کہتے ہیں قراءت اور تلاوت قدیم ہیں ایمان قدیم ہے اور روح قدیم ہے حالانکہ امت محمدیہ اور امت نصاریٰ، یہود اور براہمہ بلکہ ہر ملحد و موحد کا اجماع ہے کہ قدیم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ قادر کی قدرت کسی وجہ اور سبب سے متعلق نہیں ہوتی اور قدیم پر عدم جائز نہیں ہوتا اور قدیم محدَث نہیں ہوتا اور محدَث قدیم نہیں ہوتا اور قدیم وہ ہوتا ہے جس کے وجود کے لئے آغاز نہیں اور محدَث (حادث) وہ ہوتا ہے جو نہ ہونے کے بعد ہوتا ہے یہ طائفہ ملتوں کے عقلاء کے اجماع کے خلاف کہنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں: محدث کے لئے قدیم ہونا جائز ہے اور بندہ جب اللہ کا کلام پڑھتا ہے تو وہ اللہ کے کلام کو قدیم بنا دیتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی اینٹ اور لکڑی سے حروف تراشتا ہے یا سونے اور چاندی سے حروف بناتا ہے یا کوئی کپڑا بنتا ہے اور اس پر کتاب اللہ کی کوئی آیت منقش کرتا ہے تو انہوں نے کلام اللہ کو قدیم بنا دیا اس کا کلام مفسوخ قدیم، منحوت قدیم، مصنوع قدیم ہوگیا۔ انہیں کہا جائے گا تم اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق کیا کہتے ہو، کیا اس کا پگھلانا، مٹانا اور جلانا جائز ہے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو وہ دین سے نکل گئے اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا تمہارا ان حروف کے بارے میں کیا قول ہوگا۔ شمع یا سونا یا چاندی یا لکڑی یا کاغذ سے کتاب سے کسی آیت کی جن سے تصویر بنائی گئی ہے پھر وہ آگ میں گری اور جل گئی اور پگھل گئی، کیا تم کہتے ہو کہ اللہ کا کلام جل گیا؟ اگر وہ کہیں ہاں تو انہوں نے اپنا قول چھوڑ دیا اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا کیا تم نے نہیں کہا کہ یہ کتاب کلام اللہ ہے حالانکہ وہ جل گیا ہے، اور تم نے کہا یہ حروف اللہ کا کلام ہیں حالانکہ وہ پگھل گئے ہیں، اگر وہ کہیں حروف جل گئے ہیں اور کلام اللہ باقی ہے تو وہ حق اور صواب کی طرف لوٹ آئے اور وہ جواب کے قریب ہو گئے یہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر تنبیہ کرتے ہوئے جو اہل حق کہتے ہیں۔ اگر قرآن کھال میں ہو پھر آگ میں واقع ہو تو وہ نہیں جلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ پر کتاب نازل کی گئی ہے جس کو پانی نہیں دھوتا تم اسے سوتے ہوئے اور بیدار ہوتے ہوئے پڑھتے ہو(1)۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کا کلام نہ حروف ہے اور نہ حروف کے مشابہ ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، باب الصفات التی یعرف بھا فی الدنیا اھل الجنۃ

اس مسئلہ میں کلام طویل ہے۔ اس کی مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو الکتاب الاسنٰی، فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی میں بیان کر دیا ہے۔

**فصل**: روافض، اللہ ان کو تباہ و نا کام کرے، قرآن میں طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ایک شخص آیت اور حرف کی نقل میں کافی ہے جیسا کہ تم نے کیا، تم نے ایک شخص کے قول سے سورۂ برأت کا آخر ثابت کیا وہ خزیمہ بن ثابت تنہا ہے اور مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ (الاحزاب:23) بھی اسی ایک شخص سے ثابت کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خزیمہ رضی اللہ عنہ نے جب ان آیات کو بیان کیا تو بہت سے صحابہ کو یاد آ گئیں۔ حضرت زید ان دو آیات کو پہچانتے تھے۔ اسی وجہ سے فرمایا: میں نے سورۂ توبہ کے آخر سے دو آیتیں مفقود پائیں اگر وہ ان آیتوں کو نہ جانتے ہوتے تو وہ نہ جانتے کہ کیا کوئی آیت مفقود ہے یا نہیں۔ آیت اجماع سے ثابت ہوئی نہ کہ تنہا حضرت خزیمہ سے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک حضرت خزیمہ کی گواہی سے ثابت ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت میں اس کی صحت پر دلیل قائم ہے۔ یہ قرینہ ہے جو دوسرے گواہ کے طلب سے مستغنی کر دیتا ہے بخلاف آیت احزاب کے۔ وہ حضرت زید اور حضرت ابوخزیمہ کی شہادت سے ثابت ہوئی کیونکہ ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ آیت سنی تھی۔ مہلب نے یہ مفہوم بیان کیا اور ذکر کیا کہ حضرت خزیمہ، حضرت ابوخزیمۃ کے علاوہ ہے اور حضرت ابوخزیمہ وہ ہے جن کے پاس آیت توبہ پائی گئی، یہ انصار میں سے معروف صحابی ہیں۔ حضرت انس نے اس کو پہچانا اور کہا: ہم اس کے وارث ہیں اور سورۂ احزاب کی آیت حضرت خزیمہ بن ثابت کے پاس پائی گئی، پس کوئی تعارض نہیں۔ یہ واقعہ اس واقعہ سے مختلف ہے اس میں کوئی اشکال اور التباس نہیں ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: حضرت ابوخزیمہ کے نام کی صحت پر آگاہی نہیں ہے وہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہے اور وہ حضرت ابوخزیمہ بن اوس بن زید بن اصرم بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار ہے یہ جنگ بدر اور اس کے بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے اور حضرت عثمان کے دور خلافت میں فوت ہوئے تھے، یہ مسعود بن اوس کے بھائی تھے۔ ابن شہاب نے عبید بن سابق سے انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس پائیں، یہ وہ ہے جس کا حارث بن خزیمہ ابوخزیمہ سے نسبی رشتہ نہیں ہے مگر انصار میں دونوں جمع ہوتے ہیں۔ ایک اوسی ہے اور دوسرا خزرجی ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں انصار میں سے چار شخصوں نے جمع کیا تھا۔ حضرات ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید۔ میں نے حضرت انس سے کہا: ابوزید کون ہے؟ انہوں نے کہا: میرے چچوں میں سے ایک ہے (1)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور قرآن چار آدمیوں کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا: حضرات ابودرداء، معاذ بن جبل، زید اور ابوزید۔ حضرت انس نے کہا: ہم ابوزید کے وارث بنے (2)۔ دوسری روایت میں ہے، فرمایا: ابوزید فوت ہوئے اور کوئی اولاد نہ چھوڑی وہ بدری صحابی تھے ابوزید کا نام سعد بن

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 4619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بن کعب الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 4620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبید تھا۔ ابن طیب نے فرمایا: یہ آثار دلالت نہیں کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہرہ میں قرآن محفوظ نہیں تھا اور ان چار کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا جیسا کہ حضرت انس بن مالک نے کہا ہے۔ طرق متواترہ سے ثابت ہے کہ قرآن حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت تمیم داری، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم نے جمع کیا۔ حضرت انس کا قول کہ قرآن ان چار افراد کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا یہ احتمال رکھتا ہے کہ ان چار کے علاوہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے حاصل نہیں کیا تھا اور جمع نہیں کیا تھا کیونکہ اکثر صحابہ نے ایک دوسرے سے حاصل کیا تھا۔ روایات ایک دوسرے کی معاون ہیں کہ خلفاء اربعہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا کیونکہ وہ اسلام میں سبقت لے گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عظمت دی تھی۔

میں کہتا ہوں: قاضی نے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ کا ذکر نہیں کیا، میرے خیال میں ان دونوں نے قرآن جمع کیا ہوا تھا۔ جریر نے عبداللہ بن یزید صہبانی سے انہوں نے کمیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور آپ کے ساتھ ابو بکر بھی تھے اور وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے چاہا تھا۔ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس سے گزرے وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ام عبد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبداللہ اسی طرح قرآن پڑھ رہا ہے جس طرح پہلی قراءت پر نازل ہوا ہے۔ بعض علماء نے غضا کما اُنْزِلَ کا معنی یہ بیان فرمایا کہ وہ پہلے حرف پر پڑھ رہا ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا نہ کہ ان سات حروف پر جن کی قراءت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہر رمضان میں جبریل آپ سے قرآن کے دور فرماتے تھے۔ وکیع اور ایک جماعت نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: تم کون سی قراءت پر پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: پہلی قراءت جو ابن ام عبد کی قراءت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے مجھے فرمایا بلکہ یہ دوسری قراءت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبریل کو قرآن سناتے تھے جب آپ کے وصال کا سال تھا آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بھی موجود تھے۔ پس حضرت عبداللہ نے جان لیا جو اس میں سے منسوخ ہوا تھا اور جو تبدیل ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو: ابن ام عبد سے، پہلے ان کا نام ذکر فرمایا، معاذ بن جبل سے، ابی بن کعب سے سالم مولیٰ ابی حذیفہ سے۔

میں کہتا ہوں: یہ اخبار دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عبداللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن جمع کر لیا تھا بخلاف پہلی روایات کے۔ واللہ اعلم۔ ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں محمد بن شہر یار نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن اسود نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن آدم نے بتایا انہوں نے ابو بکر سے انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے بہتر اور تہتر سورتیں پڑھیں۔ میں نے آپ پر سورۂ بقرہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (البقرہ) تک پڑھی۔ ابو اسحاق نے کہا: حضرت

عبداللہ نے باقی قرآن مجمع بن جاریہ انصاری سے سیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ صحیح ہیں تو وہ اجماع صحیح ہے جس کا ذکر یزید بن ہارون نے کیا ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابو بکر بن طیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں قرآن جمع کرنے والوں کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کیا۔

ابو بکر انباری نے کہا: مجھے ابراہیم بن موسیٰ الخوزی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں مالک بن اسماعیل نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں زہیر نے بتایا انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اسود سے پوچھا کہ حضرت عبداللہ سورۂ اعراف کے ساتھ کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ اسے سیکھتے تھے حتیٰ کہ کوفہ میں آ گئے بعض اہل علم نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود کا وصال ہو گیا تھا معوذتین سیکھنے سے پہلے۔ اسی وجہ سے ان کے مصحف میں دو سورتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ بھی علماء کے قول میں مزید بیان معوذتین کے ذکر کے وقت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو بکر نے کہا: وہ حدیث جو ہمیں ابراہیم بن موسیٰ نے بیان کی انہوں نے کہا ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بیان کی، انہوں نے کہا: ہمیں عمر بن ہارون خراسانی نے بیان کیا انہوں نے ربیعہ بن عثمان سے انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا، فرمایا: جنہوں نے قرآن ختم کر لیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری حیات میں تھے۔ وہ حضرات عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے۔ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ محمد بن کعب پر مقصور ہے وہ مقطوع ہے اس کو نہ لیا جائے گا نہ اس پر اعتماد ہوگا۔ میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد (قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو، ابن ام عبد) یہ اس کی صحت پر دلیل ہے اور ان چیزوں میں سے جو تیرے لئے بیان کرتی ہیں کہ اصحاب قراءات اہل حجاز، شام اور عراق میں سے تھے ان میں سے ہر ایک نے ایسی قراءت حضرت کو اس کی طرف منسوب کیا ہے جس کو صحابہ میں سے کسی ایک نے اختیار کیا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کو پڑھا تھا اور جملہ قرآن سے کسی چیز کی استثنیٰ نہیں کی۔ عاصم نے اپنی قراءت حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کی طرف منسوب کی اور ابن کثیر نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی۔ اسی طرح ابو عمرو بن علاء نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی اور عبداللہ بن عامر نے اپنی قراءت حضرت عثمان کی طرف منسوب کی۔ یہ تمام کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن پڑھا۔ ان قراءتوں کی اسانید متصل ہیں اور ان کے رجال ثقہ ہیں یہ خطابی کا قول ہے۔

## قرآن کی سورتوں، آیات، شکل، نقطوں، منازل، تعشیر، حروف کی تعداد، اجزاء کلمات اور آیت کی ترتیب کے بارے میں جو وارد ہے

ابن طیب نے کہا: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ سلف کا قرآن کی سورتوں کی ترتیب میں اختلاف ہے، بعض نے اپنے مصحف میں سورتوں کو ان کے نزول کی ترتیب کے اعتبار سے لکھا مکی کو مدنی پر مقدم کیا۔ بعض نے اپنے مصحف میں پہلے سورۃ الحمد لکھی، بعض نے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (علق: 1) لکھی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصحف کے آغاز میں تھی اور مصحف ابن مسعود کے آغاز میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (فاتحہ: 3) پھر سورۂ بقرہ پھر النساء تھی یعنی مختلف ترتیب پر تھے۔ مصحف ابی کی ابتدا میں الحمد، پھر سورہ

نساء پھر آل عمران پھر انعام پھر اعراف پھر مائدہ تھی پھر اسی طرح شدید اختلاف تھا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ ترتیب پر قرآن صحابہ کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ یہ مکی بن ابی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ برأت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے ذکر کیا ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ لکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھا۔ جب آپ نے سورۂ برأت کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا حکم نہ دیا تو بسم اللہ نہ لکھی گئی۔ یہ اصح ہے جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔

ابن وہب نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے سلیمان بن بلال کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ربیعہ کو یہ کہتے سنا، ان سے پوچھا گیا سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران کیوں مقدم کی گئی ہے حالانکہ ان سے پہلے اسی (80) سے زائد سورتیں نازل ہوئی تھیں یہ سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی تھیں تو ربیعہ نے کہا: یہ دو سورتیں مقدم کی گئیں اور قرآن اس کے علم پر مرکب کیا گیا جس نے اس کو مرکب کیا تھا اور اس علم پر اجماع ہوا۔ پس اس تک ہماری انتہا ہے اور ہم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں معتمر نے بتایا انہوں نے سلام بن مسکین سے انہوں نے قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جو تم میں سے پیروی کرنا چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی پیروی کرے کیونکہ وہ دلوں کے اعتبار سے اس امت میں نیکوکار تھے، علم کے اعتبار سے گہرے تھے، تکلف کے اعتبار سے کم تھے، ہدایت کے اعتبار سے درست تھے، حالات کے اعتبار سے خوبصورت تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لئے اختیار فرمایا تھا اور اپنے دین کے قیام کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ پس تم ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان کے آثار کی اتباع کرو کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔

اہل علم کی ایک قوم نے کہا: سورتوں کی تالیف جو ہمارے مصحف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توقیفی ہے اور جو حضرات ابی، علی اور عبداللہ کے مصحف میں اختلاف مروی ہے وہ آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبریل پر پڑھنے سے پہلے کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے سورتوں کی تالیف کو مرتب فرمایا اس کے بعد کہ پہلے ایسا نہیں کیا تھا۔ یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ قرآن اسی طرح پر تالیف ہے جس طرح صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اکٹھا آسمان دنیا پر اتارا پھر بیس سال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر متفرق طور پر نازل ہوتا رہا(1)۔ کوئی سورت کسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوتی جو رونما پذیر ہوتا۔ کوئی آیت کسی سوال کرنے والے کا جواب ہوتی۔ جبریل امین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ اور آیت کی جگہ پر آگاہ کرتے۔ پس سورتوں کا سیاق بھی آیات اور حروف کے سیاق کی طرح ہے یہ سب محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور انہوں نے رب العالمین سے روایت کیا ہے جس نے مقدم سورت کو مؤخر کیا، یا مؤخر کو مقدم کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے آیات کے نظم کو خراب کیا، حروف اور کلمات کو بدلا اور اہل حق پر سورہ بقرہ کے انعام پر مقدم ہونے پر کوئی حجت نہیں ہے، سورہ انعام، بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب سے لی تھی۔ آپ خود فرماتے تھے: اس سورت کو قرآن کی فلاں جگہ پر رکھو۔ جبریل آیات کی جگہ پر آگاہ کرتے تھے۔

---

1۔ صحیح قول یہ ہے کہ تقریباً تیئس 23 سالوں میں اس کا نزول ہوا۔

حسن بن حباب نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابوہشام نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن عیاش نے بتایا انہوں نے ابواسحاق سے انہوں نے براء سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا یہ آیت تھی: یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ (النساء: 176)

ابوبکر بن عیاش نے کہا: ابواسحاق نے غلطی کی کیونکہ محمد بن سائب نے ہمیں ابوسائب سے روایت کر کے بتایا اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت تھی: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ (البقرہ)

جبریل نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کو سورۂ بقرہ کی دوسواسی آیت کے آغاز میں رکھو۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا: جو علماء یہ کہتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ قرآن کی تلاوت نماز میں اور درس میں مصحف کی ترتیب پر واجب ہے بلکہ رسم اور خط میں سورہ کی تالیف واجب ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ یہ ترتیب نماز میں اور قرآن کی تلاوت میں اور درس میں واجب ہے، اور کسی کے لئے سورۂ بقرہ سے پہلے سورۂ کہف کا سیکھنا حلال نہیں اور کہف سے پہلے حج کا سیکھنا حلال نہیں...... کیا آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا جس نے آپ سے پوچھا تھا تجھے کوئی نقصان نہ دے گی تو پہلے جو آیت بھی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں ایک رکعت میں ایک سورت تلاوت کرتے تھے پھر دوسری رکعت میں اس سورت کے علاوہ پڑھتے تھے جو پہلی رکعت کی سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی تھی اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر سے جو مروی ہے کہ وہ قرآن کو الٹا پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: یہ دل کے الٹے کرنے کا باعث ہے۔ انہوں نے اس سے مراد سورت کو الٹا پڑھنا لیا ہے مثلاً آخر سے شروع کرے اور ابتداء تک لے آئے، یہ ممنوع اور حرام ہے۔ لوگوں میں سے کچھ لوگ قرآن اور اشعار میں ایسا کرتے ہیں تاکہ ان کی زبان اس کے ساتھ چلے اور حفظ پر قادر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت کو ممنوع قرار دیا ہے اور قرآن میں اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ سورت کا خراب کرنا ہے اور سورت سے جو مقصود ہے اس کی مخالفت ہے۔

مصاحف میں قرآن کا اثبات، تاریخ نزول کے اعتبار سے واجب نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ صحیح اور ثابت شدہ بات ہے کہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ مکی سورتوں میں رکھی گئیں۔ کیا آپ نے حضرت عائشہ کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا۔ سورۂ بقرہ اور النساء نازل ہوئیں تو میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھی (1) یعنی مدینہ طیبہ میں اور یہ دونوں سورتیں مصحف میں مقدم کی گئیں ان سورتوں پر جو مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اگر وہ تاریخ نزول پر مرتب کرتے تو سورتوں کی آیات کی ترتیب کا ٹوٹنا واجب ہوتا۔

ابوبکر انباری نے کہا: ہمیں اسماعیل بن اسحاق قاضی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حجاج بن منہال نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہمام نے بتایا، انہوں نے قتادہ سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سورۂ بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانفال، برأت، الرعد، النحل، الحج، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الرحمن، الحدید، المجادلہ، الحشر، الممتحنہ، الصف، الجمعہ،

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر 4609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المنافقون، التغابن، الطلاق اور یا ایھا النبی لم تحرم دس آیات، اذا زلزلت، اذا جاء نصر اللہ یہ تمام سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں اور باقی قرآن مکہ میں نازل ہوا۔

ابو بکر نے کہا: جس نے اثر کے ترک اور اجماع سے اعراض پر عمل کیا اور سورتوں کو مکہ مدینہ کے منازل کے اعتبار سے منظم کیا اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سورۂ فاتحہ کو کہاں رکھے کیونکہ اس کے نزول کی جگہ کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور جو شخص اس آیت کو مؤخر کرنے کی طرف مجبور ہوا وہ سورۂ بقرہ کی دو سو پینتیس سے چالیس تک ہیں اور جس نے نظم قرآن کو خراب کیا اس نے کفر کیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رب تعالیٰ سے حکایت کیا اس کا رد کیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدنی سورتوں کی مکی سورتوں پر تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو ان کی لغت کے ساتھ خطاب فرمایا اور خطاب کے فنون اور محاورات میں خطاب فرمایا جن کو عرب جانتے تھے۔ جب ان کی کلام کا فن مؤخر کو مقدم کرنے اور مقدم کو مؤخر کرنے پر مبنی تھا تو اس معنی کے ساتھ کتاب اللہ میں ان کو خطاب کیا گیا۔ اگر وہ قرآن میں یہ فن نہ پاتے تو کہہ سکتے تھے کہ یہ کیسا کلام ہے جو ہمارے پسندیدہ کلام میں جو نظم تھا اس سے یہ خالی ہے۔ عبید بن ابرص نے کہا:

ان بُدّلت منهم وحوشًا　و غيرت حالها الخطوب
عيناك دمعهما سروب　كان شأنيهما شعيب

اصل کلام اس طرح ہے: عيناك دمعهما سروب لان تبدلت من اهلها وحوشاً۔ مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا اور سروب کا معنی ہے زمین کی سطح پر انڈیلا گیا، اسی سے سارب ہے زمین میں سیدھا چلنے والا۔ شاعر نے کہا:

انی سربت و کنت غیر سروب۔ میں چلا اور تو نہیں چلی۔

اور شأنيهما، شان واحد ہے اس کی جمع شؤن ہے۔ سر کے حصوں کو ملانے والی جگہ اس سے آنسو آتے ہیں۔ شعیب سے مراد متفرق ہے۔

## فصل: مصحف کے اعراب اور اس کے نقطے

روایت ہے کہ عبد اللہ بن مروان نے ان کا حکم دیا تھا، واسط میں حجاج نے یہ کام کیا اور اس میں بڑی کوشش کی اور اس کی تحزیب کا اضافہ کیا۔ اس نے حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کو یہ کام کرنے کا حکم دیا جب وہ عراق کا والی تھا۔ اس کے بعد واسط میں اس کی قراءتوں کے بارے میں کتاب تالیف کی اس میں ان تمام روایتوں کو جمع کیا جن میں لوگوں کا اختلاف تھا اور جن میں خط کی موافقت تھی، لوگ اس پر ایک زمانہ تک چلتے رہے یہاں تک کہ ابن مجاہد نے اپنی کتاب قراءات کے بارے میں ترتیب دی۔

زبیدی نے کتاب الطبقات میں مبرد تک سند بیان کر کے کہا کہ سب سے پہلے مصحف کے نقطے ابو اسود دؤلی نے لگائے تھے۔ اور اس طرح اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کا مصحف تھا اس پر یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے تھے۔

## فصل: دس دس آیات کے بعد نشان لگانا

ابن عطیہ نے کہا: بعض تاریخ کی کتب میں گزرا کہ مامون عباسی نے اس کا حکم دیا تھا، بعض نے کہا: حجاج نے یہ کام کیا

تھا ابو عمرو الدانی نے کتاب البیان میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ مصحف میں دس آیتوں کے بعد نشانات لگانا مکروہ ہے وہ اس کو مٹا دیتے تھے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ وہ مصحف میں خوشبو اور تعشیر کو ناپسند کرتے تھے۔ اشہب نے کہا: میں نے امام مالک سے سنا ان سے ان نشانات کے بارے پوچھا گیا جو سرخ سیاہی کے ساتھ یا دوسرے رنگوں کے ساتھ لگائے جاتے ہیں تو امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا اور فرمایا: سیاہی کے ساتھ مصحف کے دس دس آیتوں کے بعد نشان لگانے میں کوئی حرج نہیں ان مصاحف کے بارے میں پوچھا گیا جن میں سورتوں کے خواتم لکھے جاتے ہیں ہر سورت میں جتنی اس کی آیات ہوتیں۔ امام مالک نے فرمایا میں مصاحف کے اصل نسخوں میں سے کسی بھی چیز کو لکھنا یا کوئی شکل بنانا ناپسند کرتا ہوں۔ رہے وہ نشانات جو بچوں کو سکھانے کے لئے ہوتے ہیں ان میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔ اشہب نے کہا: پھر ہمارے لئے انہوں نے اپنے دادا کا مصحف نکالا جو انہوں نے اس وقت لکھا تھا جب حضرت عثمان نے مصاحف لکھوائے تھے ہم نے اس کا خواتم دیکھا وہ سیاہی سے لمبی سطر میں تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہی کے ساتھ آیتوں کو نشان لگایا گیا تھا۔ قتادہ نے فرمایا: پہلے انہوں نے نقطے لگائے پھر پانچ آیتوں پر نشان لگائے پھر دس آیتوں پر نشان لگائے۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: قرآن، مصاحف میں مجرد تھا سب سے پہلے باء، تاء اور ثاء پر نقطے لگائے گئے تھے اور علماء نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں یہ اس کے لئے نور ہے پھر آیات کے اختتام پر نقطے ایجاد کئے پھر فواتح اور خواتیم ایجاد ہوئے۔ ابو حمزہ سے مروی ہے، فرمایا: ابراہیم نخعی نے میرے مصحف میں سورت کے آغاز میں اس طرح دیکھا تو فرمایا: اس کو مٹا دو کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: کتاب اللہ میں کوئی ایسی چیز داخل نہ کرو جو اس میں سے نہیں ہے۔ ابو بکر سراج سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابو رزین کو کہا: کیا میں اپنے مصحف میں سورت اس اس طرح لکھوں؟ انہوں نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کوئی اس کی حقیقت کو نہ جانتے ہوئے اسے قرآن نہ گمان کرنے لگے۔

الدانی نے کہا: یہ تمام اخبار اس بات پر آگاہی دیتی ہیں کہ تعشیر، تخمیس، فواتح السور، رؤوس الآیات صحابہ کے عمل سے تھے، اس عمل کی طرف ان کی اجتہاد نے رہنمائی کی اور میرا خیال ہے جنہوں نے اس کو مکروہ کہا انہوں نے مختلف رنگوں مثلاً سرخ، زرد رنگ کے استعمال کی وجہ سے مکروہ کہا کیونکہ تمام آفاق میں مسلمانوں کا اس کے جواز اور اصل نسخوں میں اس کے استعمال پر اتفاق ہے اور حرج اور خطا دونوں ان سے اٹھ جاتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## فصل: حروف کی تعداد اور اس کے اجزاء کے بارے میں

سلام ابو محمد حمانی نے روایت کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے قراء، حفاظ اور کاتبوں کو جمع کیا اور کہا: مجھے بتاؤ سارے قرآن کے کتنے حروف ہیں؟ سلام نے کہا: میں بھی ان میں تھا ہم نے حساب لگایا تو ہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ قرآن کے تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں۔ پھر حجاج نے کہا: مجھے بتاؤ۔ کس حرف پر نصف قرآن ختم ہوتا ہے؟ تو وہ سورہ کہف میں ولیتلطف کی فاء پر ہوتا تھا۔ پھر اس نے کہا: اس کے تین حصے کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا تہائی سورہ برأت کی سویں آیت پر، دوسری تہائی سورہ الشعراء کی سویں یا ایک سو ایک آیت پر بنتا ہے اور تیسری تہائی باقی قرآن ہے۔ پھر اس نے کہا: حروف کے

اعتبار سے سات حصے کہاں کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا ساتواں سورہ نساء میں منهم من صد کی دال میں، دوسرا ساتواں حصہ اعراف میں حبطت کی تاء میں، تیسرا ساتواں حصہ سورۃ الرعد (اکلها دائم) میں اکلھا کے آخری الف میں، چوتھا ساتواں حصہ سورۃ الحج میں و لکل امة جعلنا منسکاً کے الف میں، پانچواں ساتواں حصہ سورۂ احزاب میں و ما کان لمومن ولا مومنة کی هاء میں چھٹا ساتواں حصہ سورۃ الفتح میں الظانین بالله ظن السؤ کی واؤ میں اور باقی سارا قرآن ساتواں حصہ ہے۔

سلام ابو محمد نے کہا: ہم نے چار مہینے یہ عمل کیا۔ حجاج پر رات کو چوتھائی قرآن پڑھتا تھا۔ پہلا چوتھائی سورۂ انعام کا خاتمہ ہے، دوسرا چوتھائی سورۂ کہف میں ولیتلطف پر ہے اور تیسرا چوتھائی سورۂ الزمر کا خاتمہ ہے اور چوتھا چوتھائی باقی قرآن ہے۔ اس جملہ میں ابوعمرو الدانی کی کتاب البیان میں اختلاف مذکور ہے جو اس سے آگاہی چاہے وہ وہاں مطالعہ کرے۔

## فصل: المدنی الاول میں قرآن کی آیات کی تعداد

محمد بن عیسیٰ نے کہا: مدنی اول میں قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار ہے۔ ابوعمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جو اہل کوفہ نے اہل مدینہ سے روایت کی ہے اور کسی معین شخص کا نام نہیں لیا جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہوں۔ اور رہا المدنی الاخیر تو وہ اسماعیل بن جعفر کے قول کے مطابق چھ ہزار دو سو چودہ آیات ہیں۔ فضل نے کہا: مکیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو انیس ہے۔ محمد بن عیسیٰ نے کہا: کوفیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے۔ یہ وہ عدد ہے جو سلیم اور کسائی نے حمزہ سے روایت کیا ہے، کسائی نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ محمد نے کہا: بصریوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چار ہے یہ وہ عدد ہے جس پر سلف اعتماد کرتے آئے ہیں اور یحییٰ بن حارث ذماری نے کہا: اہل شام کے نزدیک تعداد چھ ہزار دو سو چھبیس ہے ایک روایت میں چھ ہزار دو سو پچیس ہے ایک آیت کم ہے۔ ابن ذکوان نے کہا: میرا گمان ہے یحییٰ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کو شمار نہیں کیا۔ ابوعمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جس کو لوگ تالیف میں استعمال کرتے ہیں اور قدیم وجدید تمام آفاق میں اس کو شمار کرتے ہیں۔

رہے قرآن کے کلمات تو فضل بن شاذان نے کہا: قرآن کے تمام کلمات، عطا بن یسار کے قول کے مطابق ستتر ہزار چار سو انتالیس ہیں اور اس کے حروف تین لاکھ تئیس ہزار پندرہ ہیں۔

میں کہتا ہوں: حمانی سے جو قول پہلے گزرا ہے یہ اس کے مخالف ہے۔ عبدالله بن کثیر نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ تعداد جو ہم نے قرآن سے شمار کی ہے وہ تین لاکھ گیارہ ہزار ایک سو تیس ہے یہ بھی حمانی سے منقول قول کے مخالف ہے۔

## سورت، آیت، کلمہ اور حرف کا معنی

کلام عرب میں سورت کا معنی ایک سورت کو دوسری سورت سے جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

الم تر ان الله اعطاك سورة ترى كل ملك دونها يتذبذب

یعنی کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے شرف والی منزل عطا کی ہے تو ہر بادشاہ کو اس کے بارے میں متذبذب دیکھتا ہے۔

بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے شرف اور بلند ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے جیسا کہ زمین کے بلند ٹکڑے کو سود کہا جاتا ہے، بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا اس مرتبہ پر بلند ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتا جیسے عمارت کی چار دیواری یہ تمام بغیر ہمزہ کے ہے، بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن میں سے علیحدہ ہوتی ہے عرب بقیہ کو سؤر کہتے ہیں جاء فی آسار الناس یعنی بقایا ھم۔ اس مفہوم پر سورۃ کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہوگی پھر اس میں تخفیف کی گئی اور ماقبل مضموم کی وجہ سے اسے واؤ سے بدلا گیا۔ بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے تمام اور کمال کی وجہ سے دیا گیا ہے عرب مکمل اونٹنی کو سورۃ کہتے ہیں اس کی جمع سُوَر واؤ کے فتحہ کے ساتھ آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

سود المحاجر لا یقرأن بالسوَر۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس کی جمع سُوْرات اور سُوَرات ہو۔

الآیۃ اس کا معنی علامت ہے یعنی یہ اس کلام کے انقطاع کی علامت ہوتی ہے جو پہلی ہوتی ہے یعنی اس کا بعد والے کلام سے کوئی تعلق نہیں یعنی یہ اپنے قریب والی سے جدا اور منفرد ہے۔ عرب کہتے ہیں: میرے اور فلاں کے درمیان (آیۃ) علامت ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖٓ (البقرہ: 248) نابغہ نے کہا۔

توھمت آیات لھا فعرفتھا لستۃ اعوام و ذا العام سابع

میں نے اس کی آیات کا وہم کیا تو میں نے اسے چھ سال سے پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔

نابغہ نے اس شعر میں آیات کو علامات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کے حروف کی جماعت ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے: خرج القوم بآیاتھم یعنی لوگ جماعت کے ساتھ نکلے۔ برج بن مسہر الطائی نے کہا:

خرجنا من النقبین لا حی مثلنا بآیاتنا نزجی اللقاح المطافلا

اس شعر میں آیات جماعت کے معنی میں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ عجیب ہے۔ انسان اس کی مثل کے ساتھ کلام کرنے سے عاجز ہے۔ نحویوں کا آیۃ کی اصل میں اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ فَعَلَةٌ کے وزن پر اَیَیَۃ تھا جیسے اَکَمَۃٌ و شَجَرَۃ۔ جب یاء متحرک ماقبل مفتوح ہوا تو یاء الف سے بدل گئی۔ پس آیۃ ہمزہ کے ساتھ ہے اس کے بعد مدہ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کی اصل آیِیَۃٌ ہے بروزن فاعلۃٌ جیسے آمنۃ یاء الف سے بدل گئی کیونکہ وہ مفتوح تھی اور اس کا ماقبل متحرک تھا پھر جمع کے ساتھ التباس کی وجہ سے حذف ہوگئی۔ فراء نے کہا: اس کی اصل اَیِّیَۃ ہے یعنی پہلی یاء مشدد ہے پھر تشدید کی کراہت کی وجہ سے الف سے بدل گئی اور آیۃ ہوگئی اس کی جمع آی، آیات، آیاء آتی ہے۔

ابوزید نے کہا:

لم یبق ھذا الدھر من آیاتہ　　غیر اثافیہ و ارمدائہ

اس زمانہ میں اپنی آیات میں سے سوائے اپنے پتھروں اور راکھ کے کوئی شی باقی نہیں چھوڑی۔

الکلمۃ، وہ صورت جو حروف کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور قرآن میں لمباترین کلمہ وہ ہے جس کے حروف دس تک پہنچتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ اور اَنُلْزِمُكُمُوْهَا اور ان کے مشابہ کلمات ہیں، اور فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ اس کے لکھنے میں دس حروف ہیں اور بولنے میں گیارہ حروف ہیں اور چھوٹا کلمہ وہ ہے جو دو حروف پر مشتمل ہے جیسے لا، ما، لک، لہ اور ان کے مشابہ حروف۔ اور معانی کے حروف میں سے وہ جو ایک کلمہ پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً ہمزہ استفہام، واو عاطفہ، مگر اس کو مفرد نہیں بولا جاتا۔ کبھی ایک کلمہ پوری آیت ہوتا ہے مثلاً والفجر، والضحی، والعصر اسی طرح الم، المص، طه، یس، حم یہ کوفیوں کے قول کے مطابق ہے اور یہ سورتوں کے آغاز میں ہیں اور سورتوں کے درمیان میں نہیں ہیں۔

ابوعمرو الدانی نے کہا میں کوئی ایسا کلمہ نہیں دیکھتا جو آیت ہو مگر سورۃ الرحمٰن میں مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ کا کلمہ، اس کے علاوہ کوئی نہیں، البتہ دو کلمے متصل آتے ہیں اور وہ دو آیتیں ہیں۔

اور یہ اس ارشاد میں ہیں حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ (شوریٰ) کوفیوں کے قول کے مطابق کبھی کلمہ کا لفظ اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مکمل آیت اور وہ کلام جو قائم بنفسہ ہے اگرچہ وہ زیادہ ہو یا تھوڑی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف: 137) بعض علماء نے فرمایا: یہاں کلمہ سے مراد یہ ارشاد ہے: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ الی آخر الایتین (القصص: 5) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (الفتح: 26) مجاہد نے کہا اس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو کلمے زبان پر خفیف ہیں، میزان پر بھاری ہیں، رحمٰن کو محبوب ہیں سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم (1)۔ عرب پورے قصیدہ اور قصہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: قال قس فی کلمتہ کذا، یعنی قس نے اپنے خطبہ میں کہا: و قال زھیر فی کلمتہ کذا۔ یعنی اپنے قصیدہ میں یہ کہا قال فلان فی کلمتہ، یعنی فی رسالتہ۔ کلام کے جملہ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے کیونکہ کلمہ اس سے ہوتا ہے۔ عربوں کی عادت ہے کہ کسی شے کا نام اس چیز سے رکھ دیتے ہیں جس سے وہ چیز بنتی ہے یا جو اس کے قریب ہوتی ہے اور اس کا سبب ہوتی ہے۔ یہ مجازاً اور اتساعاً ہوتا ہے۔

الحرف: وہ ہوتا ہے جو تنہا قائم ہوتا ہے، حرف کو کلمہ کہا جاتا ہے اور کلمہ کو حرف کہا جاتا ہے اس میں وسعت و مجاز ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ابوعمرو الدانی نے کہا: اگر کہا جائے کہ ان حروف کو کیسے یہ کہا جائے گا جو سورتوں کے آغاز میں ایک ایک حرف آیا ہوا ہے جیسے (ص، ق اور ن) انہیں حرف یا کلمہ کیسے کہا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: کلمہ ہیں حرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف پر سکوت نہیں کیا جاتا اور صورت میں تنہا نہیں ہوتا اور جس سے

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ و نضع الموازین القسط الخ، آخری حدیث، حدیث نمبر 7008، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ملا ہوا ہوتا ہے اس سے جدا نہیں ہوتا اور ان حروف پر سکوت کیا جاتا ہے یہ علیحدہ اور جدا ہوتے ہیں جس طرح کلمہ جدا اور علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو کلمات کہا جاتا ہے حروف نہیں کہا جاتا۔ ابو عمرو نے کہا: حرف کبھی اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً مذہب اور وجہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج: 11) یعنی علی وجہ و مذہب۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے یعنی لغات کی سات وجوہ پر نازل کیا گیا ہے(1)۔ واللہ اعلم

## کیا قرآن میں عربوں کی لغت کے علاوہ کسی لغت کے کلمات وارد ہیں یا نہیں

اس میں ائمہ کا اختلاف نہیں کہ قرآن میں غیر عربی اسلوب پر کلام مرکب نہیں اس میں اسماء اعلام ہیں جو عربی زبان میں سے نہیں ہیں جیسے اسرائیل، جبریل، عمران، نوح، لوط۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا اعلام مفردہ کے علاوہ غیر عربی الفاظ ہیں یا نہیں۔ قاضی ابو بکر بن طیب اور طبری وغیرہما کا خیال ہے کہ قرآن میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، قرآن صریح عربی ہے اور وہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں اور جن کی نسبت تمام لغات کی طرف ہے ان میں اتفاق ہے کہ لغات ان پر وارد ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ عربوں، فارسیوں اور حبشیوں وغیرہ نے کلام کی ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن میں ان کا وجود ہے اور یہ الفاظ بہت کم ہیں اس لئے یہ قرآن کو عربی ہونے سے نہیں نکالتے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زبان کے ساتھ کلام کرنے والا ہونے سے نکالتے ہیں۔ المشکاۃ کا معنی طاقچہ ہے۔ نشأ کا معنی رات کو اٹھنا ہے۔ اسی سے ہے اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ (المزمل:6) يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ (الحدید:28) یعنی دوہرا اجر۔ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (المدثر:51) قسورہ سے مراد شیر ہیں۔ یہ تمام الفاظ حبشی زبان کے ہیں۔ الغساق ترکی زبان میں بدبودار پانی کو کہتے ہیں القسطاس رومیوں کی لغت میں میزان کو کہتے ہیں، السجیل فارسی زبان میں پتھر اور مٹی کو کہتے ہیں، الطور، سے مراد پہاڑ ہے، الیم سریانی زبان میں دریا کو کہتے ہیں، التنور زمین کی سطح، عجمی زبان کا لفظ ہے۔

ابن عطیہ نے کہا: ان الفاظ کی حقیقت یہ ہے کہ اصل میں یہ عجمی ہیں لیکن عربوں نے ان کو استعمال کیا ہے اور عربی بنایا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ عربی ہیں۔ عرب عاربہ جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا وہ تجارت کی وجہ سے اور قریش کے سفروں کی وجہ سے دوسری زبانوں سے بعض الفاظ خلط ملط ہوتے جیسا کہ مسافر بن ابی عمرو نے شام کی طرف سفر کیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کا سفر، حضرت عمرو بن العاص کا سفر اور عمارہ بن ولید کا حبشہ کی زمین کی طرف سفر، اعشی کا حیرہ کی طرف سفر، اور اس کا نصاریٰ سے ملنا حالانکہ وہ لغت میں حجت تھا۔ ان اسفار کی وجہ سے عربوں نے عجمی الفاظ استعمال کئے، بعض حروف میں کمی کی اور عجمہ کے ثقل کو تخفیف سے بدلا اور ان الفاظ کو اپنے اشعار اور محاورات میں استعمال کیا حتیٰ کہ یہ الفاظ عربی صحیح کے قائم مقام ہو گئے اور ان کا بیان واقع ہوا۔ اس حد پر قرآن ان سات قراءت پر نازل ہوا۔ اگر کوئی عربی ان الفاظ سے جاہل ہو تو وہ صریح عربی کا دوسروں کی لغت کو نہ جاننے کے مترادف ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فاطر کا معنی نہ جانا۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری کا نظریہ کہ دو لغتیں ایک لفظ میں متفق ہو گئیں یہ بعید ہے بلکہ اکثر میں ایک اصل ہے اور دوسری

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2868، تفصیل اس کے متعلقہ بحث میں گزر چکی ہے۔

فرع ہے کیونکہ ہم قلیل اتفاق کے جواز کا انکار نہیں کرتے۔

دوسرے علماء نے کہا: پہلا قول اصح ہے اور یہ دوسروں کے کلام میں اصل ہے اور عربوں کے کلام میں دخیل ہے۔ یہ قول اپنے برعکس قول سے اولیٰ نہیں کیونکہ عربوں نے اس کے ساتھ خطاب کیا ہوگا یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو یہ ان کے کلام سے ہوگا کیونکہ ان کی لغت اور کلام کا اور کوئی معنی نہیں مگر جو ان کے نزدیک اسی طرح ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ دوسروں نے بعض کلمات پر ان کی موافقت کی ہو۔ یہ امام کبیر ابوعبیدہ نے کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کلمات عرب کلام کے اوزان پر نہیں ہیں۔ پس یہ عرب کلام سے نہیں ہیں ہم کہیں گے کس نے تمہارے لئے یہ تسلیم کیا ہے کہ تم نے عربوں کے اوزان کو شمار کر لیا ہے تاکہ تم ان الفاظ کو ان اوزان سے خارج کردو۔ قاضی نے کلام عرب کے اوزان اصول سے بحث کی ہے اور ان اسماء کو نحوی طریقہ پر ان اصولوں کی طرف لوٹایا ہے۔ اگر عربوں نے ان کے ساتھ کلام نہیں کیا ہے اور نہ عربوں نے پہچانا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ان سے ایسی کلام سے کلام کرنا محال ہے جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔ اس صورت میں تو قرآن عربی مبین نہیں رہے گا اور نہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو ان کی زبان میں خطاب کرنے والے ہوں گے۔

## اعجاز قرآن میں نکات کا ذکر، معجزہ کی شرائط اور اس کی حقیقت

معجزہ اس کی جمع معجزات ہے۔ انبیاء کے معجزات ان کی صداقت پر دلیل ہوتے ہیں۔ معجزہ کو معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دوسرے انسان اس کے لانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس کی پانچ شرائط ہیں۔ اگر ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو وہ معجزہ نہ ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ اس پر قادر نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ، اور معجزہ کے لئے اس شرط کا حصول واجب ہے کیونکہ اگر کوئی آنے والا ایسے زمانہ میں آیا جس میں رسل کا آنا صحیح ہو اور اس نے رسالت کا دعویٰ کیا ہو، اور اپنا معجزہ حرکت کرنا، سکون کرنا، کھڑا ہونا یا بیٹھنا بنایا تو یہ اس کا دعویٰ معجزہ نہ ہوگا نہ اس کی سچائی کی دلیل ہوگا کیونکہ مخلوق اس کی مثل پر قادر ہوتی ہے، واجب ہے کہ معجزات ایسے ہوں جیسے دریا کا پھٹنا، چاند کا ٹوٹنا اور ان کے مشابہ چیزیں ہوں جن پر انسان قادر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط: وہ عادت کے خلاف ہو۔ اس شرط کا پایا جانا واجب ہے کیونکہ اگر کوئی مدعی رسالت کہے کہ میری نشانی یہ ہے کہ دن کے بعد رات کا آنا ہے اور مشرق سے سورج کا طلوع ہونا ہے تو اس کا یہ دعویٰ معجزہ نہ ہوگا کیونکہ یہ افعال اگرچہ ایسے ہیں جن پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں لیکن یہ اس شخص کی وجہ سے نہیں ہیں۔ یہ اس کے دعویٰ سے پہلے بھی اسی طرح تھے جس طرح اس کے دعویٰ کے وقت ہیں اور اپنی نبوت پر ان کی دلالت کا دعویٰ، دوسرے دعویٰ کی طرح ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کے صدق پر دلیل ہے۔ وہ چیز جس کی گواہی رسول دیتا ہے وہ اس کی سچائی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے میری سچائی پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے رسالت کے دعویٰ کی وجہ سے عادت کے خلاف کرے گا وہ اس ڈنڈے کو سانپ بنادے گا، پتھر کو پھاڑ دے گا، اس کے درمیان سے اونٹنی نکالے گا یا میری انگلیوں کے درمیان سے پانی نکلے گا جیسے چشمہ سے پانی نکلتا ہے۔ پس اس کے لئے یہ علامات اللہ تعالیٰ کے قول کے قائم مقام ہوں گی اگر ہم اس کا کلام سن سکتے تو وہ فرماتا اس نے سچ کہا میں نے اس کو مبعوث کیا ہے۔ اس مسئلہ کی مثال، اللہ اور اس کے رسول کی اعلیٰ امثال ہیں، اگر زمین کے بادشاہوں میں

سے کسی بادشاہ کے پاس ایک جماعت ہو۔ اس جماعت میں سے ایک شخص کہے جبکہ وہ سامنے ہو اور بادشاہ سن رہا ہو۔ بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے اے جماعت! اس طرح کرو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بادشاہ اپنے افعال میں سے کسی فعل کے ساتھ میری تصدیق کرے گا اور وہ میری تصدیق کے ارادہ سے اپنے ہاتھ سے اپنی انگوٹھی نکالے گا۔ جب بادشاہ اس کے کلام اور دعویٰ کو ان کے درمیان سنے پھر وہ اس کی سچائی پر گواہی پیش کر دے تو یہ اس کے اس قول کے قائم مقام ہوگا کہ اگر وہ کہتا اس نے جو میرے بارے دعویٰ کیا ہے اس میں سچا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کوئی عمل کر دے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہو اور رسول کے ہاتھ پر عادت کے خلاف کر دے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کے کلام کے قائم مقام ہوگا۔ اگر وہ ہمیں سنائی دیتا اور وہ کہتا میرے بندے نے رسالت کے دعویٰ میں سچ کہا میں نے اسے تمہاری طرف بھیجا ہے تم غور سے سنو اور اطاعت کرو۔

تیسری شرط: یہ ہے کہ وہ مدعی رسالت اس معجزہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر گواہی طلب کرے۔ وہ کہے میری نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پانی کو زیتون کا تیل بنا دے گا اور میرے زمین کو زلزلہ پیدا کرنے کا حکم دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ زمین کو حرکت دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا تو اس کا یہ چیلنج صحیح ہوگا۔

چوتھی شرط: یہ ہے کہ معجزہ اس کے دعویٰ کے مطابق واقع ہو، اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ اگر مدعی رسالت کہے کہ میری نبوت کی نشانی اور میری حجت کی دلیل یہ ہے کہ میرا ہاتھ بولے گا یا یہ سواری بولے گی، پھر وہ ہاتھ بولا یا سواری بولی اور اس نے کہا: یہ جھوٹا ہے اور یہ نبی نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ نے کلام پیدا کی ہے جو اس مدعی رسالت کے جھوٹ پر دلیل ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ نے کیا وہ اس کے دعویٰ کے مطابق نہ تھا۔ اسی طرح جو روایت ہے کہ مسیلمہ الکذاب لعنۃ اللہ۔ نے ایک کنویں میں تھوکا تا کہ اس کا پانی زیادہ ہو جائے تو پانی مزید نیچے چلا گیا، جو پانی موجود تھا وہ بھی چلا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے کیا۔ یہ آیات اس کو جھٹلانے والی ہیں جن کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوئیں، کیونکہ یہ بناوٹی جھوٹے نبی کے ارادہ کے خلاف واقع ہوئیں۔

پانچویں شرط:۔ یہ ہے کہ وہ چیز جو چیلنج کے وقت معجزہ ظاہر کرے اور کوئی دوسرا ایسا معجزہ مقابلہ کی بنا پر نہ لا سکے۔ اگر چیلنج شدہ امر جس کے ذریعے نبوت پر شہادت حاصل کی گئی ہے ان شرائط سے مکمل ہو تو وہ اس شخص کی نبوت پر دلالت کرنے والا معجزہ ہوگا جس کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے کے لئے کوئی پیدا کر دیا حتیٰ کہ وہ بھی ایسا لے آیا جو مدعی نبوت لایا تھا اور اس نے بھی اس کے عمل کی طرح عمل کر دکھایا تو اس کا نبی ہونا باطل ہو جائے گا اور اس امر کا معجزہ ہونا خارج ہو جائے گا اور اس کی صداقت پر دلیل نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٣٤﴾ (الطور: 34) (اس کی مثل کلام لے آئیں اگر وہ سچے ہیں) اور فرمایا أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ (ہود: 13) (یا وہ کہتے ہیں اس نے یہ خود گھڑا ہے فرمائیے تم اس کی مثل دس گھڑی ہوئی سورتیں لے آؤ) گویا فرمایا: اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظم سے ہے اور ان کے عمل سے ہے تو تم اس نظم کی جنس سے دس سورتیں لے آؤ۔ جب تم تمام اس سے عاجز ہو تو جان لو کہ یہ ان کے نظم اور عمل سے نہیں ہے۔

یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ معجزات جو ان پانچ شرائط کے ساتھ مقید ہیں صرف سچے لوگوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ

مسیح دجال کے لئے بھی ہوں گے جیسا کہ تم نے اپنے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اس کے ہاتھوں پر بڑی بڑی آیات اور بڑے بڑے امور ظاہر ہوں گے جو معروف و مشہور ہیں۔ ہم کہیں گے وہ نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ وہ ربوبیت کا دعویٰ کرے گا، ان کے درمیان اتنا فرق ہے جتنا اندھوں اور دیکھنے والوں کے درمیان فرق ہے۔ دلیل عقلی قائم ہو چکی ہے کہ بعض مخلوق کو بعض کی طرف بھیجنا ممنوع اور مستحیل نہیں ہے، اور کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی سچائی پر دلائل قائم کر دے جو شرع اور ملت کو ساتھ لے آئے۔ دلائل عقلیہ دلالت کرتے ہیں کہ مسیح دجال اس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلنا ہے اور یہ ثابت ہے کہ یہ صفات محدثات کے لائق ہیں اور اللہ تعالیٰ تشبیہ سے پاک ہے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

**فصل**:۔ جب یہ ثابت ہے تو جان لو کہ معجزات کی دو قسمیں ہیں: (۱) جن کی نقل مشہور ہے اور نبی کریم ﷺ کے وصال کے ساتھ ان کا زمانہ ختم ہو گیا۔ (۲) جن کی صحت اور حصول کے ساتھ اخبار متواتر ہیں اور اس کے ثبوت اور وجود کے ساتھ اخبار مشہور ہیں، سامع کو ان کا علم ضرورتاً حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی شرط میں سے یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے کثیر تعداد میں ہوں اور جس کو وہ نقل کر رہے ہوں اس کے متعلق علم ضروری رکھتے ہوں۔ کثرت تعداد میں، ابتدا اور وسط میں اور آخر میں راوی برابر ہوں حتیٰ کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ یہ صفت قرآن اور نبی کریم ﷺ کے وجود کی نقل کی ہے کیونکہ امت قرآن کو ہر دور میں ایک دوسرے سے نقل کرتی آئی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے جن کا وجود بالضرورۃ معلوم ہے اور جن کی صداقت معجزات کے ساتھ ثابت ہے اور رسول کریم ﷺ نے جبریل سے اور انہوں نے رب تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ پس قرآن کو دو معصوم رسولوں نے کمی اور زیادتی کے بغیر نقل کیا اور ہماری طرف ان کے بعد اہل تواتر نے نقل کیا جن پر نقل کرنے اور سنانے میں کثرت تعداد کی وجہ سے کذب جائز نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے لئے انہوں نے جو حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس سے قرآن کے ظہور اور چیلنج میں سے جو نقل کیا اس کے بارے میں ان کی سچائی کی وجہ سے علم ضروری حاصل ہوا۔ اس کی مثال دنیا کا علم ہے انسان اسے جانتا ہے جو شہروں کے وجود کے متعلق اس کی طرف جو نقل کیا گیا جیسے بصرہ، شام، عراق، خراسان، مدینہ، مکہ اور دوسری اس کے مشابہ مثالیں جو اخبار متواترہ سے ثابت ہیں۔ پس قرآن ہمارے نبی کریم ﷺ کا معجزہ آپ ﷺ کے بعد قیامت تک رہنے والا ہے، ہر نبی کا معجزہ اس کے جانے کے بعد ختم ہو گیا یا اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا ہو گیا جیسے تورات اور انجیل۔

## قرآن کی وجوہ اعجاز دس ہیں

### ۱۔ یکتا نظم

عربی اور غیر عربی زبان میں جو معہود نظم موجود تھا قرآن کا نظم اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا نظم نہ تو نظم شعری میں سے ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ (یٰسین: 69) (اور نہ ہم نے اسے شعر سکھایا اور نہ یہ اس

کے لئے مناسب ہے) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوذر کے بھائی انیس نے حضرت ابوذر سے کہا: میں مکہ میں ایک شخص سے ملا ہوں جو تیرے دین پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے۔ میں نے کہا: لوگ کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: وہ کہتے ہیں شاعر ہے، کاہن ہے، ساحر ہے اور انیس ایک شاعر تھا، انیس نے کہا: میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے وہ ان کے کلام جیسا کلام نہیں کرتا۔ میں نے اس کا قول شعر کی اقسام پر پیش کیا تو میرے بعد کسی کی زبان پر اس کے کلام کو شعر کہنا بھی مناسب نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں (1)۔ اسی طرح عتبہ بن ربیعہ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ نہ جادو ہے، نہ شعر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حم فصلت تلاوت کی تھی۔ اس کا بیان وہاں آئے گا جب عتبہ نے زبان کے اعتبار سے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعتراف کیا کہ اس نے قرآن کی مثل کلام نہیں سنا تو وہ اس قول میں قرآن کے اعجاز کا اقرار کرنے والا تھا حالانکہ اسے اور ان کے ہم مثل محققین کو فصاحت اور تکلم پر قدرت تھی، وہ کلام کی تمام انواع و اجناس پر کلام کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

2۔ دوسری وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کا اسلوب تمام اسالیب عرب سے مختلف ہے۔

3۔ تیسری یہ کہ اس میں ایسی بڑائی ہے جو مخلوق کے لئے کسی حال میں صحیح نہیں۔ سورہ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ (ق:1) میں آخر تک غور کر اور وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الی آخر السورۃ (الزمر:67) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ الی آخرھا۔ (ابراہیم:42) ابن حصار نے کہا جس نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اس نے جان لیا کہ اس بڑائی کی مثل کسی دوسرے کے خطاب میں صحیح نہیں اور کسی دنیا کے عظیم بادشاہ کی طرف سے یہ کہنا صحیح نہیں لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (غافر:16) اور نہ یہ کہنا جائز ہے: وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (الرعد:13)

ابن حصار نے کہا: یہ تینوں نظم، اسلوب اور جزالت ہر سورت کو لازم ہے بلکہ ہر ایک آیت کو لازم ہیں۔ ان تینوں صفات کے مجموعہ کی وجہ سے ہر آیت اور ہر سورت مسموع، بشر کے کلام سے ممتاز ہے۔ اس کے ساتھ چیلنج واقع ہوا ہے اور لوگوں کو عاجز کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سورت ان تینوں صفات کے ساتھ منفرد ہے بغیر اس کے کہ کوئی دوسری دس وجوہ اعجاز میں سے کوئی وجہ اس کی طرف مضاف ہو۔

یہ سورۃ الکوثر چھوٹی تین آیات ہیں۔ یہ قرآن کی چھوٹی سورت ہے حالانکہ یہ دو غیب کی باتیں اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ کوثر (نہر) کے متعلق خبر، اس کی بڑائی، اس کی وسعت اور اس کے برتنوں کی کثرت کے متعلق خبر دے رہی ہے اور یہ دلیل ہے کہ اس کی تصدیق کرنے والے تمام رسولوں کے متبعین سے زیادہ ہوں گے۔ دوسری ولید بن مغیرہ کے متعلق خبر ہے۔ وہ اس آیت کے نزول کے وقت مالدار اور صاحب اولاد تھا جیسا کہ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے: ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ (المدثر) پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مال اور اولاد کو ہلاک کر دیا اور اس کی نسل کو ختم کر دیا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابوذر، حدیث نمبر 4570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ عرب زبان میں اس انداز سے تصرف ہے کہ کوئی عربی میں اس طرح نہیں کرسکتا حتیٰ کہ عربوں کی طرف سے اتفاق سے یہ قول آیا ہے کہ اس کا ہر کلمہ اور ہر حرف اپنی جگہ پر بالکل درست آیا ہے۔

5۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ ان امور کی خبر دیتا ہے جو دنیا کے آغاز سے اس کے نزول کے وقت تک گزر چکے ہیں اور یہ ایسے امی کی طرف سے خبریں ہیں جس نے اس سے پہلے نہ کتاب پڑھی ہے نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس نے انبیاء اور ان کی امتوں کے حالات بتائے اور گزشتہ زمانہ کے واقعات و حالات کو بیان کیا اور اہل کتاب نے جو آپ سے سوال کئے ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے اہل کہف کے قصہ، موسیٰ و خضر علیہما السلام اور ذو القرنین کے حالات کے متعلق پوچھا تو آپ نے انہیں جواب دیا حالانکہ آپ امی تھے امی امت سے تھے جس کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔ اس کے ذریعے وہ گزشتہ کتب کی صحت کو پہچان گئے اور اس کی سچائی کا یقین کیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: ہم ضرورۃً جانتے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہے جس تک رسائی ممکن نہیں مگر سیکھنے سے جبکہ یہ معروف تھا کہ آپ اہل آثار سے اور مؤرخین سے نہیں ملے نہ آپ کسی معلم کے پاس گئے ہیں اور نہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو پڑھ سکتے ہیں تاکہ یہ جائز ہو کہ آپ کو کوئی کتاب ملی ہو جس سے یہ ساری چیزیں آپ نے لی ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ ان کے علم تک رسائی ممکن نہیں مگر وحی کی تائید سے۔

6۔ اس کی وجوہ اعجاز میں سے ایک وعدہ کا وفا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کے متعلق جو وعدہ فرمایا وہ وعدہ ظاہر و عیاں پایا گیا ہے یہ اخبار مطلقہ اور شرط کے ساتھ مقید وعدہ کی طرف منقسم ہے، اخبار مطلقہ کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور ان لوگوں کو نکالنے کا وعدہ کیا جنہوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا اور دوسرے مقید شرط کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق:3) وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (التغابن: 11) وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ (الطلاق) اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال:65)

7۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ آنے والے حالات غیبیہ کی خبر دیتا ہے جن کی اطلاع صرف وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اس میں سے اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وعدہ ہے کہ وہ اس کے دین کو سب ادیان پر غالب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ (الصف:9) تو ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب اپنے لشکروں کو کسی مہم پر روانہ کرتے تو انہیں اللہ کی طرف سے اپنے دین کو غالب کرنے کا وعدہ یاد دلاتے تاکہ انہیں نصرت کا وثوق ہو جائے اور کامیابی کا یقین ہو جائے۔ حضرت عمر بھی ایسا کرتے تھے۔ پس شرق و غرب اور بحر و بر میں متواتر فتوحات ہوتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور:55)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح:27) (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجد حرام میں جب اللہ

نے چاہا امن و امان سے۔)

اور فرمایا: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال:7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں میں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے۔

فرمایا: الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ (الروم) (الف، لام، میم ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے)۔

یہ تمام غیوب کی خبریں ہیں جن پر صرف رب العالمین واقف ہے یا وہ جس کو رب العالمین نے ان سے واقف کیا۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان آنے والے واقعات پر آگاہ کیا تا کہ آپ کی سچائی پر دلیل ہو جائیں۔

8۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن اپنے ضمن میں ایسا علم رکھتا ہے جو پوری انسانیت کے لئے قوام ہے۔ حلال، حرام اور دوسرے تمام احکام اس میں موجود ہیں۔

9۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس میں حکم بالغہ ہیں جو ایک آدمی سے عادتاً اپنے شرف اور کثرت کی وجہ سے صادر نہیں ہوتیں۔

10۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ جو علم ظاہراً اور باطناً اس میں ہے اس میں تناسب ہے اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (النساء)

میں کہتا ہوں: یہ دس وجوہ اعجاز ہیں جو ہمارے علماء نے ذکر کی ہیں اور گیارہویں وجہ اعجاز وہ ہے جو نظام اور بعض قدریوں نے بیان کی۔ وہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ سے روکا گیا ہے اور چیلنج کے وقت اس کی مثل لانے سے پھیرا گیا ہے، یہ منع اور پھیرنا ذات قرآن کے علاوہ ایک معجزہ ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمتوں کو معارضہ سے پھیر دیا ہے حالانکہ انہیں اس کی مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور یہ فاسد ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے مخالف کے حدوث سے پہلے قرآن معجز تھا۔

اگر ہم کہیں کہ منع اور پھیر دینا معجز ہے تو قرآن کا معجزہ ہونا خارج ہو جاتا ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو معلوم ہوا کہ نفس قرآن معجز ہے، کیونکہ اس کی فصاحت و بلاغت خارق للعادت ہے کیونکہ کوئی کلام اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ جب ان سے ایسا کلام مالوف و معتاد ہی نہیں ہے تو دلیل ہے کہ منع اور صرف معجز نہیں ہے اور جنہوں نے اس کے مقابلہ سے پھیرنے کا قول کیا ہے ان کے دو قول ہیں: (۱) مقابلہ کی قدرت سے انہیں پھیر دیا گیا، اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو بھی عاجز آتے (۲) وہ مقابلہ کرنے سے پھیرے گئے حالانکہ انہیں اس کی قدرت تھی۔ اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو اس پر ان کا قادر ہونا جائز ہوتا۔

ابن عطیہ نے کہا: قرآن میں چیلنج کی وجہ اس کا نظم اور معانی کی صحت، الفاظ کی فصاحت کا متواتر ہونا ہے اور اس کی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے اور از روئے علم کے کلام کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ پس اپنے احاطہ سے اس نے جان لیا کہ کون سا لفظ پہلے لفظ سے ملنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کو بیان کرے گا پھر اسی طرح اول قرآن سے آخر قرآن تک ہے۔ انسانوں کو جہالت، نسیان اور ذہول طاری ہوتا ہے اور ضرورۃً معلوم ہے کہ

انسان کبھی بھی احاطہ کرنے والا نہیں ہوا۔

اسی وجہ سے نظم قرآن انتہائی فصاحت و بلاغت کو چھو رہا ہے۔ اس نظر سے ان کا قول باطل ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ عرب کی قدرت میں تھا کہ وہ قرآن کی مثل انتہائی فصاحت و بلاغت والا کلام لائے۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو وہ اس سے پھیر دیئے گئے اور وہ اس جیسا کلام لانے سے عاجز ہو گئے۔ صحیح یہ ہے کہ قرآن کی مثل لانے کی کبھی کسی مخلوق میں قدرت ہی نہیں ہے، تیرے لئے انسانی کمزوری اس میں ظاہر ہوگی کہ ان کا فصیح شخص خطبہ دیتا ہے یا قصیدہ پڑھتا ہے، اس میں وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے پھر وہ پورا سال خود اس کی تنقیح کرتا ہے پھر اس کے بعد کسی دوسرے کو وہ قصیدہ دیتا ہے وہ اس میں تبدیلی اور تنقیح کرتا ہے اور اپنی طبیعت کے مطابق کچھ لیتا ہے پھر بھی اس کے بعد اس میں نظر اور تبدیلی کے مقامات موجود ہوتے ہیں اور کتاب اللہ اگر اس سے ایک لفظ بھی نکالا جائے پھر پوری لسان عرب سے اس سے بہتر لفظ ڈھونڈا جائے تو نہیں پایا جائے گا۔

قرآن کی فصاحت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں دو امروں، دو نہیوں، دو خبروں اور دو بشارتوں کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ (القصص: 7) (ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی کہ وہ انہیں دودھ پلائے) اسی طرح سورۂ مائدہ کا آغاز ہے وفا کا حکم دیا اور عہد توڑنے سے منع فرمایا، ایک چیز کو حلال فرمایا پھر استثنا کے بعد استثنا فرمائی پھر اس کی حکمت و قدرت کے متعلق بتایا۔ یہ ایسی چیز ہے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت، فوت شدہ کا افسوس، آخرت کا گھر، اس کا ثواب، عقاب، دارین کی فلاح، مجرموں کا ہلاک ہونا، دنیا سے دھوکا کھانے سے ڈرانے کی خبر دی اور دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں قلت سے تعبیر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآىٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (آل عمران: 185) ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تمہیں قیامت کے دن پورے اجر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح پہلے، پچھلے اور خوشحال لوگوں کے حالات، ہلاک ہونے والوں کی صفات ایک آیت کے ایک حصہ میں بیان فرما دیئے۔ ارشاد فرمایا: فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (العنکبوت: 40) (پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں سے بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا۔)

اللہ تعالیٰ نے کشتی کے امر، اس کے چلانے، کفار کو ہلاک کرنے اور کشتی کے ٹھہرنے اور اس کے استواء اور آسمان اور زمین کی طرف تسخیر کے اوامر کی توجیہ کے بارے میں بتایا۔ ارشاد فرمایا: وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ِ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝ وَ قِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ یٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَ غِیْضَ الْمَآءُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِیِّ وَ قِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (ہود)

جب قریش قرآن کی مثل لانے سے عاجز آ گئے تو کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خود کہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿33﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿34﴾ (الطور) پھر انہیں مزید عاجز کرنے کے لئے یہ اتارا: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (ہود:13) جب وہ عاجز آ گئے تو اس مقدار کو مزید کم کر دیا۔ اس کی سورتوں میں سے چھوٹی سورت کی مثل لے آؤ۔ فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ:23) پس جواب سے وہ عاجز آ گئے اور ان کے اسباب کٹ گئے اور وہ جنگ اور عناد کی طرف پلٹے اور انہوں نے بیوں بچوں کے قیدی ہونے کو ترجیح دی۔ اگر وہ معارضہ پر قادر ہوتے تو یہ ان کے لئے بہت آسان تھا اور حجت میں زیادہ بلیغ اور تاثیر میں زیادہ شدید تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ارباب البلاغت اور صاحب زبان تھے۔ ان سے فصاحت و بلاغت سیکھی جاتی تھی۔

قرآن کی بلاغت احسان کے اعلیٰ طبقات میں ہے اور ایجاز و بیان کے بلند درجات میں ہے بلکہ حسن و عمدگی کی حد سے تجاوز کرتے ہوئے زیادتی و بلندی کے مقام تک پہنچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے تھے اور آپ غرائب الحکم کے ساتھ مختص تھے۔ جب تو نبی کریم ﷺ کے قول میں غور کرے گا جو آپ نے جنت کی صفت میں فرمایا اگرچہ وہ احسان کی انتہا میں ہے لیکن تو اسے قرآن کے رتبہ سے کم پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب کا ارشاد ہے: فیھا مالا عین رات، ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ (اس میں ایسی نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے سنی ہیں نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے۔)(1)

لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس کو کیا نسبت وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ (الزخرف:71) اور ارشاد فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ:17) یہ وزن کے اعتبار سے اعدل ہے، ترکیب کے اعتبار سے احسن ہے لفظ کے اعتبار سے زیادہ اعذب (میٹھا) ہے اور حروف کے اعتبار سے کم ہے۔ اس کا اعتبار نہیں ہو سکتا مگر سورت کی مقدار میں یا لمبی آیت کی مقدار میں کیونکہ کلام جب طویل ہو تو اس میں متصرف کی مجال کی وسعت ہوتی ہے اور کوتاہ و متکلف پر مقال تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ عربوں پر حجت قائم فرمائی کیونکہ وہ ارباب فصاحت تھے اور معارضت کی جگہ تھے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں اطباء پر حجت قائم ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں جادوگروں پر حجت قائم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معجزات کو مشہور وجہ کے ساتھ زیادہ عمدہ طریقہ کے ساتھ پیش کیا جو اس نبی کے زمانہ میں جس کے اظہار کا ارادہ فرمایا تھا۔ پس جادو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا (تو موسیٰ علیہ السلام کو اس کے مقابلہ کی طاقت بخشی) طب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عروج پر تھی، فصاحت حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں کمال بلندی پر تھی۔

## ان احادیث پر تنبیہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں وضع کی گئی ہیں

قرآن کی سورتوں اور فضائل اعمال کے بارے میں احادیث کے واضعین اور جھوٹی اور باطل اخبار گھڑنے والوں کی

1۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ، حدیث نمبر 3005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہئے۔ ایک پوری جماعت نے ایسی احادیث گھڑنے کا ارتکاب کیا ہے اس ارتکاب میں ان کے اغراض و مقاصد مختلف تھے مثلاً زنادقہ میں سے مغیرہ بن سعید کوفی، محمد بن سعید شامی جس کو زندقہ کی وجہ سے پھانسی چڑھایا گیا تھا۔ انہوں نے احادیث گھڑیں اور ایسی احادیث بیان کیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالیں۔ ان گھڑی ہوئی روایات میں سے محمد بن سعید نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا خاتم الانبیاء لا نبی بعدی الا ماشاء اللہ۔ میں انبیاء کا خاتم ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے مگر جو اللہ چاہے۔ وہ الحاد اور زندقہ کی طرف جو بلاتا تھا اس کی وجہ سے استثنا کا اضافہ کر دیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبد البر نے اس حدیث کو التمہید میں ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کی ہے بلکہ رؤیاء پر استثنا کی تاویل کی ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی خواہش کے لئے احادیث گھڑیں جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ خوارج کے شیخ نے توبہ کرنے کے بعد کہا: یہ احادیث دین ہیں (پہلے) دیکھو تم یہ دین کس سے لے رہے ہو۔ ہم جب کسی امر کی خواہش کرتے تھے اسے حدیث بنا دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے ثواب کی خاطر احادیث گھڑیں جیسا کہ انہوں نے کہا کہ وہ لوگوں کو فضائل اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جس طرح ابو عصمہ بن نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جویباری وغیرہم سے روایت کیا گیا ہے۔ ابو عصمہ سے کہا گیا تم نے یہ قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں عن عکرمہ عن ابن عباس کا ارتکاب کیوں کیا؟ تو اس نے کہا: میں نے لوگوں کو دیکھا وہ قرآن سے اعراض کر رہے ہیں اور امام ابو حنیفہ کی فقہ، محمد بن اسحاق کے مغازی میں زیادہ مشغول ہو رہے ہیں تو میں نے ثواب کی خاطر یہ حدیث گھڑی۔ ابو عمرو عثمان بن صلاح نے اپنی کتاب علوم حدیث میں فرمایا۔ اسی طرح ایک طویل حدیث ابی بن کعب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں قرآن کی ہر ہر سورت کی فضیلت میں گھڑی گئی ہے۔ متلاشی نے اس کے مخرج سے بات کی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اور ایک جماعت نے اس حدیث کو وضع کیا ہے اور اس پر وضع کا اثر ظاہر ہے۔ الواحدی مفسر اور دوسرے مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس روایت کو نقل کرنے میں غلطی کی ہے۔

ایک سائلین اور بھکاری لوگوں کی جماعت نے بھی یہ کام کیا۔ وہ بازاروں اور مساجد میں کھڑے ہوتے تھے اور صحیح اسانید کے ساتھ، جو انہوں نے یاد کر رکھی ہوتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احادیث منسوب کرتے تھے۔ وہ ان اسانید کے ساتھ جھوٹی روایات بیان کرتے تھے۔ جعفر بن محمد طیالسی نے کہا: مسجد الرصافہ میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے نماز پڑھی ان کے سامنے ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور کہا: حدثنا احمد بن حنبل و یحیی بن معین قالا انبأنا عبد الرزاق قال انبأنا معمر عن قتادۃ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی اس سند کے ساتھ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے حوالہ سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے ہر کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ

سونے کی، پر مرجان کے۔ اس نے بیس ورق کا یہ واقعہ بیان کیا۔ احمد، یحییٰ کی طرف دیکھنے لگے اور یحییٰ، احمد کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: تو نے اسے یہ بیان کی ہے؟ دوسرے نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو یہ سنی بھی اسی وقت ہے۔ وہ دونوں خاموش رہے حتیٰ کہ وہ اپنے قصص سے فارغ ہوا تو یحییٰ نے پوچھا: تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اس نے کہا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ انہوں نے کہا: میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہے۔ ہم نے تو یہ کبھی رسول اللہ کی حدیث میں سنی ہی نہیں۔ اگر تجھے ضرور جھوٹ بولنا ہے تو کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا کر۔ وہ قصہ گو کہنے لگا: تو یحییٰ بن معین ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: میں سنتا رہتا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ اب مجھے اس کا یقین ہوا ہے۔ یحییٰ نے پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں۔ اس نے کہا: گویا دنیا میں یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل تمہارے علاوہ نہیں ہیں۔ میں نے اس کے علاوہ گیارہ احمد بن حنبل سے احادیث لکھی ہیں۔ احمد نے اپنے منہ پر اپنی آستین رکھی اور کہا: اسے چھوڑ و۔ وہ آدمی ان سے مزاح کرنے والے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ ان تمام گروہوں نے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولے اور دوسرے لوگ جوان کی طرح تھے انہوں نے بھی جھوٹ بولے۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ رشید کبوتروں کو پسند کرتا تھا اور ان سے کھیلا کرتا تھا۔ اس کو ایک کبوتر ہدیۃً دیا گیا اور اس کے پاس ابوالبختری القاضی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا: حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مقابلہ نہیں ہے مگر اونٹ دوڑانے میں یا گھوڑے دوڑانے میں یا پرندے اڑانے میں۔ اس نے پرندے اڑانے کا ذکر اپنی طرف سے زائد کیا۔ یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر وضع کیا تھا۔ رشید نے اسے عظیم انعام دیا۔ جب وہ چلا گیا تو رشید نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے جان لیا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ اس نے تمام کبوتر ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ اس سے کہا گیا: کبوتروں کا کیا گناہ ہے؟ اس نے کہا: ان کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ پس علماء نے اس کی وجہ سے اور دوسری موضوعات کی وجہ سے بختری کی حدیث کو ترک کر دیا۔ علماء اس کی حدیث کسی حال میں نہیں لکھتے۔

میں کہتا ہوں: اگر لوگ اس پر اکتفا کرتے جو صحاح اور مسانید میں ثابت ہیں جو علماء کے ہاتھوں کتب گردش کرتی ہیں اور جو ائمہ فقہاء نے روایت کی ہیں تو ان کے لئے ان میں کفایت تھی اور وہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کی تحذیر سے نکل جاتے۔ میرے بارے میں حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے (1)۔ (الحدیث) نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو جھوٹ کی بناء پر آگ سے ڈرایا۔ یہ دلیل ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ پر جھوٹ بولا جائے گا۔ پس دین کے دشمنوں کی من گھڑت باتوں سے بچو جو انہوں نے ترغیب و ترہیب میں وضع کی ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان دہ وہ لوگ ہیں جو زہد کی طرف منسوب ہیں اور اپنے گمان میں ثواب کی خاطر حدیثیں گھڑی ہیں۔ لوگوں نے ان کی جھوٹی باتوں کو ان پر اعتماد کی وجہ سے قبول کیا اور ان کی طرف میلان کی وجہ سے ان کی باتوں کو قبول کیا۔ پس وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برایہ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
مسند امام احمد حدیث 2675-2974

# قرآن پر طعن کرنے والے کے خلاف حجت اور مصحف عثمان کی زیادتی اور کمی کی بناء پر مخالفت کرنے والے کے خلاف حجت

امت اور ائمہ اہل سنت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے جو حضرت محمد ﷺ بطور معجزہ لے کر آئے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں پر پڑھا گیا ہے، مصاحف میں لکھا گیا ہے، اس کی سورتیں اور آیات علم یقینی کی بنا پر معلوم ہیں اس کے حروف اور کلمات کمی اور زیادتی سے مبرا ہیں۔ یہ قرآن اپنی تعریف میں نہ کسی حد کا محتاج ہے اور نہ کسی شمار کا۔ جس نے اس پر زیادتی یا اس میں کمی کا دعویٰ کیا اس نے اجماع کو توڑا اور لوگوں کو مبہوت کیا اور وہ قرآن جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آتے تھے اس نے اس کا رد کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا رد کیا: قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝ (الاسراء) (آپ فرمایئے اگر انس و جن اس قرآن کی مثل لانے پر جمع بھی ہو جائیں تو اس کی مثل نہیں لا سکیں گے اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔)

اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کو رد کیا کیونکہ اس طرح تو قرآن ان کی مقدور میں ہوگا۔ جب باطل کی اس میں ملاوٹ کی گئی ہوگی جب وہ اس پر قادر ہوں گے تو نہ حجت رہے گا نہ نشانی، اور معجزہ ہونے سے بھی خارج ہو جائے گا۔ پس جو کہتا ہے قرآن میں کمی اور زیادتی ہے تو وہ کتاب اللہ کو رد کرنے والا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اس کا انکار کرنے والا ہے جیسے کوئی کہتا ہے فرض نمازیں پچاس ہیں، نو عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے، اللہ نے رمضان کے ساتھ اور کچھ دن کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو دین میں ثابت نہیں ہیں اس نے اجماع کا رد کیا۔ قرآن پر اجماع، زیادہ مؤکد، زیادہ لازم اور زیادہ واجب تھا۔

امام ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار محمد انباری نے کہا: اہل فضل و عقل ہمیشہ سے قرآن کے شرف اور اس کے بلند مرتبہ کے معترف رہے ہیں۔ حق، انصاف اور دیانت جس کو ثابت کرتی ہے اور معطلین کے قول، ملحدین کی ملمع سازی اور زائغین کی تحریف کی اس سے نفی کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں یہ ملت اسلامیہ سے دور شخص نکلا اور امت پر حملہ آور ہوا اس حملہ کے ساتھ وہ اس شریعت کو باطل کرنے کا ارادہ کرتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تائید فرماتا رہا ہے اور اس کی بنیاد کو ثابت فرمایا ہے اور اس کی شاخوں کو بڑھایا ہے اور ظالموں کے معایب سے اور اہل عداوت و کفر کی سازشوں سے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

وہ کہتا ہے: یہ مصحف جو حضرت عثمان نے جمع فرمایا تھا جبکہ حضرت عثمان کے فعل کے صائب ہونے پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ وہ پورے قرآن پر مشتمل نہیں ہے کیونکہ اس سے پانچ سو حروف ساقط ہو گئے ہیں۔ میں نے بعض کا ذکر کیا ہے اور باقی کا بعد میں ذکر کروں گا ان میں سے بعض یہ ہیں: والعصر و نوائب الدھر۔ وہ کہتا ہے: مسلمانوں سے نوائب الدھر کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ اَتٰىهَاۤ

اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ و ما كان الله يهلكها اِلا بذنوب اهلها۔ یہ انسان دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن سے یہ بھی ساقط ہو گیا ہے (و ما کان اللہ یھلکھا الا بذنوب اھلھا) اس نے بہت سے حروف کا دعویٰ کیا ہے۔

اور اس نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمان اور صحابہ نے قرآن میں ایسی زیادتی کی ہے جو قرآن سے نہیں ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا اور لوگ سنتے رہے، اللہ الواحد الصمد۔ اس نے (قل ھو) قرآن سے ساقط کر دیا اور (احد) لفظ میں تبدیلی کی اور دعویٰ کیا کہ یہ درست ہے اور جس پر لوگ قائم ہیں وہ باطل اور محال ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا: قل للذین کفروا لا اعبد ما تعبدون۔ اور اس نے مسلمانوں کی قراءت پر طعن کیا ہے۔

اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مصحف جو ہمارے ہاتھوں میں ہے حروف کی تصحیف پر مشتمل ہے اس میں فساد اور تغیر ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ (المائدہ) اس آیت میں حکمت اور عزت، مغفرت کے مناسب نہیں ہیں۔ صحیح یہ ہے وان تغفرلھم فانك انت الغفور الرحیم اس کے ذریعے گمراہی کو اس میں ڈالا اور اشکال پیدا کیے حتیٰ کہ اس نے دعویٰ کیا مسلمان اس آیت میں تبدیلی کرتے ہیں۔ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ (الاحزاب: 69) جب کہ اس کے نزدیک درست یہ ہے جس میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ و کان عبد اللہ وجیھا۔ حتیٰ کہ اس نے فرض نماز میں پڑھا ہمیں اس جماعت نے بتایا جنہوں نے اس سے سنا اور اس کے پاس موجود تھے۔ لا تحرك به لسانك ان علینا جمعه و قراءته فاذا قراناه فاتبع قراءته ثم ان علینا نبا به۔ ہمیں دوسرے لوگوں نے کئی اور لوگوں سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے اسے یہ پڑھتے ہوئے سنا: ولقد نصرکم اللہ ببدر بسیف علی و انتم اذلة۔ اور ان لوگوں نے ہمیں اس سے روایت کیا کہ اس نے کہا: ھذا صراط علی مستقیم اور انہوں نے بتایا کہ اس نے قرآن کی آیت میں ایسی چیز داخل کی جو رسول اللہ ﷺ کی فصاحت کے مناسب نہیں اور یہ اس قوم کی زبان میں داخل ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم: 4) اس نے أانت قلت للناس کی جگہ الیس قلت للناس پڑھا ہے۔ یہ اعراب دینے والوں سے معروف نہیں اور نہ نحویوں کے مذاہب پر محمول ہے کیونکہ عرب لیس قمتَ نہیں کہتے۔ اور رہا لستَ قمتَ تاء کے ساتھ تو یہ شاذ، قبیح، خبیث اور ردی لغت ہے کیونکہ لیس فعل ماضی کی نفی نہیں کرتا اور اس کی مثل نہیں پایا جاتا مگر ان کے قول میں أليس قد خلق الله مثلهم۔ یہ شاذ لغت ہے کتاب اللہ کو اس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ اس شخص نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن جمع کرنے کا معاملہ حضرت زید بن ثابت کے سپرد کیا تو صحیح نہیں کیا۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب حضرت زید سے اولیٰ اور بہتر تھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری امت کا بڑا قاری ابی بن کعب ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کو قرآن پہلی قرأت پر پڑھنا خوش کرے جیسا کہ وہ نازل ہوا تھا تو وہ ابن ام عبد کی قراءت کے ساتھ پڑھے۔ وہ کہتا ہے: میں مصحف عثمان کی مخالفت کرتا ہوں جس طرح ابو عمرو بن العلاء نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے پڑھا: (انّ ھذین) (فاصدق واکون) (و بشر عبادی الذین) فما اتانی اللہ (یاء کے فتح کے ساتھ) اور مصحف میں ہے ان ھذان (الف کے ساتھ ہے) فاصدق واکن (بغیر واؤ کے ہے) فبشر

عباد۔ مما اتان الله (دونوں جگہ یاء کے بغیر ہے) اور جس طرح ابن کثیر، نافع، حمزہ اور کسائی نے عثمان کے مصحف کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے پڑھا: کذالك حقا علینا ننج المومنین۔ دونوں نونوں کے اثبات کے ساتھ، بعض نے دوسرے نون کو فتح دیا، بعض نے اسے ساکن کیا اور مصحف میں ایک نون ہے (1)۔ جیسا کہ حمزہ نے مصحف عثمان کی مخالفت کی۔ اس نے پڑھا: (أتمدون بمال) ایک نون کے ساتھ اور یاء پر وقف کیا اور مصحف عثمانی میں دونون ہیں اور ان کے بعد یاء نہیں ہے۔ جس طرح حمزہ نے مصحف عثمانی کی مخالفت کی اور پڑھا: الا ان ثمودا کفروا ربھم بغیر تنوین کے اور الف کے اثبات کے ساتھ جو تنوین کا موجب ہوتا ہے اور ان تمام صورتوں میں قراء پر تنقید کی ہے جن کی وجہ سے مصحف کا خلاف لازم آتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے پہلے اس تعداد کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں مصاحف کا اختلاف ہے۔ مزید بیان ان شاء الله اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔

ابو بکر نے کہا: اس شخص نے ذکر کیا کہ ابی بن کعب وہ ہے جس نے پڑھا: (کان لم تغن بالامس و ما کان الله لیھلکھا الا بذنوب اھلھا) اور یہ باطل ہے کیونکہ عبدالله بن کثیر نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا: (حصیدا کان لم تغن بالامس کذالك نفصل الایات) ایک روایت میں ہے حضرت ابی بن کعب نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھا۔ یہ سند رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہے۔ اہل عدالت وصیانت نے اس کو نقل کیا ہے جب ایک امر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح مروی ہو تو اسے اس حدیث کی وجہ سے نہیں لیا جائے گا جو اس کی مخالف ہو۔ یحییٰ بن مبارک یزیدی نے کہا: میں نے قرآن ابی عمرو بن العلاء پر پڑھا، ابو عمرو نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا، حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا اور حضرت ابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھا اور اس میں یہ نہیں ہے: و مان کان الله لیھلکھا الا بذنوب اھلھا جس نے انکار کیا کہ یہ زیادتی الله تعالیٰ نے اپنے نبی پر نازل کی ہے تو وہ کافر اور گناہگار نہیں۔

مجھے ابی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں نصر بن داؤد صاغانی نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا فرمایا: جو حروف مروی ہیں اور وہ اس مصحف کے مخالف ہیں جس پر اجماع ہے ان حروف میں سے جن کی اسانید کو خاص لوگ جانتے ہیں عام نہیں جیسا انہوں نے حضرت ابی سے نقل کئے ہیں: و ما کان الله لیھلکھا الا بذنوب اھلھا کے حروف بھی ان میں سے ہیں اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے، لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم فی مواسم الحج اور اس میں سے جو حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ غیر المغضوب علیھم و غیر الضالین پڑھتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں اہل علم نے یہ نقل نہیں کیا کہ ان کے ساتھ نماز جائز ہے اور نہ یہ نقل کیا ہے کہ یہ مصحف عثمان کے معارض ہیں کیونکہ یہ اگر کوئی اس کا انکار کرے کہ یہ قرآن سے ہیں تو کافر نہیں ہوگا۔ اور قرآن وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے جمع کیا انہیں صحابہ کی موافقت بھی حاصل تھی۔ اگر اس کے کسی حصہ کا انکار کیا تو وہ کافر ہوگا اس کا حکم مرتد کا حکم ہوگا اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔ اگر وہ توبہ

1۔ مصحف میں دونوں ہیں۔

کرے تو فبہا ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ ابو عبید نے کہا: حضرت عثمان کا قرآن جمع کرنے کا کام ہمیشہ سے آپ کے بڑے مناقب میں شمار ہوتا رہا بعض کج فہموں نے آپ کے اس کام پر طعن کیا۔ پس اس کا پردہ چاک ہوا اور شرمندہ ہوا۔

ابو عبید نے کہا: مجھے یزید بن زریع عن عمران بن جریر عن ابی مجلز کے سلسلہ سے بتایا گیا ہے، فرمایا: ایک قوم نے اپنی حماقت کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن جمع کرنے پر طعن کیا پھر انہوں نے نسخ شدہ قرآن پڑھا۔ ابو عبید نے کہا: ابو مجلز اس طرف گئے ہیں کہ حضرت عثمان نے جو ساقط کیا تو علم کے ساتھ ساقط کیا جس طرح جو ثابت کیا تو علم کے ساتھ ثابت کیا۔ ابو بکر نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) میں ایسے شخص کے کفر پر دلالت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تغییر و تبدیل سے حفاظت فرمائی ہے اور زیادتی اور کمی سے حفاظت فرمائی ہے، جب کوئی قاری تبت يدا ابی لهب و قد تب ما اغنی عنه ماله و ما كسب سيصلى ناراً ذات لهب و مريته حمالة الحطب فی جيدها حبل من ليف پڑھے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا اور ایسی بات کہی جو اس نے نہیں کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدلا اور اس میں تحریف کی اور اس نے اس کا ارادہ کیا جس سے اس نے قرآن کی حفاظت فرمائی اور اختلاط سے منع فرمایا۔ اس عمل میں جو اس نے کیا ملحد لوگوں کے لئے راستہ ہموار کیا تاکہ وہ قرآن میں ایسی چیز کو داخل کریں جس کے ساتھ وہ اسلام کے امر کو گدلا کریں اور وہ اس قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے وہ قوم جنہوں نے اس کو اباطیل کے ساتھ ان پر پھیرا۔ اس میں اس اجماع کا ابطال ہے جس کے ساتھ اسلام کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ثبات کے ساتھ نمازوں کا قیام ہوتا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی ہوتی ہے اور عبادات کا قصد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) میں ایسے انسان کی بدعت پر اور کفر کی طرف خروج پر دلالت ہے۔ کیونکہ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کا معنی مخلوق کو اس قدرت سے روکنا ہے کہ وہ ان پر اضافہ کر سکیں یا اس سے کمی کر سکیں یا اس کا معارض پیش کر سکیں، ہم نے اس انسان کو پایا کہ اس نے اس میں یہ زیادتی کی ہے و كفى الله المومنين القتال بعلی و كان الله قويا عزيزا۔ اور قرآن میں اس نے جھوٹ بولا۔ اور اس نے حضرت علی کا ایسی جگہ ذکر کیا اگر آپ اس کو یہ ذکر کرتے ہوئے سن لیتے تو آپ اس پر حد جاری فرماتے اور اس کے قتل کا حکم دیتے۔ اس نے اللہ کے کلام سے (قل هو) کو ساقط کر دیا اور (احد) کو تبدیل کیا اور الله الواحد الصمد پڑھا جو اس نے ساقط کیا اس کا اسقاط اس کی نفی ہے اور کفر ہے اور جس نے قرآن کے ایک حرف کا کفر کیا تو اس نے سارے قرآن کا کفر کیا اور آیت کا معنی باطل کر دیا کیونکہ اہل تفسیر نے کہا: یہ آیت اہل شرک کے رد میں نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا ہمارے لئے اپنے رب کی صفت بیان کیجئے کیا وہ سونے کا ہے یا تانبے کا ہے یا کسی اور دھات کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اور هو میں رد اور جواب پر دلالت ہے۔ جب وہ ساقط ہوا تو آیت کا معنی ہی باطل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ پر افترا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب واقع ہوئی۔ اس انسان کو اور اس کے مددگاروں کو کہا جائے گا ہمیں اس قرآن کے متعلق بتاؤ جو ہم پڑھتے ہیں اور ہم اور ہم سے پہلے اسلاف اس کے علاوہ کو نہیں جانتے۔ کیا وہ اول سے آخر تک پورے قرآن پر مشتمل ہے الفاظ صحیح اور معانی فساد اور خلل سے خالی ہیں؟ یا وہ بعض قرآن پر واقع ہے اور بعض ہم سے غائب

ہے جیسا کہ ہمارے اسلاف سے غائب تھا اور ہماری ملت کے پہلے لوگوں سے غائب تھا؟ اگر وہ جواب دیں کہ قرآن جو ہمارے پاس ہے وہ تمام قرآن پر مشتمل ہے اس سے کوئی چیز ساقط نہیں ہے لفظ صحیح ہیں اور معانی بھی صحیح ہیں اور ہر زلل خلل سے سلامت ہیں تو انہوں نے خود ہی اپنے اوپر کفر کا فیصلہ کرلیا۔ جب انہوں نے اس میں زیادتی کی فلیس له الیوم ھاھنا حمیم و لیس له شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم اس سے زیادہ واضح قرآن میں زیادتی کون سی ہوگی اور قرآن میں اور ملاوٹ کیسی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اسے محفوظ فرمایا ہے اور ہر مفتری اور مبطل کو اس کے ساتھ ایسے الحاق سے منع فرمایا ہے۔ جب اس کے معنی میں غور وفکر کیا گیا تو وہ فاسد اور غیر صحیح نکلا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ ملتا ہے اور نہ معنی اس کے موافق ہے کیونکہ اس کے بعد ہے لَّا يَأْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝ (الحاقہ) شراب کو کیسے کھایا جاتا ہے اور وہ جو اس نے پہلے کہا: فلیس له الیوم ھاھنا حمیم و لیس له شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم لا یاکله الا الخاطئون۔ یہ کلام ایک دوسرے کی مناقض ہے کیونکہ شراب کھائی نہیں جاتی۔ عرب یہ نہیں کہتے: اکلت الماء (میں نے پانی کھایا) بلکہ وہ کہتے ہیں شربته و ذقته و طعمته۔ اس کا معنی اللہ تعالیٰ نے صحیح قرآن میں اتارا ہے۔ جس نے ایک حرف کی مخالفت کی اس نے کفر کیا۔ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ (الحاقہ) غسلین کو نہیں کھائیں گے مگر خطا کار، یا یہ کھانا نہیں کھائیں گے مگر خطا کار۔ غسلین، پیٹ وغیرہ سے جو پیپ نکلتی ہے۔ یہ کھانا بطور سزا کھلایا جائے گا۔ اور پینے والی چیز کا کھانا محال ہوتا ہے اگر یہ انسان دعویٰ کرے کہ یہ باطل جو اس نے اپنے قول سے زائد کیا ہے (من عین تجری من تحت الجحیم) اس کے بعد لَّا يَأْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝ (الحاقہ) نہیں ہے۔ اور اس نے اس آیت کی قرآن سے نفی کردی تاکہ اس کی زیادتی صحیح ہو جائے تو اس نے کفر کیا کیونکہ اس نے قرآن کی ایک آیت کا انکار کیا۔ تیرے لئے یہ سب اس کے قول کو رد کرنے اور اس کے کلام کو رسوا کرنے کے لئے کافی ہے اور صحابہ اور تابعین سے جو مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ایسا پڑھا وہ بطور بیان اور تفسیر ہے نہ کہ وہ قرآن ہے جو پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ آیات جن کے الفاظ اور حکم یا لفظ منسوخ ہیں لیکن ان حکم نہیں وہ قرآن نہیں۔ اس کا مزید بیان مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ (البقرہ: 106) کے تحت آئے گا۔

## اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

اس کے متعلق بارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: ہر قراءت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا حکم دیا فرمایا۔ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ (النحل) یعنی جب تو تلاوت کرنے کا ارادہ کرے۔ مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ جیسا شاعر نے کہا

وانی لاتیکم لذکری الذی مضی ... من الود و استئناف ما کان فی غد

اس شعر میں مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ ما یکون کی جگہ ما کان استعمال کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر سے ہر دو فعل معنی میں قریب قریب ہوں تو جائز ہے جس کو چاہیں مقدم کردیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ

دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ (النجم) اس کا معنی ہے فتدلی ثم دنا۔ اس کی مثل ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) یہ قرآن میں کثیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا امر استحبابی ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق نماز کے علاوہ ہر قراءت میں اور نماز میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ نقاش نے عطاء سے حکایت کیا ہے استعاذہ واجب ہے۔ ابن سیرین، نخعی اور ایک اور جماعت نماز کی ہر رکعت میں تعوذ پڑھتے تھے اور استعاذہ میں عموم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نماز میں پہلی رکعت میں تعوذ پڑھتے ہیں اور وہ پوری نماز کی قراءت کو ایک قراءت کی طرح سمجھتے ہیں اور امام مالک فرضی نماز میں تعوذ پڑھنے کا نظریہ نہیں رکھتے اور قیام رمضان میں اس کے پڑھنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ تعوذ قرآن سے نہیں ہے اور نہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ یہ قرآن کے قاری کا قول ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ جمہور کے نزدیک تعوذ کے یہی الفاظ ہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم کہا تو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن ام عبد! اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مجھے جبریل نے لوح محفوظ کے واسطہ سے قلم سے اسی طرح پڑھایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ عمرو نے کہا: مجھے معلوم نہیں یہ کون سی نماز تھی۔ آپ نے کہا: اللہ اکبر کبیراً اللہ اکبر کبیراً (تین مرتبہ) الحمد للہ کثیراً الحمد للہ کثیراً (تین مرتبہ) سبحان اللہ بکرۃ واصیلاً (تین مرتبہ) اعوذ باللہ من الشیطان من نفخہ و نفثہ و همزہ۔ عمرو نے کہا: همزہ سے مراد مرگی، نفثہ سے مراد شعر اور نفخ سے مراد کبر ہے (1)۔ ابن ماجہ نے کہا: الموتۃ سے مراد جنون ہے اور النفث سے مراد بغیر تھوک کے پھونک مارنا ہے اور الکبر سے مراد بھٹکنا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے پھر تین بار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے اور اللہ اکبر کبیراً بھی تین بار کہتے پھر اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من همزہ و نفخہ و نفثہ پھر قراءت کرتے (2)۔

سلیمان بن سالم نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ استعاذۃ یہ ہے: اعوذ باللہ العظیم من الشیطان الرجیم ان اللہ هو السمیع العلیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ابن عطیہ نے کہا: پڑھنے والوں نے اسم کی صفت میں بہت زیادہ تبدیلی کی ہے جیسے بعض نے کہا: اعوذ باللہ المجید، من الشیطان المرید۔ اس قسم کو میں نہ تو اچھی بدعت کہتا ہوں اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ یہ جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** مہدوی نے کہا: قراء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سورہ الحمد کی قراءت سے پہلے استعاذہ کا اظہار کیا

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما یستفتح بہ الصلاۃ، حدیث نمبر 651، سنن ابن ماجہ، باب الاستعاذۃ فی الصلاۃ، حدیث نمبر 798، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب تفریع استفتاح الصلاۃ، باب ما یستفتح بہ الصلاۃ، حدیث نمبر 658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا مگر حمزہ نے اس کو مخفی کیا ہے۔ سدی نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے کہ وہ قراءت بسم اللہ سے شروع کرتے تھے۔ ابو لیث سمرقندی نے بعض مفسرین سے روایت کیا ہے کہ تعوذ فرض ہے۔ جب قاری بھول جائے اور بعد میں اسے یاد آئے تو تلاوت چھوڑ کر اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر ابتدا سے قرأت کرے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر اسی جگہ سے شروع کرے جہاں وقف کیا تھا۔ پہلا قول حجاز اور عراق کے علماء کا ہے اور دوسرا قول شام اور مصر کے علماء کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: زہراوی نے حکایت کیا ہے: یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی، نماز میں ہم استعاذہ کو مستحب سمجھتے ہیں، فرض نہیں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا پھر ہم نے آپ کی پیروی کی۔

**مسئلہ نمبر 7**: حضرت ابو ہریرہ سے قراءت کے بعد استعاذہ پڑھنا مروی ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے۔ ابو بکر بن عربی نے کہا: قوم کو بے علمی نے یہاں تک پہنچا دیا کہ انہوں نے کہا: جب قاری قرآن کی قراءت سے فارغ ہو جائے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت سے پہلے نماز میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھتے تھے۔ یہ نص ہے اگر کہا جائے کہ قراءت کے وقت شیطان سے پناہ مانگنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو ہم کہیں گے: ایک فائدہ تو حکم الٰہی کی پیروی ہے۔ شرعیات کا فائدہ امر کی اطاعت کرتے ہوئے وفا کے حق کو قائم کرنا اور نہی کی صورت میں اس سے اجتناب کر کے حق کو پورا کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قراءت کے وقت شیطان کے وسوسہ سے پناہ مانگ کر حکم کی پیروی کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ (الحج: 52) ابن عربی نے کہا: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل) کی تفسیر میں امام مالک کا قول ہم نے بہت عجیب پایا۔ انہوں نے کہا: جو نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھے اس کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ یہ ایسا قول ہے جس کے بارے میں کوئی اثر نہیں ہے اور نہ اس کی تائید میں کوئی نظر ہے۔ اگر یہ اسی طرح ہے جس طرح لوگوں نے کہا کہ استعاذہ قراءت کے بعد ہے تو اس کی نماز میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے ساتھ تخصیص بے بنیاد دعویٰ ہے۔ مالک کی اصل درست نہیں ہے نہ اسکو فہم تسلیم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روایت کے راز کو بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: **تعوذ کی فضیلت**: مسلم نے سلیمان بن صرد سے روایت کیا ہے، دو شخصوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آپس میں جھگڑا کیا۔ ایک اتنا غصہ میں تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس کا یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (1)

ایک شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا وہ اس کے پاس گیا اور کہا: کیا تو جانتا ہے جو ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے؟

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس سے یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب صفة ابلیس وضودة، حدیث نمبر 3040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ وہ شخص کہنے لگا: کیا تو مجھے مجنون دیکھتا ہے (کہ میں یہ کلمہ کہوں) اس حدیث کو بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔

مسلم نے عثمان بن ابی عاص ثقفی سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اسے مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شیطان ہے جسے خنزب کہا جاتا ہے۔ جب تو اسے محسوس کرے تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگ اور اپنی بائیں طرف تین دفعہ تھوک دے۔ عثمان بن ابی عاص فرماتے ہیں: میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے دور کر دیا(1)۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کرتے اور کسی جگہ رات گزارتے تو یہ پڑھتے۔ یَا اَرْضُ رَبِّیْ وَ رَبُّكِ اللّٰهُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فِیْكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا یَدِبُّ عَلَیْكِ وَ مِنْ اَسَدٍ وَ اَسْوَدَ وَ مِنَ الْحَیَّةِ وَ الْعَقْرَبِ وَ مِنْ سَاكِنِی الْبَلَدِ وَ وَالِدٍ وَ مَا وَلَدَ۔(2)

ترجمہ:۔ اے زمین میرا اور تیرا رب اللہ ہے میں تیرے شر اور اللہ تعالیٰ نے جو تجھ میں پیدا کیا اس کے شر سے اور جو تجھ پر رینگتا ہے اس کے شر شیر، ناگ، سانپ، بچھو، بستی والوں اور باپ اور اولاد کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

حضرت خولہ بنت حکیم نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: جو کسی جگہ اترے پھر یہ کہے: اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ تو اسے کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی(3)۔ اس حدیث کو موطا، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ جن کلمات کے ساتھ پناہ مانگی جاتی ہے وہ احادیث میں کثرت سے ثابت ہیں۔ واللہ المستعان۔

**مسئلہ نمبر 9:** استعاذہ کا معنی عرب کلام میں پناہ لینا ہے کسی کی طرف جگہ لینا ہے یعنی مکروہ چیز سے بچنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عُذْتُ بفلان و اسْتَعَذْتُ بہ یعنی میں نے اس کی بارگاہ میں پناہ لی وہ میری پناہ گاہ ہے۔ و اعذتُ غیری بہ و عوّذتہ دونوں ہم معنی ہیں کہا جاتا ہے أعوذ باللہ منك۔ اس کا معنی ہے: میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ راجز نے کہا:

قالت و فیها حیدة وذعر　　عوذ بربی منکم و حجر

عرب ناپسندیدہ امر کے وقت کہتے ہیں: حجراً لہ یعنی دفعاً لہ۔ یہ کسی امر سے پناہ مانگنے کے لئے ہوتا ہے۔ العوذۃ والمعاذۃ والتعویذ تمام کا معنی ہے پناہ لینا۔ اعوذ اصل میں اَعْوُذُ تھا۔ ضمہ کو عین کی طرف نقل کیا کیونکہ واؤ پر ثقیل تھا پس واؤ ساکن ہو گئی۔

**مسئلہ نمبر 10:** شیطان کی جمع شیاطین جمع مکسر ہے، اس کا نون اصلی ہے کیونکہ یہ شطن سے مشتق ہے جب کوئی خیر سے دور ہو تو شطن بولتے ہیں و شطنت دارہ اس کا گھر دور ہے۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب مایقول الرجل اذا نزل المنزل، حدیث نمبر 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الاستئذان، باب مایؤمر بہ من الکلام فی السفر

نَأتْ بسعاد عنك نوى شطون قبانت والفؤاد بها رهين

بئرٌ شطون ایسا کنواں جو بہت گہرا ہو۔ الشطن رسی کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اس کی دونوں طرفیں دور ہوتی ہیں۔ ایک اعرابی نے اپنے سرکش گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا: کانہٗ شیطان فی اشطان۔ شیطان کو شیطان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے دور ہوتا ہے اور سرکش ہوتا ہے۔ جن، انس اور جانوروں میں ہر سرکش کو شیطان کہا جاتا ہے۔ جریر نے کہا:

ایام یدعوننی الشیطان من غزل و هن یهویننی اذ کنت شیطانا

بعض علماء نے فرمایا: شیطان، شاط یشیط سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ہلاک ہونا اور نون زائدہ ہے اور شاط کا معنی جلنا بھی ہے شیطتُ اللحم۔ میں نے گوشت کو پکایا۔ اشتاط الرجل، جب کوئی شخص انتہائی غصہ میں ہو۔ ناقة مشیاط جو موٹا پا ہو۔ اشتاط کا معنی ہے ہلاک ہونا، اعشی نے کہا:

قد نخضب العیر من مکنون فائله و قد یشیط علی ارماحنا البطل

اس شعر میں ہلاکت کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس قول والے علماء پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ عرب کہتے ہیں تشیطن فلان۔ جب کوئی شیطانوں والے افعال کرے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یہ شطن سے تفیعل کا وزن بنایا گیا ہے۔ اگر یہ شاط سے ہوتا تو تشیط کہتے۔ اسی طرح امیہ بن ابی صلت کا شعر بھی ان کا رد کرتا ہے۔

ایما شاطن عصاه عکاه و رماه فی السجن والاغلال

اس شعر میں شاطن، شطن سے مشتق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**: الرجیم، خیر سے دور، ذلیل۔ الرجم کی اصل پتھر مارنا ہے قد رجمتُہٗ ارجُمہ، فھو رجیم و مرجوم کا معنی پتھر مارنا ہے۔

الرجیم کا معنی قتل کرنا، لعنت کرنا، دھتکارنا اور گالی دینا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ تمام معانی بیان کئے گئے ہیں لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ﴿ (الشعراء) اور حضرت ابراہیم کے باپ کا قول ہے: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (مریم:46) اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 12**: اعمش نے ابووائل سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو صفا کے پاس دیکھا۔ آپ ایک شخص کی طرف متوجہ تھے جو ہاتھی کی صورت میں تھا۔ آپ اسے لعنت کر رہے تھے۔ میں نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ یہ کون تھا جس کو آپ لعنت کر رہے تھے؟ فرمایا: یہ الشیطان الرجیم ہے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! اللہ کی قسم! میں تجھے قتل کروں گا اور امت کو تجھ سے راحت دوں گا۔ شیطان نے کہا: یہ میری تمہاری طرف سے کیا جزا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! میری طرف سے تیری کیا جزا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! تجھ سے کوئی دشمنی نہیں کرتا مگر میں اس کے باپ کے ساتھ اس کی ماں کے رحم میں شریک ہوا۔

## بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اس میں اٹھائیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** علماء نے فرمایا بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہمارے رب کی طرف سے قسم ہے۔ اس نے ہر سورت کے آغاز پر اس کو نازل فرمایا اس نے اپنے بندوں کے لئے قسم اٹھائی کہ یہ میں نے تمہارے لئے رکھی ہے۔ اے میرے بندو! اس سورت میں حق ہے اور میں تمہارے لئے وہ تمام وعدے، لطف اور بھلائی پوری کروں گا جو اس سورت میں ہے اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں اتارا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد خصوصی طور پر اس امت پر اسکو اتارا۔ بعض علماء نے فرمایا: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ تمام شرع کو متضمن ہے کیونکہ یہ ذات اور صفات پر دلالت کرتی ہے اور یہ صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت سعید بن ابی سکینہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لکھتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اسے فرمایا: اسے عمدہ طریقہ سے لکھو، ایک شخص نے اسے عمدہ طریقہ سے لکھا تو اس کی بخشش کر دی گئی (1)۔ حضرت سعید نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک شخص نے ایک کاغذ میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ دیکھی تو اسے بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں پر لگایا تو اس کی بخشش کر دی گئی۔ اسی مفہوم میں بشر حافی کا واقعہ ہے۔ انہوں نے جب وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا جس میں بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اسے خوشبو لگائی تو اس کے نام کو خوشبو لگائی گئی۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔

امام نسائی نے ابوملیح سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھنے والے سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تیری سواری ٹھوکر کھائے تو تعس الشیطان (شیطان تباہ ہو) نہ کہو وہ بڑا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کمرے کی مثل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اپنی طاقت سے یہ کیا لیکن تم بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کہو کیونکہ اس سے وہ چھوٹا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مکھی کی مثل ہو جاتا ہے۔ حضرت علی بن حسین نے اپنی تفسیر میں وَ اِذَا ذَكَرۡتَ رَبَّكَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا ۝ (الاسراء) کے تحت فرمایا اس کا مطلب ہے جب تم بِسۡمِ اللّٰهِ پڑھتے ہو۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابووائل سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو ارادہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کے انیس فرشتوں سے نجات عطا فرمائے تو وہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ ہر ایک فرشتے سے ڈھال بنا دے گا۔ بِسۡمِ اللّٰهِ کے دوزخ کے فرشتوں کی تعداد کے برابر انیس حروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے بارے فرمایا: علیہا تسعۃ عشر۔ وہ اپنے ہر فعل میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کہتے ہیں یہی ان کی قوت ہے اور بسم اللہ کے ساتھ وہ قوت حاصل کرتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی مثال ان کا قول لیلۃ القدر کے بارے میں ہے وہ ستائیسویں کی رات ہے کیونکہ انا انزلناہ سورت کے کلمات سے (ھی) کا لفظ ستائیسواں کلمہ ہے۔ اس کی مثال ان فرشتوں کی تعداد میں بھی ہے جنہوں نے ربنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ کہنے والے کے اس قول کو لکھنے میں جلدی کی، اس کلمہ

---

1۔ شعب الایمان، بیہقی، 2667

کے تیس سے زیادہ حروف ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو جلدی کرتے ہوئے دیکھا کہ پہلے کون لکھتا ہے(1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ عمدہ تفسیر ہے لیکن پختہ علم سے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** شعبی اور اعمش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ باسمك اللهم لکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کو بِسۡمِ اللّٰهِ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ پس آپ نے بِسۡمِ اللّٰهِ لکھا پھر جب قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ (الاسراء: 110) نازل ہوا تو آپ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ لکھا جب اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ (النمل) نازل ہوا تو آپ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لکھا اور مصنف ابوداؤد میں ہے امام شعبی، ابو مالک، قتادہ، ثابت بن عمارہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نہیں لکھا حتیٰ کہ سورہ النمل نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 4:** امام جعفر الصادق سے مروی ہے، فرمایا: بِسۡمِ اللّٰهِ، سورتوں کے تاج ہیں میں کہتا ہوں یہ دلیل ہے کہ یہ نہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ علماء کے اس کے متعلق تین مختلف اقوال ہیں۔

۱- یہ نہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

۲- یہ ہر سورت کی آیت ہے۔ یہ عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے۔

۳- امام شافعی نے فرمایا: یہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور باقی سورتوں کے بارے میں انہیں تردد ہے۔ کبھی فرمایا: ہر سورہ کی آیت ہے کبھی فرمایا: یہ صرف سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سورۃ النمل کی آیت ہے۔

امام شافعی نے دارقطنی کی اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے جو ابو بکر حنفی نے عبد الحمید بن جعفر سے انہوں نے نوح بن ابی بلال سے انہوں نے سعید بن ابی سعید مقبری سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب تم اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ کی قرأت کرو تو بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھو یہ ام القرآن ہے، ام الکتاب ہے السبع المثانی ہے اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اس کی آیت میں سے ایک آیت ہے۔

عبد الحمید بن جعفر نے اس حدیث کو مرفوع بیان کیا ہے اور عبد اللہ کو احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید اور یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابو حاتم نے اس کے بارے فرمایا: اس کا محل صدق ہے۔ سفیان ثوری اس کو ضعیف قرار دیتے تھے اور ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ نوح بن ابی بلال ثقہ مشہور ہے۔

ابن مبارک کی حجت اور امام شافعی کے ایک قول کی حجت مسلم کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے آپ کو اونگھ آگئی۔ پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کو کس نے ہنسایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے پڑھا: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝ حدیث ذکر فرمائی۔ مکمل ان شاء اللہ سورۃ کوثر میں آئے گی۔

1۔ صحیح بخاری، باب فضل اللهم ابناتك الحمد، حدیث نمبر 757، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 5**: ان اقوال میں سے صحیح قول امام مالک کا ہے کیونکہ قرآن اخبار احاد سے ثابت نہیں ہوتا، اس کا طریق تواتر قطعی ہے جس میں اختلاف نہیں ہوتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے قرآن نہ ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس میں لوگوں کا اختلاف ہے اور قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔ صحیح اخبار جن میں کوئی طعن نہیں ہے وہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی آیت ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی اور جب بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی۔ اور کبھی فرمایا میرے بندے نے میری طرف اپنا معاملہ سپرد کیا۔ اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا، جب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝- فرمایا یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا(1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ قسمت الصلوۃ۔ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے یعنی سورۂ فاتحہ کو تقسیم کیا۔ سورۃ فاتحہ کو صلاۃ کہا کیونکہ نماز اس کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ پہلی تین آیات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائیں اور انہیں اپنے ساتھ خاص کیا، اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ پھر چوتھی آیت اپنے اور اپنے بندے کے درمیان فرمائی کیونکہ وہ آیت بندے کے تذلل اور اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرنے کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے پھر تین آیات سات آیات کا تتمہ ہیں۔ جو چیز ان آیات کے تین ہونے پر دلیل ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هؤلاء لعبدی (یہ میرے بندے کے لئے ہیں) یہ حدیث مالک نے نقل کی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ (هاتان) یہ دلیل ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ ابن بکیر نے کہا: امام مالک نے فرمایا اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ پھر ساتویں آیت آخر تک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد جو آپ نے ابی کو فرمایا تھا کہ تو جب نماز شروع کرتا ہے تو کیسے پڑھتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں نے پڑھا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ حتیٰ کہ میں آخر تک پہنچا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے اسی طرح اہل مدینہ، اہل شام، اہل بصرہ اور اکثر قراء نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو آیت شمار کیا۔ اسی طرح قتادہ نے ابونضرہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ چھٹی آیت اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے اور رہے اہل کوفہ کے قراء اور فقہاء تو وہ بسم اللہ کو آیت شمار کرتے ہیں اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو علیحدہ آیت شمار نہیں کرتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بسم اللہ مصحف میں موجود ہے، لکھی ہوئی ہے اور نقل ہوتی آ رہی ہے جس طرح سورۃ النمل میں نقل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوتی آرہی ہے تو یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے جو تم نے ذکر کیا وہ صحیح ہے لیکن یہ اس کے قرآن ہونے یا سورتوں کے درمیان فاصل ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ صحابہ سے مروی ہے کہ ہم سورت کا اختتام نہیں جانتے تھے حتیٰ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوئی (1)۔ یہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے یا اس سے برکت حاصل کرنے کے لئے ہر سورت کے آغاز میں اسے لکھا جاتا ہے جیسا کہ کتب اور رسائل کی ابتدا میں اسے لکھنے پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ سب احتمال ہیں اور حریری نے کہا حضرت حسن سے بسم اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رسائل کے آغاز میں لکھی جاتی ہے اور حسن نے یہ بھی فرمایا کہ بسم اللہ، قرآن میں سے کسی سورت میں نازل نہیں ہوئی مگر سورۂ طس میں اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

• فیصلہ یہ ہے کہ قرآن نظر اور استدلال سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن نقل متواتر، قطعی اضطراری کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ پھر امام شافعی کا قول ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ کے متعلق مضطرب ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ نہ کسی سورت کی اور نہ الحمد للہ کی آیت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک جماعت سے اس کا قرآن ہونا مروی ہے۔ دارقطنی نے ایک جز میں اس جماعت کے اقوال کو جمع کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے ہم اس کے متعلق روایت کا انکار نہیں کرتے اور ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا بھی ہے اور ہماری بھی اس کے مقابلہ میں روایات ہیں جن کو ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تکبیر کے ساتھ نماز کا آغاز فرماتے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے فرماتے۔ الحدیث۔ مکمل حدیث آگے آئے گی۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر کے پیچھے نماز پڑھی، وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے آغاز کرتے تھے۔ وہ بسم اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے نہ قراءت کی ابتدا میں اور نہ آخر میں۔ (2)

ہمارا مذہب ایک عظیم وجہ کے ساتھ راجح ہے اور وہی معقول بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مسجد جو مدینہ طیبہ میں ہے اس پر زمانہ گزر چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے لے کر امام مالک کے زمانہ تک طویل عرصہ بیت چکا ہے اور اس مسجد میں کسی نے کبھی سنت کی اتباع کرتے ہوئے بسم اللہ نہیں پڑھی اور یہ تمہاری احادیث کا رد ہے۔

مگر ہمارے اصحاب نے نفل میں اس کی قراءت کو مستحب کہا ہے اور اسی پر اس کی قراءت کے بارے میں وارد آثار محمول ہیں یا اس میں وسعت کی بنا پر ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نفلوں میں بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ان کے پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں جو دور کرتے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ یہ کسی اور سورت سے ہے۔ نمازی فرض نماز میں اور کسی دوسری نماز میں اس کو سراً اور جہراً نہیں پڑھے گا اور نوافل میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ اصحاب مالک کے نزدیک یہی مشہور مذہب ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نوافل میں سورت کے آغاز میں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من جهربها، حدیث نمبر 669، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجة من قال لايجهر بالبسملة، حدیث نمبر 655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بسم اللہ پڑھی جائے گی اور سورت الحمد سے پہلے نہیں پڑھی جائے گی۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ فرض اور نفل نماز میں اس کے ساتھ قراءت شروع کی جائے گی اور کسی حال میں ترک نہیں کی جائے گی۔ اہل مدینہ میں سے بعض نے کہا: نماز میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ضروری ہے، ان میں سے حضرت ابن عمر اور ابن شہاب ہیں۔ یہی امام شافعی، احمد، اسحاق، ابوثور اور ابوعبید کا قول ہے۔

یہ دلیل ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادیہ ہے قطعیہ نہیں ہے جیسا کہ بعض جہلاء نے کہا ہے جس کے قول پر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے۔ حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح اس نے گمان کیا ہے کیونکہ اختلاف علماء موجود ہے۔ الحمدللہ۔ علماء کی جماعت کا خیال یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے گا۔ ان میں سے امام ابوحنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار اور حضرت ابن زبیر کا قول ہے یہی حکم اور حماد کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو عبید نے بھی یہی کہا ہے۔ اوزاعی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ ابوعمر نے استذکار میں یہی حکایت کیا ہے اور ان علماء نے اس اثر سے حجت پکڑی ہے جو منصور بن زاذان نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور ہمیں بسم اللہ کی قراءت نہ سنائی (1) اور عمار بن رزیق نے اعمش سے انہوں نے شعبہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرات ابوبکر و عمر کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان میں سے کسی سے بسم اللہ جہراً نہیں سنی۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے اس پر حضرت انس سے مروی آثار متفق ہیں اور ان میں تضاد نہیں ہے اور اس طرح بسم اللہ کے متعلق اختلاف سے بھی انسان نکل جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: مشرک مسجد میں آتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ پڑھتے تو وہ کہتے: یہ محمد، یمامہ کے رحمان یعنی مسیلمہ کا ذکر کرتا ہے۔ تو آپ کو بسم اللہ آہستہ پڑھنے کا حکم دیا گیا اور وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل ہوا۔ حکیم ترمذی ابوعبداللہ نے کہا: آج تک یہ اسی طریقہ پر باقی ہے اگرچہ علت زائل ہوگئی ہے۔ جس طرح طواف میں رمل باقی ہے اگرچہ علت ختم ہوگئی ہے، دن کی نماز میں سری قراءت باقی ہے اگرچہ علت ختم ہوگئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: امت کا اتفاق ہے کہ رسائل اور علم کی کتابوں میں سے ہر کتاب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا جواز ہے۔ اگر کتاب شعری دیوان ہو تو مجالد نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: علماء کا اجماع ہے کہ وہ شعر سے پہلے بسم اللہ نہ لکھیں۔ زہری نے کہا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ شعر میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اور حضرت سعید بن جبیر کا نظریہ یہ ہے کہ شعر کی کتب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنا جائز ہے۔ اکثر متاخرین نے ان کی متابعت کی ہے۔ ابوبکر خطیب نے کہا: ہم اس کو پسند کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**: الماوردی نے کہا: بسم اللہ کہنے والے کو مبسمل کہنا یہ روی لغت ہے۔ شعر میں آیا ہے، عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک الجهر بسم الله الرحمٰن الرحيم، حدیث نمبر 896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لقد بسملت ليلى غداة لقيتها　　فيا حبذا ذاك الحبيب المبسمل

لیلیٰ نے اس صبح بسم اللہ کہا جس صبح میں ملا، وہ حبیب بسم اللہ کہنے والا کتنا اچھا ہے۔

میں کہتا ہوں: اہل لغت سے مشہور بسمل ہے۔ یعقوب بن سکیت، مطرز ثعالبی وغیرہم لغویوں نے کہا: بسمل الرجل جب کوئی بسم اللہ کہے کہا جاتا ہے: اکثرت من البسملة یعنی تو نے بسم اللہ کا قول زیادہ کیا۔ اس کی مثل حوقل الرجل ہے اس نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا۔ ھلل۔ جب کوئی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے۔ سبحل جب سبحان اللہ کہے۔ حمدل جب کوئی الحمد للہ کہے، حیصل جب حی علی الصلوٰۃ کہے۔ جعفل جب جعلت فداك کہے، طبقل جب کہے اطال اللہ بقاءك (اللہ تیری عمر دراز کرے) دمعز جب کہے ادام اللہ عزك۔ حیفل جب کہے حی علی الفلاح۔ مطرز نے الحیصلة کا ذکر نہیں کیا جب حی علی الصلوٰۃ کہے اور جعفل، جب جُعِلتُ فداك کہے، طبقل، جب اطال اللہ بقاءك کہے، دمعز جب ادام اللہ عزك کہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** ہر فعل سے پہلے بسم اللہ کا ذکر مستحب ہے جیسے کھانا، پینا، ذبح کرنا، حقوق زوجیت ادا کرنا، سمندر پر سوار ہونا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام: 118) (اسے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو)۔ ارشاد ہے: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا (ہود: 41) (نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس کشتی میں اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام لو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے برتن کو ڈھانپو تو اللہ کا نام ذکر کرو اور اپنے مشکیزہ کا منہ باندھو تو اللہ کا نام ذکر کرو (1)۔ اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے: بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقتنا۔ اگر ان کی تقدیر میں بچہ ہوگا تو شیطان اسے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ عمر بن ابی سلمہ کو فرمایا: اے غلام! بسم اللہ پڑھ اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھا اور اپنے سامنے سے کھا (2)۔ اور فرمایا: شیطان کھانے کو حلال کر لیتا ہے مگر جب اس کھانے پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اور فرمایا: جس نے ابھی ذبح نہیں کیا وہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے۔ عثمان بن ابی العاص نے اس تکلیف کی شکایت کی جو انہیں اسلام قبول کرنے کے وقت سے جسم میں تھی۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے جسم میں تکلیف والی جگہ پر ہاتھ رکھ اور تین مرتبہ بسم اللہ پڑھ اور سات مرتبہ یہ کلمات کہہ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ (3)۔ یہ تمام احادیث صحیح میں ثابت ہیں۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنوں اور بنی آدم کی شرمگاہوں کے درمیان پردہ ہے کہ جب لیٹرین میں داخل ہو تو پہلے بسم اللہ پڑھے (4)۔ دارقطنی میں حضرت عائشہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنوده، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمة، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع الید علی موضع الالم مع الدعاء

4۔ سنن ابن ماجہ، مایقول الرجل اذا دخل الخلاء، حدیث نمبر 292، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پانی کو چھوتے تو بسم اللہ پڑھتے پھر اپنے ہاتھوں پر پانی بہاتے۔

**مسئلہ نمبر 9**: ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے افعال کی انہیں قدرت دی گئی ہے اور ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر فعل کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

بسم اللہ کا معنی، باللہ ہے اور باللہ کا مفہوم ہے اللہ کی تخلیق اور تقدیر سے مقصود تک پہنچا جاتا ہے۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: بسم اللہ کا مطلب ہے میں نے اللہ کی مدد، اس کی توفیق اور برکت سے شروع کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے تاکہ قراءت اور دوسرے کاموں کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر سے کریں تاکہ اللہ کی برکت سے افتتاح ہو۔

**مسئلہ نمبر 10**: ابوعبیدہ معمر بن مثنی کا نظریہ یہ ہے کہ اسم زائدہ ہے اور انہوں نے لبید کے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکم  ومن یبك حولا كاملاً فقد اعتذر

ایک سال تک تم رو پھر تم سلامتی ہو جو ایک سال تک روئے وہ معذور ہے۔

اس شعر میں اسم کا لفظ زیادہ ہے مراد ثم السلام علیکما ہے۔

ہمارے علماء نے لبید کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ اسم ہی مسمی ہے۔ مزید کلام آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 11**: اسم کے زیادہ ذکر کرنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ قطرب نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اجلال اور تعظیم کے لئے زیادہ کیا گیا ہے۔ اخفش نے کہا: یہ اس لئے زیادہ کیا گیا ہے تاکہ قسم کے حکم سے نکل جائے اور تبرک کا قصد ظاہر ہو کیونکہ اصل کلام باللہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: اس پر با کے دخول کے معنی میں بھی علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ امر کے معنی پر داخل ہوا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابدأ بسم اللہ۔ یا خبر کے معنی پر داخل ہوا؟ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابتدأت بسم اللہِ۔ پہلا قول فراء کا ہے اور دوسرا زجاج کا ہے اور نصب کی حالت میں ہونے کی دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ابتدائی بسم اللہ۔ بسم اللہ محل رفع میں ہوگا۔ مبتدا کی خبر کی حیثیت سے۔ بعض نے فرمایا: خبر محذوف ہے۔ یعنی ابتدائی مستقر یا ثابتٌ بسم اللہ۔ اور جب تو خبر کو ظاہر کرے گا تو محل نصب میں ثابت اور مستقر کی وجہ سے ہوگا۔ یہ زیدٌ فی الدار کے قائم مقام ہوگا۔ قرآن میں ہے: فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل: 40) اور عندہ محل نصب میں ہے۔ یہ بصرہ کے نحویوں سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے: ابتدائی بسم اللہ موجود او ثابت۔ پس باسم اس مصدر کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا جو ابتدائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: بسم اللہ کو بغیر الف کے لکھا جاتا ہے باء، الصاق کی وجہ سے اس کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور کثرت استعمال کی وجہ سے لفظاً اور خطاً اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ بخلاف اقرأ باسم ربك کے قلت استعمال کی وجہ سے

حذف نہیں کی جاتی۔ الرحمٰن اور القاهر کے ساتھ اس کو حذف کرنے میں اختلاف ہے۔ کسائی، سعید، اخفش نے کہا: الف حذف کی جائے گی۔ یحییٰ بن وثاب نے کہا: الف حذف نہیں کی جاتی مگر صرف بسم اللہ میں کیونکہ اس کا استعمال کثیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** با جارہ کو کسرہ دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا تا کہ اپنے عمل کے مناسب ہو جائے۔ بعض نے فرمایا: باء چونکہ صرف اسماء پر داخل ہوتی ہے اس لئے زیر کے ساتھ خاص کی جو اسماء کے ساتھ خاص ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کے اور اسم حروف کے درمیان فرق کرنے کے لئے جیسے کاف۔ شاعر کا قول ہے:

و رحنا بکابن الماء یجنب و سطنا۔		اس کا مطلب بمثل ابن الماء یا جو اس کی مثل ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اسم اس کا وزن اِفعٌ، اس میں واؤ حذف ہے کیونکہ یہ سموت سے ماخوذ ہے اس کی جمع اسماء اور تصغیر سُمَیّ ہے۔ اس کی اصل کی تقدیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: فِعْلٌ، بعض نے فرمایا فُعل ہے۔ جوہری نے کہا: اسماء جمع اس وزن کی ہوگی اس کی مثال جذع کی جمع اجذاع ہے، قُفل کی جمع اقفال ہے۔ اس کا صیغہ سماع کے ساتھ ہی پایا جاتا ہے، اس میں چار لغات ہیں اسم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، اسم ضمہ کے ساتھ۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: جنہوں نے الف کو ضمہ دیا انہوں نے اسے سموتُ اور اسمُو سے مشتق کیا ہے اور جنہوں نے ہمزہ کو کسرہ دیا انہوں نے سَمَیت اَسمی سے مشتق کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: سِمٌ اور سُمٌ۔ شاعر نے کہا:

واللّٰه اسماك سُما مباركاً		آثرك اللّٰه به ایثارك

اس شعر میں شاعر نے سُما استعمال کیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

و عامنا اعجبنا مقدمه		یدعی ابا السمح و قرضابِ سُمُهٗ

مبترا لکل عظم یلحمه۔

اس میں شاعر نے سُمٌ استعمال کیا ہے۔ ان اشعار میں قرضاب استعمال ہوا ہے۔ جب کوئی شخص خشک چیز کھائے تو وہ کہتے ہیں قرضب الرجل۔ سمہ سین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایک شاعر نے کہا:

باسم الذی فی کل سورۃ سُمہ		اس کے نام سے شروع کرتا ہے ہر سورت میں جس کا نام ہے۔

باسم سے سین کو غیر قیاسی تعلیل کر کے ساکن کیا گیا ہے اس کا الف وصلی ہے کبھی کبھی ضرورت کے لئے شاعر اس کے الف کو قطعی بنا دیتا ہے۔ جیسے احوص کا قول ہے:

و ما انا بالمخسوس فی جذم مالك		ولا من تسمّی ثم یلتزم الإسما

اس میں شاعر نے ہمزہ کو قطعی بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** عرب اسم کی نسبت کے وقت کہتے ہیں سموی۔ اگر تو چاہے تو اسمی کہہ دے، اب تو نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی جمع اسماء ہے اور اسماء کی جمع اسامی ہے، الفراء نے حکایت کیا ہے: اعیذك باسماوات اللّٰه۔

**مسئلہ نمبر 17:** اسم کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: یہ السمو سے مشتق ہے جس کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان بلند ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا: اسم مسمی کو بلند کرتا ہے اور اسے دوسروں سے بلند کر دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: سم کو اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ کلام کی دونوں قسموں حرف اور فعل پر اپنی قوت سے بلند ہوتا ہے۔ اسم، حرف اور فعل سے بالا جماع اقویٰ ہے کیونکہ اسم اصل ہے۔ پس اس کے حرف اور فعل سے بلند ہونے کی وجہ سے اسم کہا جاتا ہے۔ یہ تین اقوال ہیں۔

کوفیوں نے کہا: یہ السمة سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے کیونکہ اسم علامت ہوتا ہے اس کی جس کے لئے وضع کیا جاتا ہے اس بناء پر اسم کی اصل وسم ہوگی۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ تصغیر میں سمی اور جمع اسماء بولا جاتا ہے۔ جمع اور تصغیر اشیاء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتی ہیں۔ وُسَیْم اور اوسام نہیں کہا جاتا۔ اس کی صحت پر اختلاف کا فائدہ دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 18:** جو کہتا ہے السمو سے مشتق ہے جس کا معنی العلو ہے وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ مخلوق کے وجود سے پہلے اور ان کے وجود کے بعد اور ان کے فنا ہونے کے وقت ہمیشہ ہمیشہ موصوف تھا۔ اس کے اسماء اور صفات میں مخلوق کا کوئی اثر نہیں۔ یہ اہل سنت کا قول ہے اور جنہوں نے کہا: یہ السمة سے مشتق ہے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ازل میں بغیر اسم اور صفت کے تھا جب اس نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مخلوق نے اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء اور صفات بنائیں۔ جب اللہ انہیں فنا کر دے گا تو پھر بغیر اسم اور صفت کے رہ جائے گا۔ یہ معتزلہ کا قول ہے۔ یہ قول امت کے اجماع کے مخالف ہے۔ یہ ان کی بڑی خطا ہے کیونکہ انہوں نے کہا: اللہ کا کلام مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر اسم اور مسمی میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19:** اہل حق کا نظریہ یہ ہے جو قاضی ابوبکر بن طیب نے نقل کیا ہے کہ اسم ہی مسمی ہے۔ ابن فورک نے بھی اس کو پسند کیا ہے، یہی قول ابو عبیدہ اور سیبویہ کا ہے۔ جب کوئی کہتا ہے: اللہ عالم، تو اس کا قول اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو عالم ہونے کے ساتھ موصوف ہے پس اسم عالم ہوگا اور بعینہ وہی مسمی ہے۔ اسی طرح جب کہتا ہے: اللہ خالق تو خالق اللہ ہے۔ وہی بعینہ اس کا اسم ہے۔ پس اسم ان کے نزدیک بعینہ مسمی ہے بغیر کسی تفصیل کے۔ ابن حصار نے کہا: جو بدعتی لوگوں میں سے صفات کی نفی کرتا ہے وہ کہتا ہے اسماء کے لئے کوئی مدلول نہیں ہے مگر ذات، اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں اسم مسمی کا غیر ہے اور جو صفات کو ثابت کرتا ہے وہ اسماء کے لئے مدلولات کو ثابت کرتا ہے یہ ذات کے اوصاف ہیں اور یہ عبارات کا غیر ہیں اور یہ ان کے نزدیک اسماء ہیں اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ، یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں بڑا اور جامع ترین اسم ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم اعظم ہے اور کسی غیر کا نام اس کے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے نہ اس کا تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ (مریم: 65) کی ایک تاویل یہ بھی ہے یعنی کیا اللہ کے اسم کے ساتھ کسی کا نام رکھا جاتا ہے۔ اللہ اس موجود حق، صفات الٰہیہ کی جامع، ربوبیت کی صفات سے موصوف ذات کا اسم ہے جو وجود حقیقی کے ساتھ منفرد ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کا معنی ہے وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ واجب

الوجود جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ان سب کا مفہوم ایک ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشتق ہے یا یہ ذات کے لئے علَم وضع کیا گیا ہے۔ اکثر اہل علم کا پہلا نظریہ ہے اور اس کے اشتقاق میں اور اس کی اصل میں بھی اختلاف ہے۔ سیبویہ نے خلیل سے روایت کیا ہے کہ اس کی اصل الاہ ہے جسے فِعَال۔ پھر ہمزہ بدل الف، لام داخل کیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: یہ الناس کی مثل ہے جس کی اصل اُناس ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل (لاہ) ہے اور تعظیم کے لئے الف، لام اس پر داخل کیا گیا ہے۔ یہ سیبویہ کا مختار ہے۔ اس نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے۔

لاہ ابن عمك لا افضلتَ فی حسَب عنی ولا انت دیانی فتخزونی

اس شعر میں لاہ کا استعمال ہوا ہے اور اس شعر میں تخزونی حاء معجمہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی تسوسنی (دیکھ بال کرنا) ہے۔

کسائی اور فراء نے کہا بسم اللہ کا معنی بسم الالہ ہے۔ ہمزہ حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے لام میں ادغام کیا گیا تو لام مشدد ہو گیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ (الکہف: 38) اس کا معنی لکن انا ہے۔ اسی طرح حسن نے بھی پڑھا ہے پھر کہا ہے کہ یہ وَلَہَ سے مشتق ہے جس کا معنی حیران ہونا ہے۔ الوالہ کا مطلب عقل کا چلا جانا ہے کہا جاتا ہے: رجل والہٌ وامرۃ والھۃ و والہ۔ وماء مولہ۔ صحراء میں بھیجا گیا پانی، اللہ تعالیٰ کے بارے عقول حیران ہیں اور اس کی صفات کی حقائق میں وہ گم ہیں اور فکر اس کی معرفت میں ششدر ہے۔ اس بنا پر الاہ کی اصل ولاہ ہو گی۔ ہمزہ، واو کا بدل ہے جس طرح اشاح میں ہمزہ واو کا بدل ہے اسی طرح اسادۃ اصل میں وسادۃ تھا۔ خلیل سے مروی ہے اور ضحاک سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ کا نام الہ ہے کیونکہ مخلوق اپنی حاجات میں اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتی ہے اور تکالیف کے وقت اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تضرع و زاری کرتے ہیں۔ خلیل بن احمد سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مخلوق اس کی بارگاہ میں رجوع کرتی ہے۔ یالھون لام کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الارتفاع کے معنی میں ہے۔ عرب ہر بلند چیز کو لاھا کہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے جب سورج طلوع ہوتا تھا لاھت۔ بعض نے فرمایا: یہ اَلَہَ الرجلُ سے مشتق ہے جب وہ عبادت کرے۔ تَاَلَّہَ، جب کوئی عبادت کرے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (الاعراف: 127)۔ اس قراءت پر حضرت ابن عباس وغیرہ نے وعبادتك پڑھا ہے۔

علماء نے فرمایا: اللہ کا اسم اس سے مشتق ہے۔ پس اللہ کا معنی ہوگا: المقصود بالعبادۃ اسی سے موحدین کا قول ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس کا معنی ہے لا معبود غیر اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور الا کا کلمہ غیر کے معنی میں ہے استثناء کے معنی میں نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اصل الھاء ہے جو غائب سے کنایہ ہے۔ انہوں نے اس کو لوگوں کی عقول میں موجود ثابت کیا ہے۔ پس انہوں نے اس کی طرف حرف کنایہ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ پھر اس میں لام الملك زیادہ کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے ان کا مالک ہے پس (لَہٗ) ہو گیا پھر اس میں تعظیم و تفخیم کے لئے الف، لام زیادہ کیا گیا۔

دوسرا قول: یہ قول بہت سے علماء کا ہے ان میں امام شافعی، ابوالمعالی، خطابی، غزالی، مفضل وغیرہم ہیں، خلیل اور سیبویہ سے

مروی ہے کہ الف، لام اس کا لازمہ ہے، اس کو اس سے حذف کرنا جائز نہیں۔ خطابی نے کہا اور اس پر دلیل کہ الف، لام اس اسم کی اصل سے ہے اور الف، لام تعریف کیلئے داخل نہیں ہوا، اس پر حرف ندا کے حرف کا داخل ہونا ہے جیسے تیرا قول ہے یا اللہ۔ اور حروف نداء، الف لام تعریف کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ تو یا الرحمن اور یا الرحیم نہیں کہتا جیسا کہ تو کہتا ہے یا اللہ۔ پس یہ دلیل ہے کہ الف لام اس اسم کی اصل سے ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 22:** الرحمٰن کے اسم کے اشتقاق میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا کوئی اشتقاق نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مختصہ میں سے ہے۔ اگر یہ الرحمۃ سے مشتق ہوتا تو مرحوم کے ذکر کے ساتھ متصل ہوتا۔ پس یہ کہنا جائز ہوتا اللہ رحمن بعبادہ جس طرح رحیم بعبادہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ رحمۃ سے مشتق ہوتا، عرب اس کا انکار نہ کرتے جب انہوں نے اس کو سنا تھا کیونکہ وہ اپنے رب کی رحمت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ الآیۃ (الفرقان: 60) (جب انہیں کہا جاتا ہے۔ رحمن کے لئے سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمن کون ہے؟) جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا تو سہیل بن عمرو نے کہا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، ہم اس کو نہیں جانتے، بلکہ تم وہ لکھو جو ہم جانتے ہیں باسمك اللهم (1)۔ ابن عربی نے کہا: وہ صفت سے جاہل تھے موصوف سے نہیں۔ اس نے اس پر عربوں کے قول ما الرحمٰن سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ومن الرحمٰن نہیں کہا۔ ابن حصار نے کہا: گویا ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری آیت وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد: 30) نہیں پڑھی تھی۔ جمہور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ الرحمٰن، الرحمۃ سے مشتق ہے، مبالغہ کے لئے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے ایسا رحمت والا جس کی رحمت میں مثال نہیں۔ اسی وجہ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی جس طرح الرحیم کا تثنیہ اور جمع بنائی جاتی ہے۔

ابن حصار نے کہا: اس کے اشتقاق پر جو روایت دلالت کرتی ہے وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں رحمن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اس کے لئے اسم اپنے اسم سے مشتق کیا۔ پس جو رشتہ داری کو ملائے گا میں اسے ملاؤں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں اسے کاٹوں گا (2)۔ یہ حدیث اشتقاق میں نص ہے مخالفت وشقاق کا کوئی مطلب نہیں اور عربوں کا اس کا انکار ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کی شان سے جہالت کی بنا پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** مبرد نے لکھا ہے جو ابن انباری نے اپنی کتاب ''الزاہر'' میں بیان کیا ہے کہ الرحمٰن عبرانی اسم ہے اور اس کے ساتھ الرحیم لایا جاتا ہے۔ انہوں نے بطور استشہاد یہ اشعار پڑھے ہیں۔

لن تدركوا المجد او تشروا عباء كم    بالخز او تجعلوا الينبوت ضمرانا

1۔ صحیح بخاری، باب الشروط فی الجہاد الخ، حدیث نمبر 2529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی قطیعۃ الرحم، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

او تترکون الی القسین هجرتکم و مسحکم صلبهم رحمان قربانا

ابواسحاق زجاج نے ''معانی القرآن'' میں کہا ہے: احمد بن یحییٰ نے کہا: الرحیم عربی ہے اور الرحمٰن عبرانی ہے۔ اسی وجہ سے دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ وہ قول ہے جو مرغوب نہیں ہے۔

ابوالعباس نے کہا: نعت کبھی مدح کے لئے واقع ہوتی ہے جس طرح تو کہتا ہے۔ جریر شاعر نے کہا: مطرف نے قتادہ سے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے قول کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی۔ ابواسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے۔ قطرب نے کہا: تاکید کے لئے ان دونوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ ابواسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے اور تو کید میں عظیم فائدہ ہے۔ یہ کلام عرب میں کثیر ہے استشہاد کی ضرورت نہیں اس میں فائدہ وہ ہے جو محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ تفضل کے بعد تفضل ہے۔ انعام کے بعد انعام ہے، یہ رغبت کرنے والوں کی امیدوں کو قوت دینا ہے اور وعدہ ہے کہ اس کی امید خائب و خاسر نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 24**: اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں یا مختلف معانی رکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ہم معنی ہیں جیسے ندمان، ندیم۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعلان کی بنا پر فعیل کی طرح نہیں ہے کیونکہ فعلان واقع نہیں ہوگا مگر فعل کے مبالغہ پر، جیسے تیرا قول ہے رجل غضبان۔ جو غصہ سے بھرا ہوا ہو اور فعیل کبھی بمعنی فاعل اور مفعول کے معنی میں ہوتا ہے۔ عملّس نے کہا

فاما اذا عضت بك الحرب عضة فانك معطوف عليك رحيم

الرحمٰن خاص الاسم عام الفعل ہے اور الرحیم عام الاسم خاص الفعل ہے یہ جمہور کا قول ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: الرحمٰن، رحمت کی تمام اقسام میں عام ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خاص ہے اور الرحیم، وہ مومنین کی جہت میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾ (الاحزاب) عرزمی نے کہا: الرحمٰن وہ اپنی تمام مخلوق کو بارشیں عطا فرماتا ہے حواس کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور عام نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ الرحیم مومنین پر رحیم ہے کہ انہیں ہدایت دیتا ہے اور ان پر لطف فرماتا ہے۔ ابن مبارک نے کہا: الرحمٰن۔ جب اس سے مانگا جاتا ہے تو عطا فرماتا ہے۔ الرحیم جب اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام ترمذی نے اپنی جامع میں ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے (1)۔ فرمایا: میں نے ابوزرعہ سے ابوصالح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ابوصالح وہ ہے جسے الفارسی کہا جاتا ہے۔ یہ خوزستان کا رہنے والا تھا میں اس کا نام نہیں جانتا۔ بعض شعراء نے یہ معنی لیا اور کہا:

الله يغضب ان تركت سؤاله و بني آدم يسال يغضب

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، حدیث نمبر 3295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب فضل الدعاء، حدیث نمبر 3816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اگر اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے تو اللہ ناراض ہوتا ہے اور انسان سے سوال کیا جاتا ہے تو ناراض ہوتا ہے۔
حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ دونوں اسم رقت پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رقیق ہے یعنی رحمت میں زیادہ ہے۔

خطابی نے کہا: یہ مشکل ہے کیونکہ رقت کا اللہ کی صفات میں سے کسی شے میں دخل نہیں۔ حسین بن فضل بجلی نے کہا: یہ راوی سے وہم ہے کیونکہ رقت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے۔ یہ دونوں اسم رفق پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رفق پر دلالت کرتا ہے اور رفق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ رفیق (مہربان) ہے رفق کو پسند کرتا ہے۔ رفق پر جو وہ عطا کرتا ہے وہ سختی پر عطا نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 25**: اکثر علماء کا قول ہے کہ الرحمٰن اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کا اس کے ساتھ نام رکھنا جائز نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110) اس اسم کو ذکر فرمایا جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں فرمایا۔ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝ (الزخرف: 45) پس اس نے خبر دی کہ رحمٰن ہی عبادت کا مستحق ہے مسیلمہ کذاب لعنۃ اللہ علیہ نے افسوسناک کام کیا اور اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھا اور یہ نام نہ رکھا حتیٰ کہ کذاب کی صفت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کذاب کی صفت کو لازم کر دیا اگرچہ ہر کافر جھوٹا ہوتا ہے۔ پس یہ وصف (کذاب) مسیلمہ کے لئے علم بن گیا جس کے ساتھ وہ پہچانا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کذاب کا اسم لازم کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الرحمٰن اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**: الرحیم، مخلوق کے لئے صفت مطلقہ ہے۔ چونکہ الرحمٰن میں عموم پایا جاتا ہے ہمارے کلام میں قرآن کی موافقت میں الرحیم پر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ مہدوی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رحیم کا معنی ہے کہ تم رحیم کے ذریعے اللہ اور الرحمٰن تک پہنچے۔ الرحیم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ صفت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: (رؤوف رحیم) گویا یہ معنی ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم و بالرحیم۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے تم مجھ تک پہنچے یعنی اس کی اتباع کر کے اور جو وہ لے کر آئے اس کے ساتھ تم نے میرا ثواب، میری کرامت اور میرے چہرہ کی طرف نظر کرنے کو پایا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 27**: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: بسم اللہ ہر بیماری کی شفا ہے اور ہر دوا پر مدد ہے اور الرحمٰن ہر ایمان لانے والے کے لئے مدد ہے۔ یہ ایسا اسم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا نام نہیں رکھا جاتا اور رہا رحیم۔ یہ ہر توبہ کرنے، ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے کے لئے ہے۔ بعض نے حروف پر تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بسم اللہ کی تفسیر کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الباء سے مراد بلاء اللہ و روحہ و نصرتہ و بہاءہ ہے یعنی اللہ کا انعام، اس کی روح، اس کی شادابی اور رونق اور سین سے مراد اس کی سناء (روشنی) ہے اور میم سے مراد اللہ کا ملک ہے۔ اور اللہ سے مراد لا الہ غیرہ ہے اور الرحمن اپنی مخلوق میں سے ہر فاسق، فاجر پر مہربانی

فرمانے والا ہے۔ اور الرحیم وہ صرف مومنین پر مہربان ہے۔ حضرت کعب احبار سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: الباء سے مراد اس کی رونق و شادابی ہے۔ سین سے مراد اس کی روشنی ہے، کوئی چیز اس سے اعلیٰ نہیں ہے میم سے مراد اس کا ملک ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اسے مشکل میں نہیں ڈالتی۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر حرف، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم کا آغاز ہے۔ باء، اس کے اسم بصیر کی چابی ہے، سین اس کے اسم سمیع کی چابی ہے میم اس کے اسم ملیک کی چابی ہے، الف اس کے اسم اللہ کی چابی ہے لام اس کے اسم لطیف کی چابی ہے، ھاء اس کے اسم ھادی کی چابی ہے، راء اس کے اسم رازق کی چابی ہے، حاء اس کے اسم حلیم کی چابی ہے نون اس کے اسم نور کی چابی ہے۔ اس کا معنی ہر چیز کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 28**: الرحیم کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ حضرت ام سلمہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے الرحیم الحمد۔ میم کو ساکن کرتے اور اس پر وقف کرتے اور الف کے ساتھ علیحدہ آغاز کرتے۔ کوفیوں کی ایک قوم نے ایسا پڑھا بھی ہے۔ جمہور لوگوں کی قراءت الرحیم الحمد ہے۔ الرحیم کو جر کے ساتھ اعراب دیا جاتا ہے اور اَلْحَمْدُ کے الف کو وصلی بنایا جاتا ہے۔ کسائی نے بعض عربوں سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے الرحیم الحمد یعنی میم کے فتحہ اور الف کے وصل کے ساتھ پڑھا ہے گویا میم ساکن کی گئی اور الف کو قطعی بنایا گیا پھر اس کی حرکت میم پر ڈالی گئی اور اسے حذف کیا گیا۔ ابن عطیہ نے کہا: میری معلومات کے مطابق ایسی قراءت کسی سے مروی نہیں ہے۔ یحییٰ بن زیاد کا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ (آل عمران: 1) میں اسی طرح کا نظریہ ہے۔

# سورۃ الفاتحہ

اٰیاتھا ۷ ۱ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۵ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۧ

''سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا، بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا، مالک ہے روز جزا کا، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو سیدھے راستہ پر راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا''۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

## تفسیر سورۂ فاتحہ

اس کے متعلق چار ابواب ہیں۔

### الباب الاول

**یہ باب سورۂ فاتحہ کے فضائل اور اسکے اسماء کے بارے میں ہے اور اس باب میں سات مسائل کا ذکر ہوگا**

**مسئلہ نمبر 1**: ترمذی نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات اور انجیل میں اللہ تعالیٰ نے ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی مثل کلام نہیں اتارا اور یہ سورہ سبع مثانی (ایسی سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) ہے۔ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ (1) مالک نے علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے روایت کیا ہے کہ ابو سعید مولیٰ عبداللہ بن عامر بن کریز نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب کو بلایا جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مذکورہ بالا حدیث ذکر کی۔ ابن عبدالبر نے فرمایا: ابو سعید کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی وہ اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور ان

1۔ جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر، صفحہ 140، جلد 2، (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 3050، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی یہ حدیث مرسل ہے اور یہی حدیث ابوسعید بن معلّٰی سے بھی مروی ہے، یہ صحابہ میں سے ایک شخص ہے اس کے نام پر بھی آگاہی نہیں ہوئی۔ اس حدیث کو ابوسعید نے حفص بن عاصم اور عبید بن حسنین سے روایت کیا ہے۔

میں (قرطبی) کہتا ہوں: ''التمہید'' میں اسی طرح ہے کہ اس کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی اور ''کتاب الصحابہ'' میں اس کے نام میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ابوسعید بن معلّٰی سے روایت کیا ہے۔ ابوسعید نے فرمایا: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی۔ میں نے آپ کو جواب نہ دیا (میں دیر سے حاضر خدمت ہوا) تو عرض کی: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (الانفال: 24) لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی: حضور! آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ میں تجھے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ سورت یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ یہ سبع مثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (1)۔ ابن عبدالبر وغیرہ نے فرمایا: ابو سعید بن معلّٰی جلیل القدر انصار میں سے ہے اور انصار کے سرداروں میں سے ہے۔ امام بخاری نے تنہا ان سے روایت کیا ہے۔ اس کا نام رافع ہے۔ اسے حارث بن نفیع بن معلّٰی کہا جاتا ہے اور اوس بن معلّٰی بھی کہا جاتا ہے اور ابوسعید بن اوس بن معلّٰی بھی کہا جاتا ہے ان کا وصال ۷۴ ہجری میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ قبلہ کی تبدیلی ہوئی تو یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ مزید ذکر آگے آئے گا۔ حضرت ابی بن کعب کی حدیث کو یزید بن زریع نے مسند (متصل) ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: ہمیں روح بن قاسم نے علاء بن عبدالرحمن سے روایت کر کے بتایا، علاء نے اپنے باپ سے، ان کے باپ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا، حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی کے پاس تشریف لے گئے جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مکمل حدیث کا مفہوم ذکر کیا۔

ابن انباری نے اپنی کتاب ''الرد'' میں ذکر کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: مجھے ابوعبید اللہ وراق نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں ابوداؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں شیبان نے بتایا انہوں نے منصور سے اور انہوں نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: ابلیس۔ اللہ اس پر لعنت کرے۔ چار مرتبہ (افسوس کا اظہار کرتے ہوئے) رویا: (۱) جب اس پر لعنت کی گئی (۲) جب اسے جنت سے نکالا گیا (۳) جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا (۴) جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا بعض سورتوں اور بعض آیتوں کا دوسری بعض سورتوں اور آیتوں پر فضیلت رکھنے کے متعلق اختلاف

1۔ صحیح بخاری، تفسیر القرآن، صفحہ 642، جلد 2، (وزارت تعلیم)

ایضاً صحیح بخاری تفسیر القرآن، باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب، حدیث 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 5، زیر آیت

ہے، (اسی طرح) بعض اسماء حسنیٰ کا دوسرے بعض اسماء حسنیٰ پر فضیلت رکھنے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: کسی سورت، آیت اور اسم کو دوسری سورت، آیت اور اسم پر فضیلت نہیں ہے کیونکہ قرآن سارا اللہ کا کلام ہے، اسی طرح اس کے اسماء حسنیٰ کے درمیان بھی کوئی تفاضل نہیں ہے یہ قول شیخ ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر بن طیب، ابوحاتم محمد بن حبان بستی اور فقہاء کی ایک جماعت کا ہے۔ امام مالک سے بھی اس کا مفہوم مروی ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ نے کہا: بعض قرآن کو بعض قرآن پر فضیلت دینا غلطی ہے۔ اسی طرح امام مالک نے ایک سورت کو بار بار پڑھنا یا اسے ہی دہراتے رہنا مکروہ قرار دیا ہے۔ امام مالک سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ: 106) کے تحت یہ مروی ہے کہ ہم منسوخ آیت کی جگہ محکم آیت لے آتے ہیں۔ ابن کنانہ نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ان علماء نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ افضل، مفضول کے نقص کا شعور دیتا ہے، جبکہ تمام قرآن میں ذاتیت ایک ہے اور وہ کلام اللہ ہونا ہے اور اللہ کے کلام میں کوئی نقص نہیں ہے۔

سبتی نے کہا: حدیث کے الفاظ ''تورات و انجیل میں سورۂ فاتحہ کی مثل نہیں اتارا گیا'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تورات اور انجیل کو پڑھنے والے کو اتنا ثواب عطا نہیں فرماتا جو ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھنے والے کو عطا فرماتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت (محمدیہ) کو دوسری امتوں پر اپنے فضل خاص سے فضیلت بخشی ہے اور اپنے کلام قرآن کی قراءت پر دوسرے اپنے کلام کی قراءت کی نسبت زیادہ فضیلت دی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے اس امت کے لئے خاص فضل ہے اور فرمایا: اعظم سورت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کی سورتوں میں سے اجر کے اعتبار سے عظیم ہے، نہ کہ بعض قرآن بعض سے افضل ہے۔

بعض علماء بعض قرآن کی بعض پر فضیلت کے قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں: قرآن کی آیت وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ (البقرہ) آیۃ الکرسی، سورہ حشر کی آخری آیات، سورۂ اخلاص اور وہ سورتیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں ان میں جو فضیلت ہے وہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (لہب: 1) اور اس جیسی دوسری سورتوں میں موجود نہیں ہے۔

اور تفضیل معانی عجیبہ اور کثرت معانی کے اعتبار سے ہے نہ کہ صفت کے اعتبار سے ہے اور یہی حق ہے اور جو علماء تفضیل کے قائل ہیں ان میں سے اسحاق بن راہویہ وغیرہ متکلمین علماء میں سے ہیں اور یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی، ابن حصار کا مختار ہے۔ ان علماء کے قول کی وجہ ابوسعید بن معلیٰ اور حضرت ابی بن کعب کی حدیث ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! تیرے نزدیک کتاب اللہ میں کون سی آیت عظیم تر ہے، میں نے عرض کی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (البقرہ: 255) حضرت ابی نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابا منذر! تجھے یہ علم مبارک ہو۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ (1)

ابن حصار نے کہا: مجھے ان علماء پر تعجب ہے جو ان نصوص کے ہوتے ہوئے بھی اختلاف ذکر کرتے ہیں۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الکہف، صفحہ 271، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ)

ابن عربی نے کہا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل اور قرآن میں اس (سورہ فاتحہ) کی مثل نازل نہیں کیا(1)۔ اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باقی کتب کا ذکر نہیں کیا جیسے منزل صحیفے اور زبور وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذکور دوسری کتب سے افضل ہیں اور جب کوئی چیز کسی افضل سے افضل ہو تو وہ تمام چیزوں سے افضل ہوتی ہے جیسے تیرا قول زید، علماء سے افضل ہے۔ پس وہ تمام لوگوں سے افضل ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ایسی صفات ہیں جو کسی دوسری سورت میں نہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے کہا: پورا قرآن اس سورت میں ہے اس کے پچیس کلمات ہیں جو تمام علوم قرآن کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ اس سورت کے شرف میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم فرمایا ہے اور قربت صرف اسی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور کوئی عمل اس کے ثواب کو لاحق نہیں ہوتا۔ اسی مفہوم کی وجہ سے یہ قرآن عظیم کی اصل بن گئی۔ جیسا کہ سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ قرآن کا ثلث (۱/۳) ہے (2) کیونکہ قرآن، توحید، احکام اور مواعظ کا نام ہے اور سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ساری توحید ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا: قرآن میں کون سی آیت عظیم ہے؟ تو حضرت ابی نے کہا اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ:255)(3) یہ آیت عظیم ہے کیونکہ یہ تمام توحید ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد افضل ما قلته انا والنبیون من قبلی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (4) افضل ذکر بن گیا کیونکہ یہ ایسے کلمات ہیں جو توحید میں تمام علوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ توحید، عبادت، وعظ اور نصیحت کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران:18) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ (آل عمران:26) یہ آیات عرش سے معلق ہیں ان کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے،

ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب البیان میں اس روایت کو متصل نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** سورہ فاتحہ کے اسماء

اس کے بارہ اسماء ہیں۔

ا۔ الصلاۃ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف، نصف تقسیم کیا(5) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 7، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القراءۃ قل ھو اللہ احد، صفحہ 271، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4627، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	3۔ ایضاً

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، باب ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم) جامع ترمذی، حدیث نمبر 3305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ، صفحہ 170، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ)

۲-سورۃ الحمد

چونکہ اس میں حمد کا ذکر ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ سورۃ اعراف، سورۂ انفال اور سورۂ توبہ وغیرہا۔

۳-فاتحۃ الکتاب

اس نام میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ لفظاً اس کے ساتھ قرآن کی قراءت کا آغاز کیا جاتا ہے اور خطاً مصحف میں اس کے ساتھ کتابت کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ نمازوں کو شروع کیا جاتا ہے۔

۴-ام الکتاب

اس نام میں اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرات انس، حسن بصری اور ابن سیرین نے مکروہ قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: ام الکتاب حلال اور حرام احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران: 7) حضرت انس اور ابن سیرین نے کہا: ام الکتاب لوح محفوظ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ (الزخرف: 4)

۵: ام القرآن

اس نام میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت انس اور ابن سیرین نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ احادیث ثابتہ ان دونوں اقوال کی تردید کرتی ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الحمدللہ ام القرآن، ام الکتاب اور السبع المثانی ہے(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور بخاری میں ہے فرمایا: ام الکتاب نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ مصاحف میں اس کے لکھنے کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے اور نماز میں اس کی قراءت کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے(2)۔ یحییٰ بن یعمر نے کہا: ام القریٰ مکہ ہے، ام خراسان مرو ہے اور ام القرآن سورۂ الحمد ہے(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ فاتحہ کو ام القرآن اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قرآن کے آغاز میں ہے اور قرآن کے تمام علوم کو متضمن ہے۔ اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے کیونکہ مکہ، زمین کا پہلا ٹکڑا ہے پھر اس سے زمین پھیلائی گئی۔ اسی وجہ سے ماں کو ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نسل کی اصل ہوتی ہے اور امیہ بن ابی الصلت کے قول میں زمین کو ام کہا گیا ہے۔

فالارض معقلنا و کانت امنا　　فیھا مقابرنا و فیھا نولد

زمین ہماری پناہ گاہ ہے اور زمین ہماری اصل ہے اس میں ہماری مقابر ہیں اور اس میں ہماری پیدائش ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فاتحۃ الکتاب، حدیث 1245، جامع ترمذی، حدیث نمبر 3049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 65، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　3۔ ایضاً

جنگ کے جھنڈے کو بھی ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ آگے ہوتا ہے اور لشکر اس کی پیروی کرتا ہے اور ام کی اصل امۃ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع امہات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُمَّهٰتُكُمْ (النساء: 23)۔ بغیر ھاء کے امات بھی کہا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا: فَرَجْتَ الظَّلَامَ بِاُمَّاتِكَا۔ تو نے اپنی نسبی شرافت سے تاریکیوں کو ختم کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا: انسانوں میں امہات اور چوپاؤں میں امات بولا جاتا ہے ابن فارس نے ''المجمل'' میں یہی بیان کیا ہے۔

## ٦- المثانی

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس امت کے لئے خاص کی گئی ہے پہلی امتوں میں سے کسی پر یہ نازل نہیں ہوئی، اسی امت کے لئے محفوظ کی گئی تھی۔

## ٧- القرآن العظیم

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں قرآن کے تمام علوم ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کمال وجلال کے ساتھ اس کی ثنا پر مشتمل ہے اور عبادت کے امر اور اخلاص، بغیر اعانت الٰہیہ کے کسی کام کرنے سے عجز کے اعتراف پر مشتمل ہے نیز صراط مستقیم کی طرف ہدایت کے لئے اسی کی بارگاہ میں تضرع وزاری پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں عہد توڑنے والوں کے احوال کی کفایت بھی ہے اور محنت کرنے والوں کے انجام کے بیان پر مشتمل ہے۔

## ٨- الشفاء

دارمی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاتحہ الکتاب ہر زہر سے شفاء ہے(1)۔

## ٩- الرقیۃ (دم کرنا)

حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے یہ نام ثابت ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا، جس نے قبیلہ کے سردار کو دم کیا تھا: تجھے کیا معلوم کہ یہ دم ہے۔ حضرت ابو سعید نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ ایک چیز تھی جو میرے دل میں ڈالی گئی تھی(2)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مکمل آگے آئے گی۔

## ١٠- اساس

ایک شخص نے امام شعبی سے اپنے پہلو میں درد کی شکایت کی تو امام شعبی نے کہا: تو اساس القرآن، فاتحہ الکتاب پڑھ۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لئے ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اس سے زمین پھیلائی گئی اور آسمانوں کی اساس عریب ہے یہ ساتواں آسمان ہے، زمین کی اساس عجیب ہے، یہ نچلی ساتویں

1۔ سنن دارمی، صفحہ 320، جلد 1 (مدینۃ المنورہ الحجاز)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارہ باب مایعطی فی الرقیۃ، حدیث نمبر 2115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زمین ہے، جنتوں کی اساس جنت عدن ہے، یہ جنتوں کی ناف ہے اس پر جنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آگ کی اساس جہنم ہے اور نیچے والا ساتواں طبقہ ہے اس پر درکات کی بنیاد رکھی گئی ہے، خلق کی اساس آدم ہیں اور انبیاء کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، کتب کی اساس قرآن ہے، قرآن کی اساس سورۂ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کی اساس بسملہ ہے جب تو بیمار ہو یا تجھے تکلیف ہو تو تجھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئے، تجھے شفا ہوگی۔

۱۱- وافیہ

سفیان بن عیینہ نے یہ نام بیان کیا ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ نصف نصف نہیں ہوتی اور جدائی کو برداشت نہیں کرتی۔ اگر کوئی باقی سورتوں میں سے کسی سورت کا نصف ایک رکعت میں پڑھے اور نصف دوسری رکعت میں پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔ اگر سورۂ فاتحہ کو آدھا آدھا کر کے دو رکعتوں میں پڑھے تو جائز نہ ہوگا۔

۱۲- کافیہ

یحییٰ بن ابی کثیر نے فرمایا: اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ باقی تمام سورتوں سے کفایت کرتی ہے جبکہ باقی تمام سورتیں اس سے کفایت نہیں کرتیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن خلاد اسکندرانی نے روایت کی، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ام القرآن دوسری تمام سورتوں کا بدل ہے جبکہ دوسری سورتیں اس کا بدل نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر5:** مہلب نے کہا: دم کا مقام یہ ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۝ بعض علماء نے فرمایا: پوری سورت دم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ارشاد فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ سے دم کرنے کی خبر دی تھی: تجھے کیسے معلوم تھا کہ یہ سورت دم ہے (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں دم ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ پوری سورت دم ہے کیونکہ یہ کتاب کا آغاز ہے اور تمام علوم کو متضمن ہے جیسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر6:** دوسری چیزوں کا نام المثانی اور ام الکتاب رکھنے کی وجہ سے اس کا نام المثانی اور ام الکتاب رکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (الزمر:23) اس آیت میں کتاب پر مثانی کا اطلاق فرمایا ہے کیونکہ اس میں اخبار بار بار بیان کی جاتی ہیں۔ سبع طوال سورتوں کو بھی مثانی کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں فرائض اور قصص دہرائے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سبعاً من المثانی دی گئیں۔ فرمایا: اس سے مراد السبع الطوال سورتیں ہیں (3) یہ قول نسائی نے ذکر کیا ہے اور السبع الطوال سورتیں سورۂ بقرہ سے اعراف تک چھ سورتیں ہیں اور ساتویں میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ یونس ساتویں ہے، بعض نے فرمایا: سورۂ انفال اور توبہ ہے۔ یہ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعشی ہمدان نے کہا تھا:

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 322، جلد 1 (دار المحاسن للطباعۃ قاہرہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارہ باب مایعطی فی الرقیۃ، حدیث 2115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، صفحہ 146، جلد 1 (و۔ت)۔ کتاب افتتاح الصلاۃ، باب تاویل قول اللہ لقد آتیناک سبعا من المثانی، حدیث 905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلجوا المسجد و ادعوا ربکم وادرسوا هذی المثانی الطول

یعنی مساجد میں داخل ہو جاؤ اور اپنے رب کو پکارو اور یہ مثانی اور طوال سورتیں پڑھو۔

مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الحجر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**: المثانی، مثنیٰ کی جمع ہے اس سے مراد دوسری ہے، طُوَل جمع ہے اطول کی، الانفال کو مثانی کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ مقدار میں طویل سورتوں کے بعد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ سورت ہے جس کی آیات مفصل سورتوں سے زائد ہیں اور مئین سورتوں سے کم ہیں۔ مئون ان سورتوں کو کہا جاتا ہے جن میں سے ہر سورت کی سو سے زائد آیات ہوتی ہیں۔

دوسرا باب

یہ باب سورۂ فاتحہ کے نزول اور اس کے احکام کے بارے میں ہے۔ اس میں بیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں، مگر صرف حسین الجعفی سے روایت کیا گیا ہے کہ اس کی چھ آیات ہیں (1)۔ اور یہ قول شاذ ہے۔ (اسی طرح) عمرو بن عبید سے مروی ہے کہ اس نے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو علیحدہ آیت شمار کیا ہے (2) اور آٹھ آیات بنائی ہیں۔ یہ قول بھی شاذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ (الحجر: 87) اور فرمایا: میں نے نماز کو تقسیم کیا (3)۔ (الحدیث) یہ آیت اور حدیث ان دونوں اقوال کا رد کرتی ہیں۔

اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ یہ سورۂ قرآن سے ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر یہ قرآن میں سے ہوتی تو حضرت عبد اللہ بن مسعود اپنے مصحف میں اسے لکھتے، جب انہوں نے اسے اپنے مصحف میں نہیں لکھا تو یہ دلیل ہے کہ یہ قرآن میں سے نہیں ہے، جیسا کہ معوذتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) کا حکم ان کے ہاں تھا۔

اس کا جواب ابو بکر انباری نے یہ دیا ہے۔ فرمایا: ہمیں حسن بن حباب نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں سلیمان بن اشعث نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابن ابی قدامہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے اعمش سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا، ابراہیم نے فرمایا: حضرت عبد اللہ بن مسعود سے کہا گیا تم اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھتے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر میں اسے لکھتا تو میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا۔ ابو بکر نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ ہر رکعت میں تلاوت کی گئی سورت سے پہلے ام القرآن سے آغاز کیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے اس کو چھوڑ کر اختصار کیا ہے اور میں نے اس بات پر اعتماد کیا ہے کہ مسلمان اس کو محفوظ کئے ہوئے ہیں میں نے اسے کسی ایک جگہ پر نہیں لکھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا کیونکہ نماز میں یہ ہر سورت سے مقدم ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ مکی سورت ہے یا مدنی سورت ہے۔ حضرات ابن عباس، قتادہ اور ابو العالیہ الریاحی اس کا نام رفیع ہے وغیرہم نے فرمایا: یہ سورت مکی ہے۔ حضرات ابو ہریرہ، مجاہد، عطاء بن یسار، زہری وغیرہم نے

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 69، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

فرمایا: یہ مدنی سورت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نصف مکہ میں نازل ہوا اور نصف مدینہ میں نازل ہوا۔ یہ قول ابولیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۞ یہ آیت سورۃ الحجر کی ہے اور سورۃ الحجر بالاجماع مکی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز مکہ میں فرض تھی اور اسلام میں کبھی بغیر الحمد کے نماز نہیں تھی۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: ''لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب'' (1) (سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں)۔ یہ حکم کے متعلق خبر ہے نہ کہ ابتدا کے متعلق خبر ہے۔ واللہ اعلم

قاضی ابن طیب نے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے کہ قرآن کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ مدثر، بعض نے فرمایا: اقرأ، بعض نے فرمایا: سورۂ فاتحہ۔ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ابومیسرہ عمرو بن شرحبیل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کو فرمایا: جب میں تنہا خلوت میں ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں، اللہ کی قسم! مجھے کچھ ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے کہا: معاذ اللہ! اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ کے ساتھ ایسا کرے، اللہ کی قسم! تم امانت کو ادا کرتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، بات سچی کرتے ہو۔ جب حضرت ابوبکر داخل ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود نہیں تھے۔ حضرت خدیجہ نے حضرت ابوبکر کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بتائی اور کہا: اے عتیق! تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس جاؤ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت ابوبکر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ہمارے ساتھ ورقہ کی طرف چلو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے۔ ابوبکر نے کہا: خدیجہ نے۔ پس دونوں ورقہ کی طرف چلے اور اسے صورت حال بتائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے یا محمد، یا محمد کی آواز سنتا ہوں، پھر میں زمین میں بھاگ پڑتا ہوں۔ ورقہ نے کہا: ایسا نہ کیا کر۔ جب تیرے پاس آواز آئے تو ٹھہر جاؤ حتیٰ کہ وہ جو کہے سن لو، پھر میرے پاس آؤ اور مجھے بتاؤ۔ جب آپ تنہائی میں تھے تو آواز آئی۔ یا محمد! کہو: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۞ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۞ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۞ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۞ کہو: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس آئے اور یہ سب کچھ ذکر کیا۔ ورقہ نے آپ سے کہا: بشارت ہو، بشارت ہو، بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہ ہے جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور تو موسیٰ علیہ السلام کے ناموس کی مثل پر ہے، تو نبی مرسل ہے، تو ایک وقت جہاد کا حکم دے گا۔ اگر مجھے وہ وقت میسر آیا تو میں آپ کے ساتھ مل کر ضرور جہاد کروں گا۔ جب ورقہ فوت ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ورقہ کو جنت میں دیکھا اس پر ریشمی کپڑے تھے، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی (2)۔ بیہقی نے فرمایا: یہ حدیث منقطع ہے اگر یہ محفوظ ہو تو پھر یہ احتمال ہوگا کہ یہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اور یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کے نزول کے بعد الحمد کے نزول کی خبر ہو۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 104، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلاۃ، باب وجوب القراۃ للامام والماموم، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ دلائل النبوۃ، جماع ابواب المبعث، باب مبتدا البعث والتنزیل

**مسئلہ نمبر 3**: ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے گمان کیا کہ جبریل سورۃ الحمد کے ساتھ نازل نہیں ہوئے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر سے ایک آواز سنی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا، اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا ہے۔ جبریل نے کہا: یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے آج سے پہلے کبھی نہیں اترا، اس نے سلام کیا اور کہا: تمہیں دونوروں کی بشارت ہو جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ (وہ نور یہ ہیں) فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان میں سے کوئی حرف نہیں پڑھیں گے مگر تمہیں وہ عطا کیا جائے گا (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح بعض علماء نے گمان کیا ہے کیونکہ یہ حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس فرشتے سے پہلے آئے۔ اس کی آمد اور جو کچھ وہ لے کر آ رہا تھا اس کے متعلق آگاہ کیا۔ اس بنا پر جبریل اس کے نزول میں شریک ہو گیا۔ واللہ اعلم

میں (علامہ قرطبی) کہتا ہوں: حدیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جبریل امین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا تھا اور جبریل اس سورت کو لے کر آئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ (الشعراء) یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ سارا قرآن جبریل امین لے کر آئے۔ پس جبریل اس کی تلاوت مکہ ہی لے کر آئے ہوں گے اور یہ فرشتہ مدینہ طیبہ میں اس کا ثواب لے کر آیا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سورت مکی، مدنی ہے جبریل امین اس کو دو مرتبہ لے کر آئے تھے۔ یہ قول ثعلبی نے حکایت کیا ہے اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اولیٰ ہے کیونکہ ہمارا قول قرآن و سنت کو جمع کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: یہ پہلے گزر چکا ہے کہ بسم اللہ صحیح قول کے مطابق اس سورت کا جز نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو نماز کا حکم یہ ہے کہ جب وہ تکبیر تحریمہ کہے تو سورۂ فاتحہ پڑھے اور خاموش نہ رہے، نہ تو جیہہ ذکر کرے اور نہ تسبیح کیونکہ حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی احادیث اسی پر دلالت کرتی ہیں جو پیچھے گزر چکی ہیں۔ جبکہ توجیہہ، تسبیح اور سکوت کی احادیث بھی موجود ہیں۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ فرمایا ہے: حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ یہ دونوں حضرات جب نماز شروع کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: سبحانك اللهم و بحمدك و تبارك اسمك و تعالىٰ جدك و لا اله غيرك (2) حضرات سفیان، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول وہ ہے جو حضرت علی سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے پھر کہتے: وجهت وجهي (3) اس کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ پوری حدیث سورۂ انعام کے آخر میں آئے گی۔ اس مسئلہ میں مکمل گفتگو وہاں آئے گی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل الفاتحة و خواتیم سورة البقرة، صفحہ 271، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجة من قال لایجهر بالبسملة، صفحہ 172، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء فی صلاۃ و قیامہ، صفحہ 263، جلد 1

ابن منذر نے کہا: یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں تکبیر (تحریمہ) کہتے تو قراءت سے پہلے تھوڑی دیر خاموش رہتے اور یہ دعا پڑھتے: اللھم باعد بینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق و المغرب اللھم نقنی من خطایای کما یُنَقّی الثوبُ الابیض من الدنس اللھم اغسلنی من خطایای بالماء والثلج والبرد۔ حضرت ابوہریرہ نے اس پر عمل کیا۔ ابوسلمۃ بن عبدالرحمن نے کہا: امام کے لئے دو سکتے ہیں۔ ان سکتوں میں قراءت کو غنیمت جانو (1)۔ حضرات اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز، امام احمد بن حنبل کا میلان بھی اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کی حدیث کی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: نماز میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے وجوب میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین علماء نے فرمایا: یہ امام اور منفرد کے لئے ہر رکعت میں متعین ہے۔ ابن خویز منداد بصری مالکی نے کہا: امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے کہ جو دو رکعت والی نماز میں ایک رکعت میں الحمد شریف پڑھنا بھول جائے تو اس کی نماز باطل ہے اور جائز نہیں ہے اور اس شخص کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے جو چار یا تین رکعت والی نماز میں کسی ایک رکعت میں الحمد بھول جائے، کبھی تو فرمایا: وہ نماز کا اعادہ کرے اور کبھی فرمایا: سجدہ سہو کرے۔ ابن عبدحکیم وغیرہ نے امام مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس رکعت کا اعادہ کرے اور سلام کے بعد نماز کی دوسری رکعت پڑھے گا جیسا کہ وہ شخص جس نے بھول کر سجدہ ساقط کر دیا۔ یہ ابن قاسم کا مختار مذہب ہے۔ حضرت حسن بصری، اکثر اہل بصرہ اور مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی مدنی نے کہا: جب کوئی شخص نماز میں ایک مرتبہ ام القرآن پڑھ لے تو وہ کافی ہو جائے گی، اس پر اعادہ نہ ہوگا کیونکہ نماز میں اس نے ام القرآن پڑھ لی ہے۔ پس اس کی نماز مکمل ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کی نماز مکمل نہیں جس نے ام القرآن (الحمد) نہیں پڑھی (2)۔ اور اس شخص نے الحمد ایک مرتبہ پڑھ لی ہے (پس اس کی نماز مکمل ہوگی)۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ یہی قول صحیح ہے جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے نماز کی اکثر رکعات میں الحمد شریف نہیں پڑھی۔ یہی اختلاف کا سبب ہے۔ واللہ اعلم

حضرات امام ابوحنیفہ، ثوری، اوزاعی نے فرمایا: اگر جان بوجھ کر پوری نماز میں الحمد شریف چھوڑ دی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو اس کی نماز جائز ہو جائے گی۔ امام اوزاعی سے اس کے متعلق اختلاف مروی ہے۔ امام ابویوسف اور امام محمد بن حسن نے کہا: قراءت کی کم از کم مقدار تین آیات ہیں یا ایک بڑی آیت ہے جیسے قرضہ والی آیت۔ اور امام محمد سے یہ بھی مروی ہے۔ فرمایا: میں آیت کی مقدار اور کلمہ مفہومہ کی مقدار میں اجتہاد کو جائز قرار دیتا ہوں جیسے الحمد للہ، اور میں ایسے حرف کو جائز قرار نہیں دیتا جو کلام نہ ہو۔

علامہ طبری نے فرمایا: نمازی ہر رکعت میں الحمد کی تلاوت کرے گا، اگر الحمد نہیں پڑھے گا تو نماز جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ الحمد کی

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلاۃ، باب مایقول بعد التکبیر، حدیث 702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مثل قرآن سے الحمد کی آیات کی تعداد اور اس کے حروف کی تعداد کے مطابق تلاوت کرے۔

ابن عبدالبر نے کہا: اس کا کوئی مطلب نہیں کیونکہ الحمد کی تعیین اور تخصیص نے اس حکم کے ساتھ اس کو خاص کر دیا ہے اور یہ محال ہے کہ جس پر الحمد کا پڑھنا واجب ہے وہ اس کا بدل پڑھ لے اور الحمد چھوڑ دے جبکہ وہ الحمد پڑھنے پر قادر بھی ہو بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ الحمد ہی پڑھے اور اسی کی طرف لوٹے جیسا کہ دوسری عبادات میں متعین فرائض ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** مقتدی اگر امام کو رکوع میں پالے تو امام مقتدی کی طرف سے قراءت کرنے والا ہوگا کیونکہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو مقتدی تکبیر کہے اور رکوع میں چلا جائے، قراءت نہ کرے اور اگر امام کو قیام میں پائے تو قراءت کرے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اور کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ امام کے پیچھے سری نماز میں قراءت چھوڑ دے۔ اگر وہ قراءت چھوڑ دے گا تو اچھا نہیں کرے گا لیکن امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ اور جب امام جہری قراءت کر رہا ہو تو پھر یہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** امام کے پیچھے جہری نماز میں نہ سورۂ فاتحہ پڑھے اور نہ کوئی دوسری سورت پڑھے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کیا بات ہے مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جا رہا ہے'' (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امام کے بارے ارشاد ہے: ''جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو'' (صحیح مسلم۔ کتاب الصلاۃ)۔ اور ارشاد فرمایا: ''جس کا امام ہو، امام کی قراءت اس کی قراءت ہے'' (2)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور امام شافعی سے یہ قول بویطی اور امام احمد بن حنبل نے حکایت فرمایا کہ کسی کی نماز نہ ہوگی حتیٰ کہ وہ ہر رکعت میں الحمد پڑھے خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہو۔ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری۔ امام شافعی عراق میں مقتدی کے بارے میں کہتے تھے جب امام سری قراءت کرے تو مقتدی قراءت کرے اور جب جہری قراءت کرے تو مقتدی قراءت نہ کرے جیسا کہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ اور امام شافعی کے مصر میں امام کے جہری قراءت کرنے کی صورت میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدی قراءت کرے دوسرا یہ کہ امام کی قراءت کافی ہے مقتدی خود قراءت نہ کرے۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم، ابن حبیب اور کوفہ کے علماء نے کہا: مقتدی بالکل قراءت نہ کرے۔ خواہ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری قراءت کر رہا ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: امام کی قراءت، مقتدی کی قراءت ہے (3) یہ حکم عام ہے اور جابر کا قول ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو (4)۔

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلاۃ، باب ترک القراءۃ خلف الامام، صفحہ 59، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اقامۃ الصلاۃ، اذا قرأ الامام فانصتوا، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً 4۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 9**: ان اقوال میں سے صحیح قول امام شافعی، امام احمد کا ہے اور امام مالک کا دوسرا قول ہے کیونکہ ہر شخص کے لئے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بالعموم متعین ہے (☆)۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اس کی نماز نہیں جس نے نماز میں الحمد نہیں پڑھی (1)۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے (2)۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اعلان کروں کہ سورہ الحمد اور اس سے زائد کی قراءت کے بغیر نماز نہیں (3)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے، جس طرح کہ کسی رکعت کا سجدہ اور رکوع دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتا اسی طرح ایک رکعت کی قراءت دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتی۔

عبداللہ بن عون، ایوب سختیانی اور ابوثور وغیرہ اصحاب شوافع، داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی مثل اوزاعی سے بھی مروی ہے اور یہی قول مکحول کا بھی ہے۔ حضرات عمر بن خطاب، عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ، ابی بن کعب، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، عثمان بن ابی عاص اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، فرماتے ہیں: سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ یہی قول حضرت ابن عمر کا ہے اور اوزاعی کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ یہ صحابہ مقتداء ہیں اور ان ذوات میں اسوہ ہے یہ تمام حضرات ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں۔

امام ابوعبداللہ بن محمد یزید بن ماجہ القزوینی نے اپنی سنن میں ایسی روایت نقل کی ہے جو اختلاف کو ختم کر دیتی ہے اور ہر احتمال کو زائل کر دیتی ہے۔ فرمایا: ہمیں ابوکریب نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن فضیل نے بتایا۔ دوسری سند اس طرح ہے ہمیں سوید بن سعید نے بتایا، ہمیں علی بن مسہر نے بتایا تمام نے ابوسفیان سعدی سے روایت کیا، انہوں نے ابونضرہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں الحمد اور کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی (4)۔ خواہ فرضی نماز ہو یا نفلی نماز ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا جس کو آپ نماز سکھا رہے تھے: ''تو اس طرح اپنی تمام نماز میں کر (5)''۔ آگے یہ حدیث تفصیل سے آئے گی۔ دوسری دلیل اس کے متعلق وہ روایت ہے جو ابوداؤد نے نافع بن محمود الربیع سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عبادہ بن صامت صبح کی نماز میں لیٹ ہو گئے تو ابونعیم مؤذن نے تکبیر کہی اور خود ہی لوگوں کو نماز پڑھا دی۔ حضرت عبادہ بن صامت آئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا حتیٰ کہ ہم نے ابونعیم کے پیچھے صف بنائی، ابونعیم جہری قراءت کر رہے تھے عبادہ نے الحمد پڑھنی شروع کر دی جب سلام پھیرا تو میں نے عبادہ سے کہا: میں تجھے الحمد پڑھتے ہوئے سن رہا تھا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ باب لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ، حدیث نمبر 697، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب القراءۃ خلف الامام، حدیث نمبر 829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 119، جلد 1 (و۔ت)۔ کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، حدیث 701، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ جب امام کی قراءت مقتدی کی کفالت کر جاتی ہے تو پھر احناف کا قول راجح ہوگا کیونکہ مقتدی جب امام کو رکوع میں پائے تو اس کی رکعت مکمل ہو جاتی ہے۔ مترجم

جبکہ ابونعیم جہری قراءت کر رہے تھے؟ عبادہ نے کہا: ہاں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نماز پڑھائی جس میں آپ جہری قراءت کر رہے تھے، آپ پر قراءت خلط ملط ہوگئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام پھیرا تو ہماری طرف رخ انور پھیر لیا اور فرمایا: کیا تم قراءت کرتے ہو جب میں جہری قراءت کرتا ہوں؟ ہم میں سے بعض نے کہا: ہم واقعی ایسا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، میں کہہ رہا تھا مجھے کیا ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے، تم قرآن میں سے کچھ نہ پڑھا کرو جب میں جہری قراءت کر رہا ہوں، مگر صرف سورہ الحمد (پڑھا کرو) (1)۔ یہ مقتدی کے بارے میں نص صریح ہے کہ وہ بھی سورہ الحمد پڑھے۔ اس حدیث کا معنی ابوعیسیٰ ترمذی نے محمد بن اسحاق کی حدیث سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ اور امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اس حدیث پر اکثر اہل علم صحابہ اور تابعین کا عمل ہے۔ حضرات مالک بن انس، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ حضرات امام کے پیچھے قراءت کا نظریہ رکھتے تھے۔

اس حدیث کو دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ اسناد حسن ہے۔ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں اور انہوں نے ذکر کیا کہ محمود بن ربیع ایلیاء میں رہتے تھے اور ابونعیم پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں اذان دی۔ ابومحمد عبدالحق نے کہا: نافع بن محمود کو بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر نہیں کیا اور نہ ابن ابی حاتم نے اسے ذکر کیا اور نہ بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل کی۔ اس کے متعلق ابوعمر نے فرمایا: یہ مجہول ہے۔ دارقطنی نے یزید بن شریک سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے عمر سے قراءت خلف الامام کے بارے پوچھا تو انہوں نے مجھے قراءت خلف الامام کا حکم دیا۔ میں نے کہا: اگر آپ بھی امام ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں بھی ہوں۔ میں نے کہا: اگرچہ آپ جہری قراءت کر رہے ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں جہری قراءت کر رہا ہوں (2)۔ دارقطنی نے کہا: یہ سند صحیح ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: امام ضامن ہے (3) جو کچھ وہ کرے تم بھی وہ کرو۔ ابوحاتم نے کہا: یہ اس کے لئے (دلیل) صحیح ہے جو امام کے پیچھے قراءت کا قائل ہے۔ حضرت ابوہریرہ نے الفارسی کو یہی فتویٰ دیا تھا کہ وہ دل میں قراءت کیا کرے جب اس نے حضرت ابوہریرہ سے کہا تھا کہ میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا گیا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اس کا نصف میرے لئے ہے اور اس کا نصف میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پڑھو۔ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ..... (4) (الحدیث)

**مسئلہ نمبر 10:** پہلے علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد واذا قرأ فانصتوا (5) (جب امام قرأت کرے تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ فی کل رکعۃ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الکتاب، صفحہ 317، جلد 1 (دار المحاسن للطباعۃ القاہرہ)
3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 77، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجب علی المؤذن من تعاھد الوقت، حدیث 434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک قراءۃ بسم اللہ فی الفاتحہ، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، صفحہ 174، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

خاموش رہو) سے استدلال کیا ہے۔ اسے مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث سے نقل کیا ہے اور فرمایا: جریر عن سلیمان عن قتادہ کی سند سے جو حدیث مروی ہے اس میں زیادتی ہے: واذا قرأ فانصتوا۔ دارقطنی نے کہا: قتادہ سے اس زیادتی کو ذکر کرنے میں سلیمان تیمی کی متابعت نہیں کی گئی بلکہ قتادہ کے شاگردوں میں سے حفاظ نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا۔ حفاظ حدیث میں یہ افراد شامل ہیں: شعبہ، ہشام، سعید بن ابی عروبہ، ہمام، ابوعوانہ، معمر، عدی بن ابی عمارہ۔

دارقطنی نے کہا: ان حفاظ کا اجماع دلیل ہے کہ سلیمان تیمی کو ان الفاظ میں وہم ہوا ہے۔ عبداللہ بن عامر عن قتادہ کی سند سے تیمی کی متابعت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ قطان نے اس کو ترک کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے یہ زیادہ نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ زیادتی اذا قرء فانصتوا محفوظ نہیں ہے (1)۔ ابومحمد عبدالحق نے ذکر کیا ہے کہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح کہا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مسلم کا حضرت ابوموسیٰ کی حدیث سے ان الفاظ کو اپنی کتاب میں داخل کرنا ان کے نزدیک اس کی صحت کی دلیل ہے اگرچہ اس کی صحت کا تمام علماء کا اجماع نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور ابن منذر نے صحیح کہا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) تو یہ مکہ میں نازل ہوا اور نماز میں کلام کرنے کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت زید بن ارقم نے فرمایا: پس اس میں حجت نہ رہی کیونکہ مقصود مشرکین تھے جیسا کہ حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے آواز بلند کرنے کے بارے نازل ہوئی۔ اور دارقطنی نے فرمایا: عبداللہ بن عامر ضعیف ہے۔ رہا حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جا رہا ہے (2)۔ اسے امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے ابن اکیمہ لیثی سے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے اس کے نام کے بارے فرمایا: عمرو۔ جبکہ دوسرے محدثین نے کہا: عامر، بعض نے کہا: یزید، بعض نے کہا: عمارہ، بعض نے کہا: عباد، اس کی کنیت ابوالولید تھی، ایک سو ایک ہجری میں اس کا وصال ہوا جبکہ اس کی عمر ۹۹ سال تھی۔ ان سے زہری نے صرف یہی حدیث روایت کی ہے اور یہ ثقہ ہے۔ محمد بن عمرو وغیرہ نے اس سے روایت کیا ہے۔ اس کی حدیث میں یہ معنی موجود ہے جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو تم بلند آواز سے قراءت نہ کرو کیونکہ یہ تنازع، چھیننا اور تخالج ہے (بلکہ) دل میں پڑھو۔ حضرت عبادہ کی حدیث اور حضرت عمر فاروق اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ بھی اس حدیث کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔ اگر مالی انازع القرآن (کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے) (3) سے وہ یہ منع کا مفہوم سمجھتے تو اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ حضرت ابن اکیمہ کی حدیث میں زہری کا قول ہے کہ پھر لوگ اس نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قراءت کرنے سے رک گئے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند آواز سے قراءت کرتے تھے جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سنی۔ یہاں قراءت سے مراد الحمد ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یصلی من قعود، حدیث 511، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ترک القراءۃ خلف الامام فیما جہر فیہ، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ ایضاً

ہے۔ و باللہ توفیقنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں توفیق ملتی ہے۔

رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''جس کا امام ہو، تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے'' (1)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حسن بن عمارہ نے اسے متصل ذکر کیا ہے اور وہ متروک ہے۔ ابوحنیفہ (امام اعظم) وہ بھی ضعیف ہے (یہ تبصرہ تعجب کی بات ہے خصوصاً جب حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے محدث آپ کی شاگردی پر فخر کریں۔ مترجم)۔ ان دونوں حضرات نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث کو حضرات سفیان ثوری، شعبہ، اسرائیل، ابن یونس، شریک، ابو خالد الدالانی، ابو الاحوص، سفیان بن عیینہ، جریر بن عبدالحمید وغیرہم نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے مرسلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور مرسل ہی درست ہے۔ رہا حضرت جابر کا قول کہ ''جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں الحمد نہ پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر جب امام کے پیچھے ہو'' (2)۔ اس قول کو مالک نے وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اس قول کو یحییٰ بن سلام صاحب تفسیر نے مالک سے انہوں نے ابونعیم وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ صواب حضرت جابر پر موقوف ہے جیسا کہ مؤطا میں ہے۔ اس حدیث میں فقہی مسئلہ یہی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ رکعت باطل ہے جس میں الحمد نہ پڑھی گئی۔ یہ دلیل ہے اس مذہب کی جس کی طرف ابن قاسم گئے ہیں اور انہوں نے مالک سے اس رکعت کے لغو ہونے اور دوسری رکعت پر بنا کرنے کو روایت کیا ہے۔ نمازی اس رکعت کو شمار نہیں کرے گا جس میں اس نے الحمد نہ پڑھی ہوگی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام کی قراءت اس کے مقتدیوں کی قراءت ہے (ا)۔ یہ حضرت جابر کا مذہب تھا اور دوسرے لوگوں نے ان کی اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** ابن عربی نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: لا صلاۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب (3) (اس کی نماز نہیں جس نے الحمد نہیں پڑھی) اس کی اصل کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ کمال اور تمام کی نفی پر محمول ہے یا جواز کی نفی پر محمول ہے۔ ناظر کے حال کے اختلاف کی وجہ سے فتویٰ بھی مختلف ہے۔ اس اصل میں مشہور اور اقویٰ یہ ہے کہ نفی عموم پر ہے اور مالک کی روایت سے اقویٰ یہ ہے کہ جس نے اپنی نماز میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے پھر ہم نے ہر رکعت میں الحمد کے تکرار میں غور کیا۔ پس جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: افعل ذالک فی صلاتک کلھا (4) (اپنی نماز میں ایسا کر) کی یہی تاویل کی اسے ہر رکعت میں الحمد کا لوٹانا لازم ہے جیسا کہ رکوع و سجود کو لوٹاتا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12:** اس باب میں سورۂ فاتحہ کی تعیین میں جو معانی اور احادیث ذکر کی ہیں یہ سب کوفہ کے علماء کے اس

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب اذا قراء الامام فانصتوا، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی ام القرآن، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحۃ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)　　4۔ ایضاً، صفحہ 170، جلد 1

(ا) قراءت خلف الامام کے حوالے سے شرح معانی الآثار کتاب الصلاۃ باب قراءۃ خلف الامام میں اور علامہ عینی کی عمدۃ القاری شرح بخاری میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

قول کا رد کرتی ہیں جو کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ متعین نہیں ہے اور سورۂ فاتحہ اور قرآن کی دوسری آیات برابر نہیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے اسے متعین فرمایا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واقیموا الصلوۃ کی مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے والے ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سورۂ فاتحہ اور جو مزید قراءت میسر ہو وہ پڑھیں (1)۔ پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کو جو فرمایا تھا کہ جو تیرے پاس قرآن ہے وہ پڑھ اور جو سورۂ فاتحہ سے زائد ہے وہ پڑھ (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل:20) کی تفسیر ہے تو پڑھ لیا کرو قرآن سے جتنا آسان ہو۔

مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی (3) ایک روایت میں ''اور کچھ زائد'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے مکمل نہیں ہے (4) یعنی ادلہ مذکورہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ الخداج کا لفظ حدیث میں استعمال ہوا ہے اس کا معنی نقص اور فساد ہے۔ اخفش نے کہا: خدجت الناقۃ اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی ناقص بچہ جنم دے اور اخدجت اس وقت کہا جاتا ہے جب وقت سے پہلے بچہ پھینک دے اگرچہ اس کی تخلیق مکمل ہو۔

نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کمی کے ہوتے ہوئے نماز جائز نہ ہو کیونکہ یہ ایک ایسی نماز ہے جو مکمل نہیں ہوئی اور جو اپنی نماز سے خارج ہو جبکہ اس کی نماز مکمل نہ ہوئی ہو تو اس پر اعادہ واجب ہے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے اور جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کمی کے باوجود نماز جائز ہے حالانکہ وہ کمی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے اور اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو لازم ہو۔

**مسئلہ نمبر 13**: امام مالک سے مروی ہے کہ کسی نماز میں قراءت واجب نہیں ہے اور اسی طرح امام شافعی عراق میں اس شخص کے بارے فرماتے تھے جو قراءت بھول جائے پھر مصر میں اس قول سے رجوع کر لیا اور کہا: اس شخص کی نماز جائز نہیں، جو سورۂ فاتحہ اچھی طرح پڑھ سکتا ہے مگر سورہ فاتحہ کے ساتھ۔ اور سورۂ فاتحہ میں سے ایک حرف بھی کم ہوا تو نماز جائز نہ ہو گی۔ پس اگر سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھا یا اس سے کوئی حرف کم کر دیا تو وہ نماز کا اعادہ کرے اگرچہ دوسری کوئی سورت تلاوت بھی کی ہو۔ اس مسئلہ میں یہی قول صحیح ہے۔ اور رہا وہ مسئلہ جو حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی۔ ان کے سامنے قراءت نہ کرنے کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے پوچھا رکوع وسجود کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا: وہ تو بہت اچھا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: پھر کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث منکر اللفظ ہے اور منقطع الاسناد ہے کیونکہ اسے ابراہیم بن حارث تیمی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور کبھی ابراہیم اسے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عمر کے سلسلہ سے روایت کرتے تھے اور دونوں سندیں منقطع ہیں اس میں حجت نہیں ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں اسے ذکر کیا ہے اور یہ بعض رواۃ نے بیان

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب من ترک القراءۃ فی صلاۃ بفاتحۃ الکتاب، حدیث 695، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 169، جلد 1 4۔ ایضاً

کی ہے جبکہ یحییٰ اور ان کے ساتھ والے طائفہ نے اسے بیان نہیں کیا کیونکہ امام مالک نے اپنی کتاب میں اسے آخر میں ذکر کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث پر عمل نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ نماز جس میں الحمد نہ پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہے (1) حضرت عمر سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس نماز کا اعادہ کیا تھا اور یہ ان سے صحیح ثابت ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری نے فرمایا: ابو معاویہ نے ہمیں بتایا انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے ہمام بن حارث سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر مغرب کی نماز میں قراءت بھول گئے تو آپ نے لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھائی۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ حدیث متصل ہے۔ ہمام نے حضرت عمر سے اس کو بیان کیا اور اس کو انہوں نے کئی طرق سے روایت کیا۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: امام مالک سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جو قراءت بھول گیا تھا۔ کیا تجھے تعجب میں ڈالتا ہے جو حضرت عمر نے کہا تھا؟ انہوں نے فرمایا: میں انکار کرتا ہوں کہ حضرت عمر نے ایسا کیا تھا اور میں اس روایت کا انکار کرتا ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: لوگ حضرت عمر کو مغرب کی نماز میں ایسا کرتے دیکھتے تھے اور وہ سبحان اللہ نہیں کہتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو ایسا کرے (یعنی قراءت نہ کرے) تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 14**: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قراءت کے بغیر نماز نہیں ہوتی جیسا کہ علماء کے اصول سے گزر چکا ہے اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی قرأت متعین نہیں ہے مگر وہ مستحب قرار دیتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ ایک سورت پڑھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل اکثر ثابت ہے۔ امام مالک نے فرمایا: قراءت میں سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں الحمد اور کوئی سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: ام القرآن (الحمد) پڑھے اگر الحمد نہ پڑھی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو بھی اس کی نماز جائز ہو جائے گی اور فرمایا: اگر تین رکعتوں میں قراءت بھول جائے تو نماز کو دوبارہ پڑھے۔ ثوری نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں چاہے تو تسبیح کرے اور اگر چاہے تو قراءت کرے، اور اگر قراءت نہ کرے اور تسبیح بھی نہ کرے تب بھی نماز جائز ہو گی۔ یہ قول امام ابوحنیفہ اور دوسرے تمام کوفیوں کا ہے۔ ابن منذر نے فرمایا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قراءت کر اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح پڑھ۔ امام نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

سفیان نے کہا: اگر تین رکعتوں میں قراءت نہ کی تو نماز کا اعادہ کرے کیونکہ ایک رکعت کی قراءت جائز نہیں۔ فرمایا: اسی طرح اگر فجر کی نماز میں ایک رکعت میں قراءت بھول جائے (تو بھی نماز کا اعادہ کرے)۔ ابوثور نے کہا: نماز جائز نہیں مگر ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے ساتھ جیسا کہ امام شافعی کا مصری قول ہے اسی پر شوافع کا اجماع ہے۔ اسی طرح ابن خویز منداد مالکی کا قول ہے۔ فرمایا: ہمارے نزدیک ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت ابوقتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھاتے تھے اور ظہر اور عصر کی نمازوں

---

1۔ صحیح مسلم، باب وجوب قرأة الفاتحة فی کل رکعة وانہ اذا لم یحسن الفاتحة ولا مکنہ تعلمھا قرأ ما تیسر لہ غیرھا، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت کرتے تھے۔ کبھی ہمیں کوئی آیت کریمہ سناتے تھے، ظہر کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے اور دوسری کو چھوٹا کرتے تھے اور اسی طرح صبح کی نماز میں کرتے تھے (1)۔ ایک روایت میں ہے کہ دوسری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے (2) یہ صریح نص ہے اور حدیث صحیح ہے۔ یہی امام مالک کا مسلک ہے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے تعین میں یہ نص ہے بخلاف ان علماء کے جنہوں نے اس کا انکار کیا۔ حجت، سنت میں ہوتی ہے نہ کہ اس قول میں جو سنت کے خلاف ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سے زائد قراءت واجب نہیں ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نماز میں قراءت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہم سے جہری قراءت کی ہم نے تم سے جہری قراءت کی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مخفی (قراءت) کی ہم نے بھی تم سے مخفی کی۔ پس جس نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی اس کی طرف سے قرأت جائز ہو گئی اور جس نے سورۂ فاتحہ سے زائد پڑھا وہ افضل ہے (3)۔ بخاری میں ہے: اگر تم اس سے زائد پڑھو تو بہتر ہے (4)۔ اکثر اہل علم نے ضرورت یا غیر ضرورت کے لئے سورت کو ترک کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان میں سے حضرات عمران بن حصین، ابوسعید خدری، خوات بن جبیر، مجاہد، ابووائل، ابن عمر، ابن عباس وغیرہم ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور قرآن میں سے مزید کچھ نہ پڑھے۔ پھر ان علماء میں سے بعض نے دو آیات کی حد متعین کی بعض نے ایک آیت کی حد متعین کی، بعض نے کوئی حد متعین نہیں کی اور فرمایا: قرآن میں سے کچھ پڑھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم ہے: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (مزمل: 20) پس سورۂ فاتحہ کے ساتھ ہر حال میں جو اسے میسر ہو وہ پڑھے کیونکہ حضرات عبادہ، ابوسعید خدری وغیرہما کی حدیث میں یہی حکم ہے۔ مدونہ میں ہے: وکیع نے اعمش سے انہوں نے خیثمہ سے روایت کیا، فرمایا: مجھے اس نے بتایا جس نے حضرت عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھے۔ سورت کی قراءت کے بارے میں تین اقوال ہیں: سنت ہے، فضیلت ہے، واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**: جو شخص بسیار کوشش کے باوجود سورۂ فاتحہ یا قرآن میں سے اور کچھ نہ سیکھ سکے تو اسے لازم ہے کہ وہ قراءت کی جگہ ممکن حد تک تکبیر یا تہلیل یا تحمید یا تسبیح یا تمجید یا لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ جب وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو جبکہ سری قراءت والی نماز ہو۔

ابوداؤد وغیرہ نے عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: میں قرآن یاد نہیں کر سکتا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو قراءت کی کفایت کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو کہہ: سبحان اللہ، الحمد للہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ اِلّا باللہ۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو اللہ کے لئے ہے، میرے لئے کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراۃ فی الظہر والعصر، صفحہ 185، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 106، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب القراءۃ فی الفجر، حدیث 730، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے؟ فرمایا: تو اس طرح کہہ: اے الله! تو مجھ پر رحم کر، مجھے عافیت دے، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما (1)۔

**مسئلہ نمبر 17:** اگر کوئی شخص ان الفاظ کے یاد کرنے سے بھی عاجز ہو تو وہ امام کے ساتھ نماز کو نہ چھوڑے۔ امام اس کی طرف سے ان شاء الله یہ ادا کرنے والا ہوگا۔ اس شخص پر لازم ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید قرآن سیکھنے کی کوشش ہمیشہ کرتا رہے حتیٰ کہ اس پر موت آجائے، تو بھی وہ کوشش میں لگا ہوا ہو۔ پس الله تعالیٰ اس کا عذر قبول فرمالے گا۔

**مسئلہ نمبر 18:** جو عجمی لوگوں میں سے عربی نہ بول سکتا ہو اور اس کے لئے عربی دعا کا اس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو جس کو وہ سمجھتا ہو تاکہ وہ اپنی نماز قائم کرے تو ان شاء الله یہ بھی اس کے لئے جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19:** جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ جو عربی اچھی طرح جانتا ہو وہ اگر فارسی میں قراءت کرے گا تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: فارسی میں قراءت جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو کیونکہ مقصود معنی کو پانا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ یہ الله تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور اس کے بھی خلاف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور مسلمانوں کی جماعت کے عمل کے بھی خلاف ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے قول کی کسی عالم نے موافقت کی ہے۔ (۱)

**مسئلہ نمبر 20:** جس نے نماز کو شروع کیا جس طرح کہ حکم دیا گیا تھا جبکہ وہ قراءت نہ جانتا تھا پھر نماز کے دوران ہی اسے قرأت کا علم حاصل ہو۔ اور یہ متصور ہے اس طرح کہ کوئی شخص تلاوت سنے اور سننے کے ساتھ ہی وہ اس کے حافظہ میں معلق ہو جائے تو ایسا شخص نماز کو نئے سرے سے شروع نہ کرے کیونکہ اس نے جو پیچھے ادا کیا وہ حکم الٰہی کے مطابق تھا۔ پس اس کے سابقہ عمل کو باطل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ ابن سحنون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

## تیسرا باب

# آمین کہنے کے متعلق ہے

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** قرآن پڑھنے والے کے لئے سنت ہے کہ سورۂ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے نون پر سکتہ کے بعد آمین کہے تاکہ قرآن، غیر قرآن سے ممتاز ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے کتب حدیث میں ثابت ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے سے موافقت کر جائے گا اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے'' (2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 121، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجزئ الامی والاعجمی من القراۃ، حدیث 708، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب جهر الامام بالتأمين، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۱) احناف کی کتب میں موجود ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا ''ہدایہ'' ان کا پہلا عذر حکمی کی وجہ سے تھا۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: گناہ کی مغفرت کی ترتیب چار مقدمات پر ہے جن کو یہ حدیث متضمن ہے: (۱) امام کا آمین کہنا۔ (۲) مقتدیوں کا آمین کہنا۔ (۳) فرشتوں کا آمین کہنا۔ (۴) آمین کہنے میں موافقت۔ بعض علماء نے فرمایا: اجابت میں موافقت، بعض نے فرمایا: زمانہ میں موافقت، بعض نے فرمایا: دعا کے اخلاص کی صفت میں موافقت مراد ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو دراں حالیکہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل اور اخلاص سے خالی دل کی دعا قبول نہیں فرماتا'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**: ابوداؤد نے ابو مصبح مقرائی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ابوزہیر منیری کے پاس بیٹھتے تھے اور وہ صحابہ میں سے تھے، وہ بڑے اچھے انداز میں حدیث بیان کرتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی دعا مانگتا تو کہتے: اس پر آمین سے مہر لگاؤ کیونکہ آمین صحیفہ پر مہر کی طرح ہے۔ ابوزہیر نے کہا: میں تمہیں اس کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہم ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ ہم ایک شخص کے پاس آئے جو دعا کرنے میں اصرار کررہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے سنتے ہوئے ٹھہر گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے مہر لگادی تو یہ واجب کردے گا۔ ایک شخص نے کہا: کس چیز کے ساتھ مہر لگائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آمین کے ساتھ کیونکہ اگر آمین کے ساتھ مہر لگادے گا تو واجب کردے گا۔ وہ شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا وہ واپس آیا اور اس شخص کے پاس پہنچا اور اسے کہا: اے فلاں! مہر لگا اور خوش ہو (2)۔

ابن عبدالبر نے کہا: ابوزہیر منیری کا نام یحییٰ بن نفیر تھا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، مکڑی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا لشکر ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: آمین کے چار حرف ہیں اللہ تعالیٰ ہر حرف سے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو دعا کرتا رہتا ہے۔ اے اللہ! ہر اس شخص کو بخش دے جس نے آمین کہا اور خبر میں ہے سورۂ فاتحہ سے میرے فارغ ہونے کے بعد مجھے جبریل نے آمین کی تلقین کی اور کہا: یہ خط پر مہر کی طرح ہے ایک اور حدیث میں ہے آمین رب العالمین کی مہر ہے۔ ہروی نے کہا: ابوبکر نے کہا: اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہر لگائی کیونکہ وہ آمین کے ساتھ بندوں سے آفات وبلیات دور فرماتا ہے۔ پس گویا یہ خط کی مہر کی مانند ہے جو خط کو محفوظ رکھتی ہے اور اس میں خرابی کرنے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اسے ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے آمین جنت میں ایک درجہ ہے۔ ابوبکر نے کہا: اس کا معنی یہ ہے یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا کہنے والا اس کے ذریعے جنت میں ایک درجہ حاصل کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اکثر اہل علم کے نزدیک آمین کا معنی ہے: اللھم استجب لنا (اے اللہ ہماری دعا قبول فرما) یہ دعا کی جگہ رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ جعفر بن محمد، مجاہد، ہلال بن یساف سے مروی ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے جبکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: آمین کا معنی ہے اسی طرح ہونا چاہیے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی جامع الدعوات، صفحہ 186، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوۃ، باب التامین وراء الامام، حدیث نمبر 803، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آمین کا معنی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اس کا معنی ہے) اے میرے رب! تو (ایسا) کر۔ مقاتل نے کہا: یہ کلمہ دعا کے لئے قوت ہے اور برکت طلب کرنے کے لئے ہے۔ ترمذی نے کہا: اس کا معنی ہے ہماری امیدوں کو نامراد نہ کر۔

**مسئلہ نمبر 5:** آمین میں دو لغتیں ہیں: (۱) مد، بروزن فاعیل جیسے یاسین (۲) بغیر مد کے یمین کے وزن پر۔

شاعر نے مد میں کہا ہے۔

یا رب لا تسلبنی حبها ابداً　　　و یرحم الله عبداً قال آمینا

اے رب! مجھ سے اس کی محبت کبھی نہ نکال اور اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو آمین کہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

آمین آمین لا ارضی بواحدۃ　　　حتی ابلغها الفین آمینا

آمین آمین، میں ایک مرتبہ کہنے پر راضی نہ ہوں گا حتیٰ کہ میں اسے دو ہزار آمین تک پہنچاؤں گا۔

ایک اور شاعر نے بغیر مد کے کہا ہے:

تباعد منی فُطْحُلٌ اذ سالتُهٗ　　　امین فزاد الله ما بیننا بعداً

اس شعر میں امین بغیر مد کے استعمال ہوا ہے۔

آمین کو میم کی شد کے ساتھ پڑھنا غلطی ہے یہ جوہری کا قول ہے۔ حسن اور حضرت امام جعفر صادق سے شد کے ساتھ مروی ہے حسین بن فضل کا بھی یہی قول ہے اور یہ امّ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے قصد کرنا یعنی ہم تیری طرف قصد کرنے والے ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ (المائدہ: 2) یہ قول ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: یہ این اور کیف کی مثل مبنی بر فتحہ ہے کیونکہ اجتماع ساکنین ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: اَمَّنَ فلان تامینا۔

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اختلاف ہے کیا امام آمین کہے اور کیا وہ اسے بلند آواز سے کہے۔ امام شافعی اور مالک اور ایک روایت میں مدنی علماء اسی مسلک کی طرف گئے ہیں۔ کوفہ کے علماء اور بعض مدنی علماء نے کہا: وہ بلند آواز سے آمین نہ کہے۔ یہی طبری کا قول ہے۔ ہمارے مالکی علماء میں سے ابن حبیب نے یہی کہا ہے۔ ابن بکیر نے کہا: اسے اختیار ہے (1)۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام آمین نہ کہے بلکہ مقتدی آمین کہیں۔ یہ ابن قاسم اور اصحاب مالک میں سے مصری علماء کا قول ہے اور ان کی حجت حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور ہمارے لئے ہمارا طریقہ بیان فرمایا اور ہمیں اپنی نماز سکھائی اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو پھر تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو جب وہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے گا (2) حدیث ذکر فرمائی۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے اسی کی مثل سمی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 79، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، صفحہ 174، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اسے مالک نے نقل فرمایا۔ پہلا قول صحیح ہے اس کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب وَ لَا الضَّآلِّيْنَ پڑھتے تو آمین کہتے اور اس کے ساتھ آواز کو بلند کرتے (1)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے یہ حدیث روایت کی ہے اور یہ زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: یہ سنت ہے جس کے ساتھ اہل کوفہ منفرد ہیں یہ صحیح ہے اور جو اس کے بعد ہے۔

امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے: جھر الامام بالتامین۔(2)

عطاء نے کہا: آمین دعا ہے۔ ابن زبیر اور ان کے مقتدیوں نے آمین کہا حتیٰ کہ مسجد میں گونج پیدا ہوئی۔ امام ترمذی نے کہا: نبی کریم ﷺ کے صحابہ اور تابعین علماء میں سے اکثر علماء فرماتے ہیں کہ نمازی اپنی آواز آمین کے ساتھ بلند کرے اور آہستہ نہ کہے (3)۔ یہی قول امام شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ مؤطا اور بخاری و مسلم میں ہے، ابن شہاب نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: آمین (4)۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں نے آمین کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتے تھے تو آمین کہتے تھے حتیٰ کہ پہلی صف والے سن لیتے تھے اور مسجد اس کے ساتھ گونج جاتی تھی (5)۔ رہی ابوموسیٰ اور سمی کی حدیث تو ان دونوں کا معنی اس مقام کی وضاحت ہے جہاں آمین کہا جاتا ہے اور وہ وہ مقام ہے جب امام وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے تاکہ ان دونوں کا قول اکٹھا ہو جائے اور مقتدی آمین کے قول کے ساتھ امام سے آگے نہ بڑھ جائیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو (6)۔ ابن نافع نے اپنی کتاب ''ابن الحارث'' میں فرمایا: مقتدی آمین نہ کہے حتیٰ کہ امام کو وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتے ہوئے سن لے اور جب امام سے اتنا دور ہو کہ اس کی آواز نہ سن سکے تو آمین نہ کہے۔ ابن عبدوس نے کہا: وہ قراءت کا اندازہ کر کے آمین کہے (7)۔

**مسئلہ نمبر 7**: امام ابوحنیفہ کے ساتھیوں نے کہا: آہستہ آمین کہنا، بلند آواز سے آمین کہنے کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (اعراف:55) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ)۔ مزید کہتے ہیں: آہستہ آمین کہنے پر دلیل وہ تاویل ہے جو اس آیت قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس:89) کے بارے میں مروی ہے۔ فرمایا: موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے آمین کہنے والا فرمایا۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 135-134، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التامین وراء الامام، حدیث 797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔

3۔ سنن ترمذی، صفحہ 34، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین

4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین خلف الامام

5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 62، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجھر بامین، حدیث نمبر 842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب جھر الامام بالتامین، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ المحرر الوجیز، صفحہ 80، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کا اخفاء افضل ہے کیونکہ اس میں ریا داخل ہو جاتا ہے لیکن وہ امر جو جماعت کی نماز کے ساتھ متعلق ہے، اس میں حاضری، ایک شعار کا اظہار ہے اور حق کا اظہار بندوں کو اس کے اظہار کی دعوت دیتا ہے۔ امام سورۂ فاتحہ کی قراءت بلند آواز سے کرتا ہے جو دعا اور آمین کہنے پر مشتمل ہے۔ جب دعا ایسی چیز ہے جس میں جہر سنت ہے تو آمین کہنا تو دعا کے لئے مہر ہے اور اس کے قائم مقام ہے اور یہ واضح امر ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: آمین کا کلمہ ہم سے پہلے صرف موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لئے تھا۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں عبدالوارث بن عبدالصمد نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں رزین نے بتایا جو ہشام بن حسان کی مسجد کے مؤذن تھے۔ انہوں نے کہا: ہمیں حضرت انس بن مالک نے بتایا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین ایسی چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں فرمائیں۔ وہ یہ ہیں: اہل جنت کا سلام، فرشتوں کی صفیں اور آمین مگر موسیٰ اور ہارون کو آمین کا کلمہ دیا گیا تھا۔ ابو عبداللہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے خلاف دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا قرآن میں اس طرح ذکر کیا قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس:89) ہارون علیہ السلام کے کلام کو ذکر نہیں فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ربنا (اے ہمارے رب!) اور ہارون علیہ السلام نے کہا: آمین۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان دونوں کو دعا کرنے والا کہا کیونکہ ان کی طرف سے یہ دعا ہو گئی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: آمین اس امت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: یہود تم پر اتنا حسد کسی چیز پر نہیں کرتے جتنا کہ وہ سلام اور آمین کہنے پر حسد کرتے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے حماد بن سلمہ عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مکمل حدیث ذکر کی۔ حضرت ابن عباس کی حدیث سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا، فرمایا: یہود تم پر کسی چیز میں اتنا حسد نہیں کرتے جتنا کہ آمین پر تم سے حسد کرتے ہیں، پس آمین کا قول زیادہ کہا کرو (2)۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: اہل کتاب نے ہم سے حسد کیا کیونکہ اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے پھر اس کی بارگاہ میں عجز و نیاز ہے پھر ہمارے لئے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا ہے پھر ہمارے قول آمین کے ساتھ ان کے لئے بددعا ہے۔

## چوتھا باب

# اس میں سورۂ فاتحہ کے معانی، قراءت، اعراب اور حمد کرنیوالوں کی فضیلت ہے

اس باب میں چھتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)۔ ابو محمد عبدالغنی بن سعید الحافظ نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیہا باب الجہر بآمین، صفحہ 62، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً، صفحہ 61، جلد 1

بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے سچ کہا، بے شک حمد میرے لئے ہے (1)۔ مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو لقمہ کھائے تو اس پر اللہ کی حمد کرے، کوئی مشروب پیے تو اس پر اس کی حمد کرے (2)۔ حضرت حسن نے فرمایا: کوئی نعمت نہیں ہے مگر اس پر اللہ کی حمد ہو تو وہ اس نعمت سے افضل ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر کوئی نعمت فرمائی پھر اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس موجود نعمت سے افضل نعمت اسے عطا فرمائی (3)۔ ''نوادر الاصول'' میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ دنیا تمام کی تمام میرے امتی کے ایک ہاتھ میں ہو پھر وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ان تمام نعمتوں سے افضل ہوگی۔ ابو عبداللہ نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اسے دنیا عطا فرمائی پھر اس کے بعد یہ حمد کا کلمہ عطا فرمایا حتیٰ کہ اس نے یہ کلمہ بولا تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل تھا کیونکہ دنیا فانی ہے اور یہ کلمہ باقی ہے، یہ باقیات صالحات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ۝ (الکہف) بعض روایات میں ہے جو اس نے دیا وہ اس سے زیادہ ہے جو اس نے لیا۔ پس یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا وہ اللہ تعالیٰ سے لینے والا ہے، پس یہ تدبیر میں ہے۔ اسی طرح کلام میں جاری ہوگا کہ یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا اللہ کی طرف سے ہے اور اصل میں دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، دنیا بھی اس کی طرف سے ہے اور اَلْحَمْدُ کا کلمہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، دنیا اس نے بندے کو عطا فرمائی اور اسے غنی کر دیا پھر اسے کلمہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) عطا فرمایا اور آخرت میں اس کے ساتھ اسے شرف عطا فرمائے گا۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بیان کیا کہ ایک بندے نے کہا: یا رب لك الحمد کما ینبغی لجلال و جهك و عظیم سلطانك۔ فرشتوں کے لئے اس کا لکھنا مشکل ہوگیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اسے کیسے لکھیں۔ پس وہ دونوں آسمان کی طرف بلند ہوئے اور عرض کی: یا رب! تیرے بندے نے ایسی کلام کی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اسے کیسے لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، حالانکہ وہ زیادہ جانتا ہے جو اس کے بندے نے کہا تھا۔ میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتوں نے کہا: یا رب! اس نے کہا: یا رب لك الحمد کما ینبغی لجلال و جهك و عظیم سلطانك۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اسی طرح لکھ دو جس طرح میرے بندے نے کہا حتیٰ کہ وہ مجھ سے آکر ملے گا تو میں خود اسے اس کی جزا دوں گا (4)۔

اہل لغت نے کہا: اعضل الامر، جب معاملہ سخت ہو جائے اور بند ہو جائے۔ المعضلات سختیوں کو کہتے ہیں۔ عضلت المرأة والشاة کہا جاتا ہے جب بچہ جنم دے اور اس کا مخرج تنگ ہو یہ ضاد کی شد کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر فرمایا: اعضلت الملکین یا عضلت الملکین، یعنی اس امر نے فرشتوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ واللہ اعلم

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل لا الہ الا اللہ، صفحہ 277، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل والشرب، صفحہ 352، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل الحامدین، صفحہ 278، جلد 1 (وزارت تعلیم) 4۔ ایضاً

مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طہارت ایمان کا نصف ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اسے بھر دیتے ہیں(1)۔ آگے حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 2**: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ بندے کا قول اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ افضل ہے یا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ افضل ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ افضل ہے کیونکہ اس کے ضمن میں توحید لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی موجود ہے اور بندے کے اس قول میں توحید اور حمد ہے اور لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں صرف توحید ہے۔ اس کی بنیاد پر مخلوق سے جنگ کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال (جنگ) کروں حتیٰ کہ وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیں(2)۔ اس قول کو ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اس پر قول فیصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: افضل ذکر وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔(3)

**مسئلہ نمبر 3**: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساری نعمتوں پر محمود ہے اور اس کے انعاموں میں سے ایک ایمان بھی ہے میں یہ دلیل ہے کہ ایمان اس کا فعل اور اس کی تخلیق ہے اس پر دلیل رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس کا ارشاد ہے۔ العالمون تمام مخلوق کو کہتے ہیں اور اس مخلوق میں سے ایمان بھی ہے۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح قدریہ کہتے ہیں کہ ایمان ان کی تخلیق ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 4**: عرب کلام میں اَلْحَمْدُ کا معنی ثنا کامل ہے۔ الف اور لام محامد کی جنس کے استغراق کے لئے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی ہر حمد کا مستحق ہے کیونکہ اس کے اسماء خوبصورت ہیں اور صفات بلند ہیں۔ شاعر کے قول میں اَلْحَمْدُ کے لفظ کی جمع، جمع قلت کے وزن پر بنائی گئی ہے۔

و ابلج محمود الثناء خصصتہ بأفضل اقوالی و أفضل احمدی

اس کی محمود تعریف روشن ہے۔ میں نے اسے اپنے افضل اقوال اور افضل حمد کے ساتھ خاص کیا ہے۔

حمد، مذمت کی نقیض ہے۔ تو کہتا ہے: حمدت الرجل احمدہ حمداً فھو حمیدٌ و محمود۔ التحمید، حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد، شکر سے اعم ہے۔ المحمد اس ذات کو کہتے ہیں جس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

شاعر نے کہا:

الی الماجد القرم الجواد المحمد

اس مصرعہ میں شاعر نے المحمد اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ والزکوٰۃ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ موطا امام مالک، کتاب القرآن باب ماجاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ نام رکھا گیا ہے۔

شاعر نے کہا:

فشق له من اسمه ليجله	فذو العرش محمود و هذا محمد

اس نے اپنے نام سے اس کا نام مشتق کیا تا کہ اسے عظمت دے، وہ صاحب عرش محمود ہے یہ محمد ہے۔

المحمدۃ، یہ المذمۃ کے خلاف ہے۔ احمد الرجل، اس کا مطلب ہے اس کا امر حمد کا باعث ہوا۔ احمدتہ کا مطلب ہے: میں نے اسے محمود پایا۔ تو کہتا ہے: میں فلاں جگہ آیا اور میں نے اسے محمود اور موافق پایا۔ یہ اس وقت کہے گا جب تو اس میں رہائش یا اس کی چراگاہ پر راضی ہو۔ رجل حُمَدَۃ، ہمزہ کی مثل اس شخص کو کہتے ہیں جو اشیاء کی حمد زیادہ کرتا ہو اور ان چیزوں کی صفات بیان کرنے میں مبالغہ کرتا ہو۔ حمدۃ النار۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** ابو جعفر طبری اور ابو العباس مبرد کا خیال ہے کہ حمد اور شکر ایک معنی میں ہے اور یہ پسندیدہ نہیں ہے (1)۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی نے اپنی کتاب ''الحقائق'' میں امام جعفر صادق اور ابن عطا سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن عطا نے کہا: اس کا معنی اللہ کا شکر ہے کیونکہ اس کی ہمیں تعلیم بھی اس کا احسان ہے حتیٰ کہ ہم نے اس کی تعریف کی۔ طبری نے ان کے ہم معنی ہونے پر تیرے اس قول کی صحت سے استدلال کیا ہے الحمد للہ شکراً۔ (2) ابن عطیہ نے کہا کہ یہ حقیقت میں دلیل ہے ان کے مسلک کے خلاف پر کیونکہ تیرے قول شکراً، تو اس کو حمد کے ساتھ خاص کیا کیونکہ یہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: شکر، حمد سے زیادہ عام ہے کیونکہ شکر، زبان، جوارح اور دل سے ہوتا ہے اور حمد صرف زبان سے ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: حمد اعم ہے کیونکہ اس میں شکر اور مدح کا معنی ہے اور یہ شکر سے اعم ہے کیونکہ حمد شکر کی جگہ رکھی جاتی ہے اور شکر کو حمد کی جگہ نہیں رکھا جاتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہر شکر گزار کا کلمہ ہے۔ آدم علیہ السلام کو جب چھینک آئی تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اور اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو فرمایا: فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (المومنون) (تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جور و ستم) سے) اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراہیم: 39)

داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے کہا: وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (النمل) (اور انہوں نے کہا: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا (الاسراء: 111) (اور آپ فرمایئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا)۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

اہل جنت نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: 34) (کہیں گے سب ستائشیں الله کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)) وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (یونس: 10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں الله کے لئے ہیں) میں کہتا ہوں: حمد، ممدوح کی اس کی صفات کی وجہ سے کسی سابقہ احسان کے بغیر تعریف کرنا ہے اور شکر، مشکور کی احسان کی وجہ سے تعریف کرتا ہے۔ اس تعریف کی بنا پر ہمارے علماء نے فرمایا: اَلْحَمْدُ شکر سے اعم ہے کیونکہ حمد ثنا، تحمید اور شکر پر واقع ہوتی ہے اور جزا مخصوص ہے کہ یہ اس کا بدل ہوتی ہے جو تیرے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ پس اَلْحَمْدُ اس آیت میں اعم ہے کیونکہ یہ شکر پر زائد ہے اور یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ حمد بمعنی رضا بھی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بلوته فحمدته یعنی میں خوش ہوا۔ اس سے یہ ارشاد بھی ہے: مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (الاسراء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احمد الیکم غسل الاحلیل میں تمہارے لئے شرمگاہ کا دھونا پسند کرتا ہوں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی تفسیر میں مروی ہے۔ جس نے اس کی صفات کی وجہ سے اس کی حمد کی جس طرح اس نے خود اپنی توصیف کی ہے اس نے حمد کی، کیونکہ حمد حا، میم اور دال سے مرکب ہے، حا، وحدانیت سے ہے، میم، الملک سے ہے اور دال دیمومیت (ہمیشگی) سے ہے جس نے وحدانیت، دیمومیت اور الملک کو پہچان لیا اس نے الله تعالیٰ کی حمد کو پہچان لیا۔ یہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی حقیقت ہے۔ شقیق بن ابراہیم نے اَلْحَمْدُ کی تفسیر میں فرمایا: یہ تین وجوہ پر منحصر ہے: (۱) جب الله تعالیٰ تجھے کوئی چیز عطا فرمائے تو تو جان لے جس نے تجھے یہ چیز عطا کی۔ (۲) جو اس نے تجھے عطا فرمایا تو اس پر خوش ہو، (۳) جب تک تیرے جسم میں قوت ہے تو اس کی نافرمانی نہ کر۔ یہ حمد کی شرائط ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** الله سبحانہ نے اپنی حمد خود فرمائی اور اپنی کتاب کا آغاز اپنی حمد سے کیا اور دوسروں کو اپنی خود تعریف کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی تعریف کرنے سے اپنی کتاب اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے منع فرمایا۔ فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (النجم) (پس اپنی خودستائی نہ کیا کرو وہ خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مدح کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی ڈالو (1)۔ اس حدیث کو حضرت مقداد نے روایت کیا اس کے متعلق سورۃ النساء میں ان شاء الله وضاحت آئے گی۔

پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اپنی حمد کی ہے اس سے پہلے کہ عالمین میں سے کوئی میری حمد کرتا اور میں نے اپنی خود حمد ازل میں بغیر کسی علت کے کی تھی اور مخلوق جو میری حمد کرتی ہے وہ علل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مخلوق جس کو کمال کلی عطا نہیں کیا گیا اس کا اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں تاکہ وہ اپنے لئے منافع حاصل کرے اور اپنے آپ سے نقصان دور کرے۔

بعض علماء نے فرمایا: جب الله تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس کے بندے اس کی حمد سے عاجز ہیں تو اس نے اپنی حمد ازل میں خود ہی کی۔ پس اس کے بندوں نے انتہائی کوشش کی اس کی حمد سے عاجزی کا اظہار ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ سید

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب عن المدح اذا کان فیه افراط، صفحہ 414، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے عجز کا اظہار فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لا اُحصی ثناء علیك۔(1) (میں تیری ثناء نہیں کر سکتا)۔
اور یہ شعر پڑھو:

اذا نحن اثنینا علیك بصالح　　فانت کما نثنی وفوق الذی نثنی

اور جب ہم کسی کرم کی وجہ سے تیری ثنا کرتے ہیں تو تو واقعی اسی طرح ہے جس طرح ہم تیری تعریف کرتے ہیں اور تو اس سے بلند مرتبہ ہے جو ہم تیری تعریف کرتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: اس نے ازل میں اپنی حمد خود فرمائی جب اس نے اپنے بندوں پر نعمتوں کی کثرت کو دیکھا اور ان کے شکر کے قیام کے عجز کو دیکھا تو اس نے اپنی تعریف کی اور ان کی طرف سے اپنی تعریف خود کی تاکہ ان کے سامنے نعمت مزید خوشگوار ہو جائے اس حیثیت سے کہ اس نے لوگوں سے احسان کا بوجھ بھی ساقط کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 7**: ساتوں قراء اور جمہور لوگوں کا الحمد کی دال پر رفع پڑھنے میں اجماع ہے۔ سفیان بن عیینہ، رؤبہ بن عجاج سے الحمد میں دال کا نصب مروی ہے اور یہ فعل کے اظہار کی تقدیر پر ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رفع کے ساتھ مبتدا اور خبر میں اور خبر کی تبیل فائدہ دینا ہوتا ہے۔ اس میں کیا فائدہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ سیبویہ نے کہا: جب کوئی شخص اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رفع کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس میں اسی قسم کا معنی ہوتا ہے جو تیرے اس قول میں ہے: حمدت اللہ حمدا مگر وہ جو اَلْحَمْدُ کو رفع دے رہا ہے وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ اس کی طرف سے حمد اور تمام مخلوق کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے اور وہ جو اَلْحَمْدُ کو نصب دیتا ہے وہ خبر دیتا ہے کہ تنہا اس کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے۔ سیبویہ کے علاوہ علماء نے فرمایا: وہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے عفو، مغفرت، اس کی تعظیم اور اس کی بزرگی بیان کرنے کے لئے کرتا ہے اور خبر کے معنی کے خلاف ہے، اس میں سوال کا معنی ہے۔ حدیث میں ہے "جس کو میرے ذکر نے مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اس سے افضل دوں گا جو میں سوال کرنے والوں کو دوں گا" (3)۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا اپنی حمد و ثناء کرنا بندوں کو یہ سکھانے کے لئے ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ تم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ طبری نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تعریف ہے اس کے ساتھ اس نے اپنی ہی تعریف کی اور اس کے ضمن میں اپنے بندوں کو حکم فرمایا کہ تم بھی اس کی تعریف کرو۔ گویا یوں فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ اسی طرح ہوگا کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہو۔ عرب اس طرح حذف کرتے ہیں کہ ظاہر کلام اس حذف پر دلالت کرتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

و اعلم اننی ساکون رمسا　　اذا سار النواعج لا یسیر
فقال السائلون لمن حفرتم　　فقال القائلون لهم وزیر

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، صفحہ 192، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء کیف کانت قرأۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 116، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں جانتا ہوں کہ ہو جاؤں گا جب تیز رفتار اونٹنیاں نہیں چلیں گی۔ سوال کرنے والوں نے کہا کس کے لئے قبر کھود رہے ہو جواب دینے والوں نے کہا ان کا وزیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے قبر کھودی جا رہی ہے وہ وزیر ہے۔ پس اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ ظاہر کلام اس پر دلالت کر رہا تھا اور یہ عرب کلام میں کثیر ہے (1) ابن ابی عبلہ سے الحمد للہ دال اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا مروی ہے اس بنا پر کہ دوسرا حرف اعراب میں پہلے حرف کے تابع کر دیا گیا ہو۔ یا کالفظ متجانس ہو جائے اور لفظوں میں تجانس کا طلب کرنا عربوں کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً أجوٗك، وهو منحدرٌ من الجبل (☆)۔ اس میں دال اور جیم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ شاعر کا قول ہے: اضرب الساَمین امك هابل۔ اس مصرعہ میں ہمزہ کے ضمہ کی وجہ سے نون ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اہل مکہ کی قراءت میں مُرُدفین راء پر ضمہ پڑھا گیا ہے میم کی اتباع کرتے ہوئے۔ اسی طرح مُقُتلین میں میم کی اتباع میں قاف پر ضمہ پڑھا گیا ہے۔ اس طرح عرب کہتے ہیں: لِاِمك یعنی لام کی اتباع میں ہمزہ کو کسرہ دیتے ہیں۔ نعمان بن بشیر کے لئے یہ کہا:

ویل امها فی هواءِ الجو طالبة ولا کهذا الذی فی الارض مطلوب

اس شعر میں ہمزہ کو کسرہ دیا ہے۔

اصل میں ویل، لامها تھا پہلے لام کو حذف کیا گیا اب کسرہ کے بعد ہمزہ پر ضمہ بھاری تھا پھر اس ہمزہ کو لام کی طرف منتقل کر دیا پھر لام کو میم کی طرح حرکت دی گئی۔ حسن بن ابی الحسن اور زید بن علی سے مروی ہے، اَلْحَمْدِ لِلّٰهِ۔ یعنی دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے پہلے حرف کو حرکت میں دوسرے حرف کی اتباع کرائی گئی (2)۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا مالک ہے، ہر چیز جس کا وہ مالک ہے وہ اس کا رب ہے۔ پس الرب کا مطلب المالك ہے اور ''الصحاح'' میں الرب، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اس لئے بغیر نسبت و اضافت کے کسی دوسرے کے لئے نہیں بولا جائے گا، لوگ زمانہ جاہلیت میں مالک کے لئے رب کا لفظ بولتے تھے۔ حارث بن حلزہ نے کہا:

و هو الرب والشهيد على يوم الحيارين والبلاء بلاء

اس میں رب، مالک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

رب کا معنی سردار بھی ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے: اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف: 42) (یعنی اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا) اور حدیث میں ہے ان تلد الامة ربتها۔ (3) یعنی لونڈی اپنے سردار کو جنم دے گی۔ اور ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور الرب سے مراد مصلح، مدبر، جابر اور قائم

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 67-66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 133، جلد 1
3۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب ام الولد، صفحہ 344، جلد 1 (وزارت تعلیم)
☆ مثال غیر واضح ہے۔

(نگران) بھی ہوتا ہے۔ الہروی وغیرہ نے کہا: جو شخص کسی شے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے مکمل کرتا ہے اس کے لئے بولا جاتا ہے: ربۃ یربہ فھو ربٌّ لہ و رابٌّ۔ اسی وجہ سے علماء کو ربانیون کہا جاتا ہے جو کتب کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے ھل لك من نعمۃ تربھا علیہ (1) یعنی کیا تیرے پاس کوئی نعمت ہے جس کی تو دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے اور الرب بمعنی معبود بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

اربٌّ یبول الثعلبان براسہ لقد ذل من بالت علیہ الثعالب (2)

اور یہ لفظ زیادتی اور کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ رباہ و ربیہ و ربتہ (یعنی اس سے اسے زیادہ کر دیا) یہ معنی نحاس نے بیان کیا ہے۔ ''الصحاح'' میں ہے: ربّ فلان ولدہ یربہ ربًّا، و ربیہ و تربّبہٗ کا معنی ہے ربّاہ اور المربوب کا مطلب ہے المربی۔ جس میں کثرت کی گئی ہو۔

**مسئلہ نمبر 9:** بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم (رب) اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے کیونکہ اسے پکارنے والے کثرت سے پکارتے ہیں اور قرآن حکیم میں غور کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران، سورۂ ابراہیم وغیرہ میں ہے۔ یہ وصف رب اور مربوب کے درمیان تعلق کا شعور دیتا ہے ساتھ ساتھ اپنے ضمن میں ہر حال میں مہربانی، رحمت اور مخلوق کے اس کی طرف محتاج ہونے کا تصور بھی رکھتا ہے۔

اس کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: یہ التربیۃ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کا مدبر اور مربی ہے۔ اسی مفہوم میں ہے: وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِكُمۡ (النساء: 23) (تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں) بیوی کی بیٹی کو ربیبۃ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا خاوند اس کی تربیت کرتا ہے۔ پس اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مدبر اور مربی ہے تو یہ فعل کی صفت ہوگی اور اس بنا پر کہ الرب بمعنی مالک اور سردار ہے تو یہ ذات کی صفت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10:** جب رب پر الف لام داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص ہوتا ہے کیونکہ الف لام عہد کے لئے ہو گا۔ اور اگر ہم الف لام حذف کر دیں تو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مشترک ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اللہ رب العباد، (اللہ بندوں کا رب ہے) زید رب الدار (زید گھر کا مالک ہے) اللہ تعالیٰ رب الارباب ہے، وہ مالک و مملوک کا مالک ہے وہ ہر ایک کا خالق و رازق ہے۔ اس کے علاوہ ہر رب، غیر خالق اور غیر رازق ہے ہر مملوک، مالک بنایا گیا ہے اس کے بعد کہ وہ مالک نہ تھا اور اس سے ملکیت چھینی بھی جائے گی، مخلوق میں سے مالک کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ان معانی کے مخالف ہے اور خالق و مخلوق کی صفت کے درمیان یہی فرق ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** اَلۡعٰلَمِیۡنَ، اہل تاویل کا اَلۡعٰلَمِیۡنَ کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: العالمون، جمع ہے عالم کی اور عالم سے مراد اللہ کے سوا ہر موجود ہے اور لفظاً اس کا واحد نہیں ہے جیسے رھط اور قوم کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر زمانہ کے لوگ عالم ہیں۔ یہ حسین بن فضل کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ باب فی الحب فی اللہ، صفحہ 317، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 67، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

الْعٰلَمِیْنَ ﴿﴾ (الشعراء) اس آیت میں الْعٰلَمِیْنَ سے مراد لوگ ہیں۔ حجاج نے کہا:

فخندف هامة هذا العالم

جریر بن خطفی نے کہا:

تنصفهٔ البرية و هو سامر و يضحى العالمون له عيالا

اس شعر میں العالمون لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عالمون سے مراد جن و انس ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ﴿﴾ (الفرقان) (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس کو ڈرانے والے تھے نہ کہ چوپاؤں کو)۔ فراء اور ابوعبیدہ نے کہا: العالم سے مراد ہر ذی عقل ہے اور یہ چار امم ہیں: انسان، جن، ملائکہ اور شیاطین۔ بہائم، چوپاؤں کو عالم میں نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ جمع ذی عقل کی جمع ہوتی ہے۔

اعشی نے کہا:

ما ان سمعت بمثلهم فی العالمینا میں نے ذی عقل لوگوں میں ان کی مثل نہیں سنا۔

زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد وہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قول ابوعمرو بن علاء کا ہے کہ وہ روحانیون ہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا معنی بھی یہی ہے، ہر ذی روح جو زمین کی سطح پر چلا۔ وہب بن منبہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ دنیا، مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔ مقاتل نے کہا: عالمون، اسی ہزار عالم ہے، چالیس ہزار عالم خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار عالم سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جن ایک عالم ہے، انسان ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں پندرہ ہزار عالم ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لئے تخلیق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ عالم ہر مخلوق و موجود کو شامل ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا (الشعراء)

اور یہ علم اور علامۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ اپنے موجد پر دلالت کرتا ہے اسی طرح زجاج نے کہا: عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں پیدا فرمایا۔ خلیل نے کہا: العلم، العلامة اور المعلم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر دلالت کرے۔ عالم چونکہ دال ہے اپنے خالق و مدبر پر اور یہ واضح ہے۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید کے سامنے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو حضرت جنید نے اسے کہا: اسے مکمل کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم کہو: رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس شخص نے پوچھا: العالمین کون ہیں حتیٰ کہ تم اللہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہو؟ حضرت جنید نے فرمایا: اے بھائی! تم کہو کیونکہ حادث کا جب قدیم کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے تو حادث کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

**مسئلہ نمبر 12**: رب میں رفع اور نصب جائز ہے۔ نصب، مدح کی بنا پر اور رفع قطع (1) کی بنا پر۔ یعنی عبارت یوں ہوگی: ھو رب العالمین۔

**مسئلہ نمبر 13**: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞ - رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے اپنی صفت بیان کرنے کے بعد اپنی تعریف ان کلمات سے فرمائی کہ وہ بہت مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے، چونکہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت سے متصف ہونے میں ترہیب تھی اس لئے ساتھ ہی الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ذکر فرما دیا کیوں کہ اس میں ترغیب تھی تا کہ اس کا خوف اور اس کی طرف رغبت دونوں کو اپنی صفات میں جمع کرلے، پس یہ اس کی طاعت اور نافرمانی سے اجتناب میں مددگار ثابت ہوں گی جیسا کہ ارشاد فرمایا: نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۟ۙ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۟ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں (اور یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے)۔

اور فرمایا: غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوْلِ (غافر: 3) (گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر مومن وہ سزا جان لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی جنت کا طمع بھی نہ کرے اور اگر کافر اللہ کی رحمت جان لے تو کوئی جنت سے مایوس نہ ہو'' (2)۔

الرَّحْمٰنِ اور الرَّحِیْمِ دونوں اسموں کے معانی گزر چکے ہیں پس دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 14**: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۞ ۔ محمد بن سمیفع نے مالک کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں چار لغات ہیں: ۱۔ مالك، ۲۔ ملِك، ۳۔ مَلْك ... مَلِكَ سے مخففہ ...... ۴۔ ملیك۔

شاعر نے کہا:

وایام لنا غرّ طوال عصینا الملك فیھا ان ندینا

ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ان میں ہم نے بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔

اور ایک شاعر نے کہا:

فاقنع بما قسم الملیك فانما قسم الخلائق بیننا علامھا

میں اس پر قناعت کرتا ہوں جو مالک نے تقسیم فرمایا اور طباع کو ان کے جاننے والے نے ہمارے درمیان تقسیم فرمایا۔

اس شعر میں الخلائق سے مراد وہ فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا جاتا ہے، نافع سے ملك میں کسرہ کا اشباع مروی ہے۔ اس شخص کی لغت پر جو حرکات میں اشباع کرتا ہے مَلِكِیْ پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی عربوں کی ایک لغت ہے، جس کو مہدوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

---

1۔ صفت کو موصوف سے جدا کر دیا جائے تو پھر اس سے پہلے مبتدا محذوف ہوتا ہے۔

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعة رحمة الله تعالیٰ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر 15:** علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مَلِك زیادہ بلیغ ہے یا مالك۔ دونوں قراءتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ امام ترمذی نے ان کو ذکر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مَلِك، یہ مالك سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ ہر ملک مالک ہوتا ہے اور ہر مالک، ملک نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مَلِك کا امر، ہر مالک میں اس کی مِلك میں نافذ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ مالک، ملک کی تدبیر سے ہی تصرف کرتا ہے۔ ابوعبیدہ اور مبرد نے یہ کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مالك زیادہ بلیغ ہے کیونکہ وہ انسانوں اور دوسری چیزوں کا مالک ہوتا ہے۔ پس مالك از روئے تصرف کے زیادہ بلیغ اور عظیم ہے کیونکہ شرع کے قوانین کا اجراء اس کی طرف سے ہوتا ہے پھر مالک کے پاس تملک میں زیادتی ہوتی ہے۔

ابوعلی نے کہا: ابوبکر بن سراج نے ان لوگوں سے حکایت کیا ہے جنہوں نے ملک کی قراءت کو پسند کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے ساتھ اپنی توصیف فرمائی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس لئے مالک کی قراءت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو تکرار ہو جائے گا۔

ابوعلی نے کہا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ قرآن حکیم میں اس انداز میں بہت سی اشیاء آئی ہیں عام مقدم ہوتا ہے پھر خاص کا ذکر ہوتا ہے جیسے هو الله الخالق البارئ المصور۔ خالق عام ہے۔ پھر المصور کا ذکر فرمایا کیونکہ اس میں صنعت اور حکمت کے وجود پر تنبیہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (البقرہ) یہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (البقرہ:3) کے بعد ذکر فرمایا، جبکہ غیب کا کلمہ آخرت اور دوسری غائب چیزوں کو شامل تھا لیکن آخرت کی عظمت اور اس کے اعتقاد کے وجوب پر تنبیہ اور منکرین کفار کا رد کرنے کے لئے پھر ذکر فرمایا۔ اسی طرح فرمایا: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔ پہلے الرَّحْمٰنِ ذکر فرمایا جو عام ہے اس کے بعد الرَّحِيْمِ ذکر فرمایا کیونکہ و کان بالمومنین رحیما کے ارشاد میں مومنین کے ساتھ اس کی رحمت تخصیص ہے (1)۔

ابوحاتم نے کہا: مالك۔ خالق کی مدح میں ملك سے زیادہ بلیغ ہے اور ملك مخلوق کی مدح میں مالک سے زیادہ بلیغ ہے۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ مخلوق میں سے مالک کبھی مَلِك نہیں ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ مالک ہوگا تو ملک بھی ہوگا۔ یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی نے پسند کیا ہے اور انہوں نے اس کی تین وجوہ ذکر فرمائی ہیں:

۱- تو مالک کو خاص اور عام کی طرف مضاف کرتا ہے اور تو کہتا ہے: مالك الدار والارض والثوب (گھر کا مالک، زمین کا مالک، کپڑے کا مالک) جس طرح تو کہتا ہے: مالك الملوك (بادشاہوں کا مالک)۔

۲- مالک کا اطلاق زیادہ اور تھوڑی ملکیت والے پر ہوتا ہے۔ جب تو ان دونوں قولوں میں غور و فکر کرے گا تو دونوں کو ایک پائے گا۔

۳- تو کہتا ہے: مالك المُلك، جبکہ تو مِلك المُلك نہیں کہتا۔

ابن حصار نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ مالك سے مراد ملک پر دلالت ہے اور یہ مُلك کو متضمن نہیں ہے اور مَلِك دونوں

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 70، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

امروں کو شامل ہے پس مبالغہ کی وجہ سے اولیٰ ہے۔ اور یہ کمال کو بھی متضمن ہے اسی وجہ سے وہ دوسرے تمام بادشاہوں پر ملک کا مستحق ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ نہیں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں) اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الامامة فی قریش (1)۔ اور قریش، عرب قبائل میں سے افضل ہیں اور عرب، عجم سے افضل و اشرف ہیں۔ اقتدار اور اختیار کو متضمن ہیں۔ یہ الملك میں ضروری امر ہے اگر وہ قادر، مختار نہ ہو اور اس کا حکم اور امر نافذ نہ ہو تو دشمن اس پر جبر کرے گا اور غیر اس پر غالب آجائے گا اور اس کی رعیت ذلیل و رسوا ہو جائے گی اور یہ سخت پکڑ، امر، نہی، وعدہ، وعید کو بھی متضمن ہے۔

آپ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا: مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا (النمل) اس کے علاوہ بھی امور عجیبہ عمدہ معانی ملك میں پائے جاتے ہیں جو مالك میں نہیں پائے جاتے۔ میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حجت پکڑی ہے کہ ملك زیادہ بلیغ ہے کیونکہ مالك میں ایک حرف زائد ہے اور اس کے قاری (پڑھنے والے) کے لئے دس نیکیاں زیادہ ہوں، جبکہ ملك کے پڑھنے والے کے لئے دس نیکیاں کم ہوں گی۔ میں کہتا ہوں: یہ صیغہ کے اعتبار سے ہے نہ کہ معنی کے اعتبار سے ہے۔ ملك کے ساتھ قرأت ثابت ہے، اور ملك میں جو معنی پایا جاتا ہے وہ مالك میں نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 16:** کسی کا یہ نام نہیں رکھا جائے گا اور اس کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے ''حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضہ میں لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا: میں الملك ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں گئے'' (2) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین نام اس شخص کا ہے جسے مالك الاملاك کہا جائے (3)۔ مسلم میں یہ زائد ہے۔ ''اللہ کے سوا کوئی مالک نہ ہوگا'' (4)۔ سفیان نے کہا: ملك الاملاك شاهان شاہ کی مثل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں نے ابو عمرو شیبانی سے اخنع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس کا معنی اوضع (گھٹیا) ہے۔ ان سے ہی مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کی بارگاہ میں باعث ناراضگی اور بدترین شخص وہ ہوگا جسے ملك الاملاك کہا جاتا ہوگا، اللہ کے سوا کوئی ملک نہیں ہے (5)۔ ابن حصار نے کہا اسی طرح مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور مالك الملك ہے اس میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہئے کہ تمام مخلوق پر یہ نام

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث نمبر 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب صفة القیامة والجنة والنار، صفحہ 370، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، صفحہ 916، جلد 2 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب أبغض الاسماء الى الله تبارك و تعالى، حدیث 5737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ صحیح مسلم، کتاب الاداب، باب استحباب تغییر الاسم القبیح، صفحہ 208، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 5۔ ایضاً

رکھنا حرام کیا گیا ہے جس طرح ملك الاملاك حرام کیا گیا ہے، اور رہا مالك اور ملك بطور وصف ذکر کرنا۔

**مسئلہ نمبر 17**: ان کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز ہوگا جو ان دونوں مفہوموں کے ساتھ متصف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ناس من امتی عرض علی غزاۃ فی سبیل اللہ یرکبون ثبج ھذا البحر ملوکا علی الاسرۃ او مثل الملوك علی الاسرۃ (1) یعنی میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کئے گئے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے تھے وہ اس سمندر کے وسط پر سوار تھے (جیسے) تختوں پر بادشاہ ہوتے ہیں یا فرمایا بادشاہوں کی مثل تختوں پر سوار تھے۔

**مسئلہ نمبر 18**: اگر کوئی یہ کہے کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ کیسے فرمایا جبکہ يَوْمِ الدِّيْنِ ابھی آیا ہی نہیں اور اپنی ایسی چیز کی ملکیت سے صفت بیان کرنا کیسے صحیح ہے جس کو اس نے ابھی پایا ہی نہیں؟ اسے کہا جائے گا کہ مالك اسم فاعل کا صیغہ ہے ملك یملك سے۔ اور اسم فاعل عرب کلام میں اپنے مابعد کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور وہ فعل مستقبل کے معنی میں ہوتا ہے اور عربوں کے نزدیک یہ کلام معقول، پختہ اور صحیح ہوتی ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: ھذا ضارب زید غدا یعنی وہ کل زید کو مارے گا اور اسی طرح ھذا حاج بیت اللہ فی العام المقبل، اس کا مطلب ہے آئندہ سال وہ حج کرے گا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فعل اس کی طرح منسوب کیا گیا ہے حالانکہ اس نے ابھی وہ فعل کیا نہیں اور اس سے مراد استقبال لیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ استقبال کی تاویل پر ہے یعنی وہ مالک ہوگا روز جزا کا یا وہ روز جزا کا مالک ہوگا جب وہ دن آئے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مالك کی تاویل قدرت کی طرف لوٹنے والی ہوگی یعنی وہ روز جزا میں قادر ہوگا، یا یہ معنی کہ وہ روز جزا پر قادر ہوگا اور اسے پیدا کرنے پر قادر ہے کیونکہ کسی شے کا مالک اسی شے میں تصرف کرنے والا اور اس پر قادر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا مالک ہے اور اپنے ارادہ کے مطابق انہیں پھیرنے والا ہے اس پر اسے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ پہلی وجہ عربی زبان کے اصول سے زیادہ مس کرنے والی ہے اور اس کے ضابطہ کے مطابق زیادہ جاری ہونے والی ہے۔ یہ ابو القاسم الزجاجی کا قول ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ یہاں يَوْمِ الدِّيْنِ کی ملکیت کی تخصیص کیوں کی گئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور دوسری چیزوں کا بھی مالک ہوگا۔ جواباً کہا جائے گا کہ لوگ دنیا میں ملك میں جھگڑا کرنے والے تھے جیسے فرعون، نمرود وغیرہما، لیکن اس دن اس کی ملک میں کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہ ہوگا تمام لوگ سر جھکائے ہوئے ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (غافر: 16) آج بادشاہی کس کے لئے ہے، ساری مخلوق جواب دے گی: للہ الواحد القھار اللہ واحد قہار کی ہے۔ اسی لئے فرمایا: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی اس دن میں نہ کوئی مالک ہوگا، نہ قاضی ہوگا، نہ کوئی جزا دینے والا ہوگا سوائے اللہ تعالیٰ کے، پاک ہے وہ ذات کوئی معبود برحق نہیں سوائے اس کے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر19**: اگر اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی جائے کہ وہ ملک ہے تو یہ اس کی ذات کی صفات سے ہوگی۔ اگر مالک کے ساتھ صفت بیان کی جائے تو یہ اس کے فعل کی صفات سے ہوگی۔

**مسئلہ نمبر20**: الیوم سے مراد طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک وقت ہے پھر یہ عاریۃً یا مجازاً قیامت کے آغاز سے لے کر جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے تک اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کے لئے بولا جاتا ہے کبھی الیوم پورے دن کی ایک گھڑی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (المائدہ:3) یوم کی جمع ایام ہے۔ اصل میں ایوام تھا پھر ادغام کیا گیا بعض اوقات، شدت کو الیوم سے تعبیر کرنے میں کہا جاتا ہے۔ یوم ایوم، جس طرح کہا جاتا ہے: لیلۃ لیلاء۔ راجز نے کہا:

نعم اخو الھیجاء فی الیوم الیمی۔

ہیجا کا بھائی شدت میں کتنا اچھا تھا۔

اس مصرعہ میں الیمی میں قلب کیا گیا ہے۔ واؤ کو مؤخر کیا گیا ہے اور میم کو مقدم کیا گیا ہے۔ پھر واؤ کو یاء سے قلب کیا گیا ہے کیونکہ وہ طرف کلمہ میں ہے جیسا کہ عرب دلو کی جمع میں ادل کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر21**: الدین۔ اس کا مطلب اعمال پر جزا اور اعمال کا حساب ہے۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، ابن جریج اور قتادہ وغیرہم نے اسی طرح فرمایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ مروی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ (النور:25) اس آیت میں دین سے مراد حساب ہے۔ فرمایا: اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (غافر:17) اور فرمایا اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ (الجاثیہ:28) اور فرمایا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ (صافات) یعنی ہم جزا دیئے جائیں گے اور ہمارا محاسبہ کیا جائے گا۔ لبید نے کہا:

حصادك یوماً ما زرعت و انما یدان الفتی یوماً کما ھودائنٌ

تو اس دن وہی کاٹے گا جو تو نے بویا، نوجوان کو جزا دی جائے گی جو وہ کرنے والا ہوگا۔

ایک اور نے کہا:

اذا ما رمونا رمیناھم و دنا ھم مثل ما یقرضونا

جب انہوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے ان پر تیر پھینکے اور ہم نے انہیں جزا دی جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔

ایک اور نے کہا:

واعلم یقینا ان ملكك زائلٌ واعلم بان کماتدین تدان

جان لو کہ تمہاری حکومت ختم ہونے والی ہے اور جان لو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

اہل لغت نے بیان کیا ہے: دِنْتہٗ بفعلہ دِیْنًا (مصدر) دال کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: میں نے اسے جزا دی، اسی سے ہے: الدیان۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یعنی جزا دینے والا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: الکیس من

دان نفسه (1) (عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے) بعض نے فرمایا: الدین سے مراد فیصلہ ہے۔ یہ بھی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسی معنی میں طرفہ کا قول ہے۔

لعمرك ما كانت حمولة معبد على جدها حربًا لدينك من مضر

تیری عمر کی قسم معبد کے اونٹ کنویں پر تیرے فیصلہ کی وجہ سے مضر قبیلہ سے جنگ کرنے کے لئے نہیں تھے۔

دین کے یہ تینوں معانی قریب قریب ہیں۔ الدین کا معنی طاعت بھی ہے۔ اس معنی میں عمرو بن کلثوم کا شعر ہے۔

و ايام لنا غر طوال عصينا الملك فيها ان ندينا

ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ہم نے ان میں بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔

پس یہ دین کا لفظ مشترک ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**: ثعلب نے کہا: دان الرجل کا مطلب ہے اس نے اطاعت کی اور دان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس نے نافرمانی کی۔ دان اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی عزت پائے اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی ذلیل ہو اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی غالب آئے۔ پس یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ الدین کا اطلاق عادت اور شان پر بھی ہوتا ہے جیسا ہے کہ ایک شاعر نے کہا:

كدينك من ام الحويرث قبلها جیسا کہ تیری شان ام الحویرث کی طرف سے ہے۔

مثقب نے اپنی اونٹنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

تقول اذا درأتُ لها وضيني اهذا دينه ابدأ و ديني

وہ اونٹنی کہتی ہے جب میں اس کا تنگ زمین پر بچھا دیتا ہوں یہ اس کی اور میری ہمیشہ کی عادت ہے۔

الدین بادشاہ کی عملداری کو بھی کہتے ہیں۔ زہیر نے کہا:

لئن حللت بجوّ فی بنی اسد فی دین عمرو وحالت بيننا فَدَكُ

اگر تو بنی اسد میں جو کے مقام پر عمرو کی عملداری میں اترے گا تو ہمارے درمیان فدک کا مقام حائل ہوگا۔

شاعر نے عمرو کی طاعت کی جگہ مراد لی ہے۔

الدین سے مراد بیماری بھی ہے۔ لحیانی سے مروی ہے، اس نے کہا:

یا دین قلبک من سلمی و قد دینا

اس میں دین بمعنی مرض استعمال کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ الله تعالیٰ نے غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغہ کی طرف رجوع فرمایا کلام میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے کیونکہ سورت کے آغاز سے لے کر یہاں تک الله تعالیٰ کے متعلق خبر تھی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، حدیث نمبر 4249، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی ثنا تھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدہر) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب)۔ پھر آگے مخاطب کی ضمیر ذکر فرمائی۔ فرمایا: اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً (الدہر:22) (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے۔ اسی طرح اس کا الٹ بھی قرآن میں ہے یعنی پہلے مخاطب کے صیغے اور پھر غائب کے صیغے ذکر فرمائے۔ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ (یونس:22) (یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

نعبد کا معنی ہے نطیع (ہم عبادت کرتے ہیں) عبادت کا مطلب طاعت اور عجز و انکساری کا اظہار کرنا ہے۔ طریق معبد اس راستہ کو کہتے ہیں جو چلنے والوں کے لئے آسان بنایا گیا ہو۔ یہ ہروی کا قول ہے۔ بندہ جب یہ کہتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کو ثابت کرتا ہے، کیونکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں وغیرہ کو بھی پوجتے ہیں۔ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○ یعنی ہم تجھ سے ہی مدد، تائید اور توفیق طلب کرتے ہیں۔ سلمی نے ''حقائق'' میں کہا: میں نے محمد بن عبداللہ بن شاذان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابو حفص فرغانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○ کا اقرار کیا وہ جبر و قدر سے بری ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 24:** اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں مفعول کو فعل پر مقدم کیوں کیا گیا ہے تو جواباً کہا جائے گا اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے۔ عربوں کی یہ عادت ہے کہ اہم کو مقدم کر دیتے ہیں۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک بدو نے دوسرے بدو کو گالی دی تو جس کو گالی دی گئی اس نے گالی دینے والے سے اعراض کیا۔ گالی دینے والے نے اس سے کہا: ایاك اعنی (میری مراد تو ہی ہے)۔ اسے دوسرے نے کہا: وعنك اعرض میں تجھ ہی سے اعراض کرتا ہوں۔ دونوں نے اہم کو مقدم کیا۔ اسی طرح بندے اور عبادت کو معبود پر مقدم نہیں کیا گیا۔ پس نعبدك اور نستعینك، و لا نعبد ایاك و نستعین ایاك جائز نہیں کہ فعل کو مفعول کی ضمیر پر مقدم کیا جائے، لفظ قرآن کی اتباع کی جائے گی۔ عجاج نے کہا:

ایاك ادعو فتقبل ملقی و اغفر خطایای و کثر ورقی

میں تجھ سے ہی التجا کرتا ہوں، میری عاجزی کو قبول فرما، میرے گناہ معاف فرما اور میرے مال سے زیادہ فرما۔

اور شعر بھی مروی ہے۔ رہا شاعر کا قول:

الیك حتیٰ بلغت ایاکا اونٹنی تیری طرف چلی حتیٰ کہ تیرے پاس پہنچ گئی۔

یہ شاذ ہے اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ ورق راء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد دراہم اور واو کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مراد مال ہوگا۔ آیت میں ضمیر کو مکرر فرمایا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور غیر سے مدد چاہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 25:** جمہور قراء اور علماء ایاك کو یاء کی شد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ عمرو بن فائد نے ایاك کو ہمزہ کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے یاء کی تضعیف کو ناپسند کیا ہے کیونکہ یاء کی تشدید اور اس کے ماقبل کسرہ ہونے کی وجہ سے ثقل لازم آتا ہے یہ قرأت مرغوب نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں معنی ہوگا ہم تیرے سورج یا تیری روشنی کی عبادت

کرتے ہیں ایاۃ الشمس کا مطلب ہے سورج کی روشنی اور کبھی ہمزہ کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

سقتہ ایاۃ الشمس الا لثاتہ　　أسِفَ فلم تکدم علیہ باثمد

اس میں شاعر نے ایاۃ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اگر تو ہا کو گرادے تو مد کے ساتھ پڑھے گا۔ کہا جاتا ہے: الایاۃ للشمس کالھالۃ للقمر یعنی چاند کے اردگرد کے دائرہ کو ہالہ کہتے ہیں اور سورج کے دائرہ کو ایاۃ کہتے ہیں۔ فضل رقاشی نے ایاك ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مشہور لغت ہے(1)۔ ابو سوار غنوی نے دونوں جگہ پر ھِیَّاك پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ شاعر نے کہا:

فھیاك والامر الذی ان توسعت　　موارده ضاقت علیك مصادرہ

یہاں ھیاك، ایاك کے لئے استعمال ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26: وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○۔**

جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے نستعین کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم، اسد، قیس اور ربیعہ قبائل کی لغت ہے تاکہ مدد طلب کرنے والے پر دلالت کرے، نون کو کسرہ دیا جاتا ہے جس طرح الف وصل کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ نستعین اصل میں نستَعوِن تھا واؤ کی حرکت عین کو دی تو واو یاء بن گئی۔ اس کا مصدر استعانۃ ہے اصل میں استعوان تھا۔ واؤ کی حرکت عین کو دی گئی تو واؤ الف سے بدل گئی، دو ساکن جمع نہیں ہوتے، تو دوسرے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ زائدہ تھا۔ بعض نے فرمایا: پہلے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ دوسرا معنی کے لئے ہے اور ھاء عوضاً لازم ہے (یعنی واؤ کو حذف کیا تو اس کے عوض آخر میں ھاء لازم ہے۔)

**مسئلہ نمبر 27: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○**

اھدنا، مربوب کی، رب کی بارگاہ میں دعا اور رغبت ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہماری سیدھے راستہ پر رہنمائی فرما اور سیدھے راستہ کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما اور ہمیں اپنی ہدایت کا وہ راستہ دکھا جو تیری عبادت اور تیرے قرب تک پہنچنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دعا اور تمام چیزوں کو اس سورت میں رکھ دیا۔ اس کے نصف میں ثنا ہے اور نصف میں حاجات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ اس سورت میں جو دعا ہے وہ اس دعا سے افضل ہے جو دعا کرنے والا خود مانگتا ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ اور حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا سے زیادہ معزز کوئی چیز نہیں'' (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں سنن کے استعمال کی رہنمائی فرما۔ بعض نے فرمایا: اس میں اصل امالہ (مائل کرنا) ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ (اعراف: 156) یعنی ھدنا کا معنی ہم مائل ہوئے ہے۔ نبی کریم ﷺ مرض کی حالت میں مسجد میں تشریف لائے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 72، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

راوی نے کہا: یتھاذی بین اثنین یعنی دو آدمیوں کے درمیان جھک کر چل رہے تھے۔ یہاں یتھاذی بمعنی یتمایل ہے۔ اس سے الھدیۃ ہے جو ایک شخص کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت کی طرف جاتا ہے۔ اسی سے الھدی اس حیوان کو کہا جاتا ہے جو حرم کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے دلوں کو حق کی طرف مائل کر دے۔ فضیل بن عیاض نے کہا: الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مراد دلائل کا راستہ ہے، یہ خاص ہے، جبکہ عمومی معنی بہتر ہے۔

محمد بن حنفیہ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے بارے میں فرمایا: یہ الله کا دین ہے، الله تعالیٰ اس کے علاوہ بندوں سے کوئی دین قبول نہیں کرتا۔

عاصم احوال نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مراد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے دو خلفاء ہیں۔ عاصم نے کہا: میں نے حسن سے کہا: ابوالعالیہ کہتے ہیں: الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھی (ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما) ہیں۔ حسن نے کہا: انہوں نے سچ کہا اور ٹھیک کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 28**: الصِّرَاطَ کا اصل معنی عرب کلام میں الطریق ہے۔ عامر بن طفیل نے کہا:

شحنا ارضهم بالخيل حتى　　　ترکنا هم اذل من الصراط

شاعر نے الصِّرَاطَ کو راستہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

جریر نے کہا:

امير المومنين على صراط　　　اذا اعوج الموارد مستقيم

اس شعر میں صراط بمعنی راستہ استعمال کیا ہے یعنی امیر المومنین سیدھے راستہ پر ہے۔

ایک اور نے کہا:

فصد عن نهج الصراط الواضح　　　اس نے واضح راستہ سے روکا۔

نقاش نے بیان کیا کہ رومی لغت میں الصِّرَاطَ کا مطلب الطریق (راستہ) ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف قول ہے(1)۔ السراط (سین کے ساتھ) بھی پڑھا گیا اور اس صورت میں یہ الاستراط سے مشتق ہوگا جس کا معنی الابتلاع (نگلنا) ہے۔ گویا راستہ چلنے والوں کو نگل لیتا ہے۔ راء اور صاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور سین اصل ہے۔ سلمہ نے فراء سے روایت کیا ہے، فراء نے کہا: الزراط۔ خالص زاء کے ساتھ عذرہ، کلب اور بنی القین کی لغت ہے۔ فرمایا: لوگ کہتے ہیں: ازدق جب انہوں نے اصدق کہنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: الازد اور الاسد ولسق به اور لصق به۔ الصراط، دوسرے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، کیونکہ ہدایت کا فعل حرف جر کے واسطہ سے دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۞ (الصافات) اور ہدایت کا فعل بغیر حرف جر کے بھی دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ الْمُسْتَقِيْمَ، الصِّرَاطَ کی صفت ہے۔ مستقیم اسے کہتے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھا پن

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اور انحراف (موڑ) نہ ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (انعام: 153) مستقیم اصل میں مستقوم تھا۔ واو کی حرکت نقل کر کے ماقبل قاف کو دی گئی پھر واو ماقبل کسرہ کی وجہ سے یاء سے بدل گئی۔

**مسئلہ نمبر 29:** صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

صِرَاطَ، الصِّرَاطَ سے بدل کل ہے جیسے تو کہتا ہے: جاء بی زیدٌ ابوك۔ اس آیت کا مطلب ہے ہمیں ہمیشہ اپنی ہدایت عطا فرما کیونکہ انسان راستہ کی طرف رہنمائی کیا جاتا ہے پھر وہ اس سے بھٹک بھی جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس صراط سے مراد اور صراط ہے۔ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا فہم۔ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے اور قرآن کی لغت الذین ہی ہے حالت رفعی، نصبی اور جری میں اور ہذیل حالت رفعی میں اللذون کہتے ہیں۔ عربوں میں کچھ کہتے ہیں اللذ و اور بعض الذی کہتے ہیں (خواہ حالت رفعی ہو نصبی ہو یا جری ہو) جیسا کہ آگے آئے گا۔

عَلَيْهِمْ میں دس لغات ہیں: عَلَيْهِمْ ھاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ ھا کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ۔ علیھمی ھا اور میم کے کسرہ اور کسرہ کے بعد یاء کے الحاق کے ساتھ۔ علیھمو۔ ھا کے کسرہ، میم کے ضمہ اور ضمہ کے بعد واو کی زیادتی کے ساتھ۔ علیھمُو ھاء اور میم کے ضمہ اور میم کے بعد واو کے ادخال کے ساتھ علیھم ھا اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کی زیادتی کے بغیر۔ یہ چھ وجوہ قراء ائمہ سے منقول اور چار وجوہ عربوں سے منقول ہیں قراء کی طرف سے بیان نہیں کی گئیں۔ عِلیھِمِیْ ھا کے ضمہ، میم کے کسرہ اور میم کے بعد یاء کے ادخال کے ساتھ یہ حضرت حسن بصری نے عربوں سے حکایت کیا ہے۔ علیھم ھا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ یاء کی زیادتی کے بغیر۔ علیھمُ ھا کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کے الحاق کے بغیر۔ علیھِمِ ھاء اور میم کے کسرہ کے ساتھ میم کے بعد یاء کے بغیر۔ یہ تمام صورتیں درست ہیں۔ یہ ابن انباری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 30:** حضرت عمر بن خطاب بن زبیر رضی اللہ عنہما نے صراط من انعمت علیھم پڑھا ہے۔ علماء مفسرین کا اختلاف ہے کہ کون لوگ مراد ہیں جن پر انعام کیا گیا ہے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (النساء) (اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی)۔

ہدایت تقاضا کرتی ہے کہ یہ لوگ صراط مستقیم پر ہیں اور آیت الحمد میں ہی مطلوب ہے اور تمام اقوال کا مرجع یہی ہے۔ اس لئے متعدد اقوال ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فاللہ المستعان

**مسئلہ نمبر 31:** اس آیت میں قدریہ اور معتزلہ، امامیہ کا رد ہے کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان سے فعل کے صدور میں انسان کا ارادہ ہی کافی ہے خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ہو کیونکہ ان کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خالق ہے وہ اپنے افعال کے صدور میں اپنے رب کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تکذیب فرمائی کیونکہ انہوں نے

صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اس کی بارگاہ سے سوال کیا۔ اگر معاملہ ان کے سپرد ہوتا اور ان کے اختیار میں ہوتا ان کے رب کے پاس یہ معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہدایت کا اس سے سوال نہ کرتے اور ہر نماز میں بار بار سوال نہ کرتے۔ اسی طرح مصیبت کے دور کرنے میں اس کی طرف ان کا تضرع وزاری کرنا بھی ہے۔

اور مکروہ سے مراد ہدایت کے مخالف چیز ہے۔ جب انہوں نے کہا: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ جس طرح انہوں نے اس سے اپنی ہدایت کا سوال کیا اس طرح انہوں نے سوال کیا کہ انہیں گمراہ نہ کر۔ اسی طرح وہ دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران: 8)

**مسئلہ نمبر 32**: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

علماء کا اختلاف ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور الضَّآلِّيْنَ سے کون مراد ہیں۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ عدی بن حاتم کی حدیث میں اور ان کے اسلام کے قصہ میں نبی کریم ﷺ سے یہ بات تفسیر سے ذکر کی گئی ہے (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کیا ہے۔ اس تفسیر کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے جو یہود کے بارے میں وارد ہے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرہ: 61) (وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔) اور فرمایا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (الفتح: 6) (ان پر اللہ کا غضب ہوا) اور نصاریٰ کے بارے فرمایا: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ (المائدہ: 77) (جو گمراہ ہو چکی ہے پہلے سے (قوم) اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے) بعض علماء فرماتے ہیں: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد مشرکین ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد منافقین ہیں۔ اور بعض نے فرمایا: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نماز میں اس سورت کی فرضیت کو ساقط کیا۔ الضَّآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی قراءت کی برکت سے گمراہ ہوئے۔ یہ قول سلمی نے اپنی ''حقائق'' میں اور ماوردی نے اپنی تفسیر میں حکایت کیا ہے لیکن اس قول کی کوئی حقیقت نہیں۔ ماوردی نے کہا: یہ قول مردود ہے کیونکہ جب اس کے مفہوم میں اخبار آپس میں معارض ہیں اور آثار مقابل ہیں اور اختلاف پھیلا ہوا ہے تو اس پر اس حکم کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدعتوں کی اتباع کی اور اس وجہ سے ان پر غضب ہوا۔ الضَّآلِّيْنَ سے سنن ہدیٰ سے گمراہ لوگ مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حسن ہے اور نبی کریم ﷺ کی تفسیر اولیٰ، اعلیٰ اور احسن ہے۔ عَلَيْهِمْ حالت رفعی میں ہے کیونکہ اس کا معنی ان پر غضب کیا گیا۔ لغت میں غضب کا معنی شدت ہے۔ رجلٌ غضوب، یعنی سخت حلق والا فحش۔ الغضوب بڑے سانپ کو کہتے ہیں اس کی شدت کی وجہ سے۔ الغضبته اس ڈھال کو کہتے ہیں جو اونٹ کی جلد سے بنائی جاتی ہے اور تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ اس کی شدت کی وجہ سے اسے الغضبة کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت میں غضب کا معنی سزا کا ارادہ کرنا ہے۔ یہ ذات کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کی ذات کی صفات سے ہے۔ یا اس کا معنی نفس عقوبت (سزا) ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث

1۔ جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، الباب تفسیر فاتحۃ الکتاب، صفحہ 199، جلد 2 (وزارت تعلیم)

استعمال ہوئی ہے: ان الصدقة لتطفیٔ غضب الرب۔(1) (صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے یہ فعل کی صفت ہے)۔

**مسئلہ نمبر33:** وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ عرب کلام میں الضلال کا مطلب حق کے راستہ اور قصد کے طریقوں سے دور چلا جانا ہے۔ اس معنی میں یہ مثال ہے: ضل اللبن فی الماء، یعنی دودھ پانی میں غائب ہو گیا۔ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (السجدہ:10)۔ یعنی ہم موت کے ساتھ غائب ہو جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے۔ شاعر نے کہا:

ألم تسأل فتخبرك الديار — عن الحی المضلل این ساروا

کیا تو نے نہیں پوچھا کہ تجھے گھر خبر دیتے غائب قبیلہ کے متعلق کہ وہ کہاں چلے گئے۔

الضلضلة اس ملائم پتھر کو کہتے ہیں پانی جسے وادی میں گھماتا رہتا ہے۔ اسی طرح الغضبة پہاڑ میں اس چٹان کو کہتے ہیں جس کا رنگ پہاڑ سے مختلف ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

او غضبة فی هضبة ما امنعا

**مسئلہ نمبر34:** حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابی بن کعب نے غیر المغضوب علیهم وغیر الضالین پڑھا ہے(2) اور ان دونوں حضرات سے راء پر نصب اور جر کا پڑھنا مروی ہے اور جر یہ الَّذِيْنَ سے عَلَيْهِمْ میں ھا اور میم سے بدل ہونے کی وجہ سے ہوگا یا الَّذِيْنَ کی صفت کی حیثیت سے ہوگا۔ الَّذِيْنَ معرفہ ہے اور اصول یہ ہے کہ معرفہ کی صفت نکرہ سے اور نکرہ کی صفت معرفہ سے نہیں لگائی جاتی۔ لیکن یہاں الَّذِيْنَ سے متعین افراد نہیں ہیں بلکہ یہ عام ہے۔ پس یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہوگا: انی لا مر بمثلك فا كرمه۔ یا غَيْرِ کا لفظ معرفہ بن گیا ہے کیونکہ یہ دو چیزوں کے درمیان ہے جن کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (یعنی دو ضدوں کے درمیان ہے اور دو ضدوں کے درمیان غَيْرِ آئے تو معرفہ بن جاتا ہے) جیسے الحی غیر المیت، الساکن غیر المتحرك، القائم غیر القاعد۔

یہ ترکیب کے دو قول ہیں: پہلا فارسی کا ہے اور دوسرا زمخشری کا ہے اور غَيْرِ پر نصب کی دو وجہیں ہیں: یا تو الَّذِيْنَ سے حال ہے یا عَلَيْهِمْ میں ھا اور میم سے حال ہے۔ گویا تو نے کہا: انعمت علیهم لا مغضوباً علیهم یا استثناء کی بنا پر نصب ہے۔ گویا تو کہتا ہے: الا المغضوب علیهم۔ اور اعنی فعل کے ساتھ نصب جائز ہے۔ خلیل سے یہ حکایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر35:** وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں جو لَا ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ زائدہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (اعراف:12) (اس میں لا زائدہ ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے تاکہ وہم نہ ہو کہ الضَّآلِّيْنَ، الَّذِيْنَ پر معطوف ہے۔ یہ قول مکی اور مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ کوفیوں نے کہا لا بمعنی غَيْرِ ہے۔ یہ عمر اور ابی کی قراءت ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر36:** الضَّآلِّيْنَ اصل میں الضاللین تھا۔ پہلے لام کی حرکت حذف کی گئی پھر لام کو لام میں ادغام کیا گیا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزکوۃ، باب ما جاء فضل الصدقة، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 78، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پس دو ساکن جمع ہوئے۔ مدۃ الالف اور لام مدغمہ۔ ایوب سختیانی نے ولا الضألین غیر ممدودہ ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا اس نے التقاء ساکنین سے دوری اختیار کی۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابوزید نے حکایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عمرو بن عبید کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے: فیومئذ لا یسأل عن ذنبہ انسٌ ولا جأن۔ میں نے گمان کیا انہوں نے غلطی کی ہے حتیٰ کہ میں نے عربوں سے سنا: دأبۃ و شأبۃ۔ ابوالفتح نے کہا: اس لغت پر بہت سے اقوال ہیں۔

اذا ما العوالی بالعبیط احمأرت۔ (1)

جب تازہ خون کی وجہ سے نیزوں کی انیاں سرخ ہوگئیں۔

سورۂ الحمد کی تفسیر ہم مکمل کرتے ہیں۔ سب تعریفیں اور احسان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 78، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

# سورۃ البقرہ

ایاتھا ۲۸۶ ۲ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۸۷ رکوعاتھا ۴۰

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے کرم سے شروع کرتا ہوں جس کے سوا کوئی پالنہار نہیں۔

اس سورت کے آغاز میں اس سورت کا نزول، اس کی فضیلت اور جو کچھ اس کے متعلق مروی ہے اسے ذکر کیا جائے گا۔ ہم ہر سورت کے آغاز میں اسی طرح عمل کریں گے اگر ہمیں اس کے نزول اور فضیلت کے متعلق کچھ میسر آیا۔

سورۂ بقرہ مدنی سورت ہے۔ یہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ سوائے اس ایک ارشاد کے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ کیونکہ یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور یہ دسویں ذی الحجہ کے دن حجۃ الوداع میں منیٰ میں نازل ہوئی اور سود والی آیات بھی قرآن حکیم میں سے آخر میں نازل ہونے والی ہیں۔

اس سورت کی فضیلت عظیم ہے اور اس کا ثواب جسیم ہے، اسے فسطاط القرآن کہا جاتا ہے۔ یہ خالد بن معدان کا قول ہے۔ اس نام کی وجہ اس کی عظمت، بہا، کثرت احکام اور مواعظ کی وجہ سے ہے۔ حضرت عمر نے اس سورت کو اس کی فقاہت اور معانی کے ساتھ بارہ سال میں پڑھا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اس سورت کو آٹھ سال میں پڑھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے بعض شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سورت میں ہزار امر، ہزار نہی، ہزار حکم اور ہزار خبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، وہ کثیر تعداد میں تھا اور ایک نوجوان کو ان کا امیر بنایا گیا تھا کیونکہ اس کو سورۂ بقرہ یاد تھی۔ اسے فرمایا: ”تو جا تو ان کا امیر ہے“ (1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے، مسلم نے حضرت ابوامامہ باہلی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سورۂ بقرہ پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور بطلہ اس کے (پڑھنے کی) طاقت نہیں رکھتے (2)۔ اس حدیث کے ایک راوی معاویہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو مقابر نہ بناؤ۔ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے (3)۔

دارمی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، کوئی گھر ایسا نہیں جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے مگر اس سے شیطان نکل جاتا ہے جبکہ اس کی ہوا آواز بلند خارج ہو رہی ہوتی ہے (4)۔ اور فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا لباب ہوتا ہے اور قرآن کا لباب مفصل ہے۔ ابو محمد دارمی نے کہا: اللباب سے مراد خالص ہے۔ صحیح البستی میں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی، صفحہ 111، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قرأۃ القرآن و سورۃ البقرۃ، صفحہ 270، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ و جوازھا فی المسجد، صفحہ 265، جلد 1

4۔ سنن دارمی، صفحہ 365، جلد 2 (المدینۃ المنورہ الحجاز)

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے جس نے اسے رات کے وقت اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہ ہوگا اور جس نے اسے دن کے وقت پڑھا وہ شیطان اس کے گھر میں تین دن داخل نہ ہوگا (1)، اس سے مراد سرکش شیطان ہیں۔

دارمی نے اپنی مسند میں شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبد اللہ نے فرمایا: جس نے رات کے وقت سورۂ بقرہ کی دس آیات تلاوت کیں اس گھر میں اس رات شیطان داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ صبح ہو جائے (وہ دس آیات یہ ہیں) ابتدائی چار آیات، آیۃ الکرسی اور آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیات اور تین آخری آیات۔ جن کا آغاز لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے ہے (2)۔ شعبی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے قریب اس دن نہ شیطان آئے گا اور نہ کوئی ایسی چیز جو اسے ناپسند ہو۔ یہ کسی مجنون پر نہیں پڑھی جائے گی مگر اسے ہوش آ جائے گا۔ مغیرہ بن سبیع نے کہا: یہ عبد اللہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ قرآن نہیں بھولے گا۔ اسحاق بن عیسیٰ نے کہا: جو اس نے یاد کیا ہوگا وہ نہیں بھولے گا۔ ابو محمد دارمی نے کہا: جو یہ کہتے تھے ان میں مغیرہ بن سمیع بھی تھے۔ ابن عبد البر کی کتاب ''الاستیعاب'' میں ہے لبید بن ربیعہ (بن عامر) بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جاہلیت کے شعراء میں سے تھا اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور اسلام قبول کر کے اسے خوب نبھایا اور اسلام کے زمانہ میں اس نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اس سے اس کے اشعار کے متعلق پوچھا اور اس سے شعر سننا چاہا تو لبید نے سورۂ بقرہ پڑھ دی۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے تجھ سے تیرے اشعار کے متعلق سوال کیا ہے۔ لبید نے کہا: مجھے جب سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا علم بخشا ہے اس کے بعد میں نے کبھی شعر کا ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمر کو اس کے اس قول پر تعجب ہوا، اس کا وظیفہ دو ہزار تھا تو حضرت عمر نے مزید پانچ سو کا اضافہ کر دیا۔ بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ لبید نے جب سے اسلام قبول کیا کبھی شعر نہیں کہا۔ بعض نے فرمایا: اس نے اپنے زمانہ اسلام میں اس شعر کے علاوہ کوئی شعر نہیں کہا۔

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی حتی اکتسیت من الاسلام سربالاً

سب تعریفیں اللہ کے لئے کہ میری موت نہیں آئی حتیٰ کہ میں نے اسلام کا لباس زیب تن کر لیا۔

ابن عبد البر نے کہا: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ شعر قردہ بن نفاثہ السلولی کا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ شعر یہ ہے جو اس نے اسلام کے زمانہ میں کہا تھا۔

ما عاتب المرء الکریم کنفسه والمرء یصلحه القرین الصالح

اس نے کریم شخص کو اپنے نفس کی طرح عتاب نہیں کیا اور انسان کی اصلاح اس کا نیک دوست کرتا ہے۔

مزید فضیلت کا ذکر، آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گا اور سورۂ آل عمران کی ابتدا میں اس سورت کی فضیلت کا مزید بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ سنن دارمی، صفحہ 324، جلد 2 (المدینۃ المنورہ) 2۔ ایضاً

اے میرے رب آسان فرما اور مدد فرما۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡہِ ۚۛ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ

''الف لام میم۔ یہ ذی شان کتاب اور ذرا شک نہیں اس میں، یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے''۔

علماء تاویل کا ان حروف کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہے جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں۔ عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا: یہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے راز ہیں (1) اور اللہ کی کتب میں سے ہر کتاب میں اس کے راز ہیں یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ان کے متعلق گفتگو کرنا واجب نہیں لیکن ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح آئے ہیں۔ یہ قول حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابولیث سمرقندی نے حضرت عمر، حضرت عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حروف مقطعہ پوشیدہ حقیقت سے ہیں جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ ابو حاتم نے کہا: ہم حروف مقطعہ صرف سورتوں کے آغاز میں پاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی مفہوم کو ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی سند سے ربیع بن خثیم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل کیا اور اس میں جتنا علم چاہا اپنے ساتھ خاص فرمایا اور جتنا چاہا اس پر تمہیں مطلع فرمایا اور جو اس نے اپنے ساتھ خاص فرمایا تم اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پس تم اس کے متعلق مت پوچھو اور وہ علم جس پر اس نے تمہیں مطلع فرمایا وہ علم ہے جس کے متعلق تم پوچھتے ہو اور تجھے اس کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ پورا قرآن تم نہیں جانتے اور وہ جو تم جانتے ہو اس پر عمل کرتے ہو۔ حضرت ابوبکر نے کہا: یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ قرآن کے کچھ حروف کے معانی عام عالم سے چھپائے گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بطور آزمائش و امتحان کیا ہے۔ پس جو ان پر ایمان لایا اس نے اجر پایا اور سعادت مند ہوا اور جس نے انکار اور شک کیا وہ گنہگار ہوا اور حق سے دور ہو گیا۔ ہمیں ابو یوسف بن یعقوب القاضی نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالرحمن بن مہدی نے بتایا۔ انہوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے عمارہ سے انہوں نے حریث بن ظہیر سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا، فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا پھر یہ آیت پڑھی: اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ۔

میں کہتا ہوں: یہ قول متشابہ اور اس کے حکم کے متعلق ہے اور یہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ بہت سے علماء کبار نے فرمایا بلکہ ان کے متعلق ہم پر گفتگو کرنا واجب ہے تاکہ ہم وہ فوائد نکالیں جو ان کے ضمن میں ہیں اور وہ معانی نکالیں جو ان سے نکل سکتے ہیں، اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں: حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور حضرت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قرآن میں حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس کی ان حروف سے تالیف کیسی ہے (1)، قطرب اور فراء وغیرہما نے کہا: یہ حروف ہجاء کی طرف اشارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب عربوں کو چیلنج فرمایا تو انہیں ان کے ساتھ بتایا کہ یہ قرآن ان حروف سے مرکب ہے جن پر ان کے کلام کی بنیاد ہے تا کہ ان کا اس سے عجز زیادہ ظاہر ہو جائے کیونکہ اس نے ان کے کلام سے خروج نہیں کیا۔ قطرب نے کہا: وہ لوگ قرآن کو سننے سے بھاگتے تھے جب وہ سنتے تھے الم، المص۔ انہوں نے اس لفظ کو عجیب سمجھا۔ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لئے خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکب قرآن ان پر پڑھا تا کہ قرآن کو ان کے کانوں میں ثابت کر دیں اور ان پر حجت قائم کر دیں۔ ایک قوم نے کہا: روایت ہے کہ مشرکین نے جب مکہ میں قرآن سننے سے یہ اعراض کیا تو انہوں نے کہا: **لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ** (فصلت: 26)۔ مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور وغل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان تو یہ حروف مقطعات نازل ہوئے تا کہ وہ اس پر تعجب کریں پھر اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کریں اور اس کے قرآن کو سنیں تا کہ ان پر حجت لازم ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حروف اسماء پر دلالت کرتے ہیں، اسماء سے یہ حروف اخذ کئے گئے ہیں اور ان کے بقیہ حروف کو حذف کیا گیا ہے جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے، الف، اللہ سے ہے، لام، جبریل سے ہے، میم، محمد سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف، اسم اللہ کی چابی ہے، لام، لطیف کی چابی ہے، میم، اسم مجید کی چابی ہے۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے الٓمّٓ کے قول میں روایت کیا ہے، فرمایا: انا اللہ اعلم۔ الٓرٰ۔ انا اللہ اری۔ المص۔ انا اللہ افصل۔ (2) الف انا کے معنی کو ادا کرتا ہے، لام اللہ کے اسم کا معنی ادا کرتا ہے اور میم اعلم کا معنی ادا کرتا ہے۔ اس قول کو زجاج نے پسند کیا ہے۔ زجاج نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ان حروف میں سے ہر حرف ایک معنی ادا کرتا ہے۔ عرب بھی نظماً اور فصحاً حروف مقطعات کو ان کلمات کے بدل بولتے ہیں جن سے یہ حروف مشتق ہیں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلت لها قفی فقالت قاف

میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا: میں ٹھہر گئی۔

شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قالت وقفت۔ زہیر نے کہا:

بالخیر خیرات وان شراً فا　　ولا أرید الشر اِلّا ان تا

اس سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے وان شراً فشر اور اِلّا اَنْ تشاء۔ ایک اور شاعر نے کہا:

نادوهم ألا الجمو ألاتا　　قالوا جمیعاً کلهم ألافا

اس میں شاعر نے الاتر کبون مراد لیا ہے اور انہوں نے کہا: الا فار کبوا اور حدیث پاک میں ہے: من اعان علی قتل مسلم بشطر کلمۃ۔ (3) شقیق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اقتل میں سے اُق کہتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً

3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً، حدیث 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کفی بالسیف شا۔ اس کا مطلب ہے: شافیا۔

حضرت زید بن اسلم نے کہا: یہ حروف مقطعات سورتوں کے اسماء ہیں۔ کلبی نے کہا: یہ قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے شرف اور فضل کی وجہ سے ان کے ساتھ قسمیں اٹھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو رد کیا ہے۔ فرمایا: ان کا قسم ہونا صحیح نہیں کیونکہ قسم کے لئے مخصوص حروف ہیں مثلاً ان. قد، لقد اور ما اور ان حروف میں سے کوئی حرف یہاں نہیں پایا جاتا۔ پس قسم ہونا جائز نہیں۔ اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ قسم کی جگہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ اگر کوئی انسان قسم اٹھائے تو کہے گا: واللہ ہذا الکتاب لا ریب فیہ۔ تو یہ کلام درست ہوگا اور لا جواب قسم ہوگا۔ پس کلبی کا قول اور جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے صحیح اور درست ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسم اٹھانے میں کیا حکمت ہے۔ اس وقت میں لوگ دو قسم کے تھے: ایک تصدیق کرنے والے اور دوسرے تکذیب کرنے والے۔ تصدیق کرنے والے تو بغیر قسم کے ہی تصدیق کر دیتے ہیں اور مکذب قسم کے ساتھ بھی تصدیق نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن لغت عرب میں نازل ہوا ہے۔ عربوں میں سے جب کوئی اپنے کلام کو مؤکد کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کلام پر قسم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی حجت کو مؤکد کرنے کا ارادہ فرمایا تو قسم اٹھائی کہ قرآن اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الٓمّٓ کا مطلب ہے میں نے تجھ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔ قتادہ نے الٓمّٓ کی تفہیم میں فرمایا: یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ محمد بن علی ترمذی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں جو احکام اور قصص ودیعت فرمائے ہیں وہ ان حروف میں ودیعت فرما دیئے جو ان سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے ہیں۔ ان حقیقتوں کو سوائے نبی یا ولی کے کوئی نہیں جانتا پھر ان حقائق کو سورت میں بیان فرمایا تاکہ لوگ سمجھ سکیں (1)۔ ان اقوال کے علاوہ بھی حروف مقطعات کے بارے میں اقوال موجود ہیں۔ حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے۔

ان حروف پر وقف ان کے نقصان کی وجہ سے ہے مگر جب ان کو تو مبتدا بنائے گا یا انہیں معطوف کرے گا تو ان کو اعراب دے گا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا اعراب میں کوئی محل ہے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا کوئی اعراب نہیں کیونکہ یہ اسماء متمکنہ نہیں ہیں نہ یہ افعال مضارعہ ہیں۔ یہ حروف تہجی کے قائم مقام ہیں۔ پس یہ محکیۃ ہیں یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے اور جن علماء نے فرمایا کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں ان کے نزدیک ان کا اعراب مرفوع ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہیں یعنی ہذہ الم – جیسا کہ تو کہتا ہے: ہذہ سورۃ البقرۃ یا یہ مبتدا ہیں اور ان کی خبر ذالک ہے جیسا کہ تو کہتا ہے زیدٌ ذالك الرجل۔ ابن کیسان نحوی نے کہا الٓمّٓ نصب کی جگہ میں ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: اقرأ الم یا علیك الم۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قسم کی بنا پر جر کی جگہ میں ہیں کیونکہ حضرت ابن عباس کا قول ہے: یہ قسمیں ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسمیں اٹھائی ہیں (2)۔

**ذٰلِكَ الْكِتٰبُ** بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہذا الکتاب۔ اور ذٰلِكَ حاضر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ یہ وضع غائب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق خبر دیتے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ (السجدہ) اسی طرح خفاف بن ندبہ کا قول ہے

اقول له و الرمح یاطر متنهٔ تامل خفافاً اننی انا ذلکا

یعنی انا ھذا۔ پس ذٰلِكَ کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یہ ھذا کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ اس کی تلخیص یہ ہے: الم ھذا الکتاب لاریب۔ یہ ابوعبیدہ، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ (انعام:83) (اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی ابراہیم کو)۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (بقرہ:252) (یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ)۔ ان آیات میں تِلْكَ بمعنی ھذہ استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہ توڑیں گئیں تو گویا وہ دور ہو گئیں۔ بخاری میں ہے، معمر نے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی تفسیر میں فرمایا: کتاب سے مراد یہ قرآن ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ یہ بیان اور دلالت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ (الممتحنہ:10) یعنی ھذا حکم اللہ۔

میں کہتا ہوں: ھذا بمعنی ذالک استعمال ہوتا ہے، مثلاً ام حرام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یرکبون ثبج ھذا البحر(1)۔ یعنی ذالک البحر، (واللہ اعلم)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ غائب کی طرف اشارہ کے باب پر ہے۔

اس غائب میں علماء کے مختلف دس اقوال ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ کتاب ہے جو میں نے مخلوق کی سعادت، شقاوت، عمر اور رزق کے بارے میں لکھی۔ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ یعنی اس میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ تحریر ہے جو ازل میں میں نے اپنے بارے میں لکھی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے(2)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں اپنے بارے میں لکھا اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (ایک روایت میں تغلب کی جگہ سبقت کے الفاظ ہیں)(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جس کو پانی نہیں مٹا سکے گا۔ پس اسی وعدہ کی طرف اشارہ فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا اور اس کے عرب وعجم پر ناراضگی کا اظہار کیا سوائے اہل کتاب کے بقیہ لوگوں کے۔ اور فرمایا: میں نے تجھے مبعوث فرمایا تا کہ تجھے آزمائش میں ڈالوں اور تیرے ذریعے آزماؤں، میں تجھ پر ایک کتاب نازل کروں گا جس کو

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (وزارت تعلیم)
ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا سبقت غضبہ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً

پانی صاف نہیں کردے گا، تو اسے نیند اور بیداری کی حالت میں پڑھے گا(1)۔ (الحدیث)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قرآن کے اس حصہ کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں یہ ارشاد نازل فرمایا تھا: اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ (المزمل) (بیشک ہم جلدی ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے اس وعدہ کے پورا ہونے کے منتظر رہتے تھے۔ پھر جب مدینہ طیبہ میں الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ نازل ہوا۔ اس میں اس قرآن کا معنی ہے جو میں نے تم پر مدینہ طیبہ میں اتارا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تجھ سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تیری طرف وحی کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ سے اس کلام کی طرف اشارہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہے اور الٓمّٓ قرآن کا اسم ہے تقدیر کلام یہ ہوگا: یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر تورات اور انجیل میں کی گئی ہے یعنی تورات اور انجیل اس کی صحت کے گواہ ہیں اور جو معانی تورات اور انجیل میں ہیں ان کا یہ جامع ہے اور جو کچھ ان میں نہیں وہ بھی اس میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ تورات اور انجیل دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ الٓمّٓ دو کتابیں ہیں یا ان دو کتابوں کی مثل ہے یعنی یہ قرآن ان دونوں کتابوں کے معانی وحقائق کا جامع ہے، پس تثنیہ کو ذٰلِكَ سے تعبیر فرمایا اس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (البقرہ:68) (کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر ہو)۔ یہاں بَيْنَ ذٰلِكَ بمعنی بین تینک ہے یعنی بوڑھی اور جوان کے درمیان ہو۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ کسائی نے کہا ذٰلِكَ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جو آسمان میں تھا اور ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب نازل کرے گا۔ پس یہ اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے(2)۔ المبرد نے کہا: معنی یہ ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کے وسیلہ سے تم کفار پر فتح طلب کیا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اشارہ ہے حروف معجمہ کی طرف، اس کے قول پر جو کہتا ہے: الٓمّٓ سے مراد وہ حروف ہیں جن پر قرآن نظم کر کے میں نے تمہیں چیلنج کیا ہے(3)۔

کتاب: کتب یکتب سے مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ اسی وجہ سے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے اس کے اجتماع کی وجہ سے۔ عرب کہتے ہیں: تکتبت الخیل جو گھوڑے چھوٹے چھوٹے لشکر ہو جائیں۔ کتبت البغلۃ کہا جاتا ہے۔ جب بغلہ کے رحم کو حلقہ یا دھاگہ کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ شاعر نے کہا:

لا تامنن فزاریا حللت بہ	علی قلوصك واکتبھا باسیار

الکتبہ (کاف کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی الخرزۃ۔ سینے کا تسمہ ہے اور اس کی جمع کُتَبٌ ہے اور الکتب الخرز یعنی تسمہ۔ ذوالرمہ کا شعر ہے:

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب الصفات التی یعرف بھا فی الدنیا اھل الجنۃ واھل النار، صفحہ 385، جلد 2

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 83، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)	3۔ ایضاً

وفراء غرفية اثأى خوارزها مشلشل ضيعته بينها الكتب

اس شعر میں یہ لفظ اسی مفہوم میں شاعر نے استعمال کیا ہے۔

کتاب کاتب کے حروف معجمہ لکھنے کو کہتے ہیں خواہ وہ حروف جمع ہوں یا جدا جدا ہوں اس کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ مکتوب ہو، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تومل رجعة منى و فيها كتابٌ مثل ما لصق الغراء

اس میں مذکورہ مفہوم میں کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا معنی فرض، حکم اور القدر بھی ہے۔ جعدی کا قول ہے:

يابنة عمى كتاب الله اخرجنى عنكم وهل امنعن الله ما فعلا

اس میں شاعر نے کتاب سے مراد فرض، حکم لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَیْبَ فِیْهِ۔ یہ نفی عام ہے، اسی وجہ سے رَیْبَ کو اس کے ساتھ نصب دی گئی ہے، رَیْبَ کے تین معانی ہیں۔

۱۔ شک: عبداللہ بن الزبیری نے کہا:

ليس فى الحق يا اميمة ريبٌ انما الريب ما يقول الجهول

اے امیمہ! حق میں کوئی شک نہیں، شک تو اس میں ہوتا ہے جو جاہل کہتا ہے۔

۲۔ تہمت: جمیل نے کہا:

بثينة قالت يا جميل اربتنى فقلت كلانا يابثين مريب

بثینہ نے کہا: اے جمیل! تو نے مجھ پر تہمت لگائی۔ میں نے کہا: ہم میں سے ہر ایک اے بثین تہمت لگانے والا ہے۔

۳۔ حاجت: شاعر (کعب بن مالک) نے کہا:

قضينا من تهامة كل ريب و خيبر ثم اجمعنا السيوفا

ہم نے تہامہ اور خیبر سے ہر حاجت کو پورا کر لیا پھر ہم نے تلواروں کو جمع کیا۔

پس اللہ کی کتاب میں کوئی شک وارتیاب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں حق ہے وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کی صفات میں سے ایک صفت غیر مخلوق اور غیر حادث ہے اگرچہ کفار کے لئے شک واقع ہوا ہے۔ **بعض علماء** نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس کا معنی نہی ہے یعنی تم اس میں شک نہ کرو۔ کلام مکمل ہے۔ گویا فرمایا: یہ کتاب حق ہے، تو کہتا ہے: رابنى هذا الامر۔ جب وہ امر شک اور خوف کو داخل کر دے۔ اراب، شک والا ہو گیا۔ **فهو مريبٌ، رابنى امره، ريبٌ** الدهر۔ زمانہ کی گردشیں۔

اس کے متعلق چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِ اس میں ھلاء فی کی وجہ سے حالت جری میں ہے، اس میں پانچ وجوہ ہیں عمدہ ترین وجہ فیہِ ھدی ہے اور اس کے قریب پھر فیہُ ھدی (بغیر واؤ کے ھاء کے ضمہ کے ساتھ) یہ زہری، سلام اور ابو المنذر کی قراءت ہے۔ پھر اس کے قریب فیھی ھدی ہے یعنی (یاء کے اثبات کے ساتھ) یہ ابن کثیر کی قراءت ہے۔ اس میں فیھو ھدی (واؤ کے ساتھ) بھی جائز ہے، اس میں فیہ ھدیً مدغم کر کے پڑھنا جائز ہے، ھدی کا رفع مبتدا ہونے کی بنا پر ہے اور فِيْهِ خبر ہے، الھدی عرب کلام میں الرشد اور بیان کے معنی میں ہوتا ہے یعنی اس میں اہل معرفت کے لئے کشف، رشد، بیان کی زیادتی اور رہنمائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: الھدیٰ، ھدیان، ھدیٰ کا معنی دلالت ہے۔ یہ وہ ہے جس پر رسول اور ان کے متبعین قادر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد) (اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں)۔ اور ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ) (اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ نے رسل کے لئے ہدایت کو ثابت فرمایا جس کا معنی ہے دلالت، دعوت اور تنبیہ۔ اور وہ ہدایت جس کا معنی تائید اور توفیق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ:52)۔ (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں)۔

پس اس اعتبار سے هُدًى کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دل میں پیدا فرمایا۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرہ:5) (وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے) اور ارشاد ہے يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البقرہ:142) ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ الھدی اور الاھتداء اس کا معنی ارشاد کے معنی کی طرف راجع ہے، جیسے بھی تو اس کا صیغہ بنائے۔ ابو المعالی نے کہا: کبھی ہدایۃ کا لفظ وارد ہوتا ہے اور اس سے مراد مومنین کی جنت کے راستوں اور جنت تک پہنچانے والے طرق کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں مجاہدین کی صفت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ (محمد:4) اسی مفہوم میں یہ ارشاد ہے: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ (صافات) اس کا معنی ہے انہیں جحیم کے راستہ کی طرف چلاؤ۔

**مسئلہ نمبر 3**: الھدیٰ لفظ مونث ہے۔ فراء نے کہا: بعض بنی اسد الھدی کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ھذہ ھُدی حسنۃ۔ اور لحیانی نے کہا: یہ مذکر ہے، اس پر اعراب نہیں آتا، یہ اسم مقصور ہے اور الف پر حرکت نہیں آتی۔ یہ حرف جر کے ساتھ اور بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں یہ گزر چکا ہے، تو کہتا ہے: ھدیتہ الطریق والی الطریق، والدار والی الدار (یعنی میں نے اسے راستہ کی پہچان کرائی اور گھر کی پہچان کرائی) حرف جر کے متعدی ہونا اہل حجاز کی لغت ہے اور دوسری صورت یعنی بغیر حرف جر کے متعدی ہونا، اخفش نے حکایت کیا ہے اور قرآن حکیم میں ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (فاتحہ) (چلا ہم کو سیدھے راستے پر)۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف:43)۔ ساری تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی۔

بعض علماء نے فرمایا: الھدی دن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے کیونکہ لوگ دن میں اپنی معیشت اور [illegible] کے لئے راستوں پر نکلتے ہیں۔ اسی سے ابن مقبل کا قول ہے:

حتی استبنت الھدی والبید ھاجمۃ یخشعن فی الآل غلفا او یصلینا

اس شعر میں الھدی، دن کے لئے استعمال ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے ساتھ المتقین کو خاص فرمایا ہے اگرچہ قرآن ساری مخلوق کے لئے ہے یہ متقین کو شرف بخشنے کے لئے فرمایا ہے کیونکہ وہ ایمان لائے اور جو کچھ اس قرآن میں ہے اس کی تصدیق کی۔ ابوروق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ھُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی متقین کی عزت و شرف کے لئے ہدایت کو متقین کے لئے ذکر فرمایا اور ان کی فضیلت وعظمت کے لئے یہ فرمایا۔

متقین اصل میں الموتقیین تھا یعنی دو یاؤں کے ساتھ تھا، پہلی یاء کے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کر دیا گیا اور واؤ اور تاء کے اجتماع کی صورت میں واؤ کو تا سے بدل دیا گیا پھر تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا، پس یہ متقین بن گیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** التقویٰ اس کا اصل میں لغوی معنی قلت کلام ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی حکایت کیا ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث شریف ہے التقی ملجم، کم کلام کرنے والا لگام دیا گیا ہے۔ متقی، مومن اور اطاعت کرنے والے سے بلند درجہ ہے، یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نیک عمل اور خالص دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتا ہے۔ یہ اتقاء المکروہ بما تجعلہ حاجزاً بینک و بینہ سے مشتق ہے یعنی جس کو تو اپنے اور مکروہ چیز کے درمیان آڑ بناتا ہے جیسا کہ نابغہ نے کہا تھا:

سقط النصیف و لم ترد اسقاطہ فتناولتہٗ واتقتنا بالید

اس کی اوڑھنی گر گئی اور اس نے اس کو گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پس اس نے اس کو پکڑ لیا اور ہاتھ سے ہمیں بچالیا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فالقت قناعاً دونہ الشمس واتقت باحسن موصولین کف و معصم

اس نے دھوپ سے بچاؤ کیلئے پردہ ڈالا اور ہاتھ اور کلائی دونوں خوبصورت ملی ہوئی چیزوں کے ساتھ بچاؤ کیا۔

ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے سعید بن زربی ابو عبیدہ بن عاصم بن بھدلہ عن زربن جیش عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن مسعود نے ایک اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تو کتنے زیادہ لوگ دیکھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تائب توبہ کرنے والے اور گناہوں سے بچنے والے کے۔ پھر فرمایا: اے میرے بھائی کے بیٹے! تو لوگوں کو دیکھتا ہے کتنے زیادہ ہیں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے عالم یا متعلم کے۔

ابو یزید بسطامی نے کہا: متقی وہ ہے جب بات کرے تو اللہ کے لئے بات کرے اور جب عمل کرے تو اللہ کے لئے عمل

کرے، ابوسلیمان دارانی نے کہا: المتقین وہ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت ختم کر دی۔ بعض علماء نے فرمایا: متقی وہ ہے جو شرک سے بچتا ہے اور نفاق سے بری ہوتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول فاسد ہے کیونکہ کبھی ایک شخص شرک ونفاق سے پاک ہوتا ہے لیکن وہ فاسق ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی سے تقویٰ کے متعلق پوچھا، تو حضرت ابی نے کہا: کیا تم نے کانٹوں والا راستہ پایا ہے؟ حضرت عمر نے کہا: ہاں۔ حضرت ابی نے کہا: پھر تم نے اس سے گزرتے ہوئے کیا کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے کپڑے اوپر کر لئے اور بچ کے احتیاط سے گزرا۔ حضرت ابی نے کہا: یہ تقویٰ ہے ابن المعتز نے یہی معنی لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

خلّ الذنوب صغیرھا و کبیرھا ذاك التقی

واصنع کماشٍ فوق ار ض الشوك یحذر مایری

لا تحقرن صغیرۃ ان الجبال من الحصٰی

ترجمہ: تو گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو چھوڑ دے یہی تقویٰ ہے اور تو کانٹوں والی زمین کے اوپر چلنے والے کی طرح کر کہ وہ کانٹوں کو دیکھ کر احتیاط کرتا ہے۔ صغیرہ گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ، کنکریوں سے بنتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**: تقویٰ میں تمام خیر کے اعمال جمع ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اولین وآخرین میں وصیت ہے۔ یہ وہ خیر ہے جو انسان حاصل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابو الدرداء نے کہا، ان سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھی شعر کہتے ہیں اور تجھ سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی۔ فرمایا:

یرید المرء ان یؤتی مناہ و یابی اللہ الا ما ارادا

یقول المرء فائدتی و مالی و تقوی اللہ افضل ما استفادا

انسان ارادہ کرتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کی جائے اور اللہ تعالیٰ عطا نہیں فرماتا مگر جس کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

انسان کہتا ہے میرا فائدہ اور میرا مال حالانکہ جو اس نے فائدہ اٹھایا اس میں سے افضل اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابو امامہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: مومن تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی خیر حاصل نہیں کرتا اگر وہ اسے حکم دے، تو اس کی اطاعت کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کرے اور اس پر کوئی قسم اٹھائے تو اسے سچا کرے، اگر وہ اس سے غائب ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں اس سے اخلاص کا مظاہرہ کرے (1)۔

تقویٰ اصل میں وقویٰ تھا بروزن فعلی، پھر واؤ کو تاء سے بدلا گیا یہ وقیتہ، اقیہ سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے بچایا رجلٌ تقی، یعنی ڈرنے والا شخص۔ اصل میں وقی تھا اسی طرح تقاۃ اصل میں وقاۃ تھا جیسا کہ عرب کہتے ہیں تجاہ، و تراث اصل میں وُجاہ اور وارث تھا۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب النکاح، باب افضل النساء، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

''وہ جو ایمان لائے غیب پر اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں''۔

اس میں چھبیس مسائل ہیں☆۔

**مسئلہ نمبر 1**: الَّذِيْنَ یہ متقین کی صفت ہونے کے اعتبار سے حالت جری میں ہے اور قطع کے اعتبار سے رفع بھی جائز ہے۔ یعنی اس سے پہلے ھم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور مدح کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ کا معنی یصدقون ہے یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں۔ الایمان کا لغوی معنی تصدیق کرنا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یوسف: 17) (تو ہماری تصدیق کرنے والا نہیں) ایمان کا لفظ باء اور لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (آل عمران: 73) (ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں کہ مت مانو کسی کی بات، سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی) اور فرمایا: فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى (یونس: 83) (پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر) حجاج بن حجاج احول سے مروی ہے (یہ زق العسل سے ملقب ہوتا تھا) فرمایا: میں نے حضرت قتادہ کو یہ فرماتے سنا، اے ابن آدم! اگر تو چستی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو تیرا نفس اکتاہٹ، کوتاہی اور بے زاری کی طرف مائل ہوگا لیکن مومن وہ ہوتا ہے جو تکلیف اٹھانے والا ہوتا ہے، مومن وہ ہوتا ہے جو قوت کا اظہار کرنے ولا ہوتا ہے اور مومن اپنے نفس پر سختی کرنے والا ہوتا ہے، مومنین رات دن اللہ کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کی قسم! بندہ مومن سراً اور علانیۃً ربنا، ربنا کہتا رہتا ہے حتیٰ کہ سراً اور علانیۃً اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْغَيْبِ عرب کلام میں الغیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تجھ سے غائب ہے۔ یہ لفظ اجوف یائی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: غابت الشمس تغیب۔ الغیبۃ معروف ہے و اَغَابتِ المرأۃ یعنی وہ عورت جس کا خاوند غائب ہوتا ہے۔ و وقعنا فی غیبۃ و غیابۃ یعنی ہم زمین کی گہرائی میں واقع ہوئے۔ الغیابۃ کا معنی ہے: الاجمۃ، یعنی گھنے درخت جن میں چھپا جاتا ہے، ہموار زمین کو بھی الغیب کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ سے غائب ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: مفسرین نے الغیب کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں الغیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابن عربی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: الغیب سے مراد قضاء وقدر ہے۔ بعض علماء نے کہا: الغیب سے مراد قرآن اور اس میں موجود غیوب ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی مثلاً قیامت کی علامات، عذاب قبر، حشر، نشر، صراط، میزان، جنت، دوزخ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اقوال متعارض نہیں ہیں بلکہ ان تمام پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ایمان شرعی ہے جس کی طرف حدیث جبریل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب جبریل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے ایمان کے متعلق بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل، آخرت کے دن پر ایمان لائے اور

1۔ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس مسائل ہیں۔

خیروشر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل امین نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ (آگے مکمل حدیث ذکر کی) (1)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔ (2)

میں کہتا ہوں۔ قرآن حکیم میں ہے وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ (اعراف) (اور نہ تھے ہم ان سے غائب)۔

اور فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء: 49) (جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات آنکھوں سے غائب ہے، اس دنیا میں وہ دیکھی نہیں جاتی لیکن نظر و استدلال کے اعتبار سے غائب نہیں۔ یعنی وہ ایمان لاتے ہیں کہ ان کا رب قادر ہے وہ اعمال پر جزا دے گا، وہ اپنی خلوتوں میں بھی اس سے ڈرتے ہیں جہاں وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر آگاہ ہے۔ اس اعتبار سے آیات متفق ہو جاتی ہیں اور ان میں تعارض نہیں رہتا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

بعض علماء نے فرمایا: الغیب سے مراد لوگوں کے ضمائر اور قلوب ہیں بخلاف منافقین کے۔ یہ عمدہ قول ہے۔ شاعر نے کہا:

و بالغیب آمنا وقد کان قومنا　　یصلون للاوثان قبل محمد

ہم دل سے ایمان لائے جبکہ ہماری قوم حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے بتوں کی عبادت کرتی تھی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یہ جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ اقامۃ الصلوۃ کا مطلب ہے نماز کو اس کے ارکان، سنن اور اس کی ہیئت کے ساتھ اس کے اوقات میں ادا کرنا، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: قام الشیء یعنی اس چیز کو دوام اور ثبوت ہو گیا۔ یہ القیام علی الرجل سے مشتق نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: قام الحق یعنی حق ظاہر ہو گیا اور ثابت ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

وقامت الحرب بنا علی ساق

یعنی ہم پر جنگ قائم اور ثابت ہو گئی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

واذا یقال أتیتم لم یبرحوا　　حتی تقیم الخیل سوق طعان

اور جب کہا جاتا ہے تم آ گئے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے حتیٰ کہ گھوڑے نیزوں کے چلنے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: يُقِيْمُوْنَ کا معنی یدیمون ہے۔ واقامہ یعنی اس نے اسے ہمیشہ قائم کیا۔ اسی معنی کی طرف حضرت عمر نے اشارہ فرمایا: من حفظها و حافظ علیها حفظ دینہ و من ضیعها فهولما سواها اضیع۔ (جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر دوام اختیار کیا تو اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ نماز کے علاوہ احکام کو زیادہ ضائع کرنے والا ہو گا)۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب سوال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 27، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر 5:** اقامۃ الصلاۃ معروف ہے اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے کیونکہ جو اس کے سنن وغیرہ کو ترک کر دیتا ہے اس پر اعادہ نہیں ہے اور اوزاعی، عطا، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک اقامۃ الصلوٰۃ واجب ہے اور جو اقامت کو ترک کرے گا اس پر اعادہ واجب ہوگا، اہل ظواہر کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ابن عربی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اعرابی والی حدیث میں ہے ''اَقِمْ'' (یعنی نماز قائم کرو) یہاں اقامت کا حکم دیا ہے جس طرح تکبیر، استقبال قبلہ اور وضو کا حکم دیا ہے۔

فرمایا: اب تم حدیث پر آگاہ ہو چکے ہو تو امام مالک کی اس روایت کے مطابق قول کرنا واجب ہے وہ یہ کہ اقامت فرض ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی کی تحریم تکبیر ہے (1)'' دلیل ہے کہ جس نے تکبیر تحریمہ نہیں کی وہ نماز میں داخل نہیں ہوا۔ پس جو کچھ احرام سے پہلے تھا اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ جس چیز پر علماء کا اجماع ہو تو اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم کیا جائے گا جیسے طہارت، قبلہ، وقت اور دوسری اس قسم کی چیزیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر اقامت کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے اور یہ اقامت کے وجوب کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کا سہواً اور عمداً ترک کرنے کا حکم برابر ہوتا۔ یہ اعادہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس نے سنن کو ہلکا سمجھا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6:** علماء نے اس شخص کے بارے اختلاف کیا ہے جو نماز کی اقامت سنے تو کیا وہ جلدی چلے یا نہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ جلدی نہ چلے اگرچہ اسے رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ تم اس حال میں چلتے ہوئے آؤ کہ تم پر وقار ہو پھر جو نماز جماعت کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے وہ مکمل کر لو (2)''۔ اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم میں سے کوئی نماز کی طرف دوڑ کر نہ آئے بلکہ چل کر آئے جبکہ اس پر سکینت اور وقار ہو، جو تو پائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لے اور جو وہ تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اس کو بعد میں پڑھ لے (3)'' یہ (صراحۃ) نص ہے معنی کے اعتبار سے کہ جب وہ تیز چلے گا تو اس کا سانس اکھڑا ہوا ہوگا اور اس پر نماز میں داخل ہونا اس کی قراءت اور خشوع سب میں تشویش ہوگی۔ سابقین علماء کی ایک جماعت جن میں حضرات ابن عمر اور ابن مسعود بھی ہیں، مذکور نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ تیز چلے۔ اسحاق نے کہا: جب رکعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیز چلے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ فرمایا: اس شخص کے لئے کوئی حرج نہیں جو گھوڑے پر سوار ہو تو اسے نماز کے لئے تیز چلائے۔ بعض نے پیدل چلنے والے اور سوار کے درمیان فرق کیا ہے کیونکہ سوار کا سانس اس طرح اکھڑا ہوا نہیں ہوگا جس طرح پیدل چلنے والے کا ہوگا۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 9، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث نمبر 56، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 124، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب المشی الی الجمعۃ، حدیث نمبر 857، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی النداء للصلوٰۃ، صفحہ 53، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کرنا ہر حال میں اولیٰ ہے۔ پس وہ وقار اور سکون کے ساتھ چلے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کیونکہ وہ نماز میں ہے اور یہ محال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر اس کے خلاف ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی ہو۔ پس جس طرح نماز میں داخل ہونے والے پر سکینت اور وقار لازم ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے والے پر ہے تا کہ اسے اس کے ساتھ مشابہت حاصل ہو اور اس کی صحت پر دلیل وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور وہ حدیث ہے جو دارمی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تو وضو کرے اور مسجد کی طرف جانے کا ارادہ کرے تو اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں مت ڈال کیونکہ تو نماز میں ہے (1)''۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ صحیح ہے کہ یہ عمل جلدی چلنے سے کم ہے نماز کی طرف جانے والے کو نماز پڑھنے والے کی طرح بنایا ہے۔ یہ تمام سنن اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الجمعہ:9) کا معنی واضح کرتی ہیں۔ اس سے مراد تیز چلنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جمعہ کی تیاری کرنا ہے۔ امام مالک نے اسی طرح کی تفسیر فرمائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد و ما فاتکم فاتموا (2) (جو نماز امام کے پیچھے رہ جائے اسے مکمل کرلو) اور واقض ما سبقك (3) (جو امام تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اسے ادا کرلو) کی تعبیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ دونوں ہم معنی ہیں یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں ہم معنی ہیں، کبھی قضاء کا لفظ بولا جاتا ہے اور مراد تمام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ:10) (جب تمام مکمل کرلو) اور فرمایا: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ:200) (جب تم اپنے مناسک حج مکمل کرلو) اور بعض علماء نے فرمایا: ان دونوں جملوں کا معنی مختلف ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ اختلاف مرتب ہوتا ہے کہ جو شخص نماز میں شریک ہوتا ہے یہ اس کی نماز کا اول ہے یا اس کی نماز کا آخر ہے، پہلے قول کی طرف مالکیوں کی رائے گئی ہے ان میں ابن قاسم بھی ہے لیکن فوت شدہ نماز کو الحمد اور سورت کے ساتھ قضا کرے۔ پس وہ افعال میں بنا کرنے والا ہوگا اور اقوال میں قضا کرنے والا ہوگا۔

ابن عبدالبر نے کہا: یہ مشہور مذہب ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: وہ قول جس پر ہمارے اصحاب کا نظریہ قائم ہے وہ یہی ہے اور یہی قول اوزاعی، شافعی، محمد بن حسن، احمد بن حنبل، طبری اور داؤد بن علی کا ہے۔ اشہب نے روایت کیا ہے، یہ وہی قول ہے جو ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے۔ عیسیٰ نے ابن قاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جو اس نے امام کے ساتھ نماز پائی وہ اس کی آخری نماز ہے اور وہ افعال و اقوال میں قضا کرنے والا ہے۔ یہی کوفہ کے علماء کا قول ہے۔

قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا: یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: جن علماء نے امام کے ساتھ پائی جانے والی نماز کو پہلی نماز قرار دیا میرا خیال ہے انہوں نے احرام (تکبیر تحریمہ) کی رعایت کی کیونکہ احرام (تکبیر تحریمہ) نماز کے آغاز میں ہوتی ہے اور تشہد اور سلام نماز کے آخر میں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا: جو اس نے امام کے ساتھ

---

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 51، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی کراهیة التشبیك بین الاصابع فی الصلوٰۃ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار و سکینة والنهی عن اتیانها سعیا، صفحہ 220، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

نماز پائی وہ اس کی پہلی نماز ہے، اس کے ساتھ ساتھ سنت میں فاتموا کا ارشاد وارد ہے اور تمام آخر ہوتا ہے۔

دوسرے علماء نے فاقضوا کے ارشاد سے حجت پکڑی ہے، وہ جو قضا کرتا ہے وہ پہلی نماز کو فوت کرنے والا ہے، مگر فاتموا کی روایت زیادہ راویوں سے مروی ہے اور اس شخص کے قول پر یہ درست نہیں جس نے کہا: جو امام کے ساتھ نماز پائی وہ پہلی نماز ہے اور یہ عام ہے مگر عبدالعزیز بن ابی سلمہ، الماجشون، المزنی، اسحاق اور داؤد نے کہا: اگر امام کے ساتھ نماز پائے تو الحمد اور سورت پڑھے اور جب بقیہ نماز کو قضا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو صرف الحمد پڑھے۔ یہ ان کی اصل قول اور فعل پر عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: اقامت نفلی نماز کے شروع کرنے سے مانع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں (1)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے مگر جب کوئی پہلے نوافل شروع کر چکا ہو تو وہ انہیں نہ توڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) خصوصاً جبکہ ایک رکعت پڑھ چکا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: نوافل کو توڑ دے کیونکہ حدیث کا حکم عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: علماء کا اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو مسجد میں داخل ہوا اور اس نے فجر کی دو سنتیں نہ پڑھی ہوں۔ پھر نماز کھڑی ہو جائے۔

امام مالک نے فرمایا: امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر مسجد میں داخل نہ ہوا ہو اور اسے ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ مسجد کے باہر سنتیں ادا کرے مسجد کے احاطہ میں سنتیں ادا نہ کرے۔ جہاں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ جو مسجد سے متصل ہے۔ اگر اسے پہلی رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔ اور پھر یہ سنتیں اگر پڑھنا پسند کرے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ میرے نزدیک سورج طلوع ہونے کے بعد ان کا ادا کرنا ان کے ترک سے افضل ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے مقلدین کہتے ہیں: اگر نمازی کو فرضوں کی دونوں رکعتوں کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے امام کو نہ پا سکے تو امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائے۔ اگر اسے ایک رکعت فرض پانے کی امید ہو تو فجر کی سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔ یہی قول امام اوزاعی کا بھی ہے مگر وہ کہتے ہیں: جب تک دوسری رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو مسجد میں سنتیں ادا کرنا جائز ہے۔ ثوری نے کہا: اگر ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو سنتیں پڑھ لے اگرچہ مسجد میں داخل بھی ہو۔ حسن بن حی نے کہا: جنہیں ابن حیان کہا جاتا ہے جب مقیم اقامت سن لے تو پھر فجر کی سنتوں کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو مسجد میں داخل ہو اور جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے، نہ مسجد سے باہر اور نہ مسجد کے اندر۔ اسی طرح طبری نے کہا ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے بھی یہی حکایت ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''جب نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا باب کراھیۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع المؤذن فی اقامۃ الخ، صفحہ 247، جلد 1

کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز جائز نہیں (1)'' اور فجر کی دو رکعتیں سنت ہیں یا فضیلت ہیں یا رغبت ہیں اور جھگڑے کے وقت حجت، سنت ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے قول کی حجت وہ روایت ہے جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر آئے جبکہ امام صبح کی نماز پڑھا رہا تھا۔ پس حضرت ابن عمر نے حضرت حفصہ کے حجرہ میں دو سنتیں ادا فرمائیں پھر امام کے ساتھ فرض نماز پڑھی اور ثوری اور اوزاعی کی حجت میں سے وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے مسجد کے اندر ایک ستون کے پاس فجر کی دو رکعتیں ادا فرمائیں پھر نماز میں شریک ہوئے جبکہ حضرات حذیفہ اور ابو موسیٰ بھی وہاں موجود تھے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جب فرضی نماز کو چھوڑ کر مسجد سے باہر نوافل میں مشغول ہونا جائز ہے تو مسجد کے اندر بھی مشغول ہونا جائز ہے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جبکہ مؤذن تکبیر کہہ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو صبح کی چار رکعتیں پڑھتا ہے (2) اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس شخص پر انکار تھا جو فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ رہا تھا جبکہ امام فرض پڑھا رہا تھا۔ اس سے یہ استدلال کرنا بھی ممکن ہے کہ فجر کی دو سنتیں اس حال میں ادا کی جائیں تو صحیح ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز ختم نہیں کرائی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر تھے۔

**مسئلہ نمبر 10**: صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور صَلّٰی یُصَلِّی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دعا کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطراً فلیطعم وان کان صائماً فلیصل (3) (جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اس کی دعوت قبول کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو کھانا کھائے اور اگر روزے سے ہو تو دعا کرے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں فلیصلّ سے مراد بھی معروف نماز ہے۔ پس وہ دعوت دینے والے کے گھر دو رکعتیں پڑھے اور واپس آ جائے لیکن پہلا معنی (دعا کرنا) مشہور ہے اور اکثر علماء کا یہی نظریہ ہے۔ جب حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جنم دیا تو حضرت اسماء نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا۔ حضرت اسماء نے فرمایا: ثم مسحه و صلیٰ علیه (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ صَلِّ عَلَیْهِمْ** (توبہ: 103) یعنی ان کیلئے دعا کیجئے۔ اعشیٰ نے کہا:

تقول بنتی و قد قربت مرتحلاً  یا رب جنب ابی الاوصاب والوجعا
علیك مثل الذی صلیت فاغتمضی  نوماً فان لجنب المرء مضطجعا

ان اشعار میں صلاۃ کا لفظ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور اعشیٰ نے کہا:

وقابلها الریح فی دنها  و صلی علی دنها و ارتسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا، باب کراھیۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع المؤذن فی اقامۃ الخ، صفحہ 247، جلد 1

ایضاً، بخاری، ابواب صلاۃ الجماعۃ والامامۃ، باب اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ، حدیث نمبر 623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً  3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابۃ الداعی الی دعوۃ، صفحہ 462، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں بھی صلاۃ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ارتسم الرجل کا معنی ہے، اس نے تکبیر کہی اور دعا کی۔ صحاح میں اس کا یہی معنی درج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الصلا سے مشتق ہے اس سے مراد وہ رگ ہے جو پیٹھ کے وسط میں ہوتی ہے اور اس کے آخری حصہ میں جدا ہو جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے۔ اسی سے ہے: اخذ المصلی فی سبق الخیل، مصلی گھوڑ دوڑ میں شروع ہوا کیونکہ وہ دوڑ میں شریک ہوتا ہے اور اس کا سر سبقت لے جانے والے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ پس الصلاۃ اس سے مشتق ہے یا اس لئے کہ نماز کا ایمان کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ پس نماز کو گھوڑے سے تشبیہ دی گئی یا اس لئے کہ رکوع کرنے والا اپنے پچھلے حصہ کو دوہرا کرتا ہے۔ الصلا، گھوڑے کی دم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کا تثنیہ صلوان ہے۔ المصلی، دوسرے نمبر پر آنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا سر اگلے گھوڑے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نمبر پر تھے دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت عمر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لزوم سے ماخوذ ہے۔ اسی سے ہے: صَلِیَ بالنار جب وہ آگ کو لازم ہو جائے۔ تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً ۝ (غاشیہ)

حارث بن عباد نے کہا:

لم اکن من جناتها علم اللّٰہ — وانی بحرها الیوم صال

اس شعر میں صال، کا مطلب ہے کہ اس کی گرمی کو لازم پکڑنے والا ہے۔

گویا اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس حد پر عبارت کو لازم پکڑنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صلیت العود بالنار سے ماخوذ ہے جب تو لکڑی کو سیدھا کرے اور آگ پر گرم کر کے اسے نرم کرے۔ الصلاء، صلاء النار صاد کے کسرہ کے ساتھ ممدود ہے اگر تو صاد کو فتحہ دے گا تو مقصور ہوگا گویا نمازی اپنے نفس کو عبادت میں لگا کر اسے سیدھا کرتا ہے اور نرم کرتا ہے۔ الخارزنجی نے کہا:

فلا تعجل بامرك واستدمه — فما صلى عصاك كمستديم

اس میں صلی سیدھا کرنے کے معنی میں ہے۔

الصَّلٰوۃ کا معنی دعا ہے اور الصَّلٰوۃ کا معنی رحمت بھی ہے۔ اسی سے ہے: اللهم صل على محمد (1) (اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیج) اور الصَّلٰوۃ کا معنی عبادت بھی ہے۔ اسی سے ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ (الانفال: 35) (یعنی ان کی عبادت بیت اللہ کے پاس نہ تھی) الصَّلٰوۃ کا معنی نفلی نماز بھی ہے۔ اسی معنی میں ہے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (طٰہٰ: 132) (اپنے گھر والوں کو نفلی نماز کا حکم دو)۔ صلاۃ کا معنی تسبیح بھی ہے، اسی سے ہے: فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ۝ (صافات) اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا، اسی سے سبحة الضحیٰ ہے، چاشت کی نماز۔ بعض علماء نے نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (بقرہ: 30) کی تاویل میں فرمایا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ الصَّلٰوۃ کا معنی قراءت بھی ہے۔ اس معنی میں ہے: وَلَا تَجْهَرْ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 940، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدعوات، باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث 5880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِصَلَاتِكَ (الاسراء: 110) (اپنی قراءت کو بلند نہ کرو)۔

الصَّلٰوۃَ کا لفظ مشترک ہے۔ الصَّلٰوۃَ اس مکان کو بھی کہتے ہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: علم ہے جو عبادت کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ کو بھی شریعت سے خالی نہیں چھوڑا اور کوئی شرع نماز سے خالی نہیں تھی۔ یہ مفہوم ابونصر القشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول پر اس کا کوئی اشتقاق نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11**: علماء اصول کا اختلاف ہے کہ کیا یہ اپنے اصلی وضعی ابتدائی لغوی معنی پر باقی ہے۔ اسی طرح ایمان، زکوۃ، صیام اور حج (اپنی اصلی معنی پر باقی ہیں) شرع نے مشروط داحکام کے ساتھ اس میں تصرف فرمایا۔ یا شرع کی طرف سے یہ زیادتی اسے شرع سے پہلے کی وضع ابتدائی کی طرح موضوعہ کر دیتی ہے یہاں بھی اختلاف ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت، عربی زبان میں ثابت ہے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا لیکن عربوں کے لئے اسماء میں فیصلہ کا اختیار ہے جیسے دابۃ پر ہر اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جو زمین پر رینگ کر چلے پھر عرف نے اسے چوپائیوں کے لئے خاص کر دیا اسی طرح شرع کے عرف کے لئے اسماء میں انہیں اختیار ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12**: اس آیت میں الصَّلٰوۃَ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرائض مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا: فرائض ونوافل سب مراد ہیں، یہی صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور متقی فرائض ونوافل دونوں ادا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: نماز رزق کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوۃِ (طٰہٰ: 132) (اپنے اہل کو نماز کا حکم دو) جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ طٰہٰ میں آئے گا اور نماز پیٹ وغیرہ کی تکلیف کے لئے شفا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے ''ظہر کی نماز جلدی پڑھی میں نے بھی جلدی کی، نماز پڑھی اور میں بیٹھ گیا۔ نبی کریم ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اشکمت درد ہ (کیا تیرے پیٹ میں درد ہے؟) میں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ نماز میں شفا ہے (1)''۔ ایک روایت میں ہے، اشکمت درد (یعنی تیرے پیٹ میں درد ہے) نبی کریم ﷺ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف پناہ لیتے (2)۔

**مسئلہ نمبر 14**: نماز صحیح نہیں ہوتی مگر چند شرائط اور فرائض کے ساتھ۔ نماز کی شرائط میں ایک شرط، طہارت ہے جس کے احکام کا بیان سورۂ نساء اور مائدہ میں آئے گا، دوسری شرط شرمگاہ کا ڈھانپنا ہے، اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا اور نماز کے فرائض یہ ہیں۔ قبلہ کی طرف منہ کرنا، نیت کرنا، تکبیر تحریمہ، اس کے لئے قیام کرنا، الحمد کی قراءت کرنا، قراءت کے لئے قیام کرنا، رکوع کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، رکوع سے سر اٹھانا اور اس میں اعتدال کرنا، سجدہ کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، سجدہ سے سر اٹھانا، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور اس جلوس (بیٹھنے) میں طمانیت کا ہونا، دوسرا سجدہ کرنا اس میں

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب الصلوۃ شفاء، حدیث نمبر 3448، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب قیام اللیل، باب وقت قیام النبی من اللیل، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طمانیت کا ہونا۔ ان تمام فرائض کی اصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اس شخص کے بارے میں ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سکھائی تھی جب اس نے نماز صحیح ادا نہیں فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کا تو ارادہ کرے تو مکمل وضو کر، پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر قرآن پڑھ جو تجھے میسر ہو، پھر رکوع کر حتیٰ کہ رکوع کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر رکوع سے سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ سجدہ کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جا، پھر پوری نماز اسی اطمینان کے ساتھ ادا کر (1)''۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس کی مثل حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے جسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء (مالکی علماء) نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ارکان کو بیان فرمایا اور اقامت اور رفع یدین سے، قراءت کی حد سے انتقالات کی تکبیر سے، رکوع و سجود کی تسبیح سے، درمیانی جلسہ سے، تشہد سے، جلسہ اخیرہ سے اور سلام سے سکوت فرمایا۔ اقامت اور سورۂ فاتحہ کی تعیین پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ رفع یدین ہمارے علماء اور عام فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے، اس کی وجہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے۔ داؤد اور بعض ان کے ساتھیوں نے کہا: رفع یدین تکبیر تحریمہ کے وقت واجب ہے۔ داؤد کے بعض ساتھیوں نے کہا: تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین واجب ہے اور جس نے ہاتھ نہ اٹھائے اس کی نماز باطل ہے۔ یہ حمیدی کا قول ہے اور اوزاعی سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ان علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: صلوا کما رائیتمونی اصلی (2) (تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا)۔

اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہم پر واجب ہے کہ ہم اس طرح کریں جس طرح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو پہچاننے والے ہیں اور حدیث مذکور کی وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں مسنون ہیں۔ ابن قاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں: جس نے نماز میں تین یا اس سے زائد تکبیریں چھوڑ دیں تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ اگر اس نے سجدہ سہو نہ کیا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اگر ایک تکبیر بھول گیا یا دو تکبیریں بھول گیا تو بھی سجدہ سہو کرے لیکن اگر اس صورت میں سجدہ نہ کیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی۔ ابن قاسم سے مروی ہے کہ ایک تکبیر بھول جائے تو بھولنے والے پر کچھ واجب نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ زیادہ تکبیریں اور کل تکبیریں ان کے نزدیک فرض ہیں، لیکن تھوڑی تکبیریں اگر رہ جائیں تو معاف ہیں۔ اصبغ بن فرج اور عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا: اگر کوئی شخص ابتدا سے لے کر انتہا تک تکبیریں نہ کہے جبکہ اس نے تکبیر تحریمہ کہی ہو تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اور اگر تکبیر تحریمہ بھول جائے تو سجدہ سہو کرے۔ اگر سجدہ نہ کرے گا تو بھی کچھ واجب نہ ہو گا۔ پس کسی کے لئے جان بوجھ کر تکبیر کو ترک کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اگر اس کو کوئی چھوڑ دے گا تو وہ برا کرے گا اور اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی اور اس کی نماز ہو جائے گی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ من کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن الفاتحۃ الخ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: صحیح قول شافعی علماء، کوفی فقہاء اور اہل حدیث کی جماعت اور مالکیوں کا ہے نہ کہ ان علماء کا جو ابن قاسم کے قول کے پیروکار ہیں۔ امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے باب اتمام التکبیر فی الرکوع والسجود اور اس میں حضرت مطرف بن عبداللہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے اور حضرت عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب کے پیچھے نماز پڑھی۔ حضرت علی جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے، جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے، جب نماز کو حضرت علی نے مکمل فرمایا تو حضرت عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اس شخص نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز یاد دلا دی ہے یا فرمایا: اس نے ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز پڑھائی۔ حضرت عکرمہ کی حدیث ہے، فرمایا: میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس دیکھا جو نیچے جاتے ہوئے اور اوپر اٹھتے ہوئے تکبیر کہتا تھا اور جب کھڑا ہوتا اور بیٹھتا تو تکبیر کہتا۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ بتایا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: کیا یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز نہیں ہے (1) (تیری ماں نہ ہو)۔ امام بخاری نے تیری رہنمائی فرمائی کہ تکبیر ان کے نزدیک معمول بہ نہیں تھی۔

ابو اسحاق السبیعی نے یزید بن ابی مریم سے انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے جنگ جمل کے دن نماز پڑھائی جس کے ساتھ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز یاد دلا دی۔ آپ رضی اللہ عنہ نیچے جاتے ہوئے، اوپر اٹھتے ہوئے، قیام کرتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے تکبیر کہتے تھے (2)۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم نے یا تو ان تکبیروں کو بھول کر ترک کر دیا یا جان بوجھ کر ترک کر دیا۔ میں کہتا ہوں: کیا تو انہیں دیکھتا ہے کہ انہوں نے نماز کا اعادہ کیا۔ پس کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جس نے تکبیر کو ترک کیا اس کی نماز باطل ہے اگر یہ ایسا ہوتا تو سنت اور فرض کے درمیان فرق نہ ہوتا۔ جب کوئی چیز انفراداً واجب نہ ہو تو وہ جمعاً بھی واجب نہیں ہوتی۔ وباللہ التوفیق

**مسئلہ نمبر 15**: رکوع و سجود میں تسبیح جمہور علماء کے نزدیک مذکور حدیث کی وجہ سے واجب نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے تسبیحات کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جس نے تسبیحات کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''رکوع میں رب کی تعظیم بیان کرو اور سجدہ میں دعا میں اجتہاد کرو، یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کی جائے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 16**: جلوس اور تشہد، اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے فرمایا: پہلا جلوس (قعدہ) اور اس میں تشہد سنت ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے پہلے قعدہ کو واجب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: یہ تمام فرائض سے مخصوص ہے کہ سجدہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے جیسے بیع مزابنہ (☆) میں سے عرایا (☆☆) کی بیع جائز ہے اور اجارات میں سے قراض جائز ہے، اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد اس شخص کا وقوف جائز ہے جو امام کو رکوع کی حالت میں پائے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر یہ سنت ہوتا تو جان بوجھ کر اسے ترک کرنے والے کی نماز باطل نہ ہوتی جس طرح نماز کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب اتمام التکبیر فی السجود، حدیث 745، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح ابن ماجہ، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ وسنت، باب التسلیم، حدیث 906، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، صفحہ 191، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

☆ اندازہ سے بیع کرنا جیسے درخت پر موجود پھل کی اتارے ہوئے پھل سے بیع کرنا۔ ☆☆ ہبہ کے طور پر کھجور کا پھل درخت پر ہی دے دینا۔

دوسری سنن ترک کرنے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی اور جو علماء اسے واجب نہیں کہتے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر یہ نماز کے فرائض میں سے ہوتا تو بھولنے والا اس کی طرف واپس آ جاتا حتیٰ کہ اسے ادا کرتا جیسا کہ اگر کوئی سجدہ ترک کر دے یا رکوع ترک کر دے تو وہ واپس آ جاتا ہے۔ اس میں وہ اسی طرح تواتر اور رتبہ کی رعایت کرتا جس طرح رکوع و سجود میں کرتا ہے پھر وہ سجدہ سہو کرتا جس طرح رکوع یا سجدہ ترک کرنے والا کرتا ہے اور پھر انہیں ادا کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن بحینہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہو گئے اور تشہد پڑھنا بھول گئے۔ لوگوں نے تسبیح کہی تاکہ آپ بیٹھ جائیں، آپ سیدھے کھڑے ہو گئے اور پیچھے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام سے پہلے دو سجدے سہو کے لئے کیے (1)۔ اگر بیٹھنا فرض ہوتا تو نسیان اور سہواً سے ساقط نہ کرتے کیونکہ نماز میں فرائض کا حکم یہ ہوتا ہے۔ سہواً اور عمداً ان کا ترک برابر ہوتا ہے سوائے مقتدی کے۔ نماز کے آخری جلوس کے حکم میں بھی اختلاف ہے اور اس سے جو غرض ہے اس میں اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**: اس کے بارے علماء کے پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: بیٹھنا فرض ہے اور اس میں تشہد پڑھنا بھی فرض ہے اور سلام بھی فرض ہے۔ جن علماء نے یہ کہا ان میں امام شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت میں) ابومصعب نے اپنی مختصر میں امام مالک اور اہل مدینہ سے یہی حکایت کیا ہے اور داؤد نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے پہلا تشہد ترک کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ترک کیا اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے اور ان کے ترک کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو ہے۔ جب کوئی بھول کر یا جان بوجھ کر تشہد ترک کر دے تو نماز کا اعادہ کرے اور ان علماء نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نماز میں فرض ہے کیونکہ اس کے فرض کی اصل مجمل ہے جو بیان کا محتاج ہے مگر یہ کہ جو دلیل سے خارج ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا" (2)۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ آخری قعدہ، تشہد اور سلام واجب نہیں ہیں۔ یہ تمام سنت ہیں یہ بعض بصریوں کا قول ہے اور ابراہیم بن علیہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے آخری قعدہ کو پہلے قعدہ پر قیاس کرنے کی تصریح کی ہے۔ جمہور علماء کی اس نے مخالفت کی ہے اور ان سے جدا نظریہ قائم کیا ہے مگر وہ اس شخص پر نماز کا اعادہ لازم سمجھتے ہیں جو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ترک کر دے۔ ان کی حجت میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام اپنی نماز کے آخری سجدہ سے سر اٹھائے پھر اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی۔ یہ حدیث ابوعمرو۔ کے قول پر صحیح نہیں ہے ہم نے اسے "کتاب المقتبس" میں بیان کیا ہے اور یہ لفظ سلام کو ساقط کرتے ہیں جلوس (بیٹھنے) کو ساقط نہیں کرتے۔

تیسرا قول: تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے اور تشہد اور سلام بطور فرض واجب نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 85، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ما جاء فی الظہر، حدیث 1195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کوفیوں کی جماعت کا قول ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے افریقی عبدالرحمٰن بن زیاد سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز کے آخر میں بیٹھے پھر سلام سے پہلے اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی (☆)۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ فخر الاسلام درس میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

ویری الخروج من الصلوٰۃ بضرطۃ　　　این الضراط من السلام علیکم

وہ گوز کے ساتھ نماز سے نکلنا صحیح خیال کرتے ہیں، گوز، السلام علیکم کی جگہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے اس مسئلہ کی وجہ سے دو ضعیف فرعی مسئلے نکالے ہیں۔ ایک وہ جو عبدالملک نے عبدالملک سے روایت کیا ہے کہ جس نے دل لگی کرتے ہوئے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اس نے اگر چار رکعتوں کی نیت کی تھی تو یہ اس کی دو رکعتیں جائز ہو جائیں گی یہ اہل عراق کا مذہب ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ غیر مقبول کتب میں ہے کہ امام تشہد کے بعد سلام سے پہلے جب جان بوجھ کر حدث لاحق کرے تو اس کے مقتدیوں کی نماز جائز ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس کی طرف فتویٰ میں توجہ نہیں دی جاتی اگرچہ اس کے ساتھ یاد کے لئے مجالس آباد ہوں۔

چوتھا قول: جلوس اور سلام فرض ہے اور تشہد واجب نہیں، یہ حضرت مالک بن انس، آپ کے اصحاب اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے: اور انہوں نے یہ کہہ کر استدلال کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ اور اُم القرآن (سورۂ فاتحہ) کے علاوہ ذکر میں سے کوئی چیز واجب نہیں۔

پانچواں قول: یہ ہے کہ تشہد اور جلوس دونوں واجب ہیں اور سلام واجب نہیں ہے۔ یہ ایک جماعت کا قول ہے جس میں اسحاق بن راہویہ بھی ہے۔ اسحاق نے حضرت ابن مسعود کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تشہد کی تعلیم دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی اور جو تجھ پر لازم تھا وہ تو نے ادا کر دیا'' (1)۔

دارقطنی نے کہا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی'' (2)۔ بعض راویوں نے اس جملہ کو زہیر کی طرف سے حدیث میں داخل کیا ہے اور اس نے نبی کے کلام کے ساتھ اس کو ملا دیا ہے اور شبابۃ نے زہیر سے روایت کر کے علیحدہ ذکر کیا ہے اور اس جملہ کو حضرت ابن مسعود کے کلام سے شمار کیا ہے یہ قول زیادہ درست ہے بنسبت اس کے قول کے جس نے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ شبابۃ ثقہ شخص ہے۔ غسان بن ربیع نے اس پر ان کی

1۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ احناف کے نزدیک صورت حال یہ نہیں۔ اگر اسے اس حالت میں حدث لاحق ہو جائے تو وہ وضو کرے گا اور بنا کرتے ہوئے سلام پھیرے گا تب نماز مکمل ہو گی جس طرح ہدایہ شریف میں اس کی تصریح ہے اور اگر وہ اس حالت میں جان بوجھ کر حدث لاحق کرے گا تو صورت حال مختلف ہو گی۔ مترجم

متابعت کی ہے حدیث کے آخر کو اس نے بھی حضرت ابن مسعود کا کلام بتایا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے مرفوع روایت نہیں کی۔

**مسئلہ نمبر 18**: سلام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ واجب ہے، بعض نے فرمایا: واجب نہیں ہے لیکن حضرت عائشہ اور حضرت علی کی صحیح حدیث کی وجہ سے اس کے وجوب کا قول صحیح ہے۔ حضرت علی کی حدیث ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے سفیان ثوری نے حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل سے انہوں نے حضرت محمد بن حنفیہ سے انہوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے'' (1)۔ یہ حدیث تکبیر اور سلام کے وجوب میں اصل ہے کوئی دوسری چیز ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ستر اسماء کے ساتھ نماز کو شروع کرے اور تکبیر تحریمہ نہ کہے تو یہ جائز نہ ہوگا اور اگر سلام سے پہلے حدث لاحق ہو گیا تو بھی جائز نہ ہوگا۔ یہ عبدالرحمن بن مہدی کی طرف سے حضرت علی کی حدیث کی تصحیح ہے اور عبدالرحمن بن مہدی علم حدیث میں اور صحیح وسقیم کی پہچان میں امام ہیں۔ تیرے لئے یہی کافی ہے۔

علماء نے آغاز کے وقت تکبیر کے وجوب میں اختلاف کیا ہے:

**مسئلہ نمبر 19**: ابن شہاب زہری، سعید بن مسیب، اوزاعی، عبدالرحمن اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب نہیں ہے۔ امام مالک سے مقتدی کے بارے میں ایک روایت ہے جو اس قول پر دلیل ہے لیکن امام مالک کا مذہب صحیح یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب ہے۔ یہ فرض ہے اور نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور یہی صواب ہے اور یہی جمہور کا نظریہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اس قول کی مخالفت کی اس کا مقابلہ سنت سے کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 20**: علماء کا اختلاف ہے اس لفظ کے بارے میں جس کے ساتھ نمازی نماز میں داخل ہو۔ امام مالک ان کے متبعین اور جمہور علماء نے کہا: تکبیر کے بغیر نماز میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تکبیر کی جگہ تحلیل، تسبیح تعظیم اور تحمید جائز نہیں۔ یہ حجازیوں اور اکثر عراقیوں کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ کوئی کلمہ جائز نہیں۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے اور انہوں نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اللہ الاکبر اور اللہ الکبیر بھی جائز ہے۔

امام مالک کی حجت حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی قرأت کے ساتھ شروع فرماتے تھے'' (2)۔ حدیث علی میں ہے نماز کی تحریم تکبیر ہے۔ اعرابی کی حدیث میں ہے: فکبّر (3) (تکبیر کہہ)۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور علی بن محمد طنافسی نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں ابواسامہ نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے عبدالحمید بن جعفر نے بتایا فرمایا: ہمیں محمد بن عمرو بن عطاء نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت ابوحمید ساعدی کو یہ فرماتے ہوئے سنا، رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف رخ کرتے اور اپنے ہاتھوں

1۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 40، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ ومایفتتح بہ ویختم بہ وصفۃ الرکوع والاعتدال الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 3، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کو بلند کرتے اور اللہ اکبر کہتے (1)۔ یہ صریح نص ہے صحیح حدیث ہے جو لفظ تکبیر کی تعیین کر رہی ہے۔ شاعر نے کہا:

رأیت اللہ اکبر کل شیء　　محاولۃً و اعظمہ جنوداً

میں نے دیکھا اللہ تعالیٰ از روئے تدبیر ہر چیز سے بڑا ہے اور از روئے لشکر عظیم ہے۔

پھر یہ قدم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے جبکہ کبیر اور عظیم اس کو اپنے ضمن میں نہیں لیتے۔ پس یہ معنی میں زیادہ بلیغ ہو گا۔ واللہ اعلم

امام ابوحنیفہ نے کہا: اگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے نماز کو شروع کرے تب بھی جائز ہے اور اگر اللھم اغفرلی کہا تو جائز نہ ہو گا محمد بن حسن کا بھی یہی قول ہے۔ ابو یوسف نے فرمایا: جب تکبیر اچھی طرح کہہ سکتا ہو تو اور کلمات جائز نہیں۔ حکم بن عتیبۃ نے فرمایا: جب تکبیر کی جگہ اللہ کا ذکر کر دے تو جائز ہو گا۔ ابن منذر نے کہا: میں اس بات میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ جو قرأت اچھی طرح کر سکتا ہو وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور تکبیر کہہ دے اور قراءت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے۔ پس جس کا یہ مذہب ہے اس کو یہ کہنا لازم ہے کہ تکبیر کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہ ہو جیسا کہ قراءت کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا: فارسی میں تکبیر جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو۔ ابن المنذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جماعات سے اختلاف ہے اور اس کا خلاف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سکھایا۔ ہم کوئی ایسا شخص نہیں جانتے جس نے امام ابوحنیفہ کی اس قول میں موافقت کی ہو۔

**مسئلہ نمبر 21:** امت کا تکبیر تحریمہ کے وقت نیت کے وجوب پر اتفاق ہے۔ جو ہمارے اصحاب نے روایت کیا ہے اس پر مزید کلام آیت طہارت میں آئے گا۔ اس کی حقیقت آمر کے تقرب کا قصد کرنا ہے ایسے فعل کے ساتھ جس کا اس نے حکم دیا ہے جیسا کہ اس نے وہ فعل طلب کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: نیت میں اصل یہ ہے کہ اس کا عقد، اس فعل کے کرنے کے ساتھ ہو جس کی نیت کی گئی ہے یا استصحاب کی شرط کے ساتھ اس فعل سے قبل نیت ہو۔ اگر پہلے نیت کی ہو پھر غفلت طاری ہو جائے حتیٰ کہ اس حالت میں عبادت میں تلبس واقع ہو تو اس نیت کا اعتبار نہ ہو گا جس طرح اس نیت کا اعتبار نہیں ہوتا جب فعل میں تلبس کے بعد واقع ہو۔ روزے میں نیت کے مقدم کرنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ اس کے آغاز میں نیت متصل کرنے میں حرج واقع ہوتی ہے۔

ابن عربی نے کہا ابوالحسن قروی نے ہمیں عسقلان کی سرحد پر کہا کہ میں نے امام الحرمین کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نماز پڑھتے وقت نیت کرے اور وہ صانع میں نظر کرے، عالم کے حدوث کو دیکھے نبوت کو دیکھے، حتیٰ کہ اس کی نظر نماز کی نیت تک پہنچ جائے۔ فرمایا: اس کے لئے اسے طویل زمانہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک لمحہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ جملوں کی تعلیم تو طویل زمانہ کی محتاج ہے اور ان چیزوں کو ذہن میں یاد کرنا ایک لمحہ میں ہوتا ہے۔ نیت کی تکمیل میں سے یہ ہے کہ نیت پوری نماز میں متصل ہو مگر جب یہ امر مشکل ہوا تو شریعت نے نماز کے درمیان میں نیت کے جدا ہونے کو معاف فرما دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 58، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا باب افتتاح الصلوٰۃ، حدیث 794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں نے اپنے شیخ ابوبکر الفہری (☆) کو مسجد اقصیٰ میں یہ فرماتے سنا کہ محمد بن سحنون (☆☆) نے فرمایا: میں نے اپنے باپ سحنون کو دیکھا بعض دفعہ جب وہ نماز مکمل کر لیتے تو دوبارہ پڑھتے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: نماز کے دوران میری نیت جدا ہوگئی تھی اسی وجہ سے میں نے نماز کا اعادہ کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ نماز کے اجمالی احکام تھے اور تفصیلی احکام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ رکوع، جماعت کے ساتھ نماز، قبلہ، اوقات کی طرف جلدی کرنا اور نماز خوف کا ذکر تو اسی سورت میں آجائے گا۔ قصر نماز اور خوف کی نماز سورۂ نساء اور اوقات کا ذکر سورۂ ہود، سبحان اور سورۂ روم میں آئے گا اور رات کی نماز (تہجد) کا ذکر سورۂ المزمل میں آئے گا اور سجدہ تلاوت کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا اور سجدہ شکر کا ذکر سورۂ ص میں آئے گا۔ ان شاء اللہ ہر ایک کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 22:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

رَزَقْنٰهُمْ کا معنی ہے، ہم نے انہیں عطا کیا۔ اہل سنت کے نزدیک رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ معتزلہ کا مسلک اس کے مخالف ہے۔ ان کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے کیونکہ اس کا تملک صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ حرام عطا نہیں فرماتا بلکہ حلال عطا فرماتا ہے اور رزق ملک کے معنی میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ایک بچہ چوروں کے ساتھ پرورش پائے اور اس نے کچھ نہ کھایا مگر وہ جو چوروں نے اسے کھلایا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوا، طاقتور ہوا اور چور بن گیا پھر وہ ہمیشہ چوری کرتا رہا اور مرتے دم تک چوری کا مال کھاتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی چیز عطا نہ فرمائی کیونکہ اس کا اسے مالک نہیں بنایا تھا اور وہ مر گیا اور اس نے اللہ کے رزق سے کچھ نہ کھایا۔

یہ قول اور نظریہ فاسد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رزق بمعنی تملیک ہوتا تو واجب تھا کہ بچے کو رزق نہیں دیا گیا اور ان جانوروں کے بچوں کو بھی رزق نہیں ملا کیونکہ ان کی ماؤں کے دودھ کا مالک تو ان کا مالک تھا نہ کہ جانوروں کے بچے۔

جب امت کا اس پر اجماع ہے کہ بچہ اور جانوروں کے بچے اور دوسرے جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے حالانکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ رزق صرف غذا ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ غلاموں اور جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے جبکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا رزق وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جو معتزلہ نے بیان کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (فاطر: 3)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ (الذاریات) (بلاشبہ اللہ ہی (سب کو) روزی دینے والا قوت والا (اور) زور والا ہے) اور فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)۔ یہ آیات قطعی ہیں، اللہ تعالیٰ حقیقۃً رازق ہے اور بندہ مجازاً رازق ہے کیونکہ اس کا مالک ہونا عارضی ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ فاتحہ میں بیان کیا ہے۔ بندے کو بھی حقیقۃً ان جانوروں کی طرح رزق

---

☆ محمد بن ولید اندلسی طرطوشی شیخ المالکیہ، وفات 520ھ ☆☆ عبدالسلام بن حبیب تنوخی حمص مالکی، قاضی قیروان صاحب المدونہ

دیا گیا ہے جن کو کوئی ملکیتِ حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسے کسی چیز کے حاصل کرنے کا اذن دے دیا گیا تو وہ حکماً اس کے لئے حلال ہوگی اور جس کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کا لینا حکماً حرام ہے اور یہ تمام رزق ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استنباط کیا ہے: **كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝** (سبا) (کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور)۔

فرمایا: مغفرت کا ذکر یہ اشارہ کرتا ہے کہ رزق کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ، رزق مصدر ہے رزق یرزق رزقاً و رِزقاً کا اور الرزق راء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور الراء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس کی جمع ارزاق ہے اور الرزاق کا مطلب ہے الرازقیہ اولی سفید کپڑوں کو کہتے ہیں۔ ارتزق الجند کا مطلب ہے دس بکریوں نے اپنا اپنا رزق حاصل کیا۔ الرزقۃ ایک مرتبہ لینا، اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: الرزق کا معنی ازدشنوہ لغت میں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں رزق کا معنی شکر ہے: **وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝** (واقعہ) یعنی تمہارا شکر جھٹلانا ہے۔ رزقنی کا معنی ہے: شکرنی اس نے میرا شکر ادا کیا۔

**مسئلہ نمبر 24**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یُنْفِقُوْنَ اس کا معنی ہے: وہ نکالتے ہیں۔ انفاق کا معنی ہاتھ سے مال نکالنا ہے اسی سے ہے نفق البیع یعنی بیع بائع کے ہاتھ سے نکل کر خریدنے والے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نفقت الدابۃ یعنی جانوروں کی روح نکل گئی۔ اسی سے ہے: النافقاء اس چوہے کی بل کو کہتے ہیں جب وہ اپنی بل سے نکل جاتا ہے، جب بل کی دوسری طرف کو اختیار کرتا ہے اسی سے المنافق ہے کیونکہ وہ ایمان سے نکل جاتا ہے یا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ نیفق السراویل معروف ہے۔ شلوار کا وہ حصہ جہاں سے پاؤں نکالا جاتا ہے۔ نفق الزاد کا معنی ہے زادراہ ختم ہوگیا، مالک نے اسے خرچ کردیا۔ انفق القوم قوم کا زادراہ ختم ہوگیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ** (الاسراء: 100) (سو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہوجائیں)۔

**مسئلہ نمبر 25**: اس آیت میں نفقہ کی مراد کو متعین کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ فرضیہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ نماز کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انسان کا اپنے اہل پر خرچ کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا افضل صدقہ ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک دینار وہ ہے جو تو نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے غلام آزاد کرنے میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے مسکین پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا، ان سب سے از روئے اجر کے عظیم وہ دینار ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا(1)''۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''افضل دینار وہ ہے جو آدمی اپنے عیال پر خرچ کرتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک واثم من ضیعهم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے اور وہ دینار جو الله کے راستہ میں (جہاد کے لئے) اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جو الله کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔ ابو قلابہ نے کہا: عیال سے آغاز فرمایا پھر ابو قلابہ نے کہا: کون سا شخص اس شخص سے زیادہ اجر والا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ انہیں بچاتا ہے یا الله تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ نفع دیتا ہے اور انہیں غنی کرتا ہے" (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ضحاک سے مروی ہے کہ زکوٰۃ کا ذکر لفظ مخصوص زکوٰۃ کے ساتھ آتا ہے جب زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنے کا ذکر آئے تو فرضی اور نفلی دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور جب انفاق کے لفظ کے ساتھ آئے تو نفلی خرچ ہی مراد ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا: نفقہ ایک قرب تھا لوگ اس کے ساتھ الله تعالیٰ کا قرب اپنے اخلاص کے مطابق حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ فرضی صدقات اور ناسخات کا حکم سورۂ برأت میں نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ وہ واجبی حقوق ہیں جو مال کو لاحق ہوتے ہیں کیونکہ الله تعالیٰ نے جب اسے نماز کے ساتھ ملایا تو یہ فرض تھا جب لفظ زکوٰۃ سے عدول فرمایا تو زکوٰۃ کے علاوہ فرض مراد ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عام ہے اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ یہاں جو انہیں دیا گیا ہے اس سے خرچ کرنا مدح کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور یہ صرف حلال مال میں ہوتا ہے یعنی وہ عطا کرتے ہیں جو شرع نے اس پر لازم کیا زکوٰۃ اور دوسرے مالی حقوق جو بعض احوال میں لاحق ہوتے ہیں جبکہ اس خرچ کی طرف انہیں رغبت بھی دی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ایمان بالغیب، دل کا نصیبہ ہے اور نماز قائم کرنا بدن کا حصہ ہے اور وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ مال کا حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے۔ بعض متقدمین مفسرین نے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تاویل میں فرمایا: جو ہم نے انہیں سکھایا وہ سکھاتے ہیں۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم القشیری نے حکایت کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

"اور وہ جو ایمان لائے اس پر (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) جو اتارا گیا ہے آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں"۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اہل کتاب کے مومن ہیں جیسے حضرت عبد الله بن سلام۔ ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی اور پہلی آیت عرب کے مومنین کے بارے نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: دونوں آیتیں مومنین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسی بنا پر الَّذِيْنَ کا اعراب عطف کی وجہ سے مجرور ہے اور استیناف کی بنا پر رفع ہونا بھی صحیح ہے یعنی اس سے پہلے هم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور جنہوں نے دونوں آیتوں سے دونوں علیحدہ علیحدہ قسمیں مراد لی ہیں ان کے نزدیک الَّذِيْنَ کا اعراب مبتدا ہونے کی وجہ سے رفع ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى ہے اور عطف کے احتمال کی وجہ سے جر کا احتمال بھی رکھتا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد بِمَآ اُنْزِلَ اس سے مراد قرآن ہے وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد سابقہ کتب ہیں بخلاف اس کے جو یہود و نصاریٰ نے کہا جیسا کہ الله تعالیٰ نے خود ان کے متعلق بتایا وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک واثم من ضیعھم او حبس النھم، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

عَلَيْنَا (البقرہ:91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ تو یہود و نصاریٰ نے کہا ہم غیب پر ایمان لائے جب یہ آیت نازل ہوئی وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ تو انہوں نے کہا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جب وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا حکم نازل ہوا تو کہنے لگے: ہم خرچ کرتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ تو بدک پڑے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کتنی کتب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک سو چار کتب نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور اخنوخ (حضرت ادریس علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت ابراہیم پر دس صحائف نازل فرمائے، تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ اسلام پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ تورات، انجیل۔ زبور اور فرقان نازل فرمائیں۔ اس حدیث کو حسین آجری اور ابو حاتم البستی نے نقل کیا ہے۔

ایک مسئلہ: اگر کہنے والا کہے سابقہ تمام کتب پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جبکہ ان کے احکام منافی ہیں؟ اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے پہلی شریعتوں کی پابندی کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان سے ایمان لانا منسوخ نہیں ہوا۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے متقدمہ شرائع کے التزام کو واجب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (یعنی وہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کے متعلق جانتے ہیں)۔ الیقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یقنت الامر یقناً وایقنت واستیقنت و تیقنت ان تمام کا معنی ایک ہے میں یقین پر ہوں۔ موقن میں یا ماقبل ضمہ کی وجہ سے واؤ سے بدل گئی ہے جب تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اصل کی طرف لوٹا دے گا۔ تو کہے گا: مُيَيْقِنٌ تصغیر اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے اسی طرح جمع بھی اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ بعض اوقات ظن کو یقین کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اس سے لغو قسم میں ہمارے علماء کا قول ہے کہ وہ اللہ کی قسم اٹھائے ایک ایسے امر پر جس کا اسے گمان ہو پھر اس کے لئے ظاہر ہو کہ معاملہ تو اس کے خلاف تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

شاعر نے کہا:

تحسب هوّاس وایقن انی     بها مفتد من واحدٍ لا أغامره

آخرت، تاخر سے مشتق ہے ہم سے اس کے تاخر کی وجہ سے اور ہمارے اس سے تاخر کی وجہ سے اسے آخرت کہا جاتا ہے جیسا کہ دنیا، دنو سے مشتق ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

## اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں"۔

نحاس نے کہا: اہل نجد کہتے ہیں: أُلاك، بعض کہتے ہیں: أُلالِك، ك خطاب کے لئے ہے۔ کسائی نے کہا: جس نے اولئك

کہا اس کا واحد ذالك ہے اور جس نے الاك کہا اس کا واحد ذاك ہے اور اُلالِك، اولئك کی مثل ہے۔ ابن سکیت نے شعر کہا ہے:

الالِك قومی لم یکونوا اشابۃ و هل یعظ الضلیل الا اُلالكا

اس شعر میں الالك کا معنی اولئك ہے۔

بعض کہتے ہیں: اولئك غیر عقلاء کے لئے ہے۔ شاعر نے کہا:

ذم المنازل بعد منزلۃ اللوی والعیش بعد اولئك الایام

اس میں اولئك غیر عقلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (الاسراء)

ہمارے علماء نے فرمایا: مِّنْ رَّبِّهِمْ کے کلمات میں قدریہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ وہ ایمان اور ہدایت خود گھڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے پاک ہے۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح قدریہ نے کہا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا: من انفسھم اس پر اور ھدیٰ پر کلام گزر چکی ہے اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، هُمُ میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ دوسرا مبتدا ہو اور اس کی خبر الْمُفْلِحُوْنَ ہو۔ پھر یہ مبتدا خبر اُولٰٓىِٕكَ مبتدا کی خبر ہوں، اور یہ بھی جائز ہے کہ هُمُ زائدہ ہو۔ بصری علماء اسے فاصلہ کہتے ہیں اور کوفی علماء اسے عماد کہتے ہیں اور الْمُفْلِحُوْنَ، اُولٰٓىِٕكَ کی خبر ہو۔

الفلح کا لغوی معنی الشق اور القطع (پھٹنا اور کاٹنا) ہے۔ شاعر نے کہا

ان الحدید بالحدید یفلح

لوہے کے ساتھ لوہا کاٹا جاتا ہے۔

اسی سے فلاحۃ الارضین ہے جو زمین کو کھیتی کے لئے پھاڑتا ہے۔ یہ مفہوم ابوعبید نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کسان کو فلاح کہا جاتا ہے، جس کا نچلا ہونٹ کاٹا گیا ہو اسے افلح کہا جاتا ہے۔ جس کا شق ظاہر ہو۔ گویا مفلح مصائب و مشکلات کو کاٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے، کبھی یہ غور و بقا میں استعمال ہوتا ہے، یہ لغت میں اس کی اصل ہے۔ اس سے مرد کو اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے۔

استفلحی بامرك اس کا معنی ہے: اپنے امر میں کامیاب ہو جا۔ شاعر نے کہا:

لو کان حی مدرك الفلاح ادرکه ملاعب الرماح

اس میں فلاح کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اضبط بن قریع سعدی نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

لکل هم من الهموم سعه والمسیٔ والصبح لا فلاح معه

شاعر نے یہاں بھی فلاح کو کامیابی و کامرانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

کسی نے کہا:

لیس مع کر اللیل والنہار بقاء

رات اور دن کی گردش کے ساتھ بقا نہیں۔

ایک اور نے کہا:

نُحِل بلاداً کلھا حل قبلنا ونرجو الفلاح بعد عاد و حمیر

ہم ان تمام شہروں میں اترے جس طرح ہمارے بزرگ اترے اور ہم عاد اور حمیر کے بعد فلاح کی امید کرتے ہیں۔

عبید نے کہا:

افلح بما شئت فقد یدرک بالض عف و قد یخدع الاریب

جس کے ساتھ چاہے کامیاب ہو جا، ضعف و کمزوری ضرور آئے گی، کبھی ذہین و فطین بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔

**اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** کا معنی ہے جنت کی کامیابی حاصل کرنے والے اور اس میں باقی رہنے والے۔ ابن ابی اسحاق نے کہا: **الْمُفْلِحُوْنَ** سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ سب کچھ پالیا جو انہوں نے طلب کیا اور اس شر سے بچ گئے جس سے وہ بھاگے تھے، یہ ایک معنی ہے۔ کبھی الفلاح، السحور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ حدیث ہے ''حتی کاد یفوتنا الفلاح مع رسول الله ﷺ قلت و ما الفلاح قال السحور'' (1) حتیٰ کہ قریب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا فلاح فوت ہو جاتا۔ میں نے پوچھا: الفلاح کیا ہے؟ فرمایا: سحری کا کھانا۔ تو حدیث کا معنی یہ ہے کہ سحری کھانے کے ساتھ روزے کی بقا ہے، اسی وجہ سے سحری کے کھانے کو فلاح کہا جاتا ہے الفلاح، کرایہ پر جانور دینے والے کو کہتے ہیں۔

لھا رطل تکیل الزیت فیہ وفلاح یسوق لھا حمارا

پھر الفلاح عرف میں، مطلوب کی کامیابی اور خوفناک چیز سے نجات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

**مسئلہ:** اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حمزہ نے یہ کیسے پڑھا۔ علیھُم والیھُم و لدیھُم جبکہ، من ربھُم اور فیھُم اور جنتیھُم نہیں پڑھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علیھم الیھم و لدیھم میں یا الف سے بدلی ہوئی ہے۔ اصل میں علاھم، لداھم اور الاھم تھے۔ پس ھا اپنے ضمہ پر قائم ہے اور فیھم، من ربھم اور جنتیھم میں ایسا نہیں ہے۔ کسائی نے علیھم الذلہ اور الیھم اثنین میں حمزہ کی موافقت کی ہے۔ ان کے متعلق قراء سے یہی معروف ہے۔

**اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝**

''بے شک جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

جب پہلے مومنین اور ان کے احوال کا ذکر فرمایا تو کافروں اور ان کے انجام کا اب ذکر ہو رہا ہے۔ کفر، ایمان کی ضد ہے،

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیہا، باب ماجاء فی قیام شہر رمضان، حدیث نمبر 1316، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت میں یہی مراد ہے کبھی کفر کا لفظ نعمت اور احسان کی ناشکری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، حدیث کسوف میں عورتوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اسی معنی میں ہے۔ فرمایا: و رایت النار فلم ار منظراً کالیوم قط افظع و رایت اکثر اھلھا النساء قیل بمَ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال بکفرھن قیل أیکفرن باللہ۔ قال یکفرن العشیر و یکفرن الاحسان لو احسنت الی احداھن الدھر کلہ ثم رات منك شیئاً قالت ما رایت منك خیراً قط (1) (بخاری) میں نے جہنم دیکھی اور میں نے آج کی طرح کبھی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیوں؟ فرمایا: ان کے کفر کی وجہ سے۔ عرض کی گئی: کیا یہ اللہ سے کفر کرتی ہیں؟ فرمایا: یہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تو ان میں سے کسی سے پورا زمانہ احسان بھی کرے کبھی تجھ سے کوئی تھوڑی سی کمی دیکھے گی تو کہے گی: میں نے تجھ سے کبھی خیر نہیں دیکھی۔

عرب کلام میں کفر کی اصل ڈھانپنا اور پردہ ڈالنا ہے۔ شاعر کا قول ہے: فی لیلۃ کفر النجوم غمامھا۔ (رات کے بادلوں نے ستاروں کو چھپا دیا)۔ اسی وجہ سے رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تاریکی کے ساتھ ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فتذکرا ثقلا رثیداً بعدما　　　　القت ذکاء یمینھا فی کافر

یہاں کافر ڈھانپنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ذکاء، (ذال کے ضمہ اور مد کے ساتھ) یہ سورج کا اسم ہے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

فوردت قبل انبلاج الفجر　　　　و ابن ذکاء کامن فی کفر

وہ فجر پھوٹنے سے پہلے آئی جبکہ سورج رات میں چھپا ہوا تھا۔

کافر دریا، اور بڑی نہر کو کہتے ہیں، کافر، کسان کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع کفار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ** (الحدید:20) یعنی کسان، کیوں کہ وہ دانے کو (زمین میں) چھپاتے ہیں۔ رماد مکفور چھپائی گئی راکھ۔ سفت الریح علیہ التراب ہوا نے اس پر مٹی اڑائی۔ الکافر من الارض اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے دور ہو اور کوئی وہاں اترتا نہ ہو اور کوئی وہاں سے گزرتا نہ ہو۔ پس جو ایسی جگہوں پر اتریں انہیں اھل الکفور کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: الکفور یعنی دیہات۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ** یعنی ان کے نزدیک آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یعنی ان پر یہ برابر ہے، برابری کی وجہ سے استفہام کو لایا گیا۔ اس کی مثل ہے: **سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ** (الشعراء:136)

شاعر نے کہا: اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ، حدیث نمبر 993، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و لیل یقول الناس من ظلماته سواء صحیحات العیون و عورها

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ءَاَنْذَرْتَهُمْ الانذار کا معنی ابلاغ اور اعلام (آگاہ کرنا) ہے اور یہ معنی صرف تخویف (ڈرانے) کی صورت میں ہوتا ہے جس سے بچنے کا زمانہ وسیع ہو۔ اگر بچنے کے لئے اس کا زمانہ وسیع نہ ہو تو اشعار ہوگا، انذار نہ ہوگا۔ شاعر نے کہا:

انذرت عمراً و هو فی مهل قبل الصباح فقد عصی عمرو

تناذر بنو فلان هذا الامر، بولا جاتا ہے جب بعض، بعض کو اس امر سے ڈرائیں۔

علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظ کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا معنی اس شخص کے حق میں خاص ہے جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ آگاہ کر دے اس بات پر کہ لوگوں میں اس حال والے بھی کچھ لوگ ہوں گے، کسی کو متعین نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عباس اور کلبی نے فرمایا: یہ آیت یہود کے رؤساء کے بارے نازل ہوئی جس میں حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور ان جیسے دوسرے یہودی تھے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کفار کے سرداروں میں بدر کے دن قتل ہوئے تھے (1)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پس جنہوں نے کسی کو متعین کیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس پر غیب کھل گیا کہ اس کی موت کفر پر ہوگی۔ یہ اس آیت کے ضمن میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ ترکیبی اعتبار سے مرفوع ہے اور ان کی خبر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی خبر ہے سَوَآءٌ اور اس کے بعد والا کلام صلہ کے قائم مقام ہے۔ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: سَوَآءٌ مبتدا کے اعتبار سے مرفوع ہے ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ خبر ہے، اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ نحاس نے کہا: یعنی وہ بیوقوف ہیں انہیں ڈرانا کچھ مفید نہیں۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل مدینہ، ابو عمرو، اعمش اور عبد اللہ بن ابی اسحاق نے پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے، خلیل اور سیبویہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ یہ قریش اور سعد بن بکر کی لغت ہے، اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے۔

ایا ظبیه الوعساء بین جلاجل و بین النقا آنت ام ام سالم

اس میں آنت پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ ہے۔

اس شعر میں آنت ایک الف کے ساتھ آیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

تطاللت فا ستشرفته فعرفته فقلت له آنت زید الارانب

میں نے اسے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان لیا میں نے اسے کہا: کیا تو خرگوشوں والا زید ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن محیصن سے مروی ہے کہ انہوں نے انذرتھم ام لم تنذرھم پڑھا ہے یعنی صرف ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے بعد الف نہیں پڑھا، دو ہمزوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ایک کو حذف کیا گیا ہے یا اس لئے کہ ام استفہام پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

تروح من الحی ام تبتکر و ماذا یضیرك ولو تنتظر

اس میں شاعر نے ہمزہ کو حذف کیا ہے۔

تروح سے مراد أتروح لیا ہے اور ام پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ابی اسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے (أأنذرتھم) پڑھا ہے۔ پس انہوں نے دو ہمزوں کو قائم رکھا ہے اور ان کے درمیان الف داخل کیا ہے تا کہ دو ہمزے جمع نہ ہوں۔ ابو حاتم نے کہا: ان دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرنا اور دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ابو عمرو، اور نافع اکثر ایسا کرتے تھے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دو ہمزوں کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے(1) یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ قول ہے اور خلیل کے نزدیک یہ بعید ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ ثقل میں ضَنِنُوا کے مشابہ ہے۔ اخفش نے کہا: پہلے ہمزہ کی تخفیف اولیٰ ہے۔ یہ قول ردی ہے کیونکہ عرب استثقال کے بعد اور ایک حرف کی ادائیگی کے بعد تخفیف کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: دو ہمزوں کی تخفیف جائز ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مخالف ہے۔ اخفش نے کہا: سعید نے ہمزہ کو ھاء سے بدلا ہے اور ھانذرتھم پڑھا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ھیاك و ایاك۔ اخفش نے کہا: ھا انتم اصل میں أاءنتم تھا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٘ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

''مہر لگا دی الله تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: خَتَمَ اللّٰهُ اس آیت میں الله تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کو خَتَمَ اللّٰهُ کے ارشاد سے بیان فرمایا ہے۔ الختم ختمت الشیء ختماً فھو مختوم و مختّم (مبالغہ کے لئے شد پڑھی گئی ہے) کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی شے کو ڈھانپ دینا اور اسے باندھ دینا ہے حتیٰ کہ اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو۔ اس سے ختم الکتاب والباب اور اس کے مشابہ چیزیں ہیں حتی کہ اس کے اندر کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اس میں ہے اس کے علاوہ کچھ رکھا نہیں جا سکتا۔

اہل معانی نے فرمایا: الله تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو دس اوصاف کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ الختم، الطبع، الضیق، المرض، الرین، الموت، القساوۃ، الانصراف، الحمیۃ، الانکار۔ انکار کا ذکر اس آیت میں فرمایا: قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (النحل) الحمیۃ کے ذکر میں فرمایا: اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ (الفتح: 26) قساوت کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ذکر میں فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:22) الانصراف کے ذکر میں فرمایا: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ) موت کے بارے میں فرمایا: وَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام:122) اورفرمایا: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (الانعام:36) رین کے بارے فرمایا كَلَّا بَلْ ۫ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین) اور مرض کے بارے فرمایا: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ:10) الضیق کے بارے فرمایا: وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:125) الطبع کے بارے فرمایا: وَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ) اورفرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) اورالختم کے بارے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ (البقرہ:7) ان تمام کا بیان ان شاءاللہ اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2:** کبھی ختم (مہر لگا دینا) حسی ہوتا ہے اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں معنوی ختم مراد ہے۔ دلوں پر مہر لگانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو یاد نہ کرنا، اس کے مخاطبات کا مفہوم محفوظ نہ کرنا اور اس کی آیات میں غور وفکر نہ کرنا ہے اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو نہ سمجھنا جب ان پر تلاوت کیا جاتا ہے یا انہیں اللہ کی وحدانیت کی طرف بلایا جاتا ہے اور آنکھوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی مخلوقات اور اس کی مصنوعات کے عجائب میں غور وفکر کے لئے ہدایت حاصل نہ کرنا۔ یہ مفہوم حضرات ابن عباس، ابن مسعود، قتادہ وغیرہم نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس آیت میں بڑی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت وضلال، کفر وایمان کا خالق ہے۔ اے سننے والو! عبرت حاصل کرو، اے مفکرین! قدریہ فرقہ کی عقول پر تعجب کرو جو کہتے ہیں کہ ایمان وہدایت کا وہ خود خالق ہے، خَتَمَ کا معنی مہر لگانا ہے تو پھر ان کے لئے ایمان کہاں ہوگا اگرچہ وہ (ہزار) کوشش بھی کریں ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو پھر وہ کب ہدایت پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انہیں کون ہدایت دے گا جب کہ اللہ نے انہیں گمراہ کر دیا اور انہیں بہرہ کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (غافر:33)۔ (اور جسے گمراہ کر دے اللہ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں) اللہ کا فعل ان لوگوں کے بارے عدل ہے جن کو اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا کیونکہ اس نے انہیں حق سے نہیں روکا جو اس کے لئے واجب تھا ورنہ اس سے صفت عدل زائل ہو جائے گی انہیں اس چیز نے روکا کہ جو اس نے ان پر فضل فرمایا تھا نہ کہ اس چیز نے جو ان کے لئے ثابت تھی۔

اگر وہ کہیں کہ ختم، طبع، غشاوۃ سے مراد نام رکھنا، حکم لگانا اور خبر دینا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، نہ کہ یہ فعل کی خبر دی گئی ہے ہم کہیں گے: یہ قول فاسد ہے کیونکہ ختم اور طبع کی حقیقت وہ فعل ہے جس کی وجہ سے دل مطبوع ومختوم ہو جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی حقیقت نام رکھنا اور حکم لگانا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب کہا جاتا ہے: فلان طبع الکتاب وختمہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا فعل کیا جس کی وجہ سے کتاب مطبوع اور مختوم ہو گئی ہے نہ کہ نام رکھنا اور حکم لگانا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں ہے نیز امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف مجازاً کی ہے، یہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا

بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) (اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی) اور امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ طبع اور ختم ان کے دلوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ اور مومنین کی طرف بھی ممتنع ہے اگر ختم اور طبع نام رکھنا اور حکم لگانا ہوتا تو انبیاء اور مومنین کی طرف ممنوع نہ ہوتا کیونکہ وہ تمام کفار کا نام رکھ سکتے تھے کہ ان پر مہر لگائی گئی ہے ان کے دلوں پر ختم لگائی گئی ہے وہ گمراہی میں ہیں ایمان نہیں لائیں گے وہ تمام ان کفار پر حکم لگا سکتے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ ختم اور طبع معنوی ہے نام رکھنا اور حکم لگانا نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں پیدا فرماتا ہے جو اسے ایمان سے روکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد بھی ہے: كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (الحجر) (اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں وہ نہیں ایمان لائیں گے) اور فرمایا: وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (الانعام:25) (اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے)۔

**مسئلہ نمبر 4**: عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اس میں دلیل ہے کہ دل کو تمام اعضاء پر فضیلت حاصل ہے۔ دل انسان اور دوسری تمام چیزوں کا ہوتا ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو اور جو چیز معزز ہو وہ اس کا دل ہے۔ دل، فکر کا مقام ہے اصل میں یہ مصدر ہے قلبت الشیء اقلبه قلباً۔ جب کوئی کسی چیز کو اس کے آغاز پر لوٹا دے، تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے قلبت الاناء۔ میں نے برتن کو الٹا کر دیا پھر یہ لفظ نقل کیا گیا اور اس کے ساتھ اس عضو کا نام رکھا گیا جو معزز ترین عضو ہے کیونکہ خیالات جلدی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

ما سمی القلب الا من تقلبه فاحذر علی القلب من قلب و تحویل

قلب کو قلب اس کے پھرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے پس تو دل کی تبدیلی اور تحویل سے بچ۔

پھر جب عربوں نے اس مصدر کو اس شریف عضو کے لئے نقل کیا تو عظمت اس میں لازم ہو گئی۔ اس کے اور اس کی اصل کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دل کی مثال اس تنکا کی ہے ہوائیں جسے صحراء میں گھماتی رہتی ہیں'' (1)۔ اسی معنی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے: اللهم یا مثبت القلوب ثبت قلوبنا علی طاعتك (اے اللہ اے دلوں کو ثابت رکھنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر ثابت رکھ (2)۔) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنے عظیم منصب اور جلالت شان کے باوجود یہ دعا کرتے تھے تو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں یہ دعا بدرجہ اولیٰ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (الانفال:24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان)۔

**مسئلہ نمبر 5**: جوارح اگرچہ دل کے تابع ہیں لیکن کبھی دل، جوارح کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے اس تعلق کی وجہ سے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 10، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، مقدمہ، باب فی القدر، حدیث نمبر 84، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 18، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب فضائل صحابہ، باب فیما انکرت الجهمية، حدیث 194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو ظاہر اور باطن کے درمیان ہے، اگرچہ دل ان اعضاء کا رئیس اور مالک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے'' (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (اور اس کی سند صحیح ہے)۔ ''ایک شخص گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے'' (2)۔ فرمایا: یہی وہ الرین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس آیت کے اندر کیا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین)

مجاہد نے کہا: دل ہتھیلی کی مانند ہے ہر گناہ کی وجہ سے ایک انگلی بند ہو جاتی ہے۔ پھر مکمل بند کر دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: مجاہد کے اس قول میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ''جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو تو پورا جسم فاسد ہوتا ہے۔ خبردار وہ ٹکڑا دل ہے'' (3)۔ دلیل ہے ختم حقیقی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: دل صنوبر کے مشابہ ہوتا ہے مجاہد کا قول اس کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو احادیث بیان فرمائیں۔ ایک تو میں دیکھ چکا ہوں جبکہ دوسری کا منتظر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں نازل ہوئی پھر قرآن نازل ہوا، لوگوں نے قرآن سے اس کو جانا اور حدیث سے اس کو پہچانا۔ پھر ہمیں امانت کے اٹھ جانے کے متعلق بتایا۔ فرمایا: ایک شخص سوئے گا تو اس کے دل سے امانت اٹھالی جائے گی اس کا اثر ایک جلن کی مثل باقی ہو گا پھر وہ سوئے گا تو اس دل سے امانت اٹھالی جائے گی۔ پس اس کا اثر ایک چھالے کی مثل ہو گا جیسے تیرے پاؤں پر انگارہ گر جائے تو وہ جگہ پھول جاتی ہے تو اسے پھولا ہوا دیکھتا ہے حالانکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ نے کنکری اٹھائی اور اسے اپنے پاؤں پر لڑھکایا۔ لوگ بیع و شراء کرتے رہیں گے کوئی ایک بھی امانت ادا کرنے والا نہ ہو گا حتیٰ کہ کہا جائے گا: فلاں قبیلہ میں ایک امین شخص ہے حتیٰ کہ اس شخص کے متعلق کہا جائے گا وہ کتنا پختہ آدمی ہے، کتنا ہوشیار اور کتنا عقلمند آدمی ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہو گا، مجھ پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا کہ میں پرواہ نہیں کرتا تھا کہ میں کس سے بیع کر رہا ہوں، اگر وہ مسلمان ہو تو اس کا دین مجھ پر میری امانت لوٹا دے گا اور اگر وہ نصرانی ہو گا تو اس کا سردار مجھ پر لوٹا دے گا لیکن آج میں تم سے صرف فلاں فلاں سے بیع کرتا ہوں (4)۔ حدیث میں الوکت کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے تھوڑا سا اثر، کچی کھجور میں جب پکنے کا تھوڑا سا نشان لگتا ہے تو عرب کہتے ہیں قد وکت فھو موکت۔ اور المجل۔ اس سے مراد چھالہ ہے یعنی وہ پانی جو جلد اور گوشت کے درمیان ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر اپنے اس قول (کجمر دحرجتہ) سے فرمائی یعنی تو نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب باب قبح الکذب وحسن صدق و فضلہ، صفحہ 325، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب من سورۃ ویل للمطففین، صفحہ 169-168، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، صفحہ 13، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، حدیث 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

انگارے کو اپنے پاؤں پر گھمایا تو وہ پھول گیا، تو نے اسے ابھرا ہوا دیکھا...... یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ دل میں محسوس ہوتا ہے اس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اسی طرح الختم اور الطبع ہے۔

حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: دلوں کو نئے نئے فتنے لاحق ہوتے ہیں جیسے چٹائی ہوتی ہے، جس دل میں یہ فتنے راسخ ہو گئے اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور جو دل ان فتنوں کا انکار کرتا ہے اس میں سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دو دل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید جو صفا کی طرح ہوتا ہے اس کو کوئی فتنہ نقصان نہیں دے گا جب تک آسمان اور زمین قائم ہوں گی اور دوسرا دل سیاہ جس میں سیاہی ملی ہوتی ہے جیسے کوزہ ہوتا ہے جو ٹیڑھا ہوتا ہے وہ نیکی کو جانتا بھی نہیں وہ کسی برائی کا انکار نہیں کرتا، لیکن جو اس کے دل میں برائی راسخ ہو چکی ہوتی ہے (1) (وہ وہی کرتا ہے)۔

**مسئلہ نمبر 6**: دل کو فواد اور صدر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (فرقان: 32) اور فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الم نشرح) یعنی دونوں جگہ قلبك مراد ہے کبھی قلب سے مراد عقل لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: 37) یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک دل، عقل کا محل ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ اس آیت سے کانوں کو آنکھوں پر فضیلت دینے والے نے استدلال کیا ہے، کیونکہ کانوں کو آنکھوں پر مقدم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ (الانعام: 46) اور فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (النحل: 78)

فرمایا: کان چھ جہات، نور اور اندھیرے میں ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ صرف سامنے کی جہت کا ادراک کرتی ہے اور روشنی کے ذریعہ سے ادراک کرتی ہے۔ اکثر متکلمین نے کانوں پر آنکھوں کو فضیلت دینے کا قول کیا ہے کیونکہ کان صرف آوازوں اور کلام کا ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ جسموں، رنگوں اور تمام ہیئتوں کا ادراک کرتی ہے۔ جب اس کے تعلقات زیادہ ہیں تو یہ افضل ہوئی اور انہوں نے آنکھ کے ساتھ چھ جہتوں سے ادراک کو جائز قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ ابصار تو جمع اور سمع کو مفرد کیوں ذکر فرمایا؟ اسے کہا جائے گا: سمع کو مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر ہے قلت و کثرت کے لئے واقع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعت الشیء اسمعہ سمعاً و سماعاً۔ پس السمع، سمعت کا مصدر ہے اور السمع اس عضو کا اسم بھی ہے جس کے ساتھ سنا جاتا ہے اس کو مصدر کا نام دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: جب سمع کی اضافت جماعت کی طرف کی جائے تو یہ اس پر دلیل ہوتی ہے اس سے مراد جماعت کے کان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

بھا جیف الحسری فاما عظامھا فبیض واما جلدھا فصلیبٌ

یہاں جلد سے مراد جلود ہے۔ مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ جماعت کے لئے ایک جلد نہیں ہوتی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

اس کی مثل ایک اور شاعر نے کہا:

لا تنكر القتل و قد سُبينا      فی حلقكم عظمٌ و قد شجينا

اس شعر میں حلق سے مراد حلوق ہیں۔

اس کی مثل دوسرے شاعر کا قول ہے:

كانه وجه تركيين قد غضبا      مستهدف لطعان غير تذبيب

اس شعر میں وجه سے مراد وجهين ہے۔ شاعر نے کہا: وجه تركيين کیونکہ معلوم تھا کہ دو شخصوں کے لئے ایک وجہ (چہرہ) نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں اور وعلى اسماعهم بھی پڑھا گیا ہے، اور وعلى مواضع سمعهم کے معنی کا بھی احتمال ہے کیونکہ سمع پر مہر نہیں لگائی جاتی بلکہ سمع کی جگہ مہر لگائی جاتی ہے۔ پس مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے کبھی سمع بمعنی استماع بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعك حديثي . . . اي استماعك الي حديثي يعجبني۔ مجھے تیرا میری بات کو غور سے سننا اچھا لگتا ہے..... اسی مفہوم میں ذی الرمہ کا قول ہے جو ایک بیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاریوں اور کتوں کی آواز غور سے سنتا ہے۔

وقد توجس ركزا مقفر ندس      بنبأة الصوت ما فی سمعه كذب

یعنی اس کے استماع میں کذب نہیں یعنی وہ سچا غور سے سننے والا ہے، الندس کا معنی ہے حاذق، النبأة خفی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں الرکزہے، السمع (سین کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ) سے مراد انسان کا اچھائی کے ساتھ ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے: ذهب سمعه فی الناس یعنی لوگوں میں اس کا ذکر پھیل گیا۔ السمع بجو سے بھیڑیئے کے بچے کو بھی کہتے ہیں ...... وَعَلٰى سَمْعِهِمْ پر وقف ہے۔

**غِشَاوَةٌ** مبتدا ہے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ فی قلوبهم اور جو اس پر معطوف ہیں ان سب کی ضمیریں اس کے لئے ہیں جو الله کے علم میں ہیں کہ کفار قریش میں سے ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: منافقین کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: تمام کفار کے لئے ہے۔ یہ قول زیادہ عام ہے۔ **خَتَمَ** (مہر) دلوں اور کانوں پر ہے اور **غِشَاوَةٌ** آنکھوں پر ہے۔ الغشاء کا معنی ڈھانپنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: اسی سے غاشية السرج ہے۔ غشيت الشيء واغشيته۔ نابغہ نے کہا:

هلا سالت بنی ذبيان ماحسبی      اذا الدخان تغشى الاشمط البرما

تو نے بنی ذبیان سے کیوں نہیں پوچھا جو میرے لئے کافی ہے۔ دھواں ادھیڑ عمر والی قوم کے ساتھ شراب نہ پینے والے پر چھا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

صحبتك اذ عينی عليها غشاوةٌ      فلما انجلت قطعت نفسی الومها

میں نے تیری سنگت اختیار کی جبکہ میری آنکھوں پر پردہ تھا جب پردہ کھلا میں نے اپنے نفس کو ملامت کیا۔

ابن کیسان نے کہا: اگر اس کی جمع بنائی جائے تو یہ غِشَاوَۃٌ کے حذف کے ساتھ ہوگا۔ فراء نے اس کی جمع غشاوی ذکر کی ہے جیسے اداوی جمع ہے۔ غشاوۃ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل محذوف ہوگا اور یہ اس بات سے ہوگا علفتھا تبناً وماءً بارداً (میں نے اسے چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا)۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

یا لیت زوجك قد غدا متقلدا سیفا و رمحا

کاش! تیرا خاوند تلوار لٹکائے ہوئے اور نیزہ اٹھائے ہوئے جاتا۔

معنی ہے: اسقیتھا ماء میں نے اسے پانی پلایا، وحاملاً رمحاً۔ کیونکہ نیزہ گلے میں لٹکایا نہیں جاتا۔ فارسی نے کہا: تو یہ استعمال وسعت واختیار کی حالت میں نہیں پائے گا۔ غشاوہ پر رفع پڑھنا احسن ہے، واؤ عاطفہ ہوگی جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا اور فرمایا: میں نے غشاوہ سے واؤ کے ساتھ تصرف کرنے والا فعل نہیں سنا۔ بعض مفسرین نے کہا: کانوں اور آنکھوں پر غشاوہ ہے، وقف قُلُوْبِهِمْ پر ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا: مہر تمام پر ہے اور غِشَاوَۃٌ کا مطلب بھی خَتَمَ (مہر) ہے۔ اس صورت میں وقف غِشَاوَۃٌ پر ہوگا۔ حسن نے غشاوۃ غین کے ضمہ کے ساتھ، ابوحیوہ نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابوعمرو نے غشوہ پڑھا ہے اس نے اسے مصدر کی اصل کی طرف لوٹایا ابن کیسان نے فرمایا: غَشْوَۃ اور غِشْوَۃ پڑھنا جائز ہے اور بہتر غِشَاوَۃٌ ہے اسی طرح ہر لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز پر مشتمل ہونے پر دلالت کرے جیسے عمامہ، کنانۃ، قلادہ، عصابہ وغیرہ۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَهُمْ یعنی جھٹلانے والے کفار کے لئے عَذَابٌ عَظِیْمٌ عذاب عظیم ہے۔ عَظِیْمٌ، عَذَابٌ کی صفت ہے۔ عذاب کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً کوڑے مارنا، آگ کے ساتھ جلانا، لوہے سے کاٹنا وغیرہ جو بھی انسان کو تکلیف پہنچائے وہ عذاب ہے۔ قرآن میں ہے: وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور) اس کا معنی الحبس اور المنع (روکنا) ہے۔ لغت میں کہا جاتا ہے: اعذبہ عن کذا یعنی میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے عذوبۃ الماء ہے پانی کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ برتن میں پانی کو روکا جاتا ہے تا کہ صاف ہوجائے اور جو دوسرا مواد اس میں ملا ہوا ہے وہ جدا ہوجائے۔ اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اعذبوا نساءکم عن الخروج، یعنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا تو آپ نے فرمایا: اعذبوا عن ذکر النساء (انفسکم) اپنے نفسوں کو عورتوں کے ذکر سے روکو کیونکہ ان کا ذکر تمہیں جہاد سے محروم کرے گا۔ ہر وہ جسے تو کسی چیز سے روکے تو اس کے لئے اعذبتہ استعمال کر سکتا ہے۔ ضرب المثل میں ہے: لالجمنك لجاماً معذباً۔ (میں تمہیں ایسی لگام چڑھاؤں گا جو تجھے لوگوں پر چڑھنے سے روک لے گی)۔ کہا جاتا ہے: اعذب یعنی میں رک جاتا ہوں۔ اعذب غیرہ، غیر کو روکتا ہوں۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عذاب کو عذاب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی عذاب دیئے جانے والے کو روک دیتا ہے اور جسم کے مناسب سب خیر والی چیزوں کو اس سے روک لیتا ہے۔ اس کے مخالف چیزیں اس پر ڈالتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۟

''اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر حالانکہ وہ مومن نہیں''۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: سورۂ بقرہ میں مومنین کے بارے چار آیات نازل ہوئیں، دو آیات کافروں کے بارے نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسباط نے سدی سے وَ مِنَ النَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ علماء صوفیاء نے فرمایا: النَّاسِ اسم جنس ہے اور اسم جنس کے ساتھ اولیاء کو مخاطب نہیں کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: لفظ النَّاسِ کے بارے میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اسماء جموع میں سے ایک اسم ہے یہ بغیر لفظ کے انسان اور انسانۃ کی جمع ہے اس کی تصغیر نویس ہے۔ الناس، النوس سے مشتق ہے جس کا معنی حرکت ہے۔ کہا جاتا ہے: ناس ینوس یعنی حرکت کرنا۔ اسی سے ام زرع کی حدیث ہے أناس من حلی اذنی (1)۔ (زیورات سے میرے کانوں کو حرکت دی) بعض نے فرمایا: اس کی اصل نسی سے ہے۔ ناس کا اصل نسی ہے قلب ہوا ہے۔ پس نیس بن گیا یا مفتوح ماقبل فتح کی وجہ سے الف سے بدل گئی ہے پھر الف، لام داخل ہوا ہے، بعض نے فرمایا: اس کی اصل النَّاسِ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نسی آدم عهد الله فسمی انساناً۔ (آدم علیہ السلام اللہ کا عہد بھول گئے تو انہیں انسان کہا گیا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولی (2)۔ قرآن میں ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ:115) اس صورت میں ہمزہ زائدہ ہوگا۔ شاعر نے کہا

لاتنسین تلك العهود فانما		سمیت انسانا لانك ناسی

ان عہود کو مت بھول، تیرے بھولنے کی وجہ سے تجھے انسان کہا گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فان نسیت عهوداً منك سالفة		فاغفر فاول ناس اول الناس

اگر تو سابقہ عہود بھول گیا ہے تو توبہ کر۔ پہلا بھولنے والا پہلا انسان تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم کو انسان کہا گیا کیونکہ وہ حضرت حوا سے انس رکھتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اپنے رب سے انس رکھتے تھے، اس صورت میں ہمزہ اصلی ہوگا شاعر نے کہا:

وما سمی الانسان الا لانسه		ولا القلب الا انه یتقلب

انسان کو انسان اس کے انس کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور قلب کو قلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ پھرتا رہتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرۃ مع الاھل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ المعوذتین، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر3:** اللہ تعالیٰ نے مومنین کا پہلے ذکر فرمایا۔ ان کے شرف اور ان کی فضیلت کی وجہ سے ان سے آغاز فرمایا۔ ان کے مقابلہ میں پھر کافرین کا ذکر کیا کیونکہ کفر اور ایمان دو طرفیں ہیں۔ پھر ان کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا اور انہیں کافروں کے ساتھ ملایا کیوں کہ ان میں بھی ایمان نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

اس آیت میں کرامیہ فرقہ کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ ایمان زبان کے اقرار کا نام ہے اگرچہ دل میں اعتقاد نہ بھی ہو اور اس قول سے حجت پکڑی ہے: فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا (مائدہ:85) (تو عطا فرمائے اللہ نے بعوض اس قول کے جو وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا جو انہوں نے کہا اور دل میں تصدیق رکھی اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ ''مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ جب وہ یہ کہہ دیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے'' (1)۔ یہ کرامیہ کی عقل کا قصور اور فکر کا جمود ہے۔ قرآن و حدیث میں قول اور اعتقاد کے ساتھ عمل کا جو بیان ہے اس میں غور و فکر کے ترک کی وجہ سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان دل کی معرفت، زبان کے قول اور ارکان کے عمل کا نام ہے'' (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ محمد بن کرام سجستانی اور اس کے ساتھیوں کا جو نظریہ ہے وہ نفاق ہے اور عین شقاق ہے۔ ہم خذلان اور برے اعتقاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر4:** ہمارے علماء نے فرمایا: مومن کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس سے پیار کرتا ہے اور ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ نہ محبت کرتا ہے نہ اس سے پیار کرتا ہے بلکہ اس سے بغض رکھتا ہے اور اس سے دشمنی کرتا ہے، پس ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ایمان قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت و پیار کرتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر اختیار کرے گا تو اللہ اس سے بغض رکھتا ہے، اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے دشمنی رکھتا ہے اس کے موجودہ ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اس کفر اور گمراہی کی وجہ سے جس کے ساتھ وہ موافقت کرے گا۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک کافر وہ جس کو اللہ تعالیٰ یقیناً عذاب دے گا اور ایک کافر وہ جس کو عذاب نہیں دے گا۔ وہ کافر جسے عذاب دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو کفر سے آخر تک موافقت کرے گا۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس سے دشمنی کرتا ہے اور وہ کافر جس کو عذاب نہیں دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض نہیں ہوتا اور اس سے بغض نہیں رکھتا، بلکہ اس سے محبت و پیار کرتا ہے، اس کے موجودہ کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ایمان کی وجہ سے جس سے بالآخر وہ موافقت کرے گا۔ پس مطلق قول کرنا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر5:** مومن ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور کافر عذاب کا مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کی موافات (ایمان پر خاتمہ، کفر پر خاتمہ) کا اعتبار کرنا واجب ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر سے اس وقت بھی راضی تھا جب بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اسے ثواب دینے اور اس کے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بتوں کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ عزوجل وامرھم شوریٰ بینھم، حدیث 935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المقدمہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کرتے تھے بلکہ اس ایمان کی وجہ سے بالآخر جس سے انہوں نے موافقت کر لی تھی اور اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض تھا اس کی عبادت کی حالت میں بھی اس کے اس کفر کی وجہ سے بالآخر جس کے ساتھ اس نے موافقت کر لی تھی۔

قدریہ فرقہ والے اس مسئلہ میں مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابلیس پر اس کی عبادت کے وقت ناراض نہیں تھا اور عمر کی بتوں کی عبادت کے وقت عمر سے راضی نہیں تھا۔ یہ قول فاسد ہے۔ جب ثابت ہے کہ ابلیس جس کفر سے موافقت کرنی تھی اللہ اسے جاننے والا ہے اور عمر نے جس ایمان کی موافقت کرنی تھی اسے بھی جاننے والا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ابلیس پر اللہ تعالیٰ ناراض تھا اور عمر پر راضی تھا اس پر امت کا اجماع دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا نہیں جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ دوزخی ہے بلکہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا ہوتا ہے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ وہ جنتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان (کا ثواب و کمال) خاتمہ پر ہے''(1)۔ اسی لئے صوفیاء و علماء کہتے ہیں: ایمان وہ نہیں جس کے ساتھ بندہ قولاً اور فعلاً مزین ہے بلکہ ایمان ازل کے سوابق میں سعادت کا جاری ہونا ہے۔ رہا اس کا ہیاکل میں ظہور تو وہ کبھی عارضی ہوتا ہے اور کبھی حقیقۃً ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ثابت ہے جس طرح کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا جو سچے ہیں (اور) آپ سے سچ کہا گیا ہے، کہ تم میں کسی ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے بطن میں چالیس دن میں جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی مدت میں جما ہوا خون رہتا ہے پھر اتنی مدت میں گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اس فرشتے کو چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے (یعنی) اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور اس کا بدبخت یا سعید ہونا لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں کہ تم میں سے کوئی جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پس اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے۔ وہ دوزخیوں والا عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے تم میں سے کوئی دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اس پر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے وہ جنتیوں والا عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 6**: امام حافظ ابو محمد عبدالغنی بن سعید مصری نے محمد بن سعید شامی کی حدیث الزندقہ کے بارے میں نقل کی ہے۔ محمد بن سعید سے مراد محمد بن ابی قیس ہے، انہوں نے سلیمان بن موسیٰ سے روایت کی ہے یہ سلیمان اشدق ہے، سلیمان نے حضرت مجاہد بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: ہمیں ابو رزین عقیلی نے بتایا، فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور تو اے ابا رزین! ایسے دودھ سے ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلا۔ ابو رزین نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ مردے کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تو کبھی بنجر زمین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز زمین سے نہیں گزرا پھر تو بنجر

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم و مایخاف، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری، صفحہ 332، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز سے نہیں گزرا؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بالکل اسی طرح نشور ہوگا۔ ابورزین نے کہا: میں نے عرض کی: میں کیسے جان لوں کہ مومن ہوں؟ فرمایا: کوئی اس امت کا فرد نہیں ہے جس نے کوئی نیک عمل کیا پھر اس نے جان لیا کہ یہ نیک عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی بہتر جزا عطا کرنے والا ہے یا اس نے برا عمل کیا پھر اس نے جانا کہ یہ برا عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے والا ہے یا اسے معاف کرنے والا ہے، مگر بندہ مومن کی یہ شان ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث اگرچہ ایسی ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ اگر اس کا معنی صحیح بھی ہو تو پھر بھی حضرت ابن مسعود کی حدیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ وہ خاتمہ پر موقوف ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(1)۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ فی الحال مومن ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7**: علماء لغت نے فرمایا: منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی بات کا اظہار کرتا ہے جس کے مخالف وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے، اس کی تشبیہ جنگلی چوہا ہے اس کی ایک بل ہوتی ہے اسے نافقاء کہا جاتا ہے اور ایک اور اس کی بل ہوتی ہے جسے القاصعاء کہا جاتا ہے وہ زمین کو کریدتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین کے ظاہر تک یعنی معمولی سی مٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اسے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اس مٹی کو دور کرتا ہے اور اپنی بل سے نکل جاتا ہے، اس کی بل کے ظاہر پر مٹی ہوتی ہے اور اس کے اندر سوراخ ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق اس کا ظاہر ایمان ہوتا ہے اور باطن کوئی اور۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''فریب دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے''۔

ہمارے علماء نے فرمایا: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہے: وہ اپنے گمان اور خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لئے فرمایا کیونکہ ان کا عمل، ایک دھوکا دینے والے کے عمل جیسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے۔ اصل میں ہے: یخادعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے، ان کے رسول اللہ کو دھوکا دینے کو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ساتھ بلایا۔ اسی طرح جب انہوں نے مومنین کو دھوکا دیا تو یقیناً انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیا۔ ان کا دھوکا یہ تھا کہ وہ ایمان ظاہر کرتے تھے جبکہ ان کے دلوں میں کفر تھا۔ یہ وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں اور وہ گمان کرتے تھے کہ وہ نجات پا گئے اور انہوں نے دھوکا دے دیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اہل لغت نے فرمایا: کلام عرب میں الخدع کا معنی ہے: فساد۔ ثعلب نے یہ ابن اعرابی سے روایت کیا ہے۔ اس نے شعر کہا ہے:

ابیض اللون لذیذٌ طعمه طیب الریق اذ الریق خدع

رنگ سفید ہے ذائقہ لذیذ ہے، اس کا لعاب پاک ہے جب کہ اس کا لعاب فاسد ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: اس اعتبار سے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہوگا: وہ اپنے ایمان اور اعمال کو ریاکاری کی وجہ سے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، تفسیر کے ساتھ آیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور قرآن حکیم میں ہے: یُرَآءُوْنَ النَّاسَ (النساء: 142) (وہ لوگوں کے لئے دکھاوا کرتے ہیں)۔ بعض علماء نے فرمایا: خدع کا اصل معنی الاخفاء (چھپانا ہے) ہے۔ اسی سے مخدع البیت ہے جس میں کوئی چیز چھپائی جاتی ہے۔ یہ ابن فارس وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: انخدع الضب فی جحرہ۔ یعنی گوہ اپنے بل میں چھپ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ۔ اس میں نفی اور ایجاب ہے یعنی دھوکے کا انجام اپنے اوپر ہی نازل ہوگا۔ یہ عربوں کے کلام سے ہے: من خدع من لا یخدع فانما یخدع نفسه، جو ایسی ذات کو دھوکا دیتا ہے جس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ دھوکا تو اسے دیا جا سکتا ہے جو بواطن کو نہ جانتا ہو، اور جو بواطن کو جانتا ہو جو اس کے ساتھ دھوکا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے دھوکا کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ اسے پہچانتے ہوتے تو وہ جان لیتے کہ اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گزر چکا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: تو وہ عمل کرتا ہے جس کا اللہ نے تجھے حکم دیا اور اس کے ساتھ تو غیر کی رضا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھوکا کی حقیقت کا بیان اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے تحت آئے گا۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرہ نے دونوں جگہ یخادعون پڑھا ہے تاکہ دونوں لفظ متجانس ہو جائیں۔ عاصم، حمزہ، کسائی اور ابن عامر نے دوسری جگہ یخدعون پڑھا ہے اس کا مصدر خدع و خدیعۃ ہے۔ یہ ابو زید نے حکایت کیا ہے مورق العجلی یخدعون اللہ یعنی یا کے ضمہ، خا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھتے کثرت کا معنی لینے کے لئے۔ ابو طالوت عبد السلام بن شداد اور جارود نے یاء کے ضمہ، خا کے سکون اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اس معنی پر ما یخدعون الا عن انفسهم، حرف جر کو حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) اصل میں من قومه تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا یَشْعُرُوْنَ یعنی وہ نہیں جانتے کہ ان کے دھوکے کا وبال ان کی طرف ہی لوٹنے والا ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے دھوکہ کی وجہ سے نجات پا گئے اور کامیاب ہو گئے۔ یہ دنیا میں ہے اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا: ارجعوا وراءکم فالتمسوا نوراً۔ واپس پلٹ جاؤ اور نور تلاش کرو، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اہل لغت نے کہا: شعرت بالشیئ۔ یعنی میں نے اس کو جان لیا۔ اسی سے شاعر کی فطانت کی وجہ سے اسے شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ شاعر جو معانی پہچانتا ہے وہ دوسرے نہیں پہچانتے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: لیت شعری۔ یعنی کاش میں جان لیتا۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 90، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝

''ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ المرض سے مراد وہ فساد ہے جو ان کے عقائد میں تھا یا تو یہ شک اور نفاق تھا یا انکار اور تکذیب تھی۔ معنی یہ ہے ان کے دل مریض ہیں کیونکہ وہ عصمت، توفیق، رعایت اور تائید سے خالی ہیں۔ ابن فارس لغوی نے کہا: مَّرَضٌ سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو صحت کی حد سے خارج کر دے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق ہو یا کسی امر میں کوتاہی ہو۔ قراء کا مرض کے راء کے فتحہ پر اجماع ہے مگر اصمعی نے ابوعمرو سے روایت کیا ہے کہ اس نے راء کو ساکن کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے خلاف بددعا ہے۔ اس کلام کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شک اور نفاق میں اضافہ فرمائے ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے، اور ان کی مدد کی جگہ ضعف اور قدرت کی جگہ عجز میں اضافہ فرمائے۔ جیسے شاعر نے کہا:

یا مرسل الریح جنوباً وصبا　　اذ غضبت زید فزدھا غضباً

اے جنوب کی ہوا اور باد صبا کو چلانے والے! جب بنو زید غضبناک ہوں تو ان کے غضب میں اضافہ کر۔

اس صورت میں آیت کے اندر دلیل ہے منافقین کے خلاف دعا کرنے اور انہیں دھتکارنے کی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بری ترین مخلوق ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ ان کی مرض کی زیادتی کی اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ (توبہ:125)

اہل معانی نے کہا: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں مرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں سے پرسکون ہیں اور دنیا کی محبت ان کے دلوں میں ہے اور آخرت سے غافل ہیں اور آخرت سے اعراض کئے ہوئے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نفسوں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان پر دنیا کے غموں کو جمع کر دیا ہے اس لئے وہ دین کے اہتمام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ یعنی دنیا فانی کے بدلے انہیں ایسا عذاب دیا جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

جنید نے کہا: دلوں کی بیماریاں خواہش نفس کی پیروی کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اعضاء کی بیماریاں بدن کے مرض سے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ، اَلِیْمٌ کا معنی عرب کلام میں مؤلم ہے یعنی درد پہنچانے والا جیسے سمیع معنی مسمع ہوتا ہے۔ ذوالرمہ اونٹوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونرفع من صدور شمردلات　　یصك و جوھھا وھج الیم

ہم لمبے اونٹوں کے سینوں کو بلند کرتے ہیں جبکہ ان کے چہروں کو تکلیف دہ گرمی لگ رہی ہوتی ہے۔

الم کا معنی ہے تکلیف دینا، الایلام کا معنی ہے تکلیف دینا۔ الالم، تکلیف کو کہتے ہیں الم یألم الما۔ التألم کا معنی تکلیف

محسوس کرنا۔ اَلِیْمٌ کی جمع اُلَمَاءِ ہے جیسے کریم کی جمع کرماء ہے آلام اس کی جمع اشراف کی طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ، ما مصدریہ ہے یعنی رسل کی تکذیب کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا انکار اور اس کی آیات کی تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دردناک عذاب دیا۔ یہ ابو حاتم نے کہا ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔

**مسئلہ**: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے نفاق کا علم تھا تو ان کے قتل سے کیوں رکے رہے، اس کے متعلق علماء کے مختلف چار اقوال ہیں۔

۱۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہ فرمایا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ تھا اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر قتل نہیں کر سکتا۔ باقی تمام احکام میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عربی نے کہا: یہ قول درست نہیں کیونکہ مجذر بن زیاد کو حارث بن سوید بن الصامت نے قتل کیا تھا کیونکہ مجذر نے حارث کے باپ سوید کو جنگ بعاث میں قتل کیا تھا۔ حارث اسلام لے آیا، جنگ احد میں مجذر کو غفلت میں پایا تو اسے قتل کر دیا۔ جبریل امین نے اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر دیا، کیونکہ اس کا قتل دھوکے سے تھا اور دھوکے سے قتل کرنا اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کی غفلت ہے کیونکہ اگر اجماع مذکور ثابت ہے تو پھر اس واقعہ سے اجماع نہیں ٹوٹتا کیونکہ اجماع منعقد نہیں ہوتا، اور ثابت نہیں ہوتا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور وحی کے انقطاع کے بعد۔ یہ واقعہ تو عین وحی کے ساتھ تھا، پس اس سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی ہے یا یہ بالا اجماع منسوخ ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ امام شافعی کے پیروکار علماء فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہیں فرمایا کیونکہ زندیق وہ ہوتا ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان ظاہر کرتا ہے۔ اس سے توبہ طلب کی جاتی ہے اور اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ ابن عربی نے کہا: یہ وہم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توبہ طلب نہیں کی تھی اور نہ یہ کسی اور نے کیا تھا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ زندیق سے توبہ طلب کرنا واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق علم ہونے کے باوجود اعراض فرمایا۔ اصحاب شافعی میں سے یہ متاخر ہے۔ جس نے کہا زندیق سے توبہ طلب کرنا جائز ہے اس نے ایسی بات کہی ہے جو کسی کے لئے صحیح نہیں ہے۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلوب کی مصلحت کی خاطر انہیں قتل نہیں کیا تاکہ وہ آپ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: معاذ اللہ ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی۔(1) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ مؤلفہ قلوب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بد اعتقادی کا علم تھا یہ ہمارے اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقین کو قتل نہ کرنے کے بارے میں یہ اصحاب مالک کی دلیل

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 499، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب ماینھی عنہ من دعوۃ الجاھلیۃ، حدیث 3257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: اس پر محمد بن الجہم، قاضی اسماعیل، الابہری، ابن الماجشون نے نص قائم کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے حجت پکڑی ہے لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝ (الاحزاب)

قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے جب انہوں نے نفاق کا اعلان کیا۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو نفاق تھا وہ آج زندقہ ہے۔ پس زندیق کو قتل کیا جائے گا جب اس پر گواہی قائم ہو جائے گی اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کے قتل سے رک گئے تا کہ امت کو بیان کریں کہ حاکم اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ منافقین کے خلاف گواہی نہیں تھی۔ قاضی اسماعیل نے کہا: عبداللہ بن ابی پر گواہی نہ دی مگر صرف زید بن ارقم نے۔ اور جلاس بن سوید پر گواہی نہ دی مگر عمیر بن سعد نے جو اس کی پرورش میں تھا۔ اگر اس میں سے کسی ایک پر دو آدمی اس کے کفر اور نفاق کی گواہی دیتے تو اسے قتل کیا جاتا۔ امام شافعی نے دوسرے قول کے لئے حجت پکڑتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے بارے سنت یہ ہے جس پر زندیق ہونے کی گواہی دی گئی ہو پھر وہ انکار کرے اور ایمان کا اعلان کرے اور دین اسلام کا اعلان کرے اور دین اسلام کے علاوہ ہر دین سے براءت کرے تو اس کا خون بہانا ممنوع ہے۔ اصحاب الرائے، احمد، طبری وغیرہم کا یہی نظریہ ہے۔ امام شافعی اور ان کے متبعین نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو قتل نہیں کیا کیونکہ وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا علم تھا، وہ جس کو ظاہر کرتے تھے وہ ماقبل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بندوں پر احکام ظاہر پر رکھے ہیں، ان کے بواطن کا معاملہ اس کے اپنے سپرد ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کسی کے لئے اس کے ظاہر کے خلاف فیصلہ کرے کیونکہ یہ ظنون کے مطابق حکم ہوگا۔ اگر کسی فرد کے لئے یہ جائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ لائق ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ظاہر کی وجہ سے ان پر مسلمانوں والا حکم لگایا اور ان کے بواطن کو اللہ کے سپرد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) میں ان کے ظاہر کی تکذیب کی ہے۔ ابن عطیہ مالکی اس الزام سے اس آیت کی وجہ سے بری ہیں جو ان پر لازم آتا تھا کیونکہ آیت میں اشخاص کو متعین نہیں کیا گیا۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے زجر و توبیخ ہے جو بھی نفاق میں گھر ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ کہنا باقی رہ گیا ہے اس میں سے میں مراد نہیں ہوں۔ میں مومن ہی ہوں، اگر کسی کو متعین کر دیا جاتا تو اس کا جھوٹ کسی چیز کو ختم نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس انفصال میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جانتے تھے یا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ان کی شخصیات اور ان کے اسماء کو جانتے تھے۔ حضرت حذیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے کی وجہ سے منافقین کو جانتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر، حضرت حذیفہ کو کہتے تھے: اے حذیفہ! کیا میں ان میں سے ہوں، حذیفہ کہتے: نہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین انہیں خراب کر سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے مومنین کو ثبات عطا فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین ان کے دین میں بگاڑ پیدا کر سکیں۔ پس ان کے باقی رکھنے میں کوئی ضرر نہ تھا، لیکن آج اس طرح نہیں ہے، ہم زنادقہ سے امن میں نہیں ہیں کہ وہ ہمارے عام اور جاہل لوگوں کے نظریات خراب نہیں کریں گے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪

''اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں''۔

اِذَا ظرف کی بنا پر حالت نصبی میں ہے اور اس میں عامل قَالُوْۤا ہے، اِذَا یہ فعل منتظر کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ جوہری نے کہا اِذَا اسم ہے جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور یہ جملہ کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے مثلاً اجیئك اذا احمر البسر، واذا قدم فلان، یعنی میں تیرے پاس آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہو جائیں گی اور جب فلاں آ جائے گا اور جو چیز اس کے اسم ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ یوم کی جگہ واقع ہوتا ہے مثلاً آتیك یوم یقدم فلان یہ ظرف ہے اور اس میں مجازاۃ کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ شرط کی جزا تین چیزیں ہوتی ہیں: الفعل، الفاء اور اذا۔ فعل کی مثال ان تاتنی آتك۔ فاء کی مثال ان تاتنی فانا احسن الیك، اذا کی مثال، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ⑯ (الروم) اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ مجازاۃ کے معنی میں اِذَا اس شعر میں استعمال ہوا ہے:

اذا قصرت اسیافنا کان وصلها　　　خطانا الی اعدائنا فنضاربُ

جب ہماری تلواریں قاصر آ جائیں گی تو ہمارے قدم انہیں ہمارے دشمنوں تک پہنچائیں گے اور ہم انہیں ماریں گے۔

نضارب کا عطف کان پر ہے، اس لئے یہ مجزوم ہے۔ اگر نضارب مجزوم نہ ہوتا تو فنضارب نصب کے ساتھ ہوتا کبھی اذا پر ما تاکید اً ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کے ساتھ جزم دی جاتی ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

فقام ابو لیلی الیه ابن ظالم　　　و کان اذا ما یسلل السیف یضرب

ابولیلی ابن ظالم اس کی طرف اٹھا　　　اور وہ جب تلوار سونت لیتا ہے تو مار دیتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: کعب بن زہیر نے جو کہا وہ عمدہ ہے:

واذا ما تشاء تبعث منها　　　مغرب الشمس ناشطاً مذعوراً

اور جب تو اس سے سورج کے غروب ہونے کے وقت چلنا طلب کرے گا تو وہ اس وقت بھی ایسی تیزی سے اٹھے گی جیسے کوئی جانور شکاری سے ڈرا ہوا ہوتا ہے۔

یعنی عمدہ یہ کہ اِذَا کے ساتھ جزم نہ دی جائے جیسے اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ مبرد سے حکایت کیا گیا ہے کہ خرجت فاذا زیدٌ میں اِذَا ظرف مکان ہے کیونکہ اپنے ضمن میں جثۃ کو لئے ہوئے ہے اور یہ مردود ہے کیونکہ اس کا معنی ہے خرجت فاذا حضور زید۔ یہ مصدر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہوتا ہے جیسے دوسرے ظرف زمان تقاضا کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے

الیوم خمرٌ وغداً امرٌ۔ اس کا معنی ہے آج خمر کا وجود ہے اور کل امر کا وقوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِيْلَ یہ قول سے مشتق ہے۔ اصل میں قُوِلَ تھا۔ واؤ کے کسرہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا پھر واؤ یاء سے بدل گئی۔ اور قِيْلَ لَهُمْ میں لام کو لام میں ادغام کرنا بھی جائز ہے اور دو ساکنوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یاء حرف مدو لین ہے۔ اخفش نے کہا: قیل قاف اور یاء کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کسائی نے کہا: قاف کو ضمہ کی بو دے کر پڑھنا بھی جائز ہے تا کہ دلالت کرے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ قیس قبیلہ کی لغت ہے، اسی طرح جیء، غیض، حِیل، سیق، سیء اور سیئت (1) میں ہے۔ ہشام نے حضرت ابن عباس، رویس نے یعقوب سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ان الفاظ میں سیء اور سیئت کو نافع نے خاص طور پر اشمام سے پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے حیل اور سیق میں بھی اشمام کیا ہے اور باقی قراء نے تمام میں کسرہ دیا ہے۔ ہذیل، بنو دبیر جو اسد اور بنی فقعس سے تھے وہ اسے قُوْلَ واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تُفْسِدُوْا اس میں لا نہی ہے، فساد، صلاح کی ضد ہے، اور فساد کی حقیقت، سیدھے راستہ سے عدل کر کے اس کی ضد کی طرف جانا ہے فسد الشیء یفسُد فساداً و فسوداً و ھو فاسد و فسید آیت میں اس کا معنی ہے زمین میں کفر کر کے اور اہل کفر سے محبت کر کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور قرآن پر ایمان لانے میں جدائی کر کے فساد نہ کرو۔ بعض علماء نے فرمایا:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمین میں فساد تھا، زمین پر ہر قسم کے گناہ کیے جاتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو فساد اٹھ گیا اور زمین کی اصلاح ہوگئی۔ جب منافقین نے پھر گناہ شروع کیے تو اس کی اصلاح کے بعد فساد کیا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف: 56) (تم زمین میں فساد برپا نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الْاَرْضِ، الارض مؤنث اسم جنس ہے، اس کے واحد کا حق تھا کہ ارضۃ کہا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ اس کی جمع ارضات آتی ہے کیونکہ عرب ایسی مؤنث کی جمع تاء کے ساتھ بناتے ہیں جس کے آخر میں تاء تانیث نہیں ہوتی مثلاً عرسات۔ پھر علماء کہتے ہیں ارضون۔ انہوں نے اس کی جمع واؤ، نون کے ساتھ بنائی ہے اور مؤنث کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی مگر یہ کہ وہ منقوص ہو جیسے ثبۃ اور ظبۃ، لیکن انہوں نے واؤ اور نون کو الف اور تا جو حذف ہیں ان کے عوض کو ذکر کیا ہے اور را کے فتحہ کو اپنی حالت پر رکھا ہے۔ اور کبھی ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس کی جمع اروض بھی بنائی جاتی ہے۔ ابوالخطاب نے کہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ارض، اراض جیسا کہ اہل کے بارے میں کہا ہے: اھل، اھال، اور الاراضی بھی بغیر قیاس کے جمع آتی ہے۔ گویا انہوں نے آرضا کی جمع بنائی۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو وہ ارض ہے ارض اریضۃ یعنی پاکیزہ زمین جس کی اراضت ظاہر ہے۔ قد ارُضَتْ کا معنی ہے، پاکیزہ، عمدہ ہے۔ ابوعمرو نے کہا: نزلنا ارضًا اریضۃً یعنی ہم ایسی زمین میں اترے جو آنکھوں کو اچھی لگنے والی تھی۔ کہا جاتا ہے: لا ارض لک۔ جیسے کہا جاتا ہے: لا ام لک۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 93، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

الارض جانور کے نیچے والے پاؤں کو کہتے ہیں۔ حمید اپنے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولم یقلب ارضها البیطار و لا لحبلیه بها حبار

الارض سے مراد نفضة (جھاڑتا ہے) اور الرعدة (کپکپی) کو بھی کہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ نے قتادہ سے انہوں نے عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: بصرہ میں زمین پر زلزلہ آیا تو حضرت ابن عباس نے کہا: أزلزلت الارض امبی ارض۔ کیا زمین لرز رہی ہے یا مجھ پر کپکپی طاری ہے۔ ذوالرمہ نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

اذا توجس رکزا من سنابکها او کان صاحب ارض او به الموم

جب اس کے پاؤں کی مدہم سے آواز سنتا ہے یا اسے لرزہ ہے یا اسے برسام کی بیماری ہے۔ الْاَرْضُ کا معنی الزکام بھی ہے قد آرضه الله ایراضا یعنی اسے زکام لگادیا۔ فسیلٌ مستأرِضٌ و ودیةٌ مستأرضةٌ (راء کے کسرہ کے ساتھ) جس کی زمین میں جڑ ہو۔ اور جب کھجور تنے پر اُگ آئے تو اسے راکب کہتے ہیں۔ الاراض اون اور بالوں کی بنی ہوئی بڑی قالین۔ رجل اریض، متواضع اور نیکی کرنے والا شخص۔ اصمعی نے کہا: کہا جاتا ہے: هو آرَضُهم ان یفعل ذلک۔ یعنی اس نے انہیں پیدا کیا۔ شیء عریض۔ اریض اس کی پیروی کرنے والا۔ بعض نے اس کو علیحدہ ذکر کیا کہ جَدْیٌ اریض یعنی موٹا دنبہ یا موٹا تحفہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَحْنُ اس کی اصل نحنُ ہے۔ حاء کی پیش نون کو دی گئی اور حاء کو ساکن کر دیا۔ یہ ہشام بن معاویہ نحوی کا قول ہے، الزجاج نے کہا: نحن جمع کے لئے ہے اور جمع کی علامت میں سے واؤ ہے اور ضمہ واو کی جنس سے ہے، جب نَحْنُ کو حرکت دینے کی طرف مجبور ہوئے تو انہوں نے ایسی حرکت دی جو جماعت کے لئے تھی۔ زجاج نے کہا: اسی وجہ سے واؤ جمع کو اس ارشاد میں ضمہ دیا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ (البقرہ:16) (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو خریدا) محمد بن یزید نے کہا نَحْنُ، قبل اور بعد کی مثل ہے کیونکہ یہ دو یا زائد کی خبر دینے کے لئے ہے۔ انا، واحد کے لئے ہے نحن تثنیہ اور جمع کے لئے ہے۔ کبھی متکلم اس کے ساتھ اپنے متعلق خبر دیتا ہے جیسے نحن قمنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ (الزخرف:32) ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو۔ اور مؤنث اس صورت میں مذکر کے قائم مقام ہوتی ہے جبکہ وہ کلام کرنے والی ہو۔ عورت کہتی ہے: قمتُ و ذهبتُ، قمنَا و ذهبنَا۔ وانا فعلتُ ذاك۔ و نحن فعلنا یہ عربوں کا کلام ہے۔ خوب جان لو!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُصْلِحُوْنَ یہ اصلح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ الصلاح فساد کی ضد ہے، صلح لام کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ ابن سکیت نے کہا ہے۔ صلوح، صاد کے ضمہ کے ساتھ صلح (بضم اللام) کا مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

فکیف باطراق اذا ما شتمتنی و ما بعد شتم الوالدین صلوح

جب تم مجھے گالی دو گے تو میں کیسے سر جھکاؤں گا، والدین کو گالی دینے کے بعد صلح نہیں ہوتی۔

اور صلاح مکہ کے اسماء میں سے ہے، الصلح صاد کے کسرہ کے ساتھ نہر کو کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کا فساد کرنا، اصلاح تھا۔ یعنی ہمارا کفار کی مدد کرنا اس لئے تھا کہ ہم ان کے اور مومنین کے درمیان اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

''ہوشیار وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یہ منافقین کے قول کا رد ہے اور ان کو جھٹلانا ہے، ارباب المعانی نے کہا: جس نے دعویٰ ظاہر کیا اس نے جھوٹ بولا، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یہ صحیح ہے ان کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ابتداء کلام میں ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: انّ پر فتحہ بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے جائز قرار دیا ہے۔ حقًا انّك منطلق حقًا بمعنی الا ہے، اور ''ھم'' اس کا مبتدا ہونا جائز ہے۔ اور المفسدون خبر ہے پھر مبتدا اور خبر، ان کی خبر ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ''ھم'' انھم میں جو ہاء اور میم ہے اس کی تاکید کے لئے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہم فاصلہ ہو کوفی اس کو عماد کہتے ہیں اور المفسدون ان کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے الا انھم المفسدون جیسا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ کے قول میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ابن کیسان نے کہا: کہا جاتا ہے جو جانتا نہ ہو کہ وہ مفسد ہے تو اس کی مذمت نہیں ہوتی۔ مذمت تو اس کی ہوتی ہے جو جانتا ہو کہ وہ مفسد ہے پھر علم کے باوجود فساد برپا کرے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کے دو جواب ہیں یہ خفیۃً فساد کرتے تھے اور ظاہر صلاح کرتے تھے اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ ان کا یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ظاہر ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا فساد ان کے نزدیک صلاح تھا اور وہ نہ جانتے تھے کہ یہ فساد ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، حق کو ظاہر کرنے اور اس کی اتباع کو ترک کر کے۔ وَ لٰكِنْ یہ حرف تاکید اور استدراک ہے اس میں نفی اور اثبات ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے نفی ہو تو اس کے بعد ایجاب ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ایجاب ہو تو اس کے بعد نفی ہو گی۔ اس کے بعد ایک اسم پر اکتفا بھی جائز ہے جب پہلے ایجاب ہو۔ لیکن تو اس کے بعد ماقبل کا مخالف جملہ ذکر کرے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے اور تیرا قول ہے جاء نی زیدٌ و لکن عمرو لم یجئنی۔ اور یہ جائز نہیں جاء نی زیدٌ لکن عمرو پھر تو خاموش ہو جائے کیونکہ لکن کی جگہ بل کی وجہ سے اس جیسی مثال میں مستغنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں جائز ہے جب پہلے نفی ہو جیسے تیرا قول ہے ما جاء نی زیدٌ لکن عمرو۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور جب کہا جائے انہیں: ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف؟ خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ، هم ضمیر سے مراد منافقین ہیں۔ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کرو جیسا کہ مہاجرین نے تصدیق کی اور اہل یثرب میں سے مختلف لوگوں نے تصدیق کی۔ اٰمِنُوْا میں الف قطعی ہے۔ تو کہتا ہے یؤمن، کاف نصب کے مقام پر ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ایمانا کایمان الناس۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ یعنی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ منافقین نے السُّفَهَآءُ سے اہل کتاب کے مؤمنین مراد لئے۔ یہ منافقین کا قول ہے۔ وہ پوشیدہ اور استہزاء کے طور پر یہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو اس پر آگاہ فرمادیا۔ اور ثابت فرمایا کہ بیوقوفی، عقلوں کا نرم ہونا، بصیرت کا فاسد ہونا، ان کی اپنی ذوات میں ہے اور ان کی صفت ہے بتایا کہ یہی بیوقوف ہیں دلوں پر چڑھی ہوئی میل کی وجہ سے جانتے نہیں ہیں، کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی جب یہود کو کہا گیا کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یعنی عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایمان لائیں جیسے السُّفَهَآءُ ایمان لائے یعنی جہال اور ناسمجھ۔ کلام عرب میں السفه کا معنی ہے خفت اور رقت، کہا جاتا ہے۔ ثوب سفیه جب کپڑے کی بنائی اچھی نہ ہو یا پرانا اور باریک ہو۔ تسفهت الریح الشجر ہوا نے درخت کو جھکا دیا۔ ذوالرمہ نے کہا:

مشین کما اهتزت رماح تسفهت اعالیها مر الریاح النواسم

وہ عورتیں چلیں جیسے نیزے حرکت کر رہے ہوں ہلکی پھلکی ہوا کے چلنے نے ان کے اوپر والے حصوں کو جھکا دیا۔

تسفهت الشیء کسی چیز کو حقیر سمجھنا۔ السفه، حلم (دانشمندی) کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: ان السفه ان یکثر الرجل شرب الماء فلا یروی۔ سفاہیت ہے کہ آدمی زیادہ پانی پیے اور سیر نہ ہو۔ السفهاء کے دونوں ہمزوں میں چار وجوہ جائز ہیں۔ عمدہ وجہ یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو ثابت کرے اور دوسرے کو واؤ سے بدل دے۔ یہ اہل مدینہ کی قرأت ہے اور ابوعمرو کی قرأت سے معروف ہے اور اگر تو چاہے تو دونوں میں تخفیف کرے۔ پہلے تو ہمزہ اور واؤ کے درمیان پڑھے اور دوسرے کو خالص واؤ کے ساتھ پڑھے۔ اگر تو چاہے تو پہلے میں تخفیف کرے اور دوسرے کو ثابت رکھے۔ اگر تو چاہے تو دونوں کو ثابت رکھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ یہ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ کی مثل ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علم، معلوم کی معرفت کو کہتے ہیں جیسا کہ وہ معلوم ہے تو کہتا ہے: علمت الشیء اعلمه علماً عرفته۔ عالمتُ الرجل فَعَلَمْتُهُ اعلمه (لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی میں علم کے ساتھ اس پر غالب آیا۔

## وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

”اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے

شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ آیت منافقین کے ذکر میں نازل ہوئی۔ اصل میں لقوا، لقیوا تھا۔ ضمہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا اور یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ محمد بن سمیقع یمانی نے لاقوا الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اصل میں لاقیوا تھا۔ یاء کا ماقبل فتحہ تھا۔ اس لئے وہ الف سے بدل گئی پھر دو ساکن لام اور واؤ جمع ہوئے تو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف ہو گیا پھر واؤ کو ضمہ کے ساتھ حرکت دی گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ لاقوا میں واؤ کو کیوں ضمہ دیا گیا اور لَقُوا میں حذف کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لَقُوا میں جو واؤ ہے اس سے پہلے ضمہ تھا۔ اگر واؤ کو ضمہ کی حرکت دی جاتی تو زبان پر اس کا تلفظ ثقیل ہوتا پس اس کے ثقل کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور لاقوا میں حرکت دی گئی کیونکہ اس سے پہلے فتحہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ

اگر کہا جائے کہ خَلَوْا کا صلہ الی کیوں ذکر ہوا جبکہ معروف یہ ہے کہ اس کا صلہ باء ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہاں خَلَوْا بمعنی ذھبوا اور انصرفوا ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

کیف ترانی قالبا مجنّی اضربُ امری ظهره لبطن

قد قتل الله زياداً عني(1)

تو مجھے اپنی ڈھال پھیرنے والا کیسے دیکھتا ہے، میں اس کی پیٹھ پر اس کے بطن کے لئے مارتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے زیاد کو میری طرف سے قتل کر دیا ہو

جب صرف کے قائم مقام رکھا تو اس کا صلہ ذکر کیا۔

بعض علماء نے کہا: الی بمعنی مع ہے۔ اس قول میں ضعف ہے۔ بعض علماء نے کہا: الی بمعنی باء ہے(2)۔ اس کا خلیل اور سیبویہ نے انکار کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے واذا خلوا من المؤمنین الی شیاطینهم۔ اس صورت میں الی اپنے اصلی معنی میں ہوگا۔ الشیاطین، شیطان کی جمع مکسر ہے۔ اس کے اشتقاق اور اس کے معنی کے متعلق قول اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے تحت گزر چکا ہے۔

یہاں شیطان سے کون مراد ہیں؟ اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: یہ کفر کے سردار ہیں(3)۔ کلبی نے کہا: یہ جنوں کے شیاطین ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا: یہ کاہن لوگ ہیں۔ الشیطنة کا لفظ وہ ہے جس کا معنی ہے ایمان اور خیر سے دور ہونا۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ سب کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝ یعنی ہمیں جس کی طرف بلایا جاتا ہے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی کیا ہے: ہم تمسخر کرتے ہیں۔ الهزء کا معنی ہے تمسخر کرنا اور دل بہلانا۔ کہا جاتا ہے: هزء به و استهزأ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 96، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

راجز نے کہا:

قد هزئت منی ام طیسلہ　　قالت اراہ معدما لا مال لہ

ام طیسلہ نے مجھ سے تمسخر کیا۔ اس نے کہا: میں اسے مفلس دیکھتی ہوں، اس کے پاس کوئی مال نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

قد استهزء وا منهم بالفی مدجج　　سراتهم وسط الصحاصح جثم

انہوں نے ان سے دو ہزار ہتھیار بند وں کے ساتھ انتقام لیا۔ ان کے سردار چٹیل زمین کے درمیان اپنے کو لازم پکڑے ہوئے تھے۔

## اَللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۝

''اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں تا کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لے گا اور انہیں سزا دے گا اور ان سے تمسخر کرے گا اور انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا۔ سزا کو گناہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ اور عرب اپنے کلام میں اس قسم کی ترکیب کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

الا لا یجهلن احدٌ علینا　　فنجهل فوق جهل الجاهلینا (1)

خبردار! کوئی ہم پر (حملہ کر کے) جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم زمانہ جاہلیت کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اس نے اپنے غلبہ کو جہل سے تعبیر کیا۔ حالانکہ کوئی صاحب عقل جہالت پر فخر نہیں کرتا۔ یہ اس نے کلام کو ملانے کے لئے جہل کا لفظ استعمال کیا ہے پس یہ زبان پر خفیف ہو جائے گا حالانکہ اس کے لفظ اور اس کے اس مفہوم کے درمیان مخالفت ہے۔ عرب جب ایک لفظ کو کسی لفظ کے مقابلہ میں بطور جواب اور جزا ذکر کرتے ہیں تو اس لفظ کی مثل ذکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ لفظ اس کے معنی کے مخالف ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40) اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ اور فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (البقرہ:194) تو جو تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر زیادتی کرو لیکن اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ جزاء، سیئۃ (برائی) نہیں ہوتی اور قصاص (بدلہ) اعتدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ قصاص تو ثابت حق ہوتا ہے۔ اسی طرح فرمایا وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰہُ (آل عمران:54) اور یہودیوں نے (مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا ۝ وَّ اَكِیْدُ كَیْدًا ۝ (الطارق) یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اسی طرح فرمایا: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ)
اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ مکر ہے نہ استہزاء ہے اور نہ کید ہے بلکہ یہ ان کے مکر اور استہزا کی جزا ہے اور ان کے کید کی جزا ہے۔ اسی طرح فرمایا: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ (النساء:142) وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (التوبہ:79) تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لا یمل حتی تملوا(1) ولا یسأم حتی تساموا(2) یعنی اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا حتیٰ کہ تم اکتا جاؤ گے اور وہ ملول نہیں ہوتا حتیٰ کہ تم ملول ہو جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں حتیٰ بمعنی واؤ ہے یعنی اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض نے فرمایا: وہ تم سے تمہارے اعمال کا ثواب ختم نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم عمل چھوڑ دو گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسے افعال کرے گا جو انسان کے خیال میں استہزا، دھوکہ اور مکر ہوں گے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ آگ جم جائے گی جس طرح گھی کا تلچھٹ جم جاتا ہے۔ وہ اس آگ پر چلیں گے اور وہ انہیں نجات گمان کریں گے۔ پھر وہ انہیں دھنسا دے گی (3)۔ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا (البقرہ:14) سے مراد اہل کتاب ہیں، منافق لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اور ان کے استہزا کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں یعنی کفر کے رؤساء کے پاس جاتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ تمہارے دین پر ہیں۔ ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے تمسخر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اس تمسخر کی سزا دے گا ان کے لئے، جنت سے جہنم کا دروازہ کھولا جائے گا پھر انہیں کہا جائے گا: ادھر آؤ پس وہ آئیں گے تو وہ جہنم میں چلے جائیں گے اور مومنین اپنے پلنگوں پر بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب وہ دروازے پر پہنچیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر مومنین انہیں دیکھ کر ہنسیں گے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے، اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔ یعنی آخرت میں اللہ انہیں اس استہزا کی سزا دے گا جب ان پر دروازے بند ہوں گے تو مومنین ان پر ہنسیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ۝ (المطففین) یعنی مومنین دوزخیوں کو دیکھ رہے ہوں گے: هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المطففین) کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایک قوم نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور استہزاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے آہستہ آہستہ دوزخ کی طرف لے جا رہا ہے اللہ تعالیٰ ان کے لئے دنیا میں احسان ظاہر کرتا ہے جبکہ عذاب آخرت ان سے چھپائے ہوئے ہے۔ پس وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر حتمی عذاب کا فیصلہ کر چکا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب احب الدین الی اللہ عزوجل ادومہ، حدیث 41، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا، باب امر من نعس فی الصلوٰۃ، صفحہ 267، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

یہ انسان کی سوچ میں گویا استہزا، مکر اور دھوکا ہے۔ اس تاویل پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: اذا رأیتم الله عزّ و جل یعطی العبد ما یحب و ھو مقیم علی معاصیه فانما ذلك منه استدراج۔ جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی خواہش کے مطابق عطا فرما رہا ہے جبکہ وہ اس کی نافرمانی پر قائم ہے تو یہ اس کی طرف سے استدراج ہے، پھر اس آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام) پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں۔ کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہاں والوں کا۔ بعض علماء نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (اعراف) کی تفسیر میں فرمایا: جب وہ کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک نعمت عطا فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَمُدُّهُمْ یعنی ان کے لئے مدت لمبی کر دیتا ہے اور انہیں مہلت دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا (آل عمران: 178) (صرف اس لئے ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ گمراہی کریں)۔ اس کی اصل زیادت ہے۔ یونس بن حبیب نے کہا: کہا جاتا ہے شر کے لئے مدّ اور خیر کے لئے اَمَدّ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (الاسراء: 6) (اور ہم مسلسل تمہیں دیتے رہیں گے مال اور بیٹوں سے)۔

اور فرمایا: وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ (الطور: 22) (اور ہم مسلسل دیتے رہیں گے انہیں (ایسے) میوے اور گوشت جو وہ پسند کریں گے)۔

اخفش سے حکایت کیا گیا ہے کہ مددت له بولا جاتا ہے جب تو اسے ترک کر دے اور امددته بولا جاتا ہے جو تو اسے عطا کرے۔ فراء اور لحیانی سے مروی ہے کہ مددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جس کی زیادت اس کی مثل سے ہو۔ کہا جاتا ہے: مدّ النھر اور قرآن میں ہے وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ (لقمان: 27) (اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر) اور امددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جب اس میں زیادتی اس کے غیر سے ہو جیسے تیرا قول امددت الجیش بمدد میں نے لشکر کی کمک کے ساتھ مدد کی۔ اسی سے ہے: يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ (آل عمران: 125) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے) وامدّ الجرح (زخم میں پیپ پڑ گئی) کیونکہ پیپ زخم کے علاوہ ہے یعنی اس میں پیپ پڑ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ طُغْيَانِهِمْ یعنی کفر و گمراہی میں۔ طغیان کی اصل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) یعنی پانی بلند ہوا اور چڑھ گیا اور فرشتوں نے جو مقدار متعین کی تھی اس سے تجاوز کر گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے فرمایا: اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (طٰہٰ) یعنی اس نے دعویٰ میں اسراف کیا کہ جب اس نے کہا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (النازعات) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر کے ساتھ ڈھیل دی حتیٰ کہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ پس وہ ان کے عذاب میں اضافہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْمَهُوْنَ مجاہد نے فرمایا: یعنی وہ کفر میں متحیر ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ اہل لغت نے بیان کیا کہ عمہ الرجل یعمہ عموھا و عمہاً فھو عمہ و عامہ کا معنی ہے آدمی حیران ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: رجل عامہ و عمہ متردد اور حیران شخص۔ اس کی جمع عمہ ہے۔ عرب کہتے ہیں: ذھبت ابلہ العمھٰی۔ جب معلوم نہ ہو کہ اونٹ کہا چلا گیا۔ العمی آنکھ کے (اندھے پن) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور العمہ دل کے اندھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى سیبویہ نے کہا: اشْتَرَوُا میں واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے تا کہ واؤ جمع اور واو اصلیہ میں فرق ہو جائے جیسے وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ (الجن: 16)۔ (اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر)۔

ابن کیسان نے کہا: واؤ میں ضمہ دوسری حرکات کی نسبت خفیف ہے کیونکہ ضمہ واؤ کی جنس سے ہے۔ الزجاج نے کہا: ضمہ کی حرکت دی گئی ہے جیسے نحن میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اسحاق، یحییٰ بن یعمر نے التقاء ساکنین کی اصل پر واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ ابو زید انصاری نے قعنب ابی سمال عدوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے واؤ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فتحہ خفیف ہے اگرچہ اس کا ماقبل مفتوح ہے۔ کسائی نے واؤ کے ہمزہ اور اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے ادؤر، اشتروا، شراء سے مشتق ہے اور الشراء یہاں مستعار ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہوں نے ایمان پر کفر کو پسند کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (فصلت: 17)۔ یہاں شراء سے تعبیر فرمایا کیونکہ شراء اس چیز میں ہوتا ہے جس کو مشتری پسند کرتا ہے لیکن اگر شراء کا معنی معاوضۃ ہو تو پھر یہ معنی نہیں ہوگا کیونکہ منافقین مومن تھے ہی نہیں کہ وہ ایمان بیچتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: انہوں نے گمراہی کو لیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اس کا معنی ہے: انہوں نے ایمان کو بدلا اور کفر کو ایمان پر پسند کیا۔ وسعت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی بنا پر لفظ شراء کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ شرا اور تجارت، تبدیلی چاہنے کی طرف لوٹتے ہیں۔ عرب اس شخص کے لئے شرا کو استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلے۔ ابوذ ؤیب نے کہا:

ان تزعمینی کنت اجهل فیکم　　فانی شریت الحلم بعدك بالجهل

(اگر تو مجھے گمان کرتی ہے کہ میں تم سے ناواقف ہوں تو میں نے تیرے بعد جہالت کے بدلے حلم کو اختیار کیا۔)

الضلاله کا اصل معنی حیرت ہے، نسیان کو بھی ضلالت کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝ (الشعراء)

اس آیت میں ضالین بمعنی ناسین (بھولنے والے) ہے۔ ہلاکت کو بھی ضلالت کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (السجدہ:10) (اور کہنے لگے کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی عادت کے مطابق ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی۔ (مثلاً) عرب کہتے ہیں: ربح بیعك و خسرت صفقتك لیلٌ و نهارٌ صائمٌ۔ (1) معنی یہ ہے کہ تو نے اپنی بیع میں نفع اٹھایا اور تو نے اپنی بیع میں خسارہ اٹھایا، تو نے رات کو قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا یعنی انہوں نے تجارت میں نفع نہ اٹھایا۔ شاعر نے کہا:

نهارك هائم و لیلك نائم　　كذلك فی الدنیا تعیش البهائم

تو دن بھر گھومتا رہتا ہے اور رات بھر سویا رہتا ہے، دنیا میں حیوان اسی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

ابن کیسان نے کہا: تجارۃ و تجائر، ضلاله و ضلائل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ (وہ گمراہی کو خریدنے میں ہدایت پانے والے نہ تھے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کی بات ہے (2)۔

الاهتداء، گمراہی کی ضد ہے۔

## مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ۝

"ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا مثلهم مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے خبر کاف میں ہے یہ اسم ہے جیسا کہ اعشی کے قول میں ہے:

أتنتهون و لن ینهی ذوی شطط　　كالطعن یذهب فیه الزیت و الفتل (3)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، صفحہ 99، جلد 1

کیا تم رو کتے ہو جبکہ ظالم لوگ پیٹ تک پہنچنے والے تیر کی طرح نہ رکیں گے جس میں تیل اور ڈیوٹ چلی جاتی ہے۔

امرء القیس کا شعر ہے:

ورحنا بکابن الماء یجنب وسطنا تصوب فیه العین طوراً و ترتقی

ان اشعار میں ک بمعنی مثل ہے یعنی مثل الطعن اور بمثل ابن الماء مراد لیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو: مثلهم مستقر کمثل۔ اس صورت میں کاف حرف ہوگا، المثل، المثل و المثیل تمام کا معنی ایک ہے اور اس کا معنی شبیہ ہے۔ متماثلان کا معنی متشابهان ہے۔ اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الَّذِی یہ اسم موصول واحد اور جمع کے لئے واقع ہوتا ہے۔ ابن الشجری ہبۃ اللہ بن علی نے کہا: کچھ عرب جمع کو واحد کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

وان الذی حانت بفلج دمائهم هم القوم کل القوم یا ام خالد

وہ لوگ جن کے خون بہنے کا وقت فلج کے مقام پر قریب آیا تو اے ام خالد! وہ قوم ہی کامل قوم تھی۔

(اس شعر میں الذی کو جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے)۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر) میں بھی یہی کہا ہے (یعنی الَّذِی بمعنی الذین ہے) یہ اس لغت کے اعتبار سے ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ۔ اسی لئے آگے فرمایا ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (یعنی جمع کی ضمیر ذکر فرمائی) کلام کے آغاز کو واحد پر اور آخر کو جمع پر محمول کیا، رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا (توبہ:69) اس میں الذی مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی: خضتم کالخوض الذی خاضوا۔

بعض علماء نے فرمایا: الَّذِی اور اسْتَوْقَدَ واحد ذکر فرمایا کیونکہ آگ جلانے والا ایک تھا اگر آگ جلانا اس کے سپرد تھا۔ جب روشنی ختم ہوگئی تو ان تمام کی طرف رجوع فرمایا ..... فرمایا: بِنُوْرِهِمْ۔ اسْتَوْقَدَ بمعنی اوقد ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب ہے سین اور تاء زائدہ ہیں۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ شاعر کا قول ہے:

و داع دعا یا من یجیب الی الندی فلم یستجبه عند ذاك مجیبٌ

پکارنے والے نے پکارا: اے آواز کا جواب دینے والے! اس وقت کسی جواب دینے والے نے جواب نہ دیا۔

نحویوں کا "لما" کے جواب میں اختلاف ہے اور نورهم کی ضمیر کے مرجع میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لما کا جواب محذوف ہے اور وہ طفئت ہے اور نورهم میں ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ یہ ان کی آخرت کی حالت کی خبر دی جارہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ (الحدید:13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: اس کا جواب ''ذھب'' ہے اور نورھم میں ضمیر کا مرجع الَّذِی ہے، اس قول کے مطابق منافق کی تمثیل آگ جلانے کے ساتھ مکمل ہوگی کیونکہ آگ جلانے والے کی بقا، تاریکیوں میں جو نہیں دیکھتا، اس منافق کی بقا کی طرح ہے جو حیرت وتردد میں ہوتا ہے۔ آیت کی مراد یہ ہے کہ یہ منافقین کے لئے مثال دی گئی ہے یہ اس طرح ہے کہ جو وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں اس ایمان کی وجہ سے ان کے لئے مسلمانوں کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح، توارث، غنائم، نفوس، اولاد اور اموال پر امن وغیرہ یہ مشابہ ہے اس شخص کے جو تاریک رات میں آگ جلاتا ہے اس وجہ سے روشنی ہوجاتی ہے وہ دیکھتا ہے جس سے بچنا اور امن مناسب ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آگ بجھ جاتی ہے یا ختم ہوجاتی ہے تو اسے اذیت پہنچتی ہے اور وہ متحیر باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح منافقین جب ایمان لائے تو انہوں نے اسلام کے کلمہ کے ساتھ دھوکا کیا پھر وہ مرنے کے بعد عذاب الیم کی طرف جائیں گے جیسا کہ قرآن حکیم نے بتایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے) اور ان کا نور چلا جائے گا، اس لئے وہ کہیں گے انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید: 13)۔ ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کریں تمہارے نور سے۔ بعض علماء نے کہا: منافقین کا مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونا اور ان کے ساتھ ان کا کلام کرنا آگ کی طرح ہے اور ان کا ان کی مودت سے پھرنا اور ان کا ان سے منہ پھیر لینا اس آگ کے جانے کی طرح ہے (1)، اس کے علاوہ بھی علماء کے اقوال ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ضَآءَتْ، النار مؤنث ہے یہ نور سے مشتق ہے اس کا معنی بھی روشن کرنا ہے اور اس کا الف اصل میں واؤ کو یاء سے بدلا گیا کیونکہ ماقبل کسرہ ہے۔ ضاءت اور اضاءت دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضاء القمر یضوء ضوء واضاء یضیئ۔ یہ لازم اور متعدی ہوتا ہے۔ محمد بن سمیقع نے ضاءت بغیر الف کے پڑھا ہے۔ عام لوگ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اضاءت لھم احسابھم و دجوھھم دُجی اللیل حتی نظم الجزع ثاقبہ

مَا حَوْلَهٗ۔ مَا زائدہ مؤکدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اضاءت کا مفعول ہے اور حولہ ظرف مکان ہے اور حالت جری میں ہے کیونکہ حول اس کی طرف مضاف ہے، ذھب اور اذھب دونوں لغتیں ہیں اور یہ ذھاب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی شے کا زوال...... وَ تَرَكَهُمْ یعنی انہیں باقی رکھا۔ فِیْ ظُلُمٰتٍ یہ ظلمۃ کی جمع ہے۔ اعمش نے لام کے سکون کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے اور جنہوں نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسم اور لغت میں فرق کرنے کے لئے ایسا پڑھا ہے۔ اشہب عقیلی نے لام کے فتحہ کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ضمہ کو فتحہ سے بدلا گیا کیونکہ وہ خفیف ہے کسائی نے کہا: ظلمات، جمع الجمع ہے یہ ظلم کی جمع ہے۔ لَا یُبْصِرُوْنَ فعل مضارع حال واقع ہو رہا ہے گویا یوں فرمایا: غیر مبصرین ......اس معنی کے اعتبار سے ظلمات پر وقف جائز نہ ہوگا۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 100، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں پھریں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ۔ صُمٌّ یعنی ھم صم یعنی یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت حفصہ کی قراءت میں صماً بکماً عمیاً میں بطور ذم نصب (1) بھی جائز ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَّلۡعُوۡنِيۡنَ ۛۚ اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا (الاحزاب:61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں وہ پائے جائیں گے)۔ اسی طرح فرمایا: وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۚ (اللہب) (اور اس کی جورو بھی بدبخت ایندھن اٹھانے والی ہے)۔ شاعر نے کہا:

سقونی اتخمر ثم تکنفونی  عُدَاۃَ اللہ من کذب و زور

انہوں نے مجھے شراب پلائی پھر مجھے گھیر لیا۔ اللہ! دشمنوں کی جھوٹ اور غلط بیانی پر میں مذمت کرتا ہوں۔

اس شعر میں عداۃ اللہ بطور ذم منصوب ہے۔ اس مذہب کے مطابق مبصرون پر وقف صحیح ہے اور صما کو ترکھم کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے۔ گویا فرمایا: ترکھم صما بکما عمیا۔ انہیں بہرہ، گونگا، اندھا چھوڑ دیا۔ اس مذہب کے مطابق یبصرون پر وقف بہتر نہ ہوگا۔ الصم کا معنی عرب کلام میں بند ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے؟ قناۃ صماء ایسا نیزہ جو اندر سے کھوکھلا نہ ہو صممت القارورۃ میں نے بوتل کو بند کر دیا۔ فالاصم جس کے کان کے سوراخ بند ہوں۔ الابکم جو نہ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے اور جو سمجھتا ہو بولتا نہ ہو اسے اخرس کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اخرس اور ابکم ایک ہی ہیں۔ کہا جاتا ہے: رجل ابکم و بکیم یعنی جو پوری طرح گونگا ہو، گونگا پن بالکل ظاہر ہو۔ شاعر نے کہا:

فلیت لسانی کان نصفین منھما  بکیمٌ و نصف عندی مجری الکواکب

العمی، کا معنی بینائی کا چلا جانا، عمی فھو اعمی، قوم عمیٌ، اعماہ اللہ، تعامی الرجل جو آدمی اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرے۔ عمی علیہ الامر، جب معاملہ ملتبس ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَمِيَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ يَوۡمَئِذٍ (القصص:66) (اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں اس دن) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے مقصود ان کے حواس سے جملہ ادراکات کی نفی نہیں بلکہ ایک مخصوص جہت سے ان کی نفی مقصود ہے۔ تو کہتا ہے: فلان اصمُّ عن الخنا۔ شاعر نے کتنا خوب کہا ہے:

اصم عما ساء ہ سمیع۔ یعنی بری بات سننے سے بہرہ اس کے علاوہ کو خوب سننے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

دعوراء الکلام صممت عنھا  ولو انی اشاء بھا سمیع

ٹیڑھی کلام والی، اس سے میں بہرہ ہوں اگر میں چاہوں تو اسے خوب سننے والا ہوں۔

دارمی نے کہا:

اعمی اذا ما جارتی خرجت  حتی یواری جارتی الجدر

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں اندھا ہوتا ہوں جب میری پڑوسن نکلتی ہے حتیٰ کہ میری پڑوسن کو دیواریں چھپا لیتی ہیں۔
کسی نے ایک شخص کو وصیت کی جو اکثر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا:

اُدْخُلْ اذا ما دخلت اعمی　　وَاخْرُجْ اذا ماخرجت اخرس

جب تو بادشاہ کے پاس جائے تو اندھا ہو کر داخل ہو اور جب تو نکلے تو گونگا ہو کر نکل۔

قتادہ نے کہا: وہ حق سننے سے بہرے ہیں، حق کہنے سے گونگے ہیں، حق دیکھنے سے اندھے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی مراد ہے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا جو آپ نے آخر زمانہ کے والیوں کے متعلق حدیث جبریل میں فرمایا۔ واذا رایت الحفاۃ العراۃ الصم البکم ملوك الارض فذاك من اشراطھا۔ (جب تو دیکھے کہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن، (حق سننے سے) بہرے، (حق کہنے سے) گونگے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے(1))۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں تھا کہ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ رجع بنفسہ رجوعاً رجعہ غیرہ کہا جاتا ہے یعنی یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ ہذیل کہتے ہیں: ارجعہ غیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ (سبا: 31) یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کریں گے۔ جیسا کہ قرآن نے سورۂ سبا میں بیان فرمایا ہے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲

"یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو۔ ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ طبری نے کہا: اَوْ بمعنی واؤ ہے(2)۔ فراء نے یہی کہا ہے۔

وقد زعمت لیلیٰ بانی فاجر　　لنفسی تقاھا او علیھا فجورھا

لیلیٰ نے کہا کہ میں گنہگار ہوں میرے نفس کے لئے تقویٰ ہے اور اس کے خلاف اس کا فجور ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نال الخلافۃ اوکانت لہ قدراً　　کما اتی ربہ موسی علی قدر

اس نے خلافت کو پایا اور خلافت اس کا مقدر تھی جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں آئے جو ان کے حق میں مقدر تھا۔

ان اشعار میں او بمعنی واؤ ہے۔ بعض نے فرمایا: اَوْ تخییر کے لئے ہے۔
یعنی تم ان منافقوں کو اس سے تشبیہ دو یا اس سے، کسی ایک امر پر اکتفا نہیں۔ معنی ہے: او کاصحاب صیب۔ یا وہ بارش

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 29، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)　　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

والوں کی طرح ہیں۔ الصیب سے مراد بارش ہے۔ یہ صاب یصوب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: نازل ہونا۔ علقمہ نے کہا:

فلا تعدلی بینی و بین مغمر سقتك روایا المذن حیث تصوب

میرے اور جاہل کے درمیان برابری نہ کر بادل تجھے سیراب کرے جہاں برسے۔

صیب اصل میں صیوبٌ تھا۔ واؤ اور یا جمع ہوئے پہلا ان میں سے ساکن ہے اس لئے واؤ یا سے بدلی اور پھر مدغم ہو گئی جیسا کہ میت، ھین اور لین میں کہا گیا ہے۔ بعض کوفیوں نے کہا: اس کی اصل صوِیبٌ ہے فعیلٌ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا: اگر اس طرح اس کی اصل ہوتی تو اس کا ادغام جائز نہ ہوتا جیسا کہ طویل میں ادغام جائز نہیں ہے۔ صیب کی جمع صیایب ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: مثلھم کمثل الذی استوقد ناراً او کمثل صیب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ السَّمَآءِ، السماء، مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمیۃ، سموات اور سمی (بروزن فعول) بنائی جاتی ہے۔ عجاج نے کہا:

تلفه الریاح و السُّمی

ہواؤں اور بارشوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔

السَّمَآءِ ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو اور تجھ پر سایہ کرے وہ سماء ہے۔ اسی وجہ سے گھر کی چھت کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آسمان سے اترتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

دیارٌ من بنی الحسحاس قفر تعفیها الروامس والسماء

بنی حسحاس کے گھر چٹیل میدان ہیں۔ ہواؤں اور بارش نے ان کے نشانات مٹا دیئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

اذا سقط السماء بارض قوم رعیناه وان کانوا غضابا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش برستی ہے تو ہم اس زمین پر چراتے ہیں اگرچہ اس کے مالک ناراض بھی ہوں۔

مٹی اور گھاس کو بھی سماء کہا جاتا ہے۔ مازلنا نطأ السماء حتی اتیناکم۔

ہم گھاس اور مٹی کو روندتے رہے حتیٰ کہ ہم تمہارے پاس پہنچے۔

گھوڑے کی پیٹھ کو بھی اس کے بلند ہونے کی وجہ سے سماء کہا جاتا ہے۔

و احمر کالدیباج اما سماؤه فریا و اما ارضه فمحول

ریشم کی طرح سرخ ہے، رہی اس کی پیٹھ تو وہ بہت عمدہ ہے اور اس کے پاؤں بڑے سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِ ظُلُمٰتٌ یہ مبتدا خبر ہیں (و رعد و برق) معطوف علیہ ہے۔ ظلمات جمع ذکر فرمایا یہ اشارہ ہے رات کی تاریکی اور بادل کی تاریکی کی طرف، تہ در تہ تاریکی ہے اس لئے جمع ذکر فرمایا، اس کی وضاحت پہلے ذکر ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

علماء کا رَعْدٌ کے متعلق اختلاف ہے۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: یہود نے نبی کریم ﷺ سے رَعْدٌ کے متعلق پوچھا کہ یہ (کڑک) کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے (جو بادل پر مقرر ہے) اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانک کر لے جاتا ہے جہاں الله چاہتا ہے۔ یہود نے کہا: یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ فرشتہ بادل کو جھڑکتا ہے جب وہ اسے جھڑکتا ہے حتی کہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں الله کا حکم ہوتا ہے۔ یہود نے کہا: آپ نے سچ کہا (1)۔ الخ

اس تفسیر پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔ پس الرعد (کڑک) سنی جانے والی آواز کا اسم ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا۔ یہ لغت عرب میں معلوم ہے۔

لبید نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

فجعنی الرعد و الصواعق

مجھے کڑک اور بجلیوں نے ڈرایا......

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: الرعد ایک ہوا ہے۔ بادل کے درمیان چھا جاتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے (2)۔

البرق کے بارے میں اختلاف ہے، حضرات علی، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ البرق لوہے کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ بادل کو چلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی کی حدیث سے یہی ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ یہ نور کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ بادل کو جھڑکتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ البرق فرشتہ ہے جو نظر آتا ہے۔

فلاسفہ کہتے ہیں: الرعد بادل کے اجرام کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز ہے اور اجرام کے ٹکراؤ سے جو آگ چمکتی ہے وہ البرق ہے۔ یہ قول مردود ہے اس کی نقل صحیح نہیں ہے۔ والله اعلم۔ کہا جاتا ہے: رَعْدٌ کی اصل حرکت سے ہے۔ اسی سے الرعدید، (بزدل کی کپکپی) ہے، ارتعد کا معنی ہے: حرکت کرنا، اس معنی میں حدیث ہے: فجئ بھما ترعد فرائصھما (4) (ان دونوں کو لایا گیا تو ان کے کندھوں کا گوشت حرکت کر رہا تھا)۔ یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے۔

البرق کا اصل معنی چمک اور روشنی ہے۔ اسی سے البراق ہے وہ سواری جس پر معراج کی رات رسول الله ﷺ سوار ہوئے اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سوار ہوئے۔ رعدت السماء، یہ الرعد سے ہے جس کا معنی ہے: گرج، اور برقت، البرق سے ہے اور رعدت المرأۃ و برقت، عورت جب بناؤ سنگھار کر کے سامنے آئے، رعد الرجل و برق، جب

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 140، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب التفسیر عن رسول الله ﷺ، باب من سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 102، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

آدمی دھمکی دے اور ڈرائے۔

ابن احمر نے کہا:

یا جُل ما بعدت علیك بلادُنا و طلابنا فابرق بارضك وارعد

اے جل! تجھ پر ہمارے شہر اور ہمارے مطلوب تجھ سے کتنے ہی دور ہو گئے ہیں اب تو اپنی زمین کو ڈرا دھمکا دے۔

ارعد القوم و ابرقوا یعنی قوم کو کڑک اور بجلی نے آلیا۔ ابوعبیدہ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے: ارعدت السماء و ابرقت۔ آسمان گرجا اور بجلی چمکی۔ ارعد الرجل و ابرق فلاں نے دھمکی دی اور ڈرایا۔ اصمعی نے اس کا انکار کیا ہے اور اس پر اس کے خلاف کمیت کے قول سے حجت پکڑی گئی ہے۔

ابرق و ارعد یا یزید فما وعیدك لی بضائر

اے یزید! تو دھمکی دے تیری دھمکی مجھے کچھ مضر نہیں۔

اصمعی نے کہا کمیت حجت نہیں ہے۔

**فائدہ:** حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ہم حضرت عمر کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ایک سفر میں تھے اور ہمارے ساتھ حضرت کعب الاحبار بھی تھے۔ فرمایا: تیز ہوا چلنے لگی، بادل گرجنے لگا اور شدید بارش اور ٹھنڈک ہو گئی۔ لوگ گھبرا گئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مجھے کعب الاحبار نے کہا جس نے کڑک کی آواز سن کر کہا سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ تو اس بادل، ٹھنڈک اور بجلی میں جو مصیبت ہوگی اس سے وہ بچا لیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اور کعب نے یہ کلمات پڑھے جب صبح ہوئی تو لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! لوگوں میں جو گھبراہٹ تھی وہ ہم میں نہ تھی۔ حضرت عمر نے پوچھا: وہ کیسے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے حضرت عمر سے حضرت کعب کی بات کہی تو حضرت عمر نے کہا: سبحان اللہ! کیوں تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہم بھی وہ کہتے جیسا تم نے کہا۔ ایک روایت میں ہے، ٹھنڈک حضرت عمر کے ناک کو لگی اور اس نے حضرت عمر پر اثر کیا۔ یہ روایت ان شاء اللہ سورۃ رعد میں آئے گی۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے تابعین سے صحابہ کی روایات میں دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کڑک اور بجلیوں کو سنتے تو یہ دعا کرتے: اللھم لا تقتلنا بغضبك ولا تھلکنا بعذابك و عافنا قبل ذالك۔ (1) اے اللہ! تو ہمیں اپنے غضب کے ساتھ ہلاک نہ کر اور تو ہمیں اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور ہمیں اس سے پہلے عافیت دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالنا اس لئے تھا تا کہ وہ قرآن نہ سنیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں یہ ان کے نزدیک کفر ہے اور کفر موت ہے۔ الاصابع کے واحد •

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 183، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، ابواب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب مایقول اذا سمع الرعد، حدیث نمبر 3372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پانچ لغتیں ہیں: اصبع ہمزہ کے کسرہ اور با کے فتحہ کے ساتھ۔ أصبع، ہمزہ کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ ہمزہ اور با کے فتحہ کے ساتھ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، دونوں کے کسرہ کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے اسی طرح اذن (کان) مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس میں تخفیف، تثقیل اور تصغیر بنائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: اذینۃ۔ اگر تو اذن کے ساتھ کسی کا نام رکھے تو اس کی تصغیر بنائے گا تو کہے گا: اذین، پھر یہ مؤنث استعمال نہ ہوگا کیونکہ مذکر کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے اس سے تانیث زائل ہوگئی۔ رہا عربوں کا قول: اذینۃٌ اسم علم تو اس کے ساتھ مصغر نام رکھا گیا ہے، اذن کی جمع آذان آتی ہے۔ تو کہتا ہے: اذنتہ جب تو اسے کان پر مارے، رجلٌ اُذُنٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر ایک کا کلام سنے اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ اذانی بڑے کانوں والا۔ نعجۃ اذناء، کبشٌ آذن (کانوں والی بھیڑ اور دنبہ) و اذنت النعل وغیرھا تاذینًا جب تو جوتے وغیرہ کے کان بنائے، و اذنت الصبی جب تو بچے کا کان ملے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی بجلیوں کی وجہ سے۔

الصواعق، جمع ہے صاعقۃٌ کی۔ حضرات ابن عباس اور مجاہد وغیرہما نے کہا: جب الرعد فرشتہ زیادہ غضبناک ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے یہی صواعق ہے۔ اسی طرح خلیل نے کہا۔ فرمایا: یہ رعد کی آواز سے شدید ہوتی ہے، اس کے ساتھ کبھی آگ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ گرتا ہے اسے جلا دیتا ہے۔ ابوزید نے کہا: الصاعقہ آگ ہے جو سخت کڑک میں آسمان سے گرتی ہے، خلیل نے ایک قوم سے الساعقۃ (سین کے ساتھ) حکایت کیا ہے۔ ابوبکر نقاش نے کہا، کہا جاتا ہے: صاعقۃ، صعقۃ و صاقعۃٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ حسن نے من الصواقع (قاف کی تقدیم کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اسی سے ابوالنجم کا شعر ہے:

یحکون بالمصقوله القواطع　　تشقق البرق عن الصواقع

نحاس نے کہا: یہ بنی تمیم اور بعض بنی ربیعہ کی لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: صعقتھم السماء، جب آسمان لوگوں پر بجلی گرا دے۔ الصاعقۃ، عذاب کی ایک چیخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (فصلت: 17) (تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے)۔ کہا جاتا ہے: صعق الرجل صعقۃ و تصعاقًا یعنی اس پر چھا گئی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف: 143)

اصعقہ غیرہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا۔

ابن مقبل نے کہا:

تری النعرات الزرق تحت لبانه　　أحاد و مثنی اصعقتها صواهله

اس کے سینے کے نیچے نیلی آنکھوں والی مکھیاں ایک ایک، دو دو دیکھتا ہے اس کے ہنہنانے نے ان کو قتل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (الزمر: 68) (یعنی فوت ہوگیا جو آسمانوں میں تھا اور جو زمین میں تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے احوال کو تشبیہ دی ہے ان چیزوں کے ساتھ جو بارش میں تاریکیاں، کڑک، چمک اور بجلیوں میں سے ہوتی ہیں۔

ظُلُمٰتٌ ان کے کفریہ اعتقادات کی مثال ہے۔ کڑک اور چمک اس کی مثال ہے جس کے ساتھ انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بارش سے مثال دی کیوں کہ اس میں ان پر بہت سی مشکلات تھیں۔ العمی سے مراد تاریکیاں ہیں اور جو اس میں وعید اور زجر ہے وہ کڑک ہے اور اس میں جو نور اور دلائل باہرہ ہیں جو کبھی ان پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بجلی ہے۔ الصَّوَاعِقِ یہ مثال ہے جو قرآن میں جلدی میں جنگ کی طرف نکلنے کی دعوت دی ہے اور تاخیر میں وعید دی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصواعق شرع کی تکالیف ہیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے مثلاً جہاد، زکوۃ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَذَرَ الْمَوْتِ، حذر اور حذار دونوں کا ایک معنی ہے اور دونوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ یہ سیبویہ نے کہا: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مصدر ہے۔ سیبویہ نے ایک شعر کہا ہے:

واغفر عوراء الکریم اذخارہ　　　و اَعْرِضُ عن شتم اللئیم تکرماً

میں کریم شخص کی جہالت کو اس کے تعلق کو ذخیرہ کے لئے معاف کر دیتا ہوں اور لئیم آدمی کی گالی سے تکرماً اعراض کرتا ہوں۔

فراء نے کہا: یہ تمییز کی وجہ سے منصوب ہے۔ الموت، حیاۃ کی ضد ہے، مات یموت و یمات استعمال ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

بنیتی سیدۃ البنات　　　عیشی ولا یؤمن ان تماتی

اے میری بچی! بیٹیوں کی سردار تھی تو زندہ رہے تیری موت سے امن نہیں۔

فھو میِّت و مَیْت، قوم موتی و اموات و میتون و میتون و المُوات۔ الموت اور الموات ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو۔ الموات اس زمین کو کہتے ہیں جس کا کوئی انسان مالک نہ ہو اور نہ اس سے کوئی نفع اٹھاتا ہو۔ المَوَتان، یہ حیوان کا مخالف ہے۔ کہا جاتا ہے: اشتر الموتان ولا تشتر الحیوان یعنی زمینیں اور گھر خرید، غلام اور جانور مت خرید مُوتان اس موت کو کہتے ہیں جو جانوروں میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع فی المال مُوْتان، اماتہ اللہ و موّتہ۔ مبالغہ کے لئے تشدید ذکر کی گئی۔ شاعر نے کہا

فعروۃ مات موتا مستریحاً　　　فھا نذا اموت کل یوم

عروہ تو آرام کی موت مر گیا میں ہوں کہ ہر روز مرتا ہوں

اماتت الناقۃ، جب اونٹنی کا بچہ مر جائے، فھی ممیت و ممیتۃٌ۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح اماتت امراۃٌ ہے جس عورت کا بچہ مر جائے۔ اس کی جمع مماویت ہے۔ ابن سکیت نے کہا: امات فلان جب کسی کا ایک یا بہت سے بیٹے فوت ہو جائیں۔ المتماوت، ریاکار عبادت کرنے والے کی صفت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ موت مائتٌ، جیسے تیرا قول ہے لیلٌ لائلٌ۔ اس لفظ سے صفت کا صیغہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تاکید لگائی جاتی ہے المستمیت للأمر۔ ڈھیلا کام کرنے والا۔ رؤبہ نے کہا:

و زبد البحر لہ کتیت　　　واللیل فوق الماء مستمیت

اور سمندر کی جھاگ اس کے لئے آواز ہے اور رات پانی کے اوپر سستی سے گزرنے والی ہے۔

المستمیت، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں موت کی پروا نہیں کرتا۔

حدیث پاک میں ہے: اری القوم مستمیتین (1) وہ لوگ جو موت پر جنگ کرتے ہیں۔ المُوتۃ، جنون اور مرگی کی ایک جنس ہے جو انسان کو لاحق ہوتی ہے جب اسے افاقہ ہوتا ہے تو پوری عقل اس کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے سونے والے اور نشہ والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مُؤتۃ (میم کے ضمہ اور واو کے ہمزہ کے ساتھ) اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی وہ اس سے فوت نہیں ہوں گے۔ کہا جاتا ہے: احاط السلطان بفلان جب بادشاہ کسی کو سختی سے پکڑ لے اور ہر جہت سے اس کا محاصرہ کر لے۔ شاعر نے کہا:

احطنا بهم حتى اذا ما تيقنوا　　بما قد رأوا مالوا جميعا الى السلم

ہم نے ان کا گھیراؤ کیا حتیٰ کہ جب انہوں نے اس کا یقین کر لیا جو انہوں نے دیکھا تو وہ تمام صلح کی طرف مائل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ (الکہف: 42) (اور اس کا (باغ) برباد ہو گیا)۔

اصل میں مُحْيِط تھا یاء کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور یا کو ساکن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا احاطہ کرنے والا ہے یعنی وہ اس کے قبضہ اور اس کے غلبہ کے تحت ہے جیسا کہ فرمایا: وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الزمر: 67) (ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن)۔ بعض علماء نے فرمایا: مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کا معنی ہے انہیں جاننے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (الطلاق) (اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ انہیں ہلاک کرنے والا اور انہیں جمع کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (یوسف: 66) (مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے)۔ یعنی تم تمام ہلاک کئے جاؤ۔ کافروں کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ آیت میں پہلے ان کا ذکر ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۟

''قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی بینائی جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس (کی روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، یکاد بمعنی یقارب ہے۔ کہا جاتا ہے: کاد یفعل کذا جب کوئی شخص کام کرنے کے قریب ہو اور کرے نہیں۔ غیر قرآن میں جائز ہے یکاد ان یفعل، جیسا کہ رؤبۃ نے کہا:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 948

قد کاد من طول البلی ان یمصحا

قریب ہے کہ لمبی آزمائش ختم ہو جائے۔

یہ المصح سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ختم ہو جانا، مٹ جانا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خبر بغیر ان کے ہو کیونکہ یہ حال کی مقاربت کے لئے آتا ہے اور ان کلام کو زمانہ مستقبل کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہ منافات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ (النور)

عرب کلام میں ہے: کاد النعام یطیر، شتر مرغ اڑنے کے قریب ہے۔ کاد العروس ان یکون امیرا، دولہا امیر ہونے کے قریب ہے ان کے اس حالت کے قریب ہونے کی وجہ سے۔ کاد فعل متصرف ہے فَعِلَ یفعل کے وزن پر۔ اس کی خبر کبھی اسم ہوتی ہے لیکن یہ بہت قلیل ہے۔ تابط شرا نے کہا: وما کدت آئبا میں لوٹنے کے قریب نہ ہوا۔ کرب، جعل، قارب اور طفق بغیر ان کے خبر استعمال ہونے میں کاد کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: 22) (اور وہ دونوں چپٹانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے)۔

یہ تمام الفاظ حال اور مقاربت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ حال کے ساتھ ان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، الخطف کا معنی ہے تیزی سے اچک لینا۔ ایک پرندے کو اس کی تیزی کی وجہ سے خطاف کہا جاتا ہے۔ پس جس نے قرآن کو تخویف (ڈرانے) کے لئے بنایا ہے معنی یہ ہے کہ جو ان پر نازل ہوتا اس کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اچک نہ لے اور جس نے قرآن کو بیان کے لئے مثال بنایا جو قرآن میں ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس بیان آیا جو ان پر غالب آ گیا یخطَفُ اور یخطِف دونوں لغتیں ہیں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ خطِفه یخطَفه خطفاً یہ عمدہ لغت ہے اور دوسری لغت کو اخفش نے بیان کیا ہے خطَف یخطِفُ۔

جوہری نے کہا: یہ قلیل اور ردی لغت ہے معروف نہیں۔ یونس نے اس لغت کے ساتھ اس آیت کو پڑھا ہے: یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ۔ نحاس نے کہا: یَخْطَفُ میں سات وجوہ ہیں: قراءت فصیحہ یخطف ہے۔ علی بن الحسین اور یحییٰ بن وثاب نے یخطف طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سعید اخفش نے کہا: یہ بھی ایک لغت ہے۔ حضرات حسن، قتادہ، عاصم جحدری، ابو رجاء العطاردی نے یا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: بعض اہل مدینہ نے خا کے سکون اور طا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی، اخفش اور فراء نے کہا: یخطف یا، خا، طا کے کسرہ کے ساتھ جائز ہے۔ یہ چھ وجوہ ہیں جو لکھنے میں موافق ہیں۔ ساتویں صورت جسے عبدالوارث نے بیان فرمایا ہے، فرمایا: مصحف ابی بن کعب میں میں نے دیکھا یتخطف لکھا ہوا تھا۔ سیبویہ اور کسائی نے کہا کہ جس نے یخِطِف خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے نزدیک اس کی اصل یختطف ہے پھر تا کو طا میں ادغام کیا گیا۔ دو ساکن جمع ہوئے تو خا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: جس نے خا کو فتحہ دیا اس نے تا کی حرکت اسے دی۔ کسائی نے کہا: جس نے یا کو کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے

کہ اختطف میں الف مکسورہ ہے اور فراء نے اہل مدینہ سے جو خاء کا سکون اور ادغام حکایت کیا ہے وہ معروف نہیں اور جائز نہیں کیونکہ اس میں دو ساکنوں کو جمع کرنا ہے یہ نحاس وغیرہ نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: حسن اور ابو رجاء سے یخطف مروی ہے۔ حضرت ابن مجاہد نے کہا: میں اسے غلط گمان کرتا ہوں، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے خطف الخطفة۔ کسی نے بھی اسے فتحہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔

اَبْصَارَهُمْ یہ بصر کی جمع ہے یہ دیکھنے کا حاسہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ حجج قرآنیہ اور براہین ساطعہ ان پر روشن ہونے کے قریب تھے اور جنہوں نے الْبَرْقُ کو ڈرانے کے لئے مثال بنایا ہے ان کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ جو ان پر مصیبت اتری ہے قریب ہے ان کی آنکھیں اچک لے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ، كُلَّمَآ منصوب ہے کیونکہ یہ ظرف ہے اور جب کلما بمعنی اذا ہو تو یہ موصولہ ہوتا ہے۔ اس میں عامل مشوا ہے اور مشوا ہی اس کا جواب ہے، اس میں اضاء عامل نہیں ہے کیونکہ وہ ما کے تتمہ میں ہے اور مبرد کے قول کے مطابق مفعول محذوف ہے۔ اس کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: کلما اضاء لھم البرق الطریق۔ (یعنی جب بجلی نے ان کے لئے راستہ روشن کر دیا۔)

بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ فعل اور افعل ہم معنی ہوں، جیسے سکت اور اسکت ہم معنی ہیں۔ پس اضاء اور ضاء برابر ہوں گے۔ مفعول کے حذف کی تقدیر کی ضرورت نہ رہے گی۔ فراء نے کہا: ضاء، اضاء پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ قرآن سنتے ہیں اور ان کے لئے حجج (دلائل) ظاہر ہوتے ہیں تو وہ مانوس ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے ہیں اور جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا ہے جس میں وہ اندھے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہ ہوتے ہیں یا انہیں اس کا مکلف بنایا جاتا ہے تو قَامُوْا وہ اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جب کھیتوں اور مواشی میں ان کے حالات درست ہوتے ہیں، نعمتیں متواتر ملتی ہیں تو کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مبارک ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور کسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ناراض ہوتے ہیں اور اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود اور قتادہ سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا یہ قول عمدہ ہے اور اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (الحج: 11) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے الله تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے۔

علماء صوفیہ نے کہا: یہ الله تعالیٰ نے اس شخص کی مثال بیان فرمائی ہے جس کے ابتداءً احوال ارادت درست نہیں ہوتے، پس وہ اپنے دعاوی کے ساتھ ان احوال سے اکابر کے احوال تک بلند ہوتا ہے، گویا اس پر ارادت کے احوال روشن ہوتے اگر وہ ارادت کے اداب کی ملازمت کے ساتھ ارادت کو صحیح کرتا۔ جب اس نے ارادت میں دعاوی کی ملاوٹ کر دی تو الله تعالیٰ اس سے وہ انوار لے گیا اور اسے اپنے دعووں کی تاریکیوں میں چھوڑ دیا۔ اب وہ ان تاریکیوں سے خروج کا راستہ نہیں دیکھتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں، جب نبی کریم ﷺ کی جنگ بدر میں مدد کی گئی تو انہوں نے طمع کیا اور کہا: اللہ کی قسم! یہی وہ نبی ہے جس کی ہمیں موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ جب احد میں شکست کا سامنا ہوا تو یہ لوگ مرتد ہو گئے اور شک کرنے لگے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ یہ آیت منافقین کے متعلق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے اصح قول ہے اور معنی تمام اقوال کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ "لو" یہ حرف تمنا ہے۔ اس میں جزا کا معنی ہے۔ اس کا جواب لام یعنی جس جملہ پر لام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو مومنین کو ان پر مطلع کر دیتا پھر ان سے اسلام کی عزت چھین لیتا، مومنین کو ان پر غلبہ عطا فرما کر اور انہیں قتل کر کے اور انہیں مسلمانوں سے باہر نکال کر۔

یہاں سمع اور بصر کو خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہو چکا ہے یا اس لئے کہ یہ انسان میں معزز چیزیں ہیں۔ باسماعھم بھی پڑھا گیا ہے۔ اس پر کلام پہلے اسی جز میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس میں عموم ہے متکلمین کے نزدیک جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جائز ہے، اس پر اس کی قدرت مراد ہے۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدیر کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ قدیر، قادر اور مقتدر ہے۔ قدیر میں قادر کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ زجاجی نے کہا ہے: ہروی نے کہا: قدیر، قادر دونوں کا ایک معنی ہے۔ کہا جاتا ہے: قدرتُ علی الشیء اَقدِرُ قدراً و قَدَراً و مقتدرۃ و مقدُرۃ و قدراناً (یعنی قدرۃ) الاقتدار علی الشیء کا مطلب اس پر قدرت ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر، مقتدر اور قدیر ہے۔ ہر ممکن چیز پر جو وجود اور عدم کو قبول کرتی ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے، اسے قدرت ہے، اپنے علم اور اختیار سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور انسان پر یہ جاننا بھی واجب ہے کہ بندہ کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ کوئی کام کرتا ہے وہ قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عادۃً پیدا فرمائی، بندہ اس قدرت کا مختار نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت خاص طور پر ذکر فرمائی، کیونکہ پہلے ایک ایسے فعل کا ذکر گزرا ہے جو وعید اور خوف دلانے کو متضمن ہے، پس یہاں قدرت کا ذکر ہی مناسب تھا۔

یہ بیس آیات ہیں، کوفیوں کی تعداد کے مطابق چار آیات مومنین کی شان میں پھر دو آیات کافروں کے ذکر میں ہیں اور بقیہ تمام منافقین کے بارے میں ہیں۔ اس کے متعلق روایت ابن جریج سے گزر چکی ہے۔ یہ مجاہد کا بھی قول ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ علقمہ اور مجاہد نے کہا: ہر وہ آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ہر آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہے وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کا رد اس سے ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ اور سورۂ نساء مدنی ہیں۔ ان میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ آیا ہے۔ رہا یہ کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْٓا جس سورت میں ہے وہ مدنی ہے۔ یہ قول صحیح ہے۔ عروہ بن زبیر نے کہا: ہر حد اور ہر فرض مدینہ طیبہ میں نازل ہوا اور جہاں امم اور عذاب کا ذکر ہے وہ مکہ میں نازل ہوا۔ یہ واضح ہے۔

''یا''، یٰٓاَیُّهَا میں حرف ندا ہے۔ ای منادیٰ مفرد مبنی بر ضمہ ہے۔ کیونکہ لفظ میں وہ منادیٰ ہے اور ھا تنبیہ کے لئے ہے۔ النَّاسُ مرفوع ہے کیونکہ ای کی صفت ہے۔ یہ جمہور نحویوں کے نزدیک ہے، سوائے مازنی کے۔ انہوں نے یا ھذا الرجل میں نصب کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ای کو ضمہ دیا گیا ہے جس طرح مقصود مفرد کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ھا کو دوسری یا کے عوض ذکر کیا یا کو ذکر نہیں کیا تاکہ کلام منقطع نہ ہو جائے۔ ھا کو ذکر کیا تاکہ کلام متصل رہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا تو نے یا کو دوبارہ ذکر کیا۔ اور اسم ان دونوں کے درمیان ہو گیا جس طرح وہ کہتے ہیں: ھا ھوذا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب دو حرف تعریف سے خالی منادیٰ کی صورت میں ذکر کیے اور اس پر معرف باللام المقصود بالنداء کے احکام پر جاری کیے اور اس کے رفع کا التزام کیا کیونکہ وہ مقصود بالنداء ہے، پس انہوں نے ایسی حرکت کے ساتھ اس کو اعراب دیا جس کا وہ مستحق تھا اگر اس کے ساتھ حرف ندا ملا ہوا ہوتا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ منادیٰ ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ النَّاسُ سے کون مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کفار مراد ہیں جنہوں نے عبادت نہ کی۔ اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ (البقرہ:23) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ پس مومنین کے لئے خطاب ہمیشہ عبادت کرتے رہنے کے لئے ہے اور کفار کے لیے عبادت شروع کرنے کے لئے ہے۔ یہ قول عمدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اعْبُدُوْا یہ عبادت کا حکم ہے۔ یہاں عبادت سے مراد اس کی توحید کا اقرار اور اس کے دین کی شرائع کا التزام ہے۔ عبادت کی اصل خضوع اور تذلیل ہے، کہا جاتا ہے: طریق معبدٌ، جب راستہ قدموں سے روندا گیا ہو طرفہ نے کہا: وظیفا وظیفاً فوق مور معبد۔ میں موٹی پنڈلیوں والی اونٹنی کے پیچھے روندے ہوئے راستہ کے اوپر چلا۔

عبادت کا معنی طاعت ہے۔ التعبد کا معنی التنسک (احکام بجالانا) عبدت فلاناً میں نے اسے غلام بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْ خَلَقَكُمْ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ عرب اس بات کے مقر تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور حجت اس کو ذکر کیا اور انہیں متنبہ کرنے کے لئے اس صفت کو ذکر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا تاکہ انہیں اپنی نعمت یاد دلائے جو اس نے ان پر کی ہوئی ہے۔ الخلق کی اصل میں دو وجہیں ہیں:

1- تقدیر۔ کہا جاتا ہے خلقت الادیم للسقاء جب تو چمڑے کو مشکیزے کے لئے کاٹنے سے پہلے اندازہ کرے تو یہ جملہ بولے۔ شاعر نے کہا:

ولانت تفری ما خلقت و بعـ ... ض القوم یخلق ثم لایفری

تو وہ ہے کہ جس کا تو اندازہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ کرتے ہیں پھر اس کام کو کر نہیں سکتے۔

حجاج نے کہا: ما خلقت الافریت ولا وعدت الاوفیت یعنی میں نے کبھی اندازہ نہیں کیا مگر اسے کر گزرا۔ اور میں نے کبھی

وعدہ نہیں کیا مگر میں نے اسے پورا کیا۔

۲۔ خلق کا دوسرا معنی انشاء، اختراع اور ابداع ہے (یعنی پیدا کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (عنکبوت: 17) اور تم گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے نزدیک ان کی تخلیق ثابت تھی تو دوسروں کی تخلیق بھی ان کے نزدیک ثابت تھی (تو پھر پہلے لوگوں کی تخلیق کا ذکر کیوں کیا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کو تنبیہ اور تذکیر کے لئے جاری فرمایا تاکہ نصیحت میں بلیغ ہو جائے۔ انہیں پہلے لوگ یاد دلائے تاکہ وہ جان لیں کہ جس ذات نے ان سے پہلے لوگوں کو موت دی اور وہ ان کا بھی خالق ہے، انہیں بھی مارے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں میں غور وفکر کریں کہ وہ کیسے تھے اور کن امور کی بناء پر ہلاک ہوئے، تاکہ وہ جان لیں کہ انہیں بھی مبتلا کیا جائے گا جیسے وہ لوگ مبتلا کیے گئے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لعل اعبدوا کے متعلق ہے، خَلَقَكُمْ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہے اس نے انہیں تقویٰ کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ اس قسم کا کلام جو کلام الٰہی میں وارد ہے مثلاً لعلکم تعقلون، لعلکم تشکرون، لعلکم تذکرون، لعلکم تھتدون، تو اس میں تین تاویلات ہیں:

۱۔ لعل ترجی اور توقع کے معنی میں ہے اور ترجی اور توقع یہ بشر کی حیز میں ہے۔ گویا انہیں کہا گیا یہ کرو اس امید پر کہ تم سمجھ جاؤ، تم نصیحت حاصل کرلو اور متقی بن جاؤ۔ یہ سیبویہ اور زبان عرب کے رؤساء کا قول ہے۔ سیبویہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق کہا: اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚۖ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ) اس کا معنی ہے تم اپنی اس طمع اور رجا پر جاؤ کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا یا ڈرے گا۔ اس قول کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔

۲۔ عرب لعل کو شک سے پاک لام کی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا تاکہ تم سمجھ جاؤ، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ اس پر شاعر کا قول دلالت کرتا ہے:

وقلتم لنا كفوا الحروب لعلنا — نكف و وثقتم لنا كل موثق

فلما كففنا الحرب كانت عهود كم — كلمع سراب فی الملاء متالق

تم نے ہمیں کہا: جنگ روک لو تاکہ ہم رک جائیں اور تم نے ہمیں ہر پختہ عہد دیا۔ جب ہم نے جنگ کو روک لیا تو تمہارے عہد صحرا میں سراب کی چمک کی طرح تھے۔

مطلب یہ ہے کہ کفوا الحروب لنکف جنگ کو روکو تاکہ ہم روک لیں۔ اگر لعل یہاں شک کے لئے ہوتا تو وہ ان کے لئے ہر پختہ عہد نہ کرتے۔ یہ قول قطرب اور طبری سے منقول ہے۔

۳۔ لعل اس معنی میں ہے کہ کسی شے سے تعرض کرنا۔ گویا کہ کہا گیا: یہ کرو تعرض کرتے ہوئے تاکہ سمجھ جاؤ یا نصیحت حاصل کرلو، یا متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا معنی ہے تاکہ تم امر الٰہی کی قبولیت کو اپنے اور آگ کے درمیان بچاؤ کا ذریعہ بنالو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے اتقاہ بحقہ۔ جب تو اس کے حق کو قبول کرے گویا اس نے اسے اپنا حق دے کر اس کے مطالبہ

سے بچاؤ حاصل کر لیا، اسی سے حضرت علی کا قول ہے: کنا اذا احمر البأس اتقینا بالنبی ﷺ (1)۔ جب جنگ شدید ہو جاتی تو ہم نبی کریم ﷺ کی ذات کو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بناتے، عنترہ نے کہا۔

ولقد کررت المھر یدمی نحرہ    حتی اتقتنی الخیل یا بنی حذیم

میں نے گھوڑے کو پلٹایا حالانکہ اس کا سینہ زخمی تھا حتیٰ کہ گھوڑوں نے مجھے میرے بیٹے حذیم کے ساتھ بچایا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل حالانکہ تم جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: الَّذِیْ جَعَلَ۔ یہاں جَعَلَ بمعنی صیر ہے۔ کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے، جَعَلَ، خلق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىِٕبَةٍ (المائدہ: 103) نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور سائبہ۔ اور ارشاد ہے جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام: 1) اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو یہ سمی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا یعنی ہم نے اس کا نام قرآناً عربیاً رکھا، اور ارشاد ہے وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (الزخرف: 15) اور بنادی ہے (مشرکوں نے) اس کے لئے اس کے بندوں سے جز اور وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (الزخرف: 19) اور انہوں نے ٹھہرا لیا ہے فرشتوں کو جو خداوند رحمن کے بندے ہیں عورتیں۔ ان تمام ارشادات میں جَعَلَ بمعنی سمی ہے یعنی نام رکھنا۔

اور خلق اخذ کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے شاعر نے کہا:

وقد جعلت نفسی تطیب لضغمۃ    لضغمھما ھا یقرع العظم نابھا

اس میں جَعَلَ، خلق اور اخذ کے معنی میں ہے۔

کبھی جَعَلَ زائدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

و قد جعلت اری الاثنین اربعۃ    والواحد اثنین لما ھدنی الکبر

میں نے دو کو چار دیکھا اور ایک کو دو دیکھا جب مجھے بڑھاپے نے آلیا۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام: 1) میں بھی کہا گیا ہے کہ یہاں جَعَلَ زائدہ ہے۔ جَعَلَ اور اجتعل ایک معنی میں ہیں۔ شاعر نے کہا:

ناط امر الضعاف واجتعل اللیـ    ـل کحبل العادیۃ الممدود

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب فی غزوۃ حنین، صفحہ 101-100، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں اجتعل بھی جعل ہے۔

فِرَاشًا وہ بچھونا جو لوگ بچھاتے ہیں اور اس پر قرار پکڑتے ہیں اور وہ جگہیں جو بچھونا نہیں ہیں جیسے پہاڑ، نشیبی علاقے، سمندر یہ بچھونے کے مصالح میں سے ہیں کیونکہ پہاڑ کیلوں کی طرح ہیں جیسے فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ (النباء) کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔ اور سمندر، منافع کے حصول کے لئے ان پر سواری کی جاتی ہے جیسے فرمایا: وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ (البقرہ: 164) اور جانوروں میں سے جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائیں جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو۔

**مسئلہ نمبر 2**: شوافع نے کہا: اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ بستر پر رات نہیں گزارے گا یا چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا پھر اس نے زمین پر رات گزاری اور سورج کی دھوپ میں بیٹھا تو وہ حانث نہ ہوگا کیونکہ لفظ عرفاً ان کی طرف راجع نہیں ہوتا۔

مالکی علماء فرماتے ہیں: ایمان کی قسمیں نیت یا سبب یا بساط پر محمول ہوں گی جس پر قسم جاری ہوئی۔ اگر یہ نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے گھر کے لئے چھت۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء: 32) (ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت سے) محفوظ ہے ہر وہ چیز جو بلند ہو اور سایہ کرے اسے سماء کہا جاتا ہے، اس کے متعلق پہلے کلام گزر چکی ہے۔ تتقون پر وقف کی نسبت بناء پر وقف زیادہ بہتر ہے کیونکہ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ رب کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے: بنى فلان بيتا و بنى على اهله۔ فلاں نے گھر بنایا، اپنی بیوی سے شب زفاف گزاری۔ عام لوگ کہتے ہیں: بنى باهله۔ یہ غلطی ہے۔ گویا اس میں اصل یہ ہے کہ جو اپنے گھر والوں کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ پر دخول کی رات قبہ بناتا ہے پس اپنے اہل کے پاس جانے والے کو بانی کہتے ہیں۔ بنى کثرت کے لئے تشدید ذکر کرتے ہیں۔ ابتنى دارا و بنى دونوں کا ایک معنی ہے۔ اس نے گھر بنایا۔ اسی سے بنيان الحائط ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھنا حتیٰ کہ دیوار قائم ہو جائے۔

الماء کی اصل موۃ ہے۔ ماقبل فتحہ کی وجہ سے واؤ متحرک کو الف سے بدلا گیا تو تو نے کہا ماۃ۔ پھر دو حرف خفی ملے تو ھاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہ زیادہ پختہ ہے اور یہ الف کے زیادہ مشابہ ہے۔ تو تو نے کہا: ماءٌ۔ پہلا الف فعل کا عین کلمہ ہے اور اس کے بعد وہ ہمزہ ہے جو ھا کا بدل ہے اور ہمزہ کے بعد الف ہے جو تنوین کا بدل ہے۔ ابو الحسن نے کہا: بصریوں کے نزدیک صرف دو الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ اگر تو چاہے تو تین الف کے ساتھ لکھے۔ جب عرب اس کی جمع بناتے ہیں یا تصغیر بناتے ہیں تو اصل کی طرف لوٹاتے ہیں۔ کہتے ہیں: مُوَيْهٌ، و امواہ و میاہ جیسے جمال و اجمال۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ، الثَّمَرٰتِ ثمرۃ کی جمع ہے کہا جاتا ہے ثمر جیسے شجر۔ کہا جاتا ہے ثمر جیسے خشب، کہا جاتا ہے ثمر مثل بُدْن۔ ثمار جیسے اکام یہ ثمر کی جمع ہے اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ثمار السیاط کوڑے کے اطراف کی گرہیں۔ آیت کا معنی ہے ہم نے تمہارے لئے مختلف

رنگ کے پھل اور مختلف قسم کے نبات نکالے۔ یہ رِزْقًا تمہارے کھانے اور تمہارے جانوروں کے لئے چارہ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے اس کی وضاحت کردی اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ (عبس)

بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور طرح طرح کے پھل اور گھاس سامان زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے۔ رزق پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

اگر کہا جائے کہ پھلوں میں جو اس نے نکالا اس پر تملک (مالک ہونا) سے پہلے رزق کے اسم کا اطلاق کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کیونکہ وہ اس لائق ہیں کہ ان کا مالک ہوا جائے اور ان میں انتفاع صحیح ہو۔ پس یہ رزق ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: میں کہتا ہوں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر مخلوق سے غنی کر دیا ہے۔ صحیح حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے پھر اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اٹھا کر لے آئے تو اس کے لئے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے خواہ وہ اسے عطا کرے یا عطا نہ کرے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں ''لکڑیاں اٹھائے'' کے معنی میں تمام صنعتوں میں مشغول ہونا ہے۔ پس جس نے حرص، امید اور دنیا کی چمک میں رغبت کے سبب اپنے جیسے انسان کی طرف اپنے نفس کو محتاج بنایا تو اس نے اس شخص کی طرف کو پکڑا جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے مدمقابل بنایا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فقر کا راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ تو زمین کو بچھونا بنا، آسمان کو پردہ بنا، پانی کو پاک مشروب، گھاس کو کھانا بنا۔ دنیا کے سبب مخلوق میں سے کسی کی عبادت نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تجھے عطا فرمایا جو تیری زندگی کے لئے ضروری تھا۔ اس میں کسی انسان کا تجھ پر احسان نہیں ہے۔ نوف البکالی نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو دیکھا، وہ باہر نکلے اور ستاروں کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا: اے نوف! کیا تو سویا ہوا ہے یا دیکھ رہا ہے؟ میں نے کہا: اے امیر المومنین! میں دیکھ رہا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دنیا سے دلچسپی نہ رکھنے والوں اور آخرت میں رغبت کرنے والوں کو مبارک ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بساط بنایا، اس کی مٹی کو بچھونا بنایا، اس کے پانی کو پاکیزہ رزق بنایا۔ قرآن اور دعا کو اندر اور باہر کا لباس بنایا، حضرت مسیح علیہ السلام کے طریقہ پر دنیا کو ترک کر دیا...... باقی حدیث بھی ذکر کی (2)۔ اسی سورت میں اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ:186) کے تحت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6**: فَلَا تَجْعَلُوْا۔ یہ نہی ہے۔ انداداً۔ ہم پلہ، امثال اس جیسے، اس کا واحد نِدٌّ ہے۔ محمد بن سمیقع نے نداً پڑھا ہے۔ شاعر نے کہا

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 199، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسالۃ، حدیث نمبر 1378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 79

نحمد الله ولا ندله عنده الخير و ما شاء فعل

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں، اس کا کوئی مدمقابل نہیں، اسی کے پاس ساری خیر ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حضرت حسان نے کہا:

أتهجوه ولست له بندّ فشرکما لخیرکما الفداء

کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بکواس کرتا ہے، تو تو اس کا ہم مثل ہی نہیں۔ پس تم میں سے برا تم میں سے بہتر کے لئے قربان ہو جائے۔

کہا جاتا ہے: ندٌّ و ندیدٌ و ندیدۃ سب کا معنی مدمقابل ہے۔ لبید نے کہا:

لکیلا یکون السندری ندیدتی واجعل اقوامًا عمومًا عماعما

تا کہ سندری میرا مقابل نہ ہو اور میں جمع شدہ قوم کو جدا جدا نہ کر دوں

ابو عبیدہ نے کہا: اَنۡدَادًا کا معنی ہے: اضداداً (مدمقابل)۔ نحاس نے کہا: اَنۡدَادًا پہلا مفعول ہے اور لِلّٰہ دوسرے مفعول کی جگہ ہے۔ جوہری نے کہا: الند (بفتحہ نون) آسمان کی طرف بلند ٹیلے کو کہتے ہیں اور خوشبو میں سے الندّ عربی میں نہیں ہے۔ ندّ البعیر یندّ ندًّا وندادًا و ندودًا، جدھر منہ آئے بھاگ جانا۔ اسی سے بعض نے یوم التناد پڑھا ہے ندّد بہ یعنی اس نے اسے شہرت دی۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ یہ مبتدا خبر ہیں اور جملہ حال واقع ہو رہا ہے، خطاب کافروں اور منافقین کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف علم کے ساتھ کیسے بیان فرمایا اس کے برعکس ختم، طبع، الصمم اور العمی کے ساتھ پہلے ان کا وصف بیان کیا۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

۱۔ وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ سے مراد علم خاص ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پانی کو نازل کیا، رزق کو اگایا۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہی انعام فرمانے والا ہے، نہ کہ اس کے مقابل (جو انہوں نے خود بنا رکھے ہیں)۔

۲۔ معنی یہ ہے کہ تم بالقوۃ اور بالامکان اس کی وحدانیت کو جان لیتے ہو اگر تم غور و فکر کرتے۔ واللہ اعلم۔ اس میں دلیل ہے عقلی دلائل کے استعمال کے امر پر اور تقلید کو باطل کرنے پر۔

ابن فورک نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مومنین کو بھی شامل ہو۔ معنی یہ ہوگا: اے مومنو! مرتد نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل نہ بنانا اس علم کے بعد کہ اللہ ایک ہے(1)۔

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾

''اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 106، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

بلالو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ یعنی اگر تم شک میں ہو، مِّمَّا نَزَّلْنَا یعنی القرآن۔ اس آیت کا مخاطب مشرک ہیں جن کو چیلنج کیا گیا کیونکہ انہوں نے جب قرآن سنا تو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ ہم اس میں شک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیت میں اپنی وحدانیت وقدرت پر دلالت کو ذکر کیا تو اس کے بعد اپنے نبی کی نبوت پر دلالت کو ذکر کیا کہ وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ اس کا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے۔

عَبْدِنَا: یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ عبد، تعبد سے ماخوذ ہے جس کا معنی عجز وانکساری کرنا، غلام کو عبد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کے سامنے عجز اور خضوع کا اظہار کرتا ہے۔ طرفہ نے کہا:

الی ان تحامتنی العشیرة کلها      و افردت افراد البعیر المعبد

یہاں تک کہ پورے خاندان نے مجھے روکا اور مذلل اونٹ جدا ہونے کی طرح میں جدا ہو گیا۔

بعض علماء نے کہا: جب عبادت معزز ترین خصلت ہے اس کے ساتھ نام رکھنا معزز ترین درجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عبد کہہ کر ذکر فرمایا۔

یا قوم قلبی عند زهراء      یعرفه السامع والرائی

لا تدعنی الا بیا عبدها      فانه اشرف اسمائی

اے میری قوم! میرا دل زہراء کے پاس ہے جس کو ہر سامع اور دیکھنے والا جانتا ہے۔ وہ مجھے نہیں پکارتی مگر یا عبد کہہ کر، کیونکہ یہ میرے معزز ناموں میں سے ہے۔

فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ فاء جواب شرط ہے۔ تو لے آؤ ایک سورت کیونکہ یہ مجیٔ کے باب سے ہے۔ یہ ابن کیسان نے کہا ہے، یہ امر کا صیغہ ہے اور یہاں اس کا معنی عاجز کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سورت لانے سے ان کا عجز معلوم تھا۔ السورة، السور کا واحد ہے اس کے متعلق کلام اس سورت میں اور اعجاز قرآن کی بحث میں گزر چکا ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ من مثلہ میں "مِنْ" زائدہ ہے جیسا کہ فاتوا بسورة مثلہ کہا ہے اور مثلہ کی ضمیر کا مرجع جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے جیسے حضرات قتادہ، مجاہد وغیرہما۔

بعض مفسرین نے فرمایا: اس کا مرجع تورات اور انجیل ہیں معنی یہ ہوگا کہ تم اس کی مثل کتاب سے سورت لے آؤ، کیونکہ تورات وانجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں جو اس میں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کوئی سورت لاؤ کسی ایسے بشر سے جو آپ کی مثل ہو جو نہ لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو۔ ان دونوں تاویلوں پر من تبعیضیہ ہوگا اور مثلہ پر وقف تام نہ ہوگا کیونکہ وادعوا کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ، شُهَدَآءَ سے مراد مددگار اور حمایتی ہیں۔ فراء نے کہا: اس سے مراد ان کے

معبود (بت) ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: اگر کہا جائے کہ یہاں شہداء کا ذکر کیسے کیا۔ شہداء تو اس لئے ہوتے ہیں تا کہ وہ کسی امر کی گواہی دیں یا کسی امر کی خبر دیں جو انہوں نے دیکھا ہو۔ انہیں تو کہا گیا ہے: فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے علماء میں سے جو پاؤ ان سے مدد طلب کرو اور انہیں لے آؤ تا کہ وہ دیکھیں جو تم لے کر آتے ہو۔ تو یہ تمام لوگوں پر رد، حجت قائم کرنے کے اعتبار سے زیادہ مؤکد ہے۔ میں کہتا ہوں: مجاہد کے قول کا یہی معنی ہے۔ مجاہد نے کہا: اُدْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ کا معنی ہے: لوگوں کو بلاؤ جو تمہارے لئے گواہی دیں کہ تم نے قرآن کا مقابلہ پیش کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: شُهَدَآءَكُمْ فعل کے ساتھ اس کو نصب دی گئی ہے اور یہ شہید کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: شاهدٌ، و شهيدٌ، جیسے قادر و قديرٌ۔

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے سوا دوسروں سے، دُوْنِ کا لفظ فوق کی نقیض (متضاد) ہے اور یہ غایت سے کمی کرتا ہے۔ یہ ظرف ہوتا ہے۔ الدون، حقیر اور خسیس کو کہتے ہیں

اذا ما علا المرء رام العلاء　　ويقنع بالدون من كان دونا

جب کوئی انسان بلند ہوتا ہے تو بلندی کا قصد کرتا ہے اور خسیس آدمی، پستی پر قناعت کرتا ہے۔

دُوْنِ کے لفظ سے فعل مشتق نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں: دان يدون دوناً اور کہا جاتا ہے: هذا دون ذالك یعنی یہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ کسی چیز پر برانگیختہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے: دُوْنَكه (تم اسے پکڑو)۔ تمیم نے حجاج کو کہا: اقبرنا صالحاً ہمیں اجازت دے کہ ہم صالح کی قبر کھودیں۔ حجاج نے صالح کو سولی پر لٹکایا تھا تو حجاج نے کہا: دونكموه تم اسے لے لو اور دفن کر دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ''اگر تم سچے ہو'' اس میں جو تم نے کہا ہے کہ تم قرآن کے مقابلہ پر قادر ہو، مشرکوں نے کہا تھا: لو نشاء لقلنا مثل هذا (اگر ہم چاہیں تو ہم اس کی مثل کہہ سکتے ہیں)۔ صدق (سچائی) یہ کذب (جھوٹ) کا متضاد ہے۔ کہا جاتا ہے: و قد صدق في الحديث، اس نے بات سچی کی، الصدق، نیزوں میں سخت۔ کہا جاتا ہے: صدقوهم القتال۔ انہوں نے ان کو جنگ کے بارے سچی بات بتائی۔ الصديق جو ہمیشہ سچ بولتا ہو۔ کہا جاتا ہے رجلٌ صدق (سچا آدمی)۔ جیسے کہا جاتا ہے: نعم الرجل (اچھا آدمی) الصداقة، یہ الصدق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اخلاص اور محبت میں سچا ہونا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

''پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یعنی اگر تم یہ چیلنج پورا نہ کر سکو۔ وَ لَنْ تَفْعَلُوْا یعنی تم اس کی ہرگز طاقت نہیں رکھو گے۔

اس صورت میں صٰدِقِیْنَ پر وقف، وقف تام ہوگا۔ اکثر مفسرین نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے تم اپنے حمایتیوں کو بلاؤ اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو آگ سے ڈرو۔ اس تفسیر پر صٰدِقِیْنَ پر وقف مکمل نہ ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ لم پر ان کیسے داخل ہوا حالانکہ ایک عامل، دوسرے عامل پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اِنْ لفظ میں عاملہ نہیں ہے۔ پس یہ لم پر داخل ہو گیا جیسے کہ یہ ماضی پر داخل ہو جاتا ہے، لم میں یہ عمل نہیں کر رہا جس طرح یہ ماضی میں عمل نہیں کرتا۔ پس ان لم تفعلوا کا معنی ہے: ان ترکتم الفعل اگر تم یہ فعل چھوڑ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔ لن کے ساتھ فعل منصوب ہے عربوں میں سے کچھ لوگ اسے جزم دیتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے جزم والا قول ذکر کیا ہے۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے

فلن اعرض ابیت اللعن بالصفد (1)

میں جناب کے فضائل عطا کی خاطر بیان نہیں کر رہا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جب انہیں خواب میں آگ کی طرف لے جایا گیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: مجھے کہا گیا: لن تُرَعْ (تم نہ ڈرو) یہ اسی لغت کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَنْ تَفْعَلُوْا میں ان کے ارادوں کو ابھارنا اور ان کے نفوس کو حرکت دینا ہے تاکہ اس کے بعد ان کا عجز پھر سے ظاہر ہو جائے، یہ ان غیوب سے ہے جن کی خبر قرآن نے ان کے وقوع سے پہلے دی (2)۔ ابن کیسان نے کہا: وَلَنْ تَفْعَلُوْا ان کو اس بات سے روکنا ہے کہ یہ قرآن حق ہے اور وہ اپنے اس گمان میں سچے نہیں ہیں کہ یہ قرآن جھوٹ ہے اور یہ گھڑا گیا ہے اور یہ جادو ہے اور یہ شعر ہے اور یہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہے وہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اس کی مثل ایک سورت بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ یہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کا جواب ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے آگ سے بچو۔ التقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمیم اور اسد قبائل کی لغت فتقوا النار ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: تقی یتقی جیسے قضٰی یقضی۔

النار مفعول ہے التی اس کی صفت ہے۔ التی میں تین لغات ہیں التی، اللتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ) اللتْ (تاء کے سکون کے ساتھ) یہ مؤنث کے لئے اسم مبہم ہے اور یہ معرفہ ہے اس کو نکرہ بنانے کے لئے اس سے الف لام ہٹانا جائز نہیں ہے اور اس کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا مگر صلہ کے ساتھ۔ اس کے تثنیہ میں بھی تین لغات ہیں: اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتانّ (نون کی تشدید کے ساتھ) اس کی جمع میں پانچ لغات ہیں: اللاتی، یہ قرآن کی لغت ہے، اللاتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر یاء کے) اللواتی، واللوات (بغیر یاء کے)

ابو عبیدہ نے کہا:

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً

من اللواتی واللتی واللاتی زعمن ان قد کبرتُ لداتی

ان سب کا گمان ہے کہ وہ سب عمر رسیدہ ہو چکی ہیں۔

اللوا، (تاء کے سقوط کے ساتھ) یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ابن شجری نے یہ زیادہ کیا ہے اللائی (ہمزہ اور یاء کے اثبات کے ساتھ) اور اللاءِ (ہمزہ کے کسرہ اور یاء کے حذف کے ساتھ) واللا (ہمزہ کے حذف کے ساتھ) اگر تو اس کی جمع الجمع بنائے تو تو اللاتی میں کہے گا: اللواتی۔ اور اللائی میں کہے گا: اللوائی۔ اور جوہری نے کہا: التی کی تصغیر اللتیا (فتح اور تشدید کے ساتھ)۔ الراجز نے کہا:

بعد اللتیّا واللتیا والتی اذا علتها انفس تردّتِ

ان کے بعد جب وہ بلندی پر پہنچیں تو تھک ہار کر ہلاک ہوگئیں۔

بعض شعراء نے الّتِیْ پر حرف ندا داخل کیا اور حرف ندا ایسے اسم پر داخل نہیں ہوتا جس پر الف لام ہوتا ہے مگر صرف یا اللہ میں۔ گویا اس نے اسے اسم جلالت سے تشبیہ دی ہے اس حیثیت سے الف لام اس سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

من اجلك یا التی تیمت قلبی وانت بخیلة بالود عنی

تیری وجہ سے اے وہ محبوبہ! تو نے میرے دل کو غلام بنالیا ہے جبکہ مجھ سے محبت کرنے میں بخل کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے: وقع فلان واللتیا والتی۔ یہ دونوں مصیبت کے اسماء میں سے ہیں یعنی فلاں مصیبت میں واقع ہوا۔

الوقود، اس کا معنی لکڑی، ایندھن ہے، جبکہ واو کے فتحہ کے ساتھ ہو اور واو کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی روشن ہونا ہے۔

النَّاسُ اس میں عموم ہے لیکن مراد خاص لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ آگ کا ایندھن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آگ سے بچائے۔

الْحِجَارَةُ یہ سیاہ گندھک کا پتھر ہے۔ حضرت ابن مسعود اور فراء سے یہ مروی ہے، اس پتھر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ عذاب دینے میں پانچ اعتبار سے دوسرے تمام پتھروں سے زیادہ ہے، جلدی جلتا ہے، بدبودار ہے، دھواں زیادہ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ سختی سے چمٹ جاتا ہے، جب گرم ہوتا ہے تو باقی تمام پتھروں سے زیادہ گرم ہوتا ہے(1)۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے انسان اور پتھر کے علاوہ اس آگ میں کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیات میں جنوں اور شیاطین کے آگ میں ہونے کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْحِجَارَةُ سے مراد بت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) (تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جہنم کا ایندھن ہیں)۔ اس اعتبار سے پتھر اور لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے یہ آگ کی بڑائی کے لئے ذکر فرمایا ہے کہ وہ آگ اتنی سخت ہے کہ لوگوں کو جلانے کے ساتھ ساتھ پتھروں کو بھی جلا دیتی ہے۔ پہلی تاویل پر انہیں آگ اور پتھروں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر اذیت دینے والا آگ میں ہے اور اس تاویل میں دو وجہیں ہیں: (۱) جو دنیا میں لوگوں کو اذیت دے گا اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے آگ سے عذاب دے گا۔ (۲) وہ لوگ جو دنیا میں درندوں وغیرہ کو آگ میں عذاب دیتے ہیں وہ دوزخیوں کی سزا کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ بعض اہل تاویل کا یہ خیال ہے کہ یہ آگ جو پتھروں کے ساتھ خاص ہے یہ خاص کافروں کی آگ ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور آپ کی مدد کرتے ہیں، کیا یہ خدمت انہیں کچھ نفع دے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے اسے آگ کی سختیوں میں پایا پھر میں نے اسے چھوٹے سے گڑھے کی طرف نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے نچلے درجے میں ہوتے (1)۔ وقود یہ ترکیبی اعتبار سے مبتدا ہے اور النَّاسُ اس کی خبر ہے اور الْحِجَارَةُ اس پر معطوف ہے۔ حضرات حسن، مجاہد، طلحہ بن مصرف نے اسے وقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ عبید بن عمیر نے اسے وقیدھا الناس پڑھا ہے۔ کسائی اور اخفش نے کہا: الوقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایندھن ہے اور واؤ کے ضمہ ساتھ ہو تو اس کا معنی جلانا ہے۔ کہا جاتا ہے: وقدت النار تقد وُقوداً ووقداً وَقِدَةً و وقیداً و وَقداً و وَقَدَاناً یعنی آگ روشن ہوئی، اوقدتھا انا واستوقدتھا میں نے آگ کو جلایا۔ الاتقاد، التوقد کی مثل ہے یعنی روشن ہونا۔ اسم ظرف موقد ہے جیسے مجلس، النار موقدۃٌ آگ جلائی گئی۔ الوقدۃ۔ سخت گرمی کو کہتے ہیں یہ دس دن یا پندرہ دن ہیں۔ نحاس نے کہا: اس صورت میں اسے وقود واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس کا معنی ایندھن ہے۔ لیکن اخفش نے کہا: حکایت کیا گیا ہے کہ بعض عرب وَقود اور وُقود دونوں کو ایندھن اور مصدر کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اکثر علماء کا پہلا قول ہے۔ مثال دی کہ وَضوء واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی پانی ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ اس ارشاد کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے علاوہ اس میں داخل نہ ہوں گے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے مواقع پر گنہگاروں کے لئے وعید آئی ہے اور احادیث جو شفاعت کو ثابت کرتی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مسلمان بھی آگ میں جائیں گے۔ اس آیت میں اہل حق کے قول کی دلیل ہے کہ آگ موجود ہے اور تخلیق ہو چکی ہے جبکہ معتزلہ کا قول اس کے مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔ اسی قول کو قاضی منذر بن سعید البلوطی الاندلسی نے بھی اختیار کیا ہے۔ مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اچانک آپ ﷺ نے ایک آواز سنی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک پتھر ہے جو ستر سال پہلے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شفاعة النبی ﷺ لابی طالب والتخفیف عنه بسببه صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے دوزخ کی آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اب تک آگ میں گرتا ہے حتیٰ کہ اس کی گہرائی تک پہنچ گیا ہے (1)۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آگ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ آگ نے کہا: میرے اندر جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر ضعیف اور مسکین لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو فرمایا: تو میرا عذاب ہے تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ اس پر رحمت کروں گا۔ تم میں سے ہر ایک نے بھرنا ہے (2)۔ مسلم نے اس کا مفہوم نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: احتجت بمعنی تحتج ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابن مسعود کی حدیث کا مفہوم ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنت اور دوزخ نماز کسوف میں دکھائی گئیں۔ اسی طرح شب معراج میں جنت اور دوزخ کو دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں داخل بھی ہوئے (3)۔ پس جو اس کا مخالف قول کرے اس کا کوئی اعتبار نہیں سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

اُعِدَّتْ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ النَّارَ سے معدۃً کے معنی میں حال ہو اور قد مضمر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (النساء: 90) اس کا معنی ہے: قد حصرت صدورھم۔ حالانکہ قد مضمر ہے قد کے اضمار کا قول اس لئے کیا ہے کیونکہ ماضی قد کے ساتھ حال ہوتا ہے۔ اس صورت میں الْحِجَارَةُ پر وقف تام نہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ اُعِدَّتْ کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے فرمایا وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ (فصلت: 23) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے انہیں ہلاک کر دیا)۔

سجستانی نے کہا: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ، التی کے صلہ سے ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمایا وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران) (اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے) ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں التی کا صلہ وَقُوْدُهَا النَّاسُ موجود ہے۔ پس اسے دوسرے صلہ کے ساتھ ملانا جائز نہیں اور سورۂ آل عمران میں اُعِدَّتْ کے علاوہ کوئی صلہ ہے ہی نہیں۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۤ ۙ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لئے باغات ہیں۔ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل، (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب جھنم اعاذنا اللہ منھا، صفحہ 381، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ النساء مع الرجال فی الکسوف، حدیث 994، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی جزا کا ذکر فرمایا تو مومنین کی جزا کا بھی ذکر فرمایا: تبشیر کا مطلب ہے: ایسی چیز کی خبر دینا جس کا اثر جلد پر ظاہر ہو۔ پہلی خبر جو تجھ پر وارد ہوتی ہے اس کے ساتھ جلد میں تبدیلی ظاہر ہوتی ہے پھر یہ عام طور پر خوشی کے لئے استعمال ہونے لگا ایسی خبر کی قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہو اور کبھی غیر مقید بھی استعمال ہوتا ہے اور غم اور شر کے لئے تبشیر استعمال نہیں ہوتا مگر اس شر پر قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الانشقاق) (تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی)۔ کہا جاتا ہے: فأبشر، واستبشر وبشر یبشر جب کوئی خوشی ہو تو اس وقت بولا جاتا ہے۔ وجہ بشیر اس کو کہا جاتا ہے جو خوبصورت ہو اور جس کی خوبصورتی بالکل واضح ہو۔ البشری جو کچھ خوشخبری والے کو دیا جاتا ہے۔ تباشیر الشیء چیز کا ابتدائی حصہ۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مکلف (عاقل بالغ) جب یہ کہے کہ جو میرے غلاموں میں سے اس بات کی بشارت دے گا وہ آزاد ہے۔ ایک غلام نے پہلے اسے بشارت دی پھر دوسرے غلاموں نے بشارت دی تو ان میں سے پہلا آزاد ہوگا دوسرا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی کہے میرے غلاموں میں سے جس نے مجھے فلاں بات کی خبر دی تو وہ آزاد ہے، تو کیا اس میں دوسرا پہلے کی مانند ہے؟ شوافع نے کہا: ہاں کیونکہ ان میں سے ہر ایک مخبر ہے۔ ہمارے علماء (مالکی) نے کہا: نہیں کیونکہ مکلف اس خبر کا قصد کرتا ہے جو بشارت ہوتی ہے اور یہ پہلے غلام کے ساتھ خاص ہے اور یہ عرفاً معلوم ہے۔ پس قول کو عرف کی طرف پھیرنا واجب ہے۔ محمد بن الحسن نے اخبرنی اور حدثنی کے قول میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب کوئی شخص کہے: جس غلام نے مجھے فلاں خبر دی یا مجھے ایسا ایسا بتایا تو وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی نیت نہیں ہے، پس اس نے غلام نے اسے کتاب، یا کلام یا پیغام رسانی کے ذریعے وہ خبر دی تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ خبر ہے اس کے بعد اس کے کسی غلام نے بھی خبر دی تو وہ بھی آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس نے کہا تھا جو غلام مجھے خبر دے گا وہ آزاد ہے، اگر سب غلام یہ خبر دیں گے تو سب آزاد ہو جائیں گے۔ اگر اس نے قسم اٹھاتے وقت بالمشافہ کلام کے ذریعے خبر دینے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے صرف وہی آزاد ہوگا جو بالمشافہ کلام کے ساتھ وہ خبر دے گا اور جب کہے: اَیُّ غلامٍ لی حدثنی۔ تو یہ بالمشافہ گفتگو کرنے پر محمول ہوگا ان میں سے کوئی آزاد نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3:** وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس ارشاد میں اس شخص کا رد ہے جو کہتا ہے کہ ایمان صرف طاعات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اگر ایمان صرف اعمال ہوتے تو دوبارہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ذکر نہ کیا جاتا (1)۔ پس جنت ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جنت ایمان کے ساتھ حاصل ہوگی اور درجات کا استحقاق اعمال صالحہ کے ساتھ ہوگا۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اَنَّ لَهُمْ یہ بشر کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو بشارت دو ان کے لئے باغات ہیں الخ یعنی اس سے پہلے باء یا لام تھا۔ جب حرف جر ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا۔ کسائی اور اکثر بصری علماء نے کہا: ان باء کے اضمار کے ساتھ حالت جری میں ہے۔

جَنّٰتٍ، ان کے اسم کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ ان اور اس کا معمول، مفعول ثانی ہے۔ جَنّٰتٍ سے مراد باغات ہیں، جَنّٰتٍ کہا جاتا ہے کیونکہ اپنے درختوں کے ساتھ جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے اسے چھپا لیتے ہیں۔ اسی سے مجن (ڈھال) الجنین (پیٹ کا بچہ) اور جنت ہے۔

تَجْرِیْ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ فعل مستقبل ہے۔ یاء سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کیونکہ ضمہ یاء پر ثقیل ہے۔ الْاَنْهٰرُ۔ اس سے مراد ماء الانہار (نہروں کا پانی) ہے چلنے کی نسبت مجاز کی وجہ سے نہروں کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ چلتا صرف پانی ہے۔ ماء کا لفظ اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف:82) اصل اہل القریہ ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئت ان النار بعدك اوقدت　　　و استب بعدك يا كليبُ المجلسُ

مجھے بتایا گیا ہے کہ تیرے بعد آگ جلائی گئی۔ اے کلیب! تیرے بعد اہل مجلس نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

اس شعر میں المجلس سے مراد اہل مجلس ہیں۔ اہل کو حذف کیا گیا۔ النہر یہ أنہرت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: وسیع ہونا۔ اسی سے قیس ابن خطیم کا قول ہے:

ملكت بها كفي فانهرت فتقها　　　يرى قائم من دونها ماوراءها (1)

میں نے اپنے نیزے کے ساتھ اپنے ہاتھ کو قوت دی۔ پس اس کا سوراخ بہت وسیع ہو گیا اس کے پیچھے کھڑا ہونے والا اس کے دوسری طرف والی چیزوں کو دیکھتا تھا۔

اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ما انهر الدم و ذكر اسم الله عليه فكلوه۔(2) جو چیز ذبح کو کھلا کر دے حتیٰ کہ نہر کی طرح خون بنا دے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ۔ نہر کی جمع نُهُرٌ اور انہار ہے۔ نهرٌ، نَهِرٌ زیادہ پانی کو کہتے ہیں۔ ابوذؤیب نے کہا:

اقامت به فابتنت خيمة　　　على قصب وفراتٍ نهر

وہ ٹھہری اور اس نے وسیع پانیوں پر اور میٹھے پانیوں پر خیمہ لگایا۔

روایت ہے کہ جنت کی نہروں کی نالیاں نہیں ہیں بلکہ وہ جنت کی سطح پر قدرت الٰہیہ سے منضبط ہو کر چلتی ہیں (3) جہاں اہل

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب جواز الذبح بکل ما انهر الدم الا السن، صفحہ 156، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الشركة، باب قسمة الغنم، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جنت چاہیں گے وہ چلتی رہیں گی۔ الْاَنْهٰرُ پر وقف حسن ہے لیکن تام نہیں کیونکہ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ، جَنّٰتٍ کے وصف سے ہے (رزقاً) مصدر ہے۔ الرزاق کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ اس میں دو وجوہ ہیں: (۱) وہ کہیں گے یہ وہی ہے جس کا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے (۲) یہ وہ رزق ہے جو دنیا میں ہمیں دیا گیا ہے۔ یہ وہ اس لئے کہیں گے کیونکہ جنت کے پھلوں کا رنگ دنیا کے پھلوں جیسا ہوگا۔ جب وہ انہیں کھائیں گے تو اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلُ یعنی جنت میں جو پہلے دیا گیا، کیونکہ انہیں رزق دیا جائے گا پھر دوبارہ رزق دیا جائے گا جب انہیں دن کے آغاز میں کھانے اور پھلوں کے ساتھ رزق دیئے جائیں گے تو وہ اس سے کھائیں گے پھر دن کے آخر میں اس رزق سے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے دیا گیا تھا یعنی ہم دن کے آغاز میں کھا چکے ہیں کیونکہ اس کا رنگ اس کھانے کے مشابہ ہوگا لیکن جب اسے کھائیں گے تو صبح والے کھانے سے اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ وَاُتُوْا یہ اتیت سے مجہول کا صیغہ ہے۔ ایک جماعت نے اسے ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون الاعور نے واتوا یعنی ہمزہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی قراءت میں ضمیر اہل جنت کے لئے ہے اور دوسری میں خدام کے لئے ہے۔

بِهٖ مُتَشَابِهًا یہ بِهٖ کی ضمیر سے حال ہے یعنی دیکھنے میں بعض بعض کے مشابہ ہوں گے اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے (1)۔ یہ حضرات ابن عباس، مجاہد اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔

حضرت عکرمہ نے کہا: وہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن صفات میں ان سے مختلف ہوں گے (2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ تعجب کی بنا پر کہیں گے دنیا میں کوئی جنت کی چیزوں کے مشابہ نہیں سوائے اسماء کے۔ گویا وہ تعجب کریں گے جب وہ پھلوں کی خوبصورتی اور ان کی عظیم تخلیق کو دیکھیں گے۔ قتادہ نے کہا: مُتَشَابِهًا کا مطلب ہے: وہ سارے عمدہ ہیں ان میں کوئی گھٹیا نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: 23) اور دنیا کے پھلوں کی طرح نہیں ہیں جو مشابہ نہیں کیونکہ دنیا میں کچھ بہتر ہوتے ہیں اور کچھ بہتر نہیں ہوتے۔

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ یہ مبتدا خبر ہے، اَزْوَاجٌ جمع ہے زوج کی۔ مرد کا زوج عورت ہے اور عورت کا زوج مرد ہے (3)۔ اصمعی نے کہا: عرب زوجۃ نہیں کہتے۔ الفراء نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: زوجۃٌ۔ فرزدق نے کہا:

وان الذی یسعیٰ لیفسد زوجتی     کساعٍ الی أسد الشری یستبیلها

وہ شخص جو کوشش کرتا ہے تاکہ میری بیوی کو خراب کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو شیروں کی کچھار کی طرف کوشش کرتا ہے تاکہ ان کا پیشاب ہاتھ میں لے۔

حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہا تھا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں وہ دنیا و آخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترمہ) ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے (4)۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے۔ کسائی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 109، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)    2۔ ایضاً    3۔ ایضاً

4۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حدیث نمبر 3488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اس کو پسند کیا ہے۔

مُّطَهَّرَةٌ۔ یہ اَزْوَاجٌ کی صفت ہے۔ مُّطَهَّرَةٌ، طاہرۃ سے زیادہ جامع اور بلیغ ہے۔ اس طہارت سے مراد حیض، تھوک اور دوسری عورتوں کی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہونا ہے۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے ثوری نے ابن ابی نجیح سے روایت کر کے بتایا اور ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ مُّطَهَّرَةٌ یعنی وہ نہ پیشاب کریں گی نہ پاخانہ، نہ بچے جنم دیں گی نہ انہیں حیض آئے گا نہ ان کو منی آئے گی نہ وہ تھوکیں گے۔ ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں اہل جنت کی صفات اور جنت کی صفات اور اس کی نعمتوں کے وصف کے عنوان کے تحت ان سب چیزوں کو ذکر کر دیا ہے۔ الحمدللہ

وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ هُمْ مبتدا ہے خٰلِدُوْنَ اس کی خبر ہے۔ ظرف لغو ہے۔ غیر قرآن میں خالدین کو نصب حال کی حیثیت سے بھی جائز ہے۔ الخلود سے مراد بقا ہے، اسی سے حبۃ الخلد ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی جنت کبھی یہ زیادہ مدت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی سے عربوں کا قول دعا کے بارے میں ہے: خلد الله ملكه اس کی بادشاہی کو طوالت عطا فرمائی۔ زہیر نے کہا:

الا لا اری علی الحوادث باقیا　　　ولا خالداً الا الجبال الرواسیا

خبردار! میں حوادث کو باقی رہنے والا اور لمبی مدت رہنے والا نہیں دیکھتا سوائے ان پہاڑوں کے جو زمین میں گڑھے ہوئے ہیں۔

آیت میں جو خلود کا لفظ استعمال ہوا ہے ہمیشہ رہنے کے معنی میں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

''بے شک اللہ حیاء نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔ تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے) اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا ہے اس سے مگر نافرمانوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا حضرت ابن عباس نے حضرت ابو صالح کی روایت میں فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لئے یہ دو مثالیں دیں (یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (البقرہ:17) اور أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ (البقرہ:19) تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی ذات مثالیں بیان کرنے میں بلند اور اعلیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خداؤں کا ذکر کیا اور فرمایا: یَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (الحج:73) (اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے) اور ان کے خداؤں کے حیلہ کو ذکر کیا تو اسے مکڑی کا جالا بیان فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا تو نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا ہے اس قرآن میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، وہ اس سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرات حسن اور قتادہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ مشرکین کے لئے مثال دی تو یہودی ہنسے اور کہا: کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یَسْتَحْیٖٓ اصل میں یَسْتَحْیِیُ تھا عین اور لام کلمہ حرف علت تھے تو لام کلمہ میں تعلیل کی گئی۔ ضمہ یا پر ثقیل تھا تو اسے ساکن کر دیا۔ اسم فاعل بھی اسی طرح ہے مُسْتَحِیٍ جمع مستحیُون مُسْتحیین۔ ابن محیصن نے یستحی حاء کے کسرہ اور ایک یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے (یہ تمیم اور بکر بن وائل کی لغت ہے) اس میں پہلی یا کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور اسے ساکن کر دیا پھر ضمہ دوسری یا پر ثقیل تھا تو اسے بھی ساکن کر دیا پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک یا کو حذف کر دیا گیا۔ اسم فاعل مستحٍ ہے جمع مستحون اور مستحین ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے: اس آیت میں یستحیی کے معنی کرنے میں متاولین کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لا یخشی کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں ڈرتا)۔ طبری نے اس معنی کو ترجیح دی ہے، قرآن میں ہے: تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ (احزاب:37) یہاں تخشی بمعنی تستحیی ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ لا یترک کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں چھوڑتا)۔ بعض نے فرمایا لا یمتنع کے معنی میں ہے یعنی اللہ نہیں رکتا۔ استحیاء کا اصل معنی کسی شے سے رکنا ہے قبح کے مواقع کے خوف سے اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے لئے بیان کرنا محال ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ام سلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان اللہ لا یستحی من الحق۔ (1) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس میں حیا کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ذکر سے نہیں رکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا، یضرب کا معنی یبیّن (بیان کرنا) ہے، ان اپنے فعل کے ساتھ من کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے (مثلاً) یضرب کی وجہ سے منصوب ہے (بعوضة) کے نصب کی چار وجوہ ہیں:

۱- (ما) زائدہ ہے اور بعوضةً، مثلاً سے بدل ہے۔

۲- (ما) نکرہ ہے مثلاً سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور بعوضةً (ما) کی صفت ہے اور ما کی صفت ہے اور جنس نکرہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اس کے ابہام کی وجہ سے کیونکہ وہ بمعنی قلیل ہوتا ہے یہ فراء، زجاج اور ثعلب کا قول ہے (2)۔

۳- حرف جار کے اسقاط کی تقدیر پر اسے نصب دی گئی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا: ان یضرب مثلاً ما بین بعوضة۔ بین کو حذف کیا گیا اور اس کا اعراب بعوضة کو دیا گیا۔ فا بمعنی الی ہے یعنی جو اس سے بڑی چیز ہے یہ کسائی اور فراء کا قول ہے۔ ابو

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منہا، صفحہ 146، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111-110، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

العباس نے کہا:

یا احسن الناس ما قرنًا الی قدمٍ ولا حبال محب واصل تصل

اے وہ ذات جو سر سے قدم تک تمام لوگوں سے زیادہ حسین ہے! محب واصل کا کوئی رشتہ پہنچنے والا نہیں۔

اس شعر میں ماقرناً سے مراد ما بین قرنٍ ہے، جب بین کو ساقط کر دیا تو اس کو منصوب کر دیا۔

۴- یضرب بمعنی یجعل ہو۔ اس صورت میں بعوضۃً مفعول ثانی ہو گا۔ ضحاک، ابراہیم بن ابی عبلہ، رؤبہ بن حجاج نے بعوضہ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابوالفتح نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ما اسم ہے جو الذی کے قائم مقام ہے اور بعوضۃ کو مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: لا یستحی ان یضرب الذی ھو بعوضۃٌ مثلاً۔ پس موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا اور وہ ھو مبتدا ہے، اس کی مثل بعض قراء کی قراءت ہے: تماما علی الذی احسن یعنی علی الذی ھو احسن۔ ھو مبتدا محذوف ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: ما انا بالذی قائل لک شیئاً یعنی ھو قائل۔ (1) نحاس نے کہا: مّا میں حذف زیادہ قبیح ہے الذی میں حذف کی نسبت کیونکہ الذی کے لئے تو ایک ہی وجہ ہے، اس کے ساتھ زیادہ طویل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضربت لہ مثلاً کا معنی ہے: مثلت لہ مثلاً میں نے اس کے لئے مثال دی ھذہ الابنیۃ علی ضربٍ واحدٍ (تمام عمارتیں ایک جیسی ہیں) علی مثال واحدٍ و نوعٍ واحدٍ۔ الضرب کا معنی نوع (قسم) ہے۔ البعوضۃ یہ بَعَضَ سے فعولہ کے وزن پر ہے۔ بَعَضَ کا معنی ہے اس نے گوشت کاٹ لیا۔ کہا جاتا ہے: بضع اور بعض ہم معنی ہیں۔ قد بعضتہ تبعیضاً، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا تو وہ ٹکڑے ہو گیا۔ البعوض سے مراد مچھر ہے۔ اس کا واحد بعوضۃٌ اس کو بعوضہ اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ جوہری وغیرہ کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا فَوْقَهَا پہلے گزر چکا ہے کہ فا بمعنی الی ہے اور جنہوں نے پہلے مّا کو صلہ زائدہ بنایا ہے اس نے دوسرے ما کو اس پر معطوف کیا ہے۔ کسائی اور ابوعبیدہ وغیرہما نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا معنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ما دونها ہے (2)، یعنی جو چیز چھوٹے ہونے میں اس سے زیادہ ہو۔ کسائی نے کہا: یہ کلام میں تیرے اس قول کی مانند ہے اتراہ قصیراً؟ (کیا تو اسے چھوٹا دیکھتا ہے)۔ کہنے والا کہتا ہے: او فوق ذالک یعنی جتنا تو اسے دیکھ رہا ہے وہ اس سے بھی چھوٹا ہے۔ قتادہ اور ابن جریج نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا مطلب ہے اس سے بڑی چیز (3)، اور (انہ) کی ضمیر کا مرجع المثل ہے یعنی مثل حق ہے۔ حق، باطل کے خلاف ہوتا ہے حق کی جمع حقوق ہے۔ الحقۃ، حا کے فتحہ کے ساتھ اس سے زیادہ خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذہ حقتی یعنی یہ میرا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بنی تمیم اور بنی عامر کی لغت اَمَا میں اَیما ہے۔ وہ تضعیف کی کراہت کی وجہ سے ایک میم کو یا سے بدل دیتے ہیں۔ اس بنا پر عمر بن ابی ربیعہ کا شعر پڑھا جاتا ہے:

رأت رجلاً ایما اذ الشمس عارضت فیضحی و ایما بالعشی فیخصر

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اس نے ایک شخص دیکھا جب سورج چڑھتا تو وہ گرم ہوتا جب شام ہوتی تو وہ ٹھنڈا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَقُولُونَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا نحویوں کا مَاذَآ کے متعلق اختلاف ہے۔ یہ ایک اسم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہوگا: ای شیء اراد الله۔(1) (اللہ تعالیٰ کس چیز کا ارادہ فرماتا ہے)۔ اس صورت میں اَرَادَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ ابن کیسان نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ بعض نے فرمایا: مَا اسم تام ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور ذَآ بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ما الذی ارادہ الله بھذا مثلاً۔ ان کے اس کلام کا مطلب استفہام کے لفظ کے ساتھ انکار ہے اور مَثَلًا قطع کی بنا پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اراد مثلاً یہ ثعلب کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اس تمیز کی بنا پر منصوب ہے جو حال کی جگہ واقع ہوتی ہے(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا بعض علماء نے فرمایا کہ کفار کے قول کا معنی یہ ہے کہ اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف اور ہدایت کی طرف تفریق کرتا ہے(3)۔

بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ یہ زیادہ بہتر قول ہے کیونکہ وہ اقرار کرتے تھے کہ ہدایت اس کی طرف سے ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے یعنی توفیق دیتا ہے اور محروم کرتا ہے۔ اس میں معتزلہ کے قول کا رد ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ گمراہی پیدا کرتا ہے نہ ہدایت۔ وہ کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کا نام گمراہ رکھتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فسقت فلاناً یعنی میں نے اس کا نام فاسق رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا، یہ ان کا اضلال میں طریقہ ہے۔ یہ مفسرین کے اقوال کے خلاف ہے اور لغت میں بھی اس کا احتمال نہیں کیونکہ کہا جاتا ہے: جب کوئی کسی کا نام ضال رکھے تو کہتے ہیں ضلله، اور جب کسی کا نام رکھے تو اَضَلَّه نہیں کہا جاتا لیکن اس آیت کا معنی وہی ہے جو مفسرین نے بیان فرمایا کہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے محروم فرماتا ہے ان کے کفر کی جزا دیتے ہوئے۔ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، الْفٰسِقِيْنَ کو نصب فعل کی وجہ سے دی گئی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وما یضل احداً الا الفاسقین الذین سبق فی علمه انه لا یهدیهم۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقین کو جن کے متعلق پہلے ہی اس کے علم میں ہے کہ اس نے انہیں ہدایت کی توفیق نہیں دینی ہے۔ اور استثنا کی بنا پر الْفٰسِقِيْنَ کو نصب جائز نہیں کیونکہ استثنا ہمیشہ کلام کے مکمل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

نوف بکالی نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا: الٰہی! تو نے مخلوق پیدا کی ہے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو حضرت عزیر علیہ السلام سے کہا گیا: اس سوال سے اعراض کرو تم اس سوال کو چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا مرتبہ نبوت ختم کر دوں گا، جو میں کرتا ہوں اس کے متعلق مجھ سے سوال نہیں کیا جاتا لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 112، جلد 1 3۔ ایضاً

الضلال، اس کا اصل معنی ہلاک ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل الماء فی اللبن جب پانی دودھ میں مل کر ختم ہو جائے، اسی سے یہ ارشاد ہے: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (السجدہ:10) سورۂ فاتحہ میں بحث گزر چکی ہے۔ فسق کی اصل، کلام عرب میں کسی چیز سے خروج ہے۔ کہا جاتا ہے: فسقت الرطبۃ جب پھل اپنے پردے سے باہر آ جائے اور چوہیا اپنی بل سے باہر آ جائے۔ الفویسقۃ چوہیا کو کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم الحیۃ و الغراب الابقع و الفارۃ و الکلب العقور و الحُدَیا(1)۔

پانچ چیزیں فواسق ہیں انہیں حل وحرم میں قتل کیا جائے گا: سانپ، کالا کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اذیت کی وجہ سے ان کا نام فواسق رکھا ہے جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ ذکر آئے گا۔

فسق الرجل یفسِقُ و یفسُق... عن الاخفش... فسقا و فسوقاً یعنی نکلا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف:50) (یعنی اپنے رب کے حکم سے نکل گیا)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ اس نے جاہلیت کے کلام اور اشعار میں کبھی فاسق کا لفظ نہیں سنا۔ فرمایا: یہ عجیب ہے۔ یہ عربی کلام ہے اس کو ابن الفارس اور جوہری نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے اپنی کتاب ''الزاھر'' میں ذکر کیا ہے جب وہ فسق کے معنی پر گفتگو کر رہے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

یذھبن فی نجد و غورا غائرا فواسقاً عن قصدھا جوائرا

وہ نجد میں گئیں اور نشیبی علاقہ میں چلی گئیں اپنے مقصود سے نکل کر ٹیڑھے راستہ پر نکل گئیں۔

الفسیق ہمیشہ فسق کا ارتکاب کرنے والا، ندا کرنے والا وقت۔ کہا جاتا ہے: یا فسق و یا خبث۔ مراد ہوتا ہے: یایھا الفاسق و یایھا الخبیث۔ عرف شرعی میں فسق کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا۔ کبھی اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کفر کے ساتھ نکلتا ہے اور اس پر بھی جو نافرمانی کیساتھ نکلتا ہے۔

الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں۔ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْنَ یہ فاسقین کی نعت ہونے کی بنا پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو مبتدا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب فواسق یقتلن فی الحرم، حدیث نمبر 3067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

محذوف کی خبر بنا کر حالت رفع میں کردے یعنی ھم الذین۔ اس کی مزید بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَنْقُضُوْنَ النقض کسی دیوار، یا رسی یا عہد کو توڑ دینا۔ النقاضۃ، بالوں کی رسی کو توڑ دینا۔ المناقضۃ، ایسا کلام جس کے معنی میں تناقض ہو۔ النقیضۃ فی الشعر ایسا شعر جو کسی کے جواب میں کہا جائے۔ النقض۔ توڑی ہوئی چیز۔

علماء کا اس عہد کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیا تھا جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی اپنی مخلوق کو وصیت اور اس کا امر ہے جو اس نے انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نہی ہے جو اس نے اپنے رسل کی زبان کے ذریعے اپنی کتب میں اپنی معصیت سے روکا ہے اور اس کا نقض اس کے احکام پر عمل کا ترک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس نے آسمانوں، زمین اور دوسری اپنی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنی وحدانیت پر دیئے ہیں یہ عہد کے قائم مقام ہیں اور ان کا توڑنا ان میں غور وفکر کو ترک کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ عہد ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بیان کریں اور ان کے امر کو نہ چھپائیں۔ اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہوگی۔ ابو اسحاق الزجاج نے کہا: اس عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء اور ان کے متبعین سے لیا کہ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کریں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ (آل عمران: 81) میں کہتا ہوں: اس آیت کے ماقبل اور مابعد کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے۔ یہ پانچ اقوال ہیں اور دوسرا قول سب کو جامع ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ، میثاق اس عہد کو کہا جاتا ہے جس کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ الوثاقۃ والمعاھدۃ (☆) سے مفعال کا وزن ہے۔ اس کا معنی عقد اور باندھنے میں شدت کرنا۔ اصل پر اس کی جمع المواثیق ہے کیونکہ میثاق کی اصل موثاق ہے۔ ماقبل کسرہ کی وجہ سے واؤ یاء سے بدل گئی، اس کی جمع میاثق اور میاثیق بھی آتی ہے۔ ابن عربی نے کہا:

حتی لا یحل الدھر الا باذننا ولا نسال الأقوام عھد المیاثیق

حتی کہ ہمارے اذن کے بغیر زمانہ اسے حلال نہیں کرتا اور قوموں سے عہد و پیمان کا مطالبہ نہیں کرتے۔

الموثق، المیثاق، المواثقۃ سب کا معنی معاہدہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ (المائدہ: 7) (اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ کیا تھا تم سے)۔

**مسئلہ نمبر 4**: وَ يَقْطَعُوْنَ، القطع یہ معروف ہے۔ قطع تعلقی میں مصدر القطیعۃ استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قطیعۃ فھو رجل قطاع و قطعۃ جیسے ھُمَزَۃٌ۔ قطعت الحبل قطعاً میں نے رسی کو توڑ دیا۔ قطعت النھر قطوعا . . . قطعت

☆ یہ لفظی اعتبار سے محل نظر ہے۔

الطیر قطوعا و قطاعاً و قِطاعاً جب کوئی پرندہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے۔ اصاب الناس قطعةٌ جب لوگوں کے پانی کم ہو جائیں۔ و رجل به قطْعٌ جب آدمی کا سانس تھکاوٹ کی وجہ سے متواتر پے در پے آنے لگے۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ اس میں (مَا) یَقْطَعُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اگر تو چاہے تو اَنْ کو مَا سے بدل بنا دے اور اگر چاہے تو بِهٖ میں جو ضمیر ہے اس سے (ان) کو بدل بنا دے۔ یہ ترکیب بہتر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لئلا یوصل ہو یعنی کراھة ان یوصل۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو ملانے کا حکم دیا؟ بعض نے فرمایا: صلہ رحمی۔ بعض نے فرمایا: قول کو عمل کے ساتھ ملانے کا حکم ہے۔ پس انہوں نے قول و عمل کو جدا جدا کر دیا۔ اس طرح کہ جو انہوں نے کہا اس پر عمل نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: تمام انبیاء کی تصدیق کو ملانے کا حکم دیا۔ پس انہوں نے بعض انبیاء کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کر کے اس کو توڑا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کے دین اور زمین میں اس کی عبادت، شریعت کا قائم کرنا اور شرعی حدود کی حفاظت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہر اس صورت کو شامل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور الرحم اس کا ایک جز ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ یعنی وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور افعال میں ظلم کرتے ہیں کیونکہ ان کے افعال ان کی شہوات کے مطابق ہوتے ہیں (1)۔ یہ فساد کی حد ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور هُمْ زائدہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ دوسرا مبتدا ہو اور الْخٰسِرُوْنَ اس کی خبر ہو اور پھر مبتدا خبر دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ الخاسر وہ شخص ہے جو فلاح و فوز میں سے اپنا حصہ ہی کم کر دے۔ الخسران کا مطلب نقصان ہے خواہ وہ میزان میں ہو یا کسی اور چیز میں۔ جریر نے کہا:

ان سليطا فی الخسار انه اولاد قوم خلقوا اقنة

بے شک سلیط خسارے میں ہے وہ ایک قوم کی اولاد ہے جو غلام پیدا کئے گئے ہیں۔

یعنی اپنے حظوظ اور شرف میں کمی کرنے کی وجہ سے خسارہ میں ہیں۔

جوہری نے کہا: خسرت الشیء و اخسرته کا معنی ہے: کمی کرنا۔ الخسار و الخسارة و الخیسری۔ کا معنی گمراہ ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔ ہلاک ہونے والے کو خاسر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو خسارہ دینے والا ہے اور وہ جنت میں اپنی منزل سے روکے گئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**: اس آیت میں دلیل ہے کہ عہد پورا کرنا، اس کا التزام کرنا ہے اور ہر عہد جس کو انسان نے اپنے اوپر لازم کیا ہو اسے اس کے لئے توڑنا حلال نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان کے ساتھ ہو یا کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کی مذمت کی ہے۔ فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ (انفال: 58) پس اللہ تعالیٰ نے غدر (عہد شکنی) سے منع فرمایا ہے اور یہ نہیں ہوتا مگر عہد توڑنے کی وجہ

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے''۔

كَيْفَ حالت کے متعلق سوال ہے۔ یہ اسم ہے اور تَكْفُرُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یہ مبنی برفتحہ ہے اس کو ساکن ہونا تھا کیونکہ اس میں اس استفہام کا معنی ہے جس کا معنی تعجب ہے۔ پس اس کو حروف سے مشابہت دی گئی اور فتحہ کی خفت کی وجہ سے اس کے لئے فتحہ اختیار کیا گیا یعنی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر تعجب کرنا واجب ہے جب انہوں نے کفر کیا حالانکہ ان پر حجت ثابت ہو چکی ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ خطاب اہل کتاب کو ہونا کیسے جائز ہے کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ جب انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور جو کچھ آپ احکام لے کر آئے اس کی تصدیق نہ کی تو انہوں نے شرک کیا کیونکہ انہوں نے یہ اقرار نہ کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو یہ گمان کرے کہ قرآن انسان کا کلام ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور وہ عہد کو توڑنے والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: كَيْفَ کا لفظ تو لفظاً استفہام ہے لیکن معنی استفہام نہیں بلکہ یہ تقریر اور توبیخ کے لئے ہے یعنی تم کیسے اس کی نعمت کا انکار کرتے ہو جبکہ اس کی قدرت یہ ہے (1)۔ الواسطی نے کہا: اس کلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں حد درجہ کی توبیخ فرمائی کیونکہ مردوں اور جمادات سے اس کا صانع کسی چیز میں جھگڑا نہیں کرتا۔ منازعت (جھگڑا) بیاکل روحانیہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یہ واو حالیہ ہے اور قد مضمرۃ ہے۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت و قد کنتم ہے۔ پھر قد حذف ہو گیا۔ فراء نے کہا اَمْوَاتًا، كُنْتُمْ کی خبر ہے۔

فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ یہاں وقف تام ہے۔ ابو حاتم نے اسی طرح کہا پھر فرمایا: ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اہل تاویل نے ان دو موتوں اور دو زندگیوں کی ترتیب میں اختلاف کیا ہے اور انسان کے لئے کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرات ابن عباس اور ابن مسعود نے فرمایا: یعنی تم تخلیق سے پہلے معدوم تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہاری عمروں کے مکمل ہونے کے وقت تمہیں موت دے گا ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر تمہیں قیامت کے روز زندہ کرے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول اس آیت سے مراد ہے۔ کفار کو اس قول سے انکار نہیں تھا کیونکہ وہ ان دونوں چیزوں کا اقرار کرتے تھے (2)، جب کفار کے نفوس کو یقین تھا کہ وہ معدوم تھے اور پھر دنیا میں انہیں پیدا کیا پھر اس دنیا میں انہیں مارنے کا بھی یقین تھا تو ان پر دوبارہ زندہ کرنے کا لزوم قوی ہو گیا۔ اب ان کا آخرت میں اٹھنے کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 114، جلد 1

انکار ایسا دعویٰ تھا جس پر کوئی دلیل نہ تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: اس تاویل پر قبر کی زندگی دنیا کی زندگی کے حکم میں ہوگی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں جس میں اس کی موت کا اعتبار نہیں کیا گیا جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مارا پھر دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی آدم کی پیٹھ میں تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں اس کی پیٹھ سے چیونٹیوں کی صورت میں نکالا ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہیں دنیا کی موت دے گا پھر تمہیں اٹھائے گا۔ بعض نے فرمایا كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں نطفہ کی صورت میں تھے پھر اس نے تمہیں رحموں سے نقل کیا فَاَحْيَاكُمْ اور تمہیں زندگی بخشی ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہیں اس زندگی کے بعد موت دے گا پھر سوال کے لئے تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں قبر میں موت دے گا پھر حشر کی طرف لے جانے کے لئے نشر کی زندگی دے گا۔ یہ ایسی زندگی ہے جس کے بعد موت نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر تین موتیں اور تین زندگیاں ہوں گی اور ان کا آدم کی پیٹھ میں مردہ ہونا اور ان کا آدم کی پیٹھ سے نکلنا اور ان پر گواہی دینا مگر ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں میں ان کا نطفہ نہ ہونا اس صورت میں چار موتیں اور چار زندگیاں ہو جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے لوگوں کو ذروں کی صورت میں پیدا کیا پھر انہیں موت دی۔ اس صورت میں پانچ موتیں اور پانچ زندگیاں ہو جائیں گی چھٹی موت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرموں کے لئے جب وہ آگ میں داخل ہوں گے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہے دوزخی جو دوزخ والے ہیں وہ اس میں نہ مریں گے نہ زندہ ہوں گے لیکن کچھ لوگ جنہیں آگ لگے گی ان کے گناہوں کے سبب پھر اللہ انہیں موت دے گا حتی کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں تو اذن شفاعت ہوگا انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر جنت کی نہروں پر انہیں بکھیر دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ۔ پس اس طرح ان پر گوشت پیدا ہو جائے گا جیسے سیلاب کی مٹی پر بوٹی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے کہا: گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں بکریاں چراتے تھے (1)۔ (مسلم)

میں کہتا ہوں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اماتہ اللہ اماتۃ (اللہ پھر انہیں موت دے گا) اس سے حقیقۃ موت مراد ہے کیونکہ مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند طاری کر کے انہیں عذاب سے غائب کر دیا ہو اور یہاں حقیقی موت مراد نہ ہو لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ نحویوں کا اجماع ہے کہ جب فعل کی مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہو تو وہاں مجاز مراد نہیں ہوتا بلکہ حقیقت مراد ہوتی ہے جیسے كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۟ (النساء) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم گمنام تھے فَاَحْيَاكُمْ اس نے زندگی بخشی کہ تمہارا ذکر کیا گیا اور تم اس دین اور اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے جو تمہارے پاس آیا۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا۔ پس تمہارا ذکر ختم ہو جائے گا پھر تمہیں بعث کے لئے زندہ کرے گا۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار، صفحہ 104، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر اس کے عذاب کی طرف، اپنے کفر کی وجہ سے لوٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معنی ہے کہ زندگی کی طرف اور سوال کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (الانبیاء: 104) پس ان کا دوبارہ زندہ کرنا ان کے ابتدا میں زندہ کرنے کی طرح ہے اور یہی رجوع ہے اور ترجعون اکثر قراء کی قراءت ہے۔ یحییٰ بن یعمر، ابن ابی اسحٰق، مجاہد، ابن محیصن، سلام بن یعقوب نے حرف مضارع کو فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تھا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف تو ٹھیک ٹھیک بنادیا انہیں سات آسمان اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔)

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** خَلَقَ اس کا معنی عدم سے وجود میں لانا ہے۔ کبھی انسان کے لئے خلق بولا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو ایجاد کرے۔ شاعر کا قول ہے:

من کان یخلق ما یقو لُ فحیلتی فیه قلیلةٌ (1)

جو وہ کر گزرتا ہے جو وہ کہتا ہے تو میرا حیلہ اس کے بارے میں کم ہے۔

یہ معنی گزر چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خَلَقَ لَكُمْ کا معنی ہے من اجلکم تمہارے لئے پیدا کیا۔ بعض نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے تم پر وہ انعام کیا گیا ہے وہ تمہارے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ توحید اور اعتبار کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کے وہ محتاج ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** جن علماء کا یہ اصول ہے کہ وہ اشیاء جن سے نفع حاصل کیا جاتا ہے وہ مباح ہیں انہوں نے اسی آیت سے یہ اصول مستنبط کیا ہے اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) (یعنی نفع بخش چیزیں حلال ہیں) حتیٰ کہ منع پر دلیل آجائے۔

انہوں نے اپنے اس اصول کی تائید میں یہ کہا ہے کہ لذیذ کھانے پیدا کئے گئے ہیں ان کے پیدا کرنے کا امکان بھی موجود تھا، یہ عبث تو پیدا نہیں کئے گئے، ان کی کوئی منفعت ہوگی اور اس کی منفعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات ان چیزوں سے مستغنی ہے۔ پس یہ منفعت ہماری طرف ہی لوٹے گی اور ہماری منفعت یا تو لذت کے حاصل کرنے میں ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 114، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان چیزوں سے اجتناب میں ہے تا کہ ہماری اس طرح آزمائش کی جائے یا ہم ان سے عبرت حاصل کریں ان امور سے کوئی بھی حاصل نہیں ہوسکتا مگر چکھنے کے ساتھ۔ پس یہ لازم ہوا کہ یہ مباح ہیں، یہ قول فاسد ہے کیونکہ منفعت کے بغیر تخلیق سے عبث لازم نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے منفعت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اس پر منفعت اصل واجب نہیں ہے بلکہ یہ منفعت اس کو پیدا کرنے کا موجب ہے۔ ہم منفعت کا حصر ان صورتوں میں تسلیم نہیں کرتے جو انہوں نے بیان کی ہیں اور ان منافع میں سے بعض کا حصول چکھنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ ذائقہ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کیا جاتا ہے جیسے کہ طبائعیین کے نزدیک معروف ہے۔

پھر ان کا اصول معارض ہے ہر اس چیز سے جس کے چکھنے سے اس کے ہلاک کرنے والی زہر ہونے کا خوف ہو۔ اصحاب حظر کے شبہات سے معارض ہیں۔ بعض نے توقف فرمایا اور کہا: ہر فعل جس کا حسن اور قبح معلوم نہ ہو مگر یہ کہ وہ فی نفسہٖ حسن ہو، شرع کے ورود سے پہلے کوئی معین کرنے والا نہیں۔ وقف تو شریعت کے ورود تک موقوف ہوگا۔ یہ تینوں معتزلہ کے اقوال ہیں۔

شیخ ابوالحسن اور اس کے ساتھی اکثر مالکی اور صیرفی نے اس مسئلہ میں مطلق وقف کا قول کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس حالت میں ان اشیاء کا کوئی حکم نہیں ہوگا شرع کے لئے ہے جب وہ آئے تو جو چاہے حکم دے۔

عقل وجوب اور غیر وجوب کے ساتھ حکم نہیں لگاتی۔ اس کا حصہ ہے امور اس کے مطابق پہنچائے جائیں گے جیسے وہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا: ابن فورک نے ابن الصائغ سے روایت کر کے بیان کیا ہے، فرمایا: عقل کبھی سمع سے خالی نہیں ہوتی کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اس میں سمع (سننا) ہوتا ہے، یا اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا یا اس کے لئے ایسی حالت ہوگی جس کی وجہ سے اسے کہا جائے گا۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ یہ حظر، اباحت اور توقف میں غور و فکر سے مستغنی کر دیتا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3:** خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ کے معنی میں صحیح اعتبار ہے۔ اس سے ماقبل اور مابعد عبرتوں کے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں (مثلاً) زندہ کرنا، مارنا، تخلیق کرنا، آسمانوں کی طرف استویٰ اور آسمانوں کا تسویہ یعنی جو ذات تمہارے زندہ کرنے پر اور تمہاری تخلیق پر، آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر قادر ہے اس کی قدرت سے دوبارہ زندہ کرنا بعید نہیں۔

اگر کہا جائے کہ لَكُمْ کا معنی انتفاع ہے یعنی تا کہ تم ان تمام چیزوں سے نفع اٹھاؤ ہم کہیں گے انتفاع سے مراد اعتبار (عبرت حاصل کرنا) ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بچھوؤں اور سانپوں میں کیا عبرت ہے؟ ہم کہیں گے انسان موذی چیزوں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے آگ میں سزائیں تیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ چیزیں ایمان کا سبب اور گناہوں کے ترک کا سبب بنتی ہیں یہ بہت بڑی عبرت ہے۔ ابن عربی نے کہا: ان تمام چیزوں سے اس قدرت کے متعلق جو خبر دی گئی اس میں منع، اباحت اور توقف کا کوئی تقاضا نہیں۔ یہ آیت دلالت اور تنبیہ کے لئے ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ ارباب معانی نے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا کے متعلق فرمایا: یہ سب تمہارے لئے پیدا فرمایا ہے تا کہ تم اس کی اطاعت پر قوت حاصل کرو نہ کہ تم اس کی معصیت کی وجوہ میں تصرف کرو۔ ابو عثمان نے کہا: تجھے یہ سب کچھ عطا فرمایا اور تیرے لئے مسخر کر دیا تا کہ تم اس کے وجود کی وسعت پر استدلال کرو اور تو سکون

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حاصل کر اس سے جو آخرت میں تیرے لئے بڑی بڑی نعمتیں محفوظ کر رکھی ہیں تو اپنے قلیل عمل پر کثیر نیکی کا مطالبہ نہ کر اس نے تجھے عمل سے پہلے ہی عظیم نعمت دی ہے اور وہ توحید ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کچھ عطا کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن تم میرے نام پر مال خرید لو جب مال آئے گا تو ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمر نے عرض کی: حضور! جو آپ کے پاس ہو وہ دے دیا کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں بنایا جس پر آپ قادر نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول کو ناپسند فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا (آپ خرچ کریں اور آپ صاحب عرش کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کریں)۔ انصاری کا یہ جملہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرے سے خوشی پہچانی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اقلال کا خوف اللہ تعالیٰ کے متعلق سوئے ظن سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے) اور فرمایا: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:13) (اور میں نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے)۔ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر کر دیں تا کہ اس کا عذر ختم ہو جائے اور اس پر حجت قائم ہو جائے تا کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے جس طرح اس نے اسے بندہ پیدا کیا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہے تو اسے کمی کا اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس پر مزید مہربانی فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے)۔

اور فرمایا: فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (النمل) (بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی۔ اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے ہمیشہ عطا فرما رہا ہے دن رات کے خرچ نے اس میں کچھ کمی نہیں کی ہے(1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بہتر بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! کنجوس کا مال تلف فرما(2)۔" اسی طرح سورج کے غروب ہونے کے وقت وہ فرشتے ندا دیتے ہیں۔ یہ صحیح روایت ہے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔ والحمد للہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ ہود، باب قولہ وکان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 4316،6872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ فاما من اعطی واتقی۔۔۔ الخ، حدیث نمبر 1351، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور اس نے اپنے رب کی غنا، اس کے کرم کو جان لیا اس نے خرچ کیا اور کمی کا خوف نہ کیا، اسی طرح جس کی دنیوی خواہشات ختم ہوگئیں اور قوت لایموت سے اپنی روح کے لئے طاقت حاصل کی اور اپنے نفس کی خواہش کو فنا کر دیا تو ایسا شخص خوشحالی اور تنگی میں عطا کرتا ہے اور کمی کا اندیشہ نہیں کرتا، کمی کا خوف تو وہ کرتا ہے جسے اشیاء دنیا میں خواہش ہو جب وہ آج دے گا تو کل اسے ضرورت ہوگی وہ خوف کرتا ہے کہ کل شاید اسے یہ نہ ملے تو اس پر کمی کے خوف کی وجہ سے آج خرچ کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ مسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عطا کرو اور انڈیل دو اور خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر شمار کرے گا اور خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی عطا روک لے گا (1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک دفعہ ایک سائل میرے پاس آیا اور میرے پاس رسول اللہ ﷺ موجود تھے۔ میں نے سائل کے لئے کسی چیز کے دینے کا حکم کیا پھر میں نے اسے بلایا اور اس مال کو دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے گھر میں کوئی چیز داخل نہ ہو اور نہ کوئی چیز خارج ہو مگر تجھے اس کا علم ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! ٹھہرو، شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر شمار کرے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اسْتَوٰۤی، ثُمَّ اخبار کی ترتیب کے لئے ہے نہ کہ فی نفسہ امر کی ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ الاستویٰ کا لغوی معنی، کسی شے پر بلند ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ (المومنون: 28) (اور پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر) اور فرمایا: لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (زخرف: 13) (تاکہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر)۔ شاعر نے کہا:

فاوردتهم ماء بقيفاء تقرة　　　و قد حلّق النجم اليماني فاستوى

اس شعر میں استویٰ بھی ارتفع و علا ہے یعنی بلند ہوا۔ استوت الشمس على راسى، یعنی سورج میرے سر پر چڑھا، واستوت الطير على قمة راسى یعنی پرندے میرے سر پر بلند ہوئے۔ یہ آیت مشکلات میں سے ہے یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات کے بارے علماء کے تین نظریات ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے اکثر ائمہ کا یہی نظریہ ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسا کہ امام مالک سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) کے متعلق سوال کیا تو امام مالک نے فرمایا: الاستویٰ مجہول نہیں ہے اور کیفیت سمجھنے کے قابل نہیں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے، میں تجھے برا آدمی دیکھتا ہوں، اس کو باہر نکال دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور اس طرح اس کی تفسیر کرتے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث على الانفاق و كراهة الاحصاء، صفحہ 331، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب الہبہ، باب هبة المرأة لغير زوجها و عتقها ... الخ، حدیث نمبر 2402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن نسائی، صفحہ 254-255، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوۃ، باب الاحصاء فی الصدقة، حدیث 2501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں جس طرح ظاہر لغت احتمال رکھتی ہے یہ مشبہ فرقہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں ہم اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے ظاہر معنی پر اس کے محمل کو پھیرتے ہیں۔ فراء نے ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ کے متعلق کہا الاستوا کلام عرب میں دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ان یستوی الرجل و ینتھی شبابہ و قوتہ۔ او یستوی عن اعوجاج یعنی آدمی بڑا ہوا اور اس کی جوانی اور قوت انتہا کو پہنچی یا ٹیڑھی روش کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا (راہ راست پر آ گیا)۔ یہ دو وجہیں ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ تو کہے: کان فلان مقبلا علی فلان ثم استوی علی و الی یشاتمنی۔ (فلاں شخص فلاں کی طرف متوجہ تھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے گالی دینے لگا)۔ یعنی اس کا معنی ہو گا میری طرف متوجہ ہوا۔ اس آیت ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ میں یہی معنی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ کا مطلب ہے: بلند ہوا۔ یہ تیرے اس قول کی مانند ہے: کان قاعدا فاستوی وہ بیٹھا تھا پھر کھڑا ہو گیا۔ کان قائما فاستوی قاعدا پہلے کھڑا تھا پھر بیٹھ گیا۔ یہ تمام معانی عرب کلام میں جائز ہیں۔

امام بیہقی ابو بکر احمد بن علی بن الحسن نے کہا: اسْتَوٰٓى کا معنی اقبل (متوجہ ہونا) صحیح ہے کیونکہ اقبال کا معنی آسمان کی تخلیق کی طرف قصد کرنا ہے اور قصد سے مراد ارادہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں جائز ہے اور ثم کا لفظ خلق سے تعلق کے لئے ہے نہ کہ ارادہ کے لئے۔ اور رہی وہ بات جو اس نے حضرت ابن عباس سے حکایت کی ہے وہ انہوں نے کلبی کی تفسیر سے لی ہے اور کلبی ضعیف ہے۔ سفیان بن عیینہ اور ابن کیسان نے ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ کے متعلق فرمایا: قصد الیھا یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ یہ ایک قول ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ بغیر تکیف اور تحدید کے ہے۔ طبری نے اس قول کو اختیار کیا۔ ابو العالیہ الریاحی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ کہا جاتا ہے: اسْتَوٰٓى بمعنی ارتفع ہے (بلند ہوا)۔ بیہقی نے کہا: اس سے مراد اس کے امر کا بلند ہونا ہے وہ پانی کے بخارات ہیں جن سے آسمان کی تخلیق واقع ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: المستوی چڑھنے والا دھواں تھا۔

ابن عطیہ نے کہا: کلام کا وصف اس قول کا انکار کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسْتَوٰٓى کا معنی استولی (غالب آنا) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد استوی بشر علی العراق　　　من غیر سیف ودم مھراق (1)

بشر عراق پر غالب آیا بغیر تلوار کے اور بغیر خون بہائے۔

ابن عطیہ نے کہا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) میں یہ معنی مراد ہے (2)، میں کہتا ہوں: فراء کے قول میں پہلے گزر چکا ہے کہ علی اور الی ایک معنی میں ہیں۔ اس کے متعلق مزید معلومات سورۃ اعراف میں آئیں گی ان شاء اللہ۔ اور اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں قاعدہ نقل و حرکت نہ کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پہلے زمین کی تخلیق فرمائی۔ اسی طرح حم السجدہ

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً

سورت میں ہے اور سورۃ النازعات میں فرمایا: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۝ (کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا اس نے اسے بنایا)۔ اس میں آسمان کی تخلیق کا وصف بیان فرمایا اور اس کے بعد فرمایا: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کو زمین سے پہلے تخلیق فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (انعام:1) (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو)۔ یہ قتادہ کا قول ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو طبری نے قتادہ سے روایت کیا ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خشک کیا جس پر اس کا عرش تھا اور اسے زمین بنا دیا اس میں دھواں اٹھا اور بلند ہوا تو اس سے آسمان بنا دیا۔ پس زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی پھر اس کے امر نے آسمانوں کا قصد کیا اور انہیں سات آسمان بنایا پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ جب پہلے پیدا فرمایا تھا تو یہ پھیلی ہوئی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: قتادہ کا قول صحیح وجہ پر نکلے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کا دھواں پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا پھر آسمان کی طرف قصد کیا وہ دھواں تھا اسے سات آسمان بنایا، پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا، جو چیز دلیل ہے کہ دھویں کو زمین سے پہلے تخلیق کیا گیا وہ وہ روایت ہے جو سدی نے ابی مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے مرہ الہمدانی سے انہوں نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے اور بہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اس ارشاد کے بارے روایت کی ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور پانی سے پہلے اس نے کوئی چیز پیدا نہ کی۔ جب اس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا قصد کیا تو پانی سے دھواں نکالا۔ پس وہ دھواں پانی پر بلند ہوا اور اوپر ہو گیا، اس کا نام سماء رکھا پھر پانی کو خشک کیا اور اس سے ایک زمین بنا دی پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں (یعنی) اتوار اور سوموار میں انہیں سات زمینیں بنایا، پھر زمین کو مچھلی پر رکھا۔ الحوت سے مراد النون (مچھلی) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں کیا: نٓ وَ الْقَلَمِ (ن:1) مچھلی پانی میں ایک چٹان پر تھی اور وہ چٹان ایک فرشتے کی پیٹھ پر تھی اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر تھا اور وہ چٹان ہوا میں تھی، یہ وہ (چٹان) ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا لیست فی السماء ولا فی الارض ..... پھر مچھلی نے حرکت کی تو زمین لرزنے لگی پھر اس پر پہاڑوں کو رکھا تو وہ قرار پا گئی، پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (لقمان:10) (اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ)۔ یعنی زمین میں پہاڑ پیدا کئے اور زمین والوں کی خوراک اور درخت اور جو کچھ زمین کے لئے مناسب تھا دو دنوں میں یعنی منگل اور بدھ کو پیدا فرمایا۔ یہ جب فرمایا: قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ (فصلت) آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم

لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مدمقابل وہ تو رب العالمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہوسکتا ہے) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں کھڑے ہوئے پہاڑ اور جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازے سے مقرر کردی ہیں اس میں غذائیں (ہر نوع کے لئے) چار دنوں میں (ان کا حصول) یکساں ہے طلبگاروں کے لئے۔

جو یہ پوچھے تو معاملہ اسی طرح ہے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ (فصلت: 11) پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف وہ اس وقت محض دھواں تھا یہ دھواں پانی کے بخارات سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک آسمان بنایا پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں یعنی خمیس اور جمعہ کے روز سات آسمان بنائے۔ جمعہ کو جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق جمع ہوئی۔ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (فصلت: 12) فرمایا: ہر آسمان میں اس کی مخلوق پیدا فرمائی یعنی فرشتے اور سمندر اولوں کے پہاڑ اور دوسری چیزیں جن کا علم نہیں وہ پیدا فرمایا۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین فرمایا اور ان ستاروں کو زینت بنایا اور شیطانوں سے حفاظت کا باعث بنایا جب اس تخلیق کو مکمل فرمایا جو پسند تھی تو عرش پر استواء فرمایا۔ یہ مراد ہے جب فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (حدید: 4) (پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں)۔

فرمایا كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: 30) (آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کردیا انہیں) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں یہ سارا واقعہ ذکر فرمایا جیسا کہ ان شاء اللہ اسی سورت میں اس کا بیان آئے گا۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا پھر اسے فرمایا: تو لکھ۔ قلم نے پوچھا: یارب! کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ پس وہ سب کچھ جاری ہوگیا جو اس دن سے قیامت تک ہونا تھا۔ فرمایا: پھر مچھلی کو پیدا فرمایا اس پر زمین کو پھیلایا، پانی کے بخارات اٹھے، اس سے آسمان بنے مچھلی نے حرکت کی تو زمین پھیل گئی۔ اس پر پہاڑ پیدا کئے گئے، پہاڑ قیامت تک زمین پر فخر کرتے رہیں گے(1) اس روایت میں زمین کی تخلیق پانی کے بخار کے بلند ہونے سے پہلے ہے جو بخار دھواں تھا، یہ پہلی روایت کے خلاف ہے اور پہلی روایت اس روایت سے اور دوسری روایات سے اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو اس نے کیا ..... اس کے متعلق اقاویل مختلف ہیں اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔

ابونعیم نے حضرت کعب الاحبار سے ذکر کیا ہے کہ ابلیس اس مچھلی کے اندر داخل ہو جس کی پیٹھ پر ساری زمین تھی۔ اس نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ اس نے کہا: اے لوثیا! کیا تو جانتی ہے جو تیری پیٹھ پر قومیں، درخت، جانور، لوگ اور پہاڑ ہیں اگر تو ان کو جھاڑ دے تو تو انہیں اپنی پیٹھ سے نیچے پھینک دے گی۔ حضرت کعب نے کہا: لوثیا (مچھلی) نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک جانور بھیجا جو اس مچھلی کے نتھنے میں داخل ہوگیا، مچھلی نے اس سے نجات کے لئے اللہ کی بارگاہ میں التجا

1۔ السنن الکبری للبیہقی، کتاب السیر، باب مبتدا الخلق، صفحہ 3، جلد 9 (دارالفکر)

کی تو وہ جانور نکل گیا، حضرت کعب نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ مچھلی سامنے اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا اگر وہ کوئی ارادہ کرتی تو وہ جانور پھر اس کے ناک میں داخل ہو جاتا۔

**مسئلہ نمبر 7**: تمام اشیاء کی تخلیق کی اصل پانی سے ہے کیونکہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز پانی سے تخلیق کی گئی ہے۔ میں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلاؤ، سلام کو پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو، رات کو قیام کرو جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے (1)۔

ابو حاتم نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مجھے ہر چیز کے بارے خبر دیجئے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو پانی سے پیدا کی گئی تھی، اس کی صحت پر دلیل مصطفیٰ علیہ السلام کا جواب ہے۔ آپ نے فرمایا: کل شی خلق من الماء۔ (ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اگرچہ وہ ابھی مخلوق نہ تھی)۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے جس چیز کو اللہ نے پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اسے حکم دیا تو اس نے وہ سب کچھ لکھا جو ہونا تھا (2)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: یہاں پہلی چیز جو اس نے پیدا کی، سے مراد پانی اور ہوا ہے اور عرش کے بعد پہلی چیز جو پیدا کی وہ قلم تھا۔ یہ مفہوم حضرت عمران بن حصین کی حدیث میں واضح ہے۔ پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (3)۔ عبد الرزاق بن عمر بن حبیب المکی نے حمید بن قیس الاعرج سے انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس آیا اور پوچھا: یہ مخلوق کس سے پیدا کی گئی؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور مٹی سے۔ اس شخص نے کہا: یہ چیزیں کس سے پیدا کی گئیں۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن زبیر کے پاس آیا۔ ان سے یہی سوال کیا انہوں نے بھی حضرت عبد اللہ بن عمرو کے قول کی مثل جواب دیا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن عباس کے پاس آیا ان سے یہی سوال کیا۔ کہا: یہ مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور تاریکی سے۔ اس شخص نے پوچھا: یہ چیزیں کس سے پیدا ہوئی ہیں، تو حضرت عبد اللہ بن عباس نے یہ آیت تلاوت کی: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) (اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے اس نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے)۔ اس شخص نے کہا یہ جواب تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 95، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیہا، باب ما جاء فی قیام اللیل، حدیث 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب و کان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 6868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے گھرانے کا فرد ہی دے سکتا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا تمام چیزوں کا مصدر اس سے ہے یعنی اس کی تخلیق، ایجاد اور اختراع سے ہے، اس نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا یا پانی اور اس سے اس چیز کو پیدا کیا جس کو اس نے پیدا کرنا چاہا، نہ تو یہ کسی اصل سے ہیں نہ کسی سابق مثال سے ہیں پھر بعد میں جو اس نے پیدا کیا اس کی اصل بنائی، حقیقی پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس کے علاوہ کوئی خالق نہیں اس کی ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ آسمان سات ہیں اور زمین کے لئے کوئی صریح عدد قرآن میں ایسا نہیں آیا جو تاویل کا احتمال نہ رکھتا ہو سوائے اس ارشاد کے وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12) (اور زمین کو بھی انہی کی مانند) اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی زمین میں سے تعداد میں اس کی مثل ہیں کیونکہ کیفیت اور صفت میں تو مشاہدہ اور اخبار سے معلوم ہے کہ یہ مختلف ہیں۔ پس تعداد کے اعتبار سے ہم مثل ہونا متعین ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: موٹائی میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس میں ہم مثل ہونا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمینیں بھی سات ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے بنائی گئی ہیں، یہ داؤدی کا قول ہے: پہلا قول ہی صحیح ہے زمینیں، آسمانوں کی طرح سات ہیں۔ مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس نے ایک بالشت کسی کی زمین ظلماً لے لی اسے سات زمینوں تک اس کا طوق پہنایا جائے گا (2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے لیکن اس میں الی کی جگہ من ہے یعنی سات زمینوں سے اس کو طوق پہنایا جائے گا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کوئی شخص ناحق کسی کی ایک بالشت زمین نہیں لے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے روز) سات زمینوں تک طوق پہنائے گا (3)۔

نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ساتھ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے اس کے ذریعے دعا مانگوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! یہ تو تیرا ہر بندہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کہہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا لا الہ الا انت، میں ایسی چیز چاہتا ہوں جس کے ساتھ تو مجھے خاص کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کو آباد کرنے والے میرے سوا اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دوسرے پلڑے میں ہو، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ والا پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری ہو جائے گا۔

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ ان پر ایک بادل

---

1۔ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، باب سورۃ حم الجاثیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر 2959، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اثم من ظلم شیئا من الارض، حدیث نمبر 2273، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بادل ہے یہ زمین سیراب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے جو شکر نہیں کرتی اور دعا نہیں مانگتی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رفیع آسمان ہے (یہ) محفوظ چھت ہے اور روکی گئی موج ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اور اس آسمان کے درمیان کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: اسی طرح (کی مسافت ہے) حتیٰ کہ سات آسمانوں کو شمار کیا ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس کے اوپر عرش ہے آسمانوں اور عرش کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی کہ دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زمین ہے پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس زمین کے نیچے دوسری زمین ہے۔ ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے حتیٰ کہ آپ نے سات زمینیں شمار کیں ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر تم نچلی زمین کی طرف رسی لٹکاؤ تو وہ اللہ (کے علم) پر گرے گی۔ پھر یہ آیت پڑھی: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (الحدید) (وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے) (1)۔

ابوعیسیٰ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ وہ رسی اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور سلطنت پر گرے گی۔ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی سلطنت ہر جگہ ہے جبکہ وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت حسن (بصری) نے حضرت ابوہریرہ سے (حدیث) نہیں سنی اور ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ زمینیں سات ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ ابوالضحیٰ ...... اس کا نام مسلم ہے ...... نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق:12) سات زمینیں ہیں ہر زمین میں ایک نبی ہے جیسے تمہارے نبی ہیں آدم کی طرح آدم، نوح کی طرح نوح، ابراہیم کی طرح ابراہیم، عیسیٰ کی طرح عیسیٰ۔ بیہقی نے کہا: اس کی سند حضرت ابن عباس سے صحیح ہے یہ مرہ کی وجہ سے شاذ ہے۔ میں ابوالضحیٰ کے لئے اس پر کوئی متابع نہیں جانتا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَا محل نصب میں ہے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب سورۃ الحدید، صفحہ 162، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الحدید، حدیث نمبر 3220، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جَمِیْعًا سیبویہ کے نزدیک یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اہل نجد اس میں امالہ کرتے ہیں تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ یاء والے الفاظ میں سے ہے اور اہل حجاز تفخیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سَبْعَ یہ ھن ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی فسوّی سبع سموٰت۔ اور مفعول بھی ہوسکتا ہے اس تقدیر پر یسوی بینھن سبع سماوات، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا (الاعراف: 155) اصل میں مِنْ قومه تھا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: حال کی بنا پر (سبع) منصوب ہے۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ یہ مبتدا خبر ہیں (ھو) میں اصل ھا کی حرکت ہے اور اسکان تخفیف کی بنا پر ہے۔

السَّمَآءِ۔ واحد مونث استعمال ہوتا ہے جیسے عنان ہے اس کا مذکر ہونا شاذ ہے اور کبھی السماء، سماوۃ کی جمع ہوتا ہے یہ اخفش کے قول کے مطابق ہے اور زجاج کے قول میں یہ سماء کی جمع ہے اور جمع الجمع سماوات، سماءات ہے۔ سواھن بھی آیا یا تو اس لئے کہ السماء جمع ہے یا اس لئے کہ مفرد اسم جنس ہے سواھن کا معنی ہوگا: ان کی سطحوں کو ہموار کرنے کے ساتھ برابر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: انہیں برابر کیا۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ جو اس نے پیدا کیا اسے جاننے والا ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ ہر چیز کا عالم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک: 14) ((نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا)۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور اپنے قدیم ازلی علم کے ساتھ تمام معلومات کو جاننے والا ہے وہ یکتا ہے قائم بذاتہ ہے۔ معتزلہ عالمیت میں ہمارے ساتھ موافقت کرتے ہیں علیمیت میں موافقت نہیں کرتے۔ جہمیہ فرقہ کا نظریہ ہے کہ وہ جاننے والا ہے علم سے قائم ہے مگر کسی محل میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ گمراہوں کے قول سے بلند و بالا ہے۔ ان لوگوں کا رد دیانات کی کتب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف علم کے ساتھ بیان فرمایا: اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَشْهَدُوْنَ (النساء: 166) (اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں)۔ اور فرمایا: فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (ہود: 14) (پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے) اور فرمایا: فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ (اعراف: 7) (پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے) اور فرمایا: وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ (فاطر: 11) (اور نہ ہی حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے) اور فرمایا: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (الانعام: 59) (اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے نہیں جانتا سوائے اس کے)۔ ہم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تمام صفات کے ثبوت پر اسی سورت میں یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ: 185) کے تحت استدلال کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کسائی اور قالون نے نافع سے (ھو اور ھی) کو ہا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب ان سے پہلے فا، واو، لام یا ثم ہو۔ اسی طرح ابوعمرو نے کہا ہے مگر ثم کے ساتھ اس طرح نہیں پڑھا۔ ابوعون نے حلوانی سے انہوں نے قالون سے یہ زائد نقل کیا ہے انہوں نے ان یمل ھو میں ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہنے لگے: کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے۔ فرمایا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ، اِذْ اور اذا دونوں حرف توقیت ہیں اِذْ ماضی کے لئے ہے اور اذا مستقبل کے لئے ہے کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ المبرد نے کہا: اِذْ جب مضارع کے ساتھ آئے تو اس کا معنی ماضی ہوتا ہے جیسے وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ (الانفال:30) (واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ) اس کا معنی اذ مکروا ہے اور واذ قلت ہے یعنی مضارع کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے اور جب اذا ماضی پر داخل ہو تو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ (النازعات:34) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۞ (عبس) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (نصر:1) ان سب میں جَآءَ بمعنی یجیی ہو جائے گا۔ معمر بن المثنی ابوعبیدہ نے کہا: اِذْ زائدہ ہے تقدیر یہ ہے و قال ربك۔ اور اس نے اسود بن یعفر کے قول سے استشہاد کیا ہے۔

فاذ و ذالك لا مهاه لذكره　　والدهر يعقب صالحاً بفسادِ

اس قول کا زجاج، نحاس اور تمام مفسرین نے انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلطی ہے کیونکہ (اِذْ) اسم ہے اور یہ ظرف زمان ہے یہ ایسے حروف میں سے نہیں ہے جو زائد کئے جاتے ہیں۔ الزجاج نے کہا: یہ ابوعبیدہ کی طرف سے ایک جرم ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں اور دوسری چیز کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے۔ تقدیر یوں ہے: وابتدأ خلقکم اذ قال۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کیا جب اس نے کہا۔ پس یہ اس محذوف سے ہے جس پر کلام دلالت کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

فان المنية من يخشها　　فسوف تصادفه اينما

موت اس کے لئے بھی ہے جو موت سے ڈرتا ہے موت اسے ملے گی جہاں بھی چلا جائے گا۔

اس شعر میں اینما کے بعد ذهب محذوف ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ (اذ) فعل مقدر کے متعلق ہو۔ تقدیر اس طرح ہو: اذکر اذ قال۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ:21) کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جس نے تمہیں پیدا کیا جب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 116، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور خطاب فرشتوں کے لئے ثابت ہے اور ازل سے ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کا وجود بھی ہو اور ان کی سمجھ بھی ہو، یہ مسئلہ تمام اللہ کے اوامر، نواہی اور مخاطبات میں ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن اشعری کا قول ہے۔ اس کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ و صفات اللہ العلیٰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

رب مالک، سردار، مصلح اور جابر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اس کا واحد ملک ہے۔ ابن کیسان وغیرہ نے کہا: مَلَك بروزن فَعَل یہ الملك سے مشتق ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ مفعل کے وزن پر لَاَكَ سے مشتق ہے جس کا معنی بھیجنا ہے۔ الالوکۃ، المألکہ، المألکۃ ان کا معنی پیغام رسانی ہے۔ لبید نے کہا:

و غلامٍ ارسلتہ اُمُّہٗ — بالوك فبذلنا ما سأل

ابلغ النعمان عنی مألکاً — اننی قد طال حبسی و انتظاری

لڑکے کو اس کی ماں نے پیغام دے کر بھیجا تو ہم نے وہ سب خرچ کیا جو اس نے مانگا۔ کہا جاتا ہے: یہ کہا جاتا ہے: اَلِکْنِیْ یعنی مجھے بھیج۔ اس بنا پر اس کی اصل مَألكٌ ہوگی ہمزہ، فعل کا فا کلمہ ہے پھر لوگوں نے اسے عین کلمہ سے قلب کر دیا اور مَلْاَكٌ پھر تسہیل کی اور کہا: مَلَك۔ بعض علماء۔ نے کہا: اس کی اصل مَلْاَك ہے اور یہ ملك یملِك سے مشتق ہے جیسے شمأل، شمل سے مشتق ہے ہمزہ زائدہ ہے۔ یہ ابن کیسان سے بھی مروی ہے شعر میں اصل پر آیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلست لإنسیّ ولکن لملْاَكٍ — تنزل من جو السماء یصوب

تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترتا ہے جو بارش برساتا ہے۔

نضر بن شمیل نے کہا: عربوں کے ہاں الملك کا اشتقاق نہیں ہے۔ الملائکۃ میں ہا جمع کی تانیث کی تاکید ہے، اس کی مثل صلادمہ ہے اور الصلادم ہے (سخت گھوڑے) اس کا واحد صلدم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ۃ مبالغہ کے لئے ہے جیسے علامہ اور نسابہ کے آخر میں ۃ مبالغہ کے لئے ہے۔ ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو خطاب فرمایا یہ مشورہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان میں جو حرکات، عبادت، تسبیح اور تقدیس کی رؤیت موجود تھی اس کا ظاہر کرنا تھا۔ پھر فرشتوں کو انسانوں کا جو قیم (باپ) تھا اس کی طرف لوٹایا اور فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اعراف: 11) (آدم کے لئے سجدہ کرو)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً یہاں جَاعِلٌ بمعنی خالق ہے یعنی میں پیدا کرنے والا ہوں۔ طبری نے یہ ابوروق سے بیان کیا ہے اسی وجہ سے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الْاَرْضِ سے مراد بعض علماء نے فرمایا: مکہ ہے۔ ابن سابط نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: زمین مکہ سے پھیلائی گئی اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قبور زمزم، رکن اور مقام کے درمیان ہیں اور خَلِیْفَۃً کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے یعنی جو

زمین میں ان سے پہلے فرشتوں میں تھے ان کے پیچھے آنے والا ہے، جیسا کہ مروی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مفعول کے معنی میں ہو یعنی پیچھے لایا گیا، جیسے ذبیحہ بمعنی مفعولۃ (مذبوحۃ) استعمال ہوتا ہے۔ الخلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو نیکوکاروں میں سے جو پیچھے آئے اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو بروں میں سے جو پیچھے آئے، یہ معروف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔

خَلِیۡفَةً فاء کے ساتھ اکثر قراء کی قراءت ہے مگر حضرت زید بن علی سے مروی ہے کہ اس نے خلیقہ قاف کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں خلیفہ سے مراد حضرات ابن مسعود، ابن عباس اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اوامر نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہی زمین کی طرف پہلے رسول ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اور کہا جاتا ہے وہ کس کے لئے رسول تھے جبکہ زمین میں کوئی شخص تھا ہی نہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف رسول تھے، آپ کی اولاد چالیس تھے جو بیس بطنوں میں پیدا ہوئے تھے، ہر بطن میں جوڑا جوڑا پیدا ہوا، پھر ان کے بچے پیدا ہوئے حتیٰ کہ بہت سے لوگ ہو گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً** (النساء: 1) (پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں))

ان پر اللہ تعالیٰ نے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی تحریم نازل کی تھی اور آدم علیہ السلام نو سو تیس سال زندہ رہے تھے۔ اہل تورات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ حضرت وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ وہ ہزار سال زندہ رہے تھے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**: یہ آیت امام اور خلیفہ قائم کرنے میں اصل ہے ایسا خلیفہ اور امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تاکہ اس کے ساتھ کلمہ مجتمع رہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امام اور خلیفہ کے وجوب کے متعلق امت کے ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں مگر وہ قول جو اصم (بہرہ) سے مروی ہے یہ شریعت سے بھی اصم (بہرہ) تھا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے اصم جیسا قول کیا اور اس کی رائے اور اس کے مذہب کی پیروی کی وہ شریعت میں (بہرہ) ہے۔ اصم کا قول ہے کہ دین میں خلیفہ واجب نہیں ہے بلکہ جائز ہے، جبکہ لوگ اپنا حج اور جہاد قائم کرتے ہوں، اپنے آپ میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوں اور حق کو اپنی طرف سے ادا کرتے ہوں، مال غنیمت، مال فے اور صدقات وغیرہ ان کے اہل اور مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے ہوں اور جن لوگوں پر حدود واجب ہوں ان پر حدود جاری کرتے ہوں تو یہ ان کے لئے کافی ہے ان پر امام متعین کرنا واجب نہیں ہے جو ان تمام امور کا والی ہو۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً** (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِیۡفَةً فِی الۡاَرۡضِ** (ص: 26) (اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو نائب زمین میں) اور فرمایا: **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ** (النور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں

سے اور نیک عمل کئے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں)۔ یہ تمام آیات اور ان کے علاوہ آیات ہمارے دلائل ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان خلیفہ کے تعین میں اختلاف واقع ہونے کے بعد سیدنا صدیق اکبر کی تقدیم پر صحابہ کا اجماع ہوا حتی کہ انصار نے کہا: ایک امیر ہمارا ہوگا ایک امیر تمہارا ہوگا، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور مہاجرین نے ان کی طرف سے یہ قول قبول نہ کیا۔ مہاجرین نے انہیں کہا: عرب صرف قریش میں سے صرف اس قبیلہ کی پیروی و اطاعت کریں گے اور مہاجرین نے انصار کے لئے حدیث بھی روایت کی، تو انصار نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور قریش کی اطاعت کی۔ اگر امامت کا فریضہ واجب نہ ہوتا نہ قریش میں نہ کسی دوسرے قبیلہ میں تو یہ مناسرہ اور تلخ گفتگو جائز نہ ہوتی، اور کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ خلافت کا امر واجب نہیں ہے نہ قریش میں اور نہ کسی دوسرے قبیلہ میں، تمہارے جھگڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اس امر میں لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں جو واجب نہیں ہے، پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے حضرت عمر کو امامت کا عہدہ دیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ امر ہم پر اور تم پر واجب نہیں ہے۔ پس یہ خلافت کے وجوب کی دلیل ہے اور یہ دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا قوام اور اجتماع ہے۔

رافضیوں نے کہا: خلیفہ کا قائم کرنا عقلاً واجب ہے اور نقلی دلائل، عقلی تقاضا کی تاکید کی بنا پر وارد ہیں اور رہی امام کی معرفت یہ نقل کی جہت سے پائی گئی ہے نہ کہ عقل کے تقاضا سے۔ یہ قول فاسد ہے کیونکہ عقل نہ کسی چیز کو ثابت کر سکتی ہے نہ منع کر سکتی ہے نہ اسے برا کہہ سکتی ہے۔ نہ اس کی تحسین کر سکتی ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ثابت ہوا کہ یہ شرع کی طرف سے واجب ہے نہ کہ عقل کی جہت سے۔ یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** جب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ امامت کے وجوب کا طریق نقلی دلائل ہیں تو ہمیں بتاؤ کہ امام کی معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت سے نصوص کے ذریعے واجب ہے یا اہل حل وعقد کے اختیار کی طرف سے ہے یا اس شخص میں ائمہ کے خصال کے کمال کی وجہ سے ہے اور اس کا اپنی طرف سے دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ امامیہ وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کی معرفت کا راستہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نص ہے، اس میں اختیار کا کوئی دخل نہیں، اور ہمارے نزدیک امام کی معرفت کا طریق غور و فکر اور اہل اجتہاد کا اجماع بھی اس کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام کی معرفت کا ذریعہ صرف نص ہے انہوں نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد اپنے اصول پر رکھی ہے کہ قیاس، رائے اور اجتہاد باطل ہے اس کے ذریعے کسی چیز کی پہچان نہیں ہوتی۔ انہوں نے قیاس کو اصلاً اور فرعاً باطل قرار دیا ہے۔ پھر تین فرقوں کا اختلاف ہوا۔ ایک فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے، دوسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے اور تیسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے۔

کسی معین امام پر نص کے مفقود ہونے پر دلیل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر امت پر کسی معین امام کی طاعت کو اس طرح فرض کر دیتے کہ اس سے عدول جائز نہ ہوتا تو آپ بتا دیتے کیونکہ غیر معین امام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی پوری امت کو تکلیف دینا محال ہے اور ان کے لئے اس تکلیف کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب علم واجب ہو تو پھر اس علم کی یہ صورتیں ہیں یا تو عقلی

دلائل سے ہوگا یا خبر سے ہوگا۔ عقلی دلائل ایسے نہیں جو کسی شخص معین کی امامت کے ثبوت پر دلالت کریں اور خبر میں بھی کوئی ایسی خبر نہیں جو کسی معین امام کے ثبوت کے علم کو ثابت کرے کیونکہ وہ یا تو متواتر ہوگی جو علم ضروری یا استدلالی کو ثابت کرے گی یا خبر اخبار احاد میں سے ہوگی۔ اس کا طریق تواتر ہونا جائز نہیں جو علم ضروری یا علم استدلالی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر مکلف اس معین کی اطاعت کے وجوب کا علم رکھتا اور اس کے دین سے ہوتا جیسا کہ ہر مکلف کو علم ہے کہ اللہ کے دین سے اس پر پانچ نمازیں، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج واجب ہے لیکن معین خلیفہ کی طاعت کو ضرورۃً کوئی بھی نہیں جانتا تو یہ دعویٰ باطل ہوا اور اخبار احاد کے ساتھ معلوم ہونا بھی باطل ہے کیونکہ اس کے ساتھ علم کا وقوع محال ہے۔ اگر امام پر نص کی نقل کا رجوع واجب ہو کہ خواہ نص کیسی بھی ہو تو حضرت ابوبکر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی امامت کا اثبات واجب ہوتا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک قوم اس کی امامت پر صریح نص نقل کرتی ہے، جب نص کے ذریعے ایک وقت میں تینوں کا اثبات باطل ہے..... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا..... اسی طرح ایک کا اثبات بھی باطل ہے، کیونکہ کوئی گروہ نص کی وجہ سے دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے، جب نص کا ثبوت عدم طریق کی وجہ سے باطل ہو گیا تو اختیار اور اجتہاد ثابت ہو گیا۔ اگر کوئی ہٹ دھرم ہٹ دھری کرے اور نص کے ساتھ علم ضروری اور تواتر کا دعویٰ کرے تو اسے فوراً ان لوگوں کے دعویٰ کی نقیض پیش کرنی چاہئے جو حضرت ابوبکر کے بارے نص کے دعویدار ہیں انہیں ان اخبار کا مقابلہ پیش کرنا چاہئے جو اس سے زیادہ ہیں کہ وہ نص کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ پھر امامیہ فرقہ کے علاوہ نص کی نفی میں لوگوں کی پختہ رائے میں شک نہیں، اور یہ نظریہ خلق کثیر کا اور جم غفیر کا ہے اور علم ضروری ایسا علم ہوتا ہے جس کی نفی پر وہ افراد اجتماع نہیں کر سکتے جن کی تعداد امام کے مخالفین کی تعداد کے دسویں حصہ سے کم ہوں۔ اگر علم ضروری کا اس طرح ناجائز ہوتا تو ایک گروہ کا بغداد اور چین کا انکار کرنا جائز ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 6:** یہ ان احادیث کے رد میں ہے جن سے امامیہ فرقہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص ہونے پر حجت پکڑی ہے۔

ا۔ وہ کہتے ہیں: امت اس نص کے انکار کی وجہ سے کافر ہو گئی اور مرتد ہو گئی اس نے عناد کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی مخالفت کی ہے۔

ان نصوص میں سے ایک یہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ كنت مولاه فعلى مولاه اللهم والِ مَنْ والاه وعاد من عاداه** (1)۔ وہ کہتے ہیں: اس حدیث میں مولیٰ کا لفظ آیا ہے۔ لغت میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **فَعلِيٌ مولاه** فاء تعقیب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ مولیٰ سے مراد یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار اور زیادہ مستحق ہیں۔ پس اس سے آپ کی امامت مراد ہونا ثابت ہوا۔ اور حضرت علی کی طاعت فرض ہے۔

دوسرا ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو فرمایا: **انت منی بمنزلة هارون من موسٰى الا انه لا نبی بعدی** (2)۔ تو

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 12، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب مقدمہ، باب فضل علی بن ابی طالب، حدیث 112، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 526، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، حدیث 3430، 4064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میرے نزدیک اس طرح ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ہارون تھے لیکن میرے بعد نبی نہیں ہے...... وہ کہتے ہیں: حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام و مرتبہ معروف ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں شریک تھے جبکہ حضرت علی کے لئے نبوت تو نہیں ہے۔ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے حضرت علی، حضور علیہ اسلام کے بھائی بھی نہیں تھے۔ حضرت ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد خلافت ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اہل تشیع کے دلائل ہیں جن سے انہوں نے حجت پکڑی ہے، ان دلائل کا ذکر ان شاء اللہ اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی نے اس کی سند پر جرح کی ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس کے بطلان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مزینہ و جھینہ و غفار و مسلم موالی دون الناس کلھم لیس لھم مولی دون اللہ و رسولہ (1) مزینہ، جہینہ، غفار اور اسلم قبائل میرے موالی ہیں دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر، ان کا اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی مولی نہیں ہے۔

ہمارے یہ علماء کہتے ہیں: اگر من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی فرمایا ہے تو ان دونوں خبروں میں سے ایک خبر جھوٹی ہوگی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ خبر اگر صحیح ہو، ثقہ راوی نے ثقہ سے روایت کیا ہو تو پھر بھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل نہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے وہ اس طرح کہ المولی بمعنی الولی ہو، خبر کا معنی یہ ہوگا: من کنت ولیہ فعلی ولیہ۔ (میں جس کا ولی ہوں، علی اس کا ولی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ (التحریم: 4) یعنی اللہ تعالیٰ اس کا ولی ہے، اس حدیث سے مقصود لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر، ان کے باطن کی طرح ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ خبر ایک خاص سبب پر وارد ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا جھگڑا ہوا۔ حضرت علی نے حضرت اسامہ سے کہا: انت مولای (تو میرا غلام ہے) حضرت اسامہ نے کہا: لستُ مولاك بل انا مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارا غلام نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام ہوں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (2) جس کا میں مولی ہوں، علی اس کا مولی ہے۔

چوتھا جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا حضور! اس کے علاوہ عورتیں بہت ہیں (3)۔ یہ بات حضرت عائشہ پر شاق گزری، منافقین کو موقع مل گیا، انہوں نے حضرت علی پر طعن کیا اور ان سے برأت کا اظہار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کی بات کا رد کر کے اور انہوں نے حضرت علی سے برأت اور ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار و مزینہ و جھینہ واشجع، حدیث نمبر 3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، صفحہ 213، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 595، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ کتاب المغازی، باب حدیث الافک، حدیث نمبر 3826، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طعن کیا تھا اس کو جھٹلاتے ہوئے یہ فرمایا۔ اسی وجہ سے صحابہ کی جماعت سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین کو حضرت علی کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے (1)۔

رہی دوسری حدیث تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بمنزلہ هارون من موسیٰ سے خلافت مراد نہیں لی کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا وصال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا تھا جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ان کی وفات کا بیان آئے گا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہ تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون تھے، اگر انت منی بمنزلۃ هارون من موسٰی سے مراد خلافت ہوتی تو آپ فرماتے: انت منی بمنزلۃ یوشع من موسٰی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ خلافت مراد نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ میں اپنی زندگی اور عدم موجودگی میں اپنے اہل پر خلیفہ بناؤں گا جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کی قوم پر خلیفہ تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مناجات کے لئے نکلے تھے۔

یہ کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ایک سبب خاص پر ارشاد فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافقین نے یہ افواہ پھیلائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بغض اور ناراضگی کی بنا پر خلیفہ بنایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور عرض کی کہ منافقین ایسا ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ بولا ہے بلکہ میں نے تجھے اسی طرح اپنا خلیفہ بنایا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ هارون من موسٰی۔ (2) (کیا تجھے پسند نہیں کہ تو میری طرف سے ایسا ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام تھے)۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ نے خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے کئی صحابہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو جائیں گے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر غزوہ میں جاتے وقت کسی نہ کسی صحابی کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان میں سے ابن ام مکتوم اور محمد بن سلمہ وغیرہما صحابہ ہیں۔ اس خبر کا مدار حضرت سعد بن ابی وقاص پر ہے اور یہ خبر واحد ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے لئے روایات مروی ہیں جو اس سے اولیٰ ہیں۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: حضور! ابو بکر اور عمر کو کیوں نہیں بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ان دونوں سے استغناء نہیں کیونکہ ان کا میرے نزدیک اسی طرح مقام ہے جس طرح سر کے لئے کانوں اور آنکھوں کا ہے۔ فرمایا: وہ اہل زمین میں میرے وزیر ہیں۔ یہ بھی مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو بکر اور عمر اسی طرح ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب حضرت ہارون کا مرتبہ تھا (3)۔ یہ خبر ابتداءً وارد ہوئی ہے اور حضرت علی کی خبر ایک سبب پر وارد ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت ابو بکر حضرت علی رضی اللہ عنہما کی نسبت امامت کے زیادہ حق دار ہیں۔ واللہ اعلم

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب نبی پاک کے فضائل، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث نمبر 3650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 633، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث 3430، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، صفحہ 208، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 7:** اس میں اختلاف ہے کہ امام، امام کیسے ہوگا۔ اس کے تین طرق ہیں:

ا۔ نص: اس کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ حنابلہ، اہل حدیث کی ایک جماعت حضرت حسن بصری، بکر بن اخت عبدالواحد، اس کے ساتھی اور خوارج کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی خلافت پر اشارہ کے ساتھ نص فرمائی اور حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص فرمائی۔ جب خلیفہ بنانے والا کسی ایک شخص کی خلافت پر نص قائم کردے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص قائم کی تھی یا کسی جماعت کے سپرد یہ کام کردے جس طرح حضرت عمر نے کیا تھا تو یہ امام ہونے کا دوسرا طریقہ ہے، اور اس جماعت میں سے ایک کے چننے کا اختیار اس جماعت کے سپرد ہوگا جیسا کہ صحابہ کرام نے حضرت عثمان کی تعیین میں کیا تھا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق اہل حل وعقد کا اجماع ہو جائے۔ وہ اس طرح ہے مسلمانوں کے کسی شہر میں ایک جماعت ہو جب ان کا امام فوت ہو جائے اور ان کا امام نہ ہو اور نہ مرنے والے نے کسی کو خلیفہ بنایا، پھر جس شہر میں وہ امام موجود تھا اس شہر والے اپنے لئے کسی کو امام بنا دیں اس پر اجماع ہو جائے اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں تو آفاق میں آگے پیچھے جہاں بھی مسلمان موجود ہیں ان کو اس امام کی طاعت میں داخل ہونا واجب ہے جبکہ وہ امام اعلانیہ فسق وفساد کرنے والا نہ ہو کیونکہ یہ دعوت ان کو محیط ہے اس کا قبول کرنا واجب ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ دو اماموں کے قائم کرنے میں کلمہ کا اختلاف ہے اور واضح فساد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں کی وجہ سے مومن کے دل میں کھوٹ اور نفاق نہیں ہوتا: (۱) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص۔ ۲۔ جماعت کا لزوم ۳۔ اپنے حکمرانوں سے خلوص کا اظہار کیونکہ مسلمانوں کی دعوت ان کے ذریعے محفوظ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اگر ایک شخص اہل حل وعقد میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کردے تو وہ ثابت ہو جائے گا اور دوسروں پر اس کو تسلیم کرنا لازم ہو جائے گا لیکن بعض لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ خلیفہ نامزد اہل حل وعقد میں سے ایک جماعت کرے گی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تو کسی صحابی نے اس کا انکار نہ کیا، چونکہ یہ بھی ایک عقد ہے اس لئے کسی تعداد کی ضرورت نہیں جو اس کو منعقد کریں جس طرح کہ دوسری عقود ہیں۔ امام ابوالمعالی نے کہا: جس کے لئے ایک شخص کے عقد کے ساتھ امامت منعقد ہو جائے تو امامت لازم ہو جائے گی، بغیر حدث اور تغیر امر کے اس کو معزول کرنا جائز نہیں۔ انہوں نے فرمایا: اس پر اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اگر کوئی ایسا شخص عہدہ امامت پر غلبہ کرلے جس کو امامت کی اہلیت ہو اور وہ امامت قہر اور غلبہ سے حاصل کرلے تو کہا گیا ہے کہ یہ امامت کا چوتھا طریقہ ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری سے پوچھا گیا: ہم پر اس شخص کے لئے کیا واجب ہے جو ہمارے شہروں پر غلبہ حاصل کرلے جبکہ وہ امام ہو؟ حضرت عبداللہ نے فرمایا: تم اس کو تسلیم کرو اور اپنے حق میں سے جو وہ مطالبہ کرے اسے ادا کرو اور اس کے افعال کا انکار کرو اور اس سے مت بھاگو۔ جب اس نے تجھے امر دین میں سے کسی راز کا امین بنایا ہے تو تم اسے افشا نہ کرو۔

ابن خویز منداد نے کہا: جو شخص خود بخود تخت خلافت پر کود پڑے جبکہ وہ خلافت کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ اس نے نہ کسی سے مشورہ کیا ہو، نہ اسے اختیار کیا گیا ہو اور لوگوں نے اس کی بیعت کر لی ہو تو اس کے لئے بیعت مکمل ہو گئی۔

**مسئلہ نمبر 10**: امامت کی عقد پر شہادت میں اختلاف ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: گواہوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہادت تو قطعی نقلی دلیل کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی قطعی نقلی دلیل نہیں ہے جو شہادت کے اثبات پر دلالت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: گواہوں کی ضرورت ہے۔ جس نے یہ کہا ہے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر امر امامت پر شہادت منعقد نہ ہو گی تو ہر شخص یہ دعویٰ کر دے گا کہ سراً اس کی امامت قائم ہوئی ہے اور یہ چیز فتنہ اور جنگ تک پہنچا دے گی۔ پس ثابت ہوا کہ شہادت معتبر ہے اس میں دو گواہ کافی ہیں، جبکہ جبائی کا قول اس کے مخالف ہے۔ اس نے کہا: چار گواہ، ایک امام بنانے والا اور ایک امام بننے والا ہو کیونکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کو مشورہ سونپا تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہمارے درمیان اور اس کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی معتبر ہے اور جو زائد ہیں ان میں اختلاف ہے اور زیادتی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ پس زیادتی کا اعتبار نہ ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 11**: امام کی شرائط۔ یہ گیارہ ہیں:

۱۔ امام کا تعلق قریش کے خاندان سے ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الائمۃ من قریش (1) (قریش میں سے ائمہ ہوں گے) اس میں اختلاف ہے۔

۲- وہ مسلمانوں کا قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اجتہاد کرنے والا ہو اور اسے حوادث میں دوسروں سے استفتاء کی ضرورت نہ ہو۔ یہ متفق علیہ ہے۔

۳- وہ دانشمند اور صاحب رائے ہو، جنگی امور، لشکروں کی تدبیر، سرحدوں کی حفاظت، ملت اسلامیہ کی حمایت، امت کو انتشار سے روکنے، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کو اپنا حق دلانے کی قدرت رکھتا ہو۔

۴- وہ ایسا شخص ہو کہ حدود قائم کرنے میں اسے رقت لاحق نہ ہو اور گردنوں کو اڑانے اور جسم کو کاٹنے سے مت گھبرائے۔ ان سب پر دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ یہ صفات اس شخص میں جمع ہوں کیونکہ یہ شخص قاضیوں اور دوسرے حکمرانوں کا والی ہوتا ہے اور اس کے خود فیصلہ کرنے اور حکم کرنے کی صلاحیت بھی ہو، خلفاء کے امور اور قاضیوں کے فیصلوں کی چھان بین کر سکتا ہو اور یہ امور صرف وہی بجا لا سکتا ہے جو عالم ہو اور علم میں پختہ ہو۔

۵-۶: وہ آزاد ہو۔ امام کے آزاد ہونے اور اس کے مسلمان ہونے کی شرط میں کوئی خفا نہیں، اس کا مسلمان ہونا یہ چھٹی شرط ہے۔

۷-۸: وہ مذکر ہو۔ اس کے اعضاء سلامت ہوں۔ اس پر اجماع ہے کہ عورت کا امام ہونا جائز نہیں اگرچہ اس کے قاضی ہونے کے جواز میں اختلاف ہے ان امور میں جس میں عورت کی شہادت جائز ہے۔

۹-۱۰: وہ عاقل، بالغ ہو۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

11: وہ عادل ہو کیونکہ امت میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کے لئے امامت کی ذمہ داری جائز نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ علم میں لوگوں سے افضل ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تمہارے ائمہ تمہارے سفارشی ہیں۔ غور کرو کس سے سفارش طلب کر رہے ہو (1)۔ قرآن حکیم میں حضرت طالوت علیہ السلام کے وصف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے کشادگی علم میں اور جسم میں)۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے علم کا ذکر کیا ہے پھر اس چیز کا ذکر فرمایا جو قوت اور اعضاء کی سلامتی پر دلالت کرتی ہے۔ اصْطَفٰىهُ کا معنی ہے: اس نے اسے چن لیا۔ یہ نسب کی شرط پر دلیل ہے، اس کی شرائط میں گناہوں اور خطا سے معصوم ہونا نہیں ہے نہ اس کا عالم بالغیب ہونا ضروری ہے نہ اس کا افراد امت میں سب سے زیادہ بہادر اور گھوڑ سواری میں ماہر ہونا شرائط میں سے ہے اس کا صرف بنی ہاشم سے ہونا بھی شرط نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی امامت پر اجماع ہے حالانکہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ تھے۔

**مسئلہ نمبر 12:** فاضل کے ہوتے ہوئے فتنہ کے خوف سے مفضول کو امام بنانا جائز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ امت کا امر درست نہ ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ امام اسی لئے بنایا جاتا ہے تا کہ دشمن سے دفاع کرے، ملت بیضاء کی حمایت کرے، خلل کو روکے اور حقوق ادا کرے، حدود کو قائم کرے، بیت المال کے لئے مال جمع کرے اور اسے مستحق لوگوں پر تقسیم کرے۔ جب افضل شخص کو مقرر کرنے پر جنگ، فساد اور ان امور کے ضیاع کا خوف ہو جن کے لئے امام مقرر کیا جاتا ہے تو یہ فاضل سے مفضول کی طرف عدول کرنے کا ظاہر عذر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور ساری امت کو مشورہ کے وقت معلوم تھا کہ ان چھ افراد میں فاضل اور مفضول موجود تھے۔

حضرت عمر نے ان میں سے ہر ایک کے لئے اس ذمہ داری کی اجازت دی تھی جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی تھی اس پر امت کا اجماع ہوا تھا کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 13:** جب امام مقرر کیا جائے پھر تقرر کے بعد فاسق ہو جائے تو جمہور علماء کا قول ہے کہ اس کی امامت ختم ہو جائے گی اور ظاہر معلوم فسق کی وجہ سے وہ معزول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ امام حدود کو قائم کرنے، حقوق ادا کرنے، یتیموں اور مجنونوں کے مال کی حفاظت کرنے اور ان دوسرے امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جس شخص میں فسق ہوگا وہ ان امور کو قائم نہیں کر سکے گا، ان کے قیام سے عاجز ہوگا۔ اگر ہم فاسق کی امامت جائز قرار دیں تو ان امور کا ابطال لازم آئے گا جن کے لئے اسے مقرر کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ابتداء میں بھی فاسق کو امام بنانا جائز نہیں ہوتا کیونکہ ان امور کا ابطال لازم آتا ہے جن کے لئے وہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: امام معزول نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ کفر کرے یا نماز کا پڑھنا ترک کر دے یا نماز کی طرف بلانا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 139، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ترک کردے یا شریعت کا کوئی امر ترک کردے کیونکہ حدیث عبادہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہم امامت میں اس کے اہل لوگوں سے نہیں جھگڑیں گے۔ فرمایا: مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ظاہر کفر دیکھو جس میں دلیل ہو'' (1)۔ اور حضرت عوف بن مالک کی حدیث میں ہے اس وقت تک نہیں جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کریں (2)۔ ان دونوں حدیثوں کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر امراء بنائے جائیں گے۔ جس نے ناپسند کیا وہ بری ہو گیا جس نے انکار کیا وہ سلامت ہو گیا لیکن جوان سے راضی ہوا اور ان کی پیروی کی...... صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھیں۔ یعنی جس نے دل سے ناپسند کیا اور دل سے انکار کیا (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** جب امام اپنے آپ میں ایسا نقص پائے جو اس کی امامت میں موثر ہوتا ہو تو اسے معزول ہو جانا واجب ہے، اور جب ایسا نقص نہ پائے تو کیا اس کو معزول ہونا چاہئے اور کسی غیر کی بیعت کر لینی چاہئے اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی امامت ختم نہ ہوگی۔ بعض نے فرمایا: اسے معزول ہو جانا چاہئے۔ اس پر دلیل کہ امام جب اپنے آپ کو معزول کرے گا تو معزول ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے اقیلونی اقیلونی، ''مجھ سے بیعت واپس لے لو...... مجھ سے بیعت واپس لے لو''۔ اور صحابہ نے کہا: ہم نہ تجھ سے بیعت واپس لیتے ہیں نہ ہم اس کا مطالبہ کرتے ہیں تجھے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دین کے لئے مقدم کیا تھا۔ پس کس کی مجال کہ تجھے ہٹائے۔ تجھ سے رسول اللہ ﷺ ہمارے دین کے لئے راضی ہوئے تو ہم آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ اگر حضرت ابوبکر کے لئے ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام اس کا انکار کرتے اور حضرت ابوبکر سے کہتے تجھے یہ کہنا درست نہیں اور آپ کے لئے ایسا کرنا صحیح نہیں۔ جب صحابہ کرام اس پر قائم رہے تو معلوم ہوا کہ امام کے لئے ایسا کرنا جائز ہے چونکہ امام دوسروں کی نگرانی کرنے والا ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کا حکم حاکم کا حکم ہو، اور وکیل جب اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے امام بھی امت کا وکیل اور اس کا نائب ہوتا ہے۔ جب وکیل، حاکم اور ہر نائب کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے تو امام بھی اسی طرح ہوتا ہے اس کا بھی اس کی مثل ہونا واجب ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 15:** جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا ایک آدمی کے ذریعے کسی امام کی امامت منعقد ہو جائے تو تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ حکم سننے اور اطاعت کرنے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اقامت پر بیعت کریں اور جو کسی عذر کی بناء پر بیعت سے انکار کرے تو اس کا عذر قبول کیا جائے گا اور جو بغیر عذر کے انکار کرے تو اس پر جبر کیا جائے گا، تاکہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر نہ جائے۔ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو پہلا خلیفہ ہوگا اور دوسرا قتل کیا جائے گا۔ اس

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ، صفحہ 125، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب بخیار الائمۃ وشرارھم، صفحہ 129، جلد 2

3۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کے قتل میں اختلاف ہے کیا یہ قتل حساً ہے یا معنیً ہے۔ پس اس کا معزول کرنا اس کا قتل اور اس کی موت ہے۔ پہلا معنی ظاہر ہے (یعنی اسے قتل کیا جائے گا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو(1)۔ اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو ایک امام کی بیعت کر لے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے اور دل کا خلوص پیش کر دے تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہئے اگر اسے استطاعت ہے۔ اگر کوئی دوسرا امام آ جائے تو وہ اس سے لڑے اور دوسرے امام کی گردن اتار دے(2) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عرفجہ کی حدیث میں ہے، اس کو تلوار سے مارو خواہ کوئی بھی ہو(3)۔ یہ دو امام مقرر نہ ہونے پر بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ یہ چیز نفاق، مخالفت، انتشار، فتنوں کے ظہور اور نعمتوں کے زوال کا باعث بنتی ہے لیکن اگر قطر بہت دور ہوں اور علاقے جدا جدا ہوں جیسے اندلس اور خراسان تو پھر ہر علاقہ کے لئے علیحدہ امام جائز ہے جیسا کہ مزید بیان آئندہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 16:** اگر کوئی شخص عادل امام کے خلاف خروج کرے تو لوگوں پر اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ اگر امام فاسق ہو اور خروج کرنے والا عدل کو ظاہر کرنے والا ہو پھر بھی لوگوں کو مناسب نہیں کہ وہ اس خروج کرنے والے کی نصرت میں جلدی کریں حتیٰ کہ جو وہ عدل ظاہر کرتا ہے وہ واضح ہو جائے یا پہلے امام کے معزول کرنے پر سارے لوگ متفق ہو جائیں۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص جو اس قسم کا معاملہ طلب کرتا ہے وہ اپنی طرف سے صلاح کا نعرہ لگاتا ہے حتیٰ کہ جب غالب آ جاتا ہے تو پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آتا ہے جو اس کے ظاہری صلاح کے خلاف ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 17:** ایک زمانہ میں اور ایک شہر (ملک) میں دو یا تین اماموں کا قیام بالکل جائز نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام ابوالمعالی نے کہا: ہمارے اصحاب عالم کی دونوں طرفوں میں دو شخصوں کی امامت کی ذمہ داری کے عدم جواز کا نظریہ رکھتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا: اگر دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد پر اتفاق ہو جائے تو یہ اس کے قائم مقام ہوگا کہ ایک عورت کے دو ولیوں نے دو خاوندوں سے نکاح کر دیا جبکہ ہر ایک کو دوسرے عقد کا شعور نہ تھا۔ فرمایا: میرے نزدیک اس میں یہ ہے کہ دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد قریبی علاقوں میں تو جائز نہیں اس پر اجماع ہے ہاں جب دونوں اماموں کے درمیان بہت زیادہ دوری ہو تو پھر اس میں احتمال کی گنجائش ہے۔ استاذ ابواسحاق نے ان دو سلطنتوں میں دو اماموں کا تقرر جائز قرار دیا جو ایک دوسرے سے بہت دور ہوں تا کہ لوگوں کے حقوق اور احکام معطل نہ ہوں۔ کرامیہ فرقہ بغیر تفصیل کے دو امام مقرر کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ انہیں پھر ایک شہر میں بھی اس کی اجازت دینا لازم آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاول، صفحہ 126، جلد 2

3۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین، صفحہ 128، جلد 2

حضرت امیر معاویہ دونوں امام تھے۔ انہوں نے کہا: جب دو شہروں یا دو طرفوں میں دو امام ہوں گے تو ہر ایک اپنے علاقہ کے معاملات پر زیادہ کنٹرول کرے گا اور اس کے معاملات زیادہ نگرانی سے چلائے گا۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب ایک زمانہ میں دو نبیوں کی بعثت جائز ہے اور یہ چیز نبوت کے ابطال تک نہیں پہنچاتی تو امامت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی اور یہ چیز امامت کے ابطال تک نہیں پہنچائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جائز ہوتا اگر اس سے شرع نے منع نہ کیا ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فاقتلوا الاخر منھما۔ (1) ''دونوں اماموں میں سے جو دوسرا ہے اسے قتل کر دو''۔ امت کا اتفاق اسی پر رہا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مسئلہ انہوں نے اپنے لئے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا وہ شام کی ولایت کے مدعی تھے کہ پہلے ائمہ نے انہیں شام کی حکمرانی دی تھی۔ اس پر دلیل ان کے دور میں ائمہ کا اجماع ہے کہ امام ایک ہے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں امام ہوں اور میرا مخالف بھی امام ہے۔ اگر وہ کہیں عقل اسے محال قرار نہیں دیتی اور نقل میں کوئی چیز اس سے مانع نہیں تو ہم کہیں گے: نقلی دلائل میں سے قوی ترین دلیل اجماع ہے اور وہ اس کے منع کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ ملائکہ وہی کچھ جانتے ہیں جو انہیں بتایا گیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قول سے سبقت نہیں لے جاتے اور یہ تمام ملائکہ کے بارے میں ہے کیونکہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ (الانبیاء: 27) کا ارشاد ان کی مدح کے لئے ذکر کیا گیا ہے، پھر انہوں نے کیسے کہا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب انہوں نے خلیفہ کا لفظ سنا تو وہ سمجھے کہ بنی آدم میں کچھ لوگ فساد کریں گے کیونکہ خلیفہ کا مقصود اصلاح اور ترک الفساد ہوتا ہے لیکن انہوں نے تمام لوگوں پر معصیت کا حکم لگا دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان میں سے بعض فساد کریں گے اور بعض فساد نہیں کریں گے۔ پس ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ اور اس چیز کو ثابت فرمایا کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم سکھایا اور ان کے لئے اپنے پوشیدہ علم سے پردہ اٹھایا۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ نے دیکھا اور جان لیا تھا جو کچھ جنوں نے فساد برپا کیا تھا اور خونریزی کی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ زمین میں آدم کی تخلیق سے پہلے جن رہتے تھے، انہوں نے فساد کیا اور خونریزی کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو ملائکہ کے لشکر میں بھیجا۔ پس اس نے انہیں قتل کیا اور بعض کو سمندروں اور پہاڑوں پر بھگا دیا۔ پس اس وقت شیطان کو عزت ملی تو فرشتوں نے محض استفہام کی جہت سے اَتَجْعَلُ فِيْهَا کہا۔ کیا یہ خلیفہ پہلے جنوں کے طریقہ پر ہوگا یا نہیں؟ یہ احمد بن یحییٰ ثعلب کا قول ہے۔

ابن زید وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ خلیفہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کچھ لوگ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو انہوں نے یہ قول کیا (2)۔ انہوں نے یا تو گنہگار کو خلیفہ بنانے پر تعجب کرتے ہوئے یہ سوال کیا یا اس اعتبار سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں خلیفہ بنا رہا ہے اور جس پر یہ انعام کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا۔ بڑی تعجب کی بات ہے یا اس کام کو بہت بڑا سمجھتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اسے خلافت بھی ملے گی اور وہ نافرمان بھی ہوگا۔ حضرت قتادہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 117، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جب وہ زمین میں مخلوق پیدا کرے گا تو وہ فساد برپا کریں گے اور خونریزی کریں گے۔ انہوں نے یہ سوال کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، کیا یہ وہی ہے جس کے متعلق انہیں بتایا یا کوئی اور ہے۔ یہ قول بہتر ہے یہ عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کی تفسیر میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ زمین میں جب مخلوق ہوگی تو وہ اس میں فساد برپا کرے گی اور خون ریزی کرے گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کلام میں ان کے مذہب پر حذف ہے معنی یہ ہے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں جو ایسا ایسا کرے گا تو فرشتوں نے کہا: کیا زمین میں تو اسے خلیفہ بنانے والا ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ پہلا قول بہت بہتر ہے کیونکہ اس میں علم کا استخراج اور استنباط الفاظ کے مقتضیٰ سے ہے اور یہ نہیں ہوسکتا مگر علماء سے جو ان دونوں اقوال کے درمیان حسن ہے۔ اس میں غور و فکر کر۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے سوال کرنا کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا (1)...... جیسا کہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے...... تو یہ ان کو توبیخ کرنے کے لئے ہے جنہوں نے کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا، اور اپنی ازلی معلومات کا اظہار ہے کیونکہ انہیں فرمایا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا، مَنْ تجعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور فیھا دوسرے مفعول کے قائم مقام ہے۔ یفسد لفظ کے اعتبار سے ہے غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یفسدون بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ (الانعام: 25) یہ لفظ کے اعتبار سے ہے معنی کے اعتبار سے یستمعون ہے۔ (ویسفك) یہ معطوف ہے اس میں دو وجہیں جائز ہیں۔ اسید نے اعرج سے روایت کیا کہ انہوں نے ویسفكَ الدماء، پڑھا ہے یعنی مضارع کو منصوب پڑھا ہے اور واؤ کے ساتھ اسے استفہام کا جواب بنایا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا

الم اك جاركم و تكون بينی و بينكم المودة والاخاء

کیا میں تمہارا پڑوسی نہ تھا اور میرے اور تمہارے درمیان محبت و بھائی چارہ نہ تھا۔

السفك کا معنی انڈیلنا (بہانا) ہے سفکت الدم اسفکه سفکاً۔ میں نے خون کو بہایا اسی طرح آنسو بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ابن الفارس اور جوہری کا قول ہے۔

السفاك، کا معنی السفاح ہے جو کلام پر قادر ہو۔ مہدوی نے کہا: السفك صرف خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کبھی کلام کی نثر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سفك الکلام جب وہ کلام کرے۔ الدماء کا مفرد دم ہے، لام کلمہ محذوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل دَمْیٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: دَمَیٌ ہے اور کوئی اسم دو حرفوں پر نہیں آتا مگر اس سے حرف حذف کیا گیا ہوتا ہے۔ دم سے محذوف یا ہے اور کبھی اصل پر بھی بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلو أنا علی حجر ذبحنا جری الدمیان بالخبر الیقین

اگر ہم اس پتھر پر ہوتے تو ہم ذبح کئے جاتے، یقیناً دونوں طرف سے خون جاری ہوتے۔

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 457، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، حدیث 2984، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (یعنی ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں)۔ ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، التسبیح کا معنی تعظیم کے طور پر ہر نقص سے پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

اقول لما جاء نی فخره　　سبحان من علقمه الفاخر

میں کہتا ہوں: جب میرے پاس اس کا فخر آیا، میں علقمہ فخر کرنے والے سے برأت کرتا ہوں۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبحان اللہ کی تفسیر پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنا، یہ السبح سے مشتق ہے جس کا معنی چلنا اور جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ (المزمل) (بے شک دن میں مصروفیت ہے) پس سبحان اللہ کہنے والا اللہ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنے میں چلنے والا ہے نحن میں کلام گزر چکی ہے نون کو نون میں ادغام کرنا جائز نہیں تا کہ دو ساکن جمع نہ ہوں۔

**مسئلہ**: اہل تاویل کا فرشتوں کی تسبیح میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس نے فرمایا: فرشتوں کی تسبیح ان کی نماز ہے (1)، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ (الصافات) یعنی اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کی تسبیح، ذکر کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ مفضل نے یہی کہا ہے اور جریر کے قول سے استشہاد کیا ہے

قبح الالهُ وجوه تغلب كلما　　سبح الحجيج و كبّروا اهلالا

تغلب کے چہروں کو اللہ تعالیٰ نے قبیح کیا جب حاجیوں نے بلند آواز سے ذکر کیا اور تلبیہ کہا۔

حضرت قتادہ نے کہا: ان کی تسبیح سبحان اللہ ہے (2) عرف کے مطابق لغت میں یہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو ملائکہ کے لئے چنا ہے (یا اپنے بندوں کے لئے چنا ہے) سبحان اللہ و بحمدہ، اس کو مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ حضرت عبدالرحمن بن قرط سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس رات سیر کرائی گئی آپ نے اوپر والے آسمانوں میں یہ تسبیح سنی: سبحان العلی الاعلی سبحانہ و تعالیٰ۔ اس کو بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِحَمْدِكَ یعنی ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کو ملاتے ہیں۔ الحمد کا معنی ثنا (تعریف) ہے پہلے گزر چکا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ بِحَمْدِكَ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ گویا انہوں نے کہا: ہم تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں پھر تسلیم کی جہت پر معترض کلام ذکر کی یعنی تو اس کی طرف ہدایت میں محمود ہے (4)۔ واللہ اعلم

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل سبحان اللہ وبحمدہ، صفحہ 351، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنُقَدِّسُ لَكَ یعنی ہم تیری تعظیم کرتے ہیں اور ہم تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور ہم تیرے ذکر کو ان خرافات سے پاک کرتے ہیں جو ملحد لوگ تیرے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ مجاہد اور ابو صالح وغیرہما کا قول ہے۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: ہم تیری رضا چاہتے ہوئے اپنے نفسوں کو تیرے لئے پاک کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا جن میں قتادہ بھی ہیں: نقدس لك اس کا معنی ہے ہم نماز پڑھتے ہیں اور التقدیس کا معنی نماز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے(1)۔

میں کہتا ہوں بلکہ اس کا معنی صحیح ہے کیونکہ نماز تعظیم، تقدیس اور تسبیح پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں کہتے تھے: سبوح قدوس رب الملائکه و الروح۔ (2) یہ حضرت عائشہ نے روایت کی ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔ قدس کی بنا پر جیسے بھی بنائی جائے اس کا معنی پاک کرنا ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (المائدہ: 21) یعنی پاک زمین میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ (الحشر: 23) یعنی طاہر۔ اس کی مثل ہے بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۝ (النازعات) بیت المقدس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ مکان ہے جس میں انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوٹے کو قدس کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے وضو کیا جاتا ہے اور طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی سے القادوس ہے۔ حدیث پاک میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو پاک نہیں فرمایا جو ضعیف کے لئے قوی سے مواخذہ نہیں کرتی (3)۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ القدس پاکیزگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شاعر کا قول ہے:

فادركنه یاخذن بالساق والنسا　　كما شبرق الولدان ثوب المقدس

کتوں نے بیل کو پنڈلیوں اور رانوں سے اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے نصاریٰ کے بچے اپنے راہب کے کپڑوں کو تبرک کے لئے کاٹ لیتے ہیں۔

نماز بندے کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے، نمازی نماز میں اکمل حالات میں داخل ہوتا ہے کیونکہ نماز افضل عمل ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، اَعْلَمُ میں دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ فعل مضارع ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم بمعنی فاعل ہے جیسے کہا جاتا ہے: اللہ اکبر بمعنی کبیر جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

لعمرك ما ادری و انی لأوجل　　علی أینا تعدو المنیة اوّلُ

تیری عمر کی قسم! میں نہیں جانتا اور مجھے خوف ہے موت ہم میں سے کس پر پہلے آتی ہے۔

اگر اعلم فعل ہو تو ما اعلم کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا اور میم کا میم میں ادغام بھی جائز ہے، اگر تو اسے عالم کے معنی میں اسم بنائے تو (ما) اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔

ابن عطیہ نے کہا: نحویوں کے اجماع کی وجہ سے اس کو منصرف بنانا صحیح نہیں۔ اختلاف افعل میں ہے جب اس کے ساتھ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول فی الرکوع والسجود، صفحہ 292، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 177، جلد 1 (وزارت تعلیم)　　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نام رکھا جائے اور یہ نکرہ ہو۔ سیبویہ اور خلیل اس کو غیر منصرف بناتے ہیں اخفش اسے منصرف بناتا ہے(1)۔ مہدوی نے کہا: اَعْلَمُ میں تنوین مقدر کرنا جائز ہے جب تو اسے عالم کے معنی میں مقدر کرے، اور ماکواس کی وجہ سے نصب ہوگی۔ یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ جوہری نے کہا: نسوۃ حواج بیت اللہ اضافت کے ساتھ جب وہ حج کریں اور اگر وہ حج نہ کریں تو تو کہے گا حواج بیت اللہ۔ بیت کو تو نصب دے گا کیونکہ حواج میں تنوین کا ارادہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَالَا تَعْلَمُوْنَ اس ارشاد کی تاویل میں علماء تاویل کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس (لعنۃ اللہ علیہ) نے غرور کیا اور اس میں تکبر داخل ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کا خازن بنایا اور اسے عزت بخشی تو وہ دل میں اعتقاد رکھنے لگا کہ اسے فضیلت حاصل ہے(2)۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے معصیت اور کفر کو حقیر جانا۔ فرشتوں نے کہا: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ فرشتے نہیں جانتے تھے کہ ابلیس کے نفس میں اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ قتادہ نے کہا: جب فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِيْهَا اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ جن کو وہ خلیفہ بنا رہا ہے ان میں انبیاء، فضلاء اور طاعت شعار بھی ہیں تو فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔(3)

میں کہتا ہوں: اس معنی کا بھی احتمال ہے میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس میں سے جو پہلے ہو چکا ہے اور جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا۔ یہ عام ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا: بتاؤ تم تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، عَلَّمَ بمعنی عرف (پہچان کرانا) ہے اور یہاں تعلیم سے مراد اپنا علم ضروری الہام کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ علم فرشتے جبریل کے واسطہ سے ہو جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کو علم مجہول کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلا لفظ زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے تعلیم حق دینے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام نے ان اسماء کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے یاد کرانے کے ساتھ انہوں نے یاد کیا اور جو اللہ تعالیٰ نے آدم سے عہد کیا تھا وہ بھول گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں ان کے نفس کے سپرد کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰہٰ)

اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ابن عطا نے کہا: اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ان اسماء کا علم منکشف نہ کیا جاتا تو ملائکہ کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام خبر دینے سے زیادہ عاجز ہوتے۔ یہ واضح ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابوالبشر ہے۔ بعض نے فرمایا: ابو محمد ہے، حضرت محمد ﷺ کی کنیت خاتم الانبیاء بیان کی جاتی ہے یہ سہیلی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابو محمد تھی، زمین میں ابوالبشر تھی، اس کی اصل دو ہمزوں کے ساتھ ہے (أأدم) کیونکہ یہ افعل کے وزن پر ہے مگر دوسرے ہمزہ کو لین کر دیا، جب اس کو حرکت دینے کی طرف توجہ پکڑے گا تو تو اسے واؤ بنا دے گا تو جمع میں اوادم کہے گا کیونکہ یاء میں اس کی اصل معروف نہیں ہے عام طور پر اس میں واؤ رکھی جاتی ہے یہ اخفش سے مروی ہے۔

اس کے مادہ اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ادمة الارض وادیمها سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی سطح ہے، انسان اس سے پیدا ہوا اسی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الادمة سے مشتق ہے، جس کا معنی گندمی رنگ ہے۔ الادمة میں اختلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد گندمی رنگ ہے۔ نضر نے کہا: یہ سفید رنگ ہے آدم علیہ السلام سفید تھے اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ناقۃٌ ادماء، جب اونٹنی سفید ہو۔ اس اشتقاق پر اس کی جمع اُدُم اور اوادم ہوگی جیسے حمر اور احامر ہے، کسی بھی طرح منصرف نہیں اور الادمة سے مشتق ہو تو اس کی جمع آدمون ہوگی۔ اس قول والوں پر اس کو منصرف بنانا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ ادیم الارض سے مشتق ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: آدم کو آدم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کی سطح سے پیدا کیا گیا ہے انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ کیونکہ یہ بھولا تھا۔ ابن سعد نے اسے طبقات میں ذکر کیا ہے۔

سدی نے ابو مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، مرہ الہمدانی نے حضرت ابن مسعود سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قصہ میں روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو زمین کی طرف بھیجا تاکہ اس کی مٹی لے آئے۔ زمین نے کہا: میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ سے کچھ کمی کرے یا مجھے عیب لگائے۔ جبریل واپس آ گئے اور مٹی نہ لے آئے۔ جبریل نے عرض کی: یا اللہ! اس نے تیری پناہ مانگی تو میں نے اسے پناہ دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میکائیل کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی پناہ چاہی تو انہوں نے پناہ دے دی۔ وہ بھی واپس آ گئے اور اسی طرح کہا جس طرح جبریل نے کہا۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے پناہ مانگی تو ملک الموت نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں واپس جاؤں اور اس کا امر نافذ نہ کروں پس ملک الموت نے زمین کی سطح سے مٹی لی اور اسے مختلف جگہوں سے لیا کسی ایک جگہ سے نہ لیا، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے لیا، اسی وجہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد کے رنگ مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے آدم کو آدم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کی سطح سے لئے گئے تھے (1)۔ ملک الموت مٹی لے کر اوپر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: تجھے رحم نہ آیا جب زمین نے تیری بارگاہ میں تضرع وزاری کی۔ فرمایا: میں نے تیرا معاملہ اس کے قول سے زیادہ سخت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)

دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو آدم کی اولاد کی ارواح قبض کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر مٹی کو تر کیا حتیٰ کہ وہ لیس دار مٹی بن گئی، اللازب اس مٹی کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، پھر اس مٹی کو چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ اس میں بدبو پیدا ہوگئی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ (الحجر) یعنی بدبودار سیاہ مٹی سے۔ پھر ملائکہ سے فرمایا: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۷۱﴾ (ص) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾ (الحجر) (میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک ماروں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تاکہ ابلیس ان پر بڑائی نہ جتلائے۔ فرمایا: کیا تو اس پر بڑائی جتلاتا ہے جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے اور میں اس کی وجہ سے فخر نہیں کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بشر بنایا، وہ جمعہ کے دن کی مقدار سے چالیس سال تک مٹی کا جسم رہا۔ پھر ملائکہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے ڈر گئے، جب انہوں نے اسے دیکھا سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا وہ اس کے پاس سے گزرتا تھا تو اسے مارتا تھا، جسم سے آواز پیدا ہوتی تھی جس طرح ٹھیکری سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (الرحمٰن)

شیطان کہتا: اللہ تعالیٰ نے اسے کس امر کے لئے پیدا کیا ہے ابلیس اس آدم کے ڈھانچہ کے منہ سے داخل ہوتا اور اس کی دبر سے نکل جاتا۔ ابلیس نے ملائکہ سے کہا: اس سے مت ڈرو یہ کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ کہا جاتا ہے: ابلیس جب فرشتوں کے ساتھ آدم کے ڈھانچہ کے پاس سے گزرتا تو کہتا: کیا تم نے ملاحظہ کیا اسے جس کے مشابہ تم نے کوئی مخلوق نہیں دیکھی۔ اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم ایسا کرو گے؟ فرشتوں نے کہا: ہم اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں سوچا اگر اسے مجھ پر فضیلت دی گئی تو میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اگر مجھے اس پر فضیلت دی گئی تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ جب وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے آدم میں روح پھونکنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے کہا: جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا۔ جب اس میں روح پھونکی گئی اور روح آدم کے سر میں داخل ہوئی تو آدم نے چھینک ماری۔ فرشتوں نے اسے کہا: تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، آدم نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رحمك ربك (تیرا رب تجھ پر رحم فرمائے) جب روح آدم علیہ السلام کی آنکھوں میں پہنچی تو آدم علیہ السلام نے جنت کے پھلوں کو دیکھا۔ جب روح آدم کے پیٹ میں داخل ہوئی تو آدم کو کھانے کا شوق ہوا۔ پس وہ روح کے قدموں تک پہنچنے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے جنت کے پھلوں کی طرف لپکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿ۙ﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۱﴾ (الحجر) (پس سر بسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو)۔

ترمذی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اسی (مٹی کی) مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے بھری تھی، پس بنو آدم زمین کی قدر پر پیدا ہوئے، بعض سرخ، بعض سفید اور بعض سیاہ پیدا ہوئے اور بعض گندمی رنگ پیدا ہوئے، کچھ نرم مزاج، کچھ سخت مزاج، کچھ خبیث اور کچھ نیک۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ ادیم جمع ہے آدم کی۔ شاعر نے کہا:

الناس اخیاف و شتی فی الشیم و کلهم یجمعهم وجه الادم

لوگ مختلف رنگوں میں ہیں اور خصائل میں بھی مختلف ہیں، سب کو زمین کی سطح جمع کرتی ہے۔

پس آدم، ادیم اور الآدم سے مشتق ہے نہ کہ الادمۃ سے مشتق ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں سے مشتق ہو، اس مسئلہ کی مزید وضاحت تخلیق آدم کے قصہ میں سورۂ انعام میں آئے گی۔

اٰدَمَ، یہ غیر منصرف ہے، ابوجعفر نحاس نے کہا: اٰدَمَ معرفہ ہونے کی صورت میں غیر منصرف ہے اس پر نحویوں کا اجماع ہے کیونکہ افعل کے وزن پر یہ معرفہ ہے اور بصریوں کے نزدیک اس کو منصرف ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں مگر دو علتیں، اگر تو اسے نکرہ بنادے اور یہ نعت نہ ہو۔ خلیل اور سیبویہ اسے غیر منصرف بناتے ہیں۔ اخفش سعید اسے منصرف بناتا ہے کہ یہ نعت ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے اگر نعت نہ ہو تو منصرف ہوگا۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: قول تو سیبویہ کا ہے۔ وہ نعت اور غیر میں فرق نہیں کرتے، کیونکہ یہ بعینہٖ وہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، الْاَسْمَآءَ سے یہاں مراد عبارات ہیں۔ کبھی اسم بولا جاتا ہے اور مراد مسمیٰ ہوتا ہے جیسے تیرا قول زیدٌ قائم۔ الاسد شجاعٌ۔ کبھی نام سے مراد ذات ہوتی ہے جیسے تیرا قول اسد کے تین حرف میں پہلی صورت میں اسم بولا گیا ہے مراد مسمّیٰ ہے، دوسری صورت میں مسمیٰ مراد نہیں ہوتا کبھی لغت میں ذات کے قائم مقام عبارت ہوتی ہے اس طرح کا استعمال اکثر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یہ مشہور تاویلات پر ہے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا قول اِن للہ تسعۃ و تسعین اسماً۔ (2) کبھی یہ ذات کے قائم مقام ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ذات، نفسٌ، عینٌ اسمٌ یہ سب ہم معنی ہیں۔ اکثر اہل علم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (الاعلیٰ) اور تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ (الرحمٰن: 78) اور اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ (النجم: 23) میں اسم کو ذات پر محمول کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے ان کے معنی میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ حضرات ابن عباس، عکرمہ، قتادہ، مجاہد، ابن جبیر نے کہا: علّمه اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا۔ (3) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام بڑی چھوٹی اشیاء کے اسماء سکھا دیئے۔

عاصم بن کلیب نے سعد مولی حسن بن علی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پس

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاھا، صفحہ 342، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2531، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

لوگوں نے برتنوں کے نام اور کوڑے کے نام کا ذکر کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کے اسماء سکھائے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مرفوع حدیث میں بھی مروی ہے اور لفظ کلھا بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کلھا یہ احاطہ اور عموم کے لئے وضع کیا گیا ہے، بخاری میں حضرت انس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومنین قیامت کے روز جمع ہوں گے اور کہیں گے: اگر ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سفارش طلب کریں۔ پس لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور انہیں کہیں گے: انت ابو الناس خلقك الله بيده و اسجد لك ملائكته و علمك اسماء كل شیء، آپ لوگوں کے باپ ہیں اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، تیرے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرایا، تجھے ہر چیز کا نام سکھایا (1)۔ الحدیث۔

ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ لغت توقیفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اور تفصیلی اسماء سکھائے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام بتایا حتیٰ کہ پیالے اور دودھ دوھنے کے برتن کا نام بھی بتایا۔

شیبان نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی مخلوق کے اسماء بتائے جبکہ ملائکہ کو نہ بتائے۔ چیز کا نام بتایا اور ہر چیز کی منفعت اس کی جنس کی طرف پھیری۔ نحاس نے کہا: یہ کچھ اس باب کے متعلق مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجناس کے اسماء بھی سکھائے اور ان کے منافع بھی بتائے۔ یہ چیز اس طرح اور یہ اس کام کے لئے ہے۔ طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو فرشتوں کے اسماء اور ان کو اپنی اولاد کے اسماء سکھائے۔ طبری نے اس قول کو پسند کیا ہے اور اس قول کی وجہ سے اسے ترجیح دی ہے: **ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ**۔

ابن زید نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے اسماء سکھائے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: خاص فرشتوں کے اسماء سکھائے۔ قتبی نے کہا: جو کچھ زمین میں پیدا فرمایا ان کے اسماء سکھائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اجناس اور انواع کے اسماء سکھائے (2) میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اہل تاویل کا اختلاف ہے کہ کیا ملائکہ پر اشخاص کے نام پیش کئے تھے یا صرف اسماء پیش کئے تھے بغیر اشخاص کے۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے فرمایا: اشخاص کو پیش کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **عَرَضَهُمْ** (انہیں پیش کیا)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ** (ان کے اسماء بتاؤ) عرب کہتے ہیں: عرضت الشیء فاعرض میں نے چیز کو ظاہر کیا تو وہ ظاہر ہوگئی۔ اسی سے ہے عرضت الشیء للبیع میں نے چیز کو بیع کے لئے پیش کیا۔ حدیث پاک میں ہے: انه عرضهم امثال الذر انہوں نے چیونٹیوں کی مثال میں پیش کیا (3)۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، حدیث نمبر 6962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120-119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حضرت ابن عباس وغیرہ نے فرمایا: اسماء کو پیش کیا۔ حضرت ابن مسعود کے حرف میں ہے: عرضھن۔ انہوں نے ضمیر اسماء کی طرف لوٹائی اشخاص کی طرف نہیں، ھن ضمیر مؤنث کے ساتھ خاص ہے، اور حضرت ابی کے حرف میں ہے: عرضھا۔

مجاہد نے کہا: اصحاب الاسماء کو پیش کیا جنہوں نے کہا: اسماء سے مراد المسمیات ہے تو انہوں نے ابی کی قرأت عرضھا کو بنیاد بنایا۔ اور جنہوں نے عرضھم پڑھا انہوں نے کہا: لفظ اسماء اشخاص پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسماء کے لئے عرضھم کہنا جائز ہے اور ھؤلاء میں اسماء کے اشخاص کی طرف اشارہ مراد ہے لیکن اگرچہ وہ غائب تھے پس وہ حاضر تھا جو ان میں سے تھا ایک سبب کی وجہ سے اور وہ ان کے اسماء تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ بات جو ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے اور ان اجناس کے ساتھ ان پر اسماء پیش کئے پھر ان چیزوں کو ملائکہ پر پیش کیا اور ان سے ان چیزوں کے اسماء پوچھے، جو حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھ لئے تھے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں بتایا اس چیز کا یہ اسم ہے اس چیز کا یہ اسم ہے۔

الماوردی نے کہا: اصح یہ ہے کہ ذوات کو پیش کیا گیا تھا پھر ان چیزوں کے پیش کرنے کے زمانہ میں دو قول ہیں۔ (۱) ان چیزوں کو تخلیق کرنے کے بعد انہیں پیش کیا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے دلوں میں ان کی تصویریں ڈال دیں پھر انہیں پیش کیا۔

**مسئلہ نمبر5:** اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان کس نے بولی۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی اور سریانی کتاب اور باقی کتب جس نے وضع کیں اور تمام زبانوں کے ساتھ کلام کی وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ یہ حضرت کعب الاحبار کے علاوہ علماء کا بھی قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت کعب احبار سے بہتر وجہ مروی ہے، فرمایا: جس نے سب سے پہلے عربی بولی وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر عربی ڈالی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سام کی زبان پر ڈالی تھی اسے ثور بن زید نے خالد بن معدان سے انہوں نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے واضح عربی زبان سب سے پہلے بولی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے وہ اس وقت دس سال کے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ سب سے پہلے عربی یعرب بن قحطان نے بولی۔ اس کے علاوہ بھی روایات ہیں۔ ہم کہیں گے: صحیح یہ ہے کہ سب سے پہلے انسانوں میں سے عربی بولنے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اور لغات ساری اسماء ہیں۔ پس یہ اس کے تحت داخل ہیں، سنت میں بھی اس طرح آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھائے حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا نام بھی سکھایا اور پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے عربی بولی تو اس میں احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے سب سے پہلے حضرت اسماعیل نے عربی بولی۔ اسی طرح اس قول کے علاوہ جو اقوال ہیں وہ بھی اس پر محمول ہوں گے کہ مذکور شخص نے اپنے قبیلہ سے پہلے عربی بولی۔ اس کی دلیل وہی ہے جو میں نے ذکر کر دی ہے۔ اسی طرح جبریل

نے فرشتوں میں سے سب سے پہلے عربی بولی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو عربی سکھائی اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے یہ جاری فرمائی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰٓؤُلَآءِ۔ یہ لفظ مبنی بر کسرہ ہے تمیم اور بعض قیس اور اسد قبیلہ کی لغت میں هؤلاء میں قصر ہے۔

اعشیٰ نے کہا:

هؤلا ثم هؤلا كلا اعطيـ ت نعالا محذوّة بمثال (1)

یہ لوگ پھر یہ لوگ یقیناً تو نے ان کو مثال کے ساتھ سلے ہوئے جوتے دیئے۔

عربوں میں سے بعض اسے ھولاء پڑھتے ہیں الف اور ہمزہ حذف کر دیتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: ان کنتم صادقین ان بنی آدم یفسدون فی الارض فانبئونی یعنی اگر تم سچے ہو کہ بنی آدم زمین میں فساد برپا کریں گے تو پھر مجھے بتاؤ۔ یہ مبرد کا قول ہے صٰدِقِيْنَ کا معنی عالمین ہے یعنی اگر تم جاننے والے ہو۔ اسی وجہ سے ملائکہ کیلئے اجتہاد جائز نہیں ہے۔ فرشتوں نے کہا: سبحانك۔ تیری ذات پاک ہے۔ یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ان پر خبر دینے میں صرف سچ شرط نہ ہوتو پھر ان کے لئے اجتہاد جائز ہوتا جس طرح اس شخص کے لئے جائز تھا جسے اللہ تعالیٰ نے سو سال موت دی پھر پوچھا كم لَبِثْتَ اس پر اصابت شرط نہیں تھی۔ فرمایا: اس نے صحیح بات نہ پائی تو اس پر سختی نہ فرمائی یہ واضح ہے اس میں کسی قسم کا خفا نہیں۔

طبری اور ابو عبید نے حکایت کیا ہے کہ بعض مفسرین نے کہا: اِنْ كُنْتُمْ کا معنی ہے اذ کنتم۔ طبری اور ابو عبید نے کہا: یہ غلط ہے (2)۔

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ کا معنی ہے: مجھے خبر دو۔ النبأ خبر کو کہتے ہیں اسی سے النبیؑ (ہمزہ کے ساتھ) ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

**مسئلہ نمبر 7:** بعض علماء نے فرمایا: خبر دینے کے امر سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ نہیں جانتے۔ محققین اہل تاویل کہتے ہیں: یہ تکلیف کی جہت سے امر نہیں ہے یہ تقریر اور توقیف کی جہت سے ہے۔ تکلیف مالا یطاق پر تفصیلی کلام آگے آئے گا کیا تکلیف مالا یطاق واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یہ تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

''عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر حقیقتاً تو نے ہمیں سکھا دیا۔ بے شک تو ہی علم و

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً

حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سُبْحٰنَكَ تو اس سے پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی غیب جانے۔ یہ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ کے ارشاد کا جواب ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ تو صرف وہی جانتے ہیں جو وہ انہیں سکھاتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا انہیں علم نہیں جیسا کہ ہم میں سے جہال کہا کرتے ہیں۔ مَا عَلَّمْتَنَا میں مَا بمعنی الذی ہے یعنی وہ جو تو نے ہمیں سکھایا اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا مصدریہ ہو بمعنی الا تعلیمك ایانا یعنی مگر تیرے سکھانے کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 2**: جس شخص سے کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ نہ جانتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ فرشتوں، انبیاء، فضلاء علماء کی اقتداء کرتے ہوئے یہ کہے کہ اللہ جانتا ہے میں نہیں جانتا ... لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ علماء کی موت کے ساتھ علم اٹھالیا جائے گا، پھر جہال لوگ باقی رہ جائیں گے جن سے فتوے طلب کئے جائیں گے وہ اپنی رائے سے فتوے دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین سے اس آیت کے معنی میں جو مروی ہے وہ البستی نے ''المسند الصحیح'' میں حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بری جگہیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں جبریل امین علیہ السلام سے پوچھ لوں۔ جبریل امین علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو اس نے کہا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں میکائیل علیہ السلام سے پوچھ لوں، میکائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اچھی جگہیں مساجد ہیں اور بری جگہیں بازار ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دادی کو ایک مسئلہ میں کہا تھا تو لوٹ جا حتیٰ کہ میں لوگوں سے پوچھ لوں (2)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: وَاَبْرَدَهَا علی الکبد۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیا ہے؟ فرمایا: آدمی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جو وہ نہ جانتا ہو تو وہ کہے: اللہ اعلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ابن عمر نے ٹھیک کہا ہے ایسی بات پوچھی گئی جس کا اسے علم نہیں تھا تو کہا: مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ دارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ابی عقیل یحییٰ بن متوکل صاحب ''بہیۃ'' نے کہا: میں قاسم بن عبید اللہ اور یحییٰ بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحییٰ نے قاسم سے کہا: اے ابا محمد! تیرے جیسے شخص پر بہت بری بات ہے کہ اس دین کا کوئی مسئلہ تجھ سے پوچھا جائے پھر تیرے پاس اس کا علم نہ ہو اور نہ کوئی کشادگی کا راستہ ہو، یا کہا: نہ علم اور نہ نکلنے کا راستہ ہو۔ قاسم نے اسے کہا: یہ کس کے لئے؟ یحییٰ نے کہا کیونکہ تو ہدایت یافتہ اماموں ابو بکر اور عمر کا بیٹا ہے۔ قاسم نے اسے کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل بخشی ہے اس کے نزدیک اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ انسان بغیر علم کے کوئی بات کرے یا کسی غیر ثقہ سے مسئلہ

1۔ صحیح بخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث نمبر 98، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6511

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2507۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2027، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پوچھے۔ یحییٰ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: میں نے ابن ہرمز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عالم کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو لاادری (میں نہیں جانتا) کی میراث دے تاکہ ان کے ہاتھوں میں اصل ہو۔ جب ان میں سے کسی سے وہ مسئلہ پوچھا جائے گا جو وہ نہیں جانتا ہوگا تو کہے گا: میں نہیں جانتا۔ ہیثم بن جمیل نے ذکر کیا ہے کہ میں امام مالک سے اڑتالیس مسائل پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تو امام مالک نے بتیس مسائل میں فرمایا: میں نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء مسلمین سے بہت سی ایسی مثالیں مروی ہیں۔ اس کو اس ریاست کے ترک اور علم میں انصاف نہ کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ ابن عبدالبر نے کہا: علم کی برکت اور اس کے آداب سے اس میں انصاف کرنا ہے جس نے انصاف نہیں کیا اس نے نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ یونس بن عبدالاعلیٰ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابن وہب کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہمارے زمانہ میں انصاف سے کم کوئی چیز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صورت امام مالک کے زمانہ میں تھی تو پھر آج ہمارے زمانہ میں کیا حالت ہوگی جبکہ ہمارے اندر فساد پھیل چکا ہے اور کمینے لوگوں کی کثرت ہے اور ریاست کے لئے علم طلب کیا جاتا ہے نہ کہ شعور و آگاہی کے لئے بلکہ دنیا میں ظاہر ہونے اور اس جنگ و جدل کے ذریعے اپنے ہم عصروں پر غلبہ پانے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جو جنگ و جدل دل میں قساوت پیدا کرتا ہے اور کینہ چھوڑتا ہے۔ اس کو عدم تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

کہاں گئی وہ روایت جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: اپنی عورتوں کے مہر چالیس اوقیہ سے زائد نہ رکھو اگرچہ عورت ذی العصبہ کی بیٹی ہو یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی ہو جو زیادہ رکھے گا زیادتی بیت المال میں رکھی جائے گی۔ ایک عورت اٹھی جو صائب الرائے عورتوں میں سے تھی۔ اس کا منہ لمبا تھا اور ناک چپٹی تھی۔ اس عورت نے کہا: تجھے اس مہر کے تعین کا حق نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں؟ اس عورت نے کہا: اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا** (النساء: 20) دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔

حضرت عمر نے کہا: عورت صحیح ہے اور مرد نے غلطی کی (1)۔

وکیع نے ابو معشر سے انہوں نے حضرت محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نے حضرت علی سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت علی نے جواب دیا تو اس شخص نے کہا: اے امیر المومنین! مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے صحیح کہا اور میں نے غلطی کی ہر علم والے کے اوپر علم والا ہوتا ہے۔

ابو محمد قاسم بن اصبغ نے ذکر کیا ہے کہ جب میں مشرق کی طرف چلا تو میں قیروان میں اترا اور میں نے بکر بن حماد سے مسدد کی حدیث حاصل کی۔ پھر میں بغداد چلا گیا۔ میں لوگوں سے ملا۔ جب میں واپس آیا تو میں مسدد کی حدیث کی تکمیل کے لئے ان کی طرف لوٹا۔ ایک میں نے ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی جس کا تعلق مضر قبیلہ سے تھا انہوں نے دھاری دار قمیصیں پہنی ہوئی تھیں بکر بن حماد نے کہا: حدیث میں لفظ مجتابی النمار نہیں مجتابی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 233

الشمار ہے۔ میں نے کہا: مِجتابی النمار ہے۔ میں نے اندلس اور عراق میں جس شخص پر بھی یہ حدیث پڑھی میں نے اسی طرح پڑھی ہے۔

بکر بن حماد نے کہا: تو عراق میں جانے کی وجہ سے ہمارا مقابلہ کرتا ہے اور ہم پر فخر کرتا ہے۔ پھر مجھے فرمایا: ہمارے ساتھ اس شیخ کی طرف چلو...... جو مسجد میں موجود تھے...... اس کے پاس اس کا علم ہے۔ ہم ان کی طرف چلے۔ ہم نے ان سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ھو مجتابی النمار جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ دھاری دار کپڑے پہنتے تھے اور ان کے گریبان سامنے ہوتے تھے۔ النمار جمع ہے نِمَرَة کی۔ بکر بن حماد نے اپنا ناک پکڑ لیا اور کہا: حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو، حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو پھر وہ واپس چلے گئے۔ یزید بن ولید بن عبد الملک نے کتنا اچھا کہا ہے:

اذا ما تحدثت فی مجلس　　تناھی حدیثی الی ما علمت

ولم اعد علمی الی غیرہ　　و کان اذا ما تناھی سکت

جب میں کسی مجلس میں بات کرتا ہوں تو میری بات کی انتہا میرے علم تک ہوتی ہے۔ میں اپنے علم کو کسی غیر تک نہیں لے جاتا۔ جب میرے علم کی انتہا ہوتی ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَكَ۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک سبحان مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ اس معنی کو ادا کرتا ہے: نسبحك تسبیحا ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ کسائی نے کہا: یہ نداء کی وجہ سے منصوب ہے (1)۔

الْعَلِیْمُ مبالغہ کے لئے اور اللہ کی مخلوق میں معلومات میں کثرت کا معنی دینے کے لئے فعیل کے وزن پر ہے۔ الْحَكِیْمُ اس کا معنی حاکم ہے، ان دونوں اسموں کے درمیان مزید مبالغہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی محکم ہے اس صورت میں حکیم فعل کی صفات سے ہوگا، پھر یہ مُفعل سے فعیل کے وزن پر پھیرا گیا ہے جیسا کہ مُسمِع کو سمیع کی طرف اور مُؤلِم کو الیم کی طرف پھیرا گیا ہے یہ ابن انباری نے کہا ہے۔ ایک قوم نے کہا: الْحَكِیْمُ کا معنی ہے فساد سے روکنے والا۔ اسی سے حکمة اللجام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی گھوڑے کو مقصد کے بغیر بھاگنے اور چلنے سے روکتی ہے۔ جریر نے کہا:

أَبَنِیْ حنیفه احکموا سفهاءکم　　انی اخاف علیکم ان اغضبا (2)

کیا بنی حنیفہ نے اپنے نادان لوگوں کو روکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں تم پر غصہ کروں گا یعنی کیا بنی حنیفہ نے اپنے بیوقوف لوگوں کو فساد سے روکا ہے۔

زہیر نے کہا:

القائد الخیل منکوبا دوابرھا　　قد أُحکمت حکمات القدّ والأبَقَا

وہ گھوڑوں کو چلاتا ہے حتیٰ کہ ان کے پاؤں گھس جاتے ہیں وہ روئی اور چمڑے کی لگاموں کے ساتھ روکے گئے ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً، صفحہ 122، جلد 1

عرب کہتے ہیں: احکم الیتیم عن کذا و کذا۔ یتیم کو اس اس کام سے روکا گیا ہے۔ السورۃ المحکمۃ ایسی سورت جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو اور اس کے ساتھ اس کو ملایا جائے جو اس سے خارج ہو اور اس پر زائد کیا جائے جو اس سے نہ ہو ایسی حکمت ہے، وہ بھی حکمت والے کو جہالت سے روکتی ہے۔ کہا جاتا ہے: احکم الشیء جب کوئی کسی کام کو پختہ کرے اور مقصود سے خارج ہونے والی چیز کو رد کرے۔ فھو محکم و حکیم کثرت اور زیادتی حکمت کا معنی ہے۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝۳۳

"فرمایا: اے آدم! بتا دو انہیں ان چیزوں کے نام پھر جب آدم نے بتا دیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بلند مرتبہ پر آگاہ کرنے کے لئے انہیں حکم دیا کہ فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، اس کے بعد کہ پہلے ان پر ان چیزوں کو پیش کیا گیا تھا تاکہ فرشتے جان لیں کہ وہ زیادہ جاننے والا ہے اس کے متعلق جو ان سے پوچھی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کہ اسے ان پر مقدم کیا اس کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں آدم کا شاگرد بنایا اور انہیں حکم دیا کہ ان سے علم حاصل کرو۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کو عظمت و جلال کا رتبہ حاصل ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجود لہ بنایا اور علم کے ساتھ خاص فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 2**: اس آیت میں علم اور صاحب علم کی فضیلت کی دلیل ہے۔ حدیث پاک میں ہے فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں (1) یعنی اس کے لئے تواضع و انکساری کرتے ہیں۔ فرشتے تمام لوگوں میں صرف اہل علم کے لئے ایسا کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب و احترام ان پر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے لازم کیا تھا۔ پس یہ ادب ان فرشتوں نے سیکھا جب بھی کسی بشر میں علم ان کے سامنے ظاہر ہوا فرشتے اس کے لئے جھک گئے اور علم کی اور صاحب علم کی تعظیم کے لئے عاجزی کرنے لگے اور علم طلب کرنے اور علم سے مشغول ہونے کی وجہ سے یہ سب تعظیم و مرتبہ انہیں ملا۔ یہ مرتبہ تو طلباء کا ہے، علماء اور جو ربانیین ہیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں سے کرے بے شک وہ عظیم فضل والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اس باب میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ فرشتے افضل ہیں یا انسان افضل ہے علماء کے دو قول ہیں: ایک قوم کا خیال ہے کہ انسانوں میں سے رسل، فرشتوں میں رسل پر افضل ہیں، انسانوں میں سے اولیاء فرشتوں میں سے

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب العلم عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)
سنن ابی داؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اولیاء پر افضل ہیں۔ دوسرے علماء کا خیال ہے: ملاء اعلیٰ افضل ہے جنہوں نے فرشتوں کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے ان آیات اور احادیث سے حجت پکڑی ہے: عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں)۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء:172) ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام:50) (آپ فرمایئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں گا کہ خود جان لیتا ہوں غیب اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں)۔

اور بخاری میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: من ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منھم (1) (جس نے مجھے مجمع میں یاد کیا میں نے اسے ان سے بہتر مجمع میں یاد کیا۔) یہ نص ہے۔

اور جن علماء نے بنی آدم کو ترجیح دی انہوں نے ان آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (البینہ) (یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں)۔

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ان الملائکة لتضع اجنحتھا رضی لطالب العلم (2) (بے شک فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔)

یہ حدیث ابوداؤد نے ذکر کی ہے، ایسی بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عرفات کی وجہ سے فرشتوں پر مباہات فرماتا ہے اور مباہات ہمیشہ افضل کی وجہ سے کیا جاتا ہے (3)۔ واللہ اعلم بالصواب

بعض علماء نے فرمایا: کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ انبیاء فرشتوں سے افضل ہیں اور نہ اس پر کوئی قطعی دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں کیونکہ اس کا طریق اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا اجماع امت ہے اور اس بارے میں کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ قدریہ فرقہ اور قاضی ابوبکر کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: فرشتے افضل ہیں۔ قاضی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اور شیعہ حضرات نے جو کہا ہے کہ انبیاء افضل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کو یہ کہا جائے گا کہ مسجود لہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا، کیا

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ عزوجل ویحذرکم اللہ نفسہ، حدیث نمبر 6856، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کعبہ مسجود لہا ہے انبیاء اور ساری مخلوق اسے سجدہ کرتی ہے، پھر انبیاء بالاتفاق کعبہ سے بہتر و افضل ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ سجدہ عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو سجدہ ایک جہت کی طرف ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ جہت سجدہ کرنے والے اور عابد سے افضل ہے اور یہ بات واضح ہے۔ مزید بیان اس کے بعد آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس آیت میں دلیل ہے کہ کوئی شخص غیب نہیں جانتا مگر جن کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے جیسے انبیاء کرام یا جن کے لئے اللہ نے علم غیب عطا فرمایا وہ کسی کو کچھ غیب کا علم عطا فرما دیں۔ پس یہ نجومی اور کاہن لوگ جھوٹے ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ انعام میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ۔ یعنی ان کے قول کو میں جانتا ہوں جو انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (البقرہ:30) یہ مکی اور ماوردی نے کہا ہے زہراوی نے کہا اور جو انہوں نے ظاہر کیا وہ ان کا حضرت آدم علیہ السلام کو جلدی سے سجدہ کرنا ہے وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور سعید بن جبیر نے فرمایا: اس سے مراد وہ ہے جو ابلیس نے کبر اور معصیت اپنے نفس میں چھپائی ہوئی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: تکتمون جمع کا صیغہ ہے جبکہ وہ چھپانے والا اس قول کے مطابق ایک تھا تو یہ مجازاً اور وسعت کی بنا پر ہے۔ کسی قوم کو کہا جاتا ہے جبکہ ان کے ایک بیوقوف نے جنایت کی ہوتی ہے: انتم فعلتم کذا تم نے یہ کیا ہے، یعنی تم میں سے ایک ایسا کرنے والا ہے۔ یہ تحقق کرنے کے ارادہ سے ہوتا ہے(1)۔

اسی سے یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۝ (الحجرات) حالانکہ ایک شخص عیینہ نے پکارا تھا یا بعض نے کہا: اقرع نے پکارا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: ظاہر کرنا اور چھپانا یہ تمام فرشتوں کے ظواہر اور اسرار کی معرفت کے عمومی معنی پر ہے۔ مہدی بن میمون نے کہا: ہم حضرت حسن کے پاس موجود تھے۔ ان سے حسن بن دینار نے پوچھا: فرشتوں نے کیا چھپایا تھا؟ حسن نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے ایک عجیب مخلوق دیکھی گویا ان کے دلوں میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ فرمایا: پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور آپس میں سرگوشی کرنے لگے اور کہا: تمہیں اس مخلوق سے کوئی پریشانی نہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں فرمائی مگر ہم اس سے اس کے نزدیک افضل ہیں۔

مَا تُبْدُوْنَ سے مَا اس کو اَعْلَمُ کی وجہ سے نصب جائز ہے اس بنا پر کہ اَعْلَمُ فعل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَعْلَمُ بمعنی عالم ہو اور اس کی وجہ سے مَا منصوب ہو پس یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ٘ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ۝۳۴

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

"جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور (داخل) ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذْ قُلْنَا اس سے پہلے اذ کر محذوف ہے اور رہا ابو عبید کا قول کہ (اذ) زائدہ ہے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ (اذ) ظرف ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے، اور فرمایا: قلنا، قلت نہیں فرمایا، چونکہ جبار عظیم ذات اپنے بارے جماعت کے فعل کے ساتھ خبر دیتی ہے، عظمت اور ذکر کی بلندی کے اظہار کے اعتبار سے۔

ملائکۃ یہ جمع ہے ملك کی۔ اس سے پہلے اس کا ذکر گزر چکا ہے، ادم کے متعلق اور اس کے اشتقاق کے متعلق بھی بحث گزر چکی ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابو جعفر بن قعقاع سے مروی ہے کہ انہوں نے ملائكة کی تاء کو اسجدوا کے جیم کے ضمہ کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کی مثال الحمد لله

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْجُدُوْا۔ سجود کا معنی عرب کلام میں تذلل اور خضوع (عجز و انکساری) ہے۔ شاعر نے کہا:

بجمع تضل البلق فی حجراته ترى الأكم فيها سجداً للحوافر

اس شعر میں سجداً خضوع وخشوع اور جھکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عین ساجدۃ، ایسی آنکھ جو دیکھنے سے جھکی ہوتی ہو۔ سجدہ کی غایت زمین پر چہرے کو رکھنا ہے۔ ابن فارس نے کہا: سجد اس وقت بولتے ہیں جب کوئی سر جھکا دے۔ جس نے سجدہ کیا اس نے عجز کا اظہار کیا۔ الاسجاد، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ ابو عمرو نے کہا: اسجد کا معنی ہے: اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ شاعر نے کہا:

فضول ازمتها اسجدت سجود النصارى لاحبارها

ان عورتوں نے اپنے جمال کے اضافی کپڑے اپنی کلائیوں پر اس طرح جھکا دیئے جیسے نصاریٰ اپنے راہبوں کے لئے جھکتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے کہا: ایک بنی اسد کے اعرابی نے یہ کہا:

وقلن له اسجد لليلى فاسجد

انہوں نے اسے کہا لیلیٰ کے لئے سر جھکا دے تو اس نے سر جھکا دیا۔

یعنی جب اونٹ نے سر جھکا دیا۔ دراھم الاسجاد ان سکوں کو کہتے ہیں جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی تھیں اور لوگ انہیں سجدہ کرتے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

وافی بها كدراهم الاسجاد اس نے اسے پایا دراھم الاسجاد کی طرح۔

**مسئلہ نمبر 3**: وہ علماء جنہوں نے حضرت آدم اور ان کی اولاد کی فضیلت پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کیا، جس

میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ فرمایا: یہ ارشاد دلیل ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کا معنی ہے: آدم کے چہرے کی طرف منہ کرتے ہوئے سجدہ کرو۔ یہ اس طرح ہے جیسے ارشاد فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (الاسراء:78) یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز قائم کرو اور اس طرح ارشاد ہے: نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص) یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

یعنی اس کی تخلیق مکمل ہونے کے وقت تم اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ مسجود لہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا جیسا کہ قبلہ سجدہ کرنے والوں سے افضل نہیں۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل نہ تھے تو پھر اس کے ان کے سجدہ کرنے کے حکم میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ نے جب اپنی تسبیح اور تقدیس کی وجہ سے کچھ بڑائی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تاکہ انہیں دکھائے کہ وہ ان کی تسبیح و تقدیس اور ان کی عبادت سے مستغنی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام پر عیب لگایا اور انہیں حقیر سمجھا اور ان کی صنعت کے خصائص کو نہ جان سکے تو انہیں بطور تکریم حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (البقرہ:30) پر سزا دینے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا جب فرشتوں کو فرمایا: اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا تو وہ یہی کہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ (ص) (بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے اور اسے خلیفہ بنانے والا ہوں) وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص) اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ یہ تمہارے لئے اس وقت سزا ہوگی اس قول کی جو تم نے اب کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عباس نے انسان کی فضیلت پر اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم اٹھائی ہے۔ فرمایا: لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (الحجر) (اے محبوب! آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں) اور اپنے اس قول سے عذاب سے امن کی نوید سنائی: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) (تاکہ دور فرمادے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے)۔

اور فرشتوں کو فرمایا: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ (الانبیاء:29) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو ہم اسے سزا دیں گے جہنم کی)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی ذات کی قسم نہیں اٹھائی اسی طرح فرشتوں کی حیات کی قسم نہیں اٹھائی۔ لعمری نہیں فرمایا، اور آسمان اور زمین کی قسم اٹھائی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین اور آسمان، عرش اور ساتوں جنتوں

سے افضل ہیں۔ الله تعالیٰ نے التین اور زیتون کی قسم اٹھائی ہے۔ اور رہا یہ ارشاد: مَنۡ یَّقُلۡ مِنۡهُمۡ الخ اس کی مثال الله تعالیٰ کا اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمانا ہے: لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (الزمر: 65)۔ (اور اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے)۔ پس اس میں کوئی فضیلت کی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** ملائکہ کے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے جبکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جمہور علماء نے فرمایا: فرشتوں کو اپنی پیشانیاں زمین پر رکھنے کا حکم تھا جیسا کہ نماز میں سجدہ ہوتا ہے، کیونکہ عرف و شرع میں سجدہ سے یہی ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے یہ سجدہ آدم علیہ السلام کی تکریم اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھا اور الله تعالیٰ کی طاعت کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے ایسے تھے جیسے ہمارے لئے قبلہ ہے۔ لآدم کا مطلب ہے الی آدم جیسے کہا جاتا ہے: صلی للقبلة یعنی قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو آج معروف ہے یعنی زمین پر پیشانی رکھنا بلکہ لغت کی اصل کے اعتبار سے تھا یعنی تذلل و انقیاد یعنی حضرت آدم کے لئے انہوں نے عجز کا اظہار کیا اور اس کی فضیلت کا اقرار کیا۔ فَسَجَدُوۡۤا یعنی جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کیا وہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص تھا۔ پس الله تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ تک جائز تھا، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف: 100) (آپ نے اوپر اٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے)۔

یہ آخری وقت تھا جب مخلوق کے لئے سجدہ مباح کیا گیا تھا اور اکثر کا قول یہ ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو درخت اور اونٹ نے سجدہ کیا، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: حضور! ہم درخت اور بدکے ہوئے اونٹ کی نسبت آپ کو سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله رب العالمین کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا روا نہیں۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور البستی نے اپنی صحیح میں ابو واقد سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب حضرت معاذ بن جبل شام سے آئے تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ حضرت معاذ نے کہا: یا رسول الله! میں شام سے آیا ہوں میں نے لوگوں کو دیکھا وہ اپنے بزرگوں اور راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے آپ کے ساتھ ایسا کرنا چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا مت کرو۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی حتیٰ کہ اپنے خاوند کا حق ادا کرے حتیٰ کہ اگر عورت کا خاوند اس سے خواہش پوری کرنے کا سوال کرے اور وہ کجاوے پر ہو تو اسے منع نہ کرے (1)۔ حدیث میں القتب کا لفظ آیا ہے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: عربوں کے نزدیک ولادت کے لئے کرسی کا وجود باعث عزت تھا۔ وہ اپنی عورتوں کو ولادت کے وقت کجاوے پر سوار کرتے تھے۔ بعض طرق میں ہے انسان کو سجدہ سے منع فرمایا اور مصافحہ کا حکم دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، حدیث نمبر 1842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: یہ سجدہ جس سے منع کیا گیا ہے جاہل صوفیوں نے سماع اور مشائخ کے پاس جانے کے وقت اور ان سے دعا طلب کرنے کے وقت وہ سجدہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ جب اس کے گمان کے مطابق اسے حال آجاتا ہے تو وہ سجدہ کرتا ہے۔ یہ اس کی جہالت ہے خواہ وہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف ہو یہ ان کی جہالت ہے ان کی یہ ساری سعی وکوشش ضائع ہے اور ان کا عمل نامراد ہے۔

**مسئلہ نمبر** 5: اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ مستثنیٰ متصل کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے کیونکہ جمہور کے قول کے مطابق یہ فرشتوں میں سے تھا۔ یہ حضرات ابن عباس، ابن مسعود، ابن جریج، ابن مسیب اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے۔ شیخ ابوالحسن کا اختیار بھی یہی ہے۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے۔ یہی آیت کا ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس کا نام عزازیل تھا یہ معزز فرشتوں میں سے تھا اس کے چار پر تھے پھر بعد میں یہ مایوس کر دیا گیا۔ سماک بن حرب نے حضرت عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابلیس، ملائکہ میں سے تھا جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اس پر لعنت کی تو وہ شیطان بن گیا۔ الماوردی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے، ملائکہ میں سے افضل صنف سے ابلیس تھا جن کو الجنة کہا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جن ملائکہ میں سے ایک قبیلہ ہے جو آگ سے پیدا کئے گئے ہیں، ابلیس ان میں سے تھا اور باقی تمام ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابن زید، حسن اور قتادہ نے بھی یہ کہا ہے کہ ابلیس ابوالجن ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں وہ فرشتہ نہیں تھا۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے، فرمایا: اس کا نام الحارث تھا۔ شہر بن حوشب اور بعض اصولیوں نے کہا: ابلیس ان جنوں میں سے تھا جو زمین میں رہتے تھے ملائکہ نے ان کو قتل کیا تھا، ابلیس چھوٹا تھا تو اسے فرشتوں نے قید کر لیا تھا۔ پھر یہ ملائکہ کے ساتھ عبادت کرتا رہا اور اسے خطاب کیا گیا(1)۔ طبری نے یہ حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، اس مفہوم پر یہ مستثنیٰ منقطع ہو گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء:157) (نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی) اور ارشاد ہے: اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (المائدہ:3) سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو۔ شاعر نے کہا:

لیس علیك عطش ولا جوع الا الرقاد والرقاد ممنوع

تم پر نہ پیاس ہے نہ بھوک مگر نیند اور نیند بھی ممنوع ہے۔

بعض یہ قول کرنے والے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان فرمایا: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (الکہف:50)

اور جن ملائکہ کا غیر ہیں تو پہلے مقالہ والوں نے یہ جواب دیا کہ ملائکہ سے ابلیس کو خارج کرنا ممتنع نہیں ہے جبکہ پہلے ہی اس

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 124، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی شقاوت اللہ کے علم میں تھی۔ یہ اس کی طرف سے عدل ہے، جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا۔ اس کی تخلیق میں نہ آگ شامل تھی اور نہ وہ شہوت سے مرکب تھا جب اس پر غضب ہوا۔ یہ بعید نہیں کہ وہ ملائکہ سے ہو اور جن علماء نے کہا وہ زمین کے جنوں میں سے تھا پس وہ قیدی بنایا گیا اس کے مقابلہ میں روایت کیا گیا ہے کہ ابلیس وہ ہے جس نے زمین میں ملائکہ کے لشکر کے ساتھ جنوں سے جنگ کی۔ یہ مہدی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابلیس ملائکہ کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے تھا جنہیں جن کہا جاتا تھا ان کو نار السموم سے پیدا کیا گیا تھا اور ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ سریانی زبان میں اس کا نام عزازیل ہے۔ عربی میں حارث ہے یہ جنت کے دربانوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے ملائکہ کا رئیس تھا۔ اسے آسمان دنیا اور زمین کی سلطانی بخشی گئی تھی۔ یہ ملائکہ میں سے انتہائی محنت کرنے والا اور زیادہ علم والا تھا۔ آسمان اور زمین جو کچھ ہے سب کا انتظام چلاتا تھا، اس نے اپنا شرف اور عظمت دیکھی تو یہی چیز اس کے کفر کا باعث بنی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارا ہوا شیطان بنا دیا۔ جب انسان کی خطا کبر کی وجہ سے ہو تو اس کی امید نہ رکھو اور جب خطا معصیت کی وجہ سے ہو تو پھر اس کی امید رکھو۔

آدم علیہ السلام کی خطا معصیت تھی اور ابلیس کی خطا تکبراً تھی۔ ملائکہ کو ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہا جاتا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات: 158) شاعر نے کہا:

سخر من جن الملائك تسعة قيامًا لديه يعملون بلا اجر (1)

اس نے ملائکہ کے جنوں میں نو مسخر کر لیے۔ وہ اس کے سامنے بلا اجر کام کرتے رہتے ہیں۔

جب وہ جنت کے خزان (دربانوں) میں سے تھا تو اس کی طرف نسبت کی گئی، اس کا اسم جنت سے مشتق کیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ابلیس کا وزن افعیل ہے، اور یہ ابلاس سے مشتق ہے۔ اس کا معنی اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔ اسماء میں اس کی مثال نہیں ہے اسے عجمیت کے ساتھ مشابہ کیا گیا ہے۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ عجمی ہے اس کا اشتقاق نہیں ہے عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَبٰی اس کا معنی ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اس سے وہ رک گیا۔ اسی مفہوم میں صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے جو نبی کریم ﷺ سے انہوں نے روایت فرمائی ہے: اذا قرء ابن آدم السجدۃ (فسجد) اعتزل الشیطان یبکی یقول یا ویلۃ ... فی روایۃ ... یا ویی امر ابن آدم بالسجود فسجد فلہ الجنۃ و امرت بالسجود فابیت فلی النار (2) (مسلم) جب انسان آیت سجدہ پڑھتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا۔ پس اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ نہ کیا تو میرے لئے دوزخ ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ، صفحہ 61، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کہا جاتا ہے: اَبَیٰ یأبیٰ اباءً یہ نادر حرف ہے جو فَعَل یَفْعَل کے وزن پر آیا ہے حالانکہ اس میں حروف حلقی میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: میں نے اسماعیل بن اسحاق القاضی کو یہ کہتے سنا کہ میرے نزدیک الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ نحاس نے کہا: میں نہیں جانتا کہ ابو اسحٰق نے اسماعیل سے اس حرف کے علاوہ کوئی اس طرح روایت کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اسْتَكْبَرَ، استکبار کا معنی استعظام (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) ہے۔ گویا اس نے سجدہ کو اپنے حق میں ناپسند کیا اور آدم کے حق میں بڑا سمجھا۔ اس نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کو ترک کیا اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کو کبر سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر۔ (1) جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص نے عرض کی: ایک آدمی اچھا لباس اور اچھا جوتا پسند کرتا ہے (کیا یہ کبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللهَ جمیلٌ یحب الجمال۔ الکبر بطر الحق وغمط الناس۔ (2) اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ حق کو باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ (مسلم) غمص الناس کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ اس کا معنی بھی حقیر سمجھنا ہے۔ جب آدمی نعمت کا شکر ادا نہ کرے تو کہتے ہیں: غمص فلان النعمة . . . غمصت علیه قولاً قاله یعنی میں نے اسے عیب لگایا۔ اس معنی کی شیطان لعین نے وضاحت کی تھی۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف) (میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے)۔ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ (الاسراء) (کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا)۔ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر) (میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی)۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دیا جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی امر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا حکم بھی یہی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ سب سے پہلا گناہ حسد اور کبر تھا، ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا، درخت کھلانے میں حضرت آدم کو برانگیختہ کیا (3)۔ قتادہ نے کہا: ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا اس نعمت و کرامت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ شیطان نے کہا: میں ناری ہوں اور تو طینی (مٹی سے بنا ہوا) ہے۔ گناہوں کا آغاز کبر سے ہوا پھر حرص

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، صفحہ 21، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، صفحہ 65، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے ہوا حتیٰ کہ آدم علیہ السلام نے درخت سے کھالیا پھر آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی سے حسد کیا۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: یہاں كَانَ بمعنی صار ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ (ہود) یعنی وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔ شاعر نے کہا:

بِتَيهاء قفرٍ والمَطِيّ كانها قطا انحزن قد كانت فراخاً بيوضها

تیہاء کا میدان اور سواریاں غمگین کونج کی طرح ہیں جن کے انڈے بچے بن گئے ہیں۔

ابن فورک نے کہا: یہاں كَانَ کو بمعنی صار کرنا خطا ہے، اصول اس قول کا رد کرتے ہیں۔ جمہور متاولین نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ کفر کرے گا، کیونکہ حقیقۃً کافر اور حقیقۃً مومن وہی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ آخر میں کفر اختیار کرے گا یا ایمان اختیار کرے گا(1)۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(2)، بعض علماء نے فرمایا: ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی اور جنت میں علی الاستدراج، ریاست اور خزانت دی گئی جس طرح کہ منافقین نے اپنی زبانوں کی اطراف پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دی، اور اسی طرح بلعام نے اپنی زبان کی طرف سے اسم اعظم کی گواہی دی۔ پس یہ چیز اس کی ریاست میں تھی جبکہ کبر اس کے نفس میں متمکن تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: شیطان سوچتا تھا کہ اس کو جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف:12)

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ (ص) (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے کیا تم نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے)۔

یعنی تو نے تکبر کیا حالانکہ تجھے کبر نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تکبر نہیں کیا جب میں نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور کبر تو میرے لئے مناسب ہے۔ اسی لئے فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ شیطان کی خلقت کی اصل عزت کی آگ سے تھی اسی وجہ سے اس نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ (ص)

عزت نے اسے کبر دیا حتیٰ کہ اس نے آدم علیہ السلام پر اپنی فضیلت دیکھی۔

ابو صالح سے مروی ہے، فرمایا: ملائکہ عزت کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ابلیس عزت کی آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: ہمارے علماء نے فرمایا: جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کرامات اور خوارق للعادات امور ظاہر کرے جبکہ وہ نبی نہ ہو تو یہ چیز اس کی ولایت کی دلیل نہیں ہے، لیکن بعض صوفیاء اور رافضیوں کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف منها، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرامات دلیل ہیں کہ وہ ولی ہے اگر یہ ولی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر کرامات ظاہر نہ فرماتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے ولی ہونے کا علم صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ یہ معلوم ہو کہ وہ مومن ہو کر فوت ہوا ہے۔ جب یہ معلوم نہ ہو کہ وہ مومن ہو کر مرا ہے تو ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم قطعی طور پر کہیں کہ وہ اللہ کا ولی ہے کیونکہ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان سے ہی موافقت کرے گا۔ جب ہمارا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے لئے کسی پر قطعی طور پر یہ حکم لگانا ممکن نہیں کہ وہ ایمان سے موافقت کرے گا نہ خود اپنے بارے کوئی قطعی طور پر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کے ولی ہونے پر دلیل نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ ممنوع نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض اولیاء کو اپنے حسن انجام اور حسن عمل کے خاتمہ کی خبر دے دے اور اس کے ساتھ دوسروں کے حسن خاتمہ کی خبر دے دے (☆)۔

یہ شیخ ابوالحسن اشعری وغیرہ کا قول ہے۔ طبری کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ابلیس کے واقعہ سے انسان میں سے جو ابلیس کے مشابہ ہیں انہیں تنبیہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا حالانکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جانتے تھے اور ان نعمتوں کو جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کے اسلاف (1) پر کی تھیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** علماء کا اختلاف ہے کہ ابلیس کافر تھا یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: کافر نہیں تھا اور ابلیس نے سب سے پہلے کفر کیا اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے پہلے کفار تھے اور وہ جن تھے جو زمین میں آباد تھے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس نے جہالت یا عناد کی بنا پر کفر کیا تھا۔ اس میں اہل سنت و جماعت کے دو قول ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ اپنے کفر سے پہلے اللہ تعالیٰ کو جاننے والا تھا اور جس نے کہا اس نے جہالت کی وجہ سے کفر کیا تھا اس نے کہا اس کے کفر کے وقت اس سے علم چھین لیا گیا تھا اور جنہوں نے کہا عناد کی وجہ سے اس نے کفر کیا تھا اس نے کہا شیطان نے کفر کیا حالانکہ اس کے پاس علم تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: علم کے باقی ہوتے ہوئے عناداً کفر کرنا بعید ہے مگر یہ میرے نزدیک جائز ہے اللہ تعالیٰ جس کو رسوا کرنا چاہے اس کے لئے محال نہیں ہے۔

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہم نے فرمایا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس جنت سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

☆ اس قول میں اولیاء اللہ کے بارے حضرت مفسر نے زیادہ ہی شدت کا اظہار کیا ہے حالانکہ شرح عقائد نسفیہ میں اس پر جامع ترین گفتگو کی گئی ہے۔ ولایت کے ایمان، طاعات پر مواظبت اور معاصی سے اجتناب لازم ہے اور اولیاء اللہ سے کرامات کا وقوع حق ہے۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے کفر کرنے کے وقت اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور اسے جنت سے دور کر دیا اور اس کو نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا (اسکن) یعنی ٹھہرو اور جنت کو مسکن بناؤ۔ سکن الیہ یسکن سکونا (کسی کے پاس ٹھہرنا) السکن آگ کو بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

قد قُوِّمتْ بسکن وادھان

آگ اور تیل لگانے کے ساتھ سیدھے کیے گئے۔

اور السکن ہر وہ چیز جس کی طرف سکون حاصل کیا جائے، السکین چھری کو کہتے ہیں اور چھری کو سکین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذبوح کی حرکت کو ساکن کر دیتی ہے، اسی سے مسکین ہے جس کا تصرف کم اور حرکت قلیل ہوتی ہے، سکان السفینہ کشتی کا پچھلا حصہ وہ کشتی کو اضطراب سے سکون دیتا ہے اس لئے اسے سکان السفینۃ کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ یہ نکلنے پر تنبیہ ہے کیونکہ سکنی ملکیت نہیں ہوتا اس لئے بعض عارفین نے کہا: سکنی ایک خاص مدت تک ہوتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے پس جنت میں آدم وحواء کا دخول، بطور سکنی تھا نہ کہ بطور اقامت تھا۔

میں کہتا ہوں: جب یہ معنی ہو تو پھر جمہور کے قول کی اس میں دلیل ہے کہ جو کسی شخص کو اپنی کسی جگہ ٹھہرائے تو وہ ٹھہرنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا۔ جب ٹھہرانے کی مدت ختم ہو جائے تو اس کے لئے اسے نکالنا جائز ہے۔ امام شعبی فرماتے تھے: جب کوئی شخص یہ کہے: داری لك سکنی حتی تموت میرا گھر تیرے لئے سکنی ہے یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے تو وہ زندگی اور موت میں موہوب لہ (جس کو دیا گیا) کے لئے ہوگا۔ جب یہ کہا: داری ھذہ اسکنھا حتی تموت یہ میرا گھر ہے تو اس میں رہائش رکھ یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے۔ تو مالک کی طرف لوٹے گا جب ٹھہرنے والا مر جائے گا۔ سکنی کی طرح عمریٰ ہے مگر عمریٰ میں سکنی کی نسبت اختلاف زیادہ قوی ہے۔ عمریٰ پر کلام ان شاء اللہ سورۂ ہود میں آئے گی۔ حربی نے کہا: میں نے ابن اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عربوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اشیاء مالک کی ملک میں ہوتی ہیں اور ان کے منافع اس کے لئے ہوتے ہیں جس کو عمری، رقبی، افقار، اخبال، منحہ، عریہ، سکنی، اطراق کے الفاظ بول کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ امام مالک اور ان کے متبعین کی حجت ہے کہ ان چیزوں کا موہوب لہ مالک نہ ہوگا مگر منافع کا مالک ہوگا سوائے غلاموں کے۔ یہ لیث بن سعد، قاسم بن محمد اور یزید بن قسیط کا قول ہے۔

عمریٰ یہ ہے کہ تو کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی عمر کی مدت یا اس کی عمر کی مدت ٹھہرائے، اسی طرح رقبیٰ ہے۔ تو یہ کہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو میں تیری طرف لوٹ آؤں گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تیرے لئے ہوگا۔ یہ المراقبہ سے ہے اور مراقبہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی موت کو تاڑتا رہے۔ اسی وجہ سے اس کی اجازت اور عدم اجازت میں اختلاف ہے۔ ابو یوسف اور امام شافعی نے اس کی اجازت دی ہے گویا ان کے نزدیک یہ وصیت ہے اور امام مالک اور کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک عوض کا قصد کرتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا اسے ملے گا؟ اور ہر ایک دوسرے کی موت

کی تمنا کرتا ہے، اس کے متعلق دو احادیث ہیں جن میں اجازت اور عدم اجازت کا ذکر ہے وہ دونوں احادیث ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہیں۔ پہلی وہ ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: العمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃ لمن ارقبھا۔ (1) یعنی عمریٰ جائز ہے جس کے لئے اسے عمر بھر دیا گیا اور رقبیٰ جائز ہے اس کے لئے جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا۔ اس حدیث میں عمریٰ اور رقبیٰ حکم میں برابر ہیں۔ دوسری وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عمر نے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا رقبی ممن ارقب شیئاً فھو لہ حیاتہ و مماتہ۔ (2) "فرمایا: رقبیٰ نہیں ہے، پس جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا وہ حیات و موت میں اس کے لئے ہے۔" فرمایا: رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے: منی و منک موتاً میری اور تیری موت تک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد 'لا رقبی' یہ نہی ہے جو منع پر دلیل ہے اور من ارقب شیئًا فھولہ۔ یہ جواز پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں احادیث نسائی نے بھی نقل کی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عمریٰ اور رقبیٰ برابر ہیں۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: العمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃٌ لمن ارقبھا۔ ابن منذر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے کہا: عمریٰ ورقبیٰ برابر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ثوری اور احمد نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ پہلے کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔ اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ طاؤس نے کہا: من ارقب شیئًا فھو سبیل المیراث جس کو کوئی چیز رقبیٰ کے طور پر دی گئی تو وہ میراث ہے۔

الافقار، یہ فقار الظھر (پیٹھ کے مہرے) سے ماخوذ ہے۔ افقرتك ناقتی یعنی میں نے تجھے عاریۃً اس کی پیٹھ سوار ہونے کے لئے دی، افقرك الصید جب وہ تجھے اس کی پیٹھ پر قدرت دے حتیٰ کہ تو اس پر تیر پھینکے۔ اس کی مثل الاخبال ہے۔ کہا جاتا ہے: اخبلت فلاناً اذا اعرتہ ناقۃ یرکبھا او فرساً یغزو علیہ۔ جب کوئی اپنی اونٹنی سوار ہونے کے لئے یا گھوڑا جہاد کے لئے پیش کرے تو کہتے ہیں: اخبلت فلاناً۔ زہیر نے کہا:

هنالك ان يستخبلو المال يخبلوا وان يسئلوا يعطُوا وان ييسروا يغلوا

وہاں ان سے مال عاریۃً لیا جائے تو وہ مال دیتے ہیں، اگر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ مال دیتے ہیں اور وہ جب سستے سمجھے جاتے ہیں تو وہ مہنگے ہوتے ہیں۔

المنحۃ سے مراد عطیہ ہے۔ المنحۃ، دودھ کا عطیہ، المنیحہ وہ اونٹنی یا بکری جو کوئی شخص دوسرے کو دودھ پینے کے لئے دیتا ہے پھر وہ اسے واپس کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: العاریۃ مؤداۃٌ والمنحۃ مردودۃ والدین مقضی و الزعیم غارمٌ (3) عاریۃً دی گئی چیز واپس پہنچائی جائے گی دودھ والا جانور واپس کیا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2373، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب تضمین العاریۃ، حدیث نمبر 3094، ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس حدیث کو ابوامامہ نے روایت کیا ہے۔ اسے ترمذی، دارقطنی وغیر ہما نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

الاطراق، نر جانور عاریۃً دینا۔ استطرق فلان فلاناً فحله فلاں نے فلاں سے نر جانور طلب کیا تا کہ وہ اپنی اونٹنی پر بٹھائے فاطرقه اياه، اسے نر جانور دیا۔ کہا جاتا ہے: اطرقني فحلك یعنی مجھے اپنا نر جانور دو تا کہ میں اپنی اونٹنی پر بٹھاؤں۔ طرق الفحل الناقة، اونٹ اونٹنی پر بیٹھا۔ طروقة الفحل، مادہ اونٹنی۔ کہا جاتا ہے: ناقة طروقة الفحل یہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو جفتی کے قابل ہو۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، اَنْتَ فعل میں مضمر ضمیر کی تاکید کے لیے ہے، اس کی مثال یہ ہے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (مائدہ: 24) صرف اسکن و زوجك جائز نہیں ہے اور اذهب و ربك جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے لیے جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

قلت اذ اقبلت و زهر تهادیٰ کنعاج الملا تعسفن رملا

میں نے کہا: جب وہ اور سفید چمکنے والیاں سوار ہو کر آہستہ آہستہ چل کر آئیں جیسے جنگلی گایوں کا گروہ ہو۔

اس شعر میں زهر کا عطف ضمیر مضمر پر ہے جو اقبلت میں ہے۔ اس ضمیر کی تاکید نہیں لگائی گئی اور غیر قرآن میں بعیدی طور پر تاکید نہ لگانا جائز ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَزَوْجُكَ یہ قرآن کی لغت ہے۔ زوج هاء کے بغیر۔ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں آتا ہے (زوجةٌ) حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ایک شخص آپ کے پاس سے گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا۔ وہ آیا تو فرمایا: یا فلاں هذه زوجتي فلانة۔ یہ میری فلاں بیوی ہے۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں کون ہوں جو یہ گمان کروں میں نے آپ کے متعلق کوئی ایسا گمان نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرف چلتا ہے (1)۔ حضرت آدم کی بیوی حضرت حوا تھی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا یہ نام رکھا جب وہ ان کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تخلیق محسوس نہ ہوئی تھی۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف محسوس ہوتی تو کوئی شخص اپنی بیوی پر مہربان نہ ہوتا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ سے کہا گیا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: عورت ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا: حوا۔ پوچھا گیا: اس کا امراۃٌ نام کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیوں کہ یہ المرء (مرد) سے ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ روایت ہے کہ ملائکہ نے یہ سب سوال کئے تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا تجربہ کر لیں، فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا: اے آدم! کیا تو اس سے محبت کرتا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ پھر فرشتوں نے حضرت حوا سے پوچھا: اے حواء! کیا تو حضرت آدم سے محبت کرتی ہے؟ حضرت حواء نے کہا: نہیں حالانکہ حضرت حوا کے دل میں، حضرت آدم علیہ السلام کی محبت سے کئی گنا زیادہ محبت تھی۔ فرشتوں نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه يستحب لمن رای خالیا بامراة الخ، صفحہ 216، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے محبت میں سچ بولتی ہوتی تو حضرت حوا بھی سچ کہتی۔ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا گیا تو وہ اس میں وحشت سے چلے جب سو گئے تو ان کی بائیں جانب سے چھوٹی پسلی سے حضرت حوا پیدا کی گئی تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور مانوس ہوں، جب آپ جاگے تو آپ نے اسے دیکھا۔ پوچھا: تو کون ہے؟ حضرت حواء نے کہا: ایک عورت ہوں جو تیری پسلی سے پیدا کی گئی ہوں تا کہ تو سکون پائے (1)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا (اعراف: 189) (وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔

علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے عورت کا مزاج ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے (2)۔ ایک روایت میں ہے: پسلی میں سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا حصہ ہے یہ تیرے لئے ایک طریقہ پر سیدھی نہیں ہوگی اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو فائدہ اٹھالے جبکہ اس میں ٹیڑھا پن ہوگا۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

هي الضلع العوجاء لست تقيمها ۔ الا ان تقويم الضلوع انكسارها

اتجمع ضعفا و اقتداراً على الفتى ۔ أليس عجيبا ضعفا واقتدارُها

یہ ٹیڑھی پسلی ہے تو اس کو سیدھا نہیں کر سکے گا۔ خبردار! اس کا سیدھا کرنا اس کو توڑنا ہے۔ کیا تو ایک نوجوان پر ضعف اور اقتدار کو جمع کرے گا کیا اس (عورت) کا ضعف اور اس کا اقتدار عجیب نہیں ہے۔

اس سے علماء نے خنثیٰ مشکل کی میراث پر استدلال کیا ہے۔ جب اس میں عورتوں اور مردوں والی تمام صفات و علامات برابر ہوں مثلاً داڑھی بھی ہو، پستان بھی ہوں اور پیشاب کی جگہ میں بھی برابر ہو تو اعضاء کی کمی کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس کی پسلیاں عورت کی پسلیوں سے کم ہیں تو اسے مرد والا حصہ دیا جائے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے...... کیونکہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ مزید تفصیل آگے میراث کی بحث میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْجَنَّةَ اس کا معنی باغ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنۃ الخلد میں نہیں تھے بلکہ وہ عدن کی زمین میں ایک باغ میں تھے اور انہوں نے اپنی بدعت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ اگر یہاں جنت سے جنۃ الخلد مراد ہوتی تو ابلیس جنت میں نہ پہنچتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَ لَا تَاْثِیْمٌ (الطور) اور فرمایا: لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا (النبا) اور فرمایا لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا (الواقعہ: 25)

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نیز وہ کہتے ہیں: اہل جنت تو جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۞ (الحجر)
نیز جنت دار القدس ہے گناہوں اور خطاؤں سے پاک رکھی گئی ہے۔ جبکہ ابلیس نے تو لغو بات کی اور جھوٹ بولا نیز حضرت آدم و حضرت حوا اپنی معصیت کی وجہ سے جنت سے باہر نکالے گئے۔

وہ کہتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کے لئے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ شجرۃ الخلد طلب کریں جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقرب تھے اور آپ عقل میں کمال رکھتے تھے حالانکہ وہ دار الخلد میں تھے اور ایسے ملک میں تھے جو کبھی پرانا ہونے والا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو معرف باللام ذکر کیا ہے اور جو کہتا ہے: اسأل الله الجنة (میں اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں) مخلوق کے عرف میں جنت سے مراد جنت الخلد ہی ہوتی ہے اور عقلاً کوئی محال نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دینے کے لئے ابلیس جنت میں داخل ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: تو نے اپنی اولاد کو محروم کیا اور انہیں جنت سے نکالا (1)۔ الف، لام جنت پر داخل کیا گیا ہے تاکہ یہ دلالت کرے کہ اس سے مراد جنت معروفہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی انکار نہیں کیا اگر اس سے کوئی اور جنت مراد ہوتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رد کر دیتے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام اس پر خاموش رہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ثابت کیا تو صحیح ہوا کہ جس گھر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نکالا وہ جنت تھی اور وہ اس گھر کے مخالف تھی جس کی طرف وہ نکالے گئے تھے۔

اور جن آیات سے معتزلہ اور قدریہ نے حجت پکڑی ہے یہ حکم اس کے بعد ہوگا جب جنتی قیامت کے دن جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممتنع نہیں ہے کہ جنت دار الخلد اس شخص کے لئے ہو جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ہمیشہ اس میں رکھنے کا ارادہ کیا ہو اور وہ جنت سے نکل جائے گا جس کے متعلق فنا کا ارادہ کیا گیا ہوگا۔

اہل تاویل کا اس بات پر اجماع ہے کہ ملائکہ جنت میں اہل جنت پر داخل ہوتے ہیں اور پھر جنت سے نکل آتے ہیں۔ جنت کی چابیاں ابلیس کے ہاتھ میں تھیں پھر معصیت کے بعد اس سے واپس لے لیں گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں معراج کی رات داخل ہوئے پھر اس سے باہر تشریف لے آئے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اس کے متعلق بتایا اور یہ یقیناً جنت الخلد تھی۔ رہا معتزلہ کا یہ قول کہ جنت دار القدس ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں سے پاک رکھا ہے یہ ان کی جہالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدسہ (شام) میں داخل ہوں۔ اہل شریعت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس فرمایا حالانکہ ان میں گناہ، کفر، جھوٹ سب پائے گئے ہیں اس کی تقدیس، گناہوں سے مانع نہیں۔ اسی طرح دار القدس بھی ہے۔ ابو الحسن بن بطال نے کہا: بعض مشائخ نے بیان کیا ہے کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ جنت الخلد وہی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام اترے، جو اس کا مخالف ہے اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ان کا یہ قول کہ حضرت آدم علیہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله كلم الله موسىٰ تكليماً، حدیث نمبر 6961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

السلام کے لئے یہ کیسے جائز ہے کہ انہوں نے شجرۃ الخلد طلب کیا حالانکہ وہ عقل کے کمال کے حامل تھے اور وہ دارالخلد میں تھے، ان پر اس کا عکس پیش کیا جاتا ہے کہ کمال عقل ہونے کے باوجود حضرت آدم پر یہ کیسے جائز ہے کہ وہ دارالفناء میں شجرۃ الخلد طلب کریں یہ تو اس شخص کے لئے بھی جائز نہیں جو معمولی سی عقل رکھتا ہو، حضرت آدم پر کیسے جائز ہے جواز روئے عقل کے تمام لوگوں سے ارجح تھے، جیسا کہ حضرت ابوامامہ نے کہا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا جمہور قراء کی قراءت رغدا ہے۔ یعنی غین کے فتحہ کے ساتھ۔ نخعی اور ابن وثاب نے غین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے الرغد ایسا خوشگوار گھر جس میں کوئی تھکاوٹ نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

بينما المرء تراه ناعما یا من الاحداث فی عیش رغد(1)

جب تو کسی کو نرم و نازک دیکھتا ہے۔ نوجوان خوشگوار زندگی میں امن میں ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: رغد عیشهم و رغد (غین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) ارغد القوم جب لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ مصدر محذوف کی صفت کی وجہ سے منصوب ہے و حیثُ وحیثَ وحیثِ وحوث وحوث وحاث اس میں یہ تمام لغات ہیں۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی کھانے کے لئے اس کے قریب نہ جاؤ کیونکہ باقی نفع حاصل کرنے میں اباحت تھی (2)۔ ابن عربی نے کہا: نضر بن شمیل کی مجلس میں میں نے شاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کہا جاتا ہے: لا تقرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) تو اس کا معنی ہوتا ہے بالفعل اس کام کو مت کر اور جب راء کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے اس کے قریب نہ جا۔ صحاح میں ہے: قَرُبَ الشیء یقرب قربا یعنی چیز قریب ہوئی۔ قربتہٗ (راء کے کسرہ کے ساتھ) اقربه قربانا یعنی میں اس کے قریب ہوا۔ قربت اقربُ قرابةً جیسے کتبت، اکتب کتابةً جب تو پانی کی طرف چلے جبکہ تیرے اور اس کے درمیان ایک رات کا فاصلہ ہو، اس کا اسم القَرَب ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے اعرابی سے کہا: ما القرب؟ انہوں نے کہا: کل پانی پر وارد ہونے کے لئے رات کو چلنا۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض ماہرین کا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے جب اس درخت کے کھانے سے نہی فرمانے کا ارادہ فرمایا تو اس سے نہی فرمائی تو ایک ایسے لفظ کے ساتھ جو کھانے اور کھانے کی طرف راغب کرنے والے اقدام سے منع پر دلالت کرتا ہے اور وہ ہے: قرب۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: یہ سد ذرائع کی واضح مثال ہے (3)۔ بعض ارباب معانی نے کہا: وَلَا تَقْرَبَا یہ خطا کے وقوع اور جنت سے خروج کا شعور دیتا ہے اور اس بات کا شعور دیتا ہے کہ ان دونوں نے جنت میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، کیونکہ جس نے ہمیشہ رہنا ہو اس پر کوئی چیز ممنوع نہیں ہوتی، نہ اسے حکم دیا جاتا ہے اور نہ اسے منع کیا جاتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: 30) یہ جنت سے خروج کی دلیل ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، صفحہ 105، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 8:** هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهِ اسم مبہم ہے اس کے ساتھ ایسے اسم کو بطور صفت ذکر کیا جاتا ہے جس پر الف، لام ہو اس کے علاوہ نہیں۔ جیسے تیرا قول مررت بهذا الرجل، بهذه المرأة و هذه الشجرة۔ ابن محیصن نے ات هذی الشجرة یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے یہی اصل ہے۔ کیونکہ اس میں ھا، یا کا بدل ہے اسی وجہ سے اس کا ماقبل مکسور ہے۔ کلام میں اس لفظ کے علاوہ کوئی ایسی ھا تانیث نہیں ہے جس کا ماقبل کسرہ ہو اور اس میں ھا کا اصل یا ہے۔

والشجرة والشِجَرَة والشيرة۔ یہ تین لغات ہیں الشجرة، شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے الشِجرة والشَجرة اس درخت کو کہتے ہیں جس کا زمین میں تنا ہو، ارض شجيرة و شجراء ایسی زمین جس میں درخت زیادہ ہوں۔ و اد شجیر اور وادِ اشجر نہیں کہا جاتا شجراء کا واحد شجرة ہے اس جمع کے وزن پر بہت کم حروف کی جمع آتی ہے شجرة شجراء ۔ قصبة قصباء۔ طرفة طرفاء، حلفة حلفاء۔ اصمعی نے کہا: الحلفا مفرد حلفة ہے معنی دوسرے الفاظ سے مختلف ہے۔ سیبویہ نے کہا: الشجراء واحد اور جمع ہے۔ اسی طرح القصباء والطرفاء اور الحلفاء ہے۔ المشجرة درختوں والی جگہ۔ ارض مشجرة۔ کہا جاتا ہے: هذه الارض اشجر من هذه۔ یعنی یہ زمین اس زمین سے زیادہ درختوں والی ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اہل تاویل کا اس درخت کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، شعبہ بن جبیر، جعدہ بن ہبیرہ نے کہا: یہ انگور کی بیل تھی، اسی وجہ سے شراب ہم پر حرام کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس، ابو مالک اور قتادہ نے فرمایا: یہ سنبل کا درخت تھا اور اس کا دانہ گائے کے گردے کی طرح ہوتا ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ سفید ہوتا ہے۔ وہب بن منبہ کا یہی قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو اسے حضرت آدم کی اولاد کے لئے غذا بنا دیا۔ ابن جریج نے کہا: بعض صحابہ سے مروی ہے کہ یہ انجیر کا درخت تھا(1)۔ سعید نے حضرت قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی وجہ سے خواب میں اس کی تعبیر ندامت کی جاتی ہے کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نادم ہوئے تھے۔ یہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کوئی چیز متعین نہیں جس کی تائید خبر کرے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے منع فرمایا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے کھانے میں ان سے لغزش ہوئی۔ ابو نصر قشیری نے کہا: میرے والد صاحب فرماتے تھے معلوم ہوتا ہے بہر حال یہ محنتہ کا درخت تھا۔

**مسئلہ نمبر 10:** علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت آدم نے یہ کیسے کھالیا تھا جب کہ اس کے قریب جانے پر بھی وعید سنائی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

بعض علماء نے فرمایا: جس درخت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کوئی درخت کھایا تھا اور انہوں نے نہی کی تاویل یہ نہ کی کہ یہ نہی پوری جنس پر واقع ہے، گویا ابلیس نے انہیں ظاہر کو لینے کا دھوکا دیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ پہلی معصیت تھی جو اللہ تعالیٰ کی آدم نے کی(2)۔ اس قول کی بنا پر فرمایا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو قسم اٹھائے کہ وہ اس روٹی سے نہیں کھائے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 18، جلد 1 (دار الفکر)

گا پھر وہ اس جنس سے کھالے گا تو حانث ہو جائے گا اس میں تحقیق المذاہب یہ ہے کہ اکثر علماء فرماتے ہیں: اس میں وہ حانث نہیں ہوگا۔

امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر قسم کی بساط مشار الیہ کی تعیین کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی جنس سے کھانے سے حانث نہ ہوگا اور اگر قسم کی بساط یا اس کا سبب یا اس کی نیت جنس کا تقاضا کرتی ہے تو پھر اس پر اسے محمول کیا جائے گا اس جنس سے کسی دوسری چیز کو کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا، اس پر حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کو محمول کیا گیا ہے، ان کو متعین درخت سے نہی کی گئی تھی اور اس کی جنس مراد لی گئی تھی۔ پس انہوں نے قول کو لفظ پر محمول کیا معنی پر محمول نہ کیا۔

ہمارے علماء کا اس وجہ سے فرع میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ گندم نہیں کھاؤں گا پھر اس نے اس کی روٹی کھالی تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: الکتاب میں فرمایا: وہ حانث ہو جائے گا، کیونکہ گندم اسی طرح روٹی بنا کر کھائی جاتی ہے۔ ابن المواز نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس نے گندم نہیں کھائی اس نے روٹی کھائی ہے۔ اس نے اسم اور صفت کا اعتبار کیا۔ اور اگر اس نے اپنی قسم میں کہا میں اس گندم سے نہیں کھاؤں گا تو اس گندم سے بنائی گئی روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا اور جب اس گندم کی قیمت سے کوئی اور کھانا خریدے یا اسے اگالے تو اس میں اختلاف ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں: نہی ندب پر محمول تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ مسئلہ اصول فقہ سے تھا یہاں ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔(1)

نہی کو وعید کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿﴾ (طٰہٰ) سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

ابن مسیب نے فرمایا: حضرت آدم نے اس وقت کھایا جب حضرت حوا نے انہیں شراب پلا دی تھی اور آپ نشہ میں ہو گئے تھے اور آپ کو سمجھ نہ تھی۔ یزید بن قسیط نے بھی اسی طرح کہا: وہ دونوں قسم اٹھاتے تھے کہ حضرت آدم نے عقل میں ہوتے ہوئے اس درخت سے نہیں کھایا تھا۔ ابن عربی نے کہا: یہ نقلاً اور عقلاً فاسد ہے۔ نقل کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہے (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنتی شراب کا یہ وصف بیان کیا ہے: لَا فِيْهَا غَوْلٌ (الصافات: 47) اور رہی عقل، تو انبیاء کرام نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں ہر اس چیز سے جو فرائض میں خلل اور جرائم کے ارتکاب کا باعث بنے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کو جنت میں ٹھہرائے جانے سے پہلے سے ثابت کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ (البقرہ: 33) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو وہ علم بتاؤ جو ان کے پاس نہیں ہے۔

بعض علماء نے کہا: حضرت آدم نے وہ درخت بھول کر کھایا تھا اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں وعید کو بھول گئے ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حتمی اور قطعی طور پر بتایا: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 19، جلد 1 (دار الفکر) 3۔ ایضاً

**فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا** (طٰہٰ)

لیکن جب انبیاء کرام کو کثرت معارف اور علو منازل کی وجہ ہے ایسا تحفظ وتیقظ ضروری ہوتا ہے جو دوسروں کو لازم نہیں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام کا نہی کو یاد نہ رکھنا اسے ضائع کرنے کے مترادف تھا تو اس وجہ سے وہ مخالفت کرنے والے ہو گئے۔ حضرت ابوامامہ نے کہا: اگر حضرت آدم کی اولاد جو اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے لے کر قیامت تک پیدا کرنی ہے ان سب کی عقلیں ایک پلڑے میں اور حضرت آدم کی عقل دوسرے پلڑ ے میں رکھی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی عقل ان پر غالب آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا** (طٰہٰ)

میں کہتا ہوں: حضرت ابوامامہ کا یہ قول تمام بنی آدم کو شامل ہے اور احتمال ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خاص ہوں، کیونکہ آپ عقل و دانش کے اعتبار سے سب لوگوں سے زیادہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوامامہ کے قول کا مطلب یہ ہو کہ اگر بنی آدم کی عقول جو انبیاء نہیں ہیں وہ مراد ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: پہلا قول حسن ہے۔ پس آدم وحوا نے معین درخت مراد لیا اور حقیقت میں مراد جنس تھی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آپ نے سونے اور ریشم کو پکڑا۔ فرمایا: ھذان حرامان علی ذکور امتی (1) یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور ایک اور جگہ فرمایا: ھذان مھلکان امتی۔ یہ دونوں میری امت کو ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کی جنس مراد لی ہے نہ کہ وہ معین سونا اور ریشم۔

**مسئلہ نمبر 11**: کہا جاتا ہے: درخت سے پہلے حضرت حوا نے کھایا تھا اس کا سبب ابلیس کا انہیں اغوا (بھٹکانا) تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ شیطان نے پہلے حضرت حوا سے کلام کی کیونکہ عورت محبت کا وسوسہ ہے۔ یہ پہلا فتنہ تھا جو مردوں پر عورتوں کی طرف سے داخل ہوا۔ شیطان نے کہا: تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا گیا مگر اس لئے کہ یہ شجرۃ الخلد ہے کیونکہ شیطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس وہ دونوں کے پاس ایسی جہت سے آیا جو انہیں پسند تھی...... حبك الشیء یعمی و یصم ...... کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ جب حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا تو حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور عہد الٰہی کو یاد کیا۔ حضرت حوا پر حضرت آدم اصرار کرتے رہے (کہ نہ کھاؤ) اور حضرت حوا حضرت آدم پر کھانے کے لئے اصرار کرتی رہی حتیٰ کہ حضرت حوا نے کہا: میں تجھ سے پہلے کھاتی ہوں یہاں تک کہ اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو تم سلامت رہو گے۔ پس حضرت حوا نے وہ کھالیا اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ حضرت حوا حضرت آدم کے پاس آئی اور کہا: تم بھی کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ پس حضرت آدم نے وہ کھایا تو ان کا لباس اتر گیا اور گناہ کے حکم میں ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: **وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ**۔ وہ دونوں نہی میں جمع فرمائے تھے اس لئے سزا نہ اتری حتیٰ کہ دونوں کی طرف سے منہی عنہ کا ارتکاب پایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر یہ مسئلہ مخفی تھا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: اگر کسی نے اپنی دو بیویوں یا دو لونڈیوں کو کہا: اگر تم دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو تم دونوں کو طلاق یا تم دونوں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اللباس، باب فی الحریر للنساء، حدیث نمبر 3535، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آزاد تو طلاق اور آزادی ایک کے داخل ہونے سے واقع نہ ہوگی۔ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ابن قاسم نے کہا: دونوں کو نہ طلاق ہوگی نہ دونوں آزاد ہوں گی حتیٰ کہ اکٹھی گھر میں داخل ہوں، انہوں نے اس اصل پر محمول کیا ہے۔ مطلق لفظ کے مقتضیٰ کو لیا ہے۔ سحنون نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن قاسم نے دوسری مرتبہ کہا: کسی ایک کے داخل ہونے سے دونوں مطلقہ ہو جائیں گی اور آزاد ہو جائیں گی کیونکہ بعض قسم کا ٹوٹنا پوری قسم کا ٹوٹنا ہے۔ جیسے اگر کوئی قسم اٹھائے کہ یہ دو روٹیاں نہیں کھاؤں گا تو وہ ایک روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا بلکہ ان میں سے ایک لقمہ کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا (1)۔ اشہب نے کہا: جو داخل ہوگی وہ آزاد ہو جائے اور اسے طلاق ہو جائے گی کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی طلاق یا آزادی میں شرط تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ بعض شرط، شرط نہیں ہوتی اس پر اجماع ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے۔ نہی جب دو فعلوں پر معلق ہو تو مخالفت متحقق نہ ہوگی جب تک کہ دونوں فعل نہ پائے جائیں کیونکہ جب تو کہتا ہے تم دونوں گھر میں داخل نہ ہو۔ پھر ایک داخل ہوتی ہے تو دونوں کی طرف سے مخالفت نہ پائی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ یہ دونوں کے لئے نہی ہے: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اس کا جواب ہے۔ پس دونوں ظالم نہ ہوں گے حتیٰ کہ دونوں اس کام کو کریں جب حضرت حوا نے کھایا تو اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی کیونکہ منہی عنہ وہ تھا جو کامل پایا گیا۔ یہ معنی حضرت آدم علیہ السلام پر مخفی ہو گیا آپ نے طمع کیا اور یہ حکم بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ: 115) بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام یہ ارشاد بھول گئے: اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰہٰ) بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

**مسئلہ نمبر 12**: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین سے صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان سے مؤاخذہ ہوتا ہے اور ان پر انہیں عتاب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس اتفاق کے بعد کہ انبیاء کرام کبیرہ گناہوں اور ہر رذیل بات سے معصوم ہوتے ہیں جس میں نقص اور عیب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابو بکر کے نزدیک مسئلہ اجماعاً ثابت ہے اور استاذ ابو اسحاق کے نزدیک یہ معجزہ کی دلیل کا مقتضا ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ عقلی دلیل کا مقتضی ہے ان کے اصول پر۔ طبری وغیرہ فقہاء، متکلمین اور محدثین نے کہا: انبیاء کرام سے صغائر واقع ہوتے ہیں جبکہ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: انبیاء کرام کبائر و صغائر سے معصوم ہیں اور انہوں نے ان آیات سے حجت پکڑی ہے جو قرآن کریم میں واقع ہوئی ہیں اور جو ان کے گناہوں سے نکلنے کے متعلق احادیث میں ثابت ہے یہ بات ظاہر ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ جمہور فقہاء، مالکی، ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں: وہ تمام صغائر سے اسی طرح معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں کیونکہ ہمیں ان کے افعال، آثار اور سیرت میں ان کی اتباع کا بغیر کسی قرینہ کے التزام کے حکم دیا گیا ہے۔ اگر ان پر ہم صغائر کو جائز قرار دیں تو پھر ان کی اقتدا ممکن نہیں کیونکہ ان کے افعال میں ہر فعل کا مقصد، قربت، اباحت یا ممانعت یا معصیت کے اعتبار سے ممتاز نہیں

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 17، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ ایضاً

ہوتا اور کسی کو کسی ایسے امر کی پیروی کا حکم دینا صحیح نہیں ہے شاید کہ وہ معصیت ہو، خصوصاً ان اصولیوں کے نزدیک جو فعل کو قول پر مقدم جانتے ہیں جب ان میں تعارض آجائے۔

استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: علماء کا صغائر کے متعلق اختلاف ہے اور وہ بات جس پر اکثر علماء کا نظریہ قائم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام پر صغائر جائز نہیں۔ پس بعض علماء نے صغائر کو جائز قرار دیا ہے اور اس مقال کی کوئی اصل نہیں ہے۔

بعض متاخرین نے کہا: جو پہلے نظریہ کے حامل ہیں: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے گناہ کے وقوع کی خبر دی ہے اور گناہ کی نسبت ان کی طرف کی ہے اور اس پر انہیں عتاب بھی فرمایا ہے اور خود انبیائے کرام کے اپنے نفوس سے گناہوں کے متعلق بتایا ہے اور ان سے وہ نکلے اور ان گناہوں کی وجہ سے ڈرے اور توبہ کی۔ یہ چیزیں بہت سی جگہوں پر وارد ہیں تاویل تمام کو قبول نہیں کرتی اگرچہ اخبار احاد اس کو قبول کرتی ہیں اور یہ تمام کام ایسے ہیں جو انبیاء کے منصب کے لئے معیوب ہیں۔ یہ تمام امور ان سے نادر طور پر اور خطاونسیان کے طور پر یا ایسی تاویل کے طور پر واقع ہوئے ہیں جو تاویل اس کام کی طرف داعی تھی۔ یہ امور دوسرے لوگوں کے اعتبار سے نیکیاں ہیں اور ان کے حق میں سیئات ہیں ان کے مناصب اور بلند اقدار کی نسبت سے کیونکہ وزیر سے ایک بات پر مواخذہ ہوتا ہے جبکہ سپاہی کو اسی کام پر بدلہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ قیامت کے موقف سے ڈرے باوجود اس کے کہ ان کو امن و امان اور سلامتی کا علم تھا۔ فرمایا: یہی حق اور ثواب ہے۔ حضرت جنید نے کتنا عمدہ کہا ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین وہ کام جو ابرار کی نیکیاں ہوتے ہیں مقربین کے حق میں گناہ ہوتے ہیں۔ پس انبیاء کرام اگرچہ نصوص ان سے گناہ کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں پھر بھی یہ ان کے مناصب میں خلل ثابت نہیں اور نہ ان کے رتبہ میں جرح کا موجب ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے امور کی تلافی فرمادی انہیں چن لیا، انہیں ہدایت سے نوازا ان کی مدح فرمائی ان کا تزکیہ فرمایا، انہیں منتخب کیا اور انہیں چن لیا۔ صلوات اللہ علیہم

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ظلم کا اصل معنی کسی شے کو مناسب جگہ پر نہ رکھنا۔ الارض المظلومہ اس زمین کو کہتے ہیں جو کبھی کھودی نہ گئی ہو پھر کھودی گئی۔ نابغہ نے کہا:

وقفت فیہا اصیلاً اسائلہا ۔۔۔ عیت جواباً وما بالربع من احد

اِلّا الاواری لأیا ما ابینہا ۔۔۔ والنُّؤی کالحوض بالمظلومۃ الجلد

میں عصر کے وقت ان کھنڈرات میں کھڑا ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا تو وہ جواب دینے سے عاجز تھے اور وہاں پر کوئی شخص نہ تھا سوائے رسیوں کے اور مشقت کے میں اس کو بیان نہیں کرتا اور حوض کی طرح گڑھے کے جو اس سخت زمین میں کھودا گیا تھا۔

اس کو التراب الظلیم بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فاصبح فی غبراء بعد اشاحۃ ۔۔۔ علی العیش مردود علیہا ظلیمہا

صبح کے وقت قبر کے گڑھے میں تھا جس کی مٹی اس پر لوٹائی گئی تھی۔

جب اونٹ کو بغیر بیماری کے ذبح کیا جائے تو اس پر ظلم کیا گیا...... اونٹوں کو بغیر بیماریوں کے ذبح کرنے والوں کو ظلامون

للجزر کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: سَقَانا ظلیمۃ طیبۃ جب اس نے دودھ پکنے سے پہلے انہیں پلا دیا۔ وقد ظلم و طبۂ، مکھن نکالنے سے پہلے دودھ پلایا گیا ہو تو یہ جملہ بولتے ہیں: اللبن مظلوم و ظلیمٌ، دودھ تیار نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

و قائلۃٍ ظلمت لکم سقائی وھل یخفی علی العکد الظلیم

اور وہ کہہ رہی تھی میں نے تمہیں دودھ جمنے سے پہلے پلایا کیا زبان کی جڑ پر وہ دودھ مخفی تھا۔

رجل ظلیم، سخت ظلم کرنے والا شخص۔ الظلم سے مراد شرک بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا، کلا سے نون حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ امر کا صیغہ ہے اور ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے، اس کا حذف شاذ ہے۔ سیبویہ نے کہا: عربوں میں کچھ لوگ کہتے ہیں أُءْ كُلْ فَيْتِمَّ۔ کہا جاتا ہے: اکلت الطعام اَکْلًا و مأ کلاً۔ الاکلۃُ (بالفتح) سیر ہو کر کھانا۔ الاُکلۃُ (بالضم) لقمہ میں کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: اکلت اکلۃً واحدۃً یعنی میں نے ایک لقمہ کھایا، روٹی کو بھی کہتے ہیں ھذا الشی اکلۃ لک یعنی طعمۃٌ لک (تمہاری خوراک سے) الاُکُل جو چیز کھائی جائے۔ کہا جاتا ہے: فلان ذو اُکل یعنی وہ شخص جس کو دنیا کا بہت حصہ ملا ہو اور وسیع رزق والا ہو۔ (رغداً) یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ ابن کیسان نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کی حیثیت سے مصدر ہو۔ مجاہد نے کہا: رَغَدًا کا مطلب ہے ان پر حساب نہ ہوگا۔ الرغد لغت میں اس کثیر کو کہتے ہیں جو تجھے مشقت میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: ارغد القوم، جب لوگ خوشحالی میں ہوں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

حَيْثُ یہ مبنی برضمہ ہے یہ دوسرے ظروف سے مختلف ہے کہ یہ مضاف نہیں ہوتا یہ، قبل اور بعد سے مشابہ ہے جب وہ مضاف الیہ سے جدا کئے گئے ہوں۔ پس اس لئے اسے ضمہ دیا گیا۔ کسائی نے کہا: قیس اور کنانہ کی لغت ضمہ ہے اور تمیم کی لغت فتحہ ہے۔ کسائی نے کہا: بنو اسد جر کی جگہ اس کو جر دیتے ہیں اور نصب کی جگہ نصب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ (القلم) حیث پر ضمہ اور فتحہ پڑھا جاتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهٖ میں ھا، یا کا بدل ہے کیونکہ اصل میں ھذی تھا۔ نحاس نے کہا: میں عربی زبان میں ھا تانیث نہیں جانتا جب کہ ماقبل مکسور ہو سوائے هٰذِهٖ کے ھا کے۔ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: ھاتا ھند بعض کہتے ہیں: ھاتی ھند۔

سیبویہ نے حکایت کیا ہے: ھذہ ھند۔ (ھا کے سکون کے ساتھ) کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے: ولا تقربا ھذی الشجرۃ۔ شبل بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: ابن کثیر اور ابن محیصن قرآن میں هٰذِهٖ میں ھا کو کسی جگہ ثابت نہیں رکھتے۔ جماعت کی قراءت رغداً غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن وثاب اور نخعی سے مروی ہے کہ وہ غین کے سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سلمہ نے فراء سے حکایت کیا ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: ھذہ فعلت و ھذی فعلت۔ ذال کے بعد یا کے اثبات کے ساتھ، ھذِ فعلت (ذال کے کسرہ کے ساتھ یا اور ھا کے الحاق کے بغیر)

ھاتا فعلت۔ ہشام نے کہا: کہا جاتا ہے تا فعلت۔ شعر کہا ہے:

خليلى لو لا ساكن الدار لم أُقِمْ بتا الدار الا عابر ابن سبيل

میرے دو دوست اگر اس گھر میں رہنے والے نہ ہوتے تو میں بھی اس گھر میں نہ ٹھہرتا مگر مسافر کی طرح گزر جاتا۔

ابن انباری نے کہا: ھا کے اسقاط کے ساتھ تا اس طرح ہے جس طرح ذی، ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ہے، اور ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ذہ ہے۔ فراء نے کہا: جس نے کہا: ھذ قامت وہ ھا کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ صرف ذال پر اسم مشتمل نہیں ہوتا۔

فَتَكُوْنَا، تقربا پر اس کا عطف ہے اس وجہ سے نون کو حذف کیا گیا ہے۔ جرمی نے کہا: فا ناصبہ ہے اور دونوں جائز ہیں۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

''پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا وقت مقررہ تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا جماعت نے فازلھا بغیر الف کے الزلۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ الزلۃ کا معنی خطا ہے یعنی ان سے خطا کروائی اور انہیں خطا میں واقع کیا۔ حمزہ نے فازالھما یعنی الف کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہے: اس نے انہیں دور کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ازلتُہ فزال، میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ ابن کیسان نے کہا: فازالھما، زوال سے مشتق ہے یعنی آدم و حوا طاعت پر تھے اس سے اس (شیطان) نے معصیت کی طرف پھیر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس مفہوم پر دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہو گا مگر جماعت کی قراءت معنی کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے۔ کہا جاتا ہے: ازللتہٗ فزل۔ میں نے اسے پھسلایا تو وہ پھسل گیا۔ اس معنی پر یہ قول بھی دلیل ہے: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران: 155) ان کے بعض کرتوتوں کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (اعراف: 20) (شیطان نے ان دونوں کے لئے وسوسہ ڈالا) الوسوسہ کا مطلب ہے معصیت کے ساتھ اس نے انہیں خطا میں داخل کیا۔ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹا دے اسے ذلل میں داخل کرنے کی قدرت ہے۔ پس یہ گناہ کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف زوال کا سبب ہو گا۔ بعض نے فرمایا: ازلھما یہ زل عن المکان سے مشتق ہے جب کوئی اپنی جگہ سے ہٹ جائے پھر معنی حمزہ کی قراءت کے مطابق ہو گا یعنی یہ زوال سے مشتق ہو گا۔ امرؤ القیس نے کہا:

يزل الغلام الخف عن صهواته و يلوى باثواب العنيف المثقل

ہلکا پھلکا غلام گھوڑے سے گر جاتا ہے اور سخت اور بھاری آدمی اسے کپڑوں کے ساتھ لے جاتا ہے۔
ایک اور شاعر کہتا ہے:

کمیت یزل اللبد عن حال متنه كما زلت الصفواء بالمتنزل

کمیت گھوڑے سے اس کا کپڑا اس طرح اس کی پیٹھ سے گر جاتا ہے جیسے صاف چٹان اپنے اوپر چڑھنے والے کو گرا دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ جب ازال کو زال عن المکان سے مشتق مانا جائے تو فَاَخْرَجَهُمَا زوال کا بیان اور تاکید ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ جنت میں ہی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہو گئے ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جنت سے زمین کی طرف انہیں نکالنا تھا، کیونکہ وہ زمین سے پیدا کئے گئے تھے، تاکہ حضرت آدم علیہ السلام زمین میں خلیفہ بنیں۔ ابلیس نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کا یہ قصد تو نہیں کیا تھا۔ اس نے تو حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گرانے کا قصد کیا تھا اور انہیں رحمت الٰہی سے دور کرنے کا قصد کیا تھا جیسا کہ وہ خود دور کیا گیا تھا، اس کا مقصد پورا نہ ہوا اور اس کو اپنی مراد نہ ملی بلکہ اس کی آنکھ کی گرمی، نفس کے غصہ اور گمان کے نقصان میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ (طٰہٰ)

پس حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے گھر میں اس کے پڑوسی ہونے کے بعد اس کی زمین میں اس کا خلیفہ بن گئے خلیفہ اور پڑوسی میں بڑا فرق ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کام کو ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ وہ اس کا سبب تھا اس میں مفسرین کا کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اغواء ابلیس کے ہاتھوں ہوا لیکن کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور جمہور علماء نے فرمایا: اس کا اغوا بالمشافہ تھا (1)۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (اعراف)

مقاسمہ کا ظاہر مشافہ ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قول عبدالرزاق نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے۔ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سانپ چار ٹانگوں والا تھا جیسے بختی اونٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو پیدا کیا تھا ان میں سانپ خوبصورت ترین جانور تھا، شیطان نے پہلے اپنے آپ کو تمام حیوانوں پر پیش کیا تھا کہ وہ اسے منہ میں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ سوائے سانپ کے کسی نے اسے داخل نہ کیا جب سانپ اسے جنت میں لے گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکلا اس نے اس درخت کو لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع کیا تھا۔ ابلیس وہ لے کر حضرت حواء کے پاس آیا اور کہا: اس درخت کو دیکھو اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا ذائقہ کتنا عمدہ ہے، اس کا رنگ کتنا پیارا ہے، وہ انہیں اغوا کرتا رہا حتیٰ کہ حضرت حوا نے وہ درخت لے لیا اور کھا لیا۔ پھر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اغوا کیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا: کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اسے کھا لیا۔ ان دونوں کے لباس اتر گئے، اور گناہ کے حکم میں ہو گئے۔ حضرت آدم اس درخت کے پیٹ

1۔ تفسیر الثعلبی، صفحہ 219، جلد 1 (دار الاحیاء التراث العربی)

میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز دی: تو کہاں ہے؟ حضرت آدم نے عرض کی: میں یہاں ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تو باہر نہیں نکلے گا؟ حضرت آدم نے کہا: یا رب! مجھے تجھ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس زمین کی طرف اتر جا جس سے تیری تخلیق کی گئی ہے۔ سانپ پر لعنت کی گئی اور اس کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں لوٹا دی گئیں اور اس کے اور اولاد آدم کے درمیان عداوت و دشمنی بن گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے (جیسا کہ وضاحت آگے آئے گی)۔ حضرت حوا سے کہا گیا جس طرح تو نے اس درخت کا خون بہایا اسی طرح تجھے بھی ہر مہینے خون کی تکلیف لاحق ہوگی تو حمل اٹھائے گی اور بچہ جنم دے گی تکلیف کے ساتھ تو اس کی وجہ سے کئی مرتبہ موت کے قریب ہو جائے گی۔ طبری اور نقاش نے یہ زائد لکھا ہے کہ تو سفیہہ ہوگی حالانکہ تو سیانی تھی، ایک جماعت نے کہا: ابلیس جنت میں نکالے جانے کے بعد حضرت آدم کے پاس نہیں پہنچا تھا اس نے اپنی شیطانیت، سلطنت اور اپنے وسوسہ کے ذریعے حضرت آدم کو اغوا کیا تھا، جس کی اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت بخشی تھی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم۔(1) شیطان ابن آدم میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ اعراف میں آئے گا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تو آپ برہنہ ہو گئے اور انہوں نے لباس تلاش کرنے کی کوشش کی تو درخت ان سے دور ہو گئے اور معصیت کی وجہ سے انہیں رلایا اور انجیر کے درخت نے حضرت آدم پر رحم کھایا۔ پس آپ نے اس کے پتے لیے اور اپنے آپ کو ڈھانپا۔ پس آپ برہنہ ہونے کے ساتھ آزمائے گئے نہ کہ درخت سے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں حکمت دنیا کو آباد کرنا تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**: ذکر کیا جاتا ہے کہ سانپ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کا خادم تھا۔ اس نے خیانت کی اس طرح کہ اس نے اللہ کے دشمن کو اپنے نفس پر قدرت دی اس وجہ سے اس کے لئے عداوت ظاہر ہو گئی۔ جب وہ نیچے اترے تو عداوت مؤکد ہو گئی اور اس کا رزق مٹی بنائی گئی۔ اسے کہا گیا: تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں جہاں بھی ان میں کوئی تجھے پائے گا تیرا سر کچل دے گا۔

حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: پانچ چیزوں کو محرم قتل کر سکتا ہے (2)۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ بھی ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس نے سانپ سے کہا: مجھے تو جنت میں لے جا تو میرے ذمہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے: ابلیس کے ذمہ کو توڑ دو۔ ساکنہ بنت جعد نے سراء بنت نبہان غنویہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: چھوٹے، بڑے، کالے اور سفید سانپوں کو قتل کرو۔ جوان کو قتل کرے گا اس کے

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 1063، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب الاحکام، باب الشہادۃ تکون عند الحاکم فی ولایتہ القضاء، حدیث 6636، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 467، جلد 1۔ ایضاً، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب یقتلن فی الحرام، حدیث 3068، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے یہ آگ سے فدیہ ہوں گے اور جس کو سانپ قتل کر دے گا وہ شہید ہوگا (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: آگ سے فدیہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ ابلیس کے ساتھ شریک تھا اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچانے میں اس کا معاون تھا۔ اسی وجہ سے جس کسی نے سانپ کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کافر اور اس کا قاتل کبھی دوزخ میں جمع نہ ہوں گے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابن جریج نے حضرت عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابوعبیدہ بن عبدالله بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے، ایک سانپ گزرا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کرو۔ وہ ہم سے بھاگ کر غار میں چلا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کھجور کی شاخیں اور آگ لے آؤ اور اس پر آگ جلا دو (3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اسی نہی کو خاص کرتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا اور اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص الله تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دے۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث نے اس دشمن کے لئے کوئی حرمت نہیں چھوڑی، جہاں بھی یہ چلا جائے حتیٰ کہ جہاں بھی قدرت ہو اس تک ہلاکت کو پہنچائے، اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ انہوں نے بچھو کو آگ کے ساتھ جلانے کو ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ مثلہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: ہوسکتا ہے ان کو یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نہ پہنچی ہو اور انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا ہو جس میں ہے الله کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو۔ ان کے نزدیک اس پر عمل اس بنا پر ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ مسلم نے حضرت عبدالله بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک غار میں تھے جبکہ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝ (المرسلات) سورت نازل ہوئی۔ ہم نے اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ مبارک سے سنی تھی اچانک ہم پر ایک سانپ نکلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو قتل کرو۔ ہم اسے قتل کرنے کے لئے دوڑے تو وہ ہم سے بھاگ گیا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الله تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچا لیا اور تمہیں اس کے شر سے بچا لیا (4)، اس میں تو نہ اس پر آگ جلائی گئی اور نہ اس کے قتل کا کوئی اور حیلہ کیا گیا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے وہاں آگ نہ پائی ہو اس لئے اسے ترک کر دیا ہو۔ یا اس کی بل ایسی نہ ہو جہاں آگ فائدہ دیتی ہو دھواں بھی نقصان نہ دیتا ہو اور حیوان تک وہ نہ پہنچتا ہو۔ والله اعلم حضور علیہ السلام کا ارشاد الله تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچا لیا یعنی تم اسے قتل کر دیتے اور تمہیں اس کے شر سے بچا لیا یعنی اس کے ڈسنے سے تمہیں بچا لیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** سانپوں کو قتل کرنے کا حکم تکلیف کو دور کرنے کے ارشاد سے ہے جس نقصان کا سانپوں سے خوف ہوتا ہے۔ جس سانپ کا ضرر یقینی ہو اس کا قتل کرنے کی طرف جلدی کرنا واجب ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اقتلوا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 49، جلد 1 (دار الصادر بیروت)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قتل کافرا ثم سدد، صفحہ 137، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر بیروت)
4۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الحیات واقتلوا ذا الطفیتین والابتر فانھما یخطفان البصر و یسقطان الحبل (1) (یعنی سانپوں کو قتل کرو اور دو دھاریوں والے اور دم کٹے سانپ کو قتل کرو کیونکہ یہ دونوں آنکھوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور حمل گرا دیتے ہیں) ان دو سانپوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا حالانکہ یہ پہلے عموم میں داخل تھے اور ان کے ضرر کے بڑے سبب کی وجہ سے ان پر متنبہ فرمایا اور جس سانپ کا ضرر محقق نہ ہو پس ان میں سے جو گھروں کے علاوہ کسی جگہ پر ہوں تو ظاہری عمومی حکم کی وجہ سے انہیں قتل کر دو کیونکہ سانپوں کی ہر نوع میں ضرر غالب ہے۔ پس اس پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ سانپ اپنی صورت کی وجہ سے خوف ناک ہے اور نفوس میں نفرت ہے (اس لئے اسے قتل کرنا چاہئے۔) اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شجاعت کو پسند فرماتا ہے اگرچہ سانپ کے قتل پر ہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ کے قتل پر تشجیع فرمائی۔ ابوداؤد کی حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے، اس میں فرمایا: تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے بدلہ لینے سے ڈرا وہ مجھ سے نہیں (یعنی میرے طریقہ پر نہیں (2))

**مسئلہ نمبر 6:** وہ سانپ جو گھروں میں رہتے ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے حتیٰ کہ تین دن انہیں تنبیہ کی جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مدینہ طیبہ میں جن ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اسے آگاہ کرو (3)۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صرف مدینہ کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ہم نہیں جانتے کہ مدینہ طیبہ کے علاوہ جو جن ہیں وہ اسلام لائے ہیں یا نہیں، یہ ابن نافع کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: تمام شہروں میں گھروں کے سانپوں کو قتل کرنے سے منع ہے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (احقاف: 29)

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا داعی آیا میں ان کے ساتھ گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا۔ اس حدیث میں ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوراک کا سوال کیا وہ جزیرہ کے جن تھے (4)۔ اس کی تفصیل سورۂ جن میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جب یہ ثابت ہے تو کسی سانپ کو قتل نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ پہلے اس پر تنگی کی جائے گی اور اسے ڈرایا جائے گا۔ مزید بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** ائمہ نے ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت ابوسعید خدری کے پاس ان کے گھر میں گئے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوسعید خدری کو میں نے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا تاکہ وہ نماز کو مکمل کر لیں۔ میں نے گھر کی ایک طرف کھجور کی چھڑیوں میں کچھ حرکت سنی۔ میں متوجہ ہوا تو وہ سانپ تھا۔ میں اسے قتل

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیات، صفحہ 234، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 356، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4569، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرھا، قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجھر بالقراۃ فی الصبح والقراۃ علی الجن، صفحہ 184، جلد 1

کرنے کے لئے دوڑا تو حضرت ابوسعید نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو گھر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: کیا تم یہ کمرہ دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: اس میں ہمارا ایک نوجوان رہتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ فرمایا: ہم خندق کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ نوجوان نصف النہار کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتا تھا اور گھر واپس آجاتا تھا۔ ایک دن اس نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا ہتھیار لے لو مجھے تجھ پر قریظہ (کے حملہ) کا اندیشہ ہے۔ اس شخص نے اپنا ہتھیار لے لیا پھر لوٹ آیا وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے اسے نیزہ مارنے کے لئے نیزہ اس کی طرف جھکایا، کیونکہ اسے غیرت آگئی تھی۔ بیوی نے کہا: اپنا نیزہ دور کر لے اور گھر کے اندر داخل ہو تاکہ تو وہ دیکھ لے جس نے مجھے گھر سے باہر نکالا۔ پس وہ اندر گیا تو زمین پر ایک بہت بڑا سانپ لپٹا پڑا تھا۔ نوجوان نے اس کی طرف نیزہ جھکایا اس میں سانپ کو پرو دیا، پھر وہ باہر نکلا اور نیزہ کو گھر کے صحن میں گاڑھ دیا۔ پس اس سانپ نے اس نیزے کے اوپر حرکت کی پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کون پہلے مرا سانپ یا وہ نوجوان۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ واقعہ ذکر کیا۔ ہم نے کہا: حضور! دعا فرمائیں اسے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے زندہ کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر فرمایا...... مدینہ طیبہ کے جن مسلمان ہو گئے ہیں جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس کو تنبیہ کرو اگر پھر تمہارے لئے یہ ظاہر ہو تو اسے قتل کر دو وہ شیطان ہے۔ دوسری سند سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان گھروں میں رہنے والے سانپ ہیں جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس پر تنگی کرو اگر وہ چلا جائے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دو وہ کافر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: جاؤ اور اپنے ساتھی کو دفن کر دو۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اس حدیث سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وہ سانپ جس کو نوجوان نے قتل کیا تھا وہ مسلمان تھا اور جنوں نے اسے قصاصاً قتل کیا تھا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قصاص ہمارے اور جنوں کے درمیان مشروع ہے تو وہ پھر قتل عمد میں ہو گا اور اس نوجوان نے قتل عمد نہیں کیا تھا کیونکہ اسے تو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا، انہوں نے تو اس نوع کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا قتل کرنا شرعاً مشروع تھا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس میں قصاص نہیں ہے۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ کافر اور فاسق جنوں نے اس نوجوان کو اپنے ساتھی کا انتقام لینے کے لئے قتل کیا تھا۔ جنوں نے حضرت سعد بن عبادہ کو قتل کیا تھا وہ اپنے غسل خانہ میں مردہ پائے گئے تھے اور ان کا جسم سبز ہو چکا تھا اور لوگوں کو ان کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ انہوں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جبکہ انہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

قد قتلنا سيد الخز رج سعد بن عبادة

و رميناه بسهمي ن فلم نخط فؤاده

ترجمہ: ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا۔ اور ہم نے انہیں دو تیر مارے اور ہم نے اس کے دل سے خطا نہیں کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا ہے) تاکہ وہ راستہ بیان فرما دیں جس کے ذریعے ان

میں سے کسی مسلمان کو قتل کرنے سے بچایا جائے اور ان میں سے کسی کافر کے قتل پر غلبہ پایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک سانپ مار ڈالا، پھر انہیں خواب میں دکھایا گیا کہ کوئی انہیں کہہ رہا ہے تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر وہ مسلمان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے پاس داخل نہ ہوتا۔ اس کہنے والے نے کہا: وہ آپ کے پاس کبھی داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ صبح ہوئی تو حضرت عائشہ نے بارہ ہزار دراہم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے: وہ آپ پر داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے صدقہ کیا اور کئی غلام آزاد کیے۔ ربیع بن بدر نے کہا: الجان ان سانپوں میں سے ہے جن کے قتل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ وہ سانپ ہیں جو چلتے ہیں اور دوہرے نہیں ہوتے۔ علقمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** انذار (ڈرانے) کا طریقہ: امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تین دن انہیں ڈرایا جائے۔ عیسیٰ بن دینار کا بھی یہی قول ہے اگرچہ ایک دن میں کئی مرتبہ ظاہر ہو۔ ایک دن میں تین مرتبہ ڈرانے پر اکتفا نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ تین دن میں یہ ڈرانا پایا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: تین مرتبہ ڈرانا کافی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فلیوذنہ ثلاثاً اس کو تین مرتبہ آگاہ کرو۔ اور فرمایا: حرجوا علیہ ثلاثاً اور اس پر تین مرتبہ تنگی کرو۔ ثلاثاً (تین) کا عدد مؤنث کے لئے ہے پس ظاہر ہوا کہ مراد تین مرتبہ ہے...... امام مالک کا قول اولیٰ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ثلاثۃ ایام یہ صحیح نص ہے ان مطلقات کے لئے مقید ہے اور ثلاثا کو تین ایام کی راتوں کے ارادہ پر محمول کیا جائے گا۔ عربوں کی عادت پر تاریخ کے باب میں رات غالب ہے کیونکہ ان میں تانیث غالب ہوتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ڈرانے میں یہ کہنا کافی ہے: اُحرج علیك باللہ والیوم الاخر الا تبدوا لنا ولا تو ذونا یعنی میں تجھ پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن کے واسطہ سے تنگی کرتا ہوں کہ تم ہمارے لئے ظاہر نہ ہو اور نہ ہمیں تکلیف دو۔ ثابت بنانی نے عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے کہ ان کے سامنے گھروں میں پائے جانے والے سانپوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: جب تم ان میں سے کوئی سانپ اپنے گھروں میں دیکھو تو کہو: انشدکم بالعھد الذی اخذ علیکم نوح علیہ السلام وانشدکم بالعھد الذی اخذ علیکم سلیمان علیہ السلام۔ میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے نوح علیہ السلام نے لیا تھا اور میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا۔ پھر جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو اسے قتل کر دو۔

میں کہتا ہوں: یہ بظاہر ایک دفعہ اذن کی کفایت پر دلیل ہے لیکن حدیث اس کا رد کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ابن حبیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں: انشدکن بالعھد الذی اخذ علیکن سلیمان... علیہ السلام... الا تو ذیننا والا تظھرن علینا۔(1)

**مسئلہ نمبر 9:** جبیر نے نفیر سے انہوں نے حضرت ابو ثعلبہ الخشنی سے روایت کیا ہے...... ابو ثعلبہ کا نام جرثوم ہے...... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنوں کی تین قسمیں ہیں اور سب ایک تہائی ہیں: ایک قسم وہ ہے جن کے پر ہیں وہ ہوا میں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 357، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4576، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اڑتے ہیں اور ایک قسم سانپ اور کتے ہیں اور ایک قسم وہ ہے جو کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں اور سفر کرتے ہیں (1)۔

حضرت ابو درداء نے روایت کیا ہے...... ان کا نام عویمر ہے...... فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن تین حصوں میں پیدا کیے گئے ہیں: ایک تہائی کتے، سانپ اور زمین کے کیڑوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک تہائی تیز چلنے والی ہوا کی طرح ہوتے ہیں اور ایک تہائی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ثواب اور عقاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو تین تہائیوں میں پیدا کیا۔ ایک تہائی کے دل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہوتی ہیں جن کے ساتھ دیکھتے نہیں اور کان ہوتے ہیں جن کے ساتھ سنتے نہیں وہ نہیں ہیں مگر ڈنگروں کی مانند بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں اور ایک تہائی جن کے جسم انسانوں کے جسم جیسے ہوتے ہیں، ان کے دل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوتے ہیں اور ایک تہائی اللہ کے (عرش کے) سایہ میں ہوں گے جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (2)۔

**مسئلہ نمبر 10**: ہر وہ جانور جس کی اصل تکلیف پہنچانا ہو تو اسے ابتداءً قتل کیا جائے گا اس کی اذیت پہنچانے کی وجہ سے، اس میں کوئی اختلاف نہیں جیسے سانپ، بچھو، چوہا، چھپکلی اور اس کے مشابہ جانور...... رسول اللہ نے فرمایا: پانچ فواسق ہیں: انہیں، حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا (3)...... سانپ نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے خیانت کی اس طرح کہ وہ اپنے جبڑوں کے درمیان ابلیس کو جنت میں لے گیا۔ اگر سانپ اسے ظاہر کرتا تو جنت کا دربان اسے داخل نہ ہونے دیتا۔ ابلیس نے سانپ سے کہا: تو میرے ذمہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا: سانپ کو قتل کرو اگرچہ تم نماز میں ہو (4) (یعنی سانپ اور بچھو کو قتل کرو)۔

الوزغة (چھپکلی) اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو پھونکے دیئے تھے جبکہ دوسرے حیوانوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پس اس پر لعنت کی گئی۔ یہ اس نوع سے ہے جو آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے چھپکلی کو قتل کیا گویا اس نے ایک کافر کو قتل کیا اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، جس نے چھپکلی کو پہلی ضرب سے مارا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی اور جس نے تیسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی۔ ایک روایت میں ہے، فرمایا: پہلی ضرب پر ستر نیکیاں ہیں (5)۔

چوہیا، اس نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی رسیاں کاٹنے کا قصد کیا اور انہیں کاٹ دیا۔ عبد الرحمٰن بن ابی نعیم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: محرم سانپ، بچھو، چیل

---

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر)　　2۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر)

5۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب استحباب قتل الوزغ، صفحہ 236، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایسا درندہ جو حملہ کرے، کاٹنے والا کتا اور فویسقہ (چوہیا) کو قتل کرے (1)۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے تو چوہیا نے چراغ کی وٹ پکڑی ہوئی تھی تا کہ گھر کو آگ لگادے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

کوا، اس نے اپنا جوہر اس وقت ظاہر کیا جب حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی سے بھیجا کہ زمین کی خبر لے آئے تو اس نے نوح علیہ السلام کے حکم کو ترک کر دیا اور مردار پر جا بیٹھا۔ یہ سب سانپ کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ذکر کر دیا۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوْا، اهْبِطُوْا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ الف وصلی ہے، اور قلنا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے اس کے اور اس کے بعد ھا کے سکون کی وجہ سے۔

محمد بن مصفیٰ نے ابوحیوہ سے روایت کیا ہے کہ اھبطوا میں با پر ضمہ ہے یہ ایک لغت ہے۔ اس قول کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ یہ غیر متعدی ہے، اور اکثر غیر متعدی فعل یفعُلُ کے وزن پر آتا ہے۔ یہ خطاب حضرت آدم، حوا، سانپ اور شیطان کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حسن نے کہا: حضرت آدم، حوا اور وسوسہ کو (2)، مجاہد اور حسن نے کہا: بنو آدم اور بنو ابلیس کو ہے۔ الھبوط کا معنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں سرندیپ میں ایک پہاڑ پر اترے جسے بوذ کہا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ جنت کی خوشبو تھی۔ پس اس علاقہ کے درختوں اور وادیوں سے لگی ہر چیز خوشبو سے بھر گئی، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خوشبو سے وہاں سے خوشبو لائی جاتی ہے۔ بادل آپ کے سر کو چھوتا تھا تو آپ گنجے ہو گئے تھے۔ پس گنجا پن آپ کی اولاد کو میراث میں ملا۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا (3)۔ (الحدیث) مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، آئندہ ذکر ہوگی۔ حضرت حوا جدہ میں اتریں اور ابلیس أبلّة میں اور سانپ بیسان میں اترا۔ بعض نے فرمایا: سجستان میں، سجستان میں تمام شہروں سے زیادہ سانپ ہیں۔ اگر عربد سانپ نہ ہوتا جو سانپوں کو کھا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر مر جاتے ہیں سجستان سانپوں کے لئے خالی کر دیا جاتا۔ یہ ابوالحسن مسعودی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، بَعْضُكُمْ مبتدا ہے، عَدُوٌّ خبر ہے اور یہ جملہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: وھذہ حالکم۔ واؤ کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں ضمیر عائد موجود ہے جیسے کہا جاتا ہے: رایتك السماء تسطر علیك۔ میں نے تجھے دیکھا دراں حالیکہ آسمان تم پر بارش برسا رہا تھا۔

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء ما یقتل المحرم من الدواب، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر ثعلبی، صفحہ 221، جلد 1 (دار الاحیاء التراث)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 468، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم و ذریتہ، حدیث 3079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

العدو۔ دشمن، یہ صدیق (دوست) کا متضاد ہے یہ عدا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: ظلم کرنا۔ ذئبٌ عدوان (دشمن بھیڑیا) یعدو علی الناس جو لوگوں پر تجاوز کرتا ہے، العدوان صریح ظلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تجاوز کرنا۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: لا یعدوك هذا الامر یعنی یہ امر تجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ عداہ، اس نے اس سے تجاوز کیا، اس کو عَدُوٌّ اس لئے کہتے ہیں اپنے ساتھی کی ناپسند میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔ اسی سے ہے: العدو بالقدم۔ چلنے میں تجاوز کرنا۔ دونوں معانی قریب قریب ہیں کیونکہ جو ظلم کرتا ہے وہ تجاوز کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کو انسان پر محمول کیا ہے اگرچہ یہ معنی صحیح ہے لیکن یہ بعید ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد اس کی دلیل ہے جب بندہ صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان سے کہتے ہیں ہمارے لئے الله سے ڈر۔ تو جب سیدھی ہوگی تو ہم سیدھے ہوں گے تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم ٹیڑھے ہوں گے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ عَدُوٌّ کیسے فرمایا اعداء نہیں فرمایا؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ بعض اور کل کے لفظ کی خبر لفظ کے اعتبار سے واحد لگائی جاتی ہے اور معنی کے اعتبار سے اس کے مطابق لگائی جاتی ہے اور قرآن میں یہی ہے۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿﴾ (مریم) یہاں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد خبر لگائی۔ اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿﴾ (النمل) یہاں معنی کے اعتبار سے خبر جمع لگا دی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عدو جمع کی جگہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿﴾ (الکہف) (اور وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے)

اسی طرح فرمایا: يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۭ هُمُ الْعَدُوُّ (المنافقون: 4) (گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے۔ یہی حقیقی دشمن ہیں) ابن فارس نے کہا: اَلْعَدُوُّ، اسم ہے جو واحد، تثنیہ، جمع اور تانیث کو جامع ہے، کبھی اس کی جمع بھی بنائی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: الله تعالیٰ کا حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنا اور جنت سے اتارنا بطور سزا نہیں تھا کیونکہ الله تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد انہیں زمین پر اتارا، یا تو تادیب کی خاطر یا محنت میں سختی کی خاطر اتارا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کو اتارنا اور زمین میں ٹھہرانا حکمت ازلیہ کے سبب تھا اور وہ حکمت یہ تھی کہ زمین میں ان کی نسل پھیلائی جائے تاکہ الله تعالیٰ انہیں اپنا مکلف بنائے اور انہیں آزمائے۔ پھر اس پر ان کے ثواب اور اخروی عقاب کو مرتب فرمائے، کیونکہ جنت اور دوزخ ایسی جگہ نہیں ہیں جہاں احکام کا مکلف بنایا گیا ہو۔ پس وہ کھانا جنت سے اتارنے کا سبب بنا اور الله تعالیٰ کو زیبا ہے جو چاہے کرے۔ الله تعالیٰ نے خود فرمایا تھا: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ: 30) یہ منقبت عظیمہ اور فضیلت کریمہ شریفہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کے بعد زمین پر اتارا کیونکہ دوسری مرتبہ فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوْا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی حفظ اللسان، صفحہ 63، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یہ مبتدا خبر ہیں اور مُسْتَقَرٌّ اسم ظرف ہے۔ یہ ابو العالیہ اور ابن زید کا قول ہے۔ سدی نے کہا: مُسْتَقَرٌّ سے مراد قبور ہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا (غافر: 64) یہ دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَتَاعٌ، المتاع ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے لطف اٹھایا جائے خواہ کھانا ہو، لباس ہو، زندگی (کی کوئی اور ضرورت ہو) بات ہو، محبت وغیرہ ہو۔ اس سے منفعة النكاح کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک جب اپنے بیٹے کو دفن کے بعد اس کی قبر پر کھڑا ہوا تو کہا:

وقفت على قبر غريب بقفرة　　　متاع قليلٌ من حبيبٍ مفارق(1)

میں ایک میدان میں مسافر کی قبر پر کھڑا ہوں۔ یہ جدا ہونے والے دوست سے تھوڑا سا سامان ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَىٰ حِينٍ، الحین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک جماعت کا کہنا ہے: اس سے مراد موت ہے (یعنی مرنے تک) یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر دنیا میں ٹھہرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد ہے قیامت کے قیام تک۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر سے مراد قبور ہیں۔ ربیع نے کہا: إِلَىٰ حِينٍ سے مراد الی اجلِ یعنی موت تک۔

الحین سے مراد وقت بعید ہے اس وقت تیرے قول الآن اب سے دور کرنا سے ہے۔ خویلد نے کہا:

كابي الرماد عظيم القدر جفنته　　　حين الشتاء كحوض المنهل اللقف

بہت زیادہ سخی ہے، اس کا پیالہ بہت بڑا ہے، سردیوں کے وقت کھلے گھاٹ والے حوض کی طرح ہے۔

کبھی حین پر تا داخل کرتے ہیں۔ ابو وجزہ نے کہا:

العاطفون تحين ما من عاطف　　　والمطعمون زمان أين المطعم

وہ مہربانی کرنے والے ہوتے ہیں جبکہ کوئی مہربان نہیں ہوتا اور وہ کھلانے والے ہوتے ہیں جس وقت کہا جاتا ہے کھلانے والا کہاں ہے۔

الحین کا معنی مدت بھی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1) الحین کا معنی ساعت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ (زمر: 58)، ابن عرفہ نے کہا: الحین زمانہ کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جیسے ساعت، گھڑی اور اس سے اوپر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ (المومنون) اے محبوب رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ (ابراہیم: 25) وہ سارا سال پھل لاتا ہے، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہر چھ ماہ بعد پھل لاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: صبح و شام پھل دیتا ہے۔ الازہری نے کہا: الحین اسم ہے جیسے الوقت یہ تمام زمانوں کو شامل ہے خواہ وہ لمبا زمانہ ہو یا مختصر۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 129، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مطلب یہ ہے کہ اس سے ہر وقت نفع اٹھایا جاتا ہے اور اس کا نفع کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ فرمایا: الحین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ الحین سے مراد صبح وشام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ (الروم) (سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو) کہا جاتا ہے: عاملته محاینةً کچھ میں نے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ احینت بالمکان میں وقت وہاں ٹھہرا۔ حان حین کذا۔ یعنی قریب ہوا۔ بثینہ نے کہا:

وان سلوی عن جمیلٍ لساعة		من الدهر ما حانت ولا حان حینها

**مسئلہ نمبر 7**: جہاں الحین کے متعلق اہل زبان کا اختلاف ہے وہاں ہمارے علماء اور دوسرے علماء کے درمیان بھی اس میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: الحین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حد پر واقفیت نہیں ہوتی۔ دوسرا حین وہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) یہاں حین سے مراد چھ مہینے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: الحین المجهول وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا اور الحین المعلوم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ احکام متعلق ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلیف کا تعلق ہوتا ہے۔ معلوم کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہے۔ امام مالک احکام اور ایمان (قسموں) میں اس کو اسماء اور زمانوں میں اعم خیال کرتے ہیں۔ امام شافعی اقل خیال کرتے ہیں، ابو حنیفہ درمیانی مدت مراد لیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: چھ ماہ۔ ان کے قول کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مقدرات قیاساً ثابت نہیں ہوتی ہیں اور اس میں صاحب شریعت کی طرف سے کوئی نص نہیں ہے، معنی پر اعتبار کے لفظ کے مقتضیٰ پر لغوی طور پر آگاہی کے بعد ہوتا ہے۔ پس جس نے نذر مانی کہ وہ ایک حین نماز پڑھے گا تو اسے امام شافعی کے نزدیک ایک رکعت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایک رکعت نفل میں سے کم از کم ہے۔ انہوں نے وتر کی ایک رکعت پر قیاس کیا ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: نوافل کم از کم دو ہیں۔ پس زمانہ فعل کی مقدار کے ساتھ مقدر ہوگا۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ جو قسم اٹھائے الایکلم فلانا حینا اولا یفعل کذا حیناً۔ تو حین سے مراد ایک سال ہوگا اور فرمایا: احکام میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ ایک حین ایسا نہیں کرے گا یا فلاں سے ایک حین بات نہیں کرے گا۔ سال پر زیادتی اس کی قسم میں داخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اتفاق ان کے مذہب میں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایک حین یا زمانہ، یا دھر ایسا نہیں کرے گا تو سب سے مراد ایک سال ہوگا۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، دھر میں ایک سال ہونے میں انہیں شک ہوا۔ ابن منذر نے یعقوب اور ابن الحسن سے حکایت کیا ہے کہ دھر سے مراد چھ ماہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اصحاب الرائے، عکرمہ، سعید بن جبیر، عامر الشعبی اور عبیدہ نے تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) کے تحت فرمایا کہ کل حین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ اوزاعی اور ابو عبیدہ نے کہا: الحین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک الحین میں کوئی معلوم وقت نہیں ہے اور نہ حین کے لئے کوئی حد ہے کبھی ان کے نزدیک الحین سے مراد دنیا کی مدت ہوتی ہے، ہم کبھی بھی اسے حانث نہیں بنائیں گے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے ختم ہونے سے پہلے ادا کردے۔ ابو ثور وغیرہ نے کہا: الحین اور الزمان اس پر محمول ہوگا جو لغت کہتی ہے۔ کہا جاتا ہے: قد جئت من حینٍ شاید وہ نصف دن سے نہ آیا ہو، الکیا طبری شافعی

نے کہا: و بالجملہ، الحین کے کئی مصارف ہیں۔ امام شافعی کسی محمل کی تعیین نہیں کرتے کیونکہ یہ محمل ہے لغت میں کسی معین معنی کے لئے وضع نہیں کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلٰى حِيْنٍ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بشارت ہے تاکہ وہ جان لیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس دنیا میں باقی نہیں رہنا ہے انہوں نے جنت کی طرف منتقل ہونا ہے جس کی طرف لوٹنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ حضرت آدم کے علاوہ لوگوں کے لئے قیامت کے قائم ہونے پر دلیل ہے۔ یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ بعض علماء نے فرمایا: تلقی کا معنی سمجھنا ہے۔ بعض نے فرمایا: قبول کرنا اور لینا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام یتلقی الوحی یعنی وحی حاصل کرتے تھے اسے لیتے تھے۔ تو کہتا ہے: خرجنا نتلقی الحجیج ہم نکلے تاکہ حاجیوں کا استقبال کریں۔ بعض نے فرمایا: تلقی کا معنی تلقین کرنا ہے، یہ معنی صحیح ہے لیکن اصل میں تلقی کا تلقن سے ہونا جائز نہیں کیونکہ جب دو حرف ہم جنس ہوں تو ایک کو یاء سے قلب کیا جاتا ہے مثلاً تظنی، یہ تظنن سے ہے تقضی یہ تقضض اس کی مثل ہے تسریت یہ تسررت سے ہے املیت یہ امللت سے ہے اس کی قسم کی دوسری مثالیں بھی ہیں اسی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا تقبی، تقبل سے ہے اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ تلقی، تلقن سے ہے، مکی نے حکایت کیا حضرت آدم علیہ السلام کو کلمات الہام کئے گئے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے نفع اٹھایا۔ حسن نے کہا: وہ کلمات سیکھے اور ان پر عمل کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**: كَلِمٰتٍ میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرات ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور مجاہد نے کہا: وہ کلمات یہ تھے: رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اعراف) مجاہد سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں: سبحانك اللهم لا اله الا انت ربی ظلمت نفسی فاغفرلی انك انت الغفور الرحيم (1)۔ ایک جماعت نے کہا: انہوں نے عرش کے پائے پر یہ لکھا ہوا دیکھا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو انہوں نے ان کلمات سے سفارش طلب کی تو ان کی سفارش قبول کی گئی۔ کلمات سے مراد یہ کلمات ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: كَلِمٰتٍ سے مراد رونا، حیاء کرنا اور دعا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: ندامت، استغفار اور پریشان ہونا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے معہود استغفار کے علاوہ کچھ نہ کہا (2)۔ بعض نیک لوگوں سے پوچھا گیا کہ گناہگار کو کیا کہنا چاہئے تو اس نے کہا: جو اس کے والدین نے کہا تھا: رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (اعراف: 23) موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (القصص: 16) یونس علیہ السلام نے کہا تھا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) حضرت ابن عباس اور وہب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 131، جلد 1

بن منبہ سے مروی ہے کہ یہ کلمات تھے: سبحان اللهم و بحمدك لا اله الا انت عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ کلمات تھے: لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم لا اله الا انت سبحانك وبحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك انت الغفور الرحیم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك ارحم الراحمین۔ بعض نے فرمایا: کلمات سے مراد چھینک کے بعد الحمد للہ کہنا ہے۔

الکلمات، کلمۃٌ کی جمع ہے۔ الکلمہ کا لفظ قلیل وکثیر پر بولا جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَابَ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی یا توبہ کی توفیق بخشی۔ جمعہ کے دن دس محرم الحرام کو توبہ قبول فرمائی جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا۔ تاب العبد کا مطلب بندہ اپنے رب کی طاعت کی طرف لوٹ آیا۔

عبد توابٌ، طاعت کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا۔ توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے تاب و ثاب و آب و اناب ان سب کا معنی لوٹنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اگر کہا جائے کہ عَلَيْهِ کیوں فرمایا علیہما کیوں نہیں فرمایا، حضرت حوا بھی تو بالاجماع اس کام میں شریک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ:35) اس درخت کے قریب نہ جانا، اور قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف:23) دونوں نے کہا ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قصہ کے آغاز میں جب حضرت آدم علیہ السلام کو اُسْكُنْ کے ارشاد سے خطاب کیا گیا تو تلقی میں بھی خاص ان کا ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے واقعہ کی تکمیل بھی صرف ان کے ذکر سے کی۔ نیز عورت حرمت اور مستورہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہ فرما کر اس کے لئے پردہ کا ارادہ فرمایا۔ اسی وجہ سے معصیت میں بھی ان کا ذکر نہیں فرمایا وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ (طٰہٰ)

نیز عمومی احکام میں عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ (الکہف:75) (کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا) بعض علماء نے فرمایا: چونکہ دونوں کا امر برابر تھا حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کا ذکر حضرت حوا کی توبہ کی قبولیت کی دلیل ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا (الجمعہ:11) چونکہ قوم کی مقصود تجارت تھی اس لئے ضمیر کی طرف لوٹا دی اور تثنیہ کی ضمیر ذکر نہیں فرمائی، معنی قریب قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

رمانی بامرٍ کنت منه و والدی بریئًا و من فوق الطوی رمانی

اس نے مجھ پر ایک امر کی تہمت لگائی میں اور میرا والد اس سے بری تھے اور اس نے ایک کنویں کی وجہ سے مجھ پر تہمت لگائی۔

قرآن حکیم میں ہے اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ:62) (اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی

کریں) یہاں بھی ایجاز واختصار کی خاطر حذف کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت التَّوَّابُ بیان فرمائی اور قرآن حکیم میں یہ صفت معرفہ، نکرہ، اسم اور فعل کی صورت میں بار بار ذکر فرمائی، کبھی ثواب کا اطلاق بندے پر بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (البقرہ) (بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو)

ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا وصف ہونے میں ہمارے علماء کے تین اقوال ہیں:

ا- رب تعالیٰ کے حق میں یہ جائز ہے اس نام کے ساتھ اسے پکارا جائے گا جیسا کہ کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے اور کوئی تاویل نہیں کی جائے گی۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا وصف حقیقی ہے۔ توبة الله على العبد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو معصیت کی حالت سے طاعت کی حالت کی طرف لوٹا دیا۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: توبة الله على العبد کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی توبہ قبول کرنا یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد قبلت توبتك (میں نے تیری توبہ قبول کی) کی طرف لوٹے اور اس طرف لوٹنے کا احتمال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مجرم بندے کے دل میں توبہ کرنے اور ظاہری اعضاء پر طاعات کو جاری کرنے کی توفیق بخش دے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کے حق میں تائب کہنا جائز نہیں۔ تائب، اسم فاعل ہے تاب یتوب سے، کیونکہ ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اسم یا صفت استعمال کریں مگر صرف وہی جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے استعمال فرمایا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے استعمال فرمایا یا مسلمانوں کی جماعت نے استعمال فرمایا۔ اگرچہ لغت میں وہ جائز بھی ہو۔ اس باب میں نہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ''الکتاب الاسنٰی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی'' میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ (توبہ: 117) (یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر) اور فرمایا وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (الشوریٰ: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی) اللہ تعالیٰ کو تواب کہا گیا ہے فعل کے مبالغہ کے لئے اور جو کثرت سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے کثرت سے اس کی توبہ قبول کرنے کی وجہ سے۔

**مسئلہ نمبر 7**: کسی کو توبہ تخلیق کرنے کی قدرت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اعمال کی تخلیق میں منفرد ہے جب کہ معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ اسی طرح کسی کے لئے مجرم کی توبہ قبول کرنا اور اسے معاف کرنا جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہود ونصاریٰ نے دین میں اس اصل کا انکار کیا۔ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر) انہوں نے مجرم، گنہگار کے لئے یہ اصول بنایا کہ وہ کسی عالم یا راہب کے پاس جائے اور اسے کوئی چیز (نذرانہ) دے دے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ (انعام) (بہتان باندھ کر اللہ پر بے شک وہ گمراہ ہو

گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے)۔

**مسئلہ نمبر 8:** ابن کثیر نے فتلقی آدم من ربہ کلماتٌ پڑھا ہے باقی قراء نے آدم کے رفع اور کلمات کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے(1) دونوں قرائتیں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتی ہیں کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کلمات کو پایا تو کلمات انہیں مل گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم علیہ السلام کو ملنے والے تھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم نے وہ کلمات قبول کئے اور ان کے ساتھ دعا کی تو یہ کلمات ہی فاعل ہیں۔ گویا اصل اس قراءت پر ہے فتلقت آدمَ من ربہ کلماتٌ۔ لیکن جب مؤنث اور اس کے فعل کے درمیان بعد اور دوری پائی گئی تو علامت تانیث کو حذف کرنا اچھا ہوا۔ یہ اصل ہے جو قرآن اور کلام میں جاری ہوتی ہے جب مؤنث کا فعل بغیر علامت تانیث کے ہو۔ اسی سے عربوں کا قول ہے۔ حضر القاضی الیوم امرأۃٌ۔ عورت آج قاضی کے پاس حاضر ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات کی تانیث جب حقیقی نہ تھی تو اسے الکلم کے معنی پر محمول کیا گیا۔ پس صیغہ مذکر ذکر کیا گیا۔ اعمش نے ادمْ مِن ربہ کو مدغم کر کے پڑھا ہے۔ ابونوفل بن ابی عقرب نے (أنہ) ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے لانہ کے معنی کی بنا پر۔ باقی قراء نے نئی کلام کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو، عیسیٰ اور طلحہ نے ھا کو ھا میں ادغام کیا ہے۔ یہ ابوحاتم نے ابوعمرو وغیرہ سے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جائز نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان لفظاً واوَ ہے خطاً نہیں۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے اس واؤ کو حذف کرنا جائز قرار دیا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا ہے:

له زجل كأنه صوت حاد اذا طلب الوسيقة او زمير

اس کیلئے مترنم آواز تھی گویا وہ کسی حدی خوان کی آواز ہے۔ جب اس نے اپنی مادہ کو طلب کیا یا اس کی آواز میں مزمار ہے۔

پس اس صورت میں ادغام جائز ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور تواب خبر ہے پھر پورا جملہ انّ کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو ھاء کی تاکید ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ھو فاصلہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا گیا تو زمین میں خشکی پر گدھ کے علاوہ کچھ نہ تھا اور دریا میں مچھلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ گدھ مچھلی کے پاس پناہ لیتی اور رات گزارتی۔ جب گدھ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: اے مچھلی آج زمین کی طرف ایک چیز اتاری گئی ہے جو ٹانگوں پر چلتی ہے اور ہاتھوں سے پکڑتی ہے۔ مچھلی نے کہا: اگر تو سچی ہے تو پھر میرے لئے دریا میں نجات کی جگہ نہیں اور تیرے لئے خشکی میں اس سے خلاصی کی جگہ نہیں۔

**قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝**

''ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا تغلیظ و تاکید کے لئے امر کا تکرار فرمایا جیسے تو کسی کو کہتا ہے: اٹھ اٹھ (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: امر کو مکرر فرمایا کیونکہ ہر امر سے نیا حکم معلق تھا جو دوسرے امر کے حکم سے مختلف تھا، پہلے امر کے ساتھ عداوت معلق تھی دوسرے کے ساتھ ہدایت کا لانا۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا اترنا جنت سے آسمان کی طرف تھا دوسرا اترنا آسمان سے زمین کی طرف تھا، اس قول پر یہ دلیل ہوگی کہ جنت ساتویں آسمان میں ہے جیسے کہ حدیث اسراء اس پر دلالت کرتی ہے (2) نہ جیسا کہ آگے آئے گا۔

جَمِيْعًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حضرت وہب بن منبہ نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام زمین کی طرف اترے تو ابلیس نے درندوں سے کہا: یہ تمہارا دشمن ہے اسے ہلاک کر دو۔ وہ سب جمع ہوئے اور انہوں نے یہ کام کتے کے سپرد کیا۔ انہوں نے کتے سے کہا: تو ہم میں سے زیادہ بہادر ہے، درندوں نے کتے کو سردار بنا دیا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کتے کو دیکھا تو متحیر ہوئے۔ جبریل امین حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اپنا ہاتھ کتے کے سر پر پھیرو۔ حضرت آدم نے ایسا ہی کیا۔ جب درندوں نے دیکھا کہ کتا تو آدم سے مانوس ہو گیا ہے تو درندے بھاگ گئے۔ کتے نے حضرت آدم علیہ السلام سے امان مانگی تو حضرت آدم نے اسے امان دے دی، پس وہ اور اس کی اولاد حضرت آدم کے ساتھ باقی رہی۔ حکیم ترمذی نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین کی طرف اتارے گئے تو ابلیس درندوں کے پاس آیا، انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے کے لئے ابھارا، ان میں سے سخت ترین کتا تھا۔ پس اس کا دل مردہ کر دیا گیا۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا کہ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مطمئن ہو گیا اور حضرت آدم سے الفت کرنے لگا۔ پس کتا حضرت آدم کی رکھوالی کرنے والوں میں سے ہو گیا۔ وہ حضرت آدم کی اور آپ کی اولاد کی حفاظت کرنے والا بن گیا اور انسانوں سے الفت کرنے والا ہو گیا، اس کے دل کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے یہ انسان سے ڈرتا ہے، اگر اسے روڑا مارا جائے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے پھر ان سے محبت کی وجہ سے لوٹ آتا ہے۔ کتے میں کچھ ابلیس کا اثر ہے اور کچھ حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کا اثر ہے۔ ابلیس کے اثر کی وجہ سے یہ بھونکتا ہے اور آدمی پر حملہ کرتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کی وجہ سے اس کا دل مردہ ہو گیا حتیٰ کہ یہ تابعدار ہو گیا اور حضرت آدم اور حضرت آدم کی اولاد سے محبت کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ دل کے مردہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برے علماء کو کتے سے تشبیہ دی ہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت آدم علیہ السلام پر وہ ڈنڈا اتارا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے معجزہ بنایا تھا، اس ڈنڈے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام درندوں کو اپنے سے دور کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى، هُدًى کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملئکۃ، حدیث 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کتاب اللہ ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ہدایت کی توفیق ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الھدیٰ سے مراد رسل ہیں جو فرشتوں میں سے حضرت آدم کی طرف آئے اور بشروں میں سے حضرت آدم کی اولاد کی طرف آئے (1)۔ جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں آیا ہے۔ آجری نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

مِّنِّیْ کے قول میں اشارہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، جبکہ قدریہ وغیرہ کا قول اس سے مختلف ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

جحدری نے هُدَیَّ پڑھا ہے یہ ھذیل کی لغت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ھدیّ، عصیّ، محییّ۔ نحویوں نے ابوذویب کا شعر نقل کیا ہے جو وہ اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے:

سبقوا هوىّ واعنقوا لهواهم — فَتُخُرِّموا ولكل جنب مصرع (2)

وہ میری خواہش سے سبقت لے گئے گویا انہوں نے موت کی خواہش کی۔ پس وہ ایک ایک کر کے پکڑے گئے، ہر پہلو کے لئے گرنا ہے۔

نحاس نے کہا: خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس لغت کی علت یہ ہے کہ اضافت کی یا کا ماقبل کسرہ ہونا چاہئے تھا جب وہ نہ تھی کیونکہ الف کو حرکت نہیں دی جاتی تو الف کو یا سے بدل دیا گیا پھر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا۔

(اما) اس میں ما زائدہ ہے، اِنْ شرط کے لئے ہے، اور جواب شرط فا شرط ثانی کے ساتھ ہے۔ جو ''فَمَنْ تَبِعَ'' میں ہے۔ من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تَبِعَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ فَلَا خَوْفٌ، اس دوسری شرط کا جواب ہے، سیبویہ نے کہا دوسری شرط اور اس کا جواب دونوں پہلی شرط کا جواب ہیں، کسائی نے کہا: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ۔ دونوں شرطوں کا اکٹھا جواب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞، خَوْفٌ سے مراد پریشانی، گھبراہٹ ہے اور یہ مستقبل کے امر پر ہوتی ہے۔ خافنی فلانٌ فخفتهٗ۔ فلاں نے مجھے ڈرایا تو میں اس سے انتہائی خوف زدہ ہو گیا۔ التخوف کا معنی کمی ہونا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (النحل: 47) حضرات زہری، حسن، عیسیٰ بن عمر، ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے (فلا خوفَ) فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور نحویوں کے نزدیک پسندیدہ رفع اور تنوین ہے۔ مبتدا ہونے کے اعتبار سے۔ کیونکہ دوسرا اسم معرفہ ہے اور اس میں صرف رفع ہی ہوتا ہے کیونکہ لا معرفہ میں عمل نہیں کرتا۔ پس انہوں نے پہلے اسم میں ہی رفع کو اختیار کیا ہے تا کہ کلام ایک جیسی ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لا خوف میں لا معنی لیس ہو۔

الحُزن اور الحَزن۔ یہ سرور کی ضد ہیں۔ یہ ماضی کے کسی امر پر ہوتا ہے۔ حزِن الرجل فهو حزِن و حزين، احزنهٗ غيرهٗ و حزنه۔ جیسے اسلکه و سلکه۔ (یعنی حزن لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اس کا مجہول محزونٌ آتا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنه یہ قریش کی لغت ہے۔ احزنه یہ تمیم کی لغت ہے۔ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے احتزن اور تحزّن کا ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 132
3۔ ایضاً

معنی ہے: غمگین ہونا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان پر آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے اور دنیا میں جو فوت ہوا اس پر وہ غمگین نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اطاعت شعاروں پر قیامت کے خوف کی نفی کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قیامت کی تکلیفوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بیان فرمایا ہے لیکن اطاعت شعاروں سے وہ تکلیفیں اللہ تعالیٰ کم کردے گا جب وہ اللہ کی رحمت کی طرف چلے گئے تو گویا انہیں خوف ہے ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی جنہوں نے شرک کیا، کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ صحبت کا مطلب ہوتا ہے ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں کسی چیز سے ملا ہوا ہونا، اگر ملازمت اور اختلاط ہو تو یہ کمال صحبت ہے۔ اسی طرح یہ دوزخیوں کی دوزخ سے صحبت ہے، اس قول کی وجہ سے صحابہ کا نام رکھنے میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مراتب مختلف ہیں (1)۔ مزید تفصیل ہم ان شاء اللہ سورۂ برأت میں بیان کریں گے۔ اس آیت کے باقی الفاظ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرا کرو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ یہ ندا مضاف ہے اس میں نصب کی علامت یاء ہے۔ اضافت کی وجہ سے اس سے نون حذف کیا گیا ہے۔ بنین کا واحد ابن ہے اس میں اصل بَنَی ہے بعض نے فرمایا: بَنَوٌ ہے۔ جنہوں نے فرمایا: اس میں واو حذف کی گئی ہے انہوں نے بنوۃ سے حجت پکڑی ہے، اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: الفتوۃ میں اصل یاء ہے۔ زجاج نے کہا: میرے نزدیک یاء حذف ہے گویا یہ بنیت سے مشتق ہے۔ اخفش نے اس سے واو کے حذف کو پسند کیا ہے کیونکہ واو کے ثقل کی وجہ سے واو کا حذف اکثر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ابن بیّنٌ، البنوۃ۔ اور تصغیر بنی فراء نے کہا: یا بُنِیِّ یا بُنَیَّ دونوں لغتیں ہیں جیسے یا ابتِ و یا ابتَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ البناء سے مشتق ہے۔ یہ کسی شے کو دوسری شے پر رکھنا ہے۔ الابن یہ باپ کی فرع ہے اس پر اس کو رکھا گیا ہے۔

اِسْرَآءِيْلَ سے مراد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام ہے۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: حضرت یعقوب کے علاوہ انبیائے کرام میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے دو نام ہوں مگر ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے بہت سے نام ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''فہوم الآثار'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں کہتا ہوں: کہا گیا ہے کہ المسیح عیسیٰ علیہ السلام کا علم ہے غیر مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام روح اور کلمہ رکھا ہے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابیل الأبیلین کہتے تھے۔ یہ جوہری نے ''الصحاح'' میں ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں خلیل بن احمد سے روایت کیا ہے کہ پانچ انبیائے کرام دو دو ناموں والے تھے۔ محمد اور احمد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ اور مسیح، اسرائیل اور یعقوب، یونس اور ذوالنون، الیاس اور ذوالکفل صلی اللہ علیہم وسلم۔ میں کہتا ہوں: ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام تھے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسماء تھے۔ ان کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ اِسْرَآءِیْلَ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے، اس میں سات لغات ہیں۔ اسرائیل یہ قرآن کی لغت ہے اور اسرائیل مدہ مہموزہ مختلسہ کے ساتھ، یہ شنبوذ نے ورش سے حکایت کیا ہے۔ اسراییل بغیر ہمزہ کے یاء کے مد کے ساتھ، یہ اعمش اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ حسن اور زہری نے بغیر ہمزہ اور مد کے پڑھا ہے۔ اسرئل بغیر یاء کے اور ہمزہ مکسورہ کے ساتھ، اسرأل ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ...... تمیم کہتے ہیں: اسرائین یعنی نون کے ساتھ۔ اسرائیل کا معنی ہے: عبداللہ۔ حضرت ابن عباس نے کہا: عبرانی زبان میں اسرا سے مراد بندہ ہے اور أیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا سے مراد اللہ کا چنا ہوا ہے اور إیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا کا معنی سخت ہونا ہے گویا اسرائیل وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سخت بنایا اور اس کی تخلیق کو پختہ کیا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہیلی نے کہا: اسرائیل اس لئے کہا گیا کہ انہیں ایک رات میں سیر کرائی گئی جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ پس ان کا نام اسرائیل رکھا گیا یعنی اس نے اللہ کی طرف سیر کی۔ پس اسم کا بعض عبرانی ہے اور بعض عرب کے موافق ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، ذکر اسم مشترک ہے ذکر بالقلب (دل کا ذکر) یہ بھولنے کی ضد ہے۔ الذکر باللسان یہ خاموش رہنے کی ضد ہے۔ ذکرت الشیء بلسانی و قلبی ذکراً۔ میں نے زبان اور دل سے اس کا ذکر کیا۔ واجعله منك علی ذُكرٍ (بضم ذال) یعنی اس کو مت بھول۔ کسائی نے کہا: جو ذکر دل سے ہو وہ ذال کے ضمہ کے ساتھ ہوتا ہے اور جو زبان کے ساتھ ہو وہ ذال مکسور کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذِکر اور ذُکر ہم معنی ہیں اور الذکر (بفتحہ ذال) مؤنث کا متضاد...... الذِکر کا معنی شرف بھی ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف: 44)

ابن انباری نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ میری نعمت کے شکر کو یاد کرو۔ نعمت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے شکر کو حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں ذکر بالقلب مراد ہے اور وہی مطلوب ہے، یعنی میری اس نعمت سے غافل نہ ہو جاؤ جو میں نے تم پر کی اور اسے بھول نہ جاؤ، یہ عمدہ قول ہے۔ النعمة یہاں اسم جنس ہے یہ مفرد ہے اور جمع کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) یہاں بھی نعمة سے مراد نعمتیں ہیں۔ اللہ کی نعمتوں میں سے جو اس نے بنی اسرائیل پر فرمائیں یہ ہیں: فرعونیوں سے نجات بخشی، ان سے انبیاء بنائے، ان پر کتب اور من وسلویٰ نازل فرمایا، پتھر سے پانی نکالا، انہیں تورات عطا فرمائی جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت، نعت اور رسالت کا ذکر تھا، والدین

پر جو نعمتیں ہوں وہ اولاد پر بھی ہوتی ہے کیونکہ اولاد والدین کے شرف سے مشرف ہوتی ہے۔
نوٹ: ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نعمت کے ذکر کے ساتھ تعلق قائم فرمایا ہے، جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے نعمت کے ذکر کو ساقط کر دیا اور اپنے ذکر کی طرف انہیں بلایا ہے۔ فرمایا: فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ: 152) تا کہ دوسری امتوں کی نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ زہری نے تکثیر کے لئے اوف واو کے فتحہ اور فاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس عہد سے مراد یہ ہے: خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (اعراف: 171)
اور ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (المائدہ: 12) اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار۔
بعض علماء نے فرمایا: یہ ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران: 187)
الزجاج نے کہا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ جو میں نے تم سے تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا عہد لیا ہے اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ جو میں نے تمہیں اس پر ضمانت دی ہے وہ میں پوری کروں گا۔ اگر تم اس عہد کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ یعنی سنت اور اخلاص کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں اپنا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہیں رعایات کی منازل تک پہنچاؤں گا۔ بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ ظاہری آداب کی حفاظت میں میرا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہارے باطن کی تزئین کا عہد پورا کروں گا۔ بعض نے فرمایا: یہ حکم تمام اوامر، نواہی اور وصایا کو شامل ہے اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی داخل ہے جو تورات وغیرہ میں ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عہد یہ ہے کہ وہ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔
میں کہتا ہوں: جو وفاء عہد ان سے طلب کیا گیا ہے وہ ہم سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ (النحل: 91) کثرت سے اس قسم کے ارشاد ہمارے لئے بھی ذکر ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنا، ان کے لئے اللہ کی طرف سے وفا کی علامت ہے، اس کے لئے علت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ان پر فضل اور مہربانی ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ، الرُّهب، الرَّهب اور الرهبة ان سب کا معنی خوف ہے۔ یہ امر اپنے ضمن میں تہدید کا معنی رکھتا ہے نون کے بعد یا ساقط ہوگئی ہے کیونکہ یہ آیت کا سر ہے (1)۔ ابن ابی اسحاق نے فارھبونی (یاء کے ساتھ) پڑھا ہے اسی طرح فاتقونی اصل پر پڑھا ہے۔ ایای فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسی طرح امر، نہی اور استفہام میں اختیار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و ایای ارھبوا فارھبون۔ اور کلام میں وانا فارھبون بھی مبتدا اور خبر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کے اعتبار سے جائز ہے۔ فَارْهَبُوْنِ حذف کی تقدیر پر خبر ہوگی۔ معنی یہ ہوگا: وانا ربکم فارھبون۔

وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل کی ہے میں نے۔ یہ سچا ثابت کرنے والی ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے اور نہ خرید و تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت اور صرف مجھی سے ڈرا کرو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ یعنی قرآن کی تصدیق کرو۔ مُصَدِّقًا یہ اَنْزَلْتُ کی ضمیر سے حال ہے(1)۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: بما انزلته مصدقا۔ اس میں عامل انزلت ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما۔ سے حال ہو اور اس میں عامل اٰمِنُوْا ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: آمنوا بالقرآن مصدقا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما مصدریہ ہو۔ تقدیر عبارت آمنوا بانزال۔ لما معکم، یعنی تورات میں سے جو تمہارے پاس ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ۔ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ابو العالیہ نے کہا ہے اور ابن جریج نے کہا: اس کا مرجع قرآن ہے کیونکہ بما انزلت کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع تورات ہے کیونکہ لِمَا مَعَكُمْ کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے(2)۔

اگر کہا جائے کہ كَافِرٍ کیسے فرمایا کافرین نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ فَرِیْقٍ كَافِرٍ بِهٖ (3)۔ اخفش اور فراء نے کہا: یہ فعل کے معنی پر محمول ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: اَوَّلُ مَنْ كَفَرَ بِهٖ۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: هُوَ اَظْرَفُ الْفِتْیَانِ وَ اَجْمَلُهٗ۔ ظاہر کلام هُوَ اَظْرَفُ فَتًى وَ اَجْمَلُهٗ تھا۔ فرمایا: اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ حالانکہ ان سے پہلے کفار قریش نے اس کا انکار کیا تھا۔ اس کا معنی ہے: اہل کتاب میں سے پہلے تم کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ، کیونکہ ایسی مثال میں ان کی طرف نظر کی جاتی ہے کیونکہ وہ حجت تھے ان کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اَوَّلَ کو نصب کان کی خبر کے اعتبار سے ہے۔ یہ ان کلمات سے ہے جن کا فعل نہیں بولا جاتا یہ افعل کے وزن پر ہے اس کا عین اور فاء کلمہ واؤ ہے، اس سے فعل نہیں بولا جاتا تا کہ دونوں جہتوں (عین اور فا) سے تعلیل نہ ہو۔ یہ بصریوں کا مذہب ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہ وأل سے مشتق ہے جس کا معنی ہے نجات پانا۔ اصل میں اَوْ أَل تھا۔ پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور واؤ سے بدل دیا گیا اور پھر ادغام کیا گیا۔ اور اَوَّلَ کہا گیا جس طرح خطیئۃ کے ہمزہ کی تخفیف کی جاتی ہے۔ جوہری نے کہا: اس کی جمع الاوائل والاوالی قلب کی صورت میں بھی آتی ہے۔ بعض نے کہا: اصل میں یہ ووّل فوعل کے وزن پر تھا پہلی واؤ ہمزہ سے بدل گئی اور اس کی جمع اداول نہیں بنائی جاتی کیونکہ دو واؤ کا جمع کرنا جن کے درمیان الف جمع ہو ثقیل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آل یؤول سے افعل کے وزن پر ہے اس کی اصل اأول تھا، اس میں قلب کیا گیا اعفل، افعل سے مقلوب ہو کر آیا ہے، پھر تسہیل کی گئی بدل کر ادغام کیا گیا(4)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

**مسئلہ:** اس آیت میں ان علماء کے لئے کوئی حجت نہیں ہے جو دلیل خطاب کے ساتھ قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوفی اور ان کے موافقت کرنے والے علماء ہیں کیونکہ کلام سے مقصود اول و آخر کفر سے نہی ہے۔ اول کو ذکر کے ساتھ خاص کیا کیونکہ اس میں تقدم زیادہ شدید ہے۔ پس مذکور اور مسکوت عنہ کا حکم ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا یہ وَلَا تَكُوْنُوْٓا پر معطوف ہے اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر قیمت نہ لو یعنی حضرت محمد ﷺ کی صفات میں تبدیلی پر رشوت نہ لو۔ یہود کے علماء ایسا کرتے تھے اس لئے انہیں اس سے منع کیا گیا۔ یہ بعض مفسرین کا قول ہے ان میں سے حسن وغیرہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہودی علماء اپنے علم پر کھانا لیتے تھے جیسے وظیفہ اور تنخواہ ہوتی ہے۔ پس انہیں اس سے منع کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے علماء لوگوں کو دین اجرت پر سکھاتے تھے اس سے انہیں منع کیا گیا، ان کی کتابوں میں ہے اے ابن آدم! علم سکھاؤ جس طرح تجھے مفت علم سکھایا گیا۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم میرے اوامر و نواہی اور آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت نہ لو یعنی دنیا اور اس کی مدت۔ اور وہ زندگی جو تھوڑی ہو اس کا کوئی مرتبہ نہیں (1)۔ جو وہ عوض لیتے تھے اسے ثمنا (قیمت) کیا گیا کیونکہ انہوں نے اس کو عوض بنایا تھا جو چیز عوض ہو اس پر ثمن کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں ثمن نہ بھی ہو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ شاعر نے کہا:

ان كنت حاولت ذنبا او ظفرت به　　　فما اصبت بترك الحج من ثمن

"اگر تو گناہ کا ارادہ کرے یا گناہ کر لے تو حج کے ترک کے عوض تو نے کوئی ثمن نہیں پائی"۔

میں کہتا ہوں یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے لیکن یہ اس کو بھی شامل ہے جو ان جیسا فعل کرے گا۔ پس جو حق میں تبدیلی یا اس کو باطل کرنے پر رشوت لے گا یا واجبی تعلیم کے دینے سے انکار کرے گا یا جو اس نے سیکھا اس کی ادائیگی سے رکے گا حالانکہ اس کا سکھانا اس پر متعین ہے حتیٰ کہ وہ اس پر اجرت لے تو وہ اس آیت کے مقتضیٰ میں داخل ہے۔ واللہ اعلم

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے کہ اس کے عوض دنیا کا مال حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن اور علم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ زہری اور اصحاب الرائے (احناف) نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں: قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ تعلیم قرآن ان واجبات میں سے ایک واجب ہے جن میں تقرب کی نیت اور اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس نماز، روزے کی طرح تعلیم قرآن پر بھی

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 159، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالیٰ، حدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اجرت نہیں لی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اور نہ خرید و میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت) حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معلموا صبیانکم شرارکم اقلهم رحمة بالیتیم واغلظهم علی المسکین تمہارے بچوں کے اساتذہ تمہارے برے لوگ ہیں جو یتیم پر رحمت کم کرتے ہیں اور مسکین پر سختی زیادہ کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ معلمین کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کا درہم حرام ہے، ان کا کپڑا سُحت (حرام) ہے اور ان کا کلام ریا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اہل صفہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور کتابت سکھائی۔ ان میں ایک شخص نے مجھے ایک کمان دی۔ میں نے کہا: یہ مال نہیں ہے میں اس کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تجھے پسند ہے کہ تجھے اس کے بدلے آگ کا طوق پہنایا جائے تو پھر یہ قبول کر لے(1)۔

امام مالک، امام شافعی، احمد، ابو ثور اور اکثر علماء نے قرآن کی تعلیم پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ...... حدیث الرقیہ (دم والی حدیث) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله(2)۔ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ حقدار کتاب اللہ ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے، یہ نص ہے اختلاف کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اس پر ہی اعتماد کرنا چاہئے۔ رہا مخالف کا نماز اور روزے پر قیاس تو یہ فاسد ہے کیونکہ یہ قیاس نص کے مقابل ہے۔ پھر ان کے درمیان فرق بھی ہے وہ یہ کہ نماز اور روزہ فاعل کے ساتھ مختص عبادات ہیں اور تعلیم القرآن معلم کے علاوہ کے لئے متعدی عبادت ہے۔ پس اس کو نقل کرنے کے ارادہ پر اجرت جائز ہے جیسے قرآن کی کتابت کی تعلیم پر اجرت جائز ہے۔

ابن منذر نے کہا: امام ابو حنیفہ اجرت کے ساتھ قرآن کی تعلیم کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے کہ وہ اسے تختی یا شعر یا معلوم گانا معلوم اجرت پر لکھ دے گا۔ جو چیز معصیت ہے اس میں اجارہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور جو چیز طاعت ہے اس میں اجارہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔ آیت کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد بنو اسرائیل ہیں اور شرع من قبلنا هل هو شرع لنا (جو ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت تھی کیا وہ ہمارے لئے شریعت ہے) کے اصول میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی یہ نہیں کہتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ اس شخص کے متعلق ہے جس پر تعلیم دینا متعین ہو پھر وہ انکار کرے حتی کہ اس پر اجرت لے لے...... مگر جب متعین نہ ہو تو سنت کی دلیل کے ساتھ اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ کبھی اس شخص پر تعلیم دینا متعین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو وہ اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے تو اس پر تعلیم دینا واجب نہیں ہوتا

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 157، (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن، حدیث 2147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطب، باب الشرط فی الرقیة بقطیع من الغنم، حدیث 5296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کے لئے اپنی صنعت اور اپنے ہنر پر مال قبول کرنا جائز ہے۔ امام وقت پر واجب ہے کہ دین کی اقامت کے لئے اس کی مدد کرے ورنہ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ اس کی مدد کریں کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلافت کے والی بنے اور خلافت کے لئے آپ کو متعین کیا گیا تو آپ کے پاس اتنا مال نہ تھا جو آپ کے گھر والوں کی کفایت کرتا۔ آپ نے کپڑے اٹھائے اور بازار کی طرف نکلے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: میں اپنے عیال پر کہاں سے خرچ کروں، تو صحابہ کرام نے آپ کو واپس لوٹا دیا اور آپ کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کیا۔

رہیں وہ احادیث جو انہوں نے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو قابل حجت ہو۔ ان میں کوئی حدیث نقل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث وہ سعید بن طریف نے حضرت عکرمہ سے اور حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور سعید متروک راوی ہے اور حضرت ابوہریرہ کی حدیث علی بن عاصم نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ابوجرہم سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے، ابوجرہم مجہول غیر معروف راوی ہے۔ حماد بن سلمہ نے کسی ایسے راوی سے روایت نہیں کیا جس کو ابوجرہم کہا جاتا ہو انہوں نے ابوالمہزم سے روایت کیا ہے اور وہ بھی متروک الحدیث ہے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔ رہی حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جو ابوداؤد نے مغیرہ بن زیاد موصلی سے انہوں نے عبادہ بن نسی سے انہوں نے اسود بن ثعلبہ سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے مغیرہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے لیکن اس کی بہت سی مناکیر احادیث ہیں یہ ان میں سے ایک منکر حدیث ہے۔ یہ ابوعمر نے کہا ہے، پھر فرمایا: رہی قوس (کمان) والی حدیث یہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے کیونکہ یہ حضرت عبادہ سے دو سندوں سے روایت کی گئی ہے اور حضرت ابی بن کعب سے موسیٰ بن علی عن ابیہ عن ابی کے سلسلہ سے مروی ہے لیکن وہ منقطع ہے۔ اس بارے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے نقل کی جہت سے جس پر عمل واجب ہو اور حضرت عبادہ اور حضرت ابی کی حدیث تاویل کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ پہلے انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے تعلیم دی ہو پھر اس پر اجر لیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں میں سے بہتر اور جو زمین کی سطح پر چل رہے ہیں ان میں سے بہتر اساتذہ ہیں جب بھی دین بوسیدہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے جلا بخشی تم انہیں اجرت پر نہ لو کہ تم انہیں تنگ کرو کیونکہ معلم جب بچے کو کہتا ہے: پڑھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، بچہ کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ اس سے بچے کی برأت، معلم کی برأت اور اس کے والدین کی برأت لکھ دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اجرت پر نماز پڑھانے والے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اشھب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا جسے نماز پڑھانے کے لئے رمضان میں اجرت پر لیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہ ہوگی۔ فرضوں میں اس کے لئے سخت کراہت ہے۔

امام شافعی اور آپ کے اصحاب، ابوثور نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کے پیچھے نماز میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اس کی نماز ہی نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے اس کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا

ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ مسئلہ سابقہ مسئلہ سے معلق ہے اور ان دونوں کی اصل ایک ہے۔

میں کہتا ہوں: سورۂ برأت میں اس کی ایک اور اصل آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن قاسم نے شعر اور نحو کی تعلیم پر اجرت لی۔ ابن حبیب نے کہا: شعر، رسائل، تاریخ عرب کی تعلیم پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اشعار جن میں شراب، غنا، ہجو کا ذکر ہو وہ مکروہ ہیں۔ ابو الحسن لخمی نے کہا: اس قول پر کتب پر اجرت لینا اور کتب کو بیچنے کا جواز لازم آتا ہے، لیکن غنا اور نوحہ ہر حال میں ممنوع ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں یعقوب بن ابراہیم نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن عمر بن کمیت نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں علی بن وہب الہمدانی نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ضحاک بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ سے گزرا وہ مکہ مکرمہ جارہا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ میں کچھ دن ٹھہرا۔ اس سے پوچھا گیا: مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی سے ملاقات کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ابو حازم ہے۔ سلیمان نے ابو حازم کو بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا: اے ابو حازم! یہ جفا کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تو نے کون سی جفا مجھ سے دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا: تمام اہل مدینہ میرے پاس آئے اور تو میرے پاس نہ آیا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تو وہ کہے جو ہوا نہیں ہے، میں نے اس دن سے پہلے نہ تجھے پہچانا ہے اور نہ میں نے تجھے دیکھا ہے۔ سلیمان، محمد بن شہاب زہری کی طرف متوجہ ہوا تو زہری نے کہا: شیخ نے صحیح کہا ہے اور تو نے غلطی کی ہے۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا: کیونکہ تم نے اپنی آخرت کو خراب کر دیا ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے۔ پس تم آبادی سے خرابی کی طرف منتقل ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! تو نے صحیح کہا، کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کیسے آئیں گے؟ ابو حازم نے کہا: جو نیکوکار ہے وہ اس غائب شخص کی طرح آئے گا جو اپنے گھر والوں کے پاس آیا ہے اور جو بدکار ہے وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح آئے گا جو اپنے آقا کے پاس آتا ہے۔ سلیمان رونے لگا اور کہا: کاش! میرا شعور کام کرتا۔ ہمارے لئے اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اپنے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش کرو۔ سلیمان نے پوچھا: میں کون سا مکان پاؤں گا؟ ابو حازم نے کہا: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴾ (انفطار) (بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے) سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ ابو حازم نے کہا: رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿﴾ (اعراف) (اللہ کی رحمت قریب ہے محسنین کے)۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ کے کون سے بندے معزز ہیں؟ ابو حازم نے کہا: صاحب مروت اور صاحب عقل۔ سلیمان نے کہا: کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابو حازم نے کہا: محارم سے اجتناب کے ساتھ فرائض کا ادا کرنا۔ سلیمان نے کہا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ ابو حازم نے کہا: جو شخص اپنے محسن کے لئے کرتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابو حازم نے کہا: مسکین سائل کے لئے اور کم مال والے محنتی کے لئے جس میں احسان اور اذیت نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: کون سا قول زیادہ بہتر ہے؟ ابو حازم نے

کہا: اس کے سامنے حق کا کلمہ کہنا جس سے تو ڈرتا ہے یا جس سے تو امید رکھتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا مومن عقلمند ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اللہ کی طاعت کا عمل کرے اور طاعت پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ کون سا مومن احمق ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اپنے بھائی کی خواہش میں گر گیا حالانکہ وہ ظالم تھا، اس نے اپنی آخرت کو غیر کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالا۔ سلیمان نے اس سے کہا: تو نے صحیح کہا۔ ہم جس حالت میں ہیں اس کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! کیا تو مجھے معاف کر دے گا؟ سلیمان نے کہا: نہیں لیکن یہ تو نصیحت ہے جو تو مجھے پہنچائے گا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تیرے آباء نے تلوار کے ساتھ لوگوں پر جبر کیا اور مسلمانوں کی رضا اور مشورہ کے بغیر یہ ملک انہوں نے سختی سے حاصل کیا حتیٰ کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش! تجھے شعور ہوتا جو انہوں نے کہا اور جو ان کے بارے میں کہا گیا۔ بادشاہ سلیمان کے ایک حواری نے کہا: اے ابو حازم! تو نے بہت بری بات کی۔ ابو حازم نے کہا: تو نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حقائق بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔ سلیمان نے کہا: ہم کیسے اصلاح کریں؟ ابو حازم نے کہا: ڈینگیں مارنا چھوڑو، مروت کو پکڑو اور برابر تقسیم کرو۔ سلیمان نے پوچھا: ہم ٹیکس کیسے لیں؟ ابو حازم نے کہا: جس سے لینا جائز ہے اس سے وصول کرو اور جو حقدار ہے اسے پہنچاؤ۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہے تو ہم سے فائدہ اٹھائے، ہم تجھ سے فائدہ اٹھائیں؟ ابو حازم نے کہا: اعوذ باللہ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں) سلیمان نے پوچھا: ایسا کیوں؟ ابو حازم نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہاری طرف کسی تھوڑی سی چیز کو جھکا دوں اور اللہ تعالیٰ مجھے دنیا و آخرت کا دوہرا عذاب دے۔ سلیمان نے کہا: اپنی ضروریات ہمیں پیش کرو۔ ابو حازم نے کہا: تو مجھے آگ سے بچا لے اور مجھے جنت میں داخل کر دے۔ سلیمان نے کہا: یہ تو میری قدرت میں نہیں۔ ابو حازم نے اسے کہا: مجھے تجھ سے اور تو کوئی حاجت نہیں۔ سلیمان نے کہا: تم میرے لئے دعا کرو۔ ابوازم نے کہا: اے اللہ! اگر سلیمان تیرا ولی ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر آسان فرما دے، اگر تیرا دشمن ہے تو اس کی پیشانی کو پکڑ لے جب تک تو پسند کرے۔ سلیمان نے کہا: یہ کافی ہے۔ ابو حازم نے کہا: میں نے مختصر دعا مانگی ہے اور اگر تو اس دعا کا اہل ہے تو میں نے زیادہ مانگ لیا ہے اور اگر تو اس کا اہل نہیں ہے تو مناسب نہیں کہ میں ایسی کمان سے مارا جاؤں جس کا وتر نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ میں تجھے مختصر سی وصیت کروں گا، تو اپنے رب کی عظمت بیان کر اور اسے دور رکھ کہ تجھے ایسی جگہ دیکھے جہاں سے اس نے تجھے منع کیا ہے یا تجھے مفقود پائے جہاں اس نے تجھے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔

جب ابو حازم باہر نکل گیا تو سلیمان نے اس کی طرف سو دینار بھیجے اور اسے لکھا کہ تو انہیں خرچ کر اور تیرے لئے میرے پاس اس کی مثل بہت سے دینار ہیں۔ راوی فرماتے ہیں: ابو حازم نے وہ دینار واپس کر دیے اور اسے خط لکھا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا مجھ سے سوال کرنا مذاق ہو یا میں تیری عطا کی امید رکھوں، میں ان رقوم کو تیرے لئے پسند نہیں کرتا تو میں اپنے لئے کیسے پسند کروں گا۔

حضرت موسیٰ بن عمران جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے تو اس پانی پر چرواہوں کو اپنے جانوروں کو پانی پلاتے ہوئے پایا

اور ان کے تھوڑا دور دو لڑکیوں کو پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتیں یہاں تک کہ چرواہے واپس چلے جائیں۔ ہمارا باپ بوڑھا آدمی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریوں کو پانی پلایا پھر سائے کی طرف لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اے میرے رب! میں محتاج ہوں اس کا جو تو میری طرف خیر میں سے اتارے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بھوکے بھی تھے اور خوفزدہ بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا لوگوں سے سوال نہ کیا اور نہ آپ نے چرواہوں کو اپنا مسافر ہونا جتایا۔ وہ بچیاں آپ کی کیفیت پہچان گئی تھیں۔ جب وہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں تو سارا واقعہ انہیں عرض کیا اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی وہ بھی بتائی۔ ان بچیوں کے والد، جو حضرت شعیب علیہ السلام تھے انہوں نے کہا: وہ شخص بھوکا تھا۔ حضرت شعیب نے ایک بچی سے کہا: تو جا اور اس شخص کو بلا کر لے آ۔ جب وہ بچی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تو اس نے ان کی عظمت کو دیکھا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: میرے والد صاحب تمہیں بلا رہے ہیں تا کہ آپ کو ہمارے لئے پانی پلانے کا اجر عطا فرمائیں۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی پلانے کے اجر کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہت شاق گزرا، آپ نے اس بچی کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا کیونکہ آپ پہاڑوں کے درمیان بھوکے اور خوفزدہ تھے۔ جب آپ اس کے پیچھے چلے تو ہوا چل پڑی، اس کے کپڑے اس کی پیٹھ کے ساتھ چپک گئے اور اس کا پچھلا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ظاہر ہونے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی نظر اوپر اٹھاتے کبھی جھکا دیتے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آواز دی: اے اللہ کی بندی! میرے پیچھے ہو جا اور اپنی زبان سے میری رہنمائی کر۔ جب حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے نوجوان! بیٹھ اور کھانا کھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے پوچھا: کیوں کیا تو بھوکا نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ میرے پانی پلانے کا عوض نہ ہو جائے۔ میں اہل بیت سے ہوں ہم اپنے دین کو زمین بھر سونے کے عوض نہیں بیچتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں کہا: اے نوجوان! ایسا نہیں لیکن یہ میری اور میرے آباء کی عادت ہے ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔

ابو حازم نے کہا: یہ سو دینار میری گفتگو کا عوض ہیں تو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حالت اضطرار میں حلال ہوتا ہے، اور اگر یہ بیت المال میں حق کی وجہ سے ہے تو اس میں میرے جیسے اور لوگ بھی ہیں۔ اگر تو نے ہمارے درمیان برابری کی ہے تو فبہا ورنہ مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس طرح کتاب اور انبیاء کرام کی اقتدا ہوتی ہے۔ اس امام فاضل عالم کو دیکھو کیسے اس نے اپنے عمل پر عوض نہیں لیا اور نہ ہی اپنی وصیت کا بدل لیا اور نہ اپنی نصیحت پر بخشش لی بلکہ انہوں نے حق کو بیان کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر

1۔ سنن دارمی، باب فی اعظام العلم، صفحہ 125، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ)

بیان کیا۔ اس بارے میں اسے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کسی کی ہیبت حق کہنے یا حق کو قائم کرنے سے نہ روکے جہاں بھی ہو (1)۔ قرآن حکیم میں ہے: یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ (المائدہ: 54) (جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، فاتقونی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، سہل بن عبداللہ نے کہا: وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ تمہارے بارے میں مجھے ازلی علم ہے اس لئے مجھ سے ڈرو۔ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝ یہ استدراج اور تدبیر کے مقام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (اعراف) (ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (الاعراف) (پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) کسی نبی اور صدیق کا استثناء نہیں فرمایا۔

وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ، اللبس کا معنی خلط ملط ہونا ہے۔ لبست علیه الامر والبسه یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس کی دلیل کو اس کی مشکل کے ساتھ ملا دے اور اس کے حق کو اس کے باطل کے ساتھ ملا دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ۝ (الانعام)

و لی الامر لبسۃ، یعنی امر واضح نہیں ہے۔ اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے جو آپ نے حارث بن حوط کو کہا تھا: یاحارث انه ملبوس علیك ان الحق لایعرف بالرجال اعرف الحق تعرف اهله۔ اے حارث! معاملہ تجھ پر خلط ملط ہو گیا ہے حق مردوں کے ساتھ نہیں پہچانا جاتا میں حق کو پہچانتا ہوں تو حق والوں کو پہچانتا ہے۔

خنساء نے کہا تھا:

ترى الجليس يقول الحق تحسبه ... رُشداً و هيهات فانظر ما به التبسا

صدّق مقالتهٔ واحذر عداوته ... والبس عليه اموراً مثل مالبسا

تو دوست کو دیکھتا ہے کہ وہ حق کہہ رہا ہے تو اسے ہدایت گمان کرتا ہے دیکھ اس کے ساتھ جو کچھ اس نے ملا دیا۔ اس کی بات کی تصدیق کر اور اس کی عداوت سے محتاط ہو جا اور تو بھی اس پر امور کو ملتبس کر دے جس طرح اس نے التباس کیا۔

عجاج نے کہا

لما لبسن الحق بالتجنی ... غنین واستبدلن زیداً منی

سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے: وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ یعنی یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ ملتبس نہ

1۔ کنز العمال، حدیث 5567۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف النهی عن المنکر، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا دین وہ ہے جس کے علاوہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اور اس کے بغیر جزا نہیں دیتا وہ دین اسلام ہے، یہودیت و نصرانیت بدعت ہے وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ عنترہ کے قول سے یہ معنی ظاہر ہے:

وكتيبة لبستها بكتيبة

کتنے لشکر ہیں جن کو میں نے دوسرے لشکروں کے ساتھ ملا دیا۔

یہ اسی مفہوم میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لباس سے ہو۔ آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نہ ڈھانپو۔ اسی سے لبس الثوب ہے، کپڑے کا پہننا۔ کہا جاتا ہے: لَبِستُ الثوبَ اَلْبَسُه۔ لباس الرجل زوجتهٗ، مرد کا لباس اس کی بیوی ہے اور زوجها لباسها۔ اور مرد اپنی بیوی کا لباس ہے۔ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجيع ثنى جيدها تثنت عليه فكانت لباسًا

جب سونے والے نے اپنی بیوی کی گردن کو دوہرا کیا تو وہ اس پر لپٹی اور وہ اس کا لباس تھی۔

اخطل نے کہا:

وقد لبست لهذا الامر اعصره حتى تجلل راس الشيب فاشتعلا

اس امر کی وجہ سے میں نے اس کا زمانہ ڈھانپ لیا حتیٰ کہ میرے سر میں بڑھاپا ظاہر ہو گیا۔

اللبوس۔ کپڑے اور زرہ میں سے جو پہنا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80)

ولا لبست فلاناً حتى عرف باطنه۔ میں فلاں سے چمٹا رہا حتیٰ کہ میں نے اس کا باطن پہچان لیا۔

وفی فلان ملبسٌ۔ فلاں لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے۔ شاعر نے کہا:

الا انّ بعد العدم للمرء قنوة و بعد المشيب طول عمر و ملبسا

خبردار! آدمی کے لئے فقدان کے بعد لباس ہوتا ہے اور بڑھاپے کے بعد لمبی عمر اور لباس ہوتا ہے۔

لِبس الكعبة والهودج۔ کعبہ اور ہودج کا کپڑا۔ لباس

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ باطل کلام عرب میں حق کے خلاف کو کہتے ہیں اس کا معنی زائل کرنا ہے۔ لبید نے کہا:

الا كل شئ ما خلا الله باطل خبردار! ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سوا زوال پذیر ہے۔

بطل الشیء يبطل بُطلًا و بطولًا و بطلانًا۔ چیز ضائع ہو گئی، خسارے میں چلی گئی۔ ابطله غيره، دوسری چیز نے اسے زائل کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ذهب دمهٗ بطلاً یعنی اس کا خون رائیگاں گیا...... الباطل شیطان کو کہتے ہیں۔ البطل بہادر آدمی۔ اس کو البطل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے کی شجاعت کو زائل کر دیتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

لهم لواء بايدى ماجد بطل لا يقطع الخرق الا طرفه سامى

ان کا جھنڈا بہادر آدمی کے ہاتھوں میں ہے، وہ پھٹا نہیں ہے مگر اس کی بلند طرف۔

المرأة بطلةٌ۔ عورت بہادر ہے۔ قد بطل الرجل (طا کے ضمہ کے ساتھ) يبطل بطولة و بطالةً۔ یعنی وہ شخص بہادر ہو

گیا۔ بَطَل (بفتحہ طاء) بطالۃً یعنی معطل ہو گیا فھو بطالٌ۔

اہل تاویل کا اَلْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے مراد میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے جو تمہارے پاس کتاب میں حق ہے اسے باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یعنی اس سے مراد تغیر و تبدل کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہود نے کہا: محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے لیکن ہماری طرف نہیں ان کا نبی کریم ﷺ کی بعثت کا اقرار کرنا اور ان کی طرف بعثت کا انکار کرنا باطل ہے۔ ابن زید نے فرمایا: اَلْحَقَّ سے مراد تورات ہے اور باطل سے مراد وہ ہے جو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کے ذکر کو بدلا۔ مجاہد نے کہا: یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ نہ ملاؤ (1)۔ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس کا قول زیادہ درست ہے، کیونکہ وہ عام ہے اس میں تمام اقوال جمع ہیں۔ واللہ المستعان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ یہ جائز ہے کہ یہ تَلْبِسُوا پر معطوف ہو اور یہ مجزوم ہو، اور اس کا اَنْ کے اضمار کے ساتھ منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: لَا يَكُنْ مِنْكُمْ لُبْسُ الْحَقِّ وَكِتْمَانُهُ یعنی اگر تم حق کو چھپاتے ہو تو تمہاری طرف سے حق کا التباس اور چھپانا نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے امر کو چھپانا ہے حالانکہ وہ آپ ﷺ کو جانتے تھے۔ محمد بن سیرین نے کہا حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ایک جماعت یثرب میں آکر اتری جب بنی اسرائیل کو دشمن کے غلبہ اور ذلت کا سامنا ہوا تھا۔ یہی گروہ اس وقت تورات کا حامل تھا وہ یثرب میں ٹھہر گئے اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کے درمیان حضرت محمد ﷺ ظاہر ہوں گے وہ آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے، جب وہ بزرگ چلے گئے جو مومنین میں سے تھے پھر ان کی نسل سے لوگ آئے انہوں نے حضرت محمد ﷺ کا زمانہ پایا اور انہوں نے آپ کا انکار کیا حالانکہ وہ آپ ﷺ کو پہچانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حال ہے یعنی تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ حق ہیں اور ان کا کفر عناد کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے علم کی گواہی نہیں دی بلکہ انہیں اس سے منع فرمایا کہ جو وہ جانتے ہیں اسے نہ چھپائیں۔ یہ دلیل ہے کہ اسے سخت گناہ ہوتا ہے جو جانتے ہوئے گناہ کرتا ہے وہ جاہل سے زیادہ نافرمان ہوتا ہے۔ مزید بیان اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (البقرہ: 44) کے تحت آئے گا۔

## وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوۃ اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ امر ہے اور وجوب کے لئے ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اقامۃ الصلوۃ اور اس کے اشتقاق اور اس کے تفصیلی احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یہ امر بھی وجوب کے لئے ہے۔ الایتاء کا مطلب عطا کرنا ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

آتیتہ، کا معنی آعطیتہ میں نے اسے عطا کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ:75) (اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے)۔

آتیتہ۔ قصر کے ساتھ بغیر مد کے ہے اس کا معنی ہے میں اس کے پاس آیا۔ جب اتی استقبال کے معنی میں ہو تو مد کیساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: لآتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا خبرنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور آپ کو یہ بتاؤں گا(1)۔ تفصیل سے یہ حدیث آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3**: زکاۃ یہ زکا الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چیز میں اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے۔ زکا الزرع، والمال یزکو جب کھیتی زیادہ ہوا اور مال بڑھ جائے۔ رجل زکی زیادہ خیر والے شخص کا مال نکالنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے ظاہراً مال میں کمی ہوتی ہے لیکن برکت کے ساتھ یا اجر کے ساتھ مال بڑھتا ہے جس اجر کے ذریعے زکوٰۃ دینے والے کو ثواب دیا جاتا ہے(2)۔ کہا جاتا ہے: زرعٌ زاکٍ بیّن الزکاء۔

زکأت الناقۃ بولدھا تزکابہ۔ جب اونٹنی اپنا بچہ اپنی ٹانگوں کے درمیان پھینک دے۔ زکا الفرد جب طاق، جفت بن جائے۔ شاعر نے کہا:

کانوا خسًا او زکًا من دون اربعۃ　　لم یخلقوا وجدود الناس تعتلج

وہ طاق تھے یا جفت تھے چار سے کم تھے، انہوں نے پیدا نہیں کیا اور لوگوں کے بخت بلند تھے۔

جدؤ جمع ہے جَدّ کی اس کا معنی حصہ اور بخت ہے تعتلج کا معنی بلند ہونا ہے۔

اعتلجت الارض جب زمین کی کھیتی بڑی ہو جائے۔ فخساً سے مراد طاق اور زکاً سے مراد جفت ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ کا معنی اچھی تعریف ہے۔ اسی سے ہے: زکی القاضی الشاھد قاضی نے گواہ کی تعریف کی۔ پس جو زکاۃ نکالتا ہے اسے اچھی تعریف حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ تطہیر کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے زکا فلان یعنی فلاں غافل کرنے اور تنقید کی میل سے پاک ہوا۔ پس گویا مال کی زکاۃ نکالنے والا اپنے آپ کو اس حق کے بوجھ سے پاک کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مال میں مساکین کے لئے رکھا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ کے مال کو لوگوں کا میل کہا ہے(3)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ:103) (اے حبیب وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے)۔

**مسئلہ نمبر 4**: یہاں زکاۃ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکاۃ ہے کیونکہ یہ نماز سے متصل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد صدقہ فطر ہے، یہ امام مالک کا قول ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب القراۃ فی العشاء، صفحہ 187، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، باب من شکی امامہ، حدیث نمبر 664، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: پہلا قول اکثر علماء کا ہے۔ الزَّكٰوةَ قرآن میں مجمل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بیان فرمایا ہے۔ ائمہ نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دانوں اور کھجوروں میں صدقہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ بخاری نے کہا: خمس اواق من الورق۔(1) یعنی چاندی میں سے پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس زمین کو آسمان کا پانی یا چشموں کا پانی سیراب کرے یا وہ کھجور کے درخت جو اس بارش کے پانی سے سیراب ہوتے ہوں جو ان کے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہو، اور وہ کھیتی جو کنوؤں سے سینچی گئی ہو اس میں بیسواں حصہ ہے (2)۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گی اور سورہ برأت میں سونے اور جانوروں کی زکاۃ کا ذکر آئے گا، اور اس مال کا بیان جس سے زکاۃ وصول نہیں کی جاتی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ:103) کے تحت آئے گا۔

رہی زکاۃ الفطر کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی نص نہیں ہے مگر جو امام مالک نے تاویل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ (اعلیٰ) (بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور اپنے رب کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا)۔

مفسرین نے اس پر کلام سورۃ الاعلیٰ میں فرمائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر کلام اسی سورۂ بقرہ میں روزوں کی آیات کے تحت ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان میں زکاۃ الفطر فرض فرمائی اور اس حدیث کا ذکر آئندہ آئے گا اور اس زکاۃ کی نسبت رمضان کی طرف کی۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَارْكَعُوْا لغت میں رکوع کا معنی کسی شخص کا جھکنا ہے، ہر جھکنے والا رکوع کرنے والا ہے۔ لبید نے کہا:

اخبّر اخبار القرون التی مضت ادبّ کانی کلما قمت راکع (3)

مجھے گزشتہ قوموں کی خبر دی گئی تو میں رینگ کر چلنے لگا گویا میں جھکنے والا ہوں جب میں کھڑا ہوا۔

ابن درید نے کہا: الرکعة زمین میں گڑھے کو کہتے ہیں یہ یمنی لغت ہے۔ بعض نے فرمایا: جھکنا، رکوع اور سجود کو شامل ہے، کسی منزل میں جھکنے کے لئے عاریۃً استعمال کیا جاتا ہے۔

ولا تعاد الضعیف علك ان ترکع یومًا والدھر قد رفعه (4)

تو کسی کمزور پر زیادتی نہ کر۔ شاید کبھی تو جھک جائے اور زمانہ اسے بلند کر دے۔

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکاۃ، باب لیس فیما دون خمسة اوسق صدقة، حدیث 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء والماء الجاری، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 4۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 6**: خصوصی طور پر رکوع کے ذکر کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: رکوع کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ نماز کے ارکان میں سے ہے، اس سے مراد پوری نماز ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صرف رکوع کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ شرع نے قراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح سجدہ سے ایک رکعت مراد لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (اسراء: 78) یعنی فجر کی نماز۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من ادرك سجدۃ من الصلاۃ فقد ادرك الصلاۃ۔ (1) یعنی جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، اہل حجاز رکعت پر سجدہ کا اطلاق کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رکوع کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا کیونکہ لوگوں پر زمانہ جاہلیت میں رکوع زیادہ بھاری تھا حتیٰ کہ بعض لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا...... میرا خیال ہے وہ عمران بن حصین تھا...... انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میں جھکوں گا نہیں مگر کھڑا ہو کر، یعنی میں رکوع نہیں کروں گا جب اسلام ان کے دل میں راسخ ہو گیا اور ان کا نفس اس سے مطمئن ہو گیا تو انہوں نے رکوع کے حکم کی پیروی کی۔

**مسئلہ نمبر 7**: رکوع شرعی یہ ہے کہ آدمی اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرے اور اپنی پیٹھ اور گردن کو لمبا کرے اور اپنی ہاتھ کی انگلیوں کو کھولے اور ان سے اپنے گھٹنوں کو پکڑے پھر اطمینان سے رکوع کرے اور سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہے اور یہ کم از کم مقدار ہے۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کے ساتھ نماز شروع فرماتے تھے۔ قراءت اَلْحَمْدُ سے شروع کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو نہ زیادہ اونچا رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے بلکہ درمیان میں رکھتے تھے (2)۔ بخاری نے حضرت ابوحمید ساعدی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرتے (3)۔

**مسئلہ نمبر 8**: رکوع فرض ہے۔ یہ قرآن وسنت سے ثابت ہے اسی طرح سجدہ بھی فرض ہے کیونکہ سورۃ حج کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج: 77) سنت نے اس میں طمانیت اور ان کے درمیان فاصلہ کا اضافہ کیا اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکی ہے اور رکوع کا طریقہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اور رہا سجدہ تو وہ بھی حضرت ابوحمید ساعدی کی حدیث میں وضاحت کے ساتھ آ چکا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر ٹکاتے تھے اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے تھے (4)۔ اسی حدیث کو امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدہ میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب من ادرك ركعة من الصلوٰۃ فقد ادرك تلك الصلوٰۃ، صفحہ 221، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفة الصلوٰۃ و ما يفتتح به الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوٰۃ، باب سنة الجلوس فی التشهد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی السجود على الجبهة والانف، صفحہ 36، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اپنے بازو کتے کی طرح نہ پھیلائے (1)۔ حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو سجدہ کرے تو اپنی ہتھیلیوں کو رکھ اور اپنی کہنیوں کو بلند کر (2)۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں کو پھیلاتے تھے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اور جب بیٹھتے تھے تو اپنی بائیں ران پر بیٹھتے تھے (3)۔

**مسئلہ نمبر 9**: اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس نے سجدہ میں اپنی پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا، امام مالک نے فرمایا: وہ اپنی پیشانی اور ناک پر سجدہ کرے۔ ثوری اور احمد کا یہی قول ہے۔ نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

امام احمد نے فرمایا: صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ جائز نہیں۔ یہی قول ابوخیثمہ اور ابن ابی شیبہ کا ہے۔ اسحاق نے کہا: اگر ایک چیز پر سجدہ کیا تو ایسا کرنے والے کی نماز فاسد ہے۔ امام اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز نے یہی فرمایا۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ تمام نے ناک پر سجدہ کا حکم دیا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پیشانی پر سجدہ کافی ہے جبکہ ناک نہ بھی لگے۔ یہ قول حضرات عطا، طاؤس، عکرمہ، ابن سیرین اور حسن بصری کا ہے۔ یہی قول شافعی، ابو ثور، یعقوب اور محمد کا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ایک کہنے والے نے کہا: اگر پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا تو اس نے برا کیا لیکن اس کی نماز مکمل ہے۔ یہ نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں نہیں جانتا جس نے پہلے اس قسم کا قول کیا اور نہ بعد والے کسی کو جانتا ہوں جس نے ایسا قول کیا ہو۔

میں کہتا ہوں: سجدہ میں صحیح پیشانی اور ناک کا رکھنا ہے۔ اس کی دلیل ابو حمید کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ پیشانی پر۔ اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر اور دونوں پیروں کی اطراف پر۔ ہم کپڑے اور بال جمع نہیں کرتے (4)۔ یہ تمام نماز کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پس یہ قول متعین ہو گیا۔ واللہ اعلم

امام مالک سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ ناک لگائے بغیر صرف پیشانی پر سجدہ کو جائز قرار دیتے تھے جیسا کہ عطا اور شافعی کا قول ہے۔ ہمارے نزدیک مختار پہلا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک سجدہ جائز نہ ہوگا جب تک پیشانی پر سجدہ نہیں کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**: پگڑی کے پلو پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ اگر وہ ایسا کپڑا ہو جیسے وہ کپڑے ہوتے ہیں جو گھٹنوں اور قدموں کو ڈھانپ دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں افضل یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کرے یا ایسی چیز پر سجدہ کرے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے اگر وہاں کوئی ایسی چیز ہو جو اذیت دیتی ہو تو نماز میں داخل ہونے سے پہلے اسے زائل کر دے اگر پہلے ایسا نہ کیا ہو تو ایک

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاعتدال فی السجود ووضع الکفین علی الارض، صفحہ 193، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ، صفحہ 194، جلد 1

3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب السجود علی الانف، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرتبہ اسے برابر کر دے۔

مسلم نے حضرت معیقیب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے فرمایا جو سجدہ کرتے وقت مٹی برابر کرتا ہے۔ فرمایا: اگر تو نے ایسا کرنا ہے تو ایک مرتبہ کر لو (1)...... حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم سخت گرمی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ جب ہم سے کوئی زمین پر اپنی پیشانی نہیں رکھ سکتا تھا تو وہ اپنا کپڑا بچھاتا تھا اور اس پر سجدہ کرتا تھا (2)۔

**مسئلہ نمبر 11**: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج: 77) تو ہمارے علماء نے فرمایا: رکوع و سجود میں سے وہ کافی ہے جسے رکوع و سجود کہا جائے۔ اسی طرح قیام کا حکم ہے انہوں نے اس میں طمانیت کو شرط قرار نہیں دیا، اور انہوں نے اس کم از کم کو لیا ہے جس پر رکوع و سجود کا اطلاق ہو سکے۔ گویا انہوں نے نماز کے لغو ہونے کے متعلق ثابت شدہ احادیث سنی ہی نہیں۔ ابن عبد البر نے کہا: رکوع، سجود، رکوع کے بعد وقوف، دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز ہی نہیں حتیٰ کہ آرام سے رکوع کرے، آرام سے وقوف کرے، آرام سے سجدہ کرے اور آرام سے بیٹھے۔ حدیث میں یہی صحیح ہے۔ یہ جمہور علماء اور اہل نظر کا نظریہ ہے۔ ابن وہب اور ابو مصعب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: ابن قاسم سے فصل کے وجوب اور طمانیت کے سقوط کی روایات کثرت سے ہیں اور یہ وہم عظیم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے طمانیت سے ہر رکن کو ادا کیا اس کا حکم بھی دیا اور اس کی تعلیم بھی دی۔ اگر ابن قاسم کے لئے عذر ہو کہ وہ اس پر مطلع نہیں تھا تو تمہارے لئے کوئی عذر نہیں جبکہ علم تم تک پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ تم پر حجت قائم ہوئی۔ نسائی، دار قطنی، علی بن عبد العزیز نے حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا۔ مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی۔ جب نماز پڑھ لی تو وہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور لوگوں کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ، نماز پڑھو تم نے (پہلے صحیح) نماز نہیں پڑھی۔ وہ شخص دوبارہ نماز پڑھنے لگا ہم اس کی نماز کو تاڑتے رہے ہم نہیں جانتے تھے کہ کس وجہ سے اس کی نماز معیوب ہوئی ہے۔ پھر جب وہ آیا نبی کریم ﷺ اور لوگوں پر سلام کیا تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور نماز پڑھو تم نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی۔ ہمام نے کہا: ہم نہیں جانتے یہ امر اس کے ساتھ دو دفعہ ہوا یا تین دفعہ۔ اس شخص نے عرض کی: میں نے اب تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے مجھ پر میری نماز کی وجہ سے کیوں عیب لگایا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ وضو کو مکمل کرے جس طرح اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اپنے چہرے کو دھوئے اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے، اپنے سر کا مسح کرے اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوئے پھر تکبیر کہے۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے پھر سورۃ الحمد پڑھے اور قرآن حکیم میں سے جو میسر ہو وہ پڑھے پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، رکوع میں اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھے حتیٰ کہ اس کے جوڑ مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب کراهة مسح الحصى و تسوية التراب في الصلوٰة، صفحہ 205، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود على الثوب في شدة الحر، حدیث 372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور سیدھا کھڑا ہو جائے حتیٰ کہ اس کی پیٹھ سیدھی ہو جائے اور ہر جوڑ اپنی جگہ پر آ جائے، پھر تکبیر کہے اور سجدہ کرے اور اپنے چہرے کو زمین پر رکھے۔ ہمام نے کہا: کبھی کہتے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھے حتیٰ کہ اس کے مفاصل مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو جائے، پھر تکبیر کہے اور اپنی مقعد پر بیٹھ جائے اور اس کی پیٹھ سیدھی ہو۔ چاروں رکعتوں کا اس طرح وصف بیان فرمایا یہاں تک کہ فارغ ہو گئے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ اس طرح نماز پڑھے۔ اس کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ کتاب اللہ میں مجمل نماز کا بیان ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا ہے اور ساری امت کو پہنچایا ہے۔ پس جو اس بیان سے واقف نہیں اور اس نے کمی کی جو رحمن نے اس پر فرض کیا اور اس نے پیروی نہ کی اس امر کی جو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پہنچا وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہے **فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ** (مریم:59) اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

بخاری نے حضرت زید بن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع وسجود مکمل نہیں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ نے اسے فرمایا: تو نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی اگر تو (اسی حالت میں) مرے گا تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا (1)۔

**مسئلہ نمبر 12:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ، مَعَ کا لفظ معیت اور جمعیت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: ابتدا میں نماز کا امر جماعت کے ساتھ حاضری کا تقاضا نہیں کرتا تھا تو مَعَ کے قول کے ساتھ جماعت کی حاضری کا حکم دیا۔ جماعت کے ساتھ حاضر ہونے کے متعلق علماء کے دو مختلف اقوال ہیں: جمہور کا نظریہ یہ ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنن موکدہ سے ہے اور جو بغیر کسی عذر کے جماعت سے پیچھے رہتا ہے اس پر سزا واجب ہے اور بعض اہل علم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ تمام مساجد کا جماعت سے خالی ہونا جائز نہیں۔ جب مسجد میں جماعت کھڑی ہو جائے تو گھر میں منفرد کی نماز جائز ہو گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجے افضل ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے (3)۔ داؤد نے کہا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے جیسے جمعہ فرض ہے اور داؤد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: لا صلاۃ لجار المسجد الا فی المسجد مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی جائز ہے۔ ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبدالحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرات عطا بن ابی رباح، احمد بن حنبل، ابو ثور وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا:

---

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا لم یتم السجود، حدیث 376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، صفحہ 231، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

میں کسی شخص کو جماعت ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر قادر ہو مگر عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑ سکتا ہے یہ ابن منذر نے ان کا قول حکایت کیا ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: نبی کریم ﷺ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میرا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لے آئے، اس نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تا کہ آپ اسے رخصت دے دیں اور وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس چلا گیا تو اسے پھر بلایا اور فرمایا: کیا تو نماز کی اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر جواب دے (1) کہ (یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کر) ابو داؤد کے الفاظ اس حدیث میں یہ ہیں ''میں تیرے لئے رخصت نہیں پاتا'' اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: سائل عبداللہ بن ام مکتوم تھے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے اسے کوئی عذر مانع نہ ہو...... صحابہ نے پوچھا: عذر کیا ہے؟ فرمایا خوف یا مرض...... اس کی نماز قبول نہ ہوئی جو اس نے پڑھی (2)۔ ابو محمد عبدالحق نے کہا: اس حدیث کو مغراء العبدی نے روایت کیا ہے۔ صحیح حضرت ابن عباس پر موقوف ہے جس نے اذان سنی اور (جماعت کے ساتھ) نہ آیا تو اس کی نماز نہیں۔ قاسم بن اصبغ نے اپنی کتاب میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جواب نہ دیا (یعنی جماعت کے ساتھ حاضر نہ ہوا) تو اس کی نماز نہیں مگر یہ کہ اسے عذر ہو (3)۔ اس سند کے ساتھ تیرے لئے اس کی صحت کافی ہے۔ مغراء العبدی سے ابو اسحاق نے روایت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ہم نے دیکھا کہ جماعت سے پیچھے نہیں رہتا مگر ایسا منافق جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے (4)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارے اور منافقین کے درمیان فرق عشاء اور صبح کی جماعت کی حاضری ہے۔ منافقین ان نمازوں میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتے (5)۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے کئی اصحاب نبی ﷺ سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور بغیر عذر کے جواب نہ دیا اس کی نماز نہیں (6)۔ ان صحابہ میں حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے جوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے اکٹھے کریں پھر میں ان لوگوں کے پاس آؤں جنہوں نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی جبکہ انہیں کوئی بیماری بھی نہیں ہے تو میں ان پر ان کے گھر جلا دوں (7)۔ یہ ان کی دلیل ہے جنہوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض قرار دیا یہ وجوب میں ظاہر ہے۔ جمہور علماء نے جماعت کے ساتھ نماز کی حاضری کی تاکید پر محمول کیا ہے اور صحابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و موضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ و بیان التشدید فی التخلف عنہ، صفحہ 232، جلد 1
2۔ سنن دار قطنی، صفحہ 421، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ)
3۔ ایضاً صفحہ 420، جلد 1
4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ و بیان التشدید فی التخلفہ عنہ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ موطا امام مالک، صفحہ 114
6۔ سنن دار قطنی، صفحہ 420، جلد 1 (دار المحاسن)
7۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فی ترک الجماعۃ، حدیث نمبر 462، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے اقوال اور حدیث لا صلوۃ لہ (اس کی نماز نہیں) کو کمال اور فضیلت پر محمول کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن ام مکتوم کو فَاَجِبْ کا امر کرنا استحباب پر محمول کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقد هممت (میں نے ارادہ کیا) یہ حتمی وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ نے ارادہ فرمایا لیکن ایسا کیا نہیں۔ آپ نے یہ ارشاد غافلوں کو وعید اور تہدید کے طور پر ذکر فرمایا جو جماعت اور جمعہ سے رہ جاتے ہیں۔ اس معنی کو مسلم کی روایت بھی بیان کرتی ہے جو حضرت عبد اللہ نے روایت کی ہے، فرمایا: جسے یہ بات خوش کرے کہ وہ کل اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر ملے تو اسے ان نمازوں کی حفاظت کرنی چاہئے جہاں بھی ان کی ندا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لئے سنن ہدیٰ کو مشروع کیا ہے اور یہ نمازیں (جماعت کے ساتھ پڑھنا) سنن ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جس طرح یہ شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے اور اگر تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص اچھی طرح طہارت کرے پھر کسی مسجد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کے بدلے ایک گناہ معاف فرماتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے جماعت سے ایسا منافق پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معلوم ہوتا تھا۔ ایک شخص کو لایا جاتا تھا جبکہ وہ دو شخصوں کے سہارے پر ہوتا تھا حتیٰ کہ اسے صف میں کھڑا کیا جاتا تھا(1)۔

حضرت عبد اللہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ جماعت کے ساتھ شریک ہونا سنن ہدیٰ میں سے ایک سنت ہے اور اس کا ترک کرنا گمراہی ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابو الفضل عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سنن کے ظاہر کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں کے بارے میں اختلاف ہے کیا ان سے جنگ کی جائے گی یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ ایسے عمل پر ان سے قتال کیا جائے گا کیونکہ سنن ہدیٰ کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنا انہیں ختم کرنے کے مترادف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر حجت قائم اور ظاہر ہو جائے تو منفرد کی نماز جائز اور صحیح ہو گی۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کی نماز جماعت کے ساتھ گھر میں اور بازار میں اس کی نماز سے بیس سے زائد درجے بلند ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور اس کا ارادہ فقط جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہوتا ہے تو جو وہ قدم اٹھاتا ہے اس کے بدلے اس کے لئے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مسجد میں داخل ہو جائے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے جب تک اسے نماز روکے ہوئے ہوتی ہے وہ نماز میں ہی شمار ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس جگہ میں ہوتا ہے جہاں سے اس نے نماز پڑھی ہوتی ہے۔ فرشتے یہ کہتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر نظر رحمت فرما، یہ دعا کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ اس مجلس میں تکلیف نہیں دیتا (یعنی) جب تک اسے حدث لاحق نہیں ہوتا (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حدث سے کیا مراد ہے؟

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوۃ الجماعۃ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ و فضل انتظار الصلوٰۃ و کثیرۃ الخطا الخ، صفحہ 234، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اس کی ہوا آہستہ خارج ہو یا بلند آواز سے خارج ہو۔

**مسئلہ نمبر 13**: جماعت کی طرف جو فضیلت منسوب کی گئی ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فقط جماعت کے لئے ہے جہاں بھی ہو یا یہ فضیلت اس جماعت کی ہے جو مسجد میں ہوتی ہے، کیونکہ یہ فضیلت ایسے افعال کے ساتھ لازم ہے جو مساجد کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث پاک میں بیان ہوا ہے۔ علماء کے اس کے متعلق دو قول ہیں: پہلا زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ جماعت وہ وصف ہے جس پر حکم معلق کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسجد کی طرف زیادہ قدم چل کر جانا، مسجد کی طرف آنا، مسجد میں بیٹھنا یہ جماعت کی فضیلت کے علاوہ زیادہ ثواب ہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 14**: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ایک جماعت دوسری جماعت سے کثرت تعداد اور امام کی فضیلت کی وجہ سے فضیلت رکھتی ہے یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں۔ ابن حبیب نے فرمایا: فضیلت رکھتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور ایک شخص کا دو آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو تعداد زیادہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے نقل کی ہے، اس کی سند میں کمزوری ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: جس نے ایک جماعت سے نماز پڑھ لی ہو وہ وہی نماز دوسری جماعت سے دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب نے فرمایا: وہ شخص جو تنہا اپنے گھر میں یا کسی اور جگہ نماز پڑھ چکا ہو وہ امام کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اگرچہ وہ جماعت تھوڑی بھی ہو وہ زیادہ تعداد والی جماعت یا کم والی جماعت کے ساتھ نماز دوبارہ نہ پڑھے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور داؤد بن علی نے فرمایا: جو ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ نماز اگر چاہے تو دوسری جماعت کے ساتھ پڑھ لے کیونکہ یہ نفل اور سنت ہو جائے گی۔

یہی بات حضرات حذیفہ بن یمان، ابوموسیٰ اشعری، انس بن مالک، صلہ بن زفر، شعبی اور نخعی سے مروی ہے۔ حضرت حماد بن زید اور حضرت سلیمان بن حرب کا بھی یہی قول ہے۔

امام مالک نے اس قول سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک نماز ایک دن میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جائے گی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: دوبارہ نماز نہ پڑھو۔ یہ قول حضرت سلیمان بن یسار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ احمد اور اسحاق نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ایک فرض پڑھے پھر وہ کھڑا ہو اور دوبارہ اسی فرض کی نیت سے دوبارہ پڑھے، لیکن جب وہ امام کے ساتھ سنت یا نفل کی نیت سے پڑھے گا تو وہ نماز کا اعادہ نہیں ہوگا۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 82، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب فی فضل الصلوۃ الجماعۃ، حدیث 467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 416، جلد 1 (دارالمحاسن)

جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز کے اعادہ کا جماعت کے ساتھ حکم دیا تھا انہیں فرمایا تھا یہ تمہارے لئے نفل ہے(1) جیسا کہ حضرت ابوذر وغیرہ کی حدیث میں ہے۔

**مسئلہ نمبر16:** مسلم نے حضرت ابو مسعود سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: قوم کی امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کا اچھا قاری ہو، اگر قراءت میں برابر ہوں تو جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو اسلام لانے میں مقدم ہو۔ کوئی شخص دوسرے کی سلطنت میں امامت نہ کرائے اور اس کے بیٹھنے کی جگہ پر نہ بیٹھے مگر یہ کہ وہ اسے اجازت دے(2)۔ ایک روایت میں اسلام میں مقدم ہونے کی جگہ، عمر میں بڑا ہونے کا ذکر ہے، یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے، فرمایا: شعبہ نے فرمایا: میں نے اسماعیل سے پوچھا: حدیث میں جو تکرمتہ کے الفاظ آئے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس کا بچھونا (اس کے بیٹھنے کی جگہ) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: حضرت ابو مسعود کی حدیث حسن صحیح ہے اس پر اہل علم کا عمل ہے۔

علماء نے فرمایا: امامت کا سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جو کتاب اللہ (قرآن) کا زیادہ قاری ہو اور سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور علماء نے فرمایا: گھر کا مالک امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض نے فرمایا: جب گھر کا مالک دوسرے کو اجازت دے دے تو دوسرے کے امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں، بعض نے اس کو ناپسند کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ گھر کا مالک امامت کرائے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ ہم نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نوجوان کو امامت کے لئے مقدم کیا اور فرمایا: میں قرآن کو مقدم کرتا ہوں۔ جنہوں نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ کرائے جو قرآن کا بڑا قاری ہو، ان میں حضرات ابن سیرین، ثوری، اسحاق اور اصحاب الرائے ہیں۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ قول سنت کے موافق ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ شخص مقدم ہو جو زیادہ علم والا ہو جبکہ اس کی حالت اچھی ہو اور عمر کا بھی حق ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: وہ امامت کرائے جو زیادہ فقیہ ہو، اسی طرح امام شافعی اور ابوثور نے فرمایا جبکہ وہ قرآن پڑھ سکتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقیہ نماز میں لاحق ہونے والے حوادث کو زیادہ جانتا ہے اور انہوں نے حدیث کی اس طرح تاویل کی ہے کہ صحابہ میں سے بڑا قاری بڑا فقیہ بھی ہوتا تھا کیونکہ وہ قرآن میں سمجھ حاصل کرتے تھے اور صحابہ کے عرف میں فقہاء کو قراء کہا جاتا تھا اور انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر کو ان کے فضل و علم کی وجہ سے مقدم فرمایا۔

اسحاق نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اس لئے مقدم فرمایا تاکہ یہ دلیل بن جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے، یہ ابو عمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیا ہے۔ ابوالبزار نے اپنی حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب تم سفر کرو تو تم میں سے جو بڑا قاری ہو وہ تمہاری امامت کرائے اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا بھی ہو، جب وہ تمہاری امامت کرائے گا تو وہ تمہارا امیر ہوگا(3)؟ فرمایا: ہم نہیں جانتے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے

---

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 413، جلد 1 (دارالمحاسن)　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ کنزالعمال، حدیث نمبر 17501

روایت کی گئی ہے مگر حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس سند کے ساتھ۔

میں نے کہا: چھوٹے کی امامت جائز ہے جب وہ قاری ہو۔ صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم ایک چشمہ پر رہتے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر تھا۔ ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے تو ہم ان سے پوچھتے تھے کہ لوگوں کا کیا بنا، وہ شخص (جس نے نبوت کا اعلان کیا ہے) وہ کون ہے؟ لوگ کہتے ہیں: وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے اور اس کی طرف ایسی ایسی وحی کی ہے ایسی ایسی وحی کی ہے میں وہ کلام یاد کر لیتا تھا گویا وہ میرے سینے میں کلام جم جاتا تھا۔

عرب لوگوں کے اسلام لانے کے منتظر تھے۔ وہ کہتے تھے: اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آجائے گا تو وہ سچا نبی ہوگا۔ جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام قبول کرنے میں جلدی کی۔ میرے باپ نے اپنی قوم کے اسلام کے لئے جلدی کی، جب وہ آئے تو کہا: یقیناً میں تمہارے پاس اللہ کے نبی کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم اس وقت میں اس طرح نماز پڑھو۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان دے اور جو تم میں سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرائے۔ پس لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی قرآن پڑھنے والا نہیں کیونکہ میں قافلوں میں ملتا تھا (اور ان سے قرآن سن کر یاد کر لیتا تھا)۔ پس لوگوں نے مجھے امامت کے لئے آگے کیا۔ جب کہ میری عمر چھ یا سات سال تھی میرے اوپر ایک چادر ہوتی تھی جب میں سجدہ کرتا تھا تو وہ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی ایک عورت نے آواز دی: کیا تم اپنے قاری کی شرمگاہ نہیں ڈھانپو گے؟ پس لوگوں نے میرے لئے ایک قمیص خرید دی مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ مجھے اس قمیص کی وجہ سے ہوئی تھی (1)۔ جن علماء نے نابالغ بچے کی امامت جائز قرار دی ہے ان میں حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے جب کہ بچہ نماز کو سمجھتا ہو اور نماز پڑھا سکتا ہو، کیونکہ وہ بچہ بھی اس ارشاد میں داخل ہے "قوم کی امامت بڑا قاری کرائے (2)"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کی استثنا نہیں فرمائی۔ ان علماء نے حجت عمرو بن سلمہ کی حدیث کو بنایا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول ہے: وہ باقی تمام نمازوں کی امامت کرائے لیکن جمعہ کی امامت نہ کرائے، وہ اس سے پہلے فرماتے تھے: جس کی امامت فرض نماز میں جائز ہے اس کی امامت عید میں بھی جائز ہے مگر میں اس میں غیر ولی کی امامت کو ناپسند کرتا ہوں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: فرضی نماز میں بچہ امامت نہیں کرا سکتا حتیٰ کہ اسے احتلام ہو جائے مگر یہ کہ ایسی قوم ہو جن کے پاس قرآن نہ ہو (یعنی کسی کو قرآن یاد نہ ہو) تو پھر قریب البلوغ بچہ امامت کرا سکتا ہے۔ زہری نے کہا: اگر بچے کی امامت میں اضطرار ہو تو وہ ان کی امامت کرائے۔ مالک، ثوری اور اصحاب رائے نے بچے کی امامت سے ہر صورت میں منع فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**: ہر بالغ مسلمان آزاد کا مستقل امامت کرانا جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب وہ امام نماز کی حدود کو جانتا ہو اور الحمد شریف پڑھنے میں کوئی ایسی غلطی نہ کرتا ہو جو معنی میں غلطی کا باعث ہو مثلاً وہ ایاك نعبد میں کاف پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح، حدیث 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، حدیث 494، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسرہ پڑھ دے انعمت میں تا پر ضمہ پڑھ دے اور وہ طا اور ضاد میں فرق کر سکتا ہو، جو ان میں تفریق نہ کر سکتا ہو اس کی امامت صحیح نہیں کیونکہ ان دونوں کا معنی مختلف ہے۔ ان میں سے بعض نے ان تمام صورتوں میں رخصت دی ہے جبکہ وہ قراءت سے جاہل ہو اور جاہلوں کی ہی امامت کراتا ہو۔ عورت اور خنثیٰ مشکل، کافر اور مجنون اور ان پڑھ آدمی کی امامت جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ان لوگوں کا کسی صورت میں امامت کرانا جائز نہیں مگر ان پڑھ اپنے جیسوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس ان پڑھ کی امامت صحیح نہیں جو قراءت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو جبکہ کوئی قاری موجود ہو۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اگر ان پڑھ نے ان پڑھ کی امامت کرائی تو ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب ان پڑھ شخص کسی ایسی قوم کی امامت کرائے جن میں پڑھے ہوئے بھی ہوں اور ان پڑھ بھی ہوں تو تمام کی نماز فاسد ہے۔ امام ابو یوسف نے اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: امام کی نماز اور جو قرآن نہیں پڑھ سکتے ان کی نماز ہو جائے گی۔ ایک گروہ نے فرمایا: ان سب کی نماز جائز ہے کیونکہ ہر ایک اپنا فرض ادا کرنے والا ہے اور وذلک مثل المتیمم یصلی بالمتطھرین بالماء، والمصلی قاعدا یصلی بقوم قیام صلاتھم مجزئۃ فی قول من خالفنا، لأن کلا مؤد فرض نفسہ۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی تائید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی حجت پکڑی جاتی ہے "کیا نمازی نہیں دیکھتا جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیسے وہ نماز پڑھتا ہے وہ اپنے لئے نماز پڑھتا ہے (1)" مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط نہیں۔ واللہ اعلم ...... عطا بن ابی رباح فرماتے تھے: جب عورت پڑھی ہوئی ہو تو امام تکبیر کہے اور عورت قراءت کرے جب وہ قراءت سے فارغ ہو تو تکبیر کہے اور رکوع اور سجدہ کرے دراں حالیکہ عورت مرد کے پیچھے ہو اسی قسم کا مفہوم حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 18:** اندھے، لنگڑے، اشل، ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے، خصی اور غلام کی امامت میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان میں سے ہر شخص نماز کا عالم ہو۔ ابن وہب نے فرمایا: میں نہیں دیکھتا کہ ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا شخص اور اشل امامت کرائے کیونکہ وہ درجہ کمال سے ناقص ہے۔ میں اس کی امامت اس کی کمی اور نقص کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ جمہور علماء نے ان کی مخالفت کی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ کسی عضو کا فقدان نماز کے فروض میں سے کسی فرض سے مانع نہیں ہے۔ پس اس عضو کے نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ کی امامت جائز ہے جیسے آنکھ نہ ہو تو امامت جائز ہوتی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا جو لوگوں کی امامت کراتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے (2)۔ اسی طرح لنگڑے، ہاتھ کٹے ہوئے، اشل اور خصی کا قیاساً اور نظراً یہی حکم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نابینے شخص کے بارے میں فرمایا انہیں اس سے کیا حاجت ہے؟ (یعنی لوگ ان کے بارے میں یہ مسئلہ کیوں پوچھتے ہیں) حضرت ابن عباس اور حضرت عتبان بن مالک دونوں امامت

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر بتحسین الصلوٰۃ واتمامھا والخشوع فیھا، صفحہ 180، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ

کراتے تھے اور دونوں نابینے تھے، اسی پر عام علماء کا فتویٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**: ولد الزنا (حرامی) کی امامت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں اس کا ہمیشہ امام ہونا ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے۔ حضرت عطا بن ابی رباح فرماتے تھے اسے امامت کرانی چاہئے جبکہ وہ پسندیدہ (نیک) شخص ہو۔ یہ حضرات حسن بصری زہری، نخعی، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اصحاب رائے (احناف) کے نزدیک ولدالزنا کے پیچھے نماز جائز ہے لیکن دوسرا شخص ان کے نزدیک بھی بہتر ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میں ایسے شخص کو مستقل امام بنانا ناپسند کرتا ہوں جس کا باپ معروف نہ ہو لیکن جس نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائز ہوگی۔ عیسیٰ بن دینار نے کہا: ولدالزنا کی امامت کے بارے امام مالک کے قول کو نہیں اپنا تا اس بچے پر والدین کے گناہ میں سے کچھ نہیں ہے، ابن عبدالحکم نے اسی طرح فرمایا جب کہ اس میں امامت کی اہلیت نہ ہو۔ ابن منذر نے کہا: ولدالزنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عام ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرءھم،(1) لوگوں میں امامت ان میں سے اچھا قاری کرائے۔ ابوعمر نے کہا: امامت کی شرط میں وارد آثار میں کوئی ایسا اثر نہیں ہے جو نسب کی رعایت پر دلالت کرے، ان سب آثار میں فقہ، قراءت اور دین کی صلاح کا ذکر ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**: رہا غلام تو امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے مہاجرین کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے قبا کے مقام پر پہنچا تو اس کی امامت سالم کراتے تھے جو ابوحذیفہ کے غلام تھے اور انہیں قرآن زیادہ یاد تھا(2)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: سالم جو ابوحذیفہ کے غلام تھے مہاجرین اولین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی قبا کی مسجد میں امامت کراتے تھے، ان لوگوں میں حضرات ابوبکر، عمر، زید، عامر بن ربیعہ وغیرہ موجود تھے(3)۔ حضرت عائشہ کا غلام ذکوان قرآن سے دیکھ کر آپ کی امامت کراتا تھا(4)۔ ابن منذر نے کہا: ابوسعید جو ابواسید کے غلام تھے وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت کی امامت کراتے تھے ان صحابہ میں حضرات حذیفہ اور ابومسعود بھی تھے۔

غلام کی امامت کی رخصت نخعی، شعبی، حسن بصری، حکم، ثوری، شافعی، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے نے دی ہے۔ ابومجلز نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: غلام امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ قاری ہو اور اس کے ساتھ جو آزاد لوگ ہوں وہ قراءت نہ کر سکتے ہوں لیکن عید اور جمعہ کی امامت غلام نہ کرائے۔ اوزاعی کے نزدیک جائز ہے اگر وہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ ابن منذر نے کہا: غلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرءھم امامت وہ کرائے جو ان میں سے زیادہ قراءت جانتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 21**: رہی عورت تو امام بخاری نے حضرت ابوبکرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب امامۃ الاعمیٰ، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب استقضاء الموالی واستعمالھم، حدیث 6640، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہنچی کہ اہل فارس نے بنت کسریٰ کو اپنی ملکہ بنایا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جنہوں نے اپنا والی عورت کو بنایا (1)...... ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن خلاد سے انہوں نے ام ورقہ بنت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو اس کے لئے اذان دیتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ عبدالرحمن نے کہا: میں نے اس کا مؤذن ایک بوڑھا شخص دیکھا (2)۔ ابن منذر اور شافعی نے کہا: مردوں میں سے جنہوں نے عورت کے پیچھے نماز پڑھی ان پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ ابوثور نے کہا: ان پر اعادہ واجب نہیں۔ یہ مزنی کے قول کا قیاس ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: عورت کی امامت، مردوں اور عورتوں کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ابن ایمن نے عورتوں کے لئے عورت کی امامت کا جواز روایت کیا ہے۔

رہا خنثیٰ مشکل، تو امام شافعی نے فرمایا: وہ مردوں کی امامت نہ کرائے عورتوں کی امامت کرائے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ کسی حال میں امام نہیں بن سکتا۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** کافر جو شرع محمد یہ کا مخالف ہے جیسے یہودی اور نصرانی مسلمانوں کی امامت کرادے جبکہ مسلمانوں کو اس کے کفر کا علم نہ ہو تو امام شافعی اور احمد کہتے ہیں ان کی نماز جائز نہ ہوگی اور وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے کیونکہ وہ قربت کے اہل میں سے نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اسے سزا دی جائے گی۔ ابوثور اور مزنی نے فرمایا: جس نے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی اس پر اعادہ نہیں ہے اور وہ اپنی نماز کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوگا۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کے نزدیک ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 23:** اہل بدعت جو خواہشات نفس کے پرستار ہیں جیسے معتزلہ، جہمیہ وغیرہ۔ تو امام بخاری نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ تو نماز پڑھ لے، اس کی بدعت کا وبال اس پر ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اہل ہواء میں سے کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھے جبکہ وہ اپنی خواہش (بدعت) کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ امام مالک نے فرمایا: ظالم ائمہ کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ اہل بدعت قدریہ وغیرہم کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ ابن منذر نے کہا: ہر وہ شخص جس کی بدعت کفر کا موجب ہو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں اور جس کی بدعت ایسی نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور ایسی صفت والے کو آگے کرنا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 24:** اپنے اعضاء کے ساتھ فسق (گناہ) کرنے والا مثلاً زانی، شرابی اور اس جیسے شخص کی امامت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے فرمایا: جس نے شرابی کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز کو لوٹائے مگر یہ کہ وہ والی ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر اعادہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نشہ کی حالت میں ہو۔ یہ امام مالک کے ساتھیوں کا قول ہے جن سے میں ملا ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر، حدیث 6570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء، حدیث نمبر 500، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرد کی امامت نہ کرائے اور کوئی بدو مہاجر کی امامت نہ کرائے کوئی فاجر نیکوکار کی امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ صاحب سلطنت ہو''۔ ابو محمد عبد الحق نے فرمایا: یہ علی بن زید بن جدعان نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اکثر علماء علی بن زید کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کو اپنی نمازوں کو اچھا کرنا پسند ہے تو اپنے اچھے لوگوں کو (امامت کے لئے) آگے کرو۔ اس کی سند میں ابو الولید خالد بن اسماعیل مخزومی ہے جو ضعیف ہے۔ یہ دارقطنی کا قول ہے۔ ابو احمد بن عدی نے خالد کے بارے کہا: یہ مسلمانوں میں سے ثقہ لوگوں پر احادیث وضع کرتا تھا۔ اس کی یہ حدیث اس نے یہ ابن جریج سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

دارقطنی نے سلام بن سلیمان عن عمر بن محمد بن واسع عن سعید بن جبیر عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے امام اپنے عمدہ لوگوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور اللہ کے درمیان وفد ہیں (1)۔ دارقطنی نے کہا: یہ عمر میرے نزدیک عمر بن یزید مدائن کا قاضی ہے اور سلام بن سلیمان بھی مدائن کا رہنے والا ہے۔ یہ قوی نہیں ہے۔ یہ عبد الحق نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 25:** ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے۔ پس اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہے تو تم کہو اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (2)۔

علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے، جو رکوع کرے یا جھک جائے امام کے رکوع کرنے سے پہلے اور وہ یہ عمل جان بوجھ کر کرے۔ دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز فاسد ہے اگر اس نے یہ تمام نماز میں کیا یا اکثر نماز میں کیا۔ یہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابن علیہ نے بیان کیا انہوں نے ایوب سے انہوں نے ابو قلابہ سے انہوں نے حضرت ابو الورد انصاری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر کے پہلو میں نماز پڑھی۔ میں امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا تھا۔ جب حضرت ابن عمر نے سلام پھیرا تو حضرت ابن عمر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مروڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں نے پوچھا: حضرت آپ کو کیا ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے پوچھا: تو کون ہے؟ میں نے کہا: فلاں ابن فلاں۔ پوچھا: تو سچے اہل بیت سے ہے تجھے صحیح نماز پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ میں نے کہا: تو نے مجھے اپنے پہلو میں نماز پڑھتے دیکھا نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: میں نے تجھے دیکھا تو امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا ہے اور اس کی نماز نہیں ہوتی جو امام کی مخالفت کرے۔ حسن بن حی نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام سے پہلے رکوع یا سجدہ کرے پھر امام کے رکوع یا سجدہ کرنے سے پہلے سر اٹھالے، تو اس کا رکوع و سجود شمار نہیں ہوگا اور اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔

اکثر فقہاء نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس نے غلط کیا اور اس کی نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے اور نماز

---

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 88، جلد 2 (دار المحاسن) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام الماموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1، قدیمی کتب خانہ

میں ائمہ کی اقتدا کرنا سنت حسنہ ہے۔ پس جس نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ اس نے اپنی نماز کا فرض، اس کی طہارت، رکوع، سجود اور دوسرے فرائض کے ساتھ ادا کر دیا ہے تو اس پر اعادہ نہیں ہے اگر چہ اس نے اس کی بعض سنن کو ترک بھی کر دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا تو منفرد بھی ادا کر سکتا تھا۔ پس اس نے یہ نماز اپنے امام سے پہلے پڑھ لی ہے تو جائز ہو گئی اور اس نے جو جماعت کو ترک کیا ہے وہ اس نے برا کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: جو امام کی نماز میں داخل ہوا پھر اس نے امام کے ساتھ رکوع و سجود کیا جبکہ وہ ایک رکعت میں اور امام دوسری رکعت میں نہ تھا تو اس کی اقتدا صحیح ہے اگر چہ وہ امام سے پہلے اٹھتا ہے اور امام سے پہلے جھکتا ہے کیونکہ وہ امام کے رکوع کے ساتھ رکوع کرتا ہے اور امام کے سجدہ کے ساتھ سجدہ کرتا ہے اور اوپر اٹھتا ہے جبکہ اس میں وہ اس کی تبع میں ہے مگر وہ اپنے اس فعل میں گناہگار ہے کیونکہ مقتدی کے لئے جو متفق علیہ سنت ہے اس نے اس کے خلاف کیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبدالبر نے جو جمہور علماء سے نقل کیا ہے اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی نماز، امام کی نماز سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اتباع حسی اور شرعی مفقود ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ اثر و نظر کے اعتبار سے پہلا قول صحیح ہے۔ امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے اور اس کے افعال کی اقتدا کی جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ:124) یعنی لوگ آپ کی اقتدا کریں گے، اس آیت کا بیان آگے آئے گا۔

یہ امام کی لغت اور شرع میں حقیقت ہے۔ جس نے امام کی مخالفت کی اس نے اس کی پیروی نہیں کی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ "جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو(1)"۔ فا کے ساتھ ذکر فرمایا جو کسی کام کو پہلے کے بعد کیا جاتا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے سخت وعید ذکر فرمائی جو رکوع امام سے پہلے کرتا ہے یا پہلے سر اٹھاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے وہ ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کی طرح پھیر دے یا اس کی صورت گدھے کی صورت میں بنا دے(2)۔ یہ حدیث مؤطا، بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے(3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے(4)"۔ پس جس نے جان بوجھ کر امام کی مخالفت کی یہ جانتے ہوئے کہ اسے امام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے تو اس نے نماز کو حقیر جانا اور جو اسے حکم دیا گیا تھا اس کی اس نے مخالفت کی۔ پس واجب ہے کہ اس کی وہ نماز جائز نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 26:** اگر بھول کر امام سے پہلے سر اٹھالیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: بھولنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ جس نے رکوع یا سجود میں ایسا کیا وہ رکوع یا سجدہ کی طرف لوٹ جائے اور امام کا انتظار کرے جس نے ایسا کیا اس نے غلطی کی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس اس پر اختلاف نہ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب ایجاب التکبیر و افتتاح الصلوٰۃ، حدیث 691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 91، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فیمن یرفع قبل الامام، حدیث 528، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یفعل من رفع راسہ قبل الامام، صفحہ 75 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 371، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح، حدیث 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو(1)۔ ابن عبدالبر نے کہا: امام مالک کے اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ جو جان بوجھ کر ایسا کرے اس پر اعادہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس کی طرف سے خطا ہے اور بھولنے والے سے گناہ اٹھالیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27**: یہ اختلاف تکبیر تحریمہ اور سلام کے علاوہ میں ہے۔ رہا سلام تو اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے، رہی تکبیر تحریمہ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مقتدی کی تکبیر امام کی تکبیر کے بعد ہو۔ مگر امام شافعی سے ایک قول مروی ہے کہ وہ اپنے امام سے پہلے اگر تکبیر تحریمہ کہے گا تو پھر جائز ہوگی کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طرف آئے جب تکبیر کہی تو واپس چلے گئے اور مقتدیوں کو اشارہ فرمایا: تم جیسے ہو اسی طرح ٹھہرے رہو۔ پھر آپ گھر چلے گئے پھر آئے جبکہ سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو فرمایا: میں جنبی تھا میں غسل کرنا بھول گیا تھا(2) اور حضرت انس کی حدیث میں ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ تکبیر کہی۔ اس کا مزید بیان سورۂ نساء میں ان شاء اللہ ولا جنبا کے تحت آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 28**: مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے تھے اور فرماتے تھے: سیدھے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے تم میں سے میرے قریب صاحب عقل و دانش لوگ ہوں پھر وہ جو عقل و فکر میں ان کے قریب ہوں پھر وہ جو ان کے قریب ہوں(3)۔ حضرت ابو مسعود نے فرمایا: آج تم پہلے سے زیادہ اختلاف کرتے ہو (یعنی تمہاری صفیں درست نہیں ہوتی ہیں) اور تم بازاروں میں آوازیں اونچی کرنے سے بچو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "سیدھے ہو جاؤ" یہ صفیں سیدھی کرنے کا حکم ہے خصوصاً پہلی صف جو امام کے قریب ہوتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس حدیث کے معنی پر بھی توفیق الٰہی سے گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ

**مسئلہ نمبر 29**: چونکہ نماز میں بیٹھنے کے متعلق آثار مختلف ہیں اس لئے علماء کا نماز میں بیٹھنے کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: مصلی (نمازی) اپنی سرین زمین پر رکھے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں کو دوہرا کرے۔ اس کی وجہ وہ روایت ہے جو امام مالک نے مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے کہ قاسم بن محمد نے انہیں تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ دکھایا تو انہوں نے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کیا اور بائیں پاؤں کو دوہرا کیا اور وہ اپنی سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھے اور اپنے پاؤں پر نہیں بیٹھے۔ پھر فرمایا: مجھے یہ طریقہ حضرت عبداللہ بن عمر نے دکھایا اور انہوں نے مجھے بیان کیا کہ ان کے والد (حضرت عمر) ایسا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مسلم کی صحیح میں بھی آیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز تکبیر

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام المأموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 361، جلد 1 (دار المحاسن)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتہا وفضل الاول منہا والازدحام علی الصف الاول، صفحہ 181، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

سے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو زیادہ بلند نہیں رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو دوسرا سجدہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سیدھے بیٹھ جاتے تھے اور دو رکعتوں پر التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور دایاں پاؤں کھڑا کرتے تھے اور شیطان کی طرح ایڑیوں پر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنے بازو (زمین پر) پھیلائے اور نماز کا اختتام سلام سے کرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کی وجہ سے...... الله بہتر جانتا ہے...... حضرت ابن عمر نے فرمایا: نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کیا جائے اور بائیں کو بچھایا جائے۔ امام ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن صالح بن حیی نے کہا: دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے ان کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ اسی طرح امام شافعی، احمد اور اسحاق نے درمیانے قعدہ میں بیٹھنے کو کہا ہے اور آخری قعدہ میں ظہر، عصر، مغرب یا عشاء میں ان کا قول امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابوحمید ساعدی کی حدیث ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے گھٹنوں کو پکڑتے پھر اپنی پیٹھ کو جھکاتے جب کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے حتیٰ کہ ریڑھ کا ہر مہرہ اپنی جگہ پر آ جاتا اور جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے نہ تو بازوؤں کو زمین پر پھیلاتے اور نہ بازوؤں کو اکٹھا کرتے اور اپنے قدموں کی انگلیوں کی اطراف کو قبلہ کی طرف۔ جہ کرتے تھے جب (پہلی) دو رکعتوں پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور جب آخری رکعت۔ یں بیٹھتے تو اپنے بائیں پاؤں کو آگے کرتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور اپنی سرین کے بل بیٹھتے (2)۔ طبری نے کہا: اگر اس طرح کرے تو اچھا ہے بیٹھنے کے تمام طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

**مسئلہ نمبر 30**: مالک نے مسلم بن ابی مریم سے انہوں نے علی بن عبدالرحمٰن المعاوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبدالله بن عمر نے مجھے دیکھا جب میں نماز میں کنکریوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو مجھے منع فرمایا اور فرمایا: اس طرح کیا کرو جس طرح رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کرتے تھے؟ فرمایا: جب آپ نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنی تمام انگلیوں کو بند کرتے تھے اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی کے ساتھ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اور اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے اور فرمایا: آپ اسی طرح کرتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: حضرت ابن عمر نے جو یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنے ہاتھ کی تمام انگلیوں کو بند کر دیتے تھے سوائے سبابہ کے اس کے ساتھ آپ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہوتی تھی۔ یہ نماز میں بیٹھنے کا سنت طریقہ ہے اس پر اجماع ہے۔ میری معلومات کے مطابق علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے لیکن سبابہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰہ، باب مایجمع صفۃ الصلوۃ و مایفتتح بہ و یختم بہ و صفۃ الرکوع الخ صفحہ 95-194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوۃ، باب سنۃ الجلوس فی التشہد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انگلی کو حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: انگلی کو حرکت دینی چاہئے اور بعض نے کہا: حرکت نہیں دینی چاہئے۔ یہ تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح آثار کے ذریعے مروی ہیں اور ہر صورت مباح ہے۔ الحمد للہ

سفیان بن عیینہ نے یہ حدیث مسلم بن ابی مریم سے روایت کی ہے جو اس حدیث کے ہم معنی ہے جو امام مالک نے روایت کیا ہے اس میں کچھ زائد ہے۔ سفیان نے کہا: یحییٰ بن سعید ہمیں بیان فرماتے تھے اور وہ مسلم سے روایت فرماتے تھے پھر میں ان سے ملا تو میں نے ان سے سنا اور انہوں نے مجھے یہ زائد فرمایا: یہ انگلی کا حرکت دینا شیطان کو دور کرنا ہے تم میں سے کوئی بھولے گا نہیں جب تک وہ انگلی سے اشارہ کرتا رہے گا اور وہ اس طرح کہے گا۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے حضرت ابن زبیر کی حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تھے تو اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہی بعض عراقی علماء کا نظریہ ہے اور انہوں نے انگلی کو حرکت دینے سے منع کیا۔ ہمارے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ انگلی کو اٹھانا یہ ہمیشہ کی توحید کی طرف اشارہ ہے۔ امام مالک کے اصحاب وغیرہم میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ انگلی کو حرکت دے مگر علماء کا متواتر حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق علماء کے دو اقوال ہیں: جو متواتر حرکت دینے کے قائل ہیں انہوں نے اس طرح تاویل کی ہے کہ یہ حرکت دینا نماز میں متواتر حضور کو یاد دلاتی ہے کیونکہ یہ شیطان کو بھگاتی ہے اور اسے دور کرتی ہے جیسا کہ سفیان نے روایت کیا ہے اور جو کلمہ شہادت کے تلفظ کے وقت انگلی کو متواتر حرکت دینے کے قائل نہیں ہیں وہ حرکت میں تاویل کرتے ہیں گویا وہ اپنی اس انگلی کے ساتھ توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 31**: نماز میں عورت کے بیٹھنے کے بارے میں اختلاف ہے، امام نے فرمایا: یہ مرد کی طرح ہے، اور یہ احرام کے بعد لباس اور بلند آواز سے تہلیل کہنے کے علاوہ کسی معاملے میں مرد سے مختلف نہیں۔ امام ثوری نے کہا: عورت ایک جانب سے اپنی چادر کا سدل کرے گی۔ انہوں نے یہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے فرمایا: عورت کے لیے جس طرح آسان ہو گا وہ اس طرح بیٹھے گی۔ یہ شعبی کا قول ہے: وہ بیٹھے گی جس طرح اس کے لیے آسان ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: عورت اس طرح بیٹھے گی جس میں اس کے لیے زیادہ پردہ ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 32**: مسلم نے حضرت طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے حضرت ابن عباس سے قدموں پر بیٹھنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ سنت ہے (1)۔ ہم نے حضرت ابن عباس سے کہا: ہم تو اسے آدمی کے لئے جفا دیکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے پھر علماء کا اقعا کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا: اقعا یہ ہے کہ آدمی اپنی سرین کے بل بیٹھے جبکہ رانیں کھڑی کیے ہوئے ہو جیسے کتا اور درندہ بیٹھتا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اقعا مجمع علیہ ہے اس میں علماء کا اختلاف نہیں یہ اہل لغت اور فقہاء کے ایک گروہ کی تفسیر ہے۔ ابوعبید نے کہا: رہے اہل حدیث وہ اقعا یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی سرین دو سجدوں کے درمیان اپنی ایڑیوں پر رکھے۔ قاضی عیاض نے کہا: میرے نزدیک بہتر اقعا کی تاویل جس کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ سنت وہ ہے جس کی تفسیر فقہاء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب جواز الاقعاء علی العقبین، صفحہ 202، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دوسجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے سے کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر ملتی ہے کہ سنت یہ ہے کہ تیری ایڑیاں تیری سرین کو چھوئیں۔ ابراہیم بن میسرہ نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے۔ ابوعمر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قاضی نے فرمایا: سلف اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے مگر عام فقہاء نے یہ نہیں کہا ہے وہ اسے اقعا کا نام دیتے ہیں۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرات ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کو دیکھا کہ وہ دوسجدوں کے درمیان اقعا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 33**: جن علماء نے سلام کے وجوب اور عدم وجوب کا قول کیا ہے ان کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دوسرا سلام فرض نہیں ہے مگر حسن بن حی سے مروی ہے کہ انہوں نے دونوں سلاموں کو واجب قرار دیا ہے۔ ابوجعفر طحاوی نے فرمایا: ہم نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا کہ وہ دوسرے سلام کو نماز کے فرائض سے سمجھتے ہوں۔ ابن عبدالبر نے کہا: حسن بن حی کی دونوں سلاموں کے وجوب کی دلیل یہ ہے، فرماتے ہیں: اگر پہلے سلام کے بعد کسی کو حدث لاحق ہو جائے جبکہ ابھی دوسرا سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز کی تحلیل سلام ہے پھر سلام کی کیفیت بیان فرمائی کہ وہ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرے اور ایک سلام کو واجب کہنے والوں کی حجت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **تحلیلها التسلیم**۔ یعنی نماز کی تحلیل سلام ہے۔ علماء فرماتے ہیں: ایک سلام پر تسلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ اس اصل پر مبنی ہے کہ کم از کم اسم کو لیا جائے یا تمام کو لیا جائے۔ جب بالاجماع نماز میں داخل ہونا ایک تکبیر کے ساتھ ہے تو نماز سے نکلنا بھی ایک سلام کے ساتھ ہے مگر سنن ثابتہ وارد ہیں۔ مثلاً حضرت ابن مسعود کی حدیث، حضرت وائل بن حجر حضرمی کی حدیث، حضرت عمار کی حدیث، حضرت براء بن عازب کی حدیث، حضرت ابن عمر کی حدیث، حضرت سعد بن ابی قاص کی حدیث ...... کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سلام پھیرتے تھے (1)۔ ابن جریج، سلیمان بن بلال، عبدالعزیز ابن محمد دراوردی یہ تمام عمرو بن یحییٰ المازنی سے وہ محمد بن یحییٰ حبان سے وہ اپنے چچا واسع بن حبان سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتائیں کہ وہ کیسے تھا؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے تکبیر کا ذکر کیا جب آپ سر اٹھاتے تھے اور جب بھی سر کو پست کرتے تھے اور دائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا ذکر فرمایا۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اسناد مدنی صحیح ہے اور مدینہ طیبہ میں مشہور عمل ایک سلام ہے۔ اہل مدینہ یہ عمل نسل در نسل کرتے آرہے ہیں۔ اس کی مثل سے ہر شہر میں عمل کے ساتھ احتجاج صحیح ہے کیونکہ ہر روز کئی مرتبہ واقع ہونے کی وجہ سے وہ عمل مخفی نہیں رہتا۔ اسی طرح کوفہ وغیرہ میں بھی دوسلاموں پر عمل ہے اور یہ ان کے نزدیک متوارث ہے ہر عمل میں جو اس طرح جاری ہو تو وہ مباح میں اختلاف ہوتا ہے جیسے اذان۔ اسی طرح حجاز، عراق، شام اور مصر کے کسی عالم سے ایک سلام اور دوسلاموں کا انکار مروی نہیں بلکہ ان کے نزدیک سلام معروف ہے۔ ایک سلام والی حدیث کو حضرات سعد بن ابی وقاص، عائشہ، انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے مگر وہ معلول ہے محدثین اسے صحیح قرار نہیں دیتے۔

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوۃ، باب ماجاء فی التسلیم فی الصلوۃ، صفحہ 39، جلد 1 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 34**: دارقطنی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ التحیات آہستہ پڑھا جائے۔ حضرت امام مالک نے حضرت عمر کے تشہد کو اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ التحیات للہ الزاکیات للہ الطیبات الصلوات للہ السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ (1)۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب، لیث بن سعد نے حضرت ابن عباس کا تشہد اختیار کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ، السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ (2)۔ ثوری، کوفی علماء اور اکثر اہل حدیث نے حضرت ابن مسعود کا تشہد اختیار کیا ہے جو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یہ کہتے تھے: السلام علی اللہ السلام علی فلان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: بے شک اللہ ہی السلام ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھے تو اس طرح کہے: التحیات للہ و الصلوات و الطیبات السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین...... جب یہ کہے گا تو ہر عبد صالح کو سلام پہنچ جائے گا جو بھی آسمان اور زمین میں ہوگا...... اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ پھر اسے اختیار ہے جو چاہے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے (3)۔

امام احمد، اسحاق اور داؤد کا یہی قول ہے۔ احمد بن خالد نے اندلس میں اسی کو اختیار فرمایا اور اسی کی طرف میلان کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مرفوعاً اور موقوفاً حضرت ابن مسعود کے تشہد جیسا مروی ہے۔ یہ سب اختلاف مباح میں ہے اس میں سے کوئی چیز واجب نہیں الحمد للہ وحدہ یہ تمام احکام امام اور مقتدی کے تھے جن کو وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ (البقرہ) کا ارشاد اپنے ضمن میں لئے ہوئے تھا اور نماز میں قیام کا ذکر قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ (البقرہ) کے تحت آئے گا۔

مریض امام کا حکم اور نماز کے دوسرے احکام بھی وہاں بیان ہوں گے اور امام کے علاوہ مریض کی نماز کا حکم سورۂ آل عمران میں آئے گا اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کا حکم صلوٰۃ خوف کے ضمن میں آئے گا۔ اور سورۂ مریم میں اس امام کا حکم جو مقتدی سے بلند ہو کر نماز پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ نماز کے اوقات، اذان، مساجد کے احکامات وغیرہ بیان ہوں گے۔ یہ سب وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے ارشاد کا بیان ہے۔ سورت کی ابتدا میں نماز کے جملہ احکام بیان ہو چکے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾

”کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم اتنا بھی

---

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 72، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 142، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، حدیث 828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلاۃ، صفحہ 173، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نہیں سمجھتے''۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ یہ استفہام ہے اس کا معنی زجر و توبیخ ہے (1) اور اہل تاویل کے نزدیک اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مدینہ طیبہ کے یہودی اپنے کسی سسرالی رشتہ والے یا کسی قرابت دار یا کسی رضاعی رشتہ دار کو کہتے جو مسلمانوں میں سے ہوتا تو اس دین پر قائم رہ جس پر تو ہے، جس کا تجھے یہ شخص حکم دیتا ہے اس سے ان کی مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ کیونکہ اس کا امر حق ہے وہ لوگوں کو اس کا حکم دیتے تھے اور خود ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہود کے علماء اپنے مقلدین اور اپنے پیروکاروں کو تورات کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے انکار میں تورات کی مخالفت کرتے تھے (2)۔ ابن جریج نے کہا: علماء یہود لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارتے تھے اور خود گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا: وہ لوگوں کو صدقہ پر ابھارتے تھے اور خود بخل کرتے تھے (3)۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ بعض اہل اشارات نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں سے معانی کے حقائق کا مطالبہ کرتے ہو اور تم اس کے نقوش کے ظاہر کی مخالفت کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 2:** جس شخص کی یہ صفت ہو وہ سخت عذاب میں ہوگا۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں کچھ لوگوں کے اوپر سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ اہل دنیا کے خطباء ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں حالانکہ یہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (4) کہا جائے گا: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے: ہم وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اگرچہ کمزوری ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیب بن جحدر ہے امام احمد اسے ضعیف کہتے تھے۔ اسی طرح ابن معین نے یہ حدیث ابو غالب عن ابی امامہ صدی بن عجلان الباہلی کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ ابو غالب وہ جس کے بارے میں یحییٰ بن معین نے بیان کیا ہے کہ حزور القرشی مولیٰ خالد بن عبد اللہ بن اسید ہے۔ بعض نے فرمایا: باہلہ کا غلام تھا بعض نے فرمایا: عبد الرحمن حضرمی کا غلام تھا۔ تجارت کے لئے شام میں آتا جاتا تھا۔ یحییٰ بن معین نے کہا: یہ صالح الحدیث ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس حدیث کے ہم معنی حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائیگا پھر اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا پھر جلدی سے اس کے پیٹ سے انتڑیاں باہر آ جائیں گی وہ ان کے ارد گرد اس طرح گھومے گا جیسے گدھا چکی کے ارد گرد گھومتا ہے، دوزخی لوگ اس پر جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہوا کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میں نیکی کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 137، جلد 1
4۔ معالم التنزیل، صفحہ 75، جلد 1 (دار الفکر)

حکم دیتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا لیکن خود برائی سے رکتا نہیں تھا(1) (آگے مصنف نے حدیث کے الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے میں نے وہ حدیث کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے) میں کہتا ہوں: یہ حدیث اور آیت کریمہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو نیکی اور بدی کو جانتا ہے اور ہر ایک کے قیام کے وجوب سے باخبر ہے اسے بے علم سے زیادہ سزا ملے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرمات کی اہانت کرنے والا ہے اور اس کے احکامات کو خفیف سمجھنے والا ہے اور وہ ان لوگوں سے ہے جو اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس عالم کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اپنے علم سے نفع نہیں پہنچایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر3:** اے قاری! اللہ تجھے توفیق بخشے! جان لے کہ اس آیت میں توبیخ نیکی کے فعل کے ترک کے سبب سے ہے نہ کہ نیکی کے حکم کے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس قوم کی مذمت فرمائی ہے جو نیک اعمال کا حکم دیتے ہیں اور ان پر خود عمل نہیں کرتے انہیں سخت توبیخ فرمائی ہے جو قیامت تک سارا زمانہ پڑھی جائے گی۔ فرمایا: **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ** منصور الفقیہ نے کہا اور خوب کہا:

ان قوماً یامرونا　بالذی لا یفعلونا
لمجانین وان هم　لم یکونوا یصرعونا

بے شک ایک قوم ہمیں اس بات کا حکم دیتی ہے جسے وہ خود نہیں کرتے۔ وہ نادان ہیں اگرچہ وہ گرتے نہیں ہیں۔

ابو العتاہیہ نے کہا:

وصفت التقی حتی کانك ذوتقی　و ریح الخطایا من ثیابك تسطع

تو نے تقویٰ کی اس طرح صفت بیان کی حتیٰ کہ یوں لگا کہ تو صاحب تقویٰ ہے جبکہ تیرے کپڑوں سے گناہوں کی بدبو چھائی ہوئی ہے۔

ابو الاسود الدؤلی نے کہا:

لاتنه عن خلق و تاتی مثله　عارٌ علیك اذا فعلت عظیم
وابدأ بنفسك فانها عن غیها　فان انتهت عنه فانت حکیم
وهناك یقبل ان وعظت ویقتدی　بالقول منك و ینفع التعلیم

تو ایسے خلق سے منع نہ کر جبکہ خود تو ایسا کرے، جب تو ایسا کرے گا تو تجھ پر یہ بڑی عار ہوگا۔ تو اپنے نفس سے آغاز کر اسے گمراہی سے روک اگر تیرا نفس گمراہی سے رک جائے گا تو تو حکیم ہوگا۔ اس وقت تیری بات قبول کی جائے گی اگر تو وعظ کرے گا اور تیری بات کی اقتدا کی جائے گی اور تعلیم نفع دے گی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، باب عقوبة من یامر بالمعروف ولایفعله وینهی عن المنکر ویعمله، صفحہ 412، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ کنز العمال، حدیث نمبر 28977، صفحہ 187، جلد 10 (مکتبۃ التراث الاسلامی)

ابو عمرو بن مطر نے کہا: میں ابو عثمان الحیری الزاہد کی مجلس میں حاضر تھا۔ وہ گھر سے باہر آئے اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ وعظ و نصیحت کے لئے بیٹھا کرتے تھے، وہ خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ ان کی خاموشی لمبی ہوگئی۔ ایک شخص نے انہیں آواز دی جو ابو العباس کے نام سے مشہور تھے تو اپنے سکوت میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو ابو عثمان نے یہ شعر پڑھا:

و غير تقي يامر الناس بالتقى طبيبٌ يداوي و الطبيب مريض

جو خود غیر متقی ہے وہ لوگوں کو تقویٰ کا حکم دیتا ہے، طبیب لوگوں کا علاج کرتا ہے حالانکہ طبیب خود مریض ہے۔

ابو عمرو نے کہا: رونے اور چیخنے کے ساتھ آوازیں بلند ہوگئیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابراہیم النخعی نے کہا: تین آیات کی وجہ سے میں وعظ و نصیحت ناپسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (الایۃ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الصف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ہود: 88) (میں ارادہ نہیں کرتا کہ میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں)۔

مسلم بن عمرو نے کہا۔

ما أقبح التزهيد من واعظ يزهد الناس ولا يزهد
لوكان في تزهيده صادقاً اضحیٰ وامسیٰ بيته المسجد
ان رفض الدنيا فيا باله يستمنح الناس ويسترفد
والرزق مقسوم على من ترى يناله الابيض والاسود

اس واعظ کا لوگوں کو زہد کی تلقین کرنا کتنا برا ہے جو لوگوں کو زہد کی تلقین کرتا ہے اور خود زہد اختیار نہیں کرتا، اگر وہ زہد کی تلقین میں سچا ہوتا تو صبح و شام اس کا گھر مسجد ہوتا۔ اگر وہ دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا تو وہ لوگوں سے عطیہ طلب نہ کرتا اور بخشش نہ مانگتا۔ رزق تقسیم ہو چکا ہے ان لوگوں پر جنہیں تو دیکھتا ہے، سفید اور سیاہ اسے حاصل کر رہا ہے۔

حسن نے مطرف بن عبد اللہ سے کہا: اپنے دوستوں کو نصیحت کرو۔ مطرف نے کہا: میں وہ کہنے سے ڈرتا ہوں جو میں کرتا نہیں۔ حسن نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، ہم میں سے کون ہے جو وہی کرتا ہے جو وہ کہتا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس حال کے ساتھ کامیاب ہوجائے، کوئی شخص نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے ربیعہ بن ابی عبد الرحمن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر کو یہ فرماتے سنا کہ اگر آدمی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے تاکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ پائی جائے تو پھر کوئی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے فرمایا، انہوں نے سچ فرمایا، کون ہے وہ جس میں ایسی بات نہ ہو (یعنی ہر شخص نیکی کا حکم دیتا ہے اور خود پوری طرح نیکی نہیں کرتا۔)

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بِالْبِرِّ یہاں البر سے مراد طاعت اور عمل صالح ہے۔ البر کا معنی سچائی بھی ہے۔ البر، لومڑی کے بچے کو بھی کہتے ہیں۔ البر، بکریوں کے ہانکنے کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: لا یعرف هراً من برٍ یعنی

بکریوں کے چرواہے نہیں جانتے کہ کون بکریوں کو ہانک کر لے گیا ہے (اور اس کا لفظی معنی ہے: وہ بلی اور چوہے میں فرق نہیں کرسکتا) یہ مشترک لفظ ہے۔ شاعر نے کہا:

لا ھم رب ان بکرا دونکا ۔۔۔ یبرك الناس و یفجرونکا

''یترك الناس'' سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے لوگ تجھے عطیہ دیتے ہیں۔

مابعد شعر میں البر کا معنی دل ہے۔

اکون مکان البر منه و دونه ۔۔۔ واجعل مالی دونه و اوامرُہ

البر با کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی معروف ہے (یعنی گندم) اور با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اجلال اور تعظیم کرتا ہے۔ اسی سے ہے ولد برٌ و بار یعنی بچہ اپنے والدین کی تعظیم کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو ترک کرتے ہیں۔ النسیان (نون کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی کبھی ترک کرنا ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) (جب انہوں نے بھلا دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (انعام: 44) (جب انہوں نے بھلا دیا اسے جس کے ساتھ نصیحت کی گئی تھی)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ (البقرہ: 237) اور تم آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ یہ یاد اور حفظ کا متضاد ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث ہے نَسِیَ آدم فنسیت ذریتہ (1)، حضرت آدم بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: رجل نسیان، کسی چیز کو بہت زیادہ بھولنے والا شخص۔ و قد نَسِیت الشیٔ نِسیانًا (بکسر نون کہے گا) تو نَسیانًا نہیں کہے گا۔ کیونکہ النَسیان، یہ نسا کا تثنیہ ہے جس کا معنی رگ ہے۔

انفس یہ نفس کی جمع ہے اور جمع قلت ہے۔ النفس کا معنی روح بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت نفسه اس کی روح نکل گئی۔

ابوخراش نے کہا

نجا سالم و النفس منه بشدقه ۔۔۔ و لم ینج الا جفن سیف و مئزراً

سالم نے نجات پائی جبکہ اس کی سانس اس کے ہونٹ کے کنارے پر تھی اور اس نے تلوار کی میان اور چادر کے ساتھ نجات پائی۔

النفس سے مراد روح ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: 42) (اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک اس آیت میں الانفس سے مراد ارواح ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3290، 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت بلال نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: اخذ بنفسی یا رسول الله الذی اخذ بنفسك۔(1) میری روح کو بھی اس نے قبض کر لیا جس نے آپ کی روح کو قبض کر لیا...... یہ ابن شہاب کی حدیث میں ہے، اور حضرت زید بن اسلم کی حدیث میں ہے: ان الله قبض ارواحنا و لو شاء لردها الینا فی حین غیر هذا...... (2) اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کر لیا اگر وہ چاہتا تو اس وقت کے علاوہ ہماری طرف انہیں لوٹا دیتا، یہ دونوں روایات امام مالک نے روایت کی ہیں۔ یہ معنی اولیٰ ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ النفس سے مراد خون بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سالت نفسه اس کا خون بہہ پڑا۔ شاعر نے کہا:

تسیل علی حد السیوف نفوسُنا　　و لیست علی غیر ظبات تسیل

ہمارے خون تلواروں کی انیوں پر بہتے ہیں، تلواروں کی انیوں کے بغیر یہ بہتے ہی نہیں۔

ابراہیم نخعی نے کہا: مالیس له نفس سائلةٌ وہ جانور جس کا بہنے والا خون نہیں ہوتا وہ پانی میں مر جائے تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ النفس سے مراد جسد بھی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئتُ ان بنی سحیم ادخلوا　　ابیاتهم تامورَ نفس المنذر

مجھے بتایا گیا ہے کہ بنی سحیم نے اپنے گھروں میں منذر کے جسم کا خون داخل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ جو سمجھے تو اس کے لئے یہ بڑی توبیخ ہے۔ تَتْلُوْنَ کا معنی پڑھنا ہے۔ الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ جس نے یہود کی طرح عمل کیا وہ ان کی مثل ہے تلاوت کی اصل اتباع ہے۔ اسی وجہ سے یہ قراءت (پڑھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ بعض کلام حروف میں بعض کے تابع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ترتیب پر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: تلوته تلواً میں نے اس کی اتباع کی۔ تلوت القرآن تلاوۃً۔ میں نے قرآن کی تلاوت کی۔ تلوت الرجل تلواً کسی کو رسوا کرنا۔ التلیة اور التُلاوة (تاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بقیہ ہے۔ کہا جاتا ہے: تلیت لی من حقی تلاوة و تلیة یعنی میں نے اپنے لیے اپنے حق سے باقی رکھا۔

اتلیتُ، ابقیت (میں نے باقی چھوڑا) تتلیت حقی۔ میں نے اپنے حق کا پیچھا کیا حتیٰ کہ اسے پورا وصول کر لیا۔ ابوزید نے کہا: تلی الرجل جب انسان زندگی کے آخری سانسوں میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی تم اپنے نفسوں کو ہلاکت کی جگہوں سے نہیں روکتے۔ العقل کا معنی روکنا ہے، اسی سے عقال البعیر ہے، اونٹ کی رسی جو اسے حرکت سے روکتی ہے۔ العقل کا معنی دیت ہے کیونکہ وہ مقتول کے ولی کو قاتل کے قتل سے روکتی ہے۔ اسی سے ہے: اعتقال البطن و اللسان، پیٹ اور زبان کو روکنا۔ اسی وجہ سے قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے۔ العقل، یہ جہالت کی نقیض ہے، العقل اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جسے عربوں کی عورتیں بناتی تھیں اس کے ساتھ ہودج کو لپیٹا جاتا تھا۔ علقمہ نے کہا:

عقلاً و رقماً تكاد الطیر تخطفه　　كأنه من دم اجواف مدموم

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلوٰۃ، باب النوم عن الصلوٰۃ، صفحہ 9، قدیمی کتب خانہ　2۔ ایضاً صفحہ 10

سرخ، منقش کپڑا قریب تھا پرندے اسے اچک لیتے، گویا وہ پیٹوں کے خون سے سرخ کیا گیا ہے۔

العد موم سے مراد سرخ ہے اور اس شعر میں یہی معنی مراد ہے، اور العد موم سے مراد چربی سے بھرا ہوا اونٹ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ دو چادریں ہیں۔ ابن فارس نے کہا: وہ کپڑا جس کا نقش طول میں ہو اسے عقل کہتے ہیں اور جس کا نقش گول ہو اسے رقم کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عاقل وہ ہے جو اس پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے اور جاہل وہ ہے جو احکام الٰہیہ پر عمل نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 9**: اہل حق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقل مخلوق اور موجود ہے نہ وہ قدیم ہے نہ معدوم ہے کیونکہ اگر معدوم ہوتی تو اس کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ بعض ذوات مختص نہ ہوتیں جب اس کا وجود ثابت ہے تو اس کے قدیم ہونے کا قول محال ہے کیونکہ اس بات پر دلیل قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے جیسا کہ بیان اسی سورت میں اور دوسری سورتوں میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ عقل قدیم ہے پھر بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ عقل بدن میں ایک جوہر لطیف ہے اس سے اس کی شعاعیں پھیلتی ہیں جس طرح گھر میں چراغ کی شعاعیں پھیلتی ہیں۔ اس کے ذریعے معلومات کے حقائق کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جوہر بسیط ہے یعنی غیر مرکب ہے پھر اس کے محل کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: عقل کا محل دماغ ہے کیونکہ دماغ حس کا محل ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اس کا محل دل ہے کیونکہ دل حیات کا معدن اور حواس کا مادہ ہے۔ عقل کے بارے میں یہ قول کہ یہ جوہر ہے، یہ فاسد ہے اس حیثیت سے کہ جواہر ہم مثل ہوتے ہیں۔ اگر جوہر عقل ہوتا تو ہر جوہر عقل ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: عقل اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے معانی کے حقائق میں سے اشیاء جس پر قائم ہیں۔ یہ قول اگرچہ پہلے قول کے زیادہ قریب ہے، لیکن اس جہت سے درست ہونے سے دور ہے کہ ادراک زندہ کی صفات سے ہے، اور عقل عرض ہے اس سے یہ چیز محال ہے جیسا کہ اس کا ملتذ اور مشتہی ہونا محال ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری، استاذ ابو اسحاق اسفرائینی وغیرہما فرماتے ہیں: عقل، علم ہے اس دلیل سے کہ یہ نہیں کہا جاتا: عقلت و ما علمت او علمت و ما عقلت (میں نے سمجھا اور جانا نہیں یا میں نے جانا اور سمجھا نہیں) قاضی ابوبکر نے کہا: واجبات کے وجود، جائزات کے جواز اور مستحیلات کے استحالہ کے علوم ضروریہ کا نام عقل ہے، یہ ابو المعالی نے ''الارشاد'' میں اختیار فرمایا ہے اور ''البرہان'' میں انہوں نے یہ اختیار فرمایا کہ عقل ایک صفت ہے جس کے ذریعے علوم کا ادراک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قاضی کے مذہب پر اعتراض کیا اور قاضی کے مذہب کے فساد پر استدلال کیا۔ ''البرہان'' میں محاسبی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل ایک فطرت ہے، استاذ ابوبکر نے امام شافعی، ابو عبداللہ بن مجاہد سے حکایت کیا ہے کہ ان دونوں نے فرمایا: عقل تمیز کا آلہ ہے۔ ابو العباس القلاسی سے حکایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل تمیز کی قوت ہے۔ محاسبی سے حکایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: عقل انوار اور بصائر ہیں پھر ان اقوال کو مرتب کیا اور چند محامل پر انہیں معمول کیا۔ فرمایا: اولیٰ یہ ہے کہ یہ نقل امام شافعی اور ابن مجاہد سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آلہ تو مثبت چیز میں استعمال ہوتا ہے اور اعراض میں اس کا استعمال مجازاً

ہے۔ اسی طرح جنہوں نے کہا کہ یہ قوت ہے (یہ بھی صحیح نہیں ہے) کیونکہ قوت سے صرف قدرت سمجھی جاتی ہے۔
قلانسی نے جو اطلاق کیا ہے وہ عبارات میں مجاز کی بناء پر ہے، اسی طرح محاسبی کا قول ہے عقل نہ تو صورت ہے نہ نور ہے بلکہ اس کے ذریعے انوار و بصائر کو حاصل کیا جاتا ہے۔ آیت توحید کے تحت اس کے فائدہ کا بیان ان شاء اللہ اسی سورت میں آئے گا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

''اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے نہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، الصبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ قتل فلان صبراً، فلاں باندھا گیا اور روکا گیا حتیٰ کہ تلف ہو گیا۔ صبرت نفسی علی الشیء میں نے اپنے آپ کو اس کام پر روکا۔ المصبورۃ۔ وہ جس سے منع کیا گیا ہو۔ حدیث میں اس سے مراد وہ جانور ہے جو موت پر روکا گیا ہو، اسی کو المجثمہ بھی کہتے ہیں۔ عنترہ نے کہا:

فصبرت عارفة لذالك حرة ترسو اذا نفس الجبان تطلع

میں نے اس وجہ سے آزاد عارفہ سے اپنے آپ کو روکا جو ٹھہری ہوئی تھی جبکہ بزدل کا نفس جھانک رہا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ نے اطاعت پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور کتاب اللہ میں مخالفت سے رکے رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: واصبروا۔ کہا جاتا ہے: فلان صابر عن المعاصی جب کوئی گناہوں سے بچے اور طاعت پر قائم رہے، جو کچھ صبر کے بارے میں کہا گیا اس میں سے یہ قول بہتر ہے۔ نحاس نے کہا: جو مصیبت پر صبر کرے اسے صابر نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے صابر علی کذا، اس پر صبر کرنے والا ہے۔ جب مطلق صابر کہا جائے تو پھر اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر)

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّلٰوةِ تمام عبادات میں سے الصَّلٰوةِ (نماز) کو خاص طور پر ذکر فرمایا اس کے ذکر کی بلندی کے لئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز کی طرف پناہ لیتے۔ اسی سے وہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے بھائی قثم کی موت کی خبر دی گئی ...... بعض نے فرمایا: ان کی بیٹی کی موت کی خبر دی گئی ...... جبکہ وہ سفر میں تھے تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا یہ پوشیدہ چیز تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا۔ یہ مؤنث تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی کفایت فرمائی یہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بھیجا۔ پھر راستہ سے ایک طرف ہو گئے اور نماز پڑھی۔ پھر اپنی سواری کی طرف واپس آئے اور یہ پڑھ رہے تھے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اس تاویل پر نماز سے مراد شریعت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لغت میں اپنے عرف پر اس کا معنی دعا ہے۔ پس اس تاویل پر یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مشابہ ہو گی اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ (انفال: 45)

کیونکہ ثبات سے مراد صبر ہے۔ ذکر سے مراد دعا ہے اور تیسرا قول مجاہد نے کیا اس آیت میں الصبر سے مراد روزہ ہے، اسی

وجہ سے رمضان کو شہر الصبر کہا جاتا ہے۔ پس اس قول کی مناسبت سے روزہ اور نماز مناسب ہیں کیونکہ روزہ شہوات سے روکتا ہے اور دنیا میں عدم دلچسپی پیدا کرتا ہے نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے اس میں خشوع کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے جو قرآن آخرت کی یاد دلاتا ہے (1)...... واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** اذیتوں پر صبر کرنا اور طاعات پر صبر کرنا یہ نفس کے جہاد سے ہے اور نفس کی شہوات کو ختم کرنے اور لالچ سے اسے روکنے کے باب سے ہے۔ یہ انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق میں سے ہے۔ یحییٰ بن الیمان نے کہا: صبر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا اس کے علاوہ کی تمنا نہ کر اور رضا یہ ہے تو اپنی دنیا و آخرت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو۔ شعبی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کا ایمان سے اس طرح کا تعلق ہے جو سر کا تعلق جسم سے ہے۔ طبری نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان دل کی معرفت، زبان کے اقرار اور عمل بالجوارح کا نام ہے جو عمل بالجوارح پر صبر نہیں کرتا وہ ایمان کے اطلاق کا مستحق نہیں ہوتا اور عمل بالشرائع پر قائم رہنا بالکل ایمان کے ساتھ اس کا وہی تعلق ہے جو سر کا جسم کے ساتھ تعلق ہے کہ انسان کا جسم مکمل نہیں ہوتا مگر یہ کہ سر موجود ہو۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزا کا ذکر فرمایا اور اعمال کے لئے جزا کی ایک حد ذکر فرمائی۔ فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام:160) (جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لئے دس ہوں گی) اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی جزا سے زیادہ بیان فرمائی۔ فرمایا: مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (البقرہ:261) (مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ) اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بنایا۔ اور صبر کرنے والوں کی مدح بیان فرمائی، فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر) (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔ اور فرمایا: وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ) (اور جو شخص (ان مظالم پر) پر صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

بعض علماء نے فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ (الزمر:10) میں صابرون سے مراد روزے دار ہیں کیونکہ صحیح سنت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد مروی ہے، الصیام لی وانا اجزی بہ (2) (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا) روزے کا ثواب ذکر نہیں فرمایا جس طرح کہ صبر کی جزا ذکر نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6:** صبر کی فضیلت...... اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف صبر سے بیان فرمایا جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس احدٌ اولیس شیء اصبر علی اذی سمعہ من اللہ تعالٰی انھم لیدعون لہ ولداً وانہ لیعافیھم ویرزقھم (3)۔ (اللہ تعالیٰ سے کوئی اذیت پر زیادہ صبر کرنے

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 137، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 254، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، حدیث 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ایضاً صفحہ 901، جلد 2۔ ایضاً، کتاب الادب، باب الصبر علی الأذی، حدیث 5634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والا نہیں جسے وہ سنتا ہے، مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹا ہونے کا قول کرتے ہیں لیکن پھر وہ انہیں عافیت بھی دیتا ہے اور انہیں رزق بھی دیتا ہے۔) اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صبر کے ساتھ وصف بیان فرمایا تو صبر سے مراد حلم ہے اور حلم سے متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سزا کے مستحقین کو فوری سزا نہیں دیتا اس میں تاخیر فرماتا ہے...... اور اللہ تعالیٰ کا صبر کے ساتھ موصوف ہونا قرآن میں وارد نہیں ہے بلکہ حدیث حضرت ابوموسیٰ میں وارد ہے اہل سنت نے صبر کی تاویل حلم سے کی ہے یہ ابن فورک وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں الصبور کا لفظ آیا ہے یہ مجرموں سے حلم میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ ضمیر کے مرجع میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع صرف خاص طور پر نماز ہے کیونکہ یہ نفوس پر اتنی بھاری ہوتی ہے جتنا روزہ بھاری نہیں ہوتا، یہاں صبر سے مراد روزہ ہے اور نماز میں نفوس کی قید ہے اور روزہ میں شہوت کو ختم کرنا ہے۔ پس جو ایک شہوت سے یا دو شہوتوں سے رکا ہوا ہے وہ اس شخص کی مانند نہیں جو تمام شہوات سے روکا گیا ہے۔ پس روزہ دار کو عورتوں، کھانے اور پینے کی شہوت سے روکا جاتا ہے پھر تمام شہوات کلام، چلنے اور مخلوق سے ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پھر ان اشیاء کی وجہ سے وہ تسلی پاتا ہے جن سے اسے روکا گیا ہوتا ہے، جبکہ نمازی ان تمام شہوات سے رکتا ہے، اس کے تمام اعضاء نماز کے ساتھ مقید ہوتے ہیں اور تمام شہوات سے دور ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو نماز نفس پر زیادہ بھاری اور مشکل ہوئی، اسی وجہ سے فرمایا: یہ بہت بھاری ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اِنَّهَا کی ضمیر سے مراد دونوں (صبر اور نماز) ہیں لیکن اغلب سے کنایہ فرمایا اور وہ نماز ہے جیسے ارشاد فرمایا: وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (توبہ:34) (اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا، چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں۔)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا (الجمعہ:11) (جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو اس کی طرف گئے) پہلی آیت میں ضمیر کو الفضۃ کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ اغلب اور اعم ہے، اور دوسری آیت میں تجارت کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ افضل اور اہم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: صبر چونکہ نماز میں داخل ہے اس لئے ضمیر نماز کی طرف لوٹا دی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (توبہ:62) اس آیت میں لم یرضوھما نہیں فرمایا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے۔ اسی طرح شاعر نے کہا:

ان شرخ الشباب والشعر الاسود ما لم یعاص کان جنونا

اس شعر میں لم یعاصیا نہیں فرمایا اور ضمیر شباب کی طرف لوٹا دی کیونکہ شعر اس میں داخل ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر ہر ایک کی طرف لوٹائی لیکن اختصاراً حذف کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰیَةً (مومنون:50) اس آیت میں آیتین نہیں فرمایا اسی طرح شاعر کا قول ہے:

فمن یک أمسی بالمدینة رحله فانی و قیار بها لغریب

اور ایک شاعر نے کہا:

لکل هم من الهموم سعه　　　والصبح والمسی لا فلاح معه

پہلے شعر میں لغریب سے مراد لغربیان ہے اور دوسرے شعر میں لا فلاح معہما مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع عبادت ہے جو معنی کے اعتبار سے صبر اور صلاۃ کے ذکر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع مصدر ہے، اور وہ الاستعانۃ ہے جس کا تقاضا استعینوا ارشاد کر رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف بلاتے تھے ان میں سے صبر اور صلاۃ بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع کعبہ ہے کیونکہ نماز کا حکم اس کی طرف ہے۔ کبیرۃٌ سے مراد بھاری اور مشکل ہے اور یہ (انّ) کی خبر ہے، غیر قرآن میں وانه لکبیرۃ بھی جائز ہے۔ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ مگر ڈرنے والوں پر نماز خفیف (ہلکی) ہے۔ ارباب المعانی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ مگر جن کی ازل میں اجتباء اور ہدایت کے خصائص کے ساتھ تائید کی گئی ان پر بھاری نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلَى الْخٰشِعِيْنَ، خاشعون جمع ہے خاشع کی اس سے مراد تواضع کرنے والا ہے اور الخشوع نفس کی اس ہیئت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اعضاء میں سکون اور تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: خشوع دل میں ہوتا ہے، اور وہ نماز میں خوف اور آنکھوں کو جھکانا ہے۔ زجاج نے کہا: الخاشع وہ ہے جس پر خشوع اور ذلت کا اثر دکھائی دے جیسے خشوع الدار بعد الاقواء، یہ اصل ہے۔ نابغہ نے کہا:

رماد ککحل العین لأیا أبینهُ　　　ونؤیٌ کجذمِ الحوض اثلم خاشع

مکان خاشعٌ ایسا مکان جس کے لئے رہنمائی نہ پائی جا سکے۔ خشعت الاصوات، یعنی آوازیں ساکن ہو گئیں۔

خشعت خراشی صدرہ۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب سینہ سے لیس دار تھوک باہر پھینکے۔ خشع لبصرہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اپنی نظر کو جھکا دے۔ الخشعۃ، زمین کا نرم ٹکڑا۔ حدیث پاک میں ہے: کانت خشعۃ علی الماء ثم دحیت بعد، کعبہ پانی پر ایک نرم ٹکڑا تھا پھر بعد میں اس سے زمین پھیلائی گئی۔ بلدۃ خاشعۃٌ ایسا شہر جو غبار آلود ہو اس میں کوئی اترنے والا نہ ہو۔ سفیان ثوری نے کہا: میں نے اعمش سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے ثوری! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع کو نہیں جانتا۔ میں نے ابراہیم نخعی سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے اعمش! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع بھی نہیں جانتا۔ خشوع موٹی خوراک کھانا، موٹا لباس پہننا اور سر جھکانا نہیں ہے بلکہ خشوع یہ ہے کہ تو شریف اور گھٹیا کو حق میں برابر دیکھے اور ہر اس فرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو تجھ پر فرض ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک نوجوان کو دیکھا وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے فلاں! اپنا سر اٹھا کیونکہ خشوع اس سے زائد نہیں ہوتا جو دل میں ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو مسلم آدمی کے لئے نرم کرے اور تو نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت اچھی طرح آئے گا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (مومنون) جس نے لوگوں کے لئے اس سے

زیادہ خشوع ظاہر کیا جو اس کے دل میں ہے تو اس نے نفاق پر نفاق ظاہر کیا۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: خاشع اس وقت تک نہیں ہوگا حتیٰ کہ ہر بال اس کے جسم پر خشوع کا اظہار کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (الزمر: 23)

میں کہتا ہوں: یہ خشوع محمود ہے، کیونکہ خوف جب دل کو لاحق ہوتا ہے تو ظاہر خشوع کو ثابت کرتا ہے، ایسا شخص ظاہری خشوع کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوتا، تو اسے دیکھے گا وہ سر جھکائے ہوئے متادب اور متذلل ہوگا۔ نیک لوگ اس قسم سے جو ان پر ظاہر ہوتا تھا اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مذموم خشوع وہ ہے جس میں تکلف ہوتا ہے، جان بوجھ کر رونا اور سر جھکانا ہوتا ہے جیسا کہ جہلاء کرتے ہیں تاکہ انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے، یہ شیطان کا دھوکا ہے اور انسان کے نفس کا فریب ہے۔ حضرت حسن نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب کے پاس سانس لیا گویا وہ پریشان ہے۔ حضرت عمر نے اسے مکا مارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بولتے تھے تو اپنی آواز سناتے تھے، جب چلتے تھے تو تیز چلتے تھے جب مارتے تھے تو سخت مارتے تھے آپ سچے احکام پر عمل کرنے والے تھے اور سچا خشوع رکھنے والے تھے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: الخاشعون سے مراد سچے مومن ہیں۔

## الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

''جو یقین کرتے ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ، الَّذِيْنَ محل جر میں ہے کیونکہ یہ خاشعین کی صفت ہے اور قطع کے اعتبار سے اس کو محل رفع میں کرنا بھی جائز ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہاں ظن بمعنی یقین ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿﴾ (الحاقہ) (مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں)۔

درید بن الصمہ نے کہا:

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج　سراتهم فی الفارسی المسرد (1)

شاعر نے یہاں ظن بمعنی یقین استعمال کیا ہے۔

ابوداؤد نے کہا:

رُبّ هم فرجته بغريم　و غيوب كشفتها بظنون

یعنی میں نے کتنے ہی غیوب کو یقین کے ساتھ کھولا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں ظن اپنے معنی میں صحیح ہے۔ کلام میں ان کے گناہوں کو چھپایا گیا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ وہ گنہگار ہیں۔ یہ مہدوی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تعسف ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 138، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فراء نے کہا: ظن کبھی جھوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بصری علماء اس معنی کو نہیں جانتے۔ ظن کی اصل اور اس کا فائدہ ''شک ہونا'' ہے جبکہ اپنے معتقدات میں سے کسی ایک کی طرف میلان ہو۔ کبھی ظن یقین کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت اور دوسری آیات میں ہے لیکن جو امر حس کی طرف نکلے اس کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً عرب جو شخص دکھائی دے رہا ہو موجود ہو اس کے لیے یہ نہیں کہتے أظن هذا انسانًا، تو اس کا استعمال اس صورت میں پائے گا جو ابھی حس کے دائرے میں نہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت اور شعر میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف:53) کبھی یقین بمعنی ظن ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورت کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ تو کہتا ہے: سؤت به ظناً، واسأت به الظن (میں نے اسے برا گمان کیا) جب معرف باللام ہو تو الف داخل کراتے ہیں اور مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ سے مراد ہے جزاء ربهم بعض علماء نے فرمایا: یہ باب مفاعلہ ہے حالانکہ یہ عمل ایک طرف سے ہے۔ (فرمایا) یہ اس طرح ہے: عافاه الله۔ اَنَّهُمْ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کا پہلے اِنَّ پر عطف ہے اور قطع کے اعتبار سے اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے اِلَيْهِ سے مراد الی ربهم ہے بعض نے فرمایا الی جزاءہ ہے۔ رٰجِعُوْنَ یہ دوبارہ اٹھنے، جزا اور ملک اعلیٰ کے سامنے پیش ہونے کا اقرار ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۞

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اس سے مراد ان کے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام لوگوں پر فضیلت مراد ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء بنائے، یہ ان کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے لئے یہ شرف نہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞

''اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا یہ امر ہے اور اس کا معنی وعید ہے، تقویٰ پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔ يَوْمًا سے مراد اس دن کا عذاب اور ہول ہے۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے، يَوْمًا کی نصب اتَّقُوْا کی وجہ سے ہے، غیر قرآن میں یوم لا تجزی اضافت کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کلام میں حذف ہے اس میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: یومًا لا تجزی فیه نفس پھر فیه کو حذف کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

و یوما شهدناه سليماً و عامراً

اس دن سلیم اور عامر قبیلوں میں حاضر تھے۔

اصل میں شهدنا فیه تھا۔ کسائی نے کہا: یہ خطا ہے فیہ کا حذف جائز نہیں لیکن تقدیر اس طرح ہے: واتقوا یوما لا تجزیه نفس تھا پھر ضمیر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کا حذف کرنا جائز ہے کیونکہ ظروف کا ان کے نزدیک حذف کرنا جائز نہیں ہے اور فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں ہے: هذا رجلاً قصدت ولا رایت رجلاً ارغب۔ جبکہ تیری مراد یہ ہو قصدت الیه و ارغب فیه۔ فرمایا: اگر یہ جائز ہوتا تو یہ بھی جائز ہوتا: الذی تکلمت زید۔ یعنی تکلمت فیه زید۔ فراء نے کہا: ضمیر اور فیہ کا حذف کرنا جائز ہے۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ سیبویہ، اخفش اور زجاج کے نزدیک دونوں وجہیں جائز ہیں۔

لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے کسی سے مؤاخذہ نہ ہوگا اور کوئی نفس دوسرے کا دفاع نہیں کر سکے گا۔ جزی عنی هذا الامر یجزی جیسے تو کہتا ہے قضی عنی۔ واجتزأت بالشیء اجتزاء کہا جاتا ہے جب تو کسی کی کفایت کرے۔ شاعر نے کہا:

فان الغدر فی الاقوام عارٌ وان الحر یجزء بالکراع

اقوام میں غدر عار ہے، بے شک آزاد شخص جانور کے بازو پر کفایت کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: اذا اجریت الماء علی الماء جزیٰ عنك۔ جب تو پیشاب کے اوپر پانی بہادے گا تو اس پر مکان کی طہارت کا حکم جاری ہوگا تجھے اس جگہ کو دھونے کی ضرورت نہیں اور کپڑے وغیرہ کے ساتھ پانی کو خشک کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ ابو بردہ بن نیار سے قربانی کے بارے میں صحیح حدیث میں ہے لن تجزی عن احد بعدك (1)۔ یعنی تیرے علاوہ کسی کے لئے بکری کا چھوٹا بچہ کفایت نہیں کرے گا۔ لَا تَجْزِیْ کا معنی لا تقضی، لا تغنی اور لا تکفی ہے۔ یعنی وہ ادا نہیں کرے گا، فائدہ نہیں دے گا اور کفایت نہیں کرے گا اگر اس پر کسی کا حق نہ ہوگا اگر اس پر کسی کا حق ہوگا تو وہ اس کی نیکیوں کے اختیار کے بغیر کفایت کرے گا اور ادا کرے گا اور فائدہ دے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر اس کی عزت وغیرہ کے سلسلہ میں ظلم کیا ہو وہ آج ہی اس سے معاف کرالے اس سے پہلے کہ نہ کوئی دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، اگر اس کا عمل صالح ہوگا تو اس کے ظلم کی مقدار اس سے عمل صالح لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں میں سے گناہ لے کر ظالم کے نامہ اعمال میں داخل کیے جائیں گے (2)۔ یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے اس کی مثل مفلس کے بارے میں حدیث ہے۔ ہم نے "تذکرہ" میں ذکر کر دی ہے۔ اسے مسلم نے تخریج کیا ہے اسے تجزی تاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جزی اور اجزیٰ کا معنی ایک ہے۔ بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: جزی بمعنی قضی ہے کافأ اور اجزیٰ بمعنی اغنی و کفی ہے۔ اجزانی الشی یجزئنی یعنی کفانی اس نے میری کفایت کی۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب الاکل یوم النحر، حدیث نمبر 902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامہ، حدیث نمبر 6053، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لواجزأت امر العالمین ولم یکن      لیجزی الا کامل و ابن کامل

تو نے تمام لوگوں کے معاملات کی کفایت کی اور کوئی کفایت نہیں کرتا سوائے کامل اور ابن کامل کے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، شَفَاعَةٌ، شفع سے مشتق ہے جس کا معنی دو ہے۔ تو کہتا ہے: کان وتراً فشفعتہٗ شفعا وہ طاق تھا میں نے اسے جفت بنا دیا۔ اسی سے الشفعہ ہے کیونکہ اپنے شریک کی ملک کو اپنی ملک سے ملا دیتا ہے۔

الشفیع، شفعہ کرنے والے کو کہتے ہیں اور شفاعت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ناقۃ شافع ایسی اونٹنی جس کا حمل اور بچہ متواتر جمع ہو جائیں۔ تو کہتا ہے: شفعت الناقۃ شفعاً۔ ناقۃ شفوع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک ہی مرتبہ دوہنے میں دو برتن بھرنے والی ہو۔ استشفعتہٗ الی فلانٍ یعنی میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ میری اس کے پاس سفارش کرے۔ تشفعت الیہ فی فلانٍ فشفعنی۔ میں نے اسے فلاں کے پاس سفارش کرنے کے لئے کہا تو اس نے میری سفارش کی۔ پس شفاعت تب ہوگی جب تیرا غیر تیرے مرتبہ اور تیرے وسیلہ کے ساتھ ملے۔ یہ حقیقت میں جس کے پاس سفارش کی گئی ہے اس کے پاس شفیع کی منزلت و مرتبہ کا اظہار ہے اور اس کی منفعت مشفوع (جس کی سفارش کی گئی ہے) کو پہنچانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت حق ہے۔ معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں: گنہگار مومنین جو آگ میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے لیکن اخبار ظاہر میں ہے کہ موحدین گنہگار انبیاء کرام کی امتوں میں سے ہوں گے انہیں ملائکہ، انبیاء، شہداء اور صالحین میں سے سفارش کرنے والوں کی سفارش پہنچے گی۔ قاضی نے معتزلہ کا رد کرتے ہوئے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے: (۱) وہ اخبار جو معنی میں متواتر ہیں۔ (۲) ان اخبار کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع۔ کسی بھی زمانہ میں کسی شخص سے ان احادیث کا انکار ظاہر نہیں ہوا۔ شفاعت پر مبنی روایات اور ان کی صحت اور قبولیت پر علماء کا اتفاق، اہل حق کے عقیدہ کی صحت اور معتزلہ کے دین کے فساد پر قطعی دلیل ہے۔

اگر وہ کہیں کہ کتاب اللہ میں ایسی نصوص وارد ہیں جو ان اخبار کو رد کرتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ (غافر) (نہ ہوگا ظالموں کے لئے کوئی دوست نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے) وہ کہتے ہیں: گناہ کبیرہ کرنے والے ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (النساء:123) (جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی) وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (البقرہ:48) (اس سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی) ہم کہتے ہیں: یہ آیات ہر ظالم کے لئے عام نہیں ہیں اور عموم کے لئے وضع نہیں ہے اور یہ آیات ہر برے عمل کرنے والے اور ہر نفس کے لئے نہیں ہیں ان سے مراد کافر لوگ ہیں نہ کہ مومنین۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو شفاعت کے متعلق وارد ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کے لئے شفاعت کو ثابت کیا ہے اور بعض اقوام سے شفاعت کی نفی کی ہے۔ کافروں کی صفت میں فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾ (مدثر) (اور نہ نفع دے گی انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش) اور فرمایا: وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) (اور سفارش نہیں کریں گے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے) اور فرمایا: وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا:23) (اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو)

ہم نے ان تمام آیات سے جان لیا کہ شفاعت مومنوں کو نفع دے گی کافروں کو نفع نہ دے گی اور مفسرین کا اجماع ہے کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ سے مراد نفس کافرۃ ہے نہ کہ ہر نفس، اگر ہم ہر ظالم گنہگار کے لئے عذاب کے عموم کا قول کریں بھی تو ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو ہم نے روایت کی ہیں اور دوسری دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یوسف) (بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ۔)

اگر وہ کہیں کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) اور فاسق پر تو رضا نہیں ہوتی۔ ہم کہیں گے: الله تعالیٰ نے لمن لا یرضی نہیں فرمایا بلکہ لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) فرمایا ہے۔ اور الله تعالیٰ جن کے لئے شفاعت کو پسند کرے گا وہ توحید پرست ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (مریم) (انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا الله تعالیٰ کا اپنی مخلوق سے کیا عہد ہے؟ فرمایا: وہ ایمان لائیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں (1)۔ مفسرین نے کہا: مگر جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا۔ اگر وہ کہیں کہ جس پر الله راضی ہوتا ہے وہ توبہ کرنے والا ہے جس نے الله کی بارگاہ میں لوٹنے کا عہد کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے ان کے لئے مغفرت کرتے ہیں۔ اور فرمایا: فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (غافر:7) (بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی) اسی طرح انبیاء کرام کی شفاعت توبہ کرنے والوں کے لئے ہے اہل کبائر کے لئے نہیں ہے۔ ہم کہیں گے: تمہارے نزدیک الله پر توبہ قبول کرنا واجب ہے جب الله تعالیٰ گنہگار کی توبہ قبول کرے گا تو شفاعت اور استغفار کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اہل تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا (غافر:7) سے مراد یہ ہے کہ ان کی مغفرت فرما جنہوں نے شرک سے توبہ کی وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (غافر:7) یعنی مومنین کے راستہ کی اتباع کی۔ انہوں نے الله تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی مغفرت کرے ان کے گناہوں سے نہ کہ شرک سے جیسا کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔) اگر وہ کہیں کہ ساری امت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں رغبت رکھتی ہے، اگر یہ اہل کبائر کا خاصہ تھی تو ان کا سوال باطل ہوا۔

ہم کہیں گے ہر مسلمان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت طلب کرتا ہے اور الله تعالیٰ کی بارگاہ سے رغبت رکھتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو کیونکہ ہر شخص کا عقیدہ ہے کہ وہ گناہوں سے سلامت نہیں ہے اور الله تعالیٰ نے اس پر جو فرض کیا ہے وہ اسے پوری طرح ادا کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے بارے میں نقص کا معترف ہے اسی وجہ سے ہر شخص سزا سے ڈرتا ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل مفهوم، حدیث نمبر 5510، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث 21991

نجات کی امید رکھتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص نجات نہیں پائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی بغیر رحمت الٰہیہ کے نجات نہیں پائیں گے؟ فرمایا: ''میں بھی نجات نہیں پاؤں گا مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ڈھانپ دیا ہے (1)''۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا يُقْبَلُ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تقبل تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ شفاعت مؤنث ہے۔ باقی قراء نے مذکر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ شفاعت بمعنی شفیع ہے۔ اخفش نے کہا: تذکیر (مذکر کا صیغہ) بہتر ہے کیونکہ تو نے فعل اور فاعل کے درمیان فرق کیا ہے جس طرح کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، عَدْلٌ سے مراد فدیہ ہے۔ العدل عین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الفداء ہے اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی المثل ہے۔ کہا جاتا ہے: عَدْلٌ وعدیل اس لئے بولا جاتا ہے جو وزن اور مقدار میں تیری مثل ہو۔ کہا جاتا ہے: عدل الشیء جو چیز قدر و قیمت میں دوسری چیز کے مساوی ہو اگرچہ اس کی جنس سے نہ بھی ہو۔ العدل (عین کے کسرہ کے ساتھ) جو چیز اپنی جنس سے دوسری چیز کے مساوی ہو اور جسم میں مساوی ہو۔ طبری نے حکایت کیا ہے عرب عین کے کسرہ کے ساتھ فدیہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں (2) اور اعدال کا واحد عِدْلٌ ہی ہے (یعنی عین کے کسرہ کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞ یعنی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ النصر کا معنی العون (مدد) ہے۔ الانصار، الاعوان۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران: 52) یعنی کون اپنی نصرت کو میری نصرت کے ساتھ ملائے گا، انتصر الرجل، آدمی نے انتقام لیا۔ النصر کا معنی آنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نصرتُ ارض بنی فلاں، میں فلاں کی زمین میں آیا۔ شاعر نے کہا:

اذا دخل شهر الحرام فودعی    بلاد تميم وانصري ارض عامر

جب شہر حرام داخل ہو تو تمیم کے شہروں کو الوداع کہہ اور عامر قبیلہ کی زمین میں آ۔

النصر کا معنی بارش بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نُصِرتِ الارضُ زمین پر بارش ہوئی۔ النصر کا معنی عطا بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

واني واسطار سطرن سطرا    لقائل يا نصر نصرا نصرا

ان سطور کی قسم جو لکھی گئی ہیں میں کہنے والا ہوں: اے عطا، عطا، عطا۔

اس آیت کا سبب جو علماء مفسرین نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں اور انبیاء کی اولاد ہیں، ہمارے آباء ہماری سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ قیامت کے روز سفارشات قبول نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب ان يدخل الجنة احد بعلمه برحمة الله تعالىٰ، صفحہ 377، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، حدیث نمبر 5982، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 139، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائیں گی اور نہ فدیہ لیا جائے گا۔ شفاعت، فدیہ اور نصرت کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان چیزوں کے بنی آدم دنیا میں عادی ہیں۔ تکلیف میں مبتلا خلاصی نہیں پاتا مگر اس کے ساتھ کہ اس کی سفارش کی جائے، یا اس کی مدد کی جائے یا فدیہ دیا جائے۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

”اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب یعنی ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے“۔

اس آیت میں تیرہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اِذْ حالت نصب میں ہے۔ اس کا اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ پر عطف ہے۔ یہ اور بعد والی آیات میں بنی اسرائیل کو وہ بعض نعمتیں یاد دلانا ہے جو ان پر تھیں۔ یعنی تم میری نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں دشمن سے نجات دی اور تم میں انبیاء بنائے۔ یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے اور مراد ان کے آباء ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ (الحاقہ) (یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں سوار کیا) بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَجَّيْنٰكُمْ کیونکہ آباء کی نجات، موجودہ لوگوں کی نجات کا سبب تھی اور نَجَّيْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے تمہیں زمین کی اونچی جگہ پر ڈالا، یہ اصل ہے پھر ہر کامیاب ہونے والے کو ناجی کہا گیا۔ پس ناجی وہ ہوتا ہے جو تنگی سے خوشحالی کی طرف نکلتا ہے اسے اذا نجیتکم بھی پڑھا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اٰلِ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی قوم، اس کے متبعین اور اس کے دین کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح آل رسول جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین، آپ کی ملت پر تھے کسی زمانہ میں بھی ہوں، خواہ ان کا نسبی تعلق ہو یا نہ ہو، اور جو آپ کے دین اور ملت پر نہ ہو وہ آپ کے اہل اور آل سے نہیں ہے اگرچہ اس کا نسبی اور قربت کا تعلق موجود بھی ہو۔ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: آل رسول فقط حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (البقرہ:50) اور یہ ارشاد ہے: اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (غافر) یعنی آل سے مراد اس کے دین کی آل ہیں جبکہ انہیں اس کے ساتھ بیٹا، بیٹی، چچا، بھائی اور عصبہ ہونے کا رشتہ نہ تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو مومن، موحد نہیں وہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی بھی ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آل نبی اور اہل نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نہیں تھے اگرچہ ان دونوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمایا: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود:46)

اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا:

خبردار! آل اَبی...... یعنی فلان...... میرے اولیاء نہیں ہیں میرا مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں (1)۔ ایک طائفہ نے کہا: آل سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ کی اولاد ہے۔ کیونکہ حضرت ابو حمید کی حدیث میں ہے، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ عَلَى أَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ وَ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ عَلَى أَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ أَبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: اہل معلوم ہیں اور آل سے مراد متبعین ہیں۔

پہلا قول صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ ﷺ دعا فرماتے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ۔ میرا باپ صدقہ لے کر آیا تو یہ دعا دی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى آلِ أَبِي أَوْفَى (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**: علمائے نحو کا اس میں اختلاف ہے کہ آل کو شہروں کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: آل فلان، آل فلانة، یہ نہیں کہا جاتا: هُوَ مِنْ آلِ حِمْصَ، اور نہ یہ کہا جاتا ہے: مِنْ آلِ الْمَدِينَه۔ اخفش نے کہا: رئیس اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے، جیسے آل محمد ﷺ۔ آل فرعون۔ کیونکہ فرعون گمراہی میں ان کا رئیس تھا۔ اخفش نے کہا: ہم نے شہروں کے بارے میں سنا، وہ کہتے ہیں: اهل المدینه، آل المدینه۔

**مسئلہ نمبر 4**: نحویوں کا اختلاف ہے کہ آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ نحاس، زبیدی اور کسائی نے اس سے منع کیا ہے۔ پس صرف یہ کہا جائے گا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ (ﷺ) وآله نہیں کہا جائے گا۔ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے گا: اهله۔ علماء کے ایک طائفہ کا خیال ہے کہ آله کہا جائے گا ان علماء میں سے ابن السید بھی ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ سماع صحیح اس کی تائید کرتا ہے۔ عبد المطلب کے قول میں ہے:

لا هُمَّ ان العبد یم نع رحله فامنع حلالك

وانصر على آل الصلیب و عابدیه الیوم آلك

ان اشعار میں آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

ندبہ نے کہا تھا:

أنا الفارس الحامی حقیقة والدی وآلی كما تحمی حقیقة آلكا

میں شہسوار ہوں اپنے والد کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں اور اپنی آل کی حفاظت کرنے والا ہوں جس طرح

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاة المومنین ومقاطعة غیرهم، صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ، صفحہ 175، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، باب الدعاء لمن اتی بصدقته، صفحہ 46-345، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہاری آل کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 5:** آل کی اصل میں علمائے نحو کا اختلاف ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اصل اھل ہے پھر ھاء کو الف سے بدلا گیا۔ اگر تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اس کو اصل کی طرف لوٹائے گا۔ تو کہے گا: اُھَیْل۔ مہدوی نے کہا: اس کی اصل اول ہے۔ بعض نے فرمایا: اصل اھل تھا ھاء کو ہمزہ سے قلب کیا گیا پھر ہمزہ کو الف سے بدلا گیا۔ اس کی جمع آلون ہے، اس کی تصغیر اویل ہے جیسا کہ نسائی نے بیان کیا ہے دوسرے لوگوں نے اھیل حکایت کیا ہے ہم نے نحاس سے یہ ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: جب تو الا کی جمع بنائے گا تو کہے گا آلون اور جب تو الا کی جمع بنائے گا جس کا معنی سراب ہے تو تو کہے گا آوال، جیسے مال کی جمع اموال ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِرْعَوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس بادشاہ کا نام ہی فرعون تھا۔ بعض نے فرمایا: عمالقہ کے بادشاہوں میں سے ہر بادشاہ کا اسم فرعون تھا۔ جیسے فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا ہے روم کے بادشاہ کا اسم قیصر ہوتا ہے حبشہ کے بادشاہ کا اسم نجاشی ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا اسم قابوس تھا۔ اہل کتاب کے قول کے مطابق وہب نے کہا: اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس کی کنیت ابومرہ تھی۔ وہ بنی عملیق بن لاوذ بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے تھا۔ سہیلی نے کہا: ہر شخص جو قبطیوں اور مصر کا والی بنا وہ فرعون کہلاتا تھا۔ فرعون اہل اصطخر میں سے فارسی تھا۔ مسعودی نے کہا: فرعون کی عربی میں تفسیر معروف نہیں۔ جوہری نے کہا: فرعون، ولید بن معصب بادشاہ مصر کا لقب ہے۔ ہر سرکش فرعون ہے، العتاۃ، فراعنہ، قد تفرعن، و ھو ذو فرعنۃ، یعنی سازشی اور انکاری۔ حدیث پاک میں ہے: اَخَذْنَا فِرْعَوْنَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ہم نے اس امت کے فرعون کو پکڑا۔

اس آیت میں فرعون حالت جری میں ہے لیکن عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسُوْمُوْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: وہ تمہیں چکھاتے ہیں۔ تم پر عذاب کو لازم کرتے ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: وہ تمہیں مستحق قرار دیتے ہیں، کہا جاتا ہے: سامہ خطۃ خسف۔ جب کسی ذلت کا مستحق قرار دیا جائے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

اذا ما الملك سام الناس خسفاً ابینا ان نقر الخسف فینا

جب بادشاہ نے لوگوں کو ذلیل کیا تو ہم نے اپنے اندر ذلت کے ٹھہرائے جانے کا انکار کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تمہیں ہمیشہ دیتے ہیں۔ السوم کا معنی دوام بھی ہے۔ اسی سے سائمۃ الغنم ہے جو ہمیشہ چرنے والی ہوتی ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ نیا کلام ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال کی حیثیت سے محل نصب میں کردے۔ یعنی سائمین لکم۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ یہ يَسُوْمُوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہے، اس کا معنی سخت عذاب ہے اور سوم العذاب کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے اور اس کا سوما سیئا کے معنی میں نعت ہونا بھی جائز ہے۔ روایت ہے کہ

فرعون نے بنی اسرائیل کو خدام اور اپنے ماتحت کر دیا تھا اور ان میں اپنے کام تقسیم کر دیئے تھے۔ کچھ لوگ مکانات بناتے تھے، کچھ کھیتی باڑی کرتے تھے، کچھ خدمت کرتے تھے۔ اور فرعون کی قوم لشکر اور حکمران تھی اور بنی اسرائیل میں سے جس کا کوئی کام نہ تھا ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور یہی سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ یہ یَسُوْمُوْنَكُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر بغیر واو عطف کے ہے۔ جیسا کہ سیبویہ نے کہا اور اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

متی تاتنا تلمم بنا فی دیارنا          تجد حطبا جزلا و ناراً تأججا

جب ہمارے پاس آئے گا ہمارے شہروں میں اترے گا تو بہت زیادہ لکڑیاں روشن آگ پائے گی۔

فراء وغیرہ نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ بغیر واو کے یَسُوْمُوْنَكُمْ کی تفسیر کے طور پر ہے جیسے تو کہتا ہے: اتانی القوم زید و عمرو۔ پس تفسیر کی بنا پر زید سے پہلے واو کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال یہ بھی ہے: وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ (فرقان)

اور سورۂ ابراہیم میں ویذبحون واو کے ساتھ ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں ذبح اور بغیر ذبح کے عذاب دیتے ہیں، پس یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ عذاب کی دوسری جنس ہے، ماقبل کی تفسیر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں یہ احتمال ہے کہ اس میں واو زائدہ ہو۔ اس کی دلیل سورہ بقرہ کی آیت ہے کبھی واو زائدہ بھی ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فلما اجزنا ساحة الحی وانتحٰی

اس مصرعہ میں واو زائدہ ہے۔ مراد قد انتحٰی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الی الملك القرم و ابن الهمام          ولیث الکتیبة فی المزدحم

یہاں بھی الملك القرم، ابن الهمام، لیث الکتیبه، سے ایک ہی مراد ہے۔ یہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُذَبِّحُوْنَ اکثر قراء شد کے ساتھ پڑھتے ہیں کثرت کا معنی لینے کی بنا پر۔ ابن محیصن نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الذّبح کا معنی الشق (چیرنا) ہے۔ الذِبح سے مراد مذبوح (ذبح کیا گیا) ہے۔ الذُباح، انگلیوں کی جڑوں میں پھٹن ہو جانا۔ ذبحت الدن میں نے مٹکے میں سوراخ کر دیا۔ سعد الذابح ایک سعادت مند۔ المذابح۔ محاریب، المذابح، مذبح کی جمع۔ جب سیلاب آ جائے اور زمین کو شق کر دے، تو جو شق بالشت بھر ہو اسے مذبح کہا جاتا ہے۔

فرعون بچوں کو ذبح کرتا تھا اور بچیوں کو باقی رکھتا تھا۔ بچیوں کو مال کے اعتبار سے نساء کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ یعنی مردوں کو ذبح کرتے ہیں انہیں بیٹے کہا گیا جب وہ اسی طرح تھے۔ ابناء سے مراد

مرد لینے والوں نے نساء کم سے دلیل پکڑی ہے، پہلا قول اصح ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11**: اللہ تعالیٰ نے فعل کو آل فرعون کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ فرعون کے حکم سے یہ کرتے تھے، چونکہ یہ کام ان کے سپرد تھا، اس لئے فعل کی نسبت ان کی طرف کی۔ نیز اس لئے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کام کرنے والا اپنے کام کی وجہ سے مؤاخذہ کا حقدار ہوگا۔ طبری نے کہا: یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ جس کو کسی ظالم نے کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو اس سے مؤاخذہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں: علماء کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ ظالم حکم دینے کی وجہ سے اور مامور قتل کرنے کی وجہ سے۔ نخعی نے اسی طرح کہا ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا قول بھی یہی ہے مگر قدرے تفصیل کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا: جب سلطان کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دے جبکہ مامور (جس کو حکم دیا گیا) جانتا ہو کہ اس نے اسے ظلماً قتل کرنے کا حکم دیا ہے، مامور اور امام دونوں پر قصاص ہوگا جیسے دونوں اکٹھا قتل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر امام، مامور کو اس کے قتل پر مجبور کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اسے ظلماً قتل کروا رہا ہے تو صرف امام پر قصاص ہوگا اور مامور کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس پر قصاص ہوگا اور دوسرا یہ کہ اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس پر نصف دیت ہوگی۔ یہ ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مامور کی یا تو یہ کیفیت ہوگی کہ اس پر آمر کی اطاعت لازم ہوگی اور وہ امام کے شر سے خوفزدہ ہوگا جیسے سلطان اور سردار اپنے غلام کے لئے۔ پس اس صورت میں قصاص دونوں کو لازم ہوگا یا ایسا ہوگا کہ اس پر حکم دینے والے کی اطاعت لازم نہ ہوگی، تو اس صورت میں صرف قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا حکم دینے والے کو نہیں جیسے باپ اپنے بیٹے کو یا استاد کسی لڑکے کو یا کاریگر اپنے شاگرد کو حکم دے جب کہ وہ بالغ ہو۔ اگر وہ بالغ نہ ہو تو قتل حکم دینے والے پر ہوگا اور بچے کی عاقلہ پر نصف دیت ہوگی۔ ابن نافع نے کہا: مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ اپنے غلام کو کسی انسان کے قتل کا حکم دے اگرچہ وہ غلام عجمی بھی ہو۔ ابن حبیب نے کہا: میں ابن القاسم کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ اگر ایسے شخص نے حکم دیا جس کی مخالفت میں مامور پر کوئی خوف نہیں ہے تو وہ اکراہ (مجبور کرنے) کے ساتھ لاحق نہیں ہوگا بلکہ مامور کو قتل کیا جائے گا آمر کو نہیں اور آمر کو سزا دی جائے گی اور قید کیا جائے گا۔

امام احمد نے اس سردار کے بارے میں فرمایا جو اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے، تو سردار کو قتل کیا جائے گا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلام کو قید میں رکھا جائے گا۔ امام احمد نے فرمایا: غلام کو قید کیا جائے گا اور اسے مارا جائے گا اور ادب سکھایا جائے گا۔ ثوری نے کہا: سردار کو تعزیر لگائی جائے گی۔ حکم اور حماد نے کہا: غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر غلام فصیح تھا، سمجھدار تھا تو اسے قتل کیا جائے گا اور مالک کو سزا دی جائے گی اگر غلام عجمی تھا تو سردار پر قصاص ہوگا۔ سلیمان بن موسیٰ نے کہا: آمر کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے پھر اسے سزا دی جائے گی اور اسے قید کیا جائے گا۔ یہ دوسرا قول ہے۔ مامور کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے قتل کا فعل کیا ہے۔ اسی طرح عطا، حکم، حماد، شافعی، احمد اور اسحاق نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: ان میں سے کسی کو بھی قتل

نہیں کیا جائے گا۔ یہ تیسرا قول ہے۔ ابوالمعالی نے ''البرہان'' میں بیان فرمایا ہے: ان کا خیال ہے کہ آمر اور مباشر ان میں سے کوئی قصاص میں قتل نہیں ہے اسی وجہ سے ان کے نزدیک کسی کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12**: جمہور نے یُذَبِّحُوْنَ مبالغہ کے لئے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن محیصن نے یُذْبَحُوْنَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا اولیٰ ہے کیونکہ ذبح میں تکرار تھا۔

فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس سے نکلی ہے اور اس نے مصر کے گھروں کو جلا دیا ہے۔ اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی گئی کہ بنی اسرائیل سے ایک بچہ بڑا ہوگا، اس کے ہاتھوں فرعون کا ملک تباہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو قریب المعنی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فِيْ ذٰلِكُمْ یہ تمام امور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خبر ہے وہ مفرد حاضر کی طرح ہے یعنی ان کے اس فعل میں تمہارے لئے آزمائش و امتحان ہے۔ بَلَآءٌ اس سے مراد نعمت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (انفال: 17) (تا کہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان) ابوالہیثم نے کہا: بلا کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی المحنة، (آزمانا) ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اچھے عمل کے ساتھ آزماتا ہے تا کہ وہ اس کے شکر کا امتحان لے۔ کبھی کسی ناپسندیدہ مصیبت سے آزماتا ہے تا کہ اس کے صبر کا امتحان لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اچھائی کے لئے بَلَآءٌ اور برائی کے لئے بلاء یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: ذٰلِكُمْ کا اشارہ نجات دینے کی طرف ہے تو اس صورت میں بلا خیر میں ہوگا، یعنی تمہیں نجات دینا تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جمہور علماء نے کہا: اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہے اور البلاء یہاں شر کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے: ذبح میں مکروہ اور امتحان ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خیر کے لئے فعل ابلاہ اللہ و بلاہ استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم و ابلاھما خیر البلاء الذی یبلو

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتوں کو جمع کیا ہے۔ اکثر خیر کے لئے ابلیتہ اور شر کیلئے بلوتہ اور آزمائش کے لئے ابتلیتہ و بلوتہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝

''اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھر ہم نے تم کو بچا لیا اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ، اِذْ محل نصب میں ہے اور فَرَقْنَا کا مطلب ہے ہم نے پھاڑ دیا، ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح۔ الفرق کا معنی جدا ہونا ہے۔ اسی سے فرق الشعر اسی سے الفرقان ہے کیونکہ قرآن نے حق و باطل کے درمیان جدائی کی۔ اسی سے فالفارقات فرقاً ہے یعنی ملائکہ حق و باطل کے درمیان فرق کے ساتھ اترتے ہیں اسی سے یوم الفرقان ہے یعنی جنگ بدر کا دن۔ اس دن حق و باطل کے درمیان فرق ہوا۔ اسی سے وقرآنا فرقناہ یعنی

قرآن کو ہم نے بیان کیا اور اسے ہم نے پختہ کیا۔ زہری نے فَرَّقْنَا را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے جدا جدا کر دیا۔ بِكُمُ کا معنی لکم ہے۔ با بمعنی لام ہے۔ بعض نے فرمایا: با اپنے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے فَرَقْنَا الْبَحْرَ بِدُخُولِكُمْ اِيَّاهُ۔ ہم نے دریا کو پھاڑ دیا تمہارے اس میں داخل ہونے کے ساتھ۔ یعنی وہ دو پانیوں کے درمیان ہو گئے یعنی ان کے ساتھ جدائی ہوگئی۔ یہ اولیٰ ہے فانفلق اس معنی کو بیان کرتا ہے۔

الْبَحْرَ اس کا یہ نام اس کی وسعت کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فرس بحرٌ جبکہ گھوڑا زیادہ چلنے والا ہو۔ اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مندوب گھوڑے کے بارے میں ہے جو ابوطلحہ کا تھا۔ وَاِن وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا ہم نے اسے تیز رفتار پایا(1)۔

البحر، نمکین پانی کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ابحر الماء پانی نمکین ہوگیا۔ نصیب شاعر نے کہا:

وقد عاد ماء الارض بحرا فزادنی  الی مرضی ان ابحر المشرب العذبُ

زمین کا پانی نمکین ہوگیا اس نے میری مرض میں اضافہ کیا کہ میٹھا پانی نمکین ہو گیا۔

الْبَحْرَ: شہر کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: هذه بحرتنا یعنی یہ ہمارا شہر ہے۔ یہ اموی نے کہا ہے۔ الْبَحْرَ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو انسان کے گردے میں لگ جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: لقیتہ صحرۃً بحرۃً یعنی میں اس سے بالکل واضح اور کھلے انداز میں ملا۔ کعب الاحبار سے ایک خبر میں مروی ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا نام صندفائیل ہے۔ تمام دریا اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں ہیں۔ ابونعیم نے یہ روایت ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن کعب کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْجَيْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں اس دریا سے نکالا۔ کہا جاتا ہے: نجوتُ من کذا نجاءً و نجاۃً میں نے اسے اس سے نکالا۔ اس کا مصدر نجاء (ممدود) اور نجاۃ (مقصور) دونوں طرح آتا ہے۔ الصدق منجاۃٌ سچ نجات دینے والا ہے۔ انجیت غیری و نجیتہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے (وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ اور فَاَنْجَيْنٰكُمْ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ کہا جاتا ہے: غرق فی الماء غرقا فھو غریق و غارق۔ اسی سے ابوالنجم کا قول ہے:

من بین مقتول و طاب غارقٍ

اغرقہ و غرقہ فھو مغرق و غریقٌ۔ لجام مفرق بالفضۃِ۔ یعنی چاندی سے مزین لگام۔ التغریق کا مطلب قتل بھی ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

الا لیت قیسا غرقتہ القوابل

(کاش! قیس کو دایہ عورتیں قتل کر دیتیں)

چونکہ دایہ عورت قحط کے سال نومولود کو جیلی کے پانی میں غرق کر دیتی تھی خواہ وہ مذکر ہوتا یا مونث حتیٰ کہ وہ مر جاتا پھر ہر قتل کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شجاعتہ صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 252، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعریق بنایا گیا۔ اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

اذا غرّقت ارباضها ثنی بکرة　　بتیهاء لم تصبح رءوماً سلوبها

یعنی جب رسیوں نے جوان اونٹنی کے دوسرے بطن کو قتل کر ڈالا تو وہ تھکاوٹ کی وجہ سے اپنے بچے پر مہربان نہ ہوئی۔

## بنی اسرائیل کے نجات پانے کی کیفیت میں علماء کے مختلف اقوال

طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ وہ مصر سے بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چلیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ قبطیوں سے عاریۃً سامان اور زیورات لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حلال کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کے ابتدائی حصہ میں لے کر چلے۔ فرعون کو پتا چلا تو اس نے کہا: کوئی شخص ان کا پیچھا نہ کرے حتیٰ کہ مرغ اذان دے۔ اس رات مصر میں کسی مرغ نے اذان نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات بہت سے قبطیوں کے بیٹوں کو موت دی، وہ ان کے دفن میں مشغول ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے اس وقت نکلے جب سورج چڑھ چکا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ۝ (الشعراء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا کی جانب چلے تھے حتیٰ کہ اس کے کنارے پر پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے کچھ زائد تھی اور فرعونیوں کی تعداد بارہ لاکھ تھی (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں نے دس لاکھ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ ان میں مؤنث گھوڑی کوئی نہیں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں اپنی اولاد کے ساتھ ۷۶ افراد میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھایا اور ان کی اولاد میں برکت دی حتیٰ کہ فرعونیوں سے نکل کر دریا کی طرف گئے تو وہ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کے علاوہ چھ لاکھ تھے۔ ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں شبابہ بن سوار نے انہوں نے یونس بن اسحاق سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے عمرو بن میمون سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلے تو فرعون کو خبر پہنچی۔ اس نے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ وہ ذبح کی گئی۔ پھر اس نے کہا: اس کی کھال اتارنے سے فراغت سے پہلے میرے لئے چھ لاکھ قبطی جمع ہوں۔ فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے رہے حتیٰ کہ دریا تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا سے کہا: پھٹ جا۔ دریا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! تو نے تکبر کیا ہے، کیا میں اولاد آدم میں سے کسی کے لئے پھٹا ہوں کہ تمہارے لئے پھٹ جاؤں؟ راوی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی جانب جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اس شخص نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ وہ گھوڑا تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر اس شخص نے پوچھا: اب کس سمت کا حکم دیا گیا ہے؟ فرمایا: اس طرف کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ تو نے جھوٹ بولا ہے اور نہ تجھ سے جھوٹ بولا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 141، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

گیا ہے پھر دوبارہ اس نے گھوڑا دریا میں ڈالا وہ تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم دیا گیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ آپ نے جھوٹ بولا اور نہ آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء:63) (کہ اپنا عصا دریا پر مارو) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح تھا اس میں بارہ راستے تھے کیونکہ بارہ قبائل تھے ہر قبیلہ کا ایک راستہ تھا وہ ایک دوسرے کو دکھائی دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی کے پہاڑوں میں کھڑکیاں اور سوراخ تھے جس سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باہر نکل گئے اور فرعونی ابھی دریا کے اندر تھے تو دریا نے انہیں طمانچے مارے اور انہیں غرق کر دیا۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بحر قلزم تھا اور وہ شخص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا وہ نوجوان یوشع بن نون تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پھٹ جائے جب وہ تجھ پر ضرب لگائیں۔ وہ دریا اس رات موجیں مارتا رہا جب صبح ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو مارا اور اس کی کنیت ابو خالد رکھی۔

ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے قصص میں یہ معنی بیان کیا ہے اور جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ یونس اور سورۂ الشعراء میں آئے گا۔

**فصل:** اللہ تعالیٰ نے نجات دینے اور غرق کرنے کا ذکر فرمایا اور اس دن کا ذکر نہیں فرمایا جس میں یہ سب کچھ ہوا۔ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو یہود کو پایا کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا: یہ ایک عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن بطور شکر روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تم سے زیادہ قریبی ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا(1)۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے کے ان سے زیادہ مستحق ہو۔ پس تم روزہ رکھو۔

**مسئلہ:** ان احادیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں اس دن کے روزے کا حکم دیا جیسا کہ یہود نے اس کے متعلق بتایا۔ حقیقت اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، فرمایا: عاشوراء کے دن قریش زمانہ جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو خود بھی یہ روزہ رکھا اور اس روزے کا حکم بھی فرمایا۔ جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کے دن کا روزہ ترک کر دیا اور فرمایا: جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے یہ روزہ ترک کر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 1865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دے (1)۔ بخاری اور مسلم نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ احتمال ہے کہ قریش نے یہود کے خبر دینے کی وجہ سے یہ روزہ رکھا ہو کیونکہ وہ ان سے سنتے تھے کیونکہ یہود ان کے نزدیک اہل علم تھے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں مکہ میں روزہ رکھا ہو۔ جب آپ مدینہ طیبہ آئے اور یہود کو یہ روزہ رکھتے ہوئے پایا تو فرمایا: ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریبی اور پیروی کے زیادہ مستحق ہیں (2)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع میں روزہ رکھا۔ امر بصیامہ یعنی اس دن کے روزہ کے امر کو مؤکد فرمایا حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ ہم کہیں گے: یہ اس شخص کا شبہ ہے جو کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مکلف تھے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں جیسا کہ سورۂ انعام آیت 90 میں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کے تحت مزید بیان آئے گا۔

**مسئلہ**: عاشوراء کے دن میں اختلاف ہے۔ کیا یہ نویں محرم الحرام کا دن ہے یا دسویں کا۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ یہ نویں کا دن ہے۔ ان کی دلیل حکم بن اعرج کی حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: مجھے عاشوراء کے روزہ کے متعلق بتاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب تو محرم کا چاند دیکھے تو شمار کر اور تو نویں محرم الحرام کو روزہ سے ہو۔ میں نے پوچھا: کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح روزہ رکھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں (3)۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرات سعید بن مسیب، حسن بصری، امام مالک اور سلف کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دسویں کا دن ہے۔ امام ترمذی نے حضرت حکم کی حدیث ذکر کی ہے اور اس پر صحت و حسن کا کوئی حکم بیان نہیں کیا پھر اس کے بعد یہ ذکر کیا: انبانا قتیبة انبأنا عبد الوارث عن یونس عن الحسن عن ابن عباس قال امر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بصوم عاشوراء یوم العاشر۔ یعنی حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دسویں کے دن عاشوراء کے روزے کا حکم دیا (4)۔ پھر فرمایا: ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابن عباس کی حدیث حسن، صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بھی یہی کہتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: حضرت ابن عباس کا سائل کو یہ کہنا: تو شمار کر اور نویں کے دن روزے سے ہو۔ اس میں دسویں کے روزے کے ترک پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ وعدہ کیا کہ وہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھے۔ پس دونوں دن روزہ رکھنا دونوں احادیث کو جمع کرنا ہے۔ اور حضرت ابن عباس کا حکم کو جواب جب اس نے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ رکھتے تھے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہاں۔ اس کا مطلب ہے اگر آپ زندہ رہتے۔ وگرنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی نویں محرم کا روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس کا بیان اس روایت میں ہے جو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَئِنْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 358، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً صفحہ 359، جلد 1 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی عاشوراء ای یوم هو، صفحہ 94، جلد 1 (وزارت تعلیم)

بَقِیْتُ اِلٰی قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ الْیَوْمَ التَّاسِعَ (1) اگر میں آئندہ سال تک باقی رہا تو میں نویں (محرم) کا روزہ ضرور رکھوں گا۔

**فضیلت:** حضرت ابو قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ، اللہ تعالیٰ سے اس پر امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کا کفارہ بن جائے (2)۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: ہم کسی روایت کو نہیں جانتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ عاشوراء کے دن کا روزہ سال کا کفارہ ہے (3) سوائے حضرت ابو قتادہ کی حدیث کے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ اس کا معنی ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرعونی مردہ حالت میں پانی پر تیرنے لگے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے انہیں غرق ہوتے دیکھا اور اپنی نجات کو بھی دیکھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں کو ان کے لئے نکالا گیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے انہیں دیکھا۔ یہ احسان کے بعد دوسرا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے اور آگاہ ہونے سے غافل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس آدمی کی حالت میں تھے جو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکے جیسے تو کہتا ہے: ھذا الامر منك بمرأى و مسمع یعنی اس حالت میں ہے کہ تو اسے دیکھ سکے اور سن سکے اگر تو چاہے۔ یہ قول اور پہلا قول بنی اسرائیل کے احوال کے زیادہ مطابق ہے کیونکہ دریا سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سے جو صادر ہوا اس میں متواتر عبرت نہیں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق کیا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے دل مطمئن نہیں ہیں کہ فرعون غرق ہو گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اس نے فرعون کو باہر پھینک دیا اور انہوں نے اسے دیکھا۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: فرعون نہیں مرا اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سنا کہ وہ اس کے نبی کو جھٹلا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دریا کے کنارے پر پھینک دیا گویا وہ سرخ بیل ہے۔ بنی اسرائیل نے اسے دیکھا جب وہ مطمئن ہو گئے تو انہیں خشکی کے راستہ سے فرعون کے شہروں کی طرف بھیجا گیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کے خزانے منتقل کیے اور نعمتوں میں غرق ہو گئے۔ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بتوں کے پاس معتکف ہے، تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لئے ایک معبود بنائیں جس طرح ان کے لئے معبود ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں تمہارے لئے معبود تلاش کروں؟ اس نے تمہیں اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارض مقدس کی طرف چلنے کا حکم دیا جہاں ان کے آباء و اجداد کے گھر تھے، تا کہ وہ فرعون کی زمین سے پاک ہو جائیں۔ ارض مقدسہ اس وقت جابر لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس پر غالب تھے۔ پس انہیں اس زمین سے نکالنے کے لئے جنگ کی ضرورت تھی تو بنی اسرائیل نے کہا: (اے موسیٰ!) کیا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الحث علی صوم یوم عاشوراء، صفحہ 94، جلد 1 (و،ت)

3۔ ایضاً، حدیث 683

تم ہمیں جابر لوگوں کے لئے شکار بنانا چاہتے ہو؟ اگر تم ہمیں فرعون کے ہاتھ میں رہنے دیتے تو ہمارے لئے بہتر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ... الی قٰعِدُوْنَ۔ (المائدہ:21)، (داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ...... الخ)

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا فرمائی اور انہیں فاسقین کا نام دیا۔ پس وہ ''تیہ'' کے صحرا میں چالیس سال بطور سزا رہے پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے سلویٰ اور بادل کے ذریعے احسان فرمایا ...... جیسا کہ آگے آئے گا ...... پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء کی طرف چلے تا کہ ان کے لئے تورات لے آئیں۔ پس انہوں نے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا ...... اس کا بیان آگے آئے گا ...... پھر انہیں کہا گیا: تم بیت المقدس پہنچ چکے ہو تو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حطۃٌ کہتے ہوئے داخل ہو ...... اس کا بیان بھی آگے آئے گا ...... حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی حیاء دار اور پردہ پوش تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خصیتین کی بیماری ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے لگے تو اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے تو وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بنی اسرائیل کی مجالس کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام برہنہ اس کے پیچھے دوڑے اور کہہ رہے تھے: اے پتھر! میرے کپڑے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (احزاب:69) (1) اس کا بیان بھی آگے آئے گا ...... پھر جب حضرت ہارون کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل نے کہا: تو نے ہارون کو قتل کیا ہے اور تو نے اس سے حسد کیا ہے حتیٰ کہ ملائکہ ان کی چارپائی لے آئے اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پر مردہ تھے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ وہ اپنی قربانی کی قبولیت کی نشانی جان لیں۔ پس ایک آگ آسمان سے آتی (اور ان کی قربانیوں کو کھا جاتی) تو یہ ان کی قربانیوں کی قبولیت کی نشانی تھی۔ پھر بنی اسرائیل نے سوال کیا کہ ہمارے لئے آپ دنیا میں گناہوں کے کفارات کو بیان فرمائیں۔ پس جو گناہ کرتا اس کے دروازے پر لکھا جاتا عملت کذا تو نے ایسا عمل کیا اور اس کا کفارہ اپنے اعضاء میں سے عضو کا کاٹنا ہے۔ اس عضو کا نام لیا جاتا تھا، جس کو پیشاب لگ جاتا تو وہ پاک نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ کپڑے کو کاٹ دیتا تھا اور اپنے بدن سے جلد کو دور کر دیتا تھا پھر انہوں نے تورات کو بدلا اور اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا، اپنے ہاتھوں سے تورات میں لکھا اور تورات کے عوض سامان زندگی لیا، پھر یہاں تک پہنچے کہ اپنے انبیاء اور رسل کو قتل کیا یہ ان کے معاملات اپنے رب کے ساتھ تھے اور ان میں ان کا یہ کردار تھا اور یہ ان کا برا اخلاق تھا۔ ان شاء اللہ ان میں سے ہر فصل کا پورا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

طبری نے کہا: ان مغیبات کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے ذریعے قرآن میں بیان جن کا عربوں کو علم نہ تھا اور یہ بنی اسرائیل کے حق میں واقع ہوئے تھے۔ یہ بنی اسرائیل کے پاس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل تھے (2)۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریاناً وحدہ فی الخلوۃ الخ، حدیث 269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو (معبود) ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے"۔

اس آیت میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ابو عمرو نے وعدنا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اسے اختیار کیا ہے اور اسے راجح قرار دیا ہے اور واعدنا کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: مواعدہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ اور وعید میں منفرد ہے۔ اسی پر ہم نے قرآن کے الفاظ کو پایا۔ جیسے ارشاد ہے: وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ (ابراہیم: 22) (جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (نور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (انفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے)۔

مکی نے کہا: الفاظ کا ظاہر بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔ پس اس کو واحد پر محمول کرنا واجب ہے ظاہر نص کی وجہ سے کیونکہ فعل صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ یہ حسن، ابو رجاء، ابو جعفر، شیبہ اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ قتادہ اور ابن ابی اسحاق نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہمارے نزدیک عام لوگوں کی قراءت وعدنا بغیر الف کے ہے کیونکہ المواعدۃ زیادہ تر دو شخصوں اور دو بدلہ دینے والوں کے درمیان ہوتا ہے ہر ایک دوسرے سے وعدہ کرتا ہے۔ جوہری نے کہا المیعاد کا معنی باہم وعدہ کرنا، وقت اور جگہ ہے۔ مکی نے کہا: المواعدۃ اصل میں دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی کلام عرب میں (باب) مفاعلہ کا صیغہ واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: طَارَقْتُ النَّعْلَ، دَاوَيْتُ الْعَلِيْلَ، عَاقَبْتُ اللِّصَّ۔ ان تمام جملوں میں باب مفاعلہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ ایک شخص کی طرف سے فعل ہوا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواعدہ کا لفظ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدنا کے معنی کی طرح ہوگا۔ پس دونوں قراءتوں کا ایک معنی ہو جائے گا، واعدنا الف کے ساتھ اختیار کرنا اس لئے ہے کیونکہ یہ وعدنا کے معنی میں ہے اس کے دو معانی میں سے ایک معنی میں، نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ یا قبول کرنا ضروری ہے جو وعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس مفاعلہ کا استعمال صحیح ہے۔

نحاس نے کہا: واعدنا (الف کے ساتھ) پڑھنا اجود اور احسن ہے۔ یہ مجاہد، اعرج، ابن کثیر، نافع، اعمش، حمزہ اور کسائی کی قراءت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ واعدنا موسیٰ یہ باب الموافات ہے۔ وعدہ اور وعید میں سے کوئی شے نہیں ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے: موعدك يوم

الجمعه موعدك موضع كذ! اس میں فصیح واعدتہ کہنا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہاں واعدنا الف کے ساتھ بہتر ہے کیونکہ طاعت کا قبول کرنا مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول اور اتباع ہے۔ یہ مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ابو عبیدہ نے وعدنا کو ترجیح دی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو قبول کرنا اور اس کا التزام کرنا یہ مواعدہ کے مشابہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد مُوْسٰی یہ عجمی اسم ہے۔ عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک روایت کے مطابق قبطی لوگ پانی کو مو اور درخت کو شا (سا) کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تابوت میں پانی اور درخت کے پاس پائے گئے تو انہیں موسیٰ کہا گیا(1)۔ سدی نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ان پر خوف ہوا تو اس نے انہیں ایک تابوت میں رکھ دیا اور دریا میں پھینک دیا...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے الہام کیا تھا...... اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درختوں کے درمیان فرعون کے گھر کے قریب دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کی بیوی آسیہ کی لونڈیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا۔ پس اس مکان کے نام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ نام رکھا گیا(2)۔ نقاش وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ جس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا اس کا نام صابوت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔ موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام(3)۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً، اَرْبَعِیْنَ مفعول ثانی کی بنا پر منصوب ہے اور کلام میں حذف ہے۔ اخفش نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: واذ واعدنا موسٰی تمام اربعین لیلة جیسا کہ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) میں مضاف حذف ہے الاربعون تمام اس وعدہ میں داخل ہیں۔

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ چالیس دن ذی القعدہ کا مہینہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے اور یہ اس کے بعد ہوا جب آپ نے دریا عبور کر لیا تھا اور آپ کی قوم نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اللہ کی طرف سے ہمارے پاس کتاب لے آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر چیدہ افراد لے کر باہر نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھے اور ان سے مکمل چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا، تو مفسرین کے قول کے مطابق انہوں نے بیس دن اور بیس راتیں شمار کیں اور کہنے لگے: ہم سے وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پس انہوں نے ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ سامری نے انہیں کہا: یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے، وہ سامری کی اس بات پر مطمئن ہو گئے۔ حضرت ہارون نے انہیں منع فرمایا اور فرمایا: يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ۝ (طٰہٰ) (اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو تو قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام)۔ حضرت ہارون کی صرف بارہ ہزار نے بات

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ النکت والعیون، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ماں باقیوں نے بچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں حضرت ہارون کی اتباع نہ کی اور تمام لوگ اس بچھڑے کی عبادت میں گر گئے اور وہ دس لاکھ سے زائد تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہیں اس حال میں پایا آپ نے تختیاں نیچے ڈال دیں۔ پس ان میں سے چھ اجزاء اٹھالئے گئے اور ایک تختی باقی رہ گئی جس میں حرام، حلال اور جن احکام کی انہیں احتیاج تھی وہ باقی رہ گئی۔ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو جلا دیا اور اس کی راکھ کو سمندر میں بکھیر دیا، بنی اسرائیل نے بچھڑے کی محبت کی وجہ سے اس دریا کا پانی پیا۔ پس ان کے ہونٹوں پر زردی ظاہر ہوئی اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ پھر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:54) پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو۔

پس انہوں نے خنجر اور تلواریں اٹھائیں اور سورج کے طلوع ہونے سے چاشت کے بلند ہونے تک ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا کسی والد نے اپنے بیٹے کے بارے میں اور کسی بیٹے نے والد کے بارے میں، اور بھائی نے بھائی کے بارے میں نہ پوچھا جو سامنے آیا اسے تلوار سے قتل کر دیا اسی طرح ہر ایک نے اپنی مثل کو قتل کیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر التجا کی: یارب! بنی اسرائیل توختم ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان پر اپنا فضل فرمایا۔ پس جو باقی بچ گئے ان کی توبہ قبول فرمائی اور جو مارے گئے انہیں شہداء میں شمار کر دیا جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر4:** اگر کہا جائے کہ راتوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا دنوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے، یہ رتبہ میں دن سے بلند ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ راتوں کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ راتیں مہینوں کا آغاز ہیں اور دن ان کے تابع ہیں۔

**مسئلہ نمبر5:** نقاش نے کہا: اس آیت میں صوم وصال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر دنوں کا ذکر فرماتا تو یہ اعتقاد ممکن تھا کہ وہ رات کو افطار کرتے تھے۔ جب راتوں پر نص قائم فرمادی تو کلام کی قوت تقاضا کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن، راتوں سمیت صوم وصال رکھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: میں نے شیخ، زاہد، امام، واعظ ابوالفضل الجوہری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور نماز میں اس کے قریب ہونے کے بارے میں وعظ فرما رہے تھے کہ نماز کھانے پینے سے غافل کر دیتی ہے اور وہ فرما رہے تھے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کتنا قرب نصیب ہوگا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی کو کہا تھا: آتنا غداءنا، اس قول کی وجہ سے انہوں نے زمانہ کے اسی روزے وصال کے ساتھ رکھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے علماء صوفیہ نے وصال پر استدلال کیا ہے اور ان میں افضل چالیس دن ہیں۔ مزید کلام صوم وصال پر، آیت صیام کے تحت اسی سورت میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس آیت کے مزید احکام سورۂ اعراف میں وَ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً (اعراف:142) کے تحت آئیں گے۔ اور بچھڑے کا قصہ، اس کی کیفیت کا بیان اور اس کا ڈکارنا وغیرہ کا ذکر سورۂ اعراف میں اور سورۂ طہٰ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔ اتَّخَذْتُمْ اصل میں ائتخذتم تھا یہ الاخذ سے مشتق ہے۔ اس کا وزن افتعلتم ہے دو ہمزوں کے امتناع کی وجہ سے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی گئی پھر ایتخذتم ہوا، اور یاء گردان میں مضطرب رہتی ہے یاتخذ میں الف ہوگئی موتخذ میں واؤ ہوگی۔ پس یہاں یاء کو ایک پختہ حرف سے بدلا گیا جو مابعد کی جنس سے تھا اور وہ تاء ہے پھر ادغام کیا گیا پھر الف وصل کو نطق (بولنے) کے لئے لایا گیا۔ کبھی اس الف سے استغناء کیا جاتا ہے جب کلام کا معنی تقریر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) الف تقریر کی وجہ سے الف وصل سے استغناء کیا گیا۔ شاعر نے کہا:

استحدثَ الرکب عن اشیاعھم خبراً ام راجع القلب من اطرابه طربٗ

اس شعر میں الف وصل ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ الف تقریر موجود تھا۔ اسی طرح قرآن میں ہے: اَطَّلَعَ الْغَیْبَ (مریم:78) اَصْطَفَی الْبَنَاتِ (الصافات:153) اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ (ص) ان تینوں مثالوں میں تقریر کی وجہ سے الف وصل ذکر نہیں کیا گیا۔ ابوعلی فارسی کا مذہب یہ ہے کہ اتَّخَذْتُمْ یہ تخذ سے ہے نہ کہ اخذ سے ہے۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ جملہ حال ہے، ظلم کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

''پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکرگزار بن جاؤ''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ، العفو، اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو معاف کرنا۔ کبھی عفو سزا کے بعد ہوتا ہے اور کبھی سزا سے پہلے، بخلاف الغفران کے کہ اس کے ساتھ یقیناً عقوبت ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہو پھر اسے سزا (عقوبت) نہ دی گئی ہو تو اسے معاف کیا گیا۔ العفو کا مطلب گناہ کو مٹانا ہے، یعنی ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا اور تم سے تجاوز کیا۔ یہ عفت الریح الاثر سے ماخوذ ہے یعنی ہوا نے اثر مٹا دیا، عفا الشئ کسی شے کا کثیر ہونا یہ اضداد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰی عَفَوْا (اعراف:95)

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی تمہاری بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد۔ بچھڑے کو عجل اس لئے کہا گیا کہ بنی اسرائیل نے اس کی عبادت میں جلدی کی تھی۔ واللہ اعلم

العجل گائے کے بچے کو کہتے ہیں العجول بھی اسی کو کہتے ہیں اس کی جمع العجاجیل اور مؤنث عجلةٌ آتی ہے۔ یہ ابوالجراح سے روایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کے عفو کا۔ لعل کا معنی پہلے گزر چکا

ہے، رہا شکر تو لغت میں اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔
دابۃ شکور وہ جانور جس پر موٹا پا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی اس نیکی اور اچھائی پر تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ جوہری نے کہا: الشکر کا مطلب محسن پر اس اچھائی کی وجہ سے تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ کہا جاتا ہے: شکرتہ و شکرت لہ- لام صلہ افصح ہے، الشکران، الکفران کا متضاد ہے، تشکرت لہ یہ شکرت لہ کی مثل ہے۔
امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَشْكُرِ اللّٰهُ مَنْ لَا يَشْكُرِ النَّاسَ (1) جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔
خطابی نے کہا: اس کلام کے دو معانی ہیں: ایک یہ کہ وہ جس کی طبع میں لوگوں کی نعمت کی ناشکری ہے اور ان کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اس کی عادت سے، اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے اور اس کے شکر کا ترک ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان پر بندے کا شکر قبول نہیں کرتا جب بندہ لوگوں کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور لوگوں کے احسان کی ناشکری کرتا ہے کیونکہ ہر ایک امر دوسرے سے متصل ہے۔
**مسئلہ نمبر 4:** شکر کے معنی میں علماء کی عبارات: حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: شکر کا مطلب، سرا اور علانیۃ معصیت سے اجتناب کے ساتھ ساتھ اطاعت کی ادائیگی میں کوشش کرنا ہے۔
ایک اور گروہ نے کہا: شکر کا مطلب انعام کرنے والے کے شکر کی بجا آوری میں تقصیر کا اعتراف ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا: 13) حضرت داؤد نے کہا تھا: یا رب! میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ شکر بھی تو تیری طرف سے نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تو نے مجھے پہچان لیا اور تو نے میرا شکر ادا کیا جب تو نے پہچان لیا کہ شکر بھی میری طرف سے نعمت ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی: یا رب! مجھے اپنی سب سے زیادہ مخفی نعمتیں دکھا جو تو نے مجھ پر فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! سانس لے۔ حضرت داؤد نے سانس لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون ہے جو دن رات میں اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے (2)۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ چھوٹی سی نعمت جو تو نے اپنی نعمتوں میں سے میرے ہاتھ میں رکھی میرے سارے اعمال اس کا بدلہ نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کیا (3)۔ جنید نے کہا: شکر کی حقیقت شکر سے عجز ہے۔ حضرت جنید سے ہی مروی ہے، فرمایا: میں حضرت سری سقطی کے سامنے کھیل رہا تھا جبکہ سات سال کا تھا اور حضرت سری سقطی کے سامنے ایک جماعت شکر کے بارے گفتگو کر رہی تھی۔
حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: اے لڑکے! شکر کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی وجہ سے اس کی نافرمانی نہ کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، حدیث نمبر 4177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ الشعب للبیہقی مثلہ، حدیث 4623
3۔ ایضاً، حدیث 4415

جائے۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: مجھے [illegible] اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا حصہ تیری زبان ہو۔ جنید نے کہا: میں اس ایک کلمہ پر ہمیشہ روتا رہتا ہوں جو میرے متعلق حضرت سری سقطی نے کہا تھا۔ شبلی نے کہا: نیکیوں پر محافظت اور تواضع، شہوات کی مخالفت، طاعات میں دوام، زمین اور آسمانوں کے جبار کا مراقبہ، شکر ہے۔

حضرت ذوالنون مصری ابوالفیض نے کہا: جو تجھ سے بلند ہے اس کی اطاعت کرنا شکر ہے، ہم مثل کو بدلہ دینا شکر ہے، جو کم مرتبہ ہے اس کے ساتھ احسان اور فضل کا مظاہرہ کرنا شکر ہے۔

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت تا کہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو''۔

اِذْ ماضی کے لئے اسم ہے اور اذا مستقبل کے لئے اسم ہے، اٰتَیْنَا کا مطلب ہے ہم نے عطا کیا۔ ان تمام الفاظ کے معانی پہلے گزر چکے ہیں۔ الْكِتٰبَ سے مراد بالاجماع تورات ہے اور الْفُرْقَانَ کے بارے اختلاف ہے۔ فراء اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرقان عطا کی۔ نحاس نے کہا: یہ اعراب اور معنی میں غلطی ہے، رہا اعراب تو کسی شے پر معطوف اس کی مثل ہوتا ہے اور اس قول کے اعتبار سے کسی شے پر معطوف اس کے خلاف ہوگا۔ رہا معنی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰتَیْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (الانبیاء: 48) ابو اسحاق الزجاج نے کہا: فرقان سے مراد الکتاب ہی ہے تاکید کے لئے دو اسموں کے ساتھ اس کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

یہ فراء سے حکایت ہے، شاعر کا قول ہے:

و قدمت الادیم لراهِشَیه　　والفی قولها کذباً و میناً

اس شعر میں کذب اور مَین ایک ہی معنی میں ہیں۔ تاکید کے لئے دو اسم ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا هندٌ وارض بها هندٌ　　وهندٌ اتی من دونها النأی والبعد

اس شعر میں النأی اور البُعد تاکید کے لئے معطوف کیے گئے ہیں۔ عنترہ کا قول ہے:

حییت من طلل تقادم عهده　　اقوی واقفر بعد ام الهیثم

نحاس نے کہا: یہ شعر میں ہوتا رہتا ہے، سب سے بہتر اس کے متعلق مجاہد کا قول ہے۔ الْفُرْقَانَ سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے (1)، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ ابن زید نے کہا: الْفُرْقَانَ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹنا ہے حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تو انہوں نے دریا عبور کر لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد مصیبت سے چھٹکارا ہے کیونکہ وہ قبطیوں سے دور ہو گئے تھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال: 29)

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 327، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: اَلْفُرْقَانَ سے مراد حجت اور بیان ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: واؤ زائد ہے معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب فرقان عطا کی، واؤ کبھی لغت میں زائد بھی ہوتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: فلان حسن و طویل۔ شاعر نے کہا:

الی الملك القرم و ابن الهمام　　و ليث الكتيبة فی المزدحم

اس شعر میں واؤ دونوں جگہ زائدہ ہے، کیونکہ مراد الملك القرم، ابن الهمام ليث الكتيبه ہے۔ اس تاویل کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (انعام: 154) (پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ پوری کردیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہوجائے ہر چیز کی) یعنی حلال، حرام، کفر، ایمان، وعدہ، وعید وغیرہ سب کچھ بیان کردیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اَلْفُرْقَانَ کا مطلب ان کے اور فرعون کی قوم کے درمیان جدائی ہے۔ یعنی ان کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا۔ اس کی مثال یوم الفرقان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کی مدد فرمائی تھی اور ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا(1)۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم گمراہی سے ہدایت پاؤ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اے میری قوم بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو جنہوں نے شرک کیا یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کرلی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ قوم، صرف مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورتیں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات: 11) پھر فرمایا: وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ (الحجرات: 11)

زہیر نے کہا:

وما ادری و سوف اخال ادری　　اقوم آل حصن ام نساء

اس شعر میں اقوم سے مراد شاعر نے مرد لئے ہیں عورتوں کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ (اعراف: 80) یہاں صرف مرد مراد ہیں عورتیں نہیں کبھی قوم کا اطلاق

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ (نوح:1) اسی طرح ہر نبی کو عورتوں اور مردوں دونوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰقَوْمِ منادیٰ مضاف ہے۔ یٰقَوْمِ میں یا کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ حذف کا مقام ہے اور کسرہ اس کے حذف پر دلالت کر رہا ہے یہ یا تنوین کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پس تو اسے حذف کر دے گا جس طرح تنوین کو مفرد اسم سے حذف کیا جاتا ہے۔ غیر قرآن میں اس کا سکون کے ساتھ اثبات بھی جائز ہے۔ تو کہے گا: یاقومِیْ کیونکہ یہ اسم ہے اور حالت جری میں ہے، اگر تو چاہے تو اس یا کو فتحہ دے اگر چاہے تو اس کے ساتھ ہا لاحق کر دے۔ تو کہے: یا قومیۂ اگر چاہے تو اسے الف سے بدل دے کیونکہ یہ اخف ہے اور تو کہے: یا قوما اگر چاہے تو تو کہے: یا قومُ بمعنی یا ایھا القوم، اگر تو اسے نکرہ بنائے تو تو اسے نصب دے گا اور تنوین دے گا، قوم کا واحد امرؤ ہے جو اس کے لفظ پر نہیں ہے تو کہتا ہے: قوم، اقوام، اقاوم یہ جمع الجمع ہے، یہاں قوم سے مراد بچھڑے کے پجاری ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے امر سے خطاب فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ یہاں جمع کثرت کی جگہ پر جمع قلت کو ذکر کیا اور کبھی جمع کثرت کو جمع قلت کی جگہ رکھا جاتا ہے اور جمع قلت کو کثرت کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ:228) اور ارشاد فرمایا: فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ (الزخرف:71) ان آیات میں جمع قلت کی جگہ جمع کثرت اور کثرت کی جگہ جمع قلت کا وزن ذکر فرمایا ہے۔

جو کوئی فعل کرتا ہے اس کا ضرر (نقصان) اس کی طرف لوٹتا ہے تو کہا جاتا ہے: انما اسأت الی نفسك۔ تو نے اپنے نفس پر برا کیا۔ ظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ بعض ارباب معانی نے کہا: ہر انسان نے اپنے آپ پر جلدی کی جس نے اسے ساقط کر دیا اور نفس کی خواہش کی مخالفت کی وہ اس کے ظلم سے بری ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت میں بچھڑے کی عبادت کی تھی جیسا کہ قران حکیم نے بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ جب ان سے کہا گیا کہ تم اپنے پروردگار کی طرف توبہ کرو تو انہوں نے کہا: کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

ارباب الخواطر نے کہا: اپنے نفسوں کو اطاعات کے ساتھ مطیع کرو اور انہیں شہوات سے روکو۔ صحیح یہ ہے کہ حقیقت میں قتل کرنے کا حکم تھا اور قتل کا مطلب حرکت کو مارنا ہے۔ قتلت الخمر یعنی پانی کے ساتھ اس کی شدت کو ختم کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: توبہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف اس امت کو انعام کی، دوسری امتوں کو یہ نعمت عطا نہ فرمائی۔ بنی اسرائیل کی توبہ قتل کرنا تھا۔ اس پر اجماع ہے کہ ان بچھڑے کے پجاریوں میں سے ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے اپنے نفس کو قتل کرنے کا حکم نہیں تھا۔

زہری نے کہا: جب انہیں کہا گیا: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ تو وہ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں کہا گیا: اب رک جاؤ۔ یہ عمل مقتول کے لئے شہادت تھا اور زندہ کے لئے توبہ تھا، جیسا کہ

پیچھے گزرا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر تاریکی بھیج دی تو تاریکی میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ ایک صف میں کھڑے ہوئے اور جنہوں نے عبادت نہیں کی تھی وہ ہتھیار لے کر ان میں داخل ہوئے اور انہیں قتل کر دیا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ستر آدمی کھڑے ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے اور انہوں نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ والوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔

یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت یوشع بن نون ان کے پاس گئے جبکہ وہ سب گھٹنے کھڑے کر کے ہاتھوں یا کپڑے سے کلاوہ مار کر بیٹھے تھے۔ حضرت یوشع نے کہا: وہ ملعون ہوگا جو اپنا کپڑا یا ہاتھ کھولے گا یا اپنے قاتل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا یا اپنے ہاتھ سے بچاؤ کرے گا یا پاؤں سے بچاؤ کرے گا۔ پس ان میں سے کسی نے اپنا کپڑا نہ کھولا حتیٰ کہ ان میں قتل کیا گیا جو قتل کیا گیا اور ہر شخص نے اپنے قریب والے کو قتل کیا۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ پس جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی پہلے قول کے مطابق انہیں اپنوں کو قتل کرنے کی سزا دی گئی کیونکہ انہوں نے برائی کو روکا نہیں تھا۔ جب وہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور وہ علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو قتل کریں (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اپنے بندوں میں جب برائی پھیل جائے اور اسے روکا نہ جائے تو تمام کو سزا دی جاتی ہے۔

جریر نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے جبکہ وہ اس برائی کو روک سکتے تھے لیکن انہوں نے روکا نہیں تو اللہ تعالیٰ تمام پر عذاب نازل فرماتا ہے (3)۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل فرمایا۔ اس مفہوم پر کلام آگے آئے گی۔ جب ان میں قتل کی کثرت ہوگئی اور وہ ستر ہزار تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے قتل کو اٹھا لیا کیونکہ انہیں اپنوں کو قتل کی مشقت دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے امت محمد یہ پر اسلام کے بعد تو بہ سے افضل انعام نہیں فرمایا۔

قتادہ نے فاقیلوا انفسکم . . . اقالہ سے مشتق کیا ہے...... یعنی قتل کے ساتھ اپنی لغزش کا بدلہ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَارِىِٕكُمْ، البارئ کا معنی الخالق یعنی پیدا کرنے والا ہے ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ الباری نئے سرے سے پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور الخالق ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نقل کرنے والا ہوتا ہے۔ البریۃ کا معنی الخلق (مخلوق) ہے۔

یہ فعیل بمعنی مفعول ہے لیکن اسے ہمزہ نہیں دیا جاتا۔ ابو عمرو نے بارئکم ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، وہ تمہیں شعور دیتا ہے، تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہے۔

نحویوں کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض وصل میں ضمہ اور کسرہ کو ساکن کر دیتے ہیں اور یہ شعر میں ہوتا ہے، ابو العباس المبرد نے کہا: کلام اور شعر میں معرب حرف میں متواتر حرکات کے ساتھ ساکن کرنا جائز نہیں۔ ابو عمرو کی قراءت غلط ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً تفسیر طبری

نحاس وغیرہ نے کہا: یہ قدماء ائمہ نحو نے جائز قرار دیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ اشعار ذکر کیے ہیں۔

اذا اعْوَجَجْنَ قلت صاحبْ قومْ    بالدّو امثال السفين العوم

امرؤالقیس نے کہا:

فاليوم اشربْ غير مُستحْقب    اثماً من الله ولا واغل

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت سليمى اِشْتَرْلَنا سويقا (1)

ایک اور نے کہا:

رحت و فى رجليكِ مافيهما    و قد بداهنك من المئزر (2)

جس نے معرب کے حرف میں سکون دینے کا انکار کیا اس کی حجت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اعراب کی علامت ہوتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: بنا کی حرکت کو توالی الحرکات کے ساتھ ساکن کرنے کے جواز میں نحویوں کا اختلاف نہیں ہے۔

برأ، یہ تبری الشیء من الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ایک شے کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے...... الخلق عدم سے وجود کی طرف جدا ہوئی۔ اسی سے برأت من المرض برءً ا۔ تو مرض سے شفایاب ہوا دوسرے لوگ کہتے ہیں برئت من المرض برأ اور برأت منك و من الدیون، والعیوب براءۃً۔ میں تجھ سے، قرضوں سے، عیوب سے بری ہوا۔ اسی سے المبارأۃ للمرأۃ۔ عورت کو جدا کرنا ہے۔ قد بارأ شریکه و امرأته، اپنے شریک اور اپنی بیوی کو جدا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَابَ عَلَيْكُمْ اس کلام میں حذف ہے، اس تقدیر پر یہ ہے: ففعلتم فتاب علیکم یعنی تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر فرمایا۔ یعنی تم میں سے باقی لوگوں پر نظر کرم فرمائی۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس اس گستاخی پر آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں تمہارے مرجانے کے بعد کہ کہیں تم شکر گزار بنو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْتُمْ یہ معطوف ہے۔ يٰمُوْسٰى ندا مفرد ہے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ۔ ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ ستر آدمی تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا    2۔ ایضاً

اختیار کیا تھا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں سنایا تو انہوں نے اس کے بعد کہا: لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ انبیاء پر ایمان لانا ان کے معجزات کے ظہور کے بعد واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے آگ بھیجی اور انہیں جلا دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ (پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں مرجانے کے بعد) ان ستر آدمیوں کا واقعہ ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ابن فورک نے کہا: یہ احتمال ہے کہ ان کی سزا اس وجہ سے ہو کہ انہوں نے رؤیت کی طلب کو اس کے صحیح طریقہ سے خارج کر دیا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ارنا اللہ جهرة اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت میں نہیں تھا۔ (1)

اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیکھنے) کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر بدعتی لوگ دنیا و آخرت میں اس کا انکار کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت دنیا و آخرت میں اس کے جواز کے قائل ہیں اور آخرت میں اس کے وقوع کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے رؤیت کا طلب کرنا محال کا طلب کرنا نہیں بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا سوال کیا تھا، مزید کلام اس رؤیت کے متعلق سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَهۡرَةً یہ مصدر ہے حال کی جگہ میں اس کا معنی علانیۃ (واضح) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی عیاناً ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ الجھر کا اصل معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے اسی سے الجھر بالقرأۃ ہے یعنی قراءت کو ظاہر کرنا المجاھر بالمعاصی۔ علانیہ گناہ کرنے والا۔ رأیت الامیر جھاراً و جھرۃ یعنی میں نے امیر کو دیکھا جبکہ وہ کسی چیز سے چھپا ہوا نہ تھا۔

حضرت ابن عباس نے جَهَرَةً ھاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً زھْرَةَ زَھَرَةُ۔ الجھر میں جو وجہیں ہیں ایک یہ صفت ہے ان کے خطاب کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا، انہوں نے بھی اعلانیہ یہ کہا۔ اس ترکیب کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: واذا قلتم جهرة یا موسیٰ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہے اس کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی رویت کا سوال کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ لیں۔ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر نہ ہوگی۔ الجھر کے ساتھ مؤکد فرمایا تاکہ آنکھوں سے دیکھنے اور خواب میں دیکھنے میں فرق ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ۔ الصّٰعِقَةُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی نے اسے الصَّعۡقَة پڑھا ہے، یہ تمام قرآن میں ابن محیصن کی قراءت ہے۔ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ یہ جملہ حال ہے۔ کہا جاتا ہے: كَیۡفَ یَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ (وہ مرے کیسے تھے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے) اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کہتے ہیں: دُوۡرُ آلِ فُلَانٍ تَرَاءَیٰ یعنی آل فلاں کے گھر آمنے سامنے ہیں۔ بعض نے فرمایا: تَنۡظُرُوۡنَ کا معنی ہے: تم اپنے حال، موت اور الصّٰعِقَةُ کے آثار نازل ہوئے تم انہیں دیکھ رہے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ یعنی ہم نے زندہ کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ مر گئے تھے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ان کی روحیں چلی گئی تھیں پھر وہ اپنی عمریں پوری کرنے کے لئے لوٹائے گئے (1)۔ نحاس نے کہا: یہ قریش کے اس شخص کے خلاف حجت ہے جو دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتا اور اہل کتاب کے خلاف حجت ہے کیونکہ انہوں نے اس کی خود خبر دی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تا کہ تم شکر ادا کرو جو اس نے تمہارے ساتھ کیا کہ مرنے کے بعد زندہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ایسی موت مر گئے تھے کہ اس سے غیر عبرت حاصل کرے۔ پھر انہیں بھیجا گیا۔ البعث کا اصل معنی الارسال ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: البعث کا اصل معنی کسی شی کو اپنے محل سے اٹھانا ہے۔ کہا جاتا ہے: بعثت الناقة یعنی میں نے اونٹنی کو حرکت دی۔ امرؤ القیس نے کہا:

وفتیان صدق قد بعثت بسحرة　　　فقاموا جمیعا بین عاث و نشوان

اس شعر میں بعث بمعنی حرکت دینا، اٹھانا استعمال ہوا ہے۔ عنترہ نے کہا:

و صحابة شم الانوف بعثتهم　　　لیلاً و قد مال الكری بطلاها

اس میں بھی بعث اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ یعنی ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں تعلیم دی۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے کیونکہ اصل حقیقت ہے، وہ موت، سزا کی موت تھی اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۗ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (البقرہ:243) جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**: الماوردی نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ جو مرنے کے بعد لوٹایا گیا اور وہ احوال دیکھنے کے بعد لوٹایا گیا جو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں کیا وہ مکلف باقی رہے گا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

۱۔ ان کا مکلف ہونا باقی ہے تا کہ کوئی عاقل مکلف ہونے سے خالی نہ ہو۔

۲۔ مکلف ہونے کا سقوط استدلال کے ساتھ معتبر ہے، اضطرار کے ساتھ نہیں۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے جب ہوا میں پہاڑ دیکھا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے اور آگ انہیں گھیرے ہوئے تھی تو اس چیز نے انہیں ایمان کی طرف مجبور کر دیا اور ان پر تکلیف کا باقی ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ تھا ان کا مکلف نہ ہونا محال ہے۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ -

''اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا اور اتارا تم پر من و سلوی۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں عطا کر رکھی ہیں اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی ہم نے بادل کو تم پر چھتری کی مانند کر دیا۔ الْغَمَامَ جمع ہے غمامۃ کی جیسے سحابۃ اور سحاب۔ یہ اخفش سعید نے کہا ہے۔ فراء نے کہا: غمائم بھی جائز ہے اس سے مراد بادل ہیں کیونکہ وہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ڈھانپی گئی ہو وہ مغموم ہے۔ اسی سے المغموم علی عقلہ اور غم الھلال ہے جب چاند کو بادل ڈھانپ دے۔ الغین بھی الغیم کی مثل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انہ لیغان علی قلبی۔ میرے دل پر چھا جائے۔ صاحب العین نے کہا: غین علیہ کا مطلب اسے ڈھانپا گیا۔ الغین گھنے درختوں کو کہتے ہیں۔ سدی نے کہا: الْغَمَامَ سفید بادلوں کو کہتے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس لئے یہ کیا تھا تا کہ دن کے وقت انہیں سورج کی گرمی سے بچائے اور دن کے آخر میں بادل چھٹ جاتا تا کہ وہ چاند سے رات کے وقت روشنی حاصل کریں۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ان پر مصر اور شام کے درمیان تیہ کے صحراء میں ہوا تھا جب انہوں نے جبار لوگوں کے شہر میں داخل ہونے اور ان سے جنگ کرنے سے انکار کیا تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ (المائدہ: 24) پس انہیں اسی جگہ سزا دی گئی چالیس سال پانچ یا چھ فراسخ میں گھومتے رہے۔ روایت ہے کہ وہ دن کو چلتے تھے اور رات کو ٹھہرتے تھے۔ پس وہ وہاں ہی صبح کرتے جہاں گزشتہ کل صبح کرتے تھے، جب وہ تیہ میں جمع تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ہمارے لئے کھانا کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلویٰ اتارا۔ پھر انہوں نے کہا: ہمیں سورج کی گرمی سے کون بچائے گا اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا: ہم چراغ کس کے ساتھ جلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے محلے کے درمیان ایک نور کا ستون بنا دیا۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ وہ آگ کا ستون تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے پانی کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے لباس کون لائے گا، انہیں ایسا لباس دیا گیا جو نہ پرانا ہوتا، نہ بوسیدہ ہوتا اور نہ میلا ہوتا اور بچوں کے بڑھنے کے مطابق ان کے کپڑے بڑے ہوتے جاتے۔ واللہ اعلم (2)

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى۔ الْمَنَّ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ اس کی تعیین کئی اقوال پر ہے: بعض نے کہا: ترنجبین ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ الطرنجبین (طا کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے) یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَنَّ سے مراد میٹھی گوند ہے۔ بعض نے فرمایا: شہد ہے بعض نے فرمایا: میٹھی شراب ہے۔ بعض نے فرمایا: باریک روٹی ہے۔ یہ وہب بن منبہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: الْمَنَّ مصدر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بغیر کسی تھکن اور کھیتی باڑی کے احسان فرمایا اس تمام کو شامل ہے (3)۔ اسی سے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الکمأۃ من المن الذی انزل علی بنی اسرائیل و ماء ھا شفاء للعین (4) وفی روایۃ من المن الذی انزل اللہ علی موسٰی۔ یعنی کھمبی اس مَنّ میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً، والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　4۔ صحیح بخاری، باب وقولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام، حدیث 4118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نازل کیا۔ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔

ایک روایت میں ہے، اس مَنّ میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ کھمبی اس میں سے ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر نازل کیا یعنی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیہ کے صحرا میں پیدا فرمایا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا: کھمبی کو اَلْمَنّ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ اس میں بیج ڈالنے، پانی لگانے اور دیکھ بھال کرنے کی مشقت نہیں۔ پس یہ کھمبی بنی اسرائیل کے مَنّ سے ہے کیونکہ یہ بغیر مشقت کے ملی تھی۔ روایت ہے کہ ان پر من فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک اولوں کی طرح اترتا تھا۔ ہر شخص اپنے لئے اس دن کی خوراک لے لیتا تھا، جو اس سے ذخیرہ کرتا تھا وہ خراب ہو جاتا تھا، مگر جمعہ کے دن وہ ہفتہ کے دن کے لئے ذخیرہ کرتے تھے تو وہ خراب نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا، ہفتہ کے دن ان پر کچھ نازل نہیں ہوتا تھا۔(1)

**مسئلہ نمبر 3:** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص فرمائی کہ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ بعض علمائے طب نے فرمایا: آنکھ میں جو حرارت ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صرف اس کا پانی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی اور مرض کے لئے دوسری دوا میں مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنکھ کی ہر مرض کے لئے خالص اس کا پانی استعمال کرنے کا نظریہ رکھتے تھے (2)۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابو وجزہ تمام امراض کے لئے شہد استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کی تکلیف کے لئے بھی شہد استعمال کرتے تھے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اہل لغت نے کہا: الکمْء واحد ہے، اس کا تثنیہ کمْآن ہے اور تین ہوتو اَکْمُؤ کہا جاتا ہے اور جب زیادہ ہوں تو کمأۃ (تاء کے ساتھ) آتا ہے۔ شجرۃ اور شجر کے برعکس استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَنّ اسم جنس ہے لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: السَّلْوٰی۔ السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بٹیر ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: باجماع مفسرین السَّلْوٰی پرندہ ہے۔ ہذلی نے غلطی کی ہے، اس نے کہا:

و قاسمها بالله جهداً لانتم — الذ من السلوى اذا ما نشورها

اس نے اس شعر میں سلوی سے شہد مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے مفسرین کے اجماع کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مؤرج جو لغت اور تفسیر کے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: السَّلْوٰی سے مراد شہد ہے اور اس نے ہذلی کے مذکور شعر سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لغت کنانہ اس طرح ہے۔ اس کو سلوی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تسلی ہوتی ہے۔ اسی سے عین السلوان ہے (بیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المقدس میں ایک چشمہ ہے جس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔) جیسے شعر میں ہے:

لو اشرب السلوان ما سليت		ما بی غنی عنك وان غنيت

اسی طرح جوہری نے کہا: السلوی۔ شہد ہے اس نے بھی ہذلی کا بیت ذکر کیا ہے۔

الذ من السلوی اذا مانشورها

اور انہوں نے غلطی کا ذکر نہیں کیا۔ السُلوانة، یہ ایک سپی ہے۔ لوگ کہتے ہیں جب اس پر بارش کا پانی ڈالا جائے اور پھر عاشق اس کو پی لے تو اسے تسلی ہو جاتی ہے۔

شربت علی السلوانة ماء مزنة		فلا وجديد العيش يا مَیّ ما اسْلُو

اس پانی کا نام سلوان ہے۔ بعض نے فرمایا: السلوان ایک دوا ہے جس کو غمگین پیتا ہے تو اس کو تسلی ہوتی ہے۔ اطباء اس کو مفرح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: سلیت و سلوت یہ دو لغتیں ہیں۔ و ھوفی سلوۃ من العیش، وہ خوشحال زندگی میں ہے۔ یہ ابو زید سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا مفرد ہے۔

اخفش نے کہا: یہ لفظاً جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر ہے اور اس کا واحد سلویٰ بھی جمع سلویٰ کے مشابہ ہے جیسے کہتے ہیں دِفلی یہ واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سمانی اور شکاعی یہ بھی واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خلیل نے کہا: اس کا واحد سلواۃ ہے جیسے اس شعر میں ہے: (1)

انی لتعرونی لذکراك هزة		کما انتقض السلواۃ من بلل القطر

کسائی نے کہا: السلوی واحد ہے اور اس کی جمع سلاوی ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 6:** السَّلْوٰی کا عطف، الْمَنَّ پر ہے۔ اس میں اعراب ظاہر نہیں ہے کیونکہ اسم مقصور ہے اور اسم مقصور میں اعراب ظاہر نہ کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ اس کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ خلیل نے کہا: الف، ہوائی حرف ہے اس کا کوئی مستقر نہیں ہے یہ حرکت کے مشابہ ہے اس کی حرکت محال ہے۔ فراء نے کہا: اگر الف کو حرکت دی جائے تو یہ ہمزہ ہو جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس میں حذف سے تقدیر کلام اس طرح ہے: و قلنا کلوا۔ اختصار اظاہر کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ الطیبات کا لفظ یہاں حلال اور لذیذ دونوں معانی میں ہے۔ (3)

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا ظَلَمُوْنَا اس سے پہلے فعصوا مقدر کیا جائے گا۔ انہوں نے نعمتوں کے مقابل شکر نہ کیا۔ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے نعمتوں کے مقابلہ میں گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۗ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا تھا کہ داخل ہو اس بستی میں پھر کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو اور داخل ہونا دروازے سے سر جھکاتے ہوئے اور کہتے جانا بخش دے ہمیں اور ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو''۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ، قُلْنَا سے الف کو حذف کیا گیا ہے اس کے سکون اور اس کے بعد دال کے سکون کی وجہ سے۔ اور وہ الف جس کے ساتھ ابتدا کی گئی ہے دال سے پہلے وہ الف وصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذِهِ الْقَرْيَةَ یعنی شہر۔ شہر کو قریۃ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس میں اجتماع ہوتا ہے۔ اسی سے ہے: قریت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کیا اس پانی کا نام قِریٰ ہوتا ہے، اسی طرح جس کے ساتھ مہمان نوازی کی جائے اسے قِریٰ کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ المِقراۃ، حوض کے لئے بولا جاتا ہے۔ القِریّ، پانی کی گزرگاہ کے لئے اور القَرا پیٹھ کے لئے۔ اسی سے یہ مصرعہ ہے:

لاحقُ بطنٍ بِقَراً سمینِ

المقاری: بڑے پیالے کہا۔

کہا: عظام المقاری ضیفهم لا یُفزَّع

المقاری کا واحد مِقراۃ ہے۔ ان تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ القِریۃ (قاف کے کسرہ کے ساتھ) یمن کی لغت ہے۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے کہا: یہ بیت المقدس ہے۔ بعض نے کہا: بیت المقدس میں سے اریحا ہے۔ عمر بن شیبہ نے کہا: یہ بادشاہوں کی رہائش گاہ تھی (1)۔ ابن کیسان نے کہا: شام کا شہر ہے۔ ضحاک نے کہا: الرملہ، اردن، فلسطین اور تدمُر ہے۔ یہ دوسری نعمت ہے۔ ان کے لئے شہر میں داخل ہونا مباح کر دیا اور ان سے تیہ کی سرگردانی ختم کر دی۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا یہ امر اباحت کے لئے ہے۔ رَغَدًا کثیر اور واسع، یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَغَدًا حال ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ زمین بڑی بابرکت اور زیادہ غلہ دینے والی تھی اس لئے فرمایا: رَغَدًا (2)

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، باب کی جمع ابواب ہے اور اس کی جمع الهوبة بھی بناتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

هتاك اخبیة ولاج أبوِبَة یخلط بالبر منه الجدّ واللینا

اگر اسے مفرد ذکر کرے تو پھر جائز نہیں۔ اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: مرحباً بالقوم ... او بالوفد ... غیر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

خزایا و لا ندامی (1)۔ . . تبوبت بتوابًا یعنی میں نے دربان بنایا۔

ابواب مبوبة جیسے کہتے ہیں اصناف مصنفة۔ هذا شیء من بابتك۔ یہ تمہارے لئے مناسب ہے۔ سجدہ کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ

وہ دروازہ جس سے انہیں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ بیت المقدس میں تھا۔ آج وہ باب حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ مجاہد وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد اس قبہ کا دروازہ ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ سُجَّدًا حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب رکوع کی حالت میں جھکتے ہوئے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تواضع کرتے ہوئے، کوئی متعین ہیئت مراد نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قُوْلُوْا اس کا عطف ادْخُلُوا پر ہے۔ حِطَّةٌ جمہور کی قراءت مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدا محذوف ہے یعنی مسئلتنا حطةٌ یا اس کا یہ اعراب حکایۃً ہے اور اخفش نے کہا: حطہ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس تقدیر پر احطط عنا ذنوبنا حطةً (ہمارے گناہ معاف فرمادے۔) نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ تم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو (2)۔ ایک اور حدیث ان سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا: قولوا مغفرةً نصب کی تفسیر یعنی قولوا شیئاً یحط ذنوبکم تم ایسی شے کہو جو تمہارے گناہ معاف کردے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: قل خیراً۔ ائمہ قراء اس پر رفع ہی پڑھتے ہیں یہ لغت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔ اس کی وجہ وہ ہے جو عربوں سے بدل کے معنی میں حکایت کیا گیا ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: کہا جاتا ہے بدّلته یعنی میں نے اسے تبدیل کیا اور میں نے اس کی شخصیت کو زائل نہیں کیا ابدلته یعنی میں نے اس شخص اور عین کو بدل دیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عزل الامیر للامیر المبدل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس: 15) (اور کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کر دیجئے)۔

حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے، انہوں نے کہا حِطَّةٌ یہ رفع کی بنا پر تفسیر ہے۔ یہ تمام نحاس کے اقوال ہیں۔ حسن اور عکرمۃ نے کہا: حطة کا معنی حط ذنوبنا ہے۔ انہیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تا کہ اس کی وجہ سے ان کے گناہ گر جائیں۔ ابن جبیر نے کہا: اس کا معنی استغفار ہے (3)۔ ابان بن تغلب نے کہا: اس کا مطلب تو یہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فاز بالحطة التی جعل الله بها ذنب عبده مغفوراً

اس نے ایسی توبہ پائی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے گناہوں کو معاف فرمایا۔

ابن الفارس نے ''المجمل'' میں کہا کہ حطۃ یہ ایسا کلمہ ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے گناہ

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، 85، 402 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

معاف ہو جاتے۔ جوہری نے بھی ''الصحاح'' میں یہی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ انہیں بعینہ یہی لفظ کہنے کا مکلف کیا گیا ہو، حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو(1) اور حِطَّةٌ کہو تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ تو انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا وہ دروازے سے اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: حبۃٌ فی شعرۃٍ یعنی (جو میں دانہ)۔ یہ حدیث بخاری نے بھی نقل کی ہے۔ فرمایا: انہوں نے حکم کو بدل ڈالا۔ انہوں نے کہا: حطۃ حبۃ فی شعرۃ اور صحیحین کے علاوہ میں ہے: حنطۃ فی شعر۔ اور کہا گیا ہے: انہوں نے کہا: ھطا سمھاثا۔ یہ عبرانی لفظ ہے اس کی تفسیر سرخ گندم ہے۔ یہ ابن قتیبہ نے حکایت کیا ہے اور یہ ہروی نے سدی اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ ان کا مقصد اس کے خلاف کرنا تھا جو اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ پس انہوں نے نافرمانی کی، سرکشی کی اور استہزاء کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے ساتھ سزا دی۔ ابن زید نے کہا: یہ عذاب طاعون تھا ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ روایت ہے کہ دروازہ چھوٹا بنایا گیا تھا تا کہ وہ جھکتے ہوئے داخل ہوں تو وہ اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 6:** بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ منصوص علیہا اقوال کو شریعت میں تبدیل کرنا، اس سے خالی نہیں ہوگا کہ اس لفظ کا یا اس کے معنی کا مکلف بنایا گیا ہوگا۔ اگر اس لفظ کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم کو تبدیل کرنے والے کی مذمت کی ہے، اور اگر معنی کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز ہوگا جو اس معنی کو ادا کرے، اسے ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز نہ ہوگا جو اس معنی سے ہی اسے خارج کر دے۔(2)

علماء کا اس معنی میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم سے حکایت کیا گیا ہے کہ عالم کے لئے خطاب کے مواقع پر حدیث بالمعنی کا نقل کرنا جائز ہے لیکن مکمل طور پر معنی کے ساتھ مطابقت ہو، یہ جمہور کا قول ہے، بہت سے علماء نے الفاظ کو بدلنے سے منع کیا ہے۔ ان میں سے ابن سیرین، قاسم بن محمد اور رجا بن حیوہ ہیں۔

مجاہد نے کہا: حدیث میں اگر تو چاہے تو کمی کر لیکن اس میں اضافہ نہ کر۔ حضرت مالک بن انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں تا اور یا میں بھی سختی کرتے تھے۔ اس بنا پر ائمہ حدیث کی ایک جماعت لفظ کو تبدیل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیتی تھی کہ وہ غلط سن لیتے تھے اور اس کو جانتے تھے لیکن اسے بدلتے نہیں تھے۔ ابو مجلز نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے کوئی حدیث سنی پھر اس نے اسے اسی طرح بیان کیا جس طرح اس نے سنی تھی تو وہ سلامت رہا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت زید بن ارقم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس طرح تقدیم و تاخیر، کمی بیشی میں اختلاف ہے کیونکہ بعض علماء معنی کا اعتبار کرتے ہیں بعض لفظ کا اعتبار کرتے ہیں بعض اس میں سختی کرتے ہیں اور لفظ کو نہیں چھوڑتے۔ یہ

---

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث نمبر 3151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی زیر آیت ہذا

دین میں احوط، اتقی اور اولیٰ ہے لیکن اکثر علماء کی سیرت سے معلوم ہے وہ واقعات کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ اور یہ نہیں تھا مگر اس لئے کہ وہ اپنی توجہ معانی پر رکھتے تھے اور وہ احادیث پر تکرار اور احادیث کے لکھنے کا التزام نہیں کرتے تھے۔ حضرت واثلہ بن اسقع سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جو کچھ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہم نے تمہاری طرف اسے نقل کیا، تمہارے لئے معنی کافی ہے۔ قتادہ نے حضرت زرارہ بن اوفی سے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ سے ملا، انہوں نے مجھے الفاظ مختلف بیان کیے لیکن معنی ایک تھا۔ نخعی، حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔

حسن نے کہا: جب تو معنی صحیح بیان کرے تو تیرے لئے کافی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: جب میں تمہیں کہوں کہ میں تمہیں اسی طرح بیان کرتا ہوں جس طرح میں نے سنا تو میری تصدیق نہ کرو وہ معنی ہے۔ وکیع نے کہا: اگر معنی میں وسعت نہ ہوگی تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ علماء کا عجمیوں کے لئے ان کی زبان میں شریعت کو نقل کرنے پر اور ان کے لئے ترجمہ کرنے پر اجماع ہے۔ یہ نقل بالمعنی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسا ہی کیا ہے جو اس نے گزشتہ قوموں کی خبریں بیان کی ہیں۔ پس اس نے قصص بیان کیے۔ بعض قصص کو مختلف جگہوں پر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا جبکہ معنی ایک ہے۔ ان قصص کو ان کی زبان میں عربی زبان کی طرف منتقل کیا اور وہ تقدیم و تاخیر، حذف، الغا، کمی بیشی میں ان کے مخالف ہیں۔ جب عربی کو عجمی زبان میں بدلنا جائز ہے تو عربی میں بدلنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے اسی معنی سے حسن اور امام شافعی نے حجت پکڑی ہے۔ یہ اس بات میں صحیح ہے۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے شاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا پھر اسے آگے پہنچایا جس طرح اس کو سنا تھا (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے بستر پر سونے کے وقت کی دعا سکھائی۔ آمنت بکتابك الذی أنزلت و نبیك الذی ارسلت (2)۔ اس شخص نے دوبارہ یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا: و رسولك الذی ارسلت۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: و نبیك الذی ارسلت کہو۔ روایت بالمعنی کے عدم جواز کے قائل علماء کہتے ہیں: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے دعا سکھائی اسے لفظ کی مخالفت کی اجازت نہ دی اور فرمایا: اسی طرح ادا کرو جس طرح سنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فَاَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا کے ارشاد میں مراد اس کا حکم ہے اس کا لفظ نہیں ہے کیونکہ لفظ کا اعتبار نہیں اور تیری رہنمائی کرتا ہے یہ اصول کہ خطاب سے مراد اس کا حکم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ یعنی بہت سے فقہ حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے اور بہت سے فقہ حاصل کرنے والے اس کی طرف پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث بعینہ مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے جبکہ معنی ایک ہے اگرچہ تمام الفاظ کا مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونا ممکن ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ ایک حدیث ہے جو مختلف الفاظ سے نقل کی گئی ہے یہ جواز کی واضح دلیل ہے۔ رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو رسولك کے لفظ سے نبیك کے لفظ کی طرف لوٹانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کا لفظ زیادہ مدح کا باعث تھا ان

---

1۔ ابوداؤد، باب فضل نشر العلم، حدیث نمبر 3175 (مفہوم) ایضاً سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فضل من بات علی الوضوء حدیث نمبر 239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دونوں صفات میں ہر صفت کا خاص موقع محل ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول کا اسم تمام پر واقع ہوتا ہے اور نبی کا اسم صرف انبیاء کرام کے لئے بولا جاتا ہے۔ رسولوں کو انبیاء سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ نبوت و رسالت کو جمع کرتے ہیں۔ جب و نبیك فرمایا تو ایسی نعت ذکر فرمائی جو زیادہ مدح کا باعث تھی پھر اسے الذی ارسلت فرما کر رسالت کے ساتھ مقید فرمایا...... پس رسولك کے قول سے نبیك کے قول کی طرف اگر اسے لوٹایا ہے تو یہ اس لئے ہے تاکہ نبوت و رسالت کو جمع کرے۔ یہ کلام کہنا پسندیدہ نہیں ہے کہ تو کہے: هذا رسول فلان الذی ارسلهٔ هذا قتیل زید الذی قتلهٔ، کیونکہ ان عبارات میں معنی کا تکرار ہے کیونکہ بعد والی کلام پہلے معنی کو ہی مفید ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے: هذا رسول عبدالله الذی ارسله الی عمرو و هذا قتیل زید الذی قتله بالامس او فی وقعةِ کذا۔ یعنی یہ عبداللہ کا پیغام رساں ہے جسے اس نے عمرو کی طرف بھیجا ہے یہ زید کا مقتول ہے جسے اس نے کل قتل کیا تھا یا فلاں واقعہ میں قتل کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ جب پہلے راوی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بدلنا جائز ہے تو دوسرے راوی کے لئے راوی کے الفاظ بدلنا بھی جائز ہوگا اور یہ باریک فرق اور خفا کی وجہ سے حدیث کو کلیۃً ختم کرنے کی طرف پہنچا دے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روایت بالمعنی کا جواز معنی کی مطابقت اور مساوات کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اگر معنی سے مطابقت نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں اختلاف صحابہ اور تابعین کے زمانہ کی طرف نظیر کرنے سے متصور ہوتا ہے کیونکہ وہ مادری زبان کی معرفت میں برابر تھے۔ رہا بعد والے لوگوں کا حکم ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ طبائع بدل چکی ہے، مفہوم مختلف ہو چکے ہیں، عادتیں تبدیل ہو چکی ہیں یہی حق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ابن عربی نے ایک انوکھی بات کی ہے کیونکہ جب جواز معنی کی مطابقت کے ساتھ مشروط ہے تو پھر صحابہ، تابعین اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق نہ رہا۔ اسی وجہ سے اصولیین اور محدثین میں سے کسی نے یہ تفریق نہیں کی۔ ہاں اگر ابن عربی کہتے کہ ان کے زمانہ میں مطابقت بہت بعید ہے تو یہ بہتر ہوتا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ نافع نے یا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر نے تا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مجاہد کی قراءت ہے باقی قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور نون پر نصب پڑھی ہے یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے پہلے وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ہے۔ پس نَّغۡفِرۡ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے پر جاری ہے، تقدیر کلام اس طرح ہوگی: قلنا ادخلوا الباب سجدا نغفر۔ نیز بعد میں بھی سنزید نون کے ساتھ آرہا ہے۔ خَطٰيٰكُمۡ یہ اکثر کے قول کے مطابق ہے۔ یہ اپنے باب پر ہے اور جن علماء نے تغفر تا کے ساتھ پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ لفظ خَطٰيٰكُمۡ مونث ہے اس لئے صیغہ بھی مونث ہوگا، کیونکہ یہ خطیئۃ کی جمع مکسر ہے اور یا پڑھنے کی وجہ سے جب فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ آ گیا تو فعل کا مذکر ذکر کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے یا اور تا بہتر ہیں، اگرچہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے کا ذکر ہے وَ اِذۡ قُلۡنَا میں کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ گناہوں کو بخشنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس نون سے استغنا کیا اور فعل کو معاف شدہ خطاؤں کی طرف لوٹایا۔

**مسئلہ نمبر 8:** خطایا جو کہ خطیئۃٌ کی جمع ہے اس کی اصل میں اختلاف ہے۔ خطیئۃٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ خلیل نے کہا: خطایا اصل میں خطائیٔ تھا پھر قلب کیا گیا اور کہا گیا: خطائی یعنی ہمزہ پہلے یا بعد میں پھر یا کو الف سے بدلا گیا خطاء اہو گیا جب دو الف جمع ہوئے جن کے درمیان ہمزہ ہے تو ہمزہ الف کی جنس سے بدل گیا پھر گویا تین الف جمع ہو گئے پھر ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو ہو گیا خطایا۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اصل خطایئی ہے پھر یا کو ہمزہ بنایا گیا جس طرح مدائن میں یا کو ہمزہ بنایا گیا تو خطائیٔ ہو گیا۔ پھر ایک کلمہ میں دو ہمزے جمع نہیں ہوتے۔ پس دوسرے ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو خطائی ہو گیا پھر پہلی صورت کی طرح عمل کیا گیا۔

فراء نے کہا: خطایا جمع خطیہ (بغیر ہمزہ کے) ہے۔ جیسے تو کہتا ہو: ھدیۃ و ھدایا۔ فراء نے کہا: اگر خطایا، خطیئۃٌ (مہموزہ) جمع ہوتا تو تو خطاءا کہتا۔ کسائی نے کہا: اگر اس کی جمع مہموزہ ہو تو ایک ہمزہ دوسرے ہمزہ میں ادغام ہو جائے گا جیسے تو کہتا ہے: دواب۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی ان کے احسان میں ہم اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: دوسرے دن کے لیے من وسلویٰ جمع کرنے کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جس نے دوسرے دن کے لیے من وسلویٰ جمع نہیں کیا ان کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: جو گنہگار ہے اس کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جو محسن ہے اس کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ یعنی ہم ان کے پاس سابقہ احسان پر احسان کا اضافہ کر دیں گے۔ محسنین، احسن سے اسم فاعل ہے۔ المحسن وہ ہوتا ہے جس کا توحید کا عقدہ صحیح ہو اور اپنے آپ کو چلانے میں خوبصورت ہو اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو، مسلمانوں سے اپنے شر کو روکے۔ حدیث جبریل میں ہے، احسان کیا ہے؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ جبریل نے کہا: آپ نے سچ فرمایا(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

"پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا، الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے یعنی ان میں سے ظالموں نے بدلا اور بات سے جو انہیں کہا گیا تھا۔ یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا تھا کہ تم کہو: حِطَّةٌ تو انہوں نے کہا حنطة

1۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 184

جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے ایک حرف کلام سے زیادہ کر دیا۔ پس وہ مصیبت سے دوچار ہوئے، اس میں یہ آگاہی دی کہ دین میں زیادتی اور شریعت میں اپنی ایجاد عظیم خطرہ اور شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ ایک کلمہ کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا جو توبہ سے تعبیر تھا وہ ایسے بڑے عذاب کا موجب بنا پھر تمہارا کیا خیال ہے جو معبود کی صفات میں تبدیلی کرتے ہیں۔ یہ قول کی تبدیلی کی سزا تھی حالانکہ قول، عمل سے کم ہوتا ہے، تو جو فعل میں تبدیلی کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ، بدّل اور ابدل کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ جوہری نے کہا: ابدلت الشیء غیرہ۔ تو نے کسی چیز کو دوسری چیز سے بدل ڈالا۔ بدلہ اللہ من الخوف امناً، اللہ تعالیٰ نے اس کے خوف کو امن سے بدل دیا، تبدیل الشیء کسی چیز کو تبدیل کرنا اگرچہ اس کا بدل نہ بھی لایا جائے۔ استبدل الشیء بغیرہ و تبدلہ بہ۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز بدل دے، المبادلہ کا معنی تبادلہ کرنا۔ الاَبْدال، ایسے نیک لوگوں کو کہتے ہیں جن سے دنیا خالی نہیں ہوتی۔ جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو ابدال بنا دیتا ہے۔

ابن درید نے کہا، واحد، بدیل ہے اور البدیل کا معنی بدل ہے۔ بدل الشیء غیرہ کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلنا۔ کہا جاتا ہے: بَدَلٌ، بِدلٌ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جیسے شَبَہٌ، شِبْہٌ۔ مَثَلٌ، اور مِثل - نَکَلٌ، اور نِکْلٌ۔ ابوعبید نے کہا: ان چار حروف کے علاوہ فَعَلٌ اور فِعل نہیں سنا گیا۔ البدل اس تکلیف کو بھی کہتے ہیں جو دونوں ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہے۔ بَدِلَ، یَبْدَلُ بَدَلاً بھی استعمال ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے ظَلَمُوْا کے لفظ کو مکرر ذکر کیا ضمیر ذکر نہیں فرمائی۔ تکرار دو قسموں پر ہوتا ہے کلام کے مکمل ہونے کے بعد استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (البقرہ: 79) پھر بعد میں فرمایا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ (البقرہ: 79) مما کتبوا نہیں فرمایا۔ ویل کا لفظ ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا۔ اسی سے خنساء کا قول ہے:

تعرقنی الدھر نھسًا و حزاً — و اوجعنی الدھر قرعاً و غمزاً

یعنی زمانہ نے مجھے بڑی بڑی مصیبتوں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے دوچار کیا۔

دوسری قسم تکرار کی یہ ہوتی ہے کہ ضمیر کی جگہ پر کلام کے مکمل ہونے سے پہلے اسم ظاہر کا تکرار کیا جاتا ہے جیسے اَلْحَاۗقَّةُ ۙ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝ (الحاقہ) اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۝ (القارعہ) اگر تعظیم و تفخیم کا ارادہ نہ کیا جاتا تو قیاس کا تقاضا یہ تھا الحاقۃ ماھی، القارعۃ ماھی۔ اس کی مثل ہے فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ڏ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ (الواقعہ) وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔــمَةِ ڏ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔــمَةِ ۝ (الواقعہ) اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ کو ان کے بڑے ثواب کو پانے کی وجہ سے اظہار شان کے لئے مقرر ذکر کیا اور اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔــمَةِ کو ان کے عذاب الیم کے پانے کی وجہ سے مکرر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم سے شاعر کا قول ہے:

لیت الغراب غداة ینعب دائباً　　کان الغراب مقطع الاوداج

اس شعر میں شاعر نے الغراب کو دو دفعہ ذکر کیا۔

عدی بن زید نے دونوں معانی کو جمع کیا ہے۔ اس نے کہا:

لا اری الموت یسبق الموت شیء　　نغص الموت ذا الغنی والفقیرا

شاعر نے موت کے لفظ کو تین مرتبہ ذکر کیا۔ یہ پہلی قسم سے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا هندٌ و ارض بها هند　　و هند اتی من دونها النأی والبعد

اس میں شاعر نے محبوب کی عظمت شان کے لئے اس کا تین دفعہ ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِجْزًا جمہور کی قرأت رجزاً را کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ابن محیصن نے را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الرجز کا معنی عذاب ہے اور سین کے ساتھ رجس ہو تو اس کا معنی بدبو اور گندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (توبہ: 125) یعنی بدبو کو ان کی بدبو کی طرف زیادہ کر دیا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔ فراء نے کہا: الرجز سے الرجس ایک چیز ہے۔ ابو عبید نے کہا: جیسے کہا جاتا ہے السدغ، الزدغ اسی طرح رجس اور رجز ہم معنی ہیں۔ فراء نے کہا: بعض نے کہا الرُّجز (را کے ضمہ کے ساتھ) ایک بت کا نام ہے جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ بھی اس ارشاد میں پڑھا گیا ہے: الرُّجز فاهجر۔

اور الرجز (را اور جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ شعر کی ایک قسم ہے۔ خلیل نے شعر ہونے کا انکار کیا ہے۔ یہ الرَّجَز سے مشتق ہے جو اونٹ کے پیچھے حصہ کو لاحق ہوتی ہے جب اسے لاحق ہوتی ہے تو اس کی رانیں کانپنے لگتی ہیں۔

**بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ** یعنی یفسقهم۔ الفسق کا معنی نکلنا ہے۔ یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے یفسِقون سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۰

''اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے تو ہم نے فرمایا: مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر۔ تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے۔ پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر** 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ التقائے ساکنین کی وجہ سے ذال کو کسرہ دیا گیا ہے، سین، سوال کے لئے ہے مثلاً استعلم، استخبر، استنصر (علم طلب کرنا۔ خیر طلب کرنا، مدد چاہنا) یعنی اپنی قوم کے لئے پانی پلانا طلب کیا۔ عرب کہتے ہیں: سقیتہ و اسقیتہ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ شاعر نے کہا:

سقی قومی بنی مجدٍ واسقی نمیرًا والقبائل من هلال

اور یہ بھی کہا گیا ہے: سقیتہ یہ سقی الشفة سے مشتق ہے۔ اسقیتہ کا مطلب ہے: میں نے پانی پر اس کی رہنمائی کی۔

**مسئلہ نمبر** 2: الاستسقاء، پانی کے نہ ہونے اور بارش نہ برسنے پر ہوتا ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو تو اس وقت عبودیت، فقر، مسکنت اور ذلت کے اظہار کا حکم ہوتا ہے ساتھ ساتھ خالص توبہ کا بھی حکم ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب کی، آپ عیدگاہ کی طرف تواضع وانکساری اور تضرع وزاری کرتے ہوئے نکلے (1)۔ یہ تیرے لئے دلیل کافی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کتنا ضروری ہوگا، ہماری تو توبہ بھی نہیں ہوتی مگر یہ کہ ہٹ دھرمی، اللہ تعالیٰ کی مخالفت۔ ہمیں پھر بارش کیسے دی جائے گی۔ لیکن حدیث ابن عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لوگوں نے اپنے اموال کی زکوٰۃ کو نہ روکا مگر آسمان سے بارش روک دی گئی۔ اگر چوپائے نہ ہوتے تو انہیں بارش نہ دی جاتی (2)، مکمل حدیث آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر** 3: استسقا کا طریقہ: عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے...... جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے...... خطبہ اور نماز ہے، یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی نسبت سے نہ نماز ہے نہ عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے یہ صرف دعا ہے اور امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے بخاری ومسلم نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث میں امام ابوحنیفہ کے لئے حجت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی جو فوراً قبول کی گئی، آپ نے اسی پر اکتفا کیا اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔ اس میں سنت کے بیان کا ارادہ نہ کیا۔ جب سنت کے بیان کا قصد کیا تو اپنے فعل سے اسے بیان کیا جیسا کہ عبداللہ بن زید المازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف نکلے بارش طلب کی اور اپنی چادر کو الٹایا اور دو رکعت نماز پڑھی (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔ استسقا کے مزید احکام سورۂ ہود میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ

**مسئلہ نمبر** 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ، العصا، ڈنڈا۔ یہ اسم مقصور مؤنث ہے، اس کا الف واؤ کا بدل ہے۔ شاعر نے کہا:

علی عصویها سابریٌ مُشَبرقُ

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی صلاۃ الاستسقاء، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب العقوبات، حدیث نمبر 4008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ابواب الاستسقا، باب تحویل الرداء فی الاستسقاء، حدیث نمبر 956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(یعنی ڈول کی لکڑیوں پر باریک پھٹا ہوا کپڑا ہے)

عصا کی جمع عُصِیّ و عِصِیّ یہ فعول کا وزن ہے عین کو مابعد کسرہ کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور اس کی جمع اَعْصٍ بھی آتی ہے مثلاً زمن از مُن- ضرب المثل ہے: العصا من العُصیة یعنی بعض امر بعض سے ہے۔ عربوں کا قول ہے: القی عصاہ۔ یعنی اس نے سفر ترک کر دیا۔ یہ مثال ہے۔ کہا:

فالقت عصاها واستقربها النوی　　کما قرّ عیناً بالایاب المسافرُ

قرآن حکیم میں ہے:

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى۞　　قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (طٰہٰ)

عصا کے منافع پر کلام اسی آیت کے تحت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فراء نے کہا: سب سے پہلی غلطی عراق میں سنی گئی۔ وہ یہ تھی: ھذہ عصاتی۔ کبھی اجتماع و افتراق کو عصا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی وجہ سے خوارج کے بارے میں کہا جاتا ہے: شقوا عصا المسلمین یعنی خوارج نے مسلمانوں کے اجتماع کو پھاڑ دیا۔ وانشقت العصا، یعنی اختلاف واقع ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

اذا کانت الهیجاء وانشقت العصا　　فحسبك والضحاك سیف مهنّدٌ

یعنی تجھے اور ضحاک کو تیز تلوار کفایت کرے گی جب جنگ شروع ہو جائے اور اختلاف واقع ہو جائے۔

عرب کہتے ہیں: لا ترفع عصاك عن اهلك یعنی ان کو ادب سکھاؤ۔ واللہ اعلم

حجر (پتھر) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تھوڑے پتھر ہوں تو اس کی جمع احجار ہو اور زیادہ ہوں تو حجار، حجارۃ ہو اور الحجارۃ بہت نادر ہے۔ یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے: جمل و جمالہ۔ ذکر و ذکارۃٌ۔ اسی طرح ابن الفارس اور جوہری نے کہا۔

میں کہتا ہوں: قرآن میں ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ (البقرہ:74) وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ (البقرہ:74) قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً (الاسراء:50) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ (الفیل:4) وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً (الحجر:74) قرآن میں اتنی مرتبہ حجر کی جمع حجارۃ استعمال ہوئی ہے تو پھر یہ نادر کیسے ہے۔ مگر یہ کہ یہ دونوں یہ مراد لیتے ہوں کہ قیاس میں نادر ہے استعمال میں کثیر فصیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْفَجَرَتْ اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فضرب فانفجرت۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر تھا کہ وہ پانی کو نکال دیتا اور بغیر ضرب کے پتھر کو پھاڑ دیتا لیکن اس نے اپنی حکمت کی وجہ سے مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط فرمایا تا کہ اس کے بدلے اپنی مراد تک پہنچ سکیں اور اس پر آخرت میں ان کا ثواب و عقاب مرتب ہو الانفجار کا معنی الانشقاق (پھٹنا) ہے۔ اسی سے ہے: انشق الفجر۔ انفجر الماء انفجاراً یعنی فجر پھوٹ پڑی، پانی کھل گیا، الفجرۃ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی نکلے۔ الانبجاس۔ یہ انفجار سے تنگ ہوتا ہے کیونکہ پہلے انبجاس ہوتا ہے پھر انفجار ہوتا

ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انبجس، تجبس، تفجر، تفتق تمام کا ایک معنی ہے۔ یہ ہروی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا، اثْنَتَا یہ انفجرت کی وجہ سے محل رفع میں ہے علامت رفع اس میں الف ہے اس کو اعراب دیا گیا ہے جب کہ دوسرے اسماء اعداد (یعنی ۱۱ سے ۱۹ تک کے اسماء اعداد) کو اعراب نہیں دیا جاتا (دونوں جز مبنی بر فتحہ ہوتے ہیں) کیونکہ تثنیہ ہمیشہ اپنے معنی کی صحت کی وجہ سے معرب ہوتا ہے۔

عَيْنًا اس کو بیان کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مجاہد، طلحہ اور عیسیٰ نے عَشِرَةَ شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بنی تمیم کی لغت ہے، یہ ان کی لغت سے نادر ہے کیونکہ ان کا طریقہ تخفیف ہے اور اہل حجاز کی لغت عشرہ ہے کیونکہ ان کا طریقہ التثقیل ہے۔ یہ تمام نحاس نے بیان کیا ہے۔ العین کا لفظ اسماء مشترکہ میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: عین الماء، عین الانسان، عین الرکبۃ، عین الشمس (پانی کا چشمہ، انسان کی آنکھ، گھٹنا، سورج کی ٹکیہ) العین اس بادل کو بھی کہتے ہیں جو قبلہ کی سمت سے آتا ہے۔ العین اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو متواتر پانچ یا چھ دن برستی رہے اور ختم نہ ہو۔ بلدٌ قلیل العین۔ ایسا شہر جس میں لوگ کم ہوں۔ وَمَا بھا عین، یا کی حرکت کے ساتھ۔ العین مشکیزہ کے سوراخ کو بھی کہتے ہیں۔ العین من الماء (پانی کا چشمہ) العین من الحیوان (حیوان کی آنکھ سے) مشابہ ہے کیونکہ اس سے پانی اس طرح نکلتا ہے جس طرح حیوان کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ جو حیوان کی آنکھ سے نکلتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو انسان میں ہے۔ اسے عین الماء پانی کے چشمہ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ زمین میں جو کچھ ہے اس سے افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا عصا پتھر پر مارنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ پتھر طور پہاڑ کا تھا اور مربع شکل میں تھا، بکری کے سر کے برابر تھا، بوری کے ٹکڑے میں ڈالا جاتا تھا اور اس کے ساتھ سفر کیا جاتا تھا۔ جب کسی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اترتی تو وہ ان کے پڑاؤ کے درمیان رکھا جاتا تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ پتھر اٹھاتے نہیں تھے بلکہ ہر مقام پر وہ پتھر پالیتے تھے۔ یہ اعجاز و معجزہ میں بہت بڑی چیز ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ حجر مطلق ذکر کیا گیا ہے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس پتھر پر چاہیں عصا مار دیں، پانی جاری ہو جائے گا، یہ معجزہ ہونے میں زیادہ بلیغ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک معین پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا تھا جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بیان کیا تھا اسی وجہ سے اسے معرفہ ذکر فرمایا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہ وہ پتھر تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غسل کرتے وقت کپڑے رکھے تھے اور وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس الزام سے آپ کو بری فرمایا جو آپ کی قوم آپ پر لگاتی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: (2) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ پتھر جو مربع شکل میں تھا، ہر طرف سے تین چشمے نکلتے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے تھے۔ جب انہیں پانی کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور وہ چل پڑتے تھے تو چشمے خشک ہو جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانی اپنی انگلیوں سے اور اپنے ہاتھ سے نکالنے کا معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑا معجزہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں صبح و شام پتھروں سے پانی نکل رہا ہے لیکن ہمارے نبی کا معجزہ ایسا تھا جو ہمارے نبی سے پہلے کسی کے لئے نہیں تھا، ہمارے نبی نے گوشت اور خون کے درمیان سے پانی نکالا۔ ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہم نے پانی نہ پایا، تو ایک چھوٹا سا پتھر کا پیالہ لایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا، میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے نکل رہا تھا اور آپ فرمارہے تھے، آؤ پاکیزہ پانی کی طرف (1)۔ اعمش نے کہا: مجھے سالم بن ابی الجعد نے بیان کیا، فرمایا: میں نے حضرت جابر سے پوچھا: اس وقت تم کتنے لوگ تھے؟ حضرت جابر نے کہا: پندرہ سو۔ یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ یعنی ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے لئے ایک چشمہ تھا جسے وہ قبیلہ پہچانتا تھا اور وہ کسی دوسرے چشمہ سے نہیں پیتا تھا۔ المشرب، (پینے کی جگہ)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مشروب ہے۔

اسباط بنی اسرائیل میں عربوں کے قبائل کی طرح تھے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے (2)۔ عطا نے کہا: اس پتھر کے چار اطراف تھے ہر ایک طرف سے تین چشمے نکلتے تھے ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا ہر ایک اپنے چشمہ کو ہی استعمال کرتا تھا اور ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ہر سبط میں پچاس ہزار جنگجو تھے، ان کے گھوڑوں اور چوپایوں کے علاوہ، عطا نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے پتھر پر عورت کے پستان کی مثل پہلے ابھار پیدا ہوتا پھر پانی بہنے لگتا۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وقلنا لهم كلوا المن والسلوى واشربوا الماء المتفجر المنفصل۔ ہم نے انہیں کہا: من وسلویٰ کھاؤ اور پھوٹنے والا پانی پیو۔

وَلَا تَعْثَوْا یعنی فساد برپا نہ کرو۔ العیث، سخت فساد کو کہتے ہیں اس سے انہیں منع فرمایا۔ کہا جاتا ہے: عثِي يعثى عُثِياً و عثا يعثو عثوّاً۔ عاث يعيث عيثا وعيوثاً، معاثاً۔ پہلی لغت قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: عث يعث (مضاعف) اس کا معنی بھی فساد برپا کرنا ہے۔ اس سے العثة ہے، اون چاٹنے والا کیڑا۔

مُفْسِدِيْنَ یہ حال ہے، لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکید امعنی کو مکرر ذکر کیا ہے ان کلمات میں نعمتوں کی اباحت، ان کی تعداد، معاصی کی طرف پیش قدمی اور ان سے نہی کا ذکر ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3807
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ علیہ السلام! ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر۔ سو آپ دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ نکالے ہمارے لئے وہ جن کو زمین اگاتی ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے۔ (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا۔ اور مسلط کردی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ یہ انہوں نے تیہ کے صحراء میں کیا تھا جب وہ من و سلویٰ کھا کھا کر اکتا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی شہری زندگی کو یاد کیا (1)۔ حسن نے کہا: وہ سبزیوں، پیازوں اور دالوں کے کھانے کے عادی تھے۔ پس وہ اپنی عادت کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی طبیعتیں، ان کی سابقہ عادت کا اشتیاق کرنے لگیں۔ انہوں نے کہا: ہم ایک جیسے کھانے پر صبر نہیں کریں گے۔ انہوں نے من وسلویٰ کو ایک کھانا کہا حالانکہ یہ دو کھانے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک کھانے کو دوسرے کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ایک کھانا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر دن چونکہ بار بار یہی کھانا ملتا تھا اسی وجہ سے انہوں نے اسے ایک کھانا کہا جیسے تو اس شخص کے بارے میں کہتا ہے جو روزہ، نماز اور قراءت پر مداومت اختیار کرتا ہے، وہ ایک امر پر ہے کیونکہ وہ ان تمام کاموں پر ملازمت اختیار کیے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَنْ نَّصْبِرَ کا معنی یہ ہے کہ ہم تمام اغنیاء ہیں ہم میں سے کوئی دوسرے پر مدد حاصل کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ ہر شخص دوسرے سے مستغنی تھا (2)۔ وہ اسی طرح تھے یہ پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے غلام اور خدام بنائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى طَعَامٍ طعام کا اطلاق ہر کھانے اور پینے والی چیز پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ (البقرہ:249) (اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے) اور ارشاد ہے: لَیْسَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا (المائدہ:93) (نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے۔) یعنی جو انہوں نے شراب پی اس کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ اگر سلویٰ سے مراد شہد ہے جیسا کہ المورج نے حکایت کیا ہے تو وہ بھی مشروب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

بعض اوقات طعام کے ساتھ گندم اور کھجور کو خاص کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں ہے۔ فرمایا: ہم رسول اللہ کے عہد میں صدقہ فطر ایک صاع طعام یا ایک صاع جو نکالتے تھے (1)۔ عرف اسی سے جاری ہے کہ جب کوئی کہتا ہے: ذهبت الی سوق الطعام تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جگہ جہاں کھانے یا پینے کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ الطعم (طاء کے فتحہ کے ساتھ) جو ذائقہ دے۔ کہا جاتا ہے: طعمه مر اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔ الطعم جس کی بدخواہی کی جائے۔ کہا جاتا ہے: لیس له طعم اس کا کوئی ذوق نہیں ہے۔ و ما فلانٌ بذی طعامٍ، جب کوئی بیکار شخص ہو۔ الطعم (طاء کے ضمہ کے ساتھ) کھانا۔ ابوخراش نے کہا:

اردّ شجاع البطن لو تعلمینهٔ و أوثر غیری من عیالك بالطعم

واغتبق الماء القراح فانتهی اذا الزاد امسی للمزلّج ذا طعم

شاعر نے پہلے طعم سے کھانا مراد لیا اور دوسرے طعم سے وہ چیز مراد لی جس کا شوق کیا جاتا ہے۔ طَعِمَ یطعَمُ فهو طا م، جب کوئی کھائے اور چکھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنۡ لَّمۡ یَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیۡۤ (البقرہ:249) (یعنی جس نے نہ چکھا) فرمایا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا (احزاب:53) (یعنی جب تم کھا چکو)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کے بارے میں فرمایا: انها طعام طعم و شفاء سقم یہ کھانے کا کھانا ہے اور بیمار کے لئے شفاء ہے۔ استطعمنی فلان الحدیث یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: استطعمنی فلان الحدیث۔ یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: اذا استطعمکم الامام فاطعموہ۔ جب امام تم پر اپنے خزانے کھول دے تو تم بھی اس پر کھول دو۔ فلان ما یعطم النوم الا قائماً، وہ شخص کھڑے کھڑے سو لیتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نعامًا بوجرة صفر الخدود و ما تطعم النوم الا صیاماً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ بنی عامر کی لغت فادعِ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے کیونکہ دو ساکنوں کا التقاء ہو گیا ہے۔ وہ معتل کو صحیح کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ وہ محذوف کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور یُخۡرِجۡ کو جزم سَلۡه اور قُلۡ له کے معنی کی وجہ سے ہے۔ اخرج، یخرج۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لام کے حذف کی تقدیر کے ساتھ دعا کے معنی میں ہے۔ زجاج نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ مِمَّا میں مِنۡ اخفش کے قول کے مطابق زائدہ ہے اور سیبویہ کے قول کے مطابق غیر زائدہ ہے کیونکہ کلام موجب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش نے یہ اس لئے کیا کیونکہ اس نے خرج کا مفعول نہیں پایا۔ اس نے ما کو مفعول بنانے کا ارادہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ مفعول محذوف ہو اس پر تمام کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: یخرج لنا مما تنبت الارض ما کولاً۔ اس صورت میں پہلا من بعضیہ ہے اور دوسرا تخصیص کے لئے ہے۔ و من بقلها حرف جر کے اعادہ کے ساتھ یہ ما سے بدل ہے۔ وَ قِثَّآئِهَا، یہ معطوف ہے اسی طرح بعد والی کلام بھی معطوف ہے، البقل۔ ہر وہ سبزی جس کا تنا نہ ہو الشجر جس کا تنا ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب صدقة الفطر صاع من طعام، حدیث نمبر 1412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

القثاء یہ معروف ہے۔ کبھی اس میں قاف کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے(1)۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کسرہ زیادہ ہے۔ بعض نے جمع میں قثاثی کہا جیسے علباء کی جمع علابی مگر قثاء واوی ہے تو کہتا ہے: اقثأت القوم یعنی میں نے لوگوں کو کھیرے کھلائے و قثأت القدر جب ہانڈی کے پانی کا ابلنا ختم ہوجائے۔ جعدی نے کہا:

تفور علینا قدرھم فندیمھا　　　و نفثؤھا عنا اذا حمیھا غلا

فثأت الرجل جب کسی کو کلام یا کسی اور ذریعے سے توڑ دے اور تو اس کے غصہ کو ٹھنڈا کر دے۔ عدا حتی افثا، یعنی وہ دوڑا حتیٰ کہ وہ تھک گیا، اور اس نے پوری کوشش کی۔ افثأ الحر، گرمی ڈھیلی پڑ گئی۔ عرب تھوڑی سی نیکی میں مثال دیتے ہیں: ان الرثیئۃ تفثأ الغضب۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں سے ناراض ہوا اور غصہ کے ساتھ ساتھ وہ بھوکا بھی تھا۔ پس انہوں نے اسے دہی یا لسی پلائی تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ الرثیئۃ، کھٹی چیز پر دوہا گیا دودھ تاکہ وہ دہی بن جائے، رثأت اللبن رَثأ جب دودھ کو کھٹی چیز پر دوہا جائے تاکہ دہی بن جائے۔ اسم الرثیئۃ سے ارتثأ اللبن۔ اس کا معنی ہے: دودھ دہی بن گیا۔

ابن ماجہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری والدہ موٹاپے کے لئے میرا علاج کرتی تھی۔ آپ چاہتی تھیں کہ آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجیں۔ یہ ان کے لئے ممکن نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے کھجور کے ساتھ کھیرے کھائے تو میں اچھی طرح موٹی ہوگئی (2)۔ یہ سند صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفُوْمِهَا۔ فوم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تھوم ہے کیونکہ پیاز کے مشابہ ہے یہ جویبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ الثاء، فاء سے بدل جاتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: مغافیر اور مغاثیر۔ جَدَثٌ و جدفٌ (قبر) حضرت ابن مسعود نے ثاء کے ساتھ ثوم ہی پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امیہ بن صلت نے کہا:

کانت منازلھم اذ ذاک ظاھرۃً　　　فیھا الفرادیسُ والفومان والبصل

ان کے گھر ظاہر تھے ان میں انگور کی بیلیں، تھوم اور پیاز تھے۔

حضرت حسان نے کہا:

وانتم اناسٌ لئام الاصول　　　طعامکم الفوم و الحوقل

تم لوگ اصل کے اعتبار سے لئیم (کمینے) ہو تمہارا کھانا تھوم اور سبزیاں ہیں۔

یعنی تھوم اور پیاز ہے۔ یہ کسائی اور نضر بن شمیل کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد گندم ہے۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین سے یہی مروی ہے (3)۔ نحاس نے اس کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ معنی بہتر ہے، جس نے یہ معنی کیا ہے وہ اعلیٰ ہے اور اس کی اسانید صحیح ہیں اور جویبر کی روایت کے لئے کوئی مثال نہیں ہے اگرچہ کسائی اور فراء

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ سنن ابن ماجہ، باب القثاء والرطب یجمعان، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

نے بھی پہلے قول کو پسند فرمایا ہے کیونکہ عرب فا کو ثا سے بدل دیتے ہیں اور ابدال پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ اور یہ عربوں کے کلام میں زیادہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے احیحہ بن جلاح کا شعر پڑھا اس شخص کے لئے جس نے آپ سے فوم کا مطلب پوچھا جبکہ وہ گندم ہے:

قد کنت اغنی الناس شخصا واجداً ورد المدینة عن زراعة فوم

ابن درید نے کہا: الفومۃ سے مراد خوشہ ہے۔ اس نے یہ شعر پڑھا:

وقال ربئیهم لما اتانا بکفه فومةٌ او فومتان

ان کے چوکیدار نے کہا: جب وہ ہمارے پاس آیا اس کی ہتھیلی میں ایک خوشہ تھا یا دو تھے۔

اور بکفه میں ھا غیر مشبعہ حرکت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد دال ہے۔ یہ شامی لغت ہے اس کے پیچھے والے کو فامی مغیرٌ عن فومی۔ کیونکہ وہ نسب میں تبدیلی کرتے تھے جیسا کہ سہلی اور دہری نے کہا۔ کہا جاتا ہے: فوموا لنا، ہمارے لئے روٹی پکاؤ۔ فراء نے کہا: یہ قدیم لغت ہے۔ عطا اور قتادہ نے کہا: الفوم ہر اس دانے کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکائی جائے۔

**مسئلہ**: علماء کا پیاز، تھوم اور بدبودار دوسری سبزیاں کھانے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء ان کی اباحت کے قائل ہیں کیونکہ ان کے بارے میں احادیث ثابت ہیں اور اہل ظواہر کا ایک گروہ جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض خیال کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں کے کھانے سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو فرض کی طرف آنے اور فرض کے قیام سے رد کے اس کا کرنا حرام ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہونا حرام ہے۔ انہوں نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خبیث کہا ہے اور الله تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان فرمایا کہ یُحَرِّمُ الخبائث کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جمہور کی حجت وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھال لایا گیا جس میں سبزیاں تھیں۔ آپ نے ان سے بو محسوس کی۔ حضرت جابر نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سبزیوں کے متعلق بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو ان کے (صحابہ جو آپ کے پاس موجود تھے) قریب کر دو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ صحابہ بھی اس کا کھانا ناپسند کر رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ کیونکہ میں ان سے باتیں کرتا ہوں جن سے تم باتیں نہیں کرتے (1)۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ یہ آپ کے لئے نہ کھانا خاص تھا اور دوسروں کے لئے مباح تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا جس میں تھوم بھی تھا۔ جب کھانا واپس حضرت ابوایوب کے گھر بھیجا گیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے لگنے کی جگہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کھانا کھایا ہی نہیں۔ حضرت ابوایوب پریشان ہوئے اور آپ کے پاس اوپر چڑھ گئے۔ پوچھا: حضور! کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت ابوایوب نے کہا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل الثوم، حدیث نمبر 3326، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں یا فرمایا: جسے آپ نے ناپسند کیا۔ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی آتی تھی یہ حرام نہ ہونے پر نص ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے جب صحابہ نے خیبر کے حملہ اور اس کی فتح کے زمانہ میں تھوم کھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا میں اسے حرام نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک درخت (تھوم) ہے جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ یہ تمام احادیث یہ شعور دیتی ہیں کہ یہ حکم آپ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ فرشتوں کے ساتھ ہم کلام ہونے میں آپ خاص تھے لیکن حدیث میں اس حکم کو اس طرح پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے لوگ اس میں برابر ہیں۔ جہاں فرمایا: جس نے اس سبزی تھوم سے کھایا...... کبھی فرمایا: میں نے پیاز اور تھوم اور کراث (بدبودار سبزی ہے) سے کھایا ...... وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ ملائکہ کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے جس سے بنی آدم کو تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک طویل حدیث میں فرمایا: اے لوگو! تم ان درختوں سے کھاتے ہو میں انہیں خبیث دیکھتا ہوں۔ یہ پیاز اور تھوم ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا جب آپ مسجد میں کسی شخص سے ان دو چیزوں (پیاز، تھوم) کی بدبو محسوس کرتے تو اسے نکالنے کا حکم دیتے تو وہ بقیع کی طرف نکال دیا جاتا۔ تو جو ان دو (پیاز اور تھوم) میں سے کھائے اسے اچھی طرح پکا کر کھائے۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا، العدس معروف ہے۔ العدسۃ وہ پھوڑا جو ان کو نکلتا ہے اور بعض اوقات اسے قتل کر دیتا ہے۔ عَدَسْ خچر کو جھڑکنے کے لئے بولتے ہیں۔

عَدَسْ مالعبادِ علیكِ امارة	نجوتِ و هذا تحملین طلیق

العدس۔ سختی سے روندنے کو کہتے ہیں اور کوشش کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: عدسہ، عدس فی الارض۔ یعنی زمین میں چلا گیا۔ وعدست الیہ المنیۃ، موت اس کی طرف چلی۔

کمیت نے کہا:

اکلفها هول الظلامِ و لم ازل	اخا اللیل معدوساً الی وعادسا

یعنی میری طرف رات کے وقت اسے چلایا جاتا ہے۔

عدس ایک لغت میں حدس بھی ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: دال کھاؤ کیونکہ یہ برکت والی اور مقدس ہے، یہ دل کو نرم کرتی ہے اور آنسوؤں کو زیادہ کرتی ہے، اس میں ستر انبیاء کی برکت ڈالی گئی ہے۔ ان میں آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (1)۔ یہ ثعلبی وغیرہ نے ذکر ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک دن زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھاتے تھے، ایک دن گوشت کے ساتھ اور ایک دن دال کے ساتھ۔ حلیمی نے کہا: دال اور زیتون کا تیل نیک لوگوں کا کھانا ہے، اگر دال کی فضیلت نہ ہوتی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت اپنے شہر میں اس سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس میں کفایت تھی۔ اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ جسم کو ہلکا کرتی ہے اور بدن عبادت کے

1۔ اس روایت کو ابن جوزی نے الموضوعات جلد 2، صفحہ 197 میں ذکر کیا ہے۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 103

لئے ہلکا ہوجاتا ہے۔ اس سے شہوات نہیں ابھرتیں جس طرح گوشت سے ابھرتی ہیں اور حنطۃ، دانوں میں سے دانہ ہے اور صحیح قول کے مطابق یہی فوم (گندم) ہے اور جو اس کے قریب ہے۔ اہل مدینہ کا کھانا گندم تھی جس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شہر کا کھانا دال تھی۔ پس ان دونوں دانوں میں سے ہر ایک دانہ کے لئے کسی ایک نبی کی وجہ سے فضیلت ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی سیراب نہیں ہوئے درآں حالیکہ آپ ﷺ اور آپ کے گھر والے تین دن متواتر گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ یہ معمول رہا مدینہ طیبہ سے لے کر وصال تک (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ۔ الاستبدال کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنا۔ اسی سے بدل ہے پہلے اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ادنی زجاج کے نزدیک الدنو سے مشتق ہے یعنی قیمت میں قرب۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے: ثوبٌ مقارب۔ کم قیمت کپڑا۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ مہموز ہے الدنیٔ البیّن الدناءۃ سے مشتق ہے یعنی خسیس ترین مگر اس کے ہمزہ میں تخفیف کی گئی۔ بعض نے فرمایا: الدون سے مشتق ہے۔ گرا ہوا۔ اس کی اصل ادون، اَفْعَلُ ہے پھر اس میں قلب هو افلع ہوا پھر واو کو طرف کلمہ میں ہونے کی وجہ سے الف سے بدلا گیا اور شاذ صورتوں میں ادنئ بھی پڑھا گیا ہے (2)۔ آیت کا معنی یہ ہے کیا تم سبزیوں، ککڑیوں، تھوم، دال اور پیاز جو ادنیٰ (گھٹیا) ہیں انہیں بدلنا چاہتے ہو من وسلویٰ جگہ جو من وسلویٰ ان سے بہتر ہیں۔

ان وجوہ میں اختلاف ہے جو دوسری چیزوں پر من وسلویٰ کی فضیلت کا موجب ہیں۔

۱- سبزیوں کی من وسلویٰ کی نسبت کوئی اہمیت نہ تھی وہ دونوں کھانے افضل تھے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

۲- جب من وسلویٰ کا کھانا اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام تھا اور اس نے وہ انہیں کھانے کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے امر کی ہمیشہ پیروی کرنا اور اس کی نعمت کا شکر کرنا آخرت میں اجر اور ذخر کا موجب تھا اور جو انہوں نے طلب کیا وہ ان خصائل میں عاریۃ تھا۔ پس اس وجہ سے وہ کھانا ادنیٰ تھا۔

۳- اللہ تعالیٰ نے جو ان پر احسان فرمایا وہ زیادہ پاکیزہ اور لذیذ تھا بنسبت اس کے جو انہوں نے مطالبہ کیا۔ پس اس وجہ سے لامحالہ جو انہوں نے سوال کیا وہ ادنیٰ تھا۔

۴- اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا فرمایا تھا اس میں کوئی کلفت وتھکاوٹ نہ تھی اور جو انہوں نے طلب کیا وہ کھیتی باڑی اور تھکن سے ملتا تھا۔ پس یہ ادنیٰ ہوا۔

۵- جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا تھا اس کے حلال ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول کی وجہ سے اس کے خالص ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اور باقی تمام دانے اور زمین جن کو بیوع اور غصب لاحق ہوتا اور ان میں شبہ داخل ہوتا ہے اس وجہ سے یہ ادنیٰ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب ما کان النبی و اصحابہ یاکلون، حدیث نمبر 4996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

**مسئلہ**: اس آیت میں طیبات اور متلذذ کھانے کے جواز پر دلیل ہے۔ نبی کریم ﷺ حلوئی اور شہد پسند فرماتے تھے(1) اور ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ مائدہ اور سورۃ النحل میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا، ہبوط کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہ امر کا صیغہ انہیں عاجز کرنے کے لئے ہے جیسے یہ ہے قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ (الاسراء) کیونکہ وہ تیہ میں تھے اور یہ ان کیلئے سزا تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے جو طلب کیا وہ انہیں دیا گیا(2) مِصْرًا تنوین کے ساتھ نکرہ یہ جمہور کی قراءت ہے اور یہی قرآن کا خط ہے(3)۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے غیر معین شہر مراد لیا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: شہروں میں سے ایک شہر۔ ایک طائفہ جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے معین فرعون کا شہر مراد لیا۔ پہلے قول والے علماء نے ظاہر قرآن کے مقتضیٰ سے استدلال کیا ہے کہ انہیں شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ تیہ کے بعد شام میں ٹھہرے تھے۔ اور دوسرے قول کے قائلین نے جو قرآن میں وارد ہے اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آل فرعون کے شہروں اور آثار کا وارث بنایا تھا اور ان علماء نے اس کے منصرف ہونے کو جائز قرار دیا۔ اخفش اور کسائی نے کہا: اس کی خفت اور ھند اور دعد سے مشابہت کی وجہ سے اس کا منصرف ہونا جائز ہے۔ شعر ہے:

لم تتلفع بفضل مئزرها　　دعدٌ ولم تسق دعدُ فی العُلَب

دعد نے اپنی اضافی چادر کے ساتھ اپنے آپ کو نہ لپیٹا اور چمڑے کے پیالے میں اسے دودھ نہ پلایا گیا۔

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتیں (منصرف اور غیر منصرف) جمع کی ہیں۔ سیبویہ، خلیل اور فراء اس کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اگر تو کسی عورت کا نام زید رکھ دے تو وہ منصرف نہیں ہو جائے گا۔ اخفش کے علاوہ علماء نے کہا: اس سے مراد مکان ہے اس لئے منصرف ہے۔ حسن، ابان بن تغلب اور طلحہ نے اسے مِصْرَ غیر منصرف پڑھا ہے اسی طرح حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں اور حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے(4)۔ انہوں نے کہا: یہ فرعون کا مصر ہے۔ اشہب نے کہا: مجھے امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک مصر تمہارا شہر ہے جو فرعون کا مسکن تھا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے(5)۔ مصر کا لغوی معنی الحد ہے۔ مصر الدار (گھر کی حدود) ابن فارس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ اہل حجر اپنی شروط میں لکھتے تھے: اشتری فلان الدار بمصورھا۔ یعنی فلاں نے گھر حدود سمیت خریدا...... عدی نے کہا:

وجاعل الشمس مصراً لا خفاء به　　بین النهار و بین اللیل قد فصلا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، مَّا، اِنَّ کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے سألتم

---

1۔ صحیح بخاری، باب الحلواء والعسل، حدیث 5011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا　5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

(سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے)۔ کہا جاتا ہے: سألت وسلت بغیر ہمزہ کے، یہ واوی الفاظ میں سے ہے اس کی دلیل عربوں کا قول یتساولان ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ یعنی وہ ذلت و مسکنت سے ملائے گئے ان پر ان دونوں کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ضرب القباب سے مشتق ہے (1)۔ فرزدق نے جریر کے متعلق کہا تھا:

ضربت عليك العنكبوت بنسجها و قضى عليك به الكتاب المنزل

تجھ پر مکڑی نے اپنا جالا لگا دیا ہے اور اس کا تجھ پر فیصلہ نازل شدہ کتاب نے کیا ہے۔

ضرب الحاكم على اليد۔ یعنی اس سے اٹھایا اور لازم کیا، الذلة، رسوائی، المسكنة غربت۔ کوئی یہودی فقر اور خضوع اور ذلت سے خالی نہیں ہوگا اگرچہ وہ غنی بھی ہو۔ المسكنه، سکون سے مشتق ہے یعنی فقر نے اس کی حرکت کو کم کر دیا۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا: الذله کا معنی رسوائی ہے: المسكنة، المسكين کا مصدر ہے۔ ضحاک بن مزاحم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ فرمایا: ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَآءُوْ یعنی وہ لوٹے اور پلٹے۔ یہ ان کو لازم ہو گیا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے ابوء بنعمتك على (2)۔ یعنی میں تیری نعمت کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں اور اپنے نفس پر اسے لازم کرتا ہوں۔ لغت میں اس کا معنی رجوع ہے۔ کہا جاتا ہے: باء بكذا، یعنی اس کے ساتھ لوٹا۔ وباء الى المباءة، منزل کی طرف لوٹا۔ البواء قصاص کے ساتھ لوٹنا۔ هم فى هذا الامر بواء، یعنی وہ اس امر میں برابر ہیں۔ وہ اس امر میں ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

الا تنتهي عنا ملوك و تتقي محارمنا لايبوؤ الدم بالدم

یعنی کیا بادشاہ ہم سے رکتے نہیں ہیں اور ہماری محارم سے بچتے نہیں ہیں خود خون خون کو قصاص میں لوٹاتا نہیں

فابُوا بالنهاب و بالسبايا و ابنا بالملوك مصفدينا

یعنی وہ لوٹے اور ہم بھی لوٹے۔

الغضب کا معنی پہلے سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ علت بیان ہو رہی ہے بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی وہ جھٹلاتے ہیں بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات اور انبیاء کے معجزات جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ، يَكْفُرُوْنَ پر معطوف ہے۔ حسن سے مروی ہے، يقتّلون پڑھنا بھی مروی ہے اور ان سے دوسرے قراء کی طرح پڑھنا بھی مروی ہے۔ نافع نے النبيئين ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ قرآن میں واقع ہوا ہے مگر سورۃ الاحزاب میں اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ (الاحزاب: 50) میں اور لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ (الاحزاب: 53)

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب افضل الاستغفار، حدیث نمبر 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں بغیر مد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ان دونوں جگہوں پر ہمزہ کو ترک کیا کیونکہ دو مکسور ہمزے جمع ہو رہے تھے اور باقی قراء نے پورے قرآن میں ہمزہ کو ترک کیا ہے(1)۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ اس کا اسم فاعل مُنبیٔ ہے(2) نبی کی جمع انبیاء ہے اور نبی کی جمع نُبَاءُ بھی آئی ہے۔ عباس بن مرداس السلمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا۔

یا خاتم النبآء انك مرسلٌ بالحق كل هدى السبيل هداكا

اے خاتم النبیین! تم حق کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہو اور ہر ہدایت کا راستہ آپ کی ہدایت سے ہے۔

یہ ہمزہ کی قراءت کا معنی ہے۔ ہمزہ کے ترک کرنے والوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: ہمزہ سے اشتقاق کیا پھر ہمزہ میں تسہیل کی۔ بعض نے فرمایا: یہ نبا ینبو (ظاہر ہونا) سے مشتق ہے۔ پس النبی، نبوۃ سے جس کا معنی بلند ہونا ہے، پس نبی کا مرتبہ بلند ہے بغیر ہمزہ کے نبی سے مراد راستہ بھی ہوتا ہے رسول کو نبی کہا جاتا ہے کہ مخلوق اس سے ہدایت حاصل کرتی ہے جیسے راستہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ شاعر نے کہا:

لاصبح رَتْماً دقاق الحصى مكان النبي من الكاثب

رتمت الشیء میں نے اسے توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے: رتم انفهٗ و رثمه، یعنی تا اور ثا دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ الرتم کا مطلب المرتوم یعنی ٹوٹا ہوا بھی ہے، الکاثب پہاڑ کا نام ہے۔ انبیاء ہمارے زمین میں راستوں کی مانند ہیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: السلام علیك یا نبیٔ الله ہمزہ ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لست بنبیٔ الله۔ لیکن میں نبی الله (بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ ابوعلی نے کہا: اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور اس کے ضعف کو جو چیز مزید قوت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مدح کرنے والے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح مدح کی یا خاتم النُبَاء ...... الخ۔ اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار مروی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِغَیْرِ الْحَقِّ، برائی اور جو انہوں نے جرم کیا تھا اس کی بڑائی بیان کرنا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل ہے کہ حق کے ساتھ ان کو قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ معصوم ہوتے ہیں اس سے کہ ان سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر ہو جس کی وجہ سے انہیں قتل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے حقیقت ایسی نہیں ہے۔ یہ کلام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ انبیاء کا قتل ظلم ہے اور حق نہیں ہے۔ ان پر مذمت کی زیادتی کے لئے یہ فرمایا ہے یہ معلوم شدہ ہے کہ کسی نبی کو حق کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا لیکن حق کے خلاف قتل کیا جائے گا۔ بِغَیْرِ الْحَقِّ سے ان کے گناہ کی برائی اور اس کے واضح ہونے کی تصریح فرمائی۔ نبی سے کبھی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی کہ اس کے قتل کا موجب بنے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کافروں کو انبیاء کے قتل کی کیسے قدرت دی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انبیاء کی کرامت اور ان کے مقامات میں زیادتی کے لئے تھا جیسے مومنین میں سے جو اللہ کے راستہ

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

میں شہید کیا جاتا ہے (تو اسے مرتبہ ملتا ہے) یہ انبیاء کے لئے خذلان ورسوائی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: انبیاء میں سے کبھی کوئی نبی شہید نہیں ہوا مگر وہ جسے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور جس نبی کو قتال کا حکم دیا گیا تھا اس کی مدد کی گئی (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، ذٰلِكَ پہلے ذالك کی طرف لوٹ رہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تاکید ہے۔ بِمَا میں باسبب کے لئے ہے (2)۔ اخفش نے کہا ما مصدر یہ ہے یعنی بعصیانهم، العصیان، طاعت کا متضاد ہے۔ اعتصت النواة (گٹھلی سخت ہوگئی) الاعتداء کا معنی ہر چیز میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ ظلم اور معاصی میں معروف ہے۔ (3)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

”یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہونگے“۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔

سفیان نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ گویا یوں فرمایا کہ جو ظاہراً ایمان لائے تھے اسی وجہ سے ان کا ذکر یہود، نصاریٰ اور صابیوں کے ساتھ کیا، پھر ان تمام کا حکم بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے تھے۔ (4)

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اس کا معنی ہے: وہ یہودی ہو گئے وہ یہودا کی طرف منسوب ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کا بڑا بیٹا تھا۔ پھر عربوں نے ذال کو دال سے بدل دیا، جب عجمی زبان، عربی بنائی جاتی ہے تو اس کے لفظ بدل جاتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھا گیا۔ ھاد کا معنی ہے: تاب۔ (اس نے توبہ کی) الھائد، التائب توبہ کرنے والا۔ شاعر نے کہا:

انی امرؤ من حبه هائد (5)

میں اس کی محبت سے توبہ کرنے والا ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے: انا هُدْنا الیك۔ یعنی ہم نے توبہ کی۔ ھاد القوم یهودون هوداً هیادةً اس کا معنی ہے: قوم نے توبہ کی (6)۔ ابن عرفہ نے کہا: هُدْنا الیك کا مطلب ہے ہم نے تیرے امر کی طرف سکون حاصل کیا۔ الهوادة کا معنی السکون

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

والمواد عة ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا۔ ابوالسمال نے هادَوا (دال کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** وَالنَّصٰرٰی یہ جمع ہے اس کا واحد نَصرانی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا واحد نصران (یاء کے اسقاط کے ساتھ) ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مؤنث نصرانۃٌ ہے جیسے ندمان کی مؤنث ندمانۃ ہے۔ یہ نکرہ ہے الف، لام کے ساتھ معرفہ بنایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

صدّت کما صد عما لا یحل لہ ساق نصاری قبیل انفصح صوام

وہ رو کی گئی ہے جیسے روزہ دار نصرانیوں کا ساقی عید الفطر سے پہلے اس چیز سے روکا جاتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتی۔ یہاں نکرہ کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا ہے۔ خلیل نے کہا: النصاریٰ کا واحد نصری ہے جیسے مہری اور مہاریٰ ہے۔ سیبویہ نے اس پر استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے:

تراہ اذا دار العشا متحَنِّفا و یضحی لدیہ و ھو نصران شامس (1)

اور ایک اور شعر لکھا ہے:

فکلتا ھما خرت و اسجد راسھا کما اَسْجَدَتْ نصرانۃ لم تحنف

دونوں اونٹنیاں گر پڑیں اور انہوں نے اس طرح سر جھکا دیئے جیسے نصرانی عورت سر جھکاتی ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ کہا جاتا ہے: اسجد، یعنی جھک گیا۔ لیکن نصران اور نصرانۃ یائے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کیونکہ عرب کہتے ہیں: رجلٌ نصرانی و امراءۃ نصرانیۃ ..... نصرہ اس نے۔ سے نصرانی بنا دیا۔ حدیث میں ہے: ابواہ یھودانہ او ینصرانہ (2)۔ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے متعلق اس امت سے کوئی نصرانی اور یہودی نہیں سنے گا پھر اس پر ایمان نہیں لائے گا جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں مگر وہ دوزخی ہوگا ☆۔

واحد کے استعمال کے بغیر جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ یہ النصرانیون ہوتا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس کو نصاریٰ اس شہر کی وجہ سے کہا جاتا ہے جس کا نام ناصرہ تھا اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اترے تھے، اس شہر کی طرف ان کی نسبت کی گئی۔ کہا جاتا ہے: عیسیٰ الناصری۔ جب ان کے شہریوں کو اس کی طرف منسوب کیا گیا تو کہا گیا: النَّصٰرٰی۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے (3)۔ جوہری نے کہا: نصران شام کا شہر ہے جس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں اور اسے ناصرہ کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النَّصٰرٰی نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ شاعر نے کہا:

لما رایت نبطاً انصاراً شمرت من رکبتی الازارا

کنت لھم من النصاریٰ جارا (4)

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب اذا اسلم الصبی فمات ھل یصلی علیہ وھل، حدیث 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً

جب میں نے ایک نبطی کو انصاری دیکھا تو میں نے اپنے گھٹنے سے ازار اوپر کر لی۔ میں نصاریٰ کا پڑوسی تھا۔
بعض علماء نے فرمایا: اس قول کی وجہ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے: مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران: 52)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصّٰبِـِٕیْنَ یہ صابی کی جمع ہے۔ بعض نے فرمایا: صاب کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے ہمزہ میں اختلاف ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے نافع کے۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے صبأت النجوم سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے ستارے طلوع ہوئے۔ صبأت ثنية الغلام۔ بچے نے دانت نکالے۔ اور جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھا انہوں نے اسے صبا یصبو سے مشتق کیا ہے۔ جس کا معنی ہے مائل ہونا۔ لغت میں الصابی اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے اور نکل جائے۔ اسی وجہ سے جو شخص مسلمان ہو جائے عرب کہتے تھے: قد صبأ۔ پس الصائبون وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے دین سے نکل گئے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 5:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں اور ان کی کتاب کی وجہ سے ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے اور ان کا طعام کھانا حلال ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آئے گا اور ان پر جزیہ لگانا جائز ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں آئے گا اور الصّٰبِـِٕیْنَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: یہ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ ابن منذر اور ابن اسحاق نے کہا: صابئین کے ذبیحہ میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اہل کتاب کا ایک طائفہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: ان کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح میں کوئی حرج نہیں۔ خلیل نے کہا: یہ قوم ایسی ہے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب ہوا کے چلنے کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ مجاہد، حسن اور ابن نجیح نے کہا: وہ ایسی قوم ہے جو اپنے دین کو یہود و مجوس کے دینوں کے درمیان سے مرکب کرتی ہے، ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ حسن اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور پانچ نمازیں پڑھتی ہے۔ زیاد بن ابی سفیان نے ان کو دیکھا تو ان سے ٹیکس ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے جانا کہ یہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں (2) اور جو کچھ ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے ان کے مذہب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موحد ہیں ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ستارے فعال ہیں۔ اسی وجہ سے ابوسعید اصطخری نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا جب ان سے ان کے متعلق سوال کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ اٰمَنَ۔ یعنی جس نے تصدیق کی۔ مَنْ اٰمَنَ میں مَنْ، الَّذِیْنَ سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اور فَلَهُمْ میں فا، من میں جو ابہام تھا اس کے سبب کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ مبتدا خبر ہیں پھر جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ من حالت رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا معنی شرط ہو اور امن شرط کی وجہ سے مجزوم ہو اور الفاء جواب ہو اور لهم اجرهم، من کی خبر ہو پھر جملہ ان کی خبر ہو۔ اور الذین کی طرف عائد

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

محذوف ہو تقدیر کلام اس طرح ہو من آمن منھم باللہ۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ایمان بالرسل والکتب والبعث بھی داخل ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 7:** اگر کوئی کہے کہ لھم اجرھم میں ضمیر جمع کیوں ذکر کی گئی ہے جبکہ اٰمَنَ لفظ مفرد ہے جمع نہیں ہے۔ اگر لہ اجرہ ہوتا تو کلام درست ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے مَنْ کا لفظ واحد، تثنیہ، جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس اس کی طرف، واحد، تثنیہ اور جمع کی ضمیر لوٹانا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس:42) یہ معنی کے اعتبار سے ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (انعام:25) لفظ کے اعتبار سے ہے۔ شاعر نے کہا:

ألما بسلمی عنکما ان عرضتما　　و قولا لها عوجی علی مَنْ تخلفوا (2)

فرزدق نے کہا:

تعال فان عاهدتني لا تخونني　　نكن مثل من يا ذئب يصطحبان

اس میں معنی کا اعتبار کرتے ہوئے تخلفوا کہا۔

پس یہاں معنی پر محمول کرتے ہوئے یصطحبان کہا ہے۔ اگر لفظ پر محمول ہوتا تو یصطحب اور تخلف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (النساء:13) اس میں لفظ کا اعتبار کیا گیا۔ پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ۔ معنی کا اعتبار کیا گیا۔ اگر لفظ کا اعتبار ہوتا تو خالداً فیھا ہوتا۔ جب مَنْ کا مابعد لفظ پر محمول ہو تو اس کے مابعد میں معنی کے اعتبار سے مخالفت جائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور جب مَنْ کا مابعد معنی پر محمول ہو تو بعد میں لفظ کے اعتبار سے مخالفت جائز نہیں ہے کیونکہ الباس کلام میں داخل ہو جائے گا(3)۔ پہلا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (انعام) کے تحت کلام گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

**مسئلہ نمبر 8:** حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا کا ارشاد وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:85) سے منسوخ ہے اور دوسرے علماء نے کہا: یہ منسوخ نہیں ہے یہ اس کے حق میں ثابت ہے جو مومنین میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے پر قائم ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تم پر طور کو۔ (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ (احکام) جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنے کے بعد۔ تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ یہ آیت واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ کے معنی کی تفسیر ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلایا اور ہم نے اسے اپنی جگہ سے نکالا (1)۔ فرمایا: ہر وہ چیز جسے تو اکھیڑے اور اسے پھینکے تو اس کے لئے نتقتہ کا لفظ استعمال کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: نتقناہ کا معنی ہے: رفعناہ۔ ابن اعرابی نے کہا: الناتق کا معنی الرافع ہے۔ الناتق الباسط، الناتق الفاتق، امرءۃ ناتق و منتاق ایسی عورت جس کی اولاد زیادہ ہو۔ قتبی نے کہا یہ نتق السقاء سے مشتق کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: مشکیزہ کو ہلانا حتیٰ کہ اس سے مکھن علیحدہ ہو جائے اور واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ کا مطلب ہے اصل سے اکھیڑا گیا۔ (2)

الطُّوْرَ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تھی اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تھی۔ یہ ابن جریج نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جو کچھ اگائے، نہ کہ وہ پہاڑ جو کچھ نہ اگائے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: یعنی یہ پہاڑ تھا۔ مگر مجاہد نے کہا: یہ سریانی زبان میں ہر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے (3)۔ کتاب کے مقدمہ میں کلام گزر چکی ہے کہ قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے مفرد الفاظ موجود ہیں یا نہیں۔ الحمد للہ۔ بکری نے کہا: طور بن اسماعیل علیہ السلام کی وجہ سے اسے طور کہا جاتا ہے۔

## طور پہاڑ کے اٹھانے کے بارے میں علماء کے اقوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں لے کر آئے جن میں تورات تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو لے لو اور اس کو لازم پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی طرح کلام کرے جس طرح تجھ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کی۔ پس ان پر بجلی گرائی گئی پھر انہیں زندہ کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تو انہوں نے فلسطین کے پہاڑوں سے ایک پہاڑ اکھیڑا جس کی لمبائی چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ بنی اسرائیل کا لشکر اتنا ہی تھا۔ پس اسے ان پر چھتری کی مثل کر دیا گیا اور ان کے پیچھے سے سمندر اور آگے سے آگ کو لایا گیا، انہیں کہا گیا: اب اس کتاب کو پکڑ و اور تم پر عہد لازم ہے کہ تم اسے ضائع نہیں کرو گے ورنہ تم پر پہاڑ آ پڑے گا۔ تو بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہوئے سجدوں میں گر گئے اور تورات کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

طبری نے بعض علماء سے روایت کیا ہے (4)۔ اگر وہ پہلی دفعہ تورات کو لے لیتے تو ان پر میثاق نہیں تھا اور بنی اسرائیل کا سجدہ پیشانی کی ایک طرف پر تھا کیونکہ وہ خوف کی وجہ سے پہاڑ کو دوسری طرف سے دیکھ رہے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا: کوئی سجدہ اس سجدہ سے افضل نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

---

1۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پس انہوں نے ایک طرف پر سجدہ کا حکم دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ قول جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کے وقت ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرما دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبوراً ایمان لائے تھے اور ان کے دل مطمئن نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذُوْا یعنی ہم نے حکم دیا کہ اس کو پکڑ لو۔ مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ محذوف ہے بِقُوَّةٍ یعنی کوشش اور محنت سے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: نیت اور اخلاص کے ساتھ۔ مجاہد نے کہا: قوۃ سے مراد ہے اس میں جو احکامات ہیں ان پر عمل کرنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: بِقُوَّةٍ یعنی کثرت سے پڑھنے کے ساتھ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ یعنی غور وفکر کرو، اس کے اوامر اور وعید کی حفاظت کرو اور یاد کرو اور اس کو بھولو نہیں اور اس کو ضائع نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: کتب سے یہ مقصود ہے ان کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنا، نہ صرف زبان سے تلاوت کرنا اور ترتیل سے پڑھنا، کیونکہ صرف زبان سے پڑھنا اور عمل نہ کرنا تو نبذٌ (پھینکنا) کے زمرہ میں آتا ہے جیسا کہ شعبی اور ابن عیینہ نے کہا ہے۔ ان دونوں حضرات کا قول نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (البقرہ: 101) کے تحت آئے گا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سے فاسق شخص وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں سے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا (یعنی احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ مقصود عمل کرنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، امام مالک نے فرمایا: بعض اوقات وہ شخص قرآن پڑھتا ہے جس میں خیر نہیں ہوتی (یعنی صرف پڑھتا ہے عمل نہیں کرتا)۔ پس جو ہم سے پہلے لوگوں پر لازم تھا اور ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ ہم پر بھی لازم اور واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: 55) اس میں اپنی کتاب کی اتباع اور اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے بھی عمل اسی طرح ترک کر دیا ہے جس طرح یہود و نصاریٰ نے ترک کر دیا تھا۔ صرف کتابوں اور مصاحف کی ذوات باقی ہیں جو کچھ مفید نہیں کیونکہ جہالت، ریاست کی طلب اور خواہش نفس کی اتباع کا غلبہ ہے۔ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے، انہوں نے حضرت ابو درداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پھر کہا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم اٹھا لیا جائے گا حتیٰ کہ وہ علم میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔ زیاد بن لبید انصاری نے عرض کی: ہم سے علم کیسے اٹھا لیا جائے گا جبکہ ہم نے قرآن پڑھا۔ اللہ کی قسم! ہم قرآن پڑھتے رہیں گے اور ہم اپنی عورتوں اور بیٹوں کو پڑھائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے زیاد! تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے فقہائے مدینہ سے شمار کرتا تھا۔ یہ تورات، انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں ان کو یہ کچھ فائدہ دیتی ہیں (1)۔ یہ حدیث تفصیل سے آگے آئے گی۔ نسائی نے جبیر بن نفیر عن عوف بن مالک الاشجعی کے سلسلہ صحیحہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیاد کو فرمایا: اے زیاد! تیری ماں تجھ پر روئے۔ یہ تورات، انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں۔ مؤطا میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کو فرمایا: تو ایک ایسے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

زمانہ میں ہے جس میں فقہاء کثیر ہیں، قراء قلیل ہیں اس میں قرآن کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اور حروف کی ادائیگی کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا، سوال کرنے والے تھوڑے ہیں، عطا کرنے والے بہت ہیں، لوگ نماز لمبی پڑھتے ہیں، خطبہ چھوٹا دیتے ہیں، اپنی خواہشات سے پہلے اعمال خیر کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں فقہاء کم ہوں گے، قراء زیادہ ہوں گے، اس میں حروف کی حفاظت کی جائے گی اور اس کی حدود کو ضائع کیا جائے گا، سوال کرنے والے زیادہ ہوں گے اور عطا کرنے والے کم ہوں گے، خطبے لمبے دیں گے اور نمازیں مختصر کریں گے، اپنے اعمال سے پہلے خواہش نفس پر عمل کریں گے(1)۔ یہ نصوص ہماری اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے۔ یحییٰ نے کہا: ابن نافع سے میں نے یبدءون اھوائھم قبل اعمالھم کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا لوگ اپنی خواہش نفس پر عمل کریں گے اور اس عمل کو ترک کریں گے جو ان پر فرض ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ پر پہلے کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ، تولی باب تفعل ہے اس کا اصل معنی جسم میں سے کسی چیز سے اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا ہے، پھر یہ وسعت ومجاز کی وجہ سے اوامر، ادیان اور معتقدات میں سے اعراض میں استعمال ہوتا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی دلیل کے بعد۔ وہ میثاق کا لینا اور پہاڑ کو بلند کرنا ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، فضل سیبویہ کے نزدیک متبدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جس کا اظہار جائز نہیں کیونکہ اس کے اظہار سے مستغنی ہوتے ہیں مگر یہ کہ جب وہ اس کے اظہار کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ لاتے ہیں جب وہ ان کے ساتھ لاتے ہیں تو خبر کو حذف نہیں کرتے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فلولا فضل اللہ تدارککم۔

رَحْمَتُهٗ اس کا عطف فَضْلُ پر ہے۔ یعنی اس کا لطف اور مہلت دینا نہ ہوتا۔

لَكُنْتُمْ یہ لولا کا جواب ہے مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ، کنتم کی خبر ہے۔ الخسران کا معنی نقصان ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا فضل یہ ہے کہ توبہ قبول کرنا۔ اور رَحْمَتُهٗ سے مراد العفو ہے اور الفضل سے مراد ثابت شدہ پر زیادتی ہے۔ الافضال ایسا فعل کرنا جو واجب نہ ہو۔ ابن فارس نے المجمل میں کہا: الفضل سے مراد زیادتی اور خیر ہے۔ الافضال کا مطلب الاحسان ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـــِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

''اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے''۔

اس میں سات مسائل ہیں (☆)۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، عَلِمْتُمْ اس کا معنی ہے: تم نے ان کے اعیان (اشخاص) کو پہچان لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: تم ان کے احکام جان چکے ہو، ان دونوں (علم اور معرفت) میں فرق یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں تین مسائل ہیں۔

ہے کہ معرفت ذات مسمی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور علم مسمیٰ کے احوال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تو کہتا ہے کہ عرفت زیداً اس سے مراد ہے میں نے زید کی شخصیت کو پہچان لیا۔ جب تو کہتا ہے: علمت زیداً اس سے مراد اس کے احوال (فضل یا نقص) وغیرہ کو جان لیا۔ پہلی صورت میں ایک فعل کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور علمتم بمعنی عرفتم ہے اور دوسری صورت میں دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: لقد علمت زیداً ولم اعلمه، اس میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، قرآن حکیم میں ہے: لا تعلمونهم الله یعلمهم۔ یہ تمام معرفت کے معنی میں ہیں۔

اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، الَّذِيْنَ کا صلہ ہے۔ الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** نسائی نے حضرت صفوان بن عسال سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا: ہم اس نبی کے پاس چلیں۔ دوسرے ساتھی نے کہا: نبی نہ کہو اگر اس نے تجھے (یہ کہتے ہوئے) سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ (یعنی بہت خوش ہوگا)۔ وہ دونوں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نو آیات بینات کے بارے پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: الله تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، اس نفس کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا الله نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، کسی بری شخص کو سلطان (بادشاہ) کے پاس نہ لے جاؤ، کسی کا تمسخر نہ اڑاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامنہ پر بہتان نہ لگاؤ، جنگ کے دن پیٹھ نہ پھیرو اور اے یہودیو! خاص تمہارے لئے کہ تم ہفتہ کے دن (کے احکام سے) تجاوز نہ کرو۔ پس انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نبی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تمہیں میری اتباع کرنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ان کی اولاد سے ہمیشہ نبی ہو۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں گے تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کے الفاظ سورۂ سبحان میں ان شاء الله آئیں گے۔

**مسئلہ نمبر 3:** فِي السَّبْتِ اس کا معنی فی یوم السبت ہے، (یعنی ہفتہ کے دن میں)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد ہفتہ کے دن کا حکم ہو(1)۔ پہلا قول حسن کا ہے۔ انہوں نے حلال سمجھنے کی جہت سے اس میں مچھلیاں پکڑی تھیں۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن رومان نے کہا: ایک شخص ایک دھاگہ لیتا تھا اور اس میں ایک ایسی رسی لگاتا تھا جو جانور کی گردن میں ڈالی جاتی ہے پھر اسے مچھلی کے دم میں ڈالتا تھا اور دھاگے کی دوسری طرف ایک کیل ہوتا تھا، وہ اتوار کے دن تک اسے اسی طرح چھوڑے رکھتا تھا پھر جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ایسا کرنے والے کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کیا گیا تو عام لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مچھلی کا شکار ہفتہ کے دن میں زیادہ ہو گیا اور مچھلیاں بازار میں آنے لگیں اور فاسق لوگوں نے شکار کا اعلان کر دیا۔ ایک فرقہ اٹھا، انہوں نے ایسے لوگوں کو منع کیا اور برسر منبر انہیں منع کیا اور ایسا کرنے والوں سے جدا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ منع کرنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ پس انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ شہر کو تقسیم کر دیا۔ ایک دن منع کرنے والے اپنی مجلس میں تھے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی باہر نہ نکلا، انہوں نے کہا: لوگوں کو کچھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہو گیا ہے۔ انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور ان کے پاس گئے۔ پس بندروں کا نسب انسان سے جانا گیا ہے، لیکن انسان کا نسب بندروں سے معروف نہیں۔ وہ بندر اپنے خاندان والوں میں سے کسی انسان کے پاس آتے، اس کے کپڑے سونگھتے اور رونے لگتے۔ وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا وہ سر سے اشارہ کر کے کہتے: ہاں (1)۔ قتادہ نے کہا: نوجوان بندر بن گئے تھے، بوڑھے خنزیر بن گئے تھے صرف منع کرنے والے بچے تھے باقی سب ہلاک ہو گئے تھے (2)۔ ان لوگوں کا قول سورۂ اعراف میں آئے گا جنہوں نے کہا تھا کہ وہ تین گروہوں میں تھے، اور یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ صحیح ہے جنہوں نے کہا: ان کے دو گروہ تھے۔ واللہ اعلم

السَّبْتِ، السبت سے ماخود ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہفتہ کے دن میں اشیاء جدا کی گئی تھیں اور ان کی خلقت مکمل ہوئی تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ السبوت سے مشتق ہے جس کا معنی راحت اور سکون ہے۔ (3)

علماء کا مسخ شدہ امت کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی نسل چلی ہے یا نہیں۔ علماء کے دو قول ہیں: زجاج نے کہا: ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جائز ہے کہ یہ بندر ان لوگوں میں سے ہوں۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: مسخ شدہ امت کی نسل باقی نہیں چلی۔ رہے بندر اور خنازیر وغیرہما اس سے پہلے بھی موجود تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کیا تھا وہ ہلاک ہو گئے تھے اور ان کی نسل باقی نہیں رہی تھی کیونکہ انہیں سخط اور عذاب لاحق ہوا تھا ان کے لئے دنیا میں تین دن کے بعد قرار نہیں تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: کوئی قوم جو مسخ کی گئی تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کھایا، نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی (4)۔ ابن عطیہ نے کہا (5): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور ثابت ہے کہ مسخ شدہ کی نہ نسل چلی، نہ کھایا اور نہ پیا اور نہ تین دن سے زیادہ زندہ رہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول دونوں قولوں میں صحیح ہے اور ابن عربی وغیرہ نے پہلے قول کی صحت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی ایک امت مفقود ہو گئی۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا میں نے نہیں دیکھا مگر وہ چوہیا ہے کیا تم اسے دیکھتے نہیں کہ جب اس کے سامنے اونٹنی کا دودھ رکھا جائے تو یہ اسے نہیں پیتی اور اس کے سامنے بکری کا دودھ رکھا جائے تو پی لیتی ہے (6)۔ یہ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے اور دوسری حجت گوہ والی حدیث ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حضرت جابر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوہ لائی گئی تو آپ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں سے ہو جو مسخ کی گئیں۔ یہ روایات منقول ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔

ابن عربی نے کہا: بخاری میں عمرو بن میمون سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا۔ بندروں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ یہ بخاری کے بعض نسخوں میں ثابت

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 6۔ صحیح بخاری، باب خیر مال المسلم غنم، حدیث نمبر 3360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور بعض میں ساقط ہے۔ حدیث کی نص میں ثابت ہے (اس نے زنا کیا) یہ لفظ بعض سے ساقط ہے۔

ابن عربی نے کہا: اگر کہا جائے کہ چوپائیوں میں شریعت کی پہچان باقی ہے حتیٰ کہ وہ نسل در نسل ان احکام کے وارث بنتے رہے حتیٰ کہ عمرو کے زمانہ تک پہنچے؟ ہم کہیں گے: ہاں، اسی طرح تھا کیوں کہ یہود نے رجم میں تبدیلی کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مسخ شدہ لوگوں میں اس کو قائم رکھا تا کہ ان لوگوں پر حجت میں مبالغہ ہو جائے جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تبدیل کیا تا کہ ان کی کتب اور ان کے علماء اور ان کی مسخ شدہ قومیں ان کے خلاف گواہی دیں تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو چھپاتے ہیں اور جو اعلان کرتے ہیں اور وہ سب شمار کیا جا رہا ہے جو وہ تغیر و تبدل کرتے ہیں ان پر حجت قائم فرمائی جہاں سے اسے قیام کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد فرماتا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جاتی (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کا کلام احکام میں ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ انہوں نے جو عمرو بن میمون کا قصہ ذکر کیا ہے حمیدی نے جمع صحیحین میں ذکر کیا ہے۔ ابو مسعود الدمشقی نے حکایت کیا ہے کہ عمرو بن میمون الاودی کی صحیحین میں حصین کی روایت سے حکایت ہے، عمرو نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر دوسرے بندر جمع ہوئے اور اسے رجم کیا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اسی طرح حضرت ابو مسعود نے حکایت کیا ہے، اس نے ذکر نہیں کیا کہ کسی جگہ بخاری نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے، ہم نے اس کے متعلق کوشش کی تو ہم نے اسے بعض نسخوں میں پایا نہ کہ تمام نسخوں میں۔ امام بخاری نے اسے ''کتاب ایام الجاہلیہ'' میں ذکر کیا ہے اور نعیمی عن الفربری کی روایت میں بندروں کے بارے میں اس خبر کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شاید یہ کتاب البخاری میں مقحمات (گھسیڑی گئی روایات) میں سے ہے اور وہ جو بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں ذکر کیا ہے مجھے نعیم بن حماد نے کہا: ہمیں ہشیم نے ابو بلج سے اور حصین نے عمرو بن میمون سے روایت کر کے بتایا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر بندر جمع تھے انہوں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اس روایت میں قد زنت۔ (اس نے زنا کیا) کے الفاظ نہیں ہیں اگرچہ روایت صحیح ہو تو امام بخاری نے اسے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے روایت کیا کہ عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت پایا ان کے گمان کی کوئی پرواہ نہیں جو انہوں نے زمانہ جاہلیت کے بارے میں کیا۔ ابو عمرو نے ''الاستیعاب'' میں حضرت عمرو بن میمون کا ذکر کیا ہے ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے کوفیوں میں سے بڑے تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بندروں کا رجم دیکھا تھا اگر یہ صحیح ہو کیونکہ اس کے راوی مجہول ہیں۔ بخاری نے نعیم عن ھشیم عن حصین عن عمرو بن میمون الاودی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس نے زنا کیا تھا پھر بندروں نے اسے رجم کیا تھا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا تھا۔ اس کو عباد بن العوام نے حصین سے روایت کیا جس طرح ہشیم نے مختصراً روایت کیا۔ اور رہا یہ قصہ اپنے طول کے ساتھ تو وہ عبدالملک بن مسلم عن عیسیٰ بن حطان پر گھومتا ہے جو دونوں استاد، شاگرد قابل حجت نہیں ہیں۔ یہ اہل علم کی جماعت کے نزدیک منکر ہے کہ زنا کی اضافت غیر مکلف کی طرف کی گئی ہے اور اس میں حدود کو حیوانوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ جنوں میں

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سے ہوں گے دوسرے حیوان نہ ہوں گے۔ رہا حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد میں نے نہیں دیکھا۔ چوہے اور گوہ کے بارے میں فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں میں سے ہو جو مسخ کی گئی تھی اور اس کی مثل دوسری مثالیں۔ یہ ظن اور خوف کی بنا پر فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ گوہ اور چوہے وغیرہما مسخ شدہ سے ہوں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی آنے سے پہلے اپنی طرف سے اظہار فرمایا، جب وحی آگئی تو یہ خوف زائل ہو گیا اور جان لیا کہ گوہ اور چوہے مسخ شدہ قوموں میں سے نہیں ہیں۔ وحی کے آنے کے بعد ہمیں اپنے ارشاد میں بتایا جب آپ سے پوچھا گیا بندروں اور خنازیر کے متعلق کہ کیا یہ مسخ شدہ قوموں میں سے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا یا عذاب نہیں دیا پھر ان کی نسل چلائی ہو۔ بندر اور خنازیر اس سے پہلے موجود تھے۔ یہ نص صحیح صریح ہے اسے حضرت عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور اسے مسلم نے کتاب القدر میں نقل کیا ہے اور نصوص ثابت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور آپ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی اور آپ نے انکار نہیں فرمایا۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری توفیق ہے۔

مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ صرف ان کے دل مسخ کیے گئے اور ان کے افہام، بندروں کے افہام جیسے بنا دیئے گئے (1)، میری معلومات کے مطابق کسی اور مفسر نے یہ نہیں کہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً، قِرَدَةً کان کی خبر ہے۔ خٰسِـِٕیْنَ اس کی صفت ہے، اگر تو چاہے تو اسے کان کی خبر بنا دے یا کونوا میں ضمیر سے حال بنا دے اور خٰسِـِٕیْنَ کا معنی مبعدین دور کیے گئے ہے۔ کہا جاتا ہے: فخسأ و خسئ و انخسأ یعنی میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (الملک: 4) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام ہو کر) اخسئوا فیھا۔ یعنی اس میں دور چلے جاؤ۔ تباعد کا معنی ناراض ہونا ہے۔ کسائی نے کہا: خسأ الرجل خسوٗاً۔ وخساتہ خسأ، اس صورت میں الخاسئ کا معنی گھٹیا اور رسوا ہو گا۔ کہا جاتا ہے: قمؤ الرجل قماءً و قماءۃ صار قمیئاً یعنی ذلیل و خوار ہوا۔ اقمأتہ میں نے اسے رسوا و ذلیل کیا فھو قمیئ، فعیل کے وزن پر ہے۔

**فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۶﴾**

"پس ہم نے بنا دیا اس سزا کو عبرت ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے اور (اسے) نصیحت بنا دیا پرہیزگاروں کے لئے"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا مفعول ثانی کی بنا پر نَكَالًا منصوب ہے اور عبرت بنانے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد سزا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد شہر ہے کیونکہ کلام کا معنی اس کا تقاضا کرتا ہے، بعض نے فرمایا: امت جو مسخ کی گئی، بعض نے فرمایا: مچھلیاں۔ اس قول میں بعد ہے۔ النکال کا معنی زجر اور عقاب ہے۔ النکل والانکال، اس سے مراد بیڑیاں ہیں (2)۔ بیڑیوں کو انکال کہتے ہیں کیونکہ یہ آدمی کو روکتی ہیں۔ بھاری لگام کو نَکل اور نِکل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جانور کو روکتی ہے نَکَل عن الامر یَنْکُلُ و نَکِل یَنْکَل جب کوئی رک جائے۔ التنکیل، دشمن کو ایسی تکلیف پہنچانا کہ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دوسرے لوگوں کو وہ روک دے۔ الازہری نے کہا: النکال سے مراد عقوبت ہے۔ ابن درید نے کہا: المنکل وہ چیز جو انسان کو روک دے۔

فاضرِب علی اقفائھم بمنکل۔ تو ان کو گدیوں پر روکنے والی چیز سے مار۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس سے مراد اس قوم کے پہلے گناہ ہیں۔ وَمَا خَلْفَهَا جو ان کے بعد اس قسم کے گناہ کرے گا۔ فراء نے کہا: مسخۃ کو گزشتہ گناہوں کی وجہ سے عبرت اور سزا بنایا گیا اور جو ان کے بعد عمل کرنے والے ہیں تا کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مسخ سے ڈریں۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ عمدہ قول ہے اور دونوں ضمیریں عقوبت کیلئے ہیں۔ حکم نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جو لوگ موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے (2)۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا: یہ معنی کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا اور مَا خَلْفَهَا سے مراد شہر ہیں (3)۔ قتادہ نے کہا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا سے مراد ان کے گناہ ہیں اور مَا خَلْفَهَا سے مراد مچھلیوں کا شکار ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ اس کا عطف نکال پر ہے اس کا وزن مفعلۃ ہے یہ اتعاظ سے اور انزجار سے ہے۔ الوعظ کا معنی ڈرانا ہے۔ العظۃ اسم ہے۔ خلیل نے کہا: الوعظ سے مراد خیر کی ایسی نصیحت کرنا جس کے لئے دل نرم ہو جائے۔

الماوردی نے کہا: المتقین کو نصیحت کے لئے خاص کیا گیا ہے اگرچہ یہ تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر معاندین سے متقین نصیحت قبول کرنے میں منفرد ہوتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (5): لفظ ہر امت کے ہر متقی کو شامل ہے۔ زجاج نے کہا مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ یعنی امت محمدیہ کے لئے نصیحت ہے تا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے انہیں منع فرمایا ہے وہ ان کے ارتکاب سے بچیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اصحاب السبت جیسا عذاب پہنچے جو انہیں ہفتہ کے دن اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ افعال کے ارتکاب کی وجہ سے پہنچا۔

## وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝۶۷

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً

اس میں چار مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ابوعمرو سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے یا مرْکم راء سے ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابو العباد المبرد نے کہا: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ راحرف اعراب ہے اور ابو عمرو سے صحیح یہ مروی ہے کہ وہ حرکت میں اختلاس کرتے تھے۔ اَنْ تَذْبَحُوْا یہ يَاْمُرُكُمْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یعنی بان تذبحوا۔ بَقَرَةً پر نصب تَذْبَحُوْا کی وجہ سے ہے ذبح کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً یہ تلاوت میں مقدم ہے اور قَتَلْتُمْ نَفْسًا گائے کے متعلق جو کچھ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس پر یہ معنی کے اعتبار سے مقدم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قَتَلْتُمْ نزول میں مقدم ہو اور ذبح کا امر مؤخر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ نزول کی ترتیب تلاوت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گویا انہیں گائے کے ذبح کا حکم دیا حتیٰ کہ انہوں نے اسے ذبح کیا پھر قتل کے امر سے جو واقع ہوا وہ واقع ہوا۔ پس انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کا بعض اس مقتول کو ماریں، پہلے قول کے مطابق معنی کے اعتبار سے وَاِذْ قَتَلْتُمْ مقدم ہوگا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ واو ترتیب کا موجب نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے جو طوفان اور اس کے ختم ہونے کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس قول میں حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ( ہود) پہلے ان لوگوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا جو ہلاک ہوئے پھر اس پر اس ارشاد سے عطف فرمایا: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (ہود: 41) خطاب میں رکوب کا ذکر متاخر کیا اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ان کا سوار ہونا ہلاکت سے پہلے تھا۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ قَيِّمًا (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً و لم یجعل لہ عوجاً۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**: علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بکری کو ذبح کرنا اور اونٹ کو نحر کرنا اولیٰ ہے اور گائے میں اختیار ہے۔ بعض نے فرمایا: ذبح اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذبح کا ذکر فرمایا نیز منحر کے مذبح کے قرب کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: میں کسی عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کا کھانا حرام قرار دیا ہو جس کو ذبح کرنا تھا اس کو نحر کیا گیا یا جس کو نحر کرنا تھا اسے ذبح کیا گیا۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے اور کسی کا کسی شے کو مکروہ قرار دینا اسے حرام قرار دینا نہیں ہے۔ مزید ان شاء اللہ ذبح کے احکام، ذبح کرنے والا اور ان دونوں کی شرائط سورۂ مائدہ میں اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے تحت تفصیل سے آئیں گے۔ ماوردی نے کہا: انہیں صرف گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ان کے معبود بچھڑے کی جنس سے تھے تاکہ جس چیز کی وہ تعظیم کرتے تھے ان کے نزدیک اس کی اہانت کی جائے۔ نیز اس لئے تاکہ وہ جان لے کہ ان کے نفسوں میں اس کی عبادت کی قبولیت کتنی ہے۔ یہ معنی گائے کے ذبح میں علت ہے اور سائل کے جواب میں علت نہیں ہے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ مقتول، زندہ کے قتل کے ساتھ زندہ ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اشیاء کی ایجاد ان کی اضداد کے ساتھ کرنے میں زیادہ ظاہر کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَقَرَةً یہ مؤنث کا اسم ہے، مذکر کے لئے ثور اسم ہے، جیسے اونٹنی کے لئے ناقۃ اور

اونٹ کیلئے جملٌ، عورت کے لئے امرأۃ اور مرد کیلئے رجلٌ، البقرۃ، البقر کا واحد ہے اس میں مذکر، مؤنث برابر ہے، اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: بَقَرَ بطنَہ، اس نے اس کا پیٹ چاک کیا۔ البقرہ (گائے) زمین کو چیرتی اور پھاڑتی ہے اسی سے ابوجعفر محمد بن علی زین العابدین کو الباقر کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے علم کو چیرا اور اس کی اصل کو پہچانا، البقیرۃ وہ کپڑا جو پھاڑا جاتا ہے پھر عورت اسے اپنی گردن میں ڈالتی ہے اس کی آستین نہیں ہوتیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہدہد کی شان میں ہے۔ فبقر الارض (1) اس نے زمین کو پھاڑا۔ شمر نے کہا: بقر کا مطلب ہے: اس نے پانی کی جگہ کو دیکھا اور زمین کے نیچے پانی کو دیکھا۔ الازہری نے کہا۔ البقر جنس کے لئے اسم ہے اس کی جمع باقر ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: کہا جاتا ہے بقیر، باقر، بیقور۔ عکرمہ اور ابن یعمر نے ان الباقر پڑھا ہے۔ الثور، اس کی جمع ثیران ہے۔ الثور، مردوں میں سے سردار کو کہتے ہیں۔ الثور، پنیر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ الثور کائی کو بھی کہتے ہیں۔ ثور ایک پہاڑ کو بھی کہتے ہیں ثور عربوں کا ایک قبیلہ بھی ہے۔ حدیث میں ہے: وقت العشاء مالم یغب ثور الشفق یعنی عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا جب شفق کا پھیلاؤ غائب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ثار یثور ثوراً و ثوراناً جب افق میں پھیل جائے۔ حدیث میں ہے: من اراد العلم فلیثوّر القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے اسے قرآن پڑھنا چاہئے۔ شمر نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے ساتھ علماء سے علم تلاش کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا جواب تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان ایک مقتول پایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام عامیل تھا۔ ان پر قاتل کا معاملہ مشتبہ ہو گیا اور ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ انہوں نے کہا: ہم آپس میں لڑ رہے ہیں جبکہ اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے۔ پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے اس کا بیان پوچھا۔ یہ تورات میں قسامت کے حکم کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سنا جبکہ اس کے ظاہر میں ان کے سوال کا جواب نہیں تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس مقتول کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے۔ کہنے لگے: تو ہمارے ساتھ مزاح کرتا ہے۔ الھزء، کھیلنا، مزاح کرنا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

جحدری نے أیتخذنا پڑھا ہے وہ یہ ایک دوسرے سے کہنے لگے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ جواب دیا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں) کیونکہ سائل کے جواب سے خروج جہالت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ نے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کہا کیونکہ یہ ایسی صفت ہے جو انبیاء کرام میں نہیں پائی جاتی (2)۔ جہالت، علم کی نقیض ہے۔ اس وجہ سے جہالت سے پناہ مانگی جس طرح انہوں نے جہالت کا مظاہرہ کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ انہوں نے اسے کہا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے رہا تھا۔ اس قول کا ظاہر ایسا کہنے والے کے اعتقاد کے فساد

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر دلالت کرتا ہے اس شخص کا ایمان صحیح نہیں ہوتا جو ایسے نبی سے ایسی بات کرے جس کے معجزات ظاہر ہو چکے تھے ...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا حکم دیتا ہے، کیا تو ہم سے مزاح کرتا ہے ...... اگر کوئی اس وقت نبی کریم ﷺ کے کسی ارشاد کے متعلق یہ کہے تو اس کی تکفیر واجب ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ ان سے طبعی قساوت، جفا اور معصیت کی بنا پر تھا جیسا کہ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کسی نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا (1)۔ اسی طرح ایک اور نے کہا تھا: اعدل یا محمد ﷺ، اے محمد! ﷺ عدل کرو (2)۔ یہ تمام جہالت کے قبیح ہونے پر واضح دلیل ہے اور جہالت مفسد دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ھُزُوًا یہ دوسرا مفعول ہے، ہمزہ کی تخفیف جائز ہے تو اسے واؤ اور ہمزہ کے درمیان کر دے۔ حفص نے واو کو مفتوحہ بنایا ہے کیونکہ یہ ہمزہ مفتوحہ ہے جس سے پہلے ضمہ ہے یہ بدل کے طور پر جاری ہے جیسے السفھاء ولکن ہے۔ زاء سے ضمہ کا حذف کرنا جائز ہے جس طرح عضد سے حذف کیا جاتا ہے تو کہتا ہے: ھُزْوًا جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے۔ اسی طرح وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝ (اخلاص) ہے۔

اخفش نے عیسیٰ بن عمر سے حکایت کیا ہے کہ ہر وہ اسم جس کے تین حرف ہوں پہلا حرف مضموم ہو تو اس میں دو لغتیں ہوتی ہیں، تخفیف اور تثقیل۔ جیسے عسر، یسر، ہزء۔ اس کی مثل وہ تمام جمع کے الفاظ ہیں جو فُعلٌ کے وزن پر ہوتے ہیں جیسے کُتُبٌ، و کُتْبٌ، رُسُلٌ و رُسْلٌ، عُوُنٌ و عُوْنٌ۔

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (زخرف: 15) یہ ہزء اور کفء کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ اصل میں فعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ اپنی جگہ پر اس کا ذکر آئے گا۔

**مسئلہ:** اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے اور مسلمانوں کے دین سے اور ایسے شخص سے جس کی تعظیم واجب ہے اس سے استہزاء کرنا منع ہے اور یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا وعید کا مستحق ہے۔ مزاح، استہزاء میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ مزاح فرمایا کرتے تھے اور آپ کے بعد ائمہ بھی مزاح فرمایا کرتے تھے۔ ابن خویز منداد نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی کہ ایک شخص عبید اللہ بن الحسن کی طرف گیا۔ اس وقت عبید اللہ، کوفہ کے قاضی تھے۔ عبید اللہ نے اس شخص سے مزاح کیا۔ عبید اللہ نے کہا: تیرا یہ جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا مینڈھے کی اون کا ہے؟ وہ شخص کہنے لگا: اے قاضی! جہالت کا مظاہرہ نہ کر۔ عبید اللہ نے کہا: تو نے مزاح کو کہاں جہالت پایا ہے؟ پھر یہ آیت اسے سنائی، عبید اللہ نے اس سے اعراض کر لیا کیونکہ اس نے اسے جاہل دیکھا کیونکہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق نہیں جانتا تھا حالانکہ ہر ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث 3153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

''بولے دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے وہ گائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو۔ تو بجالاؤ جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یہ بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اطاعت کی کمی کا اظہار ہے۔ اگر وہ حکم کی پیروی کرتے اور کوئی گائے ذبح کر دیتے تو مقصود حاصل ہو جاتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ حضرت ابن عباس اور ابو العالیہ وغیرہما کا یہ قول ہے(1)۔ اسی طرح حضرت حسن بصری نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔

بنی عامر کی لغت ادع ہے(2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یُبَیِّنْ، جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مَا هِیَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ ماھیۃ الشی، شے کی حقیقت اور اس کی ذات جس پر وہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ اس میں فعل کے وقت سے پہلے نسخ کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ جب گائے کا حکم دیا تو وہ کوئی گائے تھی جب صفت میں زیادتی کی تو یہ پہلے حکم کو دوسرے سے منسوخ کرنا ہے جس طرح اگر کہا تیس اونٹوں میں ایک بنت مخاض پھر اسے نسخ فرمایا بنت لبون یا حقہ سے۔ اسی طرح یہاں جب صفت کو متعین کر دیا تو یہ پہلے حکم کے لئے نسخ ہو گیا۔

الفارض، المسنة، فرضت، تفرض فروضاً۔ یعنی بڑی ہو گئی پرانی چیز کو فارض کہا جاتا ہے۔ راجز نے کہا:

شیب اصداغی فرأسی ابیض    محامل فیها رجال فرّض

میری کان پٹیاں سفید ہو گئیں اور میرا سر سفید ہے، اس میں بوڑھے لوگ محامل کی طرح بھاری ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لعمرك قد اعطیت جارك فارضاً    تساق الیه ما تقوم علی رجل

تیری عمر کی قسم! تو نے اپنے پڑوسی کو بوڑھی گائے دی اس کو تو وہ جانور دیا جاتا ہے جو اپنے قدموں پر چلتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا رب ذی ضغن علی فارض    له قروء کقروء الحائض (3)

ہائے! مجھ پر قدیم کینہ رکھنے والا، اس کے لئے حیض ہیں جیسے حیض والی عورت کے لئے حیض ہوتے ہیں۔

لَّا فَارِضٌ، بقرہ کی صفت کی وجہ سے مرفوع ہے۔ وَّلَا بِكْرٌ معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: لَّا فَارِضٌ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی لا ھی فارض۔ اسی طرح لا ذلول ہے اور اسی طرح لا تسقی الحرث کا حکم ہے اسی طرح مسلمة کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَارِضٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس نے بہت سے بچے جنم دیئے ہوں اور اس کا پیٹ پھول گیا ہو۔ الفارض کا

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لغوی معنی واسع (کھلا) ہے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ البکر غیر حاملہ چھوٹی گائے کو کہتے ہیں۔ قتبی نے کہا: جو بچہ جنم دے چکی ہو۔ البکر پہلے بچہ کو بھی کہتے ہیں۔

یا بکر بکرین و یا خلب الکبد　　اصبحت منی کذراع من عضد

اے دو نوجوانوں کی پہلی اولاد! اے جگر کی جھلی! تو میرے نزدیک اس طرح ہے جیسے بازو سے ہاتھ کا تعلق ہے۔

البکر جانوروں اور بنی آدم کی مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو ابھی نر سے جفتی نہ کیا ہو یا با کے کسرہ کے ساتھ ہے با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اونٹ کا جوان بچہ مراد ہوتا ہے۔

العوان، نصف ایسی مادہ جو ایک یا دو بچے جنم دے چکی ہو یہ گاؤں میں سے جو طاقتور اور خوبصورت ہوتی ہے بخلاف گھوڑوں کے، شاعر گھوڑے کی صفت بیان کرتا ہے:

کمیت بھیم اللون لیس بفارض　　ولا بعوان ذات لون مخصف

سیاہ رنگ والا ہے، نہ بوڑھا ہے اور نہ چھوٹا ہے، کئی رنگوں والا چتکبرا ہے۔

فرس اخصف، چتکبرا گھوڑا۔ مجاہد نے کہا: گائیوں میں سے العوان اسے کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے بچے جنم دے چکی ہو، یہ اہل لغت نے بیان کیا ہے (1)۔ کہا جاتا ہے: ان العوان النحلة الطویلة۔ لمبی کھجور کو عوان کہتے ہیں یہ ان کے گمان کے مطابق یمنی لغت ہے۔ حرب عوان، جب اس سے پہلے ایک جنگ ہو چکی ہو۔ زہیر نے کہا:

اذا لقحت حربٌ عوان مضرةٌ　　ضروس تھر الناس انیابھا عُصل

جب جنگ تیز ہو اور نقصان دینے والی ہو۔ داڑھوں والی ہو تو لوگ اس کے ٹیڑھے دانتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

یعنی وہ گائے نہ چھوٹی ہو نہ بوڑھی ہو یعنی وہ درمیانی عمر کی ہو۔ عوان کی جمع عُوْن عین کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ عُوُن واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی اس کی جمع سنی گئی ہے جیسے رُسُل یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے حکایت کیا ہے، العوان سے عونت تعویناً ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ** یہ امر کی تجدید اور تاکید کے لئے ہے اور ہٹ دھرمی ترک کرنے پر تنبیہ ہے۔ پس انہوں نے اس کو نہ چھوڑا (2)۔ یہ دلیل ہے کہ امر وجوب کے لئے آتا ہے جس طرح کہ فقہاء کہتے ہیں یہ صحیح ہے جو اصول الفقہ میں مذکور ہے اور امر (حکم) فوری طور پر لازم ہوتا ہے۔ یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اس کی صحت پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے یہ کوتاہی سمجھی جب انہوں نے حکم کو بجا لانے میں جلدی نہ کی۔ فرمایا: **فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ** ۝ (البقرہ) بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ امر کا وجوب علی التراخی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاخیر اور خطاب میں رجوع پر سختی نہیں فرمائی۔ ابن خویز منداد نے یہ کہا ہے۔

**قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ**

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

''کہنے لگے: دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا، مَا استفہام مبتدا ہے لَوْنُهَا خبر ہے۔ لَوْنُهَا کو یبین کے ساتھ نصب دینا بھی جائز ہے اور اس صورت میں مَا زائدہ ہوگا۔ لون کی جمع الالوان ہے یہ ایک ہیئت ہے جیسے کالا، سفید، سرخ۔ اللون کا معنی نوع بھی ہے۔ فلان متلون، رنگین مزاج شخص جو ایک عادت پر اور ایک حال پر نہ رہتا ہو۔

شاعر نے کہا:

کل یوم تتلون غیر هذا بك اجمل

ہر روز تو بدلتا رہتا ہے مگر پھر بھی یہ عمل تجھ سے خوبصورت لگتا ہے۔

لون البسر تلویناً جب کھجور میں پکنے کے اثر کا آغاز ہو۔ اللون، کھجور کی ایک قسم ہے۔

اخفش نے کہا: یہ جمع ہے اور اس کا واحد لینۃٌ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صَفْرَآءُ۔ جمہور مفسرین نے کہا کہ زرد رنگ کی ہو۔ یہ الصفرۃ المعروفہ سے ہے یعنی زرد رنگ جو معروف ہے۔ مکی نے بعض سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ اس کے سینگ اور کھر بھی زرد ہوں۔ حسن اور ابن جبیر نے کہا: صرف اس کے سینگ اور کھر زرد ہوں (1)، حسن نے کہا صَفْرَآءُ کا معنی سیاہ ہے (2)۔ شاعر نے کہا:

تلك خیلی منة و تلك رکابی هن صفر اولادها کالزبیب

یہ میرے گھوڑے اور میری سواریاں اس کی طرف سے ہیں۔ یہ سیاہ ہیں ان کی اولاد کشمش کی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ ظاہر ہے اور یہ قول شاذ ہے۔ یہ مجازاً اونٹوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (3)۔ اگر یہاں سیاہ رنگ مراد ہوتا تو اس کی تاکید الفقوع کے ساتھ نہ ہوتی کیونکہ فقوع کی صفت کے ساتھ مختص ہے۔ سیاہ رنگ کی صفت اس کے ساتھ نہیں لگائی جا سکتی۔ عرب کہتے ہیں: اسود حالك حَلكوك و حُلكوك، و دجوجی و غربیب۔ یہ سب کالے رنگ کی صفات ہیں اور سرخ رنگ کی صفت قانٍ۔ کہا جاتا ہے: احمر قانٍ۔ سفید رنگ کے لئے ابیض ناصع، لهق، لهاق و یقق کہا جاتا ہے اور سبز رنگ کے لئے اخضر ناضرٌ اور زرد رنگ کے لئے اصفر فاقعٌ کہا جاتا ہے۔ فقع لونها یفقع فقوعاً جب خالص زرد رنگ ہو۔ الافقاع بری حالت کو کہتے ہیں۔ فواقع الدهر، زمانے کی مصیبتیں، و فقع باصابعه، جب انگلیوں سے آواز نکالے۔ اسی سے حضرت ابن عباس کی حدیث ہے: نهی عن التفقیع فی الصلاۃ (4)۔ نماز میں چٹخارے نکالنے سے منع فرمایا۔ الفرقعۃ انگلیوں کو موڑنا حتیٰ کہ آواز نکلے۔ صَفْرَآءُ معرفہ اور نکرہ ہر حالت میں غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ فی الصلاۃ، حدیث 954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الف تانیث ہے جو لازم ہے اور یہ ھا کے مخالف ہے کیونکہ جس اسم کے آخر میں ھا ہوتی ہے وہ نکرہ ہونے کی صورت میں منصرف ہو جاتا ہے جیسے فاطمہ، عائشہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا خالص رنگ مراد ہے اس کی جلد کی رنگت کے علاوہ اس میں کوئی رنگ نہ ہو۔ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ وہب نے کہا: گویا سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے نکل رہی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا: زرد رنگ نفس کو خوش کرتا ہے۔ انہوں نے زرد جوتا پہننے پر برانگیختہ کیا۔ یہ نقاش نے ان سے حکایت کیا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو زرد چمڑے کا جوتا پہنے گا اس کا غم کم ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔ یہ ثعلبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن الزبیر، محمد بن ابی کثیر نے سیاہ جوتا پہننے سے منع فرمایا کیونکہ یہ پریشان کرتا ہے۔ تَسُرُّ کا معنی اچھا لگنا خوش کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: اس کا معنی ہے اسے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ گائے دو وصفوں والی تھی۔ (1)

## قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝

"کہنے لگے: پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہو گئی ہے ہم پر اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا انہوں نے چوتھا سوال کیا اور بیان کے بعد بھی حکم کی پیروی نہیں کی۔ یہاں الْبَقَرَ مذکر ذکر کیا کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا۔ الْبَقَرَ کے لفظ کی تذکیر کی وجہ سے فعل کا صیغہ بھی مذکر ذکر فرمایا۔ قطرب نے کہا: البقرۃ کی جمع باقر، باقور اور بقر ہ۔ اصمعی نے کہا: الباقر، جمع ہے باقرۃ کی۔ اور کہا: باقورۃ بھی بقر کی جمع بنائی جاتی ہے۔ یہ نحاس نے حکایت کیا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی بقر کی جنس ہے۔ حسن نے اس کے مطابق پڑھا جو نحاس نے ذکر کیا ہے (2) اور اعرج نے اس کے مطابق جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَهَ (تاء اور شین کی شد کے ساتھ) انہوں نے تشابہ کو فعل مضارع اور مؤنث بنایا ہے اصل میں تتشابہ تھا۔ پھر تا کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مجاہد نے تَشَّبَّهُ جیسا کہ ان دونوں کی قراءت ہے مگر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں تشابہت (شین کی تشدید کے ساتھ) ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے اس باب میں تا ادغام نہیں ہوتی مگر مضارع میں۔ یحییٰ بن یعمر نے ان الباقر یشابہ پڑھا ہے (3)۔ انہوں نے اسے فعل مستقبل بنایا ہے بقر کو مذکر تصور کیا اور ادغام کیا۔ ان البقر تشابہ، شین کی تخفیف اور ھا کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ ثعلبی نے حسن سے حکایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یشابہ شین اور یا کی تخفیف کے ساتھ جائز نہیں ہے یہ تا میں جائز ہے کیونکہ اصل تتشابہ تھا دو تا کے اجتماع کی وجہ سے ایک کو حذف کر دیا۔ البقر، الباقر، البیقور، البقیر یہ تمام لغتیں ہیں اور سب کا معنی ایک ہے عرب اس کو مذکر اور مؤنث دونوں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

طرح استعمال کرتے ہیں۔ تشابہ میں مختلف قراءت کے معانی اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَہَ عَلَیْنَا انہوں نے اس لئے کہا کیونکہ گائیوں کے رنگ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس سے حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتنے رات کے ٹکڑوں کی طرح اس طرح آئیں گے جیسے گائیوں کے چہرے۔ یعنی بعض، بعض کے مشابہ ہوں گے اور گائیوں کے چہرے متشابہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے کہا: گائے ہم پر متشابہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ یہ ان کی طرف سے استثنا ہے۔ اس آخری میں استثنا کے ذکر کرنے میں ان کی طرف سے قبولیت اور پیروی ہے اور امر کی موافقت نہ کرنے پر شرمندگی کی دلیل ہے(1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی گائے کا پتا نہ پاتے (2)۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: انا لمھتدون ان شاء اللہ۔ اھتداء کو ذکر میں اس کے اہتمام کی وجہ سے مقدم فرمایا۔ شَآءَ شرط کی جگہ میں ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس کا جواب اِنَّ اور جس میں وہ عمل کر رہا ہے۔ اور ابو العباس المبرد کے نزدیک جزا محذوف ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

''موسیٰ علیہ السلام بولے: اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو، بے عیب بے داغ۔ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ۔ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ جمہور علماء نے لَّا ذَلُوْلٌ کو بَقَرَةٌ کی صفت کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: لَّا ذَلُوْلٌ، بَقَرَةٌ کی صفت ہے اور اس پر نصب بھی جائز ہے۔ ابو عبدالرحمن السلمی نے لا ذلول کو نفی کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور خبر مضمر ہے اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: لا ھی ذلولٌ لا ھی تسقی الحرث و ھی مسلمۃ۔ لا ذلولَ کا مطلب ہے: اسے کام نے مطیع نہ بنایا ہو۔ کہا جاتا ہے: بقرۃ مذللۃ بینۃ الذِل، انتہائی مطیع گائے۔ رجل ذلیل بین الذل (3)، انتہائی مطیع شخص، یعنی وہ گائے سخت ہو اس کو کام پر نہ لگایا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُثِيْرُ الْاَرْضَ یہ بھی بقرہ کی صفت کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی ھی بقرۃ لا ذلول مثیرۃ(4)۔ حسن نے کہا: وہ گائے وحشی تھی (5)۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ وصف بیان فرمایا لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی کھیتی کو پانی پلانے کے لئے اس کو عادی نہ بنایا گیا ہو اور نہ اس پر پانی لایا جاتا ہو۔ اس پر وقف بہتر ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً　5۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: تُثِیْرُ علیحدہ فعل ہے۔ اس کا معنی ہے: زمین چیرتی ہو اور اس سے کھیتی کو پانی نہ لگایا جاتا ہو (1)۔ اس تاویل پر لَا ذَلُوْلٌ پر وقف ہوگا پہلا قول دو وجوہ سے اصح ہے۔ ایک وجہ تو وہ ہے جو نحاس نے حضرت علی بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ تُثِیْرُ کو علیحدہ کلام بنانا جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد لَا تَسْقِی الْحَرْثَ آ رہا ہے اگر یہ مستانفہ جملہ ہوتا تو واؤ اور لا کے ساتھ جمع نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ زمین جوتتی ہوتو پھر وہ کام کی وجہ سے مطیع ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَّا ذَلُوْلٌ، وہ کام پر لگانے کی وجہ سے مطیع نہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ تُثِیْرُ الْاَرْضَ عمل شمار نہ ہوتا ہو اس کے خوش ہونے اور نشاط کی وجہ سے جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا:

یھیل و یذری تربۃ و یثیرہ  اثارۃ نباث الھواجر مخمس

وہ مٹی کو پھاڑتا ہے جس طرح گرمی میں پانچ اونٹوں والا آدمی مٹی کو چیرتا ہے تاکہ گیلی مٹی تک پہنچ جائے۔

اس صورت میں تُثِیْرُ مستانفہ ہوگا۔ وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ اس پر معطوف ہوگا۔ اثارۃ الارض، مٹی کو حرکت دینا، اسے کریدنا۔ اسی سے حدیث پاک ہے: اثیروا القرآن فانہ علم الاولین والاخرین، قرآن کو کھولو (پڑھو) کیونکہ یہ پہلے اور پچھلے لوگوں کا علم ہے۔

ایک روایت میں ہے: من اراد العلم فلیثور القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ قرآن کی تلاوت کرے۔ پہلے یہ گزر چکی ہے۔ قرآن میں ہے: آثاروا الارض یعنی انہوں نے کھیتی باڑی کے لئے زمین کو الٹ پلٹ لیا، الحرث وہ زمین جس میں کھیتی باڑی کی جائے۔

**مسئلہ:** اس آیت میں دلیل ہے کہ حیوان کو اس کی صفات سے مقید کیا جاسکتا ہے جب اس کی صفت بیان کردی جائے اور وہ صفات سے مقید کردیا جائے تو اس میں بیع سلم جائز ہے۔ یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے اور امام اوزاعی، لیث اور امام شافعی کا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کی صفت بیان ہوسکتی ہے اس کی بیع سلم جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں گائے کا وصف بیان فرمایا جو تعیین کے قائم مقام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت دوسری عورت کا اپنے خاوند کے سامنے اس طرح حلیہ بیان نہ کرے حتیٰ کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے صفت کو دیکھنے کے قائم مقام رکھا ہے اور آپ ﷺ نے قتل خطا کی دیت کو اس کے ذمہ کیا ہے جس نے دیت کو ایک مدت تک بطور قرض، اپنے اوپر لیا ہے اور فوراً ادا کرنا ضروری قرار نہیں دیا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب لاتباشر المرأۃ المرأۃ فتنعتھا لزوجھا، حدیث 4839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ کوفی علماء، امام ابوحنیفہ (ا) اور ان کے اصحاب، ثوری اور حسن بن صالح کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں: حیوان کی بیع سلم جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے، حیوان کی صفت کی حقیقت پر آگاہی نہیں ہوسکتی جیسے اس کا چلنا اور حرکت کرنا کیونکہ صفات کے اعتبار سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیع سلم کا حکم اور اس کی شرائط اس سورت کے آخر میں آیت الدین کے ضمن میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُسَلَّمَةٌ یعنی ھی مسلمۃ۔ اس کا وصف ہونا بھی جائز ہے یعنی وہ گائے لنگڑے پن اور تمام عیوب سے سلامت ہو۔ یہ قتادہ اور ابوالعالیہ کا قول ہے (1)۔ مسلمۃ من العمل، عمل سے سلامت نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمل سے نفی فرمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس کے پاؤں سلامت ہوں ان میں کام کا کوئی اثر نہ ہو۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا شِيَةَ فِيهَا اس میں ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے کثیر رنگ کے مخالف ہو۔ یہ گائے ساری زرد ہو نہ اس میں سفیدی ہو نہ سرخی ہو اور نہ سیاہی ہو۔ جیسا کہ فرمایا: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا۔ شِيَةَ اصل میں وشی تھا واو کو حذف کیا گیا جیسا کہ یشی سے حذف کیا گیا اصل میں یوشی تھا۔ اس کی مثال زنۃ، عدۃ اور صلۃ ہیں۔

الشیۃ، وشی الثوب سے مشتق ہے جب کپڑا اور رنگوں پر بنا گیا ہو۔ ثورٌ موشی جس بیل کے منہ میں اور بائیوں میں سیاہی ہو۔ ابن عرفہ نے کہا: الشیۃ سے مراد رنگ ہے، چغلخور کو واش نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ وہ کلام کو تبدیل کر دے اور اس میں مزید اپنی طرف سے رنگ بھر دے اور اسے مختلف اقسام پر کر دے اور اس میں سے جو چاہے مزین کر دے۔ الوشی، کا معنی کثرت بھی ہے۔ وشی بنو فلان اس کا مطلب ہے۔ وہ زیادہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فرس ابلق، کبش أخرج، تیسٌ ابرق، غراب ابقع اور ثورٌ اشیہ، ان میں ہر ایک کا معنی چتکبرا ہے، یہ اہل لغت کی نص ہے۔ (3)

گائے میں یہ اوصاف ذکر کرنا اس لئے تھا کہ انہوں نے سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی اللہ کا دین آسان ہے۔ انبیاء کرام اور علماء وغیرہ سے بغیر ضرورت سوال کرنا مذموم ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ اس گائے کے قصص میں بہت سی روایات مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ اس کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی ایک بچھڑی تھی اس نے اسے ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور کہا: اے اللہ! میں یہ بچھڑی تیری بارگاہ میں ودیعت کرتا ہوں اس بچے کے لئے۔ وہ شخص فوت ہو گیا، جب وہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے اسے کہا: وہ ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، تیرے باپ نے تیرے لئے ایک بچھڑی اللہ کی بارگاہ میں ودیعت کی تھی، تم جاؤ اور وہ لے آؤ۔ وہ لڑکا گیا۔ جب گائے نے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آ گئی حتیٰ کہ اس نے اس کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ وہ گائے وحشی بنی ہوئی تھی، اس نے اسے اپنی ماں کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بنی اسرائیل اسے راستہ میں ملے تو انہوں نے اس گائے کو اس صفت پر پایا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سودا کیا تو اس نے ان سے بہت زیادہ قیمت مانگی۔ عکرمہ کی روایت کے مطابق اس کی قیمت تین دینار تھی۔ وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: یہ شخص ہم سے بہت زیادہ قیمت مانگتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً (ا) احناف کے نزدیک بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے

کہا: اس کی ملکیت کے بارے میں اسے راضی کرو۔ پس انہوں نے وہ گائے اس سے اس کے وزن کے مطابق خریدی۔ یہ عبیدہ کا قول ہے۔ سدی نے کہا: دس مرتبہ وزن کے ساتھ خریدی۔ بعض نے کہا: اس کی کھال دنانیر سے بھر کر دینے کے بدلے میں خریدی۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ یہ گائے آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ زمین کی گائیوں میں سے نہیں تھی۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ یعنی تو نے حق کو بیان کیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے (2)۔ اخفش نے کہا: قَالُوا الْـٰٔنَ الف وصلی کو قطعی بنایا جیسے کہا جاتا ہے: یا اللہ۔ ایک اور وجہ حکایت کی ہے: قالوا لآن۔ واو کے اثبات کے ساتھ اس کی مثال اہل مدینہ اور ابو عمرو کی قراءت ہے عاداً لُولیٰ کوفیوں نے قالوا الآن ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ کی قراءت قال لان ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ اور التقائے ساکنین کی وجہ سے واو کے حذف کے ساتھ۔ زجاج نے کہا الآن مبنی برفتحہ ہے یہ باقی تمام کلمات کے مخالف ہے جن میں الف، لام ہوتا ہے کیونکہ الف اور لام غیر عہد کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: انت الی الآن ھنا اس کا معنی ہے: تو اس وقت تک یہاں ہے پس اس کو مبنی بنایا گیا ہے جس طرح ھذا کو مبنی بنایا گیا ہے اور نون کو التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ حال سے عبارت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ سیبویہ نے کادان یفعل کو عسیٰ کی مشابہت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ یہ بحث سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ یہ خبر ہے کہ انہوں نے گائے کے ذبح میں تاخیر کی اور اللہ تعالیٰ کے امر کو جلدی پورا نہ کیا۔ قرظی محمد بن کعب نے کہا: اس کی وجہ قیمت کا مہنگا ہونا تھا۔ بعض نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خوف تھا کہ قاتل کا پتہ چل جائے گا، یہ حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے۔ (3)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ؀

''اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ یہ کلام قصہ کی ابتدا پر مقدم ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: واذ قتلتم نفساً فادارأتم فیھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح کا حکم دیتا ہے، یہ اس ارشاد کی طرح ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً ولم یجعل لہ عوجا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں جو ہم نے قصہ کے آغاز میں بیان کر دی ہیں۔

اس شخص کے قتل کے سبب کے متعلق دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی۔ اس نے پسند کیا کہ اس کے چچا کا بیٹا اس سے نکاح کرے لیکن چچا نے اسے منع کیا۔ پس اس نے اسے قتل کر دیا اور پھر اپنے شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر میں پھینک دیا۔ بعض نے فرمایا: دونوں شہروں کے درمیان پھینک دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس نے میراث طلب کرنے کی خاطر اسے قتل کیا۔ وہ فقیر تھا اس نے کسی خاندان پر اس کے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: بنی اسرائیل کی ایک

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسجد تھی اس کے بارہ دروازہ تھے۔ ہر دروازہ ایک قوم کے لئے تھا۔ وہ اس سے داخل ہوتے تھے۔ پس انہوں نے ایک خاندان میں ایک مقتول پایا، ہر قوم نے دوسری قوم پر دعویٰ کیا پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (البقرہ: 67)

ادارأتم کا معنی ہے: تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا۔ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ تدارأتم اس کی اصل ہے تا کو دال میں ادغام کیا گیا، مدغم کے ساتھ ابتدا کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ ساکن ہوتا ہے اس لئے الف زیادہ کیا گیا...... وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَّا كُنْتُمْ یہ مُخْرِجٌ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اضافت کی وجہ سے تنوین کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَكْتُمُوْنَ یہ کان کی خبر کی جگہ ہے اس میں عائد محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: تکتمونہٗ۔

اس قول کی بنا پر کہ اس نے میراث کی خاطر قتل کیا تھا تو اس وقت جان بوجھ کر قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا تھا۔ یہ عبیدہ سلمانی نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس شخص نے اپنے چچا کو میراث کی خاطر قتل کیا تھا(3)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہماری شریعت میں بھی اسی طرح ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے کہ احیحہ بن الجلاح کا واقعہ اس کے چچا کے بارے میں یہی قاتل کے وارث نہ ہونے کا سبب بنا تھا۔ پھر اسلام میں یہ قانون ثابت رہا جس طرح بہت سی چیزیں زمانہ جاہلیت کی ثابت رہیں (4)۔ اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا دیت اور میراث کا وارث نہ ہوگا مگر ایک فرقہ جمہور سے جدا ہوا وہ سب بدعتی ہیں۔ اور خطا قتل کرنے والا دوسری میراث سے وارث ہوگا، دیت سے وارث نہ ہوگا۔ یہ امام مالک، اوزاعی، ابوثور اور امام شافعی کا قول ہے کیونکہ ایسے شخص پر تہمت نہیں ہوتی کہ اس کو میراث کے لئے قتل کیا ہے اور مال لینے کے لئے قتل کیا ہے۔ سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: امام شافعی کا بھی دوسرا قول یہی ہے عمداً اور خطا قتل کرنے والا نہ مال سے وارث ہوگا نہ دیت سے وارث ہوگا۔ یہی قول شریح، طاؤس، شعبی اور نخعی کا ہے۔

شعبی نے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا اور خطاً قتل کرنے والا کسی چیز کا وارث نہ ہوگا۔ مجاہد سے دونوں قول مروی ہیں۔ بصریوں کے ایک طائفہ نے کہا: قتل خطا میں دیت اور باقی مال دونوں سے وارث ہوگا۔ یہ ابوعمر نے حکایت کیا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے جیسا کہ آیۃ المواریث میں اس کا بیان آئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿73﴾

''تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے۔ (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو۔ اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا بعض علماء نے فرمایا: بعض سے مراد زبان ہے کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے۔ بعض نے کہا: ریڑھ کی ہڈی، کیونکہ اس سے انسان کی تخلیق مرکب کی جاتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ران ہے، بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً، زیر آیت ہذا 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کوئی ہڈی ہے، کوئی کاٹا ہوا عضو ہے، جب اسے گائے کا کوئی ٹکڑا لگایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق خبر دی پھر مردہ ہو گیا جس طرح پہلے تھا۔

**مسئلہ:** امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قسامت کے قول کی صحت پر مقتول کے قول کا (میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے) ابن وہب اور ابن قاسم کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی اور جمہور علماء نے مقتول کے قول سے استدلال سے منع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہی صحیح ہے کیونکہ مقتول کا قول میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے یہ ایک خبر ہے جو صدق وکذب کا احتمال رکھتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مدعیٰ علیہ کا خون معصوم ہے اور اس کو مباح کرنا ممنوع ہے مگر یقین کے ساتھ اور احتمال کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہو سکتا۔ پس مقتول کے قول کا اعتبار باطل ہے۔ رہا بنی اسرائیل کا مقتول تو وہ معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے زندہ کرنے کی خبر دی تھی۔ وہ اپنے قاتل کے متعلق پختہ سچی خبر دینے کا متضمن ہے اس میں کوئی احتمال نہیں ہے۔ پس یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اس شخص کے زندہ کرنے میں معجزہ تھا۔ جب وہ زندہ ہو گیا تو اس کا کلام قبول ورد میں دوسرے لوگوں کے کلام کی طرح ہو گیا۔ یہ ایک دقیق علم کا فن ہے جس کو صرف امام مالک ہی سمجھ سکتے ہیں، قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جب وہ خبر دے گا تو اس کا صدق واجب ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہیں اس کے ساتھ قسامت کا بھی حکم دیا ہو۔ امام بخاری، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو بعید سمجھا ہے۔ انہوں نے کہا: خون کے بارے اس کا قول کیسے معتبر ہو گا حالانکہ اس کا قول ایک درہم کے بارے بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ:** قسامت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ سالم، ابو قلابہ، عمر بن عبد العزیز اور حکم بن عیینہ سے اس کے حکم کے بارے میں توقف مروی ہے۔ امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قسامت کی حدیث اپنی جگہ پر ذکر نہیں کی۔ جمہور علماء نے کہا: قسامت کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے پھر اس کے حکم کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

ایک طائفہ نے کہا: پہلے دعویٰ کرنے والے قسمیں اٹھائیں گے۔ جب وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ مستحق ہو جائیں گے اگر وہ انکار کریں گے تو مدعیٰ علیہم پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور بری ہو جائیں گے۔ یہ اہل مدینہ، لیث، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس کی دلیل حویصہ اور محیصہ والی حدیث ہے۔ اس کو امام مالک وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ مدعیٰ علیہم سے پہلے قسم لی جائے گی۔ پس وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ بری ہو جائیں گے۔ حضرت عمر بن خطاب، شعبی اور نخعی سے یہی مروی ہے، ثوری اور کوفیوں نے بھی کہا ہے اور ان علماء نے شعبہ بن عبید عن بشیر بن یسار کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے مدعیٰ علیہم پہلے قسمیں اٹھائیں اور وہ یہود تھے۔ اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے ابو داؤد نے عن الزہری عن ابی سلمہ بن عبد الرحمن عن رجال من الانصار کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: اور پہلے ان سے آغاز کیا، کیا تم میں سے پچاس آدمی قسمیں اٹھائیں گے؟ انہوں نے انکار کیا۔ آپ نے پھر انصار سے فرمایا: (تم قسمیں اٹھا کر) اپنا حق طلب کرو۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم غیب پر (کیسے) قسمیں اٹھائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت یہود پر لازم فرمائی کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا تھا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ ''قسم مدعیٰ علیہ پر ہے (1)''۔ پس مدعیٰ علیہ متعین کیے گئے۔ ان علماء نے فرمایا: یہ قطعی اصل ہے دعویٰ میں جس کی حکمت پر شرع نے تنبیہ فرمائی ہے ''اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے متعلق دیا جاتا تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور مالوں کا دعویٰ کرتے لیکن قسم مدعیٰ علیہ پر ہے۔''

پہلے مقالہ والوں نے ان کا جواب اس طرح دیا ہے کہ سعید بن عبید کی حدیث یہود کے آغاز کرانے میں اہل حدیث کے نزدیک وہم ہے۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے فرمایا: اس روایت میں سعید کا متابع کوئی نہیں اور حضرت بشیر عن سہیل کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعین سے آغاز فرمایا۔ حضرات یحییٰ بن سعید، ابن عیینہ، حماد بن زید، عبدالوہاب الثقفی، عیسیٰ بن حماد اور بشیر بن المفضل یہ سات افراد ہیں انہوں نے اس حدیث کو مسند ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل ذکر کیا لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اسے متصل ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث سعید بن عبید کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ ابو محمد الاصیلی نے کہا: خبر واحد کے ساتھ ایک جماعت کی خبر پر معارضہ کرنا جائز نہیں اس کے ساتھ ساتھ سعید بن عبید نے اپنی حدیث میں کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے اونٹوں سے سو اونٹ اس کی دیت دی اور صدقہ دیت میں نہیں دیا جاتا اور صدقہ کے ذریعے غیر اہل سے صلح نہیں کی جاتی۔ ابوداؤد کی حدیث مرسل ہے اس کے ساتھ احادیث صحیحہ متصلہ کا معارضہ نہیں کیا جاسکتا اور اصل میں تمسک کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم خونوں کی حرمت کے لئے بنفسہ اصل ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بینہ (دلیل) کو مدعی اور قسم کو مدعیٰ علیہ پر جاری فرمایا اور اس کے ظاہر کے ساتھ حکم لگانا واجب ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے نبی کی زبان پر کسی چیز کے بارے میں حکم کو خاص کر دے تو اس خبر سے اس کی استثناء کی جائے گی۔ ان چیزوں میں کتاب اللہ جس پر دلالت کرتی ہے مقذوف کی حد، قاذف کو لازم کرنا جب اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں جو قاذف کی صداقت کی گواہی دیں۔ اس بارے میں جو اس نے مقذوف پر تہمت لگائی۔ اسی طرح جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو اسے اس سے حد کو ساقط کرنے کے ساتھ خاص فرمایا جب کہ وہ چار مرتبہ شہادت دے، اور ان دلائل میں سے جس کو سنت نے خاص کیا ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قسامت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ ابن جریج نے عطاء عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے پر گواہ پیش کرنا ہے اور قسم منکر پر ہے مگر قسامت میں (ایسا نہیں) اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے اس مسئلہ کے لئے مؤطا میں جس دلیل سے حجت پکڑی ہے اس میں کفایت ہے، وہاں غور کرو۔

**مسئلہ**: قسامت کے ساتھ قصاص کے وجوب میں بھی اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے اس کے ساتھ قصاص واجب کیا ہے۔ یہ امام مالک، لیث، احمد اور ابوثور کا قول ہے۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حویصہ محیصہ اور عبدالرحمٰن کو فرمایا کیا تم قسم اٹھاؤ گے اور تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے (2)۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اختلف الراھن والمرتھن فالبینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ، حدیث 2331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الموادعۃ والمصالحۃ مع المشرکین بالمال وغیرہ واثم من لم یف بالعھد، حدیث 2937، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نصر بن مالک کے ایک شخص کو قسامت کی وجہ سے قتل کیا۔ دارقطنی نے کہا: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ صحیح ہے۔ اسی طرح ابو عمر بن عبد البر نے عمرو بن شعیب کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: میں نے علی بن مدینی، احمد بن حنبل، حمیدی، اسحاق بن راہویہ کو دیکھا وہ اس حدیث سے حجت پکڑتے تھے۔ دارقطنی نے ''السنن'' میں یہی کہا۔ ایک جماعت نے کہا: قسامت کے ساتھ قصاص نہیں ہے اس سے دیت واجب ہوتی ہے۔ یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہی نخعی اور حسن کا قول ہے۔ یہی نظریہ ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور اسحاق کا ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو امام مالک سے ابن ابی لیلیٰ بن عبد اللہ عن سہل بن ابی حثمہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تم اپنے ساتھی کی دیت دے دو یا اعلان جنگ کرو۔ ان علماء نے فرمایا: یہ دیت پر دلیل ہے نہ کہ قصاص پر اور یہ علماء فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حویصہ وغیرہ کو یہ کہنا کہ تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے مقتول کے خون کی دیت کے مستحق ہو جاؤ گے کیونکہ یہود ان کے اصحاب نہیں تھے اور جو اپنے ساتھی کی دیت کا مستحق ہوگا وہی اس کے خون کا مستحق ہوگا کیونکہ کبھی دیت قتل عمد میں لی جاتی ہے۔ پس یہ خون کا استحقاق ہوگا۔

**مسئلہ**: قسامت کا موجب جب اللوث ہے اس کا ہونا ضروری ہے اور اللوث سے مراد ایسی علامت ہے جو قتل کے مدعی کی سچائی کو ظن پر غالب کر دے۔ مثلاً ایک عادل آدمی کا قتل کے دیکھنے پر گواہی دینا یا مقتول اپنے خون میں لت پت دیکھا گیا اور جس پر تہمت لگائی ہے وہ اسی طرف ہے یا اس کے قریب ہے اس پر قتل کے آثار ہیں۔ اللوث، اس کے متعلق قول میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ مقتول کا قول ہے کہ میرا خون فلاں کے پاس ہے۔

ایک عادل گواہ لوث ہے۔ اسی طرح ابن القاسم کی روایت مالک سے ہے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ ایک غیر عادل شاہد اور ایک عورت کے ساتھ قسم لی جائے گی۔ ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ عورتوں کی گواہی لوث ہے۔ محمد نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی لوث ہے نہ کہ ایک عورت کی گواہی۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اللوث میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ مذہب مشہور یہ ہے کہ وہ عادل شاہد ہے۔ محمد نے کہا: یہی میرے نزدیک محبوب ہے۔ فرمایا: ابن القاسم اور ابن عبد الحکم نے اسی کو اختیار کیا۔ عبد الملک بن مروان سے مروی ہے کہ مجروح اور مضروب جب کہے کہ میرا خون فلاں پر ہے اور پھر وہ مر جائے تو قسامت ہے۔ امام مالک اور لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک نے بنی اسرائیل کے مقتول سے حجت پکڑی ہے۔ اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا۔ امام شافعی نے فرمایا: اللوث ایک گواہ ہے یا تو وہ دلیل لائے اگرچہ وہ عادل نہ بھی ہوں۔

ثوری اور کوفیوں نے صرف مقتول کے پائے جانے کے ساتھ قسامت کو ثابت کیا ہے اور انہوں نے مقتول کے قول کی رعایت اور ایک گواہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں: جب مقتول ایک قوم کے محلہ میں پایا گیا اور اس پر قتل کا اثر بھی ہے تو

اس جگہ کے لوگ حلف اٹھائیں گے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور دیت ان (اہل محلہ) پر ہوگی اور جب اس پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا تو عاقلہ پر کچھ نہ ہوگا مگر یہ کہ کسی ایک کے خلاف بینہ (دلیل) قائم ہو جائے۔ سفیان نے کہا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ یہ ضعیف قول ہے۔ انہوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے۔ اس میں ان سے پہلے کوئی ایسا قول کرنے والا نہیں ہے۔ یہ قول قرآن وسنت کے مخالف ہے کیونکہ اس میں عاقلہ پر بغیر دلیل اور بغیر اقرار کے مال کو لازم کرنا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ ہے کہ مقتول جب کسی قوم کے محلہ میں پایا جائے تو وہ رائیگاں ہے کسی قریبی گھر والے کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ کبھی مقتول قتل کیا جاتا ہے پھر اسے کسی دوسرے قوم کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہ ملوث ہو جائیں۔ پس ایسی صورت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا حتیٰ کہ وہ اسباب جو قسامت کے وجوب میں علماء نے مقرر کیے ہیں وہ پائے جائیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا: اس میں فیصلہ کو مؤخر کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس میں فیصلہ فرمائے گا۔

**مسئلہ:** قاسم بن مسعدہ نے کہا: میں نے نسائی سے کہا امام مالک قسامت کا قول نہیں کرتے مگر لوث کے ساتھ، پھر انہوں نے قسامت کی حدیث کیوں ذکر کی ہے۔ اس میں لوث کا ذکر تو نہیں ہے۔ نسائی نے کہا: مالک نے انصار اور یہود کے درمیان جو عداوت تھی اسے لوث کے قائم مقام رکھا ہے اور لوث اور میت کے قول کو عداوت کے قائم مقام رکھا ہے۔ ابن ابی زید نے کہا: اس کی اصل بنی اسرائیل کے قصہ میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندہ فرمایا جس کو گائے کا کوئی حصہ لگایا گیا تھا اور اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا ہے اور عداوت بھی لوث (علامت) ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ہم مقتول کے قول کو لوث نہیں سمجھتے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب دو قوموں میں عداوت ظاہر ہو جیسا کہ انصار اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور مقتول کسی ایک فریق میں پایا گیا ہو اور ان کے درمیان اور کوئی قوم نہ ہو تو قسامت اس میں واجب ہوگی۔

**مسئلہ:** اس مقتول کے بارے میں اختلاف ہے جو اس محلہ میں پایا گیا جس کے باشندے کرائے دار ہیں۔ اصحاب الرائے نے کہا: قسامت مالکوں پر ہوگی، رہائشی لوگوں پر کچھ نہ ہوگا، اگر وہ مالکان اپنے مکانات بیچ دیں پھر کوئی مقتول پایا گیا تو دیت مشتری پر ہوگی رہنے والوں پر کچھ نہ ہوگا۔ اگر گھروں کے مالکان غائب ہوں اور انہوں نے اپنے گھر کرائے پر دے دیئے ہوں تو قسامت اور دیت غائب مالکان پر ہوگی، رہائشیوں پر کچھ نہ ہوگا جن کے درمیان وہ مقتول پایا گیا۔ پھر یعقوب نے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اس نے کہا: قسامت اور دیت گھروں میں رہنے والوں پر ہوگی۔ اس قول کو ابن ابی لیلیٰ سے حکایت کیا ہے اور انہوں نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہ اہل خیبر عمال تھے اور رہائشی تھے (مالکان نہیں تھے) وہ کام کرتے تھے۔ پس مقتول ان میں پایا گیا۔ ثوری نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ اصل مالکوں پر ہوگا۔ امام احمد نے کہا: ابن ابی لیلیٰ کا قول قسامت میں ہے نہ کہ دیت میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ سب برابر ہیں، نہ دیت ہے نہ قصاص ہے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو قائم ہو جائے یا کوئی ایسی بات پائی جائے جو قسامت کو ثابت کرے تو اولیاء قسم دیں گے۔ ابن منذر نے کہا: یہ قول اصح ہے۔

**مسئلہ:** قسامت میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے کیونکہ حویصہ اور محیصہ کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے ان میں سے کسی ایک پر۔" اگر مستحق پچاس ہوں تو ان میں سے ہر ایک ایک قسم اٹھائے گا۔ اگر ان کی تعداد پچاس سے کم ہو یا ان میں سے کوئی ایسا شخص قسم اٹھانے سے انکار کرے جس کا معاف کرنا جائز نہیں تو ان کی تعداد کے مطابق ان پر قسمیں لوٹائی جائیں گی اور قتل عمد میں دو مردوں سے کم قسم نہیں اٹھائیں گے۔ مردوں میں سے ایک اور عورتیں قسم نہیں اٹھائیں گی، اولیاء قسم اٹھائیں گے اور وہ قسم اٹھائیں گے جن سے اولیاء مدد طلب کرتے ہوں گے عصبہ میں سے اور یہ پچاس قسمیں اٹھائیں گے۔

یہ امام مالک، امام لیث، امام ثوری، امام اوزاعی، امام احمد اور داؤد کا مذہب ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے ساتھ کوئی قسم نہیں اٹھائے گا اور وہی خود قسمیں اٹھائیں گے جیسا کہ اگر وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں تو پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور اپنے آپ کو قسموں کے ذریعے بری کریں گے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم نہیں اٹھائے گا مگر وارث خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطا ہو۔ مال پر قسم نہیں اٹھوائی جائے گی اور اس کا مستحق نہ ہوگا مگر جس کے لئے بذات خود مالک ہو یا ورثاء میں سے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملک بنائی ہو اور ورثاء اپنی اپنی میراث کے مطابق قسمیں اٹھائیں گے۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا اور یہی صحیح ہے کیونکہ جس پر دعویٰ نہیں کیا گیا اس کے لئے کوئی سبب نہیں ہے کہ اس کی طرف اس میں قسم متوجہ ہو (یعنی اس سے قسم لی جائے)۔ قسم سے مقصود دعویٰ سے برأت ہے اور جس پر دعویٰ ہی نہیں کیا گیا وہ بری ہے۔ امام مالک نے قتل خطا میں فرمایا: اس میں مردوں میں سے اور عورتوں میں سے ایک قسم لی جائے گی۔ جب پچاس قسمیں ایک سے یا زیادہ سے مکمل ہو جائیں گی تو قسم اٹھانے والا میراث کا مستحق ہوگا اور جو قسم سے انکار کرے گا وہ کسی چیز کا مستحق نہ ہوگا۔ اگر وہ آ جائے جو غائب تھا اور قسم اٹھا دے جو اس پر واجب تھی تو وہ میراث کا مستحق ہو گا۔ یہ امام مالک کا مشہور قول ہے اور امام مالک سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قتل خطا میں قسامت نہیں دیکھتے تھے۔

قسامت کے مسائل، اس کی فروع اور احکام اور اختلاف کتب فقہ میں موجود ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

**مسئلہ:** اس گائے کے قصہ میں دلیل ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے۔ متکلمین اور فقہاء کی ایک قوم نے اسے اختیار کیا ہے۔ کرخی نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن بکیر قاضی جو ہمارے علماء سے ہیں انہوں نے اس پر نص قائم کی ہے۔ قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا: یہ وہ ہے جس کا تقاضا مالک کے اصول کرتے ہیں اور ان کا اختلاف ان کی کتب میں موجود ہے۔ امام شافعی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ** (انعام: 90) (ان کی ہدایت کی اقتدا کرو)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى** یعنی جس طرح اس نے اس شخص کو مرنے کے بعد زندہ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مرنے والے کو زندہ کرے گا، اس میں کاف محل نصب میں ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ **وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ** یعنی اپنی علامات اور اپنی قدرت **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** تا کہ تم سمجھ جاؤ۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی تم اس کی نافرمانی سے

رک جاؤ۔ عقلت نفسی عن کذا یعنی میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے روکا۔ المعاقل، قلعے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور کوئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ، القسوہ کا معنی صلابت، شدت اور خشکی ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی آیات کا یقین اور ان کی طرف لوٹنے سے محروم ہونا ہے(1)۔ ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہ نے کہا: اس سے مراد تمام بنی اسرائیل کے دل ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مقتول کے ورثاء کے دل مراد ہیں کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی اور پھر فوت ہو گیا تو انہوں نے اس کے قتل کا انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اس کے بعد کہ وہ اتنی بڑی نشانی دیکھ چکے تھے، پہلے کبھی ان کے دل اتنے اندھے نہ تھے اور کبھی اپنے نبی کی سخت تکذیب نہیں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے قتل کے بارے میں نافذ ہو گیا(2)۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کلام زیادہ نہ کرو کیونکہ کلام کی کثرت، اللہ کے ذکر کے بغیر دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے زیادہ دور سخت دل ہے۔ مسند البزار میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں شقاوت (بدبختی) سے ہیں: آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی آنسو نہ آنا) دل کی سختی، لمبی امید اور دنیا کا لالچ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً بعض علماء نے فرمایا: اَوْ بمعنی واو ہے جس طرح فرمایا اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (الدہر) عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ (المرسلات) ان دونوں آیتوں میں او بمعنی واو ہے۔ شاعر نے کہا:

نال الخلافة او كانت له قدراً

اس مصرعہ میں او بمعنی واو ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: او بمعنی بل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ (الصافات) اس کا معنی بل یزیدون ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

بدت مثل قرن الشمس في رونق الضحى　و صورتها او انت في العين املح

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

اس شعر میں او بمعنی بل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی مخاطب پر ابہام کرنا ہے۔ اسی سے ابوالاسود الدؤلی کا قول ہے:

احب محمداً حبا شدیداً و عباساً و حمزۃ او علیاً

فان یك حبهم رشداً اصبه ولست بمخطئی ان کان غیاً (1)

میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عباس، حمزہ اور علی سے شدید محبت کرتا ہوں، اگر ان کی محبت رشد و ہدایت ہے تو میں اسے پالوں گا اور میں خطا کرنے والا نہیں ہوں اگر وہ بہت دور بھی ہوگی۔

ابوالاسود کو کوئی شک نہیں کہ ان نفوس قدسیہ کی محبت رشد و ہدایت ہے اس نے صرف ابہام کا قصد کیا ہے۔ ابوالاسود نے جب یہ شعر کہے تو اس سے پوچھا گیا: تجھے شک ہے؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استشہاد کیا وَ اِنَّاۤ اَوْ اِیَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝ (سبا) ہم یا تم (دونوں میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا کھلی گمراہی میں ہے) ابوالاسود نے کہا: جس نے یہ خبر دی ہے (2) کیا اسے شک تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی تخییر ہے یعنی تم ان کو پتھروں کے ساتھ تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے یا پتھروں سے سخت چیز سے تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے۔ یہ اس طرح کا کلام ہے: جالس الحسن او ابن سیرین، تعلم الفقۃ او الحدیث او النحو (حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ۔ فقہ حاصل کر، یا حدیث، یا نحو)

بعض علماء نے فرمایا: او شک کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: اے مخاطبین! تمہاری نظر میں اگر تم ان کی قسوت کو دیکھتے تو تم شک میں مبتلا ہو جاتے کہ کیا یہ پتھروں کی مانند ہیں یا پتھروں سے سخت ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا بھی یہی معنی ہے: اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ۝ (الصافات) ایک گروہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مراد لیا ہے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کے دل پتھر کی مانند ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو گروہ ہیں (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَشَدُّ، اَشَدُّ، كَالْحِجَارَةِ میں کاف کی جگہ پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ پتھر کی مثل ہیں یا اس سے زیادہ سخت اور حجارۃ پر عطف کی وجہ سے اشدّ پر فتحہ جائز ہے اور قسوۃً، تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو حیوہ نے قساوۃ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ، الانفجار کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یَشَّقَّقُ اصل میں یتشقق ہے تاء کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ ان چشموں سے عبارت ہے جو اتنے بڑے نہ ہوں کہ وہ نہریں بن جائیں۔ یا پتھروں سے عبارت ہے جو پھٹ جاتے ہیں اگرچہ ان میں وسیع پانی جاری نہ ہو۔ ابن مصرف نے ینشقق (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں جگہ لما یتفجر اور لما یتشقق میں لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قراءت قابل توجہ نہیں ہے۔ مالک بن دینار نے ینفجر نون اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے کہا: پتھر نے عذر پیش کیا اور بنی آدم میں سے شقی لوگوں نے عذر پیش نہ کیا (1)۔ ابوحاتم نے کہا: لما یتفجر تاء کے ساتھ بھی جائز ہے اور لما تتشقق تاء کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ جب کہا: تتفجر تو الانہار کی تانیث کی وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا لیکن تشقق میں ایسی صورت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جو ابوحاتم نے انکار کیا ہے معنی کے اعتبار سے وہ جائز ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: وان منها لحجارة تتشقق۔ اور یشقق کو لفظ ما کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ الشق کی جمع الشقوق ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے۔ تو کہتا ہے: بید فلان و رجلیه شقوق۔ فلاں کے ہاتھوں اور پاؤں میں دراڑیں ہیں۔ تو شقاق نہ کہہ کیونکہ الشقاق ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لاحق ہوتی ہے وہ پھٹن ہے۔ یہ جانوروں کی کلائیوں کو لاحق ہوتی ہے اور کبھی ان کی پنڈلیوں اور ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یعقوب سے مروی ہے، الشق سے مراد الصبح بھی ہے اور لما یتفجر میں ما محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اِنّ کا اسم ہے اور لام تاکید کے لئے ہے۔ منہ لفظ ما کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے منہا بھی جائز ہے۔ اسی طرح وان منها لما یشقق فیخرج منه الماء ہے۔ قتادہ نے اِنْ کو دونوں جگہ مخففه من مثقله پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یعنی پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جو تمہارے دلوں سے زیادہ نفع مند ہیں کیونکہ ان سے پانی نکلتا ہے وہ خشیت سے گر پڑتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: جو پتھر پہاڑ کی چوٹی سے گرتا ہے، جو نہر پتھر سے پھوٹتی ہے اور اس سے جو پانی نکلتا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی کے متعلق قرآن نازل ہوا۔ اسی کی مثل ابن جریج سے مروی ہے (2)۔ بعض متکلمین نے وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کے تحت فرمایا: کہ اس سے مراد وہ اولے ہیں جو بادل سے گرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: هبوط (گرنا) یہ مجاز ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ پتھروں کی تخلیق سے دل عبرت حاصل کرتے ہیں ان کی طرف دیکھ کر دلوں میں تواضع پیدا ہوتی ہے۔ تو دیکھنے والے کی تواضع کو ان پتھروں کی طرف مضاف کیا گیا۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ناقة تاجرة۔ یعنی ایسی اونٹنی جو بیچی جاتی ہے جو اسے دیکھے گا خریدنے کے لئے (3)۔ طبری نے ایک گروہ سے حکایت کیا ہے کہ پتھروں کے لئے خشیت یہ استعارہ ہے جیسے یرید ان ینقض میں دیوار کے لئے استعارہ ہے۔ اسی طرح زید الخیل نے کہا:

لما اتی خبر الزبیر تواضعت سور المدینة والجبال الخشع

جب حضرت زبیر کی خبر پہنچی تو مدینہ کی دیواریں اور پہاڑ جھک گئے۔

ابن بحر نے ذکر کیا ہے کہ اِنَّ مِنْهَا میں ضمیر دلوں کی طرف راجع ہے نہ کہ پتھروں کی طرف یعنی دلوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو خشیت الٰہی کی وجہ سے جھک جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ تاویلات کی گئی ہیں لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے، پہلا قول صحیح ہے یہ کوئی ممتنع نہیں ہے کہ بعض جمادات کو معرفت عطا کی جائے اور وہ سمجھ جائیں۔ جیسے اس کھجور کے خشک تنے کی روایت ہے جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ خطبہ

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دینے کے لئے ٹیک لگاتے تھے۔جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے دور ہٹ گئے تو وہ رونے لگ گیا (1)۔ اور یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک پتھر جو مجھ پر زمانہ جاہلیت میں سلام کرتا تھا میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (☆)۔ اسی طرح روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثبیر پہاڑ نے مجھے کہا: اتر جائیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو میری پشت پر قتل کر دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے گا (☆☆)۔ غار حرا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا دی تھی یا رسول اللہ! میری طرف تشریف لے آئیں۔ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (احزاب:72) (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے) اور فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (الحشر:21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) اس کا مزید بیان سورۂ سبحان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اہل حجاز کی لغت پر بغافل محل نصب میں ہے اور تمیم کی لغت پر محل رفع میں ہے اور با تاکید کے لئے ہے عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی تمہارے عمل سے وہ غافل نہیں ہے ہر چھوٹا بڑا جو بھی سرزد ہوتا ہے اسے وہ تم پر شمار کرے گا۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝ (الزلزلۃ) (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا) اس میں ما، عائد کا محتاج نہیں مگر یہ کہ اسے الذی کے معنی میں کیا جائے۔ اسم کے طول کی وجہ سے عائد کو حذف کیا گیا ہے یعنی من الذی تعملونہ۔ ابن کثیر نے یعملون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوگا۔ (2)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝

"(اے مسلمانو!) کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ یہ استفہام ہے اس میں انکار کا معنی ہے۔ گویا مومنوں کو یہود کے اس ٹولہ کے ایمان سے مایوس کرنا ہے یعنی اگر انہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لئے اس میں پہلے مثال موجود ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انصار یہود کے اسلام قبول کرنے کے حریص تھے کیونکہ ان کے درمیان حلف اور معاہدہ تھا (3)۔ بعض نے فرمایا: خطاب صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، یعنی آپ پریشان نہ ہوں اس پر کہ وہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو بتا دیا کہ یہ ان برے

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3318، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً مسند امام احمد، حدیث نمبر 5886

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً ☆ تفسیر بغوی زیر آیت ہذہ ☆☆ ثبیر مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑ ہے۔

لوگوں میں سے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ ان محل نصب میں ہے یعنی فی ان یومنوا۔ یومنوا انْ کے ساتھ منصوب ہے۔ اسی وجہ سے نون کو اس سے حذف کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے: طمع فیہ طَمَعاً و طماعیۃ (مخفف) فھو طَمِعٌ، بروزن فعِلٌ۔ اطعمہ فیہ غیرہ، تعجب میں کہا جاتا ہے: طمُع الرجل میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ زیادہ لالچ والا ہوگیا۔ الطمع لشکر کی خوراک کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرھم الامیر باطماعھم یعنی امیر نے لشکر کے رزق کا حکم دیا امرأۃ مطماع ایسی عورت جو لالچ کرتی ہے لیکن غلبہ نہیں پاتی۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ۔ الفرق اسم جمع ہے لفظاً اس کا واحد نہیں ہے اور اس کی جمع قلت افرقۃٌ اور جمع کثرت افرقاء ہے۔ يَسْمَعُوْنَ، کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر مِّنْهُمْ ہو اور يَسْمَعُوْنَ فریق کی صفت ہو۔ اس میں بُعد ہے۔

كَلٰمَ اللّٰهِ۔ یہ جماعت کی قراءت ہے۔ اعمش نے كَلِمَ اللہ پڑھا ہے یعنی کلمہ کی جمع (1)۔ سیبویہ نے کہا: میں جانتا ہوں کہ ربیعہ کے کچھ لوگ منھم کو میم کے کسرہ کی اتباع میں ھاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک درمیان میں ساکن اس اتباع سے روکنے والا نہیں۔

كَلٰمَ اللّٰهِ، يَسْمَعُوْنَ کا مفعول ہے اور اس سے مراد ستر افراد ہیں جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چنا تھا۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی نہ کی۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی باتوں کو بدل ڈالا۔ یہ ربیع اور ابن اسحاق کا قول ہے اور اس قول میں ضعف ہے (2)۔ اور جنہوں نے کہا کہ ستر آدمیوں نے وہ سنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا۔ اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اور کلام کرنے کے ساتھ ان کی خصوصیت کو ختم کر دیا ہے (3)۔ سدی وغیرہ نے کہا: وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ان کے اذہان مختلط ہو گئے۔ انہوں نے امید رکھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام سنیں گے اور وہ ان کے لئے لوٹائیں گے۔ جب وہ فارغ ہوئے اور باہر نکلے تو ایک گروہ نے اللہ کے کلام کو بدل ڈالا جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (توبہ: 6) (اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام)

اگر یہ کہا جائے کہ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ انہیں اپنا کلام سنائے۔ پس انہوں نے برق کی آواز کی طرح آواز سنی انی انا اللہ لا الہ الا اللہ الحی القیوم اخرجتکم من مصر بید رفیعۃ و ذراع شدیدۃ، میں اللہ ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو حی، قیوم ہے میں نے تمہیں مصر سے نکالا بلند ہاتھوں اور سخت بازوؤں کے ساتھ۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن مروان نے کلبی سے روایت کی ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں قابل

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

حجت نہیں ہے۔ تمام اولاد آدم سے کلام کے ساتھ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص کیا گیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کلام کی ہے اور انہیں بھی اپنا کلام سنایا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان پر فضیلت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا فرمانا حق ہے۔ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ (اعراف:144) یہ زیادہ واضح قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کیسے پہچانا جبکہ انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا خطاب نہیں سنا تھا بعض علماء نے فرمایا آپ نے کلام سنا جس میں حروف اور آوازیں نہ تھیں اور نہ اس میں تقطیع تھی نہ نفس۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کلام سنا جو کسی جہت سے نہیں تھا، اور انسان کا کلام تو چھ جہتوں میں سے کسی جہت سے سنا جاتا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ کا پورا جسم قوت سماعت بن گیا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ آپ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: معجزہ نے دلالت کی کہ جو انہوں نے سنا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا: اپنا عصا ڈالو تو انہوں نے عصا ڈال دیا وہ بہت بڑا سانپ بن گیا تو یہ صدق حال پر ان کے لئے علامت تھا۔ اور وہ جس نے انہیں کہا انی انا ربك وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے اپنے دل میں کوئی بات چھپائی ہوئی تھی جس پر صرف علام الغیوب ہی واقف ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب میں اس پوشیدہ بات کی خبر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے جو اس سے مخاطب ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مزید بیان سورہ القصص میں نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص:30) کے تحت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مجاہد اور سدی نے کہا: اس سے مراد یہود کے علماء ہیں جو تورات میں تحریف کرتے تھے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتے تھے اپنی خواہشات کے مطابق (1)۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی پہچاننے اور جاننے کے بعد۔ یہ ان کو توبیخ ہے یعنی یہ یہود، ان کے آباء و اجداد برائی اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے گزر گئے یہ ان کے طریقوں پر ہیں پھر تم کیسے ان کے ایمان کی طمع کرتے ہو۔

یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ حق جاننے والا معاند، ہدایت سے دور ہوتا ہے کیونکہ وہ وعدہ اور وعید کو جان چکا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے یہ علم اپنے عناد سے نہیں روکتا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر، یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ لَقُوا کی اصل لَقِیُوا ہے پہلے یہ گزر چکا ہے۔ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ یہ آیت یہود کے بارے میں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر منافقت کی تھی وہ مومنین کو بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے آباء واجداد کو عذاب دیا گیا تھا۔ یہود نے انہیں کہا: اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ یعنی تم پر اللہ تعالیٰ نے جو عذاب کا فیصلہ فرمایا تاکہ وہ کہیں کہ ہم تم سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر کی جنگ کے موقع پر قریظہ کے پاس گئے تو آپ نے سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بک رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ انہیں تبلیغ نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا: میں گمان کرتا ہوں تو نے ان سے میری گستاخی سنی ہے، اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے تو رک جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے پاس گئے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے بندروں اور خنازیر کی اولاد! تم نے عہد توڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔ انہوں نے کہا: آپ جاہل نہیں تھے اور ہم پر جہالت کا اظہار نہ کریں۔ یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ یہ خبر ہماری طرف سے نکلی ہے یہ معنی مجاہد سے بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَا، خَلَا اصل میں خَلَوَ تھا واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے واو الف سے بدل گئی۔ خلاء کا معنی سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ فتح کا معنی حکم (فیصلہ کرنا) اور عربوں کے ہاں الفتح کا لفظ القضاء اور الحکم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ۝ (اعراف) اس آیت میں فاتحین کا معنی حاکمین (فیصلہ کرنے والے) ہے۔ میرے اور تیرے درمیان قاضی ہے۔ قاضی کو فتاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتا ہے۔ الفتح کا معنی مدد کرنا ہی ہے۔ اسی سے ہے: یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (البقرہ: 89) وہ کافروں کے خلاف مدد طلب کرتے تھے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ (انفال: 19) چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیُحَآجُّوْكُمْ لامِ کَیْ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر تو چاہے تو اَنْ کے اضمار کے ساتھ نصب دے نصب کی علامت نون کا حذف ہے۔ یونس نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ لامِ کَیْ کو فتحہ دیتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کیونکہ فتحہ اصل

---

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہے۔ خلف الاحمر نے کہا: یہ بنی العنبر کی لغت ہے۔ لیحاجوکم کا معنی لیعیروکم ہے (وہ تمہیں عار دلائیں گے) وہ کہیں گے ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ معزز ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تم پر تمہارے قول سے حجت پکڑیں گے وہ کہیں گے تم نے اس کا انکار کیا اس کی سچائی پر واقفیت کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا: یہود کا ایک شخص اپنے مسلمان دوست کو یہ تلقین کرتا تھا کہ تم دین محمد ﷺ کو مضبوطی سے پکڑے رکھو کیونکہ وہ سچا نبی ہے: عِنْدَ رَبِّكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یعنی آخرت میں۔ جیسا کہ فرمایا: ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۝ (الزمر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عند ذکر ربکم، بعض نے فرمایا: عند بمعنی فی ہے یعنی وہ تم سے تمہارے رب کے بارے میں جھگڑیں گے۔ پس وہ تم سے زیادہ حقدار ہو جائیں گے تم پر اپنی حجت کے ظہور کی وجہ سے۔ حسن سے مروی ہے، الحجۃ مطلق سیدھی کلام کو کہتے ہیں۔ اسی سے محجۃ الطریق ہے (یعنی راستہ کا درمیان) حاججت فلانا فحججتہ۔ میں نے فلاں سے جھگڑا کیا اور حجت کے ساتھ میں اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے حدیث میں ہے: فحج آدم موسیٰ (1)۔ حضرت آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ غالب آ گئے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: یہ احبار (علماء) کا اپنے پیروکاروں کو کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ یعنی تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بنی اسرائیل ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وہ ان احوال میں ہیں (2) پھر انہیں توبیخ فرمائی۔ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ استفہام، توبیخ و تقریع کے معنی میں ہے۔ جمہور علماء نے يَعْلَمُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے، ابن محیصن نے تا کے ساتھ پڑھا ہے مومنین کو خطاب ہے وہ جو انہوں نے اپنا کفر چھپا رکھا تھا اور وہ جو انہوں نے اعلانیہ انکار کیا تھا۔ (3)

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۝

''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے اور وہ تو محض وہم و گمان ہی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ یعنی یہود میں سے۔ بعض نے فرمایا: یہود اور منافقین میں سے جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ امیوں کا واحد امی ہے۔ یہ الامۃ الامیۃ کی منسوب ہے یعنی جوامت اپنی ماؤں کی ولادت کی اصل پر ہوتے ہوئے لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب (4)۔ ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں نہ حساب لگاتے ہیں۔ انہیں امیون کہا گیا کیونکہ انہوں نے ام الکتاب کی تصدیق نہیں کی یہ حضرت ابن

---

1۔ صحیح بخاری، باب واصطفعتک لنفسی، حدیث نمبر 4367، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً　　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام لانکتب ولا، حدیث 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے مروی ہے(1)۔ حضرت ابوعبیدہ نے کہا: انہیں امیون کہا گیا کیونکہ کتاب کا نزول ان پر ہوا تھا گویا وہ ام الکتاب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ گویا فرمایا: ومنهم اهل الكتاب لا يعلمون الكتاب۔ ان میں سے اہل کتاب جو کتاب کونہیں جانتے۔ عکرمہ اور ضحاک نے کہا یہ عرب کے نصاریٰ ہیں بعض نے فرمایا: یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ ان کی کتاب ان کے گناہوں کی وجہ سے اٹھالی گئی پس وہ امیین بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مجوسی ہیں۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اظہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ یہاں اِلَّآ بمعنی لکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی)۔ نابغہ نے کہا:

حلفت يميناً غير ذی مثنوية ولا علم الا حسن ظن بصاحب

میں نے قسم اٹھائی جس میں استثناء نہیں اور علم نہیں تھا مگر ساتھی پر حسن ظن کی۔

ابوجعفر، شیبہ اور اعرج نے اِلَّا امانِ یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ایک یاء کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا۔ ابوحاتم نے کہا: ہر لفظ جو اس طرح ہو کہ ایک مشدد ہو تو اس میں تشدید و تخفیف جائز ہے جیسے اثانی، اغانی، امانی وغیرہ۔ اخفش نے کہا: یہ اس طرح ہے جیسے مفتاح کی جمع میں کہا جاتا ہے: مفاتیح، و مفاتح۔ یہ جمع کی یاء ہے۔ نحاس نے کہا: معتل میں حذف اکثر ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وهل يرجع التسليم او يكشف العمى ثلاث الاثاني والرسوم البلاقع

کیا تین چیزیں تسلیم کو لوٹاتی ہیں یا اندھے پن کو کھولتی ہیں، چولہے کے پتھر، بقیہ بنیادیں جو کھنڈر بن چکی ہیں۔

الامانی، یہ امنیة کی جمع ہے اس کا معنی تلاوت ہے اصل میں امنوية، افعولة کے وزن پر تھا واو کو یا میں ادغام کیا گیا یا کی وجہ سے نون کو کسرہ دیا گیا ہے تو امنية بن گیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج: 52) یعنی جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان ڈالتا ہے۔ کعب بن مالک نے کہا تھا:

تمنى كتاب الله اول ليلة واخره لاقى حمام المقادر

اس نے رات کے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ میں تلاوت کی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تمنى كتاب الله اخر ليلة تمنى داؤد الزبور على رسل

اس نے رات کے آخری حصہ میں کتاب اللہ کی تلاوت کی جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور کی تلاوت آہستہ آہستہ کی۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الامانی کا معنی جھوٹ بھی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ما تمنیت منذ اسلمت (1)، جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ کسی عربی نے ابن دأب کو کہا تھا جب وہ بیان کر رہا تھا: أھذا شئ رَویتہٗ ام شیء تمنیتہٗ۔ کیا یہ وہ چیز ہے جو تم نے کسی سے روایت کی ہے یا تو نے خود گھڑی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے الامانی کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے (2)۔ الامانی ہر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کی انسان تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ قتادہ نے کہا: الا امانی یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر ایسی تمنا کرتے ہیں جو ان کے لئے نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: الامانی کا معنی التقدیر ہے کہا جاتا ہے: مُنِیَ لہ یعنی اس کے لئے مقدر کیا گیا۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ ابن بحر نے یہ حکایت کیا ہے۔ شاعر کا قول بیان کیا ہے:

لا تامنن وان امسیت فی حرم　　حتی تلاق ما یمنی لک المانی

تو امن میں نہ ہو اگرچہ تو شام حرم میں گزارے حتیٰ کہ تو وہ پالے جو تقدیر بنانے والے نے تیری تقدیر میں لکھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ، ان بمعنی ما نافیہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۝ (الملک) اس آیت میں اِن، ما نافیہ کے معنی میں ہے اور یَظُنُّوْنَ کا معنی ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ انہیں اس چیز کی صحت کا علم ہی نہیں ہے جو وہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے علماء کے مقلد ہیں اس میں جو وہ پڑھتے ہیں۔

ابوبکر انباری نے کہا: ہمیں احمد بن یحییٰ نحوی نے بتایا کہ عرب ظن کو علم، شک اور کذب کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: جب علم کے دلائل قائم ہو جائیں اور وہ شک کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن یقین ہوگا، اور جب یقین کے دلائل اور شک کے دلائل برابر ہوں تو ظن شک ہوگا۔ جب شک کے دلائل یقین کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن کذب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** ہمارے علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے علماء یہود کے بارے میں بتایا کہ وہ تحریف کرتے ہیں اور تبدیلی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ الآیہ (البقرہ:79) (سو ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے)

جب معاملہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اور علماء کی رعیت بری ہو گئی اور وہ دنیا پر حرص و لالچ کرنے لگے اور انہوں نے ایسی چیزیں طلب کیں جو لوگوں کے رخ ان کی طرف پھیر دیں تو انہوں نے اپنی شریعت میں بدعتوں کو نکالا اور شریعت کو بدل ڈالا۔ پھر انہیں تورات کے ساتھ لاحق کر دیا۔ اپنے بیوقوف لوگوں کو کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ ان کی طرف سے یہ قبول کر لیں اور ان کی ریاست مستحکم ہو جائے اور اس کے ذریعے وہ دنیا کا مال و متاع حاصل کریں اور جو کچھ انہوں نے اختراع کیا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ انہوں نے کہا پس لیس علینا فی الامیین سبیل وھم العرب یعنی ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی گرفت نہیں ہے اور وہ عرب ہیں یعنی جو کچھ ہم ان کے مال سے لے لیں وہ ہمارے لئے حلال ہے اور ان کی

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب کراھیۃ مس الذکر بالیمین والاستنجاء بالیمین، حدیث نمبر 306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

اختراع میں سے یہ بھی تھا کہ انہوں نے لا یضرنا ذنب فنحن احباء ہ و ابناء ہ۔ ہمیں کوئی گناہ مضر نہیں ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نازیبا بات سے بلند ہے۔

تورات میں تھا: یا احباری و یا ابناء رسلی۔ (اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد) تو انہوں نے اسے بدل ڈالا اور یہ لکھا: یا احبائی و یا ابنائی (یعنی اے میرے محبوبو! اے میرے بیٹو!) اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کو نازل فرمایا: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ:18)

یہود نے کہا: ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دے گا۔ اگر وہ عذاب دے گا تو چالیس دن عذاب دے گا جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) (اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے دن۔ آپ فرمایئے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ۔)

ابن مقسم نے کہا: عَهْدًا سے مراد توحید ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم:87) اس آیت میں عَهْدًا سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ) تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا اور فرمایا: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ) ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ دوزخ اور جنت میں خلود کفر اور ایمان کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس اعتبار سے جو انہوں نے کہا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

''پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے۔ پھر کہتے ہیں: یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ حاصل کر لیں اس کے عوض تھوڑے سے دام۔ سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** فَوَيْلٌ، ویل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ آگ کا پہاڑ ہے (1)۔ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے کہ ویل دو پہاڑوں کے

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

درمیان جہنم میں ایک وادی ہے جس میں گرنے والا چالیس سال گرتا جائے گا۔(1)

سفیان اور عطا بن یسار سے مروی ہے کہ اس آیت میں ویل سے مراد ایک وادی ہے جو جہنم کے فنا میں ہے اس میں دوزخیوں کی پیپ چلتی ہے(2)۔ بعض نے فرمایا: جہنم میں ایک حوض ہے۔ الزہراوی نے دوسروں سے حکایت کیا ہے کہ یہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے(3)، الویل، عذاب کی تکلیف ہے۔ خلیل نے کہا: اس تکلیف کی شدت ہے۔ اصمعی نے کہا: ویل سے مراد افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ اور الویح سے مراد رحم کا اظہار کرنا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جو ہلاکت میں واقع ہو اس کے لئے ویل اور جو ہلاکت کے قریب ہو اس کے لئے ویح استعمال ہوتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ویل سے مراد غم ہے۔ کہا جاتا ہے: تویل الرجل جب وہ ویل پکارے یہ غم اور مصیبت کے وقت کہا جاتا ہے۔ اس سے ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل ہلاکت ہے ہر وہ شخص جو ہلاکت میں واقع ہوا ہو وہ ویل کو پکارتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ (الکہف: 49) ویل اور ویلہ دونوں کا معنی ہلاکت ہے اس کی جمع ویلات ہے۔ شاعر نے کہا:

له الویل ان امسی ولا ام هاشم

ایک اور نے کہا:

فقالت لك الویلات انك مرجلی

ویل پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کو مبتدا بنانا جائز ہے اگرچہ نکرہ ہے کیونکہ اس میں دعا کا معنی ہے۔ اخفش نے کہا: فعل کے اضمار کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی الزمهم الله ویلاً۔ فراء نے کہا: الویل اصل میں وَیٌ تھا یعنی غم۔ جیسے تو کہتا ہے: وی لفلان یعنی فلاں کے لئے غم۔ عربوں نے اس کے ساتھ لام ملا دیا اور پھر اس سے اسے مقدر کیا اور اسے اعراب دیا۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ جب یہ مضاف نہ ہو تو اس پر رفع ہو کیونکہ یہ وقوع کا تقاضا کرتی ہے اور دعا کے معنی پر نصب بھی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

خلیل نے کہا: صرف ان الفاظ کا مبنی ہونا سنا گیا ہے: ویح و ویس و ویه و ویك و ویل و ویب۔ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں، بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ یہ مصادر ہیں ان کو عرب فعل کے ساتھ نہیں بولتے۔ الجرمی نے کہا: اور ان کلمات میں سے جن کو نصب مصادر کی نصب کی طرح دی جاتی ہے وہ ویله، عوله، ویحه اور ویسه ہیں جب ان کے ساتھ لام کو داخل کرے گا تو رفع دے گا اور کہے گا: ویلٌ له، وویحٌ له۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ کتابت معروف ہے اور سب سے پہلے جس نے قلم کے ساتھ لکھا اور قلم کے ساتھ تحریر لکھی وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے اور یہ بات حضرت ابوذر کی حدیث میں آئی ہے جسے الآجری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو کتابت کا فن دیا گیا تو وہ آپ کی اولاد میں وراثت ہو گیا۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

**مسئلہ نمبر3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَیْدِیْهِمْ یہ تاکید ہے کیونکہ یہ معلوم شدہ ہے کہ کتابت (لکھائی) ہمیشہ ہاتھ کے ساتھ ہوتی ہے یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (انعام:38) اس آیت میں جناح کا ذکر تاکید کے لئے ہے کیونکہ پرندہ اڑتا ہی پروں کے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دیقولون بافواههم۔ وہ اپنے مونہوں سے بولتے ہیں تو بولنا تو ہوتا ہی منہ کے ساتھ ہے اس لئے یہاں افواههم تاکید کے لئے ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بِاَیْدِیْهِمْ ان کے جرم کے بیان کے لئے ہے اور ان کے اعلانیہ یہ کام کرنے کے اثبات کے لئے ہے جو خود کسی کام کو شدت سے سرانجام دیتا ہے وہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جس کے وہ کام سپرد نہ ہوا گرچہ اس کی رائے موجود ہو۔ ابن سراج نے کہا بِاَیْدِیْهِمْ یہ کنایہ ہے کہ یہ ان کی اپنی طرف سے تھا ان پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ ہاتھوں کے لکھنے میں حقیقت نہ تھی۔ (1)

**مسئلہ نمبر4:** اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت میں تبدیلی تغییر اور شرع میں زیادتی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ پس جس نے اللہ کے دین میں کوئی بدعت نکالی، کوئی ایسی تبدیلی کی جو دین میں سے نہیں ہے اور دین میں وہ جائز نہ ہو تو وہ اس سخت وعید اور عذاب الیم میں داخل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو ڈرایا جب آپ نے آخر زمانہ میں جو ہونے والا ہے، اسے جان لیا...... فرمایا: خبردار! تم میں سے اہل کتاب بہتر ملتوں میں جدا جدا ہوئے اور یہ امت تہتر ملتوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک کے سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے ...... اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو قرآن وسنت اور اصحاب کی سنت کے مخالف ہوگی تو وہ لوگوں کو اس کے ساتھ گمراہ کریں گے۔ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈرایا تھا وہ واقع ہوا اور عام ہوا۔ پھیلا اور کثرت سے پھیلا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔

**مسئلہ نمبر5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو قلت کی صفت سے بیان فرمایا جو وہ لیتے تھے۔ اس لئے کہ یا تو وہ فنا ہونے والی تھی اور اس کو ثبات نہیں تھا یا وہ حرام تھی کیونکہ حرام میں بھی برکت نہیں ہوتی اور وہ اللہ کی بارگاہ میں نہیں بڑھتا۔ ابن اسحاق اور کلبی نے کہا: تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ صفت ذکر تھی ربعة اسمر (درمیانہ قد اور گندمی رنگ) اور انہوں نے اسے آدم سبطاً طویلاً کے الفاظ سے بدل ڈالا یعنی گندمی سیدھے بالوں والا لمبے قد والا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور متبعین کو کہتے: اس نبی کی صفت دیکھو جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا۔ اس کی صفت تو اس کے مشابہ نہیں ہے۔ یہود کے مشائخ اور علماء کے لئے ریاست اور کمائی تھی۔ پس انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر وہ صحیح صحیح بیان کریں گے تو ان کے کھانے بند ہو جائیں گے اور ریاست چلی جائے گی اس وجہ سے انہوں نے تحریف کی۔ (2)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ۝ بعض علماء نے فرمایا: مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ سے مراد ان کے کھانے ہیں۔ بعض نے فرمایا: گناہ ہیں اور ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے ویل کو دوبارہ ذکر کیا۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے چند دن۔ آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ، تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا یعنی یہود نے کہا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً اس کے نزول کے سبب میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے پوچھا: دوزخی کون ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم۔ پھر تم ہمارے پیچھے آؤ گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ پس اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو یہود کہتے تھے: یہ دنیا سات ہزار (سال) ہے۔ لوگوں کو دنیا کے ہر ہزار سال کے لئے آخرت کے دنوں میں سے ایک دن آگ میں عذاب دیا جائے گا یہ کل سات دن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یہ مجاہد کا قول ہے (2)۔ ایک طائفہ نے کہا: یہود نے کہا: تورات میں ہے کہ جہنم کی مسافت چالیس سال ہے وہ ہر روز ایک سال کی مسافت طے کریں گے حتیٰ کہ اس مسافت کو مکمل کر لیں گے تو جہنم ختم ہو جائے گی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا کہ انہوں نے تورات میں یہ لکھا ہوا پایا ہے کہ جہنم کے دونوں کناروں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے یہاں تک کہ لوگ زقوم کے درخت تک پہنچیں گے اور یہود نے کہا: ہمیں عذاب دیا جائے گا حتیٰ کہ ہم زقوم کے درخت تک پہنچیں گے پھر جہنم ختم ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ سے بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ انہیں چالیس دن آگ میں داخل کرے گا جتنے دن انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا (4) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اس آیت میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا رد ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد دعی الصلوۃ ایام اقرائك (5) (تو اپنے حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ دے) سے استدلال کیا ہے کہ حیض کی مدت اتنی ہے جس کو ایام حیض کہا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن (☆)۔ احناف کہتے ہیں: جو تین دن سے کم ہو اسے یوما اور یومین سے تعبیر کیا جاتا ہے جو دس سے زائد ہوا سے احد عشر یوما کہا جاتا ہے اس میں ایام نہیں کہا جاتا تین سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اذا غدر المشرکون بالمسلمین هل یعفی عنهم، حدیث 2933، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

5۔ صحیح بخاری، باب الاستحاضہ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ دقت نظر سے دیکھا جائے تو احناف کے نقطہ نظر کا کوئی رد نہیں بلکہ احناف کا استدلال قوی ہے میز اور تمیز میں یہی ملحوظ ہوتا ہے جو احناف نے ذکر کیا ہے۔

دس تک کے اسمائے اعداد کے ساتھ ایام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ (البقرہ: 196) پھر تین دنوں کے روزے حج میں تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ (ہود: 65) تم لطف اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن۔ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ (الحاقہ: 7) (مسلط کر دیا اسے ان پر سات راتیں)۔ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ: 7) (آٹھ دن جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی) تو احناف کو کہا جائے گا اللہ تعالیٰ نے روزے کے بارے میں اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا اس سے پورا مہینہ مراد ہے۔ اور فرمایا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ: 80) اس اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد چالیس دن ہیں اور جب ایام کسی عارض کی طرف مضاف ہوں تو اس سے تعداد کی تحدید مراد نہیں ہوتی بلکہ کہا جاتا ہے: ایام مشیك و سفرك و اقامتك۔ اگرچہ تیس اور بیس دن بھی ہوں، جو عدد تو چاہے مراد لے سکتا ہے۔ شاید وہ مراد لیا جو عورت کے لئے معتاد تھا اور عورت کی عادت چھ دن یا سات دن ہوتی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اس کے مطابق فرمایا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ، اتخذ کے بارے میں کلام گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا کیا تم نے پہلے نیک عمل کیا ہے تم ایمان لائے تم نے اطاعت کی کہ تم آگ سے نکلنے کے مستحق ہو۔ یا تم نے اس کی وحی سے پہچانا ہے جس میں اس نے تم سے عہد کیا ہے۔ فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ توبیخ اور تقریع ہے۔

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۲

''ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلٰی یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے ذکر کیا ہے۔

سیبویہ نے کہا بَلٰی اور نعم اسم نہیں ہیں۔ یہ بل وغیرہ کی طرح دونوں حرف ہیں۔ یہ ان کے قول لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کا رد ہے۔ کوفیوں نے کہا: اس کی اصل بل ہے جس کا معنی پہلی کلام سے اضراب ہوتا ہے۔ اس پر یا کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ وقف عمدہ ہو جائے یا ایجاب اور انعام کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (1)۔ پس بل انکار کے رد پر دلالت کرتا ہے اور یا مابعد کے ایجاب پر دلالت کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر کوئی کہے: الم تاخذ دینارا؟ (کیا تو نے دینار نہیں لیا؟) تو کہے گا: نعم تو معنی لا ہو گا یعنی میں نے نہیں لیا کیونکہ تو نے نفی کو ثابت کیا اور جب تو کہے: بَلٰی تو معنی ہو گا میں نے دینار لیا۔ فراء نے کہا: جب کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے: مالك علی شیٔ (تیرے لئے مجھ پر کچھ نہیں ہے) دوسرا کہے: نعم تو یہ تصدیق ہو گی اس کے

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لئے اس پر کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کہے: بَلٰی تو یہ اس کے قول کا رد ہوگا۔ تقدیر یوں ہوگی: بلی لی علیک (کیوں نہیں میرے لئے تجھ پر ہے) قرآن میں ہے: الست بربکم قالوا بلی۔ اگر وہ نعم کہتے تو کافر ہوتے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَیِّئَۃً اس سے مراد شرک ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے کہا من کسب سیئۃ؟ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا: شرک (1) اور پھر یہ آیت بطور دلیل پڑھی وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتْ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ (النمل:90) (جو برائی لے کر آئے گا تو ان کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں) اسی طرح حسن اور قتادہ نے کہا: خطیئۃ کبیرہ ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 3:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ تو یہ دلیل ہے کہ دو شرطوں پر یہ حکم معلق ہے، دونوں شرطوں سے کم کے ساتھ حکم مکمل نہیں ہوگا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (فصلت:30) (بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) استقامت اختیار کی) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیان بن عبداللہ ثقفی کو کہا، جب انہوں نے کہا تھا یا رسول اللہ! مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیں کہ اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنت باللہ ثم استقم (تو کہہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہ) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس مفہوم میں کلام گزر چکی ہے اور جو کچھ علماء نے وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (البقرہ:35) کے ضمن میں فرمایا وہ بھی گزر چکا ہے۔ نافع نے خطیئاتہ، یعنی جمع پڑھا ہے باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور معنی کثرت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (ابراہیم:34) یہاں نعمۃ مفرد ہے لیکن معنی کثرت ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

"اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو"۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ان الفاظ کے بیان میں کلام گزر چکی

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہے، یہاں جس میثاق کا ذکر ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ مکی نے کہا: یہ وہ میثاق ہے جو اس وقت لیا گیا جب لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا گیا۔ بعض نے فرمایا: یہ وہ میثاق ہے جو ان سے لیا گیا جبکہ وہ زندگی میں عقلاء تھے۔ انبیاء کرام کی زبانوں کے ذریعے۔ وہ یہ ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (1) (تم عبادت نہیں کرتا مگر اللہ کی) اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی توحید کا اثبات ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق ہے اور جو کچھ اس نے اپنی کتب میں نازل کیا اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ سیبویہ نے کہا: لَا تَعْبُدُوْنَ، قسم کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم نے ان سے حلف لیا اللہ کی قسم تم عبادت نہیں کرتے مگر اللہ کی۔ مبرد، کسائی اور فراء نے اس کو جائز قرار دیا۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے لا تعبدوا نہی کا صیغہ پڑھا ہے (2) اسی وجہ سے کلام امر کے صیغہ کے ساتھ متصل ہے۔ فرمایا: قوموا و قولوا۔ اقیموا و آتوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال ہے یعنی ہم نے ان سے میثاق لیا دراں حالیکہ وہ توحید کے اظہار کرنے والے تھے یا وہ معاند نہیں تھے۔ یہ قطرب اور مبرد کا قول ہے۔ یہ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی کی قراءت پر یعبدون (یاء کے ساتھ) پر صحیح ہوتا ہے۔

فراء، زجاج اور ایک جماعت نے کہا (3) اس کا معنی ہے اخذنا میثاقھم بالا یعبدوا الا اللہ و بان یحسنوا للوالدین و بالا یسفکوا الدماء (ہم نے ان سے میثاق لیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے یہ کہ وہ والدین سے حسن سلوک کریں گے، یہ کہ وہ خون ریزی نہیں کریں گے) پھر ان اور با کو حذف کیا گیا تو فعل کو رفع دیا گیا ان دونوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ (الزمر: 64) مبرد نے کہا: یہ خطا ہے جو عربی میں مضمر ہوتا ہے وہ ظاہر عامل کی طرح عمل کرتا ہے تو کہتا ہے: و بلد قطعت یعنی رُبَّ بلد۔

میں کہتا ہوں: یہ خطا نہیں ہے بلکہ دونوں وجہیں صحیح ہیں، ان دونوں وجوہ پر سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

الا ایھذا الزاجری احضر الوغی　　وان اشھد اللذات ھل انت مخلدی

اس شعر میں احضر پر نصب اور رفع دونوں پڑھے گئے ہیں۔ نصب اَنْ کے اضمار کی بنا پر اور رفع اَنْ کے حذف کی بنا پر۔

**مسئلہ نمبر3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یعنی ہم نے انہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے حق کو توحید کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور تخلیق ثانی (تربیت) والدین کی طرف سے ہوتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے شکر کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (لقمان: 14)

والدین سے احسان کا مطلب ان سے حسن معاشرت، ان کے لئے تواضع، ان کے حکم کی پیروی، ان کے وصال کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعا، ان سے محبت کرنے والوں سے تعلقات قائم کرنا وغیرہ ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ اسراء

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ذِی الْقُرْبٰی اس کا عطف والدین پر ہے الْقُرْبٰی بمعنی قرابت ہے یہ مصدر ہے جیسے الرجعی، العقبیٰ (1) یعنی ہم نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے احسان کا حکم دیا۔ تفصیلی بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْیَتٰمٰی یہ بھی معطوف ہے۔ یہ یتیمہ کی جمع ہے جیسے ندامی، ندیم کی جمع ہے۔ انسانوں میں الیتیم باپ کا نہ ہونا ہے اور جانوروں میں ماں کا نہ ہونا ہے (2)۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو۔ پہلا قول معروف ہے اس کا اصل معنی جدا ہونا ہے۔ صبی یتیمہ یعنی وہ بچہ جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ بیت یتیم جس کے آگے پیچھے کوئی شعر نہ ہو۔ درۃ یتیمۃٌ، ایسا موتی جس کی مثال نہ ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی الابطاء (تاخیر کرنا) ہے۔ یتیم کو اس لئے یتیم کہا جاتا ہے کہ نیکی اس سے مؤخر ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: یتمُ ییتمُ یتما جیسے عظم یعظم۔ اور یتمَ ییتم یُتماً ویَتماً جیسے سمع یسمعُ۔ فراء نے دو وجہیں ذکر کی ہیں: قد ایتمہ اللہ۔ اللہ نے اسے یتیم بنایا۔

یہ آیت یتیم پر شفقت کرنے پر اور اس کی کفالت اور اس کے مال کی حفاظت کرنے پر برانگیختہ کر رہی ہے۔ اس کا بیان سورۃ نساء میں آئے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے یتیم کی کفالت کرنے والا یا کسی غیر کے یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔ مالک نے سبابہ اور درمیانی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ امام حافظ ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے حسن بن دینار ابو سعید بصری، جو حسن بن واصل، کی حدیث نقل کی ہے، فرمایا: ہمیں اسود بن عبد الرحمن نے بتایا انہوں نے ہصان سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم کے پیالے پر یتیم نہ بیٹھے ان کے پیالے کے قریب شیطان ہوتا ہے۔ عبد الغنی نے حسین بن قیس کی حدیث بھی نقل کی ہے اور وہ ابو علی حبسی ہے۔ انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک یتیم مسلمان کو اپنے کھانے اور پینے میں شریک کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے سیر کر دے گا تو اس کے یقیناً سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جس کی دو محبوب چیزیں لے لے گا اور وہ صبر کرے گا اور ثواب کی امید رکھے گا تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا: کریمتاہ (دو محبوب چیزوں) سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس کی آنکھیں اور جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں گی وہ ان پر خرچ کرے گا اور ان سے حسن سلوک کرے گا حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے یا وہ فوت ہو جائیں تو یقیناً اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ ایک بدو جس نے ہجرت کی تھی اس نے کہا: یا رسول اللہ! جس کی دو بیٹیاں ہوں اس کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خواہ دو بیٹیاں ہوں اس کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عباس جب یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حدیث بیان کرتے تھے تو فرماتے تھے: اللہ کی قسم! یہ حدیث کے غرائب اور غرر سے ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 6**: سبابہ وہ انگلی ہوتی ہے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اسے سبابہ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے گالی دیتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو انہوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور انہوں نے اس کا نام المشیرہ رکھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اشارہ کرتے تھے، اس کو سباحہ بھی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام حضرت وائل بن حجر وغیرہ کی حدیث میں آیا ہے لیکن لغت زمانہ جاہلیت میں جو معروف تھا اس کے مطابق چلتی رہی اور وہ غالب رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے مطابق مروی ہے کہ ان میں سے المشیرہ، درمیانی انگلی سے بڑی تھی، اور درمیانی انگلی، المشیرہ سے چھوٹی تھی پھر بنصر درمیانی سے چھوٹی تھی۔ یزید بن ہارون نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں عبداللہ بن مقسم الطائفی نے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے میری پھوپھی سارہ بنت مقسم نے بتایا کہ انہوں نے حضرت میمونہ بنت کردم کو سنا، انہوں نے فرمایا: میں اس حج کے موقع پر نکلی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سواری پر دیکھا، میرے باپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ چیزوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے دیکھا میں تعجب کرتی تھی ...... جب کہ میں بچی تھی ......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انگلی کی لمبائی پر جو انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے وہ تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انا و ھو کھاتین فی الجنۃ اور دوسری حدیث میں ہے اُحْشَرُ انا و ابوبکر و عمر یوم القیامۃ ھکذا (میں، ابوبکر اور عمر قیامت کے روز اس طرح اٹھائے جائیں گے) اپنی تین انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ آپ نے مخلوق کی منازل اور مخلوق پر جھانکنے کا ارادہ فرمایا اور فرمایا: ہم اس طرح اٹھیں گے اور ہم اوپر سے جھانک رہے ہوں گی۔ اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والے کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کی شان کو نہیں جانتا اس نے حدیث کی تاویل انضمام واقتراب سے کی ہے یعنی درجے ملے ہوئے ہوں گے اور یہ معنی بعید ہے کیونکہ رسل، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی منازل متفرق اور مختلف ہوں گی۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْمَسٰكِيْنِ** یہ بھی معطوف ہے یعنی ہم نے انہیں مساکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حاجت نے ساکن کر دیا ہو اور انہیں ذلیل کر دیا ہو۔ یہ صدقہ، مواسات، مساکین کے احوال جاننے اور ضعیفوں کی خبر گیری کرنے کو متضمن ہے(2)۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: بیوہ اور مسکین (کی کفالت کے لئے) کوشش کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ میرا خیال ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور اس قیام کرنے والے کی طرح ہے جو کمزور نہیں پڑتا اور اس روزے دار کی طرح جو افطار نہیں کرتا(3)۔ ابن منذر نے کہا: بہنوں کے لئے محنت مزدوری کرنا اللہ کے راستہ میں جہاد سے افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا**، **حُسْنًا** کو معنی کے اعتبار سے نصب مصدر کی بنا پر ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب برالوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ صحیح بخاری، باب الساعی علی المسکین، حدیث نمبر 5548، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس کا معنی ہے تمہارا قول اچھا ہو۔ بعض نے فرمایا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: وقولو للناس قولاً ذاحسن، یہ مصدر معنی کے اعتبار سے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے حَسَنًا، حاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: دونوں کا معنی ایک ہے، جیسے بخل اور مَخَل، الرشد اور الرَّشَد کا معنی ایک ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: حسنیٰ یعنی بغیر تنوین کے فعلیٰ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا اور یہ عربی زبان میں جائز نہیں، ایسے صیغہ کو الف، لام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جیسے الفضلی، الکبریٰ، الحسنیٰ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے حُسُنًا حاء اور سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے الحُلُم۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم انہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو اور انہیں اس کا حکم دو۔ ابن جریج نے کہا: یعنی تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں لوگوں سے سچی بات کہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں تبدیلی نہ کرو۔ سفیان ثوری نے کہا: لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور انہیں برائی سے روکو۔ ابوالعالیہ نے کہا: انہیں اچھی بات کہو اور اچھا بدلہ دو اس سے جو تم چاہتے ہو کہ تمہیں بدلہ دیا جائے۔ یہ تمام مکارم اخلاق پر ابھارنا ہے(1)۔ پس انسان کو چاہئے کہ لوگوں کے ساتھ اس کا کلام نرم ہو اس کا چہرہ ہر فاسق و فاجر کے لئے، سنی اور بدعتی کے لئے مسکراتا اور کھلا ہوا ہو لیکن دین میں مداہنت نہ کرے اور ایسی کلام نہ کرے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے مذہب سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:44) (اس سے نرم لہجہ میں بات کرو) کوئی قائل، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل نہیں ہے اور کوئی فاجر فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کے ساتھ نرم کلام کرنے کا حکم دیا۔

طلحہ بن عمر نے کہا: میں نے عطا سے کہا تیرے پاس مختلف خواہشات کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور میرے اندر تیزی اور سختی ہے میں ان کو سخت کلام کہتا ہوں۔ حضرت عطا نے کہا: تم ایسا مت کیا کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اس آیت میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں تو پھر حنفی (مسلمان) کا کیسا حکم ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تو فحش کلام کرنے والی نہ ہو جا، کیونکہ بے شک فحش اگر مرد ہوتا تو برا مرد ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا: الناس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسے اس ارشاد میں ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:54) گویا یوں ارشاد فرمایا: قولوا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم حسنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی بات کہو۔

مہدوی نے قتادہ سے حکایت کیا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا ارشاد، آیت السیف (قتال والی آیت) سے منسوخ ہے(2)۔ ابونصر عبدالرحیم بن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت ابتدا میں نازل ہوئی پھر اسے آیۃ السیف نے منسوخ کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا:(3) یہ آیت دلیل ہے کہ ابتداء اسلام میں اس امت کو اس جیسے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق خبر اور جو انہیں حکم دیا گیا وہ اس میں منسوخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اس کے بارے میں قول گزر چکا ہے اس میں خطاب بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا:(4) وہ لوگ اپنی زکوٰۃ کو ایک جگہ رکھتے تھے جو قبول ہوتی اس پر آگ

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

نازل ہوتی اور جو قبول نہ ہوتی اس پر آگ نازل نہ ہوتی۔ ان کی زکوٰۃ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی زکوٰۃ جیسی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ بات نقل کی محتاج ہے جیسا کہ یہ بات ان کے مال غنیمت میں ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زکوٰۃ جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اخلاص تھا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود کو خطاب ہے، ان کی طرف نسبت کی گئی ہے حالانکہ ان کے اسلاف نے پیٹھ پھیری تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حق سے اعراض میں ان کے راستہ پر تھے اور ان کی مثل تھے جیسا کہ کہا جاتا ہے شِنْشِنَةٌ اعرفها من اخزم۔ یہ وہ خصلت ہے جو مجھے اخزم سے معلوم ہوئی۔ (یہ ابو اخزم الطائی کا قول ہے اس نے اپنے بیٹے اخزم کو عاق کر دیا تھا تو اخزم کے بیٹوں نے اپنے دادا کو مارا تو اس نے کہا: یہ خصلت میں اخزم سے ہی جانتا ہوں)

اِلَّا قَلِيْلًا جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی۔ قَلِيْلًا استثناء کی بنا پر منصوب ہے اور المستثنیٰ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہوتا ہے کیونکہ وہ مفعول کے مشابہ ہوتا ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: یہ حقیقت میں مفعول ہے معنی یہ ہے استثنیت قلیلا میں نے چند آدمیوں کی استثنا کی۔ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ الاعراض اور تولی کا ایک معنی ہے لفظ میں دونوں کے درمیان مخالفت ہے۔ بعض نے فرمایا: تولی جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور اعراض دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا: وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ حال ہے کیونکہ اس میں تولی، اعراض پر دلالت کر رہا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو''۔

اس میں دو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور معنی کے اعتبار سے بعد والے بھی داخل ہیں۔ لَا تَسْفِكُوْنَ، اعراف میں لا تعبدون کی طرح ہے، طلحہ بن مصرف اور شعیب بن حمزہ نے فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابو نہیک نے تاء کے ضمہ فاء کی تشدید اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ السفک کا معنی انڈیلنا، بہانا ہے پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ یہ معطوف ہے اَنْفُسَكُمْ، النفس ماخوذ ہے النفاسة سے۔ انسان کا نفس، انسان کی چیز سے افضل ہے۔ الدار اس منزل کو کہتے ہیں جس میں ٹھہرنے کے لئے مکان بنے ہوئے ہوں بخلاف کوچ کرنے کی منزل کے۔ خلیل نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں کوئی قوم اترے وہ ان کے لئے دار ہے اگرچہ وہ مکانات نہ بھی ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: دار کو دار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رہنے والوں پر چکر لگاتا ہے۔ اسی طرح الحائط کو حائط کہتے

1۔ [illegible] زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہیں کہ وہ اسے گھیرے ہوئے ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ اَقۡرَرۡتُمۡ یہ اقرار سے ہے۔ یعنی تم نے اس میثاق کا اقرار کیا جو تم سے اور تمہارے پہلوں سے لیا گیا تھا۔ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ یہ الشہادت سے ہے یعنی اس پر تم اپنے دلوں کے گواہ ہو۔ بعض نے فرمایا: شہادت بھی حضور ہے یعنی تم خون ریزی کے وقت اور گھروں سے نکالنے کے وقت موجود تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اگر کہا جائے کہ کیا کوئی اپنا خون بہاتا ہے اور اپنے آپ کو گھر سے نکالتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان کی ملت ایک تھی اور ان کا معاملہ ایک تھا اور وہ امم میں ایک شخص کی مانند تھے تو بعض کا بعض کو قتل کرنا اور بعض کا بعض کو نکالنا، اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو نکالنے سے بنایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد قصاص ہے یعنی کوئی کسی کو قتل کرتا تو اس سے قصاص لیا جاتا یا اس نے اپنا ہی خون بہایا۔ اسی طرح جو زنا کرتا اور جو مرتد ہوتا تو اس کا خون مباح ہو جاتا۔ وہ فساد برپا کرتا تو اسے جلاوطن کیا جاتا، یہ گویا اس نے اپنے آپ کو ہی اپنے گھر سے نکالا۔ یہ اسی تاویل پر ہے جس میں بہت بعد ہے اگرچہ معنی صحیح ہے۔

معاملہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے نہ ایک دوسرے کو جلاوطن کریں گے اور نہ غلام بنائیں گے۔ اسی طرح دوسری طاعات کا ان سے عہد لیا تھا۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ سب کام ہم پر بھی حرام ہیں، یہ تمام فتنے ہم میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔ قرآن حکیم میں ہے: اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ (انعام: 65) (خلط ملط کرے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ابن خویز منداد نے کہا: جائز ہے کہ اس سے مراد ظاہر ہو، کوئی انسان خودکشی نہ کرے، اور بیوقوفی کی وجہ سے اپنے گھر سے نہ نکلے جس طرح کہ ہندو اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں یا انسان انتہائی پریشانی اور مصیبت کے وقت خودکشی کر لیتا ہے یا صحراء میں گھومتا رہتا ہے، دین سے ناواقفی اور عقل میں کمی کی وجہ سے گھروں میں نہیں آتا۔ یہ تمام صورتوں کو حکم شامل ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیعت کی اور سب نے یہ عزم کیا کہ وہ بوریا کا لباس پہنیں گے، صحرا میں گھومیں گے اور گھروں میں نہیں آئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے اور اپنی عورتوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان بن مظعون کے گھر آئے، اسے گھر پر نہ پایا، ان کی بیوی سے فرمایا: مجھے عثمان کے بارے یہ کیا بات پہنچی ہے؟ بیوی نے اپنے خاوند کا راز افشا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بولنا ناپسند کیا۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ اسی طرح ہے جس طرح آپ کو پہنچی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم عثمان کو کہنا کیا میری سنت کی مخالفت کرتے ہو یا میری ملت کے علاوہ کسی ملت پر ہو۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں، گھروں میں بھی پناہ لیتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں جو میری سنت سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ حضرت عثمان اور آپ کے ساتھی اپنی حالت سے واپس لوٹ آئے۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب الترغیب فی النکاح، حدیث نمبر 4675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶

''پھر تم وہی ہونا (جنہوں نے یہ وعدے کیے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے۔ (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے۔ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو، حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا۔ تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا۔ (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا ہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔ اور اللہ بےخبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض۔ تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ، اَنْتُمْ مبتدا ہے اس کو اعراب نہیں دیا جاتا کیونکہ یہ ضمیر ہے۔ اَنْتُمْ میں تا کو ضمہ دیا جاتا ہے، کیونکہ واحد مذکر مخاطب کے صیغہ میں تا مفتوح ہوتی ہے واحد مونث مخاطب میں تا مکسور ہوتی ہے۔ پس جب تو تثنیہ یا جمع کا صیغہ بنائے گا تو صرف ضمہ باقی ہے۔ هٰۤؤُلَآءِ قتبی نے کہا: اس کی تقدیر یا ھؤلاء ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سیبویہ کے قول کے مطابق خطا ہے، اور ھذا اقبل جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: هٰۤؤُلَآءِ بمعنی الذین ہے، تَقْتُلُوْنَ یہ صلہ میں داخل ہے یعنی ثم انتم الذین تقتلون۔ بعض نے فرمایا: هٰۤؤُلَآءِ مبتدا ہے اور اَنْتُمْ خبر مقدم ہے اور تَقْتُلُوْنَ، هٰۤؤُلَآءِ سے حال ہے۔ بعض نے فرمایا: اعنی کے اضمار کے ساتھ هٰۤؤُلَآءِ منصوب ہے (1)۔ زہری نے تقتلون پہلی تا مضموم اور دوسری کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح فلم یُقتّلون انبیاء اللہ میں پڑھا ہے، یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے۔ یہ ان کے اسلاف کی طرف لوٹانے کا احتمال نہیں رکھتا۔ یہ بنی قینقاع، قریظہ اور نضیر یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ بنو قینقاع، قریظہ کے دشمن تھے اور اوس، بنی قینقاع کے حلیف تھے۔ خزرج، بنی قریظہ کے حلیف تھے۔ نضیر (2)، اوس اور خزرج بھائی تھے اور قریظہ اور نضیر آپس میں بھائی بھائی تھے۔ پھر وہ جدا جدا ہو گئے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے پھر جنگ ختم ہوتی تو وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر شرم دلائی اور فرمایا: وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ (3) (اور اگر آئیں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

تمہارے پاس قیدی بن کر ( تو بڑے پا کباز بن کر ) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَظٰهَرُوْنَ اس کا معنی تتعاونون (معاونت کرنا) ہے۔ یہ الظہر سے مشتق ہے کیونکہ بعض بعض کو تقویت دیتا ہے تو وہ اس کے لئے پیٹھ کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تظاھرتم استاہ بیت تجمعت		علی واحد لازلتم قرنَ واحد

اس شعر میں تظاہر کا معنی مدد کرنا ہے۔

الاثم اس فعل کو کہتے ہیں جس کا کرنے والا مذمت کا مستحق ہوتا ہے۔ الْعُدْوَانِ ظلم میں زیادتی کرنا اور ظلم میں تجاوز کرنا۔ اہل مدینہ اور اہل مکہ نے تظاھرون ظا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے وہ تا کو ظا میں ادغام کرتے ہیں ان کے قرب کی وجہ سے، اصل میں تتظاھرون تھا۔ کوفیوں نے تظاھرون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلی تا کی دلالت کی وجہ سے دوسری تا کو حذف کر دیا اسی طرح وان تظاھرا علیہ کو پڑھا ہے۔ قتادہ نے تظھرون علیھم پڑھا ہے، یہ سب تعاون کے معنی کی طرف راجع ہیں۔ اس سے ہے وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴿۵۵﴾ (الفرقان) (اور کافر اپنے رب کے مقابلہ میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ﴿۴﴾ (التحریم) (سارے فرشتے اس کے علاوہ مدد کرنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى یہ شرط ہے اور اس کا جواب تُفٰدُوْهُمْ ہے اور اُسٰرٰى کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ ابوعبید نے کہا: ابوعمرو کہتے تھے جو ان کے ہاتھوں میں تھا وہ اُسٰرٰى تھا، اور جو قیدی ہو کر آئیں وہ اسریٰ ہیں۔ اہل لغت میں یہ معروف نہیں جو ابوعمرو نے کہا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: سکاریٰ، سکریٰ۔

اکثر کی قراءت اُساریٰ ہے۔ حمزہ نے اسے اسریٰ فعلیٰ کے وزن پر پڑھا ہے۔ یہ اسیر کی جمع ہے، اسیر بھی ماسور ہے، فعلی، فعیل کی جمع ہے۔ جیسے تو کہتا ہے قتیل سے قتلی، جریح سے جرحی۔ ابوحاتم نے کہا اساریٰ جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اساریٰ جیسے کہا جاتا ہے سکاریٰ، فعلیٰ اصل ہے اور فُعالی اس پر داخل ہے۔

محمد بن یزید سے حکایت ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: اسیرٌ، اُسراءُ، جیسے ظریف سے ظرفاء۔ ابن فارس نے کہا: اسیر کی جمع میں اسریٰ، اُساریٰ کہا جاتا ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے بعض نے فرمایا: اَساریٰ (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ)

**مسئلہ نمبر 2**: الاسیر، یہ الاسار سے مشتق ہے اس سے مراد وہ چمڑے کی رسی ہے جس کے ساتھ محمل کو باندھا جاتا ہے، اس کو اسیر اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کو باندھا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: قد اَسَرَ قتبہٗ، اس نے پالان کو باندھا پھر ہر پکڑی گئی چیز کو اسیر کہتے ہیں اگرچہ اسے باندھا نہ بھی گیا ہو۔ اعشیٰ نے کہا:

و قیدنی الشعر فی بیتہ		کما قید الآسرات الحمارا

مجھے شعر نے اس طرح قید کر دیا ہے جس طرح عورتیں پالان کی لکڑی کو قید کئے ہوئے ہوتی ہیں

یعنی انا فی بیتہ۔ اس سے اس کی مراد انتہا کو پہنچنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (الدہر:28) میں اسر سے مراد خَلق ہے۔ اسرۃ الرجل، آدمی کا خاندان، گروہ۔ کیونکہ وہ ان سے قوت حاصل کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تُفْدُوْهُمْ۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے اسی طرح پڑھا ہے اور باقی قراء نے تفدوھم پڑھا ہے یہ فداء سے ہے الفداء کا معنی قیدی کا فدیہ طلب کرنا ہے۔ جوہری نے کہا: الفِداء کو جب فا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ ممدود اور مقصور ہوتا ہے اور فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو صرف مقصور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قم فدًى لك ابی۔ اور عربوں میں سے جو فا کو کسرہ دیتے ہیں اسے فداءٍ تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں خصوصاً جب اس کے ساتھ لام جارہ ہو۔ پس وہ کہتے ہیں: فداءٍ لك۔ کیونکہ یہ نکرہ ہے اس سے وہ دعا کا معنی مراد لیتے ہیں۔ اصمعی نے نابغہ کا یہ شعر پڑھا ہے:

مهلاً فداءٍ لك الاقوام كلهم ... وما اثمر من مال ومن ولدِ

کہا جاتا ہے: فداہ و فاداہ تو کوئی عطیہ دے پھر اسے ختم کر دے۔ فداہ بنفسہ و فداہ یفدیہ جب کہا میں نے تیرا فدیہ دیا۔ تفادوا، یعنی بعض نے بعض کو فدیہ دیا۔ الفدیۃ، الفَدَی، الفِداء تمام کا معنی ایک ہے۔ وفادیت نفسی یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کوئی چیز دینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ یہ بمعنی فدیت ہے، اسی سے حضرت عباس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنا ہے: فادیت نفسی و فادیت عقیلاً میں نے اپنا فدیہ دیا ہے اور عقیل کا فدیہ دیا ہے۔ یہ دونوں فعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں، ان میں سے دوسرا حرف جر کے ساتھ ہے۔ تو کہتا ہے: فدیت نفسی بمالی و فادیتہ بمالی (1)۔ شاعر نے کہا:

قفی فادی اسیرك ان قومی ... و قومَكَ ما اریٰ لهم اجتماعا

تو ٹھہر جا اور اپنے قیدی کا فدیہ دے دے میری اور تیری قوم میں ان کا اجتماع میں نہیں دیکھتا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ هُوَ مبتدا ہے یہ اخراج سے کنایہ ہے، مُحَرَّمٌ خبر ہے اور اِخْرَاجُهُمْ، هُوَ سے بدل ہے، اگر تو چاہے تو هُوَ ضمیر کو الحدیث اور القصہ سے کنایہ بنا دے اور اس کا مابعد جملہ خبر ہو، یعنی والامر محرم علیکم اخراجھم، پس فاخراجھم دوسرا مبتدا ہوگا اور محرم اس کی خبر ہوگی اور پھر جملہ هُوَ کی خبر ہوگا۔ اور محرم میں جو ضمیر نائب فاعل ہے وہ الاخراج کی طرف لوٹ رہی ہے یہ بھی جائز ہے کہ محرم مبتدا ہو اور اخراجھم اس کا نائب فاعل، محرم کی خبر کے قائم مقام ہے پھر جملہ ھو کی خبر ہو۔ فراء نے کہا: هُوَ عماد ہے یہ بصریوں کے نزدیک خطا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ عماد اول کلام میں نہیں ہوتا اور ضمہ کے ثقل کی وجہ سے ھاء کے سکون کے ساتھ وَهْوَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فَهْوَ لا تنمی رمیتہ ... ما لہ لا عدّ من نفرہ

اس میں فھو کو ھا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے لام اور ثم لائے تو بھی ھا ساکن کر دے۔

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے چار عہد لئے تھے: قتل نہ کرنا، جلاوطن نہ کرنا، مدد نہ کرنا اور قیدیوں کا فدیہ دینا۔ انہوں نے سوائے فدیہ کے حکم کے سب سے اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توبیخ فرمائی جو پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا: أفتومنون ببعض الكتاب (تورات) وتكفرون ببعض۔

میں کہتا ہوں: اللہ کی قسم! ہم نے فتنوں کی وجہ سے تمام احکام کو ترک کر دیا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی مسلمانوں پر افسوس بلکہ کافروں پر افسوس۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو ذلیل و رسوا چھوڑ دیا ان پر مشرکین کے احکام جاری ہیں۔ لاحول ولا قوة الا بالله العلی العظیم۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ایک درہم بھی باقی نہ ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت قیدیوں کے چھڑانے کے وجوب کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس کے متعلق وارد ہیں، آپ نے قیدیوں کو چھڑایا اور ان کو چھڑانے کا حکم دیا (1)، اسی پر مسلمان کا عمل جاری ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ بیت المال سے قیدیوں کو چھڑانا واجب ہے اگر بیت المال نہ ہو تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہے۔ جس نے بھی یہ فریضہ ادا کر دیا باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5:** فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یہ مبتدا اور خبر ہیں الخزی کا معنی رسوائی ہے۔ جوہری نے کہا: خزی یخزی خزیا جب کوئی ذلیل و رسوا ہو جائے۔ ابن سکیت نے کہا: وہ مصیبت میں واقع ہوا۔ اخزاہ الله اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کیا۔ خزی، یخزی خزاية جب کوئی حیا کرے۔ فهو خزیان. قوم خزایا و امرأة خزيا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ عام قراء کی قراءت یردون یا کے ساتھ ہے۔ حسن نے تردون تا خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اس سے پہلے کلام گزر چکی ہے۔ اسی طرح اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا اس پر بھی کلام ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں یوم کو نصب یردون کی وجہ سے ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے۔ اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جبریل علیہ السلام سے تو کیا جب بھی لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑ گئے بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل

1۔ صحیح بخاری، باب فکاک الاسیر، حدیث نمبر 2819، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنے لگے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ، کتاب سے مراد تورات ہے تقفینا ہم نے پیچھے بھیجا۔ التقفية پیچھا کرنا، پیچھے بٹھانا۔ یہ اتباع القفا سے ماخوذ ہے، القفا گردن کے پیچھے حصہ کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: استقفيته، جب تو کسی کے پیچھے آئے۔ اسی سے قافية الشعر ہے کیونکہ وہ سارے کلام میں پڑھا جاتا ہے، القافية کا معنی گدی ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: يعقد الشيطان على قافية رأس احد كم (1)۔ شیطان تم میں سے کسی کے سر کی گدی پر گرہ لگاتا ہے۔ القفى، القفارة دودھ وغیرہ جو اس شخص کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے جس کا تو اکرام چاہتا ہے۔ قفوت الرجل یعنی میں نے فجور کے ساتھ اسے تہمت لگائی۔ فلان قِفْوَتِي۔ فلاں میری تہمت ہے۔ وقفوتی یعنی میری خیر ہے۔ ابن درید نے کہا: گویا یہ اضداد میں سے ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت اس آیت کی مثل ہے ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا (المومنون: 44) ہر رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا وہ تورات کے اثبات اور اس کے لزوم کے امر کے ساتھ آیا (2)۔ کہا جاتا ہے: رُسُلٌ و رُسْلٌ یہ دونوں لغتیں ہیں، پہلی لغت حجاز ہے اور دوسری لغت تمیم ہے خواہ مضاف ہو یا مضاف نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ، بینات سے مراد دلائل و براہین ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (3)۔ وَ اَيَّدۡنٰهُ یعنی ہم نے قوت دی۔ مجاہد اور ابن محیصن نے اسے آیدناہ مد کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ابو مالک اور ابو صالح نے ابن عباس اور معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ حضرت حسان نے کہا:

و جبريل رسول الله فينا و روح القدس ليس به خفاءُ

جبریل ہم میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں اور وہ روح القدس ہیں اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جبریل کو روح کہا گیا اور پھر القدس کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تکوین کے ساتھ روح تھا نہ اس طرح اس کی تکوین تھی جس طرح والد، اولاد کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے۔ غالب بن عبداللہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: القدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی طرح حسن نے فرمایا: القدس اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی روح جبریل ہے۔ ابو روق نے ضحاک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد وہ اسم ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے (4)۔ حضرت سعید بن جبیر اور عبید نے بھی یہی کہا یہ اسم اعظم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انجیل ہے اس کو روح کہا ہے جس طرح قرآن کو روح کہا ہے وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (الشوریٰ: 52) پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

القدس کا معنی طہارت بھی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب عقد الشيطان على قافية الرأس اذا لم يصل بالليل، حدیث نمبر 1074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ ایضا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ یعنی جو تمہاری خواہشات کے موافق نہیں ہوتا۔ ضمیر عائد کو اسم کے طول کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اصل اس طرح ہے: بما لا تھواہ (استکبرتم) اس کی بات قبول کرنے سے تکبر کیا رسولوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اور رسالت کو مستبعد سمجھتے ہوئے۔ الھوی کا اصل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے اس کی جمع اھواء ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اس کی جمع اھویۃ نہیں آئی باوجود اس کے کہ عرب کہتے ہیں ندی اندِیَۃُ۔

فی لیلۃ من جمادیٰ ذاتِ اندیۃ　　لا یبصر الکلب فی ظلمائھا الطنبا

جوہری نے کہا: یہ شاذ ہے۔ اور الھوی کو ھویٰ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھی کو آگ میں گراتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عام طور پر ایسی بات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حق نہ ہو اور جس میں خیر نہ ہو۔ یہ آیت اسی سے ہے۔ کبھی یہ حق میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں کہا: ھوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قال ابوبکر ولم یھو ما قلت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان اس طرف ہوا جو ابوبکر نے کہا تھا اس طرف نہ ہوا جو میں نے کہا تھا (1)۔ حضرت عائشہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: واللہ ما اری ربك الا یسارع فی ھواك (☆)۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تیرے پروردگار کو دیکھتی ہوں کہ وہ تیری خواہش کو جلدی پورا فرما دیتا ہے۔ ان دونوں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ، كَذَّبْتُمْ کی وجہ سے فریقاً منصوب ہے اور اسی طرح وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ہے۔ پس کچھ ان میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما السلام کو جھٹلایا اور کچھ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو قتل کیا۔ اس کا بیان سورۂ سبحان میں آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

## وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

"اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا یعنی یہود قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، غُلْفٌ لام کے سکون کے ساتھ ہے اس کی جمع اغلف ہے یعنی ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔ یہ اس قول کی مثل ہے: قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ۔ (ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں)۔ مجاہد نے کہا غلفٌ یعنی ان پر پردہ ہے (2)۔ عکرمہ نے کہا: یعنی ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے: غلفت السیف، میں نے تلوار کے لئے غلاف بنایا۔ فقلبٌ اغلَف یعنی ایسا دل جو فہم و تمیز سے پوشیدہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اعرج اور ابن محیصن نے غُلُف لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا معنی ہے ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں انہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی دوسرے کے علم کی ضرورت نہیں (3)۔ بعض نے فرمایا: یہ غلاف کی جمع ہے جیسے خمار، خمر۔ یعنی ہمارے دل علم کے برتن ہیں کیا وجہ ہے کہ تمہاری بات کو نہیں سمجھتے حالانکہ ہم نے بہت سا علم محفوظ کر رکھا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

کا علم ان سے کیسے پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ (لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے) پھر اس کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ایمان سے کیوں بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو انہوں نے کفر کیا اور جرأت کی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے یہ گناہ پر بڑی سزا ہے۔ اللعن کی اصل دھتکارنا اور دور کرنا ہے بھیڑیئے کو لعین کہا جاتا ہے دھتکارے ہوئے شخص کو لعین کہا جاتا ہے۔ الشماخ نے کہا:

ذعرتُ به القطا و نفيتُ عنهُ مقام الذئب كالرجل اللعين

اس شعر میں اصل کلام اس طرح تھی: مقام الذئب اللعین کالرجل۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنی توفیق اور اپنی ہدایت سے دور کر دیا۔ بعض نے فرمایا: ہر خیر سے دور کر دیا یہ عام ہے۔ فَقَلِيْلًا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فایماناً قلیلاً یومنون (1)۔ معمر نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس میں سے تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں سے اکثر کا انکار کرتے ہیں (2)۔ قلیلاً حرف الصفۃ کے نزع کے ساتھ منصوب ہے، اور ما صلۃ ہے یعنی فقلیلاً یومنون۔ واقدی نے کہا: اس کا معنی ہے نہ وہ تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں نہ زیادہ پر جیسے تو کہتا ہے: ما اقل ما یفعل کذا یعنی اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کسائی نے کہا: عرب کہتے ہیں: مررنا بارضٍ قلَّ ما تنبت الکراث والبصل یعنی ہم ایسی زمین سے گزرے جو کچھ نہیں اگاتی تھی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

''اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلے سے۔) تو جب تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمْ یعنی یہود۔ (کتاب) یعنی قرآن۔ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ یہ کتاب کی صفت ہے اور غیر قرآن میں اس کو حال کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے جس طرح حضرت ابی کے مصحف میں نصب کے ساتھ ہے (3) لِّمَا مَعَهُمْ۔ یعنی تورات، انجیل، یعنی قرآن انہیں بتاتا ہے جو انجیل اور تورات میں ہے وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ یعنی وہ مدد طلب کرتے ہیں الاستفتاح کا معنی مدد طلب ہے۔ استفتحت، میں نے مدد طلب کی۔

حدیث پاک میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محتاج، کمزور مہاجرین کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور نمازوں کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے (4)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ (المائدہ: 52) (وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دے دے فتح کامل یا ظاہر کر دے کامیابی کی کوئی بات

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ الکبیر طبرانی، صفحہ 857

اپنی طرف سے) النصر کا معنی بند چیز کو کھولنا ہے۔ یہ اس قول کی طرف لوٹتا ہے فتحت الباب میں نے دروازہ کو کھولا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس امت کی، ان کے ضعیف لوگوں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے مدد فرمائی۔ نسائی نے حضرت ابو الدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میرے لئے کسی ضعیف کو طلب کرو کیونکہ تمہیں تمہارے ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: خیبر کے یہود غطفان سے جنگ کرتے تھے جب مقابلہ ہوا تو یہود کو شکست ہوئی۔ یہود پھر اس دعا کے ساتھ لوٹے۔ یا یہ معنی ہے کہ اس دعا کی انہوں نے پناہ لی۔ انا نسالك بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان الا تنصرنا علیهم۔ ہم تجھ سے اس امی نبی کے واسطہ سے سوال کرتے ہیں جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ تو ہمارے لئے اسے آخر زمانہ میں نکالے گا ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب مقابلہ ہوا تو انہوں نے یہ دعا مانگی تو انہوں نے غطفان کو شکست دے دی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے انکار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیرے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لَمَّا جَآءَهُمْ، لَمَّا کا جواب فاء اور اس کا مابعد ہے جو اس قول میں ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا فراء کے قول کے مطابق (2) دوسرے لَمَّا کا جواب کفروا ہے۔ اخفش سعید نے کہا: لَمَّا کا جواب محذوف ہے کیونکہ سامع کو معلوم ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے (3)۔ مبرد نے کہا لَمَّا کا جواب کفروا ہے اور لَمَّا کو دوبارہ ذکر کیا گیا۔ کلام کے طول کی وجہ سے یہ ذنب (گناہ) کی تقریر اور تاکید کے لئے مفید ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

"بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی، حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے پس وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے۔ اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا۔ بئس عرب کلام میں مذمت کے لئے ہے جیسے نعم مدح کے لئے ہے ان میں سے ہر ایک کی چار لغات ہیں: بِئْس بَئْسَ بِیْسَ بِیِسَ، نَعَمَ نَعْمَ نِعمَ نِعِمَ۔ سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ما، بئس کا فاعل

1۔ صحیح بخاری، باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب، حدیث نمبر 2681، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
سنن ابوداؤد، باب الانتصار برذل الخیل والضعفة، حدیث نمبر 2227، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

ہے اور یہ اسمائے اجناس اور نکرات پر داخل ہوتا ہے اسی طرح نعم ہے تو کہتا ہے: نعم الرجل زَیدٌ، نعم رجلاً زیدٌ جب اس کے ساتھ اسم بغیر الف، لام کے ہوتو اسے ہمیشہ نصب دی جاتی ہے جب اس پر الف لام ہوتو ہمیشہ مرفوع ہوتا ہے رجلاً پر نصب تمیز کی بنا پر ہے اور نعم میں ضمیر تفسیر کی شرط پر مضمر ہے اور زید دو اعتبار سے مرفوع ہے۔ ایک مبتدا محذوف کی خبر کے اعتبار سے گویا پوچھا گیا ممدوح کون ہے تو تو نے کہا: وہ زید ہے۔ دوسری وجہ مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ ابوعلی نے جائز قرار دیا ہے کہ اس کے ساتھ موصولہ اور غیر موصولہ ملا ہوا ہو اس حیثیت سے کہ وہ مبہمہ ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ کسی ایک کو خاص نہیں کرتا۔ سیبویہ کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے(1): بئس الشیء اشتروا به انفسهم ان یکفروا۔ پس ان یکفروا محل رفع میں مبتدا ہوگا اور اس کا ماقبل خبر ہوگا جیسے تیرا قول ہے بئس الرجل زیدٌ اور اس قول کے مطابق ماموصولہ ہوگا۔ اخفش نے کہا(2): ما تمیز کی بنا پر محل نصب میں ہے جیسے تیرا قول ہے: بئس رجلاً زیدٌ پس تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: بئس شیئاً ان یکفروا۔ اشتروا به انفسم۔ اس قول کے مطابق ما کی صفت ہوگا۔

فراء نے کہا: (3) بئسما ایک شے ہے حبذا کی طرح مرکب کیا گیا ہے اس قول کے مطابق یہ معترضہ ہے۔ کیونکہ فعل بغیر فاعل کے رہ جائے گا۔ کسائی نے کہا: ما اور اشتروا، ایک اسم کے قائم مقام ہے اور یہ قائم بنفسہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: بئس اشتراؤھم ان یکفروا۔ یہ قول مردود ہے کیونکہ نعم اور بئس اسم معین معرف پر داخل نہیں ہوتے۔ شراء ضمیر کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں سے واضح قول اخفش اور سیبویہ کا قول ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: ان یکفروا اگر تو چاہے تو ان کو محل جر میں کردے بہ میں ھاء ضمیر کی طرف لوٹاتے ہوئے۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہوگا اشتروا انفسم بان یکفروا بما انزل الله۔ فاشتریٰ بمعنی باع اور بمعنی ابتاع ہے۔ مطلب یہ ہے: بئس الشئ الذی اختاروا لانفسم حیث استبدلوا الباطل بالحق والکفر بالایمان۔ (یعنی بری ہے وہ چیز جو انہوں نے اپنے نفسوں کے لئے اختیار کی اس حیثیت سے کہ انہوں نے حق کو باطل سے بدلا اور ایمان کو کفر سے بدلا)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَغْیًا اس کا معنی حسداً ہے یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے(4)۔ یہ مفعول لاجلہ ہے۔ یہ حقیقت میں مصدر ہے، اصمعی نے کہا: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قد بغی الجرح، زخم خراب ہو گیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی طلب کرنا ہے اسی وجہ سے زانیہ کو بغیا کہا جاتا ہے۔ اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ یہ محل نصب میں ہے یعنی لان ینزل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل نازل کرنے کی وجہ سے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، یعقوب اور ابن محیصن نے ان ینزل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح پورے قرآن میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ماینزلہ جو سورہ الحجر میں ہے اور سوائے علی ان ینزل آیۃ جو سورۃ الانعام میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَآءُوْ وہ لوٹے۔ اکثر یہ شر میں بولا جاتا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ، غضب الله علیھم کا معنی گزر چکا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا غضب ان کے بچھڑے کی

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عبادت کرنے کی وجہ سے ہے اور دوسرا غضب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت عکرمہ نے کہا کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا یعنی یہود نے ایسا کیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے، پہلا غضب ان کا انجیل کے انکار کی وجہ سے تھا، دوسرا قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے تھا۔ بعض نے فرمایا: مراد تائید ہے(1) اور اس حال کی شدت کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا نہ کہ دو معصیتوں کی تعلیل کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا مُّهِيْنٌ یہ الهوان سے ہے، یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا مقتضی ہے بخلاف مسلمان گنہگار کے خلود کے، کیونکہ مسلمانوں کا آگ میں جانا ان کی طہارت اور تمحیص کے لئے ہوگا جیسے زانی کو رجم کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس کا بیان سورۃ نساء میں حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں: ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمایئے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا تصدیق کرو بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن قَالُوْا نُؤْمِنُ یعنی ہم تصدیق کرتے ہیں۔ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یعنی تورات۔ وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یعنی جو تورات کے علاوہ ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا:(2) جو تورات کے بعد ہے۔ یہی قول ابو عبیدہ کا ہے، معنی ایک ہے۔ جوہری نے کہا: وراء بمعنی خلف (پیچھے) ہے کبھی یہ بمعنی قدام (آگے) ہوتا ہے۔ یہ (وراء) اضداد میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ (الکہف:79) (یعنی آگے بادشاہ تھا) وراء کی تصغیر وُ ریئة ہے یعنی ھاء کے ساتھ یہ شاذ ہے۔ وراء پر نصب ظرف کی بنا پر ہے۔ اخفش نے کہا: کہا جاتا ہے لقیتہ من وراء۔ غایت کی بنا پر اس کو رفع دیا جاتا ہے جب مضاف نہ ہو اسے اسم غیر متمکن بنائے گا، جیسے تیرا قول من قبلُ و من بعدُ میں ہے۔

اذا انا لم أومَنْ عليك و لم يكن لقاءك الا مِنْ وراء وراءُ

جب مجھے تجھ پر امن نہ ہو تو تیری ملاقات پردے کے پیچھے ہوگی۔

میں کہتا ہوں: حدیث حضرت عائشہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: انما كنت خليلاً من وراء وراء۔ میں پردے کے پیچھے خلیل تھا۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

الوراء، پوتے کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْحَقُّ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مُصَدِّقًا سیبویہ کے نزدیک حال مؤکدہ ہے لِمَا مَعَهُمْ، ما محل جر میں ہے لام کی وجہ سے اور مَعَهُمْ، ما کا صلہ ہے اور مَعَهُمْ کو نصب ظرف مستقر کی بنا پر ہے اور جنہوں نے اس کو ساکن کیا ہے انہوں نے اس کو حرف بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ یہ یہود کا رد ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی تکذیب ہے اور انہیں توبیخ ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو نے کیسے قتل کیا حالانکہ تمہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور مراد ان کے اسلاف ہیں۔ خطاب ان کے بیٹوں کی طرف متوجہ ہے کیونکہ یہ ان کے پیروکار تھے جنہوں نے قتل کیا تھا جیسے ارشاد فرمایا: وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ (المائدہ: 91) (اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو اپنا دوست)

جب یہ بھی ان کے پیچھے چلے تو یہ ان کے قائم مقام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ ان کے فعل پر راضی اور خوش تھے اس لئے یہ فعل ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ تَقْتُلُوْنَ فعل مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے کیونکہ مِنْ قَبْلُ کے قول سے اشکال اُٹھ گیا۔ جب کوئی اشکال نہ ہو تو ماضی کا مستقبل کے معنی اور مستقبل کا ماضی کے معنی میں لانا جائز ہے۔ الحطیئة نے کہا: (1)

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه　　ان الوليد احق بالعذر

اس شعر میں شهد بمعنی يشهد ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان کا اعتقاد رکھتے ہو تو پھر انبیاء کے قتل پر کیوں راضی ہو۔ بعض علماء نے فرمایا اِنْ بمعنی ما ہے اور لم کی اصل لما ہے الف کو حذف کیا گیا استفہام اور خبر میں فرق کرنے کے لئے، اس پر وقف مناسب نہیں، کیونکہ اگر اس پر بغیر ھاء کے وقف کیا جائے گا تو غلطی ہوگی اور اگر اس پر ھاء کے ساتھ وقف کیا جائے گا تو تاریکی میں اضافہ ہوگا۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلیں لے کر، پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد اور تم جفا کار ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ اس میں لام، لام قسم ہے اور البینات سے مراد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (الاسراء: 101) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔ وہ یہ تھیں: عصا، سخت قحط سالی، ید بیضا، خون، طوفان، مکڑی، جوئیں، مینڈک اور دریا کا پھٹنا۔

بعض نے فرمایا البینات سے مراد تورات اور اس میں موجود دلالات ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ اس میں توبیخ ہے، اور ثُمَّ تفریع میں واؤ سے زیادہ بلیغ ہے یعنی آیات میں غور وفکر کے بعد اور ان کے آنے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنایا۔ یہ آیت دلیل ہے کہ انہوں نے آیات میں غور وفکر کی مہلت کے بعد یہ جرم کیا اور یہ ان کا بہت بڑا جرم تھا۔(1)

**وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾**

''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے، یہ ان کے انکار کی نحوست تھی۔ فرمائیے: بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب وغریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا اس پر کلام گزر چکی ہے۔ اسْمَعُوْا کا معنی ہے: اطاعت کرو اس سے مراد صرف قول کا ادراک نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو تم نے سنا اس پر عمل کرو اور اسے لازم پکڑو۔ اسی سے ہے سمع اللہ لمن حمدہ یعنی قبول فرمایا۔

شاعر نے کہا: (2)

دعوت اللہ حتی خفت الا یکون اللہ یسمع ما اقول

میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمادے جو میں کہتا ہوں۔

الراجز نے کہا:

والسمع والطاعة والتسلیم خیرٌ و اعفی لبنی تمیم

قبول کرنا، اطاعت کرنا، تسلیم کرنا بنی تمیم کے لئے بہتر و مناسب ہے اور گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا اس میں اختلاف ہے کہ ان سے یہ الفاظ حقیقۃً زبان سے ادا ہوئے تھے یا انہوں نے ایسا فعل کیا تھا جو ان کو اس کے قول کے قائم مقام تھا۔ اس صورت میں یہ مجاز ہوگا۔ جیسے شاعر نے کہا:

امتلأ الحوض وقال قطنی مهلاً رویدًا قد ملأت بطنی (3)

حوض بھر گیا اور اس نے مجھے کہا: ٹھہر جاؤ میرا پیٹ تو نے بھر دیا ہے۔

انہوں نے جو کہا تھا نؤمن بما انزل علینا اس قول میں ان پر احتجاج (حجت) ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں راسخ ہوگئی۔ معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں نے اس کی محبت کو پینا شروع کیا۔ یہ تشبیہ اور مجاز ہے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت راسخ ہوگئی۔(1)

حدیث میں ہے تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً فأیّ قلب اشربها نکت فیه نکتةٌ سوداء۔ (دلوں پر فتنے ڈالے جائیں گے چٹائی کی طرح بار بار، جو دل ان کو پیئے گا اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جائے گا) اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، کہا جاتا ہے: أشرب قلبه حُبّ کذا۔ اس کی محبت اس کے دل میں راسخ ہوگئی۔ زہیر نے کہا:

فصحوت عنها بعد حب داخلٍ والحبّ تشربهٔ فؤادك داء (2)

میں نے اس کی محبت کے دل میں داخل ہونے کے بعد صحت پائی، محبت دل کے لئے بیماری ہے۔

بچھڑے کی محبت کو شرب سے تعبیر فرمایا کھانے سے تعبیر نہیں فرمایا کیونکہ پانی کا پینا اعضاء میں جلدی چلا جاتا ہے حتیٰ کہ پیٹ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ کھانا اتنا جلدی اعضا میں نہیں پہنچتا۔ اس معنی پر ایک تابعی نے زیادتی کی ہے اس نے اپنی بیوی عثمہ سے کہا: وہ کسی معاملہ میں اس پر ناراض ہوا تو اسے طلاق دے دی حالانکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

عثمہ کی محبت میرے دل میں اتر گئی اور جنگل میں خوف زدہ کے ساتھ چلتی ہے۔

وہ محبت وہاں تک سرایت کر گئی ہے جہاں تک نہ کوئی پینا پہنچتا ہے نہ کوئی غم اور نہ کوئی خوشی پہنچتی ہے۔ جب میں اس سے کیا ہوا عہد یاد کرتا ہوں تو میں اڑنے کے قریب پہنچ جاتا ہوں کاش! انسان اڑ سکتا ہوتا۔

سدی اور ابن جریج نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توڑا اور اسے پانی میں بکھیر دیا۔ آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اس پانی سے پیو، وہ سب نے پیا۔ جو اس بچھڑے سے محبت کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سونے کا برادہ نکلا(3)، اور روایت ہے کہ کسی نے وہ پانی نہ پیا تھا مگر وہ مجنون ہوگیا تھا(4)۔ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: دریا میں اس کا بکھیرنا، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا۝ (طٰہٰ) (پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو)۔ اور رہا پانی کا پینا اور ہونٹوں پر سونے کے برادہ کا ظہور، اس کو اللہ تعالیٰ کا قول رد کرتا ہے: وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ یعنی تمہارا وہ ایمان جو تم اپنے زعم سے کہتے ہو نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ بعض نے فرمایا: یہ کلام نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ یہود کو توبیخ کرو یعنی اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرمائیں کہ بری ہیں تمہاری یہ اشیاء جو تم نے کیں اور جن کا تمہارے ایمان نے تمہیں حکم دیا(5)۔ بِئْسَمَا پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

"آپ فرمایئے: اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راتیں) الله کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور الله خوب جانتا ہے ظالموں کو"۔

جب یہود نے باطل دعوے کیے تو الله تعالیٰ نے ان دعووں کو اپنی کتاب میں ان کی طرف سے بیان فرمایا۔ جیسے الله تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ:80) اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ بجز گنتی کے چند دن۔ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (البقرہ: 111) اور انہوں نے کہا: ہرگز داخل نہ ہوں گے جنت میں مگر جو یہودی یا نصرانی ہوں گے) اور انہوں نے کہا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) (ہم الله کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

الله تعالیٰ نے انہیں جھوٹا ثابت کیا اور اس پر حجت لازم فرمائی۔ اور فرمایا: اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو۔ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ۔ دار آخرت سے مراد جنت ہے یعنی اگر تمہارے لئے جنت ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اقوال میں سچے ہو)۔ کیونکہ جس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ جنتی ہے تو اس کے نزدیک دنیوی زندگی سے موت محبوب ہوتی ہے کیونکہ اسے وہاں جنت کی نعمتیں ملیں گی اور اس سے دنیا کی تکالیف ختم ہو جائیں گی۔ پس وہ اپنے اعمال کی قباحت اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) کے قول کی وجہ سے اپنے کفر کی معرفت کی وجہ سے اور دنیا پر حرص کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے رک گئے (1)۔ اسی وجہ سے الله تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنے سچے قول کے ساتھ خبر دی وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ یہ ان کے جھوٹ کی تحقیق کے طور پر فرمایا اگر وہ تمنا کرتے تو مر جاتے اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: الله تعالیٰ نے انہیں تمنا کے اظہار سے پھیر دیا اور اس سے روک دیا تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معجزہ بن جائے۔ یہ تین وجوہ تھیں ان کے تمنا کو ترک کرنے کی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے تحت روایت کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے ایک فریق کے جھوٹا ہونے پر موت کی دعا تو کرو (2)۔ تو انہوں نے دعا نہ کی کیونکہ انہیں اپنے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: تمنا کبھی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی دل سے ہوتی ہے پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے دل سے تمنا نہیں کی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ اگر وہ دلوں کے ساتھ تمنا کرتے تو اسے اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کر دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت کو باطل کر دیں۔ یہ بالکل واضح ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَالِصَةً۔ اس کی نصب کان کی خبر کی بنا پر ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال بنادے۔ اور عِنْدَ اللّٰهِ خبر ہو۔ اَبَدًا ظرف زمان ہے قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے جیسے حین اور وقت قلیل اور کثیر کے لئے استعمال ہوتے ہیں، عمر کی ابتدا سے موت تک کی مدت یہاں مراد ہے۔ بِمَا میں ما بمعنی الذی ہے اور عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: قدمتہ، اور ما مصدریہ ہو تو عائد کی ضرورت نہیں ہے اَیْدِیْهِمْ محل رفع میں ہے یا سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کسرہ کے ساتھ اس کے ثقل کی وجہ سے۔ اگر یہ محل نصب میں ہو تو تو اسے نصب دے گا کیونکہ نصب خفیف ہے اور شعر میں ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

''اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ یعنی یہود زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا بعض علماء نے فرمایا مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے پہلے احرص محذوف ہے کیونکہ انہیں اپنے کرتوتوں کی معرفت تھی۔ اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لئے کوئی خیر نہیں ہے اور مشرکین عرب صرف دنیوی زندگی کو جانتے تھے، آخرت کے متعلق انہیں کوئی علم نہ تھا۔ آپ نے ان کے شاعر کا قول ملاحظہ نہیں کیا:

تمتع من الدنيا فانك فانٍ ... من النشوات والنساء الحسان

تو نشہ اور حسین عورتوں سے لطف اندوز ہولے کیونکہ تو فنا ہونے والا ہے۔

اَحَدُهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: حَيٰوةٍ پر کلام مکمل ہے، پھر مشرکین کے گروہ کے متعلق نئے سرے سے خبر دی جارہی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مجوسی ہیں (1) اور چھینک مارنے والے کو اپنی زبان میں دعا دیتے تھے جس کا معنی ہے: تو ہزار سال زندہ رہ۔ ہزار کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ یہ حساب میں عقد کی انتہا ہے (2)۔ حسن کا نظریہ یہ ہے کہ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد مشرکین عرب ہیں ان کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ عمر کے لمبا ہونے کی تمنا کرتے تھے (3)۔ سنة کی اصل سنهة ہے بعض نے فرمایا سنوۃ ہے۔ بعض نے فرمایا اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے ولتجدنهم و طائفة من الذين اشركوا احرص الناس على حياة۔ (تم انہیں اور مشرکین کے ایک طائفہ کو پاؤ گے زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ، یَوَدُّ اصل میں یودد تھا، دال کو دال میں ادغام کیا گیا تا کہ ایک جنس کے دو متحرک حرف جمع نہ ہو جائیں دال کی حرکت واؤ کو دی گئی تا کہ یہ دلالت کرے کہ ایسا کیا گیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے وَدَدْتُ، اس صورت میں یودّ، واؤ کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے یودّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ نحویوں کا ھُوَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ احد جو پہلے گزر چکا اس کے لئے ضمیر ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: ما احدھم بمزحزحه۔ اور مبتدا کی خبر مجرور ہے۔ اَنْ یُّعَمَّرَ، بمزحزح کا فاعل ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: تعمیر کے لئے ضمیر ہے، تقدیر یوں ہوگی وما التعمیر بمزحزحه۔ اور خبر مجرور ہے اَنْ یُّعَمَّرَ، اس قول کے مطابق تعمیر کا بدل ہے۔ طبری نے ایک فرقہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ھو عماد ہے (1)، (اسی کو فصل بھی کہتے ہیں)

میں کہتا ہوں: اس قول میں بُعد ہے کیونکہ عماد وہ ہوتی ہے جو دو متلازم چیزوں کے درمیان آجائے۔ مثلاً ان کان ھذا ھو الحق اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولکن کانوا ھم الظالمین (پہلی آیت میں کان کے اسم اور خبر کے درمیان ہے اور اسی طرح دوسری مثال میں بھی ہے) بعض علماء نے فرمایا: ما عاملہ حجازیہ ہے، اور ھو اس کا اسم ہے اور خبر بمزحزحه ہے، ایک طائفہ نے کہا: ھو ضمیر شان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اس میں بعد ہے کیونکہ نحویوں سے محفوظ قول یہ ہے کہ ضمیر شان وہ ہوتی ہے جس کی تفسیر ایسے جملہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو حرف جر سے سلامت ہو۔ (بمزحزحه)، الزحزحة کا مطلب ہے دور کرنا۔ کہا جاتا ہے: زحزحته میں نے اسے دور کیا۔ فتزحزح، یعنی وہ دور ہوا، اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے متعدی استعمال کیا ہے۔

یا قابض الروح من نفس اذا احتضرت وغافر الذنب زحزحنی عن النار

اے نفس سے روح قبض کرنے والے! جب وہ قریب المرگ ہو جائے۔ اے گناہوں کو معاف کرنے والے! مجھے آگ سے بچالے۔

ذوالرمہ نے کہا:

یا قابض الروح عن جسم عصی زمنًا وغافر الذنب زحزحنی عن النار

اے جسم سے روح قبض کرنے والے! جس نے ایک زمانہ نافرمانی کی۔ اے گناہوں کو بخشنے والے! مجھے آگ سے بچا۔

ایک اور شاعر نے لازم معنی میں استعمال کیا ہے:

خلیلی مابال الدجی لا یتزحزح وما بال ضوء الصبح لا یتوضح

اے میرے دو دوستو! اس تاریکی کو کیا ہے یہ تو دور ہی نہیں ہوتی اور صبح کی روشنی کو کیا ہے واضح نہیں ہوتی۔

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آگ سے ستر سال دور کر دے گا☆۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ یعنی یہ جو ہزار سال زندہ رہنے کی تمنا کرنے والے ہیں ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ جن قراء نے تعلمون تا کے ساتھ پڑھا ہے (1) ان کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے: قل لهم يا محمد الله بصيرٌ بما تعملون۔ اے پیارے محمد! تم انہیں فرماؤ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر فرمایا۔ اس کا یہ معنی ہے کہ وہ خفیہ امور کو جاننے والا ہے اور البصیر عرب کلام میں اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو جاننے والا ہو اس کے متعلق باخبر ہو۔ عربوں کا قول ہے: فلان بصير بالطب و بصير بالفقه و بصير بملاقات الرجال، فلاں طب کو جاننے والا ہے فلاں فقہ کو جاننے والا ہے، مردوں سے ملاقات کو جاننے والا ہے۔

شاعر نے کہا:

فان تسألونی بالنساء فانی بصیر بادواء النساء طبیب

اگر تم مجھ سے عورتوں کے متعلق پوچھو گے تو میں عورتوں کے امراض کو جاننے والا اور طبیب ہوں۔

خطابی نے کہا البصیر کا معنی عالم ہے۔ البصیر کا معنی دیکھنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر ذکر فرمایا اس کا مطلب ہے: دیکھی جانے والی اشیاء بنانے والا ہے۔ یعنی ان اشیاء کا ادراک کیا جاتا ہے آنکھوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے جو ادراک کرنے والا آلہ اور قوت پیدا فرمائی ہے اس کے ساتھ ان کا ادراک کیا جاتا ہے وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝ (آل عمران) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا بنانے والا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۝

''آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل علیہ السلام کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (یہ) تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے''۔

اس آیت کے نزول کا سبب یہ کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے کہا: کوئی نبی نہیں آیا مگر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ایک فرشتہ وحی اور رسالت کے ساتھ آیا، تمہارا ساتھی (فرشتہ) کون ہے تاکہ ہم آپ کی اتباع کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل، انہوں نے کہا: وہ تو جنگ و جدل کو لاتا ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے جو بارش اور رحمت لاتا ہے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے لِّلْكٰفِرِيْنَ۝ تک یہ آیت نازل فرمائی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ، انہ میں ضمیر دو معانی کا احتمال رکھتی ہے پہلا معنی یہ کہ فان الله نزل۔ یعنی اللہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب من کان عدوا لجبریل، حدیث نمبر 4120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے جبریل کو آپ کے دل پر اتارا۔ دوسرا معنی یہ کہ فان جبریل۔ یعنی جبریل نے قرآن کو آپ کے دل پر اتارا۔ قلب کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ عقل، علم اور معرف کے حصول کی جگہ ہے۔ یہ آیت جبریل کے شرف اور اس کے دشمنوں کی مذمت پر دلالت کرتی ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کے علم سے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اس سے مراد تورات ہے۔ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ہے۔ یہ جبریل کے دشمنوں کے لیے وعید اور مذمت ہے اور یہ اعلان ہے کہ بعض کی عداوت اللہ تعالیٰ کی عداوت کا تقاضا کرتی ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا معصیت ہے، اس کی اطاعت سے اجتناب ہے اور اس کے اولیاء سے دشمنی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے دشمنی رکھنا، اسے عذاب دینا، اور اس پر عداوت کے اثر کا اظہار کرنا ہے (2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل کا خصوصی ذکر کیوں فرمایا اگرچہ ملائکہ کا ذکر ان کو بھی شامل تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے شرف کی وجہ سے خصوصی ذکر فرمایا۔ جیسا کہ فرمایا: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ (الرحمن) فَاكِهَةٌ (پھل) میں نَخْلٌ (کھجور) اور رُمَّانٌ (انار) کا ذکر تھا لیکن ان کے شرف کے لئے علیحدہ ذکر فرما دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ یہود نے ان کا ذکر کیا تھا، آیت کا نزول ان کے سبب سے تھا پس ان کا ذکر واجب تھا تا کہ یہود یہ نہ کہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں سے عداوت نہیں کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے تخصیص کے ذریعے ان کی تاویل کو باطل کرنے کے لئے نص قائم فرما دی، علماء لغت نے جبریل اور میکائیل میں کئی لغات بیان کی ہیں۔ جبریل میں دس لغات ہیں:

۱- جبریل یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت حسان نے کہا: و جبريل رسول الله فينا (جبریل ہم میں اللہ کے رسول ہیں۔)

۲- جَبریل۔ (جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءت ہے، ابن کثیر سے مروی ہے کہ اس نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ جبریل اور میکائیل پڑھ رہے تھے میں ہمیشہ ان کو ایسا ہی پڑھوں گا۔

۳- جَبْرَئِيل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ جیسے جبرعیل) جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے (3) انہوں نے دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

شهدنا فما تلقى لنا من كتيبة مدى الدهر الا جَبْرَئِيلُ امامُها

(ہم نے دیکھا پس ہمیں ایک زمانہ کوئی لشکر نہ ملا مگر جبریل اس کے آگے تھا) یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

۴- جَبْرَئِل (علی وزن جبرعل) مقصور ہے یہ ابو بکر عن عاصم کی قراءت ہے۔(1)
۵- اس کی مثل ہے مگر لام پر شد ہے یہ یحییٰ بن یعمر کی قراءت ہے۔(2)
۶- جبرائل (را کے بعد الف پھر ہمزہ) اس طرح عکرمہ نے پڑھا ہے۔
۷- اس کی مثل ہے لیکن ہمزہ کے بعد یا ہے۔
۸- جبرئییل (ہمزہ کے بعد دو یا کے ساتھ) اس طرح اعمش اور یحییٰ بن یعمر نے پڑھا ہے۔(3)
۹- جبرئین۔ (جیم مفتوحہ، ہمزہ مکسورہ اور اس کے بعد یا اور نون کے ساتھ)
۱۰- جبرین (جیم کے کسرہ، یا کی تسکین اور بغیر ہمزہ کے نون کے ساتھ) یہ بنی اسد کی لغت ہے(4)۔ طبری نے کہا: اس طرح نہیں پڑھا گیا۔ نحاس نے کہا اور اس نے ابن کثیر کی قراءت ذکر کی ہے...... کلام عرب میں فَعليل معروف نہیں ہے۔ فِعليل ہے۔ جیسے دلہیز، قطمیر، برطیل وغیرہ۔ یہ انکار نہیں کیا جاتا کہ جو عجمی کلام میں ہو اس کی عرب کلام میں مثال نہیں اور نہ یہ انکار ہے کہ اس میں تغیر کثیر ہے جیسے عرب کہتے ہیں: ابراھیم، ابرھم، ابراھم و ابراھام۔ بعض علماء نے کہا: جبریل عجمی اسم ہے عربوں نے اسے عربی بنایا اسی وجہ سے اس میں کئی لغات ہیں اور اسی وجہ سے یہ منصرف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ عربی ہیں ان کو جبریل واضح عربی زبان میں لے کر آئے ہیں۔ نحاس نے کہا: جبریل کی جمع مکسر جباریل بنائی جاتی ہے اور میکائیل میں چھ لغات ہیں:
۱- میکایل۔ یہ نافع کی قراءت ہے۔ میکائیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ) یہ حمزہ کی قراءت ہے۔ میکال۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور ابو عمرو و حفص عن عاصم کی قراءت ہے۔

ابن کثیر سے تین وجوہ مروی ہیں۔ کعب بن مالک نے کہا:

و یوم بدر لقینا کم لنا مددٌ　　فیه مع النصر میکالٌ و جبریل

جنگ بدر میں ہمارا تم سے مقابلہ ہوا تو ہمارے لئے مدد تھی اور اس مدد میں میکائیل و جبریل تھے۔

ایک اور شاعر نے کہا:(5)

عبدوا الصلیب و کذّبوا بمحمداً　　و بجبریل و کذبوا میکالا

انہوں نے صلیب کی عبادت کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور جبریل و میکائیل کو جھٹلایا۔

۴- میکئیل جسے میکعیل یہ ابن محیصن کی قراءت ہے۔
۵- میکاییل (دو یا) یہ اعمش کی قراءت ہے۔ (ان سے اختلاف کے ساتھ)
۶- میکاءل۔ جیسے کہا جاتا ہے اسراءل (ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ) یہ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ حضرت ابن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　5۔ ایضاً

عباس نے ذکر کیا ہے کہ جبر، میکا اور اسراف یہ تمام عجمی الفاظ ہیں۔ ان کا معنی عبد، غلام ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے (1)۔ اسی سے حضرت ابو بکر صدیق کا قول ہے جب انہوں نے مسیلمہ کذاب کی سجع سنی۔ یہ ایسی کلام ہے جو اِل سے نہیں ہے یعنی اللہ کی طرف سے نہیں ہے (2)۔ قرآن حکیم میں ہے: لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً (توبہ:10) ایک تاویل کے مطابق اس آیت میں اِلًّا سے مراد اللہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

ماوردی نے کہا: جبرئیل اور میکائیل دو اسم ہیں ایک کا معنی عبداللہ اور دوسرے کا معنی عبیداللہ ہے کیونکہ ایل سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جبر کا معنی عبد ہے اور میکا کا معنی عبید ہے، گویا جبریل کا معنی عبداللہ اور میکائیل کا معنی عبیداللہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے مفسرین میں اس کی مخالفت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض مفسرین نے یہ زیادہ کیا ہے: اسرافیل عبدالرحمٰن (3)۔ نحاس نے کہا: جس نے حدیث کی تاویل کی کہ جبر سے مراد عبد اور ائل سے مراد اللہ ہے تو انہیں یہ کہنا واجب ہے: ھذا جبریلُ، رایت جبریلَ، مررت بجبریلِ اور یہ نہیں کہا جاتا۔ تو ثابت ہوا کہ حدیث کا مطلب ہے یہ مسمیٰ ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اگر اس طرح ہوتا جس طرح انہوں نے کہا ہے تو یہ منصرف ہوتا۔ اس کا منصرف نہ ہونا دلیل ہے کہ یہ اسم واحد، مفرد ہے، مضاف نہیں ہے۔ عبدالغنی الحافظ نے، افلت بن خلیفہ...... وہ فلیت العامری ہے جو ابواحسان ہے...... عن جسرہ بنت دجاجہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اللھم رب جبریل و میکائیل و اسرافیل اعوذبك من حر النار و عذاب القبر۔ اے اللہ! جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب میں تجھ سے آگ کی گرمی اور عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹

''اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے''۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ ابن صوریا کا جواب ہے جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جس کو ہم پہچانتے ہوں۔ آپ پر کوئی واضح آیت نہیں اتری کہ ہم آپ کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ یہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ (4)

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

''کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے۔ بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لائی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا یہاں واو عطف کے لئے ہے اس پر الف استفہام داخل ہوا ہے، جیسے فاء پر داخل ہوتا ہے جیسے أفحكم الجاهلية۔ أفانت تسمع الصم۔ افتتخذونه و ذريته، اور جس طرح ثم پر داخل ہوتا ہے۔ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: یہ واو زائدہ ہے، کسائی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اَوْ تھا تسہیل کے لئے واو کو

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

حرکت دی گئی۔ ایک قوم نے اوْ واؤ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ بل کے معنی میں ہوگا، جیسے کوئی کہتا ہے: لاضربنك پھر جواب دینے والا کہتا ہے: او یکفی اللہ۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ تمام تکلف ہے۔ صحیح سیبویہ کا قول ہے كُلَّمَا ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ آیت میں مراد مالک بن صیف ہے، اس کو ابن صیف بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا: اللہ کی قسم! ہماری کتاب میں ہم سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیا گیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہود نے عہد کیا تھا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ مل کر مشرکین عرب کی مخالفت کریں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا۔ عطا نے کہا: یہ وہ عہود تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان تھے۔ ان کو انہوں نے توڑا۔ جیسے قریظہ اور نضیر نے کیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ (انفال)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ، النبذ کا معنی پھینکنا ہے، اسی سے النبیذ، المنبوذ پھینکا ہوا۔

ابوالاسود نے کہا:

وخبرنی من کنت ارسلت انما　　اخذت کتابی معرضاً بشمالکا

نظرت الی عنوانہ فنبذتہ　　کنبذك نعلاً اخلقت من نعالکا

مجھے اس نے بتایا جسے میں نے بھیجا تھا تو نے میری کتاب اعراض کرتے ہوئے لی۔ اور تو نے اس کے عنوان کو دیکھا تو تو نے اسے اس طرح پھینک دیا جس طرح تو پرانی جوتی پھینکتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ان الذین امرتھم ان یعدلو　　نبذوا کتابك واستحلوا المحرما

بے شک وہ لوگ جنہیں تو نے عدل کرنے کا حکم دیا انہوں نے تیری کتاب کو پھینک دیا اور حرام کو حلال کیا۔

یہ مثال اس شخص کے لئے دی جاتی ہے جو کسی شے کو حقیر سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے۔ عرب کہتے ہیں: اجعل ھذا خلف ظھرك دبراً منك و تحت قدمك یعنی اس کام کو چھوڑ دے اور اس سے اعراض کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (ہود: 92) (اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت) فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:

تمیم بن زید لا تکونن حاجتی　　بظھرٍ فلا یعیا علی جوابھا

اے تمیم بن زید! میری حاجت کو پشت کے پیچھے نہ ڈال مجھے اس کا جواب عاجز نہیں کرے گا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ یہ مبتدا ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ فعل مستقبل خبر ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یہ رسول کی نعت ہے اور حال کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا جائز ہے نَبَذَ فَرِيْقٌ یہ لَمَّا کا جواب ہے مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ کتاب اللہ، نبذ کی وجہ سے منصوب ہے، مراد تورات ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور آپ کو جھٹلانا، یہ کتاب اللہ (تورات) کو پھینکنا ہے۔ سدی نے کہا: انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: كِتٰبَ اللّٰهِ سے قرآن مراد لینا بھی جائز ہے۔ شعبی نے کہا: قرآن ان کے ہاتھوں میں تھا اسے پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل انہوں نے ترک کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: انہوں نے اسے ریشم و دیباج میں لپیٹ دیا اور اسے سونے اور چاندی سے مزین کر دیا لیکن اس کے حلال کو حلال نہ کیا اور اس کے حرام کو حرام نہ کیا۔ یہی نبذ ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ بے علموں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی۔ جب انہوں نے جاہلوں والا فعل کیا۔ یہ لفظ بھی آئیں گے کہ انہوں نے علم کے باوجود کفر کیا۔(2)

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور پیروی کرنے لگے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں حالانکہ سلیمان علیہ السلام نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو۔ نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت اور ماروت تھے۔ اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا۔ (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس میں جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لئے نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح) کو۔ کاش! وہ کچھ جانتے"۔

اس میں چوبیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ۔ یہ اس گروہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جنہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں جادو کی اتباع کی، وہ یہود تھے۔ سدی نے کہا: یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تورات کے ساتھ معارضہ کیا تو تورات اور قرآن عقائد و نظریات میں متفق نکلے تو انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان کا رسولوں میں ذکر کیا تو ان کے کسی عالم نے کہا: محمد کہتا ہے کہ ابن داؤد نبی تھا اللہ کی قسم! وہ تو جادوگر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا (1) یعنی شیطانوں نے بنی آدم کے دلوں میں ڈالا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں، پرندوں اور جنوں کو مسخر کیے ہوئے ہیں یہ سب جادو کے بل بوتے پر ہے۔ کلبی نے کہا: شیطانوں نے جادو اور تلبیس کا عمل لکھا آصف کی زبان پر جو حضرت سلیمان کا کاتب تھا۔ انہوں نے ان کتب کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے مصلی کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہی بخشی اور حضرت سلیمان کو اس کا علم نہ تھا جب حضرت سلیمان کا وصال ہوا تو انہوں نے اس جادو کو نکالا اور لوگوں کو کہا: اس علم کے ذریعے سلیمان تم پر حکومت کرتے تھے۔ پس لوگوں نے اس جادو کو سیکھا۔

بنی اسرائیل کے علماء نے کہا: معاذ اللہ! یہ حضرت سلمان علیہ السلام کا علم نہیں ہوسکتا اور بے وقوف نے کہا: یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے۔ پس لوگ اس جادو کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے انبیاء کی کتب کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت سلیمان کا عذر نازل فرمایا اور جو ان پر تہمت لگائی گئی تھی اس کی براءت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ۔ عطا نے کہا تَتْلُوا کا معنی تقرؤا ہے یعنی تلاوت کرنا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تَتْلُوا کا معنی تتبع اور پیروی کرنا ہے، جیسے تو کہتا ہے: جاء القوم یتلو بعضهم بعضاً بعض بعض کے پیچھے آئے۔ (2)

طبری نے کہا: اتَّبَعُوْا بمعنی فضلوا (فضلیت دینا) (3)

میں کہتا ہوں: ہر وہ شخص جو کسی کی اتباع کرتا ہے اسے اپنے آگے کرتا ہے تو وہ اسے فضیلت دیتا ہے۔ تتلوا کا معنی تلت یعنی ماضی کے معنی میں ہے۔ شاعر نے کہا:

واذا مررت بقبره فاعقر به کوم الهجان و کل طرف سابح

وانضح جوانب قبره بدمائها فلقد یکون اخادم و ذبائح

جب تو اس کی قبر کے پاس سے گزرے تو عمدہ اور تیز رفتار اونٹنیوں کو ذبح کر اور قبر کی ہر طرف ان کا خون چھڑک دے تحقیق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وہ خون بہانے والا اور ذبح کرنے والا تھا۔

اس شعر میں قد یکون بمعنی کان ہے، اور (ما) اتبعوا کا مفعول ہے یعنی کچھ شیطانوں نے حضرت سلیمان کے خلاف کیا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ بعض علماء نے فرمایا: ما نافیہ ہے لیکن یہ نظم کلام کے اعتبار سے کلام کی صحت کے اعتبار سے درست نہیں۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ملک سلیمان سے مراد ان کی شرع اور ان کی نبوت ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے: علی عهد ملك سلیمان اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فی ملك سلیمان ہے۔ یعنی ان کے قصص، صفات اور اخبار میں (2)۔ فراء نے کہا: ایسی جگہ پر علی اور فی درست ہیں۔

علی فرمایا اور بعد نہیں فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ (الحج: 52)

اس حدیث میں امنیتہ کا معنی ہے: اس کی تلاوت میں۔ شیطان کا معنی اور اس کا اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں شیطان سے مراد شیاطین الجن ہیں۔ اس اسم سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد انسانوں کے شیاطین ہیں جو گمراہی میں سرکشی کرتے ہیں جیسے جریر کا قول ہے۔

ایام یدعوننی الشیطان من غزلی و کن یھویننی اذ کنت شیطاناً

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی برأت فرمائی کسی آیت میں یہ نہیں گزرا کہ کسی نے حضرت سلیمان کی طرف کفر کی نسبت کی ہو لیکن یہود نے آپ کی طرف جادو کی نسبت کی لیکن جب جادو کفر تھا تو یہ ایسے ہو گیا جیسے انہوں نے کفر کی طرف ان کی نسبت کی۔

پھر فرمایا: وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا اللہ تعالیٰ نے جادو کی تعلیم کی وجہ سے ان کے کفر کو ثابت کیا (3)۔ یُعَلِّمُوْنَ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے اور خبر ثانی کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے، عاصم کے سوا کوفیوں نے و لکن الشیاطین یعنی لکن کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الشیاطین کے نون کو رفع دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ انفال میں ہے لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال: 17) ابن عامر نے ان سے موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے تشدید اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے لکن اس کے دو معانی ہیں۔ ماضی کی خبر کی نفی اور مستقبل کی خبر کا اثبات۔ یہ تین کلمات سے بنایا گیا ہے۔ لام، کاف، ان لانفی ہے۔ ک خطاب ہے اور اِن اثبات و تحقیق ہے۔ استثقال کی وجہ سے ہمزہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ کبھی مثقلہ اور مخففہ ہوتا ہے جب مثقلہ ہو تو نصب دیتا ہے جیسے ان مثقلہ نصب دیتا ہے اور جب مخففہ ہو تو رفع دیتا ہے جیسے اِنْ مخففہ عن المثقلہ سے رفع دیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** السِّحْرَ (جادو)۔ بعض علماء نے فرمایا: سحر کا معنی حیلوں اور خیالوں سے چیز کو کچھ اور بنا کر دکھانا،

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ساحر (جادوگر) کچھ اشیاء اور معانی کرتا ہے وہ جس کے لئے جادو کیا گیا ہوتا ہے اسے وہ اپنی حقیقت کے خلاف تصور کرتا ہے جیسے وہ شخص جو دور سے سراب کو دیکھتا ہے اور وہ اسے پانی تصور کرتا ہے۔ جیسے چلنے والی کشتی میں بیٹھا ہوا شخص یہ خیال کرتا ہے کہ درخت اور پہاڑ اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سحرت الصبی سے مشتق ہے جب تو اسے دھوکا دے اور تو اسے کھیل میں ڈال دے۔ التسحیر اس کی مثل ہے۔

لبید نے کہا:

فان تسالینا فیم نحن فاِنّنا　　عصا فیر من ھذا الانام المسَحّرِ

اگر تو ہمارے متعلق پوچھے کہ ہم کس حیثیت میں ہیں تو ہم اس مسحر مخلوق میں سے چڑیاں ہیں۔

ایک اور نے کہا:

اُرانا مُوضعِین لامرِ غیبٍ　　و نسحَرُ بالطعام و بالشراب

عصافیر و ذبان و دودٌ　　اجرأ من مجلحَة الذئاب

ہم موت کے لئے جلدی کرنے والے ہیں اور ہمیں کھانے پینے کے ساتھ جادو کیا گیا ہے۔ چڑیاں مکھیاں اور کیڑے ہیں اور جری بھیڑیے سے زیادہ جری ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما انت من المسحرین۔ کہا جاتا ہے: المسحر وہ ہوتا ہے جو سحر والا پیدا کیا گیا ہو کبھی اس کا معنی المعلّلین بھی کیا جاتا ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو طعام کھاتے ہیں مشروب پیتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الخفاء ہے کیونکہ جادو خفیہ عمل کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی الصرف ہے کہا جاتا ہے: ما سحرك عن کذا یعنی کس چیز نے تجھے اس سے پھیر دیا۔

السِّحْرَ، جو اپنی جہت سے پھیرا گیا ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الاستمالہ ہے فقد سحرك اس نے تجھے مائل کیا۔ بعض نے فرمایا: بل نحن قوم مسحورون یعنی ہم پر جادو کیا گیا ہے تخیل کی وجہ سے ہماری معرفت زائل کر دی گئی ہے۔ جوہری نے کہا: السِّحْرَ کا معنی الأخذہ ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ لطیف ہو اور باریک ہو وہ سحر ہے۔ سحرہ یسحرہ سحراً والساحر، سحرہ کا معنی دھوکا دینا بھی ہے۔ یہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: ہم زمانہ جاہلیت میں السحر کو العِضہ کہتے تھے اور عربوں کے نزدیک العضہ کا مطلب بہت زیادہ ملمع سازی کرنا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو کہتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

اعوذ بربی من النافثا　　ت فی عِضہ العاضہ المُعضہ

میں اپنے رب سے جادو میں پھونکے مارنے والیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 4:** کیا جادو کی حقیقت ہے یا نہیں۔ غزنوی حنفی نے ''عیون المعانی'' میں ذکر کیا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک سحر دھوکا ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک یہ وسوسہ اور امراض ہیں۔ فرمایا: ہمارے نزدیک اس کی اصل طلسم

ہے جو ستاروں کی تاثیر پر مبنی ہوتا ہے جیسے فرعون کی لاٹھیوں کے بارے میں سورج کی تاثیر۔ یا اس میں شیاطین کی تعظیم ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی مشکل کو آسان کردیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نزدیک یہ حق ہے اور اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ پھر جادو میں کچھ وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کی صفائی سے ہوتا ہے جیسے الشعوذۃ (مداری کا تماشا)۔ پھرتی سے کرتب دکھانے والے کو الشعوذی کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: الشعوذۃ بادیہ نشینوں کے کلام سے نہیں ہے۔ یہ ہاتھوں میں پھرتی ہوتی ہے یہ جادو کی طرح ہے۔ اس سے کلام کچھ ہوتا ہے جو محفوظ کیا جاتا ہے اور دم ہوتے ہیں جو اللہ کے اسماء سے پڑھے جاتے ہیں کبھی یہ شیاطین کے عہود سے ہوتا ہے کبھی دواؤں سے اور دھوؤں وغیرہ سے ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** رسول اللہ نے کلام میں فصاحت اور زبان میں طاقت کو سحر کہا ہے۔ فرمایا: ان من البیان لسحرا (بیان میں سے بعض جادو ہوتے ہیں) اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کیونکہ اس میں بھی باطل کو درست کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ سامع اسے حق سمجھنے لگتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد اِنّ من البیان لسحرا (☆)، فصاحت و بلاغت کی مدح اور بیان کی تفضیل کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے پہلا قول اصح ہے اور اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: فلعلّ بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض (1) (شاید کوئی تم میں سے دوسرے سے اپنی حجت کو بیان کرنے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہو) اور فرمایا: اِنّ ابغضکم الیّ الثرثارون المتفیھقون تم میں سے میرے نزدیک مبغوض لوگ زیادہ بولنے والے ہیں۔ الثرثرۃ، کلام کی کثرت اور اسے گھمانا ہے۔ کہا جاتا ہے: **فھو ثرثار مھذار** زیادہ باتیں کرنے والا، ہنسانے والا۔ المتفیھق بھی اسی طرح ہے۔ ابن زید نے کہا: **فلان یتفیھق فی کلامہ**۔ وہ اپنے کلام میں وسعت رکھتا ہے۔ اس نے کہا اس کی اصل الفھق ہے جس کا معنی بھرنا ہے۔ گویا ایسا شخص کلام کے ساتھ اپنے منہ کو بھر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ معنی جو ہم نے بیان کیا ہے اس کی تفسیر عامر الشعبی جو حدیث کے راوی ہیں اور صعصعہ بن صوحان نے کی ہے، دونوں حضرات نے کہا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ان من البیان لسحرا ایک شخص پر حق ہوتا تھا (2) اور وہ حقدار سے زیادہ چرب زبان ہوتا تھا وہ اپنے بیان سے قوم کو مسحور کر دیتا تھا تو وہ حق لے جاتا تھا حالانکہ اس پر حق ہوتا تھا۔ علماء نے بلاغت اور لسانت کی تعریف کی ہے جب وہ لمبی گفتگو کرنے اور باطل کو حق ثابت کرنے کی حد تک نہ پہنچے۔ یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** جادو کچھ ایسا ہوتا ہے جس کا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو لوگوں کی صورتوں میں تبدیلی کرنے اور جانوروں کی ہیئت میں ان کو نکالنے، اور ایک مہینہ کی مسافت ایک رات میں طے کرنے، ہوا میں اڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو اس قسم کا فعل کرے تاکہ لوگوں کو وہم دلائے کہ یہ حق ہے تو اس کی طرف سے کفر ہوگا۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم قشیری کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح بخاری، باب من اقام البینۃ بعد الیمین، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی الشعر، حدیث نمبر 4359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4651

عمرو نے کہا: جو یہ کہتا ہے کہ ساحر حیوان کو ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف تبدیل کرتا ہے وہ انسان کو گدھا بنا دیتا ہے اور وہ اجساد کو نقل کرنے، انہیں ہلاک کرنے اور انہیں تبدیل کرنے پر قادر ہے وہ ایسے ساحر کے قتل کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء سے کفر کرنے والا ہے وہ ان کی آیات اور معجزات کی مثل دعویٰ کرنے والا ہے اس طرح تو نبوت کی صحت کا علم درست نہیں رہے گا کیونکہ جب اس کی مثل حیلہ سے حاصل ہو جائے گا اور رہا وہ جو کہتا ہے کہ جادو، دھوکا، تمویہات، تخیلات اور جھوٹ کا نام ہے وہ جادوگر کو قتل کرنے کو واجب نہیں کہتا مگر یہ کہ اگر جادوگر اپنے فعل میں کسی کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**: اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ جادو ثابت ہے اس کی حقیقت ہے۔ عام معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق استر آبادی کا نظریہ یہ ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تمویہ اور تخیل ہے اور وہم دلانا ہے کہ چیز اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔ یہ شعبدہ بازی اور ہاتھوں کی پھرتی کی ایک صورت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾ (طٰہٰ) (یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں)۔

یہ نہیں فرمایا کہ یہ حقیقت میں دوڑ رہے تھے بلکہ فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ (اسے خیال گزرتا تھا) اسی طرح فرمایا: سَحَرُوٓا أَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف: 116)۔ (انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ تخیل وغیرہ جادو میں سے ہے لیکن اس کے بعد ایسے امور ثابت ہیں عقل جن کو جائز قرار دیتی ہے اور نقل بھی ان کے متعلق وارد ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں جادو اور اس کی تعلیم کا ذکر آیا ہے اگر اس کی حقیقت نہ ہوتی تو اس کی تعلیم نہ ہوتی، نہ اللہ تعالیٰ خبر دیتے کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ چیز دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جادوگروں کے واقعہ میں فرمایا: وَجَآءُو بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾ (اعراف) (اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا) اور سورہ فلق میں اس کا ذکر فرمایا۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کے نزول کا سبب لبید بن اعصم کا جادو تھا۔ جس کا ذکر بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کیا جس کو لبید بن اعصم کہا جاتا تھا(1)۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جادو ختم ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی شفاء علت کے ختم ہونے اور مرض کے زائل ہونے کے ساتھ ہوتی ہے۔

یہ دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخبار اس کے وجود اور وقوع پر قطعی ہیں۔ اور صاحب عقل لوگوں کا اس پر اجماع ہے۔ چند معتزلیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ان کی اہل حق کی مخالفت قابل اعتناء نہیں، جادو عام ہو گیا ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی پھیلا ہوا تھا اور لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے اس کی اصل کا انکار نہیں کیا۔ سفیان نے ابو الاعور سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مصر کے شہروں میں سے ایک شہر میں جادو سیکھا گیا جس کو الفرما کہا جاتا تھا۔ پس جس نے اس کی تکذیب کی وہ کافر ہے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلانے والا ہے اور ایک مشاہدہ شدہ چیز کا انکار کرنے والا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب صفة ابليس و جنوده، حدیث نمبر 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 8:** ہمارے علماء نے فرمایا: اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جادوگر کے ہاتھ پر خارق للعادت عمل ظاہر ہو جو انسان کی قدرت میں نہیں ہوتا مثلاً مرض میں مبتلا کر دے، مرض کو ختم کر دے، عقل زائل ہو جائے، کوئی عضو ٹیڑھا کر دے۔ اس کے علاوہ چیزیں جن کا بندوں سے سرزد ہونا محال ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا: جادو میں یہ بعید نہیں کہ جادوگر کا جسم اتنا باریک ہو جائے کہ وہ کسی سوراخ یا چھوٹی سی کھڑکی میں داخل ہو جائے، بانس کے سرے پر کھڑا ہو جائے، باریک دھاگے پر چلنے لگے، ہوا میں اڑنے لگے، پانی پر چلنے لگے، کتے وغیرہ پر سوار ہو جائے، لیکن اس کے باوجود جادو نہ اس کا موجب ہوگا نہ اس عمل کے وقوع کی علت ہوگا نہ سبب مولد ہوگا اور نہ جادوگر اس میں مستقل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کو پیدا فرماتا ہے اور جادو کے پائے جانے کے وقت وہ اسے تخلیق فرما دیتا ہے جس طرح کھانے کے وقت سیر ہونا پیدا فرماتا ہے پانی پینے کے وقت سیرابی پیدا فرماتا ہے۔ سفیان نے عمار ذہبی سے روایت کیا ہے کہ ایک جادوگر ولید بن عقبہ کے پاس ایک رسی پر چل رہا تھا وہ گدھے کی دبر سے داخل ہوتا اور اس کے منہ سے نکل جاتا، جندب نے اس پر تلوار سونتی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ جندب بن کعب ازدی تھے جنہیں البجلی کہا جاتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: (میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کو جندب کہا جائے گا وہ تلوار مارے گا حق اور باطل کے درمیان فرق کر دے گا) اس کو جندب خیال کرتے تھے یہ جادوگر کا قاتل ہے۔ علی بن مدینی نے کہا: ان سے حارثہ بن مضرب نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ جادو کے وقت جو کچھ کرتا ہے جیسے مکڑی کا اتارنا، جوؤں اور مینڈک، دریا کا پھٹنا، عصا کا سانپ میں تبدیل ہونا، مردوں کو زندہ کرنا، جانوروں کو بلوانا اور اسی قسم کی دوسری آیات جو رسل سے ظاہر ہوئیں، یہ جادو میں سے نہیں ہیں۔ یہ معجزات اور ایسی دوسری چیزیں جن کا حکم قطعی ہے کہ وہ نہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ جادوگر کے ارادہ کے وقت ایسا نہیں کرے گا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: ہم اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اگر اجماع نہ ہوتا تو ہم جائز قرار دیتے۔

**مسئلہ نمبر 10:** جادو اور معجزہ کے درمیان فرق: ہمارے علماء نے فرمایا: جادو جادوگر وغیرہ سے پایا جاتا ہے کبھی اس کو ایک جماعت جانتی ہے اور ان کے لئے ایک وقت میں اس کا لانا ممکن ہوتا ہے اور معجزہ وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مثل اور اس کا معارض پیش کرنے کی کسی کو قدرت ہی نہیں دیتا، پھر جادوگر نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا پس اس سے جو صادر ہوتا ہے وہ معجزہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ معجزہ کے لئے نبوت کا دعویٰ اور اس کا چیلنج شرط ہے جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** فقہاء کا مسلم اور ذمی جادوگر کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان جب ایسے کلام سے جادو کرے جو کفر ہو تو اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہوتا ہے جیسے زندیق اور زانی ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر کہا ہے۔ فرمایا: وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (البقرہ:102) (اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا)

یہ امام احمد بن حنبل، ابوثور، اسحاق، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت حفصہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت قیس بن سعد اور سات تابعین سے جادوگر کا قتل کرنا مروی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، جادوگر کی حد تلوار سے اسے مارنا ہے۔ یہ ترمذی نے نقل کی ہے اور یہ قوی نہیں ہے۔ اسماعیل بن مسلم منفرد ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابن عیینہ نے اسماعیل بن مسلم عن الحسن کے سلسلہ میں مرسلاً روایت کی ہے اور بعض علماء نے عن الحسن عن الجندب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے آپ نے ایک جادوگرنی بیچی تھی جس نے جادو کیا تھا اور اس کی قیمت غلاموں کے آزاد کرنے میں لگائی تھی۔ ابن منذر نے کہا: جب کوئی شخص اقرار کرے کہ اس نے ایسے کلام سے جادو کیا ہے جو کفر تھا تو اس کا قتل کرنا واجب ہے اگرچہ وہ توبہ نہ بھی کرے اسی طرح اگر اس پر گواہوں سے ثابت ہو جائے اور وہ گواہ کلام کی ایسی صفت بیان کریں جس سے کفر لازم آتا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے...... اگر وہ کلام جو اس نے ذکر کیا ہے، جس کے ساتھ اس نے جادو کیا ہے، وہ کفر نہیں ہے تو اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اس نے مسحور میں کوئی جنایت پیدا کر دی جو قصاص کا موجب ہے تو اس نے یہ عمل عمداً کیا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ ایسی جنایت ہے جس میں قصاص نہیں ہے تو اس میں اس کی دیت ہوگی...... ابن منذر نے کہا: جب کسی مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا اختلاف ہو تو اس قول کی اتباع واجب ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ موافق ہو اور یہ جائز ہے کہ جو جادو جس کے کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ ایسا جادو ہو جو کفر ہو تو یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق ہے اور یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ نے جس جادوگرنی کے بیچنے کا حکم فرمایا وہ جادو کفر نہ ہو اور اگر کوئی جندب کی حدیث سے حجت پکڑے جو حضرت جندب نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے جادوگر کی حد، اسے تلوار سے مارنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو احتمال ہے کہ اس جادوگر کے قتل کا حکم ہو جس کا جادو کفر ہو۔ تو یہ ان اخبار کے موافق ہوگا جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں مگر تین چیزوں میں سے ایک چیز پائے جانے کے ساتھ۔(1)

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے مسلمانوں کے خون بہانا ممنوع ہیں ان کو یقین کے بغیر مباح نہیں کیا جاسکتا اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بعض علماء نے فرمایا کہ اہل فن نے کہا: جادو مکمل نہیں ہوتا مگر کفر اور تکبر کے ساتھ یا شیطان کی تعظیم کے ساتھ۔ پس اس تقدیر پر جادو کفر پر دال ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی سے مروی ہے کہ جادوگر کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے اور وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور اس میں قتل خطا کی طرح دیت ہوگی۔ اگر اس نے جادو کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو اسے اس کے نقصان کی مقدار ادب سکھایا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ دو اعتبار سے باطل ہے ایک یہ کہ اسے جادو کا علم نہیں تھا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مؤلف کلام ہے جس کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ ان النفس بالنفس والعین بالعین ۔۔۔ الآیۃ، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غیر اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور ان کی طرف مقادیر اور کائنات کی نسبت کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تصریح فرمائی کہ یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ یعنی حضرت سلیمان نے جادو کے قول کے ساتھ کفر نہیں کیا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا یعنی شیاطین نے جادو کر کے اور اس کی تعلیم کے ساتھ کفر کیا۔ ہاروت و ماروت کہتے تھے ہم فتنہ ہیں، تو کفر نہ کر۔ یہ بیان کی تاکید ہے۔

امام مالک کے اصحاب نے حجت پکڑی ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جادو ایک پوشیدہ عمل ہے اس کا کرنے والا اسے ظاہر نہیں کرتا۔ پس اس کی توبہ معروف نہیں ہوگی جیسے زندیق ہے۔ جو مرتد ہو کر کفر کا اظہار کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام مالک نے فرمایا: اگر جادوگر یا زندیق توبہ کرلے، اس سے پہلے کہ اس کے خلاف گواہی دی جائے، تو ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اس کی حجت یہ ارشاد ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (غافر: 85) (انہیں نفع نہ دیا ان کے ایمان نے جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا) یہ دلیل ہے کہ عذاب کے نزول سے پہلے ان کا ایمان انہیں نفع دیتا تھا۔ اسی طرح یہ دونوں (ساحر، زندیق) ہیں۔

**مسئلہ نمبر 12:** رہا ذمی جادوگر، بعض علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا: اسے قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے، اور جو اس نے جنایت کی ہوگی اس کا ضمان دے گا۔ اگر کوئی ایسا کافر شخص جادو کرے جس کے ساتھ معاہدہ نہیں ہے تو اسے قتل کیا جائے گا (1)، ابن خویز منداد نے کہا: اگر جادوگر ذمی ہو تو امام مالک سے اس کے متعلق روایت مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام کا اقرار ہے، کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اگرچہ وہ اسلام قبول کر بھی لے۔ رہا حربی تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ توبہ کرلے۔ اسی طرح امام مالک نے اس ذمی کے بارے فرمایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدزبانی کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام قبول کرنا ہے۔ کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی جیسے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

امام مالک نے ذمی کے بارے میں فرمایا: جب وہ جادو کرے، تو اسے سزا دی جائے گی مگر یہ کہ وہ اپنے جادو کے ساتھ کسی کو قتل کرے یا کوئی اور جنایت کر دے تو اس کے جرم کی مقدار اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے عہد کو توڑا اور جادوگر کا وارث، جادوگر کی میراث نہیں پائے گا کیونکہ جادوگر کافر ہے، مگر یہ کہ اس کا جادو کفر نہ ہو...... امام مالک نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو اپنے خاوند کو اپنے سے جادو کے ذریعے روک لیتی ہے یا کسی اور سے روک لیتی ہے تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ساحر (جادوگر) سے جادو کو دور کرنے کا سوال کیا جائے گا؟ حضرت سعید بن مسیب نے اس کو جائز قرار دیا جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے اور اسی کی طرف مزنی کا میلان ہے۔ حضرت حسن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بصری نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ شعبی نے کہا: تعویذ اور دم سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن بطال نے کہا: وہب بن منبہ کی کتاب میں ہے کہ سبز سات پتے بیری کے لے پھر اسے دو پتھروں کے درمیان پیس دے پھر اسے پانی میں ملائے اور اس پر آیۃ الکرسی پڑھے پھر اس سے تین گھونٹ پی لے اور بقیہ پانی کے ساتھ غسل کرے، اس عمل سے جو کچھ اسے ہوگا وہ دور ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ ایک عمدہ عمل ہے اس شخص کے لئے جسے اپنے اہل سے حقوق زوجیت سے روکا گیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 14**: معتزلہ کے علماء نے شیاطین اور جنوں کا انکار کیا ہے۔ ان کا انکار ان کی کم فکری اور دین کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے اثبات میں کوئی عقلی محال نہیں ہے کتاب وسنت کی نصوص ان کے اثبات پر دلالت کرتی ہے اور عقلمند اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے والے پر حق ہے کہ جس کا عقل تقاضا کرے اس کے جواز کو ثابت کرے۔ شرع نے اس کے ثبوت پر نص قائم فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (شیطانوں نے کفر کیا) اور فرمایا: وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ (الانبیاء: 82) (شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرے) اس کے علاوہ دوسری آیات اور سورہ جن ان کے ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1)۔ (شیطان ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے) اس خبر کا بہت سے لوگوں نے انکار کیا ہے اور انہوں نے ایک جسم میں دو خون کا ہونا محال قرار دیا ہے جبکہ عقل انسانی میں ان کے چلنے کو محال قرار نہیں دیتی جبکہ شیطانوں کے اجسام رقیق اور بسیط ہیں جیسا کہ بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ کہتے ہیں...... اگر ان کے جسم کثیف بھی ہوتے تو بھی صحیح تھا جیسا کہ کھانا، پینا جسم میں داخل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح کیڑے بنی آدم میں ہوتے ہیں جبکہ وہ بھی زندہ ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 15**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ، مانفی کے لئے ہے واو عاطفہ ہے اس کا عطف وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہود نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبریل و میکائیل کو جادو کے ساتھ اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی فرمائی (2)۔ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: وما کفر سلیمان و ما انزل علی الملکین و لکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر ببابل ھاروت و ماروت، ہاروت اور ماروت وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا میں الشَّيٰطِيْنَ سے بدل ہے (3)۔ جن صورتوں پر یہ آیت محمول کی گئی ہے ان میں سے یہ صورت اولیٰ ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اصح ہے اور اس کے سوا کسی قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ جادو، شیاطین کے جوہر کی لطافت اور ان کے افہام کی دقت کی وجہ سے ان سے حاصل کیا جاتا ہے اکثر انسانوں میں سے اسے عورتیں کرتی ہیں خصوصاً حیض کی حالت میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ (فلق)

شاعر نے کہا:

اعوذ　بربی　من　النافثات

---

1۔ صحیح بخاری، باب ھل یدرأ المعتکف من نفسہ، حدیث نمبر 1898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

میں پھونکیں مارنے والیوں سے اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 16**: اگر کوئی یہ کہے کہ جمع سے تثنیہ کیسے بدل ہوسکتا ہے حالانکہ مبدل منہ اور بدل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا جواب تین اعتبار سے ہے: (۱) تثنیہ پر جمع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء: 11) اور ماں کو ثلث (۱/۳) سے السدس (۱/۶) کی طرف صرف دو بھائی یا دو سے زیادہ ہی مجوب کرتے ہیں جیسا کہ سورہ نساء میں آئے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دو جب تعلیم میں اصل تھے تو ان پر نص قائم فرما دی۔ ان کے متبعین کا ذکر نہ کیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ؀ (مدثر) (اس پر نو فرشتے مقرر ہیں) تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کا خصوصی ذکر کیا ان کے تمرد و سرکشی کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيۡهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ ؀ (الرحمن) (ان باغوں میں پھل، کھجور اور انار ہیں) اور (جبریل و میکائیل) کا قول۔ یہ قرآن میں اور عرب کلام میں کثرت سے ہے کہ عموم میں سے بعض کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے ان کے شرف کی وجہ سے اور ان کی فضیلت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ (آل عمران: 68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم علیہ السلام سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز اور و جبریل و میکال ان کے ذکر کی حکمت یا تو ان کی اعلیٰ طہارت کی وجہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاكِهَةٌ وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ ؀ (الرحمٰن) یا اکثریت کی وجہ سے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جعلت لی الارض مسجداً و تربتها طهوراً (1)۔ میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور اس کی مٹی طہارت کا باعث بنائی گئی ہے یا تمرد و سرکشی کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: ما کا عطف السحر پر ہے اور یہ مفعول ہے اس بنا پر ما، الذی کے معنی میں ہوگا اور جادو، دو فرشتوں پر لوگوں کے فتنہ اور آزمائش کے لئے اتارا گیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ چاہے اپنے بندوں کو آزمائے اس کی شان کو زیبا ہے۔ جیسے اس نے طالوت کو نہر سے آزمایا تھا اسی وجہ سے وہ فرشتے کہتے: اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ (ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں) ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جادوگر کا عمل کفر ہے اگر تو ہماری اطاعت کرے گا تو نجات پائے گا اور اگر ہماری نافرمانی کرے گا تو ہلاک ہوگا۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، کعب احبار، سدی اور کلبی سے اس کا معنی مروی ہے۔ جب اولاد آدم میں فساد زیادہ ہوگیا تھا...... یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں تھا...... ملائکہ نے انہیں عار دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تم میں ان عناصر کی ترکیب ہوتی جو ترکیب ان میں ہے تو تم بھی ان جیسے اعمال کرتے۔ فرشتوں نے کہا: تیری ذات پاک ہے ہمارے لئے تو یہ مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اعلیٰ فرشتوں میں سے دو فرشتوں کا انتخاب کرو۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو چنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں اتارا اور ان میں شہوات کا عنصر رکھ دیا، ان پر ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوگئے اس عورت کا نام نبطی زبان میں (بیدخت)

1۔ صحیح بخاری، باب قول الله تعالى فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا۔ الآية، حديث 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

فارسی میں ناھیل اور عربی میں زہرہ تھا، وہ ان کے پاس جھگڑا لے کر آئی اور ان دونوں فرشتوں نے اس سے خواہش پوری کرنی چاہی تو اس نے انکار کیا، مگر یہ کہ وہ دونوں اس کے دین میں داخل ہو جائیں، شراب پئیں اور اس نفس کو قتل کریں جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ انہوں نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور انہوں نے شراب پی۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انہیں ایک شخص نے دیکھ لیا انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ ان فرشتوں سے اس عورت نے اس اسم کے بارے پوچھا جس کے ذریعے وہ آسمان پر چڑھ جاتے تھے۔ وہ بھی انہوں نے اسے سکھا دیا۔ اس نے وہ کلمہ پڑھا اور اوپر چڑھ گئی۔ اسے ایک ستارہ کی شکل میں مسخ کر دیا۔

سالم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے کعب الحبر نے بتایا کہ ان دونوں فرشتوں نے اپنا دن مکمل نہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے وہ سب کام کر دیئے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے تھے۔ اس حدیث کے علاوہ میں ہے۔ ان فرشتوں کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کا عذاب اختیار کیا۔ انہیں بابل میں ایک سرنگ میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ بعض نے کہا: بابل سے مراد بابل عراق میں ہے۔ بعض نے کہا: بابل نہاوند ہے (1)، عطا سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر جب زہرہ ستارہ اور سہیل ستارہ کو دیکھتے تو انہیں برا بھلا کہتے اور فرماتے: سہیل یمن میں عشر وصول کرتا تھا اور لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور زہرہ ہاروت و ماروت کی دوست تھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ سب حضرت ابن عمر وغیرہ سے بعید اور ضعیف ہے کوئی چیز بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو ان فرشتوں کے متعلق اصول رد کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی پر امین ہیں اس کے رسولوں کے سفیر ہیں لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) (نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجا لاتے ہیں جو حکم نہیں فرمایا جاتا ہے) بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں) یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات دن اور وہ اکتاتے نہیں)

رہی عقل تو وہ فرشتوں کے معصیت میں واقع ہونے کا انکار نہیں کرتی۔ عقلاً ان سے اس کا خلاف پایا جا سکتا ہے جن کا انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں شہوات پیدا کی جا سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء، اولیاء، فضلاء، علماء کا خوف تھا لیکن اس جائز کے وقوع کا ادراک نہیں ہو سکتا مگر نقل کے ساتھ۔ اور وہ نقل صحیح نہیں ہے ایک اور چیز جو اس واقعہ کی عدم صحت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا فرمایا اور ان کواکب کو پیدا فرمایا جب آسمان کو پیدا فرمایا۔ حدیث میں ہے: جب آسمان کو پیدا کیا گیا تو اس میں سات گردش کرنے والے ستارے پیدا کیے: زحل، مشتری، بہرام، عطارد، زہرہ، سورج اور چاند۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) کا یہی معنی ہے اس سے ثابت ہوا کہ زہرہ اور سہیل یہ آدم کی تخلیق سے پہلے موجود تھے پھر فرشتوں کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ "ہمارے لئے یہ مناسب نہیں" باعث عار ہے، تو ہمیں آزمانے پر قادر نہیں یہ کفر ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتے ہیں اور معزز فرشتوں کی

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

طرف ایسی نسبت کرنے سے پناہ مانگتے ہیں ہم ان کی پاکیزگی اور طہارت بیان کرتے ہیں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اور جو کچھ مفسرین نے نقل کیا ہے اس سے فرشتے پاک ہیں: سبحان ربك رب العزة عما يصفون۔

**مسئلہ نمبر17**: حضرت ابن عباس، ابن ابزی، ضحاک اور حسن نے الملِکین (لام کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ابن ابزی نے کہا: وہ داود اور سلیمان ہیں اس قول کے مطابق ما نافیہ ہے نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: یہ دو عجمی کافر تھے بابل کے بادشاہ تھے اس قول کے مطابق ما مفعولہ ہوگا نافیہ نہ ہوگا۔(1)

**مسئلہ نمبر18**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِبَابِلَ یہ تانیث اور تعریف اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ زمین کا ایک قطعہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد عراق اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اہل کوفہ سے کہا: تم حیرہ اور بابل کے درمیان ہو۔ قتادہ نے کہا: یہ نصیبین سے راس العین تک کا علاقہ ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ مغرب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(2): یہ ضعیف ہے ایک قوم نے کہا: نہاوند کا پہاڑ ہے۔ بابل نام رکھنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں زبانیں گڈمڈ ہوتی تھیں جب نمرود کا محل گرا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ فرمایا کہ بنی آدم کی زبانوں کے درمیان اختلاف پیدا فرمائے تو اس نے ایک ہوا بھیجی تو اس نے لوگوں کو آفاق سے بابل تک جمع کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں کو گڈمڈ کر دیا پھر اس ہوا نے انہیں شہروں میں جدا جدا کر دیا۔ البلبلة کا معنی ہے، جدا جدا کرنا۔ فرمایا: اس کا معنی الخلیل ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: جو کچھ البلبلہ کے بارے میں کہا گیا اس میں سے سب سے بہتر وہ روایت ہے جو داؤد بن ابی ہند نے علیاء بن احمر سے انہوں نے حضرت عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب جودی پہاڑ سے نیچے اترے تو انہوں نے ایک شہر بنایا جس کا نام ثمانین (اسی ۸۰) رکھا۔ ایک دن صبح کی تو اس میں اسی زبانیں بولی جا رہی تھیں ان میں سے ایک عربی زبان تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔

**مسئلہ نمبر19**: عبداللہ بن بشر مازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بچو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ دنیا ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ جادوگر ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دنیا ان سے زیادہ جادوگر ہے کیونکہ دنیا تجھے اپنے دھوکے کے ساتھ مسحور کرتی ہے، اپنے فتنہ کو تجھ سے چھپاتی ہے۔ پس یہ تجھے اپنے حرص اور اپنے حصول کے لئے مقابلہ کی دعوت دیتی ہے، اس کے لئے جمع کرنا اور منع کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے درمیان جدائی کر دیتی ہے تیرے اور حق تعالیٰ کی رویت اور اس کی رعایت کے درمیان فرق کر دیتی ہے۔ پس دنیا ان دونوں سے زیادہ مسحور کن ہے۔ یہ تیرے دل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق ادا کرنے اور وعدہ اور وعید سے روک لیتی ہے دنیا کا جادو، اس کی محبت، اس کی شہوات، تیرا لذت حاصل کرنا اور جھوٹی تمناؤں کے ساتھ تیرا تمنا کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے دل کو یہ چیزیں گھیر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حبك الشئ يعمى و يصم۔ تجھے کسی شے کی محبت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی اور معرفہ ہیں ان کی جمع ھواریت اور مواریت ہے جیسے طواغیت کہا جاتا ہے ھوارتہ و ھوار و موارتہ و موار اس کی مثل جالوت اور طالوت ہے، یہ پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے یا اس کے علاوہ تھے۔ اس میں اختلاف ہے زجاج نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا اور فرشتے جادو سے ڈرانے کی تعلیم لوگوں کو دیتے تھے نہ ان کی طرف دعوت دینے کی تعلیم دیتے تھے۔ زجاج نے کہا: یہ اکثر اہل لغت اور اہل نظر لوگوں کا قول ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے رکنے کی تعلیم دیتے تھے وہ انہیں کہتے تھے کہ ایسا نہ کرو ایسا حیلہ نہ کرو تاکہ تم مرد اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دو۔ اس پر نہی (روکنا) اتارا گیا تھا وہ گویا لوگوں سے کہتے ایسا عمل نہ کرو۔ یعلّمان بمعنی یُعلِمان (آگاہ کرتے تھے) جیسا کہ فرمایا وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (الاسراء: 70) اس میں کرّم بمعنی اکرم ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ، من تاکید کے لئے زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے: و یعلمان احداً، حَتّٰى يَقُوْلَآ حتیٰ کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے ہذیل اور ثقیف کی لغت عتی (یعنی عین غیر معجمہ کے ساتھ) ہے اور یعلمان میں ضمیر ہاروت و ماروت کے لئے ہے(1)۔ یعلمان کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) یہ تعلیم سے اپنے باب سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اعلام سے ہے، التعلیم سے نہیں ہے۔ پس یُعَلِّمان بمعنی یُعْلِمان ہوگا۔ کلام عرب میں تعلّم بمعنی اعلم آیا ہے۔ ابن الاعرابی (2) اور ابن الانباری نے یہ ذکر کیا ہے۔

کعب بن مالک نے کہا:

تعلّم رسول الله انك مدركی ۔۔۔ وان وعیداً منك كالاخذ باليد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگاہ کیا کہ تو مجھے پانے والا ہے اور تیری وعید، ہاتھ سے پکڑنے کی طرح ہے۔

القطامی نے کہا:

تعلم ان بعد الغی رشدا ۔۔۔ وان لذلكِ الغیّ انقشاعاً

اس نے آگاہ کیا کہ گمراہی کے بعد ہدایت ہے، اس گمراہی کو (ایک دن) چھٹنا ہے۔

زہیر نے کہا:

تعلمن ها لعمر الله ذاقسما ۔۔۔ فاقدر بذرعك وانظر این تنسلك

ایک اور شاعر کا قول ہے:

تعلم انه لا طیرَ الا ۔۔۔ علی متطیر و هو الثبور

ان تمام اشعار میں تعلم بمعنی اعلم استعمال ہوا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

**اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ** جب فرشتوں نے اپنا فتنہ ہونا بتا دیا تو دنیا ان سے زیادہ مسحور کن ہوئی جبکہ وہ اپنے فتنہ کو چھپاتی ہے۔
**فَلَا تَكْفُرْ** ایک جماعت نے کہا: جادو کی تعلیم کے ساتھ کفر نہ کر، ایک فرقہ نے کہا: جادو کے استعمال کے ساتھ کفر نہ کر۔ مہدوی نے کہا: یہ استہزا ہے کیونکہ وہ دونوں اسے یہ کہتے جس کی گمراہی محقق ہوتی۔(1)

**مسئلہ نمبر 22:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا** سیبویہ نے کہا: تقدیر عبارت فهم يتعلمون ہے اس کی مثل فرمایا: کن فیکون۔ بعض نے فرمایا: یہ ما یعلمان کے محل پر معطوف ہے کیونکہ (وما یعلمان) اگر اس پر ما نافیہ داخل ہوا ہے تو اس کے ضمن میں تعلیم میں ایجاب ہے(2)۔ فراء نے کہا یہ قول **يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ** کی طرف لوٹایا گیا ہے یعنی وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور سیکھتے تھے۔ اور **فَيَتَعَلَّمُوْنَ** کا قول **اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ** کے قول سے متصل ہوگا۔ پس وہ آتے تھے اور سیکھتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ دونوں کہتے تھے جو بھی ان کے پاس آتا تھا ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کر اگر وہ لوٹنے سے انکار کرتا تو وہ اسے کہتے راکھ لے آ اور اس میں پیشاب کر جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف چڑھ جاتا۔ یہ ایمان ہوتا تھا۔ پھر اس سے سیاہ دھواں نکلتا تھا وہ اس کے کان میں داخل ہو جاتا تھا یہ کفر تھا۔ جب وہ انہیں اس کے متعلق بتاتا جو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ اسے جادو بتاتے جس کے ساتھ وہ میاں بیوی میں جدائی کرتا(3)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جادوگر اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے تفریق کے متعلق بتایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمت اور اس کی تعلیم کی غایت کا اظہار کرنے کے لئے اس کو ذکر کیا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ پر قادر ہوتا تو اسے بھی ذکر فرماتا۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ اغلب سے ذکر کیا ہے۔ اس کا انکار نہیں کہ جادو کی دلوں میں تاثیر ہوتی ہے، محبت، بغض اور شر پیدا کرنے کے اعتبار سے حتیٰ کہ جادوگر میاں، بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ مرد اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یہ تکالیف کے داخل کرنے اور بڑی بڑی بیماریوں میں مبتلا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب مشاہدہ سے پایا گیا ہے اور اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ**، **هُمْ** یہ جادوگروں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے کہا: شیاطین کی طرف اشارہ ہے **بِضَآرِّيْنَ بِهٖ**، **بِهٖ** کی ضمیر جادو کی طرف لوٹ رہی ہے **مِنْ اَحَدٍ** میں **مِنْ** زائدہ ہے۔ **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** اللہ کے ارادہ اور اس کی قضا سے نہ کہ اس کے امر سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائیوں کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ساتھ اپنی مخلوق پر فیصلہ فرماتا ہے۔ زجاج نے کہا **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** کا مطلب ہے الا بعلم اللہ (یعنی اللہ کے علم سے)۔

نحاس نے کہا ابو اسحاق کا قول، **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ**، الا بعلم اللہ کے معنی میں ہے، غلط ہے کیونکہ علم میں وقد اذنت اذنا کہا جاتا ہے، لیکن ان کے اور اس کے درمیان یہ حلال نہیں تھا وہ ایسا کرتے تھے تو گویا اس نے مجاز اً مباح کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 24:** **وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ** یعنی آخرت میں نقصان دے گی۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس کے ساتھ

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تھوڑا سا نفع حاصل کیا۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں وہ اسے نقصان دے گا کیونکہ جادو کا نقصان اور تفریق دنیا میں جادوگر پر لوٹتی ہے جب وہ دریافت ہو جائے، کیونکہ اسے تادیب کی جاتی ہے اور اسے جھڑکا جاتا ہے اور اسے جادو کی نحوست لاحق ہوتی ہے۔

باقی آیات واضح ہیں کیونکہ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا میں لام تاکید ہے لَمَنِ اشْتَرٰىهُ لام قسم کے لئے ہے یہ بھی تاکید کے لئے ہے اور مَنْ محل رفع میں مبتدا ہے کیونکہ لام کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اور مَنْ بمعنی الذی ہے۔ فراء نے کہا: یہ مجازات کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: یہ شرط کی جگہ نہیں ہے اور من بمعنی الذی ہے جیسے تو کہتا ہے: علمت لمن جاءك ماله عقلٌ۔ (من خلاق) من زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے ماله فی الاخرة خلاق اور مثبت کلام میں مِنْ زائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: کبھی مثبت میں بھی زائدہ ہوتا ہے اور انہوں نے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: 31)

الخلاق کا معنی حصہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اہل لغت کے نزدیک اسی طرح ہے مگر یہ خیر کے حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے متعلق پوچھا گیا: وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ پہلے بتایا کہ وہ جان چکے تھے پھر فرمایا وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ بتایا کہ وہ نہیں جانتے اس کا جواب وہ ہے جو قطرب اور اخفش نے دیا ہے۔ جو جانتے تھے وہ شیاطین تھے اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا وہ انسان تھے جو نہیں جانتے تھے۔ زجاج نے کہا: علی بن سلیمان نے کہا: میرے نزدیک عمدہ یہ ہے کہ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا یہ فرشتوں کے لئے ہو کیونکہ وہ جاننے کے زیادہ مستحق ہیں اور فرمایا عَلِمُوْا (حالانکہ وہ دو تھے) تو یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے الزیدان قاموا۔ زجاج نے کہا: جنہوں نے جانا وہ علماء یہود ہیں۔ لیکن کہا گیا ہے: لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ پس وہ اس شخص کی جگہ داخل ہوئے جس کو کہا جاتا ہے: لست بعالم تو عالم نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق اپنا عمل ترک کر دیا اور ان سے رہنمائی حاصل کی جنہوں نے جادو کا عمل کیا تھا۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو (اس کا) ثواب الله کے ہاں بہت اچھا ہوتا۔ کاش! وہ کچھ جانتے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا یعنی جادو سے بچتے۔ لمثوبة ثواب۔ یہ بعض علماء کے نزدیک لو کا جواب ہے۔ اخفش سعید نے کہا: یہاں لو کا جواب لفظاً نہیں ہے لیکن معنی ہے۔ اس کا معنی ہے لاثیبوا۔ انهم میں اَنّ کا محل رفع ہے یعنی لو وقع ایمانهم۔ کیونکہ لو کے ساتھ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر متصل ہوتا ہے کیونکہ یہ حروف شرط کے قائم مقام ہے کیونکہ اس کے لئے جواب ضروری ہے اور (ان) اس کے ساتھ فعل متصل ہوتا ہے۔ محمد بن زید نے فرمایا: لو کے ساتھ مجاز جائز نہیں کیونکہ تمام حروف مجازات ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں جب لو میں یہ معنی نہیں ہے تو اس سے مجازات بھی جائز نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اے ایمان والو! (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو ''راعِنا'' بلکہ کہو ''انظرنا'' اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا یہود کی جہالتوں میں سے ایک اور چیز کو ذکر فرمایا۔ اور مقصود مسلمانوں کو اس کی مثل سے روکنا ہے۔ رَاعِنَا کی حقیقت لغت میں أَرْعِنا و لنرعك۔ کیونکہ باب مفاعلہ دو آدمیوں سے ہوتا ہے۔ پس یہ رعاك الله سے مشتق ہوگا یعنی تو ہماری حفاظت کر اور ہم تمہاری حفاظت کریں گے دارقبنا و لنرقبك۔ آپ ہمارا خیال کریں ہم تمہارا خیال کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارعنا سمعك سے مشتق ہو یعنی آپ ہماری کلام کے لئے اپنے سننے کو فارغ کریں۔ اس خطاب میں جفاء ہے۔ پس مومنین کو حکم دیا کہ الفاظ میں اچھے الفاظ استعمال کریں اور معانی میں سے لطیف معانی اختیار کریں (1)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے رَاعِنَا یعنی وہ رغبت وطلب کی جہت سے عرض کرتے کہ آپ ہماری طرف نظر التفات فرمائیں اور یہ یہود کی زبان میں بددعا تھا۔ یعنی تم سنو تو کبھی نہ سنے، پس یہود نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا: پہلے ہم اسے مخفی طور پر بددعا دیتے تھے اب ہم اسے جہراً بددعا دیں گے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لفظ سے مخاطب کرتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ نے ان سے یہ کلمہ سنا، حضرت سعد ان کی لغت جانتے تھے۔ حضرت سعد نے یہود سے کہا: تم پر اللہ کی لعنت ہو اب اگر میں نے تم میں سے کسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے کہتے سنا تو میں اس کی گردن اتار دوں گا۔ یہود نے کہا: کیا تم یہ کلمہ نہیں کہتے ہو تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تا کہ لفظ میں یہود اقتدا نہ کریں اور اس سے وہ فاسد معنی کا قصد نہ کریں۔

**مسئلہ نمبر 2**: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: (۱) ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرنا جس میں تنقیص شان اور عظمت میں کمی کا اشارہ ہو، اور اس سے تعریضاً قذف کا سمجھنا نکلتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حد کا موجب ہے جبکہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک حد واجب نہیں۔ انہوں نے تعریض (اشارۃً کلام کرنا) قذف اور غیر قذف کا احتمال رکھتی ہے اور حد شبہات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ النور میں آئے گا۔ (۲) سد ذرائع کو مضبوطی سے پکڑنا اور آپ کی حمایت کرنا۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی یہی ہے اس اصل پر کتاب وسنت دلالت کرتی ہے ذریعہ اس امر کو کہتے ہیں جو فی نفسہ ممنوع نہیں ہوتا لیکن اس کے کرنے سے ممنوع کام میں وقوع کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی دلیل تو یہ آیت کریمہ ہے، اس سے تمسک کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ لفظ استعمال کرتے تھے ان کی لغت میں یہ بددعا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ جان لیا تو مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے ہی منع فرما دیا کیونکہ یہ بددعا کا ذریعہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام: 108)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بتوں کو گالی دینے سے منع فرمایا اس اندیشہ سے کہ مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ الآیہ (الاعراف: 163) اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار حرام کر دیا۔ ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر ظاہر ہو کر آتی تھیں وہ انہیں ہفتہ کے دن روک دیتے تھے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے تھے۔ پس روکنا شکار کا ذریعہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندروں اور خنازیر میں انہیں مسخ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لئے تحذیر کے لئے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کو فرمایا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ: 35) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

رہیں احادیث، تو اس مفہوم میں بہت سی احادیث صحیحہ ثابت ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں۔ انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ تھے ان میں کوئی نیک شخص ہوتا تھا پھر وہ مر جاتا تھا تو یہ اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے اور اس میں ان نیک لوگوں کی تصویریں بناتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برے ترین لوگ ہیں (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ان کے پہلے لوگوں نے یہ عمل اس لئے کیا تھا تاکہ ان تصویروں کو دیکھ کر انس حاصل کریں اور ان کے احوال صالحہ کو یاد کریں اور یہ بھی ان کی طرح کوشش اور محنت کریں اور ان کی قبور کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ پس ان پر جب عرصہ دراز گزر گیا پھر ان کے بعد کے لوگ آئے جو پہلے لوگوں کی اغراض سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء و اجداد ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے۔ پس انہوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثل سے منع فرمایا اور جو ایسا کرے اس پر سخت انکار اور وعید فرمائی اور جو کام اس عمل تک پہنچانے والے تھے ان سے بھی روک دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے جس نے اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبور کو مساجد بنایا اور فرمایا: اے اللہ! میری قبر کو ایسا بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے ان کے درمیان متشابہات امور ہیں جو ان شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لے گا اور جو شبہات میں واقع ہوگا وہ حرام میں واقع ہوگا جیسے چرواہا چراگاہ کے اردگرد (مویشی) چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائے۔ (الحدیث) (2)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبہات کی طرف جانے سے منع فرمایا اس خوف سے کہ وہ محرمات میں واقع ہو جائے گا۔ یہ سد ذرائع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندہ متقین میں سے نہیں ہوتا حتیٰ کہ وہ اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں کوئی حرج نہیں احتیاط کرتے ہوئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہو جس میں حرج ہے (3)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب بناء المسجد علی القبر، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الحلال بین والحرام بین وبینهما مشبهات، حدیث نمبر 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب الورع والتقوی، حدیث نمبر 4204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والدین کو گالی دینا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول الله! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ ایک شخص دوسرے کے والد کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے جو دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے اسے اپنے والدین کو گالی دینے والا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم بیع عینہ کرو گے اور گائیوں کے دموں کو پکڑو گے اور کھیتی پر خوش ہو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو الله تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط فرمائے گا اور یہ ذلت تم سے دور نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ (1)۔ ابو عبید الہروی نے کہا: بیع عینہ یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے شخص کو معلوم قیمت کے ساتھ مخصوص مدت تک ایک چیز فروخت کرتا تھا پھر بیچنے والا اس خریدنے والے سے وہی چیز اس سے کم قیمت میں خرید لیتا تھا۔

فرمایا: اگر بیع عینہ طلب کرنے والے کی موجودگی میں سامان کسی دوسرے شخص سے معلوم ثمن کے ساتھ خریدے۔ پھر وہ قبضہ کرے پھر وہ عینہ طلب کرنے والے کو اس قیمت سے زیادہ پر بیچ دے، جس میں اس نے خریدی تھی ایک معین مدت تک، پھر یہ مشتری پہلے بائع کو نقد فروخت کرے کم قیمت پر تو یہ بھی بیع عینہ ہوگی۔ یہ پہلی صورت سے زیادہ آسان ہے اور بعض کے نزدیک یہ جائز ہے، اس کو بیع عینہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صاحب عینہ کو نقدی حاصل ہوتی ہے، یہ اس لئے ہے کہ حاضر مال موجود ہے مشتری اسے خریدتا ہے تاکہ عین حاضر مال کے ساتھ اسے بیچے جو اسے جلدی مل جائے۔

ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم کی ام ولد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا کہ اس نے زید کو ایک غلام آٹھ سو میں ادھار بیچا ہے پھر اس سے نقد چھ سو میں خرید لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: برا ہے جو تو نے بیچا ہے اور برا ہے جو تو نے خریدا ہے۔ زید کو یہ پہنچاؤ کہ اس نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کیے ہوئے جہاد کو باطل کر دیا اگر اس نے اس بیع سے توبہ نہ کی۔ یہ حضرت عائشہ نے یقیناً اپنی رائے سے نہیں کہا ہوگا کیونکہ اعمال کا باطل کرنا، اس کی معرفت صرف وحی سے ہو سکتی ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود اور شک (والی بیع) کو چھوڑو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی دراہم کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا جن کے درمیان حریزہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ ہمارے سد ذرائع پر دلائل ہیں، اس پر مالکی علماء نے بیوع وغیرہ میں کتاب الآجال وغیرہ مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ شوافع کے نزدیک کتاب الآجال (مدت کے بارے میں مسائل) نہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک مختلف مستقل عقود ہیں۔ انہوں نے کہا: اشیاء کی اصل ظواہر پر ہے نہ کہ ظنون (گمان) پر ہے۔ مالکی علماء نے اس سامان کو زیادہ دراہم کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ عین ربا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا۔ یہ نہی تحریمی ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ حضرت حسن نے راعناً پڑھا ہے یعنی تنوین کے ساتھ اور فرمایا: اس کا مطلب ہے: نامناسب بات۔ یہ مصدر ہے قول کی وجہ سے اسے نصب دی گئی ہے۔ یعنی لا تقولوا رعونۃ۔ اور زر بن حبیش اور اعمش نے راعونا پڑھا ہے، یہ پہاڑ کی چوٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبل

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النھی عن العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارعن چوٹی والا پہاڑ، جیش ارعن یعنی متفرق لشکر۔ اسی طرح رجل ارعن، متفرق جنون والا جس کی عقل مجتمع نہ ہو، نحاس سے یہ مروی ہے۔ ابن فارس نے کہا رعُن الرجل یَرْعُنُ رعنا فھو أرْعن، محتاج شخص، المرأۃ رعناء، بلند عورت، بصرہ کو رعناء کہتے ہیں کیونکہ وہ پہاڑ کی بلندی کے مشابہ ہے۔ ابن درید نے یہی کہا ہے۔ فرزدق نے کہا ہے:

لو لا ابن عتبہ عمرو والرجاء لہ ما کانت البصرۃ الرعناء لی وطناً

اگر ابن عتبہ عمرو نہ ہوتا اور اس کی امید نہ ہوتی تو بصرہ رعناء میرا وطن نہ ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوا انْظُرْنَا مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ حضرت محمد ﷺ کو عزت و احترام سے مخاطب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف توجہ فرمائیں، ہماری طرف نظر کرم فرمائیں۔ تعدیہ کا حرف حذف کیا گیا ہے یعنی تقدیر یوں ہے: وانظر الینا

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ظاھرات الجمال والحسن ینظر ن کما ینظر الاراك الظباء

ظاہری حسن و جمال والی دیکھی جاتی ہیں جس طرح ہرنیاں اراک بان کے درخت کو دیکھتی ہیں۔

اس شعر میں عبارت الی الاراك تھا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہمیں سمجھایئے اور ہمارے لئے بیان فرمایئے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہمارا انتظار فرمایئے اور ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ کلام فرمایئے۔ شاعر نے کہا:

فانکما ان تنظرانی ساعۃً من الدھر ینفعنی لدی ام جندب

تم دونوں اگر ایک گھڑی میری طرف دیکھ لو تو مجھے ام جندب کے سامنے یہ نفع دے گا۔

ظاہراً اس کا مطلب آنکھ سے دیکھنے کی استدعا ہے جو دیکھنا تدبر حال سے مقترن ہو۔ یہ راعنا کا معنی ہے، مومنین کے لئے لفظ بدل دیا گیا اور یہود کا تعلق زائل ہو گیا۔ اعمش وغیرہ نے أنظِرْنا ہمزہ قطعی اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہمیں مہلت دیجئے حتیٰ کہ ہم آپ کی بات سمجھ جائیں اور آپ سے مفہوم حاصل کر لیں۔ (1)

شاعر نے کہا:

ابا ھند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرك الیقینا

اے ابو ہند! ہم پر جلدی نہ کر اور ہمیں مہلت دے ہم تجھے یقینی خبر دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسْمَعُوْا پہلے نہی فرمائی اب حکم دیا۔ سننے کا حکم دیا جس کے ضمن میں اطاعت ہے۔ جان لو! جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے گا وہ کافر ہوگا عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ (2)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵

''نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرمالیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ یعنی خواہش نہیں کرتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ، وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ، اهل پر معطوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ کا عطف الَّذِيْنَ پر ہو۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ، من زائدہ ہے خیر فعل مجہول کا اسم ہے اَنْ محل نصب میں ہے، یعنی بان ینزل - وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ۔ یعنی بنبوتہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ مختص فرمایا(1)۔ ایک قوم نے کہا: الرحمۃ سے مراد قرآن ہے(2)۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں رحمت عام ہے ان تمام انواع رحمت کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پہلے فرمائیں اور جواب فرما رہا ہے(3)۔ کہا جاتا ہے: رحِم یرحمُ جب کوئی نرم ہو جائے، الرحم و المرحمۃ و الرحمۃ تمام کا ایک معنی ہے۔ ابن فارس نے یہ کہا ہے: رحمۃ اللہ لعبادہ، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور انہیں معاف کرنا مراد ہے وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ ذُو بمعنی صاحب ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۶

''جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے''۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا، نُنْسِهَا کا عطف ننسخ پر ہے، جزم کی وجہ سے یا کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے ننسأھا پڑھا ہے انہوں نے جزم کی وجہ سے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے اس کا معنی آگے آئے گا نأت یہ جواب شرط ہے۔ یہ احکام میں ایک عظیم آیت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہود نے جب مسلمانوں سے کعبہ کی طرف منہ کرنے میں حسد کیا اور اس کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنے اصحاب کو ایک چیز کا حکم دیتا ہے پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ پس قرآن ان کی طرف سے ہے اسی وجہ سے قرآن کا بعض، بعض کے مخالف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (نحل: 101) اور مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ کا ارشاد نازل فرمایا۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 2:** اس باب کی معرفت بڑی مؤکد ہے اور اس کا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے علماء کو بھی استغناء نہیں اس کا انکار صرف غبی جہلاء ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس پر بہت احکام مرتب ہوتے ہیں حرام سے حلال کی معرفت ہوتی ہے۔ ابوالبختری نے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ وہاں ایک شخص لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ اجتماع کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: ایک شخص لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ شخص لوگوں کو نصیحت نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہے: میں فلاں ابن فلاں ہوں مجھے پہچانو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور پوچھا: کیا تو ناسخ، منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہماری مسجد سے نکل جا اس میں تو وعظ و نصیحت نہ کر۔ دوسری روایت میں ہے، کیا تو ناسخ و منسوخ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** عرب کلام میں نسخ دو وجوہ سے ہے:

۱۔ ایک اس کا معنی نقل کرنا ہے جیسے ایک کتاب سے دوسری کتاب کو نقل کرنا، اس معنی کے اعتبار سے پورا قرآن منسوخ ہوگا یعنی یہ لوح محفوظ سے نقل ہوا ہے اور بیت العزت کی طرف آسمان دنیا میں اترا ہے۔ اس آیت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ (الجاثیہ) یعنی ہم اس کے لکھنے اور اس کے اثبات کا حکم دیتے ہیں۔ (1)

۲۔ نسخ کا دوسرا معنی ابطال اور زائل کرنا ہے۔ یہاں یہی مقصود ہے اور یہ لغت میں پھر دو قسموں میں منقسم ہے: (۱) کسی شے کو ختم کر دینا اور زائل کر دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا۔ اس سے نسخت الشمس الظل، جب سورج سائے کو مٹا دے اور اس کے قائم مقام دوسرے سائے کو کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ، اور صحیح مسلم میں ہے: لم تكن نبوة قط الا تناسخت یعنی نبوت ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھرتی رہی یعنی امت کا معاملہ پھرتا رہا۔ ابن فارس نے کہا: نسخ کا معنی کتاب کا نقل کرنا، اور النسخ کا معنی کسی ایسے امر کو ختم کر دینا جس پر پہلے عمل ہو رہا تھا پھر تو اسے کسی حادثہ کی وجہ سے ختم کر دے، جیسے کسی خاص امر کے لئے ایک آیت نازل ہوتی پھر دوسری آیت کے ساتھ وہ منسوخ ہو جاتی۔ ہر وہ چیز جو کسی شے کے قائم مقام ہو جائے تو اس نے اسے منسوخ کر دیا۔ کہا جاتا ہے: انتسخت الشمس الظل، الشیب الشباب سورج نے سائے کو ختم کر دیا، بڑھاپے نے جوانی کو ختم کر دیا۔ تناسخ الورثة ورثاء دوسرے ورثاء کے بعد مر گئے، اور میراث کی اصل قائم ہے۔ تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی طرح تناسخ الازمنة والقرون ہے یعنی ہر زمانہ اور ہر قوم پہلے زمانہ اور پہلی قوم کو ختم کر دیتی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ چیز کو ختم کر دینا اور اس کے قائم مقام دوسری چیز نہ رکھنا۔ جیسے نسخت الریح الاثر (2) ہوا نے اثر مٹا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضا

دیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ (الحج: 52) (جو شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دیتا ہے) اس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور اس کا بدل مصحف میں ثابت نہیں ہوتا۔ ابو عبید نے کہا: یہ نسخ کی دوسری قسم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سورت نازل ہوتی تھی پھر وہ اٹھالی جاتی تھی نہ اس کو پڑھا جاتا تھا اور نہ اس کو لکھا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں: اسی سے وہ روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سورۂ احزاب، طوالت میں سورۂ بقرہ کے برابر تھی جیسا کہ سورۂ احزاب میں یہ تفصیل سے بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے جو ابو بکر انباری نے بیان کی۔ فرمایا: مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں نصر بن داؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بیان کیا ہمیں عبد اللہ بن صالح نے بیان کیا انہوں نے لیث سے انہوں نے یونس اور عقیل سے انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا، فرمایا: مجھے ابو امامۃ بن سہل بن حنیف نے حضرت سعید بن مسیب کی مجلس میں بیان کیا کہ ایک شخص رات کو اٹھا تا کہ قرآن کی سورت تلاوت کرے تو وہ اس میں سے کچھ بھی پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ دوسرا اٹھا تو وہ بھی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، تیسرا اٹھا تو وہ بھی اس سورت میں سے کچھ پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ وہ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا میں یا رسول اللہ! کھڑا ہوا تا کہ قرآن کی سورت پڑھوں تو میں اس کی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، دوسرا اٹھا اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری بھی یہی کیفیت تھی، تیسرا اٹھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میری بھی یہی کیفیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورت گزشتہ رات اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دی۔ ایک روایت میں ہے، سعید بن مسیب سنتے تھے جو ابو امامہ بیان کرتے تھے اور انکار نہیں کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4:** متاخرین علماء اسلام کے ایک طائفہ نے اس کے جواز کا انکار کیا ہے اور ان کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ سلف صالحین کا اجماع ہے کہ شریعت میں نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح یہود کے ایک گروہ نے بھی نسخ کا انکار کیا ہے، اس کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ان کے اپنے خیال کے مطابق تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے نکلنے کے وقت فرمایا: ہر چوپایہ تمہارے لئے اور اولاد کے لئے خوراک ہے اور میں نے یہ تمہارے لئے مطلق رکھا ہے جیسے نبات تمہارے لئے حلال کی ہیں لیکن خون حلال نہیں ہے اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوان حرام کر دیئے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھائی کی بہن سے شادی کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر اس کو حرام کر دیا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا پھر فرمایا تو اسے ذبح نہ کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اپنے ان لوگوں کو قتل کریں جو بچھڑے کی پوجا کرتے ہیں پھر ان سے تلوار اٹھانے کا حکم دیا، پہلے وہ اپنی نبوت کے ساتھ مکلف نہ تھے پھر اس کے بعد اس کے ساتھ مکلف ہوئے۔ یہ البداء سے نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کو ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف نقل کرنا ہے اور ایک حکم کو دوسرے حکم کی طرف نقل کرنا ہے اس میں کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مملکت کا کمال مقصود ہوتا ہے۔ اس میں عقلاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء کرام کی شریعتوں سے مخلوق کے دنیوی اور اخروی مصالح کا

قصد کیا گیا ہے، بدأہ تو تب لازم آتی جب وہ امور کے انجام کو جاننے والا نہ ہوتا اور جو انجام کو جاننے والا ہوتا ہے وہ مصالح کی تبدیلی کے مطابق اپنے خطابات کو تبدیل کرتا ہے، جیسے طبیب اپنے مریض کے احوال کے مطابق خطابات کو بدلتا ہے اس نے اپنی مشیت اور ارادہ سے اپنی مخلوق میں یہ تبدیلی رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا خطاب بدلتا ہے۔ اس کا علم اور اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوتا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی جہت سے محال ہے۔

یہود نے نسخ اور بداء کو ایک چیز بتایا ہے اسی وجہ سے انہوں نے نسخ کو جائز قرار نہیں دیا، پس وہ گمراہ ہوئے (1)۔ نحاس نے کہا: نسخ اور البداء کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسخ کا مطلب ہے ایک عبادت کو دوسری عبادت کی طرف بدلنا، (مثلاً) پہلے ایک چیز حلال تھی اسے حرام کر دیا، پہلے ایک چیز حرام تھی پھر اسے حلال کر دیا اور البداء یہ ہے کہ پہلے جس چیز پر عزم کیا گیا ہے اسے ترک کر دینا جیسے تو کہتا ہے تم آج فلاں کے پاس جاؤ پھر تو کہتا ہے اس کے پاس نہ جاؤ۔ تیرے لئے پہلے قول سے عدول ظاہر ہوتا ہے یہ انسان کو لاحق ہوتا ہے ان کے نقصان اور کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اگر تو کہے اس سال تو یہ چیز کاشت کر پھر تو کہے یہ نہ کر، تو یہ البداء ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: ناسخ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے مجازاً خطاب شرعی کو ناسخ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے نسخ واقع ہوتا ہے (2)۔ جس طرح مجازاً محکوم فیہ کو ناسخ کا نام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رمضان کے روزوں نے عاشوراء کے روزہ کو منسوخ کر دیا۔ منسوخ وہ ہوتا ہے جو زائل کیا جاتا ہے اور منسوخ عنہ وہ ہوتا ہے جو زائل کی گئی عبادت کا مکلف ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: ہمارے ائمہ کی عبارات ناسخ کی تعریف میں مختلف ہیں۔ اہل سنت میں سے ماہر علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلے حکم شرعی کو بعد میں آنے والے خطاب سے زائل کرنا ہے۔ قاضی عبدالوہاب اور قاضی ابوبکر نے بھی اسی طرح تعریف کی ہے اور انہوں نے یہ زیادہ لکھا ہے اگر یہ والا حکم نہ آتا تو پہلا حکم ہی باقی رہتا (3)۔ ان دونوں حضرات نے نسخ کے لغوی معنی کا بھی لحاظ رکھا ہے کیونکہ نسخ کا لغوی معنی اٹھا دینا اور زائل کرنا ہے اور انہوں نے حکم عقلی سے احتراز کیا ہے۔ خطاب کا لفظ ذکر کیا تا کہ وجوہ دلالت نص، ظاہر، مفہوم وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ اور قیاس اور اجماع کو خارج کر دے کیونکہ قیاس اور اجماع میں نہ تو نسخ متصور ہو سکتا ہے نہ ان کے ساتھ نسخ ہو سکتا ہے اور تراخی کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ اگر بعد والا حکم پہلے سے متصل ہو تو وہ حکم کا بیان ہوتا ہے۔ ناسخ نہیں ہوتا یا دوسرا کلام، پہلے کلام کو اٹھانے والا ہوتا ہے۔ جیسے قم لا تقم، تو کھڑا ہو تو کھڑا نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 7**: منسوخ ہمارے اہل سنت کے ائمہ کے نزدیک وہ حکم ہوتا ہے جس کی ذات ثابت ہو نہ اس کی مثل جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ خطاب، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مستقبل میں ثابت حکم کی مثال آنے والی نص سے زائل ہونے والا ہے اور اس قول کی طرف ان کی رہنمائی ان کے مذہب نے کی ہے کہ اوامر مراد ہوتے ہیں اور حُسن، حَسَن کی ذاتی صفت ہے اور اللہ کی مراد حَسَن ہے اس کو ہمارے علماء نے اپنی کتب میں رد کیا ہے۔ (4)

**مسئلہ نمبر 8**: ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اخبار میں نسخ داخل ہوتا ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ نسخ،

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اوامر ونواہی کے ساتھ خاص ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کذب محال ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: خبر جب حکم شرعی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو تو اس کا نسخ جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا (النحل: 67) اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 9:** عموم سے تخصیص وہم دلاتی ہے کہ یہ نسخ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ مخصص کو عموم شامل ہی نہیں ہوتا، اگر عموم کسی شے کو شامل ہو پھر اس شے کو عموم سے نکالا جائے تو یہ نسخ ہوگا تخصیص نہ ہوگی (2)۔ اور متقدمین علماء مجازاً تخصیص پر نسخ کا اطلاق کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** کبھی شرع میں ایسی اخبار وارد ہوتی ہے جن کا ظاہر مطلق اور استغراق ہوتا ہے اور ان کی تقیید دوسری جگہ وارد ہوتی ہے، پس وہ اطلاق اٹھ جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی)۔

اس آیت میں حکم کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا ہر حال میں قبول فرماتا ہے لیکن دوسرے مقام پر اس کی قید آئی ہے: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام: 41)

وہ شخص جسے بصیرت نہیں ہوتی وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اخبار میں نسخ کے باب سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اطلاق اور تقیید کے باب سے ہے۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

**مسئلہ نمبر 11:** ہمارے علماء نے فرمایا (3): اثقل (بھاری حکم) کا نسخ اخف (ہلکے حکم) کی طرف جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے دس کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے حکم کو دو کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور اخف حکم سے اثقل کی طرف نسخ بھی جائز ہے جیسے عاشوراء کے حکم کو رمضان کے روزوں سے منسوخ کر دیا۔ اس کا بیان روزوں والی آیت میں آئے گا۔ کبھی ایک حکم کو اس جیسے حکم سے منسوخ کیا جاتا ہے جیسے ایک قبلہ کو دوسرے قبلہ سے منسوخ کر دیا۔ کبھی ایک چیز کو منسوخ کیا جاتا ہے اور اس کا بدل نہیں دیا جاتا جیسے نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ قرآن کو قرآن کے ساتھ منسوخ کیا جاتا ہے اور سنت کو عبارت سے منسوخ کیا جاتا ہے اور عبارت سے مراد "الخبر المتواتر القطعی" ہے اور خبر واحد کو خبر واحد سے منسوخ کیا جاتا ہے۔

ماہرین ائمہ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن، سنت سے بھی منسوخ ہوتا ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں موجود ہے: لا وصية لوارث کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے (4)۔ یہ امام مالک کے ظاہر مسائل سے ہے۔ امام شافعی (5) اور ابوالفرج مالکی نے اس کا انکار کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، اس دلیل سے کہ یہ سب اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، باب لا وصیة لوارث، حدیث نمبر 2703، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اختلاف ہے۔ مثلاً شادی شدہ زانی جس کو رجم کیا جاتا ہے اس سے کوڑوں کی سزا ساقط ہے اور یہ سنت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ساقط ہے اور یہ واضح ہے۔ ماہرین علماء کا یہ بھی نظریہ ہے کہ سنت، قرآن کے ساتھ منسوخ ہوتی ہے اور یہ قبلہ کی تحویل میں موجود ہے کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا کتاب اللہ میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنہ:10) ان عورتوں کا رجوع، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قریش سے صلح کی بنا پر ہوا تھا۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ عقلاً خبر واحد سے قرآن کا نسخ جائز ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرعاً واقع ہوا ہے یا نہیں۔ ابو المعالی وغیرہ کا خیال ہے کہ مسجد قبا کے واقعہ میں واقع ہوا تھا اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے۔ قیاس کے ساتھ نص کا نسخ صحیح نہیں ہے، کیونکہ قیاس کی شرائط میں سے ہے کہ وہ نص کے مخالف نہ ہو۔

یہ نسخ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تھا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور شریعت کے استقرار کے بعد، امت کا اجماع ہے کہ نسخ نہیں ہے اسی وجہ سے اجماع نہ منسوخ ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ نسخ واقع ہوتا ہے کیونکہ اجماع کا انعقاد وحی کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا اجماع پاتے ہیں جو نص کے مخالف ہوتا ہے تو پھر یہ جانا جائے گا کہ اجماع کسی ناسخ نص کی طرف منسوب ہے جسے ہم نہیں جانتے...... مخالف نص ایسی ہوتی ہے جس پر عمل چھوڑا جاتا ہے اور اس کا مقتضیٰ منسوخ ہوتا ہے لیکن اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے قرآن میں سال کی عدت والی آیت تلاوت کی جاتی ہے، اس میں غور کرو یہ ایک نفیس گفتگو ہے۔ کبھی حکم منسوخ ہوتا ہے، تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم، کبھی تلاوت منسوخ ہوتی ہے حکم منسوخ نہیں ہوتا جیسے آیت رجم۔ کبھی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں اور اس سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ہم پڑھتے تھے: لا ترغبوا عن آبائکم فانہ کفر۔ (اپنے آباء سے انحراف نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے)۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ جس کو ناسخ کا حکم نہ پہنچا ہو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے اس کا بیان تحویل قبلہ میں آئے گا۔

ماہرین کے نزدیک حکم عمل سے پہلے بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔ یہ ذبیح کے واقعہ میں موجود ہے اسی طرح نمازیں پچاس فرض تھیں عمل سے پہلے پانچ نمازوں سے منسوخ کر دی گئیں جیسا کہ سورۃ الاسراء اور سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 12**: ناسخ کی پہچان کے طرق: (۱) نص کے الفاظ نسخ پر دلالت کرتے ہوں جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا(1)۔ (میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا۔ پس (اب) زیارت کیا کرو)۔ میں نے تمہیں مشروب پینے سے منع کیا تھا مگر چمڑے کے برتنوں میں۔ پس اب ہر برتن میں مشروب پیو مگر نشہ دینے والا مشروب نہ پیو۔ (۲) راوی تاریخ ذکر کر دے۔ مثلاً وہ کہے: میں نے خندق کے سال سنا تو اس سے پہلے والا حکم منسوخ معلوم ہو جائے گا یا کہے کہ فلاں فلاں حکم منسوخ ہے۔ (۳) امت کا اجماع ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ بعد میں آنے والا ہے۔ یہ اصول فقہ میں تفصیلی مباحث موجود ہیں ہم نے بقدر ضرورت ذکر کر دیا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ مسلم شریف، جلد 1، صفحہ 314 کتاب الجنائز، باب فصل فی جواز زیارۃ القبور، فی الذھاب الی زیارۃ القبور (قدیمی کتب خانہ)

للهداية۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق بخشنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: جمہور قراء نے ما ننسخ نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس معنی پر ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ہم کسی آیت کا حکم اٹھا دیتے ہیں اور اس کی تلاوت کو باقی رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ اس معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ ہم آیت کا حکم اور تلاوت اٹھا دیتے ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عامر نے ننسخ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ انسخت الکتاب سے مشتق ہے اس معنی پر کہ میں نے اسے منسوخ پایا۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے۔ الفارسی ابو علی نے کہا: یہ لغت نہیں ہے کیونکہ نسخ اور انسخ ایک معنی میں ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا مگر یہ کہ اس کا معنی ہو ہم اس کو منسوخ نہیں پاتے۔ جیسے تو کہتا ہے: احمدت الرجل و ابخلتہ، یعنی میں نے اسے محمود اور بخیل پایا۔ ابو علی نے کہا: ہم اسے منسوخ نہیں پاتے مگر یہ کہ ہم اسے منسوخ کر دیں۔ معنی میں دونوں قراءتیں متفق ہیں اور لفظ میں مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَانَنۡسَخۡ کا مطلب ہے ہم تیرے لئے جسے نسخ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نسخت الکتاب جب تو کتاب کو لکھ لے۔ وانتسختہ غیری جب تو اس کے لئے لکھ دے۔ مکی نے کہا: ہمزہ کا متعدی کے لئے ہونا جائز نہیں کیونکہ اس طرح معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ معنی پھر یہ ہو جائے گا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کوئی آیت تجھ پر اتارتے اور انساخۃ ایاھا، کا مطلب ہے: انزالھا علیہ۔ معنی یہ ہوگا: ہم تجھ پر کوئی اتارتے ہیں یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ ہر آیت جو نازل ہوئی اس سے بہتر لائی گئی، تو اس طرح سارا قرآن منسوخ ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن کا تھوڑا حصہ منسوخ ہوا ہے جب افعل اور فعل کا ہم معنی ہونا ممتنع ہوا کیونکہ ایسا سنا نہیں گیا تو معنی کے فساد کی وجہ سے ہمزہ کا متعدی ہونا بھی ممتنع ہوتا۔ پس یہی صورت باقی رہتی ہے کہ یہ اس باب سے ہو: احمدتہ و ابخلتہ (میں نے اسے محمود اور بخیل پایا)۔

**مسئلہ نمبر 14**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوۡ نُنۡسِهَا ابو عمرو اور ابن کثیر نے نون کے فتحہ، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابو عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، حضرت ابی بن کعب، عبید بن عمیر، النخعی، ابن محیصن وغیرہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی تاخیر کرنا ہے۔ یعنی ہم اس کے الفاظ کے نسخ کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم اسے ''ام الکتاب'' میں چھوڑ دیتے ہیں پس وہ منسوخ نہیں ہوتی۔ یہ عطا کا قول ہے اور عطا کے علاوہ کا قول ہے کہ اوننسأھا کا معنی ہے: ہم وقت معلوم تک نسخ کو مؤخر کرتے ہیں۔ یہ عربوں کے قول نسأت ھذا الامر سے مشتق ہے یعنی جب تو کام کو مؤخر کر دے۔ اس سے یہ قول ہے: بعتہ نسأ۔ جب تو اس میں تاخیر کر دے (1)۔ ابن فارس نے کہا: عرب کہتے ہیں: نسأ اللہ فی اجلك و انسأ اللہ اجلك۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے، قد انتسأ القوم، جب قوم دور ہو جائے، نسأتھم، میں نے اسے پیچھے کر دیا۔ معنی یہ ہے کہ ہم اس کے نزول کو مؤخر کرتے ہیں یا اسے منسوخ کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم تم سے اس طرح اسے لے جائیں گے کہ تم نہ پڑھو گے اور نہ یاد کرو گے۔ باقی قراء نے ننسھا نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، نسیان سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ترک ہے، یعنی ہم اسے چھوڑ دیں گے نہ تبدیل کریں گے اور نہ منسوخ کریں گے۔ یہ حضرت ابن

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عباس اور سدی کا قول ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں چھوڑ دیا۔ اس قراءت کو ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا۔ ابو عبید نے کہا: میں نے نعیم القاری کو یہ کہتے ہوئے سنا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خواب میں ابو عمرو کی قراءت پڑھی تو آپ نے مجھ پر صرف دو حرفوں کی تبدیلی فرمائی۔ فرمایا: میں نے پڑھا اُرنا تو آپ نے فرمایا اَرِنا۔ ابو عبید نے کہا: دوسرا حرف میں اوننسأها خیال کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوْ نُنْسِهَا۔ الازہری نے نُنْسِهَا حکایت کیا ہے۔ یعنی ہم اسے چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: انسیته الشئ یعنی میں نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ نسیتة، میں نے اسے ترک کر دیا۔ شاعر نے کہا:

ان علیٰ عقبة اقضیها　　لست بناسیها ولا منسیها

اگر میں اپنے اور پر اونٹوں کو چرانے کا فیصلہ کروں گا تو میں اسے ترک نہیں کروں گا اور نہ اسے ترک کا حکم دوں گا۔

زجاج نے کہا: نون کے ضمہ کے ساتھ قراءت اس میں ترک کے معنی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ نہیں کہا جاتا: انسی بمعنی ترك ہے اور جو علی بن ابی طلحہ بن ابن عباس سے روایت کیا ہے اَوْ نُنْسِهَا فرمایا: ہم اسے چھوڑتے ہیں اسے تبدیل نہیں کرتے (2) یہ صحیح نہیں ہے۔ شاید حضرت ابن عباس نے فرمایا ہو نترکھا اور ضبط نہ کیا گیا ہو۔ اہل لغت میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ اَوْ نُنْسِهَا کا معنی ہے: ہم تمہارے لئے اس کا ترک مباح کرتے ہیں۔ یہ نَسِيَ سے مشتق ہے جب کوئی کسی چیز کو چھوڑ دے پھر تعدیہ کیا گیا۔ ابو علی وغیرہ نے فرمایا: اور یہ قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے: ہم تجھے بنا دیں گے کہ تم اسے چھوڑ دو (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نسیان سے ہے جس کا معنی ہے یاد نہ ہونا، اس معنی پر او تنسکها یا محمد فلا تذ کرها۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ بھلا دیں گے پس آپ اسے یاد نہیں کریں گے۔ ہمزہ کے ساتھ نقل کیا گیا اور فعل کو دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ھا ضمیر ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم محذوف ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ یہاں خیر کا لفظ تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اے لوگو! اس جلدی میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ اخف ہو اور تاخیر میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ (آیت) زیادہ مشکل ہو اور اگر ناسخ و منسوخ برابر ہوں تو اس کی مثل میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے (4)۔ امام مالک نے فرمایا: منسوخ کی جگہ محکم آیت تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت کے اعتبار سے زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال یہ ہے: من جاء بالحسنة فلهٗ خیر منها۔ یعنی جو نیکی کرے گا اس کے لیے اس سے بہتر نفع اور اجر ہوگا۔ اس خیر سے مراد افضل نہیں ہے اور پہلے قول کی دلیل او مثلها کے کلمات ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

"کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کیلئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں"۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ، لَمْ کی وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے اور حروف استفہام عامل کے عمل میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اَنَّ کو فتحہ دیا گیا ہے کہ یہ محل نصب میں ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی ایجاد و اختراع، ملک و سلطان، امر و ارادہ سب زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ ملك پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور لہ اس کی خبر ہے اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔

یہاں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجئے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے حکمرانی اور سلطانی ہے۔ آسمانوں اور زمین میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ ولیّ یہ ولیتُ امر فلان سے مشتق ہے یعنی میں نے فلاں کے معاملہ کی دیکھ بھال کی۔ اسی سے ولی العہد ہے یعنی مسلمانوں کے جو معاملات اس کے سپرد کئے گئے ہیں ان کی نگرانی کرنے والا۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ کے سوا، اللہ کے بعد۔ جیسے امیہ بن الصلت نے کہا:(1)

یا نفس مالك دون الله من واق　　وما على حدثان الدهر من باق

اے نفس! اللہ کے سوا تجھے کوئی بچانے والا نہیں اور زمانے کے واقعات میں سے کوئی باقی رہنے والا نہیں۔

جمہور قراء نے ولا نصیر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ولی پر اس کا عطف کیا ہے اور نصیرٌ ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ ولی کے مقام پر عطف کی حیثیت سے کیونکہ اس کا معنی ہے: ما لکم من دون اللہ ولیٌّ ولا نصیرٌ۔

## اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

”کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تُرِيْدُوْنَ میں اَمْ منقطعہ ہے جو بمعنی بل ہوتا ہے یعنی بل تریدون۔ کلام کا معنی توبیخ ہے۔ اَنْ تَسْـَٔلُوْا، تُرِيْدُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے كَمَا سُىِٕلَ کاف مصدر محذوف کی لغت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی سوالاً کما۔

مُوْسٰى نائب فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے مِنْ قَبْلُ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات عیاں دکھائیں اور اس امت کے لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ ان کے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دیں (2)۔ حسن نے کما سِیل پڑھا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت ہے جو کہتے ہیں: سلت اَسَالُ۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ کا بدل یاء ساکنہ ہو اور بغیر قیاس کے ہو۔ پھر اس سے پہلے سین کو کسرہ دیا گیا ہو۔ نحاس نے کہا: ہمزہ کا بدل بعید ہے۔

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

السواء ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: فی سواء الجحیم۔ (جحیم کے وسط میں) عیسیٰ بن عمر نے حکایت کیا ہے، فرمایا: ما زلت اکتب حتی انقطع سواتی (میں لکھتا رہا حتیٰ کہ میرا درمیان ٹوٹ گیا) حضرت حسان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

یا ویح اصحاب النبی و رھطہ بعد المغیّب فی سواء الملحدِ (1)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور آپ کے گروہ پر افسوس قبر کے درمیان چھپائی گئی ذات کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا السواء کا معنی قصد کرنا ہے۔ فراء سے مروی ہے: ذھب عن قصد الطریق و سَمْتِہٖ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستہ سے ہٹ گیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ رافع بن خزیمہ (2) اور وہب بن زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہمارے پاس آسمان سے کتاب لے آؤ جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لئے نہریں جاری کرو تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾

''دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے (یہ سب کچھ) اس کے بعد اور جب کہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق۔ پس (اے غلامانِ مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے ہو یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: وَدَّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ كُفَّارًا یہ يَرُدُّونَكُمْ کا مفعول ثانی ہے مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم بعض علماء نے فرمایا: یہ یود کے متعلق ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَدًا کے متعلق ہے اور كُفَّارًا پر وقف ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حَسَدًا، وَدَّ کا مفعول لہ ہے یا مصدر ہے اپنے ماقبل پر دلالت کرتا ہے اور مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے اپنی طرف سے، نہ وہ یہ کتاب میں پاتے ہیں اور نہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہوتا ہے حسد کا لفظ یہ مفہوم دیتا ہے اور عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ بطور تاکید اور الزام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ (آل عمران: 167) اسی طرح يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (البقرہ: 79) اور اسی طرح وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام: 38) ان تینوں آیات میں بِاَفْوَاهِهِمْ، بِاَيْدِيْهِمْ اور بِجَنَاحَيْهِ تاکید کے لئے ہے۔ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 2:** حسد کی دو قسمیں ہیں: (۱) مذموم، (۲) محمود۔ مذموم یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، خواہ تو نے یہ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ نعمت لوٹ آئے یا تو نے یہ تمنا نہ کی ہو۔ اس قسم کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ممانعت فرمائی ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء: 54)

یہ حسد مذموم ہے کیونکہ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ کی تقسیم کو درست نہ سمجھنا ہے کہ اس نے (گویا) غیر مستحق پر انعام کر دیا ہے۔ اور حسد کی محمود صورت وہ ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد صرف دو شخصوں سے کرنا چاہئے: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ قرآن عطا فرماتا ہے اور وہ رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور وہ اسے رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں خرچ کرتا ہے(2)۔ یہ وہ حسد ہے جس کا معنی غبطہ (رشک) ہے، اسی طرح اس پر امام بخاری نے باب باندھا ہے: باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو تمنا کرے کہ تیرے لئے بھی وہ خیر اور نعمت ہو جو تیرے مسلمان بھائی کے پاس ہے اور اس سے خیر زائل نہ ہو۔ اس کو منافسہ کہنا بھی جائز ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ (المطففین) اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (یعنی اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو چکا ہے)۔ حق سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور قرآن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** فَاعْفُوْا اصل میں اعفوو اتھا ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ العفو سے مراد گناہ پر مؤاخذہ کو ترک کرنا ہے۔ الصفح کا معنی نفس سے گناہ کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ صفحت عن فلان کا معنی ہے: میں نے اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ ضربت عنہ صفحاً میں نے اس سے اعراض کیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (الزخرف: 5) (کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو)

**مسئلہ نمبر 2:** یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب اغتباط صاحب القرآن، حدیث 4637، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صٰغِرُوْنَ (توبہ:29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر...... اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں) یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی ناسخ فاقتلوا المشرکین ہے (1)۔ ابو عبیدہ نے کہا: ہر وہ آیت جس میں قتال کا ترک ہے وہ مکی ہے اور قتال کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے (2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا یہ حکم کہ یہ آیت مکی ہے ضعیف ہے کیونکہ یہود کی مخالفتیں تو مدینہ میں تھیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بات صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گدھے پر سوار ہوئے جس کے اوپر فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور حضرت اسامہ آپ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ بنی حارث بن خزرج میں حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ پس وہ دونوں چلے حتیٰ کہ اس مجلس کے پاس سے گزرے جس میں عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہ عبداللہ کے ظاہراً اسلام قبول کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مجلس میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہود جمع تھے۔ مسلمانوں میں سے حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی تھے۔ جب مجلس پر گدھے کا غبار چھانے لگا تو عبداللہ بن ابی نے اپنا ناک اپنی چادر سے ڈھانپ دیا اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کیا پھر آپ ٹھہرے اور گدھے سے اترے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر قرآن پڑھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: اے شخص! یہ انداز اچھا نہیں جو آپ کہتے ہیں اگر حق بھی ہے تو ہمیں ہماری مجالس میں اس کے ساتھ اذیت نہ دے، اپنی منزل کی طرف لوٹ جا جو تیرے پاس آئے اسے بیان کر۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیں ہم اس پیغام کو پسند کرتے ہیں۔ مشرکوں، مسلمانوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہو گئی حتیٰ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے قریب ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں خاموش کراتے رہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہوئے اور چل پڑے حتیٰ کہ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے سعد! کیا تو نے نہیں سنا جو ابو حباب...... آپ کی مراد عبداللہ بن ابی تھا...... نے کہا ہے اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ حضرت سعد نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اس کو معاف کر دیں اور اس سے درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔ اللہ آپ کے پاس حق لایا جو اس نے آپ پر اتارا، مدینہ طیبہ کے لوگوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عبداللہ بن ابی کو تاج پہنائیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ساتھ اس معاملہ کو رد کر دیا جو آپ کو عطا فرمایا تو یہ غصہ میں ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے اس نے کہا جو آپ نے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکوں اور اہل کتاب کو معاف کر دیتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا اور اذیت پر صبر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا (آل عمران:186) (اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

دینے والی بہت باتیں) اور فرمایا وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب)۔
رسول اللہ ﷺ حکم الٰہی کے مطابق معاف فرماتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے لڑنے کی اجازت دی۔
جب رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر لڑی تو اللہ تعالیٰ نے قریش کے رئیسوں اور کفار کے سرداروں کو آپ ﷺ کے ذریعے قتل کر دیا، پس رسول اللہ ﷺ اور صحابہ جنگ بدر سے مال غنیمت حاصل کر کے اور فتحیاب ہو کر لوٹے، ان کے ساتھ قریش کے سردار اور کفار کے رئیس قیدی تھے، عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھ مشرکوں اور بت پرستوں نے کہا: یہ امر ظاہر ہو کر رہے گا۔ پس انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام کی بیعت کر لی، اور اسلام لے آئے۔(1)
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یعنی قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ حدیث پاک میں ہے بندہ جب مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: اس نے پیچھے کیا چھوڑا، فرشتے کہتے ہیں: اس نے آگے کیا بھیجا۔ بخاری اور نسائی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وارث کے مال سے زیادہ اپنا مال پسند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرا مال وہ ہے جو تو نے آگے بھیجا، اور تیرے وارث کا مال وہ ہے جو تو نے پیچھے چھوڑا۔ یہ نسائی کے الفاظ کا ترجمہ ہے اور بخاری کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال زیادہ محبوب ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا (2)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بقیع الغرقد (مدینہ طیبہ کا قبرستان) سے گزرے اور کہا: السلام علیکم اہل القبور پھر کہا: ہمارے پاس خبریں یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے نکاح کر لئے ہیں، تمہارے گھروں میں دوسرے لوگ سکون پذیر ہیں، تمہارے مال تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہاتف نے جواب دیا: اے ابن خطاب! ہمارے پاس خبریں یہ ہیں ہم نے جو آگے بھیجا وہ ہم نے پالیا اور جو ہم نے خرچ کیا اس کا ہم نے نفع پایا اور جو ہم نے پیچھے چھوڑا اس میں ہم نے نقصان اٹھایا...... کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

قدم لنفسك قبل موتك صالحاً و اعمل فليس الى الخلود سبيل

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے نیک اعمال بھیج اور نیک عمل کر کسی کے لئے ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔
ایک اور شاعر نے کہا:

قدم لنفسك توبة مرجوة قبل الممات و قبل حبس الالسن

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے اور زبانوں کے خاموش ہونے سے پہلے توبہ کر جس کی قبولیت کی امید ہو۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب كنية المشرك، حدیث نمبر 5739، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، باب ما قدم من ماله فهو له، حدیث 5961

ایک اور نے کہا:

ولدتك اذ ولدتك امك باكياً والقوم حولك يضحكون سروراً

فاعمل ليوم تكون فيه اذا بكوا فی يوم موتك ضاحكاً مسروراً

تیری والدہ نے تجھے جنم دیا جبکہ تو رو رہا تھا اور قوم تیرے اردگرد خوشی سے ہنس رہی تھی۔ تو اس دن کے لئے عمل کر جس میں لوگ تیری موت پر رو رہے ہوں جبکہ تو اس میں خوشی سے ہنس رہا ہو۔

ایک اور نے کہا:

سابق الی الخير و بادر به فانما خلفك ماتعلم

و قدم الخير فكل امرئ على الذی قدمه يقدم

تو نیکی کی طرف سبقت کر اور اس میں جلدی کر تیرے پیچھے وہ ہوگا جس کو تو جانتا ہے۔ اور نیکی کو آگے بھیج ہر شخص اس پر ہوگا جو وہ آگے بھیجے گا۔

ان تمام سے خوبصورت ابوالعتاہیہ کا قول ہے:

اسعد بما لك فی حياتك انما يبقى وراءك مصلح او مفسد

واذا تركت لمفسد لم يبقه و اخو الصلاح قليله يتزيد

وان استطعت فكن لنفسك وارثاً ان المورث نفسه لمسدد

تو اپنی زندگی میں اپنے مال سے سعادت حاصل کر لے تیرے پیچھے نیکوکار ہوگا یا فسادی ہوگا۔ جب تو اپنا مال فسادی کے لئے چھوڑے گا تو وہ اسے نہیں چھوڑے گا اور نیکوکار کا تھوڑا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو اپنے لئے وارث بنا وارث بنانے والا ہی پختہ ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''انہوں نے کہا: نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس۔ نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی مطلب یہ ہے کہ یہود نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو نصرانی ہوگا۔ فراء نے جائز قرار دیا کہ هُوْدًا بمعنی یہودیًا اور یہ جمع ہے هائدٌ کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ من کا معنی جمع ہے۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ، هَاتُوْا اصل میں هاتِيُوا تھا، ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر یا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا واحد مذکر کے لئے کہا جاتا ہے: ھات جیسے رام اور مونث کے لئے ھاتی جیسے رامی۔

البرھان سے مراد وہ دلیل ہوتی ہے جو یقین کو واقع کرتی ہے یعنی جس سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ برھان کی جمع براھین ہے جیسے قربان و قرابین، سلطان و سلاطین۔ طبری نے کہا: یہاں دلیل طلب کرنا غور وفکر کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے (1) اور جو اس کی نفی کرتا ہے اس کا رد کرتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی اگر تم اپنے ایمان میں یا اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ہی جنت میں داخل ہوگے۔ یعنی جو تم نے کہا ہے اسے دلیل سے بیان کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰی یہ ان کا رد ہے اور انہیں جھٹلانا ہے یعنی ایسا نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو۔ بعض نے فرمایا: معنی پر محمول ہے، گویا کہ کہا گیا ہے کیا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا؟ تو کہا گیا: بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ، اَسْلَمَ کا معنی سرنگوں ہونا اور سر تسلیم خم کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اپنے عمل کو خالص کرنا ہے، الوجہ (چہرہ) کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ انسان کا جو حصہ نظر آتا ہے اس میں سے معزز ترین حصہ ہے، اور اس لئے کہ یہ جو اس کی جگہ ہے، اس میں عزت و ذلت ظاہر ہوتی ہے عرب چہرہ کا ذکر کر کے پوری چیز کی خبر دیتے ہیں اس آیت میں وجہ سے مراد مقصد ہونا بھی صحیح ہے وَهُوَ مُحْسِنٌ یہ جملہ حال ہے، ضمیر، وَجْهَهٗ کی طرف لوٹ رہی ہے اور لہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسی طرح اجرہ ہے علیھم میں ضمیر جمع معنی کے اعتبار سے ہے اسی طرح یحزنون بھی معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ یحزنون کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتابیں۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے''۔

یعنی ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مقابل کسی چیز (دین) پر نہیں ہے اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا زیادہ مستحق ہے (2)۔ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی وہ تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ جملہ حال ہے اور الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

مراد جمہور کے نزدیک عرب کے کفار ہیں کیونکہ ان کے پاس کتاب نہ تھی۔ عطا نے کہا ہے: اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھیں (1)۔ ربیع بن انس نے کہا: مطلب یہ ہے کہ یہود نے نصاریٰ سے پہلے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اہل نجران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو ان کے پاس یہود کے علماء بھی آئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑنے لگے، ہر ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم کسی دین پر نہیں ہو۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

"اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَظْلَمُ خبر ہے مطلب یہ ہے کہ لا احدَ اظلم کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے۔ اور اَنْ محل نصب میں ہے۔ مَسٰجِدَ سے بدل کے اعتبار سے۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: کراھیۃ ان یُذکرَ پھر حذف کیا گیا۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: من ان یذکر فیھا۔ اور حرف جر کو طول کلام کی وجہ سے ان سے پہلے حذف کیا گیا اور یہاں مَسٰجِدَ سے مراد بیت المقدس اور اس کی محرابیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: کعبہ ہے اور جمع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کعبہ مساجد کا قبلہ ہے یا تعظیم کے لئے جمع ذکر کیا گیا۔ بعض نے فرمایا: مَسٰجِدَ سے مراد تمام مساجد ہیں، ان کا واحد مسجِد (جیم کے کسرہ کے ساتھ۔) عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: مسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) (3)۔ فراء نے کہا ہے: ہر فعل جو فعل یفعُلُ کے وزن پر ہو مثلاً دخل یدخل تو اس سے مَفعَل فتحہ کے ساتھ آتا ہے خواہ وہ اسم ہو یا مصدر ہو۔ اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً دخل یدخل مدخلا۔ ھذا مدْخَلُہٗ۔ مگر چند الفاظ ایسے ہیں جن پر کسرہ پڑھا جاتا ہے: مسجِد، مطلِع، المغرِب، المشرِق، المسقِط، المفرِق، المجزِر، المسکِن، المرفِق۔ (یہ رفق یرفق سے ہے) المنبِت، المنسِك (یہ نسك ینسك سے ہے) کسرہ کو اسم کی علامت بنایا ہے۔ بعض اوقات بعض عرب اسم میں فتحہ دیتے ہیں وہ المسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) انسان کی پیشانی جہاں سجدہ کے لیے پہنچتی ہے: الآراب، وہ سات اعضاء جو سجدہ میں زمین پر لگتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اس آیت سے مراد کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اور یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ بخت نصر کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے بیت المقدس کو خراب کیا تھا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

نے کہا: یہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ معنی یہ ہے کہ تم کیسے دعویٰ کرتے ہوا ے نصاریٰ! کہ تم اہل جنت میں سے ہو حالانکہ تم نے بیت المقدس کو خراب کیا اور اس میں نمازیوں کو نماز پڑھنے سے روکا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: نصاریٰ کے فعل پر تعجب کا اظہار ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کے ساتھ یہ کیا حالانکہ وہ اس کی تعظیم بھی کرتے تھے اور انہوں نے یہود سے عداوت کی۔

سعید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ الله کے دشمن نصاریٰ ہیں، یہود کے بعض نے انہیں ابھارا کہ انہوں نے بخت نصر بابلی مجوسی کی بیت المقدس کی تخریب میں معاونت کی۔(2)

روایت ہے کہ یہ تخریب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی۔ بعض نے فرمایا: یہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے نمازیوں کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا اور حدیبیہ کے ساتھ انہیں مسجد حرام میں داخل نہ ہونے دیا (3)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے بھی قیامت تک کسی مسجد سے کسی کو روکا۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے۔ بعض مساجد کے ساتھ تخصیص اور بعض اشخاص کے ساتھ خاص کرنا ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**: مساجد کا خراب کرنا کبھی حقیقۃً ہوتا ہے جیسے بخت نصر اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی تخریب کی تھی جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے اپنے کسی بادشاہ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام نطوس بن اسبیسانوس رومی تھا جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ پس انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنایا، تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس میں غلاظت پھینکی اور اسے خراب کیا۔

اور کبھی تخریب مسجد مجازاً ہوتی ہے، جیسے مشرکین کا مسلمانوں کو منع کرنا۔ جب انہوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے روک دیا۔ پس نماز اور شعائر اسلام کی مساجد میں ادائیگی سے روک دینا یہ اسے خراب کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: ہمارے علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: عورت کو حج کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے جب اس نے حج نہ کیا ہو خواہ اس کا محرم ہو یا نہ ہو اور اسے مساجد میں نماز پڑھنے سے بھی نہ روکا جائے جب اس پر فتنہ کا خوف نہ ہو۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تمنعوا اماء الله مساجد الله (4)۔ تم الله کی بندیوں کو مساجد سے نہ روکو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: مسجد کو توڑنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کا بیچ کرنا اور معطل کرنا جائز ہے اگرچہ محلہ خراب بھی ہو جائے اور مسجد بنانے سے بھی نہیں روکا جائے گا مگر یہ کہ لوگوں کا ارادہ اختلاف اور جھگڑا ہو مثلاً وہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائیں اور ان سے مقصود پہلی مسجد کے لوگوں میں جدائی ڈالنا ہو اور خراب کرنا ہو اور اختلاف پیدا کرنا ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو دوسری مسجد کو توڑا جائے گا اور اس کے بنانے سے منع کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ایک شہر میں دو جامع مسجد ہونی جائز نہیں ہیں اور نہ ایک مسجد کے لئے دو امام جائز ہیں اور نہ ایک مسجد میں دو جماعتیں جائز ہیں۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورہ براءت میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، باب هل على من لم يشهد الجمعة غسل من النساء والصبيان وغيرهم، حدیث نمبر 849، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے گا اور سورۂ نور میں مساجد اور ان کی بنا کا حکم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیان کیا جائے گا۔ یہ آیت نماز کے امر کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے۔ جب نماز افضل عمل ہے اور اجر کے اعتبار سے عظیم ہے تو اس کا منع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: ہر جگہ جہاں اللہ کی عبادت کرنا ممکن ہو اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا جاتا ہو اسے مسجد کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً (میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا باعث بنائی گئی ہے) اس حدیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے(1)۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ وہ جگہ جو زبان کے ساتھ نماز کے لئے متعین کی گئی ہو تو وہ مالک کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے اور وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص اپنے گھر میں مسجد بنائے اور لوگوں کو اس سے روکے اور اسے اپنے لئے مختص کرے تو وہ اس کی ملکیت پر رہے گی اور وہ مسجد کی تعریف میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ تمام لوگوں کے لئے اس میں نماز پڑھنا مباح کر دے تو پھر اس کا حکم عام مساجد جیسا ہو جائے گا اور ملکیت سے نکل جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 6**: اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ، اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے خَآئِفِيْنَ حال ہے یعنی مسلمان جب اس پر غالب آ جائیں اور وہ مسلمانوں کی سلطنت کے تحت آ جائے تو اس وقت ان مساجد میں کافر کا داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ اگر کافر اس میں داخل ہوں گے تو انہیں خوف ہوگا کہ مسلمان انہیں نکال دیں گے اور اس میں داخل ہونے پر سزا دیں گے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کافر کے لئے مسجد میں داخل ہونا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جنہوں نے اس آیت کو نصاریٰ کے بارے تصور کیا اس نے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی اسلام میں تعمیر فرمائی تو اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا کہ کوئی نصرانی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا مگر اسے سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد کہ وہ ان کی عبادت گاہ تھی (2) اور جنہوں نے اسے قریش کے بارے تصور کیا۔ اس نے کہا: نبی کریم ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی بیت اللہ کا طواف برہنہ ہو کر نہیں کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس سے مقصود امر ہے یعنی تم کافروں سے جہاد کرو اور انہیں جڑ سے اکھیڑ دو حتیٰ کہ ان میں سے کوئی مسجد حرام میں داخل نہ ہو مگر ڈرتے ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (احزاب: 53) یہ حقیقت میں نہی ہے جو خبر کے لفظ کے ساتھ وارد ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ بعض علماء نے فرمایا: یہ حربی کو قتل کرنا ہے اور ذمی کے لئے جزیہ ہے، قتادہ اور سدی سے مروی ہے، الخزی لهم فی الدنیا سے مراد مہدی کا قیام، عموریہ، رومیہ، قسطنطنیہ اور ان کے دوسرے شہروں کی فتح ہے۔ جیسا کہ ہم نے ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور جنہوں نے کہا یہ قریش کے متعلق ہے انہوں نے الخزی سے مراد فتح مکہ لیا ہے اور آخرت میں عذاب ہے اس کے لئے جو کافر ہو کر مرے گا۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ، الْمَشْرِقُ سے مراد طلوع کی جگہ اور الْمَغْرِبُ سے مراد غروب ہونے کی جگہ ہے۔ یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی جہات اور مخلوق کی ایجاد و اختراع اللہ کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ مشرق و مغرب کو خصوصی ذکر فرمایا ان کو شرف دینے کے لئے، جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ۔ کیونکہ آیت کا سبب اس کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2:** فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا یہ شرط ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے۔ این عاملہ ہے اور ما زائدہ ہے۔ اور جواب فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ہے۔ حسن نے تولوا تا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اصل میں تتولوا تھا اور ثم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے اس کا معنی بعد ہے، مگر یہ مبنی بر فتحہ ہے معرب نہیں ہے کیونکہ یہ مبہمہ ہے۔ یہ بعد کے لئے هناک کے قائم مقام ہے اگر تو قرب کا ارادہ کرے گا تو تو ھنا کہے گا۔

**مسئلہ نمبر 3:** فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا کس معنی میں نازل ہوا؟ اس میں علماء کے پانچ مختلف اقوال ہیں: حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے تاریک رات میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تاریک رات میں سفر پر تھے ہمیں معلوم نہ تھا کہ قبلہ کہاں ہے ہر شخص نے اپنی سمت پر نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث ایسی ہے جس کی سند قابل حجت نہیں ہے ہم اس کو اشعث السمان کی حدیث سے جانتے ہیں اور اشعث بن سعید ابو الربیع حدیث میں ضعیف شمار کیا جاتا ہے۔ (1)

اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب بادل کی صورت میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر بعد میں اسے علم ہو کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ حضرات سفیان، ابن المبارک، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے مگر امام مالک فرماتے ہیں: پھر وقت میں اس نماز کا اعادہ مستحب ہے اور اس پر اعادہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس نے فرض تو ادا کر لیا جیسا اسے حکم دیا گیا تھا اور کمال وقت میں پایا جا سکتا ہے۔ یہ امام مالک نے سنت سے استدلال کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے تنہا نماز پڑھی پھر اس نے اس نماز کو وقت کے اندر جماعت کے ساتھ پایا تو وہ لوگوں کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور وقت میں استحباباً اعادہ نہ کرے مگر وہ جو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھے یا مشرق یا مغرب کی طرف اپنی پوری کوشش کے بعد نماز پڑھے۔ اور جس نے قبلہ کی تھوڑی دائیں یا بائیں

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، جلد 2، صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

جانب کوشش سے نماز پڑھی اس پر وقت کے اندر اور وقت کے بعد اعادہ نہیں ہے۔ مغیرہ اور امام شافعی نے کہا: نماز جائز نہیں ہے کیونکہ قبلہ کی سمت ہونا نماز کی شروط میں سے ہے (جب شرط نہ پائی گئی تو نماز ہی نہ ہوئی)۔ جو امام مالک نے کہا ہے وہ اصح ہے کیونکہ قبلہ کی جہت کو ضرورت، جنگ کی حالت میں اس کے ترک کو مباح کر دیتی ہے اور حالت سفر میں رخصت اس کو مباح کر دیتی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: یہ آیت مسافر کے بارے نازل ہوئی وہ نفل پڑھ سکتا ہے جدھر بھی اس کی سواری کا رخ ہو۔ یہ مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے سواری پر نفلی نماز پڑھتے تھے جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا تھا (1)۔ فرمایا: اس کے متعلق فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ نازل ہوئی۔ علماء کا سواری پر نفل پڑھنے میں اس حدیث کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور کسی کے لئے جان بوجھ کر بغیر شدت خوف کے قبلہ کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

مریض کے بارے میں امام مالک کا قول مختلف ہے جو محمل پر نماز پڑھتا ہے۔ کبھی فرمایا: وہ اونٹ کی پیٹھ پر فرض ادا کرے اگرچہ مرض شدید بھی ہو۔ سحنون نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اعادہ کرے گا۔ یہ الباجی نے حکایت کیا ہے۔ کبھی کہا: اگر وہ ایسا شخص ہے جو زمین پر نماز نہیں پڑھ سکتا مگر اشارہ کے ساتھ تو وہ اونٹ کے اوپر نماز پڑھ لے اس کے بعد اس کے اونٹ کو روکا جائے اور منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔ اور اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی صحیح آدمی کے لئے فرض ادا کرنا جائز نہیں ہیں مگر زمین پر، مگر خوف شدید ہو تو پھر سواری پر فرض نماز ادا کر سکتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

فقہاء کا اس مسافر کے بارے میں اختلاف ہے جو ایسا سفر کرتا ہے جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور ثوری نے فرمایا کہ سواری پر نفل نہ پڑھے مگر ایسے سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ سفر جو رسول اللہ ﷺ سے حکایت کئے جاتے ہیں کہ ان میں آپ نوافل سواری پر پڑھتے تھے، وہ وہ سفر تھے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن حیی، اللیث بن سعد، داؤد بن علی نے کہا: شہر سے باہر ہر سفر میں سواری پر نفل نماز پڑھنا جائز ہے خواہ اس سفر میں نماز قصر کی جاتی ہو یا نہ کی جاتی ہو کیونکہ آثار ایسے ہیں جن میں کسی خاص سفر کا ذکر نہیں۔ ہر سفر میں نفلی نماز جائز ہے مگر یہ کہ کسی سفر کو ایسی روایت کے ساتھ خاص کیا گیا ہو جو واجب التسلیم ہو۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: شہر میں بھی سواری پر اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید کی حدیث حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گدھے پر اشارے سے نماز پڑھی۔ طبری نے کہا: ہر سوار اور پیدل کے لئے جائز ہے جو وہ مقیم ہو یا مسافر ہو سواری پر اور چلتے ہوئے نفلی نماز اشارے سے پڑھے۔ بعض اصحاب شافعی سے حکایت ہے کہ ان کا مذہب سفر و حضر میں سواری پر نفل پڑھنے کے جواز کا ہے۔ الاثرم نے کہا: احمد بن حنبل سے حضر میں سواری پر نماز کے بارے پوچھا گیا تو امام احمد نے فرمایا: سفر کے بارے تو میں نے سنا ہے لیکن حضر کے بارے نہیں سنا۔ ابن القاسم نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب القبلۃ، باب الحال التی یجوز علیہا استقبال غیر القبلۃ، حدیث نمبر 735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب الوتر فی السفر، حدیث نمبر 945، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو محمل میں نفل پڑھے تو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کا قیام چوکڑی مار کر بیٹھنا ہے وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکوع کرے پھر اپنے سر کو اٹھائے۔ قتادہ نے کہا: یہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ فوت ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر بلایا۔ صحابہ نے عرض کی: ہم اس شخص پر کیسے نماز پڑھیں گے جو فوت ہو چکا ہے اور وہ ہمارے قبلہ کے علاوہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا(1)۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا، اس کا نام اصحمہ تھا عربی میں اس کا معنی عطیہ ہے۔ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہوا تھا حالانکہ قبلہ تبدیل ہو چکا تھا اور قبلہ کعبہ بن چکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بارے میں نازل ہوا: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ (آل عمران:199) یہ نجاشی کے لئے عذر تھا۔(2)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ اس سے غائب پر نماز جنازہ پڑھنے پر امام شافعی نے استدلال کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میت پر نماز کے مسائل میں سے غریب ترین مسئلہ وہ ہے جو امام شافعی نے کہا کہ غائب پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ میں بغداد میں فخر الاسلام کی مجلس میں تھا۔ ان کے پاس خراسان سے ایک شخص آیا اس سے فخر الاسلام نے پوچھا: فلاں کا کیا حال ہے؟ اس شخص نے کہا: وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ فخر الاسلام نے کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ پھر ہمیں فرمایا: اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ پس وہ کھڑے ہوئے اور ہمیں اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ اس کے مرنے کے چھ ماہ بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور درمیان میں چھ ماہ کی مدت تھی۔

شوافع کے نزدیک اس کی اصل نجاشی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین وجوہ کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تھے۔ (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زمین جنوباً شمالاً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ نجاشی کا جنازہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا، جس طرح زمین شمالاً جنوباً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ آپ نے مسجد اقصیٰ دیکھ لی۔ مخالف نے کہا: اس روایت میں کیا فائدہ ہے؟ آپ کی برکت کے لاحق ہونے کا فائدہ ہے۔ (۲) نجاشی کے لئے وہاں مومنین میں سے کوئی ولی نہ تھا جو اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ مخالف نے کہا: یہ عادۃً محال ہے، بادشاہ ایک دین پر ہو اور اس کا کوئی پیروکار نہ تھا، محال کے ساتھ تاویل محال ہے (۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے میں اس پر رحمت داخل کرنے اور اس کے بعد والے بادشاہوں کی الفت چاہنے کا ارادہ کیا تھا جب وہ زندہ اور مردہ حالت میں اس کا اہتمام دیکھیں گے۔ مخالف نے کہا: دعا کی برکت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دوسروں سے میت کو بالاتفاق لاحق ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے کی حکمت یہ تھی کہ نجاشی اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں میت پر نماز پڑھنے کا علم نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بغیر نماز کے ہی اسے دفن کر دیں گے تو آپ نے اس کی نماز کی طرف جلدی کی۔

میں کہتا ہوں: پہلی تاویل احسن ہے کیونکہ جب آپ نے اسے دیکھ لیا تو غائب پر نماز نہ ہوئی بلکہ حاضر اور مرئی پر نماز جنازہ پڑھی۔ غائب وہ ہوتا ہے جو نظر نہ آئے۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

چوتھا قول: ابن زید نے کہا: یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے اور کہتے تھے: ہدایت نہیں پائی مگر ہمارے ذریعے۔ جب کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہود نے کہا: کس چیز نے پھیر دیا انہیں جس پر (پہلے) وہ تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (1) (اللہ کے لیے ہے مشرق و مغرب) اس قول پر وجہ نظم یہ ہے کہ یہود نے جب قبلہ کے امر کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اپنے بندوں کو جس قبلہ کا چاہے مکلف بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے، اگر چاہے تو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے۔ اس کے فعل کے خلاف حجت پیش نہیں کی جاسکتی۔ جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور لوگوں سے ان کے افعال کے متعلق پوچھا جائے گا۔

پانچواں قول: یہ آیت، اس آیت وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ:144) سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس نے ذکر کیا ہے گویا ابتداء اسلام میں جائز تھا کہ جدھر چاہے آدمی منہ کر کے نماز پڑھ لے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قتادہ نے کہا۔ اس آیت کا ناسخ یہ ارشاد ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ:149) (یعنی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو) یہ ابو عیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے۔

چھٹا قول: مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو ادھر ہی اللہ تعالیٰ ہے اس نے استقبال قبلہ کا حکم دیا ہے (2)۔ مجاہد اور ابن جبیر سے مروی ہے جب ادعونی استجب لکم نازل ہوا تو لوگوں نے کہا کدھر منہ کر کے مانگیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

حضرت ابن عمر اور نخعی سے مروی ہے، تم اپنے سفروں میں اور گردشوں میں جہاں بھی ہو ادھر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا تعلق وَمَنْ اَظْلَمُ الخ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے: اے مومنو! اللہ کے شہر تمہیں سما سکتے ہیں، تمہیں اس شخص کی تخریب قبلہ کی طرف منہ کرنے سے نہ روکے، جو اللہ کی مساجد کی تخریب کرتا ہے، تم زمین میں جہاں بھی ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے قریب جانے سے روکا گیا تھا، تو مسلمان اس پر مغموم ہوئے (3)۔ یہ دس اقوال ہیں۔ اور جن علماء نے اسے منسوخ کیا ہے ان پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی کیونکہ خبر، امر کے معنی کا احتمال رکھتی ہے اور اس معنی کا احتمال ہے کہ تم اپنے چہرے اللہ کی طرف کر لو۔ یہ آیت وہ ہے جو حضرت سعید بن جبیر نے تلاوت کی تھی جب حجاج نے زمین کی طرف منہ کر کے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 4:** قرآن و حدیث میں وَجْهُ جو اللہ کی طرف مضاف ہوتا ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ماہرین نے کہا: یہ وجود کی طرف راجع ہے یہ کلام میں مجاز ہے ذات کو اس سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ اعضاء میں ظاہر ترین عضو ہے اور قدر و منزلت میں عظیم ہے (4)۔ ابن فورک نے کہا: بعض دفعہ صفت ذکر کی جاتی ہے اور مجازاً موصوف مراد ہوتا ہے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً، تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے: میں نے آج فلاں کا علم دیکھا، میں نے فلاں کے علم کی طرف دیکھا۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ میں نے عالم دیکھا اور عالم کی طرف دیکھا۔ اسی طرح یہاں وَجْهُ ذکر ہے اور مراد وجود ہے۔

اسی تاویل پر یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر:9) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے لئے وَجْهُ ہے اس طرح یہ آیت ہے: اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ (اللیل) یعنی وہ ذات جس کے لئے وجہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وَجْهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن)

بعض ائمہ نے فرمایا: یہ نقل سے صفت ثابتہ ہے اور ان صفات سے زائد ہے جن کو عقول واجب قرار دیتی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا(1): اس قول کو ابو المعالی نے ضعیف قرار دیا ہے یہ اسی طرح ضعیف ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں الوجہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے یعنی قبلہ، بعض نے فرمایا: الوجہ سے مراد قصد ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

استغفر الله ذنبا لست مُحصيه رب العباد اليه الوجه والعمل

میں اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جو بے شمار ہیں بندوں کے رب کی غر ہی قصد اور عمل ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی ہے: فثم رضا الله و ثوابه، یعنی ادھر اللہ کی رضا اور ثواب ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر:9) ہم اللہ کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب میں تمہیں کھلاتے ہیں۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من بنى مسجدا يبتغى به وجه الله بنى الله له مثله فى الجنة(2)۔ جس نے مسجد بنائی اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی رضا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: قیامت کے روز مہر شدہ صحیفوں کو لایا جائے گا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: ان کو پھینک دو اور ان کی طرف توجہ کرو۔ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے رب! تیری عزت کی قسم! ہم تو انہیں خیر دیکھتے تھے اللہ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان هذا كان لغير وجهى ولا اقبل من العمل الا ما ابتغى به وجهى۔ یہ اعمال میری رضا کے لئے نہ تھے اور میں صرف وہی عمل پسند کرتا ہوں جو میری رضا کے لئے ہو...... اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مراد فثم الله ہے الوجہ زائد ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: و هو معكم۔ یہ کلبی، قتبی کا قول ہے۔ معتزلہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ اپنے بندوں پر ان کے دین میں وسعت فرماتا ہے اور انہیں ایسی تکلیف نہیں دیتا جو ان کی طاقت میں نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاسِعٌ کا معنی ہے: اس کا علم ہر چیز گھیرے ہوئے ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ)

فراء نے کہا: الواسع اس سخی کو کہتے ہیں جس کی عطا ہر چیز کو شامل ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَرَحْمَتِيْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، کتاب المساجد، باب من بنی مسجدا، حدیث نمبر 431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ سِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف: 156)

اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مغفرت میں وسعت رکھنے والا ہے، کوئی گناہ اس مغفرت سے بڑا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنے بندوں پر فضل فرمانے والا اور ان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یسع مایسئل، یعنی فلاں عطا فرماتا ہے جو اس سے مانگا جاتا ہے یعنی بخل نہیں کرتا۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (الطلاق: 7) یعنی غنی کو اس سے خرچ کرنا چاہئے جو الله تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا۔ ہم اپنی کتاب الاسنیٰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے الله نے (اپنا) ایک بیٹا، پاک ہے وہ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یہ نصاریٰ کے متعلق خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا: المسیح ابن الله (حضرت عیسیٰ علیہ السلام الله کا بیٹا ہے) نعوذ بالله من ذالك۔ بعض نے فرمایا: عرب کے کفار کے متعلق خبر ہے کہ انہوں نے کہا: الملائکۃ بنات الله (ملائکہ الله تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) اسی طرح کی اخبار جاہل کفار کے متعلق ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم اور انبیاء کرام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھا۔

**مسئلہ نمبر 2**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی الله علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: الله تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اور اسے یہ مناسب نہ تھا، ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اسے یہ چاہیے نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا: میں اسے دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں ہوں جس طرح وہ پہلے تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: میرا بیٹا ہے میری ذات کسی کو بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 3**: سُبْحٰنَهٗ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہے: پاک کرنا، بری کرنا، ہر نقص سے علیحدہ جاننا۔ لوگوں نے کہا: الله نے بیٹا بنایا نہیں بلکہ الله تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے، اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو پیدا کیا ہے کہ وہ بیوی کا محتاج ہو۔ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ (انعام: 101) (کیونکر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو)

ولم یُوْلَدْ، نہ وہ پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کوئی ہو۔ الله تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم اور منکر کہتے ہیں بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، ما مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر مجرور ہے یعنی ایجاد و اختراع کے اعتبار سے ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے، اور جو یہ کہنے والا ہے کہ اس نے بیٹا بنایا یہ جملہ آسمانوں اور زمین میں داخل ہے(2)۔ سبحان الله کا معنی

1۔ صحیح بخاری، باب وقالوا اتخذ الله ولدا سبحانه، حدیث نمبر 4122، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** بچہ، والد کی جنس سے ہوتا ہے۔ پس حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے اپنی مخلوقات میں سے بیٹا بنانا کیسے درست ہوگا جبکہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ (مریم) (کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمن کی بارگاہ میں بندہ بن کر) اسی طرح فرمایا: بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلکہ اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے)۔ اولاد ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے اور قدیم ہونا وحدانیت اور ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم، ازلی اور یکتا ہے تنہا اور بے نیاز ہے۔ وہ وہ ہے جس نے نہ کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ پھر بیٹا ہونا، غلامی اور عبودیت کے منافی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مریم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ پس بیٹا عبد کیسے ہوگا۔ یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ تقدیر عبارت کلھم ہے پھر ھا اور میم کو حذف کیا گیا۔ قٰنِتُوْنَ کا معنی اطاعت کرنے والے اور عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہے۔ جمادات کی اطاعت ان پر اور ان میں اس کی صنعت کے ظہور میں ہے۔ قنوت کا معنی اطاعت اور سکوت ہے(1)۔ اسی سے حضرت زید بن ارقم کا قول ہے ہم نماز میں کلام کرتے تھے۔ آدمی اپنے قریب والے شخص سے بات کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ (البقرہ:238) ہمیں سکوت کا حکم دیا گیا اور ہمیں کلام سے منع کیا گیا۔

القنوت کا معنی نماز بھی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

قانتاً للہ یتلو کتبہ و علی عمد من اعتزل

اس شعر میں قانتاً نماز پڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

سدی وغیرہ(2) نے كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کے تحت لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ حسن نے کہا: جو بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی دینے والا ہے وہ اس کا عبد ہے۔ القنوت کا لغوی معنی قیام ہے۔ اسی سے حدیث پاک میں ہے: افضل الصلوۃ طول القنوت(3)۔ نماز میں سے افضل نماز وہ ہے جس کا قیام لمبا ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے ساری مخلوق اس کی عبودیت کو قائم کرنے والی ہے خواہ اقرار کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے۔ اس کی صنعت کا قرآن پر ظاہر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل اطاعت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (احزاب:35) مزید تفصیل وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ (البقرہ:238) کے تحت آئے گی۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾

"موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب ارادہ فرماتا ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 164، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

جاتا ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ۔ مبالغہ کے لئے فعیل کا وزن ہے، مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اسم فاعل مبدعٌ ہے جیسے بصیر سے مبصرٌ ہے ابدعت الشیء لا عن مثال یعنی میں نے بغیر کسی مثال کے چیز کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا، ان کا موجد، ان کو نئے سرے سے بنانے والا اور بغیر کسی مثال اور حد کے ایجاد کرنے والا ہے۔ ہر وہ شخص جو کوئی نئی چیز پیدا کرے جس سے پہلے وہ چیز کسی نے پیدا نہ کی ہو تو اسے مبدع کہا جاتا ہے۔ اسی سے اصحاب البدع ہیں۔ بدعت کو بدعت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کہنے والا اپنے امام کی کلام اور فعل کے بغیر کہتا ہے۔ بخاری میں ہے: نعمت البدعة هذه۔ یعنی رمضان کا قیام اچھی بدعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** ہر وہ بدعت جو مخلوق سے صادر ہو اس کی دو صورتیں ہوں گی یا تو اس کی شرع میں اصل ہوگی یا شرع میں اس کی اصل نہ ہوگی۔ اگر تو اس کی کوئی اصل ہو، وہ اس عموم کے تحت واقع ہو جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برانگیختہ کیا ہے تو وہ مدح کے مقام پر ہوگی اگرچہ اس کی مثال موجود نہ ہو جیسے جود و سخا کی نوع، اور نیکی کا کوئی فعل، تو یہ فعل، افعال محمودہ سے ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے کوئی کرنے والا نہ بھی ہو۔ اس قول کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول کرتا ہے: نعمت البدعة هذه (1) یہ اچھی بدعت ہے جب وہ بدعت افعال خیر میں سے تھی اور مدح کے تحت داخل تھی۔ قیام رمضان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا مگر اسے ترک کر دیا تھا اور اس پر دوام اختیار نہیں فرمایا تھا اور نہ لوگوں کو جمع کیا تھا۔ پس حضرت عمر کی اس پر محافظت اور لوگوں کو اس پر جمع کرنا اور انہیں اس کی طرف بلانا، بدعت تھا لیکن یہ بدعت محمودہ ممدوحہ تھی۔ اگر وہ کوئی ایسا عمل ہو جو اللہ اور اس کے رسول کے امر کے خلاف ہو تو وہ مذمت و انکار کے مقام میں ہوتا ہے۔ یہ معنی خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد جو خطبہ میں فرمایا اس کا یہی معنی ہے: و شر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلالة (2) برے امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ یعنی ایسی بدعت جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو یا صحابہ کے عمل کے موافق نہ ہو اور اس حقیقت کو اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا: مَنْ سَنَّ فی الاسلام سُنَّةً حسنة کان له اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیء و من سَنَّ فی الاسلام سنةً سیئةً کان علیها وزرها و وزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیءٌ (3)۔ یعنی جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام شروع کیا تو اسے اس کا اجر اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا اور ان کے اجور میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا

1۔ الموطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی قیام رمضان، صفحہ 97 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعة لفصل فی خطبة الجمعة، جلد 1، صفحہ 285 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقة لو بشق تمرة او کلمة طیبة، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی کتب خانہ)

عمل شروع کیا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے، ان کے گناہوں میں کمی کئے بغیر۔ یہ اشارہ ہے جو قبیح یا حسن بدعت شروع کی جاتی ہے۔ یہ اس باب کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عصمت و توفیق کا سوال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پالنے والا نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ** جب کسی امر کے احکام اور اتقان کا ارادہ فرماتا ہے...... جیسا کہ اس کے علم میں پہلے تھا...... تو اسے کُنْ فرماتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: قضاء الشئی کا مطلب اس کا احکام اور اس کا جاری کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے، اسی وجہ سے قاضی کو قاضی کہتے ہیں کیونکہ جب وہ فیصلہ فرماتا ہے تو جھگڑا کرنے والوں کے جھگڑا سے فارغ ہو جاتا ہے۔ الازہری نے کہا: لغت میں قضیٰ کے کئی معانی ہیں اس کا مرجع کسی چیز کو ختم کرنا اور مکمل کرنا ہے۔ ابوذؤیب نے کہا:

و علیهما مسرودتان قضاهما　　داؤد او صنع السوابغ تبع

ان کے اوپر دوزرہیں ہیں جنہیں داؤد نے بنایا ہے یا تبع نے مکمل کی ہیں۔

شماخ نے حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں فرمایا:

قضیت اموراً ثم غادرت بعدها　　بوائق فی اکمامها لم تفتق

تو نے کاموں کو مکمل کیا الخ۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قضیٰ کا لفظ مشترک ہے کبھی یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ** (فصلت: 12) یہ قضیٰ بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے کبھی یہ اعلام کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ** (الاسراء: 4) یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو آگاہ کیا۔ کبھی یہ امر (حکم) کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ** (الاسراء: 23) یعنی تمہارے رب نے حکم دیا...... کبھی الزام اور احکام کو جاری کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ** (القصص: 29) (جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی) کبھی ارادہ کے معنی میں ہوتا ہے جیسے **وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا**...... الخ جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا(1): قضیٰ بمعنی قدّر (اندازہ کرنا) اور کبھی بمعنی اَمْضٰی بھی آتا ہے۔ اہل سنت کے مذہب پر اس آیت میں یہ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں یعنی ازل میں مقدر فرمایا اور اپنا حکم نافذ فرمایا اور معتزلہ کے مذہب پر خلق اور ایجاد حکم نافذ فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَمْرًا**، الامر واحد ہے اس کی جمع الامور ہے یہ امر یامر کا مصدر نہیں ہے(2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قرآن میں امر چودہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

(۱) دین: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ (توبہ:48) حتیٰ کہ حق آیا اور اللہ کا دین اسلام ظاہر ہوا۔

(۲) قول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (المومنون:28) یعنی جب ہمارا قول آئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (طہٰ:62) یہاں بھی امر بمعنی قول ہے۔

(۳) عذاب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ (ابراہیم:22) یعنی جب دوزخیوں کے بارے عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا (البقرہ:117) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ بغیر باپ کے ہوں گے۔

(۵) بدر میں قتل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ (غافر:78) یعنی بدر میں قتل اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (انفال:42) اس آیت میں مکہ کے کفار کا قتل مراد ہے۔

(۶) فتح مکہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ:24)۔ یہاں امر سے مراد فتح مکہ ہے۔

(۷) قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی: فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (البقرہ:109) اس آیت میں امر سے مراد قتل قریظہ اور بنی نضیر کی جلاوطنی ہے۔

(۸) قیامت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ (النحل:1) اللہ کا امر (قیامت) آ گیا۔

(۹) القضاء: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (السجدہ:5) اس میں امر بمعنی فیصلہ ہے۔

(۱۰) وحی: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ:5) وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی نازل فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ (طلاق:12)

(۱۱) امر الخلق: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (الشوریٰ) یعنی مخلوق کے امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۱۲) النصر (مدد، نصرت): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (آل عمران:154) (کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے)

(۱۳) الذنب (گناہ): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا (الطلاق:9) یعنی اپنے گناہ کی سزا۔

(۱۴) شان اور فعل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (ہود) اس میں امر سے مراد فعل اور شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ۔ (نور:63) اس آیت میں بھی امر سے مراد فعل ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْ بعض علماء نے فرمایا: کاف، کینونہ سے ہے اور نون نور سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اعوذ بکلمات التامۃ من شر ما خلق سے یہی مراد ہے۔ بکلمۃ اللہ التامۃ یعنی مفرد بھی مروی ہے۔ جمع اس اعتبار سے ہے کہ جب یہ کلمہ تمام امور میں ہے، پس جب ہر امر کے لئے كُنْ کہا اور ہر شے کے لئے كُنْ کہا تو یہ بہت سے کلمات ہو گئے۔ اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابوذر سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

روایت کی ہے اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عطائی کلام وعذابی کلام میری عطا کلام ہے اور میرا عذاب کلام ہے۔ ان الفاظ کو ایک طویل حدیث میں امام ترمذی نے نقل کیا ہے کلمہ، کلمات کے معنی میں بھی ہوتا ہے لیکن جب ایک کلمہ تمام اوقات میں تمام امور میں جدا جدا ہو یہ بہت سے کلمات ہو گئے اور ان کا مرجع ایک کلمہ ہے، اور تامۃ فرمایا کیونکہ اہل لغت کے نزدیک کم از کم کلام کے تین حروف ہوتے ہیں۔ ایک حرف جس سے آغاز کیا جاتا ہے ایک حرف جس کے ساتھ کلمہ جمع کیا جاتا ہے اور ایک حرف جس پر سکوت کیا جاتا ہے جب کسی کلمہ کے دو حرف ہوں تو وہ ان کے نزدیک ناقص ہوتا ہے جیسے ید، دم، ضم یہ علت کی وجہ سے ناقص ہیں۔ یہ کلمات آدمیوں کی طرف سے منقوصات میں سے ہیں کیونکہ یہ دو حرفوں پر مشتمل ہیں نیز کیونکہ یہ ادوات کے ساتھ تلفظ کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تامہ ہیں کیونکہ یہ بغیر ادوات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کی شبہ سے بلند و بالا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَكُوْنُ یہ نون کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے علیحدہ کلام کے اعتبار سے (1)۔ سیبویہ نے کہا: یہ فھو یکون ہے یا فانہٗ یکون ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ یقول پر معطوف ہے (2)۔ پہلی صورت میں یہ امر کے بعد ہوگا اگرچہ پہلے معدوم ہوگا، کیونکہ یہ موجود کے قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ معلوم ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور دوسری صورت میں امر کے ساتھ موجود ہوگا، اس کو طبری نے پسند کیا ہے۔ فرمایا اس نے کسی شے کو کُنْ کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے وہ حکم کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور کوئی شے موجود نہیں ہوتی مگر وہ جسے وجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس کی مثال، لوگوں کا قبور سے کھڑا ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے بلاوا سے نہ مقدم ہوں گے نہ مؤخر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ (الروم)

ابن عطیہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فرمایا: یہ معنی کی جہت سے غلط ہے کیونکہ یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ قول، تکوین اور وجود کے ساتھ ہے۔ (3)

اس آیت میں عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معدومات کا ہمیشہ سے آمر ہے ان کے وجود کی شرط کے ساتھ۔ مقدورات کے تاخر کے ساتھ قادر ہے۔ معلومات کے تاخر کے ساتھ عالم ہے۔ پس آیت میں ہر وہ چیز جو استقبال کا تقاضا کرتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے کیونکہ محدثات نہ ہونے کے بعد ہوتی ہیں، ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے قدرت اور علم سے وہ قدیم اور ہمیشہ ہوتی ہے (4)، پس (کن) کی عبارت جس معنی کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور قائم بالذات ہے۔

ابو الحسن الماوردی نے کہا: اگر کہا جائے کس حال میں وہ اسے کن کہتا ہے کہ وہ ہو جاتی ہے کیا عدم کی حالت میں یا اس کے وجود کی حالت میں۔ اگر تو وہ حالت عدم میں ہوتی ہے تو حکم کرنا محال ہے مگر مامور کو۔ جیسے محال ہوتا ہے امر ہونا مگر آمر کی طرف سے۔ اگر وہ حالت وجود میں ہے تو یہ ایسی حالت ہے جس میں وجود اور حدوث کا امر جائز ہی نہیں ہے کیونکہ وہ موجود حادث

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

ہے۔ اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے اس کی موجود مخلوق میں اس کے اوامر کے نفوذ کی، جیسے اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ دھتکارے ہوئے بندر بن جائیں اور یہ معدومات کی ایجاد میں وارد نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ہونے والا ہے اس کے ہونے سے پہلے اسے جانتا ہے۔ پس وہ اشیاء جو موجود نہیں وہ اس کے علم میں اپنے ہونے سے پہلے ان چیزوں کے مشابہ ہیں جو موجود ہیں۔ پس انہیں کونی کہنا جائز ہے۔ وہ انہیں حالت عدم سے حالت وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ حالت عدم میں ان کو جانتا ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جس کو اس نے پیدا کرنا ہے تمام کو شامل ہے جب وہ اس کی پیدائش اور تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور پائی جاتی ہے بغیر اس کے کہ وہاں اسے قول فرمائے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے جو وہ چاہتا ہے، اس کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ قول نہ بھی ہو۔ جیسے ابوالنجم کا قول ہے۔

قد قالت الانساع للبطن الحق (1)

یہ کوئی قول نہیں ہے، اس نے ارادہ کیا کہ پیٹھ پیٹ کے ساتھ لاحق ہوگئی ہے۔ جیسے عمرو بن حممہ الدوسی نے کہا:

فاصبحت مثل النسر طارت فراخہٗ	اذا رام تطیاراً یقال لہ قع

میں گدھ کی طرح ہو گیا جس کے بچے اڑ گئے۔ جب وہ اڑنے کا ارادہ کرتی ہے تو اسے قع کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

قالت جناحاہ لساقیہ الحقا	و نجیا لحمکما ان یمزقا

اس کے پروں نے اس کی پنڈلیوں کو کہا: مل جاؤ اور اپنے گوشت کو پھٹنے سے بچالو۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تھے، ان کی طرح بے سروپا بات۔ ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل بے شک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں۔ مجاہد نے کہا: نصاریٰ ہیں۔ طبری نے اس کو راجح کہا ہے کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہے۔ ربیع، سدی اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ولولا بمعنی ھلاّ ہے۔ یہ حرف تحضیض (2) (ابھارنا) ہے۔ جیسے اشہب بن رمیلہ نے کہا:

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا	2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تعدون عقر النیب افضل مجدکم　　بنی ضوطری لولا الکمی المقنعا (1)

اس شعر میں لولا بمعنی ھلاّ ہے۔

یہ وہ لولا نہیں ہے جو ایک چیز کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے (یعنی شرط کے پائے جانے کی وجہ سے جزا کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے) ان دونوں کے درمیان علماء لغت کے درمیان یہ فرق ہے کہ لولا جو تحضیض کے معنی میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ فعل ظاہر یا فعل مقدر ملا ہوا ہوتا ہے اور جو امتناع کے لئے ہوتا ہے اس کے ساتھ مبتدا ملا ہوا ہوتا ہے اور عادت جاری ہے کہ خبر حذف ہوتی ہے (2)۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا تاکہ ہم جان لیں کہ وہ نبی ہے پھر ہم اس پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس وہ کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتے جو ان کی نبوت کی علامت ہو۔ الایۃ کا معنی دلالت اور علامت ہے۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جن علماء نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد کفار قریش لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد پہلی قومیں ہیں، اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ بعض علماء نے فرمایا: ان کے دل ہٹ دھرمی، اقتراح اور ترک ایمان میں ان کے مشابہ ہیں۔ فراء نے کہا: ان کے دل کفر میں متفق ہونے میں مشابہ ہیں۔

قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾

"بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب! ﷺ) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا، (عذاب سے) ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہوگی ان دوزخیوں کے متعلق"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا، بَشِیْرًا حال کی بنا پر منصوب ہے اور نَذِیْرًا اس پر معطوف ہے۔ ان کا معنی گزر چکا ہے۔

وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ مقاتل نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ یہود پر عذاب نازل کرتا تو یہ ایمان لے آتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ۔ تسأل کے رفع کے ساتھ یہ جمہور کی قراءت ہے بشیرا، نذیرا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دراں حالیکہ آپ بشارت دینے والے، ڈرانے والے اور غیر مسؤل ہیں۔ سعید اخفش نے کہا: لا تسأل (تاء کے فتحہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ) اور بَشِیْرًا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہے (3)۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دراں حالیکہ آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، دوزخیوں کے متعلق آپ پوچھنے والے نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے متعلق ان کے ڈرانے کے بعد آپ کو آگاہ کر دیا تو آپ ان کے متعلق سوال کرنے سے مستغنی ہیں۔ غیر سائل کا یہ معنی ہے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

اور غیر مسئول کا معنی یہ ہے کہ جو بشارت اور انذار کے بعد کفر کرے گا اس کے کفر کی وجہ سے آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش! معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ اس شخص کی قراءت پر ہے جنہوں نے لا تسأل جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ صرف نافع کی قراءت ہے اس میں دو وجہیں ہیں: اس شخص کے بارے سوال کرنے سے نہی ہے زندہ لوگوں میں سے جس نے نافرمانی کی اور کفر کیا کیونکہ حالت تبدیل ہوتی رہتی ہے، کبھی کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے اور معصیت سے اطاعت کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے جو زیادہ واضح ہے کہ اس کے متعلق سوال سے نہی ہے جو کفر اور معصیت پر فوت ہو گیا، اس کی حالت کی بڑائی اور شان کی تغلیظ کی وجہ سے یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے: تو فلاں کے متعلق نہ پوچھ یعنی وہ تیرے گمان سے زیادہ تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے لن تسأل پڑھا ہے اور ابی نے و ما تسأل پڑھا ہے۔ ان کا معنی جمہور کی قراءت کے موافق ہے اس کی نفی کی کہ آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے سوال کیا تھا کہ میرے والدین میں سے کون از روئے موت قریب ہے (2) تو یہ آیت نازل ہوئی، ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کے لئے زندہ کیا تھا اور وہ دونوں آپ پر ایمان لائے تھے، ہم نے حضور علیہ السلام کا قول بھی ذکر کیا ہے جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ (میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں) ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ الحمد للہ۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آچکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! جو یہ آیات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی غرض ایمان لانے کی نہیں ہے بلکہ اگر آپ وہ سب کچھ لے بھی آئیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ انہیں تو صرف یہی چیز راضی کرے گی کہ آپ جس دین اسلام پر ہیں اس کی پیروی چھوڑ دیں۔ کہا جاتا ہے: رضی یرضی رِضا رُضا و رضوانا و رِضوانا و مَرضاۃ۔ یہ واوی ہے، تثنیہ میں رِضوان کہا جاتا ہے۔ کسائی نے رضیان حکایت کیا ہے۔ ممدود بھی حکایت کیا گیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ گویا یہ راضی یراضی مراضاۃ و رضائی کا مصدر ہے۔ نتبع، ان کی وجہ سے منصوب ہے لیکن حتیٰ کے ساتھ انْ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ خلیل نے کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حتیٰ اسم کو جر دیتا ہے جیسے ارشاد ہے: حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۝ (القدر) جو اسم میں عامل ہوتا ہے وہ فعل میں عامل نہیں ہوتا۔ اور جو اسم کو جر دیتا ہے وہ فعل کو نصب نہیں دیتا۔ نحاس نے کہا نتبع، حتیٰ کی وجہ سے منصوب ہے اور حتیٰ، انْ سے بدل ہے۔ الملۃ اس کا اسم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتب میں اور اپنے رسولوں کی زبان پر اپنے بندوں کے لئے مشروع فرماتا ہے۔

پس ملت اور شریعت برابر ہیں۔ رہا دین تو اس کے اور ملت و شریعت کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ شریعت وہ ہوتی ہے جس کے کرنے کی طرف اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بلاتا ہے اور دین وہ ہوتا ہے جس کو بندے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ادا کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت سے علماء کی ایک جماعت، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، داؤد اور امام احمد بن حنبل نے دلیل پکڑی ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِلَّتَهُمْ، ملت کو واحد ذکر فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝ (الکافرون: 4) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایتوارث اھل الملتین (1)۔ (دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے)۔ یہاں ملتین سے مراد اسلام اور کفر ہیں۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لایرث المسلمُ الکافرَ۔ مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

امام مالک اور ایک روایت امام احمد سے یہ ہے کہ کفر کی بہت سی ملتیں ہیں۔ پس یہودی، نصرانی کا وارث نہ ہوگا اور یہودی اور نصرانی، مجوسی کے وارث نہیں ہوں گے۔ امام مالک اور امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر قول لایتوارث اھل ملتین کو لیا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں مِلَّتَهُمْ اس سے مراد کثرت ہے اگرچہ لفظاً مفرد ہے کیونکہ کثرت کی ضمیر کی طرف مضاف ہے جیسے تو کہتا ہے: اخذت عن علماء اھل المدینہ علمھم۔ سمعت علیھم حدیثھم۔ ان مثالوں میں علومھم اور احادیثھم مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جس ہدایت پر آپ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے اسے رکھ دیتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ، الاھواء، جمع ہے ھوی کی جیسے تو کہتا ہے: جمل و اجمال۔ جب خواہشات مختلف تھیں تو جمع اھواء ذکر کیا اگر ملت کے افراد پر محمول کیا جاتا تو ھواھم ہوتا (3)۔ اس خطاب میں دو وجہیں ہیں: (۱) یہ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کیونکہ خطاب آپ کی طرف متوجہ ہے۔ (۲) خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب ھل یرث المسلم الکافر، حدیث 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب میراث اھل الاسلام من اھل الشرك، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

سے مراد امت ہے۔ پہلی صورت میں اس میں امت کے لئے تادیب ہے کیونکہ ان کا مرتبہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے۔ اس آیت کا سبب یہ ہے کہ لوگ صلح و آشتی کا سوال کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ وہ آپ سے راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان سے جہاد کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْعِلْمِ امام احمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا ہے قرآن مخلوق ہے۔ امام احمد نے فرمایا: وہ کافر ہے، پوچھا گیا: آپ نے اسے کیسے کافر کہا۔ امام احمد نے فرمایا: کتاب اللہ کی آیات کی وجہ سے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ۔ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر۔ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ قتادہ نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ اور اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے اسلام لائے تھے۔ اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ اور آیت عام ہے(1)۔ اَلَّذِيْنَ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ اٰتَيْنٰهُمُ اس کا صلہ ہے۔ يَتْلُوْنَهٗ مبتدا کی خبر ہے۔ اگر تو چاہے تو خبر اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کو بنا دے۔

يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ پیروی کرتے ہیں جیسے اس کی پیروی کرنے کا حق ہے یعنی اس کے امر و نہی کی پیروی کرنے کے ساتھ، اس کے حلال کو حلال کرتے ہیں اور اس کے حرام کو حرام کرتے ہیں اور جو احکامات اس میں ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ (الشمس) (جب چاند اس کے پیچھے آتا ہے)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کے قول کا یہی معنی

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

**قد جعلت دلوی تستتلینی** میرا ڈول میرے پیچھے آیا۔

نصر بن عیسیٰ نے مالک سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: یتبعونہٗ حق اتباعہٖ۔ یعنی وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جس طرح پیروی کا حق ہے اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں جیسا کہ خطیب ابوبکر احمد نے ذکر کیا ہے، لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کہا: جو قرآن کی پیروی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ جنت کے باغیچوں پر اترے گا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کسی رحمت والی آیت سے گزرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب عذاب والی آیت سے گزرتے ہیں تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی معنی نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے جب آپ آیت رحمت سے گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کی محکم آیات پر عمل کرتے ہیں اور متشابہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو مشکل ہوتا ہے وہ اس کے جاننے والے کے سپرد کرتے ہیں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے۔ مگر یہ کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کے الفاظ کو ترتیل سے پڑھتے ہیں اور اس کے معانی کو سمجھتے ہیں۔ معانی کا سمجھنا اتباع ہوتا ہے اس کے لیے جس کو توفیق دی گئی ہوتی ہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجالایا۔ اللہ نے فرمایا: بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی: میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک''۔

اس میں بیس مسائل ہیں (☆)۔

**مسئلہ نمبر 1**: جب کعبہ اور قبلہ کا ذکر جاری تھا تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمادیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا تھا۔ یہود کا حق تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے انحراف نہ کرتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی نسل سے تھے۔ الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ اس کا معنی حکم دینا ہے اور مکلف بنانا ہے۔ ابراھیم، اس کی سریانی زبان میں تفسیر وہ ہے جو ماوردی نے ذکر کی ہے اور عربی میں وہ ہے جو ابن عطیہ نے ذکر کی ہے اب رحیم (4) (مہربان باپ)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے حالانکہ تفصیل میں تیئس مسائل ہیں۔

سہیلی نے کہا: اکثر سریانی اور عربی زبان میں اتفاق واقع ہوتا ہے یا لفظ میں ایک دوسری کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ابراہیم کی تفسیر ابٌ راحمٌ (مہربان باپ) بچوں پر ان کی شفقت کی وجہ سے ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ قیامت تک مومنوں کے ان بچوں کے کفیل ہیں جو بچپن میں فوت ہو گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس پر بخاری کی حدیث دلالت کرتی ہے، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ ایک لمبا خواب ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باغ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا ان کے اردگرد لوگوں کی اولاد تھی۔ ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو کتاب ''التذکرہ'' میں کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے ابراہیم بن تارخ بن تاخور۔ یہ بعض مؤرخین کے قول کے مطابق ہے(1) اور قرآن حکیم میں ہے: واذ قال ابراھیم لابیہ آزر (جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا) اسی طرح صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ان میں اختلاف اور تناقض نہیں ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ اسماعیل، اسحاق، مدین، مدائن۔ جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں مفعول کو اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی حضرت ابراہیم کو آزمانے والا تھا۔ فاعل کے ساتھ ضمیر کا متصل ہونا عربی میں مفعول کی تقدیم کا موجب ہوتا ہے اس اہتمام پر کلام کی بنیاد رکھی گئی ہے(2)۔ عام قراءت ابراھیم نصب کے ساتھ ہے ربہ رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے انہوں نے اس کا الٹ پڑھا ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے انہیں اسی طرح پڑھایا۔ معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا دعا مانگی۔ اس میں بکلمات میں باء کی وجہ سے بُعد ہے۔

**مسئلہ نمبر2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِكَلِمٰتٍ یہ کلمہ کی جمع ہے ان کی تحقیق اللہ تعالیٰ کے کلام کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہاں کلمات سے مراد وہ وظائف ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا جب ان وظائف کی تکلیف کلام کے ساتھ تھی اس لئے اسے کلمات سے تعبیر فرمایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کیونکہ وہ کن کے کلمہ سے صادر ہوئے۔ کسی شے کا اس کے مقدمہ کے ساتھ نام رکھنا مجاز کی ایک قسم ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر3:** الکلمات کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شرائع اسلام ہیں اور یہ تیس ہیں۔ دس کا ذکر سورہ برأت میں ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ...... الی اخرہ۔ دس کا ذکر سورۂ احزاب میں ہے اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ الخ۔ دس کا ذکر سورہ المومنون میں ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ... عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ تک اور سورۂ سائل میں اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ سے لے کر وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ تک ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کے ساتھ جس کو بھی آزمایا تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا۔ اسلام کے ساتھ آزمایا تو حضرت ابراہیم نے اسے مکمل کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے برأت لکھی۔ فرمایا: وَ اِبْرٰهِيْمَ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الَّذِیْ وَفّٰۤی (النجم: 37)(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد امر و نہی ہے، بعض نے فرمایا: اپنے بیٹے کا ذبح کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسالت کی ادائیگی ہے۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: میں تجھے ایک امر سے آزمانے والا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کی: تو مجھے لوگوں کے لئے امام بنا دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کی: مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میری اولاد سے بھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: تو اپنے گھر کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: امن والا بنائے گا۔ فرمایا: ہاں۔ تو ہمیں مناسک دکھائے گا اور ہم پر نظر کرم فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کی: اس کے باسیوں کو پھلوں سے رزق دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ مکمل فرمانے والا ہوگا(2)۔ اس سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ کے تحت روایت کی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طہارت کے ساتھ آزمایا۔ پانچ چیزیں سر میں تھیں اور پانچ پورے جسم میں تھیں: مونچھوں کا کاٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا اور جسم میں یہ چیزیں تھیں: ناخن کاٹنا، زیر ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، پیشاب، پاخانہ کی جگہ کو پانی کے ساتھ دھونا(3)، اس قول پر حضرت ابراہیم علیہ السلام مکمل کرنے والے ہوں(4)۔ یہی قرآن کا ظاہر ہے۔ مطر نے ابوالجلد سے روایت کیا ہے کہ یہ بھی دس کلمات تھے۔ انہوں نے مانگ کی جگہ اعضاء کے جوڑوں کو دھونا، اور استنجاء کی جگہ زیر ناف بال صاف کرنے کو رکھا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ خاص مناسک حج ہیں۔ حسن نے کہا: یہ چھ خلال ہیں: ستارہ، چاند، سورج، آگ، ہجرت اور ختنہ کرنا۔ ابواسحاق الزجاج نے کہا: یہ اقوال ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں ان تمام کے ساتھ حضرت ابراہیم کو آزمایا گیا۔ میں کہتا ہوں: مؤطا وغیرہ میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا: ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے ختنہ کیا اور پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، پہلے شخص ہیں جنہوں نے زیر ناف بال صاف کئے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے ناخن تراشے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے مونچھیں کاٹیں، پہلے شخص ہیں جن کے بال سفید ہوئے، جب سفید بالوں کو دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وقار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! میرے وقار میں اضافہ فرما...... ابوبکر بن ابی شیبہ نے سعید بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے منبر پر خطبہ دیا وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، دوسرے علماء نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے ثرید (سالن میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھانا) بنائی، جس نے سب سے پہلے تلوار چلائی، جس نے سب سے پہلے مسواک کیا، جس نے سب سے پہلے پانی سے استنجا کیا، جس نے سب سے پہلے شلوار پہنی وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم نے منبر بنایا تھا، اگر میں لاٹھی پکڑوں تو میرے باپ ابراہیم نے لاٹھی پکڑی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ ایسے احکام ہیں جن کا بیان اور جن پر آگاہی اور جن پر کلام کرنا ضروری ہے، ان میں سے پہلا ختنہ کرنا ہے اور اس کے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ یہی مسئلہ ہے؟

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کا اجماع ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تھا، جس عمر میں آپ نے ختنہ کیا اس میں اختلاف ہے۔ مؤطا میں حضرت ابوہریرہ سے موقوفاً مروی ہے ختنہ کرنے کے وقت آپ کی عمر ایک سوبیس سال تھی اور اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ اس قسم کی روایت، اپنی رائے سے نہیں ہوسکتی۔ اوزاعی نے مرفوعاً یحییٰ بن سعید سے انہوں نے حضرت سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر ایک سوبیس سال تھی پھر اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ یہ ابوعمر نے ذکر کیا ہے۔ یحییٰ کے علاوہ کئی واسطوں سے مسند مرفوع روایت کی ہے کہ انہوں نے ختنہ کیا جب آپ کی عمر اسی سال کو پہنچ گئی تھی اور تیسے کے ساتھ آپ نے ختنہ کیا تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ کی عمر اسی سال تھی یہی حدیث عجلان میں اور حدیث اعرج عن ابی هریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ ہے (1)۔ حضرت عکرمہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر اسی سال تھی۔ اس کے بعد ملت ابراہیم پر کسی نے بیت اللہ کا طواف نہ کیا مگر وہ مختون تھا۔ اسی طرح عکرمہ نے کہا اور مسیب بن رافع نے کہا ہے۔ مروزی نے یہ ذکر کیا ہے۔ القدوم (تیسہ) یہ دال کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ ابوالزناد نے کہا: القدوم دال کی شد کے ساتھ ہو تو اس سے مراد جگہ کا نام ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 5:** ختنہ کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مؤکدہ سنن میں سے ہے اور فطرت اسلام میں سے ہے۔ مردوں کو اس کے ترک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (النحل: 123)

قتادہ نے کہا: اس سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ بعض مالکیوں کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، ابن سریج نے اس کے وجوب پر شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی حرمت سے استدلال کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ختنہ کرنا فرض نہ ہوتا تو مختون کی شرمگاہ کو دیکھنا مباح نہ ہوتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے جسم کی مصلحت کے لئے یہ مباح ہوتا ہے جیسے طبیب کے لئے دیکھنا مباح ہوتا ہے اور طب بالاجماع واجب نہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو حجاج بن ارطاۃ نے ابوالملیح سے اور انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ختنہ کرنا مردوں کے لئے سنت ہے اور عورتوں کے لئے اچھا عمل ہے) حجاج

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراهیم خلیلا، حدیث 3107، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5824، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قابل حجت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں جس حدیث سے حجت پکڑی جاتی ہے وہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا...... الحدیث۔ آگے تفصیل سے آئے گی۔ ابوداؤد نے حضرت ام عطیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت مدینہ طیبہ میں عورتوں کے ختنے کرتی تھیں۔ اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کاٹنے میں مبالغہ نہ کیا کر کیونکہ یہ عورت کے لئے اچھا ہے اور خاوند کے لئے پسندیدہ ہے۔ ابوداؤد نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اس کا راوی مجہول ہے (1)۔ وہ روایت جس کو رزین نے ذکر کیا ہے اس میں مبالغہ نہ کر کیونکہ چہرہ کے لئے زیادہ نور کا باعث ہے اور مرد کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اگر بچہ مختون پیدا ہو تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں۔ میمونی نے کہا: مجھے احمد نے کہا: یہاں ایک شخص ہے اس کا مختون بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس وجہ سے شدید غمگین ہوا، میں نے اسے کہا جب الله تعالیٰ نے خود تیری اس مسئلہ میں کفایت فرمائی ہے تو تو پریشان کس لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** ابوالفرج جوزی نے کہا: مجھے حضرت کعب الاحبار سے بتایا گیا ہے، فرمایا: تیرہ انبیاء کرام مختون پیدا ہوئے تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت سام، حضرت لوط، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت شعیب، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ وعلیہم اجمعین۔ محمد بن حبیب ہاشمی نے کہا: وہ چودہ انبیاء کرام تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (یہ اصحاب الرس کے نبی تھے) اور حضرت محمد ﷺ وعلیہم اجمعین۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ابونعیم الحافظ نے اپنی کتاب ''الحلیۃ'' میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ ابوعمرو نے ''التمہید'' میں اس سند، حدثنا احمد بن محمد بن احمد حدثنا محمد بن عیسیٰ حدثنا یحییٰ بن ایوب بن بادی العلاف حدثنا محمد بن ابی السری العسقلانی حدثنا الولید بن مسلم عن شعیب عن عطاء الخراسانی عن عکرمہ عن ابن عباس کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عبدالمطلب نے ساتویں دن نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا تھا اور دستر خوان لگایا تھا اور آپ ﷺ کا نام (محمد) رکھا تھا۔ ابوعمر نے کہا: یہ حدیث مسند غریب ہے۔ یحییٰ بن ایوب نے کہا: میں نے یہ حدیث تلاش کی تو مجھے ان محدثین میں سے کسی کے پاس نہیں ملی جن سے میری ملاقات ہوئی ہے مگر ابن ابی السری کے پاس ملی۔ ابوعمر نے کہا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 8:** علماء کا اختلاف ہے کہ بچے کا ختنہ کب کیا جائے۔ اخبار میں علماء کی ایک جماعت سے ثابت ہے وہ کہتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا، اپنے بیٹے اسحاق کا ختنہ

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی الختان، حدیث 4587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتویں روز کیا تھا۔ حضرت سیدہ فاطمہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا ساتویں روز ختنہ کرتی تھی۔ امام مالک نے اس کا انکار کیا اور کہا یہ یہود کا عمل ہے۔ مالک سے ابن وہب نے یہ ذکر کیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: بچے کا ختنہ سات سال سے دس سال تک کے درمیان کیا جائے۔ ابن وہب نے مالک سے اس طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے فرمایا: اس کے متعلق میں نے کچھ نہیں سنا۔ بخاری میں سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا: تم کتنی عمر کے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اس وقت مختون تھا۔ فرمایا: اور لوگ مرد کا ختنہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جاتا یا قریب البلوغ ہوتا۔(1)

بڑا آدمی جو اسلام قبول کرے علماء نے اس کا ختنہ کرنا مستحب قرار دیا ہے۔ عطا کہتے تھے: اس کا اسلام مکمل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کا ختنہ کیا جائے اگرچہ وہ اسی سال کو پہنچ جائے۔ حسن سے مروی ہے: وہ بوڑھے شخص کو ختنہ نہ کرنے کی رخصت دیتے تھے جو مسلمان ہوتا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے اور اس کی شہادت، اس کا ذبیحہ، اس کے حج اور نماز میں بھی کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور غیر مختون کے حج کے بارے میں حضرت بریدہ کی حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن زید اور عکرمہ سے روایت ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا اور اس کی شہادت جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر9**: اوّل من استحدّ کا قول۔ استحداد کا مطلب ہے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنا۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نورہ (چونا) استعمال کرتے تھے تو زیر ناف بالوں کے لئے اپنے ہاتھ سے نورہ استعمال کرتے تھے(2)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نورہ لگایا حتیٰ کہ جب زیر ناف تک پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو یہاں سے چلا جا پھر اپنے ہاتھ سے زیر ناف نورہ لگایا۔ حضرت انس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نورہ نہیں لگاتے تھے جب زیر ناف بال زیادہ ہوتے تو انہیں مونڈ دیتے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ دلیل ہے کہ آپ کا اکثر فعل حلق تھا اور نورہ کبھی استعمال کرتے تھے، یہ اس لئے تاکہ دونوں حدیثوں کو جمع کرنا صحیح ہو۔

**مسئلہ نمبر10**: تقلیم الاظفار (ناخن کاٹنا)۔ قلامہ اس حصہ کو کہتے ہیں جو ناخن سے تراشا جاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں عورتوں کے لئے ناخن کاٹنا اور زیر ناف بال صاف کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح مردوں پر ہے۔ یہ حارث بن مسکین اور سحنون نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں الاصل التاسع والعشرون فصل میں ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا فرمایا ہمیں ابراہیم بن العلاء زبیدی نے بتایا انہوں نے عمر بن بلال فرازی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن بشیر مازنی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ناخن کاٹو اور ناخنوں کے تراشوں کو دفن کرو، اپنے جوڑوں کو صاف کرو، کھانے سے اپنے مسوڑھوں کو صاف کرو، مسواک کرو

---

1۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الاطلاء بالنورۃ، حدیث 3741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور میرے پاس پیلے دانتوں اور بدبو کے ساتھ نہ آیا کرو۔ پھر اس حدیث پر کلام فرمائی اور عمدہ کلام فرمائی۔ امام ترمذی نے فرمایا: رہا ناخن کاٹنا یہ اس لئے ہے کیونکہ اس سے خراش لگتی ہے اور نقصان ہوتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان جنبی ہو جاتا ہے اور اس میل کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچتا اور وہ ہمیشہ جنبی رہتا ہے۔ جو آدمی جنبی ہو اور غسل کرنے کے بعد سوئی کی جگہ بھی خشک رہ جائے تو وہ اپنی حالت پر جنبی ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ پورے جسم کا غسل کر لے۔ اسی وجہ سے ناخن کاٹنے کی ترغیب دی۔ اظافیر جمع ہے اظفور کی۔ اور الاظفار جمع ہے الظفر کی۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں ہے: جب آپ نماز میں بھول گئے فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں نہ وہم کروں جبکہ تم میں سے کسی کے ناخنوں اور پوروں کے درمیان میل ہوتی ہے تم میں سے کوئی مجھ سے آسمان کی خبر کے متعلق پوچھتا ہے جبکہ اس کے ناخنوں میں جنابت اور میل ہوتی ہے (1)۔ اس خبر کو ابوالحسن علی بن محمد الطبری المعروف الکیا نے "احکام القرآن" میں سلیمان بن فرح ابو واصل سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: میں حضرت ابوایوب کے پاس آیا میں نے ان سے مصافحہ کیا تو انہوں نے میرے لمبے ناخن دیکھے۔ حضرت ابوایوب نے فرمایا: ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آتا ہے جب کہ اس کے ناخن پرندوں کے ناخنوں کی طرح ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے (2)۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ادفنوا قلامات کم ناخنوں کے تراشے دفن کر دو کیونکہ مومن کا جسم حرمت والا ہے، جو مومن کے جسم سے ساقط ہو اور زائل ہو اس کی بھی حرمت قائم ہے (3)۔ پس اسے دفن کر دینا چاہئے جیسے مومن جب مر جاتا ہے تو اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اور جب اس کا بعض حصہ مر جائے تو دفن کر کے اس کی حرمت قائم کی جائے گی تاکہ وہ بکھر نہ جائے، آگ میں نہ گرے یا کسی گندی جگہ نہ گرے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا خون دفن کرنے کا حکم دیا جب آپ نے پچھنے لگوائے تھے تاکہ اسے کتے نہ پئیں۔ اس کے متعلق میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں بتایا اور کہا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بتایا فرمایا: ہمیں مفید بن قاسم بن عبدالرحمٰن بن ماغر نے بتایا فرمایا: میں نے عامر بن عبداللہ بن زبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے جبکہ آپ پچھنے لگوا رہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: اے عبداللہ! یہ خون لے جاؤ اور ایسی جگہ انڈیل دو جہاں تجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ سے اوجھل ہو گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کا خون پی لیا، جب وہ واپس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ! تو نے اس خون کو کیا کیا؟ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اسے مخفی جگہ رکھ دیا ہے۔ میرا گمان ہے وہ لوگوں سے مخفی رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لعلك شربته۔ شاید تو نے وہ پی لیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تو نے خون کیوں پیا ہے؟ لوگوں کے لئے تجھ سے ہلاکت ہے اور تیرے لئے لوگوں سے ہلاکت ہے۔

میرے باپ نے مجھے بتایا، فرمایا: مالک بن سلیمان ہروی نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں داؤد بن عبدالرحمٰن نے بتایا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 45 | 2۔ احکام القرآن زیر آیت ہذہ | 3۔ نوادر الاصول، صفحہ 45

انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسان کی سات چیزوں کو دفن کرنے کا حکم دیتے تھے: بال، ناخن، خون، حیض، دانت، قلفہ (وہ حصہ جو ختنہ کرنے والا کاٹا جاتا ہے) اور قے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: نقوا براجمکم اپنے جوڑ صاف کرو جہاں میل جمع ہو جاتی ہے۔ براجم کا مفرد بُرجَمۃٌ ہے ہر جوڑ کی گرہ۔ پس ہر گرہ کی پیٹھ کو برجمہ کہا جاتا ہے اور جو دو گرہوں کے درمیان ہوا سے راجبۃ کہتے ہیں اس کی جمع رواجب ہے۔ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جو ظاہر سے ملا ہوا ہوتا ہے یہ انگلی کا قصبہ ہے ہر انگلی کے دو برجم اور تین رواجب ہوتے ہیں سوائے انگوٹھے کے اس کا ایک برجم اور دو راجب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی صفائی کا حکم دیا تاکہ میل نہ ہو اور جنابت باقی نہ رہے اور میل، پانی اور جلد کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: نظفوا لثاتکم (اپنے مسوڑوں کو صاف کرو)۔ لثۃٌ واحد ہے اور اس کی جمع لثات ہے۔ یہ وہ گوشت ہوتا ہے جو دانتوں کے اوپر اور دانتوں کے نیچے ہوتا ہے دانتوں کے نکلنے کی جگہ اور العُمُور اس تھوڑے سے گوشت کو کہتے ہیں جو دانتوں کے درمیان ہوتا ہے، اس کا مفرد عُمر ہے۔ ان کے صاف کرنے کا حکم دیا تاکہ اس میں کھانے کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہے اور اس میں بدبو نہ پیدا ہو جائے اور فرشتوں کو کوئی تکلیف ہو۔ کیونکہ یہ قرآن کا راستہ ہے اور فرشتوں کے بیٹھنے کی جگہ بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق) کے تحت خبر روایت کی گئی ہے کہ فرشتہ آدمی کے بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ محمد بن علی الشقیقی نے ہمیں یہ بیان کیا، فرمایا: میں نے اپنے باپ کو سفیان بن عیینہ سے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے بہت عمدہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ، ہونٹوں کا عمل ہے وہ کلام کو اپنی زبان سے باہر پھینکتا ہے لدیہ سے مراد اس کے پاس ہے۔ لدی اور عند کا معنی لغت میں ایک ہے اسی طرح لدن ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ گویا آیت سے معلوم ہوتا ہے سخت کلام کرنے والے کے پاس تاڑنے والا سخت موجود ہے اور وہ بڑا دانت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: تسننوا یہ السن سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے مسواک کرو، یعنی دانت صاف کرو۔

لا تدخلوا علیّ قحرا بخرا میرے نزدیک محفوظ قحلاً و قلحاً ہے۔ یعنی میرے پاس پیلے دانتوں اور منہ کی بدبو کے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے جارود کو نضر سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ اقلح اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دانت پیلے ہوں حتیٰ کہ ان کے اندر سے بدبو آئے۔ میں القحر نہیں جانتا، الابخر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے جسم سے بدبو آئے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ ابخر، رجال بخرٌ۔

ہمیں جارود نے بتایا، فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے ابو علی سے انہوں نے ابو جعفر بن تمام بن عباس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مسواک کرو تمہیں کیا ہے تم میرے پاس پیلے دانتوں کے ساتھ آتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 11**: قص الشارب (مونچھوں کا کاٹنا) مونچھیں اتنی کاٹنا کہ ہونٹ کی طرف ظاہر ہو جائے۔ بالکل نہ مونڈ

دے کہ اپنے آپ کو مثلہ کر دے(1)۔ امام مالک نے یہی فرمایا۔ ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ جو مونچھوں کا حلق (مونڈ دے) کرائے اسے ادب سکھایا جائے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں مونڈنا بدعت ہے جو ایسا کرے اسے سزا دی جائے۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک نے فرمایا: جو مونچھوں کا حلق کرے اسے مار کر تکلیف دینی چاہئے گویا وہ اسے مثلہ دیکھتے تھے، حلق کی نسبت مونچھوں کو چھوٹا کرنا امام مالک کے نزدیک اولیٰ ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ کے بال لمبے تھے۔ آپ کے صحابہ میں سے کسی کے بال لمبے ہوتے تھے اور کسی کے چھوٹے ہوتے تھے۔ عمرہ اور حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا حلق کرایا تو صحابہ نے بھی حلق کرایا۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی طرف جانے سے پہلے ناخن اور مونچھیں کاٹتے تھے۔ امام طحاوی نے فرمایا: ہم امام شافعی سے اس کے بارے میں کوئی نص نہیں پاتے اور ان کے اصحاب جن کو ہم نے دیکھا مزنی اور ربیع یہ اپنی مونچھوں کو خوب پست کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عمل لیا ہوگا۔ فرمایا: امام ابوحنیفہ، امام زفر، امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب سر کے بالوں اور مونچھوں کے بارے میں یہ تھا کہ تقصیر سے احفاء افضل ہے۔ یعنی بال اور مونچھیں چھوٹی کرنے سے بالکل مونڈ دینا افضل ہے۔ ابن خویز منداد نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ ان کا مذہب مونچھوں کو حلق (مونڈنے) کرنا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ ابوبکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل کو دیکھا وہ مونچھوں کو انتہائی پست کرتے تھے۔ میں نے سنا کہ ان سے مونچھوں کے انتہائی پست کرنے کے سنت ہونے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسی طرح انتہائی پست کی جائیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احفوا الشوارب مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔

ابوعمر نے کہا: اس باب میں دو اصل ہیں۔ ایک لفظ ہے اُحفوا مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔ یہ لفظ تاویل کا احتمال رکھتا ہے دوسرا لفظ قص الشارب ہے یہ لفظ مفسر ہے اور مفسر، مجمل پر غالب ہوتا ہے۔ یہی اہل مدینہ کا عمل ہے یعنی (مونچھوں کو کاٹنا) اور جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے یہ بہتر ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مونچھوں کو کاٹتے تھے اور فرماتے تھے: ابراہیم خلیل الرحمن ایسا کرتے تھے(2)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا، بغلوں کے بال نوچنا(3)۔ حضرت ابن عمر سے ترمذی میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو انتہائی پست کرو، داڑھیوں کو بڑھاؤ اور عجمی لوگ اپنی داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں یا دونوں کو اکٹھا بڑھاتے ہیں۔ یہ جمال اور نظامت کے برعکس ہے۔ رزین نے نافع سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر اپنی مونچھوں کو اتنا پست کرتے تھے کہ ان کی جلد نظر آتی تھی، اور مونچھوں اور داڑھی کو کاٹتے تھے۔

---

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الفطرۃ، صفحہ 712 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، ابواب الاداب، باب ما جاء فی قص الشارب، جلد 2، صفحہ 100 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، باب خصال الفطرۃ، جلد 1، صفحہ 129 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں ہے حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی جو قبضہ سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض اور طول سے کاٹتے تھے(1)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: بغلوں کے بال نوچنا سنت ہے جس طرح زیر ناف بالوں کا حلق (مونڈنا) سنت ہے اگر کوئی اس کا الٹ کر دے تو بھی جائز ہوگا کیونکہ نظافت حاصل ہو گئی۔ پہلا طریقہ بہتر ہے اور آسان و معتاد ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: فرق الشعر (بالوں کی مانگ نکالنا)۔ نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے۔ جب آپ کے بندھے ہوئے بال بکھر جاتے تو آپ مانگ نکالتے۔ کہا جاتا ہے: فرقت الشعر افرقه فرقاً بالوں کو جدا جدا کرنا۔ کہتے ہیں: ان انفرق شعر راسه فرقه فی مفرقه۔ سر کے بال بکھر جاتے تو اسے اپنی مانگ میں علیحدہ علیحدہ کر دیتے اور اگر بکھرتے نہیں تھے تو سر پر اکٹھا رکھتے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو پیشانی پر ڈالے رکھتے تھے جب کہ مشرک لوگ اپنے بالوں کی مانگ نکالتے تھے۔ آپ ﷺ ہر اس کام میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جس میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بالوں میں مانگ نکالتے تھے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے(2)۔ قاضی عیاض نے کہا: سدل الشعر کا مطلب بالوں کو کھلا چھوڑ دینا اور اس حدیث میں علماء کے نزدیک بالوں کو پیشانی پر چھوڑنا ہے اور ان کا گچھا بنانا ہے۔ بال میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ اس طرف نبی کریم ﷺ نے رجوع کیا تھا، روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جمعہ سے واپس آتے تھے تو مسجد کے دروازے پر اپنے سپاہیوں کو کھڑا کرتے تھے اور ہر اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے جو اپنے بالوں کی مانگ نکالے ہوئے نہ ہوتا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھی۔

**مسئلہ نمبر 14**: سفید بال نور ہیں اور ان کا نکالنا مکروہ ہے۔ نسائی اور ابوداؤد میں عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید بال نہ نوچو، جس مسلمان کے اسلام میں بال سفید ہوتے ہیں وہ قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھے گا اور اس سے گناہ معاف فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں: جس طرح سفید بال نوچنا مکروہ ہے اسی طرح سفید بالوں کو سیاہی میں بدلنا بھی مکروہ ہے لیکن سیاہی کے علاوہ کسی رنگ سے بدلنا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابو قحافہ کے حق میں فرمایا...... انہیں لایا گیا تھا جب ان کے بال ثغامہ بوٹی کی طرح سفید تھے...... اس کو کسی چیز سے تبدیل کر دو، اور سیاہ (خضاب) سے اجتناب کرو۔ کتنا خوبصورت شعر کہا ہے جس نے کہا ہے

يسود اعلاها و يبيض اصلها | ولا خير في الاعلى اذا فسد الاصل

1۔ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی الاخذ من اللحیة، جلد 2، صفحہ

2۔ صحیح بخاری، صفة النبی علیه الصلوٰة والسلام، حدیث 3294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اوپر سے سیاہ اور اصل سفید ہے، اوپر والے رنگ میں کوئی بھلائی نہیں جب اصل بری ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا خاضب الشیب بالحناء تسترہ　　　　سل الملیك له ستراً من النار

اے مہندی کے ساتھ سفید بالوں کو خضاب کر کے چھپانے والے! اللہ تعالیٰ سے آگ سے پردہ کا سوال کر۔

**مسئلہ نمبر 15**: الثرید (سالن میں ٹکڑے بھگو کر چوری بنا کر کھانا) یہ عمدہ کھانا ہوتا ہے اور زیادہ برکت والا ہوتا ہے۔ یہ عربوں کا کھانا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام کھانوں پر اس کھانے کی فضیلت کی گواہی دی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے (1)۔ صحیح البستی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ وہ جب ثرید بناتی تھیں تو اسے کسی چیز سے ڈھانپ دیتی تھیں حتیٰ کہ اس کی گرمی ختم ہو جائے اور فرماتی تھیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یہ بڑی برکت والا کھانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**: میں کہتا ہوں: یہ سب اس روایت کا مفہوم تھا جو عبدالرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کی اور جو سعید بن مسیب وغیرہ نے کہا، کلی، ناک میں پانی ڈالنا اور مسواک کا ذکر سورۃ النساء میں آئے گا اور استنجا کا حکم سورۂ براءت میں اور ضیافت کا حکم سورۂ ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں کاٹنے، ناخن تراشنے، بغلوں کے بال نوچنے، زیر ناف بال مونڈنے کا ہمارے لئے وقت متعین کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ انہیں نہ چھوڑے رکھیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چالیس راتیں یہ اکثر مدت کی حد ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ہر جمعہ کو یہ صفائی کی جائے۔ یہ حدیث جعفر بن سلیمان نے روایت کی ہے۔ عقیلی نے کہا: اس کی حدیث میں نظر ہے۔ ابوعمر نے اس کے متعلق کہا: جعفر بن سلیمان اپنے حافظہ کی خرابی اور غلطیوں کی کثرت کی وجہ سے حجت نہیں ہے۔ نقل کے اعتبار سے یہ حدیث قوی نہیں ہے لیکن ایک قوم نے اس کا قول کیا ہے اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ و باللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 17**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، الامام کا معنی، قُدْوَہ ہے۔ اسی سے خیط البناء کو امام کہا جاتا ہے، راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ چلنے کے لئے اس کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے امام بنائیں گے۔ ان خصال میں وہ تیری اقتداء کریں گے، نیک لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل اطاعت کے لئے امام بنایا۔ اسی وجہ سے تمام امتوں کا آپ کے بارے میں اجتماعی دعویٰ ہے کہ آپ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہونے والے تھے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 18**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اللہ کی بارگاہ میں رغبت کی جہت سے دعا ہے۔ یعنی اے میرے رب! میری اولاد سے بھی امام بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولاد کے متعلق استفہام کی جہت سے ہے یعنی اے میرے

1۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جلد 2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رب! میری اولاد سے کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں گنہگار، ظالم ہوں گے وہ امامت کے مستحق نہ ہوں گے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ ان کی اولاد سے امام بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کی اولاد میں نافرمان بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

**مسئلہ نمبر 19**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِي، ذریۃٌ یہ الذر سے فُعْلِيَةٌ کا وزن ہے کیونکہ انسانی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذروں کی طرح نکالا تھا جب انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ذرأ اللہ الخلق یذرؤھم ذرءاً سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: اللہ نے انہیں پیدا کیا، اسی سے الذریۃ ہے جس کا معنی ہے جن وانس کی نسل لیکن عربوں نے اس کا ہمزہ ترک کر دیا، اس کی جمع الذراری ہے (2)۔ حضرت زید بن ثابت نے ذریۃ ذال کے کسرہ کے ساتھ اور ذریۃ ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی ابوالفتح عثمان نے کہا: اس حرف کی اصل چار الفاظ کا احتمال رکھتی ہے: (۱) ذرأ (۲) ذرر (۳) ذرو (۴) ذری۔ ہمزہ والی صورت ہو تو یہ ذرأ اللہ الخلق سے مشتق ہوگا ذرر ہو تو الذر کے لفظ سے ماخوذ ہوگا۔ یہ اس لئے ہے کہ خبر میں وارد ہے کہ مخلوق ذروں کی مانند تھی۔ واو اور یاء سے ہو تو یہ ذروت الحبّ و ذریتہ سے ہوگا یہ دونوں اکٹھے بولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ (الکہف: 45)

یہ اس کے لطافت اور خفت کی وجہ سے ہوگا یہ دانے کی حالت ہے۔ جوہری نے کہا: ذرت الریح التراب وغیرہ تذروہ و تذریہ ذرواً و ذریاً یعنی ہوا نے مٹی کو اڑایا۔ اسی سے ہے: ذری الناس الحنطۃ۔ لوگوں نے دانوں کو اڑایا۔ اذریت الشیء۔ جب تو کسی چیز کو پھینکے جیسے تو کھیتی کے لئے دانے کو پھینکتا ہے۔ و طعنہ فاذراہ عن ظہر دابتہ۔ اس نے اسے نیزہ مارا اور سواری کی پیٹھ سے پھینک دیا۔ خلیل نے کہا: اسے ذریۃ کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مخلوق کو زمین پر اس طرح پھینک دیا جس طرح کسان دانے پھینکتا ہے۔ بعض نے کہا ذریۃ کی اصل ذرورۃ ہے لیکن جب تضعیف زیادہ ہوئی تو ایک را کو یا سے بدل دیا گیا تو ذرویۃ ہو گیا پھر واو کو یا میں ادغام کیا گیا تو ذریۃ ہو گیا، یہاں ذریت سے مراد بیٹے ہی ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق آباء اور ابناء دونوں پر ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ (یٰسین: 41) یہاں ذریت سے مراد آباء ہیں۔

**مسئلہ نمبر 20**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ عہد کے مراد میں علماء کا اختلاف ہے، ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے۔ سدی نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد امامت ہے۔ قتادہ نے کہا: ایمان ہے۔ عطا نے کہا: رحمت ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کا دین ہے، بعض نے کہا: اس کا امر ہے (3)۔ عہد کا اطلاق امر پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا (آل عمران: 183)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا۔ فرمایا: أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ (یٰس: 60)۔ یعنی میں نے پہلے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ جب عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہو تو لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ کا مطلب ہوگا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ظالم لوگ ان کی جگہ آئیں جو اللہ کے اوامر کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

قبول کرتے ہیں وہ ان کو قائم نہیں کریں گے۔ اس کا بیان ابھی قریب ہی ان شاء اللہ آئے گا۔ معمر نے قتادہ سے اس ارشاد لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کے تحت روایت کیا ہے کہ قتادہ نے فرمایا: اللہ کا عہد آخرت میں ظالموں کو نہیں ملے گا (1)۔ رہا دنیا میں تو ظالم نے اس کو پایا، اس کے ساتھ اس نے امن پایا، کھایا، زندہ رہا اور دیکھا۔

زجاج نے کہا: یہ عمدہ قول ہے لاینال امانی الظالمین یعنی میں انہیں اپنے عذاب سے امن نہیں دوں گا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہاں ظالم سے مراد مشرک ہے۔ حضرت ابن مسعود، طلحہ بن مصرف نے لاینال عهدی الظالمون پڑھا ہے یعنی ظالمون کے رفع کے ساتھ۔ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ، حفظ اور ابن محیصن نے عهدی میں یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اس آیت سے علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ امام عادل، محسن اور فضل والا ہونا چاہئے ساتھ ساتھ اس کو عدل کے قیام کی قوت بھی ہو۔ اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الاینا زعوا الامر اهله۔ یعنی جو حکمرانی کے حقدار ہیں ان سے جھگڑا نہ کرو گے، اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ رہے فاسق، ظالم اور جابر لوگ وہ حکمرانی کے اہل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ اسی وجہ سے حضرت ابن زبیر اور امام حسین رضی اللہ عنہما نے خروج کیا تھا، اہل عراق میں سے نیک لوگوں نے اور عراقی علماء نے حجاج بن یوسف پر خروج کیا تھا۔ اہل مدینہ نے بنی امیہ پر خروج کیا تھا اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حرہ کا واقعہ جوان پر مسلم بن عقبہ نے واقع کیا تھا۔ یہی وجہ تھی اکثر علماء کا یہ خیال ہے کہ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا، خروج سے اولیٰ ہے کیونکہ اس سے لڑنے اور اس پر خروج کرنے میں امن کو خوف سے بدلنا ہے اور خون بہانا ہے اور بیوقوفوں کے ہاتھ کو کھولنا ہے اور مسلمانوں پر حملہ کا دروازہ کھولنا ہے اور زمین میں فساد کا شروع کرنا ہے۔ پہلا مسلک معتزلہ کے ایک گروہ کا ہے یہی خوارج کا مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** ابن خویز منداد نے کہا، جو ظالم ہو وہ نہ نبی ہوتا ہے نہ خلیفہ نہ حاکم ہوتا ہے نہ مفتی۔ نہ نماز کا امام ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی روایت قبول کی جاتی ہے جو وہ صاحب شریعت سے روایت کرتا ہے، نہ احکام میں اس کی گواہی قبول ہوتی ہے مگر وہ اپنے فسق کی وجہ سے معزول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ اسے دانشمند لوگ معزول کریں۔ جو اس نے پہلے احکام دیئے وہ صحیح احکام تھے تو وہ جاری و نافذ ہوں گے وہ نہیں ٹوٹیں گے۔ امام مالک نے خوارج اور باغیوں کے متعلق اس پر نص قائم کی ہے کہ ان کے احکام نہیں ٹوٹیں گے جب وہ ان میں اجتہاد کے ساتھ صحیح سمت پر پہنچے ہوں اور انہوں نے اجماع کو نہ توڑا ہو اور نصوص کی مخالفت نہ کی ہو۔ یہ ہم نے صحابہ کے اجماع کی وجہ سے کہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کے ایام میں خروج کیا، نہ کوئی منقول ہے کہ ائمہ نے ان کے احکام کی جستجو کی تھی اور نہ ان میں سے کسی چیز کو توڑا اور نہ دوبارہ زکوٰۃ لی، نہ دوبارہ حدود کو قائم کیا، جو کچھ خوارج نے کہا تھا اسے ہی قائم رکھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ اجتہاد کی وجہ کو انہوں نے صحیح پایا ہو تو ان کے احکام سے تعارض نہ کیا جائے گا۔

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

**مسئلہ نمبر 23:** ابن خویز منداد نے کہا: ظالم حکمرانوں سے تنخواہ لینا، اس کے تین احوال ہیں اگر جو ان کے قبضہ میں ہے وہ شریعت کے مطابق انہوں نے حاصل کیا ہے تو پھر اس کا لینا جائز ہے۔ صحابہ اور تابعین نے حجاج وغیرہ کے ہاتھ سے مال لیا تھا اگر ملا جلا مال ہو حلال بھی ہو اور حرام بھی جیسا کہ آجر کے امراء کے ہاتھ میں ہے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ نہ لیا جائے۔ اور محتاج کے لئے اس کا لینا جائز ہے وہ چور کی مانند ہے اس کے ہاتھ میں چوری کا مال بھی ہے اور پاکیزہ حلال مال بھی ہے ایک شخص نے اس مال کا اسے وکیل بنایا ہے۔ چور نے اس مال سے کسی انسان پر صدقہ کر دیا تو اس سے صدقہ لینا جائز ہے۔ اگرچہ جائز تھا کہ چور نے چوری شدہ سے کچھ صدقہ کیا ہو جبکہ کوئی چیز چوری شدہ مال سے معروف نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی چیز بیچے یا خریدے تو عقد صحیح لازم ہوگی اگرچہ تقویٰ یہ ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اموال بذات خود حرام نہیں ہوتے بلکہ اپنی جہات کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اگر صراحۃ ظلماً لیا گیا ہو تو پھر ان سے لینا جائز نہیں اور اگر ان کے ہاتھوں میں غصب شدہ مال ہو مگر اس مال کا مالک اور مطالبہ کرنے والا معروف نہ ہو تو وہ اسی طرح ہے اگر وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پایا جائے اسے بیت المال میں رکھا جائے گا اور بقدر اجتہاد اس کے طالب کا انتظار کیا جائے گا جب معلوم نہ ہوگا تو امام اسے مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کر دے گا۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لئے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنا لو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز اور ہم نے تاکید کر دی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** جَعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ البیت سے مراد کعبہ ہے۔ مثابة کا معنی ہے مرجع کہا جاتا ہے ثاب یثوب مثابا و مثابة و ثؤوبا و ثوبانا۔ مثابة مصدر ہے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے کعبہ کے بارے میں کہا:

مثابا لافناء القبائل کلها تخب الیھا الیعملات الذوامل (1)

کعبہ تمام قبائل کا مرجع ہے اس کی طرف اونٹ آہستہ چلنے والے آتے ہیں۔

اعمش نے مثابات جمع پڑھا ہے (2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ثواب سے ہو یعنی لوگوں کو وہاں ثواب دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: کوئی شخص اس سے اپنا مطلوب پورا نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

جعل البیت مثابا لھم لیس منه الدھر یقضون الوطر

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کعبہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا گیا ہے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتے۔

اصل میں **مثوبۃ** تھا واو کی حرکت ثا کو دی گئی پھر واو ثاب یثوب کی اتباع میں الف سے بدل گئی اور اسے مفعول ثانی کی وجہ سے نصب دی گئی ہے، مبالغہ کے لئے ۃ کا اضافہ کیا گیا ہے کیونکہ کثرت سے لوٹنے والے ہوتے ہیں بہت کم ہے کہ کوئی بیت اللہ سے جدا ہوتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ابھی اس نے اپنی حاجت پوری نہیں کی۔ یہ نسابہ اور علامۃ کی طرح ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مصدر کی تانیث کی ھاء ہے، مبالغہ کے لئے نہیں ہے۔(1)

اگر کہا جائے کہ ہر شخص جو دوبارہ اس کی طرف نہیں آتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ لوٹنا ایک مرتبہ آنے والے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے خالی نہیں ہوتا لوگوں سے قصد کرنے والے معدوم نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْنًا امام ابوحنیفہ اور فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے استدلال کیا ہے کہ محصن اور چور پر حرم کی حدود میں حد قائم نہیں کی جائے گی جب وہ حرم میں پناہ لے گا۔ اور اپنے قول کی تائید اس آیت سے کی ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: 97) گویا فرمایا: جو بیت اللہ میں داخل ہو جائے اسے امن دو۔ اور صحیح، حرم میں حدود کا قائم کرنا ہے۔ یہ منسوخ ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ بیت اللہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور بیت اللہ سے باہر قتل کیا جائے گا۔ اختلاف اس میں ہے کہ حرم میں قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ حرم پر بیت کے اسم کا اطلاق حقیقۃً نہیں ہوتا اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر حرم میں کوئی قتل کرے گا تو اسے حرم میں قتل کیا جائے گا اگر کسی نے حد کا موجب جرم کیا تو اس سے جرم میں بدلا لیا جائے گا۔ اگر حرم میں کوئی جنگ کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی اس کی جگہ اسے قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جو حرم کی طرف پناہ لے گا اسے حرم میں قتل نہیں کیا جائے گا نہ اس کا پیچھا کیا جائے گا اسے ہمیشہ تنگ کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے یا حرم سے باہر آجائے۔

اور ہم اسے تلوار سے قتل کرتے ہیں اور وہ اسے بھوک کے ذریعے قتل کرتے ہیں۔ پس اس سے سخت قتل کون سا ہے؟ اَمْنًا یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید ہے یعنی بیت المقدس میں یہ فضیلت نہیں ہے نہ لوگ اس کا حج کرتے ہیں، جو حرم میں پناہ لے تو وہ حملہ سے امن میں ہو جاتا ہے، مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَاتَّخِذُوْا نافع اور ابن عامر نے خبر کے اعتبار سے خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین میں سے جنہوں نے مقام ابراہیم کو مصلی بنایا ان کے متعلق خبر ہے۔ اس کا عطف جَعَلْنَا پر ہے۔ یعنی جعلنا البیت مثابۃ واتخذوہ مصلی۔ ہم نے بیت اللہ کو لوٹنے کی جگہ بنایا اور لوگوں نے اسے مصلی بنایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اذ کی تقدیر پر معطوف ہے، گویا یوں فرمایا: واذ جعلنا البیت مثابۃ واذ اتخذوا۔

پہلی ترکیب پر کلام ایک جملہ ہے اور دوسری ترکیب پر دو جملے ہیں۔ جمہور قراء نے اسے اتخذوا امر کے صیغہ کے اعتبار سے

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلے کلام سے اسے الگ کیا ہے اور انہوں نے جملہ کا جملہ پر عطف کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اذکروا نعمتی پر اس کا عطف جائز ہے گویا یہ یہود سے فرمایا جارہا ہے۔ یا اس کا عطف اِذْ جَعَلْنَا کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے اذکروا اذ جعلنا یا اس کا عطف مثابۃ کے معنی پر ہے کیونکہ مثابۃ کا معنی ہے ثُوبُوا۔(1)(لوٹ کر آؤ)

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی ہے۔ مقام ابراہیم میں، پردے کے بارے میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ اس روایت کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بخاری نے یہ روایت حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے فرمایا: میں نے تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کی ہے یا فرمایا: میرے رب نے تین چیزوں میں میری موافقت کی ہے...... الحدیث...... ابوداؤد الطیالسی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حماد بن سلمہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں علی بن زید نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر آپ مقام کے پیچھے نماز پڑھیں تو یہ آیت نازل ہوگئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دے دیں کیونکہ ان کے پاس نیک اور فاجر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (احزاب: 53) اور یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا: تبارك الله احسن الخالقين تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الفاظ نازل ہوئے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (المومنون)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس گیا۔ میں نے کہا: تم رک جاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر دوسری عورتیں عطا فرما دے گا تو یہ آیت نازل ہوئی: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ (التحریم: 5)(2)

میں کہتا ہوں: اس روایت میں بدر کے قیدیوں کا ذکر نہیں ورنہ پانچ چیزوں میں حضرت عمر کی موافقت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ مَّقَامِ، المقام لغت میں قدموں کی جگہ کو کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: مقام، یہ قام یقوم سے ہے۔ مصدر ہوگا اور جگہ کا اسم ہوگا اور مُقام، اقام سے ہے۔ زہیر کا قول ہے:

و فیهم مقامات حسن وجوههم　　　واندية ينتابها القول والفعل

ان میں اہل مقام ہیں جن کے چہرے خوبصورت ہیں اور مجالس ہیں جن میں قول و فعل پے در پے ہوتا ہے۔

اس شعر میں مقامات سے مراد اہل مقامات ہیں۔

المقام کی تعیین میں بہت سے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے اصح یہ ہے کہ وہ پتھر آج لوگ جس کو پہچانتے ہیں جن کے پاس لوگ طواف قدوم کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں یہ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ وغیرہ کا قول

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی، حدیث 4123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر کی طویل حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب بیت اللہ کو دیکھا تو رکن کو استلام کیا پھر تین چکروں میں رمل کیا، اور چار چکر آرام سے چلے پھر مقام ابراہیم کی طرف گئے اور یہ آیت پڑھی۔ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ پھر رکعتیں پڑھیں ان میں سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی۔ یہ دلیل ہے کہ طواف کی دو رکعتیں اور دوسری نمازیں اہل مکہ کے لئے افضل ہیں اور من وجہ یہ دلیل ہے کہ مسافروں کے لئے طواف افضل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بخاری میں ہے: مقام سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چڑھتے تھے جب ان پتھروں کو اٹھانے سے کمزور پڑ گئے تھے جو کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پیش کرتے تھے، آپ کے قدم اس پتھر میں دھنس گئے تھے۔ حضرت انس نے کہا: میں نے المقام میں حضرت ابراہیم علیہ کی انگلیوں، ایڑھی اور قدموں کے نیچے اٹھی ہوئی جگہ کا نشان دیکھا، لیکن لوگوں کے ہاتھوں کے چھونے نے اس نشان کو ختم کر دیا ہے۔ قشیری نے یہ بیان کیا ہے(2)۔ سدی نے کہا: المقام سے مراد وہ پتھر ہے جو حضرت اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم کے قدموں کے نیچے رکھا تھا۔ جب اس نے حضرت ابراہیم کا سر دھویا تھا(3)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور عطا سے مروی ہے، مقام سے مراد مکمل حج ہے۔ عطا سے مروی ہے، عرفہ، مزدلفہ اور جمار ہے۔ یہ شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: پورا حرم مقام ابراہیم ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ ابو نعیم نے محمد بن سوقه عن محمد بن المنکدر عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو رکن اور مقام یا دروازے اور مقام کے درمیان دیکھا وہ دعا مانگ رہا تھا اے اللہ! فلاں کو بخش دے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس شخص نے کہا: مجھے ایک شخص نے اس مقام میں دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، لوٹ جا تیرے ساتھی کی بخشش ہوگئی۔ ابو نعیم نے اس سند سے بھی یہ روایت نقل کی ہے: حدثنا ہ احمد بن محمد احمد بن ابراهيم القاضي، قال حدثنا محمد بن عاصم بن يحيى الكاتب، قال حدثنا عبد الرحمن بن القاسم القطان الكوفي، قال حدثنا الحارث بن عمران الجعفري عن محمد بن سوقه۔

ابو نعیم نے کہا: اسی طرح یہ عبد الرحمن نے حارث سے انہوں نے محمد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حارث کی حدیث محمد عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے معروف ہے۔ مُصَلًّى کا معنی ایسی جگہ جہاں دعا کی جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے بعض نے فرمایا: نماز کی جگہ جس کے قریب نماز پڑھی جائے۔ یہ قتادہ کا قول ہے(4)۔ بعض نے فرمایا: قبلہ جس کے پاس امام کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَ عَهِدْنَاۤ بعض نے فرمایا: اس کا معنی امرنا (ہم نے حکم دیا) ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی اوحینا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

(ہم نے وحی کی) اَنْ طَهِّرَا، اَنْ حرف جر کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

سیبویہ نے کہا: اَنْ بمعنی ای مفسرہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہے۔ کوفیوں نے کہا: عَهِدْنَآ بمعنی قلنا ہے۔ طَهِّرَا بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: بتوں سے پاک کرو۔ یہ مجاہد اور زہری سے مروی ہے۔ حضرات عبید بن عمیر اور سعید بن جبیر نے کہا: آفات اور ریب سے پاک کرو۔ بعض نے فرمایا: کفار سے پاک کرو۔ سدی نے کہا: طہارت اور طہارت کی نیت سے اس کی بنیاد رکھو اور تعمیر کرو۔ اس قول کی مثل اُسّس علی التقویٰ ہے۔ یمان نے کہا: اس کا معنی ہے: اسے خوشبو لگاؤ اور دھونی دو(1)۔ بَيْتِيَ، بیت کی اضافت اپنی طرف کی، یہ شرف و تکریم بخشنے کے لئے ہے، یہ مخلوق کی خالق کی طرف اور مملوک کی مالک کی طرف اضافت ہے(2)۔ حضرات حسن، ابن ابی اسحاق، اہل مدینہ، ہشام اور حفص نے بیتیَ یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلطَّآئِفِيْنَ اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ عطا کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے مسافروں کے لئے جو مکہ میں وارد ہوتے ہیں(3)۔ اس میں بعد ہے وَالْعٰكِفِيْنَ جو اس شہر کے ہیں اور جو مسافر ہیں۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ اسی طرح کا قول لِلطَّآئِفِيْنَ کے بارے میں ہے لغت میں عکوف لزوم اور کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عکف النبیط یلعبون الفنزجا (4)

نبطی لوگ رقص کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

مجاہد نے کہا: العاکفون سے مراد مجاور ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نمازی ہیں۔ بعض نے فرمایا: جو بغیر طواف کے بیٹھنے والے ہیں۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے والے۔ رکوع و سجود کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں احوال نمازی کو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والے ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود کا لغوی معنی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام گھر شامل ہیں۔ ان کا حکم بھی تطہیر و نظافت میں اس جیسا ہوگا، کعبہ کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ اس وقت وہاں اور کوئی گھر نہ تھا یا اس لئے کہ اس کی حرمت زیادہ ہے۔ پہلا معنی اظہر ہے۔ قرآن میں ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (النور: 36) اس آیت کے تحت دوسری مساجد کا حکم آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی۔ حضرت عمر نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ کیا تو جانتا ہے تو کہاں ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی، ڈرانے والوں کے بھائی، اے رسولوں کے بھائی! اپنی قوم کو ڈراؤ کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر سلیم دلوں

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کے ساتھ، سچی زبانوں کے ساتھ، پاکیزہ ہاتھوں کے ساتھ، صاف شرمگاہوں کے ساتھ اور میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں جب تک کہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا ہو۔ کیونکہ میں اس پر لعنت کرتا ہوں جب تک وہ میرے سامنے کھڑا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ظلم سے چھینی ہوئی چیز مظلوم کو واپس کر دے۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور وہ میرے اولیاء و اصفیاء میں سے ہو جاتا ہے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ میرا پڑوسی بن جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت میں امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور سلف کی جماعت نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز اور نفل نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر بیت اللہ کے درمیان کسی دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ اگر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جبکہ دروازہ کھلا ہوا تھا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اسی طرح جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی تو اس کی نماز باطل ہے کیونکہ کعبہ کا کوئی حصہ اس کے سامنے نہ تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کے اندر فرض اور سنن ادا نہیں کی جائیں گی۔ اس میں نفل پڑھے جائیں گے مگر اس نے فرض کعبہ کے اندر پڑھے تو وقت میں دوبارہ پڑھے گا۔ اصبغ نے کہا: وہ ہمیشہ لوٹائے گا۔

میں کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1)، فرمایا: مجھے حضرت اسامہ بن زید نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کی تمام اطراف میں دعا مانگی اور اس میں نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ کعبہ سے نکل آئے۔ جب باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا: یہ قبلہ ہے اور یہ نص ہے۔

اگر کہا جائے کہ بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال، حضرت عثمان بن طلحہ حجبی بیت اللہ میں داخل ہوئے اور اپنے اوپر دروازہ بند کر لیا۔ جب دروازہ کھولا تو میں پہلا شخص تھا جو اندر داخل ہوا۔ میں حضرت بلال سے ملا۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی؟ حضرت بلال نے کہا: ہاں دو یمنی ستونوں کے درمیان پڑھی تھی۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں دو ستونوں کو اپنی بائیں جانب اور ایک ستون کو دائیں جانب اور تین ستونوں کو پیچھے رکھا، اس وقت بیت اللہ چھ ستونوں پر تھا۔

ہم کہتے ہیں: ہوسکتا ہے صلّی بمعنی دعا ہو۔ جس طرح حضرت اسامہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ صلّی سے مراد نماز ہی ہو، جب اس میں احتمال آ گیا تو اس سے احتجاج ساقط ہو گیا۔

اگر کہا جائے کہ ابن منذر وغیرہ نے حضرت اسامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ میں تصاویر دیکھیں تو میں ڈول میں آپ کے پاس پانی لے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ پانی ان تصاویر پر مارا۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن ابی ذئب نے عبدالرحمن بن مہران سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: ہمیں عمیر مولیٰ ابن عباس نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کعبہ میں داخل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی، حدیث 383، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصاویر دیکھیں، فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ڈول منگوایا۔ میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا تو آپ ان تصاویر کو مٹانے لگے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس قوم کو قتل کرے جو ان کی تصاویر بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے۔

اس میں احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت نماز پڑھی ہو جب حضرت اسامہ پانی لینے گئے ہوں اور حضرت بلال نے وہ عمل دیکھا ہو جو حضرت اسامہ نے نہ دیکھا۔ پس جو ثابت کرنے والا ہوتا ہے وہ نفی کرنے والے سے اولیٰ ہوتا ہے۔ حضرت اسامہ نے خود کہا: لوگوں نے حضرت بلال کے قول کو لیا اور میرے قول کو چھوڑ دیا۔ مجاہد نے حضرت عبداللہ بن صفوان سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطاب سے پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کعبہ میں داخل ہوئے تو کیسے عمل کیا؟ حضرت عمر نے کہا: دو رکعت نماز پڑھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ نوافل پر محمول ہے ہم کعبہ میں نوافل کی صحت میں علماء کا اختلاف نہیں جانتے۔ رہے فرض تو اس کے ہم قائل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہت کو اپنے ارشاد فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ میں متعین فرمایا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، جب آپ باہر نکلے، ھذہ القبلۃ۔ تو آپ نے اس کی تعیین فرمائی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تعیین فرمائی تھی۔ اگر کعبہ کے اندر فرض صحیح ہوتے تو آپ ھذہ القبلۃ نہ فرماتے۔ اس طرح احادیث کو جمع کرنا صحیح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بعض احادیث کو ساقط کرنے سے اولیٰ ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 5**: اسی طرح کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی نے تو وہی فرمایا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے وہ وقت میں دوبارہ پڑھے۔ اور بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ ہر حال میں اعادہ کرے (خواہ وقت موجود ہو یا وقت گزر چکا ہو) امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی اس پر کچھ واجب نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے یا اس کا طواف کرنا افضل ہے۔ امام مالک نے فرمایا: باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور اہل مکہ کے لئے نماز افضل ہے، یہ حضرات ابن عباس، عطا اور مجاہد سے ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ نماز افضل ہے، حدیث میں ہے۔ اگر خشوع کرنے والے مرد، رکوع کرنے والے بوڑھے، دودھ پینے والے بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو ہم تم پر عذاب نازل کرتے۔

ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے اپنی کتاب (السابق واللاحق) میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں خشوع کرنے والے مرد، چرنے والے جانور، دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو مجرموں پر عذاب نازل کر دیا جاتا۔ اس میں بوڑھے رکوع کرنے والوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے: نماز بہتر چیز ہے تو زیادہ پڑھ یا کم پڑھ (تیری مرضی) اس کو الا پر جری نے ذکر کیا ہے۔ نماز اور سجدہ کی فضیلت میں اخبار بہت زیادہ ہیں جو جمہور کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ

مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

''اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب! بنا دے اس شہر کو امن والا اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر۔ اللہ نے فرمایا: (ان میں سے) جس نے کفر بھی کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلَدًا اٰمِنًا اس سے مراد مکہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد اور دوسرے لوگوں کے لئے امن اور خوشحال زندگی کی دعا مانگی (1)۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے جبریل سے فرمایا: شام سے طائف کو اکھیڑ۔ پس جبریل نے طائف کے ساتھ بیت اللہ کے اردگرد سات چکر لگائے ..... طائف کو طائف اسی لئے کہا جاتا ہے (2)..... پھر طائف کو تہامہ میں اتارا، مکہ اور اس کے قریب کا علاقہ اس وقت چٹیل تھا۔ نہ پانی تھا نہ کوئی نبات۔ پس اللہ تعالیٰ نے مکہ کے اردگرد کے علاقہ جیسے طائف وغیرہ میں برکت ڈال دی اور اس میں قسم قسم کے پھل اگائے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اختلاف ہے کہ مکہ حضرت ابراہیم کے سوال سے حرم بنا یا پہلے سے ہی حرم تھا۔ اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ ہمیشہ جابر مسلطین سے، خسوف اور زلزلوں سے اور دوسرے تمام حوادث سے جو شہروں پر نازل ہوتے ہیں سے حرم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سرکش نفوس میں اس کی تعظیم اور ہیبت ڈال دی جس کی وجہ سے مکہ کے رہنے والے دوسرے لوگوں سے امن کی وجہ سے ممتاز ہو گئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر ایک بہت بڑی علامت رکھ دی جس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس میں کتا اور شکار جمع ہوتے ہیں اور کتا شکار پر حملہ نہیں کرتا اور نہ شکار اس سے ڈرتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ دونوں حرم سے نکل جاتے ہیں تو کتا اس شکار پر حملہ کرتا ہے اور وہ بھاگنے لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ مکہ کو قحط، بنجر ہونے اور حملوں سے امن والا بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ اس کا خون بہانا بھی منع ہے جس کا قتل کرنا لازم ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مقصود سے بہت بعید ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ ان کی شرع میں اس شخص کا قتل کرنا حرام ہو جو حرم میں پناہ لے۔ یہ انتہائی بعید قول ہے۔

دوسرا قول۔ مکہ حضرت ابراہیم کی دعا سے پہلے دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا اور آپ کی دعا سے حرم امنا بنا جیسا کہ مدینہ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریم سے امن والا بنا اس سے پہلے حلال تھا۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

پہلے مقالہ والوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ شہر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں جنگ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھی اور نہ میرے لئے حلال ہے مگر دن کی ایک گھڑی۔ یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، اس کا نہ کانٹا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار ڈرایا جائے گا نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے گی مگر جو اس کا اعلان کرے اور نہ اس کی خشک گھاس کاٹی جائے گی۔ حضرت عباس نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اذخر گھاس کی استثنا فرمائیں کیونکہ وہ ہمارے لوہاروں کے لئے اور ہمارے گھروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اذخر گھاس کی استثناء فرمادی۔ (1)

اسی طرح کی حدیث ابوشریح کی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور اہل مکہ کے لئے دعا کی، میں نے مدینہ کو حرم بنایا جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں نے اس کے صاع اور اس کے مد کے لئے اس کے دو مثل کی دعا کی جو حضرت ابراہیم نے اہل مکہ کے لئے دعا کی۔ ابن عطیہ نے کہا: ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی حدیث اس کے متعلق خبر دے رہی ہے جو مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں تھا اور اس کے فیصلہ میں تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی مدت ہے اور ایمان کے ساتھ افق کو آباد کرنے کے اوقات کی حرمت ہے۔

اور دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم کا اس کی حرمت کی تجدید اور اس کے مٹنے کے بعد، اس کے اظہار کی خبر ہے۔ پہلا قول نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن مومنوں پر مکہ کی حرمت کی تعظیم کی خبر دیتے ہوئے فرمایا اور اس کی تحریم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور مدینہ طیبہ کی تحریم کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور مثال ذکر فرمایا۔ لامحالہ مدینہ کی تحریم بھی اللہ کی طرف سے ہوگی اور اس کی قضا کے نفاذ سے اور اس کے سابق علم سے ہوگی۔ طبری نے کہا (3): مکہ حرام تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مکلف نہ کیا حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حرم بنادیا۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ، رزق کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ثمرات، ثمرۃ کی جمع ہے یہ بھی پہلے گزر چکا ہے مَنْ اٰمَنَ یہ اھل سے بدل ہے اور کل سے بدل بعض ہے۔ الایمان کا معنی تصدیق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ، مَنْ محل نصب میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: و ارزق من کفر۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور یہ شرط ہے اور خبر فامتعہٗ ہو اور یہ جواب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ حضرت ابی بن کعب اور اسحق وغیرہما نے کہا (4): یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور انہوں نے فامتعہ ہمزہ کے ضمہ، میم کے فتحہ اور تا کی

---

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ و تحریم صیدھا و خلاھا و شجرھا، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح بخاری، باب لاینفر صید الحرم، حدیث 1702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثم اضطرہ ہمزہ کے قطع اور را کے ضمہ کے ساتھ۔ ابن عامر کے سوا قراء سبعہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابن عامر نے میم کے سکون اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو اسحاق الزجاج نے حکایت کیا ہے کہ ابی کی قراءت میں فنمتعہ قلیلاً ثم نضطرہ یعنی نون کے ساتھ ہے (1)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے انہوں نے فامتعہ کو ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ثم اضطرہ کو الف کے وصل اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کے حق میں دعا فرمائی اور کفار کے خلاف دعا کی (2)۔ اس صورت میں قال کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور قال کو دوبارہ ذکر کیا کلام کی طوالت کی وجہ سے یا اس لئے کہ آپ مومنین کے لئے دعا مانگنے نکلے اور کفار کے خلاف دعا کرنے میں داخل ہوئے۔ جمہور کی قراءت پر قال کا فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا۔ ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون اور الف کے وصل کے ساتھ قراءت شاذ ہے، نسق کلام اور تفسیر دونوں اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ رہا نسق کلام تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے میرے رب! اس کو امن والا شہر بنا۔ پھر یہ عرض کی: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ان دونوں کے درمیان قال کے ساتھ فاصلہ نہیں کیا پھر اس کے بعد فرمایا: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد قال ابراھیم نہیں فرمایا۔

رہی تفسیر تو حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت محمد بن کعب سے صحیح مروی ہے۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابراہیم نے جو لوگ ایمان لائے تھے صرف ان کے لئے دعا فرمائی کفار کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ کافروں کو بھی اسی طرح رزق دے گا جس طرح ایمان والوں کو رزق دے گا اور وہ انہیں تھوڑا عرصہ لطف اندوز کرے گا پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف مجبور کرے گا۔ ابو جعفر نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (اسراء: 20) (ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وامم سنمتعهم (کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں۔)

ابو اسحاق نے کہا: حضرت ابراہیم کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے اس لئے آپ نے دعا میں مومنین کو خاص فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۲۴﴾ (نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک)

## وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴿۱۲۷﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ، القواعد سے مراد اس کی بنیادیں ہیں۔ یہ ابو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عبیدہ اور فراء کا قول ہے۔ کسائی نے کہا: اس سے مراد دیواریں ہیں، معروف بنیاد ہے۔

حدیث میں ہے: بیت اللہ کو جب گرایا گیا تو اس سے بڑے بڑے پتھر نکلے۔ ابن زبیر نے کہا: یہ وہ پتھر ہیں جن سے حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ بعض نے فرمایا: وہ بنیادیں مٹ گئی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان پر مطلع فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: بیت اللہ کو ان ارکان پر رکھا گیا تھا جو آپ نے دیکھے تھے اور دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے۔ پھر زمین کو اس کے نیچے سے پھیلایا گیا۔

القواعد کا واحد قاعدۃٌ ہے اور القواعد من النساء کا واحد قاعدٌ ہے(1)۔ علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے کعبہ کی بنیاد رکھی۔ بعض نے فرمایا: ملائکہ نے سب سے پہلے اس کی بنیاد رکھی۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: میرے باپ سے بیت اللہ کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں پوچھا گیا جب کہ میں بھی موجود تھا تو میرے والد صاحب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ:30) (میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں) تو فرشتوں نے کہا: کیا تو اس میں اسے خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں پر ناراض ہوا تو انہوں نے اس کے عرش کے ذریعے پناہ طلب کی۔ انہوں نے عرش کے اردگرد سات چکر لگائے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ۔ بنی آدم میں سے جس پر میں ناراض ہوں گا وہ اس کی پناہ لے گا اور اس کے اردگرد طواف کرے گا جس طرح تم نے میرے عرش کے اردگرد طواف کیا۔ پس میں اس سے راضی ہو جاؤں گا جس طرح میں تم سے راضی ہوا، پس فرشتوں نے بیت اللہ بنایا۔

عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے عطا اور ابن مسیب وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب تو نیچے زمین پر اترے تو میرے لئے ایک گھر بنا پھر اس کو گھیر لے جس طرح تو نے ملائکہ کو دیکھا کہ انہوں نے میرے عرش کو گھیرا تھا جو آسمان میں تھا۔

عطا نے کہا: لوگوں کا خیال ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کو پانچ پہاڑوں سے بنایا: حرا، طور سینا، لبنان، جودی اور طور سینا۔ اس کی ربض حرا سے تھی (2)۔ خلیل نے کہا: الربض سے یہاں مراد پتھر سے بنی ہوئی بیت اللہ کی گول بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے مدینہ کے اردگرد کی جگہ کو ربض کہا جاتا ہے۔ ماوردی نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین کی طرف اترے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اے آدم! تو جا اور میرے لئے ایک گھر بنا اور اس کا طواف کر اور اس کے پاس مجھے یاد کر جس طرح تو نے ملائکہ کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام چلتے ہوئے آئے اور زمین ان کے لئے لپیٹی گئی تھی اور جنگل ان کے لئے سکیڑے گئے تھے آپ جہاں قدم رکھتے تھے وہ جگہ آباد ہو جاتی تھی حتیٰ کہ آپ بیت حرام کی جگہ پر پہنچے۔ جبریل نے اپنے پر زمین پر مارے اور نچلی

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ساتویں زمین پر قائم بنیاد کو ظاہر کر دیا۔ پس ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف پتھر پھینکے۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ تیس آدمی انہیں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں سے کعبہ بنایا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

بعض اخبار میں مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے جنت کے خیموں سے ایک خیمہ اتارا گیا وہ کعبہ کی جگہ پر لگایا گیا تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور اس کا طواف کریں وہ خیمہ باقی رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی روح قبض فرمائی تو پھر اٹھا لیا گیا۔ یہ حضرت وہب بن منبہ کے طریق سے ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک بیت (گھر) اتارا گیا آپ اس کا طواف کرتے تھے اور آپ کی اولاد میں سے مومنین، غرق کے زمانہ تک طواف کرتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھا لیا تو وہ آسمان میں ہو گیا اسی گھر کو بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ قتادہ سے روایت ہے جسے حلیمی نے اپنی کتاب ''منہاج القرآن'' میں ذکر کیا ہے (1)۔ انہوں نے فرمایا: جو معنی قتادہ نے بیان کیا وہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک گھر اتارا گیا یعنی وہ طولاً، عرضاً اور بلندی کے اعتبار سے بیت المعمور کی مقدار کا تھا پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا: اتنا بناؤ اور کوشش کرو کہ یہ اس کے بالمقابل ہو، وہ کعبہ کی جگہ کے سامنے تھا۔ پس آپ نے اس میں کعبہ بنایا۔ رہا وہ خیمہ یہ جائز ہے کہ وہ اتارا گیا ہو اور کعبہ کی جگہ لگایا گیا ہو۔ جب کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا تو آپ نے کعبہ تعمیر کیا اور کعبہ کے اردگرد حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے لئے طمانیت تھی جب تک آپ زندہ رہے وہ خیمہ قائم رہا پھر اسے اٹھا لیا گیا۔ پس یہ اخبار اس طرح متفق ہو جاتی ہیں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بنا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ ابن جریج نے کہا: لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس میں ایک سر تھا۔ اس سر نے کہا: اے ابراہیم! تیرا رب تجھے حکم دیتا ہے کہ تو اس بادل کی مقدار لے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے دیکھنا شروع کیا اور اس کی مقدار خط کھینچ دیا۔ پھر اس سر نے کہا: تو نے کر دیا۔ پھر آپ نے اس جگہ کی کھدائی کی اور زمین میں قائم اساس کو ظاہر کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو آپ شام سے نکلے اور آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا اسماعیل اور اس کی ماں ہاجرہ بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سکینت (ہوا) کو بھیجا جس کی ایک زبان تھی جس کے ساتھ وہ کلام کرتی تھی۔ صبح کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے ساتھ چلتے جب وہ چلتی اور اس کے ساتھ آپ واپس آ جاتے جب وہ واپس آتی، حتیٰ کہ وہ سکینت حضرت آدم علیہ السلام کو لے کر مکہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: میری جگہ پر بنیاد رکھو۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دیواریں بلند کیں حتیٰ کہ حجر اسود کی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا: اے میرے بیٹے! میرے لئے ایک پتھر تلاش کر جسے میں لوگوں کے لئے علامت بناؤں۔ حضرت اسماعیل ایک پتھر لے آئے جسے آپ نے پسند نہ فرمایا اور فرمایا اور کوئی پتھر تلاش کرو۔ آپ تلاش کرتے رہے پھر آپ خود آئے اور حجر اسود لے آئے اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ حضرت اسماعیل نے کہا: اے میرے ابا جان! یہ پتھر تمہارے پاس کون لایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا: وہ جو مجھے تیرے سپرد نہیں کرتا (2)۔ حضرت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ابن عباس نے کہا: جبل ابوقبیس نے پکارا اے ابراہیم، اے خلیل الرحمن! تیرے لئے میرے پاس ایک ودیعت ہے وہ تم لے لو۔ تو وہ جنت کے یاقوت میں سے ایک سفید پتھر تھا وہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں تو چکور شکل کا ایک بادل آیا جس میں ایک سر تھا اس بادل نے آواز دی میری مقدار پر بلند (تعمیر) کرو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت اللہ تعمیر کرنے پر جزا عطا فرمائی۔

حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے نعیم بن حماد نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں عبدالوہاب بن ہمام نے بتایا جو عبدالرزاق کے بھائی تھے، انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: پہلے گھوڑے بھی دوسرے وحشی جانوروں کی طرح وحشی تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کو بنیادیں بلند کرنے کی اجازت دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم دونوں کو ایک خزانہ دینے والا ہوں جو میں نے تم دونوں کے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے پھر حضرت اسماعیل کو وحی فرمائی کہ تم اجیاد کی طرف جاؤ اور دعا مانگو تمہارے پاس خزانہ آ جائے گا آپ اجیاد کی طرف گئے ...... وہاں گھوڑے رہتے تھے ...... آپ نہیں جانتے تھے کہ دعا کیا ہے اور خزانہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام فرمایا۔ پس سطح زمین پر کوئی گھوڑا باقی نہ رہا جو عرب کی زمین پر رہتا تھا مگر وہ آپ کے پاس آ گیا۔ تمام گھوڑوں کی اپنی پیشانیوں پر آپ کو قدرت بخشی اور ان کو آپ کا مطیع کر دیا۔ پس تم ان پر سوار ہو اور انہیں چارہ ڈالو کیونکہ یہ برکت ہیں یہ تمہارے باپ اسماعیل کی میراث ہیں۔ الفرس کو عربی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کو دعا کا حکم دیا گیا تھا اور آپ نے دعا فرمائی۔

عبدالمنعم بن ادریس نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سب سے پہلے مٹی اور پتھر سے کعبہ بنایا وہ حضرت شیث علیہ السلام تھے، رہی قریش کی تعمیر کعبہ تو وہ مشہور ہے اور اس میں سانپ کی خبر مذکور ہے۔ سانپ انہیں کعبہ گرانے سے روکتا تھا، حتیٰ کہ تمام قریش مقام ابراہیم کے پاس جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہمیں نہ ڈرا ہم تیرے گھر کی تشریف و تزئین کا ارادہ رکھتے ہیں اگر تو اس سے راضی ہے تو فبہا ورنہ جو تو چاہے کر۔ انہوں نے آسمان سے پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ دیکھا تو گدھ سے بڑا ایک پرندہ تھا جس کی پیٹھ سیاہ تھی پیٹ اور پاؤں سفید تھے اس نے اپنے پنجے سانپ کی گدی میں گاڑھے پھر اس کو لے کر اڑا وہ سانپ اتنی بڑی دم کھینچتا گیا حتیٰ کہ وہ پرندہ اسے اجیاد کی طرف لے گیا۔ پھر قریش نے کعبہ کو گرایا اور پھر اسے وادی کے پتھروں سے بنانے لگے جن کو قریش اپنی گردنوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ قریش نے اس کو آسمان کی طرف بیس ہاتھ بلند کیا، اسی اثنا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجیاد سے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے آپ کے اوپر ایک چادر تھی۔ چادر آپ پر تنگ ہو گئی۔ آپ نے چادر کو کندھے پر اٹھانا شروع کیا تو چادر کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے شرمگاہ ظاہر ہو گئی، ندا آئی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی برہنہ نہ دیکھے گئے۔ کعبہ کی تعمیر اور نزول قرآن کے درمیان پانچ سال کا فاصلہ تھا۔ آپ کی ہجرت اور تعمیر کعبہ کے

درمیان پندرہ سال کا فاصلہ تھا۔

یہ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عثمان سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے۔ معمر عن الزھری سے مروی ہے حتیٰ کہ جب قریش نے کعبہ بنالیا اور حجر اسود رکھنے کی جگہ پہنچے تو قریش اس کو رکھنے میں جھگڑنے لگے کہ کون سا قبیلہ اسے اٹھا کر رکھے گا؟ حتیٰ کہ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: آؤ ہم اس کا فیصلہ تسلیم کرلیں جو اس گلی سے سب سے پہلے ہمارے پاس آئے گا، اس پر صلح ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے آپ ابھی جوان تھے آپ کے اوپر ایک دھاری دار چادر تھی۔ انہوں نے آپ کو ثالث مقرر کردیا۔ آپ نے پتھر کو ایک کپڑے میں رکھنے کا حکم دیا پھر ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا اور اسے کپڑے کی ایک طرف عطا فرمائی پھر آپ اوپر چڑھے۔ تمام سرداروں نے وہ پتھر آپ کو اٹھا کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی جگہ پر لگا دیا۔

ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قریش نے حجر اسود میں، سریانی زبان میں لکھی ایک تحریر پائی وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیا ہے حتیٰ کہ ایک یہودی نے انہیں پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہ لکھا تھا، میں اللہ ہوں، مکہ کا مالک۔ میں نے اس کو اس دن پیدا کیا تھا جس دن میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا اور چاند اور سورج کو صورت بخشی تھی اور میں نے اسے سات املاک سے گھیرا ہوا ہے، یہ زائل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے ابوقبیس اور احمر پہاڑ زائل ہو جائیں گے۔ اس کے رہنے والوں کے لئے پانی اور دودھ میں برکت رکھی گئی ہے۔ ابوجعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرمایا: کعبہ کا دروازہ عمالقہ، جرہم اور حضرت ابراہیم کے دور میں زمین پر تھا حتیٰ کہ قریش نے اسے تعمیر کیا (تو دروازہ اونچا کردیا)۔

مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یہ کعبہ کے ساتھ والی دیوار کعبہ سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کی: انہوں نے اس کو کعبہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: تیری قوم کے پاس خرچ کم ہو گیا تھا۔ میں نے عرض کی: اس کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری قوم نے یہ اس لئے کیا تھا تاکہ جنہیں چاہیں داخل کریں اور جنہیں چاہیں منع کریں اگر تمہاری قوم کا زمانہ جاہلیت قریب نہ ہوتا مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کریں گے تو میں اس دیوار کو کعبہ میں داخل کردیتا، اور اس کے دروازے کو زمین سے ملا دیتا (1)۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری خالہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تیری قوم کا زمانہ شرک قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا۔ ایک مشرق سے اور ایک مغرب سے اور اس میں چھ ہاتھ حطیم سے زیادہ کرتا کیونکہ قریش نے اسے چھوٹا بنایا تھا جہاں انہوں نے کعبہ بنایا تھا۔

عروہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہاری قوم کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ دیتا اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر بناتا کیونکہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو

---

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ وبناھا، جلد 1، صفحہ 30-429 (قدیمی کتب خانہ)

چھوٹا کر دیا اور میں اس کا خلف بناتا(1)۔ بخاری میں ہشام بن عروہ نے کہا: یعنی (بابا) دروازہ بناتا۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ میں اس کے دو دروازے بناتا یہ قریش کی بنا ہے پھر جب اہل شام نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر حملہ کیا اور ان کے جلاؤ نے کعبہ کو کمزور کر دیا۔ تو حضرت ابن زبیر نے اسے گرایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق بنایا۔ اس میں پانچ ہاتھ حطیم سے زیادہ کیا حتیٰ کہ وہ بنیاد ظاہر کر دی اور لوگوں نے اسے دیکھا اور اس پر کعبہ کی تعمیر کی۔ کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا جب اس میں زیادتی کی تو لمبائی کم کر دی پھر اس کی لمبائی میں دس ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک میں سے لوگ داخل ہوتے دوسرے سے نکل جاتے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ حدیث کے الفاظ مختلف ہیں۔

سفیان نے داؤد بن شابور عن مجاہد کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: جب حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو گرانے اور دوبارہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے لوگوں کو کہا: کعبہ کو گرادو۔ لوگوں نے اسے گرانے سے انکار کیا اور وہ ڈر گئے کہ کہیں عذاب نہ آجائے۔ مجاہد نے کہا: ہم منیٰ کی طرف نکل گئے اور ہم وہاں تین دن ٹھہرے رہے اور عذاب کا انتظار کرتے رہے۔ فرمایا: حضرت عبداللہ بن زبیر خود کعبہ کی دیوار پر چڑھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا تو لوگوں نے حوصلہ باندھا۔ فرمایا: لوگوں نے کعبہ کو گرایا۔ جب اسے حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا تو اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اس میں دیوار والی طرف سے چھ ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے طول میں نو ہاتھ کا اضافہ کیا۔ مسلم نے اپنی حدیث میں کہا: جب حضرت عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کو اس کے متعلق بتانے کے لئے خط لکھا اور اسے بتایا کہ ابن زبیر نے کعبہ کو اس بنیاد پر تعمیر کیا جس کی طرف اہل مکہ میں سے عادل لوگوں نے دیکھا۔ عبدالملک نے اس کی طرف لکھا کہ ہم ابن زبیر کی کسی چیز کو باقی رکھنے والے نہیں جو اس نے اس کی لمبائی میں زیادتی کی ہے اس کو برقرار رکھو اور جو اس نے حطیم سے زیادتی کی، اس کو پہلی بنا پر لوٹا دو اور جو اس نے دروازہ کھولا تھا اسے بند کر دو۔ پس حجاج نے اسے توڑا اور پہلی بنا پر لوٹا دیا۔

ایک روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ ابا خبیب (ابن زبیر) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے جو وہ کہتا ہے کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے۔ حارث بن عبداللہ نے کہا: کیوں نہیں میں نے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا، اس نے کہا: تو نے اسے کیا کہتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم نے بیت اللہ کی عمارت کم کر دی ہے۔ اگر ان کے شرک کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں اسے لوٹا دیتا جو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اگر میرے بعد تیری قوم کو اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا خیال آئے تو ادھر آؤ میں تجھے دکھاؤں جو انہوں نے کعبہ میں سے چھوڑ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کو سات ہاتھ کے قریب دکھایا۔

ایک اور روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: اگر میں اس کے گرانے سے پہلے یہ حدیث سن لیتا تو میں اسے حضرت ابن زبیر کی بنیاد پر چھوڑ دیتا۔ یہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں آثار مروی ہیں۔ روایت ہے کہ رشید نے حضرت مالک بن انس کے

1۔ صحیح بخاری، باب فضل مكة وبنيانها، حدیث 1482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے ذکر کیا کہ وہ حجاج کی تعمیر کعبہ کو گرانا چاہتا ہے اور اسے حضرت ابن زبیر کی تعمیر پر لوٹانا چاہتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر نے اس کی پیروی کی تھی۔ امام مالک نے رشید کو کہا: اے امیر المومنین! میں تجھے الله کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم اس گھر کو بادشاہوں کے لئے کھلونا نہ بناؤ، ہر آنے والا بیت الله کو توڑ دے گا اور نئی تعمیر کرے گا اور اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں سے چلی جائے گی۔

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں معمر نے ہمام بن منبہ سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول الله ﷺ نے اسعد حمیری کو گالی دینے سے منع فرمایا۔ یہ تبع تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے بیت الله کو غلاف پہنایا تھا اور یہ دوسرا تبع تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: پہلے قباطی کپڑے پہنائے جاتے تھے پھر یمنی چادریں بنائی جاتی تھیں اور جس نے سب سے پہلے دیباج (ریشم) کا کپڑا پہنایا وہ حجاج تھا۔ علماء نے فرمایا: کعبہ کے غلاف سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئے کیونکہ وہ کعبہ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کعبہ کی خوشبو میں سے کوئی چیز لینا شفا حاصل کرنے کے لئے مکروہ ہے۔ جب وہ خادم کو کوئی چیز لیتے ہوئے دیکھتے تو اسے سر کے پیچھے طمانچہ مارتے وہ اسے تکلیف پہنچانے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ عطا نے کہا: ہم میں سے کوئی جب اس سے شفا طلب کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ خوشبو لے آتا اس کو پتھر کے ساتھ مس کرتا پھر اسے اٹھا لیتا۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا معنی ہے وہ دونوں کہہ رہے تھے: ربنا تقبل یقولان کو حذف کیا گیا ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبد الله بن مسعود کی قراءت میں اسی طرح ہے: واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت و اسماعیل و یقولان ربنا تقبل منا (1)۔ اسماعیل کی تفسیر یہ ہے: اسمع یا الله (اے الله! سن لے) کیونکہ ایل، سریانی زبانی میں الله کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے رب سے دعا مانگی تو کہا: اسمع یا ایل (اے الله! سن لے میری فریاد) جب الله تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بچہ عطا فرمایا تو اس کا نام اپنی دعا کے ساتھ رکھا۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ یہ الله تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ان کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء الله الحسنیٰ میں کر دی ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

”اے ہمارے رب! بنا دے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو اور بتا دے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہے“۔

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یہاں وَاجْعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے اور مُسْلِمَيْنِ مفعول ثانی ہے۔ دونوں (ابراہیم واسماعیل) نے ثبات اور دوام کی دعا مانگی۔ یہاں اسلام سے مراد ایمان اور اعمال دونوں ہیں (1)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:19) اس آیت میں دلیل ہے ان علماء کی جو کہتے ہیں کہ ایمان اور اسلام ایک شے ہیں۔

ایک اور آیت سے انہوں نے اپنے اس قول کو قوت دی ہے: فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ (الذاریات) (ہم نے نکال لیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو پس نہ پایا ہم نے اس ساری بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے)۔

حضرت ابن عباس اور عوف اعرابی نے مسلمین جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔(2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یعنی ہماری اولاد سے بنا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے دعا مانگی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے، اپنی امت کے لئے اور اس امت (محمدیہ) کے لئے دعا مانگی۔ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ ظالم ہوں گے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ سے خاص عرب مراد ہیں (3)۔ سہیلی نے کہا: ان دونوں کی اولاد عرب ہیں کیونکہ عرب نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا بنو تیمن بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے: قیدر بن نبت بن اسماعیل...... العدنانیہ یہ نبت کی اولاد ہیں اور قحطانیہ قیدر بن نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا ایک قول کے مطابق تیمن کی اولاد ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (4): یہ ضعیف ہے کیونکہ آپ کی دعوت عربوں میں ظاہر ہوئی تھی اور ان لوگوں میں جو عربوں کے علاوہ تھے۔

اُمَّةً کا یہاں معنی جماعت ہے ایک شخص کو بھی امت کہا جاتا ہے خیر میں جس کی اقتدا کی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (النحل:120) (بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ کے مطیع تھے) نبی کریم ﷺ نے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں فرمایا تھا وہ ایک امت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا کیونکہ کوئی دوسرا اس کے دین میں شریک نہ تھا۔ واللہ اعلم

کبھی لفظ اُمَّةً کا اطلاق دوسرے معانی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (زخرف:22) یعنی ہم نے اپنے آباء کو ایک دین اور ملت پر پایا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (الانبیاء:92) کبھی الحین اور الزمان کے معنی میں ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف:45) (یعنی کچھ عرصہ کے بعد یاد آیا) کہا جاتا ہے ھذہ امۃ زید۔ یعنی یہ زید کی ماں ہے۔ اُمَّةً کا معنی قامت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان حسن الامہ یعنی خوبصورت قامت والا ہے۔ شاعر نے کہا:

وان معاویۃ الاکرمیـ ـن حسان الوجوہ طوال الامم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: الامۃ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو دماغ کی اصل تک پہنچ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ماموم د امیم، ایسا شخص جسے دماغ پر زخم لگا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا، اَرِنَا، یہ آنکھ سے دیکھنے سے ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ رؤیت قلب سے ہے، یہ کہنے والے پر لازم ہے کہ فعل اس کی طرف سے تین مفاعیل کی طرف متعدی ہو۔ ابن عطیہ نے کہا(1): کبھی ہمزہ کے باوجود رویت قلب سے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح بغیر ہمزہ کے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ حطائط بن یعفر اخوالاسود بن یعفر نے کہا:

اریني جواداً مات هزلا لانني　　　اری ما ترین او بخیلاً مخلّداً

حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت قتادہ، حضرت ابن کثیر، حضرت ابن محیصن، سدی اور روح نے یعقوب اور رویس السوی نے ارنا قرآن میں راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو عمرو نے راء کے کسرہ کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے، اصل میں اَرْئِنا ہمزہ کے ساتھ تھا، جنہوں نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے کہا: ہمزہ اور اس کی حرکت ختم ہو گئی اور راء اپنی حالت پر ساکن باقی رہی اور انہوں نے شاعر کے قول سے استدلال کیا ہے:

ارنا اداوة عبدالله نملؤها　　　من ماء زمزم ان القوم قد ظمئوا

ہمیں عبداللہ کا لوٹا دکھاؤ ہم زمزم کے پانی سے اسے بھریں گے کیونکہ قوم پیاسی ہے۔

شاعر نے اسے اَرْنا پڑھا ہے۔

اور جن علماء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ ہمزہ محذوفہ کی حرکت نقل کر کے را کو دیتے ہیں۔ ابو عمرو نے خفت کو طلب کیا ہے۔ شجاع بن ابی نصر سے مروی ہے، وہ امین اور سچے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا انہوں نے ابو عمرو کے حروف سے بہت سی اشیاء کا ذکر کیا تو صرف دو حروف کی تصحیح فرمائی۔ ایک یہ اَرْنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِرِنا اور دوسرا ما ننسخ من آیۃ او ننسأھا (مہموز)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنَاسِكَنَا کہا جاتا ہے: لغت میں النسک کا معنی غسل ہے۔ کہا جاتا ہے: نَسَكَ ثوبه جب کوئی اپنے کپڑے کو دھوئے۔ یہ شرع میں عبادت کا اسم ہے کہا جاتا ہے رجل ناسك، جب کوئی شخص عابد ہو۔

علماء کا اختلاف ہے کہ المناسك سے کیا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا مناسک حج اور اس کی علامات مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ مجاہد، عطا، ابن جریج نے کہا المناسك سے مراد ذبح کی جگہیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام عبادات ہیں(2) ہر وہ عمل جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اسے منسك اور منسِك کہا جاتا ہے۔ الناسك سے مراد عابد ہے۔ نحاس نے کہا نَسَكَ يَنْسُكُ۔ اس صورت میں منسُك کہنا واجب ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لیکن عرب کلام میں مفعل نہیں ہے۔ زہیر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت الحرام کی بناء سے فارغ ہوئے تو عرض کی: اے رب! میں فارغ ہو چکا ہوں تو ہمیں مناسک دکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جبریل امین کو بھیجا، پس آپ نے جبریل امین کے ساتھ حج کیا حتیٰ کہ جب عرفہ سے لوٹے اور دسویں کا دن آیا تو ابلیس آپ کے سامنے آیا جبریل امین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اسے کنکریاں مارو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں پھر اگلے دن اور تیسرے دن کنکریاں ماریں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام ثبیر پہاڑ پر چڑھے اور کہا: اے اللہ کے بندو، اجیبوا (جواب دو) پس سمندروں کے درمیان جو بھی ایسا شخص موجود تھا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان تھا اس نے آپ کی دعوت کو سن لیا۔ اور اس نے کہا: لبیك اللهم لبیك۔ فرمایا: سطح زمین پر ہمیشہ سات یا اس سے زائد مسلمان ہوں گے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زمین اور اس کے رہنے والے ہلاک ہو جاتے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کا جواب اہل یمن نے دیا۔ ابو مجلز سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور انہیں بیت اللہ کا طواف دکھایا۔ فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے فرمایا: الصفا والمروۃ پھر دونوں جمرہ عقبہ کی طرف چلے سامنے شیطان آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں اٹھائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں، پہلے جبریل امین نے کنکری ماری اور تکبیر کہی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا، کنکری مارو اور تکبیر کہو پس دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر جمرہ وسطیٰ کی طرف چلے۔ شیطان پھر سامنے آیا، جبریل نے سات کنکریاں لیں اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی سات کنکریاں دیں۔ جبریل امین نے کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ حتیٰ کہ شیطان چلا گیا۔ پھر جمرہ قصویٰ پر آئے، شیطان سامنے آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں لیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں اور کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو۔ دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر دونوں مزدلفہ میں آئے اور جبریل امین نے کہا: یہاں لوگ اپنی نمازوں کو جمع کریں گے پھر جبریل امین، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لے کر عرفات میں آئے اور کہا: عرفت (تو نے جان لیا؟) حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو عرفات کہا جاتا ہے۔ روایت ہے، جبریل امین نے تین مرتبہ کہا عرفت، عرفت، عرفت۔ یعنی منی، مزدلفہ اور اس جگہ کو پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس مکان کو عرفات کہا جاتا ہے۔ خصیف بن عبد الرحمن سے مروی ہے کہ مجاہد نے انہیں بتایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا یعنی الصفا والمروۃ۔ یہ نص قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں پھر جبریل امین آپ کو لے کر نکلے جب جمرہ عقبہ سے گزرے تو اس پر شیطان بیٹھا تھا۔ جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا: تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو، ابلیس، جمرہ وسطیٰ پر چڑھ گیا۔ جبریل امین نے کہا تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو پھر جمرہ قصویٰ پر اسی طرح ہوا۔ پھر وہ اسے مشعر حرام کی طرف لے گئے۔ پھر عرفہ میں لے آئے۔ پھر جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا کیا تو نے پہچان لیا جو میں نے تجھے دکھایا؟ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے عرفات کو عرفات کہا جاتا ہے۔ جبریل امین نے کہا: تم لوگوں میں حج کا

اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے کہا: میں کیسے کہوں؟ جبریل امین نے کہا: تم کہو: اے لوگو! اپنے رب کا حکم قبول کرو۔ یہ تین مرتبہ اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے کہا: لبیك اللهم لبیك۔ فرمایا: اس دن جس نے جواب دیا وہ حج کرے گا۔ دوسری روایت میں ہے جب آپ نے آواز دی تو آپ گھومے اور ہر طرف ندا دی۔ مشرق و مغرب ہر طرف سے لوگوں نے لبیک کہا۔ پہاڑ جھک گئے حتیٰ کہ آپ کی آواز دور تک چلی گئی۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن صلوات اللہ علیہ بیت الحرام کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور کہا: اس کے سات چکر لگاؤ۔ حضرت ابراہیم نے اس کے سات چکر لگائے اور حضرت اسماعیل بھی آپ کے ساتھ تھے، ہر طواف میں ہر رکن کا استلام کیا جب سات چکر دونوں نے مکمل کر لئے تو مقام کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ فرمایا: جبریل امین کھڑے ہوئے اور تمام مناسک دکھائے، صفا، مروہ، منیٰ اور مزدلفہ۔ فرمایا: جب منیٰ میں داخل ہوئے اور عقبہ سے اترے تو شیطان سامنے آیا، جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تمام ارکان کا استلام کرتے تھے اور فرمایا: شام سے حضرت اسحاق اور سارہ علیہما السلام نے حج کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال براق پر حج کرتے تھے ان کے بعد انبیاء اور امم نے حج کیا۔ محمد بن سابط نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نبی جب اس کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ میں آجاتا تھا اور یہاں وہ اور اس پر ایمان لانے والے عبادت کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ فوت ہو جاتے تھے۔ مکہ میں حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کا وصال ہوا اور ان کی قبور زمزم اور حطیم کے درمیان ہیں (1)۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی مکہ میں فوت ہوئے تھے ان کی قبور مکہ کی غربی جانب دار الندوہ اور بنی سہم کے درمیان ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسجد میں صرف دو قبریں ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر۔ حضرت اسماعیل کی قبر حطیم میں ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر حجر اسود کے مقابل ہے۔ عبداللہ بن ضمرہ السلولی نے کہا: رکن اور مقام کے درمیان ننانوے انبیاء کی قبور ہیں جو حج کے لئے آئے تھے یہاں دفن ہوئے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ تُبْ عَلَيْنَا** حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اس قول کے معنی میں اختلاف ہے۔ **تُبْ عَلَيْنَا** کہا حالانکہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: انہوں نے اس دعا سے تثبیت اور دوام کو طلب کیا، نہ اس لئے کہ ان کا کوئی گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں: یہ اچھا جواب ہے اور اس سے احسن جواب یہ ہے کہ جب ان دونوں نے مناسک کو جان لیا اور بیت اللہ کو تعمیر کر لیا تو ان دونوں نے ارادہ کیا کہ وہ لوگوں کے لئے بیان کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ جگہ اور دوسرے مناسک حج گناہوں سے طہارت اور توبہ طلب کرنے کی جگہیں ہیں (2)۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم میں سے جو ظالم ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔ عصمت انبیاء پر کلام حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے اور **اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** کے معنی میں بھی کلام گزر چکا ہے پس اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

''اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کردے انہیں۔ بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا، رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں ہے وابعث فی آخرھم رسولاً منھم حضرت خالد بن معدان نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپ سے عرض کی: یارسول اللہ! ہمیں اپنی ذات کے بارے میں بتائیے۔ فرمایا: ہاں میں اپنے باپ ابراہیم کی دعوت ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں (1)۔ اور رسول بمعنی مرسل (بھیجا گیا) ہے یہ رسالت سے مفعول کا وزن ہے۔ ابن انباری نے کہا: ہوسکتا ہے کہ عربوں کے اس قول سے ہو: ناقةٌ مِرسال و رَسْلَةٌ۔ جب اونٹنی آرام سے چلنے والی ہو دوسری اونٹنیوں کے آگے چلنے والی ہو اور مہمل جماعت کے لئے المرسلۃ کہا جاتا ہے۔ رسل کی جمع ارسال ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء القوم ارسالاً۔ یعنی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے آئے، اسی سے دودھ کو رسل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کھیری سے متواتر نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، الْكِتَابَ سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد دین کی معرفت، اور فہم ہے جو تاویل میں سمجھ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصلت اور نور ہے۔ یہ مالک نے کہا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد سنت اور شریعت کا بیان ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حکم اور قضا ہے، سب کا معنی قریب قریب ہے۔ تعلیم کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے کیونکہ آپ وہ تمام امور عطا فرماتے ہیں جن میں غور وفکر کیا جاتا ہے آپ غور وفکر کے طرق کی تعلیم دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعے عطا فرماتا تھا۔ (3)

وَيُزَكِّيهِمْ یعنی شرک کی میل سے انہیں پاک کرتا ہے۔ ابن جریج (4) وغیرہ سے مروی ہے، زکوۃ کا مطلب پاک کرنا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: آیات سے مراد ظاہر الفاظ کی تلاوت ہے، کتاب سے مراد الفاظ کے معانی ہیں اور حکمت سے مراد حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مراد ہے کہ وہ مطلق ہے، مقید ہے، مفسر ہے، مجمل ہے، عموم وخصوص ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الْعَزِيزُ اس کا معنی ہے وہ محفوظ ذات جس کو نہ پایا جاسکتا ہے اور نہ مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کا معنی ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہ کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (فاطر: 44)۔ الکسائی نے کہا: الْعَزِيزُ کا معنی غالب ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وعزّنی فی الخطاب۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ضرب المثل ہے: مَنْ عَزَّبَزَّ یعنی جو غالب آیا اس نے سلب کیا۔ بعض نے فرمایا: اَلْعَزِیْزُ وہ ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو، اس کا بیان ہے: لیس کمثلہ شیٔ۔ ہم نے اس معنی کو اَلْعَزِیْزُ کے اسم کے تحت اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں زیادہ بیان کیا ہے۔ اَلْحَکِیْمُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

”اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں ہوں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، مَنْ استفہامیہ ہے۔ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یرغب، مَنْ کا صلہ ہے اور اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یہ خبر کی جگہ ہے، یہ تقریع اور توبیخ ہے اس میں نفی کا معنی ہے یعنی وہ مایرغب کا معنی ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ یعنی دین اور شرع ابراہیمی سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اس سے پہلے نفس کو دور رکھتا ہے جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنایا۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں انہوں نے ملت ابراہیمی سے اعراض کیا اور یہودیت و نصرانیت خود ایجاد کی وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے (1)۔ زجاج نے کہا: سفه کا معنی ہے اپنے نفس کے امر سے جاہل رہا اور اس میں غور و فکر نہ کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ ثعلب اور مبرد نے حکایت کیا ہے کہ سَفِهَ فاء کے کسرہ کے ساتھ اسی طرح متعدی ہے جس طرح سفه فاء کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ متعدی ہے (2)۔ یعنی اس نے اپنے نفس کے ساتھ ایسا فعل کیا کہ وہ سفیہ بن گیا۔ ان سے مروی ہے، یہ ایک لغت ہے جو بمعنی سفه ہے۔ یہ مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ رہا سَفُهَ فاء کے ضمہ کے ساتھ یہ متعدی نہیں ہوتا۔ یہ مبرد اور ثعلب کا قول ہے۔ کسائی نے اخفش سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: جهل فی نفسه۔ فی کو حذف کیا گیا اور نفسه کو منصوب پڑھا گیا۔

اخفش نے کہا: اس کی مثل عقدة النکاح ہے یعنی علی عقدة النکاح۔ (علی کو حذف کیا گیا) یہ سیبویہ کے مذہب پر جاری ہے اس سے عربوں سے حکایت کیا ہے ضرب فلان الظهر و البطن۔ اصل میں فی الظهر و البطن تھا فی کو حذف کیا گیا (3)۔ فراء نے کہا: نفسه تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ابن بحر نے کہا: اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے نفس سے اور جو اس میں دلالات اور آیات ہیں ان سے غافل رہا جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس نفس کا ایک صانع (بنانے والا) ہے جس کی مثل کوئی نہیں ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کو جان لیتا۔

میں کہتا ہوں: یہ زجاج کے قول کا معنی ہے۔ وہ اپنے نفس میں غور و فکر کرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پکڑتا ہے اور اپنے قدموں سے چلتا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے، زبان سے بولتا ہے، دودھ سے غنی ہونے کے وقت اس کی داڑھیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

پیدا فرمائیں تا کہ وہ اس سے کھانے کو چبائے، معدہ بنایا گیا وہ غذا کو پکانے کے لئے ہے، جگر ہے جس کی طرف اس غذا کو صاف مال جاتا ہے اور اس کی نسیں اور رگیں ہیں جن کے ذریعے مختلف اطراف میں خون پہنچتا ہے۔ انتڑیاں ہیں جن کی طرف غذا کا فضلہ جاتا ہے اور نیچے والے بدن سے نکل جاتا ہے، اس سے انسان استدلال کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق، قادر، علیم اور حکیم ہے۔ یہی معنی ہے اس آیت کا وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات) (تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)۔

اس کی طرف خطابی نے اشارہ کیا ہے اس کا مزید بیان سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے اس نے جس نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہماری شریعت ہے مگر جو اس سے منسوخ ہو گیا یہ اس قول کی مانند ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج: 78)۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (النحل: 123)۔ آپ ابراہیمی ملت کی اتباع کریں۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ہم نے اس کو رسالت کے لئے چن لیا اور ادناس (میل کچیل) سے صاف بنایا۔ اصطفینا اصل میں اصتفینا تھا۔ تاء کو طا سے بدلا تا کہ اطباق میں صاد کے ساتھ مناسبت ہو جائے یہ لفظ الصفوۃ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: جو زیادہ صاف ہو اس کا اختیار کرنا۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، الصالح فی الاخرۃ سے مراد کامیاب ہونے والا ہے۔ پھر یہ سوال کیا گیا ہے کہ فِي الْاٰخِرَةِ کو مقدم کیسے کیا گیا ہے حالانکہ یہ صلہ میں داخل ہے؟ نحاس نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح نہیں ہے: انہ لمن الصالحین فی الآخرۃ کہ صلہ مقدم ہو۔

اہل عرب کے اس کے متعلق تین اقوال ہیں: (۱) یہ کہ اس کا معنی ہے وہ آخرت میں صالح ہے پھر کلام میں حذف کیا گیا۔ بعض نے فرمایا: فی الاخرۃ، مصدر محذوف کے متعلق ہے یعنی صلاحۃ فی الاخرۃ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ الصالحین، الذین صلحوا کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ اسم قائم بنفسہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: الرجل، الغلام۔

میں کہتا ہوں: چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: انہ فی عمل الاخرۃ لمن الصالحین کلام مضاف کے حذف پر ہے (2)۔ حسین بن فضل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ کلام اس طرح ہے: ولقد اصطفینا فی الدنیا و الآخرۃ و انہ لمن الصالحین۔

حجاج بن حجاج نے روایت کیا ہے، یہ حجاج بن الاسود ہے اور وہی حجاج الاحول ہے جو زق العسل (شہد کا مشکیزہ) سے معروف تھا۔ فرمایا: میں نے معاویہ بن قرۃ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا: اللھم ان الصالحین انت اصلحتھم و رزقتھم ان عملوا بطاعتك فرضیت عنھم۔ اللھم کما اصلحتھم فاصلحنا و کما رزقتھم ان عملوا بطاعتك فرضیت عنھم فارزقنا ان نعمل بطاعتك وارض عنا۔ اے اللہ! صالحین کو تو نے صالحیت بخشی تو نے انہیں توفیق بخشی کہ وہ تیری طاعت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

کے اعمال کریں اور تو ان سے راضی ہوا۔ اے اللہ! جس طرح تو نے انہیں صالحیت بخشی ہمیں بھی صالحیت عطا فرما اور جس طرح تو نے انہیں اپنی طاعت کی توفیق بخشی اور تو ان سے راضی ہوا ہمیں بھی اپنی طاعت کی توفیق عطا فرما اور ہم سے راضی ہو۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

''اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم!) گردن جھکا دو۔ عرض کی: میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے''۔

اِذْ کا عامل اصْطَفَیْنٰهُ کا قول ہے۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ستارے، چاند اور سورج سے آزمائش کی (1)۔ ابن کیسان اور کلبی نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ اپنے دین کو خالص کر۔ بعض نے فرمایا: اَسْلِمْ کا معنی ہے خضوع و خشوع کر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت فرمایا جب آپ سرنگ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں اس کا ذکر آئے گا۔ اسلام یہاں تمام وجوہ کے ساتھ ہے۔ کلام عرب میں اسلام کا معنی خضوع اور انقیاد ہے۔ ہر اسلام، ایمان نہیں ہے اور ہر ایمان، اسلام ہے کیونکہ جو اللہ پر ایمان لایا اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے سر جھکا دیا اور اس کی اطاعت کی۔ اور ہر اسلام لانے والا ایمان لانے والا نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا ہو اور یہ ایمان نہیں ہوگا۔ قدریہ اور خوارج کا قول اس کے خلاف ہے (☆)۔ انہوں نے کہا: اسلام ہی ایمان ہے۔ ہر مومن، مسلم ہے اور ہر مسلم، مومن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:19) یہ دلیل ہے کہ اسلام، دین ہے اور جو مسلمان نہیں وہ مومن نہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا (الحجرات:14) اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمائیے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں بیان فرمایا کہ ہر مسلمان، مومن نہیں پس یہ دلیل ہے کہ ہر مسلمان، مومن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا: جب انہوں نے عرض کی تھی: حضور! فلاں کو عطا فرمائیں وہ مومن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا بلکہ تم کہو مسلم ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ایمان اسلام نہیں ہے کیونکہ ایمان باطنی چیز ہے اور اسلام ظاہر ہے۔ یہ واضح ہے کہ کبھی ایمان، اسلام کے معنی میں ہوتا۔ اسلام بولا جاتا ہے اور مراد ایمان ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کو لازم ہے۔ جیسے اسلام جو ایمان کا ثمرہ، اور ایمان کی صحت پر دلیل ہے (یہی نقطہ نظر ماترید یہ کا ہے)۔

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆۔ یہ قول قابل توجہ ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے نزدیک اعمال ایمان کا جز ہیں اس لیے وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج کرتے ہیں۔ جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے لغوی اعتبار سے تو فرق ہے لیکن کسی کے لیے ایک کا ثبوت اور دوسرے کی نفی کرنا ممکن نہیں اہلسنت میں سے یہ ماترید یہ کی رائے ہے مفسر کا اس کی تعبیر کرنا درست نہیں۔

اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ، ھا ضمیر سے مراد ملت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ کلمہ ہے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ یہ زیادہ درست ہے کیونکہ یہ قریب مذکور ہے (1) یعنی تم اسلمنا کہو۔ وَ وَصّٰى اور اوصی دونوں ہم معنی قریش کی لغتیں ہیں۔ مثلاً کرمنا اور اکرمنا۔ اوصی اور وصی دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ کے مصحف میں وصّی تھا اور حضرت عثمان کے مصحف میں اوصٰی تھا۔ یہ اہل مدینہ، شام اور دوسرے قراء کی قراءت ہے۔ وصّی اس میں کثرت کا معنی ہے (2)۔ لفظ ابراہیم کو اس کے فعل کی وجہ سے رفع دیا ہے اور یعقوب، ابراہیم پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ علیحدہ کلام ہے اس کا معنی ہے: واوصی یعقوب۔ (3) مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

حضرت ابراہیم کے بیٹے، ایک حضرت اسماعیل تھے۔ ان کی والدہ ہاجرہ قبطیہ تھی یہ آپ کے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انہیں مکہ کی طرف منتقل کیا تھا جبکہ یہ ماں کا دودھ پیتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس وقت ان کی عمر دو سال تھی۔ بعض نے فرمایا: چودہ سال تھی۔ پہلا قول اصح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ حضرت اسماعیل اپنے بھائی اسحاق سے چودہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور ان کا وصال ہوا تو ان کی عمر ایک سو ستر سال تھی۔ بعض نے فرمایا: ایک سو تیس سال تھی اور جب آپ کے والد حضرت ابراہیم کا وصال ہوا تو ان کی عمر ۸۹ سال تھی۔ ایک قول کے مطابق حضرت اسماعیل ذبیح تھے۔ یہ اصح قول ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کی اولاد سے روم، یونان، ارمن اور جو ان کے پیچھے آئے اور بنی اسرائیل تھے۔ حضرت اسحاق ایک سو اسی سال زندہ رہے، ارض مقدسہ میں ان کا وصال ہوا اور اپنے باپ حضرت ابراہیم کے پاس دفن کئے گئے پھر جب حضرت سارہ کا وصال ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قنطورا بنت یقطن کنعانیہ سے نکاح کیا اس سے آپ کی یہ اولاد ہوئی۔ مدین، مدائن، نہشان، زمران، نشیق، شبوخ۔ پھر آپ کا وصال ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان دو ہزار چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ یہود اس سے چار سو سال کم کرتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا ذکر سورۂ یوسف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمرو بن فائد اسواری اور اسماعیل بن عبداللہ مکی نے یعقوب، بنیہ پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے (4)۔ اس صورت میں جن کو وصیت کی گئی ان میں حضرت یعقوب بھی داخل ہوں گے (5)۔ قشیری نے کہا: یعقوب پر بنیہ پر عطف کی بناء پر نصب پڑھی گئی ہے اور یہ بعید ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی تو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی اولاد کے درمیان موجود نہ تھے۔ یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کو پایا تھا۔ وہ حضرت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

ابراہیم کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی۔ حضرت یعقوب کی اولاد کے اسماء ان شاء اللہ آئندہ آئیں گے۔

کلبی نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ بتوں کی، آگ کی اور گائے کی عبادت کرتے ہیں آپ نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان پر آپ کو اندیشہ ہوا۔ فرمایا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔

کہا جاتا ہے: یعقوب کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے بھائی عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے اور آپ اپنے بھائی عیص کی عقب (ایڑھی) کو پکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس قول میں نظر ہے کیونکہ یہ عربی اشتقاق ہے اور یعقوب عجمی اسم ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نام رکھنے میں عربی میں موافقت ہے جیسے حجل پرندے کا جو مذکر ہوتا ہے اسے یعقوب کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو سینتالیس سال زندہ رہے تھے اور مصر میں آپ کا وصال ہوا تھا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ارض مقدسہ کی طرف لے جایا جائے اور ان کے باپ حضرت اسحٰق کے قریب دفن کیا جائے، تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کو ادھر لے گئے تھے اور ان کے والد حضرت اسحٰق کے پہلو میں انہیں دفن کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰبَنِیَّ اس کا معنی ہے ان یا بنی، اسی طرح حضرت ابی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ضحاک کی قراءت میں ہے (1)۔ فراء نے کہا اَنْ کو لغو کیا گیا ہے کیونکہ توصیۃ قول کی طرح ہے ہر کلام جو قول کے معنی کی طرف راجع ہو، اس میں ان کا دخول جائز ہوتا ہے اور اس کا لغو کرنا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: نحویوں کا قول کہ (اَنْ) کا ارادہ فرمایا اور ان کو لغو کیا گیا یہ کچھ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا: یٰبَنِیَّ نداء مضاف ہے۔ یہ یاء النفس ہے اس پر فتحہ ہی جائز ہے کیونکہ اگر اس کو ساکن کیا جائے تو دو ساکنوں کا جمع ہونا لازم آئے گا۔ اس کی مثال بمصرخی ہے اِنَّ اللّٰہَ میں اِنّ کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ اوصی اور قال ایک معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: قول کے اضمار کی وجہ سے اِنّ پر کسرہ پڑھا گیا ہے۔ اصْطَفٰی کا معنی اختار ہے۔ راجز نے کہا:

یا بن ملوك ورثوا الاملاكا خلافة الله التی اعطاك
لك اصطفاها ولها اصطفاك

اے بادشاہوں کے بیٹے اور انہوں نے تجھے املاک کا وارث بنایا۔ اللہ کی خلافت وہ ہے جو تجھے عطا کی۔ تیرے لئے اس کو اس نے چنا ہے اور اس کے لئے تجھے اس نے چنا ہے۔

لَكُمُ الدِّيْنَ، الدِّيْنَ سے مراد اسلام ہے۔ الدِّيْنَ پر الف، لام عہد کے لئے ہے کیونکہ وہ اس دین کو جانتے تھے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اس میں ایجاز بلیغ ہے۔ اس کا معنی ہے اسلام کو لازم پکڑو اور اس پر دوام اختیار کرو اور اس سے جدا نہ ہو حتیٰ کہ تم فوت ہو جاؤ مختصر الفاظ ذکر فرمائے جن کے ضمن میں مقصود موجود ہو اور وعظ اور موت کی یاد بھی اس کے ضمن میں ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر انسان کو یہ تو یقین ہے کہ وہ فوت ہوگا اور یہ نہیں جانتا کہ کب مرے گا۔ جب کسی کو کسی ایسے امر کا حکم دیا جائے کہ اسے موت نہ آئے مگر اسی امر پر تو خطاب امر کے وقت سے ہمیشہ کے لئے متوجہ ہوتا ہے (2)۔ لا نہی ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 213، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تَمُوْتُنَّ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ مبتدا اور خبر محل حال میں ہیں یعنی تم اپنے رب پر اچھا گمان کرنے والے ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: مخلصون (یعنی تم مخلص ہو)۔ بعض نے فرمایا: مفوضون (تم اپنا آپ اپنے رب کے سپرد کرنے والے ہو) بعض نے فرمایا: مومنون (تم ایمان لانے والے ہو)۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

''بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آپہنچی یعقوب کو موت۔ جب پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد۔ انہوں نے عرض کی: ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگ ابراہیم و اسماعیل اور اسحق کے خدا کی جو خدائے وحدہ لاشریک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ، شُهَدَآءَ، کان کی خبر ہے غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے اور یہ الف جمع کی تانیث کے لئے داخل ہوتی ہے جس طرح ھا داخل ہوتی ہے۔ خطاب، یہود و نصاریٰ کو ہے جو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت نہیں کی تھی اور وہ یہودیت اور نصرانیت پر تھے۔ الله تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا۔ یہ ارشاد توبیخ کی جہت سے ہے: تم یعقوب کے پاس موجود تھے اور جو انہوں نے وصیت کی تھی تمہیں اس کا علم تھا جس کی بنا پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو۔ یعنی تم اس وقت موجود نہ تھے بلکہ تم یہ جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ اور ام بمعنی بل ہے۔ یعنی بلکہ کیا تمہارے اسلاف یعقوب کے پاس موجود تھے۔ پہلے اِذْ کا عامل شہادت کا معنی ہے اور دوسرا اِذْ پہلے کا بدل ہے شُهَدَآءَ، شاھد کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہے حاضر اور حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ کا معنی ہے حضرت یعقوب پر موت کے مقدمات اور اسباب موجود تھے وگرنہ آگے موت آجاتی تو اس کے لئے یہ کہنا ممکن نہ ہوتا۔ المعبود کو ما کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مَنْ نہیں فرمایا کیونکہ انہیں آزمانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر مَنْ فرماتے تو اس کا مقصود یہ ہوتا کہ آپ ان میں ہدایت یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصود ان کا تجربہ تھا آپ نے ما ذکر فرمایا الله تعالیٰ کے علاوہ متعارف معبودان باطلہ جمادات تھے جیسے بت، آگ، سورج، اور پتھر پس آپ نے پوچھا کہ کس کی عبادت کرو گے؟ اور مِنْۢ بَعْدِيْ کا معنی ہے میرے وصال کے بعد۔ حکایت کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اختیار دیا گیا جس طرح انبیاء کو اختیار دیا جاتا ہے تو آپ نے موت کو اختیار فرمایا اور فرمایا: مجھے مہلت دو حتیٰ کہ میں اپنے بیٹوں اور اپنے گھر والوں کو وصیت کروں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو جمع فرمایا اور انہیں یہ فرمایا۔ پس وہ ہدایت یافتہ تھے انہوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ الآیۃ اور بیٹوں نے دین پر اپنے ثبوت اور الله تعالیٰ کی معرفت دکھائی (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ، ابرہیم، اسماعیل اور اسحاق یہ بدل کی حیثیت سے محل جر میں ہیں یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی ہیں۔ کسائی نے کہا: اگر تو چاہے تو اسحاق کو منصرف بنادے اور تو اسے السحق سے مشتق کرے اور یعقوب کو منصرف کرے اور تو اسے پرندوں سے بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے چچا اور دادا تمام کو اباء سے تعبیر فرمایا اور دادا کا ذکر پہلے فرمایا پھر اسماعیل چچا کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ اسحاق سے بڑے تھے۔ اِلٰهًا یہ الهك سے بدل ہے اور یہ معرفہ سے نکرہ بدل ہے اس کو وحدانیت کی صفت کے فائدہ کے لئے اس کا تکرار فرمایا، بعض نے فرمایا اِلٰهًا حال ہے۔ ابن عطیہ نے کہا یہ حسن کا قول ہے کیونکہ غرض وحدانیت کی حالت کا اثبات ہے۔ حسن یعمر جحدری اور ابورجاء عطاردی نے واله ابیك پڑھا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

(۱) مفرد ذکر کیا اور مراد صرف حضرت ابراہیم لئے اور اسماعیل کو اب بنانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ چچا تھے۔ نحاس نے کہا: یہ واجب نہیں ہے کیونکہ عرب چچا کو اب کہتے ہیں۔

(۲) سیبویہ کے مذہب کے مطابق ابیك جمع سالم ہوگی۔ سیبویہ نے اب کی جمع ابون اور ابین حکایت کی ہے۔ شاعر نے کہا:

فقلنا اسلموا انا اخوکم

اس میں اصل اخون تھا اضافت کی وجہ سے نون گر گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا

فلما تبین اصواتنا بکین و فدیننا بالابینا (1)

اس میں ابین، اَب کی جمع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور یہ حال ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس میں عامل نعبد ہے (2)۔

## تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

''یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، تِلْكَ مبتدا ہے اور اُمَّةٌ خبر ہے اور قَدْ خَلَتْ، اُمَّةٌ کی صفت ہے اگر تو چاہے تو قَدْ خَلَتْ کو خبر بنادے اور اُمَّةٌ، تِلْكَ سے بدل ہوگا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ، مَا محل رفع میں ہے یا کوفیوں کے ایک قول کے مطابق صفت ہے وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ یہ لَهَا مَا كَسَبَتْ کی مثل ہے۔ خیر اور شر کا ارادہ فرمایا ہے (3)۔ اس میں دلیل

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے کہ اعمال اور اکساب کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسے قدرت دی ہے اگر وہ اچھے اعمال پر اچھی جزا دے تو یہ اس کا فضل ہوتا ہے اور برے اعمال پر سزا دے تو یہ اس کا عدل ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے قرآن میں اس مفہوم کی آیات کثیر ہیں۔ بندہ اپنے افعال کا مکتسب ہے اس معنی پر کہ فعل کے متصل اللہ تعالیٰ اس کے لئے قدرت پیدا فرما دیتا ہے اس کے ساتھ حرکت اختیاری اور حرکت رعشہ کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ یہی قدرت اور تکلیف کا مدار ہے۔ جبریہ فرقہ نے بندے کے اکتساب کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں: بندہ نبات کی طرح ہے ہوائیں اسے گردش دیتی رہتی ہیں قدریہ اور معتزلہ کا قول ان دونوں قولوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اپنے افعال کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ یعنی کسی کے گناہ کی وجہ سے دوسرے سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام: 164) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔

**وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۳۵**

”اور (یہودی) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے۔ آپ فرمائیے میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ہر فرقہ نے اس کی طرف بلایا جس پر وہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا، فرمایا: بَلْ مِلَّةَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کہو ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے اسی وجہ سے مِلَّةَ کو نصب دی گئی ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے بل نهتدی بملة ابراهیم جب حرف جر حذف کیا گیا تو مِلَّةَ منصوب ہو گیا اعرج اور ابن ابی عبلہ نے بل ملةُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ تقدیر عبارت بل الهدی ملة یا ملتنا دین ابراهیم۔ (یعنی ہدایت تو ملت ابراہیمی ہے یا ہماری ملت دین ابراہیم ہے) حَنِیْفًا تمام ناپسندیدہ دینوں سے انحراف کر کے دین حق، دین ابراہیم کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: یعنی بل نتبع ملة ابراهيم فی هذه الحالةِ یعنی اس حال میں ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ اعنی کی بنا پر منصوب ہے اور حال بنانا خطا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے: جاء نی غلام هند مسرعة۔ حضرت ابراہیم کو حنیف کہا گیا کیونکہ وہ اللہ کے دین اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الحنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اسی سے ہے رجلٌ حنفاء، رجل احنف۔ یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے قدموں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف انگلیوں کے ذریعے مائل ہوتا ہے۔

ام الاحنف نے کہا:

واللہ لولا حنفٌ برجله ما کان فی فتیانکم من مثله

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ کی قسم! اگر اس کے پاؤں میں میلان نہ ہوتا تو تمہارے بچوں میں اس کی مثل نہ ہوتا۔

شاعر نے کہا:

اذا حول الظل العشی رأیتہٗ حنیفا و فی قرن الضحی یتنصرُ

الحرباء سورج ڈھلنے کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرتی ہے اور صبح کے وقت مشرق کی طرف منہ کرتی ہے۔ یہ نصاریٰ کا قبلہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الحنف کا معنی استقامت ہے۔ دین ابراہیم کو اس کی استقامت کی وجہ سے حنیف کہا جاتا ہے۔ ٹیڑھی ٹانگوں والے کو استقامت سے فال پکڑتے ہوئے احنف کہا جاتا ہے جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم کہا جاتا ہے اور ہلاکت کی جگہ کو مفازۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَاۤ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ‌ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۞

”کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحٰق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لئے عربی میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو نازل کیا گیا (1)۔ محمد بن سیرین نے کہا: جب تجھے کہا جائے تو مومن ہے؟ تو تو کہہ: **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ** الآیہ۔

اکثر سلف نے کسی کے لئے یہ کہنا ناپسند کیا: انا مؤمن حقاً میں یقیناً مومن ہوں (2)۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ متقدمین میں سے کسی سے پوچھا گیا: کسی شخص سے پوچھا جائے کیا تو فلاں نبی پر ایمان لاتا ہے، اس نے اس نبی کا نام لیا جسے وہ شخص جانتا نہیں تھا۔ اب اگر وہ ہاں کہہ دے ہوسکتا ہے وہ نبی نہ ہو، تو وہ غیر نبی کی نبوت کی شہادت دینے والا ہوگا اور اگر وہ نہیں کہہ دے تو ہوسکتا ہے وہ نبی ہو تو وہ ایک نبی کا انکار کرنے والا ہوگا۔ اب وہ شخص کیا کرے؟ اس عالم نے فرمایا: اسے یوں کہنا چاہئے کہ اگر وہ نبی تھا تو میں اس پر ایمان لایا۔ اس آیت میں خطاب اس امت کو ہے جنہیں ایمان سکھایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کا ایک گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا کہ انبیاء میں سے کس پر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ قولوا امنا باللہ، حدیث 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ یہ قول محل نظر ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں ہے جب بندے سے تصدیق اور اقرار پایا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا صحیح ہے انا مؤمن حقا

ایمان لایا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا ہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اور جو اس پر ایمان لایا اس پر ایمان نہیں لاتے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ، ابراهیم کی جمع براهیم ہے۔ اسماعیل کی جمع ساعیل ہے۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ کوفیوں نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے براهمه اور ساعلة جمع بھی حکایت کی ہے اور انہوں نے براہم اور سماعل بھی حکایت کیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ زیادت کی جگہ نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں: اباره اور اسامع جمع ہے اور اباریه و اسامیع جمع بھی جائز ہے۔ احمد بن یحییٰ نے براہ کو جائز قرار دیا ہے جیسے تصغیر میں کہا جاتا ہے بُریہ۔ اسحاق کی جمع اساحیق ہے۔ کوفیوں نے اساحقه اور اساحق حکایت کیا ہے۔ اسی طرح یعقوب کی جمع یعاقیب و یعاقبه و یعاقب حکایت کی ہے۔ نحاس نے کہا: رہا اسرائیل۔ ہم کوئی ایسا عالم نہیں جانتے جس نے اس کی ابتدا سے ہمزہ حذف کیا ہو۔ کہا جاتا ہے اساریل۔ کوفیوں نے اسارله اور اسارل حکایت کیا ہے ان تمام میں جمع سالم بنائی جائے اور کہا جائے: ابراهیمون، اسحاقون، یعقوبون اور جمع سالم میں عمل نہیں ہے۔

الْاَسْبَاطِ سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، آپ کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ہر ایک کی بہت سی اولاد تھی، اس میں سے ہر ایک سبط تھا۔ بنی اسرائیل میں سبط حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے قبیلہ کے قائم مقام تھا ان کو الْاَسْبَاطِ کہا جاتا تھا۔ یہ سبط سے ہے جس کا معنی ہے در پے ہونا وہ جماعت جو ایک دوسرے کی متابعت کرے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل السَبَط سے ہے۔ اس سے مراد درخت ہے یعنی وہ کثرت میں درخت کے قائم مقام تھے۔ اس کا مفرد سبطۃ ہے۔ ابو اسحق زجاج نے کہا: تیرے اس چیز کو یہ سند بیان کرتی ہو، جو ہمیں محمد بن جعفر انباری نے بیان کی، فرمایا: ہمیں ابونجید الدقاق نے بیان کی فرمایا: ہمیں اسود بن عامر نے بیان کیا۔ فرمایا: ہمیں اسرائیل نے بیان کیا انہوں نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا، فرمایا: تمام انبیاء بنی اسرائیل سے تھے سوائے دس کے۔ حضرت نوح، حضرت شعیب، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کسی کے دو نام نہ تھے سوائے حضرت عیسیٰ اور حضرت یعقوب کے۔ السبط کا مطلب جماعت اور قبیلہ ہے۔ ایک اصل کی طرف لوٹنے والے۔ شعر سَبْطٌ و سبطٌ۔ سیدھے بال جو گھنگھریالے نہ ہوں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم بعض پر ایمان نہیں لاتے اور نہ بعض کا انکار کرتے ہیں جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 657، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

''تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب تو ہدایت پائیں گے اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلے میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا یہ خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے۔ اس کا معنی ہے: اگر وہ ایمان لائیں تمہارے ایمان کی مثل اور تصدیق کریں تمہاری تصدیق کی طرح تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ دونوں ایمانوں کے درمیان مماثلت ہے۔ بعض نے فرمایا: باء زائدہ مؤکدہ ہے۔ ابن عباس اس طرح پڑھتے تھے جس طرح طبری نے حکایت کیا ہے۔ فان آمنوا بالذی آمنتم به فقد اهتدوا۔ یہ قراءت کا معنی ہے اگرچہ مصحف کے مخالف ہے۔ مثل کا لفظ زائدہ ہے جیسے اس قول میں ہے: لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) (یعنی لیس کھو شیٔ) میں مثل زائدہ ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

فصیروا مثل کعصف ماکول

اس مصرعہ میں بھی مثل زائدہ ہے۔

بقیہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے ابوحمزہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم یہ نہ کہو: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں ہے بلکہ تم کہو: بالذی آمنتم بہ (2)۔ علی بن نصر جہضمی نے شعبہ سے روایت کرنے میں بقیہ کی متابعت کی ہے۔ یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے: اگر وہ تمہارے نبی پر اور تمام انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں جس طرح تم نے تفریق نہیں کی تو وہ ہدایت پا جائیں گے اگر وہ اس کا انکار کریں سوائے تفریق کے وہ دین سے منہ پھیر کر شقاق کی طرف جانے والے ہیں فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) میں کاف زائدہ ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس سے جو قراءت عامہ سے نہی مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حضرت ابن عباس سے تفسیر کے طور پر ہے یعنی اس طرح تاویل کرنی چاہئے۔

بعض نے فرمایا: مثل اپنے معنی پر ہے یعنی نازل شدہ کی مثل اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: و قل آمنت بما انزل الله من کتاب اور یہ ارشاد ہے: وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ (العنکبوت: 46) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ ایمان سے اعراض کریں فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ (وہ مخالفت پر کمربستہ ہیں) زید بن اسلم نے فرمایا شقاق کا معنی جھگڑا ہے۔ بعض نے فرمایا: شقاق کا معنی جھگڑا کرنا ہے، مخالفت کرنا اور دشمنی کرنا ہے۔ اس کی اصل الشق سے ہے جس کا معنی جانب ہے۔ گویا ہر فریق اپنے مخالف کی دوسری شق (طرف) میں ہوتا ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 163، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ تفسیر طبری، صفحہ 659، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الی کم تقتل العلماء قسراً و تفجر بالشقاق و بالنفاق

ایک اور شاعر نے کہا:

و الا فاعلموا انا وانتم بغاۃ ما بقینا فی شقاق

بعض نے فرمایا: شقاق، مشکل کام سے ماخوذ ہے، دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے پر مشکل پیدا کرنے کا حریص ہوتا ہے۔(1)

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ یعنی الله تعالیٰ اپنے رسول کی طرف سے اس کے دشمن کو کافی ہے۔ یہ الله تعالیٰ کا اپنے نبی سے وعدہ ہے کہ وہ ہر معاند و مخالف کی طرف سے مومنین کے ذریعے کفایت کرے گا۔ الله تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ یہ بنی قینقاع، بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی میں پورا ہوا(2)۔ کاف، ہا، میم محل نصب میں، دونوں مفعول ہیں، اور غیر قرآن میں فسیکفیك ایاهم بھی جائز ہے۔ اس حرف فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا تھا جب وہ شہید ہوئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی خبر دی تھی۔ السَّمِيعُ وہ کہنے والے کی بات کو سننے والا ہے الْعَلِيمُ اپنے بندوں میں جو نافذ کرتا ہے اور ان پر جاری کرتا ہے، حکایت ہے کہ ابودلامہ، منصور کے پاس گیا، اس کے اوپر ایک لمبی ٹوپی تھی اور ان کے کندھوں کے درمیان جبہ کے اوپر فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ لکھا ہوا تھا اور اس کی کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ منصور نے لشکر کو اس لباس کا حکم دیا تھا۔ منصور نے کہا: اے ابودلامہ تیرا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا اے امیر المومنین! بری حالت ہے۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ اس نے کہا: تیرا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کا چہرہ اس کے وسط میں ہو، جس کی تلوار اس کی سرین میں ہو اور کتاب الله کو پیٹھ کے پیچھے ڈالا ہوا ہو...... منصور اس پر ہنسا اور اس لباس کو اسی وقت تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''(ہم پر) الله کا رنگ (چڑھا ہے) اور کس کا رنگ خوبصورت ہے الله کے رنگ سے۔ ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ اخفش وغیرہ نے کہا: اس سے مراد الله کا دین ہے یہ ملۃ سے بدل ہے۔ کسائی نے کہا: یہ اتبعوا کی تقدیر پر منصوب ہے یا اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی الزموا صبغۃ الله۔ الله کے دین کو لازم پکڑو۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تب بھی جائز ہے۔ یعنی ھی صبغۃ الله۔ شیبان نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: یہود اپنے بیٹوں کو یہودا رنگ کرتے تھے اور نصاریٰ اپنے بیٹوں کو نصاریٰ رنگ چڑھاتے تھے۔ اور الله کا رنگ اسلام ہے(3)۔ زجاج نے کہا: یہ دلیل ہے کہ صبغۃ، ملۃ سے بدل ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری، صفحہ 660، جلد 1 (داراحیاء التراث العربی)

مجاہد نے کہا: اس سے مراد فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ ابواسحق نے کہا: مجاہد کا یہ قول اسلام کی طرف راجع ہے کیونکہ فطرۃ، مخلوق کی ابتدا ہے، اور جس پر وہ ابتداً پیدا کئے گئے ہیں وہ اسلام ہے۔ مجاہد، حسن، ابوالعالیہ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الصبغۃ سے مراد دین ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ نصاریٰ اپنے بچوں کو پانی میں رنگتے تھے اسے وہ معمور یہ کہتے تھے اور کہتے: یہ ان کے لئے تطہیر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نصاریٰ کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا اور اس پر سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں داخل کرتے جسے وہ اس کے لئے معمودیہ کا پانی کہتے تھے وہ اس پانی میں بچے کو رنگتے تاکہ اس کے ساتھ اس کے ختنہ کی جگہ کو پاک کریں کیونکہ ختنہ کرنا تطہیر ہے۔ جب وہ ایسا کر دیتے تو کہتے اب یہ پکا نصرانی ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس پر رد فرمایا۔

ارشاد ہوا: صِبْغَةَ اللّٰهِ یعنی اللہ کا رنگ بہتر رنگ ہے اور وہ اسلام ہے۔ دین کو استعارۃً اور مجازاً صبغۃ کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور دیندار پر اس کی نشانی واضح ہوتی ہے جس طرح کپڑے پر رنگ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض شعراء ملوک ہمدان نے کہا:

و کل أناس لهم صبغة و صبغة همدان خير الصبغ

صبغنا على ذاك ابناءنا فاكرم بصبغتنا فى الصبغ

تمام لوگوں کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے اور ہمدان کا رنگ بہتر رنگ ہے۔ ہم نے اس پر اپنے بیٹوں کو رنگ کیا اور رنگوں میں کتنا بہتر ہمارا رنگ ہے۔

بعض نے فرمایا: الصبغۃ سے مراد غسل کرنا ہے اس کے لئے جو اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ نصاریٰ کے معمودیہ کا یہ بدل ہے۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر کافر کا غسل کرنا واجب ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2:** صِبْغَةَ اللّٰهِ کا معنی ہے: تم اسلام قبول کرنے کے وقت وہ غسل کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر واجب کیا ہے۔ اس معنی میں قیس بن عاصم اور ثمامہ بن آثال کی احادیث بھی آئی ہیں جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ابوحاتم بستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ ثمامہ حنفی کو قید کیا گیا تو نبی کریم ﷺ ایک دن اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اسلام قبول کیا۔ اسے رسول اللہ ﷺ نے ابوطلحہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے ساتھی کا اسلام خوبصورت ہے (1)۔

حضرت قیس بن عاصم سے مروی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی کریم ﷺ نے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا (2)۔ یہ حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور ابومحمد عبدالحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کی قربت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارت، باب الکافر فیغتسل، صفحہ 171، جلد 1 (دارالفکر)

2۔ سنن نسائی، کتاب الطہارت، ذکر ما یوجب الغسل وما لا یوجبہ، حدیث نمبر 188، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو صبغہ کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ''المجمل'' میں یہ حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ بعض نے فرمایا: صبغة سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو ختنہ پر صبغہ جاری ہوا کیونکہ بچوں کو پانی میں رنگا جاتا تھا۔ یہ فراء کا قول ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

''آپ فرمائیے کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک، اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں''۔

حسن نے کہا: ان کا جھگڑنا یہ تھا کہ انہوں نے کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں کیونکہ ہمارے آباء اور ہماری کتب مقدم ہیں۔ اور اس لئے کہ ہم نے بتوں کی عبادت نہیں کی۔ آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہو: یعنی ان یہود و نصاریٰ کو کہو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تم سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریبی ہیں اپنے آباء اور اپنی کتب کے مقدم ہونے کی وجہ سے، اس میں دین کی تقدیم کی کیا تاثیر ہے(1)۔ فِي اللّٰهِ کا معنی ہے: اللہ کے دین میں، اس کے قرب میں۔

اکثر قراء کی قراءت اتحاجوننا ہے ایک جنس کے دو متحرک حروف کا اجتماع جائز ہے۔ کیونکہ دوسرا حرف منفصل کی طرح ہے۔ ابن محیصن نے اتحاجونا ایک جیسے حروف کے اجتماع کو ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے لیکن اکثر علماء کے قول کے مخالف ہے۔ اتحاجون دوسرے نون کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے جس طرح نافع نے فبم تبشرون پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یعنی عبادت میں مخلص ہیں۔ اس میں توبیخ کا معنی ہے یعنی تم مخلص نہیں ہو پھر تم کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں۔ اخلاص کا معنی ہے مخلوق کے ملاحظہ سے فعل کو پاک اور صاف کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں بہتر شریک ہوں۔ پس جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا (کسی عمل میں) تو وہ عمل میرے شریک کے لئے ہے۔ اے لوگو! اپنے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر وہ جو اس کے لئے خالص ہو، اور یہ نہ کہو کہ یہ اللہ کے لئے ہے اور رحم کے لئے ہے۔ پس وہ رحم (صلہ رحمی) کے لئے ہے اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے اور یہ نہ کہو: یہ اللہ کے لئے اور تمہارے مونہوں کے لئے ہے۔ وہ تمہارے مونہوں کے لئے ہے، اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے(2)۔ یہ حضرت ضحاک بن قیس الفہری نے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... آگے یہ حدیث ذکر کی ہے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ رویم نے کہا: اخلاص یہ ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 216، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ سنن دارقطنی، باب النیہ، صفحہ 51، جلد 1 (دار المحاسن)

کہ آدمی اس عمل پر دارین میں عوض نہ چاہتا ہو نہ فرشتوں سے کوئی حصہ چاہتا ہو۔

جنید نے کہا: اخلاص بندے اور اللہ کے درمیان راز ہے جسے فرشتہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اسے لکھ لے...... اور نہ شیطان جانتا ہے کہ وہ اسے خراب کر دے۔ اور نہ خواہش جانتی ہے کہ وہ اسے مائل کر دے۔ ابوالقاسم قشیری وغیرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے جبریل امین سے پوچھا: اخلاص کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اللہ رب العزت سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے میں اسے اپنے بندوں میں سے اس کے دل میں رکھتا ہوں جسے میں پسند کرتا ہوں (1)۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

”کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی۔ فرمایئے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تَقُوْلُوْنَ یہ بمعنی قالوا ہے۔ حمزہ، کسائی اور عاصم نے اور ایک روایت میں حفص نے تقولون تاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ کلام مفصل ہے۔ گویا معنی ہے: کیا تم اللہ کے دین کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو یا تم کہتے ہو انبیاء کرام تمہارے دین پر تھے۔ یہ ام متصلہ ہے اور جنہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی قراءت پر ام منقطعہ ہے، پس یہ دو کلام ہوں گے۔ اور ام بمعنی بل ہوگا۔

هُوْدًا یہ کان کی خبر ہے اور ان کی خبر جملہ میں ہے اور غیر قرآن میں هُوْدًا کو رفع اِن کی خبر کی حیثیت سے جائز ہے اور کان ملغہ ہوگا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ یہ تقریر اور ان کے دعویٰ پر توبیخ ہے کیونکہ وہ یہود یا نصاریٰ تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ انہیں تم سے زیادہ جانتا ہے یعنی تم یہود و نصاریٰ نہ تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ یہ لفظاً استفہام ہے اور معنی ہے زیادہ ظالم نہیں ہے۔ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً مطلب یہ ہے کہ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کرام اسلام پر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت سے چھپایا تھا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

سیاق کلام کے اعتبار سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یہ وعید ہے اور آگاہ کرنا ہے کہ اس

1۔ اتحاف السادۃ المتقین، صفحہ 104، جلد 13 (دار الکتب العلمیہ)

کا معاملہ اللہ تعالیٰ رائیگاں نہیں چھوڑے گا بلکہ انہیں ان کے اعمال پر جزا دے گا۔ غافل وہ ہوتا ہے جو امور کو جانتا نہیں ہے ان سے غفلت کی وجہ سے۔ یہ الارض الغفل سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ زمین ہوتی ہے جس میں کوئی علامت نہیں ہوتی اور عمارت کا کوئی اثر نہیں ہوتا (1)۔ ناقۃ غفل ایسی اونٹنی جس کی علامت نہ ہو۔ رجل غفل جو امور کا تجربہ نہ رکھتا ہو۔ کسائی نے کہا: ارض غفل، جس پر بارش نہ ہو۔ غفلت عن الشیٔ غفلۃ و غفولاً و اغفلت الشیٔ۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس آیت کو دوبارہ ذکر فرمایا کیونکہ یہ تہدید و تخویف کا معنی ضمن میں لیے ہوئے ہے یعنی جب یہ انبیاء اپنی امامت اور فضل کے باوجود اپنے کسب کی جزا پائیں گے تو تم اس کے زیادہ لائق ہو۔ پس تاکید واجب تھی اس لیے اس کا تکرار فرمایا (2)۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ فرمائیے: اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف''۔

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ مومنین کے شام سے کعبہ کی طرف پھرنے میں وہ کہیں گے کہ انہیں کس چیز نے پھیرا ہے (3)۔ اور سَيَقُوْلُ بمعنی قال ہے اور ماضی کی جگہ مضارع کو رکھا تاکہ اس کی ہمیشگی پر دلالت کرے اور وہ اس قول پر ہمیشہ رہیں گے۔ مِنَ النَّاسِ کے قول کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بے وقوف جمادات و حیوانات میں بھی ہوتے ہیں اور السُّفَهَآءُ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے ما ولاھم کہا۔ السُّفَهَآءُ جمع ہے اس کا واحد سفیہ ہے جس کی عقل کم ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے ثوبٌ سفیہ جب کپڑا کمزور بنا ہوا ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور النساء سفانہ استعمال ہوتا ہے۔ المورج نے کہا: السفیہ وہ ہوتا ہے جو بہت زیادہ بہتان لگانے والا ہو، جھوٹ بولنے والا ہو اور اپنے علم کے خلاف کا ارادہ کرنے والا ہو۔ قطرب نے کہا: السفیہ سے مراد بہت زیادہ ظلم کرنے والا، جاہل ہے۔ السُّفَهَآءُ سے مراد یہاں مدینہ طیبہ کے یہود ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا منافقون ہیں۔ زجاج نے کہا: قریش کے کفار ہیں جب انہوں نے تحویل قبلہ کا انکار کیا تو کہا: محمد ﷺ اپنی پیدائش کی جگہ کا اشتیاق رکھتا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 217، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 218، جلد 1

ہے۔ عن قریب تمہارے دین کی طرف لوٹ آئے گا، یہود نے کہا: اس پر معاملہ ملتبس ہوگیا ہے اور یہ حیران ہے۔ منافقوں نے کہا: **مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ** اور مسلمانوں سے استہزاء کیا۔ **وَلّٰىهُمْ** کا معنی ہے: انہیں پھیر دیا۔

**مسئلہ نمبر 2:** ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ امام مالک کے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لوگ صبح کی نماز میں قباء میں تھے اچانک ایک آنے والا آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آج رات قرآن نازل ہوا ہے اور انہیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تم کعبہ کی طرف منہ کرلو۔ ان صحابہ کے چہرے پہلے شام کی طرف تھے تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے (1)۔ امام بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ ماہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ پسند فرماتے تھے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور صحابہ کرام نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں ایک کسی اور مسجد والوں کے پاس سے گزرا جبکہ وہ رکوع میں تھے تو اس نے کہا: میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو وہ صحابہ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور شہید ہو گئے تھے ہم نہیں جانتے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ** (البقرہ:143) (2) اس روایت میں نماز عصر کا ذکر ہے۔

امام مالک کی روایت میں صبح کی نماز کا ذکر ہے، بعض علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں نازل ہوا تھا جبکہ آپ ظہر کی نماز میں دو رکعت پڑھ چکے تھے تو آپ نماز میں ہی پھر گئے تھے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے (3)۔ ابو الفرج نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عباد بن نہیک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ ابو عمر نے ''التمہید'' میں حضرت نویلہ بنت اسلم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور یہ مبایعات (بیعت کرنے والیوں) میں سے تھیں فرماتی ہیں: ہم ظہر کی نماز میں تھے۔ عباد بن بشر بن قیظی آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کرلیا ہے یا کہا: بیت حرام کی طرف منہ کرلیا ہے۔ پس مرد عورتوں کی جگہ پھر گئے اور عورتیں، مردوں کی جگہ پھر گئیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نماز کے علاوہ حالت میں نازل ہوئی۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ کعبہ کی طرف پہلی نماز، نماز عصر پڑھی گئی۔ واللہ اعلم

روایت ہے کہ جب قبلہ کی تحویل ہوئی تو پہلی نماز جس نے کعبہ کی طرف پڑھی وہ ابو سعید بن معلّٰی تھے۔ حضرت ابو سعید مسجد سے گزر رہے تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ منبر پر لوگوں کو تحویل قبلہ کے بارے خطبہ دے رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے: **قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ** (البقرہ:144) حتیٰ کہ آپ آیت سے فارغ ہوئے تو میں (ابو سعید) نے اپنے ساتھی سے کہا: آؤ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر سے اترنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پس ہم پہلے کعبہ

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب القبلۃ، باب ما جاء فی القبلہ، صفحہ 182 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ سیقول السفہاء من الناس، حدیث 4126، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 172، جلد 1 (دار الفکر)

کی طرف نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ پس ہم نے جانوروں کو چھپا دیا اور ہم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ اترے اور اس دن آپ نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابو عمر نے کہا ابو سعید بن معلیٰ کے لئے اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے حالانکہ سورۂ فاتحہ کی فضیلت میں کنت اصلی والی حدیث موجود ہے (1) جو بخاری نے نقل کی ہے، یہ پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: مدینہ طیبہ تشریف لانے کے کتنے عرصہ بعد تحویل قبلہ ہوا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: سولہ ماہ بعد یا سترہ ماہ بعد قبلہ تبدیل ہوا (2)۔ جیسا کہ بخاری میں ہے۔ دار قطنی نے بھی یہ حدیث حضرت براء سے نقل کی ہے۔ فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ طیبہ آنے کے بعد سولہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی خواہش دیکھی تو یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (3) اس روایت میں بغیر شک کے سولہ ماہ کا ذکر ہے۔ مالک نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن مسیب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ تحویل قبلہ غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ ابراہیم بن اسحاق نے کہا ہجرت کے دوسرے سال رجب میں قبلہ کی تبدیلی ہوئی تھی۔ ابو حاتم بستی نے کہا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ ماہ اور تین دن متواتر نماز پڑھی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ بارہ ربیع الاول کو آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم منگل کے دن پندرہ شعبان کو دیا تھا

**مسئلہ نمبر 4**: علماء کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کیفیت میں تین مختلف اقوال ہیں:

۱۔ حسن نے کہا کہ یہ رائے اور اجتہاد سے تھا۔ عکرمہ اور ابو العالیہ کا یہ قول ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کو بیت المقدس اور کعبہ کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو آپ نے یہود کے ایمان لانے اور ان کے مائل کرنے کے لئے بیت المقدس کو اختیار فرمایا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مشرکین کی آزمائش کے لئے بیت المقدس کی طرف منہ کیا کیونکہ وہ کعبہ سے الفت رکھتے تھے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے، یہ جمہور کا قول ہے اور حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی وحی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اور جمہور نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ الآیۃ (اور نہیں مقرر کیا ہم نے بیت المقدس کو قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں)۔

**مسئلہ نمبر 5**: اس میں اختلاف ہے کہ جب ابتدا میں نماز مکہ میں فرض ہوئی تو کیا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا یا مکہ کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا: بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا اور مدینہ طیبہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب فضل الفاتحہ، حدیث نمبر 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، ولکل وجھۃ مولیھا، حدیث نمبر 4132، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دار قطنی، باب تحویل الی الکعبہ، صفحہ 273، جلد 1 (دار صادر)

میں بھی سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف قبلہ پھیر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ابتدا میں نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھنا فرض کی گئی تھی آپ مکہ میں رہائش کے درمیان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نماز تھی۔

جب آپ مدینہ طیبہ آئے تو سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ ابوعمر نے کہا: یہ میرے نزدیک اصح قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ آئے تو آپ نے یہود کی الفت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے تا کہ یہ چیز ان کو اسلام کی طرف بلانے کا باعث ہو جب ان کا عناد ظاہر ہوا اور آپ ان سے مایوس ہو گئے تو آپ نے کعبہ کی طرف پھرنا پسند کیا۔ آپ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور آپ کی محبت کعبہ کی طرف تھی کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ عربوں کو اسلام کی طرف بلانے کا زیادہ باعث تھا۔ بعض نے فرمایا: اس میں یہود کی مخالفت تھی، یہ مجاہد سے مروی ہے (1)۔ ابوالعالیہ الریاحی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد اور ان کا قبلہ کعبہ تھا، فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کعبہ کی طرف صخرہ کی جانب نماز پڑھتے تھے (2) یہ تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ناسخ و منسوخ ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے مگر جس نے علیحدہ راہ اختیار کی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ قبلہ اول قرآن سے منسوخ کیا گیا اور یہ دو مرتبہ منسوخ ہوا۔ ایک قول کے مطابق جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** یہ آیت قرآن کے ساتھ سنت کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، جبکہ یہ قرآن میں حکم نہیں تھا اور یہ حکم سنت کی جہت سے تھا پھر یہ قرآن کے ساتھ منسوخ ہوا اور اس اعتبار سے کنت علیھا بمعنی انت علیھا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 8:** اس میں خبر واحد کے ساتھ قطعی علم کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا صحابہ کے نزدیک قطعی تھا پھر اہل قباء کے پاس آنے والا آیا اور انہیں بتایا کہ قبلہ مسجد حرام کی طرف پھر گیا ہے، تو انہوں نے اس کا قول قبول کیا اور وہ کعبہ کی طرف پھر گئے پس خبر واحد کے ساتھ انہوں نے متواتر کو ترک کر دیا حالانکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

علماء کا اس کے عقلاً جواز میں اور اس کے وقوع میں اختلاف ہے۔ ابوحاتم نے کہا: مختار اس کا عقلاً جواز ہے اگر اس کے ساتھ شرع مکلف کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قباء کے قصہ کی دلیل کے ساتھ اس کا وقوع بھی ہوا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کو کسی علاقہ کا والی بنا کر بھیجتے تھے اور وہ ناسخ و منسوخ کا حکم پہنچاتے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ممنوع ہے کیونکہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن اور متواتر معلوم، خبر واحد کے ساتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ سلف و خلف میں سے کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہیں ہے اور جو منع کرتے ہیں انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ چیز

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

محال تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے ظن کے ساتھ قطعی امر کو اٹھانا۔ رہا اہل قبا کا قصہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا والی بھیجنا وہ علم کے افادہ کے قرائن پر یا تو نقلاً اور تحقیقاً محمول ہے یا احتمالاً اور تقدیراً اس سوال و جواب کی مکمل تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: اس میں دلیل ہے کہ جس کو ناسخ نہ پہنچا ہو تو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے، بخلاف اس کے جس نے کہا کہ پہلا حکم ناسخ کے وجود کے ساتھ ساتھ اٹھ جاتا ہے نہ کہ علم کے ساتھ۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اہل قبا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ آنے والا آیا اور اس نے انہیں ناسخ کے متعلق بتایا تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ پس ناسخ کا وجود پایا گیا تو وہ لامحالہ اٹھانے والا ہے لیکن اس کے علم کی شرط کے ساتھ۔ لیکن ناسخ خطاب ہے اور وہ اس کے حق میں خطاب نہیں ہوتا جسے خطاب نہ پہنچا ہو۔ اس اختلاف کا فائدہ عبادات میں ظاہر ہوتا ہے جو نسخ کے بعد ادا کی گئیں اور نسخ کے پہنچنے سے پہلے ادا کی گئیں، کیا ان کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟ اسی پر مبنی ہے وکیل کے تصرف کا مسئلہ جو مؤکل کے معزول کرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا مؤکل کے مرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا اسے علم پہنچنے سے پہلے تصرف کرتا ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں: اسی طرح مضاربت کا مسئلہ ہے اور حاکم جس کو والی بنائے جب وہ مر جائے یا معزول کیا گیا ہو تو صحیح یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کا فعل نافذ ہوگا اور اس کا حکم رد کیا جائے گا۔ قاضی عیاض نے کہا: اس شخص کے احکام میں کوئی اختلاف نہیں جس کو آزاد کیا گیا ہو اور اسے آزادی کا علم نہ ہو اس کے اور لوگوں کے درمیان احکام آزاد والے ہوں گے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس کے احکام جائز ہوں گے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ آزاد کی گئی عورت آزادی کے بعد پڑھی گئی نماز جو اس نے بغیر ستر کے، آزادی کے علم سے پہلے پڑھی تھی اس کا اعادہ نہیں کرے گی۔ انہوں نے اختلاف کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس پر کوئی ایسا موجب طاری ہو جو اس کی عبادت کے حکم کو تبدیل کر دے جب کہ وہ اس کی عبادت میں ہو، قبا کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے۔ پس جس نے ایک حال پر نماز پڑھی پھر نماز مکمل کرنے سے پہلے اس کی وہ حالت بدل گئی تو وہ اپنی نماز کو مکمل کرے اور توڑے نہیں اور اس کی پہلی نماز ہو چکی ہے۔ اسی طرح جس نے برہنہ نماز پڑھی پھر نماز کے اندر ہی اسے کپڑا مل گیا یا حالت صحت میں نماز شروع کی پھر وہ مریض ہو گیا یا مریض تھا پھر صحیح ہو گیا یا بیٹھا تھا پھر قیام پر قادر ہو گیا یا لونڈی نماز کے اندر ہی آزاد ہو گئی تو وہ اپنا پردہ لے لے اور سابقہ نماز پر بناء کرے۔

میں کہتا ہوں: جیسے کوئی تیمم کر کے نماز میں داخل ہوا پھر اس نے پانی پالیا تو وہ نماز کو نہ توڑے جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ نماز توڑ دے یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**: اس میں خبر واحد کے قبول پر دلیل ہے اور اس پر سلف کا اجماع ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت سے تواتر کے ساتھ معلوم ہے کیونکہ آپ والیوں کو اور مبلغین کو بھیجتے تھے جو ایک ایک ہوتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی بتائیں۔

**مسئلہ نمبر 11**: اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا رہا اور ایک حال کے بعد دوسرے حال میں ضرورت کے مطابق اترتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ

لَکُمْ دِیْنَکُمْ (مائدہ:3)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ حجت قائم فرمائی یعنی مشارق و مغارب کی ملکیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس اس کے لائق ہے جس جہت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف ہدایت دی۔ الصراط سے مراد راستہ ہے المستقیم جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں۔ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کعبہ زمین کے درمیان ہے اسی طرح تمہیں امت وسط بنایا یعنی تمہیں انبیاء سے کم درجہ اور دوسری امتوں سے بلند درجہ بنایا۔ الوسط کا مطلب العدل ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اچھی چیز درمیانی چیز ہوتی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے تحت روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدلاً یعنی وسط سے مراد عدل ہے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ قرآن میں ہے: قال اوسطهم یعنی درمیان والے اور بہتر شخص نے کہا۔ زہیر نے کہا:

هم وسط يرضى الانام بحكمهم　　اذا نزلت احدى الليالى بمعظم (2)

ایک اور شاعر نے کہا:

انتم اوسط حى علموا　　بصغير الامر او احدى الكبر

ایک اور شاعر نے کہا:

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ بقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

لا تذھبنّ فی الامور فرطا　　لا تسألنّ ان سألت شططا
وکن من الناس جمیعاً وسطاً

ان تمام اشعار میں وَّسَطًا بہتر اور عمدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وسط الوادی وادی کی بہتر جگہ کو کہتے ہیں جس میں گھاس اور پانی زیادہ ہو۔ جب وسط میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی تو وہ محمود ہوتا ہے۔ یعنی اس امت میں نہ تو نصاریٰ کا غلو ہے جو وہ انبیاء کرام کے بارے کرتے تھے اور نہ یہود کی طرح کوتاہی ہے جو وہ انبیاء کی شان میں کرتے تھے۔ حدیث پاک میں ہے: خیر الامور اوسطھا۔(1) بہتر کام اچھا کام ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: علیکم بالنمط الاوسط۔ تم پر بہتر جماعت کو پکڑنا لازم ہے۔ بہتر جماعت وہ ہوتی ہے، بلند جس کی طرف اترتا ہے اور نیچے والا اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ فلان من اوسط قومہ، فلاں اپنی قوم سے بہتر ہے۔ وانہ لواسطۃ قومہ ووسط قومہ۔ یعنی وہ اپنی قوم سے بہتر ہے ان میں سے اہل حسب میں سے ہے۔ قد وسط وساطۃ وسطہ۔ الوسط سے نہیں ہے جو دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے الوسط (سین کے سکون کے ساتھ) ظرف ہے تو کہتا ہے: صلیت وسط القوم، جلست وسط الدار کیونکہ یہ اسم ہے۔ جوہری نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں بین رکھنا صحیح ہو وہاں وسط ہوگا اور اگر جہاں بین رکھنا صحیح نہ ہو تو وہ وسط (حرکت کے ساتھ) ہوگا اور کبھی سین کو ساکن کیا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّتَكُوْنُوْا لام کی کی وجہ سے منصوب ہے یعنی لان تکونوا۔ شھداء، کان کی خبر ہے۔ عَلَى النَّاسِ یعنی محشر میں امتوں کے خلاف انبیاء کے گواہ بنو، جیسا کہ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے ثابت ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ وہ کہیں گے: لبیک و سعدیک یا رب۔ اے رب! میں حاضر ہوں، تیری سعادت سے سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نے پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا، کیا اس نے تمہیں پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری گواہی کون دے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کہیں گے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت۔ پس یہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کی تھی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔(2)

ابن مبارک نے اس حدیث کو طویل ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے: امتیں کہیں گی وہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دیں گے جنہوں نے ہمیں پایا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم ان کے خلاف کیسے گواہی دو گے جن کو تم نے پایا ہی نہیں۔ امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری طرف تو نے رسول مبعوث فرمایا، ہماری طرف تو نے اپنا عہد اور اپنی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب صلاۃ الخوف، صفحہ 273، جلد 3 (دار الفکر)
2۔ صحیح بخاری، باب وکذالک جعلناکم امۃ وسطا، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کتاب نازل فرمائی، تو نے خود ہم پر بیان کیا کہ انہوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ پس جو تو نے ہمیں عہد دیا تھا اس کی بنا پر ہم نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: انہوں نے سچ کہا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا... الوسط سے مراد عدل ہے...... لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابن انعم نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قیامت کے روز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گواہی دے گی مگر وہ گواہی نہیں دے گا جس کے دل میں اپنے بھائی کے بارے میں عداوت ہوگی (1)۔ ایک طائفہ نے کہا آیت کا معنی ہے: بعض بعض کے مرنے بعد گواہی دیں گے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آپ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو اس پر خیر سے تعریف کی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ حضرت عمر نے عرض کی: میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان ہوں۔ جنازہ گزرا اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی تم نے خیر کے ساتھ تعریف کی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی اس کے لئے آگ واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو (2)۔ بخاری نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ بخاری اور مسلم کے علاوہ میں کئی طرق میں ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابان اور لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا کی گئی ہیں جو سوائے انبیاء کے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا تو اسے فرمایا: مجھ سے دعا مانگ میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس (میری) امت کو فرمایا ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اور جب کسی نبی کو بھیجا تو اسے فرمایا: تم پر دین میں کوئی حرج نہیں اور اس امت کو بھی فرمایا: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر شہید بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس حدیث کو حکیم ابو عبد اللہ نے ''نوادر الاصول'' میں نقل کیا ہے (☆)۔

**مسئلہ نمبر 3:** ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں اپنے خاص فضل سے آگاہ فرمایا کہ اس نے ہمیں عدالت کے اسم سے موسوم فرمایا اور تمام مخلوق پر گواہی کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس نے مرتبہ کے اعتبار سے ہمیں اول بنایا اور زمانہ کے اعتبار سے آخر بنایا جس طرح فرمایا: نحن الآخرون الاولون۔ (3) ہم زمانہ کے اعتبار سے آخری ہیں اور مرتبہ کے

---

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 15، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)　2۔ صحیح مسلم، باب فی وجوب الجنۃ والنار بشہادۃ، صفحہ 308، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً، کتاب الجمعہ، صفحہ 282، جلد 2　☆ نوادر الاصول، صفحہ 391

اعتبار سے اوّل ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ عادل ہی صرف گواہی دیں گے غیر پر غیر کا قول نافذ نہ ہوگا مگر جب کہ وہ عادل ہو۔ عدالت کا بیان اور اس کا حکم ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اس میں اجماع کی صحت اور اس کے ساتھ حکم کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ جب وہ عادل ہوں گے وہ لوگوں پر گواہی دیں گے، ہر ہر زمانہ کے لوگ بعد والوں پر گواہ ہیں۔ صحابہ کا قول تابعین پر حجت اور شاہد ہے اور تابعین کا قول بعد والوں پر حجت ہے۔ جب امت شہداء (گواہ) ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہے۔ اس شخص کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جس نے کہا کہ اس سے پوری امت مراد ہے کیونکہ پوری امت کا اجماع تو قیامت تک ثابت نہ ہوگا۔ اصول فقہ کی کتب میں اس کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے قیامت کے روز رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بمعنی لکم ہے یعنی تمہارے لئے ایمان کی گواہی دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تمہارے لئے تم پر تبلیغ کی گواہی دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا بعض علماء نے فرمایا: یہاں قبلہ سے قبلہ اولیٰ مراد ہے کیونکہ فرمایا كُنْتَ عَلَيْهَا بعض نے فرمایا: دوسرا قبلہ مراد ہے اور کاف زائدہ ہے یعنی انت الآن علیہا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) یعنی انتم خیر امۃ۔ یہ بعض علماء کا قول ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لِنَعْلَمَ کا معنی ہے لنریٰ۔ (ہم دیکھ لیں) اور عرب رؤیت کی جگہ علم کو اور علم کی جگہ رؤیت کو استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (الفیل: 1) اس میں أَلَمْ تَرَ بمعنی الم تعلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مگر تا کہ تم جان لو کہ ہم جانتے ہیں کیونکہ منافقین شک میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے پائے جانے سے پہلے انہیں جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہم یقین والوں کو شک کرنے والوں سے ممتاز کر دیں۔ یہ ابن فورک نے بیان کیا ہے اور طبری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین جان لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی جس طرح کہا جاتا ہے، امیر نے ایسا کیا حالانکہ وہ کام اس کے متبعین نے کیا ہوتا ہے۔ یہ مہدوی نے بیان کیا ہے اور عمدہ قول ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جان لیں۔ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی تخصیص اور تفضیل کے لئے جس طرح اپنے اس ارشاد میں اپنی ذات کی طرف اشارہ فرمایا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی (1)۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے کیونکہ اس کا معنی معاینۃ کا علم ہے جو جزا کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ کسی چیز کے پائے جانے سے پہلے بھی اسے جانتا ہے۔ معلومات پر احوال مختلف ہوتے ہیں اور اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب عیادۃ المریض، صفحہ 318، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کا علم مختلف نہیں ہوتا بلکہ تمام کے ساتھ ایک تعلق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جو اس معنی کی آیات موجود ہیں ان کا یہی معنی ہے مثلاً وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران:140)، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد:31)۔ (یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے کچھ شہید اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں) اور اس کے مشابہ آیات۔

یہ آیت قریش کے قول مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا کا جواب ہے قریش کعبہ سے محبت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر مالوف سے آزمایا تاکہ ظاہر ہو جائے جو رسول کی اتباع کرتا ہے اس سے جو اتباع نہیں کرتا۔ زہری نے الا لِيُعْلَمَ پڑھا ہے۔ اس قراءت میں مَنْ محل رفع میں ہوگا کیونکہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے اور جمہور کی قراءت پر مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے يَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ یعنی استقبال قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں رسول مکرم ﷺ کی پیروی کرتا ہے۔ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ یعنی جو اس کے دین سے مرتد ہوتا ہے۔ کیونکہ قبلہ جب تبدیل ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ مرتد ہو گئے تھے اور ایک قوم منافق ہو گئی تھی۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً یعنی قبلہ تبدیل ہونا بہت بڑا تھا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا یہ قول ہے۔ عربی میں تقدیر یوں ہوگی۔ وان کانت التحویلۃ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً۔ فراء کا خیال ہے: اِنْ اور لام، بمعنی ما اور الا ہے۔ بصری کہتے ہیں: ان ثقیلۃ کو مخففہ کیا گیا ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی قبلہ، یا تحویلہ یا تولیہ بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ یعنی اس نے ہدایت کو پیدا کیا۔ اس سے مراد دلوں میں ایمان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (مجادلہ:22)۔ یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ علماء کا اتفاق ہے یہ ان کے متعلق نازل ہوئی جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت براء بن عازب کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم ﷺ کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن (1)، صحیح ہے۔ نماز کو ایمان کہا گیا ہے کیونکہ یہ نیت، قول اور عمل پر مشتمل ہے۔

امام مالک نے فرمایا میں اس آیت کے ساتھ مرجئۃ کا قول ذکر کرتا ہوں کہ جو کہتے ہیں کہ نماز، ایمان میں سے نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یعنی قبلہ کی طرف متوجہ ہونے اور اپنے نبی کی تصدیق کی وجہ سے تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کی اکثریت اور اصولیین کا نظریہ یہی ہے۔

1۔ جامع ترمذی، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ابن وہب، ابن قاسم، ابن عبدالحکم اور اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ فرمایا: ایمان سے مراد نماز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، الرأفة، رحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابوعمرو بن العلاء نے کہا: الرأفة اکثر من الرحمة۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں اس کا لغوی معنی، اس کے اشعار اور معانی کا ذکر کیا ہے۔ کوفیوں اور ابوعمرو نے لَرَؤُف، فَعُل کے وزن پر پڑھا ہے یہ بنی اسد کی لغت ہے۔ اسی سے ولید بن عقبہ کا قول ہے:

و شر الطالبین فلا تکنه　　یقاتل عمه الرؤف الرحیم

کسائی نے حکایت کیا ہے کہ بنی اسد کی لغت فَعْل کے وزن پر لَرَأْف ہے۔ ابوجعفر بن القعقاع نے لروف بغیر ہمزہ کے ثقیل پڑھا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ میں ہر ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے جو ساکن ہے یا متحرک ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف اور بے شک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں''۔

علماء نے فرمایا: یہ آیت، سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ کے قول پر نزول کے اعتبار سے مقدم ہے۔ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ کا معنی ہے: تیرا آسمان کی طرف اپنا چہرہ پھیرنا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: آسمان کی طرف آپ کا نظریں پھیرنا۔ دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ السماء کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ یہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کی تعظیم کے ساتھ مختص ہے اور آسمان سے نازل ہوتی ہے مثلاً بارش، رحمت اور وحی۔ ترضاھا یعنی آپ جس کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو پسند فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ۔

ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی طرف منہ کرنا پسند کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (1) اس کا معنی اور اس پر کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ ۔

1۔ صحیح بخاری، باب سیقول السفهاء من الناس، صفحہ 644، جلد 2 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَوَلِّ یہ امر کا صیغہ ہے۔ شَطْرَ سے مراد طرف ہے الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مراد کعبہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پورے کعبہ کے سامنے...... یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: کعبہ کے پرنالہ کے سامنے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ اور میزاب یہ مدینہ طیبہ اور اہل شام کا قبلہ ہے اور اہل اندلس کا قبلہ ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: ابن جریج نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت اللہ اہل مسجد کے لئے قبلہ ہے اور مسجد اہل حرم کے لئے قبلہ ہے اور حرم، میری امت کے مشرق و مغرب میں رہنے والے اہل زمین کا قبلہ ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، الشطر کے کئی محمل ہیں۔ طرف، جہت جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ یہ ظرف مکان ہے جیسے تو کہتا ہے: تلقاءہ وجھتہ۔ ظرف کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے یہ مفعول بہ کے قائم مقام ہے، فعل اس میں واقع ہوا ہے۔ داؤد بن ابی ہند نے فرمایا: حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے: فول وجھك تلقاء المسجد الحرام شاعر نے کہا:

اقول لام زنباع اقیمی صدور العیس شطر بنی تمیم

ایک اور شاعر نے کہا:

و قد اظلکم من شطر ثغرکم هول له ظلم یغشا کم قطعاً

ایک اور شاعر نے کہا

الا من مبلغ عمراً رسولاً و ما تغنی الرسالة شطر عمرو

اور شطر الشی کا معنی ہے: اس کا نصف۔ اسی سے حدیث ہے: الطهور شطر الایمان(3)۔ طہارت ایمان کا نصف ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: شطر الی کذا جب کوئی کسی چیز کی طرف متوجہ ہو۔ شطر عن کذا جب کسی سے اعراض کیا گیا ہو۔ شاطر اس شخص کو کہتے ہیں جو ٹیڑھی راہ اختیار کرے اور وہ اپنے اہل کو خست کی وجہ سے عاجز کر دے۔ شطَرَ و شطُرَ شطارۃً۔ بعض علماء سے شاطر کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جو اس کام کو اختیار کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ہر افق میں کعبہ قبلہ ہے اور اس پر اجماع ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو اس پر عین قبلہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ اگر اس نے اس کا استقبال ترک کر دیا جبکہ وہ کعبہ کو دیکھنے والا تھا اور اس کی جہت کا عالم تھا تو اس کی نماز نہ ہوگی جو اس نے نماز پڑھی ہوگی اس کا اعادہ لازم ہوگا۔ ابو عمرو نے ذکر کیا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جو کعبہ سے غائب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 222، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ السنن الکبری للبیہقی، صفحہ 10، جلد 2 (دار الفکر)
3۔ صحیح مسلم، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے وہ کعبہ کی طرف منہ کرے، اگر اس پر کعبہ کی جہت مخفی ہو تو ستاروں، ہواؤں، پہاڑوں وغیرہ سے استدلال کرے اور جو مسجد حرام میں بیٹھا ہو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہونا چاہئے اور اس کی طرف ایمان اور ثواب کی نیت سے دیکھے۔ روایت ہے کہ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے (1)۔ عطا اور مجاہد کا یہ قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں اختلاف ہے غائب کا عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے یا جہت کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے؟ بعض علماء کا پہلا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ ایسی تکلیف ہے جس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض نے جہت کا قول کیا ہے۔ یہ تین وجوہ سے صحیح ہے: (۱) ممکن وہ ہے جس کے ساتھ تکلیف مرتب ہو۔ (۲) قرآن میں اس کا حکم ہے **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ**۔ یعنی زمین کے مشرق یا مغرب میں ہو **فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ**۔ (۳) علماء نے لمبی صف سے حجت پکڑی ہے جو قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ بیت اللہ کی عرض سے دگنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اس آیت میں امام مالک اور ان کے موافق قول کرنے والوں کے نظریہ کی واضح حجت ہے کہ نمازی سامنے دیکھے، سجدہ کی جگہ نہ دیکھے۔ ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، حسن بن حی نے کہا: اپنے سجدہ کی جگہ کی طرف دیکھے۔ شریک قاضی نے کہا: قیام میں سجدہ کی طرف دیکھے اور رکوع میں قدموں کی طرف دیکھے اور سجدہ میں اپنے ناک کی جگہ کی طرف دیکھے اور قعدہ میں اپنی گود کی طرف دیکھے۔ ابن عربی نے کہا: سامنے دیکھے کیونکہ اگر وہ اپنے سر کو ٹیڑھا کرے گا تو اس کا سر میں جو قیام فرض تھا وہ ضائع ہو گیا، حالانکہ سر تمام اعضاء سے معزز عضو ہے اگر سر کو سیدھا کرے گا اور تکلیف سے زمین کی طرف دیکھے گا تو اسے بہت زیادہ مشقت اور حرج لاحق ہوگی اور دین میں ہم پر حرج نہیں رکھی گئی لیکن جو اس پر قادر ہو اس کے لئے یہ افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ** اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں **لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ** یعنی بیت المقدس سے قبلہ کا پھرنا حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ کیسے جانتے تھے جبکہ یہ نہ ان کے دین میں تھا اور نہ ان کی کتاب میں تھا؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جب انہوں نے اپنی کتاب سے جان لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی ہیں تو انہوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ حق کہتے ہیں اور حق کا حکم دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے: انہوں نے اپنے دین سے نسخ کا جواز جان لیا تھا اگرچہ بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ پس وہ قبلہ کے جواز کو جاننے والے ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ** اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے **تعلمون** تا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اہل کتاب یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو خطاب ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کو مہمل نہیں چھوڑے گا اور ان سے غافل نہیں ہوگا اور اس کے ضمن میں وعید ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

**وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ**

1۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 212، جلد 12 حدیث نمبر 34714 (التراث الاسلامی)

قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ کیونکہ انہوں نے کفر کیا ہے حالانکہ ان کے لئے حق واضح ہو چکا ہے، انہیں آیات وعلامات نفع نہیں دیں گی۔ قبلہ کی جمع مکسر قبلٌ ہے اور جمع سالم قبلات ہے اور کسرہ کو فتحہ سے بدلنا جائز ہے اور تو کہے قِبلات اور کسرہ کو حذف کرنا اور با کو ساکن کرنا جائز ہے اور لئن کا جواب لو کے جواب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی ضد ہے کیونکہ لو اپنے جواب میں ماضی اور وقوع کو طلب کرتا ہے اور لئن استقبال کو طلب کرتا ہے۔

فراء اور اخفش نے کہا: لو کے جواب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے لو اتیت۔ اسی طرح لئن کے جواب کے ساتھ لو کا جواب دیا جاتا ہے تو کہتا ہے لو احسنت احسن الیك اسی کی مثل قرآن میں ہے: وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم: 51) یعنی لو ارسلنا ریحاً۔ سیبویہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے کہا: لئن کا معنی لو کے مخالف ہے ایک دوسرے پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ کہ اگر آپ اہل کتاب کے پاس کوئی بھی نشانی لے آئیں وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ سیبویہ نے کہا: وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم: 51) کا معنی لیظلُنّ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ یہ لفظاً خبر ہے لیکن اپنے ضمن میں امر کو لئے ہوئے ہے یعنی اس میں سے کسی شے کی طرف مائل نہ ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہود، نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں اور نصاریٰ، یہود کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ یہ سدی اور ابن زید سے مروی ہے۔ یہ ان کے اختلاف، تدابر اور گمراہی کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا یہ معنی ہے کہ جو ان میں سے اسلام لے آئے ہیں وہ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں جو اسلام نہیں لائے۔ اور جو اسلام نہیں لائے وہ اسلام لانے والوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں (1) اور پہلا معنی زیادہ واضح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ اس آیت میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے وہ لوگ ہیں جن کا خواہش کی پیروی کرنا جائز ہے اور خواہش کی پیروی کرنے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایسا عمل کرنا جائز ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ظالم ہو جائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت اور آپ سے ایسے اعمال سرزد نہ ہونے کی قطعیت کی وجہ سے امت کے ارادہ پر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 223، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

محمول ہے۔ معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا، نیز اس لئے کہ آپ پر یہ حکم نازل ہوا۔ الاھواء جمع ہے ھویٰ کی۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی طرح علم کی تفسیر بھی گزر چکی ہے اعادہ کا فائدہ نہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ان میں سے ایک گروہ چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ، اَلَّذِيْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور يَعْرِفُوْنَهٗ خبر ہے۔ الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی صحیح ہے اور يَعْرِفُوْنَ کا حال ہونا صحیح ہے یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی رسالت کی صداقت کو جانتے ہیں۔ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کا پھرنا جانتے تھے کہ وہ حق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن جریج، ربیع اور قتادہ کا قول ہے۔ (1)

معرفت میں اَبْنَآءَ (بیٹوں) کو ذکر کیا ہے ان کے نفسوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ نفس زیادہ قریب ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر ایک ایسا وقت گزرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور کوئی ایسا وقت انسان پر نہیں گزرتا جس میں وہ اپنے بیٹے کو نہ جانتا ہو۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے عبداللہ بن سلام سے کہا کیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح اپنے بیٹے کو جانتا ہے؟ عبداللہ بن سلام نے کہا: ہاں میں آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان میں امین کو اپنی زمین میں اپنے امین کی طرف اس کی نعت کے ساتھ بھیجا پس میں اسے جان گیا۔ اور میرا بیٹا میں نہیں جانتا اس کی ماں سے کیا ہوا۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ مجاہد، قتادہ اور خصیف کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: الْحَقَّ سے مراد استقبال کعبہ ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ یہ عناداً ان کے انکار کی صحت میں ظاہر ہے (3)۔ اسی طرح ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (النمل: 14)

اور ارشاد ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

''یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، اَلْحَقُّ سے مراد استقبال کعبہ ہے۔ نہ وہ جو یہود نے آپ کو اپنا قبلہ بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے الحق کو منصوب پڑھا، يَعْلَمُوْنَ کی وجہ سے یعنی وہ حق کو جانتے ہیں اور الزم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً

الحق کی تقدیر پر بھی اس کی نصب صحیح ہے اور رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی ھو الحق، یا فعل کے اضمار پر ہوگا یعنی جاء الحقُ...... نحاس نے کہا: سورۃ الانبیاء میں اَلْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے منصوب کے علاوہ پڑھا ہو۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں آیت کے آغاز میں جبکہ سورہ انبیاء میں ایسا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ - الْمُمْتَرِيْنَ کا معنی ہے: شک کرنے والے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے، کہا جاتا ہے: امتریٰ فلان فی کذا جب کسی کو کبھی یقین حاصل ہو اور کبھی شک لاحق ہو، اور وہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے دور کرے، اس سے المراء (جھگڑنا) ہے، ہر شخص اپنے مقابل کے قول میں شک کرتا ہے۔ الامتراء فی الشیء، کسی شی میں شک کرنا، اسی طرح التماری ہے۔ طبری نے استشہاد کے طور پر اعشی کا قول ذکر کیا ہے کہ ممترین کا معنی شاکون ہے۔

تدر　علی　أسْؤق　الممتری　نُ رکضاً اذا ما السراب ارجحن

ابن عطیہ نے کہا: اس میں اسے وہم ہوا ہے کیونکہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا: الممترون۔ شعر میں جو استعمال ہوا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے پیروں کے ساتھ گھوڑوں کو تیز چلاتے ہیں۔ شعر میں شک کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ طبری نے کہا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس میں شک کا معنی موجود ہے کیونکہ مالک اپنے گھوڑے کو آزماتا ہے کہ یہ چلنے کی عادت پر قائم ہے یا نہیں تا کہ اسے کوئی مصیبت لاحق نہ ہو، یا یہ ابتدا میں خریدنے کے وقت ہوتا ہے وہ اسے چلاتا ہے تا کہ اس کے چلنے کی مقدار جان لے۔ جوہری نے کہا مریت الفرس جب تو کوڑے وغیرہ کے ساتھ اس کا چلنا نکالے۔ اسم المریۃ ہے یہ میم کے کسرہ کے ساتھ ہے کبھی میم کو ضمہ دیا جاتا ہے، مریتُ الناقۃَ مَرْیاً جب تو اس کی کھیری کو مس کرے تا کہ دودھ دوہے، اَمْرَتْ جب اس کا دودھ اتر آئے۔ اسم المِرِیَۃُ ہے میم کے کسرہ کے ساتھ اور میم کو ضمہ دینا غلط ہے۔ المریۃ کا معنی شک ہے کبھی اس کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے۔ پس آگے بڑھ جاؤ دوسروں سے نیکیوں میں تم کہیں بھی ہو، لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ، الوجھۃ کا وزن فِعلۃٌ ہے اور یہ المواجھۃ سے ہے۔ الوجھۃ، الجھۃ اور الوجہ کا ایک معنی ہے۔ اس سے مراد قبلہ ہے یعنی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ ان کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے خواہ حق ہے یا خواہش نفس ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ مُوَلِّيهَا، هُوَ ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ اس کے معنی کی طرف کیونکہ اگر معنی کی طرف راجع ہوتی تو هم مولوها ہوتا۔ ھا ضمیر مفعول اول ہے اور دوسرا مفعول مولی کا محذوف ہے۔ عبارت یوں ہوتی هو موليها وجهه و نفسه، مطلب یہ ہے کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے۔ صاحب قبلہ اپنا چہرہ ادھر پھیرنے والا ہے۔ یہ واحد کا صیغہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے۔ یہ ربیع، عطا اور حضرت ابن عباس کا قول ہے، حضرت علی بن سلیمان نے کہا: موليها کا معنی ہے: متوليها۔ ابن عبس اور ابن عامر نے مولّاها مجہول پڑھا ہے(1)۔ اس قرأت پر ضمیر واحد کی طرف لوٹے گی یعنی لوگوں میں سے ہر ایک کے لئے قبلہ ہے۔ الواحد مولاها یعنی ہر ایک اس کی طرف پھیرا گیا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمہور کی قراءت پر هُوَ ضمیر اللہ تعالیٰ کا اسم ہو اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے معنی یہ ہوگا کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف پھیرنے والا ہے۔

طبری نے حکایت کیا ہے کہ ایک قوم نے ولكل وجهة پڑھا ہے یعنی کل کو وجهة کی طرف مضاف کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری نے غلطی کی ہے(2)، جبکہ یہ تعبیر قابل توجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جہت کی نیکی میں سبقت کر جس کی طرف تمہیں اس نے پھیرا ہے اور اپنے معاملہ میں اس اور اس کے چکر میں نہ پڑو۔ یعنی تم پر تمام امور میں اطاعت لازم ہے۔ لكل وجهة کو فاستبقوا پر مقدم کیا گیا ہے الوجهه کے اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ مفعول کو مقدم کیا جاتا ہے۔ ابو عمرو دانی نے یہ قرأت حضرت ابن عباس سے ذکر کی ہے وجهة میں واو سلامت رہی ہے عدة اور زنة اور اس کے درمیان فرق کرنے کے لئے کیونکہ جهة ظرف ہے اور یہ مصادر ہیں۔ ابو علی نے کہا ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ بھی مصدر ہے اور خلاف قیاس ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ اسم ہے مصدر نہیں ہے۔ ابو علی کے علاوہ علماء نے کہا جب تو اس سے مصدر مراد لے تو تو جهة کہے گا اور ظرف میں بھی کبھی الجهة کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی الی الخيرات حرف جر کو حذف کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے البیت الحرام کی طرف منہ کرنے کا جو تمہیں حکم دیا ہے اس میں جلدی کرو۔ اگرچہ یہ اپنے ضمن میں تمام طاعات کی طرف جلدی کرنے کا معنی لئے ہوئے ہے۔ آیات کے سیاق کی وجہ سے استقبال قبلہ مراد لیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز کو اول وقت میں پڑھنے کے لئے جلدی کرو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ نسائی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کی طرف جلدی جانے والا اس شخص کی مثل ہے جو اونٹ قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس کی مانند ہے جو گائے قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس شخص کی مانند ہے جو مینڈھا قربانی دیتا ہے پھر وہ جو اس کے پیچھے آنے والا ہے وہ اس کی طرح ہے جو مرغی قربانی دیتا ہے پھر جو اس کے پیچھے آنے والا ہے اس کی طرح ہے جو انڈا قربانی دیتا ہے(3)۔ دار قطنی نے

---

1۔ معالم التنزیل، صفحہ 175، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ سنن نسائی، کتاب الامامۃ والجماعۃ، صفحہ 138، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نماز کو اپنے وقت پر پڑھتا ہے حالانکہ اس نے پہلے وقت میں اس کو ترک کر دیا تھا جو اس کے اہل اور مال سے بہتر تھا(1)۔ مالک نے یحییٰ بن سعید سے ان کا قول نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الصلاۃ فی اول وقتھا(2) بہتر عمل نماز کو وقت پر ادا کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اول وقتھا ہے۔ اس میں پہلے فی حرف جر نہیں ہے۔

ابراہیم بن عبدالملک نے حضرت ابومحذورہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اول وقت اللہ کی رضا ہے اور درمیانی وقت اللہ کی رحمت ہے اور آخر وقت اللہ کا عفو ہے(3)، ابن عربی نے زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: اللہ کی رضا ہمیں اللہ تعالیٰ کی عفو سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ اس کی رضا محسنین کے لئے ہے اور اس کا عفو کوتاہی کرنے والوں کے لئے ہے یہ امام شافعی کا اختیار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا آخری وقت افضل ہے کیونکہ یہ وجوب کا وقت ہے، امام مالک کے قول میں تفصیل ہے۔ صبح اور مغرب میں پہلا وقت افضل ہے۔ صبح میں افضلیت حضرت عائشہ کی حدیث کی وجہ سے ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں(4)۔ اور رہی مغرب کی پہلے وقت میں افضلیت تو وہ حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث کی وجہ سے ہے۔ آپ مغرب کی نماز پڑھتے تھے جب سورج غروب ہوتا تھا اور پردے میں چھپ جاتا تھا(5)۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے اور نماز عشاء میں تاخیر افضل ہے جو دیر سے پڑھنے پر قادر ہو۔ حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ایک رات عشاء کی نماز کے لئے رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے، آپ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ رات کا تیسرا حصہ یا اس کے بعد کا وقت گزر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ اپنے گھر والوں میں مشغول رہے یا کسی اور وجہ سے مشغول رہے۔ آپ جب باہر نکلے تو فرمایا: تم نماز کا انتظار کر رہے ہو تمہارے علاوہ کوئی اہل دین اس کا انتظار نہیں کر رہا۔ اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں اس وقت نماز پڑھاتا(6)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو نصف رات تک مؤخر فرمایا پھر نماز پڑھی(7)۔

حضرت ابوبرزہ نے کہا: نبی کریم ﷺ عشاء کی نماز میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے، اور رہی ظہر کی نماز کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کے وقت آتی ہے۔ پس اس میں تھوڑی تاخیر مستحب ہے تاکہ لوگ تیار ہو جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ابوالفرج نے کہا امام مالک نے فرمایا ہر نماز میں افضل وقت پہلا وقت ہے مگر سخت گرمی میں ظہر کی نماز کے لئے تاخیر افضل ہے۔ ابن ابی اویس

---

1۔ سنن دارقطنی، النھی عن الصلاۃ بعد صلاۃ الفجر و بعد صلاۃ العصر، صفحہ 248، جلد 1 (دار المحاسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 247، جلد 1 (دار المحاسن)
3۔ ایضاً، صفحہ 250، جلد 1 4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، صفحہ 230، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ ایضاً، صفحہ 228، جلد 1 6۔ ایضاً، صفحہ 229، جلد 1
7۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب وقت العشاء الی نصف اللیل، صفحہ 81، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نے کہا امام مالک زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھنا ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بعد پڑھتے اور فرماتے وہ خوارج کی نماز ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، مؤذن نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھنڈا کرو۔ پھر اس نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو پھر آپ نے فرمایا: ٹھنڈا کرو حتیٰ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کی بھڑک سے ہے جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا (2) اور دونوں حدیثوں کو حضرت انس کی روایت جمع کرتی ہے کہ جب گرمی شدید ہوتی تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھتے تھے اور جب سردی ہوتی تو جلدی پڑھتے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: اہل علم کی ایک جماعت نے سخت گرمی میں ظہر کی نماز میں تاخیر کو پسند کیا ہے۔ یہ ابن مبارک، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرنا چاہیے جب مسجد کے نمازی دور سے آتے ہوں، جو تنہا نماز پڑھنے والا ہے اور وہ جو اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے والا ہے میں اس کے لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ سخت گرمی میں بھی نماز کو مؤخر نہ کرے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: جن علماء کا سخت گرمی میں ظہر کو مؤخر کرنے کا نظریہ ہے وہ اتباع کے زیادہ قریب ہے اور رہا امام شافعی کا قول کہ دور سے آنے والوں کے لئے اور لوگوں پر مشقت کی وجہ سے رخصت ہے کیونکہ حضرت ابوذر کی حدیث امام شافعی کے قول کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے حضرت بلال نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! ٹھنڈا کرو، ٹھنڈا کرو، اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح امام شافعی نے کہا ہے تو یہاں وقت کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی معنی نہیں تھا کیونکہ سفر میں سب لوگ جمع تھے، وہ دور سے آنے کے محتاج نہ تھے (3) اور رہی عصر کی نماز تو اس کو جلدی پڑھنا افضل ہے۔ ہمارے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جماعت کی امید کرتے ہوئے نماز کو مؤخر کرنا اس کو مقدم کرنے سے افضل ہے۔ اور جماعت کی فضیلت معلوم ہے، اول وقت کی فضیلت مجہول ہے اور معلوم کی تحصیل اولیٰ ہے اور یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یہ شرط ہے اور اس کا جواب یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف ہر چیز پر قدرت کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ مرنے کے بعد اور بوسیدگی کے بعد اعادہ کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ صفت مناسب ہو جائے۔

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، صفحہ 77، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب اوقات الصلوٰۃ، صفحہ 223، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی تاخیر الظہر، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

''اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان میں سے۔ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو تاکہ میں پورا کر دوں اپنا انعام تم پر تاکہ راہ راست پر ثابت قدم رہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بعض علماء نے فرمایا: یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید اور اس کے اہتمام کے لئے ہے کیونکہ تحویل کا موقع لوگوں کے نفوس میں مشکل تھا تو معاملہ کو مؤکد فرمایا تاکہ لوگ اس کے اہتمام کو دیکھیں اور ان پر تخفیف ہو جائے اور ان کے نفوس کو تسکین حاصل ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلے فول وجھك سے مراد کعبہ کی سمت ہے یعنی جب اسے دیکھ رہا ہو تو عین اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر فرمایا حَيْثُ مَا كُنْتُمْ مسلمان جو دوسری تمام مساجد میں ہیں مدینہ طیبہ وغیرہ میں وہ کعبہ کی سمت منہ کریں۔ پھر فرمایا: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ یعنی سفر میں استقبال کعبہ واجب ہے۔ پس زمین کی تمام اطراف میں تمام جگہوں میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا یہ حکم تھا۔ یہ قول پہلے قول سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ہر آیت کو ایک فائدہ پر محمول کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے اور اپنی سواری پر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ کی طرف منہ کرتے اور تکبیر کہتے پھر نماز پڑھتے رہتے خواہ جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا (1)۔ ابوداؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے (2)۔ امام شافعی، امام احمد اور ابوثور کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ استقبال کعبہ لازم نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مدینہ طیبہ آتے ہوئے سواری پر نماز پڑھتے تھے۔ فرمایا: اس کے متعلق نازل ہوا: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: 115) (3) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: ان احادیث کے درمیان تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہیں۔ امام شافعی کا قول اولیٰ

1۔ سنن دارقطنی، صفۃ صلاۃ التطوع فی السفر، صفحہ 396، جلد 1 (دار المحاسن)

2۔ سنن ابی داؤد، باب التطوع علی الراحلۃ والوتر، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، باب وما جعلنا القبلۃ، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے اور اس کے متعلق حضرت انس کی حدیث صحیح ہے۔ روایت ہے کہ جعفر بن محمد سے قرآن میں تکرار کے بارے پوچھا گیا؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ تمام لوگ سارا قرآن یاد نہیں کریں گے: اگر قصص مکرر نہ ہوتے تو یہ بعض کے پاس ہوتے اور بعض کے پاس نہ ہوتے تکرار کیا گیا تا کہ جو کچھ حصہ یاد کرے اس کے پاس بھی یہ قصص ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ان کی حجت سے مراد ان کا قول ہے کہ آپ نے ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیا تو انہیں اس ارشاد قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ:42) سے جواب دیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ کا معنی ہے تا کہ تم نہ کہو کہ تمہیں استقبال کعبہ کا حکم دیا گیا تھا حالانکہ تم اسے خیال نہیں کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ:144) تو پہلے حکم کو زائل کر دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا الا یہاں واو کے معنی میں ہے یعنی والذین ظلموا۔ یہ استثناء واو کے معنی میں ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ما بالمدينة دارٌ غير واحدة دار الخليفة الا دار مروانا

گویا اس شعر میں کہا: الا دار الخليفة و دار مروان۔

اسی طرح یہ ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۞ (التین) یعنی والذین آمنوا زجاج نے اس قول کو باطل قرار دیا ہے(2)۔ اس نے کہا یہ حذاق نحویوں کے نزدیک غلط ہے اور اس میں معانی کا بطلان ہے اور اِلَّا اور اس کا مابعد، اپنے ذکر سے مستغنی ہو جائیں گے۔ نحویوں کے نزدیک قول یہ ہے کہ یہ پہلے کلام سے استثناء نہیں ہے، یعنی جن لوگوں نے ان میں سے ظلم کیا وہ حجت پکڑتے ہیں۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ نے قبلہ کے متعلق احتجاج کا امر اپنے فرمان وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا میں بتایا تا کہ لوگوں کے لئے تم پر حجت نہ رہے مگر جو ایک واضح امر میں احتجاج کر کے ظلم کرے۔ جیسے تو کہتا ہے: مالك على حجة الا الظلم او الا ان تظلمني، یعنی مجھ پر تیرے لئے یقیناً کوئی حجت نہیں۔ لیکن تو مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے ظلم کو حجت کہا کیونکہ اس ظالم سے حجت پکڑنے والے نے اسے حجت کہا ہے۔ اگرچہ زائل ہونے والی حجت ہے۔ قطرب نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو کہ تم پر لوگوں کے لئے حجت نہ ہو مگر ان پر جنہوں نے ظلم کیا، الذین، علیکم میں کم ضمیر سے بدل ہوگا۔ ایک گروہ نے کہا الا الذین مستثنیٰ متصل ہے۔ اس کا معنی حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے اور کہا اللہ تعالیٰ نے نفی فرمائی کہ کسی کے لئے استقبال قبلہ میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ پر حجت ہو۔ معنی یہ ہے کہ تم پر کسی کے لئے حجت نہیں ہے مگر باطل حجت...... اس حیثیت سے کہ انہوں نے کہا: انہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے اور محمد ﷺ اپنے دین میں متحیر ہے۔ وہ ہمارے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوا مگر اس لئے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، اس کے علاوہ وہ اقوال جو بت پرستوں، یہودیوں یا منافقوں سے صادر ہوتے تھے۔ حجت سے مراد مخاصمت اور جھگڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت کہا اور اس کے فساد کا حکم لگایا کیونکہ یہ ظالموں کی طرف سے

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے کہا(1): یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ الناس سے مراد یہود ہوں۔ پھر عرب کے کفار کی استثناء کی گویا فرمایا: لیکن جنہوں نے ظلم کیا جو تم سے جھگڑتے ہیں۔ لیکن مِنْهُمْ کا قول اس تاویل کو رد کرتا ہے معنی یہ ہے کہ: لیکن جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفار قریش نے اپنے اس قول میں ظلم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آیا ہے وہ ہمارے پورے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔ اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جس نے بھی یہود کے علاوہ نازل ہونی والی آیت میں کلام کیا۔ حضرت ابن عباس، زید بن علی اور ابن زید نے الا الذین ظلموا پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے فتحہ اور لام کی تخفیف کے ساتھ۔ اس معنی پر کہ یہ نیا کلام ہے اس صورت میں الذین ظلموا مبتدا ہوگا یا اغراء کے معنی پر ہوگا۔ اس صورت میں الذین فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہوگا(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْشَوْهُمْ۔ یعنی لوگوں سے نہ ڈرو وَاخْشَوْنِي، خشیت کا اصل معنی وہ طمانیت ہے جو کسی تکلیف سے بچنے پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خوف کا مطلب دل کا گھبرانا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اعضاء کی خفت کی وجہ سے اسے خوف کہا جاتا ہے۔ آیت کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کی تحقیر کرنا ہے، اللہ کے سوا ہر ایک کے امر کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر کی رعایت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ یہ لِئَلَّا يَكُونَ پر معطوف ہے۔ یعنی لان اُتم۔ یہ اخفش کا قول ہے بعض نے فرمایا: یہ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور اس کی خبر مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولا تم نعمتی علیکم عرفتکم قبلتی۔ یعنی میں تمہیں اپنے قبلہ کی معرفت عطا کر کے اپنی نعمت کو مکمل کر دوں۔ یہ زجاج کا قول ہے، نعمت کے مکمل کرنے سے مراد قبلہ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اتمام نعمت سے مراد جنت کا دخول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت مکمل نہ ہوگی حتیٰ کہ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب وحکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَآ اَرْسَلْنَا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے لا تم نعمتی علیکم اتماماً مثل ما ارسلنا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام اقوال میں سے بہتر قول ہے۔ یعنی تم پر ابراہیم کی سنت کے بیان میں اپنی نعمت مکمل کر دوں جس طرح ہم نے رسول مبعوث کیا(3)۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے لعلکم تھتدون اھتداء مثل ما ارسلنا، تاکہ تم ہدایت پاؤ ایسی ہدایت جو ہمارے رسول بھیجنے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ محل نصب میں بحیثیت حال ہے۔ معنی ہے میں تم پر اس حال میں اپنی نعمت مکمل کر دوں۔ تشبیہ اس طرح واقع ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 225، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 226، جلد 1

قبلہ میں نعمت، رسالت میں نعمت کی طرح ہے۔ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ بڑائی میں نعمت کی بڑائی کی طرح ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام کے معنی میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی مجھے یاد کرو جس طرح ہم نے رسول بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے زجاج نے پسند کیا ہے یعنی جس طرح ہم نے تم میں رسول بھیجا جسے تم سچائی کے ساتھ پہچانتے ہو۔ پس تم مجھے توحید کے ساتھ اور اسے تصدیق کے ساتھ یاد کرو۔ اس قول پر تھتدون پر وقف جائز ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اسی کو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے، یعنی جس طرح میں نے تم پہ احسان کئے ہیں جن کو میں نے تم پر شمار کیا ہے۔ پس تم شکر کے ساتھ مجھے یاد کرو میں مزید نعمت کے ساتھ تجھے یاد کروں گا کیونکہ تمہارے اس ذکر میں میرے لئے شکر ہے اور میں نے شکر پر تم سے مزید کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) یہاں کما میں کاف اور سورت انفال میں كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ (انفال: 5) میں کاف اور سورہ حجر کے آخر میں كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۙ (الحجر) میں کاف، اپنے مابعد کے متعلق ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ اس میں مجازاۃ کا معنی ہے۔ اس وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے۔ ذکر کی اصل مذکور کے لئے دل کا متنبہ ہونا اور اس کے لئے دل کا بیدار ہونا۔ ذکر باللسان کو ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر قلبی پر دلالت کرتا ہے لیکن جب زبانی ذکر پر کثرت سے ذکر کا اطلاق ہوا تو یہی ذکر سمجھا جانے لگا۔ آیت کا معنی ہے: تم اطاعت کے ساتھ میرا ذکر کرو میں تمہارا ثواب اور مغفرت کے ساتھ ذکر کروں گا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے اور اسی طرح فرمایا: ذکر، اللہ کی اطاعت ہے جس نے اس کی اطاعت نہ کی اس نے اس کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ وہ کثرت سے تسبیح، تہلیل اور قرآن کی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کا ذکر کیا اگرچہ اس کی نماز اور روزہ کم بھی ہوں اور خیر کے اعمال تھوڑے بھی ہوں اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گیا، اگرچہ نماز، روزہ اور خیر کے کام زیادہ بھی ہوں۔ ابو عبید اللہ محمد بن خویز منداد نے ''احکام القرآن'' میں اس کو ذکر کیا ہے۔..... ابو عثمان نہدی نے کہا: میں اس گھڑی کو جانتا ہوں جب اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر کرتا ہے، ان سے پوچھا گیا تم یہ کیسے جان لیتے ہو؟ ابو عثمان نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) سدی نے کہا: جو بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے، جو مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے یاد کرتا ہے اور کوئی کافر اسے یاد نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے عذاب سے یاد کرتا ہے (1)۔ ابو عثمان سے پوچھا گیا کہ ہم اللہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن ہم اپنے دلوں

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 46، جلد 2 (داراحیاء التراث العربی)

میں کوئی مٹھاس اور ذوق نہیں پاتے؟ ابوعثمان نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد کرو کہ اس نے تمہارے ظاہری اعضاء کو اطاعت کے ساتھ مزین کیا۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: جس نے حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا وہ اپنے پہلو میں ہر چیز کو بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ہر چیز کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر چیز سے عوض ہوگا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ابن آدم نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا ہو۔

ذکر کی فضیلت اور اس کے ثواب میں احادیث کثیر ہیں جن کو ائمہ حدیث نے ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اسلام کی شرائع (احکام) بہت سے ہیں مجھے ان میں سے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری زبان ہر وقت اللہ حالی کے ذکر سے تر ہو(1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں(2)۔ اس عنوان کی احادیث اور ذکر کا مزید بیان یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا (احزاب) کے تحت آئے گا ذکر سے مراد دل کا ذکر ہے جو عمومی حالات میں ہمیشہ رہنا واجب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ فراء نے کہا: کہا جاتا ہے: شکرتك و شکرت لك نصحتك و نصحت لك۔ پہلا فصیح ہے۔ شکر کا مطلب احسان کو جاننا اور اس کو بیان کرنا ہے اس کا لغوی معنی ظاہر ہونا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کر کے اس کی ثنا کرے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت پر اپنے بندے کی تعریف فرماتا ہے مگر بندے کا شکر زبان سے اور دل سے طاعات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَكْفُرُوْنِ یہ نہی ہے اسی وجہ سے جمع کا نون حذف کیا گیا ہے اور یہ نون متکلم کا ہے اور یا کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور غیر قرآن میں اس کا اثبات احسن ہے، یعنی میری نعمت اور میرے احسان کا انکار نہ کرو۔ یہاں کفر سے مراد جھٹلانا نہیں بلکہ نعمت کا چھپانا ہے۔ کفر کے لغوی معنی کی تحقیق گزر چکی ہے اور صبر اور نماز سے استعانت کا معنی بھی گزر چکا ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

''اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کئے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے''۔

یہ اس آیت کی مثل ہے: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ (آل عمران) اس آیت کے تحت شہید اور شہداء کے احکام کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

جب اللہ تعالیٰ شہداء کو ان کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے تا کہ انہیں رزق دے تو جائز ہے کہ وہ کفار کو زندہ کرے تا کہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل الذکر، صفحہ 277، (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً

انہیں عذاب دے۔ اس آیت میں عذاب قبر پر دلیل ہے۔ شہداء زندہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اگر یہ معنی ہوتا تو شہداء اور دوسرے لوگوں میں فرق نہ ہوتا کیونکہ آئندہ تو ہر ایک زندہ ہوگا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ بھی دلالت کرتا ہے۔ مومنین جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اموات کو مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع دیا گیا ہے اسی طرح بَلْ اَحْيَآءٌ کی ترکیب ہے، یعنی هم امواتٌ و هم احياءٌ۔ ان میں قول کو عمل کرانا صحیح نہیں کیونکہ قول اور اس کے درمیان مناسبت نہیں ہے۔ جس طرح تیرے اس قول میں صحیح ہے: قلت كلاماً وحجةً۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ یہ واو مفتوحہ ہے۔ سیبویہ کے نزدیک کیونکہ التقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: جب واو نون ثقیلہ کے ساتھ ملائی گئی تو فعل مبنی ہوگیا۔ پس یہ خمسة عشر کے قائم مقام ہوگیا۔ بلاء کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی محبت ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تا کہ ہم مجاہد اور صابر کو آنکھوں سے دیکھنے والے کے علم کی طرح علم حاصل کرلیں تا کہ اس پر جزا واقع ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے ساتھ آزمائے گئے تا کہ بعد والوں کے لئے نشانی بن جائیں اور وہ جان لیں کہ انہوں نے اس پر صبر کیا جب ان کے لئے حق واضح ہوگیا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں اس سے آگاہ کیا تا کہ انہیں یقین ہو جائے کہ انہیں مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پس اس پر وہ اپنے نفسوں کو تسکین دیں اور جزع وفزع سے دور رہیں۔ اس آیت میں عزم اور نفس کو تسکین دینے میں جلدی ثواب ملنے کا مژدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِشَیْءٍ یہ لفظاً مفرد ہے اور اس کا معنی جمع ہے۔ ضحاک نے باشیاء جمع پڑھا ہے جمہور نے مفرد پڑھا ہے یعنی کچھ خوف سے کچھ بھوک سے۔ پہلے کے ساتھ شے کے ذکر پر اختصار کی وجہ سے اکتفا کیا۔ مِّنَ الْخَوْفِ یعنی دشمن کا خوف اور جنگ کی گھبراہٹ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ وَ الْجُوْعِ یعنی قحط سالی کے ساتھ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا رمضان کے مہینہ کی بھوک مراد ہے۔ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کفار سے جنگ لڑنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: مال کے ضیاع کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا فرضی زکوٰۃ کے ساتھ۔ الْاَنْفُسِ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جہاد میں قتل اور موت کے ساتھ ہم جانوں میں کمی کر کے آزمائیں گے۔ امام شافعی نے فرمایا: امراض کے ساتھ الثَّمَرٰتِ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد بچوں کی موت ہے۔ انسان کی اولاد اس کے دل کا ثمرہ ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نباتات کی قلت اور برکات کا انقطاع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ صبر پر ثواب کی بشارت دو۔ الصبر کا اصل معنی روکنا ہے۔ صبر کا ثواب غیر مقدر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے لیکن صبر، پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے جیسا کہ بخاری نے حضرت انس سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبر پہلے صدمہ کے وقت ہے (1)۔ مسلم نے اس سے مکمل ذکر کی ہے۔ صبر جو نفس پر شاق ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب ہوتا ہے وہ مصائب کے ہجوم اور ان کی حرارت کے وقت ہے یہ دل کی قوت اور صبر کے مقام پر ثابت قدم رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو اس وقت ہر ایک صبر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے، عقلمند پر واجب ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اس کیفیت کو لازم پکڑے جو احمق کی تین دن کے بعد ہوتی ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ تو صبر زندگی بن گیا۔ صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) سے صبر کرنا، یہ مجاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا (2)، یہ عابد ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی معصیت سے صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی قضا پر رضا کا وارث بنا دیتا ہے۔ رضا کی علامت، نفس پر مکروہات اور محبوبات وارد ہونے پر دل اپنی جگہ سکون میں رہے۔ خواص نے کہا: صبر، کتاب وسنت کے احکام پر ثابت رہنا ہے۔ رویم نے کہا: صبر، شکوہ کا ترک کرنا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: صبر، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے۔ استاذ ابوعلی نے کہا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر معترض نہ ہو۔ رہا شکوہ کے بغیر مصیبت کا اظہار، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کے قصہ میں فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ (ص: 44) (بے شک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ) اس کے ساتھ یہ بھی ان کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ (الانبیاء: 83)

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں: بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُّصِيْبَةٌ ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت اور تکلیف دیتی ہے وہ مصیبت ہے۔ کہا جاتا ہے: اصابہ، اصابۃ و مصابۃ و مصاباً۔ اور مُّصِيْبَةٌ کی جمع مصائب ہے۔

المصُوبۃ (صاد کے ضمہ کے ساتھ) مصیبت کی مثل ہے۔ عرب ہمزہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں۔ المصائب اس کی اصل واؤ ہے گویا انہوں نے اصلی کو زائد کے ساتھ مشابہت دی۔ اس کی جمع مصاوب بھی آتی ہے یہ اصل ہے۔ المصاب الاصابۃ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 301، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

شاعر نے کہا:

أسلیم ان مصابکم رَجلاً　　اهدیٰ السلام تحیةً ظلمُ

وصاب السهم القرطاس، یصیب صیباً به، اصاب کے معنی میں ہے۔ المصیبة۔ النکبة ینکبها الانسان۔ اور یہ شر میں استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک رات چراغ بجھ گیا تو آپ ﷺ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۝ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت دے وہ مصیبت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح حدیث میں ثابت ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، ان دونوں حضرات نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ مومن کو جو مصیبت، تھکن، بیماری، غم، حتیٰ کہ دل کا روگ جو اسے پریشان کرتا ہے، لاحق ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے گناہ مٹائے جاتے ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**: ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ حضرت فاطمۃ بنت حسین سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہو پھر اس نے اپنی مصیبت کو یاد کیا اور پھر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۝ پڑھا ہو اگرچہ اس مصیبت کو بہت سا عرصہ گزر چکا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا اجر لکھ دیتا ہے جس دن اسے مصیبت پہنچی تھی (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**: مصائب میں سے بڑی مصیبت دین کی مصیبت ہے۔ ابو عمر نے فریابی سے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں فطر بن خلیفہ نے بیان کیا، فرمایا: ہمیں حضرت عطا بن ابی رباح نے بیان کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو مصیبت پہنچے تو میری وجہ سے جو اسے مصیبت پہنچی ہے اسے یاد کرنا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی مصیبت ہے (3)۔ یہ سمرقندی ابو محمد نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ ابو نعیم نے ہمیں بتایا، ہمیں فطر نے بتایا...... پھر اسی طرح حدیث بیان کی ہے۔ اسی طرح مکحول سے مرسلاً روایت کی ہے۔ حضرت ابو عمر نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا کیونکہ آپ سے جدائی کی مصیبت ہر مصیبت سے بڑی ہے جو آپ ﷺ کے بعد قیامت تک بندہ مومن کو پہنچنے والی ہے۔ آپ ﷺ کے جانے سے وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ سب سے پہلا شر جو ظاہر ہوا وہ عربوں وغیرہ کا ارتداد تھا۔

یہ خیر کا پہلا انقطاع اور پہلا نقصان تھا۔ حضرت ابو سعید نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی مٹی سے ہاتھ نہیں جھاڑے تھے حتیٰ کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔ ابو العتاہیہ نے اپنی نظم میں اس حدیث کے معنی کو کتنا حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

اصبر لکل مصیبة و تجلد　　و اعلم بان المرء غیر مخلد

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن، صفحہ 319، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، ماجاء فی الصبر علی المصیبة، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارمی، باب وفاة النبی ﷺ، صفحہ 40، جلد 1 (دار المحاسن)

اوما تری اِن المصائب جمة و تری المنیة للعباد بمرصد
من لم یصب ممن تری بمصیبة هذا سبیل لست فیه باوحد
فاذا ذکرت محمد و مصابه فا ذکر مصابك بالنبی محمدﷺ

تو ہر مصیبت اور تکلیف پر صبر کر اور جان لے کہ انسان ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ مصیبتیں بہت سی ہیں اور موت بندوں کی تاڑ میں ہے۔ کون ہے جن کو مصیبت نہیں پہنچی، تو اس راستہ میں اکیلا نہیں ہے۔ جب تو حضرت محمد ﷺ اور آپ کی مصیبت کو ذکر کرے تو اپنی مصیبت کو نبی محمد ﷺ کے ساتھ یاد کرو۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو مصیبت زدہ کے لئے پناہ گاہ بنایا ہے اور آزمائش میں مبتلا کئے گئے لوگوں کے لئے حفاظت کا باعث بنایا ہے، کیونکہ یہ مبارک معانی کا جامع ہے کیونکہ اِنَّا لِلّٰهِ کا قول توحید اور عبودیت کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا اقرار ہے اور وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کا ارشاد اپنے نفسوں پر ہلاکت کا اقرار ہے اور قبور سے اٹھنے کا اقرار ہے اور اس پر یقین کا اظہار ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا یہ کلمات، ہمارے نبی سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کو پہچان لیتے تو یہ نہ کہتے یا اسفی علی یوسف۔

**مسئلہ نمبر 5:** ابوسفیان نے کہا: میں نے اپنے بیٹے سنان کو دفن کیا جبکہ ابوطلحہ خولانی قبر کے کنارہ پر کھڑے تھے۔ جب میں نے قبر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور مجھ سے محبت کا اظہار کیا اور کہا: اے ابوسنان! کیا میں تجھے بشارت نہ دوں۔ محمد ضحاک نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب بندے کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: میرے بندے نے (اس صدمہ پر) کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو(1)۔

مسلم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اللھم اجرنی فی مصیبتی و اخلف لی خیراً منھا، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس سے بہتر بدلا دیتا ہے(2)۔ یہی تنبیہ ہے وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ کے ارشاد پر۔ یا تو نعم البدل مل جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ام سلمہ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات عطا فرمائی تھی، جب ان کا خاوند ابوسلمہ فوت ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یا بڑا ثواب عطا فرماتا ہے جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث میں ہے اور کبھی یہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب فضل المصیبة، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 300، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دونوں چیزیں ملتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ یہ صبر کرنے والوں اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بندے پر صلاۃ کا مطلب، اس کا عفو، رحمت، برکت اور دنیا و آخرت میں شرف بخشنا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلاۃ کا مطلب بخشنا اور اچھی تعریف ہے۔ اسی سے میت پر صلاۃ ہے۔ یہ اس کی تعریف اور اس کے لئے دعا ہے۔ رحمت کا لفظ دوبارہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ تاکید اور معنی کا اشباع ہے کیونکہ لفظ مختلف ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا من البینات و الھدیٰ۔ اور ارشاد ہے: اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ (زخرف:80) شاعر نے کہا:

صلی علی یحیی و اشیاعه  ربٌ کریمٌ و شفیعٌ مطاع

یحییٰ اور اس کے گروہ پر رب کریم اور شفیع مطاع نے صلاۃ بھیجی۔

بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد مصیبت کا دور کرنا اور حاجت کو پورا کرنا ہے۔

بخاری میں ہے، حضرت عمر نے فرمایا: نعم العدلان و نعم العلاوۃ: الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (بقرہ)(1) عدلان سے مراد الصلاۃ اور رحمت ہے اور علاوہ سے مراد اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ہے۔ (عدلان، اونٹ کے دونوں طرفوں کے بوجھ کو کہتے ہیں اور علاوہ وہ بوجھ ہوتا ہے جو اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے) بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد ثواب کا استحقاق اور اجر کا بڑا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: مصائب کا آسان کرنا اور حزن میں تخفیف کرنا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝

"بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدردان خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: بخاری نے عاصم بن سلیمان سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم دیکھتے تھے کہ صفا و مروہ زمانہ جاہلیت کے امور سے ہیں۔ جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے، اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ...... الخ (2)۔

ترمذی نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عائشہ سے کہا: میں کسی پر کوئی گناہ نہیں دیکھتا جو صفا و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمة الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 646، جلد 1

مروہ کے درمیان طواف نہ کرے اور میں بھی کوئی پروا نہیں کرتا کہ میں ان کے درمیان طواف نہ کروں۔ حضرت عائشہ نے کہا: اے میرے بھانجے! تو نے بری بات کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا و مروہ کا طواف کیا اور مسلمانوں نے طواف کیا جو منات بت کے لئے احرام باندھتا تھا، جو مشلل میں تھا تو صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح تو نے کہا ہے تو عبارت اس طرح ہوتی۔ فلا جناح علیہ الا یطوف بھما۔ زہری نے کہا: میں نے روایت ابو بکر بن عبدالرحمن بن حارث کے سامنے ذکر کی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: یہ علم ہے۔

میں نے بہت سے اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو عربوں میں سے صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے: ہمارا طواف ان دو پہاڑوں کے درمیان امر جاہلیت سے تھا اور انصار میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا گیا ہے، صفا و مروہ کے طواف کا حکم نہیں دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ

ابو بکر بن عبدالرحمٰن نے کہا: میرا خیال ہے یہ آیت ان لوگوں اور ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور فرمایا یہ حدیث حسن، صحیح ہے (1)۔ بخاری نے اس کا معنی نقل کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ کے الفاظ کے بعد یہ ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان طواف کی سنت قائم فرمائی، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان کا طواف چھوڑ دے۔ پھر میں نے ابو بکر بن عبدالرحمن کو بتایا تو انہوں نے کہا: جو تو نے سنا ہے یہ علم ہے۔ میں نے اہل علم سے سنا ہے وہ ذکر کرتے تھے کہ لوگ..... مگر جن کا حضرت عائشہ نے ذکر کیا، منات بت کے لئے احرام باندھتے تھے وہ تمام صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا اور قرآن میں صفا و مروہ کا ذکر نہیں کیا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر نازل کیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہم پر کوئی حرج ہے کہ ہم صفا و مروہ کا طواف کریں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ الایۃ، ابو بکر نے کہا یہ آیت دونوں فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے بارے میں بھی جو زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور ان کے بارے میں جو پہلے طواف کرتے تھے پھر دور اسلام میں ان کا طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کے طواف کے بعد اس کا ذکر کیا (2)۔

ترمذی نے عاصم بن سلیمان الاحول سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ دونوں جاہلیت کے شعائر سے تھیں جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروۃ، صفحہ 222، جلد 1 (وزارت تعلیم)

فرمایا یہ تطوع ہے...... وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ...... فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ یہ بخاری نے نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں شیاطین ساری رات صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے رہتے تھے اور صفا و مروہ کے درمیان بت رکھے ہوئے تھے۔ جب اسلام ظاہر ہوا تو مسلمانوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتے کیونکہ یہ شرک ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ شعبی نے کہا: زمانہ جاہلیت میں صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا۔ اور مروہ پر ایک بت تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا(2)۔ جب لوگ طواف کرتے تو ان بتوں کو چھوتے تھے۔ مسلمان اس وجہ سے ان کے درمیان طواف کرنے سے رک گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر2:** لغت میں الصفا، صاف پتھر کو کہتے ہیں۔ مکہ میں یہ ایک معروف پہاڑ ہے اسی طرح مروہ بھی ایک پہاڑی ہے، اسی وجہ سے دونوں کو معرف باللام ذکر کیا۔ الصفا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر حضرت آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے تو ان کے نام سے اسے موسوم کیا گیا اور حضرت حوا مروہ پر ٹھہری تھیں تو اسے عورت کے اسم سے تعبیر کیا۔ اس وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا۔ شعبی نے کہا: صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت تھا جس کو نائلہ کہا جاتا تھا، اسی اعتبار سے ان کی تذکیر و تانیث جاری ہوئی(3)۔ مذکر کو مقدم کیا۔ یہ عمدہ ہے کیونکہ احادیث اس معنی پر دلالت کرتی ہیں اور جو لوگ ان میں طواف ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ بھی یہی تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں حرج کو اٹھا دیا۔ اہل کتاب کا خیال ہے کہ اساف اور نائلہ نے کعبہ میں زنا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پتھروں میں مسخ کر دیا۔ انہیں صفا و مروہ پر رکھا گیا تا کہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں جب عرصہ زیادہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت ہونے لگی۔ واللہ اعلم

الصَّفَا (مقصور ہے) یہ صفاۃ کی جمع ہے اس سے مراد صاف پتھر ہے۔ بعض نے فرمایا: الصفا، مفرد اسم ہے اس کی جمع صُفِيّ اور اصفاء ہے جسے اَرْجَاء جمع ہے۔ راجز نے کہا:

كأن مَتْنَيْه من النفى مواقع الطير على الصُّفِى(4)

بعض علماء نے فرمایا: صفا کی شروط میں سے سفیدی اور صلابت ہے اور یہ صفا یصفو سے مشتق ہے یعنی مٹی سے پاک۔

المروہ یہ المرو کا واحد ہے، یہ چھوٹے چھوٹے پتھر جن میں نرمی ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سخت پتھر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مروہ پتھر ہے۔

شاعر نے کہا:

و تولى الارض خفا ذابلاً فاذا ما صادف المرو رضخ (5)

شاعر نے مرو کو پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 229، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی) 5۔ ایضاً

ابوذویب نے کہا:

حتی کانی للحوادث مروۃ بصفا المشقر کل یوم تقرع

شاعر نے یہاں بھی پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض نے فرمایا: یہ کالے پتھر ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سفید چمکدار پتھر ہیں جن میں آگ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ یہ عبادت کی جگہوں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ یہ شعیرۃ کی جمع ہے۔ الشعائر وہ جگہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے علامات بنایا۔ جیسے موقف، سعی اور نحر۔ شعار کا مطلب علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: اشعر الهدی۔ لوہے کی نوک سے اونٹ کی کوہان میں علامت بنانا، یہ تیرے قول اشعرت سے ہے میں نے علامت بنائی۔ کمیت نے کہا:

نقتلهم جیلاً فجیلاً تراهم شعائر قربانٍ بهم یتقربُ (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ۔ حَجَّ کا معنی قَصَدَ ہے الحج کا معنی قصد کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

فاشهد من ع ن حلولاً کثیرۃً یحجون سب الزبرقان المزعفرا

السب، یہ مشترک لفظ ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: السب (کسرہ کے ساتھ) بہت زیادہ گالی دینے والا۔ سَبَّكَ، جو تجھے گالی دے۔ شاعر نے کہا:

لا تسبنَّنِیْ فلست بسبی ان سبی من الرجال الکریم (2)

السب کا معنی دوپٹہ بھی ہے اسی طرح عمامہ بھی اس کا معنی ہے۔ مخبل سعدی نے کہا:

یحجون سِب الزبرقان المزعْفرا

وہ زعفران سے رنگے ہوئے عمامے باندھے ہوئے حج کرتے ہیں۔

لغت ہذیل میں السب، رسی کو بھی کہتے ہیں۔ ابوذویب نے کہا:

تدلی علیها بین سِبٍ و خیطة بجرداء مثل الوکف یکبو غرابُها

السبوب، رسیاں۔ روئی کا باریک دھاگہ۔ السبیبة اس کی مثل ہے جمع السبوب و السبائب۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ حج الطبیب الشجة، جب طبیب سر کچو کے ساتھ زخم کی پیمائش کا قصد کرے۔

شاعر نے کہا:

یحج مأمومةً فی قعرها لجف

وہ دماغ کے زخم کا علاج کرتا ہے جس کی گہرائی خوفناک ہے۔ اللجف، دھنسنے کو کہتے ہیں تلجفت البئر کنویں کا نچلا حصہ

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 1 (داراحیاء التراث العربی) 2۔ ایضاً، صفحہ 55، جلد 1

دھنس گیا۔ پھر یہ اسم بیت اللہ کی طرف افعال مخصوصہ کے ساتھ قصد کرنے کے لئے خاص ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوِ اعْتَمَرَ یعنی زیارت کرنا۔ العمرۃ کا معنی زیارت ہے۔ شاعر نے کہا:

لقد سما ابن معمر حین اعتمر　　مغزی بعیداً من بعید و ضبر

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ یعنی اس پر گناہ نہیں ہے۔ اس کی اصل جنوح سے ہے۔ اس کا معنی مائل ہونا ہے اسی سے الجوانح ہے۔ اعضاء کو ان کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے جوانح کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ کی تاویل اس آیت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ کہنے والے کا قول لا جناح علیك ان تفعل کا مطلب فعل کا مباح کرنا ہے اور لا جناح علیك الا تفعل کا مطلب ہے فعل کے ترک کی اباحت۔ جب عروہ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ فرمایا: یہ دلیل ہے کہ طواف کا ترک کرنا جائز ہے۔ پھر شریعت کو اس پر پایا کہ طواف چھوڑنے میں رخصت نہیں پھر ان دو متعارض کو جمع کرنا طلب کیا۔ حضرت عائشہ نے عروہ سے کہا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ طواف کے ترک کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ترک کی دلیل تب ہوتا اگر عبارت اس طرح ہوتی: فلا جناح علیہ الا یطوف بھما۔

پس یہ لفظ طواف کے ترک کی اباحت کے لئے نہیں آیا، اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ طواف کی اباحت کے افادہ کے لئے آیا ہے اس شخص کے لئے جو جاہلیت میں اجتناب کرتے تھے یا جو جاہلیت میں ان کا طواف کرتے تھے ان بتوں کا قصد کرتے ہوئے جو ان پہاڑوں کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ طواف ممنوع نہیں ہے جب طواف کرنے والا باطل کا قصد نہ کرے۔

اگر کہا جائے کہ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فلا جناح علیہ الا یطوف بھما پڑھا ہے اور یہی حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت انس سے اس کی مثل مروی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس کے خلاف ہے جو مصحف میں ہے اس لئے ایک قراءت کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑا جا سکتا جو مصحف میں ہے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قراءت صحیح ہے یا نہیں ہے۔ عطا بغیر سماع کے حضرت ابن عباس سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں اور حضرت انس سے جو روایت ہے وہ بھی ثقہ نہیں ہے یا (لا) تاکید کے لئے زائدہ ہوگا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وما ألوم البیض الا تسخرا　　لما راین الشمط القفندرا

اس شعر میں الا تاکید کے لئے زائدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں آئے تو بیت اللہ کے سات چکر لگائے اور پھر یہ آیت پڑھی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ: 125) پھر مقام کے پیچھے نماز پڑھی پھر حجر اسود کے پاس آئے اسے استلام کیا پھر فرمایا: ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا آپ نے صفا سے

شروع فرمایا اور فرمایا: صفا اور مروہ شعائر اللہ سے ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ اس پر اہل علم کے نزدیک عمل ہے صفا سے آغاز کرے۔ اگر مروہ سے پہلے شروع کیا تو یہ جائز نہ ہوگا پھر صفا سے شروع کرے۔

**مسئلہ نمبر 8**: صفا و مروہ کے درمیان سعی کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا: یہ رکن ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کی ہے(2)۔ اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ اور کتب بمعنی اوجب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (البقرہ:183) تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں(3)۔ ابن ماجہ نے شیبہ کی ام ولد سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا آپ فرما رہے تھے: ''درمیانی وادی کو تیز چل کر طے کیا جائے گا(4)''۔ جو سعی کو چھوڑ دے یا ایک چکر بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے یا جہاں سے اسے یاد آئے مکہ کی طرف لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے کیونکہ سعی ہمیشہ طواف کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ برابر ہے خواہ حج میں ہو یا عمرہ میں ہو۔ اگرچہ عمرہ میں فرض نہیں۔ اگر اس نے حقوق زوجیت ادا کر لئے ہوں تو اس پر امام مالک کے نزدیک تمام مناسک پورے کرنے کے باوجود اس پر عمرہ اور ہدی ہوگی۔

امام شافعی نے فرمایا: اس پر ہدی ہوگی عمرہ کا کوئی معنی نہیں جب وہ لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے۔ امام ابوحنیفہ نے اور ان کے اصحاب، ثوری اور شعبی نے کہا: سعی واجب نہیں ہے اگر کوئی حاجی سعی چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ اپنے شہر چلا جائے تو اس کا نقصان دم سے پورا کیا جائے گا کیونکہ سعی حج کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ امام مالک کا قول العتبیۃ میں ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت انس بن مالک اور ابن سیرین سے روایت ہے کہ سعی تطوع (نفل) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا** حمزہ اور کسائی نے یطوع مضارع مجزوم پڑھا ہے اس طرح فمن تطوع خیراً فھو خیرٌ لہ میں پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ تطوع پڑھا ہے۔ تطوع سے مراد وہ نیک عمل ہوتا ہے جو مومن اپنی طرف سے کرتا ہے پس جو نوافل ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے شکر یہ ہے کہ وہ اسے اپنی اطاعت پر ثابت رکھتا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام شافعی کا نظریہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھ سے اپنے مناسک (حج) سیکھ لو(5)۔

پس یہ حج کے مجمل کا بیان ہوگیا۔ پس فرض ہونا واجب ہے جس طرح نماز کی رکعات تعداد بیان فرمائی۔ جو اس طرح ہو تو

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند امام احمد بن حنبل، صفحہ 421، جلد 6 (دار صادر)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب السعی بین الصفا والمروۃ، صفحہ 221 (وزارت تعلیم)

5۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الحج، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)

اتفاق نہیں ہوتا کہ سنت ہے یا نفل ہے۔

طلیب نے کہا: حضرت ابن عباس نے ایک قوم کو صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے دیکھا تو فرمایا: یہ تمہیں تمہاری ماں ام اسماعیل نے وراثت میں دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح بخاری میں ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**: کسی کے لئے بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی سوار ہو کر نی جائز نہیں مگر عذر ہو تو جائز ہے۔ اگر عذر کی بناء پر سوار ہو کر طواف کیا تو اس پر دم ہوگا اور اگر غیر معذور نے سوار ہو کر طواف کیا تو وہ دوبارہ ادا کرے اگر بیت اللہ کے قریب ہو اور اگر دور جا چکا ہو تو ہدی دے۔ یہ ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود طواف کیا اور فرمایا: خذوا عنی مناسکم۔ مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔ اور عذر کی بناء پر ہم نے جائز قرار دیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر کیا تھا اور اپنی کھونٹی سے حجر اسود کو استلام کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: جب انہوں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی: لوگوں کے پیچھے طواف کر دراں حالیکہ تو سوار ہو (1)۔

ہمارے اصحاب نے اونٹ پر طواف کرنے اور انسان کی پیٹھ پر طواف کرنے کے درمیان فرق کیا ہے اگر انسان کی پیٹھ پر طواف کرے گا تو جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت وہ طواف کرنے والا نہ ہوگا بلکہ اٹھانے والا طواف کرنے والا ہوگا جب اونٹ پر طواف کرے گا تو وہ خود طواف کرنے والا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ اختیار کا تفرقہ ہے۔ رہا کفایت کرنا تو یہ کفایت کر جائے گا۔ جیسے اگر کسی پر غشی طاری ہو اور اسے اٹھا کر طواف کرایا جائے یا اٹھا کر عرفات میں اسے وقوف کرایا گیا تو اس کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں، یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو نازل شدہ بینات اور ہدایت کو چھپاتا ہے وہ ملعون ہے۔ اس کی مراد میں اختلاف ہے بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود اور عیسائی راہب ہیں جو حضرت محمد ﷺ کے امر کو چھپاتے تھے۔ یہود نے رجم کے امر کو چھپایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق کو چھپایا یہ ہر شخص میں عام ہے (خواہ) جس نے دین کے علم کو چھپایا جبکہ اس کے پھیلانے کی ضرورت تھی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں اس کی تفسیر کی گئی ہے جس سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب المریض یطوف راکباً، صفحہ 221، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کوئی علمی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا تھا پھر اس نے اسے چھپایا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز آگ کی لگام سے لگام دے گا۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص نے روایت کیا ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول اس کے معارض ہے: تو کسی قوم کے سامنے ایسی حدیث بیان کرے جن تک ان کی عقول نہیں پہنچیں گی تو وہ بعض لوگوں کے لئے فتنہ کا باعث ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو وہ بیان کرو جس کو وہ سمجھتے ہوں کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے (2)۔ یہ بعض علوم پر محمول ہے۔ جس طرح علم کلام ہے یا ایسا علم جس کے سمجھنے میں تمام لوگ برابر نہ ہوں۔ عالم کا حکم یہ ہے کہ وہ وہ چیز بیان کرے جو سمجھی جائے اور ہر انسان کو اس کے مرتبہ کے مطابق ڈیل کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کا ارادہ فرمایا تھا جب آپ نے فرمایا تھا: اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو میں تمہیں کوئی حدیث بیان نہ کرتا (3)۔ اس سے علماء نے علم حق کی تبلیغ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ عمومی طور پر علم کو بیان کرنا اس پر اجرت لئے بغیر کیونکہ اس پر اجرت لینے کا مستحق نہیں ہوتا جس کا اس پر کرنا لازم ہو۔ جس طرح اسلام پر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

آیت کی تحقیق یہ ہے کہ عالم جب علم کو چھپانے کا قصد کرے گا تو نافرمان ہوگا اور جب علم چھپانے کا قصد نہ کرے تو تبلیغ لازم نہیں۔ جب اسے معلوم ہو کہ غیر کے پاس یہ علم ہے اور جس سے کوئی بات پوچھی جائے تو اس آیت اور حدیث کی وجہ سے اس پر تبلیغ کرنا واجب ہے اور کافر کو قرآن اور علم سکھانا جائز نہیں حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اسی طرح جھگڑالو بدعتی اور جھگڑالو آدمی کو تعلیم دینا جائز نہیں تاکہ اہل حق سے جھگڑے۔ اور کسی خصم کو ایسی حجت نہ سکھائی جائے جس کے ذریعے مال ظلماً لے لے۔ اور بادشاہ کو ایسی تاویل نہ سکھائے جس کے ذریعے وہ رعیت کو تکلیف دے اور بے وقوف لوگوں میں ایسی رخصت نہ پھیلائے کہ وہ اس کو ممنوعات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کا راستہ بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمت کو اس کے اہل سے مت روکو ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے اور غیر اہل لوگوں کو حکمت نہ سکھاؤ ورنہ تم حکمت پر ظلم کرو گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، فرمایا: (موتیوں کو خنازیر کی گردنوں میں نہ لٹکاؤ (4)) یعنی فقہ کی تعلیم ایسے شخص کو نہ دو جو اس کا اہل نہیں۔ سحنون نے کہا: حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی حدیث شہادت کے بارے میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں ہے ''جس سے علم کے متعلق پوچھا گیا (5)'' یہ نہیں فرمایا جس نے شہادت کو بیان نہیں کیا۔ ظاہر پر باقی رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ اس پر کوئی ایسی چیز وارد ہو جو اس کو زائل کر دے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من سئل من علم فکتمہ، صفحہ 23 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، صفحہ 24، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 121، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 22، جلد 1 (وزارت تعلیم)　4۔ تاریخ بغداد، صفحہ 350، جلد 9 (دار الکتب المصریۃ)

5۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب فی کتمان العلم، صفحہ 89، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰی یہ منصوص علیہ اور مستنبط کو شامل ہے کیونکہ ھدی کا اسم تمام کو شامل ہے۔ اس میں ایک شخص کے قول کے عمل کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اس پر بیان واجب نہیں مگر اس کے قول کا قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا (البقرہ:160) ان کی خبر کے ساتھ بیان کے وقوع کا حکم لگایا۔

اگر کہا جائے کہ یہ جائز ہے کہ ہر ایک کو علم چھپانے سے منع کیا گیا ہو اور بیان کا حکم دیا گیا ہوتا کہ خبر دینے والے کثیر ہوں اور ان کی خبر متواتر ہو۔ ہم کہتے ہیں: یہ غلط ہے کیونکہ کتمان سے منع نہیں کیا گیا مگر انہیں جن پر اتفاق جائز ہو اور جن کا کتمان پر اتفاق جائز ہے ان کی خبر علم کا موجب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** جب مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰی فرمایا: تو یہ دلیل ہے کہ بینات اور ہدایت کے علاوہ جو علم ہے اس کا چھپانا جائز ہے، خصوصاً جب اس کے اظہار میں خوف ہو تو اس کا چھپانا مزید مؤکد ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو ترک فرمایا جب انہیں خوف تھا۔ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو برتن (علم کے) یاد کئے۔ ایک برتن کو میں نے پھیلا دیا اور دوسرا برتن اگر میں اسے پھیلاؤں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے۔ اس روایت کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو عبداللہ نے فرمایا: بلعوم، کھانے والی نالی کو کہتے ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ وہ علم تھا جس کو حضرت ابو ہریرہ نے نہیں پھیلایا اور انہیں اس کے پھیلانے میں فتنہ اور قتل کا خوف تھا۔ یہ علم فتنوں کے امر کے متعلق تھا منافقین اور مرتدین کی شخصیات پر نص کے متعلق تھا۔ ہر وہ علم کہ بینات اور ھدی کے متعلق نہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ، بَیَّنّٰهُ میں ضمیر کا مرجع بینات اور ہدایت ہیں۔ الْكِتٰبِ اسم جنس ہے اور اس سے مراد تمام کتب منزلہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے بری ہوتا ہے اور ان کو ثواب سے دور رکھتا ہے اور انہیں کہتا ہے تم پر میری لعنت ہو جس طرح شیطان لعین کو کہا وان علیك لعنتی۔ لغت میں لعن کا معنی دور کرنا اور دھتکارنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ قتادہ اور ربیع نے کہا: اللاعنون (لعنت کرنے والے) سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ واضح اور کلام کے مقتضیٰ پر جاری ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد حشرات الارض اور جانور ہیں جنہیں علماء سو جو علم کو چھپانے والے ہوتے ہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے خشکی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس وہ انہیں لعنت کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا: درست قول ان علماء کا ہے جو کہتے ہیں کہ اللاعنون سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ اور رہا یہ کہ اس سے مراد زمین کے جانور ہیں اس کی حقیقت پر آگاہی صرف نص یا خبر لازم سے ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہم کوئی چیز نہیں پاتے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: اس کے متعلق ایک خبر وارد ہے جسے حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ کے تحت فرمایا: دواب الارض یعنی اللاعنون سے مراد زمین کے جانور ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے محمد بن الصباح سے روایت کیا ہے ہمیں عمار بن محمد نے لیث سے انہوں نے ابوالمنہال سے انہوں نے زاذان سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اگر کہا جائے کہ عقول اور غیر عقول کو کیسے جمع کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر عقول کی طرف عقول والوں کا فعل منسوب کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ (یوسف: 4)۔ یہاں ساجدات نہیں فرمایا۔ فرمایا: لم شهدتم علینا۔ اور فرمایا: وَتَرٰىهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡكَ (اعراف: 198) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ ان شاء اللہ آگے وضاحت آئے گی۔

حضرت براء بن عازب اور حضرت ابن عباس نے کہا اللّٰعِنُوۡنَ سے مراد جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے اس کی چیخ جن وانس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے اور ہر سننے والا اس کو لعنت کرتا ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: ایک شخص اپنے ساتھی کو لعنت کرتا ہے پھر وہ لعنت آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے پھر وہ نیچے آتی ہے تو وہ اس شخص میں اس کی اہلیت نہیں پاتی تو وہ پھر لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے اسے بھی اس کا اہل نہیں پاتی تو وہ ان یہود پر واقع ہوتی ہے جنہوں نے نازل شدہ کلام کو چھپایا (3)، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ سے یہی مراد ہے۔ پس ان میں سے جو مر جاتا ہے اس سے لعنت اٹھ جاتی ہے اور جو باقی یہود ہوتے ہیں ان میں موجود رہتی ہے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾

''البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں (جواب تک چھپاتے رہے) تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں، اچھے اعمال کرنے والوں اور توبہ کی طرف لوٹنے والوں کی استثنا فرمائی۔ ہمارے علماء کے نزدیک توبہ میں صرف یہ کہنا (میں نے توبہ کی) کافی نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے پہلے قول وعمل کے خلاف دوسرا قول وفعل ظاہر ہو اگر وہ مرتد تھا تو وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ شرائع اسلام کو ظاہر کرنے والا ہو۔ اگر وہ گنہگاروں سے ہو تو اس سے نیک عمل ظاہر ہو اور اہل فساد اور ان احوال سے کنارہ کش ہو جس پر پہلے وہ تھا اگر وہ بت پرستوں میں سے تھا تو وہ بت پرستوں سے علیحدہ ہو جائے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح پہلے جس حالت پر تھا اس کا عکس ظاہر کرے۔ توبہ کا بیان اور اس کے احکام ان شاء اللہ سورۂ نساء میں آئیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَبَیَّنُوۡا سے مراد شراب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب لعقوبات، صفحہ 300 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب جاء فی عذاب القبر، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اللعن، صفحہ 316، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے مٹکے توڑ دینا اور شراب کو بہا دینا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد تورات میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور آپ کی اتباع کا وجوب جو موجود ہے اسے بیان کرنا ہے۔ عموم اولیٰ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یعنی جس حالت پر تھے اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فَأُولٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خٰلِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ كُفَّارٌ واو حالیہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: مجھے میرے اکثر مشائخ نے بتایا کہ معین کافر پر لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کی وفات کی حالت معلوم نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لعنت کے اطلاق میں کفر پر وفات شرط رکھی ہے۔ اور وہ روایت جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے متعین کفار پر لعنت کی (1)۔ تو یہ اس لئے تھا کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے انجام کا علم تھا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک ظاہر حال کی وجہ سے لعنت کرنا اور اسے قتل کرنا اور اس سے قتال کرنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! عمرو بن العاص نے میری ہجو کی اسے معلوم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس پر لعنت کر اور اس کی ہجو کر جتنی اس نے میری ہجو کی (2)، آپ ﷺ نے عمرو بن العاص پر لعنت کی، اگرچہ ایمان، دین اور اسلام اس کا انجام تھا۔ آپ ﷺ نے انصاف فرمایا کہ عرض کی: جتنی اس نے میری ہجو کی ہے اتنی اس کی ہجو فرما، زیادتی نہیں کی تا کہ وہ عدل و انصاف کو جان لے اور ہجو کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا یہ باب الجزاء سے ہے۔ اس وصف سے ابتدا نہیں کی۔ جس طرح مکر، استہزا اور خدیعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: بغیر تعیین کے تمام کفار پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام مالک نے داؤد بن حصین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اعرج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: خواہ کفار ذمی ہوں یا ذمی نہ ہوں یہ واجب نہیں۔ لیکن جو کفار پر لعنت کرے اس کے لئے مباح ہے کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا اور دین اور دینداروں سے عداوت کی۔ اسی طرح جو سر عام گناہ کرے جیسے شراب پینے والے، سود کھانے والے اور جو عورتوں میں سے مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں اور مردوں میں سے جو عورتوں کی مشابہت

1۔ احکام القرآن لابن عربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 548، جلد 13، حدیث نمبر 37431 (مکتبۃ التراث الاسلام)

اختیار کرتے ہیں ان کے علاوہ جن کے متعلق احادیث میں لعنت وارد ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** کافر کو لعنت کرنا کفر پر زجر کے اعتبار سے نہیں بلکہ وہ کفر پر جزا اور اس کے کفر کے قبح کے اظہار کے طور پر ہے کافر مردہ ہو یا مجنون ہو۔ سلف کی ایک قوم نے کہا: جو کافر مجنون ہے یا جو کافر مر چکا ہے اس کو لعنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ بطریق جزا جائز ہے اور نہ بطریق زجر کیونکہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس معنی کے اعتبار سے آیت سے مراد یہ ہوگا کہ لوگ قیامت کے دن اسے لعنت کریں گے تا کہ وہ اس سے متاثر ہو اسے نقصان پہنچے اور اس کا دل دکھے...... تو یہ اس کے کفر پر جزا ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت:25)

اس قول پر دلیل ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینا ہے کہ وہ ان پر لعنت کرتا ہے یہ بطور امر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: معین گنہگار کو لعنت کرنا بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک بار شراب پینے والے کو لایا گیا تو ما حود لوگوں میں سے کسی نے کہا اللہ اس پر لعنت کرے اسے کتنی بار لایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے معاون نہ ہو۔ آپ نے اس کے لئے اخوت کی حرمت کا ذکر کیا، یہ شفقت کا موجب ہے، یہ حدیث صحیح ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے معین گنہگار کو لعنت کرنے میں جواز کا قول کیا ہے۔ انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نعیمان کے حق میں فرمایا جبکہ اس پر حد قائم ہو چکی تھی۔ اور جس پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم ہو جائے اسے لعنت کرنا مناسب نہیں اور جس پر حد قائم نہ ہو اسے لعنت کرنا جائز ہے۔ خواہ اس کا نام لیا گیا ہو یا متعین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لعنت نہیں فرماتے تھے مگر اس پر جس پر لعنت واجب ہوتی ہے جب تک وہ اس لعنت کی موجب حالت پر باقی رہتا، جب وہ اس جرم سے توبہ کر لیتا اور اس کو ختم کر دیتا، اور حد اسے پاک کر دیتی تو لعنت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان نے واضح کیا ہے: جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے حد لگاؤ اور اسے برا نہ کہو (2)...... یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تثریب (برا بھلا کہنا) اور لعنت کرنا حد لگنے سے پہلے اور توبہ کرنے سے پہلے ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

ابن عربی نے کہا: گنہگار پر مطلقاً لعنت کرنا بالاجماع جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے جو انڈا چوری کرتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے۔ اللعن کا اصل معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندوں کی طرف سے لعنت، دھتکارنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت عذاب ہے۔ حسن بصری نے والملائكة والناس اجمعون حالت رفعی میں پڑھا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا، صفحہ 70، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب لعن السارق، صفحہ 1003، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1) اس کی تاویل یہ ہے: اولئك جزاء هم ان يلعنهم الله و يلعنهم الملائكة و يلعنهم الناس اجمعون۔ جیسے تو کہتا ہے: کرهت قيام زيدٍ و عمروٌ و خالدٌ کیونکہ اس کا معنی ہے کرهت انْ قام زيدٌ۔ حسن کی قراءت مصاحف کے مخالف ہے۔

اگر کہا جائے: تمام لوگ تو لعنت نہیں کرتے کیونکہ ان کی قوم تو انہیں لعنت نہیں کرتی۔ اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں: (۱) اکثر لوگوں کی طرف سے لعنت ہوتی ہے اس لئے تمام لوگوں کی لعنت کا اطلاق کیا گیا۔ اکثر کو اقل پر غلبہ دیا گیا۔ (۲) سدی نے کہا: ہر ایک ظالم پر لعنت کرتا ہے جب کافر ظالم پر لعنت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے۔ (۳) ابو العالیہ نے کہا: اس سے مراد قیامت کے دن کی لعنت ہے تمام لوگوں کے ساتھ ان کی قوم بھی انہیں لعنت کرے گی۔ جیسے الله تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت:25)

پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے یعنی لعنت کی جزا میں۔ بعض نے فرمایا ان کا لعنت میں خلود ہمیشہ ہے۔ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی کسی وقت بھی عذاب سے مؤخر نہیں کئے جائیں گے خٰلِدِيْنَ، علیہم میں ہا اور میم سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس میں عامل علیہم کا قول ظرف ہے۔ کیونکہ اس میں لعنت کے استقرار کا معنی ہے۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

''اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی خدا بجز اس کے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ جب الله تعالیٰ نے حق کو چھپانے سے ڈرایا تو یہ بیان فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جس کا اظہار واجب ہے اور جس کا چھپانا جائز نہیں وہ توحید کا امر ہے اور اس کو برہان کے ذکر سے ملایا، نظر وفکر کا طریقہ سکھایا اور وہ کائنات کے عجائب میں غور وفکر ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس کائنات کے لئے کوئی فاعل ہونا ضروری ہے جس کے مشابہ کوئی شی نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قریش کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے لئے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو الله تعالیٰ نے سورہ اخلاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اور مشرکین کے لئے تین سو ساٹھ بت تھے۔ تو الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ ایک ذات ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 2**: الله تعالیٰ نے فرمایا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ نفی اور اثبات ہے اس کا اول کفر ہے اور اس کا آخر ایمان ہے۔ اس کا معنی ہے الله تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

شبلی سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: الله الله کہتے اور لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ نہیں کہتے تھے، اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: مجھے ڈر رہتا ہے کہ میں نفی کا کلمہ کہوں اور اقرار کا کلمہ نہ کہہ سکوں۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علوم دقیقہ میں سے ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے اس معنی کو اپنی کتاب میں نفی اور اثبات میں ذکر فرمایا اور اس کا تکرار فرمایا اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے اس کے کہنے والے کے لئے بہت بڑے ثواب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 232، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اخلاص، صفحہ 172، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کا وعدہ فرمایا۔ موطا، بخاری اور مسلم وغیرہم نے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا آخری کلام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا (1) اور اس سے مقصود دل سے یہ تسلیم کرنا ہے، زبان سے کہنا نہیں ہے۔ اگر کسی نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور وہ فوت ہوا جبکہ اس کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ان تمام صفات پر تھا جو اللہ تعالیٰ کے لئے واجب ہیں تو اہل سنت کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسم واحد اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کا معنی اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں بیان کر دیا ہے۔ والحمد للہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا رہے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں، جو حکم کا پابند ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے۔ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں"۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: عطا نے کہا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار قریش نے کہا: ایک خدا سب لوگوں کی باتیں کیسے سنتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ سفیان نے اپنے باپ سے انہوں نے ابوالضحی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے کہا اس پر کوئی دلیل بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (2) گویا انہوں نے نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے توحید کی دلیل بیان فرمائی کہ یہ عالم اور اس کی عجیب تخلیق کا ضرور کوئی بانی اور صانع ہے۔ اور سمٰوٰت کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ یہ مختلف اجناس ہیں اور ہر آسمان کی جنس، دوسرے سے مختلف ہے اور زمین کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ تمام مٹی ہی ہیں۔ واللہ اعلم

آسمانوں کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ یہ بلند ہیں اور نہ تو ان کے نیچے کوئی ستون ہے اور نہ ان کے اوپر رسی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خرق عادت پر دلیل ہے۔ اگر ایک نبی آئے وہ ہوا میں ایک پہاڑ کو بغیر کسی سہارا کے ٹھہرانے کا چیلنج کرے تو یہ معجزہ ہوگا۔ پھر آسمان میں سورج، چاند اور چلنے والے ستارے اور مشرق و مغرب میں چمکتے اور روشن ستارے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب التلقین، صفحہ 88، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 75، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

چھپے ہوئے ستارے دوسری نشانی ہیں۔

اور زمین کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اس کے دریا، اس کی نہریں، اس کی معدنیات، اس کے درخت، اس کا ہموار ہونا اور اس کے نشیبی علاقے یہ سب صانع کی قدرت کی دلیل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا ہے اس حیثیت سے کہ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا اوصاف میں مختلف ہونا ہے جیسے نور وظلمت میں، طول وقصر میں۔ اللیل یہ لیلۃ کی جمع ہے۔ جیسے تمرۃ و تمر، نخلۃ و نخل اور لیلۃ کی جمع لیالی اور لیائل بھی آتی ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ یہ جمع کے قیاس سے جدا ہے، جسے شبه و مشابه، حاجة و حوائج، ذکر و مذاکر، گویا قیاساً لیالی کی جمع لیلاۃ ہوتی۔ لیلاۃ کو شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فی کل یوم وکل لیلاۃ

ایک اور شاعر نے کہا:

فی کل یوم ما وکل لیلاہ حتی یقول کل راءِ اذا رأہ

یا ویحۃ من جمل ما اشقاہ

ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی پرندے کو بھی لیلاً کہا جاتا ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔ النہار کی جمع نُهُرٌ و أَنْهِرَةٌ۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: نہر کی جمع نُهُر ہے اور یہ نہار کی جمع الجمع ہے۔ بعض نے فرمایا: النہار ایسا اسم مفرد ہے جس کی جمع نہیں بنائی جاتی کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے۔ جس طرح تیرا قول الضیاء ہے یہ قلیل وکثیر پر واقع ہوتا ہے۔ پہلا اکثر ہے۔ شاعر نے کہا:

لولا الثریدان هلکنا بالضمر ثرید لیل و ثریدٌ بالنهر (1)

ابن الفارس نے کہ النہار معروف ہے اور اس کی جمع نہر اور انہار ہے اور کہا جاتا ہے النہار کی جمع نہر بنائی جاتی ہے۔ النہار سے مراد طلوع فجر اور غروب شمس کے درمیان کی روشنی ہے۔ رجلٌ نَهِرٌ، صاحب نہار کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: النہار، حباریٰ (چکور) پرندے کے بچے کو کہتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے کہا: نہار کا آغاز سورج کے طلوع سے ہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کو نہار سے شمار نہیں کیا جاتا۔ ثعلب نے کہا: عربوں کے نزدیک اس کا اول سورج کا طلوع ہونا ہے اور اس نے امیہ بن ابی الصلت کے شعر سے استشہاد کیا ہے۔

والشمس تطلع کل آخر لیله حمراء یصبح لونها یتورد

اور عدی بن زید کا شعر ہے:

و جاعل الشمس مصراً لا خفاء به بین النهار و بین اللیل قد فصلا

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

اور کسائی نے یہ شعر لکھا ہے:

اذا طلعت شمس النهار فانها　　أمارةُ تسليمي عليك فسلمي

اور زجاج نے ''کتاب الانواء'' میں کہا ہے: دن کا آغاز سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہے(1)۔

ابن انباری نے زمانے کی تین اقسام بنائی ہیں: ایک کو اس نے محض رات بنایا ہے اور وہ سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر کے طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور دوسری قسم کو محض دن بنایا ہے اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے اس کے غروب ہونے تک کا وقت ہے ایک اور قسم دن اور رات کے درمیان مشترک بنائی ہے اور وہ فجر کے طلوع ہونے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کا وقت ہے یہ رات کی تاریکی کا بقایا ہے اور دن کی روشنی کا آغاز ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے، جس طرح کہ ابن فارس نے المجمل میں روایت کیا ہے اور اس پر دلیل صحیح مسلم میں حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے، فرمایا: جب یہ ارشاد حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ: 187) نازل ہوا تو عدی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھتا ہوں ایک دھاگہ سفید اور ایک دھاگہ سیاہ، ان کے ساتھ دن سے رات کی پہچان کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے(2)۔ یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قسموں میں فقہ کا مقتضا بھی یہی ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوتے ہیں۔ پس جو قسم اٹھائے کہ لا یکلم فلاناً نهاراً میں فلاں سے پورا دن کلام نہیں کروں گا تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے بھی کلام کرے گا تو حانث ہوگا، اور پہلے قول کے مطابق حانث نہ ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کا قول اس میں فیصل اور حکم ہے۔ اور رہا لغت کے ظاہر اور سنت کے اعتبار سے تو روشنی کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کا وقت وسیع ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

ملكت بها كفي فانهرت فتقها　　يرى قائمٌ من دونها ما وراءها

اور حضرت حذیفہ سے مروی حدیث بھی اسی قول پر دلالت کرتی ہے جس کو نسائی نے نقل فرمایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزوں کی آیات کے ضمن میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ، الْفُلْكِ سے مراد کشتیاں ہیں۔ مفرد اور جمع کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور مذکر اور مونث کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے(3)۔ لیکن مفرد اور جمع کی حرکات ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ ایسی ہیں کہ گویا جمع کی دوسری بنا ہے۔ اور اس پر دلیل تثنیہ کا درمیانی حرف ہے۔ عرب کہتے ہیں: فُلْكان، الفلك مفرد مذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ (یاسین) یہاں مذکر استعمال ہوا ہے اور فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 233، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 349، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 1 (دار احیاء التراث العربیۃ)

وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ۔ یہاں مونث ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور فرمایا: اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ (یونس:22) اس آیت میں جمع استعمال ہوا ہے گویا جب یہ واحد ہو اور مرکب کے معنی میں ہو تو مذکر ہوتا ہے اور سفینۃ کے معنی میں ہو تو مونث ہوتا ہے۔ فلك السماء۔ جس پر ستارے گردش کرتے ہیں۔ فلكت الجارية جب بچی کے پستان گول ہو جائیں۔ اسی سے ہے فلكة المغزل، چرخہ کا پرتلہ۔ کشتی کو فلک کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی ہے۔ آیت میں الْفُلْكِ کو بطور قدرت کی نشانی پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسخر کر دیا ہے حتیٰ کہ پانی کی سطح پر چلتی ہے اور اتنی بوجھل ہونے کے باوجود پانی کے اوپر ٹھہرتی ہے سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور جبریل امین نے انہیں کہا: پرندے کے سینہ پر بنا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسے بنایا جس طرح جبریل امین نے آپ کو دکھایا جبکہ یہ عالمین میں وراثت ہے، کشتی ایک الٹا پرندہ ہے پانی اس کے نیچے ہے جس طرح ہوا اس کے اوپر ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: یہ آیت اور اس کی مثل آیات سمندر پر سوار ہونے کے جواز کی دلیل ہیں خواہ وہ سوار ہونا تجارت کے لئے ہو یا عبادت کے لئے ہو جیسے حج اور جہاد۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے (1)۔ اور حضرت انس بن مالک کی حدیث ام حرام کے واقعہ کے متعلق ہے۔ ان دونوں احادیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث کو ان میں سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو بشر بن عمر نے امام مالک سے انہوں نے اسحاق سے انہوں نے حضرت انس سے انہوں نے حضرت ام حرام سے روایت کیا ہے، انہوں نے اسے مسند ام حرام میں شامل کیا ہے نہ کہ حضرت انس کی مسند میں۔ اسی طرح حضرت انس سے بندار محمد بن بشار نے اس کو بیان کیا ہے اس میں جہاد کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے سمندر پر سوار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ جب جہاد کے لئے سوار ہونا جائز ہے تو فرض حج کے لئے سوار ہونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے سمندر پر سوار ہونے سے منع کرنا مروی ہے جبکہ قرآن و حدیث اس قول کا رد کرتے ہیں۔ اگر اس کا سوار ہونا مکروہ ہوتا یا جائز نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو منع فرما دیتے جنہوں نے کہا تھا: ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں (2)۔ یہ آیت اور اس کی مثل آیات اس غرض سے نص ہیں۔ ان کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور اس کی تاویل کی جائے گی جو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے وہ احتیاط اور طلب دنیا اور کثرت دنیا کی طلب کے لئے سوار ہونے پر محمول

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء بماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، باب ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ہوگا، فرائض کی ادائیگی پر محمول نہیں ہوگا۔ اور معنی کی جہت سے اس کے اوپر سوار ہونے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو زمین کے درمیان رکھا اور باقی مخلوق کو زمین کے کناروں پر رکھا۔ اور منافع کو دونوں جہتوں کے درمیان تقسیم فرمایا اور ان منافع کو حاصل نہیں کیا جا سکتا مگر سمندر عبور کرنے کے بعد۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کا راستہ کشتی کے ذریعے آسان فرمایا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک عورت کے لئے حج کی خاطر سمندری سفر کو ناپسند کرتے تھے اور جہاد کے لئے زیادہ مکروہ ہوگا۔ قرآن وسنت اس قول کو رد کرتے ہیں مگر بعض اہل بصرہ نے کہا: امام مالک نے اس لئے مکروہ فرمایا کیونکہ حجاز میں کشتیاں چھوٹی تھیں، عورتیں اس میں پردہ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ تنگ ہوتی تھیں اور لوگوں کی ان میں بھیڑ ہوتی تھی اور مدینہ سے مکہ کی طرف جانے کا خشکی کا راستہ بھی موجود تھا، اس لئے امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بڑی کشتیاں جیسے اہل بصرہ کی کشتیاں ہیں ان میں کوئی حرج نہیں اور فرمایا: اصل یہ ہے کہ حج آزاد، بالغ آدمیوں میں سے حج کی استطاعت رکھنے والے پر فرض ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، جبکہ راستہ امن والا ہو۔ اس میں سمندری یا بری راستہ کی تخصیص نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب وسنت اور معنی ان دونوں سفروں کے لئے اس پر سوار ہونے کی اباحت پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ عبادت ہو یا تجارت ہو پس یہ حجت ہے اور اس میں نمونہ ہے مگر سمندر پر سوار ہونے میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں، بہت سے سواروں پر اس پر سوار ہونا آسان ہوتا ہے اور ان کے لئے دشوار نہیں ہوتا، جبکہ بعض دوسروں پر اس کا عبور کرنا دشوار ہوتا ہے اور اس مسئلہ میں کمزور ہوتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور جو ایسی حالت میں فرائض ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے، پس پہلے لوگوں کے لئے جائز ہے اور دوسرے لوگوں پر حرام ہے اور ممنوع ہے اور اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**: سمندر جب طغیانی میں ہو تو کسی کے لئے بھی اس پر سوار ہونا جائز نہیں اور اس زمانہ میں بھی سوار ہونا جائز نہیں جبکہ غالب گمان عدم سلامتی کا ہو۔ ان کے نزدیک ایسے زمانہ میں سوار ہونا جائز ہے جس میں غالب گمان سلامتی کا ہو وہ لوگ جو سلامتی کی حالت میں سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور نجات پاتے ہیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں اور وہ جو اس میں ہلاک ہوتے ہیں وہ روکے جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ یعنی تجارت اور دوسرے مقاصد جس کے ساتھ لوگوں کے احوال درست ہوتے ہیں وغیرہ منافع کے ساتھ چلتی ہے۔ سمندر پر سوار ہونے کے ساتھ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور جو اس میں سامان اٹھاتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے اور جنہوں نے دین میں طعن کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہاری کتاب میں فرماتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (انعام:38)

پس جو کھانے کی مصلحت کی چیزیں ہیں مثلاً نمک، کالی مرچ وغیرہ میں ان کا ذکر کہاں ہے تو اس کو بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ کے ساتھ جواب دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ یعنی بارشیں جن کے ساتھ عالم کی

بڑھوتری ہے، نباتات اور خوراک کا پیدائش ہے (1) اور اس سے کچھ جمع کیا جاتا ہے تاکہ بارشوں کے نہ ہونے کے وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (المومنون: 18)

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، بَثَّ کا معنی تفریق کرنا اور پھیلانا ہے۔ اسی سے كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ (القارعۃ) ہے دَآبَّةٍ کا لفظ تمام حیوانوں کو جامع ہے۔ بعض نے ان سے پرندوں کو نکالا ہے وہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6)

پرندہ بعض حالات میں اپنے پیروں پر چلتا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

دبیب قطا البطحاء فی کل منهل

علقمہ بن عبدہ نے کہا:

صواعقها لطیرهن دبیب

**مسئلہ نمبر 9**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ ہواؤں کا چلنا۔ تصریف سے مراد انہیں عقیم اور باربردار کر کے چلانا ہے اور کچھ کو مدد کرنے والی اور ہلاک کرنے والی بنا کر چلانا ہے، کچھ کو ٹھنڈی اور کچھ کو گرم بنا کر چلانا ہے، کچھ کو نرم اور کچھ کو سخت بنا کر چلانا ہے۔ بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ سے مراد ان کا جنوباً شمالاً (مشرق و مغرب) چلانا ہے۔ نقصان دہ اور فائدہ مند بنا کر چلانا ہے اور یکبارگی ہوا کا چلانا ہے اس سے مراد وہ ہوا ہے جو ان دونوں ہواؤں کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ سے مراد ان ہواؤں کا اتنی مقدار میں چلانا ہے جتنی کہ وہ کشتیاں سامان اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، ان کو برداشت کر لیں۔ اسی طرح چھوٹی کشتیوں کے لئے ان کے مطابق ہواؤں کو چلاتا ہے اور ان سے ان ہواؤں کو روکتا ہے جو انہیں نقصان دیتی ہیں۔ ان کے بادبانوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں اگر ہوا ایک جسم بن کر آتی تو اس کے بادبانوں کو پھاڑ دیتی اور انہیں غرق کر دیتی۔

الرِّيٰحِ، یہ ریح کی جمع ہے، اس کا یہ نام اس لئے ہے کہ عام طور پر رحمت کو لاتی ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ الريح من روح الله تاتی بالرحمة و تاتی بالعذاب فاذا رأیتموها فلا تسبوها و اسألوا الله خیرها و استعیذوا بالله من شرها۔ (2) (یعنی ہوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو لاتی ہے اور کبھی عذاب کو لاتی ہے، جب تم ہوا کو دیکھو تو اسے برا مت کہو اور اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو)۔ اسی حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ رحمت لاتی ہے اور کبھی عذاب لاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو (3)۔ نبی کریم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، صفحہ 339، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 273 (وزارت تعلیم)

صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ رحمن کے نفس سے ہے (1)۔ معنی یہ ہے: اس نے ہواؤں میں تفریج، تنفیس اور ترویح رکھی اور اور اضافت، فعل کے طریق سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا بنایا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نصرت بالصبا و أھلکت عادٌ بالدبور۔ (2) (صبا کے ساتھ میری مدد کی گئی اور عاد کو دبور کے ساتھ ہلاک کیا گیا)۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے جنگ احزاب میں ہوا کے ذریعے تکلیف کو دور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب: 9) (پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے) کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فلاں سے دنیا کی مصیبتوں سے ایک مصیبت کو دور فرمایا۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں اس کی ایک مصیبت کو دور کرے گا (3)۔ شاعر نے کہا:

كأن الصبا ريحٌ اذا ما تنسمت　　على كبد مهموم تجلت همومها

ابن عربی نے کہا: النسیم ہوا کے چلنے کی ابتدا کو کہتے ہیں۔ الریح کی اصل روح ہے اسی وجہ سے جمع قلت ارواح آتی ہے ارياح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ واوی ہے کثرت کی جہت سے اور یا کی مناسبت کی طلب کی وجہ سے ریاح کہا جاتا ہے اور حضرت حفصہ کے مصحف میں و تصریف. رواح ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ حمزہ اور کسائی نے الریح مفرد پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف، کہف، ابراہیم، النمل، الروم، فاطر، شوری اور جاثیہ میں پڑھا ہے ان کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حمزہ اور کسائی کی ابن کثیر نے سورہ اعراف، النمل، الروم، فاطر اور شوریٰ میں موافقت کی ہے اور حمزہ نے الریح لواقح کو مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے ھو الذی ارسل الریح کو سورۂ الفرقان میں مفرد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تمام جگہوں پر جمع کا صیغہ پڑھا ہے سوائے ان الفاظ کے جو سورہ ابراہیم اور شوریٰ میں ہیں۔ ان کو نافع کے سوا کسی نے جمع نہیں پڑھا۔ ان مواقع کے علاوہ میں ساتوں قراء کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو سورہ روم میں ہم نے ذکر کیا ہے وہ دوسرا مقام ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (روم: 48) اور الریاح مبشرات میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع نے پورے قرآن میں الریاح کو جمع پڑھا ہے جب اس پر الف لام آیا ہے، سوائے ان مقامات کے تھوی بہ الریح۔ الریح العقیم اور اگر الف، لام اس پر نہ ہو تو مفرد پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے الریاح کو مفرد پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسم جنس ہے، قلیل و کثیر پر دلالت کرتا ہے اور جنہوں نے جمع پڑھا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ ہوائیں مختلف جہات سے چلتی ہیں اور بعض نے رحمت والی ہواؤں کو جمع پڑھا ہے اور عذاب والی ہوا کو واحد پڑھا ہے۔ انہوں نے اس میں قرآن کے اغلب قول کا اعتبار کیا ہے جیسے

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، صفحہ 298، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، صفحہ 141، جلد 1 (وزارت تعلیم) و صحیح مسلم، کتاب الاستسقاء، صفحہ 295، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، صفحہ 345، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الریاح مبشرات ۔ الریح العقیم ۔ قرآن میں رحمت کے ساتھ جمع اور عذاب کے ساتھ مفرد کا ذکر ہے سوائے سورہ یونس کے ان الفاظ کے ۔ و جرین بھم بریح طیبۃ ۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب ہوا چلتی تو آپ یہ دعا پڑھتے : اللھم اجعلھا ریاحا و لا تجعلھا ریحا(1) ۔ (یا اللہ! اسے رحمت بنا اور اسے ریح نہ بنا) ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عذاب کی ہوا سخت ہوتی ہے، اس کے اجزاء ملے ہوئے ہوتے ہیں گویا وہ ایک جسم ہے جبکہ رحمت کی ہوا نرم اور جدا جدا ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے ان ہواؤں کو الریاح کہا جاتا ہے اور سورۂ یونس میں الفلك کے ساتھ مفرد آیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشتیوں کو چلانے والی ہوا یہ ایک متصل ہوا ہوتی ہے پھر طیب کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو ان کے درمیان اور عذاب کی ریح (ہوا) کے درمیان اشتراک زائل ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 11**: علماء نے فرمایا: الریح تو ہوا کو حرکت دیتی ہے کبھی وہ سخت ہوتی ہے اور کبھی کمزور ہوتی ہے، جب ہوا کی حرکت قبلہ کے سامنے سے ظاہر ہوتی ہے قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اس ہوا کو صبا کہا جاتا ہے ۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کے پیچھے سے ظاہر ہوتی ہے اور قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اسے دبور کہا جاتا ہے ۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی دائیں طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ قبلہ کی بائیں جانب کو چلتی ہے تو اسے ریح الجنوب کہا جاتا ہے ۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی بائیں جانب سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دائیں طرف کو چلتی ہے تو اسے ریح الشمال کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر ہوا کی ایک خاص طبع ہے، اس کی منفعت اس کی طبع کے مطابق ہوتی ہے ۔ صبا گرم خشک ہوتی ہے دبور ٹھنڈی تر ہوتی ہے ۔ جنوب گرم تر ہوتی ہے اور شمال ٹھنڈی خشک ہوتی ہے ۔ ان کی طبع کا اختلاف سال کے موسموں کے طبائع کے اختلاف کی طرح ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کے لئے چار موسم بنائے ۔ ان کا مرجع ہوا کے احوال کی تبدیلی کی طرف ہے ۔ موسم ربیع بنایا جو موسموں کا آغاز ہے اسے گرم تر بنایا اور اس میں نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، اس میں بارشیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنا نکھار نکالتی ہے اور اس کا سبزہ ظاہر ہوتا ہے لوگ درخت لگاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، اس میں حیوان پیدا ہوتے ہیں اور دودھ زیادہ ہوتے ہیں ۔ جب موسم ربیع ختم ہوتا ہے تو اس کے پیچھے موسم گرما ہوتا ہے یہ ایک طبع میں موسم ربیع کے مشابہ ہے اور وہ حرارت ہے اور رطوبت میں اس کے مخالف ہے کیونکہ گرمیوں میں ہوا گرم اور خشک ہوتی ہے اس میں پھل پکتے ہیں اور موسم ربیع میں کھیتوں کے دانے خشک ہوتے ہیں ۔ جب موسم گرما ختم ہوتا ہے تو موسم خزاں اس کے پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع میں موسم گرما کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ ہے خشکی اور حرارت میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ موسم خزاں میں ہوا ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے ۔ اس میں پھلوں کی صلاح اپنی انتہا کو پہنچتی ہے اور وہ خشک ہوتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں اور ذخیرہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھل اس موسم میں توڑے جاتے ہیں اور انگور کاٹے جاتے ہیں اور تمام درختوں سے فراغت حاصل کی جاتی ہے ۔ جب موسم خریف ختم ہوتا ہے تو موسم سرما پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع یعنی برودت میں موسم خریف کے موافق ہوتا ہے اور دوسری طبع خشکی میں مخالف ہوتا ہے کیونکہ ہوا سردیوں میں ٹھنڈی اور تر ہوتی ہے ۔ پس اس میں بارشیں اور اولے زیادہ ہوتے ہیں ۔ زمین آرام پانے والے جسم

1 ۔ المعجم الکبیر للطبرانی، صفحہ 214، جلد 11، حدیث نمبر 11533 (العلوم والحکم)

کی طرح ہوتی ہے اور حرکت نہیں کرتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف موسم ربیع کی حرارت کو لوٹا دے، جب وہ رطوبت کے ساتھ جمع ہوتی ہے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، کبھی کبھی ہوائیں زیادہ چلتی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے مگر اصول یہی چار ہیں۔ ہر ہوا، دو ہواؤں کے درمیان چلتی ہے۔ پس اس کا حکم اس ہوا والا ہوتا ہے جو اس کے مکان کے قریب ہوتی ہے اس ہوا کو النکباء کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ، السَّحَابِ کو یہ نام اس لئے دیا جاتا ہے کیونکہ ہوا میں یہ چلتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: سحبت ذیلی مسحباً، تسحّبَ فلان علی فلان جرأت کرنا۔ السحب کا مطلب زیادہ کھانا، پینا ہے۔ السخر، مطیع۔ بادل کی تسخیر کا مطلب: اسے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چلانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بادل کی تسخیر کا مطلب بغیر کسی سہارا کے آسمان اور زمین کے درمیان اس کا ٹھہرنا ہے (1)۔ پہلا معنی اظہر ہے کبھی بادل پانی کے ساتھ اور کبھی عذاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص صحرا میں اپنی زمین میں تھا۔ اس نے بادل میں ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سیراب کر، پس وہ بادل چلا اور اپنا پانی ایک ٹیلے پر بہایا وہاں ایک نالی تھی، وہ پانی سے بھر گئی۔ متواتر پانی چلتا رہا وہ شخص اپنے باغ میں اپنی کسی کے ساتھ پانی ادھر ادھر پھیر رہا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: فلاں۔ اس نے وہ نام بتایا جو اس نے بادل میں سنا تھا۔ اس نے اسے کہا: اے اللہ کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو سیراب کر تیرا نام لیا۔ تو اس باغ میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا: جب تو نے یہ کہا ہے تو میں اس کی پیداوار کا انتظار کرتا ہوں میں اس کی تہائی صدقہ کرتا ہوں اور تہائی خود اور اپنے عیال کو کھلاتا ہوں اور تہائی پھر اسی زمین میں کاشت کرتا ہوں (2)۔ ایک روایت میں ہے: میں تہائی مساکین، سائلین اور مسافروں کے لئے رکھوں گا (3)۔ قرآن حکیم میں ہے: وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (فاطر: 9) (اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھالاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف) اور فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ (اعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف)

ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب آفاق میں سے کسی افق میں سے بادل کو آتا ہوا دیکھتے تو اپنا کام چھوڑ دیتے تھے اگرچہ نماز میں ہی ہوتے حتیٰ کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگتے: اے اللہ! ہم اس شر سے پناہ مانگتے ہیں جس کے ساتھ اس (بادل) کو بھیجا گیا ہے۔ اگر بارش نازل ہوتی تو آپ یہ دعا کرتے: اللھم سیباً نافعاً (نفع بخش بارش دے) دو یا تین مرتبہ کہتے اگر اللہ تعالیٰ اس بادل کو ختم کر دیتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے (4)۔ مسلم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب فضل الانفاق علی المسکین، صفحہ 411، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، صفحہ 286 (وزارت تعلیم)

نے اس حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عائشہ سے نقل کی ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب ہوا اور بادل والا دن ہوتا تو آپ کے چہرہ سے پریشانی معلوم ہو جاتی آپ آگے پیچھے آتے جاتے۔ جب بارش ہو جاتی تو آپ خوش ہو جاتے اور آپ کی پریشانی دور ہو جاتی۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے آپ سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہیں یہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔ اور جب آپ بارش کو دیکھتے تو کہتے: رحمت (1)۔ ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! شاید جس طرح قوم عاد نے کہا تھا: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (احقاف: 24)(2)

یہ احادیث اور آیات پہلے قول کی صحت پر دلیل ہیں اور تسخیر السحاب سے مراد بادل کا زمین و آسمان کے درمیان ثبوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ ثبوت تو عدم انتقال پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ثبوت سے مراد اس کا ہوا میں ہونا مراد لیا گیا ہوتا نہ کہ آسمان اور زمین میں تو یہ صحیح تھا کیونکہ بین استعمال ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ مسخرہ محمولہ ہے۔ یہ قدرت کی عظیم نشانی ہے جیسے پرندہ ہوا میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (النحل: 79) (کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے)۔

اور فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۃ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (الملک: 19) (کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلاتے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمن کے۔)

**مسئلہ نمبر 13**: کعب الاحبار نے کہا: بادل، بارش کی چھلنی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ یہ کعب نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ خطیب ابو بکر احمد بن علی نے معاذ بن عبد اللہ بن خبیب الجہنی سے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو دیکھا وہ خچر پر گزرے جبکہ میں بنی سلمہ میں تھا۔ ان کے پاس سے کعب کی بیوی کا بیٹا تبیع گزرا۔ اس نے حضرت ابن عباس کو سلام کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس سے پوچھا: کیا تو نے کعب احبار سے بادل کے بارے کچھ کہتے سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: بادل بارش کے لئے چھانی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا جب آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ انہوں نے کہا: کیا تو نے کعب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین ایک سال ایک نبات اگاتی ہے اور دوسرے سال دوسری نبات اگاتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ بیج آسمان سے اترتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے یہ کعب سے سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَاٰيٰتٍ ایسی دلالات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 294، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ ایضاً

دلالت کرتی ہیں اسی وجہ سے اِن امور کو وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کے بعد ذکر کیا ہے تا کہ ان سے پہلے جو اللہ کی وحدانیت، اس کی رحمت کے ذکر اور اس کی مخلوق پر رأفت، ذکر کی ہے اس کی سچائی پر دلالت کرے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس میں غور و فکر نہیں کیا(1)۔ اگر کہا جائے کہ اس میں انکار نہیں ہے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔ کہا جائے گا: یہ محال ہے اگر یہ خود پیدا ہوئی ہیں تو پھر ان کا دو حالتوں سے خالی ہونا جائز نہیں یا تو یہ موجود ہوں گی یا موجود نہیں ہوں گی۔ اگر یہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں پہلے موجود نہیں تھیں تو یہ محال ہے کیونکہ کسی چیز کے عدم سے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حی، عالم، قادر اور مرید ذات کی تخلیق سے ہو اور جو پہلے موجود نہ ہو اس کا اس سے وصف صحیح نہیں۔ اگر یہ پہلے موجود تھیں تو پھر ان کا موجود ہونا ان کے پیدا کرنے سے انہیں غنی کر دے گا۔ پس جو کچھ انہوں نے کہا جائز ہو تو خود بخود پیدا ہونا جاری ہوگا۔ اسی طرح چیرنا اور بننا ہے، یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ محال ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت میں صرف اخبار پر اکتفا نہیں فرمایا حتیٰ کہ اس نے قرآن کی آیات میں غور و فکر کے ساتھ اس کو ملایا۔ اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمائیے غور سے دیکھو کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اور یہ کفار کو خطاب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس) (اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے اور فرمایا۔ اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف: 185) (کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں) یعنی ملکوتی آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اور فرمایا: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) فرمایا کیا انہوں نے تفکر و تدبر کی نظر سے نہیں دیکھا حتیٰ کہ یہ استدلال کرتے کہ یہ چونکہ حوادث و تغیرات کا محل ہیں تو یہ حادث ہیں اور حادث چیز اپنے صانع سے مستغنی نہیں ہوتی اور وہ صانع حکیم، عالم، قدیر، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے کیونکہ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو انسان اس سے کامل ہوگا، یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا فرمایا پھر ہم نے اس کی نسل اور اولاد بنائی نطفة فی قرار مکین ...... تبعثون، انسان جب اس تنبیہ کے ساتھ غور و فکر کرے گا اس عقل کے ساتھ جو اسے عطا کی گئی ہے تو وہ اسے غور و فکر کرنے والا پائے گا اور مختلف احوال پر پھرتا ہوا پائے گا۔ وہ پہلے نطفہ تھا پھر جما ہوا خون تھا پھر گوشت کا لوتھڑا پھر گوشت اور ہڈیاں تھا، تو وہ جان لے گا کہ حالت نقص سے حالت کمال کی طرف خود بخود پھرنے والا نہیں کیونکہ وہ خود اس پر قادر نہیں کہ وہ اس افضل حالت میں پیدا ہو جو اس کی عقل کا کمال ہے اور اس کے اعضاء کامل اور مضبوط ہوں۔ انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اعضاء میں کسی عضو کا اضافہ کرے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنی حالت نقص میں اور اپنے ضعف کے وقت میں کسی فعل سے زیادہ عاجز ہے۔ کبھی اپنے آپ کو جوان دیکھتا ہے، کبھی ادھیڑ عمر میں دیکھتا ہے، کبھی بوڑھا دیکھتا ہے۔ وہ خود بخود

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، صفحہ 400، جلد 4، حدیث نمبر 7158 (دار الباز)

حالت شباب اور قوت سے بڑھاپے کی حالت کو نہیں پہنچتا۔ نہ وہ خود اختیار کرتا ہے اور نہ اس کی وسعت میں ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت کو زائل کر کے پھر جوانی کی قوت کو لوٹا لے۔ پس وہ جان لے گا کہ وہ ایسا نہیں ہے جو ان افعال کو خود کر سکے، اس کا کوئی صانع ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نقل کرنے والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے احوال بلا ناقل و مدبر تبدیل نہ ہوتے۔ بعض حکماء نے کہا: اس عالم کبیر میں جو چیز بھی ہے اس کی عالم صغیر میں ایک مثال ہے اور عالم صغیر سے مراد انسان کا بدن ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۞ (التین)

بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) انسان کے حواس چمکنے والے ستاروں سے اشرف ہیں، سمع اور بصر مدرکات کے ادراک میں سورج اور چاند کے قائم مقام ہیں اور اس کے اعضاء بوسیدگی کی حالت میں زمین کی جنس سے مٹی ہو جاتے ہیں۔ اس میں پانی کی جنس سے رگیں اور دوسری بدن کی رطوبات ہیں اور ہوا کی جنس سے اس میں روح اور نفس ہے اور آگ کی جنس سے اس میں زرد پتہ ہے اور اس کی رگیں زمین کی نہروں کے قائم مقام ہیں اور اس کا جگر ان چشموں کی مانند ہے نہریں جن سے مدد حاصل کرتی ہیں اور رگیں جگر سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ اس کا مثانہ دریا کے قائم مقام ہے۔ بدن کے برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس میں جاتا ہے جس طرح نہریں دریا میں جاتی ہیں اور اس کی ہڈیاں پہاڑوں کی طرح ہیں جو زمین کے کیل ہیں اور اس کے اعضاء، درختوں کی طرح ہیں جس طرح ہر درخت کے پتے ہوتے ہیں یا پھل ہوتے ہیں اسی طرح ہر عضو کا فعل یا اثر ہوتا ہے اور بال بدن پر نباتات اور گھاس کی مانند ہیں پھر انسان اپنی زبان سے ہر حیوان کی آواز کو حکایت کرتا ہے اور اپنے اعضاء کے ساتھ ہر حیوان کے کام کو حکایت کرتا ہے۔ یہ عالم صغیر، عالم کبیر کے ساتھ مخلوق ہے صانع واحد کا پیدا کردہ ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ۞

''اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں ایسی چیز کی خبر دی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت اور عظیم سلطانی پر دلیل تھی۔ تو آپ نے بتایا کہ ان آیات قاہرہ کے باوجود ذوی عقول میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا مدمقابل بناتے ہیں۔ انداد کا

واحد ند ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ اس طرح عبادت کرتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے حالانکہ وہ عاجز ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے بتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: انداد سے مراد وہ رؤساء ہیں جن کی پیروی کی جاتی تھی وہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔ یُحِبُّوْنَهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق اصل پر ہے اور پہلے قول کے مطابق ضمیر بتوں کے لئے ہے۔ یہ غیر اصل پر ہے۔ ابن کیسان اور زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ محبت میں بتوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان برابری کرتے ہیں (1)۔ ابو اسحٰق نے کہا یہ صحیح قول ہے اور اس کی صحت پر دلیل وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ہے۔

ابو رجاء نے یحبونهم یاء کی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس طرح جہاں بھی قرآن میں آیا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حببت الرجل فهو محبوبٌ۔ فراء نے کہا: ابو تراب نے کہا:

احب لحبها السودان حتی حببت لحبها سود الکلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے کالے لوگوں سے محبت کرتا ہوں حتیٰ کہ اس کی محبت کی وجہ سے کالے کتوں سے بھی محبت کرتا ہوں۔

اور مَنْ، من یتخذ میں مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور یتخذ واحد کا صیغہ من کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ اور غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یتخذون بھی جائز ہے اور یُحِبُّوْنَهُمْ معنی کے اعتبار سے ہے اور یحبهم لفظ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ یتخذ میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی محبین کے معنی میں ہے۔ اگر تو چاہے تو انداد کی نعت بنادے یعنی محبوبة کے معنی میں۔ کحب میں کاف محذوف کی صفت ہے یعنی یحبونهم حبًا کحب اللہ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی بت پرست جتنی اپنے بتوں اور تابعین اپنے متبوعین سے محبت کرتے ہیں مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان سے محبت کرتا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ پس جو محبت کی وجہ سے اس کی محبت کی گواہی دیتا ہے اس کی محبت اتم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ: 54) مومنین کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی مومنین سے محبت کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ اہل مدینہ اور اہل شام کی قراءت تا کے ساتھ ہے۔ اہل مکہ، اہل کوفہ اور ابو عمرو نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اس آیت میں اشکال اور حذف ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کا معنی ہے اگر ظالم دنیا میں آخرت کا عذاب دیکھ لیتے تو جان لیتے جب وہ اسے دیکھتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اور اس بنا پر یری بصر کی رؤیت پر محمول ہوگا۔ (2)

نحاس نے معانی قرآن میں کہا ہے: یہ قول وہ ہے جس پر اہل تفسیر کا نظریہ ہے اور اعراب القرآن میں فرمایا: محمد بن یزید

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 235، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: یہ تفسیر جو ابو عبید نے کی ہے بعید ہے۔ اس کی عبارت اس میں عمدہ نہیں ہے کیونکہ کلام مقدر کی جاتی ہے۔ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ گویا اس نے اس کو مشکوک بنایا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب کیا ہے۔ لیکن تقدیر عبارت اس طرح ہے اور یہی اخفش کا قول ہے...... ولو یری الذین ظلموا ان القوۃ للہ۔ اور یری بمعنی یعلم ہے یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی حقیقت اور اس کے عذاب کی شدت کی حقیقت کو جان لیتے تو حقیقۃً وہ جان لیتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ والذین، یری کا فاعل ہے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے تاکہ انہیں خدا بنانے کا نقصان واضح ہو جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (انعام: 30) وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ (انعام: 27) اور لو کا جواب نہیں ہے۔

زہری اور قتادہ نے کہا: اضمار، وعید کے لئے سخت ہے اس کی مثال، قائل کا قول ہے: لو رایت فلاناً والسیاط تاخذہ!۔ اور جنہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی تقدیر یہ ہے: ولو تری یا محمد الذین ظلموا۔ یعنی اے پیارے محمد! ﷺ اگر تم ظالموں کو اس حال میں دیکھتے جب وہ عذاب کو دیکھتے اور اس سے گھبراہٹ کے وقت انہیں دیکھتے اور اس کی عظمت کو دیکھتے تو یہ اقرار کرتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے۔ پس جواب اس طریق پر مضمر ہے اور وہی ان کا عامل ہے۔ دوسری تقدیر یہ ہے کہ اے محمد! ﷺ اگر آپ ظالموں کو اس کے عذاب دیکھنے اور اس سے گھبراہٹ کی حالت میں دیکھتے تو آپ جان لیتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو جان لیا تھا لیکن خطاب آپ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ ان میں سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے علم کی تقویت کے لئے اس قسم کا مشاہدہ کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ معنی ہونا بھی جائز ہے۔ اے محمد! ﷺ اس ظالم کو فرمایئے۔ بعض نے فرمایا: ان مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا سیبویہ نے استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے۔

واغفر عوراء الكريم ادخاره و اعرض عن شتم اللئيم تكرما

یہ ادخار، لادخار کے معنی میں ہے۔ معنی ہے کہ اے محمد! ﷺ اگر آپ ظالموں کو عذاب دیکھنے کی حالت میں دیکھتے کیونکہ قوت اللہ کے لئے ہے تو آپ ان کی سزا کا مبلغ جان لیتے اور جو عذاب ان پر نازل ہوا اس کو عظیم جانتے۔ اذ، داخل ہوا ہے جب کہ ماضی میں امر ثابت کرنے کے لئے آتا ہے مقصود امر کو قریب ثابت کرنا اور اس کے وقوع کی تصحیح ہے۔ ابن عامر نے یُرون یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، یعقوب، شیبہ، سلام اور ابو جعفر نے اِنَّ القوۃ اور اِنَّ اللہ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نئے کلام کے اعتبار سے یا قول کی تقدیر پر۔ یعنی اگر تو ظالموں کو دیکھے جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ قوت اللہ کے لئے ہے بخلاف معتزلہ کے قول کے وہ صفات قدیمہ کے معانی کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

''(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں

گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا اس سے مراد سردار اور رؤساء ہیں وہ کفر پر اپنے متبعین سے براءت کریں گے۔ حضرت قتادہ، عطا اور ربیع سے مروی ہے۔ قتادہ اور سدی کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد گمراہ کرنے والے شیاطین ہیں جو انسانوں سے براءت کریں گے(1)۔ بعض نے فرمایا: یہ ہر متبوع میں عام ہے وَ رَاَوُا الْعَذَابَ یعنی اتباع کرنے والے اور جن کی اتباع کی گئی۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے وقت۔ بعض نے فرمایا: آخرت میں پیشی اور سوال کے وقت۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں ہوں گے۔ وہ موت کے وقت اس ذلت کو دیکھیں گے جس کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے اور آخرت میں عذاب الیم کا مزہ چکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اسباب سے مراد وہ تمام تعلقات ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا سے ملتے ہیں خواہ وہ رشتہ داری کے تعلقات ہیں یا کوئی اور۔ یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ اسباب کا واحد سبب ہے اور اس کا معنی حلق ہے۔ السبب کا اصل معنی وہ رسی ہے جس کے ساتھ کسی شے کو باندھا جاتا ہے اور پھر اسے کھینچا جاتا ہے۔ پھر ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کو کھینچے۔

سدی اور ابن زید نے کہا: اسباب سے مراد اعمال ہیں اور سبب کا معنی کنارہ بھی ہے۔ اس سے زہیر کا قول ہے:

و من هاب اسباب المنايا ينلنه　　و لو رام اسباب السماء يُسَلّم

جو موت کے اسباب سے ڈرا انہوں نے اسے پالیا۔ اگر وہ آسمانی اسباب کا قصد کرتا تو سلامت رہتا۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے وہ (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے۔ یونہی دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں گے ان کے لئے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً، اَنّ محل رفع میں ہے یعنی اگر ہمارے لئے لوٹنا ہوتا۔ فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ یہ تمنا کا جواب ہے۔

الکرۃ، سے مراد ایک حالت کی طرف لوٹنا ہے یعنی اتباع کرنے والے کہیں گے: اگر ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا جاتا حتیٰ کہ ہم نیک عمل کرتے اور ان سے بری ہو جاتے۔ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ اس کا حال کے اعتبار سے منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ متبرئین اس کی تقدیر ہوگی۔ التبرء کا معنی ہے: جدا ہونا۔

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 193، جلد 1 (دار الفکر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ کاف محل رفع میں ہے یعنی امر اسی طرح ہے یعنی جس طرح اللہ انہیں عذاب دکھائے گا اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا یُرِیْهِمُ اللّٰهُ بعض علماء نے فرمایا یہ آنکھ سے دیکھنا ہے۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے پہلا مفعول ھم ضمیر ہے اور دوسرا اَعْمَالَهُمْ ہے اور حَسَرٰتٍ حال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رویۃ قلب سے ہو اس صورت میں حَسَرٰتٍ تیسرا مفعول ہوگا۔ اَعْمَالَهُمْ۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب کیا پس ان کے لئے ان اعمال کی وجہ سے دوزخ واجب ہے، حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں جن کو انہوں نے چھوڑ دیا، پس وہ جنت سے محروم ہو گئے۔ اس قول میں احادیث روایت کی گئی ہیں۔ سدی نے کہا: ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اسے دیکھیں گے اور جنت میں اپنے گھروں کو دیکھیں گے (1)۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے تو انہیں وہ گھر ملتے، پھر ان کے گھر مومنین کے درمیان تقسیم کئے جائیں گے تو اس وقت وہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ اعمال ان کی طرف مضاف کئے گئے ہیں کیوں کہ انہیں ان کا حکم دیا گیا تھا اور اعمال فاسدہ کی ان کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ انہوں نے ان کا ارتکاب کیا۔ الحسرة کی جمع الحسرات ہے جیسے تمرة اور تمرات، جفنة اور جفنات، شهوة اور شهوات۔ یہ اس صورت میں ہے جب اسم ہو۔ جب تو اسے نعت بنائے گا تو تو اس کو ساکن کرے گا جیسے ضخمة و ضخمات، عبلةٌ و عبلات۔ الحسرة فوت شدہ چیز پر اعلیٰ درجہ کی ندامت کو کہتے ہیں۔ التحسر کا معنی افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: حسرت علیه، سین کے کسرہ کے ساتھ۔ احسر حسرا و حسرةً۔ یہ اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو تھک جائے اور اس کی قوت ختم ہو جائے جیسے اونٹ تھک جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حسر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: کھل جانا، اسی سے الحاسر فی الحرب ہے وہ شخص جنگ میں جس کے پاس زرہ نہ ہو۔ الانحسار کا معنی انکشاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ یہ کفار کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی دلیل ہے، کفار دوزخ سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ یہ اہل سنت کے علماء کا قول ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (اعراف: 40) (اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں)۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖ٘ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۶۸﴾

”اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثقیف، خزاعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر جانوروں میں سے کچھ حرام کئے تھے۔ لفظ عام ہے اور یہاں طیب سے

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 194، جلد 1 (دار الفکر)

مراد حلال ہے یہ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکید ہے۔ یہ طیب کے بارے میں امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: طیب سے مراد ہے جس سے لذت حاصل کی جائے۔ یہ تنویع ہے اسی وجہ سے گندے حیوان کے کھانے سے منع کیا گیا ہے(1)۔ اس کا بیان سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاءاللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَلٰلًا طَیِّبًا، حَلٰلًا حال ہے۔ بعض نے فرمایا: مفعول ہے حلال کو حلال کہنے کی وجہ یہ ہے اس سے منع کی گرہ کھل جاتی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: نجات تین چیزوں میں ہے: حلال کھانا، فرائض ادا کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا، ابوعبداللہ ساجی نے کہا..... اس کا نام سعید بن زید تھا...... پانچ خصال کے ساتھ علم مکمل ہوتا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت (۲) حق کی معرفت (۳) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص (۴) سنت پر عمل (۵) حلال کھانا۔ اگر ان میں سے ایک خصلت بھی نہ پائی جائے تو عمل بلند نہیں ہوتا۔ حضرت سہل نے کہا: حلال کھانا ہو ہی نہیں سکتا مگر علم کے ساتھ۔ اور مال حلال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ چھ چیزوں سے پاک ہو: سود، حرام، السحت یہ مجمل اسم ہے..... خیانت، مکروہ اور شبہ۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ نہی ہے۔ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ، خُطُوٰتِ جمع ہے خَطْوَۃ اور خُطْوَۃ کی، دونوں کا معنی ایک ہے۔ فراء نے کہا الخطوات خطوۃ کی (خاء کے فتحہ کے ساتھ) جمع ہے خُطْوَۃ (خاء کے ضمہ کے ساتھ) دو قدموں کے درمیان کے فاصلہ کو کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: جمع قلت خَطْوَات، خُطُوَات اور خَطَوَات ہے اور جمع کثرت خطا ہے اور الخطوۃ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) مصدر ہے۔ جمع خطوات اور خطاء ہے جیسے رکوۃ اور رکاء ہے۔ امرء القیس نے کہا:

لها وثبات كوثب الظباء فوادٍ خطاءٌ و وادٍ مطر

ابوالسماء العدوی اور عبید بن عمیر نے خطوات (خا اور طا کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، قتادہ، اعرج، عمرو بن میمون اور اعمش نے خطؤات خا اور طا کے ضمہ اور واؤ پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: قراءت کرنے والوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خطیئۃ کی جمع ہے یہ الخطاء سے ہے الخطو سے نہیں ہے۔ جمہور کی قراءت پر معنی یہ ہوگا: شیطان کے پیچھے نہ چلو اور اس کے اعمال پر نہ چلو۔ اور جس عمل کے بارے شرع کا حکم وارد نہیں وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: خطوات الشیاطین سے مراد شیطانی اعمال ہیں۔ مجاہد نے کہا: شیطان کی خطائیں ہیں (2)۔ سدی نے کہا: اس سے مراد شیطان کی اطاعت ہے۔ ابومجلز نے کہا: یہ گناہوں کی نذریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ سنن اور شرائع کے علاوہ تمام بدعات اور گناہوں کو شامل ہے۔ شیطان کے بارے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ شیطان دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے۔ عقلمند پر واجب ہے کہ وہ اس دشمن سے بچے جس کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ظاہر ہے۔ اس نے اپنی پوری عمر انسان کے احوال کے خراب کرنے میں خرچ کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچنے کا حکم فرمایا۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری، صفحہ 92، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

ارشادفرمایا: وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ) ''وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اور فرمایا: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ (البقرہ:268)

شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (النساء)

''چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ)

''یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے اور روک دے تمہیں یادالٰہی سے اور نماز سے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (القصص) ''وہ دشمن کھلا گمراہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (فاطر)

''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں''۔

یہ ڈرانے میں حد ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: شیطان نچلی زمین میں باندھا ہوا ہے جب وہ حرکت کرتا ہے تو زمین میں ہر دو شخصوں یا زیادہ کے درمیان شر اس کے تحرک سے ہوتا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو مالک اشعری کی حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے: میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس کی مثال اس شخص کی مثل ہے جس کے پیچھے دشمن جلدی سے نکلتا ہے حتیٰ کہ وہ شخص ایک محفوظ قلعہ میں آتا ہے اور دشمنوں سے اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ اسی طرح بندہ شیطان سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

## اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''وہ تو حکم دیتا ہے فقط تمہیں برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ۝ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ، سوء کو سوء اس لئے کہا جاتا ہے: آدمی اپنے مقابل کو برے

1۔ جامع ترمذی، ابواب الامثال، باب ما جاء فی مثل الصلوٰۃ والصیام، صفحہ 110-109، جلد 2 (وزارت تعلیم)

انجام سے پریشان کرتا ہے۔ سوء، ساء یسوٗ سوءً ا اور مساءۃً کا مصدر ہے، جب کوئی کسی کو پریشان کرے۔ سؤتہ فسیئ جب اس نے اسے پریشان کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (الملک: 27)

شاعر نے کہا:

ان یك هذا الدهر قد ساءنی فطالما قد سرنی الدهر

الامر عندی فیهما واحد لذاك شكر و لذاك صبر

اگر اس زمانہ نے مجھے پریشان کیا ہے تو اس نے مجھے خوش بھی کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں حالتوں میں معاملہ ایک ہے۔ خوشی کے لئے شکر ہے اور تکلیف اور پریشانی کے لئے صبر ہے۔

الفحشاء برے منظر کو کہتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

و جید كجید الریم لیس بفاحش

(اور اس کی گردن، ہرن کی گردن کی طرح ہے وہ بری نہیں ہے۔)

پھر یہ لفظ برے معانی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ شرع ہی کسی چیز کو حسین اور قبیح بناتی ہے، ہر وہ چیز جس سے شریعت نے منع فرمایا وہ فحشاء میں سے ہے۔ مقاتل نے کہا: قرآن میں فحشاء کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد زنا ہے سوائے اس ارشاد کے اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ: 268) یہاں فحشاء سے مراد زکاۃ نہ دینا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس بناء پر بعض علماء نے کہا السوٗ وہ جرم ہے جس میں حد نہیں اور الْفَحْشَآءِ وہ گناہ ہے جس میں حد ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ طبری نے کہا: کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انہوں نے بحیرہ اور سائبہ میں سے حرام کی تھیں اور انہیں اپنی طرف سے شرع بنایا تھا (1)۔ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا، بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ۝

''اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 93، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ، هم ضمیر سے مراد کفار عرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ طبری کا قول ہے: لَهُمُ میں ضمیر، یا ایھا الناس میں جو الناس ہے اس کی طرف راجع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: من یتخذ من دون الله میں جو مَنْ ہے اس کی طرف راجع ہے(1) اور اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قول و عمل میں قرآن کی اتباع کرو۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا، اَلْفَيْنَا کا معنی ہے ہم نے پایا۔

شاعر نے کہا:

فَالفیتہ غیر مستعتب ولا ذاکر الله الا قلیلاً(2)

میں نے اسے نہ تو یہ کرنے والا اور نہ الله کا ذکر کرنے والا پایا مگر تھوڑا۔

**مسئلہ نمبر 2**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ الف استفہام کے لئے ہے اور واو کو فتحہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ واو عاطفہ ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے کیونکہ فساد کی غایت التزام میں یہ ہے کہ وہ کہیں ہم اپنے آباء کی پیروی کریں گے اگرچہ وہ نہ بھی سمجھتے تھے۔ پس انہوں نے اپنے نظریہ سے چمٹے رہنے اور اس کے التزام کو ثابت کیا کیونکہ یہی ان کے آباء کی حالت تھی۔

**مسئلہ**: ہمارے علماء نے فرمایا: اس آیت کے الفاظ کی قوت، تقلید کے ابطال کا تقاضا کرتی ہے اس کی مثل یہ آیت بھی ہے۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ: 104) (جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے الله نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف تو کہتے ہیں: کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو)۔

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت اپنے ماقبل سے متصل ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ الله تعالیٰ نے عربوں کی جہالت کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے اپنی بیوقوفانہ آراء سے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ جانوروں کی حرمت کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے حجت اس سے پکڑی کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس پر انہوں نے اپنے آباء کو پایا اور اس میں ان کی اتباع کی اور اس کو چھوڑ دیا جو الله تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا اور جس کا اس نے اپنے دین میں حکم دیا۔ پس لھم میں ضمیر دونوں آیتوں میں کفار عرب کی طرف لوٹے گی۔

**مسئلہ نمبر 3**: بعض علماء نے اس آیت کی وجہ سے تقلید کی مذمت کی ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے کفار کی مذمت فرمائی کیونکہ انہوں نے باطل میں اپنے آباء کی اتباع کی تھی اور کفر و معصیت میں ان کی پیروی کی تھی۔ یہ مذمت تقلید باطل میں تو صحیح ہے لیکن حق میں تقلید کرنا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور مسلمانوں کی عصمتوں میں سے ایک عصمت (حفاظت) ہے۔ جاہل جو خود غور و فکر سے قاصر ہوتا ہے وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہے۔ علماء کا اصول کے مسائل میں اس کے جواز میں اختلاف ہے جیسا کہ آگے آئے گا اور فروعی مسائل میں اس کا جواز صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: علماء کے نزدیک تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر دلیل کے قبول کرنا۔ اس معنی کے اعتبار سے

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 94، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ) 2۔ ایضاً صفحہ 95، جلد 2

جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں غور و فکر کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قبول کیا وہ مقلد ہے اور جس نے معجزات میں غور و فکر کر کے آپ کے قول کو قبول کیا وہ مقلد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو کسی کے قول کی صحت کو نہیں جانتا اس کے فتویٰ کی صحت کا اعتقاد کرنا تقلید ہے۔ لغت میں یہ قلادۃ البعیر (اونٹ کا ہار) سے ماخوذ ہے۔ عرب کہتے ہیں: قلدت البعیر، جب تو اس کے گلے میں ایسی رسی ڈالے جس کے ساتھ اس کو چلایا جائے۔ گویا مقلد اپنے تمام امور اپنے قائد کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

و قلدوا امرکم لله دژکم ثبت الجنان بامر الحرب مضطلعاً

**مسئلہ نمبر 5**: تقلید یہ تو علم کا طریق ہے، نہ علم تک یہ پہنچانے والی ہے، نہ اصول میں ہے، نہ فروع میں ہے۔ یہ جمہور عقلاء اور علماء کا قول ہے جبکہ حشویہ اور ثعلبیہ جہال سے حکایت ہے کہ یہ (تقلید) حق کی معرفت کا ذریعہ ہے اور یہ واجب ہے اور غور و فکر حرام ہے۔ اور ان پر ہمارے علماء نے جو حجت پیش کی ہے وہ کتب اصول میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: عام آدمی پر فرض ہے کہ وہ احکام کے استنباط میں احکام کے اصول میں مشغول نہ ہو کیونکہ اسے اس کی اہلیت نہیں ہے اور یہ حکم اس کے لئے ہر اس دینی معاملہ میں ہے جس کو وہ خود نہیں جانتا اور وہ محتاج ہوتا ہے اپنے زمانہ اور اپنے شہر کے بڑے عالم کی طرف جانے کا...... پس وہ ہر نئے مسئلہ کو اس سے پوچھے اور اس کے فتویٰ کی پیروی کرے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿النحل﴾ (پوچھو اہل علم سے اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے)۔

اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم سے پوچھنے کی کوشش کرے تاکہ اکثر لوگوں کا اس پر اتفاق واقع ہو اور عالم پر بھی فرض ہے کہ وہ کسی بھی جدید مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی تقلید کرے جس میں دلیل و نظر کی وجہ اس پر مخفی ہو گئی ہے وہ اس میں غور و فکر کرنے کا ارادہ کرے حتیٰ کہ وہ مطلوب تک پہنچ جائے۔ پس اس کے پاس وقت تنگ ہو اور اسے عبادت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا حکم کے ضیاع کا خوف ہو، خواہ وہ دوسرا مجتہد صحابی ہو یا کوئی اور ہو۔ قاضی ابوبکر اور محققین کی جماعت کا یہی قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: ابن عطیہ نے کہا: عقائد میں تقلید کے ابطال پر امت کا اجماع ہے (1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی، ابو عمرو عثمان بن عیسیٰ بن درباس الشافعی جیسے علماء کا قول اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابن درباس نے اپنی کتاب ''الانتصار'' میں کہا ہے کہ بعض علماء نے کہا: توحید کے امر میں تقلید جائز ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (زخرف: 22) اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنے آباء کی تقلید پر اور رسل کی اتباع ترک کرنے پر ان کی مذمت کی ہے جیسے اہل بدعت نے اپنے بڑوں کی تقلید کی اور دین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کیا کیونکہ ہر مکلف پر توحید کے امر کا سیکھنا فرض ہے اور ضروری ہے اور یہ کتاب و سنت سے ہی حاصل ہوتا ہے جس طرح آیت توحید میں ہم نے بیان کیا تھا۔ اَللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿الحج﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 238، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن درباس نے کہا: اکثر اہل زیغ کا قول یہ ہے کہ جو کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ مقلد ہے۔ یہ ان کی خطا ہے بلکہ یہ ان کے زیادہ لائق ہے ان کے مذہب کے مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے رہنماؤں اور بڑوں کے قول کو قبول کیا جن میں انہوں نے الله کی کتاب اور رسول الله کی سنت اور اجماع صحابہ کی مخالفت کی ہے۔ پس یہ ان میں داخل ہیں جن کی الله تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مذمت کی ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (سورۂ احزاب) (اے ہمارے رب ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی پس ان ظالموں نے ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے الخ)۔

اور الله تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (زخرف) پھر الله تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا۔ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (زخرف) (اس نبی نے فرمایا: اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا: ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فانتقمنا منهم پس ہم نے انتقام لیا ان سے۔ الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہدایت ان احکام میں ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے۔

اہل اثر کا قول ان کے عقائد کے بارے میں نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ائمہ اور آباء اور لوگوں کو کتاب وسنت اور صالحین کے اجماع پر پایا۔ اور کفار نے کہا: ہم نے اپنے آباء کو پایا اور ہم نے اپنے سادات اور بڑوں کی ایک راستہ میں اطاعت کی۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنی اطاعت کو قران اور متابعت رسول کی طرف منسوب کیا جبکہ کافروں نے اپنے جھوٹ کو اہل باطل کی طرف منسوب کیا پس وہ گمراہی میں زیادہ ہو گئے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ الله تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ ارشاد فرمایا: اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ (یوسف) (میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے الله پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں اور میں تو پیروکار بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں الله تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو (توحید پر ایمان) تو الله تعالیٰ کا خاص احسان ہے)۔

جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء وحی کے متبعین تھے اور یہی دین خالص ہے جس کو الله تعالیٰ نے پسند کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آباء کی پیروی کرنا ان کی مدح کی صفات سے ہے۔ اور آپ وہ نہیں لائے جو وہ لائے تھے، اعراض کا ذکر اور اعراض کا جواہر کے ساتھ تعلق اور ان کا ان سے بدلنا پس یہ دلیل ہے کہ ان میں ہدایت نہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والوں میں ہدایت ہے۔

ابن حصار نے کہا: ان کے ساتھ تلفظ دو سو سال بعد مامون کے زمانہ میں ظاہر ہوا تھا جب پہلی کتب کے ترجمے کئے گئے اور ان میں عالم کے قدم اور حدوث میں اختلاف ظاہر ہوا اور جوہر اور اس کا ثبوت، عرض اور اس کی ماہیت میں اختلاف ظاہر ہوا۔

پس بدعتیوں اوران لوگوں نے جن کے دلوں میں کجی تھی، انہوں نے ان اصطلاحات کی حفاظت کی طرف جلدی کی اوران کے ذریعے اہل سنت پر اعراب کا قصد کیا اور اہل ملت میں سے کمزور لوگوں پر شبہات کو داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ معاملہ اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ بدعت غالب آئی اور بدعتی ایک گروہ بن گیا اور سلطان پر معاملہ ملتبس ہو گیا حتیٰ کہ امیر نے خلق قرآن کا قول کیا اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا اور امام احمد بن حنبل کو اس کی مخالفت پر سزا دی۔ اہل سنت کے علماء شیخ ابوالحسن اشعری، عبداللہ بن کلاب اور ابن مجاہد، محاسبی اور دوسرے ان جیسے علماء نے ان کو جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور بدعتیوں کے ساتھ ان کی اصطلاحات میں غور وخوض کیا پھر ان کے ساتھ جنگ کی اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ انہیں قتل کیا جو مسلمان کتاب وسنت کو پکڑنے والے تھے اور ملحدین کے شبہات سے اعراض کرنے والے تھے۔ انہوں نے جوہر اور عرض میں غور نہ کیا اور اسی پر سلف صالحین تھے۔

میں کہتا ہوں: جس نے اب متکلمین کی اصطلاح میں غور وفکر کیا حتیٰ کہ اس کے ساتھ دین کا دفاع کیا اس کا مرتبہ انبیاء کے مرتبہ کے قریب ہے...... اور جو غالی متکلمین میں سے ان لوگوں کے راستہ پر چلا جنہوں نے اثر کو مضبوطی سے پکڑا اور علم کلام کی کتب کے درس پر برانگیختہ کیا اور وہ حق کو صرف ان اصطلاحات کے واسطہ سے پہچانتا تھا تو وہ مذموم ہو گیا کیونکہ انہوں نے سابقہ ائمہ کے راستہ کو چھوڑ دیا...... دلیل اور حجت کے ساتھ جھگڑنا یہ تو قرآن میں واضح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۱۷۱**

”اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے“۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کو وعظ کرنے والے اور ان کو دعوت دینے والے کو اس چرواہے کے ساتھ تشبیہ دی جو بکریوں اور اونٹوں کو آواز دیتا ہے...... وہ داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے...... اور وہ جانور صرف اس کی آواز اور ندا کو سنتے ہیں اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اسی طرح حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سدی، زجاج، فراء اور سیبویہ نے اس کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ یہ انتہائی ایجاز کے ساتھ کلام ہے(1)۔ سیبویہ نے کہا: ان کفار کو پکارنے والے سے تشبیہ نہیں دی بلکہ جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیری مثال اور کفار کی مثال ان جانوروں کو آواز دینے والے اور ان جانوروں کی ہے جو سمجھتے نہیں ہیں۔ پس معنی کی دلالت کو حذف کیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے کہ کفار کی اپنے پتھر کے خداؤں کو پکارنے کی مثال رات کے درمیان میں چیخنے والے کی ہے۔ پس صدیٰ اس کو جواب دیتی ہے وہ ان کو آواز دیتا ہے جو سنتے نہیں ہیں اور وہ ایسا جواب دیتا ہے جس کی حقیقت نہیں ہے اور نفع بخش نہیں ہے(2)۔ قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے کفار کا انہیں پکارنا جو ان کی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں جس طرح چرواہا اپنی بکریوں کو آواز دیتا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ طبری نے کہا: اس سے مراد کافروں کا اپنے بتوں کو پکارنے کی مثال اس شخص کی ہے جو دور سے کسی چیز کو پکارتا ہے اور دوری کی وجہ سے

1۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری آیت ہذا　　2۔ ایضاً

اس کی آواز نہیں سنی جاتی۔ پس پکارنے والے کے لئے صرف پکار اور ندا ہے جو اسے مشقت اور تھکن میں ڈالتی ہے۔ ان تینوں تاویلات میں کفار کو پکارنے والے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بتوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ النعیق کا معنی بکریوں کو جھڑکنا اور ان کو آواز دینا ہے۔ کہا جاتا ہے: نعق الراعی بغنمہ ینعق نعیقا و نعاقاً و نعقاناً۔ یعنی چرواہا اپنی بکریوں پر چلایا اور انہیں جھڑکا۔ اخطل نے کہا:

انعق بضانك يا جرير فانما منتك نفسك فى الخلاء ضلالاً

شاعر نے یہاں آواز دینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا۔ یعنی اے جریر! اپنی بکریوں کو آواز دے۔

قتبی نے کہا: جریر بھیڑیں چرانے والا نہیں تھا۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بنی کلیب کو بھیڑیں چرانے کی وجہ سے عار دلائی جاتی تھی اور جریر ان میں سے تھا، وہ ان کی جہالت میں تھا۔ عرب جہالت میں بکریوں کے چرواہے سے مثال دیتے تھے وہ کہتے تھے: اجھل من راعی الضان، وہ بھیڑیں چرانے والے سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ قتبی نے کہا: جو اس آیت کا یہ معنی بیان کرتا ہے یہ اس کا اپنا مذہب ہے مگر ہماری معلومات کے مطابق علماء میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔

ندا بعید کے لئے اور دعا قریب کے لئے ہوتی ہے اسی وجہ سے نماز کی اذان کو ندا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دور والوں کے لئے ہوتی ہے۔ ندا کو کبھی نون کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے جبکہ اصل نون پر کسرہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو تشبیہ دی کہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

''اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

یہ پہلے امر کی تاکید ہے اور یہاں تفضیل کے لئے مومن کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا اور کھانے سے مراد ہر اعتبار سے انتفاع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اکل سے مراد معروف کھانا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اسی بات کا حکم فرمایا جو اس نے رسولوں کو فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (المومنون) اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بے شک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ اور ارشاد فرمایا: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ بال ہے، غبار آلود ہے وہ ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور کہتا ہے: یارب یارب! جبکہ اس کا کھانا حرام ہے اور مشروب حرام ہے اور اس کا لباس

حرام ہے اور حرام کی غذا دی گئی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی (1)۔ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ شکر کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞

''اس نے حرام کیا تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام۔ لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ، اِنَّمَا کا کلمہ حصر کے لئے وضع کیا گیا ہے نفی اور اثبات کو متضمن ہے، خطاب جس کو شامل ہوتا ہے اسے ثابت کرتا ہے اور ماعدا کی نفی کرتا ہے یہاں تحریم کی حصر کی گئی ہے خصوصا تحلیل کے بعد آئی ہے۔ پہلے فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اس میں مطلقا اباحت ہے پھر حرام کا ذکر اِنَّمَا کے کلمہ کے ساتھ کیا۔ پس یہ دونوں قسموں کے ایجاب کا تقاضا ہے۔ پس کوئی حرام اس آیت سے خارج نہیں۔ یہ آیت مدنی ہے، اس کو دوسری آیت کے ساتھ مؤکد کیا۔ روایت ہے کہ یہ عرفہ میں نازل ہوئی۔ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ ...... الایۃ (انعام: 45) آپ فرمایئے میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے۔ پس اول و آخر بیان مکمل ہوا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے اس پر مزید کلام سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 2**: اَلْمَيْتَةَ اس کو حرم کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اور ما کافہ ہے اور اسے الذی کے معنی میں کرنا بھی جائز ہے جو لکھنے میں جدا ہوتا ہے اور ان کی خبر کی حیثیت سے المیتۃ، الدم اور لحم الخنزیر کو رفع دیا جائے گا۔ یہ ابن ابی عبلہ کی قراءت ہے اور حرم میں ضمیر الذی کی طرف لوٹے گی ...... اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ (طٰہٰ: 69) ابو جعفر نے حُرِمَ حاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعد والے اسماء کو رفع دیا گیا ہے یا نائب فاعل کی حیثیت سے یا ان کی خبر کی حیثیت سے۔ ابو جعفر بن قعقاع نے المیتۃ (2) تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ طبری نے کہا ہے: لغوی علماء کی جماعت نے کہا: میت اور میت، تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ ابو حاتم وغیرہ نے کہا: جو فوت ہو چکا ہو اس میں میت اور میت کہا جاتا ہے اور جو ابھی تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے میت تخفیف کے ساتھ نہیں بولا جاتا اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر: 30)۔ شاعر نے کہا:

لیس من مات فاستراح بمیت انما المیت میت الاحیاء

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، صفحہ 326، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 239، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جو فوت ہو گیا اور راحت پا گیا وہ میت نہیں میت تو زندوں کا میت ہے۔

جب تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے کسی نے تخفیف کے ساتھ نہیں پڑھا، مگر جو بزی نے ابن کثیر سے روایت کیا ہے و ما ھو بمیت اس سے مشہور تثقیل ہے۔ رہا شاعر کا قول:

اذا ما مات میت من تمیم فسرك ان یعیش فجئ بزاد

جب تمیم میں سے کوئی میت مرتا ہے تو تجھے خوش کرتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زادراہ لایا جائے۔

میں مکمل ہجو نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے حقیقتاً میت کا ارادہ کیا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے شارف الموت (قریب الموت) کا ارادہ کیا ہے۔ پہلا معنی اشہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** الْمَیْتَةَ جو چیز ذبح کی جاتی ہے اگر ذبح کے بغیر اس کی روح نکل جائے تو اسے المیتة کہتے ہیں اور جو چیز کھائی نہیں جاتی اس کی ذبح اس کی موت کی طرح ہے جس طرح درندے وغیرہ ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور سورۂ انعام میں بھی آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** یہ آیت عام ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے ساتھ تخصیص داخل ہوئی ہے۔ ہمارے لیے دو مردے حلال کئے گئے ہیں: مچھلی اور مکڑی اور دو خون حلال کئے گئے ہیں: جگر اور تلی (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح عنبر (مچھلی) کے بارے میں حضرت جابر کی حدیث ہے۔ قرآن کا عموم اس کی سند کی صحت کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) (2) کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے اس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

اکثر اہل علم سمندر کے تمام جانور زندہ اور مردے کھانے کے جواز کے قائل ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے اور پانی کے خنزیر کے بارے میں جواب دینے سے توقف کیا ہے اور فرمایا: تم کہتے ہو: خنزیر۔ ابن القاسم نے کہا: میں اس سے بچتا ہوں اور میں اسے حرام خیال نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا کتاب کی تخصیص سنت (حدیث) سے کرنے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث کے ساتھ قرآن کی تخصیص جائز نہیں۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ کبھی اس آیت کی تخصیص پر صحیح مسلم کی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے (3)، فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سات غزوات میں شرکت کی، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکڑی کھاتے تھے۔ اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اسے کھایا جائے جیسے بھی وہ مرے پکڑنے سے یا خود بخود ابن نافع، ابن عبدالحکم اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 246 (وزارت تعلیم) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4013، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 826، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 152، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب اکل الجراد، حدیث 5071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حنیفہ (1) وغیرہما کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس دریائی جانور کو کھانے سے منع کیا ہے جو طبعی موت مر جائے کیونکہ وہ خشکی کے شکار سے ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ محرم جب اسے قتل کرے گا تو اس کی جزا دے گا۔ پس وہ ہرن کے مشابہ ہے۔ اشہب نے کہا: اگر وہ پاؤں یا پر کے کاٹنے کی وجہ سے مر جائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا کیونکہ یہ ایسی حالت تھی جس کے ساتھ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی نسل جاری ہو سکتی تھی۔ مکڑی کے حکم کا مزید بیان سورہ اعراف میں اس کے ذکر کے وقت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اختلاف ہے کیا میت سے نفع حاصل کرنا اور نجاسات میں سے کوئی فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ امام مالک کے اس مسئلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ کبھی فرمایا: ان سے نفع اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ کی (مردہ) بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں حاصل نہیں کی (1) (الحدیث) اور کبھی فرمایا: مردہ چیز ساری کی ساری حرام ہے، کسی اعتبار سے بھی اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اور نہ نجاستوں میں سے کسی نجاست سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ ناپاک پانی سے کھیتی کو سیراب کرنا اور کسی حیوان کو پلانا جائز نہیں اور جانوروں کو نجاستوں کا چارہ نہیں کھلایا جائے گا، مردار کتوں اور درندوں کو بھی نہیں کھلایا جائے گا۔ اگر حیوان ناپاک چیز کھائیں تو انہیں منع کیا جائے گا۔ اس قول کی وجہ کو خاص نہیں فرمایا۔ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ خطاب مجمل ہے، کیونکہ مجمل وہ ہوتا ہے جس کے ظاہر سے مراد سمجھی نہیں جاتی۔ عربوں نے اس فرمان حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (مائدہ:3) کا مراد سمجھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے "مردار کی کھال اور پٹھوں سے نفع نہ اٹھاؤ (2)"۔ اور یہ ارشاد آپ نے وصال سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔ ان اخبار کا بیان اور ان پر کلام سورہ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 7:** رہی وہ اونٹنی یا گائے یا بکری جو ذبح کی گئی اور اس میں مردہ بچہ تھا تو بغیر ذبح کیے اس کا کھانا جائز ہے مگر یہ کہ وہ زندہ نکلے تو اسے ذبح کیا جائے گا۔ اس کے لئے اس کے نفس کا حکم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ بچہ جب ذبح کے بعد مردہ نکلا تو وہ اس جانور کے اعضاء میں سے ایک عضو کے قائم مقام ہے۔ اور اس کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بکری بیچے اور اس کے پیٹ کی چیز کا استثناء کرے تو جائز نہیں ہے جس طرح اگر کوئی جانور کے کسی عضو کی استثناء کرے تو جائز نہیں ہوتا۔ جو کچھ جانور کے پیٹ میں ہوتا ہے وہ دوسرے تمام اعضاء کی طرح اس کا تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لونڈی کو آزاد کرے جبکہ اس کے پیٹ والی چیز پر آزادی کو واقع نہ کرے تو بھی وہ آزاد ہو جائے گا لیکن اگر بچہ ماں سے جدا ہو تو وہ بیع، عتق (آزادی) میں تابع نہ ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گائے اور بکری کے بارے پوچھا گیا جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور اونٹنی جسے نحر کیا جاتا ہے اور اس کے پٹ میں مردہ بچہ ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 158، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 1397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب روی ان لاینتفع باھاب المیتة، حدیث 3598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(1) امام ابوحنیفہ کی یہ رائے نہیں

فرمایا: اگر تم چاہو تو اس مردہ بچے کو کھاؤ کیونکہ اس کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہے۔ ابوداؤد نے اس کا معنی حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے (1)، یہ نص ہے جو احتمال نہیں رکھتی ہے اس کا مزید بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 8:** امام مالک سے مردار کی کھال کے متعلق روایات مختلف ہیں، کیا اس کو دباغت کے ساتھ پاک کیا جائے گا یا نہیں؟ امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک نہیں کیا جائے گا یہ ان کا ظاہر مذہب ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کھال کی دباغت کی جائے گی وہ پاک ہو جائے گی (2)۔ اور پاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مردار کا جز ہے اگر بحالت حیات اس کی کھال اتاری جاتی تو وہ نجس ہوتی۔ پس واجب ہے کہ دباغت بھی اسے پاک نہ کرے جس طرح گوشت دباغت سے پاک نہیں ہوتا اور جو اخبار طہارت کے متعلق ہیں انہیں اس پر محمول کیا جائے گا کہ جلد سے دباغت میل کچیل کو زائل کر دیتی ہے حتیٰ کہ اس سے خشک چیزوں میں اور اس پہ بیٹھنے کا نفع اٹھایا جاسکتا ہے اور مشکیزہ بنا کر پانی میں بھی اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے کیونکہ پانی طہارت کی اصل پر ہے جب تک اس کا وصف نہ بدلے۔ اس کا حکم سورۂ فرقان میں آئے گا۔ طہارت لغت میں میل کچیل کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس طرح طہارت شرعیہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** مردار کے بال اور اس کی اون پاک ہے، کیونکہ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردار کی کھال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کی جائے اور اس کی صوف اور بالوں میں کوئی حرج نہیں جب وہ دھوئے جائیں (3) کیونکہ وہ طاہر تھے اگر وہ زندہ حالت میں جانور سے لئے جاتے پس واجب ہے کہ موت کے بعد بھی اسی طرح ہوں مگر گوشت جب حالت حیات میں نجس تھا تو موت کے بعد بھی اسی طرح ہوگا۔ پس اون کا حکم موت کی حالت میں گوشت کے خلاف ہوگا جیسا کہ حالت حیات میں اس کا حکم گوشت سے مختلف تھا۔ یہ استدلال بالعکس کے اعتبار سے ہے۔ اس پر دودھ اور مردہ مرغی سے نکلنے والے انڈے کا حرام ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے نزدیک موت کے بعد بھی دودھ پاک ہے اسی طرح انڈا بھی پاک ہے لیکن وہ ناپاک برتن سے حاصل ہوئے تو برتن کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گئے نہ کہ وہ موت سے نجس ہوئے۔ مزید تفصیل اس مسئلہ کی اور اس سے پہلے والے مسئلہ کی اور علماء کا اختلاف ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10:** وہ چیز جس میں چوہا گر جائے اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ چوہا زندہ نکل آئے گا تو وہ پاک ہوگا اور اگر اس میں چوہا مر جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز مائع ہوگی تو وہ ساری ناپاک ہو جائے گی۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز جامد ہوگی تو جو حصہ اس چوہے کے ساتھ متصل ہوگا وہ ناپاک ہوگا پس جو اس کے قریب ہوگا اسے پھینک دیا جائے گا اور مابقی سے نفع اٹھایا جائے گا وہ پاک ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چوہے کے متعلق پوچھا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، صفحہ 35، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، صفحہ 266 (وزارت تعلیم) و جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 208، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن دارقطنی، صفحہ 47، جلد 1 (دار المحاسن)

گیا جو گھی میں گر کر مر جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ گھی جامد ہو تو اسے اور اس کے ارد گرد کے گھی کو پھینک دو اور اگر وہ مائع ہو تو اسے بہا دو (1)''۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب اسے دھویا جائے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ دھونے سے پاک نہ ہوگا کیونکہ نجس مائع ہے وہ خون، شراب، پیشاب اور دوسری نجاستوں کے مشابہ ہے۔

ابن قاسم نے فرمایا: دھونے کے ساتھ پاک ہو جائے گا کیونکہ وہ جسم تھا جو نجاست کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گیا۔ پس وہ کپڑے کے مشابہ ہے، اس سے خون کا پاک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہے اور شراب اور پیشاب، ان کو دھونا ان کو ہلاک کر دیتا ہے انہیں دھویا نہیں جاسکتا۔

**مسئلہ نمبر 11**: جب ہم غسل کے ساتھ طہارت کا حکم کریں گے تو وہ طہارت میں اور تمام وجوہ انتفاع میں پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا لیکن اسے بیچے گا نہیں حتیٰ کہ اسے بیان کرے کیونکہ یہ لوگوں کے نزدیک عیب ہے اور نفوس اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور بعض علماء اس کی تحریم اور نجاست کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ عیب کو بیان کرے جس طرح کہ دوسری معیوب اشیاء ہیں اور غسل سے پہلے اس کا بیچنا کسی حال میں جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک نجاسات کا بیچنا جائز نہیں۔ نیز یہ نجس مائع ہے یہ شراب کے مشابہ ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ سے شراب کی قیمت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے ان پر چربی حرام کی گئی تھی پھر انہوں نے اسے پگھلایا اور اسے بیچا اور اس کی اثمان کو کھایا (2)''۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی ثمن کو حرام کرتا ہے۔ یہ مائع نجاست کی وجہ سے حرام کی گئی تھی پس اس کی ثمن کا ظاہر حکم کی وجہ سے حرام کرنا واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: جب ہانڈی میں کوئی حیوان پرندہ وغیرہ گر جائے اور مر جائے تو ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہانڈی میں جو کچھ تھا اسے نہیں کھایا جائے گا۔ مردار کی مخالطت سے وہ ناپاک ہو چکا ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور شوربہ انڈیل دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور اسے کھایا جائے گا اور شوربے کے متعلق ان کے شاگردوں میں سے کوئی مخالف نہیں یعنی اسے انڈیل دیا جائے گا۔ یہ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: رہا مردار کے معدہ کا پنیر اور مردار کا دودھ، تو امام شافعی نے فرمایا یہ نجس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ** (المائدہ: 3) عام ہے۔ امام ابو حنیفہ نے ان دونوں چیزوں کی طہارت کا کہا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ خلقت کی جگہ کا اس چیز کے پلید کرنے میں کوئی اثر نہیں جس میں خلقت کا عمل ہوا ہے اسی وجہ سے وہ گوشت کھایا جاتا ہے جس میں رگیں ہوتی ہیں حالانکہ ان رگوں میں خون داخل ہوتا ہے اور نہ اس کو دھویا جاتا ہے اور نہ اس کی تطہیر کی جاتی ہے۔ امام مالک کا قول بھی امام ابو حنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ موت کے ساتھ ناپاک نہیں ہوتا بلکہ ناپاک برتن کی مجاورت کی وجہ

---

1۔ سنن ابی داود، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 181، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ، صفحہ 23، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

سے ناپاک ہوتا ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جس کو دھویا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مرغی سے جو انڈا اس کے مرنے کے بعد نکلتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ انڈا مرغی سے نکلنے سے پہلے مائع کے حکم میں ہوتا ہے یہ ہوا کے ساتھ سخت ہو جاتا ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا: اگر کہا جائے کہ تمہارا قول اجماع کے خلاف تک پہنچا تا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد مسلمان پنیر کھاتے تھے جو ان کے پاس عجمیوں کی زمین سے لایا جاتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ عجمی مجوسی تھے ان کا ذبیحہ مردار ہے۔ صحابہ کرام یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ مردار جانور کے معدہ کا پنیر ہے یا ذبح کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: خشک دودھ میں جو پنیر کی مقدار واقع ہوتی تھی وہ تھوڑی ہوتی تھی اور تھوڑی نجاست معاف ہے جبکہ وہ کثیر مائع میں مل جائے۔ یہ ایک روایت کے مطابق جواب ہے اور دوسری روایت پر یہ جواب ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور یہ کسی کے لئے نقل کرنا ممکن نہیں کہ صحابہ کرام نے عجمیوں کی زمین سے لایا گیا پنیر کھایا تھا بلکہ پنیر عربوں کے طعام سے نہیں تھا جب مسلمان عجم کی زمین میں فتوحات کے ذریعے پھیل گئے تو ذبائح ان کے لئے ہو گئے پھر ہمارے لئے کہاں سے ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے پنیر کھایا تھا چہ جائیکہ وہ عجم کی زمین سے لایا گیا ہو اور وہ ان کے ذبائح کے معدہ سے بنایا گیا ہو۔

ابو عمر نے کہا: بت پرستوں، مجوسیوں کے کھانے کو کھانے میں کوئی حرج نہیں اور باقی تمام کفار کے کھانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ کھانا ان کے ذبائح سے نہ ہو اور نہ اسے ذبح کی احتیاج ہو مگر وہ پنیر جس میں مردار کے معدہ کا پنیر ہو۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: پنیر اور گھی۔

حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور فراء (ایسی پوستین جس کا اندرونی حصہ لومڑی بلی وغیرہ کی کھال سے تیار کیا جاتا ہے) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے سکوت اختیار کیا گیا وہ معاف ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 14**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الدَّمَ علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام نجس ہے نہ اسے کھایا جائے گا اور نہ اس سے نفع اٹھایا جائے گا، ابن خویز منداد نے کہا: خون حرام ہے جب تک اس میں عموم بلویٰ نہ ہو اور عموم بلویٰ معاف ہے اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جو خون معاف ہوتا ہے اس سے مراد وہ خون ہے جو گوشت اور رگوں میں ہوتا ہے یہ بدن میں اور کپڑے میں تھوڑا ہو اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ہم نے یہ اس وجہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (المائدہ: 3)

دوسری جگہ فرمایا: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (انعام: 145)

(آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس کتاب میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا ہوا خون)۔

پس بہنے والا خون حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہانڈی پکاتے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب اکل الجبن والسمن، صفحہ 249 (وزارت تعلیم)

تھے خون کی وجہ سے زردی بلند ہوتی تھی ہم کھاتے تھے اور ہم اسے ناپسند نہیں کرتے تھے (1)۔ اس سے بچنا بوجھ ہے اور اس میں مشقت ہے اور دین میں بوجھ اور مشقت اٹھالی گئی ہے۔ یہ شرع میں اصل ہے۔ جب عبادت کی ادائیگی میں امت کو حرج لاحق ہوا اور اس پر بوجھ ہوا تو عبادت ساقط کر دی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ مضطر مردار کھاتا ہے، مریض افطار کرتا ہے اور مرض میں تیمم کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے یہاں مطلقاً خون کا ذکر کیا اور سورۃ الانعام میں **مَّسْفُوْحًا** کے ساتھ مقید فرمایا۔ علماء نے یہاں مطلق کو مقید پر محمول فرمایا ہے یہاں خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ جو گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے وہ بالا جماع حرام نہیں ہے اسی طرح جگر اور تلی کی حلت پر بھی اجماع ہے اور مچھلی کے خون میں اختلاف ہے۔ قابسی سے مروی ہے کہ یہ پاک ہے۔ اس کی طہارت سے لازم آتا ہے کہ یہ حرام نہیں ہے (2)۔ یہ ابن عربی کا اختیار ہے۔ فرمایا: اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو اس کی زکاۃ (ذبح کرنا) مشروع ہوتی۔

میں کہتا ہوں: یہ مچھلی کے خون کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ میں نے بعض حنفیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس کے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کا خون خشک ہوتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے بخلاف دوسرے خونوں کے، وہ سیاہ ہو جاتے ہیں یہ نکتہ شوافع پر احناف کی طرف سے حجت ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ** اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کا ذکر کیا تا کہ اس کے عین کی تحریم پر دلالت کرے خواہ ذبح کیا گیا ہو یا ذبح نہ کیا گیا ہو، تا کہ چربی اور دوسری بھربھری ہڈیوں وغیرہ کو شامل ہو جائے۔(3)

**مسئلہ نمبر 16**: خنزیر کی چربی کی تحریم پر امت کا اجماع ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ جس نے چربی نہ کھانے کی قسم اٹھائی پھر اس نے گوشت کھایا تو وہ گوشت کھانے کی وجہ سے حانث نہ ہوگا۔ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھائی تو حانث ہوگا کیونکہ چربی کے ساتھ گوشت ہو تو اس پر گوشت کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے۔ گوشت کے اسم میں چربی داخل ہے اور گوشت، چربی کے اسم میں داخل نہیں اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام کیا اور گوشت کا ذکر کیا اور چربی کا ذکر نہ کیا کیونکہ یہ گوشت کے تحت داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر چربی کو حرام کیا اپنے اس ارشاد کے ساتھ **حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ** (انعام:146) اس سے ان پر گوشت کی حرمت واقع نہیں ہوئی اور چربی کے اسم میں گوشت داخل نہیں۔ اسی وجہ سے امام مالک نے چربی کی قسم اٹھانے والے اور گوشت کی قسم اٹھانے والے میں فرق کیا ہے مگر یہ کہ قسم اٹھانے والے کی نیت گوشت کی ہو، چربی کی نیت نہ ہو تو وہ حانث نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کے قول میں حانث نہ ہوگا جب وہ قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر وہ چربی کھالے۔ امام احمد نے کہا: جب قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھالی تو کوئی حرج نہیں مگر اس نے چربی سے اجتناب کا ارادہ کیا ہو۔

---

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 17**: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خنزیر سارا حرام ہے سوائے بالوں کے۔ اس کے بالوں کے ساتھ جوتی سینا جائز ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے خنزیر کے بالوں کے ساتھ جوتا سینے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن خویز منداد نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس کے ساتھ جوتیاں سی جاتی تھیں، اس کے بعد بھی یہ عمل موجود تھا، ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کسی امام نے اس کا انکار کیا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جس کو جائز قرار دیا وہ ابتداء الشرع کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**: خشکی کے خنزیر کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور پانی کے خنزیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے اس کے بارے میں کچھ جواب دینے سے انکار کیا اور فرمایا: تم خنزیر کہتے ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19**: اکثر لغوی علماء کا خیال ہے کہ خنزیر کا لفظ رباعی ہے۔ ابن سیدہ نے بعض سے روایت کیا ہے کہ یہ خزر العین سے مشتق ہے کیونکہ وہ اس طرح دیکھتا ہے، اس صورت میں لفظ ثلاثی ہوگا (1) اور ''الصحاح'' میں ہے تخازر الرجل، اپنی پلک کو تنگ کرنا تا کہ نظر کو تیز کرے۔ الخزر، آنکھ کا تنگ ہونا اور چھوٹا ہونا۔ رجل اخزر بین الخزر۔ اور کہا جاتا ہے: گویا وہ انسان آنکھ کے آخری حصہ سے دیکھتا ہے۔ خنزیر کی جمع خنازیر ہے۔ خنازیر ایک معروف بیماری بھی ہے یہ ایک سخت زخم ہوتا ہے جو گردن میں ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس سے مراد مجوسی، بت پرست اور معطل کا ذبیحہ ہے کیونکہ بت پرست بت کے لئے ذبح کرتا ہے مجوسی آگ کے لئے ذبح کرتا ہے اور معطل، وہ کسی ذات کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ اپنے لئے ذبح کرتا ہے۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مجوسی جسے آگ کے لئے ذبح کرتا ہے، بت پرست جو اپنے بت کے لئے ذبح کرتا ہے اسے نہیں کھایا جائے گا اور ان کا ذبیحہ امام مالک، اور امام شافعی وغیرہما کے نزدیک نہیں کھایا جائے گا اگرچہ وہ آگ اور بت کے لئے نہ بھی ہو۔ ابن مسیب اور ابوثور نے ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے جو وہ مسلمان کے لئے اس کے حکم سے ذبح کرے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ الاھلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: اھل ہکذا یعنی اس نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ابن احمر صحرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

يهل بالفرقد ركبانها　　كما يهل الراكب المعتمر

قافلہ والے فرقد میں اس طرح آواز بلند کرتے ہیں جس طرح عمرہ کرنے والا سوار آواز نکالتا ہے۔

نابغہ نے کہا:

او درة صدفية غواصها　　بهج متى يرها يهل و يسجد

یا صدف والا موتی جس کا غواص خوش ہوتا ہے جب اسے دیکھتا ہے آواز نکالتا ہے اور جھکتا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اسی سے اهلال الصبی واستهلاله ہے ولادت کے وقت بچے کا چیخنا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو بتوں اور تھانوں کے لئے ذبح کی جاتی ہیں (1)۔ اس سے مراد وہ نہیں ہے جس پر مسیح کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ذبیحہ سے مقصود اسم کا اعتبار کرتے ہیں اور اس استعمال میں یہ غالب ہو گیا نیت کا اعتبار ہی نہیں کیا جو تحریم کی علت ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان اونٹوں میں نیت کا اعتبار کیا جن کو غالب ابو فرزدق نے نحر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ ان جانوروں سے ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا، میں نے حسن بن ابی حسن کی اخبار میں دیکھا، ان سے ایک مال دار عورت کے متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی دل لگی کے لئے ایک شادی کا اہتمام کیا اور اس نے کئی اونٹ ذبح کئے۔ حضرت حسن نے فرمایا اس کا کھانا حلال نہیں یہ بت کے لئے ذبح کئے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں وہ روایت ہے جو ہم نے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی مسلم کے شیخ سے روایت کی ہے فرمایا: ہمیں جریر نے قابوس سے روایت کر کے بتایا، کہ میرے باپ نے ایک عورت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا اور اسے کہا کہ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی طرف سے سلام کہنا اور پھر ان سے پوچھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سی نماز زیادہ پسند تھی اور کس نماز پر آپ دوام اختیار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے جن میں قیام لمبا فرماتے تھے اور رکوع و سجود خوب اچھا کرتے تھے اور رہی وہ نماز جس کو آپ صحت، مرض، سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑتے تھے وہ صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ ایک عورت نے عرض کی: اے ام المومنین! ہمارے لئے عجمیوں میں سے کچھ مہربان ہیں ان کی ایک عید ہوتی ہے اس موقع پر وہ ہمیں تحائف بھیجتے ہیں کیا اس میں سے ہم کچھ کھا سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: جو اس دن کے لئے ذبح کیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ اور ان کے درختوں کے پھلوں سے کھاؤ۔

**مسئلہ نمبر 21:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اضۡطُرَّ یہ اتباع کی وجہ سے نون کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ کسرہ اصل ہے کیونکہ التقاء ساکنین ہوا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی ان محرمات میں سے کسی چیز کی طرف کوئی مجبور ہے۔ اضطر۔ یہ ضرورۃ سے باب افتعال ہے۔ ابن محیصن نے فمن اطَّر ضاد کو طا میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور ابو السمال نے طا کے کسرہ کے ساتھ فمن اضطِر پڑھا ہے اور اس کی اصل اضطرر ہے جب ادغام کیا گیا تو را کی حرکت طا کی طرف نقل کی گئی۔

**مسئلہ نمبر 22:** اضطرار یا تو ظالم کے مجبور کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے یا بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جمہور فقہاء اور علماء کا اس آیت میں اس معنی پر اتفاق ہے کہ وہ بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ اور یہی صحیح ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے جو ان محرمات کے کھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ مجاہد نے کہا یعنی کسی کو مجبور کیا گیا ہو مثلاً ایک شخص کو دشمن پکڑ لیتا ہے اور وہ اسے خنزیر وغیرہ کا گوشت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 240، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کھانے پر مجبور کرتا ہے مگر یہ اکراہ مجبور کرنا اس کے کھانے کو اس وقت مباح کرے گا جب وہ اکراہ مجبور کرنا انتہا کو پہنچ جائے۔

وہ بھوک یا تو وہ دائمی ہوگی یا دائمی نہیں ہوگی۔ اگر بھوک دائمی ہو تو مردار سے بھوک مٹانے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں مگر مردار کا کھانا اس کے لئے حلال نہیں جبکہ وہ کسی مسلمان کا مال پاتا ہو جس میں اس کو قطع ید کا خوف نہ ہو مثلاً لٹکی ہوئی کھجوریں اور حریسۃ الجبل (پہاڑ کی چھوڑی گئی بکری) اور اس قسم کی چیزیں جن میں ہاتھ نہیں کاٹے جاتے اور اذیت نہیں دی جاتی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ہم نے ایک اونٹنی دیکھی جس کی کھیری درخت کے کانٹوں سے باندھی گئی تھی تو ہم اس کی طرف لوٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پکارا تو ہم آپ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اونٹ مسلمانوں کے گھر والوں کے لئے ہیں یہ ان کی خوراک ہیں اور ان کی برکت ہیں...... کیا تمہیں اچھا لگے گا اگر تم اپنے مشکیزوں کی طرف جاؤ اور تم دیکھو کہ جو کچھ ان میں تھا وہ ختم ہو چکا ہے کیا تم اس کو عدل سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اسی طرح حرام ہے۔ ہم نے کہا: آپ فرمایئے اگر ہمیں کھانے پینے کی ضرورت ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ اور ساتھ نہ لے جاؤ، پیو اور ساتھ نہ لے جاؤ (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک اصل ہے، ابن منذر نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب ہم سے کوئی شخص مجبور ہو جائے تو اس کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کیا حلال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کھائے اور ساتھ نہ لے جائے، پیئے اور ساتھ نہ لے جائے (2)۔ ابن منذر نے کہا: تمام چیزیں جن میں اس کے بعد اختلاف ہوگا وہ تحریم کی طرف لوٹائی جائیں گی۔

ابو عمر نے کہا: اس کے متعلق قول یہ ہے کہ مسلمان پر جب کھانا کھلانا متعین ہو جائے تو وہ اتنی مقدار میں کھلائے جس سے اس کی روح لوٹ آئے اور اس مسلمان پر کھانا کھلانا فرض ہوگا۔ مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہاں کوئی اور نہ ہو، تو اس پر آدمی کی روح کو لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو ایسی حالت میں کھانے سے روکا گیا ہو اس کے لئے اس سے لڑنا جائز ہے جو اسے کھانے سے منع کرے، اگرچہ یہ چیز اس کے اپنے خلاف ہی چلی جائے۔ اہل علم کے نزدیک اس صورت میں ہے جب صرف ایک شخص وہاں موجود ہو اس پر فرض کا تعین ہو جائے گا۔ اگر بہت سے لوگ ہوں پھر ان پر کھانا کھلانا فرض کفایہ ہوگا اور اس میں پانی اور دوسری چیز جو مسلمان کے نفس لوٹاتی اور قائم رکھتی ہیں برابر ہیں، مگر اس شے کی قیمت کے وجوب میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ اس کی روح لوٹ آئی ہے، بعض نے قیمت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں دو قول ہیں: متقدمین اور متاخرین علماء کے درمیان مسلمان کی روح لوٹانے کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں جب کہ اس کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، کسی تھوڑی سی چیز کے ساتھ جس میں اس کے مالک کا نقصان نہ ہو اور اس میں گزارہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 23**: ابن ماجہ نے دو سندوں کے ساتھ حضرت عباد بن شرحبیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں ایک سال بھوک کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینہ طیبہ آیا پھر میں ایک باغ میں آیا۔ میں نے ایک خوشہ پایا، میں نے اسے توڑا اور اسے کھایا

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 68-167 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور میں نے اسے اپنی چادر میں رکھ دیا۔ باغ کا مالک آیا، اس نے مجھے مارا اور مجھ سے میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے اس شخص کو فرمایا: تو نے اسے نہ کھلایا جب یہ بھوکا تھا اور تو نے اسے نہ علم سکھایا جب وہ جاہل تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے کپڑا لوٹا دے اور اسے طعام کا ایک وسق یا نصف دے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم اس کے رجال پر متفق ہیں مگر ابن ابی شیبہ، وہ صرف مسلم کا راوی ہے عباد بن شرحبیل الغبری یشکری بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل نہیں کی، اس کے لئے نبی کریم ﷺ سے اس واقعہ کے علاوہ کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ ابو عمر نے جو ذکر کیا ہے یہ حدیث بھوک کی حالت میں قطع ید اور تنبیہ کرنے کی نفی کرتی ہے۔ ابو داؤد نے حسن سے انہوں نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی جانور کے پاس آئے اگر اس کے پاس اس کا مالک ہو تو وہ اس سے اجازت لے پھر وہ اگر اسے اجازت دے تو وہ دودھ دوہ لے اور پی لے۔ اگر مالک نہ ہو تو تین دفعہ آواز دے اگر تو مالک جواب دے تو اس سے اجازت طلب کرے۔ اگر وہ اسے اجازت دے تو فبہا ورنہ وہ دودھ دوہے اور پی لے لیکن اٹھا کر ساتھ نہ لے جائے (2)۔

ترمذی نے یحییٰ بن سلیم سے انہوں نے عبید اللہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے اور جھولی میں نہ ڈال لے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں جانتے مگر یحییٰ بن سلیم کی حدیث سے۔ اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کسی ضرورت مند نے ان پھلوں میں سے کچھ لے لیا جبکہ وہ جھولی میں ڈالنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے جب تم میں سے کوئی باغ سے گزرے تو اسے ضرورت کے مطابق کھالینا چاہئے اور کپڑے میں نہیں ڈالنا چاہئے (یعنی ساتھ نہ لے جائے)۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو نے کہا ثباناً اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے اگر تو اسے اپنے آگے اٹھائے تو وہ ثبان ہے۔ کہا جاتا ہے: قد تثبنت ثباناً، اگر تو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائے تو بھی اس کا وہی ثبان نام ہے۔ اسی سے جب چادر کو لپیٹ کر اس میں کوئی چیز ڈالی جائے اور پیٹھ پر اٹھائی جائے تو ثبانا کہا جاتا ہے۔ اگر تو اسے اپنی جھولی میں ڈال لے تو اسے خبنۃ کہا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن شعیب کی مرفوع حدیث ہے۔ ولا یتخذ خبنۃً، (3) جھولی میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: خبنت اخبن خبناً۔ ابو عبید نے کہا: اس حدیث میں بھوکے مجبور کے لئے رخصت ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو جس کے ساتھ وہ کچھ خرید سکے اور وہ نہ اٹھائے مگر اتنی مقدار جتنی اس کے پیٹ میں طاقت ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ اصل جس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ غیر کا مال حرام ہے مگر یہ کہ غیر خوشی سے دے۔ اگر معاشرہ میں اس عمل کی عادت ہو جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں تھا یا اب بعض شہروں میں ہے تو یہ جائز ہے اور کبھی اسے بھوک اور ضرورت

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 167 (وزارت تعلیم)　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، صفحہ 352، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، صفحہ 154، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کے اوقات پر محمول کیا جاتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور اگر بھوک دائمی نہ ہو کسی وقت میں ہو تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ کھائے حتیٰ کہ سیر ہو جائے اور خوب سیر ہو جائے، اور اگر آئندہ اس صحرا اور جنگل میں ضرورت کا خدشہ ہو تو ساتھ لے جائے، جب اس سے مستغنی ہو جائے تو اسے پھینک دے۔ یہی معنی امام مالک نے اپنے مؤطا میں بیان کیا اور یہی قول امام شافعی اور کثیر علماء کا ہے۔ حجت یہ ہے کہ ضرورت، حرمت کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اباحت لوٹ آتی ہے اور ضرورت کی مقدار، خوراک نہ ہونے کی حالت میں خوراک کے موجود ہونے تک ہوتی ہے۔ العنبر (مچھلی) والی حدیث اس میں نص ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب سفر سے لوٹ کر آئے تو ان کا زادراہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ساحل سمندر تک چلے تو ان کے لئے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑے ٹیلے کی طرح (مچھلی) ظاہر ہوئی۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو وہ ایک جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو لشکر کے امیر تھے، انہوں نے کہا: مردار ہے۔ پھر فرمایا: نہیں بلکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام رساں ہیں اور اللہ کے راستہ میں ہیں اور تم بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ پس تم اسے کھاؤ۔ راوی فرماتے ہیں: ہم ایک مہینہ اسے کھاتے رہے اور ہم تین سو آدمی تھے حتیٰ کہ ہم موٹے ہو گئے۔ (الحدیث)

صحابہ نے اسے کھایا اور سیر ہوئے (رضی اللہ عنہم) اس کے باوجود کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ مردار ہے اور وہ اس میں سے مدینہ طیبہ کی طرف بھی لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ حلال ہے اور فرمایا: اس کے گوشت میں سے کچھ تمہارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ صحابہ نے اس میں سے گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کھایا(1)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اتنی مقدار کھائے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔ ابن ماجشون اور ابن حبیب کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کے اصحاب نے مسافر اور مقیم کے درمیان فرق کیا ہے وہ فرماتے ہیں: مقیم اتنا کھائے جس سے اس کی زندگی بچ جائے اور مسافر سیر ہو کر کھائے اور ساتھ بھی لے جائے جب اس سے غنا پائے تو اسے پھینک دے، اگر کوئی مجبور پائے تو اسے دے دے اور اس سے عوض نہ لے کیونکہ مردار کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 24:** اگر کوئی شراب پینے پر مجبور ہو۔ اگر شراب پینے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں وہ شراب پی لے۔ اگر بھوک یا پیاس کی وجہ سے مجبور ہو تو نہ پیئے۔ یہ امام مالک کا العتبیۃ میں قول ہے۔ فرمایا: شراب، پیاس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو مطلقاً حرام فرمادیا اور مردار کو ضرورت نہ ہونے کی شرط کے ساتھ حرام کیا۔ ابہری نے کہا: اگر شراب اس کی بھوک یا پیاس کو مٹائے تو اسے پی لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے پھر ضرورت کے لئے مباح کیا اور شراب کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے۔ پس خنزیر اباحت میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوگا اس جلی معنی کی وجہ سے جو قیاس سے زیادہ قوی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ سیر کرے گا اگرچہ ایک گھڑی کے لئے ہی سیر کرے گا اور بھوک کو مٹائے گا اگرچہ تھوڑی سی مدت کے لئے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، صفحہ 147، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر 25**: اصبغ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجبور خون پی لے اور شراب نہ پیئے۔ مردار کھالے اور کسی کے گم شدہ اونٹوں کے قریب نہ جائے ...... یہ ابن وہب کا قول ہے ...... پیشاب پی لے اور شراب نہ پیئے، کیونکہ شراب میں حد لازم ہوتی ہے۔ معلوم ہوا یہ زیادہ سخت ہے۔ اس پر امام شافعی کے اصحاب کی نص ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**: اگر کسی کو لقمہ پھنس جائے تو کیا وہ شراب کے ساتھ اسے نگلے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں۔ اس خوف سے کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ اور ابن حبیب نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ یہ ضرورت کی حالت ہے۔ ابن عربی نے کہا: جس کو لقمہ پھنس جائے اس کے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو معاملہ ہے اس کے اعتبار سے جائز ہے اور رہا ہمارے درمیان کا مسئلہ تو ہم اسے دیکھیں گے اور اگر ہم پر قرائن کی وجہ سے پھنسنے کی صورت مخفی نہیں ہوگی تو ہم اس کی تصدیق کریں گے جب یہ ظاہر ہو جائے گا اور اگر پھنسنے کی صورت ظاہر نہ ہوگی تو ہم ظاہر کی بنا پر اسے حد لگائیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں باطناً عقوبت سے محفوظ رہے گا۔ پھر جب مجبور شخص مردار، خنزیر اور آدمی کا گوشت پائے تو وہ مردار کھالے کیونکہ وہ حلال ہے، جبکہ خنزیر اور آدمی کسی حالت میں حلال نہیں ہیں۔ ہلکی تحریم کو اختیار کرنا بہتر ہے بنسبت بھاری تحریم میں داخل ہونے کے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی بہن یا کسی اجنبی عورت سے وطی کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اجنبی عورت سے وطی کرلے کیونکہ بہن کسی صورت میں حلال نہیں۔ یہی ان احکام میں ضابطہ ہے۔ انسان کا گوشت نہ کھائے اگرچہ مر بھی جائے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی امام احمد اور داؤد نے کہا ہے۔ امام احمد نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ "مردہ آدمی کی ہڈی توڑنا، زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے(1)"۔ امام شافعی نے فرمایا: آدمی کا گوشت کھالے اور اس کے لئے کسی ذمی کو قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ محترم الدم ہے اور نہ کسی مسلمان اور نہ قیدی کو قتل کرے کیونکہ وہ غیر کا مال ہے۔ اگر حربی یا زانی شادی شدہ ہو تو اس کا قتل کرنا اور اس سے کھانا جائز ہے۔ ابوداؤد نے مزنی پر سخت تنقید کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: انبیاء کرام کا گوشت کھانا مباح ہے۔

ابن شریح نے بھی اس پر سخت جرح کی ہے کہ تو انبیاء کرام کے قتل تک پہنچ گیا ہے جبکہ تو نے کافر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ آدمی کا گوشت نہ کھائے مگر جب اسے یقین ہو کہ یہ اسے مرنے سے بچا لے گا اور زندگی کا باعث بنے گا۔

**مسئلہ نمبر 27**: امام مالک سے پوچھا گیا کہ مجبور مردار کھا سکتا ہے جبکہ وہ غیر کا مال کھجور، کھیتی یا بکریاں پائے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر اسے اپنے بدن پر ضرر کا اندیشہ نہ ہو مثلاً اسے چور شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی تو وہ جو چیز پائے اس سے کھالے جو اس کی بھوک کو مٹائے لیکن اس میں سے ساتھ نہ لے جائے۔ میرے نزدیک مردار کھانے سے یہ کھانا بہتر ہے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے اور اگر اسے اندیشہ ہو کہ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور اسے چور شمار کریں گے اگر وہ مردار کھالے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ اس مقام پر مردار کھانے میں اس کے لئے وسعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 28**: ابوداؤد نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے، ایک شخص پتھر یلے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، صفحہ 102، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ٹیلے پر اترا اور اس کے ساتھ اس کے گھر والے اور بچے بھی تھے۔ ایک شخص نے کہا: میری اونٹنی گم ہوگئی ہے اگر تو اسے پائے تو اسے روک لینا۔ پس اسے اونٹنی مل گئی لیکن اس کا مالک اسے نہ ملا۔ وہ اونٹنی مریض ہوگئی۔ بیوی نے اسے کہا: تو اسے نحر کر دے لیکن اس شخص نے انکار کیا حتیٰ کہ وہ مرگئی۔ بیوی نے کہا: اس کی کھال اتار لے تا کہ ہم اس کے گوشت اور چربی کو خشک کریں اور اسے کھائیں۔ اس شخص نے کہا: نہیں حتیٰ کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھ لوں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے پاس اتنی غذا ہے جو تجھے مستغنی کر دے۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تم اسے کھالو۔ فرمایا: پھر اس کا مالک آیا تو اس نے اسے پورا قصہ بتایا، اس نے کہا: تو نے اسے نحر کیوں نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے تجھ سے حیا آ گیا تھا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ایک یہ کہ مجبور، مردار میں سے کھالے اگرچہ اسے تلف (ضائع) ہونے کا اندیشہ نہ بھی ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے غنا کے متعلق پوچھا تھا، اس سے اپنے نفس پر خوف کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کھائے، سیر ہو کر کھائے، ذخیرہ بھی کرے اور ساتھ بھی لے جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادخار (ذخیرہ کرنا) کو مباح کیا اور اس پر سیر نہ ہونے کی شرط بھی نہیں لگائی۔ ابوداؤد نے اپنی سند سے فجیع عامری سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا: ہمارے لئے کون سا مردار حلال ہے؟ فرمایا: جو تمہارا کھانا ہے۔ ہم نے کہا: نغتبق و نصطبح۔ ابونعیم نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم ایک پیالہ صبح پیتے ہیں اور ایک شام کو پیتے ہیں۔ فرمایا: میرے باپ کی قسم! یہ بھوک ہے۔ فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں مردار کو ان کے لئے حلال کیا(1)۔

ابوداؤد نے کہا: الغبوق سے مراد دن کا آخری حصہ ہے اور الصبوح سے مراد دن کا ابتدائی حصہ ہے۔ خطابی نے کہا: الغبوق سے مراد شام کا کھانا ہے اور الصبوح سے مراد صبح کا کھانا ہے یعنی صبح کے وقت ایک دودھ کا پیالہ اور شام کے وقت دودھ کا پیالہ زندگی کو باقی رکھتا ہے اور نفس کو قائم رکھتا ہے اگرچہ جسم کو مکمل غذا اور تام سیرابی نہ دے، ان کے لئے اس کے ہوتے ہوئے مردار کھانے کو مباح کیا۔ یہ دلالت ہے کہ مردار کا کھانا مباح ہے یہاں تک کہ وہ نفس خوراک سے اپنی ضرورت حاصل کر لے۔ یہی امام مالک کا نظریہ ہے، یہی امام شافعی کا ایک قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب صبح و شام دودھ کا پیالہ پینا جائز ہے تو سیر ہونا اور زاد راہ ساتھ لے جانا بھی جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے مردار کا کھانا جائز نہیں ہے مگر جو اس کی زندگی بچالے۔ مزنی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر ابتدا میں یہ حالت ہو تو اس سے کھانا جائز نہیں اسی طرح جب اس کو کھانے کے بعد اس حال پر پہنچ جائے اسی طرح حسن سے مروی ہے قتادہ نے فرمایا: سیر ہو کر نہ کھائے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: تین لقموں سے زیادہ نہ کھائے، صحیح اس کے خلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 29**: ان چیزوں کے ساتھ علاج کرنا، ان کے استعمال کی دو صورتیں ہیں: یا تو ان کے عین کو باقی رکھ کر انہیں استعمال کیا جائے گا یا جلا کر استعمال کیا جائے گا۔ اگر جلانے کے ساتھ بدل جائیں تو ابن حبیب نے کہا: ان کے ساتھ علاج کرنا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن ماجشون نے اس کی تخفیف کی اس بنا پر کہ جلانا، صفات کی تبدیلی کے لئے تطہیر ہے۔ اور **العتبیۃ**

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 178، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں امام مالک نے کہا: مَرْتَك (دواء) دوا جو مردار کی ہڈیوں سے بنائی جاتی ہے جب اسے زخم پر رکھا جائے تو اس کے ساتھ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ اسے دھو لے۔ اگر مردار قائم بعینہ ہو تو سحنون نے کہا: اس کے ساتھ اور خنزیر کے ساتھ کسی حالت میں علاج نہ کیا جائے کیونکہ ان کا بدل حلال موجود ہوتا ہے بخلاف بھوک کے۔ اگر ان کا بھوک میں بھی عوض پایا جائے تو پھر مردار کو نہیں کھایا جائے گا۔ اسی طرح شراب سے علاج نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا ظاہر بھی یہی ہے۔ یہ ابن ابی ہریرہ جو امام شافعی کے اصحاب میں سے ہیں ان کا بھی یہی مختار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: دوا کے طور پر پینا جائز ہے، پیاس کے لئے پینا جائز نہیں۔ یہ اصحاب شافعی میں قاضی طبری کا مختار مذہب ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ شوافع میں سے بعض بغدادیوں نے کہا: پیاس کے لئے پینا جائز ہے، دواء کے لئے جائز نہیں کیونکہ پیاس کا نقصان جلدی پہنچنے والا ہے بخلاف علاج کے۔

بعض علماء نے فرمایا: دونوں کے لئے پینا جائز ہے۔ بعض اصحاب شافعی نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے سوائے اونٹوں کے پیشاب کے۔ کیونکہ اس کے متعلق عرنیین والی حدیث موجود ہے۔ بعض علماء نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جوان پر حرام کی گئی ہے(1) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت طارق بن سوید سے کہا: جب انہوں نے شراب کے متعلق پوچھا تو آپ نے اسے منع فرمایا تھا یا شراب بنانے کو ناپسند فرمایا تھا۔ اس نے کہا: میں اسے دواء کے لئے بناتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دواء نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے(2)۔ مسلم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ یہ حالت اضطرار کے ساتھ مقید ہو۔ کیونکہ زہر کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے اور اس کا پینا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 30:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرَ بَاغٍ، غَيْرَ کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ بعض نے فرمایا: استثنا کی بنا پر ہے، جب تو غَيْرَ کو دیکھے کہ اس کی جگہ فی صحیح ہوتا ہے تو یہ حال ہوتا ہے اور جب اس کی جگہ الا رکھنا صحیح ہو تو یہ استثنا ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کر لو۔ بَاغٍ اصل میں باغی تھا ضمہ یا پر دشوار تھا اسے ساکن کر دیا گیا پھر تنوین اور یا ساکن جمع ہوئے تو یا کو حذف کیا گیا اور کسرہ یا کے حذف پر دلالت کرتا ہے۔ قتادہ، حسن، ربیع، ابن زید اور عکرمہ نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے وہ حاجت سے زیادہ کھانے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ۔

اور سدی نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا مطلب ہے: وہ شہوت ولذت کے لئے کھانے والا نہ ہو اور وَّلَا عَادٍ سیر ہونے کی حد تک پورا کھانے والا نہ ہو۔ مجاہد، ابن جبیر وغیر ہما نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے: مسلمانوں پر بغاوت کرنے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ اور ان پر تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ باغی اور عادی میں ڈاکو، سلطان پر خروج کرنے والا، قطع رحمی میں سفر کرنے والا، اور مسلمانوں پر حملہ کرنے والا داخل ہے۔ یہ صحیح ہے، کیونکہ لغت میں البغی کا معنی فساد کا قصد کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغت المرأۃ تبغی بغاءً، جب عورت بدکاری کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ (النور: 33)

کبھی البغی فساد کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: تو کہتا ہے: خرج الرجل فی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربہ، صفحہ 840، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، صفحہ 163، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

بغاء ابل لہ، وہ اونٹوں کی تلاش میں نکلا۔ شاعر کا قول ہے:

لا ینعك من بغا ء الخیر تعقاد الرتائم

ان الأشائم كالايا من والأيامن كالأشائم

خیر کی تلاش تجھے نہ روکے۔ دھاگے باندھے جاتے ہیں۔ بائیں، دائیں کی طرح ہیں اور دائیں بائیں کی طرح ہیں۔

**مسئلہ نمبر 31**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا عَادٍ، عاد کی اصل عائد ہے اور یہ مقلوب سے ہے جیسے شاکی السلاح، ھار اور لاث (1)۔ اصل میں شائك، ھائر، لائث یہ لثت العمامة سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں تمام محرمات کو مباح قرار دیا کیونکہ یہ تمام مباحات سے عاجز تھا۔ پس مباح چیز کا نہ ہونا حرام چیز کی اباحت کے لئے شرط ہے۔

**مسئلہ نمبر 32**: علماء کا اختلاف ہے جب اس کی ضرورت کے ساتھ معصیت متصل ہو مثلاً ڈاکہ ڈالنے والا ہو، یا مسافروں کو خوف دلانے والا ہو۔ امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں معصیت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مباح کیا بطور مدد اور گنہگار کی مدد کرنا حلال نہیں۔ اگر کھانے کا ارادہ کرے تو اسے توبہ کرنا چاہئے اور کھانا چاہئے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے دوسرے قول میں ان کے لئے بھی مباح کیا ہے۔ انہوں نے معصیت اور اطاعت کے درمیان مباحت میں برابری کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: عجب ہے ان کے لئے جو گنہگار کے لئے بھی اس کو مباح کرتا ہے میں کسی کو یہ کہنے والا خیال نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا کہے تو وہ قطعاً غلطی کرنے والا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا خلاف صحیح ہے کیونکہ سفر معصیت میں اپنے آپ کو ضائع کرنا اس معصیت سے زیادہ ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النساء:29) یہ عام ہے۔ شاید وہ دوسری حالت میں توبہ کرے اور توبہ اس کے گناہ کو مٹا دے۔ مسروق نے کہا: جو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی طرف مجبور ہو اور وہ نہ کھائے حتیٰ کہ مر جائے تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ ابوالحسن طبری المعروف بالکیا نے کہا: ضرورت کے وقت مردار کھانا رخصت نہیں بلکہ عزیمت واجبہ ہے۔ اگر کوئی مردار کے کھانے سے رک جائے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ مردار کا کھانا سفر کی رخصت نہیں ہے یا سفر سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت کے نتائج سے ہے خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں ہو۔ مقیم گنہگار کے افطار کی طرح ہے جب وہ مریض ہوتا ہے اور اسی طرح گنہگار مسافر کا تیمم کرنا پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ فرمایا: ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں امام مالک سے روایات مختلف ہیں ان کا مشہور مذہب جو الباجی نے ''المنتقی'' میں ذکر کیا ہے۔ سفر معصیت میں اس کے لئے کھانا جائز ہے اور سفر معصیت میں نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ ابن خویز منداد نے کہا: اضطرار کی حالت میں کھانا، اس میں اطاعت شعار اور گنہگار برابر ہیں، کیونکہ سفر و حضر میں مردار کا کھانا جائز ہے۔ گناہوں کی طرف نکلنے والوں سے مقیم کا حکم اس سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ مقیم ہونے سے بھی بری حالت میں ہوتا ہے، یہ فطر اور قصر اس طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں رخصتیں سفر سے متعلق ہیں۔ جب سفر، سفر معصیت ہو تو اس میں قصر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ رخصت سفر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: وہ سفر معصیت میں پانی کے نہ ہونے کے وقت تیمم کرے کیونکہ تیمم سفر و حضر میں برابر ہے اس کو مردار کھانے اور تیمم کرنے سے معصیت کی وجہ سے یہ منع کرنا جائز ہے جس معصیت کا اس نے ارتکاب کیا ہے۔ مردار کو نہ کھانے میں جان کا ضیاع ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور تیمم کے ترک میں نماز کو ضائع کرنا ہے کیا یہ کہنا جائز ہے؟ تو نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اب دوسرا گناہ کر۔ کیا شراب پینے والے کو یہ کہنا جائز ہے کہ تو زنا کر، اور زانی کو کیا کہنا جائز ہے کہ تو کفر کر یا دونوں کو کہا جا سکتا ہے کہ تم دونوں نماز ضائع کرو؟ یہ تمام مسائل انہوں نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں بیان کئے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے کسی کا خلاف ذکر نہیں کیا۔

الباجی نے کہا: زیاد بن عبدالرحمٰن اندلسی نے روایت کیا ہے کہ گنہگار اپنے سفر میں نماز کو قصر کرے اور رمضان میں افطار کرے اور یہ حکم تمام لوگوں میں برابر ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو اپنی جان کو مردار کے کھانے سے رک کر تلف کرنا جائز نہیں کیونکہ اسے وجوب کے طور پر مردار کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور جو معصیت کے سفر میں ہو اس سے فرائض واجبات، روزہ، نماز ساقط نہیں ہوتے بلکہ ان کا ادا کرنا اس پر لازم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ معانی سفروں میں لوگوں کی حاجت کے لئے مباح ہیں۔ اس کے لئے ان سے گناہوں پر مدد حاصل کرنا مباح نہیں تھا اور اس کو اپنے نفس کو قتل کرنے کی حاجت نہیں۔ ابن حبیب نے کہا: وہ پہلے گناہ سے توبہ کرے پھر توبہ کے بعد مردار کا گوشت کھائے۔ ابن حبیب نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے تعلق جوڑا ہے: **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ** ضرورت کے لئے مردار کی اباحت میں شرط رکھی ہے کہ وہ باغی نہ ہو اور حرابۃ، ڈاکہ، قطع رحمی، گناہ کا طالب باغی اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ ان میں اباحت کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: یہ استدلال خطاب کے مفہوم سے ہے اور اس میں اصولی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کا نظم یہ ہے کہ مضطر باغی نہیں ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا نہیں اور اس پر گناہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ سے خاموشی کی گئی ہے۔ اصل عموم خطاب ہے۔ جس نے کسی امر کے لئے اس کے زوال کا دعویٰ کیا اس پر دلیل لانا لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 34** (☆): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ پس جس میں رخصت دی گئی ہے اس سے مؤاخذہ نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے کہ اس نے رخصت دی۔

**اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝**

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ۔ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں (33) مسائل ہیں۔

نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ تورات میں محمد ﷺ کی صفت اور رسالت کی صحت کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا تھا اسے انہوں نے چھپایا۔ اَنْزَلَ بمعنی اظھر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: و مَنْ قال سانزل مثل ما انزل اللہ اس آیت میں سانزل بمعنی سأظھر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نزول کے معنی میں ہی ہے۔ یعنی جو ملائکہ نے اس کے رسل پر اتارا۔ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ، بِهٖ میں ضمیر کا مرجع چھپائی گئی بات ہے۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا یعنی رشوت لیتے ہیں۔ اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اس کی مدت ختم ہونے والی ہے اور اس کا انجام برا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو وہ رشوت لیتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت اگرچہ علماء یہود کے متعلق ہے یہ مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو دنیا کے حصول کی خاطر حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ بُطُوْنِهِمْ یہ بطون کا ذکر کھانے کی حقیقت پر تاکید اور دلالت کے لئے ہے، کبھی یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے مثلاً اکل فلان ارضی و نحوہ (فلاں نے میری زمین کو کھایا) اور بطون کے ذکر میں ان کی نادانی پر تنبیہ ہے۔ انہوں نے اپنی آخرت کو اپنے اس کھانے کے بدلے فروخت کیا جس کا کوئی مقام نہیں (1)۔ اِلَّا النَّارَ کا معنی یہ ہے کہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ اس پر انہیں آگ کا عذاب دے گا۔ جو انہوں نے رشوت کھائی اسے آگ فرمایا کیونکہ وہ انہیں آگ تک پہنچانے والا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ انہیں حق کو چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھانے کے ساتھ عذاب دے گا۔ اس نے مآل کے مطابق حال کے ساتھ خبر دی (2)۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (النساء:10) یعنی ان کا انجام اسی کی طرف پھیرا جائے گا۔ اسی سے عربوں کا قول ہے:

لدوا للموت وابنوا للخراب موت کے لئے پیدا کرو اور خرابی کے لئے بناؤ۔

ایک اور نے کہا:

فللموت ما تلد الوالدۃ جو ماں جنم دیتی ہے وہ موت کے لئے ہے۔

ایک اور نے کہا:

و دورنا لخراب الدھر نبنیھا ہم اپنے گھر زمانے کی خرابی کے لئے بناتے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں قرآن اور اشعار میں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یہ ان پر ناراضگی اور رضا کے زوال سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان لا یکلم فلاناً، جب تو کسی سے ناراض ہو۔ طبری نے کہا: لَا يُكَلِّمُهُمْ یعنی ایسی کلام نہیں فرمائے گا جس کو وہ پسند کرتے ہوں گے۔ قرآن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حکیم میں ہے: اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ۝ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ) بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتوں کو ان کی طرف سلام کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ یعنی ان کے برے اعمال کی اصلاح نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ زجاج نے کہا: وہ ان کی خیر کے ساتھ تعریف نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو ازکیاء کہے گا۔ اَلِیْمٌ یہ بمعنی مؤلم (دردناک) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: (۱) بوڑھا زانی (۲) جھوٹا بادشاہ (۳) متکبر غریب (1)۔ ان کو عذاب الیم اور سخت سزا کے ساتھ خاص فرمایا محض مخالفت کی وجہ سے اور اس استخفاف کی وجہ سے جس نے انہیں ان جرموں پر برانگیختہ کیا کیونکہ اس پر انہیں کسی حاجت نے نہیں ابھارا اور نہ کسی ضرورت نے اس کی طرف انہیں بلایا جس طرح ضرورت انہیں بلاتی ہے جو ان کی مثل نہ ہوں لاینظر الیھم کا معنی ہے وہ ان پر نہ رحم کرے گا اور نہ مہربانی کرے گا۔ مزید بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

## اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۝

”یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض اور عذاب کو نجات کے بدلے (تعجب ہے) کس چیز نے صابر بنا دیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ جب عذاب ضلالت کے تابع ہے اور مغفرت اس ہدایت کے تابع ہے جس کو انہوں نے ترک کر دیا تو یہ دونوں شراء کے مجاز میں داخل ہوئیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ جمہور کا مذہب...... جن میں حسن اور مجاہد بھی ہیں کہ اس کا معنی تعجب ہے۔ یہ مخلوق کی طرف راجع ہے۔ گویا فرمایا: انہوں نے ان کے آگ پر صبر کرنے پر اور آگ پر ٹھہرے رہنے پر تعجب کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ۝ (عبس) غارت ہو (منکر) انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ واسمع بھم وابصر (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے۔ اس معنی کی بنا پر ابوعلی نے لکھا ہے کہ حسن، قتادہ، ابن جبیر اور ربیع نے کہا: اللہ کی قسم! آگ پر انہیں صبر نہیں ہے لیکن وہ کتنے آگ پر جرأت کرنے والے ہیں (3)۔ یہ یمنی لغت ہے۔ فراء نے کہا: مجھے کسائی نے بتایا، فرمایا: مجھے یمن کے قاضی نے بتایا کہ دو جھگڑنے والے ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک پر قسم واجب ہوئی تو اس نے قسم اٹھا دی۔ دوسرے مخالف نے اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ پر کتنا جرأت کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ آگ پر کتنے بہادر ہیں کیونکہ وہ ایسے اعمال کرتے ہیں جو انہیں آگ تک پہنچاتے ہیں۔ زجاج نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ 71، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اس کا معنی ہے وہ آگ پر کتنے باقی رہنے والے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: ما اصبر فلانا علی الحبس، یعنی وہ کتنا حبس (قید) میں باقی رہنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا آگ سے جزع فزع کتنا کم ہے۔ جزع کی قلت کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسائی اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے وہ دوزخیوں کے عمل پر کتنا دوام اختیار کرنے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ما استفہام ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس (1)، سدی، عطا، ابوعبیدہ، معمر بن مثنی کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے: کس چیز نے انہیں دوزخیوں کے عمل پر صبر دیا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کی استہانت اور ان کے امر کے استخفاف (ہلکا سمجھنا) کی بناء پر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

''یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بے شک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے اور حکم کی طرف اشارہ ہے۔ گویا فرمایا: ذالك الحکم بالنار۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہے: الامر ذالك یا ذالك الامر یا ذالك العذاب لهم۔ اور ذٰلِكَ کی خبر مضمر ہے اس کا معنی ہے: یہ ان کو معلوم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فعلنا ذالك بهم (ہم نے یہ ان کے ساتھ کیا)

بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یہاں الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ بِالْحَقِّ سے مراد سچ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حجت ہے۔ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد تورات ہے۔ نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے اور یہود نے آپ کی صفت سے انکار کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے آباء اور سلف کی مخالفت کی تورات سے حجت پکڑنے میں۔ بعض نے فرمایا: جو تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت تھی اس میں مخالفت کی اور اس میں اختلاف کیا۔ بعض نے فرمایا: الْكِتٰبِ سے مراد قرآن ہے اور جنہوں نے اختلاف کیا وہ کفار قریش تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا: یہ قرآن جادو ہے۔ بعض نے کہا یہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ گھڑا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور شِقَاقٍ کے معنی پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

"نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیز گار ہیں"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَیْسَ الْبِرَّ اس خطاب کی مراد میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: ہمیں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے نیکی کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرائض کے نازل ہونے سے پہلے جو ان لا الہ الا اللہ اور ان محمدا عبدہ و رسولہ کی گواہی دیتا اور پھر فوت ہو جاتا تو اس کے لئے جنت واجب تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ربیع اور قتادہ نے یہ بھی کہا کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ قبلہ کی طرف منہ پھیرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ یہود کہتے تھے: قبلہ مغرب کی طرف بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کہتے تھے مشرق کی طرف سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے اور انہوں نے قبلہ کی تبدیلی میں بھی کلام کیا، ہر فرقہ نے اپنے قبلہ کی فضیلت بیان کی۔ ان سے کہا گیا یہ نیکی نہیں ہے جس میں تم ہو بلکہ نیکی تو یہ ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ... الخ۔(1)

**مسئلہ نمبر 2:** حمزہ اور حفص نے البر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لیس، کان کے اخوات سے ہے۔ اس کے بعد دو معرفے واقع ہوں تو تو جس کو چاہے اسم بنادے یا خبر بنادے۔ اور جب لیس کے بعد البر واقع ہوا تو اسے تو نے نصب دی اور اَنْ تُوَلُّوْا کو اسم بنایا اور مصدر کا اسم ہونا اولیٰ ہے کیونکہ وہ نکرہ نہیں بنتا۔ اور البر کبھی نکرہ بن جاتا ہے اور فعل تعریف میں قوی ہوتا ہے۔ باقی قراء نے البر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ لیس کا اسم ہے اور اس کی خبر اَنْ تُوَلُّوْا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: لیس البر تولیتکم و جوھکم۔ یعنی نیکی تمہارا اپنے قبلہ کی طرف مونہوں کو پھیرنا نہیں۔ اور پہلی ترکیب کے اعتبار سے معنی ہوگا تمہارا منہ پھیرنا نیکی نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا (الجاثیہ: 25) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں: ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا (روم: 10) (آخر کار ان کا انجام جنہوں نے برائی کی تھی بہت برا ہوا کیونکہ انہوں نے جھٹلایا) فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَاۤ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ (الحشر: 17) (ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے)

یہ رفع کی قرأت قوی ہے کیونکہ دوسری آیت میں بالاجماع خبر پر با آئی ہوئی ہے لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (البقرہ: 189) اس آیت میں صرف البر پر رفع جائز ہے۔ پہلی آیت کو دوسری پر محمول کرنا اولیٰ ہے بنسبت مخالفت

1۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے۔ اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں با کے ساتھ ہے لیس البربان تولوا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کے مصحف میں بھی ہے۔ اکثر قراء کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں قرأتیں بہتر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، الْبِرَّ یہاں خیر کے لئے اسم جامع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: و لکن البربرّ من آمن۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ جیسے اس آیت میں مضاف حذف ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) اصل میں اہل القریہ تھا۔ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ:93) اس میں بھی مضاف محذوف ہے۔ یہ فراء، قطرب اور زجاج کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

فانما　ھی　اقبال　و　ادبارٗ

یہ اصل میں ذات اقبال و ذات ادبار ہے۔

نابغہ نے کہا:

و کیف تواصل من اصبحت　خلالتہ　کابی　مرحب

اس شعر میں اصل کخلالۃ ابی مرحب ہے۔ پس اس میں حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: لکن ذالبر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (آل عمران:163) یہ اصل میں ذو درجات ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور فرائض، فرض کئے گئے اور قبلہ، کعبہ کو بنایا گیا اور حدود مقرر کی گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: کامل نیکی یہ نہیں کہ تم نماز پڑھو اور اس کے علاوہ عمل نہ کرو بلکہ نیکی والا وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے...... الخ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، عطا، سفیان اور زجاج کا قول ہے(1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ البرّ، البارّ اور البرّ کے معنی میں ہو۔ فاعل کو کبھی مصدر کے معنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل عدل، رجل صوم و فطر قرآن حکیم میں ہے: اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا (الملک:30) اس میں غورا کا معنی غائرا ہے۔ یہ ابوعبیدہ کا اختیار ہے(2)۔ مبرد نے کہا: اگر میں قرآن کے قاریوں میں سے ہوتا تو میں و لکن البر۔ یعنی با کے فتحہ کے ساتھ پڑھتا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف مَنْ پر ہے کیونکہ من جمع کے معنی میں اور محل رفع میں ہے گویا اس طرح فرمایا و لکن البر المؤمنون والموفون۔ یہ فراء اور اخفش کا قول ہے۔ الصابرین پر نصب مدح کی بنا پر یا فعل کے اضمار کے ساتھ ہے عرب مدح اور ذم کی بنا پر نصب دیتے ہیں۔ گویا وہ اس سے ممدوح اور مذموم کے افراد کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ اسے پہلے کلام کا تابع نہیں کرتے بلکہ اسے نصب دیتے ہیں۔ مدح کی مثال یہ ارشاد ہے: وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ (3) (النساء:162) نسائی نے یہ اشعار پڑھے ہیں

وکل قوم اطاعوا امر مرشد ھم　الا نمیرا اطاعت امرغاویھا
الظاعنین ولما یظعنوا احداً　والقائلون لمن دارٌ نخلیھا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہر قوم نے اپنے مرشد کے حکم کی اطاعت کی سوائے نمیر کے۔ انہوں نے اپنے گمراہ کرنے والے کے امر کی اطاعت کی۔ وہ کوچ کرنے والے ہیں انہوں نے کسی کو کوچ نہیں کرایا اور جس کا گھر اس کے کہنے والے ہیں کہ ہم اسے خالی کرتے ہیں۔

ابوعبیدہ نے یہ شعر پڑھے ہیں:

لا یبعدن قومی الذین هم سم العداة وآفة الجزر

النازلین بکل معترك والطیبون معاقد الأزر

ان اشعار میں النازلین کو بطور مدح نصب دی گئی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نحن بنی ضبة اصحاب الجمل

اس میں بھی بنی ضبہ کو نصب مدح کے طور پر ہے۔ ذم کی مثالیں یہ ہیں: مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا (احزاب: 61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں پائے جائیں گے)۔

عروہ بن الورد نے کہا:

سقونی الخمرثم تکنفونی عداة الله من کذب وزور

اس میں عداۃ اللہ کو نصب بطور ذم دی گئی ہے۔

یہ سلسلہ نعوت میں عام ہے، اعراب کی جہت سے اس میں طعن نہیں کیا جاتا۔ کلام عرب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ وہ لوگ جو کلام میں ہٹ دھرمی کرتے ہیں انہوں نے کہا: لکھنے میں کاتبوں سے غلطی ہوئی ہے جب انہوں نے قرآن کا نسخہ لکھا تھا اور کہا کہ اس پر وہ روایت ہے جو حضرت عثمان (1) سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن کا نسخہ دیکھا تو انہوں نے کہا اس میں غلطی ہے عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اس کو درست کرلیں گے۔ اسی طرح سورہ النساء میں وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ (النساء: 162) اور سورہ المائدہ میں الصائبون کے بارے میں کہا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا (کہ عرب کلام میں بطور مدح یا ذم، صفت کو اعراب میں جدا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح کیا گیا ہے)۔

بعض علماء نے فرمایا: الموفون کو رفع مبتدا کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت و ھم الموفون ہے۔ کسائی نے کہا والصابرین کا عطف ذوی القربی پر ہے گویا فرمایا وآتی الصابرین۔ نحاس نے کہا: یہ قول غلط ہے اور خطا واضح ہے۔ کیونکہ جب تو الصابرین کو نصب دے گا اور اس کا عطف ذوی القربی پر کریگا تو یہ (من) کے صلہ میں داخل ہوجائے گا۔ اور جب تو الموفون کو من پر عطف کی وجہ سے رفع دے گا تو تو نے صلہ کے مکمل ہونے سے پہلے من پر عطف کر دیا اور تو نے معطوف کے ساتھ صلہ اور موصول کے درمیان فرق کر دیا۔ کسائی نے کہا: حضرت عبداللہ کی قراءت میں الموفین

---

1۔ حضرت عثمان کے قول کی صحت کا محققین علماء نے انکار کیا ہے۔ علامہ زمخشری، ابوحیان اور آلوسی وغیرہ نے اس قول کی حضرت عثمان کی طرف نسبت کا شد و مد سے انکار کیا ہے۔ یہ واضعین کی کارستانی ہے۔

والصابرین ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں ذوالقربیٰ پر معطوف ہیں یا بطور مدح منصوب ہیں۔ فراء نے کہا: عبداللہ کی قراءت میں سورہ النساء میں وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (النساء:162) ہے۔ یعقوب اور اعمش نے الموفون والصابرون پڑھا ہے یعنی دونوں کو رفع کے ساتھ (1)۔ جحدری نے بعهودهم پڑھا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف اس ضمیر پر ہے جو آمن میں ہے۔ ابوعلی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا کہ معنی اس پر نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد ان البر برمن آمن باللہ ھو والموفون۔ یعنی ہم تمام پر ایمان لائے جیسے تو کہتا ہے: الشجاع مَنْ اقدم ھو و عمرو۔ اور من آمن کے قول کے بعد جو کچھ ہے وہ من آمن کے افعال کو اور ان کے اوصاف کو شمار کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت عظیمہ امہات الاحکام میں سے ہے کیونکہ یہ سولہ قواعد اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات پر ایمان...... ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی وضاحت اپنی کتاب ''الاسنیٰ'' میں کر دی ہے...... نشر، حشر، میزان، صراط، حوض، شفاعت، جنت، دوزخ ان کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں کر دیا ہے...... ملائکہ، نازل شدہ کتب یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہیں...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے...... انبیاء کرام، مال خرچ کرنا، واجبی طور پر اور نفلی طور پر قریبی رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا۔ ان سے قطع تعلقی کو ترک کرنا، یتیم کی دیکھ بھال کرنا ان کو بے یارومددگار نہ چھوڑنا اسی طرح مساکین کی خیر خواہی کرنا، مسافروں کی رعایت کرنا۔ ابن السبیل سے مراد بعض نے فرمایا: جو راستہ سے پیچھے رہ جانے والے ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مہمان ہے...... سوال کرنا، غلاموں کو آزاد کرانا...... اس کا بیان آیت الصدقات میں آئے گا...... نماز کی حفاظت کرنا، زکوٰۃ دینا، عہد کو پورا کرنا، تکلیف میں صبر کرنا، ان قواعد میں سے ہر قاعدہ ایک کتاب کا محتاج ہے، اکثر پر تنبیہ پہلے گزر چکی ہے۔ باقی کا بیان ان شاء اللہ ان کے مواقع پر آئے گا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا نفلی صدقہ سے یتیم کو صلہ رحمی کے طور پر یتیم ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی بھی ہو یا نہیں دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ فقیر ہو۔ اس کے متعلق عطا کے دو قول ہیں: یہ واجب زکوٰۃ کے علاوہ مال دینے کی بنا پر ہے، جیسا کہ ابھی ہم بیان کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ جنہوں نے یہ کہا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے اور نیکی کا کمال اسی کے ساتھ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کے راستہ میں دیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے (3)۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ دار قطنی نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے پھر یہ آیت تلاوت کی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، ترمذی نے اپنی جامع میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث ایسی ہے کہ اس کی سند ایسی نہیں ہے۔

ابوحمزہ میمون اعور کو ضعیف کہا گیا ہے، بیان اور اسماعیل بن سالم نے شعبی سے یہ قول روایت کیا ہے اور یہ اصح ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے اس کی صحت پر آیت کا معنی ہی دلالت کرتا ہے۔ فرمایا: وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ۔ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ سے مراد فرضی زکوٰۃ نہیں ہے (کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ورنہ تکرار ہو جائے گا(1) واللہ اعلم۔ علماء کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کو کوئی ضرورت پڑ جائے تو اس میں مال کا خرچ کرنا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر اپنے قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگر چہ ان کا سارا مال بھی اس میں غرق ہو جائے۔ اس پر اجماع بھی ہے اور یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى حُبِّهٖ، حُبِّهٖ میں ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: مال دینے والے کی طرف راجع ہے۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور وہ مال ہے۔ ذوی القربیٰ کو حُبِّهٖ کی وجہ سے نصب دینا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: علی حب المعطی ذوی القربیٰ۔ بعض نے فرمایا: یہ ضمیر مال کی طرف لوٹ رہی ہے مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا(2): اور عَلٰى حُبِّهٖ کا قول، کلام کے درمیان اعتراض بلیغ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا (الدھر: 8) یہ دونوں معانی کو جامع ہے الاعتراض اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کرنا۔ یعنی علی حب الطعام۔ اعتراض کی مثال یہ ہے: وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ (النساء: 124) اس کو تتمیم کہا جاتا ہے اور یہ بلاغت کی ایک قسم ہے احتراس و احتیاط کہا جاتا ہے۔ پس عَلٰى حُبِّهٖ کے قول کے ساتھ تتمیم کی اور وھو مومنٌ کے قول کے ساتھ تتمیم کی۔ اسی سے زہیر کا قول ہے:

من یلق یوماً علی عِلّاتِہ ھرماً    یلق السماحة منه والندی خلقاً

اس شعر میں علی علاتہ تتمیم حسن ہے۔

اور امرء القیس نے کہا:

علی ھیکل یعطیك قبل سؤاله    افانین جريٍ غیر کزّ و لا وان

اس شعر میں قبل سوالہ، تتمیم حسن ہے۔

اسی طرح عنترہ کا قول ہے:

اثنی علیّ بما علمت فانني    سهلٌ مخالفتي اذا لم أُظلم

اس شعر میں لم أظلم، تتمیم حسن ہے۔

طرفہ نے کہا:

فسقی دیارك غیر مفسدها    صوب الربیع و دیمة تهمی

اس میں غیر مفسدھا تتمیم اور احتراس ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ربیع بن ضبع الفزاری نے کہا:

فنیت و ما یفنی صنیعی و منطقی و کل امرئ الا احادیثہ فان

اس شعر میں الا احادیثہ تتمیم اور احتراس ہے۔

ابو ہفان نے کہا:

فأفنی الردی ارواحنا غیر ظالم وأفنی الندی اموالنا غیر عائب

اس میں غیر ظالم اور غیر عائب تتمیم اور احتیاط ہے۔ شعر میں یہ کثیر ہوتا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع الایتاء ہے کیونکہ فعل اپنے مصدر پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ (آل عمران:80) یعنی بخل ان کے لئے بہتر ہے جب کوئی حاجت لاحق ہو یا فاقہ لاحق ہو تو مال کا عطا کرنا انہیں محبوب ہے(1)۔ بعض نے فرمایا: حبہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کا اسم ہے جو مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان ان وجوہ میں خرچ کرے جبکہ وہ صحیح ہو (اس مال پر) بخیل ہو فقر کا اندیشہ ہو اور بقا کی امید رکھتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ، الْبَاْسَآءِ سے مراد شدت اور فقر ہے اور الضَّرَّآءِ سے مراد مرض اور اپاہج پن ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں سے کوئی بندہ جسے میں اس کے بستر میں بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اپنے تیمارداروں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اس کے گوشت سے بہتر گوشت اور اس کے خون سے بہتر خون عطا کرتا ہوں، اگر میں اس کی روح قبض کر لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہوں، اگر میں اسے عافیت دیتا ہوں تو اسے عافیت دیتا ہوں جبکہ اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کے گوشت سے کون سا گوشت بہتر ہے؟ فرمایا: وہ گوشت جس نے گناہ نہیں کیا ہوتا۔ عرض کی گئی: اس کے خون سے بہتر خون کون سا ہے؟ فرمایا: ایسا خون جس نے گناہ نہیں کیا الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ۔ دونوں فعلاء کے وزن پر ہیں۔ ان کا فعل نہیں ہے کیونکہ یہ اسم ہیں اور صفت نہیں ہیں وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اس سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یعنی وہ اپنے امور میں سچ اور تقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے امور کو پورا کرتے ہیں۔ وہ دین میں کوشش کرنے والے ہیں یہ انتہائی تعریف اور ثناء ہے۔ صدق کا متضاد کذب ہے۔ کہا جاتا ہے: صدقوھم القتال انہوں نے قتال کی تصدیق کی۔ الصدیق جو صدق کو لازم پکڑتا ہے اور حدیث میں ہے: علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر و ان البر یھدی الی الجنۃ و ما یزال الرجل یصدق و

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

یتحری الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً ☆ ۔ (تم پر سچ بولنا لازم ہے۔ سچ، نیکی کی طرف ہدایت دیتا ہے نیکی جنت کی طرف ہدایت دیتی ہے انسان سچ بولتا ہے اور سچ کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سچا لکھا جاتا ہے)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اے ایمان والو! فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پس جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز تو چاہیے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہیے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح۔ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ تو جس نے زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: بخاری (1)، نسائی اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: بنی اسرائیل میں صرف قصاص (بدلہ) تھا ان میں دیت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کہا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ، العفو سے مراد قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ وہ معروف طریقہ سے طلب کرے اور وہ احسان کے ساتھ ادا کرے۔ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ جو تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ جس نے دیت کی قبولیت کے بعد قتل کیا تو اس پر عذاب الیم ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ حمیدی نے ہمیں بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں سفیان نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں عمرو نے بیان کیا، فرمایا: میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ شعبی نے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کے تحت فرمایا: یہ عربوں کے دو قبائل کے بارے اتری جو آپس میں لڑے تھے۔ انہوں نے کہا ہم اپنے غلام کے بدلے میں فلاں بن فلاں کو قتل کریں گے اور ہم اپنی لونڈی کے بدلے میں فلانۃ بنت فلاں کو قتل کریں گے۔ اسی طرح قتادہ سے مروی ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ، كُتِبَ کا معنی فُرِضَ اور اثبت ہے۔ اسی سے عمر بن

---

1۔ صحیح بخاری، باب یایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص۔۔۔الایہ، حدیث نمبر 4138، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ابی ربیعہ کا قول ہے:

کتب القتل والقتال علینا و علی الغانیات جر الذیول

ہم پر قتل اور قتال فرض کیا گیا ہے اور گانے والیوں پر دامنوں کو گھسیٹنا۔

بعض علماء نے فرمایا: کُتِبَ یہاں خبر دینا ہے اس کے متعلق جو لوح محفوظ پر رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے القصاص۔ یہ قص الاثر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پیچھا کرنا۔ اسی سے القاص ہے کیونکہ وہ آثار اور اخبار کی اتباع کرتا ہے۔ قص الشعر اس کے اثر کی اتباع کرنا۔ گویا قاتل قتل کے راستہ پر چلتا ہے تو اس میں اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اس میں اس کے راستہ پر چلا جاتا ہے (1)۔ اسی سے ہے: فارتدا علی اثارھما قصصا، وہ اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھے آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: القص کا معنی کاٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصصت ما بینهما۔ اسی سے قصاص لینا ہے کیونکہ اسے اس کی مثل زخم لگایا جاتا ہے جو اس نے لگایا تھا یا اسے قتل کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اقصّ الحاکم فلاناً من فلان و أباء ہ بہ فا مثلہ فامتثل بہ یعنی حاکم نے فلاں سے قصاص لیا۔

**مسئلہ نمبر 3:** قصاص کی صورت یہ ہے کہ قاتل پر فرض ہے کہ جب ولی قتل کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کرے اور قصاص شرعی کی پیروی کرے اور ولی پر فرض ہے کہ وہ قاتل کو ہی قتل کرے، اس کے ولی کو قتل نہ کرے اور غیر پر تعدی نہ کرے جیسا کہ عرب تعدی کرتے تھے وہ غیر قاتل کو قتل کرتے تھے (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہی معنی ہے کہ لوگوں میں سے اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے روز تین شخص زیادہ نافرمان ہوں گے: ایک وہ جس نے غیر قاتل کو قتل کیا، وہ جس نے حرم میں قتل کیا، وہ جس نے جاہلیت کی دشمنی کا بدلہ لیا۔ شعبی اور قتادہ وغیرہما نے کہا: اہل جاہلیت میں برائی اور شیطان کی اطاعت تھی۔ ایک قبیلہ جس میں عزت اور قوت ہوتی تھی پھر اس کا غلام قتل کیا جاتا تھا تو اس کے مقابل والے کہتے: ہم اس کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے۔ جب ان کی عورت قتل ہوتی تو کہتے: ہم اس کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے جب ان کا کوئی کم مرتبہ شخص قتل ہوتا تو وہ کہتے: ہم اس کے بدلے میں شریف کو قتل کریں گے اور کہتے: قتل، قتل سے بچانے والا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حد سے تجاوز کرنے سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ**۔ اور فرمایا: **وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ** فصاحت و بلاغت میں ان دونوں کے کلاموں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں کوئی اختلاف نہیں قتل کا فیصلہ اولی الامر حاکم کرے گا۔ ان پر قصاص کا قائم کرنا اور حدود کا قائم کرنا فرض کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کو قصاص کے ساتھ خطاب فرمایا۔ پھر تمام مسلمان تو قصاص پر جمع نہیں ہو سکتے تو انہوں نے سب کے قائم مقام سلطان کو کیا کہ وہ قصاص اور حدود کو قائم کرے۔ القصاص لازم نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ قصاص اور دوسری حدود زیادتی تک تجاوز نہ کریں (3)۔ جب قصاص کے بدلے میں دیت یا معافی کے ساتھ مقتول کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اولیاء راضی ہو جائیں تو یہ مباح ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کُتِبَ عَلَيْكُمُ کا معنی ہے: تم پر فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا ہے تو پھر قصاص کیسے واجب ہوگا؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب تم ارادہ کرو جان لو کہ قصاص جھگڑے کے وقت غایت ہے۔ القتلی، قتیل کی جمع ہے اور مونث کا لفظ، جماعت کی تانیث ہے یہ ان افعال میں سے ہیں جو لوگوں پر کرھاً (ناپسندیدگی) داخل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس بنا پر یہ الفاظ آئے ہیں جیسے جَرْحٰی، زمنی، حمقی، صرعی، غرقی، اور اس کے مشابہ الفاظ۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا یہ آیت نوع کے حکم کو بیان کررہی ہے جب کوئی اپنی نوع کو قتل کرے۔ اس آیت سے آزاد کا حکم بیان کیا جب وہ آزاد کو قتل کرے، غلام جب غلام کو قتل کرے، عورت جب عورت کو قتل کرے، ایک نوع جب دوسری نوع کو قتل کر دے تو اس سے تعرض نہیں کیا۔ یہ آیت محکم ہے اور اس میں اجمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان کر رہا ہے: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ۔ (المائدہ:45) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے بیان فرمایا جب ایک یہودی نے ایک عورت کو قتل کر دیا تھا(1)۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ ابوعبید نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ آیت سورۂ مائدہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** کوفیوں اور ثوری نے کہا: آزاد کو غلام کے بدلے، مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى۔ یہ حکم عام ہے اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ:45) وہ فرماتے ہیں: حرمت میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔ جس میں قصاص ہوتا ہے وہ ہے خون کی حرمت جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔ ذمی بھی ہمیشہ محفوظ الدم ہوتا ہے اور اسی طرح مسلمان بھی۔ دونوں دارالاسلام کے اہل سے ہو گئے اور اس چیز کو یہ امر بھی ثابت کرتا ہے کہ ذمی کا مال مسلمان کے مال کے برابر ہے۔ پس خون کی مساوات کی یہ دلیل ہے کیونکہ مال کی حرمت، مالک کی حرمت کے ساتھ ہوتی ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی، ثوری، ابن ابی لیلیٰ کا اتفاق ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح غلام کے بدلے غلام کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے اور یہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ سعید بن مسیب، قتادہ، ابراہیم نخعی اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔ جمہور علماء غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: آیت میں تنویع و تقسیم کے لئے حکم ہے۔ ابوثور نے کہا: جب تمام علماء کا اتفاق ہے کہ نفوس سے کم میں غلاموں اور آزاد لوگوں میں قصاص نہیں ہے تو نفوس اس کے زیادہ لائق ہیں اور جنہوں نے ان کے درمیان فرق کیا ان کے کلام میں تناقض ہے۔ اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جو غلام کو خطا قتل کر دے تو اس پر غلام کی قیمت واجب ہے۔ پس جس طرح غلام قتل خطا میں آزاد کے مشابہ نہیں ہے قتل عمد میں بھی مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح غلام سامانوں میں سے ایک سامان ہے اور بیچا جاتا ہے اور خریدا جاتا ہے اور اس میں مرضی سے تصرف کیا جاتا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومة بین المسلم، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس غلام اور آزاد کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے اور کوئی برابری نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ اجماع صحیح ہے۔ رہا پہلا قول (جب تمام علماء کا اتفاق ہے اس کی کلام میں تناقص ہے) ابن ابی لیلیٰ اور داؤد نے نفس میں اور تمام اعضاء میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص کا قول کیا ہے اور داؤد نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: المسلمون تتکافأ دمائهم (1) (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ بخاری نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت نقل کی ہے (2) اور اس کے مخالف جو حدیث ربیعہ سے روایت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ایک مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کیا۔ یہ حدیث اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع ہے اور ابن البیلمانی کی حدیث جو حضرت ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع مروی ہے یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ ابن البیلمانی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابراہیم بن ابی یحییٰ کے علاوہ کسی نے اس کو مسند نہیں بنایا اور ابراہیم متروک الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عن ربیعہ عن ابن البیلمانی مرسل ہے ابن البیلمانی ضعیف الحدیث ہے۔ جب وہ حدیث کو متصل بیان کرے تب بھی اس کی حدیث حجت نہیں ہوتی تو پھر اس کی مرسل کیسے حجت ہوگی۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں بخاری کی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کی تخصیص کرتی ہے یعنی كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى اور النفس بالنفس کے عموم کو خاص کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** حضرت علی بن ابی طالب، حسن بن ابی حسن بصری سے روایت ہے کہ یہ آیت مذکورین کے حکم کو بیان کرتی ہے تاکہ ان کے درمیان اور ان کے درمیان جو آزاد، غلام کو قتل کردے یا غلام، آزاد کو قتل کردے یا مذکر، مونث کو قتل کر دے، مونث، مذکر کو قتل کردے فرق پر دلالت کرے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا: جب کوئی مرد، عورت کو قتل کردے اگر اس عورت کے اولیاء اس کو قتل کرنا چاہیں تو اس کے ورثاء کو نصف دیت دے دیں اور اگر اس عورت کے اولیاء اسے زندہ رکھنے کا ارادہ کریں تو اس سے نصف دیت لے لیں۔ اور اگر کوئی عورت مرد کو قتل کردے پھر اگر اس مرد کے اولیاء اس عورت کو قتل کرنا چاہیں تو اسے قتل کردیں اور نصف دیت لے لیں۔ وگرنہ اپنے ساتھی کی دیت لے لیں اور عورت کو زندہ چھوڑ دیں (3)۔ شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام شعبی نے حضرت علی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ حضرت حکم نے حضرت علی اور حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب مرد، عورت کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا قصاص ہوگا۔ یہ روایت شعبی کی حضرت علی سے روایت کے مخالف ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ کانا اور ایک ہاتھ جس کا شل ہو جب وہ کسی سلامت اعضاء والے کو قتل کردے تو اس کے ولی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کانے شخص کو قتل کردے اور نصف دیت لے لے۔ اس وجہ سے کہ اس نے دو آنکھوں والے کو قتل کیا تھا اور یہ کانا تھا اور اس نے دو ہاتھوں والے کو قتل کیا جب کہ اس کا

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی السریة ترد علی اهل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب کتابة العلم، حدیث نمبر 108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　3۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ایک ہاتھ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ نفس، نفس کا مقابل ہے بچے کا نفس بڑے کے نفس کا مقابل ہے۔

اور یہ کہنے والے کو کہا جائے گا کہ آدمی، عورت کا مقابل نہیں ہوتی اور نہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) کے تحت داخل ہے۔ پھر تم نے اس عورت کے بدلے میں مرد کو کیوں قتل کر دیا جبکہ وہ مرد کے برابر نہیں ہے؟ پھر تم نصف دیت بھی لیتے ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ دیت قصاص کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ جب دیت قبول کی جائے گی تو خون حرام ہو جائے گا اور قصاص اٹھ جائے گا۔ پس تیرا یہ قول اس کی نہ اصل ہے نہ قیاس۔ یہ ابو عمر کا قول ہے جب آزاد غلام کو قتل کرے گا تو پھر اگر غلام کا مالک چاہے تو آزاد کو قتل کرے اور آزاد کی دیت دے دے مگر غلام (مقتول) کی قیمت منہا کر لے اگر چاہے تو آزاد کو زندہ چھوڑ دے اور غلام کی قیمت لے لے۔ یہ حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس روایت نے بھی پہلے لوگوں کا انکار کیا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے بدلے مرد کو اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا اور جمہور علماء کسی شے کے ساتھ رجوع کا نظریہ نہیں رکھتے۔ ایک فرقہ اضافی دیتوں کا نظریہ رکھتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ثوری اور ابوثور نے کہا: اسی طرح نفس سے کم میں بھی ان کے درمیان قصاص ہوگا۔ حماد بن ابی سلیمان اور امام ابوحنیفہ نے کہا: نفس سے کم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ قصاص نفس کے بدلے نفس کا ہے ان پر حجت اس طرح پیش کی گئی ہے کہ جب نفس کے بدلے نفس ہے تو اس سے کم میں بدلہ بدرجہ اولیٰ ہوگا جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** ابن عربی نے کہا: لوگوں میں جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگوں نے کہا: آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اس کے متعلق انہوں نے حسن عن سمرہ کے سلسلے سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے (2)۔ یہ حدیث ضعیف ہے اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ** (اسراء: 33)۔ یہاں ولی سے مراد سردار اور مالک ہے اس کے لئے اپنے نفس پر سلطان کیسے ہوگی؟ علماء کا اتفاق ہے کہ مالک اگر خطا اپنے غلام کو قتل کر دے تو مالک سے غلام کی قیمت بیت المال کے لئے نہیں لی جائے گی۔ عمرو بن شعیب سے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوڑے لگائے اور ایک سال تک اسے جلاوطن کیا مسلمانوں سے اس کا حصہ ختم کر دیا اور اس غلام کے بدلے میں اس سے قصاص نہ لیا۔ (3)

اگر کہا جائے کہ جب مرد اپنی بیوی کو قتل کر دے تو پھر تم کیوں کہتے ہو کہ خاوند سے قصاص دور کرنے میں شبہ نکاح ہے کیونکہ نکاح غلامی کی ایک قسم ہے۔ یہ لیث بن سعید نے کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکاح عورت کے لئے خاوند پر منعقد ہوتا ہے، جس طرح مرد کے لئے عورت پر منعقد ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نہ تو اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے اور نہ

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ سنن ابن ماجہ، باب هل يقتل الحر بالعبد، حدیث نمبر 2652، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 2653

چار عورتوں سے زائد سے نکاح کر سکتا ہے۔ عورت خاوند سے وطی کے حق کا مطالبہ کر سکتی ہے جس طرح مرد اس سے مطالبہ کر سکتا ہے لیکن مرد کو عورت پر قوامت کی فضیلت حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے بنائی ہے کیونکہ وہ اپنے مال سے اس پر خرچ کرتا ہے یعنی اس پر مہر اور نفقہ واجب ہوتا ہے اگر شبہ ہوگا تو دونوں طرف سے ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث جس کو ابن عربی نے ضعیف کہا ہے وہ صحیح ہے۔ نسائی اور ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے۔ اس کا مکمل متن یہ ہے: جو غلام کا ناک کاٹے گا ہم اس کا ناک کاٹیں گے اور جو اس کو خصی کرے گا ہم اسے خصی کریں گے۔ بخاری نے علی بن مدینی سے روایت کیا ہے کہ حسن کا سمرہ سے سماع صحیح ہے اور انہوں نے اس حدیث کو لیا ہے۔ بخاری نے کہا: میں اسی کی طرف جاتا ہوں (یعنی میرا مذہب یہی ہے) اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو یہ دونوں امام اس کو اپنا مذہب نہ بناتے۔ تیرے یہ دونوں امام کافی ہیں۔ آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ نخعی اور ثوری نے ایک قول میں یہی کہا۔ بعض محدثین نے کہا: حسن نے حضرت سمرہ سے نہیں سنا سوائے عقیقہ کی حدیث کے۔ واللہ اعلم۔ غلاموں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یہ عمر بن عبدالعزیز، سالم بن عبداللہ زہری، قران، امام مالک، امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے شعبی، نخعی، ثوری اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ان کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول اصح ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** دارقطنی، ابوعیسیٰ ترمذی نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باپ بیٹے سے قصاص لے گا اور بیٹا باپ سے قصاص لے گا۔ ابوعیسیٰ نے کہا: اس حدیث کو ہم سراقہ کی حدیث سے نہیں جانتے مگر اس طریق سے۔ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اس کو اسماعیل بن عباس سے مثنی بن صباح سے روایت کیا ہے اور مثنی حدیث میں ضعیف ہے۔ اس حدیث کو ابوخالد احمر نے حجاج سے انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اس کے دادا سے انہوں نے حضرت عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، یہ حدیث عمرو بن شعیب سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ اس حدیث میں اضطراب ہے اہل علم کے نزدیک علم اس پر ہے کہ باپ جب بیٹے کو قتل کردے گا تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب باپ بیٹے پر تہمت لگائے گا تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر قصاص نہیں ہے اور اس پر دیت ہے۔ یہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ عطا اور مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک، ابن نافع، ابن عبدالحکم نے کہا: باپ کو بیٹے کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: ہم کتاب و سنت کے ظاہر کی وجہ سے یہی کہتے ہیں: ظاہر کتاب یہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے المومنون تتکافأ دمائهم "مومنوں کے خون برابر ہیں" اور ہم کوئی خبر ایسی نہیں جانتے جس میں باپ کی استثناء ثابت ہو۔ اس کے متعلق ہم نے جو اخبار روایت کی ہیں وہ ثابت نہیں ہیں۔ الکیا طبری نے عثمان البتی سے حکایت کیا ہے کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ قرآن میں قصاص کے متعلق عام حکم ہے۔ اس کی مثل امام مالک سے مروی ہے۔ شاید وہ قرآن کی عمومات کے مقابلہ میں اخبار احاد کو قبول نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کر دے مثلاً اسے لٹائے اور ذبح کر دے یا اسے باندھ دے جبکہ اس کے لئے اس میں کوئی عذر نہ ہو اور اس کے خطا کے دعویٰ میں کوئی شبہ نہ ہو تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ رہا وہ شخص جو ادب سکھانے کے لئے اسے ہتھیار سے مارے یا گلا دبا کر اسے قتل کر دے تو اس میں دو قول ہیں: اس کو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسے قتل نہیں کیا جائے گا (1)۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے شیخ فخر الاسلام الشاشی سے سنا وہ فرما رہے تھے: باپ کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کے وجود کا سبب تھا پس بیٹا اس کے عدم کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ قول اسی سے باطل ہو جاتا ہے کہ جب کوئی اپنی بیٹی سے بدکاری کرے تو اسے رجم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس بچی کے وجود کا سبب تھا اور یہ اس کے عدم کا سبب ہوئی ہے۔ پھر یہ کس فقہ کے تحت ہے، وہ اس کے عدم کا سبب کیوں نہ ہو۔ جب اس کے متعلق اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والد سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ یہ حدیث باطل ہے (2)۔ ان کے متعلق ہے کہ حضرت عمر نے بیٹے کے قاتل کے بارے میں دیت مغلظہ کا فیصلہ فرمایا اور کسی صحابی نے ان پر انکار نہیں کیا۔ تمام فقہاء نے مطلق مسئلہ کو لیا اور کہا کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور امام مالک نے مسئلہ کو محکمہ مفصلہ لیا اور فرمایا: اگر اس نے اس پر تلوار سونتی تو یہ حالت قتل کے قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے اور عدم قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ ابوہ کی شفقت ایک قائم شبہ ہے۔ قتل کے قصد کے نہ ہونے کا شاہد شبہ ہے۔ پس قصاص ساقط کیا جائے گا۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کو لٹا دے تو اس کے قصد سے پردہ اٹھ گیا پس وہ اصل کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کہتے ہیں بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں بیٹے کو قتل کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 12:** امام احمد بن حنبل نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مساوات کی شرط رکھی ہے اور جماعت اور ایک آدمی کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ (المائدہ: 45) اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص سے مراد آیت میں جس نے کسی کو قتل کیا ہے اسے قتل کرنا ہے۔ اس میں عربوں کا رد ہے جو اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے تھے جس نے قتل کیا ہوتا تھا اور ایک کے مقابلہ میں سو کو قتل کرتے تھے، اپنی جاہ و حشمت کا اظہار اور فخر کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل اور مساوات کا حکم دیا کہ جو قتل کرے صرف اسے قتل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صنعا میں ایک شخص کے بدلے میں سات شخصوں کو قتل کیا اور فرمایا: اگر اہل صنعا اس کو قتل کرنے میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن خباب کے بدلے میں خارجیوں کو قتل کیا۔ حضرت عبد اللہ بن خباب کو انہوں نے بکری کی طرح ذبح کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے کہا: اللہ اکبر۔ آپ نے فرمایا: انہیں کہو کہ حضرت عبد اللہ بن خباب کے قاتل کو ہمارے سامنے نکالو۔ انہوں نے کہا: ہم سب نے قتل کیا ہے۔ تین مرتبہ یہ کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابن ماجہ، باب لا یقتل الوالد بولدہ، حدیث نمبر 2650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اپنے اصحاب سے کہا: اس قوم کو پکڑو۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علی اور ان کے ساتھیوں نے خارجیوں کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں حدیثیں دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں اور ترمذی میں حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر سارے آسمان والے اور سارے زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو آگ میں اوندھا گرائے گا۔ اس حدیث کے متعلق فرمایا یہ حدیث غریب ہے اگر ایک جماعت کو معلوم ہو گا کہ جب وہ ایک شخص کو قتل کریں گے تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا...

اس قاعدہ کی رعایت کرنا، الفاظ کی رعایت کرنے سے اولیٰ ہے۔ ابن منذر نے کہا: زہری، حبیب بن ابی ثابت اور ابن سیرین نے کہا: دو شخصوں کو ایک کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے یہ حضرت معاذ بن جبل، ابن زبیر اور عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ اصح ہے۔ جس نے ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل کرنا مباح کیا ہے اس کے پاس کوئی حجت نہیں حالانکہ حضرت ابن زبیر سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: ائمہ نے ابو شریح کعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اے خزاعہ کے گروہ! تم نے ہذیل کا یہ شخص قتل کیا ہے اور میں اس کی دیت دینے والا ہوں۔ پس میری اس گفتگو کے بعد جس کا کوئی شخص قتل کیا جائے گا اس کے ورثا کو دو چیزوں میں اختیار ہو گا یا تو وہ دیت لے لیں یا قاتل کو قتل کریں۔ یہ ابو داؤد کے لفظ ہیں (1)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو شریح خزاعی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا کوئی شخص قتل ہو جائے تو اسے قتل کرنے یا معاف کرنے یا دیت لینے کا اختیار ہے۔ بعض اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**: جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں دیت لینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: مقتول کے ولی کو اختیار ہے اگر چاہے تو قصاص لے لے اگر چاہے تو دیت لے لے۔ اگرچہ قاتل راضی نہ بھی ہو۔ یہ سعید بن مسیب، عطاء، حسن سے مروی ہے اس کو اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے۔ لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ان کی حجت ابو شریح کی حدیث ہے اور جو اس کے ہم معنی احادیث ہیں یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ نیز نظر کے طریق سے اس کی رضا کے بغیر اس پر دیت لازم ہے کیونکہ اس پر فرض، نفس کا احیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) نہ قتل کرواپنے نفسوں کو اور ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی جو اپنا خون ترک کر دے۔ (یہ تاویل کے مطابق) اور اس سے دیت لینے میں راضی ہو۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس نے دیت لینی ہے وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل پر ضروری ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے ادا کرے۔ ٹال مٹول نہ کرے اور ادائیگی کے وقت سے تاخیر نہ کرے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ہم سے پہلے لوگوں پر قصاص کے علاوہ کچھ فرض نہ تھا اس امت پر دیت کے ساتھ فضل فرمایا جبکہ مقتول کا وارث راضی ہو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مقتول کے ولی کے لئے صرف قصاص ہے وہ دیت نہیں لے گا مگر جب قاتل راضی ہو۔ ابن القاسم نے مالک سے یہ روایت کیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب ولی العمد یرضی بالدیۃ، حدیث نمبر 3905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ ان کا مشہور قول یہی ہے۔ ثوری اور کوفیوں نے یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ربیع کے واقعہ کے متعلق ہے جب اس نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا تھا۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول الله ﷺ نے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور فرمایا: کتاب الله کا فیصلہ قصاص ہے، کتاب الله کا فیصلہ قصاص ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو اختیار نہیں دیا جس پر جنایت کی گئی تھی کہ وہ قصاص لے یا دیت لے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتاب الله اور رسول الله ﷺ کی سنت سے عمد (جان بوجھ کر جنایت کرنے) میں قصاص ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے ابو شریح کی مذکور حدیث کی وجہ سے۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے ابوحنیفہ بن سماک بن فضل شہابی نے بتایا، فرمایا: اور مجھے ابن ابی ذئب نے بتایا، انہوں نے مقبری سے انہوں نے ابوشریح کعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول الله ﷺ نے فتح مکہ کے سال فرمایا: جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو چیزوں میں اختیار ہے اگر پسند کرے تو دیت لے لے، اگر پسند کرے تو اس کے لئے قصاص (بدلہ) ہے۔ ابوحنیفہ نے کہا: میں نے ابن ابی ذئب سے کہا۔ اے ابوالحارث! تو اس پر عمل کرتا ہے۔ اس نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور بلند آواز سے مجھے کہا: میں تجھے رسول الله ﷺ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے: تو اس پر عمل کرتا ہے۔ ہاں میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ یہ مجھ پر اور سننے والے پر فرض ہے۔ الله تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو لوگوں سے منتخب فرمایا اور آپ کے ذریعے ہدایت دی اور آپ کے ہاتھوں پر ہدایت دی اور لوگوں کے لئے وہ پسند کیا جو آپ ﷺ کے لئے پسند کیا اور آپ کی زبان پر پسند کیا۔ مخلوق پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ کی خوشی سے یا ذلیل ہو کر اطاعت کریں۔ مسلمان کے لئے اس سے خروج کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ابوحنیفہ نے کہا: ابن ابی ذئب مجھ سے خاموش نہ ہوئے حتی کہ میں نے خواہش کی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔

**مسئلہ نمبر 15**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔

مَنْ اور عفی کی تاویلات میں پانچ اقوال ہیں:

۱- مَنْ سے مراد قاتل ہے اور عُفِیَ، عافیا کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور وہ مقتول کا ولی ہے۔ الاخ سے مراد مقتول ہے اور شیئٌ سے مراد وہ خون ہے جو اس کو معاف کیا گیا ہے اور دیت لینے کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے اور العفو اس قول میں اپنے معنی پر ہے اور وہ ہے: ترک کرنا۔ معنی یہ ہے کہ قاتل کو جب مقتول کا ولی خون معاف کر دے اور قصاص ساقط کر دے تو وہ دیت لے، وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل اچھے طریقہ سے دیت ادا کرے۔

۲- یہ امام مالک کا قول ہے۔ مَنْ سے مراد ولی ہے اور عُفِیَ کا معنی آسانی کرنا ہے یہ العفو کے معنی میں نہیں ہے اور الاخ سے مراد قاتل ہے اور شیئ سے مراد دیت ہے یعنی ولی جب قصاص معاف کر کے دیت لینے کی طرف مائل ہو تو قاتل کو اختیار ہے کہ وہ اسے دیت دے یا اپنا آپ حوالے کر دے۔ ایک مرتبہ اس پر آسانی کی گئی ہے اور ایک مرتبہ آسانی نہیں کی گئی۔ امام مالک کے علاوہ علماء فرماتے ہیں: جب اولیاء دیت پر راضی ہوں تو قاتل کو کوئی اختیار نہیں بلکہ اس پر دیت لازم ہے۔ امام مالک سے یہ قول

بھی مروی ہے ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس کو ترجیح دی ہے(1)۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عُفِیَ کا معنی بُذِلَ ہے، خرچ کیا گیا اور العفو کا لغوی معنی بذل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خذ العفو وہ لو جو آسان ہو۔ ابو الاسود الدؤلی نے کہا:

خذی العفو منی تستدیمی مودتی

تو مجھ سے جو آسان ہے وہ لے تو میری محبت کو ہمیشہ پائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کا پہلا وقت اللہ کی رضا ہے اور اس کا آخری وقت اللہ کی معافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر گواہی دی۔ گویا فرمایا: دیت میں سے جو خرچ کیا گیا ہو وہ اسے قبول کرے اور معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور ایک قوم نے کہا: قاتل اسے اچھے طریقہ سے ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مال لینے کو کہا جب قاتل کی جہت سے یہ آسان ہو اور بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں قصاص کے ذکر کے بعد فرمایا **فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ** (المائدہ:45) پس عفو اور صدقہ کی رحمت کی طرف بلایا۔ اسی طرح اس آیت میں دیت کے قبول کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی جبکہ مجرم دیت ادا کرے۔ پھر ولی کو عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرنے اور قاتل کو اچھے طریقہ سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

ایک قوم نے کہا: یہ الفاظ ان کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جن کے درمیان برابری ہے ان کے درمیان دیتوں کو ساقط کر دیا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان دیات میں سے کسی اعتبار سے دونوں طائفوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو۔ اس صورت میں عُفِیَ بمعنی فُضِلَ (فضیلت دیا گیا) ہوگا۔

سفیان بن حسین بن شوعہ نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: عربوں کے دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ ایک قبیلہ سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور دوسرے قبیلہ سے بھی کچھ لوگ قتل ہوئے۔ ایک قبیلہ والوں نے کہا: ہم راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا۔ پس وہ اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب مقتول برابر ہیں۔ پس انہوں نے دیات پر صلح کی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر زیادتی دی گئی۔ کتب سے **فَمَنۡ عُفِیَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ** تک یہی مراد ہے یعنی جس کی اپنے بھائی پر دیت زائد ہو تو وہ اسے معروف طریقہ سے ادا کرے۔ شعبی نے آیت کے نزول کے سبب کے بارے میں بتایا اور سفیان نے یہاں عفو کا معنی زیادہ ذکر کیا ہے اور لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہے۔

پانچویں تاویل- یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ مرد اور عورت کی دیت اور آزاد اور غلام کی دیت میں فرق ہے یعنی جس کے لئے دیت زیادہ ہو وہ معروف طریقہ سے طلب کرے۔ اس قول میں بھی عُفِیَ بمعنی فضل ہے۔(2)

**مسئلہ نمبر 16**: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیت کا مطالبہ کرنے والے کو حسن تقاضا پر ابھارا ہے اور ادا کرنے والے کو بھی عمدہ طریقہ سے ادا کرنے پر ابھارا ہے(3)۔ کیا یہ وجوب پر ہے یا استحباب پر؟ رفع کی قراءت وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ معنی ہے **فعلیہ اتباع المعروف** یعنی اس پر واجب ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرے۔ نحاس نے کہا **فَمَنۡ**

---

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

عُفِيَ لَهٗ شرط ہے اور فَاتِّبَاعٌ جزا ہے اس کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر اس طرح ہے فعلیہ اتباع بالمعروف اور غیر قرآن میں فاتباعاً و اداءً بھی جائز ہے یعنی دونوں کو مصدر بنایا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا(1): ابراہیم بن ابی عبلہ نے فاتباعاً نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع، واجبات کے لئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فامساك بمعروف۔ رہا مندوب تو وہ منصوب آتا ہے جیسے فضربَ الرقاب۔

**مسئلہ نمبر 17**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ اہل تورات کے لئے صرف قتل کرنا تھا ان کے لئے اور کوئی صورت نہ تھی اور اہل انجیل کے لئے عفو تھا ان کے لئے قصاص اور دیت نہ تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف فرمائی پس جو چاہے قتل کرے اور جو چاہے دیت لے لے اور جو چاہے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ یہ شرط اور جواب ہے یعنی دیت لینے کے بعد اور خون معاف کرنے کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حسن نے کہا: زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا تو وہ اپنی قوم کی طرف بھاگ جاتا پھر اس کی قوم دیت کے ساتھ صلح کرتی اور مقتول کا ولی کہتا میں دیت قبول کرتا ہوں حتیٰ کہ قاتل امن میں ہو جاتا اور وہ باہر نکلتا تو اسے قتل کر دیتا اور پھر دیت انہیں واپس کر دی جاتی۔

علماء کا اختلاف ہے کہ جس نے دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کیا۔ ایک جماعت نے کہا جن میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں: وہ ابتداءً قتل کرنے والے کی طرح ہے۔ اگر اس کا ولی چاہے تو اسے قتل کر دے اگر چاہے تو معاف کر دے اور آخرت میں اس کے لئے عذاب ہوگا۔ حضرات قتادہ، عکرمہ اور سدی نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ اسے یقیناً قتل کیا جائے گا۔ حاکم ولی کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے جس سے دیت لینے کے بعد قتل کیا اس کا مال زیادہ نہ ہو۔ حسن نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ صرف دیت لوٹائی جائے گی اور قتل کا گناہ آخرت کے عذاب تک اس پر رہے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس کا معاملہ امام کے سپرد ہے جو دیکھے وہ کرے۔ سنن دارقطنی میں ابوشریح خزاعی سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس کو خون کی مصیبت پہنچائی گئی یا لنگڑا کر دیا گیا تو اسے تین باتوں میں اختیار ہے اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھوں کو پکڑ لو۔ وہ قصاص لے۔ یا معاف کر دے یا دیت لے۔ اگر ان چیزوں میں سے جو قبول کر لی پھر اس کے بعد اس نے تجاوز کیا تو اس کے لئے دوزخ کا عذاب ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۹

''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ یہ بلیغ مگر مختصر کلام ہے۔ اس کا معنی ہے: بعض بعض کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

قتل نہ کریں۔ یہ سفیان نے سدی سے انہوں نے ابو مالک سے روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قصاص جب قائم کیا جائے گا اور حکم قاتل میں ثابت ہو جائے گا تو وہ دوسرے کے قتل کے ارادہ سے باز رہے گا اس خوف سے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ پس اس سے وہ دونوں زندہ رہیں گے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تھا تو دونوں کے قبیلے گرم ہو جاتے اور آپس میں جنگ کرتے اور یہ چیز بہت زیادہ لوگوں کے قتل کا باعث بنتی جب اللہ تعالیٰ نے قصاص مشروع فرمایا تو تمام اس پر قناعت کرنے والے ہو گئے اور جنگ ترک کر دی، پس ان کے لئے اس میں زندگی ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 2:** ائمہ فتویٰ کا اتفاق ہے کہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سلطان کے بغیر خود اپنے حق میں قصاص لے۔ لوگوں کے لئے ایک دوسرے سے قصاص لینا جائز نہیں۔ یہ کام سلطان کے سپرد ہے یا اس کے سپرد ہے جس کو سلطان مقرر کرے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سلطان بنایا تاکہ وہ لوگوں کے ہاتھوں کو روکے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ سلطان سے بھی قصاص لیا جائے گا اگر وہ اپنی رعیت میں سے کسی پر تعدی کرے گا۔ کیونکہ سلطان بھی ان میں سے ایک ہے، اسے لوگوں کی دیکھ بھال کی فضیلت ہے جیسے وصی اور وکیل ہوتا ہے۔ یہ چیز قصاص سے مانع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں حاکم اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى** (البقرہ:178) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے اس شخص سے کہا جس نے شکایت کی تھی کہ عامل نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے، میں تیرا اس سے قصاص لوں گا اگر تو سچا ہو گا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص آپ کے اوپر جھکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی اس چھڑی سے چوک دی جو آپ کے پاس تھی، وہ شخص چیخا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ادھر آ اور اپنا بدلہ لے لے۔ اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا۔ ابو داؤد طیالسی نے ابو فراس سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے خطبہ دیا اور کہا: خبردار! امیر جس پر ظلم کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے تو میں اس کا اس امیر سے قصاص لوں گا۔ حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور کہا: اے امیر المومنین! اگر ہم میں سے کوئی اپنی رعیت میں سے کسی کو تادیب کرے تو آپ اس سے قصاص لیں گے؟ حضرت عمر نے کہا: میں اس سے قصاص کیسے نہیں لوں گا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ اپنے نفس سے لوگوں کو قصاص لیتے دیتے۔ ابو داؤد سجستانی کے لفظ یہ ہیں، فرمایا: ہمیں حضرت عمر بن خطاب نے خطاب فرمایا اور فرمایا: میں نے اپنے عمال اس لئے نہیں بھیجے کہ وہ تمہارے چمڑوں پر ضربیں لگائیں اور نہ اس لئے بھیجے کہ وہ تم سے تمہارے اموال لیں۔ جو کسی کے ساتھ ایسا کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے میں اس سے قصاص لوں گا اس کے ہم معنی حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں مراد ہے تم قتل سے بچ جاؤ اور قصاص سے سلامت رہو پھر یہ تقویٰ کی دوسری اقسام کی طرف داعی ہو گا۔ اللہ اطاعت پر اطاعت کے ساتھ ثواب دیتا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ الربعی نے ولکم فی القصص حیاۃٌ پڑھا ہے(1)۔ نحاس نے کہا: ابوالجوزاء کی قراءت شاذہ ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قصاص کی طرح مصدر ہو(2)۔ بعض نے فرمایا: القصص سے مراد قرآن ہے یعنی تمہارے لئے کتاب اللہ میں حیات ہے جس میں قصص کو بیان کیا گیا ہے۔ حیاۃ سے مراد نجات ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝

''فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آجائے تم میں سے کسی کو موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ آیت وصیت ہے۔ قرآن میں اور وصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت میں اور سورہ النساء میں من بعد وصیۃ اور سورہ مائدہ میں حین الوصیۃ اور جو سورہ بقرہ میں ہے وہ اتم اور اکمل ہے یہ فرائض اور مواریث کے نزول سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ کلام میں واو عطف کی تقدیر ہے۔ یعنی و کتب علیکم۔ جب کلام طویل ہوگئی تو واو ساقط کر دی گئی اور اس کی مثل بعض اقوال میں ہے: لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ (اللیل)۔ یعنی والذی۔ یہاں بھی واو کو حذف کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب ذکر کیا کہ مقتول کے ولی کے لئے قصاص لینا ہے پس جس سے قصاص لیا جانا ہے وہ قصاص اس کی موت کا سبب ہے گویا موت اس پر حاضر ہے اور یہ وصیت کا وقت ہے اس آیت کا تعلق ماقبل آیت سے ہے اسی وجہ سے واو عطف ساقط ہوگئی ہے۔ كُتِبَ کا معنی فرض اور اُثبت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضور الموت سے مراد موت کے اسباب کا آنا ہے اور جب سبب موجود ہو تو عرب اسے مسبب سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

یایھا الراکب المزجی مطیتہ سائل بنی اسد ما ھذہ الصوتُ
و قل لھم بادروا بالعذر والتمسوا قولا یبرئکم انی انا الموت

اے سوار! جو اپنی سواری کو آہستہ آہستہ چلانے والا ہے بنی اسد سے پوچھ یہ آواز کیسی ہے۔ اور انہیں کہو کہ عذر پیش کرنے میں جلدی کرو اور کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمہیں بری کر دے کہ میں (تمہارے لئے) موت بنوں۔

عنترہ نے کہا:

وان الموت طوع یدی اذا ما وصلت بنانھا بالھندوان

موت میرے ہاتھوں کی خوشی ہے جب ان کے پورے ہندوان تک پہنچ جائیں۔

جریر نے فرزدق کی ہجو میں کہا:

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

انا الموت الذی حدّثت عنه فلیس لهاربٍ منی نجاء

وہ موت جس کے متعلق میں نے بتایا، مجھ سے بھاگنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اگر کہا جائے کہ کُتِبَ فرمایا، اور۔ کتبت نہیں فرمایا، حالانکہ وصیت مؤنث ہے۔ کہا جائے گا کہ یہاں وصیت سے مراد الایصاء ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے اور فاصل تاء تانیث کے عوض کی طرح ہے۔ عرب کہتے ہیں: حضر القاضی الیوم امرأۃ یہاں بھی فاصلہ کی وجہ سے فعل مذکر اور فاعل مؤنث ہے۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: قام امرأۃ۔ لیکن اس ''کتب'' فعل کے مذکر لانے کا حسن، حائل کے طول کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا، اِنْ شرط ہے اس کے جواب میں ابوالحسن اور اخفش کے دو قول ہیں: اخفش نے کہا: تقدیر فالوصیۃ ہے پھر فاء کو حذف کیا گیا۔ جیسے شاعر نے کہا:

من یفعل الحسنات اللہ یشکرھا والشر بالشر عنداللہ مثلان

جو نیکیاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدردانی فرماتا ہے اور اللہ کے نزدیک شر کے بدلے شر برابر ہے۔

دوسرا جواب: ماضی کا جواب اس سے پہلے اور اس کے بعد ہونا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: الوصیۃ للوالدین والاقربین ان ترك خیراً۔ اگر تو فاء کو مقدر مانے گا تو الوصیۃ کو رفع ابتدا کی وجہ سے ہوگا۔ اگر فاء کو مقدر نہیں مانے گا تو اس کو ابتداء کی وجہ سے رفع دینا جائز ہے اور نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ یعنی کتب علیکم الوصیۃُ۔ جمہور نحویوں کے نزدیک الوصیۃ کا اذا میں عمل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ مصدر کے صلہ کے حکم میں ہے جو الوصیۃ ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس کا اپنے سے پہلے میں عمل کرنا جائز نہیں اور یہ جائز ہے کہ اذا میں عامل کتب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایجاب کا تمہاری طرف متوجہ ہونا اور کتاب کے مقتضی کا متوجہ ہونا ہے جب موت حاضر ہو۔ ایجاب کی توجہ کو کتب سے تعبیر فرمایا تا کہ اس معنی کی طرف منظم ہو جائے کہ یہ حکم ازل میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اذا میں عامل الایصاء مقدر ہو جو وصیت پر دلالت کر رہا ہو۔ معنی ہوگا: کتب علیکم الایصاء اذا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَيْرًا اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے اور اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مال کثیر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ انہوں نے سات سو دینار میں بھی فرمایا کہ یہ قلیل ہے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے الخیر سے مراد ہزار دینار اور اس سے زائد مال ہے۔ شعبی نے کہا: پانچ سو دینار سے ہزار تک ہے (2)۔ الوصیۃ ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زندگی میں اور موت کے بعد اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ عرف نے اس کو اس کے ساتھ خاص کر دیا ہے جس کے کرنے کا عہد کیا جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو نافذ کیا جاتا ہے۔ وصیۃ کی جمع وصایا ہے جیسے قضیۃ کی جمع قضایا ہے۔ الوصی وصیت کرنے والا ہوتا ہے اور جس کو وصیت کی جاتی ہے اس کی اصل وَصَیٰ سے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تواصی النبت تواصیاً، جب کھیتی متصل ہو۔ ارض واصیۃ، جس کی کھیتی متصل ہو۔ اوصیت لہ بشیء و اوصیت الیہ، جب تو کسی کو اپنا وصی مقرر کرے۔ اس کا اسم الوِصایۃ اور الوَصایۃ ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ اوصیتہ و وصیتہ توصیۃ ہم معنی ہیں، اسم، الوصاۃ ہے۔ تواصی القوم اوطی بعضھم بعضًا۔ بعض نے بعض کو وصیت کی۔ حدیث پاک میں ہے: استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عندکم (1)۔ عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ ووصیت الشئ بکذا جب تو کسی چیز کو دوسری چیز سے ملا دے۔

**مسئلہ نمبر 5**: علماء کا وصیت کے وجوب میں اختلاف ہے جو مال چھوڑ جائے اور اس پر اجماع ہے کہ جس پر ودیعتیں ہوں اور جس پر قرض ہو اس کا وصیت کرنا واجب ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں: وصیت اس پر واجب نہیں ہے جس پر ودیعت اور قرض وغیرہ نہ ہوں، یہ امام مالک، امام شافعی اور ثوری کا قول ہے خواہ وصیت کرنے والا امیر ہو یا فقیر ہو۔ ایک طائفہ نے کہا: ظاہر قرآن کے مطابق وصیت واجب ہے، یہ زہری اور ابومجلز کا قول ہے (2) مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ابوثور نے کہا: وصیت واجب نہیں ہے مگر اس پر جس پر قرض ہو یا اس کے پاس کسی قوم کا مال ہو۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی وصیت کو لکھے اور جو کچھ اس پر کسی کا حق ہے اس کے متعلق بتائے۔ رہا وہ جس پر نہ قرض ہے اور نہ ودیعت ہے، اس پر وصیت کرنا واجب نہیں مگر وہ چاہے تو۔ ابن منذر نے کہا: یہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانات کی ادائیگی فرض کی ہے اور جس پر کوئی حق نہیں ہے اور کوئی امانت نہیں ہے اس پر وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کے حاملین نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ائمہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو وہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔ ایک روایت میں ہے، وہ تین راتیں گزارے۔ اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے مجھ پر ایک رات بھی نہیں گزری مگر میرے پاس میری وصیت (لکھی ہوئی) ہے اور جن علماء نے وصیت کو واجب نہیں کہا انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اگر وصیت واجب ہوتی تو اس کو وصیت کرنے والے کے ارادہ پر نہ چھوڑا جاتا، اس پر ہر حال میں وصیت کرنا لازم ہوتا۔ پھر اگر تسلیم کیا جائے کہ اس کا ظاہر وجوب ہے تو وجوب کا قول اسے رد کرتا ہے۔ یہ اس کے متعلق ہے جس پر لوگوں کے حقوق ہوں ان کے ضیاع کا خوف ہوگا جیسا کہ ابوثور نے کہا۔ اسی طرح جس کے لئے لوگوں کے پاس حقوق ہوں گے ورثۃ پر اس کے تلف ہونے کا خوف ہوگا، اس صورت میں اس پر وصیت کرنا واجب ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُتِبَ عَلَيْكُمْ، كُتِبَ بمعنی فرض ہے تو یہ وصیت کے وجوب کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق جواب پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا معنی ہے: جب تم وصیت کا ارادہ کرو۔ نخعی نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور وصیت نہیں کی اور حضرت ابوبکر نے وصیت کی۔ اگر وصیت کرے تو یہ اچھا ہے اگر وصیت نہ کرے تو اس پر کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس مال سے وصیت کرنی ہے اس کی مقدار بیان نہیں کی۔ فرمایا: اِنْ

1۔ سنن ابن ماجہ باب حق المرأۃ علی الزوج، حدیث نمبر 1840، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تَرَكَ خَيْرًا ۚ الخیر سے مراد مال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ (البقرہ: 272) وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ (العادیات: 8) ان آیات میں خیر سے مراد مال ہے۔ اس کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پانچویں حصہ کی وصیت کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانوں کے مال غنیمت سے خمس (پانچویں حصہ) ہے۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے چوتھائی کی وصیت کی، یہ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک خمس کی وصیت کرنا چوتھائی وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے اور چوتھائی وصیت کرنا ثلث وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جس کا مال تھوڑا ہو اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے وصیت نہ کرنا بہتر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن ابی ملیکہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تمہارا کتنا مال ہے؟ اس نے کہا: تین ہزار۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا: چار۔ حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ اور یہ تمہارا مال تھوڑا ہے۔ یہ اپنے عیال کے لئے چھوڑ دے کیونکہ تیرے لئے یہی افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: جمہور علماء کا خیال ہے کہ کسی کے لئے ثلث سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں مگر امام ابوحنیفہ اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ موصی اگر ورثاء نہ چھوڑے تو اس کے لئے پورے مال کی وصیت کرنا جائز ہے۔ احناف فرماتے ہیں: وصیت میں ثلث پر اکتفا اس لئے ہے کہ ورثاء کو اغنیاء چھوڑے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا ان کو فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور جس کا وارث نہ ہو وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ابوعبیدہ اور مسروق کا بھی یہی قول ہے۔ اسحاق اور امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ اختلاف کا سبب ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ بیت المال میں اختلاف ہے کہ کیا وہ وارث ہے یا حافظ ہے اس مال کا جو اس میں رکھا جائے۔ اس میں دو قول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**: علماء کا اجماع ہے کہ جو فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے تمام مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فرمایا: جب ان کی موت کا وقت قریب آیا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: آپ وصیت فرمائیں، آپ کا مال میرے مال میں ہے۔ حضرت عمرو نے کاتب کو بلایا اور اسے وصیت لکھوائی۔ حضرت عبداللہ نے کہا میں نے انہیں کہا میں نہیں دیکھتا ہوں مگر یہ کہ آپ نے میرے اور اپنے مال کی وصیت کر دی ہے اگر میں اپنے بھائیوں کو بلاؤں تو ان سے یہ حلال کروالوں۔

1۔ صحیح بخاری، الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر 2538، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللھم امض لاصحابی ھجرتھم و مرثیتہ لمن مات مکۃ، حدیث 3643، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کا اجماع ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اس میں سے جتنا چاہے رجوع کرے مگر مدبر غلام کے بارے میں اختلاف ہے۔
امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ وصیت کرنے والا حالت صحت میں یا حالت مرض میں ایسی وصیت کرے جس میں غلاموں میں سے کسی غلام کو آزاد کرنا ہو یا اس کے علاوہ کوئی امر ہو تو جو چاہے اس میں تبدیلی کرے اور جو چاہے اس میں عمل کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہو جائے۔ اگر وہ اس وصیت کو ختم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے مگر یہ کہ اس کے غلام کو مدبر بنایا جائے اگر غلام کو مدبر بنائے تو اس میں اس کو تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں گزارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔ ابوالفرج مالکی نے کہا: قیاس میں مدبر بھی ایک مہینہ تک آزاد کئے جانے والے غلام کی طرح ہے موت لامحالہ آنے والی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ وہ مدت تک آزاد کرنے اور عتق کی قسم جو ایک مدت تک اس نے اٹھائی ہے اس میں رجوع نہیں کر سکتا اسی طرح مدبر بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے امام شافعی، احمد اور اسحاق نے کہا: یہ وصیت ہے اور یہ بھی ثلث میں ہوگا جس طرح دوسرے وصایا کا حکم ہے اور مدبرہ (لونڈی) سے ان کا وطی کی اجازت دینا ان کے مدبر کو ایک مدت تک عتق پر قیاس کرنے کو توڑتا ہے..... حالانکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدبر غلام کو فروخت کیا(1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی لونڈی کو مدبرہ بنایا پھر اسے فروخت کیا یہ تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: انسان اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے مگر آزادی میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شعبی، ابن سیرین، ابن شُبرمہ اور نخعی نے کہا ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جو اپنے غلام کو کہتا ہے: تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور وصیت کا ارادہ کیا تو امام مالک کے نزدیک اس کو رجوع کا حق ہے اور اگر کہا: فلاں میری موت کے بعد مدبر ہے تو اس میں اس کے رجوع کا حق نہیں ہے اور اگر پہلے قول سے تدبیر کا ارادہ کیا ہوگا تو اسے اکثر اصحاب مالک کے نزدیک رجوع کا حق نہ ہوگا۔ امام شافعی، احمد، اسحاق کے نزدیک یہ وصیت ہے کیونکہ یہ ثلث میں ہے اور جو ثلث میں ہو وہ وصیت ہے مگر امام شافعی نے کہا: مدبر میں رجوع نہیں مگر یہ کہ اسے فروخت کرے یا ہبہ کے ساتھ اپنی ملکیت سے نکال دے۔ اور صرف یہ کہنا (میں نے رجوع کیا) رجوع نہیں ہے اور اگر مدبر کو اپنی ملکیت سے نہ نکالا حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا تو اس کے مرنے کے ساتھ غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام شافعی کا پہلا قول یہ ہے کہ وہ مدبر میں اسی طرح رجوع کر سکتا ہے جس طرح وصیت میں رجوع کر سکتا ہے۔ مزنی نے اس کو اختیار فرمایا۔ انہوں نے علماء کی اس بات کے اجماع پر قیاس کیا ہے کہ جو عتق کی وصیت کرے وہ رجوع کر سکتا ہے۔ ابوثور نے کہا: اگر اس نے کہا: میں نے اپنے مدبر میں رجوع کیا تو اس کی تدبیر باطل ہو گئی اگر وہ مر گیا تو غلام آزاد نہ ہوگا۔ ابن القاسم اور اشہب نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے کہا: میرا غلام میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور اس نے اس قول سے وصیت اور

1۔ صحیح بخاری، بیع المدبر، حدیث نمبر 2078، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تدبیر کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن القاسم نے کہا: یہ وصیت ہے، اشہب نے کہا: وہ مدبر ہے اگرچہ اس نے وصیت کا ارادہ نہ کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 11**: علماء کا اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ منسوخ ہے یا محکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ محکم ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی ان والدین کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہیں ہوتے جیسے والدین کافر ہوں اور غلام ہوں اور ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہ ہوں (1)۔ یہ ضحاک، طاؤس اور حسن کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وصیت زیادہ اور کم ہر مال میں واجب ہے۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اجماع ہے کہ ان والدین کے لئے وصیت ہے جو وارث نہیں ہوتے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے جو وارث نہیں ہوتے۔

حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت عامۃ ہے اس کا حکم ایک تھوڑے سے عرصہ کے لئے ثابت رہا پھر جو رشتہ دار آیت فرائض کے ذریعے وارث ہوا ان میں سے ہر ایک منسوخ ہو گیا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت الفرائض نے اس کو مستقل منسوخ نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ضمیمہ کے ساتھ منسوخ ہوئی اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا فرمایا، وارث کے لئے وصیت نہیں (3)''۔

اس حدیث کو حضرت ابو امامہ نے روایت کیا ہے اور اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ آیت کا نسخ سنت ثابتہ سے ہے نہ کہ ارث سے۔ علماء کے اقوال میں سے صحیح قول کے مطابق اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو ان دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہوتا کہ میت سے وصیت کے ذریعے مال حاصل کریں اور اگر وصیت نہ کی ہو تو میراث کے ذریعے حاصل کریں یا جو وصیت کے بعد باقی بچے لیکن اس سے مانع یہ حدیث اور اجماع ہے۔ امام شافعی اور ابو الفرج اگرچہ کتاب کا سنت کے ساتھ نسخ تسلیم نہیں کرتے، لیکن صحیح اس کا جواز ہے اس دلیل کی وجہ سے کہ ہر ایک اللہ کا حکم ہے اور اسی کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں اختلاف ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگرچہ یہ خبر ہمیں احاداً پہنچی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا اجماع مل گیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ قریبی وارثوں کے لئے وصیت کا وجوب سنت کے ساتھ منسوخ ہے اور علماء کے اجماع سے اس کو تائید حاصل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: والدین کے لئے وصیت اس فرض کے ساتھ منسوخ ہے جو سورۃ النساء میں ہے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت ثابت ہے جو وارث نہیں ہوتے۔ یہ امام شافعی اور اکثر مالکیوں اور اہل علم کا مذہب ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مال بچے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تھی۔ پس اس نے جو پسند کیا اسے منسوخ کر دیا۔ پھر دو عورتوں کے حصہ کی مثل ایک مذکر کے لئے حصہ مقرر کیا اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ مقرر کیا اور عورت کے لئے آٹھواں اور چوتھا حصہ مقرر کیا، خاوند کے لئے نصف اور چوتھا حصہ مقرر کیا۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید نے کہا: یہ ساری آیت منسوخ ہے اور وصیت ندباً باقی ہے۔ امام

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا، باب ما جاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک کا قول اسی طرح ہے۔ نحاس نے یہ شعبی اور نخعی سے ذکر کیا ہے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: وصیت نہیں ہے، عروہ بن ثابت نے کہا: میں نے ربیع بن خثیم سے کہا مجھے اپنے مصحف کی وصیت کیجئے۔ ربیع نے اپنی اولاد کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (انفال: 75) حضرت ابن عمر نے اسی طرح کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 12**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَقْرَبِيْنَ یہ اقرب کی جمع ہے ایک قوم نے کہا: اقربین کے لئے وصیت کرنا، اجنبیوں کے لئے وصیت کرنے سے اولیٰ ہے کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نص قائم فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ ضحاک نے کہا: اگر کسی نے اپنے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو معصیت کی وجہ سے اس کا عمل ختم ہو گیا۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد لونڈیوں کے لئے وصیت کی، ہر ایک کے لئے چار ہزار کی وصیت کی۔ روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنی لونڈی کے لئے گھر کے سامان کی وصیت کی۔ حضرت سالم بن عبد اللہ سے اس کی مثل مروی ہے(1)۔ حسن نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو وصیت اقربین کے لئے پھیری جائے گی۔ اگر اجنبی کے لئے وصیت ہو گی تو وہ ان کے ساتھ ہو گا۔ قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ کر غیروں کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ جب ابوالعالیہ فوت ہوئے تو لوگوں نے کہا: اس کے لئے تعجب ہے اس کو ریاح قبیلہ کی ایک عورت نے آزاد کیا تھا اور اس نے اپنے مال کی بنی ہاشم کے لئے وصیت کی۔ شعبی نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں تھا نہ کرامت تھی۔ طاؤس نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی ہو گی تو اسے قرابتداروں کی طرف پھیرا جائے گا اور اس کا فعل توڑ دیا جائے گا۔ یہ حضرت جابر بن زید کا قول ہے(2) اس کی مثل حسن سے مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: جس نے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی اور اپنے قرابتداروں کو ترک کر دیا تو اس نے برا کیا اور اس کا فعل جائز ہو گا اور جس کے لئے اس نے وصیت کی ہو گی غنی، فقیر، قریب، بعید، مسلمان، کافر سب کے لئے نافذ ہو گی۔ یہی معنی حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول احسن ہے۔ رہا ابوالعالیہ کا فعل، شاید اس نے دیکھا کہ بنی ہاشم اس کے آزاد کرنے والوں سے زیادہ مستحق ہیں، حضرت ابن عباس کی صحبت کی وجہ سے اور حضرت ابن عباس کے تعلیم دینے کی وجہ سے اور اسے دنیا و آخرت میں علماء کے درجہ پر فائز کرنے کی وجہ سے۔ یہ ابوۃ اگرچہ معنوی ہے حقیقت میں یہی حقیقی ہے۔ اور اس کی آزاد کرنے والی نے دنیا میں اسے احرار کے ساتھ لاحق کیا تھا۔ پس اس نے اپنے عتق سے ثواب کی نیت کی تھی اس کے لئے اس کا ثواب کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مریض پر اس کے مال میں حجر کیا جائے گا اور اہل ظاہر نے اس پر سختی کی اور کہا: اس پر حجر نہیں کیا جائے گا اور یہ صحیح کی طرح ہے۔ حدیث اور معنی جمہور کا رد کرتا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا: حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس تکلیف میں بیمار پرسی کی جس میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ تکلیف پہنچ چکی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

میں اپنے مال کا دوثلث صدقہ کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کی: نصف صدقہ کر دوں؟ فرمایا: نہیں۔ تیسرا حصہ صدقہ کرو اور تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اگر تم اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ تو یہ ان کے غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اہل ظاہر نے ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ ورثاء جائز بھی قرار دیں اور باقی تمام علماء نے اس کو جائز قرار دیا جب ورثاء جائز قرار دیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ مریض تو ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے، وارث کے حق کی وجہ سے منع کیا گیا ہے جب ورثاء نے اپنا حق خود ساقط کر دیا تو یہ جائز اور صحیح اور یہ ان کی طرف سے ہبہ کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ورثاء چاہیں۔ حضرت عمرو بن خارجہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت نہیں مگر یہ کہ ورثاء اجازت دیں۔

**مسئلہ نمبر 14**: موصی کی زندگی میں وارث کے لئے وصیت کو جائز کرنے والے کے اس کے مرنے کے بعد رجوع میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ ان پر جائز ہے، اس میں ان کے لئے رجوع جائز نہیں۔ یہ عطاء بن ابی رباح، طاؤس، حسن، ابن سیرین، ابن ابی لیلیٰ، زہری، ربیعہ اور اوزاعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اگر وہ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود، شریح، حکم، طاؤس، ثوری، حسن بن صالح، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور کا قول ہے، ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب وہ حالت صحت میں اجازت دیں تو ان کے لئے رجوع کرنا جائز ہے اگر وہ اس کی حالت مرض میں اجازت دیں جب اسے مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے تو یہ ان کے لئے جائز ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے پہلے مقالہ والوں نے حجت پیش کی ہے کہ منع ورثاء کی وجہ سے تھا، جب وہ جائز قرار دیں تو جائز ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ جو وہ ثلث سے زیادہ اجنبی کے لئے وصیت کرے تو ورثاء کی اجازت سے جائز ہے اسی طرح یہاں ہے۔ اور دوسرے قول والوں نے یہ حجت پیش کی ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی جبکہ اس وقت وہ مالک نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد وہ مالک ہوں گے۔ کبھی وارث جو پہلے اجازت دینے والا تھا وہ فوت ہو جاتا ہے اور وہ وارث نہیں ہوتا ہے کبھی کوئی اور وارث ہو جاتا ہے کبھی وہ اجازت دیتا ہے جس کا اس مال میں کوئی حق نہیں ہوتا تو اس سے کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ امام مالک نے اس قول سے حجت پیش کی ہے کہ ایک شخص جب صحیح ہوتا ہے تو وہ اپنے مال کا زیادہ حقدار ہوتا ہے جو چاہے اس میں تصرف کرے۔ جب انہوں نے اس کو اس کی حالت صحت میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو چھوڑا جو ان کے لئے واجب نہ تھی۔ اور جب انہوں نے اس کی حالت مرض میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو ترک کیا جو ان کے لئے ثابت تھی۔ پس ان کے لئے اس میں رجوع نہیں جب وہ کر چکا ہے کیونکہ وہ فوت ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: اگر مریض اس کو نافذ نہ کرے تو وارث کے لئے اس میں رجوع ہے کیونکہ تنفیذ کے ساتھ فوت نہ ہوا۔ یہ ابہری کا قول ہے۔ ابن منذر نے اسحاق بن راہویہ سے روایت کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک کا قول سنت کے زیادہ مشابہ ہے۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور ابوثور کا قول متفق ہے کہ جب اس کی وفات کے

بعد جائز قرار دیں تو انہیں لازم ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 16:** علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو بعض کے لئے مال کی وصیت کرے اور اپنی وصیت میں کہے: اگر ورثاء نے اجازت دی تو یہ اس کے لئے ہوگا اگر وہ اجازت نہیں دیں گے تو وہ الله کے راستہ میں خرچ کیا جائے گا۔ پس ورثاء نے اجازت نہ دی۔ امام مالک نے فرمایا: اگر ورثاء اس کی اجازت نہ دیں تو ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور معمر (صاحب عبدالرزاق) کے قول میں الله کے راستہ میں خرچ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 17:** بالغ، عاقل غیر محجور علیہ کی وصیت میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسروں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ جس کی عقل میں ضعف ہو، سفیہ اور وہ شخص جو کبھی دماغی تکلیف میں افاقہ پاتا ہو ان کے وصایا جائز ہیں جب کہ وہ اتنی عقل رکھتے ہوں کہ جو وہ وصیت کر رہے ہوں انہیں جانتے ہوں۔ اسی طرح چھوٹا بچہ جب اس چیز کو سمجھتا ہو جس کی وصیت کر رہا ہے اور کوئی غلط نہ کرے تو اس کی وصیت جائز اور نافذ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: بچے کی وصیت جائز نہیں۔ مزنی نے کہا: یہ امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ میں نے امام شافعی کی اس کے متعلق کوئی چیز نہیں پائی جو انہوں نے ذکر کی ہو اور اس پر نص قائم ہو۔ شوافع کے اصحاب کے دو قول ہیں: ایک امام مالک کے قول کی طرح ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ اس کی طلاق اور غلام آزاد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ جنایت میں اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور نہ قذف میں اسے حد لگائی جاتی ہے۔ وہ بالغ محجور علیہ کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اس کی وصیت جائز ہے اور یہ معلوم شدہ ہے کہ بچوں میں سے جو اپنی وصیت کو سمجھتا ہے اس کا حال اس کے مال میں محجور علیہ کے حال کی طرح ہے اور حجر کی علت مال میں اسراف اور اسے تلف (ضائع) کرنا ہے۔ یہ علت اس سے موت کے ساتھ اٹھ گئی ہے اور محجور علیہ اپنے مال میں اس مجنون کے مشابہ ہے جو عقل نہیں رکھتا۔ پس اس امر کے ساتھ اس کی وصیت واجب ہے جس کے متعلق حضرت عمر سے روایت مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مدینہ طیبہ میں اس پر اجماع ہے۔ محمد بن شریح نے کہا: جس نے وصیت کی بڑا ہو یا چھوٹا ہو اس نے حق کو پالیا الله تعالیٰ نے اس کی زبان پر فیصلہ فرمایا اور حق کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔

**مسئلہ نمبر 18:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِالْمَعْرُوْفِ** یعنی عدل کے ساتھ، نہ اس میں کمی ہو نہ اس میں زیادتی ہو۔ یہ میت کے اجتہاد اور موصی کی نظر پر منحصر ہے پھر الله تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر اس کی تقدیر بیان فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تہائی اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله تعالیٰ نے تم پر تمہاری وفات کے وقت اموال کے ثلث کو صدقہ کیا ہے یہ تمہاری نیکیوں میں زیادتی ہے تاکہ اس کو تمہارے لئے زکوٰۃ بنا دے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابو امامہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: وصیت جائز نہیں مگر تہائی میں۔ بخاری کا نظریہ بھی یہی ہے اور انہوں نے الله تعالیٰ کے اس فرمان میں حجت پکڑی ہے۔ **وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (المائدہ: 49) (اور تم فیصلہ کرو ان کے درمیان اس کے مطابق جو الله نے نازل کیا)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ کہ ثلث (تہائی) کثیر ہے یہ وہ حکم ہے جو الله تعالیٰ نے

اتارا ہے اور جس نے اس حد سے تجاوز کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی اور تہائی سے زائد وصیت کی تو اس نے وہ کام کیا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو وہ جاننے والا ہو تو وہ اس فعل میں گنہگار ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الثلث کثیر اس سے آپ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ یہ قلیل نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَقًّا اس سے مراد ثبوت ہے لیکن فرض اور وجوب کا ثبوت مراد نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد فرمایا عَلَى الْمُتَّقِينَ یہ دلیل ہے کہ اس کا ہونا بطور استحباب ہے اگر یہ فرض ہوتا تو تمام مسلمانوں پر ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے متقی کو خاص فرمایا یعنی جو کوتاہی اور گناہ کا خوف کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لازم نہیں ہے مگر اس صورت میں جس میں اسے تلف ہونے کی توقع ہو۔ اگر فوت ہو جائے اس صورت میں اس پر بطور قرض لازم ہوگا وہ لکھنے اور وصیت میں جلدی کرے کیونکہ اگر وہ خاموش رہے گا تو وہ ضائع کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوگا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے...... حَقًّا، مصدر مؤکد کی بنا پر منصوب ہے اور غیر قرآن میں حق بھی جائز ہے یعنی ذالك حق۔

**مسئلہ نمبر 20**: علماء نے فرمایا: وصیت کو جلدی لکھنا یہ آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عمر کی حدیث سے ہے۔ اس کا فائدہ یقین کی زیادتی میں مبالغہ کرنا ہے اور اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی گواہی دی گئی ہے اور اس وصیت پر عمل کرنے میں اتفاق ہے۔ اگر عادل آدمیوں کو گواہ بنالے اور گواہ اس شہادت کو لفظاً قائم کریں تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا اگرچہ لکھی نہ گئی ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ سے لکھے اور گواہ نہ بنائے تو امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا مگر ایسی صورت میں جس میں اس شخص کے لیے حق کا اقرار ہو جس کے بارے میں اس پر تہمت نہ ہو تو اس کا نفاذ لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 22**: دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ اپنے وصایا کے آغاز میں یہ لکھتے تھے: هذا ما اوصى به فلان بن فلان انه يشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وان محمدا عبده و رسوله، وان الساعة آتية لا ريب فيها، وان الله يبعث من فى القبور، واوصى من ترك بعده من اهله بتقوى الله حق تقاته وان يصلحوا ذات بينهم، و يطيعوا الله و رسوله ان كانوا مؤمنين، و اوصاهم بما وصى به ابراهيم بنيه و يعقوب يا بنى ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون۔ ترجمہ:۔ میں فلاں بن فلاں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے (برگزیدہ) بندے اور رسول ہیں اور (وہ گواہی دے کہ) قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ اٹھائے گا انہیں جو قبور میں ہیں اور میں اسے بھی وصیت کرتا ہوں، جو وہ اپنے گھر والوں میں سے چھوڑے، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے اور میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرائیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اگر وہ مومن ہیں اور میں انہیں اس کے ساتھ وصیت کرتا ہوں جو ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ (اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لیے یہی دین سو ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ

''پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہی بدلنے والوں پر ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ہے۔ ما کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روکنے والا ہے۔ اثمہ کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے، علی الذین یبدلونہ خبر ہے۔ بدلہ میں ضمیر کا مرجع بھی ایصاء ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ۔ اس میں مَوۡعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور ارشاد ہے: اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ (النساء: 8) یعنی مال۔ اس کی دلیل منہ کا قول ہے...... اس کی مثل شاعر کا قول ہے: ما ھذہ الصوت، یعنی الصیحۃ۔ امرء القیس نے کہا:

برھرھۃ　رؤدۃ　رخصۃ　کخرعوبۃ　البانۃ　المنفطر

نرم جلد، خوبصورت جوان، ملائم الحلق، نرم ٹہنی، کھلنے والا بان کا درخت۔

سَمِعَهٗ یہ احتمال رکھتا ہے اس نے وصی سے خود سنا ہو اور احتمال ہے کہ اس نے ان سے سنا ہو جن کے پاس وہ ثابت ہے۔ یہ دو عادل آدمی ہیں اثمہ میں ضمیر کا مرجع التبدیل ہے یعنی تبدیلی کا گناہ تبدیل کرنے والے پر ہے، میت پر نہیں ہے۔ کیونکہ موصی وصیت کے ساتھ ملامت سے خارج ہو گیا۔ اور ملامت وارث پر یا ولی پر متوجہ ہوئی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس موصی نے جب تبدیلی کی اور وصیت کو ترک کر دیا یا اس نے اس طرح اس کو جاری نہ کیا جو شرع میں اس کے لئے لکھا گیا تھا اس پر گناہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اس آیت میں دلیل ہے کہ جب میت دین (قرض) کی وصیت کرے تو وہ ذمہ سے بری ہو گیا اور ولی سے مطالبہ کیا جائے گا اس کی ادائیگی میں اس کے لئے اجر ہوگا اور تاخیر میں گناہ بھی اس پر ہوگا۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: یہ اس صورت میں صحیح ہے جب میت نے قرضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی ہو مگر جب وہ ادائیگی پر قادر تھا اور پھر ادائیگی کو ترک کیا پھر اس کی وصیت کی تو ولی کی کوتاہی اس کے ذمہ سے اس کو زائل نہیں کرے گی۔

**مسئلہ نمبر 3**: اس میں اختلاف نہیں کہ جب کسی ایسی چیز کی وصیت کرے جو جائز نہ ہو مثلاً شراب یا خنزیر یا کسی گناہ کی وصیت کرے تو اس کو تبدیل کرنا جائز ہے، اس کا پورا کرنا جائز نہیں جس طرح تہائی سے زائد کا پورا کرنا جائز نہیں۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان کے ہوتے ہوئے وصیت کرنے والے کا ظلم کرنا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا تبدیلی کرنا مخفی نہیں ہے۔

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸۲﴾

''اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا پس وہ صلح کرادے ان کے درمیان تو کچھ گناہ نہیں اس پر بے شک اللہ تعالیٰ غفور (اور) رحیم ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ، مَنْ شرطیہ ہے اور خاف کا معنی ہے: ڈرنا۔ بعض نے فرمایا: خَافَ کا معنی جاننا ہے خاف اصل میں خَوِفَ تھا، واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے الف سے بدل گئی۔ اہل کوفہ خاف میں اِمالہ کرتے ہیں تاکہ کسرہ پر دلالت کرے۔ یہ فَعِلَ سے ہے۔ مِنْ مُّوْصٍ عاصم، حمزہ اور کسائی سے ابو بکر نے تشدید کے ساتھ قرأت روایت کی ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تخفیف زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اکثر نحوی کہتے ہیں: موص، تکثیر کے لئے ہے اور کبھی مرد اکی مرکی مثل ہونا بھی جائز ہے۔ جنفاً۔ یہ جنف یجنف سے ہے جس کا معنی ظلم کرنا، اس سے اسم جنف و جانفٌ ہے۔ نحاس سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

تجانف عن حجر الیمامة ناقتی      وما قصدت من اهلها لسوائکا (1)

میری اونٹنی یمامہ کے پتھر سے مائل ہوگئی، اس نے تیرے سوا اپنے اہل کا قصد نہ کیا۔

الصحاح میں ہے الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ جنف یجنف کا معنی ہے: مائل ہونا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا۔

شاعر نے کہا: (2)

هم المولی وان جنفوا علینا      وانا من لقائهم لزور

وہ سردار ہیں اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں ہم ان کی ملاقات سے قوت حاصل کرنے والے ہیں۔

ابو عبید نے کہا: یہاں المولی، موالی کی جگہ ہے۔ اس سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (الحج: 5) پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے بچہ بنا کر)

لبید نے کہا:

انی امرء منعت ارومة عامر      ضیمی و قد جنفت علی خصومی

میں ایسا شخص ہوں عامر کی اصل نے مجھے میرے ظلم سے روکا اور میرے خصم میری طرف مائل ہوئے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح الجانئ (ہمزہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی مائل ہونے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجنف الرجل یعنی زیادتی لایا۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلَامَ، یعنی ایسا عمل کیا جس پر ملامت کی جاتی ہے۔ اَخَسَّ یعنی خسیس کام کیا۔ تجانف لاثم گناہ کی طرف مائل ہوا۔ رجل اجنف (پشت کوز) جنفی فَعَلیٰ (فاء کے ضمہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ) کے وزن پر ہے۔ یہ جگہ کا نام ہے اور ابن السکیت سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حیفاً پڑھا (حاء اور یاء کے ساتھ) اس

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کا معنی ہے ظلماً۔

مجاہد نے کہا: فَمَنْ خَافَ یعنی جسے موصی کے ظلم کرنے اور بعض لوگوں کو میراث سے محروم کرنے اور اذیت پہنچانے کا اندیشہ ہو یا بلا ارادہ اذیت دینے کا اندیشہ ہو۔ یہ جنف بغیر گناہ کے ہے۔ اگر ارادۃً ہو تو گناہ میں مائل ہونا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس کو نصیحت کی گئی اور وہ لوٹا اور اس نے اس کے اور ورثاء کے درمیان اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ موصی کو بخشنے والا ہے جب اس نے موعظت پر عمل کیا اور اذیت کے ارادہ سے باز آیا۔ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بتایا کہ آیت کا معنی ہے: موصی کے مرنے کے بعد جو اسے علم تھا اسے اس نے بیان کیا کہ موصی نے بعض ورثاء کو اذیت دینے کا ارادہ کیا تھا پھر اس نے ورثاء کے درمیان جو جھگڑا تھا اس کی اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ پہلے تبدیل کرنے والے کا گناہ اس کو لاحق نہ ہوگا اگرچہ اس فعل میں تبدیلی ہے اور یہ ضروری ہے لیکن یہ تبدیلی مصلحت کے لئے ہے وہ تبدیلی جس میں گناہ ہے وہ وہ ہے جو خواہش نفس سے تبدیل ہو۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** فَمَنْ خَافَ کا خطاب تمام مسلمانوں کے لئے ہے، انہیں کہا گیا: اگر تمہیں موصی سے وصیت میں حق سے میل اور عدول کا خوف ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور تمہیں خوف ہو کہ وہ معروف طریقہ سے وصیت نہیں کرے گا ...... یہ اس طرح ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے خاوند کے لئے مال کی وصیت کرے یا اپنی بیٹی کی اولاد کے لئے وصیت کرے تاکہ مال اس کی بیٹی کی طرف یا پوتے کی طرف لوٹ آئے ...... اس کی غرض یہ ہے کہ مال اس کے بیٹے کی طرف لوٹ آئے یا وہ اپنے غلاموں کے لئے وصیت کرے اور قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ دے تو ان کے درمیان اصلاح میں جلدی کرو۔ جب صلح واقع ہوگی تو مصلح سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔ اصلاح کرنا فرض کفایہ ہے جب لوگوں میں سے کوئی اصلاح کر دے گا تو باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر سب اصلاح نہیں کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس آیت میں ظن کے ساتھ حکم لگانے پر دلیل ہے کیونکہ جب فساد کے قصد کا گمان ہو تو اصلاح میں سعی واجب ہے جب فساد متحقق ہو تو صلح نہیں ہوتی بلکہ دفع کا حکم ہوتا ہے۔ فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے اور فساد کو کاٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ اس کا عطف خاف پر ہے۔ ضمیر سے مراد ورثاء ہیں اور ان کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے کیونکہ معنی معروف ہے اور جواب شرط فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زندگی میں اور صحت میں صدقہ کرنا، موت کے وقت صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، آپ سے پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو صدقہ کرے جب کہ تو صحیح ہو اور اس پر بخل کرنے والا ہو (2)۔ (الحدیث) بخاری و مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب فضل صدقۃ الشحیح الصحیح، حدیث نمبر 1330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سو درہم صدقہ کرنے سے افضل ہے (1)۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ اس شخص کی مثل ہے جو سیر ہونے کے بعد ہدیہ دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اور جو اپنی وصیت میں کسی کو نقصان نہ دے تو اس کی یہ وصیت اس کی طرف سے اس زکوٰۃ کا کفارہ ہوگی جو اس نے ادا نہ کی تھی۔ دار قطنی نے حضرت معاویہ بن قرۃ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس پر موت آنے کا وقت قریب ہو پھر وہ وصیت کرے اور اس کی وصیت کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہو تو اس کی سابقہ زکوٰۃ جو اس نے ادا نہیں کی تھی اس کے لئے کفارہ ہوگی اور اگر وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچائے تو پھر یہ صورت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 6:** دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک مرد یا عورت ساٹھ سال اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہوتی ہے۔ نسائی نے باب باندھا ہے: الصلاۃ علی من جنف فی وصیتہ۔ پھر اپنی سند سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کئے جبکہ اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے ناراض ہوئے اور فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے غلاموں کو بلایا ان کے تین حصے بنائے پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا، دو کو آزاد فرمایا اور چار کو غلام بنایا۔ مسلم نے اس حدیث کا معنی بیان کیا ہے مگر انہوں نے آخر میں فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سخت کلام کہی جبکہ پہلی حدیث میں تھا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

''اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور جو خوشی سے زیادہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی کراہیۃ الاضرار فی الوصیۃ، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ۔ جب مکلفین پر قصاص اور وصیت کے فرض ہونے کا ذکر کیا تو ان پر روزوں کے فرض ہونے کا بھی ذکر کیا اور ان پر روزوں کو بھی لازم کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ صوم کا لغوی معنی رکنا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہ ہونا ہے۔ خاموشی کو بھی صوم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کلام سے رکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (مریم: 26) یعنی کلام نہ کرنے کی میں نے نذر مانی ہے۔ الصوم کا معنی ہوا کا رک جانا بھی ہے، ہوا کا چلنے سے رک جانا، گھوڑا اپنی رسی پر ٹھہرا رہے یعنی وہ ٹھہر جائے اور چارہ نہ کھائے۔ صام النہار کا معنی ہے: دن کا معتدل ہونا۔ مصام الشمس، نصف النہار کے وقت میں سورج کا برابر ہونا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

خیلٌ صیام و خیل غیر صائمۃ　　تحت العجاج و خیل تعلك اللجما

یعنی گھوڑے کھڑے ہوئے ہیں چلنے سے اور حرکت کرنے سے رکے ہوئے ہیں۔

امراؤالقیس نے کہا:

کان الثریا علقت فی مصامها

گویا ستارے اپنی جگہوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں منتقل نہیں ہوتے ہیں۔

ایک اور کا قول ہے:

والبکرات شرهن الصائمة

جوان اونٹنیاں ان کی برائی یہ ہے کہ وہ چلتی اور گھومتی نہیں ہیں۔

امرؤالقیس نے کہا:

فدعها و سل الهمّ عنك بجسرۃ　　ذمولٍ اذا صام النهار و هجرا

یعنی سورج منتقل ہونے سے اور چلنے سے ست پڑ گیا۔ پس سستی کی وجہ سے وہ رکنے والے کی طرح ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

حتیٰ اذا صام النهار و اعتدل　　و سال للشمس لعابٌ فنزل

جب دن درمیان میں تھا اور سورج کے لئے لعاب ٹپکا تو وہ ڈھل گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، حدیث نمبر 7، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک اور نے کہا:

نعمًا بوجرۃ صفر الخدو د ما تطعم النوم الا صیاماً

شرع میں روزہ کا معنی، طلوع فجر سے سورج کے غروب ہونے تک نیت کے ساتھ روزہ کو توڑنے والی چیزوں سے رکنا ہے اور اس کا تمام اور کمال ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور محرمات میں واقع نہ ہونا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه (1)۔ (جو جھوٹ کے قول کو اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس کے کھانے، پینے کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں)۔

**مسئلہ نمبر 2: روزہ کی عظیم فضیلت اور بڑا ثواب**

اس کے متعلق کثرت سے صحیح اور حسن احادیث آئی ہیں جن کا ذکر ائمہ نے اپنی اپنی مسانید میں کیا ہے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔ تیرے لئے اب اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے رب کریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزے کے یہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا (2)۔ (الحدیث) روزے کو خاص فرمایا کہ وہ اس کے لئے ہے اگرچہ تمام عبادات اس کے لئے ہیں۔ دو امور کی وجہ سے روزے کا مرتبہ باقی تمام عبادات سے بلند ہے۔

پہلا امر یہ ہے کہ روزہ نفس کو لذتوں اور شہوات سے روکتا ہے جبکہ ان چیزوں سے دوسری عبادات اتنا نہیں روکتی ہیں۔ دوسرا امر یہ ہے کہ روزہ بندے اور اس کے رب کے درمیان راز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ مختص ہے اور دوسری عبادات ظاہر ہیں۔ بعض اوقات انسان اسے تصنع اور ریاکاری کے طور پر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے روزے کو دوسری عبادات سے خاص فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی روزے کی عظمت کے متعلق اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَمَا كُتِبَ کاف صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: کتابًا کما یا صومًا کما۔ یا یہ صیام سے حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، بعض نحویوں نے فرمایا: کاف صیام کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے کیونکہ اس کی تعریف محض نہیں ہے اس اجمال کی وجہ سے جو اس میں ہے جس کے ساتھ شریعت نے تفسیر بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی کما کے ساتھ صفت جائز ہے کیونکہ صفت ہمیشہ نکرہ کی لگائی جاتی ہے۔ یہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے قائم مقام ہے اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ما محل جر میں ہے اور اس کا صلہ كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ہے۔ اور کتب میں ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ اہل تاویل کا تشبیہ کے مقام پر اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** شعبی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: تشبیہ روزے کے وقت اور روزے کی قدر کی طرف لوٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

---

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب هل یقول انی صائم اذا شتم، حدیث نمبر 1771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی قوم پر رمضان کے روزے فرض کئے پھر انہوں نے اس میں تبدیلی کی۔ ان کے علماء نے ان پر دس ایام زیادہ کردیئے۔ پھر ایک عالم بیمار ہوا تو اس نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دی تو وہ دس روزوں کا اضافہ کرے گا تو اس نے ایسا ہی کیا۔ نصاریٰ کے روزے پچاس دن ہو گئے۔ پھر گرمی میں روزے رکھنا ان پر مشکل ہوئے تو انہوں نے اپنے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا(1)۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: یہ آیت کے مفہوم کے مشابہ ہے۔ اس کے متعلق ایک حدیث ہے جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہے، حضرت دغفل بن حنظلہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نصاریٰ پر ایک مہینہ کے روزے فرض تھے، ان کا ایک شخص مریض ہوا تو لوگوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا تو ہم دس دنوں کا اضافہ کریں گے پھر دوسرا ایک شخص تھا جس نے گوشت کھایا اور اس کے منہ کو تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفاء دے گا تو ہم سات دنوں کا اضافہ کریں گے پھر ایک اور بادشاہ کا دور آیا۔ لوگوں نے کہا: ہم ان سات ایام کو مکمل کریں گے اور ہم روزے موسم بہار میں رکھیں گے۔ فرمایا: پس پچاس روزے ہو گئے۔

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے تھے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے عہد کیا کہ تیس دنوں سے پہلے ایک دن اور ایک دن بعد ہر سال روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ان کے پچاس دن مکمل ہو جائیں گے پھر گرمیوں میں ان پر مشکل ہوئی تو انہوں نے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بارے میں حضرت دغفل بن حنظلہ، حسن بصری اور سدی سے حدیث مروی ہے۔(2)

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے..... حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے..... شک والے دن (انتیس شعبان کے بعد والے دن) کا روزہ اور عید الفطر کے متصل چھ روزوں کو مکروہ کیا گیا ہے۔ شعبی نے کہا: اگر میں پورا سال روزہ رکھتا تو شک والے دن پھر بھی افطار کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے گئے تھے جس طرح ہم پر فرض کئے گئے ہیں۔ پس انہوں نے موسم بہار کی طرف روزوں کو پھیر دیا کیونکہ یہ روزے کبھی گرمیوں میں آجاتے تھے۔ پھر انہوں نے تیس دن شمار کئے۔ پھر اس کے بعد ان پر ایک زمانہ آیا انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ تیس دنوں سے پہلے اور بعد ایک ایک دن روزہ رکھیں گے پھر..... حتیٰ کہ ان کے روزے پچاس ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے: كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اصل وجوب کی طرف راجع ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نہ وقت میں تشبیہ ہے نہ کیفیت میں۔ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اس روزے کی صفت میں واقع ہے جو ان پر فرض تھا کہ کھانا، پینا، حقوق زوجیت ادا کرنا منع تھا۔ جب افطار کا وقت ہوتا تو جو سو جاتا وہ یہ کھانا، پینا بھی نہیں کرتا تھا۔

نصاریٰ بھی ابتدا میں اسی طرح تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے پہلا

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حکم منسوخ کر دیا۔ فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ (البقرہ: 187) جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا یہ سدی، ابو العالیہ اور ربیع کا قول ہے (1)۔ حضرت معاذ بن جبل اور عطا نے کہا: تشبیہ صرف روزے پر واقع ہے نہ صفت میں ہے نہ تعداد میں ہے۔ اگرچہ دونوں روزے زیادہ اور کمی میں مختلف تھے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر مہینہ میں تین دن اور عاشوراء کے دن کا روزہ فرض تھا كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی جس طرح یہود پر روزہ فرض تھا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق تین دن اور عاشوراء کا روزہ ان پر فرض تھا پھر اس امت میں رمضان کے مہینہ کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہو گیا (2)۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا اس کو اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے ساتھ منسوخ کیا گیا پھر ایام کو رمضان کے ساتھ منسوخ کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لعل ان کے حق میں ترجی (امید) کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تَتَّقُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہاں کمزور ہونا ہے کیونکہ جب کم کھایا جاتا ہے تو شہوت کم ہوتی ہے، جب شہوت کم ہوتی ہے تو گناہ کم ہوتے ہیں۔ یہ خوبصورت وجہ مجاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تاکہ تم گناہوں سے بچ جاؤ۔ بعض نے فرمایا: یہ عموم پر ہے کیونکہ روزہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الصیام جنۃ (3) و وجاءٌ (روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو ختم کرتا ہے) کے مطابق تقویٰ کا سبب ہے کیوں یہ شہوات کو مار دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، اَيَّامًا، كُتِبَ کا مفعول ثانی ہے یہ فراء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: كُتِبَ کی ظرف کی بنا پر منصوب ہے یعنی تم پر روزے ایام میں فرض کئے گئے ہیں۔ اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان کا روزہ ہے۔ یہ حضرت معاذ سے جو مروی ہے اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

اس میں سولہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّرِيْضًا مریض کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی حال میں بھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اس پر تو افطار کرنا واجب ہے دوسری حالت یہ ہے کہ وہ ضرر اور مشقت کے ساتھ روزہ پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے افطار مستحب ہے اور ایسی صورت میں صرف جاہل ہی روزہ رکھتا ہے۔ ابن سیرین نے کہا: جب انسان کو ایسی حالت لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ مریض کہا جا سکتا ہو تو اس کے لئے افطار کرنا صحیح ہے اس کو مسافر پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ اس میں سفر کی علت کی وجہ سے افطار کرنا صحیح ہے اگرچہ افطار کی ضرورت نہ بھی ہو۔ طریف بن تمام العطاردی نے کہا: میں رمضان میں محمد بن سیرین کے پاس گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میری اس انگلی میں تکلیف ہے۔ جمہور علماء نے فرمایا: جب اسے کوئی ایسی مرض ہو جو اسے تکلیف دیتی ہو یا اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے افطار

---

1۔ تفسیر طبری، والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب فضل الصوم، حدیث نمبر 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنا صحیح ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ اصحاب مالک کے ماہر علماء کا مذہب ہے، اس کے ساتھ وہ مناظرے کرتے تھے۔ رہے امام مالک کے الفاظ کہ وہ مرض جو آدمی کو تکلیف دیتی ہو اور اسے انتہا تک پہنچاتی ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک سے ایسی مرض کے بارے میں اختلاف ہے جو افطار کو مباح کرتی ہے۔ کبھی فرمایا: روزے سے تلف ہونے کا خوف ہو، کبھی فرمایا: شدت مرض اور مرض میں زیادتی، سخت مشقت۔ یہ صحیح مذہب ہے اور ظاہر کا مقتضا ہے کیونکہ کوئی مرض خاص نہیں ہے۔ یہ ہر مرض میں مباح ہے مگر جس کو دلیل خاص کرے جیسے سر درد، تھوڑا سا بخار یا کوئی تھوڑی سی مرض جس کے ہوتے ہوئے روزے میں تکلیف نہ ہو۔ حسن نے کہا: ایسی مرض جس میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ روزہ افطار کرے۔ یہ نخعی کا قول ہے(2)۔ ایک فرقہ نے کہا: کسی مرض میں افطار نہ کرے مگر ایسی مرض جس کی ضرورت افطار کی داعی ہو، جب اس مرض کے ساتھ ضرورت کا احتمال ہو تو افطار نہ کرے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔(3)

میں کہتا ہوں: اس باب میں ابن سیرین کا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں رمضان میں تھوڑا سا بیمار تھا، اسحاق بن راہویہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں میری عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے فرمایا: اے ابوعبداللہ! تو نے افطار کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: تجھے اندیشہ تھا کہ تو رخصت کے قبول کرنے سے کمزور ہو جائے گا۔ میں نے کہا: ہمیں عبدان نے بتایا انہوں نے ابن المبارک سے روایت کیا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا، فرمایا: میں نے عطا سے پوچھا میں کس مرض کی وجہ سے افطار کروں؟ انہوں نے فرمایا: جو بھی مرض ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا۔ بخاری نے فرمایا یہ حدیث اسحاق کے پاس نہ تھی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب انسان کو اپنے نفس پر خوف ہو جبکہ وہ روزہ سے ہو اگر وہ افطار نہیں کرے گا تو اس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ جائے گی یا بخار شدید ہو جائے گا تو وہ افطار کرے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ عَلٰى سَفَرٍ علماء کا اس سفر کے بارے اختلاف ہے جس میں افطار اور قصر جائز ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ سفر اطاعت ہو جیسے حج اور جہاد۔ ان دونوں سفروں کے ساتھ صلہ رحمی کا سفر، ضروری معاش کی طلب کا سفر متصل ہے، رہا تجارت کا سفر اور مباحات کا سفر اس میں منع اور اجازت کا اختلاف ہے، جواز کا قول ارجح ہے اور رہا سفر گناہ اس کے متعلق بھی علماء کا جواز و منع میں اختلاف ہے۔ منع کا قول راجح ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے(4)۔ سفر کی مسافت امام مالک کے نزدیک وہی ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے پھر انہوں نے رجوع کیا اور فرمایا: اڑتالیس میل کی مسافت ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ کبھی فرمایا: بیالیس میل ہے، کبھی فرمایا: چھتیس میل ہے، کبھی فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے۔ ان سے دو دن بھی مروی ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ کبھی خشکی اور سمندری سفر کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ فرمایا: سمندری راستہ میں ایک دن اور ایک رات ہے اور خشکی کے راستہ میں اڑتالیس میل ہے اور مذہب میں تیس میل ہے اور غیر مذہب میں تین دن ہیں۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور ثوری

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے کہا: افطار تین دنوں کے سفر میں ہے۔ یہ ابن عطیہ نے حکایت کیا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں: بخاری میں ہے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس چار برد کے سفر میں افطار کرتے تھے اور یہ چار برد، سولہ فرسخ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**: علماء کا اختلاف ہے کہ رمضان میں سفر کرنے والے کے لئے فطر کی نیت کرنا جائز نہیں کیونکہ مسافر نیت کے ساتھ مسافر نہیں ہوتا بخلاف مقیم کے۔ مسافر عمل کرنے اور اٹھ کر جانے کے ساتھ ہی مسافر ہو جاتا ہے اور مقیم عمل کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اقامت کی نیت کرتا ہے تو اسی وقت مقیم ہو جاتا ہے کیونکہ اقامت عمل کی محتاج نہیں ہوتی۔ پس یہ دونوں جدا جدا ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف نہیں کہ جو سفر کی امید رکھتا ہے تو اس کے لئے نکلنے سے پہلے افطار جائز نہیں اگر افطار کرے تو ابن حبیب نے کہا: اگر وہ سفر کے لئے تیاری کر چکا تھا اور سفر کے اسباب لے چکا تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ یہ اصبغ اور ماجشون سے حکایت کیا گیا ہے۔ اگر سفر سے اسے کوئی عارضہ روک لے تو اس پر کفارہ ہوگا اور اگر سفر کرے تو کفارے سے بچ جائے گا۔ عیسیٰ نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے: اس پر ایک دن کی قضا لازم ہے کیونکہ وہ فطر میں تاویل کرنے والا تھا۔ اشہب نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں خواہ سفر کرے یا نہ کرے۔ سحنون نے کہا: اس پر کفارہ ہے خواہ سفر کرے یا نہ کرے یہ اس عورت کی طرح ہے جو کہتی ہے کل مجھے حیض آ جائے گا اس لئے وہ افطار کر دیتی ہے۔ پھر سحنون نے عبدالملک اور اصبغ کے قول کی طرف رجوع کر لیا اور فرمایا: عورت کی طرح نہیں ہے کیونکہ مرد جب چاہتا ہے سفر کرتا ہے اور عورت حیض خود نہیں لاتی۔

میں کہتا ہوں: ابن القاسم اور اشہب کا قول کفارہ کی نفی میں بہتر ہے کیونکہ اس نے وہ فعل کیا جو اسے کرنا جائز تھا اور ذمہ بری ہے اور اس میں کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا۔ پھر اَوْ عَلٰی سَفَرٍ کے ارشاد کا یہی مقتضا ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ اس مسئلہ میں صحیح ترین قول ہے۔ کیونکہ وہ روزے کی حرمت کو توڑنے والا نہیں تھا اس نے اس کا قصد اور ارادہ کیا ہوا تھا۔ پس متاول تھا۔ اگر کھانا سفر کی نیت کے ساتھ ہو تو اس پر کفارہ واجب ہے کیونکہ یہ سفر کی طرف نکلنے سے پہلے تھا ابھی تک خروج نے اس سے اس کو ساقط نہیں کیا تھا۔ پس تو اس میں غور کرے گا تو تو بھی اسی طرح پائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے، حضرت محمد بن کعب سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کے پاس آیا، وہ سفر کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور ان کی سواری بھی تیار کر دی گئی تھی اور وہ سفر والا لباس پہن چکے تھے اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ انہوں نے کھانا منگوایا اور اس سے کھایا پھر سوار ہو گئے۔ میں نے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: مجھے حضرت ابو موسیٰ نے کہا: کیا میں تجھے نہ بتاؤں جب تو نکلے گا تو روزہ سے نکلے گا اور جب تو داخل ہوگا تو روزہ سے داخل ہوگا۔ جب تو سفر پر نکلے تو افطار کر کے نکل جب تو گھر میں داخل ہو تو افطار کرتے ہوئے داخل ہو۔ حسن نے کہا: جس دن سفر کا ارادہ ہو اس دن گھر میں اگر چاہے تو افطار کرے۔ احمد نے کہا جب وہ گھروں سے نکل جائے تو افطار کرے۔ اسحاق نے کہا: نہیں۔ بلکہ جب سواری پر کجاوہ رکھے تو افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: احمد کا قول صحیح ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو حالت صحت میں صبح کرے پھر بیمار ہوا تو وہ بقیہ دن

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

افطار کرے۔ اسی طرح جب حضر میں صبح کرے پھر سفر کی طرف نکلے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس دن افطار نہ کرے اگر چہ سفر شروع بھی کر دے۔ اسی طرح زہری، مکحول اور یحییٰ انصاری، امام اوزاعی، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے۔ اگر وہ افطار کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ پھر تمام کہتے ہیں کہ وہ قضا کرے گا اور کفارہ نہیں دے گا۔ امام مالک نے فرمایا: سفر چونکہ طاری عذر ہے۔ یہ مرض کی طرح ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ قضا کرے اور کفارہ بھی دے۔ یہ ابن کنانہ اور مخزومی کا قول ہے۔ الباجی نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے، ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے اور یہی کہا ہے۔ فرمایا: سفر عذر ہے جو عبادت کے لزوم کے بعد لاحق ہوا ہے۔ یہ مرض اور حیض کے مخالف ہے کیونکہ مرض اس کے لئے افطار کو مباح کرتی ہے۔ حیض اس پر روزے کو حرام کر دیتا ہے اور سفر یہ اس کے لئے مباح نہیں کرتا اس پر روزے کی حرمت توڑنے کی وجہ سے کفارہ واجب ہے۔ ابوعمر نے کہا: یہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت میں اس کے لئے افطار کو مباح کیا ہے۔ رہا علماء کا یہ قول کہ وہ افطار نہ کرے یہ اس کا استحباب ہے جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ اگر وہ اللہ کی رخصت کو لے گا تو اس پر قضا ہوگی۔ رہا کفارہ تو اس کی کوئی وجہ نہیں، جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس نے اس چیز کو واجب کیا جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب نہیں کیا۔ حضرت ابن عمر سے اس مسئلہ میں مروی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس دن افطار کرے جب وہ سفر پر نکلے۔ یہ شعبی، امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے اس مسئلہ پر یہ باب باندھا ہے: من افطر فی السفر لیراہ الناس اور حضرت ابن عباس سے حدیث نقل کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف نکلے تو روزہ رکھے رہے، حتیٰ کہ عسفان تک پہنچ گئے پھر پانی منگوایا اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا تا کہ لوگوں کو دکھائیں کہ آپ نے افطار کیا ہے حتیٰ کہ مکہ مکرمہ آئے اور یہ رمضان کا مہینہ تھا(1)۔ مسلم نے بھی یہ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، اس میں فرمایا: پھر برتن منگوایا جس میں مشروب تھا دن کے وقت وہ مشروب پیا تا کہ لوگ آپ کو دیکھ لیں پھر آپ نے افطار کیا تا کہ مکہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ اس باب میں نص ہے۔ پس مخالف قول ساقط ہوا۔ وباللہ التوفیق۔ اس میں جو یہ کہتا ہے کہ روزہ سفر میں منعقد نہیں ہوتا، حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جو سفر میں روزہ رکھے تو حضر میں قضا کرے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی طرح ہے(2)۔

اہل ظواہر کی ایک قوم نے یہی کہا ہے اور انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت کعب بن عاصم سے روایت ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اس میں اس کے قول کی حجت ہے جو کہتا ہے: جو سفر میں رات کو روزہ کی نیت کرے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے اگر چہ عذر نہ بھی ہو۔ مطرف کا خیال بھی یہی ہے۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے اور یہی اہل ظواہر کی ایک جماعت کا قول

1۔ صحیح بخاری، باب من افطر فی السفر لیراہ الناس، حدیث نمبر 1812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الافطار فی السفر، حدیث نمبر 1655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ امام مالک ایسے شخص پر قضا اور کفارہ واجب کرتے تھے۔ امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہے یہ عبدالملک کے سوا اکثر اصحاب مالک کا قول ہے۔

عبدالملک نے کہا: اگر جماع کے ساتھ افطار کرے گا تو کفارہ دے گا کیونکہ اس میں سفر پر نہ قوت حاصل کرتا ہے اور نہ اسے کوئی عذر ہے، مسافر کے لئے افطار اس لئے مباح ہوتا ہے تا کہ اپنے سفر پر قوت حاصل کرے، عراق اور حجاز کے تمام فقہاء نے کہا: اس پر کفارہ نہیں۔ ان میں سے ثوری، امام اوزاعی، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور تمام کوفہ کے فقہاء ہیں۔ یہ حضرت ابوعمر کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں علماء کا اختلاف ہے سفر میں افطار افضل ہے یا روزہ افضل ہے؟ امام مالک اور امام شافعی نے بعض روایات میں فرمایا: روزہ افضل ہے جو روزہ کی طاقت رکھتا ہو اور امام مالک کا مذہب اختیار کا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور دوسرے ان کے متبعین علماء نے کہا: اسے اختیار ہے اور انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اسی طرح ابن علیہ نے کہا: کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے، فرمایا: ہم نے رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر کیا تو روزہ دار نے افطار کرنے والے پر عیب نہیں لگایا اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔(1)

اس حدیث کو بخاری، مسلم اور مالک نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اور حضرت انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے کہا: سفر میں روزہ افضل ہے اس کے لئے جو اس پر قدرت رکھتا ہو(2)۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رخصت افضل ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، شعبی، عمر بن عبدالعزیز، مجاہد، قتادہ، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: افطار افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:185)

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اس کلام میں حذف ہے یعنی تم میں سے جو مریض یا مسافر ہو وہ افطار کرے اور قضا کرے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اہل شہر جب انتیس دن روزے رکھیں اور شہر میں کوئی مریض آدمی ہو اور صحیح نہ ہو تو وہ انتیس دن روزے رکھے۔ ایک قوم نے کہا: ان میں سے حسن بن صالح بن حی ہے۔ انہوں نے کہا: ایک مہینہ کے بدلے میں ایک مہینہ روزے رکھے ایام کی تعداد کا اعتبار کئے بغیر۔ الکیا طبری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔ یہ نہیں فرمایا کہ دوسرے ایام سے ایک مہینہ روزے رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَعِدَّةٌ جو اس نے افطار کیا ہے اس کی تعداد پوری کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کچھ دن رمضان کے افطار کیا ہو تو ان کی تعداد کے مطابق قضا کرنا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورا مہینہ افطار کیا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ اس کو رفع مبتدا کی خبر کے اعتبار سے ہے اس کی تقدیر الحکم بالواجب

---

1۔ صحیح بخاری، باب لم یعب اصحاب النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بعضھم بعضا فی الصوم والافطار، حدیث 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عدۃٌ ہے۔ فعلیہ عدۃٌ بھی صحیح ہے(1)۔ کسائی نے کہا: فعدۃً بھی جائز ہے یعنی فلیصم عدۃً من ایامٍ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس پر روزوں کی تعداد ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور عدۃ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے۔ عدۃٌ۔ یہ العد سے فعلۃ کے وزن پر ہے یہ بمعنی معدود ہے جیسے طحن بمعنی مطحون ہوتا ہے تو کہتا ہے: اسمع جعجعۃ ولا اری طحنا (یہ اس شخص کی مثال دی جاتی ہے جو کثرت سے کلام کرتا ہے اور عمل نہیں کرتا) اسی سے عورت کی عدت ہے۔

مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، اُخَرَ سیبویہ کے نزدیک غیر منصرف ہے کیونکہ یہ الف لام سے پھیرا گیا ہے۔ کیونکہ اس باب سے فُعَل کے وزن پر الف لام کے ساتھ آتا ہے جیسے الکبر، الفضل۔ کسائی نے کہا: یہ آخر سے معدول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے حمراء، حمر، اسی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے۔ بعض نے فرمایا یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جُمَع کے وزن پر ہے، یہ ایام کی صفت ہے أخری نہیں آیا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ یہ عدۃ کی صفت ہے۔ بعض نے فرمایا: اخر یہ اخری کی جمع ہے گویا ایام اخری پھر کثرت کی وجہ سے ایام اخر کہا گیا۔ بعض نے فرمایا: اگر یہ ایام کی صفت ہوتا تو مونث ہوتا اسی وجہ سے اُخر کے ساتھ نعت لگائی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: لوگوں کا قضا روزے متواتر رکھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں: دونوں دار قطنی نے اپنی سنن میں ذکر کئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا فعدۃ من ایام اُخر متشابہات نازل ہوا ہے پھر متشابہات ساقط ہو گیا اور یہ فرمایا: یہ اسناد صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر رمضان کے روزے ہوں وہ متواتر رکھے اور ان میں انقطاع نہ کرے۔ اس کی سند میں عبد الرحمن بن ابراہیم ضعیف الحدیث ہے۔ حضرت ابن عباس سے قضا روزوں کے متعلق مروی ہے، صمہ کیف شئت۔ تو جیسے چاہے روزے رکھ۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: صمہ کما افطرتہ۔ جیسے تو نے افطار کئے اسی طرح روزے رکھ۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عمرو بن عاص سے مسنداً مروی ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان کے (قضا) روزے علیحدہ علیحدہ قضا کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ تجھ پر منحصر ہے تم بتاؤ اگر تم میں سے کسی پر قرض ہو ایک درہم، وہ دو درہم ادا کرے تو کیا وہ ادا ئیگی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بخشنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کی سند حسن ہے مگر مرسل ہے اور متصل ثابت نہیں ہے۔ مؤطا امام مالک میں نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے تھے: رمضان کے متصل روزے رکھے جو مرض یا سفر کی وجہ سے متواتر افطار کرے۔ الباجی نے "المنتقی" میں فرمایا یہ احتمال ہے کہ وجوب کے متعلق خبر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ استحباب کے متعلق خبر ہو، جمہور کا قول استحباب پر ہے۔ اگر وہ جدا جدا بھی رکھے تب بھی جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اس قول کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یہاں متفرق اور متواتر کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ جب متفرق رکھے گا تو دوسرے دنوں کی گنتی پوری کر دی پس اس کا جائز ہونا واجب ہے۔ ابن عربی نے کہا: (رمضان کے) مہینہ میں تواتر واجب ہے کیونکہ وہ معین ہے اور قضا میں تعیین واجب نہیں۔ پس تفریق جائز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

**مسئلہ نمبر 8**: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یہ قضا کے وجوب پر بغیر زمانہ کی تعیین کی دلیل ہے کیونکہ لفظ زمانہ کے متعلق عام ہے بعض، بعض کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے تھے میں شعبان سے پہلے قضا نہیں کر سکتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشغولیت کی وجہ سے۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے خیال سے (1)۔ یہ نص ہے اور آیت کا بیان ہے۔ یہ داؤد کے قول کا رد کرتی ہے۔ اس پر دو شوال سے قضا واجب ہے تو جس نے دو شوال کو روزہ نہ رکھا پھر وہ مر گیا تو ان کے نزدیک وہ گنہگار ہے اور انہوں نے اس پر بنیاد رکھی ہے کہ جس پر غلام کا آزاد کرنا واجب تھا پھر اس نے غلام پایا جو ثمن کے ساتھ بیچا جا سکتا تھا تو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے تجاوز کرے اور کوئی دوسرا خرید ے کیونکہ اس پر پہلا غلام آزاد کرنا واجب تھا جو اس نے پایا تھا دوسرا غلام جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس غلام ہو تو اس کے لئے دوسرا خریدنا جائز نہیں اگر وہ مر جائے جو اس کے پاس ہے تو عتق باطل نہ ہوگا جس طرح اس کے حق میں عتق باطل ہو جاتا ہے جو معین غلام کو آزاد کرنے کی نذر مانے پھر وہ مر جائے تو اس کی نذر باطل ہو جائے گی اور یہ اس کے قول کو فاسد کرتا ہے۔ بعض اصولی علماء نے کہا: جب شوال کے دوسرے دن کے گزرنے کے بعد وہ مر جائے تو عزم کی شرط پر گنہگار نہ ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وہ نہ تو گنہگار ہوگا اور نہ وہ کوتاہی کرنے والا شمار ہوگا۔ یہ جمہور کا قول ہے لیکن جلدی قضا کرنا مستحب ہے تا کہ کہیں اسے موت نہ آ جائے اور اس پر فرض باقی ہو۔

**مسئلہ نمبر 9**: جس پر رمضان کے قضا روزے ہوں اور اس پر عید الفطر کے بعد اتنے ایام گزر گئے جن میں اس کا روزے رکھنا ممکن تھا اس نے روزوں کو موخر کیا پھر اس کو کوئی مانع لاحق ہوا جس نے اسے دوسرے رمضان تک قضا کرنے سے روکے رکھا تو اس پر کوئی کھانا کھلانا نہیں ہے کیونکہ وہ تاخیر کے جواز کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مالکیوں میں سے بغدادی علماء کا قول ہے اور وہ ''المدونہ'' میں ابن قاسم کا قول روایت کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**: اگر آئندہ شعبان تک بھی قضا روزے نہ رکھے تو کیا اس وجہ سے اس پر کوئی کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: ہاں، اس پر قضا ہے۔ امام ابوحنیفہ، حسن، نخعی اور داؤد نے کہا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس سے مرسلاً مروی ہے کہ وہ کھانا کھلائے اور اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ فرمایا فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ سے مسنداً اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں کوتاہی کرتا ہے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جاتا ہے۔ فرمایا: وہ لوگوں کے ساتھ اس رمضان کے روزے رکھے اور جن روزوں میں کوتاہی کی ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے رمضان کے مہینہ کے روزے کسی مرض کی وجہ سے نہیں رکھے پھر وہ صحیح ہو گیا اور پھر بھی روزے نہیں رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو وہ اس رمضان کے روزے رکھے پھر اس

1۔ صحیح بخاری، باب متی یقضی رمضان، حدیث نمبر 1814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہینہ کے روزے رکھے جس کے روزے افطار کئے تھے یا یہ ہر دن کے لئے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی سند میں ابن نافع اور ابن وجیہ دو ضعیف راوی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 11:** اگر کسی کا مرض لمبا ہو گیا اور وہ صحیح نہ ہوا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد گندم کھلائے پھر اس پر قضا نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: جب دو رمضانوں کے درمیان صحیح نہ ہو تو اس رمضان کے روزے رکھے اور دوسرے رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ جب صحیح ہوا اور روزہ نہ رکھا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جائے تو اس رمضان کے روزے رکھے اور گزشتہ رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے جب افطار کرے تو قضا کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ کے اقوال سے قیاس کے خلاف حجت پکڑی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا: میں دو رمضان بیمار رہا۔ اسے حضرت ابن عباس نے فرمایا: تمہاری مرض متواتر رہی ہے یا درمیان میں تو صحیح بھی ہوا تھا؟ اس شخص نے کہا: میں صحیح ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: دونوں رمضانوں کے روزے رکھ اور ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا۔ یہ حضرت ابن عباس کے اس قول کا بدل ہے: اگر اس کے ساتھ مرض بڑھ جائے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے بارے میں ان کے مذہب کے مشابہ ہے کہ وہ کھانا کھلائیں اور ان پر قضا نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 12:** پھر جن علماء نے کھانا کھلانا واجب کیا ہے، اس کھانے کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ، قاسم بن محمد، امام مالک، امام شافعی فرماتے ہیں: ہر دن کی طرف سے ایک مد کھلائے۔ ثوری نے کہا: ہر دن کے بدلے نصف صاع کھلائے۔

**مسئلہ نمبر 13:** پھر اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں افطار کرے یا جماع کرے اس پر کیا واجب ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے قضا روزوں میں سے کوئی روزہ توڑ دیا تو اس پر بغیر قضا کے کچھ واجب نہیں ہے۔ اس کے لئے مستحب ہے کہ اختلاف کی وجہ سے اس روزے کو پورا کرے پھر اس کی قضا کرے اور اگر جان بوجھ کر افطار کیا تو گنہگار ہو گا اور اس پر اس دن کی قضا کے علاوہ کچھ نہ ہو گا اور اس روزہ کی پابندی نہ کرے کیونکہ اس کو ان چیزوں سے روکنے کا اب کوئی معنی نہیں جن سے روزہ دار رکتا ہے کیونکہ جان بوجھ کر توڑنے کی وجہ سے علماء کے نزدیک وہ روزہ دار نہیں رہا۔ رہا کفارہ تو امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس میں کفارہ واجب نہیں ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کر کے یا اس کے علاوہ کسی طرح رمضان کا قضا روزہ توڑا تو اس پر کفارہ نہیں ہے، اس پر اس دن کی قضا ہے۔ قتادہ نے کہا: جس نے رمضان کے قضا روزے میں جماع کیا اس پر قضا اور کفارہ ہے۔

ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے رمضان کا قضا روزہ توڑ دیا تو اس پر دو دن کی قضا ہے۔ ابن القاسم پہلے بھی فتویٰ دیتے تھے پھر اس سے رجوع کر لیا تھا پھر فرمایا: اگر قضا کی قضا میں جان بوجھ کر افطار کیا تو اس کی جگہ دو دنوں کے روزے رکھے گا، جیسے جس نے اپنا حج اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا، پھر اس نے آئندہ سال حج

کیا پھر اسے اپنی بیوی سے جماع کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا تو اس پر دو حج ہوں گے۔ ابو عمرو نے کہا: ابن وہب اور عبد الملک نے حج میں اس کی مخالفت کی ہے۔ مختلف فیہ میں اصل پر قیاس واجب نہیں ہے۔ میرے نزدیک...... واللہ اعلم ...... صحیح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک دن کی قضا واجب ہے کیونکہ یہ ایک دن تھا اس نے اسے دو مرتبہ فاسد کیا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا یہی مقتضا ہے جب اس نے قضا رمضان میں افطار کی وجہ سے ایک پورا دن روزہ رکھ لیا تو اس نے واجب ادا کر دیا اس پر اس کے علاوہ کچھ واجب نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 14**: جمہور علماء کا قول ہے کہ جو کسی بیماری کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑ دے پھر وہ اسی بیماری کی وجہ سے مر جائے یا وہ سفر کرے اور اسی سفر میں مر جائے تو اس پر کچھ واجب نہیں۔ طاؤس اور قتادہ نے اس مریض کے بارے میں فرمایا جو صحیح ہونے سے پہلے مر جائے کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔

**مسئلہ نمبر 15**: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس پر رمضان کے روزے تھے اور ابھی قضا نہیں کئے تھے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے۔ امام احمد، اسحاق، ابو ثور، لیث، ابو عبید اور اہل ظواہر نے کہا: اس کی طرف سے روزہ رکھا جائے مگر انہوں نے اس کو نذر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی سے مروی ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے رمضان کے قضا روزوں کے متعلق بتایا کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔ جنہوں نے روزہ رکھنے کا قول کیا ہے انہوں نے مسلم کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مروی سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو مر جائے اور اس پر روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے (1) مگر یہ ارشاد روزہ میں عام ہے اور مسلم کی حضرت ابن عباس سے روایت اس کی خاص کرتی ہے۔ فرمایا: ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس پر نذر کا روزہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم بتاؤ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو تو اسے ادا کرتی تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھ۔ امام مالک اور ان کے ہم مذہب لوگوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر: 18) (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم) (انسان کے لئے نہیں ہے مگر جو اس نے کوشش کی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164)

اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو نسائی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: کوئی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے بلکہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک مد گندم کھلائی جائے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث عام ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لا یصوم احد عن احد سے مراد رمضان کا روزہ ہو۔ رہا نذر کا روزہ

1۔ صحیح بخاری، باب من مات وعلیہ صوم، حدیث نمبر 1816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو وہ جائز ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث حضرت ابن عباس کی حدیث کی طرح ہے اور اس کے بعض طرق میں ہے دو مہینوں کے روزے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی طرف سے روزہ رکھو۔ پھر اس عورت نے کہا: اس نے کبھی حج نہیں کیا تھا، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر۔ اس عورت کا قول کہ دو مہینے کے روزے تھے، یہ رمضان کے روزے ہونے کی نفی کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ سب سے قوی دلیل جو امام مالک کی طرف سے پیش کی جاتی ہے وہ اہل مدینہ کا عمل ہے اور قیاس جلی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ عبادت بدنی ہے اس میں مال کا کوئی دخل نہیں ہے پس جس پر بدنی عبادت جیسے نماز واجب ہو تو دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرے گا اور یہ قول، حج کرنے کے قول سے نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس میں مال کا دخل ہے (☆)۔

**مسئلہ نمبر 16:** اس آیت میں ان علماء نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ منعقد ہی نہیں ہوتا اس پر ہمیشہ قضا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یعنی اس پر تعداد ہے کلام میں نہ حذف ہے، نہ اضمار ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سفر میں روزہ نیکی میں سے نہیں ہے۔ فرمایا: جو نیکی میں سے نہ ہوگا وہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رمضان کا روزہ سفر میں جائز نہیں۔

جمہور علماء کہتے ہیں: فافطر محذوف ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے: ہم نے رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا کسی روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور کسی افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہ لگایا۔ اس کو مالک نے حمید الطویل سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اس کو مسلم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر ایک جنگ میں شرکت کی رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا تھا اور بعض نے افطار کیا تھا۔ روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ جمہور علماء نے طا کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل یطوقونہ تھی کسرہ کو طا کی طرف نقل کیا گیا اور واو کو ماقبل کسرہ کی وجہ سے کسرہ سے بدلا گیا۔ حمید نے اصل پر بغیر اعلال کے پڑھا ہے اور قیاس اعلال ہے (1)۔ حضرت ابن عباس کی مشہور قراءت یطوقونۃ طاء مخففہ کے فتحہ اور واو کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مجاہد سے یطیقونہ طاء کے بعد یاء کے ساتھ یکیلونہٗ کے لفظ پر پڑھا ہے۔

☆ ائمہ احناف کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

یہ باطل اور محال ہے کیونکہ فعل طوق سے ماخوذ ہے اس میں واو لازم اور واجب ہے اس مثال میں یا کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ابو بکر انباری نے کہا: احمد بن یحییٰ النحوی نے ابن ذوئب کا یہ شعر پڑھا ہے:

فقيل تحمل فوق طوقك انها مطبعة من ياتها لا يضيرها

طوق میں واو کو ظاہر کیا، اس کی وجہ سے صحیح یہ ہے کہ واو کی جگہ یا کو رکھنے والا اصواب (صحیح رائے) سے دور ہے۔ ابن انباری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، یطیقونه یا کے فتحہ، طا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ، پھر یا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ بمعنی یطیقونه کہا جاتا ہے طاق، اطاق، اَطیَق سب کا ایک معنی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت طاؤس اور حضرت عمرو بن دینار سے یطوقونه یا مفتوحہ، طا مشددہ مفتوحہ کے ساتھ مروی ہے۔ لغت میں یہ درست ہے کیونکہ اس کی اصل لیتطوقونه ہے تا کو ساکن کر کے طا میں ادغام کیا گیا تو طا مشددہ ہوگی اور یہ قرآن سے نہیں ہے خلاف اس کے جس نے اس قراءت کو قرآن ثابت کیا ہے۔ یہ تفسیر کی بنا پر قراءت ہے۔ اہل مدینہ اور شام نے۔ فِدْيَةُ طَعَامُ مضاف کر کے پڑھا ہے اور مساکین جمع پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے طعام مسکین، مفرد پڑھا ہے جیسا کہ بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(1)۔ یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ اس نے ایک دن میں جو حکم تھا اس کو بیان کیا۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا یہ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابو عبید نے کہا اس قرأت نے بیان کیا کہ ہر دن کے لئے ایک شخص کو کھانا کھلانا ہے اور واحد جمع کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ جمع، واحد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مساکین جمع ہو تو معلوم نہیں ہوتا ان میں سے کتنے ایک دن میں مگر کسی دوسری آیت سے اور مساکین میں جمع کی قراءت اس کو ظاہر کرتی ہے۔

کیونکہ الذین یطیقونه جمع اور ان میں سے ہر ایک کو ایک مسکین لازم تھا پس اس کا لفظ جمع لایا گیا جیسے الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً (النور: 4) یعنی ہر ایک کو اسی کوڑے لگاؤ۔ اسی کوڑے ان تمام میں متفرق طور پر نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے لئے اسی کوڑے ہیں۔ ابو علی نے یہ معنی بیان کیا(2)۔ جمع کی قراءت نحاس نے اختیار کی۔ فرمایا: ابو عبید نے جو اختیار کیا وہ مردود ہے کیونکہ یہ دلالت سے پہچانی گئی ہے۔ اور عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کا معنی یہ ہے کہ ہر دن کے لئے ایک مسکین ہے اس قراءت کا اختیار جمع پر جمع کو رد کرتا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبید نے فديةٌ طعامُ پڑھنا پسند کیا ہے فرمایا: طعام سے مراد فدیہ ہے پس طعام کا صفت ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ جوہر ہے لیکن بطور بدل جائز ہے۔ فدية طعامِ اضافت کے ساتھ پڑھنا اس سے زیادہ واضح ہے کیونکہ فدية مبہم ہے طعام وغیرہ کے لئے واقع ہوتا ہے۔ پس یہ تیرے قول هذا ثوب خزٍ کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** آیت کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ منسوخ ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے، ابن نمیر نے فرمایا: ہمیں اعمش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں عمرو بن مرہ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں ابن ابی لیلیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ رمضان کا حکم نازل ہوا تو لوگوں پر گراں گزرا۔ پس جس نے ہر دن

1۔ سنن ابی داؤد، باب نسخ قوله تعالیٰ و علی الذین یطیقونه فدية، حدیث نمبر 1972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ایک مسکین کو کھانا کھلایا اس نے روزہ چھوڑ دیا ان لوگوں میں سے جو روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ پہلے ان کو اس کی رخصت دی گئی تھی پھر اس کو وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ نے منسوخ کر دیا۔ اسی پر جمہور کی قراءت یطیقونہ ہے یعنی وہ روزہ کی طاقت رکھتے تھے۔ کیونکہ روزے کا فرض اسی طرح تھا جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا مسکین کو کھانا کھلاتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت شیوخ اور بوڑھے لوگوں کے لئے رخصت تھی جب کہ وہ افطار کرنا چاہیں اگرچہ وہ روزے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ پھر یہ آیت اس قول فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ:185) سے منسوخ ہوگئی۔ پس یہ رخصت ختم ہوگئی مگر اس کے لئے باقی ہے جو ان میں سے روزہ رکھنے سے عاجز ہے۔(1)

فراء نے کہا: یطیقونہ میں ضمیر کا مرجع صیام ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ان پر جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ جب افطار کریں تو کھانا کھلائیں پھر یہ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا کے ساتھ منسوخ ہوگیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع فدیہ ہو یعنی جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور رہی یطوقونہ کی قراءت اس کا معنی ہے: وہ مشقت جو ان کو لاحق ہوئی ہے اس کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں جیسے مریض اور حاملہ عورت وہ دونوں اس پر قدرت رکھتے ہیں لیکن مشقت کے ساتھ جو نہیں لاحق ہوئی ہے، اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بھی جائز ہے اور اگر وہ فدیہ دیں تو یہ بھی ان کے لئے جائز ہے۔ حضرت ابن عباس نے یطیقونہ کی تفسیر یتکلفونہ سے بیان فرمائی ہے۔ اگر ان سے اسناد صحیح ہو۔ بعض نقل کرنے والوں نے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(2)، وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فرمایا یہ حبلی (حاملہ عورت) اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے ثابت ہے اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ بوڑھے اور بوڑھی عورت کے لئے رخصت تھی حالانکہ وہ روزہ رکھ سکتے تھے وہ افطار کریں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو جب اپنی اولاد پر خوف ہو تو وہ افطار کریں اور کھانا کھلائیں(3)۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا ہے، فرمایا: بوڑھے آدمی کے لئے رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ صحیح سند ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے، فرمایا: وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس سے مراد بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہر دن کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے آپ نے اپنی ام ولد کو فرمایا جو حاملہ تھی یا دودھ پلانے والی تھی، تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تم پر جزا ہے، قضا نہیں ہے۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے، آپ کی ام ولد دودھ پلاتی تھی (بغیر شک کے ہے) اس کو تکلیف ہوئی تھی تو آپ نے اسے افطار کرنے کا حکم دیا اور قضا نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس سے صحیح اسانید کے ساتھ ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، باب من قال هی مثبتة للشیخ، حدیث 1973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، باب من قال هی مثبتة للشیخ، حدیث 1974، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے حق میں محکم ہے۔ پہلا قول بھی صحیح ہے مگر یہ احتمال ہے کہ نسخ وہاں تخصیص کے معنی میں ہو۔ متقدمین اکثر تخصیص کے معنی میں نسخ کو استعمال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرات حسن بصری، عطا بن ابی رباح، ضحاک، نخعی، زہری، ربیعہ، اوزاعی اور اصحاب رائے نے فرمایا: حاملہ اور دودھ پلانے والی دونوں روزہ افطار کریں اور ان پر کھانا نہیں ہے۔ یہ مریض کی طرح ہیں وہ افطار کرتا ہے اور قضا کرتا ہے۔ یہ ابو عبید اور ابوثور کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے ابوثور سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ امام مالک کا قول حاملہ کے بارے میں ہے اگر وہ افطار کرے۔ رہی دودھ پلانے والی اگر وہ افطار کرے تو اس پر قضا اور کھانا کھلانا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا: وہ افطار کریں گی اور کھانا کھلائیں گی اور قضا کریں گی۔ اور اس پر اجماع ہے کہ بوڑھے مرد اور عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اور سخت مشقت کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں وہ افطار کریں اور جوان پر واجب ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ربیعہ اور مالک نے کہا: ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ لیکن امام مالک نے کہا: اگر وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں تو میرے نزدیک محبوب ہے۔ حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قیس بن السائب اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا: ان پر فدیہ ہوگا۔ یہ امام شافعی اور اصحاب الرائے کا مسلک ہے۔ انہوں نے تمام صحابہ کے قول کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ پھر فرمایا وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ یہ لوگ نہ مریض ہیں اور نہ مسافر ہیں ان پر فدیہ واجب ہے اور امام مالک کے قول کی دلیل ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے افطار کرنے والا ہے جو اس میں موجود ہے اور وہ بوڑھا ہونا ہے اور بڑی عمر کا ہونا ہے۔ پس کھانا کھلانا لازم نہ ہو گا جیسے مسافر اور مریض پر کھانا کھلانا نہیں ہے۔ یہ ثوری، مکحول سے مروی ہے، ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا فدیہ کی مقدار میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ہر دن کے بدلے ایک مدنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے برابر دے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: ہر دن کا کفارہ ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم ہے۔ حضرت ابن عباس سے نصف صاع گندم مروی ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: جو بوڑھا ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر ہر دن کے لئے ایک مد گندم ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ وہ ایک سال روزہ رکھنے سے کمزور ہو گئے تو آپ نے کھانے کا ایک تھال تیار کیا پھر تیس مساکین کو بلایا اور انہیں سیر کر کے کھلایا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ابن شہاب نے فرمایا: جو روزے کے ساتھ کھانا کھلانے کا ارادہ کرے اور مجاہد نے کہا: جو کھانے میں مد پر زیادتی کرے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا دوسرے مسکین کو کھلائے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے اور کہا: اس کی سند صحیح ثابت ہے اور دوسرا خیر، اسم تفضیل ہے اسی طرح تیسرا اور پہلا بھی (2)۔ عیسیٰ بن عمر اور یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے یطوع خیرا مشدد پڑھا ہے اور عین کو جزم دی ہے یتطوع کے معنی میں اور باقی قراء نے تطوع تا اور طا کی تخفیف اور عین کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضا

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ تَصُوْمُوْا یعنی روزہ تمہارے لئے بہتر ہے اسی طرح ابی نے پڑھا ہے(1) یعنی فدیہ کے ساتھ افطار سے روزہ رکھنا بہتر ہے یہ نسخ سے پہلے تھا۔ بعض نے فرمایا وَاَنْ تَصُوْمُوْا یعنی سفر اور مرض میں بغیر تکلیف کے روزہ رکھنا، واللہ اعلم۔ یہ روزے رکھنے پر ابھارنے کا تقاضا کرتا ہے یعنی تم یہ جان لو اور روزہ رکھو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری اور (چاہتا ہے) تم گنتی پوری کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکرگزاری کیا کرو''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ اہل تاریخ نے کہا: سب سے پہلے رمضان کا روزہ حضرت نوح علیہ السلام نے رکھا جب وہ کشتی سے باہر نکلے تھے۔ مجاہد کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان فرض کیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں۔ واللہ اعلم۔ الشھر یہ الاشھار سے مشتق ہے کیونکہ یہ مشہور ہوتا ہے کسی پر اس کا علم مشکل نہیں ہوتا جو اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شھرت السیف (جب کوئی تلوار سونت لے) رمضان رمض الصائم یرمض سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے: شدت پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا پیٹ گرم ہو گیا۔ الرمضاء (ممدودۃ) سخت گرمی کو کہتے ہیں۔ اس سے حدیث ہے: صلاۃ الاوابین اذا رمضت الفصال۔ اوابین کی نماز اس وقت ہے جب گرمی سے پاؤں جلنے لگ جائیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ رمض الفصال کا مطلب ہے: گرمی اونٹوں کے پاؤں جلا دے اور وہ گرمی کی وجہ سے بیٹھ جائیں۔ رمضان گرمی میں واقع ہوا۔ یہ رمضاء سے ماخوذ ہے جوہری نے کہا: شھر رمضان اس کی جمع رمضانات اور ارمضاء آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے مہینوں کے اسماء لغت قدیمہ سے نقل کئے ہیں اور انہوں نے ان کے نام اس زمانہ کے ساتھ رکھے جس میں وہ مہینہ واقع ہوا۔ یہ مہینہ شدید گرمی میں واقع ہوا تو اس وجہ سے اس کا نام رمضان رکھا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: رمضان کو رمضان اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی اعمال صالحہ کے ساتھ گناہوں کو جلا دیتا ہے یہ الارماض سے ہے جس کا معنی جلانا ہے۔ اس سے رمضت قدمہ ہے۔ یہ الرمضاء سے ہے یعنی اس کا پاؤں جل گیا۔ ارمضتنی الرمضاء یعنی گرمی نے مجھے جلا دیا۔ اسی سے کہا جاتا ہے ارمضنی الامر۔ معاملہ نے مجھے جلا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مہینہ میں دل موعظت اور آخرت کے امر میں فکر کی حرارت حاصل کرتے ہیں جس طرح ریت اور پتھر سورج کی گرمی حاصل کرتے ہیں۔ الرمضاء۔ گرم پتھر۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رمضت النصل ارمضہ وارمُضُہ رمضاً سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے دو پتھروں کے درمیان تیر کے بھالے کو کوٹنا تاکہ باریک ہوجائے۔ اسی سے نصل رمیض و مرموض ہے۔ یہ ابن السکیت سے مروی ہے۔ رمضان کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ رمضان میں اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے تھے تاکہ ان کے ساتھ حرمت والے مہینوں کے داخل ہونے سے پہلے شوال میں جنگ کریں۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ اس کا نام زمانہ جاہلیت میں ناتق تھا۔

و فی ناتق اجلتْ لدی حومۃ الوغی ودلَّتْ علی الادبار فرسان خثعما

اس شعر میں ناتق رمضان کے مہینہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شَهْرُ پر رفع ابتدا کی بنا پر ہے اور خبر الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ہے یا یہ مبتدا کے اضمار کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: المفروض علیکم صومہ شھر رمضان، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ یا یہ معنی کہ تم پر رمضان کا مہینہ فرض کیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ شَهْرُ مبتدا ہو اور الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ صفت ہو اور خبر فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ہو(1)۔ الشَّهْرَ کا ذکر تعظیماً لوٹایا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَآقَّةُ ۙ مَا الْحَآقَّةُ ۚ (الحاقہ) اور جائز ہے کہ جزا کا معنی اس میں داخل ہو کیونکہ شہر رمضان اگرچہ معرفہ ہے لیکن بعینہٖ معرفہ نہیں کیونکہ ہر آنے والے مہینہ میں عام ہے۔ یہ ابو علی کا قول ہے۔ مجاہد اور شہر بن حوشب سے شہر کا نصب بھی مروی ہے۔ اس کو ہارون اعور نے حضرت ابو عمرو سے روایت کیا ہے(2)۔ اس کا معنی ہے: الزموا شھر رمضان یا صوموا، اور الذی انزل فیہ القرآن اس کی نعت ہے اور تصوموا کے ساتھ اس کو نصب دینا جائز نہیں تاکہ صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ فاصلہ نہ ہوجائے اور وہ خیر لکم ہے۔ رمانی نے کہا اس پر ایاماً معدودات کے قول سے بدل کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر2:** اس میں اختلاف ہے کہ کیا شہر کے بغیر رمضان کہا جائے یا نہیں۔ مجاہد نے اس کو ناپسند کیا ہے اس نے کہا: اسی طرح کہا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا(3) شَهْرُ رَمَضَانَ اور حدیث میں ہے: رمضان نہ کہو کیونکہ اس کو منسوب کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے منسوب کیا اور فرمایا شَهْرُ رَمَضَانَ فرماتے تھے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے وہ اس معنی کی وجہ سے اس کے لفظ کی جمع بنانا ناپسند کرتے تھے اور اس روایت سے حجت پکڑتے تھے۔ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ابو معشر نجیح کی حدیث سے ہے اور یہ ضعیف ہے۔ بغیر اضافت کے رمضان کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ صحاح میں ثابت ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان آتا ہے تو رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیطان جکڑے جاتے ہیں۔ البستی کی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان ہوتا ہے تو اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں (1)۔ ابن شہاب عن انس بن ابی انس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ فرماتے سنا...... پھر یہ حدیث بیان کی۔ البستی نے کہا: انس بن ابی انس یہ مالک بن انس کا والد ہے۔ ابو انس کا نام مالک بن ابی عامر ہے یہ مدینہ طیبہ کے ثقہ لوگوں سے ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث بن عثمان بن جثیل بن عمرو یمن کے قبائل میں سے ذی اصبح سے تھا۔

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس رمضان آیا ہے، مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اس میں دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور اس میں سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اس میں اللہ کی ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہو گیا۔ ابو حاتم البستی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا: سرکش شیطانوں کا جو ذکر آیا ہے پہلے جو مطلق احادیث میں ہے کہ شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے اس کے لئے یہ تقیید ہے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری عورت کو فرمایا: اذا کان رمضان فاعتمری فان عمرۃ فیه تعدل حجة۔ جب رمضان آئے تو تو عمرہ کر کیونکہ اس میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے (2)، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کا قیام تمہارے لئے سنت بنایا ہے۔ جو اس کا روزہ رکھے گا اور اس کا قیام کرے گا ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسے جس دن بچے کو ماں جنم دیتی ہے (اور اس پر گناہ نہیں ہوتا) اس کے متعلق آثار کثیر ہیں۔ ان تمام احادیث میں رمضان کے ساتھ شہر کا لفظ نہیں ہے۔ عرب اکثر رمضان سے شہر کا ذکر ساقط کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

جارية لی درعها الفضفاض ابیض من اخت بنی اباض
جاريةٌ لی رمضان الماضی تقطع الحدیث بالایماض

کھلی قمیص میں لڑکی تھی بنی اباض کی بہن سے سفید تھی۔ گزشتہ رمضان میں لڑکی تھی چمک کی وجہ سے بات کاٹتی تھی۔

رمضان کی فضیلت عظیم ہے اور ثواب بڑا ہے۔ اشتقاق کا معنی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گناہوں کو جلانے والا ہے اور اس کے علاوہ احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں وہ اس کی فضیلت پر دلیل ہیں۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب هل یقال رمضان او شهر رمضان ومن رأی کله واسعا، حدیث نمبر 1766، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی قیام شهر رمضان، حدیث نمبر 1317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے یعنی رمضان کے چاند کی مدت کی وجہ سے اس کو شہر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: فان غبی علیکم الشھر اگر تم پر چاند ابر آلود ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

اخوان من نجد علی ثقة　　والشھر مثل قلامة الظفر

حتی تکامل فی استدارته　　فی اربع زادت علی عشر

نجد سے بھائی پر اعتماد تھے چاند ناخن کے تراشے کی طرح تھا۔ حتیٰ کہ وہ گولائی میں مکمل ہوا چودھویں کی رات کو بڑھا۔

چاند ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دنوں کو مکمل کرنا فرض ہے اور رمضان کے تیس دن مکمل کرنا فرض ہے تاکہ ہم عبادت میں یقین سے داخل ہوں اور یقین سے خارج ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے جو نازل کیا گیا اس کی طرف)۔

ائمہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند کو دیکھ کر افطار کرو۔ اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تعداد کو مکمل کرو (1)۔ ایک روایت میں ہے، اگر تم پر مہینہ ابر آلود ہو جائے تو تیس دن شمار کرو۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر جو کبار تابعین میں سے تھے اور ابن قتیبہ جو لغت کے علماء میں سے تھے ان دونوں حضرات نے کہا: رمضان کے روزہ میں بادل کے وقت منازل کی تقدیر منازل کے حساب سے حساب لگایا جائے گا حتیٰ کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو دیکھا جاتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تم اس کی منازل سے استدلال کرو (2) اور مہینہ کی تکمیل کا اندازہ اس کے حساب سے لگاؤ۔ جمہور نے کہا: فاقدروا کا معنی ہے: مقدار کو مکمل کرو۔ حضرت ابوہریرہ کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے: فاکملوا العدّة۔ داؤدی نے کہا ہے کہ فاقدروالہ کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ منازل کا اندازہ کرو۔ ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ معنی کیا ہو۔ مگر بعض اصحاب شوافع نجومیوں کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس پر اجماع حجت ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے "الامام" میں روایت کیا ہے: چاند کی رؤیت سے نہ روزہ رکھے نہ افطار کرے بلکہ حساب پر روزہ رکھے اور افطار کرے۔ اس قول کی نہ اقتداء کی جاتی ہے نہ اتباع۔ ابن عربی نے کہا: بعض اصحاب شافعی سے لغزش ہوئی ہے انہوں نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے حساب پر اعتماد کیا ہے یہ لغزش ہے۔ اللہ تعالیٰ ٹھوکر سے محفوظ رکھے۔

**مسئلہ نمبر 4**: امام مالک، امام شافعی کا اختلاف ہے کہ ایک شخص کی شہادت سے رمضان کا چاند ثابت ہوگا یا دو گواہوں سے ثابت ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں ایک شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ چاند پر گواہی ہے اور اس میں دو سے کم افراد کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس کی اصل شوال اور ذی الحجہ کے چاند پر شہادت ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ایک شخص کی خبر قبول کی جائے گی کیونکہ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے (3)، فرمایا: لوگوں

---

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اذا رأیتم الهلال فصوموا فاذا رأیتموہ فافطروا، حدیث نمبر 1776، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1773　　3۔ سنن ابی داؤد، باب فی شهادة الواحد علی رؤیة هلال رمضان، حدیث 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے چاند دیکھا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ پس آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ دار قطنی نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا: اس میں مروان بن محمد نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ ہے۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان کا چاند دیکھنے کی گواہی دی تو آپ نے روزہ رکھا۔ میرا خیال ہے آپ نے فرمایا: لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا اور حضرت علی نے فرمایا: شعبان کا میں ایک دن روزہ رکھوں۔ یہ میرے نزدیک رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے سے زیادہ محبوب ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر عام لوگوں نے رمضان کا چاند نہ دیکھا ہو اور ایک عادل شخص نے دیکھا ہو تو میرا خیال ہے کہ میں اسے اثر اور احتیاط کی وجہ سے قبول کرلوں گا۔ امام شافعی نے اس کے بعد کہا: رمضان پر شہادت دینے کے لئے بھی دو گواہ ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ہمارے بعض اصحاب نے کہا: میں اس پر دو گواہ ہی قبول کروں گا۔ یہ ہر مغیب پر قیاس ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے صرف رمضان کا چاند دیکھا ہو یا صرف شوال کا چاند دیکھا ہو۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے: جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار کرے اور اس کو پوشیدہ رکھے۔ ابن وہب نے مالک سے اس شخص کے بارے روایت کیا ہے جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اس کے لئے افطار کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دن رمضان کے مہینہ سے ہے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار نہ کرے کیونکہ لوگ تہمت لگائیں گے کہ اس نے افطار کیا جو مامون نہیں پھر جب یہ لوگ غالب آجائیں گے تو کہیں گے ہم نے چاند دیکھا۔ ابن منذر نے کہا: یہی قول لیث بن سعد، امام احمد بن حنبل کا ہے۔ عطا اور اسحاق نے کہا: نہ وہ روزہ رکھے اور نہ افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: وہ روزہ رکھے اور افطار کرے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں چاند نظر آنے کی خبر دے پھر وہ شہر قریب ہوگا یا دور ہوگا اگر وہ شہر قریب ہے تو اس کا حکم ایک ہے اور اگر وہ شہر دور ہے تو ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے۔ یہ عکرمہ، قاسم اور سالم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی طرف بخاری نے اشارہ کیا ہے جہاں اس نے باب باندھا ہے کہ ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے اور دوسرے علماء نے کہا جب لوگوں کے نزدیک ثابت ہو جائے کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تھا تو ان پر اس روزے کی قضا لازم ہے جو انہوں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح لیث بن سعد اور امام شافعی نے کہا: ابن منذر نے کہا: میں یہ نہیں جانتا مگر مزنی اور کوفی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جب کسی شہر والوں نے چاند دیکھ کر تیس دن روزے رکھے ہوں اور دوسرے شہر والوں نے انتیس روزے رکھے ہوں تو جنہوں نے انتیس روزے رکھے ہوں گے وہ ایک دن کی قضاء کریں گے۔ اصحاب شافعی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ کیونکہ شہروں کے مطالع کا مختلف ہونا جائز ہے۔ احناف کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ ایک شہر والوں کی رؤیت سے ثابت ہوا کہ تعداد تیس ہے، پس ان پر ان کا مکمل کرنا واجب تھا اور ان کے مخالف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول سے حجت پکڑتے ہیں

کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (الحدیث) اور یہ ہر قوم کی ان کے شہر میں عادت کے اعتبار کو ثابت کرتی ہے۔ ابو عمرو نے اجماع حکایت کیا ہے کہ دور والے شہروں کی رؤیت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ جیسے اندلس، خراسان سے دور ہے اور فرمایا: ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہے مگر جو بڑا شہر ہو اس کے قطر مسلمانوں کے دوسرے شہروں کے قریب ہوں تو پھر سب کے لئے ایک ہی رویت کافی ہوگی۔ مسلم نے کریب سے روایت کیا ہے کہ حضرت ام فضل بنت حارث نے حضرت امیر معاویہ کی طرف انہیں شام کی طرف بھیجا۔ کریب نے کہا: میں شام میں آیا اور اپنی ضرورت کو پورا کیا مجھ پر وہاں رمضان کا چاند طلوع ہوگیا جبکہ میں ابھی شام میں ہی تھا میں نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا پھر میں مہینہ کے آخر میں مدینہ آیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ ابن عباس نے پوچھا پھر چاند کا ذکر ہوا تو پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا تو نے خود چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں لوگوں نے چاند دیکھا، لوگوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ ہم روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ہم تیس دن مکمل کریں گے یا ہم خود چاند دیکھ لیں گے۔ میں نے کہا: تمہارے لئے حضرت معاویہ کی رویت اور اس کا روزہ کافی نہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: نہیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تصریح ہے۔ یہ حجت ہے کہ شہر جب دور ہوں جیسے شام، حجاز سے دور ہے تو ہر شہر والوں پر اپنی رؤیت پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسروں کی رؤیت کا اعتبار نہیں۔ اگرچہ امام اعظم کے نزدیک ثابت ہو جبکہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور نہ کرے، اگر وہ لوگوں کو مجبور کرے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ الکیا طبری نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول کہ "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔" یہ احتمال ہے کہ اس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صوموا لرؤیتہ وافطروا لرویتہ کی تاویل کی ہو۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس کے اس قول کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اس کو رد کیا کیونکہ یہ خبر واحد تھی۔ بعض نے فرمایا: اس لئے رد کیا کیونکہ مطالع میں قطر مختلف تھے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ قریب نے گواہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے اس حکم کے متعلق بتایا تھا جو شہادت کے ساتھ ثابت تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم ثابت میں خبر واحد بھی جائز ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ اغمات میں چاند کا دیکھنا جمعہ کی رات ثابت ہوا اور اشبیلیہ میں ہفتہ کی رات کو نظر آئے تو ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ سہل ستارہ اغمات میں نظر آتا ہے اور اشبیلیہ میں نظر نہیں آتا یہ اختلاف مطالع کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے "المجموعہ" میں روایت کیا ہے کہ جب اہل بصرہ رمضان کا چاند دیکھیں پھر کوفہ، مدینہ، یمن والوں کو یہ خبر پہنچے تو ان پر روزہ یا قضاء لازم ہے اگر ادا فوت ہو جائے۔ قاضی ابو اسحاق نے ابن ماجشون سے روایت کیا ہے کہ اگر ایک عام امر کے ساتھ بصرہ میں چاند ثابت ہو جائے جو شہادت اور تعدیل سے مستغنی ہو تو دوسرے شہر والوں پر بھی لازم ہوگی۔ اگر چاند کا ثبوت حاکم کے پاس دو آدمیوں کی شہادت سے ہو تو پھر ان شہروں پر روزہ رکھنا لازم ہوگا جو اس حاکم کی ولایت میں ہیں اور اگر چاند امیر المومنین کے پاس

ثابت ہوتو تمام مسلمانوں پر قضا لازم ہے۔ فرمایا: یہ امام مالک کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** جمہور لوگوں نے شہر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی ذلکم شھر المفترض علیکم صیامہ شھر رمضان۔ یا الصوم شھرٌ یا الایام شھرٌ۔ اس کی تقدیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کتب کا نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یعنی کتب علیکم شھر رمضان۔ اور رمضان غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں نون زائدہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہونا بھی جائز ہے اور اس کی خبر الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی خبر فمن شھد ہے الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اس کی صفت ہے بعض نے فرمایا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ جس نے کہا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ میں الصِّيَامُ سے مراد تین روزے اور عاشورا کا روزہ ہے اس نے مبتدا ہونے کا قول کیا ہے اور جنہوں نے کہا الصِّيَامُ سے مراد رمضان ہے تو انہوں نے ابتدا یا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع کہا ہے یعنی کتب علیکم شھر رمضان(1)۔ مجاہد، اشہر بن حوشب نے شہر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا معنی وان تصوموا شھر رمضان ہے۔ فراء نے کہا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ یعنی ان تصوموا شھر رمضان۔ نحاس نے کہا: شھر رمضان کو تصوموا کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ صلہ میں داخل ہوگا پھر صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کرے گا۔ اسی طرح صیام کے ساتھ نصب دینی بھی جائز نہیں لیکن اغراء کی بنا پر نصب دینا جائز ہے۔ ای الزموا شھر رمضان، و صوموا شھر رمضان۔ یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ شہر کا ذکر پہلے نہیں ہوا تا کہ اس پر اغرا (ابھارنا) کیا جائے میں کہتا ہوں: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ یہ الشھر پر دلالت کرتا ہے پس اغرا جائز ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اخفش نے کہا: ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن اور ابو عمرو سے راء کا راء میں اوغام حکایت کیا ہے یہ جائز نہیں تا کہ دو ساکن جمع نہ ہوں (2) اور را کی حرکت کو ہا پر بدلنا جائز ہے ہا کو ضمہ دیا جائے گا پھر ادغام کیا جائے گا یہ کوفیوں کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ یہ نص ہے کہ قرآن رمضان میں نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کو بیان کرتا ہے: حٰمٓ ۚ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ (دخان) حٰمٓ حق کو واضح کرنے والی کتاب کی قسم ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ (القدر) ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں۔ یہ دلیل ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کسی اور مہینہ میں نہیں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن لوح محفوظ سے لیلۃ القدر میں اکٹھا نازل ہوا۔ پھر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں رکھا گیا۔ پھر جبریل اوامر، نواہی اور اسباب کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارتے رہے۔ یہ بیس سال میں اترا (3)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن لوح محفوظ سے یکبارگی آسمان دنیا میں فرشتوں کی طرف اتارا گیا پھر جبریل اسے مختلف اوقات میں اکیس سال میں اتارتے رہے۔ مقاتل نے شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ کے بارے میں فرمایا: لوح محفوظ سے ہر سال لیلۃ القدر میں آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا پھر بیس مہینوں میں ملائکہ کی طرف اتارا گیا۔ جبریل بیس سال میں اس کو لے کر آیا۔

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: مقاتل کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے قرآن اکٹھا نازل ہوا تھا۔ واللہ اعلم

حضرت واثلہ بن اسقع نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو نازل کئے گئے تھے تورات چھ رمضان کو، انجیل تیرہ رمضان کو اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔(1)

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں حسن کے قول کی دلیل ہے کہ لیلۃ القدر چوبیس رمضان کو ہوتی ہے۔ اس کا بیان ان شاءاللہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: الْقُرْاٰنُ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اسم ہے اور یہ بمعنی المقروء (پڑھا گیا) ہے جیسے مشروب کو شراب کہا جاتا ہے، المکتوب کو کتاب کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ قرء یقرء قراءۃ و قرانًا کا مصدر ہے قراءت اور قرآن کا معنی ایک ہے۔ شاعر نے کہا:

ضحوا باشمط عنوان السجود به یقطع اللیل تسبیحاً و قرآنا

اس شعر میں قرآنا بمعنی قراءت ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سمندر میں شیطان بندھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو باندھا ہے قریب ہے وہ نکلیں اور لوگوں پر قراءت کریں، قرآن حکیم میں ہے: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء) یعنی فجر کی قراءت مقروء کو قراءۃ کہا جاتا ہے۔ مفعول کو مصدر کا نام دینا عربوں کی عادت ہے جس طرح وہ معلوم کو علم، مضروب کو ضرب اور مشروب کو شرب کا نام دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر اس میں استعمال مشہور ہوا اور اس کے ساتھ عرف شرعی متصل ہو گیا۔ پس قرآن اللہ کے کلام کا اسم بن گیا حتیٰ کہ جب کہا گیا القرآن غیر مخلوق تو اس سے مراد المقروء لیا گیا ہے نہ کہ اس کی قراءت اور وہ مصحف جس میں اللہ کا کلام لکھا جاتا ہے اس کو قرآن کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر نہ کرو۔ یہاں قرآن سے مراد مصحف ہے۔ یہ قرأت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کا علم ہے۔ یہ غیر مشتق ہے جیسے تورات اور انجیل یہ امام شافعی سے حکایت کیا اور صحیح یہ ہے کہ تمام میں اشتقاق ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ، هُدًى قرآن سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی لوگوں کے لئے ہدایت دینے والا ہے وَ بَيِّنٰتٍ، هُدًى پر معطوف ہے۔ الہدی کا مطلب الارشاد اور البیان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے بیان اور ارشاد ہے، اس سے مراد پورا قرآن ہے۔ محکم، متشابہ، ناسخ و منسوخ ذکر اور تخصیص سے شرف بخشا البینات سے مراد حلال، حرام، مواعظ اور احکام ہیں۔ بینات، بینہ کی جمع ہے یہ بان الشیء یبین سے مشتق ہے کسی چیز کا واضح ہونا۔ الْفُرْقَانِ جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ لام کی جزم کے ساتھ عام قراء کی قراءت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ حسن اور اعرج نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) یہ لام امر ہے اور اس کا حق کسرہ ہے جب علیحدہ ہو جب یہ کسی چیز کے ساتھ ملایا گیا ہو تو اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں: جزم اور کسرہ۔ اور تین حروف کے ساتھ یہ ملایا جاتا ہے۔ فاء جیسے ارشاد ہے: فلیصمه، فلیعبد وا واو جیسے ولیوفوا اور ثم، جیسے: ثم لیقضوا۔ شَہِدَ کا معنی حضر ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی من شهد منكم المصر في الشهر عاقلاً بالغاً صحيحاً مقيماً فليصمه۔ جو تم میں سے رمضان کے مہینہ میں شہر میں موجود ہو جبکہ وہ عاقل، بالغ، صحیح، مقیم ہو تو وہ روزے رکھے۔ کہا جاتا ہے: یہ عام ہے اس کی تخصیص اس قول سے ہے فمن كان منكم مريضاً او على سفر، الشَّهْرَ مفعول بہ نہیں بلکہ ظرف زمان ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت سوید بن غفلہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اور ابو مجلز لاحق بن حمید اور عبیدہ السلمانی نے کہا: جو رمضان کے مہینہ کے آغاز میں اپنے شہر میں اور اپنے گھر والوں میں موجود ہو اسے اپنے روزوں کو مکمل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ سفر کرے یا مقیم ہو اور سفر میں افطار کرے جس پر رمضان داخل ہو جبکہ وہ سفر میں ہو۔ ان علماء کے نزدیک معنی یہ ہے کہ جس نے رمضان کو سفر کی حالت میں پایا وہ افطار کرے اور اس پر دوسرے دنوں سے تعداد پوری کرنا لازم ہے اور مقیم حالت قیام میں رمضان کو پائے تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ جمہور امت نے کہا: جو رمضان کے مہینہ میں آغاز اور آخر میں مقیم ہو جب تک وہ مقیم رہے تو روزہ رکھے۔ اگر سفر کرے تو افطار کرے (2)۔ یہ قول صحیح ہے۔ اس پر اخبار ثابتہ دلالت کرتی ہیں۔ امام بخاری نے پہلے کا رد کرتے ہوئے یہ باب باندھا۔ باب اذا صام اياماً من رمضان ثم سافر۔ امام بخاری نے اس باب کے تحت اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں مکہ کی طرف نکلے آپ نے روزہ رکھا حتیٰ کہ آپ کدید کے مقام پر پہنچے تو روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ پس لوگوں نے بھی روزہ رکھنا چھوڑ دیا حضرت ابوعبیداللہ نے کہا الکدید، عسفان اور قدید کے درمیان ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کے قول کو سفر مندوب پر محمول کیا جائے جیسے فضلاء او رصالحین کا بھائیوں کی زیارت کرنے کے لئے سفر کرنا یا سفر مباح پر محمول ہو جیسے کفایت پر زائد رزق کی طلب کے لئے سفر کرنا۔ رہا ضروری خوراک کے لئے واجب سفر کرنا یا کسی شہر کو فتح کرنے کے لئے سفر کرنا جبکہ اس کی فتح یقینی ہو۔ یا دشمن کو دور کرنے کا سفر ہو تو اس صورت میں اسے اختیار ہے اسے روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ قوت کے لئے اس میں افطار افضل ہے اگرچہ وہ رمضان کے مہینہ میں اپنے شہر میں موجود بھی ہو اور اس میں بعض روزے رکھ بھی لئے ہوں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث ہے، اس میں ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: مکلف ہونے کی شرط کے ساتھ جو رمضان کے مہینہ میں موجود ہو مجنون اور بیہوش بھی نہ ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے اور جس پر رمضان آئے جبکہ وہ مجنون ہو اور اس کا جنون پورا مہینہ طاری رہے تو اس پر قضا

---

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب اذا صام ایاما من رمضان ثم سافر، حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں ہے کیونکہ اس نے رمضان کے مہینہ کو اس صفت پر نہیں پایا جس کے ساتھ روزے واجب ہوتے ہیں اور جس کو مہینہ کی ابتدا میں اور آخر میں جنون لاحق ہو تو وہ جنون کے دنوں کی قضا کرے۔ اس تاویل پر شھر کو نصب شھِدَ کے مفعول بہ کی حیثیت سے صریح ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 12**: یہ ثابت شدہ امر ہے کہ روزے کی فرضیت اسلام، بلوغ اور رمضان کے مہینہ کے علم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب فجر سے پہلے کوئی کافر مسلمان ہو یا بچہ بالغ ہو تو ان پر اس دن کا روزہ لازم ہوگا اور اگر فجر کے بعد بالغ ہو یا مسلمان ہو تو دونوں کے لئے کھانے پینے وغیرہ سے رکا رہنا مستحب ہے اور ان پر رمضان کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی جس میں بچہ بالغ ہوا اور کافر مسلمان ہو، قضا لازم نہیں ہے اور علماء کا اس کافر کے بارے میں اختلاف ہے جو رمضان کے آخری دن میں مسلمان ہو گیا اس پر سارے رمضان کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ کیا اس پر اس دن کی قضا لازم ہے جس میں وہ مسلمان ہوا؟ امام مالک اور جمہور علماء نے کہا: اس پر گزشتہ دنوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے اسلام کے وقت رمضان کا مہینہ پایا۔ امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک اس دن کی قضا کرنا محبوب ہے جس دن وہ مسلمان ہوا۔ عطا اور حسن نے کہا: وہ باقی دنوں کے روزے رکھے اور گزشتہ دنوں کی قضا کرے۔

عبدالملک بن ماجشون نے کہا: اس دن کھانے سے رکا رہے اور اس کی قضا کرے۔ امام احمد اور اسحاق نے اس کی مثل کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر مہینہ کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی قضا لازم نہیں ہے۔ الباجی نے کہا: ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کفار شرائع الاسلام کے مخاطب ہیں...... یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول کا مقتضا ہے...... انہوں نے اس پر بقیہ دن کھانے پینے سے رکا رہنے کو واجب کہا ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے ''المدونہ'' میں اس کو روایت کیا ہے یہی شیخ ابو القاسم کا قول ہے اور ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کہ کفار مخاطب نہیں ہیں، انہوں نے کہا: بقیہ دن رکا رہنا لازم نہیں ہے۔ یہ اشہب، عبدالملک بن ماجشون کے قول کا مقتضا ہے۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اس میں صرف مومنین کو خطاب فرمایا کسی اور کو خطاب نہیں فرمایا یہ واضح ہے پس بقیہ دن اس پر رکا رہنا واجب نہیں اور گزشتہ دنوں کی قضا بھی نہیں۔ پہلے وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ کے تحت کلام گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ، الْیُسْرَ یہ جماعت کی قرأت ہے الیُسُر (سین کے ضمہ کے ساتھ) یہ دونوں لغتیں ہیں اسی طرح العسر میں دونوں لغتیں ہیں (2)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا(3): الیسر سے مراد سفر میں افطار اور العسر سے مراد سفر میں روزہ ہے۔ لفظ کا عموم تمام امور دینیہ کو شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے دین اللہ یسر (اللہ کا دین) آسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یسروا ولا تعسروا۔ آسانی کرو، تنگی نہ کرو۔ الیسر، سہولت سے ہے اور اسی سے غناء کے لئے یسار

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

استعمال ہوتا ہے، بائیں ہاتھ کو الید الیسریٰ کہا جاتا ہے یا تو فال پکڑنے کے لئے یا اس لئے کہ دائیں ہاتھ کی یہ معاونت کرتا ہے تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کا معنی يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ہے۔ تاکید کے لئے تکرار فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 14**: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قدیم، ازلی ذات پر زائد ارادہ کے ساتھ ارادہ فرمانے والا ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے جس طرح وہ علم کے ساتھ عالم ہے، اپنی قدرت کے ساتھ قادر ہے، حیات کے ساتھ زندہ ہے، سمع کے ساتھ سمیع ہے، بصر کے ساتھ بصیر ہے، کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ یہ تمام معانی موجود، ازلی ذات پر زائد ہیں۔ فلاسفہ اور شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زائغین کے قول اور مبطلین کے ابطال سے بلند و بالا ہے اور جو بات ان اہل تعطیل کی جڑ کاٹتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے صاحب ارادہ ہونے کی تصدیق نہ کی جائے تو صادق آئے گا کہ وہ صاحب ارادہ نہیں ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو پھر وہ ذات جو صاحب ارادہ نہ ہو وہ اس کی نسبت ناقص ہوگی جو صاحب ارادہ ہوگی۔ بے شک جس کی صفات ارادہ یہ ہوں اس کے لئے جائز ہوتا ہے کہ کسی شے کو خاص کرے اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہوتا ہے کہ اسے خاص نہ کرے۔ پس عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ ارادہ کمال ہوتا ہے نہ کہ نقص حتیٰ کہ اگر وہم کے ساتھ اندازہ کیا گیا ہو اور اس سے یہ امر سلب کیا گیا ہو تو اس کا پہلا حال دوسرے حال کی نسبت اکمل ہوگا۔ پس یہی باقی رہ جائے گا کہ جو ارادہ سے متصف نہیں وہ ناقص ہے اس سے جو ارادہ سے متصف ہے اور اس میں جو محال ہے وہ مخفی نہیں، یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخلوق خالق سے اکمل ہو اور خالق اس سے کم مرتبہ ہو؟ بداہت اس کا رد اور ابطال کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنا وصف بیان کیا ہے کہ وہ مرید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ (البروج) کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ ارادہ فرماتا ہے اللہ تم سے آسانی کا اور نہیں ارادہ فرماتا تم سے تنگی کا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (النساء: 28) اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے تم سے تخفیف کرنے کا اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰس: 82) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو: ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے پھر یہ عالم حکمت، پختگی، انتظام اور احکام پر مبنی ہے، اس کے باوجود اس کا ہونا اور اس کا نہ ہونا جائز ہے اور وہ ذات جس نے وجود کے ساتھ اس کو خاص کیا اس کے لئے اس کا ارادہ کرنے والا ہونا، اس پر قادر ہونا اور اس کا عالم ہونا واجب ہے اگر وہ عالم، قادر نہ ہو تو اس سے کسی شے کا صدور صحیح نہیں اور جو عالم نہ ہو اگرچہ قادر ہو اس سے حکمت و اتقان پر اشیاء کا صدور ممکن نہیں اور جو مرید نہ ہو بعض جائزات کی بعض احوال اور اوقات کے ساتھ تخصیص اولیٰ نہ ہو۔ کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ایک نسبت ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جو اس کا قادر، مرید ہونا ثابت ہوا تو اس کا زندہ ہونا بھی ثابت ہوا کیونکہ زندہ ہونا ان صفات کی شرط ہے۔ زندہ ہونے سے لازم آتا ہے کہ وہ سمیع، بصیر اور متکلم بھی ہو اگر اس کے لئے یہ صفات ثابت نہ ہوں تو لامحالہ ان صفات کی اضداد سے متصف ہوگا جیسے اندھا، بہرہ اور گونگا ہونا جیسا کہ اس عالم شہادت میں معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے ان تمام صفات سے جو اس کی ذات میں نقص کا موجب ہوں۔

**مسئلہ نمبر 15**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اس میں دو تاویلیں ہیں: (1) جس نے سفر یا مرض میں

روزے چھوڑے ان کی تعداد پوری کرنا (۲) چاند کی تعداد پوری کرنا خواہ وہ انتیس دنوں کا ہو یا تیس دنوں کا ہو۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے اس میں اس شخص کی تاویل کا رد ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد شهرا عيد لا ينقصان رمضان و ذوالحجة(1) کی تاویل کی کہ تیس دنوں سے یہ دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور جمہور علماء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ دو مہینے اجر اور خطاؤں کی تکفیر میں کم نہیں ہوتے خواہ یہ انتیس دنوں کے ہوں یا تیس دنوں کے ہوں۔

**مسئلہ نمبر 16**: تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آئے تو وہ شوال کا نہیں ہوگا بلکہ وہ آئندہ رات کا ہوگا یہ صحیح قول ہے۔ حضرت عمر سے اس مسئلہ کو روایت کرنے والے مختلف ہیں، دارقطنی نے شقیق سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا جبکہ ہم خانقین میں تھے۔ حضرت عمر نے اپنے خط میں فرمایا: چاند بعض، بعض سے بڑے ہوتے ہیں۔ جب تم دن کے وقت چاند کو دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ دو گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا۔

ابو عمر نے عبد الرزاق عن معمر عن الاعمش عن ابی وائل کی سند سے روایت کیا ہے، ابو وائل نے کہا: حضرت عمر نے ہماری طرف لکھا...... آگے سابقہ کلام ذکر کیا۔ حضرت ابو عمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے جو عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے۔ یہی قول حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا ہے اور یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن، لیث اور اوزاعی کا ہے اور یہی قول امام احمد اور اسحاق کا ہے۔ سفیان ثوری اور امام ابو یوسف نے کہا: اگر زوال کے بعد چاند دیکھا گیا تو وہ آئندہ رات کا ہوگا اگر زوال سے پہلے چاند دیکھا گیا تو وہ گزشتہ رات کا ہوگا۔ حضرت عمر سے اس کی مثل قول مروی ہے۔ عبد الرزاق نے ثوری سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے شباک سے انہوں نے ابراہیم سے یہ روایت ذکر کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ جب تم دن کے وقت سورج کے زوال سے پہلے چاند کو دیکھو تو تیس دن مکمل ہونے کی وجہ سے تم افطار کر دو اور جب تم سورج کے زوال کے بعد چاند دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ شام ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسناد کی جہت سے اس مسئلہ میں کوئی چیز صحیح مروی نہیں ہے۔ سلیمان بن ربیعہ سے ثوری کے قول کی مثل مروی ہے۔ عبد الملک بن حبیب کا بھی یہی خیال ہے وہ قرطبہ میں اسی کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سے اس مسئلہ میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عمر سے جو حدیث مروی ہے جس کے مطابق امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ کا قول ہے وہ متصل ہے اور وہ حدیث جو ثوری کے مذہب کے مطابق مروی ہے وہ منقطع ہے۔ پس متصل کی طرف رجوع کرنا اولیٰ ہے۔ جن علماء نے ثوری کا مذہب اختیار کیا انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے مگر حضرت اعمش کی حدیث مجمل ہے اس میں زوال سے پہلے اور بعد کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور حضرت ابراہیم کی حدیث مفسر ہے پس اس کے ساتھ قول کرنا اولیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں: جو حضرت عمر سے متصلاً موقوفاً مروی ہے اسی معنی میں مرفوع بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو

1۔ صحیح بخاری، باب شهرا عيد لا ينقصان، حدیث نمبر 1779، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تیس رمضان کی صبح روزے سے تھے آپ نے دن کے وقت شوال کا چاند دیکھا تو افطار نہ کیا حتیٰ کہ شام ہوگئی اس کو واقدی کی حدیث سے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: واقدی نے کہا: ہمیں معاذ بن محمد انصاری نے بیان کیا، فرمایا: میں نے زہری سے شوال کے چاند کے مطابق پوچھا جب وہ جلدی دیکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر شوال کا چاند فجر کے طلوع ہونے سے لے کر عصر تک یا سورج کے غروب ہونے کے درمیان تک دیکھا جائے تو وہ آنے والی رات کا ہوگا۔ ابو عبداللہ نے کہا اس پر اجماع ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 17**: دارقطنی نے حضرت ربعی بن خراش سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگوں کا رمضان کے آخری دن کے بارے میں اختلاف ہوا۔ دو دیہاتی آئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس گزشتہ شام چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روزہ افطار کرنے کا حکم دیا اور صبح عید گاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے کہا: یہ اسناد حسن سے ثابت ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور اصحاب مالک سے کوئی اختلاف مروی نہیں (2)۔ عید کی نماز عید کے علاوہ کسی دن نہیں پڑھی جائے گی اور نہ عید کے دن زوال کے بعد پڑھی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ سے یہی قول حکایت کیا گیا ہے۔ امام شافعی کا قول اس مسئلہ میں مختلف ہے کبھی امام مالک کے قول کے مطابق فرمایا اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: جب عید کے دن زوال کے بعد عید کی نماز پڑھنی جائز نہیں تو دوسرا دن عید کے وقت سے زوال سے بھی زیادہ دور ہے اس لئے دوسرے دن بدرجہ اولیٰ نہیں پڑھی جائے گی اور امام شافعی سے دوسری روایت مروی ہے کہ دوسرے دن چاشت کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی۔ بویطی نے کہا: عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی مگر جب اس کے بارے میں کوئی حدیث ثابت ہو۔ ابو عمر نے کہا: اگر نماز عید وقت کے بعد ادا کی جائے گی تو یہ فرائض کے مشابہ ہو جائے گی اور علماء کا سنن کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کی قضا نہیں کی جاتی۔ اور یہ نماز عید سنن کی مثل ہے۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: دوسرے دن وہ نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے ''الاملاء'' میں اسی طرح فرمایا۔ حسن بن صالح بن حی نے فرمایا: عید الفطر میں نہیں نکلیں گے، عید الاضحیٰ میں (دوسرے دن) نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں امام تیسرے دن نماز عید پڑھائے گا (اگر پہلے دو دنوں میں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے ہوں) ابو عمر نے کہا: اضحیٰ ایام عید ہیں اور یہ نماز عید ہے۔ اور فطر کی عید صرف ایک دن ہے جب پہلے دن عید الفطر نہیں پڑھی ہوگی تو دوسرے دن قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ فرض نہیں ہے کہ اسے قضا کیا جائے۔ لیث بن سعد نے کہا: دوسرے دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ پڑھی جائے گی۔ (اگر وہ پہلے دن نہیں پڑھ سکے ہوں گے)

میں کہتا ہوں: ان شاء اللہ دوسرے دن پڑھنے کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کے متعلق سنت ثابت ہے اور شارع علیہ السلام سنن میں سے جس کو چاہیں مستثنیٰ کر دیں اور اس کے وقت کے نکلنے کے بعد اس کی قضا کا حکم دے دیں، اس میں کوئی مانع نہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں

1۔ سنن دارقطنی، جلد 2، صفحہ 173
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 169

(سنتیں) ادا نہیں کیں وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے (1)۔ ابو محمد نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: بعض اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے اور اس کے مطابق سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور حضرت ابن المبارک کا قول ہے اور حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: جس پر وقت تنگ ہو اور وہ صبح کی نماز (فرض) پڑھ لے اور فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) چھوڑ دے تو وہ اگر چاہے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت ادا نہ کرے پھر جب ہم نے کہا کہ وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھے تو کیا وہ یہ قضا پڑھے گا یا ان دو رکعتوں کا ثواب، فجر کی سنتوں کے ثواب کے قائم مقام ہو جائے؟ شیخ ابو بکر نے کہا: یہ اصل مذہب پر جاری ہے اور قضا کا ذکر مجازاً ہے۔

میں کہتا ہوں: کوئی بعید نہیں کہ دوسرے دن نماز عید الفطر کا حکم اسی اصل پر ہو خصوصاً جبکہ یہ نماز سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے نیز سنت سے بھی ثابت ہے۔ نسائی نے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے عمرو بن علی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں شعبہ نے بتایا فرمایا: مجھے ابو بشر نے بتایا انہوں نے ابو عمیر بن انس سے روایت کیا، انہوں نے اپنے چچوں سے روایت کیا کہ ایک قوم نے چاند دیکھا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سورج بلند ہونے کے بعد افطار کرنے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ دوسرے دن عید کے لئے نکلیں ایک روایت میں ہے، وہ عید گاہ کی طرف دوسرے دن نکلیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 18**: ابو بکر نے عاصم سے اور ابو عمرو نے (بعض روایات میں جو ان سے مروی ہیں (2)) اور قتادہ، حسن اور اعرج نے وَ لِتُكَمِّلُوا الْعِدَّةَ پڑھا ہے یعنی میم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے تخفیف کو پسند کیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ: 3) نحاس نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہم معنیٰ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (طارق) (اس میں مهّل اور امهلهم دونوں لغتیں ہم معنی ہیں) اور و لتکملوا کو لام کے سکون کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں اور اس کے اور اس سے پہلے والے لام میں فرق پہلے گزر چکا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و یرید لان تکملوا اور ان اور کسرہ کا حذف کرنا جائز نہیں۔ یہ بصریوں کا قول ہے اسی طرح کثیر ابو صخر کا قول ہے: ارید لانسی ذکرھا میں اس کا ذکر بھولنا چاہتا ہوں۔

یہ اصل میں لان انسی ہے۔ یہ لام مفعول پر داخل ہوتا ہے جیسے تیرے اس قول میں ہے ضربت لزید۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تعداد کے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے العدۃ رخص لکم ھذہ الرخصۃ۔ یہ کوفیوں کا قول ہے نحاس نے یہ قول فراء سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حسن قول ہے۔ و کذالك نری ابراھیم ملکوت السموات والارض و لیکون من الموقنین، ای ولیکون من الموقنین فعلنا ذالك۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب الاذان، باب ما جاء فی اعادتھما، حدیث نمبر 388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

[illegible] اللہ، حدیث نمبر 977، ضیاء القرآن 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: یہ واو مقحمہ ہے، بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ لام، لام امر ہو اور واو عاطفہ ہو جملہ کلام کا جملہ کلام پر عطف ہو (1)۔ ابو اسحٰق براہیم ابن السری نے کہا: یہ معنی پر محمول ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فعل الله ذالك یسھل علیکم ولتکملوا العدۃ۔ ابو اسحاق نے کہا: سیبویہ نے اس کی مثل یہ شعر کہے ہیں:

بادت غیر آیھن مع البلیٰ الا رواکد جمرھن ھباء

ومشجج اما سواء قذاله فبدا و غیب سارہ المعزاء

اس کا معنی ہے: بادت الا رواکد بھا رواکد۔ گویا یوں فرمایا: و بھا مشجج او ثم مشجج۔ یعنی شہر ہلاک ہو گئے بوسیدگی کے ساتھ ان کے نشان تبدیل ہو گئے سوائے چولہوں کے نشانات کے، ان کے انگارے غبار ہیں پھر خیموں کے کیل ان کا درمیان برابر ہے۔ پس وہ ظاہر ہوا اور پتھریلی زمین نے اس کا چلنا غائب کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 19**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ۔ اس کا وَلِتُكْمِلُوا پر عطف ہے اس کا مطلب جمہور علماء کے قول کے مطابق رمضان کے آخر میں تکبیر پر برانگیختہ کرنا ہے اس کی حد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا سعید بن مسیب، عروہ، ابوسلمہ سے مروی ہے کہ یہ لوگ عید الفطر کی رات تکبیریں کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اور فرمایا: یہ لیلۃ النحر (قربانی والی رات) کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: مسلمانوں پر حق ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیریں کہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ انسان چاند دیکھنے سے لے کر خطبہ کے ختم ہونے تک تکبیریں کہے اور امام کے ظاہر ہونے کے وقت رک جائے اور اس کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہے۔ ایک قوم نے کہا: چاند دیکھنے سے لے کر امام کے نماز کے لئے ظاہر ہونے تک تکبیریں کہے۔ سفیان نے کہا: یہ فطر والے دن کی تکبیر ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: لوگ جب عید گاہ کی طرف نکلتے تو تکبیریں کہتے جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو عید ختم ہو جاتی ہے (2)۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ تکبیریں گھر سے نکلنے سے لے کر امام کے نکلنے تک ہیں۔ ابن قاسم اور علی بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ اگر سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکلے تو راستہ میں تکبیریں نہ کہے اور بیٹھے ہوئے تکبیر کہے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے اگر سورج طلوع ہونے کے بعد گھر سے جائے تو راستہ میں عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہے اور جب بیٹھ جائے تب بھی تکبیریں پڑھتا رہے حتیٰ کہ امام نقل کرے۔ امام مالک کے نزدیک اس مسئلہ میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ برابر ہیں۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں تکبیریں کہے اور عید الفطر میں تکبیریں نہ کہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ کیونکہ یہ عید کا دن ہے اور سال میں اس کا تکرار نہیں ہوتا۔ پس اس کی طرف نکلنے میں تکبیر سنت ہے جس طرح عید الاضحیٰ میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے۔ دارقطنی نے ابو عبد الرحمٰن سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ عید الفطر میں تکبیریں، عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ شدت سے کہتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن اپنے گھر سے نکلنے کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وقت تکبیر کہتے حتیٰ کہ عیدگاہ پہنچ جاتے اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ جب وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی طرف جاتے تو بلند آواز سے تکبیریں کہتے حتیٰ کہ عید گاہ میں پہنچ جاتے۔ پھر آپ تکبیر کہتے رہتے حتیٰ کہ امام آجاتا۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے اکثر اہل علم عید الفطر میں تکبیریں کہنے کا نظریہ رکھتے تھے۔ یہ ابن منذر نے نقل کیا ہے، فرمایا: یہ امام اوزاعی نے الیاس سے ذکر کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے: جب کسی کو شوال کا چاند نظر آجائے تو میں پسند کرتا ہوں کہ لوگ اکٹھی اور علیحدہ علیحدہ تکبیریں کہیں۔ وہ متواتر تکبیریں کہتے رہیں اور تکبیروں کو ظاہر کریں حتیٰ کہ جنازہ گاہ کو چلے جائیں اور جب امام نکل آئے تو تکبیریں کہنا بند کر دیں۔ اسی طرح جس نے حج نہیں کیا اس کے لئے تکبیریں کہنا پسند ہے۔ عیدوں کی نماز کا حکم اور ان میں تکبیر کا حکم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (اعلیٰ) اور سورہ الکوثر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 20:** امام مالک اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک تکبیر کے الفاظ یہ ہیں: الله اکبر، الله اکبر، الله اکبر تین مرتبہ کہے۔ حضرت جابر بن عبد الله سے مروی ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: تکبیروں کے درمیان میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ اور سبحان الله بھی کہے۔ بعض فرماتے ہیں: یہ الفاظ کہے: الله اکبر کبیراً، الحمد لله کثیراً و سبحان الله بکرۃ واصیلاً۔ حضرت ابن مبارک جب عید الفطر کے لئے نکلتے تھے تو یہ کہتے تھے: الله اکبر الله اکبر لا الہ الا الله والله اکبر ولله الحمد الله اکبر علی ما ھدانا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک نے اس کی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ امام احمد نے فرمایا: اس میں وسعت ہے۔ ابن عربی نے فرمایا: ہمارے علماء نے مطلق تکبیر کو اختیار کیا یہی ظاہر قرآن ہے اور میرا میلان بھی اسی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اپنے روزے میں تبدیلی کر کے نصاریٰ اس میں بھٹک گئے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء پر فخر کرتے تھے اور اپنے حسب ظاہر کرتے تھے اور اپنے مناقب شمار کرتے تھے اس کے بدلے میں جو ہدایت دی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے تمہاری شرائع کی طرف جو رہنمائی فرمائی ہے اس پر تم اس کی عظمت بیان کرو۔ یہ عام ہے (1) اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝

''اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے پس انہیں چاہیے کہ میرے حکم مانیں اور ایمان لائیں مجھ پر تاکہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا سَاَلَكَ اس کا معنی ہے جب یہ آپ سے معبود کے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتاؤ کہ وہ قریب ہے وہ اطاعت پر ثواب دیتا ہے اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے اور بندہ جو صوم وصلاۃ میں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے کرتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ مقاتل نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے تو اس پر بہت شرمندہ ہوئے اور رونے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صورت حال عرض کی اور پریشان ہو کر واپس آئے اور رخصت کے نزول سے پہلے یہ مسئلہ تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔

**مسئلہ نمبر 2**: بعض علماء نے فرمایا: جب ابتدا میں سونے کے بعد کھانا ترک کرنا واجب ہوا تو بعض نے سونے کے بعد کھانا کھالیا پھر پریشان ہوا تو توبہ کی قبولیت میں یہ آیت نازل ہوئی اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ کلبی نے ابو صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہود نے کہا ہمارا رب ہماری دعا کیسے سنتا ہے جبکہ تمہارا خیال ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور پھر ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے کہ ہم اسے پکاریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عطا اور قتادہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تو ایک قوم نے کہا ہم کس وقت اسی سے دعا مانگیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ یعنی جو میری عبادت کرتا ہے میں اس کی عبادت قبول کرتا ہوں۔ دعا بمعنی عبادت ہے، اجابت کا معنی قبول کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابوداؤد نے حضرت نعمان بن بشیر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: دعا عبادت ہے تمہارے رب نے فرمایا: تم میری عبادت کرو میں تمہاری عبادت قبول کروں گا۔ دعا کو عبادت کہا جاتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۞ (غافر) (جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔)

اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم دیا اور اس پر ابھارا اور اس کو عبادت فرمایا اور دعا مانگنے والوں کی دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میری امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو کسی کو عطا نہیں کی گئیں سوائے انبیاء کرام کے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا: تو مجھ سے دعا کر میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس امت کو بھی یہی فرمایا: اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جب بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور اس امت کو بھی فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر گواہ بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ خالد الربعی فرماتے تھے اس امت کے لئے اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں میں تعجب کرتا ہوں۔ خود ہی اللہ نے انہیں دعا کا حکم فرمایا اور خود ہی قبولیت کا وعدہ فرمایا اور ان کے درمیان کوئی شرط نہیں ہے۔ کسی

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کہنے والے نے ان سے کہا اس کی مثل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ:25) یہ شرط ہے اور وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (یونس:2) میں عمل کی شرط نہیں ہے۔ اور فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (غافر:14) یہاں شرط ہے اور ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں شرط نہیں ہے۔ پہلی امتیں اپنی ضروریات میں اپنے انبیاء کی بارگاہ میں پناہ لیتی تھیں حتیٰ کہ ان کے انبیاء ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ بہت سے دعا کرنے والے دعا مانگتے ہیں لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اجیب اور استجب ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو مطلقاً قبول کرنے کا تقاضا نہیں کرتا اور ہر مطلوب کو عطا کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (اعراف) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو) ہر وہ شخص جو جانتے ہوئے گناہ کبیرہ پر مصر ہے یا جہالت کی وجہ سے گناہ کبیرہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پس اس کی دعا کیسے قبول کرے گا اور حد سے تجاوز کرنے کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں آئے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اگر میں چاہوں گا تو قبول کروں گا جیسے ارشاد فرمایا: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام:41) (تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لئے اگر چاہے) پس یہ مطلق و مقید کے باب سے ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں مانگیں اور دو آپ کو عطا کی گئیں اور ایک سے روکا گیا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ انعام میں آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان اخبار کا مقصود تمام مومنین کی تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ فی الجملہ دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے، وہ اپنے بندے کے قریب ہے، اس کی دعا کو سنتا ہے اور اس کے اضطرار کو جانتا ہے اور جو چاہتا ہے قبول فرماتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ (احقاف:5) (اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کرسکتا۔)

مالک اپنے غلام کی بات کبھی قبول کرتا ہے، والد اپنے بیٹے کی بات کبھی قبول کرتا ہے پھر اس کا سوال اسے عطا نہیں کرتا۔ پس دعا کے پائے جانے کے وقت قبولیت لامحالہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُجیبُ اور استجبْ خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوتی ورنہ مخبر جھوٹا ہو جائے گا۔ اس تاویل پر حضرت عبداللہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے لئے دعا میں (دروازہ) کھولا گیا اس کے لئے قبولیت کے دروازے کھولے گئے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تم میرے بندوں میں سے ظالموں کو کہو مجھ سے مت مانگو کیونکہ میں نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں گا جو مجھ سے دعا مانگے گا اور میں جب ظالموں کی دعا قبول کروں گا تو میں ان پر لعنت کروں گا...... ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول فرماتا ہے یا تو اس کی قبولیت دنیا میں ظاہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی، حدیث نمبر 3471، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرماتا ہے یا اس دعا کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یا آخرت میں اس کے لئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان دعا مانگتا ہے جب کہ اس میں گناہ اور قطع رحمی کا سوال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا فرماتا ہے یا تو جلدی اس کی دعا کو (قبول فرما کر) پورا کر دیتا ہے یا اس کے لئے اسے ذخیرہ فرما دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: پھر تو ہم زیادہ دعا کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ قبول کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے اور موطا میں یہ منقطع ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر:60) کی تفسیر میں نقل کی جاتی ہے۔ یہ سب اجابت (قبولیت) پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بندہ دعا کرتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اگر جو دنیا میں اپنے لئے رزق کی دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کیا جاتا ہے اگر اسے دنیا میں نہیں دیا جاتا تو اس کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو سعید کی حدیث اگرچہ تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبولیت کی دلیل ہے لیکن گزر چکا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے سے اجتناب کرنے والا ہو جو قبولیت سے مانع ہے۔ ارشاد فرمایا: جب وہ گناہ یا قطع رحمی کا سوال نہ کرے۔ اور مسلم میں یہ زائد ہے کہ جب وہ جلدی نہ کرے۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا بندہ کہے میں نے دعا کی اور میں نے دعا کی میں نے نہیں دیکھا کہ میری دعا قبول ہوئی پس وہ اس دعا کو نہیں مانگتا اور دعا چھوڑ دیتا ہے (1)۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہے کہ میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث کے الفاظ یستجاب لاحدکم (ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے) قبولیت کے وقوع کے وجوب کے متعلق خبر دینے اور قبولیت کے وقوع کے جواز کے متعلق خبر دینے کا احتمال رکھتے ہیں۔ جب وجوب کے متعلق خبر دینے کا معنی ہو تو قبولیت مذکورہ تین چیزوں کے مفہوم کے ساتھ ہوگی۔ جب وہ کہے: میں نے دعا مانگی اور قبول نہیں ہوئی تو ان تین چیزوں میں سے ایک کا وقوع باطل ہوا اور دعا سب چیزوں سے خالی ہوگئی اور اگر قبولیت کے جواز کے معنی میں ہو تو جو اس نے مانگا اس کے فعل کے ساتھ خاص ہوگی اور دعا کرنے والے کا یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی اسے مانع ہے کیونکہ مایوسی ضعف، تعیین اور ناراضگی کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح دعا کی قبولیت سے حرام کا کھانا بھی مانع ہے اور جو چیز حرام کے مفہوم میں ہو وہ بھی دعا کی قبولیت سے مانع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے پراگندہ بال اور پراگندہ حال وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے (عرض کرتا ہے) یا رب یا رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کا پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام

1۔ صحیح بخاری، باب یستجاب للعبد مالم یعجل، حدیث نمبر 5865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اسے حرام کے ساتھ غذا دی گئی ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ سوالیہ انداز میں فرمایا کہ جو اس صفت پر ہو اس کی دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے کیونکہ دعا کی قبولیت کے لئے داعی (دعا کرنے والا) میں، دعا میں اور جس چیز کا سوال کیا گیا ہے ان میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ داعی (دعا کرنے والا) میں یہ شرط ہے کہ وہ جاننے والا ہو کہ اس کی حاجت پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے اور سارے وسائط اس کے قبضہ میں ہیں اور اس کی تسخیر کے ساتھ مسخر ہیں اور وہ سچی نیت اور حضور قلب کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا اور وہ حرام کھانے سے اجتناب کرنے والا ہو اور دعا سے اکتانے والا نہ ہو اور جو چیز مانگی جا رہی ہے اس کی شرط سے یہ ہے کہ ایسے امور سے ہو جس کا طلب کرنا جائز ہو اور وہ فعل شرعی ہو جیسے ارشاد فرمایا جب تک وہ گناہ اور قطعی رحمی کا سوال نہ کرے۔ پس گناہ میں ہر گناہ داخل ہے جس کے ساتھ انسان گنہگار ہوتا ہے اور قطع رحمی میں مسلمانوں کے تمام حقوق اور مظالم داخل ہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: دعا کی سات شرائط ہیں (۱) تضرع (۲) خوف (۳) امید (۴) ہمیشگی (۵) خشوع (۶) عموم (۷) حلال کھانا۔

ابن عطا نے کہا: دعا کے ارکان، پر، اسباب اور اوقات ہیں اگر اس کے ارکان پائے جائیں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔ اگر اسے پر مل جائیں تو وہ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے، اگر اسے وقت سے موافقت ہو جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، اگر اسباب سے موافقت کر جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، دعا کے ارکان حضور قلب، رأفت، عجز اور خشوع ہے اس کے پر سچائی ہے، اس کا وقت سحری کا وقت ہے اس کے اسباب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی چار شرائط ہیں (۱) تنہائی کے وقت، دل کی حفاظت کرنا مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے زبان کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے آنکھ کی حفاظت کرنا جن کا دیکھنا حلال نہیں اور حرام چیز سے پیٹ کی حفاظت کرنا۔ بعض علماء نے فرمایا: دعا کی شرائط میں سے ہے کہ وہ غلطی سے سلامت ہو۔ بعض نے کہا:

ینادی ربه باللحن لیث      کذالك اذا دعاه لا یجیب

لیث اپنے رب سے غلطی کے ساتھ دعا مانگتا ہے اس طرح جو وہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کہ ہم دعا مانگتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا لیکن تم نے اس کی اطاعت نہ کی، تم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور اس کی سنت کی اتباع نہ کی، تم نے قرآن کو پہچانا اور اس کے مطابق عمل نہ کیا، تم نے اللہ کی نعمتوں کو کھایا اور ان کا شکر ادا نہیں کیا، تم نے جنت کو پہچانا اور اس کو طلب نہیں کیا، تم نے آگ کو پہچانا اور اس سے بھاگے نہیں ہو، تم نے شیطان کو پہچانا اور اس سے تم نے جنگ نہیں کی ہے بلکہ تم نے اس سے موافقت کی ہے، تم نے موت کو پہچانا اور تم نے اس کے لئے تیاری نہیں کی، تم نے مردوں کو دفن کیا اور تم نے عبرت حاصل نہیں کی، تم نے اپنے عیوب کو ترک کیا اور لوگوں کے عیوب کے ساتھ مشغول ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نوف البکالی کو کہا: اے نوف! اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی تھی کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر پاک دلوں کے ساتھ، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ، پاک ہاتھوں کے ساتھ، میں ان میں سے

کسی کی دعا قبول نہیں کروں گا جب تک میری مخلوق میں سے کسی کے لئے ظلم موجود ہوگا۔ اے نوف! نہ تو شاعر بن، نہ تو پیغام پہنچانے والا بن، نہ سپاہی بن، نہ ٹیکس وصول کرنے والا بن اور نہ تو عشر وصول کرنے والا بن کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام رات کی ایک گھڑی میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ ایسا وقت ہے جو بندہ دعا مانگتا ہے اس کے لئے دعا قبول کی جاتی ہے مگر یہ کہ وہ بادشاہوں کو پیغام پہنچانے والا ہو یا سپاہی ہو یا ٹیکس وصول کرنے والا ہو یا عشر وصول کرنے والا ہو یا طنبور بجانے والا ہو یا طبل بجانے والا ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دعا کرنے والا یہ نہ کہے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر، اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت کر اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر بلکہ اپنی دعا اور اپنے رسول کو چاہنے کے قول سے خالی کرے۔ اور اس شخص کے سوال کی طرح سوال کرے جو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتا مگر جو چاہتا ہے (اگر تو چاہے) کے قول میں اس کی مغفرت، عطا اور رحمت سے استغنا کی ایک قسم ہے جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے اگر تو چاہے کہ مجھے عطا کر تو ایسا کر۔ یہ استغنا اور عدم ضرورت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مجبور شخص تو اپنے سوال میں عزم و یقین رکھتا ہے وہ اس فقیر کی طرح سوال کرتا ہے جو اپنے سوال کی طرف مجبور ہوتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے، یہ بخاری کے الفاظ کا ترجمہ ہے حضرت انس بن مالک نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو عزم کے ساتھ سوال کرے۔ یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں (1)۔ مؤطا میں ہے (2) یہ نہ کہے: اے اللہ! میری مغفرت فرما اگر تو چاہے، اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: (عزم سے سوال کرے) یہ قول دلیل ہے کہ مومن کو دعا میں کوشش کرنی چاہئے اور وہ قبولیت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ وہ کریم ذات سے دعا مانگ رہا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: کسی کو کسی دعا سے منع نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے بدترین ابلیس کی دعا کو بھی قبول فرمایا۔ اس نے عرض کی تھی: اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (اعراف: 14) مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (اعراف: 15) بےشک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے)

دعا کے لئے کچھ اوقات اور احوال ہیں جن میں غالب طور پر قبول ہوتی ہے جیسے سحری کا وقت، افطاری کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان، اضطرار کے وقت، سفر اور مرض کی حالت میں، بارش کے نزول کے وقت اور اللہ کے راستہ میں مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کے وقت ان اوقات میں سے ہر وقت کے بارے میں آثار مروی ہیں ان کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ حضرت شہر بن حوشب نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام الدرداء نے انہیں کہا: اے شہر! کیا تم کپکپی محسوس نہیں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں کپکپی محسوس کر رہا ہوں۔ فرمایا: اللہ سے دعا مانگو کیونکہ کپکپی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ (3)

---

1۔ صحیح بخاری، باب لیعزم المسألۃ فانہ لا مکرہ لہ، حدیث نمبر 5863، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 5864

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا: مسجد الفتح میں تین دن دعا مانگی، سوموار، منگل اور بدھ اور بدھ کے روز دو نمازوں (ظہر اور عصر) کے درمیان آپ کی دعا قبول کی گئی میں نے آپ کے چہرہ اقدس میں خوشی دیکھی۔ حضرت جابر نے فرمایا: مجھ پر کبھی انتہائی مشکل امر نازل نہیں ہوا مگر میں نے اس گھڑی کی کوشش کی پھر میں نے اس میں دعا مانگی تو میں قبولیت کو جان گیا۔

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي ابو رجا خراسانی نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے مانگو (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہیں طلب کرنا چاہئے کہ میں ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔ یہ باب استفعال سے ہے یعنی اس نے چیز کو طلب کیا مگر جو سخت تھی جیسے استغنی اللہ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ قبول کریں ایمان جس کی طرف میں نے انہیں بلایا ہے یعنی اطاعت اور عمل..... کہا جاتا ہے اجاب اور استجاب ہم معنی ہیں۔ شاعر کا قول ہے۔

فلم يستجبه عند ذالك مجيب۔ اس وقت قبول کرنے والے نے اس کی بات قبول نہ کی۔ (2)

سین زائدہ ہے اور لام، لام امر ہے اسی طرح وَلْيُؤْمِنُوا لام امر نے فعل کو جزم دی کیونکہ یہ فعل کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔ پس یہ ان شرطیہ کے مشابہ ہے۔ بعض نے فرمایا کیونکہ یہ صرف فعل پر واقع ہوتا ہے۔ الرشاد، یہ الغی (گمراہی) کا متضاد ہے۔ وقد رشد يرشد رُشدًا اور رَشِدَ يرشد رشدًا اس میں ایک لغت ہے اور ارشدہ اللہ، المراشد، مقاصد الطرق۔ راستوں کے مقاصد۔ الطريق الارشد جیسے الطريق الاقصد ہے۔ تو کہتا ہے هو لرشدة تیرے قول زِنْيَة کے خلاف ہے، ام راشد، چوہیا کی کنیت ہے۔ بنو رشدان عربوں کے قبائل۔ جوہری سے مروی ہے، ہروی نے کہا: الرُّشد، الرَّشد و الرشاد سب کا معنی ہدایت و استقامت ہے اسی سے ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورت کے پاس جانا۔ وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت اور آرام ہو۔ جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں۔ یہ الله تعالیٰ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے الله تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کرلیں''۔

اس میں چھتیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لفظ اُحِلَّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہ عمل حرام تھا پھر منسوخ کیا گیا(1)۔ ابوداؤد نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے اصحاب نے ہمیں بیان کیا، فرمایا: ایک شخص جب روزہ افطار کرتا تھا پھر کچھ کھانے سے پہلے سو جاتا تھا تو وہ صبح تک نہیں کھاتا تھا۔ فرمایا: حضرت عمر آئے اور اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا تو بیوی نے کہا: میں سو چکی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: ویسے کہہ رہی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ ایک انصاری آیا اس نے کھانے کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے کہا: ہم تیرے لئے کھانا گرم کرتے ہیں۔ وہ شخص سو گیا جب صبح ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جب کوئی روزہ رکھتا تھا پھر افطاری کے وقت افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تو وہ اس رات اگلے دن شام تک کچھ نہ کھاتا تھا، قیس بن صرمہ انصاری روزہ دار تھا...... ایک روایت میں ہے وہ دن کے وقت کھجوروں کے باغ میں کام کرتا رہتا اور وہ روزے سے تھا...... وہ افطار کے وقت حاضر ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا تیرے پاس کھانا ہے؟ اس نے کہا: نہیں لیکن میں جاتی ہوں اور تیرے لئے کھانا طلب کرتی ہوں۔ وہ سارا دن کام کرتا رہا تھا پس اسے نیند آگئی اس کی بیوی آئی تو اس نے اسے سویا ہوا دیکھا تو کہا: ہائے تیرے لئے خسارہ۔ جب آدھا دن گزرا تو اس پر غشی طاری ہوگئی۔ اس چیز کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ تو صحابہ کرام بہت خوش ہوئے اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

اور بخاری میں حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ پورا رمضان عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور کچھ لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، الله تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔

کہا جاتا ہے: خان اور اختان، خیانۃ سے مشتق ہیں اور ہم معنی ہیں یعنی روزوں کی راتوں میں مباشرت کی وجہ سے اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے اور جس نے الله کی نافرمانی کی اس نے اپنے نفس سے خیانت کی اپنے نفس کی طرف اس عذاب کو کھینچا۔ قتبی نے کہا: خیانت کی اصل یہ ہے کہ کسی کو کسی شے کا امین بنایا جائے اور وہ اس امانت کو صحیح ادا نہ کرے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس آئے اور حضرت عمر آپ کے پاس ایک رات دیر تک باتیں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرتے رہے۔ واپس آئے تو بیوی کو سویا ہوا پایا۔ حضرت عمر نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے حضرت عمر سے کہا: میں تو سو گئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: تو نہیں سوئی تھی۔ حضرت عمر نے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں اللہ تعالیٰ اور آپ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں، میں نفس کے دام میں پھنس گیا اور میں نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ کیا میرے لئے کوئی رخصت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے عمر! تو اس کا حق نہیں رکھتا تھا جب حضرت عمر اپنے گھر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا بھیجا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عذر کی قبولیت قرآن کی آیت کے ذریعے سنائی۔

نحاس اور مکی نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت عمر سو گئے پھر اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کے متعلق خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی (1): **عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ**۔ (جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ)۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ**، **لَيْلَةَ** کو نصب ظرف کی وجہ سے ہے۔ یہ اسم جنس ہے اسی وجہ سے مفرد ذکر کی گئی ہے۔ **الرَّفَثُ**، یہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے کنایہ فرماتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا ہے (2) اور زجاج نے کہا: **الرَّفَثُ** ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس عمل کا جامع ہے جس کا مرد اپنی بیوی سے ارادہ کرتا ہے۔ یہ الازہری کا قول بھی ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: یہاں **الرَّفَثُ** سے مراد جماع ہے۔ الرفث صراحۃً جماع کا ذکر کرنا ہے اور اس کا واضح ذکر کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

> و یرین من انس الحدیث زوانیا وبھن عن رفث الرجال نفارُ

یہاں رفث کو شاعر نے صراحۃً جماع کے ذکر کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: الرفث کا اصل معنی فحش کلام ہے۔ کہا جاتا ہے: رفث، ارفث جب کوئی قبیح کلام کرے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

> و رب اسراب حجیج کظم عن اللغا و رفث التکلم (3)

یہاں رفث فحش کلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

**الرَّفَثُ** اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں الی کے ساتھ متعدی ہے جبکہ تو رفثت الی النساء نہیں کہتا لیکن یہاں یہ الافضاء پر محمول ہے جس سے مراد ملابست لی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ** (النساء: 21) (مل جل چکے ہو تم تنہائی میں ایک دوسرے سے) اسی معنی سے ہے: **وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ** (البقرہ: 14) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا** (توبہ: 35) یہاں یحمی، یوقد پر محمول ہے کیونکہ تو کہتا ہے: احمیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

الحدیدۃ فی النار۔ یعنی احمی کا صلہ فی استعمال ہوتا ہے جبکہ پہلی آیت میں علی استعمال ہوا ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ (النور:63) اس آیت میں یخالفون کو ینحرفون کے معنی پر محمول کیا گیا ہے جس کا صلہ عن استعمال ہوتا ہے یا یروغون عن امرہ کے معنی پر محمول ہے۔ کیونکہ تو کہتا ہے خالفت زیدا یعنی خالف کا صلہ استعمال ہی نہیں ہوتا اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ (احزاب) یہاں رحیم، رؤف کے معنی پر محمول ہے جیسے ارشاد ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ) کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تو کہتا ہے رؤفت بہ۔ یعنی رأف کا صلہ با استعمال ہوتا ہے تو رحمت بہ نہیں کہتا جب اس کا معنی رؤف کے موافق ہو تو متعدی ہونے میں اس کے قائم مقام ہوا۔ اسی قسم سے ابو کبیر ہذلی کا قول ہے۔

حملت بہ فی لیلة مزءودة کرھا و عقد نطاقھا لم یحلل

اس شعر میں حمل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ اس کا حق یہ ہے کہ بغیر صلہ کے متعدی ہو، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا (احقاف:15) لیکن شاعر نے حملت بہ کہا کیونکہ یہ حبلت بہ کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ یہ مبتدا خبر ہیں اور هُنَّ میں نون کو مشدد کیا گیا ہے کیونکہ یہ مذکر میں جو واو اور میم ہے اس کے قائم مقام ہے وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، لِبَاسٌ اصل میں کپڑے میں استعمال ہوتا ہے پھر میاں، بیوی کے ملنے کو لباس کہا گیا کیونکہ ان کے جسم بھی آپس میں مل جاتے ہیں، کپڑے کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے۔

نابغہ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تداعت فکانت علیہ لباسا (1)

جب پہلو میں سونے والے نے اس کی گردن دوہری کی اس نے اسے بلایا تو وہ اس پر لباس تھی۔ اور کہا:

لبست أناساً فافنیتھم و افنیتُ بعد أناسٍ أناساً

میں کئی لوگوں سے ملا اور میں نے انہیں فنا کر دیا اور کئی لوگوں کے بعد کئی لوگوں کو فنا کر دیا۔

بعض نے کہا: ہر اس چیز کو لباس کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ لے اور اس کا گھیراؤ کر لے۔ یہ بھی جائز ہے کہ میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حرام سے پردہ بن جاتا ہے جیسا کہ خبر میں وارد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا: عورت کو کہا جاتا ہے، یہ تیرا لباس ہے، تیرا بستر ہے اور تیرا ازار ہے، ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب سے کہا تھا۔

الا ابلغ ابا حفص رسولا فدی لک من اخی ثقة ازاری

ابو عبیدہ نے کہا: اس شعر میں ازار سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نفس ہے۔

ربیع نے کہا: یہ تمہارے لئے بچھونا ہیں اور تم ان کے لحاف ہو۔ مجاہد نے کہا: تمہارے لئے سکون ہے یعنی بعض، بعض سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سکون حاصل کرتے ہیں۔(1)

**مسئلہ نمبر 4**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ سونے کے بعد روزوں کی راتوں میں کھانے، پینے اور جماع جیسی ممنوع چیزوں میں مشورہ کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:85) یعنی ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ ہر ایک اپنے نفس سے خیانت کرتا ہے، اپنے نفس سے خیانت کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کا نقصان اس کی اپنی طرف ہی لوٹنے والا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ دو معانی کا احتمال رکھتا ہے: (۱) اپنے نفسوں سے خیانت سے ان کی توبہ قبول کرنا (۲) رخصت و اباحت کے ساتھ ان سے تخفیف کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (مزمل:20) یعنی اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ یعنی قتل خطا کے بعد۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (النساء:92) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے۔ کیونکہ جو خطأً قتل کرنے والا ہے اس نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے توبہ لازم ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (توبہ:117) یہاں بھی تَابَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اگرچہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی ایسی چیز واجب نہیں ہوئی تھی جو توبہ کا موجب تھی۔ وَ عَفَا عَنْكُمْ یہ گناہ کو معاف کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور توسع و تسہیل کا بھی احتمال رکھتا ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اول وقت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور آخر وقت اللہ تعالیٰ کا عفو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمائی اور آسانی فرمائی عَلِمَ اللّٰهُ کا معنی تم سے اس کا وقوع مشاہدةً جان لیا فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی اس میں وقوع کے بعد اس نے تم پر تخفیف فرمائی۔ وَ عَفَا یعنی آسانی فرمائی۔ تَخْتَانُوْنَ یہ خیانت سے ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء زہد نے فرمایا: عنایت اور شرف منزلت اس طرح ہوا کہ حضرت عمر نے اپنے نفس سے خیانت کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شریعت بنا دیا اور ان کی وجہ سے پوری امت سے تخفیف فرما دی۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ یہ جماع سے کنایہ ہے یعنی جو تم پر حرام تھا اسے حلال کر دیا۔ جماع کو مباشرت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دو جلدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ دلیل ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب حضرت عمر کا حقوق زوجیت ادا کرنا ہے نہ کہ حضرت قیس کی بھوک ہے کیونکہ اگر حضرت قیس کی بھوک سبب ہوتی تو ارشاد ہوتا: فالآن کلوا یعنی اب کھاؤ۔ کلام کا آغاز اس سے فرمایا کیونکہ یہی اہم امر تھا جس کے لئے آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ حضرت ابن عباس، مجاہد، حکم بن عیینہ، عکرمہ، حسن، سدی، ربیع اور ضحاک نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اولاد طلب کرو(2)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے بعد اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھا وہ قرآن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے قرآن کو طلب کرو جو تمہارے لئے اس میں مباح کیا گیا ہے اور تمہیں جس کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: لیلۃ القدر کو طلب کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: رخصت اور وسعت طلب کرو۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ قول حسن ہے۔ بعض نے فرمایا: لونڈیاں اور بیویاں طلب کرو۔ حسن بصری اور حسن بن قرۃ نے کہا: اتباع طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے اس کو جائز قرار دیا اور ابتغوا کو الابتغاء سے ترجیح دی۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا یہ جواب حضرت قیس کے بارے نازل ہوا اور پہلا حضرت عمر کا جواب تھا۔ پہلے حضرت عمر کا جواب نازل ہوا کیونکہ وہ زیادہ اہم تھا اور وہ مقدم تھا۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، حتی یہ تبیین کی غایت کے لئے ہے اور کسی ایک کے لئے ظہور کا وقوع صحیح نہیں ہے اور اس پر کھانا حرام نہیں ہے مگر فجر کے طلوع ہونے کی مقدار گزر چکی ہے اور اس حد میں اختلاف ہے جس کے ظہور کے ساتھ کھانے پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ جمہور نے کہا: وہ فجر جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے اس کے متعلق اخبار آئی ہیں اور علماء اسی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔(2)

مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ افق کی لمبی سفیدی جو اس طرح اوپر نیچے پھیلتی ہے۔ حماد نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے اس کو حکایت کیا۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے: فجر وہ نہیں جو اس طرح ہوتی ہے اپنی انگلیوں کو جمع کیا پھر زمین کی طرف اس کو جھکایا۔ لیکن صبح وہ ہوتی ہے جو اس طرح ہوتی ہے۔ اپنی مسبحہ انگلی کو دوسری مسبحہ انگلی پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (☆)۔

دار قطنی نے حضرت عبدالرحمن بن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو قسمیں ہیں وہ جو اس طرح ہوتی ہے گویا بھیڑیے کی دم ہے وہ نہ تو کسی چیز کو حلال کرتی ہے اور نہ حرام کرتی ہے۔ اور وہ جو افق میں عرضاً پھیلتی ہے اس میں نماز حلال ہوتی ہے اور کھانا (روزوں میں) حرام ہوتا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ فجر کے طلوع ہونے کے بعد جس کے ساتھ راستوں اور گھروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابن عباس، حضرت طلق بن علی، حضرت عطا بن ابی رباح اعمش سلیمان وغیرہم سے مروی ہے۔ راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر فجر کے ظاہر ہونے کے ساتھ کھانے، پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ مسروق نے کہا: وہ تمہاری فجر کو فجر شمار نہیں کرتے تھے وہ اس فجر کو شمار کرتے تھے جو گھروں کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ نسائی نے عاصم سے انہوں نے زر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نے حذیفہ سے کہا: تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس وقت سحری کھائی؟ فرمایا: وہ دن تھا مگر سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ دار قطنی سے حضرت طلق بن علی سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: کھاؤ، پیو اور تمہیں اوپر بلند ہونے والی صبح دھوکے میں نہ ڈالے۔ کھاؤ، پیو حتیٰ کہ تمہارے لئے سرخی عرضاً پھیل جائے۔ دار قطنی نے کہا قیس بن طلق

---

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان قبل الفجر، حدیث نمبر 586، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قوی نہیں ہے۔ ابوداؤد نے کہا اس میں اہل یمامہ منفرد ہیں (1)۔ طبری نے کہا: وہ چیز جس نے اس کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ روزہ دن کے وقت ہے اور دن ان کے نزدیک سورج طلوع ہونے سے مشروع ہوتا ہے اور اس کا آخر اس کا غروب ہوتا ہے۔ لغوی علماء کے درمیان اس میں اختلاف گزر چکا ہے (2)۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان فرمائی کہ وہ رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس میں اور ایامًا معدودات میں یہی فیصل قول ہے۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے رات کو روزہ نہ رکھا اس کا روزہ نہیں۔ اس روایت میں حضرت عبدالله بن عباد، حضرت مفضل بن فضالہ سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ اس سند کے ساتھ تمام راوی ثقہ ہیں۔ حضرت حفصہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں۔ حضرت عبدالله بن ابی بکر نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے۔ یہ ثقہ راویوں میں سے ہیں جو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ حضرت حفصہ سے مرفوعًا مروی ہے۔ ان دو حدیثوں میں فجر کے بارے میں جمہور کے قول کی دلیل ہے اور فجر طلوع ہونے سے پہلے نیت کے بغیر روزہ نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: روزہ جملہ عبادت سے ہے یہ بغیر نیت کے صحیح نہیں ہے۔ شارع علیہ السلام نے فجر سے پہلے اس کا وقت مقرر فرمایا۔ یہ کیسے کہا جائے گا کہ فجر کے بعد بھی کھانا، پینا جائز ہے؟ بخاری (3) اور مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے **وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ** تک نازل ہوا اور **مِنَ الْفَجْرِ** کے الفاظ نازل نہ ہوئے۔ لوگ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو ان میں سے ایک اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگہ باندھ دیتا اور وہ اس وقت تک کھاتا، پیتا رہتا حتی کہ ان دونوں کا دیکھنا اس کے لئے ظاہر ہو جاتا۔ الله تعالیٰ نے اس کے بعد **مِنَ الْفَجْرِ** کے الفاظ نازل کئے تو وہ جان گئے کہ اس سے مراد دن کی سفیدی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول الله! خیط ابیض اور خیط اسود سے کیا مراد ہے، کیا یہ دو دھاگے مراد ہیں؟ فرمایا: اگر تو دو دھاگے دیکھے تو پھر بڑی چوڑی گدی والا ہے، پھر فرمایا: نہیں بلکہ اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے فجر کو خیط (دھاگہ) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ابتدا میں سفیدی لمبے دھاگے کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر ابوداؤد ابادی نے کہا:

الخیط الابیض ضؤ الصبح منفلق　　والخیط الاسود جنح اللیل مکتوم

خیط ابیض سے مراد صبح کی روشنی ہے جو پھوٹنے والی ہے اور خیط اسود سے مراد رات کا جھکاؤ ہے۔

عربوں کے کلام میں خیط سے مراد رنگ ہے۔ الفجر، فجرت الماء افجرہ، فجرا کا مصدر ہے۔ پانی کا جاری ہونا اور پھوٹنا ہے۔ اس کا اصل معنی پھٹنا ہے۔ اسی وجہ سے سورج کی روشنی جو مطلع سے ظاہر ہوتی ہے اسے فجر کہتے ہیں۔ یہ دن کی سفیدی کا آغاز ہے جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے عربی میں اس کو خیط ابیض کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب وقت السحور، حدیث نمبر 2001، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب قول الله تعالیٰ وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض ۔۔۔ الآیۃ، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوداؤد ابادی نے کہا:

فلما اضاءت لنا سدفة ولاح من الصبح خیط انارا (1)

جب ہمارے لئے رات کی تاریکی روشن ہوئی اور صبح سے دھاگہ ظاہر ہوا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قد کاد یبدو و بدت تباشرہ و سدف اللیل البھیم ساترۃ

قریب تھا کہ روشنی ظاہر ہو اور کالی رات کی تاریکی چھپانے والی تھی۔

فجر کو الصدیع بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے عرب کہتے ہیں: انصدع الفجر، فجر پھوٹی۔ بشر بن ابی خازم یا عمرو بن معدیکرب نے کہا:

تری السرحان مفترشاً یدیه کان بیاض لبته صدیع

تو نے بھیڑیے کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے تھا اس کی گردن کی سفیدی دھاگے کی مانند تھی۔

شماخ نے سر کی مانگ کو فجر سے تشبیہ دی ہے:

اذا ما اللیل کان الصبح فیه اشق کمفرق الراس الدھین

جب رات میں صبح ہوتی ہے تو وہ اس طرح پھوٹتی ہے جس طرح تیل لگے ہوئے سر میں مانگ ہوتی ہے۔

واضح امر کو بھی الفجر کہتے ہیں۔ یہ صبح کے پھوٹنے کی طرح واضح ہے۔ شاعر نے کہا:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وارد ہوئی اور صبح تاریکی میں چھپنے والی تھی۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ اللہ تعالیٰ نے رات کو کھانے، سونے اور جماع کے لئے ظرف بنایا اور دن کو روزے کے لئے ظرف بنایا۔ دونوں زمانوں کے احکام بیان فرمائے اور ان دونوں کے درمیان فرق کیا۔ دن کے وقت کوئی چیز جائز نہیں ہے جس کو رات کے وقت مباح فرمایا مگر مسافر اور مریض کے لئے جائز ہے۔ جیسا کہ بیان گزر چکا ہے۔ جس نے رمضان میں روزہ افطار کیا (مسافر اور مریض کے علاوہ) تو پھر یا تو وہ جان بوجھ کر یا بھول کر توڑنے والا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو امام مالک نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر کھایا، پیا یا جماع کیا تو اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ جیسا کہ امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں افطار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو غلام آزاد کرنے یا دو ماہ کے روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ دینے کا حکم دیا۔ (الحدیث) یہی امام شعبی نے فرمایا: امام شافعی وغیرہ نے فرمایا: یہ کفارہ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو جماع کے ساتھ روزے کو توڑے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تجھے کس چیز نے ہلاک کیا، اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا ہے(1) (الحدیث) اس میں کفارہ کا بیان ترتیب سے ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ یہ قضیہ پہلے قضیہ پر علماء نے محمول کیا ہے۔

انہوں نے کہا: یہ ایک واقعہ ہے اور یہ غیر مسلم ہے بلکہ یہ دو قضیے ہیں جو مختلف ہیں کیونکہ دونوں کا انداز مختلف ہے۔ جس نے افطار کیا کفارہ کو اس پر قیود سے معلق نہیں فرمایا تو مطلقاً لازم ہے۔ یہی قول امام مالک، ان کے اصحاب، اوزاعی، اسحاق، ابوثور، طبری اور ابن منذر کا ہے۔ یہ ایک روایت میں عطا سے مروی ہے۔ حسن اور زہری سے مروی ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول لازم ہے۔ احوال کے تعارض کے باوجود تفصیل کا ترک کرنا حکم کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے اس پر قضا کے ساتھ عقوبت (سزا) کو واجب کیا کیونکہ اس نے رمضان کی حرمت کو توڑا۔

**مسئلہ نمبر 10**: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ عورت جس سے خاوند رمضان میں وطی کرے، امام مالک، امام ابو یوسف اور اصحاب رائے نے فرمایا: اس عورت پر بھی خاوند کی طرح کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر ایک کفارہ واجب ہے خواہ اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہو یا خاوند نے اسے مجبور کیا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک کفارہ کے ساتھ سائل کا جواب دیا اور تفصیل نہیں فرمائی۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے: اگر اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہوگی تو ہر ایک پر کفارہ ہوگا اور اگر خاوند نے اسے مجبور کیا ہو تو پھر صرف مرد پر کفارہ ہوگا۔ یہ سحنون بن سعید مالکی کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر دو کفارے ہیں۔ یہی امام مالک کے پیروکاروں کی جماعت کے نزدیک امام مالک کے مذہب کا ماحصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**: علماء کا اختلاف ہے جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر جماع کیا یا بھول کر کھایا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور اسحاق نے فرمایا: دونوں صورتوں میں اس پر کوئی چیز واجب نہیں نہ قضا ہے نہ کفارہ ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے، قضاء ہے۔

اس کی مثل عطا سے مروی ہے۔ اور عطا سے مروی ہے، اس پر کفارہ ہے اگر جماع کرے اور انہوں نے فرمایا: ایسی بات نہیں بھولتی۔ اہل ظاہر کی ایک قوم نے کہا: خواہ بھول کر وطی کی ہو یا جان بوجھ کر اس پر قضا اور کفارہ دونوں ہیں۔ یہ ابن ماجشون عبدالملک کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حدیث کفارہ کو ثابت کرتی ہے اس میں بھولنے والے اور جان بوجھ کر توڑنے والے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا: جب بھول کر کھائے پھر یہ خیال کرے کہ روزہ تو ٹوٹ گیا ہے پھر جان بوجھ کر جماع کر لیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ المذہب میں فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے اگر اس نے روزے کی حرمت کو توڑنے کا ارادہ کیا ہے۔ ابوعمر نے کہا: مالک کی اصل پر واجب ہے کہ وہ کفارہ نہ دے کیونکہ جس نے بھول کر کوئی چیز کھائی تو وہ ان کے نزدیک افطار کرنے والا ہے وہ اس دن

1۔ صحیح بخاری، باب قولہ تعالیٰ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم۔۔۔۔، حدیث نمبر 6215، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی قضا کرنے والا ہے۔ اس نے حرمت توڑنے کا ارادہ کیا ہے دراں حالیکہ وہ افطار کرنے والا ہے۔ امام مالک کے علاوہ علماء کے نزدیک جس نے بھول کر روزے میں کوئی چیز کھائی وہ افطار کرنے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے جس نے بھول کر کھایا یا پیا تو اس پر قضا نہیں اور اس کا روزہ مکمل ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب روزہ دار بھول کر کھائے یا بھول کر پیئے تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا اور اس پر قضا نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے: وہ روزے کو مکمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا اور پلایا۔

اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔ ابو بکر اثرم نے کہا: میں نے حضرت ابو عبد اللہ سے سنا ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو بھول کر رمضان میں کچھ کھائے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کی بنا پر اس پر کچھ نہیں ہے پھر ابو عبد اللہ مالک نے فرمایا اور لوگوں نے کہا: امام مالک کہتے ہیں: اس پر قضا ہے اور ہنس پڑے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے بھول کر کھایا یا پیا، وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جب فرمایا یتم صومہ (وہ روزہ مکمل کرے) پس اس نے روزہ مکمل کیا تو اس کا روزہ مکمل ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے بھول کر روزہ افطار کیا اس پر قضا نہیں ہے اور اس کا روزہ مکمل ہے اور جس نے جان بوجھ کر جماع کیا اس پر قضاء اور کفارہ ہے...... واللہ اعلم...... اس طرح جس نے بھول کر افطار نہیں کیا، ہمارے علماء نے قضا کے ایجاب پر اس طرح حجت پکڑی ہے کہ مطلوب پورا روزہ ہے جس میں کسی قسم کی دراڑ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر اتموا الصیام الی اللیل۔ رات تک روزہ مکمل کرو۔ یہ روزہ اس نے مکمل نہیں کیا۔ بس وہ اس پر باقی ہے۔ شاید یہ حدیث نفلی روزہ کے متعلق ہو کیونکہ اس میں تخفیف ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے جو بھول گیا حالانکہ وہ روزہ سے تھا اس نے کھا، پی لیا تو وہ اپنے روزہ کو مکمل کرے (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قضا کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ آپ نے مؤاخذہ کے سقوط اور روزہ پر جاری رہنے اور اسے مکمل کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ اگرچہ واجب تھا۔ پس یہ قضا کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا نفلی روزہ تو اس میں قضا نہیں ہے جس نے بھول کر کھایا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے جس چیز سے حجت پکڑی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ شارع علیہ السلام سے اس کا مروی ہونا صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ نص صریح میں آیا ہے اور اس کو حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے مہینہ میں روزہ افطار کیا اس پر قضا اور کفارہ نہیں ہے۔ اس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ابن مرزوق اس میں منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے اس نے انصاری سے روایت کیا ہے۔ پس احتمال زائل ہو گیا اور اشکال اٹھ گیا۔ الحمد للہ ذی الجلال والکمال۔

**مسئلہ نمبر 13:** جب اللہ تعالیٰ نے روزے میں ممنوعہ چیزوں کا ذکر کیا وہ کھانا، پینا، جماع ہیں لیکن اس مباشرت کا

1۔ صحیح بخاری، باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا، حدیث نمبر 1797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ذکر نہیں فرمایا جس کا معنی ہے: جلد کا جلد سے مل جانا جیسے بوسہ دینا، چھونا وغیرہ۔ یہ دلیل ہے کہ جس نے بوسہ دیا اور جسم کے ساتھ جسم ملایا اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ کلام کا انداز اس چیز کی حرمت پر دلالت کرتا ہے جس کو رات نے مباح کیا اور وہ تین چیزیں ہیں۔ اس میں کسی اور چیز پر دلالت نہیں ہے بلکہ یہ دلیل پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ علماء متقدمین کا اختلاف ہے، اسی سے مباشرت ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جس کو اپنے نفس پر ضبط نہ ہو اس کے لئے مکروہ ہے تاکہ روزے کے فساد کا سبب نہ بن جائے۔ مالک نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روزہ دار کو بوسہ اور مباشرت سے منع فرمایا۔ یہ اس خوف کی وجہ سے ہے جو ان سے فساد پیدا ہوگا۔ اگر بوسہ دے اور سلامت رہے تو اس پر کوئی حرج نہیں اسی طرح اگر مباشرت کرے۔ بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے تھے اور مباشرت (جسم سے جسم ملانا) کرتے تھے حالانکہ آپ روزے سے ہوتے تھے، جنہوں نے روزہ دار کے لئے بوسہ کو مکروہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عروہ بن زبیر بھی ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، وہ ایک دن اس کی جگہ قضا کرے اور حدیث ان پر حجت ہے۔ ابو عمر نے فرمایا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس شخص کے لئے مباشرت اور بوسہ کی رخصت دی ہو جس پر روزے کا فساد پیدا ہوتا ہو اور جس نے بوسہ دیا اور اس کی منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن اور امام شافعی کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ اور فرمایا: جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: اگر بوسہ دیا اور مذی نکل آئی تو ان کے نزدیک اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام احمد نے فرمایا: جس نے بوسہ دیا اور اسے مذی آ گئی یا منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے مگر جس نے جماع کیا اور بھول کر یا جان بوجھ کر آلہ تناسل کو داخل کیا تو اس پر کفارہ بھی ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے بوسہ دیا، مباشرت کی...... اس سے کوئی پانی نہ نکلا تو اس پر قضا ہے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر قضا نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے مذی نکلے۔ قاضی ابو محمد نے فرمایا: ہمارے اصحاب کا اتفاق ہے کہ ایسے شخص پر کفارہ نہیں ہے اگر منی نکلے تو کیا قضا کے ساتھ کفارہ لازم ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: بوسہ دیا ہوگا، پھر انزال ہو گیا ہوگا یا اس نے بوسہ دیا ہوگا پھر اس نے لذت اٹھائی اور پھر دوبارہ بوسہ لیا پھر انزال ہو گیا۔ اگر اس نے ایک بوسہ دیا یا ایک مرتبہ مباشرت اور چھوا تو اشہب اور سحنون نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بار بار یہ عمل کرے۔

ابن قاسم نے کہا: وہ تمام صورتوں میں کفارہ دے گا مگر نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں حتیٰ کہ بار بار یہ عمل کرے اور جنہوں نے کفارہ کے وجوب کا قول کیا ہے جب وہ بوسہ دے یا مباشرت کرے یا اپنی بیوی سے ملامست کرے یا فرج کے علاوہ میں جماع کرے پھر اسے منی آ جائے۔ ان میں حسن بصری، عطا، ابن المبارک، ابو ثور اور اسحاق ہیں۔ یہ "مدونہ" میں امام مالک کا قول ہے اور اشہب کے قول کی حجت یہ ہے کہ چھونے، بوسہ دینے اور مباشرت فی نفسہا روزہ توڑنے والی چیزیں نہیں ہیں معاملہ کو اسی کی طرف پھیرا جائے گا جن سے افطار ہوتا ہے جب اس نے ایک مرتبہ یہ عمل کیا اور انزال اور افساد صوم کا ارادہ نہیں کیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے جس طرح عورت کی طرف دیکھنا ہے۔ جب اس نے اس عمل کا تکرار کیا تو اس نے روزہ

کے افساد کا قصد کیا پس اس پر کفارہ لازم ہے جیسا کہ اگر بار بار دیکھے۔ لخمی نے کہا: دیکھنے سے انزال کی صورت میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر کفارہ نہیں مگر یہ کہ وہ بار بار کرے۔ اصل یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں مگر اس پر جس نے روزہ توڑنے کا قصد کیا اور روزہ کی حرمت تا تار کرنے کا ارادہ کیا۔ جب یہ صورت ہو تو جس کو انزال ہو جاتا ہو یا اس کی عادت مختلف ہو، کبھی انزال ہوتا ہو اور کبھی انزال نہ ہوتا ہو تو میں اس پر کفارہ دیکھتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے والا روزہ توڑنے کا ارادہ کرنے والا ہے اور اگر اس کی عادت سلامتی ہو تو اندازہ کیا جائے گا کہ عادت کے خلاف ہو تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ امام مالک کا قول کفارہ کے وجوب کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ یہ جاری نہیں ہوتا مگر اس سے جس کی یہ طبع ہو اور ظاہر پر اکتفا کیا۔ اشہب نے لوگوں کے غالب امر پر محمول کیا کہ وہ اس سے سلامت ہوتے ہیں اور نظر میں ان کا قول اس پر دلیل ہے۔

میں کہتا ہوں: نظر میں جو اتفاق حکایت کیا ہے اور اس کو اصل بنایا ہے، حقیقۃً اس طرح نہیں ہے۔ باجی نے ''المنتقی'' میں حکایت کیا ہے۔ اگر ایک نظر دیکھا اس سے مقصود لذت تھی پھر اسے انزال ہو گیا تو شیخ ابوالحسن نے کہا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ الباجی نے کہا: میرے نزدیک یہی صحیح ہے کیونکہ جب اس سے اس نے لطف اٹھانے کا قصد کیا تو وہ بوسہ ہے اور دوسری استمتاع کی قسموں کی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔ جابر بن زید، ثوری، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے عورت کی طرف بار بار دیکھا حتیٰ کہ اس سے منی نکل آئی تو اس پر قضاء و کفارہ نہیں ہے۔ یہ ابن منذر کا قول ہے۔ الباجی نے کہا: مدینہ میں ابن نافع نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر برہنہ عورت کو دیکھا پھر لذت محسوس کی اور انزال ہو گیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** جمہور علماء کا قول ہے کہ جنبی حالت میں جس پر فجر طلوع ہو اس کا روزہ صحیح ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ بالاجماع جائز ہے۔ صحابہ کے درمیان اس میں کلام واقع ہوئی پھر اس پر معاملہ ٹھہر گیا کہ جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے اس کا روزہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کے درمیان کلام کے وقوع کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے وہ صحیح اور مشہور ہے۔ یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے: جس نے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں اس کو مؤطا وغیرہ نے نقل کیا ہے(1)۔ نسائی کی کتاب میں ہے جب حضرت ابوہریرہ نے رجوع کیا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے نہیں کہا یہ اللہ کی قسم! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ اس سے حضرت ابوہریرہ کے رجوع کے متعلق اختلاف ہے اہل علم کے نزدیک حضرت ابوہریرہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کا روزہ نہیں۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ حسن بن صالح سے روایت ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے ایک تیسرا قول بھی مروی ہے، فرمایا: جب اسے جنابت کا علم ہو پھر سو جائے حتیٰ کہ صبح ہو جائے تو وہ افطار کرنے والا ہے اگر وہ نہ جانے حتیٰ کہ وہ صبح کرلے تو روزہ دار ہے۔ یہ عطا، طاؤس اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ حسن اور نخعی سے مروی ہے کہ یہ نوافل میں جائز ہو گا فرض میں قضا کرے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ علماء کے اس شخص کے بارے میں چار اقوال ہیں جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے ان میں سے صحیح

1۔ صحیح بخاری، الصائم یصبح جنبا، حدیث نمبر 1791، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قول جمہور علماء کا ہے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت بغیر احتلام کے جماع سے جنبی ہوتے تھے پھر روزہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بغیر احتلام کے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرتے تھے پھر غسل کرتے تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے(1) فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے ارشاد سے ضرورۃً یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب طلوع فجر تک جماع کرتا رہے تو ضرورۃً معلوم ہوا کہ اس پر فجر طلوع ہوگی تو وہ جنبی ہوگا۔ غسل فجر کے بعد ہی ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ذکر عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو وہ اسے فجر طلوع ہونے کے ساتھ نکالے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ مزنی نے کہا: اس پر قضا ہے کیونکہ یہ مکمل جماع ہے۔ پہلا قول صحیح ہے اور وہی ہمارے علماء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: علماء کا حیض والی عورت کے بارے میں اختلاف ہے جو فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل نہ کرے حتیٰ کہ صبح ہو جائے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اس پر روزہ واجب ہے خواہ اس نے جان بوجھ کر روزہ ترک کیا ہو یا بھول کر جس طرح جنبی کا حکم ہے۔ یہ امام مالک اور ابن قاسم کا قول ہے۔ عبد الملک نے کہا: جب عورت فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل کو مؤخر کرے حتیٰ کہ فجر طلوع ہو جائے تو اس کا وہ دن افطار کا دن ہے کیونکہ وہ دن کے بعض حصہ میں پاک نہیں تھی وہ جنبی کی طرح نہیں ہے کیونکہ احتلام روزے کو نہیں توڑتا جبکہ حیض کا خون روزے کو توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ابو الفرج نے اپنی کتاب میں عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ اوزاعی نے کہا: اس نے چونکہ غسل کرنے میں کوتاہی کی ہے اس لئے وہ قضا کرے گی۔ ابن الجلاب نے عبد الملک سے روایت کیا ہے کہ اگر وہ فجر سے پہلے ایسے وقت میں پاک ہوتی جس میں غسل کرنا اس کے لئے ممکن تھا پھر اس نے کوتاہی کی اور غسل نہ کیا حتیٰ کہ صبح ہوگئی تو اسے کچھ ضرر نہیں جیسے جنبی کا حکم ہے۔ اگر وقت تنگ ہو جس میں وہ غسل نہیں کر سکتی تو اس کا روزہ جائز نہیں اور اس کا وہ دن افطار کا دن ہے۔ یہی قول امام مالک کا ہے۔ یہ اس عورت کی مانند ہے جس پر فجر طلوع ہو جبکہ وہ حیض سے ہو۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ایسی عورت کے بارے فرمایا وہ روزہ بھی رکھے اور قضا بھی کرے۔ جیسا کہ اوزاعی کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے اور ان کا یہ قول شاذ ہے۔ انہوں نے فجر سے پہلے پاک ہونے والی عورت پر کفارہ اور قضا کو واجب کیا ہے جبکہ اس نے سستی کی ہو اور صبح تک غسل نہ کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 16**: جب عورت رمضان میں رات کو پاک ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ کیا اسے طہارت فجر سے پہلے ہوئی یا بعد تو وہ اس دن روزہ رکھے اور احتیاطاً اس دن کے روزہ کی قضا بھی کرے اور اس پر کفارہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: پچھنے لگانے والا اور پچھنے لگوانے والا افطار کرے۔ یہ حضرت ثوبان کی حدیث، حضرت شداد بن اوس اور حضرت رافع بن خدیج کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد نے شداد کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علی بن المدینی نے حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: اس پر قضا نہیں ہے مگر یہ تغریر (کمزوری کے اندیشہ) کی بنا پر اس کے لئے مکروہ

---

1۔ صحیح بخاری، باب الاغتسال الصائم، حدیث نمبر 1795، ایضاً

ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ حضرت انس سے پوچھا گیا: کیا تم پچھنے لگوانے روزہ دار کے لئے مکروہ جانتے تھے؟ حضرت انس نے فرمایا: نہیں مگر ضعف کی بناء پر (2)۔ ابو عمر نے کہا: شداد اور رافع اور ثوبان کی حدیث ہمارے نزدیک منسوخ ہے اور اس کی ناسخ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ کیونکہ حضرت شداد وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اٹھارہ رمضان کو پچھنے لگوار رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پچھنے لگانے والا اور جس کو پچھنے لگائے گئے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سال احرام اور روزہ کی حالت میں خود پچھنے لگوائے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج، حجۃ الوداع کا سال تھا تو یہ لامحالہ پہلی حدیث کی ناسخ ہے کیونکہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان پایا ہی نہیں تھا کیونکہ ربیع الاول میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 18**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ یہ امر ہے اور وجوب کا مقتضا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اِلٰی غایت کے لئے ہے جب اس کا مابعد اس کے ماقبل کی جنس سے ہو تو وہ ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے جیسے تیرا قول ہے اشتریت الفدان الی حاشیتہ (میں نے چار سو مربع زمین حاشیہ سمیت خریدی) یا اشتریت منك من ھذہ الشجرۃ الی ھذہ الشجرۃ۔ مبیع شجر ہے اور آخری درخت بھی اس مبیع میں داخل ہے۔ بخلاف تیرے اس قول کے: اشتریت الفدان الی الدار۔ اس میں دار مبیع میں داخل نہ ہوگا کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے ظہور تک روزہ کو مکمل کرنے کی شرط رکھی ہے جیسا کہ کھانا جائز قرار دیا حتیٰ کہ دن ظاہر ہو جائے۔ (3)

**مسئلہ نمبر 19**: روزے کی تکمیل میں سے نیت کا متصل ہونا بھی ہے۔ اگر دن کا بعض حصہ روزے کی نیت نہ کی اور فطر کی نیت کی مگر اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ تو ''مدونہ'' میں اسے افطار کرنے والا بنایا ہے اور اس پر قضا لازم ہے۔ ابن حبیب کی کتاب میں ہے کہ وہ اپنے روزے پر ہے اور روزے میں اسے کوئی چیز خارج نہیں کرتی مگر بالفعل افطار کرے اور نیت بھی نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ سحنون نے کہا: جس نے رات کو افطار کی نیت کی وہ کفارہ دے اور جس نے دن میں روزے کی نیت کی اسے کوئی نقصان نہیں لیکن وہ استحساناً قضا کرے۔ میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ جب رات ظاہر ہو جائے تو افطار کرنا شرعاً سنت ہے خواہ کچھ کھائے یا نہ کھائے۔ ابن عربی نے کہا: امام ابو اسحاق شیرازی سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے تین طلاق کی قسم اٹھائی کہ وہ گرم، سرد چیز پر روزہ افطار نہیں کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے وقت افطار کرے گا تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے حجت پکڑی ہے۔ جب رات ادھر سے آئے اور دن ادھر سے چلا جائے تو روزہ افطار کر دے (4)۔ امام ابو نصر بن صباغ صاحب الشامل سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصائم یحتجم، حدیث نمبر 2020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، باب الحجامۃ والقیئ للصائم، حدیث نمبر 1804، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، باب متی یحل فطر الصائم، حدیث نمبر 1818، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گرم یا سرد چیز پر افطار کرنا ضروری ہے اور امام ابو اسحاق نے جو جواب دیا وہ اولیٰ ہے کیونکہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

**مسئلہ نمبر** 21: اگر کسی نے بادل کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے، پھر اس نے روزہ افطار کر دیا پھر سورج ظاہر ہو گیا تو اکثر علماء کے قول کے مطابق اس پر قضا ہے۔ بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: ہم نے بادل والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں روزہ افطار کر دیا، پھر سورج طلوع ہو گیا۔ ہشام سے پوچھا گیا: انہیں قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ فرمایا: انہیں قضا لازم ہے۔ حضرت عمر نے اس مسئلہ میں فرمایا: مسئلہ آسان ہے۔ ہم نے وقت میں اجتہاد کیا۔ آپ نے قضا مراد لی۔ حضرت عمر سے مروی ہے، فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے، فرمایا: اس پر بھولنے والے کی طرح قضا نہیں ہے۔ یہی قول اسحاق اور اہل ظاہر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس قول کو رد کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 22: اگر روزہ افطار کیا دراں حالیکہ اسے سورج کے غروب ہونے میں شک تھا تو وہ قضا کے ساتھ کفارہ دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے مگر یہ کہ اس کا غالب گمان سورج کے غروب ہونے کا ہو۔ اور جسے فجر کے طلوع ہونے کا شک ہو تو اسے کھانے، پینے سے رکنا لازم ہے۔ اگر اس نے شک کے ساتھ کھایا تو اس پر قضا ہوگی جیسے بھولنے والے کا حکم ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اہل مدینہ وغیرہ کے علماء میں سے بعض اس پر کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے حتیٰ کہ اس کے لئے فجر کا طلوع ہونا واضح ہو جائے۔ ابن منذر کا یہی قول ہے۔ الکیا طبری نے کہا: ایک قوم نے گمان کیا کہ جب اس کے لئے اول فجر تک افطار مباح ہے جب اس نے اس گمان پر کھایا کہ فجر طلوع نہیں ہوئی تو اس نے شرع کی اجازت سے کھانے کے جواز کے وقت میں کھایا۔ پس اس پر قضا نہیں ہے۔ اسی طرح مجاہد اور جابر بن زید نے کہا ہے اور قضا کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب رمضان کی پہلی رات میں چاند مطلع کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے پھر اس نے کھایا۔ اس کے بعد ظاہر ہوا کہ آج رمضان کا دن تھا ہم بھی اس جیسے مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی طرح دار الحرب میں قیدی نے جب شعبان کا دن گمان کرتے ہوئے کچھ کھایا پھر اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

**مسئلہ نمبر** 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس میں صوم وصال سے نہی کا تقاضا پایا جاتا ہے کیونکہ رات روزے کی غایت ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے(1)۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، ابراہیم التیمی، ابوالجوزا، ابوالحسن دینوری وغیرہم صوم وصال رکھتے تھے۔ حضرت ابن زبیر سات دن وصال کا روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کرتے تھے تو کبھی گھی اور مصبر پیتے تھے حتیٰ کہ انتڑیاں بھر جاتی تھیں۔ فرمایا: ان کی انتڑیاں خشک ہوتی تھیں۔ ابوالجوزاء سات دنوں اور سات راتوں کا صوم وصال رکھتے تھے، اگر وہ کسی سخت آدمی کے بازو کو پکڑتے تو اس کا بازو توڑ دیتے۔ قرآن وسنت کا ظاہر صوم وصال سے منع کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب سورج ادھر سے غروب ہو اور رات ادھر سے آجائے تو روزہ دار افطار کر دے۔ اس کو مسلم نے حضرت عبداللہ بن ادفی کی حدیث سے نقل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا، جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو کوئی دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ان کے ساتھ صوم وصال رکھا پھر عید الفطر کا چاند نظر آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر چاند نظر نہ آتا تو میں اور زیادہ تمہیں صوم وصال رکھواتا، یہ آپ ان پر انکار کے طور پر فرما رہے تھے جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے: اگر ہمارے لئے مہینہ لمبا ہوتا تو ہم متواتر صوم وصال رکھتے رہتے تاکہ اعمال میں شدت کرنے والے شدت چھوڑ دیتے۔

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صوم وصال سے اجتناب کرو صوم وصال سے اجتناب کرو۔ یہ صوم وصال سے منع میں تاکید کے طور پر فرمایا۔ اور بخاری نے اس حدیث کو نقل فرمایا ہے۔ صوم وصال کو اس لئے ناپسند فرمایا کیونکہ اس میں قویٰ میں ضعف آ جاتا ہے اور بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ جمہور علماء میں سے بعض نے صوم وصال کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ظاہر کی مخالفت ہے اور اہل کتاب سے مشابہت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ صوم وصال نہ رکھو جو وصال کا ارادہ کرے وہ سحری تک وصال کرے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہاری ہیئت کی طرح نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا کھلانے والا ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور میرا پلانے والا ہے جو مجھے پلاتا ہے۔ علماء نے کہا: سحری تک فطر کی تاخیر میں اباحت ہے اور یہ وصال کی غایت ہے جو وصال کرنا چاہے اور ایک دن کو دوسرے دن کے ساتھ ملانے سے منع ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابن وہب (جو مالک کے شاگرد ہیں) کا قول ہے اور جنہوں نے وصال کے جواز پر حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے کہا: وصال سے اس لئے نہی فرمائی تھی کہ لوگوں کا زمانہ اسلام قریب تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ وہ وصال کی تکلیف اٹھائیں گے اور اعلیٰ مقامات کی کوشش کریں گے اور جہاد اور دشمن پر قوت جو اس سے زیادہ نفع بخش ہے اس میں کمزور پڑ جائیں گے اس وقت انہیں قوت و جہاد کی ضرورت ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صوم وصال اور طاعات کے اعلیٰ مقام کو لازم پکڑتے تھے جب صحابہ نے وصال کے بارے میں پوچھا تو اپنے اور ان کے درمیان فرق ظاہر فرمایا اور انہیں بتایا کہ اس سلسلہ میں ان کی حالت، عام لوگوں کی حالت سے مختلف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہاری مثل نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ جب صحابہ کے دلوں میں ایمان مکمل ہو گیا اور ان کے سینوں میں مستحکم و راسخ ہو گیا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی اور دشمنوں پر غالب آ گئے تو اولیاء اللہ نے صوم وصال رکھا اور اپنے لئے اعلیٰ مقامات کو لازم پکڑا۔

میں کہتا ہوں: اسلام کے ظہور اور دشمنوں کے مغلوب ہونے کے باوجود صوم وصال کو ترک کرنا اولیٰ ہے اور یہ اعلیٰ درجہ اور ارفع مقام ہے۔ اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور رات صوم شرعی کا زمانہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی رات کو نیت کے ساتھ روزہ رکھے تو اسے اس پر ثواب نہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے متعلق خبر دی کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب مایجوز من اللو، حدیث نمبر 6700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ گمان کیا تو کہا: آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ آپ کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا کھانا، پینا دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان معانی اور لطائف پر محمول ہے جو آپ کے دل پر وارد ہوتے تھے۔ جب کوئی لفظ حقیقت ومجاز کا احتمال رکھتا ہو تو اصل حقیقت، ہوتی ہے حتیٰ کہ کوئی دلیل وارد ہو جو حقیقت کو زائل کر دے پھر جب صحابہ نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے ساتھ صوم وصال رکھا آپ کی تو عادت تھی جیسا آپ نے اپنے متعلق خود خبر دی اور صحابہ ایسی عادت پر تھے حتیٰ کہ وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کا صبر کم ہوگا تو وہ صوم وصال نہیں رکھیں گے۔ یہ ہے آپ کے انکار کی حقیقت تا کہ وہ تعمق (انتہائی گہرائی) کو چھوڑ دیں اور اس شدت کو ترک کر دیں جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ اگر ہم (میں کھلایا اور پلایا جاتا ہو) کا اپنا معنی مراد لیں تو آپ حکماً افطار کرنے والے ہوں گے جیسے جس نے روزے میں چغلی کھائی یا جھوٹ کی گواہی دی تو وہ حکماً افطار کرنے والا ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 24**: روزہ دار کے لئے مستحب ہے کہ جب وہ افطار کرے تو کھجوروں، چھوہاروں اور پانی کے گھونٹوں سے افطار کرے جیسا کہ ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے سے پہلے کھجوروں سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوہاروں سے افطار کرتے اگر چھوہارے بھی نہ ہوتے تو پانی کے گھونٹ بھرتے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ دعا مانگتے: لَكَ صمنا و علی رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السميع العليم۔ ''ہم نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا، تیرے رزق پر افطار کیا تو ہماری طرف سے قبول فرما بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ کہتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہوگئیں اور ان شاء اللہ اجر ثابت ہے۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: حسین بن واقد اس میں منفرد ہیں اس کی سند حسن ہے (2)۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کے پاس روزہ افطار کیا تو یہ کہا: افطر عندکم الصائمون و اکل طعامکم الابرار و صلت علیکم الملائکۃ (تمہارے پاس روزہ داروں نے روزہ افطار کیا، تمہارا کھانا نیکوکاروں نے کھایا اور تم پر فرشتوں نے درود بھیجا)۔ حضرت زید بن خالد جہنی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزہ دار کو روزہ افطار کرایا اسے ان جیسا اجر ملے گا اور ان کے اجروں سے بھی کچھ کم نہ ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ دار کے لئے افطار کے وقت کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو یہ فرماتے سنا کہ جب وہ افطار کرتے تو یہ دعا

---

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدع قول الزور والعمل بہ، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب القول عند الافطار، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مانگتے۔ اللهم انی اسألك برحمتك التی وسعت کل شیٔ ان تغفرلی (اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس رحمت کے طفیل اپنی مغفرت کا سوال کرتا ہوں جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے جب افطار کرتا ہے تو افطاری سے خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملاقات کرے گا تو اپنے روزے سے خوش ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 25**: شوال کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے جیسا کہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوایوب انصاری سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے پیچھے شوال کے روزے رکھے اس کے لئے پورے زمانہ کے روزوں کے ثواب کی طرح ثواب ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سعد بن سعید انصاری مدنی کی حدیث ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے بخاری نے کوئی چیز نقل نہیں کی۔ اور ابو اسماء الرحبی عن ثوبان مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے عمدہ سند کے ساتھ تفسیر سے یہ حدیث مروی ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کے بدلے دس نیکیاں رکھی ہیں، رمضان کا مہینہ دس مہینوں کا بدل ہے اور عیدالفطر کے بعد چھ ایام پورے سال کا بدل ہیں (1)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ان ایام کے روزوں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں مکروہ کہا ہے اس خوف سے کہ جاہل لوگ رمضان کے ساتھ اس چیز کو نہ ملا دیں جو رمضان میں سے نہیں ہے اور جس کا خوف امام مالک نے کیا وہ واقع بھی ہوا حتیٰ کہ خراسان کے بعض شہروں میں رمضان کی عادت کے مطابق سحری کے وقت اٹھتے تھے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام مالک خود یہ روزے رکھتے تھے۔ امام شافعی نے ان روزوں کو مستحب کہا ہے، امام ابو یوسف نے ان کو مکروہ کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جماع اعتکاف کو فاسد کر دیتا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو اعتکاف کی حالت میں جان بوجھ کر جماع کرے گا وہ اپنے اعتکاف کو فاسد کرنے والا ہوگا پھر جب کوئی ایسا کرے تو اس پر جو ہوگا اس میں اختلاف ہے۔ حسن بصری اور زہری نے کہا: ایسے شخص پر وہی ہوگا جو رمضان میں اپنی اہلیہ سے جماع کرنے والے پر ہوتا ہے اور رہی بغیر جماع کے مباشرت اگر اس سے تلذذ کا قصد کیا ہوگا تو یہ مکروہ ہے۔ اگر تلذذ کا قصد نہیں کیا تو مکروہ نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کو کنگھی کرتی تھی جبکہ آپ معتکف ہوتے تھے (2) لامحالہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کو اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوں گی۔ یہ دلیل ہے کہ بغیر شہوت کے مباشرت ممنوع نہیں ہے۔ یہ عطا، امام شافعی اور ابن منذر کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ معتکف نہ مباشرت کرے نہ بوسہ دے۔ اگر ایسا کرے تو اس پر حد ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔

امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ یہ مزنی کا قول ہے۔ مسائل

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی ثواب من فطر صائما، حدیث نمبر 1705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب المعتکف یدخل رأسه البیت للغسل، حدیث نمبر 1905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف میں انہوں نے دوسری جگہ فرمایا: وطی سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا مگر ایسی وطی جو حد کو واجب کرتی ہے۔ مزنی نے حج اور روزے میں اس کی اصل پر قیاس کرتے ہوئے یہ اختیار کیا۔

**مسئلہ نمبر 27:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ لغت میں اعتکاف کا معنی ملازمت ہے۔ کہا جاتا ہے: عکف علی الشیٔ جب کوئی کسی چیز کو لازم پکڑ لے اور اس کی طرف متوجہ ہو۔ راجز نے کہا: عکف النبیط یلعبون الفنزجا (نبطی نے رقص، کھیل کو لازم پکڑا۔)

ایک اور شاعر نے کہا:

وظل بنات اللیل حولی عکفا عکوف البواکی بینهن(1) صریع

خیالات میرے اردگرد جمے رہے، رونے والیوں کے بیٹھنے کی طرح جن کے درمیان قبر ہو۔

جب معتکف اعتکاف کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے عمل کو لازم پکڑتا ہے تو اسے یہ اسم لازم ہوتا ہے اور عرف شرع میں اعتکاف سے مراد مخصوص جگہ میں مخصوص شرط پر مخصوص وقت میں مخصوص اطاعت کو لازم پکڑنا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہیں ہے۔ یہ قربتوں میں سے ایک قربت ہے اور نوافل میں سے ایک نفل ہے۔ رسول اللہ ﷺ، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کا عمل کیا اور اگر اپنے نفس پر لازم کرے گا تو اس پر لازم ہو جائے گا۔ اس شخص کے لئے اعتکاف کرنا مکروہ ہے جسے اعتکاف کے حقوق پورے کرنے سے عجز کا اندیشہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 28:** علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الْمَسٰجِدِ پھر علماء کا مساجد کی مراد میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد مساجد کی ایک خاص قسم ہے اور وہ وہ ہے جسے کسی نبی نے تعمیر کیا ہو جیسے مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد ایلیاء (بیت المقدس) حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے۔ ان کے نزدیک اعتکاف ان مساجد کے علاوہ کسی مسجد میں جائز نہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف صرف جامع مسجد میں جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک آیت میں اس جنس کی مساجد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ عروہ، حکم، حماد، زہری، ابو جعفر محمد بن علی کا قول ہے اور امام مالک کا ایک قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر اور ابو قلابہ وغیرہم سے مروی ہے۔ یہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ ان کی حجت آیت کو عموم پر محمول کرنا ہے ہر اس مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس میں امام اور مؤذن ہو۔ امام مالک کا ایک قول بھی یہی ہے۔ ابن علیہ، داؤد بن علی طبری اور ابن منذر کا قول بھی یہی ہے۔ دارقطنی نے ضحاک سے انہوں نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ دارقطنی نے کہا: ضحاک نے حضرت حذیفہ سے نہیں سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 29:** امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک کم از کم اعتکاف ایک دن اور ایک رات ہے۔ اگر کسی نے کہا: مجھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر اللہ کیلئے اعتکاف ہے تو اِس پر ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر مانی تو ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ سحنون نے کہا: جس نے ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر ایک دن کی نذر مانی تو بغیر رات کے دن کا اعتکاف لازم ہوگا اور اگر رات کی نذر مانی تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں جیسا کہ سحنون نے کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر وہی ہے جو اس نے نذر مانی اگر رات کی نذر مانی تو رات کا اعتکاف ہوگا، اگر دن کی نذر مانی تو دن کا اعتکاف ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: کم از کم ایک لحظہ کا اعتکاف ہے اس کے اکثر کی کوئی حد نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بعض اصحاب نے کہا: ایک ساعت (گھڑی) کا اعتکاف بھی صحیح ہے۔ اس قول کی بناء پر اعتکاف کی شرط سے روزہ نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل سے ایک قول مروی ہے اور یہی قول داؤد بن علی اور ابن علیہ کا ہے، ابن منذر اور ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف رمضان میں ہوتا تھا اور یہ محال ہے کہ رمضان کا روزہ رمضان کے لئے اور دوسرے دنوں کے لئے ہو۔ اگر معتکف نے رمضان میں اپنے روزے سے نفل اور فرض روزے کی نیت کی تو اس کا روزہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک فاسد ہے۔ یہ معلوم ہے کہ معتکف کو اعتکاف کی رات میں عورتوں سے مباشرت سے اجتناب لازم ہے جس طرح دن میں اجتناب لازم ہے اور اعتکاف کی رات اس کے اعتکاف میں داخل ہے اور رات روزے کا محل نہیں ہے اسی طرح دن بھی روزے کا محتاج نہیں ہے۔ اگر وہ روزہ رکھے تو بہتر ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور موطا میں قاسم بن محمد اور نافع مولی حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ اعتکاف روزے کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ کیا ہے۔ یحییٰ نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک معاملہ اسی پر ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو عبداللہ بن بدیل نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات اور دن کے اعتکاف کی (کعبہ کے پاس) نذر مانی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف کر اور روزہ رکھ۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابن بدیل، عمرو سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے۔ دارقطنی نے کہا: سوید بن عبدالعزیز نے سفیان بن حسین سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت عروہ سے انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک روزے کی شرط سے نہیں ہے کہ وہ اعتکاف کے لئے ہو بلکہ اعتکاف کے لئے روزہ ہو، رمضان کے لئے ہو، نذر کے لئے ہو اور کسی اور وجہ سے ہو۔ صحیح یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے نے نذر مانی تو اس کی نذر کو اصل شرع میں

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یر علیہ صوما اذا اعتکف۔ حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کے مقتضا کی طرف پھیرا جائے گا۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے نماز کی نذر مانی تو وہ اس پر لازم ہے اس پر خاص اس نماز کے لئے پاک ہونا ضروری نہیں بلکہ جائز ہے کہ کسی دوسری چیز کے لئے کی گئی طہارت سے بھی اسے ادا کرنا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 30**: معتکف کے لئے اپنی اعتکاف کی جگہ سے نکلنا جائز نہیں مگر وہ کام جو اس کے لئے ضروری ہو جیسا کہ ائمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرتے تھے تو اپنے سر کو میرے قریب کرتے تھے میں آپ کو کنگھی کیا کرتی تھی اور گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر حاجت انسانی کے لئے (1) (یعنی پیشاب، پاخانہ کے لئے)۔ اس مسئلہ میں ائمہ اور امت کا کوئی اختلاف نہیں جب معتکف ضرورت کے لئے باہر نکلے تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپس آجائے اور اپنے سابقہ اعتکاف پر بنا کرے اور اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ضرورت میں سے واضح مرض اور حیض ہے۔ ان کے علاوہ امور کے لئے نکلے گا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک کے مذہب کو اس کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں اسی طرح امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، حسن، نخعی مریض کی عیادت کرتے تھے اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن ان سے ثابت نہیں۔ اسحاق نے واجب اعتکاف اور نفل اعتکاف میں فرق کیا ہے۔ واجب اعتکاف کے بارے میں فرمایا: اس میں مریض کی عیادت نہ کرے اور جنازوں میں شرکت نہ کرے اور نفلی اعتکاف کے بارے میں فرمایا: وہ اعتکاف کی ابتدا میں جنازوں میں حاضر ہونے، مریضوں کی عیادت کرنے اور جمعہ پڑھنے کی شرط لگالے۔ امام شافعی نے فرمایا: مریض کی عیادت، جنازوں میں حاضری اور دوسری ضروریات کے لئے اعتکاف سے نکلنے کی شرط لگانا صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں امام احمد نے مختلف روایات بیان کی ہیں کبھی منع فرمایا، کبھی فرمایا: مجھے امید ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے امام مالک کی طرح فرمایا ہے: اعتکاف میں شرط نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: معتکف اعتکاف سے نہ نکلے مگر جس کے لئے نکلنا ضروری ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاجات ضروریہ کے لئے نکلتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 31**: معتکف کا جمعہ کے لئے نکلنا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے اور سلام پھیرنے کے ساتھ ہی واپس آجائے کیونکہ وہ ایک فرض کے لئے نکلا تھا اور اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹا۔ یہ ابن الجہم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابن عربی اور ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جو دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ کرے یا دس دنوں کی نذر مانے تو وہ جامع مسجد میں اعتکاف کرے جب وہ کسی دوسری مسجد میں اعتکاف کرے تو جمعہ کے لئے جانا اس کو لازم ہے اور اس کا اعتکاف باطل ہے۔ عبدالملک نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے، جمعہ میں حاضر ہو اور پھر اپنی جگہ واپس آجائے اس کا اعتکاف صحیح ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ یہ ارشاد عام ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف واجب نہیں سنت ہے اور جمہور ائمہ کا اجماع ہے کہ جمعہ ذوات پر فرض ہے۔ جب دو واجب کسی پر جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے مؤکد ہو تو مؤکد کو مقدم کیا جاتا ہے۔ جب مندوب اور واجب جمع ہوں تو پھر کیا کیفیت ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب لایدخل البیت الالحاجۃ، حدیث نمبر 1889، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسی نے بھی جمعہ کو ترک کرنے کا قول نہیں کیا۔ جمعہ کی طرف نکلنا یہ حاجت سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 32:** معتکف جب کبیرہ گناہ کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا کیونکہ کبیرہ گناہ عبادت کی ضد ہے جس طرح کہ حدث، طہارت اور نماز کی ضد ہے۔ اور جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کیا ہے ان کا چھوڑنا اعتکاف کی عبادت میں اعلیٰ منازل میں سے ہے۔ یہ ابن خویز منداد نے مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 33:** مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو صبح کی نماز پڑھتے پھر اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ (الحدیث)

معتکف کے اعتکاف میں داخل ہونے کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہا ہے، ثوری اور لیث سے ایک قول یہی مروی ہے۔ ابن منذر اور تابعین کے ایک طائفہ کا یہی قول ہے۔ ابو ثور نے کہا: یہ وہ شخص کرے جس نے دس دنوں کی نذر مانی ہو۔ اگر دس سے زیادہ کی نذر مانی ہو تو سورج غروب ہونے سے پہلے داخل ہو جائے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب اس نے ایک مہینہ کا اعتکاف اپنے اوپر واجب کیا ہو تو وہ اس دن کی رات سے سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائے۔ امام مالک نے فرمایا: اسی طرح جس نے ایک دن یا زیادہ دنوں کے اعتکاف کی نیت کی ہو۔ یہی امام ابوحنیفہ، ابن ماجشون اور عبدالملک کا قول ہے کیونکہ پہلی رات اعتکاف کے دنوں میں داخل ہے وہ اعتکاف کا زمانہ ہے۔ دن کی طرح اس کا بعض حصہ چھوڑا نہیں جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: جب کسی نے کہا مجھ پر اللہ کے لئے ایک دن (کا اعتکاف) ہے وہ طلوع فجر سے پہلے داخل ہو اور سورج غروب ہونے کے بعد نکلے۔ یہ ان کا قول مہینے والے اعتکاف کے بارے میں قول کے خلاف ہے۔ لیث نے ایک قول میں اور زفر نے کہا: فجر کے طلوع ہونے سے پہلے داخل ہو۔ مہینہ، اور ایک دن ان کے نزدیک حکم میں برابر ہیں اسی طرح امام ابو یوسف سے مروی ہے۔ قاضی عبدالوہاب کا بھی یہی قول ہے۔ رات اعتکاف میں تبعاً داخل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے اور رات روزے کا زمانہ نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ اعتکاف سے مقصود دن ہے رات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت عائشہ کی حدیث ان اقوال کو رد کرتی ہے تنازع کے وقت یہ حجت ہے یہ ایسی حدیث ہے جو ثابت ہے اس کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 34:** امام مالک نے اس شخص کے لئے مستحب قرار دیا ہے کہ جو دس دنوں کا اعتکاف کرے وہ عیدالفطر کی رات مسجد میں گزارے حتیٰ کہ صبح یہاں سے عیدگاہ کی طرف جائے۔ یہی امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی اور امام اوزاعی نے کہا: جب سورج غروب ہو تو نکل جائے۔ یہ سحنون نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کیونکہ مہینہ کے ختم ہونے کے ساتھ دس دن بھی ختم ہو گئے اور رمضان شریف کے آخری دن کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ سحنون نے کہا: یہ وجوب کے طور پر ہے۔ پس جو عیدالفطر کی رات نکلے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

ابن ماجشون نے کہا: ہم نے جو مہینہ کے ختم ہونے کے متعلق کہا ہے وہ اس قول کا رد کرتا ہے اگر عیدالفطر کی رات ٹھہرنا

اعتکاف کی شرط سے ہوتا تو وہ اعتکاف صحیح نہ ہوتا جو فطر کی رات سے متصل نہ ہوتا اور اس کے جواز پر اجماع ہے کہ عید الفطر کی رات ٹھہرنا معتکف کے لئے اعتکاف کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے۔ یہ روزے کے احکام اور اعتکاف جو آیات کے متعلق تھے کافی وشافی ہیں، جو ان پر انحصار کرنے والا ہے اس کے لئے کفایت ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 35**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں پس ان کی مخالفت نہ کرو۔ تِلْكَ، ان اوامر ونواہی کی طرف اشارہ ہے۔ الحدود سے مراد رکاوٹیں ہیں اور الحد سے مراد منع کرنا ہے۔ اسی وجہ سے لوہے کو حدید کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہتھیار کو بدن تک پہنچنے سے روکتا ہے، چوکیدار اور جیل کے داروغے کو حداد کہا جاتا ہے کیونکہ جو گھر کے اندر ہوتے ہیں ان کو نکلنے سے روکتا ہے اور باہر والوں کو اندر جانے سے روکتا ہے۔ ان احکام کو اللہ کی حدود اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ان چیزوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہوتے اور جو ان سے ہوتے ہیں ان کو خروج سے روکتے ہیں۔ اسی سے گناہوں کی حدود ہیں جو گناہ کرنے والوں کو دوبارہ گناہ کرنے سے روکتی ہیں۔ اسی طرح عدت والی عورت کو حاد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زیب وزینت سے رک جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 36**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان حدود کو بیان فرمایا اسی طرح تمام احکام کو بیان فرماتا ہے تا کہ تم ان سے تجاوز کرنے سے بچو۔ الایات سے مراد وہ علامات ہیں جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لَعَلَّهُمْ لوگوں کے حق میں ترجی (امید) ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی اس شخص میں خاص ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت کو آسان فرماتا ہے ان آیات کی دلالت کی وجہ سے جن کے ضمن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔(1)

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تا کہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت عبدان بن اشوع حضری کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے امرء القیس کندی پر مال کا دعویٰ کیا تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ امرء القیس نے انکار کیا۔ اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ قسم سے رک گیا۔ اس نے اپنی زمین کا فیصلہ عبدان کے سپرد کر دیا اور اس سے جھگڑا نہ کیا(2)۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ زاد المسیر، صفحہ 168، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت سے خطاب حضرت محمد ﷺ کی تمام امت کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض، بعض کا مال ناحق نہ کھائے۔ اس میں جوا، دھوکا، غصب، حقوق سے انکار اور ایسی چیز جس کے دینے پر مالک خوش نہیں ہے یا ایسی چیز جس کو شریعت نے حرام کیا ہے اگرچہ مالک خوشی سے دینے پر راضی بھی ہو جیسے زانیہ کی کمائی، کاہن کا نذرانہ، شرابوں اور خنازیر کی قیمتیں وغیرہ داخل ہیں۔ اور بیع میں غبن داخل نہیں جبکہ بائع اس چیز کی حقیقت بتادے جو اس نے بیچی کیونکہ اس صورت میں غبن (زیادتی) گویا ہبہ ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۂ نساء میں آئے گا۔ اموال کو ان لوگوں کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے جن کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جس کو روکا گیا ہے اور جس سے روکا گیا ہے جیسا فرمایا: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 85) ایک قوم نے کہا: اس آیت سے مراد کھیلوں میں جو مال لگائے جاتے ہیں، گانے والیوں کے مال، شراب کی قیمت اور برے لوگوں رشوت خور وغیرہ کے اموال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** جس نے کسی کا مال شرع کی اجازت کے بغیر لیا اس نے باطل ذریعہ سے کھایا وہ مال بھی باطل شمار ہوگا جس کا فیصلہ قاضی تیرے حق میں کردے جبکہ تو جانتا ہے کہ تو باطل پر ہے۔ قضا قاضی سے حرام، حلال نہیں ہوجاتا کیونکہ قاضی تو ظاہر حال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اموال کے بارے میں اجماع ہے اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی کی قضا فروج (شرمگاہوں) میں باطناً بھی نافذ ہوجاتی ہے۔ جب قضا قاضی اموال میں باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتی تو فروج میں بدرجہ اولیٰ تبدیلی نہیں کرے گی (☆)۔ ائمہ نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس جھگڑا لے کر آتے ہو شاید تم میں سے کوئی دوسرے سے حجت بیان کرنے میں زیادہ فصیح ہو میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں نے (گواہیاں، دلائل) سنے تو میں اس کے بھائی کے مال سے کوئی چیز اس کے لئے کردوں تو وہ نہ لے میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا اسے دینے والا ہوں گا (1)۔ ایک روایت میں ہے: وہ اس کو اٹھالے یا اس کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کے مطابق جمہور علماء اور ائمہ فقہاء کا قول ہے۔ یہ نص ہے کہ حاکم کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتا خواہ وہ مال، خون اور شرمگاہوں کے متعلق ہو۔ مگر امام ابوحنیفہ سے فروج کے متعلق جو قول حکایت کیا گیا ہے کہ باطن میں حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر دو جھوٹے گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور حاکم ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ کردے کیونکہ وہ گواہ اس کے نزدیک عادل ہیں تو اس عورت کی شرمگاہ عدت کے بعد نئے نکاح کرنے والے کے لئے حلال ہوجائے گی۔ جو یہ جانتا بھی ہے کہ فیصلہ غلط تھا۔ اسی طرح اگر ان گواہوں میں سے بھی ایک اس سے نکاح کرلے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ جب وہ ظاہر میں تمام مردوں کے لئے حلال ہوگئی تو گواہ اور دوسرے سب برابر ہیں۔ کیونکہ قاضی کی قضا نے اس کی عصمت کو ختم کردیا اور اس میں تحلیل و تحریم کی ظاہر و باطن میں

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)

☆۔ ائمہ احناف کا کہنا یہ ہے کہ جب عورت ایسی ہے جو مرد پر حرام نہیں اور اس کے عقد میں آسکتی ہے تو قاضی کے فیصلہ سے پہلے بطور اقتضاء النص نکاح تسلیم کیا جائے گا تاکہ دونوں کا ایک دوسرے سے انتفاع درست ہوجائے۔ ہدایہ۔ کتاب النکاح۔

ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دوسرے خاوندوں کے لئے حلال نہ ہوتی اور امام ابوحنیفہ نے لعان سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: بیوی جھوٹے لعان کی وجہ سے اپنے خاوند سے جدائی تک پہنچ گئی۔ جس کے بارے میں اگر قاضی کو اس کے کذب کا علم ہو جاتا تو وہ اسے حد لگاتا، ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اور پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق سے کسی چیز کا فیصلہ کر دوں تو وہ اسے نہ لے، کے عموم میں شامل نہیں (1)۔ (الحدیث)

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت سے ہر موافق و مخالف دلیل پکڑنے والا ہے اپنے حکم کے بارے میں جو وہ اپنے لئے دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ جائز نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کرتا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کہا جائے گا ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ باطل ہے حتیٰ کہ دلیل کے ساتھ واضح کرے۔ اس وقت اس عموم میں داخل ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ معاملات میں باطل جائز نہیں۔ اس میں باطل کی تعیین نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ لغت میں باطل کا معنی ہے: جانے والا، زائل ہونے والا۔ کہا جاتا ہے: بطل یبطل بطولا وبطلانا۔ باطل کی جمع بواطل ہے۔ بطولۃ کی جمع اباطیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا یاتیہ الباطل۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ابلیس ہے۔ وہ قرآن میں کمی بیشی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ھو اللہ الباطل۔ یعنی شرک۔ البطلہ، جادوگروں کو کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ودیعت ہے اور ایسی چیز ہے جس میں دلیل نہ ہو۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ یتیم کا مال ہے جو اوصیاء کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہی حکام کے پاس معاملہ لے جاتا ہے جب اس سے اس مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا کچھ حصہ ہتھیا لے اور ظاہراً اس کے لئے حجت بھی ہو۔ زجاج نے کہا: تم اس کے مطابق عمل کرتے ہو احکام کا ظاہر جس کو ثابت کرتا ہے اور تم اس کو ترک کرتے ہو جس کے بارے تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے۔ کہا جاتا ہے: ادلی الرجل بحجتہ او بالامر الذی یرجو النجاح بہ (اس شخص نے اپنی حجت پیش کی یا وہ امر پیش کیا جس کے ساتھ وہ نجات کی امید رکھتا ہے) اس کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو کنویں میں اپنا ڈول پھینکتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: ادلی دلوہ اس نے ڈول چھوڑا دلاھا، ڈول نکالا۔ الدلو، الدلاء کی جمع ادلٍ و دلاءٌ و دُلِیٌّ۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ باطل کے ذریعے مال کھانے اور حکام تک حجج باطلہ کے ساتھ معاملات کو لے جانا جمع نہ کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (البقرہ:42) یہ تیرے اس قول کے قبیل سے ہے: لا تاکل السمک و تشرب اللبن مچھلی کا کھانا اور دودھ کا پینا جمع نہ کر۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اپنے اموال کے ساتھ حکام سے تعلق نہ جوڑو اور انہیں رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے لئے اس سے زیادہ کا فیصلہ کریں۔ پس باء مطلق ملانے کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول راجح ہے کیونکہ حکام رشوت لینے والے ہوتے ہیں مگر جسے اللہ محفوظ رکھے اور وہ بہت کم ہیں۔ دونوں الفاظ متناسب ہیں۔ تدلوا، ارسال الدلو سے مشتق ہے الرشوۃ، الرشاء سے ہے۔ وہ اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ المحرر الوجیز بر آیت ہذا

رسی کو لمبا کرتا ہے تا کہ حاجت کو پورا کرے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس قول کو تدلوا بھا کا قول قوت دیتا ہے تدلوا، تاکلوا پر عطف کی بناء پر مجزوم ہے جیسا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مصحف حضرت ابی میں ہے ولا تدلوا حرف نہی کے تکرار کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت تدلوا کے جزم کی تائید کرتی ہے جو اکثر کی قراءت ہے۔ بعض نے فرمایا تدلوا ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک اس جیسی مثال میں ناصب ان مضمرہ ہوتا ہے اور بھا میں ضمیر کا مرجع اموال ہیں اور پہلے قول کے مطابق اس کا مرجع حجت ہے اور اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے دوسرے قول کو اموال کا ذکر بھی قوت دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔ الصحاح میں ہے: الرشوۃ معروف ہے الرُشوۃ بھی اس کی مثل ہے اس کی جمع رُشَی و رِشَیٰ ہے۔ رشاہ یرشوہ، وارتشی کا معنی رشوت لینا ہے استرشی فی حکمہ۔ یعنی حکم پر اس نے رشوت طلب کی۔ میں کہتا ہوں: اس دور میں حکام سراپا رشوت ہیں۔ ان کے بارے رشوت لینے کا گمان نہیں بلکہ یقیناً رشوت لیتے ہیں۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِتَاْكُلُوْا، لام کی کی وجہ سے منصوب ہے فَرِیْقًا ٹکڑا، جز کو کہتے ہیں۔ فریق کو قطعہ اور بعض سے تعبیر فرمایا۔ الفریق بکریوں کا چھوٹا سا ریوڑ جو بڑے ریوڑ سے جدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لتاکلوا اموال فریق من الناس۔ بِالْاِثْمِ اس کا معنی ظلم اور تعدی ہے اس کو اثم اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ظلم کرنے والے کے ساتھ گناہ متعلق ہوتا ہے اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم اس کا بطلان اور گناہ جانتے ہو۔ یہ جرأت و معصیت میں مبالغہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اہل سنت کا اتفاق ہے کہ جس نے وہ چیز لی جس پر مال کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اس کی وجہ سے اسے فاسق کہا جائے گا کیونکہ اس پر اس کا لینا حرام تھا۔ لیکن بشر بن معتمر اور اس کے متبعین معتزلیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: مکلف کو فاسق نہیں کہا جائے گا مگر دو سو دراہم لینے کے ساتھ۔ اس سے کم میں فاسق نہیں کیا جائے گا۔ ابن الجبائی کا قول اس کے خلاف ہے اس نے کہا: دس دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا دس سے کم میں فاسق نہیں کہا جائے گا۔ ابن ہذیل کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: پانچ دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا۔ اور بعض بصرہ کے قدریوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: ایک درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا اس سے کم میں نہیں۔ یہ تمام اقوال قرآن و سنت سے اور امت کے علماء کے اتفاق سے مردود ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2) (الحدیث) اس کی صحت پر اتفاق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 260، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحریم الدماء، صفحہ 61، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

’’دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) فرمائیے: یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ‘‘۔

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ** یہ ان سوالوں میں سے ہے جو یہود نے پوچھے تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت معاذ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہود ہم پر غالب آ گئے وہ ہم سے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ چاند کو کیا ہے کہ یہ باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ برابر اور گول ہو جاتا ہے پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ پہلی حالت پر ہو جاتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب مسلمان قوم کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے متعلق سوال تھا۔ اس چاند کے آخری راتوں میں چھپنے، اس کے مکمل ہونے اور سورج کی حالت سے مختلف ہونے کا سبب کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **عَنِ الْاَهِلَّةِ**، اهلة جمع ہے هلال کی۔ اس کو جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ چاند حقیقت میں ایک ہے اس حقیقت سے کہ ایک مہینہ میں ایک ہوتا ہے اور دوسرے مہینہ میں دوسرا ہوتا ہے۔ مہینہ کے تمام احوال چاندوں سے ہوتے ہیں اور اهلة سے مراد مہینے ہیں، کبھی شهر سے چاند مراد ہوتا ہے کیونکہ چاند مہینہ میں وارد ہوتا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

اخوان من نجد على ثقة      والشهر مثل قلامة الظفر

اس شعر میں شهر سے مراد چاند ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چاند کو شهر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ہاتھ اس کی رؤیت کی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اس کو شہرت دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں اور هلال کے لفظ کا اطلاق مہینہ کی آخری دو راتوں اور آغاز کی دو راتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: پہلی تین راتوں کو کہا جاتا ہے۔ اصمعی نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو باریک دھاگے کی طرح گول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ آسمان کو روشن کرتا ہے اور یہ ساتویں کی رات میں ہوتا ہے (2)۔ ابو العباس نے کہا: چاند کو ہلال اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کے متعلق خبر دینے کے لئے اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں۔ اسی سے استهل الصبي ہے جب بچے کے چیخنے کے ساتھ اس کی زندگی ظاہر ہو۔ استهلّ وجهه فرحا و تهلل جب اس میں سرور ظاہر ہو۔ ابو کبیر نے کہا:

واذا نظرت الى اسرة وجهه      برقت كبرق العارض المتهلل

کہا جاتا ہے: اهللنا الهلال جب ہم مہینہ میں داخل ہوں، جوہری نے کہا: أُهِلّ الهلال و استُهِلّ۔ مجہول کا صیغہ استعمال ہوتا ہے استهلّ بمعنی تبيّن (ظاہر ہونا) بھی بولا جاتا ہے۔ أَهَلّ نہیں کہا جاتا، کہا جاتا ہے: اهللنا عن ليلة كذا اور

---

1۔ زاد المسیر، صفحہ 169، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)      2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 261، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

املناہ فهل نہیں کہا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ہم نے اسے داخل کیا تو وہ داخل ہو گیا۔ یہ اس کا قیاس ہے۔ ابونصر عبد الرحیم القشیری نے اپنی تفسیر میں کہا جاتا ہے: اهل الهلال واستهل واهللنا الهلال واستهللنا۔

**مسئلہ نمبر 3:** ہمارے علماء نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ قرضہ ادا کرے گا یا ایسا کرے گا فی الهلال اور رأس الهلال او عند الهلال۔ پھر اس نے وہ کام چاند دیکھنے کے دو دن بعد کیا یا ایک دن بعد کیا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ اور تمام مہینے تمام عبادات و معاملات کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس آیت میں چاند کے بڑھنے اور کم ہونے کی حکمت بیان ہو رہی ہے۔ مدتوں، معاملات، قسموں، حج، تعداد، روزہ، عید، مدت حمل، اجارات، کرایوں کے علاوہ دوسرے بندوں کی مصلحتوں سے اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (الاسراء: 12) اس آیت کی وضاحت آگے آئے گی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (یونس: 5) چاندوں کا شمار کرنا، دنوں کے شمار سے آسان ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** جو ہم نے ثابت کیا ہے اس پر اہل ظواہر اور ان کے ہمنواؤں کا رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ مساقات (درختوں کو پانی لگانا) کا عمل مجہول عدل تک غیر معلوم سالوں تک جائز ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف کھیتی اور کھجوروں پر یہود کو عامل مقرر کیا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے بغیر کسی وقت کے تعین کے۔ اس میں اہل ظواہر کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو کہا تھا: میں تمہیں ان زمینوں پر باقی رکھوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں باقی رکھے گا (1)۔ یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی آپ اس فیصلہ میں اپنے رب کے منتظر تھے کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں۔ شریعت نے اجازت اور تمام معاملات کے معانی و مطالب کو پختہ و مضبوط کر دیا ہے۔ یہی علماء امت کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَوَاقِيْتُ یہ میقات کی جمع ہے جس کا معنی ہے: وقت۔ بعض نے فرمایا: میقات، وقت کا منتہیٰ ہے اور مواقیت غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی احاد میں کوئی مثال نہیں یہ جمع ہے اور جمع کی نہایت ہے، کیونکہ اس کی جمع نہیں بنائی جاتی۔ پس یہ ایسی ہوگی جس میں گویا تکرار ہو چکا ہے اور قوارير منصرف ہے کیونکہ وہ آیت کے سرے پر واقع ہوا ہے اس کو تنوین دی گئی ہے جس طرح قوافی کو تنوین دی جاتی ہے۔ یہ تنوین الصرف نہیں جو کسی اسم کے معرب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَجِّ جمہور کی قراءت میں حا پر فتحہ ہے۔ ابن ابی اسحاق نے پورے قرآن میں اسے حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حج البیت جو سورہ آل عمران میں ہے اس میں بھی حا کے کسرہ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، صفحہ 452، جلد 1 (وزارت تعلیم)

پڑھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: اَلْحَجّ جیسے الرد اور الشدّ۔ اور الحِج جیسے الذِ کر۔ یہ دونوں مصدر ہیں اور ہم معنی ہیں بعض نے فرمایا: حاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور حاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 7**: اللہ تعالیٰ نے حج کا ذکر علیحدہ فرمایا کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس میں وقت کی معرفت کی احتیاج ہے۔ اس میں وقت سے تاخیر جائز نہیں بخلاف عربوں کے نظریہ کے وہ عدد اور مہینوں کی تبدیلی کے ساتھ حج کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول اور فعل کو باطل کر دیا۔ اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 8**: امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ اس آیت کی وجہ سے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام چاندوں کو اس کے لئے ظرف بنایا ہے۔ پس تمام مہینوں میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے۔ امام شافعی نے اس میں مخالفت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ: 197) جیسا کہ آگے آئے گا، اس آیت کا معنی ہے بعض چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں، بعض حج کے لئے وقت ہیں یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: الجارية لزيد و عمرو۔ یہ لونڈی زید اور عمرو کے لئے ہے یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی کا بعض زید کے لئے ہے اور بعض عمرو کے لئے ہے۔ یہ کہنا جائز نہیں کہ تمام لونڈی زید کے لئے ہے اور تمام عمرو کے لئے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں اور تمام چاند حج کا وقت ہیں۔ اگر بعض مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: بعضها مواقيت للناس و بعضها مواقيت للحج۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: ان شهر رمضان ميقات لصوم زيد و عمرو رمضان کا مہینہ زید اور عمرو کے روزے وقت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام رمضان ہر ایک کے روزے کے وقت ہے اور جو انہوں نے لونڈی کی مثال دی تھی وہ صحیح ہے کیونکہ پوری لونڈی کا زید کے لئے ہونا اور پوری لونڈی کا عمرو کے لئے ہونا محال ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا زید کے لئے وقت ہونا اور عمرو کے لئے وقت ہونا صحیح ہے، پس جو انہوں نے کہا: وہ باطل ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے کوئی سامان بیچا معلوم سامان معلوم قیمت کے ساتھ عربوں کے مہینوں سے معلوم مدت تک یا ایسے ایام تک جن کی تعداد معروف ہو، بیع جائز ہے۔ اسی طرح معلوم مدت تک بیع سلم کے بارے میں کہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس نے فصل کاٹنے تک یا گہنے تک یا عطا تک یا اس کے مشابہ کوئی غیر معین وقت تک کے لئے کوئی چیز بیچی۔ امام مالک نے فرمایا: یہ جائز ہے کیونکہ یہ معروف ہے۔ ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے کہا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہوگی۔ اس طرح نمازیوں کے واپس آنے تک کوئی چیز بیچی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ عطا کرنے تک کوئی چیز خریدتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرمایا ہے اور وقت کو ان کی بیوع اور مصالح میں ان کی علامت بنایا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: یہی امام شافعی اور نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول صحیح ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 261، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

**مسئلہ نمبر 10**: جب چاند بڑا دکھائی دے تو ہمارے علماء نے کہا: اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ وہ اسی رات کا ہوگا۔ مسلم نے ابوالبختری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم عمرہ کے لئے نکلے۔ جب ہم نخلہ کے بطن میں اترے۔ فرمایا: ہمیں چاند نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کہا: یہ تین راتوں کا ہے، بعض نے کہا: دوراتوں کا ہے۔ فرمایا: ہم حضرت ابن عباس سے ملے۔ ہم نے کہا: ہم نے چاند دیکھا۔ بعض نے کہا: تین راتوں کا ہے بعض نے کہا: دوراتوں کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: کس رات تم نے اسے دیکھا تھا؟ ہم نے کہا: فلاں رات، حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے چاند کو دیکھنے کے لئے لمبا کیا وہ اسی رات کا ہے جس رات کو تم نے اسے دیکھا (1)۔

**مسئلہ نمبر 11**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا اس مسئلہ کو حج کے وقت کے ذکر کے ساتھ ملایا کیونکہ چاندوں کے متعلق اور گھروں کے پیچھے سے داخل ہونے کے متعلق اکٹھے سوال ہوئے تھے۔ پس یہ آیت دونوں مسئلوں کے متعلق نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو ان کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ وہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھتے تھے وہ شرعاً التزام کرتے تھے کہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو جب ان سے کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد گھر سے نکلتا تھا پھر کسی حاجت کے لئے لوٹ آتا تھا تو وہ حجرہ کے دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا بلکہ گھر کی چھت سے داخل ہوتا تھا تاکہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو وہ اپنے گھر کے پیچھے دیواروں پر ایک کوہان بناتا تھا پھر وہ اپنے حجرہ میں کھڑا ہوتا تھا اور اپنی حاجت کا حکم دیتا تھا پھر اس کے گھر سے وہ چیز اس کی طرف نکالی جاتی تھی اور وہ اس عمل کو نیکی اور عبادت سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ کئی چیزوں کو عبادت سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ان کا رد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نیکی اس کے حکم کی پیروی میں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوصالح کی روایت میں ہے فرمایا: لوگ زمانہ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی دور میں (اس طرح تھے) کہ ان میں سے کوئی جب حج کا احرام باندھتا تھا اگر وہ کچے مکانوں والوں میں سے ہوتا تھا تو وہ اپنے گھر کے پیچھے سے سوراخ کرتا تھا اس سے داخل ہوتا تھا اور اس سے خارج ہوتا تھا یا وہ سیڑھی رکھتا تھا اس سے چڑھتا تھا اور اس سے اترتا تھا اگر وہ خیمہ والوں میں سے ہوتا جو وہ خیمہ کے پیچھے سے داخل ہوتا تھا مگر جو حمس (قریش) میں سے ہوتا تھا وہ ایسا نہیں کرتا تھا (2)۔

زہری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے زمانہ میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ اپنے حجرہ میں داخل ہوئے اور بنی سلمہ میں سے ایک انصاری بھی آپ کے پیچھے دروازہ سے داخل ہوگیا، اس نے اپنی قوم کی عادت کو توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: تو کیوں دروازہ سے داخل ہوا جبکہ تو نے احرام باندھا ہوا تھا؟ اس نے کہا: حضور! آپ داخل ہوئے تو میں بھی آپ کے داخل ہونے کے ساتھ داخل ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تو حمس ہوں یعنی ایسی قوم سے ہوں جو اس کو دین نہیں سمجھتے۔ اس شخص نے کہا: میں اپنے اور تمہارے دین پر ہوں تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ یہ حضرات

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 348، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 233، جلد 1 (دارالفکر)

3۔ تفسیر طبری ملی قولہ تعالیٰ ویسئلونک عن الاھلہ، صفحہ 225، جلد 2 (داراحیاء التراث العربیۃ)

ابن عباس، عطا اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شخص قطبہ بن عامر انصاری تھا۔

الحمس قریش، کنانۃ، خزاعہ، ثقیف، جشم، بنوعامر بن صعصعہ، بنونصر بن معاویہ کو کہا جاتا ہے۔ ان کو حمس اس لئے کہا جاتا ہے: یہ اپنے دین میں بہت سخت تھے۔ الحماسہ کا معنی شدت ہے۔ حجاج نے کہا: و کم قطعنا من تقاف حمس، ہم نے حمس کی کتنی سخت جگہوں کو کاٹا؟ پھر اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے وہ کہا جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ تاخیر کرنا ہے اور حج کو مؤخر کرنا مراد ہے حتیٰ کہ وہ حلال مہینہ کو حج کی تاخیر کے لئے حرام بنا دیتے تھے اور حرام مہینہ کو حلال بنا دیتے تھے تا کہ حج کو اس سے مؤخر کریں تو بیوت کا ذکر اس بنا پر ہے حج میں واجب کی مخالفت اور حج کے مہینوں میں مخالفت کی یہ مثال ہے۔ تاخیر کرنے کا بیان ان شاء اللہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ آیت ضرب المثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم جاہلوں سے پوچھو بلکہ تم اللہ سے ڈرو اور علماء سے پوچھو۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے: اتیت هذا الامر من بابه۔ اس کام کو میں نے اس کے تقاضا کے مطابق کیا۔ مہدوی اور مکی نے ابن انباری سے، ماوردی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عورتوں کے جماع میں مثال ہے حکم دیا کہ ان کی قبل میں وطی کرو، دبر میں وطی نہ کرو۔ عورتوں کو بیوت (گھر) کہا گیا ہے کیونکہ عورتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس طرح گھروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ابن عطیہ نے کہا: یہ بعید ہے اور کلام کے انداز کو بدلنا ہے۔ حسن نے کہا: وہ فال پکڑتے تھے، پس جو سفر کرتا اور اس کی حاجت پوری نہ ہوتی تو وہ خسارہ سے فال پکڑتے ہوئے گھر کے پیچھے سے آتا تو انہیں کہا گیا کہ بدشگونی میں نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس پر توکل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے کیونکہ حضرت براء نے روایت کیا ہے، فرمایا: انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: ایک انصاری شخص آیا اور اپنے دروازے سے داخل ہو گیا۔ اس کو اس کے متعلق کہا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی (1) وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ یہ بیوت کے بارے میں حقیقی نص ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رہے دوسرے اقوال وہ دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔ آیت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے کہ نیکی کو اس کے تقاضا کے مطابق کرو اور تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق کرو۔ گھروں کے دروازوں سے آنے کا ذکر بطور مثال ہے تا کہ اشارہ ہو جائے کہ ہم امور کو اس طریقہ سے ادا کریں جس طرح اللہ نے ہمیں ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر جو اقوال ذکر کیے گئے ہیں سب صحیح ہیں۔ البیوت جمع ہے بیت کی۔ البُیوت کو با کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تقویٰ اور فلاح اور لعل کا معنی گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 12**: اس آیت میں بیان ہے کہ جس کام کو اللہ نے قربت نہیں بنایا اور اس کی طرف اس نے بلایا نہیں تو وہ قربت نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی قربت حاصل کرنے والا قربت حاصل کرے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب کسی کام کے قربت ہونے اور قربت نہ ہونے کا اشکال ہو تو اس عمل کو دیکھا جائے گا اگر تو اس کی فرائض و سنن میں کوئی مثال ہے تو وہ جائز ہو

1۔ صحیح مسلم، صفحہ 421، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

گا اور اگر مثال نہ ہو تو نہ وہ نیکی ہوگا نہ قربت۔ فرمایا: اس کے متعلق آثار نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ذکر ہے، فرمایا: رسول الله ﷺ خطبہ دے رہے تھے جبکہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا تھا۔ اس کے متعلق آپ نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا، نہ سایہ حاصل کرے گا، نہ بولے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو کہو کہ یہ کلام کرے، سایہ حاصل کرے اور بیٹھے اور اپنے روزے کو مکمل کرے (1)۔ نبی کریم ﷺ نے ان تمام کاموں کو باطل کر دیا جو قربت نہیں تھے، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں تھی اور اس قربت کو صحیح قرار دیا جس کی فرائض وسنن میں مثال تھی۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

''اور لڑو الله کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک الله تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم میں نازل ہوئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت سے پہلے ان ارشادات کی وجہ سے قتال ممنوع تھا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (المومنون: 96) (دور کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ (المائدہ: 13) (معاف فرماتے رہیے اور درگزر فرمایئے)۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾ (مزمل) (اور ان سے الگ ہو جایئے بڑی خوبصورتی سے)۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ﴿۲۲﴾ (الغاشیہ) (آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) اس قسم کے دوسرے ارشادات جو مکہ میں نازل ہوئے۔ جب آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کو قتال کا حکم دیا گیا یہ ارشاد نازل ہوا: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرہ: 190) یہ حضرت ربیع بن انس وغیرہ کا قول ہے (2)۔ حضرت ابو بکر صدیق سے مروی ہے کہ پہلی آیت قتال کے بارے میں یہ نازل ہوئی (3): اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: 39) پہلا قول زیادہ ہے۔ اذن والی آیت عام مثال کے بارے نازل ہوئی مشرکین میں سے جو قتال کرے اور جو نہ کرے ہر ایک سے جنگ کرنے کا اذن ہوا۔ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف عمرہ کے لئے نکلے تھے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں اترے...... حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے، اس کنویں کے نام کی وجہ سے اس جگہ کو بھی حدیبیہ کہا جاتا ہے ...... مشرکوں نے آپ کو بیت الله کی طرف جانے سے روکا۔ آپ ایک مہینہ حدیبیہ میں ٹھہرے رہے پھر مشرکوں نے آپ سے صلح کی کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں جس طرح آئے ہیں آئندہ سال ان کے لئے تین دن مکہ خالی کر دیا جائے گا اور اس شرط پر صلح کی کہ دس سال ان کے درمیان قتال نہ ہوگا۔ آپ ﷺ مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ جب اگلا سال آیا تو آپ نے عمرۃ القضاء

1۔ صحیح بخاری، باب النذر فیما لا یملك ولی معصیۃ، حدیث نمبر 6210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

کی تیاری کی۔ مسلمانوں کو کفار کے دھوکا کا خوف ہوا۔ مسلمانوں نے حرم میں اور حرمت والے مہینہ میں لڑنا ناپسند کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہارے لئے قتال حلال ہے اگر کفار تم سے قتال کریں۔ یہ آیت حج کے ذکر اور گھروں کے پیچھے سے آنے کے گزشتہ ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ کرتے تھے جو آپ سے جنگ کرتا تھا اور اس سے جنگ نہیں کرتے تھے جو آپ سے جنگ نہیں کرتا تھا(1) حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (توبہ:5)

پس یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن زید اور ربیع نے کہا اس کو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (توبہ:36) نے منسوخ کیا تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابن عباس، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجاہد نے کہا: یہ آیت محکم ہے یعنی تم ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑے ہیں اور عورتوں اور بچوں اور راہبوں کے قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: یہ سنت اور نظر میں اصح قول ہے۔ سنت میں ابن عربی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنگ میں عورت کو مقتولہ دیکھا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا(2)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ رہی نظر تو فَاعَل کا صیغہ عام طور پر دو شخصوں سے پایا جاتا ہے جیسے مقاتله، مشاتمة، مخاصمه، جھگڑنا، گالی دینا، لڑنا وغیرہ۔ قتال عورتوں، بچوں اور ان کے مشابہ لوگوں میں نہیں ہوتا جیسے راہب، اپاہج، بوڑھے اور مزدور لوگ۔ پس یہ لوگ قتل نہیں کئے جائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو یہی وصیت کی تھی جب اسے شام کی طرف بھیجا تھا مگر یہ کہ یہ لوگ اذیت دینے والے ہوں تو ان کو قتل کیا جائے گا۔ اس کو مالک وغیرہ نے نقل کیا ہے اور علماء کی اس میں چھ صورتیں ہیں۔

(۱) عورتیں اگر قتال کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ سحنون نے کہا: جنگ کی حالت میں اور جنگ کے بعد(3) ایسی عورتوں کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (ان کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ) اور عورت کے لئے جنگ میں آثار عظیمہ ہوتے ہیں مثلاً اموال سے امداد، جنگ پر ابھارنا کبھی عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، ندبہ کرتے ہوئے، ابھارتے ہوئے اور فرار پر عار دلاتے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس صورت میں ان کا قتل کرنا مباح ہے مگر جب وہ قیدی ہو جائیں تو انہیں لونڈیاں بنانا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ وہ جلدی اسلام قبول کر لیتی ہیں اور اپنے ادیان سے رجوع کر لیتی ہیں اور ان کا اپنے اوطان کی طرف بھاگ جانا مشکل ہوتا ہے بخلاف مردوں کے۔

(۲) بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچوں کے قتل سے نہی ثابت ہے کیونکہ ان پر تکلیف نہیں یعنی وہ مکلف نہیں ہیں۔ اگر بچہ

---

1۔ الکشاف، صفحہ 235، جلد 1 (مکتبۃ الاعلام الاسلامی بیروت)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب قتل النساء فی الحرب، صفحہ 423، جلد 1 (وزارت تعلیم)

مؤطا امام مالک، کتاب الجهاد، النهی عن قتل النساء والولدان، صفحہ 465 (وزارت تعلیم)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دارالفکر)

جنگ میں شریک ہو تو اسے قتل کیا جائے گا(1)۔
(۳) راہبوں کو نہ قتل کیا جائے گا نہ انہیں غلام بنایا جائے گا بلکہ ان کے اموال وغیرہ بھی چھوڑ دیئے جائیں گے جن سے وہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اہل کفر سے جدا رہیں کیونکہ حضرت ابوبکر نے حضرت یزید کو کہا تھا: اور تم ایسی قوم پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روک رکھا ہے۔ انہیں چھوڑ دو اور جو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو روک رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دو...... اگر وہ کفار کے ساتھ کنائس میں ہوں تو پھر قتل کئے جائیں گے۔ اگر عورت راہبہ بن چکی ہو تو اشہب نے کہا: اُسے نہیں ڈرایا جائے گا۔ سحنون نے کہا: راہبہ ہونا اس کے حکم کو نہیں بدلے گا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح اشہب کی روایت ہے کیونکہ وہ اس قول کے تحت داخل ہے انہیں چھوڑ دو اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روکا ہوا ہے(2)۔
(۴) اپاہج: سحنون نے کہا: ان کو قتل کیا جائے گا۔ ابن حبیب نے کہا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے احوال کا اعتبار کیا جائے گا، اگر وہ اذیت دینے والے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا ورنہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اس کے راستہ میں بیٹھنے والے ہیں وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کے حال پر وحشت نہیں ہے(3)۔
(۵) الشیوخ: مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: شیوخ (بوڑھوں) کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس پر جمہور کا نظریہ ہے اگر کوئی بوڑھا شخص ہو جو قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو نہ اس کی رائے سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور وہ دفاع کرنے والا ہو تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا ہے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں: (۱) جمہور کے قول کی مثل ہے اور دوسرا یہ ہے کہ راہب کو قتل کیا جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر نے حضرت یزید کو یہی کہا تھا اور اس قول کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس پر اجماع ہے۔ نیز یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جنگ نہیں کرتے اور نہ دشمن کی مدد کرتے ہیں۔ پس اس کا قتل کرنا جائز نہیں جیسے عورت ہے مگر ایسا بوڑھا جس کے نقصان کا خوف ہو وہ جنگ کرتا ہو یا رائے دیتا ہے یا مال دیتا ہے پھر یہ جب قیدی ہو جائے گا تو امام کو اس میں اختیار ہو گا قتل کرے، احسان کرے یا فدیہ لے یا غلام بنالے یا جزیہ کی ادائیگی پر ذمہ کا عقد کرے۔
(۶) عسفاء: مزدور لوگ اور کسان لوگ ہیں۔ مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا(4)۔ امام شافعی نے فرمایا: کسانوں، مزدوروں اور بوڑھے لوگوں کو قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں یا جزیہ ادا کریں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ رباح بن ربیع کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خالد بن ولید سے مل جاؤ اور کسی بچے اور مزدور کو قتل نہ کرنا(5)۔ حضرت عمر نے فرمایا: بچوں اور ان کسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارے لئے جنگ کھڑی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کسان کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

1۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر)    2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل النساء و الولدان، صفحہ 465 (و، ت)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 105، جلد 1 (دار الفکر)    4۔ ایضاً، صفحہ 106، جلد 1
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، فی قتل النساء، صفحہ 6، جلد 2 (و، ت)، ایضاً، حدیث 2295، سنن ابن ماجہ، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 2:** اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ سے مراد اہل مدینہ ہیں جنہیں ان سے قتال کا حکم دیا گیا تھا جوان سے قتال کریں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام مسلمانوں کو خطاب ہے ہر ایک کو حکم دیا کہ وہ ان سے جہاد کریں جو ان سے جنگ کرے۔ جب کوئی اور صورت ممکن نہ ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کیسے سورہ برأت میں بیان فرمایا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ (توبہ:123)

پہلا مقصود اہل مکہ تھے۔ پس ان سے آغاز متعین ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح فرمایا تو پھر ان سے متصل لوگوں سے جنگ تھی جو اذیت دیتے تھے حتیٰ کہ دعوت عام ہو جائے اور کلمۃ اللہ تمام آفاق میں پہنچ جائے اور کفار میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ یہ حکم قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر رکھی گئی ہے، اجر اور مال غنیمت (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی غایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔ یہ پہلی حدیث کے موافق ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَعْتَدُوْا اس کی تاویل میں وہی کہا گیا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ محکم آیت ہے اور رہے مرتد لوگ تو ان کے لئے قتل ہے یا توبہ ہے۔ اسی طرح گمراہ لوگوں کے لئے تلوار یا توبہ ہے۔ اور جس نے باطل اعتقاد کو چھپایا پھر ظاہر ہو گیا تو وہ زندیق کی طرح قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ رہے ائمہ عدل پر خوارج سے جنگ کرنا واجب ہے حتیٰ کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ایک قوم نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ جیسے حمیت، شہرت کا حصول وغیرہ بلکہ اللہ کے راستہ میں ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور مقصود دین کی سربلندی ہو اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کا اظہار ہو۔ بعض نے فرمایا: وَ لَا تَعْتَدُوْا یعنی جو تم سے نہیں لڑتا اس سے نہ لڑو، اس صورت میں تمام کفار سے جنگ کرنے کے حکم کے ساتھ یہ آیت منسوخ ہوگی۔ واللہ اعلم

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾

''اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ وہ (خود) تم سے وہاں جنگ کرنے لگیں۔ سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں۔ یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثَقِفْتُمُوْهُمْ کہا جاتا ہے ثقف یثقف ثقفا و ثقفا۔ رجل ثقف وہ شخص (2) جو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ، صفحہ 319، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کاموں کو پختہ کرتا ہے۔ اس آیت میں قیدی کو قتل کرنے پر دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ انفال میں ان شاء اللہ آئے گا۔ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ یعنی مکہ سے تم ان کو نکالو۔ طبری نے کہا: یہ خطاب مہاجرین کے لئے ہے اور ضمیر کفار قریش کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وہ فتنہ جس پر انہوں نے تمہیں ابھارا اور انہوں نے اس کے ذریعے تمہارے کفر کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا وہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مومن کو قتل کرنے سے۔ پس قتل کرنا اس پر فتنہ سے زیادہ خفیف ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ان کا اللہ سے شریک ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا اس قتل سے بڑا جرم ہے جس کی وہ تمہیں عار دلاتے ہیں (1)۔ یہ دلیل ہے کہ یہ آیت عمرو بن حضرمی کے بارے میں نازل ہوئی جب اسے واقد بن عبداللہ تیمی نے رجب (جو حرمت والا مہینہ تھا) کے آخری دن قتل کر دیا تھا جیسا کہ عبداللہ بن جحش کے سریہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ اس آیت کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: (۱) ایک یہ کہ یہ منسوخ ہے (۲) دوسرا یہ کہ یہ محکم ہے۔ مجاہد نے کہا: آیت محکم ہے کسی کے لئے مسجد حرام میں جنگ کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس سے مسجد حرام میں جنگ کی جائے (2)۔ یہ طاؤس کا قول ہے اور آیت کی نص اس کا تقاضا کرتی ہے اور دونوں قولوں میں سے یہی قول صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ الصحیح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ وہ شہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے حرام فرمایا جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک حرام (حرمت والا) ہے اس میں کسی کے لئے مجھ سے پہلے قتال حلال نہ تھا اور میرے لئے صرف دن کی ایک گھڑی حلال کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت سے قیامت تک کے لئے حرام ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: یہ آیت اس آیت فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے (4)۔ مقاتل نے کہا: اس آیت کو اس آیت وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ نے منسوخ کیا ہے پھر اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) پس حرم میں قتال سے آغاز کرنا جائز ہے اور جس سے انہوں نے حجت پکڑی وہ یہ ہے کہ سورہ براءت، سورۂ بقرہ کے دو سال بعد نازل ہوئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر خود تھا۔ کسی نے کہا: ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کر دو (5)۔

ابن خویز منداد نے کہا: وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ منسوخ ہے کیونکہ اجماع سے ثابت ہے کہ دشمن اگر مکہ پر غالب آجائے اور کہے میں تم سے جنگ کروں گا اور میں تمہیں حج سے روکوں گا اور میں مکہ سے نہیں جاؤں گا تو اس سے جنگ کرنا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ معالم التنزیل، صفحہ 235، جلد 1 (دار الفکر)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ، صفحہ 437، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
5۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، صفحہ 614، جلد 2 (وزارت تعلیم)

واجب ہے اگرچہ وہ قتال (جنگ) کا آغاز نہ بھی کرے مکہ اور دوسرے شہر برابر ہیں اس کی تعظیم کے لئے اسے حرام کیا گیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو فتح مکہ کے دن بھیجا اور فرمایا: تلوار سے ان کو کاٹ دے حتیٰ کہ تم مجھے صفا پر ملو۔ حتیٰ کہ حضرت عباس آئے اور کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش ختم ہو گئے آج کے بعد کوئی قریش نہیں۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا اس کی تعظیم کی خاطر فرمایا: اس کی گری پڑی چیز کوئی نہ اٹھائے مگر (1) وہ جو اعلان کروائے مکہ میں گری پڑی چیز اور کسی دوسرے شہر میں برابر ہے اور یہ آیت وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کے ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے۔

ابن عربی نے کہا: میں بیت المقدس میں...... اللہ اسے پاک کرے...... ابوعقبہ حنفی زنجانی کے مدرسہ میں آیا اور قاضی زنجانی نے ہمیں جمعہ کے دن درس دیا۔ ہم اس کیفیت میں تھے کہ ایک خوبصورت شکل والا شخص آیا، اس کی پیٹھ پر پرانے کپڑے تھے اس نے علماء کی طرف سلام کیا اور چرواہوں کے لباس کے ساتھ صدر مجلس بن کر بیٹھ گیا۔ قاضی زنجانی نے کہا: سردار کون ہے؟ اس نے کہا: وہ شخص کہ کل جس سے شاطر نے مال چھینا تھا اور میرا ارادہ اس حرم مقدس کا تھا۔ میں اہل صاغان کے طالبعلموں میں سے ہوں۔ قاضی نے جلدی سے کہا: اس سے سوال کرو...... عادت کے مطابق علمائے اکرام میں ان سے جلدی سے سوال کئے جاتے ہیں کافر کے مسئلہ پر قرعہ نکلا۔ جب وہ حرم میں پناہ لے تو کیا اسے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ اس نے فتویٰ دیا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کی دلیل پوچھی گئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ اور ولا تقتلوھم ولا تقاتلوھم بھی پڑھا گیا ہے اگر ولا تقتلوھم پڑھا جائے تو مسئلہ واضح ہے اور اگر ولا تقاتلوھم پڑھا جائے تو یہ تنبیہ ہے کیونکہ جب جنگ سے منع فرمایا جو قتل کا سبب ہے تو یہ قتل سے نہی پر ظاہر، واضح دلیل ہو گی اس پر قاضی نے امام شافعی اور امام مالک کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اعتراض کیا اگرچہ قاضی ان کے مسلک کا قائل نہیں تھا...... عادت کے مطابق...... اس نے کہا: یہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے۔ صاغانی نے کہا: یہ قاضی کے منصب اور اس کے علم کے مناسب نہیں۔ یہ آیت جو آپ نے پیش کی ہے وہ تمام جگہوں میں ہے اور جس سے تو نے حجت پکڑی ہے وہ خاص ہے، کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عام، خاص کو منسوخ کرتا ہے۔ قاضی زنجانی مبہوت ہو گیا۔ یہ بدیع الکلام سے ہے (2)۔ ابن عربی نے کہا: اگر کافر حرم میں پناہ لے تو اس کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ نص قرآنی اور سنت ہے اس میں قتال منع ہے۔ رہزانی اور قاتل اس پر حد قائم کرنا ضروری ہے مگر کافر جنگ کا آغاز کرے تو نص قرآنی کی وجہ سے اسے قتل کیا جائے گا (3)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے جو ابن خطل اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے حجت پیش کی ہے، اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ اس وقت ہوا تھا جب مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حلال کیا گیا تھا۔ یہ دار حرب اور دار کفر تھا۔ جس گھڑی میں مکہ حلال کیا گیا تھا اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اہل مکہ میں سے جن کا خون بہانا چاہتے تھے جائز تھا۔ پس ثابت ہوا کہ پہلا قول صحیح ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، عام الفتح، صفحہ 617، جلد 2

2۔ احکام القرآن، صفحہ 107، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

**مسئلہ نمبر 4:** بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ امام پر بغاوت کرنے والا الحکم میں کافر کے خلاف ہے۔ کافر جب قتال کرے تو اسے ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور باغی جب قتال کرے تو دفاع کی نیت سے اس سے جنگ کی جائے گی۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور زخمیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ باغیوں کے احکامات سورۂ الحجرات میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنِ انْتَهَوْا اگر وہ ایمان لانے کے ساتھ جنگ سے رک جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے سب گناہ معاف کر دے گا اور ان میں سے ہر ایک پر جرموں سے عفو کے ساتھ رحم فرمائے گا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (انفال: 38) (اس کا بیان آگے آئے گا)۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قٰتِلُوْهُمْ یہ ہر جگہ ہر مشرک سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس کے قول کے مطابق جو اسے ناسخ دیکھتا ہے اور جو اسے غیر ناسخ کہتا ہے وہ کہتا ہے: اس کا معنی ہے ان سے لڑو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ اگر وہ تم سے لڑیں، پہلا قول اظہر ہے۔ یہ مطلق قتال کا امر ہے اس میں کفار کے آغاز کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (دین اللہ کے لئے ہو جائے)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا یہ کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔(1) یہ آیت اور حدیث دلالت کرتی ہیں کہ قتال کا سبب کفر ہے کیونکہ فرمایا: حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے) یعنی کفر نہ رہے۔ جہاد کی غایت کفر کا نہ ہونا بیان فرمائی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس قتادہ، ربیع، سدی وغیرہم نے فرمایا: یہاں فتنہ سے مراد شرک اور وہ تمام چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی اذیت کا باعث تھیں (2)۔ فتنہ کا اصل معنی اختیار اور امتحان ہے۔ یہ فتنت الفضة سے ماخوذ ہے جب تو چاندی کو آگ میں ڈالے تاکہ ردی، عمدہ سے علیحدہ ہو جائے، اس کے محاصل کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا اگر وہ کفر سے رک جائیں، اسلام قبول کرنے کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا جزیہ ادا کرنے کے ساتھ، یہ اہل کتاب کے حق میں ہے۔ اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔ کفر سے باز آ جائیں تو فبہا ورنہ قتل کئے جائیں گے۔ یہ ظالم ہیں ان پر ہی تعدی ہوگی۔ ظالموں کی سزا کو عدوان (تعدی) سے تعبیر فرمایا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل استقبال القبلة، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کیونکہ وہ ان کی تعدی (ظلم) کی سزا ہے کیونکہ ظلم اپنے ضمن میں عدوان کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عدوان کی جزا کو بھی عدوان کہا گیا۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40)، الظالمون، دونوں تاویلوں میں سے ایک تاویل پر۔ جس نے قتال سے آغاز کیا۔ اور دوسری تاویل پر جو کفر اور فتنہ پر باقی رہا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے۔ تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ اس سے پہلے اَلشَّهْرُ کا اشتقاق گزر چکا ہے اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو حضرات ابن عباس، قتادہ، مجاہد، مقسم، سدی، ربیع اور ضحاک وغیرہ سے روایت کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ عمرة القضاء اور حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے نکلے حتیٰ کہ ذی القعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفار قریش نے بیت اللہ کی طرف جانے سے روک دیا۔ آپ واپس آ گئے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ مکہ میں ضرور داخل ہوں گے۔ پس آپ سات ہجری کو مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے عمرہ کی قضا کی تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حسن سے مروی ہے کہ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا تجھے شہر حرام میں قتال سے منع کیا گیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پس مشرکین نے حرمت والے مہینے میں جنگ کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ اس مہینہ میں قتال کو حلال کریں تو آپ ان سے قتال کریں (2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان کی موافقت کو مباح کیا۔ پہلا قول مشہور ہے اور اکثر علماء کی رائے اسی پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، الحرمات جمع ہے حرمةٌ کی جیسے الظلمة کی جمع الظلمات ہے۔ حجرة کی جمع حجرات ہے حرمات جمع ذکر فرمایا کیونکہ شہر حرام کی حرمت، بلد حرام کی حرمت، احرام کی حرمت مراد لی ہے۔ الحرمة کا مطلب جس کے توڑنے سے منع کیا گیا ہو۔ القصاص کا معنی المساوات ہے یعنی میں نے تمہارے لئے ان سے برابری کر دی ہے۔ انہوں نے تمہیں چھ ہجری میں روکا تو تم نے سات ہجری میں عمرہ قضا کیا۔ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ ما قبل سے متصل ہے اور اس کے متعلق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی کلام سے جدا ہے۔ یہ ابتداء اسلام میں تھا جو تیری حرمت کو تار تار کرتا تو اس سے اتنا بدلہ لے سکتا تھا جتنی اس نے تجھ پر زیادتی کی ہوتی تھی پھر یہ قتال کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 111، جلد 1 (دار الفکر)

طائفہ نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے درمیان تعدی اور جنایات میں سے جو اس آیت میں شامل ہیں وہ منسوخ نہیں ہیں جس کے مال میں یا زخم کے اعتبار سے ظلم کیا گیا ہو اس کے لئے اتنی تعدی (زیادتی) کرنا جائز ہے جو اس پر کی گئی ہے جب کہ اس کے لئے زیادتی ظاہر ہو جائے۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اپنی زیادتی کا بدلہ لینے میں کچھ نہیں ہوگا (یعنی اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ امام شافعی وغیرہ کا قول ہے یہ امام مالک کے مذہب کی روایت ہے۔ امام مالک کے اصحاب میں سے ایک طائفہ نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ قصاص (بدلہ) کا امر حکام پر موقوف ہے اور اموال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد شامل ہے۔ امانت اسے ادا کرو جس نے تمہیں امین بنایا اور جس نے تم سے خیانت کی تم اس سے خیانت نہ کرو (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ پس جس کو خیانت کرنے والے نے امین بنایا ہو اسے اس کے ساتھ خیانت کرنا جائز نہیں اور جس نے اسے امین بنایا ہے اس کا حق اسے پہنچائے۔ یہ مشہور مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے انہوں نے اسی حدیث کو دلیل بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء: 58) (بے شک اللہ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں)۔ یہ عطا خراسانی کا قول ہے۔ قدامۃ بن الہیثم نے کہا: میں نے عطا بن میسرہ خراسانی سے سوال کیا، میں نے ان سے پوچھا: میرا ایک شخص پر حق ہے، جس کا اس نے مجھ پر انکار کیا ہے اور میرے لئے دلیل پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیا میں اس کے مال سے اپنے مال کے برابر لے لوں؟ عطا نے کہا: تم بتاؤ اگر وہ تیری لونڈی سے جماع کرتا تو تو جانتا ہے جو تو کرتا۔

میں کہتا ہوں: صحیح اس کا جواز ہے جیسے ہی اپنے حق کو حاصل کرے جبکہ تو چور شمار نہ ہو۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے اس کو داؤدی نے امام مالک سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے یہ خیانت نہیں ہے یہ تو اپنے حق کو پانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو (2)۔ ظالم سے حق لینا یہ اس کی مدد کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند بنت عتبہ، ابوسفیان کی بیوی کو کہا: جب اس نے کہا تھا۔ ابوسفیان کنجوس آدمی ہے مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے لئے کافی ہو اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو مگر یہ کہ میں اس کے مال سے اس کے علم کے بغیر لے لوں، کیا مجھ پر مال لینے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو معروف طریقہ سے اتنا لے لے جو تجھے کافی ہو اور تیری اولاد کو کافی ہو (3)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے لینا مباح قرار دیا مگر وہ اتنی مقدار ہے جو اس کے لئے ضروری ہو۔ یہ تمام صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو لیکن اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی)۔ یہ اختلاف کی صورت میں قطعی حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں اختلاف ہے کہ جو اپنے مال کی جنس کے علاوہ مال حاصل کرنے پر کامیاب ہو جائے۔ بعض

1۔ سنن ابی داؤد، باب البیوع، فی الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ، صفحہ 142، جلد 2 (و،ت)
ایضاً، حدیث 3968، جامع ترمذی، حدیث 1183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، فی المظالم والقصاص، صفحہ 330، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، کتاب النفقات، صفحہ 808، جلد 2

علماء نے فرمایا: وہ نہ لے مگر حاکم کے حکم سے۔ امام شافعی کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں: اصح لے لینا ہے انہوں نے اسے اس پر قیاس کیا ہے اگر وہ اپنے مال کی جنس سے حاصل کرنے پر قادر ہو۔ دوسرا قول ہے کہ وہ نہ لے کیونکہ وہ اس کے مال کی جنس کے خلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو اس کے خصم پر ہے اس کی قیمت کا قصد کرے اور اس کی مقدار لے لے یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے دلیل سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** ہم اس لینے پر فرعی مسائل نکالتے ہیں۔ کیا اس پر خود قرض وغیرہ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام شافعی نے فرمایا: نہیں، بلکہ جو اس کا اس پر ہے وہ لے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مقروض کو مفلس قرار دیا گیا ہو تو اس کے لئے دوسرے غرباء کے ساتھ جو حاصل ہو گا اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی قیاس ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ یہ عموم متفق علیہ ہے، خود لینا ممکن ہو تو خود لے لے یا حکام کے ذریعے لے لے۔ لوگوں کا بدلہ لینے میں اختلاف ہے۔ کیا بدلہ کو عدوان کہا جائے گا یا نہیں جس نے کہا: قرآن میں مجاز نہیں ہے۔ فرمایا: مقابلہ عدوان ہے اور وہ مباح عدوان ہے جیسا کہ کلام عرب میں مجاز مباح کذب ہے۔ کیونکہ کہنے والے کا قول ہے: فقالت له العينان سمعاً و طاعة . . . ۔ اس کی آنکھوں نے اسے کہا ہم سنیں گی اور اطاعت کریں گی۔ اسی طرح قول ہے: امتلأ الحوض وقال قَطْنِي۔ حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے کافی ہے۔ اسی طرح جملہ ہے: شكا إليّ جملي طول السرى۔ میرے اونٹ نے مجھ سے طویل چلنے کی شکایت کی۔

یہ معلوم شدہ ہے کہ یہ اشیاء بولتی نہیں ہیں اور جھوٹ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق اس کی حقیقت کے خلاف خبر دینا۔ اور جنہوں نے کہا: قرآن میں مجاز ہے، انہوں نے اسے مجاز کے طریق پر عدوان کا نام دیا۔ کلام کا مقابلہ اس کی مثل ہے۔ جیسے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

الا لا يجهلن احد علينا　　فنجهل فوق جهل الجاهلينا

خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم اس کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اسی طرح ایک اور نے کہا:

ولی فرس للحلم بالحلم ملجم　　ولی فرس للجهل بالجهل مسرج

میرے لئے ایک گھوڑا حلم کے لئے ہے جسے حلم کی لگام دی گئی ہے اور ایک جہالت کا گھوڑا ہے جسے جہالت کی زین پہنائی گئی ہے۔

و من رام تقويمي فانی مقوم　　و من رام تعويجي فانی معوج

جس نے میری تقویم کا ارادہ کیا تو میں مقوم (سیدھا کیا گیا) ہوں اور جس نے میرے ٹیڑھے پن کا ارادہ کیا تو میں ٹیڑھا ہوں۔ اس کی مراد ہے: میں جاہل اور ٹیڑھے شخص کو بدلہ دیتا ہوں۔ وہ اپنی جہالت اور ٹیڑھے پن سے مدح نہیں کر رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس نے کوئی حیوان یا سامان ضائع کر دیا جس کا نہ کیل کیا

جاتا ہے نہ وزن کیا جاتا ہے۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: اس پر اس کی مثل ہے قیمت کی طرف نہیں پھیرا جائے گا مگر مثل کے نہ پائے جانے کے وقت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) (اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔)

علماء فرماتے ہیں: یہ تمام اشیاء میں عام ہے اور انہوں نے اس سے تائید حاصل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ کے گھر ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا تھا جس نے دوسری زوجہ محترمہ کا پیالہ توڑا تھا اور صحیح پیالہ واپس کیا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: برتن کے بدلے برتن اور کھانے کے بدلے کھانا ہے (1)۔ اس حدیث کو ابو دوٗد نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا دوسری سند میں ہے ہمیں محمد بن مثنیٰ نے بتایا: انہوں نے کہا: ہمیں خالد نے بتایا انہوں نے حمید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی زوجہ محترمہ کے پاس تھے۔ تو دوسری امہات المومنین میں سے کسی نے اپنے خادم کے ساتھ ایک پیالہ بھیجا جس میں کوئی کھانا تھا۔ فرمایا: جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اس نے ہاتھ مارا اور پیالہ توڑ دیا۔ حضرت ابن مثنیٰ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ٹکڑے لئے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور اس میں کھانے کو جمع کرنا شروع کر دیا اور فرمایا: تمہاری ماں نے غیرت کی ہے۔ حضرت ابن مثنیٰ نے یہ زائد بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ۔ پس حاضرین مجلس نے وہ کھانا کھایا حتیٰ کہ جس نے وہ پیالہ توڑا تھا وہ اپنا وہ پیالہ لے آئی جو اس کے گھر میں موجود تھا۔

پھر ہم مسدد کی حدیث کے الفاظ کی طرف لوٹتے ہیں۔ فرمایا: کھاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خادم اور پیالے کو روک لیا حتیٰ کہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح پیالہ خادم کو دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ اپنے گھر میں روک لیا (2)۔ ہمیں ابو داؤد نے بتایا، فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا، فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے سفیان سے روایت کیا فرمایا: ہمیں فلیت عامری نے بتایا، ابو داؤد نے کہا: یہ افلت بن خلیفہ ہے انہوں نے جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے کوئی ایسا کھانا تیار کرنے والا نہیں دیکھا جو حضرت صفیہ کی طرح کھانا تیار کرتا ہو۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا پھر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ شدت غیرت کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی میں نے برتن توڑ دیا۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اس کا کیا کفارہ ہے جو میں نے کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برتن کی مثل برتن (3)، کھانے کی مثل کھانا۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے فرمایا: جس شخص پر حیوان یا سامان ہو جن کا نہ کیل کیا جاتا ہو نہ وزن کیا جاتا ہو اس کی قیمت ہو گی، مثل نہیں ہو گی...... اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو غلام کے نصف کی قیمت اپنے شریک کو دینے کو کہا جس نے غلام کا نصف آزاد کر دیا۔ آپ نے اس غلام کے نصف کی مثل کی ضمانت کا حکم نہ دیا۔ اور علماء کے درمیان کھانے، پینے والی چیزوں اور وزنی چیزوں میں مثل کی ضمانت دینے پر کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، باب فیمن افسد شیئا یغرم مثلہ، صفحہ 146، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

نے فرمایا: طعام کے بدلے طعام ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت قصاص میں برابری میں اصل ہے جس نے کسی کو جس چیز سے قتل کیا ہوگا اسے اس چیز کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ جمہور کا قول ہے جب تک کہ اس نے کسی برائی سے قتل نہ کیا ہو۔ جیسے لواطت سے قتل کیا ہو یا شراب پلا کر قتل کیا ہو تو اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ شوافع کے دو قول ہیں: اسے اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ اس صفت پر ایک لکڑی بنائی جائے گی اور وہ اس کی دبر میں ماری جائے گی حتیٰ کہ وہ بھی مر جائے اور اسے شراب کی جگہ پانی پلایا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ ابن ماجشون نے کہا: جس نے آگ یا زہر سے قتل کیا تو اس کے ساتھ قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سوا آگ کے ساتھ کوئی عذاب نہ دے (1)۔ اور زہر پوشیدہ آگ ہے۔ جمہور علماء کا خیال ہے: وہ اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا کیونکہ آیت میں عموم ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**: لاٹھی کے ساتھ قصاص لینا: امام مالک کی ایک روایت میں ہے کہ اگر لاٹھی سے قتل کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہو اور عذاب ہوتا ہو تو تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے اور ابن قاسم کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسے لاٹھی کے ساتھ قتل کیا جائے گا اگرچہ اس میں تطویل و تعذیب بھی ہو۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب اور ابن نافع نے مالک سے پتھر اور لاٹھی سے قتل کرنے والے کے متعلق روایت کیا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ جب ایک ضرب سے اس کا کام تمام ہو جائے اور اگر بہت سی ضربوں کی ضرورت ہو تو پھر نہیں۔ پتھر اور تیر نہیں مارے جائیں گے کیونکہ اس میں تعذیب ہے۔ یہ عبدالملک کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء کے اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ مماثلت (برابری) واجب ہے، مگر یہ کہ تعذیب ہوتی ہو تو پھر تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ جب کسی نے کسی کا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی اور اس نے اسے عذاب دینے کا قصد کیا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کے چرواہے کے قاتلوں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر وہ مدافعت یا لڑائی میں تھا اور قتل کر دیا تو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ ایک جماعت کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا (2)۔ یہ امام ابوحنیفہ، شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصاص نہیں ہے (3) مگر لوہے کے ساتھ اور مثلہ سے نہی کی گئی ہے۔ نیز فرمایا: آگ کے ساتھ صرف آگ کا رب ہی عذاب دے گا (4)۔

صحیح مذہب جمہور کا ہے کیونکہ ائمہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ ایک لونڈی کا سر دو پتھروں میں رکھ کر کچلا گیا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا: تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا، کیا فلاں نے کیا فلاں نے؟ حتیٰ کہ جب انہوں نے یہودی کا ذکر کیا تو اس نے سر سے (ہاں) میں اشارہ کیا۔ وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کا سر دو پتھروں

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ احکام القرآن، صفحہ 14-113، جلد 1 (دار الفکر)
3۔ سنن ابن ماجہ، باب لا قود الا بالسیف، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے درمیان کچلنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو پتھروں کے درمیان قتل کیا (1)۔ یہ صریح صحیح نص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ اور انہوں نے حدیث جابر سے جو استدلال کیا ہے وہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے وہ صحیح طریق سے مروی نہیں ہے۔ اگر صحیح ہوتی تو ہم اس کے مطابق قول کرتے۔ جب لوہے کے ساتھ قتل کرے گا تو اسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے گا اس پر حضرت انس کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ایک یہودی نے ایک بچی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلنے کا حکم دیا (2)۔ رہی مثلہ کرنے سے نہی تو بھی یہی کہتے ہیں کہ جب اس قاتل نے مثلہ نہ کیا ہو تو اس کا مثلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب وہ مثلہ کرے گا تو ہم بھی اس کا مثلہ کریں گے۔ اس پر عرنیین کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اسے ائمہ نے نقل کیا ہے۔ اور رہا یہ ارشاد کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک عذاب دے گا۔ صحیح ہے جب اس نے نہ جلایا ہو اگر اس نے جلایا ہوگا تو اسے جلایا جائے گا۔ اس پر قرآن کا عموم دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر قاتل نے جان بوجھ کر مقتول کو آگ میں ڈالا ہوگا تو اسے بھی آگ میں ڈالا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ وقار نے اپنی مختصر میں مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ یہی محمد بن عبد الحکیم کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: بہت سے اہل علم کا قول، اس شخص کے بارے میں جو کسی کا گلہ دبا دیتا ہے یہ ہے کہ اس پر قصاص ہوگا۔ امام محمد بن حسن نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: اگر اس نے گلا دبایا اور آدمی مر گیا یا اسے کنویں میں پھینکا اور وہ مر گیا یا اس نے اسے پہاڑ سے گرایا یا کسی بلند جگہ سے گرایا اور وہ مر گیا تو اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس کے عاقلہ (خاندان) پر دیت ہوگی۔ اگر وہ شخص اس جرم میں معروف ہو اس نے کئی شخصوں کا گلا دبایا ہو تو اس پر قتل ہے۔ ابن منذر نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی سے قصاص لیا جس نے بچی کا سر پتھروں سے کچلا تھا تو یہ بھی اس کے مفہوم میں ہے۔ پس امام محمد بن حسن کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہی قول امام ابوحنیفہ سے حکایت کیا گیا ہے، نقل کرنے والے نے کہا: امام ابوحنیفہ کا قول منفرد ہے۔ انہوں نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے گلا دبا کر قتل کیا ہو یا زہر دے کر قتل کیا ہو یا پہاڑ سے گرایا ہو یا کنویں میں گرایا ہو یا لکڑی کے ساتھ مارا ہو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر جس نے اس کو تیز دھار آلہ کے ساتھ یا پتھر کے ساتھ یا لکڑی کے ساتھ قتل کیا ہو وہ گلا دبانے میں معروف ہو یا پہاڑ سے گرانے میں معروف ہو تو اس کے عاقلہ پر دیت ہوگی۔ یہ ان کی طرف سے کتاب و سنت کو چھوڑنا ہے اور امت کا معاملہ جس پر قائم تھا اس میں بدعت نکالنا ہے اور یہ قصاص کو دور کرنے کا ذریعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے لئے مشروع کیا ہے۔ اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے کسی کو روکا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ عطا نے کہا: قاتل کو قتل کیا جائے گا اور روکنے والے کو قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے اسے روکا اور

1۔ صحیح مسلم، باب القسامة، صفحہ 58، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 115، جلد 1 (دار الفکر) صحیح بخاری، کتاب الخصومات باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومة، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ بھی اسے قتل کرنا چاہتا تھا تو دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی، ابو ثور، نعمان کے قول میں روکنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: عطا کا قول صحیح ہے یہ نزول قرآن کا مقتضا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب کوئی کسی شخص کو روک لے اور دوسرا اسے قتل کر دے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو روکنے والا ہو گا اسے قید کیا جائے گا(1)۔ اس حدیث کو سفیان ثوری نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو معمر اور ابن جریج نے اسماعیل سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى، الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و من یتعدّ حدود اللہ (جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔) پس جس نے تجھ پر ظلم کیا تو اپنے ظلم کی مقدار اس سے اپنا حق وصول کر لے اور جس نے تمہیں گالی دی تو اس کو اس کی مثل قول لوٹا دے۔ جس نے تیری عزت کو تار تار کیا تو بھی اس کی عزت کے ساتھ ایسا کر۔ تو اس کے والدین تک تجاوز نہ کر نہ اس کے بیٹے اور اس کے قریبی تک تجاوز کر اور تیرے لئے اس پر جھوٹ بولنا جائز نہیں اگرچہ اس نے تجھ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ معصیت کا مقابلہ معصیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اگر مثلاً اس نے تجھے کہا: اے کافر! تو بھی اسے کہہ سکتا ہے: تو کافر۔ اگر اس نے تجھے کہا: اے زانی! تو تیرا قصاص اسے یہ کہنا ہے: اے جھوٹا! جھوٹ کی گواہی دینے والا۔ اگر تو اسے اے زانی! کہے گا تو تو جھوٹا ہو گا اور جھوٹ میں تو گنہگار ہو گا۔ اگر وہ قرضہ وغیرہ کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے حالانکہ وہ غنی ہے کوئی عذر بھی نہیں ہے تو تو اسے کہہ: اے ظالم! اے لوگوں کا مال کھانے والا! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غنی کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے(2)۔ عرض سے مراد وہی ہے جو ہم نے تفسیر بیان کی ہے اور عقوبت سے مراد قید خانہ ہے جس میں اسے قید کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ اسلام کے قوی ہونے سے پہلے نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں میں سے جس کو اذیت دی جاتی تھی اسے اپنی ذات کے برابر اذیت دینے کا حکم تھا یا وہ صبر کرے یا معاف کر دے پھر اس کو اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا(3) وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (التوبہ: 36) بعض علماء نے فرمایا اس کو سلطان کی طرف لوٹانے کے ساتھ منسوخ کیا اور کسی کے لئے سلطان کی اجازت کے بغیر کسی سے قصاص لینا جائز نہیں۔

وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَ اَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں اور اچھے کام کیا کرو۔ بے شک اللہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود و الدیات، حدیث 176، صفحہ 140، جلد 3 (دار المحاسن)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، صفحہ 323، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تعالیٰ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: بخاری نے حذیفہ سے روایت کیا ہے: وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ۔ کا ارشاد خرچ کے بارے میں نازل ہوا(1)۔ یزید بن ابی حبیب نے اسلم ابو عمران سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی اور مسلمانوں کی جماعت کے جرنیل عبدالرحمن بن ولید تھے اور رومیوں نے اپنی پیٹھیں شہر کی دیوار سے لگائی ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے دشمن پر حملہ کیا تو لوگوں نے کہا: رک جا رک جا لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، یہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے کہا: سبحان اللہ۔ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی تھی اور دین کو غالب کیا تھا تو ہم نے کہا: آؤ اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور ان کی اصلاح کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اموال کی طرف متوجہ ہوں ان کی اصلاح کریں اور جہاد کو چھوڑ دیں۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اللہ کے راستہ میں ہمیشہ جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ قسطنطنیہ میں دفن ہوئے ان کی قبر مبارک بھی وہاں ہے۔ حضرت ابوایوب نے کہا: القاء بالید الی التھلکۃ کا مطلب اللہ کے راستہ میں جہاد کو ترک کرنا ہے۔ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اس کی مثل حضرات حذیفہ، حسن، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی نے یزید بن ابی حبیب سے انہوں نے اسلم ابو عمران سے یہ خبر اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ فرمایا: ہم روم کے شہر میں تھے، رومیوں نے ہماری طرف ایک بڑا لشکر نکالا مسلمانوں میں سے ان کے مقابلہ میں اتنے ہی لوگ نکلے یا ان سے بھی زیادہ تھے۔ اور اہل مصر پر عقبہ بن عامر امیر تھے اور جماعت پر فضالہ بن عبید۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رومیوں کے لشکر پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ وہ ان کے اندر داخل ہو گیا۔ لوگ چیخے اور کہا: سبحان اللہ۔ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کر رہے ہو، یہ آیت تو ہم انصار کے گروہ کے بارے نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہنے لگے ہمارے مال ضائع ہو گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور جو ضائع ہو چکا ہے اس کی اصلاح کریں تو بہتر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہماری بات کا رد نازل فرمایا۔ وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ۔ آیت میں التَّہۡلُکَۃِ سے مراد اموال کی دیکھ بھال کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اور جہاد کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابوایوب اللہ کے راستہ میں لڑتے رہے حتیٰ کہ روم کی زمین میں دفن ہوئے (2)۔ ابو عیسیٰ نے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، عکرمہ، عطاء، مجاہد اور جمہور لوگوں کا قول ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کو ترک کر دینا اور اہل و عیال کا خوف کرنا۔ ایک شخص کہتا: میرے پاس تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے (1) جسے میں خرچ کروں۔ اس معنی کی طرف امام بخاری گئے ہیں جبکہ کسی دوسرے نے ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اگرچہ تمہارے پاس تیر وغیرہ نہ بھی ہو، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: میں تو کوئی چیز نہیں پاتا (2)۔ سدی سے اسی طرح مروی ہے تم خرچ کرو اگرچہ رسی ہی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور تم کہو کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے (3)۔ تیسرا قول حضرت ابن عباس کا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو جہاد کی طرف نکلنے کا حکم دیا تو مدینہ طیبہ کے کچھ بدو لوگ ٹھہر گئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیا تیاری کریں؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو نہ زادراہ ہے اور نہ ہمیں کوئی کھلائے گا تو یہ ارشاد نازل ہوا: وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ یعنی اے خوشحال لوگو! اللہ کے راستہ میں یعنی اللہ کی طاعت میں خرچ کرو۔ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے ہاتھوں کو صدقہ سے نہ روکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح مقاتل نے کہا: حضرت ابن عباس کے قول کا معنی یہ ہے کہ صدقہ سے نہ رکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے یعنی کمزور لوگوں پر خرچ کرنے سے نہ رکو۔ کیونکہ جب وہ تم سے پیچھے رہ جائیں گے تو دشمن تم پر غالب آ جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا کیا اس سے مراد وہ شخص ہے جو لشکر پر تنہا حملہ کرتا ہے؟ حضرت براء نے کہا: نہیں بلکہ ایک شخص گناہ کرتا تھا پھر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا تھا۔ وہ کہتا تھا: میں گناہوں میں حد کو پہنچ چکا ہوں توبہ کا کوئی فائدہ نہیں وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ گناہوں میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ یہاں ہلاکت سے مراد اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا ہے۔ یہ عبیدہ سلمانی کا قول ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: اس کا معنی ہے جہاد میں بغیر زادراہ کے سفر نہ کرو۔ کچھ لوگوں نے ایسا کیا تھا تو اس عمل نے انہیں راستہ میں ہی کاٹ دیا تھا یا وہ لوگوں پر بوجھ بن گئے تھے (4)۔ یہ پانچ اقوال ہیں:

سَبِیْلِ اللّٰهِ سے یہاں جہاد مراد ہے اور لفظ تمام راستوں کو شامل ہے۔ بِاَیْدِیْكُمْ میں با زائدہ ہے۔ تقدیر عبارت تلقوا ایدیکم ہے۔ اس کی مثال الم یعلم بان اللہ یری اس میں با زائدہ ہے۔ مبرد نے کہا: بِاَیْدِیْكُمْ سے مراد نفوس ہیں۔ بعض سے کل مراد لیا ہے۔ جیسے ارشاد ہے: فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ: 30) بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ (الحج: 10) ان آیات میں ایدی اور ید سے مراد پوری ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ضرب المثل ہے تو کہتا ہے: فلان القی بیدہ فی امر کذا۔ جب کوئی امر کو تسلیم کرے۔ قتال میں شکست تسلیم کرنے والا اپنے ہتھیار اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ہر عاجز کرتا ہے خواہ وہ کسی فعل میں عاجز ہو۔ اسی سے عبدالمطلب کا قول ہے: واللہ ان القاءنا بایدینا للموت لعجز۔ اللہ کی قسم! موت کے لئے ہمارا اپنے آپ کو ڈال دینا عجز ہے۔ بعض علماء نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: لا تلقوا انفسکم بایدیکم۔ جیسے تو کہتا ہے: لا تفسد حالك برایك۔ اپنے حال کو اپنی رائے کے ساتھ خراب نہ کر۔ التهلكة لام کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، صفحہ 242، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)
3۔ معالم التنزیل، صفحہ 238، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

هلك يهلك هلاكاً وهلكاً و تهلكة کا مصدر ہے۔ یعنی اس عمل میں نہ پڑو جو تمہیں ہلاک کردے (1)۔ یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے یعنی اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو تم اللہ کی نافرمانی کرو گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے اپنے اموال کو نہ روکو کہ تم سے تمہارے علاوہ اس کے وارث بنیں ورنہ تم اپنے اموال کی منفعت سے محرومی کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ خرچ سے باز نہ آؤ ورنہ دنیا میں نعم البدل اور آخرت میں ثواب چلا جائے گا۔ کہا جاتا ہے لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ یعنی حرام مال سے خرچ نہ کرو، وہ تم پر لوٹا دیا جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ اسی طرح حضرت عکرمہ سے مروی ہے، فرمایا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ۔ فرمایا ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی) اس سے خبیث مال خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ طبری نے کہا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ عام ہے، ہر صورت جو ذکر کی گئی ہے اس کو شامل ہے کیونکہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جنگ میں گھس جاتا ہے اور اکیلا دشمن پر حملہ کر دیتا ہے، قاسم بن مخیمرہ، قاسم بن محمد اور عبد الملک (جو ہمارے علماء سے ہیں) نے فرمایا: تنہا ایک شخص کا بڑے لشکر پر حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں طاقت ہو اور نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اگر قوت نہ ہو تو یہ تهلكة (ہلاکت) سے ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اسے شہادت مطلوب ہو اور نیت خالص ہو تو اسے حملہ کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا یہی مقصود ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بیان میں فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ: 207)
(لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے (2))

ابن خویز منداد نے کہا: جو تنہا سو آدمیوں پر یا ایک لشکر پر یا چوروں کے گروہ پر یا محاربین پر یا خوارج پر حملہ کرتا ہے اس کی دو حالتیں ہیں: اگر اسے غالب گمان ہے کہ جس پر وہ حملہ کرے گا اسے قتل کر دے گا اور خود نجات پائے گا تو یہ بہتر ہے اسی طرح اگر اسے غالب گمان ہو کہ وہ شہید ہو جائے گا لیکن وہ دشمن کو سخت نقصان پہنچائے گا یا وہ انہیں آزمائش میں ڈال دے گا یا وہ کوئی ایسا اثر چھوڑے گا جس سے مسلمان نفع پائیں گے تو یہ بھی جائز ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کا جب ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کے گھوڑے ایرانیوں کے ہاتھیوں سے ڈر گئے۔ تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مٹی کا ایک ہاتھی بنایا اور اس نے اپنے گھوڑے کو مانوس کیا حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اس کا گھوڑا ہاتھی سے نہ بھاگا، اس نے اس ہاتھی پر حملہ کر دیا جو آگے آگے تھا۔ اس کو کہا گیا: یہ تجھے قتل کر دے گا، اس مسلمان نے کہا: میرا قتل ہونا کوئی نقصان نہیں جبکہ مسلمانوں کو فتح مل جائے۔ اسی طرح جنگ یمامہ میں ہوا۔ جب بنو حنیفہ ایک باغ میں محفوظ ہو گئے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: تم مجھے چمڑے کی ڈھال میں رکھو اور مجھے دشمنوں کے پاس پھینکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اس نے تنہا ان سے جہاد کیا اور ان کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

میں کہتا ہوں: اسی قسم سے ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 65-264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ احکام القرآن، صفحہ 116، جلد 1 (دار الفکر)

کہ اگر میں صبر کرتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اللہ کے راستہ میں شہید ہو جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لئے جنت ہے۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھس گیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ احد میں سات انصاریوں اور دو قریش میں تنہا تھے۔ جب دشمن قریب آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ ایک انصاری آگے بڑھا اس نے جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا پھر دشمن قریب آئے تو فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہے پھر ایک انصاری آگے بڑھا جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ آپ اسی طرح فرماتے رہے حتیٰ ساتوں آدمی شہید ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ما انصفنا اصحابنا (1) (ہم نے اپنے ساتھیوں کی قتال پر رہنمائی نہیں کی حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے) (انصَفْنَا اصحابنا) میں ایک روایت فا کے سکون اور اصحابنا با کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دوسری روایت میں فا کے فتحہ اور با کے رفع کے ساتھ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت لوٹ جائے گی اس کی طرف جو آپ کے ساتھیوں میں سے بھاگ گیا تھا۔ محمد بن حسن نے کہا: اگر ایک مسلمان شخص ہزار مشرکوں پر حملہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ اسے نجات کی غالب امید ہو یا دشمن کو قتل کرنے کی امید ہو۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو یہ عمل مکروہ ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کے لئے پیش کیا جبکہ اس میں مسلمانوں کا کوئی نفع نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد مسلمانوں کو کفار پر جرأت دلانا ہے تا کہ وہ بھی اس کی طرح عمل کریں تو اس کا جواز بعید نہیں کیونکہ اس میں بعض وجوہ کے اعتبار سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اگر اس کا قصد دشمن کو ڈرانا ہے تا کہ وہ مسلمانوں کے دین میں صلابت کو جان لیں۔ پس اس کا جواز بھی بعید نہیں ہے اور جب اس میں مسلمانوں کا نفع ہو اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دین کے اعزاز کے لئے اور کفر کی توہین کے لئے اپنی جان دیتا ہے تو یہ وہ مقام ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدح کی ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیۃ (توبہ: 111) یہ آیت اور دوسری آیات جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جان قربان کرنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی بنیاد پر ہونا چاہئے جب اسے دین کے نفع کی امید ہو وہ اس میں جان دے دے حتیٰ کہ وہ شہید کر دیا جائے تو وہ شہداء کے اعلیٰ درجات میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (لقمان) (حکم دو نیکی کا اور منع کرو برائی سے اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: شہداء میں سے افضل حمزہ بن عبد المطلب ہے اور وہ شخص ہے جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ادا کیا اور اس نے اسے شہید کر دیا (2)۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۂ آل عمران میں آئے گی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، صفحہ 107، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی، صفحہ 247، جلد 2 (وزارت تعلیم)

سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الامر بالمعروف، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 3**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَحْسِنُوْا طاعت میں خرچ کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہتر بدل عطا کرنے میں اچھا گمان کرو بعض علماء نے فرمایا: طاعات کی پیروی کرنے کے ساتھ اپنے اعمال میں اچھائی کرو یہ مفہوم بعض صحابہ سے مروی ہے۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

"اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈا لے) تو وہ فدیہ دے دے روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس (روزے) ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: علماء کا حج و عمرہ اللہ کے لئے مکمل کرنے کے مرادی معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: حج و عمرہ کا اللہ کی رضا کے لئے ادا کرنا ہے، جیسے ارشاد ہے: فَاَتَمَّهُنَّ (انہیں ادا کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَى الَّیْلِ (البقرہ: 187) پھر تم رات تک روزہ رکھو، یہ مفہوم ان علماء کے نزدیک ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے عمرہ کو واجب نہیں کیا انہوں نے فرمایا: حج اور عمرہ شروع کرنے کے بعد انہیں مکمل کرنا مراد ہے جس نے عبادت (حج یا عمرہ) کا احرام باندھا اس پر اس کو مکمل کرنا واجب ہے وہ اسے فسخ نہ کرے۔ شعبی اور ابن زید نے یہی مفہوم بیان کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تم اپنے اہل کے گھر سے دونوں کا احرام باندھو۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہی مروی ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے یہی کہا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تو ان کا قصد کر کے نکلے، تجارت یا کوئی غرض نہ ہو۔ اس قول کو لِلّٰهِ کا قول تقویت دیتا ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: ان کا اتمام یہ ہے کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔ تمتع اور قران نہ کیا جائے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا اتمام یہ ہے کہ اس میں تم وہ عمل نہ کرو جو تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ وہ احرام میں شرک کرتے تھے وہ تلبیہ اس طرح کہتے تھے: لبیك اللھم لبیك لا شریك لك اِلّا شریکاً ھو لك تملکه و ما ملك (اے اللہ! میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شرک بھی تیرے لئے ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی مالک ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج و عمرہ کو مکمل کرو اور ان کے ساتھ کسی اور شے کو نہ ملاؤ۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے اور جو حضرت عمران بن حصین نے احرام میں ان مواقیت سے پہلے کیا جن کو رسول اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود اور متقدمین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ایلیاء سے احرام باندھا تھا۔ حضرات اسود، علقمہ، عبدالرحمن اور ابو اسحق نے اپنے گھروں سے احرام باندھا تھا۔ امام شافعی نے اس میں رخصت دی ہے۔ ابو داؤد، دارقطنی نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے بیت المقدس سے حج یا عمرہ کا احرام باندھا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جس طرح وہ اس دن تھا جس دن والدہ نے اسے جنم دیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ وکیع پر رحم فرمائے انہوں نے بیت المقدس سے مکہ تک احرام باندھا تھا۔ اس میں میقات سے پہلے احرام باندھنے کی اجازت ہے۔ امام مالک نے میقات سے پہلے احرام باندھنے کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی مروی ہے۔ انہوں نے حضرت عمران بن حصین پر انکار کیا تھا جنہوں نے بصرہ سے احرام باندھا تھا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عمر پر انکار کیا تھا جبکہ انہوں نے میقات سے پہلے احرام باندھا تھا۔

امام احمد اور اسحاق نے کہا: عمل کی وجہ مواقیت ہیں۔ اس قول کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواقیت کو متعین فرمایا اور ان کی تعیین فرمائی، پس یہ حج کے اجمال کے لئے بیان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حج کا احرام اپنے گھر سے نہیں باندھا تھا بلکہ اس میقات سے باندھا تھا جو اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا تھا اور جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا وہی افضل ہے۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح جمہور صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے کہا: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی وجہ سے پہلے باندھنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا (3)، اور حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے نیز صحابہ کرام سے جو میقات سے پہلے احرام باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حجت پکڑی ہے حالانکہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میقات سے حج کے احرام باندھنے

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، من اھل بعمرة من بیت المقدس، صفحہ 222 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، قول النبی یسروا ولا تعسروا، صفحہ 904، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے وقت موجود تھے انہوں نے اس کی مراد و مقصود کو پہچانا تھا اور انہیں علم تھا کہ میقات سے احرام باندھنا امت پر آسانی کرنے کے لئے تھا۔

**مسئلہ نمبر 2:** ائمۃ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ کو، اہل شام کے لئے جحفہ کو، اہل نجد کے لئے قرن کو، اہل یمن کے لئے یلملم کو میقات مقرر کیا اور یہ میقات ان لوگوں کے لئے ہیں اور جو دوسرے شہروں سے ان مواقیت پر آئے جو حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہو۔ اور اس کے علاوہ علاقوں کے لوگ جہاں سے چاہیں احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں (1)۔ اہل علم کا اس حدیث کے ظاہر قول پر اور اس کے استعمال پر اجماع ہے اس میں سے کسی چیز پر اختلاف نہیں ہے اور اہل عراق کے میقات میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے اس کا میقات مقرر فرمایا۔ ابوداؤد، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مشرق کے لئے العقیق کو میقات مقرر کیا (2)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا (3)۔ صحیح ہے۔ اور جنہوں نے روایت کیا کہ حضرت عمر نے عراق کے لئے میقات مقرر کیا...... اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے دور میں عراق فتح ہوا...... یہ ان کی غفلت ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا میقات مقرر کیا جس طرح اہل شام کے لئے جحفہ کو مقرر کیا اور شام اس وقت دار کفر تھا جس طرح عراق اور دوسرے شہر دار کفر تھے۔ عراق اور شام حضرت عمر کے عہد میں فتح ہوئے تھے۔ اس میں سیرت نگاروں کا کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے کہا: ہر عراقی یا مشرقی ذات عرق سے احرام باندھے گا تمام کے نزدیک وہ اپنے میقات سے احرام باندھنے والا ہوگا اور العقیق علماء کے نزدیک ذات عرق سے احوط اور اولیٰ ہے اور ذات عرق بالاجماع عراقیوں کا میقات ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھا وہ محرم ہے اور جو علماء میقات سے احرام باندھنے کو افضل قرار دیتے ہیں وہ میقات سے پہلے احرام باندھنے سے منع کرتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے نفس پر اس چیز میں تنگی نہ کریں جو اللہ نے اس پر وسیع فرمائی ہے اور احرام میں کوئی بدعت نہ کرے۔ لیکن تمام کے نزدیک جو میقات سے پہلے احرام باندھے گا اس پر احرام لازم ہوگا کیونکہ اس نے زیادتی کی نہ کہ کمی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت میں عمرہ کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اتمام کا حکم دیا ہے جس طرح حج کے اتمام کا حکم دیا ہے۔ صبی بن معبد نے کہا: میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ میں نے کہا: میں نصرانی تھا پھر میں نے اسلام قبول کیا، میں نے حج اور عمرہ کو اپنے اوپر فرض پایا ہے۔ میں نے دونوں کا احرام باندھا ہے۔ حضرت عمر نے اسے فرمایا: تجھے اپنے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، مهل اهل مكة للحج والعمرة، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی مواقیت الاحرام لاهل الآفاق، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، فی المواقیت، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نبی کی سنت کی ہدایت دی گئی ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت عمر نے اس کے قول (میں نے اپنے اوپر حج اور عمرہ کو فرض پایا ہے) پر انکار نہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس نے ان کے وجوب کا قول کیا ہے۔ دارقطنی نے ابن جریج سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: مجھے نافع نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے اللہ کی مخلوق میں سے کوئی نہیں ہے مگر اس پر حج اور عمرہ واجب ہیں جو ان کی طرف جانے کے راستہ کی طاقت رکھتا ہے(1) اور تابعین میں سے جو عمرہ کے وجوب کے قائل ہیں وہ یہ ہیں۔ حضرات عطا، طاؤس، مجاہد، حسن، ابن سیرین، شعبی، سعید بن جبیر، ابو بردہ، مسروق، عبداللہ بن شداد، شافعی، احمد، اسحاق، ابو عبید، ابن الجہم (مالکیوں میں سے) ثوری نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ وہ عمرہ واجب ہے۔ زید بن ثابت سے حج سے پہلے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: دو نمازیں ہوں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے تو آغاز کرلے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ محمد بن سیرین عن زید بن ثابت کے سلسلہ سے مرفوع حدیث مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے چاہے آغاز کرلے(2)۔ امام مالک فرماتے تھے، عمرہ سنت ہے اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو چھوڑنے کی رخصت دی ہو۔ یہ نخعی اور اصحاب رائے کا قول ہے جو ابن منذر نے حکایت کیا ہے بعض قزوینی اور بغدادی علماء نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اسے حج کی طرح واجب کہتے تھے اور یہ سنت ثابتہ ہے(3)۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ کا قول ہے۔

دارقطنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں محمد بن قاسم بن زکریا نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن العلاء ابو کریب نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبدالرحیم بن سلیمان نے بیان کیا انہوں نے حجاج سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بیان کیا، فرمایا: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں پوچھا کیا یہ واجب ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے عمرہ کے متعلق پوچھا کیا یہ واجب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اور تیرا عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے۔ اس حدیث کو یحییٰ بن ایوب نے حجاج اور ابن جریج سے انہوں نے ابن المنکدر سے انہوں نے حضرت جابر سے موقوف روایت کی ہے(4) یعنی یہ حضرت جابر کا قول ہے۔ یہ ان علماء کی حجت ہے جو عمرہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ سنت کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اس آیت میں وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اتمام کے وجوب میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا ہے نہ کہ آغاز کے وجوب کے اعتبار سے ملایا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کی ابتدا کا ذکر کیا تو فرمایا: **وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ** (البقرہ: 43) اور حج کے ایجاب کا ذکر ابتداً فرمایا **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ** (آل عمران: 97) جب عمرہ کا ذکر فرمایا تو اس کے اتمام کا مکمل کرنا واجب ہے۔ آیت کریمہ اتمام کے الزام کے لئے ہے نہ کہ ابتدا کے الزام کے لئے آئی ہے(5)۔ واللہ اعلم۔۔۔۔ مخالف نے نظر کی جہت سے اس کے وجوب پر یہ دلیل دی ہے کہ حج کا رکن عرفات میں ٹھہرنا ہے اور عمرہ میں وقوف نہیں ہے اگر یہ حج کی سنت کی طرح ہوتا تو افعال میں اس کے مساوی کرنا واجب ہوتا، جس طرح نماز کی سنت

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 2 (قاہرہ) 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
4۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 1 (قاہرہ) 5۔ احکام القرآن، صفحہ 19-118، جلد 1 (دار الفکر)

افعال میں اس کی فرضیت کے مساوی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** شعبی اور ابوحیوہ نے العمرۃ کو تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی اس کے عدم وجوب کی دلیل ہے اور جماعت نے العمرۃ کو تا کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ وجوب کی دلیل ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں واتموا الحج و العمرۃ الی البیت للہ ہے اور ان سے اقیموا الحج والعمرۃ الی البیت (1) بھی مروی ہے۔ لِلّٰہِ کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ عرب حج کا قصد اجتماعیت، تعاون، مقابلہ، تنافر، قضاء حاجت اور بازاروں میں جانے کے لئے کرتے تھے۔ ان سب میں اللہ کے لئے اطاعت نہیں ہے اور اس ارادہ کا کوئی حصہ نہیں ہے اور عقیدہ کے اعتبار سے کوئی قربت نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی اور اللہ کے حق کی ادائیگی کے لئے قصد کرنے کا حکم دیا پھر تجارت کی بھی اجازت فرمادی جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف نہیں جو مناسک حج میں حاضر ہو جبکہ اس نے حج اور عمرہ کی نیت نہ کی ہو..... قلم اس کے حق میں اور اس کے خلاف جاری ہے..... اس کا بغیر نیت اور قصد کے ان مقامات پر آنا اسے کچھ مفید نہیں ہے..... نیت کرنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَتِمُّوا اور عبادت کے تمام سے نیت کا حضور بھی ہے یہ احرام کے وقت احرام کی طرح فرض۔ ۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوئے تو کہا: لبیك بحجة و عمرة معاً۔(2) جیسا کہ آگے آئے گا۔

ربیع نے بویطی کی کتاب میں امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: اگر کسی نے تلبیہ کہا اور حج اور عمرہ کی نیت نہیں کی تو وہ حج اور عمرہ کرنے والا نہ ہوگا اور اگر نیت کی اور تلبیہ نہ کہا حتیٰ کہ تمام مناسک پورے کر دیئے تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے حجت پکڑی ہے: انما الاعمال بالنیات۔(3) فرمایا: جس نے اس طرح کہا جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا تھا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر احرام باندھا تھا تو یہ نیت درست ہے کیونکہ یہ غیر کی نیت پر واقع ہوا ہے جو پہلے ہو چکی ہے بخلاف نماز کے۔

**مسئلہ نمبر 7:** علماء کا مراہق اور غلام کے بارے میں اختلاف ہے یہ جو حج کا احرام باندھتے ہیں پھر مراہق بالغ ہو جاتا ہے، غلام آزاد ہو جاتا ہے اور یہ وقوف عرفہ سے پہلے ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ان دونوں کو احرام کھولنے کی اجازت نہیں اور نہ کسی اور کو یہ اجازت ہے۔ امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اور جس نے احرام کو کھولا اس کا حج اور عمرہ مکمل نہ ہوا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جب بچہ وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ احرام کو نئے سرے سے باندھے۔ اگر اس نے اپنے حج کو جاری رکھا تو یہ فرض حج کی طرف سے جائز نہ ہوگا اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب اس کا حج جائز نہ تھا اور نہ اس کو فرض لازم تھا۔ جب اس نے حج کا احرام باندھا تھا پھر اس کو حج لازم ہو گیا جب وہ بالغ ہوا تو اس کے لئے اس فرض کو چھوڑنا محال ہو گیا جو اس پر متعین ہو چکا ہے، نوافل کا ادا کرنا اور فرض کو

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، باب القران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، بدأ الوحی، صفحہ 2، جلد 1 (وزارت تعلیم)

چھوڑنا محال ہے، جس طرح کوئی شخص نوافل میں داخل ہوا پھر فرضوں کی جماعت کھڑی ہوگئی اور اسے فرض کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ نوافل کو توڑ دے اور فرض میں داخل ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: جب بچہ احرام باندھے پھر وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ اسی احرام کے ساتھ عرفات میں ٹھہرا تو اس کا یہ حج فرض ادا ہو جائے گا اور اسی طرح غلام کا حکم ہے۔ فرمایا: اگر مزدلفہ میں آزاد ہوا اور بچہ مزدلفہ میں بالغ ہوا تو وہ دونوں آزادی اور بلوغ کے بعد عرفہ کی طرف لوٹ آئیں پھر وہ طلوع فجر سے پہلے عرفہ کے وقوف کو پالیں تو ان کا فرض حج ادا ہو جائے گا اور ان پر بکری لازم نہ ہوگی اور اگر وہ احتیاطاً بکری وغیرہ دے دیں تو میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ میرے نزدیک واضح نہیں ہے، اور احرام کی تجدید کو ساقط کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کیونکہ جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ یمن سے حج کا احرام باندھ کر آئے تھے تم نے کیسا احرام باندھا ہے۔؟ حضرت علی نے کہا: میں نے کہا: لبیك اللهم باهلالٍ کاهلال نبیّكَ۔ اے اللہ! میں نے تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام جیسا احرام باندھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے اور میں ہدی (بکری یا اونٹ) ساتھ لایا ہوں (1)۔ امام شافعی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کا انکار نہ کیا اور انہیں حج مفرد یا حج تمتع یا حج قران کی نئی نیت کرنے کا حکم فرمایا۔ امام مالک نے اس نصرانی کے بارے میں فرمایا جو عرفہ کی شام کو اسلام قبول کرتا ہے پھر وہ حج کا احرام باندھتا ہے تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح غلام آزاد ہو جائے، بچہ بالغ ہو جائے جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے نہ ہوں اور ان میں سے کسی پر بکری لازم نہ ہوگی...... بکری اس پر لازم ہوتی ہے جو حج کا ارادہ کرے اور میقات سے احرام نہ باندھے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: غلام پر بکری لازم ہے وہ اس آزاد کی مانند ہے جو میقات سے تجاوز کر گیا۔ بخلاف بچے اور نصرانی کے ان پر دخول مکہ کے لئے احرام لازم نہ تھا کیونکہ ان پر فرض ساقط تھا جب کافر مسلمان ہوا، بچہ بالغ ہو تو ان کا حکم مکی کے حکم کی طرح ہے۔ میقات کو ترک کرنے کی وجہ سے ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: ابن عربی نے کہا یہ آیت انتہائی مشکل ہے اور علماء کو عاجز کر دینے والی آیت ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی اشکال نہیں ہے ہم اس کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ ہم کہتے ہیں: احصار کا معنی اس وجہ سے روکنا ہے جس کا تو قصد کئے ہوئے ہے خواہ وہ کسی عذر سے ہو، خواہ دشمن روک لے یا ظالم بادشاہ روک لے، یا مرض روک لے یا کوئی اور وجہ ہو۔ علماء کا مانع کی تعیین میں اختلاف ہے۔ علماء کے دو قول ہیں: (1) حضرت علقمہ، حضرت عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا: مانع مرض ہے، دشمن نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: صرف دشمن ہے۔ یہ حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر، حضرت انس اور امام شافعی کا قول ہے، ابن عربی نے کہا: یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے۔ اکثر اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ اُحْصِرَ کا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من اهل فی زمن النبی، صفحہ 211، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر)　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

معنی ہے: اس کو مرض لاحق ہوئی اور حصر کا مطلب ہے: اس پر دشمن نازل ہوا (1)۔
میں کہتا ہوں: ابن عربی نے جو حکایت کیا ہے کہ یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے، یہ صرف اشہب کا قول ہے باقی تمام اصحاب مالک نے اس میں مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: احصار سے مراد مرض کا روک لینا ہے اور رہا دشمن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: حصر حصرا فهو محصور۔ یہ الباجی کا المنتقی میں قول ابو اسحاق۔ زجاج نے حکایت کیا ہے کہ تمام اہل لغت کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا: احصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) حُصِرَ (دشمن کے ذریعے روکا گیا (2)) ابن فارس کی مجمل میں اس کے برعکس ہے۔ فحصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) احصر (دشمن کے ذریعے روکا گیا)
ایک طائفہ نے کہا: دونوں کے لئے احصر استعمال ہوتا ہے یہ ابو عمرو نے حکایت کیا ہے۔
میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کے قول کے مشابہ ہے کہ انہوں نے مؤطا میں دونوں کے لئے احصر کا عنوان باندھا ہے۔ فراء نے کہا: مرض اور دشمن میں دونوں صیغے برابر ہیں۔ قشیری ابو نصر نے کہا: شوافع نے دعویٰ کیا ہے کہ احصار دشمن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مرض کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں صیغے دونوں (مرض اور دشمن) کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: شوافع نے جو دعویٰ کیا ہے امام خلیل بن احمد وغیرہ نے اس کے خلاف نص قائم کی ہے۔ خلیل نے کہا: حصرت الرجل حصرا (میں نے اسے روک لیا) واحصر الحاج عن بلوغ المناسك من مرض او نحوه (حاجی مرض یا اس جیسی چیز سے مناسک تک پہنچنے سے روک دیا گیا)۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا: پہلے تو ثلاثی بنایا حصرت سے مشتق کیا اور دوسرے کو مرض میں رباعی بنایا۔ اسی پر حضرت ابن عباس کا قول ہے: لا حصر الاحصر العدو۔ (3) حصر نہیں ہے مگر دشمن کا حصر۔ ابن السکیت نے کہا: احصرہ المرض جب مرض سفر سے یا حاجت سے روک دے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ حصرہ العدو یحصرونه، جب دشمن اسے روک لے اور وہ دشمن کا گھیراؤ کرلیں۔ حاصروہ محاصرۃ و حصارا۔ انہوں نے اس کا گھیراؤ کرلیا۔ اخفش نے کہا: حصرت الرجل فهو محصورٌ۔ یعنی میں نے اسے روک لیا۔ فرمایا: احصرنی بولی و احصرنی مرضی اس نے مجھے اپنے نفس کو روکنے والا بنا دیا۔ ابو عمرو شیبانی نے کہا: حصرنی الشیء و احصرنی۔ یعنی اس نے مجھے روک لیا۔
میں کہتا ہوں: اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ حصر دشمن کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احصر مرض کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ الله تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (البقرہ: 273) (فقراء کے لئے جو روکے گئے ہیں الله کے راستہ میں)۔ ابن عبادہ نے کہا:

و ما هجر ليلى ان تكون تباعدت  عليك ولا ان احصرتك شغولُ

لیلیٰ کی جدائی نہیں کہ وہ تجھ سے دور ہوگئی نہ تجھے مشغولیت نے روکا۔
زجاج نے کہا: تمام اہل لغت کے نزدیک احصار مرض سے ہوتا ہے۔ رہا دشمن سے احصار تو اس کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حُصِرَ حصرا۔ پہلے میں اُحصر احصارا کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے قول کی دلیل ہے اس کا معنی روکنا ہے۔ اس

1۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر)  2۔ ایضاً صفحہ 121، جلد 1  3۔ معالم التنزیل، صفحہ 244، جلد 1 (دار الفکر)

سے الحصیر ہے وہ شخص جو دل کے راز بتانے سے اپنے نفس کو روکتا ہے۔ الحصیر بادشاہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ حجاب کے پیچھے محبوس (قیدی) کی طرح ہوتا ہے۔ الحصیر چٹائی کو بھی کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے کیونکہ اس کے پتے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ رکی ہوئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** جب الحصر کا اصل معنی روکنا ہے تو احناف نے کہا: محصر وہ ہے جو احرام کے بعد مرض یا دشمن یا کسی وجہ سے مکہ سے روکا گیا ہو اور انہوں نے مطلق احصار کے مقتضا سے حجت پکڑی ہے اور انہوں نے فرمایا: آخر آیت میں امن کا ذکر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ مرض کی وجہ سے نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الزکام امان من الجذام زکام جزام کی مرض سے امان ہے اور فرمایا: جس نے چھینک مارنے والے سے پہلے الحمد کہا وہ دانتوں کی تکلیف، کان کی تکلیف اور پیٹ کی تکلیف سے محفوظ ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ احناف نے کہا: ہم نے دشمن کے روکنے کو مرض پر قیاس کرتے ہوئے حصار بنایا جب وہ اس کے حکم میں ہے نہ کہ ظاہر کی دلالت کے اعتبار سے حصار بنایا ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عباس، امام شافعی اور اہل مدینہ نے کہا: آیت سے مراد دشمن کا روکنا ہے کیونکہ آیت عمرہ حدیبیہ میں ۶ ہجری میں نازل ہوئی جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے روکا تھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو کفار قریش بیت اللہ اور آپ کے درمیان حائل ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدی کو نحر کیا اور اپنے سر کا حلق کرایا(1)۔ اس پر فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کا ارشاد دلالت کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا: جب تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** جمہور علماء کا خیال ہے کہ محصر جسے دشمن نے روک لیا ہو وہ جہاں روکا گیا ہو وہاں اپنا احرام کھول دے، اپنی ہدی کو نحر کردے اگر اس کے پاس ہدی ہو اور وہ اپنے سر کا حلق کرائے۔ قتادہ اور ابراہیم نے کہا: وہ اپنی ہدی بھیجے اگر ممکن ہو جب اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے تو وہ حلال ہو جائے (2) (یعنی احرام کھول دے) امام ابو حنیفہ نے کہا: احصار کا جانور، دسویں ذی الحجہ کو ذبح کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دسویں کے دن سے پہلے بھی اس کو ذبح کرنا جائز ہے جب ہدی اپنے محل کو پہنچ جائے۔ صاحبین نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ صاحبین نے کہا: یہ دسویں کے دن ذبح کیا جائے گا، اگر دسویں کے دن سے پہلے ذبح کی تو جائز نہ ہوگی۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جو دشمن کی وجہ سے روکا گیا ہو خواہ وہ دشمن کافر ہو یا مسلمان ہو یا جابر سلطان نے اسے قید خانہ میں بند کر دیا ہو اس پر ہدی واجب ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: جو حج یا عمرہ میں بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز ہدی کو نحر کیا تھا، اسے اشعار کیا تھا اور اسے ہار پہنایا تھا جب عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب وہ ہدی اپنے مقام پر نہ پہنچی کفار کے روکنے کی وجہ سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نحر کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ ہدی تھی اور اس کو قلادہ پہنانا اور اشعار کرنا واجب تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لئے نکلے تھے۔ پس اس میں رجوع

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب العمرة، اذا احصر المعتمر، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائز نہ تھا اور رسول اللہ ﷺ نے رکاوٹ کی وجہ سے اسے نحر نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے جو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی واجب نہیں ہے۔ اور جمہور علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے روز نہ احرام کھولا تھا اور نہ حلق کرایا تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ محصر کے احرام کھولنے کی شرط ہدی کا ذبح کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہدی ہو اور اگر وہ فقیر ہو تو جب وہ ہدی پائے اور اس پر قادر ہو وہ احرام نہ کھولے مگر ہدی دینے کے بعد۔ یہی ارشاد فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا مقتضا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب وہ ہدی پر قادر ہو تو حلال ہو جائے اور ہدی دے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں اسی طرح جو ہدی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کا حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** عطا وغیرہ نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر، دشمن کی وجہ سے محصر کی طرح ہے۔ امام مالک اور شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: جس کو مرض نے روک لیا ہو اس کو بیت اللہ کا طواف ہی حلال کرے گا اگرچہ وہ کئی سال ہی ٹھہرا رہے حتیٰ کہ اسے تکلیف سے افاقہ ہو جائے (1)۔ اسی طرح جس کو گنتی میں غلطی ہوئی یا اس پر ذی الحج کا چاند مخفی ہوا، اس کا حکم ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں اہل مکہ اہل آفاق کی طرح ہیں۔ فرمایا: اگر مریض دواء کا محتاج ہو تو وہ اس کے ساتھ علاج کرے اور فدیہ دے اور اپنے احرام پر باقی رہے اور اسے کسی چیز سے حلال ہونا جائز نہیں حتیٰ کہ مرض سے ٹھیک ہو جائے۔ جب مرض سے ٹھیک ہو جائے تو وہ بیت اللہ کی طرف جائے اس کے سات چکر لگائے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور اپنے حج اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ یہ تمام امام شافعی کا قول ہے اور ان کا نظریہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کا ہے۔ انہوں نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر یا گنتی میں غلطی کی وجہ سے محصر کے بارے میں فرمایا: اس کو طواف ہی حلال کرے گا۔ اسی طرح کوئی عضو ٹوٹ جائے یا جلاب لگ جائیں۔ اس کا بھی یہی حکم ہے امام مالک کے نزدیک جس کی یہ حالت ہو اسے اختیار ہوگا جب اسے وقوف عرفہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو مرض کی وجہ سے تو اگر وہ چاہے تو چلا جائے جب اس کے لئے بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو تو وہ طواف کرے اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ اور اگر چاہے تو آئندہ سال تک احرام پر باقی رہے اگر وہ احرام پر باقی رہے گا تو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو حاجی کو منع ہوتا ہے۔ پس اس پر ہدی نہ ہوگی اور اس میں حجت صحابہ کا اجماع ہے کہ جو تعداد میں غلطی کر جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ طواف سے ہی حلال ہوگا اور مکی کے بارے میں فرمایا: جب وہ محصور باقی رہے حتیٰ کہ لوگ اپنے حج سے فارغ ہو جائیں تو وہ حل کی طرف نکل جائے، تلبیہ کہے اور وہ وہی کرے جو عمرہ کرنے والا کرتا ہے اور حلال ہو جائے جب آئندہ سال آئے تو حج کرے اور ہدی دے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: مکہ والوں میں سے مکہ میں محصر ہو تو اسے وقوف عرفہ لازم ہے اگرچہ اسے چارپائی پر اٹھا کر لے جایا جائے۔ اس قول کو ابو بکر محمد بن احمد بن عبد اللہ بن بکیر مالکی نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: محصر مکی کے بارے میں امام مالک کا قول یہ ہے کہ اس پر بھی آفاقیوں کی طرح حج اور ہدی کا اعادہ ہے۔ یہ ظاہر کتاب کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور فرمایا: میرے نزدیک اس مسئلہ میں زہری کا قول پسندیدہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ہے۔ یہ اباحت ان لوگوں کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہیں ہیں وہ ٹھہر جائیں کیونکہ ان کی مسافت دور ہے وہ علاج کرائیں اگرچہ حج فوت بھی ہو جائے اور ایسا شخص جس کے درمیان اور مسجد حرام کے درمیان اتنی مسافت ہو جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی تو وہ مناسک حج پر جائے اگرچہ اسے چارپائی پر ہی لے جایا جائے کیونکہ وہ بیت اللہ کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ہر وہ شخص جو دشمن، مرض، خرچ ختم ہونے، سواری گم ہونے یا کسی موذی چیز کے ڈسنے کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا گیا ہو تو وہ احرام کے ساتھ اپنے مکان پر ٹھہرا رہے اور اپنی ہدی بھیج دے یا ہدی کی قیمت بھیج دے، جب وہ نحر کر دے تو اپنے احرام کو کھول دے۔ اسی طرح حضرات عروہ، قتادہ، حسن، عطا، نخعی، مجاہد اور اہل عراق کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ (الآیۃ)

**مسئلہ نمبر 6**: امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: محرم کو حج میں شرط لگانا کچھ نفع نہیں دیتا جب اسے مرض یا دشمن سے محصر ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ شرط لگانا یہ ہے کہ تلبیہ کہتے وقت لبیك اللھم لبیك۔ جہاں تو مجھے روک لے گا میں اپنا احرام وہاں کھول دوں گا۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور نے کہا شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے لئے وہ شرط ہوگی جو وہ لگائے گا۔ دوسرے بہت سے صحابہ اور تابعین نے بھی یہی کہا ہے ان کی حجت ضباعہ بنت زبیر عن عبد المطلب کی حدیث ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں کیا میں شرط لگا دوں؟ فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میں کیسے کہوں؟ فرمایا: تو یوں کہہ: لبیك اللھم لبیك و محلی من الارض حیث حبستنی (1) (جہاں تو مجھے روک لے گا میں احرام کھول دوں گی) اس حدیث کو ابو داؤد اور دار قطنی وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ضباعہ کی حدیث ثابت ہوتی تو میں اس سے زیادتی نہ کرتا اس کا احرام کھولنا جائز ہے جہاں اسے اللہ تعالیٰ روک لے۔

میں کہتا ہوں: بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ان میں سے ابو حاتم بستی اور ابن منذر ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ضباعہ بنت زبیر سے کہا: تو حج کر اور شرط لگا لے (2)۔ یہی امام شافعی کا قول ہے جب وہ عراق میں تھے پھر مصر میں اسے توقف کیا۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول بہتر ہے۔ عبد الرزاق نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن جریج نے بتایا فرمایا مجھے ابو زبیر نے بتایا کہ طاؤس اور عکرمہ نے انہیں حضرت ابن عباس سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت ضباعہ بنت زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: میں ایک مریض عورت ہوں، میں حج کرنا چاہتی ہوں آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں اگر میں احرام باندھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو احرام باندھ لے اور شرط لگا لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں تو مجھے روک لے گا (3)۔ راوی فرماتے ہیں: اس عورت نے حج کر لیا تھا۔ یہ سند صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**: علماء کا اختلاف ہے کہ محصر پر قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: دشمن نے

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الاشتراط فی الحج، صفحہ 247، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، حدیث 82، صفحہ 235، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ ایضاً، حدیث 83، صفحہ 235، جلد 2

جسے روک لیا ہو اس پر نہ حج کی قضا ہے نہ عمرہ کی، مگر جس نے اپنا فرض حج نہ کیا ہو تو اس پر وجوب کے مطابق حج ہے۔ اسی طرح ان علماء کے نزدیک عمرہ کرنا واجب ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا مرض یا دشمن نے روک لیا ہو تو اس پر حج اور عمرہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اگر وہ حج کا احرام باندھنے والا تھا تو وہ احصار کی صورت میں حج اور عمرہ قضا کرے گا کیونکہ اس کا حج اور احرام عمرہ بن گیا تھا۔ اگر وہ حج قران کرنے والا تھا تو وہ ایک حج اور دو عمرے قضا کرے گا اگر وہ عمرہ کا احرام باندھنے والا تھا وہ ایک عمرہ قضا کرے گا ان کے نزدیک ہر مرض یا دشمن کے ذریعے روکا گیا برابر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ میمون بن مہران کی حدیث سے انہوں نے حجت پکڑی ہے۔ فرمایا: میں اس سال عمرہ کے ارادہ سے نکلا جس میں اہل شام نے حضرت ابن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا ہوا تھا۔ میری قوم کے کئی لوگوں نے میرے ساتھ اپنی ہدی کے جانور بھیجے، میں اہل شام تک پہنچا تو انہوں نے مجھے حرم میں داخل ہونے سے روک لیا۔ میں نے اسی جگہ ہدی کو نحر کیا پھر میں نے احرام کھول دیا اور واپس آ گیا۔ جب آئندہ سال آیا تو میں اپنے عمرہ کی قضا کے لئے نکلا۔ میں حضرت ابن عباس کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ہدی کا بدل دے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو اس ہدی کا بدل دینے کو کہا جو انہوں نے عمرہ قضا میں حدیبیہ کے سال نحر کی تھیں اور ان علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا جس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج یا دوسرا عمرہ ہے (1)۔ اس حدیث کو عکرمہ نے حجاج بن عمرو انصاری سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج ہے (2)۔ ان علماء نے فرمایا: آئندہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کا حدیبیہ کے سال عمرہ کرنا اس عمرہ کی قضا کے لئے تھا۔ اسی وجہ سے اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی صحابی کو اور کسی ساتھی کو کسی چیز کے قضا کرنے کا حکم دیا اور نہ وہ کوئی چیز لئے لوٹے اور کسی وجہ سے ان سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ سال یہ کہا کہ میرا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا ہے جس میں مجھے روکا گیا تھا۔ یہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: عمرۃ القضاء اور عمرۃ القضیۃ برابر ہیں۔ یہ اس عمرہ کا نام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش سے فیصلہ کیا تھا اور اس سال بیت اللہ سے واپس چلے جانے اور آئندہ سال آنے پر ان سے صلح کی تھی اسی وجہ سے اس کو عمرۃ القضیۃ کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** فقہاء میں سے کسی نے اس شخص کے بارے میں نہیں کہا کہ جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تو ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسی جگہ اپنا احرام کھول دے سوائے ابوثور کے۔ انہوں نے حجاج بن عمرو کی حدیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اس کی متابعت داؤد بن علی اور اس کے اصحاب نے کی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وہ عضو ٹوٹنے کے ساتھ احرام کھولے گا لیکن کیسے کھولے گا۔ امام مالک وغیرہ نے کہا: بیت اللہ کے طواف کے ساتھ کھولے گا اس کے علاوہ نہیں کھولے گا اور کوفہ کے علماء نے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب المحصر، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الذی یھل بالحج فیکسر او یعرج، صفحہ 113، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ نیت اور اس فعل کے ساتھ کھولے گا جو اسے حلال کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**: علماء کے درمیان اس میں اختلاف نہیں کہ احصار (روکنا) حج اور عمرہ میں عام ہے۔ ابن سیرین نے کہا: عمرہ میں احصار نہیں ہے کیونکہ اس کا وقت متعین نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ متعین وقت میں نہیں ہے لیکن عذر کے ختم ہونے تک صبر کرنا ضرر (نقصان) ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن زبیر سے حکایت ہے کہ جس کو دشمن یا مرض نے روک لیا ہو تو اس کا طواف کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں اور یہ حدیبیہ کے سال والی خبر جو نص ہے اس کے مخالف ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**: رکاوٹ یا تو کافر کی طرف سے ہوگی یا مسلمان کی طرف سے ہوگی۔ اگر کافر کی طرف سے ہو تو قتال جائز نہیں اگرچہ اس پر غالب آنے کا وثوق بھی ہو اور وہ وہاں حلال ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** (البقرہ: 191) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اگر تاوان کا سوال کرے تو دینا جائز نہیں کیونکہ یہ اسلام میں کمزوری ہے اگر مسلمان نے روکا ہو تو اس سے بھی کسی حال میں قتال جائز نہیں اور احرام کھول دینا واجب ہے اگر وہ کوئی چیز طلب کرے اور راستے چھوڑ دے تو اس کو وہ چیز دینا جائز ہے اور قتال جائز نہیں کیونکہ اس میں روح کا اتلاف ہے اور عبادت کی ادائیگی میں یہ لازم نہیں کیونکہ دین آسان ہے اور رہا اس کو تاوان دینا تو اس میں دو نقصانوں میں سے آسان کا قبول کرنا ہے کیونکہ حج میں مال کو خرچ کیا جاتا ہے پس یہ اس کے خرچ میں سے شمار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11**: روکنے والے دشمن کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کے احصار کے بقا اور ہمیشہ ہونے کا یقین ہوگا کیونکہ اس کو قوت اور کثرت حاصل ہے یا ایسا نہیں ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو محصر اسی وقت اس کی جگہ احرام کھول دے اور اگر دوسری صورت ہو اور اس احصار کے زوال کی امید ہو تو وہ محصور نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے اور حج کے درمیان اتنا وقت پایا جائے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اب اگر دشمن چلا بھی گیا تو وہ حج کو نہیں پا سکے گا۔ اس وقت ابن قاسم اور ابن ماجشون کے نزدیک وہ احرام کھول دے۔ اشہب نے کہا: دشمن کی وجہ سے حج سے روکا جانے والا شخص احرام نہ کھولے حتیٰ کہ دسویں کا دن آ جائے اور تلبیہ کو ختم نہ کرے حتیٰ کہ لوگ عرفہ کی طرف چلے جائیں۔ ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کے غلبہ کی وجہ سے اس کے حج کی تکمیل سے مایوسی کا وقت ہے۔ پس اس وقت اس کا احرام کھولنا جائز ہے۔ اس کی اصل عرفہ کا دن ہے اور اشہب کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ممکن حد تک احرام کے حکم میں رہنا ہے اور اس کا دسویں کے دن تک التزام کرنا ہے اور حاجی کے لئے یہی وہ وقت ہے جس میں احرام کھولنا جائز ہے۔ پس اس پر دسویں کے دن احرام کھولنا جائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**، ما محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: **فالواجب او فعلیکم ما استیسر**۔ اور محل نصب میں ہونے کا بھی احتمال ہے یعنی **فانحروا او فاهدوا، ما استیسر** سے مراد جمہور اہل علم کے نزدیک بکری ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر نے فرمایا: وہ اونٹ اور گائے ہے اس کے علاوہ نہیں (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حسن نے کہا: اعلی ہدی اونٹ ہے، درمیانی گائے ہے اور کم از کم بکری ہے (1)۔ اس میں امام مالک کے نظریہ کی دلیل ہے: جس کو دشمن نے روکا ہو اس پر قضا واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس میں قضا کا ذکر نہیں۔

**مسئلہ نمبر 12**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْهَدْيِ، الْهَدْيِ اور الهدی دونوں لغتیں ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجا جاتا ہے خواہ اونٹ ہو یا کوئی اور جانور، عرب کہتے ہیں: کم هدی بنی فلاں، بنوفلاں کے کتنے اونٹ ہیں۔ ابوبکر نے کہا: اس کو ہدی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے بعض بیت اللہ کی طرف بھیجی جاتی ہیں۔ پس جو حکم بعض کو لاحق ہوتا ہے اس کے ساتھ تمام کا نام رکھ دیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء: 25)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لونڈیاں زنا کریں تو ان میں سے لونڈی پر جب وہ زنا کرے تو آزاد کنواری عورت کی سزا کا نصف ہے جب آزاد کنواری عورت زنا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے المحصنات کا لفظ ذکر فرمایا۔ مراد کنواری عورتیں ہیں کیونکہ احصان ان میں سے اکثر میں ہوتا ہے۔ پس انہیں ایسے امر کے ساتھ ذکر کیا گیا جو ان میں سے بعض میں پایا جاتا ہے آزاد عورتوں میں سے محصنۃ اسے کہا جاتا ہے جو خاوند والی ہو اس پر رجم واجب ہوتا ہے جب وہ بدکاری کرے اور رجم نصف نہیں ہوتا کہ وہ لونڈی پر نصف ہو۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ المحصنات سے مراد یہاں کنواری عورتیں ہیں نہ کہ خاوند والیاں۔ فراء نے کہا: اہل حجاز اور بنو اسد ہدی کو تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فرمایا: تمیم اور سفلی قیس شد کے ساتھ ہدی پڑھتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

حلفت بربّ مكة والمصلّٰی و اعناق الهَدِیّ مقلداتِ

میں نے مکہ، مصلی اور ہار پہنائی گئی ہدیوں کے گردنوں کے مالک کی قسم اٹھائی۔

فرمایا: الهدی کا واحد هدیه اور الهدی کی جمع میں اهداء بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ یہ خطاب تمام امت کو ہے خواہ محصر ہو یا محصر نہ ہو۔ علماء میں بعض یہ محصرین کے لئے خاص کرتے ہیں یعنی احرام نہ کھولیں حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا جائے۔ محل وہ جگہ ہے جس میں ذبح حلال ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک دشمن کی وجہ سے روکے گئے شخص کے لئے محل احصار کی جگہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اس میں ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں آپ جہاں محصور ہوئے وہاں ہی احرام کھول دیا اور ہدی کو نحر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (الفتح: 25) بعض علماء نے معکوفاً کا معنی محبوساً فرمایا جب بیت اللہ تک پہنچنے سے روکی گئی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک احصار میں ہدی کا محل حرم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ (الحج) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مخاطب وہ امن والا شخص ہے جو بیت اللہ تک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پہنچ پاتا ہے۔ رہا محصر (روکا گیا) وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے خارج ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں اپنی ہدی نحر کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے نہیں ہے اور دوسری دلیل احناف کی حضرت ناجیہ بن جندب کی حدیث ہے، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: حضور! آپ میرے ساتھ ہدی بھیجیں میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو اسے کیسے لے جائے گا(1)؟ اس نے کہا: میں اسے وادیوں سے لے جاؤں گا مشرک اس پر قادر نہیں ہوں گے میں اسے لے جاؤں گا حتیٰ کہ میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے جہاں احرام کھولے وہاں ہی نحر کر دے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حدیبیہ کے مقام پر فعل کی اقتدا کرتے ہوئے۔ یہ صحیح ہے اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے، نیز ہدی، مہدی (بھیجنے والے) کے تابع ہے۔ جب بھیجنے والا اپنے احصار کی جگہ احرام کھول دے گا تو ہدی بھی اس کے ساتھ نحر کر دی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 2:** محصر (روکا گیا) کے بارے میں ہم نے جو ثابت کیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کو حلق کرانا جائز ہے یا مقام حل جیسا کوئی عمل کرنا جائز ہے اس سے پہلے کہ اس نے میسر (ہدی) ذبح نہ کی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: سنت ثابتہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ کسی کے لئے اپنے بال کاٹنا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب محصر، ہدی نحر کرنے سے پہلے احرام کھول دے گا تو اس پر بکری ہوگی اور وہ احرام میں ہوگا جیسا پہلے تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دے۔ اور اگر اس نے شکار کیا ہدی نحر کرنے سے پہلے تو اس پر جزا ہوگی۔ اس میں امیر اور غریب برابر ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا حتیٰ کہ وہ ہدی کو ذبح کرے یا اس کی طرف سے ذبح کر دیا جائے۔ علماء احناف نے فرمایا: کم از کم ہدی بکری ہے جو نہ اندھی ہو، نہ اس کے کان کاٹے ہوئے ہوں اور ان کے نزدیک روزہ کا یہ مقام نہیں ہے۔ ابوعمر نے کہا: کوفیوں کے قول میں ضعف اور تناقض ہے کیونکہ وہ دشمن سے روکے گئے شخص کے لئے اور مرض سے روکے گئے شخص کے لئے احرام کھولنا جائز قرار نہیں دیتے حتیٰ کہ حرم میں اس کی ہدی نحر کر دی جائے۔ اور جب وہ مرض کی وجہ سے محصر کے لئے جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ ہدی کا بھیجنے والا اور جس کے ساتھ ہدی بھیجی گئی ہے اس سے متعین دن کا وعدہ لے جس میں وہ اس کی ہدی نحر کرے گا۔ پس اس دن کے بعد وہ احرام کھول دے اور حلق کرا دے۔ پس انہوں نے اس کے لئے احرام کھولنا جائز قرار دیا جبکہ ہدی کے نحر ہونے اور اس کے حرم میں پہنچنے کا یقین نہیں ہے اور انہوں نے غالب گمان کے ساتھ احرام کھولنے پر اس کو محمول کیا جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس پر فرائض لازم ہوں اس کے لئے ان سے گمان کے ساتھ نکلنا جائز نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کے قول کا گمان ہے کہ اگر وہ ہدی ہلاک ہو جائے یا گم ہو جائے یا چوری ہو جائے ادھر اس کا بھیجنے والا احرام کھول چکا ہے۔ اپنی ازواج سے حقوق زوجیت ادا کر چکا ہے یا شکار کر چکا ہے تو وہ احرام میں ہوگا اور جو اس نے شکار کیا اس پر اس کی جزا ہوگی۔ پس انہوں نے اس کے لئے حج کے فساد کو مباح کیا اور اس پر وہ لازم کیا جو احرام نہ کھولنے والے شخص پر لازم ہوتا ہے۔ اس میں تناقض اور مذاہب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب نجاسۃ الدم و کیفیۃ غسلہ، صفحہ 140، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کا ضعف ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ احناف نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت ابن مسعود کے قول پر رکھی اور انہوں نے اس کے خلاف میں نظر نہیں کی۔ امام شافعی نے فرمایا: جب محصر ہدی سے عاجز ہو تو اس میں دو قول ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا مگر ہدی دینے کے ساتھ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ جس پر وہ قادر ہے وہ ادا کرے۔ اگر وہ کسی چیز پر قادر نہیں تو جب وہ قادر ہو وادا کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے یہ کہا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی جگہ احرام کھول دے اور جب قادر ہو ہدی ذبح کرے۔ اگر وہ مکہ میں ذبح پر قادر ہو تو اس کے لئے مکہ میں ہی ذبح کرنا ضروری ہے اگر مکہ میں ذبح کرنے پر قادر نہ ہو تو جہاں قادر ہو ذبح کر دے اور فرمایا: کہا جاتا ہے اس میں جائز نہیں مگر ہدی اور کہا جاتا ہے: جب ہدی نہ پائے تو اس پر کھانا کھلانا یا روزے ہوں گے۔ اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ پائے تو ان میں سے ایک ادا کرے جب قادر ہو۔ غلام کے بارے میں فرمایا: اس کے لئے صرف روزہ جائز ہے پہلے اس کے لئے بکری کی قیمت دراہم میں لگائی جائے گی پھر دراہم کا کھانا بنایا جائے گا پھر کھانے کے ہر مد کے بدلے میں ایک دن روزہ رکھے گا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں اختلاف ہے جب محصر اپنی ہدی کو نحر کرے کیا اس کے لئے حلق کرانا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا: اس پر سر کا حلق کرانا واجب نہیں کیونکہ اس سے عبادت ختم ہو چکی ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب احصار کی وجہ سے باقی تمام مناسک ساقط ہو چکے ہیں مثلاً طواف، سعی وغیرہ...... حالانکہ ان کے ساتھ حاجی احرام سے حلالی ہوتا ہے...... تو اس سے وہ تمام احکام ساقط ہو گئے جن کے ساتھ حاجی احرام سے حلالی ہوتا ہے کیونکہ وہ محصر ہو گیا ہے۔ اور جنہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے ان میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن ہیں۔ انہوں نے فرمایا: محصر پر نہ بال کٹوانا ہے نہ حلق کرانا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: محصر حلق کرالے اور حلق نہیں کرائے گا تو اس پر کوئی چیز واجب بھی نہ ہوگی اور ابن ابی عمران نے ابن سماعہ سے اور انہوں نے امام ابو یوسف سے ان کی ''نوادر'' میں روایت کیا ہے کہ اس پر حلق کرانا لازم ہے اور بال کٹوانے کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو مختلف اقوال ہیں: (۱) محصر کے لئے حلق کرنا عبادت سے ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبادت میں سے نہیں ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے۔ امام مالک کی حجت یہ ہے کہ طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی وغیرہ سے محصر کو روکا گیا ہے۔ پس جن چیزوں سے اسے روکا گیا ہے وہ تو ساقط ہو جائیں گی لیکن حلق کرانا، اس کے کرنے میں تو کوئی حائل نہیں کہ وہ اس کے کرنے پر قادر ہے اور جس کے کرنے پر وہ قادر ہے وہ اس سے ساقط نہیں اور اس پر دلیل کہ محصر پر حلق کرانا باقی ہوتا ہے جس طرح بیت اللہ تک پہنچنے والے پر باقی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ اور وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلقین (حلق کرنے والوں) کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی تھی۔ یہ قطعی حجت ہے اور اس مسئلہ میں نظر صحیح ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک وہ حاجی جس نے حج کو مکمل کیا اور جس کا حج فوت ہوا، دشمن کے ذریعے روکا گیا اور مرض کے ذریعے روکا گیا تمام پر حلق کرانا عبادت ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ائمہ نے روایت کیا ہے کہ امام مالک کے یہ الفاظ ہیں۔ نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے دعا فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی: یا اللہ! مقصرین پر رحم فرما (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلق کرانے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کرنا اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا کرنا دلیل ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق کرانا، قصر کرانے سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ کا مقتضا بھی یہی ہے ولا تقصروا نہیں فرمایا اور اہل علم کا اجماع ہے کہ قصر کرانا مردوں کے لئے جائز ہے مگر ایک چیز حسن بصری سے ذکر کی گئی ہے کہ وہ پہلا حج جو انسان کرتا ہے اس میں حلق کو واجب قرار دیتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 5:** عورتیں حلق میں داخل نہیں ہیں ان کے لئے سنت قصر کرانا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: عورتوں پر حلق نہیں ہے ان پر صرف قصر کرانا ہے (2)۔ اس روایت کو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ عورت کا اپنے سر کا حلق کرانا مثلہ ہے اور عورت بالوں کو کتنا کٹوائے اس مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر، امام شافعی، امام احمد، اسحاق کہتے ہیں: وہ ہر مینڈھی سے پورے کی مثل کاٹے۔ عطا نے کہا: بند تین انگلیوں کی مقدار کاٹے۔ قتادہ نے کہا: تہائی یا چوتھائی کی مقدار کاٹے۔ حفصہ بن سیرین نے بوڑھی عورت اور جوان عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں: بوڑھی عورت چوتھائی بال کاٹ دے اور جوان عورت کے لئے انگلی کے پورے کے ساتھ اشارہ کیا وہ تھوڑے تھوڑے کاٹ لے۔ مالک نے فرمایا: پورے سر کے بالوں کو تھوڑا تھوڑا کاٹے جتنا وہ کاٹ لے گی وہ کافی ہوگا۔ امام مالک کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ بعض بالوں کو کاٹے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ابن منذر نے کہا: جس پر کاٹنے کے اسم کا اطلاق ہو وہ جائز ہوگا۔ احوط یہ ہے کہ انگلی کے پورے کی مقدار تمام بال کاٹے۔

**مسئلہ نمبر 6:** کسی کے لئے سر کا حلق کرانا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کرلے۔ یہ اس لئے ہے کہ ذبح کی سنت حلق سے پہلے ہے۔ اس میں اصل یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا تھا پہلے آپ نے نحر کیا تھا پھر حلق کرایا تھا جس نے اس کی مخالفت کی حلق پہلے کرایا نحر بعد میں کیا اس نے یہ خطأً اور جہالت کی وجہ سے کیا ہوگا یا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہوگی تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ یہ ابن حبیب نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے اور یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن ماجشون نے کہا: اس پر ہدی ہے، یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اگر دوسری صورت میں ہو تو قاضی ابوالحسن نے روایت کیا ہے کہ نحر پر حلق کو مقدم کرنا جائز نہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ظاہر مذہب منع ہے اور صحیح جواز ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذبح، حلق، رمی، تقدیم و

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج باب الحلق والتقصیر عند الاحلال، صفحہ 233، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر، صفحہ 272، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے حلق کرانے سے پہلے ذبح کیا یا ذبح کرنے سے پہلے حلق کرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 7:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں سر کا حلق کرانا عبادت اور مطلوب ہے اور حج کے علاوہ جائز ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا: سر کا حلق کرانا مثلہ ہے، اگر یہ مثلہ ہوتا تو حج اور غیر حج میں جائز نہ ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے (3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت جعفر کی شہادت کی خبر آنے کے تین دن بعد ان کے بچوں کا حلق کرایا۔ اگر حلق جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کا حلق نہ کرواتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سر کا حلق کراتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: علماء کا بالوں کے رکھنے اور حلق کی اباحت پر اجماع ہے یہی حجت کافی ہے۔ وباللہ التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اس آیت سے بعض شوافع نے استدلال کیا ہے کہ پہلی آیت میں محصر سے مراد دشمن سے روکا گیا ہے نہ مرض سے روکا گیا ہے۔ یہ لازم نہیں ہوتا کیونکہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ کا معنی ہے، جو مریض ہو یا اس کے سر میں اذیت ہو پھر حلق کرادے فَفِدْيَةٌ تو اس پر فدیہ ہے۔ جب یہ بلا اختلاف مرض کے بارے میں وارد ہے تو ظاہر یہ ہے کہ آیت کا آغاز بھی اسی کے متعلق وارد ہے جس کے بارے میں اس کا وسط اور اس کا آخر وارد ہے۔ کیونکہ کلام کا بعض، بعض کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور بعض، بعض کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور آخر آیت میں اضمار کو آیت کے ابتدائی مخاطب کی طرف لوٹانا ہوتا ہے۔ پس ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ ظاہر سے پھیرنے کی دلیل موجود ہو۔ اور ہمارے کلام پر دلیل اس آیت کے نزول کا سبب بھی ہے۔ ائمہ نے روایت کی ہے اور یہ دارقطنی کے الفاظ میں حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے دیکھا جبکہ جوئیں اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کیا یہ جوئیں تجھے تکلیف دیتی ہیں؟ کعب نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کعب کو حلق کرانے کا حکم دیا جبکہ آپ حدیبیہ میں تھے۔ اور صحابہ کے لئے واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے وہ ابھی مکہ میں داخل ہونے کی امید پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کو نازل فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ چھ مساکین کو ایک فرق کھانا کھلائیں یا ایک بکری ہدی دیں یا تین دن روزے رکھیں۔ اس حدیث کو بخاری نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ قول کہ (صحابہ کے لئے واضح نہ تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے (4)) دلیل ہے کہ صحابہ کو دشمن کے روکنے کا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز تقدیم الذبح علی الرمی والحلق، صفحہ 422، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من قدم نسکا قبل نسک، صفحہ 225 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، صفحہ 336، جلد 1 (وزارت تعلیم)　4۔ ایضاً، کتاب المغازی، فی غزوۃ حدیبیہ، صفحہ 599، جلد 2 (وزارت تعلیم)

یقین نہ تھا۔ پس فدیہ کا موجب اذیت اور مرض کی وجہ سے حلق کرانا ہے۔) واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** امام اوزاعی نے اس محرم کے بارے فرمایا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، وہ حلق کرانے سے پہلے فدیہ کے ساتھ کفارہ دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: پھر اس صورت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ کا معنی ہوگا جب وہ حلق کرانے کا ارادہ کرے، جو قادر تھا اور حلق کرایا تو اس پر فدیہ ہے وہ فدیہ نہ دے حتیٰ کہ حلق کرا دے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** ابن عبد البر نے کہا: اس حدیث میں نُسُكٍ سے مراد بکری ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن روزے اور کھانا کھلانے میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ روزے تین ہیں اور حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث سے یہ صحیح محفوظ ہے۔ حضرات حسن، عکرمہ اور نافع سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: اذیٰ کے فدیہ میں دس روزے ہیں اور دس مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ فقہاء امصار اور ائمہ حدیث میں سے کسی کا قول نہیں ہے اور ابوزبیر کی روایت میں مجاهد عن عبد الرحمن عن کعب بن عجرہ کے سلسلہ سے مروی ہے، کعب نے بیان فرمایا کہ اس نے ذی القعدہ میں احرام باندھا ان کے سر میں جوئیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئے وہ اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گویا تجھے تیرے سر کی جوئیں تکلیف دے رہی ہیں۔ حضرت کعب نے کہا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلق کرا لو اور ہدی دے دو۔ حضرت کعب نے عرض کی: میں ہدی نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ دن روزہ رکھو (1)۔ حضرت ابو عمر نے کہا: اس حدیث کا ظاہر ترتیب پر ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو پھر اس کا معنی ہوتا کہ پہلا پھر دوسرا اختیار کرو جبکہ عام آثار جو حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے وہ لفظ تخییر (اختیار) کے ساتھ وارد ہیں اور یہ نص قرآنی ہے اسی پر علماء کا فتویٰ اور عمل ہے۔ وباللہ التوفیق

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کا اذیت کے فدیہ میں جو کھانے کا ذکر ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس میں کھانا دو مد ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے حساب سے ہوں۔ یہ ابوثور اور داؤد کا قول ہے۔ ثوری سے مروی ہے، فرمایا: یہ گندم سے نصف صاع (۲ کلو) اور کھجور، جو اور کشمش سے ایک صاع ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس نے نصف صاع گندم کو کھجور کے ایک صاع کے برابر بنایا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ حضرت کعب کی بعض اخبار میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو کھجور کے تین صاع چھ مساکین پر صدقہ کر (2)۔ امام احمد بن حنبل نے کبھی تو اسی طرح کہا جس طرح امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے اور کبھی کہا: اگر وہ گندم کھلانا چاہے تو ہر مسکین کو ایک مد دے اگر کھجور کھلانا چاہئے تو نصف صاع دے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، فمن کان منکم مریضا، صفحہ 244، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز حلق الرأس للمحرم، صفحہ 382، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر5:** مساکین کو اذیت کے کفارہ میں صبح و شام کا کھانا کھلانا جائز نہیں حتیٰ کہ ہر مسکین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے مطابق دو مد دے۔ یہ امام مالک، ثوری، امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: صبح و شام کا کھانا کھلانا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر6:** اہل علم کا اجماع ہے کہ محرم کے لئے بالوں کا حلق کرنا، انہیں کاٹنا، توڑنا اور انہیں تلف کرنا جائز نہیں خواہ وہ نورہ یا کسی اور چیز کے ساتھ ہو مگر بیماری کی حالت میں جیسا کہ قرآن میں نص موجود ہے اور جس نے احرام کی حالت میں بغیر کسی بیماری کے حلق کرایا تو اس پر فدیہ واجب ہے۔ اور اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے بغیر عذر کے حلق کرایا، سلا ہوا لباس پہنا یا خوشبو لگائی۔ امام مالک نے فرمایا: اس نے برا کیا ہے اور اس پر فدیہ ہے اسے اس میں اختیار ہے اور امام مالک کے نزدیک اس میں عمد، خطا، ضرورت اور عدم ضرورت برابر ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور اس کے اصحاب اور ابو ثور نے کہا: اسے اختیار نہیں مگر ضرورت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ اور جس نے جان بوجھ کر حلق کرایا یا بغیر عذر کے جان بوجھ کر لباس پہنا تو اسے اختیار نہیں ہے اس پر صرف بکری واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر7:** جس نے بھول کر ایسا کیا اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جان بوجھ کر اور بھول کر یہ عمل کرنے والا فدیہ کے وجوب میں برابر ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، ثوری اور لیث کا قول ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: (ا) اس پر فدیہ نہیں ہے۔ یہ داؤد اور اسحاق کا قول ہے۔ دوسرا اس پر فدیہ ہے۔ اکثر علماء محرم پر لباس پہنے، سر ڈھانپنے یا بعض سر ڈھانپنے، خفین (موزے) پہنے، ناخن کاٹنے، خوشبو لگانے، اذیت کو دور کرنے کی صورت میں فدیہ کو واجب کرتے ہیں۔ اسی طرح جب اپنے جسم کے بالوں کا حلق کیا یا تیل لگایا یا پچھنے لگوانے کی جگہ کا حلق کیا تو یہی حکم ہے۔ عورت اس مسئلہ میں مرد کی طرح ہے۔ اس پر سرمہ لگانے میں فدیہ ہے اگرچہ اس میں خوشبو نہ بھی ہو اور مرد کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو اور عورت پر فدیہ ہے جو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپے یا دستانے پہنے۔ اس میں یہ عمل جان بوجھ کر کرنا، بھول کر کرنا اور جہالت کی وجہ سے کرنا برابر ہے۔ بعض علماء ہر چیز میں دم (بکری) واجب کرتے ہیں۔ داؤد نے کہا: جسم کے بال مونڈنے میں مرد، عورت پر کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر8:** علماء کا مذکورہ فدیہ دینے کی جگہ میں بھی اختلاف ہے۔ عطا نے کہا: جو دم (بکری) ہوگا وہ مکہ میں دیا جائے گا اور جو کھانا یا روزہ ہوگا وہ جہاں چاہے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اصحاب رائے نے کہا ہے: حسن سے مروی ہے کہ بکری، مکہ میں دی جائے گی۔ طاؤس اور امام شافعی نے کہا: کھانا اور بکری دونوں مکہ میں ہی دیئے جائیں گے روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے کیونکہ روزہ میں اہل حرم کی کوئی منفعت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ:95) یہ بیت اللہ کے پڑوس میں رہنے والے مساکین پر شفقت کے لئے فرمایا ہے کھانا کھلانے میں بھی منفعت ہے جبکہ روزہ میں کوئی اہل حرم کی منفعت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے فرمایا: یہ عمل جہاں چاہے کرے اور یہ صحیح قول ہے اور یہ مجاہد کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہاں ذبح

سے نسک مراد ہے اور نص قران وسنت کی وجہ سے یہ ہدی نہیں ہے اور نسک جہاں چاہے ادا ہو سکتی ہے اور ہدی صرف مکہ میں ہوتی ہے۔ امام مالک کی حجت وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے مؤطا میں حضرت یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے اس میں ہے حضرت علی بن ابی طالب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا حلق کرنے کا حکم دیا (آپ بیمار تھے) پھر ان کی طرف سے سقیا کے مقام پر نسک دیا ان کی طرف سے اونٹ نحر کیا۔ مالک نے فرمایا: یحییٰ بن سعید نے فرمایا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ کی طرف سفر میں نکلے۔ اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ اذیت کا فدیہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ دینا بھی جائز ہے اور مالک کے نزدیک ہدی میں جائز ہے کہ وہ حرم میں نحر کی گئی ہو تو وہ اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مقصود مسلمان مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ مالک نے فرمایا: جب روزہ حرم کے علاوہ کسی جگہ رکھنا جائز ہے تو اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو کھانا کھلانا بھی جائز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ** مطلق ہے اس میں کسی جگہ کی قید نہیں ہے پس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں بھی فدیہ ادا کرے گا جائز ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا **اَوْ نُسُكٍ** جو ذبح کیا جاتا ہے اسے نسک کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہی نام رکھا ہے اس کو آپ نے ہدی نہیں فرمایا اور ہم پر اس کو ہدی پر قیاس کر کے ہدی کے حکم کی طرف لوٹانا لازم نہیں ہے اور ہم ہدی کا اعتبار نہیں کرتے جو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب کو فدیہ کا حکم فرمایا تھا تو وہ حرم میں نہیں تھے۔ پس یہ سب کچھ حرم سے باہر بھی جائز ہے۔ امام شافعی سے اس کی مثل ایک بعید وجہ کے اعتبار سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ نُسُكٍ**، **نُسُكٍ** کا اصل معنی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَرِنَا مَنَاسِكَنَا** (البقرہ: 128) یعنی ہمیں اپنی عبادت کی جگہیں دکھا۔ بعض نے فرمایا: لغت میں **نُسُكٍ** کا معنی غسل کرنا ہے۔ اسی سے ہے: نَسَكَ توبة، یعنی اس نے اپنے کپڑے کو دھویا گویا عبادت کرنے والا اپنے نفس کو عبادت کے ذریعے گناہوں سے دھوتا ہے۔ بعض نے فرمایا: النسك کا معنی چاندی کی پگھلی ہوئی ڈلی ہے، اس کی ہر ڈلی کو نسیکہ کہا جاتا ہے۔ گویا عابد اپنے نفس کو گناہوں کی میل اور کھوٹ سے پاک کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اَمِنْتُمْ** بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ بعض نے فرمایا: روکنے والے دشمن کے خوف سے امن میں ہو جاؤ۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ مفہوم الفاظ کے زیادہ قریب ہے مگر مرض کا خوف خیال کیا جائے تو پھر مرض سے امن مراد ہوگا (1) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ** علماء کا اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت علقمہ اور حضرت ابراہیم نے فرمایا: اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جنہیں راستہ میں حج اور عمرہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے روک دیا گیا ہو وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کے لئے راستہ کھلا ہوا ہو۔ ابن زبیر کے نزدیک متمتع کی صورت یہ ہے کہ آدمی کو روک دیا گیا ہو حتیٰ کہ اس کا حج فوت ہو جائے پھر وہ بیت اللہ تک پہنچے اور عمرہ کر کے حلال ہو جائے پھر آئندہ سال حج کو قضا کرے یہ عمرہ اور آئندہ حج تک کے درمیان میں متمتع ہوا اور دوسرے علماء کے نزدیک محصر متمتع وہ ہے جو روک دیا گیا ہو پھر بغیر عمرہ کئے احرام کھول دے اور اسے موخر کر دے حتیٰ کہ وہ آئندہ سال آئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور اسی سال پھر حج کرے۔ حضرت ابن عباس اور علماء کی جماعت کا قول ہے کہ آیت میں روکے گئے اور جن کے لئے راستہ کھلا ہے سب مراد ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمتع جائز ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی اور حج افراد جائز ہے اور حج قران بھی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صورتوں کو پسند فرمایا اور کسی صحابی کے حج پر اعتراض نہیں فرمایا بلکہ انہیں ہر حج کی اجازت دی اور ان سے راضی ہوئے۔ علماء کا اختلاف اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی کون سی صورت کا احرام باندھا تھا اور حج کی ان صورتوں میں افضل صورت کیا ہے؟ کیونکہ اس کے متعلق وارد احادیث مختلف ہیں، بعض علماء نے فرمایا: جن میں سے امام مالک بھی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج مفرد کیا تھا اور حج افراد، حج قران سے افضل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم میں سے حج اور عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ ایسا کرے اور جو صرف حج کا احرام باندھنا چاہے وہ حج کا احرام باندھ لے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرہ کا احرام باندھ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی احرام باندھا، اور بعض لوگوں نے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا، بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا اور میں ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اس حدیث کو ایک جماعت نے ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے (2)۔ یہ اختلاف کے مقام پر نص ہے یہ ان علماء کی حجت ہے جنہوں نے حج افراد کا قول کیا اور اس کو افضل فرمایا، امام محمد بن حسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف احادیث مروی ہوں اور ہمیں خبر پہنچے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے ان میں سے ایک حدیث پر عمل کیا اور دوسری کو ترک کیا تو اس میں دلالت ہے کہ حق وہ ہے جس پر ان دونوں نے عمل کیا۔ اور ابو ثور نے افراد کو پسند کیا اور اسے حج تمتع اور حج قران پر فضیلت دی۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول ہے اور دوسرے علماء نے حج تمتع کو پسند فرمایا۔ انہوں نے فرمایا: حج تمتع افضل ہے یہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر کا مذہب ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے دارقطنی نے کہا: امام شافعی نے کہا: میں نے افراد کو پسند کیا۔ تمتع بھی اچھا ہے ہم اسے ناپسند نہیں کرتے اور جنہوں نے حج تمتع کو فضیلت دی انہوں نے مسلم کی حضرت عمران بن حصین سے مروی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمتع کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی (یعنی حج تمتع کے بارے میں آیت) ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا پھر کوئی آیت نازل نہ ہوئی جس نے متعۃ الحج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، افراد الحج، صفحہ 388، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کی آیت کو منسوخ کر دیا ہو اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے کہا جو کہا (1)۔ ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ بن سعید نے بتایا انہوں نے مالک بن انس سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے محمد بن عبداللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن ابی وقاص، ضحاک بن قیس سے معاویہ بن ابی سفیان کے حج کرنے کے سال سنا ان دونوں نے حج تمتع کا ذکر کیا۔ ضحاک بن قیس نے کہا: حج تمتع نہیں کرے گا مگر وہ جو اللہ کے حکم سے جاہل ہو گا۔ سعد نے کہا: اے میرے بھتیجے! تو نے میری بات کی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عمر بن خطاب اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت سعد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ حج تمتع کیا تھا (2)، یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن اسحاق نے زہری اور انہوں نے سالم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شامی شخص آپ کے پاس آیا اس نے حج تمتع کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: خوبصورت عمل ہے۔ اس شخص نے کہا: تمہارا باپ اس سے منع کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: تجھ پر افسوس میرا باپ اس سے اگر منع کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور اس کا حکم بھی فرمایا تھا۔ میں اپنے باپ کے قول پر عمل کروں یا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کروں؟ تو مجھ سے اٹھ جا۔ اس روایت کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث ابو عیسیٰ ترمذی نے صالح بن کیسان عن ابن شہاب عن سالم کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ لیث عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے حج تمتع کیا تھا سب سے پہلے حج تمتع سے حضرت معاویہ نے منع کیا تھا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث کی یہ حدیث منکر ہے، لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مشہور ہے کہ وہ دونوں حج تمتع سے منع کرتے تھے اگرچہ اہل علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ تمتع جس سے حضرت عمر نے منع کیا تھا اور جس پر مارا تھا وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ کرنا ہے۔ رہا پہلے عمرہ کرنا اور پھر حج کرنا اس سے حضرت عمر منع نہیں کرتے تھے اور جنہوں نے حضرت عمر کے حج تمتع سے منع کرنے کو صحیح کہا ہے ان کا خیال ہے کہ آپ حج تمتع سے اس لئے منع فرماتے تھے تا کہ بیت اللہ میں لوگ سال میں دو یا زیادہ مرتبہ آئیں تا کہ موسم حج کے علاوہ بھی زائرین کی اس میں کثرت رہے۔ آپ نے اہل حرم پر رفق و مہربانی داخل کرنے کا ارادہ کیا تھا تا کہ حضرت ابراہیم کی دعا ثابت ہو جائے فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ۔ (ابراہیم: 37)

دوسرے کئی علماء نے فرمایا: حضرت عمر نے حج تمتع سے اس لئے منع فرمایا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ آسانی اور رخصت کی وجہ سے حج تمتع کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ پس آپ کو حج افراد اور حج قران کے ضیاع کا اندیشہ ہوا جبکہ وہ دونوں حج بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہیں۔ امام احمد نے حج تمتع کے اختیار پر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے ''اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لے آتا اور میں حج کے احرام کو عمرہ بنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی التمتع، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)

دیتا(1)۔اس حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: حج قران افضل ہے، ان میں امام ابو حنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی قول مزنی کا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ اس میں انسان دو فرض اکٹھے ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے، اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب کا قول بھی ہے اور حضرت علی نے حج قران کو پسند کیا ہے اور اس کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو بخاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرمایا: میں نے وادی عقیق میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "اس رات میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اس نے کہا: اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور حج و عمرہ کرو(2)۔" ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبيك بعمرة و حجة۔(3) یعنی آپ نے عمرہ اور حج کی نیت سے تلبیہ کہا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: ان شاء اللہ حج افراد افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ حج مفرد کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: حج افراد افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے حج افراد کے متعلق آثار زیادہ صحیح ہیں نیز حج افراد میں عمل زیادہ ہے پھر عمرہ دوسرا عمل ہے یہ سب طاعت ہیں اور جس میں عمل زیادہ ہو وہ افضل ہوتا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: حج افراد کرنے والے کو متمتع سے زیادہ تھکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ثواب زیادہ ہے اور احادیث کے اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حج تمتع اور قران کا حکم دیا تو یہ کہنا جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع اور قران کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ (زخرف: 51)۔

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: ہم نے رجم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا حالانکہ آپ ﷺ نے رجم کا حکم فرمایا تھا۔ میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے حج میں ظاہر حج قران ہے آپ قران کرنے والے تھے اس کی وجہ حضرت عمر اور حضرت انس کی مذکورہ احادیث ہیں اور صحیح مسلم میں بکر سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا اکٹھا تلبیہ کہتے ہوئے سنا(4)۔ بکر نے کہا میں نے یہ حضرت ابن عمر سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ کہا۔ میں حضرت انس سے ملا۔ میں نے انہیں حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا۔ حضرت انس نے کہا: تم ہمیں شمار نہیں کرتے مگر بچے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبيك عمرة و حجة۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا اور صحابہ کرام نے حج کا احرام باندھا اور نبی کریم ﷺ نے احرام نہ کھولا اور ان صحابہ نے بھی احرام نہ کھولا جنہوں نے ہدی ساتھ لائی تھی اور باقی لوگوں نے احرام کھول دیا تھا۔ بعض اہل علم نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ جب آپ قران کرنے والے تھے تو آپ

---

1۔ صحیح مسلم، كتاب الحج، حجة النبي ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح بخاری، كتاب الحج، قول النبي العقيق واد مبارك، صفحہ 207، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، كتاب الحج، في الجمع بين الحج والعمرة، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، كتاب الحج، في الأفراد والقران، صفحہ 404، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نے حج اور عمرہ کیا تھا۔ اس طرح احادیث متفق ہو گئیں۔ نحاس نے کہا: سب سے بہتر وہ ہے جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جس نے آپ کو دیکھا اس نے کہا: آپ نے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا، بعض نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے افراد کیا پھر کہا: لبیك بحجة و عمرة (1) جس نے آپ سے یہ سنا اس نے کہا: آپ نے قران کیا۔ پس احادیث متفق ہو گئیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو میں نے حج مفرد کیا اور تمتع نہیں کیا اور آپ سے یہ صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے حج قران کیا۔ جیسا کہ نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا تو نے کیسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی: میں نے آپ کے احرام جیسا باندھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور حج قران کا احرام باندھا ہے۔ حضرت علی نے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں بھی ایسا کرتا جیسا تم نے کیا ہے لیکن میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور میں نے حج قران کا احرام باندھا ہے (2)۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عمرہ کا احرام کھول دیا ہے اور آپ نے احرام نہیں کھولا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے سر پر گوند لگائی ہوئی ہے اور میں ہدی ساتھ لایا ہوں میں احرام نہیں کھولوں گا حتیٰ کہ میں قربانی کر لوں گا (3)۔ یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج قران کرنے والے تھے، اگر آپ حج تمتع یا حج مفرد کرنے والے ہوتے تو آپ ہدی کے نحر کی وجہ سے نہ رکتے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے جو یہ کہا ہے کہ کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ میں نے حج افراد کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حج کا احرام باندھتا ہوں اور مسلم کی حضرت ابن عمر سے روایت ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا تو میں حج کا احرام باندھتا ہوں کے ارشاد میں حج مفرد پر دلیل باقی نہ رہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ میں نے حج قران کیا باقی رہا اور حضرت انس جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لبیك بحجة و عمرة معاً کہتے ہوئے سنا۔ یہ جملہ حق قران پر نص صریح ہے کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتا۔ دار قطنی نے عبد اللہ بن ابی قتادہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد آپ دوبارہ حج کرنے والے نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** جب حج مفرد، تمتع اور قران کے بارے قول گزر چکا ہے کہ یہ سب بالاجماع جائز ہیں اور حج تمتع کی علماء کے نزدیک چار صورتیں ہیں: (۱) ایک صورت ایسی ہے جس پر اجماع ہے اور تین صورتیں مختلف فیہا ہیں۔ رہی وہ صورت جو مجتمع علیہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔

یعنی انسان حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور وہ شخص آفاقی ہو، مکہ مکرمہ میں آیا ہو، عمرہ

---

1۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، قران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم)　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، التمتع والقران والافراد بالحج، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

سے فارغ ہو گیا ہو پھر مکہ میں اسی سال حج شروع کرنے تک بغیر احرام کے رہا ہو، اپنے گھر کی طرف واپس نہ گیا ہو یا باہر سے آنے والوں کے میقات کی طرف جانے سے پہلے اسی کیفیت میں رہا ہو۔ جب وہ اس طرح کرے گا تو وہ متمتع ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ واجب کیا ہے جو متمتع پر واجب کیا ہے اور یہ میسر ہدی ہے۔ وہ اس ہدی کو ذبح کرے گا اور منیٰ یا مکہ کے مساکین کو کھلائے گا۔ اگر ہدی نہ پائے تو تین روزے رکھے گا اور سات روزے اپنے شہر واپس آ کر رکھے گا۔ جیسا کہ آگے آئے گا اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس پر دسویں کا روزہ نہیں ہے اور ایام تشریق کے روزوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

اس حج تمتع پر علماء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے۔ اس کی آٹھ شروط ہیں: (۱) حج وعمرہ کا جمع کرنا (۲) ایک سفر میں ہونا (۳) ایک سال میں ہونا (۴) حج کے مہینوں میں ہونا (۵) عمرہ کا پہلے کرنا (۶) دونوں کو نہ ملانا بلکہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنا (۷) عمرہ اور حج ایک شخص کی طرف سے ہونا (۸) اہل مکہ کے علاوہ سے ہونا۔ ان شروط میں غور کر جو ہم نے تمتع کے حکم میں بیان کی ہیں تو ان کو پالے گا۔

دوسری وجہ حج قران ہے وہ یہ ہے کہ ایک احرام میں حج اور عمرہ کو جمع کرنا، وہ دونوں کا اکٹھا احرام حج کے مہینے میں باندھے یا کسی اور مہینے میں باندھے اور وہ کہے: لبیك بحجة و عمرة معا (میں نے حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا) جب مکہ شریف میں آئے تو حج وعمرہ کے لئے ایک طواف کرے اور ایک سعی کرے۔ یہ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، اسحاق اور ابوثور کی رائے ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عطا بن ابی رباح، حسن، مجاہد اور طاؤس کا مذہب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع کے لئے نکلے ہم نے عمرہ کا احرام باندھا .....الحدیث (1)۔

اس حدیث میں ہے جنہوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا تھا، انہوں نے ایک طواف کیا تھا، یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ سے جانے کے دن فرمایا جبکہ حضرت عائشہ نے بیت اللہ کا طواف نہیں کیا تھا کیونکہ آپ کو حیض آ گیا تھا: تیرا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا۔ ایک روایت میں: تیرا صفا و مروہ کا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا (2)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے یا مکہ پہنچ کر دو طواف اور دو سعی کرے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح اور ابن ابی لیلیٰ کا نظریہ ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ یہی قول شعبی اور جابر بن زید کا بھی ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے حجت پکڑی ہے کہ انہوں نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور دونوں کے لئے دو طواف اور دو سعی کیں پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ دار قطنی نے اپنی سنن میں یہ احادیث روایت کی ہیں اور تمام کو ضعیف قرار دیا ہے اور حج قران کو تمتع کے باب سے بتایا ہے کیونکہ قارن ایک مرتبہ عمرہ اور ایک حج کے سفر کی مشقت کو ترک کرنے کے ساتھ متمتع ہوتا ہے اور دونوں سے اکٹھا متمتع ہوتا ہے اور ہر ایک کے لئے میقات سے علیحدہ احرام نہیں باندھتا اور حج کو عمرہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان وجوہ الاحرام، صفحہ 386، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، صفحہ 91-390، جلد 1

ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ یہ تمتع کی ایک صورت ہے اس کے جواز میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں اور اہل مدینہ حج اور عمرہ جمع کرنے کی اجازت صرف اس صورت میں دیتے ہیں جبکہ حاجی ہدی ساتھ لایا ہو۔ اور ان کے نزدیک اس صورت میں اونٹ دینا ہوگا اس سے کم نہیں۔ قران کے تمتع ہونے پر دلیل حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ قران کو انہوں نے اہل آفاق کے لئے بنایا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

پس جو مسجد حرام والوں سے ہو اور وہ حج تمتع یا حج قران کرے تو اس پر قران اور تمتع کا دم (بکری) نہیں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں نے نہیں سنا کہ کسی مکی نے حج قران کیا ہو اگر وہ کرے گا تو اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے اور امام مالک کے قول پر جمہور فقہاء کا نظریہ ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے کہا: جب مکی حج، عمرہ کے ساتھ کرے گا تو اس پر قران کا دم (بکری) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ سے خون اور روزہ کو تمتع میں ساقط کیا ہے۔

تیسری وجہ تمتع کی یہ ہے جس پر حضرت عمر نے دھمکی دی تھی۔ آپ نے فرمایا: دو متعے ایسے ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھے اور میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان پر سزا دیتا ہوں۔ ایک عورتوں کا متعہ اور دوسرا متعۃ الحج۔ اس کے جواز میں علماء کا ابھی تک جھگڑا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی حج کا احرام باندھے حتیٰ کہ جب مکہ میں داخل ہو تو حج کے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر دے۔ پھر احرام کھول دے پھر بغیر احرام کے ٹھہرا رہے حتیٰ کہ آٹھویں کے دن حج کا احرام باندھے۔ یہ وہ وجہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آثار وارد ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جس کے پاس ہدی نہیں ہے اور وہ ہدی ساتھ نہیں لایا ہے اور وہ حج کا احرام باندھ چکا تھا تو وہ اسے عمرہ کا احرام باندھے اور ان آثار کی تصحیح پر بھی علماء کا اجماع ہے۔ ان میں سے کسی اثر کو نہیں چھوڑا ہے لیکن اس کے متعلق قول اور علل کی وجہ سے عمل میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے اس پر عمل ترک کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ خاص تھا اور اسی حج کے متعلق تھا۔

حضرت ابوذر نے کہا: حج میں تمتع ہمارے لئے خاص تھا۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: دو متعے صرف ہمارے ساتھ خاص تھے۔ عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعۃ الحج (1)۔ خصوصیت کی علت اور اس میں فائدہ وہ ہے جو حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا ہے لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر بہت بڑا گناہ ہے اور وہ خود محرم کو صفر بنا دیتے تھے اور وہ کہتے تھے جب اونٹ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا، اثر مٹ جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب چار ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کو عمرہ بنانے کا حکم دیا۔ یہ حکم صحابہ کو بڑا عظیم لگا۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ احرام کھولنا کیسا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر پابندی سے حلال ہو گئے ہو (2)۔ یہ حدیث مسلم نے نقل فرمائی ہے۔ مسند صحیح ابو حاتم میں حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 402، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز العمرۃ فی اشہر الحج، صفحہ 406، جلد 1

ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کو ذی الحجہ میں اس لئے عمرہ کرایا تھا کہ اہل شرک کے نظریہ کا قلع قمع ہو جائے۔ قبیلہ قریش اور جوان کے دین کے پیروکار تھے وہ کہتے تھے: جب اونٹ سے اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا زخم ٹھیک ہو جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہو جائے گا، وہ عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے حتیٰ کہ ذوالحجہ گزر جائے۔ حضرت عائشہ کو آپ ﷺ نے ان کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے عمرہ کرایا تھا۔ اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ نے حج کو عمرہ میں اس لئے تبدیل کیا تھا تاکہ آپ انہیں دکھائیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو حج اور عمرہ مکمل کرنے کا حکم مطلق دیا جو بھی ان میں داخل ہو اور ظاہر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ثابت نہیں مگر ناسخ کتاب یا سنت مبینہ کی طرف رجوع ضروری ہے جس میں کوئی اشکال نہ ہو۔ اور ان علماء نے حضرت ابوذر کے قول اور حضرت حارث بن بلال کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ حارث اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں، انہوں نے فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! حج کا فسخ کرنا ہمارے ساتھ خاص ہے یا تمام لوگوں کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے ساتھ خاص ہے(1)۔ اور فقہاء حجاز، عراق اور شام کا یہ نظریہ ہے مگر ایک چیز حضرت ابن عباس، حسن، اور سدی سے مروی ہے اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: میں ان صحیح متواتر آثار کو جو حج کو عمرہ میں فسخ کرنے کے متعلق وارد ہیں حضرت حارث بن بلال عن ابیہ کی حدیث سے اور حضرت ابوذر کے قول سے رد نہیں کرتا۔ امام احمد نے فرمایا: جو حضرت ابوذر نے کہا ہے اس پر اجماع نہیں ہے اگر اجماع ہوتا تو حجت ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت ابوذر کی مخالفت کی ہے اور اس کو خصوصیت نہیں بنایا ہے۔

امام احمد نے حضرت جابر کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حج کے بارے میں ہے۔ اس میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اسے عمرہ بناتا۔ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم اٹھے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ ہمارے اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا اور فرمایا: عمرہ حج میں داخل ہوا۔ یہ دو مرتبہ فرمایا: نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے(2)۔ یہ مسلم کے لفظ ہیں اور امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے یہ باب باندھا ہے، جس نے حج کا تلبیہ کہا اور اس کا نام لیا۔ پھر حضرت جابر کی حدیث ذکر کی، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئے اور ہم نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنانے کا حکم دیا(3)۔

بعض علماء نے فرمایا: احرام کھولنے کا نبی کریم ﷺ نے جو حکم دیا تھا وہ دوسری وجہ سے تھا۔ مجاہد نے وہ وجہ ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے پہلے حج کو فرض نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں مطلقاً احرام باندھنے اور نئے حکم کا انتظار کرنے کا

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، الرجل یحل بالحج ثم یجعلها عمرة، صفحہ 252، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من لبی بالحج و سماہ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حکم دیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے مطلق احرام باندھا تھا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام تھا اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دیتا۔ گویا آپ حکم کے منتظر ہو کر نکلے تھے اور صحابہ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا۔ اس پر دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''میرے پاس میرے رب کی طرف سے آنے والا اس مبارک وادی میں آیا اور کہا: تم کہو میں حج کو عمرہ میں بدلتا ہوں (1)''۔

متعہ کی چوتھی وجہ محصر اور جس کو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس کا متعہ ہے۔ یعقوب بن شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابوسلمہ تبوذکی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں وہب نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اسحاق بن سوید نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا: اے لوگو! اللہ کی قسم! حج تمتع اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کرتے ہو تمتع یہ ہے کہ ایک شخص حج کے ارادہ سے نکلے پھر دشمن یا کوئی عذر اسے روک لے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں پھر وہ بیت اللہ کے پاس آئے طواف کرے صفا و مروہ کی سعی کرے پھر آئندہ سال تک حلالی ہونے کے ساتھ متمتع ہو، پھر حج کرے اور ہدی دے۔ محصر کا حکم اور اس کے متعلق علماء کی آراء واضح طور پر گزر چکی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور ان (حضرت عبداللہ بن زبیر) کے مذہب سے یہ تھا کہ محصر احرام نہ کھولے بلکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ دسویں کے دن اس کی طرف سے ہدی ذبح کی جائے پھر وہ حلق کرائے اور اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ وہ مکہ میں آئے پھر عمرہ کے عمل سے اپنے حج سے حلالی ہو۔ اور حضرت ابن زبیر نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کے خلاف ہے: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس کے بعد فرمایا وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ (اللہ کے لئے حج اور عمرہ مکمل کرو) احصار کے حکم میں حج اور عمرہ کے درمیان کوئی فرق بیان نہیں کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ جب حدیبیہ میں روکے گئے تو صحابہ نے احرام کھولا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احرام کھولا اور صحابہ کرام کو احرام کھولنے کا حکم دیا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ متمتع کو متمتع کیوں کہا جاتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا: کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جس کا کرنا محرم کے لئے عمرہ سے حلالی ہونے کے وقت سے حج شروع کرنے کے وقت تک جائز نہیں ہوتا۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کو متمتع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دو سفروں میں سے ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا کیونکہ عمرہ کا حق ہے کہ تو اس کے لئے سفر کا قصد کرے اور حج کے لئے بھی اسی طرح حق ہے جب ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ہدی کو لازم کیا جیسے قارن پر لازم کیا جس نے ایک سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ پہلی وجہ اعم ہے کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوتا ہے جو حلالی کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوا اور میقات سے حج کا احرام باندھنا بھی ساقط ہوا۔ اس وجہ سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود نے حج تمتع کو ناپسند کیا۔ ان دونوں حضرات نے یا ان میں سے ایک نے فرمایا: تم میں سے کوئی منیٰ میں آئے گا جبکہ اس کے ذکر سے منی کے قطرے گر رہے ہوں گے جبکہ حج تمتع پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

1۔ ایضاً، کتاب الحج، قول النبی العقیق واد مبارک، صفحہ 207، جلد 1

علماء کی ایک جماعت نے کہا: حضرت عمر نے اس کو ناپسند کیا کیونکہ وہ پسند کرتے تھے کہ بیت اللہ کی سال میں دو مرتبہ زیارت کی جائے۔ ایک دفعہ حج کے لئے ایک دفعہ عمرہ کے لئے۔ حضرت عمر حج مفرد کو افضل سمجھتے تھے اور وہ حج مفرد کا حکم دیتے تھے، اس کی طرف ان کا میلان تھا اور استحباب کے طور پر حج تمتع اور قران سے منع کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اپنے حج اور اپنے عمرہ کو علیحدہ علیحدہ کرو۔ یہی تمہارے لئے حج کا اتمام ہے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کا احرام باندھنا، عمرہ کا اتمام ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 5:** جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرے پھر اپنے شہر کو واپس آجائے اور پھر اسی سال حج کرے، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ وہ متمتع نہیں ہے اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے۔ حسن بصری نے کہا: وہ متمتع ہے اگرچہ وہ گھر کی طرف لوٹ بھی آئے خواہ اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ متعہ ہے۔ یہ ہشیم نے یونس سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے۔ یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اس پر ہدی نہیں ہے، پہلا قول صحیح ہے اسی طرح ابوعمر نے ذکر کیا ہے، اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کو ابن منذر نے ذکر نہیں کیا۔ ابن منذر نے کہا: ان کی حجت کتاب اللہ کا ظاہر ہے ارشاد ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ۔ اس آیت میں کوئی استثناء نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنے والا ہو یا نہ ہو۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبان پر بیان کر دیتا۔ سعید بن مسیب سے حسن کے قول کی طرح مروی ہے۔ ابوعمر نے کہا: حسن سے اس مسئلہ میں ایسا قول مروی ہے جس کی متابعت نہیں کی گئی اور اہل علم میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے دسویں ذی الحجۃ کے دن کے بعد عمرہ کیا وہ متعہ ہے۔ طاؤس سے دو قول مروی ہیں، دونوں زیادہ شاذ قول ہیں۔ اس سے بھی جو ہم نے حسن سے ذکر کیا ہے، ایک یہ ہے کہ جس نے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ کیا پھر وہ ٹھہرا رہا حتیٰ کہ حج کا وقت داخل ہو گیا، پھر اس نے اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے(2)۔ یہ طاؤس کے علاوہ کسی عالم نے نہیں کہا ہے اور فقہاء امصار میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔ یہ اس لئے کہ حج کے مہینے عمرہ کی نسبت حج کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ عمرہ پورے سال میں سنت ہے اور حج کے لئے معلوم مہینے ہیں۔ جب کسی نے حج کے مہینوں میں عمرہ کیا تو اس نے ایسے وقت میں عمرہ کیا جس میں حج اولیٰ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر متمتع اور قران کرنے والے کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کی رخصت دی ہے اور اس کے لئے جو عمرہ کو علیحدہ کرے۔ یہ اس کی طرف سے رحمت ہے اور اس میں میسر ہدی کو اس میں مقرر کیا ہے۔ دوسری وجہ وہ ہے جو مکی نے بیان کی ہے جو کسی شہر سے حج تمتع کرے اس پر ہدی ہے۔ یہ ظاہر قرآن کے مطابق نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ تمتع علماء کے نزدیک ان شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اجماع ہے کہ ایک ایسا شخص جو اہل مکہ سے نہ ہو اگر وہ حج کے مہینوں میں مکہ میں ٹھہرنے کے ارادہ

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع ما جاء فی العمرۃ، صفحہ 358 (وزارت تعلیم)　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 269، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے عمرہ کرتے ہوئے آئے پھر اسی سال حج کرے تو وہ متمتع ہے۔ اس پر وہی کچھ ہے جو متمتع پر ہے اور مکی کے بارے میں اجماع ہے کہ وہ میقات کے پیچھے سے عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے آئے پھر مکہ سے حج شروع کرے جبکہ اس کے گھر والے مکہ میں ہوں اور وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہرے تو اس پر بکری نہیں ہے۔ اسی طرح کا حکم ہے جب وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ ٹھہرے یا مکہ میں ٹھہرے جبکہ مکہ میں اس کے اہل ہوں اور مکہ کے علاوہ کسی شہر میں بھی اس کے اہل ہوں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر وہ مکہ سے اپنے اہل کے ساتھ منتقل ہو گیا پھر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرتے ہوئے آیا پھر مکہ میں ٹھہرا رہا حتیٰ کہ اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری اور ابوثور کا اتفاق ہے۔ متمتع عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کرے گا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے گا تو اس پر اس کے بعد حج کے لئے دوسرا طواف اور دوسری صفا و مروہ کے درمیان سعی ہوگی۔ عطا اور طاؤس سے مروی ہے کہ ایک سعی کافی ہے۔ پہلا قول مشہور ہے وہی جمہور کا نظریہ ہے اور قارن کے طواف کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ شروع کرے پھر حج کے مہینوں میں عمرہ کا عمل کرے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کا عمرہ اس مہینہ میں ہوا جس میں وہ حلالی ہوا تھا اگر وہ حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں اس سے حلالی ہونا چاہتا ہے تو وہ متمتع نہیں ہے۔ اگر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ سے حلالی ہوا ہے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب عمرہ کے لئے حرمت والے مہینوں میں بیت اللہ کا طواف کرے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے کیونکہ عمرہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ مکمل ہوتا ہے اور اس کے کمال کی طرف دیکھا جاتا ہے یہ حسن بصری، حکم بن عیینہ، ابن شبرمہ اور سفیان ثوری کا قول ہے اور قتادہ، احمد اور اسحٰق نے کہا: عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔ یہی معنی حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔ طاؤس نے کہا: اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوا۔ اصحاب رائے کا قول ہے: اگر اس نے رمضان میں تین چکر لگائے اور چار چکر شوال میں لگائے پھر اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔ اگر رمضان میں چار چکر لگائے اور شوال میں تین چکر لگائے تو وہ متمتع نہیں ہوگا۔ ابو ثور نے کہا: جب حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ میں داخل ہو تو برابر ہے اس نے رمضان میں طواف کیا ہو یا شوال میں طواف کیا ہو وہ اس عمرہ کی وجہ سے متمتع نہیں ہوگا۔

یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔

**مسئلہ نمبر 9:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا اس پر حج کو داخل کر دیا جب تک کہ بیت اللہ کا طواف ابھی شروع نہیں کیا تھا تو وہ قارن شمار ہوگا۔ اس پر وہ لازم ہوگا جو اس قارن پر لازم ہوتا ہے جو حج اور عمرہ کی اکٹھی نیت کرتا ہے۔ اور عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد عمرہ پر حج کو داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر یہ لازم ہے اور جب تک عمرہ کا طواف مکمل نہ کیا ہو وہ قارن شمار ہوگا، اس کی مثل امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ سے مشہور یہ ہے کہ اس کے لئے یہ جائز نہیں مگر طواف میں شروع ہونے سے پہلے نیت کر لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس

کے لئے جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کو داخل کرے جب تک طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں۔ یہ تمام امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول ہیں۔ جب عمرہ کرنے والے نے عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو پھر اس نے حج کا احرام باندھا ہو تو وہ قارن ہوگا اور اس سے باقی عمرہ ساقط ہو جائے گا اور قران کا دم اس پر لازم ہوگا اسی طرح جس نے حج کا احرام باندھا اپنے عمرہ کے طواف کے نصف میں یا اس سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے تو اس کا یہی حکم ہے۔ بعض نے فرمایا: جب تک صفا و مروہ کے درمیان سعی مکمل نہ کی ہو اس کے لئے حج کو عمرہ پر داخل کرنا جائز ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ تمام اقوال اہل علم کے نزدیک شاذ ہیں۔ اشہب نے کہا: جب عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو تو اس پر حج کا احرام لازم نہیں اور وہ قارن نہ ہوگا، وہ اپنے عمرہ کو جاری رکھے حتیٰ کہ اسے مکمل کرے پھر حج کا احرام باندھے۔ یہ امام شافعی اور عطا کا قول ہے اور یہی ابو ثور کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** حج کو عمرہ میں داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: عمرہ حج پر داخل نہ ہوگا اور جس نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا تو عمرہ کسی چیز کے ساتھ نہیں۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول ہے اور مصر میں ان سے یہی مشہور ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ وہ قارن ہو جائے گا اور اس پر وہی ہوگا جو قارن پر ہوتا ہے جب تک کہ اس نے حج کے طواف کا ایک چکر بھی نہ لگایا ہو۔ اگر طواف کر لیا ہو تو اس پر لازم ہوگا کیونکہ اس نے حج میں عمل کیا۔ ابن منذر نے کہا: اس مسئلہ میں میں امام مالک کے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 11:** امام مالک نے فرمایا: جس نے عمرہ کے لئے ہدی دی دراں حالیکہ وہ متمتع ہے تو اس کے لئے یہ کافی نہیں اور اس پر متعہ کے لئے دوسری ہدی ہے کیونکہ وہ متمتع ہو جائے گا جب عمرہ سے حلال ہونے کے بعد حج شروع کرے گا اس وقت اس پر ہدی واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہ، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: وہ ہدی کو نحر نہ کرے مگر دسویں کے دن۔ امام احمد نے فرمایا: اگر متمتع دس دنوں سے پہلے آئے تو طواف کرے، سعی کرے اور اپنی ہدی کو نحر کر دے اور اگر دس دنوں میں آئے تو دسویں کے دن نحر کرے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب طواف اور سعی کر لے تو وہ عمرہ کا احرام کھول دے خواہ ہدی لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

**مسئلہ نمبر 12:** امام مالک اور امام شافعی کا اس متمتع کے بارے میں اختلاف ہے جو مر جائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب حج کا احرام باندھ لیا تھا تو اس پر متعہ کا دم (بکری) ہے جبکہ وہ اس کو پانے والا ہو۔ زعفرانی نے امام شافعی سے یہ حکایت کیا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس متمتع کے بارے پوچھا گیا جو حج کا احرام باندھنے کے بعد عرفہ یا اس کے علاوہ کسی جگہ فوت ہو جاتا ہے، کیا اس پر ہدی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جو جمرہ عقبہ پر رمی جمار کرنے سے پہلے مر جائے تو اس پر ہدی نہیں ہے اور جس نے رمی جمار کر لیا تھا پھر مر گیا تو اس پر ہدی ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کل مال سے ہدی دی جائے گی یا تہائی مال سے،'' ۔م مالک نے فرمایا: کل مال سے۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ یعنی جو ہدی نہ پائے مال نہ ہونے کی وجہ سے یا حیوان نہ ہونے کی وجہ سے تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات روزے اپنے شہر میں واپس آکر رکھے اور حج کے تین روزے اس طرح رکھے کہ آخری روزہ نویں ذی الحجہ کا ہو۔ یہ طاؤس کا قول ہے۔ شعبی، عطا، مجاہد، حسن بصری، نخعی، سعید بن جبیر، علقمہ، عمرو بن دینار اور اصحاب رائے سے مروی ہے۔ ابن منذر نے اس کو حکایت کیا ہے۔ ابوثور نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے عمرہ کے احرام میں روزے رکھے کیونکہ وہ تمتع کا ایک احرام ہے۔ پس اس میں ان دنوں کا روزہ جائز ہے جس طرح حج کے احرام میں جائز ہے (1)۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ وہ آٹھویں کے دن سے پہلے ایک دن روزہ رکھے پھر آٹھویں اور عرفہ کے دن کا روزہ رکھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت مالک بن انس نے کہا: اس کے لئے ہے کہ وہ روزہ رکھے جب سے اس نے حج کا احرام باندھا ہے دسویں کے دن تک (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج میں تین روزے رکھے۔ جب عمرہ میں روزہ رکھے تو وہ اپنے وقت سے پہلے ادا کرنے والا ہوگا تو وہ جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل نے کہا: حج کا احرام باندھنے اور نویں ذی الحجہ کے درمیان روزے رکھے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ یہ امام مالک سے مروی ہے، مؤطا میں ان کے قول کا یہی مقتضا ہے تاکہ وہ عرفہ کے دن افطار کرنے والا ہو۔ اس میں سنت کی اتباع ہے اور عبادت پر زیادہ قوت دینے والا ہے (3)۔ امام احمد سے مروی ہے، جائز ہے کہ وہ احرام باندھنے سے پہلے تین روزے رکھے۔ ثوری اور اوزاعی نے کہا: ذی الحجہ کے دس دنوں کے آغاز سے روزے رکھے (4)۔ یہ عطا کا قول ہے۔ عروہ نے کہا: ایام منیٰ میں مکہ میں وہ روزے رکھے۔ یہ امام مالک اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایام منیٰ یہ وہ تین دن ہیں جو دسویں کے دن سے متصل ہیں۔ امام مالک نے مؤطا میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی تھیں: روزہ اس کے لئے ہے جو حج تمتع کرے اور حج کا احرام باندھنے سے لے کر عرفہ کے دن تک ہدی نہ پائے، اگر پہلے روزے نہیں رکھے تو ایام منیٰ میں روزے رکھے (5)۔ یہ الفاظ حج تمتع کا احرام باندھنے کے وقت سے عرفہ کے دن تک روزہ کی صحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ آغاز کا وقت ہے کیونکہ یہ ادائیگی کا وقت ہے اور اس کے بعد ایام منیٰ قضا کا وقت ہے۔ جیسا کہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے اور دسویں کے دن سے پہلے روزے رکھنا ذمہ سے بری ہونا ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ مذہب یہ ہے کہ ادا کے طور پر ہیں اگرچہ ایام منیٰ سے پہلے روزے رکھنا افضل ہے جس طرح نماز کا وقت ہے اس میں ادائیگی کی وسعت ہے اگرچہ پہلا وقت آخری وقت سے افضل ہے۔ یہ صحیح ہے

1۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ تفسیر طبری، صفحہ 297، جلد 2 (دار احیاء التراث العلمیہ)
5۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، صیام التمتع، صفحہ 462 (وزارت تعلیم)

اور یہ ادا ہے قضا نہیں ہے کیونکہ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ کے کلمات یہ احتمال رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حج کی جگہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایام حج مراد ہوں۔ اگر ایام حج مراد ہوں تو یہ قول صحیح ہے کیونکہ آخری دن ایام حج کا دسویں کا دن ہے اور یہ احتمال ہے کہ آخری دن رمی جمار کے دن ہوں کیونکہ رمی جمار کرنا خالص حج کے عمل سے ہے اگرچہ اس کے ارکان سے نہیں ہے۔ اگر حج کی جگہ مراد ہو تو وہ ایام منیٰ میں جب تک مکہ میں ہے روزے رکھ لے جیسا کہ عروہ نے کہا ہے۔ یہ بہت قوی ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ روزوں کو ایام تشریق تک مؤخر کرے، کیونکہ اس پر روزہ واجب نہیں ہے مگر یہ کہ دسویں کے دن ہدی نہ پائے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اگر کہا جائے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت اور امام شافعی کا جدید قول یہ ہے کہ امام شافعی کے اکثر اصحاب کا یہ نظریہ ہے کہ ایام تشریق کا روزہ جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام منیٰ کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نہی ثابت ہو تو یہ عام ہوگا، اس سے متمتع خاص ہوگا اس روایت سے جو بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ ان دنوں میں روزہ رکھتی تھیں۔ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی رخصت نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو ہدی نہ پائے۔ دارقطنی نے کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے تین طرف سے مرفوع روایت کیا ہے اور تینوں طرف کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ حج کے ایام میں سے باقی صرف یہی مقدار رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے روزے کا وجوب متحقق ہو جاتا ہے، ہدی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ فوت ہو جاتا ہے تو ایام تشریق کے بعد روزہ رکھے گا (2)۔ یہ حسن اور عطا کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں، ایک طائفہ نے کہا: جب دس دنوں میں روزہ نہ رکھے تو پھر ہدی کے سوا کوئی چیز یاد نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، طاؤس اور مجاہد سے مروی ہے۔ امام ابوعمر نے امام ابوحنیفہ سے اور آپ کے اصحاب سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ متمتع ہدی پائے تو اسے روزہ رکھنے کا اختیار نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی ہدی کو پانے والا نہ ہو تو پھر وہ روزے رکھنے شروع کر دے پھر روزے مکمل کرنے سے پہلے ہدی کو پالے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ میں داخل ہو پھر ہدی کو پالے تو میرے نزدیک ہدی دینا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اگر اس نے ہدی نہ دی تو روزہ بھی اس کے قائم مقام ہو جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: روزے کو وہ مکمل کرے جبکہ وہ فرض ہے اسی طرح ابو ثور نے کہا: یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے، ابن منذر نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب تیسرے روزے میں ہدی میسر آ گئی تو روزہ باطل ہو جائے گا اور ہدی واجب ہو جائے گی۔ اگر حج میں تین دن روزے رکھ لے پھر اسے ہدی میسر آ گئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ گھر واپس آ کر سات روزے رکھ لے اور ہدی کی طرف نہ لوٹے۔ یہ ثوری، ابن ابی نجیح اور حماد کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبْعَةٍ جمہور کی قرأت عطف کی بنا پر مجرور ہے۔ زید بن علی نے و سبعۃ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: و صوموا سبعۃ (سات روزے رکھو)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا رَجَعْتُمْ جب تم اپنے شہروں کی طرف لوٹو۔ یہ حضرت ابن عمر، قتادہ، ربیع، مجاہد اور عطا کا قول ہے۔ مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: امام شافعی کا بھی یہی قول ہے(1)۔ قتادہ اور ربیع نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اور کسی پر سات روزے واجب نہیں ہوتے مگر جب وطن واپس آ جائے مگر جو اپنے اوپر سختی کرے جس طرح جو رمضان میں سفر میں روزہ رکھتا ہے(2)۔ امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: راستہ میں اسے روزہ جائز ہے۔ مجاہد اور عطا سے مروی ہے، مجاہد نے کہا: اگر وہ چاہے تو راستہ میں روزہ رکھے، یہ رخصت ہے۔ اسی طرح عکرمہ اور حسن نے کہا۔ بعض اہل لغت نے کہا: اس کا مطلب ہے جب تم حج سے لوٹو یعنی جب تم اس حلت کی طرف لوٹو جس پر تم احرام سے پہلے تھے۔ امام مالک نے ''الکتاب'' میں فرمایا: جب منیٰ سے واپس آ جائے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عربی نے کہا: اگر تخفیف اور رخصت ہو تو رخصت کو مقدم کرنا جائز ہے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت کی طرف لوٹنا بالاجماع جائز ہے اگرچہ اس کا وقت متعین ہے لیکن اس میں نص نہیں ہے، نہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شہر کی طرف لوٹنا ہے اور اغلب یہی ہے کہ حج مراد ہے(3)۔ میں کہتا ہوں: بلکہ اس میں ظاہر نص کے قریب ہے۔

مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا اور ہدی دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحلیفہ سے ہدی لے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا احرام باندھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی حج تمتع کیا لوگوں میں سے کچھ ہدی ساتھ لائے تھے اور کچھ ہدی ساتھ نہ لائے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آئے تو لوگوں سے فرمایا: تم میں سے جو ہدی ساتھ لایا ہے وہ کسی چیز سے حلال نہ ہو جو حج کی وجہ سے حرام ہوئی حتیٰ کہ اپنے حج کو مکمل کرے اور جس کے پاس ہدی نہیں ہے وہ بیت اللہ کا طواف کرے پھر صفا و مروہ کا طواف کرے، بال قصر کرائے اور احرام کھول دے پھر محرم احرام باندھے اور ہدی دے۔ جو ہدی کو نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے اور سات روزے گھر والوں کے پاس لوٹ آئے تو رکھے(4)۔ یہ نص کی طرح ہے کہ سات روزے گھر والوں میں شہر والوں میں رکھے۔

اسی طرح بخاری میں حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ ذی الحجہ کی شام ہمیں حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک حج سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ کا طواف کریں گے، صفا و مروہ کا طواف کریں گے تو ہمارا حج مکمل ہو گا اور ہم پر ہدی واجب ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۔(5) (یعنی جب ہم اپنے شہروں کی طرف آئیں۔ الحدیث) نحاس نے کہا: یہ بالاجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کہا جاتا ہے: كمل يكمل بروزن نصر ينصر كمل

---

1۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر)　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر)　4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، وجوب الصوم علی المتمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالك لمن لم يكن اهله، صفحہ 241، جلد 1 (وزارت تعلیم)

یکمل بروزن عظُم یعظُم، کمِلَ یکمل بروزن حَمِد یحمد۔ اس میں یہ تین لغات ہیں۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ کے معنی میں اختلاف ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ دس ہیں۔ زجاج نے کہا: جب کسی خیال کرنے والے کا یہ خیال ہوسکتا تھا کہ حج کے تین روزوں یا واپسی پر سات روزوں میں اختیار ہے اور یہ سات روزے ان تین کا بدل ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ سات روزے اور رکھے تو تِلْكَ عَشَرَةٌ کے قول سے اس وہم وخیال کو زائل کر دیا۔ پھر فرمایا کَامِلَةٌ حسن نے کہا: ثواب میں کامل، جس طرح اس شخص کا ثواب ہے جو ہدی دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: ہدی کا بدل ہونے میں کامل ہے۔ یعنی یہ پورے دس، ہدی کا بدل ہیں، بعض نے فرمایا: ثواب میں کامل ہیں جس طرح اس شخص کا ثواب ہے(1) جس نے تمتع نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظاً اخبار ہے اور اس کا معنی امر ہے یعنی یہ دس مکمل کرو یہ فرض ہیں۔ مبرد نے کہا: عَشَرَةٌ تعداد کے ختم ہونے پر دلیل ہے تا کہ کسی وہم کرنے والے کو وہم نہ ہو کہ ان سات کے بعد بھی کوئی شے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تاکید ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: کتبت بیدی۔ میں نے ہاتھ سے لکھا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے

ثلاث و اثنتان فھن خمسٌ و سادسة تمیل الی شمامی

اس میں خمسٌ تاکید ہے۔

ثلاث بالغداۃ فذاك حسبی وست حسین یدرکنی العشاء
فذالك تسعة فی الیوم ریی و شرب المرء فوق الری داء

ان اشعار میں تسعة تاکید ہے۔

اور کَامِلَةٌ کا ارشاد دوسری تاکید ہے اس میں روزہ رکھنے کی زیادہ تاکید ہے کہ اس تعداد سے کم نہ کرے جیسے تو کسی کو اہم کام کا حکم دیتا ہے تو کہتا ہے: الله الله لا تقصر۔ الله سے ڈرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔

**مسئلہ نمبر 7:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی وہ مسافر جو مسجد حرام کے رہنے والوں سے نہیں ہے اس پر تمتع کا دم واجب ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: مہاجرین، انصار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی احرام باندھا۔ جب ہم مکہ مکرمہ آئے تو رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنادو مگر جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو۔ ہم نے بیت الله اور صفا و مروہ کا طواف کیا اور ہم عورتوں کے پاس آئے اور ہم نے سلے ہوئے کپڑے پہنے اور فرمایا: جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو وہ حلال نہ ہو حتیٰ کہ اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں آٹھویں کی شام حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت الله اور صفا و مروہ کا طواف کریں گے، پس ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی لازم ہوگی، جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ۔ ہدی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں بکری کافی ہے ایک سال میں انہوں نے دو عبادتیں حج اور عمرہ جمع کیں۔ الله تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کیا اور اپنے نبی کی زبان پر بیان فرمایا اور مکہ کے علاوہ لوگوں کے لئے اس کو مباح فرمایا۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ۔ اشھر حج سے مراد شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ہیں جو ان مہینوں میں حج تمتع کرے اس پر ہدی یا روزہ ہے۔ الرفث سے مراد جماع ہے اور الفسوق سے مراد گناہ ہیں الجدال سے مراد جھگڑا ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 8:** لِمَنۡ میں لام بمعنی علی ہے۔ یعنی جو مکی نہیں ہے اس پر دم (بکری) واجب ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: اشترطی لھم الولاء۔ اس میں لام بمعنی علی ہے اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان اسأتم فلھا۔ اس میں بھی لام بمعنی علی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک مسافر کے لئے حج تمتع اور قران کرنے کی طرف اشارہ ہے اور مکہ کے رہنے والوں کے لئے قران و تمتع نہیں ہے۔ ان میں سے جو ایسا کرے اس پر جنایت کا دم ہوگا جس سے وہ نہیں کھائے گا کیونکہ یہ دم تمتع نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ان کے لئے دم تمتع اور قران ہے۔ اشارہ ہدی اور روزہ کی طرف ہے ان پر ہدی اور روزہ نہیں ہے۔ عبدالملک بن ماجشون نے تمتع اور قران کے درمیان فرق کیا ہے، پس قران میں خون کو واجب کیا ہے اور تمتع میں ساقط کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس بات پر اجماع ہونے کے بعد کہ اہل مکہ اور اس سے متصل رہنے والے لوگ مسجد حرام میں رہنے والے لوگ ہیں۔ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ طبرانی نے کہا: اہل حرم پر اجماع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس طرح جس طرح اس نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جن پر جمعہ واجب ہے وہ حضری ہے جو اس سے دور ہے وہ بدوی ہے یہ لفظ حضارۃ اور بداوۃ سے بنائے ہیں (2)۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ اہل مکہ اور اس کے متصل رہنے والے لوگ ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد مواقیت اور اس کے اندر رہنے والے لوگ ہیں۔ پس مواقیت یا مواقیت سے اندر رہنے والے ہیں وہ حاضری المسجد الحرام میں سے ہیں۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی جگہ پر رہتے ہیں جن پر مکہ آتے وقت نماز قصر نہیں ہوتی۔ یہ مواقیت کے قریب رہنے والے لوگ ہیں۔ آیت کی تاویل میں متقدمین کے ان اقوال پر مذاہب ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی جو الله نے تم پر فرض کیا اس کے بارے میں الله سے ڈرو۔ بعض نے فرمایا: بالعموم تقویٰ کا امر ہے اور عذاب کی شدت سے ڈرانا ہے۔

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول الله تعالیٰ ذالك لمن لم یکن اھلہ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

”حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ پس جو نیت کرلے ان میں حج کی تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیزگاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو!“۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ جب اللہ تعالیٰ نے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ میں حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا تو وقت میں ان کے اختلاف کو بیان فرمایا۔ سارا سال عمرہ کے احرام کا وقت ہے اور عمرہ کا وقت ہے۔ رہا حج یہ سال میں ایک مرتبہ واقع ہوتا ہے، یہ ان مخصوص مہینوں کے علاوہ میں واقع نہیں ہوتا۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ مبتدا خبر ہیں اور کلام میں حذف ہے۔ اس کی تقدیر اشهر الحج اشهرٌ ہے یا وقت الحج اشهرٌ ہے یا وقت عمل الحج اشهرٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر الحج فی الاشهر ہے۔ حرف جر کے سقوط کے ساتھ اشہر کی نصب لازم ہے اور کسی نے اس کی نصب کے ساتھ نہیں پڑھا مگر کلام میں ظرف کی بنا پر نصب جائز ہے۔ فراء نے کہا: اشہر مرفوع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: وقت الحج اشهرٌ معلومات۔ فراء نے کہا: میں نے کسائی کو یہ کہتے سنا: انما الصيف شهران، انما الطيلسان ثلاثة اشهر۔ اس سے مراد گرمیوں کا وقت اور چادر اوڑھنے کا وقت لیا ہے۔ اس میں حذف ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** الاشهر المعلومات میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، عطا، ربیع، مجاہد اور زہری نے کہا: اشہر حج شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ پورا ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی، شعبی اور نخعی نے کہا: یہ شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر کا یہی قول ہے۔ دونوں قول مالک سے مروی ہیں۔ آخری قول ابن حبیب نے حکایت کیا ہے(1) اور پہلا ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ فرق کا فائدہ دم (جانور قربان کرنا) سے متعلق ہے۔ جس نے کہا: ذی الحجہ مکمل، حج کے مہینوں میں سے ہے وہ دسویں کے دن کے بعد اعمال حج میں سے جو عمل واقع ہو اس میں دم واجب نہیں کرتے کیونکہ وہ اشہر حج میں سے ہے۔ دوسرے قول پر حج دسویں کے دن ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جو عمل کرے گا وقت سے تاخیر کی بناء پر دم لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کا اپنی کتاب میں نام نہیں لیا کیونکہ یہ لوگوں کو معلوم تھے۔ اور الاشہر کے لفظ کا اطلاق دو مہینوں اور تیسرے مہینہ کے بعض حصہ پر ہوتا ہے کیونکہ بعض مہینہ پورے مہینہ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رائيتك سنة كذا۔ او على عهد فلان (یعنی میں نے تجھے فلاں سال یا فلاں کے عہد میں دیکھا) اس نے اسے دیکھا تو ایک لحہ میں تھا۔ وقت کے بعض کو کل کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ايام منى ثلاثة۔(2) حالانکہ یہ دو دن اور تیسرے دن کا بعض حصہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں: رايتك اليوم، جئتك العام۔ میں نے آج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی من ادرک الامام، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تجھے دیکھا اور میں تیرے پاس اس سال آیا۔ بعض نے فرمایا: جب دو اور دو سے زیادہ جمع ہوتے ہیں تو اشہر فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4**: حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینے میں احرام باندھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حج کی سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھے۔ حضرت عطا، مجاہد، طاؤس اور اوزاعی نے کہا: جس نے حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو وہ اس کے حج کی طرف سے نہ ہوگا...... وہ عمرہ کا ہوگا جیسے کوئی وقت سے پہلے نماز میں داخل ہو تو وہ اس کی فرض نماز نہیں ہوتی وہ نفل ہوتی ہے۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے۔ اوزاعی نے کہا: وہ عمرہ کے ساتھ احرام کھول دے گا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ مکروہ ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ان کا مشہور قول پورے سال میں حج کا احرام باندھنے کا جواب ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے، نخعی نے کہا: حج مکمل کرنے تک احرام کھولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (البقرہ:189) اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ امام شافعی کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ عام ہے اور یہ آیت خاص ہے یہ بھی احتمال ہے کہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہو کیونکہ ان مہینوں کو دوسرے مہینوں پر فضیلت ہے۔ اس پر امام مالک کا قول صحیح ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ یعنی جس نے نیت کے ساتھ قصداً باطناً حج میں شروع ہو کر اپنے اوپر حج لازم کر دیا اور احرام کے ساتھ ظاہر فعل کے ساتھ اور تلبیہ کے ساتھ زبانی اپنے اوپر حج کو لازم کر لیا۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے اور امام ابوحنیفہ نے کہا: جس نے تلبیہ کے ساتھ اپنے اوپر حج فرض کر لیا(1)۔ امام شافعی کے نزدیک تلبیہ ارکان حج میں سے نہیں ہے۔ یہ حسن بن حی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: حج کے احرام میں نیت کافی ہے اور تلبیہ کو اہل ظاہر اور دوسرے علماء نے واجب کہا ہے۔ فرض کا لغوی معنی کاٹنا ہے اسی سے فرضة القوس والنهر والجبل ہے۔ قوس کی شگاف کی جگہ، نہر سے پانی پینے کی جگہ، پہاڑ کا وہ حصہ جو اس کے وسط اور جانب سے لڑھک جائے۔ پس فرضية الحج کا مطلب آزاد آدمی پر اس کا لازم ہونا ہے جس طرح تیر کیلئے شگاف ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرض کا معنی علیحدہ کرنا ہے۔ یہ بھی قطع کے معنی کی طرف لوٹتا ہے کیوں کہ جو کسی چیز کو کاٹتا ہے تو وہ اسے دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے اور من مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اس کا معنی شرط ہے اور خبر فرض ہے کیونکہ من موصولہ نہیں ہے۔ فرمایا: رجل فرض۔ اور فرمایا فیھن اور فیھا نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: استعمال میں دونوں برابر ہیں۔ مازنی ابوعثمان نے کہا: غیر ذوی العقول کی جمع کثیر واحد مونث کی طرف آتی ہے اور قلیل اس طرح نہیں آتی۔ تو کہتا ہے: الاجذاع انکسرن، الجذوع انکسرت۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے: ان عدة الشهور۔ پھر فرمایا: منها۔

**مسئلہ نمبر 6**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ حضرت ابن عباس، ابن جبیر، سدی، قتادہ، حسن، عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک نے کہا: الرفث سے مراد جماع ہے(2)۔ یعنی جماع نہ ہو کیونکہ یہ حج کو فاسد کر دیتا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وقوف عرفات سے پہلے جماع، حج کو فاسد کرنے والا ہے اور اس پر آئندہ سال حج اور ہدی دینا ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر،

---

1۔ احکام القرآن، صفحہ 133، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

طاؤس، عطا وغیرہم نے فرمایا: الرفث سے مراد عورت کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے۔
اس کا قول: جب ہم احرام کھولیں گے تو ہم تیرے ساتھ ایسا کریں گے۔ یعنی بغیر کنایہ کے کہے...... یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے انہوں نے احرام کی حالت میں شعر میں کہا:

و هن يمشين بنا هميسا ان تصدق الطير ننك لميسا

تو آپ کے ساتھی حصین بن قیس نے کہا: کیا تو احرام کی حالت میں رفث کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الرفث وہ ہے جو عورتوں کے پاس کیا جائے۔ ایک قوم نے کہا: عورتوں کے ذکر کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے خواہ وہ حاضر ہوں یا نہ ہوں۔ بعض نے کہا: الرفث ایک جامع کلمہ ہے۔ یہ ہر اس کو شامل ہے جو مرد، عورت سے چاہتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الرفث کا معنی لغو کلام ہے اور یہ شعر پڑھا ہے۔

و رب اسراب حجيج كظم عن اللغا و رفث التكلم

کہا جاتا ہے: رفث یرفث، فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ حضرت ابن مسعود نے فلا رفوث پڑھا ہے یعنی جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عربی نے کہا: فلا رفث سے مراد اس کی مشروعیت کی نفی ہے نہ کہ اس کے وجود کی نفی ہے کیونکہ ہم رفث حج میں پاتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خبر غلط واقع نہیں ہو سکتی۔ نفی اس کے مشروع اوجود کی طرف لوٹتی ہے، محسوساً اس کے وجود کی طرف نہیں لوٹتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ: 228) ہم طلاق والی عورتوں کو پاتے ہیں کہ وہ انتظار نہیں کرتی ہیں پس نفی حکم شرعی کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ وجود حسی کی طرف، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؁ (الواقعہ) جب ہم کہتے ہیں یہ آدمیوں کے بارے میں وارد ہے اور یہ صحیح ہے...... اس کا معنی ہے شرعاً آدمیوں میں سے اس کو بے وضو شخص نہیں چھوتا اگر چھونا پایا گیا تو وہ شرع کے حکم کے خلاف ہو گا۔ یہ نکتہ علماء سے فوت ہو گیا انہوں نے کہا: خبر، نہی کے معنی میں ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں پائی جاتی ہے اور اس کا پایا جانا صحیح بھی نہیں ہے یہ دونوں حقیقۃً مختلف ہیں وصفاً متضاد ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا فُسُوْقَ اس سے مراد تمام گناہ ہیں یہ حضرت ابن عباس، عطا اور حسن کا قول ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر اور ایک جماعت نے کہا: الفسوق کا معنی حج کے احرام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے جیسے شکار کو قتل کرنا، ناخن کاٹنا، بال نوچنا اور اس کے مشابہ گناہ کرنا ہے۔ ابن زید اور مالک نے کہا: الفسوق سے مراد بتوں کے لئے جانور ذبح کرنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ او فسقاً اُھل لغیر اللہ بہ۔

ضحاک نے کہا: الفسوق سے مراد برے القاب سے یاد کرنا ہے اسی سے ارشاد ہے: بئس الاسم الفسوق۔ حضرت ابن عمر نے کہا: الفسوق سے مراد گالی دینا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے(1)''۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اقوال کو شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور

1۔ صحیح مسلم، سباب المسلم فسوق، صفحہ 58، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73-272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جماع اور گناہ نہ کیا تو وہ اس طرح لوٹا جیسے اس دن تھا جس میں اسے اس کی والدہ نے جنم دیا تھا(1)'' اور مقبول حج کی جزا صرف جنت ہے(2)۔ یہ مسلم وغیرہ نے نقل کی ہے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے راستہ میں جہاد اور مقبول حج سے بہتر عمل کوئی نہیں جس میں جماع، فسق اور جھگڑا نہ ہو(3)۔ فقہاء نے کہا: حج مقبول وہ ہے جس کی ادائیگی کے دوران اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ فراء نے کہا: وہ ہے جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ یہ دونوں قول ابن عربی نے ذکر کیے ہیں۔ میں کہتا ہوں: حج مبرور وہ ہے جس میں اور جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ حسن نے کہا: حج مبرور یہ ہے کہ وہ لوٹے تو دنیا سے دلچسپی نہ رکھتا ہو اور آخرت سے رغبت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ رفع اور تنوین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور وَلَا جِدَالَ میں فتحہ پر اجماع ہے۔ یہ پہلے کلمات میں نصب کی قراءت کو تقویت دیتا ہے کیونکہ مقصود رفث، فسوق اور جدال سے عام نفی ہے تاکہ منفی کے عموم میں ایک نظام پر کلام ہو جائے۔ نصب پر اکثر قراء ہیں۔ تینوں اسماء محل رفع میں ہیں ہر ایک لا کے ساتھ ہے اور فِي الْحَجِّ تمام کی خبر ہے اور رفع کی قراءت کی وجہ یہ ہے کہ لا بمعنی لیس ہے۔ پس اس کے بعد اسم مرفوع ہوا کیونکہ وہ اس کا اسم ہے اور خبر محذوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فلیس رفثٌ ولا فسوق فی الحج۔ اور اس پر دلیل فی الحج کا قول ہے اور دوسرا ظاہر ہے وہ لا جدال کی خبر ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: رفع اس معنی میں ہوگا: فلا یکونن رفثٌ ولا فسوق۔ یعنی ہر ایسا عمل جو حج سے نکالتا ہے پھر نفی کی ابتدا کی۔ فرمایا: وَلَا جِدَالَ۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ کان تامہ ہو۔ جیسے اس قول میں ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ (بقرہ: 280)۔ تو یہ خبر کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کان ناقصہ ہو اور خبر محذوف ہو جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔ اور رفث اور فسوق کو رفع دینا بھی جائز ہے مبتدا کی حیثیت سے اور لا نفی کے لئے ہو اور خبر محذوف ہو۔ ابو جعفر بن قعقاع نے تینوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض طرق میں عاصم سے یہ مروی ہے۔ اس صورت میں فی الحج تینوں کی خبر ہوگا جیسا کہ ہم نے نصب کی قراءت کے بارے میں کہا اور فی الحج کا قراءت کے اختلاف کے ساتھ تمام کی خبر ہونا اچھا نہیں کیونکہ لیس کی خبر منصوب ہوتی ہے اور ولا جدال کی خبر مرفوع ہوتی ہے کیونکہ ولا جدال پہلے سے علیحدہ کیا گیا ہے یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ایک اسم میں دو فاعل نہیں ہوتے اور فلا رفثٌ ولا فسوقٌ جائز ہے۔ مقام پر عطف ہے۔ نحویوں نے یہ شعر پڑھا ہے:

لا نسب الیوم ولا خلة اتسع الخرق علی الراقع

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل الحج والعمرہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال، صفحہ 462، جلد 1

نہ اس دن نسب کا فائدہ ہوگا نہ دوستی ہوگی چیتھڑے والے پر پھٹن زیادہ ہوگی۔
اور کلام میں فلا رفث ولا فسوقا ولا جدالا فی الحج لفظ پر عطف کے اعتبار سے جو لا میں واجب تھا یہ فراء نے کہا ہے اور اس کی مثال یہ ہے:

فلا أب وابنا مثل مروان و ابنه اذا هو بالمجد ارتدى و تأزرا

نہ باپ، نہ بیٹا مروان اور اس کے بیٹے کی مثل ہے جب اس نے بزرگی کی چادر اوڑھی اور تہبند باندھا۔
ابورجاء عطاردی نے کہا فلا رفث ولا فسوق دونوں میں نصب کے ساتھ اور ولا جدال رفع اور تنوین کے ساتھ۔ اخفش نے کہا:

هذا وجدكم الصغار بعينه لا ام لي ان كان ذاك ولا اب

یہ اور تمہارا ذلیل دادا میرے لئے نہ ماں ہو نہ باپ اگر وہ ہو۔
بعض علماء نے کہا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ کا معنی نہی ہے، یعنی لا ترفثوا ولا تفسقوا۔ اور ولا جدال کا معنی نفی ہے۔ جب معنی میں اختلاف ہے تو لفظ میں بھی اختلاف کیا گیا۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ ولا جدال بھی نہی ہے یعنی لا تجادلوا پھر ان کے درمیان کیوں فرق کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ یہ مجادلہ سے فعال کے وزن پر ہے یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی قتل کرنا ہے اسی سے زمام مجدول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالہ سے مشتق ہے جو زمین ہے۔ گویا ہر شخص اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس پر غالب آتا ہے۔ پس وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے مخالف کو زمین پر مارا۔ شاعر نے کہا:

قد اركب الآلة بعد الآلة و اترك العاجز بالجدالة
منعفراً ليست له محالة

**مسئلہ نمبر 10:** علماء نے ان الفاظ کے مرادی معنی میں چھ مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور عطاء نے کہا: الجدال کا یہاں معنی یہ ہے کہ تو کسی مسلمان سے جھگڑے حتیٰ کہ تو اس پر ناراض ہو اور وہ گالی تک پہنچ جائے۔ رہا مذاکرہ علم تو اس سے نہی نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: الجدال سے مراد گالی دینا ہے، حضرت ابن زید اور حضرت مالک بن انس نے کہا: یہاں الجدال سے مراد لوگوں کا اختلاف ہے کہ کس نے حضرت ابراہیم کے موقف کو پایا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے جب قریش دوسرے عربوں سے مختلف جگہ پر ٹھہرتے تھے پھر اس کے بعد جھگڑتے تھے۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ ابراہیم کے موقف کے بارے میں نہ جھگڑو۔ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ کہے کہ آج حج ہے اور دوسرا کہے کہ کل حج ہے۔ مجاہد اور ان کے ساتھ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد مہینوں کے بارے میں جھگڑنا ہے جیسا نسئ (1) (ایک مہینہ کو مؤخر کرنا، دوسرے کو مقدم کرنا) میں عربوں کا معمول تھا، کبھی وہ حج کو ذی الحجہ کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

علاوہ مہینے میں کرتے تھے۔ بعض مزدلفہ میں ٹھہرتے، بعض عرفہ میں ٹھہرتے اور درست مقام میں ٹھہرنے کے بارے میں جھگڑتے تھے (ہر ایک کہتا: میں ٹھیک ہوں)

میں کہتا ہوں: ان دو تاویلوں پر معنی ہوگا نہ وقت میں جھگڑو، نہ ٹھہرنے کی جگہ میں جھگڑو۔ یہ قول زیادہ درست ہے جو وَلَا جِدَالَ کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانہ اس دن کی ہیئت پر گھوم آیا ہے جس پر الله تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا (1) (الحدیث) مزید بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ یعنی حج کا امر اسی جہت پر لوٹ آیا جس پر تھا یعنی اس دن اور وقت پر لوٹ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب حج فرمایا تو فرمایا: ''مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (2)'' اس کے ساتھ آپ نے حج کے مواقف اور مواضع بیان فرمائیں۔ محمد بن کعب قرظی نے بتایا کہ جدال یہ ہے کہ ایک طائفہ کہتا ہمارا حج، تمہارے حج سے زیادہ درست ہے دوسرا بھی اسی طرح کہتا (3)۔ بعض نے فرمایا: الجدال سے مراد اپنے آباء واجداد پر فخر کرنا ہے۔ والله اعلم

**مسئلہ نمبر 11**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ شرط اور جواب شرط ہے۔ معنی یہ ہے کہ الله تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا کیونکہ عالم میں کسی چیز کے بدلے جزا واقع ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ فحش کلام کی جگہ حسن کلام پر برانگیختہ کرنا ہے اور فسوق وجدال کی جگہ اخلاق میں تقویٰ اور نیکی پر ابھارنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خیر (نیکی) کے فعل کو ضبط نفس سے تعبیر کیا ہے تاکہ وہ عمل نہ پایا جائے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَزَوَّدُوْا زادراہ ساتھ لینے کا حکم ہے۔ حضرت ابن عمر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو حج پر بغیر زادراہ کے آتے تھے۔ بعض کہتے ہیں: ہم بیت الله کا حج کیسے کریں گے وہ ہمیں کھانا نہیں کھلائے گا؟ وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے تھے۔ انہیں اس عمل سے منع کیا گیا اور انہیں زادراہ ساتھ لانے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبدالله بن زبیر نے کہا: لوگ زادراہ کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے تو انہیں زادراہ کا حکم دیا گیا (4) اور نبی کریم ﷺ کا حج کے سفر میں ایک اونٹ تھا جس پر زادراہ تھا۔ آپ کے پاس مزینہ قبیلہ کے تین سو آدمی آئے جب انہوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! ان لوگوں کو زادراہ دو۔ بعض لوگوں نے کہا: تَزَوَّدُوْا کا مطلب ہے نیک صالح دوست ساتھ لو۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تخصیص ضعیف ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ تم اپنی آخرت کے لئے اعمال صالحہ کا زادراہ ساتھ لو (5)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول واضح ہے کیونکہ زاد سے مراد حج کے سفر میں کھانے کا سامان ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل یمن حج کرتے تھے اور زادراہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور کہتے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب القسامة، تغليظ تحريم الدماء والاعراض، صفحہ 60، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، لتأخذوا عني مناسككم، صفحہ 419، جلد 1

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

5۔ ایضاً

تھے ہم توکل کرنے والے ہیں جب مکہ مکرمہ آئے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى یہ اس میں نص ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ شعبی نے کہا الزاد سے مراد چھوارے اور ستو ہے۔ ابن جبیر نے کہا: کیک اور ستو ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں زادراہ کا حکم دیا جن کے پاس مال تھا اور جن کے پاس مال نہیں تھا اگر وہ کوئی پیشہ رکھتا ہے تو راستہ میں اس کو استعمال کرے یا سائل ہے تو اسے خطاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا جو مال والے تھے اور مال چھوڑ جاتے تھے اور بغیر زادراہ کے نکلتے تھے اور کہتے تھے ہم توکل کرنے والے ہیں، توکل کی شرائط ہیں جو ان شرائط کو بجالائے تو وہ زادراہ کے بغیر نکلے اور وہ خطاب میں داخل نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق کے اعتبار سے حکم فرمایا عام لوگ توکل کے درجہ سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کے حقائق سے غافل ہوتے ہیں (1)۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: ابلیس نے اس قوم پر تلبیس کی جو توکل کا دعویٰ کرتے اور وہ بغیر زادراہ کے نکلتے اور گمان کرتے کہ یہ توکل ہے۔ وہ انتہائی خطا پر ہیں۔ ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی طرف توکل کرتے ہوئے بغیر زادراہ کے جاؤں۔ امام احمد نے اسے کہا: بغیر قافلہ کے جاؤ، اس نے کہا نہیں قافلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ امام احمد نے فرمایا: لوگوں کے برتن پر توتوکل کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بہتر زادراہ منہیات سے بچنا ہے۔ پس اللہ نے انہیں زادراہ کے ساتھ تقویٰ کو ملانے کا حکم دیا اور فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اپنے معنی پر معمول ہے کیونکہ تَزَوَّدُوْا کا معنی ہے اس حکم کی اتباع میں اللہ سے ڈرو جو تمہیں زادراہ ساتھ لے جانے کا دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس معنی کا احتمال رکھتا ہے کہ بہتر زاد وہ ہے جس کے ساتھ مسافر ہلاکت سے اور سوال کرنے اور ہاتھ پھیلانے کی حالت سے بچ جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یہ دنیا، قرار کی جگہ نہیں ہے۔ اہل اشارات نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آخرت کا سفر یاد دلایا اور انہیں تقویٰ کے زاد پر ابھارا، تقویٰ آخرت کا زاد ہے۔ اعشی نے کہا: جب تو تقویٰ کے زادراہ کے بغیر کوچ کرے گا اور مرنے کے بعد ان سے ملے گا جو زادراہ ساتھ لے گئے ہیں تو تو شرمندہ ہوگا کہ تو ان کی مثل نہیں ہے۔ تو نے اس طرح اعمال کی نگرانی نہ کی جس طرح انہوں نے کی تھی۔ ایک اور شاعر نے کہا: موت ایک موجیں مارنے والا سمندر ہے اس میں تیرنے والے کا حیلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اے نفس! میں کہنے والا ہوں پس تو ایک مشفق ناصح سے بات سن، انسان کے ساتھ قبر میں تقویٰ اور عمل صالح کے علاوہ کچھ نہیں جاتا۔

**مسئلہ نمبر 14:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ خطاب میں عقل والوں کو خاص فرمایا اگرچہ معاملہ تمام کو شامل ہے کیونکہ ان پر اللہ کی حجت قائم ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو پانے والے ہیں اور انہیں قائم رکھنے والے ہیں۔ الباب، جمع ہے لبّ کی اور لب ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں اسی وجہ سے عقل کو بھی لب کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے ابو اسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: کیا تو عرب کلام میں مضاعف میں سے کوئی ایسی

1۔ احکام القرآن، صفحہ 135، جلد 1 (دار الفکر)

چیز جانتا ہے جو فعُلَ کے وزن پر آئی ہو؟ میں نے کہا: ہاں، سیبویہ نے یونس سے حکایت کیا ہے: لبُبْتَ تلب۔ انہوں نے اس کی تحسین کی اور کہا: میں اس کی مثال نہیں جانتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَ اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

''نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل (رزق) پھر جب واپس آؤ عرفات سے تو ذکر کرو الله کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: جُنَاحٌ اس کا مطلب ہے: گناہ۔ یہ لَيْسَ کا اسم ہے اَنْ تَبْتَغُوْا۔ لَيْسَ کی خبر کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یعنی فی ان تبتغوا۔ خلیل اور کسائی کے قول پر محل جر میں ہے۔ جب الله تعالیٰ نے حج کو رفث، فسق، جدال سے پاک رکھنے کا حکم دیا تو تجارت کی رخصت دی۔ یعنی الله کا فضل تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ ابتغاء الفضل (فضل کا تلاش کرنا) قرآن میں تجارت کے معنی میں وارد ہوا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:10) اس کی صحت پر دلیل بخاری کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت میں بازار تھے پس لوگ حج کے موسم میں تجارت کرنا گناہ سمجھتے تھے تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی لیس عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، فی مواسم الحج۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2**: جب یہ اس آیت میں ثابت ہے، تجارت کا قصد شرک نہیں ہوگا اور مکلف اخلاص سے نہیں نکلے گا جو اخلاص اس پر فرض تھا۔ فقراء کا قول اس کے خلاف ہے۔ حج بغیر تجارت کے افضل ہے تاکہ عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک رہے اور دل عبادت کے علاوہ کسی چیز سے معلق نہ ہو۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ابوامامہ التیمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں اس راستہ میں کرایہ پر جانور دیتا ہوں (2) اور لوگ کہتے ہیں تیرا حج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اس کی مثل سوال کیا جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا حج ہے (3)''۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، لیس علیکم جناح، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 253، جلد 1 (دارالفکر)

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 292، جلد 2 (قاہرہ)

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ اس میں سولہ مسائل ہیں (☆):

**مسئلہ نمبر 1**: فَاِذَآ اَفَضْتُمْ یعنی جب تم چلو۔ کہا جاتا ہے: فاض الاناء۔ جب برتن بھر جائے حتیٰ کہ کناروں سے چھلکنے لگے۔ رجل فیاض، بہت زیادہ عطا کرنے والا۔ زہیر نے کہا۔

وابیض فیاض یدہ غمامۃ علی معتفیہ ما تغب فواضلہ

سفید، اس کے ہاتھ طلب گاروں پر بادل کی طرح سخاوت کرتے ہیں اس کی عطاء دائمی ہے۔

اور حدیث مستفیض۔ مشہور حدیث۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ عَرَفٰتٍ قراء کی جماعت نے عَرَفٰتٍ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نام مسلمات رکھا جائے تو اسے تنوین کے ساتھ پڑھا جائے گا کیونکہ تنوین منصرف اور غیر منصرف کے درمیان فرق کرنے کے لئے نہیں ہے تا کہ تو اسے حذف کرے۔ یہ تو مسلمین میں جو نون ہے اس کے قائم مقام ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے۔ سیبویہ نے عربوں سے، عرفات سے تنوین کا حذف حکایت کیا ہے۔ کہتا ہے: هذه عرفات یا هذا و رایت عرفات یا هذا۔ (تا کے کسرہ کے ساتھ اور بغیر تنوین کے) جب عربوں نے اسے معرفہ بنایا تو تنوین کو حذف کیا۔ اخفش اور کوفیوں نے تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاطمہ اور طلحہ کی تا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اور انہوں نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

تنورتها من اذرعات واهلها بیثرب ادنی دارها نظرٌ عالِ (1)

اس میں اذرعات پر فتحہ پڑھا ہے۔

پہلا قول عمدہ ہے، اس میں تنوین وہی ہے جو مسلمات میں ہے کسرہ مسلمین میں یا کے مقابلہ میں ہے اور تنوین (2)، نون کے مقابل ہے۔ عرفات، اسم علم ہے جمع کے ساتھ نام رکھا گیا ہے جیسے اذرعات۔ بعض نے فرمایا: اس کے اردگرد کی وجہ سے اسے عرفات کہا جاتا ہے جیسے ارض سباسب (چٹیل زمین) بعض نے فرمایا: اس جگہ کو عرفات اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ وہاں ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ جب ہند میں حضرت آدم علیہ السلام اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں جو بہت لمبی مدت تلاش کے بعد عرفہ کے دن عرفات میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اس دن کو اسی وجہ سے عرفہ کہا جاتا ہے وہ جگہ عرفات کہلائی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ اقوال کہے ہیں جو وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرہ: 128) کے قول کے تحت گزر چکا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل (☆☆) ہے جس طرح تمام جگہوں کے نام ہیں۔ عرفۃ یہ نعمان الاراک ہے۔ اس کے متعلق شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 345، جلد 2 (داراحیاء التراث العلمیہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دارالکتب العلمیہ)

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں اٹھارہ مسائل ہیں

☆☆ ایک اصطلاح ہے جو منقول کے مقابل ہے منقول اس کو کہتے ہیں جو پہلے کسی اور کے لیے وضع کیا جائے بعد میں اسم میں استعمال ہو۔ مرتجل جو ابتدا سے ہی اس کے لیے استعمال ہوا۔

تزودت من نعمان عود اراكة لهند ولكن من يبلغ هندا (1)

میں نے ہند کے لئے عرفات سے سامان لیا لیکن ہند کو کون یہ پہنچائے گا۔

یہ العرف سے ماخوذ ہے جس کا مطلب خوشبو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عرفها لهم۔ یعنی اللہ نے اس کو ان کے لئے پاک کیا...... یہ پاک جگہ ہے بخلاف منیٰ کے جہاں جانوروں کی غلاظت اور خون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو عرفات کہا جاتا ہے اور وقوف کے دن کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: ان دو اسموں کی اصل صبر ہے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ عارف جب کوئی شخص صبر کرنے والا، خشوع کرنے والا ہو۔ ضرب المثل ہے: النفس عروف وما حملتها تتحمل۔ نفس صبر کرنے والا ہے جو تو اس کو برداشت کرائے گا یہ برداشت کرے گا۔

فصبرت عارفة لذلك حرۃً یعنی میرا نفس صبر کرنے والا آزاد ہے۔

ذوالرمہ نے کہا:

عروف لما خطت عليه المقادر وہ صبر کرنے والا ہے جو اس پر تقدیر نے لکھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر صبر کرنے والا ہے۔ اس اسم کے ساتھ نام رکھا گیا ہے کیونکہ حاجی خضوع و خشوع کا اظہار کرتے ہیں اور دعا پر صبر کرتے ہیں، مختلف مصائب اور تکلیف برداشت کرتے ہیں تاکہ حج کی عبادت کو قائم کریں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جو عرفہ کے دن، عرفہ میں زوال سے پہلے ٹھہرا پھر وہاں سے زوال سے پہلے چلا گیا تو اس کا وقوف شمار نہیں ہوگا اور علماء کا اجماع ہے کہ اس کا حج مکمل ہے جو زوال کے بعد ٹھہرا اور رات سے پہلے دن کے وقت چلا گیا مگر امام مالک بن انس نے فرمایا کہ وہ رات کا کچھ حصہ موقف میں گزارے، رہا وہ شخص جو رات کے وقت عرفہ میں ٹھہرا اس کے حج کے مکمل ہونے میں امت کے درمیان اختلاف نہیں ہے اور جمہور کی حجت مطلق یہ ارشاد ہے فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ اس ارشاد میں دن سے رات کو خاص نہیں فرمایا اور حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث ہے فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں طی کے دو پہاڑوں سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو بھی تھکا دیا ہے اللہ کی قسم میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں اس پر ٹھہرا، کیا میرے لئے حج ہے یا رسول اللہ! ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ صبح کی مزدلفہ میں نماز پڑھی اور اس سے پہلے وہ رات یا دن کے وقت عرفات میں آ چکا تھا تو اس نے حج کے مناسک پورے کر دیئے اور اس کا حج مکمل ہوا (2)۔ اس حدیث کو بہت سے ائمہ نے نقل کیا ہے ان میں سے ابوداؤد، نسائی اور دارقطنی ہیں یہ لفظ دارقطنی کے ہیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو عمر نے کہا حضرت عروہ بن مضرس میں طائی کی حدیث ثابت صحیح ہے۔ اس کو شعبی کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے شعبی سے اور انہوں نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے اسماعیل بن ابی خالد،

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناسک، ما جاء من ادرك الامام، صفحہ 109، جلد 1 (وزارت تعلیم)

داؤد بن ابی ہند، زکریا بن ابی زائدہ، عبد اللہ بن ابی السفر اور مطرف ہیں۔ ان سب نے شعبی سے انہوں نے عروہ بن مضرس بن اوس بن حارثہ بن لام سے روایت کیا ہے۔ امام مالک کی حجت، سنت ثابتہ سے حضرت جابر کی طویل حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور تھوڑی زردی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال وجوب پر ہیں خصوصاً حج کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک حج لے لو (1)۔

**مسئلہ نمبر 4:** جمہور کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو سورج غروب ہونے سے پہلے عرفات سے چلا گیا اور واپس نہ آیا اس پر حج کی صحت کے ساتھ کیا لازم ہے؟ حضرات عطا، سفیان ثوری، شافعی، احمد، ابو ثور اور اصحاب رائے وغیرہ نے کہا: اس پر بکری ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس پر ہدی ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس پر اونٹ ہے۔ مالک نے کہا: اس پر آئندہ سال حج ہے اور ہدی کو وہ آئندہ نحر کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا حج فوت ہو گیا۔ اگر وہ عرفہ کی طرف لوٹ آیا پھر سورج غروب ہونے کے بعد نکلا تو امام شافعی نے فرمایا: اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی احمد، اسحاق اور داؤد کا قول ہے۔ طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: اس سے دم ساقط نہ ہو گا اگرچہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد لوٹ آئے یہی ابو ثور کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو سواری پر قادر ہو اس کے لئے سوار ہو کر عرفہ میں وقوف کرنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ سے جانے تک سورج کے غروب ہونے کے بعد سواری پر وقوف کیا اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا۔ یہ حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں محفوظ ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں بھی ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے حتیٰ کہ موقف میں آئے اپنی اونٹنی قصواء کا بطن جبل رحمت کے نیچے پتھروں کی طرف کیا اور پیدل چلنے والوں کے راستہ کو سامنے رکھا اور قبلہ کی طرف منہ کیا اور آپ سورج کے غروب ہونے تک ٹھہرے رہے اور زردی تھوڑی سی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہو گئی اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا (2) (الحدیث) اگر سواری پر سوار ہونے پر قادر نہ ہو تو اپنے قدموں پر دعا مانگتا ہوا کھڑا ہو جب تک طاقت رکھتا ہے اور کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو بیٹھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، سوار ہو کر وقوف کرنے میں مباہات اور حج کی تعظیم ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ (الحج)

ابن وہب نے اپنے مؤطا میں کہا: مجھے مالک نے کہا: عرفہ میں وقوف سواری اور اونٹ پر وقوف میں نزدیک کھڑا ہو کر وقوف کرنے سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور جو کھڑا ہو کر وقوف کرے اس کے آرام کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرفہ سے چلے تو تھوڑے

1۔ السنن الکبری، کتاب الحج، الایضاح فی وادی محسر، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

تیز چلتے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے (1)۔ ہشام بن عروہ نے کہا: نص، عنق سے زیادہ تیز چلنا ہے۔ اسی طرح حاجیوں کے اماموں اور دوسرے لوگوں کو چلنا چاہئے کیونکہ مزدلفہ کی طرف جلدی چلنا، نماز کی طرف جلدی چلنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغرب کی نماز اس رات مزدلفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، یہ سنت ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**: قرآن اور سنت ثابتہ کا عموم ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عرفہ سارا موقف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں ٹھہرا اور عرفہ سارا موقف ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے حضرت جابر کی طویل حدیث سے روایت کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ سارا موقف ہے اور بطن عرنہ سے بلند رہو۔ اور مزدلفہ سارا موقف ہے اور بطن محسر سے بلند رہو (3) (یعنی ان میں نہ ٹھہرو) اسی طرح حفاظ ثقات اور اہل حدیث میں سے اثبات لوگوں نے جعفر بن محمد کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: فقہاء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے وادی عرفہ میں وقوف کیا۔ ابن منذر نے مالک سے ان کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ شخص بکری دے اور اس کا حج مکمل ہے۔ یہ روایت خالد بن نزار نے مالک سے روایت کی ہے، ابو المصعب نے کہا کہ وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے وقوف کیا ہی نہیں اور اس کا حج فوت ہے اس پر آئندہ سال حج ہے جب وہ بطن عرنہ میں ٹھہرا ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جو وادی عرنہ سے چلا اس کا حج نہیں یہ ابن قاسم اور سالم کا قول ہے ابن منذر نے یہ قول امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اس جگہ پر نہ ٹھہرے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: عرفہ سے بطن عرنہ کی استثناء ایسی نہیں ہے جس کی حجت لازم ہو، نہ نقل کی جہت سے اور نہ اجماع کی جہت سے، اور جو ابو المصعب کے مذہب پر چلتے ہیں۔ ان کی حجت یہ ہے کہ عرفہ کا وقوف فرض ہے اس پر اجماع ہے اور یہ معین جگہ میں ہے۔ پس اس کی ادائیگی یقین کے ساتھ ہی ہوگی اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا بطن عرنہ راء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ عرفہ کی مسجد کے مغربی جانب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: عرفہ کی مسجد کی مغربی دیوار اگر گرے گی تو وہ بطن عرنہ میں گرے گی۔ الباجی نے ابن حبیب سے روایت کیا ہے کہ عرنہ حل میں ہے اور عرفہ حرم میں ہے۔ ابو عمر نے کہا: رہی بطن محسر تو وکیع نے ذکر کیا ہے ہمیں سفیان نے بتایا انہوں نے ابو زبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بطن محسر میں تیز چلے (4)۔

**مسئلہ نمبر 8**: نو ذی الحجہ کو عرفہ کے علاوہ دوسری مساجد میں اہل عرفہ سے تشبیہ اختیار کرتے ہوئے جمع ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شعبہ نے قتادہ سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے، فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابن عباس نے یہ بصرہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الاضافة من عرفات الی المزدلفة، صفحہ 417، جلد 1

2۔ صحیح مسلم، ایضاً، کتاب الحج، حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 400، جلد 1

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، الوقوف بعرفة، صفحہ 410 (وزارت تعلیم)

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ماجاء فی الافاضة من عرفات، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کیا تھا یعنی نویں ذی الحجہ کے دن لوگوں کا بصرہ کو عرفہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے دیکھا جبکہ لوگ ان کے پاس جمع تھے۔ اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے عرفہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں لوگوں کے جمع ہونے کے متعلق پوچھا جو عرفہ کے دن جمع ہوئے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں کئی لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ حسن، بکر، ثابت اور محمد بن واسع عرفہ کے دن مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 9**: نویں ذی الحجہ کی فضیلت: نویں کے دن کی بہت بڑی فضیلت ہے اور بہت بڑا ثواب ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور نیک اعمال کو اس میں کئی گنا کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نویں کے دن کا روزہ گزشتہ اور باقی سال کے گناہوں کا کفارہ ہے(1)۔ اس کو ''الصحیح'' میں نقل کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے اور اس میں سے افضل وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ(2)۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ کے دن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی دن میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتا ہے، جو انہوں نے ارادہ کیا اسے بیان فرماتا ہے(3)...... اور مؤطا میں عبید اللہ بن کریز سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن ذلیل وحقیر، دھتکارا ہوا اور غصہ میں نہیں دیکھا جاتا یہ نہیں ہوتا مگر اس لئے کہ جو رحمت کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے گناہوں سے تجاوز دیکھتا ہے۔ مگر بدر کے دن جو اس نے (مسلمانوں کے لیے فرشتوں کی مدد) دیکھی (تو اتنا ہی پریشان و ذلیل ہوا تھا) پوچھا گیا: یا رسول اللہ! بدر کے دن شیطان نے کیا دیکھا تھا؟ فرمایا: اس نے جبریل کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی صفوں کو جنگ کے لئے ترتیب دے رہا ہے(4)۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث ابو النضر اسماعیل بن ابراہیم عجلی نے مالک سے انہوں نے ابراہیم بن ابی عیلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ اور اس حدیث میں عن ابیہ کسی اور نے نہیں کہا اور یہ کچھ نہیں ہے۔ صحیح وہ ہے جو مؤطا میں ہے۔ ترمذی الحکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے اپنی مسند سے عباس بن مرداس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے عرفہ کے پچھلے پہر مغفرت اور رحمت کی دعا مانگی اور بہت زیادہ دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے تیری دعا قبول کر لی مگر جو بعض نے بعض پر ظلم کیا۔ ان کے جو گناہ میرے اور ان کے درمیان ہیں میں نے وہ معاف کر دیئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی: یا رب! تو قادر ہے کہ تو اس مظلوم کو اس پر جو ظلم کیا گیا ہے اس سے زیادہ بہتر جزا عطا فرما دے اور تو اس ظالم کو معاف فرما دے تو اس وقت کوئی جواب نہ دیا جب مزدلفہ کی صبح تھی تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شہر، صفحہ 368، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع الحج، صفحہ 457 (وزارت تعلیم)

آپ نے دعا میں مزید اجتہاد و کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ ایسے وقت میں مسکرائے ہیں جس وقت آپ پہلے کبھی نہیں مسکرائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کے دشمن ابلیس پر ہنسا ہوں جب اسے علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے بارے میری بات قبول کر لی ہے تو وہ ویل اور موت کو پکارنے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا اور بھاگنے لگا۔ بو عبدالغنی حسن بن علی نے کہا: ہمیں عبدالرزاق نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے ابو الزناد سے انہوں نے اعرج سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ خالص حاجی کو معاف کر دیتا ہے اور جب مزدلفہ کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ تاجروں کو معاف فرما دیتا ہے اور جب منیٰ کا دن ہوتا ہے تو اونٹوں والوں کو معاف فرما دیتا ہے جب جمرہ عقبہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور جو مخلوق موقف میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں میں سے موجود ہوتی ہے اسے معاف فرما دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث مالک کی حدیث سے غریب ہے اور محفوظ نہیں ہے مگر اسی سند سے۔ ابو عبدالغنی نے کہا: میں اسے نہیں جانتا اور اہل علم رغبت اور فضائل والی احادیث ہر ایک سے آسانی سے روایت کر لیتے ہیں اور احکامات کی احادیث میں سختی کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 10**: اہل علم نے نویں ذی الحجہ کا روزہ مستحب قرار دیا ہے مگر عرفات کے مقام پر نہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کا روزہ نہ رکھا اور حضرت ام الفضل نے آپ کو دودھ کا پیالہ بھیجا تو آپ نے نوش فرمالیا۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا اور آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ وہ افطار کو پسند فرماتے تھے تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے۔ بعض اہل علم نے عرفہ کا روزہ رکھا (1)۔ حضرت ابن عمر سے پہلی حدیث کی مثل مسند سے مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے حضرت عثمان کے ساتھ میں نے حج کیا اور انہوں نے روزہ نہیں رکھا، میں نہ خود روزہ رکھتا ہوں نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں (2)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ عطا نے عرفہ کے دن کے روزہ کے متعلق فرمایا: میں سردیوں میں روزہ رکھتا ہوں اور گرمیوں میں نہیں رکھتا ہوں۔ یحییٰ انصاری نے فرمایا: عرفہ کے دن فطر واجب ہے۔ حضرت عثمان بن ابو العاصی، حضرت ابن زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم عرفہ کا روزہ رکھتے تھے۔ ابن منذر نے کہا: عرفہ کے دن عرفات میں میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں روزہ نہ رکھنا محبوب ہے اور عرفات کے علاوہ عرفہ کا روزہ رکھنا محبوب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عرفہ کے دن کے روزہ کے بارے پوچھا گیا، یہ "گزشتہ اور باقی سال کا کفارہ ہے (3)"۔ اور ہم نے عطا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے عرفہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصوم، فی کراھیۃ صوم یوم عرفہ، صفحہ 93، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، صفحہ 94، جلد 1 3۔ ایضاً، صفحہ 93، جلد 1

کے دن روزہ افطار کیا تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے تو اس کے لئے روزہ دار کے اجر کا مثل اجر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ یعنی مشعر حرام کے پاس دعا اور تلبیہ کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، اس کو جمع کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ اس میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ ملے تھے۔ اذدلف الیہا کا مطلب ہوتا ہے وہ اس کے قریب ہوا اسی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس میں موجود لوگوں کے فعل کی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس میں ٹھہرنے کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اس کو مشعر کہا جاتا ہے۔ یہ شعار سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، کیونکہ یہ حج، نماز اور رات گزارنے کی علامت ہے اور اس کے پاس دعا حج کے شعائر میں سے ہے اور حرمت کی صفت اس کی حرمت کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی (1)۔ اہل علم کا اجماع ہے اور کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حاجی کے لئے مغرب وعشاء کی نماز کو جمع کرنا ہے اور اس کے متعلق اختلاف ہے جس نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے نماز پڑھی۔ امام مالک نے کہا: جو امام کے ساتھ ٹھہرے اور امام کے ساتھ نکلے تو وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ آئے اور یہاں دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے اور اس پر انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا جو نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید کو فرمایا تھا ''نماز آگے ہے''۔ ابن حبیب نے کہا: جس نے مزدلفہ میں آنے سے پہلے بغیر عذر کے نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے جب اسے علم ہو، یہ اس شخص کی مانند ہے جس نے زوال سے پہلے نماز پڑھی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الصلاة امامك (نماز آگے ہے (2)) یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: اس پر اعادہ نہیں ہے مگر جب اس نے شفق کے غیب ہونے سے پہلے نماز پڑھی ہو، وہ صرف عشاء کی نماز کا اعادہ کرے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ قاضی ابوالحسن نے اس کی تائید کی ہے اور اس نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ دو نمازیں مزدلفہ میں جمع کرنا سنت ہے اور ان کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں ہے، یہ استحباب کے معنی پر ہے جیسے ظہر اور عصر کو عرفہ میں جمع کرنا ہے۔ ابن منذر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے یہ قول عطا بن رباح، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، سعید بن جبیر، احمد، اسحاق، ابوثور اور یعقوب سے حکایت کیا ہے اور امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ میں آئے اگر مزدلفہ پہنچنے سے پہلے نصف رات گزر چکی ہو تو دونوں نمازیں پڑھے۔

**مسئلہ نمبر 13:** جس نے جلدی کی اور شفق کے غروب ہونے سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا تو ابن حبیب نے کہا: جو شفق کے غروب ہونے سے پہلے جلدی مزدلفہ پہنچا اس کی نماز نہیں، نہ امام کی نماز ہے اور نہ کسی اور کی حتیٰ کہ شفق غائب ہو جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز آگے ہے۔ پھر شفق کے غروب ہونے کے بعد مزدلفہ میں نماز پڑھی اس اعتبار سے اس

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من جمع بینهما ولم یتطوع، صفحہ 227، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، الافاضة من عرفات الی المزدلفة، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نماز کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد ہے۔ پس شفق کے غائب ہونے سے پہلے اس کو ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر اس کا وقت شفق کے غائب ہونے سے پہلے ہوتا تو اس وقت سے مؤخر نہ کی جاتی۔

**مسئلہ نمبر 14**: جو امام کے جانے کے بعد عرفہ میں آیا یا جس کو عذر لاحق ہوا جو امام کے ساتھ ٹھہرا تھا تو ابن المواز نے کہا: جو امام کے بعد ٹھہرا وہ ہر نماز اپنے وقت پر پڑھے۔ امام مالک نے اس شخص کے بارے فرمایا جس کو عذر امام کے ساتھ جانے سے روک لے تو وہ دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے جب شفق غائب ہو جائے۔ ابن القاسم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام کے بعد ٹھہرا، اگر اسے رات کے تیسرے حصہ میں مزدلفہ پہنچنے کی امید ہو تو وہ نماز کو مؤخر کرے حتیٰ کہ مزدلفہ پہنچ جائے ورنہ ہر نماز کو اپنے وقت پر پڑھے۔ ابن المواز نے مزدلفہ تک نماز کو مؤخر کرنے کو کہا جو امام کے ساتھ ٹھہرے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے لئے۔ امام مالک نے وقت کی رعایت کی ہے، مکان کی نہیں۔ ابن القاسم نے نماز کے لئے مختار وقت اور مکان کا اعتبار کیا ہے۔ جب مختار وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو مکان کا اعتبار باطل ہو جائے گا اور مختار وقت کی رعایت اولیٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**: علماء کا مزدلفہ میں نماز کی ہیئت میں دو اعتبار سے اختلاف ہے: (۱) اذان اور اقامت کے اعتبار سے (۲) کیا ان کا جمع کرنا متصل ہو گا یا کسی عمل سے ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا یا ان کے درمیان عمل جائز ہے، مثلاً سواریوں کا اتارنا وغیرہ۔ رہی اذان اور اقامت، ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھی (1)، اسی طرح ظہر اور عصر کی نمازوں میں عرفہ میں کیا مگر یہ بالاجماع ظہر کے پہلے وقت میں ادا کی جائیں گی۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے جو کہا اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مرفوع حدیث نہیں جانتا لیکن حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے۔ ابن منذر نے حضرت ابن مسعود کا بھی زائد ذکر کیا ہے۔ نظر کی جہت سے اس بات میں امام مالک کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ اور عرفہ کی نمازوں میں سنت قائم فرمائی کہ ان دونوں نمازوں کا ایک وقت ہے جب ان کا وقت ایک ہے اور ہر نماز اپنے وقت پر پڑھی جائے گی تو کوئی نماز دوسری سے اذان اور اقامت کے اعتبار سے اولیٰ نہ ہو گی کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ یہ نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی ہے اور جو نماز اپنے وقت پر پڑھی گئی ہو اس کی سنت یہ ہے کہ اس کے لئے اذان دی جائے اور جماعت کے لئے تکبیر کہی جائے اور یہ واضح ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے علماء نے کہا: ان میں سے پہلی نماز اذان اور اقامت کے ساتھ پڑھی جائے اور دوسری نماز بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی جائے۔ علماء نے کہا: حضرت عمر نے دوسری اذان کا حکم دیا تھا کیونکہ لوگ شام کے کھانے کے لئے جدا جدا ہو گئے تھے۔ پس آپ نے اذان دلوائی تا کہ وہ لوگوں کو جمع کریں۔ علماء نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں جب لوگ امام سے کھانے وغیرہ کے لئے جدا ہو گئے تو آپ نے مؤذنین کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں تا کہ لوگ جمع ہو جائیں۔ جب اذان دی تو اقامت بھی کہی۔ علماء نے کہا: یہ وہ معنی ہے جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ عبدالرحمن بن یزید کی حدیث ذکر کی۔ فرمایا: حضرت ابن مسعود عشاء کا کھانا مزدلفہ میں دو نمازوں کے درمیان میں کھاتے تھے اور دوسری سند میں ہے ہر نماز کو اذان اور اقامت کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

پڑھا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: دونوں نمازیں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی جائیں گی اور ان کے درمیان کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ عبدالرزاق اور عبدالمالک بن صباح نے ثوری سے انہوں نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کیا مغرب کی تین رکعتیں پڑھیں اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ایک اقامت کے ساتھ۔ دوسرے علماء نے کہا: مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھی ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ جمع کرے۔ یہ علماء اس روایت پر عمل کرتے ہیں جو ہشیم نے یونس بن عبید سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز کو مزدلفہ میں جمع کرتے تھے اور ان کے درمیان کچھ نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثل حضرت خزیمہ بن ثابت کی حدیث سے مرفوع روایت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ جوز جانی نے محمد بن حسن سے انہوں نے امام ابو یوسف سے انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حکایت کیا ہے کہ دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کی جائیں گی۔ مغرب کے لئے اذان دی جائے گی اور عشاء کے لئے صرف تکبیر کہی جائے گی۔

یہی نظریہ امام طحاوی کا ہے کیونکہ حضرت جابر کی حدیث اس کی دلیل ہے۔ یہ پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔ بعض علماء نے کہا: بغیر اذان کے دونوں نمازیں دو اقامتوں کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور یہ جن علماء نے کہا ان میں سے امام شافعی، ان کے اصحاب اور اسحاق ہیں اور امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ یہ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد کا قول ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے سالم سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ آئے تو مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ہر ایک کے لئے ایک تکبیر کہی اور ان کے درمیان کوئی نوافل نہ پڑھے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت ابن عمر سے آثار اس قول کے بارے میں زیادہ ثابت ہیں جو اس باب میں مروی ہیں لیکن یہ تاویل کا احتمال رکھتے ہیں اور حضرت جابر کی حدیث میں اختلاف نہیں ہے اور یہ اولیٰ ہے۔ اس مسئلہ میں نظر کو کوئی دخل نہیں ہے اس میں صرف اتباع ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**: نماز کے علاوہ دونوں نمازوں کے درمیان کسی عمل کے ساتھ فاصلہ کرنا۔ حضرت اسامہ بن زید سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ میں آئے تو اترے، وضو کیا اور مکمل وضو کیا پھر نماز کے لئے تکبیر کہی گئی، آپ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر ہر شخص نے اپنی منزل میں اپنے اونٹ کو بٹھایا پھر تکبیر کہی گئی تو پھر آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی (1)۔ ایک روایت میں ہے ''اور صحابہ نے سامان نہ کھولا حتیٰ کہ عشاء کی تکبیر ہوئی آپ نے نماز پڑھائی پھر سامان کھولا'' ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ کرنے کا جواز ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو مزدلفہ میں آیا کیا وہ پہلے نماز پڑھے یا نماز کو مؤخر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الافاضة من عرفات إلى المزدلفة، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کرے حتیٰ کہ سواری سے سامان اتارے؟ امام مالک نے فرمایا: سامان خفیف ہوتو کوئی حرج نہیں کہ نماز سے پہلے اس کو اتار دے اور رہی ساز و سامان والی سواریاں ان کو بٹھانے اور ان کا سامان اتارنے کا نظریہ نہیں رکھتا، اسے چاہئے کہ پہلے نمازیں پڑھے پھر سواری سے سامان اتارے۔ اشہب نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ اس کے لئے نماز سے پہلے سواری سے اتارنا جائز ہے اور مغرب کی نماز پڑھ کر سامان اتارنا میرے نزدیک محبوب ہے جب تک کہ اس کی طرف مجبور نہ ہو۔ مثلاً سواری پر بوجھ زیادہ ہو یا عذر ہو۔ رہا دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا تو ابن منذر نے کہا: اس میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ سنت یہ ہے کہ جمع کرنے والا دونوں نمازوں کے درمیان نفل نہیں پڑے گا۔ حضرت اسامہ کی حدیث میں ہے ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔

**مسئلہ نمبر 17**: جمہور علماء کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا حج کا رکن ہے جو شخص مزدلفہ میں دسویں کی رات نہیں گزارتا اور مزدلفہ میں نہیں ٹھہرتا اس پر جو واجب ہوگا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے مزدلفہ میں رات نہیں گزاری اس پر دم ہے اور جو رات کا اکثر حصہ ٹھہرا اس پر کچھ واجب نہیں ہے کیونکہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک مزدلفہ میں دسویں کی رات گزارنا سنت مؤکدہ ہے فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کا قول عطا، زہری، قتادہ، سفیان ثوری، احمد، اسحاق، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے رات نہیں گزاری۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر مزدلفہ سے نصف رات کے بعد نکل گیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں اور اگر نصف رات سے پہلے نکل گیا اور واپس نہ آیا تو فدیہ دے گا (1) اور فدیہ ایک بکری ہے۔ حضرات عکرمہ، شعبی، نخعی، حسن بصری نے کہا: مزدلفہ میں وقوف فرض ہے اور جس سے مزدلفہ کا وقوف فوت ہو جائے تو اس کا حج فوت ہو جائے گا اور وہ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دے گا۔ یہ حضرت ابن زبیر سے مروی ہے اور یہ اوزاعی کا قول ہے اور ثوری سے اس کی مثل مروی ہے۔ اور ان سے اصح قول یہ مروی ہے کہ مزدلفہ کا وقوف سنت مؤکدہ ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: جس سے مزدلفہ سے چلنا فوت ہو گیا اس کا حج فوت ہو گیا، وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرے اور انہوں نے ظاہر کتاب و سنت سے حجت پکڑی ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔

اور سنت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا پایا پھر وہ لوگوں کے ساتھ ٹھہرا حتیٰ کہ وہ وہاں سے چلا تو اس نے حج پا لیا اور جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا نہیں پایا اس کے لئے حج نہیں ہے (2)۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ دار قطنی نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ کیا میرے لئے حج ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا حتیٰ کہ ہم یہاں سے چل پڑے اور اس سے پہلے وہ عرفات سے رات یا دن کے وقت نکل چکا ہے تو اس کا حج مکمل ہے اور وہ مناسک حج ادا کر چکا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، من لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1)۔ امام شعبی نے فرمایا: جو مزدلفہ میں نہیں ٹھہرا وہ اس احرام کو عمرہ کا احرام بنادے اور جس نے جمہور کے لئے حجت پکڑی اس نے یہ جواب دیا کہ آیت میں وقوف کے وجوب اور رات گزارنے پر کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ مذکور نہیں ہے آیت میں صرف اس کا ذکر ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جب سورج دسویں کے دن طلوع ہو جاتا ہے تو مزدلفہ میں وقوف کا وقت فوت ہو جاتا ہے اور جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیتا ہے تو وہ وقوف کو پالیتا ہے یہ اجماع ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے اور جو کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور رہی حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث اس کے بعض طرق میں عرفہ میں وقوف کا بیان ہے مزدلفہ میں رات گزارنے کا بیان نہیں ہے۔ اس کی مثل حضرت عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی کی حدیث ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرفہ میں حاضر تھا۔ اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے انہوں نے حج کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفہ (میں وقوف ہے) جو اسے مزدلفہ کی رات سے فجر طلوع ہونے سے پہلے پالے تو اس کا حج مکمل ہوا(2)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا فرمایا: ہمیں وکیع نے بتایا فرمایا: ہمیں سفیان ثوری نے بتایا انہوں نے بکیر سے انہوں نے عطا سے انہوں نے عبدالرحمن بن یعمر الدیلی سے روایت کیا، فرمایا: میں حاضر تھا، پھر انہوں نے مذکورہ حدیث ذکر کی۔ اس کو ابن عیینہ نے بکیر سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے، کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفات ہے جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیا اس نے حج کو پالیا اور منیٰ کے دن تین ہیں جس نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور عروہ کی حدیث میں ہے "جس نے ہماری اس نماز جیسی نماز پڑھی (3)"۔ آپ نے مزدلفہ میں نماز کا ذکر فرمایا۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مزدلفہ میں رات گزارے اور امام کے ساتھ نماز پڑھے بغیر سو جائے حتیٰ کہ اس سے نماز فوت ہو جائے تو اس کا حج مکمل ہے۔ جب امام کے ساتھ نماز میں حاضر ہونا حج کی اصل میں سے نہیں ہے تو اس جگہ کا وقوف جس میں نماز ہوتی ہے وہ بدرجہ اولیٰ حج کی اصل میں سے نہیں ہوگا۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث کی وجہ سے یہ فرض متحقق نہیں ہوتا مگر خاص عرفہ میں۔

**مسئلہ نمبر 18**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ تاکید کے لئے امر کو دوبارہ ذکر کیا جیسے تو کہتا ہے ارمِ ارمِ (تیر مار، تیر مار) بعض علماء نے فرمایا: پہلا حکم مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم ہے اور دوسرا ذکر کا حکم اخلاص کے حکم پر ذکر کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دوسرے سے مراد نعمت کا شمار کرنا ہے اور اس کے شکر کا حکم ہے پھر انہیں ان کی گمراہی کی حالت یاد دلائی تا کہ انعام کی قدر ظاہر ہو۔ فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ، کما میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور ما مصدریہ یا کافہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عمدہ ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں عمدہ ہدایت دی اور اسے یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا کہ تم کیسے اس کا ذکر کرو، اس سے عدول نہ کرو۔ اِنْ مخففہ من ثقیلہ ہے۔ اس کی دلیل خبر پر لام کا دخول ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: ان نافیہ بمعنی ما ہے اور لام بمعنی اِلّا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

---

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 240، جلد 2 (قاہرہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من اتی عرفۃ قبل الفجر، صفحہ 223 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، فیمن لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ثکلتك امُك ان قتلت لمسلما حلت علیك عقوبة الرحمن

تیری ماں تجھ پر روئے تو قتل نہیں کرے گا مگر کسی مسلمان کو تو تجھ پر رحمن کی سزا ہوگی۔

یا ان بمعنی قد ہے یعنی قد کنتم۔ یہ تین اقوال ہیں۔ قَبْلِهٖ میں ضمیر ھدیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم قرآن کے انزال سے پہلے نہیں تھے مگر گمراہ۔ اگر تو چاہے تو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹادے اگرچہ پہلے آپ کا ذکر نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جاکر) واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب جس کو ہے وہ لوگوں کے ساتھ عرفات میں نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ حرم میں ہے۔ وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں رہنے والے ہیں، پس ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم حرم کی تعظیم کریں اور حل میں سے کسی چیز کی تعظیم نہ کریں۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے وہ حرم سے نہیں نکلتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اسی سے نکلتے تھے اور لوگ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ تو انہیں کہا گیا کہ اکٹھے نکلو اور ثُمَّ اس آیت میں ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ یہ جملہ کلام کے عطف کے لئے ہے۔ یہ اس آیت سے جدا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس آیت کا مخاطب تمام امت ہے اور النَّاسُ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسے ارشاد فرمایا: الذین قال لھم الناس۔ یہاں النَّاسُ سے مراد ایک فرد ہے اور اس تاویل پر احتمال ہے کہ انہیں عرفہ سے جانے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دوسرا چلنا ہو اور یہ مزدلفہ سے چلنا ہے پھر ثُمَّ اپنے معنی پر ہوگا (1)۔ اس احتمال کی بنا پر طبری نے اعتماد کیا۔ معنی یہ ہے کہ تم چلو جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مزدلفہ سے چلے تھے یعنی پھر منیٰ کی طرف چلو کیونکہ عرفات سے نکلنا، مزدلفہ سے نکلنے سے پہلے ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے مزدلفہ میں وقوف کو واجب قرار دیا، اس سے نکلنے کے امر کی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تاویل میں دونوں اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: قریش اور ان کے دین کے پیروکار یعنی حمس، مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں ٹھہرنے والے ہیں اور جو ان کے علاوہ تھے وہ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (2) یہ حدیث حسن صحیح ہے اور مسلم کی صحیح میں حضرت عائشہ سے مروی ہے الحمس وہ لوگ ہیں جن کے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع الترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الوقوف بعرفات، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوگ عرفات سے نکلتے تھے اور الحمس، مزدلفہ سے نکلتے تھے وہ کہتے: ہم نہیں نکلیں گے مگر حرم سے جب یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ تو وہ عرفات کی طرف لوٹے۔ یہ صریح نص ہے اور اس کی مثل زیادہ صحیح ہے۔ باقی اقوال پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ واللہ المستعان۔

حضرت سعید بن جبیر نے الناسی پڑھا ہے اور اس کی تاویل حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿﴾ (طہ) بعض کے نزدیک یا کی تخفیف جائز ہے۔ وہ الناس کہتے ہیں جیسے القاض و الهادِ۔ ابن عطیہ نے کہا: عربی میں اس کا جواز سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور اس کو پڑھنے کا جواز مجھے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا کیونکہ یہ استغفار کی جگہ اور قبولیت کا مقام اور رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی طلب کرو جو تم نے وقوف کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی مخالفت کرتے ہوئے کیا۔ تم مزدلفہ میں جبل قزح پر ٹھہرے اور عرفات میں نہ ٹھہرے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2:** ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی تو آپ قزح پر ٹھہرے اور فرمایا: یہ قزح موقف ہے اور مزدلفہ سارا موقف ہے۔ میں نے یہاں نحر کیا اور منیٰ سارا نحر کرنے کی جگہ ہے تم اپنے خیموں میں نحر کرو اور حاجیوں کا حکم جب وہ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف جائیں تو یہاں رات گزاریں پھر اندھیرے میں امام لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائے اور مشعر حرام میں وہ وقوف کریں۔ قزح ایک پہاڑ ہے جس پر امام ٹھہرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے رہیں اور سورج کے طلوع ہونے کے قریب تک دعا مانگتے رہیں۔ پھر طلوع شمس سے پہلے چلے جائیں۔ عربوں کی مخالفت کرتے ہوئے، کیونکہ وہ سورج طلوع ہونے کے بعد جاتے تھے اور کہتے تھے: اَشْرِقْ ثَبِيْرُ كَيْمَا نُغِيْرُ ثبیر پہاڑ روشن ہوتا کہ ہم احرام کھولنے کے قریب ہوں اور ہم غارت گری تک پہنچیں۔

بخاری نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت عمر کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھی پھر ٹھہرے اور کہا: مشرکین نہیں نکلتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا اور کہتے تھے: اشرق ثبیر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے چلے (2)۔ ابن عیینہ نے ابن جریج سے انہوں نے محمد بن قیس بن مخرمہ سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اہل جاہلیت، عرفہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے چلتے تھے اور مزدلفہ سے سورج طلوع ہونے کے بعد چلتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے چلنے میں تاخیر فرمائی اور مزدلفہ سے چلنے میں جلدی فرمائی، یعنی مشرکین کے طریقہ کی مخالفت کی۔

**مسئلہ نمبر 3:** جب سورج طلوع ہونے سے پہلے چلیں تو ان کو حکم ہے کہ وہ عرفہ سے چلنے کی ہیئت پر چلیں۔ یعنی امام

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، متی یدفع من جمع، صفحہ 228، جلد 1 (وزارت تعلیم)

لوگوں کو تھوڑا تیز چلائے جب ان میں سے کوئی کھلی جگہ پائے تو مزید تیز چلے۔ حدیث میں تیز چلنے کے لئے العنق کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ جانوروں کی معروف چال ہے اور النص مزید تیز چلنا ہے جیسے الخبب (جس میں ہچکولے آتے ہیں) یا اس سے زیادہ تیز چلنا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے، ان سے پوچھا گیا جب رسول اللہ ﷺ عرفہ سے چلتے تھے تو کیسے چلتے تھے؟ فرمایا: تیز چلتے تھے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے تھے (1)۔ ہشام نے کہا: النص فوق العنق کہ نص عنق سے تیز رفتاری کا نام ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور مستحب ہے کہ بطن محسر میں پتھر پھینکنے کی مقدار اپنی سواری کو حرکت دے اگر ایسا نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ منی سے ہے۔ ثوری وغیرہ نے ابوالزبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ چلے تو آپ پر سکینت تھی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''وادی محسر میں تیز چلو (2)'' اور فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھو۔ جب وہ منیٰ میں آئیں یہ دسویں کے دن کی صبح کا وقت ہے تو جمرہ عقبہ پر چاشت کے وقت سوار ہو کر رمی جمار کریں اگر قادر ہوں اور اس کے علاوہ جمروں میں سوار ہونا مستحب نہیں اور سات کنکریاں ماریں، ہر کنکری ٹھیکری کی مثل ہو۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... جب وہ کنکریاں مارلیں گے تو جو کچھ لباس وغیرہ میں سے اور مثل میں سے حلال ہو جائیں گے مگر عورتیں، خوشبو اور شکار امام مالک اور اسحاق کے نزدیک حلال نہ ہوں گے۔ یہ ابوداؤد خفاف کی ان سے روایت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عمر نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔ امام مالک کے نزدیک جس نے رمی جمار کے بعد اور افاضہ سے پہلے خوشبو لگائی اس پر فدیہ نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ارشاد وارد ہے اور جو امام مالک کے نزدیک جمرہ عقبہ کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے شکار کرے اس پر جزا ہے۔ امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں کے اور یہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**: حاجی جمرہ عقبہ پر پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کر دے مدینہ اور دوسرے شہروں کے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز اور مباح ہے اور ان کا مشہور قول یہ ہے کہ عرفہ کے دن سورج کے زوال کے وقت سے تلبیہ ختم کر دے جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ امر ہمارے نزدیک ہے۔ میں کہتا ہوں: اس عمل میں سنت وہ ہے جو مسلم نے حضرت فضل بن عباس سے روایت کی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو جب لوگ چلے، تم پر سکینت لازم ہے۔ آپ اپنی سواری کو تیز چلا رہے تھے حتیٰ کہ آپ وادی محسر میں داخل ہوئے۔ وہ منیٰ کے علاقہ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم وہ کنکریاں لے کر چلو جو جمرہ پر ماری جائیں گی۔ حضرت فضل بن عباس نے کہا: رسول اللہ ﷺ تلبیہ کہتے رہے حتیٰ کہ جمرہ عقبہ پر رمی کی (3)۔ ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے جیسے انسان کسی چیز کو پھینکتا ہے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الافاضۃ من عرفات الی المزدلفۃ، صفحہ 417، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، التعجیل من جمع، صفحہ 268، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، استحباب ادامۃ الحج، صفحہ 415، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ وہ جمرہ کبریٰ تک پہنچے تو بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں جانب تھا، انہوں نے سات کنکریاں ماریں اور فرمایا: اسی طرح کنکریاں ماری تھیں اس ذات نے جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی (1)۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم رمی جمار کرلو اور حلق کرالو اور جانور ذبح کرلو تو تمہارے لئے ہر چیز حلال ہوگئی سوائے بیویوں کے اور تمہارے لئے کپڑے اور خوشبو حلال ہوگئی (2)''۔ اور بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہاتھوں سے خوشبو لگائی جب انہوں نے احرام باندھا اور اس وقت بھی جب طواف افاضہ سے پہلے احرام کھولا اور حضرت عائشہ نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (3)۔ یہ علماء کے نزدیک چھوٹا حلال ہونا ہے اور بڑا حلال ہونا ہے طواف افاضہ کے بعد اس سے عورتیں اور تمام وہ چیزیں جو احرام کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اس کا مزید ذکر ان شاء اللہ سورۂ حج میں آئے گا۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝

''پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ مجاہد نے مناسک سے مراد ذبائح اور ان کا خون بہانا لیا ہے (4)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہی حج کے شعائر ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک سیکھو۔ معنی یہ ہے کہ جب تم حج کے مناسک میں سے کوئی نسک ادا کرلو تو اللہ کا ذکر کرو اور اس پر اس کی نعمتوں کی تعریف کرو۔ ابو عمرو نے کاف کو کاف میں مدغم کیا ہے اسی طرح اس نے سلککم میں کیا ہے کیونکہ دونوں ایک جیسے ہیں اور قضیتم یہاں ادیتم اور فرغتم کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاذا قضیت الصلوٰۃ یعنی جب تم جمعہ ادا کرلو۔ یہاں فعل کی ادائیگی کو قضا سے تعبیر کیا ہے جس کا متعین وقت نکل چکا ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ عربوں کی عادت تھی جب وہ حج ادا کر لیتے تو جمرہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء پر فخر کرتے اور اپنے آباء کی جرأت و بہادری اور سخاوت کے کارنامے بیان کرتے۔ حتیٰ کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، رمی الجمار سبع حصیات، صفحہ 235، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 276، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، الطیب بعد رمی الجمار، صفحہ 236، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان میں سے کسی نے کہا: اے اللہ! بے شک میرا باپ عظیم قبہ اور عظیم تھال والا تھا اور کثیر مال والا تھا تو مجھے اسی طرح عطا فرما جس طرح تو نے اسے عطا فرمایا۔ پس اس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے زیادہ کریں جتنا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس، عطا، ضحاک اور ربیع نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے ہیں۔ ابا، اماں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے استغاثہ کرو اور اس کی بارگاہ میں پناہ لو جیسے تم اپنے بچپنے میں اپنے آباء سے کرتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کی حرمت کا دفاع کرو اور جو اس کے دین اور اس کے مشاعر میں شرک کا ارادہ کرے اسے دور کرو جیسے تم اپنے آباء کا خیر کے ساتھ ذکر کرتے ہو جب ان میں سے کسی کی شان گھٹائی جاتی اور تم ان کی طرف سے حفاظت کرتے ہو اور دفاع کرتے ہو (1)۔ ابو الجوزاء نے حضرت ابن عباس سے کہا: ایک شخص آج اپنے باپ کا ذکر نہیں کرتا، پھر اس آیت کا معنی کیا ہے؟ فرمایا: اس طرح بات نہیں ہے لیکن تو اللہ کے لئے ناراض ہو جب اس کی نافرمانی کی جائے، اس سے زیادہ جتنا کہ تو اپنے والدین کی وجہ سے غصہ کرتا ہے جب انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے۔ کذکرکم میں کاف محل نصب میں ہے یعنی ذکرا کذکرکم۔ اَوْ اَشَدَّ زجاج نے کہا او اشد، ذکرکم پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔ معنی ہے: او کاشد ذکرا۔ اور منصرف نہیں کیونکہ افضل صفت کا صیغہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ او اذکروہ اشد کے معنی میں محل نصب میں ہو اور ذکرا بیان کی بنا پر منصوب ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اگر تو چاہے اسے صفت بنا دے يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، من کا صلہ ہے اور مراد مشرکین ہیں۔ ابو وائل، سدی اور ابن زید نے کہا: عرب زمانہ جاہلیت میں صرف دنیا کے مصالح کے لئے دعا مانگتے تھے (2)۔ وہ اونٹ، بکری، دشمن پر کامیابی مانگتے تھے اور آخرت کی خیر نہیں مانگتے تھے کیونکہ وہ آخرت کو جانتے نہ تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ پس انہیں صرف دنیا کے لئے دعا مانگنے سے منع کیا گیا، نہی، خبر کے صیغہ میں آئی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وعید مومن کو بھی شامل ہو جو صرف دنیا کے لئے دعا مانگے۔ اس بناء پر وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ یعنی اس شخص کے حصہ کی طرح جو آخرت کا سوال کرتا ہے **الخلاق** سے مراد حصہ ہے، اور من زائدہ ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

''اور بعض لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ یعنی لوگوں میں سے۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو دنیا اور آخرت کی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

خیر طلب کرتے ہیں۔ اور الحسنتین کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دنیا میں الحسنۃ سے مراد حسین و شکیل عورت ہے (1) اور آخرت میں آہو چشم حوریں ہیں۔ وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس سے مراد بری اور بدصورت عورت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ النَّارِ سے مراد حقیقۃً جلانے والی آگ ہے اور آگ سے عورت مراد لینا تجوز ہے۔ قتادہ نے کہا: حسنۃ الدنیا سے مراد دنیا میں عافیت اور مال بقدر ضرورت ہے۔ حسن نے کہا: حسنۃ الدنیا سے مراد علم اور عبادت ہے (2)۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ اکثر اہل علم کا یہ قول ہے کہ الحسنتین سے مراد دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اور یہ صحیح ہے کیونکہ لفظ تمام چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ حسنۃ نکرہ ہے اور دعا کے سیاق میں ہے۔ یہ بطور بدل ہر حسنۃ کا احتمال رکھتا ہے اور حسنۃ الاخرۃ سے مراد بالا جماع جنت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کوئی ایک حسنۃ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں اچھا عطیہ عطا فرما۔ پس اسم کو حذف کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ، قنا اصل میں اوْقنا تھا واو کو حذف کیا گیا جس طرح یقِ اور یشی میں حذف کی گئی کیونکہ واو، یا اور کسرہ کے درمیان واقع ہے جیسے یَعِدُ، میں واو حذف ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: واو کو لازم اور متعدی کے درمیان فرق کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں ورم، یرم، واو کو حذف کرتے ہیں۔ آیت سے مراد یہ دعا ہے کہ وہ ان لوگوں سے نہ ہو جو گناہوں کی وجہ سے آگ میں داخل ہوں گے اور شفاعت انہیں نکالے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دعا جنت میں داخلہ کی طلب کے لئے دعا کو مؤکد کرنا ہے تاکہ دونوں طرف سے نجات اور فوز میں رغبت ہو جیسا کہ ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تھی میں اپنی دعا میں کہتا ہوں: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر اور مجھے آگ سے عافیت دے اور میں آپ کی کلام اور معاذ کی کلام کو نہیں جانتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''ہماری کلام تیری کلام کے قریب ہوتی ہے (3)''۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ نے یہ روایت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** یہ آیت ایک جامع دعا ہے دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرمائیں۔ آپ نے دعا کی: اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار۔ لوگوں نے کہا: ہمارے لئے مزید دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو، میں نے دنیا و آخرت تو مانگ لی ہے؟ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے تھے: اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار۔ (4) حضرت انس جب دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تو یہ دعا مانگتے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اس کے علاوہ آپ کی کوئی عادت نہ تھی۔ یہ ابو عبید نے ذکر کیا ہے۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 277، جلد 1

4۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 945، جلد 2 (وزارت تعلیم)

موقف میں مسلمان کی اکثر دعا یہ ہونی چاہیے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رکن کے پاس ایک فرشتہ کھڑا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا وہ آمین کہتا ہے۔ پس تم کہو: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ عطا بن ابی رباح سے رکن یمانی کے متعلق پوچھا گیا جب کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عطا نے کہا: مجھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ستر فرشتوں کو اس پر مقرر کیا گیا ہے کہ جو یہ دعا پڑھے: اللهم انی اسالك العفو والعافية فی الدنيا والآخرة ربنا آتنا فی الدنيا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار۔ تو وہ کہتے ہیں: آمین (1) (الحدیث) اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے اور پوری حدیث مسنداً سورۃ الحج میں آئے گی۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

"انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب ان کی (نیک) کمائی کے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا یہ فریق ثانی کی طرف راجع ہے۔ یعنی اسلام کے فریق کی طرف۔ یعنی ان کے لئے حج کا ثواب ہے یا دعا کا ثواب ہے۔ بے شک مومن کی دعا عبادت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ کا مرجع دونوں فریق ہیں مومن کے لئے اس کے عمل اور دعا کا ثواب ہے اور کافر کے لئے اس کے شرک کی سزا اور دنیا پر اس کی نظر کا منحصر ہونے کا وبال ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (انعام: 132)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ یہ سرع یسرع سرعا و سرعة سے مشتق ہے جیسے عظم یعظم، اس کا اسم فاعل سریع ہے۔ الحساب محاسبہ کی طرح مصدر ہے۔ محسوب کو حساب کا نام دیا جاتا ہے الحساب کا معنی شمار کرنا ہے: کہا جاتا ہے: حسبَ یحسب حساباً و حسابة و حسبانا و حسبانا و حسباً یعنی شمار کرنا۔ ابن الاعرابی نے کہا:

یاجمل اسقاك بلا حسابه	سقیًا ملیك حسن الربابة

قتلتنی بالدلّ والخلابة

اور الحسب، انسان کے مفاخر جو شمار کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حسبه دینُهُ۔ کہا جاتا ہے: حسبه ماله، اسی سے حدیث ہے: الحسب المال والكرم التقوى۔ (2) (حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے) اس حدیث کو حضرت سمرہ بن

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، فضل الطواف، صفحہ 218 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ حجرات، صفحہ 160، جلد 2 (وزارت تعلیم)

جندب نے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور یہ الشہاب میں بھی ہے۔ الرجل حسیبٌ و قد حسُبَ حسابة جیسے خطُبَ خطابة۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ وہ شمار اور عقد اور فکر کو عمل میں لانے کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حساب لگانے والے کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا: کفٰی بنا حاسبین رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اللھم منزل الکتاب سریع الحساب (الحدیث)(1)

اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے جو کچھ ان کے حق میں ہے اسے جانتا ہے اور جو ان کے خلاف ہے اسے بھی جانتا ہے اسے غور و فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے جو محاسب کے لئے ہے اور جو اس کے خلاف ہے کیونکہ حساب میں فائدہ اس کی حقیقت کا علم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ بندوں کو ان کے اعمال کی بہت جلد جزا دینے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کو ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ وہ ایک حالت میں ان کا محاسبہ کرے گا جیسا کہ فرمایا اور اس کا قول حق ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان: 28)

حسن نے کہا: اس کا حساب آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیز ہے(2)۔ خبر میں ہے اللہ تعالیٰ بکری دوہنے کی دیر سے حساب لے لے گا۔ بعض نے فرمایا: وہ جب ایک کا حساب لے گا تو تمام مخلوق کا حساب لے چکا ہوگا۔ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ تعالیٰ ایک دن میں بندوں کا کیسے محاسبہ فرمائے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے ایک دن میں انہیں رزق دیتا ہے۔ حساب کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق جزا کی تقادیر کو جانتا ہے اور انہیں وہ چیزیں یاد دلاتا ہے جو وہ بھول چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ (المجادلہ: 6) بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے وہ حساب کے دن کو جلدی لانے والا ہے۔ اس آیت سے مقصود قیامت کے دن سے ڈرانا ہے(3)۔

میں کہتا ہوں: ہر مفہوم کا احتمال ہے۔ انسان اپنے لئے اعمال صالحہ کے ساتھ حساب کی تخفیف کو لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں حساب میں تخفیف فرمائے گا اس پر جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** حضرت ابن عباس نے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وہ شخص جو مال لیتا ہے اور کسی دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ اس آیت کے تحت مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے حج نہیں کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر تیرے والد پر قرضہ ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ جائز ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا قرض ادا کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس شخص نے کہا: کیا اس میں میرے لئے اجر ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ یعنی جو میت کی طرف سے حج کرے تو اس کے اور میت کے درمیان اجر ہوگا۔ ابو عبد اللہ محمد بن خویز منداد نے احکام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، الدعاء علی المشرکین، صفحہ 411، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ معالم التنزیل، صفحہ 260، جلد 1 (دار الفکر)
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 277، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کیونکہ امام مالک کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اس کو خرچ کا ثواب ملے گا اور حاجی کو حج کا ثواب ملے گا، گویا اسے اس کے بدن اور اعمال کا ثواب ملے گا اور جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اسے مال اور خرچ کا ثواب ملے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اس میں جس نے پہلے حج کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو حکم مختلف نہیں ہے۔ (یعنی پہلے جس نے حج نہ کیا ہوا ہو وہ حج بدل کر سکتا ہے) کیونکہ وہ اعمال جن میں نیابت ہو سکتی ہے ان میں جس کو نائب بنایا گیا ہے اس کا حکم مختلف نہیں ہے۔ اس نے پہلے اپنا وہ فریضہ ادا کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو اس میں دین و دنیا کے اعمال کا ہم نے اعتبار کیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وہ شخص جس پر زکوٰۃ ہو یا کفارہ ہو یا کوئی اور واجب ہو وہ کسی غیر کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اگرچہ اپنا کفارہ ادا نہ بھی کیا ہو۔ اسی طرح جس نے دنیا میں اپنے مصالح کی رعایت نہ کی ہو اس کا اس کی مثل مصالح میں غیر کا نائب بننا صحیح ہے۔ پس وہ غیر کے لئے مکمل ہو گا اگرچہ اس کے لئے مکمل نہ ہو گا۔ آدمی دوسرے کا نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اپنا نکاح نہ بھی کیا ہو۔

تم ترجمة الجزء الثانی من تفسیر القرطبی ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوة والسلام علی سید المرسلین

سید محمد اقبال شاہ عفی عنہ

ابوالفدا حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیر نگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر ابن کثیر 4 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور ۔ کراچی ۰ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

جلد دوم

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان    مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی    مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ۰ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد دوم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، باراول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

# ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411 فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

''اور (خوب) یاد کرلو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ معدودات میں الف اور تاعدد کی قلت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور بصریوں کا موقف ہے کہ یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں اور اس پر دلیل رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَهُمۡ فِی الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ﴿﴾ (سبا: 37) اور غرفات کثیر ہیں۔ (یعنی غرفات میں الف اور تا کثرت کے بیان کے لئے ہیں اور مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں قلت کو بیان کرنے کے لئے۔ معلوم ہوا یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں۔)

اور علماء کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد ایام منیٰ ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں، اور یہ تینوں اسماء انہی پر واقع ہوتے ہیں، اور یہی رمی جمار کے ایام ہیں، اور ان کا اطلاق ان تینوں دنوں پر ہوتا ہے جن میں حاجی یوم نحر کے بعد دو دنوں میں جلدی کر کے کوچ کر سکتا ہے۔ پس تو اس پر واقف رہ۔

ثعلبی اور ابراہیم نے کہا ہے کہ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ دس دن ہیں اور ایام معلومات ایام نحر ہیں۔ اسی طرح مکی اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد دس دن ہیں۔ ابو عمر بن عبد البر وغیرہ کے نقل کرنے کی بنا پر جو ہم نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ (اجماع) یا تو کتابت کی غلطی کی بنا پر ہے یا پھر وہ دس دن مراد ہیں جو یوم نحر کے بعد ہیں اور یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور یہ یوم نحر کے بعد والے تین دن ہیں، یوم نحر ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یوم النفر کو کوئی بھی (وہاں سے) کوچ نہیں کر سکتا اور یوم النفر سے مراد یوم النحر کا دوسرا دن ہے (یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن)۔ اگر یوم نحر اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں شامل ہوتا تو پھر یہ جائز ہوتا کہ جو کوئی یوم نفر کو جلدی (وہاں سے) کوچ کرنا چاہتا وہ کر سکتا کیونکہ اس طرح وہ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں سے دو دن وہاں ٹھہر چکا ہوتا۔ (لیکن ایسا کرنا درست نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ یوم نحر اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں شامل نہیں۔)

دار قطنی اور ترمذی وغیرہما نے عبد الرحمٰن بن یعمر الدیلی سے روایت بیان کی ہے کہ اہل نجد میں سے کچھ لوگ رسول اللہ

ﷺ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ عرفات میں تھے۔ تو انہوں نے (اس کے بارے) آپ ﷺ سے پوچھا، تو آپ ﷺ نے منادی کو حکم ارشاد فرمایا۔ پس اس نے یہ اعلان کیا "حج تو عرفات میں ہے۔ پس جو کوئی مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہلے یہاں آ گیا اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ تین ہیں پس جو کوئی جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (1)" یعنی حاجیوں میں سے جو کوئی ایام منیٰ میں سے دو دنوں میں ہی جلدی کر کے چلا گیا تو اس کا قیام بھی منیٰ میں یوم نحر سمیت تین دن ہو گیا۔ اور اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی اور تیسرے دن کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی اور جس کسی نے تیسرے دن کے آخر میں وہاں سے کوچ کیا تو یوم نحر کے سبب اس کے لئے چار دن منیٰ میں قیام ہو گیا اور اس نے رمی کی تعداد پوری کر لی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایام منیٰ تین دن ہیں اس کے بارے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک دلیل عرجی کا یہ قول بھی ہے۔

ما نلتقی الاّ ثلاث منًی حتی یفرق بیننا النفر

ہم منیٰ کے تین دن مل کر اکٹھے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہاں سے کوچ ہمیں متفرق کر دیتی ہے۔

پس ایام رمی مَّعْدُوْدٰتٍ کہلاتے ہیں اور ایام نحر معلومات کہلاتے ہیں۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور ایام معلومات مجموعی طور پر چار دن ہیں۔ ایک یوم نحر اور تین اس کے بعد۔ ان میں سے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) یوم معلوم ہے معدود نہیں۔ اور بعد والے دو دن (یعنی گیارہوں اور بارہویں ذوالحجہ کا دن) معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن (یعنی تیرہویں ذوالحجہ کا دن) فقط یوم معدود ہے معلوم نہیں۔ اور یہی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔

اور بلاشبہ اسی طرح ہے کیونکہ پہلا دن ان دنوں میں سے نہیں ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق منیٰ کے ساتھ خاص ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور نہ ہی یہ ان میں سے ہے جنہیں حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں معین فرمایا ہے کہ اَیّام منیٰ ثلاثۃ کہ ایام منیٰ تین ہیں (پس اس سے معلوم ہوا کہ) پہلا دن معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج: ۲۸)

(اور وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد قربانی ہے اور قربانی پہلے دن ہوتی ہے اور یہی یوم الاضحیٰ ہے اور پھر دوسرے اور تیسرے دن ہوتی ہے۔ (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کے دن) اور چوتھے دن قربانی نہیں ہوتی اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ (پس اس سے معلوم ہوا کہ) ارشاد باری تعالیٰ: فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ میں چوتھا دن مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں قربانی نہیں کی جاتی اور چونکہ اس میں رمی کی جاتی ہے پس وہ رمی کے سبب ایام معدودات میں سے ہے۔ اور قربانی نہ ہونے کے سبب وہ یوم معلوم نہیں ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب فیمن ادرک الامام بجمع الخ، حدیث نمبر 814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس میں حقیقت یہ ہے کہ یوم نحر رمی کے سبب یوم معدود ہے اور ذبح (قربانی) کے سبب وہ یوم معلوم ہے۔ لیکن ہمارے علماء کے نزدیک قول باری تعالیٰ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں یہ مراد نہیں ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ علیہما نے فرمایا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد دس دن ہیں ان میں سے پہلا دن ذوالحجہ کا پہلا دن ہے اور آخری دن یوم نحر ہے۔ اس بارے میں ان دونوں کا قول مختلف نہیں اور دونوں نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد ایام نحر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور یہی میرا موقف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

اور امام کرخی نے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد تین ایام نحر (قربانی کے دن) ہیں۔ یعنی ایک یوم الاضحیٰ اور دو دن اس کے بعد۔

الکیا طبری نے کہا ہے(1): کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ علیہما کے قول کے مطابق مَّعْلُوْمٰتٍ اور مَّعْدُوْدٰتٍ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں مذکور اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد بلا اختلاف ایام تشریق ہیں۔ اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کرتا کہ مَّعْدُوْدٰتٍ ایام عشر کو شامل نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور ایام عشر میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو دو دنوں (گیارہویں، بارہویں) سے تو تعلق رکھتا ہو اور تیسرے سے نہ رکھتا ہو۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معلومات دس ہیں اور معدودات ایام تشریق ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ابن زید نے کہا ہے: ایام معلومات ذوالحجہ کے دس دن اور ایام تشریق ہیں اور اس میں بہت بُعد ہے، ایک تو اس بنا پر جو کچھ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور (دوسرا) آیت کا ظاہر بھی اس کا دفاع کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور مَّعْلُوْمٰتٍ میں ذکر کا بیان کیا ہے وہ بھی اس قول کے خلاف پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس سے مشغول ہونے کا کوئی معنی نہیں۔

**مسئلہ نمبر3**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ (آیت میں) اس ذکر کا مخاطب حج کرنے والا (حاجی) ہے اسے ہی رمی جمار کے وقت تکبیر کہنے کے بارے خطاب کیا گیا ہے (اور یہ کہ وہ تکبیر کہیں) مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) اور نمازوں کے بعد (تکبیر کہیں) نہ کہ تلبیہ۔ (اب سوال یہ ہے) کیا غیر حاجی بھی اس میں داخل ہے یا نہیں؟ تو وہ نظریہ جو فقہاء امصار اور مشاہیر صحابہ کرام اور تابعین نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ تکبیر کے حکم میں مراد ہر کوئی ہے (چاہے وہ حج کر رہا ہو یا نہیں) خصوصاً اوقات نماز میں، پس وہ ہر نماز کو ادا کرنے کے بعد تکبیر کہے۔ چاہے نمازی اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا ہو۔ ان ایام میں یہ تکبیر ظاہر اور بلند آواز سے کہی جائے گی اور یہی اسلاف رضی اللہ عنہم کی اقتدا ہے۔ اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 121

مختصر میں ہے: عورتیں نمازوں کے بعد تکبیر نہ کہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے کیونکہ احرام کا حکم مردوں کی طرح انہیں بھی لازم ہے، ''مدونہ'' میں اسی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جو کوئی نماز کے پیچھے تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہہ لے اگر وہ قریب ہو اور اگر دور چلا جائے تو اس پر کوئی شے (کفارہ وغیرہ) لازم نہیں ہوگی۔ ابن الجلاب نے یہی کہا ہے اور حضرت امام مالک نے ''المختصر'' میں کہا ہے: وہ تکبیر کہے جب تک اسی مجلس میں رہے اور جب اپنی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا، تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں اور مدونہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے: اگر امام تکبیر بھول جائے تو اگر وہ قریب ہی ہو تو وہ بیٹھ جائے اور تکبیر کہے اور اگر دور ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے نہیں اور اگر وہ چلا گیا اور اس نے تکبیر نہ کہی درآنحالیکہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ تکبیر کہہ لیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مدت تکبیر کی دونوں طرفوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب، حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ (آدمی) نویں ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) کی عصر تک تکبیر کہے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر یوم نحر کی نماز عصر تک (ہر نماز کے بعد) تکبیر کہے گا۔

صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما) نے ان دونوں سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے پہلا قول یعنی حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہی لیا ہے۔ پس انہوں نے ابتدائے مدت میں تو اتفاق کیا ہے لیکن انتہا میں نہیں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ (آدمی) یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن کی نماز صبح تک تکبیر کہے گا۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی قول ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہے۔

ابن عربی نے کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو تکبیر کا آغاز کرے گا اور یوم نحر کی عصر کے وقت ختم کر دے گا، تو ان کا یہ قول ظاہر کلام سے خارج ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ** اور یہ ایام تین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ دو دنوں میں تکبیر کہے گا تو اس طرح انہوں نے ظاہر کلام کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ (تکبیر کہنے کے ایام) یوم عرفہ اور ایام تشریق ہیں تو انہوں نے کہا: بلاشبہ رب کریم نے ارشاد فرمایا **فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ** (بقرہ: 198) تو اس میں عرفات کا ذکر ایام کے ذکر میں داخل ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتے کہ وہ عرفہ کے دن مغرب کی نماز سے تکبیر کہے گا کیونکہ عرفات سے واپس لوٹنے کا وقت تو وہی (مغرب کا وقت) ہے اور جو وقت اس سے پہلے ہے ظاہر لفظ اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آٹھویں ذی الحجہ (یوم ترویہ) میں سے ہو جو کہ منیٰ میں اترنے کا وقت ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ تکبیر کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد

تین بار تکبیر کہے گا۔ اسے زیاد بن زیاد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک مذہب میں ایک روایت یہ ہے کہ تین بار تکبیر کہنے کے بعد یہ کہا جائے گا: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر وللہ الحمد اور المختصر میں امام مالک سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد۔

قول باری تعالیٰ: فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ میں اکیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس مقام پر تعجیل (جلدی کرنا) ہمیشہ دن کے آخری حصہ میں ہوگی اور اسی طرح یہ تیسرے دن ہوگی، کیونکہ ان ایام میں رمی جمار کا وقت زوال کے بعد ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ کے سوا کسی پر رمی نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو اس کے سوا کسی جمرہ پر رمی نہیں کی۔ اور اس کا وقت طلوع شمس سے لے کر زوال تک ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ایام تشریق میں جمرات پر رمی کرنے کا وقت زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ البتہ اس کے بارے اختلاف ہے جس نے جمرہ عقبہ پر رمی طلوع فجر سے پہلے کی یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے کی۔

حضرت امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر طلوع ہونے سے پہلے کسی کو رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہو۔ لہٰذا فجر سے پہلے اس کی رمی جائز نہیں اور اگر کسی نے فجر سے پہلے وہاں رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جمرہ عقبہ کی رمی (طلوع فجر سے پہلے) جائز نہ ہوگی اور اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور ایک گروہ نے طلوع فجر سے پہلے رمی کرنے کی رخصت دی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں: بلاشبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایسا کرتی تھیں۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے(1)۔ اور یہی قول حضرت عطا، ابن ابی ملیکہ اور عکرمہ بن خالد سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے بشرطیکہ رمی نصف رات کے بعد ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی نہیں کی جائے گی۔ مجاہد، نخعی اور ثوری نے یہی کہا ہے۔ اور ابوثور نے کہا ہے: اگر کسی نے طلوع شمس سے پہلے رمی کی تو اگر (علماء نے) اس میں اختلاف کیا، تو پھر یہ جائز نہیں ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اتفاق کر لیا یا اس میں کوئی سنت موجود ہو تو پھر یہ جائز ہوگی۔ ابوعمر نے کہا ہے: جہاں تک ثوری اور ان کی اتباع کرنے والوں کا قول ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے بعد جمرہ کی رمی کی اور فرمایا: خُذُوۡا عَنِّیۡ مَنَاسِکَکُمۡ (احکام حج مجھ سے سیکھ لو) اور ابن منذر نے کہا ہے: سنت یہ ہے کہ رمی جائز نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1659، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس طرح کرنے والا اس طریقہ اور سنت کے خلاف کرنے والا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا۔ اور جس کسی نے طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی کی، تو اس پر اعادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کے بارے نہیں جانتا کہ اس نے کہا ہو" یہ جائز نہیں ہے۔"

**مسئلہ نمبر 2**۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یوم نحر کو مکہ مکرمہ میں صبح کرے اور یہی اس کا دن تھا۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں ہشام پر اختلاف کیا گیا ہے، پس ایک گروہ نے اسے ہشام عن ابیہ سے مرسل روایت کیا ہے جیسا کہ اسے معمر نے روایت کیا ہے اور دوسروں نے اسے ھشام عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مسند روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح حکم ارشاد فرمایا تھا۔ اور بعض دوسروں نے اسے عن ھشام عن ابیہ عن زینب بنت ابی سلمہ عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بھی مسند روایت کیا ہے۔ اور تمام راوی ثقہ ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوم نحر کی صبح مکہ میں کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جبکہ رات کے وقت منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی ہو۔ واللہ اعلم۔

اور اسے ابوداؤد نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہارون بن عبداللہ نے ہمیں بیان کیا کہ ابن ابی فدیک ضحاک بن عثمان نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کی رات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف حکم بھیجا، پس انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی، پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا۔ اور یہ دن وہی دن تھا جس میں رسول اللہ ﷺ انہی کے پاس ہوتے تھے (1)۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر جس کسی نے رات کے وقت رمی کی وہ جائز ہے، اور سورج طلوع ہونے سے لے کر زوال تک اختیار ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بارے پسندیدہ وقت سورج طلوع ہونے سے لے کر اس کے زوال تک ہے۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی نے نحر کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے اس پر رمی کی، تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

مگر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ اگر اس نے جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑ دی یہاں تک کہ شام ہو گئی تو وہ خون بہائے (یعنی ایک جانور قربانی کرے) اور اسے وہ مقام حل سے لے کر آئے۔ اور ایسے آدمی کے بارے اختلاف ہے کہ جس نے جمرہ پر رمی نہ کی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، پھر اس نے رات کے وقت یا دوسرے دن رمی کی تو اس کے بارے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس پر دم واجب ہے، اور اس طرح استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمی جمار کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے، اور وہ یوم نحر ہے (2) پس جس نے غروب شمس کے بعد رمی کی، تو اس نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی رمی یوم النحر ضحیٰ، حدیث 818، ابن ماجہ، باب رمی الجمار ایام التشریق، حدیث 3043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رمی کا وقت نکلنے کے بعد رمی کی۔ اور جو کوئی بھی حج کے دوران کوئی عمل اس کے وقت کے بعد کرے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے۔

حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے: اس پر دم لازم نہیں ہوگا، یہی قول حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا بھی ہے۔ اور اسی طرح ابو ثور نے بھی کہا ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا: جب اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا حرج کوئی حرج نہیں ہے۔ (1)

حضرت امام مالک نے فرمایا: جو رمی جمار بھول گیا یہاں تک کہ شام ہوگئی تو پھر رات یا دن کے وقت جس ساعت میں اسے یاد آجائے وہ رمی کر لے جیسا کہ (بھولنے والا) نماز پڑھ لے جب اسے یاد آجائے، اور وہ رمی نہ کرے مگر صرف وہی جو فوت ہوئی (یعنی جو رمی اپنے وقت پر نہ ہو سکی) اور اگر وہ ایک جمرہ ہو تو اس پر رمی کرے پھر اس رمی کے بعد جن جمروں پر رمی کرنی ہے وہ رمی کرے گا، کیونکہ رمی جمار میں ترتیب واجب ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ پہلے جمرہ کی رمی مکمل کرنے سے پہلے دوسرے جمرہ کی رمی میں شروع ہو جائے جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہی مشہور مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رمی کے صحیح ہونے کے لئے ترتیب واجب نہیں ہے بلکہ جب مکمل رمی ادائیگی کے وقت کے دوران ہو تو وہ جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب رمی کے ایام گزر جائیں تو پھر کوئی رمی نہیں ہے۔ پس اس کے بعد اگر وہ اسے یاد آجائے جو اس سے صادر ہو رہا ہے درآنحالیکہ ابھی وہ مکہ میں ہی ہو یا مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد، تو اس پر ہدی (قربانی) واجب ہوگی چاہے اس نے مکمل رمی جمار چھوڑ دیا ہو، یا ان میں سے ایک جمرہ کی رمی ترک کر دی ہو، یا ایک جمرہ کی کنکری چھوڑ دی ہو، یہاں تک کہ ایام منیٰ (یعنی ایام رمی) گزر گئے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اگر اس نے مکمل رمی جمار ترک کر دیا تو اس پر دم واجب ہوگا اور اگر ایک جمرہ چھوڑ دیا تو اس پر جمرہ کی ہر کنکری کے بدلے مسکین کو نصف صاع کھانا دینا ہوگا یہاں تک کہ وہ دم کو پہنچ جائے، پھر وہ جو چاہے کھلا دے۔ مگر جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑنے کے عوض اس پر دم واجب ہوگا۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ صدقہ کرے گا اگر اس نے کنکری چھوڑ دی۔ اور امام ثوری نے کہا ہے: وہ ایک، دو اور تین کنکریوں کے عوض تو کھانا کھلائے گا اور اگر اس نے چار یا اس سے زیادہ کنکریاں چھوڑ دیں، تو پھر اس پر دم واجب ہوگا، اور فقیہ اللیث نے کہا ہے: ایک کنکری چھوڑ دینے میں دم واجب ہے، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اور ان کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ایک کنکری میں ایک مد (2) طعام واجب ہے، دو کنکریوں میں دو مد اور تین کنکریوں میں دم واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ رمی جمار میں سے جو ایام تشریق کے دوران رہ جائے یہاں تک کہ آخری یوم تشریق کا سورج غروب ہو جائے تو تمام کے نزدیک رمی کرنے کا کوئی ذریعہ اور جواز نہیں۔ (آخری یوم تشریق سے مراد) یوم نحر سے لے کر چوتھا دن ہے اور یہ ایام تشریق میں سے تیسرا دن ہے (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) البتہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دم یا کھانا کھلانا

1۔ صحیح بخاری، باب الذبح قبل الحلق، حدیث نمبر 1608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل حجاز کے نزدیک 1.33 رطل اور اہل عراق کے نزدیک 2 رطل ہے

اس کی طرف سے جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ایام تشریق کی راتیں منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ یا کہیں اور گزارنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے سوائے چرواہوں کے اور آل عباس کے ان افراد کے جنہیں پانی پلانے کی ولایت حاصل ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ کی راتیں (حاجیوں کو) پانی پلانے کے لئے مکہ مکرمہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی (1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پانی پلانے بارے نگرانی کرتے تھے اور اس کے معاملے کا اہتمام کرتے تھے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو اس کا پانی پلاتے تھے۔ سو اس لئے آپ کو منیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں رات گزارنے کی رخصت دی گئی، جیسا کہ اونٹ چرانے والوں کو ان کی حاجت کے پیش نظر رخصت دی گئی، کیونکہ انہیں اونٹ چرانے کے لئے چراگاہ کی طرف نکلنے کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ منیٰ سے دور تھی۔

منیٰ کا نام منیٰ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ اس کا نام منیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا: آپ تمنا اور آرزو کیجئے۔ تو آپ نے کہا: ''میں جنت کی تمنا کرتا ہوں۔'' پس اس کا نام منیٰ رکھ دیا گیا۔ اور فرمایا: اس کا نام جمع بھی رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں حضرت حوا اور حضرت آدم علیہما السلام جمع اور اکٹھے ہوئے ہیں (یعنی ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ہے۔) اور جمع مزدلفہ کا بھی نام ہے۔ اور یہ المشعر الحرام بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں رخصت دی گئی ہے حاجیوں کے لئے منیٰ کی راتیں منیٰ میں گزارنا حج کے شعائر اور اس کے احکام میں سے ہے۔ حج اور اس کے تمام احکام پر قیاس کرتے ہوئے عقل (نظر وفکر) حج کے احکام میں سے کسی حکم کو ساقط کرنے والے پر دم واجب کرتی ہے۔ اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حاجیوں میں سے کوئی بھی منیٰ کی راتیں عقبہ کے پیچھے نہیں گزارے گا۔ اور وہ عقبہ جس کے پیچھے رات گزارنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے یہ وہی عقبہ ہے جو اس جمرہ کے پاس ہے جس پر لوگ یوم نحر کو کنکریاں مارتے ہیں، ان میں سے ہے جو مکہ کے قریب ہیں۔ ابن نافع نے حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ''المبسوط'' میں اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت مالک نے فرمایا: اور جس نے منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات اس کے پیچھے بسر کی، تو اس پر فدیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے منیٰ کی راتیں منیٰ کے سوا (دوسری جگہ) بسر کی ہیں۔ اور حج میں ایسا کرنا مشروع ہے لیکن اسے ترک کرنے کے سبب اس پر دم لازم ہوگا، جیسا کہ مزدلفہ کی رات کا حکم ہے۔ اور یہاں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فدیہ سے مراد ہدی (قربانی کا جانور) ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ ہدی ہے جسے حل سے حرم کی طرف ہانک کر لایا جائے گا (☆)۔

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4731

☆ ائمہ احناف کے نزدیک یہ راتیں وہاں گزارنا رمی جمار کی سہولت کے لیے ہے وہاں ہی گزارے لیکن اگر کوئی وہاں نہیں رہتا تو اس پر دم واجب نہیں، ہدایہ

**مسئلہ نمبر 7**۔ حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے واسطہ سے ان کے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت عطا فرمائی۔ وہ یوم نحر کو رمی کرتے تھے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ اور بارہویں دو دنوں کی رمی کرتے تھے، اور پھر یوم النفر (یعنی تیرہویں ذی الحجہ) کو بھی رمی کرتے تھے۔

ابوعمر نے بیان کیا ہے: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مقتضا کے مطابق قول نہیں کیا۔ اور وہ کہتے تھے: وہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرتے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کو رمی نہ کرتے تھے اور جب بارہویں ذی الحجہ کا دن آتا، اور یہ ایام تشریق میں سے دوسرا دن ہے، اور یہی وہ دن ہے جس میں وہ لوگ جلدی کوچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تعجیل (جلدی چلے جانے) کا ارادہ رکھتے ہیں، یا جن کے لئے تعجیل جائز ہوتی ہے، تو وہ اس دن گیارہویں اور بارہویں دو دنوں کی رمی اکٹھی کرتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ اسے ادا کرتے تھے جو ان پر لازم تھا۔ اور آپ کے نزدیک کوئی بھی کسی شے کو ادا نہیں کرتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے ذمہ واجب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اس حدیث کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ اور آپ کے سوا کوئی اور کہتا ہے: جو کچھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے اس کی بناء پر اس تمام میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ تمام کے تمام رمی کے ایام ہیں۔ البتہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چرواہوں کے لئے رمی کو مقدم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چرواہے نہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار کریں۔ پس اگر کسی نے زوال سے پہلے رمی کی، تو وہ اس کا اعادہ کرے، ان کے لئے تقدیم جائز نہیں۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوسرے اور تیسرے دن (یعنی بارہویں اور تیرہویں) کی رمی کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ جو کچھ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں کہا ہے وہ ابن جریج کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مجھے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے واسطہ سے خبر دی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت عطا فرمائی کہ وہ واپس چلے جائیں۔ پس وہ یوم نحر کو رمی کرتے، پھر ایک دن اور ایک رات چھوڑ دیتے، پھر دوسرے دن رمی کرتے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور تیسرے جمرہ کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی جس نے چلے جانے میں جلدی کی۔

ابن ابی زمنین نے کہا ہے: جب کوئی جلدی چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ نفر اول کے دن (یعنی بارہویں ذی الحجہ) اس پر رمی کرے گا۔ ابن المواز نے کہا ہے: جلدی کوچ کا ارادہ کرنے والا دو دنوں میں اکیس کنکریاں مارے گا، ہر جمرہ پر سات کنکریاں، تو اس طرح اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی، کیونکہ اس نے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں پھینکیں ہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور تیسرے دن کی رمی ساقط ہو جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی جمار کر لیں۔ وہ کہتے

ہیں: ''زمانہ اول میں'' باجی نے کہا ہے کہ قولہ فی الزمن الاوّل حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ پر اپنے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس شریعت کا زمانہ اول ہے۔ پس اس بنا پر یہ روایت مرسل ہے اور وہ قول یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلا زمانہ ہے جسے حضرت عطا نے پایا ہو تو پھر یہ روایت موقوف مسند ہو گی۔ واللہ اعلم۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ یہ روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کی حدیث سے مسند ہے، اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور ہم نے اسے المقتبس فی شرح مؤطا مالک بن انس میں ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ ان (چرواہوں) کے لئے رات کے وقت رمی جمار کو مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ انتہائی نرم رویہ ہے، اور اس میں ان کے لئے انتہائی زیادہ احتیاط ہے جو وہ اونٹ چرانے کا قصد کرتے تھے۔ کیونکہ رات کے وقت نہ وہ چرتے ہیں اور نہ وہ منتشر ہوتے ہیں، پس وہ اس وقت میں رمی کر لیں۔

تحقیق ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جس کی رمی رہ گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تو اس بارے میں حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اونٹ چرانے والوں کے سوا رات کے وقت کسی کے لئے رمی جائز نہیں۔ رہے تجار، تو ان کے لئے بھی جائز نہیں۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس کی رمی فوت ہو گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، تو پھر اسے چاہیے کہ وہ رمی نہ کرے یہاں تک کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت امام مالک نے فرمایا ہے کہ جب کوئی دن کے وقت رمی چھوڑ دے تو وہ رات کے وقت رمی کر لے اور اس پر ابن القاسم کی روایت کے مطابق دم لازم ہو گا۔ اور آپ نے مؤطا میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر دم ہو گا۔

امام شافعی، ابو ثور، یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کوئی رمی بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے، تو وہ رمی کرے گا اور اس پر دم نہیں ہو گا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت رمی جمار کرنے کی رخصت دیتے تھے۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے فرمایا ہے: وہ رمی کرے گا اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہو گی، اور اگر اسے رات کے وقت بھی رمی یاد نہ آئی، یہاں تک کہ دوسرا دن آ گیا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ رمی کرے اور اس پر دم لازم ہو گا، اور امام ثوری نے کہا ہے: جب کسی نے بھول کر یا بالارادہ رمی کو رات تک مؤخر کر دیا، تو وہ خون بہائے (یعنی جانور قربانی کرے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: چرواہوں میں سے یا پانی پلانے والوں میں سے کسی نے رات کے وقت رمی کی، تو اس پر دم واجب نہ ہو گا۔ (یہ حکم حدیث کے مطابق ہے۔) اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا، تو عقل و نظر دم واجب کرے گی جبکہ یہ بالارادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کو اپنی سواری پر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ اور امام مالک

وغیرہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ اس پر رمی کرنے والا سوار ہو، حالانکہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم پیدل حالت میں رمی کرتے تھے اور چاہیے کہ ہر روز تینوں جمروں پر اکیس کنکریاں رمی کرے، اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہے، اور رمی کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ شریف کی طرف ہو، اور جمرات ترتیب کے ساتھ رکھے، نہ انہیں اکٹھا کرے اور نہ ہی انہیں متفرق کرے اور نہ انہیں اوندھا رکھے، وہ جمرہ اولیٰ سے ابتدا کرے اور اس پر سات کنکریاں مارے، وہ انہیں اس کے پاس رکھ نہیں دے گا۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ پس اگر اس نے انہیں پھینک دیا تو یہ اصحاب رائے کے نزدیک جائز ہے۔

ابن قاسم نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں تمام کنکریاں پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کنکریاں مارتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک ہی بار دو یا دو سے زیادہ کنکریاں نہیں پھینکنی چاہئے۔ پس اگر اس نے ایسا کیا، تو وہ اسے ایک کنکری شمار کرے۔ اور جب وہ ایک جمرہ سے فارغ ہو جائے تو وہ اس کے سامنے کی طرف آگے بڑھے اور طویل وقت تک دعا کے لئے کھڑا رہے اور جو میسر آئے (وہی مانگے) بعد ازاں دوسرے جمرہ پر رمی کرے اور یہ جمرہ وسطی ہے اور وہ اس سے وادی کے بطن میں شمال کی طرف پھر جائے اور اس کے پاس بھی دعا کے لئے طویل وقت تک وقوف کرے۔ پھر تیسرے جمرہ پر کنکریاں مارے اور یہ جمرہ عقبہ ہے، اس پر بھی سات کنکریاں مارے گا اور اس کے نیچے کی جانب سے اس پر کنکریاں پھینکے گا اور اس کے پاس کھڑا نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اس پر اس کی اوپر کی جانب سے رمی کی تو وہ بھی اس کی طرف سے جائز ہے اور وہ رمی کے دوران ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے گا۔ رمی جمار کے دوران سنت ذکر تکبیر ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذکر اور وہ پیدل رمی کرے گا بخلاف یوم نحر کے جمرہ کے۔ یہ سب کا سب (حکم) توقیفی ہے۔ نسائی اور دارقطنی نے اسے حضرت زہری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس جمرہ پر رمی کرتے تھے جو مسجد منیٰ کے ساتھ متصل ہے تو آپ اس پر سات کنکریاں مارتے تھے اور جب بھی ایک کنکری پھینکتے تو ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے تھے۔ پھر اس سے آگے بڑھتے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور آپ طویل وقت تک کھڑے رہتے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے جمرہ کے پاس آتے تھے اور اسے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ پھر آپ بائیں جانب اس جگہ کی طرف نیچے اترتے جو وادی کے ساتھ متصل ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جمرہ کے پاس آتے جو عقبہ کے پاس ہے اور اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے، پھر واپس پھر جاتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ زہری نے کہا ہے: میں نے حضرت سالم بن عبد اللہ کو اپنے باپ سے اور انہیں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 10۔** کنکریوں کا حکم یہ ہے کہ وہ پاک ہوں، ناپاک نہ ہوں اور نہ ہی ان میں سے ہوں جو پہلے ماری جا چکی

1۔ بخاری شریف، باب رفع الیدین عند الجمرۃ، حدیث نمبر 1634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، سو اگر کسی نے ایسی کنکری ماری جو پہلے ماری جا چکی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ تحقیق ان سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے: اگر ایسا ایک کنکری میں ہوا تو آپ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور میں ابن قاسم کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے بارے فتویٰ دیا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اہل علم نے مستحب قرار دیا ہے کہ وہ کنکریاں مزدلفہ سے اٹھائے نہ کہ وہ جو مسجد میں پڑی ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ کنکریاں اٹھالیں اور رمی کرنے کے بعد وہ اس کے پاس باقی بچ رہیں تو وہ انہیں دفن کر دے، انہیں پھینکے نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ جمہور کے نزدیک کنکریوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ طاؤس نے اس میں اختلاف کیا ہے حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ اگر اس نے ناپاک کنکریوں کو نہ دھویا یا ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی جو پہلے ماری جا چکی تھیں تو اس نے گناہ کیا اور آپ نے اس کی طرف سے رمی کو جائز قرار دیا۔

ابن منذر نے بیان کیا ہے: یہ مکروہ ہے کہ وہ ان کنکریوں کے ساتھ رمی کرے جن کے ساتھ پہلے رمی کی جا چکی ہو۔ اگر ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی، کیونکہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسا کرنے والے پر رمی کا اعادہ واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی ہم اخبار میں سے کوئی ایسی خبر جانتے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنکری کو دھویا ہو اور نہ ہی آپ نے اسے دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ تحقیق ہم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ وہ کنکریاں دھوتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ رمی جمار میں مٹی کا ڈھیلا پھینکنا جائز نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی شی جو پتھر نہ ہو۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خشک مٹی کا ڈھیلا جائز ہوگا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو اس نے پھینکی اور اس کا تعلق زمین سے ہو، تو وہ جائز ہوگی۔

امام ثوری نے کہا ہے: جس نے مٹی کے ڈھیلے اور ٹھیکری کے ساتھ رمی کی تو وہ رمی کا اعادہ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے: سنگریزوں کے سوا رمی جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم پر انگلیوں سے کنکریاں پھینکنا لازم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رمی کنکریوں کے ساتھ تھی۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ کنکری کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: وہ طولاً اور عرضاً پورے سے چھوٹی ہوگی۔ اور ابوثور اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: ٹھیکری کی کنکری کی مثل ہوگی۔ اور ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ بکری کی مینگنی کے برابر کنکری کے ساتھ رمی کرتے تھے۔ اور حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے: اس سے بڑی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؛ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھیکری کی کنکری کی مثل کے ساتھ رمی کی سنت قائم فرمائی ہے۔ البتہ جس پر حصاۃ کا نام واقع ہو سکے اس کے ساتھ رمی کرنا جائز ہے اور سنت کی اتباع کرنا افضل ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح قول (یا عمل) جس کا خلاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا جو ہدایت یافتہ ہو اور اقتدا کرے (وہ یہ ہے کہ) امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح ارشاد فرمایا: درآنحالیکہ آپ اپنی سواری پر تھے: میرے لئے کنکریاں چن کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کنکریاں چنیں، وہ ٹھیکری کی کنکریوں کی مثل تھیں۔ پس جب میں نے انہیں آپ کے دست مبارک میں دیا تو فرمایا: ہاں انہی کی مثل (یعنی رمی کے لئے اتنی مقدار ہی مناسب اور موزوں ہے۔) اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بلاشبہ جو تم سے پہلے تھے انہیں دین میں غلو کرنے نے ہلاک کر دیا(1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وَاِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّيْنِ بڑی کنکریوں کے ساتھ رمی کرنے کی کراہت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ یہ غلو میں سے ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 15**۔ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں کنکری باقی ہو، وہ نہ جانتا ہو یہ کون سی کنکریوں میں سے ہے تو وہ اسے پہلی میں سے بنائے (یعنی اسے جمرہ اولیٰ پر مارے) اور اس کے بعد پھر وسطیٰ اور آخری پر رمی کرے۔ اور اگر زیادہ وقت گزر جائے تو پھر مکمل رمی نئے سرے سے کرے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ امام مالک، امام شافعی، عبدالملک، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے کہا ہے جس نے ایک جمرہ پر دوسرے جمرہ کو مقدم کر دیا: وہ رمی اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ پے در پے اور لگاتار رمی کرے۔ حسن، عطا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور بعض لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا ہے کہ ''جس کسی نے ایک حکم کو دوسرے حکم پر (جو کہ متصل اس کے بعد ہو) مقدم کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں''۔ اور فرمایا: یہ اس آدمی سے زیادہ نہیں ہوگا جس پر کئی نمازیں اور روزے جمع ہو گئے اور اس نے بعض کو بعض سے پہلے قضا کر لیا۔ پہلے قول میں احتیاط زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 17**۔ مریض کے رمی کرنے اور اس کی طرف سے رمی کیے جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ایسے مریض اور بچے کی جانب سے رمی کی جائے گی جو رمی کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور مریض ان کی رمی کے وقت کوشش کرے کہ وہ ہر جمرہ کے لئے سات تکبیریں کہے اور اس پر ہدی (قربانی) ہو گی، اور جب مریض رمی کے ایام میں تندرست ہو جائے اور وہ خود اپنی طرف سے رمی کر لے، اس کے باوجود اس پر امام مالک کے نزدیک دم واجب ہوگا۔

امام حسن، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مریض کی طرف سے رمی کی جائے گی اور انہوں نے ہدی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ بچہ جو رمی پر قدرت نہیں رکھتا اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کی طرف سے رمی کی جائے گی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3248

کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کنکریاں جو یہاں ہر سال پھینکی جاتی ہیں تو ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ کم ہو جاتی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ ان میں سے جو قبول کر لی جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں، اور اگر اس طرح نہ ہوتو تو انہیں پہاڑوں کی مثل دیکھے(1)۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حاجیوں میں سے جو منیٰ سے نفر اول کے دن اپنے شہر کی طرف واپس جانے کے لئے نکلنے کا ارادہ کرے، درآنحالیکہ وہ (شہر) حرم سے باہر ہو اور وہ مکہ مکرمہ میں مقیم نہ ہو، تو اسے چاہئے وہ زوال شمس کے بعد کوچ کرے، بشرطیکہ وہ یوم نحر سے متصل دن میں شام سے پہلے پہلے رمی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ ''اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں'' پس جو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کوچ کرے جب تک کہ ابھی دن موجود ہو۔ تحقیق ہم نے حضرت نخعی اور حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: ایام تشریق کے دوسرے دن جسے عصر کی نماز کا وقت منیٰ میں ہو گیا، تو وہ آنے والے دن کی صبح تک وہاں سے کوچ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ دونوں نے یہ قول بطور استحباب کیا ہے اور پہلا قول جو ہم کہتے ہیں وہ ظاہر کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اہل مکہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا نفر اول کے دن (منیٰ سے) جا سکتے ہیں؟ تو ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تمام لوگوں میں سے جو چاہے نفر اول کے دن وہ وہاں سے جا سکتا ہے سوائے آل خزیمہ کے وہ صرف نفر ثانی کے دن ہی وہاں سے کوچ کر سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے اس آدمی پر کوئی تعجب نہیں جس نے کوچ کے پہلے دن وہاں سے کوچ کیا تا کہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو جائے۔ مزید فرمایا: اہل مکہ تو نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

امام احمد اور اسحاق نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول الا آل خزیمۃ کا معنی یہ بیان کیا ہے کیونکہ وہ اہل حرم ہیں۔

اور حضرت امام مالک اہل مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جس کے لئے کوئی عذر ہو اس کے لئے تو جلدی کر کے دو دنوں میں وہاں سے چلے جانا جائز ہے۔ اور اگر کوئی امور حج میں سے کسی کے بارے میں محض اپنے لئے تخفیف کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو گویا آپ نے تعجیل کا حکم ان کے لئے قرار دیا جن کا علاقہ دور ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت اپنے عموم پر ہے، رخصت تمام لوگوں کے لئے ہے، چاہے وہ اہل مکہ ہوں یا دوسرے، کوئی منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ کرے یا اپنے شہر کی طرف جانے کا قصد کرے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت عام لوگوں کے لئے ہے۔ ابن منذر کا قول حضرت امام شافعی کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی رحمہم اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: ایام معدودات میں سے دوسرے دن جس نے منیٰ سے کوچ کیا تو اس پر کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو تیسرے دن تک وہاں ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ پس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ سب مباح ہے۔ اور اس کی اس تقسیم کو اہتمام اور تاکید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

1۔ سنن دارقطنی، جلد 2، صفحہ 300

عربوں میں سے کچھ تھے جو جلدی کر کے وہاں سے چلے جانے والے کی مذمت کرتے تھے اور اس کا برعکس (یعنی کچھ ایسے تھے جو تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے تھے) تو ان تمام سے گناہ کو اٹھانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی جس نے جو طریقہ بھی کیا چاہے جلدی کی یا تاخیر کی کسی کے لئے بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔)

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے: مَنْ تَعَجَّلَ کا معنی ہے جس نے جلدی کی تحقیق اسے بخش دیا گیا اور جس نے تاخیر کی تحقیق اسے بھی بخش دیا گیا، اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''جس نے اس بیت اللہ شریف کا حج کیا اور اس نے رفث وفسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا۔''(1)

اور ارشاد باری ہے: فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ یہ بھی نفی عام ہے اور براءت مطلقہ ہے۔

اور مجاہد نے بھی کہا ہے: آیت کا معنی ہے جس نے جلدی کی یا جس نے تاخیر کی تو اس پر آنے والے سال تک کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس قول میں اثر کو بیان کیا گیا ہے۔

ابو العالیہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنی بقیہ عمر متقی بن کر رہا اور حج کرنے والے کے لئے یقینی مغفرت ہے، یعنی اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا۔

ابو صالح وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے ''اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جو شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا اور ہر اس شے سے جس سے اجتناب کرنا حج کے دوران اس پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی کہا: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنے حج میں بچتا رہا اور اسے مکمل ادا کر دیا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کے شبہ اور خیانت سے پاک تھا۔

**مسئلہ نمبر 21۔** قول باری تعالیٰ فَمَنْ تَعَجَّلَ میں، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ خبر ہے۔ اور قرآن کے علاوہ اسے فلا اثم علیہم پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ مَنْ جمع کے معنی کے لئے ہے، جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس:42) میں من جمع کے لئے ہے۔ اور وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں بھی اسی طرح ہے اور لِمَنِ اتَّقٰى میں لام غفران سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کلام اسی طرح ہے المغفرة لمن اتّقٰی یعنی مغفرت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ مغفرت اس کے لئے رکھی گئی ہے جو حج سے واپس لوٹنے کے بعد تمام گناہوں سے بچتا رہا۔

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ذلک لمن اتقی وہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کے لئے (مغفرت ہے) جو حالت احرام اور حرم میں شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہے الاباحة لمن اتقی اباحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

---

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولا فسوق ولا جدال فی الحج، حدیث نمبر 1691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ قول بھی ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے: السلامة لمن اتقی سلامتی اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وَاذْكُرُوا کے متعلق ہے۔ یعنی الذکر لمن اتقی یعنی نصیحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور سالم بن عبداللہ نے فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ میں تخفیفاً الف کو ملا کر پڑھا ہے۔ اور عرب اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

ان لم اقاتل فالبسوانی برقعا

اگر میں نے قتال نہ کیا تو تم مجھے برقعہ پہنا دینا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور حشر و وقوف کو یاد رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

''اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جن کی ہمتیں اور توانائیاں دنیا پر ہی محدود و محصور ہو گئیں (یعنی ان کی صلاحیتیں اور کوششیں فقط دنیا کے لیے ہی صرف ہوئیں) (یعنی) اس ارشاد گرامی میں فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا (بقرہ:200) اور ان مومنین کا ذکر کیا جنہوں نے دونوں جہان کی خیر اور منفعت کا سوال کیا، تو اب منافقین کا ذکر کیا، کیونکہ انہوں نے ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔

سدی وغیرہ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام ابی تھا اور اخنس اس کا لقب تھا۔ اس کا یہ لقب اس لئے تھا کیونکہ وہ غزوۂ بدر کے دن اپنے حلفاء میں سے بنی زہرہ کے تین سو افراد کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور لشکر کفار سے واپس چلا گیا تھا) جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران میں آئے گی۔ وہ انتہائی شیریں بیان اور حسین المنظر آدمی تھا۔ سو اس کے بعد وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اپنے قول میں سچا ہوں، پھر اس کے بعد بھاگ گیا۔ اس کا گزر مسلمانوں میں سے ایک قوم کی کھیتی کے پاس سے ہوا اور وہاں ساتھ گدھے بھی تھے، تو اس نے کھیتی کو جلا دیا اور گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اسی کے بارے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ (قلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی جو بہت نکتہ چین، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) اور وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ (ہمزہ) (اور ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے (پیٹھ پیچھے) عیب جوئی کرتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اخنس نے اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منافقین کی ایک قوم کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں باتیں کیں جو غزوۂ رجیع میں شہید کر دیے گئے یعنی حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب وغیرہ رضی اللہ عنہم، منافقین نے کہا: ان لوگوں پر افسوس ہے کہ نہ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی یہ اپنے صاحب (مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کا پیغام پہنچا سکے۔ پس یہ آیت منافقین کی صفات کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر غزوۂ رجیع میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ: 207) (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس (بندے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے باطن میں کفر، نفاق، کذب یا اضرار (کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا) چھپا ہو اور وہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتا ہو۔ پس یہ آیت عام ہے اور یہ اس حدیث سے مشابہت رکھتی ہے جو ترمذی میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک قوم ہوگی جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں ہوں گی اور ان کے دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔ وہ نرمی سے بھیڑوں کے چمڑے لوگوں کو پہنائیں گے اور وہ دین کے عوض دنیا خریدیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کیا وہ مجھے دھوکہ دیتے ہیں اور وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں؟ مجھے قسم ہے میں ضرور بضرور ان پر ایسا فتنہ مسلط کر دوں گا جو ان میں سے حلیم کو حیران وششدر کر چھوڑے گا (1)۔

ارشاد باری تعالیٰ وَيُشْهِدُ اللّٰهَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ جانتا ہے بلاشبہ میں حق کہہ رہا ہوں۔ ابن محیصن نے اسے وَيَشْهَدُ اللّٰهُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ یعنی یشهد میں یا اور ہا کو مفتوح اور لفظ اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے "اس کی بات تجھے پسند آئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے قول کے خلاف کو جانتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) (لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت وَاللّٰهُ يُشْهِدُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ اور جماعت کی قراءت مذمت میں زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر اچھا کلام لازم کرنے کی قوت رکھی اور پھر اس کے باطن سے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وَيَسْتَشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ پڑھا ہے۔ اور یہ جمہور کی قراءت کی دلیل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان امور کے بارے میں انتہائی احتیاط برتنے پر دلیل اور تنبیہ ہے جو دین اور دنیوی امور سے متعلق ہیں اور گواہوں اور قاضیوں کے احوال کے بارے میں طلب براءت پر دلیل ہے، بلاشبہ حاکم لوگوں کے ظاہر احوال پر اور جو کچھ ان کے ایمان اور مصالح میں سے ظاہر ہوا اس پر عمل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ان کے باطن کے بارے میں بحث کر لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے احوال بیان فرما دیے ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو بظاہر انتہائی خوبصورت اور حسین بات کرتے ہیں حالانکہ وہ نیت قبیح کرتے ہیں (یعنی ان کی نیت میں فتور اور برائی ہوتی ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

پس اگر کہا جائے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی اس کے معارض آتا ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، الحدیث۔(1)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اس کے خلاف ہے: ''پس میں اس کے لئے اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں سنتا ہوں'' (2)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح ابتدائے اسلام میں تھا، جہاں ان کا اسلام ہی ان کی سلامتی کا باعث تھا لیکن جب فساد عام ہو گیا تو پھر یہ حکم نہ رہا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح بات یہ ہے کہ ظاہر کے مطابق عمل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا خلاف ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: صحیح بخاری میں ہے: اے لوگو! بلاشبہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، بلاشبہ اب ہم تمہیں تمہارے ان اعمال سے پکڑیں گے جو ہمارے لئے ظاہر ہوں گے۔ پس جس نے ہمارے لئے خیر اور بھلائی کو ظاہر کیا تو ہم اسے امن عطا کریں گے اور ہم اسے قرب عطا کریں گے۔ اس کے اسرار اور پوشیدہ چیزوں میں سے کوئی شے ہمارے لئے (باعث تشویش) نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ چیزوں کے بارے میں اس کا محاسبہ فرمائے گا اور جس نے ہمارے لئے برائی کو ظاہر کیا، تو ہم نہ اسے امان دیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ کہے کہ اس کے دل اور ارادہ میں نیکی اور اچھائی ہے۔(3)

**مسئلہ نمبر 3**۔ ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ اس میں اَلَدُّ سے مراد سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: هو رجل أَلَدُّ وامرأة لَدَّاءُ (وہ سخت جھگڑالو مرد اور وہ سخت جھگڑالو عورت ہے۔) وهم اهل لَدَد اور وہ سخت جھگڑا کرنے والے ہیں۔ وَ قَدْ لَدِدْتَ اس میں دال مکسور ہے (تو نے جھگڑا کیا) تَلَدُّ یہ عین کلمہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ لَدَدًا (یعنی یہ باب سَمِعَ يَسْمَعُ ہے۔) یعنی تو سخت جھگڑالو ہو گیا۔ اور لددتُه أَلُدُّهُ یعنی پہلے میں دال مفتوح ہے اور دوسرے میں مرفوع ہے۔ یہ تب کہا جائے گا جب تو کسی سے جھگڑا کرے اور تو اس پر غالب آ جائے۔ اور الالدُّ یہ اللَّدِيدين سے مشتق ہے۔ اس سے مراد گردن کی دونوں سطحیں ہیں یعنی جھگڑا میں جس جانب سے بھی پکڑ لیا جائے غلبہ پا لیا جاتا ہے۔

شاعر کا قول ہے:

والدّ ذی حنق علیّ کأنما تغلی عداوة صدره فی مرجل

وہ بڑی شدت اور سختی کے ساتھ میرے گلے کو دبانے والا ہے، گویا کہ اس کے سینے کی عداوت ہنڈیا میں کھول رہی ہے۔

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

ان تحت التراب عزما و حزماً و خصیما ألدّ ذامغلاق

---

1۔ بخاری شریف، باب قتل من ابی قبول الفرائض الخ، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب اذا غصب جارية الخ، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ بخاری شریف، باب الشهداء العدول، حدیث نمبر 2447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں بھی خصیماالد سخت جھگڑالو کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت میں الخصام خاصم کا مصدر ہے۔ امام خلیل نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خَصْم کی جمع ہے۔ یہ قول زجاج کا ہے، جیسا کہ کلب کی جمع کلاب، صعب کی جمع صعاب اور ضخم کی جمع ضخام ہے۔ اور اس کا معنی ہے، جھگڑا کرنے والوں میں سے سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا، یعنی سخت جھگڑالو، جب وہ تجھ سے بات کرے اور تجھ پر بات دہرائے اور تو اس کے کلام کو خوبصورت اور حسین دیکھے درآنحالیکہ اس کے باطن میں باطل ہو۔ یہ (معنی) اس پر دلالت کرتا ہے کہ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہوتا مگر ایسے سبب سے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہو۔ اور صحیح مسلم (1) میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔''

## وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵

''اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا''۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا کے تحت کہا گیا ہے کہ تولیٰ اور سعی فعل قلب میں سے ہیں۔ پس تَوَلّٰى، ضَلَّ و غَضِبَ و انف فی نفسه کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی وہ گمراہ ہو گیا، غصے ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں اسے ناپسند کیا۔ اور سعی کا معنی ہے اس نے اپنے حیلہ اور ارادہ کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام پر مصائب لانے کی کوشش کی۔ یہ ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کے فعل ہیں۔ پس تَوَلّٰى بمعنی ادبر (پیٹھ پھیرنا) آتا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس نے پیٹھ پھیری اور وہ آپ سے چلا گیا اور سعی کا معنی ہے: اور وہ اپنے قدموں کے ساتھ چلا اور اس نے راستہ طے کیا اور اسے پامال کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے: دونوں کوششیں فساد ہیں۔ کہا جاتا ہے: سعی الرجل يسعى سعيا۔ یعنی آدمی نے دوڑ لگائی۔ اور اسی طرح جب وہ کام کرے اور کچھ کمائے تو یہ کہا جاتا ہے: فلان يسعى على عياله یعنی فلاں اپنے گھر والوں کے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ وَ يُهْلِكَ یہ لِيُفْسِدَ پر معطوف ہے۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَ لِيُهْلِكَ ہے۔ حسن اور قتادہ نے اسے و يُهْلِكُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کے رفع کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ اس کا عطف يُعْجِبُكَ پر ہے (اس لئے مرفوع ہے) اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سعی پر معطوف ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے ''وہ سر توڑ کوشش کرتا ہے اور

1۔ بخاری شریف، قول الله تعالى وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، حدیث نمبر 2277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تباہ کرتا ہے۔'' اور ابو اسحاق نے کہا ہے: یہ اصل عبارت وھو یُھلِكُ ہے یعنی وہ تباہ کرتا ہے۔ اور ابن کثیر سے ویُھلِكُ یعنی یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔

اور اَلحَرثُ وَالنَّسلُ، یُھلِكُ کے سبب دونوں مرفوع ہیں۔ اور یہی حسن، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ اور ابن محیصن کی قراءت ہے۔ اور عبدالوارث نے اسے ابو عمرو سے روایت کیا ہے۔

اور ایک قوم نے اسے ویَھلَكُ یعنی یا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الحرث کو رفع دیا ہے۔ اور لغوی طور پر ھَلَكَ یَھلَكُ یہ رَكَنَ یَرْكَنُ، أبی یأبی، سَلَی یسلی، قلی یقلی اور ان کے مشابہ افعال کی مثل ہے۔ اور آیت میں مراد اخنس کا کھیتی کو جلانا اور گدھوں کو قتل کرنا ہے۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مفسرین نے کہا: لیکن اب یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہوگئی ہے۔ پس جو بھی اس کے عمل کی طرح عمل کرے گا وہی اس لعنت اور سزا کا مستحق ہوگا۔

بعض علماء نے کہا ہے: بے شک جو گدھے کو قتل کرتا ہے یا اناج کے ڈھیر کو جلاتا ہے وہ مستوجب ملامت ہے اور یوم قیامت تک اسے یہ عیب لاحق رہے گا۔

مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ظالم زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے اور وہ کھیتی اور نسل (انسانی) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحرث (کھیتی) سے مراد عورتیں ہیں اور النسل سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کیونکہ نفاق متفرق اور متضاد گفتگو اور قتال کے وقوع تک پہنچاتا ہے اور اسی میں مخلوق کی ہلاکت ہے۔

زجاج نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ السعی فی الارض کا معنی ہے سرعت اور تیزی کے ساتھ چلنا۔ اور یہ لوگوں کے درمیان (فساد کی) انگیخت اور فتنہ برپا کرنے سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی جانب سے دی جانے والی سزا میں شامل کرلے''۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلحَرثَ وَالنَّسلَ لغۃً الحرث کا معنی شق کرنا اور پھاڑنا ہے۔ اور اسی سے المحراث ہے یعنی وہ آلہ (ہل) جس کے ساتھ زمین کو پھاڑا جاتا ہے۔ اور الحرث سے مراد مال کمانا اور اسے جمع کرنا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے۔ احرث لدنیاك كأنك تعيش ابداً تو اپنی دنیوی زندگی کے لئے مال کما اور جمع کر گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (یعنی ایسا نہ ہو کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے یا پھر حالات کی تلخیوں کے پیش نظر زندگی کی بازی ہار دے۔ واللہ اعلم۔

اور الحرث کا معنی کھیتی ہے اور الحراث کھیتی کاشت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تحقیق حرث و احترث یہ زرع اور ازدرع کی مثل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اُحرُثِ القرآن، ای اُدرُسہ یعنی قرآن پڑھانا۔ اور حَرَثْتُ النَّاقَۃَ و اَحرَثْتُھا، یعنی میں اس پر سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ کمزور ہوگئی۔ اور حرثت النار ای حرکتھا میں نے آگ کو حرکت دی اور المحراث اس

لکڑی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ تنور کی آگ کو ہلایا اور حرکت دی جاتی ہے۔ جوہری سے مروی ہے۔ کہ النسل سے مراد وہ اولاد ہے جو کسی بھی مؤنث سے پیدا ہو۔ اس کا اصل معنی الخروج (نکلنا) اور السقوط (گرنا) ہے۔ اور اسی سے ہے: نسل الشعر و ریش الطائر۔ یعنی بال اور پرندے کے پر گر گئے۔ اس سے مستقبل کا صیغہ یَنْسِلُ آتا ہے۔ اسی کے مطابق رب کریم کا ارشاد ہے: اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ (یٰسین) (اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے) اسی طرح یہ ارشاد بھی ہے: مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ (الانبیاء) (اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے)

اور امرؤ القیس کا قول ہے:

فسلی ثیابی من ثیابك تنسل

(پس تو میرے کپڑے اپنے کپڑوں سے نکال دے تو وہ نکل جائیں گے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت زمین میں ہل چلانے اور اس میں فصل کاشت کرنے پر دلالت کرتی ہے اور زمین میں درخت لگانے پر۔ یہ زراعت اور کھیتی باڑی پر ابھارنے کے لئے ہے اور طلب النسل سے مراد حیوانوں اور جانداروں کی نشوونما اور ان کا بڑھنا ہے اور اسی سے انسان کی قوت و طاقت مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے ترک اسباب کا قول کیا ہے۔ عنقریب اسی کتاب میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ عباس بن فضل نے کہا ہے کہ فساد کا معنی خرابی اور بربادی ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قطع الدراھم من الفساد فی الارض (اس نے زمین میں فساد اور خرابی کے سبب دراہم ختم کر دیے۔)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: ایک آدمی تھا جسے عطا بن منبہ کہا جاتا تھا۔ اس نے جبہ میں احرام باندھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے اتار دے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں نے حضرت عطا سے کہا: بے شک ہم تو سنتے تھے کہ وہ اسے پھاڑ دے، تو حضرت عطا نے کہا: ان اللہ لایحب الفساد۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے سبب ہر فساد اور بربادی کو شامل ہے، چاہے وہ زمین میں ہو یا مال میں یا دین میں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہی صحیح ہے (1)۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ کا معنی ہے وہ اسے اہل اصلاح (اصلاح کرنے والوں) سے پسند نہیں کرتا یا وہ اسے دین کے اعتبار سے پسند نہیں کرتا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کا حکم نہیں دیتا۔ واللہ اعلم

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

"اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو، تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر پس اس کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

یہ کافر اور منافق کی صفت ہے جو اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مومن کے لئے یہ ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ گناہ اسے ان میں سے کسی میں واقع کر دے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: کسی آدمی کے لئے بطور گناہ اتنا کافی ہے کہ اسے کوئی دوسرا بھائی کہے: ''تم اللہ سے ڈرو'' تو وہ آگے سے یہ کہہ دے: تجھ پر اپنے نفس کے بارے میں وہی لازم ہے جس کی نصیحت تو مجھے کر رہا ہے (1)۔

اور الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ یہ عزّہ یَعُزُّہٗ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اسی سے وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ۝ (ص) ہے، یعنی وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی حمیت ہے۔ اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

اخذتہ عزۃ من جھلہ فتولّی مغضبا فعل الضجر

اسے اس کی دور جاہلیت کی حمیت نے آلیا، پس اس نے حالت غضب میں تنگی اور نقصان کے فعل کا ارتکاب کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور شدت نفس ہے۔ یعنی اس نے اپنی ذات میں قوت و طاقت حاصل کی اور ادھر ہی جھک گیا، پس اسی قوت نے اسے گناہ میں واقع کر دیا جبکہ اس نے اسے آلیا اور گناہ کو اس پر لازم کر دیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب اسے کہا جائے رک جا، ٹھہر جا، تو وہ گناہ کا ارتکاب زیادہ کرتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ قوت و طاقت نے اسے گناہ پر ابھارا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: قوت و طاقت نے اسے ایسی شے سے پکڑ لیا جو اسے گناہ میں مبتلا کر دے گی۔ یعنی اس نے قوت و طاقت اور زمانہ جاہلیت کی حمیت کے سبب کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے۔ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۝ (ص) (لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِالْاِثْمِ میں با بمعنی لام ہے۔ یعنی عزت و حمیت نے اسے وعظ و نصیحت قبول کرنے سے پکڑ لیا، اس گناہ کے سبب جو اس کے دل میں تھا۔ اور وہ نفاق ہے۔ اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے جس میں وہ ناقہ کے پسینے کی صفت بیان کرتا ہے:

و كَاَنَّ رُبًّا او كُحَيلًا مُعْقَدًا حَشَّ الْوَقودُ به جوانبَ قُمْقُمِ

تو یہ بمعنی حش الوقود لہ ہے۔ یعنی با بمعنی لام ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی مع ہے۔ یعنی حمیت نے اسے گناہ کے ساتھ پکڑ لیا۔ پس با کا معنی تاویلات کے مطابق مختلف ہوتا رہتا ہے۔

یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کسی یہودی کا ہارون الرشید کے پاس کچھ کام تھا، وہ اس کے دروازے پر سال بھر آتا رہا لیکن وہ اپنا نہ کر سکا، پس ایک دن وہ دروازے پر کھڑا تھا، جب ہارون الرشید نکلا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

---

(1)۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو ہارون الرشید اپنی سواری سے نیچے اترا اور سجدے میں گر گیا، پس جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے کام کے بارے حکم دیا سودہ کر دیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اسے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! تو ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اترا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۝

حَسْبُهٗ کا معنی ہے کہ اسے بطور سزا اور عذاب جہنم کافی ہے۔ جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے کفاك ما حل بك تجھے وہی کافی ہے جو تجھے پیش آیا ہے۔ اور انت تستعظم و تُعظّم علیه ما حل تو عظمت طلب کرتا ہے اور تجھے اس پر عظمت دی جائے گی جو تجھے پیش آیا۔ اور المهاد، المهد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو سونے کے لئے تیار کی جائے۔ اور اسی سے مهد الصبی (بچے کا جھولا) بھی ہے۔ اور جہنم کو مہاد کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کفار کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لئے کہ ان کے لیے مہاد کے بدلے جہنم ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۝ (آل عمران) اور اسی کی مثل عرب کلام میں ان کا یہ قول ہے: تحية بينهم ضرب وجيع (ان کے درمیان تحیہ دردناک ضرب لگانا ہے۔)

## وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

اس آیت میں ابْتِغَآءَ مفعول لاجلہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ جب منافقین کی کارکردگی کا ذکر کیا، تو پھر بعد میں مومنین کی کارکردگی کا ذکر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا اور تعاقب کیا۔ تو وہ اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے اور ترکش میں موجود تمام تیر نکال لئے، اور اپنی قوس (تیر کمان) پکڑ لی اور فرمایا: تم جانتے ہو میں تم سے زیادہ تیر چلانے میں ماہر ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم! تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے سارے تیر پھینک دوں۔ بعد ازاں میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک اس کی کوئی شے میرے ہاتھ میں باقی رہی پھر اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تجھے نہیں چھوڑ سکتے کہ تم غنا اور خوشحالی کی حالت میں ہم سے چلے جاؤ حالانکہ تم ہمارے پاس محتاج بن کر افلاس کی حالت میں آئے تھے۔ لیکن اگر تم مکہ مکرمہ میں موجود اپنے مال پر ہماری راہنمائی کرو تو ہم تمہارا راستہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے اسی (مال کی) شرط پر آپ سے معاہدہ کیا، تو آپ نے اسے پورا کر دیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے ابو یحییٰ! نفع بخش سودا کیا ہے اور ان پر یہ (مذکورہ) آیت تلاوت فرمائی۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ نے اسے بیان کیا ہے(1)۔

اور مفسرین نے کہا ہے: مشرکین نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کو بہت ستایا اور اذیت دی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں کوئی نقصان اور ضرر نہ پہنچے گا، میں تمہارے ساتھ رہوں یا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے (یہ بہتر نہیں) کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے اور میرے دین کو چھوڑ دو؟ تو انہوں نے اس طرح کر لیا اور آپ نے ان پر سواری اور نفقہ کی شرط لگائی تھی (یعنی میں سواری اور اپنے روزمرہ اخراجات کے لئے مناسب اپنے مال سے لے لوں گا) پس وہ مدینہ طیبہ کی طرف نکل پڑے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور کچھ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے ملے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابویحییٰ تیری بیع نفع بخش ہوئی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''آپ کی بیع میں تو کبھی خسارہ نہیں ہوتا، سو یہ کیسی کلام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں اس طرح (آیت) نازل فرمائی ہے، پھر آپ نے ان پر یہ آیت پڑھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ یہ ایک مسلمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ایک کافر سے ملا اور اسے کہا: تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، پس جب تو نے اسے کہہ لیا، تو تو نے اپنے مال اور اپنی جان کو بچا لیا، لیکن اس نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کر دیا، تو مسلمان نے اسے کہا: قسم بخدا! میں ضرور بضرور اپنی جان اللہ تعالیٰ کے لئے بیچ دوں گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ قتال کرنے لگا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے نیکی کا حکم دیا اور منکر سے روکا۔ اسی کے مطابق حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تاویل کی ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ دو آدمی باہم ایک دوسرے سے لڑے۔ یعنی **مغیر** (تبدیلی لانے والے) نے **مفسد** (فساد برپا کرنے والے) کو کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ مفسد نے انکار کر دیا اور اسے حمیت نے آلیا تو مغیر نے اپنی جان اللہ تعالیٰ سے بیچ ڈالی اور اس کے ساتھ لڑنے لگا، پس دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔

اور ابوخلیل نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کسی انسان کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ وہ آدمی اٹھا اور نیکی کا حکم دینے لگا اور برائی سے منع کرنے لگا اور خود شہید ہو گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ دو آدمیوں نے قاری کی اس آیت کی قراءت کے وقت ایک دوسرے کو قتل کر دیا، پس آپ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے اس کی یہی تفسیر بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابن عباس! تیرا مال اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ میں گھس جاتا ہے، ہشام بن عامر قسطنطنیہ میں لشکر میں داخل ہوئے اور خوب قتال کیا، یہاں تک کہ شہید کر دیے گئے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ مِنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 591

النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور حضرت ابوایوب سے بھی اسی طرح مروی ہے(1)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت غزوۂ رجیع کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: وہ مہاجرین وانصار ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس رات (ہجرت کی رات) اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار (ثور) کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ براءت میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر جہاد کرنے والے کو شامل ہے یا اپنی ذات کے بارے شہادت کی تمنا کرنے والے کو یا برائی کو تبدیل کرنے والے کو۔ اور اس کا حکم پہلے آچکا ہے جو لشکر پر حملہ آور ہو اور منکر کو تبدیل کرنے والے کا، اس کی شرائط اور اس کے احکام کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

اور یَشْرِیْ کا معنی یبیع (بیچ ڈالنا) ہے۔ اسی معنی میں یہ ارشاد بھی ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ (یوسف: 20) یعنی انہوں نے آپ کو کھوٹے ثمن کے عوض بیچ ڈالا۔ اور اس کا اصل معنی الاستبدال (بدلہ میں لینا) ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہے ایمانداروں سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وان کان ریب الدھر امضاك فی الألی شَرَوْا ھذہ الدنیا بجناته الخلد

اور ایک دوسرے شاعر کا قول:

و شریت بُرداً لیتنی من بعد بُرْدٍ کنتُ ھَامَهْ

یہاں برد غلام کا نام ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

یعطی بھا ثمنا فیمنعھا و یقول صاحبھا ألا فاشرِ

یہاں بیع النفس سے مراد اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر (کی اطاعت) کے لئے خرچ کرنا ہے۔ اور ابتغاء مفعول من أجلہ ہے۔ کسائی نے مرضات تاء پر وقف کیا ہے، اور باقیوں نے ہاء کے ساتھ وقف کیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: کسائی نے تا کے ساتھ یا تو ان کی لغت پر وقف کیا ہے جو کہتے ہیں طلحت اور علقمت۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بل جوزِ تَیْھاء کظھر الحَجَفَت

یا پھر اس لئے کہ جب ہی مضاف الیہ کلمہ کے ضمن میں ہے تو پھر تا کو ثابت رکھنا ضروری ہے جیسا کہ وہ حالت وصل میں ثابت رہتی ہے، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مضاف الیہ مراد ہے(2)۔ اور مرضاۃ سے مراد رضا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَضِیَ یَرْضَی

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 593

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

رِضاً و مَرْضَاةً۔

ایک قوم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہا جائے: شَرٰی بمعنی اشتریٰ ہے اور اس صورت میں آیت کو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف پھیرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنے مال کے عوض خریدا تھا، نہ کہ اسے بیچا تھا، مگر یہ کہا جا سکتا ہے: بلاشبہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہوجانا یا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بیچنا ہے۔ پس لفظ باع (بیچنے) کے معنی پر ہی صحیح اور درست ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے مومن، کافر اور منافق ہونے کے بارے میں بیان کر چکا تو فرمایا: تم ایک دین پر ہو جاؤ اور اسلام پر جمع ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں السِّلْمِ بمعنی اسلام ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے، اور اسے ابو مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق کندی شاعر کا قول بھی ہے:

دعوت عشیرتی للسلم لمّا　رأیتهم تولّوا مُدبرینا

میں نے اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دی جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ پیٹھیں پھیر کر واپس چلے گئے۔

یعنی میں نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جبکہ اہل کندہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ مرتد ہو گئے، کیونکہ مومنین کو کبھی بھی مسالمہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا گیا اور مسالمہ سے مراد صلح ہے۔ اور بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا گیا کہ آپ صلح کے لئے مائل ہوں جبکہ وہ اس کی طرف مائل ہوں۔ اور رہا یہ کہ آپ صلح کی ابتدا کریں تو اس طرح نہیں۔ یہ قول علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا ہے جو اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں۔ طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ تم امر دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تم نیکی کی تمام اقسام میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ السِّلم پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ السِّلم اور السَّلم دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور اسی طرح یہ اکثر بصریوں کے نزدیک بھی ہے۔ اور یہ دونوں لفظ اکٹھے اسلام اور صلح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ابو عمرو بن العلاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور یہاں اسے ادخلوا فی السِّلم پڑھا ہے اور کہا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ اور وہ لفظ جو سورۃ انفال اور سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ہے۔ اسے السَّلم سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فرمایا: فتحہ کے ساتھ اس کا معنی مسالمہ (صلح) ہے۔

اور مبرد نے اس تفریق کا انکار کیا ہے اور عاصم جحدری نے کہا ہے کہ السِّلْم کا معنی اسلام، السَّلْم کا معنی صلح اور السَّلَم کا معنی الاستسلام (تابعدار ہونا) ہے۔ محمد بن یزید نے ان تفریقات (الگ الگ تعبیروں) کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: لغت اس طرح نہیں لی جاتی بلکہ یہ تو سماع کے ساتھ لی جاتی ہے نہ کہ قیاس کے ساتھ۔ اور جس نے (معانی میں) تفریق کی اسے دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور بصریوں نے بیان کیا ہے: بنوفلان سِلْمٌ و سَلْمٌ و سَلَمٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: السِّلْم کا معنی صلح ہے چاہے فتحہ کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ اور مذکر ہو یا مؤنث۔ اور اس کا اصل معنی الاستسلام اور الانقیاد (تابعداری کرنا) سے لیا گیا ہے۔ اسی لئے صلح کے لئے سَلْم کہا گیا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

وقد قلتما اِنْ نُدرِكِ السِّلم واسعًا　　بمالٍ و معروفٍ من الأمر نَسْلَم

تحقیق تم دونوں نے کہا: اگر ہم نے صلح کو مال اور امر بالمعروف کے بدلے زیادہ نفع بخش پالیا تو ہم صلح کرلیں گے۔

علامہ طبری نے اس کلمہ کو اسلام کے معنی پر محمول کرنے کو ترجیح دی ہے اس وضاحت کے مطابق جو پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے: اسلام کے آٹھ حصص ہیں، ایک حصہ نماز ہے، ایک حصہ زکوٰۃ ہے، ایک حصہ روزہ ہے، ایک حصہ حج ہے، ایک حصہ عمرہ ہے، ایک حصہ جہاد ہے، ایک حصہ امر بالمعروف ہے اور ایک حصہ نہی عن المنکر ہے۔ تحقیق وہ خائب و خاسر ہوا جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے! حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ! تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لاکر مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ (1)۔

اور صحیح مسلم میں ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں نہ سنے پھر وہ مرجائے اور وہ اس دین پر ایمان نہ لائے جس کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا گیا تو وہ اصحاب نار میں سے ہوگا۔''

**كَآفَّةً** کا معنی ہے مکمل طور پر، ترکیب کلام میں یہ السِّلْمِ سے یا مومنین کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ ان کے اس قول سے مشتق ہے: کففت ای منعت، یعنی تم میں سے کوئی بھی اسلام میں داخل ہونے سے باز نہ رہے۔ اور الکف کا معنی ہے المنع (روکنا) اور اسی سے كُفَّةُ القميص ہے (کرتے کے دامن کے اردگرد کی گوٹ) کیونکہ یہ کپڑے کو پھیلنے اور منتشر ہونے سے روکتی ہے۔ اور اسی سے كِفَّةُ المِيزَانِ ہے (ترازو کا پلڑا) جو کہ موزون کو جمع رکھتا ہے اور اسے بکھرنے سے روکتا ہے، اور اسی سے کف الانسان ہے (انسان کی ہتھیلی) جو کہ اس کے منافع اور نقصانات کو جمع کرتی ہے۔ اور ہر گول شے كِفَّة کہلاتی ہے، اور ہر لمبی شے كُفَّة کہلاتی ہے۔ اور آدمی مكفوف البصر ہے یعنی اسے دیکھنے سے روک دیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

گیا ہے۔ اور جماعۃ کو کافۃ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ متفرق اور تقسیم ہونے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ فعل نہی ہے اور خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یہ مفعول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضرت مقاتل نے کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے نماز میں تورات پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ نیز یہ کہ وہ ان بعض احکام پر عمل کریں گے جو تورات میں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ کیونکہ بلاشبہ سنت کی اتباع کرنا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے بہتر اور اولیٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس کا معنی ہے) تم اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف تمہیں شیطان دعوت دیتا ہے کیونکہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بلاشبہ تمہارے لئے اس کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

''اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آچکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ زَلَلْتُمْ کا معنی ہے اگر تم صراط مستقیم سے دور ہٹنے لگو۔ دراصل زلل یعنی پھسلاہٹ قدم میں ہوتی ہے، بعد ازاں یہ لفظ اعتقادات، آراء اور دیگر چیزوں میں (سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے لئے) استعمال کیا جانے لگا ہے۔

کہا جاتا ہے: زَلَّ یَزِلُّ زَلًّا و زَلَلًا وَ زُلُوْلًا، یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ابو السمال العدوی نے زَلِلْتُم لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حرف کی اصل الزلق سے ہے اور معنی ہے: ''تم حق سے بھٹک گئے اور بہک گئے۔''

ارشاد خداوندی مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ میں الْبَیِّنٰتُ سے مراد معجزات اور آیات قرآن ہیں۔ اگر آیت میں خطاب مومنین کو ہے اور اگر خطاب اہل کتاب کو ہے تو پھر بینات سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اور آپ کے بارے وہ علامات ہیں جو ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں۔

آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ گناہ کے بارے جاننے والے کی سزا اس کی سزا کی نسبت بہت زیادہ اور شدید ہوگی جو اس سے ناواقف اور جاہل ہو اور جس تک دعوت اسلام نہ پہنچی وہ احکام شرع کو ترک کرنے کے سبب کافر نہ ہوگا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو وہ قرآن کریم پڑھ رہے تھے، تو انہیں جو قرآن پڑھا رہا تھا۔ اس نے پڑھایا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو حضرت کعب نے کہا: بلاشبہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اس طرح ہو، پھر ان دونوں کے پاس سے ایک آدمی گزرا، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم یہ آیت کس طرح پڑھتے ہو؟ تو اس آدمی نے کہا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (بقرہ) تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اسی طرح ہونا چاہئے (1)۔ اور عَزِیْزٌ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

کا معنی ہے (وہ زبردست ہے) یعنی جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے اس سے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور حَكِيْمٌ کا مفہوم ہے کہ وہ جو فعل بھی کرتا ہے اس میں حکمت کارفرما ہوتی ہے (اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس الله کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔ اور (آخرکار) الله کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔"

ارشاد باری تعالیٰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی اسلام میں داخل نہ ہونے والے، اور هَلْ یہاں اس سے مراد انکار ہے۔ یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ، نظرته اور انتظرته ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور النظر اور الانتظار بھی ہم معنی ہیں۔

حضرت قتادہ، ابوجعفر یزید بن قعقاع اور ضحاک نے فِي ظِلالٍ من الغمام پڑھا ہے۔ اور ابوجعفر نے والملائكة کو الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر عبارت ہے مع الملائكة یعنی ملائکہ کے ساتھ۔ عرب کہتے ہیں: أقبل الأمير في العسكر۔ امیر آیا لشکر کے ساتھ۔ یعنی اس میں فی بمعنی مع ہے۔ ظُلَلٍ یہ ظُلّة کی جمع مکسر ہے، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع ظلم ہے اور اس کی جمع سالم ظُلُلات ہے۔

سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

اذا الوحش ضَمَّ الوحشَ فی ظُلُلَاتِها	سَواقِطُ من حَرٍّ و قد كان اَظهَرَا

اس میں ظُلُلات ظُلّۃ کی جمع سالم ذکر کی گئی ہے۔

اور ظُلّات اور ظلال یہ ظل کی جمع کثرت ہے اور اس کی جمع قلت اظلال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ظِلال ظُلة کی جمع ہے جیسا کہ قُلّۃ کی جمع قِلال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

ممزوجةٌ بماء القِلال	(گھڑوں کے پانی میں ملائی گئی ہے)

اخفش سعید نے کہا ہے کہ والملائكةِ مجرور ہے۔ یہ وفی الملائكة کے معنی میں ہے۔ فرمایا: اس میں رفع عمدہ ہے، جیسا کہ ان آیات میں ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانعام: 158) اور وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (الفجر)

فراء نے کہا ہے: حضرت عبدالله رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَ الْمَلَائِكَةُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ملائکہ ان کے پاس ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن (وہ آئیں گے) اور یہی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ ملائکہ ان کے پاس چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں آئیں گے اور الله تعالیٰ ان کے

پاس آئے گا جس حالت میں چاہے گا۔

اور زجاج نے کہا ہے: تقدیر کلام اس طرح ہے فی ظلل من الغمام و من الملائکۃ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حق میں کلام اپنے ظاہر پر نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم ان کے پاس آ جائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و عذاب میں سے جس کا ان کے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے اس کے ساتھ چھائے ہوئے بادلوں میں ان کے پاس آ جائے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا (الحشر: 2) (پس آیا ان پر اللہ (کا قہر) اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا۔) یعنی اللہ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور پہلا اخفش سعید کا قول ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ الاتیان (یعنی آنے) کا معنی راجعًا الی الجزاء (جزا کی طرف رجوع کرتے ہوئے) ہو۔ اور جزا کو اسی طرح اتیان کا نام دیا گیا ہو جیسا کہ نمرود کے قصہ میں تخویف اور تعذیب کو اتیان کا نام دیا گیا ہے اور فرمایا ہے: فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26)

(پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی۔ پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اور بنی نضیر کے قصہ میں فرمایا: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (الحشر: 2)

اور اسی طرح فرمایا: وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا (الانبیاء: 47)

(اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔)

بلا شبہ اتیان ان معانی کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اہل لغت کے نزدیک اتیان کا اصل معنی ''کسی شے کی طرف قصد کرنا'' ہے۔ پس آیت کا معنی یہ ہے: کیا وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزا اور بدلہ دینے کے ارادہ سے اپنی مخلوق میں سے کسی مخلوق کے ساتھ افعال میں سے کوئی فعل ظاہر فرمائے اور ان کے امور کے بارے میں فیصلہ فرمائے جو وہ فیصلہ فرما دے؟

اور جس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کوئی فعل کیا اور اسے نزول اور استوا کا نام دیا۔ اسی طرح وہ کوئی فعل کرتا ہے اور اسے اتیان کا نام دیتا ہے اور اس کے افعال بغیر آلہ اور علت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ ان پوشیدہ اور مخفی چیزوں میں سے ہے جس کی تفسیر بیان نہیں کی جا سکتی۔ بعض ان کی تاویل سے خاموش رہے ہیں اور بعض نے تاویل کی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فا بمعنی با ہے یعنی یاتیهم بظلل (یعنی وہ ان کے پاس آئے چھائے ہوئے بادلوں کے ساتھ) اور اسی کے مطابق حدیث طیبہ ہے: یَاتِیْهِمُ اللّٰهُ فی صورة ای بصورة امتحانًا لَهُمْ (1) (اللہ تعالیٰ ان کے پاس آئے گا ایک صورت میں، یعنی ایک صورت کے ساتھ ان کا امتحان لینے کے لئے)۔

یہ جائز نہیں کہ اسے اور جو کچھ اس کے مشابہ قرآن و حدیث میں مذکور ہے اسے وجہ انتقال، حرکت اور زوال پر محمول کیا جائے، کیونکہ یہ اجرام و اجسام کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ وہ ذوالجلال

1۔ بخاری شریف، باب الصراط جسر جہنم، حدیث نمبر 6088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والاکرام ہے اور اجسام کی مماثلت سے بلند و بالا اور برتر ہے۔

**الْغَمَامِ** اس سے مراد ہے سفید باریک بادل، اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**قُضِیَ الْاَمْرُ** کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وَ قَضَاءُ الْاَمْرِ پڑھا ہے۔ اور یحییٰ بن یعمر نے وَ قُضِیَ الْاُمُوْرُ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے وَ قُضِیَ الْاَمْرُ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جزا واقع ہو اور گناہ کرنے والوں کو عذاب دیا جائے۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے **تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ** صیغہ معروف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی دلیل اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (الشوریٰ) اور اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ (المائدہ: 48) ہے۔ اور باقیوں نے تُرْجَعُ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور یہ بھی قرأۃ حسنہ ہے۔ اور اس کی دلیل ثُمَّ تُرَدُّوْنَ (التوبہ: 94) اور ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ (الانعام: 62) اور وَّ لَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (الکہف: 36) ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔ دونوں قراءتیں معنی کے اعتبار سے حسن اور اچھی ہیں لیکن اصل پہلی قرأت ہے۔ اور اسے مجہول پڑھنے میں توسع ہے اور یہ فرع ہے۔ اور تمام کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹیں گے، پہلے بھی اور بعد والے بھی۔ اور قیامت کے دن میں اس کے ذکر کے سبب اس پر تنبیہ اور آگاہ کرنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ملوک کے پاس ہے وہ زوال پذیر ہے۔

سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

''آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ: **سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ** اس میں سَلْ السوأل سے ماخوذ ہے۔ تخفیف ہمزہ کے تحت ہمزہ کی حرکت سین کو دے کر اسے حذف کر دیا، اور جب سین متحرک ہوگئی تو پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی (یعنی سل دراصل اسئل تھا۔ تخفیف ہمزہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت یہ سل ہوگیا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام عرب میں سَلْ میں ہمزہ وصل کے ساقط ہونے اور اِسْئَلْ میں اس کے ثابت رہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک میں ہمزے کو حذف کرنا اور دوسرے میں اسے ثابت رکھنا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ دونوں مذکور ہیں۔ پس تو ہمزے کو ثابت رکھنے اور اسے گرانے میں خط مصحف کی اتباع کر۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے کلام کے اختلاف کے ساتھ اسے ثابت رکھنا اور اسے ساقط کرنا بھی مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا ابتدائے کلام میں ہمزہ حذف ہو جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ** اور **سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ** ﴿﴾ (القلم) اور حالت عطف (مراد درمیان کلام) میں ثابت رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف:82) اور وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:32) علی بن عیسیٰ نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عمرو نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اِسْأَل اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور ایک قوم نے اِسَلْ ہمزہ کی حرکت کو سین کی طرف نقل کر کے اور ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے کہا ہے اَلاحمر اور کَمْ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اٰتَیْنٰهُمْ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے کم آتَیْنَا آتَیْنَاھم اور فعل کو اس سے مقدم لانا جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے صدر کلام ضروری ہے۔ اور مِّنْ اٰیَةٍۭ تقدیر اول کے مطابق تمیز ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر ثانی کی بنا پر یہ اٰتَیْنٰهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کَمْ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو، اور اس کی خبر اٰتَیْنٰهُمْ ہو۔ اس میں کَمْ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہوگی اور تقدیر کلام یہ ہوگی کم آتیناھموہ اور یہ (یعنی کم) معرب نہیں، بلکہ یہ اسم ہے کیونکہ یہ حروف کے قائم مقام ہے جب کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جائیں۔

اور جب تو فرق کرنے لگے کم اور اسم کے درمیان، تو اختیار ہے کہ تو اسے مِنْ کے ساتھ لائے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اگر تو اسے (من کو) حذف کرے تو پھر تو اسے نصب دے، چاہے کم استفہامیہ ہو یا کم خبریہ۔ اور خبریہ کی صورت میں جر بھی جائز ہوتی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کم بِجودِ مُقْرِفٌ نَال العُلَا و کریم بُخلُه قد وَضَعه

اس میں کم خبریہ کی تمیز حرف جر با کے سبب مجرور ہے۔

اور آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان کے پاس کتنی آیات وعلامات آئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہچان کراتی ہیں اور آپ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت مجاہد اور حسن وغیرہما نے کہا ہے: یعنی وہ آیات و معجزات جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جیسا سمندر کا پھٹ جانا (اور اس میں راستوں کا بن جانا) بادلوں کا سایہ، عصا مبارک اور ید موسیٰ وغیر ذلک۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو ان کے سوال کے بارے حکم ارشاد فرمایا یہ زجر و توبیخ کی بنا پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ یہ لفظ عام ہے جو تمام عوام کو شامل ہے، اگرچہ اس کا مشار الیہ بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے تبدیل کیا جو ان کی کتابوں میں تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو تھا اس کا انکار کیا۔ لیکن لفظ کا اطلاق تو اس پر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا: یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے اور یہ پہلے (معنی) کے زیادہ قریب ہے اور لفظ میں کفار قریش بھی داخل ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر بطور احسان و نعمت ان میں مبعوث فرمائے گئے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قبولیت اور اس پر شکر کرنے کو کفر کے ساتھ بدل دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ یہ جملہ خبریہ ہے جو کہ وعید کو متضمن ہے۔ اور الْعِقَاب عِقب سے ماخوذ ہے۔ گویا کہ تعاقب کرنے والا بدلہ اور جزا دینے کے لئے اس کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ اسی سے عُقبة الراکب (وہ جگہ جہاں

سے سوار ہوا جاتا ہے) اور عقبة القِدر (شوربے کا باقی حصہ جو ہانڈی والے کے لئے چھوڑا جائے) عقاب اور عقوبة دونوں گناہ کے بعد ہوتی ہیں۔ وقد عاقبه بذنبه "تحقیق اس نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی۔"

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

"آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے"۔

ارشاد باری تعالیٰ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا میں الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مفعول ما لم يُسَمّ فاعله ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اس سے مراد سرداران قریش ہیں (زُيِّنَ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے)۔ مجاہد اور حمید بن قیس نے فعل کو معروف یعنی علی بناء الفاعل پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت سے شاذ ہے، کیونکہ فاعل کا پہلے ذکر موجود نہیں۔ ابن ابی عبلہ نے زُيِّنَتْ یعنی علامت تانیث کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کیونکہ تانیث غیر حقیقی ہے۔

اور مزین کرنے والا ہی اس کا خالق اور اس کا موجد ہے اور وہی خالق الکفر بھی ہے اور اسے شیطان بھی اپنے وسوسہ اور اپنے دھوکہ کے ساتھ آراستہ کرتا ہے۔ اور یہاں خاص طور پر کافروں کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ انہوں نے تزیین (زیب و آرائش) کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اسی سبب سے انہوں نے آخرت سے اعراض کر لیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے زینت بنا دیا ہے تاکہ وہ مخلوق کو آزمائے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ حسین کون ہے؟

اور مومن وہ ہیں جو شریعت کے طریقوں پر گامزن ہیں زینت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں۔ اور رہے کفار تو زینت ان کی مالک بن جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے سوا کسی کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب مال لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اے اللہ! بلاشبہ ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ہم اس سے خوش ہوں جسے تو نے ہمارے لئے زینت بنایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ کفار قریش کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ دنیوی اعتبار سے اپنی حالت کو عظیم قرار دیتے ہیں اور وہ اس پر رشک اور اظہار مسرت کرتے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ اہل ایمان کے آخرت کو طلب کرنے کے سبب ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبب مذاق ان کا فقر اور ان کی تنگدستی تھی (یعنی ان کے فقر و فاقہ کی وجہ سے کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے۔) جب کہ حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور انہیں کی مثل دیگر جانثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کے قبیح اور برا ہونے کے سبب ان کے رتبہ اور درجہ کی پستی پر آگاہ کیا اور فرمایا: وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہوگا۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھایا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا (یعنی بندۂ مومن سے اپنے قول کی معذرت کرلے اور معافی مانگ لے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن کی عظمت اور عزت و اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا معنی یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے۔ کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو۔ اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے (یعنی پرہیزگار لوگ بلند مکان یعنی جنت میں ہوں گے۔)

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فضیلت اس پر ہو جو کچھ کافران کے بارے میں گمان کررہے ہیں (یعنی قطعاً ایسا نہ ہوگا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہوگی۔)

کیونکہ کفار تو کہتے ہیں: اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اسی معنی میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ جو واقعہ انہیں عاص بن وائل کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا تاکہ اس سے قرض کا مطالبہ کروں، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے ہرگز قرض ادا نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کرے۔ میں نے اسے جواب دیا: بلاشبہ میں ہرگز ان سے کفر اختیار نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو مرجائے اور پھر تجھے اٹھایا جائے۔ تو اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟ تو پھر میں تجھے قرض ادا کردوں گا جب میں مال و اولاد کی طرف لوٹ کر گیا۔ الحدیث۔ عنقریب یہ مکمل حدیث بھی آئے گی۔ (1)

اور کہا جاتا ہے: سخِرت منه و سخرت به، ضحكت منه و ضحكت به، و هزئت منه و به۔ یہ سب الفاظ ایک معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے اور اسم السخرية، والسُّخرِيُّ اور السِخرِيُّ ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: 32) اور فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا (المومنون: 110)

اور رجل سُخْرَةٌ (کا معنی ہے) وہ آدمی جس سے تمسخر کیا جاتا ہو۔ اور اگر یہی لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ ہو یعنی رجل سُخَرَةٌ۔ تو مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں سے تمسخر کرتا ہو۔ اور فلان سخرة فلاں کام میں تمسخر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خادمه سُخْرَة

1۔ بخاری شریف، باب ذکر القین والحداد، حدیث نمبر 1949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسخرہ تسخیرا، یعنی فلاں نے اسے بغیر اجرت کے کام کا مکلف اور پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ضحاک نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بغیر کسی تاوان کے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کمزور لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ پس یہ آیت متنبہ کر رہی ہے کہ ان پر عظیم انعام ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کو بغیر حساب قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ دائمی ہے اور لا متناہی ہے، پس وہ شمار نہیں ہوسکتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی صفت ہے۔ وہ کیسے تصرف کرتا ہے، جبکہ اس کی قدرت اتنی عظیم ہے تو وہ کسی حد و شمار کے ساتھ خرچ نہیں کرتا۔ پس اس کا سارے کا سارا فضل ہی بغیر حساب ہے۔ اور وہ جو حساب کے ساتھ ہے وہ آدمی کے اس عمل کے مطابق ہے جو آدمی نے آگے بھیجا ہوگا (یعنی ہر عمل کی جزا تو اس کے مطابق ہوگی مگر اس کا فضل اور عطا بلا حساب ہوگی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (النبا) (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام) اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جنہیں عطا کیا جاتا ہے (یعنی مرزوقین) وہ ان کے وہم و گمان کے بغیر ہو۔ جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: 3) (اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہوگیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کردے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد ازاں کہ آگئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا، پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔

ارشاد باری تعالیٰ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا معنی ہے سب لوگ ایک دین پر تھے۔

حضرت ابی بن کعب اور ابن زید نے کہا ہے کہ النَّاسُ سے مراد بنی آدم (اولاد آدم) ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: النَّاسُ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں، (پھر اس پر یہ سوال ہوتا ہے) کہ واحد کو لفظ جمع کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ اس لئے) کیونکہ آپ ہی ساری نسل کی اصل اور بنیاد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد حضرت آدم اور حضرت مائی حوا علیہما السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں (ان میں) وہ لوگ حق پر تھے یہاں تک کہ ان میں اختلاف ہو گیا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والوں کو مبعوث فرمایا(1)۔

اور ابن ابی خیثمہ نے کہا ہے: جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اس وقت سے لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک پانچ ہزار آٹھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین بارہ سو برس کی مدت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے اور آپ کے زمانے میں لوگ ایک ہی دین پر تھے، وہ دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور ملائکہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور وہ اسی حال پر رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام (آسمانوں پر) اٹھا لئے گئے۔ پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں۔ کلبی اور واقدی وغیرہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی میں سوار ہونے والے لوگ ہیں، وہ مسلمان تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کفر پر ایک امت تھے اور اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کا وہ زمانہ ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔

اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تمام لوگ ایک امت تھے اور وہ تمام کے تمام کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت دور جاہلیت میں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

پس ان اقوال کی بنا پر کَانَ اپنے باب پر ہے یعنی زمانہ ماضی کے لئے جو کہ گزر چکا ہے اور وہ تمام جنہوں نے آیت میں النَّاسُ سے مراد مومنین لئے ہیں، انہوں نے کلام میں **فاختلفوا فبعث** مقدر مانا ہے۔ اور اس حذف پر دلیل یہ بیان کی ہے: وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ یعنی تمام لوگ دین حق پر تھے، پھر ان میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات مبعوث فرمائے، جو انہیں بشارت دینے والے ہیں جنہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی اور انہیں ڈرانے والے ہیں جنہوں نے نافرمانی کی۔ اور جنہوں نے النَّاسُ سے مراد کفار لئے ہیں، تو پھر انہیں کی طرف انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 285

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ كَانَ ثبوت کے لئے ہو (یعنی تامہ ہو) اور مراد ان لوگوں کے بارے خبر دینا ہو جو تمام کے تمام ایک جنس ہیں کہ وہ شرائع سے خالی ہونے میں اور حقائق سے جاہل اور ناواقف ہونے میں ایک امت ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ان پر احسان نہ فرماتا اور ان کی طرف اپنے رسول بھیج کر ان پر مہربانی نہ فرماتا۔ پس اس تاویل پر كَانَ صرف ماضی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا معنی وہی ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء) اور اُمَّةً کا لفظ ان (عربوں) کے اس قول سے ماخوذ ہے: أممت کذا یعنی میں نے اس کا قصد کیا۔ پس امّة واحدة کا معنی یہ ہوا کہ ان کا مقصد ایک تھا۔ اور واحد کے لئے امة بولا جاتا ہے یعنی مقصده غیر مقصد الناس اس کا مقصد لوگوں کے مقصد کے سوا ہے۔ اسی کے مطابق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت قس بن ساعدہ کے بارے میں ارشاد گرامی بھی ہے يُحْشَرُ يوم القيامة امّة واحدة (قیامت کے دن اسے ایک امت (مقصد) پر اٹھایا جائے گا اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل کے بارے فرمایا والامة القامة (سیدھا اور صحیح مقصد) گویا کہ تمام بدن کا مقصد یہی ہے۔

اور الامة اگر کسرہ کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی نعمت ہے کیونکہ لوگ اسی (نعمت) کا ہی قصد کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ہے کیونکہ لوگ اسی کو کرنے کا قصد کرتے ہیں جو وہ کرتا ہے۔ نحاس سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کان البشر امة واحدة پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کان الناس امة واحدة فاختلفوا فبعث قراءت کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں اور قرآن کریم میں جن کے اسمائے گرامی مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں۔ اور سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے، اسے آجری اور ابو حاتم البستی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شفاعت کے مطابق اول الرسل حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ لوگ انہیں کہیں گے انت اوّل الرسل آپ پہلے رسول ہیں (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے رسول حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد باری تعالیٰ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد اسم جنس بمعنی کتب ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: الْكِتٰبَ پر الف لام عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد تورات ہے۔ اور لِيَحْكُمَ جمہور کے قول کے مطابق الْكِتٰبَ کی طرف مسند ہے، اور یہ اَنْ مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یعنی لِاَنْ يَحْكُمَ اور یہ نسبت مجازی ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: 29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ) اور

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ، حدیث نمبر 3092، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
بخاری شریف، باب قول اللہ وعلم آدم الاسماء کلھا، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ ہر نبی اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔ اور جب اس نے کتاب کے مطابق فیصلہ کیا تو گویا کتاب نے ہی فیصلہ کیا۔

عاصم جحدری کی قراءت میں لِیُحْکَمَ بَیْنَ النَّاسِ ہے یعنی فعل مجہول پڑھا گیا ہے۔ اور یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔ اور پہلے فیه کی ضمیر فِیْمَا میں ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور دوسرے فیه کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹنے کا احتمال رکھتی ہے۔ یعنی کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ عطا کی گئی تھی۔ الذین فعل کے سبب محل رفع میں ہے اور اُوْتُوْهُ بمعنی اعطوہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر منزل علیہ کی طرف لوٹتی ہے اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے، یعنی نبی علیہ السلام کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ان لوگوں کے جنہیں اس کے بارے علم عطا فرمایا گیا۔

بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ یہ مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی هم یختلفوا الا للبغی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر باہمی حسد کے سبب۔ اس کا معنی ومفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس میں ان کے فعل کی سفاہت اور اس قباحت پر تنبیہ ہے جس میں وہ واقع ہوئے۔

اور ھدی کا معنی ارشد راہنمائی کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی حق کی طرف راہنمائی فرمادی، اس طرح کہ ان کے لئے وہ کچھ بیان کر دیا جس میں ان سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں سے بعض نے بعض کی کتابوں کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی ان تمام کی تصدیق کے لئے راہنمائی فرمادی۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی ان امور میں جن میں اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) نے اختلاف کیا۔ ان کے قول میں سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا یہودی تھے یا عیسائی۔ (یعنی یہودیوں نے کہا: وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔)

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا ہے: ان کا قبلہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بیت المقدس کی طرف اور نصاریٰ نے مشرق کی طرف (منہ کیا) اور یوم جمعہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ہماری راہنمائی فرمادی، پس یہودیوں کے لئے ہفتے کا دن ہے اور عیسائیوں کے لئے اتوار کا(1)۔ اور ان کے روزوں کے بارے جو اختلاف ہے۔ المختصر وہ تمام امور جن میں انہوں نے اختلاف کیا (ان میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمادی۔)

ابن زید نے کہا ہے: انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس یہودیوں نے انہیں فریہ

---

1۔ بخاری شریف، باب فرض الجمعة، حدیث نمبر 827، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(حیرت انگیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے انہیں رب بنالیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہنمائی فرمائی تو انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیا۔

فراء نے کہا ہے: اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ علامہ طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت یہ ہے **فهدى الله الذين آمنوا للحق لما اختلفوا فيه** (پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تقدیر عبارت کی طرف انہیں اس خوف نے دعوت دی ہے کہ لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اس بعض کے بارے میں راہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اسی (خوف) نے فراء کو فی نفسہٖ غیر حق (کے مفہوم) کے قریب کر دیا۔ علامہ طبری نے بھی فراء سے اسے بیان کرنے میں اسی کا قصد کیا ہے۔ اور رہا کتاب اللہ کے لفظ پر بغیر ضرورت کے قلب کا دعویٰ کرنا، تو اس کی طرف دھکیلنے والی شے عجز اور کوتاہ نظری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اپنی ذات اور وصف پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَهَدَى تقاضا کرتا ہے کہ بلاشبہ وہ حق تک پہنچ گئے اور فیہ کے کلمہ میں معنی مکمل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول مِنَ الْحَقِّ سے اس جنس کی وضاحت کی ہے جس میں اختلاف واقع ہوا۔

مہدوی نے کہا ہے: لفظ اختلاف کو اہتماماً لفظ حق پر مقدم ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصود صرف اختلاف کا ذکر کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ قوی نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے **لما اختلفوا عنه من الحق، اي عن الاسلام**۔ یعنی اسلام سے اختلاف کیا۔ اور بِاِذْنِهٖ کے بارے زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے **بعلمه**۔ یعنی اس کے علم کے ساتھ۔

نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور اس کا معنی ہے **بأمره** یعنی اس کے حکم کے ساتھ۔ اور جب تو نے کسی شے کے بارے اجازت دی (تو اس کا مفہوم ہے) تحقیق تو نے اس کے بارے حکم دے دیا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہنمائی فرمائی کہ انہیں ایسی چیزوں کے بارے حکم فرمایا جن کے مطابق ان کے لئے عمل کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ میں معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ بندہ اپنی ذات کی ہدایت و راہنمائی کا اہتمام خود کرتا ہے (یعنی یہ بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔)

**اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾**

''کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرزا اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا)

رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی الله کی مدد؟ سن لو! یقیناً الله کی مدد قریب ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ میں حَسِبْتُمْ بمعنی ظننتم (تم نے گمان کیا) ہے۔ حضرت قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت غزوۂ خندق کے دوران نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو مشقت، شدت، گرمی، سردی، تلخ اور تکلیف دہ زندگی اور طرح طرح کی تکالیف اور مصائب آپہنچے اور ان کی کیفیت یہ ہوگئی جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: ۱۰) (اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔)

اور بعض نے کہا ہے: یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی۔ اس کی مثل آل عمران میں بھی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۴۲) (کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں الله نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔)

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کو تسلی اور حوصلہ دینے کے لئے نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے اموال مشرکین کے ہاتھوں چھوڑ دیئے اور الله تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے ترجیح دی اور یہودیوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا اور اغنیاء اور مالدار لوگوں میں سے بعض نے اپنے باطن میں نفاق پیدا کر لیا تو الله تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اَمْ منقطعہ بمعنی بَل ہے۔ اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کبھی اَمْ الف استفہام کے بدلے بھی آتا ہے تا کہ اس سے کلام کی ابتدا کی جائے اور حَسِبْتُمْ دو مفعولوں کو چاہتا ہے، لہٰذا علمائے نحو نے کہا ہے: اَنْ تَدْخُلُوا قائم مقام دو مفعولوں کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی محذوف ہے: یعنی أحسبتم دخولکم الجنّةَ واقعاً اور لَمَّا بمعنی لم ہے اور مَثَلُ بمعنی شبہ ہے۔ یعنی اس طرح کے امتحان میں تمہیں نہیں ڈالا گیا جس طرح انہیں آزمایا گیا جو تم سے پہلے تھے۔ پس تم صبر کرو جیسا کہ انہوں نے صبر کیا۔

نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے کہ مَثَلُ بمعنی صفة ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: اور ابھی تک تمہیں اس طرح کی مصیبت اور شدت نہیں پہنچی، جس طرح کی آزمائش ان لوگوں پر آئی جو تم سے پہلے تھے۔

وہب نے کہا ہے: مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام مردہ حالت میں پائے گئے اور ان کی موت کا سبب بھوک اور چچڑیاں تھیں۔ اسی آیت کی مثل یہ بھی ہے: الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (العنکبوت) (الف-لام-میم- کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔)

پس الله تعالیٰ نے انہیں صبر کی دعوت دی اور اس پر ان سے نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ۝ اور الزلزلة سے مراد سخت حرکت دینا ہے۔ یہ اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور احوال میں بھی۔ کہا جاتا ہے: زلزل الله

الارض زلزلة و زلزالا یعنی بالکسر - فتزلزلت۔ جب وہ حرکت کرے اور کانپنے لگے اور زُلْزِلُوْا کا معنی ہے وہ خوفزدہ کیے گئے اور حرکت دیے گئے۔ اور الزَّلزال۔ فتحہ کے ساتھ اسم ہے۔ اور الزلزِل کا معنی شدائد اور سختیاں ہیں۔

زجاج نے کہا ہے: زلزلہ کا اصل معنی کسی چیز کا اپنی جگہ سے پھسل جانا، ہٹ جانا ہے اور جب تو کہے زلزلتہ تو اس کا معنی ہے: تو نے بار بار اپنی جگہ سے ہٹایا اور پھسلایا۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ زلزل دحرج کی طرح فعل رباعی ہے۔

نافع نے حتّٰی یَقُوْلُ رفع کے ساتھ، جبکہ دوسروں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ حَتّٰی کے مابعد کلمہ پر دو اعتبار سے فتحہ اور دو اعتبار سے رفع آ سکتا ہے۔ مثلاً تو کہتا ہے: سرت حتی أدخلَ المدینۃَ یہ منصوب ہے۔ اس شرط پر کہ سیر اور دخول دونوں اکٹھے ایک ساتھ گزر چکے ہوں۔ یعنی میں اس میں داخل ہونے تک چلتا رہا۔ ای سرت الی ان ادخلھا اور یہ غایت ہے اور اسی کے مطابق ان کی قراءت ہے جنہوں نے منصوب پڑھا ہے۔

اور آیت کے سوا میں نصب کی دوسری وجہ یہ ہے سرت حتّٰی ادخلھا۔ ای کَی ادخلھا (یعنی میں چلا تاکہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔)

اور رفع کی بھی دو وجہیں ہیں سرت حتّٰی ادخلُھا، ای سرت فأدخلھا یعنی میں چلا اور اس میں داخل ہو گیا۔ تحقیق یہ دونوں سیر اور دخول اکٹھے گزر چکے ہیں۔ ای کنت سرت فدخلت۔ اور یہاں (آیت میں) حَتّٰی ان مضمرہ کے ساتھ عمل نہیں کرتا، کیونکہ اس کے بعد جملہ ہے۔ جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے: فَیَاعَجباً حتی کُلیبٌ تَسُبُّنِیْ (پس کتنی تعجب کی بات ہے کہ بنی کلیب مجھے گالیاں دیتے ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر رفع کی قراءت زیادہ واضح اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ ای و زلزلوا حتّٰی الرسولُ یقول اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ (اس زمانہ کا) رسول کہہ اٹھا۔ یعنی یہاں تک کہ یہ اس کا حال تھا۔ کیونکہ قول زلزلہ سے منقطع نہیں ہوا اور نصب معنی غایت کی بنا پر ہے اور اس میں وہ معنی نہیں ہے۔

مقاتل کے قول کے مطابق یہاں رسول سے مراد شعیا ہیں۔ اور وہی حضرت یسع علیہ السلام ہیں۔

اور کلبی نے کہا ہے: یہ ہر رسول کے بارے میں ہے جسے اپنی امت کی طرف مبعوث کیا گیا اور اس نے خوب محنت اور مشقت اٹھائی، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھا: اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کب آئے گی؟ اور ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: مراد حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور اسی پر آیت کا نزول دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت کے سوا میں رفع کی دوسری صورت یہ ہے سرت حتی ادخلُھا یہ اس بنا پر ہے کہ چلنا ماضی میں ہو اور دخول اب (یعنی زمانہ حال میں) ہو۔

اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: مرِض حتی لا یرجونہ، ای ھو الآن لایرجی۔ یعنی وہ بیمار ہوا اور اب اس کے بارے کوئی

امید نہیں ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے سرت حتی ادخلہا لا امنع یعنی میں چلا اور اب میں داخل ہوں گا، اس سے باز نہ رہوں گا۔

مجاہد، اعرج، ابن محیصن اور شیبہ نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن، ابوجعفر، ابن ابی اسحاق اور شبل وغیرہ نے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے۔

مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے کیونکہ قراء کی ایک جماعت اسی نظریہ پر ہے۔

اور اعمش نے وزلزلوا ویقول الرسول حتی کی بجائے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے وزلزلوا ثم زلزلوا ویقول۔

اور تاویل کرنے والوں میں سے اکثر نے کہا ہے کہ آیت کے آخر تک کلام رسول اور مومنین کے قول میں سے ہے۔ یعنی انہیں مشقت پہنچی یہاں تک کہ وہ مدد ونصرت کو موخر اور دور سمجھنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ اور وہ رسول کے قول میں سے ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے مدد ونصرت کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا، نہ کہ کسی شک اور ارتیاب کی بنا پر اور الرسول اسم جنس ہے۔

اور ایک گروہ کا کہنا ہے: کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، اور تقدیر کلام یہ ہے: حتّٰی یقول الَّذِیْنَ آمنوا متٰی نصر الله (یعنی یہاں تک کہ ایمان والے کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟) تو اللہ کا رسول کہتا ہے: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ، پس رسول علیہ السلام کو رتبہ میں بلندی اور حیثیت کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور پھر مومنین کے قول کو مقدم لایا گیا ہے، کیونکہ وہ زمانے کے اعتبار سے متقدم ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تو تحکم ہے۔ اور کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا متعذر نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہو اور یہ قول کے ذکر کے مکمل ہونے کے بعد بطور استیناف ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ سیبویہ کے قول کے مطابق نصر الله مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور ابوالعباس کے قول کے مطابق یہ فعل کے سبب مرفوع ہے۔ یعنی حتی یقع نصر الله۔ اور قریبٌ۔ اِنّ کی خبر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں قریباً پڑھنا بھی جائز ہے یعنی مَكَانًا قَرِیبًا اور قریبٌ کا عرب نہ تثنیہ لاتے ہیں، نہ جمع اور نہ ہی اس معنی میں مونث۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (الاعراف) اور شاعر نے کہا:

له الویلُ ان أمسٰی ولا أُمُّ هاشم　　قریبٌ ولا بَسْبَاسةُ بنةُ یَشْکُرَا

شعر میں تثنیہ مونث کے لئے قریب لایا گیا ہے۔

اور اگر تو کہے: فلان قریب لی فلاں میرے قریب ہے، تو اس کی تثنیہ اور جمع بنانا چاہے تو پھر تو کہے گا: قریبون و اقرباء قرباء۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۱۵﴾

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمایئے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ اس آیت کریمہ میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس میں اگر ہمزہ کو مخفف کر دیا جائے تو اس کی حرکت سین کو دے کر اسے مفتوح پڑھا جائے اور ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو تو اسے پڑھے گا: یَسَلُوۡنَکَ۔

یہ آیت حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ شیخ کبیر (بہت زیادہ بوڑھے) تھے۔ تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ میرا مال کثیر اور بہت زیادہ ہے، تو میں اسے کیونکر صدقہ کروں اور کس پر خرچ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ، (1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ ارشاد باری تعالیٰ: مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ میں مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ذَا خبر ہے اور یہ بمعنی الذی ہے۔ اور اسم کی طوالت کے سبب اس سے ھا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: ما الذی ینفقونه اور اگر تو چاہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما یُنۡفِقُوۡنَ کے سبب محل نصب میں ہو۔ اور ذا، ما کے ساتھ مل کر ایک شے کے قائم مقام ہو۔ تو (اس صورت میں) ضمیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جب یہ اسم مرکب ہے تو پھر یہ محل نصب میں ہوگا۔ بخلاف شاعر کے اس قول کے:

وما ذا عسی الواشون ان یتحدثوا سوی ان یقولوا اننی لكِ عاشق

(چغلی کھانے والوں کے پاس بات کرنے کے لئے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کہیں: میں تیرا عاشق ہوں۔)

کیونکہ عسی اس میں عمل نہیں کر رہا۔ پس مَاذَا مرکب کلمہ ہے اور محل رفع میں ہے، کیونکہ ذَا کا کوئی صلہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ کہا گیا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ اور معنی یہ ہے: ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کونسی وہ وجوہ (اور اسباب) ہیں جن میں وہ مال خرچ کر سکتے ہیں اور جو مال خرچ کرنا لازم ہو وہ اسے کہاں رکھیں؟

سدی نے کہا ہے: یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی، پھر فرض زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: مہدوی کو سدی کے بارے میں اس مسئلہ میں وہم ہوا ہے، لہٰذا ان کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا: یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہے اس سے والدین کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مستحب صدقہ کے بارے ہے اور زکوٰۃ اس انفاق کے سوا ہے۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 60

پس اس قول کی بنا پر اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور یہ نفلی صدقہ کے مصارف کو بیان کر رہی ہے۔ پس خوشحال اور غنی آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج اور فقیر والدین پر اتنا مال خرچ کرے جو ان دونوں کی ان کی حالت کے مطابق اصلاح کر سکے (اور ان کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔) مثلاً کھانا، لباس اور دیگر ضروریات حیات۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے: بیٹے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی شادی کرائے۔ البتہ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی کو خرچہ مہیا کرے چاہے وہ اس کی اپنی ماں ہو یا اجنبی عورت ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اپنے باپ کی شادی کرانا لازم نہیں کیونکہ آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ (باپ) اغلباً شادی سے مستغنی ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسے اس کی شدید حاجت ہو تو پھر اس کی شادی کرانا بھی اس پر واجب ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو پھر اس پر یہ واجب نہ کیا جاتا کہ وہ دونوں (یعنی باپ اور اس کی بیوی) پر خرچ کرے۔ اور عبادات میں سے وہ جو اموال سے تعلق رکھتی ہیں تو (بیٹے پر) لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اتنا مال دے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو، یا جہاد پر جا سکتا ہو۔ البتہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ باپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، کیونکہ صدقہ فطر نفقہ اور اسلام کی شرط کے ساتھ ضروری ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ۔ اس میں اَنْفَقْتُمْ کی وجہ سے مَا محل نصب میں ہے۔ اور اسی طرح وَ مَا یُنْفِقُوْا میں بھی ہے۔ اور یہ شرط ہے اور جواب شرط فَلِلْوَالِدَیْنِ ہے۔ اسی طرح وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۱۵﴾ ہے۔ یتیم، مسکین اور ابن سبیل کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ (الروم: 38)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یَفْعَلُوْا یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ آیت کا ظاہر تو خبر ہے، حالانکہ یہ جزا کے وعدہ کو متضمن ہے (1)۔

كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

''فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ كُتِبَ اس کا معنی ہے: ''فرض کیا گیا ہے۔'' اس کی مثل پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے اس کی قراءت کَتَبَ علیکم القتلَ کی ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

كُتب القتل والقتال علينا　　و على الغانيات جرّ الذيول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 279

ہمارے اوپر جنگ و قتال فرض کیا گیا ہے اور حسن و جمال والیوں پر (فقط کپڑوں کے) دامنوں کو کھینچنا۔

یہ جہاد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: یہ وہی ہے جس کے ساتھ انہیں آزمایا گیا ہے اور اسے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس میں قتال سے مراد کفار دشمنوں کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا علم انہیں قرائن احوال سے ہوا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جتنی مدت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کی اجازت نہ دی گئی اور جب آپ ہجرت فرما ہوئے تو پھر آپ کو اجازت فرما دی گئی کہ مشرکین میں سے جو کوئی آپ کے خلاف جنگ کرے۔ آپ اس کے ساتھ مقابلہ کریں اور جنگ لڑیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۳۹) (اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا) پھر آپ کو عام مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرما دی گئی (1)۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مراد کون ہیں۔

تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مراد صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں۔ پس ان پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ کرنا فرض عین تھا۔ پھر جب شریعت مضبوط ہوگئی اور قرار پکڑ گئی تو جہاد فرض کفایہ ہو گیا۔ حضرت عطا اور امام اوزاعی نے یہی کہا ہے۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عطا کو کہا: کیا اس آیت کے مطابق لوگوں پر جہاد کرنا واجب (فرض عین) ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلاشبہ یہ ان (صحابہ کرام) پر فرض کیا گیا تھا۔ اور امت میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جہاد کی پہلی فرضیت ہی فرض کفایہ تھی نہ کہ فرض عین، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب انہیں جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دیتے تھے تو ان پر اس کے لئے نکلنا لازم ہو جاتا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی واجب (فرض عین) ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جس پر مسلسل اجماع رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ہر فرد پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں میں سے کچھ افراد یہ فریضہ ادا کر دیں تو باقیوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دشمن (حملہ آور ہو کر) دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ البراءۃ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور مہدوی وغیرہ نے حضرت ثوری سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہاد تطوع ہے (یعنی نفلی عبادت ہے اس میں رضاکارانہ طور پر شامل ہونا ہوتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ عبارت کسی سائل کے سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ تحقیق اس نے جہاد کی تعیین کے بارے سوال کیا تو اسے کہا گیا: ذلك تطوع (کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بتکلف اطاعت کی جاتی ہے۔)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے (اور معنی ہے) اور وہ مزاجوں میں ناپسند ہے۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: الكُرْهُ کا معنی مشقت ہے۔ اور الكَرْه کاف کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وہ عمل ہے جس پر تجھے مجبور کیا

1۔ تفسیر رازی، زیر آیت ہذہ

جائے۔ یہی پسندیدہ مفہوم ہے۔ اور یہ بھی جائز کہ بالضم (الکُرہ) کا معنی بالفتح (الکَرہ) کی مثل ہو۔ پس یہ دونوں لغتیں ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: کرھت الشیء کَرھًا و کُرھًا و کَراھۃ و کراھیۃ (میں نے شے کو ناپسند کیا) اور اکرھتہ علیہ اکراھاً (میں نے اسے اس پر مجبور کیا۔)

بلاشبہ جہاد ایک مشقت ہے۔ کیونکہ اس میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، وطن اور اہل وعیال کو چھوڑنا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو زخم کھانے، اعضائے بدن کو کٹوانے اور اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہی ہے نہ کہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ناپسند کیا۔

حضرت عکرمہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک (پہلے) انہوں نے اسے ناپسند کیا اور پھر اسے پسند کرنے لگے اور کہا: سمعنا و اطعنا، ہم نے حکم سنا اور اطاعت و پیروی کے لئے سر تسلیم خم کر لیا(1)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ حکم کی پیروی مشقت کو متضمن ہوتی ہے۔ لیکن جب ثواب معلوم ہو جائے تو اس کے ضمن میں مشقتوں کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دنیا میں اس کی مثال اس شے کو زائل کرنا ہے جو انسان کو تکلیف دیتی ہے، درد پہنچاتی ہے، اور وہ اس سے ڈرتا ہے جیسا کہ کسی عضو کو کاٹنا، داڑھ کو نکالنا اور فصد کروانا اور پچھ لگوانا تاکہ درد اور تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور صحت قائم رہ سکے۔ اور دار الخلد (جنت) میں دائمی حیات سے اور مقعد صدق میں عزت و کرامت سے افضل و اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قول باری تعالیٰ ہے: وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا۔ کہا گیا ہے کہ عَسٰی بمعنی قد ہے۔ الاصم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے واجبۃ (یعنی ضروری اور لازم ہونا) اور پورے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لفظ عَسٰی واجبۃ کے معنی میں ہے (یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو پھر اس میں شک کا معنی نہیں ہوتا، بلکہ بالیقین ثابت ہونے کا معنی ہوتا ہے۔) سوائے اس ارشاد گرامی کے: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ (التحریم: ۵) (کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔)

ابو عبیدہ نے کہا ہے: عَسٰی کالفظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایجاب کے لئے ہے اور معنی یہ ہے: ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اس اعتبار سے کہ اس میں تمہیں غلبہ دے دیا جائے، تم کامیابی سے ہمکنار ہو، تم مال غنیمت حاصل کرو اور تمہیں اجر و ثواب بھی دیا جائے گا۔ اور اس دوران جو فوت ہوا وہ شہادت کی موت فوت ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم جہاد چھوڑنے اور ترک کر دینے کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں برا ہو اس اعتبار سے کہ تم پر غلبہ پا لیا جائے، تمہیں ذلت و رسوائی پر مجبور کر دیا جائے اور تمہارے اختیارات اور حکومت ختم کر دی جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح اور درست ہے، اس پر کوئی غبار اور شک و شبہ نہیں۔ جیسا کہ بلاد اندلس میں اتفاق ہوا ہے،

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذہ

ان لوگوں نے جہاد چھوڑ دیا، انہوں نے جنگ سے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اور اکثر اوقات میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کی تو نتیجتاً دشمن وہاں کے شہروں پر قابض ہو گئے، پھر وہاں کے باسیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ انہیں قیدی بنایا گیا، قتل کیا گیا، جلاوطن کیا گیا، اور غلام بنالیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا اور ان کی کمائی تھی۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے تم پیش آنے والی سختیوں اور مصیبتوں کو ناپسند نہ کرو کیونکہ بسا اوقات جس امر کو تو ناپسند کر رہا ہوتا ہے اسی میں تیری نجات ہوتی ہے اور بسا اوقات جس امر کو تو پسند کرتا ہے اس میں تیری ہلاکت اور بربادی ہوتی ہے۔

ابو سعید الضریر نے کہا ہے

رُبَّ أمرٍ تَتَّقِيهِ جرّ أمرًا تَرتَضِيهِ	خفی المحبوب منه و بدا المکروہ فیه

کئی امور ہیں جن سے تو اجتناب کرتا ہے اور بچتا ہے وہ ایسے امر کو کھینچ لاتے ہیں جن سے تو راضی ہوتا ہے۔ پسندیدہ امر ان میں مخفی ہوتا ہے اور ناپسندیدہ امر ان میں ظاہر ہوتا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۱۸﴾

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔ اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں بارہ مسئلے ہیں:۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ اس لفظ کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور محمد بن فضیل نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے زیادہ بہتر قوم کوئی نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تیرہ مسائل کے بارے سوال کیا اور وہ تمام کے تمام قرآن کریم میں موجود ہیں۔

مثلاً یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ اور یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى اور وہ سوال نہ کرتے تھے مگر ایسی شے سے متعلق جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی تھی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: تیرہ مسئلوں میں سے سوائے تین کے حدیث طیبہ میں کوئی نہیں ہے۔

ابوالیسار نے جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جتھہ بھیجا اور ان پر ابوعبیدہ بن حارث یا عبیدہ بن حارث کو امیر مقرر کیا۔ پس جب وہ روانہ ہونے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرط محبت سے فریفتہ ہو کر رونے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو (امیر بنا کر) بھیج دیا اور انہیں ایک خط لکھ کر عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس خط کو کھول کر نہ پڑھیں یہاں تک کہ وہ فلاں فلاں جگہ تک پہنچ جائیں اور ارشاد فرمایا: اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر پر مجبور نہ کرنا۔ پس جب وہ اس مقررہ جگہ پر پہنچے تو خط پڑھا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا: سمعاً و طاعةً لله و لرسوله (کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لئے حکم کی تعمیل میں دل و جان حاضر ہے۔)

راوی کا بیان ہے: دو آدمی واپس لوٹ آئے اور باقی افراد ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابن حضرمی سے ہوئی، تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور انہیں اس کا علم نہ تھا کہ آج رجب کا پہلا دن ہے، تو اس پر مشرکین نے کہا: تم نے شہر حرام میں قتل کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ(1)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ بنی کلابہ کے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری سے ملے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے اور وہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ تب قریش نے کہا: اس نے ان دونوں کو شہر حرام (حرام مہینے) میں قتل کیا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کے سبب نزول میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ اکثر اور زیادہ مشہور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نو افراد کے گروہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ افراد کے ساتھ غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے جمادی الآخر میں بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجب میں بھیجا تھا۔

ابوعمر نے کتاب الدرر میں اس کے بارے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرز بن جابر کی تلاش سے واپس لوٹ کر آئے۔ اس خروج کو بدر اولیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمادی الثانی کے بقیہ ایام اور رجب کا مہینہ مدینہ طیبہ میں قیام فرما

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 656-655

رہے اور رجب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش بن رباب الاسدی کو بھیجا اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد اور بھی تھے۔ اور وہ تھے ابو حذیفہ بن عتبہ، عکاشہ بن محصن، عتبہ بن غزوان، سہیل بن بیضاء فہری، سعد بن ابی وقاص، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ تمیمی اور خالد بن بکیر لیثی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھیں یہاں تک کہ وہ دو دن سفر کر لیں، پھر اسے کھول کر پڑھیں۔ پس آپ نے وہی کچھ کیا جس طرح کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا۔ اور آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور آپ ان کے امیر ہیں۔ پس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پس جب آپ نے خط کھولا اور اسے پڑھا، تو اس میں پایا کہ جب تو میرے اس خط میں دیکھے تو پھر اس پر عمل کرنا یہاں تک کہ تو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترنا اور وہاں قریش کی تاک میں رہنا اور ہمیں ان کی خبروں کے بارے آگاہ کرنا۔ اذا نظرت فی کتابی هذا فامض حتی تنزل نخلة بین مكة و الطائف فَتَرَصَّدْ بها قریشا، و تعلم لنا من اخبارهم۔

پس جب آپ نے تحریر پڑھی تو کہا: سمعاً و طاعة (دل و جان سے تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہیں) پھر اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بارے آگاہ کیا اور اس کے بارے بھی کہ وہ ان میں سے کسی کو مجبور نہ کریں گے اور یہ کہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے انہیں کو ساتھ لے کر اٹھیں گے جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور یہ کہ اگر کسی نے بھی آپ کی اطاعت نہ کی تو پھر وہ اکیلے ہی آگے بڑھیں گے۔ پس جو کوئی شہادت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (آگے بڑھنے کے لئے) اٹھے، اور جو کوئی موت کو ناپسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ تو ساتھیوں نے جواب دیا: ہم تمام کے تمام اس (کام) میں رغبت رکھتے ہیں جس میں آپ رغبت رکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کے لئے دل و جان سے حاضر ہے۔ اور وہ سارے آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ بھاگ گیا، وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے اور اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے چلے گئے یہاں تک کہ مقام نخلہ پر جا کر اترے، تو وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرا، جو کشمش اور دیگر سامان تجارت اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں عمرو بن حضرمی تھا۔ حضرمی کا نام عبداللہ بن عباد ہے جو صدف سے تعلق رکھتا تھا اور صدف حضر موت کا ایک قبیلہ ہے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزوی اور حکم بن کیسان مولیٰ بنی مغیرہ بھی شامل تھے۔ پس مسلمانوں نے باہمی مشاورت کی اور کہا: ہم شہر حرام رجب کے آخری دن میں ہیں، پس اگر ہم ان سے قتال کرتے ہیں، تو ہم شہر حرام کی حرمت کو پامال کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں آج رات چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ حرم پاک میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے پر اتفاق کر لیا اور واقد بن عبداللہ تمیمی نے تیر مارا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا اور نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا۔

پھر سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدیوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: جو مال غنیمت ہم نے حاصل کیا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خمس علیحدہ کر دو۔ پس انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسلام میں پہلا خمس

یہی تھا۔ پھر قرآن کریم نازل ہوا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ الخ) (الانفال: 41)

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے فعل کو برقرار رکھا اور اسے پسند کیا اور یوم قیامت تک اسے امت کے لئے سنت قرار دیا۔ یہی پہلی غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوئی اور (حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ) پہلے امیر ہیں اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر حرام میں ابن حضرمی کے قتل کو ناپسند کیا اور اس معاملہ کو قوم پر چھوڑ دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ تا قولہ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔

پھر عثمان بن عبداللہ حالت کفر میں ہی مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اور حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ہی رہے یہاں تک کہ انہوں نے بئر معونہ میں جام شہادت نوش کیا اور حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما صحیح سالم مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما کا اپنے اونٹ کی تلاش میں جانا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی اجازت سے تھا۔ اور عمرو بن حضرمی اور اس کے ساتھیوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا، تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک یہ قوم تم سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئی ہے، پس تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور پھر اسے چاہئے کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا جس کا سر مونڈا ہوا تھا، تو وہ امن میں ہو گئے اور کہنے لگے: یہ قوم عمار ہے تم پر کوئی حرج اور خطرہ نہیں ہے اور پھر انہوں نے ان کے قتال کے بارے میں باہمی مشاورت کی۔ الحدیث۔

یہودیوں نے فال نکالی اور کہا: واقد سے مراد وقدت الحرب ہے یعنی جنگ بھڑک اٹھی اور عمرو سے مراد عمرت الحرب ہے یعنی جنگ قائم ہو گئی اور حضرمی سے مراد حضرت الحرب ہے جنگ شروع ہو گئی۔

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم ان دونوں کا فدیہ قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما آ جائیں اور اگر وہ دونوں نہ آئے تو ہم ان دونوں کو ان کے بدلے قتل کر دیں گے۔ پس جب وہ دونوں آ گئے تو ان دونوں نے فدیہ ادا کر دیا۔ پھر حکم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ میں ہی مقیم ہو گیا یہاں تک کہ غزوۂ بئر معونہ میں شہید کر دیا گیا۔ رہا عثمان! تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا اور رہا نوفل! تو اس غزوہ احزاب کے دن اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ خندق کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے، تو وہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضائے بدن ٹوٹ گئے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا۔ مشرکین نے اس کا مردہ جسم ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم اسے اٹھا لو کیونکہ اس کا مردہ بدن بھی ناپاک ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے" خذوہ فانہ خبیث الجیفۃ خبیث الدیۃ پس یہی اس ارشاد باری تعالیٰ کے

نزول کا سبب ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیۃ۔

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حضرمی کا قتل رجب کے آخری دن میں ہوا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور طبری نے سدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جمادی الثانی کے آخری دن قتل ہوا، لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے، اس بنا پر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات میں ہوا اور مسلمان اسے جمادی الثانی میں سے گمان کرتے تھے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ صاحب بن عباد نے اپنے رسالہ المعروفہ بالاسدیہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر المومنین کا نام دیا گیا اس لئے کہ انہیں مومنین کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا اس آیت کے نسخ کے بارے اختلاف ہے، پس جمہور اس کے نسخ کے قائل ہیں اور یہ کہ اشہر حرام میں مشرکین کے ساتھ قتال کرنا مباح ہے۔ البتہ اس کے ناسخ کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ زہری نے کہا ہے: اسے ارشاد باری تعالیٰ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (التوبہ: ۳۶) (اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے) نے منسوخ کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر حرام میں بنی ثقیف کے ساتھ جنگ کرنے نے منسوخ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر کو شہر حرام میں اوطاس کی طرف جنگ کے لئے بھیجا تھا (لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس حکم کے لئے ناسخ ہے۔)

اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذوالقعدہ کے مہینہ میں جنگ پر بیعت رضوان لینے نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیئے جانے کی خبر پہنچی اور یہ کہ وہ (اہل مکہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ان کے دفاع پر بیعت لی (کہ وہ ان کا مقابلہ پوری جرأت کے ساتھ کریں گے۔) نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت ان سے جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے لی۔

اور امام بیہقی نے عروہ بن زبیر سے محمد بن اسحاق کی حدیث کے علاوہ حضرمی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ الآیہ۔ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ شہر حرام میں قتال اسی طرح حرام ہے جیسے پہلے تھا اور جس سبب سے مومنین اسے حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس (قتال) سے بڑا جرم ہے۔ وہ یہ کہ (کفار) انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے جائیں، وہ انہیں بیڑیاں پہنا دیتے ہیں، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور ستاتے ہیں اور انہیں محبوس کر لیتے ہیں۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حج و عمرہ اور نماز کے لئے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ مسجد حرام کے باسیوں کو باہر نکالتے ہیں حالانکہ اس کے مکین مسلمان ہیں اور دین کے بارے میں انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا رکھتے ہیں اور ہم تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حضرمی کے قتل کی دیت ادا فرمائی اور شہر حرام کو اسی طرح حرام قرار دیا جس طرح وہ انہیں حرام قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ (التوبہ: 1) (یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) (1)

1۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 17-18

حضرت عطا کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اشہر حرام میں قتال جائز نہ ہوگا اور اسی پر حلف اٹھایا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد وارد ہونے والی آیات زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ خاص ہے اور بالاتفاق عام خاص کے لئے ناسخ نہیں ہوسکتا۔

اور ابوالزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر حرام میں جنگ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ آپ کے ساتھ جنگ کی جاتی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: قِتَالٍ فِيهِ۔ اس میں قِتَالٍ سیبویہ کے نزدیک بدل اشتمال ہے، کیونکہ سوال مہینے اور قتال دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کفار مہینے کی حرمت کو توڑنے پر تعجب کرتے ہوئے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ پس ان کا سوال شہر (مہینے) کے متعلق ہوا، صرف اس لئے کہ اس میں قتال پایا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کے بارے سوال کرتے ہیں۔

اور قتبی نے کہا: وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے پوچھتے ہیں: کیا یہ جائز ہے؟ پس اسی وجہ سے انہوں نے قتال کو شہر سے بدل قرار دیا ہے اور سیبویہ نے ایک شعر بھی بیان کیا ہے:

فما كان قيسٌ هُلكُه هُلْكَ وَاحِدٍ و لكنه بُنيانُ قومٍ تهدَّما

قیس کا ہلاک ہوجانا ایک آدمی کا ہلاک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا ہلاک ہونا تو پوری قوم کے محل کے گر جانے کے مترادف ہے۔ (تو اس میں هُلكُه قیس سے بدل ہے۔)

عکرمہ نے اس طرح قراءت کی ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قَتْلٍ فِيهِ قُلْ قَتْلٌ یعنی دونوں مقامات پر (قتال کو) بغیر الف کے پڑھا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے میں اور اس میں جنگ کرنے کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یعنی يسألونك عن الشهر الحرام وعن قتال فيه) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ پس اس صورت میں قتال، عن، مکررہ کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ قتال مجرور ہے کیونکہ اس سے پہلے عن۔ نیۃً موجود ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ قتال جوار کی بنا پر مجرور ہے۔ (یعنی چونکہ یہ مجرور کے پڑوس میں ہے جو کہ الشهر الحرام ہے، اس لئے اس کا اعراب اسے بھی دے دیا گیا ہے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کلام میں ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ محض جوار کا اعتبار غلط ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ شاذ ہے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے: هذا جُحْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ اور اس کے غلط ہونے پر دلیل تثنیہ میں عربوں کا یہ قول ہے: هذان جحرا ضب خربان بلاشبہ یہ اِقواء (شعر کے قافیہ کو مختلف کرنا یعنی کسی کو رفع دینا اور کسی کو جر دینا) کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ کتاب اللہ میں سے کسی شے کو اس پر محمول کیا جائے اور افصح اور اصح لغات کے سوا اس طرح نہیں ہوسکتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہ حق جوار کی بنا پر مجرور ہے، ان کا یہ قول خطا ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ عن کو مضمر کرنا جائز نہیں ہے اور اس بارے میں یہ قول کرنا کہ یہ بدل ہے (بھی جائز نہیں)
اعرج نے قتال کو مرفوع پڑھا ہے یعنی یسألونك عن الشهر الحرام قتالٌ فيه
نحاس نے کہا ہے: یہ عربی میں ابہام اور پیچیدگی ہے اور اس میں معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے سوال کر رہے ہیں، کیا اس میں قتال جائز ہے؟ اور ارشاد باری تعالیٰ يَسْئَلُوْنَكَ استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أصاحِ ترى بَرْقًا أُرِيكَ وَ مِيضَه كلَمعِ اليدَيْن في حَبِيٍّ مُكَلَّل

اے میرے ساتھی! کیا تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے جس کی چمک تجھے دکھائی گئی اونچے بادلوں کی چمک میں دونوں ہاتھوں کی چمک (حرکت) کی طرح۔
تو اس میں ترى سے پہلے الف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ أصاحِ کا الف اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ حرف ندا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

تَرُوحُ من الحيّ امر تَبْتَكِر

کیا تو قبیلے سے شام کے وقت جائے گا یا صبح کے وقت۔

تو اس میں بھی اصل عبارت أتروح ہے، ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ام اس پر دلالت کر رہا ہے۔
**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی اس میں قتال کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا عمل ہے۔ کیونکہ شہر حرام میں قتال کو حرام قرار دینا اس وقت ثابت ہے جبکہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ آیت میں لفظ الشَّهْرِ اسم جنس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے لئے شہر حرام کو قوام بنا دیا تھا، وہ اس دوران اعتدال برتتے تھے، وہ خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی اشہر حرام میں غارتگری کرتے تھے۔ اشہر حرام سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں تین مسلسل اور لگاتار ہیں اور ایک منفرد ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔
**مسئلہ نمبر 5**۔ قول باری تعالیٰ: وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مبتدا ہے اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ، صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا سبیل اللہ پر عطف کیا گیا ہے۔ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ بھی صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور مبتدا کی خبر اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی مذکورہ اعمال کرنا شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑھ کر گناہ ہیں۔ یہ قول مبرد وغیرہ نے کیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کو طویل عرصہ تک کعبہ معظمہ کا طواف کرنے سے روکنا ہے۔ اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد ہے بالحج والمسجد الحرام۔ یعنی حج اور مسجد حرام میں کفر کا ارتکاب کرنا۔ اور وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ یعنی وہاں سے باسیوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے (اور اس کی سزا زیادہ ہے۔)
فراء نے کہا ہے: صَدٌّ کا عطف كَبِيْرٌ پر کیا گیا ہے اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِهٖ کی ہا ضمیر پر کیا گیا ہے۔ پس یہ کلام عطف نسق اور متصل ہے منقطع نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلطی ہے کیونکہ معنی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ او کفر بہٖ۔ ای باللہ کا عطف بھی کَبِیۡرٌ پر کر دیا جائے۔ اور اس سے یہ معنی ظاہر ہوگا کہ اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور بین ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے: اے کفار قریش! بلاشبہ تم ہمارے بارے میں شہر حرام میں جنگ کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم کر رہے ہو یعنی جو کوئی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور تمہارا اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا، جیسا کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے ساتھ کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ اور بڑا جرم ہے (1)۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

تَعُدُّون قتلاً فی الحرام عظیمةً　　واعظمُ منه لویَرَی الرُّشدَ راشِدُ

تم ماہ حرام میں قتل کو بڑا گناہ شمار کر رہے ہو حالانکہ اگر کوئی ہدایت یافتہ راہ ہدایت کو دیکھے تو اس سے بھی بڑے گناہ یہ ہیں:

صُدُودکُمْ عما یقول محمّدٌ　　وَ کُفرٌ به واللهُ رائٍ و شاهدُ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات سے تمہاری مخالفت اور آپ سے کفر، اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کا گواہ ہے۔

واخراجکم من مسجد الله اهله　　لئلا یُری لله فی البیت ساجد

اور تمہارا اللہ کی مسجد سے اس میں بسنے والوں کو نکال دینا تاکہ بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔

فانّا وان عَیّر تمونا بقتْله　　وأرجفَ بالاِسلام باغٍ و حاسدُ

اگرچہ تم نے ہمیں قتل کی عار دلائی اور سرکش اور حسد کرنے والوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

سَقَیْنَا من ابنِ الحَضرَمی رماحنا　　بِنَخْلَةَ لتا أوقد الحربَ واقدُ

لیکن ہم نے وادیٔ نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو سیراب کیا جب واقد نے جنگ کی آگ بھڑکائی

دَمًا وابنُ عبدالله عثمان بیننا　　یُنازعه غُلٌّ من القِدِّ عانِدُ

عثمان بن عبداللہ ہمارے پاس ہے، تسمے کے خون آلود طوق نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

زہری اور مجاہد وغیرہما نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ قُلْ قِتَالٌ فِیۡهِ كَبِیۡرٌ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ ارشاد ہیں وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیۡنَ كَآفَّةً اور فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیۡنَ (توبہ:5)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے اور اشہر حرام میں قتال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے۔ یعنی تمہارا کفر کرنا ہمارے انہیں قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 290

جمہور نے کہا ہے: یہاں فتنہ سے مراد ان (کفار) کا مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے، یعنی تمہارا یہ رویہ اختیار کرنا اشہر حرام میں تمہیں قتل کرنے سے زیادہ شدید اور سخت جرم ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُوْنَ۔ یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے، اور اس کے ذریعہ مؤمنین کو کافروں کے شر سے ڈرانا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں اور يَرُدُّوْكُمْ حَتّٰى کے سبب منصوب ہے، کیونکہ یہ خلاصۂ غایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ اور جو کوئی اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جائے۔ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ تو ان کے عمل باطل ہو گئے اور فاسد ہو گئے۔ اسی سے الحبَط بھی ہے۔ مراد وہ بیماری ہے جو جانوروں کے پیٹوں میں بہت زیادہ گھاس اور چارہ وغیرہ کھا جانے سے لگ جاتی ہے۔ اس کے سبب ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور بسا اوقات اسی سبب سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے بطور تہدید ہے تاکہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ علماء کے مابین مرتد کے بارے یہ اختلاف ہے کہ کیا اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی یا نہیں؟ کیا نفس ردت کے ساتھ ہی اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مگر یہ کہ اس کی موت کفر پر واقع ہو؟ کیا اسے وارث بنایا جائے گا یا نہیں؟ یہ تین مسائل ہیں۔

(ا) ایک گروہ نے کہا ہے: اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی، پس اگر وہ توبہ کر لے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: ایک ساعت ترغیب دی جائے گی اور دوسروں نے کہا ہے: ایک مہینہ تک اسے توبہ کی رغبت دلائی جائے گی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اسے تین (بار) توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی قول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا ہے جسے آپ سے ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔

حسن نے کہا ہے: اسے سو بار توبہ کی ترغیب دلائی جائے گی اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے توبہ کی رغبت دلائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی نے بھی اپنے ایک قول میں یہی کہا ہے اور یہی طاؤس اور عبید بن عمیر کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

سحنون نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون کہا کرتے تھے: مرتد کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی اور انہوں نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: تشریف رکھیے اور ان کے لئے تکیہ وغیرہ رکھا۔ تو اس وقت ان کے پاس ایک آدمی تھا جسے بیڑیاں پہنائی گئی تھیں، تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی تھا، اس نے اسلام قبول کیا، اس نے پھر اپنے دین کو برے دین کی طرف لوٹا دیا ہے اور یہ یہودی ہو گیا ہے، تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 659

بیٹھ جایئے۔ انہوں نے کہا: (ہاں) میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تین بار آپ نے یہی کہا۔ چنانچہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ روایت امام مسلم وغیرہ نے بیان کی ہے۔(1)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا، ورنہ اسی جگہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ مہلت کا مطالبہ کرے۔ پس اگر اس نے مہلت کا مطالبہ کیا، تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی، لیکن آپ سے اور آپ کے اصحاب سے مشہور قول یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے، ان کے نزدیک زندیق اور مرتد برابر ہیں۔ اور امام مالک نے کہا ہے کہ زنادقہ کو قتل کیا جائے گا اور انہیں توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی۔ یہ پہلے سورۃ البقرہ (ج:۱ص:۱۹۸) میں گزر چکا ہے۔

جو کوئی کفر کی ایک نوع سے نکل کر کفر کی ہی دوسری نوع میں داخل ہوا، تو اس کے بارے علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقہاء نے کہا ہے: اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس طرح وہ اسی کفر کی طرف ہی منتقل ہوا ہے جس پر وہ ابتدا میں تھا، لہٰذا اسے اسی پر برقرار رکھا جائے گا۔ ابن عبد الحکم نے حضرت امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من بدّل دینہ فاقتلوہ** جو کوئی اپنا دین بدل دے تم اسے قتل کر دو(2)۔ اور آپ نے کسی مسلمان کو کافر سے خاص نہیں کیا۔

امام مالک نے فرمایا ہے: حدیث کا معنی یہ ہے جو کوئی اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جائے اور رہا وہ جو کفر سے کفر کی طرف نکلا تو وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ یہی فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔

امام شافعی سے مشہور قول وہ ہے جو مزنی اور ربیع نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ میں سے اپنا دین بدلنے والے کو امام وقت دار الحرب بھیج دے گا اور اسے اپنے شہر (ملک) سے نکال دے گا اور حربیوں کے اموال کے ساتھ اس کا مال بھی حلال ہو جائے گا اور دار الحرب پر غلبہ پالیا گیا۔ کیونکہ امام وقت نے اسے اس دین کی بنا پر ذمی بنایا تھا جس پر وہ عقد ذمہ کے وقت تھا۔

مرتدہ عورت کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے:

امام مالک، امام اوزاعی، امام شافعی اور لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرتد ہونے والی عورت کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ مرتد آدمی کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان کی دلیل ظاہر حدیث ہے **من بدّل دینہ فاقتلوہ** اور اس میں لفظ مَن مذکر و مونث دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔

امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے، اسی کو ابن علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عطا اور حسن کا قول ہے اور انہوں نے استدلال اس سے کیا ہے کہ

1۔ بخاری شریف، باب حکم المرتد والمرتدۃ الخ، حدیث نمبر 6412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب لا یعذب بعذاب اللہ، حدیث نمبر 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بدّل دینه فاقتلوه۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا اور جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل اور مفہوم بہتر جانتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور پہلے فریق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک کے ساتھ (یعنی) ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا...... الحدیث۔'' پس یہ حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام شافعی نے کہا ہے: بے شک وہ آدمی جو مرتد ہوا (نعوذ باللہ) پھر اسلام کی طرف واپس آ گیا تو نہ اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ہی اس کا وہ حج ضائع ہوگا جس سے وہ فارغ ہو چکا۔ بلکہ اگر وہ حالت ردت پر ہی فوت ہو گیا تب اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

امام مالک نے فرمایا ہے: مرتد ہوتے ہی اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اختلاف کا اظہار مسلمان میں ہوگا کہ جب وہ حج کرے، پھر مرتد ہو جائے اور پھر اسلام قبول کر لے۔ پس امام مالک نے فرمایا کہ اس پر حج کرنا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا پہلا حج ردت کے سبب ضائع ہو چکا ہے۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس پر حج کا اعادہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ابھی اس کے عمل باقی ہیں۔

ہمارے علماء نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے)

انہوں نے کہا: یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعاً ردت کا پایا جانا محال ہے۔

اور امام شافعی کے اصحاب نے کہا ہے: بلکہ امت پر بطریق تغلیظ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شرف مرتبہ کے باوجود اگر شرک کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ لیکن آپ اپنے مرتبہ کے فضل و شرف کے سبب شرک نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: ۳۰) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔) اور یہ ان کے شرف مرتبہ کے سبب ہے۔ ورنہ ان سے اس قسم کے فعل کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان کے زوج مکرم و معظم کی حفاظت و صیانت کی خاطر، یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی دونوں شرطوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر خلود فی النار کی جزا کو معلق کیا ہے۔ پس جو کوئی کفر پر قائم رہا اللہ تعالیٰ اس آیت کے مطابق اسے ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 147

جس کسی نے شرک کا ارتکاب کیا دوسری آیت کے مطابق اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پس یہ دونوں آیتیں دو معنوں اور دو مختلف حکموں کے لئے مفید ہیں اور جو خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے تو وہی آپ کی امت کے لئے ہے تا کہ آپ کا اختصاص ثابت ہو جائے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے وارد ہے، تو بلا شبہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تا کہ وہ یہ واضح کر دے کہ اگر ایسا تصور بھی کیا جائے تو یقیناً اس میں دو بے عزتیاں ہیں۔ اس میں ایک حرمت دین کی ہتک ہے اور دوسری حرمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہے اور ہر حرمت کی ہتک پر عقاب اور سزا ہے۔ اور یہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا جس نے شہر حرام میں، یا بلد حرام میں، یا مسجد حرام میں گناہ اور نافرمانی کا ارتکاب کیا اور جتنی حرمتوں کو اس نے پامال کیا ان کی تعداد کے مطابق اس پر عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11**۔ مرتد کی میراث میں علماء کا اختلاف ہے:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حسن، شعبی، حکم، لیث، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہے۔

امام مالک، ربیعہ، ابن ابی لیلیٰ، شافعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس کی میراث بیت المال میں جائے گی۔ ابن شبرمہ، ابو یوسف، محمد اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ مرتد نے ردت کے بعد جو کچھ کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مرتد نے حالت ردت میں جو کچھ کمایا وہ مال فے ہے، اور حالت اسلام میں جو کچھ اس نے کمایا پھر مرتد ہو گیا تو اس کے وارث اس کے مسلمان ورثاء ہوں گے۔

لیکن ابن شبرمہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم دونوں امروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلق ارشاد گرامی لا وراثة بين اهل ملتين (دو دین رکھنے والوں کے درمیان کوئی وراثت نہیں) ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس کے کافر ورثاء اس کے وارث نہیں بنیں گے۔ لیکن آپ نے کہا ہے کہ وہ اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا الآیہ۔ جندب بن عبداللہ اور عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا ہے کہ جب واقد بن عبداللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا، تو مسلمانوں نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا۔ اور یہ خبر دی کہ ان کے لئے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے۔ انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پھر یہ آیت ہر اس کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا الی آخر الآیہ۔

اور ہجرت کا معنی ہے الانتقال من موضع الی موضع ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا اور دوسری جگہ کے لئے ایثار کرتے ہوئے پہلی کو ترک کرنے کا قصد کرنا۔ ہجر وصل کی ضد ہے۔ (کہا جاتا ہے) هَجرہ هَجْرا و هِجرانا (فلاں نے اسے چھوڑ دیا) اور اس کا اسم الهِجرة ہے۔ اور المهاجرة من ارض الی ارض کا معنی ہے دوسری جگہ کے لئے پہلی کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور التهاجُر کا معنی التقاطع (باہمی مقاطعہ کرنا، تعلق توڑ دینا) ہے۔

اور جس نے المهاجرة کی تعریف یہ کی ہے الانتقال من البادية الی الحاضرة یعنی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونا تو اس نے اس سبب سے یہ وہم دلایا ہے کیوں کہ عرب میں اغلباً ایسا ہی ہوا ہے اور اس قول کے مطابق اہل مکہ مہاجرین نہیں ہیں۔

اور رہا جاهد تو یہ جَهد سے باب مفاعلہ ہے، جب کوئی پوری کوشش اور محنت صرف کر دے (اس کا مصدر) مجاہدۃ و جہادا ہے۔ اور اجتہاد اور تجاہد کا معنی ہے بذل الوسع والمجهود پوری طاقت، صلاحیت اور محنت کو صرف کر دینا۔ اور الجَهاد بالفتح کا معنی ہے: سخت اور مضبوط زمین۔ اور وَیَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ طمع اور حرص رکھتے ہیں اور حصول قرب کے متمنی ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یَرْجُوْنَ کا کلمہ ان کی مدح اور تعریف میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ جنت کی طرف جائے گا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں آخری حد کو پہنچا ہوا ہو، اس کے دو سبب ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کون سے عمل پر ہوگا اور دوسرا یہ ہے: تاکہ وہ اپنے عمل پر توکل اور بھروسہ نہ کرلے۔

اور رجا (امید) عام ہوتی ہے اور رجا کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ خوف کے ساتھ رجا (امید) ہوتی ہے۔ گویا رجا ایک طویل اور وافر امید کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے: رجوتِ فلانا رجوا و رجاء و رجاوة (میں فلاں سے امید باندھے ہوئے ہوں) کہا جاتا ہے: ما أتیتك الا رَجَاوَةَ الخیر (میں تیرے پاس فقط خیر اور بھلائی کی امید لے کر آیا) اور ترجیته وارتجیته اور رجیته یہ سب رجوتُه کے معنی میں ہیں۔ بشر نے اپنی بیٹی کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

فَرَجِّي الخیرَ وانتظری اِیابی ۔۔۔ اِذا ما القارِظُ العَنَزِیُّ آبَا

اس میں ترجی امید کے معنی میں ہی مذکور ہے، یعنی تو خیر اور بھلائی کی امید رکھ اور میرے لوٹنے کا انتظار کر۔

و ما لی فی فلان رجیّة۔ ای ما ارجو، یعنی میں فلاں کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔ اور کبھی الرجو اور الرجاء خوف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ (سورۃ نوح) یعنی کیا ہے تمہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں ڈرتے نہیں۔

ابوذؤیب نے کہا ہے:

إذا لسعته النحلُ لم یَرْجُ لَسْعَها ۔۔۔ و خالفَها فی بَیت نُوبٍ عواملِ

اس میں لم یرجُ خوف اور ڈر کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی جب شہد کی مکھی نے اسے ڈسا تو اسے اس کے ڈسنے کا کوئی خوف اور پرواہ نہ ہوئی۔

اور الرجا الف مقصورہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کنوئیں کی طرف اور اس کے دونوں کنارے اور ہر طرف اور کنارہ رَجا کہلاتا ہے (1)۔ لوگوں میں سے عوام اس قول میں خطا کر جاتے ہیں: یا عظیم الرجا، کہ وہ اسے الف مقصورہ کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ کہ الف ممدودہ کے ساتھ۔ (یعنی اسے مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔)

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَاؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَۙ﴿۲۱۹﴾

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔ اور پوچھتے ہیں آپ سے: کیا خرچ کریں؟ فرمائیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو تا کہ تم غور و فکر کرو۔''

ارشاد باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ یَسْـَٔلُوْنَكَ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور الخمر خَمَرَ سے ماخوذ ہے جبکہ وہ ڈھانپ لے، چھپا لے۔ اور اسی سے خمار المرأۃ عورت کی اوڑھنی اور دوپٹہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو کسی شے کو ڈھانپ لے تو کہا جاتا ہے: فقد خَمَرَہ اور اسی سے خَمِّرُوْا آنیتکم ہے (2) (تم اپنے برتن ڈھانپ لو) اور خمر (شراب) عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے گھنے درخت کو الخَمَر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے نیچے والی شے کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسے چھپا لیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اخمرتِ الأرضُ کَثُرَ خَمَرُھا (زمین نے ڈھانپ لیا اس کے درخت زیادہ ہو گئے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَلَا یَا زَیْدُ والضحاکَ سِیْرَا فقد جاوزتما خَمَرَ الطَّرِیْقِ

خبردار! اے زید اور ضحاک! دونوں چلو (خوب تیز چلو) تحقیق تم راستے کے درختوں سے گزر چکے ہو۔

یعنی تم ہمت اور جرأت کے ساتھ چلو، تحقیق تم نے اس نشیبی زمین کو عبور کر لیا ہے جہاں بھیڑیے وغیرہ چھپے رہتے ہیں۔ عجاج ایک لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جو جھنڈوں اور لشکروں کے ساتھ بغیر کسی کمزوری کے چل رہا ہے:

فی لامع العِقبان لایمشی الخَمَر یُوجّه الارضَ ویستاقُ الشجر

اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: دخل فی غُمَار الناس و خُمارھم وہ لوگوں کی جماعت اور ان کی بھیڑ میں داخل ہوا۔ یعنی وہ خوفناک جگہ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ شراب (خمر) عقل کو چھپا لیتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے اس وجہ سے اسے خمر کا نام دیا جاتا

1۔ الصحاح مادہ ''رجا''

2۔ بخاری شریف، باب خمس من الدواب الخ، حدیث نمبر 3069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خمر کو خمر کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے پا لیا جیسا کہ کہا جاتا ہے: اختمر العجین یعنی وہ اپنے ادراک کو پہنچ گیا۔ وخُمِر الرأی، یعنی رائے چھوڑ دی گئی یہاں تک کہ اس میں وجہ ظاہر ہو گئی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ خمر کو خمر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عقل کو خلط ملط کر دیتی ہے۔ یہ المخامرہ سے ہے اس کا معنی ہے المخالطة (باہم خلط ملط ہو جانا) اسی سے ان کا یہ قول ہے: دخلتُ فی خُمار الناس یعنی میں لوگوں کے ساتھ مل جل گیا۔ نتیجتاً تینوں معانی بالکل قریب قریب ہیں۔ پس خمر کو پہلے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے (نشہ کو) پا لیا، پھر اس نے عقل کو خلط ملط کر دیا، پھر اسے ڈھانپ دیا تو گویا اس میں اصل معنی الستر (ڈھانپنا) ہوا۔

اور الخمر: یہ انگور کا وہ پانی ہے جو ابل جائے یا اسے پکایا جائے اور اس کے علاوہ جو شے بھی عقل کو ماؤف کر دے گی تو وہ اسی کے حکم میں ہو گی، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ہر قسم کا جوا حرام ہے۔ اور بلاشبہ ان میں سے ذکر صرف میسر کا کیا گیا ہے۔ تو حکماً تمام اقسام کو میسر پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ حالانکہ میسر صرف وہ جوا ہوتا ہے جو جزر (ذبح شدہ اونٹ) میں ہو۔ تو اسی طرح ہر وہ شے جو خمر کی طرح ہو گی تو وہ اسی کے قائم مقام ہو گی (یعنی حکم تمام کا ایک ہو گا۔)

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور امت کا نظریہ یہ ہے کہ انگور کی شراب کے علاوہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اور اسے پینے کی صورت میں حد واجب ہو گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہم اور فقہاء کوفہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: انگور کی شراب کے علاوہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حلال ہے، لہٰذا اس کے سبب جو کوئی نشہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ نشے کی حد تک پہنچنے کا اس نے قصد اور ارادہ نہ کیا تو اس پر حد شرب نہ ہو گی۔ یہ قول ضعیف ہے۔ عقل و خبر (نقل) اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ المائدۃ اور النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 3**۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے عزت و کرامت اور بر و احسان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑی مگر وہ اس امت کو عطا فرمائی ہے، اس کے احسان اور کرامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ان پر تمام احکام شرعیہ کو یکبارگی واجب نہیں کیا بلکہ ان پر تدریجاً اور یکے بعد دیگرے احکام نازل فرمائے، پس شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی طرح نازل ہوا۔ اور یہی پہلی آیت ہے جو شراب کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی، پھر اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء:42) (تم نماز کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم نشہ میں ہو) پھر فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۞ (المائدہ) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟) پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدہ:90) (یہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو ان سے بچو)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمَیْسِرُ اس سے مراد عرب کا جوا ہے جو تیروں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنی بیوی اور مال کی شرط لگا دیتا تھا پھر جو کوئی جوئے میں اپنے ساتھی پر غالب آجاتا وہ اس کا مال اور اس کی بیوی لے جاتا تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرات مجاہد، محمد بن سیرین، حسن، ابن مسیب، عطا، قتادہ، معاویہ ابن صالح، طاؤس، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی بیان کیا ہے: ہر وہ کھیل جس میں قمار (جوا) ہو چاہے چوسر ہو یا شطرنج وغیرہ سو وہ جوا (میسر) ہی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور نرد کے مہروں کے ساتھ کھیلنا بھی۔ سوائے ان کے جن میں اس کو مباح قرار دیا گیا ہے مثلاً گھوڑ دوڑ میں مقابلہ اور حقوق کی تقسیم اور علیحدگی کے لئے قرعہ اندازی کرنا وغیرہ...... تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج عجم کا جوا ہے اور ہر وہ کھیل جس کے ساتھ شرط لگائی جائے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کے نزدیک میسر (جوا) ہے (1)۔ اس کا بیان کچھ اضافے کے ساتھ سورۂ یونس میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

المیسر یَسَرَ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے: کسی شے کا اپنے صاحب (جوا کھیلنے والے) کے لئے واجب اور لازم ہو جانا۔ کہا جاتا ہے: یَسَرَلی کذا جب کوئی شے کسی کے لئے واجب اور ثابت ہو جائے تب وہ یہ کہہ سکتا ہے یَسَرَلی کَذَا (میرے لئے اتنی شے ثابت ہوگئی) اس کا باب اس طرح چلتا ہے یَسَرَ یَیْسِرُ یَسْرًا و مَیْسِرًا۔ اور یاسر سے مراد تیروں کے ساتھ کھیلنے والا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَأَعِنْهُمْ وَایْسِرْ بِمَا یَسَرُوا بِهٖ ‏ ‏ ‏ ‏ وَ إِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

اور ازہری نے کہا ہے کہ المیسر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر وہ جوا میں شرط لگاتے تھے۔ ان کا نام میسر اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں اجزاء کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ محل تقسیم ہے اور ہر وہ شے جسے تو تقسیم کر دے (اس کے لئے تو کہہ سکتا ہے) یسرته۔ اور الیاسر کے معنی میں اصل یہی ہے۔ پھر تیروں کے ساتھ کھیلنے والوں اور اونٹوں پر شرط لگا کر جوا کھیلنے والوں کو یاسرون کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہی تقسیم کرنے والے ہیں جبکہ وہ اس تقسیم کا سبب ہیں اور الصحاح میں ہے: یَسَرَ القوم الجزور۔ یعنی قوم نے اونٹوں کو ذبح کیا اور ان کے اعضاء کو تقسیم کیا۔ سحیم بن وثیل یربوعی نے کہا ہے:

اقولُ لهم بالشِّعب اذ یَیْسِرُوننی ‏ ‏ ‏ ‏ ألم تَیْأَسُوا أنی ابنُ فارِسِ زَهْدَمِ

میں نے انہیں گھاٹی میں جا کر کہا جبکہ وہ مجھے قیدی بنا کر لے جا رہے تھے کیا تم جانتے نہیں میں زہدم گھوڑے کے شہسوار کا بیٹا ہوں۔

اسے قیدی بنایا گیا تھا اور اسے تیر مارے گئے تھے اور جب کوئی قوم باہم شرط اور بازی لگانے لگ جائے تو کہا جاتا ہے یَسَرَ القوم اور رَجُلٌ یَسَرٌ وَ یَاسِرٌ دونوں کا ایک ہی معنی ہے (یعنی شرط اور بازی لگانے والا آدمی جوا باز) اور اس کی جمع ایسار

1۔ ابن ابی حاتم فی تفسیر، جلد 2، صفحہ 390

ہے۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

انی أُتمم أیساری وامنحهم　　مثنی الأیادی واُکسُو الجفنةَ الأُدمَا

اور طرفہ نے کہا ہے:

و هم أیسارُ لقمانَ إذا　　أغلَتِ الشَّتْوَةُ أبداءَ الجُزُرْ

جو اونٹوں کے ذبح کرنے کو مباح قرار دیتا وہ ان کے نزدیک قابل تعریف ہوتا تھا، شاعر نے کہا ہے:

و ناجیةٍ نحرتُ لقومِ صدقٍ　　و ما نادیتُ أیسارَ الجزور

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں داؤد بن حصین سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اہل جاہلیت کا جوا یہ تھا کہ وہ گوشت کی بیع ایک یا دو بکریوں کے عوض کرتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے جمہور اصحاب کے نزدیک اس کا اطلاق جنس واحد میں ہوتا ہے، (یعنی) ایک حیوان کی اس کے گوشت کے عوض بیع ہو اور یہ ان کے نزدیک بیع مزابنہ (☆)، غرر (☆☆) اور قمار کے باب سے ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کیا حیوان میں اس گوشت کے برابر گوشت ہے جو اس نے بدلے میں دیا ہے یا اس سے کم ہے یا اس سے زیادہ ہے اور گوشت کی بیع گوشت کے عوض متفاضلاً جائز نہیں ہوتی (یعنی جب مقدار برابر نہ ہو تو بیع جائز نہیں ہوتی۔)

پس حیوان کی بیع گوشت کے عوض کرنا اس گوشت کی بیع کی طرح ہے جو اس کی جلد میں چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ یہ دونوں ایک جنس سے ہوں اور آپ کے نزدیک جنس واحد اونٹ، گائیں، ریوڑ (بھیڑ بکریاں) ہرن، پہاڑی بکرے اور تمام وحشی جانور اور وہ تمام چار ٹانگوں والے جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے وہ آپ کے نزدیک ایک جنس ہیں۔ لہٰذا ان تمام اصناف و اجناس میں سے کسی حیوان کی بیع اس کے گوشت میں سے کسی شے کے ساتھ کسی بھی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ آپ کے نزدیک بیع مزابنہ کے باب سے ہے، جیسا کہ کشمش کی بیع کرنا انگور کے ساتھ، زیتون کی بیع کرنا اس کے تیل کے ساتھ اور تلوں کے تیل کی بیع کرنا تلوں کے ساتھ اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔

اور آپ کے نزدیک تمام پرندے ایک جنس ہیں اور اسی طرح تمام مچھلیاں ایک ہی جنس سے ہیں اور آپ سے یہ مروی ہے کہ اکیلے مکڑی ایک صنف (قسم) ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، حضرت لیث اور ابن سعد نے کہا ہے: گوشت کی بیع کرنا حیوان کے عوض کسی حال

☆ المزابنہ: بیع مزابنہ سے مراد درخت پر لگی ہوئی کچی کھجوروں کی پکی کھجوروں کے عوض اندازے سے بیع کرنا ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر وہ اندازہ جس کا کیل، عدد اور وزن معلوم نہ ہو اس کی بیع کی جائے کسی معینہ کیلی، وزنی اور عددی شے کے ساتھ یا ایک ہی جنس میں سے معلوم شے کی مجہول کے ساتھ بیع کرنا یا مجہول کی بیع مجہول کے عوض کرنا جبکہ جنس ایک ہو۔

☆☆ الغرر: مچھلی ابھی پانی میں ہو اور پرندہ ابھی ہوا میں ہو اس کی بیع کرنا بیع الغرر ہے۔ الختصر ہر وہ بیع جس میں مشتری کے لئے دھوکے کا احتمال ہو وہ اسی زمرہ میں داخل ہوگی۔

میں جائز نہیں ہے، چاہے وہ ایک جنس سے ہوں یا دو مختلف جنسوں سے۔ کیونکہ حدیث طیبہ عام ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اونٹ ذبح کیے گئے اور انہیں دس اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تو ایک آدمی نے کہا: تم ان میں سے ایک جز ایک بکری کے عوض مجھے دے دو تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی یہ درست نہیں ہے)۔ امام شافعی نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرام کی رائے کے خلاف عمل کیا ہو۔

ابوعمر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے گوشت کے عوض بکری کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ روایت قوی نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری عن یحییٰ بن سعید کی سند سے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ آپ اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ کسی زندہ کی بیع مردہ کے عوض کی جائے، یعنی ذبح کی ہوئی بکری کی بیع زندہ کھڑی بکری کے عوض کی جائے۔

حضرت سفیان نے کہا ہے: ہم اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ مزنی نے کہا ہے: اگر گوشت کے عوض حیوان کی بیع کے بارے میں حدیث طیبہ صحیح نہیں ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور اگر حدیث صحیح ہے تو پھر قیاس باطل ہے اور حدیث کی اتباع کی جائے گی۔

ابوعمر نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں کے پاس اس بارے میں قیاس اور اعتبار کی جہت سے کثیر دلائل موجود ہیں کہ حیوان کے عوض گوشت کی بیع کرنا جائز ہے، مگر یہ کہ جب حدیث صحیح ہوگی تو قیاس و نظر باطل ہوگا۔

اور مالک نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوشت کے عوض حیوان کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: اس حدیث کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ اس کا اتصال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو اور اس کی اسانید میں سے احسن حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اصل یہ ہے کہ آپ مرسل روایات کو قبول ہی نہیں کرتے، مگر گمان یہ ہے کہ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی مراسیل کو تلاش کیا اور انہیں پالیا یا ان میں سے اکثر کو صحیح قرار دیا۔ پس ظاہر حدیث اور عموم حدیث کی بنا پر انواع حیوان کی گوشت کی انواع کے ساتھ بیع کرنا مکروہ ہے کیونکہ کوئی ایسی حدیث نہیں جو اسے خاص کر رہی ہو اور نہ ہی اجماع ہے۔ اور آپ کے نزدیک نص کی تخصیص قیاس کے ساتھ کرنا جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حیوان ہر اس جانور کا نام ہے جو خشکی یا پانی میں زندگی گزار رہا ہو اگرچہ اس کی اجناس مختلف ہیں، جیسا کہ طعام ہر اس شے کا نام ہے جو کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيْهِمَآ یعنی خمر اور جوئے میں اِثْمٌ كَبِيْرٌ بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب کا گناہ وہ ہے جو پینے والے سے صادر ہوتا ہے مثلاً باہم ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، گالی گلوچ دینا، فحش گوئی اور جھوٹا قول اور اس کی عقل کا زائل ہو جانا جس کے ساتھ وہ ان امور کو پہچانتا ہے جن کی ادائیگی اپنے خالق کے لئے واجب ہوتی ہے، نمازوں کو چھوڑ دینا اور اللہ

تعالیٰ کے ذکر سے رک جانا وغیرہ۔

امام نسائی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: شراب سے اجتناب کرو کیونکہ یہ ام الخبائث ہے، تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار تھا۔ پس ایک گمراہ عورت اس سے حاملہ ہوگئی۔ اس نے اس آدمی کی طرف اپنی لونڈی کو بھیجا اور اس نے اسے کہا: بے شک ہم تجھے شہادت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ اس لونڈی کے ساتھ چل پڑا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ جونہی وہ دروازے کے اندر داخل ہوا، تو اس نے دروازہ بند کر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک خوبرو عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ساتھ ہی شیشہ کے برتن میں شراب پڑی تھی۔ تو اس عورت نے کہا: قسم بخدا! میں نے تجھے شہادت کے لئے نہیں بلایا، بلکہ میں نے تجھے اس لئے دعوت دی ہے تاکہ تو میرے ساتھ بدکاری کرے، یا شراب کا یہ جام پیے یا پھر اس بچے کو قتل کر دے۔ اس آدمی نے کہا: تو مجھے شراب کا یہ جام پلا دے۔ چنانچہ اس نے وہ جام اسے پلا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اور پلاؤ۔ پس وہ پیتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی کر لیا اور اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ پس تم شراب سے بچو۔ کیونکہ قسم بخدا! ایمان اور شراب پر دوام یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قریب ہی ان میں سے ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے، ابو عمر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ اعشیٰ جب اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف جانے لگا تو کچھ مشرک لوگ اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اسے کہا: تو کہاں جا رہا ہے؟ تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، تو انہوں نے کہا: تو ان سے نہ مل، کیونکہ وہ تجھے نماز کے بارے حکم ارشاد فرمائیں گے۔ اس نے جواب دیا: بلاشبہ رب تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے۔ تو انہوں نے پھر کہا: بلاشبہ وہ تجھے فقراء کو مال دینے کا حکم دیں گے۔ تو اس نے جواب دیا: نیکی کا عمل کرنا واجب ہے۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو زنا سے منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا: یہ عمل عقلاً انتہائی فحش اور قبیح ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ تب اس نے کہا: کیا ایسا بھی ہے؟ میں تو اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ واپس لوٹ گیا اور کہا: میں ایک سال تک شراب پیوں گا پھر آپ کی طرف لوٹ جاؤں گا، لیکن وہ اپنے گھر تک نہ پہنچ سکا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے گرا، اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا(1)۔

قیس بن عاصم منقری دور جاہلیت میں بہت زیادہ شراب پیتا تھا پھر اس نے اپنے اوپر اسے حرام کر دیا اور اس کا سبب یہ بنا کہ اس نے نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے پیٹ کی سلوٹوں کو ٹٹولا اور اپنے والدین کو گالیاں دیں، اس نے چاند کو دیکھا تو اس کے بارے میں بھی کچھ (نازیبا) کلمات کہے اور شراب بنانے والے کو اپنا بہت سامال دے دیا، جب اس کا نشہ اترا اور اسے اس کے بارے خبر ہوئی تو اس نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا اور اس کے بارے وہ کہتا ہے:

رایت الخمرَ صالحةً و فیها　　خصالٌ تُفسِد الرجلَ الحلیما

1۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 203

میں نے شراب کو اچھا دیکھا تھا حالانکہ اس میں ایسی خصال بھی ہیں جو حلیم آدمی کو خراب کر دیتی ہیں۔

فلا واللہ اشربُھا صحیحا ولا اشفی بھا أبدا سقیما

قسم بخدا! میں اسے حالت صحت میں نہیں پیوں گا اور نہ ہی کبھی بیماری کی حالت میں اس سے علاج کروں گا۔

ولا أعطی بھا ثمنا حیاتی ولا أدعو لھا أبدا ندیما

میں اس کے عوض اپنی حیات بطور ثمن ادا نہیں کروں گا اور نہ میں اس کے لئے کبھی شراب پینے والے ساتھی کو بلاؤں گا۔

فإن الخمر تفضح شاربیھا و تجنیھم بھا الأمر العظیما

کیونکہ شراب اپنے پینے والے کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور انہیں بہت بڑے گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اور ابن عرابی نے المفضل الضبی سے روایت کیا ہے کہ یہ اشعار ابو محجن ثقفی کے ہیں اس نے شراب چھوڑنے کے وقت یہ کہے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ یہ کہہ رہے ہیں:

اذا مُتُّ فادفنّی إلی جَنْب کَرْمَۃٍ تروّی عظامِی بعد موتی عُروقُھا

جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے انگور کی بیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو تراوت دیں گی۔

ولا تَدْفِنَنِّی بالفَلاۃ فاننی أخاف اذا ما مِتُّ أن لا أذُوقَھا

اور تم مجھے صحرا میں دفن نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ جب میں مر جاؤں تو اسے نہ چکھ سکوں گا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں کئی بار حد شرب کے کوڑے لگائے اور انہیں سمندر میں ایک جزیرہ کی طرف جلاوطن کر دیا، پس وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف انہیں قید کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کر لیا اور یہ انتہائی بہادر شہسواروں میں سے ایک تھے، جب یہ جنگ قادسیہ میں آپ کے حکم سے شریک ہوئے تو معروف یہی ہے کہ آپ نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور فرمایا: ہم کبھی بھی تمہیں شراب پینے پر کوڑے نہیں لگائیں گے۔ تو ابو محجن نے کہا: قسم بخدا! میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا، پھر اس کے بعد کبھی بھی شراب نہیں پی۔ اور ایک روایت میں ہے: میں شراب پیتا تھا جب مجھ پر حد قائم کی جاتی تو میں اس سے پاک ہو جاتا تھا اور جب تم نے مجھ سے حد ساقط کر کے مجھے ہدر چھوڑ دیا ہے تو قسم بخدا! میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ ہیثم بن عدی نے بیان کیا ہے کہ اسے اس نے خبر دی ہے جس نے آذر بیجان میں ابو محجن کی قبر دیکھی ہے یا کہا: جرجان کے نواح میں اس حال میں کہ اس پر بیل کی تین جڑیں اگی ہوئی ہیں۔ وہ خوب بڑھی ہوئی ہیں اور وہ پھل بھی دیتی ہیں اور وہ ان کی قبر پر بچھی ہوئی ہیں اور ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا ہے ھذا قبر ابی محجن (یہ ابو محجن کی قبر ہے)۔ اس نے کہا کہ میں نے اس پر خوب تعجب کیا اور مجھے ان کا یہ قول یاد آ گیا اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃ۔

بلاشبہ شراب پینے والا اہل عقل کے لئے تمسخر بن جاتا ہے اور وہ اپنے پیشاب اور نجاست کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے اور بسا

اوقات وہ اپنے چہرے پہ ملنے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض کو اس حالت میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو پیشاب سے دھو رہا ہوتا ہے اور یہ کہہ رہا ہوتا ہے: اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین اور بعض کو اس حال میں دیکھا گیا ہے کہ کتا اس کے چہرے کو چاٹ رہا ہوتا ہے اور وہ اسے کہہ رہا ہوتا ہے: اکرمك اللہ۔ اور رہا جوا! تو یہ تو عداوت اور بغض کا وارث بناتا ہے کیونکہ یہ کسی غیر کا مال باطل طریقے سے کھانے کا نام ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ شراب میں تاجروں کے لئے نفع ہے کیونکہ وہ اسے شام سے سستے داموں خرید کر لاتے تھے اور حجاز میں منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتے تھے اور وہ اس میں کوئی تنگی نہیں دیکھتے تھے کیونکہ شراب کا طالب اسے مہنگے داموں خرید لیتا ہے۔ شراب کے منافع کے بارے جو کچھ کہا گیا ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اور اس کے منافع کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شراب کھانے کو ہضم کرنے میں معاون ہوتی ہے، ضعف اور کمزوری کو قوت دیتی ہے، قوت مردانگی میں معاون ہوتی ہے، بخیل کو سخی بناتی ہے، بزدل کو بہادر اور دلیر بناتی ہے اور رنگ کو صاف کرتی ہے، علاوہ ازیں لذت کا کام بھی دیتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

و نشربھا فتترکنا ملوکًا　　وأُسْدًا ما یُنَھْنِھنا اللقاءُ

اور ہم اسے پیتے ہیں اور یہ ہمیں ایسا بادشاہ اور شیر بنا کر چھوڑتی ہے کہ حملہ آور لشکریوں کو ہم سے روک دیتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی راحتیں اور خوشیاں ہیں۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

فاذا شربت فاننی　　ربُّ الخَوَرْنَقِ والسَّدیر

جب میں شراب پیتا ہوں تو میں خورنق اور سدیر (نعمان اکبر بن امرؤ القیس کا محل جو عراق میں تھا) کا مالک ہوتا ہوں۔

واذا صَحَوْتُ فاِننی　　ربُّ الشُّوَیْھَۃِ وَالْبَعِیْرِ

اور جب میں نشے میں افاقہ پالیتا ہوں تو میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوتا ہوں۔

اور جوئے کے منافع میں سے یہ ہے کہ اس میں بغیر کسی کدو کاوش اور محنت کے ایک چیز انسان کی طرف لوٹ آتی ہے، پس وہ اونٹ خریدتے ہیں اور اپنے تیر ڈالتے ہیں، جس کا تیر نکل آئے گوشت سے اس کا حصہ لے لیا جاتا ہے اور اس پر کوئی ثمن وغیرہ نہیں ہوتے اور جس کا تیر آخر میں باقی رہ جائے اس پر تمام اونٹوں کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور اس کے لئے گوشت میں سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جوئے کی منفعت محتاج لوگوں پر وسعت و خوشحالی کا آنا ہے کیونکہ لوگوں میں سے جو جوا کھیلتا تھا وہ اونٹوں کا گوشت نہیں کھاتا تھا بلکہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

جوئے کے تیر گیارہ تیر ہوتے، ان میں سے سات کے لئے حصص ہوتے اور ان میں حصوں کی تعداد کے مطابق مقررہ چیز لازم ہوتی اور وہ یہ ہیں: الفذ اس میں ایک علامت ہوتی اور اس کے لئے ایک حصہ ہوتا اور ناکامی کی صورت میں اس پر ایک حصہ لازم ہوتا۔ دوسرا التوأم ہے۔ اس میں دو علامتیں ہوتی اور اس کے لئے دو حصے ہوتے اور اس پر دو حصے لازم ہوتے، تیسرا

الرقیب ہے۔اس میں تین علامات ہوتیں اسی ترتیب پر جو ہم نے پہلے بیان کردی ہیں۔ چوتھا الحلس ہے۔اس کے لئے چار علامات ہوتیں۔ پانچواں النافذ ہے۔اس کا نام النافس بھی ہے۔اس کے لئے پانچ علامات ہوتیں۔ چھٹا المسبل ہے۔اس کے لئے چھ علامات ہوتیں اور ساتواں المعلی ہے۔اس کے لئے سات علامات ہوتیں۔اس طرح یہ اٹھائیس حصص ہوتے اور اصمعی کے قول کے مطابق اونٹوں کے حصص بھی اسی طرح ہوتے اور تیروں میں سے ابھی چار باقی ہیں۔ان پر کوئی علامت نہ ہوتی اور نہ ہی فروض اور انصباء میں سے کوئی ان کے لئے ہوتا اور وہ یہ ہیں: المصدر، المضعف، المنیح اور السفیح۔اور یہ بھی کہا گیا ہے: باقی تین تیر بغیر علامت کے ہیں وہ یہ ہیں السفیح، المنیح اور الوغد۔اس پر تیروں کی کثرت کی وجہ سے ان تینوں کا اضافہ کیا جاتا جو انہیں حرکت دیتا اور کسی کی طرف میلان کا وہ کوئی راستہ نہ پاتا۔اور تیروں کو حرکت دینے والے کو المفیض الضارب اور الضریب کا نام دیا جاتا۔اور جمع الضرباء آتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرکت دینے والے کے پیچھے ایک تاکنے والا بھی رکھا جاتا تاکہ وہ کسی کی طرفداری نہ کرے، پھر ضریب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور کپڑے کے ساتھ مکمل طور پر لپٹ جاتا اور اپنا سر باہر نکالتا اور اپنا ہاتھ ربابہ (ترکش کی مانند تیر جمع کرنے کا برتن) میں داخل کرتا اور تیر نکالتا۔اور عربوں کی عادت تھی کہ وہ موسم سرما میں وقت کے تنگ ہونے اور فقراء پر سردی اور حالات کے سخت ہونے کی حالت میں انہی تیروں کے ساتھ اونٹوں کو تقسیم کرتے تھے۔اونٹ خریدے جاتے تھے اور خوشحال اور امیر لوگ ان کی قیمت کے ضامن ہوتے تھے اور ان کا مالک اپنے حق سے دستبردار ہوجاتا اور وہ اس کے ساتھ فخر کرتے تھے اور جو ان میں سے اس طرح نہ کرتا وہ اس کی مذمت کرتے تھے اور وہ اسے البرَم کا نام دیتے تھے۔ متمم بن نویرہ نے کہا ہے:

ولا بَرَمًا تُهدِی النساءُ لعرسه　　　اذا القَشْعُ من بَرْدِ الشتاء تَقَعْقَعَا

پھر اونٹ ذبح کیے جاتے اور انہیں دس اقسام پر تقسیم کردیا جاتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اونٹوں کی تقسیم میں اصمعی نے خطا کی ہے۔انہوں نے ذکر کیا ہے کہ تیروں کے حصص کی مقدار کے مطابق ان کے بھی اٹھائیس حصے کیے جاتے، حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ پھر وہ دس پر تقسیم کرتا۔پس جو کوئی ربابہ سے پہلے اپنا تیر نکالنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ اپنے حصص لے لیتا اور فقراء کو عطا کردیتا۔اور ربابہ سے مراد ترکش کے مشابہ (برتن) ہے جس میں جوئے کے تیر جمع کیے جاتے ہیں۔اور بسا اوقات انہوں نے تمام تیروں کو ربابہ کا نام دیا ہے۔ابو ذؤیب نے گدھے اور گدھیوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وکأنهن رِبابَةٌ و کأنه　　　یَسَرٌ یُفیض علی القِداح و یَصْدَعُ

اور ربابہ کا معنی عہد اور میثاق بھی ہے۔شاعر نے کہا ہے:

وکنتُ امْرَأً أفضتْ الیكَ رِبَابَتِیْ　　　وَ قَبْلَكَ رَبَّتْنِی فَضِعتُ رُبُوْبُ

اور بعض قبائل میں وہ بسا اوقات اپنی ذاتوں کے لئے جوا کھیلتے پھر دشمن کی چٹی اسی پر ہوتی جو اپنے تیر میں کامیاب نہ ہوتا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔اور اسی طریقے پر قبیلے کے فقراء زندگی گزارتے تھے۔اسی کے مطابق اعشیٰ کا قول ہے:

المطعمو الضیف اذا ماشتَوا والجاعِلو القوتِ علی الیاسَرِ

اور ایک دوسرے کا قول ہے:

بایدیھمُ مَقْرومۃٌ و مَغالِق یعودُ بأرزاق العُفاۃ مَنِیحُھا

اس شعر میں المنیح سے مراد المستمنَح (عطیہ) ہے کیونکہ وہ لوگ وہ تیر عاریۃً لے لیتے تھے جو باعث نجات ہوتا اور اس کی کامیابی وافر ہوتی۔ اس لئے یہ قابل تعریف اور پسندیدہ منیح ہے۔ اور رہا وہ منیح جو بے علامت تیروں میں سے ایک ہے تو اسے انکار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اخطل نے اپنے اس شعر میں اسی کا ارادہ کیا ہے:

و لقد عَطَفْنَ علی فزارۃ عطفۃً کَرَّ الْمَنِیحِ و جُلنَ ثَمَّ مَجالا

اور الصحاح میں ہے: المنیح جوئے کے ان تیروں میں سے ہے جس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے مالک کو کوئی شے عطا کر دی جائے۔ اور جوئے سے متعلق لبید کا قول ہے:

اذا یَسَروا لم یُورِث الیُسْرُ بینھم فواحشَ یُنْعَی ذکرُھا بالمصایف

یہ سب کا سب جوئے کا نفع ہے مگر یہ کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے کہ ان کا گناہ نفع سے کہیں زیادہ اور بڑا ہے اور آخرت میں ضرر اور نقصان کی طرف زیادہ لوٹانے والے ہیں۔ پس گناہ کبیر ان کی تحریم کے بعد ہے اور منافع تحریم سے پہلے کے ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے کثیر ثاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پر لعنت کی ہے اور اس کے ساتھ مزید دس پر لعنت کی ہے: اسے فروخت کرنے والے پر، اسے خریدنے والے پر اور اس پر جس کے لئے خریدی جائے اور اس پر جس نے اسے کشید کیا اور اس پر جس کے لئے کشید کیا گیا، اسے پلانے والے پر، اسے پینے والے پر، اسے اٹھانے والے پر، اس پر جس کے لئے شراب اٹھائی جائے اور اس کے ثمن کھانے والے پر (1) اور یہ بھی کہ منافع کو جمع ذکر کرنے کے ساتھ جمع الآثام ہی زیادہ حسین اور مناسب ہے اور لفظ کثیر یہ معنی ادا کر سکتا ہے۔

باقی قراء اور لوگوں میں سے جمہور نے کَبِیْرٌ پڑھا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جوئے اور شراب پینے میں جو گناہ ہے وہ کبائر میں سے ہے اور اسے کبیر کے ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور یہ بھی کہ ان کا اکبر پر اتفاق کرنا کبیر کے لئے دلیل اور حجت ہے۔ اور لفظ اکثر کے چھوڑنے پر تمام نے اجماع کیا ہے سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے، کیونکہ اس میں ہے: قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَثِیْرٌ۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْثَرُ دونوں مقامات پر با کی جگہ ثا ہے۔

---

1۔ ابن ماجہ، باب لعنت الخمر علی عشرۃ اوجہ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً ابوداؤد، باب العنب یعصر للخمر، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 9**۔ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: شراب اس آیت کے ساتھ حرام کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ (الاعراف: ۳۳)

(آپ فرمائیے: بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں ان سے اور جو پوشیدہ ہیں اور (حرام کر دیا) گناہ کو۔)

اور اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اس میں گناہ ہے اور وہ حرام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نظر و فکر عمدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں جو گناہ ہے وہ حرام ہے نہ کہ یہ بعینہا حرام ہے۔ یہ نظر و فکر اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور بعض نے کہا ہے: اس آیت میں شراب کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اثم کا نام دیا ہے اور اثم کو ایک دوسری آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ اور بعض نے کہا ہے: اثم سے مراد خمر (شراب) ہی ہے۔ اس پر دلیل شاعر کا یہ قول ہے:

شربتُ الإثم حتّی ضَلَّ عقلِي كذاكَ الإثمُ يَذهبُ بالعقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل گمراہ ہوگئی جس طرح کہ گناہ عقلوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول بھی عمدہ اور جید نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خمر کو اثم کا نام نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ اس نے کہا ہے: قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (یعنی آپ فرمائیے: ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے) یہ نہیں فرمایا قُلْ هُمَا اثمٌ كبير (کہ یہ دونوں بہت بڑا گناہ ہیں)

اور رہی سورۃ الاعراف کی آیت اور شعر تو ان دونوں کے بارے تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ اس آیت میں شراب کی مذمت ہے اور رہی اس کی تحریم تو وہ دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے اور وہ سورۃ المائدہ کی آیت ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ الْعَفْوَ جمہور کی قراءت نصب کے ساتھ ہے اور صرف ابو عمرو نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور حسن، قتادہ اور ابن ابی اسحاق کی قراءت رفع کے ساتھ ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا ہے: اگر ذا بمعنی الذی بنایا جائے تو پھر پسندیدہ رفع ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے اور نصب بھی جائز ہے اور اگر ما اور ذا کو ایک ہی شے قرار دیا جائے تو پھر پسندیدہ نصب ہے، اس معنی کی بنا پر کہ آپ فرما دیجئے: وہ عفو خرچ کریں۔ اور رفع بھی جائز ہے۔

اور علماء نحو نے بیان کیا ہے: ماذا تعلمت: أنحوا ام شعرا یعنی نصب اور رفع دونوں کے ساتھ۔ اس بنا پر کہ اس میں

دونوں اعراب جید اور حسن ہیں، مگر آیت میں تفسیر نصب کی بناء پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے کہا ہے: جب سابقہ آیت ارشاد باری تعالیٰ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ میں سوال نفقہ کے بارے ہے کہ وہ کس پر خرچ کیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور جواب بھی اس پر دال ہے اور جواب بھی سوال کے موافق ہی ظاہر ہوا ہے۔ اس آیت میں دوسرا سوال خرچ کرنے کی مقدار کے بارے ہے اور یہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ (البقرہ:215) انہوں نے کہا: میں کتنا خرچ کروں؟ تب یہ حکم نازل ہوا قُلِ الْعَفْوَ اور عفو کا معنی یہ ہے: ما سھل و تیسر و فضل و لم یشق علی القلب اخراجہ، یعنی وہ شی جو آسان ہو، میسر ہو، اور فالتو ہو اور اس کا نکالنا دل پر شاق نہ ہو۔

اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

خُذِی العفوَ منیّ تستدیمی مودّتی　　ولا تَنطِقی فی سَوْرَتی حین اغضبُ

تو عفو لے لے میری محبت کو ہمیشہ برقرار رکھ اور جب میں غصے میں ہوں تو میرے غصے کی حالت میں تو بات نہ کر۔

پس معنی یہ ہے کہ تم اپنی حاجات سے فالتو مال خرچ کر دو اور تم اس میں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا نہ کرو کہ تم محتاج اور فقیر ہو جاؤ۔ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی معنی زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ اور حضرات حسن، قتادہ، عطا، سدی، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: العفو ما فضل من العیال کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل وعیال سے فالتو ہو۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: صدقہ وہ ہے جو اس مال سے ہو جس کی حاجت نہ ہو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نے ضرورت سے زائد مال سے خرچ کیا اور دوسری حدیث میں ہے: ''بہترین صدقہ اس مال کا ہے جو ضرورت سے زائد ہو۔'' (1)

قیس بن سعد نے کہا ہے (2): اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے: نہیں بلکہ یہ نفلی صدقات ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کسی آدمی کے پاس سونا، چاندی یا اناج یا دودھ دینے والے جانور وغیرہ ہوتے تو وہ غور وفکر کرتا کہ ان میں سے کتنا مال اس کی اپنی ذات اور اس کے اہل وعیال کے خرچے کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس روک لیتا اور بقیہ تمام ساز و سامان صدقہ کر دیتا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو اپنے ہاتھ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ اپنی اور گھر والوں کی ایک دن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے مال اپنے پاس روک لیتا اور باقی ماندہ صدقہ کر دیتا حتیٰ کہ پھر آیت زکوٰۃ نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی اور ہر وہ صدقہ منسوخ ہو گیا جس کے بارے انہیں حکم دیا گیا تھا۔

---

1۔ بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، بخاری شریف، باب لا صدقہ الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 694

ایک قوم نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے اور ظاہر حال قول اول پر ہی دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: مراد نفقہ کے احکام ہیں (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ نفقہ کے بارے میں اپنے احکام تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تا کہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔ پس تم اپنے مالوں میں سے اتنے روک لو جو تمہارے لئے دنیوی معاملات میں نفع بخش اور ضروری ہوں اور باقی ماندہ ان امور میں خرچ کر دو جو آخرت میں تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کے امور کے بارے میں اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم دنیا، اس کے زوال اور اس کی فنا کے بارے میں غور و فکر کرو اور تم اس میں زہد اختیار کرو اور آخرت کے آنے اور اس کے باقی رہنے کے بارے غور و فکر کرو اور اس میں تم رغبت رکھو۔

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

''دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں، فرمائیے: (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الانعام: ۱۵۲) (اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا الآیہ (النساء: ۱۰) (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔) تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا۔ پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچا تا تھا وہ اسے اس کے لئے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ الآیہ۔ پس انہوں نے ان کے کھانے پینے کی اشیاء کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (1)۔

اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کا امر مقترن ہے۔ اور کہا گیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب مخالطة اليتيم فى الطعام، حدیث نمبر 2487، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مالوں کو ملانے سے بدشگونی لیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرما دی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کر لیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہنے لگا تو اس کے بارے اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے پاس ہونے پر ہی اقتصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ذمہ داری خود ادا کرتے تھے۔)

**مسئلہ نمبر 3**۔ یتیم کا مال مضاربت اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شرا کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربت وغیرہ کے لئے بھی دینا جائز ہے۔ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ ان کے لئے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض لے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دیا جائے گا، جیسا کہ وہ یتیم کے لئے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خریدے تو یہ یتیم کے لئے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔

محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لئے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لئے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لئے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے، کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح وہ اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کر سکتا ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباۃ (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے ہبہ کی جائے تو وصی کے لئے اس پر

قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اصلاح اور بھلائی ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جن چیزوں کے لئے وصی اور کفیل یتیم کا مال خرچ کر سکتے ہیں ان کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ حالت ہے جس پر گواہ بنانا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بینہ کے بغیر اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا اور ایک وہ حالت ہے جس پر شاہد بنانا ممکن نہیں ہوتا، تو اس پر بغیر بینہ کے اس کا قول قبول ہوگا، پس جب کسی نے زمین خریدی اور وہ جس میں توثیق کی عادت جاری ہو تو بغیر بینہ کے اس میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ یتیم وصی کے گھر میں ہو تو وہ اس پر خرچ کر سکتا ہے اور اسے اس کے نفقہ اور اس کے لباس وغیرہ مہیا کرنے پر شاہد بنانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لئے ہر وقت اس پر گواہ بنانا متعذر رہو گا جو اسے کھلائے اور اسے پہنائے، بلکہ جب اس نے یہ کہا: میں نے سال بھر کے لئے یہ خرچہ کیا ہے تو یہ اس سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اس کے درمیان کہ وہ اپنی ماں یا اپنی دایہ (پرورش کرنے والی) کے پاس ہو اور وصی یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ وہ اس پر خرچہ کر رہا ہے یا وہ اس کی ماں یا دایہ کو نفقہ اور کسوۃ دیتا ہے تو بینہ کے بغیر ماں یا دایہ کے خلاف اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے لئے بطور مشاہرہ یا خاطر مدارت اس پر قبضہ کرتی رہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جو اپنی زیر نگرانی یتیم بچی سے اپنا نکاح کر لیتا ہے کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش یتیم بچے یا بچی کے مال سے اپنے لئے خرید سکتا ہے؟

پس حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کفالت اور حضانت کے سبب نکاح کی ولایت قرابت کی نسبت زیادہ قوی ہے، حتیٰ کہ ان اعراب کے بارے میں کہا جو قحط کے دنوں میں اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے: بے شک وہ انہیں ان کا نکاح کرنے کا اختیار دے دیتے تھے اور رہا کفیل اور پرورش کرنے والے کا اپنے ساتھ نکاح کرنا تو اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہا اس سے خریدنا تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشہور اقوال کے مطابق وہ اس سے خرید سکتا ہے اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم بچے کا مال مثلی قیمت سے زیادہ کے عوض اپنے لئے خرید لے، کیونکہ یہ اصلاح اور خیر ہے جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: نکاح اور بیع میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آیت میں تصرف کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے: اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ (ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے) اس میں اس کا ذکر نہیں جس کے لئے دیکھ بھال جائز ہوتی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں: جب بھلائی کرنا بہتر ہے تو پھر اس کی شادی کرانا بھی جائز ہوگا اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اور امام شافعی شادی کرانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے سوائے اس جہت کے کہ اس سے حاجت دور ہو جاتی ہے اور بالغ ہونے سے پہلے کوئی حاجت نہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وصی کے لئے شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ بھلائی ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دادا

کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرادے اور باپ کے لئے بھی ایسے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو نہ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی کے لئے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار، ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کافل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔)

اور اگر کہا جائے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ان میں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے نص بیان کر دی گئی ہو، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرما دی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اور ہر وہ امر جس کے بارے خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہٰذا اس سے منع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے، اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے)

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور و فکر کریں جو اس کے لئے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لئے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)۔

محمد بن عبد الحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لئے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ یہ اختلاط اور میل جول دو ہم مثل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابو عبید نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لئے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ

یتیم کے مال سے اتنا لے لے جسے وہ غور وفکر کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لئے کافی ہوگا اور اسے اپنے اہل خانہ کے خرچہ کے ساتھ ملا لے اور اس میں کبھی کمی بیشی بھی واقع ہوسکتی ہے۔ اور یہ آیت ناسخہ اس میں رخصت کے لئے نازل ہوئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: میرے نزدیک یہی اس کی اصل ہے جو دوران سفر دوست احباب کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جانب سے برابر برابر خرچہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ کھانے کی قلت و کثرت میں وہ باہم متفاوت ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کا کھانا کم ہو وہ اپنے ساتھی کے خلاف فضل (اضافی کھانے) کا دعویٰ نہیں کرتا۔ تو جب یتیموں کے مال میں یہ وسعت موجود ہے تو ان کے علاوہ میں بدرجہ اولیٰ وسعت ہوگی۔ اگر اس طرح نہ ہو تو مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر اس بارے میں امر انتہائی شدید اور شاق ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 7** ۔ قولہ تعالیٰ: فَاِخْوَانُكُمْ۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی فهم اخوانكم ہے۔ اور فا جواب شرط کے لئے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یہ تحذیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یتیموں کا مال خراب کرنے والے کو اسے سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے، پس وہ ہر ایک کو اس کے سنوارنے اور اس کے بگاڑنے کے بدلے جزا دے گا۔

**مسئلہ نمبر 8** ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ۔ حکم نے مقسم سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا امر کر دیتا کہ تم یتیموں کے مال کے سبب ہلاک ہونے تک پہنچ جاتے۔ اور کہا گیا ہے کہ لَاَعْنَتَكُمْ کا معنی ہے لأهلكم (کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں ہلاک کر دیتا۔) یہ زجاج اور ابو عبید کا بیان ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: (معنی یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم پر معاملہ تنگ اور سخت کر دیتا، لیکن اس نے تم پر سہولت اور آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ تمہیں ایسے امر کا مکلف اور پابند بنا دیتا جس کو ادا کرنا تم پر انتہائی شدید اور سخت ہوتا اور ان کا اختلاط تمہیں گنہگار کر دیتا، جیسا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا جو تم سے پہلے تھے، لیکن اس نے تم سے تخفیف کی ہے۔

اور العنت کا معنی مشقت ہے، و قد عَنِتَ و أَعْنَتَهُ غيرُه۔ وہ مشقت میں پڑا اور غیر نے اسے مشقت میں ڈالا۔ اور جب ہڈی کو کوئی شے لگے اور وہ اسے توڑ دے تو ایسی جڑی ہوئی ہڈی کے لئے کہا جاتا ہے: قد اعنته، تحقیق اس نے اسے مشقت میں اور درد میں مبتلا کیا فهو عَنِتٌ وَ مُعْنِتٌ۔ اور عَنِتَت الدابة تعنَتُ عنتا: جب چوپائے کا پاؤں جڑنے کے بعد پھر ٹوٹ جائے اور اس کے لئے چلنا ممکن نہ ہو۔ اور اَكَمَةٌ عنوتٌ ایسا ٹیلہ جس پر چڑھنا انتہائی دشوار ہو۔ ابن الانباری نے کہا ہے: العنت کا اصل معنی تشدید (سختی) ہے۔ جب عرب یہ کہتے ہیں: فلان يتعنَّت فلاناً و يُعْنِته تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس پر انتہائی شدت اور سختی کرتا ہے اور اسے ایسے کام کا پابند بناتا ہے جسے کرنا اس پر انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا ہے، پھر اسے ہلاکت کے معنی کی طرف منقول کیا گیا ہے۔ اور اصل معنی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ یعنی اس پر کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ حَكِيْمٌ وہ اپنی ملک میں اس کے مطابق تصرف کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے اس پر کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں، وہ انتہائی عظمت و شان والا اور بزرگ و برتر ہے۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ

اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۗ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۟ؒ

''اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں، وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور الله تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے الله تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَنْكِحُوا اس میں جمہور کی قراءت تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ البتہ شاذ قراءت میں ضمہ (پیش) کے ساتھ بھی اسے پڑھا گیا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ اس کی شادی کرنے والے نے اپنے سے اس کا نکاح کر دیا۔ اور نکح کا اصل معنی جماع ہے اور شادی کرنے کے معنی میں مجازاً اور وسعتہً استعمال ہوتا ہے۔ تفصیل ان شاء الله تعالیٰ آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب الله تعالیٰ نے یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے اور (اہل کتاب کے ساتھ) نکاح کا میل جول رکھنے کی اجازت عطا فرما دی تو یہ واضح کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ باہم نکاح کرنا صحیح نہیں ہے۔

مقاتل نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرثد بن ابی مرثد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا نام کناز بن حصین غنوی تھا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خفیہ طور پر مکہ مکرمہ بھیجا، تاکہ وہ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ وہاں ہیں انہیں نکال لائے، تو مکہ مکرمہ میں ایک عورت تھی جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اسے عَنَاق کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس آگئی، تو آپ نے اسے فرمایا: بے شک اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے جو کچھ عہد جاہلیت میں تھا، تو اس نے کہا: پھر تم مجھ سے شادی کر لو، تو آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے شادی کرنے سے منع فرما دیا، کیونکہ آپ مسلمان تھے اور وہ مشرکہ تھی (1)۔ اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء الله تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، پھر ان تمام سے اہل کتاب عورتوں کو نکال دیا ہے اور انہیں سورۂ

1۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 67-66

مائدہ میں حلال قرار دیا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور مالک بن انس، سفیان بن سعید ثوری اور عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی کہا ہے۔

اور حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: آیت کا لفظ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے اور اس سے مراد خاص طور پر اہل کتاب ہیں اور اس خصوص کو سورۃ المائدہ کی آیت نے بیان کیا ہے۔ اور یہ عموم کبھی بھی اہل کتاب عورتوں کو شامل نہیں ہوا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اور پہلے قول کے مطابق عموم ان کو بھی شامل ہے پھر سورۃ المائدہ کی آیت نے بعض عموم کو ختم کر دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے، اسے ابن حبیب نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہودیہ اور نصرانیہ کا نکاح مذموم اور ثقیل ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم حربی نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ناسخ ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت منسوخ ہے، لہٰذا انہوں نے ہر مشرک عورت کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ کتابیہ ہو یا غیر کتابیہ ہو۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کرنے والے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور ہمیں محمد بن ریان نے وہ بیان کی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رمح نے بیان کیا کہ لیث نے حضرت نافع سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی آدمی کے یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر مشرک عورتیں حرام قرار دی ہیں اور میں اس سے بڑا شرک کوئی نہیں جانتا کہ ایک عورت کہتی ہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ یہ کہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول اس جماعت کے قول سے خارج ہے جو اپنے ساتھ حجت قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے اہل کتاب کی عورتوں کے حلال ہونے کے بارے قول کیا ہے، ان میں سے حضرات عثمان، طلحہ، ابن عباس، جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور تابعین میں سے حضرات سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک ہیں اور فقہائے امصار بھی اسی قول پر ہیں۔ اور یہ بھی کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کا سورۃ المائدہ کی اس آیت کے لئے ناسخ ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ سورۃ البقرہ ان سورتوں میں سے ہے جو پہلے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ المائدہ آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اور بلاشبہ آخر میں نازل ہونے والی پہلے والی کو منسوخ کرتی ہے۔

رہی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما! تو اس میں بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما توقف کرنے والے آدمی تھے، جب آپ نے دونوں آیتیں سنیں کہ ایک میں حلت کا ذکر ہے اور دوسری میں حرمت کا اور نسخ کی دلیل بھی آپ پر واضح نہ ہوئی، تو آپ نے توقف فرما لیا، پس آپ سے نسخ کا ذکر مروی نہیں، بلکہ صرف نسخ کی تاویل کی گئی ہے اور ناسخ و منسوخ تاویل کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان بعض روایات میں کہا ہے جو ان سے مروی ہیں کہ یہ آیت بت

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ تعالیٰ ولا تنکحوا المشرکات الخ، حدیث نمبر 4877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پرست، آتش پرست اور کتابی عورتوں کے بارے میں عام ہے اور ہر وہ عورت جو دین اسلام پر نہیں وہ حرام ہے۔ اسی بنا پر یہ سورۃ المائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اسی کی تائید کرتا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر شرک کرنے والا کسی کو نہیں جانتا کہ ایک عورت کہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دو کتابی عورتوں کے درمیان تفریق کی اور ان دونوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ طلاق دلوا دیں اور آپ غصے میں نہ ہوں، تو آپ نے فرمایا: اگر تم دونوں کی طلاق جائز ہے تو یقیناً تمہارا نکاح بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم دونوں کے درمیان انتہائی ذلت وحقارت کی تفریق کر رہا ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سند کے اعتبار سے جید اور عمدہ نہیں ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کا ارادہ کیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو میں اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہوں یا امیر المومنین؟ (یعنی میں اسے فارغ کر دیتا ہوں) تو آپ نے فرمایا: میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے، البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم ان میں سے بدکار عورتوں میں مشغول ہو جاؤ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن منذر نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان صحابہ کرام اور تابعین سے بھی جن کا ذکر نحاس کے قول میں ہوا ہے (نکاح کا جواز ذکر کیا ہے) اور اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے: اوائل میں سے کسی سے بھی یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہو۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جہاں تک دونوں آیتوں کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ ظاہراً لفظ شرک اہل کتاب کو شامل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ: 105) (نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔) اور فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ (البینہ: 1) (جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین)

پس لفظ میں ان کے درمیان فرق کیا ہے اور ظاہر عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسم شرک عام ہے اور یہ نص نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کے بعد یہ ارشاد گرامی: وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ: 5) (اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) یہ نص ہے، پس جس میں احتمال ہے اور جس میں کوئی احتمال نہیں ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے یہ ارادہ کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 297-296

کہ وہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور وہ اسلام لے آئے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ (آل عمران: 199) (اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر۔) اور یہ ارشاد ہے: مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ (آل عمران: 113) (اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔)

تو اسے کہا جائے گا: یہ اس ارشاد میں آیت کی نص کے خلاف ہے: وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور اس نظریہ کے خلاف ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے کیونکہ ان میں سے جو اسلام لے آیا اس کی شادی کے جائز ہونے پر تو کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہو گیا ہے۔

اور اگر وہ کہیں: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُولٰٓىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ اور ان کے نکاح کے حرام ہونے میں آگ کی طرف بلانے کو علت قرار دیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی علت ہے: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ کیوں کہ مشرک آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ علت تمام کفار میں جاری ساری ہے، نتیجتاً مسلمان مطلقاً کافر سے بہتر اور اچھا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور رہا اہل کتاب کا نکاح جب وہ حالت جنگ میں ہوں تو نکاح حلال نہیں ہوگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حلال نہیں، اور رب العالمین کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبہ) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں)

محدث نے کہا: میں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم نخعی سے کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور امام مالک نے اہل حرب کی شادی کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس کی علت دار الحرب میں بچے کو چھوڑنا ہے اور اس وجہ سے کہ عورت وہاں شراب اور خنزیر میں تصرف کرے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ یہ اس کی خبر دی جارہی ہے کہ مومنہ لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ صاحب حسب اور صاحب مال ہو۔ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ وہ تمہیں حسن و جمال وغیرہ میں بہت پسند آئے۔ یہی علامہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

یہ آیت حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: اے خنساء! تحقیق اس کے باوجود کہ تو سیاہ ہے اور تو بدصورت ہے تیرا ذکر ملاء اعلیٰ میں کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیرا ذکر اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔

اور حضرت سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ رنگ کی

کنیز تھی۔ انہوں نے غصے میں اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر نادم ہوئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! وہ کیسی ہے؟ آپ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، اچھے طریقے سے وضو کرتی ہے اور شہادتین کی شہادت دیتی ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تو مومنہ ہے۔'' تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بالضرور اسے آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا، پھر انہوں نے ایسا ہی کیا، تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا: انہوں نے لونڈی سے نکاح کیا ہے؟ اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ مشرکین سے نکاح کریں اور وہ ان کے حسب ونسب میں رغبت رکھتے ہوئے ان سے نکاح کرتے رہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اہل کتاب کی لونڈیوں کے نکاح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کے تحت کتابیہ لونڈی ہو تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں کا نکاح جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ہمیں شیخ ابوبکر الشاشی نے مدینۃ السلام کے بارے درس دیا اور کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کتابیہ لونڈی کے نکاح کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ اور آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنہ لونڈی اور مشرکہ کے نکاح کے درمیان اختیار دیا ہے، پس اگر مشرکہ لونڈی کا نکاح جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان اختیار نہ دیتا، کیونکہ بلاشبہ اختیار دو جائز چیزوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ جائز اور ممتنع کے درمیان اور نہ ہی دو ضدوں کے درمیان۔

جواب یہ ہے کہ دو ضدوں کے درمیان اختیار لغۃً بھی اور قرآن کی رو سے بھی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ۞ (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی۔) اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے خط میں کہا: حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَاَمَةٌ سے مراد وہ غلامی نہیں جو کسی کی ملکیت ہو بلکہ اس سے مراد آدمیت ہے اور عورتیں اور مرد سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی باندیاں ہیں، قاضی بصرہ ابوالعباس جرجانی نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ پس امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، اوزاعی اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ اور ابن حنبل نے کہا ہے: مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسیہ عورت سے شادی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اس کو طلاق دے دو۔

ابن القصار نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: دو قولوں میں سے ایک کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

ابن وہب نے حضرت مالک سے روایت کیا ہے کہ مجوسیہ لونڈی ہو تو ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرنا جائز

نہیں اور اسی طرح بت پرست عورتوں اور دیگر کافر عورتوں کا حکم ہے۔ یہی موقف علماء کی ایک جماعت کا ہے، مگر ایک روایت ہے جسے یحییٰ بن ایوب نے ابن جریج سے اور انہوں نے حضرت عطا اور عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں سے مجوسی لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بارے پوچھا گیا، تو ان دونوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ کی تاویل کی ہے۔ وہ یہ کہ ان دونوں کے نزدیک اس کا اطلاق عقد نکاح پر ہے نہ کہ خریدی ہوئی لونڈی پر اور ان دونوں نے اوطاس کے قیدیوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام نے ان میں سے لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین کی حیثیت سے وطی کی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے، رہے اوطاس کے قیدی! تو ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لونڈیوں نے اسلام قبول کر لیا ہو تو پھر ان کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ سے استدلال کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ انہوں نے لفظ نکاح کو عقد کے معنی پر محمول کیا ہے، حالانکہ لغت میں نکاح کا اطلاق عقد اور وطی دونوں پر ہوتا ہے۔ پس جب فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ تو ہر اس نکاح کو حرام کر دیا جو مشرکات پر واقع ہوتا ہے چاہے وہ عقد نکاح ہو یا وطی ہو۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے کہ امام اوزاعی نے بیان کیا: میں نے زہری سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو مجوسیہ لونڈی خریدتا ہے، کیا وہ اس سے وطی کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب وہ یہ شہادت دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ اس سے وطی کر سکتا ہے۔

یونس نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے اور ابن شہاب مغازی اور سیر کے بارے لوگوں سے بڑھ کر عالم ہیں۔ آپ کا یہ قول اس کے قول کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جس نے یہ گمان کیا ہے کہ اوطاس کے قیدیوں سے وطی کی گئی اور ان عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ قول ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان میں سے حضرت عطا اور عمرو بن دینار بھی ہیں۔ ان دونوں نے کہا ہے: مجوسیہ کے ساتھ وطی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور فقہاء امصار میں سے کوئی ایک بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا (یعنی کسی نے اسے اہمیت نہیں دی) حالانکہ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اور وہ ان میں سے ہیں جن کی فارس اور پھر خراسان کے سوا نہ اپنی جنگ ہوئی اور نہ ان کے اطراف والوں کی جنگ ہوئی اور ان میں سے کوئی بھی اہل کتاب نہیں جو تیرے لئے یہ بیان کرے کہ ان کی عورتوں کی سیرت اور کردار کیا ہوتا جب وہ قیدی بنالی جاتیں۔ فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن محمد بن اسد نے خبر دی ہے، اس نے کہا: ہمیں ابراہیم بن احمد بن فراس نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں علی بن عبد العزیز نے بیان کیا ہے، اس نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں ہشام نے یونس سے اور انہوں نے حسن سے ہمیں بیان کیا ہے، اس نے کہا: ایک آدمی نے اسے کہا: اے ابو سعید! تم کیا طریقہ کرتے ہو جب تم

عورتوں کو قیدی بناتے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہم انہیں قبلہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لو اور یہ شہادت دو لا الٰہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ، پھر ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ غسل کریں۔

اور جب اس کا مالک اس سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے قریب نہیں جاتا یہاں تک کہ وہ اسے استبرا (☆) کرا لے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ علماء کی ایک جماعت کی تاویل اسی کے مطابق ہے کہ بلاشبہ ان سے مراد بت پرست اور مجوسی عورتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتابی عورتیں اپنے اس ارشاد کے ساتھ حلال قرار دی ہیں۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی پاکدامن عورتیں، نہ کہ وہ مسلمان عورتیں جن کا زنا مشہور ہے۔ اور علماء میں سے بعض نے ان کے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے اور اسے کہ وہ ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرے جب تک کہ ان کی جانب سے توبہ نہ ہو۔ کیونکہ اس میں نسب کو فاسد کرنا لازم آتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا کا معنی ہے تم کسی مسلمان عورت کا کسی مشرک آدمی سے نکاح نہ کرو۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ مشرک کسی بھی وجہ سے مومنہ عورت کے ساتھ وطی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں اسلام کی ذلت و رسوائی ہے۔ اور قراء نے تنکحوا میں تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں نص کے ساتھ اس پر دلیل موجود ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد بن علی بن حسین نے کہا ہے: کتاب اللہ میں ہے کہ نکاح ولی (کی اجازت) کے ساتھ ہوتا ہے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا نکاح الا بولی (1) یعنی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔

اہل علم نے بغیر ولی کے نکاح کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بہت سے اہل علم نے کہا ہے: نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ، یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت جابر بن زید، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت ابن شبرمہ، حضرت ابن مبارک، حضرت امام شافعی، حضرت عبید اللہ بن حسن، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق اور حضرت ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

☆ رحم کو مادہ منویہ سے پاک کرنے کا اہتمام کرنا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسے حیض آ جائے۔

1۔ ابو داؤد، باب الولی، حدیث نمبر 1785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی قول حضرت امام مالک، حضرت ابو ثور اور حضرت طبری رحمۃ اللہ علیہم کا بھی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا" ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا نکاح الا بولی۔

اس حدیث کو حضرت شعبہ اور ثوری نے ابو اسحاق سے، انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے۔ پس جو مرسل روایات قبول کرتے ہیں اس کو قبول کرنا ان پر لازم ہوگا اور رہے وہ جو مرسل روایات قبول نہیں کرتے تو ان پر بھی اسے قبول کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وہ جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے وہ اہل حفظ اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں اور جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے ان میں سے اسرائیل اور ابو عوانہ دونوں راوی ابو اسحاق سے، وہ ابو بردہ سے، وہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (1)۔ اور اسرائیل اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ سب حفاظ ہیں اور حافظ کی زیادتی قبول کی جاتی ہے اور اس زیادتی کو اصول تقویت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: 232) (تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے) یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ اسے امام بخاری نے بیان کیا ہے اور اگر ان کے لئے نکاح کرنے میں کوئی حق نہ ہوتا تو انہیں رجوع سے روکنے سے منع نہ کیا جاتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے بھی جو آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (النساء: 25) (تو نکاح کر لو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے) اور یہ ارشاد وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور: 32) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے) پس اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بارے خطاب مردوں کے سوا کسی کو نہیں کیا۔ اگر یہ خطاب عورتوں کو ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے کہا ہے: "بے شک میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں تجھے نکاح کر دوں" اس کی وضاحت سورۃ القصص میں آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: 34) (مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر) پس کتاب و سنت نے اس پر قوت اور تائید فراہم کی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے جس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا عقد نکاح کیا (2) اور انہوں نے خود نکاح نہ کیا۔ یہ اس کے قول کا بطلان ہے جس نے کہا ہے کہ بالغہ عورت اپنے نفس کی مالک ہوتی ہے اپنے ولی کے بغیر وہ اپنی شادی کر سکتی ہے اور عقد نکاح کر سکتی ہے اور اگر یہ اختیار اسے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب شہود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3704، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان کی اپنی ذات کے بارے میں پیغام نکاح بھیجنا ترک نہ کرتے جبکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے باپ کی نسبت زیادہ قریب تھیں اور آپ نے پیغام نکاح اس کی طرف بھیجا جو ان کے معاملے کا مالک نہیں اور نہ ان کا عقد کرنے کا مالک ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت بھی ہے الایم احق بنفسھا من ولیھا(1) (بیوہ عورت اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے اس میں زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس پر عقد نہیں کر سکتا، یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے۔ اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی عورت اپنی شادی کرے گی کیونکہ زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کر لیتی ہے۔“ فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔(2)

اور ابوداؤد نے سفیان عن الزہری عن عروۃ کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کر دیا گیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ پس اگر اس کے ساتھ دخول کر لیا گیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اس عمل کے عوض جو اس نے اس کے ساتھ کیا اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو(3)۔“ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور ابن علیہ نے جو قول ابن جریج سے نقل کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے اس کے بارے حضرت زہری سے پوچھا تو انہیں اس کی پہچان نہ تھی۔ اور ابن علیہ کے سوا کسی ایک نے بھی ابن جریج سے یہ قول نقل نہیں کیا، حالانکہ ایک جماعت نے حضرت زہری سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر زہری سے یہ ثابت ہو جائے تو بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ آپ سے اسے ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے، ان میں سے سلیمان بن موسیٰ ہیں اور وہ ثقہ امام ہیں اور جعفر بن ربیعہ ہیں (4) اور اگر زہری اسے بھول گئے تب بھی یہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں، کیونکہ نسیان سے کوئی آدمی محفوظ نہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی ساری اولاد بھول گئی (5)“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نسیان لاحق ہو جاتا تھا، تو پھر آپ کے سوا کون ہے جو نسیان سے زیادہ محفوظ ہو اور جس نے یاد رکھا تو وہ اس پر حجت ہے جو بھول گیا، پس جب ثقہ راوی خبر کو روایت کرے تو جو بھول گیا اس کا نسیان اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ یہ تب ہے جبکہ وہ صحیح ہو جو ابن علیہ نے ابن جریج سے بیان کیا ہے، تو کیا حال ہوگا جبکہ اہل علم نے اس حکایت کا انکار کیا ہے اور انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی البستی نے المسند الصحیح میں تقاسیم وانواع پر اس کی سند میں

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888 2۔ ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابوداؤد، باب فی الولی، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انقطاع کے پائے جانے کے بغیر نقل کیا ہے اور اس کے ناقل میں کوئی جرح بھی ثابت نہیں یہ حفص بن غیاث عن ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور دو عادل شاہدوں کی شہادت کے ساتھ اور جو نکاح اس کے بغیر ہو وہ باطل ہے اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان وقت اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔''

ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری کی روایت میں سوائے تین آدمیوں کے کسی نے بھی یہ الفاظ نہیں کہے وَ شَاهِدَیْ عَدْلٍ (وہ تین افراد یہ ہیں) سوید بن یحییٰ اموی، حفص بن غیاث سے، عبداللہ بن عبدالوہاب جمحی، خالد بن حارث سے اور عبدالرحمٰن بن یونس الرقی، عیسیٰ بن یونس سے، شاہدین کے بارے میں اس خبر کے سوا کوئی صحیح نہیں ہے۔ اور جب یہ خبر ثابت ہوگئی تو کتاب و سنت نے اس بارے تصریح کردی کہ ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ اور جو ان دونوں کے خلاف ہو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت زہری اور شعبی کہتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنی شادی کفو میں کرلی تو وہ نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنا نکاح کفو میں کیا تو وہ نکاح جائز ہے، یہی امام زفر کا قول ہے۔ اور اگر کسی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کیا، تو وہ نکاح جائز ہوگا، لیکن اولیاء کو ان کے درمیان تفریق کا اختیار ہوگا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جو کچھ حضرت نعمان نے کہا ہے وہ سنت کے مخالف ہے اور اکثر اہل علم کے قول سے باہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق ہم کہہ رہے ہیں۔

اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: نکاح جائز نہیں ہوگا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور اگر ولی تسلیم کرلے تو پھر جائز ہے اور اگر وہ انکار کردے اور اسے حوالے نہ کرے اور زوج عورت کا کفو ہو تو قاضی اس کی اجازت دے دے۔ اور بلاشبہ جب قاضی اس کی اجازت دے دے گا تو وہ نکاح مکمل ہو جائے گا، یہی قول امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: قاضی ولی کو نکاح کی اجازت دینے کا حکم دے گا اور اگر وہ نہ دے تو (قاضی) نئے سرے سے عقد کردے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے درمیان اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں جب عورت کا ولی اسے اجازت دے دے، پس اس نے اپنا نکاح خود کرلیا تو وہ جائز ہوگا۔

امام اوزاعی نے کہا ہے: جب عورت اپنے معاملے کا کسی آدمی کو ولی بنائے اور وہ اس کا نکاح کفو میں کردے تو وہ نکاح جائز ہے، اب ولی کے لئے ان کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ عورت عربیہ ہو اور شادی کسی مولیٰ (غلام) سے کرلے، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی طرح ہے جو کہ آگے آئے گا۔

اور امام زہری، امام ابو حنیفہ اور شعبی رحمہم اللہ کے مذہب کے قائلین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: لا نکاح الا بولی کو معنی کمال پر محمول کیا ہے نہ کہ وجوب پر، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد (کہ

مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی۔) اور لا حَظَّ فی الاسلام لمن ترك الصلوٰۃ(1) کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں) (ان ارشادات میں کمال کی نفی ہے اسی طرح اس حدیث میں بھی کمال کی نفی ہے یعنی نکاح کامل نہیں ہوگا۔) اور انہوں نے اس پر ان ارشادات سے استدلال کیا ہے: فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ یَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اور فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكُمۡ فِیۡمَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (البقرہ: 234) (تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔) اور اس روایت سے جو دارقطنی نے سماک بن حرب سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: ایک عورت ہے میں اس کا ولی ہوں اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ اس نے کیا ہے اس میں غور و فکر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا، سو اگر اس نے کفو میں شادی کی ہے تو ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے اور اگر اس نے ایسے آدمی سے شادی کی جو اس کا ہم کفو نہیں تو ہم اسے تیرے حوالے کر دیں گے(2)۔

اور موطا میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی بیٹی کی شادی کی اور وہ غائب تھے۔ الحدیث۔

اور ابن جریج نے اسے عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک آدمی منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنے بھائی کی اولاد میں سے ایک عورت کے ساتھ کیا۔ آپ نے ان کے درمیان پردہ لٹکا دیا، پھر گفتگو فرمائی۔ یہاں تک کہ جب عقد کے سوا کچھ باقی نہ بچا تو آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس نے نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا: عورتوں کے پاس نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے (یعنی عورتوں کو ولایت انکاح حاصل نہیں) اور امام مالک کی حدیث میں وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مہر اور احوال نکاح کو پختہ کیا اور اس (عورت) کے عصبہ میں سے ایک عقد کا ولی بنا اور عقد کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی کیونکہ اسے پختہ کرنے کی نسبت آپ کی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے: اولیاء کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں کہ وہ کون ہیں؟ پس آپ نے ایک بار فرمایا: ہر وہ آدمی جس نے عورت کو اچھے اور حسین منصب میں رکھا وہی اس کا ولی ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا ذوی الارحام میں سے ہو یا اجنبی ہو یا امام ہو یا وصی ہو۔ اور ایک بار فرمایا: اولیاء عصبات میں سے ہوتے ہیں، پس ان میں سے جس نے عورت کو اچھے منصب میں رکھا وہ اس کا ولی ہوگا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک نے اس بیان میں کہا ہے جو ان سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ولی کے علاوہ کوئی اور اس عورت کی اجازت سے کر دے تو پھر اگر وہ عورت شریف ہو اور لوگوں میں اس کا کوئی مقام ہو تو اس کے نکاح کو فسخ کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس کے ولی کو اختیار ہوگا اور اگر وہ عورت رذیل اور کمینی ہو جیسا کہ آزاد شدہ

1۔ التمہید، جلد 19، صفحہ 90-91

2۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 237

لونڈی، سوداء یعنی قبطی قوم سے تعلق رکھنے والی، زناکار اور مسلمانیہ اور وہ عورت جس کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہو تو اس کا نکاح جائز ہو گا اور اس کے ولی کو اختیار نہ ہو گا کیونکہ ہر کوئی اس کا کفو ہے۔

اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عورت شریف ہو یا رذیل ولی یا سلطان کے علاوہ کوئی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ اس قول کو ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مسکین عورت اور وہ جو ذی مرتبہ اور ذی قدر ہو کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خون کے بارے میں ان کے احکام کے درمیان مساوات اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: ''تمام مسلمانوں کا خون مساوی اور برابر ہوتا ہے'' (1)۔ اور جب وہ خون میں برابر ہوئے تو وہ اس کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ایک شے ہوں گے۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے بعض مومنین کو بعض کا ولی بنا دیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) اور فی الجملہ مومنین اسی طرح بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، پس اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث تمام مسلمانوں کے لئے ہو گی اور اگر وہ کسی جنایت (جرم) کا ارتکاب کرے تو اس کی جانب سے مسلمان ہی دیت ادا کریں گے، پھر ایک ولایت دوسری ولایت سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ایک قرابت دوسری قرابت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اور جب عورت ایسی جگہ میں ہو جہاں نہ سلطان ہو اور نہ اس کا ولی ہو تو وہ اپنا معاملہ پڑوسیوں میں سے اس کے حوالے کر دے گی جو قابل اعتماد ہو گا اور وہ اس کی شادی کر سکے گا اور اس حال میں وہی اس کا ولی ہو گا، کیونکہ لوگوں کے لئے شادی کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اس بارے میں جتنا ممکن ہو سکے وہ اچھا عمل کرتے ہیں، اسی بنا پر امام مالک نے کمزور حالت والی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ اس کی شادی وہ کر سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے معاملے کو منسوب کرے گی، کیونکہ وہ عورت ان میں سے ہے جو سلطان کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ پس اسے اس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس کی موجودگی میں سلطان نہ ہو، پس فی الجملہ وہ اس طرف راجع ہوئی کہ مسلمان اس کے اولیاء ہیں۔ پس جب اس نے اپنا معاملہ ایک آدمی کے حوالے کر دیا اور اپنے اولیاء کو چھوڑ دیا تو بلاشبہ اس نے بلاوجہ ایک امر کو اختیار کیا ہے اور اس نے وہ کام کیا ہے جس کے بارے حاکم اور مسلمان اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کی حقیقت حرام ہے۔

جب ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ مومنین بعض بعض کے اولیاء ہیں اور یہ بھی کہ اس میں اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود نکاح فسخ کر دیا جائے گا کیونکہ یہ کام بلاوجہ ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ فروج کے بارے زیادہ احتیاط ہے اور اس لئے بھی کہ ان کی حفاظت (ضروری ہے) اور جب دخول ہو جائے اور معاملہ طویل ہو جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے تو پھر صحیح یہی ہے کہ فسخ

1۔ ابوداؤد، باب السریۃ ترد علی اهل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المسلمون تتکافأ دماءهم، حدیث نمبر 2674-2672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں، کیونکہ امور جب متفاوت ہوجائیں تو پھر ان سے اس حرام کے سوا کسی کا ارادہ نہیں کیا جاتا جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور یہ اس کے مشابہ ہوجاتا ہے جو حاکم کے حکم سے فوت ہوجائے جب کہ وہ حکما یہ فیصلہ دے کہ اسے فسخ نہ کیا جائے مگر یہ کہ وہ ایسی خطا اور غلطی ہو جس میں کوئی شک نہ ہو (تو اس صوت میں حاکم کا فیصلہ نافذ العمل نہ ہوگا۔)

اور رہے امام شافعی اور آپ کے اصحاب! تو ان کے نزدیک بغیر ولی کے کیا ہوا نکاح ہمیشہ فسخ کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے۔ اور ان کے نزدیک ولی نکاح کے فرائض میں سے ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس پر کتاب وسنت سے دلیل قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وانکحوا الایامی منکم اسی طرح فرمایا: فانکحوھن باذن اھلھن اور اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لا نکاح الا بولی اور انہوں نے رذیل اور شریف عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں کے درمیان خون کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون تتکافؤ دماؤھم اور تمام احکام اسی طرح ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں کتاب وسنت میں بلند مرتبہ اور گھٹیا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اس نکاح کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے واقع ہو اور پھر ولی قبل از دخول اس کی اجازت دے دے، تو حضرت امام مالک اور عبدالملک کے سوا ان کے اصحاب نے کہا ہے: وہ نکاح جائز ہے، کیونکہ اس کے لئے اس کی اجازت قرب کے سبب ہے، چاہے دخول ہوا ہو یا دخول نہ ہوا ہو۔ یہ تب ہے جب عقد نکاح غیر ولی نے کیا ہو اور عورت نے بذات خود عقد نکاح نہ کیا ہو اور اگر عورت نے اپنی شادی خود کی اور اس نے مسلمانوں میں سے کسی قریبی یا بعیدی ولی کے بغیر عقد نکاح خود کیا ہو تو یہ نکاح کسی حال میں ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا اگرچہ وقت زیادہ گزر جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے۔ البتہ دخول کی صورت میں بچے کو اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور حد ساقط ہوجائے گی اور ہر حال میں اس نکاح کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس صورت میں فسخ بغیر طلاق کے ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اولیاء کے مراتب اور ان کی ترتیب میں علماء نے اختلاف کیا ہے:

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: اولیاء میں سے سب سے اول بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کی طرف ہوں، پھر باپ، پھر وہ بھائی جو باپ اور ماں دونوں جانب سے سگے ہوں، پھر وہ جو صرف باپ کی طرف سے ہوں (علاتی بھائی) پھر حقیقی بھائیوں کے بیٹے پھر علاتی بھائیوں کے بیٹے، پھر باپ کی جانب سے اجداد (دادے) اگرچہ وہ کتنے ہی اوپر ہوں، پھر چچے بھائیوں کی ترتیب پر، پھر ان کے بیٹے بھائیوں کے بیٹوں کی ترتیب پر اگرچہ وہ کتنے نیچے ہوں، پھر آقا پھر سلطان یا قاضی۔

اور وصی یتیموں کا نکاح کرنے میں اولیاء پر مقدم ہوتا ہے اور وہی باپ کا خلیفہ اور اس کا وکیل ہوتا ہے اور یہ اس حال کے مشابہ ہوتا ہے اگر باپ زندہ ہوتا۔

اور حضرت امام شافعی نے کہا ہے: باپ کے ساتھ کسی کی کوئی ولایت نہیں ہے اور اگر باپ فوت ہوجائے تو پھر دادا، پھر دادے کے باپ کا باپ، کیونکہ یہ سب کے سب آباء ہیں۔ اور دادا کے بعد ولایت بھائیوں کی ہوتی ہے، پھر اس کے لئے جو

ان کے بعد زیادہ قریبی ہو۔

مزنی نے قول جدید میں کہا ہے: وہ جو ماں کی طرف سے منفرد ہو وہ نکاح میں زیادہ اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ میراث میں۔ اور قدیم قول میں انہوں نے کہا ہے کہ دونوں برابر ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اہل مدینہ نے امام مالک سے امام شافعی کے قول کی مثل روایت کیا ہے اور یہ کہ باپ بیٹے سے زیادہ اولیٰ اور قریب ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اسے الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: دادا بھائیوں سے زیادہ اولیٰ ہے اور مشہور مذہب وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

امام احمد نے کہا ہے: عورت کی شادی کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ حقدار اس کا باپ ہے، پھر بیٹا، پھر بھائی، پھر اس کا بیٹا، پھر چچا۔ اور اسحاق نے کہا ہے: بیٹا باپ سے زیادہ اولیٰ ہے: جیسا کہ حضرت امام مالک نے کہا ہے اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیوں کہ عمرو بن ام سلمہ نے ان کی اجازت کے ساتھ ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے اور عنوان یہ ہے انکاح الابن امه۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کثرت کے ساتھ اس سے استدلال کیا ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحاح میں ثابت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر ادھر گھومتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے بچے! تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اس سے کھا جو تیرے سامنے ہے(1)۔''

اور ابو عمر نے کتاب الاستیعاب میں کہا ہے: عمر بن ابی سلمہ کی کنیت ابو حفص ہے، وہ سرزمین حبشہ میں ۲ ھ میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس کی عمر اتنی ہو وہ ولی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ ابو سلمہ کا ام سلمہ سے ایک دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا نام سلمہ تھا اور یہی وہ ہے جس نے اپنی ماں ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا اور سلمہ کی عمر اپنے بھائی عمر بن ابی سلمہ سے زیادہ تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کے اعتبار سے زیادہ حافظ نہ تھے اور ان کے بھائی عمر نے ان سے روایت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو دور کے اولیاء میں سے ہو اور وہ کسی عورت کی شادی کرے۔ اسی طرح واقع ہوا ہے اور اقرب عبارت ہے کہ کہا جائے: ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس کی شادی اس کے اولیاء میں سے بعیدی ولی کرتا ہے درآنحالیکہ قریبی ولی حاضر ہو۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: اگر قریبی ولی نے اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کیا اور نہ ہی اس نے اسے رد کیا تو وہ نکاح نافذ ہو

1۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا اور اگر اس نے اس کا انکار کیا اور وہ ثیبہ ہو یا باکرہ بالغہ ہو، یتیم ہو اور اس کا کوئی وصی نہ ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور اہل مدینہ کی جماعت کا قول اس بارے میں مختلف ہے۔ سوان میں سے کہنے والوں نے کہا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا اور وہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ وہ ایسا نکاح ہے جو اصول اور خاندان میں سے ولی کی اجازت کے ساتھ منعقد ہوا ہے اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہے کہ نافذ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ اولیاء میں افضل اور اولیٰ رتبہ کا ولی موجود ہے اور وہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک ان کے مذہب کا ماحصل یہی ہے اور اسے ہی اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلطان اس میں غور وفکر کرے گا اور وہ ولی اقرب سے اس شے کے بارے پوچھے گا جسے وہ ناپسند کر رہا ہے پھر اگر وہ اسے نافذ کرنا مناسب سمجھے تو اسے نافذ کر دے اور اگر اسے رد کرنا مناسب سمجھے تو اسے رد کر دے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قریبی ولی ہر حال میں اسے رد کر دے گا، کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رد کرنے اور اس کی اجازت دینے کا اختیار ہے جب تک کہ عرصہ طویل نہ ہو اور وہ بچوں کو جنم نہ دے۔ یہ تمام اقوال اہل مدینہ کے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر ولی اقرب محبوس یا سفیہ ہو تو پھر اس کے بعد اولیاء میں سے جن کا مرتبہ ہو وہ اس کی شادی کر دے اور اسے ان میں میت کی طرح شمار کیا جائے۔ اسی طرح جب ولی اقرب غیبت بعیدہ پر غائب ہو یا اس طرح غائب ہو کہ جلدی اس کے واپس لوٹنے کی امید نہ ہو تو پھر بھی اس کے بعد والا ولی اس کی شادی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اقرب ولی غائب ہو اور اس کے پیچھے اس کی شادی کرنے والا کوئی نہ ہو، تو حاکم اس کی شادی کر سکتا ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جب دو ولی قرب میں واقع ہوں اور ان میں سے ایک غائب ہو اور عورت اپنے عقد نکاح کی ذمہ داری حاضر ولی کے سپرد کر دے تو جب غائب ولی واپس آئے تو اس کے لئے انکار کی اجازت نہیں۔ اور اگر دونوں حاضر ہوں اور عورت اپنا معاملہ ان میں سے ایک کے حوالے کرے تو وہ دوسرے ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر حاکم اس میں غور وفکر کرے اور ان دونوں میں سے جس کو عورت کے حق میں اچھا سمجھے اس کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ رہی نکاح میں شہادت! تو یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک رکن نہیں ہے اور اس بارے میں اس کی شہرت اور اعلان ہی کافی ہوگا اور یہ کہ وہ نکاح خفیہ اور سری ہونے سے نکل جائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اگر کسی نے بینہ کے ساتھ نکاح کیا اور گواہوں کو حکم دیا کہ وہ اسے چھپا کر رکھیں تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ نکاح سر ہے اور اگر اس نے بغیر گواہوں کے غیر سری انداز میں نکاح کیا تو وہ جائز ہے اور وہ دونوں اس میں گواہ بنالیں جس سے وہ دوچار ہوں گے۔

ابن وہب نے امام مالک سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایک عورت سے دو آدمیوں کی شہادت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور ان دونوں کو چھپانے کے لئے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان طلاق کے ساتھ تفریق کر دی جائے گی اور نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر آدمی نے اس کے ساتھ دخول کیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اور دونوں گواہوں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا ہے: جب کسی نے دو شاہدوں کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کی اور اس نے ان دونوں کو کہا: تم اسے خفیہ رکھنا تو نکاح جائز ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ہمارے ساتھی یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: ہر وہ نکاح جس پر دو آدمی گواہ ہوں تحقیق وہ سر (خفیہ) کی حد سے نکل گیا اور میرا گمان ہے کہ اسے لیث سے ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی، اہل کوفہ اور ان کے متبعین کے نزدیک سر سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نکاح جس پر دو یا دو سے زیادہ آدمی گواہ نہ ہوں اور اسے ہر حال میں فسخ کر دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام شافعی کا قول اس حدیث کے مطابق زیادہ صحیح ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: دو عادل شاہدوں اور ولی مرشد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہے اور اس بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے، صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے لئے اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوع جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان میں عقد کے وقت گواہ بنانا ہے اور اس پر دلیل قائم ہے کہ گواہ بنانا بیوع کے فرائض میں سے نہیں ہے اور وہ نکاح جس میں اللہ تعالیٰ نے گواہ بنانے کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کے لئے زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ گواہ بنانا اس کی شروط اور فرائض میں سے نہ ہو، بلاشبہ مقصود انساب کی حفاظت کے لئے اعلان اور ظہور ہے۔ اور اشہاد کی ضرورت عقد کے بعد تب ہوتی ہے جب دو نکاح کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی دعویٰ منعقد ہو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: اعلنوا النکاح (1) تم نکاح کا اعلان کرو۔ امام مالک کا یہ قول ابن شہاب اور اکثر اہل مدینہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ اور مومن غلام خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ مشرک حسب والے سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ اگرچہ اس کا حسب اور اس کا مال تمہیں اچھا لگے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: مومن آدمی اور اسی طرح لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ سے مراد مومنہ عورت ہے، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے تمام مرد اللہ تعالیٰ کے غلام اور تمہاری تمام عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔'' مزید فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو (2)۔'' اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص) (بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ) یہی وہ اچھا اور حسین قول ہے جس پر اس آیت کو محمول کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اختلاف زائل ہو جاتا ہے۔ واللہ الموفق

---

1۔ ابن ماجہ، باب اعلان النکاح، حدیث نمبر 1884، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4655

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ میں اشارہ مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کی طرف ہے۔ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی وہ ایسے اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جو آتش جہنم کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی صحبت اور ان کا طرز معاشرت نسل کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات میں سے کثیر میں انحطاط اور تنزل کا سبب بنتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کے عمل کی طرف بلاتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنے امر سے۔ زجاج نے یہی کہا ہے۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۙ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲

''اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق۔ فرمائیے: وہ تکلیف دہ ہے، پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے، بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔''

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ۔ طبری نے سدی سے ذکر کیا ہے کہ سائل حضرت ثابت بن دحداح ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما ہیں اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے اور سوال کے سبب کے بارے میں حضرت قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عرب لوگ حیض والی عورتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنے سے اجتناب کرنے میں بنی اسرائیل کے طریقے پر چلتے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ حالت حیض میں عورتوں سے دور رہتے تھے اور وہ زمانہ حیض کی مدت ان کی دبروں میں وطی کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تھی تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ مل کر کھاتے تھے اور نہ ان کے ساتھ مجامعت کرتے تھے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۙ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ الی آخر الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اصنعوا کل شی الا النکاح (تم ان کے ساتھ وطی کے سوا ہر معاملہ کرو) یہ خبر یہودیوں کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: یہ آدمی ہمارے امور میں سے کسی شے کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا مگر اس نے ہر معاملے میں ہماری مخالفت کی ہے۔ پس حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما دونوں آئے اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ یہودی اس اس طرح کہہ رہے ہیں، کیا ہم ان (عورتوں) سے جماع نہ کیا کریں؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا، یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں پر غصے اور ناراض ہوں گے،

پس وہ دونوں نکل گئے اور پھر ان دونوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دودھ کا ہدیہ آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ان کے پیچھے بھیج دیا اور ان دونوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور انہیں پہچان ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ناراض نہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: یہودی اور مجوسی حیض والی عورتوں سے دور رہتے تھے اور عیسائی حیض والی عورتوں سے مجامعت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان کا قصد کرتے ہوئے یہ حکم ارشاد فرمایا۔

**مسئلہ نمبر** 2۔ قولہ تعالیٰ: عَنِ الْمَحِيْضِ۔ الْمَحِيْضِ سے مراد حیض ہے اور یہ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ حیضا و محاضا و محیضا فھی حائض اور یہ حائضۃ بھی ہے۔ فراء نے ایک شعر میں کہا ہے:

کحائضة یُزْنیٰ بِھا غیرَ طاھر (جیسا کہ حیض والی عورت اس سے ناپاک حالت میں زنا کیا جاتا ہے)

اور (کہا جاتا ہے) نساء حیض و حوائض اور الحَیضة کا معنی ہے: ایک بار۔ اور الحِیضة کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور جمع الحِیَض ہے۔ اور الحیضة کا معنی وہ کپڑے کا ٹکڑا بھی ہے جس کے ساتھ عورت اپنی فرج کو (حیض آنے کے وقت) باندھتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: لیتنی کنتُ حِیضة مُلْقَاۃً(1) (اے کاش! میں وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتی جسے پھینک دیا جاتا ہے۔) اسی طرح المحیضة ہے اور اس کی جمع المحائض ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ المحیض زمان و مکان سے عبارت ہے اور نفس حیض کو بھی محیض کہا جاتا ہے، یہ زمان و مکان میں اصل ہے اور حیض کے معنی میں مجاز ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: المحیض حیض کا اسم (نام) ہے اور اسی کی مثل رؤبہ کا عیش کے بارے قول ہے۔

الیك أشكو شدّة المَعِیش و مرّ أعوام نتفن ریشی

میں زندگی کی تلخی اور شدت کی تیرے پاس شکایت کر رہا ہوں اور سال ہا سال گزر گئے، انہوں نے میرے بال و پر اکھیڑ دیے۔

اور کلمہ کی اصل سیلان (بہہ پڑنا) اور انفجار (پھوٹ پڑنا) سے ہے۔ کہا جاتا ہے: حاض السیل و فاض سیلاب پھوٹ پڑا اور بہہ گیا اور حاضت الشجرۃ یعنی درخت کی رطوبت ظاہر ہوگئی بہہ گئی۔

اور اسی طرح الحیض بمعنی الحوض ہے، کیوں کہ پانی اس کی طرف بہتا ہے اور عرب یاء کی جگہ واؤ اور واؤ کی جگہ یاء داخل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی حیز سے ہیں۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: المحیض اور الحیض کا معنی اس کے محل کی طرف خون کا جمع ہونا ہے اور اسی سبب سے حوض کو بھی یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ و تحیّضت، و درست و عرکت، و طمثت، تحیض حیضاً و مَحَاضاً وَ محیضاً جبکہ معلوم اوقات میں عورت کا خون بہہ پڑے۔ اور جب وہ غیر معلوم ایام میں جاری ہو اور حیض کی رگ کے سوا کہیں اور سے آئے تو پھر تو کہے گا: أُستحیضت فھی مستحاضة کہ عورت مستحاضہ ہوگئی۔ (یہ) ابن عربی نے کہا ہے۔ اور اس کے آٹھ اسماء ہیں (۱) حائض (۲) عارک (۳) فارک (۴) طامس (۵) دارس (۶) کابر (۷) ضاحک (۸) طامث۔

---

1۔ مصنف عبد الرزاق، 16، 206

حضرت مجاہد نے ارشاد باری تعالیٰ: فَضَحِكَتْ کا معنی بیان کیا ہے: حاضت۔ پس وہ حائضہ ہو گئی۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ یعنی حضن (پس جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ حائضہ ہو گئیں۔) اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی فرج سے ظاہر بہنے والا خون دیکھنے کی حالت میں تین احکام ہیں۔ پس ان میں سے حیض معروف ہے اور خون حیض سیاہ گاڑھا ہو اس پر سرخی غالب ہو اور یہ کہ عورت اس کی وجہ سے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ترک کر دے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور کبھی یہ خون متصل (مسلسل) آتا ہے اور کبھی منقطع ہوتا ہے (یعنی ایک دو دن کے وقفے سے آتا ہے) پس اگر یہ متصل جاری رہے تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور اگر منقطع ہو اور عورت ایک دن خون دیکھے اور ایک دن طہر یا وہ دو دن خون دیکھے اور دو دن یا ایک دن طہر تو بلا شبہ وہ خون کے دنوں میں نماز چھوڑ دے گی اور اس کے انقطاع کے وقت غسل کرے گی اور نماز پڑھ لے گی، پھر وہ خون کے ایام کو اکٹھا کر لے گی اور درمیان میں آنے والے ایام طہر کو لغو چھوڑ دے گی اور وہ انہیں عدت اور استبرا کی صورت میں طہر شمار نہیں کرے گی۔ حیض عورتوں کی فطرت میں ہے اور ان کی معروف طبعی عادت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف تشریف لائے اور آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ کرو کیونکہ اہل نار میں سے اکثر تم مجھے دکھائی گئی ہو۔ تو انہوں نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر ناقصات عقل و دین کسی کو نہیں دیکھا جو ایک محتاط آدمی کی عقل و فہم کو ختم کر دے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقل و دین کے اعتبار سے ہم میں کون سی کمی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت آدمی کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، کیوں نہیں، پھر آپ نے فرمایا: یہ ان کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے اور کہا: جب وہ حائضہ ہو جائے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، کیا اسی طرح نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی کی وجہ سے ہے۔''

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرے گی اور نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

حضرت معاذہ کی حدیث ہے انہوں نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور کہا: حیض والی عورت کو کیا ہے کہ وہ روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (☆) ہے؟ میں نے

---

1۔ بخاری شریف، باب ترک الحائض الصوم، حدیث نمبر 293، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ حروریہ خوارج کا ایک گروہ ہے اور یہ کوفہ کے قریب ایک گاؤں حروراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ ان کے نزدیک دین میں انتہائی شدت اور سختی ہے جیسا کہ معروف ہے۔

کہا: میں حروریہ تو نہیں، البتہ میں پوچھ رہی ہوں۔ تو پھر انہوں نے فرمایا: چونکہ وہ ہمیں لاحق ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1) اور جب عورت کا خون ختم ہو جائے تو اس کے لئے اس سے پاکیزگی اور طہارت غسل ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے حیض کی مقدار میں اختلاف کیا ہے:

فقہائے مدینہ نے کہا ہے: بلاشبہ حیض پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ جائز ہے کہ وہ پندرہ دن اور اس سے کچھ کم ہو اور جو پندرہ دنوں سے زیادہ ہوگا وہ حیض نہ ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔

اور امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ حیض کے قلیل ہونے اور کثیر ہونے کا کوئی وقت نہیں مگر وہی جو عورتوں میں پایا جاتا ہے (یعنی ان کی عادت ہوتی ہے)۔ گویا آپ نے اپنا پہلا قول چھوڑ دیا ہے اور عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کم سے کم طہر پندرہ دن ہے، بغداد کے رہنے والے اکثر اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی، امام اعظم ابوحنیفہ، ان دونوں کے اصحاب اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اس باب میں صحیح قول یہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت تین حیض مقرر کی ہے اور جنہیں بڑھاپے یا صغر سنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ مقرر کی ہے، گویا کہ ہر حیض ایک مہینے کا عوض ہے اور مہینہ طہر اور حیض دونوں کو جامع ہوتا ہے۔ پس جب حیض کم ہوگا تو طہر زیادہ ہوگا اور جب حیض کے دن زیادہ ہوں گے تو طہر کے دن کم ہوں گے۔ پس جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہو تو واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہو۔ تاکہ ایک مہینے میں حیض اور طہر دونوں مکمل ہو جائیں اور قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ عورتوں کی خلقت اور ان کی فطرت میں اغلباً یہی متعارف ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا ہے: کم سے کم حیض کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی اکثر مدت پندرہ دن ہے اور ان سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے کہ اسے عورتوں کے عرف اور عادت کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک جو خون تین دنوں سے کم ہوگا وہ استحاضہ ہوگا، یہ نماز کے مانع نہیں ہوتا مگر جب کہ یہ پہلی بار ظاہر ہو، کیونکہ اس کی انتہائی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر عورت پر ان اوقات کی نماز قضا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح وہ خون جو دس دنوں سے زیادہ ہو (وہ بھی) اہل کوفہ کے نزدیک استحاضہ ہے۔ اور اہل حجاز کے نزدیک جو پندرہ دنوں سے زائد ہوگا وہ دم استحاضہ ہوگا اور جو ایک دن اور ایک رات سے کم ہوگا امام شافعی کے نزدیک وہ استحاضہ ہوگا اور یہی قول امام اوزاعی اور طبری کا ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے ان میں سے حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت ابوثور اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

1۔ بخاری شریف، باب لا تقضی الحائض الصلوۃ، حدیث نمبر 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام اوزاعی نے کہا ہے: ہمارے پاس ایک عورت صبح کے وقت حائضہ ہوتی ہے اور شام کے وقت پاک ہو جاتی ہے۔

حیض کی اکثر اور اقل مدت، طہر کی اقل مدت، احتیاط اور اس کی حجت کے بارے میں ہم نے اس باب میں وہی کچھ ذکر کیا ہے جسے علماء نے اپنایا ہے۔

پس المقتبس فی شرح مؤطا مالك بن انس میں ہے کہ اگر کسی عورت کو پہلی بار حیض آئے تو امام شافعی کے قول کے مطابق جو خون وہ پہلی بار دیکھے گی وہ پندرہ دن تک بیٹھی رہے گی پھر وہ غسل کرے گی اور چودہ دن کی نماز لوٹائے گی۔

اور امام مالک نے کہا ہے: وہ نماز قضا نہیں کرے گی اور اس کے خاوند کو اس سے روکا جائے گا۔ علی بن زیاد نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی مقدار بیٹھی رہے گی اور یہی قول حضرت عطا اور ثوری وغیرہما کا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ایک دن اور ایک رات بیٹھے گی، پھر وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی اور اس کا خاوند اس کے پاس نہ آئے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ دس دن نماز چھوڑے رکھے گی۔ پھر غسل کرے گی اور بیس دن تک نماز پڑھتی رہے گی، پھر بیس دنوں کے بعد دس دن کے لئے نماز چھوڑ دے گی، پس اس کی یہی حالت جاری رہے گی یہاں تک کہ اس سے خون ختم ہو جائے۔ رہی وہ عورت جس کے دن معلوم ہوں تو وہ ایام معلومہ کے مطابق تین دنوں تک احتیاط کرے گی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: جب تک وہ پندرہ دنوں سے تجاوز نہ کرے۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اس کے دن گزر جائیں تو بغیر کسی احتیاط کے وہ غسل کرے گی۔

خون میں سے دوسرا دم نفاس ہے جو ولادت کے وقت ظاہر ہوتا ہے: علماء کے نزدیک اس کے لئے بھی معلوم حد ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ وہ دو مہینے ہیں۔ یہی امام مالک کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ چالیس دن ہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔

اور اس سے طہارت اس کے ختم ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور اس کا غسل غسل جنابت کی طرح ہے۔ قاضی ابو محمد عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حیض اور نفاس کا خون گیارہ چیزوں سے روکتا ہے اور وہ نماز کا واجب ہونا، اسے پڑھنا، صحیح ہونا، روزہ رکھنا نہ کہ اس کا واجب ہونا (یعنی روزے کا وجوب برقرار رہتا ہے لیکن اسے عملاً رکھنا مؤخر ہو جاتا ہے) اور فرق کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کی قضا لازم ہے اور نماز کی قضا لازم نہیں۔ فرج اور اس کے سوا میں جماع کرنا، عدت، طلاق، طواف، قرآن کریم کو مس کرنا، مسجد میں داخل ہونا، اس میں اعتکاف کرنا اور قرآن کی قراءت میں دو روایتیں ہیں۔

اور تیسری قسم کا خون وہ ہے جو نہ عورتوں کی عادت ہے اور نہ ان کی طبع اور خلقت میں داخل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک رگ ہے جو کٹ جاتی ہے اور اس سے سرخ رنگ کا خون بہتا ہے اور یہ خون منقطع نہیں ہوتا مگر تبھی جبکہ وہ تندرست اور مندمل ہو جائے اور اس کا حکم یہ ہے کہ عورت اس کی موجودگی میں بھی پاک ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے نماز، روزے سے مانع نہیں ہوتا۔ اس پر

علماء کا اجماع ہے اور آثار مرفوعہ کا اتفاق ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ یہ رگ کا خون ہے، خون حیض نہیں ہے۔

امام مالک (1) نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پاک نہیں ہوتی! کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے اور جب اس کی مقدار (دن) گزر جائیں تو تو اپنے آپ سے خون دھو ڈال اور نماز پڑھ لے۔'' یہ حدیث اپنے صحیح ہونے اور اپنے الفاظ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حائضہ اور مستحاضہ کے احکام تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں یہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے جو عقبہ بن عامر اور مکحول سے مروی ہے کہ حیض والی عورت ہر نماز کے وقت غسل کرے گی اور وضو کرے گی اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوگی۔ اور اس میں ہے کہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھے گی اور اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے خوارج کے ایک گروہ کے کہ وہ کہتے ہیں: حیض والی عورت پر نماز ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ مستحاضہ عورت پر سوائے اس غسل کے جو وہ انقطاع حیض کے وقت کرتی ہے اور کوئی غسل لازم نہیں، اگر اس کے علاوہ بھی غسل اس پر لازم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بارے اسے حکم ارشاد فرما دیتے اور اس میں ان کے قول کا بھی رد ہے جن کا خیال ہے کہ اس پر ہر نماز کے لئے غسل لازم ہے اور ان کے قول کا بھی جن کا خیال یہ ہے کہ وہ دن کی دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کرلے اور رات کی دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرلے اور وہ صبح کی نماز کے لئے علیحدہ غسل کرے اور ان کے قول کا جنہوں نے کہا: وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی شے کا حکم اسے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور اس میں اس کے قول کا بھی رد ہے جس نے انتظار واحتیاط کی بات کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے (فاطمہ کو) یہ حکم دیا کہ جب تجھے یقین ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو تو غسل کرلے اور نماز پڑھ لے، آپ نے اسے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ حیض آنے یا نہ آنے کے انتظار میں تین دن تک نماز چھوڑے رکھے اور احتیاط نماز پڑھنے میں ہوتی ہے نہ کہ اسے چھوڑنے میں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ هُوَ اَذًى، یعنی یہ وہ شے ہے جس کے سبب عورت اور اس کے سوا مرد کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یعنی خون حیض کی بدبو کے سبب۔ اور الاذی قذر اور نجاست سے کنایہ ہے۔ اور اس کا اطلاق قول مکروہ پر بھی ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى (البقرہ: 264) (مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر) یعنی اس مکروہ اور ناپسندیدہ قول کے ساتھ جو تم اسے سناتے ہو اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَدَعْ اَذٰىهُمْ (الاحزاب: 48) (اور پرواہ نہ کر دان کی اذیت رسانی کی۔) یعنی آپ منافقین کی اذیت رسانی کی پرواہ

1۔ بخاری شریف، باب الاستحاضۃ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہ کریں آپ انہیں جزا نہ دیں مگر یہ کہ ان میں امیر بنادیں۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: و أمیطوا عنه الأذی (1) اور اس سے اذیت کو دور کرو۔ اس میں الاذی سے مراد وہ بال ہیں جو پیدائش کے وقت بچے کے سر پر ہوتے ہیں اور ساتویں دن اس سے مونڈ دیے جاتے ہیں اور یہی عقیقہ ہے اور حدیث ایمان میں ہے وادناها اماطة الأذی عن الطریق راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹادو۔ یعنی کانٹے، پتھر اور ان کی طرح کی دیگر چیزیں جن سے گزرنے والا کسی تکلیف میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اور رب کریم کا ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ (النساء:102) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ دم استحاضہ بہنے کے سبب جنہوں نے مستحاضہ عورت سے وطی کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے استدلال کیا اور کہا: ہر خون تکلیف دہ (نجس) ہے، اسے کپڑے اور بدن سے دھونا واجب ہوتا ہے، پس دم حیض اور استحاضہ کے درمیان مباشرت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر ناپاکی اور نجاست ہے۔ اور رہی نماز تو اس کی رخصت کے بارے حدیث طیبہ موجود ہے جیسا کہ سلس البول کی بیماری کی حالت میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، یہ قول ابراہیم نخعی، سلیمان بن یسار، حکم بن عیینہ، عامر شعبی، ابن سیرین اور زہری کا ہے اور حسن کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ مستحاضہ کا خاوند اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا اور اسی طرح ابن علیہ اور مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے کہا ہے اور یہ اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں اور ابو مصعب نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: مستحاضہ عورت روزہ رکھ سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے، طواف کعبہ کرسکتی ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کرسکتی ہے اور اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: اہل فقہ وعلم نے اسی کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس کا خون بہت زیادہ بھی ہو اور آپ سے اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ خاوند اس سے وطی نہ کرے، البتہ اگر عرصہ طویل ہوجائے تو پھر وطی کرسکتا ہے۔

اور مستحاضہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ جماع کرے اگرچہ اس کا خون اس کی ایڑیوں پر بہہ رہا ہو۔

اور امام مالک نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ وہ رگ کا خون ہے وہ حیض نہیں ہے۔'' پس جب وہ حیض نہیں ہے تو پھر کون سی شے ہے جو خاوند کو اس کے پاس جانے سے روک سکتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی پڑھ رہی ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مستحاضہ کے خون کے بارے میں یہ حکم فرمادیا ہے کہ وہ نماز کے مانع نہیں ہے اور وہ عورت اس حالت میں حائضہ کی عبادت کے سوا بھی عبادت کرسکتی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے حیض کے

1۔ بخاری شریف، باب اماطة الأذی عن الصبی فی العقیقة، حدیث نمبر 5049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

احکام میں سے کسی شے کا حکم نہ لگایا جائے مگر وہی جس پر اجماع ہے (یعنی) تمام خونوں کی طرح اسے بھی دھونا لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ یعنی تم زمانہ حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، یہ تب ہے جبکہ محیض کو مصدر بنایا جائے یا معنی یہ ہے کہ تم عورتوں سے علیحدہ رہو محل حیض میں جبکہ محیض کو اسم بنایا جائے اور اس نہی کا مقصود مجامعت ترک کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کے بارے میں اور جو کچھ اس سے مباح سمجھا جاتا ہے اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عبیدہ السلمانی سے مروی ہے کہ یہ واجب ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے بستر سے علیحدہ رہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو۔ یہ قول شاذ ہے اور علماء کے قول سے خارج ہے۔ اگرچہ عموم آیت اس کا تقاضا کرتی ہے لیکن سنت ثابتہ اس کے خلاف ہے اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ حضرت ام میمونہ رضی اللہ عنہا اس پر آگاہ ہوئیں تو آپ نے فرمایا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے اعراض کر رہے ہو۔

اور امام مالک، شافعی، اوزاعی، ابو حنیفہ، ابو یوسف اور علماء کی ایک بہت بڑی جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرد کے لئے عورت کے اس حصے سے استمتاع جائز ہے جو ازار کے اوپر ہے، کیونکہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا تو آپ نے اسے ارشاد فرمایا: (سائل نے کہا) کیا حالت حیض میں میری بیوی میرے لئے حلال ہوتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: چاہیے کہ وہ اپنی ازار (چادر) مضبوطی کے ساتھ باندھ لے تو پھر اس کے اوپر سے وہ تیرے لئے مباح ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حالت حیض میں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: اپنی چادر کو مضبوط باندھ لے پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آ۔ (1)

اور امام ثوری، محمد بن حسن اور بعض اصحاب شافعی نے کہا ہے کہ وہ محل خون سے اجتناب کرے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''تم ہر عمل کرو سوائے وطی کے۔'' اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہی داؤد کا قول ہے اور امام شافعی کے قول سے یہی صحیح ہے۔

ابو معشر نے ابراہیم کے واسطہ سے مسروق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا میری زوجہ میرے لئے حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: سوائے فرج کے ہر شے حلال ہے۔

علماء نے کہا ہے: حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت (کا مباح ہونا) اس حال میں کہ وہ چادر باندھے ہوئے ہو احتیاط اور ذریعہ وسبب کو ختم کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اگر اس کی رانوں سے استمتاع مباح ہو تو یہ محل خون (فرج) تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب ہے جو کہ بالا جماع حرام ہے، پس احتیاطاً اس کا حکم دیا گیا ہے اور فی نفسہ محل دم کو حرام قرار دیا گیا اور آثار کے معانی اس کے ساتھ متفق ہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو حالت حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کرتا ہے کہ اس پر

1۔ بخاری شریف، باب من سمی النفاس حیضا والحیض نفاسا، حدیث نمبر 289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہوگا؟

حضرت امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور مزید اس پر کوئی شے لازم نہیں، یہی قول ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا ہے اور اسی طرح داؤد نے بھی کہا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ نصف دینار صدقہ کرے گا۔(1)

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عبدالحمید کی حدیث کتنی اچھی ہے کہ وہ مقسم کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کی ہے کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا۔'' اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اسی طرح صحیح روایت ہے۔ فرمایا: دینار یا نصف دینار۔ علامہ طبری نے اسے مستحب قرار دیا ہے، پس اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی اور بغداد میں امام شافعی کا یہی قول ہے۔

اور محدثین میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: اگر اس نے خون کی حالت میں وطی کی تو اس پر دینار ہوگا اور اگر اس نے خون کے انقطاع کی حالت میں وطی کی تو اس کے لئے نصف دینار ہوگا۔

اور امام اوزاعی نے کہا ہے: جس نے اپنی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں وطی کی تو وہ ایک دینار کے دو خمس صدقہ کرے۔ ان تمام کی اسناد سنن ابی داؤد اور دار قطنی وغیرہ میں ہیں۔

اور کتاب ترمذی (2) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: ''جب خون سرخ ہو تو ایک دینار ہوگا اور خون کا رنگ زرد ہو تو نصف دینار ہوگا۔''

ابوعمر نے کہا ہے: ان کی دلیل جنہوں نے استغفار اور توبہ کے سوا ایسے آدمی پر کوئی کفارہ واجب نہیں کیا اس حدیث کا مضطرب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی مثل حدیث حجت نہیں بن سکتی، کیونکہ فی الاصل ہر کوئی ذمہ داری سے بری ہے اور یہ واجب نہیں کہ اس میں کسی مسکین اور کسی دوسرے کے لئے کوئی شے ثابت ہو مگر کسی دلیل کے ساتھ جس میں نہ کوئی رد ہو اور نہ اس پر طعن ہو اور یہ اس مسئلہ میں معدوم ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: میں نے علامہ الشاشی سے مجلس النظر میں سنا ہے وہ فرماتے ہیں: جب کہا جائے لا تقرب یعنی راء کے فتحہ کے ساتھ تو اس کا معنی ہے تو کام میں مشغول نہ ہو اور اگر راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے تو اس کے قریب نہ ہو۔

نافع، ابوعمرو، ابن کثیر، ابن عامر اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے اس روایت میں جو حفص نے ان سے نقل کی ہے يَطْهُرْنَ طا کے سکون اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حمزہ، کسائی اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے ابوبکر اور مفضل کی روایت میں یطھرن یعنی طا اور ہا دونوں کو شد اور فتحہ کے

1۔ ابوداؤد، باب فی کفارۃ من اتی حائضا، حدیث نمبر 1853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الکفارۃ فی ذالک، حدیث نمبر 127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے مصحف میں یَتَطَهَّرْنَ ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ولا تقربوا النساء فی محیضھن واعتزلوھن حتی یتطھرن ہے۔ اور علامہ طبری نے طا کی تشدید والی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے: یہ بمعنی یغتسلن ہے، کیونکہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ آدمی پر حرام ہے کہ وہ اپنی زوجہ کا خون ختم ہونے کے بعد اس کے پاک ہونے سے پہلے اس کے قریب جائے۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ طہر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ طہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس سے مراد نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا ہے اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد شرمگاہ کو دھونا ہے۔ اور یہ اسے اپنے خاوند کے لئے حلال کر دے گا اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا۔

اور ابوعلی فارسی نے طا کی تخفیف والی قراءت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ثلاثی ہے اور طمث کی ضد ہے اور یہ بھی ثلاثی ہے۔

**مسئلہ نمبر 10** ۔قولہ تعالیٰ: فَإِذَا تَطَهَّرْنَ، یعنی جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کر لیں، یہی موقف امام مالک اور جمہور علماء کا ہے اور بلاشبہ وہ طہارت جس کے سبب حائضہ عورت سے جماع حلال ہو جاتا ہے جب اس کا خون ختم ہو جائے وہ اس کا پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا ہے جیسا کہ جنبی کی طہارت (پانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے) اور تیمم یا کوئی اور اس کی جانب سے جائز نہ ہوگا، یہی امام مالک، امام شافعی، طبری، محمد بن مسلمہ، اہل مدینہ اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ اور یحییٰ بن بکیر اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: جب حیض والی عورت پاک ہو جائے (یعنی اس کا خون ختم ہو جائے) اور اس نے ایسی جگہ تیمم کر لیا جہاں پانی نہ ہو تو وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہو گئی اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا ہو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خون کا منقطع ہونا ہی اسے زوج کے لئے حلال کر دیتا ہے، لیکن اسے وضو کر لینا چاہئے۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اگر اس کا خون دس دن گزرنے کے بعد ختم ہوا تو آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل سے پہلے اس سے وطی کر لے اور اگر خون کا انقطاع دس دنوں سے پہلے پہلے ہو گیا تو پھر جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یا اس پر نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی کوئی وجہ اور علت نہیں، تحقیق انہوں نے حائضہ عورت کے لئے اس کا خون منقطع ہونے کے بعد اس طرح فیصلہ کیا ہے جو عدت میں محبوس ہو۔ اور انہوں نے اس کے خاوند کو کہا: عورت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے غسل نہ کر لے، پس ان کے اس قول کے قیاس کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے وطی کی جائے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یہ اہل مدینہ کے ساتھ موافقت ہے۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں حکم کو دو شرطوں پر معلق کیا ہے: ان میں سے ایک خون کا منقطع ہونا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى يَطْهُرْنَ اور دوسرا پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَإِذَا تَطَهَّرْنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ غسل کر لیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ الآیہ (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر کو)۔ اس میں بھی حکم دو شرطوں پر معلق ہے اور حکم

مال دینے کا جواز ہے۔ دو شرطوں میں سے ایک مکلف کا نکاح کی عمر کو پہنچنا ہے اور دوسرا دانائی کا محسوس کرنا ہے، اسی طرح مطلقہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ:230) (تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) پھر عسیلہ کی شرط (مراد جماع ہے) کے بارے حدیث پاک موجود ہے۔ پس حلالہ بھی مجموعی طور پر دو امروں پر موقوف ہوا اور وہ نکاح کا انعقاد اور وطی کا پایا جانا ہے۔ (1)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: بے شک آیت کا معنی ہے: شرط میں غایت وہی ہے جو اس سے پہلی غایت میں مذکور ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰى يَطْهُرْنَ یعنی مخفف بعینہ يَطَّهَّرْنَ مشدد کے معنی میں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آیت میں دو لغتوں کو جمع کر دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ) (اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے۔) کُمیت نے کہا ہے:

وما كانت الانصارُ فيها أذِلَّةً ولا غُيَّبًا فيها اذا الناسُ غُيَّبُ

اور یہ بھی کہ دو قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان دونوں کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور ہم ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیحدہ معنی پر محمول کرتے ہیں۔ پس ہم مخفف کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں سے کم میں ختم ہو جائے، تو ہم اس کے ساتھ وطی کی اجازت نہیں دیتے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے، کیونکہ آدمی خون کے دوبارہ لوٹ آنے سے محفوظ اور امن میں نہیں ہوتا اور ہم دوسری قراءت کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون اکثر مدت پر جا کر ختم ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وطی جائز ہوتی ہے اگرچہ وہ غسل نہ بھی کرے۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: ان کے دلائل میں سے یہ قوی ترین ہے۔ پس پہلے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ وہ فصحاء کے کلام میں سے نہیں ہے اور نہ ہی بلغاء کی زبان ہے، کیونکہ وہ تعداد میں تکرار کا تقاضا کرتا ہے اور جب لفظ کو ایک الگ فائدہ پر محمول کرنا ممکن ہو تو اسے لوگوں کے کلام میں تکرار پر محمول نہیں کیا جاتا، تو پھر علیم حکیم رب کریم کے کلام میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور دوسرے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ معنی پر محمول ہے، تو پھر ان پر لازم ہے کہ جب خون منقطع ہو جائے تو وہ اس کے لئے غسل سے پہلے رجعت کی صورت میں حیض کا حکم نہ لگائیں اور وہ اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور یہ عورت جب حائضہ ہے تو حیض والی عورت کے ساتھ وطی کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی جو انہوں نے کہا ہے وہ اکثر مدت پر انقطاع دم اباحت وطی کا تقاضا کرتا ہے اور جو ہم نے کہا ہے وہ ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جب ایسی دو دلیلوں کے درمیان تعارض آ جائے جن میں سے ایک نہی کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری اباحت کا تو ان دونوں کے باعث اور سبب کو غلبہ دیا جائے گا (پس) نہی کے سبب کو غلبہ دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے ملک یمین کی حیثیت سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے بارے میں کہا ہے۔ ایک آیت نے دونوں کو حلال قرار دیا ہے

1۔ بخاری شریف، باب من اجاز طلاق الثلاث لقول اللہ تعالی الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح، حدیث نمبر 4856، ضیاء القرآن

اور دوسری نے دونوں کو حرام قرار دیا ہے اور تحریم اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر** 11۔ ہمارے علماء نے کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اسے غسل کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں، تو حضرت امام مالک نے ابن قاسم کی روایت میں کیا ہے: ہاں، تا کہ خاوند کے لئے اس کے ساتھ وطی حلال ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ آپ کہتے ہیں: جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرلیں اور یہ صرف مسلمان عورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اسے حیض کے سبب غسل پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کا اعتقاد ہی نہیں رکھتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ:228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر) اور وہ حیض اور حمل ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب صرف مومنہ عورتوں کو کیا ہے اور فرمایا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ:252) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اور اسی طرح محمود بن عبدالحکم بھی کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر** 12۔ حائضہ عورت کے غسل کا طریقہ وہی ہے جو اس کے غسل جنابت کا طریقہ ہے، اس پر اس میں اپنے بالوں کو کھولنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے سر کی مینڈھیاں باندھے ہوئے ہوں کیا میں غسل جنابت کے لئے انہیں کھول دوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تیرے لئے اپنے سر پر تین بار پانی بہانا کافی ہوگا پھر تو اپنے سارے بدن پر پانی بہائے گی تو تو پاک ہو جائے گی۔'' اور ایک روایت میں ہے: کیا میں (1) انہیں حیض اور جنابت (کے غسل) کے لئے کھولوں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ ابوداؤد نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے: ''اور تو ہر چلو ڈالتے وقت اپنے سر کو خوب ملے گی۔''

**مسئلہ نمبر** 13۔ قولہ تعالیٰ: فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ، یعنی اور تم ان سے جماع کرو۔ یہ امر اباحت کے لئے ہے اور اتیان وطی سے کنایہ ہے اور یہ امر اسے مزید مضبوط اور قوی کرتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ تطہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صیغہ امر یقیناً اکمل وجہ پر ہی واقع ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور مِنْ بمعنی فی ہے، یعنی تم اس محل میں جماع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور وہ قُبل (فرج) ہے اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (فاطر:40) یعنی فی الارض (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے) اور یہ ارشاد بھی ہے: اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ:9) یعنی فی الجمعۃ (جب (تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے یعنی اس وجہ سے جس میں تمہیں اجازت دی گئی ہے، یعنی جب تم روزے، احرام اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی المراۃ هل تنقض شعرها عند الغسل، حدیث نمبر 219، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ اصم نے یہی کہا ہے۔ اور ابن عباس اور ابورزین نے کہا ہے: (معنی ہے) طہر کی جانب سے نہ کہ حیض کی جانب سے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور محمد بن حنفیہ نے کہا ہے: معنی ہے من قبل الحلال لا من قبل الزنی یعنی حلال طریقے سے نہ کہ زنا کے طریقے سے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۝ اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ مراد ہے گناہوں اور شرک سے توبہ کرنے والے اور المتطهرون یعنی جنابت اور حدث کے لاحق ہونے کے وقت پانی سے طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے والے۔ حضرت عطا وغیرہ نے یہی کہا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا: التوابين سے مراد گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کرنے سے توبہ کرنے والے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف دیکھا ہے جو لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بطور حکایت ہے: اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ۝ (الاعراف) (باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔)

اور یہ بھی قول ہے: المتطهرون وہ ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیے اور اگر کہا جائے کہ جس نے گناہ کیے ہیں اس کا ذکر اس پر مقدم کیسے ہوسکتا ہے جس نے گناہ نہیں کیے، تو جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا تا کہ توبہ کرنے والا رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو جائے اور متطہر اپنی ذات کے بارے میں عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر کیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ (فاطر: 32) اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۝

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کرلو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو۔''

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ائمہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (1) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ فرمایا: یہودی کہتے تھے جب کوئی آدمی اپنی عورت کے ساتھ اس کی دبر کی جانب سے اس کی قبل (فرج) میں وطی کرتا ہے تو بچہ بھینگا ہوتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ اور زہری سے ایک روایت میں یہ زائد ہے: اگر چاہے تو اسے اوندھا لٹائے اور اگر چاہے تو سیدھا لٹائے مگر وطی ایک سوراخ میں ہو اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صمام کا لفظ سمام سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ترمذی نے یہی کہا ہے۔(1)

اور امام بخاری نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کریم پڑھتے تھے تو گفتگو نہ کرتے تھے یہاں تک کہ قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ پس ایک دن میں قرآن کریم اٹھائے ہوئے تھا اور انہوں نے سورۃ البقرہ پڑھی یہاں تک کہ اس مقام (اس آیت) پر پہنچ کر رک گئے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کیونکر یہ آیت نازل کی گئی ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا: یہ اس اس میں نازل ہوئی ہے، پھر آپ آگے پڑھنے لگے۔

اور عبد الصمد نے بیان کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ مجھے ایوب نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ کے بارے انہوں نے کہا: یاتیہا فی۔ یعنی اس میں مجرور محذوف ہے۔ حمیدی نے کہا ہے: وہ الفرج ہے(3) یعنی وہ اس کے ساتھ فرج میں جماع کرے۔

ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بلاشبہ یہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، وہ بت پرست تھے اور اس قبیلے کے ساتھ یہودی بھی تھے اور وہ اہل کتاب ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور وہ بہت سے افعال میں ان کی اقتدا کرتے تھے اور اہل کتاب کے امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ ایک طرف پر جماع کرتے تھے اور یہ عورت کے لئے زیادہ باعث ستر ہوتا تھا۔ پس انصار کے اس قبیلے نے ان کے افعال میں سے اس فعل کو بھی اختیار کر لیا اور یہ قبیلہ قریش میں سے تھا جو عورتوں کو گدی کے بل لٹا کر ان سے وطی کرتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے، کبھی سامنے کی جانب سے، کبھی پیچھے کی جانب سے اور کبھی چت لٹا کر، پس جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی اور وہ اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگا، تو اس نے اسے ناپسند کیا اور ایسا کرنے سے روکا اور کہا: ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ایک طرف سے جماع کیا جاتا ہے پس تو بھی اسی طرح کر ورنہ مجھ سے دور ہو جا، یہاں تک کہ ان دونوں کا معاملہ بڑھ گیا اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ یعنی سامنے کی جانب سے، پیچھے کی جانب سے اور چت لیٹنے کی حالت میں (محل حرث میں جماع کرو۔) اور یہی محل ولد ہے۔(4)

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس شے نے تمہیں ہلاک کیا ہے؟ عرض کی: آج رات میں نے اپنے پالان (مراد بیوی ہے) کو الٹا کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یہ آیت وحی فرمائی:

---

1۔ سنن ترمذی، باب سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2904، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4163، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی جامع النکاح، حدیث نمبر 1849، ایضاً

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، اقبل و ادبر واتق الدبر والحیضة ( تو سامنے کی جانب سے اور پیچھے کی جانب سے وطی کر اور دبر اور حالت حیض میں وطی کرنے سے بچ۔ ) فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (1)

اور نسائی نے ابوالنضر سے بیان کیا ہے کہ اس نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہارے بارے میں اکثر قول ہے کہ تم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہو کہ انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کیا جا سکتا ہے۔ تو حضرت نافع نے فرمایا: تحقیق انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا: البتہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ معاملہ کیسے تھا۔ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن کریم مجھے دیا اور میں ان کے پاس تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔ فرمایا: نافع! کیا تو جانتا ہے اس آیت کا حکم کیا ہے؟ بے شک ہم گروہ قریش عورتوں کو منہ کے بل اوندھا لٹاتے تھے، جب ہم مدینہ منورہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان سے وہی کرنا چاہا جو ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے تو ان عورتوں نے اسے ناپسند کیا اور اسے بڑا معاملہ قرار دیا، کیونکہ انصار کی عورتوں کے ساتھ ان کے پہلوؤں کے بل جماع کیا جاتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ احادیث تمام کیفیات اور حالت کی اباحت میں نص ہیں بشرطیکہ وطی محل حرث میں ہو، یعنی جس کیفیت میں تم چاہو پیچھے کی جانب سے اور آگے کی جانب سے وہ سینے کے بل لیٹی ہوئی ہو یا چت یا پہلو کے بل۔ اور رہا محل حرث کے سوا کسی جگہ میں وطی کرنا تو یہ نہ مباح رہا ہے اور نہ اسے مباح کیا جائے گا اور حرث کا ذکر اس پر دلالت کرتا ہے کہ محل حرث کے سوا میں وطی کرنا حرام ہے۔ اور حرث یہ تشبیہ ہے، کیونکہ ان میں بھی بیج بویا جاتا ہے اور لفظ حرث واضح کرتا ہے کہ اباحت صرف اور صرف فرج میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ وہی بیج ڈالنے کا محل ہے اور ثعلب نے کہا ہے:

انما الأرحام أرض ون لنا محترثات

بے شک ارحام زمینیں ہیں ہمارے لئے کھیتیاں بنائی گئی ہیں۔

فعلینا الزرع فیها و علی الله النبات

پس ہمارے اوپر ان میں بیج ڈالنا ہے اور اگانا (یعنی اولاد عطا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔

پس عورت کی فرج زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی مانند ہے اور بچہ نباتات کی طرح ہے۔ پس الحرث بمعنی المحترث ہے اور الحرث کو واحد لایا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَجلٌ صومٌ، وقومٌ صومٌ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اَنّٰى شِئْتُمْ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فتویٰ کے نزدیک اس کا معنی ہے: جس طرح تم چاہو سامنے کی جانب سے اور پشت کی جانب سے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور اَنّٰى سوال کے لئے اور کسی کام کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ لغوی اعتبار سے کیف، این اور متی سے عام ہے۔ یہی انی میں عربی استعمال ہے اور لوگوں نے اس آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ انی کی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب من سورة البقرة، حدیث نمبر 2906، ایضاً

اور سیبویہ نے کیف اور این دونوں کے ساتھ اکٹھی اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

اور ایک فرقہ نے این کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ دبر میں وطی مباح ہے اور جن کی طرف یہ قول منسوب ہے وہ حضرت سعید بن مسیب، حضرت نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم، حضرت محمد بن کعب قرظی اور عبدالملک بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہما ہیں اور اسے امام مالک سے ان کی جس کتاب سے بیان کیا گیا ہے اس کا نام کتاب السر ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ماہر اصحاب اور ان کے مشائخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں اور امام مالک کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کے لئے کتاب السر ہو اور یہ قول التنبیہ میں ہے۔

اور علامہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ ابن شعبان نے اس قول کے جواز کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی روایات کتاب جماع النسوان و احکام القرآن میں منسوب کی ہیں اور الکیا الطبری نے کہا ہے: محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (الشعراء) (کیا تم بدفعلی کے لئے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں۔) اور فرمایا: تقدیر کلام یہ ہے تترکون مثل ذلك من ازواجکم یعنی تم اس کی مثل اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، اگر اس کی مثل بیویوں سے مباح نہ ہوتا تو یہ صحیح نہ ہوتا اور اس کی مثل کسی دوسرے محل میں مباح نہیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: تم وہ کرتے ہو اور اس کی مثل مباح کو چھوڑ دیتے ہو۔

الکیا نے کہا: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: اور تم چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں جن میں تمہاری شہوت کی تسکین ہے اور جماع کی لذت ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ حاصل ہو جاتی ہیں، پس اس معنی پر زجر و توبیخ جائز ہے، قول باری تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اس ارشاد گرامی کے ساتھ: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ محل جس میں واقع ہونا ہے وہ خاص ہے اور وہ اسی میں مقصور ہے جو محل ولد ہے (یعنی جس محل میں وطی کرنے سے اولاد کا ہونا ممکن ہے وہی محل حرث ہے اور اسی میں جماع جائز ہے تو چونکہ دبر میں یہ عمل کرنے سے اولاد کا امکان نہیں اس لئے نہ وہ محل حرث ہے اور نہ ہی اس میں وطی مباح ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہی حق اور صحیح ہے۔

ابوعمر بن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے رتقاء میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ ایسی عورت ہے جس سے وطی نہیں کی جا سکتی، یہ عیب ہے اس کے سبب اسے رد کیا جا سکتا ہے، مگر وہ روایت جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کئی طرق سے مروی ہے وہ قوی نہیں ہے وہ یہ کہ رتقاء کو نہیں لوٹایا جائے گا اور نہ کسی اور کو، تمام کے تمام فقہاء اس کے خلاف ہیں کیونکہ مسیس (وطی) ہی نکاح کا مقصود ہے اور اس پر ان کے اجماع میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ دبر محل وطی نہیں ہے اور اگر یہ وطی کا محل ہوتی تو پھر اسے رد نہ کیا جاتا جس کی فرج میں وطی نہ کی جا سکتی ہو۔

اوران کے اجماع میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ ایسی بانجھ عورت جو بچے نہیں جنتی اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے اور وہ جو امام مالک اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب ہے وہ باطل ہے اور وہ اس سے بری الذمہ ہیں، کیونکہ وطی کی اباحت محل حرث کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اور اس لئے بھی کہ بیویوں کو پیدا کرنے میں حکمت نسل کو پھیلانا ہے اور جو اس کا محل نہیں ملک نکاح اسے شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہی بات حق ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے: ہمارے نزدیک وہ (یعنی دبر میں وطی کرنا) اور ذکر کو ساتھ مس کرنا حکم میں برابر ہیں۔ کیونکہ محل نجاست میں قذر (گندگی) اور اذیت دم حیض کی نسبت زیادہ ہے، پس وہ زیادہ شنیع اور برا ہے اور رہی بول کی تکلیف تو یہ رحم کی تکلیف کے سوا ہے۔

علامہ ابن عربی نے قبس میں کہا ہے کہ ہمیں الشیخ الامام فخر الاسلام ابوبکر محمد بن احمد بن حسین فقیہ وقت اور امام وقت نے کہا: فرج پینتیس چیزوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر گن کر بتایا اور کہا: بول کا راستہ تیس کے ماتحت ہے اور ذکر اور فرج کا راستہ وہ ہے جس پر پانچ مشتمل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرج کو حالت حیض میں عارضی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے تو پھر دبر کو لازمی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا جانا بدرجہ اولیٰ ہے۔

اور امام مالک نے ابن وہب اور علی بن زیاد کو اس وقت کہا جب ان دونوں نے انہیں یہ خبر دی کہ مصر میں لوگ آپ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ وہ اسے (دبر میں وطی کو) جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے نفرت کی (اسے انتہائی ناپسند کیا) اور ناقل کی تکذیب بالفور کی اور فرمایا: انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے، انہوں نے میری تکذیب کی ہے، انہوں نے میری طرف جھوٹی نسبت کی ہے۔ (کَذَبوا علیّ تین بار کہا) پھر فرمایا: کیا تم عرب قوم نہیں ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تو کیا اگانے والے محل کے سوا کوئی کھیت ہو سکتا ہے (اور وہ محل فرج ہی ہے۔)

اور جس سے مخالف نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنّٰى شِئْتُمْ یہ اپنی عمومیت کے اعتبار سے تمام راستوں کو شامل ہے (یعنی قبل اور دبر دونوں کو) تو اس میں ان کے لئے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ جو ہم نے اس کے بارے ذکر کیا ہے اس کے سبب یہ خاص ہو چکا ہے اور ان احادیث کے سبب جو صحیح، حسن اور مشہور ہیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ صحابہ کرام نے مختلف متنوں کے ساتھ روایت کیا ہے وہ تمام کی تمام عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کے حرام ہونے پر دال ہیں۔

انہیں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی رحمہم اللہ علیہم وغیرہم نے روایت کیا ہے اور انہیں ابوالفرج بن جوزی نے ان کی سندوں سمیت ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے تحریم المحل المکروہ اور ہمارے شیخ ابوالعباس نے بھی ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا اظہار ادبار من أجاز الوطی فی الادبار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی وہ حق ہے جس کی اتباع کی گئی ہے اور اس مسئلہ میں صحیح (نظریہ) ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھنے والے کو نہیں چاہئے کہ وہ اس مصیبت میں پڑے کیونکہ یہ عالم کی خطا اور لغزش ہے اس کے بعد کہ اس کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں اور ہمیں عالم کی غلطی سے ڈرایا اور محفوظ رکھا گیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے اور جس نے ایسا کیا اس کی تکفیر مروی ہے اور یہی آپ رضی اللہ عنہ کے لائق اور شایان شان ہے۔ اسی طرح حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے جس نے آپ کی طرف سے اس بارے میں بیان کیا، جیسا کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اسے بہت بڑا قدم قرار دیا اور جس نے اسے آپ کی طرف منسوب کیا اسے جھوٹا قرار دیا۔

اور الدارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں سعید ابن یسار ابی الحباب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: آپ ان عورتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے ساتھ تحمیض کی جائے؟ آپ نے فرمایا: تحمیض کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا: ''دبر''، تو آپ نے فرمایا: کیا مسلمانوں میں سے بھی کوئی ایسا کرتا ہے۔

اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسند روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں کرتا تم عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو'' اور اسی کی مثل حضرت علی بن طلق سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا۔''

اور ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت قتادہ سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ لواطت صغریٰ ہے'' (1)۔ یعنی عورت کی دبر میں وطی کرنا۔

اور حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کرنے سے ہی قوم لوط کا عمل شروع ہوا تھا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب کوئی شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر جو بھی اس کے سوا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، یعنی پہلے پہلے وہ عمل کر لو جو کل (یعنی آخرت میں) تمہارے لئے باعث نفع ہوں، اس میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی تصریح اس ارشاد باری تعالیٰ میں کی گئی ہے: وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرہ: 110) (اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں) پس معنی یہ ہوا تم اپنے لئے طاعت اور عمل صالح آگے بھیجو (یعنی پہلے پہلے کر لو)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اولاد اور نسل کی چاہت ہے کیونکہ اولاد دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ تحقیق بیٹا شفیع بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تاکہ اولاد صالح اور طاہر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد افراط کو آگے بھیجنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''جس نے تین بچے آگے بھیجے جو ان

---

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6706

بلوغت کو نہ پہنچے ہوں تو آگ اسے مس نہ کرے گی مگر کفارہ قسم کے طور پر'' الحدیث (1)۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عطا رحمہم اللہ نے کہا ہے: جماع کے وقت پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی جب اپنی بیوی کے پاس مجامعت کے لئے آیا اور اس نے یہ پڑھا بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقتنا (اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو ہمیں شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔) تو اگر ان دونوں کے مابین بچہ مقدر ہوا تو شیطان کبھی بھی اسے ضرر نہ پہنچائے گا۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ تحذیر ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ یہ خبر ہے جو تحذیر میں مبالغہ کا تقاضا کرتی ہے، یعنی وہ تمہیں نیکی اور گناہ پر جزا دے گا۔ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوران خطبہ یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بلاشبہ تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو گے اس حال میں کہ تم سر اور پاؤں سے ننگے ہو گے، پیدل ہو گے اور غیر مختون ہو گے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔ مسلم نے اسے اسی معنی میں روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ نیکی کرنے والے اور ہدایت کے طریقے تلاش کرنے والے کے لئے تانیس ہے۔(2)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴

''اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیزگاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے اور یتیموں کے ساتھ زندگی گزارنے اور عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم فرمایا تو فرمایا: تم مکارم اخلاق میں سے کسی شے سے انکار نہ کرو اس علت کی بنا پر کہ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم اس طرح نہ کریں گے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابراہیم نخعی، مجاہد اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے سوا کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واقسموا باللہ جہد ایمانہم، حدیث نمبر 6164، ایضاً

2۔ صحیح بخاری، باب کیف الحشر، حدیث نمبر 6043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: مراد ایسا آدمی ہے جو قسم کھالیتا ہے کہ وہ نیکی نہ کرے گا اور صلہ رحمی نہ کرے گا اور نہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے گا، پس اسے کہا جاتا ہے: تو نیکی کر، تو وہ کہتا ہے: میں نے تو (نیکی نہ کرنے کی) قسم کھا رکھی ہے۔

اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے قسمیں نہ کھاؤ جب تم نیکی، پرہیزگاری اور اصلاح (صلح کرانے) کا ارادہ کرو، پس اُن کے بعد لا کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دلوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اور کثرت سے قسمیں کھانے والے کی مذمت بیان فرمائی۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ (القلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی۔) اور عرب کم قسمیں کھانے کے سبب تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا:

قليل الألايا حافظٌ ليمينه وان صدرت منه الأليّةُ برّتِ

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ سچی ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر اَنْ تَبَرُّوْا کا معنی ہے تم قسمیں کم کھاؤ کیونکہ اس میں نیکی اور پرہیزگاری ہے، کیونکہ کثیر قسموں کے ساتھ حِنث (قسم توڑنا) بھی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت اور پاسداری میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ تاویل حسن اور اچھی ہے۔

حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم ہر شے میں رائج ہے اور کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ تم ہر حق اور باطل میں تصرف کے لئے قسم نہ کھاؤ۔

اور زجاج وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے کہ ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس سے فعل خیر کا مطالبہ کیا جائے تو اللہ کے ساتھ عذر پیش کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے: مجھ پر قسم ہے، حالانکہ اس نے قسم نہیں کھائی ہوتی۔ قتبی نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم یہ قسم کھاؤ کہ تم صلہ رحمی نہ کرو گے، صدقہ نہ کرو گے اور صلح نہیں کراؤ گے اور انہی کے مشابہ نیکی اور خیر کے کاموں سے متعلقہ قسمیں تو تم قسم کا کفارہ ادا کر دو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ (تاویل) حسن ہے اس کے لئے جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی پر سبب نزول بھی دلالت کرتا ہے، ہم اس کے بعد والے مسئلہ میں اسے بیان کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح پر (مال) خرچ نہ کریں گے جس وقت اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے باتیں کیں (اور آپ پر تہمت لگائی) جیسا کہ حدیث الافک میں ہے، اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔(1)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۂ نور، حدیث نمبر 4381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے۔(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور وہ آپ کی بہن کی نسبت سے آپ کے داماد تھے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ یعنی کھڑی کی ہوئی علامت۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔

اور فلان عرضة ذاك یعنی فلاں اس کے لئے علامت (رکاوٹ) ہے، یعنی وہ اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ اس پر قوی اور غالب ہے اور عرضہ کا معنی الهمة بھی ہے۔ کسی نے کہا:

هم الأنصار عرضتها اللقاء

وہ انصار ہیں ان کا ارادہ لشکر سے ملاقات ہے۔

اور فلان عرضة للناس اور فلاں لوگوں کا ٹارگٹ ہے: وہ مسلسل اس میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔ و جعلت فلانا عرضة لكذا یعنی میں نے فلاں کو اس کے لئے علامت قرار دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرضة یہ شدت اور قوت سے ہے اور اسی سے عورت کے لئے ان کا قول ہے: عرضة للنكاح، جب وہ نکاح کی صلاحیت رکھے اور اس کے لئے قوی ہو جائے۔

اور لفلان عرضة: یعنی فلاں کے لئے سفر اور جنگ کی قوت و طاقت ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

من كل نَضَّاخَةَ الذِّفرى اذا عرقت عُرْضَتُها طامسُ الاعلامِ مجهولُ

اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

فهذى لأيام الحروب و هذه لِلَهْوِى و هذى عرضةٌ لارتحالنا

پس یہ جنگ کے دنوں کے لئے ہے اور لہو و لعب کے لئے ہے اور یہ ہمارے سفر کے لئے قوت و طاقت ہے۔ یعنی تیاری ہے۔ اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

فَلَا تجعلنى عُرضة للّوائم

اور اوس بن حجر نے کہا ہے:

وأدماء مثل الفحل يوماً عرضتُها لرحلى و فيها هزّةٌ و تقاذُفُ

اور معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم کھانے کو اپنے لئے قوت نہ بناؤ اور نیکی سے رکنے کے لئے بہانہ نہ بناؤ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی البر و التقوىٰ و الاصلاح أولى و أمثل: یعنی نیکی کرنا، تقویٰ اختیار کرنا اور صلح کرانا زیادہ بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔

جیسا کہ یہ قول ہے طاعةٌ و قول معروف یہ زجاج اور نحاس سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا محل نصب ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نیکی، تقویٰ اور صلح کرانے سے باز نہ رکھے، یہ بھی زجاج سے منقول ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی أَلاَّ تبرّوا اور لا کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا۔ ای لئلا تضلوا (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) طبری اور نحاس نے اسی طرح کہا ہے اور وجوہ نصب میں سے چوتھی وجہ یہ ہے: کراھۃ ان تبرّوا، (کہ نیکی کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں نہ کھاؤ۔) پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے، اسے نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ محل جر میں ہے۔ یہ قول خلیل اور کسائی کا ہے اور تقدیر کلام ہے: فی أَنْ تبرّوا اور فی مضمر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسے جر دی گئی۔
اور سَمِیْعٌ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ عَلِیْمٌ اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

''نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: بِاللَّغْوِ۔ اللغو: یہ مصدر ہے لَغَا یَلْغُوْ وَ یَلْغٰی، و لَغِیَ یَلْغَی لَغًا جب کلام میں کوئی ایسی شے ذکر کی جائے جس کی حاجت اور ضرورت نہ ہو یا ایسی شے کو لانا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو یا ایسی شے جس کا گناہ لغو ہو جائے اور حدیث میں ہے: ''جب تو اپنے ساتھی کو کہے ''خاموش ہو جا'' اس حال میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا'' (1) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں۔ لَغَوْتَ کی بجائے لغیت ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

و رُبّ أسرابِ حجیج کُظَّمِ عن اللّغا و رَفَثِ التَّکَلُّمِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

و لستَ بمأخوذ بلَغْوٍ تقولُہ اذا لم تَعَمّد عاقداتِ العزائمِ

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا یمین لغو کے بارے میں اختلاف ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کسی آدمی کا وہ قول جو اس کے کلام کے درمیان میں ہو اور محاورہ میں اس کی عجلت پسندی کے سبب ہو: لا واللہ اور بلیٰ واللہ، یہ (الفاظ) قسم کے ارادے سے نہ ہوں۔
مروزی نے کہا ہے: وہ یمین لغو جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لغو ہے وہ آدمی کا یہ قول ہے: لا واللہ اور بلیٰ واللہِ۔ جبکہ یہ اس کی گفتگو اور کلام میں واقع ہوں نہ ان سے قسم کا اعتقاد ہو اور نہ ہی قسم کا ارادہ ہو۔
اور ابن وہب نے یونس سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، حدیث نمبر 882، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المومنین زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یمین لغو وہ ہے جو (محض) دکھاوا، تمسخر اور مزاح میں ہو اور وہ بات جس پر دل کا اعتقاد نہ ہو۔

اور بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ ایک آدمی کے اس قول کے بارے میں نازل ہوا: (یعنی) لا واللہ اور بلی واللہ۔

اور کہا گیا ہے: لغو وہ ہے جس کے بارے میں کوئی ظن کی بنا پر قسم کھاتا ہے اور وہ امر قسم کے خلاف ہوتا ہے، امام مالک نے یہی کہا ہے آپ سے اسے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور اسلاف میں سے ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی کسی شے کی قسم کھائے اور اس کا ظن یہی ہو کہ وہ اسی طرح ہے جبکہ (فی الحقیقت) وہ اس طرح نہ ہو تو وہ قسم لغو ہوگی اور اس میں کفارہ نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور روایت ہے کہ ایک قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گفتگو کا تبادلہ کیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تہمت عائد کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے قسم کھائی کہ میں نے درست کہا اور اے فلاں! تو نے غلط بیانی کی ہے، جبکہ معاملہ اس کے خلاف نکلا، تو اس آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ حانث ہو گیا ہے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أیمان الرُّماۃ لغو لا حنثَ فیھا ولا کفارۃ(1) (گفتگو میں زیادتی کی قسم لغو ہے، اس میں نہ حانث ہونا ہے اور نہ کوئی کفارہ ہے۔)

اور موطا میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا میں نے سنا ہے (وہ یہ ہے) کہ اللغو سے مراد انسان کا کسی شے کے بارے میں قسم کھانا ہے جس کے بارے وہ یقین رکھتا ہو کہ وہ اسی طرح ہے پھر وہ اس کے برعکس پائی جاتی ہے، اس میں کفارہ نہیں ہے اور وہ جو کسی شے کے بارے میں قسم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس میں گنہگار ہے، جھوٹا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی کو راضی کرے یا مخلوق کے لئے معذرت کرے یا وہ اس کے ذریعہ مال ہتھیا لے تو یہ اس سے بڑھ کر ہے کہ اس میں کفارہ ہو۔

اور کفارہ اس پر ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا حالانکہ اس کے لیے اس کا کرنا مباح ہے پھر وہ اسے کر گزرتا ہے یا (یہ قسم کھائے) کہ وہ اس طرح کرے گا پھر وہ ایسا نہ کرے، مثلاً اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنا کپڑا دس درہم کے عوض نہیں بیچے گا پھر وہ اتنے کے عوض ہی فروخت کر دیتا ہے یا کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنے غلام کو ضرور مارے گا پھر وہ اسے نہ مارے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے...... اگر آپ سے یہ روایت صحیح ہے...... آپ نے فرمایا: یمین لغو یہ ہے کہ تو قسم کھائے درآنحالیکہ تو غصے میں ہو اور طاؤس نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یمین فی غَضَبٍ (2) حالت غضب میں قسم نہیں ہوتی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ (اللغو سے مراد) حلال کو حرام قرار دینا ہے، پس وہ کہتا ہے: میرا مال مجھ پر حرام

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 31
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 26

ہے اگر میں نے اس طرح کیا اور حلال مجھ پر حرام ہے، مکحول دمشقی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور امام مالک نے بھی یہی کہا ہے، سوائے بیوی کے کیونکہ اس نے اس میں تحریم لازم کردی ہے مگر یہ کہ قسم کھانے والا اپنے دل کے ساتھ اسے خارج کردے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغو سے مراد معصیت کی قسم ہے، حضرت سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں حضرت عروہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے جیسا کہ کوئی یہ قسم کھاتا ہے: ''وہ شراب ضرور پیے گا یا وہ قطع رحمی ضرور کرے گا۔''

پس اس کی نیکی اس فعل کو ترک کرنا ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور ان کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا دیکھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے اور بے شک اس کا ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے (1)۔'' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر بھی ''المائدۃ'' میں آئے گا۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں بددعا کرے: (مثلاً) اللہ تعالیٰ اس کی بصارت کو اندھا کردے، اللہ تعالیٰ اس کا مال ضائع کردے، وہ یہودی ہے، وہ مشرک ہے، وہ ولد الزنا ہے اگر اس نے اس طرح کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دو آدمی خرید و فروخت کرتے ہیں، پس ان میں سے ایک کہتا ہے: قسم بخدا! میں تجھے اتنے کے عوض نہیں بیچوں گا اور دوسرا کہتا ہے: قسم بخدا! میں اتنے کے عوض اسے نہیں خریدوں گا۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: وہ آدمی جو قسم کھاتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ بھول جاتا ہے اور اسے کرگزرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بے شک یمین لغو وہ ہے جس کا کفارہ ادا کیا جائے، یعنی جب قسم کا کفارہ ادا کردیا جائے تو وہ ساقط ہوجاتی ہے اور لغو ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ادا کرنے کے سبب اور اس سے بہتر کی طرف لوٹنے کے سبب مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ ابن عبدالبر نے ایک قول بیان کیا ہے کہ لغو سے مراد مکرہ کی قسم ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قسم جو نسیان اور بھول کے ساتھ ہو اس کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ وہ اس کے قصد اور ارادہ کے خلاف واقع ہوئی ہے، پس وہ محض لغو ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مُکْرَہ کی قسم اپنے انجام سمیت، جس نے بالاکراہ قسم کھائی اس کا حکم ''النحل'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: رہا وہ جس نے کہا کہ لغو سے مراد یمین المعصیۃ ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ ترک معصیت پر قسم کھانے والے کی قسم عبادت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجاتی ہے اور معصیت کا ارتکاب کرنے پر قسم کھانے والے کی قسم معصیت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجائے گی اور اسے کہا جائے گا: تو معصیت کا ارتکاب نہ کر اور کفارہ ادا کردے اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6736

2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 635

اگر اس نے اقدام فعل کیا تو وہ اپنے اقدام میں گنہگار ہوگا اور اپنی قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد انسان کا اپنے خلاف دعا کرنا ہے اگر اس طرح نہ ہوا تو اس کے عوض اس طرح آفات نازل ہوں، تو یہ قول لغو ہے کفارہ کے طریق میں، لیکن فی القصد یہ قول منعقد ہو جائے گا اور مکروہ ہے اور بسا اوقات اس کے سبب مؤاخذہ بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے بارے میں بددعا نہ کرے بسا اوقات اتفاقیہ ایسی ساعت ہوتی ہے کہ جو کوئی اس میں اللہ تعالیٰ سے کسی شے کے بارے سوال کرتا ہے تو وہ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔''

اور رہا وہ جس نے کہا اس سے مراد یمین الغضب ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حالت غضب میں قسم کھانا اس کی تردید کرتا ہے کہ وہ اشعریین کی بوجھ اٹھانے میں مدد نہیں کریں گے اور پھر آپ نے ان کی مدد کی اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس کا ذکر ''سورۂ براءۃ'' میں آئے گا۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جس کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہے تو یہ اس کے متعلق نہیں جو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے اور کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے مطلقاً لغو سے مؤاخذہ اٹھا لیا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ ہے اور قسم میں مؤاخذہ یمین غموس میں جو کہ حالف نے اپنے ذمہ لازم کر رکھی ہو اور اس میں جس کا کفارہ ادا کرنا ترک کر دیا گیا ہو حالانکہ وہ اس میں سے ہو جن میں کفارہ ہوتا ہے آخرت کی سزا ہے اور لازم کرنے میں دنیا کی سزا ہے، پس یہ قول ضعیف ہو جاتا ہے اس سبب سے کہ یہ یمین المکفر ہ ہے، کیونکہ اس میں مؤاخذہ واقع ہوا ہے اور مؤاخذہ کو فقط آخرت کے ساتھ خاص کرنا یہ مرضی کا فیصلہ ہے (جس کی کوئی حقیقت نہیں)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ۔ الأیمان یمین کی جمع ہے اور الیمین کا معنی قسم ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ عرب لوگ جب آپس میں قسم اٹھاتے تھے یا باہم عقد کرتے تھے تو ایک آدمی اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے ساتھی کا دایاں ہاتھ پکڑتا پھر یہ رواج بہت زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ نفس قسم اور عہد کا نام ہی یمین پڑ گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یمین فَعِيلٌ کے وزن پر یُمْنٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی برکت ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نام اس لئے دیا ہے کیونکہ یہ حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور يَمِيْنٌ کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اس کی جمع ایمان اور ایمن ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

فتجمع　أيمُنٌ　منا　و　منكم

(پس ہماری طرف سے اور تمہاری طرف سے بہت سی قسمیں جمع ہو رہی ہیں۔)

(۴) قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ اس قول کی مثل ہے: وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (المائدہ: 89) اس کے تحت اس کے بارے مکمل بحث آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا: قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ ایسے آدمی کے بارے میں ہے

جو یہ کہتا ہے: وہ مشرک ہے اگر وہ ایسا کرے، یعنی یہ لغو ہے مگر یہ کہ وہ اپنے دل سے شرک کرنے کا اعتقاد اور اس کا ارادہ کرے اور غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ یہ دونوں صفتیں ہیں جو اس کے مناسب ہیں جو مؤاخذہ چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نرمی اور وسعت کے باب سے ہے۔(1)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

''ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے مہلت ہے چار ماہ کی پھر اگر رجوع کرلیں (اس مدت میں) تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور اگر پکا ارادہ کرلیں طلاق دینے کا تو بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چوبیس مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ۔ يُؤْلُوْنَ کا معنی ہے وہ قسم اٹھاتے ہیں (2) اور مصدر ایلاءٌ، اَلِيَّةٌ، اَلْوَةٌ اور اِلْوَةٌ ہیں۔ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِلَّذِيْنَ يقسمون (3) قراءت کی ہے اور یہ بات جانی پہچانی ہے کہ يقسمون، يُؤْلُوْنَ کی تفسیر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ آلَوْا بھی پڑھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: آلَى يُؤْلِي اِيلاءً اور تَأَلَّى تَأَلِّيًا اور اِئْتَلَى ائتلاء یعنی اس نے قسم کھائی۔ اور اسی میں سے ہے: وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ (نور:22) (اور تم میں سے صاحب فضل قسم نہ کھائیں)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فآليتُ لا أنفكُ أحذُ و قصيدةً    تكون و اياها بها مثلا بعدِي

اور دوسرے نے کہا:

قليل الألايا حافظٌ ليمينهِ    وان سبقَت منه الألية برّتِ(4)

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی پاسداری کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہوجائے تو وہ پوری ہوجاتی ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے:

أليّة باليَعْملاتِ يَرْتَمِي    بها النّجَاءُ بين أجواز الفَلَا

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دور جاہلیت کا ایلاء ایک سال، دو سال اور اس سے زیادہ عرصہ کا تھا۔ وہ اس سے رات کے وقت عورت کو اذیت پہنچانے کا قصد کرتے تھے، پس ان کے لئے چار ماہ رکھے گئے اور جس نے اس سے کم عرصہ کے لئے ایلاء کیا تو وہ حکماً ایلاء نہ ہوگا (5)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ    2۔ ایضاً    3۔ ایضاً
4۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 215، دار الکتب العلمیہ    5۔ احکام القرآن ابن عربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلاء کیا اور طلاق دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کا سبب آپ سے ازواج مطہرات کا ایسے نفقہ کا سوال تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھا، اسی طرح صحیح مسلم میں ہے اور کہا گیا ہے کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدیہ آپ پر واپس لوٹا دیا تھا، پس اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے ہو گئے اور ان سے ایلاء کر لیا (1)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ایلاء ہر اس کے لئے ثابت ہوتا ہے جس کے لئے طلاق ثابت ہے، پس آزاد، غلام اور سکران (نشے والا) ہر ایک کو ایلاء لازم ہوتا ہے اور اسی طرح سفیہ (احمق) اور جس پر ایلاء کیا جائے بشرطیکہ وہ بالغ اور غیر مجنون ہو اور اسی طرح خصی ہے جبکہ وہ مقطوع الذکر نہ ہو اور بوڑھا آدمی جبکہ اس میں رمق اور نشاط باقی ہوں۔

مقطوع الذکر آدمی جب ایلاء کرے تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے۔

ایک قول میں ہے کہ اس کے لئے کوئی ایلاء نہیں ہے اور ایک قول میں ہے: اس کا ایلاء صحیح ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح اور کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ رجوع وہ ہے جو قسم کو ساقط کر دیتا ہے اور رجوع بالقول اسے ساقط نہیں کرتا تو جب حنث سے مانع قسم باقی ہے تو پھر ایلاء کا حکم بھی باقی ہوگا اور گونگے آدمی کا ایلاء ایسی تحریر یا اشارہ کے ساتھ ہوتا ہے جو سمجھا جا سکتا ہو اور وہ اس کو لازم ہو۔ اسی طرح عجمیوں کا حکم ہے جب وہ اپنی عورتوں سے ایلاء کر لیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا اس بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ قسم میں سے ایلاء واقع ہوتا ہے۔

پس ایک قوم نے کہا ہے: ایلاء واقع نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی قسم کھانے کے ساتھ (2)، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من کان حالفا فلیحلف باللہ او لیصمت (3) یعنی جو کوئی قسم اٹھانے والا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا پھر وہ خاموش رہے۔)

امام شافعی نے بھی اپنے جدید قول میں یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "ہر وہ قسم جو جماع سے روکے تو وہی ایلاء ہے (4) اور اسی کے مطابق شعبی، نخعی، مالک، اہل حجاز، سفیان ثوری، اہل عراق، امام شافعی نے اپنے دوسرے قول میں، ابو ثور، ابو عبید، ابن منذر اور قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: ہر وہ قسم جس کے سبب حالف اپنی بیوی کے ساتھ جماع کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ حانث ہو جائے گا تو وہ اس کے سبب ایلاء کرنے والا ہوگا، بشرطیکہ اس کی قسم چار مہینوں سے زیادہ کی ہو، پس ہر وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات اور اس کی کفالت، اس کا عہد اور اس کا ذمہ ہے کہا تو اس پر ایلاء لازم ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کہا: اقسم یا اعزم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1 صفحہ 148، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1 صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

3۔ بخاری شریف، کتاب الایمان، باب لا تحلفوا بآبائکم، جلد 2 صفحہ 983، وزارت تعلیم

ایضاً، کتاب الشہادات، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1 صفحہ 356، دار الکتب العربیۃ

اور ساتھ باللہ کا ذکر نہ کیا تو کہا گیا ہے: اس پر ایلاء واقع نہ ہوگا، مگر یہ کہ وہ باللہ کا ارادہ کرے اور اس کی نیت کرے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ قسم ہے تو اس پر ایلاء واقع ہو جائے گا۔ اس کا تفصیلی بیان ''سورۃ المائدۃ'' میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اگر کسی نے روزوں کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اپنے بیوی سے وطی نہ کرے گا اور کہا: اگر میں تجھ سے وطی کروں تو مجھ پر ایک ماہ یا ایک سال کے روزے ہیں تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہر وہ جو حج، طلاق، عتق، نماز یا صدقہ میں سے اپنے ذمہ لازم کرتا ہے (تو وہ مولیٰ ہو جائے گا) اور ان تمام میں بنیاد اور اصل قول باری تعالیٰ کی عمومیت ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ اور کوئی فرق نہیں ہے جب اس نے صدقہ یا معین غلام کی آزادی یا غیر معین غلام کی آزادی کے ساتھ ایلاء کیا تو ایلاء ثابت ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اگر کسی نے قسم کھائی قسم بخدا! وہ وطی نہ کرے گا اور استثنا کر دی اور کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ، تو بلاشبہ وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور اگر اس نے اس سے وطی کی تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، یہ امام مالک سے ابن قاسم کی روایت میں ہے اور ابن ماجشون نے المبسوط میں کہا ہے: وہ مولی نہیں ہوگا، یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ استثناء (ان شاء اللہ کہنا) قسم کو کھول دیتا ہے۔ اور حالف کو اس طرح کر دیتا ہے گویا کہ اس نے قسم کھائی ہی نہیں اور یہی فقہائے امصار کا مذہب ہے، کیونکہ ان شاء اللہ کہہ کر اس نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ فعل کا قصد کرنے والا نہیں (1) اور اس کی وجہ جسے ابن القاسم نے روایت کیا ہے اس کی بنا اس پر ہے کہ استثنا قسم کو نہیں کھولتا، البتہ وہ کفارہ کو ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے، اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ پس جب اس کی قسم باقی ہے، منعقد ہو چکی ہے تو پھر ایلاء کا حکم اسے لازم ہوگا، اگرچہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اگر کسی نے نبی علیہ السلام، ملائکہ یا کعبہ معظمہ کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اس سے وطی نہ کرے گا یا اس نے کہا: وہ یہودی یا نصرانی یا زانی اگر وہ اس سے وطی کرے، تو اس صورت میں وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ اسے قسم کے طریقہ کے بغیر لایا ہے اور اگر وہ اسے اس ارادہ پر لایا کہ ان میں سے یا کوئی اور جو الفاظ اس نے اسے کہے ہیں وہ اس کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہے، تو المبسوط میں ہے کہ ابن القاسم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: لا مرحبا اور اس سے وہ ایلاء کا ارادہ کرتا ہے وہ مولی ہو جائے گا، تو انہوں نے ذکر کیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر وہ کلام جس سے اس نے طلاق کی نیت کی تو وہ طلاق ہو جاتی ہے اور یہ (ایلاء) اور طلاق دونوں برابر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قرآن کریم میں مذکور ایلاء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کوئی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ قسم کھائے کہ وہ ہمیشہ عورت کو مس نہیں کرے گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ ایک دن یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اپنی بیوی کے قریب نہیں آئے گا پھر اس نے چار مہینے تک وطی نہ کی تو وہ عورت ایلاء کے سبب اس سے جدا ہو جائے گی۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 178، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب الایلاء واللعان باب فمن قال علی نذر، جلد 6، صفحہ 86، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حکم، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے اور یہی اسحاق نے بھی کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: کثیر اہل علم نے اس قول کا انکار کیا ہے۔(1)

اور جمہور نے کہا ہے: ایلاء یہ ہے کہ آدمی قسم کھائے کہ وہ چار مہینے سے زیادہ (عرصہ) وطی نہ کرے گا۔ پس اگر اس نے چار ماہ اور ان سے کم کی قسم کھائی تو وہ مولیٰ نہ ہوگا اور ان کے نزدیک وہ صرف قسم ہے۔ اگر اس نے اس مدت کے دوران وطی کی تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی جیسا کہ تمام قسموں میں ہوتا ہے یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور ثوری اور علماء کوفہ نے کہا ہے کہ ایلاء یہ ہے کہ آدمی چار مہینے اور کچھ زائد کی قسم کھائے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے(2)۔

اہل کوفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء میں چار مہینے مہلت مقرر کی ہے جیسا کہ اس نے عدت وفات کے لئے چار ماہ دس دن اور عدت میں تین حیض مقرر کیے ہیں اور اس کے بعد کوئی مہلت اور انتظار نہیں۔ انہوں نے کہا: مدت کے بعد ایلاء کا ساقط ہونا واجب ہو جاتا ہے اور وہ ساقط نہیں ہوتا مگر فیئ (رجوع) کے ساتھ اور اس سے مراد مدت کے اندر جماع کرنا ہے (ورنہ) چار مہینے گزرنے کے بعد طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے استدلال کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والے کے لئے چار ماہ مدت مقرر کی ہے۔ پس یہی اس کی کامل مدت ہے، اس دوران اس کی بیوی کو اس پر کوئی اعتراض (کا حق) نہیں۔ جیسا کہ دین مؤجل کا مالک مدت مکمل ہونے کے بعد ہی اس کے بارے مطالبے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اور حضرت اسحاق کے قول کی وجہ مدت کم ہونے کے بارے میں (یعنی چار ماہ سے کم) کہ اس کے ساتھ بھی قسم کھانے والا مولی ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ وطی نہ کرے۔ اس کا قیاس چار مہینے سے زیادہ کی قسم کھانے والے پر ہے کیونکہ وہ مولی ہو جاتا ہے، کیونکہ قسم سے مقصود ضرر اور اذیت پہنچانا ہے اور یہ معنی قلیل مدت میں بھی موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس بارے اختلاف ہے کہ جس نے چار مہینے سے زیادہ مدت اپنی بیوی سے وطی نہ کرنے کی قسم کھائی اور چار ماہ گزر گئے اور عورت نے اس سے مطالبہ نہ کیا اور اسے نہ سلطان وقت کے پاس پیش کیا تاکہ وہ اسے مطلع کرے (3)، تو امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر اہل مدینہ کے نزدیک اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے ساتھ ایک طلاق رجعیہ اس پر لازم ہو جائے گی اور ان سے بعض اور کچھ دوسرے علماء کہتے ہیں: چار مہینے گزرنے کے ساتھ اسے ایک طلاق بائنہ لازم ہوگی اور صحیح قول وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ مولی کو طلاق لازم نہیں ہوتی یہاں تک کہ حاکم وقت اسے اس کی بیوی کے مطالبہ کے بارے میں آگاہ کرے تاکہ وہ رجوع کرلے تو وہ اپنی بیوی کی طرف وطی کے ساتھ رجوع کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے یا وہ طلاق دے دے اور (حاکم) اسے نہ چھوڑے یہاں تک کہ وہ رجوع کرلے یا طلاق دے دے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اور فیئ (رجوع) سے مراد جماع کرنا ہے جس صورت میں اس کے ساتھ مجامعت ممکن ہو۔ سلیمان بن یسار نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں نو (یا انیس) آدمی تھے جو ایلاء میں توقف کرتے تھے۔ امام مالک نے کہا: یہ حکم ہمارے نزدیک ہے اور اسی طرح لیث، شافعی، احمد، اسحاق، ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اسے ابن منذر نے پسند کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اور ایلاء کرنے والے کی مدت قسم کھانے کے دن سے شروع ہوگی نہ کہ اس دن سے جس دن اس کی زوجہ اس سے جھگڑے اور اسے حاکم کے پاس پیش کرے اور اگر عورت نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا اور وہ اس کے مباشرت نہ کرنے کے ساتھ راضی نہ ہوئی تو حاکم قسم کے دن سے اس کے لئے چار مہینے کی مدت مقرر کر دے، پس اگر اس نے مباشرت کی تو اس نے زوجہ کے حق کی طرف رجوع کر لیا اور وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے اور اگر اس نے رجوع نہ کیا تو وہ اس پر طلاق رجعیہ ڈال دے۔

امام مالک نے فرمایا: اگر اس نے رجوع کر لیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ عدت میں مقاربت اختیار کرے۔

ابہری نے کہا ہے: اس میں طلاق کا واقع ہونا دفع ضرر کے لئے ہے تو جب اس نے مقاربت نہ کی تو ضرر باقی رہا، تو اس صورت میں رجعت کا کوئی معنی نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو جو اسے مقاربت سے روکتا ہو تو پھر اس کا رجوع صحیح ہو گا، کیونکہ ضرر زائل ہو جائے گا اور وطی سے اس کا باز رہنا ضرر پہنچانے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو عذر کی وجہ سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ حالت غضب کے سوا ایلاء کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حالت غضب کے سوا ایلاء نہیں ہوتا (1) اور اس کے بارے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مشہور میں یہی مروی ہے اور اسی طرح لیث، شعبی، حسن اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، یہ سب کہتے ہیں: ایلاء نہیں ہوتا مگر اس وجہ سے کہ وہ باہم ایک دوسرے پر غصے ہوں، آپس میں جھگڑ رہے ہوں، تنگ ہوں اور تکلیف دینا مقصود ہو کہ وہ اسے ضرر پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کرے گا، چاہے اس کے ضمن میں بچے کی اصلاح مقصود ہو یا نہ ہو اور اگر یہ غضب کی وجہ سے نہ ہو تو پھر ایلاء نہیں ہوگا (2)۔

اور ابن سیرین نے کہا ہے: چاہے قسم حالت غضب میں ہو یا بغیر غضب کے ہو وہ ایلاء ہے۔ یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ثوری، مالک اور اہل عراق، امام شافعی اور آپ کے اصحاب اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے مگر امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے بچے کی اصلاح کا ارادہ نہ کیا ہو (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: یہی اصح ہے کیونکہ انہوں نے جب اس پر اجماع کیا ہے کہ ظہار، طلاق اور تمام قسمیں حکم میں برابر ہیں، چاہے حالت غضب میں ہوں یا حالت رضا میں تو پھر ایلاء بھی انہیں کی طرح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اور اس پر قرآن کریم کا عام حکم دلالت کرتا ہے اور حالت غضب کی تخصیص دلیل کی محتاج ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جو اسے لازم قرار دے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی جو بغیر ایسی قسم کے اپنی بیوی کی مقاربت سے رکا رہا جو اس نے بیوی کو ستانے کے لئے قسم کھائی ہو۔ تو اسے اس کے ساتھ مباشرت کا حکم دیا جائے اور اگر وہ انکار کر دے اور اسے ضرر پہنچانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے لئے امتناع وطی پر قائم رہے تو بغیر مدت مقرر کیے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے مدت ایلاء مقرر کی جائے گی اور یہ قول بھی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں اس پر ایلاء داخل نہ ہوگا، اگرچہ وہ کئی سال تک اس سے مقاربت نہ کرنے پر قائم رہے، لیکن اسے نصیحت کی جائے گی اور اسے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا جائے گا کہ وہ اسے ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے نہ روکے رکھے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہ چھڑا لے، تاکہ حاملہ اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے اور وہ اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یہاں تک کہ مدت رضاع گزر گئی تو امام مالک کے نزدیک بچے کی اصلاح کا ارادہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اسے ایلاء نہ قرار دیا (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں یہی کہا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مولی ہو جائے گا اور بچے کو دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور یہی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ آدمی ایلاء کرنے والا نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی زوجہ سے اس کمرے میں یا اس گھر میں دخول نہ کرے گا کیونکہ وہ مقاربت کے لئے اس کے سوا اور جگہ بھی پا سکتا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ اور اسحاق نے کہا ہے: اگر اس نے اسے چار ماہ تک چھوڑے رکھا تو وہ ایلاء کے ساتھ جدا ہو جائے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ اس سے چار ماہ تک رکا رہا ہے اور اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اس سے اس مصر یا اس شہر میں وطی نہ کرے گا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مولی ہو جائے گا۔ اور ایسا بلاشبہ سفر میں ہوتا ہے کہ وہ مشقت اور کلفت برداشت کرتا ہے نہ کہ اپنے باغ یا اپنے قریبی کھیتوں میں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ نِّسَآىٕهِمْ اس میں آزاد عورتیں، ذمیہ عورتیں اور لونڈیاں سبھی داخل ہیں جب وہ شادی کر لیں اور غلام کا ایلاء بھی اپنی بیوی سے ثابت ہو جاتا ہے۔

امام شافعی، احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء بھی آزاد آدمی کے ایلاء کی مثل ہے (2)۔ ان کی دلیل اس قول باری تعالیٰ کا ظاہر ہے: لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىٕهِمْ کیونکہ یہ تمام ازواج کے لئے ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

امام مالک، زہری، عطا بن ابی رباح اور اسحاق نے کہا ہے: اس (غلام) کی مدت دو مہینے ہے۔ اور حسن اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اگر غلام کی بیوی کسی کی لونڈی ہو تو اس کے ایلاء کی مدت دو مہینے ہے اور اگر وہ آزاد ہو تو اس کے ایلاء کی مدت چار مہینے ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے، اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لونڈی کے ایلاء کی مدت آزاد

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 515، وزارت تعلیم　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

عورت کے ایلاء کا نصف ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور نخعی وغیرہم نے کہا ہے کہ ایلاء کے لازم ہونے میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں برابر ہیں۔ اور زہری، عطا اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ ایلاء نہیں ہوتا مگر دخول کے بعد۔

اور امام مالک نے کہا ہے: صغیرہ عورت میں ایلاء نہیں ہوتا جب تک وہ بالغ نہ ہو اور اگر اس نے اس سے ایلاء کیا اور وہ بالغ ہوگئی تو اس کے بالغ ہونے کے دن سے ایلاء لازم ہو جائے گا (1)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اور رہا ذمی تو اس کا ایلاء صحیح نہیں ہوتا، جس طرح کہ اس کی جانب سے ظہار اور طلاق درست نہیں ہوتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک اہل شرک کا نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے لئے نعمت اور احسان کے مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شریعت کے مکلف نہیں کہ ان پر قسموں کے کفارات لازم ہوں اور اگر وہ ہمارے پاس ایلاء کا مقدمہ پیش بھی کریں تو ہمارے حاکم کو نہیں چاہئے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ اپنے حکام کی طرف جائیں گے اور اگر ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم ہونے لگے تو پھر یہ حکم اسلام کے مطابق فیصلہ کرے، جیسا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی چھوڑ دے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ، التربص کا معنی ہے: مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔ یہ تصبّر (مصنوعی صبر) کا الٹ (مقلوب) ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تَرَبَّصْ بها ريبَ المَنُونِ لعلّها		تُطلَّقُ يوما او يموتُ حليلُها

تو اس کے ساتھ حوادثات زمانہ کا انتظار کر شاید کسی دن اسے طلاق ہو جائے گی یا اس کا خاوند فوت ہو جائے گا

اور رہا چار مہینے وقت مقرر کرنے کا فائدہ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بارے میں اہل جاہلیت سے جو ذکر کیا ہے وہ پہلے گزر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس (ایلاء) سے منع فرما دیا اور دوری اور علیحدگی کے ساتھ عورت کو ادب سکھانے کے لئے خاوند کے لئے چار مہینے مدت مقرر کر دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (النساء: 34) (اور تم انہیں بستروں میں چھوڑ دو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ انہیں ادب سکھانے کے لئے ایک ماہ تک ایلاء کیا اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے وہ ہیں جن سے زیادہ کوئی خاوند صبر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کسی رات مدینہ طیبہ میں گشت کر رہے تھے تو آپ نے ایک عورت کی آواز سنی، وہ یہ اشعار کہہ رہی تھی:

الاطال هذا الليلُ و اسودَّ جانبُه		وأرّقني أن لاحبيب أُلاعِبُه

فو الله لو لا الله لا شيءَ غيره		لَزُعْزِعَ من هذا السرير جوانبُه

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

مخافۃ ربی والحیاءُ یکفنی واکرامَ بعلی أن تُنال مراکبُہ

جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تیرا خاوند کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: آپ نے اسے عراق بھیجا ہوا ہے پھر آپ نے عورتوں کو بلایا اور ان سے پوچھا: ایک عورت کتنی دیر تک اپنے خاوند کے بغیر صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا: دو مہینے اور تیسرے ماہ اس کا صبر کم ہو جاتا ہے اور چوتھے ماہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے جہاد کی مدت چار مہینے مقرر کر دی، جب چار ماہ گزر جاتے تو آپ جہاد کرنے والے لشکر کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسرا لشکر بھیج دیتے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ بات بھی مدت ایلاء کے چار مہینوں کے ساتھ اختصاص کو قوی کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ فَآءُوْ اس کا معنی ہے: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا اور اس سے یہ بھی ہے (1) حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ اور اس معنی میں زوال کے بعد والے سایہ کو فیئ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے مغرب کی جانب لوٹ آتا ہے، کہا جاتا ہے: فَاءَ یَفِیْءُ فَیْئَۃً وَ فُیُوْءًا۔ وانہ لسریع الفیئۃ یعنی وہ رجوع میں تیز رفتار ہے۔ شاعر نے کہا:

ففاءَتْ و لم تقضِ الذی اقبلَتْ لہ و مِنْ حاجۃ الانسان ما لیس قاضیا

پس وہ لوٹ آئی اور اس نے اسے پورا نہ کیا جس کے لئے آئی اور انسان کی حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ سب کے سب جن سے کچھ محفوظ اور یاد کیا جاتا ہے وہ اس پر ہیں کہ فیء سے مراد اس آدمی کا جماع کرنا ہے جس کا کوئی عذر نہ ہو اور اگر اس کا کوئی عذر ہو (مثلاً) وہ بیمار ہو جائے، قید ہو جائے یا اس کے مشابہ کوئی اور عذر ہو تو بلاشبہ اس کا رجوع صحیح ہوگا اور یہ اس کی بیوی ہوگی اور جب سفر سے آنے کے سبب یا مرض سے افاقہ پانے کے سبب عذر زائل ہو جائے یا قید سے رہائی پانے کے سبب (عذر ختم ہو جائے) اور وہ وطی سے انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، بشرطیکہ مدت ایلاء گزر چکی ہو۔ امام مالک نے المدونہ میں اور المبسوط میں یہی کہا ہے۔

اور عبد الملک نے کہا ہے: وہ عورت مولی سے اس دن سے جدا ہوگی جس دن مدت ختم ہوئی، پس اگر رجوع کے ساتھ اس کا عذر سچا ہوا جبکہ عورت نے اسے قدرت دی تو گزرے ہوئے ایام میں بھی اس کے سچا ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اگر عورت پر قدرت حاصل ہونے کے وقت (وطی سے) انکار کے ساتھ جس رجوع کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کر دی، تو اس کے معاملہ کو جھوٹ اور جھگڑے پر محمول کیا جائے گا اور اس وقت میں جو کچھ احکام واجب ہوتے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب عذر کی حالت میں گواہوں نے اس کے رجوع کے بارے شہادت دی ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہوگی۔ حسن، عکرمہ اور نخعی نے یہی کہا ہے اور امام اوزاعی نے بھی یہی کہا ہے۔

اور نخعی نے بھی کہا ہے: صرف قول اور شہادت کے ساتھ رجوع صحیح ہوتا ہے اور ایلاء کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، تیرا کیا خیال ہے اگر اسے وطی کے مواقع میسر نہ ہوں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر اس نے مباشرت نہ کی تو اس قول کو باب ضرر کی طرف لوٹایا جائے گا(1)۔

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو تو وہ یہ کہے: میں نے اس (بیوی) کی طرف رجوع کرلیا۔ الکیا الطبری نے کہا ہے: امام ابوحنیفہ ایسے آدمی کے بارے فرماتے ہیں جس نے ایلاء کیا درآنحالیکہ وہ مریض تھا اور اس کے اور اس کی بیوی کے مابین چار ماہ کی مسافت تھی یا یہ رتقاء تھی یا صغیرہ تھی یا آدمی مقطوع الذکر تھا تو جب اس نے اس کی طرف زبان سے رجوع کیا اور مدت گزر گئی اور عذر ابھی تک موجود تھا تو وہ رجوع صحیح ہے۔ امام شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جماع کے بغیر رجوع نہیں ہوسکتا، چاہے حالت عذر ہو یا غیر عذر اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے، فرمایا: اور اسی طرح حکم ہے اگر وہ سفر میں ہو یا قید میں۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور جمہور علماء رحمہم اللہ علیہم نے مولی پر کفارہ واجب کیا ہے جب وہ اپنی بیوی کی طرف جماع کے ساتھ رجوع کرلے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کفارہ نہیں ہے(2) اسی طرح نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ حضرت نخعی نے بیان کیا ہے وہ کہا کرتے تھے: جب مُولی رجوع کرلے تو اس پر کفارہ نہیں ہو گا اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاِنْ فَآءُوْ میں بعض اہل تاویل نے کہا ہے: یعنی اس قسم کے لئے جس میں وہ حانث ہوئے (اگر انہوں نے رجوع کرلیا)، قسم میں بعض تابعین کا ان کے بارے میں یہی مذہب ہے جنہوں نے نیکی، تقویٰ یا کسی بھی بھلائی اور خیر کے خلاف یہ قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں کرے گا، پھر وہ اسے کرے اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اس میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہ یہ اس معنی پر مترتب ہوتا ہے کہ یمین لغو وہ ہے جو کسی معصیت پر قسم کھائی جائے اور زوجہ کے ساتھ وطی ترک کرنا معصیت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی اس قول کے لئے سنت سے استدلال کیا جاتا ہے، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ترک کردے کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس (قسم) کا کفارہ ہے(3)۔"

اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان آیۃ الایمان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیأت الذی ھو خیر و لیکفر عن یمینہ (4) (کہ جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ کرے جو بہتر اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 511، دار احیاء التراث العربیۃ
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من قال کفارتها ترکها، جلد 1، صفحہ 154، وزارت تعلیم
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من حلف علی یمین، جلد 1، صفحہ 153، وزارت تعلیم

اچھا ہو اور اپنی قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دے)

**مسئلہ نمبر 20**۔ جب اس نے قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تو اس سے ایلاء ساقط ہو گیا، ہمارے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس میں ایک مذہب کے مطابق حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے پر دلیل ہے، ایلاء کے مسئلہ میں یہی اجماع ہے اور ایمان کے مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ آپ حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز کے قائل نہیں (1)۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حانث ہونے سے پہلے کفارہ جائز نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مولی کے لئے دو فیصلوں میں سے ایک کے بارے حکم دیا ہے یعنی رجوع یا طلاق کا ارادہ، پس اگر حانث ہونے پر کفارہ کی تقدیم جائز ہو تو یقیناً رجوع یا طلاق کے ارادہ کے بغیر ہی ایلاء باطل ہو گیا، کیونکہ اگر وہ حانث ہوا تو حنث کے سبب کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی اور جب حانث پر قسم توڑنے کے سبب کوئی شے لازم نہیں تو وہ مولی نہ ہوا۔ اور کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز میں ایلاء کے حکم کو اس کے بغیر ساقط کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾ اس میں العزیمة کا معنی ہے: کسی شے پر عقد کو مکمل کرنا، کہا جاتا ہے: عَزَمَ علیه یَعْزِمُ عُزْما و عَزِیْمَةً و عَزِیْمًا و عَزَمَاناً، و اعتزم اعتزاما، و عزمتُ علیك لتفعلن، یعنی میں نے تجھ پر قسم کھائی کہ تو ضرور ایسا کرے گا۔

شمر نے کہا ہے: العزیمة والعزم اس سے مراد تیرا کسی کام پر اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے کہ تو اسے کرے گا۔ اور الطلاق من طلقت المرأة تطلق (یہ نصر ینصر کے وزن پر ہے) طلاقا، (میں نے عورت کو طلاق دی وہ طلاق والی ہو گئی) فهی طالق و طالقة۔ (یعنی صفت کا صیغہ مذکر اور مونث دونوں طرح آتا ہے۔) اعشی نے کہا ہے:

أیا جارتا بینی فانكِ طالقة

اے میری زوجہ! تو مجھ سے علیحدہ ہو جا کیونکہ تو طلاق والی ہے۔

اور طلقت میں (لام کو مضموم پڑھنا بھی) جائز ہے مثلاً عظُم یعظُم اور اخفش نے اس کا انکار کیا ہے اور طلاق سے مراد ہے نکاح کی گرہ کو کھولنا اور اس کی اصل الانطلاق (جانا) ہے اور المطلقات سے مراد المخلیات ہے (یعنی وہ عورتیں جنہیں آزاد چھوڑ دیا گیا) اور الطلاق کا معنی ہے: تخلیة (فارغ چھوڑ دینا) کہا جاتا ہے: نعجة طالق و ناقة طالق: یعنی وہ بھیڑ یا اونٹنی جسے کھیت میں مہمل چھوڑ دیا جائے، اس پر کوئی رکاوٹ (قید) نہ ہو اور نہ ہی کوئی چرواہا ہو۔ اور بعیر طلق (طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی وہ اونٹ جو بندھے ہوئے نہ ہوں۔ اور اس کی جمع اطلاق ہے۔ اور حبس فلان فی السجن طلقاً ای بغیر قید یعنی فلاں کو قید خانہ میں بغیر بیڑی اور قید کے بند کیا گیا ہے اور الطالق من الابل: یعنی وہ اونٹنی جسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 182، دار الفکر

چرواہا اپنے لئے چھوڑ دیتا ہے وہ اسے پانی پر نہیں دوہتا ہے، کہا جاتا ہے: استطلق الراعی ناقة لنفسه۔ چرواہے نے اونٹنی اپنے لئے آزاد چھوڑ دی اور یہی نام اس عورت کو دے دیا گیا ہے جس کا راستہ چھوڑ دیا جائے جیسا کہ یہی نام اس بھیڑ یا ناقہ کو دیا گیا ہے جس کا معاملہ مہمل ہو۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ طلق الفرس سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے گھوڑے کا دور چلے جانا، اس کے لئے کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو۔ پس وہ عورت جسے آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو طالق کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اب اس کے لئے کوئی مانع نہیں ہوتا جبکہ اس سے پہلے اس کے لئے رکاوٹ تھی۔

**مسئلہ نمبر** 23۔ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ میں اس پر دلیل ہے کہ عورت کو چار ماہ کی مدت گزرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو گی، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جب تک کہ مدت گزرنے کے بعد طلاق دینے کا عمل واقع نہ ہو۔

اور یہ بھی کہ کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا ہے: سَمِیْعٌ اور سمیع مدت گزرنے کے بعد مسموع کا تقاضا کرتا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: سَمِیْعٌ یعنی وہ اس کے ایلاء (قسم) کو سننے والا ہے، عَلِیْمٌ اور اس کے اس عزم وارادہ کو جاننے والا ہے جس پر چار ماہ کا گزرنا دلالت کرتا ہے۔

اور سہیل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بارہ آدمیوں سے اس آدمی کے بارے پوچھا ہے جو اپنی بیوی سے ایلاء کرتا ہے تو تمام کہتے ہیں: اس پر کوئی شے نہ ہو گی یہاں تک کہ چار ماہ گزر جائیں اور وہ (اسی حالت پر) ٹھہرا رہے، پھر اگر وہ رجوع کرلے (توفیھا) ورنہ وہ طلاق دے دے(1)۔

قاضی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تحقیق الامر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک آیت کی تقدیر یہ ہے: للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعة اشھر فان فاءوا بعد انقضائھا فان الله غفور رحیم وان عزموا الطلاق فان الله سمیع علیم اور ان کے نزدیک تقدیم آیت اس طرح ہے: للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعة اشھر فان فاءوا۔ فیھا۔ فان الله غفور رحیم۔ وان عزموا الطلاق۔ بترک الفیئة فیھا، یرید مدة التربص فیھا۔ ان الله سمیع علیم۔ یعنی اگر وہ اس مدت (چار ماہ) میں رجوع کرلیں تو بے شک الله تعالیٰ غفور رحیم ہے اور اگر وہ اس مدت میں رجوع ترک کر کے طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں تو بلاشبہ الله تعالیٰ سمیع علیم ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ احتمال متساوی (برابر) ہیں، اسی مساوات کی وجہ سے صحابہ کرام نے اس میں توقف کیا ہے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب احتمال متساوی ہے تو پھر مہینوں اور حیضوں کے ساتھ عدت گزارنے والی عورت پر قیاس کرتے ہوئے علمائے کوفہ کا قول زیادہ قوی ہے، کیونکہ یہ سب وہ مدت ہے جسے الله تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، پس اس کے گزرنے کے ساتھ عصمت (حفاظت) منقطع ہو جاتی ہے اور بغیر کسی اختلاف کے اسے جدا اور الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے خاوند کو اس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور ایلاء بھی اسی طرح ہے یہاں تک کہ اگر وہ رجوع بھول گیا

1۔ المنتقی والعیون، جلد 1، صفحہ 289، مؤسسۃ الکتب الثقافۃ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 181، دارالفکر

اور مدت گزر گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی ملک یمین کے ساتھ ہوتی ہے اس میں ایلاء نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس پر طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

''اور طلاق دی ہوئی عورتیں رو کے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر۔ اور ان کے خاوند زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کر لیں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ جب اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا ذکر فرمایا اور بلاشبہ اس میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے حکم کو بیان فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ الآیہ کے بارے میں فرمایا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دے تو پس یہ منسوخ ہے (1) اور فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیہ۔

اور الْمُطَلَّقٰتُ لفظ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ ہے مدخول بہا عورتیں اور دخول سے پہلے جس عورت کو طلاق دے دی گئی وہ سورۃ الاحزاب کی آیت کے تحت اس سے خارج ہو گئی۔ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب:۴۹) (پس تمہارے لئے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو) اس کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح حاملہ عورت اس ارشاد کے ساتھ اس سے خارج ہو گئی: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق:4) (اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے۔)

اور اقراء سے مقصود استبراء ہے، بخلاف عدت وفات کے کہ وہ عبادت ہے (2) اور وہ صغیرہ جسے ابھی تک حیض نہ آئے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ، جلد 1، صفحہ 297، وزارت تعلیم
ایضاً، حدیث نمبر 1876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

وہ کبیرہ جو نا امیدی کی عمر کو پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت مہینے مقرر کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: بلاشبہ المطلقات میں عموم ان تمام کو شامل ہے پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت صرف ان عورتوں کے بارے ہے جو حائضہ ہیں اور یہی عورتوں کا عرف ہے اور اسی پر ان کا بڑا حصہ ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: یَتَرَبَّصْنَ۔ التربص کا معنی انتظار کرنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہ (بظاہر) خبر ہے لیکن اس سے مراد امر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ: 233) اور جیع رجل علیہ ثیابہ، (اور آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے لے) اور حسبك درھم یعنی تو ایک درہم پر اکتفا کر۔ یہ اہل زبان کا قول ہے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں جو ابن الشجری نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ باطل ہے اور بلاشبہ یہ حکم شریعت کے بارے خبر ہے، پس تو کسی مطلقہ کو پائے کہ وہ انتظار نہیں کرتی تو یہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا مخبر کے خلاف واقع ہونا لازم نہیں آئے گا(2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی لیتربصن (یعنی چاہئے کہ وہ انتظار کریں) اور پھر لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جمہور لوگوں نے قُرُوْءٍ۔ فُعُوْلٍ کے وزن پر قراءت کی ہے، اس میں لام کلمہ ہمزہ ہے اور حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے قُرُوٍّ روایت کیا گیا ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور شد کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔ اور حسن نے قَرْءٍ قاف کے فتحہ، را کے سکون اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے(3)۔

اور قرؤ، اَقْرُؤ اور اَقْرَاء کی جمع ہے(4) اور واحد قُرْءٌ قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اصمعی نے یہی کہا ہے۔ اور ابو زید نے کہا ہے: قَرْءٌ قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: أَقْرَأَتِ المرأة جب عورت حائضہ ہو جائے۔ فھی مُقْرِءٌ۔ اور أَقْرَأَتْ کا معنی طہرت بھی ہے جب وہ پاک ہو جائے۔

اور اخفش نے کہا ہے: أقرأت المرأةُ (یہ کہا جاتا ہے) جب عورت حیض والی ہو جائے اور جب اسے حیض آئے تو تو کہے گا: قرأت، بغیر الف کے۔ کہا جاتا ہے: أقرأت المرأة حیضة أو حیضتین (عورت کو ایک حیض آیا یا دو) اور القرء کا معنی حیض کا ختم ہونا بھی ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ایام ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتے ہیں (یعنی طہر) اور أقرأتْ حاجتك: تیری حاجت قریب آ گئی۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور ابو عمرو ابن العلاء نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض حیض کو قرء کا نام دیتے ہیں، بعض طہر کو قرءٌ کہتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں کو ایک ساتھ قرء کہتے ہیں۔ پس طہر کو حیض کے ساتھ قرء کہا جاتا ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اقراء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے: اہل کوفہ نے کہا ہے: أقراء سے مراد حیض ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت سدی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن للماوردی، جلد 1، صفحہ 188، دار الفکر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 302، دار الفکر

رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے(1)۔

اور اہل حجاز نے کہا ہے: أقراء سے مراد اطہار ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت زہری، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ پس جنہوں نے حیض کو قرءٌ کا نام دیا ہے تو انہوں نے رحم میں خون جمع ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا ہے اور جنہوں نے اسے طہر کا اسم قرار دیا ہے تو وہ بدن میں خون جمع ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ جو القرء میں اس اصل کو تیرے لئے ثابت کر رہا ہے وہ وقت ہے، کہا جاتا ہے: ھبت الریح لقرئھا و قارئھا ای لوقتھا (یعنی ہوا چلی اپنے وقت کے سبب)۔ شاعر نے کہا ہے:

کَرِھتُ العقر عقرَ بنی شلیل　　اذا ھبّت لقارئھا الریاح(2)

میں نے بنی شلیل کی بستی العقر کو ناپسند کیا جب کہ ہوائیں چلیں اپنے وقت پر۔

اور کہا گیا ہے کہ حیض کے لئے ایک وقت ہے اور طہر کے لئے بھی ایک وقت ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک معین وقت کی طرف راجع ہوتے ہیں اور اعشیٰ نے الاطہار کے بارے میں کہا ہے:

أفی کل عام انتَ جاشمُ غزوۃ　　تشد لأقصاھا عزیم عَزَائکا

مورِّثۃٍ عزا و فی الحیّ رفعۃ　　لِما ضاع فیھا من قُرُوُ نسائکا(3)

اور ایک دوسرے نے حیض کے بارے میں کہا ہے:

یا رب ذی ضِغْن علیٰ فارض　　له قُرُوءٌ کقُرُوْ الحائض (4)

یعنی اس نے اسے نیزہ مارا تو اس کا خون حیض والی عورت کے خون کی طرح تھا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ قرء الماء فی الحوض سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد حوض میں پانی کا جمع ہونا ہے(5) اور اسی سے القرآن ہے کیونکہ یہ معانی کو مجتمع ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماع حروف کی وجہ سے قرآن کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ماقرأتِ الناقۃ سَلَیٰ قَطُّ، یعنی کبھی اس کے پیٹ میں جیلی جمع نہیں ہوئی اور عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

ذِراعَیْ عَیْطَلٍ أدماء بکرٍ　　ھِجَان اللون لم تَقْرَأ جنِینا(6)

تو گویا رحم حیض کے وقت خون کو جمع کرتا ہے اور جسم طہر کے وقت اسے جمع کرتا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: اس کا قول جس نے یہ کہا کہ القرءان کے اس قول سے ماخوذ ہے: قریت الماء فی الحوض (میں نے حوض میں پانی جمع کیا) یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ القرء مہموز ہے اور یہ غیر مہموز ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

2۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 1، صفحہ 292، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ بیروت

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 303، دار الفکر

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

5۔ ایضاً

6۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 365، دار الکتب العربیۃ بیروت

میں (مفسر) کہتا ہوں: اہل لغت کی نقل کے مطابق یہ صحیح ہے، یعنی جوہری وغیرہ نے یہ کہا ہے اور اس پانی کا نام قری ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القرءکا معنی ہے الخروج (نکلنا) یا طہر سے حیض کی طرف یا حیض سے طہر کی طرف، اسی بنا پر امام شافعی نے ایک قول میں کہا ہے: القرء الانتقال من الطهر الی الحیض، یعنی القرء کا معنی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا ہے اور وہ حیض سے طہر کی طرف نکلنے کو قرء نہیں کہتے۔ اور اشتقاق کے حکم کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ وہ بھی قرء ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کا معنی ہوگا تین ادوار یا تین انتقالات اور مطلقہ عورت صرف دو حالتوں سے متصف ہوتی ہے، پس کبھی وہ طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی حیض سے طہر کی طرف اس کلام کا معنی صحیح ہو جائے گا اور اس کی دلالت طہر اور حیض دونوں پر ہوگی اور یہ اسم مشترک ہوگا۔
اور کہا جاتا ہے: جب یہ ثابت ہو گیا کہ القرء سے مراد انتقال (تبدیل ہونا) ہے تو عورت کا طہر سے حیض کی طرف نکلنا آیت میں بالکل مراد نہیں اور اسی لئے حالت حیض میں طلاق کا ہونا طلاق سنی (سنت والی) نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ عدت کے لئے وہ طلاق ہے، کیونکہ عدت کے لئے طلاق وہ ہے جو حالت طہر میں ہو اور یہ القرء کے انتقال سے ماخوذ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جب حالت طہر میں طلاق سنی ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی: فعدتهن ثلاثة انتقالات، (پس ان کی عدت تین انتقالات ہیں۔) ان میں سے پہلا اس طہر سے انتقال ہے جس میں طلاق واقع ہوئی اور وہ انتقال جو حیض سے طہر کی طرف ہے اسے قرء نہیں بنایا گیا، کیونکہ لغت اس پر دلالت نہیں کرتی، لیکن ہمیں دوسری دلیل سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور جب ان دو میں سے ایک معنی مراد بہ ہونے سے خارج ہو گیا تو دوسرا مراد بہ باقی رہ گیا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا، پس اس بنا پر اس کی عدت تین انتقالات ہے، ان میں سے پہلا طہر ہے اور اس معنی کی بنا پر کامل تین اقراء کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے بشرطیکہ طلاق حالت طہر میں ہو اور کسی اعتبار سے اسے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔
الکیا طبری نے کہا ہے: امام شافعی کے مذہب کی انتہائی توجیہ کے لئے یہ گہری نظر ہے اور ممکن ہے کہ ہم اس میں وہ راز ذکر کریں جسے شریعت کی حکمتوں کی باریکیوں میں سے سمجھنا بعید نہ ہوگا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا۔ اسے قرء کہا گیا ہے کیونکہ یہ براءت رحم پر دلالت کرتا ہے تو چونکہ حاملہ عورت کو اغلباً حیض نہیں آتا پس اسے حیض آنا اس کے لئے براءت رحم کی علامت ہے اور حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونا اس کے خلاف ہے اور حیض والی عورت کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیض کے بعد حاملہ ہو جائے اور جب حمل برقرار رہے اور بچہ قوی ہو جائے تو اس کا خون منقطع ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عرب حالت طہر میں اپنی عورتوں کے حمل کے سبب تعریف کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح بیان کی۔ شاعر کہتا ہے:

وَ مُبَرَّءٍ مِن کل غُبَّرِ حَیْضَةٍ وَ فَسَادِ مُرْضِعَةٍ وَ دَاءٍ مُغْيَلِ

یعنی یہ کہ اس کی ماں اپنے حیض کے باقی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ حاملہ نہیں ہوئی۔
پس یہ وہ ہے جو علماء اور اہل زبان نے القراء کی تاویل میں کہا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرأت المرأة قرءا جب وہ

(عورت) حائضہ ہو یا پاک ہو۔ اور قرأت تب بھی بولا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہو اور اس پر انہوں نے اتفاق کیا ہے کہ القرء سے مراد الوقت ہے اور جب تو کہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ اوقات، تو آیت عدد میں مفسر ہو جائے گی درآنحالیکہ معدود میں احتمال ہوگا۔ اور پھر معدود کے لئے بیان کی تلاش کسی دوسری آیت میں ضروری ہوگی، پس ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے طہر کے وقت طلاق دینے کے بارے حکم دیا جائے گا پس ضروری ہے کہ وہی (طہر) عدت میں بھی معتبر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ یعنی تم انہیں ایسے وقت میں طلاق دو جس کے ساتھ عدت گزاری جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وأحصُوا العِدَّةَ (اور تم عدت کو شمار کرو) اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ مطلقہ عدت گزارتی ہے اور وہ وہ طہر ہے جس میں طلاق دی جاتی ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''اسے (یعنی اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اس کی طرف رجوع کرلے پھر اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے۔ پھر وہ حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو اس وقت طلاق دی جائے (1)۔'' اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اس بیان میں نص ہے کہ طہر کا زمانہ ہی وہ ہے جسے عدت کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عورتوں کو طلاق دی جائے گی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ اس حیض کو شمار نہ کرے گی اور جس نے حالت طہر میں طلاق دی تو جمہور کے نزدیک وہ اس طہر کو عدت میں شمار کرے گی۔ پس یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے کہا ہے: ہم اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتے مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق وہ یہ کہتا ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں۔ پس جب آدمی ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے وطی نہ کی تو عورت ماتقی طہر کو شمار کرلے گی اگرچہ وہ ایک ساعت اور ایک لحظہ ہو، پھر وہ حیض کے بعد دوسرے طہر کی طرف متوجہ ہوگی، پھر دوسرے حیض کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوگی۔ پس جب اس نے تیسرے حیض کا خون دیکھ لیا تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی (یعنی وہ نئی شادی کرسکتی ہے) اور عدت سے نکل گئی۔

اور اگر طلاق دینے والے نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے مباشرت کی تھی تو طلاق ثابت ہو جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا اور وہ اس طہر میں سے ماتقی کے ساتھ عدت گزارے (3)۔ اور زہری نے ایسی عورت کے بارے میں کہا ہے جسے طہر کے دوران طلاق دی گئی کہ وہ اس طہر کے ماتقی دنوں کے سوا تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی (☆)۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض، جلد 1، صفحہ 476، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیۃ بیروت

☆ عورت کی عدت حیض کے اعتبار سے یا طہر کے اعتبار، ائمہ فقہ کا اس میں اختلاف ہے ائمہ احناف کے نزدیک حیض کے اعتبار سے ہے احناف کے دلائل قوی ہیں تفصیل 'ہدایہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ الأقراء سے مراد اطہار ہیں۔ یہ ابن شہاب زہری کے علاوہ کوئی کہتا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے وہ طہر جس میں طلاق دی گئی وہ لغو ہو جائے گا پھر وہ عورت تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر مطلقہ عورت حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چوتھے حیض میں داخل ہو جائے اور ابن القاسم اور امام مالک اور آپ کے جمہور اصحاب، امام شافعی اور علمائے مدینہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض کا پہلا نقطہ دیکھے گی تو وہ عصمت (پابندی) سے نکل جائے گی (1)، یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔

اور زہری کے خلاف دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاہر کی طلاق میں بغیر جماع کے اجازت عطا فرمائی اور اول طہر اور آخر طہر کا ذکر نہ فرمایا۔

اور اشہب نے کہا ہے: عصمت اور میراث منقطع نہیں ہوتیں یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دم حیض ہے، تاکہ ایک دفعہ خون کا آنا دم حیض کے سوا کوئی اور نہ ہو (2)۔

علمائے کوفہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش کو اس وقت فرمایا جب اس نے آپ کے پاس خون کی شکایت کی: ''بے شک وہ ایک رگ ہے پس تو ابھی دیکھ اور جب تجھے دم حیض آئے تو تو نماز نہ پڑھ اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو تو طہارت حاصل کر (غسل کر لے) پھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک نمازیں پڑھتی رہ (3)۔''

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق: 4) (اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔) پس جس سے اسے ناامید اور مایوس قرار دیا گیا ہے وہ حیض ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہی عدت ہے اور جو اس کا عوض بنایا گیا ہے وہ مہینے ہیں جبکہ وہ معدوم ہو (یعنی حیض نہ آنے کی صورت میں عدت مہینوں کے ساتھ ہوگی۔) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کہا کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے (یعنی) آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے۔ اور اگر میں اس پر قدرت رکھتا کہ میں اس کی عدت ایک کامل اور ایک نصف حیض مقرر کر سکوں تو میں کر دیتا اور کسی صحابی نے بھی آپ کی بات کا انکار نہ کیا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجماع ہے اور یہی دس صحابہ کرام کا قول ہے انہیں میں سے خلفائے اربعہ بھی ہیں اور تیرے لئے وہی کافی ہے جو انہوں نے کہا ہے! اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الطہارۃ، باب ماء الرجل وماء المرأۃ، جلد 1، صفحہ 45، وزارت تعلیم

دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا معنی یتربصن ثلاثۃ اقراء ہے اور اس سے مراد کامل تین حیض ہیں اور یہ ممکن نہیں ہو سکتا مگر ہمارے قول کے مطابق کہ اقراء سے مراد حیض ہیں کیونکہ جو کہتے ہیں کہ مراد طہر ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ دو طہر اور تیسرے کے بعض ایام عدت گزارے، کیونکہ جب اس نے حالت طہر میں طلاق دی تو وہ ان کے نزدیک اس طہر کا بقیہ حصہ عدت گزارے، یہی ایک قرء ہے اور ہمارے نزدیک وہ شروع حیض سے آغاز کرے گی تاکہ اسم (قرء) صادق آجائے اور جب آدمی نے عورت کو ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے وطی نہ کی تو وہ متوجہ ہوگی حیض کی طرف پھر حیض کی طرف پھر حیض کی طرف (یعنی وہ تین حیض عدت گزارے گی) اور جب وہ تیسرے حیض سے غسل کر لے تو وہ عدت سے نکل جائے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رد کرتا ہے: سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقۃ: 7) (اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک) اور ثمانیۃ ایام میں ہاء کو ثابت رکھا ہے، کیونکہ الیوم مذکر ہے اور اسی طرح القرء ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی مراد ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے ساتھ اس میں موافقت کی ہے کہ عورت کو جب حالت حیض میں طلاق دی جائے کہ وہ اس حیض کو عدت میں شمار نہ کرے گی جس میں اسے طلاق دی گئی اور نہ ہی اس طہر کو جو اس حیض کے بعد ہوگا، بلکہ وہ عدت کا آغاز اس حیض سے کرے گی جو طہر کے بعد ہوگا اور ہمارے نزدیک وہ طہر سے عدت شروع کرے گی، جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور اہل لغت نے جائز قرار دیا ہے کہ وہ بعض کو کل کے نام سے تعبیر کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اور اس سے مراد شھران (دو مہینے) اور تیسرے کے بعض ایام ہیں (1) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہے۔ واللہ اعلم

اور جو یہ کہتے ہیں کہ قرء سے مراد حیض ہیں ان میں سے بعض نے کہا ہے جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بعد اس کی عدت گزر گئی اور رجعت کا حق باطل ہو گیا (2)۔ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابن شبرمہ اور امام اوزاعی رحمہم اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور شریک نے کہا ہے: جب عورت غسل میں بیس برس تک کوتاہی کرے گی تو اس کے خاوند کو اس پر رجعت کا حق حاصل رہے گا جب تک وہ غسل نہ کر لے۔

اور اسحاق بن راہویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب تیسرے حیض میں عورت میں عیب پڑ گیا تو وہ جدا ہو جائے گی اور خاوند کے لئے رجوع کا حق منقطع ہو جائے گا، مگر یہ کہ عورت کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے غسل کر لے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ قول ضعیف ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 185، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے) اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور رہا وہ جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ طہر سے حیض کی طرف نفس انتقال کو قرء کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ عورت پر عدت کو کم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ عورت کو اس کے طہر کی آخری ساعت میں طلاق دے پھر وہ حیض میں داخل ہو جائے تو وہ اسے ایک قرء شمار کر لے گی اور تیسرے طہر سے منتقل ہوتے ہی عصمت منقطع ہو گئی اور وہ حلال ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ لونڈی جسے حیض آتا ہے جب اس کا خاوند اسے طلاق دے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اور ابن سیرین سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں لونڈی کی عدت کو آزاد عورت کی عدت کی طرح ہی دیکھتا ہوں مگر یہ کہ اس میں کوئی سنت جاری ہو چکی ہو، کیونکہ سنت زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

اور الاصم عبدالرحمٰن بن کیسان، داؤد بن علی اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک طلاق اور وفات کی عدت مہینوں اور حیضوں کے ساتھ ہے اس سے متعلقہ آیات لونڈی اور آزاد عورت کے حق میں عام ہیں، پس آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔

اور جمہور نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: طلاق الأمة تطليقتان و عدتها حيضتان(1) (لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) اسے ابن جریج نے عطا عن مظاھر بن اسلم عن ابيه عن القاسم بن محمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے۔ قالت: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: طلاق الأمة تطليقتان و قرؤها حيضتان(2) آپ نے طلاق اور عدت دونوں کی اکٹھی نسبت اس کی طرف کی ہے مگر مظاہر بن اسلم اس حدیث کے ساتھ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ان دونوں میں سے جو بھی غلام ہوا اس کی طلاق کم ہوگی۔ اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ یعنی حیض میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپانا ان کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عکرمہ، زہری اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حمل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے(3)۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد حیض اور حمل دونوں ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ حاملہ عورت حائضہ ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی سنة طلاق العبد، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، حدیث نمبر 1102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

آیت سے معنی مقصود یہ ہے کہ جب عدت کا دارومدار حیض اور اطہار پر ہے اور دونوں پر اطلاع فقط عورتوں کی جانب سے ہو سکتی ہے تو پھر اس میں قول عورت کا ہی تسلیم کیا جائے گا جب وہ عدت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا دعویٰ کرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر امین بنادیا ہے اور یہی اس ارشاد کا مقتضی ہے: وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ۔(1)

اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے: ہمیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھولیں اور ان کی شرمگاہوں کی طرف دیکھیں، بلکہ اسے ان کے سپرد کیا گیا ہے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر امین بنایا گیا ہے۔

اور چھپانے سے منع کرنے کے معنی مرد کو نقصان پہنچانے اور اس کا حق ضائع کرنے سے منع کرنا ہے، پس جب مطلقہ نے کہا: میں حیض سے ہوں، حالانکہ وہ حیض سے نہ ہو تو اس نے مرد کے رجوع کا حق ضائع کر دیا اور جب اس نے کہا: میں حیض سے نہیں ہوں، حالانکہ وہ حالت حیض میں ہو تو اس نے مرد پر وہ نفقہ لازم کر دیا جو اس پر لازم نہیں تو اس طرح اس نے مرد کو ضرر اور نقصان پہنچایا یا وہ حیض کی نفی کے بارے اپنے جھوٹ سے یہ قصد کرتی ہے کہ اسے واپس نہ لوٹایا جا سکے یہاں تک کہ عدت گزر جائے اور شریعت اس کے حق کو ختم کر دے اور اسی طرح حاملہ عورت حمل کو چھپاتی ہے تاکہ وہ مرد رجوع کے حق کو ختم کر دے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: دور جاہلیت میں ان کی عادت تھی کہ وہ حمل کو چھپاتی تھیں تاکہ وہ بچے کو نئے خاوند کے ساتھ ملادیں، پس اس بارے میں آیت نازل ہوئی (2)۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور وہ حاملہ ہے اور مجھے اس کے شادی کرنے سے امن نہیں ہے اور میرا بیٹا دوسرے کے پاس چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اشجعی کی عورت اس کے پاس لوٹا دی گئی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن منذر نے بیان کیا ہے: اہل علم میں سے ہر اس نے کہا جس سے میں نے حفظ کیا: جب عورت نے دس دنوں میں کہا: میں نے تین حیض گزار لئے ہیں اور میری عدت گزر چکی ہے۔ بلاشبہ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا، مگر وہ یہ کہے: میں نے کچا بچہ (سقط) گرادیا ہے تحقیق اس کی خلقت ظاہر ہو چکی تھی (تب اس کا قول قبول کر لیا جائے گا)۔

اور اس مدت میں علماء کا اختلاف ہے جس میں عورت کے قول کی تصدیق کی جائے گی، تو حضرت امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے کہا ''میری عدت گزر چکی ہے'' یہ اتنی مدت میں کہا جس کی مثل میں عدت گزر سکتی ہے تو اس کا قول قبول کیا جائے گا (3) اور اگر اس نے اتنی مدت میں عدت گزرنے کی خبر دی جس میں شاذ و نادر ایسا ہو سکتا ہے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ آپ نے المدونہ میں فرمایا: جب عورت نے کہا میں نے ایک مہینے میں تین حیض گزار لئے ہیں اس کی تصدیق کر لی جائے بشرطیکہ عورتیں اس کی تصدیق کر دیں (4)، اسی طرح شریح نے کہا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا قالون!

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

3۔ المدونۃ الکبری، کتاب ارخاء الستور، باب دعوی المرأۃ انقضاء عدتھا، جلد 5، صفحہ 10، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر　4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 12

یعنی تو نے درست کہا اور اچھا کہا۔

اور کتاب محمد میں فرمایا: اس کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر ڈیڑھ ماہ میں۔ اور اسی طرح ابوثور کا قول ہے۔ ابوثور نے کہا ہے: کم سے کم اس کے قول کی تصدیق سینتالیس دنوں میں ہوسکتی ہے اور وہ اس طرح کہ کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہے اور کم سے کم حیض کی مدت ایک دن ہے۔ اور حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: ساٹھ دنوں سے کم مدت میں عورت کے قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ، رحم میں موجود شے کو چھپانے کی حرمت کی تاکید کے لئے یہ انتہائی شدید اور عظیم وعید ہے اور فی الحقیقت رحم میں جو کچھ ہے اس کے بارے خبر دینے کی امانت کی ادائیگی کے لئے واجب ہونے کا اظہار ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتا اس کے لئے چھپانا مباح ہے، کیونکہ ایسا کرنا اس کے لئے بھی حلال نہیں جو ایمان نہیں رکھتا، بلاشبہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان کنت اخی فلا تظلمنی (اگر تو میرا بھائی ہے تو تو مجھ پر ظلم نہ کر)، (بلکہ مقصود یہ ہے) کہ چاہئے ایمان تجھے ایسا کرنے سے روکے، کیونکہ ایسا کرنا اہل ایمان کے فعل میں سے نہیں ہے (یعنی ان کے شایان شان نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ بُعُوْلَتُهُنَّ۔ البعولۃُ: البعل کی جمع ہے اور اس کا معنی زوج (خاوند) ہے (1) اور اسے بعل اس لئے نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ زوجہ پر ان چیزوں کے بارے میں غالب اور بلند ہوتا ہے جن کا وہ اس کی زوجیت کے اعتبار سے مالک ہوتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا (الصافات: 125) ای ربّا۔ کیا تم رب کو پکارتے ہو۔ تو اسے ربوبیت میں بلند ہونے کی وجہ سے بعل کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے: بَعْل و بُعُولۃ۔ جیسا کہ ذکر کی جمع میں کہا جاتا ہے ذَکَرٌ و ذُکُوْرَۃٌ اور فحل کی جمع میں کہا جاتا ہے: فَحلٌ و فُحُوْلَۃٌ، اس کے آخر میں یہ ہا زائدہ ہے اور جمع مؤنث کی تاکید کے لئے ہے (2) اور یہ شاذ ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور اس میں سماع معتبر ہوتا ہے، پس لَعْبٌ میں لُعُوْبَۃٌ نہیں کہا جاسکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ہا تانیث ہے جو فُعُوْل پر داخل کی گئی ہے (3)۔

اور البَعُولۃ البَعل کا مصدر بھی ہے اور بَعل الرجل یَبْعَل (مثل منع یمنع) بُعُوْلۃٌ، یعنی آدمی بعل ہوگیا اور المباعلۃ اور البِعال کا معنی جماع ہے۔ اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایام تشریق کے بارے ارشاد گرامی ہے: انها أيام أكل و شرب و بعال (4) (کہ وہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کے دن ہیں۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس آدمی عورت کے لئے بعل ہوتا ہے اور عورت مرد کے لئے بعلۃٌ ہوتی ہے اور بَاعل مُبَاعلۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس سے مباشرت کرے اور فلان بعل هذا، یعنی فلاں اس کا مالک اور مربی ہے۔ اس کے کثیر محامل ہیں وہ آگے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

4۔ سنن دار قطنی، کتاب طلوع الشمس بعد الافطار، جلد 3، صفحہ 212، حدیث نمبر 32، دار المحاسن القاہرہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ وہ انہیں واپس لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے: پس مراجعت کی دو صورتیں ہیں: ایک مراجعت عدت کے دوران اس کی بنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پر ہے اور دوسری مراجعت عدت کے بعد اس کی بنا حضرت معقل کی حدیث پر ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر آیت میں اس کی تخصیص پر دلیل ہوگی جسے مسمیات کا عموم شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ عام ہے ان کے بارے میں بھی جنہیں تین طلاقیں دی گئی ہوں اور ان کے بارے میں بھی جنہیں تین سے کم دی گئی ہوں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ یہ اس کے بارے میں خاص حکم ہے جس کی طلاقیں تین سے کم ہوں۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی آزاد بیوی کو طلاق دے ایک طلاق یا دو طلاقیں اور وہ مدخول بھا بھی ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے جب تک اس کی عدت نہ گزرے اگرچہ عورت ناپسند بھی کرے اور اگر طلاق دینے والے نے اس کی طرف رجوع نہ کیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی تو پھر وہ عورت اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور وہ اس سے اجنبیہ ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے ولی کی اجازت اور شاہدوں کی شہادت کے ساتھ نیا نکاح کیے بغیر حلال نہیں ہوگی نہ کہ مراجعت کے طریقہ پر، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

مہلب نے کہا ہے: ہر وہ جس نے عدت کے دوران رجوع کر لیا صرف رجوع پر گواہ بنائے بغیر احکام نکاح میں سے کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: 2) (تو جب پہنچنے لگیں اپنی میعاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے) پس رجعت میں تو گواہ بنانے کا ذکر کیا ہے اور نکاح اور طلاق میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہم نے کتاب اللہ میں جو مسائل اہل علم کے اجماع کے ساتھ ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں ان کے ذکر کی حاجت نہیں جو اس باب میں متقدمین سے مروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے جس کے ساتھ ایک آدمی عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی عدت کے دوران عورت سے وطی کرے اور وہ رجعت کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ شاہد بنانے سے جاہل ہو اور ناواقف ہو تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو مباشرت سے روکے، یہاں تک کہ وہ گواہ بنا لے۔ اسی طرح اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی(1) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔)

اور اگر اس نے عدت میں وطی کی لیکن وہ رجعت کی نیت نہیں کرتا تو امام مالک نے فرمایا ہے: وہ عدت میں رجوع کر سکتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان باب کیف کان بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم

ہے اور وہ اس سے وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اسے فاسد پانی سے استبرا کرالے(1) (یعنی یہ یقین کرلے کہ پہلی وطی سے استقرار حمل نہیں ہوا)۔

ابن قاسم نے کہا ہے: اگر اس کی عدت گزر جائے تو وہ اور کوئی غیر بقیہ مدت استبرا میں اس کے ساتھ نکاح نہ کرے، اگر اس نے کیا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہوگی کیونکہ وہ پانی بھی تو اسی کا پانی ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب مرد نے عورت کے ساتھ مجامعت کرلی تو اس نے اس کی طرف رجوع کرلیا: اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، ابن سیرین، زہری، عطا، طاؤس اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ مزید کہا: اور وہ شاہد بنالے گا، اسی طرح اصحاب الرائے، امام اوزاعی اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، اسے ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: تحقیق کہا گیا ہے: اس کی وطی ہر حال میں رجوع ہوگی، چاہے وہ رجعت کی نیت کرے یا نہ کرے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ایک فریق سے اسی طرح روایت کیا جاتا ہے اور یہی موقف لیث نے اپنایا ہے۔

اور انہوں (علماء) نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی لونڈی خیار کے ساتھ فروخت کی کہ اس کے لئے مدت خیار میں اس کے ساتھ وطی کرنا مباح ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ اسے اپنی ملکیت کی طرف واپس لوٹا لائے اور اسے اپنے اس فعل کے ساتھ بیع توڑنے کا اختیار ہے اور یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لئے ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جس نے بوسہ لیا یا مباشرت کی اور اس سے وہ رجعت کی نیت کرتا ہے تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور اگر اس نے بوسہ اور مباشرت سے رجعت کی نیت نہ کی تو وہ گنہگار ہوگا اور رجوع کرنے والا نہ ہوگا اور سنت یہ ہے کہ وہ وطی کرنے سے پہلے یا بوسہ لینے یا مباشرت سے پہلے گواہ بنالے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ اسے مس کیا یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کی رجعت ثابت ہو جائے گی، یہی امام ثوری کا قول ہے اور اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنالے اور امام مالک، امام شافعی، اسحاق، ابوعبید اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق رجعت ثابت نہ ہوگی۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے اور المنتقی میں کہا ہے بالقول رجوع کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور رہا بالفعل جیسا کہ جماع اور بوسہ وغیرہ تو قاضی ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے ساتھ اور ان تمام افعال کے ساتھ جو حصول لذت کے لئے کیے جاتے ہیں رجوع صحیح ہوتا ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: لذت کے لئے جسم کو چھونا یا اس کی فرج کی طرف دیکھنا یا اس کے محاسن میں سے جو اس کے قریب ہیں انہیں دیکھنا جبکہ وہ اس سے رجعت کا ارادہ کرے بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے کہ رجعت صحیح نہیں ہوتی مگر بالقول، اسے ابن منذر نے ابوثور، جابر بن زید اور ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے جماع کیا وہ رجعت کی نیت کرے یا اس کی نیت

---

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، باب ما جاء فی عدۃ المطلقۃ، جلد 5، صفحہ 122، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

نہ کرے تو اس طرح رجعت ثابت نہ ہوگی اور اس کے لئے مرد پر مہر مثل ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اگر وہ اسے لوٹا لیتا تو اس پر کوئی مہر نہ تھا اور بغیر رجعت کے وطی مہر کے عوض رجعت سے اولی نہیں ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا سوائے امام شافعی کے کہ جس نے اس پر مہر مثل واجب کیا ہو اور ان کا قول قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت زوجات کے حکم میں ہے اور یہ اس مرد کی وارث بنتی ہے اور وہ اس کا وارث بنتا ہے تو کس طرح اس عورت کے ساتھ وطی کرنے میں مہر مثل واجب ہوگا جس کا حکم اپنے اکثر احکام میں زوجہ کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں شبہ قوی ہے، کیونکہ بغیر رجعت کے اس عورت کو اس مرد پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ وہ عورت جس کے ساتھ شبہ کے سبب وطی کی جائے اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور تجھے یہی کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا آدمی عورت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے؟ تو امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ رجوع کر لے (1)۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے سوا آپ کے دیگر اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ کیونکہ امام زفر سے حسن بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ آدمی کے لئے رجعت سے پہلے اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اور ان سے عمرو بن خالد نے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ کیا آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے پاس داخل ہو اور اس کے محاسن میں سے کوئی شے دیکھے اور کیا وہ عورت اس کے لئے بناؤ سنگھار کرے گی اور پھر اس پر ظاہر ہوگی؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ اس کے ساتھ خلوت اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر اجازت کے وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف وہ دیکھ سکتا ہے مگر یہ کہ اس پر کپڑے ہوں اور نہ ہی وہ اس کے بالوں کی طرف دیکھ سکتا ہے اور کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ان کے سوا کوئی اور بھی ہو اور نہ وہ ایک کمرے میں اس کے ساتھ رات بسر کر سکتا ہے بلکہ وہ اس سے (دوسرے کمرے میں) منتقل ہو جائے گا۔

ابن قاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور کہا ہے: نہ وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بال دیکھ سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، خوشبو لگا سکتی ہے، زیور پہن سکتی ہے اور اس کے سامنے بھی آ سکتی ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی اپنی عورت کو ایک طلاق دے دے تو وہ اس کے پاس اجازت لے کر آ سکتا ہے اور وہ لباس اور زیور میں سے جو چاہے پہن سکتی ہے اور اگر ان دونوں کے لئے ایک کمرے کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 146، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

وہ اپنے درمیان پردہ ڈال لیں اور آدمی اس کے پاس داخل ہوتے وقت سلام کہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے اور وہ اسے کنکھارنے یا کھانسنے وغیرہ کے ساتھ اپنے آنے کا احساس دلائے جب وہ داخل ہو۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عورت جسے ایک طلاق دی گئی ہو آدمی اس کی طرف رجوع کا مالک ہوتا ہے اور وہ طلاق دینے والے پر طلاق بائنہ والی کی طرح حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کرلے اور وہ رجوع نہیں کرے گا مگر قول کے ساتھ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ طلاق دینے والے نے جب عدت گزرنے کے بعد کہا: بلاشبہ میں نے عدت میں تیری طرف رجوع کرلیا تھا اور اس نے انکار کردیا، تو اس میں عورت کا قول اس کی قسم کے ساتھ قبول کرلیا جائے گا اور آدمی کو اس پر کوئی اختیار نہ رہے گا، مگر حضرت نعمان (امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) نکاح اور رجعت میں قسم کا نظریہ نہیں رکھتے اور صاحبین نے اس میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان دونوں نے دیگر تمام اہل علم کے قول کی مثل ہی کہا ہے۔ اور اسی طرح جب بیوی لونڈی ہو اور آقا اور لونڈی کا اختلاف ہوجائے اور خاوند عدت گزرنے کے بعد عدت میں رجوع کا دعویٰ کرتا ہو اور اس (لونڈی) نے انکار کیا ہو تو اس میں قول زوجہ لونڈی کا معتبر ہوگا اگرچہ اس کا آقا اسے جھوٹا قرار دے، یہی امام شافعی، ابوثور اور نعمان رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور یعقوب اور محمد نے کہا ہے: قول آقا کا معتبر ہوگا کیونکہ وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ لفظ رد عصمت کے زوال کا تقاضا کرتا ہے مگر ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک طلاق رجعی وطی کو حرام کردیتی ہے اور رجوع اسے حلت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اور لیث بن سعد، ابوحنیفہ اور جنہوں نے ان دونوں کے قول کے مطابق کہا ہے، ان کا بیان ہے کہ رجعت وطی کو حلال کر دیتی ہے، طلاق کا فائدہ اس عدد کو کم کرنا ہے جو صرف اس کے لئے رکھا گیا ہے اور احکام زوجیت باقی ہیں ان میں سے کوئی شے نہیں کھلی۔ انہوں نے کہا: احکام زوجیت اگرچہ باقی ہیں، لیکن جب تک عدت میں ہے وہ عدت گزرنے کے ساتھ زوال کے راستے پر چل رہی ہے۔ پس رجعت اس راستے سے واپس لوٹانے کا نام ہے جسے عورت نے اپنے چلنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ اور یہ رد مجازی ہے اور وہ رد جس کے ساتھ ہم نے حکم لگایا وہ رد حقیقی ہے کیونکہ وہاں زوال روپذیر ہو چکا ہے اور وہ وطی کو حرام قرار دینا ہے، پس اس سے حقیقۃً رد (رجوع) واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 10**۔ لفظ اَحَقُّ کا اطلاق دو حقوں کے درمیان تعارض کے وقت ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حق ترجیح پا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ انتظار کی مدت (عدت) میں خاوند کا حق عورت کے بارے میں اس کے اپنے حق سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے نفس کی مالک بنتی ہے اور اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: الأیم احق بنفسها من ولیها (1) (بیوہ عورت اپنے بارے میں اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ آدمی کے لئے رجوع مستحب ہے لیکن جب عورت کے لئے اپنے احوال کی اصلاح کے سبب

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 1888

اصلاح کا قصد کرے اور آپس میں وحشت کو زائل کرنے کا قصد کرے اور اگر عورت کو ضرر پہنچانے، عدت کو طویل کرنے اور اس کے ساتھ نکاح کے پٹے سے خلاصی پانے کو قطع کرنے کا قصد اور ارادہ کرے تو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے: وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا (البقرہ: 231) (اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو) پھر جس نے ایسا کیا تو رجعت صحیح ہوگی۔ اگرچہ اس نے نہی کا ارتکاب کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر ہم نے اس مقصد کو جان لیا تو ہم اسی پر چھوڑ دیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِيۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ، اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ یعنی حقوق زوجیت میں سے ان کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و زینت کا انتظار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ میں اپنے وہ تمام حقوق اچھی طرح حاصل کروں جو میرے اس پر ہیں اور وہ اپنے وہ حقوق حاصل کرے جو اس کے مجھ پر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِيۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق) یعنی ایسی زینت جس میں گناہ نہ ہو۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے: یعنی ان کے لئے حسن صحبت اور حسن سلوک ان کے خاوندوں پر اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے۔ لئے ان پر ہر اس کام میں اطاعت واجب ہے جو وہ ان پر لازم قرار دیں۔

اور کہا گیا ہے: بے شک ان کے لئے ان کے خاوندوں پر انہیں اذیت نہ دینا اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے مضرت کو ترک کرنا ان پر لازم ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: تم ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح کہ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں (1)۔ تمام معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ آیت حقوق زوجیت سے متعلقہ تمام حقوق کو شامل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''بلاشبہ میں اپنی زوجہ کے لئے زیب و زینت کرتا ہوں''۔ (2)

علماء نے کہا ہے: رہی مردوں کی زینت تو اس کا انحصار ان کے مختلف احوال پر ہوتا ہے۔ بے شک وہ اس کے اعمال نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور اتفاق کی بنا پر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک طرح کی زینت ایک وقت میں مناسب ہوتی ہے اور ایک وقت میں وہی مناسب نہیں ہوتی، کبھی ایک طرح کی زینت جوانوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ایک زینت بوڑھوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور وہ جوانی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ شیخ اور بوڑھا آدمی جب اپنی لبیں مونڈ دے تو یہ اس کے لئے موزوں ہے اور اس کے لئے باعث زینت ہے اور جوان جب ایسا فعل کرے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے، کیونکہ داڑھی ابھی بڑھی نہیں اور جب وہ اپنی لبیں مونڈ دے جونہی وہ پہلی بار ظاہر ہوں تو

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 543، دار احیاء التراث العربیۃ　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 544

اس کا چہرہ قبیح ہو جاتا ہے اور جب اس کی داڑھی بڑھ جائے اور وہ اپنی لبوں کو مونڈ دے تو یہی اس کے لئے زینت بن جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے رب نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں داڑھی مبارک کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور اپنی لبوں کو کاٹوں (1)۔'' اسی طرح لباس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ اور ان تمام میں حقوق کی طلب اور چاہت ہے۔ بلاشبہ وہ نرم مزاجی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے نزدیک اتنا حسین اور خوبصورت ہو جائے کہ اسے خوش کردے۔ اور وہ اسے کسی بھی غیر مرد سے پاکدامن کردے۔ اسی طرح سرمہ ہے مردوں میں سے بعض کے ساتھ وہ مناسبت رکھتا ہے اور بعض کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک خوشبو لگانا، مسواک کرنا، دانتوں کا خلال کرنا، میل کچیل اور فالتو بالوں کو دور کرنے، پاکیزگی وطہارت حاصل کرنے اور ناخن تراشنے کا تعلق ہے تو یہ اعمال بالکل ظاہر اور تمام کے موافق ہیں اور خضاب بوڑھوں کے لئے اور انگوٹھی جوانوں اور بوڑھوں تمام کے لئے زینت ہے اور یہ مردوں کا زیور ہے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔ پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کی حاجت کے اوقات مقرر کرے اور اسے پاکدامن بنائے اور اسے کسی غیر کی طرف دیکھنے سے بے نیاز کردے اور اگر آدمی اپنے آپ میں بستر پر عورت کے حقوق ادا کرنے سے عجز اور کمزوری دیکھے تو وہ ایسی ادویہ استعمال کرے جو اس کی قوت باہ میں اضافہ کریں اور اس کی شہوت کو تقویت پہنچائیں یہاں تک کہ وہ اسے پاکدامن بنادے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کے لئے عورتوں پر درجہ اور رتبہ ہے۔ اور مَدْرَجَةُ الطریق: اس کا معنی ہے راستے کا بلند اور بڑا حصہ۔ اس میں اصل معنی الطیّ لپیٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دَرَجوا، یعنی طَوَوْا اعمرهم انہوں نے اپنی اپنی عمریں لپیٹ لیں اور اسی سے وہ درجہ ہے جس پر وہ ترقی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے: رجل بین الرّجلة، یعنی ایسا آدمی جس کی قوت ظاہر ہو۔ وھو أرجل الرجلین اور وہ ان دو میں سے زیادہ قوی ہے اور فرس رجیل یعنی طاقتور گھوڑا اور اسی سے الرِجل ہے کیونکہ اس میں چلنے کی قوت ہوتی ہے۔ پس آدمی کے مرتبہ کی زیادتی اس کی عقل اور اس کے خرچ کرنے کی قوت کے سبب اور دیت، میراث اور جہاد کے سبب ہے۔

حمید نے کہا ہے: الدرجه کا معنی داڑھی ہے۔ یہ اگر ان کی طرف سے صحیح بھی ہے تو بھی ضعیف ہے۔ اس کا تقاضا نہ آیت کا لفظ کرتا ہے اور نہ اس کا معنی۔ (2)

ابن عربی نے کہا ہے: بندے کے لئے اچھا اور خوبصورت یہ ہے کہ اس سے باز رہے جو وہ نہیں جانتا اور خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اور مردوں کی عورتوں پر فضیلت کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہے اور اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی عورت مرد سے تخلیق کی گئی ہے۔ پس مرد اس کی اصل ہے (3) اور مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بغیر اجازت کے تصرف کرنے سے روکے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی مگر مرد کی اجازت کے ساتھ اور وہ حج نہیں کر سکتی مگر محرم کے ساتھ۔ اور کہا گیا ہے کہ الدرجة کا معنی الصداق

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 656، موسسۃ الرسالہ بیروت۔ بخاری شریف، باب تقلیم الأظفار، حدیث نمبر 5442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 188-189، دار الفکر

(دوستی) بھی ہے۔ شعبی نے یہی کہا ہے اور کہا گیا ہے اس کا معنی جواز الادب (ادب کا لحاظ رکھنا) ہے۔ جملہ معانی کے اعتبار سے الدرجہ کا لفظ تفضیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خاوند کا حق زوجہ پر اس سے زیادہ ہے جو بیوی کا حق خاوند پر ہے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ولو امرت احدا بالسجود لغیر اللہ لأمرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا(1) (اگر میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ الدرجۃ کا لفظ مردوں کو حسن معاشرت پر ابھارنے اور عورتوں کے لئے مال اور اخلاق میں وسعت ظرفی اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بلاشبہ افضل کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بوجھ برداشت کرے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حسین اور عمدہ ہے۔(2)

ماوردی نے کہا ہے: احتمال ہے کہ یہ حقوق نکاح میں ہو۔ اس کے لئے ان کے سوا کو عقد نے اٹھا دیا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ مرد کے بلانے پر اس کے بستر پر جائے اور مرد پر اس کی دعوت کو قبول کرنا لازم نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اسی کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: ''جس عورت کو اس کے خاوند نے اپنے بستر کی جانب بلایا اور اس نے اس سے انکار کر دیا تو ملائکہ صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں''(3)۔ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ یعنی وہ مضبوط سلطان ہے، اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ حَکِیْمٌ یعنی وہ جاننے والا ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی درست اور صحیح کرتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۲۹

''طلاق دو بار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ، جلد 1، صفحہ 134، وزارت تعلیم
جامع ترمذی، باب ما جاء فی حق الزوج علی المرأۃ، حدیث نمبر 1079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ　3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر 4794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۔ یہ بات ثابت ہے کہ اہل جاہلیت کے نزدیک طلاق کے لئے کوئی عدد معین نہ تھا۔ البتہ ان کے نزدیک عدت (کی مدت) معین اور مقرر تھی اور ابتدائے اسلام میں بھی کچھ عرصہ یہی رہا۔ ایک آدمی اپنی عورت کو جو چاہتا تھا طلاق دے دیتا تھا اور جب وہ اس کی طلاق سے حلال ہونے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا جب تک چاہتا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی عورت کو کہا: نہ میں تجھے گھر میں رکھوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا کہ تو (کسی کے لئے) حلال ہو جائے۔ اس نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہوگی تو میں تجھ سے رجوع کر لوں گا (1)۔ تو اس عورت نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کی شکایت کی اور آپ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا، سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آدمی کے لئے طلاق کی اس تعداد کو بیان کرتی ہے جس میں وہ بغیر مہر اور ولی کے رجوع کر سکتا ہے اور جو طریقہ ان میں رائج تھا اسے منسوخ کر دیا۔ اس کا یہ معنی حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید وغیرہم نے بیان کیا ہے۔(2)

اور حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود سنت طلاق کی پہچان ہے، یعنی جو دو طلاقیں دے تو اسے تیسری کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، پس یا تو اس کے حقوق میں سے کسی شی کا ظلم کیے بغیر اسے چھوڑ دے یا پھر اسے حسن معاشرت کے ساتھ اپنے پاس روک لے اور آیت ان دونوں معنوں کو متضمن ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ طلاق سے مراد اس بندھن اور عصمت کو کھولنا ہے جو مخصوص الفاظ کے ساتھ زوجین کے درمیان منعقد اور قائم ہوئی۔ اس آیت اور اس کے علاوہ دیگر آیات کے ساتھ ثابت ہے کہ طلاق مباح ہے اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فان شاء امسك وان شاء طلق (4) (پھر اگر وہ چاہے تو اسے روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے دے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی اور پھر ان کی طرف رجوع کر لیا(5)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔(6)

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی عورت کو ایسے طہر کے دوران طلاق دی جس میں اس نے اس سے مقاربت نہ کی ہو تو وہ سنت کے مطابق طلاق دینے والا ہے اور اس کے لئے وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جب عورت مدخول بہا ہو تو مرد کے لئے اس کی عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجعت کا حق حاصل ہوگا اور جب عدت

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 10، دار المحاسن قاہرہ

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 146، وزارت تعلیم

6۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گئی تو وہ بھی خطاب میں سے ایک خاطب (پیغام نکاح بھیجنے والا) ہے۔ کتاب اللہ، سنت اور اجماع امت اس پر دال ہے کہ طلاق مباح ہے ممنوع نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اس سے منع کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے جو ثابت ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے ''مجھے ابو العباس محمد بن موسیٰ بن الدولابی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں نے حدیث بیان کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: ہمیں حسن بن عرفہ، اسماعیل بن عیاش بن حمید ابن مالک اللخمی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک عتاق (آزاد کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی شے تخلیق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو۔ پس جب کوئی آدمی اپنے غلام کو کہے انت حر ان شاء اللہ تعالیٰ تو آزاد ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو وہ آزاد ہے اور اس کے لئے استثنا نہیں ہے اور اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تعالیٰ تو اس کے لئے استثنا ہے اور اسے طلاق واقع نہ ہوگی۔''

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع، یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا کہ اسماعیل بن عیاش نے اپنی اسناد کے ساتھ اسی طرح ہمیں خبر دی ہے۔

حمید نے کہا ہے کہ مجھے یزید بن ہارون نے کہا ہے: کون سی حدیث ہے اگر حمید ابن مالک اللخمی معروف ہوتا! میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں! تو یزید نے کہا: تو نے مجھے خوش کر دیا ہے، اب یہ حدیث ہوئی ہے!''(1)

ابن منذر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے طلاق میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کو مؤخر قرار دیا ہے ان میں سے طاؤس، حماد، امام شافعی ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

امام مالک اور امام اوزاعی کے قول کے مطابق طلاق میں استثنا جائز نہیں ہے اور حسن اور قتادہ کا صرف طلاق کے بارے میں یہی قول ہے۔ فرمایا: وبالقول الاول اقول۔ میں تو پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: **فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ** یہ مبتدا ہے اور خبر امثل یا احسن ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، یعنی فعلیکم امساک بمعروف، یا فالواجب علیکم امساک بما یعرف أنه الحق (2) (یعنی تم پر واجب ہے روک لینا ایسے طریقہ سے جس کے بارے یہ معلوم ہو کہ یہ حق اور درست ہے) اور قرآن کے علاوہ اسے مصدر ہونے کی بنا پر فَاِمۡسَاکًا پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور **بِاِحۡسَانٍ** کا معنی یہ ہے کہ وہ بیوی کے حقوق میں سے کسی بھی شے میں اس پر ظلم نہ کرے اور نہ قول میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرے۔ اور الامساک، الاطلاق کے خلاف ہے (یعنی امساک کا معنی روکنا اور اطلاق کا معنی چھوڑنا ہے۔) اور التسریح کا معنی ہے کسی شے کو چھوڑ دینا اور اسی سے تسریح الشعر (یعنی بالوں کو چھوڑ دینا ہے، تاکہ وہ بعض کو بعض سے علیحدہ

---

1۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 35، دار المحاسن قاہرہ　　2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 200، دار الکتب العلمیہ

کر لے اور سرّح الماشیۃ: اس نے مویشی کو چھوڑ دیا اور تسریح کا لفظ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دوسری طلاق کی عدت مکمل ہو جائے اور وہ اپنے نفس کی زیادہ مالک ہو جائے۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسے تیسری طلاق دے اور اسے چھوڑ دے یہ حضرت عطا اور حضرت مجاہد وغیرہما کا قول ہے(1) اور تین وجوہ کی بناء پر یہ زیادہ صحیح ہے۔

(۱) وہ حدیث جسے دارقطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (طلاق دو بار ہے) تو یہ تین کیونکر ہوئیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ ایک روایت میں ہے: یہ تیسری طلاق ہے(2)۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۲) تَسْرِيْحٌ الفاظ طلاق میں سے ہے، کیا تو جانتا نہیں کہ ان عزموا السراح بھی پڑھا گیا ہے۔

(۳) بے شک فعل تفعیلا یعنی باب تفعیل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے دوسری طلاق پر فعل کو مکرر کیا ہے اور ترک میں فعل کو نئے سرے سے کرنا نہیں ہے جسے تفعیل سے تعبیر کیا جاتا ہو۔(3)

ابوعمر نے کہا ہے: اس پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مراد لی گئی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ:230) (دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہو گی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں تو اس کے لئے اس کی طرف رجوع کا حق ہے اور اگر اس نے اسے تیسری طلاق دے دی تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی کر لے(4)۔ اور یہ قرآن کریم کا وہ محکم حکم ہے جس کی تاویل (اور معنی) میں کوئی اختلاف نہیں، اسی کی مثل عادل راویوں کی احادیث بھی مروی ہیں۔ سعید بن نصر نے بیان کیا کہ ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن وضاح نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا اور انہوں نے کہا: ہمیں ابومعاویہ نے اسماعیل بن سمیع کے واسطہ سے ابورزین سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے آپ کا کیا خیال ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تو اس میں تیسری طلاق کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (وہ ہے) فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور اسے ثوری وغیرہ نے اسماعیل بن سمیع سے اور انہوں نے ابورزین سے اسی طرح روایت کیا ہے۔(5)

میں (مفسر) کہتا ہوں: الکیا الطبری نے یہ خبر ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کو ترجیح دی ہے اور بلاشبہ تیسری طلاق ہی اس ارشاد گرامی میں سیاق خطاب میں مذکور ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ 2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 4، دارالمحاسن
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ 4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دارالفکر 5۔ سنن دارقطنی، جلد 4، صفحہ 4، دارالمحاسن

لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ پس تیسری طلاق اس خطاب کی صلب میں مذکور ہے اور یہ ایسی بینونت کا فائدہ دیتی ہے جو تحریم کا موجب ہے مگر زوج (ثانی) کے بعد (وہ تحریم ختم ہوجاتی ہے) پس ارشاد باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو نئے فائدہ پر محمول کرنا واجب ہے اور وہ عدت گزرنے کے ساتھ دوطلاقوں کے ساتھ بینونت کا واقع ہونا ہے اور اس پر (محمول کرنا واجب ہے) کہ آیت سے مقصود ایسی طلاق کے عدد کا بیان ہے جو تحریم کو ثابت کرتی ہے اور اسے منسوخ کرنا ہے جو ان میں بلا عدد محصور طلاق واقع کرنا جائز تھا اور اگر قول باری تعالیٰ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہی تیسری طلاق ہو تو یہ تین کے ساتھ تحریم واقع کرنے کا مقصد ظاہر نہیں کرتی، کیونکہ اگر اس پر اقتصار کرلیا جائے تو پھر یہ اس کے لئے بینونت محرمہ کے وقوع پر دلیل نہیں مگر زوج کے بعد، بلا شبہ تحریم کا علم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ تو پھر یہ ضروری ہے کہ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی تیسری طلاق نہ ہو۔ اور اگر اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تیسری طلاق کے معنی میں ہو تو پھر اس کے پیچھے ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق ہوگی، کیونکہ فا تعقیب کے لئے ہے اور یہ ان کے بعد نئی طلاق کا تقاضا کرتی ہے جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد عورت کو چھوڑ دینا ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** امام بخاری نے اس آیت پر یہ عنوان باندھا ہے: باب من أجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالى: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے مذکورہ ارشاد گرامی کے ساتھ تین طلاقوں کو جائز قرار دیا ہے) اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ تعداد بلا شبہ ان کے لئے وسعت ہے۔ پس جس نے اپنے اوپر تنگی اور شدت کی تو یہ اس پر لازم ہوجائے گی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ائمہ فتویٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے لازم ہوجاتی ہے اور یہی جمہور اسلاف کا قول ہے۔

اور طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے یہ کہا ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور یہ محمد بن اسحاق اور حجاج بن ارطاۃ سے روایت کیا جاتا ہے اور ان دونوں سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے کوئی شے لازم نہیں ہوتی اور یہ مقاتل کا قول ہے اور داؤد سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا (کوئی شے) واقع نہ ہوگی۔ اور حجاج بن ارطاۃ اور جمہور سلف اور ائمہ سے مشہور قول یہ ہے کہ وہ تینوں لازم اور واقع ہوجاتی ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تین طلاقیں اکٹھی ایک کلمہ کے ساتھ واقع کرے یا تین متفرق کلمات کے ساتھ۔

اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے کوئی شے لازم نہ ہوگی انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی دلیل سے استدلال کیا ہے۔ یہ ہر مطلقہ کو شامل ہے سوائے اس کے جسے اس سے خاص کر دیا جائے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاق دو بار ہے اور تیسری فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہے اور جس نے ایک کلمہ میں تین طلاقیں دیں پس وہ لازم نہ ہوگی، کیونکہ وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ایک

واقع ہوئی ہے تو انہوں نے تین احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت طاؤس، ابو صہباء اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور دوسری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اس کی روایت کے مطابق جس نے یہ بیان کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور وہ آپ کے لئے ایک طلاق شمار ہوئی (1) اور تیسری حدیث یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رجعت کا حکم فرمایا (2) اور رجعت ایک طلاق واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

ان احادیث کا جواب وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عطا، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک بن حویرث، حضرت محمد بن ایاس بن بکیر اور حضرت نعمان ابن ابی عیاش رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے (کہ) جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو گئی اور اب وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا مگر دوسرے زوج کے بعد (3) اور اس بارے میں ان ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت کی ہے وہ جماعت (جمہور کی رائے) سے موافقت رکھتی ہے اور طاؤس وغیرہ کی روایت وہن (کمزوری) پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مخالفت کریں۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، عراق، مشرق اور مغرب کے شہروں کے فقہاء میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موالی میں سے ابو صہباء معروف نہیں ہیں۔

قاضی ابو الولید الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک ابن طاؤس سے اس بارے میں روایت صحیح ہے اور ان سے ائمہ نے روایت کی ہے: (یعنی) معمر اور ابن جریج وغیرہ اور ابن طاؤس امام ہیں اور وہ حدیث جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ ہے جسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق کے عہد اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت کے پہلے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک لوگ اس امر میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔ پس اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں! پھر آپ نے اسے ان پر نافذ کر دیا۔ (4)

اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ ایک طلاق واقع کرتے تھے اس کے بدلے جہاں اب لوگ تین طلاقیں واقع کرتے ہیں اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ بے شک لوگ اس معاملے میں جلدی کرنے لگے

---

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ شرح معانی الآثار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 34، مکتبہ امدادیہ ملتان 4۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 477-478، وزارت تعلیم

ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی تو آپ نے انہیں ناپسند کیا کہ وہ طلاق دینے کے معاملہ میں جلدی کریں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی پس اگر ابتدائے اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان کا یہی حال ہوتا جو آپ نے کہا ہے تو ان پر یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔

اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ نے اس کے لئے تین طلاقوں کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جس نے اکٹھی تین واقع کیں۔ پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کے یہ معنی ہیں تو یہ تو ہم نے بیان کر دیے ہیں اور اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے جس میں وہ تاویل کرتے ہیں جن کے قول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، تو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور قیاس کے اعتبار سے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ طلاق ہے اور اسے وہ واقع کرتا ہے جو اس کا مالک ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے لازم قرار دیا جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کوئی مفرد طلاق واقع کرے (تو وہ واقع ہو جاتی ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو تاویل الباجی نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جس کا معنی الکیا الطبری نے علمائے حدیث سے ذکر کیا ہے؟ یعنی وہ ایک طلاق دیتے تھے۔ وہی اب تین طلاقیں دیتے ہیں، یعنی وہ ہر طہر میں ایک طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ وہ پوری عدت میں ایک طلاق دیتے تھے یہاں تک کہ وہ جدا ہو جاتی اور عدت گزر جاتی۔

قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ لوگ ایک طلاق پر اقتصار کرتے تھے، پھر وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے تین طلاقیں دینے لگے۔ قاضی نے کہا: یہی معنی راوی کے اس قول کے زیادہ مشابہ ہے کہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقوں میں جلدی کی تو آپ نے ان پر جلدی نافذ کر دی۔ اس کا معنی ہے کہ آپ نے ان کا حکم ان پر لازم کر دیا۔

اور رہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث تو دارقطنی نے احمد بن صبیح عن طریف بن ناصح عن معاویہ بن عمار الدھنی عن ابی الزبیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابوالزبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں درآنحالیکہ وہ حائضہ ہو۔ تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں (اور وہ حائضہ تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت کی طرف لوٹا دیا۔ اور دارقطنی نے کہا: تمام کے تمام (راوی) شیعہ ہیں۔ اور محفوظ روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی۔ (1)

عبیداللہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اسے حالت حیض میں ایک طلاق دی تھی مگر انہوں نے سنت کے خلاف عمل کیا تھا۔

اسی طرح صالح بن کیسان، موسیٰ بن عقبہ، اسماعیل بن امیہ، لیث بن سعد، ابن ابی ذئب، ابن جریج، جابر، اسماعیل بن

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

ابراہیم بن عقبہ نے حضرت نافع سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک طلاق دی تھی (1) اور اسی طرح زہری نے سالم عن ابیہ اور یونس ابن جبیر اور شعبی وحسن سے بیان کیا ہے۔

اور رہی حدیث رکانہ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب، منقطع ہے، کسی ایسی سند سے یہ بیان نہیں کی جاسکتی جس سے استدلال ہوسکتا ہو۔ اسے ابوداؤد نے ابن جریج کی حدیث سے بیان کیا جو انہوں نے بنی رافع کے بعض افراد سے نقل کی ہے اور ان میں کوئی بھی قابل حجت نہیں ہے۔ (یعنی) عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے۔ اور اس میں ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تو اسے واپس لوٹا لے۔'' (2)

تحقیق اسے کئی طرق سے عن نافع بن عجیر بھی روایت کیا ہے کہ رکانۃ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق البتۃ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قسم دی کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ان کی طرف واپس لوٹا دیا (3)۔ پس یہ اسم اور فعل دونوں میں اضطراب ہے اور اس طرح کی شے سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو کئی طرق سے دارقطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے، بعض میں کہا ہے: حدثنا محمد بن یحییٰ بن مرداس حدثنا ابو داؤد السجستانی حدثنا احمد بن عمرو بن السرح و ابو ثور ابراهیم بن خالد الکلبی اور دوسروں نے کہا: حدثنا محمد بن ادریس الشافعی حدثنی عمی محمد ابن علی بن شافع عن عبداللہ بن علی بن السائب عن نافع بن عجیر بن عبد یزید کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ المزنیہ کو بتہ طلاق دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کیا اور کہا: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے (بیوی کو) اس کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دی اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (4)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: ''یہ حدیث صحیح ہے''۔ پس حدیث رکانہ میں سے جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق البتۃ دی نہ کہ تین طلاقیں دیں۔ اور طلاق البتۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پس اس سے استدلال ساقط ہوگیا۔ والحمدللہ، واللہ اعلم۔

اور ابوعمر نے کہا کہ حدیث رکانہ کے بارے میں امام شافعی کی روایت اپنے چچا سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے اور انہوں نے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 476، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886۔ 1887، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، و ت۔ ترمذی حدیث، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی زیادتی بیان کی ہے جسے اصول رد نہیں کرتے۔ پس اس کے ناقل کے ثقہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول کرنا واجب ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے چچا اور ان کے دادا رکانہ کے اہل بیت ہیں اور تمام کے تمام بنی عبد المطلب بن عبد مناف میں سے ہیں اور وہ اس قصہ کو زیادہ بہتر جانتے ہیں جو انہیں پیش آیا۔

**فصل:** احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی نے اپنی وثائق میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے: طلاق دو قسموں پر منقسم ہے: طلاق سنت، طلاق بدعت، پس طلاق سنت وہ ہے جو اس طریقہ پر واقع ہو جو شریعت نے مباح قرار دیا ہے اور طلاق بدعت وہ ہے جو اس کی نقیض اور ضد ہو اور وہ یہ ہے کہ آدمی عورت کو طلاق دے حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی۔

اہل علم کے اس پر اجماع کر لینے کے بعد کہ وہ طلاق دینے والا ہے، ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ کتنی طلاقیں اسے لازم ہوں گی، تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اسے ایک طلاق لازم ہو گی، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے اور فرمایا: اس کا قول ثلاثا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے تین بار طلاق نہیں دی۔ البتہ اس کا قول فی ثلاث جائز ہو گا جبکہ وہ اس سے اس کے بارے خبر دے رہا ہو جو گزر چکا ہے۔ پس وہ کہتا ہے: میں نے تین طلاقیں دیں تو یہ ان تین افعال کی خبر دینے والا ہو جائے گا جو اس سے تین اوقات میں صادر ہوئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی کہے: ''میں نے کل فلاں سورۃ تین بار پڑھی'' تو وہ صحیح ہو گا اور اگر اس نے ایک بار سورۃ پڑھی اور کہا: میں نے اسے تین بار پڑھا'' تو وہ جھوٹا ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین بار قسم کھائے کہ وہ قسم کو بار بار لوٹاتا ہے تو یہ تین قسمیں ہوں گی اور اگر اس نے ایک بار قسم کھائی اور کہا: أحلف باللہ ثلاثا میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین قسمیں کھاتا ہوں تو یہ صرف ایک قسم ہو گی اور طلاق بھی اسی کی مثل ہے۔

حضرت زبیر بن عوام اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے اور ہم نے یہ سب ابن وضاح سے روایت کیا ہے اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبد السلام الحسنی جو اپنے وقت میں منفرد عالم دین اور فقیہ عصر تھے، اصبغ بن الحباب اور ان کے سوا ایک پوری جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حجت میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ طلاق تفریق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس سے مراد وہ اکثر طلاقیں ہیں (یعنی دو بار طلاق) جن کے بعد امساک بالمعروف ہو سکتا ہے اور اس سے مراد عدت میں رجوع کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی ہے کہ وہ اسے بغیر رجوع کیے اسی حالت پر چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے (1) اور اس میں اس پر احسان ہے اگر ان دونوں کے درمیان ندامت واقع ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ (الطلاق) (تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔) اس سے مراد فرقت پر ندامت اور رجعت میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر

رغبت رکھنا ہے اور تین کو واقع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس میں اس وسعت کو ترک کرنا ہے جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اس پر متنبہ کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا طلاق کو متفرقاً ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب انہیں جمع کیا جائے تو وہ لفظ واحد ہے (لہٰذا ایک واقع ہوگی) اور المدونہ میں موجود دیگر مسائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں ان پر قیاس کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے انسان کا یہ قول ہے: مالی صدقۃ فی المساکین کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو ثلث مال اس کی طرف سے جائز ہوتا ہے۔ اور ابن منذر کی الاشراف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابوالشعثاء، عطا اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ ایک واقع ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ بسا اوقات انہوں نے ہمت کی اور کہا: غیر المدخول بہا لاعدۃ علیھا، کیونکہ جب اس نے غیر مدخول بہا عورت کو کہا انت طالق ثلاثا تو وہ انت طالق سے اس کے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی، تو ثلاثاً کا لفظ اس پر اس حال میں پڑ رہا ہے کہ وہ بائن ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا قول: انت طالق (معنی طلاق کو ادا کرنے میں) بنفسہ مستقل ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ غیر مدخول بہا عورت میں بینونت (جدائی) اس پر موقوف نہ ہو جو اس کے بعد وارد ہو رہا ہے جبکہ اس میں اصل "انت طالق" ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** امام شافعی نے قول باری تعالیٰ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور سَرِّحُوْهُنَّ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ یہ لفظ طلاق کے لئے صریح ہے۔ (1) حالانکہ علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو محمد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صریح وہ ہوتا ہے جو کسی بھی طریقہ پر لفظ طلاق کو متضمن ہو، مثلاً وہ کہے: أنت طالق، انت مطلقۃ، قد طلقتك، یا الطلاق لہ لازم۔ اور اس کے سوا الفاظ طلاق میں سے جو بھی اس معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ الفاظ کنایہ ہیں اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: طلاق کے لئے الفاظ صریح کثیر ہیں اور ان میں سے بعض بعض کی نسبت زیادہ بین اور واضح ہیں: (مثلاً) لفظ طلاق، سراح، فراق، حرام، خلیۃ اور بریۃ وغیرھا۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: صریح تین الفاظ ہیں اور وہ وہ ہیں جن کے بارے قرآن وارد ہو چکا ہے اور وہ ہیں لفظ طلاق، السراح اور الفراق۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق: 2) (یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ) اور فرمایا: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور مزید فرمایا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق: 1) (تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب یہ بات پختہ اور ثابت ہوگئی تو پھر طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔

پس صریح تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور کنایہ وہ ہے جو اس کے سوا ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صریح میں آدمی نیت کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظ کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور کنایہ نیت کی محتاج ہوتی ہے اور ان کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیۃ

دلیل جنہوں نے کہا: بے شک (الفاظ) الحرام، الخلیة اور البریة، صریح الطلاق ہیں، طلاق کے معنی میں کثیر الاستعمال ہیں یہاں تک کہ وہ اس معنی میں معروف ہیں اور یہ ایقاع طلاق میں بین اور واضح ہو گئے، جیسا کہ جس طرح غائط کا لفظ پست زمین کے لیے وضع کیا گیا، پھر اسے بطریق مجاز قضائے حاجت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور وہ اس معنی میں زیادہ بین، ظاہر اور مشہور ہو جائے اس کی نسبت جس کے لئے اسے وضع کیا گیا اور ہمارے مسئلہ میں اسی طرح کی مثال ہے۔

پھر عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے: ''اگر طلاقیں ہزار ہوں تو (طلاق) البتة ان میں سے کوئی شے باقی نہیں چھوڑتی۔ پس جس نے کہا ہے: البتة، تو اس نے انتہائے اخیر کو چھو لیا (1)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الخلیة والبریة والبتة والبائن اور الحرام تین طلاقیں ہیں، اور عورت آدمی کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے شادی کر لے۔ (2) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ البتہ تین طلاقیں ہیں۔ اَنّ البتة ثلاث سند کے اعتبار سے اس میں ضعف ہے، اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے اور عنقریب ارشاد خداوندی: وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا کے تحت اس کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء نے اس کے بارے کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد طلقتُكِ میں نے تجھے طلاق دی، کہ یہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے حق میں صریح طلاق ہے اور جس نے اپنی عورت کو کہا: انت طالق تو طلاق والی ہے تو یہ ایک طلاق ہے مگر یہ کہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے۔ اور اگر اس نے دو یا تین کی نیت کر لی تو اتنی ہی لازم ہو جائیں گی جن کی اس نے نیت کی اور اگر اس نے کسی شے کی نیت نہ کی تو پھر ایک طلاق ہو گی اور آدمی رجعت کا مالک ہو گا (یعنی ایک طلاق رجعیہ ہو گی) اور اگر اس نے کہا: انت طالق اور کہا: میں نے قید (بیڑیوں) سے آزاد ہونے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا اور طلاق اس پر لازم ہو جائے گی، مگر یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اور جس نے کہا: انت طالق واحدة، لا رجعة لی علیك تو اس کا قول: لا رجعة لی علیك (مجھے تجھ پر رجوع کا حق نہیں) باطل ہو گا اور اس کے قول واحدة کی وجہ سے اس کے لئے رجعت ثابت ہو گی، کیونکہ واحدة سے مراد تین نہیں ہو سکتیں اور اگر اس نے اپنے قول: لا رجعة لی علیك سے تین کی نیت کی، تو امام مالک کے نزدیک یہ تین ہی ہوں گی۔

اور اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد فارقتك (میں نے تجھے جدا کر دیا)، سرحتكِ (میں نے تجھے چھوڑ دیا)، انت خليةٌ (تو فارغ ہے)، انت برئة (تو بری ہے) انت بائن (تو جدا ہے)، حبلك علی غاربك (تیری رسی تیرے کندھے پر)، انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے)، الحقی باهلك (تو اپنے اہل سے جا مل)، قد وهبتك لأهلك (میں نے تجھے تیرے اہل کے حوالے کر دیا)، قد خليت سبيلك (میں نے تیرا راستہ چھوڑ دیا)، لا سبيل لی علیك (مجھے تجھ پر کوئی اختیار نہیں) تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس سے طلاق

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتة، جلد 1، صفحہ 511، وزارت تعلیم

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 2، جز رابع، صفحہ 32، دار المحاسن

بائن واقع ہوگی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب آدمی نے اپنی بیوی کو کہا استقلی بأمرك (تو اپنے معاملے میں مستقل ہے) یا امرك لك (تیرا معاملہ تیرے سپرد ہے) یا الحقی باھلك۔ (تو اپنے گھر والوں سے جا مل) اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس سے ایک طلاق بائن ہوگی۔

اور امام مالک سے اس کے بارے میں یہ مروی ہے جس نے اپنی عورت کو کہا: قد فارقتك یا سرحتك کہ یہ صریح طلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ اس کا قول: انت طالق صریح ہے اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ طلاق کنایہ ہے، لہٰذا اس میں کہنے والے کی نیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا جتنے عدد کا اس نے ارادہ کیا ہے مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ عورت جس کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا اس کے بارے میں دو میں سے اصح قول یہ ہے کہ ایک طلاق ہوگی، مگر یہ کہ وہ اکثر کی نیت کرے۔ ابن القاسم اور ابن عبد الحکم نے یہی کہا ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ تین طلاقیں ہیں اور اس کی مثل یہ الفاظ بھی ہیں: خلعتك (میں نے تجھے چھوڑ دیا) یا لا ملك لی علیك (میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام الفاظ کنایات سے مدخول بہا عورت کے حق میں تین طلاقیں ہوتی ہیں جن میں کہنے والا کوئی نیت نہ کرے اور غیر مدخول بہا کے بارے میں وہ نیت کرے اور اگر وہ حلف اٹھا دے اور کہے: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ خطاب میں سے ایک خاطب ہے کیونکہ مدخول بہا عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑ سکتا ہے نہ جدا کر سکتا ہے اور نہ ہی بری قرار دے سکتا ہے مگر تین طلاقوں کے ساتھ اور جس سے دخول نہ کیا گیا ہو اسے وہ ایک طلاق کے ساتھ چھوڑ سکتا ہے، بری کر سکتا ہے اور جدا کر سکتا ہے۔

امام مالک اور آپ کے اصحاب کے ایک طائفہ سے مروی ہے اور یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ان تمام الفاظ میں نیت کرے گا اور طلاق میں سے جس کی اس نے نیت کی وہ اسے لازم ہو جائے گی۔

اور آپ سے تمام کنایات میں سے بالخصوص البتۃ کے بارے یہ مروی ہے کہ وہ اس سے نیت نہ کرے نہ مدخول بہا کے بارے میں اور نہ غیر مدخول بہا کے بارے میں۔

اور امام ثوری، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان تمام میں اس کی نیت کا اعتبار ہے، پس اگر اس نے تین کی نیت کی تو یہ تین ہوں گی اور اگر ایک کی نیت کی تو وہ ایک بائنہ ہوگی اور وہ اپنے نفس کے بارے زیادہ حقدار ہو جائے گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ ایک ہوگی۔ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ دو ہوں گی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ان تمام الفاظ میں وہ طلاق دینے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ کہے: میں نے اپنے کلام سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو پھر اتنی ہوں گی جتنی کی اس نے نیت کی۔ پس اگر اس نے تین سے کم کی نیت کی تو وہ رجعی ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے ایک بائن طلاق دی تو وہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔

اور اسحاق نے کہا ہے: ہر وہ کلام جو طلاق سے مشابہت رکھتا ہو تو اس سے وہ طلاق واقع ہو جائے گی جس کی اس نے نیت کی اور ابوثور نے کہا: یہ طلاق رجعیہ ہوگی اور اس کی نیت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ طلاق بائن کا تصور نہیں کرتے مگر خلع یا ایلاء میں اور ان میں یہی روایت محفوظ ہے۔ ابوعبید نے بھی یہی کہا ہے۔

اور امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب اذا قال فارقتك او سرحتك او البرية او الخلية او ما عنى به الطلاق فهو على نيته (1) (یعنی ان الفاظ سے طلاق کا انحصار اس کی نیت پر ہے۔) اور آپ نے اس سے علمائے کوفہ اور امام شافعی کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے قول ماعنی بہ من الطلاق سے اسحاق کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ ہر وہ کلمہ جو طلاق یا غیر طلاق ہونے کا احتمال رکھتا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اس سے طلاق لازمی ہو مگر تب جبکہ متکلم یہ کہے: بلاشبہ اس نے اس سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو اس کے اقرار کے ساتھ اسے طلاق لازم ہو جائے گی اور نکاح کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یقین کے ساتھ اس کے صحیح ہونے پر انہوں نے اجماع کیا ہوا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: امام مالک کا قول ایسے آدمی کے قول کے بارے میں مختلف ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: اعتدی (تو عدت کے دن شمار کر)، قد خلیتك، یا حبلك علی غاربك۔

آپ نے ایک بار کہا: وہ ان میں نیت نہیں کرے گا اور یہ تین طلاقیں ہیں۔ اور ایک بار کہا: وہ ان تمام میں نیت کرے گا۔ مدخول بہا کے بارے میں بھی اور غیر مدخول بہا کے بارے میں بھی اور اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف جمہور نے اختیار کیا ہے اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ ان الفاظ میں نیت کرے گا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ صحیح ہے، ہم نے اسے دلیل سے بیان کر دیا ہے اور اس صحیح حدیث سے جسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہم نے یزید بن رکانہ سے بیان کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتۃ دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عورت ان کی طرف لوٹا دی۔ ابن ماجہ نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن الطنافسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ حدیث کتنی اشرف واعلیٰ ہے۔ (2)

اور امام مالک نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: انت علی کالمیتة والدم ولحم الخنزیر کہ تو

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 792، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتۃ، جلد 1، صفحہ 149، وزارت تعلیم

ایضاً۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ترمذی، کتاب الطلاق اللعان، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ پر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہے کہ میں اسے البتہ (بالکل جدا) دیکھتا ہوں اگرچہ آدمی کی نیت نہ بھی ہو اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی مگر دوسرے زوج کے بعد۔

اور امام شافعی کے قول میں ہے کہ اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا تو وہ طلاق ہوگی جتنی بھی طلاقوں کا اس نے ارادہ کرلیا اور اگر اس نے طلاق کا ارادہ نہ کیا تو پھر اس کے حلف دینے کے بعد کوئی شے واقع نہ ہوگی۔

اور ابوعمر نے کہا ہے: ہر وہ لفظ جو کنایہ عن الطلاق ہے کے بارے میں اس باب کی اصل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس عورت کے لئے جس سے کسی نے شادی کی تو اس وقت اس عورت نے کہا: اعوذ باللہ منك۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا قد عذت بمعاذ الحقی باهلك (1) (تجھے پناہ حاصل ہے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جامل) پس وہ طلاق ہوگئی۔ اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس سے علیحدہ رہنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا الحقی باهلك اور وہ طلاق نہ ہوئی تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ نیت کا محتاج ہے اور اس میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر وہی جس کی بولنے والا نیت کرے گا۔ اور اسی طرح تمام الفاظ کنایات کا حکم ہے جو فراق اور غیر فراق کے معنی کا احتمال رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور رہے وہ الفاظ جو الفاظ طلاق میں سے نہیں ہیں اور نہ انہیں فراق (جدائی) سے کنایہ قرار دیا جاسکتا ہے تو اکثر علماء ان میں سے کسی سے طلاق واقع نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا اس کا ارادہ بھی کرے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جس نے کسی بھی لفظ سے طلاق کا ارادہ کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی، حتیٰ کہ اس قول کے ساتھ بھی كلی و اشربی و قومی و اقعدی۔ (تو کھا، تو پی، تو کھڑی ہو، تو بیٹھ جا) اس میں امام مالک کے اپنے اصحاب کے سوا کسی نے ان کی اتباع نہیں کی۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اس میں ''اَنْ'' يَحِلُّ کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور آیت میں خطاب ازواج کو ہے، انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ازواج سے کوئی شے ضرر اور اذیت پہنچانے کی غرض سے لیں اور یہ وہ خلع ہے جو صحیح نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ آدمی ضرر اور اذیت دینے میں متفرد نہ ہو۔ اور ذکر خاص کرانہی چیزوں کا کیا گیا ہے جو خاوندوں نے اپنی عورتوں کو دے رکھی ہوں، کیونکہ لوگوں میں عرف اور رواج یہی ہے کہ فساد اور ناچاکی کے وقت آدمی اس شے کا مطالبہ کرتا ہے جو مرد کے ہاتھ سے عورت کے لئے مہر اور اس کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لئے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ما یقع بہ الطلاق، جلد 1، صفحہ 149۔
بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4852-4853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، کتاب حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر 4066

سامان نکلا ہو۔ اسی وجہ سے اسے ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلَا يَحِلُّ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے فصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طلاق پر فدیہ لینا جائز ہے اور عورت کا مال نہ لینے کی تشدید پر اجماع ہے مگر یہ کہ نافرمانی اور معاملات میں فساد عورت کی جانب سے ہو۔

ابن منذر نے حضرت عثمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب ظلم اور خصومت مرد کی جانب سے ہو اور عورت اس سے خلع لے تو اس کا مال لینا جائز ہے اور وہ گنہگار ہوگا اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حلال نہ ہوگا اور جو مال اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: ان کے قول میں سے یہ ظاہر کتاب اللہ، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت (1) ہونے والی خبر اور اس نظریہ کے خلاف ہے جس پر عام اہل علم کا اجماع ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ تو خطا کی تلاش میں خوب محنت اور کوشش کر، تو وہ اس سے بڑھ کر کوئی امر نہیں پائے گا کہ کتاب اللہ کسی شے کی تحریم کے بارے حکم لگائے پھر کوئی مقابلہ کرنے والا اس کے مقابل ایسی شے لائے جو نص کے خلاف ہو اور وہ کہنے لگے: بلکہ وہ جائز ہے اور جو کچھ اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے اور ابن قاسم نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ قول ظاہر کتاب اللہ کے خلاف ہے اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی والی حدیث کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ وہ (کوئی شے) لے مگر اس اندیشہ اور خوف کے بعد کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور تحریم کو اس کے لئے وعید کے ساتھ مؤکد کیا جس نے حد سے تجاوز کیا۔

اور معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ اپنے ساتھی کے نکاح سے متعلقہ حقوق اس طرح پورے نہ کر سکے گا جس طرح اس پر واجب ہیں۔ اس میں وہ کراہت اور ناپسندیدگی بھی ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے تو پھر عورت پر فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر کچھ لینے میں حرج ہے اور خطاب زوجین (میاں بیوی دونوں) کو ہے اور اَنْ يَّخَافَآ میں ضمیر دونوں کے لئے ہے اور اَلَّا يُقِيْمَا مفعول بہ ہے اور خفت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ یہ خوف بمعنی علم ہے یعنی وہ دونوں جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہیں کر سکیں گے اور یہی خوف حقیقی ہے اور یہ مکروہ عمل کے واقع ہونے کا ڈر اور خوف ہے اور یہ ظن کے معنی کے قریب ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی) لیکن اگر نافرمانی عورتوں کی جانب سے ہو تو پھر تم پر فدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ

حمزہ نے اسے الا ان یُخافا یاء کے ضمہ کے ساتھ (1) صیغہ مجہول میں پڑھا ہے اور فاعل محذوف ہوگا اور وہ والی اور حکام ہیں۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے فَاِنْ خِفْتُمْ فرمایا: خوف زوجین کے علاوہ کسی اور کے لئے ذکر کیا ہے (یعنی والی یا حاکم کو خوف ہو) اگر زوجین کا ارادہ کرتا تو کہتا: فَاِنْ خَافَا اس میں ان کے لئے حجت اور دلیل ہے جنہوں نے خلع سلطان کے حوالے کیا ہے (یعنی حاکم وقت کے فیصلے کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت سعید بن جبیر، حسن اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور شعبہ نے کہا ہے، میں نے حضرت قتادہ کو کہا: کس سے حسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ خلع سلطان کے سپرد ہے؟ تو انہوں نے کہا: زیاد سے اور یہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے والی تھے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول زیاد سے معروف ہے اور اس قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں ہے کیونکہ آدمی جب اپنی بیوی سے خلع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ ایسی شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ دونوں راضی ہوتے ہیں اور سلطان اس پر اسے مجبور نہیں کر سکتا اور اس کے قول کی کوئی اصل نہیں ہے جس نے کہا ہے: یہ سلطان کے سپرد ہے اور انہوں نے ابوعبید کے اختیار کا انکار کیا ہے اور اسے رد کیا ہے اور میں ان کے اختیار اور پسند میں اس حرف سے زیادہ بعید اور کوئی شے نہیں جانتا، کیونکہ اعراب، لفظ اور معنی میں سے کوئی بھی اسے ثابت نہیں کرتا۔ جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الا ان یخافا کو پڑھا ہے تخافوا اور یہ عربی ہے۔ جب اسے مالم یسم فاعلہ کی طرف لوٹایا گیا تو کہا گیا الا ان یخاف، اور رہا لفظ تو اگر اس کا انحصار لفظ یخافا پر ہو تو پھر ضروری ہے کہ کہا جائے: فان خیف۔ اور اگر لفظ فان خفتم پر ہو تو پھر واجب ہے کہ یہ کہا جائے: الا ان تخافوا۔

اور رہا معنی تو یہ بعید ہے کہ کہا جائے کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم اس میں سے کوئی شے لو جو تم نے انہیں دے رکھی ہے مگر یہ کہ تمہارے سوا کسی کو خوف ہو اور نہ رب العالمین نے یہ کہا ہے: فلا جناح علیکم ان تاخذوا لہ منہا فدیۃ، (کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم مرد کے لئے عورت سے فدیہ لو) کہ خلع سلطان کے حوالے ہو جائے۔

امام طحاوی نے کہا ہے: حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سلطان کے بغیر خلع کا جائز ہونا صحیح ہے اور جس طرح طلاق اور نکاح بغیر سلطان کے جائز ہیں اسی طرح خلع بھی جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا اگر تمہیں خوف ہو اس پر کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے حُدُوْدَ اللّٰهِ اللہ کی حدیں۔ یعنی ان حقوق میں جو ان دونوں پر واجب ہیں مثلاً حسن صحبت اور خوبصورت طرز زندگی اور اس میں خطاب حکام کو اور حاکم نہ ہونے کی صورت میں اس طرح کے معاملات میں واسطہ بننے والوں کو کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ کرنے کا معنی ہے عورت کا اپنے خاوند کے حق کو حقیر جاننا اور اس کا اس کی اطاعت و پیروی نہ کرنا وغیرہ حضرت ابن عباس، مالک بن انس اور جمہور فقہاء نے یہی کہا ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 308، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ

اور حسن بن ابی الحسن اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: جب عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں تیرے حکم کی اطاعت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے غسل جنابت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے قسم پوری نہیں کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا ہے: اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کریں گے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ترک طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے (1)۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: خلع اور مال لینا حلال ہو جاتا ہے جب کہ عورت اپنے خاوند کو کہے: میں تجھے ناپسند کرتی ہوں اور میں تجھ سے محبت نہیں کرتی اور اسی طرح کے جملے (2)۔ تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔

امام بخاری نے ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت بن قیس کے بارے میں اخلاق و کردار اور دین کے اعتبار سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے (اس اعتبار سے ان میں کوئی عیب اور نقص موجود نہیں) لیکن میں اس کی طاقت نہیں رکھتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی''؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ (3)

اسے ابن ماجہ نے حضرت قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: قسم بخدا! میں دین اور اخلاق کے بارے میں ثابت بن قیس میں کوئی عیب نہیں پاتی، لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری، انکار) کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس سے اپنا باغ لے لے اور مزید کچھ نہ لے (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے انتہائی شدید بغض رکھتی تھیں اور وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بطریق خلع تفریق کر دی۔ اسلام میں یہی پہلا خلع تھا۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اسلام میں سب سے پہلے جس نے خلع کیا وہ عبداللہ بن ابی کی بہن ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا سر اور اس کا سر کبھی جمع نہیں رہ سکتے۔ میں نے خیمے کی ایک طرف اٹھائی تو میں نے اسے ایک جماعت میں آتے دیکھا تو وہ ان تمام میں سب سے زیادہ سیاہ تھا، قد و قامت کے اعتبار سے ان سے چھوٹا تھا اور چہرے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قبیح تھا! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں زائد بھی دوں گی، تو آپ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، الخلع و کیف طلاق فیہ، جلد 2، صفحہ 794، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 4867-4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، المختلعة یأخذ ما أعطاها، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 2045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے مابین تفریق کر دی۔ یہ حدیث خلع میں اصل ہے اور جمہور فقہاء اسی پر عمل پیرا ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اہل علم سے اس کے بارے مسلسل سنتا رہا ہوں اور یہی امر ہے جس پر ہمارے نزدیک اجماع ہے اور وہ یہ کہ آدمی جب عورت کو کوئی ضرر اور تکلیف نہ دے اور اس کی طرف برائی کی نسبت بھی نہ کرے اور مرد کی جانب سے اسے ستایا بھی نہ جائے اور عورت اس سے جدائی اور علیحدگی پسند کرے تو آدمی کے لئے حلال ہے کہ وہ اس سے ہر وہ شے لے لے جو بطور فدیہ وہ اسے دے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کے بارے میں کہا اور اگر ناچاکی اور اختلاف مرد کی جانب سے ہو کہ وہ اسے تنگ کرتا ہو اور اسے اذیت اور ضرر پہنچاتا ہو تو وہ اسے وہ شے واپس لوٹا دے جو اس سے لی ہے۔

عقبہ بن ابی الصہباء نے کہا ہے: میں نے بکر بن عبداللہ مزنی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس کی عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے خلع لے لے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی شے لے۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے وہ کہاں گیا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ؟ انہوں نے کہا: یہ منسوخ ہو چکا ہے، میں نے کہا: ناسخ آیت کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: سورۃ النساء میں یہ آیت ہے: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (النساء) (1) (اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو اپنی بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے اور اپنے شاذ ہونے کی وجہ سے اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں سے ایک آیت دوسری کو ختم کرنے والی نہیں ہے کہ نسخ واقع ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ خِفْتُمْ الآیہ اس آیت کے ساتھ زائل اور ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دونوں کو جب یہ خوف اور اندیشہ ہو تو پھر خاوند وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (النساء: 20) میں داخل نہیں، کیونکہ یہ صرف مردوں کے لئے ہے اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ آیت محکم ہے (2) اور بکر کے قول کی کوئی حقیقت نہیں اگر عورت دینے کا ارادہ کرے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ اپنی زوجہ سے وہ کچھ لے لے جو اسے دے رکھا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے خلع کو شقاق اور ضرر کی حالت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ کہ خلع میں یہ شرط ہے اور یہ نظریہ اس روایت سے مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے جو ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے اسے مارا اور کندھے کے کنارے کی باریک ہڈی توڑ دی، چنانچہ صبح کے وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور شکایت پیش کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ''تو اس سے کچھ مال لے لے اور اسے فارغ کر دے۔''

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 566، دار احیاء التراث العربیۃ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173

انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ اس سے صلح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ حضرت ثابت نے کہا: میں اسے دو باغ دیتا ہوں اور دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو وہ دونوں لے لے اور اسے جدا کر دے۔'' چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے وہ دونوں لے لئے اور اسے فارغ کر دیا (1)۔ اور جس موقف پر جمہور فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ ضرر اور تکلیف کی شکایت کیے بغیر خلع جائز ہے۔

جیسا کہ اس پر حدیث بخاری وغیرہ دلالت کرتی ہے (2) اور رہی آیت تو اس میں کوئی حجت موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرط کے انداز میں اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ خلع کے احوال میں اس کا غالب امکان ہے۔ پس یہ قول غالب کے بارے ہے اور وہ ارشاد جو عذر کو ختم کرتا ہے اور علم کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ۝ (النساء) (پس اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔)

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ خلع اس سے زیادہ مال کے عوض بھی جائز ہے جو آدمی نے عورت کو دے رکھا ہو (3)۔ تحقیق علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ سو امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ عورت آدمی کو بطور فدیہ اتنا مال دے جس پر دونوں راضی ہوں، چاہے وہ اس سے کم یا زیادہ ہو جو مرد نے عورت کو دے رکھا ہے اور یہ حضرت عثمان بن عفان، ابن عمر رضی اللہ عنہم اور قبیصہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور قبیصہ نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مکارم اخلاق میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اہل علم میں سے کسی کو دیکھا کہ وہ اسے مکروہ جانتا ہو اور دار قطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی اس نے اس کے ساتھ ایک باغ کے عوض شادی کی تھی، تو ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی تو وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیش ہو گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کا باغ اسے واپس کر دے اور وہ تجھے طلاق دے دے گا۔''؟ (کیا تجھے قبول ہے) اس نے عرض کی: جی ہاں اور میں اسے زائد بھی دوں گی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے اور اسے زائد بھی دے۔'' (4)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''اور اگر اس نے چاہا تو میں اسے زیادہ دوں گی اور آپ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔''

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الخلع، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 565، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 254، دار المحاسن قاہرہ

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس سے اس مال سے زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت طاؤس، حضرت عطا اور حضرت اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: قضاۃ اس کے مال لینے کی اجازت نہیں دیتے مگر اتنا جو اس نے اسے دیا ہوا ہو۔ یہی قول امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے کہ ابوالزبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں زینب بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھی۔ اور انہوں نے بطور مہر ایک باغ اسے دیا تھا۔ پھر اس نے انہیں ناپسند کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زیادہ تو نہیں البتہ اس کا باغ واپس کر دے۔'' تو اس نے عرض کی! جی ہاں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے وہ باغ لے لیا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی اسے فارغ کر دیا) اور جب یہ خبر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ قبول ہے (1)۔ اسے ابوالزبیر نے کئی ایک سے سنا ہے اور دارقطنی نے اسے بیان کیا ہے اور حضرت عطا سے مرسل روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی خلع لینے والی عورت سے اس سے زیادہ مال نہیں لے گا جتنا اس نے اسے دیا ہوا ہے۔'' (2)

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام مالک کے نزدیک خلع جائز ہے ایسے پھل کے عوض جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہو، بدکنے والے اونٹ کے عوض، بھاگ جانے والے غلام کے عوض، جنین کے عوض جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہو یا اسی طرح کی اور چیزیں جن کی ہلاکت کا امکان ہو، بخلاف بیوع اور نکاح کے اور اس کے لئے ان تمام کا مطالبہ جائز ہے پس اگر وہ اس کے حوالے ہو گئی تو وہ اس کی ہو جائے گی اور اگر اس کے حوالے نہ ہوئی تو پھر اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی اور طلاق اس کے حکم پر نافذ ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا ہے: خلع جائز ہوگا اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔ اسے ابن خویز منداد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ وہ عقود جن میں معاوضہ ہوتا ہے جب وہ بدل فاسد کو متضمن ہوں اور وہ ضائع ہو جائے تو ان میں بدل کی مثل واجب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (لہٰذا مہر مثل لوٹایا جائے گا۔)

اور ابوثور نے کہا ہے: خلع باطل ہے، اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خلع جائز ہے اور اس کے لئے وہ ہوگا جو لونڈی کے پیٹ میں ہے اور اگر اس میں بچہ نہ ہو تو اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی۔

اور ''المبسوط'' میں ابن قاسم سے منقول ہے: خلع جائز ہوتا ہے اس پھل کے عوض جو اس کے درخت اس سال دیں گے اور ان کے عوض جو بچے اس کا ریوڑ اس سال دے گا، اس سے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابن القاسم کے موقف کی دلیل اس ارشاد کا عموم ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

اور قیاس کی جہت سے یہ کہ یہ ان میں سے ہیں جن کا وہ ہبہ اور وصیت کے ساتھ مالک بن جاتا ہے تو پھر جائز ہے کہ یہ معلوم کی طرح خلع میں بھی عوض ہوں اور یہ بھی کہ خلع طلاق ہے اور طلاق اصلاً بغیر عوض کے صحیح ہوتی ہے تو جب بغیر کسی شے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ 2۔ ایضاً

کے عوض کے یہ صحیح ہے تو پھر فاسد عوض کے ساتھ اس کا صحیح ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ مبذول کی سب سے بری حالت یہی ہے کہ وہ مسکوت عنہ کی طرح ہو اور جب وہ نکاح جو عقد تحلیل ہے فاسد عوض اسے فاسد نہیں کرتا تو یہ اس طلاق کو کیونکر فاسد کر سکتا ہے جو عقد کو زائل کرنے والی اور اسے کھولنے والی ہے (یعنی بدرجہ اولیٰ عوض فاسد اسے فاسد نہیں کرے گا۔)

**مسئلہ نمبر 8۔** اگر کسی عورت نے اس کے عوض آدمی سے خلع کیا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کو دو سال تک دودھ پلائے گی تو یہ جائز ہے۔ خلع کی صورت میں دو سال کے بعد مدت معلومہ تک اس کا نفقہ بیٹے پر ہوگا اس کے بارے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ جائز ہے اور یہ مخزومی کا قول ہے اور اسے سحنون نے اختیار کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ جائز نہیں اسے ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور اگر خاوند نے اس کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے اور زوجہ سے اسے اتار دیا جائے گا (1) (یعنی اس پر اسے لازم نہیں کیا جائے گا)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے بدکنے والے اونٹ، بھاگ جانے والے غلام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کے ضائع ہونے کا امکان ہے کہ عوض خلع کو جائز قرار دیا ہے ان کے ذمہ پر لازم ہے کہ وہ اسے بھی جائز قرار دیں۔ ان کے علاوہ قرومین نے کہا: امام مالک نے اس نفقہ کے عوض خلع سے منع نہیں کیا جو دو سال سے زائد ہو غرر کی وجہ سے۔ بلکہ اس سے منع کیا ہے کیونکہ یہ وہ حق ہے جو ہر حال میں باپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پس اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور اس میں اور دو سال کے نفقہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ نفقہ اور یہ دودھ پلانا زوجیت کی حالت میں ماں پر واجب ہوتا ہے اور طلاق کے بعد بھی جب باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو جائز ہے کہ وہ نفقہ ماں کی طرف منتقل ہو جائے، کیونکہ یہی اس کا محل ہے۔ اور امام مالک نے اس پر المبسوط میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ: ۲۳۳) (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتا ہے۔)

**مسئلہ نمبر 9۔** اگر بیٹے کے نفقہ کے عوض وجہ مباح پر خلع واقع ہو اور مدت مکمل ہونے سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو کیا بقیہ نفقہ کے لئے خاوند اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے؟ تو ابن المواز نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی شے کے لئے عورت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اور ابو الفرج نے آپ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو خلع کے عوض اس کے لئے عورت کے ذمہ ثابت ہے اور وہ بچے کی موت سے ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر وہ اس سے خلع کرے ایسے مال کے عوض جو عورت کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو۔ اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ایسے مال کی شرط نہیں لگائی جو اسے خوشحال بنا دے گا، بلکہ اس نے اپنے بچے کی مشقت کی کفایت کرنے کی شرط لگائی ہے اور جب بچہ فوت ہو گیا تو اب اس کے لئے عورت کی طرف کسی شے کے لئے رجوع نہیں ہوگا جیسا کہ اگر کوئی آدمی ایک سال تک کسی بچے پر استحساناً اور تطوعاً خرچ کرنے کی ذمہ داری لے اور بچہ فوت ہو جائے تو اس پر کسی شے کے لئے رجوع نہیں کیا

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ماجاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 27، السعادۃ بجوار محافظہ مصر

جائے گا کیونکہ اس نے اپنے تطوع سے بچے کی مشقت برداشت کرنے کا قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے کہا ہے: میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے جو اس طرح کی صورت میں رجوع کرتا ہو اور اگر وہ اس کا پیچھا کرے تو بھی اس بارے اس کے لئے آپ کا ایک قول ہے۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر عورت فوت ہوگئی تو بچے کا نفقہ اس کے مال میں ہوگا کیونکہ یہ وہ حق ہے جو اس کی موت سے پہلے اس میں ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا وہ اس کی موت کے ساتھ ساقط نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جس کسی نے خلع کی صورت میں اپنی عورت پر اس کے حمل کے نفقہ کی شرط لگائی اور عورت کے پاس کوئی شے نہ ہو تو نفقہ اس آدمی پر ہوگا کیونکہ عورت کے پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ خرچ کر سکے اور اگر وہ اس کے بعد خوشحال ہو جائے تو آدمی اس مال کے لئے اس کی طرف رجوع کر لے جو اس نے خرچ کیا اور وہ اس سے لے لے۔

امام مالک نے کہا: حق یہ ہے کہ آدمی کو اس کے اپنے بچے کے نفقہ کا مکلف اور پابند بنایا جائے اگرچہ اس نے بچے کی ماں پر اس کے نفقہ کی شرط لگائی ہو بشرطیکہ ماں کے پاس ایسا مال نہ ہو جو وہ اس پر خرچ کر سکے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ خلع کے بارے میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ طلاق ہے یا فسخ نکاح ہے؟ پس حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع طلاق ہے(1) اور یہی امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے۔ پس جس نے خلع سے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ اسے لازم ہو جائیں گی اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: اگر خاوند نے تین طلاقوں کی نیت کی تو وہ تین ہی ہوں گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو وہ ایک طلاق بائنہ ہوگی ( کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے )۔

اور امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے: اگر اس نے خلع سے طلاق کی نیت کی اور اس کا نام بھی لیا تو وہ طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی اور نہ اس کا نام لیا تو فرقت واقع نہ ہوگی، آپ نے قدیم قول میں یہی کہا ہے اور آپ کا پہلا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ مزنی نے کہا ہے: وہی ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب وہ طلاق کا نام نہ لے تو خلع فقط فرقت ہوگی اور طلاق نہیں ہوگی اور اس نے طلاق کا نام لیا تو وہ طلاق ہوگی اور زوج رجعت کا زیادہ مالک ہوگا جب تک وہ عدت میں رہی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ خلع فسخ ہے، طلاق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس کی نیت کرے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت اسحاق اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن عیینہ نے عمرو سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر بیوی نے اس سے خلع لے لیا کیا وہ اس

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 18، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

سے شادی کر سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں چاہیے کہ وہ اس سے نکاح کر لے، خلع طلاق نہیں ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کی ابتدا میں اور اس کے آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع کا ذکر ان کے درمیان میں ہے، پس خلع کوئی شے نہیں ہے۔ پھر کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، پھر پڑھا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اگر خلع طلاق ہو تو پھر دو طلاقوں کے ذکر کے بعد یہ تیسری ہو گی اور اس کے بعد فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق پر دال ہوگا، پس تحریم چار طلاقوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گی۔

انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں خلع لیے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا یا اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض کے ساتھ عدت گزارے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ربیع کی حدیث صحیح ہے کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے (3)۔ انہوں نے کہا: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع فسخ ہے نہ کہ طلاق اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور اگر یہ (خلع لینے والی) عورت مطلقہ ہوتی تو اس کے لئے ایک حیض پر اقتصار نہ کیا جاتا (کیونکہ عدت تو تین حیض ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر اس نے اس سے خلع کر لیا، پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے لئے صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اگرچہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے دو طلاقوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور خلع لغو ہے۔

اور جنہوں نے خلع کو طلاق بنایا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کے لئے اس عورت کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے شادی کر لے، کیونکہ خلع کے ساتھ تین طلاقیں مکمل ہو گئی ہیں اور یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: اس آدمی کے بارے میں قول کیسے جائز ہو سکتا ہے جسے اس کی بیوی نے کہا: تو مجھے مال کے عوض طلاق دے دے، پس اس نے اسے طلاق دے دی، کہ یہ طلاق نہیں ہو گی اور اگر اس نے بغیر کسی شے کے عورت کا معاملہ اس کے ہاتھ دے دیا اور اس نے اپنے آپ کو طلاق دے دی تو وہ طلاق ہو گی۔ (فرمایا) رہا قول باری تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ تو یہ اس قول پر معطوف ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کیونکہ اس کا ارشاد: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ بلاشبہ یہ مراد بہ ہے یا تطلیق ہے اور اگر خلع کا عطف دو طلاقوں پر کیا جائے تو پھر خلع اصلاً جائز ہی نہ ہو گا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب الخلع ہل ہو فسخ او طلاق، جلد 7، صفحہ 316، دار الفکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم اسلام آباد۔ ابوداؤد، باب الخلع، حدیث نمبر 1902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

مگر دو طلاقوں کے بعد اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور کسی اور نے کہا ہے: آیت میں جو تاویل انہوں نے کی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نے دو طلاقوں کے حکم کا فائدہ دیا ہے جب وہ ان دونوں کو خلع کی وجہ کے سوا پر واقع کرے۔ اور ان دونوں کے ساتھ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ کے سبب رجعت بھی ثابت ہوگی۔ پھر ان دونوں کا حکم ذکر کیا جب یہ علی وجہ الخلع ہوں۔ پس خلع ان دو کی طرف لوٹ آئے گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کیونکہ اس سے مقصود طلاق مطلق اور طلاق بالعوض کا بیان ہے اور تیسری طلاق چاہے بالعوض ہو یا بغیر عوض کے ہو بلاشبہ وہ حلت کو ختم کر دیتی ہے مگر زوج ثانی کے بعد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جواب تو آیت کا ہے اور رہی حدیث! تو ابوداؤد نے کہا ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حیض کے بیان میں ذکر کی۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے معمر بن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے اور قعنبی نے مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی مثل ہے (1)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: ہمارے نزدیک عمل اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم اور دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حیض کے بارے میں حدیث اپنی غرابت کے باوجود جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور مرسل ہونے کے باوجود جیسا کہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی (2)، اسے دارقطنی نے معمر عن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ یہاں معمر سے ڈیڑھ حیض روایت کرنے والا وہی راوی ہے جو ان سے ایک حیض روایت کرتا ہے اور وہ ہشام بن یوسف ابو عبدالرحمٰن الصنعانی الیمانی ہے۔ اکیلے امام بخاری نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ پس سند اور متن کے اعتبار سے حدیث مضطرب ہے، پس اس سے اس بارے میں استدلال کرنا ساقط ہو گیا کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس بارے میں بھی کہ مطلقہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہر مطلقہ مدخول بہا کے بارے میں نص باقی رہا۔ سوائے ان کے جنہیں اس سے خاص کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب نے کہا ہے: خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے (3)، اسحاق نے کہا ہے: اگر کوئی جانے والا اس طرف جائے تو وہ مذہب قوی ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اس کی عدت ایک حیض ہے اور یہی ابان

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بن عثمان اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح ہے اور حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی طرح ہے (1) اور یہ قول صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ امام مالک کا قول اس کے بارے میں مختلف ہے جس نے بلاعوض خلع واقع کرنے کا قصد کیا۔ پس عبدالوہاب نے کہا ہے: امام مالک کے نزدیک وہ خلع ہے اور طلاق بائن ہے اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق بائن نہ ہو گی مگر عوض پائے جانے کے ساتھ۔ اشہب اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ یہ طلاق عوض اور استیفاء عدد سے خالی ہے پس یہ رجعی ہو گی جیسا کہ اگر یہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: میرے نزدیک اور دیگر اہل علم کے نزدیک نظر و فکر کے اعتبار سے آپ کے دو قولوں میں سے یہ زیادہ صحیح ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ خلع میں عوض کا حاصل نہ ہونا اسے اپنے مقتضا سے نہیں نکالتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ شراب یا خنزیر کے عوض خلع کرے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ خلع کرنے والی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی کل شے کے عوض خلع کرتی ہے۔ اور مفتدیہ فدیہ دینے والی وہ ہوتی ہے جو بعض مال بطور فدیہ دیتی ہے اور بعض لے لیتی ہے اور مبارئۃ مبارات کرنے والی وہ ہوتی ہے جو دخول سے پہلے ہی اپنے خاوند سے جدائی اختیار کر لے۔ پس وہ کہتی ہے: قد ابرأتك فبارئني (میں نے تجھے جدا کیا پس تو مجھے جدا کر دے۔) یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور عیسیٰ بن دینار نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: مبارئۃ وہ عورت ہے جو نہ کوئی شے لیتی ہے اور نہ کچھ دیتی ہے (2) اور مختلعہ (خلع کرنے والی) وہ ہے جو وہ مال بھی دے دیتی ہے جو خاوند نے اسے دیا ہو اور اپنے مال سے اس میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ اور مفتدیہ وہ ہے جو اس مال کے بعض سے فدیہ دیتی ہے جو مرد نے اسے دیا ہو اور بعض اپنے پاس روک لیتی ہے اور یہ سب دخول سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد بھی۔ پس جو دخول سے پہلے ہو اس میں عدت نہیں ہے۔ اور مصالحہ (صلح کرنے والی) مبارئۃ کی مثل ہے۔

قاضی ابو محمد وغیرہ نے کہا ہے: یہ چاروں الفاظ ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتے ہیں (3) اگرچہ ایقاع کے اعتبار سے ان کی صفات مختلف ہیں۔ اور یہ طلاق بائنہ ہے چاہے وہ اس کا نام لے یا نام نہ لے، مرد کے لئے عدت کے دوران رجعت کا حق نہیں ہو گا اور اسے عدت میں اور اس کے بعد ولی کی رضامندی اور مہر کے ساتھ زوج ثانی سے پہلے اور بعد نکاح کا حق حاصل ہو گا، بخلاف ابوثور کے، کیونکہ عورت نے جب عوض ادا کر دیا تو وہ اپنے نفس کی مالک ہو جائے گی اور اگر طلاق خلع رجعی ہو تو

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخدم، جلد 5، صفحہ 14، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیۃ بیروت

پھر وہ اپنے نفس کی مالک تو نہ ہوئی: پس خاوند کے لئے عوض اور معوض عنہ دونوں جمع ہو جائیں گے (اور یہ صحیح نہیں ہے۔)

**مسئلہ نمبر 14**۔ اور یہ عقد مطلق کے ساتھ نافذ ہے: پس اگر عورت نے مرد کے لئے عوض خرچ کر دیا اور اس نے رجعت کی شرط لگالی، تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ ابن وہب نے دونوں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کا ثبوت ہے اور سحنون نے بھی اسی طرح کہا ہے اور دوسری میں اس کی نفی ہے۔ سحنون نے کہا ہے: پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں (مرد و عورت) اس پر متفق ہو گئے کہ عوض اس کے مقابلے میں ہوگا جو عدد طلاق میں سے ساقط ہو رہا ہے اور یہ جائز ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عقد میں شرط ایسی قائم کی ہے جو مقصود کے مانع ہے، پس وہ ثابت نہ ہوگی، جیسا کہ اگر وہ عقد نکاح میں شرط رکھ لے کہ میں اس سے وطی نہ کروں گا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ قولہ تعالیٰ: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ جب اللہ تعالیٰ نے نکاح اور فراق کے احکام بیان کیے تو فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں روزے کی تحریمات کا ذکر کیا اور فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں سو تم ان کے قریب نہ جاؤ) اور حدود کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک وہ حدود الامر ہیں جن کی پیروی لازم ہے اور دوسری حدود النہی ہیں جن سے اجتناب لازم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا: وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔)

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

"(دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ احناف میں سے بعض مشائخ خراسان نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ خلع والی عورت کو طلاق لاحق ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: ایسی طلاق جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صریح طلاق کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فا حرف تعقیب ہے (1)۔ اور یہ بعید ہے کہ اسے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ درمیان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت

میں ایسا کلام ہے جو فَاِنْ طَلَّقَهَا کی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ پر بنا کرنے کے مانع ہے۔ بلکہ اقرب یہی ہے کہ اس کا رجوع اس پر ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے جیسا کہ استثنا (ان شاء اللہ تعالیٰ) میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی طرف راجع نہیں ہوگا جو اس سے متقدم ہے مگر دلالت کے ساتھ (یعنی جب کوئی قرینہ دال ہو تو پھر متقدم کی طرف راجع ہوسکتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (النساء: ۲۳) (اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔)

پس یہ اسی پر مقصور ہوگی جو اس کے متصل بعد ہے اور اس کی طرف عائد نہیں جو اس پر متقدم ہے یہاں تک کہ عورتوں کی ماؤں کے بارے میں دخول کی شرط نہیں ہوگی۔

علماء کا خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے اختلاف ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب آدمی نے اپنی بیوی سے خلع کر لیا پھر اسے طلاق دے دی اور وہ عورت ابھی عدت میں تھی تو جب تک وہ عدت میں ہے اسے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، شریح، طاؤس، نخعی، زہری، حکم، حماد، ثوری، اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسے طلاق لازم نہ ہوگی اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت جابر بن زید، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر عورت نے اس شرط پر اسے طلاق کا فدیہ دیا کہ وہ اسے مسلسل تین طلاقیں ترتیب کے ساتھ دے گا پھر جس وقت اس نے اسے طلاق دی تو وہ اس پر ثابت ہوگئی اور اگر اس کے درمیان خاموشی ہو تو جو طلاق خاموشی اور وقفے کے بعد ہوگی وہ کوئی شے نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسق الکلام کا معنی ہے کہ وہ بعض بعض کے ساتھ متصل ہو اور یہ اس کے لئے ایک حکم ثابت کرتا ہے اسی طرح جب استثناء قسم کے متصل بعد ہو تو اس کے لئے استثنا کا حکم ثابت ہو جاتا ہے اور جب اس سے منفصل ہو تو پھر اس کا متقدم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاِنْ طَلَّقَهَا سے مراد تیسری طلاق ہے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے (کیا) نکاح کافی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کہ کیا شے تحلیل کو مباح کرتی ہے۔ پس حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ موافقت رکھنے والوں نے کہا ہے: صرف عقد نکاح ہی کافی ہے۔ اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: صرف وطی کافی نہیں ہے یہاں تک کہ انزال ہو جائے۔

جمہور علماء اور تمام فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اس میں وطی کافی ہے اور اس سے مراد شرمگاہوں کا اس طرح ملنا ہے جو حد اور غسل کو واجب کر دے۔ روزے اور حج کو فاسد کر دے اور زوجین کو محصن بنا دے اور کامل مہر لازم کر دے۔

ابن عربی نے کہا ہے: فقہ میں میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ نہیں آیا جو اس سے زیادہ مشکل ہو اور وہ یہ کہ اصول فقہ میں سے ہے کہ کیا حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے یا اواخر اسماء سے؟ سو اگر ہم کہیں کہ حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم

ہے کہ ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کے مطابق کہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ حکم اواخر اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم حشفہ کو فرج میں غائب کرنے کے ساتھ انزال کی شرط بھی لگائیں، کیونکہ یہی ذوق عسیلہ کا آخر ہے (1) جیسا کہ حسن نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ذوق عسیلہ کا معنی وطی کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب کے سوا علماء کی جماعت کا یہی موقف ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پس لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوسرا اس سے مجامعت کر لے اور میں یہ کہتا ہوں جب دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح صحیح کر لیا کہ وہ اس سے اس کے حلالہ کا ارادہ نہ کرے تو پھر کوئی حرج نہیں کہ زوج اول اس سے نکاح کر لے۔ اور یہ قول ہے جس کے بارے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے آپ کے ساتھ موافقت کی ہو سوائے خوارج کی ایک جماعت کے اور اس کے ماسوا کے بارے میں سنت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید بن مسیب کے قول کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ اسے نحاس نے کتاب ''معانی القرآن'' میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے، کیونکہ فرمایا: زَوْجًا غَيْرَهٗ حالانکہ زوجیت مقدم ہے پس نکاح جماع کے معنی میں ہوگا۔ مگر سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ یہاں لفظ نکاح نکاح صحیح کے معنی میں ہے جب اس نے اسے حلالہ کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔

میں (مفسر) نے کہا ہے: میں ان دونوں کے بارے یہ گمان کرتا ہوں کہ حدیث عسیلہ ان تک نہیں پہنچی یا وہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پس انہوں نے ظاہر قرآن کو لے لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ واللہ اعلم۔

ائمہ کرام نے روایت کیا اور الفاظ دارقطنی کے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور خاوند سے شادی کر لے اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا شہد چکھ لے۔'' (2)

بعض علمائے احناف نے کہا ہے: جو کوئی حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق عقد نکاح کر لے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اسے فسخ کر دے اور اس میں آپ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ علماء کے اجماع سے خارج ہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اور وہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے سمجھا جاتا ہے: حتی یذوق کل واحد منهما عسيلة صاحبه (3) کہ وہ دونوں جماع کی لذت پانے میں برابر ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس بارے میں دو قولوں میں سے ایک کے لئے حجت ہے کہ اگر اس نے اس سے وطی کی درآنحالیکہ وہ سوئی پڑی ہو یا اس پر غشی طاری ہو تو وہ طلاق دینے والے (زوج اول) کے لئے حلال نہ ہوگی، کیونکہ اس نے شہد نہیں چکھا جب اسے اس کا ادراک نہ ہوا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام نسائی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بال گودنے والی اور گودوانے والی، دوسرے کے بال اپنے بالوں میں لگانے والی اور بال لگوانے والی، سود کھانے والے اور

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دارالفکر بیروت

2۔ دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 32، دارالمحاسن قاہرہ

3۔ ایضاً

کھلانے والے، حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے ان تمام پر لعنت کی ہے۔(1)

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے پر لعنت کی ہے(2)۔ اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ حدیث حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اسناد سے مروی ہے اور اہل علم کے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جن کا اس پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

اور تابعین میں سے فقہاء کا بھی یہی قول ہے اور اسی طرح سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم بھی کہتے ہیں اور میں نے جارود سے سنا ہے وہ وکیع سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور فرمایا: چاہئے کہ اس باب کے بارے میں اصحاب رائے کا قول بیان کیا جائے اور حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے تاکہ وہ اسے (پہلے خاوند کے لئے) حلال کر دے پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسے روک لے تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ نیا نکاح کرے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ حلالہ نکالنے والے کے نکاح میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک نے کہا ہے: حلالہ نکالنے والا اپنے نکاح پر قائم نہیں رہے گا یہاں تک کہ وہ نکاح جدید کرلے، پس اگر اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا اور اس کی مجامعت اسے زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ برابر ہے دونوں کو علم ہو یا علم نہ ہو جب اس نے حلالہ کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔ اور نہ وہ اپنے نکاح پر برقرار رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امام ثوری اور اوزاعی نے بھی کہا ہے اور اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جو نکاح خیار اور محلل کے بارے میں امام ثوری سے مروی ہے کہ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے اور اس میں اور نکاح متعہ کے بارے میں ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح محلل کے بارے میں مروی ہے: کتنا برا ہے جو اس نے کیا ہے اور نکاح جائز ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: نکاح جائز ہے اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا اور اس کے لئے اسے اپنے پاس روک لینا جائز ہے اگر وہ چاہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ عورت زوج اول کے لئے حلال نہیں ہوگی اگر اس نے اس کے ساتھ حلالہ کی غرض سے شادی کی اور ایک بار انہوں نے کہا: اس نکاح کے ساتھ وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی بشرطیکہ زوج ثانی اس کے ساتھ مجامعت کرے اور اسے طلاق دے دے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کہ اس زوج (مراد زوج ثانی) کا نکاح صحیح ہے اور یہ کہ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر قائم رہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 101، وزارت تعلیم۔ ایضاً، مسند امام احمد، حدیث نمبر 4283

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً، باب ماجاء فی المحل الخ، حدیث نمبر 1038-1039۔ ابوداؤد، باب فی التحلیل، حدیث نمبر 1778، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المحلل والمحلل لہ، حدیث نمبر 1923-1924-1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی نے یہ کہا کہ میں تیرے ساتھ شادی کرنے لگا ہوں تا کہ میں تجھے (زوج اول کے لئے) حلال کر دوں پھر اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں، تو یہ نکاح متعہ کی قسم ہے اور یہ فاسد ہے، وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا اور اگر اس نے اس نکاح پر وطی کی تو وہ (زوج اول کے لئے) حلال نہ ہوگی اور اگر زوج ثانی نے اس کے ساتھ مطلقاً نکاح کیا نہ اس نے کوئی شرط لگائی اور نہ ہی اس پر حلالہ کی شرط لگائی گئی تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کی قدیم کتاب میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور ان کی جدید مصری کتاب میں ان کا قول مختلف نہیں کہ نکاح صحیح ہوگا جب اس نے کوئی شرط نہ لگائی اور یہی داؤد کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الماوردی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اگر حلالہ کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی تو نکاح صحیح ہوگا اور وہ اسے زوج اول کے لئے حلال کر دے گا۔ اور اگر دونوں نے عقد کے دوران حلالہ کی شرط لگائی تو نکاح باطل ہوگا اور وہ اسے پہلے کے لئے حلال نہیں کرے گا۔ فرمایا: یہی امام شافعی کا قول ہے اور حسن اور ابراہیم نے کہا ہے: جب تین میں سے کسی ایک نے حلالے کا قصد کیا تو نکاح فاسد ہوگا اور یہ بہت شدت اور سختی ہے اور سالم اور قاسم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ حلالہ کی غرض سے شادی کرے بشرطیکہ زوجین کو اس کا علم نہ ہو (1) اور وہ ماجور ہوگا۔ اسی طرح ربیعہ اور یحییٰ بن سعید نے کہا ہے اور داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے بشرطیکہ عقد کرتے وقت اس کی شرط کا اظہار نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے علماء کے نزدیک حلالہ کے لئے نکاح کے جائز ہونے کا دارومدار نکاح کرنے والے زوج پر ہے۔ خواہ اس کی شرط لگائی جائے یا وہ اس کی نیت کرے اور جب اس میں سے کوئی شے ہوگی تو اس کا نکاح فاسد ہوگا اور وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اس کی وطی اس عورت کو زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ اور طلاق دینے والے خاوند کا اس بارے میں جاننا اور نہ جاننا برابر ہے اور کہا گیا ہے: بے شک اسے چاہئے کہ جب اسے علم ہو کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے والے نے اس لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے تو وہ اس کے رجوع سے احتیاط برتے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے حلال نہیں کرے گا مگر وہ نکاح جو رغبت کے ساتھ ہو اور اسے عورت کی حاجت اور ضرورت ہو اور اس سے حلالہ کا قصد نہ کیا جائے اور اس کا عورت کے ساتھ وطی کرنا مباح ہو (یعنی) نہ وہ روزے دار ہو، نہ حالت احرام میں ہو اور نہ ہی حیض کی حالت میں ہو اور زوج بالغ مسلمان ہو۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: جب زوج ثانی نکاح صحیح کے ساتھ اس سے وطی کرے اور اس کی فرج میں حشفہ غائب کر دے تو تحقیق دونوں نے شہد چکھ لیا اور اس میں نکاح کرنے والے کا قوی اور ضعیف ہونا برابر ہے اور برابر ہے کہ وہ اسے داخل کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ یا عورت کے ہاتھ کے ساتھ اور وہ بچہ ہو یا مراہق (قریب البلوغ) ہو یا مجبوب (مقطوع الذکر) ہو اس کا اتنا حصہ باقی ہو جسے وہ غائب کر سکتا ہو جیسا کہ غیر خصی آدمی غائب کرتا ہے اور برابر ہے کہ خاوند اس سے وطی کرے اس حال

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

میں کہ وہ عورت احرام باندھے ہوئے ہو یا روزے دار ہو ے یہ سب کچھ اس بنا پر ہے جو امام شافعی نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح کا قول بھی ہے اور بعض اصحاب مالک کا قول بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن حبیب نے کہا ہے: اگر وہ اس سے شادی کرے پھر اگر وہ اسے پسند آ جائے تو وہ اسے روک لے گا ورنہ اسے حلال کرنے میں اس کے لئے اجر ہوگا تو یہ جائز نہیں۔ جب اس نے اپنے نکاح کو حلالہ کی نیت سے ملا دیا تو اب اس کے ساتھ وہ زوج اول کے لئے حلال نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ آقا کا اپنی اس لونڈی کے ساتھ وطی کرنا جس کا خاوند اسے قطعی طلاق دے دے اسے حلال نہیں کرتا، کیونکہ وہ زوج نہیں ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عبیدہ، مسروق، شعبی، ابراہیم، جابر بن زید، سلیمان بن یسار، حماد بن ابی سلیمان اور ابوالزناد رحمۃ اللہ علیہم کا بھی قول ہے اور اسی موقف پر فقہائے امصار کی جماعت بھی ہے۔

اور عثمان، زید بن ثابت اور زبیر سے اس کے خلاف بھی روایت ہے وہ یہ کہ وہ اسے حلال کر دے گا جب اس کے آقا نے اس کے ساتھ وطی کی اور وہ اس سے نہ دھوکہ دہی کا ارادہ کرے اور نہ ہی حلالہ کا اور وہ اپنے زوج کی طرف نکاح اور مہر کے ساتھ لوٹ جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور آقا اس پر ملک یمین کی حیثیت سے مسلط ہوا ہے اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہما سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنے غلام کی شادی اپنی ایک لونڈی سے کی، پھر غلام نے اسے طلاق البتہ (قطع کرنے والی طلاق) دی، پھر آقا نے وہ لونڈی اسی غلام کو ہبہ کر دی تو کیا وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال ہوگی؟ تو دونوں نے کہا: وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ حضرت امام مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے نکاح میں ایک مملوکہ لونڈی تھی پھر اس نے اسے خرید لیا درآنحالیکہ اس نے اسے ایک طلاق دے رکھی تھی۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ اس کے لئے ملک یمین کی حیثیت سے حلال ہوگی جب تک وہ اس کی طلاق کو مغلظہ نہ بنائے اور اگر اس نے اسے طلاق مغلظہ دی تو پھر وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: علماء کی جماعت اور ائمہ فتویٰ کا یہی موقف ہے، امام مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، ابوحنیفہ، احمد، اسحاق، ابوثور انہی میں سے ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا، طاؤس اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جب اس نے اسے خرید لیا جس نے اسے طلاق البتہ دی تو وہ اس کے لئے ملک یمین کے طور پر حلال ہوگی، اس لئے کہ یہ ارشاد عام ہے: او ما ملکت ایمانکم۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس قول میں خطا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او ما ملکت ایمانکم کا معنی ہے مائیں اور بہنیں مباح

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 504، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً

نہیں ہیں اور اسی طرح تمام محرمات بھی مباح نہیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب مسلمان نے اپنی ذمیہ بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر ایک ذمی نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول بھی کیا اور پھر اسے طلاق دے دی تو ایک گروہ نے کہا کہ وہ ذمی اس کے لئے زوج ہے، لہٰذا اب اس کے لئے زوج اوّل کی طرف لوٹنا جائز ہے۔ اسی طرح حسن، زہری، سفیان ثوری، شافعی، ابوعبید اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ** اور نصرانی بھی زوج ہے اور مالک اور ربیعہ نے کہا ہے: وہ اسے حلال نہیں کرسکتا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ نکاح فاسد تین طلاقوں والی عورت کو حلال نہیں کرسکتا۔ امام مالک، ثوری، امام شافعی، اوزاعی، اصحاب الرائے، امام احمد، اسحاق اور ابوعبید تمام یہ کہتے ہیں کہ وہ نکاح صحیح کے بغیر زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔ اور حکم کہتے ہیں کہ وہ زوج ہے اور ابن منذر نے کہا ہے: وہ زوج نہیں ہے کیونکہ ظہار، ایلاء اور لعان میں ازواج کے احکام ان دونوں کے درمیان ثابت نہیں ہیں اور اہل علم میں سے جن سے کچھ یاد رکھا جاسکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت نے جب زوج اوّل کو کہا: میں نے شادی کی ہے اور میرے خاوند نے مجھ سے دخول کیا ہے اور زوج اوّل نے اس کی تصدیق کردی تو وہ اس کے لئے حلال ہوجائے گی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہ کرے جب اس کے دل میں اس کے جھوٹا ہونے کا خیال واقع ہوجائے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس باب میں انتہائی شدت اور تغلیظ مروی ہے اور آپ کا ارشاد ہے: میرے پاس جو حلالہ نکالنے والا اور جس کے لئے حلالہ نکالا گیا لایا گیا تو میں یقیناً ان دونوں کو رجم کردوں گا (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حلالہ نکالنا تو زنا ہے وہ مسلسل زنا ہی کرتے رہیں گے اگرچہ وہ بیس برس تک بھی اس پر قائم رہیں۔

ابوعمر نے کہا ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول فقط تغلیظ کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ آپ سے یہ صحیح روایت ہے کہ آپ نے حرام فرج میں وطی کرنے والے سے حد کو اٹھا لیا درآنحالیکہ وہ اس کی تحریم سے جاہل تھا اور آپ نے جہالت کے سبب اسے معذور قرار دیا۔ پس اس بارے میں تاویل اولیٰ اور بہتر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس پر رجم نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝**

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا** اس میں مراد زوج ثانی ہے (یعنی اگر زوج ثانی اسے طلاق دے دے) **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ** اس میں **هما** تثنیہ ضمیر سے مراد عورت اور زوج اوّل ہے (تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں)۔ یہ حضرت ابن

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 211، دارالکتب العلمیہ

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (1)۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گزر جائے اور وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت کرے پھر اسے فارغ کر دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے، پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (یعنی زوج اوّل کو ازسرنو تین طلاقوں کا اختیار حاصل ہوگا)۔

اور ایسے آدمی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیتا ہے پھر وہ کسی دوسرے سے شادی کرتی ہے، پھر اس سے پہلے خاوند کی طرف لوٹ کر آتی ہے تو اس کے بارے ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (چاہے مابقی ایک ہو یا دو)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب نے کہا ہے: ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت عمران ابن حصین اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور اسی طرح حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور یہی قول حضرت عبیدہ السلمانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت مالک، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابو ثور، حضرت محمد بن حسن اور حضرت ابن نصر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نکاح بھی جدید ہے اور طلاق بھی جدید ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح حضرات عطا، نخعی، شریح، نعمان اور یعقوب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اور وکیع نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے اصحاب کہتے ہیں: کیا زوج ثانی تین طلاقوں کو تو گرا دیتا ہے اور وہ ایک اور دو طلاقوں کو نہیں گراتا فرمایا: ہمیں حفص نے حجاج سے، انہوں نے طلحہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کہا کرتے تھے: زوج ثانی ایک اور دو طلاقوں کو اسی طرح گرا دیتا ہے جیسے وہ تین طلاقوں کو گرا دیتا ہے سوائے عبیدہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: یہ عورت اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے ساتھ رہے گی (2)۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں قول اوّل کے مطابق کہتا ہوں۔

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے تو طلاق بھی جدید ہے اور نکاح بھی جدید ہے اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی مابقی طلاقوں پر ہوگی۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ یہ شرط ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر دونوں کو گمان

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ الکتاب المصنف لابن ابی شیبہ، باب من قال عندہا، جلد 4، صفحہ 113، مکتبۃ الزمان للثقافۃ والعلوم، المدینۃ المنورہ

ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کر سکے گا۔

اور کہا گیا ہے کہ حُدُوْدَ اللّٰهِ سے مراد اس کے فرائض ہیں، یعنی جب دونوں کو علم ہو کہ ان کے درمیان دوسرے نکاح کے سبب صلح اور بہتری ہوگی اور جب خاوند کو علم ہو کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ یا اس کے مہر یا اس کے وہ حقوق جو اس پر واجب ہیں ان میں سے کسی شے سے وہ عاجز ہے تو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے یہاں تک کہ وہ اسے واضح طور پر بتا دے یا وہ اپنے بارے میں عورت کے حقوق کی ادائیگی پر قدرت کے بارے جانتا ہو اور اسی طرح اگر اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو اسے استمتاع سے روکتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بیان کر دے تاکہ وہ اپنی جانب سے عورت کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے نسب کے بارے دھوکے میں مبتلا کرے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور اس کے پاس نہ مال ہو اور نہ ہی کوئی قابل ذکر کاروبار اور اس میں جھوٹ بولنے والا ہو۔ اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے کہ جب وہ اپنی ذات میں خاوند کے حقوق کی ادائیگی سے عجز کے بارے جانتی ہو یا اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو استمتاع سے مانع ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا فرج میں کوئی بیماری ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد کو دھوکے میں ڈالے اور اس پر لازم ہے کہ اسے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی وضاحت کر دے، جس طرح کہ بائع پر سامان کے بارے واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامان میں جو عیوب اور نقائص ہیں وہ انہیں بیان کر دے۔

اور جب زوجین میں سے کوئی اپنے شریک میں کوئی عیب پالے تو اس کے لئے اسے رد کر دینا جائز ہے، پس اگر عیب مرد کی جانب ہو تو عورت کے لئے کامل مہر ہوگا اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا ہو اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اگر عیب عورت کی جانب ہو تو خاوند اسے واپس لوٹا دے اور جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے لے لے اور تحقیق یہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی بیاضہ کی ایک عورت سے شادی کی تو آپ نے اس کے پہلو میں برص کا نشان پایا تو آپ نے اسے رد کر دیا اور فرمایا: ''تم نے مجھ پر اسے پوشیدہ رکھا ہے۔''

اور عنین کی بیوی کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس نے اپنا آپ مرد کے حوالے کر دیا پھر مرد کے عنین ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی گئی تو آپ نے ایک بار کہا: اس کے لئے مکمل مہر ہوگا اور ایک بار کہا: اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اس کا انحصار اس قول کے اختلاف پر ہے کہ وہ کس کے ساتھ مہر کی مستحق ہوگی کیا اپنے آپ کو مرد کے سپرد کرنے کے ساتھ یا دخول کے ساتھ؟ اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے کہ کیا عورت کے ذمہ خدمت کرنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: عورت پر خدمت کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عقد استمتاع (لطف اندوز ہونا) کو شامل ہے نہ کہ خدمت کو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ملک رقبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ تو فقط استمتاع پر عقد ہے اور عقد کے ذریعہ صرف استمتاع کا مستحق بنا جاتا ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور کا، لہٰذا اس سے زیادہ کا عورت سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ

سَبِيْلًا۔(النساء:34)۔

اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: اس پر اس کی حیثیت کے مطابق خدمت ہے، پس اگر وہ عورت شریفة المحل ہے اس کے والدین دولتمند اور خوشحال ہیں تو اس پر گھر کی تدبیر اور خادم کا معاملہ ہوگا اور اگر وہ متوسط الحال ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ بستر وغیرہ بچھائے اور اسی طرح کے دیگر کام۔ اور اگر وہ اس درجہ سے بھی کم ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ گھر میں جھاڑو دے اور کھانا وغیرہ پکائے اور کپڑے وغیرہ دھوئے۔ اور اگر وہ کرد اور دیلم کی عورتوں میں سے ہو اور ان کے علاقے میں پہاڑ ہوں تو وہ عورت بھی اس کام کی پابند ہوگی جس کی ان کی عورتیں پابند ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:228)

اور مسلمانوں کا عرف اور رواج ان کے شہروں میں قدیم وجدید دور سے اس کے بارے جاری ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کے صحابہ کرام کی بیویاں آٹا پیسنے، روٹیاں پکانے، ہانڈی تیار کرنے، بستر بچھانے، کھانا پیش کرنے اور اسی طرح کے دیگر کاموں کی پابند ہوتی تھیں اور ہم تو کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے اس سے انکار کیا ہو اور نہ ہی اس کا انکار کرنا جائز ہوتا ہے بلکہ وہ تو اپنی عورتوں کو سزا دیتے تھے جب وہ کاموں میں کوتاہی اور سستی کرتیں اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے اور اگر یہ لازم اور ضروری نہ ہوتی تو وہ ان سے اس کا مطالبہ نہ کرتے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وہ ہیں جن سے روکا گیا ہو اور حد فواحش کے ارتکاب کی جرأت کرنے سے مانع ہوتی ہے اور احدّت المرأۃ اس کا معنی ہے عورت زینت سے باز آگئی اور رَجُلٌ محدودٌ وہ آدمی جسے خیر سے روک دیا جائے اور البوّاب حدادٌ یعنی دربان روکنے والا ہے اور یہ مکمل بحث پہلے ہو چکی ہے۔

اور فرمایا: لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ کیونکہ جاہل جب اس کے لئے امر اور نہی زیادہ ہو جائیں تو وہ نہ اسے یاد رکھتا ہے اور نہ اس کی پاسداری کرتا ہے اور عالم اسے یاد بھی رکھتا ہے اور اس کی پاسداری بھی کرتا ہے پس اسی وجہ سے اس نے علماء کو خطاب کیا ہے اور جاہلوں کو خطاب نہیں کیا۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

"اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر اور نہ بنا لو اللہ کی آیتوں کو مذاق اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد

کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس میں بلغن کا معنی قاربن ہے (یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں) اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (1) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی میں مجاز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، امساک بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک امساک بالمعروف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں۔ اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، یحییٰ القطان اور عبد الرحمن ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن مسیب نے یہی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہی سنت ہے اور اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور اس پر صبر کرنا عورت کے ذمہ لازم ہو گا اور حاکم کے حکم کے مطابق نفقہ مرد کے ذمہ پڑے گا۔ یہ قول حضرت عطا اور زہری رضی اللہ عنہما کا ہے اور علماء کوفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (البقرہ:280) اور فرمایا: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ الآیہ (النور:32)۔

پس اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ فقر و افلاس کا سبب فرقت ہونا جائز نہیں اور اس کا اس کے باوجود نکاح کرنا مستحب ہے۔

اور یہ بھی کہ زوجین کے درمیان نکاح اجماع کے ساتھ منعقد ہوا ہے لہٰذا ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی مگر اس کی مثل اجماع کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی سنت کے ساتھ جس کے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اور پہلے قول کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو صحیح بخاری میں ہے: "عورت کہے گی یا مجھے کھانا مہیا کرا اور یا مجھے طلاق دے دے۔ (2)" اور یہ محل خلاف میں نص ہے اور ہمارے نزدیک تنگدستی کے سبب ہونے والی فرقت طلاق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ　　2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806، وزارت تعلیم

رجعی ہے، بخلاف امام شافعی کے کہ ان کا کہنا ہے: وہ طلاق بائنہ ہے کیونکہ یہ بنا کے بعد فرقت ہوئی ہے اس کے ساتھ طلاق کا عدد مکمل نہیں ہوا اور نہ یہ کسی عوض کے لئے اور نہ ہی اس کا سبب خاوند کی جانب سے ضرر ہے، پس یہ رجعیہ ہوگی۔ اس کی اصل مولی (ایلاء کرنے والا) کی طلاق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی یا تم انہیں طلاق دے دو، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا امام مالک نے ثور بن زید الدیلی سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسے اس کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے اپنے پاس روکنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس طرح اس پر عدت کو طویل کر دے اور اسے ضرر اور اذیت پہنچائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں نصیحت کر رہا ہے (1) اور زجاج نے کہا ہے: فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ، یعنی اس نے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کیا، کیونکہ اس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اسے کرنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لئے پیش کرنا ہی ہے۔ اور یہ خبر اس خبر کے موافق ہے جو طلاق اور رجوع کو ترک کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جس طریقہ پر اہل جاہلیت تھے، جیسا کہ اس کا بیان اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے تحت گزر چکا ہے۔ پس ان دونوں خبروں نے ہمیں یہ فائدہ دیا ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کا نزول قریب قریب ایک ہی معنی میں ہے اور وہ مرد کا عورت کو ضرر اور اذیت پہنچانے کے ارادہ سے اسے اپنے پاس روکنا اور اس کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق کے طریقہ پر نہ لو، کیونکہ یہ تمام کے تمام سنجیدہ ہیں۔ پس جس نے ان میں مذاق کیا تو یہ اسے لازم ہو جائیں گے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: دور جاہلیت میں ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور کہتا ہے: بلاشبہ میں نے طلاق دی ہے اور مذاق کر رہا ہوں اور وہ غلام کو آزاد کرتا اور کسی سے اپنا نکاح کرتا اور یہ کہتا: میں نے استہزا کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جس نے طلاق دی یا جس نے کسی کو آزاد کیا یا اپنا نکاح کیا یا کسی کا نکاح کیا اور پھر یہ گمان کیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تو وہ سنجیدہ شمار ہوگا (3)'' (یعنی یہ تمام احکام نافذ ہو جائیں گے) اسے معمر نے روایت کیا ہے کہا ہے: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے عمرو سے، انہوں نے حسن سے اور انہوں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے اور اسی کے معنی میں اسے ذکر کیا ہے اور موطا امام مالک میں ہے کہ ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو بار طلاق دی ہے، آپ میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے تیری جانب سے تین طلاقیں واقع ہوئیں اور ستانوے طلاقوں کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیت کے ساتھ استہزا کیا ہے (4)۔

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 576، دار احیاء التراث العربیۃ　　2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العربیۃ
3۔ مجمع الزوائد، باب فمن نکح او اعتق او طلق لاعبا، جلد 4، صفحہ 529، دار الفکر　　4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 510، وزارت تعلیم

اور دار قطنی نے اسماعیل بن امیہ القرشی کی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ اس نے طلاق البتہ دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: "تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو یا اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر اور مذاق کے طور پر لیتے ہو، جس نے طلاق البتہ دی ہم نے اس کے لئے تین طلاقیں لازم کر دیں اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے۔" اس میں راوی اسماعیل بن امیہ کوفی ہے اور ضعیف الحدیث ہے۔ (1)

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ آدمی جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر کہتا ہے: قسم بخدا! نہ میں تجھے وارث بناؤں گا اور نہ میں تجھے چھوڑوں گا۔" عورت نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو میں تیری طرف رجوع کرلوں گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (2): وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا الآیۃ۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: تمام اقوال آیت کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کرے اسے ہی کہا جائے گا: اتخذھا ھزوا۔ اس نے اسے مذاق کے ساتھ لیا ہے اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اس (آیت) کے ساتھ کفر کیا اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اسے پرے پھینک دیا اور اسے نہ لیا اور عمل اس کے خلاف کیا، سو اس بنا پر یہ تمام اقوال آیت میں داخل ہیں اور آیات اللہ سے مراد اس کے دلائل، اس کا امر اور اس کی نہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے مذاق کے طور پر طلاق دی تو وہ طلاق اسے واقع ہو جائے گی اور اس کے سوا میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تین کام ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجعت۔" (3)

اور حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ان تمام نے کہا: تین فعل ہیں جن میں کوئی مذاق اور استہزاء نہیں اور ان میں مذاق کرنے والا بھی سنجیدہ شمار ہوتا ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں۔ (4)

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک نہ کرو کہ تم کوتاہی کرنے والے اور مذاق کرنے والے ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں گناہ سے قولاً استغفار کرنا بھی داخل ہے جبکہ فعلاً اس پر اصرار ہو اور اسی طرح ہر وہ عمل جو اس معنی میں ہو پس اس کے بارے آگاہ رہ۔

---

1۔ دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 20، دار المحاسن قاہرہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی طلاق المعتوہ، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الطلاق علی الھزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب من طلق الخ، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 341، دار الفکر

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، یعنی اسلام اور احکام کے بیان (کے ساتھ تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اسے یاد کرو۔) وَالْحِكْمَةِ اس سے مراد سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں بیان اور وضاحت نہ ہو (1)۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

”اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے۔ یہ فرمان الٰہی (ہے) نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر، یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن ابو البداح کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دی اور اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی، پھر وہ نادم ہوا تو اسے پیغام نکاح بھیجا سو وہ راضی ہو گئی اور اس کے بھائی نے انکار کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور کہا: میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے اگر تو اس سے شادی کرے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت مقاتل نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معقل کو بلایا اور فرمایا: ”اگر تو مومن ہے تو اپنی بہن کو ابو البداح سے نہ روک۔“ تو معقل نے عرض کی: اٰمنت باللّٰہ اور بہن کی شادی اس سے کر دی (2)۔

اور امام بخاری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو اس کے خاوند نے طلاق دی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر اس نے اسے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت معقل نے انکار کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔

اور اسے دارقطنی نے بھی حسن سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے: میری ایک بہن تھی میرے پاس اس کے لئے پیغام نکاح آتے تھے اور میں اس سے لوگوں کو روکتا رہتا تھا، پھر میرے چچا کا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے اس کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا، پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں ایک ساتھ رہے پھر اس نے اسے طلاق رجعی دے دی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

2۔ ایضاً

گزر گئی، پھر اس نے دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دیا تو میں نے کہا: میں نے اس کے بارے لوگوں سے انکار کیا اور میں نے تیرے ساتھ اس کی شادی کر دی پھر تو نے اسے طلاق دی جس میں رجعت کا حق تھا پھر تو نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی اور جب میرے پاس پیغام نکاح آئے تو تو بھی دیگر خواہش رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میرے پاس نکاح کی خواہش لے کر آیا میں تیرے ساتھ کبھی شادی نہ کروں گا۔ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یا فرمایا: یہ آیت نازل کی گئی: وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔ پس میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اس کا نکاح اس سے کر دیا (1)۔

بخاری کی روایت میں ہے: پس حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے ابھی تک نفرت کی اور کہا: اس نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا تھا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کی خواہش کر رہا ہے۔ سو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی پھر حضرت معقل نے حمیت کو چھوڑ دیا اور الله تعالیٰ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی (2)۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ معقل بن سنان (یعنی نون کے ساتھ) ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں معقل بن یسار یا سنان سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ وہ معقل بن سنان ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہوتا کیونکہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن ثیبہ تھی۔ اگر ولی کے بغیر اختیار اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنی شادی کر لیتی اور وہ اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب اولیاء کو ہے اور شادی کے بارے میں اختیار انہیں کے پاس ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے ساتھ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب ازواج کو ہے اور وہ اس طرح کہ غیر کے نکاح سے روکتے ہوئے اس کا رجوع کر لینا عورت پر عدت کے طویل ہونے کے سبب اذیت ناک اور ضرر رساں ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عورت اپنی شادی خود کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ الله تعالیٰ نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اور ولی کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے جو کہ اس کے سبب نزول کے بارے ہم نے ذکر کیا ہے۔ والله اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس مقام پر بلوغ الاجل سے مراد انتہا کو پہنچنا ہے کیونکہ نکاح کی ابتدا کا تصور عدت گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے اور تَعْضُلُوْهُنَّ کا معنی ہے تحبسوهن (یعنی جب وہ اپنی عدت کی انتہا کو پہنچ جائیں تو تم انہیں نہ روکو۔)

اور خلیل نے بیان کیا ہے: دجاجۃ معقل جب مرغی اپنا انڈا روک لے (تب یہ کہا جاتا ہے)۔

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن
2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

اور کہا گیا ہے کہ العضل کا معنی التضییق والمنع ہے یعنی تنگ کرنا اور روکنا اور یہ حبس کے معنی کی طرف ہی راجع ہے۔ کہا جاتا ہے: اردت امرا فعضلتنی عنہ یعنی میں نے کام کا ارادہ کیا اور تو نے مجھے اس سے روک دیا اور مجھ پر اسے تنگ اور مشکل کر دیا۔ اور اعضل الامر کہا جاتا ہے جب تجھ پر کام کے ذرائع تنگ ہو جائیں۔ اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: انہ لعضلۃ من العضل جب وہ کام میں کسی قسم کے حیلہ اور ذریعہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

اور الازہری نے کہا ہے: عضل کی اصل ان کے اس قول سے ہے: عضلت الناقۃ (1) (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اونٹنی کا بچہ پھنس جائے اور اس کا نکلنا آسان نہ ہو اور عضلت الدجاجۃ، جب اس کا انڈا پھنس جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے معضلۃ ولا اباحسن یعنی مسئلہ مشکل ہے اور اس کے مخارج بہت تنگ ہیں اور حضرت طاؤس نے کہا ہے: تحقیق مشکل ترین فیصلے لائے گئے اور سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کوئی ان پر قائم نہ رہا۔ لقد وردت عُضَل اقضیۃ ما قام بھا الا ابن عباس اور عربوں کے نزدیک ہر مشکل معضل ہے اور اسی سے امام شافعی کا قول ہے:

اذا المعضِلاتُ تصدّیننی کشفتُ حقائقَھا بالنظر

جب مشکلات مجھے چیلنج کرتی ہیں تو میں ان کے حقائق کو نظر و فکر سے کھول دیتا ہوں

اور کہا جاتا ہے: اعضل الأمر جب معاملہ بہت سخت ہو جائے اور داء عُضال یعنی شدید بیماری جس کا درست ہونا مشکل ہے اور وہ طبیبوں کو تھکا دے اور عضل فلان ایمہ یعنی فلاں نے اپنی مطلقہ منع کیا۔ یعضُلُھا و یَعضِلُھا یعنی ضمہ اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ اس میں ذلکم نہیں کہا کیونکہ یہ جمع کے معنی پر محمول ہے اور اگر ذلکم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ مثلاً ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہارے لئے اس میں صلاح اور خیر نہیں ہے۔ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم اسے نہیں جانتے ہو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَي الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَي الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

”اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیۃ

مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے۔ تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کر لیں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو، پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔"

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْوَالِدٰتُ یہ مبتدا ہے۔ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ یہ محل خبر میں ہے۔ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ یہ ظرف زمان ہے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نکاح اور طلاق کا ذکر کر چکا تو پھر اس نے اولاد کا ذکر کیا کیونکہ کبھی زوجین آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچہ ہوتا ہے۔ پس تب یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو۔ سدی اور ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے (1)۔ یعنی وہ خود اجنبی عورتوں کی نسبت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں کیونکہ وہ زیادہ شفیق اور زیادہ نرم ہیں اور صغیر بچے کو چھین لینا بچے اور اس کی ماں دونوں کے لئے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے کو اگر دودھ چھڑا دیا جائے تو ماں ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے اور وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہوتی ہے جب تک وہ شادی نہ کرے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور اس پر یہ قول اشکال پیدا کرتا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کیونکہ مطلقہ عورت تو لباس کی مستحق نہیں ہوتی جب طلاق رجعی نہ ہو بلکہ وہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے مگر یہ کہ اسے مکارم اخلاق پر محمول کیا جائے اور کہا جائے: اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اجرت اس سے کم نہ ہو جو اس کی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت عام ہے ان مطلقات کے بارے میں بھی جن کی اولاد ہو اور بیویوں کے بارے میں بھی (یعنی تمام کو شامل ہے) اور اظہر یہی ہے کہ یہ آیت ان بیویوں کے بارے میں ہے جن کا نکاح ابھی باقی ہو، کیونکہ وہ نفقہ اور لباس دونوں کی مستحق ہوتی ہیں اور زوجہ نفقہ اور لباس کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے، نفقہ اور لباس دونوں تمکین (قدرت) کے مقابلے میں ہیں۔ اور جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو جائے گی تو قدرت کامل نہ رہے گی اور کبھی یہ وہم کیا جاتا ہے کہ نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، پس اس وہم کو اس ارشاد کے ساتھ زائل کر دیا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ مراد زوج (بچے کا باپ) ہے رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی دودھ پلانے کی حالت میں (ان کا نفقہ اور لباس زوج پر ہے۔) کیونکہ یہ زوج کے مصالح اور منافع میں مشغول ہونا ہے تو یہ اسی طرح ہو گیا جیسا کہ اگر وہ خاوند کے کام کی غرض سے اس کی اجازت کے ساتھ سفر پر چلی جائے تو نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: یُرْضِعْنَ یہ خبر ہے۔ اس کا معنی ہے کہ یہ امر بعض والدات کے لئے وجوب کے معنی پر ہے اور بعض کے لئے مستحب کے معنی پر (1)، جیسا کہ آگے آرہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے مشروع ہونے کی خبر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور دودھ پلانے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا یہ ماں کا حق ہے یا یہ اس پر لازم ہے لفظ دونوں کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ اگر ماں پر اس کے لازم ہونے کی تصریح مراد ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وعلی الوالدات رضاع اولادھن (ماؤں پر اپنی اولاد کو دودھ پلانا لازم ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ لیکن یہ اس پر زوجیت کی حالت میں ہے اور یہی عرف ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ شرط کی طرح ہو گیا ہے (2) مگر یہ کہ وہ شریف اور خوشحال ہو تو اس کا عرف یہ ہے کہ وہ دودھ نہ پلائے اور یہ شرط کی طرح ہے اور اس پر دودھ پلانا واجب ہے اگر بچہ کسی غیر کو قبول نہ کرے، تو دودھ پلانا اس پر واجب ہے اس کے اختصاص کی وجہ سے بشرطیکہ اور معدوم ہو۔ اور اگر باپ فوت ہو جائے اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو المدونہ میں امام مالک کا یہ مذہب بیان ہوا ہے کہ دودھ پلانا ماں کے لئے لازم ہے بخلاف نفقہ کے اور ابن الجلاب کی کتاب میں ہے: اسے دودھ پلانے کا انتظام کرنا بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

اور عبدالوہاب نے کہا ہے: وہ (بچہ) بھی مسلمان فقراء میں سے ایک فقیر ہے۔

اور رہی وہ عورت جسے طلاق بائن دی گئی ہو تو اس پر رضاع نہیں ہے، بلکہ رضاع خاوند پر لازم ہے مگر یہ کہ وہ عورت چاہے تو اجرت مثل کے عوض یہ زیادہ حقدار ہوگی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ خاوند خوشحال ہو اور اگر وہ تنگ دست ہو تو پھر اس مطلقہ عورت کے لئے دودھ پلانا لازم نہیں مگر یہ کہ بچہ اس کے سوا کسی کو قبول نہ کرتا ہو تو اس وقت اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ تمام جو دودھ پلانا اس پر لازم کرتے ہیں (ان کا موقف ہے) کہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو جائے جو اسے دودھ پلانے سے مانع ہو تو دودھ پلانے کا امر باپ کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور امام مالک سے مروی ہے کہ باپ جب مفلس ہو اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو دودھ پلانا ماں پر لازم ہے (3) اور اگر اس کا دودھ نہ ہو لیکن اس کے پاس مال ہو تو پھر اپنے مال سے دودھ پلانے کا انتظام کرنا اس پر لازم ہوگا۔

امام شافعی نے فرمایا: دودھ پلانے کا اہتمام لازم نہیں ہوتا مگر باپ پر یا دادا پر اور جو بھی اس سے اوپر ہوں اس بارے میں علماء کا نظریہ اس ارشاد کے تحت آئے گا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔

کہا جاتا ہے: رَضِعَ یَرْضَعُ رَضَاعَةً و رضاعا اور رَضَعَ یَرْضِعُ رِضَاعًا و رَضَاعَةً (یعنی پہلے میں راء مکسور ہے اور دوسرے میں مفتوح ہے) اور دونوں میں اسم فاعل راضع ہے اور الرضاعۃ کا معنی اللؤم (بخل کرنا) بھی ہے۔ (یہ لفظ فقط راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: حَوْلَيْنِ یعنی دو سال، یہ حال الشیء سے ماخوذ ہے جب کوئی شے پلٹ جائے، پس حول

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311

اوّل وقت سے دوسرے کی طرف پلٹنے والا ہے اور کہا گیا ہے کہ سال کو حول اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اغلباً امور بدل جاتے ہیں۔ کاملین یہ کامل ہونے کے لئے قید ہے کیونکہ کبھی کوئی کہنے والا کہتا ہے: اقمت عند فلان حولین اور اس سے وہ ایک سال اور دوسرے سال کا کچھ حصہ مراد لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ یعنی جو کوئی ایک دن اور دوسرے دن کے کچھ حصے میں جلدی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس پر دلیل ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں ہے کیونکہ دو سال سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ لیکن یہ حد اس لئے بیان کی گئی ہے تاکہ زوجین کے درمیان مدت رضاع کے بارے میں تنازع ختم ہو جائے۔ لہٰذا خاوند پر دو سال سے زیادہ عرصہ اجرت دینا واجب نہیں ہے اور اگر باپ اس مدت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہے اور ماں اس پر راضی نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا اور دو سال میں زیادتی یا کمی تب ہو سکتی ہے جب بچے کے لئے اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور والدین رضامند ہوں۔

حضرت مجاہد اور ابن محیصن نے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّتِمَّ الرَّضَاعَةُ پڑھا ہے یعنی تاء کو فتحہ کے ساتھ اور الرضاعۃ کو رفع کے ساتھ۔ یعنی فعل کی نسبت اس کی طرف کی ہے۔

اور ابو حیوہ، ابن ابی عبلہ، جارود بن ابی سبرہ نے الرِّضَاعَةَ کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ الحَضارۃ اور الحِضارۃ ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے الفعلة کے وزن پر الرضعة پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے أن يكمل الرضاعة (1) قراءت کی ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ بصری الرَّضَاعَةَ کو صرف راء کے فتحہ کے ساتھ اور الرضاع کو صرف راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً القتال اور کوفی الرضاعة کو راء کے کسرہ کے ساتھ اور الرضاع کو راء کے فتحہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے تابعین اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ وہ رضاعت جو حرمت میں نسب کے قائم مقام ہے وہ یہی ہے جو دو سال میں ہو، کیونکہ دو سال گزرنے کے ساتھ رضاعت کی مدت مکمل ہو گئی اور دو سال کے بعد کی رضاعت معتبر نہیں ہے (2)۔ آپ کا یہ قول موطا میں ہے اور یہ آپ سے محمد بن عبد الحکم کی روایت ہے اور یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حضرت زہری، قتادہ، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور ابن عبد الحکم نے آپ سے دو سال اور کچھ تھوڑے دن زیادہ کا قول روایت کیا ہے۔ عبد الملک نے کہا ہے کہ وہ مہینہ اور اس طرح کی مدت ہے۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رضاعت کی مدت دو سال اور دو مہینے ہے (3) اور ولید بن مسلم نے آپ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد دودھ پلانے کی جو مدت ہو گی ایک مہینہ یا دو مہینے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 90، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یا تین مہینے وہ دوسالوں میں ہی شمار ہوگی اور جو اس سے زائد ہوگی وہ عبث ہوگی۔

اور حضرت نعمان سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دوسالوں کے بعد چھ ماہ تک جو مدت ہوگی وہ رضاع میں ہی شمار ہوگی۔ ان میں پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے نے جو دوسال کے بعد دودھ پیا ہے اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

اور حضرت سفیان نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا رضاع الا ما کان فی الحولین (رضاع نہیں ہے مگر وہی جو دو برس میں ہو۔) دار قطنی نے کہا ہے: اسے ابن عیینہ سے ہیثم بن جمیل کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا ہے اور یہ ثقہ اور حافظ راوی ہے۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ یہ خبر آیت اور معنی کے ساتھ موافق ہے۔ یہ کبیر کی رضاعت کی نفی کرتی ہے اور یہ کہ اس کے لئے حرمت کا حکم ثابت نہ ہوگا۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے اور علماء میں سے لیث بن سعد بھی یہی کہتے ہیں اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بڑے کی رضاعت کا لحاظ رکھتے ہیں اور آپ کا اس سے رجوع بھی مروی ہے (2)۔ عنقریب سورۃ النساء میں یہ مسئلہ تفصیل سے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6۔** جمہور مفسرین نے کہا ہے: یہ دوسال ہر بچے کے لئے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ اس بچے کے بارے میں جو چھ ماہ تک پیٹ میں رہتا ہے اور اگر وہ سات ماہ تک پیٹ میں رہے تو پھر اس کی رضاعت کی مدت تیئس ماہ ہے اور اگر آٹھ مہینے رہے تو اس کی مدت رضاعت بائیس مہینے ہے اور اگر وہ نو مہینے رہے تو پھر اس کی مدت رضاعت اکیس مہینے ہے (3) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: و حمله و فصاله ثلاثون شهراً (اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے) اس بنا پر مدت حمل اور مدت رضاعت دونوں ایک دوسرے میں داخل ہیں اور ایک دوسرے سے اپنا حصہ لے لیتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7۔** قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ یعنی باپ پر ہے اور عربی میں و علی المولود لھم کہنا جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و منهم من يستمعون اليك۔ کیونکہ معنی ہے: و علی الذی ولد له اور اس پر جس کا بیٹا ہے اور الذی کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کو تعبیر کیا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ اس حکم میں رزق سے مراد وہ طعام (کھانا) ہے جو کافی ہو اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بچے کا نفقہ والد پر واجب ہے، چاہے وہ کمزور اور عاجز ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے ماں کے لئے مقرر فرمایا ہے کیونکہ رضاع کی صورت میں ماں کے واسطہ سے غذا بچے تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الرضاع، جلد 4، صفحہ 174، دار المحاسن قاہرہ
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العربیۃ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ (الطلاق:6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو تم ان پر خرچہ کرو) کیونکہ انہی کے سبب غذا پہنچتی ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آدمی پر اپنی اولاد میں سے ان بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا کوئی مال نہ ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہند بنت عتبہ کو فرمایا اس حال میں کہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ ابوسفیان انتہائی بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو تو پھر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے لے لیتی ہوں، کیا مجھ پر اس میں گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف (1) (تو اتنا مال لے لے مناسب طریقے سے جو تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے کافی ہو۔)

اور الکسوۃ کا معنی لباس ہے اور قولہ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ہے جو عرف شرع میں بغیر افراط و تفریط کے متعارف ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نفقہ خاوند کی دولت اور اس کے منصب کے مطابق ہوگا مد یا کسی اور پیمانے کے ساتھ اندازے کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کا بیان سورۃ الطلاق میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: عورت کو اجرت میں کنجوسی پر صبر کرنے کا پابند اور مکلف نہیں کیا جائے گا اور خاوند کو اسراف (فضول خرچی) کا پابند نہیں کیا جائے گا بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس آیت میں امام مالک کی اس پر دلیل موجود ہے کہ پرورش کا حق ماں کو ہے اور یہ بچے میں اس کے بالغ ہونے تک ہے اور بچی میں نکاح تک ہے اور یہ ماں کا حق ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب بچہ آٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ وہ عمر ہے جس میں وہ تمیز کر سکتا ہے، لہٰذا اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیونکہ اس کی یہ حالت قرآن کریم کی تعلیم، ادب اور دیگر وظائف عبادات کے لئے اس کی ہمت اور استعداد کو متحرک کرنے کی ہے اور اس میں بچہ اور بچی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اور امام نسائی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا مجھ سے لے لے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بچے کو فرمایا: یہ "تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان میں سے جسے چاہے پکڑ لے" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا (2)۔

اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا لے جائے، حالانکہ یہ ابوعنبہ کے کنوئیں سے مجھے پانی لا کر دیتا ہے اور میرے لئے بہت نفع بخش ہے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ اندازی کر لو"۔ تو اس کے خاوند نے کہا: میرے بیٹے کے بارے میں کون میرے ساتھ جھگڑ سکتا ہے؟ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیٹے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، جلد 1، صفحہ 167، وزارت تعلیم

2۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 112، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب تخییر الصبی ابویہ، حدیث نمبر 2341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے ان دو میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لے۔'' تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی (1)۔

اور ہماری دلیل وہ ہے جسے ابوداؤد نے امام اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کے لئے جائے حفاظت رہا، میرے پستان اسے سیراب کرتے رہے اور میری گود اس کے لئے گھر بنی رہی اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اب اس نے اسے مجھ سے چھیننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: انت احق بہ مالم تنکحی (2) تو اس کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زوجین جب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ان دونوں کا بچہ ہو تو ماں اس بچے کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک وہ نکاح نہ کرے۔ اسی طرح ابو عمر نے کہا ہے: میں علماء سلف میں سے کہیں بھی مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے تو وہ باپ کی نسبت اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے جس وقت تک وہ چھوٹا بچہ ہے اور کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس کے پاس وہ حفاظت میں ہو اور (اخراجات کی) کفایت بھی ہو اور اس عورت میں فسق اور اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار ثابت نہ ہو۔ پھر اس کے بعد اسے اختیار دینے میں اختلاف ہے جبکہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور یہ عقل رکھتا ہو کہ ان میں سے کون اس کے حق میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں بغیر تخییر کے خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے لوں گا اور میں ہی اس کا زیادہ حقدار ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے اور خالہ ماں ہوتی ہے اور حضرت علی نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی میرے گھر ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، میں اس کے لئے (گھر سے) نکلا اور میں نے سفر کیا اور میں اسے لے کر آیا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہ حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا: وأما الجارية فأقضي بها لجعفر تكون مع خالتها وانما الخالة ام (3) اور رہی بچی تو میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی،

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1938، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر** 10۔ ابن منذر نے کہا ہے: تمام معتمد اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ بچے میں ماں کا حق نہیں ہے جب وہ شادی کر لے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح انہوں نے اپنی ''کتاب الاشراف'' میں کہا ہے اور قاضی عبدالوہاب نے ''شرح الرسالہ'' میں حسن سے ذکر کیا ہے کہ شادی کے سبب پرورش میں اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور امام مالک، امام شافعی، نعمان اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نانی بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ جب بچے کی ماں نہ ہو اور اس کی دادی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب بچے کی خالہ نہ ہو تو پھر دادی زیادہ حقدار ہے (1) اور ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا: خالہ دادی سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے (2)۔

اور امام شافعی اور نعمان کے قول میں ہے کہ دادی خالہ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک باپ دادی کی نسبت اپنے بیٹے کے لئے زیادہ اولیٰ ہے (3)۔

ابوعمر نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کی کوئی اجنبی بیوی نہ ہو۔ پھر باپ کے بعد بہن اور پھر پھوپھی کا حق ہے اور یہ تب ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس بچہ محفوظ و مامون ہو اور وہ اس کے پاس حفاظت و کفایت میں ہو اور جب اس طرح نہ ہو تو پھر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے غور و فکر کیا جائے گا جس کے پاس بچہ زیادہ محفوظ ہوگا اور وہ اس کی حفاظت اور خیر اور بھلائی کی تعلیم کے سلسلہ میں انتہائی اچھا اور حسین سلوک کرے گا اور یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ پرورش بچے کا حق ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور آپ کے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور اسی طرح فاجرہ عورت، ضعیف اور بیماری یا اپاہج ہونے کی وجہ سے جو بچے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اسے حق حضانت نہیں دیتے۔

ابن حبیب نے مطرف سے اور ابن ماجشون نے امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ پرورش کا حق پہلے ماں کو ہے، پھر نانی کو، پھر خالہ کو، پھر دادی کو پھر بچے کی بہن کو پھر بچے کی پھوپھی کو پھر بچے کی بھتیجی کو اور پھر باپ کو ہے۔ دادی بہن سے اولیٰ ہے اور بہن پھوپھی سے اولیٰ ہے اور پھوپھی اپنے مابعد افراد سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور تمام مردوں میں سے اولیاء زیادہ ارجح اور اولیٰ ہیں اور خالہ کی بیٹی کے لئے، پھوپھی کی بیٹی کے لئے اور بچے کی بھانجیوں کے لئے اس کی پرورش میں سے کوئی حق نہیں ہے۔ اور جب پرورش کرنے والے کی جانب سے بچے پر ضائع ہونے یا فساد برپا ہونے کا کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ اس کی مسلسل پرورش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ بچہ ہونے کے اطلاق سے نکل جائے۔ اور یہاں تک کہ بچی شادی کر لے مگر یہ کہ باپ سفر پر نکلنے اور وطن سے منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس وقت وہ ماں

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 39 3۔ ایضاً

اور کسی غیر کی نسبت اپنے بچے کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ (بچے کی ماں) منتقل نہ ہونا چاہے اور اگر باپ نے تجارت کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو پھر اس کے لئے حق حضانت نہیں اور اسی طرح بچے کے وہ اولیاء ہیں جن کے ساتھ وہ رہتا ہے جب وہ وطن بنانے کے لئے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اور ماں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو باپ کے رہنے کی جگہ سے منتقل کرے مگر اس صورت میں کہ وہ اتنی مسافت سے بھی قریب ہو جس میں نماز قصر ہو جاتی ہے اور اگر آدمی نے عورت کے شہر سے منتقل ہوتے وقت اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس کے پاس اپنا بچہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کا نفقہ اور اس کی مشقت معین سالوں تک اس پر لازم ہوگی، تو اگر عورت نے اسے اپنے ذمہ لازم کر لیا تو وہ اس پر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فوت ہوگئی تو پھر اس کے ترکہ میں سے اس کے لئے اس کے ورثاء کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرض ہے جو اس کے ترکہ میں سے لیا جائے گا۔ اور پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اگر بچہ فوت ہو جائے یا جیسا کہ اگر وہ حمل اور رضاع کے خرچہ کی بھی اس سے صلح کر لے اور وہ اسے ساقط کر دے تو پھر اس میں سے کسی شے کے لئے اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جب ماں شادی کر لے تو اس سے اس کا بچہ نہ چھینا جائے یہاں تک کہ اس کا خاوند اس سے دخول کر لے (1)۔ یہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب اس نے نکاح کر لیا تو اس کا حق حضانت ختم ہو گیا۔ اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی تو امام مالک کے نزدیک اس میں اس کے لئے رجوع کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا مشہور مذہب یہی ہے اور قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے اور اسے ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں آپ کا قول مختلف ہے۔ سو ایک بار کہا: وہ بچہ اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایک بار کہا: وہ نہیں لوٹایا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب ماں اس شہر سے نکل گئی جس میں اس کا بیٹا تھا، پھر اس کی طرف واپس آگئی تو پھر یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہوگی۔ یہ امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور اسی طرح اگر اس نے شادی کی پھر اسے طلاق ہوگئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو بچہ بھی اس کے حق میں لوٹا دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا ہے: پس اگر خاوند نے اسے طلاق دی یا وہ فوت ہو گیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بچے کو لے لے کیونکہ وہ عذر زائل ہو چکا ہے جس کے سبب بچے کو چھوڑنا جائز ہوا تھا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اگر عورت نے اپنے بچے کی پرورش چھوڑ دی اور اس نے اسے لینے کا ارادہ ہی نہ کیا حالانکہ وہ فارغ تھی اور زوج کے سبب مشغول نہ تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچے کو لینے کا ارادہ کیا تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی۔ پس اگر اس کا بچے کو چھوڑنا کسی عذر کے باعث تھا تو اس کے لئے اسے لینا جائز ہے اور اگر اس کا ترک اسے چھوڑنے اور نفرت کے سبب ہو تو اب اس کے بعد اس کے لئے بچے کو لینا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اور علماء نے ایسے زوجین کے بارے اختلاف کیا ہے جو طلاق کے سبب جدا ہو جاتے ہیں اور زوجہ ذمیہ ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے: ذمیہ اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ قول ابو ثور، اصحاب الرائے اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: تحقیق ہم نے حدیث مرفوع روایت کی ہے جو اس قول کے موافق ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ بچہ ان میں سے مسلمان کے ساتھ ہوگا۔ یہ قول امام مالک، سوار اور عبد اللہ بن حسن کا ہے اور یہی حضرت امام شافعی سے بھی بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا ان زوجین میں بھی اختلاف ہے جو آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک آزاد ہے اور دوسرا مملوک۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: آزاد اولیٰ ہے۔ یہ قول حضرت عطا، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: باپ جب آزاد ہو اور اس کا آزاد بیٹا ہو اور ماں مملوکہ (کنیز) ہو تو بلاشبہ ماں اس کی زیادہ حقدار ہوگی مگر یہ کہ اسے بیچ دیا جائے اور وہ کہیں اور منتقل ہو جائے تو پھر باپ کا حق زیادہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ قولہ تعالیٰ: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ماں بچے کے باپ کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے اسے دودھ پلانے سے انکار نہ کرے یا وہ اجرت مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کے لئے بھی حلال نہیں ہے کہ ماں کو دودھ پلانے میں اس کی رغبت کے باوجود اس سے منع کرے، یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔

نافع، عاصم، حمزہ اور کسائی نے تضار راء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نہی کی بنا پر محل جزم میں ہے(1) اور اس کی اصل لا تضارر ہے اور پہلی راء کو دوسری میں ادغام کیا گیا اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے دوسری کو فتحہ دے دیا گیا۔ اسی طرح مضاعف میں کیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے فتحہ یا الف ہو، تو کہتا ہے: عض یا رجل (تو کاٹ اے آدمی!) اور ضار فلانا یا رجل (تو فلاں کو ضرر پہنچا اے آدمی) یعنی بچہ ماں سے نہیں چھینا جائے گا جب وہ دودھ پلانے پر راضی ہو اور بچہ اس سے مانوس ہو۔

ابو عمرو، ابن کثیر اور ابان نے حضرت عاصم اور ایک جماعت سے تضار سے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا عطف تُكَلَّفُ نَفْسٌ پر کیا ہے اور یہ خبر ہے اور اس سے مراد امر ہے(2)۔

اور یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: لا تضارر زوجها (یعنی وہ اپنے خاوند کو ضرر نہ پہنچائے) کہ وہ یہ کہے: میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی اور نہ خاوند اسے ضرر پہنچائے کہ وہ اس کا بیٹا چھین لے حالانکہ وہ کہہ رہی ہو: میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ اور یہ احتمال ہے کہ یہ اصل میں تضارر ہو، اور والدۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہو۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لا تضارر پڑھا ہے یعنی دو راء میں سے پہلی مفتوح ہے۔

اور ابو جعفر بن قعقاع نے تُضَارْ یعنی راء کو اسکان اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح لَا يُضَارْ كَاتِبٌ ہے۔ اور یہ بعید ہے کیونکہ دو ہم مثل لفظ جب جمع ہو جائیں اور وہ دونوں اصلی ہوں تو ان میں سے ایک کو تخفیف کے لئے حذف کرنا جائز نہیں۔ پس یا ادغام ہوگا یا اظہار ہوگا۔ اور آپ سے اسکان اور تشدید بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے لا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

تُضَارِرْ پہلی راء کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ قول باری تعالیٰ: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ پر معطوف ہے۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس حضرت قتادہ، سدی، حسن اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے کہ اگر وہ فوت ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے: مراد بچے کا ایسا وارث ہے جو صرف مردوں میں سے ہو کہ دودھ پلانے کا اہتمام کرنا اس کے ذمہ لازم ہوگا جیسا کہ یہ بچے کے باپ پر لازم تھا اگر وہ زندہ ہوتا اور حضرت مجاہد اور حضرت عطا نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: مراد بچے کا وارث ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی ہو۔ اسے دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے اتنی مقدار جتنا اس کی میراث میں ان کا حصہ ہے(2) اور یہی امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق نے اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں کہا ہے: ''پس رہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو انہوں نے کہا ہے: صغیر کا نفقہ اور اسے دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بہن کا صغیر اور محتاج بیٹا ہو اور چچا کا بیٹا صغیر اور محتاج ہو اور وہی اس کا وارث ہو، تو نفقہ ماموں پر واجب ہوگا اپنے اس بھانجے کے لئے جس کا وہ وارث نہیں ہے اور چچا کے بیٹے سے اپنے چچا کے اس بیٹے کے لئے جس کا وہ وارث ہے نفقہ ساقط ہو جائے گا''۔ ابو اسحاق نے کہا ہے: انہوں نے ایسا قول کیا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں جس نے یہ کہا ہو۔

علامہ طبری نے امام ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ وارث جس پر بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے وہی اس کا وارث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا ذی رحم محرم ہو اور اگر چچا کا بیٹا وغیرہ ذی رحم محرم کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی(3)۔

اور کہا ہے: (الوارث) سے مراد باپ کا حصہ ہے ان پر نفقہ اور لباس دونوں واجب ہوں گے۔

ضحاک نے کہا ہے: اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے اور بچے کا مال ہو تو اسے دودھ پلانے والا اس مال سے لے لے گا۔ اور اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو پھر وہ عصبہ سے لے گا۔ اور اگر عصبہ کے پاس بھی مال نہ ہو تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔

اور قبیصہ بن ذؤیب، ضحاک اور بشیر بن نصر قاضی عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: الوارث سے مراد بچہ بذات خود ہے اور انہوں نے علی الوارث کی تاویل المولود سے ہے جیسا کہ ما علی المولود لہ ہے، یعنی اس پر اپنے مال میں سے اپنے آپ کو دودھ پلانا واجب ہے جب وہ اپنے باپ کا وارث بن جائے۔

اور سفیان نے کہا ہے: یہاں وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد جو باقی رہ جائے(4)، وہ ہے۔ پس اگر باپ فوت ہو جائے تو ماں پر بچے کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا لازم ہے جبکہ بچے کا مال نہ ہو اور

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 600، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

عصبہ بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنے میں اس کے ساتھ اتنی مقدار شراکت کرے گا جتنا میراث میں سے اس کا حصہ ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر یتیم فوت ہو، اس کا کوئی مال نہ ہو، تو امام وقت پر بیت المال سے اس کا انتظام کرنا واجب ہے اور اگر امام ایسا نہ کرے تو پھر مسلمانوں پر ایسا کرنا واجب ہے اخص فالاخص کے طریقہ پر۔ اور ماں بچے کے ساتھ سب سے زیادہ مختص ہے لہٰذا اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کا اہتمام کرنا واجب ہوگا نہ وہ بچے کی طرف رجوع کرے گی اور نہ کسی اور کی طرف (یعنی بچے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے بچے یا کسی اور طرف متوجہ نہ ہوگی) اور دودھ پلانا واجب ہے اور نفقہ مستحب ہے اور وجہ استحباب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور ازواج پر ان کے ساتھ حقوق کا قیام واجب ہے اور جب خاوند کے فوت ہوجانے یا اس کے تنگدست ہوجانے کے سبب ان کے حق کا پورا ہونا متعذر اور مشکل ہوجائے تو حق ان سے ساقط نہیں ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ عدت ان (عورتوں) پر واجب ہے اور نفقہ اور سکنٰی ان کے خاوندوں پر لازم ہے اور جب ان کے لئے نفقہ متعذر ہوجائے تو ان سے عدت ساقط نہیں ہوتی۔

عبدالرحمٰن بن قاسم نے الاسدیہ میں امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی کے ذمہ بھائی، قریبی رشتہ دار اور ذورحم محرم کا نفقہ لازم نہیں ہوتا (1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ امام مالک کے الفاظ ہیں اور آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا ناسخ کون ہے اور نہ ہی عبدالرحمٰن بن قاسم (نے بیان کیا ہے) اور نہ مجھے معلوم ہوسکا ہے کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اسے بیان کیا ہو اور وہ جو یہ شبہ ڈالتا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اس کا ناسخ ہو۔ واللہ اعلم، وہ یہ کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہوجائے جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک سال کا نفقہ اور سکنٰی متوفی کے مال سے واجب کیا پھر اسے منسوخ کردیا اور اسے اٹھالیا۔ اسی طرح وارث سے بھی اسے منسوخ کردیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اسی بنا پر نفقہ بچے کی اپنی ذات پر اس کے مال سے ہوتا ہے اور وارث پر اس میں سے کوئی شے نہیں ہوتی اس بنا پر جو آرہا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، ابن قاسم نے امام مالک سے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس میں غافلوں کے دل خوفزدہ ہوجاتے ہیں اور تھوڑے لوگوں کی عقلیں اس میں حیرت زدہ ہوجاتی ہیں، حالانکہ اس میں امر قریب ہے اور وہ یہ کہ فقہاء و مفسرین میں سے علماء متقدمین تخصیص کو نسخ کا نام دیتے تھے، کیونکہ اس میں ان بعض افراد سے حکم کو اٹھانا ہوتا ہے جنہیں عموم شامل ہوتا ہے۔ یہ ان کا تسامح تھا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری رہا یہاں تک کہ اس نے ان کے بعد والے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا۔ اور اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ ماتقدم کی طرف اشارہ ہے۔ پس لوگوں میں سے وہ جنہوں نے ایجاب نفقہ اور تحریم اضرار میں سے تمام کی طرف لوٹایا ان میں فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلف میں سے حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما ہیں اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ارخاء الستور، جلد 5، صفحہ 48، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا معنی تمام ماتقدم کی طرف نہیں لوٹتا، بلکہ یہ صرف تحریم اضرار کی طرف لوٹتا ہے اور معنی یہ ہے کہ وارث پر بھی ماں کو ضرر پہنچانا اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ پر ہے اور یہی اصل ہے۔ پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں عطف جمیع ماتقدم کی طرف راجع ہے تو دلیل لانا اس پر لازم ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ان کا قول هذا هو الاصل اس سے مراد قریب ترین مذکور کی طرف ضمیر کو لوٹانا ہے۔ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اگر وہ ان تمام کا ارادہ کرتا یعنی دودھ پلانا، نفقہ مہیا کرنا اور ضرر نہ پہنچانا تو یقیناً فرماتا: وعلى الوارث مثل هؤلاء پس یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کا عطف ضرر سے روکنے پر ہے۔

اور اسی بنا پر تمام مفسرین نے اس کی تاویل اس معنی میں کی ہے جسے قاضی عبدالوہاب نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اس طرح ضرر نہ پہنچائے کہ باپ جب اسے اجرت مثلی دے (تو وہ کہے) کہ وہ اسے دودھ نہیں پلائے گی اور نہ باپ اپنے بچے کے باعث ضرر پہنچائے۔ اس طرح کہ ماں جب تیار ہو کہ وہ اسے اجرت مثلی کے عوض دودھ پلائے گی تو پھر اسی کا وہ حق ہے۔ (باپ انکار نہ کرے) کیونکہ ماں بچے کے لئے زیادہ نرم اور زیادہ محبت وشفقت سے پیش آنے والی ہے اور اس کا دودھ کسی بھی اجنبیہ عورت کے دودھ کی نسبت زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: امام مالک، آپ کے تمام اصحاب، شعبی، زہری، ضحاک اور علماء کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِثْلُ ذٰلِكَ سے مراد ہے کہ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ رہا رزق (نفقہ) اور لباس تو ان میں سے کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ نفقہ اور لباس وارث پر ہے پھر اسے اجماع امت کے ساتھ اس معنی میں منسوخ کر دیا گیا ہے کہ وارث کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس پر نفقہ اور لباس ہے یا نہیں؟

اور یحییٰ بن یعمر نے وعلى الورثة جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کریں لا يقبل الله صدقة و ذو رحم محتاج کہ اللہ تعالیٰ کوئی صدقہ اس حال میں قبول نہیں فرماتا کہ ذورحم محتاج ہو۔ تو انہیں کہا جائے گا کہ الرحم ہر ذی رحم کے لئے عام ہے، چاہے وہ محرم ہو یا غیر محرم اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ذورحم پر صدقہ خرچ کرنا اولیٰ اور ارجح ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اجعلها في الأقربين (2) (تم صدقہ کو اقربین میں خرچ کرو) پس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا انہوں نے قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور نحاس نے کہا ہے: رہا اس کا قول جس نے کہا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے تو یہ قول حسن اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں اور اس میں کوئی شے بغیر دلیل قطعی کے نہیں نکل سکتی اور جنہوں نے على ورثة الأب

1۔ احکام القرآن لابن العربی جلد 1 صفحہ 205، دار الفکر
2۔ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، جلد 1 صفحہ 385، وزارت تعلیم

مراد لیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ باپ پر لازم ہے۔ لہٰذا اس کے وارث بیٹے کے وارثوں سے اولیٰ ہوں گے اور ان کی دلیل جنہوں نے کہا: مراد بیٹے کے وارث ہیں، تو وہ کہتے ہیں: جس طرح وہ اس کے وارث ہوتے ہیں (اسی طرح) وہ اس کے حقوق کو بھی ادا کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن جریر ان کے قول کو پسند کرتے تھے جنہوں نے کہا ہے کہ یہاں مراد بیٹے کے وارث ہیں، یہ اگرچہ قول غریب ہے لیکن اس سے استدلال صحیح ہے اور اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کا مال اسی کے زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اور فقہاء نے اجماع کیا ہے سوائے اس کے جو ان سے الگ ہو گیا کہ ایک آدمی کا اگر چھوٹا بچہ ہو اور بچے کا مال بھی ہو اور باپ خوشحال ہو تو باپ پر نفقہ اور رضاع واجب نہ ہوگا بلکہ وہ بچے کے مال سے ادا ہوگا۔

اور اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کہا جائے گا کہ یہ ضمیر مؤنث کے لئے ہے اور اس کے ساتھ اجماع آیت کی حد ہے، اس کی وضاحت کرنے والا ہے، کوئی مسلمان اس سے نکلنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

اور رہا وہ جس نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو والدین میں سے ایک کے مرنے کے بعد باقی رہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں کے لئے اپنے بچے کو ضائع کرنا جائز نہیں، حالانکہ وہ فوت ہو جائے جو بچے پر اور اس کی ماں پر خرچ کرتا تھا۔

اور امام بخاری نے اس قول کے رد میں ایک باب بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے ''باب - وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، و هل على المرأة منه شیء'' اور آگے ام سلمہ اور ہند کی حدیث بیان کی ہے۔

اس میں معنی یہ ہے کہ ام سلمہ کے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹے تھے اور ان کا کوئی مال نہ تھا تو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے بتایا کہ اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے بیٹوں کا نفقہ اس پر واجب نہیں اور اگر واجب ہوتا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس یہ نہ کہتی: اور میں نے اسے چھوڑ نہیں (1)۔

اور رہی ہند کی حدیث تو اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے باپ کے مال سے اپنا نفقہ اور اپنے بچے کا نفقہ لینے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ نے نفقہ اس پر واجب نہیں کیا جیسا کہ اسے باپ پر واجب کیا۔ پس امام بخاری نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب باپوں کی زندگی میں بیٹوں کا خرچہ ماؤں پر لازم نہیں ہے تو اسی طرح باپوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان پر لازم نہ ہوگا۔

اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ بلا شبہ نفقہ اور لباس ہر ذی رحم محرم پر لازم ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہر ذی رحم محرم پر خرچ کرے جب وہ فقیر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معارض یہ ہے کہ نہ اسے کتاب اللہ سے لیا گیا ہے نہ اجماع سے اور نہ ہی سنت صحیحہ سے۔ بلکہ جو قول ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سوا یہ کہیں معروف ہی نہیں ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 809، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب النفقات، حدیث نمبر 4950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس رہا قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ پس اگر وارث پر نفقہ اور لباس ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب وہ اپنا ماموں اور اپنے چچا کا بیٹا چھوڑے تو نفقہ اس کے ماموں پر ہے اور اس کے چچا کے بیٹے پر کوئی شے نہیں ہے تو یہ قرآن کریم کی نص کے خلاف ہے کیونکہ ماموں چچا کے بیٹے کے ساتھ کسی کے قول کے مطابق بھی وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اکیلا کثیر علماء کے قول کے مطابق وارث بن سکتا ہے اور وہ جنہوں نے اس سے ہر ذی رحم محرم پر نفقہ کا استدلال کیا ہے، اکثر اہل علم اس کے خلاف ہیں۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا اس میں اَرَادَا میں ضمیر والدین کے لئے ہے اور فِصَالًا کا معنی ہے دودھ چھڑانا (1)۔ یعنی ماں کے دودھ کے سوا کسی اور خوراک کو غذا بنانا اور الفصال اور الفصل کا معنی الفطام ہے اور اس کا اصل معنی التفریق ہے اور یہ بچے اور پستان کے درمیان تفریق اور جدائی کرنا ہے اور اسی سے الفصیل ہے (یعنی اونٹنی یا گائے کا بچہ) کیونکہ اسے اپنی ماں سے جدا کیا جاتا ہے۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا یعنی وہ راضی ہو جائیں دو سالوں سے پہلے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی انہیں کا دودھ چھڑانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب مدت رضاع دو سال مقرر کی تو اس نے بیان کر دیا کہ ان دونوں کا دودھ چھڑانا ہی فطام ہے اور ان دونوں کا جدا کرنا ہی فصال ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، مگر یہ کہ والدین اس مدت سے کم پر بچے کو نقصان پہنچائے بغیر متفق ہو جائیں اور وہ اس بیان کے ساتھ جائز ہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دو سال دودھ پلانا واجب تھا اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں تخفیف کی گئی اور دو سال سے کم مدت دودھ پلانا مباح کر دیا گیا، اس قول کے ساتھ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا الآیہ۔ اور اس میں احکام میں اجتہاد کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لئے مشاورت مباح قرار دی ہے ایسے امور میں جو صغیر کی اصلاح کرنے والے ہوں اور یہ ان دونوں کے ظن غالب پر موقوف ہے نہ کہ حقیقت ویقین پر۔ اور التشاور کا معنی ہے: رائے کا اظہار کرنا۔ اسی طرح المشاورۃ اور المشورۃ ہے جیسا کہ المعونۃ اور شرت العسل کا معنی ہے میں نے اسے (شہد کو) نکالا۔ اور شرت الدابۃ و شورتھا یعنی میں نے اسے چلایا اس کی چال کو تیز کرنے کے لئے اور الشوار کا معنی ہے گھر کا سامان، کیونکہ وہ دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور الشارۃ کا معنی ہے آدمی کی ہیئت اور الاشارۃ کا معنی ہے جو تیرے دل میں ہے اسے نکالنا اور اس کا اظہار کرنا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ یعنی لاولادکم غیر الوالدۃ اگر تم چاہو تو اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ والدہ کے علاوہ (دایہ سے) زجاج نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے اَنْ تسترضعوا اجنبیۃ لاولادکم (کہ تم اجنبی عورت سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے: كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی کالوا لھم او وزنوا لھم اور لام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں ان میں سے ایک حرف کے ساتھ ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ

فقد ترکتُك ذا مال و ذا نَشَبِ امرتُك الخیر فافعل ما أمرتَ به

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہ کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب جائیداد چھوڑا ہے۔

اور یہ جائز نہیں ہے: دعوتُ زیدا، ای دعوت لزید، کیونکہ یہ تلبیس (حقیقت کو چھپانا) تک پہنچا دیتا ہے اور اس نوع میں سماع معتبر ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر اس آیت میں دایہ بنانے کے جواز پر دلیل موجود ہے جبکہ آباء اور مائیں اس پر متفق ہو جائیں اور عکرمہ نے قول باری تعالیٰ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ میں کہا ہے۔ اس کا معنی ہے دایہ۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے(1)۔

اور اصل یہ ہے کہ ہر ماں پر اپنے بچے کو دودھ پلانا لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ الله تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ پس اس نے زوجات کو اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے اور ان کے لئے ازواج پر نفقہ اور لباس واجب کیا ہے اور زوجیت قائم رہے گی اور اگر دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ پر لازم ہوتا تو جب الله تعالیٰ نے اس پر ان کے نفقہ اور لباس کے لازم ہونے کا ذکر کیا ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کر دیتا۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر فقہاء امصار کے سوا حسیبہ (خاندانی شرف والی عورت) کی استثنا کی ہے اور کہا ہے: اس پر دودھ پلانا لازم نہ ہوگا(2) اور اسے آیت سے نکال دیا ہے اور اصول فقہ کے ایک اصول کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی ہے۔ اور وہ ہے العمل بالعادۃ۔ عمل عادت اور رواج کے مطابق ہوتا ہے اور یہ وہ اصول ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھا۔ اور اس میں عمدہ اصول یہ ہے کہ یہ امر دور جاہلیت میں صاحب حسب و شرف لوگوں میں رائج تھا، پھر اسلام آیا اور اس نے اسے تبدیل نہیں کیا اور آپ کے زمانے تک صاحب ثروت و حسب لوگ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے حوالے کرنے کے ساتھ ماؤں کو استمتاع کے لئے فارغ کرنے پر مصر رہے۔ تو آپ نے یہ کہہ دیا اور رہا ہمارے زمانے کا حکم تو ہم نے اسے شرعاً ثابت کر دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 18۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم یعنی آباء اجرت دودھ پلانے والی دایہ کو ادا کر دو۔ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: جب تم ماؤں کو ان کی اجرت اس حساب سے ادا کر دو جس کے مطابق انہوں نے دودھ پلانے کے وقت تک دودھ پلایا(3)۔

سات قراء میں سے چھ نے ما آتیتم بمعنی ما أعطیتم پڑھا ہے اور ابن کثیر نے اَتَیْتُمْ بمعنی ما جئتم و فعلتم (جو تم لائے اور تم نے کیا) پڑھا ہے۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و ما کان من خیر أتوہُ فانما توارثه آباءُ آبائهم قبلُ (4)

جو انہوں نے کہا ہے وہ خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کے آباء کے آباء اس سے پہلے اس کے وارث بنیں ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

حضرت قتادہ اور زہری رحمہما اللہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب تم وہ ادا کر دو جو تم نے دودھ پلوانے کے ارادہ سے طے کیا ہے، یعنی والدین میں سے ہر ایک حوالے کر دے اور راضی ہو جائے اور یہ ان دونوں کے اتفاق کی بنا پر ہو اور خیر کے قصد اور امر معروف کے ارادہ سے ہو اور اس احتمال پر سَلَّمْتُمْ کے خطاب میں مرد اور عورتیں بھی داخل ہوں گے (1) اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر خطاب مردوں کو ہے۔

ابو علی نے کہا ہے: اذا سلمتم ما آتیتم معنی ہے نقدہ او اعطاءہ ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور تقدیر کلام ہے: ما آتَيْتُمُوْهُ، پھر ضمیر کو صلہ سے حذف کر دیا گیا اور اس تاویل کی بنا پر خطاب مردوں کو ہوگا، کیونکہ وہی دودھ پلانے کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: اور یہ احتمال بھی ہے کہ ما مصدریہ ہو یعنی اذا سلمتم الاتیان اور معنی پہلے کی طرح ہی ہے، لیکن یہ مضاف کے حذف اور پھر ضمیر کے حذف کے طریقہ سے مستغنی ہو جائے گا۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

''اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں چار مہینے اور دس دن اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے۔''

اس میں پچیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ متصل مسئلہ رضاعت کا ذکر فرمایا، پھر ساتھ ہی عدت وفات کا ذکر بھی کر دیا، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وفات عدت طلاق کی مثل ہے۔ وَالَّذِيْنَ یعنی وہ آدمی جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں۔ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں یا اور ان کی بیویاں ہوں، تو وہ بیویاں انتظار کریں گی، زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ کلام میں مبتدا کا حذف بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ (الحج: 72)

یہ اصل میں ھو النار ہے اور ابو علی فارسی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بعدھم وہ آدمی جو تم میں فوت ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ ان کے بعد انتظار کریں گی (2) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: السمن منوان بدرھم یہ اصل میں منوان منہ بدرھم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے وازواج الذین یتوفون منکم یتربصن (اور وہ ازواج جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 612، دار احیاء التراث العربیۃ

ان کی بیویاں انتظار کریں گی۔) پس عبارت میں انتہائی ایجاز اور اختصار ہے۔ اور مہدوی نے سیبویہ سے بیان کیا ہے کہ معنی ہے: و فیمایتلی علیکم الذین یتوفون۔

اور کوفہ کے بعض علمائے نحو نے کہا ہے: الذین کی خبر چھوڑ دی گئی ہے اور مقصود ان کی ازواج کے بارے خبر دینا ہے کہ وہ انتظار کریں گی۔ اور اس لفظ کا معنی ہے مشروع ہونے کی خبر دینا دو وجہوں میں سے ایک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس میں ظاہراً عموم ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ مہدوی نے بعض علماء سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حاملہ عورتوں کو بھی شامل تھی پھر اسے اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ہے: **وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** (طلاق: 4)(1) (اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل وضع کر لیں۔)

اور اکثر علماء نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لئے ناسخ ہے: **وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ**۔ کیونکہ لوگ اسلام کا کچھ عرصہ اس پر قائم رہے جب کوئی آدمی فوت ہوتا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی چھوڑتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے ایک سال کے نفقہ کی وصیت کرتا اور سکنیٰ (رہائش گاہ) کی وصیت کرتا جب تک وہ نہ نکلے اور شادی نہ کرلے، پھر اسے چار مہینے اور دس دن اور میراث کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس میں نسخ نہیں ہے بلکہ یہ سال کی مدت میں کمی کرنا ہے جیسا کہ صلوٰۃ مسافر کہ جب یہ چار سے کم ہو کر دو رکعتیں ہوئی تو یہ نسخ نہیں ہے اور یہ واضح طور پر غلط ہے جب اس کا حکم یہ تھا کہ وہ ایک سال تک عدت گزارے گی جب وہ نہ نکلے اور اگر وہ نکل گئی تو اسے روکا نہ جائے پھر اس حکم کو زائل کر دیا گیا ہے اور اس پر چار مہینے دس دن عدت لازم ہو گئی ہے اور یہی وہ نسخ ہے اور صلوٰۃ مسافر میں اس میں سے کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ مسافر کو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا(2)۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اس کی عدت دو مدتوں میں سے آخری مدت (طویل مدت) کو مکمل کرنا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے سحنون نے اسے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس کی دلیل جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ ان دونوں قولوں کو جمع کرنے کا ارادہ ہے: یعنی **وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا** (3) اور اس قول کے درمیان: **وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** اور وہ اس طرح کہ جب وہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث نمبر 337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 613، دار احیاء التراث العربیۃ

دو مدتوں کی انتہا تک بیٹھی رہی تو اس نے دونوں آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ اور اگر وہ وضع حمل کے ساتھ عدت گزارے تو اس نے عدت وفات والی آیت کے ساتھ عمل ترک کر دیا۔ اور دونوں کو جمع کرنا ترجیح سے زیادہ اولی اور بہتر ہے۔ اس پر تمام اہل اصول کا اتفاق ہے۔ یہ انتہائی اچھی نظر وفکر ہے اگر اس پر حدیث سُبَیْعَه اسلمیہ (1) سے اعتراض نہ کیا جائے کہ اسے اپنے خاوند کی وفات کے بعد چند ہی راتیں گزرنے کے ساتھ نفاس آنے لگا اور اس نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اسے الصحیح میں نقل کیا ہے اور حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ رب کریم کا ارشاد: وَ أُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ مطلقات اور ان عورتوں کے بارے میں جن کے خاوند فوت ہو جائیں اپنے عموم پر محمول ہے اور عدت وفات دونوں صنفوں میں سے غیر حاملہ کے ساتھ مختص ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصریٰ کی آیت عدت وفات کی آیت کے بعد نازل ہوئی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر کلام بے شک اس کا ناسخ ہے لیکن وہ اس سے مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بلاشبہ یہ آیت اس کے لئے مخصصہ ہے اور اس نے اس سے اس کے بعض مشتملات کو نکال دیا ہے اور اسی طرح حدیث سُبَیْعَه عدت وفات سے متاخر ہے۔ کیونکہ سبیعہ کا قصہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے۔ اور اس کا خاوند سعد بن خولہ تھا اور وہ بنی عامر بن لوی میں سے تھا۔ اور وہ غزوۂ بدر میں شامل ہونے والے صحابہ کرام میں سے تھا۔ جس وقت وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی۔ اور یہ وہی ہیں جن کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مرثیہ کہا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کے وصال سے نصف مہینہ گزرنے کے بعد اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور بخاری نے کہا ہے: چالیس راتیں گزرنے کے بعد (2)۔

اور مسلم نے حضرت عمر بن عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ سبیعہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اس وقت سے حلال ہو چکی ہوں جب سے میں نے حمل کو وضع کر لیا ہے اور آپ ﷺ نے مجھے شادی کی اجازت مرحمت فرما دی اگر میرے لئے ضرورت ہو (3)۔

ابن شہاب نے بیان کیا ہے: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس وقت شادی کر لے جب بچے کی ولادت ہو جائے اگرچہ اس کا خون جاری ہو، مگر یہ کہ اس کا خاوند اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اسی نظریہ پر جمہور علماء اور ائمہ فقہاء ہیں۔

اور حسن، شعبی، نخعی اور حماد نے کہا ہے: نفاس والی عورت جب تک دم نفاس میں ہے نکاح نہیں کرے گی اور انہوں نے دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک وضع حمل اور دوسری نفاس سے پاک ہونا۔ اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے اور ان کے لئے اس

---

1۔ صحیح بخاری، باب و اولات الاحمال الخ، حدیث نمبر 4907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
صحیح بخاری، باب والذین یتوفون الخ، حدیث نمبر 4168، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 729، وزارت تعلیم 3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486، وزارت تعلیم

قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ فلما تعلّت من نفاسها تجملت للخُطّاب (1) (جب وہ اپنے نفاس سے پاک ہو جائے تو وہ دعوت نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کرے) جیسا کہ صحیح مسلم اور ابی داؤد میں ہے۔ کیونکہ تَعَلَّتْ کا اگرچہ اصلی معنی دم نفاس سے پاک ہونا ہے، جیسا کہ خلیل نے بیان کیا ہے، پھر بھی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہاں اس سے مراد اس کے نفاس کے دردوں اور تکلیف کا کم ہونا ہو اور اگر وہ معنی تسلیم کر لیا جائے جو خلیل نے بیان کیا ہے تو پھر اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل سبیعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے "کہ تو حلال ہو گئی جب سے تو نے وضع حمل کر لیا (2)" پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضع کے وقت حلت کو واقع کیا اور اسی پر اسے معلق کیا اور یہ نہیں فرمایا جب تیرا خون منقطع ہوا اور نہ یہ فرمایا کہ جب تو پاک ہوئی۔ لہٰذا وہ صحیح ہے جو جمہور نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کے درمیان اس پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے خاوند رجعت کا مالک ہو یا نہ ہو (یعنی طلاق رجعی ہو یا بائن) وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی، مدبرہ ہو یا مکاتبہ۔ البتہ حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی مدت عدت میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور تمام نے آپس میں اختلاف کیے بغیر اس پر اجماع کیا ہے کہ اگر آدمی فوت ہو جائے اور وہ حاملہ عورت پیچھے چھوڑے اور چار مہینے اور دس دن گزر جائیں تو وہ حلال نہ ہو گی یہاں تک کہ بچے کو جنم دے لے پس اس سے معلوم ہوا کہ مقصود ولادت ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: يَّتَرَبَّصْنَ، التربص کا معنی نکاح میں تاخیر کرنا اور صبر کرنا ہے اور مسکن نکاح سے نہ نکلنا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنی کتاب میں سکنیٰ کا ذکر نہیں کیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے لئے اپنے اس قول کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اَسْكِنُوْهُنَّ اور کتاب اللہ میں لفظ عدت میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو احداد (سوگ کا اظہار کرنا) پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ فقط فرمایا: يَّتَرَبَّصْنَ حدیث طیبہ نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ عدت وفات میں انتظار بلاشبہ احداد کے ساتھ ہے اور احداد سے مراد زیب و زینت سے، خوبصورت رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور خوشبو وغیرہ لگانے سے رکنا اور باز رہنا ہے (3) اور یہ جمہور علماء کا قول ہے۔

حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: احداد کوئی شے نہیں ہے صرف زوج سے انتظار کرنا ہے اور عورت کے لئے مباح ہے کہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فریعہ بنت مالک بن سنان کو فرمایا اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا: اُمکثی فی بیتك حتّٰی یبلغ الکتاب اجله (4) (تو اپنے گھر میں ہی رکی رہ یہاں تک کہ کتاب اللہ کے مطابق عدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) اس نے بیان کیا ہے سو میں نے

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 115، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب عدۃ الحامل، حدیث نمبر 1962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569، وزارت تعلیم　　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

چار مہینے اور دس دن عدت گزاری ہے۔ یہ حدیث ثابت ہے۔ اسے امام مالک نے سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سے بیان کیا ہے اور اسے ان سے امام مالک، ثوری، وہیب بن خالد، حماد بن زید، عیسیٰ بن یونس اور ایک کثیر تعداد نے، ابن عیینہ، القطان اور شعبہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

اور تحقیق امام مالک نے اسے ابن شہاب سے روایت کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

الباجی نے کہا ہے: ان سے ان کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی اسے اخذ کیا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: انہوں نے اس کے ساتھ متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور علمائے حجاز و عراق کے نزدیک یہ حدیث مشہور و معروف ہے کہ متوفی عنہا زوجہا پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں عدت گزارے اور اس سے نہ نکلے۔ اور یہی قول حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ امصار کے فقہاء کی جماعت کا ہے۔

اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں سکنیٰ کا ذکر مطلقات کے بارے ہے اور ان کی دلیل میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔

انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حدیث ایک ایسی عورت روایت کر رہی ہے جس کا علمی مرتبہ معروف نہیں۔ اور سکنیٰ کو واجب کرنا ایک حکم کو واجب کرنا ہے اور احکام ثابت نہیں ہوتے مگر کتاب اللہ کی نص کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے ساتھ یا اجماع کے ساتھ۔

ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو یہ تو بحمد اللہ ثابت ہے اور رہا اجماع تو سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو حجت اس کا قول ہوتا ہے جس قول کی تائید اور موافقت سنت کرے۔ و باللہ التوفیق۔

اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی داؤد کے قول کی مثل مروی ہے اور اسی طرح حضرت جابر بن زید، عطا اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا** اور یہ نہیں فرمایا: یعتددن فی بیوتھن (وہ اپنے گھروں میں عدت گزاریں) لہٰذا عورت جہاں چاہے عدت گزار لے (1)۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

اور عبد الرزاق نے بیان کیا ہے کہ معمر نے زہری سے اور انہوں نے حضرت عروہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلیں اس وقت اس کا خاوند طلحہ بن عبید اللہ شہید ہو چکا تھا اور آپ فتویٰ دیتی تھیں کہ متوفی عنہا زوجہا اپنی عدت کے دوران نکل سکتی ہے (2)۔

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیۃ

فرمایا: ہمیں ثوری نے عبیداللہ بن عمر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں نے اس بارے میں ان کا انکار کیا ہے (1)۔ مزید فرمایا: معمر نے زہری سے ہمیں بیان کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کے بارے میں رخصت دینے والوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو لیا ہے اور اہل ورع وعزم لوگوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو لیا ہے۔ (2)

اور مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسی عورتوں کو مقام بیداء سے لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے اور آپ انہیں حج سے منع کرتے تھے (3) اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اجتہاد ہے۔ کیونکہ آپ اس گھر میں عورت کے لئے عدت گزارنے کے قائل تھے جس میں اس کا خاوند فوت ہوا، آپ عورت کے لئے اسے لازم قرار دیتے تھے اور یہی قرآن وسنت کا تقاضا ہے۔ پس عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے لئے نکلے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

امام مالک نے کہا ہے: اسے واپس لوٹا دیا جائے گا جب تک کہ اس نے احرام نہ باندھا ہو۔

**مسئلہ نمبر 6۔** جب خاوند رہائش گاہ کا ذاتی طور پر مالک ہو تو عورت کے لئے اس میں عدت گزارنا لازم ہے۔ یہی اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ (مثلاً) امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔ اور یہ حدیث فریعہ کی وجہ سے ہے۔ کیا گھر کو فروخت کرنا جائز ہے جب کہ وہ مرنے والے کی ملکیت ہو اور ورثاء نے اس کا ارادہ کیا ہو؟ تو ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں عورت کے عدت گزارنے کی شرط رکھی جائے گی۔

ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ عورت غرماء کی نسبت سکنی کی زیادہ حقدار ہے اور محمد بن حکم نے کہا ہے: یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں یہ شک ہوسکتا ہے کہ اس کی عدت طویل ہو جائے۔

اور ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب سلامتی ہے اور شک نادر ہے، لہٰذا یہ عقود کو فاسد کرنے میں مؤثر نہیں ہوسکتا اور اگر اس میں اس شرط کے ساتھ بیع واقع ہو جائے پھر عورت کو شک پڑ جائے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے کہ وہ اس مقام کا زیادہ حق رکھتی ہے یہاں تک کہ شک ختم ہو جائے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع فسخ کرنے یا اسے مکمل کرنے کا اختیار ہو اور کسی شے کے ساتھ اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ عدت معتادہ داخل ہوا ہے۔ اور اگر بیع زوال شک کی شرط کے ساتھ واقع ہوئی تو وہ فاسد ہے۔

سحنون نے کہا ہے: مشتری کے لئے کوئی حجت نہیں ہے اگرچہ شک پانچ سال تک پھیل جائے کیونکہ وہ عدت پر داخل ہے اور عدت کبھی پانچ سال ہوتی ہے اور اسی طرح اسے ابوزید نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اگر خاوند کا سکنی تو ہو لیکن ذاتی ملکیت نہ ہو تو عورت کے لئے عدت کی مدت میں سکنیٰ ہوگا۔ بخلاف امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے۔ اور اس کی علت فریعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے حالانکہ آپ

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دارالکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 7، صفحہ 28

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

جانتے تھے کہ اس کا خاوند رہائش گاہ کی ذاتی ملکیت نہیں رکھتا: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (1) (تو اپنے گھر میں ہی ٹھہر یہاں تک کہ لکھی ہوئی مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گھر اس عورت کا تھا، پس اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: امکثی فی بیتک (2) کیونکہ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی کہ اس کا خاوند قتل کر دیا گیا ہے اور اس نے اسے ایسے گھر میں چھوڑا ہے جو اس کا نہیں اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور ہمارے لئے معنی کی نوعیت یہ ہے کہ اس نے ایسا گھر چھوڑا جس کے باسی اس کے اس طرح مالک ہوتے ہیں کہ اس میں اس پر کوئی تاوان اور برائی نہیں ہوتی۔ تو لازم ہے کہ اس کی بیوی اسی میں عدت گزارے، اس کی اصل یہی ہے جبکہ وہ ذاتی طور پر اس کا مالک ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب اس نے کرایہ ادا کر رکھا ہو۔ اور رہی وہ صورت جب اس نے کرایہ نہ ادا کیا ہو تو المدونہ میں ہے کہ میت کے مال میں عورت کے لئے کوئی سکنیٰ نہیں اگرچہ وہ خوشحال ہو۔ کیونکہ عورت کا حق اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جس رہائش گاہ کا وہ مکمل طور پر مالک ہوتا ہے اور جس کا کرایہ اور عوض اس نے ادا نہ کیا ہو وہ اس کا کامل طور پر مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عوض کا مالک ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور اس میں بیوی کا کوئی حق نہیں مگر میراث کے سبب نہ کہ سکنیٰ کی حیثیت سے، کیونکہ وہ مال ہے سکنیٰ نہیں ہے اور امام محمد نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ میت کے لئے اس کے مال میں کرایہ لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فریعہ کے لئے ارشاد گرامی: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (3) یہ احتمال رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اس لئے حکم دیا تھا کہ اس کے خاوند نے گھر کا کرایہ ادا کیا ہوا تھا یا یہ کہ اس میں اس کی وفات تک سکونت اختیار کی گئی تھی یا یہ کہ گھر والوں نے اس کے لئے اس میں عدت کو مباح قرار دیا تھا کرائے کے عوض یا بغیر کرائے کے یا ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ اس گھر میں رہنا اس کے لئے لازم ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اس عورت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس اس کے خاوند کی موت کی خبر آتی ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں ہو۔ تو امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس کے گھر اور قرار گاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب اور نخعی نے کہا ہے کہ وہ وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کے پاس خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نہیں جائے گی یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے، مگر یہ کہ خاوند نے اسے اس مکان کی طرف منتقل کیا ہو تو پھر عدت اسی مکان میں لازم ہوگی۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 144، وزارت تعلیم　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 11**۔ اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے صبح کے وقت لوگوں کے عام پھیل جانے کے وقت سے لے کر شام کے بعد ان کے اپنے گھروں میں پرسکون ہونے کے وقت تک گھر سے نکل سکتی ہے اور وہ اپنے اس گھر کے سوا رات کہیں نہیں گزار سکتی۔

اور بخاری اور مسلم میں ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرے گی سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار مہینے اور دس دن ہے۔ وہ نہ تو رنگا ہوا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی کپڑے کے (یعنی عصب کا کپڑا) نہ وہ سرمہ لگا سکتی ہے اور نہ خوشبو لگا سکتی ہے مگر جب وہ پاک ہو تو قسط یا اظفار (1) (خوشبو کی دو قسمیں ہیں) میں سے تھوڑی سی لگا سکتی ہے۔

اور ام حبیبہ کی حدیث میں ہے: ''وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کا اظہار کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن (2) (سوگ کرے گی) الحدیث۔ الاحداد کا معنی ہے: عورت جب تک عدت میں ہے اس کا ہر قسم کی زیب و زینت کو ترک کر دینا مثلاً بھڑکیلا لباس، خوشبو، زیورات، سرمہ اور مہندی لگانا وغیرہ۔ کیونکہ زینت ازواج کی طرف دعوت دیتی ہے، پس سد ذرائع کے طور پر اس سے منع کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حرمات کو تار تار ہونے سے بچانے کے لئے اور عورت زیتون اور تلوں کا تیل کسی خوشبو میں ملا کر اپنے سر کو نہ لگائے۔ کہا جاتا ہے: امرأۃ حاد و مُحِدٌّ سوگ منانے والی عورت۔ اصمعی نے کہا ہے: ہم حدٌّ نہیں پہچانتے۔ اور لایحل کا فاعل وہ مصدر ہے جسے تُحِدُّ مع اَنْ سے بنانا ممکن ہے یہی مراد ہے تو گویا کہ اس نے کہا: الاحداد۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عورت کو ایمان سے متصف کرنا دو قولوں میں سے ایک کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی کتابیہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد نہیں ہے۔ یہ قول ابن کنانہ اور ابن نافع کا ہے۔ اور اسے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر نے کہا ہے اور ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ اس پر بھی مسلمان عورت کی طرح احداد (سوگ کا اظہار کرنا) ہے۔ یہی لیث، شافعی، ابو ثور اور ہمارے عام اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ یہ عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور یہ مسلمان کے تحت کتابیہ عورت پر اسی طرح لازم ہے جس طرح رہائش کی جگہ اور عدت لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں: فوق ثلاث الا علی زوج (3) اس پر دلیل ہے کہ مسلمان عورتوں پر تین دنوں سے زیادہ اپنے ازواج کے سوا کسی پر احداد کرنا حرام ہے اور ان پر تین دن سوگ کا اظہار کرنا مباح ہے۔ مرنے کے بعد آنے والی رات سے لے کر تیسری رات کے اختتام تک اسے شمار کیا جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دیور فوت ہوا اس

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تلبس الحادۃ... الخ، حدیث نمبر 4924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب الکحل للحادۃ، حدیث نمبر 4921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم

حال میں کہ ابھی دن یا رات کا کچھ حصہ باقی تھا تو اسے وہ لغو قرار دے گی اور آنے والی رات سے حساب لگائے گی۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ یہ حدیث اپنے حکم کے عام ہونے کے سبب ان تمام زوجات کو شامل ہے جن سے ان کے ازواج فوت ہو جائیں اور اس میں لونڈیاں، آزاد عورتیں، بڑی اور چھوٹی سب داخل ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ لونڈی اور صغیرہ پر احداد نہیں ہے آپ سے اسے قاضی ابو الولید الباجی نے بیان کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: لونڈی جو کسی کی بیوی ہو وہ جملہ ازواج میں اور عموم اخبار میں داخل ہے اور یہ قول امام مالک، شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور مجھے اس بارے کسی کا اختلاف یاد نہیں ہے اور نہ میں انہیں جانتا ہوں کہ وہ ام ولد پر احداد ہونے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔ کیونکہ وہ زوجہ نہیں ہوتی اور احادیث ازواج کے بارے میں وارد ہیں۔

الباجی نے کہا ہے: صغیرہ جب ان عورتوں میں سے ہو جو امر و نہی کی عقل رکھتی ہیں اور اس کے لئے جو حد بیان کی جائے اس کا وہ التزام کرتی ہو تو اسے احداد کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ اپنی صغر سنی کے سبب کسی شے کو نہ جانتی ہو تو ابن مزین نے عیسیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس کے گھر والے اسے ان تمام چیزوں سے روکیں گے جن سے کبیرہ اجتناب کرتی ہے اور یہ (احداد) اس کے لئے لازم ہے اور صغیرہ پر احداد کے واجب ہونے کی دلیل وہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک عورت نے اپنی اس بیٹی کے بارے پوچھا جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دکھنے لگیں کہ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں'' آپ نے یہ دو بار یا تین بار پوچھا تو آپ ہر بار یہی کہتے رہے ''نہیں'' (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عمر کے بارے نہ پوچھا۔ اگر صغر اور کبر کے سبب حکم مختلف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عمر کے بارے ضرور سوال کرتے تاکہ آپ اس کا حکم بیان فرمائیں اور اس قسم کے مسئلہ میں بیان میں تاخیر جائز نہیں ہوتی اور یہ دلیل بھی ہے کہ ہر وہ جس پر عدت وفات لازم ہے اس پر کبیرہ کی طرح احداد کرنا بھی لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ خضاب بھی اس زینت میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ سوگ والی عورت کے لئے رنگے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے مگر ایسا کپڑا جسے سیاہ رنگ سے رنگا جائے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کی رخصت دی ہے۔ اور زہری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے چاہئے کہ وہ عصب کا کپڑا نہ پہنے۔ اور یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اور المدونہ میں امام مالک نے کہا ہے: وہ یمن کے عصب کا باریک کپڑا نہیں پہن سکتی اور آپ نے موٹے کپڑے کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ باریک کپڑا رنگے ہوئے کپڑے کے قائم مقام ہے (2) اور وہ ریشم، کتان اور

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 314، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تحد المتوفی الخ، حدیث نمبر 4920، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 113، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

روئی کا باریک اور موٹا کپڑا پہن سکتی ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہر اس نے رخصت دی ہے جس نے آپ سے سفید لباس کے بارے کچھ محفوظ کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ رنگ جو باعث زینت ہو سوگ منانے والی عورت اسے مس نہ کرے گی، چاہے وہ باریک ہو یا موٹا ہو۔ اسی طرح قاضی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رنگوں میں سے ہر وہ جس کے ساتھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے زیب و زینت اور حسن کا اظہار کرتی ہیں سوگ منانے والی عورت کو چاہئے کہ وہ اس سے باز رہے۔

اور ہمارے بعض متاخرین مشائخ نے ایسا عمدہ سفید لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے جس سے زیب و زینت کی جاسکتی ہے اور اسی طرح اعلیٰ قسم کا سیاہ لباس (پہننے سے بھی منع کیا ہے)۔

ابن المواز نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ زیور نہیں پہن سکتی اگرچہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہو، فی الجملہ ہر وہ شے جسے ایک عورت اس طور پر پہنتی ہے کہ اسے حسن و خوبصورتی کے اظہار کے لئے بطور زیور استعمال کیا جاتا ہو سوگ منانے والی عورت اسے نہیں پہن سکتی۔

اور ہمارے اصحاب نے جواہرات، یواقیت اور زمرد پر کوئی نص بیان نہیں کی حالانکہ وہ بھی زیور کے معنی میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر** 16۔ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد کے واجب ہونے پر سوائے حسن کے تمام لوگوں نے اجماع کیا ہے حسن نے کہا ہے: احداد واجب نہیں۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے عبداللہ بن شداد بن الہاد نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تین دن تک سوگ کا لباس پہن لے پھر جو چاہے وہ کر(1)۔''

ابن منذر نے کہا ہے: تمام اہل علم میں سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ احداد کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دونوں سرمہ لگا سکتی ہیں، خضاب لگا سکتی ہیں اور جو چاہیں وہ کر سکتی ہیں۔ حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے احداد ثابت ہے اور جس کے پاس بھی یہ احادیث پہنچی ہیں اس نے اسے تسلیم کیا ہے۔ شاید حسن بصری تک یہ احادیث نہیں پہنچیں یا پہنچی تو ہیں لیکن آپ نے اسماء بنت عُمیس کی حدیث کے سبب ان کی تاویل کر لی ہے کہ اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سوگ کا اظہار کرنے کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی اور یہ ان کی بیوی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تین دن کی اجازت عطا فرمائی اور پھر تین دن گزرنے کے بعد اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ طہارت کا اہتمام کرے اور سرمہ لگالے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے کئی وجوہ سے اس کا رد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ حدیث شاذ ہے، اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اسحاق نے بھی کہا ہے۔

1۔ مسند ابن جعد، جلد 1، صفحہ 398، مؤسسہ نادر بیروت

**مسئلہ نمبر 17**۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃاللہ علیہما نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ طلاق والی عورت پر احداد نہیں ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن، ایک ہو یا اس سے زیادہ۔ یہی قول ربیعہ اور عطا کا ہے۔

اور علمائے کوفہ، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی، ابو ثور اور ابو عبید رحمۃاللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اس پر احداد ہے اور یہی حضرت سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، ابن سیرین اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔

حکم نے کہا ہے کہ احداد متوفی عنہا زوجہا کی نسبت اس پر زیادہ مؤکد اور شدید ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں عدت میں ہیں جس کے ساتھ نسب کی حفاظت کی جاتی ہے۔

امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمۃاللہ علیہم نے کہا ہے: احتیاط اسی میں ہے کہ مطلقہ عورت کو زینت سے بچنا چاہئے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی میت پر سوگ کا اظہار کرے مگر خاوند پر چار مہینے اور دس دن (1) (سوگ منائے)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور طلاق دینے والا زندہ ہو اس پر احداد نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایسی طلاق دی جس میں وہ رجوع کا مالک ہو پھر وہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے فوت ہو جائے تو عورت پر عدت وفات ہوگی اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی۔ اور وہ عورت جسے حالت مرض میں تین طلاقیں دی جائیں اس کی عدت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عدت طلاق گزارے گی (2)۔ یہ قول امام مالک، امام شافعی، یعقوب، ابو عبید اور ابو ثور رحمۃاللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہی ہم کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت حیض قرار دی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں دی جائیں اگر وہ فوت ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کا وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور جب وہ اس کی بیوی نہیں تو پھر وہ اس کا خاوند بھی نہیں ہوگا۔

اور ثوری نے کہا ہے: دو عدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی اس کے مطابق عدت گزارے گی اور نعمان و محمد نے کہا ہے: اس پر چار مہینے اور دس دن عدت ہوگی اور اس میں تین حیض مکمل کرے گی۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ علماء کا ایسی عورت کے بارے اختلاف ہے جسے اپنے خاوند کے فوت ہونے یا اس کی طرف سے طلاق کی خبر پہنچی۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: طلاق اور وفات کی صورت میں عدت اس دن سے ہوگی جس دن وہ مرتا ہے یا طلاق دیتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت مسروق، عطا اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ثوری، ابو ثور، اصحاب الرائے اور ابن منذر کا موقف ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم　　2۔ المدونۃ الکبری، کتاب الطلاق، جلد 6، صفحہ 35، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت حسن بصری، قتادہ، عطا خراسانی اور جلاس بن عمرو رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اگر بینہ قائم ہو جائے تو اس کی عدت یوم وفات یا یوم طلاق سے ہوگی اور اگر بینہ قائم نہ ہو تو اس دن سے جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدت کو وفات یا طلاق کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اگر وہ اس کی موت کے بارے جان لے اور احداد چھوڑ دے تو عدت گزر جاتی ہے اور جب اس نے علم نہ ہونے کے سبب احداد چھوڑ دیا تو یہ اور زیادہ آسان ہے کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ صغیرہ کی عدت گزر جاتی ہے اور اس پر احداد نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو اور وہ خاوند کی طلاق یا اس کی وفات کا علم نہ رکھتی ہو پھر وہ اپنا حمل وضع کر لے تو بلا شبہ اس کی عدت گزر گئی اور اس مسئلہ اور مختلف فیہا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور ان کی دلیل جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی یہ ہے کہ زیب و زینت ترک کرنے کے سبب عدت عبادت ہے اور وہ قصد اور نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور قصد نہیں ہو سکتا مگر علم کے بعد۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 20۔** آزاد، لونڈی، صغیرہ، کبیرہ، وہ عورت جو حیض کی عمر کو نہ پہنچے، وہ جو حائضہ ہو اور حیض سے ناامید ہو جائے اور کتابیہ عورت اس کے ساتھ دخول ہوا یا نہیں جبکہ وہ غیر حاملہ ہو ان تمام پر عدت وفات لازم ہوتی ہے اور سوائے لونڈی کے ان تمام کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ کیونکہ اس ارشاد میں آیت عام ہے: **يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا** اور وہ لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت دو مہینے اور پانچ راتیں ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی عدت بالاجماع آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے مگر وہ جو اصم سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آزاد اور لونڈی کو اس میں برابر قرار دیا ہے، حالانکہ اجماع اس سے پہلے ہے لیکن اپنے بہرے پن کے سبب (1) اس نے سنا نہیں۔

الباجی نے کہا ہے: اس بارے میں ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے اور وہ ان سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہے: لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کی مثل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصم کا قول من حیث النظر صحیح ہے کیونکہ وہ آیات جو مہینوں اور حیضوں کے ساتھ وفات اور طلاق کی عدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ لونڈی اور آزاد کے حق میں عام ہیں۔ پس اس نقطۂ نظر سے آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔ کیونکہ عمومات میں آزاد اور لونڈی کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح نکاح میں لونڈی اور آزاد برابر ہیں اسی طرح وہ عدت میں بھی اس کے ساتھ برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک سے روایت ہے کہ کتابیہ عورت تین حیضوں کے ساتھ عدت گزارے گی تب اس سے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 210، دار الفکر

براءت رحم ہوگی اور یہ آپ سے انتہائی فاسد قول منقول ہے، کیونکہ اس قول نے اسے (کتابیہ کو) آیت وفات کے عموم سے خارج کر دیا ہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہے اور اس نے اسے آیت طلاق کے عموم میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ اس میں سے نہیں ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس کی بنا ہے جو مدونہ میں ہے اس پر عدت نہیں اگر وہ غیر مدخول بہا ہو کیونکہ اس کی براءت رحم معلوم ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد کسی مسلمان یا غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے کیونکہ جب اس پر عدت وفات نہیں ہے اور نہ ہی دخول کے سبب استبراء رحم لازم ہے تو پھر وہ ازواج کے لئے حلال ہے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اور علماء نے ام ولد کی عدت کے بارے اختلاف کیا ہے جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔

پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یہی تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ ان میں سے حضرت سعید بن مسیب، حضرت زہری، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم اور کئی اور بھی ہیں اور یہی امام اوزاعی اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔

اور ابوداؤد اور دارقطنی نے قبیصہ بن ذؤیب سے اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مشتبہ نہ بناؤ کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ہے یعنی ام ولد کے حق میں۔ یہ لفظ ابوداؤد کے ہیں اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ موقوف ہے۔ اور یہی درست ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ قبیصہ نے عمرو سے سماع نہیں کیا(2)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور ابوعبید نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی عدت تین حیض ہے اور یہی قول حضرت عطا، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ عدت آزادی کی حالت میں واجب ہو رہی ہے لہٰذا یہ واجب ہے کہ عدت کامل ہو اور اس کی اصل آزاد عورت کی عدت ہے۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور نے کہا ہے: اس کی عدت ایک حیض ہے(3) اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور طاؤس سے روایت ہے کہ اس کی عدت اس آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے اور اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ وہ سب سے قلیل مدت ہے جو کچھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دار الفکر

2۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 2، صفحہ 310، دار المحاسن قاہرہ۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب فی عدۃ ام الولد، حدیث نمبر 1964، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 120، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں کوئی سنت نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ آزادی کی حالت میں اس کی عدت میں ان کے اختلاف کا ذکر حالت وفات میں اختلاف کی طرح برابر برابر ہے۔ مگر امام اوزاعی نے کہا ہے کہ آزادی کی حالت میں اس کی عدت تین حیض ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے اصح قول امام مالک کا ہے، کیونکہ الله سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ**۔ پس حیضوں کے انتظار میں یہ شرط ہے کہ وہ طلاق کے سبب ہو۔ پس اس کے ساتھ کسی غیر سبب سے ہونے کی نفی ہوگئی۔ اور الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا**۔ پس اس کے وجوب کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے کہ انتظار کرنے والی بیوی ہو۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی اس کے خلاف ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بے شک یہ ملک یمین کے سبب موطوءہ لونڈی ہے پس اس کا استبراء رحم ایک حیض سے ہے۔ لونڈی میں اصل یہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو کیا ام ولد کی عدت محض استبرا ہے یا عدت ہے؟ پس اس کے بارے ابو محمد نے اپنی معونت میں ذکر کیا ہے کہ ایک حیض استبراء ہے اور عدت نہیں ہے۔ اور المدونہ میں ہے کہ ام ولد پر عدت ہے اور اس کی عدت ایک حیض ہے جس طرح کہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے کہا: یہ عدت ہے تو امام مالک نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی سے وعدہ کرے جو اس سے نکاح کرلے گا مگر یہ کہ ایک حیض گزر جائے (1)۔

ابن القاسم نے کہا ہے: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ہی رات گزارے گی اور آپ نے اس کی مدت استبرا کے لئے عدت کا حکم ثابت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہوں یا ایسی مطلقہ جس پر خاوند کو رجوع کا حق ہو درآنحالیکہ وہ حاملہ ہو اس کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** (الطلاق: 6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں۔)

اور حاملہ متوفیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات جابر بن عبدالله، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطا، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، عبدالملک بن یعلی، یحییٰ انصاری، ربیعہ، مالک، احمد اور اسحاق رضی اللہ عنہم ورحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو عبید نے اصحاب الرائے سے اسے بیان کیا ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے کل مال سے نفقہ ہوگا اور یہ قول حضرت علی اور حضرت عبدالله رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، شریح، ابن سیرین، شعبی، ابو العالیہ، نخعی، جلاس بن عمرو، حماد بن ابی سلیمان، ایوب سختیانی، سفیان ثوری اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 121، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

ابن منذر نے کہا ہے: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں، کیونکہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ہر اس آدمی کا نفقہ جس کے نفقہ پر اسے زندگی میں مجبور کیا جا سکتا ہے مثلاً اس کے بچے، بیوی اور اس کے والدین وہ نفقہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو اسی طرح اس کی ازواج میں سے حاملہ کا نفقہ بھی اس سے ساقط ہو جائے گا۔

اور قاضی ابو محمد نے کہا ہے: کیونکہ حمل کا نفقہ دین ثابت نہیں ہے کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے مال سے متعلق ہو جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنگدستی کے سبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو موت کے سبب اس کا ساقط ہونا زیادہ اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔

**مسئلہ نمبر 24۔** قولہ تعالیٰ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ علماء نے ان چار ماہ اور دس دن میں اختلاف کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے لئے وقت مقرر فرمایا ہے کہ کیا ان میں سے وہ ایک بار حیض آنے کی محتاج ہوتی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا ہے: جب وہ عورت موطوءہ ہو تو اس کی براءت رحم نہ ہوگی مگر اس حیض کے ساتھ جو اسے چار مہینے اور دس دن کے دوران آئے گا ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گی اور بعض دوسروں نے کہا ہے: اس پر چار ماہ اور دس دن سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنے آپ کو واضح شک میں دیکھے۔ کیونکہ اس مدت میں حیض نہیں آتا یا ان میں سے ہو جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا یا اسے پہچان لیا جائے کہ اس کا حیض اسے نہیں آئے گا مگر اس مدت سے زیادہ اور اکثر مدت میں۔

**مسئلہ نمبر 25۔** قولہ تعالیٰ: وَّعَشْرًا۔ وکیع نے ابو جعفر الرازی سے، انہوں نے ربیع بن انس سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ چار مہینوں کے ساتھ دس دن کو کیوں ملایا گیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ اتنی مدت میں روح پھونکی جاتی ہے۔ عنقریب سورۃ الحج میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اصمعی نے کہا ہے: بے شک ہر حاملہ کا بچہ اس کے حمل کی نصف مدت میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس یہ بھی حرکت کرنے لگے گا (یعنی فھی **مرکضتین** ذکر کیا ہے) اور کسی اور نے کہا ہے: ارکضت فی مرکضة (اس نے حرکت دی پس یہ حرکت کرنے والی ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و مرکضة صریحی ابوھا　　تھان لھا الغلامة والغلام

اس میں **مرکضة** اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور خطابی نے کہا ہے: **قولہ: وَّعَشْرًا** اس سے مراد راتوں سمیت دن ہیں۔ واللہ اعلم

اور مبرد نے کہا ہے: **العشر** مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد مدت ہے۔ اس کا معنی ہے و عشر مدد ہر مدت ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ پس رات اپنے دن کے ساتھ مل کر زمانے کی ایک مدت معلوم ہے اور کہا گیا ہے: عشرۃ نہیں فرمایا راتوں کے حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کیونکہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے اور ایام ان کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ وَّعَشْرًا لفظ کے اعتبار سے زیادہ خفیف ہے(1)۔ پس راتوں کو دنوں پر غلبہ دیا جاتا ہے جب یہ تاریخ میں جمع ہو جائیں، کیونکہ مہینوں کی ابتدا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ

رات سے چاند طلوع ہونے کے وقت ہوتی ہے تو جب مہینے کی ابتدا اور پہلا حصہ رات ہے تو پھر رات کو ہی غلبہ دیا جائے گا۔ آپ کہتے ہیں: صمنا خمسا من الشھر ہم نے مہینے سے پانچ روزے رکھے۔ پس راتیں غالب ہوتی ہیں اگرچہ روزہ دن کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور علمائے کوفہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن اور راتیں ہیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: پس اگر کسی عقد کرنے والے نے اس سے اس قول کی بنا پر نکاح کیا درآنحالیکہ چار مہینے اور دس راتیں گزر چکی تھیں تو وہ نکاح باطل ہوگا یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر جائے۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اس کی مدت چار مہینے اور دس راتیں گزر گئی تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور وہ اس لئے کہ انہوں نے عدت کو مبہم دیکھا تو تانیث کو غلبہ دے دیا اور اسے راتوں پر محمول کر دیا۔ اور یہ موقف فقہاء میں سے امام اوزاعی اور متکلمین میں سے ابوبکر الاصم نے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اربعة اشھر و عشر لیال پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے اجل (مدت) کی نسبت ان (عورتوں) کی طرف کی ہے کیونکہ وہ انہیں کے معاملے کی حد بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد ہے عدت کا گزرنا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے اور یہ اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو حکام اور اولیاء کے لئے ہے (1)۔ فِيمَا فَعَلْنَ اس سے مراد شادی کرنا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا ہے (یعنی) بناؤ سنگھار کرنا اور احداد کو ترک کرنا وغیرہ (2)۔ بِالْمَعْرُوفِ یعنی ایسے طریقے سے جس کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے یعنی ازواج کو دیکھنے کا اختیار اور عقد ہونے سے پہلے مہر مقرر کرنا وغیرہ کیونکہ یہ اولیاء کا حق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ انہیں عدت کے دوران شادی کے لئے بناؤ سنگھار کرنے اور آراستہ ہونے اور حسن و خوبصورتی کا اظہار کرنے سے منع کریں۔ اس میں اسحاق کے اس قول کا رد بھی ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض میں داخل ہو جائے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور پہلے خاوند کے لئے رجعت کا حق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ غسل کرلے اور شریک سے روایت ہے کہ اس کے خاوند کے لئے رجعت کا حق رہتا ہے جب تک وہ غسل نہ کرے اگرچہ بیس سال بعد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ اور یہاں بلوغ الاجل سے مراد تیسرے حیض کے خون میں اس کے داخل ہونے کے ساتھ عدت کا گزرنا ہے اور اس میں غسل کا ذکر نہیں تو جب اس کی عدت گزر گئی وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور بناؤ سنگھار میں سے جو بھی وہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اگر وہ صحیح

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

ہے تو وہ استحباب پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: عن ابن عباس من أن المرأة اذا طعنت فی الحیضة الثالثة بانت و انقطعت رجعة الزوج، و هذا قول اسحاق المتقدم و هو ضعیف) حاشیہ قرطبی

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

''اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پکی کرلو نکاح کی گرہ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ یعنی کوئی گناہ نہیں، جُنَاحَ کا معنی گناہ ہے، یہی معنی شریعت میں اصح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شاق گزرنے والا امر ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ معنی اصح ہے۔ شماخ نے کہا ہے:

اذا تعلو براکبها خلیجا تذکر مالدیه من الجناح

اس میں الجناح سے مراد مشقت آمیز امر ہے۔

اور قولہ تعالیٰ: عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ اس میں خطاب تمام لوگوں کو کیا گیا ہے: اور حکما اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دل میں معتدہ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہو(1)۔ یعنی عدۃ وفات میں اشارۃ پیغام نکاح دینے میں تم پر کوئی بوجھ اور گناہ نہیں۔ تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اس سے مراد افهام المعنى بالشئ المحتمل له ولغیرہ ہے یعنی کسی معنی کو ایسی شے کے ساتھ سمجھا دینا جو اس معنی اور دوسرے کا احتمال رکھتی ہو اور یہ عرض الشی سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی شے کی جانب اور طرف ہے۔ گویا وہ اس طرح مطلوبہ شے کے اردگرد گھومتا رہتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ میرے اس قول سے ہے عرضت الرجل یعنی میں نے آدمی کو بطور تحفہ ہدیہ پیش کیا اور حدیث طیبہ میں ہے: ان رکبا من المسلمین عرضوا رسول الله ﷺ و ابابکر ثیابا بیضا۔ ای اهدوا لهما۔ کہ مسلمان شہسواروں نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے بطور تحفہ پیش کیے۔ اور کلام کے ساتھ تعریض کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی تک بات اس طرح پہنچاتا ہے کہ وہ اس کا معنی ومفہوم سمجھ جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی ومفہوم کے مشابہ ہو گا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور تصریح کے جو قریب تر کلام ہے وہ حضور نبی رحمت ﷺ کا وہ قول ہے جو آپ نے فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کیا: کونی عند ام شریك ولا تسبقینی بنفسك(1) (تو ام شریک کے پاس رہ اور اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا) اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو بالاجماع اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تعریض کی تفسیر میں بہت سے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ دو قسموں کی طرف لوٹتا ہے:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اس کا ذکر اس کے ولی سے کرے اور اسے اس طرح کہے لا تسبقنی بها (تو اس کے بارے مجھ سے (کسی اور کی طرف) آگے نہ بڑھنا۔) اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے اس کی طرف اس سے اشارہ کرے۔ اور اسے اس طرح کہے: بلاشبہ میں شادی کا ارادہ رکھتا ہوں یا تو بڑی خوبصورت ہے یا بلاشبہ تو صالحہ اور نیک ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھے خیر و برکت عطا فرمانے والا ہے۔ میں تجھ سے رغبت رکھتا ہوں، کون ہے جو تجھ سے اعراض کر سکتا ہے، بے شک تجھ میں رغبت بہت زیادہ ہے، بلاشبہ مجھے کسی عورت کی حاجت وضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی امر مقدر فرمائے گا تو وہ ہو جائے گا۔

یہ تمام امام مالک اور ابن شہاب کی بیان کردہ تمثیلات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا(2)''۔ اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کر دے جبکہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو۔ ابراہیم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃً شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

ابو جعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے اسی طرح کہا ہے۔ سکینہ بنت حنظلہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن علی رضی اللہ عنہما میرے پاس اجازت لے کر آئے اور میرے خاوند کے فوت ہونے کے وقت سے ابھی میری عدت نہیں گزری تھی اور انہوں نے کہا: تو

---

1۔ [illegible]، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ　　2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 619، دار احیاء التراث العربیۃ

جانتی ہے رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میری قرابت ہے اور عرب میں میرے مقام و مرتبہ کو بھی تو جانتی ہے۔ میں نے کہا: اے ابوجعفر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، بلاشبہ تم ایسے آدمی ہو جس سے مؤاخذہ کیا جائے گا، تم مجھے میری عدت کے دوران پیغام نکاح دے رہے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ میں نے تو تجھے رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی قرابت کے بارے بتایا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہو چکی تھیں اور ارشاد فرمایا: ''یقیناً تو جانتی ہے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا پسندیدہ ہوں اور میری قوم میں میرے مقام سے بھی تو آگاہ ہے۔'' یہی پیغام نکاح تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(1) اور معتدہ کے پاس ہدیہ بھیجنا بھی جائز ہے اور یہ بھی تعریض میں سے ہے۔ سحنون اور بہت سے علماء نے یہی کہا ہے اور ابراہیم نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضرت مجاہدؒ نے یہ ناپسند کیا ہے کہ کوئی اسے یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ کرنا اور وہ اسے ہی خفیہ معاہدہ جان لے(2)۔

قاضی ابومحمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کی تاویل کی بنا پر جائز ہے جو آپ نے فاطمہ کو فرمایا تھا کہ یہ اس کے لئے اس آدمی کے بارے میں رائے کے طور پر ہے جو اس سے شادی کرے گا نہ کہ اس طور پر کہ اس سے اس نے اپنی ذات کا ارادہ کیا ہو، کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے خلاف ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الخطبہ خاء کے کسرہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا۔ کہا جاتا ہے: خطبها يخطبها خطبا و خطبة (پیغام نکاح دینا) اور رجل خطاب کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے

بَرَّحَ بالعَيْنَيْن خطاب الكُثَب　　يقول انی خاطِبٌ وقد كَذَبْ
وانما يخطُبُ عُسًّا مَنْ حَلَبْ (4)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا۔ اور الخطیبی کا معنی الخِطبة (منگنی) ہے۔

عدی بن زید نے کہا ہے، وہ جذیمہ الابرش کی طرف سے الزباء کی منگنی کے ارادہ کا ذکر کرتا ہے:

لخطّيبَىَ التي غدرت و خانت　　و هُنّ ذواتُ غائلةِ لِحُيِنَا

اور الخِطْبُ سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: هی خطبه و خطبته التی يخطبها۔ یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی منگیتر وہ ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے۔ اور الخِطبة فِعلةٌ کے وزن پر ہے جیسے جِلسةٌ اور قِعدةٌ۔ اور الخُطبة خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: خُطبہ وہ ہے جو اس کے اول اور آخر میں ہو۔ اور اسی طرح وہ جو فُعْلة کے وزن پر ہو جیسے الاکلة

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن قاہرہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

(خارش) اور الضغطة (تنگی، ایک دفعہ کا بھینچنا) ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ الاکنان کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا۔

کہا جاتا ہے: کننته و اکننته دونوں کا معنی ایک ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا۔

اور کہا گیا ہے: کننته یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آ پہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو۔ اور اسی سے بَيْضٌ مكنون اور دُرٌ مكنون ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور موتی) اور اکننته کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے ڈھانپ لیا۔

اور کہا جاتا ہے: كَنَنْتُ الشيء (من الأجرا) جب تو اسے چھپالے کپڑے سے، یا گھر سے یا زمین وغیرہ سے اور اكننت الأمر في نفسي: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ اور عربوں سے یہ جملہ نہیں سنا گیا۔

كننته في نفسي اور کہا جاتا ہے: اَكَنَ البيتُ الانسان گھر نے انسان کو چھپا لیا وغیر ہا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسا وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بناء ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور جاننے کی رخصت دی ہے، نفوس کے غلبہ اور ان کے مغرور ہونے کے سبب اور انسان کے اس کی ملکیت سے کمزور اور ضعیف ہونے کے سبب۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ شوافع نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تعریض میں حد واجب نہیں ہوگی۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے تعریضاً پیغام نکاح دینے میں گناہ کو اٹھا لیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ قذف کے بارے تعریض کرنا حد کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تعریض کو تصریح کے مقام پر نہیں رکھا۔ ہم نے کہا ہے: یہ (قول) ساقط (الاعتبار) ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پیغام نکاح میں نکاح کے بارے تصریح کی اجازت نہیں دی۔ اور اس نے ایسی تعریض کی اجازت عطا فرما رکھی ہے جس سے نکاح کو سمجھا جا سکتا ہو۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ تعریض سے قذف سمجھی جائے گی اور عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اور یہ تعریض کرنے والے پر حد کو ثابت کر دے گا تا کہ فاسق لوگوں کو ایسی تعریض کے ذریعہ عزتوں کو ہاتھ میں لینے کا راستہ نہ مل جائے جس سے وہی سمجھا جاتا ہو جو تصریح سے سمجھا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ۔ سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم انہیں پیغام نکاح دو گے (1)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ای علی سِرٍّ یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو۔ اس میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

سِرًّا سے پہلے حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ فعل ان میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور سِرًّا کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے: بعض نے کہا ہے اس کا معنی نکاح ہے یعنی کوئی آدمی اس معتدہ کو یہ نہ کہے ''تو مجھ سے شادی کر لے'' بلکہ تعریض کرے اگر ارادہ ہو۔ اور اس سے خفیۃً یہ عہد و پیمان نہ لے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، مالک اور آپ کے اصحاب، شعبی، مجاہد، عکرمہ، سدی اور جمہور اہل علم رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اس تاویل پر سِرًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے بمعنی مستسرین۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السر سے مراد زنا ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی عدت کے دوران زنا اور پھر عدت کے بعد نکاح کا وعدہ نہ لے۔ اس کا یہ معنی جابر ابن زید، ابو مجلز، لاحق بن حمید، حسن بن ابی الحسن، قتادہ، نخعی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں السر بمعنی زنا ہے، یعنی تم ان سے زنا کا وعدہ نہ لو (2) اور اسے طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور اس معنی میں اعشیٰ کا قول ہے:

فلا تقربَنَّ جَارَةً اِنَّ سرَّها　　علیك حرامٌ فأنكحَن أو تَأَبَّدا

تو کسی پڑوسن کے قریب نہ جا بلاشبہ اس کے ساتھ زنا کرنا تجھ پر حرام ہے پس تو اس سے نکاح کر لے ورنہ تو وحشی ہو جائے گا۔

اور حطیئہ نے کہا ہے:

و یحرم سرّ جارتھم علیھم　　و یاکل جارُھم أنف القِصاع (3)

اور ان پر اپنی پڑوسن کے ساتھ زنا کرنا حرام ہے ورنہ ان کا پڑوسی سارے پیالے کو کھا جائے گا۔

اور یہ بھی قول ہے کہ السر کا معنی جماع ہے۔ یعنی تم انہیں نکاح کی ترغیب دینے کے لئے اپنے آپ کو کثرت جماع سے متصف نہ کرو، کیونکہ بیوی کے سوا کسی اور کے ساتھ جماع کا کرنا فحش ہوتا ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور امرؤالقیس نے کہا ہے:

ألَا زعمت بَسْباسة الیومَ أنني　　کبِرْتُ وألَّا یُحسِن السِرَّ أمْثَالِي

اور رؤبہ نے کہا ہے:

**فکُفّ عن اسرارھا بعد العسق**

یعنی اس کے لئے اپنے کو لازم کر لینے کے بعد اس کے جماع سے رک جا۔ اور کبھی السر کا معنی عقد نکاح ہوتا ہے، چاہے وہ سراً ہو یا جہراً ہو۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

فلن یطلبوا سِرَّھا للغِنَی　　ولن یُسْلِموھا لازھادھا

مراد یہ ہے کہ وہ ہرگز اس کے مال کی کثرت کے پیش نظر اس کے نکاح کا مطالبہ نہ کریں اور نہ وہ اسے مال کم ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

اور ابن زید نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا کا معنی یہ ہے کہ تم ان سے نکاح نہ کرو اور پھر تم اسے چھپاتے پھرو۔ بلکہ جب وہ حلال ہو جائے تو تم اسے ظاہر کرو اور ان سے دخول کرو (1)۔ اور یہی پہلے قول کا معنی ہے۔ پس اس بنا پر ابن زید پہلے قول کے ہی قائل ہیں۔ اور بلاشبہ انہوں نے شاذ قرار دیا ہے کہ عقد کو مواعدۃ کا نام دیا جائے اور یہ پریشانی اور اضطراب ہے (2)۔ مکی اور ثعلبی نے ان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ (3)

**مسئلہ نمبر 8**۔ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: امت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی عورت کے لئے اپنے بارے میں عدت کے دوران نکاح کا وعدہ کرنا اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کے بارے میں اور آقا کے لئے اپنی لونڈی کے بارے میں وعدہ کرنا مکروہ ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ ولی جو جبر کرنے کا مالک نہیں ہوتا تو میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں اور اگر وہ نکاح کر دے تو میں اسے فسخ نہیں کرتا۔

امام مالک نے ایسے آدمی کے بارے میں جو عدت میں وعدہ کرتا ہے اور پھر عدت کے بعد شادی کرتا ہے کہا ہے: میرے نزدیک اس کی تفریق زیادہ پسندیدہ ہے چاہے اس سے دخول کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ تفریق ایک طلاق ہوگی اور جب وہ حلال ہو جائے تو پھر وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دے سکے گا۔ یہ ابن وہب کی روایت ہے (4) اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان کے درمیان وجوباً تفریق کر دی جائے گی۔ ابن القاسم نے بھی یہی کہا ہے اور ابن الحارث نے ابن ماجشون سے اسی طرح بیان کیا ہے اور کچھ زائد کیا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ یہ تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی (5)۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اگر اس نے دعوت نکاح صراحۃً دی اور عورت نے بھی صراحۃً اس کا جواب دیا اور عقد نکاح نہ ہوا یہاں تک کہ عدت گزر گئی تو نکاح ثابت ہوگا اور دونوں کے لئے تصریح مکروہ ہوگی۔ کیونکہ نکاح منگنی کے بعد واقع ہوا ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یہ استثنا منقطع ہے اور الا بمعنی لکن ہے (6)۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اِلَّا خَطَاً بمعنی لکن خطأ۔ اور قول معروف سے مراد ایسی تعریض ہے جو شرعاً مباح ہو اور ضحاک نے ذکر کیا ہے کہ قول معروف میں سے یہ ہے کہ وہ معتدہ کو کہے: تو میرے لئے اپنے آپ کو محبوس کر لے کیونکہ مجھے تیرے ساتھ رغبت ہے اور وہ کہتی ہے: میں بھی اسی طرح ہوں (7) تو یہ ایک دوسرے سے وعدہ کرنے کے مشابہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ

اس میں نو مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً — 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً — 6۔ ایضاً — 7۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عزم کے معنی میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: عزم الشیء و عزم علیہ (اس نے شے کا ارادہ کیا اور اس پر پختہ ہو گیا) اور یہاں معنی ہے: ولا تعزموا علی عقدۃ النکاح (اور تم نکاح کی گرہ پر پختہ نہ ہو جاؤ) اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن کریم سب سے فصیح کلام ہے۔ پس جو اس میں وارد ہوا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی صحت و فصاحت میں کوئی شک کیا جا سکتا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرہ: 227) (اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں) اور یہاں فرمایا: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تو اس کا معنی ہے لا تعزموا علی عقدۃ النکاح فی زمان العدۃ (تم عدت کے دوران نکاح کی گرہ پختہ نہ کرلو۔) پھر اس سے علیٰ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سیبویہ نے کہا ہے: ضُرِبَ فلانٌ الظھرَ والبطنَ یعنی علی الظھر والبطنِ (فلاں کو پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا) سیبویہ نے کہا ہے: ان اشیاء میں حذف پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَلَا تَعْقِدُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ ہو کیونکہ تَعْزِمُوْا اور تعقدوا کا معنی ایک ہے (اور تم نکاح کی گرہ کو پختہ نہ باندھ لو) اور کہا جاتا ہے: تَعْزُمُوْا یعنی زا کے ضمہ کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ اس سے مراد عدت کا مکمل ہونا ہے اور الکتاب سے یہاں مراد وہ حد ہے جو مقرر کی گئی اور مدت میں سے وہ مقدار ہے جسے بیان کر دیا گیا، لکھ دیا گیا اور اس کا نام کتاب رکھا ہے کیونکہ کتاب اللہ نے اس حد کو بیان کیا ہے اور اسے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کتاب اللہ علیکم۔

اور اسی طرح فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النساء) (بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر) پس الکتاب کا معنی الفرض (مقرر کرنا) ہے۔ یعنی یہاں تک کہ مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ (حتی یبلغ الفرض أجلہ)

کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے حتی یبلغ فرض الکتاب أجلہ یعنی کتاب کی مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس تاویل کی بنا پر الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور پہلی تاویل پر اس میں کوئی حذف نہیں ہے، سو وہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران عقد نکاح کو حرام قرار دیا ہے اپنے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ یہ محکم ہے، اس کی تاویل پر اجماع ہے کہ بلوغ اجلہ سے مراد انقضاء العدۃ (عدت کا گزرنا) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ عدت میں تعریض کو مباح قرار دیا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الآیہ۔

اور علماء نے اس کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ انہوں نے تعریض کے الفاظ میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر

چکا ہے۔ اور انہوں نے اس آدمی کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت میں پیغام نکاح دیتا ہے درآنحالیکہ وہ جاہل ہو یا وہ اس سے وعدہ لیتا ہے اور عدت کے بعد عقد نکاح کرتا ہے اور اس سے پہلی آیت میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی نے عدت میں نکاح کی گرہ پختہ کر لی اور اس پر اطلاع پالی گئی اور حاکم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا اور وہ دخول سے پہلے ہوا تو وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ بھی نکاح میں دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ نکاح کا ایک خواہشمند ہو سکتا ہے (اور پیغام نکاح بھیج سکتا ہے) امام مالک نے یہی کہا ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں اس باب کے آخر میں بیان کیا ہے جس کے پیچھے ضرب اجل المفقود ہے۔

اور ابن جلاب نے امام مالک سے ایک روایت بیان کی ہے کہ عقد میں تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اگرچہ نکاح کا فسخ دخول سے پہلے ہو (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نکاح عدت میں کیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تحریم دائمی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس جائے۔ اور اگر عقد عدت میں ہوا اور وہ اس کے پاس داخل ہوا اس کی عدت گزرنے کے بعد تو پھر مسئلہ یہ ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ پس اہل علم میں سے ایک قوم نے کہا ہے: یہ عدت میں دخول کی طرح ہے۔ لہٰذا دونوں کے درمیان تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اور اہل علم میں سے ایک گروہ نے کہا ہے اس سے تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے: تحریم دائمی ہوگی اور ایک بار کہا: اس سے تحریم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل واضح ہے۔ آپ کے دونوں قول المدونہ میں طلاق سنت کے بیان میں ہیں اور اگر اس نے عدت میں دخول کیا تو پھر مسئلہ یہ ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی۔ امام مالک اور لیث نے کہا ہے: ملک یمین کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے مزنی کی اس کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ دونوں کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہوگا جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (4)۔ اسے امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔

اور ثوری، علمائے کوفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور تحریم دائمی نہ ہوگی بلکہ ان کے درمیان فسخ نکاح کیا جائے گا پھر وہ اس کی عدت گزارے گی پھر وہ دعوت نکاح دینے والوں میں سے ایک دعوت نکاح دینے والا ہو جائے گا اور انہوں نے اس پر علماء کے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 504، وزارت تعلیم

اس سے شادی کرنا حرام نہیں ہوتا۔ تو اس طرح دوران عدت اس کا اس سے وطی کرنا بھی ہے۔ انہوں نے کہا: یہی حضرت علی بڑتھ کا قول ہے، اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن مسعود بڑتھ اور حسن بڑتھ سے بھی اسی کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور عبدالرزاق نے ثوری عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بڑتھ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں، جمع ہو سکتے ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے المنتقی میں بیان کیا ہے: عدت میں نکاح کرنے والا اس سے خالی نہ ہوگا کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو یا وہ اس کے پاس عدت میں جائے گا یا عدت کے بعد۔ پس اگر وہ عدت میں اس کے پاس گیا ہے تو پھر مشہور مذہب یہ ہے کہ تحریم دائمی ہوگی۔ یہی امام احمد بن حنبل رطیقلیہ نے کہا ہے اور شیخ ابوالقاسم نے تفریع میں بیان کیا ہے کہ جب آدمی عدت میں عورت سے شادی کرتا ہے، چاہے وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو، یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا حرام ہے تو اس کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تحریم دائمی ہوگی (کبھی بھی وہ عورت اس پر حلال نہ ہو سکے گی) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ وہ زنا کرنے والا ہے اور اس پر حد لازم ہے اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے جائز ہے کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہی امام شافعی (1) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔

پہلی روایت کی وجہ یہ ہے اور وہی مشہور ہے کہ وہ حضرت عمر بڑتھ کے اس طرح فیصلہ کرنے اور لوگوں میں اس کے نافذ ہونے سے ثابت ہے اور آپ کے فیصلے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے تھے اور پھیل جاتے تھے اور آپ سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ اسی پر اجماع ہے۔

قاضی ابو محمد نے بیان کیا ہے کہ اس کی مثل حضرت علی بن ابی طالب بڑتھ سے بھی مروی ہے اور اس کے مشہور ہونے اور عام منتشر ہونے کے باوجود دونوں کے ساتھ اختلاف کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی اجماع کا حکم ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممنوع وطی ہے اور اس کی تحریم دائمی نہیں۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی شادی خود کرے یا نکاح متعہ کرے یا زنا کرے (تو ان سے دائمی تحریم ثابت نہیں ہوتی۔)

اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: اس بارے میں امام مالک کا مشہور مذہب نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے سند بیان کی ہے: حدثنا عبدالوارث بن سفیان حدثنا قاسم بن اصبغ عن محمد ابن اسماعیل عن نعیم بن حماد عن ابن المبارک عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب بڑتھ کے پاس خبر پہنچی کہ قریش کی ایک عورت سے ثقیف کے ایک آدمی نے اس کی عدت میں شادی کی تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور ان دونوں کو سزا دی اور فرمایا: تو کبھی اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور آپ نے اس کا مہر بیت المال سے دے دیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور حضرت علی بڑتھ تک بھی پہنچی، تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317-318، دار الکتب العلمیہ

رحم فرمائے۔ مہر اور بیت المال کا کیا تعلق ہے۔ وہ دونوں جاہل تھے۔ پس امام کو چاہئے کہ وہ ان دونوں کو سنت کی طرف لوٹا دے۔ عرض کی گئی: آپ ان دونوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے لئے مہر وہ ہے جس کے عوض اس کی فرج کو حلال سمجھا گیا اور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور ان پر بطور حد کوڑوں کی سزا نہ ہوگی، اور وہ پہلے خاوند کی جانب سے اپنی عدت کو مکمل کرے گی، پھر دوسرے خاوند کی جانب سے کامل تین حیض عدت مکمل کرے گی، پھر اگر وہ چاہے تو اسے دعوت نکاح دے سکتا ہے(1)۔ پس یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! جہالتوں کو سنت کی طرف لوٹا دو۔ الکیا الطبری نے کہا ہے: فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ آدمی جس نے کسی عورت کے ساتھ عقد نکاح کیا درآنحالیکہ وہ عورت کسی اور مرد کی عدت میں ہو تو وہ نکاح فاسد ہے اور حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کا ان سے حد کی نفی پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ نکاح فاسد حد کو ثابت نہیں کرتا مگر اس کی جہالت کے باوجود تحریم متفق علیہ ہے اور اس کا علم ہونے کے ساتھ اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور علماء نے اختلاف کیا ہے کیا وہ دونوں کی جانب سے اکٹھی عدت گزارے گی؟ یہ دو عدتوں کا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 7**۔ اہل مدینہ نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ پہلے کی جانب سے بقیہ عدت مکمل کرے گی اور دوسرے کی جانب سے دوسری عدت نئے سرے سے گزارے گی۔ یہی لیث، حسن بن حیی، شافعی، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

محمد بن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ دوسرے خاوند کی جانب سے اس کی عدت اس کے لئے اس دن سے کافی ہوگی جس دن مرد اور عورت کے درمیان تفریق کر دی گئی، چاہے وہ حمل کے ساتھ ہو یا حیضوں کے ساتھ ہو یا مہینوں کے ساتھ۔ یہی قول ثوری، اوزاعی اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور ان کی دلیل اس پر اجماع ہے کہ پہلا خاوند اپنی بقیہ عدت میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ دوسرے کی عدت میں ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کر سکتا۔

پہلے گروہ نے جواب دیا اور کہا: یہ لازم نہیں ہے کیونکہ پہلے خاوند کو اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس پر دوسرے کی عدت واجب ہے۔ یہ دونوں حق ہیں جو دو خاوندوں کی جانب سے اس پر واجب ہیں جیسا کہ آدمیوں کے تمام حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے حق میں داخل نہیں ہو سکتا۔

امام مالک نے ابن شہاب عن سعید بن مسیب اور عن سلیمان بن یسار کی سند سے بیان کیا ہے کہ طلیحہ اسدیہ رشید ثقفی کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دے دی اور اس نے اپنی عدت میں نکاح کر لیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے خاوند کو خفیف سی ضربیں لگائیں اور ان کے درمیان تفریق کر دی۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت نے بھی اپنی عدت کے دوران نکاح کیا پس اگر اس کا خاوند ایسا ہے جس نے اس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

کے ساتھ دخول نہیں کیا ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے، پھر وہ عورت پہلے خاوند کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے، پھر دوسرا پیغام نکاح دینے والوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس نے دخول کر لیا ہے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے پھر وہ پہلے کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے پھر دوسرے کی جانب سے عدت گزارے پھر وہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہے جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (1)۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ طلیحہ طلیحہ بنت عبید اللہ ہے، طلحہ بن عبید اللہ التیمی کی بہن ہے اور موطا کے بعض نسخوں میں یحییٰ کی روایت سے یہ ہے: طلیحہ الاسدیہ اور یہ خطا اور لاعلمی ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ: فضربها عمر بالمخفقة و ضرب زوجها ضربات (2) اس سے مراد ہے کہ آپ نے بطور سزا انہیں یہ ضربیں لگائیں جب کہ ان دونوں نے ایک ممنوع عمل کا ارتکاب کیا اور وہ ہے عدت میں نکاح کرنا۔

اور زہری نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ وہ کوڑے کتنی مقدار تک پہنچے۔ فرمایا: اس مسئلہ میں عبد الملک کے کوڑے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چالیس کوڑے تھے۔ فرمایا: اس بارے میں قبیصہ بن ذویب سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اگر تم تخفیف بھی کرو تو بیس کوڑے لگاؤ۔ اور ابن حبیب نے ایسی عورت کے بارے میں کہا جو عدت میں شادی کرتی ہے اور مرد اسے مس کرتا ہے یا بوس و کنار کرتا ہے یا مباشرت کرتا ہے یا ہاتھ سے ٹٹولتا ہے یا شہوت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے تو زوجین پر سزا ہوگی، ولی پر، گواہوں پر اور ان میں سے ہر اس پر جو یہ جانتا ہو کہ یہ عدت میں ہے اور ان میں سے جو نہ جانتا ہو اس پر سزا نہ ہوگی۔ اور ابن المواز نے کہا ہے: زوجین کو بطور حد کوڑے لگائے جائیں گے اگر دونوں نے عمداً کیا ہو۔ اور ابن حبیب کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ یہ اس کے بارے ہے جسے عدت کے بارے علم ہو۔ اور شاید وہ جو تحریم سے ناواقف ہو اور اس نے فعل ممنوع کا ارتکاب جان بوجھ کر نہ کیا ہو تو وہ وہ ہے جسے سزا دی جائے گی اور اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت اور اس کے خاوند کو ہلکی سی شے کے ساتھ ضربیں لگائیں۔ اور اس بارے میں سزا اور تادیب اس کے حال کے مطابق ہوگی جسے سزا دی جا رہی ہے۔ اور ابن المواز کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان دونوں کو تحریم کا علم ہو اور انہوں نے جرأت اور دلیری کرتے ہوئے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہو۔ اور شیخ ابو القاسم نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں روایتیں عمداً کرنے کے بارے میں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حد جاری کی جائے گی اور دوسری کے مطابق سزا دی جائے گی اور حد جاری نہیں کی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 9۔** قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ یہ تحذیر اور ڈرانے کی انتہا ہے ایسے امر کے وقوع کے بارے جس سے منع کیا گیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

1۔ موطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 503-504، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 503

عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہئے، یہ فرض ہے نیکوکاروں پر۔''

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ یہ بھی مطلقات کے احکام میں سے ہیں۔ جماع اور بیوی کے پاس جانے سے قبل طلاق دینے والے سے حرج کے اٹھا دینے کے بارے یہ خبر کی ابتدا ہے، چاہے مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ مقرر کیا جائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوق اور قضائے شہوت کی غرض سے شادی کرنے سے منع فرما دیا اور پاکدامنی کی طلب اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی التجا اور صحبت دوام کے ارادہ سے شادی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو مومنین کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس کسی نے عورت کے پاس جانے سے قبل طلاق دی تو وہ اس مکروہ عمل کے جز میں واقع ہونے والا ہے۔ تو اس بارے میں حرج کو اٹھانے اور ختم کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ بشرطیکہ اصل نکاح حسین مقصد پر ہو۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اس کا معنی ہے کہ اس میں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم حیض کے وقت میں طلاق بھیجو، بخلاف مدخول بہا عورت کے، کیونکہ غیر مدخول بہا پر عدت نہیں ہوتی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ مطلقات چار ہیں: (۱) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اس سے پہلی آیت میں ذکر کیا ہے کہ اس سے مہر میں سے کوئی شے واپس نہیں لی جائے گی اور یہ کہ اس کی عدت تین حیض ہے۔ (۲) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے۔ پس یہ آیت اسی کے بارے میں ہے اور اس کے لئے کوئی مہر نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے متعہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سورۃ الاحزاب میں بیان فرمایا ہے کہ غیر مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔ (۳) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ اس کا ذکر اس آیت کے بعد کیا ہے جبکہ فرمایا: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرۃ: 237) (اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر۔) (۴) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء: 24) (پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں ایسی مطلقہ کا ذکر کیا ہے جسے چھوئے جانے سے قبل اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دے دی جائے اور اس مطلقہ کا جسے چھوئے جانے سے پہلے اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دی جائے۔ پس پہلی کے لئے متعہ مقرر کیا ہے اور دوسری کے لئے نصف مہر، کیونکہ عورت کو گرہ کا کھلنا اور اس حلت میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

عیب اور نقص پڑنا لاحق ہوا ہے جو مرد کو عقد کے سبب حاصل ہوئی تھی اور مس مہر واجب کے بالمقابل ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب الله تعالیٰ نے مطلقہ کی حالت کو یہاں دو قسموں میں تقسیم کر دیا ایک ایسی مطلقہ جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور دوسری ایسی مطلقہ جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نکاح کی تفویض جائز ہے اور اس سے مراد ہر وہ نکاح ہے جو مہر کا ذکر کیے بغیر کیا جائے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے بعد مہر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ مقرر کر دیا جائے تو وہ عقد کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ جائز ہے اور اگر وہ نہ مقرر کیا جائے اور طلاق ہو جائے تو پھر بالا جماع مہر واجب نہیں ہوتا (1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے یہی کہا ہے۔

اور مہدوی نے حماد بن ابی سلیمان سے نقل کیا ہے کہ جب آدمی عورت کو طلاق دے اور اس سے دخول نہ کیا ہو اور نہ ہی اس کے لئے مقررہ مہر ہو تو اسے نصف مہر مثل پر مجبور کیا جائے اور اگر عقد نکاح کے بعد اور طلاق واقع ہونے سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: طلاق کے سبب وہ نصف نہ ہوگا کیونکہ وہ عقد کے ساتھ واجب نہیں ہوا اور یہ اس ارشاد باری کے ظاہر کے خلاف ہے: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرۃ: 237)

اور یہ خلاف قیاس بھی ہے، کیونکہ عقد کے بعد مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے پس یہ ضروری ہے کہ یہ طلاق کے ساتھ نصف ہو جائے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر مہر مقرر کرنے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایسی عورت سے شادی کی جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا اور اس کے ساتھ دخول نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لئے اس جیسی عورتوں کا مثل ہوگا نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ زیادتی اور اس پر عدت ہوگی اور اس کے لئے میراث بھی ہوگی۔ تو حضرت معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوئے اور کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں اسی طرح فیصلہ فرمایا جیسے تم نے کیا ہے۔ تو اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ سے کئی اسناد سے مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم اور ان کے سوا دوسروں کا اسی پر عمل ہے اور ثوری، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔

اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم جن میں حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں نے کہا ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے اور اس کے ساتھ دخول نہ کرے اور نہ اس کے لئے مہر مقرر کرے یہاں تک کہ مر جائے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے میراث ہوگی اور اس کے لئے مہر نہیں ہوگا اور اس پر عدت ہوگی۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور کہا ہے: اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہے تو پھر یقیناً وہ حجت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور امام شافعی کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اس

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 218، دار الفکر

کے بعد مصر میں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور بروع بنت واشق کی حدیث کے مطابق بیان کیا۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: بروع کی حدیث ثابت کرنے میں اختلاف ہے، پس قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے ابن ابی زید کے رسالہ کی شرح میں کہا ہے کہ بروع بنت واشق کی حدیث کو حفاظ حدیث اور ائمہ اہل علم نے رد کر دیا ہے اور واقدی نے کہا ہے: یہ حدیث مدینہ منورہ میں پیش ہوئی تو علماء میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے آپ سے اور ابن منذر سے ذکر کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں اور بیان کیا کہ یہی ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔

اور زہری، اوزاعی، مالک، شافعی رحمہم اللہ سے حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس مسئلہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے میراث نہیں ہوگی یہاں تک کہ مہر ہو (یعنی مہر کے بغیر میراث نہیں ہو سکتی) مسروق نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مہر مقرر ہونے سے پہلے نکاح میں تفریق ہے پس اس میں مہر واجب نہیں اور اس کی اصل طلاق ہے لیکن جب حدیث صحیح ہے تو اس کے مقابلے میں قیاس فاسد ہے اور ابو محمد عبد الحمید نے ایسا مذہب بیان کیا ہے جو حدیث سے موافقت رکھتا ہے۔ الحمد للہ۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: حدیث بروع کو عبد الرزاق نے ثوری عن منصور عن ابراهیم عن علقمه عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے: پس معقل ابن سنان کھڑے ہوئے اور اس میں ابن مہدی نے ثوری عن فراس عن الشعبی عن مسروق عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا اور کہا: معقل بن یسار۔ اور میرے نزدیک صحیح اس کا قول ہے جس نے معقل بن سنان کہا ہے نہ کہ معقل بن یسار (2)۔ کیونکہ معقل بن یسار قبیلہ مزینہ کا آدمی ہے اور یہ حدیث ایسی عورت کے بارے ہے جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے ہے نہ کہ مزینہ سے۔ اور اسی طرح اسے داؤد نے شعبی عن علقمہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے۔ پس اشجع کے لوگوں نے کہا اور معقل بن سنان یوم حرہ میں شہید ہوئے اور یوم حرہ کے بارے میں شاعر کہتا ہے

ألا تلكم الأنصار تبكى سراتها و أشجع تبكى معقل بن سنان

خبردار! وہ انصار اپنے شیروں کو رو رہے ہیں اور بنی اشجع معقل بن سنان کو رو رہے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اس میں ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی اگر تم نے ان عورتوں کو طلاق دی جنہیں تم نے مس نہیں کیا اور تَمَسُّوْهُنَّ کو ثلاثی سے تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ نافع، ابن کثیر، ابو عمر، عاصم اور ابن عامر کی قراءت ہے اور حمزہ اور کسائی نے تماسوهن باب مفاعلہ سے پڑھا ہے کیونکہ وطی دونوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم

2۔ ابن ماجہ، باب الرجل یتزوج ولا یفرض لہا فیموت، حدیث نمبر 1880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کبھی باب مفاعلہ میں فاعل بمعنی فعل بھی آتا ہے۔ جیسے طارقت النعل (میں نے نعل کھٹکھٹائے) اور عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) اور پہلی قراءت اس باب میں مفاعلہ کے معنی کا تقاضا کرتی ہے اس معنی کے اعتبار سے جو مس سے سمجھا گیا ہے اور ابوعلی نے اسے ترجیح دی ہے کیونکہ اس معنی کے افعال اس وزن پر ثلاثی آئے ہیں۔ جیسا کہ نکح، سفد، قرع، دفط اور ضرب الفحل (ان تمام میں جفتی کرنے اور وطی کرنے کا معنی مشترک ہے) اور دونوں قرأتیں حسن ہیں۔

اور اَوْ تَفْرِضُوْا میں اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی واؤ ہے۔ یعنی مالم تمسوھن و لم تفرضوا لھن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَیَاتًا اَوْ هُمْ قَآىٕلُوْنَ۝ (الاعراف) (اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر عذاب رات کے وقت یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ۝ یہ و یزیدون کے معنی میں ہے۔ (الصافات) (اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف) اور ارشاد گرامی ہے: وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا۝ بمعنی و کفورا ہے (الدہر) (اور نہ کہنا ماننے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اور یہ قول: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىٕطِ (النساء: 43) یہ بمعنی و جاء احد من الغائط و انتم مرضی او مسافرون ہے۔ (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے۔)

اور یہ ارشاد: اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَایَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (الانعام: 146) اور اسی کے مثل دیگر ارشادات۔ (مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ۔)

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے مہر مفروض کا عطف کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً

پس اگر پہلا ارشاد مس سے قبل مفروض لہا کی طلاق کے بیان کے لئے ہوتا تو اس کا وہ دوبارہ ذکر نہ فرماتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ مَتِّعُوْهُنَّ اس کا معنی ہے تم انہیں کوئی ایسی شی دو جو ان کے لئے متعہ بن سکتی ہو۔ حضرت ابن عمر، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بن ابی حسن، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو قلابہ، حضرت زہری، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک بن مزاحم رضی اللہ عنہم نے اسے وجوب پر محمول کیا ہے۔

اور ابوعبید، امام مالک بن انس اور ان کے اصحاب اور قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے اسے ندب پر محمول کیا ہے (1)۔

پہلے قول والوں نے مقتضائے امر سے استدلال کیا ہے (یعنی الامر للوجوب) اور دوسرا قول کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: حقا علی المحسنین اور علی المتقین اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر اس کا اطلاق تمام مخلوق پر ہوتا اور پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ امر کے عمومات میں ہے متعوھن کے قول میں امتاع ہے اور امتاع کی اضافت ان کی طرف لام تملیک کے ساتھ ہے۔ اس ارشاد میں و للمطلقات متاع اس میں وجوب ندب سے زیادہ ظاہر ہے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

قولہ: علی المتقین یہ اس کے ایجاب کی تاکید ہے کیونکہ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے میں اور اس کی نافرمانی اور معصیت کرنے میں اس سے ڈرے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے: **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اور قول باری تعالیٰ: **وَّ مَتِّعُوْهُنَّ** کی ضمیر متصل میں اختلاف ہے کہ عورتوں میں سے ان سے کون مراد ہیں؟ تو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن رضی اللہ عنہم، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت عطا، حضرت اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ایسی مطلقہ عورت کے لئے متعہ واجب ہے جس کے پاس جانے اور اس کا مہر مقرر کیے جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے سوا دوسری عورتوں کے حق میں مستحب ہے۔

اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر مطلقہ عورت کے حق میں متعہ مستحب ہے اگرچہ اس سے دخول کیا گیا ہو، مگر اس کے حق میں کہ جس کے ساتھ دخول نہ کیا گیا اور اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہو گا(1)۔

اور ابو ثور نے کہا ہے اس کے لئے بھی اور ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول بھی نہ کیا گیا تو اس کے لئے متعہ کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔ زہری نے کہا ہے: اس کے لئے متعہ کا فیصلہ قاضی کرے گا اور جمہور لوگوں نے کہا ہے: قاضی اس کے لئے اس کے بارے فیصلہ نہیں کرے گا(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اجماع بلا شبہ صرف آزاد عورت کے حق میں ہے۔ پس رہی لونڈی جب اسے مس کیے جانے اور مہر مقرر ہونے سے قبل طلاق دے دی جائے تو جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس کے لئے متعہ ہو گا۔ امام اوزاعی اور ثوری نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے آقا کے لئے ہو گا اور وہ اپنی مملوکہ کو طلاق کے سبب پہنچنے والی تکلیف کے مقابلے میں کسی مال کا مستحق نہیں ہے۔ رہا امام مالک کے مذہب کا ربط تو ابن شعبان نے کہا ہے: متعہ طلاق کے غم کے بدلے ہوتا ہے، اسی لئے وطی سے پہلے یا بعد خلع لینے والی عورت، مبارات کرنے والی اور لعان کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ وہ ہے جس نے خود طلاق کو اختیار کیا ہے۔

اور ترمذی، عطا اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خلع لینے والی عورت کے لئے متعہ ہے اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: لعان کرنے والی عورت کے لئے متعہ ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: فسخ کئے گئے نکاح میں کوئی متعہ نہیں ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: ایسا نکاح جس کا عقد صحیح ہونے کے بعد اس میں فسخ داخل ہو جائے تو اس میں متعہ نہیں ہے۔ مثلاً زوجین میں سے ایک دوسرے کا مالک ہو جائے(3)۔ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کی اصل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ** پس یہ حکم طلاق کے ساتھ مختص ہے فسخ اس میں شامل نہیں۔ اور ابن وہب نے مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت جسے اختیار دیا گیا اس کے لئے متعہ ہے بخلاف اس لونڈی کے جو کسی غلام کے نکاح میں آزاد ہو جائے تو اسے اپنے نفس کے بارے اختیار ہو گا۔ پس اس صورت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں اس کے لئے متعہ نہیں ہوگا رہی وہ آزاد عورت جسے اختیار دیا گیا یا جو مالک ہو جائے یا مرد اس پر کسی لونڈی سے شادی کرے تو وہ ان تمام صورتوں میں اپنے نفس کی مختار ہوتی ہے اور اس کے لئے متعہ بھی ہوتا ہے کیونکہ زوج فرقت کا سبب بنتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مقدار کے قلیل اور کثیر ہونے کے اعتبار سے متعہ کی کوئی معروف حد نہیں ہے (1)۔ البتہ لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کم سے کم وہ مقدار جو متعہ میں دینی جائز ہے وہ تیس درہم یا ان کے مشابہ کوئی شے ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے اعلیٰ اور ارفع متعہ خادم ہے پھر لباس ہے اور پھر نفقہ ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اوسط متعہ قمیص، دوپٹہ اور چادر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہی اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ ابن محیریز نے کہا ہے: صاحب دیوان پر تین دینار ہوں گے اور غلام پر متعہ ہوگا۔

اور حسن نے کہا ہے: ہر کوئی اپنی قدر کے مطابق متعہ ادا کرے گا کوئی خادم کے ساتھ، کوئی کپڑوں کے ساتھ، کوئی ایک کپڑے کے ساتھ اور کوئی نفقہ کے ساتھ۔ اسی طرح امام مالک بن انس بھی کہتے ہیں اور یہی قرآن کریم کا مقتضا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نہ اس کی مقدار مقرر کی ہے اور نہ اس کی حد بیان فرمائی ہے۔ بے شک اس نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیس ہزار اور ایک زقاق (مشکیزہ) شہد بطور متعہ دیا۔ اور شریح نے پانچ سو درہم بطور متعہ دیئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلاشبہ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ بعض شوافع نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا ہے: اگر ہم صرف مرد کی حالت کا اعتبار کریں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر وہ دو عورتوں سے شادی کرے ان میں سے ایک شریف اور اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ اور گھٹیا ہو پھر وہ مس کرنے سے پہلے ہی دونوں کو طلاق دے دے اور دونوں کے لئے مہر مقرر نہ کرے کہ وہ دونوں متعہ میں برابر ہوں۔ پس گھٹیا کے لئے بھی وہی کچھ واجب ہوگا جو شریف اور اعلیٰ کے لئے واجب ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے: مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (متعہ دو مناسب طریقہ کے ساتھ۔) اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انتہائی دولتمند اور خوشحال آدمی جب کسی کمینی اور گھٹیا عورت سے شادی کرے کہ وہ اس کی مثل ہو جائے، کیونکہ اس نے جب اسے دخول اور مہر مقرر ہونے سے پہلے طلاق دے دی تو مرد کی حالت اور عورت کے مہر مثل کے اعتبار سے اس پر متعہ لازم ہوگا، پس اس طرح متعہ اس کے مہر مثل کا کئی گنا ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ دخول سے قبل اس کے اس مہر کے کئی گنا کا مستحق ہو جائے گی جس مہر مثل کا وہ دخول کے بعد مستحق ہوگی جس میں استعمال کی انتہا ہے اور وہ وطی ہے۔

اصحاب الرائے وغیرہم نے کہا ہے: وہ عورت جسے دخول اور مہر مقرر کیے جانے سے پہلے طلاق دی جاتی ہے اس کا متعہ نصف مہر مثل ہے اس کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ مہر مثل عقد کے سبب لازم ہوا ہے اور متعہ مہر مثل کا ہی بعض ہے، پس یہ اس کے لئے اسی طرح واجب ہوگا جیسے مہر مسمی کا نصف واجب ہوتا ہے جبکہ طلاق قبل از دخول ہو اور اس کی تردید رب العالمین کا یہ ارشاد کرتا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ اور یہ تحدید چھوڑنے پر دلیل ہے (2) اور اللہ تعالیٰ ہی حقائق الامور

1۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 522، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

کے بارے جاننے والا ہے۔

اور ثعلبی نے حدیث ذکر کی ہے۔ بیان کیا ہے کہ یہ آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الآیہ انصار کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے مہر مقرر نہ کیا پھر اسے چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو اسے متعہ دے اگر چہ وہ تیری ٹوپی ہی ہو'' متعھا ولو بقلنسوتك۔ (1)

اور دارقطنی نے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ خشعمیہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کر لی گئی تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! تجھے خلافت مبارک ہو۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور تو خوشی کا اظہار کر رہی ہے! اذھبی فأنت طالق ثلاثا تو جا تجھے تین طلاقیں ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس نے اپنا کمبل لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی۔ پس آپ نے اس کی طرف بطور متعہ دس ہزار اور اس کے مہر میں سے جو ابھی باقی تھا وہ سب بھیج دیا۔ تو اس نے کہا:

متاع قليل من حبيب مُفارِق

جدا ہونے والے محبوب کی نسبت متعہ انتہائی قلیل ہے۔

پس جب آپ کے پاس اس کا یہ قول پہنچا تو آپ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اپنے جد امجد سے نہ سنا ہوتا یا میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے میرے جد امجد سے سنا۔ آپ فرماتے ہیں: وہ آدمی جس نے اپنی بیوی کو تین مبہم یا اقراء کے وقت تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور زوج سے شادی کر لے، تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ (2)

ایک روایت میں ہے کہ قاصد نے انہیں اس کی خبر دی اور وہ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اسے طلاق کے ساتھ مکمل جدا نہ کر دیا ہوتا تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں ہر طہر کے وقت ایک طلاق یا ہر مہینے کے شروع میں ایک طلاق یا اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے (ایما رجل طلّق امرأته ثلاثا عند كل طهر تطليقة او عند رأس كل شهر تطليقة او طلّقها ثلاثا جميعا لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره) (3)

**مسئلہ نمبر 9**۔ وہ آدمی جو متعہ سے جاہل اور ناواقف ہو یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دے اگر چہ وہ شادی بھی کر لے۔ اور اگر وہ عورت فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کو دے۔ اسے ابن مواز نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر عورت فوت ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں ہے کیونکہ متعہ طلاق کی وجہ سے پہنچنے والے غم کے سبب عورت کو تسلی دینے کے لئے ہے اور وہ مقصود فوت ہو چکا ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حق ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 324، دار الفکر	2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 30، دار المحاسن قاہرہ	3۔ ایضاً

جو مرد کے ذمہ ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ دیگر حقوق کی طرح عورت سے اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ ان کے مذہب میں متعہ کے واجب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10** ۔ قولہ تعالیٰ: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ یہ متعہ کے وجوب پر دلیل ہے۔ جمہور نے اسے الْمُوْسِعِ یعنی واؤ کے سکون اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور اس سے مراد وہ ہے جس کی حالت میں وسعت اور خوشحالی ہو۔ کہا جاتا ہے: فلاں ینفق علی قدرہ یعنی فلاں اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اور ابو حیوہ نے اسے واؤ کے فتحہ اور سین کی شد اور فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی الْمُوَسَّعِ) ابن عامر، حمزہ، کسائی اور عاصم نے حفص کی روایت میں دونوں مقامات پر دال کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی قَدَرُہٗ) اور ابن کثیر، نافع، ابو عمرو اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں قَدْرُہٗ یعنی دونوں جگہوں پر دال کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو الحسن الاخفش وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں ہم معنی ہیں، دونوں لغتیں فصیح ہیں۔

اور اسی طرح ابو زید نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں: خذ قَدْرَ کذا و قَدَرَ کذا۔ دونوں کا معنی ایک ہے (یعنی اتنی مقدار لے لو) اور کتاب اللہ میں پڑھتے ہیں: فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا (الرعد: 17) (پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ (الانعام: 91) (اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا) اگر دال کو حرکت دی جائے تو بھی جائز ہے اور الْمُقْتِرِ کا معنی ہے قلیل المال (یعنی ایسا آدمی جس کے پاس مال کم ہو، وہ تنگدست ہو۔) مَتَاعًا یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے (2)۔ یعنی متعوھن متاعاً۔ تم انہیں خرچہ دو بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس طرح شریعت میں بیان کیا گیا ہے میانہ روی وغیرہ۔

**مسئلہ نمبر 11** ۔ قولہ تعالیٰ: حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ یعنی یہ نیکوکاروں کا فرض ہے۔ کہا جاتا ہے: حققت علیہ القضاء أحققت، یعنی میں نے فیصلہ اس پر لازم کر دیا۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ متعہ واجب ہے کیونکہ اس کے بارے حکم دیا گیا ہے اور قول باری تعالیٰ حَقًّا وجوب کی تاکید کے لئے ہے۔ اور عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ اور عَلَى الْمُتَّقِيْنَ کا معنی ہے علی المؤمنین یعنی مومنین پر لازم ہے۔ اسی لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے: لست بمحسن ولا متق (کہ میں محسن اور متقی نہیں) اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام کے تمام محسنین اور متقین ہوں۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ محسن ہوتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ وہ جہنم میں داخل نہ ہوں۔ پس تمام مخلوق پر واجب ہے کہ وہ محسنین اور متقین ہوں اور حَقًّا یہ مَتَاعًا کی صفت ہے یا پھر مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اسے امر کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ		2۔ ایضاً

''اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے لین دین) میں، بے شک اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لوگوں نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے، اس میں سے امام مالک وغیرہ ہیں کہ یہ مہر مقرر ہونے کے بعد متعہ کے حکم سے مطلقہ کو نکالنے والی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے شامل ہے **وَّمَتِّعُوْهُنَّ** اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت کو سورۃ الاحزاب کی آیت نے منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ وہ ہر اس مطلقہ کے متعہ کو متضمن ہے جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت نے اپنے سے پہلی آیت کو منسوخ کیا ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید اور حضرت قتادہ کا قول محل نظر ہے کیونکہ نسخ کی شروط موجود نہیں ہیں اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں کہا ہے: متعہ اس ارشاد کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے ہے: **وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ** اور غیر مدخول بہا کے لئے اس آیت کے مطابق ہے جو سورۃ الاحزاب میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اس مطلقہ کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اسے قبل از دخول طلاق ہو گئی اور اس کے لئے صرف اس مہر کا نصف ثابت کیا جو اس کے لئے مقرر کیا گیا(2)۔

اور علماء کے ایک فریق نے کہا ہے ان میں سے ابو ثور ہیں کہ عموماً ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے اور اس آیت نے یہ بیان کیا ہے کہ جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا وہ اس میں سے نصف بھی لے گی اور آیت سے اس کے متعہ کو ساقط کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لئے متعہ اور نصف مہر ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: **فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ** یعنی جو مہر تم نے مقرر کیا اس کا نصف واجب ہے۔ یعنی بالاجماع مہر میں سے نصف خاوند کے لئے ہے اور نصف عورت کے لئے اور نصف دو میں سے ایک جز ہے۔

پس کہا جاتا ہے: **نَصَفَ الماءُ القدحَ** یعنی پانی پیالے کے نصف تک پہنچ گیا۔ اور **نصف الازار الساق** چادر پنڈلی کے نصف تک ہو گی، ہر وہ شے جو اپنے غیر کے نصف تک پہنچ جائے تو تحقیق وہ اس کا نصف ہو گئی۔

جمہور نے **فَنِصْفُ** رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور ایک جماعت نے **فَنِصْفَ** یعنی فا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ تم نصف دو۔

حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے **فَنُصْفُ** تمام قرآن میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور اسی طرح اصمعی نے ابو عمرو بن العلاء سے قراءت روایت کی ہے(4)۔ کہا جاتا ہے: **نِصف و نُصف و**

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 320، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

نَصِیفٌ۔ یہ تینوں نصف کے بارے میں لغات ہیں اور حدیث میں ہے: لو أن احد کم انفق مثل اُحد ذھبا ما بلغ مد أحدھم ولا نصیفه۔ ای نصفه۔(1) (یعنی اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی کے مدکو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے نصف کو) اور نصیف کا معنی القِناع (اوڑھنی دوپٹہ) بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر3**۔ جب آدمی نے عورت کو مہر دے دیا پھر اسے قبل از دخول طلاق دے دی اور مہر عورت کے قبضے میں بڑھتا رہا تو امام مالک نے فرمایا ہے: کل سامان جو مرد نے اسے بطور مہر دیا یا غلام تو دونوں کی بڑھوتری دونوں (مرد و عورت) کے لئے ہوگی اور اس کا نقصان بھی دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اور اس کی ہلاکت بھی ان دونوں پر اکٹھی پڑے گی، اس صورت میں اس میں سے عورت پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے سونے یا چاندی کی معینہ مقدار بطور مہر دی اور اس نے اس کے ساتھ غلام یا گھر خرید لیا یا اس کے عوض ان کا کچھ حصہ خرید لیا یا اس کے سوا خوشبو یا گھر کا ساز و سامان یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے خریدی جس میں عورت کا تصرف ہوا اپنی حاجت و ضرورت کے لئے اور مرد کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی خاطر اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے، تو وہ تمام کا تمام اسی کے قائم مقام ہے کہ اگر وہ اسے وہی بطور مہر دیتا اور اس کی نمو اور کمی دونوں کے درمیان منقسم ہوگی۔

اور اگر اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی تو پھر اس کے لئے نصف کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ مرد کو اس مہر کا نصف بطور قرض ادا کرے جس پر اس نے قبضہ کیا ہے۔ اور اگر عورت نے کامل مہر یا اس کے کچھ حصہ کے ساتھ کوئی شے خریدی تو وہ اس کے ساتھ مختص ہو جائے گی اور عورت پر مرد کے لئے اس مہر کا نصف بطور قرض ہوگا جس پر عورت نے قبضہ کیا ہے اور اسی طرح اگر عورت نے کسی غیر سے غلام یا گھر خرید لیا اس ہزار کے عوض جو مرد نے اسے بطور مہر دیا تھا پھر اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اس پر ہزار کے نصف کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

**مسئلہ نمبر4**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کی پھر فوت ہو گیا درآنحالیکہ اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تھا تو اس عورت کے لئے وہ کامل مہر مسمی ہوگا اور میراث بھی ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی۔

اور علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو عورت کے ساتھ خلوت تو اختیار کرتا ہے اور اس سے مجامعت نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے جدا کر دیا۔ تو علمائے کوفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر تمام مہر واجب ہوگا اور عورت پر عدت بھی ہوگی، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: خلفائے راشدین نے اس آدمی کے بارے میں فیصلہ فرمایا جس نے دروازہ بند کر لیا یا پردہ لٹکا لیا تو اس عورت کے لئے میراث ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی(2)۔ یہ مرفوع روایت ہے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور امام شافعی کامل مہر واجب نہیں کرتے اور نہ ہی عورت پر عدت ہوگی جبکہ دخول نہ ہو۔ ظاہر قرآن کریم اس کی تائید کرتا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب قول النبی لو کنت متخذا، حدیث 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ السنن الکبری، جلد 7، صفحہ 255، دارالفکر

ہے۔ شریح نے کہا ہے: میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بابًا یا ستراً کا ذکر کیا ہو، جبکہ آپ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مرد نے عورت کو مس نہیں کیا لہٰذا اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اور اس بارے میں ہمارے علماء کا موقف عنقریب سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کریم کے اس ارشاد کے تحت: و قد افضی بعضکم الی بعض۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ الآیۃ۔

اس میں اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ استثنا منقطع ہے۔ کیونکہ ان کا نصف معاف کرنا ان کے لینے کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اور یَّعۡفُوۡنَ کا معنی یترکن (وہ چھوڑ دیتی ہیں) اور تصفحن (وہ درگزر کرتی ہیں) ہے اور اس کا وزن یَفۡعُلۡنَ ہے۔ معنی یہ ہے مگر یہ کہ وہ اس نصف کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کے لئے زوج پر واجب ہوتا ہے اور اَن داخل ہونے کے باوجود نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ مضارع میں جمع مؤنث کا صیغہ رفع، نصب اور جزم کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور یہ ضمیر ہے علامت اعراب نہیں ہے۔ پس اسی وجہ سے نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ اگر نون ساقط ہو جائے تو پھر مذکر کے ساتھ اس کا اشتباہ لازم آئے۔

اس آیت میں معاف کرنے والیوں میں ہر وہ عورت ہے جو اپنی ذات کے معاملہ کی خود مالک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں مہر ثابت ہو جانے کے بعد اسے ساقط کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اسے خالص ان کا حق بنایا ہے۔ پس وہ اس میں قائم رکھنے اور ساقط کرنے کا تصرف کر سکتی ہیں جیسے چاہیں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے معاملہ کی مالک ہیں اور وہ بالغ، عاقل اور ہدایت یافتہ بھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فقہاء و تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے: اس باکرہ عورت کا معاف کرنا بھی جائز ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو اور اسے سحنون نے المدونہ میں ابن قاسم کے سوا کسی اور سے بیان کیا ہے اس کے بعد کہ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ رہی وہ جو باپ یا وصی کے زیر پرورش رہی تو اس کا اپنے نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں۔

یہ ایک ہی قول ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں جسے میں جانتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ اس کا عطف پہلے پر ہے، وہ مبنی ہے اور یہ معرب ہے اور حسن نے اَوۡ یَعۡفُوۡ واؤ کو ساکن پڑھا ہے (1)۔ گویا کہ انہوں نے واؤ پر فتحہ کو ثقیل سمجھا ہے۔ لوگوں نے اس ارشاد کے معنی مراد میں اختلاف کیا ہے: اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ پس دار قطنی نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بنی نصر کی ایک عورت سے شادی کی اور پھر دخول سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی اور اس کی طرف کامل مہر بھیج دیا اور فرمایا: میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ (بقرہ: 237) اور میں اس سے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں (2)۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ
2۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ

کی تاویل کی: اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ مراد اپنی ذات ہے ہر حال میں طلاق سے پہلے بھی اور طلاق کے بعد بھی۔ یعنی یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں اپنے نکاح کی گرہ ہے (یعنی عبارت ہے) عقدۃ نکاحہ۔ پھر جب لام داخل کیا گیا تو ہاء کو حذف کر دیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔ ای مأواہ۔ نابغہ نے کہا ہے:

لهم شِيمَة لم يعطها اللهُ غيرَهم — من الجود والاحلام غيرُ عَوَازِبِ

اس میں الأحلام اصل میں أحلامهم ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ: عُقْدَةُ النِّكَاحِ اصل میں عقدۃ نکاحہ ہے۔

دار قطنی نے حضرت قتیبہ بن سعید کی حدیث سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ابن لہیعہ نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ولی عقدۃ النکاح الزوج (1) کہ نکاح کی گرہ کا ولی زوج ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم سے بھی مسند بیان کی گئی ہے۔ فرمایا: اسی طرح نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاؤس، مجاہد، شعبی اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے اور اس کے سوا نے حضرت مجاہد اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہما کا اضافہ کیا ہے۔ اسے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام شافعی کے قول سے بھی یہی صحیح ہے۔ یہ تمام کے تمام عورت کے مہر میں سے کسی شے پر ولی کے لئے کوئی حق نہیں دیکھتے، اس پر اجماع ہونے کی وجہ سے کہ ولی اگر زوج کو طلاق سے پہلے مہر سے بری کر دے تو یہ جائز نہیں اور اسی طرح طلاق کے بعد بھی ہے۔

اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ولی اس کے مال میں سے کوئی شے ہبہ کرنے کا مالک نہیں ہوتا اور مہر بھی اس کا مال ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اولیاء میں سے وہ بھی ہیں جن کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ چچا کے بیٹے اور بھائیوں کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح باپ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے وہ بھی ہے جس نے کہا وہ ولی ہے، اسے دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بیان کیا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: یہی ابراہیم، علقمہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس کے سوا حضرت عکرمہ، طاؤس، عطا، ابو الزناد، زید بن اسلم، ربیعہ، محمد بن کعب، ابن شہاب، اسود بن یزید، شعبی، قتادہ، مالک اور شافعی کے قدیمی قول نے اس میں اضافہ کیا ہے۔

اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کا نصف مہر معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب اسے طلاق ہو جائے، چاہے وہ حیض کی عمر کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: وہ اس میں سے کسی شے کے لئے اپنے باپ کی طرف رجوع نہیں کرے گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: 237) پس ازواج کا ذکر کیا اور اس خطاب کے ساتھ انہیں خطاب فرمایا، پھر فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ پس عورتوں کا ذکر کیا۔ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ تو یہ تیسرا حصہ ہے اسے اس زوج کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا جس کا ذکر پہلے ہوا مگر یہ کہ اس کے سوا کوئی موجود نہ ہو، حالانکہ وہ پایا گیا

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 280

ہے اور وہ ولی ہے اور وہی مراد ہے۔ اس کا یہ معنی مکی نے بیان کیا ہے اور اسے ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ہر عورت معاف نہیں کر سکتی، کیونکہ صغیرہ اور وہ عورت جس پر پابندی ہو ان کے لئے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کو بیان فرما دیا اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ یعنی اگر وہ اس کے اہل ہوں اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ اور اس سے مراد ولی ہے کیونکہ اس میں اختیار اسی کے پاس ہے۔

اور اسی طرح ابن وہب، اشہب، ابن عبد الحکم اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی باکرہ بیٹی کے حق میں باپ ہے اور اپنی لونڈی کے حق میں آقا ہے۔ اور بلاشبہ ولی کا معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب کہ وہ صائب الرائے لوگوں میں سے ہو اور اس کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا جبکہ وہ بیوقوف اور احمق ہو۔

اور اگر کہا جائے: ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مراد ولی ہے بلکہ اس سے مراد زوج ہے اور یہ اسم اس کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ ولی کی نسبت عقد کرنے کا زیادہ مالک ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ کی نسبت زوج عقد کا زیادہ مالک ہوتا ہے، بلکہ وہاں تو صرف باکرہ کا باپ مالک ہوتا ہے نہ کہ زوج، کیونکہ جس پر عقد کیا گیا ہے وہ باکرہ کی بضع ہے اور زوج اس کا عقد کرنے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ باپ اس کا مالک ہوتا ہے۔

اور شریح نے بھائی کے نصف مہر معاف کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی طرح عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معاف کرنا بھی جائز ہے جس نے دونوں کے درمیان عقد نکاح کیا چاہے وہ چچا ہو یا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اگرچہ وہ ناپسند بھی کرے۔

ابونہیک اور شعبی نے اَوْ یَعْفُوْ واؤ کو الف کے مشابہ قرار دے کر اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول بھی ہے:

فما سوّدتني عامر عن وراثة　　　أبى الله أن اسمُو بأم ولا أب

اس میں اسمو کی واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور تَعْفُوْ دراصل تَعْفُوُوْا ہے پہلی واؤ کو ساکن کر دیا گیا اس پر حرکت ثقیل ہونے کی وجہ سے، پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے اور مردوں کو اس میں غلبہ دیا گیا ہے۔ اور لام بمعنی الیٰ ہے یعنی اقرب الی التقوىٰ۔

اور جمہور نے اسے تعفو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابونہیک اور شعبی نے وَاَنْ یَّعْفُوْا یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ضمیر اسی کی طرف راجع ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے وان تعفونَ تاء کے ساتھ نہیں پڑھا گیا کہ یہ عورتوں کے لئے ہو۔

اور جمہور نے وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یحییٰ بن یعمر نے اسے کسرہ دیا ہے۔ اور حضرت علی، مجاہد، ابوحیوہ، ابن ابی عبلہ رحمۃ اللہ علیہم نے ولا تناسوا الفضل پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت معنی کو پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ تناسی (بھولنے کا بہانہ کرنا) کا محل ہے نہ کہ نسیان کا مگر تشبیہ کی بنا پر۔

مجاہد نے کہا ہے: الفضل سے مراد مرد کا کل مہر کو مکمل کرنا ہے یا عورت کا اپنے نصف مہر کو چھوڑ دینا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یہ خبر اپنے ضمن میں محسن کے لئے وعدہ اور غیر محسن کے لئے محرومی لئے ہوئے ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارا معاف کرنا اور تمہارا پورا پورا طلب کرنا مخفی نہیں ہے۔

**حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸**

"پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: حٰفِظُوْا یہ خطاب تمام امت کو ہے اور یہ آیت نمازوں کو ان کے اوقات میں ان کی تمام شرائط کے ساتھ قائم کرنے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اور محافظۃ کا معنی کسی شے پر مداومت اور مواظبت اختیار کرنا ہے اور الوسطیٰ الاوسط کی تانیث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور متناسب ہونا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا اس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک اعرابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

یا اوسط الناس طُرًّا فِی مَفَاخِرِهِم　　واکرم الناس اُمًّا بَرَّةً و أبا

اور وسط فلان القوم یَسِطُهم یعنی فلاں ان کے وسط میں ہو گیا۔ اور الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کا علیحدہ اور منفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ الصلوٰت کے عموم میں بھی وہ داخل ہے تو اس کی عظمت اور مرتبہ کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

**وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ** (الاحزاب: 7) (اور اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) (اس میں مِنْكَ اور مِنْ نُّوْحٍ کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے حالانکہ النبیین کے عموم میں یہ داخل ہیں۔ تو یہ اظہار شرف و مرتبہ کے لئے ہے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: **فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝۶۸** (الرحمن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔)

(فَاكِهَةٌ کے عموم میں داخل ہونے کے باوجود نخل اور رمان کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔)

ابوجعفر الواسطی نے وَالصَّلٰوةَ الْوُسْطٰى کو اغراء کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی الزموا الصلاۃ الوسطی (تم صلوٰۃ وسطیٰ کو لازم پکڑو) اور اسی طرح حلوانی نے بھی پڑھا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

اور قالون نے نافع سے الوصطی صاد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ طاء اس کی مجاورت میں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی محل میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ صراط وغیرہ۔

**مسئلہ نمبر 2۔** لوگوں نے وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی کی تعیین میں اختلاف کیا ہے اس پر دس اقوال ہیں۔

(۱) اس سے مراد ظہر ہے، کیونکہ یہ نماز دو قولوں میں سے صحیح قول کی بنا پر دن کے وسط میں ہے کہ دن کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ہم نے ظہر سے ابتدا کی ہے کیونکہ یہی وہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ہے ان میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور ان روایات میں سے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہی صلوٰۃ وسطی ہے ایک وہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، جس وقت ان دونوں نے املا کرائی حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى وَصَلَاةِ العصر اسے واؤ کے ساتھ بیان کیا (1)۔

اور روایت ہے کہ یہ مسلمان پر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کیونکہ یہ تیز گرمی کے وقت میں آتی ہے درآنحالیکہ انہیں اپنے اموال میں کاموں نے خوب تھکا رکھا ہوتا ہے۔

اور ابو داؤد نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر کی نماز سخت گرمی میں ادا فرماتے تھے اور کوئی ایسی نماز نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر اس سے زیادہ شاق اور مشقت آمیز ہوتی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی اور یہ بھی فرمایا: اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (2)۔ اور امام مالک نے مؤطا میں اور ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: صلوٰۃ وسطی صلوٰۃ ظہر ہے (3)۔

طیالسی نے یہ زیادہ کہا ہے: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے سخت گرمی کے وقت میں ادا فرماتے تھے۔

(۲) الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اس استدلال میں سے عمدہ اور اعلیٰ یہ ہے کہ یہ نماز ہے جس کے لئے وسطیٰ کہا گیا ہے کیونکہ یہ دو نمازوں کے درمیان ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو سب سے اول فرض کی گئی اور دوسری وہ نماز ہے جو دوسرے نمبر پر فرض کی گئی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی نماز صلوٰۃ وسطی ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم ہیں (4)، یہی امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا مختار ہے۔ امام شافعی

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121، وزارت تعلیم
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 59، وزارت تعلیم
3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم
4۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل الاثر نے یہی کہا ہے اور عبد الملک بن حبیب نے بھی یہی موقف اپنایا ہے اور ابن عربی نے بھی قبس میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں اسے ہی اختیار کیا ہے اور کہا ہے: اسی قول پر جمہور لوگ ہیں اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

اور انہوں نے اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے استدلال کیا ہے انہیں مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور میں ان میں سے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کروں گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصلاۃ الوسطی صلاۃ العصر صلاۃ وسطیٰ نماز عصر ہے۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1) اور ہم اس سے زیادہ احادیث ''القبس فی شرح موطا مالک بن انس'' میں لائے ہیں۔

(۳) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز مغرب ہے۔ قبیصہ بن ابی ذؤیب نے ایک جماعت میں یہی کہا ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ یہ رکعتوں کی تعداد میں متوسط ہے نہ رکعتوں کی تعداد بہت کم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ ہے اور نہ ہی سفر میں اس کی قصر کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ اپنے وقت سے مؤخر کیا ہے اور نہ ہی اسے جلدی ادا فرمایا ہے اور اس کے بعد دو نمازیں جہری ہیں اور اس سے پہلے دو نمازیں سری ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب ہے۔ اس نے اسے نہ کسی مسافر سے ساقط کیا اور نہ کسی مقیم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رات کی نماز کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ دن کی نمازوں کو ختم کر دیا۔ پس جس نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا اور جس نے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے بیس سال کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ یا فرمایا چالیس سال کے''۔

(۴) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں کی جاتی اور یہ نیند کے وقت میں آتی ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہوتا ہے اور یہ شاق اور گراں ہوتی ہے، لہٰذا اس کی محافظت کی تاکید فرمائی۔

(۵) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے رات کی دو نمازیں ہیں جن میں قراءت بالجہر کی جاتی ہے اور اس کے بعد دن کی دو نمازیں ہیں جن میں سراً قراءت کی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور اس کے لئے سردی کے موسم میں سردی کی شدت کی وجہ سے اٹھنا اور گرمی کے موسم میں رات کے چھوٹا ہونے کے باعث اٹھنا شاق اور مشکل ہوتا ہے۔

اور جنہوں نے کہا کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اسے مؤطا نے بلاغاً ذکر کیا ہے۔ (یعنی امام مالک نے الموطا میں فرمایا کہ ان دونوں سے یہ خبر ان کے پاس پہنچی ہے) اور ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (معلق ایسی روایت ہے جو غیر مسند ہو) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی امام مالک اور آپ کے اصحاب کا قول ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا میلان ہے اس میں جو آپ سے القشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے اور آپ

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی صلوٰۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر 166، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے یہ صحیح اور معروف سند سے مروی ہے۔(1)

اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ یعنی فیھا (اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے اس میں عاجزی کرتے ہوئے) (لیکن استدلال کرنے والوں نے ترجمہ کیا قنوت پڑھتے ہوئے۔) اور صبح کی نماز کے سوا کوئی فرض نماز نہیں ہے جس میں قنوت ہو۔ ابورجاء نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہمیں بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھائی اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس میں قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے رہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی (2)۔ قنوت کا حکم آگے آئے گا اور اس بارے میں علماء کی جو آراء ہیں سورہ آل عمران میں اس ارشاد کے تحت: لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (آل عمران: 128)

(۶) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اس کے لئے جمع ہونے اور اس میں خطبہ ہونے کے سبب اسے خاص کیا گیا ہے اور اسے عید بنایا گیا ہے۔ ابن حبیب اور مکی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس قوم کے لئے جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں لقد ھممت أن آمر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون من الجمعة بیوتھم (3) میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دوں پھر ان لوگوں کو ان کے گھروں میں جلا دوں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۷) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح اور عصر کی دونوں نمازیں ہیں۔ شیخ ابوبکر الابہری نے یہی کہا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: یتعاقبون فیکم ملائکة باللیل و ملائکة بالنھار الحدیث (4) (تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں۔) اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: أما أنکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رؤیته فان استطعتم الا تغلبوا علی صلاة قبل طلوع الشمس و صلاة قبل غروبھا، یعنی العصر و الفجر۔ (بے شک عنقریب تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم ان چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی مشقت نہ ہوگی۔ پس اگر تم

1۔ صحیح بخاری، باب الدعا علی المشرکین، حدیث نمبر 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت الخ، حدیث نمبر 946، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232، وزارت تعلیم
4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 522، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استطاعت رکھو تو خبردار! اس نماز کے بارے میں تم مغلوب نہ ہو جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے اور وہ نماز جو غروب آفتاب سے پہلے ہے) ان سے مراد عصر اور فجر کی نمازیں ہیں۔ پھر حضرت جریر نے یہ آیت پڑھی وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طہٰ: 130) (1) (اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔)

اور حضرت عمارہ بن رؤیبہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہرگز کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھی (2)۔'' ان سے مراد بھی فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من صلی البردین دخل الجنة (3) جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ تمام صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہیں۔ ان دونوں نمازوں کو بَرْدَین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں ٹھنڈک کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

(۸) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء اور صبح کی نمازیں ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مرض کے دوران فرمایا جس میں ان کا وصال ہوا: تم سنو اور تم اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی پہنچاؤ ان دو نمازوں پر مواظبت اختیار کرو۔ یعنی جماعت کے ساتھ ادا کرو۔ عشاء اور صبح کی نمازیں اور اگر تم جان لو جوان دونوں میں (اجر) ہے تو تم ان دونوں کو ادا کرنے کے لئے آؤ اگرچہ تمہیں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

ائمہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر وہ جان لیں جو (اجر) عشاء اور صبح کی نمازوں میں ہے تو وہ ان دونوں کے لئے آئیں اگرچہ گھسٹ کر آنا پڑے اور فرمایا بے شک یہ دونوں نمازیں منافقین پر بہت سخت اور بھاری ہیں (4)۔'' اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کے لئے پوری رات قیام کرنے اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے والے کے لئے نصف رات قیام کرنے کا (اجر) رکھا گیا ہے۔ اسے امام مالک نے موقوف علی عثمان ذکر کیا ہے اور مسلم نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: من شهد العشاء في جماعة كان له قيام نصف ليلة و من صلى العشاء و الفجر في جماعة كان له كقيام ليلة (5) جو آدمی عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس کے لئے نصف رات کا قیام کرنے کا اجر ہے اور جس نے عشاء اور فجر کی نمازیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰة العصر، حدیث نمبر 521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰة الفجر، حدیث نمبر 540، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب فضل العشاء الخ، حدیث نمبر 617، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 30، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب فضل صلوٰة الجماعة، حدیث نمبر 468، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعة، حدیث نمبر 205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جماعت کے ساتھ ادا کیں تو اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کی طرح اجر ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جسے امام مالک اور مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

(۹) یہ پانچوں کی پانچوں نمازیں ہیں یہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ سے فرض اور نفل کو شامل ہے پھر فرض کا خصوصاً ذکر کیا۔

(۱۰) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی سے مراد غیر معین نماز ہے۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے اور ربیع بن خیثم نے بھی یہی کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ کو اسی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے جیسے کہ رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا ہے اور جس طرح کہ جمعہ کے دن (مقبول) ساعت کو اور رات کی ان ساعتوں کو مخفی رکھا جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، تاکہ وہ رات کے وقت اندھیروں میں عالم الخفیات کی مناجات کے لئے قیام کریں۔

اور جس سے اس کی صحت پر استدلال ہوتا ہے کہ یہ مبہم ہے غیر معین ہے وہ وہ روایت ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں باب کے آخر میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی: حافظوا علی الصلوات وصلوۃ العصر تم نمازوں پر اور نماز عصر پر مواظبت اختیار کرو۔ پس ہم نے اسے پڑھا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی تو کسی آدمی نے کہا: کیا یہ صلوٰۃ عصر ہی ہے؟ براء نے کہا ہے: میں نے تجھے خبر دی ہے کیسے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے منسوخ فرمایا؟(1) واللہ اعلم۔ پس اس سے لازم ہوا کہ اسے معین کرنے کے بعد اس کی تعیین کو منسوخ کر دیا گیا اور اسے مبہم رکھا گیا پس تعیین اٹھ گئی۔ واللہ اعلم۔

اور یہ مسلم کی پسند ہے، کیونکہ اسے باب کے آخر میں لایا گیا ہے اور علماء متاخرین میں سے کئی ایک نے اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دلائل کے مابین تعارض ہونے اور ترجیح نہ ہونے کی وجہ سے (علماء متاخرین نے یہی کہا ہے۔) پس تمام نمازوں پر محافظت اور ان کے اوقات میں ان کی ادائیگی کے سوا کوئی شے باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی میں یہ اختلاف ان کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وصلواۃ العصر ثابت کیا ہے جو کہ ابو یونس مولیٰ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جبکہ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے مصحف قرآنی لکھے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی مانند ہیں۔ اور اس پر عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کے لئے مصحف لکھوں۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس آپ نے مجھے اسی طرح املاء کرائی حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ---وھی العصر---وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (2) اور فرمایا: اسی طرح میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا۔ پس آپ کا قول وھی العصر اس پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلام اللہ میں سے الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی کی اپنے قول وھی العصر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 227، وزارت تعلیم

2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121-122، وزارت تعلیم

کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ اور نافع نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے صلاۃ العصر کے الفاظ روایت کیے ہیں (1) جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے صلاۃ العصر کے الفاظ بھی یعنی بغیر واؤ کے روایت کیے گئے ہیں (2)۔

اور ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس زائد لفظ میں یہ اختلاف اس کے بطلان پر اور جو کچھ تمام مسلمانوں کے مصحف الامام میں ہے اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس پر ایک دوسری دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنہوں نے کہا: والصلاۃ الوسطی وصلاۃ العصر انہوں نے ہی صلاۃ وسطی غیر عصر کو قرار دیا ہے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کا رد ہے جسے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: غزوۂ احزاب کے دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عصر کی نماز سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج کا رنگ زرد ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شغلونا عن الصلاۃ الوسطی ملأ اللہ اجوافھم وقبورھم نارا (3) الحدیث۔ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے مشغول رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وتر واجب (فرض) نہیں ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا فرض نمازوں کی تعداد پر اتفاق ہے کہ وہ سات سے کم ہیں اور تین سے زیادہ ہیں اور تین سے سات کے درمیان سوائے پانچ کے اور کوئی طاق عدد نہیں ہے۔ اور جفت اعداد کا کوئی وسط نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور حدیث معراج میں یہی پانچ ہی وہ پچاس ہیں کیونکہ میرے نزدیک قول تبدیل نہیں ہوتا۔ ھی خمس و ھن خمسون لا یبدل القول لدی۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اس کا معنی ہے تم اپنی نمازوں میں عجز و انکساری کرتے ہوئے کھڑے رہو۔ اور لوگوں کا قٰنِتِيْنَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت شعبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے طائعین اطاعت کرنے والے اور حضرت جابر بن زید، عطا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: قرآن کریم میں ہر مقام پر قنوت کا لفظ طاعت کے معنی میں ہے۔ اور ابوسعید نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی بیان کیا ہے اور بے شک ہر دین والے آج وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس امت کو کہا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت و پیروی کرتے ہوئے کھڑے رہو (4)۔

اور مجاہد نے کہا ہے: قٰنِتِيْنَ کا معنی ہے خاشعین خشوع کرنے والے۔ قنوت کا معنی ہے رکوع کو طویل کرنا، خشوع کرنا، آنکھوں کو جھکانا اور عجز و انکساری کرنا۔

اور ربیع نے کہا ہے: القنوت کا معنی ہے قیام کو طویل کرنا (5)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 442، دار الکتاب العربیۃ بیروت

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 227، د ت

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 323، دار الکتب العلمیہ

5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 324

اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا پڑھا ہے۔ (الزمر: 9) (بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے اور کبھی کھڑے ہوئے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: افضل الصلاۃ طول القنوت (1) افضل نماز طویل قیام والی ہے۔ مسلم وغیرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

قانتا للہ یدعو ربّہ و علی عَمْدٍ مِن الناس اعتزل

اس میں بھی قانتاً طویل قیام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: قانتین داعین۔ دعا مانگنے والے، پکارنے والے (2)۔ اور حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک قنوت پڑھی اور آپ رعل و ذکوان کے خلاف دعا مانگتے رہے (3)۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے دعا۔ اس نے دعا مانگی۔ اور ایک قوم نے کہا: ہے اس کا معنی ہے طول قیامہ۔ اس نے اپنا قیام طویل کیا۔ اور سدی نے کہا ہے: قانتین کا معنی ہے ساکتین۔ خاموش رہنے والے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے روکنے کے لئے نازل ہوئی۔ اور ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھی اور یہی صحیح ہے اس روایت کی وجہ سے جسے مسلم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرتے تھے، درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے اور جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹ کر آئے، ہم نے آپ پر سلام پیش کیا تو آپ نے ہمیں جواب نہ لوٹایا، تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر نماز میں سلام عرض کرتے تھے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فی الصلوٰۃ شغلا (4) بے شک نماز میں مشغولیت ہے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا اور کہا: ہم نماز میں کلام کرتے تھے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا درآنحالیکہ وہ اس کے پہلو میں حالت نماز میں ہوتا، یہاں تک کہ پھر یہ آیت نازل ہوئی: قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور گفتگو سے ہمیں روک دیا گیا (5)۔

اور کہا گیا ہے: لغوی اعتبار سے قنوت کا اصل معنی کسی شے پر دوام اختیار کرنا ہے اور اس حیثیت سے کہ لغت میں قنوت کا اصل معنی دوام علی الشیء ہے۔ یہ جائز ہے کہ طاعت و پیروی پر دوام اختیار کرنے والے کو قانت کا نام دیا جائے اور اسی طرح جس نے قیام، قراءت اور دعا نماز میں طویل کر دیے یا خشوع اور سکوت کو طویل کیا۔ یہ سب کے سب قنوت کرنے والے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ سب کے سب مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر کلام کرنا جبکہ نمازی جانتا ہو

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیۃ

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت قبل الرکوع و بعدہ، حدیث نمبر 948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے، سوائے اس روایت کے جو اوزاعی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے نفس کے احیاء کے لئے کلام کی یا اسی جیسے بڑے امور کے بارے میں تو اس کے ساتھ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ قول نظر وفکر کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔

اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نماز میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ (1) الحدیث اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ نیا حکم بیان کیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کرو'' (2) اور ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے جس کے لئے نماز کو توڑنا وہ پسند کرتا ہو اور اس وجہ سے وہ استیناف سے منع کرتا ہو۔ پس جس کسی نے ایسے کام کے لئے اپنی نماز کو توڑ دیا جسے وہ احیاء نفس یا مال یا ایسا کام جو انہی کے طریقہ پر ہو کے لئے فضیلت دیکھتا ہو تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے اور بنا نہ کرے۔ اس مسئلہ میں یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ نماز کے دوران بھول کر کلام کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان کے اصحاب ان تمام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز میں سہواً گفتگو کرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ لیکن امام مالک نے یہ بھی کہا ہے: نماز میں عمداً گفتگو کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کی کیفیت اور اس کی اصلاح کے بارے ہو۔ یہی ربیعہ اور ابن القاسم کا قول ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کسی قوم کو امام نے دو رکعتیں نماز پڑھائی اور بھول کر سلام پھیر دیا اور انہوں نے اس کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہا) کہی اور وہ اسے نہ سمجھا، تو ان لوگوں میں سے جو اس کے پیچھے نماز میں تھے ایک آدمی نے کہا: بلاشبہ تم نے نماز مکمل نہیں کی سو اپنی نماز مکمل کرو۔ پس وہ قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا یہ حق ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ تو فرمایا: امام انہیں وہ نماز پڑھا دے گا جو ان کی نماز میں سے باقی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنی بقیہ نماز پڑھیں گے ان میں سے وہ بھی جس نے کلام کیا اور وہ بھی جس نے کلام نہیں کیا اور ان پر کوئی شے نہ ہوگی اور وہ اس میں وہی کچھ کرنے والے ہوں گے جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذوالیدین کے دن کیا۔ یہ المدونہ میں ابن القاسم کا قول ہے اور ان کی روایت امام مالک سے ہے اور یہ امام مالک کے تمام اصحاب ذوالیدین کے مسئلہ میں امام مالک کے قول کے خلاف ہیں سوائے اکیلے ابن قاسم کے، کیونکہ اس بارے میں وہی امام مالک کا قول بیان کرتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بلاشبہ یہ ابتدائے اسلام میں ہوا۔ اور آپ لوگ اپنی نماز کے بارے میں پہنچانتے ہیں۔ پس جس کسی نے اس دوران گفتگو کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ کل یوم ھو فی شان، قبل حذا الحدیث 6968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عراقیین کا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ نماز میں گفتگو کرنا کسی بھی حال میں اسے فاسد کر دیتا ہے چاہے وہ سہواً ہو یا عمداً ہو، نماز کے بارے میں ہو یا کسی غیر کے بارے میں۔ اور یہی ابراہیم نخعی، عطا، حسن، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ کے اصحاب کا خیال ہے کہ ذوالیدین کے قصہ کے بارے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی حدیث سے منسوخ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگرچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں لیکن انہوں نے ذوالیدین کی حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے: من ادرکه الفجر جنبا فلا صوم له (1) جسے جنبی حالت میں فجر نے پالیا تو اس کے لئے روزہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے مرسل حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

اور علی بن زیاد نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ابوقرہ نے بتایا کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی نماز میں کلام کرے تو مستحب یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے اور بنا نہ کرے۔ مزید کہا: اور ہمیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو فرمائی اور اس دن آپ کے اصحاب نے بھی آپ کے ساتھ گفتگو کی، کیونکہ ان کا گمان تھا کہ نماز کم ہوگئی ہے اور آج کسی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس نے اکیلے نماز پڑھی اور اپنی طرف سے وہ چار رکعتوں سے فارغ ہوگیا، تو اس کے پہلو میں موجود ایک آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ تو نے تو صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں، تو وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ درست ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کی نماز فاسد ہوگئی اور اس کو نہیں چاہئے تھا کہ وہ اس سے کلام کرتا اور نہ یہ چاہئے تھا کہ اس (دوسرے) کی طرف متوجہ ہوتا۔

ابوعمر نے کہا ہے: وہ اس مسئلہ میں جماعت کے ساتھ امام اور منفرد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پس وہ امام اور اس کے مقتدیوں کے لئے نماز کی حالت کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور منفرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے سوا دوسرے اس مسئلہ میں ابن القاسم کے جواب کو منفرد اور امام اور اس کے ساتھیوں پر محمول کرتے ہیں آپ کے اس قول میں اختلاف کی بنا پر جو ذوالیدین کی حدیث کے استعمال میں ہے۔ جیسا کہ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔

اور امام شافعی اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: جس نے عمداً کلام کیا اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس نے نماز مکمل نہیں کی اور یہ کہ وہ نماز میں ہے تو اس نے اپنی نماز کو فاسد کر دیا اور اگر اس نے سہواً گفتگو کی یا اس نے گفتگو کی اور وہ یہ گمان کرتا ہو کہ وہ نماز میں نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل کر لیا ہے تو وہ بنا کر سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں امام احمد نے اختلاف کیا ہے اور ان سے الاثرم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی نے اپنی نماز کے دوران اس کی اصلاح کے لئے جو گفتگو کی تو اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور گفتگو کی تو اس کی

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 353، وزارت تعلیم

نماز فاسد ہوگئی۔ یہی امام مالک کا مشہور قول ہے اور الحزمی نے ان سے ذکر کیا ہے کہ ان کا مذہب اس کے بارے میں جس نے عمداً کلام کیا یا بھول کر، یہ ہے کہ اس کی نماز باطل ہوگئی، سوائے صرف امام کے کیونکہ جب اس نے اپنی نماز کی اصلاح کے لئے گفتگو کی تو اس کی نماز باطل نہیں ہوئی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے سحنون نے یہ استثنا بیان کی ہے کہ جس نے چار رکعت نماز میں دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور وہاں کلام ہوئی تو نماز باطل نہ ہوگی اور اگر اس کے سوا کسی اور محل میں کلام واقع ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور صحیح وہ ہے جو امام مالک کا مشہور قول ہے اور حدیث سے استدلال ہے اور احکام کے متعدی ہونے اور شریعت کے عموم کے بارے میں اسے اصل کلی پر محمول کرتے ہوئے اور خصوصیت کے وہم کو دور کرتے ہوئے جبکہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: تحقیق کلام بھی نماز میں واقع ہوئی اور سہو بھی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تسبیح کہنا مردوں کے لئے ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے ہے'' (1) تو انہوں نے تسبیح کیوں کر نہ کہی؟ تو کہا جائے گا: شاید اس وقت میں انہیں اس کا حکم نہیں تھا اور اگر تھا جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے تسبیح نہ کہی، کیونکہ انہیں یہ وہم ہوا کہ نماز کم ہوگئی ہے۔ اس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ فرمایا: لوگوں میں سے ایک تیز رفتار آدمی نکل گیا تو لوگوں نے کہا: کیا نماز کم ہوگئی ہے؟ پس اس وجہ سے کلام کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور بعض مخالفین نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور وہ (ابوہریرہ) ان میں سے نہ ہوں، جیسا کہ نزال بن سبرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''بے شک ہم اور تم بنی عبد مناف پکارے جاتے تھے اور تم آج بنو عبداللہ ہو اور ہم بھی بنو عبداللہ ہیں''۔ (2) اس سے مراد یہ لیا ہے کہ آپ نے یہ اپنی قوم کو فرمایا اور یہ بعید ہے، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کہیں صلی بنا آپ نے ہمیں نماز پڑھائی حالانکہ اس وقت وہ کافر تھے۔ اہل صلوٰۃ میں سے نہ تھے اور یہ کذب ہوگا، اور نزال کی حدیث وہ بھی من جملہ قوم میں سے تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جو سنا۔

اور رہا وہ دعویٰ جو حنیفہ نے نسخ اور ارسال کے بارے کیا ہے تو ہمارے علماء وغیرہم نے ان کے قول کا جواب دیا ہے اور اسے باطل قرار دیا ہے۔ خاص کر حافظ ابو عمر ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے سال اسلام لائے اور اسی سال مدینہ طیبہ میں آئے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چار سال تک رہے اور ذوالیدین کے قصے کو دیکھا اور اس میں حاضر تھے۔ اور یہ بدر سے پہلے کا نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے اور ذوالیدین بدر میں شہید ہوئے۔ فرمایا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذوالیدین کے دن حاضر ہونا ثقہ حفاظ کی روایت کے مطابق محفوظ ہے اور جنہوں نے اسے جانا، اسے یاد کیا اور اس کا ذکر کیا ان کے خلاف حجت لانے سے جو باز رہے اس میں ان کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 180، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب التصفیق للنساء، حدیث 1128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب تشبیك الاصابع الخ، حدیث 460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ شرح مشکل الآثار، جلد 8، صفحہ 282، موسسۃ الرسالۃ بیروت۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ القنوت: اس کا معنی قیام ہے اور یہ اس کی ان اقسام میں سے ایک ہے جو ابوبکر بن انباری نے ذکر کی ہیں۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ فرض نماز میں قیام کرنا ہر تندرست اور اس پر قدرت رکھنے والے آدمی پر واجب ہے چاہے وہ منفرد ہو یا امام ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ امام بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو'' (1) الحدیث۔ اسے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بیان ہے: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اور انہوں نے صحت مند مقتدی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایسے مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے جو کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اہل علم کے ایک گروہ نے اس کی اجازت دی ہے بلکہ جمہور اہل علم نے، کیونکہ امام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اور جب وہ (امام) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم تمام بھی بیٹھ کر نماز پڑھو'' (2)۔ یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ ابھی ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء کے ایک گروہ نے مریض امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جس میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اور اپنی نماز انہیں کے ساتھ بیٹھ کر مکمل کی اور وہ کھڑے تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اپنے گھوڑے سے گرنے کے بعد کا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دوسرا فعل پہلے فعل کے لئے ناسخ ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے ان میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد بن علی ہیں اور یہی ولید بن مسلم کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ امام کے پہلو میں ان میں سے کوئی کھڑا ہو جائے جو لوگوں کو امام کی نماز کے بارے بتلاتا رہے (یعنی امام کی حرکات وسکنات سے آگاہ رکھے۔) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت غریب ہے۔

اور اس کے بارے اہل مدینہ کی ایک جماعت اور دوسروں نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ کوئی بیٹھنے والا کھڑے ہونے والوں کی امامت نہیں کرائے گا۔ پس اگر بیٹھ کر اس نے ان کی امامت کرائی تو امام اور مقتدی تمام کی نماز باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میرے بعد بیٹھ کر کوئی بھی امامت نہ کرائے گا (3)''۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 89، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم به، حدیث نمبر 647-648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم به، حدیث نمبر 648-646، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 398، دار المحاسن قاہرہ

فرمایا: اگر امام بیمار ہو تو امام کی نماز مکمل ہوگی اور اس کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز فاسد ہوگی۔ مزید کہا: جس نے بغیر علت کے بیٹھ کر نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ امام مالک سے ابو مصعب نے اپنی مختصر میں روایت بیان کی ہے۔ پس جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اس پر وقت میں اور وقت کے بعد اعادہ واجب ہوگا۔ اور امام مالک سے اس بارے میں روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ صرف وقت میں اعادہ کریں گے۔ اور اس بارے میں امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام مالک کے مشہور قول کی مثل ہی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کے لئے اور اپنے مذہب کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو مصعب نے بیان کیا ہے، اسے دارقطنی نے جابر سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا دارقطنی نے کہا ہے: اسے جابر جعفی کے سوا کسی نے حضرت شعبی سے روایت نہیں کیا ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جابر جعفی کسی بھی شے سے حجت نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ اسے مسند روایت کرتا ہو تو پھر اس سے کیسے استدلال ہوسکتا ہے جسے وہ مرسل روایت کرتا ہے؟

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مریض امام بیٹھ کر ایسی قوم کو نماز پڑھائے جن میں کچھ صحت مند اور کچھ مریض ہوں تو امام کی نماز اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں میں سے ان کی نماز جو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے صحیح اور جائز ہے اور ان کی نماز جن کے لئے قیام کا حکم ہے باطل ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: امام اور تمام مقتدیوں کی نماز جائز ہے اور انہوں نے کہا: اگر امام نے اشارے کے ساتھ ایسے لوگوں کو نماز پڑھائی جو رکوع وسجود کر سکتے ہیں تو تمام کے قول کے مطابق مقتدیوں کی نماز جائز نہیں اور امام کی نماز جائز ہے اور امام زفر کہتے ہیں: ان کی نماز بھی جائز ہوگی کیونکہ انہوں نے اپنے فرض ادا کیے ہیں اور ان کے امام نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ابو عمر اور ان کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے علماء نے کہا ہے کہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھائی، حالانکہ میں نے ان کے سوا اس کے خلاف بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس باب میں طرق احادیث کو جمع کیا ہے اور ان پر گفتگو کی ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے تاکہ تیرے لئے راہ صواب واضح ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے قول کی صحت واضح ہو جائے جس نے یہ کہا کہ تندرست مقتدی کا مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

پس ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے المسند الصحیح میں اس کا ذکر کیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت میں تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے نہیں ہو کہ جس نے میری اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں میری طاعت ہے؟'' انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم تو شہادت دیتے ہیں کہ جس کسی نے آپ کی اطاعت کی تحقیق اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آپ کی اطاعت ہے۔ پھر فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت یہ ہے کہ تم اپنے امراء کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو(1)۔'' اس کی سند میں عقبہ بن ابی الصہباء راوی ہے اور وہ ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے یہی کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ واضح بیان ہے کہ مقتدیوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا جبکہ ان کا امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے اللہ تعالیٰ کی اس اطاعت میں سے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ یہ میرے نزدیک اس اجماع کی ایک قسم ہے جس کی اجازت پر انہوں نے اجماع کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چار ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی) حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت قیس بن فہد رضی اللہ عنہم اور ان صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ان چار کے خلاف مروی نہیں جو وحی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت حاضر تھے اور جنہیں تحریف و تبدیل سے محفوظ رکھا گیا، نہ اسناد متصل کے ساتھ اور نہ منقطع کے ساتھ۔ تو گویا صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا کہ امام جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ اسی طرح جابر بن زید، اوزاعی، مالک بن انس، احمد بن حنبل، اسحاق ابن ابراہیم، ابو ایوب سلیمان بن داؤد الہاشمی، ابو خیثمہ، ابن ابی شیبہ، محمد بن اسماعیل اور اصحاب حدیث میں سے جو ان کے متبعین ہیں مثلاً محمد بن نصر اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اس حدیث کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

اس امت میں سب سے اول جس نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیا جبکہ امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے وہ مغیرہ بن مقسم صاحب النخعی ہیں اور ان سے حماد بن ابی سلیمان نے اسے لیا ہے اور پھر حماد سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اخذ کیا ہے اور پھر آپ کے بعد آنے والے آپ کے اصحاب نے آپ کی اتباع کی ہے اور اس بارے میں وہ اعلیٰ روایت جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے اسے جابر جعفی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا اس روایت کی اسناد اگر صحیح بھی ہو تو بھی یہ مرسل ہے اور مرسل خبر اور وہ جسے کوئی روایت نہ کرے ہمارے نزدیک حکم میں دونوں برابر ہیں، پھر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں: جن سے میں نے ملاقات کی ان میں حضرت عطا سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا اور جن سے میں ملا ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کوئی نہیں دیکھا اور میں کبھی اس کے پاس رائے سے کوئی شے نہیں لایا مگر وہ اس بارے میرے پاس حدیث لایا اور گمان ہوا کہ اس کے پاس اتنے اتنے ہزار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں ہیں جن کے بارے گفتگو نہیں۔ پس یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو جابر جعفی پر جرح کر رہے ہیں اور اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور یہ اس قول کی ضد ہے جس کی بنا پر آپ کے اصحاب نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے(2)۔

---

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 470، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 417 تا 474، موسسۃ الرسالہ بیروت

ابو حاتم نے کہا ہے: رہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وہ نماز جو آپ نے حالت مرض میں ادا فرمائی تو اس کے بارے مجمل اور مختصر اخبار مروی ہیں اور ان میں سے بعض مفصل اور واضح بھی ہیں، تو ان میں سے بعض میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا کر رہے تھے (1) اور بعض میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب تشریف فرما ہو گئے۔ یہ روایت مفصل ہے۔ اس میں ہے: فکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بالناس قاعدا و ابوبکر قائما پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور ابوبکر کھڑے ہو کر۔

ابو حاتم نے کہا ہے: جہاں تک اس خبر کے اجمال کا تعلق ہے تو بلا شبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس مقام پر اس نماز کو بیان کیا ہے اور آخر القصہ یہ ہے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس نماز میں بھی انہیں بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جیسا کہ آپ نے انہیں اپنے گھوڑے سے گرنے کے وقت اس کا حکم دیا تھا (2)، محمد بن الحسن بن قتیبہ نے ہمیں خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں یزید بن موہب نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: مجھے لیث بن سعد نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیمار ہوئے تو ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں تک آپ کی تکبیر کی آواز پہنچا رہے تھے۔ راوی فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں کھڑا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے اور ہم نے بیٹھ کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا: ''قریب ہے کہ تم اہل فارس اور روم کے عمل جیسا عمل کرو وہ اپنے بادشاہوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں پس تم اس طرح نہ کرو تم اپنے ائمہ کی اقتدا کرو اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

ابو حاتم نے کہا ہے: پس اس مفصل خبر میں واضح بیان ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مقتدی ہو گئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نماز کی اقتدا کرنے لگے اور آپ تکبیر کہتے اور وہ لوگوں تک تکبیر کی آواز پہنچاتے تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نماز کی اقتدا کریں اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جب آپ نے انہیں کھڑے ہوئے دیکھا اور جب آپ اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے انہیں بیٹھنے کا بھی حکم فرمایا جب ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس نماز میں حاضر تھے جس وقت آپ اپنے گھوڑے سے گرے اور آپ کی دائیں جانب کچھ زخمی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ماہ ذی الحجہ ۵ ھ کے آخر میں گرے تھے اور وہ اس نماز میں بھی حاضر تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے مرض کی حالت میں اس تاریخ کے علاوہ ادا فرمائی اور آپ نے ہر خبر کو اس کے الفاظ

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوۃ، جلد 5، صفحہ 489، موسسۃ الرسالہ بیروت
ایضاً صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام الخ، حدیث نمبر 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 490-491

کے ساتھ بیان فرمایا کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ اس نماز میں ذکر کر رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تا کہ لوگ آپ کی اقتدا کریں اور وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑے سے گرنے کے وقت اپنے گھر میں پڑھائی تھی اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں تا کہ وہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنوا سکیں۔ تو بلاشبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عظیم مسجد میں تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حالت مرض میں نماز پڑھائی، پس جب صحیح ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ہم ان اخبار میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیں (1) اور اس نماز کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں امام تھے اور آپ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور انہیں بھی بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور رہی وہ نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کی آخری نماز پڑھی تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ (یا ثویبہ) رضی اللہ عنہما کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے اور اس میں آپ مقتدی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہی کپڑا پہن کر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرمائی (2)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوم کے ساتھ ایک کپڑا پہن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ادا فرمائی (3)، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں نہ کہ ایک نماز۔ اور عبید اللہ ابن عبد اللہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مردوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ ان دو میں سے ایک حضرت عباس اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو خبر بیان کی ہے اس میں ہے: پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ میں کچھ آرام اور سکون پایا تو آپ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ بے شک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعلین کی طرف دیکھتی رہی وہ سنگریزوں میں لکیر ڈال رہے تھے اور میں آپ کے قدموں کے تلووں کی طرف دیکھتی رہی۔ الحدیث۔

پس یہ تیری اس پر راہنمائی کرتی ہے کہ وہ دو نمازیں تھیں نہ کہ ایک نماز (4)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: ہمیں محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں بدل بن محبر نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبید اللہ بن عبد اللہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صف میں آپ کے پیچھے تھے (5)۔

---

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 491 تا 493، موسسۃ الرسالہ بیروت　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 496

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء اذا صلی الامام قاعدا، حدیث نمبر 331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب من قام الی جنب الامام لعلۃ، حدیث 642۔ صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام، حدیث 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 488، موسسۃ الرسالہ بیروت　5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 483

ابو حاتم نے کہا ہے: شعبہ بن حجاج نے زائدہ بن قدامہ سے اس خبر کے متن میں موسیٰ بن ابی عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ پس شعبہ نے حضور نبی کریم ﷺ کو مقتدی بنایا ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر۔ اور زائدہ نے آپ ﷺ کو امام قرار دیا ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور قوم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور یہ دونوں انتہائی ثقہ اور حافظ ہیں۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسی دو روایتیں جن کے ظاہر میں ایک فعل میں تضاد ہے ان میں سے ایک کو مطلق متقدم امر کے لئے ناسخ بنا دیا جائے پس جس نے دو حدیثوں میں سے ایک کو حضور نبی کریم ﷺ کے امر متقدم کے لئے ناسخ بنایا اور دوسرے کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا تو اس کی صحت پر ثبوت لانا اس کے ذمہ ہے اس نے اپنے خصم کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ دو خبروں سے اسے لے لے جسے اس نے چھوڑا ہے اور اسے چھوڑ دے جسے اس نے لیا ہے۔ اور سنن میں سے اس نوع کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے (1) اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان سے نکاح کیا اور وہ دونوں حلال تھے (یعنی حالت احرام میں نہ تھے۔) (2) پس یہ دونوں حدیثیں ایک فعل میں بظاہر متضاد ہیں بغیر اس کے کہ ہمارے نزدیک ان دونوں کے درمیان تضاد ہو، اصحاب حدیث کی ایک جماعت نے ان دونوں حدیثوں کو متعارض قرار دیا ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے مروی ہیں اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خبر کو لے لیا ہے جو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ لا ینکح المحرم ولا ینکح (محرم نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی کا نکاح کر سکتا ہے) تو انہوں نے اسے لے لیا۔ جبکہ یہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر کو چھوڑ دیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان کے ساتھ حالت احرام میں نکاح کیا۔ پس جس نے یہ کہا اس کے لئے یہ کہنا لازم ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے دو حدیثیں متضاد ہیں، اس طریقہ پر جو اس سے پہلے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی خبر لائے جس میں مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم موجود ہو جبکہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور وہ اسے پکڑ لیں جبکہ وہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے موافق ہو جو حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے روایت کی گئیں ہیں اور وہ چھوڑ دے اس خبر کو جو ان میں سے منفرد ہو، جیسا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں کیا گیا (3)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: بعض عراقیین نے گمان کیا ہے جو کوفیوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ قول واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ کر تشہد پڑھے تو تم تمام بھی بیٹھ کر تشہد پڑھو۔ تو یہ خبر کو اس کے عموم سے

1۔ صحیح بخاری، باب التزویج المحرم، حدیث نمبر 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ تزویج المحرم، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوۃ، جلد 5، صفحہ 483 تا 485، موسستہ الرسالہ بیروت

پھیر دینا ہے جس کے بارے میں خبر وارد ہے بغیر کسی ایسی دلیل کے جو اس معنی کو ثابت کر سکے (1)۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۚ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾

''پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَإِنْ خِفْتُمْ یہ خوف سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھبراہٹ اور ڈر ہے۔ فَرِجَالًا یعنی تم نماز پڑھو پیدل چلتے ہوئے أَوْ رُكْبَانًا یا سوار۔ یہ رجالا پر معطوف ہے۔ اور الرجال راجل یا رَجُل کی جمع ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: رَجِلَ الانسانُ يَرْجَلُ رَجَلاً جب آدمی کے پاس سواری نہ ہو اور وہ اپنے قدموں پر چلے۔ (صفت کا صیغہ ہوگا) فهو رَجِل و رَاجِل و رَجُلٌ (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یہ اہل حجاز کی لغت ہے، وہ کہتے ہیں: مشى فلان الى بيت الله حافيا رَجُلاً (فلاں بیت اللہ شریف کی طرف ننگے پاؤں پیدل چلا) اسے طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ و رَجْلَان و رَجِيل و رَجْل، (2) اور اس کی جمع رِجَال و رَجْلى و رُجَال و رَجَالة و رُجالى و رُجْلان و رِجْلَةٌ و رِجَلة (جیم کے فتحہ کے ساتھ) و أَرْجِلة و أَراجِل و أَراجِيل کے اوزان پر بنائی جاتی ہے اور الرَّجُل وہ جو کہ اسم جنس ہے اس کی جمع رجال بھی بنائی جاتی ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نماز میں قنوت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کا حکم ارشاد فرمایا اور قنوت سے مراد وقار، سکینہ اور اعضاء کا پرسکون ہونا ہے اور یہ اغلباً أمن اور طمانینت کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے تو پھر حالت خوف کا ذکر فرمایا جو کبھی کبھار طاری ہو سکتی ہے اور بیان فرمایا کہ یہ عبادت بندے سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی اور اپنے بندوں کو نماز کے بارے میں رخصت عطا فرمائی کہ وہ اپنے قدموں پر پیدل چلتے ہوئے اور گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کی کسی شے پر سواری کرتے ہوئے اپنے سر کے اشارے کے ساتھ جس طرف منہ کرنا ممکن ہو متوجہ ہو کر نماز پڑھ لیں۔ یہ عطاء کا قول ہے، اور یہی اس گھبراہٹ اور خوف کی نماز ہے جب خوف شدت اور سختی کے ساتھ آدمی کی ذات پر مسلط ہو جائے جنگ کی حالت میں یا ایسا درندہ جو اسے تلاش کر رہا ہو، اس سے خوف کی حالت میں یا ایسے دشمن سے خوف ہو جو اس کا پیچھا کر رہا ہو یا ایسے سیلاب کا خوف ہو جو اسے اٹھا سکتا ہو۔ بالجملہ ہر وہ شے جس سے آدمی کو اپنی جان پر خوف ہو تو وہی وہ عذر مبیح ہے جسے یہ آیت متضمن ہے (4)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ رخصت اپنے ضمن میں علماء کا اجماع بھی لئے ہوئے ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو راستوں سے

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 487، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہٹ جائے اور رخ تبدیل کرلے اور اپنی عقل کے مطابق اپنی جان بچانے کے لئے ممکنہ اقدام کرے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس خوف کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس میں نماز پیادہ اور سوار پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے: مراد ایسا خوف ہے کہ دشمن ان پر بالکل قریب آچکا ہو اور وہ اکٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں اور مسلمان غیر محفوظ ہوں یہاں تک کہ ہتھیار تیر وغیرہ ان تک پہنچ سکتے ہوں یا اس سے بھی زیادہ دشمن ان کے قریب ہو کہ نیزے اور تلواریں ان تک پہنچ سکتی ہوں یا اس کے پاس کوئی ایسا مخبر آئے جس کی خبر کی تصدیق کی جاسکتی ہو اور وہ اسے خبر دے کہ دشمن اس کے قریب ہے اور بڑی تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، پس اگر ان دو معنوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ صلوٰۃ الخوف پڑھے اور اگر خبر کی بنا پر انہوں نے صلوٰۃ خوف پڑھی پھر دشمن چلا گیا تو وہ نماز کا اعادہ نہ کریں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کریں گے۔ یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: وہ حالت جس میں خوفزدہ ہونے والے کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھے پیادہ یا سوار، قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے یا کسی اور طرف یہ شدت خوف کی حالت ہے اور وہ حالت جس کے بارے میں آثار وارد ہیں وہ اس کے سوا ہے۔ اور صلاۃ خوف امام کے ساتھ اور لوگوں کو تقسیم کر کے پڑھی جاتی ہے اور اس آیت میں اس کا حکم نہیں ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور امام مالک نے جنگجو دشمن کے خوف اور درندے کے خوف اور اس جیسی دیگر چیزیں مثلاً حملہ کرنے والا اونٹ، سیلاب یا ہر وہ شے جس میں غالب گمان ہلاکت کا ہو، کے درمیان فرق کیا ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرنا مستحب ہے اگر امن اور سکون میسر آجائے اور اکثر فقہائے امصار نے کہا ہے کہ حکم برابر ہے (چاہے خوف دشمن کا ہو یا کسی درندے وغیرہ کا)

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلا شبہ قتال نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کا رد کرتی ہے اور ظاہر آیت اس پر قوی دلیل ہے۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام شافعی نے کہا ہے: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض شروط کو ترک کرنے کے جواز کی رخصت عطا فرمائی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نماز میں قتال کرنا اسے فاسد نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک خوف کی حالت میں مسافر کی نماز سے رکعتوں کی تعداد کم نہ ہوگی۔

اور حسن بن ابی الحسن اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے کہ وہ ایک رکعت اشارے کے ساتھ پڑھ سکتا ہے (1)۔

امام مسلم نے بکیر بن اخنس سے، انہوں نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر شہر میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 335، دار الکتب العلمیہ

وقت ایک رکعت نماز فرض کی ہے(1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس روایت کو بیان کرنے میں بکیر بن اخنس منفرد ہے اور وہ روایت حجت نہیں ہوتی جس میں وہ منفرد ہوتا ہے اور نماز میں اولیٰ یہ ہے کہ اس میں احتیاط برتی جائے وہ آدمی جس نے اپنے خوف اور سفر کی حالت میں دو رکعتیں نماز پڑھ لی تو وہ اختلاف سے یقین کی طرف نکل گیا۔

اور ضحاک ابن مزاحم نے کہا ہے: وہ آدمی جسے حالت جنگ یا کسی اور حالت میں موت کا خوف ہو تو وہ ایک رکعت پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ دو تکبیریں کہہ لے۔

اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: اگر وہ صرف ایک تکبیر پر ہی قادر ہوا تو وہی اس کی طرف سے جائز ہوگی۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے(2)۔

اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ، یعنی (جب تمہیں امن حاصل ہو جائے) تو تم اس حکم کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہیں ارکان کی تکمیل کے بارے دیا گیا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ کا معنی ہے جب تم دارالسفر سے دارالاقامہ کی طرف نکل جاؤ۔ علامہ طبری نے اس کا رد کیا ہے(3) اور ایک جماعت نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ جب تمہارا وہ خوف زائل ہو جائے جس نے تمہیں اس نماز پر مجبور کر دیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء نے خائف کی بنا کے بارے اس باب میں اختلاف کیا ہے جب وہ امن میں ہو جائے، حضرت امام مالک نے کہا ہے: اگر کسی نے ایک رکعت حالت امن میں پڑھ لی پھر اسے خوف لاحق ہو گیا تو وہ سوار ہو اور اسی پہ بنا کر لے (یعنی دوسری رکعت سواری پر پڑھ لے تو نماز مکمل ہو جائے گی۔) اور اسی طرح اگر کسی نے حالت خوف میں سوای پر ایک رکعت پڑھی، پھر اسے امن ہو گیا، تو وہ اترے اور اسی پر بنا کر لے۔ یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور مزنی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی امن کی حالت میں نماز شروع کرے، پھر اسے خوف لاحق ہو جائے وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور بنا نہ کرے اور اگر اس نے حالت خوف میں نماز شروع کی پھر اسے امن حاصل ہو جائے تو وہ بنا کر لے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سواری سے اترنے والا تو بنا کر سکتا ہے (لیکن) سوار ہونے والا بنا نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: وہ ان تمام صورتوں میں سے کسی میں بھی بنا نہیں کر سکتا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی نماز کی تعلیم دی ہے جو اصل نماز کے قائم مقام ہے اور تمہاری کوئی نماز فوت نہیں ہوئی اور یہ وہی ہے جسے تم نہ جانتے تھے اور قول باری كَمَا میں کاف بمعنی شکر ہے تو کہتا ہے: تو میرے ساتھ اسی طرح (سلوک) کر جیسے میں نے تیرے ساتھ کیا اسی طرح بدلہ اور شکر ہوگا اور مَا اَنْ میں ما، عَلَّمَكُمْ کا مفعول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 241، وزارت تعلیم　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دارالکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 9**۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: صلاۃ کا اصل معنی دعا ہے اور حالت خوف میں تو بدرجہ اولیٰ دعا کے معنی میں ہوگی، اسی لئے خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوتی اور جب خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوئی تو پھر یہ زیادہ مناسب اور لائق ہے کہ یہ اس کے سوا حالت مرض یا کسی اور حالت میں ساقط نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں نمازوں پر مواظبت اور ان کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، چاہے صحت کی حالت ہو یا مرض کی، حضر ہو یا سفر، نماز کی قدرت ہو یا عجز خوف ہو یا امن، یہ کسی حال میں بھی مکلف سے ساقط نہیں ہوتی اور کسی قسم کا فساد اور خلل اس کی فرضیت میں حائل نہیں ہوسکتا، راہ نہیں پکڑ سکتا۔ مریض کا حکم سورۂ آل عمران کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نماز پڑھی جائے گی جس کیفیت میں ممکن ہوگی اور یہ کسی حال میں ساقط نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر اسے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو مگر آنکھ کے اشارے کے ساتھ تب بھی اسے پڑھنا لازم ہے اور اسی وجہ سے یہ تمام عبادات سے ممتاز ہے، تمام کی تمام عذروں کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں اور ان میں رخصت حاصل ہو جاتی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسئلہ عظمیٰ ہے، بے شک نماز ترک کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ نماز اس ایمان کے مشابہ ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا اور انہوں نے اس بارے میں کہا ہے: نماز اسلام کے ستونوں میں سے ایک ہے جس کی نیابت نہ بدن کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور نہ مال کے ساتھ (یعنی نماز کا قائم مقام کوئی اور بدنی یا مالی عبادت نہیں ہوسکتی) اور اس کے تارک کو قتل کر دیا جائے گا، اس کی اصل شہادتین ہے (1)۔ تارک صلوٰۃ کے بارے میں علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بیان سورۂ براءۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے کہ انہیں خرچ دیا جائے ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ اپنے فوت ہونے والے خاوند کے گھر میں ایک سال تک بیٹھی رہے گی اور جب تک وہ گھر سے نہ نکلی اس کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جاتا رہے گا اور اگر وہ نکل گئی تو اس کا نفقہ ختم کرنے میں ورثاء پر کوئی حرج نہیں۔ پھر سال کی مدت کو چار مہینے اور دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا اور نفقہ کو سورۂ نساء میں چوتھے اور آٹھویں حصے کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ابن زید اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور سکنیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: یہ آیت جو سورۃ البقرہ میں ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ تحقیق اسے دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے آپ نے اسے کیوں نہیں لکھا یا آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے اس میں سے کسی شے کو اس کے مکان سے تبدیل نہیں کیا (1)۔

اور علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: بے شک یہ آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور عدت چار مہینے اور دس دن ثابت ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وصیت بنا دی اس میں سکنیٰ سات مہینے اور بیس راتیں ہے۔ پس اگر عورت چاہے تو اپنی وصیت میں رہے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2) ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تمام کا حکم نسخ متفق علیہ کے ذریعے زائل ہو چکا ہے مگر وہ جو طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے دعویٰ کیا ہے۔ اس بارے میں طبری محل نظر ہیں۔

اور حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع منعقد ہے کہ سال کی مدت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ دوسروں نے کہا: قولہ وصیۃ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورتوں پر زوج کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک گھروں میں رہنا واجب ہوتا ہے۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ طبری نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ صحیح ثابت ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے: ہمیں اسحاق، روح، شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا فرمایا: یہ عدت اپنے زوج کے گھر والوں کے پاس گزارنا واجب تھی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تمام سال کو سات مہینے اور بیس راتیں وصیت بنا دیا، اگر وہ چاہے تو اپنی وصیت میں سکونت رکھے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (3) مگر پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''بلا شبہ یہ عدت چار مہینے اور دس دن ہے تم میں سے کوئی زمانہ جاہلیت میں سال مکمل ہونے پر مینگنیاں پھینکتی تھی۔'' الحدیث (4)

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شریعت کے احکام نافذ ہونے سے پہلے ان عورتوں کی حالت کا بیان ہے جن کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ
3۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۂ بقرہ، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 143، وزارت تعلیم

خاوند فوت ہو جاتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سال تک گھروں میں ہی رہنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس مدت کو چار مہینے دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا یہ وضاحت کے ساتھ سنت ثابتہ میں ہے جسے اخبار آحاد سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر علماء مسلمین کا اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا اور اسی طرح پوری آیت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ جمہور علماء کے نزدیک یہ سب منسوخ ہے۔ پھر بیویوں کے لئے سال بھر رہائش کی وصیت کرنے کو منسوخ کر دیا گیا، سوائے ایک شاذ روایت کے جسے چھوڑ دیا گیا ہے وہ ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی متابع نہیں لائی گئی اور نہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد آنے والے علمائے مسلمین میں سے کسی نے اس کے سبب چار مہینے اور دس دن پر اضافہ کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔

اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے جس پر لوگوں کا عمل ہے، پس اجماع منعقد ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔ و باللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَّصِيَّةً حضرت نافع، ابن کثیر، کسائی، عاصم نے ایک روایت میں اور ابو بکر رحمۃ اللہ علیہم نے مبتدا ہونے کی بناء پر وَّصِيَّةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر لِّاَزْوَاجِهِمْ ہے۔ اور یہ معنی ہونے کا احتمال بھی ہے علیهم وصية۔ ان پر وصیت لازم ہے اور قول باری تعالیٰ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو (1)۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ معنی ہے کُتبت علیهم وصية ان پر وصیت فرض کی گئی ہے اور قولہ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہوگا (2)۔ فرمایا: اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے وصيّةً منصوب پڑھا ہے اور اسے فعل پر محمول کیا ہے۔ یعنی فلیوصُوا وصيّةً پس چاہئے کہ وہ ضرور وصیت کریں پھر میت تو وصیت نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ وفات کے قریب ہوں اور لِاَزْوَاجِهِمْ اس قراءت کی بنا پر بھی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے اوصی اللہ وصيّةً۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور مَتَاعاً۔ مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعاً ہے۔ یعنی تم انہیں ضرور نفقہ ادا کرو۔ یا جعل اللہ لهن ذلك متاعاً۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وہ خرچہ مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو یا مصدر کے سبب جو کہ الوصیۃ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا (البلد) یہاں متاع سے مراد اس کے سال کا نفقہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: غَيْرَ اِخْرَاجٍ اس کا معنی ہے کہ میت کے اولیاء کے لئے اور گھر کے ورثاء کے لئے عورت کو باہر نکالنا جائز نہیں ہے اور غَيْرَ اخفش کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا لا اخراجاً۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ متاعا کی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الموصین (وصیت کرنے والے) سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی متعوهنَّ غیر مُخرَجاتٍ (تم انہیں نفقہ دو اس حال میں انہیں نکالا نہ جائے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

حرف جر کے حذف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اصل عبارت ہے: من غیر اخراج۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنۡ خَرَجۡنَ الآیہ اس کا معنی ہے اگر وہ اپنے اختیار اور مرضی سے سال سے پہلے نکل جائیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ تو کسی ولی پر یا حاکم پر کسی اور پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر پورا سال اپنے خاوند کے گھر میں ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نفقہ منقطع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا ازواج کی خواہش کے لئے ان پر بناؤ سنگھار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اے ورثاء! ان کے بارے تمہاری نگہبانی کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے پھر ان پر لازم ہے کہ وہ ایک سال عدت گزرنے سے پہلے پہلے شادی نہ کریں یا عدت گزرنے کے بعد ان کی شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ۔ مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت سے موافقت رکھتا ہو۔ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ یہ صفت ہے جو اس کے بارے میں وعید کا تقاضا کرتی ہے جس نے اس آیت میں بیان کردہ حد کی مخالفت کی اور عورت کو نکال دیا حالانکہ وہ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ حَکِیۡمٌ یعنی اپنے بندوں کے امور میں سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے خوب پختہ کرنے والا ہے۔

وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ حَقًّا عَلَی الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲۴۱﴾ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴۲﴾

''اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ۔''

اس آیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ابوثور رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ محکم آیت ہے اور متعہ ہر مطلقہ عورت کے لئے لازم ہے اسی طرح زہری نے کہا ہے (زہری نے کہا) یہاں تک کہ ایسی لونڈی کے لئے بھی جسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے(1) اور اس آیت کی وجہ سے یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے چاہے اسے دو طلاقیں ہوں یا ایک طلاق، وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے، اس کے لئے مہر مقرر کرے یا نہ کرے، سوائے اس عورت کے جس کے پاس جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے نصف مہر کافی ہوگا اور اگر اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لیے متعہ ہوگا چاہے وہ مہر مثلی سے کم ہو یا زیادہ اور اس متعہ کی کوئی حد نہیں ہے، اسے آپ سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور ابن قاسم نے المدونہ سے پردے ڈالنے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے متعہ مقرر کیا ہے، پھر دوسری آیت میں اس کی استثنا کر دی ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا تو اسے متعہ سے خارج کر دیا اور ابن زید نے گمان کیا ہے کہ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ ابن قاسم نے لفظ نسخ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

سے لفظ استثنا کی طرف فرار اختیار کیا ہے، اس محل میں استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو صرف نسخ ہے جیسا کہ زید بن اسلم نے کہا ہے اور ابن قاسم نے لازم قرار دیا ہے کہ **قولہ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ** ہر مطلقہ کو شامل ہے۔ تو پھر نسخ کا قول لازم اور ضروری ہے۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت ان ثیبہ عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت کے سوا دوسری میں ان عورتوں کے لئے متعہ کا ذکر گزر چکا ہے جن کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا۔ پس یہ قول ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کے لئے مس سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا یہ کبھی عموم میں داخل نہیں ہوئی۔ اور یہ اس بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ** یہ عورتوں میں سے اس صنف کو خاص کر رہا ہے اور جب کہا گیا ہے کہ یہ عموم اس قسم کو بھی شامل ہے تو پھر یہ نسخ ہوگا تخصیص نہیں۔ (1)

اور امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا ہے: بلا شبہ متعہ نہیں ہے مگر اس عورت کے لئے جسے قبل از دخول طلاق دی جائے اور وہاں نہ مس ہوا اور نہ مہر مقرر ہو۔ کیونکہ جو مہر میں سے کسی شے کی مستحق ہو جائے تو وہ اپنے حق میں متعہ کی محتاج نہیں رہتی۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ** (الاحزاب:28) اس پر محمول ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک احسان ہے، نہ کہ آپ کے لئے واجب ہے اور قول باری تعالیٰ: **فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ** (الاحزاب:49) بھی غیر مفروضہ پر محمول ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا جائے اس کے لئے مہر ہوگا جب اسے قبل المسیس طلاق دی جائے، اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے مجامعت کے بغیر نصف مہر لے لیا ہے۔ اور مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس کے لئے متعہ ہوگا، کیونکہ مہر وطی کے مقابلہ میں واقع ہوتا ہے اور متعہ عقد کے ساتھ انتہائی استعمال کے سبب (لازم ہے) اور امام شافعی نے خلع اور مبارات کرنے والی کے لئے بھی متعہ واجب کیا ہے اور امام مالک کے اصحاب نے کہا ہے: فدیہ دینے والی کے لئے کیسے متعہ ہو سکتا ہے حالانکہ وہ خود دیتی ہے تو وہ متعہ کیسے لے گی اور جدائی اور فراق کو اختیار کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے چاہے، وہ خلع لینے والی ہو یا فدیہ دینے والی یا مبارات کرنے والی یا صلح کرنے والی یا لعان کرنے والی یا آزاد ہونے والی فراق اور جدائی کو اختیار کر لے۔ اس کے ساتھ دخول ہو یا نہ ہو، اس کے لئے مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔

**اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝**

"کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ رؤیت قلب مراد ہے۔ اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا آپ نہیں جانتے اور سیبویہ کے نزدیک اس کا معنی ہے: کیا آپ آگاہ نہیں ان لوگوں کے معاملہ کے بارے۔ (یعنی الم تنبّہ) اور یہ رؤیت (یعنی اَلَمْ تَرَ) دو مفعولوں کا محتاج نہیں ہے۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی نے اَلَمْ تَرْاء کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور القائے حرکت کے بغیر ہی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی اصل ہے: الم ترءَ۔

ان لوگوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم ہے۔ ان میں وبا پھیل گئی، یہ ایک گاؤں میں تھے جسے داوَرْدان کہا جاتا ہے (یہ گاؤں واسط کے مشرقی نواح میں واقع ہے اور ان کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے "معجم یاقوت") پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکلے اور ایک وادی میں جا اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط کر دی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھے۔ طاعون سے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے کہا: ہم ایسی زمین پر آئے ہیں جہاں موت نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو مار دیا۔ پھر ان کے پاس سے ایک نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ آٹھ دن تک مرے رہے اور بعض نے کہا: سات دن تک، واللہ اعلم۔

حضرت حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا مدت مقررہ سے پہلے مار دیا، پھر انہیں باقی ماندہ عمروں کے لئے اٹھا دیا۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات میں سے ایک نبی علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کے لئے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اسم گرامی حضرت شمعون علیہ السلام ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ وہ بخار سے بھاگے تھے (2)۔

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ جہاد سے فرار ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی زبان سے جہاد کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو وہ جہاد میں قتال ہونے کے سبب موت سے خوفزدہ ہو گئے، پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی تاکہ وہ انہیں متنبہ کر دے کہ کوئی شے انہیں موت سے نجات نہیں دلا سکتی پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں اپنے اس ارشاد سے جہاد کے بارے حکم دیا: وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو) حضرت ضحاک نے یہی کہا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تمام کے تمام قصص ضعیف الاسانید ہیں، البتہ آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ اور توقیف کی عبارت میں انسانوں کو ایک قوم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ موت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا، تاکہ وہ اور ان کے بعد آنے والے تمام یہ جان لیں کہ موت دینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ڈرنے والے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 328

کے خوف کا اور کسی دھوکہ کھانے والے کے دھوکہ کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اپنے اس امر کا مقدمہ بنایا ہے جو اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کو جہاد کے بارے حکم فرمایا۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے اور یہی آیت کے ظاہر الفاظ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ أُلُوفٌ جمہور نے کہا ہے: یہ الف کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے: وہ چھ لاکھ تھے۔ بعض نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وہ چالیس ہزار تھے۔ ابو مالک نے کہا ہے: وہ تیس ہزار تھے (1)۔ سدی کا قول ہے: وہ سینتیس ہزار تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار تھے۔ حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی چالیس ہزار اور آٹھ ہزار کی روایت ہے، آپ سے اسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی آٹھ ہزار کی روایت بھی ہے اور آپ سے چار ہزار کی روایت بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ أُلُوفٌ اور یہ جمع کثرت ہے اور دس اور اس سے کم کے بارے میں أُلُوفٌ نہیں بولا جاتا۔

ابن زید نے الوف کے لفظ کے بارے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وھم موتلفون، یعنی انہیں اپنی قوم کے افتراق نے نہیں نکالا اور نہ ان کے درمیان کوئی فتنہ برپا ہوا، بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھتے تھے اور الفت اس فرقت کے خلاف ہے۔ پس وہ موت سے فرار اختیار کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی جگہ موت دے دی جو ان کے گمان کے مطابق ان کے لئے جائے نجات تھی۔ پس اس معنی کی بنا پر ألوف آلف کی جمع ہے۔ جیسا کہ جَالِسٌ کی جمع جلوس ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک خاص مدت تک موت دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا اور سزا کے لئے موت دینے کے بعد زندگی ہے اور اپنی مدت مقررہ پر موت آنے کے بعد زندگی نہیں ہے (2)۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب وہ زندہ کیے گئے اور اپنی قوم کی طرف لوٹے تو وہ پہچانے جا سکتے تھے (کہ وہ مردہ تھے) اور موت کی علامات ان کے چہروں پر تھیں اور ان میں سے کوئی جو کپڑا بھی پہنتا تھا تو وہ میلا سا کفن بن جاتا یہاں تک کہ وہ اپنی اس مدت مقررہ پر فوت ہوئے جو ان کے لئے لکھی گئی تھی۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی اس نسل میں وہ بو باقی ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ عراق کے (شہر) واسط کے پاس تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بدبودار ہو جانے کے بعد زندہ کیے گئے، پس وہ بو آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: حَذَرَ الْمَوْتِ، ای لحذر الموت یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ اور یہ بھی مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مُوْتُوْا امر تکوین ہے اور کہا جانا بھی بعید نہیں ہے۔ انہیں ندا دی گئی اور انہیں کہا گیا: تم مر جاؤ اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر

بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو فرشتوں نے ان کے پاس چیخ لگائی تم مرجاؤ، پس وہ مر گئے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرشتوں کے واسطہ سے کہا: مُوۡتُوۡا کہ تم مرجاؤ (1)۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح (اور زیادہ بین) اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ وبا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے۔ اسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: وہ طاعون سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے تو وہ مر گئے، پھر انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے تاکہ وہ اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا (2) اور عمرو بن دینار نے اس آیت کے بارے کہا ہے: ان کی بستی میں طاعون پھیل گیا تو کچھ لوگ وہاں سے نکل گئے اور کچھ لوگ باقی رہ گئے اور نکلنے والوں کی تعداد باقی رہنے والوں کی نسبت زیادہ تھی، فرمایا: پس جو نکل گئے وہ محفوظ رہے اور جو وہیں مقیم رہے وہ مر گئے اور جب دوسری بار ایسا ہوا تو سوائے قلیل لوگوں کے وہ تمام کے تمام نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو بھی موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا اور وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ طاعون سے ڈرتے ہوئے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ہی ساعت میں مار دیا اور وہ چالیس ہزار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر اس آیت میں کئی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے الفاظ بخاری کے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سنا وہ حضرت سعد کو حدیث بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کا ذکر کیا اور فرمایا: ''(یہ) رجز یا عذاب ہے جس کے ساتھ بعض امتوں کو عذاب دیا گیا پھر اس سے کچھ بچ جانے والے باقی رہے اور وہ ایک بار ختم ہو جاتا ہے اور دوسری بار پھر آتا ہے۔ پس جو کوئی اس کے بارے کسی زمین میں سنے تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں بالکل نہ آئے اور جو اس علاقے میں ہو کہ وہاں وبا پھیل جائے تو وہ اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلے (3)''۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں حماد بن زید نے عمرو ابن دینار عن عامر بن سعد عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سند سے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ''یہ باقی رہنے والا رجز یا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا۔ پس جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں نہ ہو تو تم وہاں نہ جاؤ (4)''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس حدیث کے مقتضا کے مطابق حضرت عمر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا جب وہ مقام سرغ سے اس وقت واپس لوٹے جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث کے بارے خبر دی۔ اسی بناء

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 700، دار احیاء التراث العربیۃ

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، جلد 2، صفحہ 1032، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 126، وزارت تعلیم۔

ایضاً سنن ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الفرار من الطاعون، حدیث نمبر 985، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر یہ مؤطا وغیرہ میں مشہور ہے۔

اور ایک قوم نے وباء اور بیماری والی زمین سے فرار کو مکروہ قرار دیا ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ''وباء سے بھاگنا میدان جہاد سے بھاگنے کی طرح ہے (1) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف نکلنے کا واقعہ معروف ہے اور اس میں ہے کہ آپ واپس لوٹ آئے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس پر دلیل موجود ہے کہ آدمی پر تکلیف اور اذیت ناک چیزوں کے آنے سے پہلے ان سے بچنا اور احتیاط کرنا لازم ہے اور خوف زدہ کرنے والی اشیاء کے ہجوم اور حملہ سے پہلے ان سے اجتناب کرنا ایک طرف ہو جانا لازم ہے اور ان کے آنے کے بعد اس پر صبر کرنا اور جزع فزع نہ کرنا لازم ہے اور یہ اس لئے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے جو وباء والی زمین میں نہ ہو کہ وہ وباء پھیل جانے کے بعد اس میں داخل ہو اور جو وہاں ہو اسے وباء پھیل جانے کے بعد اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلنے سے منع فرمایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسی طرح امور کی تکالیف و مصائب سے ہر بچنے والے کے لئے حکم ہو۔ اس میں اس کے لئے طاعون سے بچنے کی راہ بھی ہے اور یہ معنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی مثل ہے: ''تم دشمن سے ملاقات کی (جنگ کرنے کی) تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجاء کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر صبر کرو (2)۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا مقتضا ہے اور اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نیکوکار اور عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس پر بطور حجت فرمایا جبکہ انہوں نے آپ سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے فرار ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! کاش! تیرے سوا کوئی اور یہ کہتا: ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اور اس کے خلاف جو مقدر فرما دیا ہے اس سے بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈرانے والی اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وسعت و طاقت کے مطابق مکروہات سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تیرا اونٹ ہو اور تو وادی میں اترے جس کے دو کنارے ہوں ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو، کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تو نے سرسبز و شاداب حصہ میں چرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے اور اگر تو نے قحط زدہ حصہ میں چرایا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس جگہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئے۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ کفار یا ڈاکو جب ایک کمزور شہر کا قصد کریں اور اس کے باسیوں میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے سامنے سے دور ہٹ جائیں، اگرچہ موت کی مقررہ مدت

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہو سکتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وبا سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وبا کی جگہ میں جو ہو رہا ہے، شاید اس سے کچھ حصہ لے لیا جائے تاکہ اس مرض عام کے سبب میں اس جگہ والے شریک ہو جائیں اور وہاں سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ رہے، بلکہ وہ اسے سفر کی ان مشقتوں کی طرف منسوب کرے گا جو اسے وبا کی مبادیات میں سے پہنچیں۔ پس درد کئی گنا بڑھ جائے گا اور ضرر زیادہ ہو جائے گا اور وہ ہر راستے میں ہلاک ہو جائیں گے اور وہ ہر کشادہ اور تنگ جگہ میں گر جائیں گے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے جو کوئی وبا سے نہیں بھاگا وہ محفوظ رہا۔ اسے ابن المدائنی نے بیان کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نصیحت کافی ہے کہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا، شاید اگر وہ فرار ہو اور بچ جائے تو وہ کہنے لگے: بلاشبہ میں نے اپنے نکلنے کے سبب وبا سے نجات پالی ہے تو اس طرح اس کا اعتقاد خراب اور فاسد ہو جائے گا۔ بالجملہ اس سے فرار ممنوع ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں شہروں کو خالی کرنا لازم آتا ہے اور کمزور لوگ اس سے بھی بری نہیں ہوتے کیونکہ ان پر شہروں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ ان سہولتوں سے شہروں کے خالی ہونے کے سبب اذیت اٹھاتے ہیں جو شہروں کا حصہ ہوتی ہیں اور کمزور لوگوں کے لئے معاون اور مددگار ہوتی ہیں۔

اور جب کسی زمین میں وبا ہو تو وہاں احتیاط، خوف اور ضرر کے مقامات سے پرہیز کرنے کے ارادہ سے کوئی نہ آئے اور ایسے وہموں کو دور کرنے کے لئے جو انسان کے دل میں تشویش پیدا کر دیتے ہیں اور وہاں داخل ہونے میں ہلاکت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جائز نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ سے اپنے آپ کو بچانا واجب ہے اور اس پر سوء اعتقاد کا خوف کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کہنے لگے: اگر میں اس جگہ میں داخل نہ ہوتا تو مجھے یہ تکلیف نہ آتی۔ پس طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے سے منع کرنے یا وہاں سے نکلنے سے منع کرنے میں یہی فائدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: طاعون مقیم پر اور بھاگنے والے پر ایک آزمائش ہے۔ کیونکہ بھاگنے والا کہتا ہے: میں نے اپنے فرار کے سبب نجات پالی ہے اور مقیم کہتا ہے: میں یہاں مقیم رہا سو میں مر گیا۔ اسی قسم کی طرف امام مالک نے اس وقت اشارہ کیا جس وقت ان سے کوڑھ زدہ کی طرف دیکھنے کی کراہت کے بارے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: میں نے اس میں کوئی کراہت نہیں سنی ہے اور جو روایات اس سے نہی کے بارے وارد ہوئی ہیں وہ صرف اس خوف سے ہیں کہ وہ اسے گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا کر دے گا یا اسے وہ شے (وہم) خوفزدہ کرتی رہے گی جو اس کے دل میں واقع ہو جائے گی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وبا کے بارے میں فرمایا ہے: "جب تم کسی زمین میں اس کے بارے سنو تو تم اس کی طرف نہ آؤ اور جب وبا پھیل جائے اور تم وہاں ہو تو پھر اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو" اور اس شہر کے بارے میں بھی پوچھا گیا جس میں موتیں اور بیماریاں واقع ہو رہی ہوں کیا اس سے نکلنا بھی مکروہ ہے؟ تو فرمایا: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا وہ نکلے یا وہیں مقیم رہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: "جب کسی زمین میں وبا واقع ہو جائے اور تم وہاں ہو تو اس

سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو(1)'' اس میں اس پر دلیل ہے کہ فرار کے ارادہ کے بغیر طاعون والے شہر سے نکلنا جائز ہے، بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ جو کچھ اسے پہنچنا ہے وہ اس سے خطا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح حکم وہاں داخل ہونے کا بھی ہے جبکہ اسے یہ یقین ہو کہ اس کا داخل ہونا اس کی طرف ایسی تقدیر کو نہیں کھینچ سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر نہیں بنائی۔ پس آدمی کے لئے وہاں داخل ہونا اور وہاں سے نکلنا اس حد کی بنا پر مباح ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ طاعون پر صبر کی فضیلت اور اس کے بیان کے بارے میں یہ ہے کہ الطاعون بروزن فاعول الطعن سے ماخوذ ہے مگر یہ کہ جب اسے اصل معنی سے پھیر دیا گیا تو اسے وبا کے سبب عام موت پر دلالت کرنے کے لئے وضع کر دیا گیا۔ جوہری نے یہی کہا ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہے۔ (2)'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: طعن کو تو ہم نے پہچان لیا ہے پس طاعون کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پھوڑ (گلٹی) ہے اونٹ کے پھوڑے (طاعون) کی طرح جو کہ پیٹ سے نیچے والی جگہوں اور بغلوں کے نیچے نکلتا ہے(3)۔

علماء نے کہا ہے: اس وبا کو اللہ تعالیٰ بطور عذاب اور سزا کے اپنے بندوں میں سے گنہگاروں اور کافروں میں سے جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور کبھی اسے صالحین کے لئے شہادت اور رحمت بنا کر بھیج دیتا ہے، جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے طاعون عمواس میں کہا: بے شک یہ تمہارے لئے شہادت اور رحمت ہے اور تمہارے نبی علیہ السلام کی دعا ہے: اے اللہ! معاذ اور اس کے گھر والوں کو اپنی رحمت سے ان کا حصہ عطا فرما۔ اور ان کی ہتھیلی میں نیزہ مارا گیا۔

حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تحقیق میں نے شہادت اور رحمت کو تو پہچان لیا اور میں اسے نہ پہچان سکا کہ یہ تمہارے نبی کی دعا ہے؟ چنانچہ میں نے اس کے بارے پوچھا تو کہا گیا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ آپ کی امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہو، جس وقت آپ نے یہ دعا مانگی کہ آپ کی امت کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس سے آپ کو روک دیا گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طاعون سے بھاگنے والا میدان جہاد کے لشکر سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا میدان جہاد میں صبر کرنے والے کی طرح ہے(4)۔'' اور بخاری میں حضرت یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے پوچھا، تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ایک عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے، پس کوئی بندہ نہیں ہے جو طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صبر کرتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرا رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 494، وزارت تعلیم
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 255، دار صادر بیروت
3۔ ایضاً
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے مگر اس کے لئے شہید کے اجر کی مثل اجر ہے (1)۔" اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی یہی تفسیر ہے کہ "طاعون شہادت ہے اور مطعون شہید ہے (2)۔" یعنی اس پر صبر کرنے والا کہ اس کے اجر کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور یہ جاننے والا کہ اسے ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے لکھ دی ہے، اسی لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تمنا کی کہ اس میں فوت ہو جائیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو مر گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی طاعون سے خوفزدہ ہو گیا اور اسے مکروہ جانا اور اس سے بھاگ گیا تو وہ اس حدیث کے معنی میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابو عمر نے کہا ہے: مجھ تک کوئی خبر نہیں پہنچی کہ اہل علم میں سے کوئی طاعون سے بھاگا ہو سوائے اس کے جو ابن مدائنی نے ذکر کی ہے کہ علی بن زید بن جدعان طاعون کی وجہ سے السَّیَالہ (یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اہل مدینہ کا مکہ کی طرف آتے ہوئے یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ملل اور روحاء کے درمیان واقع ہے)۔ (شرح القاموس) کی طرف چلے گئے اور وہ ہر جمعہ کی نماز میں شریک ہونے کے لئے لوٹ آتے تھے اور جب وہ جمعہ میں شریک ہوتے تو لوگ ان کے بارے پکارتے تھے: فرّ من الطاعون یہ طاعون سے بھاگ گئے ہیں۔ اور وہ السیالہ میں ہی فوت ہوئے۔ ابن مدائنی نے مزید کہا: عمرو بن عبید اور رباط بن محمد رباطیہ کی طرف بھاگ گئے اور ابراہیم بن علی الفقیمی نے اس بارے میں کہا ہے:

و لما استفزّ الموتُ كلَّ مكذِّب ... صبرتُ و لم يصبر رباطٌ ولا عمرو

جب موت نے ہر جھٹلانے والے کو ہلاک و برباد کر دیا (تو) میں نے صبر کیا اور رباط اور عمرو نے صبر نہ کیا۔

اور ابو حاتم نے اصمعی سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: بصرہ کے بعض لوگ طاعون سے بھاگے اور ان میں سے کوئی اپنے گدھے پر سوار ہوا اور سفوان (یہ بصرہ میں باب المربد سے ایک مرحلہ کے فاصلہ پر پانی ہے) معجم یاقوت کی طرف اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا اور اس نے حدی گانے والے کو سنا کہ وہ اس کے پیچھے حدی گا رہا ہے:

لن يُسبقَ الله على حمار ... ولا على ذي مَنْعة طيّارِ

اويأتي الحَتفُ على مقدارِ ... قد يُصبح الله أمام السارى

اور مدائنی نے ذکر کیا ہے: عبدالعزیز بن مروان کی حکومت کے دوران مصر میں طاعون پڑا، تو وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکل گیا اور الصعید کے دیہاتی علاقوں میں سے ایک دیہات میں جا اترا۔ اسے سُکّر یہ الصعید کے مشرق کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے اور مصر کے درمیان دو دن کا فاصلہ ہے (یاقوت) کہا جاتا ہے۔ تو عبدالعزیز نے اس سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا: طالب بن مدرک۔ تو اس نے کہا: اوہ میں اپنے آپ کو فسطاط کی طرف لوٹنے والا نہیں دیکھ رہا پھر وہ اسی گاؤں میں مر گیا۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت تعلیم

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، و۔ت۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 92-5291، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے کا خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے اور اس سے ارادہ اور نیت یہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے (1)۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور یہ ہر راستے کو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ (آپ فرما دیجئے: یہ میری راہ ہے)

امام مالک نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے مگر اس پر یا اس میں یا اس کے لئے قتال کیا جاتا ہے اور ان میں سب سے عظیم دین اسلام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جو بنی اسرائیل میں سے زندہ کیے گئے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور وَ قَاتِلُوْا میں واؤ سابقہ امر پر عطف کرنے کے لئے ہے اور کلام میں اس کی تقدیر کو چھوڑ دیا گیا ہے: و قال لھم، قاتلوا اور پہلے قول کی بنا پر یہ سارا کلام سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور کلام میں مضمر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو حکم ہے کہ تم نہ بھاگو جیسا کہ وہ بھاگ گئے۔ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ یعنی وہ تمہارے قول کو بھی سن لے گا اگر تم نے اس کی مثل کہا جیسا کہ انہوں نے کہا اور اس سے تمہاری مراد کو بھی جان لے گا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس قول کی کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے جس نے یہ کہا کہ لڑائی کرنے کا حکم ان لوگوں کو ہے جنہیں زندہ کیا گیا۔ واللہ اعلم

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حق کی راہ پر جہاد اور قتال کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ شریعت میں سے کوئی شے (حکم) نہیں ہے مگر اس کی حفاظت اور اس کے دفاع میں قتال جائز ہوتا ہے اور ان میں عظیم تر دین اسلام ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں (اپنا مال) خرچ کرنے پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 329، دار الکتب العلمیہ

برانگیختہ کیا۔ پس اس خبر میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے والا بھی داخل ہے (اور لشکر کی تیاری میں سامان خرچ کرنے والا بھی) کیونکہ وہ بھی ثواب کی امید پر یہ مال دیتا ہے جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جیش عسرہ (غزوۂ تبوک) میں کیا(1)۔

اور مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِیْ اس کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے اپنے رب سے ثواب چاہتے ہوئے اپنا مال صدقہ کرنے میں بہت تیزی اور جلدی کی۔ ہمیں شیخ الفقہ، امام، محدث، قاضی ابو عامر یحییٰ بن عامر بن احمد بن منیع الاشعری نسباً و مذہباً قرطبۂ میں۔ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ لوٹائے۔ ربیع الثانی ۶۲۸ھ میں میری طرف سے ان پر قراءت کے دوران انہوں نے خبر دی اور کہا: ہمیں ابو اجازہ نے خبر دی، فرمایا: میں نے ابوعبداللہ بن سعدون سے سماع کرتے ہوئے ابوبکر عبدالعزیز بن خلف بن مدین الازدی پر پڑھا، اس نے کہا: ہمیں ابوالحسن علی بن مہران نے بیان کیا اور کہا: ہمیں ابوالحسن محمد بن عبداللہ ابن زکریا بن حیوہ النیشاپوری (متوفی) ۳۶٦ھ نے بیان کیا اور کہا ہمیں میرے چچا ابوزکریا یحییٰ ابن زکریا نے خبر دی اور کہا: ہمیں محمد بن معاویہ بن صالح نے بتایا کہ ہمیں خلف بن خلیفہ نے حمید الاعرج عن عبداللہ بن الحارث عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا ارادہ فرما رہا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اے ابوالدحداح۔ تو انہوں نے عرض کی: اپنا دست مبارک مجھے دکھائیں اور پھر آپ نے اسے دراز کیا۔ تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ کو وہ باغ بطور قرض دے دیا جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں پھر چلتے ہوئے آئے یہاں تک کہ اس باغ کے پاس آگئے اور ام دحداح اپنے بچوں سمیت اس میں تھی، تو آپ نے اسے آواز دی: اے ام دحداح! اس نے کہا: لبیک (میں حاضر ہوں) آپ نے فرمایا: تو باہر نکل آ، میں نے اپنا وہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے (2) جس میں چھ سو درخت ہیں۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابوالدحداح نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرما رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو قرض سے غنی اور بے نیاز ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ تمہیں اس کے عوض جنت میں داخل فرمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ اگر میں اپنے رب کو قرض پیش کر دوں تو وہ اس کے عوض میرا ضامن ہو جائے گا اور میری بچی الدحداحہ کو بھی میرے ساتھ جنت میں پہنچا دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' تو انہوں نے عرض کی پھر اپنا ہاتھ مجھے دیجئے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ انہیں دیا، تو انہوں نے کہا: بلاشبہ میرے دو باغ ہیں ان میں سے ایک سافلہ (نچلی زمین) میں ہے اور دوسرا عالیہ (بلند زمین) میں۔ قسم بخدا! میں ان کے سوا کسی شے کا مالک نہیں

1۔ سنن ترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان، حدیث نمبر 3633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 250، دارالکتب العلمیہ

ہوں، تحقیق میں نے وہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے لئے دے دے اور دوسرے کو اپنے اور اپنے بال بچوں کی گزر اوقات کے لئے رکھ لے۔'' انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: میں نے ان میں سے زیادہ اچھا اور بہتر اللہ تعالیٰ کے لئے دے دیا اور وہ وہ باغ ہے جس میں چھ سو درخت ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب اللہ تعالیٰ اس کے عوض تجھے جنت کی جزا عطا فرمائے گا۔'' پھر ابوالدحداح رضی اللہ عنہ چل پڑے یہاں تک کہ ام الدحداح کے پاس آ پہنچے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں درختوں کے نیچے گھوم پھر رہی تھی تو آپ کہنے لگے:

هداكِ ربی سُبُلَ الرشاد    الی سبیل الخیر و السداد
بِینِی من الحائط بالوداد    فقد مضی قرضا الی التناد
اقرضته الله علی اعتمادی    بالطَّوع لا مَنٍّ ولا ارتداد
الاّ رَجاء الضِعف فی المَعاد    فارتحلی بالنفس والاولاد
والبِرّ لا شكّ فخیرُ زاد    قدّمَه المرءُ الی المعاد

تو ام الدحداح نے کہا: تو نے نفع بخش سودا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے جو تو نے خریدا ہے، پھر ام الدحداح نے آپ کو جواب دیا اس طرح کہا:

بشّرك الله بخیر و فَرَحْ    مثلُك أدّی مالدیه ونَصَحْ
قد مَتَّع الله عیالی و مَنَحْ    بالعَجْوَة السَّوْداء والزَّهْوِ البَلَحْ
والعبدُ یسعیٰ وله ما قد كَدَحْ    طول اللیالی و علیه ما اجْتَرَحْ

پھر ام الدحداح اپنے بچوں کے پاس آئی، جو کچھ ان کے مونہوں میں تھا اسے نکالنے لگی اور جو ان کے پاس خوشوں میں تھا اسے بھی جھاڑ دیا یہاں تک کہ وہ دوسرے باغ میں منتقل ہوگئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کتنے ہی پھلوں سے لدے ہوئے بھاری بھر کم درخت اور وسیع گھر ابوالدحداح کے لئے ہیں''۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا ہے: مخلوق خالق کے حکم، اس کی حکمت، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر کے مطابق تقسیم ہوگئی جب انہوں نے یہ آیت سنی پس وہ تین حصوں میں بٹ گئے۔

پہلا گروہ انتہائی کمینہ اور رذیل ہے۔ انہوں نے کہا: بے شک محمد (مصطفیٰ ﷺ) کا رب فقیر اور ہمارا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں، پس یہ ایسی جہالت ہے جو کسی بھی صاحب عقل پر مخفی نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ان کا رد کیا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ۔ (آل عمران: 181)

اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جب اس نے یہ قول سنا تو اس نے بخل اور کنجوسی کو ترجیح دی اور مال میں رغبت کو مقدم سمجھا اور انہوں

1۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 249، حدیث نمبر 3451، دار الکتب العلمیہ

نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا، نہ انہوں نے کسی قیدی کو چھڑایا اور نہ کسی کی معاونت کی۔ اطاعت و پیروی سے سستی اور کوتاہی کرتے ہوئے اور اس دنیا کی طرف میلان رکھتے ہوئے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے یہ قول سنا تو اس کی پیروی اور تعمیل میں جلدی کی اور ان میں سے ایک قبول کرنے والے نے تو اپنے مال کی طرف تیزی سے بڑھنے کو ترجیح دی جیسا کہ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: قَرْضًا حَسَنًا، القرض کا معنی ہے: اسم لکل ما یلتمس علیہ الجزاء یعنی قرض ہر اس شے کا نام ہے جس پر وہ جزا کا طالب ہوتا ہے۔ اقرض فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو وہ عطا کیا جس کے بدل کا وہ اس سے تقاضا کر سکتا ہے۔ لبید نے کہا:

و اذا جُوزِيتَ قَرْضًا فَاَجْزِهِ ۔۔۔ انما يَجْزِي الْفَتَى ليس الجَمَلُ

جب تجھے بطور قرض جزا دی جائے تو تو اس کی جزا دے بلاشبہ جوان ہی جزا اور بدلہ دیتا ہے نہ کہ اونٹ۔

اور القرض یعنی قاف کے کسرہ کے ساتھ یہ بھی ایک لغت ہے جسے کسائی نے بیان کیا ہے اور استقرضت من فلان کا معنی ہے میں نے اس سے قرض طلب کیا پس اس نے مجھے قرض دے دیا۔ اور اقترضت منہ کا معنی ہے میں نے قرض لیا۔ اور زجاج نے کہا ہے: لغت میں قرض کا معنی ہے البلاء الحسن و البلاء السیٔ یعنی اچھی آزمائش اور بری آزمائش۔ امیہ نے کہا ہے:

كل امْرِئٍ سوفَ يُجْزَى قَرْضَه حسنا ۔۔۔ او سيئًا و مَدِينًا مثلَ مَادَانَا

ہر آدمی کو اس کے قرض کا بدلہ دیا جائے گا چاہے وہ حسن ہو یا سیئہ ہو اور جس کو قرض دیا گیا ہے وہ قرض دینے والے کی مثل ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تُجَازَى الْقُرُوضُ بِأَمْثَالِهَا ۔۔۔ فَبِالْخَيْرِ خيرًا و بِالشَّرِّ شَرًّا

قرضوں کا بدلہ ان کی مثلوں کے ساتھ ہی دیا جائے گا پس اچھائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ اور شر کا بدلہ شر کے ساتھ ہوگا۔

اور کسائی نے کہا ہے: قرض سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو گزر گئے اور کلمے کا اصل معنی قطع کرنا اور کاٹنا ہے اور اسی سے المقراض قینچی ہے اور اقرضتہ سے مراد یہی ہے کہ میں نے اس کے لئے اپنے مال سے ایک حصہ الگ کر دیا ہے جس پر بدلہ دیا جائے گا۔ اور انقرض القوم: اس کا معنی ہے ان کا اثر ختم ہو گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اور یہاں پر القرض اسم ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہاں اقراضاً ہوتا۔

اس آیت میں قرض کی استدعا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی تقریب الی الفہم اور انہیں ایسے انداز سے مانوس کرنے کے لئے ہے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تو الغنی الحمید ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بندۂ مومن کی وہ عطا جس کے عوض وہ آخرت میں ثواب کی امید رکھتا ہے اسے قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ اس نے جنت کے حصول میں جان اور مال دینے کو بیع اور شرا سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد صدقہ پر اور فقراء اور محتاج لوگوں پر مال خرچ کرنے اور ان پر وسعت و خوشحالی

لانے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دین کی مدد و نصرت کرنے پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کنایۃً فقیر کو اپنی ذات کے ساتھ ذکر کیا ہے صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے۔ اس کی علت یہ ہے کہ اس کی ذات حاجات سے منزہ اور پاک ہے جیسا کہ اس نے مریض، بھوکے اور پیاسے کو کنایۃً اپنی ذات سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس کی ذات نقائص و آلام سے پاک ہے۔

اور صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہ کی اور میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا اور میں نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔'' تو یہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے پلا سکتا تھا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ تو رب العالمین فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے اسے نہ پلایا۔ بلاشبہ اگر تو اسے پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا(1)۔'' اور اسی طرح ان چیزوں میں بھی ہے جو اس سے پہلے ہیں۔ اسے مسلم اور بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ سب کی سب اس کے لئے محل شرف میں واقع ہیں جس کے بارے اسے ترغیب دینے کے لئے کنایۃً ذکر کیا جس کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قرض لینے والے پر قرض کو واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضائع نہ ہوگا بلکہ وہ بالیقین ثواب لوٹائے گا اور اس نے جزا کو مبہم رکھا ہے اور حدیث شریف میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا گیا (مال) سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے(2)۔'' جیسا کہ اس کا بیان اس سورۃ میں اس ارشاد کے تحت آئے گا۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الآیہ (بقرہ: 261)۔ اور یہاں فرمایا: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (بقرہ: 245) اور اس کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی حد۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قرض کا ثواب بہت زیادہ ہے، کیونکہ اس میں ایک مسلمان کے لئے وسعت اور کشادگی لانا ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے شب معراج جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا: صدقے کا اجر اس کی دس مثل ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ مثل۔ تو میں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: قرض میں کیا ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے کہا: کیونکہ سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس (کچھ مال موجود ہوتا ہے) اور قرض لینے والا بغیر حاجت کے قرض کا مطالبہ نہیں کرتا(3)۔''

محمد بن خلف عسقلانی، یعلی، سلیمان بن یسیر نے قیس بن رومی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ سلیمان بن اذنان نے علقمہ کو ایک ہزار درہم ان کی عطا (وظیفہ) تک قرض دیے پھر جب ان کی عطا کا وقت نکل گیا تو انہوں نے ان سے اس کا تقاضا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب السیر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 318، وزارت تعلیم

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 196، و۔ت۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل النفقۃ فی الغ، حدیث 1550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اور اس پر شدت اور سختی کا اظہار کیا، تو انہوں نے وہ پورا کر دیا۔ گویا علقمہ ناراض ہو گئے اور کئی مہینے ٹھہرے رہے (اور ان سے نہ ملے) پھر ان کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک ہزار درہم میری عطا تک قرض دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں بڑی عزت و کرامت سے! اے ام عتبہ وہ تھیلا لاؤ جس پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ راوی کا بیان ہے: چنانچہ وہ لے کر آئی تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! یہ تمہارے وہی دراہم ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی نہیں ہلایا۔ تو آپ نے کہا: تیرے باپ کی قسم! جو تو نے میرے ساتھ سلوک کیا کس نے تجھے اس پر ابھارا؟ تو انہوں نے کہا: میں نے تم سے سنا ہے کہ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دوبار قرض دیتا ہے تو وہ اس کے ایک بار صدقہ دینے کی طرح ہے(1)۔'' فرمایا: مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خبر دی ہے۔

(ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6**۔ آدمی کا قرض ایک کا بدلہ ایک ہوتا ہے، یعنی وہ اس پر اتنا ہی لوٹائے گا جتنا اس نے اسے قرض دیا ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ دنانیر، دراہم، گندم، جو، کھجور، کشمش اور ہر وہ شے طعام میں سے جس کی مثل موجود ہے اسے قرض کے طور پر لینا جائز ہے اور مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا ربا ہے۔ اگرچہ وہ چارے کی ایک مٹھی ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یا ایک دانہ ہو اور جو چیز قرض کے طور پر لی ہے اس سے افضل واپس لوٹانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگائی جائے، کیونکہ یہ احسان کے باب سے ہے۔ البکر کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے: ''بے شک تم میں سے اچھا وہ ہے جو قضا کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے(2)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے، یعنی بخاری اور مسلم وغیرہمانے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے جس نے ادائیگی اچھے طریقہ سے کی اور اسے مطلق قرار دیا اور اسے کسی صفت سے مقید نہ کیا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے البکر کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس سے مراد عمدہ اور پسندیدہ جوان اونٹ ہے اور عمدہ اونٹ وہ ہوتا ہے جو رباعی ہو۔ اس میں خیار سے مراد مختار ہے اور رباعی سے مراد وہ ہے جو چوتھے سال میں داخل ہو، کیونکہ وہ اس میں اپنے رباعیہ دانت گرا دیتا ہے اور یہ وہ دانت ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ چاروں رباعیات کہلاتے ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ جس نے قرض لیا ہے وہ قرض دینے والے کو کچھ ہدیہ وغیرہ دے اور نہ ہی قرض دینے والے کو اسے قبول کرنا حلال ہے مگر یہ کہ پہلے بھی دونوں کی عادت ہو (کہ وہ ہدیہ اور تحفہ وغیرہ دیتے رہتے ہوں) سنت اسی طرح ہے۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ ہشام بن عمار، اسماعیل بن عیاش، عتبہ بن حمید الضبی نے یحییٰ بن ابی اسحاق الہنائی

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً، صفحہ 176

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنے بھائی کو مال قرض کے طور پر دیتا ہے اور وہ اسے کچھ ہدیہ دیتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ اسے ہدیہ دے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اسے نہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو مگر یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ عادت جاریہ ہو(1)۔''

**مسئلہ نمبر 8**۔ قرض مال میں سے ہوتا ہے۔ تحقیق ہم اس کا حکم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ عزت و آبرو سے بھی ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے: ''کیا ہم میں سے کوئی ابو ضمضم کی طرح ہونے سے عاجز ہوگا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو کہتا: اے اللہ! میں نے اپنی عزت تیرے بندوں پر صدقہ کر دی (2)۔''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''تو اپنی عزت اپنے فقر و افلاس کے دن کے لئے قرض دے دے۔'' مراد یہ ہے کہ جو کوئی تجھے گالی گلوچ دے تو تو اس سے حق نہ لے اور نہ تو اس پر حد قائم کر یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے جو وافر اجر دینے والا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے: عزت کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ فاسد ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث صحیح میں کہا ہے: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (3)۔'' الحدیث۔ اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ تینوں محرمات اس میں ایک کے قائم مقام ہیں کہ ان کا احترام کرنا آدمی کے لئے فرض اور لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: حَسَنًا واقدی نے کہا ہے: جس کی ذات کو اچھا شمار کیا جائے اور عمرو بن عثمان صدفی نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہ احسان جتلایا جائے اور نہ وہ اسے اذیت اور پریشانی میں مبتلا کرے۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: وہ اپنے قرض میں کسی عوض کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ عاصم وغیرہ نے فَيُضَاعِفَهٗ الف اور فاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے عین کو مشدد بغیر الف کے اور فاء کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابو جعفر اور شیبہ نے تشدید اور فاء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے الف کے ساتھ اور فاء کو مرفوع پڑھا ہے۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے انہوں نے یقرض کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ھو یُضَاعِفُهٗ ہے۔ اور جنہوں نے منصوب پڑھا ہے تو انہوں نے فاء کے ساتھ استفہام کا جواب بنایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے اَنْ مضمر ہے۔ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ اور تشدید کی دلیل اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ہے کیونکہ تشدید کثرت بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حسن اور سدی نے کہا ہے: ہم اس تضعیف (کئی گنا) کو نہیں جانتے مگر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 231، دار الفکر　　3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 632، وزارت تعلیم

ارشاد گرامی ہے: وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جہاد کے نفقہ کے بارے میں ہے اور ہم حساب لگاتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان تھے کہ ایک آدمی کا خرچہ اپنی ذات پر اور اپنے رفقاء پر اور اپنی سواری پر بیس لاکھ تھا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ یہ ہر شے میں عام ہے، پس وہی تنگ کرنے والا ہے اور وہی فراخ اور کشادہ کرنے والا ہے۔ ہم نے ''شرح الاسماء الحسنی فی الکتاب الاسنیٰ'' میں ان دونوں پر بحث کی ہے۔ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یہ وعید ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

''کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کردو ہمارے لئے ایک امیر تاکہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں۔ نبی نے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو وہ کہنے لگے: (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔''

قتال اور جنگ پر برانگیختہ کرنے کے بارے میں دوسرا قصہ بیان فرمایا جو بنی اسرائیل میں پیش آیا۔ الملأ کا معنی ہے اشراف لوگ، گویا کہ وہ شرف و عزت سے بھرے ہوئے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی۔

اور اس آیت میں الملأ سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور الملأ اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ۔ اور الملأ کا معنی حسن خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: احسنوا الملأ فکلکم سیروی، (1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (تم اخلاق اچھے کرلو تو تم تمام کے تمام سیراب (خوشحال) ہو جاؤ گے)

قولہ تعالیٰ: مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا، کہا گیا ہے کہ وہ نبی حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے، سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ ان کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 240، وزارت تعلیم

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا۔ پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی: اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے درمیان میں لوگوں کی کئی امتیں ہیں۔ اور حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے (1) اور محاسبی نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام اسماعیل تھا۔ واللہ اعلم

یہ آیت بنی اسرائیل کی اس قوم کے بارے خبر ہے جنہیں ذلت نے آلیا اور دشمن نے ان پر غلبہ پالیا تو انہوں نے جہاد کے بارے اجازت طلب کی کہ انہیں اس کا حکم دیا جائے اور جب انہیں حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور قلیل لوگ ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ مذکورہ لوگ وہی ہیں جنہیں موت دی گئی اور پھر وہ زندہ کر دیے گئے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: نُّقَاتِلْ یہ نون اور جزم کے ساتھ ہے اور جمہور قراء کی قراءت جواب امر کی بنا پر ہے اور ضحاک اور ابن ابی عبلہ نے یاء کے ساتھ اور فعل کو مرفوع پڑھا ہے (یعنی یُقَاتِلُ) اور یہ الملک کی صفت کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اور یہ عَسِيْتُمْ بھی ہے یعنی فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں۔ دوسری کے مطابق حضرت نافع نے قراءت کی ہے اور باقیوں نے پہلی کے مطابق (یعنی فتحہ کے ساتھ) اور یہی مشہور ہے۔

ابو حاتم نے کہا ہے: کسرہ کی کوئی وجہ (اور علت) نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسن اور طلحہ نے پڑھا ہے۔

مکی نے اسم فاعل میں کہا ہے: عَسٍ، اور یہ ماضی میں سین کے کسرہ پر دلالت کرتا ہے اور سین پر فتحہ یہ لغت مشہورہ ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: کسرہ کی وجہ عربوں کا یہ قول ہے: هو عسٍ بذلك مثلاً حِرٍ اور شَجٍ۔ اور یہ فَعَلَ اور فَعِلَ دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسا کہ نَعَمَ اور نَعِمَ میں ہے اور اسی طرح عَسَيت اور عَسِيت ہے، پس اگر فعل کی نسبت اسم ظاہر کی طرف کی جائے تو عسیتم میں قیاس یہ ہے کہ کہا جائے: عَسِيَ زَيْدٌ۔ مثلاً رَضِيَ زَيد اور اگر یہ کہا جائے تو یہ قیاس کے مطابق ہے اور اگر نہ کہا جائے تو پھر جائز ہے کہ دونوں لغتیں لے لی جائیں۔ اور دونوں میں سے ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتی رہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کیا تم پیٹھ پھیرنے اور فرار اختیار کرنے کے قریب ہو؟ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا۔ (2)

زجاج نے کہا ہے: اَلَّا تُقَاتِلُوْا محل نصب میں ہے، یعنی هل عسیتم مقاتلة (کیا تم لڑائی نہ کرنے کے قریب ہو) قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اخفش نے کہا ہے: اس میں اَنْ زائدہ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ اپنے معنی پر محمول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 330، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 330-331

ہے۔ یعنی و ما منعنا (یعنی کون سی شے ہمارے لئے رکاوٹ ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: مالك آلا تصلی؟ ما منعك یعنی کون سی شے تیرے لئے نماز پڑھنے سے رکاوٹ ہے۔

اور کہا ہے: معنی یہ ہے ہمارے لئے اس میں کون سی شے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہیں کریں گے۔ نحاس نے کہا: یہ معنی زیادہ عمدہ اور اچھا ہے۔ اور ''اَنْ'' محل نصب میں ہے۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا یہ علت بیان ہو رہی ہے اور اسی طرح وَ اَبْنَآئِنَا بھی ہے یعنی اپنی اولادوں کے سبب سے (ہم ضرور لڑیں گے)

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ یعنی جب ان پر فرض کر دیا گیا تَوَلَّوْا اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب اس نے ان پر قتال فرض کیا اور انہوں نے حقیقت کو دیکھا تو جنگ لڑنے کے بارے میں ان کے افکار تبدیل ہو گئے اور ان کی جانیں نکلنے لگیں۔ تَوَلَّوْا یعنی ان کی نیتیں مضطرب ہو گئیں اور ان کے عزائم ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ حال ہے ان امتوں کا جو بڑی خوشحال اور متنعم تھیں اور انہوں نے خوشحالی کے اوقات میں جنگ کی تمنا کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور اپنی طبع کی پیروی کی۔

اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعا سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ ''تم دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر تم ثابت قدم رہو (1)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے قلیل لوگوں کی خبر دی کہ وہ پہلی نیت پر ثابت اور مستحکم رہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے پر ان کے ارادے برقرار رہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر، بولے: کیوں کر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں۔ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا یعنی تم نے جو اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424

تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور طالوت پانی پلاتے تھے۔ بعض نے کہا: وہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے: وہ اجرت پر کام کرتے تھے اور عالم بھی تھے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند کر دیا جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ وہ حضرت بنیامین کے قبیلے سے تھے اور وہ نہ تو نبوت کے قبیلے سے تھے اور نہ ہی بادشاہت کے قبیلے سے۔ اور نبوت بنی لاوی میں تھی اور بادشاہت یہودا کے قبیلے میں تھی، سو اسی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل کے گروہ نے حضرت شمویل بن بال علیہ السلام سے کہا جو کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ ان کی طرف ایک امیر اور بادشاہ بھیجے اور اس پر راہنمائی بھی فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم اپنے اس سینگ کی طرف دیکھو جس میں تمہارے گھر میں تیل پڑا ہے۔ جب کوئی آدمی تمہارے پاس آئے اور وہ تیل جوش مار کر آواز نکالنے لگے جو سینگ میں ہے، تو وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہو گا اور اس تیل میں سے کچھ اس کے سر پر لگا دو اور اسے ان پر بادشاہ مقرر کر دو۔

فرمایا: طالوت چمڑے کی دباغت کا کام کرتے تھے۔ ان کا جانور گم ہو گیا اور وہ اس کی تلاش میں نکلے اور حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تا کہ وہ اپنے لئے جانور کے معاملہ میں دعا کرائیں یا ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ پالیں کہ امید لگ جائے، تو تیل میں جوش پیدا ہو گیا جیسا ان کا گمان تھا۔ بیان کیا: پس حضرت شمویل علیہ السلام اس کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے اٹھا لیا اور اس میں سے کچھ تیل طالوت کے سر پر لگا دیا اور اسے فرمایا: تو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ اور امیر ہے جن کے بارے اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے (1)۔ پھر بنی اسرائیل کو فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ اور امیر مقرر کیا ہے۔

طالوت اور جالوت یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دونوں معرب ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں منصرف نہیں (2)۔ اسی طرح داؤد بھی ہے۔ ان کی جمع طوالیت، جوالیت اور دوادید ہے۔ اور اگر کسی آدمی کا نام طاؤس اور راقوذ رکھا جائے تو یہ دونوں منصرف ہوں گے اگرچہ یہ دونوں عجمی ہیں۔

اس کے اور پہلے کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں: الطاؤس، پس الف لام داخل ہوتے ہیں اور یہ عربی میں غیر منصرف بنا دیتے ہیں اور یہ انہیں متمکن نہیں بنا سکتے (یعنی طالوت اور جالوت کو)

قولہ تعالیٰ: **اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا** یعنی وہ کیسے ہمارا امیر بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کا حق رکھتے ہیں؟ وہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے تکبر اور انکار کے بارے میں اپنے طریقے پر چلتے رہے۔ اور انہوں نے کہا: ''اَنّٰی'' یعنی کون سی جہت سے۔ پس ''اَنّٰی'' یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

حالانکہ ہم بادشاہ کے قبیلے سے ہیں اور وہ اس طرح نہیں ہے اور وہ فقیر اور مفلس ہے۔ پس انہوں نے اس اقوی سبب کو چھوڑ دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پہلے سے اس کا فیصلہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نبی علیہ السلام نے اس قول کے ساتھ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 719-718
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

ان پر حجت اور دلیل بیان فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا ہے اور یہی حجت قاطعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے طالوت کو چننے کی علت بھی بیان فرمادی اور وہ اس کی علم میں کشادگی اور وسعت ہے جو انسان کی بقا ہے اور وہ جسم ہے جو جنگ میں اس کا معاون اور مقابلے کے وقت اس کا سامان جنگ ہے۔ پس یہ آیت امام کی صفت اور امامت کے احوال کے بیان کو متضمن ہے اور بلاشبہ اس کے لئے علم، دین اور قوت کا ہونا ضروری ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس میں علم اور فضائل نفس کے ساتھ نسب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بلاشبہ یہ نسب پر متقدم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے طالوت کو ان پر علم اور اس کی قوت کی وجہ سے اختیار اور ترجیح دی ہے، اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں۔ اور سورت کے پہلے حصہ میں امامت اور اس کی شرائط کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی ہے اور دوبارہ اس کے بیان کی حاجت نہیں اور یہ آیت اس میں اصل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اس وقت طالوت بنی اسرائیل میں سب سے بڑا عالم تھا اور بڑا خوبصورت اور طاقتور انسان تھا اور وہ اتنا جسیم تھا کہ دشمن بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام طالوت اس کی قد و قامت طویل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسم کی زیادتی سے مراد خیر اور شجاعت کے اوصاف کی کثرت ہے اور اس سے جسم کا عظیم ہونا مراد نہیں ہے۔ کیا آپ شاعر کے قول کی طرف نہیں دیکھتے:

تری الرجل النحیف فتزدریه و فی اثوابه اَسَدٌ هَصُوْرٌ
و یعجبك الطَّریر فَتَبْتَلِیه فیُخْلِف ظنك الرجلُ الطَّرِیرُ
و قد عَظُمَ البعیر بغیر لُبّ فلم یسْتَغْنِ بالعِظَم البعیرُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: ''تم میں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے وہ ملے گی جس کا ہاتھ تم میں سے زیادہ طویل ہوگا''۔ پس وہ آپس میں طوالت کو دیکھنے لگیں۔ تو ان میں حضرت زینب پہلے فوت ہوئیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں (1)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے کہ علم سے مراد جنگ کا علم ہے اور یہ بغیر دلیل کے عام کی تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم کی زیادتی اس اعتبار سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی اور یہ اس بنا پر ہے کہ طالوت نبی ہوں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ۔ بعض تاویل کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رب العالمین کا یہ ارشاد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شمویل علیہ السلام کے قول میں سے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں یہ تب کہا جب آپ نے دلائل میں ان کی سرکشی اور ان کے جھگڑے کو دیکھا، تو ارادہ کیا کہ آپ اپنی کلام کو ایسی قطعی دلیل سے مکمل کریں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 291، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور دنیوی ملک کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مملوک کی اضافت مالک کی طرف کرنے کی طرح ہے۔ پھر ان کے لئے رشک اور تنبیہ کی بنا پر ان کی طرف سے سوال کے بغیر فرمایا: اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖۤ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے آپ سے اس قول میں صدق پر دلیل طلب کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پہلا قول سیاق آیت کے مطابق زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کے اخلاق ذمیمہ کے زیادہ مشابہ ہے، یہ موقف طبری نے اختیار کیا ہے (1)۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھالائیں گے اس صندوق کو فرشتے۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ یہ بمعنی اتیان التابوت ہے، یعنی تابوت کا آنا ان کی بادشاہی کی نشانی ہے اور تابوت (صندوق) کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا (اتارا) اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثۃً) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے، حتیٰ کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا۔ سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ نافرمانی (گناہوں کی کثرت) ذلت و رسوائی کا سبب ہے اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ تابوت میں نشانی اس طور پر تھی کہ یہ مروی ہے اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، پس جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پرسکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اسے میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس جب انہوں نے ہلاکت اور اپنا ذکر ختم ہونے کی علامت دیکھی، تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا اور وہ اپنے معاملات میں مشاورت کرنے لگے یہاں تک کہ ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

کی ایک جماعت اس پر جمع ہوگئی کہ وہ اپنے وقت کے نبی علیہ السلام کو عرض کریں کہ ہمارے لئے کوئی امیر مقرر کردو۔ پھر جب نبی علیہ السلام نے انہیں یہ بتایا تمہارا بادشاہ طالوت ہے تو انہوں نے اس میں رجوع کرلیا (یعنی رائے بدل لی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے۔ پس جب انہیں دلیل کے ساتھ خاموش کرادیا گیا تو انہوں نے اس پر بینہ طلب کرلیا۔ یہ طبری کا قول ہے اور جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے اس پر شہادت طلب کی جو انہوں نے کہا، تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اس کے سبب اس قوم پر بیماری نازل ہوئی جنہوں نے تابوت لے لیا تھا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے کنیسہ (عبادتگاہ) میں رکھا۔ اس میں بت تھے تو وہ بت صبح کے وقت اوندھے پڑے تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں بڑے بت کے نیچے رکھا۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ بت کے اوپر پڑا ہوا تھا، تو انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے بت کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا اور پھر صبح اس حال میں کی کہ بت کے دونوں ہاتھ اور اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں اور تابوت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ پس انہوں نے اسے اٹھایا اور ایک قوم کے گاؤں میں جا کر رکھ دیا تو اس قوم کی گردنوں میں درد ہونے لگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے ایک قوم کے پاخانہ کی جگہ رکھا تو وہ بواسیر کی بیماری میں مبتلا ہونے لگے اور جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی جس حالت میں وہ تھی تو انہوں نے کہا: یہ تکلیف نہیں ہے مگر اسی تابوت کی وجہ سے۔ پس ہمیں چاہئے کہ ہم اسے بنی اسرائیل کی طرف واپس لوٹا دیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے دو بیلوں کے درمیان ریڑھے پر رکھا اور انہیں بنی اسرائیل کے شہروں کی طرف بھیج دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ بیلوں کو ہانکتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ طالوت کی حکمرانی میں تھے تو انہیں مدد و نصرت کا یقین ہوگیا۔ اس روایت میں یہی ملائکہ کا تابوت کو اٹھانا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ اسے اٹھا کر لائے اور حضرت یوشع بن نون نے اسے ریگستان میں رکھ دیا اور یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے ہوا میں تابوت دیکھا یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اتر گیا۔ ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے۔

اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ اس تابوت (صندوق) کی مقدار تقریباً تین ہاتھ لمبائی اور دو ہاتھ چوڑائی تھی۔ کلبی نے کہا ہے: یہ شمسار کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے التابوہ پڑھا ہے اور یہ بھی اس کی لغت ہے اور لوگ آپ کی قراءت پر اسے تا کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ گزر چکا ہے۔ اور آپ سے التیبوت بھی مروی ہے۔ نحاس نے اسے ذکر کیا ہے۔ اور حمید بن قیس نے یحملہ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ سکینہ اور بقیہ کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس سکینہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے یہ سکون، وقار اور طمانینت سے لیا گیا ہے۔ پس یہ قول فِيْهِ سَكِيْنَةٌ یہ تمہارے دلوں کے سکون کا سبب ہے اس میں جو طالوت کے بارے تم میں اختلاف ہے۔ اور اسی کی طرح یہ ارشاد ہے: فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ نازل فرمایا جس کے سبب اس کے دل کو سکون ہوا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تابوت ان کے دلوں کے سکون کا سبب تھا، پس وہ جہاں بھی ہوئے انہیں اس کے

پاس سکون واطمینان ملا۔ جب تابوت جنگ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا وہ اس سے قطعاً نہ بھاگتے تھے۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے: سکینہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص روح ہے جو کلام کرتی تھی۔ جب ان کا کسی امر میں اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کی وضاحت اور بیان کے ساتھ بولتی تھی جو وہ ارادہ رکھتے تھے اور جب وہ جنگ میں چیخ مارتی تو کامیابی وکامرانی ان کے لئے ہو جاتی تھی۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یہ بہت تیز رفتار ہوا تھی اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی مثل تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایسی ہوا تھی جو ناہموار جگہوں سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتی، اس کے دو سر تھے(1)۔

اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ایک بلی کی طرح کا حیوان تھا اس کے دو پر تھے، دم تھی اور اس کی آنکھیں چمکدار تھیں اور جب یہ کسی لشکر کی طرف دیکھتا تو وہ شکست کھا جاتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ جنت سے لائی ہوئی سونے کی ایک طشتری تھی جس میں حضرات انبیاء علیہم الصلوت والتسلیمات کے دل دھوئے جاتے تھے، سدی نے یہی کہا ہے۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ تابوت میں انبیاء کرام علیہم الصلوت والتسلیمات کی باقی رہ جانے والی کچھ اشیاء (تبرکات) اور ان کی علامات اور نشانیاں تھیں۔ لوگ اس کے پاس سکون حاصل کرتے تھے، اس سے انس رکھتے تھے اور قوت وطاقت حاصل کرتے تھے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑا دو رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو اس آدمی پر بادل سا چھا گیا اور وہ گھومتا رہا اور اس کے قریب آتا گیا اور اس کا گھوڑا اس کے سبب خوف سے بدکنے اور اچھلنے کودنے لگے۔ جب صبح ہوئی تو وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا تذکرہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سکینہ ہے جو قرآن کے سبب نازل ہوا'' اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے مربد (کھجوریں خشک کرنے کی جگہ) میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ الحدیث۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے جو تیری تلاوت سن رہے تھے اور اگر تو پڑھتا رہتا تو وہ صبح اس حال میں کرتے کہ لوگ انہیں دیکھ سکتے جو ان سے مخفی رہتے ہیں(3)۔ اسے بخاری اور مسلم نے بیان کیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار سکینہ کے نزول اور ایک بار ملائکہ کے نازل ہونے کے بارے فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ سکینہ اس سایہ میں تھا اور وہ ہمیشہ ملائکہ کے ساتھ اترتا ہے اور اس میں ان کے لئے بھی حجت ہے جنہوں نے کہا کہ سکینہ روح ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 333، دار الکتب العلمیہ 2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 268، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 269، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل سورۃ کہف، حدیث نمبر 4625، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً۔ صحیح بخاری، باب فضل المعوذات، حدیث نمبر 4630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی شے ہے جس کی روح ہے، کیونکہ قرآن کا سننا صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے لئے جو عقل رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ بَقِيَّةٌ ۔ بقیۃ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

سو کہا گیا ہے: (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی بیان کیا ہے اور عکرمہ نے یہ زائد کہا ہے کہ اس میں تورات بھی تھی۔

اور ابو صالح نے کہا ہے: بقیۃ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔

اور عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا عصا، دونوں کے کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور ثوری نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ البقیۃ سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز من (وہ کھانا جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں (1)۔

جو کچھ اس بارے روایت ہے اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا، تو آپ نے غصے میں آ کر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ پس آپ نے ان میں سے جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئی تھیں ان کے ٹکڑے اٹھا لئے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔

اور ضحاک نے کہا ہے: البقیۃ سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کو لانا ہی اس کے بارے امر کی طرح ہے۔ اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام ہی تھے اور کسی آدمی کی آل سے مراد اس کے قرابتدار ہوتے ہیں (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

''پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے، وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پس سب نے پیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے: کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (مگر) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قول تعالیٰ: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ، فَصَلَ کا معنی ہے جب وہ ان کے ساتھ نکلا فصلت الشیء فانفصل یعنی میں نے شے کو کاٹا پس وہ کٹ گئی۔

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب طالوت روانہ ہوا تو لشکریوں نے اسے کہا: بے شک ہم سے نہیں اٹھائے جا سکتے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے نہر جاری کر دے۔ تو طالوت نے انہیں کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے۔

سدی کے قول کے مطابق فوجوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اور حضرت وہب نے کہا ہے کوئی بھی اس سے پیچھے نہ رہا تھا سوائے اس کے جو صغر سنی یا کبر سنی یا مرض کی وجہ سے معذور تھا (1)۔ اور الابتلاء کا معنی الاختبار آزمائش اور امتحان ہے۔ اور النَّهَر اور النَّهْر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی السعة سے ہے (یعنی وسعت، خوشحالی) اور اس سے النہار بھی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا: وہ نہر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان ہے (2)۔ جمہور نے بِنَهَر کو ہا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد اور حمید الاعرج نے بِنَهْر ہاء کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے اور اس ابتلاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا، پس جس کی اطاعت و پیروی پانی کو ترک کرنے میں ظاہر ہوئی تو اس کے بارے یہ معلوم ہوگا کہ وہ اس کے سوا دیگر احکام میں بھی مطیع و فرمانبردار رہے گا۔ اور جس پر پانی کے بارے میں اس کی خواہش اور طلب غالب رہی اور اس نے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بدرجہ اولیٰ دیگر تکالیف و مصائب میں نافرمان ہوگا۔

پس روایت ہے کہ وہ نہر پر پہنچے اس حال میں کہ پیاس انہیں لگی ہوئی تھی اور نہر کا پانی انتہائی میٹھا اور خوبصورت تھا۔ سو اس لئے اطاعت کرنے والوں کو چلو میں لینے کی رخصت دی گئی، تاکہ ان سے شدت پیاس کی اذیت کچھ نہ کچھ ختم ہو جائے اور اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

حال میں وہ نفس کا جھگڑا ختم کر سکیں (1) اور یہ بیان فرمادیا کہ زندگی کی تنگی پر صبر کرنے والوں کی احتیاط کے وقت پیاس کے ضرر اور تکلیف کو ختم کرنے کے لئے ایک چلو کافی ہو رہے گا جن کا قصد و ارادہ آسودگی اور خوشگواری نہ ہو۔ جیسا کہ عروہ نے کہا ہے:

و أحسوا قَرَاحَ الماء والماءُ باردُ

اور انہوں نے خالص پانی تھوڑا تھوڑا پلایا اور پانی ٹھنڈا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حسب المرء لُقیمات یُقِمن صلبه، (2) آدمی کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی صلب (ریڑھ کی ہڈی مراد پشت) کو سیدھا رکھ سکیں۔

اور بعض وہ لوگ جو معانی کی گہرائی میں غور و فکر کرتے ہیں انہوں نے کہا ہے: یہ آیت ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے دنیا کو نہر سے تشبیہ دی ہے اور اس سے پانی پینے والے کو اس سے جو دنیا کی طرف مائل ہے اور اس سے حظ وافر لینے کا طالب ہے اور پانی نہ پینے والے کو دنیا سے انحراف کرنے والے اور اس میں زہد و تقویٰ اختیار کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک چلو لینے والے کو دنیا میں بقدر حاجت لینے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تینوں احوال مختلف ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کتنی حسین تعبیر ہے اگر اس تاویل میں تحریف اور ظاہر معنی سے خروج کا اندیشہ نہ ہو لیکن اس کا صحیح معنی دوسرا ہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ طالوت نبی تھے انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کی طرف وحی اور الہام فرمایا اور اس نے الہام کو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش قرار دیا۔ اور جنہوں نے کہا وہ نبی نہ تھا انہوں نے کہا: اسے ان کے نبی حضرت شمویل علیہ السلام نے وحی کے سبب اس کی خبر دی جب طالوت نے اپنی قوم کو اس کے بارے آگاہ کیا اور بلاشبہ یہ آزمائش اس لئے آئی تاکہ صادق اور کاذب کے مابین تمیز ہو سکے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی اطاعت و پیروی کو آزمانے کے لئے انہیں آگ روشن کرنے اور پھر اس میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن اسے اس معنی پر محمول کیا گیا کہ یہ آپ کا اس امر سے ڈرانے کے لئے مزاح ہے جس کا آپ نے انہیں مکلف اور پابند بنایا تھا، اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ یہاں شَرِبَ بمعنی کَرَعَ ہے (یعنی پانی پر منہ رکھ کر بلاواسطہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دارالکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60، وزارت تعلیم

ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراھیۃ کثرۃ الأکل، حدیث نمبر 2302، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پانی پینا) اور فَلَيْسَ مِنِّيْ کا معنی ہے وہ اس جنگ میں میرا ساتھی نہیں ہے اور اس نے انہیں اس جملہ کے ساتھ ایمان سے خارج نہیں کیا۔

سدی نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے اور لامحالہ ان میں مومن، منافق، محنت کرنے والے اور سست بھی تھے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: مَنْ غشنا فليس منا(1) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی وہ ہمارے اصحاب میں سے نہیں ہے اور وہ ہمارے طریقہ اور ہماری ہدایت پر نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اذا حاولتَ فی أسد فجوراً فانی لستُ منك و لستَ مِنّی

جب تو اخلاق میں فسق وفجور کا قصد کرے گا تو پھر میں تجھ سے نہیں ہوں اور تو مجھ سے نہیں ہے۔ اور کلام عرب میں یہ عام رائج ہے کہ جب کسی آدمی کا بیٹا اس کے اسلوب اور طریقہ کے خلاف چلے تو وہ بیٹے کو کہہ دیتا ہے: لستَ مِنی تو مجھ سے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ کہا جاتا ہے: طعمت الشیءَ یعنی میں نے شے کو چکھ۔ اور اطعمته الماءَ یعنی میں نے اسے پانی چکھایا۔ اور یہاں و من لم یشربہ نہیں کہا کیونکہ یہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی شے کو مکرر (دوبارہ) ذکر کریں تو وہ اسے دوسرے لفظ کے ساتھ مکرر لاتے ہیں اور لغۃ القرآن تو تمام لغات سے زیادہ فصیح ہے۔ لہٰذا اس میں اس کی جرح وقدح کا کوئی اعتبار نہیں جو یہ کہتا ہے: کہ طعمت الماء (میں نے پانی کھایا) نہیں کہا جا سکتا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ہمارے علماء نے اس سے سد ذرائع کے قول پر استدلال کیا ہے کیونکہ ذوق (چکھنا) وہ کم سے کم شے ہے جو لفظ طعم میں داخل ہے اور جب طعم سے نہی واقع ہے تو شرب کے وقوع کا اس سے کوئی امکان نہیں ہے جو طعم سے اجتناب کرے گا۔ اسی مبالغہ کی خاطر کلام و من لم یشرب منہ نہیں لائے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی طعام ہے اور جب وہ طعام ہے تو پھر وہ (انسان کی زندگی) باقی رکھنے کے لئے خوراک ہے اور بدنوں کی خوراک اسی سے (حاصل ہوتی ہے) تو پھر یہ واجب ہے کہ اس میں ربا جاری ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی مذہب صحیح ہے۔(2)

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا: (دریا کے) کنارے پر پانی کی بیع پانی کے ساتھ کرنا متفاضل اور ایک خاص مدت تک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور امام محمد بن حسن نے کہا ہے: یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن کا کیل اور وزن کیا جاتا ہے۔ پس اس قول کی بنا پر ان کے نزدیک تفاضل جائز نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اس میں ربا ہے، کیونکہ ربا میں اس کی علت کیل اور وزن ہیں۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: پانی کی بیع نہ متفاضلا جائز ہے اور نہ اس میں معینہ مدت کا ادھار جائز ہے۔ اور ربا میں اس کی علت یہ ہے کہ یہ جنس ماکول میں سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ابن عربی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے کہا ہے: جس کسی نے کہا: اگر میرے فلاں غلام نے فرات سے پیا تو وہ آزاد ہے تو وہ آزاد نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اس میں منہ لگا کر پانی پیے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 70، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

الکرع کا معنی ہے کہ آدمی دریا سے اپنا منہ لگا کر بلاواسطہ پانی پیے۔ اور اگر اس نے اپنے ہاتھ سے پانی پیا یا برتن کے ساتھ اس سے پیا تو وہ آزاد نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دریا میں منہ لگا کر پانی پینے اور ہاتھ کے ساتھ پانی پینے کے درمیان فرق کیا ہے (1)۔ فرمایا: یہ فاسد ہے، کیونکہ شرب الماء کا اطلاق لغت عرب میں ہر ہیئت اور صفت پر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر یا منہ لگا کر پینا یہ ایک ہی ہے اور جب لغۃً اور حقیقۃً وہ شرب پایا گیا جس کی قسم کھائی گئی ہے تو وہ حانث ہو گیا۔ پس اسے جان لو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اہل لغت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے جیسا کہ کتاب وسنت نے فرق بیان کیا ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: کَرَعَ فی الماء کَرْعاً (کہا جاتا ہے) جب کوئی اپنے منہ کے ساتھ پانی اس کے محل سے پیے نہ وہ ہتھیلی کے ساتھ پیے اور نہ کسی برتن کے ساتھ اور اس میں دوسری لغت ہے۔ کَرِعَ یعنی را کے کسرہ کے ساتھ یکرع، کرعا۔ اور الکرع سے مراد بارش کا پانی ہے جو منہ میں پڑتا ہے۔

اور رہی حدیث طیبہ تو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے کہ واصل بن عبدالاعلیٰ، ابن فضیل نے لیث عن سعید بن عامر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے اور ہم اس میں منہ لگا کر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھو اور پھر ان سے پانی پیو کیونکہ ہاتھ سے بڑھ کر اچھا اور پاکیزہ برتن کوئی نہیں ہے (2) اور یہ نص ہے۔ لیث بن ابی سلیم مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ۔ الاغتراف کا معنی ہے: کسی شے سے ہاتھ اور کسی آلہ سے لینا۔ اور اسی سے المِغرَفة (چمچہ) ہے۔ اور الغَرْف، الاغتراف کا ہم معنی ہے۔ اور غَرْفة غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مصدر ہے اور اغترافۃ نہیں کہا، کیونکہ الغرف اور الاغتراف کا معنی ایک ہے۔ اور الغَرْفَة کا معنی ہے ایک بار۔ اور اسے غُرْفَة غین کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کا چلو بھرا جاتا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الغَرْفة ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھرنا اور الغُرْفة دو ہاتھوں کے ساتھ چلو بھرنا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہتھیلیاں صاف ترین برتن ہیں۔ اسی معنی میں حسن کا قول ہے:

لا يدلفون الى ماء بآنية الا اغترافا من الغدران بالراح

الدلیف کا معنی ہے آہستہ چال۔

وہ برتن لے کر پانی کی طرف آہستہ چال نہیں چلتے مگر نہروں سے ہتھیلی کے ساتھ چلو بھرتے ہوئے (لیتے ہیں)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربہ، جلد 1، صفحہ 253، وزارت تعلیم۔ ابن ماجہ، باب الشرب بالاکف والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کوئی ان زمانوں میں بغیر شبہ، شک اور ارتیاب کے خالص حلال کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ چشموں اور ان دریاؤں سے جو مسخر کیے گئے ہیں اور رات دن جاری ہیں اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ پانی پیے، اس کے سبب اللہ تعالیٰ سے نیکیاں کمانے، بوجھ اتارنے، نیکوکار ائمہ کرام کے ساتھ ملنے کا ارادہ اور نیت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا در آنحالیکہ وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو (اور) اس سے وہ تواضع کا ارادہ رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی انگلیوں کی تعداد کے مطابق نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ اور یہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا برتن ہے جب انہوں نے پیالہ پھینکا تو کہا: اف! یہ دنیا کے ساتھ ہے'' اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم اپنے پیٹوں کے بل لیٹ کر پانی پئیں اور وہ منہ پانی پر رکھ کر پانی پینا ہے، اور آپ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر پئیں اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس طرح آواز نکال کر (پانی) نہ پیے جس طرح کتا آواز نکال کر پیتا ہے اور کوئی ایک ہاتھ کے ساتھ اس طرح نہ پیے جس طرح وہ قوم پیتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا اور کسی برتن میں رات کے وقت نہ پیے یہاں تک کہ وہ حرکت دے لے (خوب ہلا لے) مگر یہ کہ برتن ڈھانپا ہوا ہو اور جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا اور وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو (1) ....'' آگے حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہے۔ اس کی اسناد میں بقیہ بن الولید ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کی حدیث لکھی جاتی ہے اور اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور ابو زرعہ نے کہا ہے: جب بقیہ ثقہ راویوں سے حدیث بیان کرے تو وہ ثقہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے! انہوں نے اپنے یقین کی مقدار پر پانی پیا اور کفار نے شدت پیاس کی بیماری والے کی طرح پیا اور گنہگاروں اور نافرمانوں نے اس سے تھوڑا کم پیا اور قوم سے چھہتر ہزار واپس لوٹ آئے اور بعض مومنین باقی رہ گئے انہوں نے کچھ نہ پیا اور بعض نے ایک چلو پانی لیا، پس جنہوں نے پانی پیا وہ سیراب نہ ہوئے بلکہ ان کی پیاس مسلسل باقی رہی اور جنہوں نے پانی چھوڑ دیا ان کی حالت اچھی رہی اور وہ ان کی نسبت زیادہ مضبوط رہے جنہوں نے چلو لے لیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ اس میں ہا ضمیر نہر کی طرف لوٹ رہی ہے اور هُوَ تاکید کے لئے ہے۔ وَالَّذِيْنَ یہ محل رفع میں ہے اور جَاوَزَهٗ میں ضمیر فعل پر اس کا عطف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاوزت المکان مجاوزۃ و جوازا۔ (میں نے مکان سے تجاوز کر لیا) اور کلام میں مجاز وہی ہے جو استعمال میں جائز ہوا اور نافذ ہوا اور اپنی علت پر برقرار ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس (طالوت) کے ساتھ نہر کو چار ہزار آدمیوں نے عبور کیا، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے پانی پیا۔ پس جب انہوں نے جالوت اور اس کے لشکروں کی طرف دیکھا، ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، تمام کے تمام ہتھیاروں کی شکایت کرنے لگے اور ان میں سے تین ہزار چھ سو اسی سے کچھ زائد واپس لوٹ گئے (2)۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، جلد 1، صفحہ 253۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الشرب والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 336، دار الکتب العلمیہ

پس اس قول کی بنا پر کہا کہ وہ مومنین جنہیں اس وقت دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا ایقان حاصل تھا ان کی تعداد اہل بدر کے برابر تھی۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اکثر مفسرین نے اس پر کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہر کو عبور انہوں نے کیا جنہوں نے بالکل پانی نہ پیا اور بعض نے کہا: دشمن کی اتنی کثرت کے باوجود ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ تو ان میں سے جو صاحب عزم و ہمت تھے۔ انہوں نے کہا: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (اللہ کے اذن سے بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم گفتگو کرتے رہتے تھے کہ اہل بدر کی تعداد ان اصحاب طالوت کی تعداد کی مثل تھی جنہوں نے اس کے ساتھ نہر کو عبور کیا وہ تین سو دس سے کچھ زائد آدمی تھے اور ایک روایت میں ہے: تین سو تیرہ آدمی اور اس کے ساتھ صرف مومنین نے اسے عبور کیا تھا (1)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بمعنی شک ہو یقین نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں نے کہا جو وہم رکھتے تھے کہ انہیں طالوت کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا اور وہ شہداء بن کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے۔ پس قتل میں شک پڑ گیا۔

قولہ تعالیٰ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ۔ الفئة کا معنی ہے لوگوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک گروہ۔ یہ فاوتُ رأسه بالسیف اور فأیتُه سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اس کا سر تلوار سے کاٹ دیا۔ اور ان (صحابہ کرام) رضی اللہ عنہم کے قول میں ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ الآیہ۔ یہ قتال پر انگیخت دلانا ہے اور صبر کا شعور بیدار کرنا ہے اور ان کی اقتدا اور پیروی کرنا ہے جنہوں نے اپنے رب کی تصدیق کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح کرنا ہم پر بھی واجب ہے لیکن اعمال قبیحہ اور نیات فاسدہ اس سے مانع ہیں۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بڑی تعداد دشمن کی قلیل تعداد کے سامنے شکست خوردہ ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم نے کئی بار اس کا مشاہدہ کیا ہے اور ایسا ہمارے اپنے اعمال کے سبب ہے۔

اور بخاری میں ہے: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ تم اپنے اعمال کے ساتھ جنگ لڑتے ہو۔ اور اس میں مسند روایت بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے ضعفاء کے سبب تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے (2)۔'' پس اعمال فاسد ہو چکے ہیں، ضعفاء مہمل ہو گئے ہیں، صبر قلیل ہے، اعتماد ضعیف اور کمزور ہو چکا ہے اور تقویٰ زائل ہو گیا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (ال عمران: 200) (صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمربستہ رہو (خدمت دین کے لئے) ہمیشہ ہی اللہ سے ڈرتے رہو)۔ اور مزید فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ

---

1۔ صحیح بخاری، باب عدۃ اصحاب بدر، حدیث نمبر 3663، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405، وزارت تعلیم

فَتَوَكَّلُوْا (اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرو) اور مزید فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل) (یقینا اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔) مزید فرمایا: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج: 40) (اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا) مزید فرمایا: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الانفال) (جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ) پس یہی نصرت کے اسباب ہیں اور اس کی شرائط ہیں اور یہ ہمارے پاس معدوم ہیں، ہم میں موجود نہیں ہے۔ پس اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اس پر جو مصیبت اور آفت ہم پر آئے اور ہم میں اترے بلکہ اسلام میں سے سوائے اس کے ذکر کے کوئی شے باقی نہیں رہی اور نہ ہی دین میں سے سوائے اس کی رسم کے کچھ باقی رہا ہے۔ یہ فساد کے ظہور، رعونت و سرکشی کی کثرت اور ہدایت و راہنمائی کی قلت کے سبب ہے۔ یہاں تک کہ دشمن شرق و غرب اور بحر و بر میں غالب آ چکا ہے، فتنے عام ہو گئے ہیں، آزمائشیں بڑھ گئی ہیں اور کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جو رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور جب سامنے آ گئے جالوت اور اس کی فوجوں کے، تو بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے: اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔''

بَرَزُوْا جب وہ براز میں آ گئے اور براز سے مراد وسیع زمین میں سے کشادہ اور کھلا میدان ہے۔ جالوت عمالقہ کا امیر تھا اور ان کا بادشاہ تھا اس کا سایہ ایک میل تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ (قوم) بربر اس کی نسل سے ہے اور اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی فوج میں تین لاکھ گھڑ سوار تھے اور عکرمہ نے کہا ہے: نوے ہزار تھے اور جب مومنین نے اپنے دشمن کی کثرت کو دیکھا تو انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں عجز و انکساری کی اور یہ رب العالمین کے اس قول کی طرح ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا الآیہ (العمران) (اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے...... اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے: اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو آپ جنگ میں اس طرح دعا کرتے تھے: اللّٰھم بك أصول و أجول، (1) اے اللہ! میں تیری مدد و نصرت کے ساتھ ہی حملہ کرتا ہوں اور پلٹ کر آتا ہوں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن کے سامنے ہوتے تو اس طرح کہتے: اللھم انی اعوذ بك من شرورھم و أجعلك فی نحورھم (2) اے اللہ! میں ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تجھے ہی ان کے مقابلے میں دیکھتا ہوں۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن دعا مانگی حتیٰ کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی اور آپ اللہ تعالیٰ سے اپنا وعدہ پورا کرنے کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 354، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 215

التجا کرتے رہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۵۱﴾

''پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی داود کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر۔''

قولہ تعالیٰ: فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مدد و نصرت نازل فرمائی۔ فَهَزَمُوْهُمْ تو انہوں نے انہیں شکست دی (ان کی کمر توڑ دی) اور الهزم کا معنی ہے توڑنا۔ اور اسی سے ہے سقاء مُتَهَزِّم یعنی ایسی مشک جو خشکی کے سبب ٹوٹ جائے اور اسی سے وہ قول ہے جو زمزم کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گڑھا ہے (هَزْمَةُ جبريل) یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے زمین کو اپنے پاؤں سے نیچے دبایا، گڑھا بن گیا اور پانی نکل آیا۔ اور الهزم سے مراد وہ خشک لکڑی بھی ہے جو ٹوٹ جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اس لئے کہ طالوت بادشاہ تھا اور جالوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے یہ اپنی قوم میں سے چنا گیا تھا۔ یہ قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹا، زیادہ تر بیمار رہنے والا، زرد رنگ کا تھا اس کی (آنکھیں چھوٹی اور نیلی تھیں۔) اور جالوت لوگوں میں سے انتہائی مضبوط اور بہت زیادہ قوی تھا۔ اور یہ اکیلا لشکروں کو شکست دے سکتا تھا اور جالوت کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ وہ عمالقہ کا امیر اور سردار تھا اور (قتل کرنے والے) داؤد ابن ایشی تھے۔ یہ ایشی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ داؤد بن زکریا بن رشوی تھے، یہ یہوذا ابن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں اکٹھی عطا فرما دی گئیں۔ اس سے پہلے یہ چرواہے تھے اور یہ اپنے بھائیوں میں سے چھوٹے تھے اور ریوڑ چراتے تھے اور ان کے سات بھائی اصحاب طالوت میں سے تھے۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دل میں کہا: میں ضرور بہ ضرور اس جنگ کو دیکھنے کے لئے جاؤں گا، جب اس راستے پر چلے ایک پتھر کے پاس سے گزرے تو اس نے آپ کو آواز دی اے داؤد! مجھے اٹھا لے، اور میرے ساتھ تو جالوت کو قتل کرے گا، پھر ایک دوسرے پتھر نے انہیں آواز دی، پھر ایک اور نے آواز دی، پس آپ نے انہیں اٹھا لیا اور انہیں اپنے توبرے میں رکھ لیا اور چل پڑے۔ پس جالوت (لشکر کی صفوں سے) باہر نکلا اور دعوت مبارزت دینے لگا تو لوگوں نے اس کے مقابلے کی جرأت نہ کی اور کمزوری دکھائی یہاں تک کہ طالوت نے کہا: جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کر دے گا میں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کروں گا اور اپنے مال میں اسے حکم بناؤں گا، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام

آئے اور کہا: میں اس کے ساتھ مقابلہ کروں گا اور اسے قتل کر دوں گا (1)، لیکن طالوت نے جب ان کی صغرسنی اور چھوٹے قد کو دیکھا تو انہیں کمزور قرار دے کر واپس لوٹا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نیلگوں چھوٹے قد کے تھے۔ پھر طالوت نے دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کیا اور پھر بھی حضرت داؤد علیہ السلام ہی باہر نکلے۔ تب طالوت نے ان سے کہا: کیا تو اپنی ذات میں کسی شے سے تجربہ رکھتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں: اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: ایک دفعہ ایک بھیڑیا میرے ریوڑ میں داخل ہو گیا تو میں نے اسے مارا، پھر اس کے سر کو پکڑ لیا اور میں نے اسے اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ طالوت نے کہا: بھیڑیا تو کمزور ہے، کیا اس کے علاوہ بھی تو کوئی تجربہ رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ ایک شیر میرے ریوڑ میں آ گیا تو میں نے اسے مارا، پھر میں نے اسے جبڑوں سے پکڑ لیا اور میں نے ان دونوں کو چیر ڈالا۔ کیا تو اسے شیر سے بھی زیادہ طاقتور جانتا ہے؟ طالوت نے کہا: نہیں۔ طالوت کے پاس ایک زرہ تھی اور وہ اسی پر پوری آ سکتی تھی جو جالوت کو قتل کرے گا۔ پس اس نے اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا اور وہ زرہ آپ پر ڈال دی تو وہ بالکل برابر ہو گئی۔ پھر طالوت نے کہا: تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میرا ہتھیار پکڑ لے (اور اس کے مقابلے میں جا)۔ چنانچہ آپ نے ایسا کر لیا، لیکن جب تھوڑا سا چلے تو واپس لوٹ آئے اور لوگوں نے کہا: یہ نوجوان تو بزدل ہو گیا ہے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: بے شک الله تعالیٰ نے اسے میرے سبب قتل نہ کیا اور اس کے خلاف اس نے میری مدد نہ فرمائی تو پھر یہ گھوڑا اور یہ ہتھیار میرے لئے نفع بخش نہیں ہیں۔ البتہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اس سے اپنی عادت کے مطابق ہی لڑوں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مِقلاع (پتھر پھینکنے کا گوپھیا، فلاخن) کے ساتھ پتھر پھینکنے کے لوگوں کی نسبت زیادہ ماہر تھے۔ پس آپ (گھوڑے سے) اترے اور اپنے توبرے کو اٹھایا اور اسے لٹکا لیا اور اپنا گوپھیا اٹھایا اور جالوت کی طرف چل نکلے۔ وہ مکمل اپنے ہتھیار پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر خود تھا اس میں تین سو رطل تھے، جیسا کہ الماوردی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ تو جالوت نے انہیں کہا: اے نوجوان! تو میری طرف نکلا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اس طرح جیسا کہ تو کتے کی طرف نکلا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، بلکہ تو اس سے بھی آسان ہے۔ فرمایا: میں یقیناً آج تیرا گوشت پرندوں اور درندوں کو کھلاؤں گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیر جانتے ہوئے انہیں اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ اور روایت ہے کہ وہ پتھر جڑ چکے تھے اور وہ ایک پتھر بن گیا تھا۔ سو آپ نے اسے پکڑا اور اپنے گوپھیا میں رکھا اور الله تعالیٰ کا نام لیا اور اسے گھمایا اور پھینک دیا، پس وہ جالوت کے سر میں جا لگا اور اسے قتل کر دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر اپنے توبرے میں رکھ لیا اور لوگوں میں مل گئے۔ اور طالوت کی فوج نے حملہ کر دیا اور یہی ہزیمت اور شکست تھی (2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر خود سے ناک کی جگہ پر جا لگا۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے آنکھ پر جا کر لگا اور اس کی گدی کی جانب سے نکل گیا اور اس کے لشکر کی ایک جماعت کو جا کر لگا اور اس نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ پتھر ٹوٹ کر بکھر گیا یہاں تک کہ لشکر کے ہر فرد کو اس کا کچھ حصہ جا کر لگا اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

(سنگریزوں کی) اس مشت کی طرح تھا جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین کے دن بنی ہوازن پر پھینکی۔ واللہ اعلم

ان آیات کے قصص میں لوگوں نے بہت زیادہ بیان کیا ہے اور میں نے تیرے لئے ان میں سے خاص مقصود کو ہی ذکر کیا ہے واللہ المحمود۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: طالوت کے اس قول کے بارے میں ہے ''جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا تو میں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے اپنے مال میں حکم بناؤں گا'' یہ مفہوم ہماری شریعت میں بھی ثابت اور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ امام وقت کہے: جو فلاں کا سر لائے گا تو اس کے لئے اتنا ہوگا، یا جو فلاں کو قیدی بنا کر لائے تو اس کے لئے اتنا انعام ہو گا۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مبارزت امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ امام احمد اور اسحاق وغیرہما اس کے بارے کہتے ہیں اور اس میں امام اوزاعی سے اختلاف منقول ہے، سو ان سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی بھی اپنے امام کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر امام مبارزت سے روک دے تو پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی مبارز طلب نہ کرے گا۔

اور ایک گروہ نے مقابلے کو مباح قرار دیا ہے اور انہوں نے امام کی اجازت ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

امام مالک سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا جو دو صفوں کے درمیان کہتا ہے: کون مقابلہ کرے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کا انحصار اس کی نیت پر ہے اگر اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ رکھتا ہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا۔ زمانہ ماضی میں ایسا کیا جاتا رہا ہے اور امام شافعی نے کہا ہے: مبارزت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام کی اجازت کے ساتھ مبارزت طلب کرنا اچھا ہے اور اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے جس نے امام کی اجازت کے بغیر مبارز طلب کیا یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں کوئی مانع خبر نہیں جانتا۔

وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ، سدی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طالوت کا ملک (بادشاہی) اور شمعون کی نبوت عطا فرمائی۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا وہ زرہیں بنانے اور پرندوں کی گفتگو سمجھنے اور دیگر ان علوم کی انواع میں سے کئی عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک زنجیر عطا فرمایا جو کہکشاں اور فلک سے ملا ہوا تھا اور اس کا ایک سرا حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ کے پاس تھا اور ہوا میں جو واقعہ بھی پیش آتا زنجیر بجنے لگتا اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہو جاتا جو وقوع پذیر ہوتا اور کوئی آفت زدہ اسے چھو لیتا تو وہ اس سے نجات پا جاتا اور یہ آپ کی قوم کے دین میں داخل ہونے کی علامت تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ مس کرتے پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینوں پر مل لیتے اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ

کے بعد اس کے پاس فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ اسے اٹھالیا گیا۔

قولہ تعالیٰ: مِمَّا یَشَآءُ یہ بمعنی مما شاء ہے اور کبھی ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اسی طرح تمام کی قراءت ہے سوائے حضرت نافع کے کیونکہ انہوں نے دِفَاعُ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کا مصدر ہو جیسا کہا جاتا ہے: حسبت الشیٔ حِسَاباً، آبَ اِیَاباً، لقیتہ لقاء، اور اسی کی مثل کتبہ کتابا ہے اور اسی سے کِتَابَ اللہ عَلَیۡکُمۡ (النساء) بھی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا ہے۔ پس دفاع اور دَفۡع دونوں دَفَعَ کے مصدر ہوں گے۔ یہی سیبویہ کا مذہب ہے۔

اور ابوحاتم نے کہا ہے: دَافَعَ اور دَفَعَ دونوں کا معنی ایک ہے، جیسا طرقت النعل اور طارقت ہے یعنی میں نے جوتے کو ایک دوسرے پر سیا۔ الخصف کا معنی الخرز، سینا ہے۔

ابوعبیدہ نے جمہور کی قراءت کو اختیار کیا ہے (یعنی) وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ اور انہوں نے دِفَاعُ پڑھنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے، کیونکہ الله تعالیٰ پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔ مکی نے کہا ہے: یہ وہم ہے باب مفاعلہ نے اس میں وہم پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ اور لفظ اللّٰهِ فعل کے سبب محل رفع میں ہے یعنی لولا ان یدفع اللہُ۔ اور دفاع سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ النَّاسَ مفعول ہے اور بَعْضَهُمْ، النَّاسَ سے بدل ہے اور بِبَعْضٍ سیبویہ کے نزدیک مفعول ثانی کے محل میں ہے اور یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی مثل ہے: ذھبت بزید، تو اس میں زید مفعول کے محل میں ہے۔ اسے جان لو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا ان لوگوں کے بارے میں اختلاف ہے جنہیں فساد سے بچایا گیا ہے وہ کون ہیں؟

تو کہا گیا ہے: وہ ابدال ہیں اور وہ چالیس آدمی ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی فوت ہوتا ہے تو الله تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے۔ اور جب قیامت قریب ہوگی تو وہ تمام فوت ہو جائیں گے ان میں سے بائیس شام میں ہیں اور اٹھارہ عراق میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الابدال یکونون بالشام وھم اربعون رجلا کلما مات منھم رجل ابدل اللہ مکانہ رجلا یسقی بھم الغیث و ینصر بھم علی الأعداء و یصرف بھم عن اھل الأرض البلاء (1) (بلاشبہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی آدمی فوت ہوا الله تعالیٰ اس کی جگہ اور آدمی مقرر فرما دے گا، ان کے سبب الله تعالیٰ بارش برساتا ہے، ان کے سبب دشمنوں کے خلاف مدد فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین سے بلائیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے۔) حکیم ترمذی نے اسے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے: انہوں نے کہا: بلاشبہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات زمین کے اوتاد ہیں اور جب نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو الله تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ مشکوۃ المصابیح، ذکر الیمن والشام، جلد 1، صفحہ 582

امت سے ایک جماعت کو ان کا بدل بنا دیا۔ انہیں ابدال کہا جاتا ہے: اور کثرت صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے ان لوگوں کو فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ حسن خلق، صدق وورع، حسن نیت، تمام مسلمانوں کے لئے دلوں کا صاف اور سلامت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے انہیں صبر، حلم، دانشمندی اور بغیر کسی ذلت کے تواضع وانکساری اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے سبب انہیں فضیلت دی گئی۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں، وہ ایسی قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے اور انہیں اپنی ذات کے بارے میں اپنے علم کے ساتھ خالص اور مختص کر لیا ہے اور وہ چالیس صدیق ہیں، ان میں سے تیس آدمی حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے یقین کی مثل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبب اہل زمین سے مصائب اور لوگوں سے آفات اور آزمائشوں کو دور فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایسا آدمی پیدا فرما دے جو اس کا خلیفہ اور نائب ہوگا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فوجوں کے سبب دشمنوں کو دور نہ کرتا تو مشرکین غالب آجاتے اور وہ مومنین کو قتل کرتے اور شہروں اور مساجد کو برباد کر دیتے۔

اور حضرت سفیان ثوری نے کہا ہے: مراد وہ گواہی اور شہادت دینے والے لوگ ہیں جن کے سبب حقوق حاصل کیے جاتے ہیں اور مکی نے بیان کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے سبب انہیں نہ بچائے جو نماز نہیں پڑھتے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے سبب ان کی حفاظت نہ کرے جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے تو وہ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دے (2)۔

اسی طرح نحاس اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا ہے اور تمام مفسرین نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نیکوکار مومنین کو فجار اور کفار سے نہ بچائے تو زمین برباد اور فاسد ہو جائے۔ اور ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کے نماز پڑھنے والوں کے سبب نماز نہ پڑھنے والوں سے اور تزکیہ اختیار کرنے والوں کے سبب تزکیہ اختیار نہ کرنے والوں سے اور روزے رکھنے والوں کے سبب روزے نہ رکھنے والوں سے اور حج کرنے والوں کے سبب حج نہ کرنے والوں سے اور جہاد کرنے والوں کے سبب جہاد نہ کرنے والوں سے عذاب دور فرماتا رہے گا اور اگر وہ ان اعمال کے ترک کرنے پر جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ انہیں آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہ دے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: ان لله ملائكة تنادي كل يوم لولا عباد رُكَّعٌ وأطفال رُضَّعٌ وبهائم رُتَّعٌ لصبّ عليكم العذاب صبًّا (بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ہر روز ندا دیتے ہیں: اگر عبادت گزار بندے نہ ہوتے، شیر خوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب موسلا دھار برسا دیا جاتا) (3)۔ اے

1۔ نوادر الاصول، بیان عدد الابدال، جلد 1 صفحہ 69، دار صادر بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ
3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 155، حدیث نمبر 9820، دار الکتب العلمیۃ

ابوبکر الخطیب نے اسی معنی میں حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

منصور نے ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم میں خشوع کرنے والے آدمی، چرنے والے جانور اور شیر خوار بچے نہ ہوں تو مومنین پر موسلا دھار عذاب برسا دیا جائے (1)۔

بعض نے یہ معنی لیا اور کہا:

لو لا عبادٌ لِلّالِهِ رُکَّعٌ وَ صِبْیَةٌ من الیتامی رُضَّعٌ

اگر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے نہ ہوں اور شیر خوار یتیم بچے نہ ہوں۔

و مُهْمَلاتٌ فی الفَلاة رُتَّعٌ صُبَّ علیکم العذابُ الأوْجَعُ

اور جنگل میں چھوڑے گئے چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر دردناک عذاب موسلا دھار برسا دیا جائے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ آدمی کے اپنے بیٹے اور پوتے کی اصلاح کرنے کے سبب اس کی اصلاح فرما دیتا ہے اس کے گھر والوں کی اور اس کے اردگرد کے گھروں کی (اصلاح فرما دیتا ہے) اور وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہیں جب تک وہ ان میں ہو'' (2)

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کے سبب آزماتا ہے اور کافر کو مومن کے سبب عافیت عطا کرتا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لیدفع بالمؤمن الصالح عن مائة من اهل بیته و جیرانه البلاء بے شک اللہ تعالیٰ نیک صالح مومن کے سبب اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں میں سے سو افراد سے مصیبت اور آفت کو دور فرماتا ہے (3)۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور کہا گیا ہے: یہ دفاع اور بچاؤ اس شریعت کے سبب ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی زبانوں پر شریعتوں میں سے جاری ہوئیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاء چھینتے اور ایک دوسرے کا سامان لوٹتے اور ہلاک ہو جاتے۔ یہ حسین قول ہے کیونکہ روکنے اور دفاع وغیرہ میں عموم ہے۔ پس اس میں غور کرلو۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے کفار کے شر کو دور کرنا یہ اس کا فضل اور خاص انعام ہے۔

## تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞

''یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب!) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

تِلْكَ مبتدا ہے۔ اور اٰيٰتُ اللّٰهِ اس کی خبر ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور خبر نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ بنا لے۔ وَ اِنَّكَ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صلاۃ الاستسقاء، جلد 3، صفحہ 345، دار الفکر
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 755
3۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 355، دار الفکر بیروت

لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ یہ انّ کی خبر ہے یعنی وانك لمرسل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا ہے کہ یہ آیات وہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہیں نبی مرسل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

”یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الرُّسُلُ یہاں تِلْكَ فرمایا ہے۔ ذلك نہیں فرمایا تو یہ لفظ جمع کی تانیث کی رعایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور الرُّسُلُ اس کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مابعد جملہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرسل عطف بیان ہے اور فَضَّلْنَا خبر ہے۔ یہ مشکل آیت ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تخيّروا ما بين الانبياء (1) (تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو) اور مزید فرمایا: لا تفضلوا بين انبياء الله (2) (تم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو) انہیں ائمہ ثقات نے روایت کیا ہے۔ یعنی تم یہ نہ کہو، فلاں فلاں سے بہتر ہے اور نہ یہ کہو: فلاں فلاں سے افضل ہے۔ کہا جاتا ہے: خيّر فلان بين فلان و فلان (فلاں نے فلاں فلاں کے درمیان ایک کو بہتر قرار دیا) اور فضیلت دی جب اس نے یہ کہا تو اس میں (فضّل) مشدد ہوگا۔

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لئے ناسخ ہے۔

اور ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد أنا سيد ولد آدم (3) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب بدء الخلق وذکر الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507۔ 2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، و۔ت۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 4343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور لواء الحمد اور حوض کوثر آپ ہی کے لئے ہوگا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع اور انکساری کے طور پر یہ ارشاد فرمایا: لا تخیرونی علی موسٰی (1) (تم مجھے موسیٰ علیہ السلام سے بہتر اور برتر قرار نہ دو) جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں تواضع مراد ہے: وُلیتکم و لست بخیر کم (مجھے تمہارا والی بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں) اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی ہے لا یقل احد أنا خیر من یونس بن متی (2) (کوئی یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں) یعنی یہ تواضع اور انکساری کی بنا پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (قلم: 48) (اور تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ) اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب العالمین فرما رہا ہے: ولا تکن مثلہ (اور تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ) اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کا ارشاد لا تفضلونی علیہ (3) (تم مجھے ان پر فضیلت نہ دو) یہ بطریق تواضع ہے۔ اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم مجھے ان پر عمل میں فضیلت نہ دو، شاید وہ عملاً مجھ سے افضل ہوں اور نہ ہی آزمائش اور امتحان میں مجھے فسیلت دو کیونکہ وہ آزمائش کے اعتبار سے مجھ سے اعظم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے دن تمام انبیاء علیہم السلام پر سرداری اور فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ کے عمل کے سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آپ کو فضیلت دینے کے سبب ہے اور اپنے لئے آپ کو خاص کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس تاویل کو مہلب نے اختیار کیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس میں گہری غور و خوض سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ گہری غور و خوض اس میں جھگڑے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور وہ یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے اور مقابلے کے وقت ان کا احترام کم ہو جاتا ہے۔

ہمارے شیخ نے کہا ہے: پس یہ نہیں کہا جائے گا: نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: وہ فلاں سے افضل ہیں اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ وہ بہتر ہیں۔ جیسا کہ نہی کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس سے مفضول میں نقص اور عیب کا وہم ہو جاتا ہے، کیونکہ نہی لفظ کے اطلاق سے روکنے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ اس معنی کا اعتقاد رکھنے سے روکنے کا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا ہے کہ رسل علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس آپ یہ نہیں کہیں گے: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام سے بہتر ہیں اور نہ یہ کہ آپ فلاں نبی علیہ السلام سے بہتر ہیں، اس سے اجتناب کرتے ہوئے جس سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی اقتدا کرتے ہوئے اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے جس تفضیل کو قرآن متضمن ہے اور حقائق امور کو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے احسن قول اس کا ہے جس نے یہ کہا ہے: بلاشبہ فضیلت دینے سے روکنا خالصۃً

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 481، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، حدیث نمبر 2235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

اس نبوت کی جہت سے ہے جو ایک خصلت ہے جس میں کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ یہ فضیلت احوال وخصوصیات، کرامات والطاف میں زیادتی اور متفرق معجزات کی بنا پر ہے اور رہی نبوت فی ذاتہا تو اس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں، بلکہ یہ تفاضل دوسرے امور کے سبب ثابت ہوتا ہے جو اس پر مستزاد ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض رسل اولوالعزم ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) (اور تحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔) اور مزید فرمایا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس نے بغیر نسخ کے آیات اور احادیث کے درمیان تطبیق کر دی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قول ان فضائل کی بنا پر ہے جو انہیں عطا فرمائے گئے اور ان وسائل کی وجہ سے ہے جو انہیں دیے گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ مَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (الانبیاء) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی۔ یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔)

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح) (یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔) پھر انہوں نے کہا: انبیاء علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: 4) (اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (السبا: 28) (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف) پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن وانس کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اسے ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: خیر بنی آدم نوح و ابراهیم و موسیٰ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1) کہ بنی آدم میں سے افضل اور بہتر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولوالعزم ہیں۔ پس یہ تعیین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے مگر ابن عطیہ ابو محمد عبدالحق نے کہا ہے: بلاشبہ قرآن کریم تفضیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ فی الجملہ ہے اس میں کسی ایک مفضول کی تعیین نہیں ہے اور اسی طرح احادیث بھی ہیں اور اسی لئے حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: انا اکرم ولد آدم علی ربی (1) (میں اپنے رب کے نزدیک (تمام) اولاد آدم سے زیادہ معزز ہوں) اور فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)'' اور آپ نے تعیین نہیں فرمائی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''کسی کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں (3)۔'' اور فرمایا: ''تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (4)۔'' اور ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں مفضول کی تعیین سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام نوجوان تھے اور آپ اعبائے نبوت کے نیچے دب گئے، تو جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے یہ حکم توقیفی ہے تو دوسروں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ خبر دی ہے کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو وہ بعض فضیلت والے انبیاء کو بیان بھی کرتا ہے اور ان احوال کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے سبب انہیں فضیلت دی گئی ہے۔ پس اس نے فرمایا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (البقرہ: ۲۵۳) (ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔)

اور مزید فرمایا: وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۞ (بنی اسرائیل) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی اور مزید فرمایا: وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ (الانبیاء) (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لئے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: 15) (اور تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا) اور مزید فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (احزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی نوح سے بھی) پس یہ عام بیان کیا پھر خاص بیان کیا اور آغاز حضور نبی رحمت ﷺ سے کیا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح گفتگو صحابہ کرام کے بارے میں بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ شرف صحبت میں تمام

---

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، فضل سید المرسلین، جلد 1، صفحہ 514۔ ایضاً، ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، وزارت تعلیم　　3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم
4۔ ایضاً　　5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دارالکتب العلمیہ

مشترک ہیں، پھر ان فضائل میں وہ متفرق اور جدا جدا ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مواہب و رسائل میں سے عطا فرمائے ہیں۔ پس وہ ان کے سبب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اس کے باوجود ان تمام کو صحابیت، عدالت اور ان کی تعریف وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح:29) ((جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر طاقتور ہیں) اور مزید فرمایا: وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (الفتح:26) (اور انہیں استقامت بخش دی تقوی کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی تھے۔) پھر فرمایا: لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ (الحدید:10) (تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی) اور مزید فرمایا: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:18) (یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی اس درخت کے نیچے۔) پس یہ بھی عام اور خاص بیان ہے۔ اور ان سے عیب اور نقص کی نفی کی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین و نفعنا بحبہم آمین۔

قولہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ جس سے کلام کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے عرض کی گئی: کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ نبی مکلم تھے'' (یعنی جن سے کلام کی گئی۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل یہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف ہمکلامی جنت میں عطا ہوا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے گی (1)۔ عبادت سے اسم کے طویل ہونے کے سبب ہا ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل عبارت ہے: من کلمه الله۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنا دی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں (2) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔'' اور اسی سے قرآن کریم، چاند کا شق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت بڑی مخلوق کو کھلانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دوہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور زائد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے سوا وہ ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں۔ اور کلام کا ذکر تاکیداً ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم

(آسمان) کی طرف اٹھانا ہو اور مراد آسمان میں انبیاء علیہم السلام کے مراتب ہوں جیسا کہ حدیث اسراء میں ہے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات یہ ہیں: مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرنا اور مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے۔ وَ اَیَّدْنٰهُ اور ہم نے اسے قوت عطا فرمائی۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے۔ (1)

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اور تثنیہ کو جمع سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے: من بعد جمیع الرسل یعنی تمام رسولوں کے بعد اور یہی لفظ کا ظاہر معنی ہے۔

اور کہا گیا ہے: بے شک یہ قتال اور جھگڑا ان لوگوں کی طرف سے واقع ہوا جو ان کے بعد آئے اور معنی اس طرح نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ لوگ ہر نبی کے بعد نہ لڑتے جھگڑتے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اشتریت خیلا ثم بعتها (میں نے گھوڑا خریدا پھر اسے بیچ دیا۔) پس اس عبارت میں تیرے لئے جائز ہے کہ تو ایک گھوڑا خریدے اور اسے بیچ دے پھر دوسرا خرید لے اور اسے بیچ دے پھر تیسرا خریدے اور اسے بیچ دے اور اسی طرح یہ نوازل (سخت مصیبتیں) بھی ہیں کہ لوگوں کا ہر نبی علیہ السلام کے بعد اختلاف ہوا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیوی ساز و سامان کی طلب اور حسد میں کفر اختیار کیا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور قضا و قدر کے ساتھ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ اس کا خلاف اور برعکس چاہتا تو وہی ہوتا لیکن وہ اس فعل کو سر حکمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ اور وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا میں نون کو دو ساکن ملنے کی وجہ سے کسرہ دیا گیا ہے اور قرآن کے سوا اور کلام میں اس کا حذف بھی جائز ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

فلستُ بآتیه ولا استطیعهُ　　ولاكِ اسقنی ان کان ماؤك ذافضلِ

پس میں اس کی طرف آنے والا نہیں ہوں (جس کی طرف تو نے مجھے دعوت دی ہے) اور نہ میں اس کی استطاعت رکھتا ہوں، لیکن تو مجھے پانی سے سیراب کر اگر تیرے پاس فالتو پانی ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔ اس میں مَنْ مبتدا ہونے اور صفت کے سبب محل رفع میں ہے۔

## یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"اے ایمان والو! خرچ کر لو اس (مال) سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن جس میں نہ تو خرید و فروخت ہو گی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہو گی اور نہ (ان کے لئے) شفاعت۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔"

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، حدیث نمبر 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حسن نے کہا ہے: یہ فرض زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ آیت فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات وغیرہ کو جامع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے لیکن سابقہ آیات قتال کے ذکر میں ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ اس کو روکتا ہے جو کافروں کے سینوں میں ہے اور اس سے یہ موقف ترجیح پاتا ہے کہ اس سے مراد ندباً اور مستحباً اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور آیت کے آخر میں یہ قول اسے مزید تقویت دیتا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی تم ان سے اپنی جانوں کے ساتھ لڑتے ہوئے اور اموال خرچ کرتے ہوئے مقابلہ کرو۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل پر ایک بار مال خرچ کرنا واجب ہوگا اور ایک بار مستحب جہاد کے تعین اور اس کے عدم تعین کے اعتبار سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس (مال) سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور جس کے ساتھ ان پر انعام کیا۔ اور انہیں روک کر رکھنے سے ڈرایا یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی خرید و فروخت ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی کسی نفقہ کو پانا ممکن ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ (تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا۔)

اور الخُلَّة سے مراد خالص دوستی ہے۔ یہ تخلل الأسرار بین الصدیقین سے ماخوذ ہے۔ (دو دوستوں کے درمیان راز خاص ہیں۔) اور الخِلالةُ و الخَلالةُ و الخُلالةُ تمام کا معنی دوستی اور محبت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

وكيف تواصِلُ مَنْ اَصْبَحَتْ　　خلالتُه　　كأبي　　مَرْحَب

تو اسے کیسے پہنچ سکتا ہے جس کی دوستی ابو مرحب کی طرح ہو گئی ہے۔

اور ابو مرحب سائے کی کنیت ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس عرقوب کی کنیت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: مواعید عرقوب (عرقوب کے وعدے۔) اور الخُلَّةُ سے مراد میٹھی اور شیریں گھاس بھی ہے جو عام بوٹی سے خالی ہو۔ کہا جاتا ہے: الخُلَّةُ خُبْزُ الاِبِلِ و الحُمْض فاکھتها (شیریں گھاس اونٹ کی روٹی ہے اور نمکین و تلخ گھاس اس کا پھل ہے۔) اور الخَلَّةُ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی حاجت اور فقر ہے اور الخُلَّة کا معنی ابن مخاض بھی ہے۔ (یعنی ایک سال کا اونٹ)، یہ اصمعی سے روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: أتاهم بقُرْص كأنه فِرْسِن خَلَّةٍ (وہ ان کے پاس ایک ٹکیہ لے کر آیا گویا کہ وہ اونٹ کا کھر ہے۔) اس کا مؤنث بھی خَلَّةٌ ہی ہے۔ اور میت کے لئے کہا جاتا ہے: اللّٰهم اصلح خَلَّتَهٗ (اے اللہ! اس کے اس خلل کی اصلاح فرما دے جو اس نے چھوڑا ہے۔) اور الخَلَّة کا معنی ترش نمکین گھنا پودا بھی ہے۔

اور الخِلَّةُ یہ خلل السیوف کا واحد مؤنث ہے۔ اور یہ وہ غلاف ہیں جن کے ساتھ تلواروں کی میانوں کو ڈھانپا جاتا ہے اور یہ سونے وغیرہ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے سُیُور تُلْبس ظهر سیتی القوس یعنی وہ تسمے جو قوس کی دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ

طرفوں کے ظاہر کو پہنائے جاتے ہیں اور الخِلَّۃ کا معنی وہ شے بھی ہے جو دانتوں میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں الخلیل کے مادہ اشتقاق اور اس کے معنی کی بحث میں آئے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آخرت میں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ اسے شرف بخشے گا جسے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ نصب کے ساتھ بغیر تنوین کے قراءت کی ہے اور اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خِلٰلَ۔

اور سورہ الطور میں ہے لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ۔ (1)

اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

أَلَا طِعَانَ وَلَا فُرْسانَ عادیۃٌ        إلّا تَجَشُّوُكُمْ عند التَّنَانِیر

اس میں بھی لا طعانَ ولا فُرسانَ منصوب ہیں۔

ہمزہ استفہام لَا کے عمل کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے: أَلا رجلَ عندك۔ اور یہ بھی جائز ہے أَلا رجلٌ ولا امرأۃٌ۔ جیسا کہ بغیر استفہام کے ایسا کہنا جائز ہے۔ پس تو اسے جان لے۔

باقی تمام نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ الراعی نے کہا ہے:

وما صَرَمْتُكِ حتى قُلْتِ مُعْلِنَۃً        لا ناقۃٌ لِیَ فی ھذا ولا جَمَلُ

اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ تو نے اعلان کرتے ہوئے کہا اس میں نہ میری کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے

اور یہ روایت بھی ہے: وما ھجرتكِ پس فتحہ نفی عام پر دلالت کرتا ہے جو اس صنف کی تمام وجوہ کو مستغرق ہے۔ گویا کہ یہ جواب ہے اس کا جس نے کہا: کیا اس میں بیع ہوگی؟ پس سائل نے عام سوال کیا، تو پھر جواب بھی نفی عام کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور لا اسم منفی کے ساتھ مل کر ایک اسم کے قائم مقام ہے جو مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور فِيْهِ خبر ہے۔ اور اگر چاہے تو اسے يَوْمٌ کی صفت بنا لے اور جنہوں نے رفع دیا ہے انہوں نے لا کو بمنزلہ لَيْسَ قرار دیا ہے اور جواب کو خبر عام بنایا ہے اور گویا یہ اس کا جواب ہے جس نے کہا: ''کیا اس میں بیع ہوگی''؟ یعنی کلام میں بیع سے پہلے مِنْ کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جواب ایسا لایا گیا جو رفع سے اسے تبدیل کرنے والا نہیں اور اسم مرفوع مبتدا ہے یا لَيْسَ کا اسم ہے اور فِيْهِ خبر ہے۔

مکی نے کہا ہے: بہتر اور عمدہ رفع ہے، کیونکہ اکثر قراء نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ دیگر کلام میں الا بیعَ فیہ ولا خلۃٌ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور سیبویہ نے بنی مذحج کے ایک آدمی کے لئے کہا ہے:

ھذا لعمرکُمُ الصغار بعینہ        لا أُمَّ لِی ان کان ذاك ولا أبُ

اس میں بھی لا أُمَّ لِی ولا أبٌ پڑھا گیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 340، دار الکتب العلمیہ

اور جائز ہے کہ پہلے کو مبنی (برفتحہ) پڑھا جائے اور دوسرے کو نصب اور تنوین دی جائے۔ پس تو کہہ سکتا ہے: لا رجلَ فیه ولا امرأۃً، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لا نسبَ الیوم ولا خلۃً اتسع الخرقُ علی الرَّاقِعِ

اور لا دونوں مقامات میں زائدہ ہے، پہلے کا عطف محل پر ہے اور دوسرے کا لفظ پر ہے۔ اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلے کو رفع دیا جائے گا اور دوسرے کو مبنی پڑھا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کا قول: لا رجلٌ فیها ولا امرأۃَ، جیسا کہ امیہ نے کہا ہے:

فلا لَغْوٌ ولا تَأْثِیمَ فیها وما فَاهُوا به أبَدًا مقیم

اعراب کی پانچوں وجہیں تیرے اس قول میں جائز ہیں: لا حول ولا قوۃ الا باللہ، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ وَالْكٰفِرُوْنَ یہ مبتدا ہے۔ هُمُ یہ مبتدائے ثانی ہے، الظّٰلِمُوْنَ یہ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور اگر تو چاہے تو هُمُ ضمیر کو زائدہ بنا لے بطور ضمیر فصل کے۔ اور الظّٰلِمُوْنَ خبر ہے الْكٰفِرُوْنَ کی۔ عطا بن دینار نے کہا ہے (1): سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے یہ کہا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور یہ نہیں کہا ہے وَالظَّالِمُوْنَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (یعنی یہ کہا ہے کہ کفار ظالم ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ظالم کافر ہیں۔)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

''اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے۔ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکاتی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔ یہ آیۃ الکرسی ہے، یہ قرآن کی آیات کی سردار ہے اور سب سے بڑی آیت ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوئی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت لکھوا دی۔

حضرت محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 526

طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اور ان کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے اور ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے مطلع کیا، تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے تفتیش کریں۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ ائمہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس کتاب اللہ میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' تو میں نے عرض کی: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو(1)۔'' حکیم ترمذی ابو عبداللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے۔ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے(2)''۔

ابو عبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اسے نازل فرمایا اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے۔ پس دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔ نوف البکالی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: آیت الکرسی تورات میں وَلِیَّۃ اللہ کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کو ملکوت السموات والارض میں عزیز پکارا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے (3)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا، تو جن نے آپ کو کہا: مجھ سے ذرا ہٹو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا، تو اس نے کہا: بلاشبہ تم ہم سے آیۃ الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اور حدیث میں ہے: جس نے ہر نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کی روح قبض کرنے کی ذمہ داری رب ذوالجلال لے لیتا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جنگ لڑی یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے کے مانع نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی آیۃ الکرسی، حدیث نمبر 1248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 337-338 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

اسے، اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کے پڑوسیوں کو اور اس کے اردگرد کے گھروں کو محفوظ فرما دیا (1)''۔

اور بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا۔ اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھا دے گا جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ (صحابہ کرام) خیر کی چیز لینے کے بہت زیادہ حریص تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابوہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تینوں راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟'' عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شیطان ہے (2)''۔

مسند داری ابومحمد میں ہے شعبی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی کا ایک جن سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ آپس میں کشتی کرنے لگے تو اس صحابی نے اسے پچھاڑ دیا۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ میں تجھے کمزور بلند غبار کی مانند دیکھ رہا ہوں گویا تیرے دونوں ہاتھ کتے کے ہاتھوں کی طرح ہیں، کیا تم اسی طرح ہوتے ہو۔ اے جنوں کے گروہ! یا تو انہیں میں سے اس طرح ہے؟ اس نے کہا: نہیں قسم بخدا! بلاشبہ میں ان میں سے مضبوط پسلیوں والا ہوں، البتہ تو دوبارہ میرے ساتھ کشتی کر، اگر تو نے مجھے پچھاڑ لیا تو میں تجھے ایسی شے سکھا دوں گا جو تیرے لئے نفع بخش ہوگی۔ صحابی نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اسے پچھاڑ دیا، تو اس نے کہا: کیا تم آیت الکرسی پڑھتے ہو: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو اس نے کہا کیونکہ تم جب بھی اسے اپنے گھر میں پڑھو گے تو شیطان گدھے کی مثل ہوا خارج کرتے ہوئے اس سے نکل جائے گا اور پھر صبح ہونے تک اس میں داخل نہ ہوگا۔ اسے ابونعیم نے ابو عاصم ثقفی سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غریب حدیث میں ذکر کیا ہے۔ ابومعاویہ نے اس کے بارے ہمیں ابو عاصم ثقفی سے، انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: امکان یہی ہے کہ وہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

ابومحمد دارمی نے کہا ہے۔ الضئیل کا معنی ہے: باریک (کمزور)، الشخیت کا معنی ہے: انتہائی لاغر کمزور، الضلیع کا معنی ہے: پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا۔ اور یہ لفظ حاء کے ساتھ الحبج بھی ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے حم - المؤمن - اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھیں تو شام ہونے تک وہ ان دونوں کے سبب محفوظ رہے گا اور

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الذکر بعد الصلوٰت، جلد 1، صفحہ 89 2۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم

جس نے ان دونوں کو شام کے وقت پڑھا تو وہ صبح ہونے تک ان کے سبب محفوظ رہے گا(1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

اور ابو عبداللہ الترمذی الحکیم نے کہا ہے: روایت کیا گیا ہے کہ مومنین کے لئے محافظت کی خاطر ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے پر دوام اختیار کیا میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر دوام اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔''

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! جس کسی نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو میں اسے انبیاء علیہم السلام (کے اعمال) کا ثواب عطا کروں گا۔ ابو عبداللہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے: میں اسے انبیاء علیہم السلام کے عمل کا ثواب عطا فرماؤں گا اور جہاں تک نبوت کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کے لئے نہیں ہے(2)۔

یہ آیت توحید اور اعلیٰ صفات کو متضمن ہے۔ اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں۔ اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح وارد ہے۔ ابن عطیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

اور لفظ اَللّٰهُ مبتدا ہے اور لَآ اِلٰهَ مبتدا ثانی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور وہ معبودٌ یا موجود ہے۔ اور اِلَّا هُوَ، لا اله کے محل سے بدل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا اور خبر ہے اور یہ مرفوع ہے اور اس معنی پر محمول ہے یعنی ما اله الا هو۔ (سوائے اس کے کوئی الٰہ نہیں ہے) اور غیر قرآن میں لا اله الا اياه پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور استثنا کی بناء پر ضمیر منصوب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں کہا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سے کون سی سب سے بڑی آیت آپ پر نازل فرمائی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کریم میں اشرف اور بلند رتبہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا تکرار مضمراً اور ظاہراً اٹھارہ بار کیا جاتا ہے۔ (اس لئے یہ دوسری آیات

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 111　2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271

سے بلند رتبہ اور اعلیٰ ہے۔)

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر چاہے تو اسے ھُوَ سے بدل بنالے اور اگر چاہے تو یہ خبر کے بعد خبر بھی ہوسکتی ہے اور اگر چاہے تو اس سے پہلے مبتدا مضمر بھی ہوسکتا ہے اور غیر قرآن میں اسے مدح کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور اَلْحَیُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ انہیں اسماء کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ یا حَیُّ یا قیوم۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول کے ساتھ دعا مانگی: یا حَیُّ یا قیوم۔ اور یہ قول بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں فرمایا: أیاھیا أیاھیا یعنی یا حیّ یا قیوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں)۔

علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ کہا جائے گا: حیّ قیوم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے اور پھر اس میں کوئی غور و فکر کیے بغیر اسے اس کے سپرد کردیا جائے گا۔

اور یہ قول بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حیّ رکھا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حیّ وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔

اور سدی نے کہا ہے: الحیّ سے مراد باقی رہنے والا ہے۔ لبید کا قول ہے:

فامّا تریننی الیوم اصبحتُ سالما　　فلستُ بأحیا من کلابٍ و جَعْفَرِ

پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صحیح سالم صبح کی ہے تو میں کلاب وجعفر میں سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔

اور کبھی کہا جاتا ہے: بلاشبہ یہی اسم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ **الْقَیُّوْمُ** یہ قَامَ سے ہے: یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے) امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لم تُخلَقِ السماءُ والنجوم　　والشمس معها قمر یقوم

آسمان اور ستارے، سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کیے گئے۔

قدّرہ مُھَیمن قَیُّومٌ　　والحشر والجنة والنعیم

جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے۔ اور حشر اور جنت اور تمام نعمتیں (نہیں پیدا کی گئیں)

اِلّا لأمر شانه عظیمْ

مگر ایسے امر کے لئے جس کی شان انتہائی عظیم ہے۔

علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے: میں نے اسماعیل الضریر کی ''عیون التفسیر'' میں اَلْقَیُّوْمُ کی تفسیر میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ وہ ہے جو سوتا نہیں ہے، گویا کہ انہوں نے یہ مفہوم آیۃ الکرسی میں اس کے بعد والے ارشاد گرامی سے لیا ہے: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

اور کلبی نے کہا ہے: اَلْقَیُّوْمُ وہ ہے جس کی ابتدا نہ ہو۔ اسے ابوالانباری نے بیان کیا ہے۔

قیوم کی اصل قَیْوُوم ہے، واؤ اور یاء ایک کلمے میں جمع ہیں ان میں سے پہلا حرف ساکن ہے پس واؤ کو یاء سے بدلنے کے بعد پہلی یا کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ قیوم فعول کے وزن پر نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ واؤ سے ہے تو یہ قوّوم ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علقمہ، حضرت اعمش اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے الحی القیام الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور اہل لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عربوں کے نزدیک القیوم زیادہ اعرف ہے اور بنا کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور علت کے اعتبار سے زیادہ ثابت ہے۔ اور القیام القوام سے القیام کی طرف منقول ہے۔ الفعال کو الفیعال کی طرف پھیرا گیا ہے، جیسا کہ الصواغ کو الصیاغ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اِن ذا العرش لَلذی یرزق النا س و حیٌ علیهم قیّوم

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حی و قیوم ہے۔

پھر رب العالمین نے اس کی نفی کی ہے کہ اسے اونگھ آئے یا نیند (یعنی نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

السِنَةُ کا معنی تمام کے قول کے مطابق اونگھ ہے اور اونگھ وہ ہوتی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے اور جب وہ دل میں ہو جائے تو پھر نوم (نیند) ہو جاتی ہے۔ عدی بن رقاع نے ایک عورت کا فتورِ نظر کے ساتھ وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وسْنَانُ اقصَدَه النُعاسُ فَرَنَّقتْ فی عینه سِنَةٌ و لیس بنائم

وسنان کا اونگھ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ پس اس کی آنکھوں میں اونگھ داخل ہو چکی ہے اور وہاں نیند نہیں ہے۔

اور مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِنة یہ سر کی جانب سے ہوتی ہے اور نعاس آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: وسنان وہ ہے جو نیند سے بیدار ہوتا ہے حالانکہ وہ عقل و سمجھ نہیں رکھتا یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنے گھر والوں پر تلوار ننگی کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو کچھ ابن زید نے کہا ہے یہ محل نظر ہے۔ کلام عرب سے اسے نہیں سمجھا جاسکتا (1)۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ

اور سدی نے کہا ہے: اَلسِّنَةُ سے مراد اس نیند کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی۔ اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔

سنة میں اصل وَسْنَةٌ ہے اس میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ یَسِنُ سے حذف کی گئی ہے اور النوم سے مراد وہ ثقل اور بوجھ ہے جس کے ساتھ انسان کے حق میں ذہن زائل ہو جاتا ہے (یعنی عقل کام نہیں کرتی) اس میں واؤ عطف کے لئے ہے اور لا تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں: لوگ اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطور حکایت موسیٰ علیہ السلام سے منبر پر بیان کرتے ہوئے سنا ہے ''کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کیا اللہ تعالیٰ جل ثناؤہ بھی سوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے آپ کو تین بار بیدار کیا پھر اس نے آپ کو دو بوتلیں دے دیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور آپ کو حکم دیا کہ ان دونوں کی حفاظت کریں۔ فرمایا: پھر آپ سونے لگے اور قریب تھا کہ آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں مل جاتے پھر آپ بیدار ہو جاتے اور آپ انہیں ایک دوسرے سے دور ہٹا لیتے بالآخر آپ گہری نیند سو گئے اور آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا...... اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر وہ سوتا رہتا تو پھر یہ آسمان اور زمین (اپنی اپنی جگہ) مضبوطی سے ٹھہرے نہ رہتے (1)۔'' یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے کئی ایک نے ضعیف کہا ہے اور ان میں سے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (یعنی زمین و آسمان کی ہر شے) اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ عبارت میں مَا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو عقل رکھتے ہیں تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مراد مجموعی طور پر موجود چیزیں ہیں۔ (چاہے وہ ذوی العقول یا غیر ذوی العقول ہوں) علامہ طبری نے کہا ہے: یہ آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: 3) (ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔)

قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اس میں مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِيْ، ذَا کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ذَا زائدہ ہو جیسا کہ مَا کے ساتھ زائد کیا گیا ہے کیونکہ مَا مبہم ہوتا ہے اور ذَا کی اس کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسے زائد کر دیا گیا ہے۔

اور اس آیت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کے بارے میں جسے چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء، مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین یہ اعزاز و اکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔

1۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 257، حدیث نمبر 273، دار الفکر

پھر وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر انہیں کے لئے جن کے لئے وہ راضی ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالحہ بھی ہوں گے۔

اور بخاری باب بقیۃ من ابواب الرؤیۃ میں ہے: بے شک مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! بلاشبہ ہمارے بھائی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور یہ شفاعت ان کے بارے میں ہے جن کا معاملہ بالکل قریب کا ہوتا ہے(1) جیسا کہ جنت کے دروازے کے ساتھ چمٹنے والا بچہ شفاعت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ان کے قرابتداروں اور ان کے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں ہے اور انبیاء علیہم السلام ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ان کے گنہگار امتی اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے بغیر کسی قرابت اور معرفت کے صرف نفس ایمان کے سبب (وہ شفاعت کریں گے)۔ پھر خطاؤں اور گناہوں میں مستغرق ان لوگوں کے بارے میں ارحم الراحمین کی شفاعت باقی رہ جائے گی جن کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت نے کوئی عمل نہ کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت حساب کی تعجیل کے بارے میں ہوگی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں شفاعت کی کیفیت بڑے شافی بیان کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ شاید آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں پڑھا کہ شفاعت کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے عذاب واجب جان لیا ہوگا۔ پس اس بنا پر یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ مومنین کے لئے دو شفاعتیں ہوں گی: ایک شفاعت ان کے بارے میں جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور دوسری شفاعت ان کے بارے میں جو اس تک پہنچ چکے ہوں گے اور اس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سو آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے: ''پھر جہنم پر ایک پل بچھایا جائے گا اور شفاعت کھل جائے گی اور وہ کہنے لگیں گے: اللّٰھم سلّم سلّم۔ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ پل کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پھسلن ہوگی (پاؤں قرار نہ پا سکیں گے) اس کے ساتھ لوہے کے ٹیڑھے کنڈے ہوں گے اور اس میں سخت جگہ پر ایسے خاردار پودے ہوں گے جن کو سعدان کہا جاتا ہے۔ پس مومنین اس سے آنکھ جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح اور بعض گھوڑوں اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی طرح گزر جائیں گے اور وہ نجات پا جائے گا جو سلامت رہا، جسے فقط خراشیں آئیں اور جسے آتش جہنم میں گرنے سے بچا لیا گیا، یہاں تک کہ جب مومنین آگ سے خلاصی پا جائیں گے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ان مومنین سے زیادہ طاقتور نہیں جو قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کا حق لینے کے لئے جو جہنم میں ہوں گے اللہ کی بارگاہ میں قسم کے ساتھ عرض کریں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ۔ بخاری شریف، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان کو کہا جائے گا: تم انہیں نکال لو جنہیں تم پہچانتے ہو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کردی جائیں گی اور وہ بہت زیادہ مخلوق کو نکال کر لے آئیں گے حالانکہ آگ نے نصف پنڈلی تک اور گھٹنوں تک انہیں پکڑا ہوا ہوگا۔ پھر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا، تو رب العالمین ارشاد فرمائے گا: تم واپس جاؤ اور جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ۔ پھر وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ اور پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پھر رب کریم فرمائے گا تم واپس لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم نصف دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکال کر لے آئیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا، پھر رب العالمین ارشاد فرمائے گا تم واپس چلے جاؤ اور جس کے دل میں تم رائی کے دانے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ چنانچہ وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی۔'' ...... حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اگر تم اس حدیث کے بارے میری تصدیق نہ کرو تو پھر چاہو تو یہ پڑھ لو: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی، (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم۔)

پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ملائکہ شفاعت کر چکے، انبیاء علیہم السلام شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور رب ارحم الراحمین کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک قبضہ (مشت) بھرے گا اور اس سے اس قوم کو نکال کر لے آئے گا جنہوں نے کبھی بھی خیر اور نیکی کا عمل نہیں کیا حالانکہ وہ کوئلہ بن چکے ہوں گے (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سو میں عرض کروں گا: اے میرے پروردگار! مجھے اس کے بارے اجازت عطا فرما جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ تو رب کریم فرمائے گا: وہ تیرے لئے نہیں ہے ...... یا فرمایا: وہ تیری طرف نہیں ہے۔ مجھے اپنی عزت، کبریائی اور عظمت و جلال کی قسم ہے میں ضرور بہ ضرور اسے نکالوں گا جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (2)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا گیا ہے: ''یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان قضا (فیصلہ فرمانے) سے فارغ ہوگا اور ارادہ فرمائے گا کہ وہ اہل جہنم میں سے جنہیں چاہے اپنی رحمت کے ساتھ نکال لے تو وہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمائے گا کہ وہ جہنم سے انہیں نکال لائیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے ان میں سے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمانے کا ارادہ کیا ہے اور وہ کہتے ہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پس وہ فرشتے انہیں جہنم

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 102، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 110، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پہچان لیں گے اور وہ انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے، آگ ابن آدم کو کھا جائے گی سوائے سجدوں کے اثر کے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر سجدوں کے اثر (نشان) کو کھانا حرام قرار دیا ہے (1)۔'' الحدیث بطولہ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین وغیرہم کی شفاعت بلاشبہ ان کے لئے ہے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے اور اس میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اور ابن عطیہ کا قول: ''ان میں سے جو نہیں پہنچے یا پہنچ چکے'' یہ احتمال رکھتا ہے کہ وہ دوسری احادیث سے لیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگوں کی کئی صفیں بنائی جائیں گی''...... اور ابن نمیر نے کہا ہے: اہل جنت کی ...... پس اہل نار میں سے ایک آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا تو وہ کہے گا: اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب تو نے پانی طلب کیا تو میں نے تجھے خوب جی بھر کر پانی پلایا تھا؟ فرمایا: تو وہ اس کی شفاعت کر دے گا اور ایک اور آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب میں نے تجھے طہور (جس سے پاکی حاصل کی جائے) دیا تھا؟ چنانچہ وہ اس کی شفاعت کر دے گا ...... ابن نمیر نے کہا ...... وہ کہے گا اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جس دن تو نے مجھے فلاں فلاں کام کے لئے بھیجا تھا اور میں تیرے لئے چلا گیا تھا؟ پس وہ اس کی شفاعت کرے گا (2)۔'' رہیں ہمارے نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں تو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

ایک قول ہے کہ وہ تین ہیں ایک قول ہے کہ وہ دو ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ اس کا بیان سبحان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہم نے ان پر کتاب ''التذکرہ'' میں بحث کی ہے۔ والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ** دونوں ضمیریں ہر اس ذی عقل کی طرف لوٹ رہی ہیں جنہیں یہ قول متضمن ہے: **لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ** اور مجاہد نے کہا ہے: **مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ** سے مراد دنیا اور **وَ مَا خَلْفَهُمْ** سے مراد آخرت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سب فی نفسہ صحیح ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ما بین الید سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کے سامنے ہے اور ما خلفہ سے مراد ہر وہ شے ہے جو اس کے بعد آئے گی۔ اور حضرت مجاہد کے قول کی طرح ہی سدی وغیرہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ** یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ اس کی معلومات میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا جب چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری، میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے کم نہیں ہے مگر اتنا ہی جتنی یہ چڑیا اس سمندر سے کم ہے۔ پس یہ اور جو اس کے مشابہ ہے وہ معلومات کی طرف راجع ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم تو وہ ہے جو اس کی ذاتی

1۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6885، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، جلد 1 صفحہ 270، وزارت تعلیم

صفت ہے وہ منقسم نہیں ہوتا۔ اور آیت کا معنی ہے: کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت اتنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

حماد بن سلمہ نے عاصم بن بہدلہ سے...... اور یہی عاصم بن ابی النجود ہیں...... اور انہوں نے زر بن حبیش کے واسطہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں اور جس پر تم ہو۔ کہا جاتا ہے: كُرْسِيّ اور كِرْسِيّ اور جمع الكراسيّ ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کرسیہ کا معنی علمه (1) (اس کا علم) ہے۔

اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے اور کہا ہے: اسی سے وہ کراسه (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور محفوظ رکھتی ہے) اور اسی وجہ سے علماء کو الکراسیّ کہا گیا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

يَحُفّ بهم بِيضُ الوُجوه و عُصْبَةٌ　كَرَاسِيّ بالأَحداث حين تَنُوبُ

اچھی شہرت رکھنے والے اور علماء کا گروہ انہیں ان امور کے ساتھ گھیر لیتا ہے (2) جب وہ پیش آتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: کرسیُّه سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: اجعل لهذا الحائط كرسيا، اس دیوار کی کرسی بنا دو یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے قریب ہے جو انہوں نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں کیا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ہم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔ اور اسرائیل نے سدی سے اور انہوں نے ابو مالک سے اس قول وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک وہ چٹان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے، اس پر چار فرشتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں: ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں حالانکہ وہ زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھے ہوئے ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 16

ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔

اور أسباط عن السدی عن ابی مالك اور عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن ناس من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں ارشاد باری تعالیٰ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت موجود ہے کہ آسمان وزمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ اور ملحدین اس کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش وکرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی کجاوے کے چرچرانے کی طرح چرچراہٹ ہے۔

علامہ بیہقی نے کہا: ہم نے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عرش سے (نیچے) رکھی ہوئی ہے (جیسے) تخت سے قدم رکھنے کی جگہ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کا اثبات نہیں ہے۔ اور حضرت ابن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تم نے کوئی انتہائی تعجب خیز شے دیکھی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے اس کے سر پر کھانے کا ایک ٹوکرا ہے۔ پس ایک شہسوار گزرا اور اس نے وہ ٹوکرا گرا دیا۔ پس وہ عورت بیٹھ گئی اور اپنا کھانا (طعام) جمع کرنے لگی۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے کہا: تیرے لئے اس دن ہلاکت اور بربادی ہو جس دن بادشاہ اپنی کرسی رکھے گا اور وہ مظلوم کے لئے ظالم کو پکڑے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: لاقُدِّسَتْ اُمَّة (امت پاک کردی گئی) یا فرمایا: کیف تقدس اُمة (امت کیسے پاکی بیان کرتی ہے) ...... اس کا کمزور اس کے طاقتور سے اپنا حق نہیں لے سکے گا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے۔ ''کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے'' وہ مراد یہ لیتے ہیں (کہ کرسی) عرش رحمن سے اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے تختوں سے قدم رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ عرش کے سامنے بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی نسبت عرش کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کرسی کی نسبت بادشاہ کے تخت کی طرف ہے۔

اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد نفس عرش ہے۔ اور یہ قول پسندیدہ نہیں ہے اور جس کا تقاضا احادیث کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ کرسی عرش کے سامنے پیدا کی گئی ہے اور عرش اس سے بڑا ہے (2)۔

اور ابو ادریس خولانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیۃ الکرسی ...... (3) پھر فرمایا:

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الخلافۃ، صفحہ 375، حدیث نمبر 9054

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ

3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 457

... اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) سات آسمانوں کو کرسی کے ساتھ ایسی ہی نسبت ہے جیسے وسیع زمین پر پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور عرش کو کرسی پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی وسیع زمین کو انگوٹھی کے حلقہ پر ہوتی ہے۔'' اسے آجری، ابوحاتم بستی نے اپنی صحیح مسند میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں وسیع زمین میں پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کی طرح ہیں۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے عظیم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس امر عظیم کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی۔

اور یَئُوْدُہٗ کا معنی ہے وہ اسے بھاری اور بوجھل بنا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے: آدنی الشیٔ بمعنی أثقلنی۔ اس نے مجھے تھکا دیا اور میں نے اس سے مشقت برداشت کی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما وغیرہم نے اس لفظ کی تفسیر بیان کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ اس میں ہا ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کرسی کے لئے ہو۔ اور جب کرسی کے لئے ہوگی تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے ہے (یعنی کرسی) ...... اور الْعَلِیُّ اس سے مراد قدر و منزلت کی بلندی ہے نہ کہ مکان کی بلندی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے منزہ اور پاک ہے۔

اور علامہ طبری نے ایک قوم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی مخلوق سے بلند ہے کیونکہ اس کا مکان اپنی مخلوق کی جگہوں سے بلند ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جسم ماننے والے جہلاء کا قول ہے اور اصل یہی ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے (1)۔

اور عبدالرحمن بن قرط سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج آسمانوں کی بلندیوں میں تسبیح سنی: سبحان اللہ العلیّ الأعلی سبحانہ و تعالیٰ اور العلی و العالی ان کا معنی ہے اشیاء پر بہت سخت غلبہ رکھنے والا۔ عرب کہتے ہیں: علا فلان فلانا۔ یعنی فلاں فلاں پر غالب آگیا۔ شاعر نے کہا ہے:

فلما عَلَونا و استَوَینا علیھم ترکنا ھم صَرْعیٰ لِنَسْرٍ و کاسِرٍ

پس جب ہم غالب آئے اور ہم نے انہیں خوب ہلاک کیا تو ہم نے ان کے مردوں کو گدھوں اور عقابوں کے لئے چھوڑ دیا

اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ۔

الْعَظِیْمُ۔ یہ صفت ہے۔ اس کا معنی ہے قدر و منزلت اور شرف کے اعتبار سے عظیم۔ یہ اجسام کی عظمت کے معنی میں نہیں ہے۔ علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ العظیم بمعنی المعظم ہے (جس کو عظمت دی جائے) جیسے کہا جاتا ہے: عتیق بمعنی معتق ہے اور اعشیٰ کا شعر ہے:

فکأن الخمر العَتِیقَ من الاِس فِنط ممزوجۃً بماءٍ زُلالِ (2)

گویا کہ وہ شراب جو اسفنط (شراب کی ایک قسم) سے آزاد ہے درآنحالیکہ وہ میٹھے پانی سے ملی ہوئی ہو۔

اور ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اگر یہ بمعنی معظم ہو تو پھر لازم آتا ہے کہ وہ مخلوق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19-18، دار احیاء التراث العربیۃ

کو پیدا کرنے سے پہلے اور اسے فنا کرنے کے بعد عظیم نہ ہو کیونکہ اس وقت اسے عظیم بنانے والی کوئی شے نہیں (1)۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں۔ بے شک خوب واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے۔ تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ اس آیت میں دین سے مراد وہ ہے جس کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور وہ ملت ہے اور اس پر قرینہ یہ ارشاد ہے: قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ اور اکراہ وہ جو ایمان، بیوع، ہبات وغیرہ احکام میں سے ہے یہ اس کا محل نہیں ہے، اس کی بحث اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو عبدالرحمن نے قَدْ تَبَيَّنَ الرَّشَدُ مِنَ الْغَيِّ پڑھا ہے اور اسی طرح حسن اور شعبی سے بھی روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: رَشَدَ يَرْشُدُ رُشْدًا، اور رَشِدَ يَرْشَدُ رَشَدًا جب آدمی اس شے تک پہنچ جائے جسے وہ پسند کرتا ہے اور غوی اس کی ضد ہے۔ نحاس سے یہی منقول ہے۔ ابن عطیہ نے ابو عبدالرحمن السلمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے الرشاد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن سے اَلرُّشُدُ اور شین کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے (2)۔

اَلْغَيُّ یہ مصدر ہے غَوٰى يَغْوِىْ سے۔ جب کوئی آدمی اعتقاد یا رائے میں گمراہ ہو جائے اور یہ مطلقاً نہیں کہا جا سکتا اَلْغَيُّ فِي الضلال۔ (غی گمراہی میں ہے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں چھ اقوال ہیں:

(۱) کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے عربوں کو دین اسلام پر مجبور کیا اور ان سے لڑائیاں کیں اور آپ ان سے اسلام کے بغیر کسی پر راضی نہ ہوئے۔ سلیمان بن موسیٰ نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے اس ارشاد سے منسوخ کر دیا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (التوبہ: 73) (اے نبی مکرم ﷺ! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے۔

(۲) یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صرف اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب وہ جزیہ ادا کریں اور وہ لوگ جن پر زبردستی کی جائے گی وہ بت پرست ہیں۔ سو ان سے اسلام کے سوا کوئی شے قبول نہیں کی جائے گی اور انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ۔ یہ حضرات شعبی، قتادہ، حسن اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19، دار احیاء التراث العربیۃ　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ

سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ بوڑھی نصرانی عورت کو کہہ رہے تھے: اے بڑھیا! تو اسلام قبول کر لے تو محفوظ ہو جائے گی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس نے جواب دیا: میں انتہائی بوڑھی عورت ہوں اور موت میرے بہت قریب ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا اور پھر یہ آیت تلاوت کی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الآية۔

(۳) وہ قول ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک عورت مقلات (وہ عورت جس کا بچہ زندہ نہ رہے) ہوتی تھی، پس وہ اپنے اوپر یہ لازم کر لیتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی۔ پس جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان سے انصار کے بہت سے بچے تھے۔ تو انہوں نے کہا: ہم اپنے بچے نہیں چھوڑیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ ابوداؤد نے کہا ہے: مقلات وہ عورت ہوتی ہے جس کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو (1)۔

ایک روایت میں ہے: بلاشبہ ہم نے کیا جو ہم نے کیا اور ہم گمان کرنے لگے کہ ان کا دین اس سے افضل ہے جس پر ہم ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام عطا فرمایا تو ہم انہیں اس پر مجبور کرنے لگے تب لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل ہوئی (یعنی) جو چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے اور جو چاہے وہ دین اسلام میں داخل ہو جائے۔ یہ قول حضرت سعید بن جبیر، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، مگر آپ نے یہ بھی کہا ہے: انصار کے بچوں کا بنی نضیر میں ہونے کا سبب رضاعت تھا (یعنی دودھ پلانے کے لئے بچے ان کے پاس چھوڑے گئے تھے۔)

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحت اسناد کی وجہ سے تمام اقوال سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ کہ اس کی مثل قول فقط رائے سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) سدی نے کہا ہے: یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اسے ابوحصین کہا جاتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شام سے کچھ تاجر زیتون کا تیل لے کر مدینہ طیبہ آئے اور جب انہوں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو حصین کے دونوں بیٹے ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان دونوں کو نصرانیت کی دعوت دی، سو وہ دونوں عیسائی ہو گئے اور ان کے ساتھ شام چلے گئے تو ان کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ان کے معاملے کی شکایت لے کر حاضر ہوا اور اس نے یہ خواہش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی ایسا آدمی بھیج دیں جو انہیں واپس لوٹا لائے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور اس وقت تک اہل کتاب کے ساتھ لڑنے کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو دور کر دیا ہے وہ دونوں کفر کرنے والوں میں اول ہیں۔'' پس ابوحصین کے دل میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں (کچھ ملال سا) پیدا ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تلاش میں کوئی آدمی نہ بھیجا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ الآيہ (النساء: 65) پھر اللہ تعالیٰ نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کو منسوخ کر دیا اور اہل

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 9

کتاب کے ساتھ لڑائی کرنے کے بارے سورۂ برأت میں حکم ارشاد فرمایا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے سبب نزول کے بارے میں صحیح حضرت زبیر کا اپنے پڑوسی انصاری (1) کے ساتھ پانی والا واقعہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو تلوار کے خوف سے اسلام لائے تم اسے مُجْبَرًا اور مُكْرَهًا نہ کہو۔ یہی ان میں پانچواں قول ہے۔

(۶) اور چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب وہ اہل کتاب میں سے ہوں کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے جب وہ بڑے ہوں اور اگر وہ مجوسی ہوں چھوٹے ہوں یا بڑے یا بت پرست ہوں تو بلاشبہ انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جس نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے وہ ان سے ان کے بت پرست ہونے کے ساتھ کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا اور ان کی عورتوں سے وطی نہیں کی جا سکتی اور وہ مردار کھانے اور دیگر نجاستوں کے بارے اعتقاد رکھتے ہیں۔ مالک ان کے لئے انہیں نجس سمجھے گا اور ملک کے اعتبار سے ان سے نفع اٹھانا اس پر متعذر ہو جائے گا۔ نتیجۃً اس کے لئے زبردستی کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے اور رہے اشہب تو انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے دین پر ہوں گے جس نے انہیں قیدی بنایا ہے۔ پس جب وہ انکار کریں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے اور چھوٹوں کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہیں دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی باطل دین کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔

پس تمام کی تمام انواع کفر جب جزیہ دینے لگیں تو ہم انہیں اسلام پر مجبور نہ کریں گے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی، قریشی ہوں یا کوئی اور...... اس کا بیان آگے آئے گا۔ علماء نے جزیہ کے بارے میں جو کہا ہے اور جس سے جزیہ قبول کیا جائے گا اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ۔ شرط کی وجہ سے فعل کو جزم دی گئی ہے۔ الطاغوت مؤنث ہے طَغَی یطغَی سے۔ اور علامہ طبری نے یطغو بیان کیا ہے۔ جب کوئی حد سے اس پر زیادتی کرتے ہوئے تجاوز کر جائے (2) اور اس کا وزن فعلوت ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مفرد مذکر اسم ہے گویا کہ یہ اسم جنس ہے اور قلیل وکثیر کے لئے واقع ہوتا ہے اور ابو علی کا مذہب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا رَهَبُوت اور جَبَرُوت۔ اور اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جا سکتی ہے اور اس کے لام کلمے کو عین کلمے کی جگہ اور اس کے عین کو لام کی جگہ بدل دیا گیا ہے جیسا کہ جبذ اور جذب میں ہے۔ پھر واؤ کو متحرک ہونے اور اس کے ماقبل کے متحرک ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا ہے اور طاغوت کہا گیا ہے۔ اس قول کو نحاس نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 343، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، بہاب سکر الانہار، حدیث نمبر 2187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 25، دار احیاء التراث العربیۃ

اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے: طاغوت کی اصل لغت میں الطُغیان سے ماخوذ ہے اور یہ بغیر اشتقاق کے اپنا معنی ادا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: لآل یہ اللؤلؤ سے ہے۔

اور مبرد نے کہا ہے: یہ جمع ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے (1)۔

جوہری نے کہا ہے: الطاغوت سے مراد کاہن، شیطان اور ہر وہ ہے جو گمراہی میں سردار ہو اور کبھی یہ واحد ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا (النساء: 60) ((اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔) اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ (البقرہ: 257) (ان کے ساتھی شیطان ہیں۔) اور اس کی جمع طواغیت آتی ہے اور وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یہ معطوف ہے۔ اور فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى یہ جواب شرط ہے اور اَلوُثْقٰی کی جمع الوُثَق ہے جیسا کہ اَلفُضْلٰی کی جمع اَلفُضَل ہے۔ اور الوُثْقٰی، فُعْلٰی کے وزن پر الوثاقۃ سے ہے اور یہ آیت تشبیہ ہے اور مشبہ بہ کے بارے میں مفسرین کی عبارت مختلف ہے۔

پس حضرت مجاہد نے کہا ہے: العروۃ سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا: اسلام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور یہ سب عبارات ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ پھر فرمایا: لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (2) حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو تبدیل کر لیں یعنی ان سے ایمان کا نام زائل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کافر ہو جائیں۔

اور الانفصام کا معنی ایسا ٹوٹنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی نہ ہو۔ اور القصم کا معنی، ایسا توڑنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی بھی ہو۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوتی (3)''۔ یعنی پیشانی پسینہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔

جوہری نے کہا: فصم الشیٔ اس نے اسے توڑ دیا اسے جدا کیے بغیر۔ آپ کہتے ہیں: فصمتہ فانفصم میں نے اسے توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا انْفِصَامَ لَهَا اور اس کی مثل توڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ذوالرمہ نے ہرن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہ اسے چاندی کے بازوبند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے:

كأنه دُمْلُجٌ مِن فضة نَبَهٌ فی ملعب من جواری الحیّ مفصوم

بے شک اس نے اسے مفصوم قرار دیا ہے اس کے مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے سبب جب وہ سوتا ہے۔ اور مقصوم قاف کے ساتھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ دو حصوں میں بٹ جانا ہوتا ہے۔ اور افصم المطر کا معنی ہے بارش تھم گئی۔ اور افصمت عنه الحمّی (اس سے بخار اتر گیا) اور جب کفر شیطان کے ساتھ ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا زبان اقرار کرتی ہے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی، حدیث نمبر 2، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دل اعتقاد رکھتا ہے تو نطق کے سبب صفات میں سے سَمِیْعٌ اور اعتقاد کی وجہ سے صفات میں سے عَلِیْمٌ ذکر کی گئی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۠ ﴿۲۵۷﴾

''اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں، نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اَلْوَلِیُّ فعیل کے وزن پر بمعنی فاعل ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: الولی الناصر ینصر عبادہ المؤمنین۔ یعنی الولی کا معنی مددگار ہے وہ اپنے مومن بندوں کی مدد فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ تعالیٰ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔) اور مزید فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ (محمد) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کفار کا کوئی مددگار نہیں۔)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الظلمات سے مراد گمراہی اور نور سے مراد ہدایت ہے اور اسی معنی کو ضحاک اور ربیع نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت مجاہد اور عبدۃ بن ابی لبابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا۔ پس یہی انہیں نور سے اندھیروں کی جانب نکالنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا یہ اعتقاد رکھنے والے نے نور معتقد میں محفوظ رکھ دیا اور اس سے اندھیروں کی جانب نکل گیا۔ آیت کا لفظ اس تخصیص سے مستغنی ہے، بلکہ یہ تو ہر کفر کرنے والی جماعت میں مترتب ہوتا ہے جس کے بعض افراد ایمان لے آئے ہوں جیسا کہ عرب (1)، اس لئے کہ ان میں سے جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ اس کا مددگار رہے اور اس نے اسے کفر کی تاریکی سے نور ایمان کی طرف نکال دیا اور جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داعی مرسل کی تشریف آوری کے بعد کفر کیا تو اس کا شیطان اسے گمراہ کرنے والا ہے، گویا کہ اس نے اسے ایمان سے نکال دیا، جبکہ وہ اس کے لئے تیار اور اس میں داخل ہونے کے اہل تھا اور اس نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے جہنم میں داخل ہونے کا حکم لگا دیا، ایمان سے پھیرتے ہوئے۔ اس سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کرتا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور حسن نے اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّوَاغِيْتُ پڑھا ہے، مراد شیاطین ہیں۔ واللہ اعلم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

''کیا نہیں دیکھا آپ نے (اے حبیب!) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ یہ الف توقیفی ہے اور کلام میں تعجب کا معنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تعجب میں ڈال دیا اور فراء نے کہا ہے: اَلَمْ تَرَ بمعنی ھل رأیت ہے یعنی کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا اور کیا آپ نے اسے دیکھا جو بستی کے پاس سے گزرا اور وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن سام بن نوح اپنے زمانے کا بادشاہ اور آگ اور مچھر والا تھا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ربیع، حضرت سدی، حضرت ابن اسحاق اور حضرت زید بن اسلم وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے(1) اور اسے ہلاک کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر مچھروں کا ایک باب کھول دیا۔ پس انہوں نے سورج کو ڈھانپ لیا اور اس کے لشکر کو کھانے لگے اور انہوں نے سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہ چھوڑا اور ان میں سے ایک اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور اسے کھا ڈالا یہاں تک کہ وہ چوہیا کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد اس کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے معزز وہ تھا جو اس کے دماغ پر بھاری ہتھوڑے کے ساتھ مارتا تھا۔ پس چالیس دن تک وہ اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا رہا۔

ابن جریج نے کہا ہے: زمین میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول مردود ہے۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: وہ پہلا حکمران ہے جس نے جبر واستبداد اور رعونت و سرکشی اختیار کی اور وہی بابل میں صاحب الصرح (محل کا مالک) تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ پوری دنیا کا حکمران تھا اور یہ دو کافر بادشاہوں میں سے ایک ہے اور دوسرا بخت نصر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا وہ نمروذ بن فالخ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام تھا۔ اس تمام کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

اور سہیلی نے بیان کیا ہے کہ وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح تھا اور وہ سواد عراق کا بادشاہ تھا اور اسے اس ضحاک نے حکمران بنایا تھا جو ازدھاق سے معروف تھا اور اس کا نام بیوراسب بن اندراست تھا اور وہ تمام سلطنتوں کا بادشاہ تھا اور یہ وہی ہے جسے افریدون بن اثفیان نے قتل کیا تھا اور اس بارے میں حبیب کہتا ہے:

وَ كأنه الضحاك من فتكاته في العالمين وأَنْتَ أَفْرِيدُونُ

ضحاک سرکش اور جابر حکمران تھا اور اس کی حکومت ہزار برس تک رہی جس بارے میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے سولی دی اور پہلا حکمران ہے جس نے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور نمروذ کا صلبی بیٹا تھا اس کا نام ''کوش'' تھا یا اس نام کی طرح کا کوئی نام تھا اور اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نمروذ الاصغر تھا اور نمروذ الاصغر ایک سال تک حاکم رہا۔ اور نمروذ الاکبر کی حکومت چار سو برس تک رہی جیسا کہ اس کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔

اس جھگڑے کے قصص میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے میلے کی طرف نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو (ٹوٹ کر) گر جاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اس رب کی عبادت کرتا ہوں جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: بے شک نمروذ طعام (اناج) ذخیرہ کر لیتا تھا اور جب انہیں طعام کی حاجت ہوتی تھی تو وہ اس سے اسے خریدتے تھے اور جب وہ اس کے پاس آتے تھے تو اسے سجدہ کرتے تھے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو آپ نے اسے سجدہ نہ کیا تو اس نے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو مجھے سجدہ نہیں کرتا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمروذ نے آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہ نمروذ بیٹھ گیا اور لوگوں کو اہل و عیال کے لئے طعام لے جانے کا حکم دینے لگا۔ پس جب بھی کوئی قوم آتی یہ ان سے پوچھتا: تمہارا رب اور تمہارا الٰہ کون ہے؟ تو وہ کہتے: تو ہے، تو یہ کہتا: تم انہیں طعام دے دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو طعام مہیا کرنے کے لئے اس کے پاس آئے تو اس نے آپ سے کہا: تمہارا رب اور تمہارا معبود کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ جب نمروذ نے یہ سنا تو اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کے معاملہ کے ساتھ اس کا معارضہ کیا تو وہ کفر اختیار کرنے والا متحیر ہو گیا اور اس نے کہہ دیا: تم اسے اناج نہ دو۔ تو حضرت ابراہیم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

علیہ السلام بغیر کسی شے کے واپس اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں آپ ریت کے ٹیلے کے پاس سے گزرے جو آٹے کی مثل تھا۔ تو آپ نے اپنے دل میں کہا: اگر میں اس سے اپنا بورا بھر لوں تو جب میں اسے لے کر گھر داخل ہوں گا تو بچے خوش ہو جائیں گے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ پس آپ وہ لے گئے، جب آپ اپنے گھر پہنچے تو بچے خوش ہو گئے اور وہ دونوں بوروں کے اوپر کھیلنے لگے اور آپ تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے کہا: اگر میں آپ کے لئے کھانا تیار کر دوں جب آپ بیدار ہوں گے تو آپ اسے موجود پائیں گے (اور تناول فرمالیں گے۔) چنانچہ اس نے ایک بورا کھولا تو انہوں نے اسے اس سے بھی اچھا پایا جتنا سفید آٹا ہوتا ہے اور پھر اس کی روٹیاں پکا دیں اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ وہی آٹا ہے جو آپ لائے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسانی پیدا فرما دی ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابو صالح سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام طعام لانے کے لئے چلے اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے، تو آپ سرخ موٹی ریت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے بورے بھر لیے اور پھر اپنے گھر والوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ سرخ گندم ہے۔ پس انہوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم ہی پایا اور جب اس میں سے کچھ کاشت کی تو جڑ سے شاخ کے سرے تک سٹہ نکلا جو دانوں سے بھرا ہوا تھا (2)۔

اور ربیع وغیرہ نے ان قصص میں کہا ہے کہ نمروذ نے جب کہا میں جلاتا بھی ہوں اور مارتا بھی ہوں تو اس نے دو آدمیوں کو حاضر کیا، ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا: تحقیق میں نے اسے زندہ کر دیا اور اسے مار دیا۔ اور جب آپ نے اس پر سورج کا معاملہ لوٹایا تو وہ مبہوت اور متحیر ہو گیا (3)۔ اور الخبر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میں سورج کو مغرب سے طلوع کروں گا تا کہ وہ جان لے کہ میں اس پر قادر ہوں (4)۔ پھر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے حکم دیا تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا اور اسی طرح جابر حکمرانوں کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے اور دلیل لانے سے عاجز ہو جائیں تو وہ سزا دینے میں لگ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات عطا فرمائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور سدی نے کہا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے نکلے تو انہوں نے آپ کو بادشاہ کے پاس پیش کر دیا ...... اور اس سے پہلے آپ کو اس پر پیش نہیں کیا گیا تھا...... اور اس نے آپ سے گفتگو کی۔ اور آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمروذ نے کہا: میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، میں چار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 330، حدیث نمبر 31819، الزمان للثقافۃ والعلوم مدینہ منورہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346

4۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آدمیوں کو پکڑوں گا اور انہیں ایک کمرے میں بند کردوں گا اور وہ کوئی شے کھا پی نہیں سکیں گے یہاں تک کہ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو جائیں گے تو میں انہیں نکال دوں گا اور دو کو کھانا وغیرہ کھلاؤں گا۔ پس وہ دونوں زندہ رہیں گے اور دو کو چھوڑ دوں گا اور وہ مر جائیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور معارضہ سورج کا معاملہ پیش کر دیا (کہ اگر وہ طاقت رکھتا ہے تو وہ سورج کو مغرب سے طلوع کرے) تو وہ متحیر و مبہوت ہو گیا۔

علمائے اصول نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب کریم کا وصف بیان کیا ایسی شے کے ساتھ جو اس کی صفت ہے یعنی احیاء (جلانا) اور اماتۃ (مارنا) لیکن یہ ایسا امر ہے جس کے لئے حقیقت اور مجاز دونوں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت کا قصد کیا (1) اور نمروذ نے مجاز کی پناہ لی اور اپنی قوم پر جھوٹا امر پیش کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم نے اسے بطور قیاس جدلی کے تسلیم کر لیا اور آپ اس کے ساتھ مثال سے منتقل ہو گئے اور اس کے سامنے ایک ایسا امر رکھ دیا جس میں مجاز نہیں ہے۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ یعنی اس کی دلیل اور حجت حکم سے کٹ گئی، ختم ہو گئی اور اس نے لئے یہ کہنا ممکن نہ رہا کہ میں سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہوں کیونکہ صاحب عقل و فہم اس کی تکذیب کر دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کافر کو بادشاہ (مَلِك) کا نام دینا جائز ہے جب اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے بادشاہی، عزت اور بلندی عطا کر دے اور یہ مناظرہ، مجادلہ اور حجت قائم کرنے کے اثبات پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس پر کثیر دلائل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرہ) (آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو)

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ یعنی تمہارے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا اور بتوں کی عبادت کے بارے میں آپ کی جانب سے ان کا رد بھی بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ الانبیاء وغیرہ میں ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے: قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ (ہود) (وہ (برافروختہ ہو کر) بولے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مجادلہ ہے اس کا کئی آیات میں ذکر ہے۔ پس یہ سب کی سب اللہ کی جانب سے دین کے بارے میں سوال و جواب اور مجادلہ کی تعلیم ہے، کیونکہ حق اور باطل کے درمیان فرق ظاہر ہی نہیں ہوتا مگر تبھی جب حق کی دلیل ظاہر اور غالب ہو اور باطل کی دلیل فاسد ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے مجادلہ کیا اور حجت قائم کرنے کے بعد ان سے مباہلہ کیا، جیسا کہ اس کا بیان '' آل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346، دار الکتب العلمیہ

عمران'' میں آئے گا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں مکالمہ ہوا اور آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ ان پر غالب آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سقیفہ کے دن جھگڑتے رہے، ایک دوسرے کو دور ہٹاتے رہے، تقریر کرتے رہے اور باہم مناظرہ کرتے رہے یہاں تک کہ حق اس کے بارے میں ظاہر ہو گیا جو اس کے اہل تھا اور انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینے کے بعد مرتدین کے بارے میں مناظرہ کیا، علاوہ ازیں کثیر ایسے واقعات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ میں اس پر دلیل ہے کہ علم کے ساتھ حجت پیش کرنا، احتجاج کرنا مباح ہے اور غور و فکر کرنے والوں کے درمیان شائع ہے۔

مزنی صاحب شافعی نے کہا ہے: مناظرہ کے حقوق میں سے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا جائے اور اس سے جو شے واضح ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

اور بعض نے کہا ہے: مناظرہ صحیح نہیں ہوتا اور مناظرہ کرنے والوں کے درمیان حق ظاہر اور واضح ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین، عقل، فہم اور انصاف میں ایک دوسرے کے قریب ہوں یا ایک ہی مرتبہ میں مساوی اور برابر ہوں، مگر اس میں ریاکاری اور باہمی عداوت، مخالفت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

قراءات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اَلَمْ تَرْ را کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے متحرک پڑھا ہے اور یا جزم کے لئے حذف کر دی گئی ہے۔ اور اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ محل نصب میں ہے یعنی لِأن آتاہ الله، یا مِنْ اجلِ اَنْ آتاہ الله۔ اور جمہور قراء نے اَنَ اُحْیٖ یعنی وصل کلام میں اَنَا سے نون کے بعد الف کو گرا کر پڑھا ہے اور نافع اور ابن ابی اویس نے اسے ثابت رکھا ہے، جب بھی پورے قرآن میں ہمزہ اس کے ساتھ ملا ہے سوائے اس قول کے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ کیونکہ وہ اسے اس جگہ میں اس کی قلت کے سبب تمام قراء کی طرح گرا دیتے ہیں، کیونکہ یہ قرآن کریم میں صرف تین مقامات پر واقع ہوا ہے اور یہ اپنے قلیل ہونے کی وجہ سے اس کے قائم مقام ہے جس کے بعد ہمزہ نہ ہو لہٰذا الف کو وصل کلام میں بھی حذف کر دیا گیا۔

علمائے نحو نے کہا ہے: متکلم کی ضمیر اسم ہے اس میں ہمزہ اور نون ہے، اور جب تو کہے: أَنَا یا أَنَه تو الف اور ہاء وقف میں حرکت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور جب کلمہ کسی شے سے متصل ہو تو وہ دونوں ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ شے جس کے ساتھ کلمہ متصل ہوتا ہے وہ قائم مقام الف کے ہوتا ہے۔ پس یہ نہیں کہا جائے گا: أنا فعلت الف کے اثبات کے ساتھ مگر شعر میں یہ شاذ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أنا سیف العشیرۃ فاعرفونی حُمَیدا قد تَذَرَّیْتُ السَّناما

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر کہ نافع نے الف کو ثابت رکھا ہے اور پڑھا ہے ''أَنَا أُحْیِی وَ أُمِیْتُ'' اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک الف زائدہ ہے اور ان کے نزدیک اسم مضمر ہمزہ اور نون ہیں اور الف کو تقویت کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وقف کے لئے زائد کیا گیا ہے تاکہ نون کی حرکت ظاہر ہو۔ اور کوفیوں کے نزدیک أنا مکمل طور پر اسم ہے۔ پس نافع نے ان کے قول کے مطابق اصل کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے اور

جنہوں نے الف کو حذف کیا ہے تو انہوں نے تخفیف کے لئے اسے حذف کیا ہے کیونکہ فتحہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: اور رہا ان کا قول أنا تو یہ اسم کنایہ ہے اور یہ اکیلا متکلم کے لئے ہے اور یہ مبنی بر فتحہ ہے تاکہ اس کے اور أنْ حرف ناصب کے درمیان فرق ہو سکے اور آخر میں الف حالت وقف میں حرکت کے بیان کے لئے ہے اور اگر درمیان کلام میں ہو تو یہ گر جاتا ہے سوائے لغت رویہ کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

أنا سیف العشیرۃ فاعرفونی　　حُمیدا قد تَذَرَّیْتُ السناما

اور بَهُتَ الرجل و بَهِت و بُهِتَ کا معنی ہے جب آدمی کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے اور وہ متحیر ہو کر خاموش ہو جائے۔ یہ نحاس وغیرہ سے منقول ہے۔

اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور انہوں نے بعض عربوں سے اس معنی میں بَهَتَ یعنی با اور ہا کے فتحہ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے (1)۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابوحیوہ نے فَبَهُتَ الَّذِیْ کَفَرَ یعنی با کے فتحہ اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بُهِتَ میں ایک لغت ہے۔ فرمایا: اور ابن السمیقع نے فَبَهَتَ باء اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ اس معنی پر پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے متحیر کر دیا جس نے کفر کیا۔ پس الذی محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ بَهَتَ فتحہ کے ساتھ بَهُتَ میں ہی ایک لغت ہو۔

فرمایا: ابوالحسن اخفش نے فَبَهِتَ کی قراءت بیان کی ہے جیسا کہ غَرِقَ اور دَهِشَ۔

مزید کہا: اکثر نے ہا میں ضمہ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے اس کی قراءت کی تاویل کی ہے جنہوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ بمعنی سَبَّ (گالی گلوچ دینا) اور قذف (تہمت لگانا) ہے۔ اور بلاشبہ نمرود وہی ہے جس نے اس وقت گالیاں دیں جب اس کے دلائل ختم ہو گئے اور اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہا (2)۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

"یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر درآنحالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد۔ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے عرض کی: میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان)

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 32، دار احیاء التراث العربیۃ　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

کی طرف۔ یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت، پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا۔ اَوْ معنی پر محمول کرتے ہوئے عطف کے لئے ہے اور امام کسائی اور فراء کے نزدیک تقدیر کلام یہ ہے: ھل رأیت کالذی حاج ابراھیم فی ربہ او کالذی مرّعلی قریۃ۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الم ترالی الّذی حاج ابراھیم فی ربہ، الم ترمن ھو! کالذی مرّعلی قریۃ۔ پس کلام میں مَنْ ھو کے الفاظ مضمر ہیں۔

ابوسفیان بن حسین نے اَوَ كَالَّذِیْ مَرَّ واوَ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ واوَ عاطفہ ہے اور اس پر الف استفہام داخل ہے جس کا معنی تقریر (1) (پختہ کرنا) ہے۔ اور القریۃ (یعنی خاص بستی) کو قریۃً (کوئی بستی) کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں کا اجتماع تھا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: قَرَیتُ الماء یعنی میں نے پانی جمع کیا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

سلیمان بن بریدہ، ناجیہ بن کعب، قتادہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع، عکرمہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے جو اس بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

حضرات وہب بن منبہ، عبداللہ بن عبید بن عمیر، عبداللہ بن بکر بن مضر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ ارمیاہ تھے اور وہ نبی تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: ارمیاء ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ نقاش نے وہب بن منبہ سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے مگر یہ کہ وہ ایک نام ہو جو اس نام کے موافق ہو کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمعصر تھے اور یہ جو اس بستی کے پاس سے گزرے وہ ان کے بعد کے زمانہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے جیسا کہ اسے حضرت وہب بن منبہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر خضر علیہ السلام ہی ارمیاء ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہی ہوں کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے اب تک مسلسل موجود ہیں۔ اس بارے میں صحیح روایت اسی طرح ہے۔ اس کا بیان سورۃ الکہف میں آئے گا اور اگر وہ اس واقعہ سے پہلے وصال فرما چکے ہیں تو پھر ابن عطیہ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نحاس اور مکی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام معلوم نہیں۔ نقاش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے وہ حضرت لوط علیہ السلام کا غلام تھا (2)۔

سہیلی نے قتبی سے بیان کیا ہے وہ ان کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق شعیا تھے اور وہ جس نے اس بستی کو برباد ہونے کے بعد زندہ (آباد) کیا تھا وہ کوشک الفارسی ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ربیع بن انس وغیرہم کے قول کے مطابق وہ بستی جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت المقدس ہے۔ فرمایا: وہ مصر سے آنے والا تھا اور اس کے جس طعام و

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

شراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سبز انجیر اور انگور اور چمڑے سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا برتن شراب کا تھا اور یہ بھی ہے کہ اس میں جوس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پانی کا ایک مٹکا تھا یہی اس کی شراب تھی اور وہ جس نے اس وقت بیت المقدس کو خالی کرایا وہ بخت نصر تھا اور وہ عراق پر لہراسب کی طرف سے پھر یستاسب بن لہراسب والد اسبند یاد کی جانب سے والی تھا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے: یہ ایک الٹی کی ہوئی بستی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل سے جنگ لڑی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنالیا۔ وہ انہیں لے کر آیا اور ان میں عزیر بن شرخیا بھی تھے اور وہ بنی اسرائیل کے علماء میں سے تھے۔ پس وہ ان کے ساتھ بابل کی طرف آئے، وہ ایک دن اپنے کسی کام سے ہرقل کی عبادت گاہ کی طرف دریائے دجلہ کے کنارے پر نکلے۔ پس وہ درخت کے سائے میں اترے اور وہ اپنے ایک گدھے پر سوار تھے۔ انہوں نے درخت کے سائے میں گدھا باندھا پھر بستی کا چکر لگایا اور وہاں کوئی رہائشی نہ دیکھا اور یہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی تو کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہلاکت و بربادی کے بعد زندہ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ بستی ہے جس سے موت کے ڈر سے ہزاروں افراد نکلے۔

ابن زید نے یہی کہا ہے۔ اور ابن زید سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ لوگ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم مر جاؤ، ان کے پاس سے کوئی آدمی گزرا درآنحالیکہ وہ خالی ہڈیاں تھے جو بالکل ظاہر تھیں۔ پس وہ آدمی کھڑے ہو کر دیکھنے لگا اور اس نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن زید کی جانب سے یہ قول آیت کے الفاظ کے مناقض ہے، کیونکہ یہ آیت ایسی بستی کو متضمن ہے جو گری پڑی ہے اور اس میں کوئی انیس و غمخوار نہیں ہے اور ھذہٖ کے ساتھ اشارہ اسی بستی کی طرف ہے اور اسے زندہ کرنے سے مراد اسے آباد کرنا ہے اور اس میں عمارتوں اور رہنے والوں کا موجود ہونا ہے (1)۔

حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ بستی بیت المقدس ہے جبکہ اسے بخت نصر بابلی نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور طویل حدیث میں ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل ایسے واقعات سے دوچار ہوئے تو ارمیاء یا عزیر اس بستی کے پاس ٹھہرے اور وہ بہت بڑے ٹیلے کی مانند تھی بیت المقدس کے وسط میں، کیونکہ بخت نصر نے اپنے لشکر کو اس کی طرف مٹی منتقل کرنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ اس نے اسے پہاڑ کی طرح بنا دیا اور ارمیاء نے گھروں کو دیکھا، ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔

اور العریش کا معنی ہے: مکان کی چھت۔ اور ہر وہ شے جو اس لئے تیار کی جاتی ہے کہ وہ سایہ دے یا وہ چھپا لے تو وہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

عریش ہے اور اسی سے عریش الدّالیہ بھی ہے ( کنویں کی من ) اور اسی سے رب کریم کا ارشاد بھی ہے: وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ سدی نے کہا ہے: کہتے ہیں ھی ساقطة علی سقفها، یعنی چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور سدی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ بستی لوگوں سے خالی ہے اور گھر قائم ہیں۔ اور خاویة کا معنی خالیة ( خالی ہونا ) ہے۔ اور الخَوَاء کا اصل ( معنی ) الخلو ہے۔ کہا جاتا ہے: خَوَالدار و خَوِیَتْ تَخْوِی خواء ( یہ الف ممدودہ کے ساتھ بھی ہے ) و خَوِیًا: أَقْوَت یعنی گھر کا ساکنین سے خالی ہونا (1)۔ اور اسی طرح جب وہ ساقط ہو جائے، گر جائے اور اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ( نمل: 52 ) اس میں خَاوِيَةً بمعنی خالیہ ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خَاوِيَةٌ بمعنی ساقطة ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یعنی وہ گرنے والی ہے اپنی چھتوں پر۔

الخَوَاء الجوع پیٹ کے غذا سے خالی ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور خَوَت المرأة اور خَوِیت بھی ہے خَوًی یعنی عورت کا پیٹ ولادت کے وقت خالی ہو گیا۔ اور خوّیت لها تخویة کہا جاتا ہے جب تو اس کے لئے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائے گی اور اس سے مراد طعام ہے۔ اور الخَوِیُّ فعیل کے وزن پر ہے اور اس سے مراد زمین کا نشیبی ہموار حصہ ہے۔ اور خوّی البعیرُ جب اونٹ کے بیٹھنے کے وقت اس کا پیٹ زمین سے دور ہو اور اسی طرح آدمی اپنے سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس کا معنی ہے: کونسے طریقے اور کون سے سبب سے اللہ تعالیٰ اسے موت کے بعد زندہ کرے گا؟ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بستی کو آبادی اور مکینوں کے ساتھ زندہ کرنے کے بارے سوال ہے، جیسا کہ اب ان خراب و برباد شہروں کے بارے کہا جاتا ہے جو آباد ہونے اور مکینوں سے دور ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر اپنی بربادی کے بعد آباد ہوں گے۔ گویا کہ یہ وہاں کھڑے ہونے والے کی طرف سے اظہار افسوس ہے جو اس شہر پر عبرت کی نظر ڈال رہا ہے جس میں اس کے گھر والے اور اس کے دوست احباب موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی ذات میں ایسی شے سے مثال بیان فرمائی جو اس سے عظیم تر ہے جس کے بارے اس نے سوال کیا ہے اور وہ مثال جو اس کے لئے اس کی ذات میں بیان کی گئی ہے وہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا سوال بنی آدم کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کیونکر اس کے مردوں کو زندہ کرے گا (2)۔

علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: یہ قول احیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک ہے اور اسی لئے اس کی ذات میں اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک داخل نہیں ہو سکتا کہ وہ بستی کو دوبارہ آباد کر کے اسے زندہ کر دے۔ بلاشبہ دوسری وجہ میں شک کا تصور صرف جاہل کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور درست یہ ہے کہ آیت میں شک کی کوئی تاویل نہ کی جائے (3)۔

قولہ تعالیٰ: فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ، مِائَةَ یہ ظرف کی بناء پر منصوب ہے اور عام بمعنی سال ہے۔ کہا جاتا ہے: سنون

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 39، دار احیاء التراث العربیۃ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

عُوَّم یہ پہلے کی تاکید کے لئے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: بینھم شُغْلٌ شَاغِلٌ۔ اور عجاج نے کہا ہے: مِن مرّ أعوامِ السنین العُوّم اس میں العوم السنین کی تاکید کے لئے ہے۔

اور یہ تقدیر میں عائم کی جمع ہے، مگر یہ مفرد مذکور نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسم نہیں ہے بلکہ یہ تو تاکید ہے۔ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نقاش نے کہا ہے: العام مصدر ہے جیسا کہ عوم مصدر ہے اور اس کے ساتھ سال بھر کے زمانے کا نام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ سورج کے فلک میں گھومنے اور چکر لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور العوم، السَّبْح کی طرح ہے (یعنی تیرنا) اور رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نقاش کے قول کے معنی میں ہے اور العام اس بنا پر القول اور القال کی طرح ہے اور اس اماتت (مارنے) کا ظاہر معنی جسم سے روح کو نکالنا ہے اور اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اس کے لئے بھیجا جو اسے آباد کرے گا اور اس بارے میں اہتمام اور کوشش کرے گا، یہاں تک کہ اس کی آبادی کا کمال کہنے والے کو دوبارہ اٹھانے (زندہ کرنے) کے ساتھ ہوگا (1)۔ اور کہا گیا ہے کہ جب اس کی موت کو ستر برس گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملوک فارس میں سے ایک عظیم بادشاہ بھیجا اسے کوشک کہا جاتا ہے تو اس نے اسے تیس سال میں آباد کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثَهٗ اس کا معنی ہے: پھر اس نے اسے زندہ کر دیا۔ اس کے بارے میں کلام ہو چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ كَمْ لَبِثْتَ۔ یہ قول کہنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ رب العالمین ہے اور اس نے اسے یہ نہیں کہا ''اگر تو سچا ہے'' جیسا کہ ملائکہ کو فرمایا تھا جیسا کہ پہلے بحث گزر چکی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس نے آسمان کی جانب سے ہاتف غیبی سے سنا وہ اسے یہ کہہ رہا ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سے مخاطب ہوئے۔ اور یہ بھی ہے کہ نبی علیہ السلام نے کہا۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک مومن آدمی جو اس کی قوم میں سے تھا اور اس نے اسے مرتے وقت دیکھا تھا اور وہ اس کے زندہ ہونے کے وقت تک زندہ تھا تو اس نے اسے کہا: كَمْ لَبِثْتَ (کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر بات یہ ہے کہ کہنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔ واللہ اعلم۔

اہل کوفہ نے كَمْ لَبِثَّ پڑھا ہے یعنی ثا کو تا میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں کا مخرج طرف لسان اور ثنایا علیا کی جڑیں ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: ثا اور تا کا مخرج جدا جدا ہونے کی وجہ سے اظہار احسن اور بہتر ہے اور کہا جاتا ہے: یہ سوال علی جہۃ تقریر فرشتے کے واسطہ سے تھا۔ اور کم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 349، دار الکتب العلمیہ

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ اس نے یہ قول اس بنا پر کیا جو اس کے نزدیک تھا اور جو اس کے گمان میں تھا اور اس بنا پر وہ اپنی خبر دینے میں جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اسی کی مثل اصحاب کہف کا قول ہے: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) بلاشبہ وہ تین سو نوے برس تک ٹھہرے رہے...... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... اور وہ جھوٹے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس مدت کی خبر دی جو ان کے نزدیک تھی، گویا کہ انہوں نے کہا: جو ہمارے نزدیک ہے اور جو ہمارے گمان میں ہے (وہ یہ ہے) کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ اور اس کی نظر ذوالیدین کے قصہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہے: لم أقصر ولم أنس (1) (یعنی نہ نماز کم ہوئی اور نہ میں بھولا۔)

اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اس میں جھوٹ حقیقتاً موجود ہے لیکن اس کے سبب اس کا مواخذہ نہیں، ورنہ جھوٹ سے مراد کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو اور یہ علم اور جہالت کے سبب مختلف نہیں ہوتا اور یہ اصول کی نظر میں واضح اور بین ہے اور اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: بے شک انبیاء علیہم السلام کسی شے کے بارے ایسی خبر دینے سے معصوم نہیں ہیں جو خلاف واقعہ ہو بشرطیکہ وہ بالقصد اور بالارادہ نہ ہو، جیسا کہ وہ سہو ونسیان سے معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ وہ ہے جو اس آیت سے تعلق رکھتا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریج، قتادہ اور ربیع نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دن صبح کو موت دی پھر اسے غروب آفتاب سے پہلے زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تو اس نے اسے ایک دن گمان کیا اور کہا: میں ایک دن ٹھہرا، پھر اس نے سورج کو باقی دیکھا اور اسے جھوٹا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے کہہ دیا: ''یا دن کا کچھ حصہ'' تو اسے کہا گیا: ''بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا۔'' اور بستی کی آبادی، اس کے درخت اور اس کی ان عمارتوں کو دیکھا جو اس پر دال تھیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ۔ طعام سے مراد وہ انجیر ہے جو اس نے اس بستی کے درختوں سے جمع کیا تھا جس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی ہے وھذا طعامک و شرابک لم يتسنه (اور یہ تیرے کھانے اور تیرے پینے کا سامان ہے، یہ باسی نہیں ہوا) اور طلحہ بن مصرف وغیرہ نے اس طرح پڑھا ہے: وانظر لطعامک و شرابک لمائۃ سنۃ (3) اور جمہور نے وصل کلام میں ہا کو ثابت رکھا ہے مگر اخوان (حمزہ اور کسائی) اسے حذف کرتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پر وقف ہا کے ساتھ ہے اور طلحہ بن مصرف نے بھی لم يَسَّنَّ۔ وانظر پڑھا ہے سین میں تا کو مدغم کیا گیا ہے (4)۔ اور جمہور کی قراءت کے مطابق ہا اصلیہ ہے اور ضمہ کو جزم کے سبب حذف کر دیا گیا ہے اور یہ يَتَسَنَّهُ ہو جاتا ہے یہ السَّنہ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ جوہری نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے سُنون اور السَّنَة یہ السِّنین کی واحد ہے۔ اور اس کے ناقص ہونے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ واوی ہے اور آخر میں ہا ہے۔ اور اس کی اصل سَنْهَة، جَبْهَة کی مثل ہے کیونکہ یہ سَنَهَتِ النخلةُ و تسنَّهت سے ہے جب اس پر کئی

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 181۔ ایضاً صحیح بخاری، باب هل یاخذ الامام الخ، حدیث نمبر 673، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 350

سال گزر جائیں۔ اور نخلۃ سَنَاء یعنی درخت ایک سال بار آور ہوتا ہے اور دوسرا سال بار آور نہیں ہوتا۔ اور سَنْهَاء بھی ہے۔ جیسا کہ انصار میں سے کسی نے کہا ہے:

فَلَيْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَبِيَّةٍ　　وَلٰكِن عَرَايَا فِي السِّنِينَ الجَوَائِحِ (1)

اور اَسْنهتُ عند بنی فلان تو اس کے پاس مقیم رہا، و تَسَنَّيتُ بھی ہے۔ اور استأجرته مساناۃ و مُسانهۃ بھی ہے اور اس کی تصغیر سُنَيّةٌ اور سُنَيْهَةٌ ہے۔

نحاس نے کہا ہے: جس نے لم يتسنّ اور انظر پڑھا ہے اس نے تصغیر میں سُنَيَّة کہا ہے اور الف کو جزم کے لئے حذف کر دیا ہے اور وقف ہا پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: لم یتسنه یہ ہا بیان حرکت کے لئے ہوتی ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل سانَيْتُه مساناۃ سے ہے یعنی میں نے اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی سال معاملہ کیا۔ یا یہ سانهت (ہا کے ساتھ) سے ہے۔ پس اگر یہ سانيت سے ہو تو اس کی اصل یتسنّی ہے اور الف جزم کی وجہ سے گر گئی۔ اور یہ اصل میں واوی ہے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے سنوات اور اس میں ہا برائے سکتہ ہے اور اگر یہ سانهت سے ہو تو پھر ہا فعل کے لام کلمہ کی جگہ ہے اور سنۃ کی اصل اس بنا پر سَنْهَة ہے اور پہلے قول کی بنا پر سَنَوَة ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أَسِنَ الماء سے ماخوذ ہے۔ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پانی متغیر ہو جائے اور اس بنا پر اس کا يتأسن ہونا لازم آتا ہے۔ ابو عمرو الشیبانی نے کہا ہے: یہ اس ارشاد سے ہے حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾ (الحجر) پس معنی ہے کہ وہ متغیر نہ ہوا۔ زجاج نے کہا ہے: اس طرح نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ مَّسْنُوْنٍ کا معنی متغیر (تبدیل شدہ) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زمین کی سبزی اور طراوت پر انڈیل دیا جانا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شیبانی کے قول کے مطابق اس کی اصل یتسنّن ہے۔ دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اس میں تضعیف (مضاعف ہونا) مکروہ ہے تو یہ یتسنی ہو گیا۔ پھر حالت جزمی میں الف کو گرا دیا گیا اور سکتہ کے لئے ہا داخل کر دی گئی۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: لَمْ يَتَسَنَّهْ کا معنی ہے: وہ بدبودار نہیں ہوا۔

نحاس نے کہا ہے: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اصح یہ ہے کہ یہ السَّنَةِ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ السَّنَة سے ہو اور اس کا معنی قحط سالی ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (الاعراف: 130) (اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی سے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اَللّٰهُمَّ اجعلها عليهم سِنِيْنَ كسِنِي يوسف (2) (اے اللہ! ان پر قحط سالی مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کے قحط کی طرح) اسی سے کہا جاتا ہے: أَسنَتَ القومُ یعنی قوم قحط میں مبتلا ہو گئی۔ پس معنی یہ ہوگا: قحطوں اور خشک سالیوں نے تیرے طعام کو تبدیل نہیں کیا یا سالوں اور برسوں نے اسے متغیر نہیں کیا

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 46، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تسمیۃ الولید، حدیث نمبر 5732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی وہ اپنی طراوت اور عمدگی پر باقی رہا۔

قولہ تعالیٰ: وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ۔ حضرت وہب بن منبہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کی ہڈیوں کے جڑنے اور اس کے ایک ایک عضو کے زندہ ہونے کی طرف دیکھ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح زندہ کیا یہاں تک کہ وہ جڑی ہوئی ہڈیاں ہو گیا، پھر اس پر گوشت پیدا کر دیا یہاں تک کہ وہ کامل گدھا بن گیا۔ پھر اس کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے اس میں روح پھونک دی تو گدھا کھڑا ہو کر ہینگنے لگا۔ یہی موقف اکثر مفسرین کا ہے۔

حضرت ضحاک اور حضرت وہب بن منبہ سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا، بلکہ اسے کہا گیا: تو اپنے گدھے کی طرف دیکھ درآنحالیکہ وہ اپنے باندھنے کی جگہ میں کھڑا ہے، سو برس میں اسے کوئی شے (آفت، تکلیف) نہیں پہنچی۔ اور وہ ہڈیاں جن کی طرف اس نے دیکھا ہے وہ اس کی اپنی ہڈیاں تھیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور اس کے سر کو پہلے زندہ کر دیا اور ابھی اس کا سارا جسم مردہ تھا۔ ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارمیاء اور اس کے گدھے کی طرف اتنی طویل مدت تک دیکھنے سے اندھا کیے رکھا (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ فراء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ لِنَجْعَلَكَ میں واؤ داخل کی گئی ہے اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ یہ اپنے مابعد فعل کے لئے شرط ہے۔ اس کا معنی ہے: وَ لِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ، و دلالة على البعث بعد الموت جعلنا ذالك۔ (اور یہ سب اس لئے) (کہ ہم بنائیں تجھے لوگوں کے لئے نشان) اور ہم نے بعث بعد الموت پر بطور دلیل اسے بنایا ہے۔ اور اگر تو چاہے تو واؤ کو مقحمہ زائدہ بنا لے۔ اور اعمش نے کہا ہے: اس کے نشانی ہونے کا محل یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حالت پر نوجوان اٹھا جس حالت پر وہ اس دن تھا جس دن فوت ہوا اور اس نے بیٹے اور پوتے بڑھاپے کی حالت میں پائے۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: جس دن وہ فوت ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عزیر اپنے گھر والوں سے نکلے اور پیچھے اپنی حاملہ بیوی چھوڑی۔ آپ کی عمر پچاس سال تھی اور اللہ تعالیٰ نے سو برس آپ کو مردہ حالت میں رکھا، پھر آپ کو اٹھایا اور آپ لوٹ کر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ پچاس سال کے جوان تھے اور آپ کا بیٹا سو برس کا تھا۔ پس آپ کا بیٹا آپ سے پچاس برس بڑا تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا تو وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے، تو نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے اور نہ ہی لوگ انہیں پہچان سکے۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک نابینی بڑھیا کو پایا وہ ان کی کنیز تھی۔ جب حضرت عزیر ان سے نکلے تھے اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی۔ تو آپ نے اسے فرمایا: کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی: عزیر اتنے برس سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں عزیر ہوں، اس نے کہا: بلاشبہ عزیر تو سو برس سے ہم سے گم اور مفقود ہیں۔ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سو برس تک مجھے موت دیئے رکھی پھر اس نے مجھے زندہ فرما دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: عزیر تو مریض کے لئے مستجاب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

الدعوات تھے اور کسی مصیبت و لاذیت میں مبتلا آدمی افاقہ پالیتا تھا تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری بصارت مجھے لوٹا دے۔ سو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اسی جگہ صحت یاب ہوگئی، گویا اسے بیڑیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تو وہ کہنے لگی: میں شہادت دیتی ہوں بلاشبہ تو عزیر ہے۔ پھر وہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف چل پڑی اور ان میں حضرت عزیر کا بوڑھا بیٹا بھی تھا اس کی عمر ایک سو اٹھائیس برس تھی اور اس کے بیٹوں کے بیٹے بھی بوڑھے تھے۔ تو بڑھیا نے کہا: اے قوم! قسم بخدا! یہ عزیر ہے۔ تو آپ کا بیٹا لوگوں کے ساتھ آپ کی طرف آیا تو ان کے بیٹے نے کہا: میرے باپ کے دونوں کندھوں کے درمیان ہلال کی مثل سیاہ نشان تھا، سو اس نے اسے دیکھا تو وہ عزیر ہی تھے۔ اور کہا گیا ہے: آپ اس حال میں آئے کہ آپ کو پہچاننے والے تمام ہلاک ہو چکے تھے تو آپ ان کے لئے ایک نشانی تھے جو آپ کی قوم میں سے زندہ تھے کیونکہ آپ کے احوال سننے کے سبب وہ یقین رکھتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اتنی مدت آپ کو موت دینے میں اور پھر اس کے بعد آپ کو زندہ کرنے میں بہت عظیم نشانی ہے اور آپ کا سارا معاملہ آنے والے زمانے کے لئے علامت و نشانی ہے۔ بعض کو چھوڑ کر بعض کی تخصیص کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں (1)۔

قولہ تعالیٰ: **وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا**۔ علمائے کوفہ اور ابن عامر نے زا کے ساتھ قراءت کی ہے اور باقیوں نے را کے ساتھ اور اَبان نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نَنْشُرُهَا یعنی نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور را کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابوحیوہ نے قراءت کی ہے اور کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں احیاء (زندہ کرنے) کے معنی میں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رَجَعَ وَ رَجَعْتُهُ اور غاض الماء و غِضْتَه، خَسِرت الدابة و خَسِرتها، مگر لغت میں معروف یہ ہے: أنشر الله الموتى فنشروا، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝** (عبس) (پھر جب چاہے گا اسے زندہ کر دے گا) اور اس کا اٹھنا کپڑے کے اٹھنے (لپیٹنے) کی مثل ہوگا۔ نشر الميتُ ينشرُ نُشُوْرًا یعنی مرنے والا موت کے بعد زندہ ہو گیا۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

حتى يقولَ الناسُ مما رأوْا　　يا عَجَبًا للميّت النّاشِرِ (2)

یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے جو کچھ انہوں نے دیکھا موت کے بعد زندہ ہونے والے میت کا واقعہ کتنا عجیب ہے۔

گویا موت ہڈیوں اور اعضاء کو لپیٹنے کا نام ہے اور احیاء اور اعضاء کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نشر ہے۔

اور رہی نُنْشِزُهَا کی قراءت زا کے ساتھ تو اس کا معنی ہے: ''ہم انہیں اٹھاتے ہیں'' اور النَّشَز کا معنی ہے: زمین کی بلند اور اٹھی ہوئی جگہ ...... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ترى الثعلب الحَوْليَ فيها كانه　　اذا ما علا نَشَزًا حصان مجلّلُ

اس میں نشزًا بلند جگہ کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیۃ

مکی نے کہا ہے: معنی یہ ہے تو ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم کیسے زندہ کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو اٹھا کر بعض پر ترکیب کے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ النشز کا معنی الارتفاع (بلند ہونا) ہے اور اسی سے المرأۃ النشوز ہے اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ موافقت کرنے سے بلند ہوتی ہے۔ (یعنی اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتی) اور اسی سے رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ:11) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو) یعنی تم اٹھو اور مل جاؤ۔ اور یہ بھی ہے کہ را کے ساتھ قراءت ہو تو معنی احیاء (زندہ کرنا) ہے۔ اور ہڈیاں انفرادی طور پر زندہ نہیں ہوتیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور زا اس معنی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ بمعنی انضمام (ملنا) ہے نہ کہ بمعنی احیاء۔ پس احیاء کے ساتھ آدمی متصف ہے نہ کہ انفرادی طور پر ہڈیاں اور یہ نہیں کہا جا سکتا: ھذا اعظم حی (یہ زندہ ہڈی ہے)۔ لہٰذا معنی یہ ہوا: پس تو دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم کیسے انہیں زمین میں ان کی جگہوں سے جسم کی طرف اٹھاتے ہیں (جس) جسم والے کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

اور نخعی نے نَنْشُزُھَا نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور زا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ننشیھا یا کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اور کسوہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ڈھانپ لیں۔ اور گوشت کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لبید نے اسلام کے لئے بطور استعارہ اسے استعمال کیا ہے۔ اور کہا ہے:

حتی اکتسبتُ من الاسلامِ سِربالا (1)

(یہاں تک کہ میں نے اسلام سے لباس پہن لیا، یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا۔) اور یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (اَعْلَمُ) میں ہمزہ قطعی ہے اور یہ روایت ہے کہ اللہ جل ذکرہٗ نے اس کے بعض (حصے) کو زندہ فرمایا پھر اسے دکھایا کہ اس نے اس کے بقیہ حصہ کو کیسے زندہ کیا ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ وہ دیکھنے لگا اللہ تعالیٰ کیسے بعض ہڈیوں کو بعض کے ساتھ جوڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول اس کے سر کو تخلیق فرمایا اور اسے کہا گیا: تو دیکھ، تو اس وقت اس نے کہا: أعلم الف قطعی کے ساتھ، یعنی أعلم ھذا میں اسے جان گیا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ میں معنی یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے وہ شے اس کے لئے بالکل عیاں اور واضح ہو گئی جس سے وہ ناواقف تھا تو اس نے اپنے بالعین دیکھنے کو قبول کر لیا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا: أعلم۔ (میں جان گیا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس نے ایسی شے کو لازم کیا ہے لفظ جس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس نے شاذ قول اور ضعیف احتمال کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ یہ میرے نزدیک اس شے کے بارے میں اقرار نہیں ہے جس کا وہ اس سے پہلے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیۃ

انکار کرتا تھا جیسا کہ علامہ طبری نے گمان کیا ہے، بلکہ یہ ایسا قول ہے جس پر اعتبار نے ابھارا ہے، جیسا کہ ایک بندہ مومن جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے کوئی عجیب وغریب شے دیکھے تو کہتا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اور اسی طرح کے الفاظ۔

ابوعلی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں علم کی اس قسم کو جان گیا جس کا علم میرے پاس نہ تھا(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے یہ معنی حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے اور اسی طرح مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ مکی نے کہا ہے: بلاشبہ جب اس نے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر لیا تو اس نے اپنے بارے میں خبر دی، اور اسے مشاہدہ کے ساتھ اس کا یقین ہو گیا اور اس نے اقرار کر لیا کہ وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی میں علم کی اس قسم کو جان گیا ہوں معائنہ کی بنا پر جسے میں پہلے نہ جانتا تھا اور یہ ان کی قراءت کے مطابق ہے جنہوں نے أَعْلَمُ الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اکثر قراء ہیں۔ اور حمزہ اور کسائی نے ہمزہ وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے فرشتے نے کہا: اعلم (تو جان لے) اور دوسری یہ کہ وہ اپنی ذات کو اجنبی اور منفصل مخاطب کے قائم مقام رکھے، تو معنی یہ ہوگا کہ جب اس کے لئے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے اپنے آپ کو کہا: اے نفس! تو جان لے یہ وہ علم یقینی ہے جسے تو بالعین نہ جانتا تھا اور اس معنی کی مثل میں ابوعلی نے کہا ہے:

وَدِّعْ هريرةَ ان الركب مرتحل    ألم تغتمِض عيناك ليلة أرمدا

تو ہریرہ کو چھوڑ دے۔ بے شک قافلہ کوچ کرنے والا ہے۔ کیا تیری آنکھیں آشوب چشم والی رات بند نہیں ہوئیں

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابوعلی اس معنی میں شاعر کے قول سے مانوس ہوئے ہیں:

تذكَّر من أنّى و من أين شُرْبُه    يُؤامِرُ نفسَيه كذِى الهَجمَة الابل (2)

مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور یہ بعید ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ جل ذکرہ کی جانب سے علم کے بارے حکم ہو۔ کیونکہ اس نے تو اس پر اپنی قدرت ظاہر فرما دی ہے اور اسے ایسا امر دکھا دیا ہے جس کی صحت کا اسے یقین حاصل ہو گیا اور اس نے قدرت کا اقرار کر لیا۔ لہٰذا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے علم کے بارے حکم دے بلکہ اس کے بارے وہ اپنے آپ کو حکم دے رہا ہے اور یہ جائز اور حسن ہے۔

اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حرف میں جو اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کے بارے میں حکم ہے اس معنی میں کہ تو اس کے بارے میں علم کو لازم پکڑ لے اور یقین کر لے جب تو نے معائنہ کر لیا اور یقین کر لیا۔ اس لئے کہ ان کی قراءت میں ہے: قیل اعلم۔ اور یہ بھی کہ یہ اپنے ماقبل امر کے موافق ہے جو اس قول میں ہے: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ اور وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ اور وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ پس اسی طرح ہے۔ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پڑھتے تھے قیل اعلم اور کہتے تھے: کیا وہ بہتر ہے یا ابراہیم؟ کیونکہ انہیں کہا گیا: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ پس یہ واضح کرتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے جب اس نے احیاء (زندہ کرنے) کا معائنہ کر لیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 351، دار الکتب العلمیہ    2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 352

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

''اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو۔ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل۔ فرمایا: تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔''

لوگوں نے اس سوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ شک کے سبب صادر ہوا یا نہیں؟ تو جمہور نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں کبھی شک لاحق نہیں ہوا۔ بلاشبہ آپ نے معائنہ کا مطالبہ کیا، وہ اس لئے کہ نفوس ہر اس شے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کے بارے انہیں خبر دی جائے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لیس الخبر کالمعاینة (1) (خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے) اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے آپ کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا، ابو عمر نے یہی کہا ہے۔

امام اخفش نے کہا ہے: اس سے دل کی رؤیت مراد نہیں لی گئی بلکہ آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور حضرت حسن، قتادہ، سعید بن جبیر اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: آپ نے سوال کیا تاکہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں عنوان بنایا اور کہا: وقال آخرون سال ذالك ربه، لأنه شك فی قدرة الله تعالیٰ (اور دوسروں نے کہا: آپ نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔) اور انہوں نے اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول ذکر کیا ہے آپ نے فرمایا: میرے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید افزا نہیں۔

اور حضرت عطا ابن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ بعض داخل ہو گیا جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نحن أحق بالشك من ابراهیم، الحدیث۔ (ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں)۔ پھر علامہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 315، حدیث نمبر 3250　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 352، دار الکتب العلمیہ

نے فرمایا: ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن سوال اس لئے ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ رکن شدید (مضبوط شے) کی طرف پناہ لیتے تھے اور اگر میں قید میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو علامہ طبری نے عنوان بنایا ہے میرے نزدیک وہ مردود ہے اور جو عنوان کے تحت انہوں نے ذکر کیا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ پس جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا تعلق ہے: ھی أرجی آیة تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر اور دنیا میں مردوں کے زندہ کرنے کے سوال پر رہنمائی موجود ہے اور یہ اس وہم میں ڈالنے والی نہیں ہے اور آپ کا یہ کہنا جائز ہے: ھی أرجی آیة (یہ زیادہ امید دلانے والی آیت ہے) یعنی بلاشبہ ایمان کافی ہے یہ اپنے ساتھ کسی چھان بین اور بحث و تمحیص کا محتاج نہیں ہوتا۔

اور رہا حضرت عطا کا یہ قول: دخل قلبَ ابراھیم بعضُ مایدخل قلوب الناس تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ شک کرنے والے ہوتے تو یقیناً ہم ان کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے اور ہم شک نہیں کرتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ شک نہ کریں (2)۔ پس حدیث طیبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر مبنی ہے اور وہ حدیث جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك محض الایمان (3) (وہ خالص ایمان ہے) تو یہ ایسے خطرات (کھٹکنے والی چیزوں) کے بارے میں ہے جو ثابت نہیں رہتے اور رہا شک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دو امروں کے درمیان توقف کرنا ہے جس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اور اس کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے نفی کی گئی ہے اور مردوں کو زندہ کرنا تو دلیل سمعی سے ثابت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بارے زیادہ جانتے تھے اور اس پر آپ کا یہ قول تیری رہنمائی کرتا ہے: رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِ وَيُمِيتُ اور اس پر شک کرنا اس کے لیے بعید ہے جس کا قدم فقط ایمان میں ثابت ہو تو جو مرتبہ نبوت اور خلت پر فائز ہو اس کے بارے شک کیسے ہو سکتا ہے اور انبیاء علیہم السلام تو کبائر سے معصوم ہیں اور بالاجماع ان صغیرہ گناہوں سے بھی جن میں رذالت ہوتی ہے اور جب تو آپ علیہ السلام کے سوال اور آیت کے تمام الفاظ میں غور و فکر کرے گا تو وہ قطعاً شک پیدا نہیں کرتے اور وہ اس طرح کہ سوال کیف کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ سوال کسی شے کی حالت کے بارے ہوتا ہے جو موجود ہو اور سائل اور مسئول دونوں کے نزدیک اس کا وجود متقرر اور ثابت ہو۔ مثلاً تیرا یہ قول: کیف علمُ زیدٍ (زید کا علم کیسا ہے؟) کیف نسج الثوب (کپڑے کی بنائی کیسی ہے) اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اور جب تو نے کہا: کیف ثوبك؟ (تیرا کپڑا کیسا ہے) اور کیف زید؟ (زید کیسا ہے) تو بلاشبہ سوال ان کے احوال میں سے کسی حال کے بارے ہے اور کبھی کیف کسی شی کے بارے خبر دینے کے لئے ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1 صفحہ 477، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 3121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1 صفحہ 79، وزارت تعلیم۔

کہ اس کے بارے کیف سے سوال کیا جائے۔ جیسے تیرا یہ قول: کیف شئت فَکُنْ۔ (جس حالت میں تو چاہے تو ہو جا) اور اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: کیف کان بدء الوحی (وحی کا آغاز کیسے ہوا؟) اور اس آیت میں کَیْفَ زندہ کرنے کی ہیئت کے بارے سوال کرنے کے لئے ہے اور احیاء (زندہ کرنا) متقرر اور ثابت شدہ امر ہے۔

لیکن جب ہم نے کسی شے کے وجود کا انکار کرنے والے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اس کے انکار کو اس شے کی حالت کے بارے سوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دعویٰ کرنے والا یہ کہے: انا ارفع ھذا الجبل، میں اس پہاڑ کو اٹھا سکتا ہوں۔ تو اسے جھٹلانے والا کہتا ہے: مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو عبارت میں یہی طریقہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے ایک بار بطور قیاس جدلی کے تسلیم کرنا۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے: میں فرض کرتا ہوں کہ تو اسے اٹھا سکتا ہے سو تو مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھائے گا۔ پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی عبارت اس اشتراک مجازی کے مطابق تھی، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اسے خالص کر دیا اور اسے اس پر محمول کیا کہ آپ کے لئے حقیقت بیان فرما دی اور آپ کو فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی تو اس سے امر مکمل ہو گیا اور ہر قسم کے شک سے پاک ہو گیا پھر آپ علیہ السلام نے راحت وطمانینت کے ساتھ اپنے سوال کی علت بیان کی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے وہ اپنی (انتہا کو) پہنچا۔ اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے بارے میں اس طرح کا شک جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ کفر ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات دوبارہ اٹھائے جانے کے ساتھ ایمان لانے پر متفق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے رکھی ہے کہ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے اولیاء رحمۃ اللہ علیہم پر شیطان کو کوئی راہ اور غلبہ نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: ۴۲) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) اور اس لعین نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۸۳﴾ (ص) یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا تسلط نہیں ہو سکتا) اور جب شیطان کے لئے ان پر کوئی غلبہ اور تسلط نہیں ہے تو پھر وہ انہیں شک میں کیسے ڈال سکتا ہے؟ بلاشبہ آپ نے سوال کیا کہ آپ مردوں کے اجزاء بکھر جانے کے بعد ان کے جمع ہونے کی کیفیت اور پٹھوں اور جلدوں کو پھاڑنے اور بکھیرنے کے بعد انہیں جوڑنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔ اور ارادہ یہ کیا کہ آپ علم یقین سے مزید علم یقین کی طرف ترقی کریں۔ پس آپ کا قول: اَرِنِیْ کَیْفَ یہ کیفیت کے مشاہدہ کی طلب پر دال ہے۔

اور بعض علمائے معانی نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ رائے فاسد اور مردود ہے اس بیان کے سبب جو اس کے پیچھے ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور اس ارشاد اَوَلَمْ تُؤْمِنْ میں الف برائے استفہام نہیں ہے، بلکہ یہ الف برائے ایجاب وتقریر ہے۔ جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

ألستم خیر من رکب المطایا

کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو جو سواریوں پر سوار ہوئے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

(یعنی ان سے بہتر ہو۔ تو گویا الف برائے ایجاب ہوا)

اور و تُؤْمِنْ میں واوَ حالیہ ہے۔ اس کا معنی ایمان مطلق ہوا اور اس میں مردوں کو زندہ کرنے کی فضیلت داخل ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ یعنی میں نے تجھ سے سوال کیا ہے تاکہ میرا دل برہان (دلیل) کے ساتھ معلوم اور مشاہدہ کے مابین فرق حاصل ہونے سے مطمئن ہو جائے۔

اور طمانینت کا معنی اعتدال اور سکون ہے اور اعضاء کی طمانینت تو معروف ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثم ارکع حتی تطمئن راکعا۔(1) الحدیث (پھر تو رکوع کر یہاں تک کہ تو پورے اطمینان سے رکوع کرے) اور دل کی طمانینت یہ ہے کہ کسی شے معتقد میں اس کی فکر پر سکون ہو جائے (اور راحت میں بدل جائے۔) اور احیاء کے بارے میں فکر کرنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ آج ہمارے لئے ہے کہ ہم اس میں فکر کریں کیونکہ اس فکر میں ہی عبرت ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو مشاہدہ اور معائنہ کا ارادہ کیا تو احیاء کی صورت میں ان کی فکر ختم ہو جائے گی۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ کا معنی ہے تاکہ میرا دل محفوظ ہو جائے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ یقین میں اضافہ ہو جائے۔ ابراہیم اور قتادہ نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے: تاکہ وہ میرے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس معنی میں کوئی زیادتی ممکن نہیں ہوتی مگر فکر سے سکون حاصل کرنے کے ساتھ، ورنہ یقین منقسم نہیں ہوتا(2)۔

سدی اور ابن جبیر نے بھی کہا ہے: کیا تم یقین نہیں رکھتے اس کے ساتھ کہ تم میرے خلیل ہو؟ آپ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ (سوال اس لئے ہے) تاکہ میرا دل خلت کے ساتھ مطمئن ہو جائے۔

اور یہ قول بھی ہے: آپ نے دعا کی کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں؟ آپ نے عرض کی: ایمان تو ہے (لیکن سوال اس لئے کیا ہے) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ تو میری دعا قبول کرتا ہے۔

آپ کو اس پر برانگیختہ کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو خلیل بنائے گا، تو آپ نے اس پر کسی نشانی (کے حصول) کا ارادہ کیا۔

سائب بن یزید نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: (کہ وہ) نمروذ کا یہ قول تھا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے ایک مردار دیکھا اس کا نصف حصہ خشکی میں پڑا تھا اسے درندے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے اور نصف حصہ سمندر میں تھا اسے سمندری جانور چیر پھاڑ رہے تھے، تو جب آپ نے اسے متفرق ہوتا اور بکھرتا دیکھا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 105، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب ابواب صلاۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

پسند کیا کہ اسے جڑتا اور ملتا بھی دیکھیں تو آپ نے سوال کر دیا تا کہ آپ کا دل اس کے جمع ہونے کی کیفیت دیکھ کر مطمئن ہو جائے جیسا کہ اس نے تفریق اور تقسیم کی کیفیت کو دیکھا ہے: سو آپ کو کہا گیا: فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ کہا گیا ہے کہ وہ چار پرندے مرغ، مور، کبوتر اور کوا تھے۔ اسے ابن اسحاق نے بعض اہل علم سے ذکر کیا ہے اور مجاہد، ابن جریج، عطاء بن یسار اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کوے کی جگہ سارس کا ذکر کیا ہے(1) اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے۔ پس آپ نے حسب حکم یہ پرندے پکڑ لئے اور انہیں ذبح کیا اور انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا اور بعض کا گوشت بعض کے ساتھ خون اور پروں سمیت خلط ملط کر دیا یہاں تک کہ آپ بہت تعجب کرنے لگے، پھر اس ملے جلے مجموعہ میں سے ایک ایک جز ہر پہاڑ پر رکھ دیا اور آپ ایسی جگہ پر ٹھہر گئے جہاں سے آپ ان اجزاء کو دیکھ سکتے تھے اور آپ نے پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں ہی روک لئے۔ پھر کہا: تعالین باذن اللہ (تم اللہ تعالیٰ کے اذن سے آجاؤ) پس وہ اجزاء اڑنے لگے اور خون خون کی طرف اور پر پروں کی طرف اڑے یہاں تک کہ پہلے کی طرح وہ سب جڑ گئے اور بغیر سروں کے وہ باقی رہ گئے۔ پھر آپ نے دوبارہ آواز دی تو وہ آپ کے پاس اپنی ٹانگوں پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور پرندے کے لئے سعی کا لفظ نہیں بولا جاتا جب وہ اڑے مگر تمثیل کی بنا پر۔ نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان میں سے ایک کی طرف اس کے سر کے بغیر اشارہ کیا تو پرندہ دور ہو گیا اور جب اس کی طرف اس کے سر کے ساتھ اشارہ کیا تو وہ قریب ہوا یہاں تک کہ ہر پرندہ اپنے سر کے ساتھ مل گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اڑ گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے پھر ہر پہاڑ پر ہر ایک کا ایک ایک جز رکھ دے۔

ابو بکر نے عاصم اور ابو جعفر سے جُزُوًا بروزن فُعُل پڑھا ہے اور ابو جعفر نے جُزًّا زاء مشددہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مہموز مخفف پڑھا ہے یہ اس کی لغات ہیں اور اس کا معنی ہے: نصیب اور حصہ۔

یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا۔ سَعْیًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور صُرْهُنَّ کا معنی ہے: تو انہیں کاٹ دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، ابو عبیدہ اور ابن انباری رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: صار الشیءَ یَصُورہ۔ یعنی اس نے شے کو کاٹ دیا۔ اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ اور ابو الاسود الدؤلی سے ہے، اور یہ سریانی زبان کے ساتھ تقطیع ہے، توبہ بن الحمیر نے اس کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فلما جذبت الحبل أطت نُسوعُه بأطراف عیدان شدید سیورها

فأدنت لی الأسباب حتی بلغتُها بنهضی و قد کاد ارتقائی یصورها

یعنی وہ اسے کاٹ دے گا اور الصَّوْر بمعنی القطع (کاٹنا) ہے۔ ضحاک، عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی کسی روایت میں کہا ہے جو ان سے روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ نبطی زبان کا ہے اور اس کا معنی ہے: قَطِّعْهُنَّ تو انہیں کاٹ دے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: أمِلْهُنَّ الیك، یعنی تو انہیں ملا دے اور انہیں اپنے پاس جمع کر لے۔ کہا جاتا ہے: رجل أصور جب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

وہ گردن کو جھکانے والا ہو۔ اور آپ کہتے ہیں: انی الیکم لأصور، یعنی بلاشبہ میں تمہاری طرف مشتاق اور راغب ہوں۔ اور امرأۃ صَوْراء (جھکنے والی عورت) اور اس کی جمع صُوْرٌ ہے جیسا کہ أسود کی جمع سُوْدٌ ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اللهُ يعلم أنَا فی تلفُتِنا يومَ الفِراق الی جيراننا صُورُ

اور قولہ اِلَیۡكَ تقطیع کی تاویل پر متعلق خذ کے ہے اور کسی مضمر کی حاجت نہیں۔ اور امالہ اور ضم کی تاویل پر یہ صُرۡهُنَّ کے متعلق ہے اور کلام میں یہ چھوڑ دیا گیا ہے: فأَمِلۡهُنَّ الیك ثم قطعهن (تم انہیں اپنے پاس جمع کرلو اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کردو) اور اس میں پانچ قراءتیں ہیں۔ سات میں سے دو یہ ہیں: صاد کا ضمہ، صاد کا کسرہ اور را کی تخفیف۔ اور ایک قوم نے فصُرّهن یعنی صاد کے ضمہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے پس تو انہیں باندھ دے۔ اور اسی سے صُرّۃ الدنانیر ہے۔ اور ایک گروہ نے فصِرّهُنَّ صاد کے کسرہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے تو انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: صرّ البابُ و القلمُ اذا صوّت۔ (دروازہ اور قلم پھٹ گئے جب تو نے آواز لگائی۔) اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہ قراءت غریب ہے اور وہ اس لئے کہ مضاعف متعدی بکسر عین بہت قلیل آتا ہے بلکہ اس کا باب یفعل عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسے شَدَّ یَشُدُّ وغیرہ۔ لیکن کبھی کبھی اس سے یہ بھی آتا ہے نَمّ الحدیثَ ینِمُّه وینُمّه۔ اس نے چغلخوری کی۔ اور هرّ الحرب یهُرُّها و یهِرُّها، جنگ چھڑ گئی۔

اور اسی سے اعشیٰ کا شعر ہے:

لیَعۡتَوِرَنۡكَ القولُ حتی تهِرَّہٗ

علاوہ ازیں بھی قلیل حروف میں سے ہے۔

ابن جنی نے کہا ہے: پس عکرمہ کی قراءت صاد کے ضمہ کے ساتھ تو یہ را میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ تینوں کا احتمال رکھتی ہے۔ (جیسے مد اور شد) کے را پر ضمہ اس کے بعد ہا پر ضمہ کی وجہ سے ہے۔

پانچویں قراءت صَرِّهنّ صاد کے فتحہ اور را مکسورہ کی شد کے ساتھ ہے۔ اسے مہدوی وغیرہ نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، یہ بمعنی فاحبسهن (اور تو انہیں روک لے) ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: صَرّی یُصَرِّی جب کوئی قید کرلے، روک لے۔ اور اسی سے الشاۃ المُصَرّاۃ ہے۔

اور یہاں ایک اعتراض ہے جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخرت کی نشانیوں کے بارے میں کیسے قبول کرلی گئی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی قبول نہیں کی گئی جو اس قول میں ہے: رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ (الاعراف: 143) (اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں) تو ان سے دو جواب منقول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا وہ مکلف باقی رہتے ہوئے صحیح نہیں ہے اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا وہ خاص ہے اور اس کے ساتھ مکلف باقی رہنا صحیح ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ احوال مختلف ہوتے ہیں پس بعض اوقات اصلح قبولیت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں اس بارے میں منع کرنا اور روکنا

اصلح ہوتا ہے جس میں پیشگی اذن نہ ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے بارے حکم دیا تھا اس سے پہلے کہ آپ کی اولاد ہو اور اس سے پہلے کہ آپ پر وہ صحف نازل کرے۔ واللہ اعلم۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۱

''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگا تا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے وہ قصے بیان کر دیئے جن میں دلائل ہیں، تو اس نے جہاد پر برانگیختہ کیا اور تو جان لے کہ جس نے اس برہان اور دلیل کے بعد جہاد کیا جسے نبی کے بغیر کوئی نہیں لاسکتا تو اس کے لئے اس جہاد میں ثواب عظیم ہے۔

البستی نے اپنی صحیح مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: ''اے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔'' تو پھر یہ آیت نازل ہوئی، مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عرض کی: ''اے میرے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما'' تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰ (الزمر)

اس آیت کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے شرف اور اس کے حسن کی مثال بیان کرنے کے لئے ہیں اور یہ اس پر انگیخت دلانے کو متضمن ہیں۔ اور کلام میں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: **مثل نفقة الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة**۔ ان کے نفقہ کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: **مثل الذين ينفقون اموالهم كمثل زارع زرع في الأرض حبة فأنبتت الحبة سبع سنابل** یعنی ان کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کسان کی مثل ہے جس نے زمین میں ایک دانہ کاشت کیا اور اس دانے نے سات بالیں اگائیں۔ یعنی سات بالیں نکالیں اور ہر بال میں سو دانہ ہو۔ پس صدقہ کرنے والے کو کاشت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی اور صدقہ کو بیج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر صدقہ کے عوض سات سو نیکیاں عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے سات سو پر بڑھا دیتا ہے۔ پس صدقہ کرنے والے کی مثل کاشت کرنے والے کی مثل ہو جائے گی، (جیسا کہ) اگر وہ اپنے عمل میں حاذق (ماہر) ہو اور بیج عمدہ ہو، زمین آباد ہو تو پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح اگر صدقہ کرنے والا جب صالح ہو، مال طیب اور پاک ہو اور وہ اسے اپنے محل میں خرچ کرتا ہو تو ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا ہے: آیت میں سات

سو گنا پر زیادتی کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو صدقہ پر ابھارا جس وقت آپ نے غزوہ تبوک کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار تھے تو میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے چار ہزار رکھے ہیں اور چار ہزار میں نے اپنے رب کو بطور قرض پیش کر دیئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بارك الله لك فيما امسكت و فيما أعطيت (اللہ تعالیٰ تجھے برکت عطا فرمائے اس میں بھی جو تو نے (گھر والوں کے لئے) روک لیا اور اس میں بھی جو تو نے پیش کر دیا) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تیاری کا سامان میرے ذمہ ہے جس کے پاس تیاری کا سامان نہیں ہے، تو ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ آیت آیت زکوۃ نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی پھر آیت زکوۃ کے ساتھ یہ منسوخ ہوگئی اور نسخ کے دعویٰ کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور ان میں عظیم تر جہاد ہے تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اس میں الحبة اسم جنس ہے ہر اس شے کے لئے جسے انسان کاشت کرتا ہے اور اس سے خوراک حاصل کرتا ہے اور اس سے زیادہ مشہور گندم ہے اور اکثر حب سے مراد یہی لی جاتی ہے اور اسی معنی میں المتلمس کا قول ہے:

آلیتُ حَبّ العراقِ الدهرَ أطعمه والحَبُّ یاکلُه فی القریة السُّوسُ

اور حبة القلب سے مراد دل کی سیاہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ثمرة القلب (دوستی، الفت) ہے اور وہ وہی ہے۔ اور الحِبة حاء کے کسرہ کے ساتھ، اس سے مراد سبزیوں کا وہ بیج ہے جو خوراک (غذا) نہیں ہوتا اور حدیث شفاعت میں ہے: فینبتون کما تنبت الحِبة فی حمیل السَّیل (1) (پس وہ اس طرح اگ پڑیں گے جس طرح سیلاب کے لائے ہوئے کیچڑ میں بیج اگتے ہیں۔ اور جمع حِبب آتی ہے اور الحُبّةُ (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی حُب ہے۔ کہا جاتا ہے: نَعَمْ و حُبّة و کرامة۔ (وہ محبت و کرامت کے اعتبار سے اچھا ہے۔) اور الحُب کا معنی محبت ہے اور اسی طرح الحِب (بالکسر) کا معنی بھی ہے اور الحِب سے مراد حبیب (گہرا دوست) بھی ہے۔ جیسے خِدْن اور خَدِیْنٌ (گہرا دوست) اور سُنبلة یہ فُنعلَةٌ کے وزن پر أسبل الزرع سے ماخوذ ہے جب کھیتی میں بالیں ظاہر ہو جائیں یعنی وہ بالیں چھوڑ دے جس طرح پردے کو لٹکا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اس میں چھپے ہوئے دانے ہیں جس طرح کہ کسی شے پر پردہ لٹکانے سے وہ چھپ جاتی

1۔ صحیح بخاری، باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال، حدیث نمبر 21، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اس کی جمع سَنَابِلَ ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سنبل الدخن (باجرے یا کنگنی کی بال) ہے۔ وہی وہ شے ہے جس کی ایک بال میں اتنی تعداد میں دانے ہوتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ باجرے کی بالیں میں سے ایک بال میں اس تعداد سے دوگنا زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں۔ ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: گندم کی بالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور رہے تمام دانے تو وہ کہیں زیادہ ہوتے ہیں، لیکن مثال اس مقدار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ اس کا معنی ہے اگر وہ اسے پائے، ورنہ اس بنا پر کہ وہ اسے فرض کرے۔ پھر انہوں نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے ہر بال نے سو دانے اگائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری نے حضرت ضحاک کے قول کو اسی طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور یہ ضحاک کے قول سے لازم نہیں آتا اور ابوعمرو الدانی نے بیان کیا ہے کہ بعض نے مائة کو اس تقدیر پر منصوب پڑھا ہے۔ انبتت مائةَ حبة۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یعقوب حضرمی نے کہا ہے: اور بعض نے پڑھا ہے: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انبتت مائة حبة ہے۔ اور اسی طرح بعض قراء نے پڑھا ہے: وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابَ جَهَنَّمَ اور یہ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ کی بنا پر ہے، یعنی واعتدنا للذین کفروا عذاب جھنم۔ (اور ہم نے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا) اور ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے انبتت سَبْعَ سَنَابِلَ میں تا کو سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ابوعمرو نے شعر بیان کیا ہے:

یا لعنَ الله بنی السِّعلاةِ عمرو بنَ میمون لئام النات

مراد لوگ (الناس) لئے ہیں اور سین کو تا میں بدل دیا ہے اور باقی قراء نے اصل کی بنا پر دونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں دو کلمے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قرآن کریم اس بارے میں وارد ہوا ہے کہ نیکی کے جملہ اعمال میں ایک نیکی کا بدلہ اس کی مثل دس کے ساتھ ہے اور یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے کی نیکی کا عوض سات سو گنا ہے اور علماء نے اس قول وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ سابقہ سات سو کے ذکر کے بیان اور تاکید کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں سات سو گنا سے بڑھانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے: بلکہ یہ اس پر اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے لئے عوض سات سو گنا سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی ابتدائی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے: **حدثنا هارون بن عبد الله الحمال حدثنا ابن ابی فُدیك عن**

الخلیل بن عبداللہ عن الحسن عن علی بن ابی طالب و ابی الدرداء و عبداللہ بن عمرو ابی امامہ الباھلی و عبداللہ بن عمرو و جابر ابن عبداللہ و عمران بن حصین یہ تمام کے تمام صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچہ بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں ہی رہا تو اس کے لئے ایک درہم کے بدلے سات سو درہم ہیں۔ اور جو بذات خود بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کیا تو اس کیلئے ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس عوض کو بڑھاتے بڑھاتے بیس لاکھ تک کر دیتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت آپ سے ثابت الاسناد نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ زراعت کا پیشہ ان پیشوں میں سے اعلیٰ ترین پیشہ ہے جنہیں لوگ اختیار کرتے ہیں اور ان کمائیوں میں سے اعلیٰ ہے جن کے ساتھ کام کرنے والے (مزدور) مشغول ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الآیہ۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم ﷺ سے روایت موجود ہے: ''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا فصل کاشت کرتا ہے اور اس سے پرندے، انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے (2)۔'' اور ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے واسطہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''زمین کی تہوں میں رزق تلاش کرو'' مراد زراعت ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا ہے۔

اور آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کے بارے فرمایا ہے: ''یہ کیچڑ میں گڑھے ہوتے ہیں (اور) محلات میں خوراک باہم پہنچاتے ہیں'' یہ مدح کے محل میں بیان ہوا ہے۔

اور زراعت فروض کفایہ میں سے ہے اور امام وقت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور کرے اور اس پر جو اس کی مثل ہے مثلاً درخت لگانا وغیرہ۔ (یعنی باغبانی)

عبداللہ بن عبدالملک نے حضرت ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور کہا: میری ایسے مال پر رہنمائی کیجئے جس کے لئے میں محنت و مشقت کروں۔

تو ابن شہاب رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے:

اقول لعبد الله یوم لقیته　　و قد شدّ أحلاس المطیّ مُشرّقا

تتبع خبایا الأرض وادع ملیکھا　　لعلّك یوما ان تُجاب فتُرزقا

فیؤتیك مالا واسعا ذا مثابة　　اذا ما میاہ الأرض غارت تدفّقا

---

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی النفقۃ فی الاھل، حدیث نمبر 1889۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2749-2750، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المزارعۃ، باب فضل الزرع، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور معتضد سے بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ مجھے بیلچہ (یا کدال) عطا فرما رہے ہیں اور آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو کیونکہ یہ زمین کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ (خذها فانها مفاتیح خزائن الأرض)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں، انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ جیش العُسرہ (غزوہ تبوک) کی تیاری کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیا، تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ اپنا دست مبارک ان میں داخل کرتے ہیں اور انہیں الٹ پلٹ کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: ما ضَرَّ ابن عفان ما عمل بعد الیوم اللّٰھم لا تنس ھذا الیوم لعثمان آج کے بعد ابن عفان نے جو عمل بھی کیا وہ ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔ اے اللہ! تو آج کے دن عثمان کو نہ بھولنا۔'' اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے: یا ربِّ عثمان انی رضیت عن عثمان فارض عنه (اے عثمان کے رب! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو گئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى الآیہ(1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بالعموم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر جب پہلی آیت میں گزر چکا، تو اس آیت میں یہ بیان کیا کہ وہ حکم اور ثواب بلاشبہ اس کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتا ہے اور نہ وہ دکھ دیتا ہے کیونکہ احسان جتلانا اور اذیت دینا یہ صدقہ کے ثواب کو باطل کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں بیان کر دیا ہے۔ بلاشبہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منفق علیہ پر خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول کا ارادہ کرے اور وہ منفق علیہ سے کسی شے کی امید نہ رکھے اور سوائے اپنے استحقاق کی رعایت کرنے کے اس کے احوال میں سے کسی حال پر نظر نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ﴿۹﴾ (الدہر) (نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریہ کے)

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 81

اور جب اس نے اس ارادے سے مال خرچ کیا کہ وہ کسی بھی وجہ سے منفق علیہ سے جزا حاصل کرے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہ کیا اور یہ تب ہے جب اس کے اس گمان کے پیچھے خرچ کرنے سے مقصود احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا ہو۔ اور اسی طرح جس نے کسی مضطر اور مجبور آدمی سے مشقت اور تکلیف دور کرنے کے لئے خرچ کیا یا تو اس پر احسان جتلانے کے لئے جس پر خرچ کیا گیا ہے یا مشقت کے کسی دوسرے قرینہ کے سبب اذیت پہنچانے کے لئے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ بلا شبہ اس کا یہ عمل قبول کیا جائے گا جب اس کی یہ عطا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ارادہ اس (اجر و ثواب) کی خواہش ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

یا عُمَر الخیر جُزیت الجنه اُکسُ بُنَیّاتِی و اُمَّهُنَه

اے عمر! بھلائی اور نیکی کیجیے آپ کو جنت کی جزا دی جائے میری بیٹیوں اور ان کی ماں کو لباس پہنا یئے۔

و کُنْ لنا من الزمان جُنَّه اُقسم باللہ لتفعلَنّه

تو ہمارے لئے (مصائب) زمانہ سے ڈھال بن جا۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں آپ ضرور ایسا کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

اِذًا اَبا حفص لأذهَبَنّه

اے ابا حفص! تب میں چلا جاؤں گا۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تو چلا گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

تکون عن حالی لَتُسْأَلَنّه یوم تکون الأعطیّات هَنّه

میرے حال کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جس دن عطیات کی آرزو ہوگی۔

و مَوقِفُ المسئول بَیْنَهُنَّهْ اِمّا الی نارٍ واِمّا جَنّه

اور ان کے درمیان مسئول کا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) یا جہنم ہوگی یا جنت۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے غلام! اس دن کے لئے اسے میری یہ قمیص دے دو نہ کہ اس کے شعر کے لئے۔ قسم بخدا! میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ہوں۔ ماوردی نے کہا ہے: جب عطا اس ارادہ پر ہو کہ وہ جزا اور شکر کی طلب سے خالی ہو اور احسان جتلانے اور شہرت سے بھی پاک ہو تو وہ خرچ کرنے والے کے لئے انتہائی اشرف و اعلیٰ ہے اور قبول کرنے والے کے لئے باعث مبارک ہے، لیکن جب عطا کرنے والا اپنی عطا سے جزا کا خواہشمند ہو اور اس کے عوض شکر اور ثنا کا طالب ہو تو وہ شہرت کا طالب اور ریا کاری کرنے والا ہے۔ اور ان دونوں میں ایسی ذم اور برائی ہے جو سخاوت کے منافی ہوتی ہے اور اگر اس نے جزا کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا نفع کمانے والا تاجر ہے جو حمد اور مدح کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝

(المدثر) یعنی آپ کسی کو ایسا عطیہ نہ دیں کہ آپ اس کے عوض اس سے افضل واعلیٰ کی خواہش رکھتے ہوں۔

اور ابن زید نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خود جہاد میں نہیں نکلتے بلکہ وہ خرچ کرتے ہیں اس حال میں کہ خود بیٹھے ہوتے ہیں اور اس سے پہلی آیت ان کے بارے میں ہے جو بنفس نفیس جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ فرمایا: اسی لئے ان پر شرط لگائی گئی ہے اور پہلوں پر کوئی شرط نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ اس میں اپنی رائے سے فیصلہ دینے کا اظہار ہو رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 3۔ قولہ تعالیٰ: مَنًّا وَّلَآ اَذًى، المنّ کسی نعمت و احسان کا ذکر کرتا ہے اس کو شمار کرنے اور گننے کے لئے اور اس کے سبب (دوسرے کو) پریشان کرنے کے لئے۔ مثلاً وہ یہ کہے: قد احسنت الیك و نعشتك میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھے ہلاک ہونے سے بچالیا۔ اور اسی کے مشابہ اور الفاظ۔

اور بعض نے کہا ہے: المنّ کا مفہوم ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنا جو اس نے دیا یہاں تک کہ وہ گفتگو اس تک پہنچ جائے جسے دیا گیا اور وہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو اور احسان جتلانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے(1)۔ اور یہ بھی ان تین میں سے ایک ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور نسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا: اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، مرد کی طرح بننے والی عورت جو کہ مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہو اور دیوث (بے غیرت انسان۔) اور تین ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے: اپنے والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور اس کے ساتھ احسان جتلانے والا جو کسی کو عطا کرے(2)۔'' اور مسلم کی بعض اسناد میں ہے: المنّان (احسان جتلانے والا) وہ ہے جو کسی کو بغیر احسان جتلائے کوئی شے نہیں دیتا۔'' اور الاذی سے مراد گالیاں دینا اور شکایت کرنا ہے اور یہ مَنّ سے اعم ہے۔ کیونکہ مَنّ، الاذی کا جز ہے لیکن اس کے کثیر الوقوع ہونے کے سبب اس پر نص وارد ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اگر تجھے گمان ہو کہ تیرا اسلام اس پر ثقیل اور گراں ہوگا جس پر تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کچھ خرچ کیا ہے تو تو اس پر سلام نہ کر اور آپ کو ایک عورت نے کہا: اے ابو اسامہ! میری ایسے آدمی پر رہنمائی کیجئے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے کیونکہ وہ تو نکلتے ہیں (اور) وہ پھل کھاتے ہیں بلاشبہ میرے پاس تیر اور ترکش ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیروں اور تیرے ترکش میں تیرے لئے برکت نہ رکھے تحقیق تو نے انہیں دینے سے پہلے انہیں اذیت اور تکلیف دی ہے۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے پیچھے نہ احسان جتلایا اور نہ دکھ پہنچایا جیسا کہ اس کا یہ قول: تیرا اصرار اور تیری احتیاج کتنی شدید تھی! تیری جانب سے اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اور اسی

1۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی إسبال الازار، حدیث نمبر 3565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ مسند امام احمد، حدیث 6180

طرح کی دیگر مثالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اجر کی ضمانت دی ہے اور وہ اجر جنت ہے اور اس کی موت کے بعد مستقبل کے لئے اس سے خوف کی نفی کر دی اور اس حزن اور غم کی نفی کر دی جو اسے اس پر ہوا جو دنیا میں سے گزر چکا ہے کیونکہ وہ تو اپنی آخرت کے ساتھ خوش اور مسرور ہوتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہ فضل و شرف کافی ہے۔ اور اس میں ان کے لئے دلیل ہے جنہوں نے غنی کو فقیر پر فضیلت دی ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾**

''اچھی بات کرنا اور (غلطی) معاف کر دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قول معروف اولیٰ و أمثل (اچھی بات کرنا اولیٰ اور عمدہ ہے) اس کا ذکر نحاس اور مہدوی نے کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خبر ہو اور مبتدا محذوف ہو۔ یعنی الذی أمرتم بہ قول معروف۔ (وہ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ اچھی بات کرنا ہے) اور قول معروف سے مراد دعا کرنا، انس اور غمخواری کا اظہار کرنا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کی آرزو کرنا ہے، یہ صدقہ سے بہتر ہے، کیونکہ یہ ظاہر میں صدقہ ہے اور اپنے باطن میں کوئی شی نہیں ہے اور قول معروف کے ذکر میں اجر ہے اور ایسے صدقہ میں کوئی اجر نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے(1) اور بلاشبہ تیرا اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی میں سے ہے۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس چاہیے کہ آدمی سائل کو خوشی سے اور مرحبا کہتے ہوئے ملے اور کشادہ روئی اور انتہائی قرب اور فرحت کے ساتھ اس کا سامنا کرے، تاکہ وہ مشکور ہو اگر کچھ عطا کرے اور معذور ہو اگر کچھ نہ دے۔ اور بعض حکماء نے کہا ہے: تو حاجتمند کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش روئی سے ملاقات کر۔ پس اگر تو اس کے شکر سے محروم رہا تو اس کے عذر سے محروم نہ رہے۔

اور ابن لنکک نے کہا ہے کہ ابو بکر بن درید نے ایک حاجت کے بارے میں کسی وزیر کا قصیدہ لکھا جس نے اسے پورا نہ کیا اور اس کے لئے اس کی جانب سے تنگی کا اظہار ہوا تو اس نے کہا:

لا تدخلنّك ضجرة من سائل	فلَخيرُ دهرِك أن تُرى مسئولا

کسی سائل سے کوئی تنگی تجھ میں نہ آنے پائے۔ پس تیرے زمانے کی خیر اور بھلائی اس میں ہے کہ تیرے سامنے دست سوال دراز کیا جاتا رہے۔

لا تجبَهَنْ بالردِّ وجه مُؤمِّلٍ	فبقاءُ عِزّك أن تُرى مأمولا

1۔ صحیح بخاری، باب من اخذ بالرکاب، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو کسی آرزومند کی حاجت لوٹا کر اس کے چہرے پر نہ مار۔ پس تیری عزت کی بقا اس میں ہے کہ تجھ سے آرزو اور امید وابستہ کی جاتی رہے۔

تلقَی الکریمَ فتستدلّ ببِشْرِهٖ و تَری العُبُوس علیٰ اللّئیم دَلیلا

تو کسی کریم اور سخی سے ملے تو تیرے لئے اس کی دلیل اس کی خندہ پیشانی ہے اور لئیم کی دلیل اس کے چہرے کی یبوست اور تیوری چڑھانا ہے۔

وَاعلَمْ بأنك عن قلیل صائرٌ خبرا فکُن خبراً یَروق جمیلا

تو اس کے بارے میں جان کہ تو قلیل کی طرف سے خبر دینے والا ہے۔ پس تو ایسی خبر بن جا جو حسن و جمال کے اعتبار سے خوش کرنے والی ہو۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سائل سوال کرے تو تم اس پر اس کا سوال کاٹ نہ دو یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے، پھر بڑے وقار اور نرمی کے ساتھ یا تھوڑے سے بدل کے ساتھ یا حسین انداز میں رد کے ساتھ اس پر جواب لوٹاؤ۔ تحقیق تمہارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ انسانوں میں سے ہیں اور نہ جنات میں سے ہیں، وہ اس بارے میں تمہارے احسانات کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی دلیل ابرص (برص کا مریض) أقرع (گنجا) اور اعمٰی (اندھا) والی حدیث ہے (1)، اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرشتے نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ایک بار برص کے مریض کی، دوسری بار گنجے آدمی کی اور تیسری بار اندھے آدمی کی مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کا امتحان لینے کے لئے۔

اور حضرت بشر بن حارث نے کہا ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی: اے امیر المؤمنین! مجھے کوئی ایسی شے بتایئے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائے، تو انہوں نے فرمایا: اغنیاء کا فقراء پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی رغبت اور آرزو رکھتے ہوئے لطف و مہربانی کرنا بہت اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے اغنیاء پر سرگشتہ پھرنا ہے، پھر میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! کچھ اضافہ فرمایئے تو آپ نے پیٹھ پھیری اور آپ یہ کہنے لگے:

قد کنتَ میتا فصرتَ حیّا وعن قلیل تصیر میتاً

تحقیق تو مردہ تھا اور تو زندہ ہو گیا اور پھر قلیل کے سبب تو مردہ ہو جائے گا۔

فاخرب بدار الفناء بیتا و ابن بدار البقاء بیتا

پس تو دار الفنا (دنیا) میں گھر گرا دے اور دار البقاء (آخرت) میں گھر بنا لے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ مَغْفِرَةٌ۔ یہاں مغفرت سے مراد محتاج کی بری حالت اور خصلت کو چھپانا ہے۔ اور اسی

1۔ صحیح بخاری، باب ماذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اعرابی کا قول ہے تحقیق اس نے فصیح کلام کے ساتھ ایک قوم سے سوال کیا تو کہنے والے نے اسے کہا: تو کس (خاندان کا) آدمی ہے؟ تو اس نے اسے کہا: اللہ تعالیٰ مغفرت کرے! بری کمائی نسب ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: سائل کو معاف کر دینا جب وہ اصرار کرے، اکھڑپن اور خشکی کا مظاہرہ کرے اس پر ایسا صدقہ کرنے سے بہتر ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلائے اور اسے دکھ پہنچائے۔

نقاش نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مشکل ہے اعراب (ترکیب) اس کی وضاحت کرے گا۔ وَّ مَغْفِرَةٌ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ ہے اور معنی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور وہ فعل جو مغفرت تک پہنچا دیتا ہے وہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچانا ہو۔ اور عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے: و فعل مغفرة او یہ بھی جائز ہے کہ یہ تیرے اس قول کی مثل ہو: تفضلُ اللہ علیك اکبر من الصدقة التی تَمُنُّ بھا (تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اس صدقہ سے بڑا ہے جس کے ساتھ تو احسان جتلاتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت تمہارے اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ تم احسان جتلاتے ہو۔ (ای غفران اللہ خیر من صدقتکم ھذہ التی تمُنُّوْنَ بھا)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غنائے مطلق کی خبر دی ہے کہ وہ بندوں کے صدقہ سے مستغنی ہے اور اس کا حکم صرف اس لئے دیا ہے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا جو احسان جتلائے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اس آدمی کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور دن قیامت پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو پھر برسے اس پر زور کی بارش اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۔ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی اس سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدم قبول اور ثواب سے محروم ہونے کو ابطال سے تعبیر کیا ہے اور مراد وہ صدقہ ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے، جو اس کے سوا ہو وہ مراد نہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ گناہ (سیئات) نیکیوں (حسنات) کو نہ باطل کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں بالکل بے کار بنا دیتے

ہیں۔ پس صدقہ میں احسان جتلانا اور دکھ پہنچانا بھی اس صدقہ کے سوا کسی صدقہ کو باطل نہیں کرتا۔

جمہور علماء نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک وہ صدقہ جس کے دینے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احسان جتلائے گا یا اس کے سبب دکھ پہنچائے گا تو وہ قبول نہیں کیا جاتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ کبھی اس پر بطور اَمارۃ فرشتہ کو مقرر کر دیتا ہے اور وہ اسے لکھتا ہی نہیں۔ اور یہ قول حسن اور اچھا ہے۔ اور عرب اس کے بارے کہتے ہیں جس کے ساتھ احسان جتلایا جاتا ہے: یَدٌ سوداء (سیاہ ہاتھ (یعنی ایسی نعمت جس کو ضائع کر دیا گیا) اور جو کسی کو بغیر سوال کے عطا کرتا ہے اسے یَدٌ بیضاء (روشن ہاتھ) کہتے ہیں اور جو سوال کرنے پر عطا کرتا ہے اسے یَدٌ خضراء (سبز ہاتھ) کہتے ہیں۔ اور بعض بلغاء نے کہا ہے: جس نے اپنی نیکی کے ساتھ احسان جتلایا اس کا شکر ساقط ہو گیا۔ اور جس نے اپنے عمل کے ساتھ تکبر کیا اس کا اجر ضائع ہو گیا اور بعض شعراء نے کہا ہے:

و صاحب سلفتْ منه الیَ ید أبطا علیه مُکافاتی فعادانی

میرا وہ ساتھی جس کی طرف سے مجھ پر پہلے احسان ہوتا رہا ہے اس پر میری طرف سے بدلہ موخر ہوا تو اس نے میرے ساتھ عداوت اختیار کر لی۔

لما تیقن ان الدھر حاربنی أبدَی الندامة فیما کان أولانی

جب یقین ہو گیا کہ زمانے نے مجھ سے جنگ شروع کر دی ہے تو جو شے میرے قریب آئی اسی میں اس نے ندامت ظاہر کر دی۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

أفسدتَ بالمنّ ما اسدیت من حَسَن لیس الکریم اذا اسدی بمنّان

تو نے احسان جتلانے کے ساتھ اس نیکی کو ضائع کر دیا جس کا تو نے احسان کیا اور کریم (سخی آدمی) جب احسان کرتا ہے تو وہ احسان نہیں جتلاتا۔

اور ابوبکر وراق نے کہا اور خوب اچھا کہا:

أحسن من کل حَسَنٍ فی کل وقت و زَمَنٍ

ہر اچھائی اور نیکی سے بڑھ کر اچھائی ہر وقت اور ہر زمانے میں

صنیعةٌ مَرْبُوبَةٌ خالیة من المنن

وہ احسان ہے جو بڑھایا جائے درآنحالیکہ وہ احسان جتلانے سے خالی ہو۔

ابن سیرین نے ایک آدمی کو سنا وہ دوسرے کو کہہ رہا ہے: فعلتُ الیك و فعلت (میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا اور ایسا کیا) تو آپ نے اسے کہا: تو خاموش رہ نیکی کو جب شمار کر لیا جائے تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایاکم و الامتنان بالمعروف فانه یبطل الشکر و یمحق الأجر تم نیکی کے ساتھ احسان جتلانے سے بچو کیونکہ یہ شکر کو باطل کر دیتا ہے اور اُجر کو مٹا ڈالتا ہے...... پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت

فرمائی...... لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیۃ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس آیت کی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ آدمی اپنا واجب صدقہ اپنے اقارب کو دے تاکہ وہ ان سے تعریف وثنا کی صورت میں عوض کا طالب نہ ہو۔ وہ ان پر اپنے احسان کا اظہار کرے گا اور وہ اسے اس پر بدلہ اور عوض دینے کی کوشش میں ہوں گے۔ نتیجتاً وہ صدقہ خالصۃ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو گا۔ اور مستحب یہ ہے کہ وہ صدقہ اجنبی لوگوں کو دے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ وہ کسی غیر کو اس کی تقسیم پر مقرر کرے جبکہ امام وقت عادل نہ ہو، تاکہ احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے ساتھ یا جس کو دیا گیا ہے اس کی طرف سے شکر، تعریف یا خدمت کی صورت میں عوض دینے کے سبب وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور یہ اس نفلی صدقہ کے خلاف ہے جو سِرًّا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ثواب جب ضائع ہو جائے تو وہ وعید سے محفوظ رہتا ہے اور وہ ایسے آدمی کے حکم پر ہو جاتا ہے جس نے وہ کام نہیں کیا لیکن واجب صدقہ کا جب ثواب ضائع ہو جائے تو اس کی طرف وعید متوجہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے حکم میں ہو چکا ہے جس نے وہ ادا ہی نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ۔ یہاں کاف محل نصب میں ہے۔ ای ابطال كَالَّذِىْ اور یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے جو احسان جتلاتا ہے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچاتا ہے اس آدمی کے ساتھ جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کافر کے ساتھ جو مال خرچ کرتا ہے تاکہ اسے سخی کہا جائے اور طرح طرح سے اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس خرچ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی ایسی چٹان کے ساتھ جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو اور گمان کرنے والا اسے اچھی اگانے والی زمین گمان کر رہا ہو اور جب اس پر موسلا دھار بارش پڑے تو وہ اس سے ساری مٹی بہا کر لے جائے اور وہ صاف چٹیل پتھر باقی رہ جائے۔ پس یہ ریا کاری کرنے والا بھی اسی طرح ہے۔

پس احسان جتلانا، دکھ پہنچانا اور ریا کاری آخرت میں نیت کو ظاہر کر دیں گے اور صدقہ باطل ہو جائے گا جیسا کہ موسلا دھار بارش چٹان کو ظاہر کر دیتی ہے۔ صفوان سے مراد وہ بڑا پتھر ہے جو چکنا ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد فضل (اضافی ثواب) کو باطل کرنا ہے نفس ثواب کو باطل کرنا نہیں۔ اپنے نفقہ سے ریا کاری کا ارادہ کرنے والا نہ کہ ثواب کا وہ کافر کی طرح ہے، کیونکہ اس نے اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا کہ وہ ثواب کا مستحق ہو۔ اور یہ اس احسان جتلانے والے اور دکھ پہنچانے والے کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کرتا ہے وہ اس کے ثواب کا مستحق ہوگا اگرچہ اس نے بار بار کسی کو عطا کیا اور اس نے اس کے فضل اور زیادتی کو باطل کر دیا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اپنے احسان جتلانے اور اس کو دکھ پہنچانے کے وقت سے اپنے صدقہ کے ثواب سے محروم ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے اور اسے بڑھایا جاتا ہے اور جب وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے تو اس کی تضعیف (کئی گناہ زیادتی) منقطع ہو جاتی ہے کیونکہ صدقہ دینے والے کے لئے صدقہ بالتدریج بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑے پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے مالک کے ہاتھ سے خالصہ علی وجہ المشروع نکلے تو وہ کئی گنا بڑھا

دیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا شامل ہو جائے تو اس کے سبب وہ وہیں رک جاتا ہے اور اس سے تضعیف کی زیادتی منقطع ہو جاتی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم

صَفْوَانٍ جمع ہے اور اس کی واحد صَفْوانة ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صفوان واحد ہے جیسا کہ حجر اور کسائی نے کہا ہے: صَفْوان واحد ہے اور اس کی جمع صِفْوان، صُفِيّ اور صِفِيّ ہے۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ صُفِيّ صَفَا کی جمع ہے جیسا کہ قفا کی جمع قُفِيّ ہے اور اسی معنی سے الصَّفْواء اور الصَّفَا ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور زہری نے صَفَوَان فاء کو متحرک پڑھا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔ اور قطرب نے صِفْوان بیان کیا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: صَفْوان اور صَفَوان یہ بھی جائز ہے کہ یہ جمع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد ہو۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ یہ واحد ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد گرامی ہے } عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ اگرچہ جمع کے لئے مذکر ضمیر لانا جائز ہوتا ہے مگر کوئی شے دلیل قاطع کے بغیر اپنے باب سے نہیں نکل سکتی۔ اور رہا وہ جو امام کسائی نے جمع کے بارے میں بیان کیا ہے تو وہ فی الحقیقت صحیح نہیں ہے۔ البتہ صِفْوان صَفا کی جمع ہے اور صفا بمعنی صَفْوان ہے۔ اور اس کی نظیر وَرَلٌ (گوہ کی مانند ایک جانور) اور وِرْلانٌ، أخٌ اور اخوان اور کَرٌ اور کِروان (بھورے رنگ اور لمبی چونچ کا ایک پرندہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رات کو نہیں سوتا ہے۔) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لنا یوم و لِلکِروان یومٌ تطیر البائسات و لا نطیر

اور عربی میں کَرَوان کی جمع کِروان ضعیف ہے اور صُفِيّ اور صِفِيّ صَفا کی جمع بھی جیسا کہ عَصَا اور الوابل کا معنی ہے: شدید اور موسلا دھار بارش اور (کبھی کہا جاتا ہے) وَبَلَت السماء تَبِل (آسمان موسلا دھار برسا) اور الارض مَوْبُولة (اور زمین خوب تر ہو گئی) اخفش نے کہا ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا یعنی ہم نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اور ضرب وَبیل (سخت مار) اور عذاب وبیل (شدید عذاب) اور الصَّلْد کا معنی ہے: چکنا پتھر۔ امام کسائی نے کہا ہے: صَلِد يَصْلَد صَلَدًا اس میں لام متحرک ہے فهو صَلْدٌ اس میں لام ساکن ہے۔ مراد ہر وہ شے ہے جو کسی شے کو نہ اگائے۔ اور اسی سے جَبِينٌ أَصْلَد (روشن پیشانی) ہے۔ اصمعی نے رؤبہ کے لئے شعر کہا ہے:

بَرَّاقُ أَصْلادِ الجَبِينِ الأَجْلَه

نقاش نے کہا ہے: ہذیل کی لغت کے مطابق اصلد کا معنی اجرد (خالی ہونا) ہے۔

اور لَا يَقْدِرُونَ کا معنی ہے: ریاکار، کافر اور احسان جتلانے والا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ عَلَىٰ شَيْءٍ یعنی اپنے خرچ کرنے سے کسی شے کے ثواب کا نفع اٹھانے پر (وہ قادر نہیں ہو سکیں گے) اور یہی ان کی کمائی ہے انہیں اس کی ضرورت اور حاجت ہونے کے وقت، کیونکہ یہ غیر اللہ کے لئے (صدقہ) تھا۔ اور نفقہ کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے کسب (کمائی) کا ارادہ کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: یہ ریاکار کے لئے اس کا ثواب باطل کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور احسان جتلانے والے اور اذیت

دینے والے کے لئے اس کی فضل وزیادتی کو باطل کرنے کی مثال ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞

''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال الله کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اس لئے تاکہ پختہ ہو جائیں ان کے دل ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو، برسا ہو اس پر زور کا مینہ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے اور الله تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ اس میں اِبْتِغَاءَ مفعول من اجلہ ہے۔ اور وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اس پر معطوف ہے۔ اور مکی نے المشکل میں کہا ہے: یہ دونوں مفعول من اجلہ ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور تَثْبِيْتًا کو مفعول من اجلہ بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ انفاق (خرچ کرنا) تثبیت (پختہ ہو جانا) کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور ابْتِغَآءَ کو حال کے محل میں مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور اس میں نصب مفعول من اجلہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مصدر کی بنا پر نصب دینا اس وجہ سے درست ہے کہ اس پر تَثْبِيْتًا مصدر کا عطف ہے۔ جب الله تعالیٰ نے اس قوم کے صدقات کا حال بیان کیا جن کے صدقات کا خیر و بھلائی میں کوئی بڑا حصہ نہیں اور مومنین کو ان مواقع سے منع فرمایا جو من وجہ اس سے مشابہت رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس آیت میں اس قوم کے نفقات کا ذکر فرما رہا ہے جنہوں نے اپنے صدقات کو پاک کیا کیونکہ وہ شریعت کے موافق اور اس کی طرز پر تھے۔

اور ابْتِغَآءَ کا معنی طلب ہے اور مَرْضَاتِ یہ رَضِيَ يَرْضَى سے مصدر ہے۔ اور وَتَثْبِيْتًا کا معنی ہے کہ وہ پختہ ہو جائیں جہاں وہ اپنے صدقات کو رکھیں۔ یہ مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: آدمی جب صدقہ کا قصد کرے تو وہ ثابت ہو جاتا ہے۔ پس اگر وہ الله تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو تو وہ اسے ادا کر دے اور اگر اس میں شک کی آمیزش ہو جائے تو اسے روک لے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تصدیق اور یقین کرتے ہوئے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے دلوں میں ثواب کی نیت کرتے ہوئے۔ اور حضرات شعبی، سدی، قتادہ نے بھی، ابن زید اور ابو صالح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: وَتَثْبِيْتًا کا معنی وَتَيَقُّنًا ہے یعنی کہ ان کے دلوں کو بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور الله تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر ان کے پختہ ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ یہ تینوں اقوال حضرت حسن اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی نسبت زیادہ صحیح اور درست ہیں، کیونکہ وہ معنی جسے ان دونوں نے اختیار کیا ہے اس کی عبارت میں وَتَثْبِيْتًا مصدر غیر مصدر پر محمول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا مگر مصدر کے

ذکر کے ساتھ اور فعل متقدم کی فصاحت و بیان کے ساتھ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ۝ (المزمل) (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو) لیکن جب فعل کے ساتھ وضاحت نہ ہو تو ایسا مصدر لانا جائز نہیں ہوتا جو اس کا ہم معنی نہ ہو۔ پھر تو کہے گا: میں اسے فلاں فلاں معنی پر محمول کرتا ہوں اس فعل کے لئے جن کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب کا وسیع راستہ ہے جس کے بارے تو نے جان لیا ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ حضرت مجاہد نے کہا ہے تو پھر وَتَثْبِیْتًا تثبتً سے ہوتا جیسا کہ تکرمت تکرما ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ یہ اِحْتِسَابًا کے معنی میں ہے، یہ نہیں پہچانا جا سکتا مگر اس طرح کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ ان دلوں نے احتساب کرتے ہوئے ان کی خوب چھان بین کی اور یہ بعید ہے اور حضرت شعبی کا قول اچھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو پختہ رکھتے ہوئے۔ کہا جاتا ہے: ثَبَّتُّ فلانا فی ھذا الامر میں نے فلاں کو اس کام میں پختہ کر دیا۔ یعنی میں نے اس کے عزم اور ارادہ کی تصحیح کی اور میں نے اس میں اس کی رائے کو قوی کر دیا، أثبته تثبیتًا اور میں نے اسے بہت پختہ کر دیا۔ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اس میں بہت پختہ ہو گئے۔

اور بعض نے کہا ہے: وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر پختہ کر دے گا ای و تثبیتا من انفسھم لثوابھا۔ یعنی تاکہ اس کے ثواب کے بارے ان کے دل پختہ ہو جائیں بخلاف اس منافق کے جو ثواب کا گمان بھی نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اس میں جنۃ کا معنی باغ ہے اور یہ وہ قطعہ زمین ہوتا ہے جس میں درخت اگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور یہ لفظ جِنّ اور جنین سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اور رَبْوَةٌ کا معنی ہے: ایسی بلند جگہ جس میں بلندی تھوڑی ہو اور اغلباً اس کے ساتھ مٹی کی کثافت اور کثرت بھی ہو۔ اور جو زمین اس طرح ہوتی ہے اس کی پیداوار اور نباتات اچھی ہوتی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر ربوۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ریاض الحزن اس میں سے نہیں ہے جیسا کہ طبری نے گمان کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ ریاض ہے جو نجد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تہامہ کے ریاض سے بہتر ہے اور نجد کی نباتات زیادہ معطر اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ اور اس کی ہوا زیادہ ٹھنڈی اور راحت بخش ہوتی ہے اور نجد کو ہی حزن کہا جاتا ہے۔ اور تہامہ کی ہوا سوائے رات کے بہت کم صحت مند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک اعرابیہ عورت نے کہا ہے: زوجی کلیل تھامة (میرا خاوند تہامہ کی رات کی مثل ہے) (1) اور سدی نے کہا: بِرَبْوَةٍ بمعنی بربادۃ ہے یعنی زمین کا وہ حصہ جو پست ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قَلَقَة (دشواری، پریشانی) سے عبارت ہے اور ربوۃ کا لفظ رَبَا یَرْبُوْ سے ماخوذ ہے جب وہ بڑھ جائے اس میں اضافہ ہو جائے۔

---

1۔ صحیح بخاری، باب حسن المعاشرۃ مع الاھل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: سدی کی عبارت کوئی شے نہیں ہے کیونکہ رَبَ وَکی بناء کا معنی کلام عرب میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے اور اسی سے الربو بلند نفس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رَبَا یَرْبُو جب ربوٌ (زیادتی) اسے آلے اور ربا الفرس جب دوڑنے یا گھبراہٹ کے سبب گھوڑے کی سانس پھول جائے۔ اور فراء نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: اَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً کہ یہ بمعنی زائدہ ہے۔ (یعنی اس نے انہیں سخت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا) جیسے کہ تیرا یہ قول ہے: اَرْبَيتُ جب تو اس سے زیادہ لے جو تو نے دیا ہو۔ اور رَبَوْتُ فی بنی فلان و رَبِيت ای نشأت فیهم۔ (میں نے ان میں نشوونما پائی) اور خلیل نے کہا ہے: الرَّبْوَةُ بلند زمین جو اچھی ہو۔ اور الله تعالیٰ نے اس زمین کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بلاد عرب میں عرف کے اعتبار سے پانی جاری نہیں ہوتا اور ان کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کا ادراک کر سکتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ربوۃٌ سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس میں نہریں جاری نہیں ہو سکتیں، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد: اَصَابَهَا وَابِلٌ آخر آیت تک اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں جاری پانی نہیں ہے اور نہ ہی اس زمین کی جنس کا ارادہ کیا ہے، جس میں نہریں جاری ہو سکتی ہیں، کیونکہ الله تعالیٰ نے ربوۃ ذات قرار و مَعین کا ذکر کیا ہے اور کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ ربوہ سے مراد وہ جگہ ہے جو اپنے آس پاس سے بلند ہو چاہے اس میں پانی جاری ہو یا نہ جاری ہو۔ اور اس میں پانچ لغات ہیں، رُبْوَۃٌ راء کے ضمہ کے ساتھ، ابن کثیر، حمزہ، کسائی، نافع اور ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہم نے پڑھا ہے۔ اور رَبْوَۃٌ عاصم، ابن عامر اور حسن رحمۃ اللہ علیہم نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رِبْوَۃٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو اسحاق سبیعی نے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور رَبَاوَۃٌ ابو جعفر اور ابو عبد الرحمن نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

مَن مُنزِلٍ فی رَوْضَة بِرَبَاوَة بین النخیل الی بقیع الغَرْقَدِ؟

اور رِبَاوَۃ اشہب نے اسے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے: بِرَبَاوَة اور بِرِبَاوَة، اور یہ سب الرابیہ سے ہیں اور اس کا فعل رَبَا یَرْبُو ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَصَابَهَا اس میں ہا ضمیر کا مرجع ربوۃ ہے۔ وَابِلٌ اس کا معنی ہے: شدید بارش۔ شاعر نے کہا ہے:

ما رَوْضَةٌ من رِیاض الحَزْن مُعْشِبَةٌ خضراء جَادَعلیها وَابِلٌ هَطِلٌ

اس میں وابل هَطِل موسلا دھار بارش کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

فَاٰتَتْ، ای اعطت تو لایا ہو اُکُلَهَا ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ مراد وہ پھل ہے جو کھایا جاتا ہے اور اسی سے الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ (ابراہیم: 25)

ہر شے میں سے کھائی جانے والی شے کو اُکُل کہا جاتا ہے اور الاکلۃ سے مراد لقمہ ہے۔۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: فان کان للطعام مشفوها قلیلا فلیضع فی یدہ منه أكلة أو أكلتین (اگر کھانا بہت تھوڑا رہ جائے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ میں اس سے ایک یا دو لقمے رکھ لے۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

---

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اتاہ خادمه بطعامه، حدیث نمبر 2370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی اضافت باغ کی طرف یہ اضافت اختصاص ہے۔ جیسا کہ سرج الفرس اور باب الدار میں اضافت اختصاص ہے ورنہ پھل اس میں سے نہیں ہے جسے باغ کہا جاتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اُكْلَهَا ہمزہ کو ضمہ اور کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو مؤنث کی طرف مضاف ہو۔ اور ابو عمرو نے ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے کہ جب اسے مذکر کی طرف مضاف کیا جائے مثلاً اُكُلُهٗ یا کسی بھی شے کی طرف مضاف نہ ہو مثلاً اُكُلٍ خَمْطٍ (سبا: 16) تو ابو عمرو نے اسے مثقل پڑھا ہے اور دوسرے دونوں نے مخفف پڑھا ہے۔

اور عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان تمام صورتوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں اسے مثقل پڑھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُكْلٍ اور اُكُلٍ دونوں ہم معنی ہیں۔

ضِعْفَيْنِ یعنی وہ دوسری زمین کے مقابلہ میں دوگنا پھل لایا۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سال میں دو بار پھل لایا۔ اور پہلا قول زیادہ ہے۔ یعنی اس نے اپنی پیداوار ایک سال میں دی جتنی پیداوار دوسری زمین دو سالوں میں دیتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بلند زمین کی مدح کی تاکید کے لئے ہے۔ اس طرح کہ اگر اسے موسلا دھار بارش نہ بھی پہنچے تو اسے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور یہی دوگنا پھل نکالنے میں شدید بارش کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور یہ زمین کے زرخیز اور طیب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مبرد وغیرہ نے کہا ہے: تقدیر کلام میں فطلٌّ یکفیھا۔ (پس شبنم ہی اسے کافی ہو جائے) اور زجاج نے کہا ہے: فالذی یصیبھا طلّ (اور وہ جس پر شبنم برسے) اور طلّ سے مراد کمزور سی بارش ہے جس کے قطرے باریک اور بالکل خفیف سے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس کی مشہور لغت ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے جن میں سے حضرت مجاہد ہیں کہ الطّل کا معنی شبنم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مجاز اور تشبیہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور اہل لغت نے بیان کیا ہے: وَبَلَتْ اور اَوْبَلَت، طَلَّتْ اور أَطَلَّتْ۔ اور الصحاح میں ہے: الطلّ سے مراد انتہائی ضعیف اور کمزور بارش اور اس کی جمع الطِّلال ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: طُلَّت الارض و اطلها الندی زمین پر شبنم پڑی فھی مَطْلولة۔

ماوردی نے کہا ہے: شبنم کی کھیتی بارش کی کھیتی *سے دگنی ہوتی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے اور اس میں ہے ...... اور اگرچہ پیداوار اور نفع کم ہے۔

بعض نے کہا ہے: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اس کا معنی ہے: کمثل جنة بربوة أصابها و ابل فان لم یصبها و ابل فطل فأتت اكلها ضِعفين۔ یعنی باغ کے اوراق (پتے) سبز ہو گئے اور اس کا پھل دوگنا نکلا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے اور تقدیم و تاخیر کی کوئی حاجت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مخلص بندوں کے خرچ کئے ہوئے مال کے بڑھنے کو جن کے صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ گھوڑے اور اونٹ کے بچے کو بڑھانا وغیرہ ایسے باغ کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بلند جگہ پر واقع ہو بخلاف اس چکنی چٹان کے جس کی مٹی بہہ گئی

اور وہ خالص پتھر باقی رہ گیا۔

اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''کوئی آدمی بھی جو اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت کے ساتھ لے لیتا ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے اور اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے'' اسے مؤطا نے بھی روایت کیا ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یہ وعدہ اور وعید ہے۔ زہری نے يَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا وہ اس سے تمام لوگ مراد لیتے ہیں یا پھر صرف خرچ کرنے والے مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں یہ صرف وعدہ ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۶۶

''کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آ لیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

قولہ تعالیٰ: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ الآیہ۔ طبری نے سدی سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال ہے اور آپ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے بیان فرمایا: یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریاکاروں کے اعمال کے بارے بیان فرمائی ہے جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باطل کر دے گا جن کی طرف وہ زیادہ محتاج ہوگا، جیسا کہ اس آدمی کی مثال جس کا ایک باغ ہو اور اس کے بچے ہوں اور وہ اسے کوئی نفع اور فائدہ نہ دیں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور باغ کو بگولہ آ پہنچے یعنی ایسی تیز آندھی جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے اور وہ اسے گم کر دے اس وقت جب وہ اس کا زیادہ محتاج ہوا۔ اور ابن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پڑھا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیہ (بقرہ: 264) پھر فرمایا: پھر اس بارے میں مثال بیان فرمائی اور فرمایا: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ الآیہ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ اس سے واضح اور زیادہ بین ہے جسے طبری نے ترجیح دی ہے اور یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی سیاق کلام کا تقاضا ہے۔ اور رہا وہ معنی جو اس سیاق کے سوا میں ہے تو وہ ہر منافق یا کافر کے حال کے مشابہ ہے جو ایک عمل کرتا ہے اور وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خوب اچھا کر رہا ہے اور جب وہ حاجت کے وقت وہاں آئے گا تو وہ کوئی شے نہ پائے گا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ مثال اس آدمی کی ہے جس نے غیر اللہ کے لئے عمل کیا چاہے وہ منافق ہو یا کافر ہو۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ مگر بخاری میں آپ سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبید بن عمیر سے روایت بیان کی ہے (1)، انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو ایک دن کہا: تم کیا رائے رکھتے ہو یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے اور فرمایا: تم کہو: ہم جانتے ہیں یا ہم نہیں جانتے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اے امیر المومنین! میرے دل میں اس کے بارے ایک شے آ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ایک عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون سا عمل ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: غنی اور سخی آدمی کے عمل کی جو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی میں کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک شیطان بھیج دیا اور اس نے گناہ کے عمل کئے یہاں تک کہ اس نے پہلے عمل کو جلا دیا (2) اور ایک روایت میں ہے: جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی موت قریب آ گئی تو بدبختی کے اعمال میں سے کسی عمل پر اس کا خاتمہ ہوا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے خوش ہوئے (اور اس رائے کو پسند فرمایا) اور ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو ایسے انسان کی بیان کی گئی ہے جو عمل صالح کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری عمر کو پہنچتا ہے اور زیادہ اس کا محتاج ہوتا ہے تو اس وقت برائی اور گناہ کا عمل کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ایک نظر اور رائے ہے جس کے ساتھ آیت کو ہر اس شے پر محمول کیا جا سکتا ہے جو اس کے الفاظ کے تحت داخل ہو۔ اور اسی طرح مجاہد، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ کھجور اور انگور کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ ان دونوں کو تمام درختوں پر فضل و شرف حاصل ہے۔

اور حسن نے جنات جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ یہ ماضی کا مستقبل پر عطف ہے اور وہ تَكُوْنَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ يَوَدُّ ہے۔ اور کہا گیا ہے: تقدیر عبارت ہے: و قد اصابہ الکبرُ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معنی پر محمول ہے، کیونکہ معنی یہ ہے: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ ان لو کانت لہ جنۃ۔ (کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اگر اس کا ایک باغ ہو۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور اسی طرح وَلَهٗ میں بھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔ حسن نے کہا ہے: اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ ایسی ہوا جس میں شدید سردی ہو۔ زجاج نے کہا ہے: لغت میں الاعصار سے مراد ایسی شدید اور سخت ہوا ہے جو زمین سے آسمان کی طرف عمود (خط عمودی) کی طرح چلتی ہے اور یہی وہ ہے جسے الزوبعہ کہا جاتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الزوبعة جنات کے سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور اسی سے الاعصار کا نام زوبعہ رکھا گیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4174، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ ایضا

ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اعصار زوبعہ اور یہ وہ ہوا ہے جو غبار اڑاتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے گویا وہ عمود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ الاعصار سے مراد وہ ہوا ہے جو بادلوں کو چلاتی ہے جن میں گرج اور چمک ہوتی ہے۔ اور مہدوی نے کہا: اس کو اعصار کہا گیا ہے کیونکہ یہ لپٹ جاتی ہے کپڑے کی طرح جب اسے نچوڑا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول ضعیف ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بلکہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہی محسوس مشاہدہ ہے کیونکہ یہ عمودی شکل میں لپٹے ہوئے اوپر چڑھتی ہے اور کہا گیا ہے: بلاشبہ ہوا کو اعصار کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بادلوں کو نچوڑ دیتی ہے اور بادل مُعْصِرات کہلاتے ہیں یا تو اس لئے کہ یہ (بارش) اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس یہ عورتوں میں سے معصر کی طرح ہیں یا اس لئے کہ یہ ہواؤں کے سبب نچڑ جاتے ہیں۔

ابن سیدہ نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے معصرات کی تفسیر ریاح (ہواؤں) سے کی ہے نہ کہ بادلوں سے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ اعصار سے مراد سخت آندھی اور گرم ہوا ہے اور اسی طرح سدی نے بھی کہا ہے کہ اعصار سے مراد ہوا اور سخت گرم آگ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ایسی ہوا جس میں شدید گرمی اور تپش ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سخت گرمی میں بھی ہوتی ہے اور سخت سردی میں بھی ہوتی ہے اور یہ سب جہنم کی گرمی اور اس کی سانس لینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسے متضمن ہے: اِذَا اشتدّ الحر فأبردوا عن الصلوٰۃ فَاِنّ شدّۃ الحر من فیح جھنم جب گرمی شدید ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی گرمی میں سے ہے۔ اور ان النار اشتکت الی ربھا الحدیث (1)۔ (اور بے شک آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے، یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور منافقین کے لئے بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اس آدمی کی حالت جس نے ایک باغ لگایا اور اس میں کثرت سے پھل اگائے پھر اسے بڑھاپا آپہنچا اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو...... اولاد سے مراد بچے، بچیاں اور غلام ہیں...... پس اس کا گزارا اور اس کی اولاد کا گزارا اسی باغ سے ہو، تو اللہ تعالیٰ اس باغ پر ایسی ہوا چلا دے جس میں آگ ہو اور وہ اسے جلا کر بھسم کر دے اور اس کے پاس کوئی اور قوت و طاقت نہ ہو کہ وہ دوبارہ اسے لگا سکے اور نہ ہی اس کے بیٹوں کے پاس خیر و نفع ہو کہ وہ اپنے باپ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح کافر اور منافق ہے جب وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہوں گے تو اس کے لئے (بھاگنے کا) کوئی ذریعہ نہ ہوگا، اسے اٹھایا جائے گا اور وہ دوسری بار حاضر ہو جائے گا۔ جیسا کہ اس کے پاس کوئی قوت نہیں کہ وہ اپنا باغ دوسری بار لگا سکے۔ اور نہ اس کے پاس وہ ہے جس کا وہ اپنی کبر سنی کے وقت محتاج ہے اور اس کی اولاد کمزور ہے اور اس سے مستغنی ہے۔

**كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ** اس سے مراد ہے تاکہ تم میری عظمت اور میری ربوبیت کی طرف رجوع کرو اور میرے سوا کسی کو دوست نہ بناؤ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: تاکہ تم دنیا کے زوال اور اس کی فنا اور آخرت کے آنے اور اس کی بقا میں غور و فکر کرو۔

**يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ**

1۔ صحیح بخاری، باب الابراد بالظھر فی شدۃ الحر، حدیث نمبر 502-504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۲۶۷﴾

''اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا۔ یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام امت کو ہے اور یہاں انفاق سے جو معنی مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب، عبیدہ سلمانی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو فرض کی گئی ہے۔ اس میں عمدہ شے کی بجائے ردی اور گھٹیا چیز خرچ کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت براء بن عازب، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے اور لوگوں پر مستحب قرار دیا گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ و خیرات نہ کریں مگر عمدہ اور جید چیز کے ساتھ۔ اور آیت دونوں وجہوں کو شامل ہے لیکن صاحب زکوٰۃ کا تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اسے ردی شے دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرض زکوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے اور رہا نفلی صدقہ تو جس طرح آدمی کے لئے نفلی صدقہ میں قلیل شے دینا جائز ہوتا ہے تو اسی طرح اس کے لئے کم درجے کی شے نفلی صدقہ میں دینا جائز ہوگا اور درہم کھجور سے بہتر اور اچھا ہے۔

اور ندب والوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اِفْعَل کا لفظ (مراد صیغہ امر ہے) ندب و استحباب کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح وہ فرض کی صلاحیت رکھتا ہے اور ردی اور گھٹیا شے دینے سے نفلی صدقہ میں بھی اسی طرح منع کیا گیا ہے جس طرح فرض میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کے لئے عمدہ اور اچھی شے دی جائے۔ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: بئسما علق کتنی ردی شے ہے جو اس نے لٹکائی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ عنقریب یہ مکمل روایت آئے گی۔ اس قول کی بنا پر امر ندب و استحباب پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا انہوں نے مستحب قرار دیا کہ وہ نفلی صدقہ میں اچھی اور عمدہ شے کے سوا کوئی نہ دیں۔

اور جمہور متاولین نے کہا ہے: مِنْ طَیِّبٰتِ کا معنی ہے: عمدہ اور پسندیدہ شے میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔ اور ابن زید نے

1۔ ابن ماجہ، باب النهی أن یخرج الرجل الصدقة شر ماله، حدیث نمبر 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: حلال چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کسب (کمائی) وہ ہوتا ہے جو بدن کی مشقت اور محنت سے حاصل ہو۔ اور یہی اجارہ ہے اس کا حکم آگے آئے گا یا تجارت میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور وہ بیع ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور میراث اس میں داخل ہے کیونکہ غیر وارث نے اسے کمایا ہے، (حاصل کیا ہے)۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابن مبارک سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کچھ کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی کمائی سے ارادہ اور نیت یہ کرتا ہو کہ وہ اس سے صلہ رحمی کرے گا، جہاد کرے گا اور وہ نیکی اور خیر کا کام کرنے لگتا ہے اور اس غرض سے کسب کی آفات اور مشقتوں میں داخل ہو جاتا ہے تو انہوں نے کہا: اگر اس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے اتنی مقدار میں سامان اور قوت موجود ہو جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے روک سکتا ہو (یعنی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت اسے نہ پڑے) تو پھر اس کسب کو ترک کرنا افضل ہے، کیونکہ جب اس نے حلال طلب کیا اور حلال میں ہی خرچ کیا تو اس سے اس کی کمائی کے بارے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے سوال کیا جائے گا اور اسے چھوڑنا زہد ہے کیونکہ زہد حلال چھوڑنے میں ہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اس آیت کے مطابق والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی سے کھا سکتا ہے اور اس لئے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری اولاد تمہاری عمدہ اور اچھی کمائی میں سے ہے۔ پس تم اپنی اولاد کے اموال میں سے خوشی خوشی کھاؤ۔'' (1)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی نباتات، معادن اور رکاز (زمین میں قدرتی طور پر گڑی ہوئی دھاتیں) یہ تین ابواب ہیں۔ یہ آیت ان تینوں کو متضمن ہے۔

پس رہی نباتات، دارقطنی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے سنت جاریہ یہ ہے ''کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہے اور وہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں سے تین سو صاع ہیں۔ اور زمین جو سبزہ وغیرہ اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک قوم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ بے شک یہ آیت عام ہے اور زمین سے قلیل یا کثیر مقدار میں پیدا ہونے والی تمام اقسام کی چیزوں کو شامل ہے اور انہوں نے امر کے ظاہر کو دیکھا کہ وہ وجوب کے لئے ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۂ انعام میں آئے گا۔

اور جہاں تک معدن کا تعلق ہے تو ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جانوروں کا زخم رائیگاں ہے، کنواں ہدر ہے، معدن بھی ہدر ہے اور رکاز میں خمس ہے (2)۔'' تو یہ اس پر دلیل ہے کہ معادن کا

---

1۔ ابوداؤد، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فی الرکاز الخمس، حدیث نمبر 1403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکم رکاز کے حکم کے سوا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معادن اور رکاز کے مابین واؤ فاصلہ کے ساتھ فرق بیان کیا ہے۔ اگر دونوں میں حکم ایک جیسا ہوتا تو آپ فرماتے: معدن ہدر ہے اور اس میں خمس ہے۔ اور جب آپ نے یہ فرمایا: وفی الرکاز الخمس تو اس سے معلوم ہوا کہ رکاز کا حکم معدن کے حکم کے سوا ہے اس بارے میں جو اس سے لیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

رکاز دراصل لغت میں اس سے مراد وہ سونا، چاندی اور جواہرات ہیں جو زمین میں گڑے ہوئے ہوں۔ تمام فقہاء کے نزدیک اسی طرح ہے، کیونکہ وہ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کے بارے میں کہتے ہیں جو معدن میں پائے جاتے ہیں وہ زمین میں گڑے ہوئے ہیں وہ عمل، محنت اور مشقت سے نہیں پائے جاتے، ان میں خمس ہے: کیونکہ وہ رکاز ہے اور امام مالک سے روایت ہے کہ معدن میں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا حکم اس شے کا حکم ہے جس میں عمل اور محنت کی مشقت کی جاتی ہے جو کچھ معدن سے نکالا جاتا ہے وہ رکاز میں داخل ہے۔ پہلا قول ہی آپ کے مذہب کا حاصل ہے اور اسی پر جمہور فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اور عبداللہ بن سعید ابن ابی سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رکاز کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس دن پیدا فرمایا جس دن آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا۔'' یہ عبداللہ بن سعید متروک الحدیث ہیں۔ اسے ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے بھی یہ مروی ہے اور وہ صحیح نہیں ہے، اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ علماء کی جماعت کے نزدیک دور جاہلیت میں لوگوں کے دفن کئے ہوئے اموال بھی رکاز ہیں وہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتے بشرطیکہ اس کا دفن اسلام سے پہلے اموال عادیہ (پرانے اموال) میں سے ہو۔ اور وہ جو زمانہ اسلام کے اموال میں سے ہو تو ان کے نزدیک اس کا حکم لقطہ کے حکم کی مثل ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ رکاز جب پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے بیان کیا ہے: زمانہ جاہلیت کے دفینوں میں سے جو سرزمین عرب میں یا اس ہموار اور جنگلی زمین میں پایا جائے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کی ملکیت میں آئی ہو تو وہ دفینہ اسی کے لئے ہوگا جس نے اسے پایا اور اس میں خمس ہوگا اور جو مسلمانوں کی زمین میں پایا جائے تو وہ لقطہ کی مثل ہوگا۔ مزید فرمایا: اور جو دفینہ جنگ کے علاقے میں پایا جائے تو وہ اس پوری جماعت (لشکر) کے لئے ہوگا جس نے اسے فتح کیا نہ کہ صرف پانے والے کے لئے اور جو کچھ صلح والے علاقے سے پایا جائے تو وہ اس شہر والوں کے لئے ہوگا نہ کہ عام لوگوں کے لئے اور اس میں پانے والے کے لئے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ اہل دار میں سے ہو تو پھر وہ ان کے سوا اس کے لئے ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ تمام صلح کرنے والوں کے لئے ہوگا۔

اسماعیل نے کہا ہے: بلاشبہ رکاز کا حکم مال غنیمت کے حکم کے ساتھ ہے کیونکہ وہ کافر کا مال ہے جسے مسلمان نے پالیا ہے۔ پس اسے اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے جو کافر کو قتل کرے اور اس کا مال لے لے۔ پس اس کے لئے کل مال کے چار خمس ہوں گے۔

ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک ساز و سامان، جواہرات، لوہا، تانبہ اور اسی طرح کی دیگر چیزوں میں جو بطور رکاز پائی جاتی ہیں ان کے بارے کہتے تھے کہ ان میں خمس ہے۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کرلیا اور فرمایا: میں اس میں کوئی شے نہیں

دیکھتا۔ پھر آخری بار جب ہم آپ سے جدا ہوئے تو آپ نے کہا: اس میں خمس ہے۔ اور عموم حدیث کی بنا پر یہی صحیح ہے اور اسی پر جمہور فقہاء ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے ایسے رکاز کے بارے میں جو گھر میں پایا جاتا ہے کہا ہے: بلاشبہ یہ گھر کے مالک کے لئے ہے نہ کہ پانے والے کے لئے اور اس میں خمس بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے کہ وہ پانے والے کے لئے ہے نہ کہ صاحب خانہ کے لئے اور یہی ثوری کا قول ہے اور اگر وہ جنگل میں پایا جائے تو پھر تمام کے قول کے مطابق وہ پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں خمس ہوگا اور ان کے نزدیک صلح اور جنگ کی زمین کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور اسی طرح ان کے نزدیک عرب کی زمین اور دوسری زمین سب برابر ہے اور ان کے نزدیک پانے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا خمس اپنے لئے روک لے جبکہ وہ خود محتاج ہو اور اس کے لئے وہ مساکین کو دینا بھی جائز ہے۔

اہل مدینہ اور اصحاب مالک میں سے کچھ ہیں جو ان میں سے کسی شے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا ہے: برابر ہے رکاز جنگ والی زمین یا صلح کی زمین میں پایا جائے یا سرزمین عرب میں ہو یا علاقہ حرب میں جب وہ کسی ایک کی ملکیت نہ ہو اور نہ کسی ایک نے اس کا دعویٰ کیا ہو تو وہ اپنے پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں ظاہر حدیث کے عموم کی بنا پر خمس ہوگا اور یہی لیث، عبداللہ بن نافع، شافعی اور اکثر اہل علم کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو معادن سے حاصل کی جاتی ہیں اور کانوں سے نکلتی ہیں ان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: سونا یا چاندی میں سے جو کچھ کانوں سے نکلتا ہے اس میں کوئی شے واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ سونا بیس مثقال یا چاندی پانچ اوقیہ ہو جائے۔ پس جب یہ دونوں چیزیں اس مقدار کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور جو مقدار اس سے زائد ہو اس کے حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی ہوگی جب تک وہ معدن میں پائی جائے اور اگر ایک بار وہ ختم ہو جائے اور پھر دوبارہ اس کے بعد پائی جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ شروع کر دی جائے گی اور ان کے نزدیک رکاز کھیتی کی طرح ہے کہ جب کوئی شے نکلے گی تو اسی وقت اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اس پر سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

سحنون نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس کی کئی کانیں ہوں کہ وہ ان میں سے ایک میں جو کچھ ہے اسے دوسری سے حاصل ہونے والی شے کے ساتھ نہیں ملائے گا اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرے گا مگر تبھی جب ان میں سے ہر ایک میں سے دو سو درہم یا بیس دینار حاصل ہوں۔ اور محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: وہ بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے گا اور تمام کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرے گا جیسا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: معدن رکاز کی مثل ہے۔ پس سونے یا چاندی میں سے جو کچھ معدن میں پایا گیا خمس نکالنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس جس نے اپنے ہاتھ سے محنت کے ساتھ وہ شے حاصل کی جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو سال مکمل ہونے پر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر اس پر سال گزر جائے اور

وہ نصاب اس کے پاس ہو۔ یہ تب ہے جب اس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اگر اس کے پاس اس میں سے اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اسے اس کے ساتھ ملا لے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک سال کے دوران جو نفع حاصل ہوگا اسے اپنی جنس کے نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور اصل نصاب پر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہی ثوری کا قول ہے۔

اور مزنی نے امام شافعی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ شے جس میں میں شک کرتا ہوں وہ وہی ہے جو معادن سے نکلتی ہے۔ مزنی نے کہا ہے: ان کی اصل کی بنا پر اولیٰ یہ ہے کہ جو کچھ معدن سے نکلتا ہے وہ فائدہ اور نفع ہو وہ اسے نکالنے کے بعد سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اور لیث بن سعد نے کہا ہے: سونا اور چاندی میں سے جو کچھ بھی معادن سے نکلتا ہے وہ بمنزلہ نفع اور فائدہ کے ہے وہ نئے سرے سے اس پر سال پورا کرے گا۔ اور یہی امام شافعی کا اس بارے میں قول ہے جسے مزنی نے ان کے مذہب سے حاصل کیا ہے۔

اور اس کے بارے میں داؤد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: جب اس پر ایسے مالک کے پاس پورا سال گزر جائے جس کی ملکیت صحیح ہو (تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی) کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے "جس نے مال حاصل کیا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے" اسے ترمذی اور دارقطنی نے بیان کیا ہے۔ (1)

اور انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے عبدالرحمٰن بن انعم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مؤلفۃ قلوب میں سے ایک قوم کو کچھ سونا عطا فرمایا جو ابھی اپنی مٹی میں ملا ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ یمن سے بھیجا تھا۔ (2)

حضرت امام شافعی نے کہا ہے: مؤلفۃ قلوب کا حق زکوٰۃ میں ہے، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ معادن کا طریقہ وہی ہے جو زکوٰۃ کا طریقہ ہے۔ (یعنی ان کے احکام ایک جیسے ہیں۔)

امام مالک کی دلیل حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو معادن قبلیہ (☆) عطا فرمائیں اور یہ الفرع (☆☆) کی طرف میں واقع ہیں اور ان معادن سے آج تک صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ حدیث منقطع الاسناد ہے۔ محدثین اس قسم کی حدیث سے استدلال نہیں کرتے لیکن آپ نے عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور اسے دراوردی نے ربیعہ سے، انہوں نے حارث بن بلال المزنی

1۔ سنن ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 572، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3095، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ القبلیہ (بالتحریک) یہ منسوب ہے قبل کی طرف جو ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے اور مدینہ طیبہ سے پانچ دنوں کے فاصلے پر ہے۔

☆☆ اور الفرع: یہ السقیا سے بائیں جانب ربذہ کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان مکہ کی راہ پر آٹھ برید کا فاصلہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار راتوں کی مسافت ہے۔

سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے ذکر کیا ہے اور اسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو قبلیہ کی ساری کانیں عطا فرمائیں جو وہاں کی بلند زمین میں تھیں اور پست زمین میں تھیں۔ اور قُدس (مشہور پہاڑ) سے وہ زمین عطا فرمائی جو کاشت کی صلاحیت رکھتی تھی اور آپ نے انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔ اسے بزار نے بھی ذکر کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کے ضعف پر اجماع کیا ہے۔ یہ حکم ان چیزوں کا ہے جنہیں زمین نکالے اور عنقریب سورۃ النحل میں ان چیزوں کا حکم آئے گا جو سمندر سے نکلیں کیونکہ وہ بھی زمین کا قسیم ہے اور سورۃ الانبیاء (1) میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی بیان ہوگا: العجماء جَرحها جُبار ہر ایک کا بیان اپنے محل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ تَيَمَّمُوا کا معنی تقصدوا ہے۔ یعنی تم قصد وارادہ نہ کرو۔ عنقریب سورۃ النساء میں عرب اشعار سے اس پر شواہد ذکر ہوں گے کہ التیمم بمعنی القصد ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آیت اس پر دلیل ہے کہ کمائی ہوئی شے طیب اور عمدہ بھی ہوتی ہے اور گھٹیا اور ردی بھی۔ امام نسائی نے حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے اس آیت کے بارے روایت کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ فرمایا: وہ جُعرور اور لون حُبَیق (یہ دونوں کھجور کی انتہائی ردی اور گھٹیا اقسام میں سے ہیں)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو صدقہ میں لینے سے منع فرمایا ہے اور دار قطنی نے حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو ایک آدمی ایسی کچی کھجوروں کا خوشہ لے کر آیا (جن کے پکنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی تھی)...... سفیان نے کہا: یعنی بالکل ناکارہ اور ردی کھجوریں...... تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''یہ کون لے کر آیا ہے؟'' اور کوئی کوئی شے بھی نہیں لاتا ہے مگر وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اسے لے کر آتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جُعرور اور لون الحبُیق سے منع فرمایا کہ ان دونوں (قسموں) کو صدقہ میں لیا جائے زہری نے کہا ہے: یہ دونوں قسمیں مدینہ کی کھجوروں میں سے ہیں (2) ...... اور اسے ترمذی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3) اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

علامہ طبری اور نحاس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَلَا تَاَمَّمُوْا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور حضرت مسلم بن جندب نے وَلَا تُيَمِّمُوْا تاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے تَيَمَّمُوْا یاء کو مشدد پڑھا ہے اور اس لفظ میں کئی لغات ہیں ان میں سے أَمَمْتُ الشَّيْءَ پہلی میم مخفف اور آمَّمْتُهٗ پہلی میم مشدد، اور يَمَّمْتُهٗ اور تَيَمَّمْتُهٗ

1۔ ابوداؤد، ولی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2661، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابوداؤد، باب مالا یجوز من الثمرۃ فی الصدقۃ، حدیث نمبر 1369، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2913، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں۔ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وَلَا تُؤَمِّمُوْا تاء مضمومہ کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ علامہ جرجانی نے کتاب ''نظم القرآن'' میں کہا ہے کہ لوگوں میں سے ایک فریق نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الْخَبِيْثَ پر کلام مکمل ہے۔ پھر خبیث کے وصف میں دوسری خبر کی ابتدا کی اور فرمایا: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور تم ردی چیز نہ لو بجز اس کے کہ تم نرمی کا برتاؤ کرو، گویا یہ معنی لوگوں کے لئے عتاب اور ڈانٹ ہے۔ اور مِنْهُ کی ضمیر الْخَبِيْثَ کی طرف راجع ہے۔ اور الْخَبِيْثَ سے مراد انتہائی گھٹیا اور ردی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: دوسرے فریق نے کہا ہے کہ کلام قول باری تعالیٰ مِنْهُ تک متصل ہے اور مِنْهُ میں ضمیر مَا كَسَبْتُمْ کی طرف راجع ہے۔ اور تُنْفِقُوْنَ کو حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: أنا أخرج أجاهد في سبيل الله۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ یعنی تم اپنے قرضوں اور اپنے حقوق میں سے لوگوں سے نہیں لیتے مگر یہ کہ تم اس بارے میں نرمی کا برتاؤ کرو اور اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دو، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے اور تم اسے (ردی کو) نہ لو اگرچہ تم اسے بازار میں پاؤ کہ اسے بیچا جا رہا ہے مگر یہ کہ وہ تمہارے لئے اس کے ثمن کم کر دے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ دونوں قول آیت کے زکوٰۃ فرضیہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ کیونکہ ردی اور عیب ناک چیز فرض میں کسی بھی حال میں لینا جائز نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی کے طریقہ پر اور نہ اس کے سوا کسی طریقہ پر، البتہ چشم پوشی کے بغیر بھی نفل میں لی جا سکتی ہے۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اگر تمہیں ہدیہ دیا جائے (تو تم ردی شے نہ لو) اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ مگر یہ کہ تم ہدیہ دینے والے سے حیاء کرو اور اس سے وہ شے قبول کر لو جس کی نہ تمہیں حاجت ہے اور نہ وہ شے فی نفسہ کوئی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت کے نفلی صدقہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتا ہے اور ابن زید نے کہا ہے: اور تم حرام چیز نہ لو مگر یہ کہ تم اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں اغماض برتو۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ جمہور کی قراءت اسی طرح ہے۔ یہ اغمض الرجل في امر كذا سے ہے۔ جب آدمی کسی کام میں تساہل اور نرمی برتے اور اپنے بعض حق کے ساتھ راضی ہو جائے اور بعض سے درگزر کر لے اور اسی معنی میں طرماح کا قول ہے:

لم يَفُتْنَا بالوتر قومٌ وللذُّ　　لِّ أناس يَرْضَوْنَ بالإغماضِ

کسی قوم نے وتر کے بارے میں ہمیں فتویٰ نہیں دیا اور سہولت کے لئے لوگ بعض حق کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تغمیض العین سے لیا گیا ہو کیونکہ جو مکروہ اور ناپسندیدہ شے پر صبر کا ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔۔۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

الی کَمْ وکَمْ اشیاءَ منك تُرِیْبُنی　　أُغَمِّضُ عنها لستُ عنها بذی عَمَی

کتنے تک اور تیری طرف سے کتنی اشیاء مجھے شک میں ڈالتی ہیں میں ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں ان سے اندھا نہیں ہوں۔

اور یہ مکروہ کے وقت اِغضاء (آنکھ بند کرنا) کی طرح ہے۔ اور نقاش نے یہی معنی اس آیت میں ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مکی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یا یہ عربوں کے اس قول سے ہے: أغمض الرجل اذا أتی غامضا من الأمر۔ (یعنی جب کوئی کسی کام میں نرمی برتے و کہا جاتا ہے: اغمض الرجل۔ (آدمی نے نرمی کا سلوک کیا۔) جیسا کہ تو کہتا ہے: أعْمَنَ یعنی وہ عُمان آیا۔ اور اَعرق یعنی وہ عراق آیا اور انجد و اغور، یعنی وہ نجد اور غور آیا اور غور سے مراد تہامہ ہے، یعنی وہ اسے لینے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتا ہے۔

زہری نے اسے تاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور ان ہی سے تُغَمِّضُوْا بھی مروی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ، غین کے فتحہ اور میم کے کسرہ اور اس کی شد کے ساتھ۔ پس پہلی قراءت اس معنی کی بناء پر ہے تم اپنے بائع سے اس کا سودا ختم کر دو کہ وہ تمہارا بھاؤ کم کر دے۔

اور دوسری قراءت اور یہی حضرت قتادہ کی قراءت ہے جو کہ نحاس نے ذکر کی ہے۔ یہ معنی ہے کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔ ابوعمرو الدانی نے کہا ہے کہ زہری کی دونوں قراءتوں کا معنی ہے: ''یہاں تک کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔'' اور مکی نے حسن سے بیان کیا ہے: اِلَّاۤ اَنْ تُغْمَضُوْا یعنی میم مشدد اور مفتوح ہے اور قتادہ نے تُغْمَضُوْا بھی قراءت کی ہے یعنی تا کے ضمہ، غین کے سکون اور میم مخفف مفتوح کے ساتھ۔ ابوعمرو الدانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تمہارے لئے اس کی قیمت کم کر دی جائے۔

اسے نحاس نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے اور ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اس حال میں پائے جاؤ کہ تم نے تاویل کے سبب یا نرمی کے سبب معاملے میں چشم پوشی کر لی ہے اور تم نے ادنیٰ چیز اپنے لئے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: احمدت الرجل وجدته محمودًا۔ (میں نے آدمی کی تعریف کی اور میں نے اسے محمود پایا) اسی طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جمہور کی قراءت تجاوز (درگزر کرنے) اور آنکھیں بند کرنے کے معنی دیتی ہے، کیونکہ اَغْمَضَ غَمَضَ کے قائم مقام ہے۔ اور اسی بنا پر معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اسے لینے میں غور وفکر اور تاویل سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آؤ۔ یا تو اس کے حرام ہونے کی وجہ سے ابن زید کے قول کے مطابق اور یا پھر اس لئے کہ ایک ہدیہ ہے یا اسے قرض میں لیا گیا ہے۔

دوسروں کے قول کے مطابق۔
اور مہدوی نے کہا ہے جنہوں نے تُغْمِضُوْا پڑھا ہے تو معنی یہ ہے تم اسے لینے سے اپنی بصیرت کی نگاہیں بند رکھتے ہو۔
جوہری نے کہا ہے: غَمَضْتُ عن فلان کا معنی ہے جب بیع یا شرا کے معاملہ میں تو اس پر نرمی کرے۔ اور چشم پوشی کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ کہا جاتا ہے: أغمِض لی فیما بعتنی۔ (میرے لئے چشم پوشی اور نرمی کی گئی اس میں جو تو نے مجھے بیچی) گویا تو اس سے زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ردی ہونے کے سبب اور اس کے ثمن میں سے کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور أَنْ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے اِلَّا بِأنْ۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۔ اللہ تعالیٰ نے صفت غنی پر متنبہ فرمایا کہ تمہارے صدقات کی اسے کوئی حاجت نہیں۔ پس جو قرب حاصل کرنا چاہے اور ثواب کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ ادا کرے ایسی شے کے ساتھ جو قدر و منزلت والی ہو اور مہتم بالشان ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لئے آگے بھیجتا ہے۔
اور حَمِيْدٌ کا معنی ہے: محمود فی کل حال ہر حال میں تعریف کیا ہوا۔ ہم نے ان دونوں اسموں کے معنی الکتاب الأسنی میں ذکر کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ۔
اور زجاج نے قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ کے تحت کہا ہے: اس نے تمہیں حکم نہیں دیا ہے کہ تم حاجت اور تنگی کے باوجود صدقہ کرو البتہ اس نے تمہارے اخیار اور نیک لوگوں کا امتحان لیا ہے اور وہ ان تمام نعمتوں پر تعریف کیا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾

''شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (وکرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:
**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلشَّيْطٰنُ شیطان اور اس کے مادۂ اشتقاق کا معنی پہلے گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور يَعِدُكُمُ کا معنی ہے: وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ اَلْفَقْرَ تنگدستی سے تاکہ تم خرچ نہ کرو۔
یہ آیت ماقبل سے متصل ہے اور یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کو باز رکھنے میں خاصہ دخل ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ فحشاء (بے حیائی) کا حکم دیتا ہے اور فحشاء سے مراد معاصی اور ان میں خرچ کرنا ہے اور کہا گیا ہے یعنی اس طرح کہ تم صدقہ نہ کرو تم گنہگار ہو جاؤ گے اور آپس میں جدا جدا ہو جاؤ گے اور الفُقْرَ فاء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔
جوہری نے کہا ہے: الفَقْرَ میں ایک لغت الفُقْرَ ہے۔ مثلاً الضُّعف اور الضَّعف۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کلام عرب میں الوعد کا لفظ جب مطلق ہو تو وہ خیر اور بھلائی کے لئے ہوتا ہے اور جب اسے موعود (وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا) کے ساتھ مقید کر دیا جائے تو پھر وہ خیر اور شر دونوں کے لئے مقدر ہو سکتا ہے، جیسا کہ البشارۃ۔ تو اس آیت میں لفظ الوعد اکٹھا دو معنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں دو وعدے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور دو شیطان کی طرف سے۔

اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک شیطان کی جانب سے ایک وسوسہ یہ ہے کہ وہ شر کے ساتھ خوفزدہ کرتا ہے اور حق کی تکذیب کی طرف راغب کرتا ہے اور فرشتے کا القاء یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کی رغبت دلاتا ہے۔ پس جو کوئی اسے پائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسرا انہیں پائے تو اسے چاہیے کہ وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1) اور غیر قرآن میں باء کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ سیبویہ نے شعر کہا ہے:

امرتُك الخير فافعل ما امرتَ به	فقد تركتك ذا مال و ذا نسب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہی کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب نسب چھوڑا ہے۔

اور المغفرۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر دنیا اور آخرت میں پردہ ڈالنا ہے اور فضل سے مراد دنیا میں رزق ہے اور آخرت میں وسعت اور نعمتیں ہیں۔ تمام کے بارے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ نقاش نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ اس بارے میں اس آیت سے مانوس ہوئے ہیں کہ فقر (تنگدستی) غنیٰ (دولتمندی، خوشحالی) سے افضل ہے، کیونکہ شیطان بندے کو نیکی اور خیر سے دور ہٹاتا ہے اور وہ اسے فقر کا خوف دلا کر اس سے دور کرتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت میں کوئی حجت قاطعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ معارضہ قوی ہے اور روایت ہے کہ تورات میں ہے۔ ''میرے بندے میرے رزق سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل وسیع کر دوں گا کیونکہ میرا ہاتھ ہر کشادہ ہاتھ سے زیادہ کشادہ ہے۔'' اور قرآن کریم میں اس کا مصداق یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوشحالی اور وسعت عطا فرماتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے جہاں اسے رکھتا ہے اور وہ غیب وشہادۃ کا علم رکھتا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں ہم نے ان دونوں کا ذکر بھی تمام اسماء میں الکتاب الاسنی میں کیا ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والحمد للہ۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

''عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔''

قولہ تعالیٰ: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرما دیتا ہے۔ یہاں حکمت کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد نبوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے یعنی اس کی فقاہت، نسخ، محکم، غریب اور مقدم و مؤخر آیات کا علم۔ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی سمجھ اور فقاہت ہے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد قول و فعل میں صائب اور درست ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حکمت سے مراد دین میں عقل و فہم کا رکھنا ہے۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی، دین میں فقاہت اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد خشیت ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم میں فہم اور سمجھ رکھنا ہے اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے اور حسن نے کہا ہے: حکمت سے مراد ورع ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ماسوائے سدی، ربیع اور حسن کے اقوال کے آپس میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، کیونکہ حکمت مصدر ہے الاحکام سے اور اس کا معنی ہے: قول یا فعل میں پختہ اور مضبوط ہونا۔ پس کتاب اللہ حکمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی حکمت ہے اور فضیلت میں سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب حکمت ہے۔ دراصل حکمت وہ شے ہے جس کے سبب انسان سفاہت اور بے وقوفی سے باز رہے، پس علم کو حکمت کہا گیا ہے کیونکہ اس کے سبب اس سے روکا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ سفاہت سے باز رہنے کو جانا جا سکتا ہے اور سفاہت سے مراد ہر وہ فعل ہے جو قبیح ہو۔ اور اسی طرح قرآن کریم، عقل اور فہم و فراست (یہ سب حکمت ہیں کیونکہ ان کے سبب سفاہت کے ارتکاب سے باز رہا جاتا ہے۔)

اور بخاری شریف میں ہے: مَنْ يُرِدِ اللہ بِهِ خيرا يفقهه فی الدين (اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر اور بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (اور جسے دانائی عطا کی گئی یقیناً اسے بہت بھلائی دے دی گئی۔ (1)) اور دوبارہ حکمۃ کا لفظ ذکر فرمایا اس کے لئے ضمیر ذکر نہیں فرمائی، اس کا اہتمام کرتے ہوئے اور اس کے شرف و فضل پر تنبیہ کرتے ہوئے جیسا کہ اس کا بیان اس قول باری تعالیٰ کے تحت گزر چکا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا (البقرہ: 59)

---

1۔ صحیح بخاری، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ مروان بن محمد، رفدہ الغسانی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ثابت بن عجلان انصاری نے خبر دی ہے اس نے کہا: بیان کیا جاتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اور جب وہ معلم کو بچوں کو حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے سنتا ہے تو وہ اسے ان سے پھیر دیتا ہے۔ مروان نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ کہا جاتا ہے: بے شک جسے حکمت اور قرآن عطا کر دیئے گئے تحقیق اسے اس سے افضل و اعلیٰ عطا کر دیا گیا جسے پہلی کتابوں اور صحف وغیرہ کا جمیع علم عطا کیا گیا، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاسراء)

اور اسے خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جوامع الکلم ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: جسے علم اور قرآن عطا کیا گیا اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اہل دنیا کے سامنے ان کی دنیا کی وجہ سے نہ جھکے، کیونکہ جو اسے عطا کیا گیا ہے وہ اس سے بہت افضل ہے جو اصحاب دنیا کو دیا گیا ہے (من اعطی العلم والقرآن ینبغی ان یعرف نفسہ ولا یتواضع لاھل الدنیا لأجل دنیاھم فانھا أعطی افضل اصحاب الدنیا) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع قلیل کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النساء: 77)

اور علم اور قرآن کو خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا ہے (2)۔

جمہور نے وَمَنْ يُّؤْتَ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور زہری اور یعقوب نے وَمَنْ يُّؤْتِ تاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (یعنی فعل معروف) اس معنی کی بناء پر و من یؤتِ اللہُ الحکمۃ اور جسے اللہ تعالیٰ دانائی عطا فرما دے۔ اس میں فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ اور مَنْ مفعول اول مقدم ہے اور الحکمۃ مفعول ثانی ہے اور الالباب کا معنی عقول ہیں اور اس کا واحد لب ہے اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

"اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار۔"

یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ عربوں کے رواج میں منتیں کثرت سے مانی جاتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو آدمی بطور نفل اور تبرع فعل کرتا ہے اور ایک وہ جو آدمی اپنے لئے اسے لازم کرنے کے بعد وہ فعل کرتا ہے۔ اور آیت میں وعدہ اور وعید کا معنی موجود ہے، یعنی وہ آدمی جس کی نیت میں اخلاص ہو اسے ثواب دیا جائے گا اور جس نے ریا کاری یا کسی اور معنی مثلاً احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے لئے خرچ کیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اس کا عمل باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے لئے اس میں کوئی معاون و مددگار نہیں پائے گا اور يَعْلَمُهٗ کا معنی ہے وہ اسے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے (ای يُحْصِيْهِ) اور ضمیر واحد ذکر کی حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا، تو نحاس نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

---

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 1، صفحہ 232

نَفَقَةٍ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهَا (یعنی جو تم خرچ کرتے ہو یقینا اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے) اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: وما انفقتم فان اللہ یعلمہ۔ اور اس میں ھا ضمیر ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ سیبویہ نے (امرء القیس کے لئے) کہا ہے:

فَتُوضِحَ فالمِقْرَاةِ لم يَعْفُ رَسْمُها لِما نَسَجَتْها من جَنُوبٍ و شَمَأَلِ

اس میں نسجتھا میں ھا ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ اس پر معطوف ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: يَعۡلَمُهٗ میں واحد ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ دو چیزوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ ارادہ اس کا کیا ہے جسے ذکر کیا گیا ہے یا جسے بیان کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حسین اور اچھا ہے کیونکہ کبھی ضمیر سے مراد وہ تمام ہوتے ہیں جو مذکور ہوتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہوں۔ نذر کی حقیقی تعریف یہ ہے: ھو ما اوجبہ المکلف علی نفسہ من العبادات مما لو لم یوجبہ لم یلزمہ (ان عبادات میں سے وہ عبادت جو مکلف نے اپنے اوپر لازم کی ہو کہ اگر وہ اسے لازم نہ کرتا تو وہ اس پر لازم نہ ہوتی۔) لہٰذا جب کوئی فعل آدمی اپنے ذمہ لازم کر لے تو تو کہتا ہے: نذر الرجل، ینذر ذال کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی۔ اس کے کئی احکام ہیں جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ‌ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

''اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۔''

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفا افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں ایسی طرح نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفا افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گنا ہے۔ فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طرح کا قول رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بالیقین وہ امر توقیفی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فرض نماز کے سوا آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔'' اور یہ اس لئے ہے کہ فرائض میں ریا داخل نہیں ہوتا اور نوافل اس کے نشانے پر ہیں۔

اور امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک وہ آدمی جو قرآن بالجہر پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ بالجہر دیتا ہے اور جو قرآن سراً پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ سراً دیتا ہے۔'' اور حدیث میں ہے۔ سراً صدقہ دینا رب العالمین کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے (1)۔''

ابن عربی نے کہا ہے: اعلانیہ صدقہ کی سری صدقہ پر فضیلت کے بارے میں اور نہ ہی سری صدقہ کی اعلانیہ صدقہ پر فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ پس رہا نفلی صدقہ تو اس کے بارے صراحۃً قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ سراً دینا جہراً دینے سے افضل ہے۔ اس کے بارے ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک اس کا اطلاق غالب کیفیت پر ہے اور اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ صدقہ میں حالات مختلف ہوتے ہیں صدقہ دینے والے کی حالت کے ساتھ، جس کو صدقہ دیا جائے اس کی حالت کے سبب اور ان لوگوں کی حالت کے ساتھ جو صدقہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ رہا صدقہ دینے والا تو اس کے لئے اس میں سنت کے اظہار اور پیشوائی کا ثواب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے لئے ہے جس کی حالت قوی ہو اور اس کی نیت نیک اور اچھی ہو اور وہ اپنے بارے میں ریا سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور رہا وہ آدمی جو اس مرتبہ سے ضعیف اور کمزور ہو تو اس کے لئے سراً صدقہ دینا افضل ہے۔

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے جسے صدقہ دیا گیا ہے تو اسے سری صدقہ لوگوں کے اسے حقیر سمجھنے سے محفوظ کرنے والا ہے اور اس شے کی نسبت سے کہ اس نے غنی اور غیر محتاج ہونے کے باوجود صدقہ لیا ہے اور پاکدامنی کو ترک کر دیا ہے اور رہا لوگوں کا حال تو ان کے اعتبار سے بھی سری صدقہ اعلانیہ سے افضل ہے، اس جہت سے کہ وہ کبھی دینے والے کو ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں اور صدقہ لینے کو اس کا مستحق قرار نہیں دیتے اگرچہ ان کے لئے جہری صدقہ میں دلوں کو صدقہ کی طرف مائل اور راغب کرنے کا سامان بھی ہے لیکن آج کے دور میں یہ بہت قلیل ہے۔

یزید بن حبیب نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ پر صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس وہ سراً زکوٰۃ کی تقسیم کا حکم دے رہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے بالخصوص سلف صالحین کے نزدیک اور علامہ طبری نے کہا ہے: لوگوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ واجب صدقہ میں اظہار افضل ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا الطبری نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ مطلقاً صدقات میں اخفا اولیٰ ہے اور یہ فقیر کا حق ہے اور صاحب مال کے لئے جائز ہے کہ وہ صدقات بذات خود تقسیم کرے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا ایک قول ہے اور ان کے دوسرے قول کے مطابق انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں صدقات سے مراد نفلی صدقات ہیں نہ کہ وہ فرض جسے ظاہر کرنا اولیٰ ہے تاکہ اسے کوئی تہمت لاحق نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفلی نماز انفرادی طور پر پڑھنا افضل ہے (یعنی بغیر جماعت کے) اور فرض نماز میں جماعت تہمت سے دور رکھنے والی ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: آیت سے مراد فرض زکوٰۃ بھی ہے اور نفلی صدقات بھی۔ پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ

1۔ طبرانی، الکبیر، حدیث 8014

مقدس میں اخفا افضل تھا پھر اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور گمان غلط ہو گئے تو علماء نے فرائض میں اظہار کو مستحسن قرار دیا تا کہ کسی کے بارے عدم ادائیگی کا گمان نہ کیا جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول آثار و روایات کے خلاف ہے اور یہ ہمارے زمانے میں فرض صدقہ میں اخفا کے مستحسن ہونے کو مشتبہ کرتا ہے اور اس کے مانع کثیر ہیں اور اسے اعلانیہ نکالنا ریا کے لئے پیش کرنا ہو گا۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آیت سے فرض زکوٰۃ اور نفل صدقہ مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخفا کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے اور اظہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی بھی مدح کی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دونوں کی طرف اکٹھا متوجہ ہوا جائے۔

اور نقاش نے کہا ہے: بے شک اس آیت کو اس قول باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا ہے: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً الآیہ (البقرہ:274) (جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ (تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس)

قولہ تعالیٰ: فَنِعِمَّا هِيَ۔ یہ اظہار صدقہ پر تعریف ہے۔ پھر اس پر یہ حکم لگایا کہ اظہار سے اخفا بہتر ہے اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے جب تو نیکی کرے تو اسے مخفی رکھ اور جب تیرے ساتھ نیکی کی جائے تو تو اسے پھیلا' (اذا اصطنعت المعروف فاسترہ و اذا اصطنع الیک فانشرہ)

دعبل الخزاعی نے کہا ہے:

اذا انتقموا اعلنوا امرهم وان أنعموا انعَمُوا باكتتام

جب وہ انتقام لیتے ہیں تو اپنے معاملے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اگر وہ نیکی اور احسان کریں تو وہ نیکی خاموشی اور پوشیدہ طور پر کرتے ہیں۔

اور سہل بن ہارون نے کہا ہے:

خل اذا جئته يوما لتسأله اعطاك ماملكت كفاه و اعتذرا

تو چھوڑ دے جب تو کسی دن مانگنے اور سوال کرنے کے لئے اس کے پاس آئے اس نے تجھے وہ عطا کر دیا ہے جس کا تو مالک ہے تو اسے کافی سمجھ اور اس کا عذر قبول کر لے۔

يخفي صنائعه والله يُظهرها ان الجميل اذا اخفيته ظَهَرَا

وہ اپنے کارناموں کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکی کو جب تو مخفی رکھے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی نیکی تین خصلتوں کے سوا مکمل نہیں ہوتی: اسے جلدی کرنا، اسے صغیر سمجھنا اور اسے مخفی رکھنا، جب تو نے اسے جلدی کر لیا تو تو نے اسے حاصل کر لیا اور جب تو نے اسے چھوٹا سمجھا تو تو نے اسے عظیم بنا دیا اور جب تو نے اسے مخفی رکھا تو تو نے اسے مکمل کر دیا اور بعض شعراء نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

زاد معروفك عندي عِظَما انه عندك مستور حقير

تیری نیکی میرے نزدیک بہت عظیم اور بڑی ہے بلاشبہ وہ تیرے نزدیک چھپی ہوئی اور حقیر ہے۔

تتناساہ کأن لم تأتہ ... و ھو عند الناس مشھور خطیر

تو اسے بھلا دیتا ہے گویا تو نے اسے کیا ہی نہیں حالانکہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مشہور ہوتی ہے۔

قراء نے قول باری تعالیٰ فَنِعِمَّاھِیَ میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو اور نافع نے ورش کی روایت میں، عاصم نے روایت حفص میں اور ابن کثیر نے فَنِعِمَّاھِیَ کو نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے بھی اور نافع نے ورش کی روایت کے سوا میں اور عاصم نے ابوبکر اور مفضل کی روایت میں فَنَعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام نے میم کو ساکن کیا ہے۔

اور قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں فَنِعْمَ مَاھِی پڑھنا بھی جائز ہے۔

نحاس نے کہا ہے لیکن چونکہ یہ سواد میں متصل ہے اس لئے ادغام لازم ہے۔

علمائے نحو نے نِعْمَ میں چار لغات بیان کی ہیں: نَعِمَ الرجلُ زیدٌ، یہ اصل ہے اور نِعِمَ الرجل یعنی عین کے کسرہ کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ اور نَعْمَ الرجل یعنی نون کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ۔ یہ اصل میں نَعِمَ تھا کسرہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور نِعْمَ الرجلُ اور یہ افصح اللغات ہے، اس میں بھی اصل نَعِمَ ہے۔ اور یہ ہر مدح اور تعریف کے محل میں واقع ہوتا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور عین کا کسرہ نون کو دے دیا گیا اور عین کو ساکن کر دیا گیا۔

اور جنہوں نے فَنِعِمَّاھِیَ پڑھا ہے تو اس کی دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جو نِعِم کہتے ہیں اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ یہ جید اور عمدہ لغت پر ہو۔ پس اصل نِعْمَ ہوگا۔ پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے عین کو کسرہ دے دیا گیا۔ نحاس نے کہا ہے کہ ابو عمرو اور نافع سے عین کے ساکن ہونے کے بارے جو قول بیان کیا گیا ہے وہ محال ہے۔ محمد بن یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر عین ساکن ہو اور میم مشدد ہو تو کوئی بھی اسے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ دو ساکنوں کو جمع کرنے کا قصد کرے گا اور حرکت دے گا اور اس کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

اور ابوعلی نے کہا ہے: جس نے عین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے دو ساکنوں کو جمع کر دیا ہے اور ان میں سے پہلا حرف مد و لین نہیں ہے اور وہ نحویوں کے نزدیک تب جائز ہوتا ہے جب کہ پہلا حرف مدہ ہو، کیونکہ مد حرکت کے عوض ہوتی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دابّۃ اور ضَوَّال وغیرہ، شاید ابو عمرو نے حرکت کو مخفی رکھا ہے اور اسے پر کئے بغیر پڑھا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بَارِئِکُمْ ...... اور یَأمُرُکُمْ میں اخفا کیا ہے اور سامع نے سمع اور خفا میں لطف کے سبب اخفا کو اسکان گمان کر لیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے اور جنہوں نے نَعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کو اپنے اصل پر لائے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

ما أقلتْ قدمایَ اِنَّھُمْ ... نَعِمَ الساعون فی الأمر المُبِر

میرے قدم کمزور نہیں ہیں بلاشبہ وہ نیکی کے معاملہ میں کوشش اور سعی کرنے والے بہت اچھے ہیں۔

ابوعلی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: نِعِمَّا میں ما محل نصب میں ہے اور قولہ ھِیَ یہ اس فاعل کی تفسیر ہے جو اس سے پہلے مضمر مذکور ہے۔ اور تقدیر عبارت نعم شیئا ابداؤہ (اسے ظاہر کرنا کتنی اچھی شے ہے) اور الابداء ہی مخصوص بالمدح ہے، مگر مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ دلالت کرتا ہے یعنی الاخفاء خیر۔ بس جس طرح یہاں ضمیر اخفا کے لئے ہے صدقات کے لئے نہیں ہے۔ پس اسی طرح پہلا فاعل وہ الابداء ہے اور وہی ہے جس کے ساتھ ضمیر متصل ہے، پھر الابداء کو حذف کر دیا گیا اور صدقات کی ضمیر کو اسی کی مثل اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔

وَ اِنْ تُخْفُوْهَا یہ شرط ہے، اسی لئے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور وَ تُؤْتُوْهَا کو اس پر عطف کیا گیا ہے اور جواب شرط فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ يُكَفِّرُ قراء نے اس کی قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابوعمرو، ابن کثیر اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں، قتادہ اور ابن ابی اسحاق تمام نے وَ نُكَفِّرُ نون اور را کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور (نافع)، حمزہ اور کسائی نے نون کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح حضرت عاصم سے بھی مروی ہے اور حسین بن علی الجعفی نے اعمش سے روایت کیا ہے يُكَفِّرَ یعنی را کو منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر نے یا کے ساتھ اور را کو مرفوع پڑھا ہے اور اسے حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حسن سے بھی مروی ہے اور ان سے یا اور جزم کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ تُكَفِّرُ یعنی تا کے ساتھ، فا کو کسرہ کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عکرمہ نے وَ تُكَفَّرْ پڑھا ہے یعنی تا کے ساتھ اور فا کو مفتوح اور را کو مجزوم...... اور مہدوی نے ابن ہرمز سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے وَ تُكَفِّرُ تا کے ساتھ اور را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عکرمہ اور شہر بن حوشب سے بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے تا کے ساتھ اور را کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس یہ نو قراءتیں ہیں میں انہیں بیان کرتا ہوں۔ وَ نُكَفِّرُ یعنی نون اور رفع کے ساتھ۔ یہ امام خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے کہ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں رفع کی ایک ہی وجہ ہے اور وہی جید اور عمدہ ہے کیونکہ فا کے بعد کلام غیر جزا کے قائم مقام ہوتا ہے اور معنی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جزم کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے: وان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء یکن خیرا لکم و نکفر عنکم (اور اگر تم صدقوں کو پوشیدہ رکھو اور انہیں فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور ہم تم سے بعض گناہ مٹا دیں گے۔)

اور ابوحاتم نے کہا ہے: اعمش نے پڑھا ہے يُكَفِّرْ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے واؤ نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جو ابوحاتم نے اعمش سے بغیر واؤ کے جزم کے ساتھ بیان کیا ہے تو وہ بدل کے طور پر ہے گویا وہ فا کے محل میں ہے اور وہ جو عاصم سے وَ يُكَفِّرُ یا اور رفع کے ساتھ مروی ہے اس کا معنی ہے: وَ يُكَفِّرُ الله (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور ابوعبید کا قول ہے۔ اور ابوحاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یکفر الاعطاء (یعنی صدقہ دینا مٹا دے گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ تُكَفِّرُ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا اور صدقات مٹا دیں گے۔ المختصر یہ کہ ان قراءتوں میں سے جو نون کے ساتھ ہیں تو

وہ نواں نون عظمت ہے اور جو تا کے ساتھ ہیں تو ان سے مراد صدقہ ہے۔ پس تو اسے یاد کر لے۔ سوائے اس کے جو عکرمہ سے فا کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے کیونکہ اس قراءت میں تا وہ سیئات کے لئے ہے اور ان میں سے جو قراءت یا کے ساتھ ہے تو اس میں مٹانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خفیۂ صدقہ دینا بھی انہیں مٹانے والا ہے اسے مکی نے بیان کیا ہے۔

اور رہا را کا رفع تو اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل مبتدا کی خبر ہو اور تقدیر کلام ہو: و نحن نکفر یا وھی تکفر۔ یعنی صدقہ مٹا دے گا۔ یا واللہ یکفر (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور دوسری وجہ قطع اور استئناف ہے واؤ عاطفہ اشتراک کے لئے نہ ہوگی بلکہ جملہ کلام کو جملہ پر عطف کیا جائیگا۔ اور ہم نے جزم کی قراءت کا معنی ذکر کر دیا ہے اور جہاں تک نصب کا تعلق ہے وَ نُکَفِّرَ تو یہ ضعیف ہے اور یہ ان مضمرہ کی بنا پر ہے اور یہ بعد کی بنا پر جائز ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ جواب استفہام میں نصب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ جزا کے ساتھ غیر کے وجوب کے سبب شے واجب ہوتی ہے جیسا کہ استفہام۔ ان قراءتوں میں را پر جزم افصح ہے، کیونکہ یہ تکفیر کے جزا میں داخل ہونے کی خبر دیتی ہے اور اس کے مشروط ہونے کی (اس شرط کے ساتھ) کہ اگر اخفا واقع ہو اور جہاں تک رفع کا تعلق ہے تو اس میں یہ معنی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ اختلاف ہے جسے خلیل اور سیبویہ نے اختیار کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ میں مِنْ صرف تبعیض کے لئے ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ان سے خطا ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یہ وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

''نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ۔ یہ کلام صدقات کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، تو گویا اس میں مشرکین کو صدقہ دینے کے جواز کو بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں مرسل روایت بیان کی ہے کہ مسلمان ذمی لوگوں میں سے فقراء کو صدقہ دیتے رہتے تھے۔ جب مسلمان فقراء زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تتصدقوا الا علی اھل دینکم تم اپنے اہل دین کے سوا کسی کو صدقہ نہ دو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جو ان کے لئے صدقہ مباح کر رہی ہے جو دین اسلام پر نہیں ہیں۔

اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صدقات لائے جاتے تھے۔ پس ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ عطا فرمائیے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیس لك من صدقة المسلمين شئ (تیرے لئے مسلمانوں کے صدقہ میں سے کوئی شے نہیں ہے۔) پس وہ یہودی ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا تو یہ آیت نازل ہو گئی: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے مال عطا فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آیت صدقات کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: انصار میں سے کچھ لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں اور وہ انہیں اس تصور اور رغبت کے تحت صدقات نہیں دیتے تھے کہ جب وہ محتاج ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے۔ پس یہ آیت ان کے سبب سے نازل ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے دادا ابو قحافہ کو کچھ دے پھر وہ اس سے رک گئیں اس لئے کہ وہ کافر ہیں۔ تب اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صدقہ روکنے سے مقصود یہ تھا تاکہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور دین میں داخل ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ (ان کو سیدھی راہ پر چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ماقبل سے متصل نہیں ہے۔ پس یہ صدقات کے بارے میں اور انہیں کفار پر خرچ کرنے کے بارے میں ظاہر ہے بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ابتدائے کلام ہو۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ صدقہ جو ان کے لئے مباح کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ آثار اسے متضمن ہیں یہ نفلی صدقہ ہے اور جہاں تک فرض زکوٰۃ کا تعلق ہے تو وہ کسی کافر کو دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: "مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں (1)۔" ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ تمام جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ذمی کو مالوں کی زکوٰۃ میں سے کوئی شے نہ دی جائے گی، پھر انہوں نے ان میں سے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے بیان کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے: مسلمانوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس آیت کے تحت اپنے مشرک قرابتداروں کو فرض زکوٰۃ میں سے دیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ بالا جماع مردود ہے۔ واللہ اعلم۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ صدقہ پاک کرنے والا اور واجب ہے لہٰذا کسی کافر کو نہیں دیا جائے گا جیسا کہ چوپائے اور عمدہ مال کا صدقہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اغنوهم عن سوال هذا اليوم تم انہیں اس دن یعنی عید الفطر کے دن سوال کرنے سے غنی کر دو۔ (یعنی تم انہیں اتنا دے دو کہ وہ اس دن سوال کرنے کے محتاج نہ رہیں۔)

---

1۔ صحیح بخاری، باب ما جاء في العلم، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے عید اور نماز عید میں مشغول ہونے کے سبب ہے اور یہ مشرکین میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور صدقہ فطر غیر مسلم کو دینا ان کے قول کے مطابق جائز ہے جنہوں نے اسے سنت قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک دوقولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے وہ آیت کو نیکی، کھانا کھلانے اور صدقات کے اطلاق میں عام قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ حکم ان مسلمانوں کے لئے متصور ہے جو اہل ذمہ کے ساتھ اور اہل حرب میں سے جنہیں غلام بنایا گیا ہے ان کے ساتھ ہیں۔

میں کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا۝ (الدہر) (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔)

اور اسیر (قیدی) دارالاسلام میں ہوتا ہے اور وہ مشرک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔)

پس ان آیات کا ظاہر انہیں جملہ صدقات دینے کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرض زکوٰۃ کو خاص کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''ان کے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ لو اور ان کے فقراء پر لوٹا دو (1)۔'' اور اس پر علماء نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وہ محتاج ہوں تو انہیں نفلی صدقات میں سے دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا گنہگار مسلمان تو اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسے صدقہ فطر دیا جائے گا مگر جب وہ ارکان اسلام نماز، روزہ وغیرہ کو چھوڑ دے تو پھر اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تمام گنہگار جو کہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں مسلمانوں میں سے شامل ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اور صحیح مسلم میں ہے (2) کہ وہ آدمی جس نے کسی غنی، چور اور زانی کو صدقہ دیا اور اس کا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ اس کا بیان آگے آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اس میں قدریہ اور معتزلہ کے گروہوں کا رد ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس آیت میں خَيْرٍ سے مراد مال ہے، کیونکہ یہ انفاق کے ذکر سے مقترن ہے اور یہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مال ہے اور جہاں ایسے قرینہ سے مقترن نہ ہو جو اس سے مراد مال ہونے پر دلالت کرتا ہو تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ مال کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب اذا تصدق علی غنی وھو لا یعلم، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معنی میں ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان:24) اور مزید ارشاد ہے: مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ (الزلزلۃ) الی غیر ذالک۔ اور یہ عکرمہ کے اس قول سے پرہیز اور احتیاط کرتا ہے کہ کتاب اللہ میں جہاں کہیں لفظ خیر ہے وہ مال کے معنی میں ہے۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ بعض علماء بہت سی نیکیاں کرتے ہیں پھر حلف اٹھا دیتے ہیں کہ اس نے کسی کے ساتھ خیر (نیکی) نہیں کی۔ تو اس بارے میں اسے کہا جائے تو وہ کہتا ہے: بلاشبہ میں نے اپنے ساتھ یہ عمل کیا ہے اور یہ آیت تلاوت کرتا ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ نفقہ جو قبولیت کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ اور ابْتِغَآءَ یہ مفعول لہ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے شہادت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور یہ آیت ان کی فضیلت اور مدح کے محل میں وارد ہوئی ہے اور پہلی تاویل کی بنا پر یہ ان پر شرط عائد کرنا ہے اور پھر یہ شرط ان کے علاوہ پوری امت کو شامل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: انك لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله تعالیٰ الا اجرت بها حتی ما تجعل فی فی امرأتك(1) (بلاشبہ تو ہرگز کوئی نفقہ خرچ نہیں کرے گا جس سے تو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے گا مگر تجھے اس کے عوض اجرت دی جائے گی یہاں تک کہ جو کچھ تو اپنی بیوی کے منہ میں بھی ڈالے گا۔)

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ، يُوَفَّ اِلَيْكُمْ یہ قول باری تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ کے لئے تاکید اور بیان ہے اور یہ کہ خرچ کرنے والوں کو خرچ کرنے کا ثواب پورا پورا دیا جائے گا اور اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ پس یہی کمی ان کے لئے ظلم ہوگی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

''(خیرات) ان فقیروں کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں۔ خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے۔ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ۔ اس میں لام وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ کے متعلق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر 54، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت ہے: الانفاق او الصدقة للفقراء۔ سدی، مجاہد وغیر ہما نے کہا ہے: ان فقراء سے مراد فقراء مہاجرین ہیں جو قریش اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ آیت ہر اس کو شامل ہے جو مستقبل میں فقراء کی صفت کے تحت داخل ہوگا اور مہاجرین فقراء کو ذکر کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ وہاں ان کے سوا کوئی (فقیر) نہ تھا۔ اور یہ فقراء اہل صفہ تھے اور تقریباً چار سو افراد تھے، وہ فقر و افلاس کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے نہ ان کے اہل و عیال تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال تھا۔ پس ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایک صفہ (سایہ دار چبوترہ) تعمیر کیا گیا۔ پس ان کو اہل صفہ کہا گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں اہل صفہ میں سے تھا جب شام ہوتی تھی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر حاضر ہوتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر آدمی کو حکم ارشاد فرماتے تھے اور وہ ایک آدمی کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور اہل صفہ میں سے جو باقی رہ جاتے وہ دس یا اس سے کم افراد ہوتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا شام کا کھانا لے آتے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا تناول کر لیتے اور جب ہم فارغ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ناموا فی المسجد مسجد میں جا کر سو جاؤ۔''

اور ترمذی نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: (یہ آیت) وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے مالک تھے، فرمایا: ہر آدمی اپنے درخت سے اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ یا کم کھجوریں لاتا تھا اور کوئی آدمی ایک خوشہ اور دو خوشے لے کر آتا تھا اور انہیں مسجد میں لٹکا دیتا تھا اور اہل صفہ کے لئے کوئی کھانے کی شے نہ ہوتی تھی تو ان میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تھی تو وہ اس خوشے کے پاس آتا، اسے اپنا عصا مارتا، تو اس سے خشک اور پکی کھجوریں گر پڑتی اور وہ کھا لیتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی اور عمدہ شے میں رغبت نہ رکھتے تھے اور وہ ایسا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور گھٹیا قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ اور کوئی ایسا خوشہ لے کر آتا جو ٹوٹا ہوا ہوتا اور وہ اسے مسجد میں لٹکا دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو ایسا ہدیہ دیا جائے جیسا اس نے دیا ہے تو وہ اسے نہ لے گا مگر چشم پوشی کرتے ہوئے اور حیاء کرتے ہوئے۔ فرمایا: پس اس کے بعد ہم میں سے ہر آدمی وہی لاتا تھا جو اس کے پاس عمدہ اور اچھی شے ہوتی تھی۔ فرمایا: یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں ضرورت کے تحت رہتے تھے اور ضرورت کے تحت ہی صدقہ وغیرہ کھاتے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے وہ اس حالت سے مستغنی ہو گئے اور نکل گئے پھر وہ مالک بن گئے اور حاکم بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فقراء مہاجرین کے وہ احوال بیان کئے جو ان پر واپس مڑنے کو واجب کرتے ہیں اور فرمایا: الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور معنی ہے وہ جو روک دیئے گئے۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا معنی ہے: جنہوں نے اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے اپنے کاروبار میں تصرف کرنے

سے روک لیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ وہ زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کیونکہ تمام شہر مکمل طور پر کفر کے زیر تسلط ہیں اور یہ ابتدائے اسلام میں تھا اور انہیں اکتساب دولت سے باز رکھنے کی علت جہاد تھا اور کفار کا اسلام قبول کرنے سے انکار کرنا کاروبار تجارت میں تصرف کرنے سے مانع تھا۔ نتیجتاً وہ فقراء ہی باقی رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ کا معنی ہے یعنی کیونکہ انہوں نے جہاد کو لازم پکڑ لیا ہے اور پہلا معنی زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ یعنی بے شک ان کے سوال کرنے اور مانگنے کو چھوڑنے اور ترک کرنے کے سبب اور ان کے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے سبب ناواقف لوگ انہیں مالدار اور اغنیاء گمان کرتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ لفظ فقر کا اطلاق اس پر بھی کرنا جائز ہے جس کا لباس بہت قیمتی ہو اور وہ اسے زکوٰۃ دینے سے مانع نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زکوٰۃ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وہ ان مہاجرین میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے تھے نہ وہ مریض تھے اور نہ ہی اندھے۔ اور التَّعَفُّفِ یہ تفعل کے وزن پر ہے اور یہ عفّ من الشیٔ سے مبالغہ کا وزن ہے جب کوئی اس شے سے رکا رہے اور اس کی طلب سے احتیاط برتے۔ اس معنی کے ساتھ حضرت قتادہ وغیرہ نے تفسیر بیان کی ہے اور یحسبھم میں سین کو فتحہ اور کسرہ دونوں دیئے گئے ہیں اور یہ دو لغتیں ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: فتحہ زیادہ قیاس کے مطابق ہے کیونکہ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے۔ پس اس کا باب مضارع میں مفتوح آتا ہے اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا اچھا اور حسین ہے۔ کیونکہ سماع اسی طرح ہے۔ اگرچہ یہ قیاس کے مقابلہ میں شاذ ہے اور مِنَ التَّعَفُّفِ میں مِنَ ابتدائے غایت کے لئے ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ بیان جنس کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ شکل و صورت سے کسی پر جو آثار ظاہر ہوتے ہیں ان کا اعتبار میں خاصا اثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب ہم کسی میت کو دار الاسلام میں دیکھیں اور اس پر زنار ہو (مراد وہ دھاگا سا ہے جو ذمی لوگ اپنی کمر میں باندھتے ہیں) اور وہ غیر مختون ہو تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق اسے دار کے حکم پر آگے کر دیا جائے گا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: 30) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے)

پس یہ آیت ایسے آدمی کو صدقہ دینا جائز ہونے پر دلیل ہے جس کے پاس اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے لباس، کپڑے وغیرہ موجود ہوں۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس مقدار میں انہوں نے اختلاف کیا ہے جو ضرورت مند ہونے کی صورت میں وہ لے سکتا ہے۔ پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مقدار کا اعتبار کیا ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سال کی خوراک کا اعتبار کیا ہے اور امام مالکؒ نے چالیس درہم کا اعتبار کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کمانے والے کو زکوٰۃ کا مصرف قرار نہیں دیتے۔

اور السیما (الف مقصورہ کے ساتھ) اس کا معنی علامت، نشانی ہے اور کبھی اسے مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور کہا جاتا

ہے: السِّیْمَاء۔ اور یہاں اس کے معنی کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد خشوع اور تواضع ہے۔ سدیؒ نے کہا ہے: ان کے چہروں پر حاجت اور فاقہ کشی اور تنگدستی کا اثر مراد ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ان کے کپڑوں کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے اور ایک قوم نے کہا ہے اور اسے مکی نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سجدوں کا اثر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فارغ اور توکل کرنے والے لوگ تھے ان کا زیادہ تر نماز کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ لہٰذا ان پر سجدوں کے نشانات تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ سیما جس سے مراد سجدوں کا اثر ہے اس میں تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشترک ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے: سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح: ۲۹) (ان (کے ایمان وعبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔)

لہٰذا اس معنی میں تو ان کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ پس کوئی معنی باقی نہ رہا مگر یہ کہ سیما سے مراد فقر و افلاس اور حاجت مند ہونے کا اثر ہو یا پھر سجدوں کے نشانات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں، وہ رات کے قیام اور دن کے روزوں کی وجہ سے چہروں کی زردی سے پہچانے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور رہا خشوع! تو اس کا محل دل ہے اور اس میں غنی اور فقیر سب مشترک ہوتے ہیں، نتیجتاً جو معنی ہم نے اختیار کیا ہے اس کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ والموفق الالہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ الحاف مصدر ہے جو حال کے محل میں واقع ہے، یعنی معنی ولحفین۔ کہا جاتا ہے: ألحف، أحفٰی اور ألَحَّ سوال میں اصرار کرنے کے معنی میں برابر ہیں اور کہا جاتا ہے۔ و لیس لِلْمُلْحِف مِثْلُ الرَّد۔

اور الالحاف اللحاف سے مشتق ہے۔ سوال کرنے اور مانگنے میں وجوہ طلب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے جیسا کہ اللحاف ڈھانپنے کے معنی کو شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ سائل عوام الناس سے اپنا سوال کرتا ہے اور اپنے سوال میں خوب اصرار کرتا ہے (گویا وہ ان کے ساتھ لپٹ کر سوال کر رہا ہے) اسی معنی میں ابن احمر کا یہ قول ہے:

فظلّ يَحُفُّهُنَّ بقفقفيه و يَلْحَفُهُنَّ هَفْهافا ثخينا

شاعر شتر مرغ کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ انڈوں کو اپنے پیروں کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور وہ ان پر اس طرح پر ڈال لیتا ہے جیسا کہ لحاف اور وہ اپنے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا باریک ہوتا ہے۔

نسائی اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یا دو کھجوریں اور ایک یا دو لقمے دیئے جاتے ہیں بلکہ مسکین تو پاکدامن بننے والا (سوال کے لئے ہاتھ نہ پھیلانے والا) ہے اگر چاہو تو یہ پڑھ لو لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔

1۔ صحیح بخاری، باب لا یسئلون الناس الحافا، حدیث نمبر 4175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: پس ایک گروہ نے کہا ہے جن میں طبری اور زجاج ہیں کہ اس کا معنی ہے: وہ قطعاً سوال نہیں کرتے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ سوال سے کلی طور پر بچتے اور پاکدامن رہتے ہیں۔ یہی موقف جمہور مفسرین کا ہے اور پاکدامنی کی صفت ان کے لئے ثابت ہوتی ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے نہ اصرار کے ساتھ اور نہ بغیر اصرار کے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد الحاف کی نفی ہے، یعنی وہ اصرار اور لپٹے بغیر تو سوال کرتے رہتے ہیں اور یہ فہم کے زیادہ قریب اور اس میں جلدی آنے والی شے ہے اور اس میں اس کی بری حالت پر تنبیہ ہے جو لوگوں سے لپٹ کر سوال کرتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ امام مسلم کے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سوال میں اصرار نہ کرو قسم بخدا! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا تو اس کا سوال اس کے لئے مجھ سے کوئی شے نکال لاتا ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں، پس اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی جو کچھ میں نے اسے عطا کیا۔''

اور مؤطا میں ہے، حضرت زید بن اسلم نے حضرت عطاء بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے تو میرے گھر والوں نے مجھے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا اور آپ سے ہمارے لئے کوئی چیز لے آتا کہ ہم اسے کھائیں اور وہ اپنی حاجت اور ضرورت ذکر کرنے لگے۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کو سوال کرتے ہوئے پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرما رہے تھے: لا أجد ما اعطیك میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جو میں تجھے دوں۔ وہ آدمی آپ سے پیٹھ پھیر کر لوٹا اس حال میں کہ وہ بڑے غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا مجھے اپنی عمر کی قسم بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ مجھ پر غصے ہو رہا ہے کہ میں نے اسے دینے کے لئے کوئی شے نہیں پائی۔ تم میں سے جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) یا اس کے برابر (سامان) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار اور لپٹ کر سوال کیا۔''

اسدی نے کہا ہے: پس میں نے کہا ہمارے لئے تو دودھ دینے والی ایک اونٹنی اوقیہ سے بہتر ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں...... اس آدمی نے بیان کیا تو میں واپس لوٹ گیا اور میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا، پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو اور کشمش لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے لئے تقسیم فرمادیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی فرمادیا۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے اسی طرح اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ہشام بن سعد وغیرہ نے ان کی اتباع کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور علماء کے نزدیک جب صحابی کا نام نہ لیا جائے تو اس کا حکم کسی دوسرے آدمی کے حکم کی طرح نہیں ہے جب اس کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ تمام صحابہ کرام سے جرح اٹھ چکی ہے اور ان کے لئے عدالت ثابت ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت

کرتی ہے کہ اس کے لئے سوال کرنا مکروہ ہے جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی ہو۔ پس جس نے سوال کیا اس میں کہ اس کے پاس یہ حد ہو اور اتنی مقدار اور تعداد میں چاندی یا وہ شے ہو جو اس کے قائم مقام ہوتی ہے اور وہ اس کے مساوی ہو تو وہ مُلْحِف ہے (یعنی لپٹ کر سوال کرنے والا ہے) اور میں اہل علم میں سے کسی کو نہیں جانتا مگر ہر کوئی اس کے لئے سوال کو مکروہ قرار دیتا ہے جس کے پاس اتنی مقدار میں چاندی ہو یا اس کے مساوی سونا ہو۔ یہ حکم اس حدیث کے ظاہر کی بنا پر ہے اور جو شے بغیر سوال کے کسی کے پاس آ جائے تو اس کے لئے اسے کھانا جائز ہے اگر وہ زکوٰۃ میں سے نہ ہو۔ اور یہ ان (مسائل) میں سے ہے جس میں میں کسی اختلاف سے واقف نہیں اور اگر وہ شے مال زکوٰۃ میں سے ہو تو اس میں اختلاف ہے اس کا بیان آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: سوال کے معانی اور اس کی کراہیت کے بارے میں فقہاء کے جوابات اور اہل ورع کا مذہب بیان کیا گیا ہے اس میں سے احسن ترین وہ ہے جسے اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ آپ سے سوال کرنے کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کب حلال ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب اس کے پاس اتنی شے بھی نہ ہو جس سے وہ اپنی صبح اور شام کا کھانا تیار کر سکے۔ یہ حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ہے (1)۔ ابو عبداللہ (یہ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ہے) کو کہا گیا اگر وہ سوال کرنے پر مجبور ہو جائے، تو آپ نے فرمایا: جب وہ مجبور ہو جائے تو اس کے لئے مانگنا مباح ہے پھر کہا گیا: اور اگر وہ مانگنے سے باز رہے تو؟ آپ نے فرمایا: یہ اس کے لئے بہت بہتر ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں کسی کے بارے یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ بھوک سے مرجائے گا! اللہ تعالیٰ اسے اس کا رزق ضرور عطا فرمائے گا۔ (ما اظن أحدا یموت من الجوع! اللہ یاتیہ برزقہ) پھر آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی: مَن استعفف اعفہ اللہُ (2) جو پاکدامنی کا طالب ہوا اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن کر دے گا (یعنی جو سوال سے رکا رہا اللہ تعالیٰ اسے اس سے محفوظ کر دے گا۔)

اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تَعَفَّفْ تو پاکدامن رہ (یعنی کسی سے نہ مانگ) ابوبکر نے بیان کیا ہے: میں نے آپ کو سنا۔ آپ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جس کے پاس کوئی شے نہیں ہوتی کیا وہ لوگوں سے سوال کر سکتا ہے یا مردار کھا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا وہ مردار کھا سکتا ہے جو ایسے آدمی کو پائے جس سے وہ کچھ مانگ سکتا ہو، یہ بہت شنیع اور برا ہے۔ مزید بیان کیا اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا کہ آپ سے سوال کیا گیا کیا آدمی کسی دوسرے کے لئے مانگ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، البتہ وہ تعریض کر سکتا ہے۔ (یعنی اشارۃً توجہ اس کی طرف دلوا سکتا ہے) جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی وہ ننگے پاؤں تھے، بدن پر کپڑے نہ تھے اور اپنے جسموں کو اونی دھاری دار چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ ابی داؤد، باب من یعطی من صدقۃ وحد الغناء، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الاستعفاف عن المسألۃ، حدیث نمبر 1376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصدّقوا (اے صحابہ!) تم صدقہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: اعطوهم۔ تم انہیں دو...... ابوعمر نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اشفعوا توجروا تم مدد کرو تم اجر دیئے جاؤ گے (1) تو اس میں دوسرے کے لئے سوال کا اطلاق ہے۔ واللہ اعلم...... اور فرمایا: ألا رجل يتصدق على هذا کیا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کر سکتا ہو۔؟ ابوبکر نے بیان کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا ایک آدمی اس آدمی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: بے شک وہ محتاج ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تعریض ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بے شک سوال تب بنتا ہے کہ وہ کہے: أعطه تو اسے دے۔ پھر فرمایا: میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ذات کے لئے سوال کرے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ البتہ میرے نزدیک تعریض کرنا پسندیدہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوداؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ فراسی (بنی فراس بن مالک کا کوئی آدمی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میں سوال کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں اور اگر تو سائل ہے تو پھر ضروری ہے کہ تو صالحین سے مانگ۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجت و ضرورت کے وقت اہل فضل و صلاح کے سوال کو مباح قرار دیا ہے اور اگر وہ اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرے تو یہ اور اعلیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں سے حاجات کا مطالبہ کرنا یہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ پس تو اپنی حاجت اس کے پاس پیش کر جو ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے اور چاہیے کہ تیرا بھاگ کر جانا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ماسویٰ سے کافی ہو جائے گا اور تو خوشحال اور مسرور زندگی گزارے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر بغیر مانگے کسی کے پاس کوئی شے آ جائے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اسے قبول کر لے اور اسے رد نہ کرے کیونکہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عطا بن یسار سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کچھ عطا (ہدیہ، تحفہ) بھیجی تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو فرمایا: ''تم نے اسے کیوں لوٹا دیا ہے؟'' تو آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کوئی شے نہ لے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ سوال کے بارے میں ہے اور رہی وہ شے جو بغیر مانگے مل جائے تو یقیناً وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے۔'' تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کسی سے کسی شے کے بارے سوال نہیں کروں گا اور بن مانگے جو شے بھی میرے پاس آئے گی میں اسے لے لوں گا۔

یہ نص ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے اپنی سنن میں (2) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھے عطیات عطا فرماتے رہتے تھے تو میں عرض کرتا: آپ اسے عطا فرما دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے، حتیٰ کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کی: آپ مجھ سے زیادہ محتاج اور حاجت مند کو عطا فرما دیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے لے لو اور اس مال میں سے جو تمہارے پاس آئے اور تو نہ اس پر جھانکنے والا ہے اور نہ سوال کرنے والا، پس اسے اور اس مال کو لے لو اور تم اس میں اپنے نفس کی اتباع و پیروی نہ کرو۔'' نسائی نے خذہ کے قول کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے۔ ''پس تم اسے اپنے پاس جمع کرلو یا اسے صدقہ کردو۔''

اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن سعدی مالکی سے حدیث نقل کی ہے(1) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اذا اعطیت شیئًا من غیران تسأل فکل و تصدق (کہ جب تمہیں کوئی شے بغیر سوال کے دی جائے تو اسے کھاؤ اور صدقہ کرو) یہ روایت تمہارے لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل حدیث کو صحیح بناتی ہے۔

الاثرم نے کہا ہے: میں نے ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: ''جو شے تیرے پاس بغیر سوال اور بغیر اشراف کے آجائے۔'' اس میں اشراف سے آپ نے کون سا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ تو اس پر جھانکتا رہے اور اپنے دل میں یہ کہتا رہے۔ شاید یہ شے میری طرف بھیج دی جائے۔ آپ سے کہا گیا: اگرچہ وہ تعرض نہ بھی کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں بلاشبہ وہ (اشراف) دل کے ساتھ ہوتا ہے پھر آپ سے کہا گیا: یہ تو بہت سختی ہے آپ نے فرمایا: اگرچہ یہ شدید ہے لیکن یہ اسی طرح ہے۔ آپ سے کہا گیا: اگر کوئی آدمی مجھے عادی نہ بنائے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے مگر یہ کہ اس کا خیال میرے دل میں آئے اور میں کہوں: قریب ہے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اشراف ہے۔ پس اگر وہ تیرے پاس آئے اس کے بغیر کہ تو اس کا تصور کرے اور نہ ہی وہ تیرے دل میں کھٹکے تو یہ وہ شے ہے جس میں اشراف نہیں ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: لغت میں الاشراف سے مراد اس شے کی طرف سر اٹھانا ہے جو اس آدمی کے پاس ہو جس کی حرص ہو اور اس شے میں بھی حرص اور طمع ہو۔ اور یہ کہ وہ انسان کو خوش کرے اور یہ تعرض کرنے لگے۔ اور امام احمدؒ نے اشراف کی تاویل میں جو کچھ کہا ہے وہ تضییق اور تشدید ہے اور وہ میرے نزدیک بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس سے درگزر فرمالی ہے جو کچھ ان کے دلوں میں پیدا ہو، نہ زبان اس کے ساتھ بولے اور نہ ہی اعضاء اس کے مطابق عمل کریں۔ کفر کے سوا گناہوں میں سے دل جن کا اعتقاد رکھے وہ کوئی شے نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اس کے مطابق عمل کرے اور دل میں کھٹکنے والے خیال اور وہم سے بالاجماع درگزر کرلیا گیا ہے۔ (یعنی ان پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔)

**مسئلہ نمبر 8**۔ کسی سے کچھ مانگنے میں اصرار کرنا اور اس سے مستغنی ہونے کے باوجود اس سے لپٹ جانا حرام ہے حلال نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کثرت مال کے باوجود لوگوں سے ان کے مالوں کے بارے سوال کیا تو وہ (آگ کے) انگارے مانگ رہا ہے چاہے وہ قلیل طلب کرے یا زیادہ مانگے۔'' اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مسلسل (بھیک) مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے گا اور اس کے چہرے میں گوشت (☆) کا ٹکڑا تک نہ ہوگا۔'' اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 9**۔ سائل جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تین بار تک عذر پیش کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے اپنا سوال بار بار کرے۔ اور ایسا نہ کرنا افضل ہے اور اگر وہ آدمی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ اس کے بارے جانتا ہو اور وہ اس پر قادر بھی ہو جو شے اس نے مانگی ہے تو اس پر اسے عطا کرنا واجب ہے اور اگر وہ اس کے بارے ناواقف ہو تو وہ اسے اس خوف سے دے دے کہ ہوسکتا ہے وہ اپنے سوال میں سچا ہو اور وہ اسے واپس لوٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اور اگر وہ ایسی شے کا محتاج ہو جس کے ساتھ وہ سنت کو قائم کرسکتا ہے مثلاً ایسے کپڑے کے ساتھ آراستہ ہونا جسے وہ عید اور جمعہ (کی نمازوں) میں پہنتا ہو۔ تو ابن عربی نے ذکر کیا ہے: ''میں نے خلیفہ بغداد کی جامع مسجد میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ یہ تمہارا بھائی ہے جو تمہارے ساتھ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ جمعہ کی سنت کو قائم کرسکتا ہو۔ پس جب دوسرا جمعہ آیا تو میں نے اس پر دوسرا لباس دیکھا۔ تو مجھے بتایا گیا۔ ابو الطاہر البرسی نے اسے یہ لباس پہنایا ہے اور مدح و تعریف حاصل کی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۴

''جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابوذر، حضرت ابو امامہ، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن بشر غافقی اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ اور ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے محمد بن شعیب بن شابور سے خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں سعید بن سنان نے یزید بن عبداللہ بن عریب عن ابیہ عن جدہ عریب کی سند سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا گیا: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ

1۔ صحیح بخاری، باب من سأل الناس تكثرا، حدیث نمبر 1381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہو کر آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہی محمول ہے اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ میں فقط ہڈیاں ہوں گی گوشت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اصحاب الخیل کہ ان سے مراد گھوڑوں والے ہیں۔

اور اسی اسناد کے ساتھ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے پر خرچ کرنے والا صدقے کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہے۔ (یعنی کثرت سے صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔) کہ وہ اسے بند نہیں کرتا۔ ان کا پیشاب اور ان کی لید قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی پاکیزگی کی طرح ہوگی۔''

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے پاس چار دراہم تھے تو آپ نے ایک درہم رات کے وقت اور ایک درہم دن کے وقت، ایک درہم سرا اور ایک درہم جہرا صدقہ کر دیئے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے ہمیں عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی خبر دی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: یہ ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اس طرح عمل کیا اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور آدمی کا نام ذکر نہیں کیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اسراف اور کنجوسی کے بغیر خرچ کرتے ہیں اور بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ کا معنی ہے فی اللیل والنہار (رات اور دن میں) اور فَلَهُمْ میں فا داخل ہے کیونکہ کلام میں جزا کا معنی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور زید فمنطلق کہنا جائز نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

''جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے

چھوکر۔ یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا''

تین آیات سود کے احکام، بیع کی عقود کے جواز اور اس کے لئے وعید کو متضمن ہیں جو کوئی سود کو حلال سمجھے اور اس پر عمل کرنے پر مصر ہو۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا یہاں یَاْكُلُوْنَ بمعنی یاخذون ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اخذ (لینے) کو اکل (کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے اور ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ربا الشیء یربو۔ جب کوئی شے زیادہ ہو جائے اور اس معنی میں حدیث طیبہ بھی ہے: فلا واللہ ما اخذنا من لقمۃ الا ربا من تحتہا (قسم بخدا! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہو گیا) مراد وہ کھانا ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

قیاس یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ لکھا جائے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قرآن کریم میں واوٌ کے ساتھ لکھا ہے۔

پھر شریعت نے اس اطلاق میں تصرف کیا اور اسے بعض مواقع کے ساتھ محصور کر دیا۔ پس ایک بار اس کا اطلاق حرام کمائی پر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا: وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ اس کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے) اور اس سے وہ شرعی ربا مراد نہیں لیا جس کے حرام ہونے کا ہم پر حکم لگایا، بلکہ اس سے حرام مال مراد لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ: 42) (قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو بڑے حرام خور ہیں) اس سے مراد مال حرام ہے رشوت وغیرہ۔ اور وہ جسے انہوں نے اُمِّیّین کے اموال میں سے حلال سمجھ لیا تھا جہاں انہوں نے کہا: لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (العمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) اس بنا پر اس میں نہی ہر مال حرام کو شامل ہے جس طریقہ سے بھی مال کمایا جائے اور وہ ربا جس پر شرعی

1۔ صحیح بخاری، باب السمر مع الضیف والاھل، حدیث نمبر 567، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصطلاح ہے وہ دو چیزیں ہیں: نَسَاء کو حرام قرار دینا اور عقود اور مطعومات میں تفاضل (زیادتی) جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے اور اس میں غالب وہی ہے جو عرب کرتے تھے، قرض دینے والے کے لئے ان کا یہ قول ہے: أتقضی ام تُربی؟ (کیا تو ادا کرے گا یا تو اضافہ کرے گا) پس وہ (قرض دینے والا) مال کی تعداد میں اضافہ کر دیتا اور قرض لینے والا اس پر صبر کرتا اور یہ سب حرام کر دیا گیا ہے اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اکثر وہ بیعیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے ان میں ممنوع ہونے کی علت زیادتی کے معنی کا پایا جانا ہے یا تو عین مال میں زیادتی یا پھر (بائع اور مشتری میں سے) کسی ایک کے لئے تاخیر کے سبب منفعت میں زیادتی وغیرہ...... اور بیوع میں سے وہ جس میں زیادتی کا معنی نہ ہو، جیسا کہ پھل کی بیع کرنا اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی طرح وہ بیع جو جمعہ کے دن اذان کے وقت ہو، اگر ان کے کرنے والے کو کہا جائے، سود کھانے والا تو یہ مجازاً اور تشبیہاً ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض، چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہے۔ پس جس نے زیادتی کی یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود لیا لینے اور دینے والا اس میں برابر ہیں۔''

اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر ان کی بیع کرو جیسے تم چاہو بشرطیکہ دست بدست ہو۔'' اور ابو داؤد نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، چاندی کی بیع چاندی کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، گندم کی بیع گندم کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد اور نمک کی بیع نمک کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد۔ پس جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تحقیق اس نے سود لیا اور سونے کو چاندی کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان میں سے چاندی کی مقدار زیادہ ہو درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی نسیئہ (ادھار) تو یہ جائز نہیں ہے اور گندم جو کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو ان دونوں میں زیادہ ہوں درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی ادھار تو یہ جائز نہیں (1)۔'' علماء نے اس سنت کے تقاضا کے مطابق قول پر اجماع کیا ہے اور اسی طریقہ پر مسلمان فقہاء کی جماعت ہے مگر گندم اور جو میں، کیونکہ امام مالک نے ان دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ پس ان دونوں میں سے دو کی بیع ایک کے عوض جائز نہیں ہے۔ اور یہی قول لیث، اوزاعی اور مدینہ اور شام کے عظیم علماء کا ہے۔ اور امام مالک نے ان دونوں کی طرف السلت (جو کی ایک قسم جس پر چھلکا نہیں ہوتا) کی اضافت کی ہے اور لیث نے کہا ہے: السلت (جو)، باجرہ اور مکئی یہ ایک ہی صنف ہے اور ابن وہب نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب حدیث طیبہ ثابت ہے تو اس کے ساتھ کسی قول کی کوئی حیثیت نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصرف، حدیث نمبر 2907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والسلام نے فرمایا ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو انہیں بیچو بشرطیکہ بیع دست بدست ہو۔'' اور آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: ''کہ گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض'' تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ دونوں دو مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ گندم اور کھجور مختلف ہیں کیونکہ دونوں کی صفات مختلف ہیں اور دونوں کے نام بھی مختلف ہیں۔ اور اگانے والے اور کاٹنے والے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ جدائی اور فرق بالکل واضح اور بین ہے اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور اصحاب حدیث کا یہی مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے نہی اور تحریم ڈھلے ہوئے دینار اور ڈھلے ہوئے درہم کے بارے میں وارد ہے نہ کہ سونے کی پتریوں اور ڈھالی گئی چاندی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے بارے میں جو ڈھلی ہوئی (چاندی) سے شے بنائی گئی ہو۔ اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نہی صرف اس کے بارے میں ہے جو اس سے خاص نمونہ پر تیار کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوگئی، جسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے، بیان فرمایا: ہم جہاد میں شریک ہوئے اور لوگوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ پس ہم نے بہت زیادہ مال غنیمت اکٹھا کیا اور ہمارے اس مال غنیمت میں چاندی کے برتن بھی تھے۔ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو لوگوں کے عطیات میں انہیں بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ تو اس بارے میں لوگوں کے مابین تنازع شروع ہو گیا۔ پس اس کی اطلاع حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے مگر (اس صورت میں کہ وہ) برابر برابر ہو اور عین کے عوض عین ہو۔ جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا طالب ہوا تو تحقیق اس نے سود لیا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس لوٹا دیا...... پس یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: خبردار! سنو کیا حال ہے ان لوگوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم آپ کے پاس حاضر رہتے تھے اور آپ کی صحبت و معیت میں رہتے تھے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی احادیث نہیں سنیں، تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دوبارہ وہی حدیث بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: ہم ضرور بہ ضرور اس کے بارے حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کریں ...... مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے سیاہ رات میں آپ کے لشکر میں آپ کی صحبت اختیار نہیں کی۔ حماد نے یہی یا اسی طرح کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ یہ قصہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں کا آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن عرف میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث محفوظ رہی۔ اور یہی وہ اصل ہے جس پر علماء نے ربا کے باب میں اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ پر مخفی رہا ہو حالانکہ حضرت ابو الدرداء اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہما دونوں نے اسے جان لیا ہو کیونکہ یہ دونوں فقہاء اور کبار صحابہ کرام میں سے جلیل القدر صحابی ہیں، کبھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر کوئی ایسی شے مخفی رہی جو ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام سے پائی گئی جو درجہ اور رتبہ میں ان سے کم ہیں۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے ہیں...... اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مذہب کی طرح ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ علم کا سمندر تھے وہ ایک درہم کی بیع دو درہم کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے پھیر دیا۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسی طرح ہے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیش آیا۔ قبیصہ بن ذؤیب نے کہا ہے: بے شک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی شے سے منع کیا تو انہوں نے کہا: میں تجھے اس زمین پر نہیں رہنے دوں گا جہاں تو رہ رہا ہے تو وہ مدینہ میں داخل ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کون سی شے تجھے لے آئی ہے؟ تو انہوں نے آپ کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو اپنی جگہ کی طرف لوٹ جا، اللہ تعالیٰ اس زمین کو فاسد کرے جس میں تم اور تمہاری مثل لوگ نہ ہوں! اور ساتھ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ دیا لا امارۃ لك علیه (تجھے اس پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔)

**مسئلہ نمبر 5۔** ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دار قطنی کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دینار دینار کے عوض ہے اور درہم درہم کے عوض ہے ان کے درمیان کوئی فضل اور زیادتی نہیں ہے جسے چاندی کی حاجت ہو اسے چاہیے کہ وہ اسے سونے کے عوض بدل لے اور اگر سونے کی ضرورت ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ چاندی کے عوض اسے بدل لے دست بدست (یعنی ایک ہاتھ سے لے اور دوسرے سے دے)

علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: الدینار بالدینار والدرھم بالدرھم لا فضل بینھما یہ اس اصل کی جنس کی طرف اشارہ ہے جو ڈھلی ہوئی ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: الفضۃ بالفضۃ والذھب بالذھب الحدیث۔ چاندی چاہے سفید ہو یا سیاہ اور سونا سرخ ہو یا زرد کسی کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ دونوں ہم مثل ہوں اور ہر حال میں برابر ہوں۔ اسی پر علماء کی ایک جماعت ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور حضرت امام مالک سے فلوس کے بارے میں روایت مختلف ہے۔ سو آپ نے انہیں دراہم کے ساتھ ملحق کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ اشیاء کے ثمن ہیں اور ایک بار انہیں ان کے ساتھ ملانے سے منع بھی کیا ہے اس اعتبار سے کہ یہ ہر شہر میں ثمن نہیں ہیں بلکہ بعض شہران کے ساتھ مختص ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے اصحاب سے مروی ہے۔ ان میں سے بعض اسے امام مالک سے تاجر کے بارے میں روایت کرتے ہیں درآنحالیکہ خروج (گھر سے نکلنا) اسے دھوکہ دے رہا ہو۔ اور اس کے سبب اسے ڈھالے گئے دراہم یا دنانیر کی حاجت پڑ جائے۔ پس وہ اپنی چاندی یا اپنا سونا لے کر ٹکسال میں آتا ہے اور ڈھالنے والے کو کہتا ہے، میری یہ چاندی یا یہ سونا تو لے لے اور اپنی محنت بھی لے لے اور تو مجھے میرے سونے کے بدلے

ڈھلے ہوئے دنانیر یا میری اس چاندی کے بدلے ڈھلے ہوئے دراہم مجھے دے دے۔ کیونکہ مجھے خروج کے وقت دھوکا دیا گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا جس کے ساتھ میں نکلا ہوں۔ تو ضرورت کے تحت اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قبس میں امام مالک سے تاجر کے سوا دوسروں کے بارے میں بھی اسے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے اس میں تخفیف فرمائی ہے...... اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی وہ چاندی بیچے جس کا وزن ایک سو پانچ درہم تھا اور وہ اس کے بدلے اسے سو درہم دے اور یہ خالص رہا ہے۔ اور جس نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اسے اس طرح کہے: یہ چاندی مجھے ڈھال دے اور اس پر تو اس سے اجرت کاٹ لے۔ پس جب وہ اسے ڈھال لے اور یہ اسے اس سے لے لے اور یہ اسے اس کی اجرت ادا کر دے۔ پس جو امام مالک نے پہلے کہا ہے وہ وہی ہے جو آخر میں ہوگا۔ امام مالک نے مال کی طرف دیکھا ہے اور اس پر حال کا حکم مرتب کیا ہے اور تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے، ابن عربی نے کہا ہے: اس میں امام مالک کی حجت واضح ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ عین ربا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے حرام کیا ہے: مَنْ زاد او ازداد فقد اربی (جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تحقیق اس نے سود لیا)

ابن وہب نے اس مسئلہ میں امام مالکؒ کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔

اور علامہ ابہری نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تجارت کے فروغ کے لئے نرم رویہ اپنایا گیا ہے تا کہ تجارتی منڈی ختم ہی نہ ہو جائے اور ربا (سود) نہیں ہے مگر اس پر جو اس سے زیادہ لینے کا ارادہ کرے جو اس کا قصد کرتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور ابہری بھول گئے اس کی اصل سد ذرائع میں ہے اور ان کا قول اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کپڑا ادھار بیچا اور وہ اسے خریدنے کی نیت اور ارادہ نہ رکھتا ہو پھر وہ اسے بازار میں پاتا ہے کہ اسے بیچا جا رہا ہے۔ بے شک اس کے لئے اس سے کم قیمت کے ساتھ اسے خریدنا جائز نہیں ہے جتنے کے ساتھ اس نے اسے بیچا تھا، اگرچہ وہ اس کا قصد نہ بھی کرے اور نہ اسے چاہے اور اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اگر ربا نہیں ہے مگر اسی پر جو اس کا قصد کرے تو پھر (ہر شے) فقہاء پر ہی حرام کی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمارے بازار میں کوئی تجارت نہیں کرے گا مگر وہی جو اس کی خوب سمجھ بوجھ رکھتا ہو ورنہ وہ ربا کھائے گا۔ یہ اس کے لئے بالکل واضح ہے جسے انصاف عطا کیا گیا اور اسے رشد و ہدایت عطا فرمائی گئی۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالکؒ نے زیادتی (لینے دینے) سے روکنے میں انتہائی مبالغہ کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے متوہم (موہومہ) کو متحقق (ثابت شدہ) کی مثل قرار دیا ہے۔ سو آپ نے ایک دینار اور ایک درہم کی بیع ایک دینار اور ایک درہم کے بدلے کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ سد ذرائع کے لئے اور توہمات کی جڑ کاٹنے کے لئے کیا ہے کیونکہ اگر زیادتی کا وہم نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ نہ کرتے اور تقسیم کے وقت مماثلت متعذر ہونے کو اس منع کی علت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے سونے اور چاندی کا تبادلہ سونے کے عوض لازم آتا ہے اور اس سے زیادہ واضح یہ ہے کہ انہوں نے تفاضل معنوی سے بھی منع

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ علی النبی، حدیث نمبر 449، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے کہ کوئی اعلیٰ اور عمدہ سونے کے ایک دینار اور گھٹیا سونے کے ایک دینار کی بیع اعلیٰ کے مقابلہ میں کرے اور گھٹیا پن کو لغو قرار دے۔ اور یہ آپ کی دقت نظر کی علامت ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ سے وہ روایت منکر ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ خطابی نے کہا ہے: تبر سے مراد سونے اور چاندی کا وہ ٹکڑا ہے جسے ابھی تک ڈھالا نہ گیا ہو اور نہ ہی اس سے دراہم یا دنانیر بنائے گئے ہوں۔ اس کی واحد تِبْرَۃٌ ہے۔ اور العین سے مراد وہ ہے جس سے دراہم یا دنانیر بنا لئے گئے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے کہ ایک مثقال عین سونا بیچا جائے مثقال اور ایسی پتریوں کے ساتھ جو ڈھلی ہوئی نہ ہوں۔ اور اسی طرح مضروب چاندی اور غیر مضروب چاندی کے درمیان تفاوت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد تِبْرُھا وعَیْنُھا سواء کا یہی معنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کی بیع کھجور سے کرنا جائز نہیں ہوتی مگر برابر برابر۔ اور انہوں نے ایک کھجور کی بیع دو کھجوروں کے ساتھ کرنے میں اور گندم کے ایک حبہ (دانہ یا دو جو کے برابر وزن) کی بیع دو جووں کے ساتھ کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہی امام مالک کے قول کا قیاس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ شے جس میں ربا جاری ہوتا ہے اس کی کثیر مقدار میں تفاضل کے سبب تو قیاساً اور نظراً اس کی قلیل مقدار بھی اس میں داخل ہے۔ اور جنہوں نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ایک یا دو کھجوریں ضائع کرنے والے پر قیمت واجب نہیں ہوتی، فرمایا: کیونکہ اس کا کوئی ماپ اور وزن نہیں ہے لہٰذا اس میں تفاضل (زیادتی) جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ تو جان! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے کہ اس باب کے مسائل کثیر ہیں اور اس کی فروع پھیلی ہوئی ہیں، وہ شے جو تیرے لئے مضبوط ہو وہ یہ ہے کہ تو ربا کی اس علت میں غور و فکر کرے جس کا علماء میں سے ہر ایک نے اعتبار کیا ہے۔ پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے کیلی یا وزنی ہونا ہے۔ پس ہر وہ شے جس میں کیل یا وزن داخل ہوگا آپ کے نزدیک وہ ایک جنس میں سے ہے اور اس کے بعض کی بعض کے ساتھ متفاضلاً یا نسیئاً بیع کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس آپ نے مٹی کی مٹی کے ساتھ بیع متفاضل سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں کیل داخل ہوتا ہے اور ایک روٹی کی بیع دو روٹیوں کے ساتھ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ اس کیل میں داخل نہیں ہیں جو اس کی اصل ہے۔ پس یہ اس جنس سے خارج ہو گئی جس میں ربا داخل ہوتا ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے اس شے کا مطعوم (وہ شے جو کھائی جائے) ہونا ہے۔ یہ آپ کا جدید قول ہے۔ پس آپ کے نزدیک آٹے کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی روٹی کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز ہے نہ متفاضلاً اور نہ نسیئاً، چاہے روٹی خمیری ہو یا تازہ ہو۔ اور آپ کے نزدیک ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک انار کی بیع دو اناروں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک تربوز کی بیع دو تربوزوں سے کرنا جائز نہیں ہے نہ

دست بدست اور نہ ہی ادھار کیونکہ یہ سب کھایا جانے والا طعام ہے۔

اور آپ نے اپنے پرانے قول میں کہا ہے کہ اس کی علت کیلی یا وزنی ہونا ہے۔

اور اس بارے میں ہمارے اصحاب مالکیہ کی عبارات مختلف ہیں اور ان میں سے جو سب سے اچھی اور حسین ہے وہ یہ ہے کہ وہ شے ایسی جنس سے ہو جو خوراک بن سکتی ہو اور اغلباً زندگی گزارنے کے لئے ذخیرہ کی جا سکتی ہو۔ جیسا کہ گندم، جو، کھجور اور نمک جن پر نص بیان کی گئی ہے اور وہ چیزیں جو ان کے معنی میں ہیں جیسا کہ چاول، مکئی، باجرہ اور تل اور وہ دانے جو ہانڈی میں پکائے جاتے ہیں مثلاً لوبیا، دالیں، سیم اور چنے وغیرہ۔ اور اسی طرح گوشت، دودھ، سرکہ اور تیل وغیرہ۔ اور پھل مثلاً انگور، کشمش اور زیتون وغیرہ اور انجیر میں اختلاف کیا گیا ہے اور شہد اور شکر اس کے ساتھ ملحق کئے جاتے ہیں۔ پس یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن میں نساء کی جہت سے ربا داخل ہوتا ہے اور ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو ان کی بیع کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔'' اور ان تازہ پھلوں میں ربا نہیں ہے جو باقی نہیں رہتے مثلاً سیب، تربوز، انار، ناشپاتی، ککڑی، کھیرا، بینگن اور اس کے علاوہ دیگر سبزیاں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انڈے کی بیع انڈے کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جو ذخیرہ کئے جا سکتے ہیں اور ان کے نزدیک برابر برابر بیع جائز ہوتی ہے۔

اور محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا ہے: ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے اور زیادہ سے کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں۔ اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر10** ۔ الرِّبَا کے لفظ میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے۔ بصریوں نے کہا ہے یہ واوی الفاظ میں سے ہے کیونکہ تو اس کے تثنیہ میں کہتا ہے: رِبَوان۔ سیبویہ نے یہی کہا ہے اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ یا کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کا تثنیہ یا کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے۔

زجاج نے کہا ہے: میں نے کوئی خطا نہیں دیکھی جو اس سے زیادہ قبیح اور زیادہ شنیع ہو اور لکھنے میں خطا انہیں کافی نہ ہوتی یہاں تک کہ انہوں نے تثنیہ میں غلطی کی، حالانکہ وہ یہ پڑھتے ہیں: وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: مصحف میں الرِّبٰوا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس کے درمیان اور زنا کے درمیان فرق ہو جائے۔ رِبَا واؤ کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ ربا یربو سے ہے۔

**مسئلہ نمبر11** ۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہے اور وہ اَلَّذِيْنَ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن جبیر، قتادہ، ربیع، ضحاک، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ شیطان رکھا جائے گا وہ اس کا گلا دباتا رہے گا۔ اور تمام نے کہا ہے: اسے بطور سزا

اور تمام اہل محشر کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دینے کے لئے مجنون کی طرح اٹھایا جائے گا۔ اور اس تاویل کو جس پر اجماع کیا گیا ہے یہ بات قوی اور پختہ کرتی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: لا یقومون یوم القیامۃ الا کما یقوم (کہ قیامت کے دن وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ دنیوی تجارت کی طرف انتہائی حرص و لالچ کے ساتھ کھڑے ہونے والے کی حالت کو پاگل کے کھڑے ہونے کے ساتھ تشبیہ دینے کا احتمال رکھتے ہیں کیونکہ طمع اور رغبت اسے مضطرب کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کے اعضاء مضطرب ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ تو تیز رفتار چلنے والے کے بارے کہتا ہے کہ وہ اپنی حرکات کی ہیئت میں پاگل لگتا ہے یا تو گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اسے پاگل کہا گیا ہے اور اَعْشیٰ نے اپنی ناقہ کو اپنے اس قول میں اس کی چستی اور تیزی میں جنون کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

وَ تُصبِح عن غِبّ السُّرَی و کانّما أَلَمَّ بها من طائِف الجِنّ أَولَقُ

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لَعَمْرُكَ بِي من حُبّ أسماءَ أَوْلَقُ

لیکن وہ جس کے مطابق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اس کے مطابق مفسرین کے اقوال ظاہر ہیں۔ وہ اس تاویل کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اور یَتَخَبَّطُهُ یہ یتفعلہ کے وزن پر خَبَط یخبِط سے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں تملکہ و تَعبدَہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سود کھانے والوں کے لئے علامت قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے ان کے پیٹوں میں بڑھا دے گا اور انہیں خوب بوجھل کر دے گا، پس وہ جب اپنی قبروں سے نکلیں گے تو وہ کھڑے ہوں گے اور گر پڑیں گے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ بے شک انہیں قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے پیٹ حاملہ عورتوں کی طرح پھولے ہوئے ہوں گے اور جب بھی وہ اٹھیں گے تو گر جائیں گے اور لوگ ان کے اوپر چلتے رہیں گے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ ان کی علامت اور نشانی ہوگی اس سے وہ قیامت کے دن پہچانیں جائیں گے پھر عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔ جیسا کہ کینہ رکھنے والا قیامت کے دن اس شے کی شہرت کے ساتھ آئے گا جس کے ساتھ اس نے کینہ رکھا اس کے ساتھ اسے مشہور کیا جائے گا پھر اس کے پیچھے اسے عذاب دیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَاْكُلُوْنَ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سود کھاتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اُکل (کھانے) کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ انسان کا مال میں سب سے قوی مقصد یہی ہوتا ہے۔ اور اس لئے کہ یہ انتہائی رغبت اور حرص پر دلالت کرتا ہے۔ الجشع کا معنی شدید حرص ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل جشع بیّن الجَشَع و قوم جشعون (یعنی انتہائی شدید حرص رکھنے والا آدمی اور قوم) المجمل میں یہی ہے۔ اور کسب (کمائی) کے توابع میں سے اس بعض کو کل کسب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس لباس، رہائش، ذخیرہ اور اہل و عیال پر خرچ کرنا سب اس ارشاد میں داخل

ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ

**مسئلہ نمبر 12**۔ اس آیت میں ان کے انکار کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جنہوں نے جن کی جانب سے گرا دینے کا انکار کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ طبائع کے فعل میں سے ہے اور یہ کہ شیطان نہ انسان میں چل سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے چھوا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے ان کا رد گزر چکا ہے۔

نسائی نے ابوالیسر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا مانگتے تھے: اللهم انی اعوذبك من التردی والهدم والغرق والحریق و اعوذبك ان یتخبطنی الشیطان عند الموت و أعوذبك أن اموت فی سبیلك مُدبِرا و أعوذبك أن اموت لدیغا (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں (کنویں میں) گرنے سے اور (اس سے کہ مجھ پر کوئی عمارت) گر پڑے اور (پانی میں) غرق ہونے سے اور (آگ میں) جلنے سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت مجھے پاگل بنادے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تیرے راستے میں (میدان جہاد سے) پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھے کسی شے کے ڈسنے سے موت آئے۔)

اور محمد بن مثنی کی حدیث سے مروی ہے کہ ابوداؤد نے ہمام سے انہوں نے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے تھے: اللّٰهم انی اعوذبك من الجنون والجذام والبرص و سیّئ الاسقام (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جنون سے، جذام سے، برص سے اور بیماریوں کی شدت اور تلخی سے)

اور مس کا معنی جنون ہے۔ کہا جاتا ہے مُسَّ الرجل واُلِسَ، فَهُوَ ممسوس و مألوس جب وہ آدمی مجنون ہو، اور یہ آخرت میں ربا کی علامت ہوگی۔ اور حدیث اسراء میں روایت کیا گیا ہے۔ ''جبرائیل امین علیہ السلام مجھے لے کر چلے تو میں بہت سے لوگوں کے پاس سے گزرا ان میں سے ہر آدمی کا پیٹ بہت بڑے گھر کی مثل ہے درآنحالیکہ وہ آل فرعون کے راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پس وہ شدید پیاسے اونٹوں کی مثل آتے ہیں وہ پتھروں اور درختوں سے ٹکراتے ہیں نہ وہ کچھ سنتے ہیں اور نہ عقل رکھتے ہیں پس جب ان بڑے پیٹوں والوں نے انہیں محسوس کیا تو وہ کھڑے ہوئے اور ان کے پیٹ ان پر غالب آگئے اور وہ گرنے لگے پھر ان میں سے کوئی کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیٹ اس پر بھاری ہو جاتا اور وہ گر پڑتا۔ پس وہ واضح استطاعت اور قدرت نہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آل فرعون نے انہیں ڈھانپ لیا اور وہ انہیں آتے جاتے ہوئے روندنے لگے۔ پس دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں یہی ان کا عذاب ہے۔ اور آل فرعون کہتے ہیں اے اللہ! کبھی قیامت قائم نہ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞ (الغافر) (اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں) میں نے پوچھا...... اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو اس نے کہا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔'' اور مس سے مراد جنون ہے اور اسی سے اَوْلَق، اَلْس اور الزود کے الفاظ بھی اسی معنی میں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13۔** قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا تمام متاولین کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے اور ان کو کہا گیا ہے: فَلَهٗ مَا سَلَفَ (تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ہے) اور کسی گنہگار مومن کو یہ نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کی بیع ٹوٹ جاتی ہے اور اس کا فعل رد کر دیا جاتا ہے اگر چہ وہ ناواقف ہو۔ سو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عمل عملا لیس علیه امرُنا فهو رَدٌّ (جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے) لیکن نافرمان اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے اس آیت کی وعید سے ایک طرف ہو کر سود لیتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 14۔** قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بے شک قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد آخر میں زیادتی اسی طرح ہے جس طرح عقد کی ابتدا میں اصلی ثمن تھے۔ اور عربوں میں صرف یہی ربا معروف تھا۔ پس جب ان کے قرض کی ادائیگی کا وقت آ پہنچتا تو وہ مقروض کو کہتے: کیا تو پورا ادا کرے گا یا اسے بڑھائے گا۔ یعنی قرض میں اضافہ کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اپنے اس قول حق کے ساتھ ان کے قول کو رد کر دیا ہے: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا اور واضح کر دیا ہے جب مدت گزر جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو اسے آسانی اور خوشحالی آنے تک مہلت دی جائے اور یہی وہ ربا ہے جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نویں ذی الحجہ کے دن اپنے قول کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ جب آپ نے فرمایا: ''خبردار! سنو بلاشبہ تمام سود ختم کر دیا گیا ہے اور وہ پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے وہ سارے کا سارا ختم کر دیا گیا ہے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے اور لوگوں میں سے خاص ترین آدمی سے اس کا آغاز کیا۔ اور یہی امام وقت کے عدل کے طریقوں میں سے ہے کہ وہ عدل کو اپنی ذات پر اور اپنے خواص پر نافذ کرتا ہے اور پھر وہ تمام لوگوں میں پھیل جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15۔** قولہ تعالیٰ: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا یہ قرآن کریم کے عمومات میں سے ہے۔ اور اس پر الف لام جنس کیلئے ہے، عہد کے لئے نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے بیع کا ذکر نہیں ہوا جس کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) پھر استثنیٰ فرمائی: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیع عام ہے تو پھر اسے اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جس ربا وغیرہ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے اور ان کا عقد کرنے سے روکا گیا ہے، جیسا کہ خمر، مردار اور کسی حاملہ جانور کا حمل وغیرہ ذالک اور اس بارے میں یہی سنت ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کی نظیر یہ بھی ہے: اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ۔

اور وہ تمام کے تمام ظواہر جو عمومات کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں تخصیص داخل ہو سکتی ہے اور یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

اور بعض نے کہا ہے یہ قرآن کریم کی وہ مجمل آیت ہے جس کی تفسیر بیع کی اس قسم کے ساتھ کی گئی ہے جو حلال کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جو حرام کی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے بیع کو حلال کرنے اور اسے حرام کرنے کے بارے میں استعمال کیا جائے مگر تب جب اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے کوئی بیان مقترن ہو...... اگر چہ یہ تفصیل کے بغیر فی الجملہ

بیوع کی اباحت پر دال ہے اور یہ عموم اور مجمل کے درمیان فرق ہے۔ پس عموم فی الجملہ اور تفصیل کے ساتھ بیوع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک وہ کسی دلیل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ اور مجمل ان کی اباحت پر تفصیل سے دلالت نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیان مقترن ہو۔ اور پہلا زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ البیع لغت میں مصدر ہے باع کذا بکذا۔ یعنی اس نے عوض دیا اور معوض لیا۔ اور یہ بائع (بیچنے والا) کا تقاضا کرتی ہے اور وہ مالک ہوتا ہے یا اس کا نائب ہوتا ہے اور بیع مشتری (خریدار) کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ ہے جو ثمن ادا کرتا ہے۔ اور مبیع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور مبیع وہ شے ہوتی ہے جس کے ثمن لگائے جائیں یعنی جس کے مقابلے میں ثمن دیئے جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر بیع کے چار ارکان ہوئے۔ بائع (بیچنے والا) مشتری (خریدار) ثمن (قیمت) اور مثمن (مبیع وہ شے جو بیچی جارہی ہو) پھر عربوں کے نزدیک معاوضہ اپنے مضاف الیہ کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر معاوضہ رقبہ یعنی ذات کے مقابلہ میں ہو تو اسے بیع کا نام دیا گیا ہے اور اگر رقبہ کی منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اگر وہ منفعت بضع ہو تو اسے نکاح کا نام دیا گیا ہے اور اگر اس کے سوا کسی اور منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام اجارہ ہے اور عین (دراہم و دنانیر) کی بیع عین کے عوض ہو تو وہ بیع النقد ہے اور وہی بیع الصرف ہے اور اگر بیع دین موجل کے ساتھ ہو تو وہ بیع سلم ہے۔ اس کا بیان آگے آیۃ الدین میں آئے گا۔ اور بیع الصرف کا حکم گزر چکا ہے اور اجارہ کا حکم سورۃ القصص میں آئے گا اور نکاح میں مہر کا حکم سورۃ النساء میں آئے گا ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے محل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ بیع قبول اور ایجاب (کا نام) ہے یہ مستقبل اور ماضی کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ اس میں ماضی حقیقۃً ہوتی ہے اور مستقبل کنایۃً ہوتا ہے اور یہ ایسے لفظ صریح اور کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے جس سے ملکیت کا منتقل ہونا سمجھا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے: بعتك هذه السلعة بعشرة میں نے تجھے یہ سامان دس کے عوض بیچا اور خریدنے والا کہے: اشتریتها۔ میں نے اسے خرید لیا۔ یا خریدنے والا پہلے کہے: اشتریتها۔ میں نے اسے خرید لیا اور پھر بیچنے والا کہے: بعتُکها۔ میں نے اسے تجھے بیچ دیا یا بائع کہے: میں تجھے دس کے عوض بیچوں گا اور پھر مشتری کہے۔ میں خرید لوں گا یا میں نے خرید لیا۔ اور اسی طرح ہے اگر وہ کہے تو اسے دس کے عوض لے لے یا میں نے تجھے یہ دے دیا یا تو اسے لے لے یا تجھے اس میں برکت دی جائے دس کے عوض یا میں نے اسے تیرے حوالے کر دیا اور وہ دونوں بیع کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تو ان تمام الفاظ کے ساتھ بیع لازم ہو جائے گی۔ اور اگر بائع نے کہا: میں نے تجھے دس کے عوض بیچ دی پھر وہ مشتری کے قبول کرنے سے پہلے رجوع کر لے تو امام مالکؒ نے کہا ہے: اس کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ مشتری کے قبول یا اس کے رد کو سن لے، کیونکہ اس نے اپنی جانب سے اسے دے دیا ہے اور اسے اس پر ثابت کر دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ابھی اس پر عقد مکمل نہیں ہوا۔

اور اگر بائع کہے: میں نے تو مذاق کیا تھا تو اس بارے میں روایت مختلف ہے۔ پس آپ نے ایک بار کہا: بیع لازم ہو جائے گی اور اس کے قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور ایک بار فرمایا: سامان کی قیمت کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر ثمن اس

کی قیمت سے موافقت رکھتے ہوں تو بیع لازم ہوگی اور اگر متفاوت ہوں جیسا کہ غلام ایک درہم کے عوض اور گھر ایک دینار کے بدلے، تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے اس سے بیع کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ مذاق کرنے والا ہے نتیجتاً بیع لازم نہیں ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ قولہ تعالیٰ: وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا یہاں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد وہی ربا ہے جس کا کاروبار عرب کرتے تھے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، پھر یہ شامل ہوگا اسے جسے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی بیع سے منع کیا گیا ہے جس میں ربا داخل ہو سکتا ہے اور جو بھی اس کے معنی میں بیوع ہیں ان سے منع کر دیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ عقد ربا کو فسخ کر دیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ائمہ نے اسے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرخ کھجوریں لے کر آئے، تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''یہ کہاں سے لائے ہو؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہمارے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں، تو میں نے ان میں سے دو صاع ایک صاع کے عوض بیچ دیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے کے لئے، تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ''اوہ! یہی تو عین ربا ہے تو اس طرح نہ کر۔ البتہ جب تو کھجوریں بیچنے کا ارادہ کرے تو تو پہلے ایک بیع کے ساتھ انہیں بیچ دے پھر ان (کے ثمن) کے عوض وہ خرید لے۔'' اور ایک روایت میں ہے۔ ''یہ ربا ہے پس تم اسے لوٹا دو پھر تم ہماری کھجوریں بیچو اور ان کے (ثمن کے) عوض ہمارے لئے کھجوریں خرید لو۔'' (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: اوہ عین الربا سے مراد وہ ربا ہے جو فی نفسہ حرام ہے نہ کہ وہ جو اس سے مشابہت رکھتا ہے اور آپ کے قول: فردّوہ عقد ربا کو فسخ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بیع کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور یہی جمہور کا قول ہے، بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ کے کہ وہ فرماتے ہیں: بلاشبہ ربا کی بیع اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اس حیثیت سے کہ وہ بیع ہے اور اپنے وصف کے اعتبار سے ممنوع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ربا ہے۔ پس ربا ساقط ہو جائے گا اور بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر اس طرح ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عقد کو فسخ نہ کرتے اور آپ ایک صاع پر جو زیادتی تھی اسے واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرماتے۔ اور یقیناً ایک صاع کے مقابلہ میں صفقہ کو صحیح قرار دیتے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ ہر وہ عقد جو واضح طور پر حرام ہو اور اسے فسخ کر دیا جائے تو مشتری پر سامان بعینہ واپس لوٹانا واجب ہے اور اگر مشتری کے ہاتھ سے وہ ضائع ہو گیا تو وہ اس سامان میں قیمت لوٹائے گا جس کی قیمت ہو اور وہ یہ ہیں مثلاً زمین، سامان اور حیوان وغیرہ۔ اور جن کی مثل موجود ہو اس کی مثل واپس لوٹائے گا وزنی چیزوں میں سے ہو یا کیلی چیزوں میں سے طعام ہو یا عرض (سامان) ہو۔

امام مالک نے کہا ہے: جس کا حرام ہونا بین ہو وہ واپس لوٹایا جائے گا چاہے وہ ضائع ہو یا نہ ہو۔ اور وہ جو اس میں سے ہو جسے لوگوں نے مکروہ جانا ہو تو اسے رد کر دیا جائے مگر یہ کہ سامان ضائع ہو جائے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ (یعنی رد نہ کیا جائے۔)

**مسئلہ نمبر 21**۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حضرت امام جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے سود حرام کر دیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کو قرض دیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ دینے کے مساوی ہوتا ہے۔'' اسے بزار نے نقل کیا ہے اور اس کا مکمل معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ مالوں کے لئے باعث ضیاع اور لوگوں کے لئے باعث ہلاکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ جَآءَهٗ میں فعل کے آخر سے علامت تانیث ساقط ہے کیونکہ الموعظة مونث غیر حقیقی ہے اور یہ بمعنی وعظ ہے اور حسن نے علامت تانیث کو ثابت رکھتے ہوئے فَمَنْ جَاءَتْهُ پڑھا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے فعل کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ دارقطنی نے عالیہ بنت انفع سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اور ام محبہ مکہ کی طرف نکلیں اور ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس داخل ہوئیں اور آپ پر سلام عرض کیا تو آپ نے ہم سے پوچھا تم کن میں سے ہو؟ ہم نے عرض کی۔ ہم اہل کوفہ میں سے ہیں، اس نے کہا گویا آپ نے ہم سے اعراض کر لیا۔ پھر ام محبہ نے آپ سے عرض کی: اے ام المومنین! میری ایک کنیز تھی اور میں نے اسے حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو آٹھ سو درہم کے عوض انہیں عطیہ ملنے تک فروخت کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اسے بیچنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان سے اسے نقد چھ سو درہم کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ پس آپ رضی اللہ عنہا ہماری طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا: تیری خرید بہت بری ہے اور وہ بھی جو تو نے خریدی ہے۔ اور زید رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں کئے جانے والے اپنے جہاد کو باطل کر دیا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

پھر اس نے آپ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں ان سے اپنے راس المال کے سوا اور کچھ نہ لوں؟ تب آپ نے کہا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ (سود سے) رک گیا تو اس کے لئے جائز ہے جو گزر چکا ہے۔) عالیہ ابو اسحاق ہمدانی کوفی السبیعی کی بیوی اور یونس بن ابی اسحاق کی ماں ہے۔ اور یہ حدیث امام مالک نے بیوع الآجال کے بیان میں نقل کی ہے جو آپ سے ابن وہب نے روایت کی ہے۔ پس اگر بیوع میں ایسی شے ہو جو ممنوع میں پڑنے تک پہنچاتی ہو تو آپ (امام مالک) نے اس بیع سے منع کیا ہے اگرچہ ظاہر اُوہ جائز ہو۔ اور جمہور فقہاء نے اس اصل (بنیاد) میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: احکام کا دارومدار ظاہر پر ہے نہ کہ ظنون پر۔ اور ہماری دلیل سد ذرائع کے بارے قول ہے۔ پس اگر اسے تسلیم کر لیا جائے (توفیہا) ورنہ ہم نے اس کی صحت پر استدلال بیان کیا ہے۔ اور وہ گزر چکا ہے۔ اور یہ حدیث نص ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ نہ فرماتیں: أبلغی زیدًا أنه قد ابطل جهاده الا ان یتوب یہ ارشاد توقیفی ہے۔ کیونکہ فقط رائے سے ایسا قول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اعمال کو باطل کرنے کی معرفت بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم (1) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک حلال واضح اور بین

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من استبرأ الدینه، حدیث نمبر 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور حرام بھی واضح اور بین ہے اور ان دونوں کے درمیان امور مشتبہات ہیں۔ لوگوں میں سے بہت سے انہیں نہیں جانتے پس جو کوئی شبہات سے بچتا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی شبہات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں واقع ہو گیا، اس چرنے والے کی طرح جو چراگاہ کے اردگرد چرتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ اس میں واقع (داخل) ہو جائے۔ خبردار! سنو بلاشبہ ہر مالک کے لئے ایک چراگاہ ہے۔ خبردار! سنو اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں''۔

اور وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ نے محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے متشابہات میں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی ذریعہ کو بند کرنا اور ختم کرنا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک کبائر میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے۔'' صحابہ نے عرض کی: آدمی اپنے والدین کو گالیاں کیسے دے سکتا ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دوسرے آدمی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے ☆۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً کسی کے والدین کو گالیاں دینے کو اپنے والدین کو گالیاں دینے کی طرح قرار دیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود پر لعنت فرمائی جب انہوں نے ان (چیزوں کے ثمن کھائے جن) کے کھانے سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ (1)

اور ابو بکر نے اپنی کتاب میں کہا ہے: صدقہ کے خوف سے متفرق اشیاء کو جمع نہیں کیا جائے گا اور مجتمع کو متفرق نہیں کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی بیع دراہم کے ساتھ کرنے سے منع کیا ہے جبکہ ان کے درمیان گناہ ہو۔ اور علماء نے بیع اور قرض کو جمع کرنے سے روکنے پر اتفاق کیا ہے اور اس پر کہ شراب کی قلیل مقدار حرام ہے اگرچہ وہ نشہ نہ بھی لائے اور اس پر کہ اجنبیہ عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام ہے اگرچہ وہ عنین ہو اور اس پر کہ نوجوان عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا حرام ہے، علاوہ ازیں بہت سی چیزیں ہیں اور ان کے بارے قطعی اور یقینی علم ہے کہ شریعت نے ان سے باز رہنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ وہ محرمات تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اور رب اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی چراگاہ کی حفاظت کی جائے اور اس کے راستوں کو بند کیا جائے۔

اور جنہوں نے ان اسباب کو مباح قرار دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے کنواں کھودنے اور پھندے گاڑنے کو بھی مباح قرار دیں۔ اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آدمی کو زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار شے بیچنے کو منع کیا جائے گا، بشرطیکہ یہ معروف ہو اور اس کی عادت ہو۔ اور یہ اسی باب کے معنی میں ہے۔ واللہ الموفق للصواب۔

**مسئلہ نمبر 22۔** ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جب تم زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار چیزیں بیچنے لگو اور بیلوں کی دمیں پکڑنے لگو اور کھیتی پر ہی راضی ہو جاؤ اور جہاد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ تم پر ایسا رعب اور خصلت مسلط کر دے گا وہ اسے تم سے دور نہیں کرے گا یہاں

1۔ صحیح بخاری، باب لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع، حدیث نمبر 1358، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6529

تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس لوٹ آؤ(1)۔'' اس کی اسناد میں ابو عبد الرحمٰن خراسانی ہے۔ وہ مشہور راوی نہیں ہے۔

ابو عبید ہروی نے العینہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی اپنا سامان ثمن معلوم کے عوض کسی آدمی کو ایک مقررہ مدت تک ادھار بیچ دے اور پھر اسے اس سے ان ثمنوں سے کم کے عوض خرید لے جتنے کے عوض اسے بیچا تھا۔ فرمایا: اگر کسی نے عینہ کے طالب کی موجودگی میں ایک سامان دوسرے آدمی سے ثمن معلوم کے عوض خریدا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر اسے عینہ کے طالب کو اس سے زیادہ ثمن کے عوض مقررہ مدت تک ادھار بیچ دیا جتنے کے عوض اسے خریدا تھا پھر وہ مشتری پہلے بائع سے نقد اس سے کم ثمن کے ساتھ بیچ دے تو یہ بھی عینہ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ آسان ہے اور یہ بعض کے نزدیک جائز ہے اور صاحب عینہ کے پاس نقد موجود ہونے کی وجہ سے اسے عینہ کا نام دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ العین سے مراد مال حاضر ہے اور مشتری بلا شبہ اسے خرید رہا ہے تا کہ وہ اسے حاضر مال کے عوض بیچے جو اسے جلدی مل جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جس نے کچھ سامان ایک خاص مدت تک ثمن کے عوض فروخت کیا پھر اسے خرید لیا ایسے ثمن کے عوض جو اس ثمن کی جنس میں سے تھے جن کے عوض اسے بیچا تھا تو وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ وہ اسے نقد ثمن کے عوض خریدے گا یا اتنی مدت تک ادھار جو اس مدت سے کم تھی جس تک اس نے اسے بیچا تھا یا اس تک جو اس مدت سے زیادہ تھی، ثمن مثلی کے عوض یا اس سے کم کے عوض یا اس سے زیادہ کے عوض۔ پس یہ تین مسائل ہیں۔ جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے تو اگر وہ مثل ثمن یا اکثر ثمن کے عوض خریدے تو یہ جائز ہے اور کم ثمن کے عوض ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مقتضا کے مطابق جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے چھ سو دیئے ہیں تا کہ وہ آٹھ سو لے لے اور سامان لغو ہو گیا۔ اور یہ ہی خالص ربا ہے۔ اور رہا تیسرا مسئلہ کہ وہ اس سے زیادہ مدت تک ادھار لے لے، پس اگر اس نے صرف اسے ہی خریدا یا کچھ اور بھی، تو مثل ثمن یا اقل ثمن کے ساتھ یہ جائز ہوگی، البتہ زیادہ ثمن کے عوض جائز نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اس میں سے بعض حصہ خرید لیا تو پھر کسی حال پر بھی یہ خرید جائز نہ ہوگی نہ مثل ثمن کے ساتھ، نہ اقل کے ساتھ اور نہ ہی اکثر کے ساتھ۔ اس باب کے مسائل کو ہمارے علماء نے ستائیس مسائل میں محصور کیا ہے اور ان کا دارومدار اسی پر ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس تو جان لے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَهٗ مَا سَلَفَ یعنی سود کے معاملہ میں سے جو گزر چکا ہے اس پر نہ دنیا میں کوئی مواخذہ ہوگا اور نہ آخرت میں، سدی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے حکم ہے جس نے کفار قریش میں سے اسلام قبول کیا اور بنی ثقیف اور ان میں سے جو وہاں تجارت کرتے تھے (ان میں سے جس نے اسلام قبول کیا) اور سلف کا معنی ہے وہ زمانہ جو پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ اس میں چار تاویلات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہے کہ سود کا معاملہ اس کی یا دوسری چیزوں کی تحریم کو جاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النہی من العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری یہ کہ ضمیر ما سَلَفَ کی طرف لوٹ رہی ہو یعنی جو کچھ گزر چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اسے معاف کرنے کے بارے میں اور اس میں تاوان اور سزا کو ساقط کرنے کے بارے میں۔ اور تیسری یہ ہے کہ ضمیر سود لینے والے (ذی الربا) کی طرف لوٹ رہی ہے، اس معنی میں کہ اس کا معاملہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے کہ وہ اسے اس سے رکنے پر ثابت قدم رکھے یا اسے دوبارہ ربا میں گناہ کی طرف لوٹا دے۔

اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ قول اچھا اور واضح ہے۔ یعنی مستقبل میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے تحریم پر ثابت رکھے اور اگر چاہے تو اسے مباح قرار دے۔ اور چوتھی تاویل یہ ہے کہ ضمیر رکنے والے اور باز رہنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو لیکن اسے مانوس کرنے اور خیر اور بھلائی میں اس کی آرزو اور امید پھیلانے کے معنی میں، جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ اطاعت اور خیر کے سپرد ہے اور جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ نمو اور توجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کے سپرد ہے۔

**مسئلہ نمبر 26۔** قولہ تعالیٰ: وَمَنْ عَادَ یعنی جو فعل ربا کی طرف لوٹ آیا (یعنی دوبارہ سود کھانے لگا) یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حضرت سفیان نے یہ کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: جو لوٹا اور اس نے کہا بے شک بیع ربا کی مثل ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اگر ہم کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ مجازاً مبالغہ کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: مُلْكٌ خالد یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

**مسئلہ نمبر 27۔** قولہ تعالیٰ: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا یعنی اس کی نمو ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہی ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الرِّبا وان کثر فعاقبته الی قُلّ (بلاشبہ سود اگرچہ بہت زیادہ ہو اس کا انجام قلیل ہی ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کوئی صدقہ، حج، جہاد اور صلہ رحمی قبول نہیں کرے گا۔

المَحْقُ کا معنی النقص والذهاب۔ کم ہونا یا گھٹانا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے مُحَاق القمر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ یعنی وہ دنیا میں خیرات کو برکت کے ساتھ بڑھاتا ہے اور آخرت میں ان کا ثواب کئی گناہ کر کے بڑھا دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''بے شک تم میں سے کسی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ اسے اس کے لئے بتدریج بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑی اور گائے کے بچوں کی نشوونما کرتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا اور بے شک ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جائے گا۔''(1)

---

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الصدقة، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن زبیر نے یُمۡحِقُ یا کے ضمہ اور حا کے کسرہ کو مشدد اور یُرۡبِیۡ را کو فتحہ کے ساتھ اور با کو مشدد پڑھا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 28۔** قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ اس میں کفار کی صفت اَثیم مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار میں اشتراک کے معنی کو زائل کرنے کے لئے یہ صفت لگائی گئی ہے کیونکہ کبھی اس کا اطلاق اس کسان پر بھی ہوتا ہے جو زمین میں دانا چھپاتا ہے۔ (یعنی کاشت کرتا ہے) ابن فورک نے یہی کہا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور نماز اور زکوٰۃ کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے حالانکہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہیں متضمن اور شامل ہے۔ تو یہ ان دونوں کے شرف وعظمت اور ان کی قدر ومنزلت پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں اعمال کی اصل ہیں، نماز بدنی اعمال کی اصل ہے اور زکوٰۃ مالی اعمال کی اصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 29۔** قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ ظاہر یہ ہے کہ وہ اس سود کو باطل کردے جس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اگرچہ آیت تحریم کے نازل ہونے سے پہلے اس کا عقد ہو چکا ہو۔ اور جب اس پر قبضہ ہو چکا ہو تو پھر اس کے فسخ کے پیچھے نہ پڑے۔

تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی ثقیف کے سبب نازل ہوئی۔ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس پر معاہدہ کیا تھا کہ ان کے سود کا مال جو لوگوں پر ہے تو وہ انہیں کے لئے ہے اور جو لوگوں کا ان پر ہے تو وہ ان سے ختم کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے سود کی مقررہ مدتیں آ پہنچیں تو انہوں نے اہل مکہ کی طرف تقاضا کے لئے (پیغام) بھیجا۔ قرضے بنی عبدہ کے تھے اور وہ بنو عمرو بن عمیر ثقیف میں سے تھے اور یہ بنی مغیرہ مخزومیوں پر تھے۔ اور بنو مغیرہ نے کہا: ہم کوئی شے نہیں دیں گے کیونکہ ربا ختم کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لکھا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حضرت عتاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا اور ثقیف نے بھی اس کے بارے جان لیا اور وہ (سود کا مطالبہ کرنے) سے رک گئے۔ یہی آیت کا سبب نزول ہے اور یہ اس مجموعے کا اختصار ہے جو ابن اسحاق، ابن جریج اور سدی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے تم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ بنالو اپنے باقی ربا کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے۔

**مسئلہ نمبر 30۔** قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یہ اس بنا پر ثقیف کے حق میں شرط محض ہے کیونکہ یہ حکم ان کے اسلام میں داخل ہوتے ہی پہلے پہل نازل ہوا۔ اور جب ہم آیت کو ان کے بارے میں مقدر قرار دیں جن کا ایمان پختہ ہو چکا تھا تو پھر یہ مبالغہ کی جہت پر شرط مجازی ہے جیسا کہ تو اس کے بارے میں کہتا ہے جس کی ذات کو تو ابھارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ''اگر تو مرد ہے تو اس طرح کر۔'' اور نقاش نے مقاتل بن سلیمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس آیت میں اِنْ بمعنی

اِذْ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور لغت میں معروف نہیں ہے۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایمان لانا ہو اور ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا مراد ہو، کیونکہ اس کے بغیر پہلا ایمان نفع نہیں دے گا اور یہ اس کے سبب مردود ہے جو آیت کے سبب نزول میں بیان کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 31**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ یہ وعید ہے اگر انہوں نے سود نہ چھوڑا اور جنگ قتل کی دعوت دیتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا: جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے: جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے، پس اگر وہ باز آ جائے (تو فبہا) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو، یعنی تم ان کے دشمن ہو۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر کسی نہر والوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کر لی تو وہ مرتد ہو گئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (پھر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ سن لیں) اور ابو بکر نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے ''فَاٰذِنُوْا'' پڑھا ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر کہ تم اپنے سوا کو بتا دو کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے حالت جنگ میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 32**۔ ابن بکیر نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبداللہ! میں نے ایک آدمی کو نشہ کی حالت میں دیکھا، وہ گالی گلوچ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ چاند کو پکڑ لے، سو میں نے کہا میری بیوی کو طلاق اگر ابن آدم (انسان) کے پیٹ میں شراب سے بڑھ کر کوئی بری شے داخل ہوتی ہو۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تو واپس چلا جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ پھر وہ دوسرے دن آیا، تو آپ نے اسے پھر فرمایا: تو واپس لوٹ جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ وہ پھر تیسرے دن آیا تو آپ نے اسے فرمایا: تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے میں نے کتاب اللہ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں خوب چھان بین کی، گہری غور و فکر کی تو میں نے سود سے بڑھ کر کوئی بری شے نہ دیکھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنگ کا اعلان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 33**۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سود کھانا اور اس کے مطابق کاروبار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہم اسے بیان کریں گے۔

حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاتی علی الناس زمان لا یبقی أحد الا أکل الربا ومن لم یأکل الربا أصابه غبارہ (لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ سود کھائے گا اور جس نے نہ کھایا تو اس کا غبار اس تک پہنچ جائے گا۔)

اور دارقطنی نے حضرت عبد اللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لَدِرهمُ ربًا اشد عند الله تعالیٰ من ست وثلاثین زنیة فی الخطیئة (سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے۔)

اور آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الرِّبا تسعة و تسعون بابا أدناها کاتیأن الرجل بأمه(1) (سود کے ننانوے دروازے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کی مثل ہے) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود کھانے والا، کھلانے والا، اسے لکھنے والا اور اس کی شہادت دینے والا سب پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اور امام بخاری نے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(2) کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے خون کے ثمن (قیمت) کتے کے ثمن اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے پر (بال) گودنے اور گدوانے والی پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے۔ نھی رسول الله ﷺ عن ثمن الدم و ثمن الکلب و کسب البغی و لعن آکل الربا و مؤکله و الواشمة و المستوشمة و المصور اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو اور ان میں ہے...... و آکل الربا اور سود کھانے والا۔

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(3) انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس پر شاہد بننے والے سبھی پر لعنت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 34**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ الآیہ۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے(4) کہ انہوں نے کہا: میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''خبردار! سنو بے شک دور جاہلیت کے سودوں میں سے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔'' اور آگے پوری حدیث بیان کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کے ساتھ اپنے راس الاموال کی طرف لوٹا دیا اور انہیں فرمایا: سود لینے میں ''تم ظلم نہ کرو'' ''اور تم پر یہ ظلم نہیں کیا جائے گا''۔ کہ تمہارے راس

---

1۔ ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الرباء، حدیث نمبر 2264، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر 2084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی وضع الرباء، حدیث نمبر 2896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الاموال میں سے کوئی شے روک لی جائے اور تمہارے اموال ختم ہو جائیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر ٹال مٹول کر کے ظلم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ غنی کا ٹال مٹول کرنا بھی ظلم ہے (1)۔ پس معنی یہ ہوا کہ فیصلہ سود ختم کرنے کے ساتھ ہی ہوگا اور اسی طرح صلح کا طریقہ ہے اور یہی صلح کے زیادہ مشابہ شے ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب بن مالک کی طرف ابن ابی حدرد کے قرض میں نصف ختم کرنے کے بارے اشارہ کیا اور کعب نے کہا: جی ہاں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو فرمایا: ''اٹھ اور اسے ادا کر دے'' پس علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر بالقضاء کو مصالحات میں سنت کے طور پر لیا ہے۔ عنقریب سورۃ النساء میں صلح کا بیان آئے گا اور ان کا جن میں صلح جائز ہوتی ہے اور جن میں جائز نہیں ہوتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 35۔** قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ یہ تاکید ہے اس (ربا) کو باطل کرنے کی جس پر قبضہ نہیں کیا گیا اور اس رأس المال کو لینے کی جس میں سود نہیں۔ پس بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر وہ شے جو بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ان چیزوں میں سے طاری ہو جو عقد کی تحریم کو ثابت کرتی ہیں تو وہ عقد کو باطل کر دے گی، جیسا کہ جب کوئی مسلمان شکار خریدے پھر مشتری یا بائع قبضہ سے پہلے اسے حرام کر دے تو بیع باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس پر قبضہ سے پہلے وہ شے طاری ہو چکی ہے جس نے عقد کے حرام ہونے کو ثابت کر دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس (ربا) کو باطل قرار دیا ہے جس پر قبضہ نہیں ہوا، کیونکہ اس پر وہ طاری ہو چکی ہے جس نے قبضہ سے پہلے اس کی تحریم کو ثابت کر دیا ہے اور اگر اس پر پہلے قبضہ کر لیا گیا ہو تو پھر اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور یہی امام شافعی کے اصحاب کا بھی قول ہے اور اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ قبضہ سے پہلے بائع کے ہاتھ میں مبیع کا ہلاک ہو جانا اور مبیع میں قبضہ کا ساقط ہو جانا عقد کے باطل ہونے کو واجب کرتا ہے۔ بخلاف بعض سلف کے اور یہ اختلاف امام احمد سے روایت کیا جاتا ہے۔

اور اس کے قول کے مطابق جاری ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: بے شک ربا میں عقد فی الاصل منعقد ہو چکا تھا اور پھر وہ قبضہ سے پہلے طاری ہونے والے اسلام کے سبب باطل ہو گیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے اصل میں ربا کے انعقاد کا انکار کیا ہے تو (ان کے نزدیک) یہ کلام صحیح نہیں ہے وہ یہ کہ سود (تمام) ادیان میں حرام کر دیا گیا ہے اور وہ جو دور جاہلیت میں اس کا کاروبار کرتے تھے تو وہ مشرکین کی عادت تھی اور ربا میں سے جس پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ان مالوں کے جمع ہونے کی جگہ میں ہے جو ان تک غصب اور سلب کے ذریعہ پہنچے ہیں تو اس پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ پس اس بنا پر استشہاد صحیح نہیں ہوگا ان مسائل میں جو انہوں نے ذکر کئے ہیں اور ہم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ربا کی تحریم پر مشتمل ہونا مشہور ہے اور کتاب اللہ میں مذکور ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں یہودیوں کے بارے بیان کیا گیا ہے: وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ ان کی قوم نے ان کا انکار کیا اور کہا: اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا

1۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود: 87) (کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کرتے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں)

پس اس بنا پر اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ ہاں اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقود جو دارالحرب میں واقع ہوں جب امام وقت ان پر غالب آئے تو وہ فسخ کے احکام جاری نہیں کرے گا اگرچہ وہ عقود فاسدہ ہی ہوں۔

**مسئلہ نمبر 36**۔ ارباب ورع وزہد میں سے بعض غلو کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حلال مال میں جب حرام مال اس طرح مل جائے کہ تمیز ممکن نہ رہے پھر وہ ملے جلے مال میں سے حرام مال کی مقدار مال نکال دے تو پھر بھی (باقی مال) حلال اور پاک نہ ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو مال نکالا گیا ہے وہ حلال ہو اور جو باقی ہے وہ حرام ہو۔ ابن عربیؒ نے کہا ہے: یہ دین میں غلو ہے۔ کیونکہ ہر وہ مال جس میں تمیز کرنا (اور اسے علیحدہ علیحدہ کرنا) ممکن نہ رہے تو پھر اس سے مقصود اس کی مالیت ہوتی ہے نہ کہ اس کا عین۔ اور اگر مال ضائع ہو جائے تو پھر اس کی مثل مال اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے مالوں کا مخلوط ہو جانا اس کی تمیز اور علیحدگی کے اعتبار سے اتلاف اور ضیاع ہی ہے جیسا کہ ہلاک کر دینا اس کے عین (ذات) کے لئے اتلاف اور ضیاع ہے اور مثل ضائع ہونے والے مال کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہ حسناً اور معنیً بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس لوٹا دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں سے حرام کتنا ہے، تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے۔ پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا اسے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے یہ معروف ہو کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے یا اس سے بطور سود مال لیا ہے اور اگر وہ ایسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے، سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے

اموال کسی زیادتی یا ظلم کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے وہ مال اس کے حوالے کر رکھے ہوتے ہیں۔ پس اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دیا جائے گا جو اسے چھپا لے گا اور وہ وہ ہے جو اس کے لباس کی ہیئت و کیفیت میں ہو۔

اور ابو عبید وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مفلس کے لئے لباس نہ چھوڑے مگر وہ کم سے کم مقدار جو نماز میں اسے کافی ہو اور وہ وہ ہے جو اسے ناف سے گھٹنے تک ڈھانپ لے، پھر جب بھی کوئی شے اس کے ہاتھ میں آئے اسے وہ اپنے ہاتھ سے نکال دے اور اس سے وہ کچھ روک کر نہ رکھے سوائے اس مقدار کے جو ہم نے ذکر کر دی ہے، یہاں تک کہ وہ جان لے، اور کون اس کی حالت کو جان سکتا ہے کہ اس نے وہ ادا کر دیا ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

**مسئلہ نمبر 37**۔ یہ وہ وعید ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کی صورت میں جنگ سے ڈرایا دھمکایا ہے اور اسی کی مثل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے بٹائی پر کھیتی کرنے کے بارے میں بھی وارد ہے۔ ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یحییٰ بن معین اور ابن رجا نے ہمیں خبر دی ہے اور ابن رجا نے کہا ہے کہ مجھے ابن خثیم نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے بٹائی پر کھیتی کرنے کو نہ چھوڑا تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ سن لے۔'' پس یہ بٹائی پر کھیتی کرنے سے روکنے پر دلیل ہے اور مخابرہ سے مراد زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لینا ہے اور اسے مزارعت کہا جاتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اصحاب، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زمین ثلث اور ربع پر دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس پیداوار کے جز پر جو زمین سے حاصل کی جائے گی، کیونکہ وہ مجہول ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زمین کو اناج کے عوض کرائے پر دینا جائز ہے بشرطیکہ مقدار معلوم ہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پس جو شے معلوم ہو اس کی ضمانت ہو سکتی ہو تو اس کے عوض کوئی حرج نہیں ہے۔''

اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ مسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیتے تھے اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ پس ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایسے معاملے سے منع کیا ہے جو ہمارے لئے باعث نفع تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس سے منع کیا ہے کہ ہم زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیں اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کی شرط پر کرائے پر دیں اور آپ نے زمین کے مالک کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا اسے مزارعت پر دے دے۔ اور آپ نے اس کے کرائے کو اور جو کچھ اس کے سوا ہے اسے ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: پس زمین کا کرایہ اناج میں سے کسی شے کے ساتھ جائز نہیں ہے کسی بھی حال میں چاہے وہ شے کھائی جانے والی ہو

یا پی جانے والی، کیونکہ یہ طعام کے بدلے طعام ادھار بیچنے کے معنی میں ہے اور اسی طرح زمین کا کرایہ ان کے نزدیک اس شے سے دینا بھی جائز نہیں ہے جو زمین سے نکلے گی اگر چہ وہ کھایا اور پیا جانے والا طعام نہ بھی ہو، سوائے لکڑی، کانے اور ایندھن کی لکڑی کے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیع مزابنہ کے معنی میں ہے۔ (بیع مزابنہ سے مراد بغیر کیل اور وزن کے صرف اندازے کے ساتھ کسی شے کی بیع کرنا ہے) یہی وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب سے محفوظ ہے۔

اور ابن سحنون نے مغیرہ بن عبدالرحمٰن مخزومی مدنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ زمین کو اس اناج کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس سے نہ پیدا ہوتا ہو اور یحییٰ بن عمر نے مغیرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ ابن کنانہ کہتے تھے: زمین کو ایسی شے کے عوض کرائے پر نہیں دیا جائے گا کہ جب وہ شے زمین میں لوٹائی جائے تو وہ اگ پڑے۔ اور اس کے سوا تمام ایسی اشیاء کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کھائی جاتی ہوں اور ان کے عوض جو نہ کھائی جاتی ہوں چاہے وہ زمین سے پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی طرح یحییٰ بن یحییٰ نے بھی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں سے ہے۔ (ابن حبیب نے) کہا ہے اور ابن نافع کہا کرتے تھے: زمین کو طعام وغیرہ میں سے ہر شے کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو زمین سے پیدا ہو یا نہ پیدا ہو، ماسوائے گندم اور اس جیسی اجناس کے، کیونکہ یہ محاقلہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ (اور محاقلہ سے مراد کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کر دینا ہے۔)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے الموطا میں کہا ہے وہ آدمی جو اپنی سفید زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ثلث اور ربع کے عوض دے دیتا ہے تو یہ اس میں سے ہے جس میں دھوکہ داخل ہے کیونکہ پیداوار ایک بار کم ہوتی ہے اور دوسری بار زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات بالکل کچھ بھی نہیں ہوتا تو زمین کا مالک مقررہ کرایہ ترک کرنے والا ہو جائے گا، بے شک اس کی مثال اس آدمی کی مثل ہے جس نے کسی مزدور کو معین شے کے عوض سفر کے لئے اجرت پر لیا پھر مستاجر نے اجیر کو کہا: میں اپنے اس سفر سے جو نفع حاصل کروں گا اس کا دسواں حصہ تجھے دوں گا وہی تیرے لئے اجرت ہوگی۔ تو نہ یہ حلال ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

امام مالک نے کہا ہے کسی آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، اپنی زمین کو، اپنی کشتی اور اپنے جانور کو اجرت پر دے مگر ایسی معلوم شے کے عوض جو زائل اور ہلاک نہ ہو اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل، لیث، ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک خاص جز مثلاً ثلث اور ربع وغیرہ کی شرط پر دے دے، یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور انہوں نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں کے باسیوں کو ہی اپنی زمینوں پر ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور پھلوں میں سے نصف کی شرط پر عامل مقرر کیا۔ امام احمد نے کہا ہے کہ کھیت کے کرائے سے نہی کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب

الالفاظ ہے اور وہ صحیح نہیں ہے اور قصہ خیبر کے بارے قول اولی اور ارجح ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔(1)

تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد آنے والوں نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اپنی کشتی اور اپنی سواری کسی کو دے جس طرح کہ وہ اپنی زمین اس جز کے بدلے دیتا ہے جو اس پیداوار میں سے ہو جو اللہ تعالیٰ اسے محنت کے سبب عطا فرمائے گا۔ اور انہوں نے اس میں اپنی اصل اور بنیاد اس مضاربت کو بنایا ہے جس پر اجماع ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المزمل میں اس ارشاد کے تحت آئے گا: وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے کہا ہے کہ ہم بٹائی پر کھیتی کرتے تھے اور ہم اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہمیں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، یعنی ہم زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے بعض کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: اس میں قصہ خیبر والی حدیث کا نسخ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو شے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نسخ کے بارے قول کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیتی فروخت کر دینا) مزابنہ (اندازے سے بیع کرنا) مخابرہ (بٹائی پر کھیتی کا کام کرنے) اور الثنایا (عقد بیع کے وقت مبیع میں سے مجہول شے کی استثنا کر دینا) سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ (جس شے کی استثنا کی گئی ہے) وہ معلوم ہو۔ یہ روایت صحیح ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ مخابرہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو زمین نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لے لے۔

**مسئلہ نمبر 38**۔ یہ قراءتوں کے بیان میں ہے۔ جمہور نے مَا بَقِیَ میں یا کو متحرک پڑھا ہے اور حسن نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فارضَوا مارَضِي لكم ماضي العزيمةِ ما في حكمه جَنَفَ

اور عمر بن ربیعہ نے کہا ہے:

كم قد ذكرتُك لو أُجْزَى بذكرِكُم يا أشبهَ النَّاسِ كُلَّ الناسِ بالقَمرِ

إنّي لأَجْذَلُ أن أُمْسِي مُقَابِلَهُ حُبًّا لرؤية مَنْ اشبهت في الصُّوَرِ

اس کی اصل ما رَضِیَ اور اَنْ اُمْسِیَ ہے۔ اور انہوں نے انہیں سکون دیا ہے اور شعر میں ایسا کثرت سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یا کو الف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح الف پر حرکت نہیں آسکتی تو اسی طرح یہاں یا پر بھی حرکت نہیں آسکتی۔ اور اس لغت میں سے جس کی طرف دعوت دینا میں پسند کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے اس کی نصیحت

1۔ صحیح بخاری، باب اذا لم یشترط السنین فی المزارعة، حدیث نمبر 2161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی المخابرة، حدیث نمبر 2958، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں وہ واؤ اور یا کو ساکن کرنا ہے۔ حسن نے مابَقِی الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لغت طی ہے۔ وہ جاریہ کے لئے جاراۃ اور ناصیۃ کے لئے ناصاۃ بولتے ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

لعمرکَ لا أخشی التصعلُکَ مابَقَی علی الأرض قَیْسِیّ یسوق الأباعرا

ابوالسمال نے تمام قراء کے درمیان سے مِنَ الرِّبُوا مشددہ کے کسرہ، با کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو الفتح عثمان بن جنی نے کہا ہے: دو اعتبار سے یہ حرف شاذ ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف خروج ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ اس میں اسم کے آخر میں ضمہ کے بعد واؤ واقع ہے اور مہدوی نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے الف کو پر پڑھا ہے تو وہ اس سے اس واؤ کی طرف جھک گئی جس سے الف ہے اور سوائے اس وجہ کے کسی پر اسے محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کلام میں کوئی اسم نہیں جس کے آخر میں واؤ ساکن ہو اور اس سے پہلے ضمہ ہو۔ کسائی اور حمزہ نے الربا میں را میں کسرہ کے محل کی وجہ سے امالہ کیا ہے۔ اور باقیوں نے با کے فتحہ کی وجہ سے اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوبکر نے عاصم اور حمزہ سے فَأْذَنُوْا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (ای کونوا علی اذن) یہ تیرے اس قول سے ہے: انی علی علم (میں جانتا ہوں) اسے ابوعبید نے اصمعی سے بیان کیا ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أذنت بہ اذنا، ای علمت بہ یعنی میں نے اس کے بارے جان لیا۔ اور مفسرین میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: فَأْذَنُوْا کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنگ یقینی سمجھو۔ اور یہ بمعنی الاذن ہے اور ابوعلی وغیرہ نے قراۃ المد کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: کیونکہ جب انہیں ان دوسروں کو خبردار کرنے کے بارے حکم دیا گیا جو اس سے آگاہ نہیں تو لامحالہ انہوں نے انہیں بتایا۔ مزید کہا: پس ان کے بتانے میں ان کا علم ہے اور ان کے علم میں ان کا اعلام (بتانا) نہیں ہے۔ اور علامہ طبری نے قراۃ القصر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ مختص ہے۔ بے شک انہیں مد کی قراءت پر اپنے سوا کو آگاہ کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے اور تمام قراء نے لَا تَظْلِمُوْنَ تا کے فتحہ کے ساتھ اور وَلَا تُظْلَمُوْنَ تا کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور مفضل نے عاصم سے لَا تُظْلَمُوْنَ۔ وَلَا تَظْلِمُوْنَ یعنی پہلی میں تا کو ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں تا کو فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابوعلی نے کہا ہے۔ جماعت کی قرأت ترجیح یافتہ ہے کیونکہ یہ وَاِنْ تُبْتُمْ کے قول سے مناسبت رکھتی ہے اس میں کہ دونوں فعلوں کی اسناد فاعل کی طرف ہے اور تَظْلِمُوْنَ تاء کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور یہ اپنے ماقبل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

## وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸۰

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک، اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو ان کے اصل اموال کے

بارے حکم فرمایا درآنحالیکہ وہ ان کے پاس ہو جو مال کو پانے والے ہوں، تو تنگدستی کی حالت میں خوشحال ہونے تک مہلت دینے کا ارشاد فرمایا اور وہ یہ کہ ثقیف نے جب اپنے ان اموال کا مطالبہ کیا جو بنی مغیرہ پر قرض تھے تو بنی مغیرہ نے تنگدستی کا عذر پیش کیا اور کہا: ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے اور انہوں نے اپنے پھلوں کے تیار ہونے کے وقت تک مہلت کا مطالبہ کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ۔(1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ اس ارشاد کے ساتھ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ صاحب قرض کے اپنے مدیون (مقروض) سے مطالبہ کے ثبوت اور اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لینے کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ غریم جب امکان کے باوجود قرض ادا کرنے سے رکا رہے تو وہ ظالم ہے، کیونکہ الله تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ پس الله تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے رأس المال کے مطالبہ کو جائز قرار دیا ہے تو جب اس کے لئے مطالبہ کا حق ہے تو پھر وہ جس پر قرض ہے لامحالہ اسے ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مہدوی اور بعض علماء نے کہا ہے یہ آیت اس طریقہ اور رواج کے لئے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدست کو بیچنے کے بارے میں تھا اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں اس کے بارے حکم فرمایا تھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پس اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ثابت ہے تب تو یہ نسخ ہے ورنہ یہ نسخ نہیں ہے (2)۔

امام طحاوی نے کہا ہے: ابتدائے اسلام میں قرض میں آزاد آدمی کو بیچ دیا جاتا تھا جب اس کے پاس اتنا مال نہ ہوتا جسے وہ اپنے قرض میں ادا کر سکتا یہاں تک کہ الله تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دارقطنی نے مسلم بن خالد زنجی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہمیں زید بن اسلم نے ابن البیلمانی سے اور انہوں نے سرق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کا مجھ پر کچھ مال تھا...... یا کہا مجھ پر قرض تھا...... پس وہ مجھے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور آپ نے میرے لئے کوئی مال نہ پایا تو آپ نے مجھے اس سے یا فرمایا اس کے لئے فروخت کر دیا۔ بزار نے اسے اس سے طویل سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلم ابن خالد الزنجی اور عبدالرحمن بن البیلمانی دونوں قابل حجت نہیں ہیں اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ تمام لوگوں کے لئے عام ہے، پس ہر وہ جو تنگدست ہو اسے مہلت دی جائے۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حسن اور عام فقہا رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے سب سے اچھا قول حضرت عطاء، ضحاک اور ربیع بن خیثم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر تنگدست کے لئے ہے کہ اسے ربا اور تمام قرضوں میں مہلت دی جائے گی اور یہ قول تمام اقوال کو جامع ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ آیت عام ناسخ ہو ربا کے بارے میں نازل ہوئی ہو پھر دوسرے قرضوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 376 2۔ ایضاً

کا حکم بھی اس کے حکم کی طرح ہو گیا ہو۔ اور اس لئے بھی کہ رفع کے ساتھ قرأت اس معنی میں ہے وان وقع ذو عسرۃ من الناس اجمعین (اور اگر تمام لوگوں میں سے مقروض تنگدست واقع ہو۔)

اور حضرت ابن عباس اور شریح رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یہ آیت ربا کے بارے میں خاص ہے اور رہے قرضے اور دیگر تمام معاملات تو اس میں مہلت نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ان کے مالکوں کو ادا کرے گا یا اس سے اسے محبوس کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے پورا کر دے اور یہی ابراہیم کا قول ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا الآیہ (النساء: 58) (بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس پر مرتب ہوتا ہے جب فقر و افلاس شدید اور ذلیل و رسوا کرنے والا نہ ہو اور اگر وہ اس کے فقدان اور فقر کی حالت بالکل صریح اور واضح ہو تو پھر بالضرور اس کے لئے مہلت کا حکم ہو گا (1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جس آدمی کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اپنے کل مال سے فارغ کر دے اور اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کر سکے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں چھوڑے گا مگر صرف اتنا جو اسے ڈھانپ سکتا ہو۔ اور مشہور یہ ہے کہ وہ اس کے لئے اتنا مروجہ لباس چھوڑ دے گا جس میں کوئی شے فالتو اور اضافی نہ ہو اور اس سے اس کی چادر نہیں چھینی جائے گی بشرطیکہ وہ اسے بطور تہبند پہنتا ہو۔ اور اس کی بیوی کا لباس چھوڑنے میں اور اگر وہ عالم ہے تو اس کی کتابیں فروخت کرنے میں اختلاف ہے۔ اس کے لئے نہ گھر چھوڑا جائے گا اور نہ خادم اور نہ ہی جمعہ کا لباس چھوڑا جائے گا جبکہ اس کی قیمت کم نہ ہو اور اس وقت اسے محبوس کرنا حرام ہوتا ہے اور اس میں اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی کو ان پھلوں میں نقصان ہو گیا جو اس نے خریدے تھے تو اس کا قرض بہت بڑھ گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تصدقوا علیہ تم اس پر صدقہ کرو پس لوگوں نے اس کے لئے صدقہ دیا لیکن وہ اس مقدار کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کا قرض پورا ہو سکتا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے قرض کا مطالبہ کرنے والوں کو فرمایا: خذوا ما وجدتم ولیس لکم الا ذالك (تم جو پاؤ وہ لے لو اور تمہارے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔) اور مصنف ابی داؤد میں ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے غرماء (قرض کا مطالبہ کرنے والے) کے لئے یہ زائد نہیں کہا کہ ''وہ ان کے لئے اپنا مال چھوڑ دے'' اور یہ نص ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کو محبوس کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا: اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے جیسا کہ شریح نے کہا ہے اور نہ ہی اسے لازم پکڑنے (یعنی اس کے ساتھ ساتھ رہنے) کا حکم فرمایا، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے کیونکہ ممکن ہے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 377

مال ظاہر ہو جائے اور قرض خواہ اسے مال کمانے کا پابند نہیں کرے گا اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللّٰہ توفیقنا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مفلس کو محبوس کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے پاس مال کا نہ ہونا ظاہر ہو جائے اور امام مالک کے نزدیک اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس پر یہ وہم نہ ہو کہ اس نے اپنا مال غیب کر دیا ہے اور اس کا جھگڑالو ہونا بھی ظاہر نہ ہو اور اسی طرح اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس کی تنگدستی درست ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اور اگر مفلس کا مال جمع کر لیا جائے پھر وہ قرض کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچنے سے پہلے اور بیع سے پہلے ضائع ہو جائے، تو مفلس پر اس کی ضمانت ہو گی اور قرض خواہوں کا قرض اس کے ذمہ ثابت رہے گا اور اگر حاکم نے اس کا مال فروخت کر دیا اور اس کے ثمن پر قبضہ کر لیا پھر قرض خواہوں کے قبضہ سے پہلے وہ ثمن ضائع ہو گئے تو اس کی ضمانت ان پر ہو گی اور مفلس اس سے بری الذمہ ہو گا اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے اس کی ضمانت ہمیشہ مفلس سے لی جائے گی یہاں تک کہ وہ غرماء تک پہنچ جائے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ العسرۃ کا معنی ہے مال نہ ہونے کی جہت سے حال کا تنگ ہونا اور اسی سے جیش عسرہ ہے۔ (یعنی وہ لشکر جس کے پاس مالی حالت تنگ تھی۔) اور النظرۃ کا معنی التاخیر (مہلت دینا) ہے۔ اور المیسرۃ مصدر بمعنی الیسر (خوشحال ہونا) ہے۔ اور ذُو اس کانَ تامہ کی وجہ سے مرفوع ہے جو بمعنی وجد اور حدث ہے۔ یہ سیبویہ اور ابوعلی وغیرہما کا قول ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فِدًى لبني ذُهل بن شَيبان ناقتِي　　اذا كان يوم ذو كواكب أشهب

اور نصب بھی جائز ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں ہے وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ اس معنی کی بنا پر "کہ اگر مطلوب (مقروض) تنگ دست ہو اور اعمش نے وَاِنْ کَانَ مُعْسِرًا فَنَظِرَۃٌ پڑھا ہے۔ ابوعمر والدانی نے احمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے۔ نحاس، مکی اور نقاش نے کہا ہے: اس قرأت پر آیت کا لفظ اہل ربا کے ساتھ مختص ہو جائے گا اور جمہور نے ذُو پڑھا ہے ان کی قرأت کے مطابق یہ آیت ان تمام کے بارے میں عام ہے جن پر قرض ہو اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں فَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فا کے ساتھ ہے اور معتمر نے حجاج الوراق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں وَاِنْ کَانَ ذا عُسْرَۃٍ ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور جماعت کی قرأت نَظِرَۃٌ ظا کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مجاہد، ابورجا اور حسن نے فَنَظْرَۃٌ ظاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور وہی ہیں جو کہتے ہیں فی کَرُمَ زید بمعنی کَرُمَ زید اور وہ کہتے ہیں کَبْدٌ بمعنی کبِد۔ اور اکیلے نافع نے مَیْسُرَۃٍ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

نحاس نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے فَنَاظِرْہُ الی مَیْسُرِہٖ ھی یعنی صیغہ امر اور مَیْسُرِہٖ میں سین کو ضمہ، راء کو کسرہ اور درج

کلام میں یاء کو ثابت رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور فَنَاظِرَۃٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے: فناظِرَۃٌ جائز نہیں ہے، وہ سورۃ النمل میں ہے، کیونکہ وہ ایک عورت ہے جس نے اس کے ساتھ اپنی ذات کے بارے کلام کیا ہے۔ یہ نظرتُ تنظُرُ فھی نَاظِرَۃٌ سے ہے اور جو سورۃ البقرہ میں ہے وہ التاخیر بمعنی مہلت دینا سے ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے۔ انظرتك بالدین۔ یعنی میں نے تیرا قرض موخر کر دیا ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿﴾ (الحجر) (پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے) ابواسحاق الزجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ مصادر کے اسماء میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿﴾ (واقعہ) (نہیں ہو گا جب یہ برپا ہو گی (اسے) کوئی جھٹلانے والا) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ ﴿﴾ (القیامہ) (خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہو گا) اور اسی طرح خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وغیرہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر خَیْرٌ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تنگدست پر صدقہ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے اور اسے مہلت دے کر اسے بہتر بنا دیا ہے۔ سدی، ابن زید اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا غنی اور فقیر پر صدقہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور پہلا قول صحیح ہے اور آیت میں غنی داخل نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تنگدست مقروض کو مہلت دی اس کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ (کا ثواب) ہے۔'' پھر میں نے عرض کی (کیا) ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر دن کے عوض صدقہ ہے جب تک قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آ پہنچے اور ادائیگی کا وقت آ جانے کے بعد اگر اس نے اسے مؤخر کر دیا تو اس کے لئے ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے۔''

اور مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا محاسبہ کیا گیا تو اس کے لئے خیر اور نیکی میں سے کوئی شے نہ پائی گئی سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا تھا اور خوشحال تھا تو وہ اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ تنگدست سے چشم پوشی کریں، اسے معاف کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: ہم اس سے زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اسے معاف کر دیں۔''

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مقروض کو تلاش کیا تو وہ آپ سے چھپ گیا پھر آپ نے اسے پا لیا تو اس نے کہا: بلاشبہ میں تنگدست ہوں۔ آپ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کی قسم۔ اس نے کہا: (ہاں) اللہ کی قسم۔ آپ نے بیان کیا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بیان فرماتے ہوئے سنا ہے: من سرہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفس عن معسر او یضع عنہ (جسے یہ شے خوش کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے یوم قیامت کی تکالیف سے نجات عطا فرمائے تو

اسے چاہیے کہ وہ تنگدست مقروض کو مہلت دے یا اس سے قرض بالکل ساقط کر دے (یعنی معاف کر دے)۔

ابو الیسر الطویل کی حدیث میں ہے...... اور ان کا نام کعب بن عمرو ہے...... کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس سے قرض ساقط کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے (عرش کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ مَنْ انظر معسرا أو وضع عنه أظلّه الله فی ظلہ ان احادیث میں اس کے بارے ترغیب موجود ہے جس کے بارے نص بیان کی گئی ہے اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرض کا مالک جب اپنے مقروض کی تنگدستی کا علم رکھتا ہو یا اسے اس کا گمان ہو تو اس پر اس کا مطالبہ حرام ہے، اگرچہ حاکم کے پاس اس کی تنگدستی ثابت نہ بھی ہو۔

اور انظار المعسر کا معنی ہے اسے مہلت دینا یہاں تک کہ وہ خوشحال ہو جائے اور الوضع عنه سے مراد اس کے ذمہ سے قرض کو ساقط کرنا ہے اور دونوں معنوں کو ابو الیسر نے اپنے مقروض کے لئے اس طرح جمع کیا کہ اس کے بارے تحریر مٹا دی اور اسے کہہ دیا: اگر تو ادائیگی کی وسعت پائے تو تو اسے ادا کر دے ورنہ تو بری الذمہ ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾

''اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی۔''

کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے نو راتیں قبل نازل ہوئی پھر اس کے بعد کوئی شے نازل نہ ہوئی، ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ ابن جبیر اور مقاتل نے کہا ہے: سات راتیں پہلے نازل ہوئی۔ اور تین راتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے تین ساعتیں قبل نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے آیۃ الربا اور آیۃ الدین کے درمیان رکھ دو۔'' اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا اسے دو سو اسی نمبر آیت کے بعد رکھ دو۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آخر میں جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ، الی آخر الآیۃ۔ اور پہلا قول زیادہ معروف، بہت زیادہ اصح اور زیادہ مشہور ہے۔ اور اسے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے سورۃ البقرہ میں دو سو اسی آیت کے آخر پر رکھو۔'' اسے ابو بکر انباری نے ''کتاب الرد'' میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہوئی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بعد اکیس دن تک باحیات رہے۔ اس کا بیان سورہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ آیت تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور ایسا حکم ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے اور یَوْمًا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے نہ کہ ظرف ہونے کی بناء پر۔ تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ یہ اس کی صفت ہے۔

ابوعمرو نے اسے تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اِلَیْنَاۤ اِیَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔) اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت پر قیاس کرتے ہوئے یوما تصیرون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے۔) اور باقیوں نے اسے تا کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ (انعام: ٦٢) (پھر لوٹائیں جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف) وَلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ (اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا) اور یہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت کے اعتبار سے ہے۔ یَوْمًا تردُّون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

اور حسن نے یرجعون یا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس معنی کی بنا پر ہے کہ تمام لوگ لوٹائیں جائیں گے۔

ابن جنی نے کہا ہے: گویا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اس بنا پر نرمی اور مہربانی فرمائی کہ وہ ان کی طرف رجعت کے ذکر کے ساتھ متوجہ ہوا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس کے ساتھ دل پھٹنے لگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: وَاتَّقُوْا یَوْمًا پھر رجعت کے ذکر میں ان کے ساتھ انتہائی نرمی فرماتے ہوئے غیب کی طرف رجوع فرمایا اور جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ دن جس سے ڈرایا گیا ہے یہ قیامت قائم ہونے، حساب و کتاب اور پوری پوری جزا ملنے کا دن ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس سے مراد موت کا دن ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت کے الفاظ کے حکم کے مطابق پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى اللّٰهِ میں مضاف محذوف ہے۔ اس کی تقدیر عبارت ہے الی حکم الله و فصل قضائه (یعنی تم لوٹائے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقدیر کے فیصلے کی طرف) وَهُمْ یعنی جمع ضمیر کُلٌّ کے معنی پر محمول ہے نہ کہ لفظ پر۔ مگر حسن کی قرأت میں یُرْجَعُوْنَ ہے تو اس کے مطابق وَهُمْ میں ضمیر یرجعون میں جمع ضمیر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس آیت میں اس پر نص ہے کہ ثواب اور عقاب کسب اعمال کے متعلق ہیں اور یہ جبریہ کا رد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

''اے ایمان والو! جب تم ایک دوسرے کو قرض دو مدت مقررہ تک تو لکھ لیا کرو اسے اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف سے۔ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو الله نے پس وہ بھی لکھ دے اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے اور ڈرے الله تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ تا کہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی میعاد تک۔ یہ تحریر عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے الله کے نزدیک اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھوا سے اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری اور ڈرا کرو الله سے اور سکھاتا ہے تمہیں الله تعالیٰ (آداب معاشرت) اور الله تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں باون مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ الآیہ۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ قرآن کریم نے آیۃ الدین عرش کے پاس سے حاصل کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت خاص کر بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اہل مدینہ کا بیع سلم کرنا اس آیت کے نازل ہونے کے سبب ہے پھر یہ بالاجماع ان عقود کو شامل ہوگئی ہے جن میں قرض اور دین وغیرہ ہوتا ہے (1)۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت تیس احکام کو متضمن ہے اور اس سے ہمارے بعض علماء نے قرضوں میں مدت مقرر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 378

کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے قرض اور تمام عقود مداینات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور شوافع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اس آیت میں تمام قرضوں میں تاجیل کے جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ اس میں گواہ بنا لینے کا حکم ہے جب وہ دین مؤجل ہو، پھر دین میں تاجیل کے جواز اور اس کے ممتنع ہونے کے بارے دوسری دلیل سے جانا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: بِدَیْنٍ یہ تاکید ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے وَلَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (انعام: ۳۸) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (الحجر) (پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے) اور دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت ہے ہر اس معاملہ سے جس میں دو عوضوں میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا دوسرے کے ذمہ ادھار ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک عین وہ ہے جو حاضر ہو اور دین وہ ہے جو غائب ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَعَدَتْنَا بِدِرھَمَیْنَا طِلَآء　　و شواء معجّلا غَیْرَ دَیْنِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لِترم بِی المَنَایَا حیثُ شاءتْ　　اذا لم تَرْمِ بِی فی الحُفْرَتَیْنِ

اِذَا ما اَوْقَدُوْا حطبا و نارًا　　فذاك الموتُ نقداً غَیْرَ دَیْنِ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنے اس قول حق کے ساتھ بیان کیا ہے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ابن منذر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس پر دلیل ہے کہ بیع سلم کرنا مجہول مدت تک جائز نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی کتاب اللہ کے معنی کی مثل پر دلیل ہے۔ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور وہ پھلوں میں قرض دو، تین سال کے لئے لے لیا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو کوئی کھجوروں کے عوض قرض کسی کو دے تو اسے چاہیے کہ وہ معین کیل اور وزن، معین مدت تک قرض دے“ (1)۔

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اسے بخاری، مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دور جاہلیت کے لوگ اونٹوں کے گوشت کی بیع اونٹنی کے حمل کے حاملہ ہونے تک کرتے تھے حبل الحبلہ کا معنی ہے کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حاملہ ہو جو جنا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا (2)۔ اہل علم میں سے وہ تمام جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ جائز بیع سلم وہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ ایسے طعام (اناج) کی بیع سلم کرے جس کی مقدار معلوم ہو اور وصف بھی معلوم ہو، وہ عام زمین کے اناج میں سے ہو جس کی مثل میں وہ غلطی اور خطا نہ کرے، معین کیل کے ساتھ، مدت معلومہ تک معلوم دنانیر یا دراہم کے عوض، جو وہ اسے مسلم فیہ کے بدلے دے گا دونوں

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم، حدیث نمبر 2085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب السلم الی تنتج الناقۃ، حدیث نمبر 2096، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(رب السلم اور مسلم الیہ) کے اس مقام سے جدا ہونے سے پہلے پہلے جہاں انہوں نے آپس میں بیع کی ہے اور دونوں اس جگہ کا تعین بھی کریں گے جس میں اس طعام پر قبضہ کیا جائے گا۔ پس جب دونوں نے ایسا کرلیا تو یہ امر جائز ہو گیا اور بیع سلم صحیح ہو گئی۔ میں اہل علم میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا جو اسے باطل قرار دیتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک بیع سلم کرنا فصل کی کٹائی، پھل توڑنے اور نیروز اور مہرجان کے دنوں تک یہ جائز ہے کیونکہ یہ وقت اور معلوم زمانے کے ساتھ مختص ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے علماء نے بیع سلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے(1) یہ معلوم شے کی بیع ہے جو دوسرے کے ذمہ لازم ہو جائے اور اس کا وصف معلوم ہو ایسے دراہم و دنانیر کے عوض جو موجود ہوں یا ایسی شے کے عوض جو ان کے حکم میں ہو مدت معلومہ تک۔ پس اسے معلوم فی الذمۃ کے ساتھ مقید کرنا مجہول سے بچنے کا فائدہ دیتا ہے اور اعیان معینہ میں سلم کرنے سے (بچنے کا فائدہ دیتا ہے) مثلاً وہ جو مدینہ طیبہ کے باسی اس وقت قرض لیتے تھے جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، کیونکہ وہ کھجور کے پھلوں میں ان کے اعیان کے بدلے قرض لیتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں دھوکے اور نقصان کا امکان ہے، کیونکہ کبھی وہ درخت خراب ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل ثمر بار نہیں ہوتے اور ان کا قول **محصور بالصفۃ** یہ اس معلوم سے بچنے کے لئے ہے جس کے بارے مجمل علم تو ہو لیکن تفصیلی علم نہ ہو۔ جیسا کہ اگر کوئی کھجوروں، یا کپڑوں یا مچھلیوں میں بیع سلم کرے اور ان کی نوع بیان کرے اور نہ ان کی کوئی معین صفت بیان کرے۔

اور ان کا قول بِعَيْنٍ حَاضِرَةٍ یہ دین کے عوض دین کی بیع کرنے سے بچنے کے لئے ہے اور ان کا قول أو ما هو في حكمها یہ ان دو اور تین دنوں سے بچنے کے لئے ہے جن میں مسلم الیہ کو رأس المال میں تاخیر کرنا جائز ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک اتنی مقدار اسے موخر کرنا جائز ہوتا ہے، شرط کے ساتھ بھی اور بغیر شرط کے بھی کیونکہ یہ بالکل قریب ہے اور اسے اس پر مشروط کرنا جائز نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے بیع سلم میں رأس المال کو عقد اور افتراق (رب السلم اور مسلم الیہ کا مجلس عقد سے جدا ہونا) سے مؤخر کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ اور انہوں نے یہ جانا ہے کہ یہ بیع صرف کی طرح ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں باب مختلف ہیں اور اپنے اپنے اوصاف کے ساتھ مختص ہیں، کیونکہ بیع صرف اس کا باب تنگ ہے اور اس میں شروط زیادہ ہیں بخلاف سلم کے کیونکہ اس پر معاملات کے عیوب بہت زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور **قولھم**، الی أجل **معلوم** یہ سلم حال سے بچنا ہے کیونکہ یہ مشہور قول کے مطابق جائز نہیں ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا اور اجل کو معلوم کی صفت سے متصف کرنا اس مجہول مدت سے بچنا ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں بیع سلم کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ سلم اور سلف دونوں لفظ ایک ہی معنی سے عبارت ہیں اور یہ دونوں حدیث میں آئے ہیں مگر اس باب سے خاص اسم سلم ہے کیونکہ سلف قرض پر بولا جاتا ہے اور سلم بالاتفاق جائز بیوع میں سے ایک بیع ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ

---

1۔ (بیع معلوم فی الذمۃ محصور بالصفۃ بعین حاضرۃ او ما ھو فی حکمھا الی اجل معلوم)

والسلام نے اس شے کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو منع فرمایا ہے (1) یہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلم میں رخصت دی ہے کیونکہ سلم جب ذمہ میں معلوم شے کی بیع ہے تو یہ ایک غائب شے کی بیع ہے جس کی طرف متبایعین میں سے ہر ایک کی ضرورت دعوت دیتی ہے، کیونکہ رأس المال کا مالک اس کا محتاج ہے کہ وہ پھل خریدے اور پھل کا مالک اسے توڑنے اور علیحدہ کرنے سے پہلے اس کے ثمن کا محتاج ہے تاکہ وہ اسے اس پر خرچ کر سکے، پس یہ ظاہر ہوا کہ بیع سلم ضروری مصالح میں سے ہے۔ اور فقہاء نے اس کا نام بیع المحاویج رکھا ہے۔ اور اگر یہ حالاً (یعنی ثمن اور مبیع کا موجود ہونا) ہی جائز ہو تو یہ حکمت باطل ہو گئی اور یہ مصلحت اٹھ گئی اور جو شے تیرے پاس موجود نہیں اس کی بیع سے اس کی استثنا کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ بیع سلم کی وہ شرائط جن پر اتفاق کیا گیا ہے اور جن میں اختلاف کیا گیا ہے وہ نو ہیں: چھ شرائط مسلم فیہ میں ہیں اور تین بیع سلم کے رأس المال میں ہیں۔

پس وہ چھ جو مسلم فیہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: مسلم فیہ اس کے ذمہ لازم ہو جائے، اس کا وصف بیان ہو، اس کی مقدار معلوم ہو، وہ مؤجل ہو، اس کی مدت معلوم ہو اور وہ مدت پوری ہونے کے وقت محل معین پر موجود ہو۔

اور رہیں وہ تین شرطیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: اس کی جنس معلوم ہو، مقدار معلوم ہو، اور نقد ہو۔ اور یہی وہ تین شرائط ہیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں اور یہ نقد کے سوا متفق علیہ ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم فیہ اس کے ذمہ ہو جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اس سے مقصود اس کا ذمے میں ہونا ہے، کیونکہ یہ عقد مداینہ ہے (یعنی یہ اس کے ذمہ قرض ہو جاتی ہے) اور اگر ایسا نہ ہو تو از روئے دین کے یہ مشروع نہ ہو اور نہ ہی ربح و رفق کے طور پر لوگ اس کا قصد کریں۔ اور اس قول پر لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک نے کہا ہے: کسی معین شے میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ بستی محفوظ و مامون ہو اور دوسری یہ کہ وہ اس کے لینے میں شروع ہو جائے مثلاً بکری سے دودھ اور کھجور کے درخت سے تر کھجوریں اور ان کے سوا کسی نے یہ قول نہیں کیا ہے۔ اور یہ دونوں مسئلے دلیل میں صحیح ہیں، کیونکہ بیع سلم میں تعیین ممتنع ہے مزابنہ اور غرر کے خوف سے تاکہ (ادائیگی کے) محل کے وقت وہ متعذر نہ ہو اور جب جگہ مامون ہو تو اغلباً جو شے اس میں ہوتی ہے اس کا پایا جانا متعذر نہیں ہوتا (لہٰذا) وہ جائز ہے۔ کیونکہ مسائل فقہ میں عواقب اور انجام کی ضمانت کے قطعی ہونے پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور ان میں تھوڑے سے دھوکے کا احتمال ضرور ہوتا ہے اور فرعی مسائل میں ایسا بہت زیادہ ہے۔ ان کی تعداد کتب مسائل میں ہے۔

اور رہی بیع سلم دودھ میں اور ایسی کچی کھجوروں میں جنہیں لینا شروع کر دیا ہو تو یہ مدینہ طیبہ کا مسئلہ ہے اور اس پر اہل مدینہ کا اجماع ہے اور اس کی بناء مصلحت کے قاعدہ پر ہے کیونکہ آدمی دودھ اور کھجوریں یومیہ مزدوری اور اجرت کے طور پر لینے کا محتاج ہے اور ہر روز ابتداءً اس کے لئے لینا شاق ہوتا ہے، کیونکہ نقد کبھی موجود نہیں ہوتے اور اس لئے بھی کہ بھاؤ مختلف ہوتا رہتا ہے اور کھجوروں اور دودھ والا نقد کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس تو سامان ہے وہ اپنے لئے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث 6628

پس جب دونوں ہی حاجت میں مشترک ہیں تو دونوں کے لئے اس معاملہ میں رخصت دی گئی ہے عرایا اور دیگر اصول حاجات ومصالح پر قیاس کرتے ہوئے۔

اور رہی دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ اس کی صفت بیان کی گئی ہو۔ یہ متفق علیہ ہے اور اسی طرح تیسری شرط بھی ہے اور اندازہ تین وجہوں سے ہوسکتا ہے۔ کیل (ماپ) وزن اور عدد۔ اور اس کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اور وہ یا تو لوگوں کا عرف ہوگا یا عرف شرع ہوگا۔

اور رہی چوتھی شرط! تو وہ یہ کہ مسلم فیہ مؤجل ہو اور اس میں اختلاف ہے، پس امام شافعی نے کہا ہے: سلم حال جائز ہوتی ہے اور اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: مدت مقرر کرنے میں مالکیہ مضطرب ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک دن کی طرف لوٹا دیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: سلم حال جائز ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں تاجیل (مدت مقررہ) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مبیع کی دو قسمیں ہیں: معجل اور وہ معین ہے اور دوسری مؤجل، پس اگر یہ سلم حال ہو اور مسلم الیہ کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو یہ بیع مالیس عندك کے باب سے ہوجائے گی۔ پس مدت کا مقرر ہونا اور مہلت ہونا ضروری ہے تاکہ ہر عقد اپنی صفت اور اپنی شرائط کے مطابق خالص ہو۔ اور اس میں احکام شرعیہ جاری ہوسکتے ہوں۔

اور ہمارے علماء کے نزدیک اس کی حد اتنی مدت ہے جتنی مدت میں منڈیاں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔

اور الله تعالیٰ کا ارشاد: **اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى** اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی: **الی اجل معلوم** یہ ہر کہنے والے کے قول سے غنی اور بے نیاز کردیتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: سلم حال میں سے ہمارے علماء نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ وہ ہے جس کا بھاؤ شہروں میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس سلم ان چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن میں اور اس کے درمیان ایک دن یا دو دن یا تین دن باقی ہوں۔ اور رہا ایک ہی شہر تو اس میں جائز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا بھاؤ ایک ہی ہوتا ہے۔ والله اعلم۔

اور رہی پانچویں شرط اور وہ یہ ہے کہ اجل معلوم ہو تو امت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ الله تعالیٰ اور اس کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجل (مدت کے تعین) کے بارے فرمادیا ہے۔

اور امام مالک فقہائے امصار میں سے اس میں منفرد ہیں کہ باغ توڑنے اور فصل کاٹنے کے وقت تک بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے مدت معلوم ہی قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں الله تعالیٰ کے اس ارشاد: یسالونك عن الاهلة کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

اور رہی چھٹی شرط! تو وہ یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ موجود ہو تو اس میں بھی امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر مدت پوری ہونے پر امر الٰہی سے مبیع ناپید ہوجائے تو تمام علماء کے نزدیک عقد فسخ ہوجائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ بیع سلم کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ مُسْلَم الیہ مسلم فیہ کا مالک ہو بخلاف بعض سلف کے

کیونکہ امام بخاری نے محمد بن مجالد سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن شداد اور ابو بردہ نے مجھے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی طرف بھیجا اور ان دونوں نے کہا: ان سے پوچھو کیا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے زمانہ میں گندم میں بیع سلم کرتے تھے؟ تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم شام کے رہنے والے کسانوں سے گندم، جو اور زیتون میں معلوم کیل کے ساتھ معلوم مدت تک بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے کہا کون ہے جس کے پاس اس کی اصل ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم اس کے بارے ان سے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے عبدالرحمن بن ابزی کی طرف بھیجا، سو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے عہد مقدس میں بیع سلم کرتے تھے اور ہم ان سے نہ پوچھتے کیا ان کی کھیتی ہے یا نہیں (1)؟ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد کے وقت سے لے کر مدت مقررہ تک مسلم فیہ کا پایا جانا شرط قرار دیا ہے، اس خوف کی وجہ سے کہ مسلم فیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ نہ پائی جائے تو وہ دھوکہ اور نقصان ہوگا۔ اور تمام فقہاء نے آپ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مدت مقررہ مکمل ہونے کے وقت اس کے موجود ہونے کا لحاظ رکھا جائے گا۔

علمائے کوفہ اور ثوری نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر مسلم فیہ ایسی شے ہو جس کا بوجھ ہو اور اسے اٹھانے میں مشقت ہو تو پھر محل قبض کا ذکر کیا جائے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب مسلم فیہ سپرد کرنے کی جگہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بیع سلم فاسد ہوگی۔ اور اوزاعی نے کہا ہے: وہ مکروہ ہوگی۔ اور ہمارے نزدیک اگر وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے تو عقد فاسد نہ ہوگا اور محل قبض متعین ہو جائے گا۔ امام احمد، اسحاق اور محدثین کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس جگہ کا ذکر موجود نہیں ہے جس میں مسلم فیہ پر قبضہ کیا جائے گا۔ اگر یہ بیع سلم کی شرائط میں سے ہوتی تو یقیناً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اسی طرح بیان فرما دیتے جس طرح آپ نے کیل، وزن اور اجل (مدت) کے بارے بیان فرما دیا ہے اور اسی کی مثل حضرت ابن ابی اوفی کی حدیث ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ابو داؤد نے سعد الطائی سے، انہوں نے عطیہ بن سعد سے اور انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی شے میں بیع سلم کی تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کسی اور کی طرف نہ پھیرے (2)۔'' ابو محمد عبدالحق بن عطیہ نے کہا ہے: وہ عوفی ہے (یہ عطیہ بن سعد کا لقب ہے) اور کسی نے بھی اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے، اگرچہ بزرگ اور اجلہ راویوں نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس آدمی کے بارے میں حکم یہ ہے جس نے معلوم قیمت کے ساتھ مقررہ مدت تک کسی اناج میں بیع سلم کی۔ پس مدت گزر گئی اور خریدنے والے نے بائع کے پاس اس شے میں سے ادا کرنے کے لئے کوئی شے نہ پائی جسے اس نے اس سے خریدا تھا تو وہ اس سے اقالہ کر لے اور اسے چاہیے کہ وہ اس سے چاندی یا سونے یا بعینہٖ اس ثمن کے سوا جو اس نے اسے دیئے تھے نہ لے اور نہ اس ثمن کے عوض وہ اس سے کوئی اور شے خریدے، یہاں تک کہ وہ ان پر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، حدیث نمبر 2088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب السلف لا یحول، حدیث نمبر 3008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قبضہ کر لے اور وہ اس لئے ہے کہ جب اس نے ان ثمنوں کے علاوہ لے لئے جو اس نے دیئے تھے یا اس نے انہیں ایسے سودے کی طرف پھیر دیا جو اس طعام کے سوا ہو جو اس نے اس سے خریدا تھا تو یہ طعام کو پورا کرنے سے پہلے اسے بیچنا لازم آتا ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کو پورا کرنے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** قولہ تعالیٰ: فَاكْتُبُوْهُ یعنی تم قرض اور مدت کو لکھ لو...... اور کہا جاتا ہے: کتابت کا حکم دیا گیا ہے لیکن مراد لکھنا اور گواہ بنانا ہے کیونکہ تحریر گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہوتی۔ اور کہا جاتا ہے: ہمیں کتابت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم بھول نہ جائیں۔

ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن سلمہ سے، انہوں نے علی بن زید سے انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ الی آخر الآیۃ بلاشبہ جس نے سب سے اول انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا نور انتہائی روشن اور پھیلا ہوا تھا، تو آپ نے عرض کی اے میرے رب! یہ کون ہے؟ رب کریم نے فرمایا یہ تیرا بیٹا داؤد علیہ السلام ہے۔ عرض کی اے میرے پروردگار اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس۔ عرض کی: اے میرے رب! اس کی عمر میں اضافہ فرما دے۔ تو رب کریم نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تو اپنی عمر میں سے اس میں اضافہ کر دے۔ عرض کی: میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ہزار برس۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی: میں نے چالیس برس اسے عطا کر دیئے۔ بیان فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے اس پر تحریر لکھ لی اور اس پر اپنے ملائکہ کو گواہ بنا لیا۔ پس جب وفات کا وقت آ پہنچا اور ملائکہ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا ابھی میری عمر سے چالیس برس باقی ہیں۔ ملائکہ نے کہا: بلاشبہ آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو ہبہ کر دیئے تھے تو آپ نے فرمایا: میں نے کسی کو کوئی شے ہبہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر نکالی اور اس پر ملائکہ گواہ تھے...... اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے سو برس اور آدم علیہ السلام کے لئے ان کی عمر ہزار برس مکمل کر دی (1)۔'' اسے ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاكْتُبُوْهُ میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ (قرض کے بارے) تحریر لکھے اس طرح جو اس کی مکمل وضاحت کرنے والی ہو اور اس سے ہر قسم کے وہم کو دور کرنے والی ہو ایسے اختلاف کے بارے میں جس کا وہم دو باہم معاملات کرنے والوں کے درمیان ہو سکتا ہے اور اگر وہ دونوں اپنا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کریں تو وہ تحریر حاکم کی ایسی راہنمائی کرنے والی ہو جس کے مطابق وہ فیصلہ کر سکے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10۔** بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرضوں کا لکھنا ان کے مالکوں پر واجب ہے، اسی آیت کے ساتھ وہ فرض کیا گیا ہے، چاہے وہ بیع کے سبب ہو یا قرض کی صورت میں ہو، تاکہ اس میں بھول یا انکار ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی علامہ طبری

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3002-3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا اختیار ہے اور ابن جریج نے کہا ہے: جس کسی کو کوئی قرض دے اسے چاہیے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی شے فروخت کرے تو اسے چاہئے کہ وہ گواہ بنالے۔

اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ یہ حکم تحریر کے لئے ناسخ ہے اور اسی طرح ابن جریج نے بیان کیا ہے اور ابن زید نے یہی کہا ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور ربیع نے یہ موقف اپنایا ہے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس میں تخفیف فرمائی: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا۔

اور جمہور نے کہا ہے: اموال کی حفاظت اور شک کو زائل کرنے کے لئے لکھ لینا مستحب ہے۔ اور جب مقروض متقی ہو تو تحریر اس کے لئے ضرر رساں نہیں اور اگر وہ ایسا نہ ہو تو تحریر اس کے قرض کے بارے اور صاحب حق کی حاجت کے بارے ایک اعتماد اور یاددہانی ہے، بعض نے کہا ہے: اگر تو گواہ بنالے تو یہ احتیاط ہے اور اگر تو امین بن جائے تو یہ بھی حلال ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی قول صحیح ہے اور اس میں نسخ مرتب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس شے کے بارے میں لکھنا مستحب قرار دیا ہے جسے وہ ہبہ کرے اور اسے چھوڑ دے یہ اجماع سے ثابت ہے اور اس کا مستحب ہونا بلاشبہ لوگوں کے اعتماد اور بھروسہ کی بناء پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ حضرت عطا وغیرہ نے کہا ہے: کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے، شعبی نے یہی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس کے سوا کوئی کاتب موجود نہ ہو تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ سدی نے کہا ہے: اس پر لکھنا واجب ہے جب وہ فارغ ہو۔ پہلے سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ دوسرا غائب کے لئے ہے اور پہلا مخاطب کے لئے ہے۔ اور کبھی یہ مخاطب میں ثابت ہوتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلْتَفْرَحُوْا یہ تاء کے ساتھ ہے اور غائب میں حذف ہو جاتی ہے اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

محمد تفد نفسَكَ كلُّ نَفْسٍ   إذَا ما خِفْتَ من شئٍ تَبَالا

اس میں تُفْدِ سے لام محذوف ہے یہ مونث غائب کا صیغہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قولہ تعالیٰ: بِالْعَدْلِ یعنی حق اور انصاف کے ساتھ، یعنی صاحب حق کے لئے نہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا اور نہ اس سے کم۔ اور فرمایا: بَّيْنَكُمْ یہ نہیں کہا أحد کم، کیونکہ جب وہ آدمی جس کا قرض ہے وہ اس کی کتابت میں شک کر سکتا ہے جس پر قرض ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کاتب ایسے آدمی کو قرار دیا ہے جو ان دونوں کے سوا ہو وہ عدل کے ساتھ لکھے، اس کے دل میں اور نہ اس کے قلم میں دونوں میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح ہو۔ (یعنی ایک جانب اس کا جھکاؤ نہ ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک لوگ جب معاملات کرتے ہیں تو کوئی بھی معاملہ سے جدا نہیں ہوتا اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں لکھ سکتے، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے درمیان ایک کاتب عدل و انصاف کے

ساتھ لکھ دے۔

**مسئلہ نمبر 13** ۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِالْعَدْلِ میں باء وَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہے كَاتِبٌ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ کوئی معاہدہ (یادستاویز) نہ لکھے مگر اپنی ذات میں عدل کے ساتھ، حالانکہ اسے بچہ، غلام اور حفاظت و نگرانی کرنے والا سب اسے لکھ سکتے ہیں جبکہ وہ اس کی سمجھ اور فقاہت رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جو لکھنے کے لئے مقرر ہوتے ہیں والیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انہیں چھوڑ دیں مگر جب کہ وہ اپنی رضامندی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کے درمیان معاہدے کوئی نہیں لکھ سکتا مگر وہی جو انہیں جاننے والا ہو، فی نفسہ عادل ہو اور مامون ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر با کاتب کے متعلق ہے یعنی چاہیے کہ ان کے درمیان عادل کاتب لکھے، پس بِالْعَدْلِ محل صفت میں واقع ہے۔

**مسئلہ نمبر 14** ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ اس میں اللہ تعالیٰ نے کاتب کو انکار کرنے سے منع کیا ہے۔ لوگوں نے کاتب پر کتابت کے وجوب اور شاہد پر شہادت کے وجوب میں اختلاف کیا ہے، پس طبری اور ربیع نے کہا ہے۔ ''کاتب پر واجب ہے جب اسے لکھنے کا حکم دیا جائے اور حسن نے کہا ہے: یہ اس پر ایسی جگہ واجب ہے جہاں اس کے سوا اور کوئی کاتب میسر نہ ہو، کیونکہ اس کے انکار سے صاحب قرض کا نقصان ہو جائے گا...... پس اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر یہ فرض ہے اور اگر اس کے سوا دوسرے کاتب پر قدرت ہو تو پھر اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے جبکہ وہ دوسرا اس ذمہ داری کو ادا کرے۔ سدی نے کہا ہے: کاتب پر فارغ ہونے کی حالت میں لکھنا واجب ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مہدوی نے ربیع اور ضحاک سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا يَاْبَ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے نظریہ پر جاری ہوتا ہے جن کا یقین یا ظن یہ ہے کہ پہلے متبایعین میں سے جو بھی لکھنا پسند کرے اس پر لکھنا واجب تھا اور اس کے لئے انکار کرنا جائز نہ تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اسے منسوخ کر دیا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اور یہ بعید ہے۔ کیونکہ اس کا واجب ہونا ہر اس پر ثابت نہیں جو بھی متبایعین میں سے اس کا ارادہ کرے وہ جو بھی ہو۔ اگر کتابت واجب ہوتی تو اس کے عوض اجرت لینا صحیح نہ ہوتا، کیونکہ فرائض میں سے کسی فعل پر اجرت لینا باطل ہے اور اس دستاویز کے لکھنے پر اجرت لینے کے جواز میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ امر ارشاد ہے پس وہ لکھتا ہے اور اپنا حق لے لیتا ہے اور اَبَى يَاْبَى شاذ ہے، اور یہ نہیں آتا مگر اس طرح قَلَى يَقْلَى، اَبَى يَاْبَى، غَسَى يَغْسَى اور جَبَى الخراج يَجْبَى اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15** ۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ، كَمَا میں کاف اَنْ يَّكْتُبَ کے متعلق ہے معنی یہ ہے کتبا کما علمہ اللہ، یعنی لکھنا اس طرح ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس کے متعلق ہو جو اس قول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 379

میں ہے وَلَا یَأْبَ معنی کے اعتبار سے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر علم کتابت کے ساتھ انعام واحسان فرمایا ہے پس وہ انکار نہ کرے اور چاہیے کہ اسے اسی طرح فضیلت دے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر (اسے) فضیلت دی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ کلام اس معنی پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَنْ یَّكْتُبَ کے پاس مکمل ہو پھر كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ یہ نیا کلام ہو اور کاف قول باری تعالیٰ فَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہو۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ اور املا کرانے والا وہ مقروض اور مطلوب ہے جو اپنے بارے میں اپنی زبان سے اقرار کرتا ہے تا کہ جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے وہ اس کے بارے آگاہ کرے۔ املا اور املال دو لغتیں ہیں۔ أَمَلَّ اور أَمْلٰی، پس أَمَلَّ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت ہے اور بنی تمیم کہتے ہیں: أَمْلَيْتُ۔ اور قرآن میں دونوں لغتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَهِیَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (الفرقان) (پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تا کہ از بر ہو جائیں)) اصل اَمْلَلْتُ ہے اس میں لام کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ یہ زیادہ خفیف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے املا کا حکم دیا ہے جس پر حق ہے، کیونکہ شہادت اس کے اقرار کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تقویٰ کا حکم دیا ہے جس میں وہ املا کرائے اور حق میں سے کوئی شے کم کرنے سے منع کیا ہے۔ اور النحس کا معنی کم کرنا اور گھٹانا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ (البقرہ:228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں)

**مسئلہ نمبر 17**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا بعض لوگوں نے کہا ہے: ضعیف سے مراد صغیر ہے اور یہ غلطی ہے کیونکہ سفیہ (بے وقوف) کبھی بڑا بھی ہوتا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اَوْ ضَعِيْفًا یعنی ایسا کبیر جس کی عقل نہ ہو۔ اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ وہ جس پر قرض ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی چار قسمیں قرار دی ہیں: ایک مستقل بنفسہ ہو خود املا کرائے۔ اور تین قسموں کے وہ ہیں جو خود املا نہیں کرا سکتے اور ہر وقت ان کی تکلیفیں اور اعذار باقی رہتے ہیں، معاملات کے سوا کئی جہتوں میں ان کا حق اس طرح مترتب ہوتا ہے جس طرح کہ میراث جب وہ تقسیم کی جائے وغیرذالك اور وہ بے وقوف، کمزور اور وہ آدمی ہے جو املا کرانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس سفیہ وہ ہے جس کی رائے اس مال کے بارے میں عمدہ ہو جسے نہ تو اپنی ذات کے لئے لینا اچھا ہوتا ہے اور نہ اس میں سے کوئی شے دینا (حسین ہوتا ہے) اسے اس گھٹیا کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کی بنائی باریک اور ہلکی ہو۔ اور بدزبان کو سفیہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ بدزبانی لوگوں میں سے جاہلوں اور کمزور عقل والے لوگوں میں داخل کر دیتی ہے اور عرب کبھی عقل کی کمزوری پر سفہ کا اطلاق کرتے ہیں اور کبھی بدنی کمزوری پر۔

شاعر نے کہا ہے:

نَخافُ أن تَسْفَهَ أحلامُنا و يجهل الدهرُ مع الحالِم

اس میں عقل کی کمزوری کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

اور ذوالرمۃ نے کہا ہے:

مَشْيُنَ كما اهتزَّتْ رِماحٌ تَسَفَّهَتْ　　أعالِيَهَا مَرُّ الرياحِ النَّواسِمِ

اس میں بدنی کمزوری اور ضعف کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی اس نے اسے کمزور اور نرم پایا تو اس نے اسے حرکت دی۔

تحقیق انہوں نے کہا ہے: الضعف ضاد کے ضمہ کے ساتھ بدن کی کمزوری کے لئے اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ رائے میں کمزوری کے لئے آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں اور پہلی زیادہ صحیح ہے۔

جبکہ ابو داؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی خریداری کرتا تھا اور اس کی عقل میں ضعف (کمزوری) تھی۔ پس اس کے گھر والے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلاں کو روک دیجئے کیونکہ وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کی عقل میں ضعف ہے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے بیع کرنے سے روک دیا، تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو ایک ساعت بھی خرید و فروخت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر یہ کہہ کر لے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں (1)۔'' اسے ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ سلمی ترمذی نے حدیث انس سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور کہا ہے: بے شک ایک آدمی کی عقل میں ضعف تھا اور آگے حدیث ذکر کی (2) اور امام بخاری نے اسے تاریخ میں ذکر کیا ہے اور اس میں یہ کہا ہے۔ ''جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر دھوکہ نہیں ہے اور تو ہر سامان تین راتوں کے خیار کے ساتھ خریدا کر۔'' یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو انصاری تھا اور یحییٰ اور واسع ابن حبان کا والد تھا...... اور یہ قول بھی ہے کہ وہ منقذ یحییٰ اور واسع کا دادا تھا۔ یہ دونوں امام مالک کے شیخ تھے اور منقذ کا والد حبان تھا۔ اس کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ایک غزوہ میں زخمی ہو گئے اور زخم ان کے دماغ میں لگا جس سے ان کی عقل اور زبان میں وہم اور خلل پیدا ہو گیا۔

اور دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حبان بن منقذ کمزور آدمی تھا اور اس کی قوت بصارت بھی کمزور تھی اس کے سر میں طمانچہ مارا گیا درآنحالیکہ اس کے سر میں زخم ہو گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے ہر اس شے میں تین دن کا خیار رکھ دیا جو وہ خریدے گا اور اس کی زبان بھی بوجھل تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: تو خرید و فروخت کر اور یہ کہہ کوئی دھوکہ وغیرہ قبول نہیں۔'' پس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا کرتا تھا: لَا خِذَابَةَ لَا خِذَابَةَ اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے، الخلابۃ کا معنی الخدیعۃ (دھوکہ دہی) ہے۔ اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: اذا لم تغلب فاخلُب(3) (جب تو غالب نہ آسکے تو پھر حیلے اور چال سے مقصد تلاش کر۔)

**مسئلہ نمبر 18**۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جسے تجربہ کی قلت اور عقل کے ضعف کی وجہ سے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو کیا اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں؟ تو امام احمد اور اسحاق نے اس پر پابندی کا قول کیا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یقول فی البیع لا خلابۃ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فیمن یخدع فی البیع، حدیث نمبر 1171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث 1171

دوسروں نے کہا ہے اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ دونوں قول ایک ہی مذہب میں ہیں۔ اور صحیح پہلا قول ہے، اس آیت کی بنا پر۔ اور حدیث طیبہ میں اس قول کی بناء پر۔ یا نبی اللہ أحجر علی فلان (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلاں پر پابندی لگا دیجئے) البتہ اس قول کی بنا پر پابندی کا ترک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یا نبی اللہ انی لا أصبر عن البیع (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیع سے رک نہیں سکتا۔) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے بیع کو مباح قرار دیا اور اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا، کیونکہ وہ جسے خرید وفروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو چاہیے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے بالخصوص جب اس کی عقل ناقص اور فاسد ہو۔ اور جو شے اس کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے، محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بیان کیا ہے: وہ میرے دادا منقذ بن عمرو تھے اور وہ وہ آدمی تھے جن کے سر میں زخم آ لگا، تو ان کی زبان میں لکنت آ گئی اور ان کی عقل چھن گئی (یعنی کمزور ہو گئی) وہ تجارت نہیں چھوڑتے تھے اور انہیں ہمیشہ دھوکہ دیا جاتا تھا۔

پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر کوئی دھوکہ (قبول) نہیں پھر تو جو سامان بھی خریدے گا تیرے لئے تین راتوں کا خیار ہوگا پس اگر تو اس پر راضی ہو جائے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور اگر راضی نہ ہو تو اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دے۔'' اور انہوں نے طویل عمر پائی ہے، وہ ایک سو تیس برس تک زندہ رہے ہیں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب لوگ پھیل گئے اور تعداد میں کثیر ہو گئے تو وہ بازار میں خرید وفروخت کرتے تھے اور شے لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے حالانکہ انہوں نے غبن فاحش کھایا ہوتا، پھر گھر والے انہیں ملامت کرتے تھے اور کہتے کس کے لئے خریدتے ہو؟ تو وہ کہتے: مجھے خیار حاصل ہے اگر میں پسند کروں تو لے لوں اور اگر نہ پسند کروں تو واپس لوٹا دوں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین دن کا خیار عطا فرمایا ہے، پس وہ دوسرے دن یا تیسرے دن سامان اس کے مالک پر واپس لوٹا دیتے، تو وہ کہتا: قسم بخدا! میں اسے قبول نہیں کروں گا، تحقیق تو نے میرا سامان لے لیا ہے اور مجھے دراہم دے دیئے ہیں، تو وہ کہتے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین دنوں کا اختیار عطا فرمایا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تو وہ تاجر کو کہتا: تجھ پر افسوس ہے! بلاشبہ یہ سچ بول رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تین دنوں کا خیار عطا فرمایا تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابوعمر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: بخاری نے تاریخ میں عیاش بن ولید عن عبد الاعلی عن ابن اسحاق کی سند سے اسے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19۔** قولہ تعالیٰ: اَوْ ضَعِیْفًا ضعیف سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل میں نقص اور فساد داخل ہو چکا ہو، لکھوانے سے اس کی فطرت اور طبیعت عاجز ہو یا تو اس کے بولنے میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے یا اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے یا ادائے کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی کہ کبھی اس کا ولی باپ ہوتا ہے یا وصی۔ اور وہ جو املا کرانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا وہ صغیر ہے اور اس کا ولی اس کا وصی ہوگا یا اس کا باپ ہوگا۔ اور وہ غائب ہے جو محل اشہاد سے غائب ہو یا تو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی عذر کی وجہ سے اور اس کا ولی اس کا وکیل ہوگا اور رہا گونگا تو یہ جائز ہے کہ وہ بھی ضعفاء میں سے ہو۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہو جو استطاعت نہیں رکھتے۔ پس یہی وہ اصناف ہیں جو ممتاز ہو سکتی ہیں، ان کا

تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ طبری نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وَلِيُّهٗ میں ضمیر الحق کی طرف عائد ہے اور انہوں نے اس بارے میں ربیع سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ صحیح نہیں ہے اور کس طرح گواہ اس شے پر شہادت دے سکتے ہیں اور سفیہ کے ذمہ اس کی املا کے سبب مال ڈال سکتے ہیں جس کا قرض ہو! یہ شے شریعت میں جائز نہیں ہے مگر اس کا قائل ارادہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ جو املا کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا بیماری کی وجہ سے یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے اس کی زبان لڑکھڑا جائے یا گونگا ہونے کی وجہ سے اور جب صورتحال اس طرح ہو تو مریض پر اور جس کی زبان گونگا ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے عاجز ہو تو علماء میں سے کسی کے نزدیک کوئی ولی نہیں، مثلاً جو بچے پر اور سفیہ پر ان کے نزدیک جو اس پر پابندی لگاتے ہیں کچھ ثابت نہیں۔ پس جب صورتحال اس طرح ہو تو صاحب حق (قرض کا مالک) عدل و انصاف کے ساتھ املا کرائے اور اسے سنائے جو اس سے عاجز ہے اور جب املا مکمل ہو جائے تو وہ اس کا اقرار کرائے۔ اور یہ معنی آیت سے مراد نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہو سکتا ہے مگر صرف اس کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے املا کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور جن کا اس کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ یہ اس پر دلیل ہے کہ بے شک اسے اس بارے میں امین بنایا گیا ہے جسے وہ شروع کر رہا ہے اور جسے وہ پورا کر رہا ہے اور یہ راہن کا قول قسم کے ساتھ قبول ہونے کا تقاضا کرتا ہے جبکہ راہن اور مرتہن کا قرض کی مقدار میں اختلاف ہو جائے اور رہن موجود ہو۔ اور یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے، یعنی سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم۔ اور اسے ہی ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے: کیونکہ مرتہن زیادتی کا دعویٰ کرنے والا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: البیّنة علی المدّعی و الیمینُ علی المدّعَی علیه (گواہ لانا مدعی پر لازم ہے اور قسم مدعی علیہ پر ہے) اور امام مالک نے کہا ہے: اس صورت میں قول مرتہن کا قبول کیا جائے گا جبکہ وہ (راہن کے) قول اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو اور اس سے زیادہ پر اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، تو گویا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ رہن اور اس کی قسم مرتہن کے لئے شاہد ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ آپ کے اس نظریہ کا رد ہے۔ بے شک وہ جس پر حق ہے وہ راہن ہے اور یہ مسئلہ عنقریب آئے گا۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے رہن کو شہادت اور کتاب (تحریر) کا بدل بنایا ہے اور شہادت مشہود لہ کے صدق پر دال ہے اس قول میں جو اس کے دعویٰ اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو جب وہ اس کی قیمت کو پہنچ جائے اور زیادتی کے بارے میں کوئی دستاویز نہ ہو، تو اسے کہا جائے گا رہن اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کی قیمت کا قرض کی مقدار کے برابر ہونا واجب ہوتا ہے بسا اوقات مرہونہ شے قلیل اور کثیر کے عوض ہوتی ہے۔ ہاں اکثر اوقات رہن قرض کی مقدار سے کم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 380

نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ اس کے مطابق ہوتی ہے تو ایسا بھی نہیں۔

اور یہ کہنے والا کہتا ہے: قرض کی مقدار میں قسم کے ساتھ مرتہن کے قول کی تصدیق کی جائے گی یہاں تک کہ وہ رہن کی قیمت کے مساوی ہو۔ اور عرف اس پر نہیں ہے بسا اوقات قرض رہن سے کم ہوتا ہے اور یہی اس میں غالب ہے، پس ان کے اس قول کا کوئی نتیجہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ مراد ولی ہے تو اس میں اس پر دلیل ہے کہ اس کا اقرار اپنے یتیم کے خلاف جائز ہے کیونکہ جب اس نے اسے املا کرایا تو اس کا قول اس پر اس بارے میں نافذ ہوگیا جو اس نے اسے لکھوایا۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ اور وہ سفیہ جس پر پابندی عائد کی گئی ہو اس کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا فاسد ہے اس پر اجماع ہے یہ ہمیشہ کے لئے فسخ کر دیا گیا ہے نہ یہ کوئی حکم ثابت کرے گا اور نہ کسی شے میں موثر ہوگا۔ پس اگر سفیہ تصرف کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ۔ الاستشهاد کا معنی ہے شہادت طلب کرنا (یعنی شاہد بنانا) اور لوگوں کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ قولہ تعالیٰ: شَهِيْدَيْنِ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے ساتھ شہادت کو حقوق مالیہ، بدنیہ اور حدود میں مرتب فرمایا ہے اور سوائے زنا کے ہر شے میں دو گواہ مقرر کئے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ اور شہید مبالغہ کا وزن ہے اور اس میں اس پر دلالت ہے جو شہادت دے اور وہ اس کی طرف سے بار بار ہو، تو گویا یہ اس کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ رِّجَالِكُمْ یہ کفار، بچوں اور عورتوں کو چھوڑنے کے بارے نص ہے اور رہے غلام! تو لفظ انہیں شامل ہے اور مجاہد نے کہا ہے مراد آزاد مرد ہیں اور قاضی ابو اسحاق نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس میں مبالغہ کی حد تک بحث کی ہے اور علماء نے غلاموں کی شہادت کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس شریح، عثمان البتی، احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو اور انہوں نے آیت کے لفظ کو غلبہ دیا ہے اور امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز نہیں ہوتی اور انہوں نے غلامی کے نقص کو غلبہ دیا ہے اور علامہ شعبی اور نخعی نے تھوڑی سی شے میں اسے جائز قرار دیا ہے اور صحیح جمہور کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اور خطاب مِنْ رِّجَالِكُمْ تک جاری ہے۔ پس ظاہر خطاب ان لوگوں کو شامل ہوگا جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں اور غلام اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر کسی شے کے مالک نہیں ہوتے۔

اور اگر وہ کہیں کہ آیت کے اول حصہ کا خاص ہونا اس کے آخر کے عموم کے ساتھ تعلق کے مانع نہیں ہے تو انہیں کہا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خاص کر رہا ہے: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ رِّجَالِكُمْ اس پر دلیل ہے کہ اندھے اہل شہادت میں سے ہیں لیکن تب جب انہیں یقینی علم ہو۔ مثلاً وہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہادت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس سورج کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کی مثل پر شہادت دے یا چھوڑ دے'' اور یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد کا اس شے کو دیکھنا شرط ہے جس کے بارے وہ شہادت دے رہا ہے نہ کہ وہ ایسے استدلال کے ساتھ شہادت دے جس میں اس کے خطا کرنے کا احتمال اور امکان ہو۔ البتہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ اس کی آواز پہچان لے، کیونکہ وطی کا عمل کرنا غلبہ ظن کے ساتھ جائز ہے، پس اگر شب زفاف کوئی عورت اس کی طرف بھیج دی گئی اور اسے کہا گیا، یہ تیری بیوی ہے اور وہ اسے نہ پہچانتا ہو تو اس کے لئے اس سے وطی کرنا جائز ہے اور اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا حلال ہوتا ہے قاصد کے قول کے ساتھ جو اس کے پاس آئے۔ اور اگر کوئی خبر دینے والا اسے زید کے بارے میں اقرار یا بیع یا قذف یا غصب کی خبر دے تب اس کے لئے مخبر عنہ کے خلاف شہادت دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ شہادت کا راستہ یقین ہے اور ان کے سوا میں ظن غالب کا استعمال جائز ہوتا ہے اور اسی لئے امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب اسے نابینا ہونے سے پہلے اس کا علم ہو تو اندھا ہونے کے بعد اس کی شہادت جائز ہے۔ اور اس کے اور مشہود علیہ کے درمیان حائل ہونے والا اندھا پن مشہود علیہ میں غیبت اور موت کے طاری ہونے کی طرح ہے اور یہ ان کا مذہب ہے اور وہ جو اندھے کو اس بارے میں ادائے شہادت سے روکتے ہیں جو شہادت اس نے بصارت کے ساتھ لی ہو اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے اور اس کی شہادت اس نسب کے بارے میں صحیح ہوگی جو خبر مشہور سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ وہ ایسی شے کے بارے خبر دے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔

اور علماء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اندھے کی شہادت کو ان چیزوں میں قبول کیا ہے جن کی شہادت کا ذریعہ آواز ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ استدلال کو حد یقین تک پہنچنے والا خیال کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ آوازوں کا مشتبہ ہونا شکلوں اور رنگوں کے مشتبہ ہونے کی طرح ہی ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آنکھ والے کے لئے بھی آواز پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ نابینے آدمی کا طلاق وغیرہ میں آواز پر شہادت دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ آواز کو پہچانتا ہو۔ ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: ایک آدمی دیوار کے پیچھے سے اپنے پڑوسی کی آواز کو سنتا ہے اور اسے دیکھتا نہیں، وہ یہ سنتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے (کیا) وہ اس پر شہادت دے سکتا ہے درآنحالیکہ اس نے اس کی آواز پہچان لی ہو؟ تو امام مالک نے فرمایا: اس کی شہادت جائز ہے اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، قاسم بن محمد، شریح الکندی، شعبی، عطا بن ابی رباح، یحییٰ ابن سعید، ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور لیث رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ معنی یہ ہے کہ اگر طالب دو مرد گواہ نہ لا سکے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتیں لے آئے، یہ جمہور کا قول ہے۔ فَرَجُلٌ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور

وَّامْرَاَتٰنِ اس پر معطوف ہے اور خبر محذوف ہے۔ (تقدیر کلام یہ ہے) فرجل و امرأتان یقومان مقامهما۔ یعنی ایک مرد اور دو عورتیں دو مردوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔ اور غیر قرآن میں نصب بھی جائز ہے (یعنی) فاستشهدو ا رجلا و امرأتین۔ پس تم گواہ بناؤ ایک مرد اور دو عورتیں۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: ان خنجرًا فخنجرًا (اگر وہ خنجر لے کر آئے تو تم بھی خنجر لے کر آؤ) اور ایک قوم نے کہا ہے: بلکہ معنی یہ ہے پس اگر دو مرد نہ ہوں، یعنی وہ نہ پائے جائیں تو دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز نہ ہوگا مگر مرد نہ ہونے کی صورت میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): یہ ضعیف ہے اور آیت کے الفاظ یہ معنی نہیں دیتے، بلکہ اس سے ظاہر جمہور کا قول ہے، یعنی اگر گواہ بنانے والے کے پاس دو مرد نہ ہوں یعنی اگر صاحب حق اسے چھوڑ دے یا کسی عذر کے سبب اس کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مردوں کی موجودگی کے باوجود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور میں اس کا ذکر نہیں فرمایا اور جمہور کے قول کے مطابق اسے صرف اموال میں جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ایک مرد بھی ہو۔ بلاشبہ یہ اموال میں ہو سکتا ہے ان کے سوا میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اموال کو پختہ کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے اسباب کثیر بنائے ہیں کیونکہ انہیں حاصل کرنے کی جہتیں کثیر ہیں اور ان کے ساتھ عموم بلوی ہونے اور ان کا کاروبار بار بار ہونے کی وجہ سے۔ پس ان میں مضبوطی اور توثق کو کبھی لکھوانے کے ساتھ، کبھی گواہ بنالینے کے ساتھ، کبھی رہن کے ساتھ اور کبھی ضمان کے ساتھ رکھ دیا۔ اور ان تمام میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کے ساتھ داخل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ سے یہ وہم نہیں ہوتا کہ یہ بضع کے ساتھ مہر کے قرض پر اور دم عمد کی صلح پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ شہادت شہادت علی الدین نہیں ہے، بلکہ وہ شہادت علی النکاح ہے اور علماء نے ان معاملات میں اکیلی عورتوں کی شہادت جائز قرار دی ہے جن پر ضرورت کے وقت ان کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ضرورت کے وقت بچوں کی شہادت کی اجازت دی گئی ہے ان زخموں اور جھگڑوں میں جو ان کے آپس کے درمیان ہوں۔

تحقیق علماء نے زخموں میں بچوں کی شہادت کے بارے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 28**۔ امام مالک نے اسے جائز قرار دیا ہے جب تک وہ مختلف اور متفرق نہ ہوں۔ اور ان میں سے دو سے کم کی شہادت جائز نہیں ہے نہ بڑے کی چھوٹے پر اور نہ چھوٹے کی بڑے پر۔ اور علماء میں سے جو بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں ان کی شہادت کے ساتھ فیصلے کرتے تھے وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس پر اجماع کیا گیا ہے۔

اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے بچوں کی شہادت کو جائز قرار نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ رِّجَالِكُمْ اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ اور ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور یہ صفات بچوں میں موجود نہیں ہوتیں۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک آدمی کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے تو پھر یہ ضروری

1۔ المحرر الوجیز

ہے کہ ان دونوں کا حکم ایک مرد کے حکم کی طرح ہو، پس اسی طرح ہمارے نزدیک آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کھائے اور امام شافعی کے نزدیک بھی اسی طرح ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ بھی قسم کھا سکتا ہے کیونکہ مطلقاً دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کا عوض ہے۔ اور اس میں امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف کیا ہے اور وہ شاہد کے ساتھ قسم کے قائل نہیں اور انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے شہادت کو تقسیم کیا اور اسے متعدد شمار کیا، لیکن شاہد اور یمین کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو تقسیم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ قسم اس پر زائد ہے اور یہ نص پر زیادتی ہے اور یہ نسخ ہے اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں سے ثوری، اوزاعی، عطا، حکم بن عتبہ اور ایک جماعت ہے۔

بعض نے کہا ہے: شاہد کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا قرآن کے ساتھ منسوخ ہے اور عطا نے یہ گمان کیا ہے کہ سب سے پہلے عبدالملک بن مروان نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور حکم نے کہا ہے: قسم اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا بدعت ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے فیصلہ کیا اور یہ سب غلط اور وہم ہے جو حق میں سے کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور جو نفی کرے اور ناواقف ہو وہ اس کی طرح نہیں جو ثابت کرے اور جانتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیہ۔ میں وہ نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہد کے ساتھ قسم کے بارے میں فیصلہ رد ہو سکتا ہو۔ اور نہ اس میں یہ ہے کہ اسے حقوق کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا اور نہ یہ کہ شہادت کے ساتھ صرف انہی چیزوں میں حق حاصل ہوتا ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے کسی اور کا نہیں، کیونکہ وہ مطلوب کے انکار اور طالب کی قسم کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے۔ بے شک وہ اس کے ساتھ بالاجماع مال کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے اور یہ ان کے خلاف قطعی رد ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ انہیں کہا جائے گا: آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف مال کا دعویٰ کرے تو کیا مطلوب اس کے بارے قسم نہیں دے گا جو حق اس پر ہے؟ پس اگر وہ قسم کھا لے تو وہ حق اس سے باطل ہو جائے گا اور اگر قسم سے انکار کر دے تو پھر صاحب حق (مدعی) قسم دے گا کہ اس کا حق یقینی ہے اور اس کا حق مدعیٰ علیہ پر ثابت ہو جائے گا۔ پس یہ ایسی شے ہے جس میں لوگوں میں سے کسی کے نزدیک اور نہ ہی شہروں میں سے کسی شہر میں کوئی اختلاف ہے۔ پس کون سی شے ہے جسے انہوں نے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب میں اسے پایا ہے؟ پس جس نے اس کا اقرار کیا تو اسے چاہیے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کا بھی اقرار کرے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پھر تعجب ہے کہ مشہور اور صحیح احادیث کے باوجود انہوں نے اسے بدعتی قرار دیا جس نے ان کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ اس کے فیصلے کو توڑ دیا اور اس کی رائے کو حقیر سمجھا، اس کے باوجود کہ اس کے مطابق خلفائے اربعہ، ابی بن کعب، معاویہ، شریح، عمرو بن عبدالعزیز...... اور آپ نے اس کے بارے اپنے عمال کی طرف لکھا...... ایاس بن معاویہ، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، ابوالزناد اور ربیعہ رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے عمل کیا ہے اور اسی لئے امام مالک نے کہا ہے۔ اس بارے میں وہی کافی ہے جو سنت کے عمل میں سے گزر چکا ہے۔ کیا آپ ان کے بارے رائے رکھتے ہیں کہ ان کے احکام توڑ دیئے جائیں

گے اور ان کی بدعت کے مطابق فیصلے کیے جائیں گے؟ یہ شدید عدم توجہ اور غفلت ہے اور ایسی رائے ہے جو پختہ اور مضبوط نہیں۔ ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ صرف اموال میں ہے، اسے سیف بن سلیمان نے قیس بن سعد سے انہوں نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کی یہ سند اصح الاسناد ہے اور یہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی کے لئے کوئی طعن نہیں ہے اس حدیث کے بارے اہل معرفت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ یحییٰ القطان نے کہا ہے: سیف بن سلیمان ثابت اور مضبوط راوی ہیں میں نے ان سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا اور نسائی نے کہا ہے: یہ اسناد جید ہے، سیف ثقہ راوی ہے اور قیس ثقہ راوی ہے اور مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ابو بکر البزار نے کہا ہے: سیف بن سلیمان اور قیس بن سعد دونوں ثقہ راوی ہیں اور جو ان دونوں کے بعد ہیں وہ ثقاہت اور عدالت میں اپنی شہرت کے سبب ذکر سے مستغنی ہیں اور صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس نے شاہد کے ساتھ قسم کا انکار کیا ہو، بلکہ اس کے بارے ان سے قول مروی ہیں اور مدینہ طیبہ کے جمہور اہل علم اسی موقف پر ہیں اور اس میں حضرت عروہ بن زبیر اور ابن شہاب رضی اللہ عنہم سے اختلاف مروی ہے۔ معمر نے کہا ہے: میں نے زہری سے یمین مع الشاہد کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے جسے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ دو شاہدوں کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ جب قضا کے والی بنے تو پہلا فیصلہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ کیا اور امام مالک اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور آپ کے متبعین، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور، داؤد بن علی اور محدثین کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے متواتر آثار ہیں اور کئی صدیوں سے اہل مدینہ کا اس پر عمل ہے۔ اور امام مالک نے فرمایا ہے: ہر شہر میں ایک شاہد اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور آپ نے الموطا میں اس کے سوا کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل بیان نہیں فرمائی اور آپ کے ساتھ یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی مدینہ طیبہ اور مصر وغیرہما میں آپ کے اصحاب میں سے کسی سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر شہر میں مالکی اس کے سوا اپنے مذہب سے نہیں پہچانے جاسکتے سوائے ہمارے پاس اندلس میں، کیونکہ یحییٰ [بن یحییٰ] نے گمان کیا ہے کہ انہوں نے لیث کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے یہ موقف اپنایا ہے۔ اور اس مسئلہ میں یحییٰ نے امام مالک سے اختلاف کیا ہے باوجود اس کے کہ یہ ان کی سنت اور دار الہجرت کے عمل سے مخالفت ہے۔

پھر یمین مع الشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ایک حکم کی زیادتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے(1) (یعنی پہلے کسی آدمی کے نکاح میں پھوپھی ہو اوپر سے دوسرا نکاح بھتیجی یا پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لا تنکح المرأۃ علی عمتها، حدیث نمبر 4718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالہ ہو اور پھر بھانجی آ جائے تو یہ دونوں ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔) اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) (اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لئے ماسوا ان کے) اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّآ اَجِدُ (الانعام:145) (آپ فرمائیے میں نہیں پاتا) اور اسی طرح مسح علی الخفین کا حکم ہے حالانکہ قرآن کریم میں صرف پاؤں کو دھونے یا ان کا مسح کرنے کے بارے وارد ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور اگر یہ کہا جانا جائز ہو کہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلے کو منسوخ کر دیا ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ:275) اور اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء:29) (مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔) بیع مزابنہ، بیع الغرر، ان چیزوں کی بیع جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ تمام بیوع جو ممنوع ہیں ان کی نہی کے لئے ناسخ ہیں اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں، کیونکہ سنت کتاب اللہ کے لئے مبین اور وضاحت کرنے والی ہے۔

اور اگر کہا جائے: بے شک جو حدیث میں وارد ہے اور وہ ایک معین فرد کے بارے فیصلہ ہے اور اس میں عموم نہیں ہے تو ہم کہیں گے، بلکہ وہ اس قاعدہ کی تقعید (روک دینا) سے عبارت ہے، گویا کہ انہوں نے یہ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ حکم ثابت کیا ہے اور جو اس تاویل کی شہادت دیتی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا اور قیاس اور نظر و فکر کے اعتبار سے ہم قسم کو دو عورتوں کی نسبت زیادہ قوی پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا لعان میں کوئی دخل نہیں ہے اور قسم لعان میں داخل ہوتی ہے۔ اور جب حدیث صحیح ہے تو پھر اس کے ساتھ کلام کرنا واجب ہے اور سنت ان کی محتاج نہیں ہوتی جو اس کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ جو اس سے مخالفت کرے گا وہی اس کے خلاف حجت بن جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ اور جب یہ بات پختہ ہوگئی اور یمین مع الشاہد کے ساتھ حکم ثابت ہو گیا، تو قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا: یہ اموال اور ان کے متعلقات کے بارے ہے بدنی حقوق کے بارے نہیں، جو بھی یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا قائل ہے ان تمام کی طرف سے اس پر اجماع ہے۔ فرمایا: کیونکہ اموال کے حقوق ابدان کے حقوق سے پست اور ہلکے ہوتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور عمداً زخم لگانے کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، کیا اس میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ قصاص ثابت ہو سکتا ہے؟ اس میں دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ساتھ قصاص اور دیت کے درمیان اختیار ثابت ہو جائے گا اور دوسری یہ ہے کہ اس سے کوئی شے بھی ثابت نہ ہو گی کیونکہ یہ بدنی حقوق میں سے ہے۔ فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔

امام مالک نے الموطا میں کہا ہے: وہ (یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ) صرف اموال میں ہو سکتا ہے اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا ہے اور مازری نے کہا ہے: بغیر کسی اختلاف کے اسے صرف مال میں قبول کیا جائے گا اور محض نکاح اور طلاق میں

بغیر کسی اختلاف کے اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر شہادت کا مضمون مال نہ ہو، لیکن وہ مال تک پہنچانے والی ہو، جیسا کہ وصیت اور موت کے بعد نکاح کے بارے شہادت دینا، یہاں تک کہ اس کے ثابت ہونے سے صرف مال وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے مال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول کیا ہے جیسے وہ اسے مال میں قبول کرتے ہیں اور جنہوں نے حال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اور مہدوی نے کہا ہے: عام فقہاء کے قول کے مطابق حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں اور اسی طرح اکثر علماء کے قول کے مطابق نکاح اور طلاق میں بھی (ان کی شہادت جائز نہیں) اور یہی امام مالک اور امام شافعی وغیرہما کا مذہب ہے، وہ صرف اموال میں شہادت دے سکتی ہیں اور ہر وہ معاملہ جس میں وہ خود شہادت نہیں دے سکتیں وہ اس میں اپنے سوا کسی اور کی شہادت پر بھی شہادت نہیں دے سکتیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی مرد ہو یا نہ ہو اور وہ شہادت نقل نہیں کر سکتیں مگر مرد کے ساتھ (جبکہ انہوں نے مرد اور عورت سے شہادت نقل کی ہو۔ اور ان تمام معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا جن میں ان کے سوا کوئی حاضر نہ ہو سکتا ہو، جیسا کہ ولادت اور ولادت کے وقت بچے کا رونا وغیرہ۔ یہ سب امام مالک کا مذہب ہے اور بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 31**۔ قولہ تعالیٰ: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ یہ رجل و امرأتان کی صفت ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ ابن بکیر وغیرہ نے کہا ہے: یہ حکام کو خطاب کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ عمدہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے لیکن جن کا اس قضیہ کے ساتھ تعلق ہے وہ صرف حکام ہیں اور یہ کتاب اللہ میں بہت زیادہ ہے کہ ان احکام میں خطاب عام ہوتا ہے جن کے ساتھ تعلق بعض کا ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 32**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گواہوں میں سے وہ بھی ہیں جو پسند نہیں کئے جاتے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو عدالت پر محمول نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان کے لئے ثابت ہو جائے اور یہ معنی اسلام پر زائد ہے اور یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے: ہر وہ مسلمان جس کا اسلام ظاہر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ظاہری فسق سے سلامت اور محفوظ ہو تو وہ عادل ہے، اگرچہ وہ مجہول الحال ہو۔

اور شریح، عثمان البتی اور ابوثور نے کہا ہے: وہ مسلمانوں میں سے عادل لوگ ہیں اگرچہ وہ غلام ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں...... پس انہوں نے حکم کو عام قرار دیا ہے اور اس سے شہری کے خلاف بدوی (جنگل میں رہنے والا) کی شہادت کا قبول ہونا لازم آتا ہے، بشرطیکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو اور یہی امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والوں نے کہا ہے اور وہ (بھی) ہمارے مردوں اور ہمارے اہل دین میں سے ہے۔ اور اس کا بدوی ہونا اس کے دوسرے شہر سے ہونے کی طرح ہے اور قرآن کریم میں آیات عمومات عادلوں کی شہادت قبول کرنے پر دال ہیں اور وہ بدوی اور شہری کو مساوی قرار دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اور مزید ارشاد فرمایا: وَ اَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ (اور تم اپنے میں سے عدل کرنے والوں کو گواہ بنالو) پس مِنۡكُمۡ میں خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ یقیناً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عدالت کا

معنی بالضرور اسلام پر زائد ہو (یعنی وہ مسلمان ہونے کے ساتھ عادل بھی ہو) کیونکہ صفت موصوف پر زائد ہوتی ہے اور اسی طرح مِمَّنْ تَرْضَوْنَ بھی اسی کی مثل ہے، بخلاف اس کے جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے پھر اس کا پسندیدہ ہونا معلوم نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی حالت کو آزما لیا جائے، پس اس سے لازم آتا ہے کہ فقط ظاہر اسلام پر اکتفاء نہ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک نے ان سے ابن وہب کی روایت میں شہری کے خلاف بدوی کی شہادت رد ہونے کا موقف اپنایا ہے، اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بدوی کی شہادت شہر میں رہنے والے کے خلاف جائز نہیں ہوتی (1)۔'' اور صحیح یہ ہے کہ اس کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء اور سورۃ البرأۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفر یا حضر میں شہری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جب وہ سفر میں ہو تو اس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: عدالت سے مراد احوال دینیہ میں اعتدال ہے اور یہ تب مکمل ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو، اپنی مروت کی حفاظت کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ کو ترک کرنے کا محافظ ہو اور امانت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے (غفلت نہ برتی جائے) اور کہا گیا ہے: عادل قرار دینے والے کے گمان میں باطن صاف ہو اور سیرت مستقیم ہو اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

**مسئلہ نمبر 33**۔ جب شہادت ولایت عظیمہ اور مرتبہ بلند ہے اور یہ غیر کے قول کو غیر کے خلاف قبول کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں رضا اور عدالت کی شرط لگائی ہے۔ پس شاہد کے حکم میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کے ساتھ منفرد ہو اور فضائل و کمالات سے آراستہ اور مزین ہو، یہاں تک کہ اسے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل ہو اور وہی فضیلت اس کا قول قبول کرنے کے بارے اس کے لئے رتبہ اختصاص ثابت کرتی ہو اور اس کی شہادت کے ساتھ مطلوب کے ذمہ کے مشغول ہونے کے بارے حکم لگایا جا سکتا ہو۔ ہمارے علماء کے نزدیک اجتہاد اور امارات وعلامات کے ساتھ استدلال کرنے کے جواز پر اسی شے میں جس کے معانی اور احکام مخفی اور پوشیدہ ہوں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں ایسی دلیل موجود ہے جو امر کو حکام کے اجتہاد کے سپرد کرنے پر دلالت کرتی ہے اور بسا اوقات وہ شاہد میں غفلت یا شک کو دیکھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کی شہادت رد کر دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 34**۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اموال میں ظاہر اسلام پر اکتفا کیا جائے گا لیکن حدود میں نہیں۔ اور یہ مناقضہ ہے جو آپ کے کلام کو ساقط کر دیتا ہے اور آپ پر اس کے مقاصد فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس شہادت میں فقط ظاہر دین پر ہی اکتفا نہ کیا جائے گا جیسا کہ حدود میں۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 35**۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقود مداینہ میں شاہد کے لئے عدالت اور رضا کی شرط عائد کی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو پھر نکاح میں ان کا شرط ہونا بدرجہ اولیٰ ہے، بخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جہاں انہوں نے فرمایا: بے شک

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من لا تجوز شہادتہ، حدیث نمبر 2357، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح دو فاسق آدمیوں کی شہادت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے اموال میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اس کی نکاح سے نفی کر دی ہے حالانکہ یہ زیادہ اولیٰ اور ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ حل و حرمت اور حد و نسب تعلق رکھتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رضا اور عدالت کی شرط عائد کی ہے اور اس کا پسندیدہ ہونا خالی اسلام سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو اس کے احوال میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فقط اس کے اس قول سے دھوکہ نہیں کھایا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔ بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جو اس کی شہادت کو رد کرنے کا موجب ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (البقرہ) (اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے...... (اور اللہ تعالیٰ) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا) اور مزید فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ الآیہ (المنافقون:4) (اور جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے......)

**مسئلہ نمبر 36**۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ابو عبید نے کہا ہے: تَضِلَّ بمعنی تنسی ہے (کہ ان میں سے ایک بھول جائے) اور شہادت میں ضلال کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھول جانا اور کچھ یاد ہو اور آدمی اس کے درمیان حیران باقی رہ جاتا ہے یہی ضال ہے اور جو پوری شہادت بھول جائے تو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاتا: ضل فیہا۔ (وہ اس میں بھول گیا) حمزہ نے جزا کے معنی کی بنا پر اِن میں ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اور فَتُذَكِّرُ میں فا کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ اور شرط اور جواب شرط رَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔ اور تُذَكِّرُ استیناف کی بنا پر مرفوع ہے۔ جیسا کہ یہ قول مرفوع ہے وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (المائدہ:95) (اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے) یہ سیبویہ کا قول ہے۔

اور جنہوں نے ان میں ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو یہ مفعول لہ ہے اور اس میں عامل محذوف ہے اور جماعت کی قرأت کے مطابق فَتُذَكِّرَ منصوب ہے اور اس فعل پر معطوف ہے جس کو اَنْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

نحاس نے کہا ہے: تَضَلّ تا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور تِضَل تا کے کسرہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ پس جس نے کہا: تضل یہ ان کی لغت پر ہے جنہوں نے کہا ہے: ضَلِلْتُ تَضَل۔ اور اسی پر آپ تِضَل کہتے ہیں اور تا کو کسرہ دیا جاتا ہے تا کہ وہ ماضی فَعِلت ہونے پر دلالت کرے۔ اور جحدری اور عیسیٰ ابن عمر نے اَنْ تُضَلّ تا کو ضمہ، ضاد کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بمعنی تُنْسٰی (یعنی اگر ان میں سے ایک بھلا دی جائے) اور اسی طرح ان دونوں سے ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے۔ اور نقاش نے جحدری سے تا کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی اَنْ تُضِلَّ الشَّهَادَةَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 255

(کہ وہ شہادت کو بھلا دے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أَضْلَلْتُ الفرس والبعیر (میں نے گھوڑے اور اونٹ کو گم کر دیا۔)
جب وہ دونوں تجھ سے ضائع ہو جائیں اور چلے جائیں سو تو انہیں نہ پا سکے۔ (تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)

**مسئلہ نمبر 37۔** قولہ تعالیٰ: فَتُذَكِّرَ ابن کثیر اور ابوعمرو نے ذال اور کاف کو مخفف پڑھا ہے اور اس پر معنی یہ ہوگا کہ تو اسے شہادت میں مذکر کی طرف لوٹا دے، کیونکہ عورت کی شہادت نصف شہادت ہے اور جب دو عورتوں نے شہادت دی تو دونوں کا مجموعہ ایک مرد کی شہادت کی طرح ہوگا۔ سفیان بن عیینہ اور ابوعمرو بن العلاء نے یہی کہا ہے۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ وہ ضلال جس کا معنی نسیان ہے اس کے مقابلہ میں صرف ذکر (یاد دلانا) ہی آ سکتا ہے اور یہی جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔ فَتُذَكِّرَ یعنی وہ دوسری اسے آگاہ کرے جب وہ غافل ہو جائے اور بھول جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوعمرو کی قرأت اس کی طرف راجع ہے، یعنی اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، کہا جاتا ہے: تذَكَّرتُ الشیٔ و اذکرتُه غیری و ذَكَّرتُهٗ (میں نے اسے یاد دلایا) ان تمام کا معنی ایک ہے الصحاح میں اس طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 38۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا حسن نے کہا ہے یہ آیت دو امروں کو جمع کئے ہوئے ہے اور وہ دونوں یہ ہیں کہ تو انکار نہ کرے جب تجھے تحصیل شہادت کے لئے بلایا جائے اور نہ تب جب تجھے ادائے شہادت کی طرف بلایا جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ، ربیع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یعنی (تو انکار نہ کرے جب تجھے بلایا جائے) تا کہ تو شہادت اخذ کر لے اور اسے کتاب میں ثابت اور محفوظ کر لے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے جب تجھے ادائے شہادت کے لئے بلایا جائے درآنحالیکہ وہ شہادت تجھے حاصل ہو چکی ہو۔ اور نقاش نے حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کی ہے کہ آپ نے آیت کی اس طرح تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے پس جب تجھے بلایا جائے تا کہ تو پہلے شہادت دے تو تو اگر چاہے تو جا اور اگر چاہے تو نہ جا۔ ابومجلز، عطا، ابراہیم، ابن جبیر، سدی، ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس بنا پر متعاقدین کے پاس گواہوں کا حاضر ہونا واجب نہیں ہے، البتہ قرض لینے دینے والے دونوں افراد پر لازم ہے کہ وہ گواہوں کے پاس حاضر ہوں۔ پس جب وہ دونوں ان کے پاس حاضر ہوں اور دونوں انہیں کتاب میں اپنی شہادت ثبت اور محفوظ کرنے کی درخواست کریں تو یہی وہ حالت ہے جو اس ارشاد سے مراد لینا جائز ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا یعنی گواہ انکار نہ کریں جب انہیں شہادت کے اثبات کے لئے بلایا جائے اور جب ان کی شہادت ثابت ہو جائے، پھر انہیں حاکم کے پاس شہادت ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو یہ وہ دعوت ہے جس کے سبب حاکم کے پاس ان دونوں کی حاضری ہوگی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے جیسا کہ حسن نے کہا ہے: آیت ندب کے اعتبار سے دو امروں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ پس مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی معاونت کرنا مستحب ہے۔ پس جب گواہوں کی کثرت کے سبب وسعت ہو اور حق معطل ہونے اور مٹنے سے محفوظ و مامون ہو تو یہ دعوت مستحب ہے اور جسے بلایا گیا ہے اس کے لئے معمولی عذر کے سبب پیچھے رہ جانا جائز ہے

اور اگر وہ بغیر عذر کے بھی پیچھے رہ جائے تو نہ اس پر گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہے۔

اور جب ضرورت ہو اور حق کے معطل ہونے کا تھوڑا سا بھی خوف ہو تو ندب قوی ہو جائے گا اور یہ وجوب کے قریب ہو جائے گا اور جب اسے یہ علم ہو کہ شاہد کے شہادت سے پیچھے ہو جانے کے سبب حق ضائع اور تلف ہو جائے گا تو پھر اس پر شہادت دینا واجب ہے، بالخصوص جب شہادت اسے حاصل ہو چکی ہو اور دعوت اسے ادا کرنے کے لئے ہو، کیونکہ یہ ظرف زیادہ پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ گردن میں قلادہ ہے اور امانت ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے اس پر دلیل ظاہر ہوتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے گواہوں کا انتظام کرے اور بیت المال سے ان کے لئے ان کی ضروریات پوری کرے اور ان کا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تحمل شہادت کے بغیر اور کوئی کام نہ ہو۔ اور اگر اس طرح نہ ہوا تو حقوق ضائع اور باطل ہو جائیں گے سو معنی یہ ہوگا: گواہ انکار نہ کریں جب وہ لوگوں کے حقوق اخذ کریں کہ وہ انہیں ادا کریں گے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کہا جائے: یہ شہادت تو بالاجرت ہے، تو ہم کہیں گے: یہ خالصۃً ایسی قوم کی شہادت ہے جنہوں نے اپنے حقوق بیت المال سے پورے کئے اور یہ قاضیوں اور والیوں کی تنخواہوں اور ان جمیع مصالح کی طرح ہے جو مسلمانوں کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ اور یہ (شہادت) بھی من جملہ انہی میں سے ہے، واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا پس ان کے لئے مقرر کر دیئے۔

**مسئلہ نمبر 39**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد وہ ہے جو حاکم کے پاس چل کر جاتا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے مطابق ہر زمانے میں عمل کیا گیا ہے اور ہر امت نے اسے سمجھا ہے۔ اور ان کی امثال میں سے یہ ہے: فِيْ بَيْتِهٖ يُؤْتَى الْحَكَمُ (اس کے گھر میں حَکَم (فیصلہ کرنے والا ثالث) کو لایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 40**۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو غلام گواہوں کی جماعت سے خارج ہو گیا اور یہی مِنْ رِّجَالِكُمْ کے عموم کو خاص کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لئے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (شہادت کے لئے) آنا صحیح ہے، کیونکہ وہ بذات خود مستقل بالحکم نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ غیر کی اجازت سے تصرف کرتا ہے، نتیجتاً وہ منصب شہادت سے اسی طرح گر گیا جیسا کہ وہ ولایت کے مرتبہ سے گر گیا ہے۔ ہاں بلکہ! جیسا کہ وہ جمعہ، جہاد اور حج کے فرض کی ادائیگی سے گرا ہوا ہے (1)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 41**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ شہادت کی طرف بلانے کی حالت میں ہے۔ رہا وہ جس کے پاس کسی آدمی کے حق میں شہادت ہو اور اس کا وہ مستحق جو اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے وہ اسے نہ جانتا ہے، تو ایک قوم نے کہا ہے اس شہادت کو ادا کرنا مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور بلانے کے وقت اللہ تعالیٰ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 257

نے ادائے شہادت کو فرض قرار دیا ہے اور جب نہ بلایا جائے تو پھر شہادت دینا مستحب ہے کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''گواہوں میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شہادت دینے کے لئے آئے اس سے قبل کہ اسے اس کے لئے کہا جائے'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ شہادت دینا فرض ہے اگرچہ اس کے بارے درخواست نہ کی جائے جبکہ حق کے ضائع یا فوت ہونے کا خوف ہو یا اس پر طلاق یا عتق کا خوف ہو جسے بیوی ہونے کے اعتبار سے اس سے استمتاع کرنے اور غلام سے خدمت لینے کا تصرف حاصل تھا وغیرذالک۔ پس جس نے اس میں سے کوئی شی اخذ کر رکھی ہو تو اس شہادت کو ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کو اس پر موقوف نہیں کرے گا کہ اسے شہادت کے لئے کہا جائے اور وہ اس طرح حق کو ضائع کر دے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: 2) (گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو) اور مزید فرمایا: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ (الزخرف) (ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں) اور حضور نبی مکرم ﷺ سے صحیح روایت میں ہے: انصر اخاک ظالما او مظلوما (تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) تو اس پر اس کی مدد کرنا متعین ہو گیا اس شہادت کی ادائیگی کے ساتھ جو اس کے پاس ہو اس حق کو زندہ کرنے کے لئے جسے انکار مار دے (ضائع کر دے)۔

**مسئلہ نمبر 42**۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ آدمی جس پر شہادت دینا واجب ہو ان وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ اسے ادا نہ کرے تو یہ شاہد اور شہادت میں عیب ہے اور اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم وغیرہ کا قول ہے۔ اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شہادت حقوق العباد میں سے کسی حق کے بارے ہو تو وہ خاصۃً اس نفس شہادت میں عیب ہو گا اور اس کے بعد اسے ادا کرنا اس کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ شے جو اس کے عیب کو ثابت کر رہی ہے وہ اس کا اس امر کو ادا نہ کرنے کے سبب فاسق ہو جانا ہے جس امر کی ادائیگی بغیر عذر کے اس پر واجب تھی اور فسق مطلق شہادت کی اہلیت کو سلب کر لیتا ہے اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 43**۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: خیر الشھداء الذی یاتی بشھادتہ قبل ان یُسالھا اور اس ارشاد کے درمیان جو حدیث عمران بن حصین میں ہے کوئی تعارض نہیں (وہ ارشاد یہ ہے) اِن خیرکم قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم (بے شک تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں) پھر عمران نے کہا: میں نہیں جانتا کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد دو بار ذکر فرمایا یا تین بار...... پھر ان کے بعد قوم ہو گی جو شہادت دیں گے اور انہیں شاہد نہیں بنایا جائے گا وہ خیانت کریں گے اور انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے اور پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا (1)۔'' دونوں کو صحیحین نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث تین وجوہ پر محمول ہے: ان میں سے ایک یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا، حدیث نمبر 5948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہو کیونکہ وہ ایسی شے کے بارے گواہی دیتا ہے جس پر اسے شاہد نہ بنایا گیا ہو۔ یعنی ایسی شے کے بارے میں جسے نہ اس نے خود اخذ کیا ہو اور نہ ہی اس جانب اس کی توجہ کرائی گئی ہو۔

اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باب الجابیہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم میں اسی طرح قیام فرماتے تھے جیسے میں تم میں کھڑا ہوں پھر آپ نے فرمایا: یایھا الناس اتقوا اللہ فی اصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشو الکذب شھادۃ الزور (اے لوگو! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر جھوٹ اور جھوٹی شہادت پھیل جائے گی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہو جسے حرص اور طمع اس شے کے نافذ کرنے پر برانگیختہ کرے جس کے ساتھ وہ شہادت دے گا لہٰذا وہ درخواست سے قبل ہی شہادت دینے میں جلدی کرتا ہے۔ پس یہ شہادت مردود ہے کیونکہ یہ ایسی خواہش پر دلالت کرتی ہے جو شاہد پر غالب ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے جسے ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے جو کہ اس حدیث کے بعض طرق کے راوی ہیں: وہ ہمیں عہد اور شہادت سے منع کرتے تھے اور ہم ابھی بچے تھے۔

**مسئلہ نمبر 44**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ تَسْـَٔمُوْٓا کا معنی ہے تملوا اور تم اکتاؤ نہیں۔

اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے سَئِمْتُ اَسْاَمُ سَاْمًا و سَآمَةً و سَآمًا [وسَاْمَةً] و سَاْمًا (اکتا جانا) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَئِمْتُ تكاليف الحياة و مَنْ يَعِشْ ثمانين حولا - لا أبالك - يَسأمِ

میں زندگی کی تکالیف سے اکتا گیا اور جو اسی برس تک زندہ رہا..... تیرا باپ نہ ہو وہ اکتا ہی جاتا ہے۔

اَنْ تَكْتُبُوْهُ یہ فعل کے سبب محل نصب میں ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا یہ دونوں تکتبوہ کی ضمیر سے حال ہیں۔ اور صغیر کو اس کے خاص اہتمام کے سبب مقدم ذکر کیا گیا ہے اور یہ نہی اکتانے سے ہے۔ بلاشبہ یہ اس لئے وارد ہوئی ہے کیونکہ ان کے درمیان قرضوں کا لین دین کثرت سے تھا لہٰذا ان کے بارے یہ خوف ہونے لگا کہ وہ لکھنے سے اکتا جائیں (1) اور کوئی یہ کہنے لگے: قرضے کی یہ مقدار تو بالکل قلیل اور تھوڑی ہے مجھے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے قلیل و کثیر میں لکھنے کی انگیخت دلا کر تاکید فرمائی۔ ہمارے علماء نے کہا ہے مگر وہ شے جو اپنی کمی اور اقرار و انکار میں نفس کے اس کی طرف جھکاؤ نہ ہونے میں وہ قیراط اور اسی کی طرح کی ہو (تو اس میں لکھنے کی ضرورت نہیں)۔

**مسئلہ نمبر 45**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اَقْسَطُ بمعنی اعدل (یہ تحریر زیادہ عدل کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یعنی یہ کہ قلیل و کثیر مقدار کو لکھ لیا جائے اور اس پر گواہ بنا لئے جائیں۔ (2)

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ احکام القرآن، صفحہ 257، جلد 1، دار الفکر لبنان

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یعنی یہ شہادت کو صحیح کرنے والی اور اسے محفوظ بنانے والی ہے۔ وَاَدْنٰی اس کا معنی ہے اَقرب۔ زیادہ قریب ہے۔ اور تَرْتَابُوْا تم شک کرو۔ (یعنی یہ تحریر تمہیں شک سے بچانے کا بہت آسان اور قریب ترین طریقہ ہے۔)

**مسئلہ نمبر 46**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یہ اس پر دلیل ہے کہ شاہد جب کتاب دیکھے اور اسے شہادت یاد نہ ہو تو وہ اسے ادا نہیں کرے گا کیونکہ اس پر اس میں شک داخل ہو چکا ہے اور وہ شہادت نہیں دے سکتا مگر اسی شے کی جسے وہ جانتا ہو، لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے: یہ میری تحریر ہے اور اب مجھے وہ یاد نہیں جو میں نے اس میں لکھا۔ (1)

ابن منذر نے کہا: اہل علم میں سے اکثر وہ جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں وہ اس سے منع کرتے ہیں کہ کوئی شاہد اپنے خط پر شہادت دے جب اسے شہادت یاد نہ ہو۔

اور امام مالک نے اس کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت عدالت کی طرف کی ہے تو اس میں اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے کہ وہ اپنے خط پر شہادت دے اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو۔

ابن مبارک نے معمر عن ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ شہادت پر شہادت دیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ وہ شہادت دے، بشرطیکہ وہ تحریری معاہدہ میں اپنی علامت یا اپنے ہاتھ کی تحریر کو پالے۔ ابن مبارک نے کہا: میں نے یہ بہت اچھا سمجھا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی اخبار و روایات مروی ہیں کہ آپ نے کئی ایک اشیاء میں دلائل و شواہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آنے والے رسل عظام علیہم السلام سے بھی ایسی روایات ہیں جو اس مذہب کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 47**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ اس میں اَنْ استثنا ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے یہ اول کلام سے نہیں ہے (2)۔ اخفش (ابوسعید) نے کہا ہے: ای الا ان تقع تجارۃ (مگر یہ کہ تجارت واقع ہو)۔ پس کان بمعنی وقع اور حدث کے ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: وَ تُدِيْرُوْنَهَا یہ خبر ہے۔ اور اکیلے عاصم نے کان کی خبر ہونے کی بنا پر تجارۃً پڑھا ہے (3) اور اس کا اسم اس میں مخفی ضمیر ہے اور حَاضِرَةً یہ تجارۃ کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے الا ان تکون التجارۃُ تجارۃ حاضرۃ۔ یا الا ان تکون المبایعۃ تجارۃ حاضرۃ (مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو) کی اور ابو علی فارسی نے اسے اسی طرح مقدر کیا ہے اس کی نظائر اور اس پر استشہاد پہلے گزر چکا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنے کی مشقت کو ملاحظہ فرمایا تو اس کے ترک پر نص بیان فرمائی اور ہر اس بیع میں حرج کو اٹھا دیا جو نقد و نقد ہو اور اغلباً یہی بیع ہوتی ہے جبکہ وہ قلیل شے میں ہو مثلاً کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ نہ کہ کثیر میں جیسا کہ املاک وغیرہ (یعنی املاک کی خرید و فروخت میں چونکہ عوض کثیر ہوتا ہے اس لئے اسے لکھنا لازم ہے۔) سدی اور ضحاک نے کہا ہے:

---

1۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر لبنان 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً

یہ (رخصت) اس سودے میں ہے جو دست بدستی ہو۔(1)

**مسئلہ نمبر 48۔** قولہ تعالیٰ: تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ یہ ارشاد باہم قبضہ کرنے اور مقبوض کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جب گھر، زمین اور حیوانوں میں سے کثیر جدائی اور علیحدگی کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں چھوڑا جاسکتا ہے تو ان کے سودے میں لکھ لینا اچھا ہے اور اس میں قرضے کا لین دین ملحق ہو جائے گا(2) تو گویا تحریر اس کے لئے اعتماد اور مضبوطی کا باعث ہوگی جبکہ یہ قریب ہے کہ احوال بدلنے اور دلوں کی کیفیت میں تغیر آنے سے نزاع وہاں طاری ہو جائے۔ پس جب وہ معاملہ میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے عوض پر قابض ہوں گے اور دونوں میں سے ہر ایک اس شے کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہوگا جو اس نے اپنے ساتھی سے خریدی ہے تو عرفاً و عادۃً تنازع کا خوف کم ہوگا مگر مخفی اور پوشیدہ اسباب کے ساتھ شریعت نے نقد اور ادھار دونوں حالتوں میں ان مصالح پر آگاہ کیا ہے(3) اور جس پر غائب ہوا جا سکتا ہے اور جس پر غائب نہیں ہوا جا سکتا تحریر، شہادت اور رہن کے ساتھ۔

امام شافعی نے کہا ہے: بیوع تین ہیں: ایک وہ بیع جو کتابت اور گواہوں کے ساتھ ہو اور دوسری وہ بیع جو رہن کے عوض ہو اور تیسری وہ بیع جو امانت کے ساتھ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نقد کے عوض بیع کرتے تھے تو گواہ بنا لیتے تھے اور جب ادھار کوئی شے بیچتے تھے تو اسے لکھ لیتے تھے۔(4)

**مسئلہ نمبر 49۔** قولہ تعالیٰ: وَ اَشْهِدُوْٓا علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور تم گواہ بنا لیا کرو چھوٹے سودے پر بھی اور بڑے سودے پر بھی(5)۔ اور لوگوں نے اس کے واجب ہونے یا مستحب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے(6)، پس حضرات ابو موسیٰ اشعری، ابن عمر، ضحاک، سعید بن مسیب، جابر بن زید، مجاہد، داؤد بن علی اور ان کے بیٹے ابو بکر رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بیع کے وقت گواہ بنانا واجب ہے(7)۔ اور اس بارے میں ان میں سے زیادہ شدت حضرت عطا نے کی ہے انہوں نے کہا ہے: تو گواہ بنا لے جب تو کوئی شے فروخت کرے اور جب تو کوئی شے خریدے درہم کے عوض یا نصف درہم کے عوض یا چوتھائی درہم کے عوض یا اس سے بھی کم کے عوض، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو)

اور ابراہیم نے کہا ہے: گواہ بنا لے جب کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے اگرچہ وہ سبزی کی گانٹھ ہی ہو۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے ان میں سے علامہ طبری بھی ہیں اور انہوں نے کہا ہے: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے جب وہ کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے مگر یہ کہ اس پر گواہ بنا لیا جائے، ورنہ وہ

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر بیروت 4۔ ایضاً
5۔ جامع البیان، صفحہ 158، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ 6۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان 7۔ ایضاً

کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والا ہوگا اور اسی طرح اگر وہ مقررہ مدت تک ادھار ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھوا لے اور گواہ بنا لے اگر وہ کوئی کاتب پالے۔

اور علامہ شعبی اور حسن نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس امر کا اطلاق معنی ندب (1) اور ارشاد پر ہے وجوب پر نہیں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہی قول امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور ابن عربی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام کا قول ہے، فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔ اور ضحاک کے سوا کسی سے بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ وجوب کے لئے ہے۔ فرمایا تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور اسے تحریر کیا۔ فرمایا: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کا نسخہ یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هذا ما اشترى العدّاء بن خالد بن هوذة من محمد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، اشترى منه عبدا۔ او امة۔ لاداء ولا غائلة ولا خبثة بيع المسلم المسلم (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ وہ ہے جسے عداء بن خالد بن ہوذہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خریدا ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلام یا کنیز خریدی۔ اس میں کوئی بیماری نہیں، کوئی شر اور فساد نہیں، اور کوئی پلیدی اور نجاست نہیں اور یہ مسلمان کی بیع مسلمان کے ساتھ ہے۔) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خریدا اور اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی اور آپ نے کوئی گواہ نہیں بنایا۔ اگر گواہ بنانا امر واجب ہوتا تو جھگڑے کے خوف کی وجہ سے رہن کے ساتھ بھی واجب ہوتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں سے وجوب ذکر کیا ہے۔ اور عداء کی اس حدیث کو دارقطنی اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور وہ کہتے ہیں ہم نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ لڑی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نہیں دیا اور نہ ہماری مدد کی، پھر وہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا۔ اسے ابوعمر نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے راوی کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ''اصمعی نے کہا ہے: میں نے سعید بن ابی عروبہ سے غائلہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد بھاگ جانا، چوری کرنا اور زنا کرنا ہے اور میں نے ان سے الخبثہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسلمانوں کے عہد میں رہنے والوں کی خرید و فروخت کرنا (یعنی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت رہ رہا ہو)۔

اور امام ابومحمد بن عطیہ نے کہا ہے: اس میں وجوب تو باعث قلق و اضطراب ہے اور رہا دقائق میں تو وہ بہت مشکل اور شاق ہے اور جو کچھ اکثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک تاجر گواہ بنانے کو ترک کر کے دوستی کا ارادہ اور قصد کرتا ہے اور کبھی بعض شہروں میں اس کی عادت اور رواج ہوتا ہے (کہ گواہ نہیں بنایا جاتا) اور کبھی وہ عالم اور باعزت بڑے آدمی سے حیا محسوس کرتا ہے لہٰذا اس پر گواہ نہیں بنایا جاتا، پس یہ سب ائتمان (امین بنانا) میں داخل ہیں اور امر بالاشہاد مستحب باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ اس میں اغلباً مصلحت ہوتی ہے جب اس سے مانع کوئی عذر موجود نہ ہو جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت۔ ابن ماجہ کتاب التجارات حدیث 2241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہدوی، نحاس اور مکی نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (1) اور نحاس نے اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَ لْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَ لْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَ لَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِیْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ اور کہا اس آیت نے اپنے ماقبل کو منسوخ کر دیا ہے۔ (2)

نحاس نے کہا ہے: یہ حسن، حکم اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ حکم پہلے کا مغایر اور اس کے سوا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حکم اس کے بارے ہے جو لکھنے والا کاتب نہ پائے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا یعنی پھر وہ اس سے رہن کا مطالبہ نہ کرے فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ (البقرۃ:283) (اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۔) فرمایا: اگر اس کا پہلے کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ الآیۃ (النساء:43) (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے......) یہ اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ الآیۃ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو۔) اور پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: فمن لم یجد فصیام شهرین متتابعین (پس جو (غلام کو) نہ پائے تو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے۔) اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: فتحریر رقبة مومنة (پس ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کا ابتدائے آیت سے جو کہ امر بالاشہاد پر مشتمل ہے

---

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دارالکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع البیان، صفحہ 141، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 2355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نزول میں متاخر ہونا واضح اور ظاہر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے۔ اور ایک حالت میں اکٹھے نازل ہونے والے دو حکموں کو ناسخ و منسوخ قرار دینا جائز نہیں ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے کہا گیا آیۃ الدین منسوخ ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں قسم بخدا! آیۃ الدین محکم ہے اس میں کوئی نسخ وغیرہ نہیں۔ فرمایا: اشہاد یعنی گواہ بنا لینے کا حکم طمانینت کے لئے فرمایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی توثیق اور پختگی کے لئے کئی طرق اور ذرائع بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک لکھوانا ہے، ایک رہن رکھنا ہے اور ایک گواہ بنا لینا ہے۔ اور علمائے امصار کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رہن بطریق ندب مشروع ہے نہ کہ بطریق وجوب۔ پس گواہ بنانے میں بھی حکم اسی کی مثل سمجھا جائے گا اور لوگ ہمیشہ سفر و حضر، بر و بحر اور صحراء و پہاڑ میں بغیر گواہ بنائے خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ لوگ اسے جانتے ہیں لیکن کوئی انکار نہیں کرتا تو اگر گواہ بنانا واجب ہوتا تو وہ اس واجب کو ترک کرنے والے پر اعتراض کرنا قطعاً ترک نہ کرتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام خوبصورت استدلال ہے اور اس سے حسین تر وہ ہے جو ترک اشہاد کے بارے میں صریح سنت میں وارد ہے اور وہ وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے طارق بن عبداللہ محاربی سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ''ہم ربذہ اور جنوب ربذہ سے ایک قافلہ کی صورت میں آئے اور مدینہ طیبہ کے قریب آ کر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور ہمارے ساتھ ہماری ایک عورت پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پس اس اثنا میں کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس پر دو سفید کپڑے تھے اور اس نے سلام کیا اور ہم نے بھی اس پر سلام کا جواب لوٹایا، تو اس نے پوچھا: یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟ تو ہم نے کہا: ربذہ سے اور ربذہ کے جنوب سے۔ راوی کہتے ہیں: اور ہمارے ساتھ ایک سرخ اونٹ تھا، تو اس نے پوچھا کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟ تو ہم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: کتنے کے عوض؟ ہم نے کہا: کھجور کے اتنے اتنے صاع کے عوض۔ اس نے کہا: ہم اس میں سے کوئی شے کم نہیں کرائیں گے (یعنی پورا پورا ادا کریں گے) اور کہا: میں اسے پکڑ لوں، پھر اس نے اونٹ کو سر سے پکڑا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا اور ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ہم نے کہا: تم نے اپنا اونٹ ایسے آدمی کو دے دیا ہے جسے تم پہچانتے ہی نہیں! تو اس پالکی میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے، میں نے کسی آدمی کا چہرہ اس کے چہرہ سے بڑھ کر چودھویں رات کے چاند سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ تو جب شام ہوئی تو ہمارے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے کہ تم اس سے کھاؤ یہاں تک کہ تم خوب سیر ہو جاؤ اور تم اپنا کیل کر لو یہاں تک کہ تم اپنا حق پورا کر لو۔ اس نے بیان کیا: پس ہم نے کھایا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اور ہم نے کیل کیا یہاں تک کہ ہم نے اپنا حق پورا کر لیا۔ (1)

اور زہری نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان کے چچا نے انہیں بتایا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس اعرابی نے

1۔ سنن الدارقطنی، کتاب بیوع، صفحہ 45، حدیث 186، جلد 3، دار المحاسن قاہرہ

کہنا شروع کر دیا: گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے تمہیں (گھوڑا) فروخت کیا ہے..... تو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تو نے (گھوڑا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچا ہے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''تو کیونکر شہادت دیتا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: آپ کی تصدیق کرنے کے ساتھ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ راوی کہتے ہیں: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شهادة خزيمة بشهادة رجلين اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 50۔** قولہ تعالیٰ: **وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ** اس میں تین اقوال ہیں۔

(1) کاتب نہ لکھے جب تک اسے لکھوایا نہ جائے اور شاہد اپنی شہادت میں کوئی کمی وبیشی نہ کرے۔ حسن، قتادہ، طاؤس اور ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور عطاء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ معنی یہ ہے کہ کاتب لکھنے سے اور شاہد شہادت دینے سے انکار نہ کرے (2)۔ ان دونوں قولوں کی بنا پر **وَلَا يُضَآرَّ** اصل میں **يُضَارِرَ** را کے کسرہ کے ساتھ ہے، پھر ادغام ہوا اور حالت جزمی میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے را کو فتحہ دے دیا گیا (3)۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس قول کی طرف مائل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا: کیونکہ اس کے بعد **وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ** ہے۔ پس اس طرح ہونا اولیٰ ہے کہ جس نے بغیر حق کے شہادت دی یا لکھنے میں کوئی تغیر و تبدل کیا اسے فاسق کہا جائے اور یہ اس کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اولیٰ ہے کہ آدمی شاہد کو شہادت دینے کے لئے کہے اور وہ مشغول ہو۔ (یعنی شہادت کے لئے فارغ نہ ہو تو اسے فاسق کہا جائے۔)

حضرت عمر بن خطاب، ابن عباس اور ابن ابی اسحاق رضی اللہ عنہم نے **يُضَارِرَ** پہلی را کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حضرت مجاہد، ضحاک، طاؤس اور سدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ آیت **وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ** کا معنی یہ ہے کہ شاہد کو شہادت کی طرف اور کاتب کو کتابت کی طرف بلایا جائے اور وہ دونوں مشغول ہوں (4)۔ اور جب وہ دونوں اپنے عذر پیش کر دیں تو وہ ان دونوں کو نکالے اور انہیں اذیت پہنچائے اور ستائے اور کہے: تم دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور اسی طرح کی باتیں ان سے کرے اور انہیں ضرر پہنچائے۔ اس قول کی بنا پر **يُضَآرَّ** کی اصل **يُضَارَرَ** ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے **يُضَارَرَ** پہلی را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (5)۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اگر وہ اسے مطلق قرار دیتا تو پھر اس میں ان دونوں کے لئے اپنے دین اور اپنی معاش کے امر سے شغل اور مصروفیت ہے اور لفظ المضارۃ چونکہ دو سے متعلق ہے یہ ان معانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن نسائی، کتاب بیوع، صفحہ 228، جلد 2، وزارت تعلیم، اسلام آباد

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، صفحہ 145، حدیث نمبر 186، جلد 3، مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ

5۔ المحرر الوجیز، صفحہ 385، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

کاتب اور شہید پہلے دونوں قولوں کی بنا پر اپنے فعل کے سبب مرفوع ہیں اور تیسرے قول کی بنا پر نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

**مسئلہ نمبر 51** ۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تَفْعَلُوْا یعنی اگر تم ستانے کا عمل کرو گے۔ فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، یہ سفیان ثوری سے مروی ہے۔ پس کاتب اور شاہد زیادتی یا کمی کے ساتھ نافرمانی کرتے ہیں اور یہ وہ جھوٹ ہے جو اموال وابدان میں اذیت پہنچانے والا ہے اور اس میں حق کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور اسی طرح ان دونوں کا ستانا اور اذیت دینا یہ بھی ہے کہ جب وہ دونوں نافرمانی میں مشغول ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرنے کے اعتبار سے راہ صواب سے نکل جائیں اور قولہ بِکم میں تقدیر عبارت یہ ہے: فسوقٌ حالٌ بکم۔

**مسئلہ نمبر 52** ۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرا وہ اسے سکھا دے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ سمجھ جائے گا جو اس کی طرف القا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ابتداءً فرقان رکھ دے گا یعنی ایسی قوت عطا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکے گا۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال: 29) (اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت۔) واللہ اعلم۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر، پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے۔ اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گنہگار ہے اس کا ضمیر۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں چوبیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ جب اللہ تعالیٰ نے اموال و دیون کی حفاظت کی مصلحت کے لئے لکھوانے اور گواہ بنا لینے کے مستحب ہونے کا ذکر فرمایا، تو اس کے بعد ایسے عذروں کا تذکرہ کیا جو لکھوانے سے مانع ہیں اور ان کی صورت میں رہن (گروی رکھنا) کا حکم بیان فرمایا اور عذر کے احوال میں سے سفر پر نص بیان فرمائی جو سفر تمام عذروں پر غالب ہے، بالخصوص اس وقت میں کثرت غزوات کی وجہ سے اور معنوی طور پر اس میں ہر عذر داخل ہے۔ بسا اوقات سفر کے بغیر حضر میں بھی کاتب کا ملنا متعذر اور مشکل ہو جاتا ہے جیسا کہ لوگوں کی مشغولیت کے اوقات اور رات کا وقت اور یہ بھی کہ مقروض کی ذمہ داری کے فساد کا خوف

ہوتو یہ بھی ایک ایسا عذر ہے جو رہن کے مطالبہ کو ثابت کرتا ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی جس سے آپ نے جو ادھار لینے کا مطالبہ کیا، تو اس نے کہا: بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا مال لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے جھوٹ بولا ہے بلاشبہ میں زمین میں بھی امین ہوں اور آسمان میں بھی امین ہوں اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتا تو میں یقیناً اسے ادا کر دیتا تم میری زرہ اس کے پاس لے جاؤ(1)۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا درآنحالیکہ آپ کی زرہ اس کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور علماء نے کہا ہے: سفر میں گروی رکھنا نص قرآن سے ثابت ہے اور حضر میں گروی رکھنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اور ہم نے حضر میں آیت سے معنوی طور پر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا ہے، کیونکہ کبھی اعذار حضر میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور سوائے حضرت مجاہد، ضحاک اور داؤد کے کسی سے بھی حضر میں اس کا ممنوع ہونا مروی نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ آیت سے استدلال کرتے ہیں اور آیت میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ کلام اگرچہ شرط کے مخرج میں نکلا ہے سو اس سے مراد غالب احوال ہیں۔ اور آیت میں حالت سفر میں رہن کا ہونا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو حالت سفر کے بغیر ممنوع ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ایک معین مدت تک اناج خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی (2)۔ اسے نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور آپ کی زرہ یہودی کے پاس گھر والوں کے لئے تیس صاع جو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا جمہور نے كَاتِبًا پڑھا بمعنی وہ آدمی جو لکھتا ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابی، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو العالیہ رضی اللہ عنہم نے وَلَمْ تَجِدُوْا كِتَابًا پڑھا ہے (4)۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور فرمایا ہے: اس کا معنی ہے پس اگر تم دوران سفر سیاہی نہ پاؤ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كُتَّابًا بھی مروی ہے (5)۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے اور قراءت عامہ اس کے خلاف ہے۔ اور بہت کم ہی کوئی شے قراءت عامہ سے خارج ہوتی ہے مگر اس میں طعن ہوتا ہے اور کلام تو کاتب کے بارے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ لکھے) اور كُتَّابٌ پوری جماعت کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: کتاب اس اعتبار سے حسین ہے کہ ہر مصیبت کے لئے ایک کاتب ہو، پس یہ جمع کے لئے کہا گیا ہے: ولم تجدوا کتابا۔ (اور تم لکھنے والے نہ پاؤ) مہدوی نے ابو العالیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے كُتُبًا پڑھا ہے اور یہ کتاب کی جمع ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً سنن ترمذی، حدیث نمبر 1134، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ روایت بالمعنی

2۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 31، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب البیوع، صفحہ 1926، جلد 1، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 229 4۔ الکشاف، جلد 1، مکتب الاعلام الاسلامی 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386

حیثیت سے کہ نوازل (مصائب) مختلف ہیں۔ اور رہی حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأۃ کُتَّابًا تو نحاس اور مکی نے کہا ہے: یہ کاتب کی جمع ہے جیسے قائم وقیام ہے۔ مکی نے کہا ہے معنی یہ ہے: ''اور اگر دوات، قلم اور قرطاس موجود نہ ہوں اور لکھنے والے کے وجود کی نفی اس آلہ کے معدوم ہونے کے ساتھ ہوتی ہے جو متفق علیہ ہے اور کاتب کی نفی بھی کتاب کی نفی کا تقاضا کرتی ہے، پس دونوں قراءتیں حسین اور اچھی ہیں مگر مصحف کے خط کی جہت سے (1)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ابو عمرو اور ابن کثیر نے فَرُهُنٌ را اور ہا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان دونوں سے ہا کی تخفیف بھی مروی ہے اور طبری نے کہا ہے: ایک قوم نے یہ تاویل کی ہے کہ رُهُن را اور ہا کے ضمہ کے ساتھ رہان کی جمع ہے۔ اور وہ جمع الجمع ہے، اسے زجاج نے فراء سے بیان کیا ہے (2) اور مہدوی نے کہا ہے: فَرِهَانٌ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے اور معنی ہے فرهان مقبوضة يكفى من ذالك (تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس پر قبضہ دے دیا کرو اس میں یہ کافی ہو جائے گا) نحاس نے کہا ہے: عاصم بن ابی النجود نے فَرُهْنٌ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اہل مکہ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں باب رِهَانٌ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بغل وبغال، (خچر) کبش وکباش (مینڈھا) اور رُهُنٌ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ رِهان کی جمع ہو، مثلاً کتاب اور کُتُب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے، جیسا کہ سَقْفٌ اور سُقُفٌ، حَلْقٌ اور حُلُقٌ، فَرْشٌ اور فُرُشٌ، نَشْرٌ اور نُشُرٌ اور ان کے مشابہ دیگر الفاظ۔ اور رُهْنٌ ہا کے سکون کے ساتھ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے، مثلاً سَهْمٌ حَشْرٌ یعنی باریک اور تیز تر۔ اور سِهام حُشْرٌ اور پہلا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ پہلا نعت (صفت) نہیں ہے اور یہ صفت ہے۔

اور ابو علی فارسی نے کہا ہے اور رَهْنٌ کی جمع مکسر جمع قلت کے وزن پر میں نہیں جانتا کہ آئی ہو۔ اور اگر آئے تو اس کا قیاس اَفْعُلٌ ہے جیسے کَلْبٌ اور اَكْلُبٌ ہے۔ گویا کہ وہ قلیل کے سبب کثیر سے مستغنی ہیں، جیسا کہ جمع کثرت کے وزن کے ساتھ جمع قلت کے وزن سے اس قول میں مستغنی ہیں: ثلاثة شُسُوع اور وہ رَسَن اور اَرْسَان میں جمع قلت کے وزن کے ساتھ جمع کثرت سے مستغنی ہیں۔ پس رَهْنٌ دونوں وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے اور وہ دونوں فُعُل اور فِعَال ہیں۔ اخفش نے کہا ہے: فَعْل کی جمع فُعُل کے وزن پر قبیح ہے اور یہ قلیل اور شاذ ہے۔ فرمایا: اور کبھی رهانٌ کی جمع رُهُنٌ آئی ہے، گویا کہ رُهُنٌ کی جمع رِهَان بنائی جاتی ہے اور رِهَانٌ کی جمع رُهُنٌ بنائی جاتی ہے جیسا کہ فراش اور فُرُش ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** رَهْن کا معنی ہے کسی حق کے عوض توثیق اور اعتماد کے لئے کسی خاص چیز کو روک لینا تا کہ اس کے ثمن سے یا اس کے منافع کے ثمن سے وہ حق پورا کر لیا جائے جبکہ اسے مقروض سے لینا متعذر اور مشکل ہو، اسی طرح علماء نے اس کی تعریف بیان کی ہے اور یہ عرب کلام میں بمعنی دوام اور استمرار ہے۔ ابن سیدہ نے کہا ہے: ورهنه اى أدامه یعنی اس نے اسے ہمیشہ رکھا۔ اور یہ رهن بمعنی دام سے ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

الخُبْزُ　والتَّحْمُ　لهم　راهِنٌ　وقَهْوَةٌ　راوُوقها　ساكِبٌ (1)

اس میں راہن ہمیشہ رہنے والا کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: رَهَن الشيئُ رَهناً۔ ای دام۔ یعنی شے ہمیشہ رہی اور أرْهنتُ لهم الطعام و الشراب اور میں نے ان کے لئے طعام وشراب ہمیشہ رکھا، و هو طعام راهن اور الراهن کا معنی الثابت (یعنی ثابت رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا) اور الراهن کا معنی ہے اونٹوں اور لوگوں میں سے کمزور ہونے والا۔

شاعر کا قول ہے:

اما تَرَى جِسْمِيَ خَلًّا قد رَهَن　هَزْلًا وما مَجْدُ الرجالِ في السِّمَنْ

اس میں رہن کمزور کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ رہن جو کہ وثیقہ اور اعتماد کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے وہ الرھن سے ہے۔ أرهنتُ ارهانا (میں نے شے گروی رکھی) اسے ان میں سے بعض نے بیان کیا ہے۔

اور ابوعلی نے کہا ہے: أرهنتُ في المُغَالاة (میں نے مہنگائی میں اضافہ کر دیا) اور رہی قرض اور بیع کی صورت تو اس میں ہے فرهنتُ۔ (2) (پس میں نے قرض اور بیع کے عوض شے گروی رکھی۔)

اور ابوزید نے کہا ہے: أرهنت في السلعة أرهانا (میں نے سامان کی قیمت خوب چڑھا دی) اور یہ مہنگائی کے معنی میں خاص ہے۔

کسی شاعر کا قول ہے:

عِيدِيَّةٌ　أُرْهِنَتْ　فِيها　الدَّنَانِيرُ

عیدیہ میں دنانیر بڑھا دیئے گئے ہیں۔

شاعر اونٹنی کا وصف بیان کر رہا ہے اور العید مہرہ کا ایک قبیلہ ہے اور مہرہ کے اونٹ بڑے عمدہ اور اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں۔

اور زجاج نے کہا ہے: گروی رکھنے کے معنی میں کہا جاتا ہے: رَهَنْتُ اور أرْهنتُ (میں نے گروی رکھی)

ابن اعرابی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ عبد الله بن ہمام السلولی نے کہا ہے:

فلتا　خَشِيتُ　أظَافِيرَهم　نَجَوتُ　و أَرْهَنْتُهُمْ　مالكا (3)

اس میں أرهنتهم گروی رکھنے کے معنی میں ہے۔

ثعلب نے کہا ہے: تمام رواۃ نے أرهنتهم کہا ہے اس بنا پر کہ رَهَنْتُهُ اور أرْهَنْتُهُ دونوں جائز ہیں سوائے اصمعی کے کیونکہ انہوں نے اسے و أرْهَنُهُمْ روایت کیا ہے، اس بنا پر کہ انہوں نے فعل مضارع کا عطف فعل ماضی پر کیا ہے اور اسے ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387　3۔ ایضاً

کے اس قول کے مشابہ قرار دیا ہے: قمتُ و أصُكُّ وجهه اور یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، کیونکہ یہ واؤ حالیہ ہے اور أصك کو پہلے فعل کے لئے حال بنایا گیا ہے اس معنی کی بنا پر قمت صاكا وجهه، یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا درآنحالیکہ وہ ان کے پاس مقیم تھا، کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: أَرْهَنْتُ الشَّيْئَ، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: رهنته (میں نے شے گروی رکھی) اور آپ کہتے ہیں رهنت لسانی بکذا، (میں نے اپنی زبان اتنے کے عوض گروی رکھ دی) اور اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا، أرهنت، اور ابن السکیت نے کہا ہے: اس میں ارهنت بمعنی أسلفت ہے۔ (یعنی میں نے قرض دیا) اور مرتہن وہ ہوتا ہے جو گروی کے طور پر شے لیتا ہے اور وہ شے جو گروی رکھی جائے وہ مرهون اور رهين کہلاتی ہے اور اس کی مؤنث رهينة ہے اور راهنت فلانا على كذا مُراهنة کا معنی ہے میں نے فلاں کو اتنے کی شرط پر خطرے میں ڈال دیا (ای خاطرتُه) اور أرهنت به ولدی ارهانا ای اخطرتهم به خطرا۔ یعنی میں نے اس کے عوض اپنی اولاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ (یعنی شرط پر رکھ دیا) اور الرهينة الرهائن کی واحد ہے۔ یہ تمام جوہری سے منقول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بیع اور قرض کے معاملہ میں بلا اختلاف کہا جائے گا: رهنت رهنا۔ پھر اسی صدر سے اس شے کا نام رکھ دیا گیا ہے جو دی جاتی ہے۔ تو کہتا ہے: رهنت رهنا، جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے رهنت ثوبا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابوعلی نے کہا ہے جب رہن بمعنی ثبوت اور دوام ہے تو اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک رہن باطل ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے مرتہن کے قبضے سے نکل کر راہن کے پاس چلی جائے، کیونکہ وہ اس سے نکل چکی ہے جو اختیار مرتہن کو اس کے بارے دیا گیا تھا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے نزدیک اس بارے میں یہی معتمد علیہ ہے کہ رہن جب راہن کی طرف مرتہن کے اختیار سے لوٹ جائے تو رہن باطل ہو جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ عاریۃً یا ودیعۃً (امانت کے طور پر) لوٹے تو پھر رہن باطل نہ ہوگی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کا راہن کے قبضہ کی طرف لوٹنا مطلق سابقہ حکم کو باطل نہیں کرتا اور ہماری دلیل فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ہے۔ پس جب مرهونہ شئ قابض کے ہاتھ سے نکل جائے تو یہ الفاظ نہ لغۃً اس پر صادق آتے ہیں اور نہ ہی حکماً اس پر صادق آتے ہیں اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جب کوئی قولاً گروی رکھے اور فعلاً اس پر قبضہ نہ کرے تو وہ حکماً ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ

امام شافعی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے صرف اس رہن کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو موصوف بالقبض ہو اور جب صفت نہ پائی جائے تو پھر ضروری ہے کہ حکم بھی نہ پایا جائے (3) اور یہ بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔

اور مالکیہ نے کہا ہے: رہن عقد کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے اور راہن کو رہن دینے پر مجبور کیا جائے گا تا کہ مرتہن اسے خاص کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) (پورا کرو (اپنے) عہدوں کو) اور یہ بھی ایک عقد ہے اور مزید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 387، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 386 3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 260

ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (الاسراء: 34) (وعدہ پورا کرو) اور یہ بھی ایک عہد ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المؤمنون عند شروطهم (1) (مومنین اپنی شروط کے ساتھ ہوتے ہیں) اور یہ بھی ایک شرط ہے۔ پس ہمارے نزدیک قبضہ کمال فائدہ کے لئے شرط ہے اور ان دونوں ائمہ کے نزدیک قبضہ اس کے صحیح ہونے اور لازم ہونے کے لئے شرط ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: مَقْبُوْضَةٌ یہ لفظ مرتہن کی رہن کے ساتھ بینونت اور علیحدگی کا تقاضا کرتا ہے اور لوگوں نے مرتہن کے قبضہ کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے اور اسی طرح اس کے وکیل کے قبضہ پر (بھی اجماع ہے) اور عادل آدمی کے قبضہ کے بارے اختلاف ہے جو رہن کو اس کے ہاتھوں پر رکھے گا۔ پس امام مالک، آپ کے تمام اصحاب اور جمہور علماء نے کہا ہے: عادل کا قبضہ کرنا قبضہ ہے اور ابن ابی لیلیٰ، قتادہ، حکم اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ قبضہ نہیں ہے اور رہن مقبوض نہیں ہوگی مگر تب جب وہ مرتہن کے پاس ہو اور انہوں نے اسے تعبداً دیکھا ہے۔ اور جمہور کا قول معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب وہ عادل کے پاس ہو گیا تو وہ لغۃً اور حقیقۃً مقبوض ہو گیا، کیونکہ عادل آدمی صاحب حق کا نائب ہے اور وہ قائم مقام وکیل کے ہے اور یہ ظاہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اور اگر رہن کو عادل آدمی کے قبضہ میں رکھ دیا جائے اور وہ ضائع ہو جائے تو نہ مرتہن ضامن ہوگا اور نہ وہ جس کے قبضہ میں اسے رکھا گیا، کیونکہ مرتہن کے قبضہ میں تو کوئی شے نہیں آئی جس کا وہ ضامن ہوگا اور جس کے قبضہ میں وہ شے دی گئی ہے وہ امین ہے اور امین ضامن نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَقْبُوْضَةٌ تو ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ لفظ اپنے ظاہر اور مطلق ہونے کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کے (2)۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی گھر کا تیسرا حصہ، اپنے غلام اور تلوار کا نصف حصہ بطور رہن رکھے، پھر انہوں نے کہا ہے: جب دو آدمیوں کا ایک آدمی پر مال (قرض) ہو اور وہ دونوں اس میں شریک ہوں اور وہ آدمی اس کے عوض دونوں کے پاس زمین رہن رکھ دے تو وہ جائز ہے بشرطیکہ دونوں اس پر قبضہ کر لیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ مشترک شے کو رہن رکھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نصف گھر کا مرتہن ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے جیسا کہ اسے بیچنا جائز ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ ہمارے علماء کے نزدیک جو شے ذمہ میں ہو اس کو گروی رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مقبوض ہے بخلاف ان کے جنہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے دو آدمی مل کر کاروبار کریں ان میں سے ایک کا دوسرے کے ذمہ قرض ہو۔ پس اس نے اپنا وہی قرض اس کے پاس رہن رکھ دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہر وہ سامان جس کی بیع کرنا جائز ہے اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے اور اسی علت کی وجہ سے ہم نے اس شے کو رہن رکھنا جائز

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث 3120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 261

قرار دیا ہے جو مرتہن کے ذمہ واجب الادا ہو، کیونکہ اس کی بیع جائز ہے اور اس لئے بھی کہ وہ مال ہے اس کے ساتھ توثیق واقع ہو سکتی ہے تو پھر اس کا رہن ہونا بھی جائز ہے (تو گویا اسے) موجود سامان پر قیاس کیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے اس سے منع کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس پر قبضہ کرنا متحقق نہیں ہوتا اور رہن کے لازم ہونے میں قبضہ کرنا شرط ہے اور اس لئے بھی کہ قرض کی میعاد مکمل ہونے کے وقت اس سے حق پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور حق کا استیفا اس کی مالیت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے عین سے اور دین میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سواری پر اس کے نفقہ کے عوض سوار ہوا جا سکتا ہے جبکہ وہ رہن رکھی ہوئی ہو اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ اس کے نفقہ کے عوض پیا جا سکتا ہے جب مرہونہ ہو اور جو سوار ہوگا اور دودھ پئے گا اسی پر نفقہ ہوگا (1)۔'' اسے ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے اور دونوں جگہوں پر یشاب کی بجائے یحلب (2) (دودھ دوہنا) کا لفظ ذکر کیا ہے۔

خطابی نے کہا ہے: یہ کلام مبہم ہے نفس لفظ میں اس کا بیان نہیں ہے جو سوار ہوگا اور دودھ دوہے گا کیا وہ راہن ہے یا مرتہن ہے یا وہ عادل آدمی ہے جس کے قبضہ میں مرہونہ شے دی گئی؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: دو حدیثوں میں مبین مفسر ذکر آیا ہے اور انہیں کے سبب علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب کوئی جانور گروی رکھا جائے تو اس کا چارہ مرتہن پر ہوگا اور وہ دودھ دوہ کر پی سکتا ہے اور اسی پر اس کا نفقہ ہوگا جو دودھ پئے گا (3)۔''

آپ نے اسے احمد بن علی حدثنا زیاد بن ایوب حدثنا ھشیم حدثنا زکریا عن الشعبی عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اور یہی احمد اور اسحاق کا قول ہے کہ مرتھن بقدر نفقہ مرہونہ جانور کا دودھ دوہ کر اور اس پر سواری کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب راہن اس پر خرچ کرتا ہے تو پھر مرتہن اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا اور اگر راہن اس پر خرچہ نہ کرے اور اسے مرتہن کے قبضہ میں چھوڑ دے اور وہی اس پر خرچہ کرے تو اس کے لئے اس پر سوار ہونا اور غلام سے خدمت لینا جائز ہے۔ اور امام اوزاعی اور لیث نے بھی یہی کہا ہے اور دوسری حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اسماعیل بن عیاش کی حدیث میں سے ہے کہ ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اور اس کے مالک کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 341، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الرہن، جلد 1، صفحہ 2329، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 141، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الاجارہ، جلد 2، صفحہ 3059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 34، حدیث نمبر 135، وزارت تعلیم

لئے اس کے منافع ہیں اور اس پر اس کا تاوان ہے(1)''۔

اور یہی امام شافعی، شعبی اور ابن سیرین کا قول ہے اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہن کے منافع راہن کے لئے ہیں اور اس کا نفقہ بھی اسی پر ہے اور مرتھن رہن سے کسی قسم کی منفعت حاصل نہیں کر سکتا سوائے وثیقہ کی حفاظت کرنے کے۔

خطابی نے کہا ہے: یہی اقوال میں سے اولیٰ اور زیادہ صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گا وہ اپنے اس مالک کے لئے ہوگا جس نے اسے رہن رکھا ہے۔ (اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان (خرچہ) ہے)'' [خطابی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: من صاحبہ، لصاحبہ کے معنی میں ہے۔] عرب لام کی جگہ من استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ان کا قول ہے:

أمِنْ أمِّ أوْفَى دِمْنَةٌ لم تُكَلَّمِ

میں (مفسر) کہتا ہوں: لصاحبہ صراحۃً موجود ہے لہٰذا تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور امام طحاوی نے کہا ہے: یہ اس وقت تھا جبکہ ربا مباح تھا اور منفعت لانے والے قرض سے منع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ایک شے کے بدلے دوسری شے لینے سے منع کیا گیا تھا اگرچہ وہ دونوں غیر متساوی ہوں، پھر اس کے بعد ربا حرام کر دیا گیا۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مرہونہ لونڈی کے ساتھ راہن کے لئے وطی کرنا جائز نہیں اور اسی طرح اس کا اس سے خدمت لینا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ رہن سے کسی بھی اعتبار سے نفع حاصل نہیں کرے گا اور یہی شعبی ہیں جنہوں نے حدیث روایت کی ہے اور اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور ان کے نزدیک وہ جائز نہیں مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ مرہونہ شے کا دودھ اور اس کی پشت راہن کے لئے ہے اور وہ اس سے خالی نہیں ہوگا کہ مرتھن کا اپنے لئے دودھ دوہنا راہن کی اجازت کے ساتھ ہوگا یا اس کی اجازت کے بغیر ہوگا، پس اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''کوئی بھی کسی کے جانور کا دودھ نہ دوہے مگر اس کی اجازت کے ساتھ(2)'' یہ اس کا رد کرتی ہے اور اس کے نسخ کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اجازت کے ساتھ ہو تو پھر مجہول، غرر، اس شے کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو اور اس کی بیع جو ابھی پیدا نہیں کی گئی کی تحریم کے بارے میں مجمع علیہ اصول ہے، چنانچہ یہ بھی اسے رد کر دے گا کیونکہ ایسا ربا کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر مرتھن نے رہن سے نفع اٹھانے کی شرط لگائی تو اس کی دو حالتیں ہیں: اگر وہ قرض کے عوض ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور اگر وہ بیع یا اجارہ کی وجہ سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ وہ مذکور ثمن کے عوض سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا اور

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 80، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب اللقطہ، حدیث نمبر 2255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہن کے منافع مدت معلوم تک ہیں گویا کہ وہ بیع اور اجارہ ہے اور جہاں تک قرض کا تعلق ہے تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جو منفعت کو لایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرض دینے کا مقصود تو یہ ہے کہ وہ باعث قربت ہو اور جب اس میں نفع داخل ہو جائے گا تو وہ جنس میں زیادتی ہو جائے گی اور وہی ربا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ رہن کا ملکیت میں آنا جائز نہیں اور وہ یہ کہ مرتہن شرط لگا لے کہ مرہونہ شے اس کے حق کے عوض ہو جائے گی اگر اس نے مقررہ مدت تک وہ حق ادا نہ کیا اور یہ جاہلیت کے افعال میں سے تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ باطل کر دیا: لا یغلق الرھن (1) رہن ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح ہم نے اسے قاف کو رفع دینے کے ساتھ خبر پر مقید کر دیا ہے، یعنی لیس یغلقُ الرھن۔ آپ کہتے ہیں: أغلقت الباب فھو مُغْلَقٌ۔ (میں نے دروازہ بند کیا پس وہ بند ہو گیا) اور غَلَقَ الرھنُ فی ید مرتھنہ یہ تب کہا جاتا ہے جب اسے اس کے قبضہ سے چھڑایا نہ جا سکے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أجارَتَنا مَنْ یجتمِعْ یَتَفَرّق و مَنْ یكُ رھنا للحوادث یُغْلَقِ

اور زہیر نے کہا ہے:

و فارَقَتْك بِرَھن لا فكاك له یوم الوداع فأمسی الرَّھْنُ قد غَلِقَا (2)

**مسئلہ نمبر 14**۔ دارقطنی نے سفیان بن عیینہ کی حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے زیاد بن سعد سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اسی کے لئے اس کے منافع ہوں گے اور اسی پر اس کا تاوان (اخراجات) ہو گا (3)۔'' زیاد بن سعد ثقہ حفاظ میں سے ایک ہیں اور یہ اسناد حسن ہے۔ اور اسے مالک نے ابن شہاب سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی (4)''۔

ابو عمر نے کہا ہے: اسی طرح اسے روایت کیا ہے ہر اس راوی نے جس نے امام مالک سے المؤطا روایت کی ہے جہاں تک میں جانتا ہوں، مگر معن بن عیسیٰ نے اسے متصل بیان کیا ہے اور معن ثقہ راوی ہے، مگر مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس میں علی بن عبد الحمید غضائری عن مجاھد بن موسیٰ عن معن بن عیسیٰ سے خطا ہوئی ہے۔ اور اس میں ابو عبد اللہ عمروس نے ابہری سے اپنی اسناد کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: له غنمه و علیه غرمه (5) اور راویوں نے ان الفاظ کے رفع میں اختلاف کیا ہے۔ سو ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہما نے انہیں مرفوع قرار دیا ہے اور اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یونس نے کہا ابن شہاب نے بیان کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: رہن اسی کے لئے ہے جس نے اسے رہن رکھا ہے، اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا خرچہ ہے۔

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528 2۔ ایضاً 3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33
4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 637 5۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

اور ابن شہاب نے خبر دی ہے کہ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے (1)، مگر معمر نے اسے ابن شہاب سے مرفوع ذکر کیا ہے اور معمر ابن شہاب سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر مضبوط اور ثقہ ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے پر یحییٰ بن ابی انیسہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور یحییٰ قوی راوی نہیں ہے۔ دراصل اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل منقول ہے اگرچہ کثیر جہتوں سے یہ متصل بھی ہے لیکن وہ اسے معلل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ حدیث ہے جسے ان میں سے کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اگرچہ اس کی تاویل اور اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اور اسے دار قطنی نے بھی اسماعیل بن عیاش عن ابن ابی ذئب عن الزهری عن سعید عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ کی سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسماعیل نے ابن ابی ذئب سے اس کا سماع نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اسے عباد بن کثیر عن ابن ابی ذئب سے سنا ہے اور عباد ان کے نزدیک ضعیف ہے، قابل حجت نہیں ہے اور اسماعیل بھی ان کے نزدیک حدیث میں غیر مقبول ہے جب وہ اپنے شہر والوں کے علاوہ کسی اور سے حدیث بیان کرے۔ اور جب وہ شامیوں سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث صحیح ہوتی ہے اور جب وہ اہل مدینہ وغیرہم سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث میں بہت زیادہ خطا اور اضطراب ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ رہن کی نمو اور بڑھوتری اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے اگر وہ ایسی ہو جسے الگ نہ کیا جا سکتا ہو جیسا کہ اس کا موٹا تازہ ہونا یا وہ نسل ہو جیسا کہ ولادت اور جنین اور وہ جو اس معنی میں ہو جیسا کہ کھجور کے پودوں کو ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگانا اور جو ان کے سوا ہو مثلاً غلہ، پھل، دودھ اور اون وغیرہ یہ اس میں داخل نہ ہوں گے مگر یہ کہ وہ (مرتہن) اس کی شرط لگا لے۔ اور ان دونوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اولاد زکوٰۃ میں ماؤں کے تابع ہوتی ہے اور اون، دودھ اور درختوں کا پھل اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ یہ زکوٰۃ میں اصل کے تابع نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی صورت میں ہیں اور نہ اس کے معنی میں اور نہ یہ اس کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ پس ان کا اپنا حکم ہے ان کے لئے اصل کا حکم نہیں ہے بخلاف بچے اور جنین کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اور اس آدمی کا رہن رکھنا جائز ہے جس کے مال کو قرض محیط ہو جب تک کہ وہ اسے مفلس قرار نہ دے اور مرتہن قرض خواہوں کی نسبت رہن کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ امام مالک اور لوگوں کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور امام مالک سے اس کے خلاف بھی مروی ہے..... اور عبد العزیز بن ابی سلمہ نے یہ کہا ہے کہ قرض خواہ مرتہن کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ وہ جس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو اس کے تصرفات بیع و شراء میں سے تمام احوال میں صحیح ہوتے ہیں اور قرض خواہوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ وہ خرید و فروخت کرے اور (قرض) ادا کرے۔ اس باب میں امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے اور رہن بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا الآیہ یہ شرط ہے اور اس کے ساتھ اس کی وصیت کو مربوط کیا

---

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

گیا ہے جس پر ادا کرنے اور ٹال مٹول ترک کرنے کا حق ہے، یعنی اگر وہ جس پر حق ہے صاحب حق کے نزدیک امین اور ثقہ ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت اسے ادا کردے۔ اور قولہ فَلْيُؤَدِّ یہ الاداسے ماخوذ ہے اور مہموز ہے۔ (اور یہی جواب شرط ہے) اور ہمزہ کی تخفیف بھی جائز ہے۔ اور ہمزہ کو واؤ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اور اسے الف سے نہیں بدلا گیا اور نہ ہی بین بین بنایا گیا ہے، کیونکہ الف کا ماقبل صرف مفتوح ہوسکتا ہے اور یہ امر وجوب کے معنی میں ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی واجب ہونے پر اجماع ہے اور اس بارے میں حاکم کے حکم کے ثبوت پر اور اس کے مقروضوں کو اس پر جبر کرنے پر اجماع ہے اور مزید قرینہ غیر کا مال حرام ہونے میں صحاح کی احادیث ہیں۔(1)

**مسئلہ نمبر 18**۔ قولہ تعالیٰ: اَمَانَتَهٗ الأمانة مصدر ہے اور اس کے ساتھ اس شے کا نام رکھا گیا ہے جو کسی کے ذمہ میں ہو۔ اور اس کی اضافت اس کی طرف ہے جس پر قرض ہے۔ اس حیثیت سے اس کی اس کی طرف ایک نسبت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء:5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال۔)

**مسئلہ نمبر 19**۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اور قولہ: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یہ قول باری تعالیٰ: ولا یضار ر عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ کی تفسیر ہے اور شاہد کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ شہادت چھپانے کے ساتھ ضرر پہنچائے اور یہ نہی متعدد قرائن کے ساتھ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان میں سے ایک وعید ہے اور نہی کا محل وہاں ہے جہاں شاہد کو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: شاہد پر شہادت دینا لازم ہے جہاں اسے شہادت دینے کے لئے کہا جائے اور وہاں وہ خبر دے جہاں اس سے خبر کا مطالبہ کیا جائے، فرمایا: اور تو یہ نہ کہہ اخبربها عند الامیر (میں اس کے بارے امیر کے پاس خبر دوں گا) بلکہ (یہ کہہ) اخبرہ بها (میں اسے اس کے بارے خبر دوں گا) شاید وہ رجوع کرلے اور واپس لوٹ آئے۔)

ابوعبدالرحمٰن نے ولا یکتموا یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نہی للغائب بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ جب حق پر گواہ موجود ہوں تو ان پر اس کی ادائیگی کفایۃً متعین ہے پس اگر دو اسے ادا کردیں اور حاکم انہیں دو پر اکتفا کرلے تو باقیوں سے فرض ساقط ہوجائے گا اور اگر وہ اس کے ساتھ اکتفا نہ کرے تو اسے جاری رکھنا متعین ہے، یہاں تک کہ اثبات واقع ہوجائے۔ اور یہ صاحب حق کی دعوت کے ساتھ معلوم ہوسکتا ہے پس جب وہ اس کو کہے: تو میرا حق زندہ (ثابت) کردے اس شہادت کو ادا کرکے جو میرے لئے تیرے پاس ہے تو وہ اس پر متعین ہوگیا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ اس میں دل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ چھپانا اس کے افعال میں سے ہے اور کیونکہ وہ ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جس کی اصلاح سے سارے کا سارا بدن اصلاح پالیتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے(2)۔ پس یہاں کل بدن کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (اور یہ اول سورۃ) میں گزر چکا ہے۔ اور الکیا نے کہا ہے: جب اس نے اس کا قصد کیا کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا اور شہادت کی ادائیگی زبان سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6891، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ 2۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 13، وزارت تعلیم

ترک کر دی تو گناہ اکٹھا دونوں وجہوں کی طرف راجع ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اٰثِمٌ قَلْبُهٗ یہ مجاز ہے اور یہ حقیقۃً وعید پر دلالت کو پختہ کرنے والا ہے اور یہ معانی کے اعتبار سے بیان کی عمدگی اور اعراب کی لطافت میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: دل کا گناہ اسے مسخ کرنے کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ جب دل کو مسخ کر دیتا ہے تو وہ اسے منافق بنا دیتا ہے اور اس پر مہر لگا دیتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

(اور اس کا بیان سورت کی ابتدا میں آچکا ہے) اور قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ کی وجہ سے مرفوع ہے اور اٰثِمٌ، اِنَّ کی خبر ہے اور اگر چاہے تو آثم کو مبتدا ہونے کے سبب رفع دے لے اور قَلْبُهٗ فاعل سَدَّ مسد الخبر بن جائے گا اور پھر جملہ اِنَّ کی خبر ہو گا۔ اور اگر چاہے تو آثم کو رفع دے اس بنا پر کہ یہ مبتدا مؤخر کی خبر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ سے بدل بعض من الکل ہو۔ اور اگر چاہے تو اسے آثم کی ضمیر سے بدل بنا لے۔

چوبیس مسائل کی تکمیل اور تتمہ کے طور پر میں نے یہاں تین مسائل بیان کئے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت اور کتابت کا جو حکم فرمایا ہے یہ دونوں فریقوں کی اصلاح اور منافع کے لئے ہے اور ایسے فساد اور تنازع کی نفی کے لئے ہے جو دونوں کو باہمی فساد اور خرابی تک پہنچانے والا ہے، تا کہ شیطان اسے حق کا انکار کرنے اور شریعت نے اس کے لئے جو حد مقرر کی ہے اس سے تجاوز کرنے یا مقدار مستحق پر اقتصار کو ترک کرنے پر نہ اکسائے اور اسی وجہ سے شریعت نے ان مجہول چیزوں کی بیع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جن میں عادت اور رواج یہ ہو کہ وہ فریقین کو فساد اور اختلاف تک پہنچا دیتی ہوں اور وہ باہمی کینہ اور ایک دوسرے سے جدائی واقع کرنے والی ہوں۔ اور انہی میں سے وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ حرام قرار دیا ہے جوا اور شراب نوشی وغیرہ: اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ الآیہ (المائدہ: 91) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ)

پس جس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و زواجر کے بارے میں اس کے ادب سکھانے کے ساتھ ادب سیکھ لیا اس نے دین اور دنیا کے منافع جمع کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ الآیہ۔ (النسا: 66) (اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔)

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ سے لئے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا (یعنی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے گا) اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ سے لئے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا (1)''۔ اور نسائی نے حضرت میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قرض لیا، تو انہیں کہا گیا: اے ام المومنین! آپ قرض لے رہی ہیں اور آپ کے پاس اسے ادا کرنے کے وسائل نہیں ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 321۔ ایضاً، حدیث نمبر 2212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”جس نے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی معاونت فرمائے گا(1)۔“ اور طحاوی، ابوجعفر طبری اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم نفسوں کو ان کے امن کے بعد خوفزدہ نہ کرو۔“ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ وہ کیا ہے؟ فرمایا: ”وہ قرض ہے(2)“ اور بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے دعا میں اس طرح ذکر کیا: اللھم انی اعوذ بك من الھم والحزن والعجز والکسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبۃ الرجال (3) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم اور حزن سے، عجز اور سستی، غفلت سے، بزدلی اور بخل سے، قرضے کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے۔) علماء نے کہا ہے: ضَلَعِ الدَّین سے مراد یہ ہے کہ مقروض ایسے وسائل نہ پائے کہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اور یہ عربوں کے اس قول سے بنایا گیا ہے: حِمل مُضلِع یعنی بہت بھاری اور ثقیل بوجھ اور دابۃ مُضلِع یعنی ایسا جانور جو بوجھ اٹھانے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ صاحب العین نے یہی کہا ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: الدَّینُ شین الدِّین (4) (قرض دین کے لئے عیب ہے۔) اور آپ سے ہی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الدَّینُ ھَمٌّ باللیل و مَذَلَّۃٌ بِالنَّھَارِ (5) (قرض رات کا غم ہے اور دن کی ذلت ہے۔) ہمارے علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ عیب اور ذلت ہے کیونکہ اس میں دل و دماغ مشغول رہتے ہیں اور ادائیگی کا غم اور فکر لازم رہتا ہے۔ اور مقروض کے لئے ملاقات کے وقت ذلت اور پستی کا سامنا ہوتا ہے اور اسے اپنے وقت تک مؤخر کر کے اس کا احسان برداشت کرنا ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنی طرف سے اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف کرتا ہے یا مقروض اس کے سبب سے گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا وہ اس کے لئے قسم کھاتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ وغیر ذالك۔ اسی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گناہ اور قرض سے پناہ مانگتے تھے۔

اور المغرم سے مراد قرض ہے۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ کیونکر آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک آدمی جب قرض ادا کرتا ہے تو وہ گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے اور اس کا خلاف کرتا ہے(6)۔“ اور یہ بھی کہ بسا اوقات وہ مر جاتا ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر چکا ہوتا۔ پس وہ اس کے عوض گروی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ مومن کی روح اپنی قبر میں اس کے قرض کے عوض گروی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے اسے ادا کر دیا جائے(7)۔“ اور یہ تمام کے تمام اسباب دین میں عیب ہی ہیں۔ ان سے دین کا حسن و جمال ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کمال کم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 232 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 146
3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 942۔ ایضاً، حدیث نمبر 5005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 231 5۔ ایضاً 6۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 322
7۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176، ایضاً، حدیث 2403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھنے، گواہ بنانے اور کوئی شے بطور گروی لینے کا حکم ارشاد فرمایا تو یہ اموال کی حفاظت اور انہیں بڑھانے کا لحاظ رکھنے پر نص قطعی ہے۔ اور یہ جاہل متصوفہ اور ان کی رعایت کرنے والے وہ لوگ جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے ان کا رد ہے کہ وہ اپنے تمام اموال سے فارغ ہو جاتے ہیں (یعنی وہ غربا و مساکین وغیرہ کو دے دیتے ہیں) اور وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی کفایت اور حاجت کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتے، پھر جب وہ محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے فقیر ہوتے ہیں تو پھر یا تو وہ بھائیوں کے احسانات یا ان کے صدقات کا طالب ہوتا ہے یا پھر وہ دنیا داروں اور ان میں سے ظلم کرنے والوں سے کچھ لیتا ہے اور یہ فعل مذموم اور ممنوع ہے۔

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: مجھے ان زہد و ورع اختیار کرنے والوں سے زیادہ تعجب نہیں جنہوں نے اپنی کم علمی کے سبب ایسا کیا، بلکہ زیادہ تعجب ان اقوام کے بارے ہے جو صاحب علم وعقل ہیں انہوں نے اس پر کیسے برانگیختہ کیا۔ اور انہوں نے اس کے بارے حکم دیا باوجود اس کے کہ شرع اور عقل اس کے خلاف ہیں۔ پس محاسبی نے اس بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے اور ابو حامد طوسی نے اسے پختہ اور مضبوط کیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور میرے نزدیک حارث ابو حامد کی نسبت زیادہ معذور ہے، کیونکہ ابو حامد زیادہ فقیہ ہے مگر ان کے تصوف میں داخل ہونے نے ان پر ان کی مدد ونصرت لازم کر دی جو اس میں پہلے داخل ہو چکے ہیں۔

محاسبی نے اپنے طویل کلام میں کہا ہے: تحقیق مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: بلاشبہ ہم عبدالرحمٰن پر اس مال کے بارے میں خوف کھا رہے ہیں جو انہوں نے چھوڑا، تو حضرت کعب نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پر خوف کھا رہے ہو؟ انہوں نے پاکیزہ مال کمایا، پاکیزہ اور طیب مال خرچ کیا اور حلال وطیب مال چھوڑا۔ پس یہ خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو وہ حضرت کعب کو تلاش کرنے کے ارادہ سے غصے کی حالت میں نکلے اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی کے پاس سے گزرے تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور پھر حضرت کعب کی تلاش میں نکل پڑے، تو حضرت کعب کو بتایا گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں تو وہ بھاگتے ہوئے نکل گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے ان سے مدد لینے لگے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت کعب کی تلاش میں نشانات کی اتباع کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دار پر آ کر رک گئے، جب اندر داخل ہوئے تو حضرت کعب اٹھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے یہودیہ کے بیٹے! تو یہ گمان رکھتا ہے کہ جو کچھ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے چھوڑا ہے اس کے بارے کوئی حرج نہیں ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''کثیر مال و دولت والے ہی قیامت کے دن قلیل مال و دولت والے ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے اس اس طرح خرچ کیا(1) (یعنی نیکی اور صدقہ میں وافر مال خرچ کیا)۔ محاسبی نے کہا ہے: پس یہ عبدالرحمٰن اپنی فضیلت کے باوجود قیامت کے دن

1۔ مسند احمد حنبل، جلد 5، صفحہ 152۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاستقراض و اداء الدیون والحجر والتفلیس، حدیث نمبر 2213

میدان حشر میں روک لئے جائیں گے اس حلال مال کے سبب جو انہوں نے پاکدامنی اور نیکی کرنے کے لئے کمایا اور انہیں فقراء کے ساتھ جنت کی طرف دوڑ کر جانے سے روک دیا جائے گا اور وہ ان کے نشانات پر گھسٹنے لگیں گے، علاوہ ازیں بھی انہوں نے کلام کیا ہے (☆)۔

ابو حامد نے اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث ثعلبہ کے ساتھ اسے پختہ اور قوی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اسے مال عطا کیا گیا تو اس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو حامد نے کہا ہے: جس نے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے احوال اور ان کے اقوال میں گہری غور و فکر کی ہے تو اسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مال کا نہ ہونا اس کے وجود سے افضل ہے۔ اگرچہ وہ صدقہ و خیرات میں خرچ ہو، کیونکہ وہ کم سے کم شے جو اس میں حاصل ہوتی ہے وہ مال کی اصلاح کے لئے ہمت و کوشش ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول رکھتی ہے۔ پس مرید کو چاہئے کہ وہ اپنا مال نکال دے یہاں تک کہ بقدر ضرورت کے سوا کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ رہے۔ پس جو ایک درہم بھی اس کے پاس باقی ہوگا اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے حجاب اور پردہ بن جائے گا۔

علامہ جوزی نے کہا ہے: یہ سب کا سب خلاف شرع اور خلاف عقل ہے اور کوتاہ فہمی ہے اس میں جو مال سے مراد لیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف عطا فرمایا ہے، اس کی قدر و مرتبہ کو عظمت عطا فرمائی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ اسے آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنایا گیا ہے اور وہ شے جو شریف آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنائی گئی ہے تو وہ یقیناً شریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (النساء: 5) اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے لئے) سہارا۔) اور اللہ تعالیٰ نے مال احمق اور بے وقوف انسان کے حوالے کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء: 6) (پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا: بے شک تیرا اپنے ورثاء کو غنی اور دولتمند چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حالت میں چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں (1)‘‘۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما نفعنی مال کمال ابی بکر (2) (مجھے کسی مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ’’صالح آدمی کے لئے صالح اور پاکیزہ مال نعمت ہے (3)‘‘۔ اور آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے آخر میں یہ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 943

2۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، جلد 1، صفحہ 10۔ ترمذی شریف، حدیث 3594، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 197

☆ یہ محاسبی کی رائے ہو سکتی ہے ورنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ (1) (اے اللہ! اس کے مال واولاد میں کثرت فرما اور اس کے لئے اس میں برکت عطا فرما۔) اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بلاشبہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اپنا سارا مال صدقہ کر دوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے لئے کچھ مال روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے (2)''۔

علامہ جوزی نے کہا: یہ احادیث کتب صحاح میں نقل کی گئی ہیں اور یہ اس عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہیں جو متصوفہ رکھتے ہیں کہ مال کی کثرت حجاب اور سزا ہے اور یہ کہ اسے محفوظ رکھنا توکل کے منافی ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے فتنہ اور آزمائش سے ڈرا جاتا ہے اور بلاشبہ خلق کثیر نے اس کے خوف کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اور یہ کہ اسے جمع کرنا من وجہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ کہ دل بہت کم فتنوں سے سلامت اور محفوظ رہتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے دل کا ذکر آخرت میں مشغول ہونا نایاب ہو جاتا ہے سو اسی وجہ سے اس کے فتنہ سے ڈرایا گیا ہے۔

اور جہاں تک مال کمانے کا تعلق ہے تو اگر کوئی صرف گزر اوقات کے لئے حلال کمانے پر اکتفا کرلے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور رہا وہ جس نے مال جمع کرنے اور حلال مال کثرت سے طلب کرنے کا قصد کیا تو اس کے مقصود اور مدعیٰ میں دیکھا جائے گا۔ پس اگر اس نے فخر ومباہات کا قصد کیا تو یہ مقصود بہت برا ہے اور اگر اس نے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی پاکدامنی کا قصد کیا اور اس نے حوادثات زمانہ کے لئے مال ذخیرہ کیا اور اس نے بھائیوں کی خوشحالی، فقراء کو غنی بنانے اور نیکی کے کام کرنے کا قصد کیا تو اسے اس ارادہ پر ثواب واجر عطا کیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ مال جمع کرنا کثیر طاعات و ریاضات سے افضل ہے اور صحابہ کرام میں سے کثیر مخلوق کی نیتیں مال جمع کرنے میں سلیم اور حسین تھیں کیونکہ مال جمع کرنے سے ان کے مقاصد حسین تھے، پس وہ اس کے حریص ہوئے اور انہوں نے اس میں زیادتی اور کثرت کی دعائیں کیں۔ اور جب ایک مضبوط آدمی کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیز رفتار گھڑ دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے اپنا کوڑا پھینک دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسے اتنی (جگہ) دے دو جہاں اس کا کوڑا پہنچا ہے (3)''۔

اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے وسعت وخوشحالی عطا فرما، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (یوسف: 65) (اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ) اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (القصص: 27) (پھر اگر تم پورے کرد دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی) اور حضرت ایوب علیہ السلام کو جب صحت عطا فرما دی گئی تو ان پر سونے کی مکڑیوں کا بہت بڑا گلہ اڑایا گیا تو آپ پکڑ کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے اور ان میں کثرت وزیادتی کی طلب کرنے لگے تو آپ کو کہا گیا: کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 298۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 362۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ البراۃ، حدیث نمبر 4308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 156۔ ابی داؤد، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2670، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ سیر نہیں ہوئے ہیں؟ تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! کیا فقیر بھی تیرے فضل سے سیر ہوسکتا ہے؟ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انحصار طبائع اور مزاجوں پر ہے۔

اور جہاں تک محاسبی کے کلام کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے وہ علم سے نابلد ہونے پر دلالت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت کعب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے وہ محال ہے۔ وہ جہال کی وضع کردہ ہے۔ اور متصوفہ کے ساتھ ان کے ملنے کی وجہ سے حدیث کی عدم صحت ان پر مخفی رہی ہے اور بعض نے اس کے بارے روایت کیا ہے کہ اگرچہ اس کی سند ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ مطعون راوی ہے۔

یحییٰ نے کہا ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا اور تاریخ میں صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال ۲۵ھ میں ہوا۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا۔ تحقیق وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد بھی سات برس تک زندہ رہے۔ پھر وہ لفظ جو انہوں نے اپنی حدیث میں ذکر کئے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی حدیث موضوع ہے، پھر صحابہ کرام یہ کیسے کہہ سکتے ہیں: ہم عبدالرحمٰن پر خوف کھا رہے ہیں! کیا حلال مال جمع کرنے کی اباحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے پھر اباحت کے ساتھ خوف کی کیا وجہ ہے؟ کیا شریعت ایک شے کے بارے میں اجازت دیتی ہے پھر اسی پر سزا دیتی ہے؟ یہ فہم وادراک کی قلت کی وجہ سے ہے، پھر کیا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرسکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایسی چیزوں کے سبب بہتر اور افضل ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں ہوسکتے؟ پھر ان کا اکیلے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق ہونا اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت صحابہ کو آزمایا اور اس کا تجربہ کیا ہی نہیں، کیونکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تین سو بہار چھوڑے تھے اور ہر بہار میں تین قنطار تھے! اور البہار کا معنی بوجھ ہے۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مال دو لاکھ پچاس ہزار تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نوے ہزار ترکے میں چھوڑے۔ اور اکثر صحابہ کرام نے مال کمایا اور اسے پیچھے چھوڑا اور ان میں سے کسی نے بھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور رہا یہ قول: ان عبدالرحمٰن یحبو حبوا یوم القیامۃ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے حدیث کو پہچانا اور سمجھا ہی نہیں۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ عبدالرحمٰن قیامت کے دن گھسٹ کر چلیں، کیا آپ انہیں جانتے نہیں ہیں جو (اسلام قبول کرنے میں) سبقت لے جانے والے ہیں اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور آپ اہل بدر میں سے ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں تو کیا آپ گھسٹ کر چلیں گے؟ پھر حدیث عمارہ ابن زاذان روایت کرتے ہیں اور امام بخاری نے کہا ہے: بسا اوقات ان کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے: یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے اور ابوحاتم رازی نے کہا ہے: یہ قابل حجت نہیں ہے اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے۔ اور آپ کا یہ قول: ترك المال الحلال افضل من جمعه (مال حلال کو چھوڑ دینا اسے جمع کرنے سے افضل ہے) اس طرح نہیں ہے اور جب نیت وقصد صحیح ہو تو بلا اختلاف علماء کے نزدیک اسے جمع کرنا افضل ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو مال طلب نہیں کرتا وہ اس کے ساتھ اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ مر جائے تو وہ اسے اپنے بعد والوں کے لئے بطور میراث چھوڑ دے اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار پیچھے چھوڑے اور حضرت سفیان ثوری نے دو سو دینار پیچھے چھوڑے اور وہ کہتے تھے: المال فی ھذا الزمان سلاح اس زمانے میں مال ہتھیار ہے اور اسلاف ہمیشہ مال کی تعریف کرتے رہے اور حوادثات زمانہ اور فقراء کی امداد کے لئے اسے جمع کرتے رہے، البتہ ان میں سے ایک گروہ نے عبادات میں مشغول ہونے اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہوئے مال سے پرہیز کی ہے۔ پس انہوں نے تھوڑے مال پر ہی قناعت کی۔ پس اگر قائل یہ کہے: بے شک مال کو کم کرنا قرب امر کے لئے اولیٰ ہے لیکن وہ مرتبہ اثم کو اس کے ساتھ تنگ کرنے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اموال کی حفاظت اور ان کا لحاظ رکھنے پر جو روایات دلالت کرتی ہیں ان میں سے گھٹیا مال اور اعلیٰ مال کے لئے قتال کو مباح قرار دینا بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون مالہ فھو شھید (1) (جو اپنے حقیر اور گھٹیا مال (کی حفاظت) میں قتل کر دیا گیا تو وہ شہید ہے) اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ لوگوں کا اس ارشاد باری تعالیٰ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

(ا) کہ یہ ارشاد منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حضرت شعبی، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین، حضرت محمد بن کعب، حضرت موسیٰ بن عبیدہ رحمۃ اللہ علیہم اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور یہ کہ یہ تکلیف اور پابندی ایک سال تک باقی رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ کشادگی اور وسعت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اور یہ حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہم کا قول ہے)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا: ان میں سے کوئی شے ان کے دلوں میں داخل ہو (یا) شے میں سے کوئی ان کے دلوں میں داخل نہ ہو، تو حضور نبی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 170۔ صحیح بخاری، باب من قاتل دون مالہ، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کہو ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم نے تسلیم کر لیا۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (فرمایا: ''میں نے کر دیا'')(1) اور ایک روایت میں ہے۔ پس جب انہوں نے ایسا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

(۲) حضرت ابن عباس، حضرت عکرمہ، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم نے فرمایا: یہ آیت محکم مخصوص ہے اور یہ اس شہادت کے معنی میں ہے جسے چھپانے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس آیت میں بتایا کہ شہادت کو چھپانے والا اسے چھپانے والا ہے جو اس کے دل میں ہے اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ آیت اس شک و یقین کے بارے ہے جو نفوس پر طاری ہوتے ہیں، حضرت مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔(2)

(۴) یہ آیت محکم ہے اور عام ہے منسوخ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ان اعمال پر بھی حساب لے گا جو انہوں نے کئے اور ان پر بھی جو انہوں نے کئے تو نہیں مگر ان کے دلوں میں ثابت اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے انہیں مخفی رکھا اور ان کی نیت اور ارادہ کر لیا۔ پس اللہ تعالیٰ مومنوں کی مغفرت فرما دے گا اور اس کے ساتھ اہل کفر و نفاق کو پکڑ لے گا(3)، علامہ طبری نے ایک قوم سے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (اس میں) وہ داخل کیا ہے جو اس سے مشابہ ہے۔

علی بن ابی طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، لیکن جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع فرمائے گا تو ارشاد فرمائے گا: ''میں تمہیں اس کے بارے بتاتا ہوں جو تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو۔'' پس مومن کو اللہ تعالیٰ اس کے بارے بتائے گا اور پھر ان کی مغفرت فرما دے گا۔ اور رہے شک کرنے والے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے انہیں بتائے گا جس تکذیب وغیرہ کو انہوں نے چھپائے رکھا تھا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ:225) یعنی شک اور نفاق میں سے جو تمہارے دلوں نے کمایا اس پر تمہارا مواخذہ کیا جائے گا(4)۔

اور حضرت ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے بارے آگاہ فرمائے گا جسے وہ چھپاتا تھا تاکہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ اور حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں مخفی رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا اور چھپی ہوئی باتیں باہر نکل آئیں گی۔ میرے لکھنے والے فرشتوں نے نہیں لکھے مگر تمہارے وہی

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 173
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 174

اعمال جو ظاہر ہوئے اور میں ان پر بھی مطلع ہوں جن پر وہ مطلع نہیں ہوئے، نہ انہوں نے ان کی خبر دی اور نہ ہی انہیں لکھا۔ پس میں ان کے بارے تمہیں خبر دوں گا اور ان پر تمہارا محاسبہ بھی کروں گا اور پھر جسے میں چاہوں گا اسے بخش دوں گا اور جسے چاہوں گا اسے عذاب دوں گا (1)۔'' پس وہ مومنوں کو بخش دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا'' اس باب میں یہ اصح روایت ہے۔ اور اسی پر حدیث نجویٰ بھی دلالت کرتی ہے جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ (نہیں کہا جائے گا) تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے'' بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان چیزوں کو معاف فرما دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں گی جب تک کہ وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا ان کے مطابق عمل نہ کریں (2)۔'' چنانچہ ہم کہتے ہیں: یہ ارشاد احکام دنیا پر محمول ہے۔ مثلاً طلاق، عتاق اور وہ بیع جس کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کلام نہ ہو اور جو آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بندے کا اس پر مواخذہ ہو گا وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آخرت میں ہو گا۔

حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے (3)۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور دوسروں نے اس معنی کی طرح بیان کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے، مگر انہوں نے یہ کہا ہے: بے شک وہ عذاب جو اس کی جزا ہوتا ہے جو دلوں میں کھٹکے اور اس کے بارے فقط غور و فکر ہو وہ دنیوی مصائب و آلام اور دنیا کی تمام تکالیف کے ساتھ ہے پھر اسی معنی کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی (پانچواں قول ہے) اور علامہ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ** اس کا معنی ہے ان چیزوں میں سے جو تمہاری وسعت اور تمہارے کسب کے تحت ہیں۔ اور یہ ان چیزوں کے ساتھ ہیں جن کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور جن کے بارے فکر کی جاتی ہے۔ پس جب لفظ ایسے ہیں جن میں دلوں میں کھٹکنے والی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں تو صحابہ کرام اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوفزدہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دوسری آیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی جس کا اس نے ارادہ کیا اور اسے خاص کر دیا اور اس کے حکم پر نص بیان فرما دی کہ وہ کسی نفس کو مکلف نہیں بنائے گا مگر (اس کا) جو اس کی وسعت میں ہو گا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا دفاع وسعت میں ہے، بلکہ وہ امر غالب ہے اور وہ ان امور میں سے نہیں ہے جو کمائے جاتے ہیں۔ پس اس بیان اور وضاحت سے مقصود ان کے لئے کشادگی پیدا کرنا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرنا ہے۔ اور باقی آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور جس سے نسخ کا حکم دور کیا جا سکتا ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خبر کے انداز میں ہے اور اخبار میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی نسخ کا قول کرے تو وہ اس حکم پر مترتب ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو اس وقت لاحق ہوا جب وہ اس آیت سے گھبرائے اور اس کی دلیل ان کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **قولوا سمعنا و اطعنا** اس سے یہ حکم ثابت ہو رہا ہے کہ وہ اس ارشاد پر ثابت

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 174
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

قدم ہو جائیں اور اسے لازم پکڑ لیں اور بخشش و غفران کے بارے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا انتظار کریں۔ پس جب یہ حکم پختہ کر دیا گیا تو پھر اس میں نسخ کا واقعہ ہونا صحیح ہے۔ اور اس وقت آیت اس قول باری تعالیٰ کے مشابہ ہو گی: اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ (الانفال: 65) پس یہ الفاظ بھی الفاظ خبر ہی ہیں لیکن اس کا معنی ہے: التزموا ھذا و اثبتوا علیہ و اصبروا بحسبہ، تم اسے لازم پکڑ لو اور اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اس کے مطابق صبر کرو۔ پھر اس کے بعد اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس بارے میں جو میں جانتا ہوں اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے اور یہ منسوخ ہے دو سو کے مقابلے میں ایک سو کے صبر کرنے (والے حکم) کے ساتھ۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: سورۃ البقرہ میں یہ آیت اس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں اضمار اور تقیید ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یحاسبکم بہ اللہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا اگر اس نے چاہا۔ اور اس بنا پر کوئی نسخ نہیں ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں جو احسن قول کیا گیا ہے اور وہ ظاہر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، پھر نجوی کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث (اس میں) داخل کر دی گئی ہے جسے بخاری، مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کو قیامت کے دن اپنے رب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ رب کریم اپنا دست قدرت اس پر رکھ دے گا اور وہ اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا کیا تو (اپنے ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ تو وہ مومن عرض کرے گا اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں۔ رب کریم فرمائے گا: کیونکہ میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور بلاشبہ آج کے دن بھی میں تیرے لئے انہیں بخش دوں گا اور پھر نیکیوں کا نامہ عمل اسے عطا فرما دے گا اور رہے کفار اور منافقین! تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا (2)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مومنین میں سے ان کے بارے نازل ہوئی ہے جو کافروں کو ولی مقرر کرتے تھے۔ یعنی اے مومنین! کفار کی ولایت کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کا اعلان کرو یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا۔ واقدی اور مقاتل نے یہ کہا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے جو کہ آل عمران میں ہے استدلال کیا ہے۔ قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ یَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ یعنی کفار کی ولایت میں سے جو تمہارے سینوں میں ہے اگر تم اسے چھپاؤ یا تم اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس پر اس کا ماقبل قول دلالت کرتا ہے: لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (آل عمران: 28) (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں اس میں (حقیقت سے) بعد اور دوری ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس کا تقاضا نہیں کرتا اور جو سورۂ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360۔ صحیح بخاری، باب ستر المومن علی نفسہ، حدیث نمبر 5609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آل عمران میں ہے وہ بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس آیت کے ساتھ اپنی قوم کے پاس تشریف لاتے تھے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے فیغفر اور ویعذب کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف جواب شرط پر کیا گیا ہے اور ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں رفع کے ساتھ قطعی طور پر پڑھا ہے۔ یعنی فھو یغفرُ و یعذبُ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اعرج، ابو العالیہ اور عاصم جحدری سے دونوں میں نصب کے ساتھ مروی ہے اس بنا پر کہ ان سے پہلے اَنْ مضمر ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا عطف معنی پر ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فیضاعفه له (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور باہم مشاکلہ کی وجہ سے لفظ پر عطف عمدہ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و متی مایَعِ منك كلاماً یتكلم فیجبك بعقل

نحاس نے کہا ہے اور طلحہ بن مصرف سے روایت ہے یحاسبکم به الله یغفر یعنی بغیر فا کے بدل کی بنا پر۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جعفی اور خلاد نے اسی طرح پڑھا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے یہ یُحَاسِبْكُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر ہے اور یہی محاسبہ کی تفسیر ہے۔ اور یہ شاعر کے اس قول کی طرح ہے:

رُوَيْدًا بنی شیبانَ بعضَ وعیدِكم تُلاقوا غدًا خیلی علی سفوان

تلاقوا جیادًا لا تحید عن الوَغَی اذا ما غدَتْ فی المأزق المتَدَانِی

اور یہ بدل کی بنا پر ہے۔ شاعر نے فعل کو مکرر ذکر کیا ہے، کیونکہ فائدہ اس قول میں ہے جو اس کے پیچھے آ رہا ہے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: اگر بغیر فا کے ہو تو جزم کی نسبت رفع زیادہ عمدہ ہے۔ وہ حال کے محل میں ہو جائے گا، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

متی تَاتِہِ تعشو الی ضَوْءِ نارہ تجدْ خیر نارٍ عندھا خیر مُوقِدِ

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 390، دار الکتب العلمیہ

''ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں الله کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا الله تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہو گا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر، تو ہی ہمارا دوست (مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک سے روایت ہے کہ یہ آیت قصہ معراج میں عطا ہوئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں اسی طرح مروی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: تمام قرآن سوائے اس آیت کے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت شب معراج سماعت فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا واقعہ معراج سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ لیلۃ المعراج تو مکہ مکرمہ میں تھی اور یہ ساری سورت مدنی ہے۔

پس جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق شب معراج سے ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلندیوں کی جانب چڑھے اور آسمانوں میں بلند مقام پر پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ سے آگے گزر گئے تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو اس مقام سے تجاوز کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے گزر گئے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچے جہاں تک الله تعالیٰ نے چاہا، تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے رب کریم کو سلام عرض کیجئے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: التحیات لِلّٰه والصلوٰتُ والطیّبات۔ (قولی عبادات، بدنی عبادات اور مالی عبادات سب الله تعالیٰ کے لئے ہیں۔) تو الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: السلام علیك ایها النبی و رحمة الله و برکاته (اے نبی مکرم تجھ پر سلام ہو اور الله تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں۔) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت کے لئے بھی سلام میں حصہ موجود ہو۔ چنانچہ عرض کی: السلام علینا و علیٰ عبادِ الله الصّالِحِیْنَ(1) (سلام ہو ہم پر اور الله تعالیٰ کے صالح بندوں پر۔) تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور آسمانوں میں رہنے والے تمام ملائکہ نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، باب التشهد فی الآخرة، حدیث نمبر 788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ یہ معنی شکر کی بنا پر ہے یعنی رسول نے تصدیق کی۔ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (اس (کتاب) کی جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی۔) پس حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بھی کرامت وفضیلت میں شریک کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ یعنی وہ کہتے ہیں ہم تمام رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فرق کرتے ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے فرق کیا......تو آپ کے رب نے آپ کو فرمایا اس آیت کے بارے ان کی قبولیت کیسی ہے جسے میں نے نازل کیا ہے؟ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کی وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ (انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) یعنی الْمَصِیْرُ بمعنی المرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی طاقتها۔ (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو۔)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: الا دون طاقتها مگر اس کی طاقت سے کم۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ یعنی اس کے لئے اس خیر اور نیکی کے عمل کا اجر ہوگا جو اس نے کیا۔ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور اس پر اس برے عمل کا وبال ہوگا جو اس نے کمایا۔ تو اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا: مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔ تب حضور نبی کریم ﷺ نے کہا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اے ہمارے رب! ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یعنی لاعلم رہیں اَوْ اَخْطَاْنَا یا ہم خطا کر بیٹھیں یعنی اگر ہم ارادۃً کریں۔

اور کہا جاتا ہے: اگر ہم عمل کر بیٹھیں بھول کر اور خطاءً۔ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے کہا: آپ کو یہ عطا کر دیا گیا، تحقیق آپ کی امت سے خطا اور نسیان اٹھالئے گئے ہیں۔ (1)

پس آپ کسی دوسری شے کی التجا کیجئے۔ تو آپ نے کہا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا، اِصْرًا سے مراد ثقل اور بوجھ ہے۔ (یعنی اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال) كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا (جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے ظلم کے سبب پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دیں۔ اور وہ جب رات کے وقت گناہ کرتے تھے تو وہ اسے اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے تھے اور ان پر نمازیں پچاس تھیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف کر دی اور ان سے پچاس نمازیں فرض کرنے کے بعد کم کر دیں (2)۔ پھر عرض کی: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وہ کہہ رہے ہیں: ایسے عمل کا بوجھ ہم پر نہ ڈال جسے کرنے کی طاقت ہم نہیں رکھتے کہ پھر تو ہمیں عذاب دے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جو ہم پر گراں اور مشکل ہو، کیونکہ اگر انہیں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا تو وہ اس کی طاقت رکھتے

1۔ السنن ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، لیکن وہ ان پر شاق اور مشکل ہوگا اور وہ اس پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے ہر قسم کے (گناہوں کو) معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہم سے درگزر فرما اور کہا جاتا ہے: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمیں مسخ (شکل بدلنے) سے معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہمارے خسف (زمین میں دھنسا) سے درگزر فرما۔ وَارْحَمْنَا اور ہم پر قذف (پتھر برسانا) سے رحم فرما، کیونکہ سابقہ امتوں میں سے بعض کی شکلیں مسخ کر دی گئیں، بعض کو زمین میں دھنسا دینے کا عذاب دیا گیا اور بعض پر پتھر برسائے گئے۔ پھر کہا اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی ہے اور تو ہمارا محافظ ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ سو آپ کی دعا قبول کر لی گئی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میری ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔ نصرت بالرعب مسیرۃ شھر (1) اور کہا جاتا ہے کہ لشکری جب اپنے گھروں سے خالص نیت کے ساتھ نکلتے اور جنگ کا طبل بجاتے تو کفار کے دلوں میں رعب اور ہیبت ایک مہینہ کی مسافت سے واقع ہو جاتی۔ انہیں ان کے نکلنے کا علم ہوتا یا علم نہ ہوتا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب (معراج سے) لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات وحی فرمائیں تاکہ آپ اپنی امت کو اس کے بارے آگاہ کریں۔ اور اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نماز اور زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا اور حج کے احکام اور حیض، طلاق، ایلا کا حکم اور انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے اور ربا کا حکم بیان فرمایا، (تو) اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اپنی عظمت وشان کا ذکر فرمایا: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور پھر ان تمام کے بارے مومنین کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اشیاء کی تصدیق کی جن کا ذکر جاری ہے۔ اور اسی طرح تمام مومنین نے اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول اس کی ماقبل آیت ہے اور وہ یہ ہے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ کیونکہ جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر انتہائی گراں اور شدید ثابت ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایسے اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے جن کی ہم طاقت رکھتے ہیں: نماز، روزہ، جہاد (اور صدقہ) اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم اس طرح کہو جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا تھا۔ سمعنا وعصینا (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) تو انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ پس جب قوم نے اسے پڑھا تو اس کے ساتھ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 433

ان کی زبانیں پست ہوگئیں۔ تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۲۸۵﴾

پس جب انہوں نے یہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا فرمایا "ہاں" رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا فرمایا: "ہاں" رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ فرمایا: "ہاں" وَاعۡفُ عَنَّا ۚ وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ وَارۡحَمۡنَا ۚ اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۸۶﴾ فرمایا: "ہاں" اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پہلی روایت میں یہ قول قد فعلت اور اس روایت میں کہا: نعم یہ اس پر دلیل ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی گئی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور جب اس پر امر پختہ ہوگیا کہ انہوں نے کہا: سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تعریف اور مدح کی اور اس مشقت کو دور کر دیا جو انہیں دلوں میں کھٹکنے والی چیزوں کے سبب ہوئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی طرف کامل متوجہ ہونے کا ثمرہ ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے اس کا برعکس ظاہر ہوا، ان کی مذمت کی اور انہیں ذلت، محتاجگی، اور جلاوطنی جیسی مشقتوں میں ڈال دیا جب انہوں نے یہ کہا تھا۔ سمعنا و عصینا ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احسان اور مہربانی سے اس عذاب اور سزا سے پناہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کی گئی کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کا گھر ہر رات چراغوں کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: شاید وہ سورۃ البقرہ پڑھتا ہو، سو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے سورۃ البقرۃ میں سے اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ پڑھی ہے (2)۔ یہ تب نازل ہوئی جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر وہ دھمکی شاق گزری جو اللہ تعالیٰ نے ان تصورات پر حساب لینے کے بارے انہیں فرمائی جنہیں ان کے دل مخفی رکھے ہوئے ہوں گے، تو انہوں نے اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شاید تم یہ کہہ رہے ہو سمعنا و عصینا جیسا کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا۔" تو انہوں نے عرض کی: (نہیں) بل سمعنا و اطعنا۔ بلکہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ نازل فرمائی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور ان کے لئے فرض ہے کہ وہ ایمان لائیں (3)۔"

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ اس کا معنی صدق ہے یعنی تصدیق کی اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو نازل کیا گیا وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 77
2۔ فضائل القرآن، سور القرآن و آیاتہ، صفحہ 229، دار ابن کثیر دمشق بیروت
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 178-179

قرآن کریم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ وآمن المومنون کل امن باللہ یہ لفظ پر (عطف کی بنا) پر ہے(1)۔ اور غیر قرآن میں معنی پر (عطف کرتے ہوئے) آمنوا پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافع، ابن کثیر، عاصم ابوبکر کی روایت میں اور ابن عامر رحمہم اللہ علیہم نے وَ کُتُبِہٖ صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور انہوں نے سورۃ التحریم میں کتابہ صیغہ واحد پڑھا ہے۔ اور ابوعمرو نے یہاں اور سورۃ التحریم میں وَ کُتُبِہٖ صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے دونوں میں کتابہ واحد کے ساتھ قرأت کی ہے۔ پس جنہوں نے جمع پڑھا ہے انہوں نے کتاب کی جمع کا ارادہ کیا ہے اور جنہوں نے مفرد پڑھا ہے انہوں نے اس مصدر کا ارادہ کیا ہے جو ہر لکھی ہوئی شے کو جامع ہوتا ہے جس کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو(2)۔ اور جنہوں نے واحد پڑھا ہے ان کی قرأت میں بھی یہ جائز ہے کہ اس سے مراد جمع لیا جائے، اس اعتبار سے کہ کتاب اسم جنس ہے۔ پس دونوں قرأتیں مساوی طور پر برابر ہوگئیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (البقرہ:213) (تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب۔)

جماعت نے وَ رُسُلِهٖ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح رسُلنا و رسُلکم و رسُلك میں ہے سوائے ابوعمرو کے اور ان سے رسْلنا و رسْلکم کی تخفیف مروی ہے۔ اور ان سے رسلك میں تثقیل اور تخفیف دونوں مروی ہیں۔ ابوعلی نے کہا ہے: جنہوں نے رسلك کو تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کی اصل ہے اور جنہوں نے تخفیف کی ہے تو اسی طرح احاد میں تخفیف کی جاتی ہے، مثلاً عُنْق و طُنْب۔ اور جب احاد میں تخفیف کی جائے تو یہ اس جمع میں زیادہ مناسب ہے جو زیادہ ثقیل ہے۔ فرمایا اس کا (یہ) معنی کلی ہے۔ اور جمہور لوگوں نے لَا نُفَرِّقُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے یقولون لا نفرق(3) (وہ کہتے ہیں ہم فرق نہیں کرتے) اور قول حذف کر دیا گیا۔ اور قول کا حذف کرنا کثیر اور زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ علیھم من کل باب سلام علیکم یعنی یقولون سلام علیکم۔ (وہ کہیں گے تم پر سلام ہو) اور مزید فرمایا: و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، ای یقولون ربنا (وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اور اسی طرح (ان میں ہے) جو اس کی مثل ہیں۔ سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر، ابوزرعہ بن عمرو بن جریر اور یعقوب نے لا یفرق یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لفظ کل کی بنا پر ہے۔

ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لا یفرقون(4) ہے۔ اور بَيْنَ اَحَدٍ مفرد پڑھا ہے آحاد نہیں کہا ہے، کیونکہ احد واحد اور جمع تمام کو شامل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ (الحاقہ) اس میں حٰجِزِيْنَ احد کی صفت ہے، کیونکہ اس کا معنی جمع ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما احلت الغنائم لاحد سود الرؤس غیرکم(5) (تمہارے سوا بڑے سرداروں میں سے کسی کے لئے غنائم حلال نہیں کی گئیں۔) اس میں سود

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 391، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 392 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ جامع ترمذی، باب سورۃ الانفال، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الرؤس، احد کی صفت ہے۔ اور رؤبہ نے کہا ہے:

اذا أمور الناس دِینَتْ دینکا لا یرھَبون أحدا مِنْ دونکا

جب لوگوں کے امور تیرے دین کے تابع بنا دیئے گئے ہیں تو وہ تیرے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اس آیت کا معنی ہے: بے شک مومنین یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں اس میں کہ وہ بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اس میں حذف ہے، یعنی سمعنا سماع قابلین ہم نے قبول کرنے والوں کے سماع کی طرح سنا۔ اور کہا گیا ہے: سَمِعَ بمعنی قَبِل ہے (یعنی قبول کرنا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سمع اللہ لمن حمدہ، تو اس میں حذف نہ ہوگا۔ المختصر یہ قول اپنے کہنے والے کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعت کا معنی حکم کو قبول کرنا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: غُفْرَانَكَ یہ مصدر ہے جیسا کہ کفران اور خسران ہیں اور اس میں عامل فعل مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: اغفر غفرانك، (تو اپنی بخشش عطا فرما۔) زجاج نے یہی کہا ہے اور اس کے سوا دوسروں نے کہا ہے: نطلب او أسال غفرانك (ہم یا میں تیری بخشش کے طالب ہیں۔) وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ یہ دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا اقرار ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو کہا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر غنائم کو حلال کیا ہے سو آپ مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا''۔ پس آپ نے آخر سورت تک التجا کی (1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...... تکلیف سے مراد وہ امر ہے جس کے ساتھ کسی کو آزمایا جائے اور تَكَلَّفْتُ الْاَمْرَ کا معنی ہے میں نے اسے کام کرنے کی تکلیف دی، اسے جوہری نے بیان کیا ہے اور اَلْوُسْعُ کا معنی ہے طاقت اور کوشش۔ اور یہ یقینی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص بیان فرمائی ہے کہ وہ آیت نازل ہونے کے وقت سے بندوں کو دل یا دیگر اعضاء بدن کے اعمال میں سے کسی عبادت کا پابند اور مکلف نہیں بنائے گا مگر اسی کا جو مکلف کی وسعت اور طاقت میں ہوگی اور اس کے ادراک اور اس کی فطرت کے تقاضا کے مطابق ہوگی تو اس سے مسلمانوں سے وہ غم اور پریشانی دور ہوگئی جو دلوں میں آنے والے تصورات کا حساب لینے کے حکم سے انہیں لاحق ہوئی تھی (2)۔ اور اس آیت کے معنی میں وہ روایت ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی جسے اس کی ماں نے جنم دیا ہے، کیونکہ میں ایک دن ان کے پیچھے پیچھے گیا اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے گھی کی مشک کے سوا کچھ نہ پایا، اس میں گھی کے کچھ اثرات تھے، چنانچہ انہوں نے اسے ہمارے سامنے پھاڑ دیا اور ہم نے اسے چاٹنا شروع کر دیا جو اس میں گھی اور کھجوروں کا اثر تھا۔ اور وہ کہنے لگے:

ما کلّف اللہ نفسًا فوق طاقتها ولا تجوُد یَدٌ الا ما تَجِدُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 392، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا اور ہاتھ وہی شے سخاوت کرتا ہے جو وہ پاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ دنیوی احکام میں تکلیف مالا یطاق کے جائز ہونے کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان کا اتفاق ہے کہ شریعت میں تکلیف مالا یطاق واقع نہیں ہے اور اس آیت نے اس کے معدوم ہونے کے بارے آگاہ کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت نے کہا ہے: تکلیف مالا یطاق عقلاً جائز ہے۔ اور یہ عقائد شرعیہ میں سے کسی شے کو ساقط نہیں کرتی اور یہ مکلف کو عذاب دینے پر علامت ہے اور اس کے بارے یہی (حکم) قطعی ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی مصور کو جَو پر گرہ لگانے کا پابند کیا جائے۔(1)

اور اس کے جواز کے قائلین نے اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں واقع ہے یا نہیں ہے؟ پس ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہونے والی سورت میں واقع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام شریعت کے ساتھ ایمان لانے کا مکلف بنایا اور من جملہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کیونکہ اس پر دونوں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور آتش جہنم میں پھینکے جانے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ اس پر مطلع کرتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تحقیق اسے ایمان لانے کا مکلف بنایا باوجود اس کے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

اور ایک جماعت نے کہا ہے۔ یہ کبھی واقع نہیں ہوئی۔ اور اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ سَیَصْلٰی نَارًا کا معنی یہ ہے: اگر وہ اس میں پہنچا(2) اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

اور یُکَلِّفُ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک محذوف ہے اور وہ عبادۃً یا شیئًا ہے(3)۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر اپنا لطف وانعام فرمایا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں ایسے امور کا مکلف بنا دیتا جو مشقت آمیز اور اذیت رساں ہوتے ہیں جیسا کہ دس کے مقابلہ میں ایک کا ثابت قدم رہنا، انسان کا ہجرت کرنا اور اپنے وطن سے نکلنا اور اپنے گھر والوں، اپنے وطن اور اپنے کاروبار سے کلیۃً علیحدگی اختیار کرنا، لیکن اس نے ہمیں ایسے کاموں کا جو سخت مشقت آمیز ہوں اور ایسے امور جو اذیت اور تکلیف پہنچانے والے ہوں ان کا مکلف اور پابند نہیں بنایا۔ جیسا کہ اس نے ہم سے پہلے لوگوں کو مکلف بنایا مثلاً اپنے نفسوں کو قتل کرنا اور اپنے کپڑوں اور جسم پر پیشاب لگ جانے والی جگہ کاٹنا وغیرہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سہولت عطا فرمائی اور نرمی فرمائی اور ہم سے اس بوجھ اور طوق کو دور فرما دیا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ فللہ الحمد والمنۃ والفضل والنعمۃ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے وہ نیکیوں اور برائیوں کا ارادہ فرما رہا ہے۔ (یعنی اس کے لئے اجر ہوگا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔) سدی نے یہی کہا ہے۔ اور مفسرین کی جماعت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ابن عطیہ نے یہ کہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) اور

1۔ بخاری حدیث، باب من کذب فی حلمہ، حدیث نمبر 6520، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً

وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164) (اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے) اور دل میں پیدا ہونے والے تصورات اور اس طرح کے دیگر وساوس انسان کی کمائی اور کسب میں سے نہیں ہیں۔ اور نیکیوں کے ذکر میں لَهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے اور ان کے ساتھ مسرت محسوس کرتا ہے لہٰذا انہیں اس کی ملکیت کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے اور سیئات کے ذکر میں عَلَيْهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ وہ بھاری بوجھ ہیں اور انہیں اٹھانا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: لی مال و علی دین (میرے لئے مال ہے اور مجھ پر قرض ہے یعنی مال میری ملکیت ہے اور قرض مجھ پر بوجھ ہے۔)

فعل کسب کو مکرر (دوبار) لایا گیا ہے اور باب مختلف ذکر کیا ہے تاکہ نوع کلام حسین ہو جائے جیسا کہ فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (الطارق) (پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں میرے لئے جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں وہ ہیں جو بغیر تکلف کے کمائی جاتی ہیں کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کے راستہ پر اور طریقہ شریعت پر ہوتا ہے اور برے اعمال تکلف اور مبالغہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کی نہی کے حجاب کو پھاڑ کر ان کے بارے میں تکلف کرتا ہے اور ان کی طرف خطا اور غلطی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اس فعل کا دو بابوں سے آنا اس معنی کی حفاظت کے لئے انتہائی حسین ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بندوں کے افعال پر ائمہ نے جو کسب اور اکتساب کا اطلاق کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے ان پر خلق اور خالق کا اطلاق نہیں کیا ہے، بخلاف ان کے جنہوں نے بدعتی گروہوں میں سے اس کا اطلاق کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور ہمارے ائمہ میں سے جنہوں نے بندے پر اس کا اطلاق کیا ہے اور یہ کہ وہ فاعل (کام کرنے والا) ہے تو وہ خالصۃً مجاز ہے۔ اور مہدوی وغیرہ نے کہا ہے: آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: فی نفسہٖ یہ صحیح ہے لیکن یہ اس آیت کے سوا سے ثابت ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا بھاری ہتھیار کے ساتھ یا گلا گھونٹ کر یا پانی میں غرق کر کے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں اس کی ضمان ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اس کی دیت عاقلہ پر قرار دی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ باپ سے قصاص کا ساقط ہونا اس کے شریک سے اس کے ساقط ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ قول عاقلہ پر حد واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ مجنون کو اپنی ذات پر قدرت دے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: ''ہمارے علماء نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ قصاص باپ کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اور خطا کرنے والے کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے قتل کا کسب کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ

اس کا ایسے آدمی کے ساتھ شریک ہونا جس پر قصاص واجب ہوتا ہے اس حکم کے سقوط میں شبہ نہیں بن سکتا جسے شبہ کے سبب ساقط کر دیا جاتا ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اس کا مفہوم یہ ہے اس گناہ سے درگزر فرمالے جو ہم سے ان دونوں طریقوں پر یا ان میں سے ایک طریقہ پر صادر ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ(2) (میری امت سے خطا، نسیان اور اس (گناہ) کو جس پر انہیں مجبور کیا جائے اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ایسے گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گناہ اٹھالیا گیا ہے۔ البتہ ان احکام میں اختلاف ہے جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیا وہ اٹھالئے ہیں اور اس سے کوئی شے لازم نہ آئے گی یا اس کے سارے احکام لازم آئیں گے؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ واقعات مختلف ہونے سے یہ بھی مختلف ہوتے ہیں، پس ایک قسم وہ ہے کہ وہ بالاتفاق ساقط نہیں ہوتی مثلاً تاوان، دیات اور فرض نمازیں۔ اور ایک قسم وہ ہے جو بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً قصاص اور کلمہ کفر زبان پر لانا۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے مثلاً وہ آدمی جس نے رمضان المبارک میں بھول کر کھالیا یا بھول کر حانث ہوگیا (یعنی قسم توڑ دی) اور وہ کام جو ان کی مثل ہوں اور خطا اور بھول کر واقع ہو سکتے ہوں اور وہ فروع میں معروف ہوں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا۔ اِصْرًا کا معنی ثقل اور بوجھ ہے۔ امام مالک اور ربیع نے کہا ہے: اصر سے مراد انتہائی سخت اور مشکل امر ہے(3) اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اصر سے مراد عمل کی شدت اور سختی ہے اور وہ جو بنی اسرائیل پر انتہائی شدید اور سخت تھے مثلاً پیشاب وغیرہ کے مسائل۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ انتہائی تکلیف دہ اور شدید امور برداشت کرتے تھے اور یہ امام مالک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی طرح ہی ہے۔ اور اسی سے نابغہ کا قول ہے:

یا مانع الضیم ان یَغشی سَرَاتَھم والحامل الإصر عنھم بعد ما عرفوا

حضرت عطا نے کہا ہے: الاصر سے مراد شکل مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دینا ہے۔ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس میں نہ توبہ ہو اور نہ ہی کفارہ ہو(4)۔ اور لغت میں اصر کا معنی عہد ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ اور الاصر کا معنی تنگی، گناہ اور بوجھ ہے اور الاصار سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ بوجھ وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اَصَرَ یَاْصِرُ اَصْرًا بمعنی حبسہ یعنی اس نے اسے روک لیا۔ اور الاصر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسی سے ہے، جوہری نے کہا ہے: اسم ظرف مَاْصِر اور مَاْصَر ہے اور جمع مَاٰصِر ہے اور عام طور پر تو کہتا ہے معاصر۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 264

2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث نمبر 10307۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ 4۔ ایضاً

ابن خویز منداد نے کہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ظاہر سے ہر اس عبادت میں استدلال کیا جائے جس کے بوجھ اور ثقیل ہونے کا خصم دعویٰ کرے، پس یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:78)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الدین یسر فیسروا ولا تعسروا (1) (دین آسان ہے پس تم آسانی پیدا کرو اور تنگی اور مشکل نہ بناؤ)۔ اللھم شق علی من شق علی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اے اللہ اس پر مشقت ڈال دے جس نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مشقت ڈالی ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح الکیا الطبری نے کہا ہے: اس سے حرج اور تنگی کی نفی میں استدلال کیا جاتا ہے اور جس کا ظاہر بخشش اور نرمی کے میلان کے منافی ہو۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہم پر شدت اور سختی نہ کر جس طرح تو نے ان پر سختی کی جو ہم سے پہلے تھے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ہم پر ایسے اعمال کا بوجھ نہ ڈال جنہیں کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے اور اسی طرح ابن زید نے کہا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو ہماری شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ نہ کر دے۔ اور سلام بن سابور نے کہا: وہ جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ وہ شہوت پرستی ہے۔ اسے نقاش نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے بیان کیا ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: واعوذبك من غُلْمَة لیس لھا عدۃ (میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شہوت پرستی سے جس کی عدت نہ ہو۔) سدی نے کہا ہے: اس سے مراد وہ سختی اور پیاس ہے جو بنی اسرائیل پر مسلط تھی (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ عفوت عن ذنبہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اسے چھوڑ دے اور اسے سزا نہ دے۔ وَاغْفِرْ لَنَا ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے (ان پر پردہ ڈال دے) اور الغفر کا معنی پردہ ہے۔ وَارْحَمْنَا اور رحمت فرما جس کا آغاز تیری جانب سے ہم پر ہو۔ اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے۔ اور یہ آیات مخلوق کی تعلیم کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیسے دعا مانگیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب اس سورت کی قرأت سے فارغ ہوتے تو کہتے۔ آمین۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کے بارے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہو، پس اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے اور اگر یہ سورۃ الحمد پر قیاس کے سبب ہے اس حیثیت سے کہ وہاں دعا ہے اور یہاں بھی دعا ہے تو یہ اچھا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں گمان نہیں رکھتا کہ کسی نے اسلام کو سمجھا ہو اور اس کا ادراک کیا ہو اور وہ ان دونوں (آیات) کو پڑھے بغیر سو جائے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم نے اس معنی میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ

---

1۔ کشف الخفاء للعجلونی، جلد 1، صفحہ 498، بحوالہ موسوعہ اطراف الحدیث	2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 395

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رات کے وقت سورۃ البقرہ کی یہ دونوں آیتیں پڑھ لیں تو یہ اسے کافی ہیں (1)۔'' کہا گیا ہے: یہ اسے قیام اللیل سے کافی ہیں (یعنی یہ اس طرح ہے گویا اس نے رات کو عبادت کرتے ہوئے گزارا۔) جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جنت کے خزانوں میں سے دو آیتیں نازل فرمائی ہیں، ان کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا ہے رحمٰن نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے انہیں تحریر فرمایا۔ جس نے عشاء کے بعد ان دونوں کو دو بار پڑھا وہ دونوں اس کے لئے قیام اللیل سے کافی ہوں گی۔ اور وہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ البقرہ تک ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں اسے شیطان کے شر سے (محفوظ رکھنے کے لیے) کافی ہوں گی اور اسے اس پر کوئی غلبہ نہ ہو سکے گا۔ اور ابو عمرو الدانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی پس اس سے یہ تین آیات نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا گیا جس نے انہیں اپنے گھر میں پڑھا تین راتوں تک شیطان اس کے گھر کے قریب نہیں آئے گا (3)۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أُوتیتُ هذه الآیات من آخر سورة البقرة من کنز تحت العرش لم یوتهن نبی قبلی (4) (مجھے سورۃ البقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے والے خزانے سے عطا کی گئی ہیں اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو عطا نہیں کی گئیں۔) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں فرشتے کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ انہیں لے کر نازل ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271۔ ایضاً صحیح بخاری، باب فضل سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 4624، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 333

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 112۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی آخر سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2807، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 151

# سورۃ آل عمران

آیاتہا ۲۰۰ | ۳ سورۃ آل عمران مدنیۃ ۸۹ | رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ؕ

''الف-لام-میم۔ اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ؕ یہ بالاجماع مدنی سورت ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ تورات میں اس کا نام طیبہ ہے(1)، اور حسن، عمرو بن عبید، عاصم بن ابی النجود اور ابوجعفر الرواسی نے الٓمّٓ - اللّٰهُ الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، اس تقدیر پر کہ الٓمّٓ پر وقف ہے۔ جیسا کہ وہ اسماء اعداد مثلاً واحد، اثنان، ثلاثۃ اور اربعۃ وغیرہ میں وقف مقدر کرتے ہیں، حالانکہ وہ انہیں اکٹھا اور ملا کر پڑھتے ہیں۔

اخفش سعید نے کہا ہے: الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے۔ ثقیل ہونے کی وجہ سے عرب اس طرح نہیں کہتے۔ نحاس نے کہا ہے: پہلی قرأت ہی قرأت عامہ ہے اور متقدمین علمائے نحو نے اس میں گفتگو کی ہے۔ پس سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے میم کو فتحہ دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے فتحہ کو اختیار کیا ہے تاکہ کسرہ اور یا اور اس کے ماقبل کے کسرہ کے درمیان اسے جمع نہ کر دیا جائے۔

اور کسائی نے کہا ہے: حروف تہجی کے ساتھ الف وصل مل جائے اور تو الف وصل کو حذف کر دے تو اسے الف کی حرکت کے ساتھ حرکت دے گا اور یہ کہے گا: الٓمَّ اللہ، والمُ اذکر، والمِ اقتربت۔

اور امام فراء نے کہا ہے: الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ کی اصل وہی ہے جسے رواسی نے پڑھا ہے پھر ہمزہ کی حرکت میم پر ڈال دی گئی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اَلْحَيُّ الْقَيَّامُ پڑھا ہے(2) اور خارجہ نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں الحیُّ القَیِّمُ ہے۔ وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں آئے ہیں ان کے بارے علماء کی آراء سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس حیثیت سے اس سورت میں اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ایسا جملہ آیا ہے جو قائم بنفسہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام اقوال متصور ہو سکتے ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 397

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام کسائی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور سورۂ آل عمران شروع کی اور پڑھا الٓمّٓ۔ اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیام اور پہلی رکعت میں سو آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں بقیہ سو آیات پڑھیں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: دو رکعتوں میں ایک سورت نہیں پڑھی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور امام مالک نے المجموعہ میں کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ (مہتم) بالشان نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف تلاوت فرمائی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا (2)۔ اسے نسائی نے بھی بیان کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس سورت کی فضیلت میں کئی آثار و اخبار موجود ہیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورت سانپوں سے امان ہے۔ اور فقراء اور محتاجوں کے لئے یہ خزانہ ہے۔ اور یہ آخرت میں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑا کرے گی اور رات کے وقت جس نے اس کی آخری آیات پڑھیں اس کے لئے ساری رات قیام کرنے کی طرح کا ثواب لکھا جائے گا۔ وغیر ذالك۔

دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابو عبید قاسم بن سلام نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے عبید اللہ اشجعی نے بتایا، انہوں نے کہا مجھے مسعر نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے جابر نے اس حالت میں واقع ہونے سے پہلے بتایا جس میں وہ واقع ہوئے کہ حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فقراء اور محتاجوں کے لئے سورۂ آل عمران کتنا بہترین اور اچھا خزانہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے (3)۔ (یعنی نوافل میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔)

محمد بن سعید نے، عبد السلام نے جریری سے انہوں نے ابی السلیل سے بیان کیا ہے: ایک آدمی وسیع جنگل میں پہنچا اور اس نے وادی مجنہ میں پناہ لی اور یہ وہ وادی ہے جس میں جو بھی چلتا تھا اسے سانپ ڈس لیتے تھے اور اس وادی کے کنارے پر دو راہب تھے۔ پس جب شام ہوئی تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: قسم بخدا! یہ آدمی ہلاک ہو گیا! راوی کا بیان ہے۔ پس اس آدمی نے سورۂ آل عمران پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں راہبوں نے کہا: اس نے سورۃ طیبہ پڑھی ہے شاید نجات پا جائے گا۔ راوی کہتا ہے: پس اس آدمی نے صحیح سالم صبح کی۔ اور مکحول سے روایت ہے: جس نے جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھی رات تک ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس نے رات کے وقت سورۂ آل عمران کی آخری آیات پڑھیں تو اس کے لئے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا گیا اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

اور مسلم نے نواس بن سمعان کلابی سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اسے قیامت کے دن قرآن کے ساتھ اور ان اہل قرآن کے ساتھ لایا جائے گا جو اس کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے تین مثالیں بیان فرمائیں جنہیں میں ابھی تک نہیں بھولا، فرمایا: گویا کہ یہ دونوں دو بادل ہیں یا دو سیاہ سائے ہیں جن کے درمیان روشنی اور چمک ہے یا گویا

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، جلد 1، صفحہ 154 2۔ ایضاً 3۔ فضائل القرآن، سور القرآن وآیاتہ، صفحہ 238

یہ دونوں پرندوں کا گروہ ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے قاری کی جانب سے جھگڑیں گی (1)۔

مسلم نے ہی حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے شفیع بن کر آئے گا تم زَہْرَاوَین (یعنی) سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس حال میں آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا گویا کہ یہ دو سائے ہیں یا گویا کہ یہ دونوں پرندوں کے غول ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اسے لے لینا برکت ہے اور اسے چھوڑنا حسرت ہے اور جادوگر اس کی استطاعت نہیں رکھیں گے۔'' معاویہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ سورۃ البقرہ اور آل عمران کا نام الزہراوَین رکھا گیا ہے اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) بلاشبہ یہ دونوں روشن کرنے والیاں ہیں۔ (زہراوین) الزَّھْر اور الزُّھْرَۃُ سے بنایا گیا ہے چونکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کی وجہ سے ان کے قاری کے لئے ان کے انوار یعنی معانی ظاہر اور روشن ہو جاتے ہیں۔ (اس لئے ان کا نام زہراوین رکھا گیا)

(۲) پھر اس لئے کہ ان کی قرأت پر قیامت کے دن نور تام مرتب ہوگا۔ اور یہی دوسرا قول ہے۔

(۳) ان دونوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو متضمن ہونے میں شریک ہیں، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرَّحمن الرحیم اور وہ آیت جو آل عمران میں ہے اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اسے ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ الغمام کا معنی ہے وہ بادل جو اکٹھا اور گھنا ہو۔ اور الغیایۃ کا معنی بھی یہی ہے جب کہ وہ سر کے قریب ہو۔ اور یہی ظُلَّۃ بھی ہے اور روایت کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کی تلاوت کرنے والا ان کے ثواب کے سائے میں ہوگا جیسا کہ ایک آدمی اپنے صدقہ کے سائے میں آئے گا'' اور قولہ تُحاجان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ملائکہ پیدا فرمائے گا جو ان کے ثواب کے عوض پڑھنے والے کی جانب سے جھگڑا کریں گے (4)۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔ ''بلاشبہ جس نے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ ستر فرشتے پیدا فرما دے گا وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔''

اور قولہ: بینھما شَرْقٌ اسے را کے سکون اور اس کے فتحہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور یہ روشنی پر تنبیہ ہے، کیونکہ جب فرمایا: سَوْدَاوان اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریک ہیں تو اپنے قول بینھما شرق سے اس کی نفی کی گئی۔ یعنی یہ

---

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 270　2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 210۔ ایضاً، باب الدعاء، حدیث نمبر 1278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 371، حدیث نمبر 16109

دونوں اپنی کثافت کے سبب ان کے درمیان جو ان کے نیچے ہوں گے اور سورج کی حرارت اور تپش کی شدت کے درمیان حائل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس سورت کا ابتدائی حصہ وفد نجران کے سبب نازل ہوا اس بارے میں محمد بن اسحاق نے محمد بن جعفر بن زبیر سے نقل کیا ہے: وہ نصاریٰ تھے جو ساٹھ سواروں پر مشتمل وفد بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ ان کے اشراف میں سے چودہ افراد ان میں تھے، ان چودہ افراد میں تین آدمی ایسے تھے جن کی طرف ان کا امر لوٹتا تھا۔ (یعنی جملہ معاملات کا انحصار تین افراد پر تھا۔) ایک عاقب تھا جو قوم کا امیر اور ان میں صاحب رائے تھا۔ اور اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ اور ایک ان کا معاون و مددگار سردار تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والا تھا اس کا نام الأیہم تھا، اور ابو حارثہ بن علقمہ بکر بن وائل میں سے ایک تھا وہ ان کا بشپ اور ان کا عالم تھا، وہ عصر کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، وہ یمنی کپڑوں کے جبے اور چادریں پہنے ہوئے تھے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا: ہم نے ان کی مثل جمال و جلال والا کوئی وفد نہیں دیکھا، ان کی نماز کا وقت ہوا، وہ اٹھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں مشرق کی طرف انہوں نے نماز پڑھی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم انہیں چھوڑ دو" پھر وہ کئی دنوں تک وہاں ٹھہرے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مناظرہ کرتے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ابن اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے بیٹے) تھے۔ علاوہ ازیں وہ اضطراب میں ڈالنے والی شنیع باتیں کرتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہین ساطعہ کے ساتھ ان کا رد کرتے رہے اور ان کی کوئی مدد نہ کی گئی اور انہیں کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی تقریباً اسی آیات نازل ہوئیں، یہاں تک کہ ان کا معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دے دی۔ جیسا کہ سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں مذکور ہے (1)۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

"نازل فرمائی اس نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں اور اتاری اس نے تورات اور انجیل، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اتارا فرقان کو۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیتوں کے ساتھ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے بِالْحَقِّ اس سے مراد صدق (سچائی) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حجت غالبہ ہے اور قرآن کریم کو بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، سو اسی لئے فرمایا: نَزَّلَ اور تنزیل کے بعد دیگرے مرۃ بعد مرۃ نازل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تورات اور انجیل دونوں یکبارگی نازل ہوئیں۔ سو اسی لئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ

(ان کے بارے) ارشاد فرمایا اَنۡزَلَ اور بِالۡحَقِّ میں باالکتاب سے حال کے محل میں ہے۔ اور با محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے آتیا بالحق اور یہ نَزَّلَ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تیسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور مُصَدِّقًا حال مؤکدہ ہے حال منتقلہ نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر مصدق یعنی غیر موافق ہو، یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے اس میں الانتقال کو مقدر مانا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ وہ مصدق لنفسہٖ بھی ہے اور مصدق لغیرہٖ بھی۔

قولہ تعالیٰ: لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ یعنی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ اور تورات کا معنی روشنی اور نور ہے۔ یہ مشتق ہے وَرَی الزَّند اور وَرِیَ سے یہ دونوں لغتیں ہیں جب چقماق سے آگ نکلے (تو کہا جاتا ہے وَرَی الزند) اور اس کی اصل تَوۡرَیَۃٌ بروزن تَفۡعَلَۃ ہے۔ تا زائدہ ہے اور یا متحرک ہے اس کا ماقبل مفتوح ہے اسے الف سے بدل دیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تَفۡعِلَۃٌ ہو اور پھر را کسرہ سے فتحہ کی طرف منتقل ہو جائے، جیسا کہ انہوں نے جاریۃ میں جَارَاۃ اور ناصیۃ میں ناصاۃ کہا ہے اور یہ دونوں وزن فراء سے منقول ہیں۔

اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل وزن فَوۡعَلَۃٌ ہے۔ پس اصل وَوۡرَیَۃٌ ہوئی، پھر پہلی واؤ کو تا سے بدل دیا گیا جیسا کہ تَوۡلَجٌ میں بدلا گیا ہے اور یہ اصل میں وَوۡلَجٌ تھا فَوۡعَلٌ کے وزن پر اور یہ وَلَجۡتُ سے ماخوذ ہے(1)، اور پھر یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا گیا۔ اور فَوۡعَلَۃٌ کا وزن تَفۡعَلَۃٌ کی نسبت زیادہ (قابل استعمال) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ التوراۃ یہ التَّوۡرِیَۃ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے کسی شے کے بارے تعریض کرنا اور اسے دوسرے سے چھپانا، تو گویا تورات میں زیادہ کنایات ہیں اور بغیر کسی تصریح اور وضاحت کے اشارات ہیں، یہ مورج کا قول ہے۔

اور جمہور نے پہلا قول اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكۡرًا لِّلۡمُتَّقِيۡنَ مراد تورات اور انجیل ہیں۔ انجیل اِفۡعِيۡلٌ کے وزن پر النَّجَل سے ماخوذ ہے اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی جمع أناجیل اور توراۃ کی تَوَارٍ بنائی جاتی ہے۔ پس انجیل علوم اور حکم (کے معنی) کے لئے اصل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: لعن اللہ نَاجِلَيۡهِ یعنی اللہ اس کے والدین پر لعنت کرے۔ کیونکہ والدین اس کی اصل ہیں (اس لئے انہیں ناجلیہ کہا گیا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نَجَلۡتُ الشَّيۡءَ سے بنا ہے جب تو کسی شے کو نکالے (تو یہ جملہ بولتا ہے) پس انجیل کے ساتھ علوم وحکم نکالے گئے ہیں اور اس معنی میں اولاد اور نسل کو اس کے نکلنے کی وجہ سے نجلاً کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الی مَعۡشَرٍ لَمۡ يُوۡرِثِ اللُّؤۡمَ جَدُّهُمۡ أصاغِرَهُم وَ كُلُّ فَحۡلٍ لَهُمۡ نَجۡلُ

اس میں لفظ نَجۡلُ نکالنے کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اَلنَّجۡلُ سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اسۡتَنۡجَلَتِ الۡاَرۡضُ کا معنی ہے زمین پانی رسنے کی وجہ سے دلدلی ہوگئی۔ اور اسی کو نِجَالٌ کہتے ہیں جب اس سے پانی نکلنے لگے۔ پس اسی معنی کی بنا پر اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 398، دار الکتب العلمیہ

تعالیٰ نے اسے حق کا درس دینے والا عافیت بنا کر نازل کیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ النَّجَلُ فی العین سے ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ کا وسیع اور کشادہ ہونا(1) اور طعنة نجلاء ہے۔ یعنی بڑا نیزہ۔ شاعر نے کہا ہے:

رُبَّما ضَرْبَةٍ بسيفٍ صقيلٍ　من بُصْرَى و طعنة نَجْلاء

اس میں طعنة نجلاء بڑے نیزہ کے معنی میں مذکور ہے۔
اور اس کے ساتھ انجیل کا نام رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ اصل ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے نکالا ہے اور اسے ان پر نور اور ضیاء کے ساتھ پھیلا دیا ہے، وسیع کر دیا ہے۔
اور کہا گیا ہے: کہ التَنَاجُل کا معنی التنازع (جھگڑا کرنا) ہے۔ اور لوگوں کے اس جھگڑا کرنے کی وجہ سے اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے۔ اور شمر نے بعض سے بیان کیا ہے: انجیل سے مراد ہر کتاب ہے جو لکھی ہوئی ہو اور اس کی سطریں وافر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے: نجل بمعنی عمل اور صنع ہے۔ یعنی کام کرنا۔ کسی نے کہا ہے۔ وانجل فی ذاك الصنيع كما نجل (اس کاروبار میں تو بھی کام کر جیسے اس نے کیا۔)
اور یہ قول بھی ہے کہ تورات اور انجیل سریانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ انجیل سریانی میں انکلیون ہے، اسے ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اسے مذکر و مونث دونوں طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ پس جس نے مونث ذکر کیا ہے اس نے صحیفہ کا ارادہ کیا ہے اور جس نے مذکر ذکر کیا ہے اس نے کتاب مراد لی ہے۔ کئی دوسروں نے کہا ہے: کبھی قرآن کو انجیل بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے قصہ میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رب أری فی الألواح اقواما أنا جیلهم فی صدورهم فاجعلهم امّتی (اے میرے رب! میں تختیوں میں کئی اقوام کو دیکھ رہا ہوں ان کی کتابیں ان کے سینوں میں ہیں پس تو انہیں میرا امتی بنا دے) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا تلك اُمّة احمد وہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ بلاشبہ اس میں آپ نے اناجیل سے قرآن مراد لیا ہے۔ اور حسن نے والأنجیل ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے(2) اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ مثلاً اِکْلِیل۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ ان میں سے ہو جنہیں عربوں نے اسماء عجمیہ میں سے عربی بنایا ہے۔ اور اس کی ان کے کلام میں کوئی مثال نہ ہو۔
قولہ تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ یعنی قرآن کریم سے پہلے هُدًى لِلنَّاسِ (لوگوں کی ہدایت کے لئے) ابن فورک نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے هدی للناس المتقین (3) یعنی متقی لوگوں کی راہنمائی کے لئے۔ اور اس کی دلیل سورۃ البقرہ میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ہے۔ پس اس عام کو اس خاص کی طرف لوٹا دیا گیا ہے اور هُدًى یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور اَلْفُرْقَانَ سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 424　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین اور نہ آسمان میں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشیاء کے بارے تفصیلی علم رکھنے کی خبر ہے اور اس کی مثل قرآن کریم میں کثیر آیات ہیں۔ پس وہ جانتا ہے اسے بھی جو ہو چکا، اسے بھی جو ہوگا اور اسے بھی جو نہ ہوگا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ یا اس کے بیٹے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان پر کئی اشیاء مخفی ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ⑥

''وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے (وہی) غالب ہے حکمت والا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے رحموں میں انسان کی تصویریں بنانے کی خبر دی ہے۔ اور رحم کی اصل رحمۃ سے ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم کیا جاتا ہے اور صورۃ کا اشتقاق صارہ الی کذا سے ہے جب وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، پس صورت مائل ہوتی ہے ایک شبیہ اور ہیئت کی طرف۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان کو بیان کرتی ہے اور اس کے ضمن میں نجران کے عیسائیوں کا رد ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج اور المومنون میں تصویر کی شرح اور وضاحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (1) میں اس کی وضاحت کی ہے، جیسا کہ وہاں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس میں طبائعیین کا بھی رد ہے کیونکہ وہ اسے مستقل فاعل بناتے ہیں اور ان کا رد آیۃ التوحید میں گزر چکا ہے اور مسند ابن سنجر میں حدیث ہے۔ (ان کا نام محمد بن سنجر ہے) ''بے شک اللہ تعالیٰ جنین کی ہڈیاں اور اس کی غضاریف (کچی ہڈیاں جو کھائی جا سکتی ہیں) مرد کی منی سے اور اس کی چربی اور گوشت عورت کی منی سے پیدا فرماتا ہے (2)''۔

اور اس میں اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صریحاً موجود ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (الحجرات: 13) (اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے) اور صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ''کہ ایک یہودی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں ایک شے کے بارے آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سوائے نبی یا ایک آدمی یا دو آدمیوں کے اہل زمین میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے نفع ہوگا اگر میں تجھے بتا دوں؟'' اس نے کہا: میں کان لگا کر پورے غور سے سنوں گا۔ پھر اس نے کہا: میں بچے کے بارے آپ سے پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کا پانی سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد۔ اور جب وہ دونوں جمع ہو جائیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

ہوتو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچہ (مذکر) پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہوتو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے (1)۔'' الحدیث، اس کا بیان سورۃ الشوریٰ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَشَآءُ یعنی جسے وہ چاہتا ہے خوبصورت یا بدصورت، سیاہ اور سفید، طویل القامت یا پستہ قد، اعضاء کے اعتبار سے صحیح سالم یا اپاہج (پیدا کرتا ہے) یہاں تک کہ اس کا شقی (بدبخت) ہونا اور سعید ہونا وغیرہ۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا کہ قرآء آپ کے پاس جمع ہیں تا کہ جو احادیث آپ کے پاس ہیں وہ انہیں سنیں، تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تم سے چار چیزوں کے سبب مشغول ہوں اور میں روایت حدیث کے لئے فارغ نہیں ہوں۔ تو آپ سے عرض کی گئی: وہ مشغولیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک یہ ہے میں یوم میثاق میں غور وفکر اس حیثیت سے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ جنت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ جہنم میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' اور میں نہیں جانتا اس وقت میں کون سے فریق میں تھا۔ اور دوسری یہ ہے کہ رحم میں میری صورت بنائی گئی تو اس فرشتے نے کہا جو رحموں پر مقرر ہے: ''اے میرے رب! یہ شقی ہے یا سعید ہے (2)'' تو میں نہیں جانتا اس وقت اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ جس وقت ملک الموت میری روح قبض کرے گا تو وہ کہے گا: ''اے میرے رب! کفر کے ساتھ یا ایمان کے ساتھ'' تو میں نہیں جانتا جواب کیسا ہوگا۔ اور چوتھی شے یہ ہے کہ وہ کہے گا: وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (یٰسین) (اور (حکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ) تو میں نہیں جانتا میں کون سے فریق میں ہوں گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور نہ کوئی مصور (تصویر بنانے والا) ہے اور یہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الٰہ مصور ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی تصویر بنائی گئی ہے یعنی وہ مصور ہیں۔ الْعَزِيْزُ سے مراد وہ ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا۔ الْحَكِيْمُ سے مراد ذوالحکمت (صاحب حکمت) یا مُحْكِم (حکم (دانا بنانے والا) دینے والا) ہے۔ یہ اس کے مقابلہ میں اخص ہے جو تصویر کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی کو بغیر اللہ تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146 2۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ، حدیث نمبر 2969، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ ام المومنین نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں تو وہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام دیا ہے لہٰذا تم ان سے بچو(1)''۔

ابو غالب نے بیان کیا ہے: میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے گدھے پر سوار تھے، یہاں تک کہ جب وہ مسجد دمشق کے راستے تک پہنچ کر رکے تو وہاں کچھ سر کھڑے کئے گئے، تو آپ نے پوچھا: یہ سر کن کے ہیں؟ تو بتایا گیا: یہ خوارج کے سر ہیں جو عراق سے لائے گئے ہیں۔ تو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کے کتے ہیں۔ آگ کے کتے ہیں، آگ کے کتے ہیں! آسمان کے سائے کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، اچھائی اور مبارک اس کے لئے جس نے انہیں قتل کیا اور انہوں نے اسے قتل کیا۔ انہوں نے یہی جملہ طوبی لمن قتلهم و قتلوه تین بار کہا۔ پھر رونے لگے۔ تو میں نے عرض کی: اے ابو امامہ! رضی اللہ عنہ کون سی شے تمہیں رلا رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا: ان کے لئے رحمت ہو، بے شک وہ اہل اسلام میں سے تھے پھر اس سے نکل گئے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الی آخر الآیات۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران:105) (اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آچکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں)

تو میں نے کہا: اے ابو امامہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے کہا: کیا یہ ایسی شے ہے جو تم اپنی رائے سے کہہ رہے ہو یا ایسی شے ہے جسے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا ہوں، بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا! (نہیں) بلکہ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (کئی بار) سنا ہے نہ ایک بار، نہ دو بار، نہ تین بار، نہ چار بار، نہ پانچ بار، نہ چھ بار، نہ سات بار اور انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھ لیں۔ بیان کیا: ورنہ انہیں خاموش کرا دیا جاتا(2)...... انہوں نے یہ تین بار کہا...... پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور بقیہ تمام فرقے جہنم میں ہوں

1۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339۔ ایضاً صحیح بخاری، باب منه آیات محکمات، حدیث نمبر 4183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 267، حدیث نمبر 8034۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورة آل عمران، حدیث 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور یقیناً یہ امت ان پر ایک فرقے کا اضافہ کرے گی ایک جنت میں ہوگا اور باقی تمام جہنم میں ہوں گے (1)"۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ محکمات اور متشابہات کے بارے میں متعدد اقوال پر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور وہی حضرت شعبی اور حضرت سفیان ثوری وغیرہما کے قول کا مقتضا بھی ہے کہ محکمات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کی تاویل معروف ہو اور اس کا معنی و تفسیر سمجھے جا سکیں۔ اور متشابہ وہ ہے جسے جاننے کے لئے کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے نہ کہ اپنی خلق کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا ہے: ان کی مثال میں قیامت قائم ہونے کا وقت ہے، یاجوج اور ماجوج اور دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے اور اسی طرح سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احسن قول ہے جو متشابہ کے بارے کیا گیا ہے اور ہم نے سورۃ البقرہ کے اوائل میں ربیع بن خثیم سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں سے جو چاہا اسے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا (3)، الحدیث۔

اور ابو عثمان نے کہا ہے: محکم سے مراد وہ سورۃ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ اور محمد بن فضل نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ اخلاص ہے کیونکہ اس میں فقط توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) (یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنا دی گئی ہیں جس کی آیتیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کا تمام متشابہ ہے، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: کتابا متشابها۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کے معنی میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یعنی نظم اور وصف میں اس کی آیات پختہ اور مضبوط ہیں اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں اور کتابا متشابها کا معنی ہے کہ اس کی بعض آیات بعض کے مشابہ ہیں اور بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اور وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ سے مراد یہ معنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں متشابہ احتمال اور اشتباہ کے باب سے ہے جو اس قول میں ہے ان البقر تشابه علینا یعنی وہ گائے ہم پر ملتبس ہو گئی۔ یعنی یہ (لفظ) گائیوں میں سے بہت سی انواع کا احتمال رکھتا ہے۔ اور محکم سے مراد وہ ہے جو اس کے مقابلہ میں ہو۔ اور وہ وہ ہے جس میں کوئی التباس نہ ہو اور وہ سوائے ایک وجہ کے اور کوئی احتمال نہ رکھتا ہو۔

اور کہا گیا ہے: بے شک متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، پھر جب ان وجوہ کو ایک وجہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور باقی باطل قرار دی جائیں تو وہ متشابہ محکم ہو جاتا ہے۔ پس محکم ہمیشہ اصل ہوتا ہے اور فروع اس کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور متشابہ وہی فرع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: محکمات سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ تین آیات تک، اور سورۃ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

---

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 273، حدیث نمبر 8051

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 401، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 400

اِحْصَانًا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ایک مثال ہے جو آپ نے محکمات کے بارے میں بیان فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا: محکمات سے مراد قرآن کریم کی ناسخ آیات، احکام حرام کو بیان کرنے والی اور اس کے فرائض کو بیان کرنے والی وہ آیات ہیں جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور متشابہات سے مراد اس کی منسوخ آیات، اس کی مقدم ومؤخر آیات، اس کی امثال، اس کی اقسام اور وہ جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: محکمات سے مراد ناسخ آیات ہیں اور متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ اور یہی حضرت قتادہ، ربیع اور ضحاک نے کہا ہے(1)۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: محکمات وہ آیات ہیں جن میں رب کریم کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو دور کرنے کا ذکر ہے، جس معنی پر انہیں وضع کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں پھیرا جاسکے اور نہ اس میں کوئی تحریف کی جاسکے۔ اور متشابہات وہ ہیں جن میں تصریف وتحریف اور تاویل ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بندوں کو آزمایا ہے، مجاہد اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں سب سے احسن قول یہی ہے(2)۔

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ محکمات اور متشابہات کے بارے کہا گیا ہے ان میں احسن یہ ہے کہ محکمات وہ ہیں جو قائم بنفسہ ہیں ان میں کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص:4) اور وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ:82) اور متشابہات مثلاً ان الله يغفر الذنوب جميعاً میں ان ارشادات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ:82) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النساء:48)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ نحاس نے کہا ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے جسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے اور وہی وضع زبان پر جاری ہے اور وہ یہ کہ محکم احکم سے اسم مفعول ہے اور الاحکام کا معنی الاتقان (پختہ کرنا) ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لفظ واضح المعنی ہو اس میں کوئی اشکال اور تردد نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ (محکم) اپنے مفرد کلمات کے واضح ہونے اور ان کی ترکیب کے پختہ اور مضبوط ہونے میں اسی طرح ہوتا ہے اور جب دو امروں میں سے کوئی ایک مختل ہوجائے تو اس میں تشابہ اور اشکال آجاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: مشابہ کی کئی وجوہ ہیں، ایک وہ ہے جس کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے وہ یہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو کہ دو آیتوں میں سے کون سی آیت نے دوسری کو منسوخ کردیا ہے، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ایسی حاملہ عورت کے بارے جس کا خاوند فوت ہوجائے یہ نظریہ ہے کہ یہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ کے ساتھ عدت گزارے گی اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، اور وہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 401

کہتے ہیں: چھوٹی سورۂ نساء (1) (یعنی سورۂ طلاق) نے چار مہینے اور دس دن عدت والے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کہتے ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اور اسی طرح ان کا وارث کے لئے وصیت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ منسوخ کر دی گئی ہے یا منسوخ نہیں کی گئی؟ اور اسی طرح دو آیتوں میں تعارض کی صورت میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیٰ کون سی ہے کہ اسے مقدم کیا جائے جب نسخ نہ پہچانا جائے اور نہ اس کی شرائط پائی جائیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء: 24) یہ تقاضا کرتا ہے کہ ملک یمین کی حیثیت سے دو قریبی عورتوں کو اپنے پاس جمع کرنا مباح ہے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النسا: 23) اس سے منع کرتا ہے اور اسی میں سے وہ تعارض بھی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پایا جاتا ہے اور وہ جو قیاس میں پایا جائے، پس وہی متشابہ ہے اور ایک آیت کو دو قراتوں سے پڑھنا متشابہ میں سے نہیں ہے اور اسم کبھی محتمل یا مجمل ہوتا ہے وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سے واجب اتنی مقدار ہی ہوتی ہے جسے وہ اسم یا پوری آیت شامل ہوتی ہے اور دو قراتیں دو آیتوں کی طرح ہوتی ہیں اور دونوں کے موجب کے مطابق عمل واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پڑھا گیا ہے: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ (المائدہ: 6) (اَرْجُلَكُمْ) کی قرات فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا: میں قرآن کریم میں ایسی اشیاء پاتا ہوں جو مجھے مختلف نظر آتی ہیں۔ (یعنی ان میں اختلاف ہے) آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ (المومنون) (تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔) اور فرمایا: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الطور) (اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے) اور کہا: وَ لَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا (وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے) اور پھر کہا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ۝ (انعام) (قسم بخدا! اے ہمارے رب ہم مشرک نہ تھے) تو انہوں نے اس آیت میں (اپنے شرک کو) چھپایا۔ اور سورہ النازعات میں ہے اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَ اَغْطَشَ لَیْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ پس اس میں زمین کی تخلیق سے پہلے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا، پھر فرمایا اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ ۝ (فصلت) سو اس میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا اور فرمایا: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝ (النسا) تو گویا کہ وہ تھا پھر

---

1۔ صحیح بخاری، باب تفسیر سورۃ الطلاق، حدیث نمبر 4529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فلا انساب بینھم نفخہ اولیٰ کے بارے میں ہے پھر صور میں پھونکا جائے گا اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہوگا وہ گر پڑے گا سوائے اس کے جس کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس وقت ان کے درمیان نہ نسب ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے پوچھیں گے۔ پھر دوسرے نفخہ میں ان میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

اور جہاں تک ما کنا مشرکین اور ولا یکتمون اللہ حدیثا کا تعلق ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص والوں کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا، تو مشرکین کہیں گے! آؤ ہم کہتے ہیں: ہم مشرک نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگادے گا اور ان کے اعمال کے بارے ان کے اعضاء گفتگو کریں گے تو اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کو نہیں چھپائے گا اور اس وقت کفار یہ خواہش کریں گے کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں تخلیق فرمایا، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی تو دو دنوں میں انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنادیا، پھر زمین کو بچھایا اور اس سے پانی اور کھیتی نکالی اور ان میں پہاڑ، درخت، ٹیلے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب دوسرے دو دنوں میں تخلیق فرمادیا۔ پس اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۞ (نازعات) نتیجتاً زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ چار دنوں میں تخلیق کیا گیا اور دو دنوں میں آسمان بنایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: و کان اللہ غفورا رحیما (یعنی وہ ذاتی طور پر غفور اور رحیم ہے یعنی وہ ہمیشہ رہا اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر اسے اسی کے مطابق کیا جو ارادہ فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے! چاہیے کہ تجھ پر قرآن مختلف نہ ہو، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اس میں اُخَرُ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اسے الف لام سے معدول کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اصل یہ ہے کہ یہ الف لام کے ساتھ صیغہ صفت ہو جیسا الکبر اور الصغر، پس جب اسے الف لام کے جاری ہونے کی جگہ سے معدول کر دیا گیا تو یہ غیر منصرف ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: انہوں نے اسے منصرف نہیں کہا کیونکہ اس کا واحد منصرف نہیں ہوتا چاہے وہ معرفہ ہو یا نکرہ۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ غضاب اور عطاش بھی منصرف نہ ہوں۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ اور مبرد نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے: بے شک لبدا اور حطما بھی دونوں صفتیں ہیں اور یہ دونوں منصرف ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اُخَرُ الف لام سے معدول ہو، کیونکہ اگر یہ الف لام سے معدولہ ہوتا تو یہ معرفہ ہوتا، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ سَحَر تمام اقوال میں معرفہ ہے کیونکہ یہ السحر سے معدول ہے اور اَمسِ اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ذھب اَمسِ یہ الامس سے معدول ہے، پس اگر اخر بھی الف لام سے معدول ہوتا تو وہ بھی معرفہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نکرہ کے ساتھ اس کی صفت بیان کی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 712

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ پس الَّذِیْنَ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ہے۔ اور زَیْغٌ کا معنی جھکاؤ اور کجی ہے اور اسی سے زاغت الشمس (سورج کا ڈھلنا) اور زاغت الابصار (آنکھوں کا تھکنا) ہے۔ اور کہا جاتا ہے: زاغ یزیغ زیغا جب وہ قصد وارادہ ترک کردے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اور یہ آیت کفار، زندیق، جاہل، بدعتی تمام گروہوں کو عام ہے۔ اگرچہ اس وقت اس سے اشارہ نجران کے عیسائیوں کی طرف تھا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر یہ حروریہ اور خارجیوں کے گروہ نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے گزر چکی ہے۔ وہی کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ہمارے شیخ ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: متشابہ کی پیروی کرنے والے اس سے خالی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی پیروی کریں اور اسے جمع کرتے رہیں قرآن کریم میں تشکیک تلاش کرنے کے لئے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، جیسا کہ زنادقہ اور قرآن کریم میں طعنہ زنی کرنے والے قرامطہ نے کیا، یا وہ متشابہ کے ظواہر کے مطابق اعتقاد رکھنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، جیسا کہ ان مجسمہ نے کیا جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث طیبہ سے ان آیات وروایات کو جمع کیا جن کا ظاہر (اللہ تعالیٰ کی) جسمیت پر دلالت کرتا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم مجسم ہے اور وہ صورت مصورہ ہے اس کا چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، پاؤں اور انگلیاں سبھی اعضاء ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے مبرہ اور بلند ہے یا وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں ان کی تاویلات کو ظاہر کرنے کے لئے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کے لئے یا جیسا کہ صبیغ نے کیا جس وقت اس نے عمر پر کثرت سے اس بارے سوال کئے۔ پس یہ چار اقسام ہوئیں:

(۱) ان کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کئے بغیر ان کے بارے میں قتل کا حکم دیا ہے۔

(۲) صحیح قول ان کی تکفیر کا ہے، کیونکہ ان کے اور بتوں اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اور اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی، ورنہ یہ قتل کر دیئے جائیں گے جیسا کہ مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۳) چونکہ اس کی تاویل کے جواز میں اختلاف ہے لہٰذا اسی بنا پر اس کے جائز ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ سلف کا مذہب متشابہ کی تاویل کے لئے تعرض کو ترک کرنا ہے باوجود اس کے کہ انہیں ان کے ظاہر معنی کے محال ہونے کا یقین تھا۔ پس وہ کہتے: تم اس سے گزر جاؤ جیسے وہ آئے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی تاویلات کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے ایسے معنی پر محمول کیا جائے بغیر یقین کے جس پر لغۃً محمول کرنا صحیح ہو جیسا کہ مجمل کی تعیین کی جاتی ہے۔

(۴) اس میں حکم ادب بلیغ کا ہے، جیسا کہ حضرت عمر نے صبیغ کے ساتھ کیا اور ابوبکر انباری نے کہا ہے: ائمہ سلف اسے سزا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 402، دارالکتب العلمیہ

دیتے تھے جو قرآن کریم کے مشکل حروف (متشابہ) کی تفسیر کے بارے سوال کرتا تھا۔ کیونکہ سائل اگر اپنے سوال سے بدعت کو دوام بخشنے اور فتنہ برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ درحقیقت انکار اور بہت بڑی تعزیر کا مستحق ہے اور اگر اس کا یہ قصد نہیں تب بھی وہ گناہ کا جرم کرنے کے سبب عتاب کا مستحق ہے، کیونکہ اس نے منافقین ملحدین کے لئے اس وقت ایک راستہ ایجاد کر دیا ہے کہ وہ تاویل کے حقائق اور قرآن کریم کے مناہج سے انحراف کرتے ہوئے قرآن کریم میں تحریف کرنے کے بارے کمزور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کا قصد وارادہ کریں۔ اور اسی سے وہ روایت ہے جو اسماعیل بن اسحاق القاضی نے ہمیں بیان کی کہ ہمیں سلیمان بن حرب نے حماد بن زید عن یزید بن حازم عن سلیمان بن یسار کی سند سے یہ خبر دی ہے کہ صبیغ بن عسل مدینہ طیبہ آیا اور وہ قرآن کریم کی متشابہ (آیات) اور دیگر اشیاء کے بارے سوال کرنے لگا تو اس کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے بلا بھیجا۔ پس اسے حاضر کیا گیا تو آپ نے اس کے لئے کھجور کے گچھوں کی جڑیں تیار کی ہوئی تھیں۔ پس جب وہ حاضر ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں عبداللہ صبیغ ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں عبداللہ عمر ہوں، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس جڑ کے ساتھ اس کے سر پر ضرب لگائی اور اسے زخمی کر دیا، پھر لگاتار اسے مارا یہاں تک کہ اس کا خون اس کے چہرے پر بہنے لگا، تو اس نے کہا: یہ کافی ہے اے امیر المومنین! قسم بخدا! جو میں اپنے سر میں پاتا تھا وہ نکل گیا ہے (1) اور اس کے ادب کے بارے میں روایات مختلف ہیں ان کا ذکر سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی طرف متوجہ کیا اور اسے اس کے دل میں ڈال دیا۔ پس اس نے توبہ کر لی اور اس کی توبہ انتہائی اچھی اور حسین تھی۔ اور ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ کا معنی ہے مومنین کے لئے التباس اور شبہات کو طلب کرنا تاکہ وہ ان کے درمیان فساد پیدا کر دیں اور وہ لوگوں کو اپنی کجی کی طرف لوٹا لائیں اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: ابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهٖ کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنے دوبارہ اٹھائے جانے اور زندہ کئے جانے کے بارے تاویل تلاش کی، تو اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرما دیا کہ اس کی اور اس کے وقت کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی جس دن وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا، قبروں سے اٹھایا جانا اور عذاب ...... يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ ...... یعنی انہوں نے تو اسے چھوڑ دیا ہے ...... قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (اعراف: 53) یعنی تحقیق ہم نے اس کی تاویل دیکھ لی جس کے بارے ہمیں رسل علیہم السلام نے آگاہ کیا تھا۔ فرمایا: پس وقف اس قول باری تعالیٰ پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوبارہ کب اٹھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** قولہ تعالیٰ: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ، کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت جن میں حیی بن اخطب بھی تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ پر الٓمّٓ نازل ہوئی ہے۔ پس اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں تو پھر آپ کی امت کی بادشاہی اکہتر برس ہوگی، کیونکہ حساب الجمل میں الف سے مراد ایک ہے، لام سے مراد تیس ہیں

1۔ سنن دارمی، کتاب مقدمہ باب، من هاب الفتیا و کرہ التنطع والبدع، جلد اول، حدیث نمبر 144 مکتبہ مدینہ منورہ

اور میم سے مراد چالیس ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ اور یہاں تاویل بمعنی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: تاویل هذه الكلمة على كذا (یعنی اس کلمہ کی تفسیر اس معنی پر ہے) اور یہ مايؤول الأمر اليه کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ (یعنی جس کی طرف امر لوٹتا ہے۔) اور اس کا اشتقاق آل الأمر إلى كذا يؤول اليه سے ہے یعنی بمعنی صار۔ اور اَوَّلْتُهٗ تَأْوِيْلًا بمعنی صَيَّرْتُهٗ ہے۔ (یعنی میں نے اس کی تاویل کی) اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف کی اور کہا: هو ابداء احتمال فی اللفظ مقصود بدليل خارج عنه۔ یعنی کسی لفظ میں مقصود احتمال کو خارجی دلیل کے ساتھ ظاہر کرنا۔ اور تفسیر سے مراد لفظ کا بیان اور اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔ اور تفسیر کی اصل فسر ہے اور اس کا معنی بیان ہے، کہا جاتا ہے: فسرت الشئ (بالتخفیف) أفسره (بالکسر) فسرا اور تاویل معنی کا بیان ہوتا ہے، جیسا کہ یہ قول لاشك فيه عند المومنين یعنی مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں یا چونکہ یہ فی نفسہ حق ہے لہٰذا اس کی ذات شک کو قبول نہیں کرتی۔ اور بلاشبہ شک کرنے والے کا وصف ہے اور جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دادا کے بارے میں اب (باپ) ہونے کا قول ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تاویل کی ہے: يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ ابتداء کلام ہے اور اس کا ماقبل سے تعلق منقطع ہے، یا یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور واؤ جمع کے لئے ہے۔ اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ ماقبل سے منقطع ہے اور یہ کہ قول باری تعالیٰ اِلَّا اللّٰهُ پر پہلا کلام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اور کئی دوسروں کا ہے، اور یہی امام کسائی، اخفش فراء اور ابو عبید وغیرہم کا مذہب ہے۔ ابونہیک اسدی نے کہا ہے: بے شک تم اس آیت کو ملاتے ہو حالانکہ یہ اس سے منقطع ہے۔ اور راسخین کے علم کی انتہا نہیں مگر ان کے اس قول پر اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اور اسی کی مثل حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے اور علامہ طبری نے اسی طرح یونس بن اشہب عن مالک بن انس سے بیان کیا ہے(1)۔ اور اس بنا پر يَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ کی خبر ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ کتاب جس کے ساتھ ایمان لانے اور جس کی تصدیق کرنے کا ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے اس کی آیات کی دو قسمیں بنا دی ہیں، ایک محکم اور دوسری متشابہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے قائل سے فرمایا: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا پس بتا دیا کہ کتاب میں متشابہ کو اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی اس کی تاویل کو نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کی تعریف بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ اور اگر ان کی طرف سے ایمان صحیح نہ ہوتا تو وہ اس پر تعریف کے مستحق نہ ہوتے۔ اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت میں وقف تام اس قول پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ اور جو اس کے بعد ہے وہ دوسرا نیا کلام ہے اور وہ یہ قول ہے: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

اٰمَنَّا بِهٖ اور یہی حضرات ابن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ روایت ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ کا اپنے ماقبل پر عطف نسق ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ بھی اس کا علم رکھتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بعض اہل لغت نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: اس کا معنی ہے والراسخون فی العلم یعلمونہ قائلین امنا (راسخون فی العلم اسے جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے) اور یہ گمان ہے کہ یَقُوْلُوْنَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور عام اہل لغت اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے بعید سمجھتے ہیں، کیونکہ عرب فعل اور مفعول کو اکٹھا مضمر نہیں کرتے اور حال مذکور نہیں ہوتا مگر تبھی جب فعل ظاہر ہو اور جب فعل ظاہر نہیں تو وہ حال نہیں ہو سکتا اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کہا جانا بھی جائز ہے۔ عبد الله راکباً، یعنی اقبل عبد الله راکباً۔ بلاشبہ فعل مذکور کے ساتھ یہ جائز ہوتا ہے جیسا کہ یہ قول: عبد الله یتکلم یصلح بین الناس (عبد اللہ کلام کر رہا ہے درآنحالیکہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرا رہا ہے۔) تو اس میں یصلح اس کے لئے حال ہے۔ اسی طرح شاعر کا قول ہے۔۔۔۔۔ ابوعمر نے یہ مجھے سنایا ہے اور اس نے کہا ہمیں ابوالعباس ثعلب نے سنایا ہے:

ارسلتُ فیھا قَطِمًا لُکَالِکَا یَقْصُر یَمْشِی ویطول بَارِکَا

بمعنی یقصر ماشیاً (یعنی یمشی حال واقع ہو رہا ہے۔) پس عام علماء کا قول علمائے نحو کے مذاہب کی تائید سے اکیلے حضرت مجاہد کے قول سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ بھی کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے کسی شے کی نفی کرے اور اسے اپنی ذات کے لئے ثابت کرے اور پھر اس میں کوئی اس کا شریک ہو۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں دیکھتے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔) اور یہ ارشاد: لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ (الاعراف: 187) (نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی) اور یہ ارشاد: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: 88) (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) پس یہ سب انہیں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنے سوا کسی کو اس میں شریک نہیں کیا۔ اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ اور اگر "والراسخون" واؤ عطف نسق کے لئے ہوتو پھر اس قول کا کوئی فائدہ نہیں كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ خطابی نے بیان کیا ہے انہوں نے حضرت مجاہد وغیرہ کے قول کے سبب نہیں کہا، تحقیق انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ اسم جلالت پر معطوف ہے اور وہ بھی متشابہ کا علم رکھنے میں شامل ہیں۔ اور بلاشبہ وہ اس کے بارے اپنے علم کے ساتھ ہی کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ (ہم اس کے ساتھ ایمان لائے)، اور ربیع، محمد بن جعفر بن زبیر اور قاسم بن محمد وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر یَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے (1)، جیسا کہ شاعر نے کہا:

الریح تبکی شجوھا والبرق یلمع فی الغمامہ (2)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 5

یہ شعر دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے، پس یہ بھی جائز ہے کہ والبرق مبتدا ہو، اور تاویل اول کی بنا پر یلمع خبر ہو اور یہ ماقبل سے منقطع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الریح پر معطوف ہو، اور یلمع دوسری تاویل کی بنا پر حال کے محل میں ہو بمعنی لامعا۔ اور یہ قول کرنے والوں نے بھی اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسوخ فی العلم کے ساتھ ان کی مدح کی، پس وہ کیسے ان کی مدح کر سکتا تھا جبکہ وہ جاہل اور ناواقف ہوتے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: أنا ممن یعلم تأویله (1) (میں بھی ان میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں) اور حضرت مجاہد نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: انا ممن یعلم تأویله۔ اسے ان سے امام الحرمین ابو المعالی نے بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بعض علماء نے اس قول کو پہلے قول کی طرف ہی لوٹایا ہے اور کہا ہے: کلام مکمل ہو رہا ہے عند اللہ پر اس کا معنی ہے یعنی متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم اس کے بعض کو جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ یہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (اور ان کا یہ علم) ان دلائل کے سبب ہے جو محکم آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور اسے اس کی قدرت دی گئی ہے جس نے اسے اس کی طرف لوٹایا ہے۔ پس جب انہوں نے بعض تاویل کو جان لیا اور بعض کو نہ جانا اور انہوں نے یہ کہا: ہم تمام کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے، اور ان مخفی چیزوں میں سے جو اس کی شرع صالح میں ہیں جنہیں ہمارا علم محیط نہیں تو ان کا علم ہمارے رب کے پاس ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے کہ راسخین پر بعض کی تفسیر مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نہیں جانتا الاواہ کیا ہے اور نہ جانتا ہوں کہ غسلین کیا ہے، تو کہا جائے گا: یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بعد اسے جان لیا اور اس کی تفسیر بیان فرمائی جس پر واقف ہوئے۔ اور اس سے زیادہ پختہ اور مضبوط جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وکل راسخ۔ کہ اس سے یہ ثابت ہو۔ پس جب ایک کو اس کا علم نہیں ہوا تو دوسرے نے اسے جان لیا۔ اور ابن فورک نے اسے ترجیح دی ہے کہ راسخون فی العلم تاویل جانتے ہیں اور انہوں نے اس میں خوب بیان کیا ہے (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے ہے۔ اللھم فقھه فی الدین وعلمه التاویل (3) (اے اللہ! اسے دین میں فقاہت عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما) وہ جسے تیرے لئے وہ بیان کرے، یعنی اسے اپنی کتاب کے معانی کا علم عطا فرما۔ اور اس بناء پر وقف وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ پر ہوگا۔ ہمارے شیخ ابو العباس احمد بن عمر نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ انہیں راسخین کا نام دینا اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس محکم سے زیادہ علم رکھتے ہیں جسے جاننے میں وہ تمام لوگ برابر ہوتے ہیں جو کلام عرب کو سمجھتے ہیں اور پھر کون سی شے میں ان کا رسوخ ہے جب وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا سب جانتے ہیں! لیکن متشابہ متنوع قسم ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے جسے یقیناً کوئی نہیں جانتا جیسا کہ روح اور قیامت کا علم کہ یہ ان میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم غیب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور اس کا علم کوئی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ

3۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد 14، صفحہ 435، دار الکتب المصریۃ۔ ایضاً، بخاری، کتاب الوضو، حدیث 140، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں حاصل کرسکتا نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور نہ کوئی اور۔ پس حذاق اور متبحر علماء میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ راسخین متشابہ کا علم نہیں رکھتے تو انہوں نے متشابہ کی اسی نوع کا ارادہ کیا ہے اور رہا وہ جسے وجوہ لغت پر اور کلام عرب کی طرز پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے تو اس میں تاویل کی جاسکتی ہے اور اس کی صحیح تاویل جانی جاسکتی ہے اور اس سے اسے زائل کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق غیر صحیح تاویل کے ساتھ ہو، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول: وَرُوْحٌ مِّنْهُ، الی غیر ذالک۔ پس کسی کو راسخ کا نام نہیں دیا جاسکتا مگر تبھی جب وہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) دی گئی قدرت و استطاعت کے مطابق اس نوع میں سے کثیر کا علم رکھتا ہو۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہ سے مراد منسوخ ہے تو اس قول کی بنا پر راسخین کو تاویل کے علم میں داخل کرنا صحیح ہے لیکن متشابہات کو اس نوع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے (1)۔

الرُّسُوْخ کا معنی ہے کسی شے میں ثابت ہونا۔ اور ہر ثابت راسخ ہوتا ہے۔ اور اجرام میں اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے پہاڑ اور درخت زمین میں راسخ کر دیئے (2)، شاعر نے کہا ہے:

لقد رَسَخَتْ فی الصدر منّی مودّۃٌ　　لِلَیلَیٰ ابَتْ آیاتھا أنْ تَغَیَّرا

میری طرف سے لیلیٰ کے لئے محبت سینے میں راسخ ہوگئی اس کی علامات نے انکار کر دیا کہ وہ متغیر ہوں۔

اور رسخ الایمان فی قلب فلان یَرْسَخُ رسوخاً۔ فلاں کے دل میں ایمان راسخ ہوگیا۔

اور بعض نے بیان کیا ہے: رسخ الغدیر: اس کا معنی ہے تالاب کا پانی بہہ پڑا۔ اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے پس یہ اضداد میں سے ہے۔

اور رَسَخَ و رَضَخَ و رَصَنَ و رَسَبَ تمام ثبت فیہ کے معنی میں ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راسخین فی العلم کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ وہ ہے جس کی قسم سچی ہو، اس کی زبان سچ بولے اور اس کا دل مستقیم اور سیدھا ہو۔'' ھو من برّت یمینہ و صدق لسانہ و استقام قلبہ (3) اور اگر کہا جائے: قرآن کریم میں متشابہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) تو اللہ تعالیٰ نے کیونکر تمام قرآن کو واضح نہیں بنایا؟ تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر اس میں حکمت علماء کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اگر سارا قرآن واضح ہوتا تو علماء میں سے بعض کی بعض پر فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اسی طرح وہ کرتا ہے جو کوئی شے تصنیف کرتا ہے کہ اس کے بعض مقامات کو واضح ذکر کرتا ہے اور بعض کو مشکل بنا دیتا ہے اور اس میں (علماء کی) جماعت کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ شے جسے پانا آسان ہو اس کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 9۔** قولہ تعالیٰ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اس میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کے محکم و متشابہ سبھی کی طرف لوٹ رہی ہے اور تقدیر عبارت ہے: کلہ من عند ربنا۔ اور لفظ کُلٌّ کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، صفحہ 404　　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 217

کیونکہ یہ لفظ اضافت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی صاحب عقل ہی یہ کہتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور جہاں وقف ہو وہاں وقف کرتا ہے اور متشابہ کی اتباع چھوڑ دیتا ہے۔ اور لُب کا معنی عقل ہے اور لُبّ کل شیٔ سے مراد ہر شے کا مغز اور اس کا خالص ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے عقل کو لب کہا گیا ہے اور اُولو، ذُو کی جمع ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

"اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے یقولون وہ کہتے ہیں۔ اور یہ راسخین کی جانب سے بطور حکایت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو قل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہئے) اور کہا جاتا ہے: ازاغۃ القلب (دل کو ٹیڑھا کرنے) سے مراد فساد برپا کرنا اور دین سے اعراض برتنا ہے۔ کیا وہ خوفزدہ ہو رہے تھے حالانکہ انہیں ہدایت دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں فساد کی طرف منتقل کر دے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی فرما دی تو وہ یہ التجا کرنے لگے کہ وہ انہیں اعمال میں سے کسی ایسے عمل کے ساتھ نہ آزمائے جو ان پر ثقیل اور بھاری ہو اور وہ اس سے عاجز آ جائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِكُمْ (النساء:66) (اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کر وا اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے اپنے گھروں سے۔)

ابن کسان نے کہا ہے: انہوں نے التجا کی کہ وہ ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دے، جیسے یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف:5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) یعنی تو ہمیں اپنی ہدایت پر ثابت قدم رکھ جب تو نے ہمیں ہدایت عطا فرما دی ہے اور یہ کہ ہم ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ ہم مستحق بن جائیں کہ تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ماقبل کلام سے منقطع ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اہل الزیغ (ٹیڑھا ہونے والے) کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے اسے لائے کہ اس کے ساتھ اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ سے مانگنے کی دعا سکھائی کہ وہ اس برے گروہ میں سے نہ ہو جائیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور وہ اہل زیغ ہیں۔

اور الموطا میں حضرت ابو عبد اللہ الصنابحی سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور مغرب کی نماز آپ کے پیچھے ادا کی، تو آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قصار مفصل میں سے ایک سورت کی قرأت کی، پھر جب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے اتنا قریب تھا کہ میرے کپڑے آپ کے کپڑوں کے ساتھ مس کرنے کے قریب ہو گئے، تو میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ یہ

آیت رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا الآیہ پڑھتے ہوئے سنا (1)۔ علماء نے کہا ہے: آپ کا یہ آیت پڑھنا قنوت اور دعا کی ایک قسم ہے کیونکہ آپ کے دور میں مرتدین کا معاملہ (خاصا پریشان کن) تھا۔ اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک مغرب کی نماز میں قنوت پڑھنا جائز ہے اور ہر نماز میں بھی جب مسلمانوں پر ایسا شدید امر چھا جائے جو انہیں خوفزدہ اور مضطرب کر دے اور وہ اس سے اپنے آپ پر خوف محسوس کرنے لگیں۔

اور ترمذی نے شہر بن حوشب کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کہا: اے ام المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کون سی دعا مانگا کرتے تھے جب آپ کے پاس ہوتے؟ تو انہوں نے بیان فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ ہوتی یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك (اے دلوں کو بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) تو میں عرض کرتی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اکثر یہ دعا مانگتے ہیں یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك! تو آپ نے فرمایا: یا أُمّ سلمة انه ليس آدمی الاو قلبه بين اصبعين من أصابع الله فمن شاء اقام و من شاء أزاغ (اے ام سلمہ! بے شک کوئی آدمی نہیں مگر اس کا دل رب العالمین کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے پس وہ جسے چاہے اسے سیدھا رکھے اور جسے چاہے ٹیڑھا کر دے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ آیت معتزلہ کے اس قول میں ان کے خلاف حجت ہے: بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر دلوں کو ٹیڑھا کرنا اس کی جانب سے نہ ہو تو پھر یہ جائز نہیں کہ اسے دور کرنے کے بارے دعا، اس سے کی جائے جس پر اس کا کرنا جائز ہی نہیں ہوتا۔

ابو واقد الجراح نے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا فعل کی نسبت قلوب کی طرف کرتے ہوئے قرأت کی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف انتہائی رغبت اور میلان ہے اور دونوں قرأتوں پر آیت کا معنی یہ ہے کہ تیری جانب سے زیغ (ٹیڑھاپن) کو دلوں میں پیدا کرنا نہ ہو کہ وہ ٹیڑھے ہو جائیں (3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اپنے پاس سے اور اپنی جانب سے فضل و رحمت عطا فرما نہ کہ ہمارے کسی سبب سے اور نہ عمل سے۔ اس میں تابعداری اور عجز و انکساری کا اظہار ہے (4)۔ اور لَدُنْ میں چار لغتیں ہیں۔ ایک لَدُنْ یعنی لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کی جزم کے ساتھ۔ اور یہی زیادہ فصیح ہے۔ اور دوسری لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کے حذف کے ساتھ (یعنی لَدُ)، اور تیسری لام کے ضمہ، دال کی جزم اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لُدْنَ) اور چوتھی لام کے فتحہ، دال کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لَدْنَ)

شاید جاہل متصوفہ اور زنادقہ باطنیہ اس آیت اور اس کی مثل آیات سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: علم تو وہی ہے جو بغیر کسب کے ابتداءً اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور کتابوں اور اوراق میں دیکھنا تو حجاب ہے۔ یہ (نظریہ) مردود ہے اس کا بیان

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 63، وزارت تعلیم، اسلام آباد
2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 190
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

اپنے محل میں آئے گا۔

اور آیت کا معنی ہے: ہمیں رحمت سے صادر ہونے والی نعمتیں عطا فرما، کیونکہ رحمت صفت ذات کی طرف راجع ہے اور اس میں ہبہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَهَبَ يَهَبُ، یہ اصل میں يَوْهِبُ ھا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ يَوْهَبُ ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے تو اس نے خطا اور غلطی کی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا جیسے اس نے کہا ہے تو پھر واؤ حذف نہ ہوتی، جیسا کہ يَوْجَلُ میں حذف نہیں ہوئی۔ بلاشبہ واؤ کسرہ اور یا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دی گئی پھر اس کے حذف کے بعد کسرہ کو فتحہ میں بدل دیا گیا کیونکہ اس میں ھا حروف حلقی میں سے ایک ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

''اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لئے نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدہ سے۔''

یعنی تو لوگوں کے متفرق ہونے کے بعد انہیں اٹھانے والا اور انہیں لانے والا ہے اور اس میں قیامت کے دن کے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہی وہ تاویل ہے جس کا علم راسخین فی العلم کو ہوا اور انہوں نے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اختلاف کیا جنہوں نے اس کی اتباع کی جو ان پر دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملہ میں متشابہ ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اور الرَّيْبُ کا معنی شک ہے (2) اور اس کے محامل (محمول ہونے کے محل) سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں، اور میعاد مفعال کے وزن پر الوعد سے ماخوذ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اور وہی (بدبخت) ایندھن ہیں آگ کا۔''

اس کا معنی بین اور واضح ہے۔ یعنی ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کوئی شے ہرگز ان سے دور نہ کر سکیں گے۔ اور سلمی نے لن يُغْنِي یاء کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔ اس لئے کہ فعل متقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے اور حسن نے يُغْنِيْ باء کے ساتھ قرأت کی ہے مگر آخری یاء کو تخفیف کے لئے ساکن دیا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كفى باليأس من اسماء كافي	وليس لسقمها اذ طال شافي

اس میں حق یہ تھا کہ وہ کافیا کہتا۔ پس اس نے یا کو چھوڑ دیا۔

اور اسی کی مثل فرا نے شعر کہا ہے:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

كَاَنَّ اَيدِيهِنَّ بِالقَاعِ القَرِقِ أَيدِي جَوَارٍ يَتَعَاطَيْنَ الوَرِقَ

القَرِقُ اور القَرِقَةَ القاع میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنَ اللهِ میں مِنْ بمعنی عند ہے، ابوعبید نے یہی کہا ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ، الوقود یہ جلنے والی لکڑی کا اسم ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرف نے وُقُود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے حطب وُقود النار۔ (1) اور عرب کلام میں یہ جائز ہے کہ جب واؤ مضموم ہو تو اسے ہمزہ سے بدل دیا جائے لہٰذا اُقُود پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اُقِتَتْ۔

اور وُقُود واؤ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے اور وَقَدَت النار تقد کہا جاتا ہے جب آگ بھڑک اٹھے۔ ابن مبارک نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کو عبور کر لے گا اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کرتے ہوئے) گھوڑے سمندروں میں ڈال دیئے جائیں گے، پھر کچھ قومیں آئیں گی وہ قرآن کریم پڑھیں گے اور جب وہ اسے پڑھیں گے تو کہیں گے: کون ہم سے بڑھ کر قاری ہے اور کون ہم سے بڑھ کر عالم ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں کوئی خیر اور بھلائی دیکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''وہ تم میں سے ہوں گے اور وہ اس امت میں سے ہوں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہوں گے (2)''۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

''(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

الدأب کا معنی عادت اور طریقہ ہے۔ اور دأب الرجل فی عملہ یدأب دأبا و دؤبا کہا جاتا ہے جب وہ اپنے کام میں کوشش کرے اور خوب محنت کرے اور أدأبتہ أنا اور أدأب بعیرہ جب وہ اونٹ کو چلانے میں خوب تھکا دے۔ اور الدائبان سے مراد رات اور دن ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے یعقوب کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کَدَأَبِ کہ یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور انہوں نے مجھے کہا درآنحالیکہ میں نوجوانی کی حالت میں تھا۔ کون سی شے پر کَدَأَب جائز ہو سکتا ہے؟ تو میں نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ دَئِبَ یَدْأَب دَأَباً سے ہے۔ تو انہوں نے میری بات کو قبول کر لیا اور میرے چھوٹا ہونے کے باوجود میری عمدہ وضاحت پر اظہار تعجب و مسرت کیا اور میں نہیں جانتا کیا یہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نحاس نے کہا ہے: یہ قول غلط ہے، بالیقین دَئِبَ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ کہا جائے گا دَأَبَ یَدْأَب دُؤُباً [ودَأْباً]، اسی طرح نحویوں نے بھی بیان کیا ہے، ان میں سے امام فراء نے اسے کتاب المصادر میں بیان کیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ 2۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 212، حدیث نمبر 29121

کَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الحُوَيرِثِ قَبْلَهَا وجارتِهَا أُمِّ الرَّبَابِ بمَأْسَلِ

پس رہا الدأب تو یہ کہنا جائز ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شَعْرٌ و شَعَرٌ، نَهْرٌ و نَهَرٌ کیونکہ اس میں حروف حلقی میں سے ایک حرف ہے، البتہ الکاف میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے: یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام ہے دَأْبُهُمْ کَدَأْبِ آلِ فرعون، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفار کا رویہ اسی طرح ہے جیسے آل فرعون کا رویہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اور فراء کا خیال ہے کہ معنی یہ ہے: عرب آل فرعون کے کفر کی طرح کافر ہو گئے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: یہ جائز نہیں کہ کاف کفروا کے متعلق ہو، کیونکہ کفروا صلہ میں داخل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اَخَذَهُمُ اللّٰهُ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں شدید پکڑ لیا جیسا کہ اس نے آل فرعون کو پکڑا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس ارشاد کے متعلق ہے: لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ یعنی انہیں دولت نے کوئی فائدہ نہ دیا جیسا کہ آل فرعون کو ان کے مال اور اولاد نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور یہ ان کے لئے جواب ہے جو جہاد سے پیچھے رہ گئے۔ اور انہوں نے کہا: ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں لفظ وقود سے مقدر شدہ کوئی فعل عامل ہو۔ اور تشبیہ نفس احتراق (جلنے) میں ہو۔ اور اس معنی کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (المومن) (اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہو گی (حکم ہو گا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

پہلا قول ارجح ہے(1) اور علماء میں سے کئی ایک نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ کا معنی ہے جیسا کہ آل فرعون کی عادت اور رویہ تھا، وہ کہہ رہے ہیں: ان کافروں کا الحاد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اسی طرح ہے جیسا کہ آل فرعون نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اپنایا اور کہا: یہ معنی ازہری نے بیان کیا ہے۔ اور رہا وہ قول جو سورۃ الانفال میں ہے كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں قتل اور قید کی سزا دی گئی جیسا کہ آل فرعون کو غرق اور ہلاکت کی سزا دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: بِاٰيٰتِنَا یہ احتمال رکھتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جن کی تلاوت کی گئی ہے (یعنی آیات متلوہ) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جو وحدانیت پر بطور دلیل بیان کی گئی ہیں۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ

كَفَرُوْا سے مراد یہودی ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: جب رسول اللہ ﷺ نے میدان بدر میں قریش کو شکست سے دو چار کیا (اور فتح و کامرانی کے ساتھ) مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا: ''اے گروہ یہود! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کی مثل عذاب سے جو اس نے بدر کے دن قریش پر نازل کیا قبل اس کے کہ وہ تم پر بھی وہی نازل کرے جو ان پر نازل کیا۔ تحقیق تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا نبی ہوں تم اسے اپنی کتاب میں بھی پاتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد بھی لے رکھا ہے۔'' تو انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) تجھے یہ بات دھوکہ نہ دے کہ تو نے ان لوگوں کو قتل کیا جو ناتجربہ کار تھے وہ فنون جنگ سے ناواقف تھے، پس تم نے ان میں (قتل و غارت) کا موقع پالیا! قسم بخدا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ چھیڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے (بہادر اور تجربہ کار) لوگ ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ تا کے ساتھ اور مراد یہود ہیں یعنی تمہیں شکست فاش سے دو چار کر دیا جائے گا۔ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (1)۔ اور آپ ہی سے ابو صالح کی روایت میں ہے کہ یہودی جب خوش ہوئے اس تکلیف اور اذیت سے جس سے مسلمان غزوہ احد کے دن دو چار ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر سَيُغْلَبُوْنَ یا کے ساتھ، مراد قریش ہیں وَيُحْشَرُوْنَ یا کے ساتھ یعنی دونوں لفظ یا کے ساتھ ہیں اور یہ حضرت نافع کی قرأت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَبِئْسَ الْمِهَادُ مراد جہنم ہے یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے برا ہے وہ جو انہوں نے اپنے لئے ٹھکانا بنایا، تو گویا معنی یہ ہوا: ان کا وہ فعل بہت برا ہے جس نے انہیں جہنم تک پہنچا دیا (2)۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

''بے شک تھا تمہارے لئے (عبرت کا) نشان (ان) دو گروہوں میں جو ملے تھے (میدان بدر میں) ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ، اٰيَةٌ کا معنی علامت ہے۔ اور یہاں كَانَ فرمایا كانت نہیں فرمایا، کیونکہ اٰيَةٌ کی تانیث غیر حقیقی ہے اور کہا گیا ہے: اسے بیان کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ یعنی قد كان لكم بيان (بے شک تمہارے لئے بیان اور وضاحت تھی)

---

1۔ اسباب النزول للنیشاپوری، جلد 1، صفحہ 62۔ ایضاً، ابی داؤد، باب کان اخراج الیہود من المدینہ، حدیث 2607، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 406، دار الکتب العلمیہ

تو اس میں معنی کو اپنایا گیا ہے اور لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہے: جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

بَرَهْرَهَةٌ رُؤْدَةٌ رَخْصَةٌ كَخُرْعُوبَةِ البَانَةِ الْمُنْفَطِرِ

اور اس میں المنفطرۃ نہیں کہا، کیونکہ انہوں نے قضیب کے معنی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اسے مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان صفت سے فاصلہ کیا گیا ہے اور جب اسم اور فعل کے درمیان صفت حائل ہو گئی تو فعل مذکر لایا گیا۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں اس قول کے تحت گزر چکا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ ۨا ۚ الْوَصِيَّةُ (البقرہ:180) (فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے) فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کے دو گروہ جو بدر کے دن ملے تھے۔ فِئَةٌ جمہور نے فِئَةٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی احدا هما فِئَةٌ۔

اور حسن اور مجاہد نے فِئَةٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے وَاُخْرٰی كَافِرَةٍ کو بدل ہونے کی بنا پر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی عبلہ نے دونوں میں نصب پڑھی ہے (1)۔

احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھنا جائز ہے، یعنی التقتا مختلفتین مؤمنةً و كافرةً۔ زجاج نے کہا ہے: نصب پڑھی گئی ہے بمعنی اعنی۔ اور لوگوں کی جماعت کو فئة کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے شدت اور تکلیف کے وقت۔

اور زجاج نے کہا ہے: الفئة کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے اور یہ فَأَوْتُ رَأْسَهُ بالسیف سے ماخوذ ہے۔ (یعنی میں نے تلوار کے ساتھ اس کا سر جدا کر دیا۔) اور کہا جاتا ہے: فأيته۔ (یہ تب کہے گا) جب تو اسے پھاڑ دے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں سے اشارہ ان کی طرف ہے جو غزوہ بدر کے دن ملے تھے (2)۔ اور اس کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے۔

پس کہا گیا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مومنوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ خطاب تمام کفار کو کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور ان میں سے ہر احتمال کے مطابق قوم نے قول کیا ہے (3)۔ اور مومنین کو خطاب کا فائدہ نفوس کو ثابت قدم رکھنا اور انہیں تشجیع دلانا ہے یہاں تک کہ وہ دو چند اور کئی چند ہو کر آگے بڑھے، جیسا کہ واقع ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ابوعلی نے کہا ہے: اس آیت میں رؤیت سے مراد آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے (4)۔ مکی اور مہدوی نے کہا ہے: اس پر رَاْيَ الْعَيْنِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور نافع نے تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، صفحہ 407
3۔ ایضاً، صفحہ 406
4۔ ایضاً، صفحہ 407

نے یا کے ساتھ۔ مِّثْلَيْهِمْ کو تَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم سے حال ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور جمہور لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ترون کا فاعل مومنین ہیں۔ اور اس کے ساتھ ضمیر متصل کفار کے لئے ہے(1)۔

اور ابو بکر نے اس کا انکار کیا ہے کہ اسے ترونھم تا کے ساتھ پڑھا جائے۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور اگر اس طرح ہوتا تو پھر مِثْلَيْكُمْ ہوتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ لازم نہیں آتا، لیکن یہ جائز ہے کہ وہ مثلی اصحابکم ہو۔ مکی نے کہا ہے: تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ لَكُمْ میں خطاب کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہو۔ اور ھا اور میم (ھم) مشرکین کے لئے ہو۔ اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مثلیکم کاف کے ساتھ پڑھیں اور یہ خط کی مخالفت کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن یہ کہ کلام خطاب سے غیب کی طرف نکلنے پر واقع ہو، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ اور یہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ پس پہلے خطاب کیا پھر فرمایا: فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: 39) اور غیب کی طرف رجوع کیا۔

پس مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین کے لئے ہو، یعنی اے مسلمانو! تم مشرکوں کو دو چند دیکھ رہے تھے اس تعداد سے جس پر وہ تھے اور معنوی طور پر یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکوں کو زیادہ نہیں کیا، بلکہ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے انہیں مومنین کی نگاہوں میں کم کر دیا، پس معنی یہ ہوگا: اے مومنین! تم مشرکوں کو تعداد میں اپنے سے دو چند دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، پس اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مسلمانوں کی نظروں سے کم کر دیا اور انہیں اپنی تعداد سے دوگنا مشرکین دکھائے تا کہ ان کے دل قوی اور مضبوط ہو جائیں اور ان میں جرأت و دلیری آجائے۔ اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان میں سے سو افراد دو سو کافروں پر غالب آجائیں گے۔ اور مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کر دیا تا کہ وہ ان پر حملے کی جرأت کریں اور پھر ان میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نافذ ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مِّثْلَيْهِمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہو یعنی اے مسلمانو! تم مسلمانوں کو اس تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے جس پر تم تھے۔ یعنی تم اپنے آپ کو اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا اس لئے کیا تا کہ ان کے نفوس مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے قوی اور طاقتور ہو جائیں۔ پہلی تاویل اولیٰ اور ارجح ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا (الانفال: 43) (یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل)

اور یہ ارشاد: وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا (الانفال: 44) (اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے اپنے پہلو میں ایک آدمی کو کہا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: میں انہیں سو گمان کر رہا ہوں۔ پس جب ہم نے قیدیوں کو پکڑا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہزار تھے (2)۔ اور علامہ طبری نے ایک قول سے بیان کیا ہے کہ انہوں

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظروں میں مومنین کی تعداد کو زیادہ کر دیا یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک ان سے دوگنا تھے۔ اور طبری نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی طرح کئی جہتوں سے یہ مردود ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مومنوں کی نگاہوں میں کم کر دیا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے (1)۔ اور اس تاویل کی بنا پر، ہوتو ترون کافروں کے لئے ہو گا یعنی اے کافرو! تم مومنوں کو ان کی اصلی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم انہیں اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فراء نے گمان کیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم انہیں دوگنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ تین گنا تھے۔ اور یہ بعید ہے لغت میں غیر معروف ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ باب الغلط ہے۔ اس میں غلطی تمام قیاسوں میں ہے، کیونکہ ہم کسی شے کی مثل کو اس کا مساوی سمجھتے ہیں اور ہم اس کی دو مثل اسے سمجھتے ہیں جو دو بار اس کے مساوی ہوتی ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: فراء نے اس کا قول بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: جیسا کہ تو کہتا ہے اور تیرے پاس غلام ہو کہ میں اس کی مثل کا محتاج ہوں۔ پس تو اس کا اور اس کی مثل کا محتاج ہو گا۔ اور تو یہ کہے: میں اس کی دو مثل کا محتاج ہوں، تو تو تین گنا کا محتاج ہو گا اور معنی اور لغت اس کے خلاف ہے جو اس نے کہا۔

اور وہ جو فراء نے اس میں بیان کیا ہے کہ مشرکین غزوۂ بدر کے دن مومنین سے تین گناہ تھے۔ پس اسے یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہوں مگر ان کی اسی تعداد پر (جس پر وہ تھے) اور یہ بعید ہے اور معنی اس کے مطابق نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو اعتبار سے ان کی تعداد بدل کر دکھائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اس میں نفع اور فائدہ دیکھا، کیونکہ مومنین کے دل اس کے ساتھ قوی ہو جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامت و نشانی ہو جائے۔ اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہی یا کی قرأت تو ابن کیسان نے کہا ہے: یَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم (یعنی ھم ضمیر) وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مِثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پر عائد ہے اور اضمار میں سے یہ وہ ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ کافر دکھائی دینے میں مسلمانوں کی دو مثل تھے حالانکہ تعداد میں وہ تین مثل تھے، فرمایا یہاں رؤیت یہود کے لئے ہے اور مکی نے کہا ہے: یہاں رؤیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والے گروہ کے لئے ہے اور جس کو دیکھا گیا وہ کافروں کا گروہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا گروہ کافروں کے گروہ کو مومنین کے گروہ کا دوگنا دیکھ رہا تھا حالانکہ کافروں کا گروہ مومنین سے تین گناہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نظروں میں کم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور لَكُمْ میں خطاب یہودیوں کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہم نے تَرَوْنَهُمْ تا کو ضمہ کے ساتھ اور سلمی نے تا مضمومہ کے ساتھ فعل مجہول کی بنا پر پڑھا ہے (2)۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، صفحہ 406

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

''آراستہ کی گئی لوگوں کے لئے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: زُيِّنَ لِلنَّاسِ زُيِّنَ تزیین سے ہے۔ اور آراستہ کرنے والے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے آراستہ کیا ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول کا ظاہر معنی یہی ہے، اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (الکہف: 7) (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت)

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے رب! اس وقت تو نے اسے ہمارے لئے آراستہ کیا ہے! پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (آل عمران: 15) (آپ فرمایئے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آراستہ کرنے والا شیطان ہے اور حضرت حسن کے قول کا ظاہر یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: کس نے اسے آراستہ کیا ہے؟ اس کے خالق سے زیادہ شدید اس کی مذمت کرنے والا کوئی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی تزیین یہ ہے کہ اس نے اسے ایجاد کیا اور نفع کے لئے اسے تیار کیا اور ان اشیاء کی طرف میلان فطرت میں رکھ دیا۔ اور شیطان کی تزیین یہ ہے کہ اس نے وسوسہ اندازی کی، دھوکے میں مبتلا کیا اور بغیر اسباب کے انہیں لینے کو حسین قرار دیا۔ اور آیت دونوں وجہوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں تمام لوگوں کے لئے وعظ و نصیحت ہے اور اس کے ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر یہود وغیرہ کے لئے زجر و توبیخ ہے (1)۔ جمہور نے مفعول کا فعل ہونے کی بنا پر زُيِّنَ (یعنی مجہول) پڑھا ہے۔ اور حُبُّ کو رفع دیا ہے۔ اور حضرت ضحاک اور مجاہد نے فاعل کا فعل ہونے کی بنا پر زَيَّنَ (یعنی معروف) پڑھا ہے اور حُبَّ کو نصب دی ہے (2)۔ اور الشهوات میں اسم اور صفت میں فرق کرنے کے لئے ہا کو حرکت دی گئی ہے۔ اور الشَّهَوَات شَهْوَةٌ کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔ اور آدمی کسی شے کی خواہش رکھنے والا ہوتا ہے، (کہا جاتا ہے رجل شھوان للشئ) اور شے کی خواہش رکھی جاتی ہے (لہذا کہا جاتا ہے شئ شھی ای مشتھی)، اور شہوات (خواہشات) کی اتباع و پیروی سرکش بنا دیتی ہے اور ان کی اطاعت اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''جنت کا احاطہ مصائب و مکروہات سے کیا گیا ہے اور جہنم کا احاطہ خواہشات سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

کیا گیا ہے'' اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے (1)۔ اور اس تمثیل کا فائدہ یہ ہے کہ جنت حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تبھی جب مصائب و مکروہات کے جنگل کو کاٹ دیا جائے اور ان پر صبر کیا جائے اور جہنم سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تب جب شہوات کو چھوڑ دیا جائے اور نفس کو ان سے چھٹکارا دلا دیا جائے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جنت کا راستہ ٹیلوں کے سبب کٹھن اور دشوار ہے اور جہنم کا راستہ نرم ہموار زمین ہونے کے سبب سہل ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی یہی ہے: حفت الجنة بالمکارہ و حفت النار بالشھوات (2) یعنی جنت کا راستہ مشکل ہے کیونکہ اس میں چلنے کے لئے کئی ٹیلوں سے اوپر چڑھنا پڑھتا ہے، اور جہنم کا راستہ آسان ہے اس میں نہ کوئی ناہمواری ہے اور نہ دشوار گزاری۔ اور یہی معنی اس قول کا ہے سھل بسھوۃ اور یہ لفظ سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: مِنَ النِّسَآءِ ان کی عادت اور رویہ کی وجہ سے لوگوں کا کثرت سے ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا جال (پھندا) اور مردوں کے لئے فتنہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی شدید فتنہ نہیں چھوڑا (3)'' اسے بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔ پس عورتوں کا فتنہ تمام اشیاء سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کہا جاتا ہے: عورتوں میں دو فتنے ہیں اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔ پس وہ دو جو عورتوں میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطع رحمی تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماؤں اور بہنوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ آدمی کو حلال و حرام مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور رہے بیٹے! تو ان میں صرف ایک فتنہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان کے لئے مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تُسکنوا نسآء کم الغرف ولا تعلموھن الکتاب (4) (تم اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں سکونت نہ دو اور تم انہیں لکھنا نہ سکھاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ڈرایا (اور محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔) کیونکہ ان کے لئے بالا خانوں میں سکونت اختیار کرنے میں مردوں کی طرف دیکھنا (آسان) ہے۔ اور اس میں ان کے لئے نہ حفاظت ہے اور نہ پردہ۔ کیونکہ وہ مردوں پر جھانکتی رہیں گی نتیجتاً فتنہ اور آزمائش کھڑی ہو جائے گی اور کیونکہ یہ مرد سے پیدا کی گئی ہیں، لہٰذا ان کی خواہش اور قصد مرد کی جانب ہوتی ہے۔ اور مرد میں شہوت پیدا کر دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے لئے باعث راحت و تسکین بنا دیا گیا ہے، پس دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں اور انہیں لکھنے کی تعلیم دینے میں یہ فتنہ بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمھا واھلھا، جلد 2، صفحہ 378

2۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب حجبت النار بالشھوات، حدیث نمبر 6006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب مایتقی من شوم المرأۃ، حدیث 4706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 380، حدیث نمبر 44999

اور کتاب الشہاب میں حضور نبی مکرم ﷺ سے حدیث موجود ہے: اُعْرُوا النساء یَلْزَمْن الحجالَ (1) (تم عورتوں کو چھوڑ دو وہ اپنے خاص کمروں کو لازم پکڑے رکھیں گی) پس آدمی پر لازم ہے جب وہ ان زمانوں میں صبر نہ کر سکے تو وہ کسی دیندار عورت کو تلاش کرے تاکہ وہ اپنے دین کو محفوظ رکھ سکے، حضور ﷺ نے فرمایا علیک بذات الدین تَرِبَتْ یداك (2) (تجھ پر کسی دیندار عورت کو تلاش کرنا لازم ہے تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں) اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا تزوجوا النساء لحسنهن فعسی حسنهن ان یُردیهن ولا تزوجوهن لا موالهن فعسی اموالهن ان تطغیهن ولكن تزوجوهن على الدين ولامة سوداء خرماء ذات دين افضل (3) (تم عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کا حسن انہیں ہلاک کر دے، اور تم ان کے مالوں کی وجہ سے ان سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کے مال انہیں سرکش بنا دیں البتہ تم دین کی بنا پر ان سے شادی کرو اور سیاہ رنگ چھیدے ہوئے کانوں (اور کٹی ہوئی ناک) والی دیندار کنیز افضل ہے۔)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْبَنِيْنَ اس کا عطف اپنے ماقبل پر ہے اور بنین کا واحد اِبْنٌ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ (بے شک میرا بیٹا میری اہل میں سے ہے۔) اور اس کی تصغیر بُنَیٌّ ہے۔ جیسا کہ لقمان نے کہا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کیا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے تیری کوئی اولاد ہے''؟ انہوں نے عرض کی: جی ہاں، میرا اس سے ایک بیٹا ہے اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس کے لئے میرے پاس طعام کا ایک کنواں ہو اور بنی جبلہ کا جو فرد بھی باقی رہے وہ اسے کھلاتا رہے تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو نے ایسا کیا ہے تو بلاشبہ وہ (بیٹے) دلوں کی الفت اور راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بزدل بنا دینے والے، بخیل بنا دینے والے اور غمزدہ کر دینے والے ہیں۔ لئن قلت ذالك انهم لثمر القلوب و قرة الاعين و انهم مع ذالك لمجبنة مبخلة محزنة۔ (4)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْقَنَاطِيْرِ، القناطیر قنطار کی جمع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَآتیتم احدهن قنطارا۔ اور اس سے مراد مال کی بہت بڑی گانٹھ ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پیمانے کا نام ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، جیسا کہ رطل اور ربع وغیرہ۔ اور جو شی اس خاص وزن تک پہنچ جائے اس کے لئے کہا جاتا ہے: هذا قنطار یعنی یہ قنطار کے مساوی اور برابر ہے۔ اور عرب کہتے ہیں: قنطر الرجل۔ جب اس کا مال اس حد کو پہنچ جائے کہ قنطار کے ساتھ وہ اس کا وزن کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القنطار ماخوذ ہے عقد الشیٔ و احکامه (6) سے (یعنی کسی شے کو باندھنا اور اسے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 374، حدیث نمبر 44962

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 474۔ ایضاً صحیح بخاری، الاکفاء فی الدین، حدیث 4700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 135۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث 1848، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 211 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ 6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 409

مضبوط کرنا، عرب کہتے ہیں: قنطرت الشئ۔ جب تو اسے خوب پختہ اور مضبوط کر دے اور اسی سے القنطرہ ہے کہ اس کے پختہ ہونے کی وجہ سے اس کا نام قنطرہ رکھا گیا ہے جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے:

كَقَنْطَرَةِ الرُّومِيِّ اقسم ربُّها　　لَتُكْتَنَفَنْ حتّى تُشَادُ بِقَرْمَدِ

اور القنطرہ سے مراد وہ شے ہے جس کا عقد کیا جائے تو گویا قنطار مال کا عقد کرنا ہے (1) اور علماء نے اس کی حد بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کتنی ہے، اس کے بارے متعدد اقوال ہیں۔ سو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایک قنطار ایک ہزار دو سو اوقیہ کا ہے۔'' اور اسی کے مطابق حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور علماء کی ایک جماعت نے قول کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے: لیکن شہروں میں اوقیہ کی مقدار مختلف ہونے کے سبب قنطار بھی مختلف ہوتا ہے (2)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے، اسے البستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے اور ایک اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ زمین و آسمان کے مابین ہے (3)''۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے اور مسند ابی محمد الدارمی میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ''جس نے ایک رات میں دس آیات پڑھیں اسے ذاکرین میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے سو آیات پڑھیں اسے قانتین (بندگی پر قائم و دائم رہنے والے) میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے پانچ سو سے ہزار آیات تک پڑھیں تو وہ صبح اس حال میں کرے گا کہ اس کے لئے ایک قنطار اجر ہو گا۔'' عرض کی گئی: قنطار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ملْءُ مَسْكِ ثَوْرٍ ذَهَبًا (مشکیزہ سونے سے بھرا ہوا ہو۔)

یہ روایت موقوف ہے اور ابو نضرۃ العبدی نے یہی کہا ہے اور ابن سیدہ نے بیان کیا ہے: یہ سریانی زبان میں اسی طرح ہے اور نقاش نے ابن کلبی سے بیان کیا ہے کہ یہ لغت روم کے مطابق بھی اسی طرح ہے (4) اور حضرت ابن عباس، حضرت ضحاک اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: قنطار کی مقدار، بارہ سو مثقال چاندی ہے، اسے حسن نے مرفوع ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: چاندی کے بارہ ہزار درہم اور سونے میں سے ایک ہزار دینار مسلم آدمی کی دیت ہے۔ اور حسن اور ضحاک سے یہی مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی ہزار ہیں۔ حضرت قتادہ نے کہا: سونے کے ایک سو رطل یا چاندی کے اسی ہزار درہم (5) اور ابو حمزہ الثمالی نے بیان کیا ہے: افریقہ اور اندلس میں ایک قنطار سے مراد آٹھ ہزار مثقال سونا یا چاندی ہے۔ سدی نے کہا ہے: چار ہزار مثقال کا ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: ستر ہزار مثقال کا۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (6) اور مکی نے ایک قول بیان کیا ہے کہ ایک قنطار چالیس اوقیہ سونا یا چاندی ہے، اور یہی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 268۔ ایضاً مسند امام احمد حدیث 8758

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408-409، دار الکتب العلمیہ　　5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408　　6۔ ایضاً

ابن سیدہ نے المحکم میں بیان کیا ہے اور کہا ہے: لغت بربر کے مطابق ایک قنطار ہزار مثقال کا ہے اور ربیع بن انس نے کہا ہے: قنطار سے مراد مال کثیر ہے جو بعض بعض پر پڑا ہو (1)۔

اور عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے۔ اور اسی کے مطابق یہ ارشاد ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا (النساء: 20) یعنی تم نے ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: ''بے شک صفوان بن امیہ زمانہ جاہلیت میں ایک قنطار کو پہنچ گیا اور اس کا باپ بھی قنطار کو پہنچ گیا۔'' یعنی اس کا مال قنطار ہو گیا۔ اور حکم سے روایت ہے: قنطار وہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ اور الْمُقَنْطَرَةِ کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس طبری وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الْمُضَعَّفَه (دو چند کیا ہوا) گویا قناطیر سے مراد تین قنطار اور مقنطرہ سے مراد نو ہیں (2)۔ اور فراء سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: قناطیر قنطار کی جمع ہے اور مقنطرۃ جمع الجمع ہے۔ پس وہ نو قنطار ہو جائیں گے۔ سدی نے کہا ہے: مقنطرۃ سے مراد ڈھالا ہوا سونا یا چاندی ہے یہاں تک کہ دنانیر یا دراہم ہو جائے۔ مکی نے کہا ہے: یہ المقنطرۃ المکملۃ (یعنی جمع کئے ہوئے خزانے (3) ''مکمل قنطار'')۔ اور اسے ہروی نے بیان کیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بِدَرٌ مُبَدَّرَة (دس ہزار کی تھیلی جوان سے بھری ہوئی ہو۔) اور آلاف مؤلفة (ہزاروں جو جمع کئے گئے ہوں۔) اور بعض نے کہا ہے: اور اسی لئے بنا (عمارت) کو اس کی بناوٹ ایک دوسرے کے اوپر گھنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے قنطرہ کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان اور فراء نے کہا ہے: نو قنطار سے کم مقنطرۃ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المقنطرۃ حضور مال اور اس کے بھاری بھرکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (4)

اور صحیح البستی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں سے نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا اسے قانتین میں لکھا جائے گا اور جس نے ہزار آیتوں کے ساتھ قیام کیا تو اسے مقنطرین (خزانہ جمع کرنے والے) میں لکھا جائے گا (5)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ الذَّهَبِ مونث ہے کہا جاتا ہے: ھی الذھب الحسنۃ (یہ حسین سونا ہے) اس کی جمع ذھاب اور ذھوب آتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذَهَبَةٌ کی جمع ہو۔ اور جمع اذھاب بنائی جائے۔ اور ذھب فلان مذھبا حسنا (فلاں خوب اچھی طرح گزر گیا) اور الذھب اہل یمن کا ایک پیمانہ بھی ہے۔ اور رجل ذھب جب کوئی آدمی سونے کی کان دیکھے اور حیران رہ جائے۔ اور الفضةُ یہ تو معروف ہے اور اس کی جمع فِضَضٌ ہے۔ پس الذھبُ، الذّھاب سے ماخوذ ہے۔ اور الفضّةُ یہ انفضّ الشئ (شے کا متفرق ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور اسی سے فَضَضْتُ الْقَوْمَ فَانْفَضُّوْا ہے۔ یعنی میں نے قوم کو تقسیم کیا تو وہ تقسیم ہو گئی اور یہ مادہ اشتقاق ان دونوں کے زوال اور ان کے عدم ثبوت کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا وجود میں ·· کیا گیا ہے۔ اور اس معنی میں جو سب سے اچھا کہا گیا ہے وہ بعض کا یہ قول ہے:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً　5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

النّار آخرُ دینار نطقتَ بہ والھمّ آخرُ ھذا الدِّرھم الجاری

جس دینار کے بارے تو نے گفتگو کی ہے اس کا آخر آگ ہے اور اس جاری درہم کا آخر غم ہے۔

والمرء بینھما ان کان ذا وَرَعٍ مُعذّبُ القلبِ بَیْنَ الھَمّ والنّارِ

اگر آدمی کمزور دل ہو تو وہ ان دونوں کے درمیان اس حال میں ہوتا ہے کہ اس کا دل غم اور آگ کے درمیان عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْخَیْلِ الخیل مؤنث ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ابو عبیدہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خیل کا واحد خائل ہے، جیسا طیر کا واحد طائر اور ضَیْن کا واحد ضائن ہے اور گھوڑے کو یہ نام اسی لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی چال میں اکڑ اور تکبر کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ یہ اسم جمع ہے لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں، (1) (بلکہ) اس کا واحد فرس ہے، جیسا کہ یہ الفاظ القوم، الرھط، النساء اور الابل وغیرہ...... اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو ہوا سے پیدا کیا ہے اور اسی لئے اسے بغیر پروں کے اڑنے والا بنا دیا" (مراد اس کی تیز رفتاری ہے۔) اور وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جنوب کی ہوا سے تخلیق فرمایا ہے۔ حضرت وہب نے کہا ہے: کوئی تسبیح، تکبیر اور تہلیل نہیں ہے جسے پڑھنے والا پڑھتا ہے مگر وہ (گھوڑا) اسے سن بھی رہا ہے اور اسے اسی کی مثل کے ساتھ جواب بھی دیتا ہے۔ گھوڑے کا ذکر اور اس کے وصف کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا جو اس میں کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام جانور پیش فرمائے اور آپ کو کہا گیا: ان میں سے ایک پسند کر لو۔ تو انہوں نے گھوڑا چنا۔ تو آپ کو فرمایا گیا: تم نے اپنی عزت کو اختیار کیا ہے۔ پس اسی وجہ سے اس کا نام الخیر پڑ گیا۔ اور اس کا نام خیل رکھا گیا کیونکہ یہ (گھوڑا) العز سے موسوم ہے اور جو اس پر سوار ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے عزت پا لیتا ہے اور وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر اظہار فخر کرتا ہے۔ اور اس کا نام فرس رکھا گیا ہے کیونکہ یہ شیر کے جھپٹنے کی طرح اچھلتے کودتے فضا کی مسافتوں کو طے کر لیتا ہے اور وہ زور سے روندتے ہوئے انہیں اس طرح کاٹتا ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی شے دبوچ لی جائے۔ اور اس کا نام عربی رکھا گیا ہے کیونکہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے کعبہ معظمہ کی بنیادیں اٹھانے کی جزا کے طور پر لایا گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی ہیں۔ پس چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو عطا ہوا اس لئے اس کا نام عربی رکھا گیا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: "شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا جس میں عتیق گھوڑا ہو (2)" گھوڑے کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ ھجانہ سے جدا اور مبرا ہوتا ہے (ھجانہ سے مراد خراب نسل کا گھوڑا جس میں گھوڑی ترکی ہو اور گھوڑا عربی ہو تو ان سے پیدا ہونے والے گھوڑے کو ھجین کہا جاتا ہے۔)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ

2۔ المطالب العالیہ لابن حجر، حدیث نمبر 3630

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین گھوڑا وہ سیاہ رنگ کا گھوڑا ہے جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو اور اس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ بھی سفید ہو۔ (پھر وہ جس کی پیشانی اور چاروں پاؤں سفید ہوں) طلق الیمین ہو (یعنی اس کا دایاں پاؤں سفید نہ ہو) اور اگر سیاہ (ادھم) گھوڑا نہ ہو تو پھر کُمیت (جس کا رنگ سیاہی مائل ہو) گھوڑا جو اسی وضع پر ہو (1)۔''

اسے ترمذی نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور مسند دارمی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں [میں کون سا گھوڑا خریدوں؟] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہوں اور محجل طلق الیمین ہو۔ (یعنی اس کی پیشانی اور تین پاؤں سفید ہوں) یا پھر اسی صورت پر کمیت گھوڑا خرید لے تو نفع پائے گا اور تو سلامت رہے گا (2)۔'' اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں کے بعد گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ شے کوئی نہ تھی (3)۔ اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں، ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے باعث ستر (پردہ) ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے بوجھ ہوتا ہے (4)''۔ یہ حدیث طویل اور مشہور ہونے کے سبب ذکر سے مستغنی ہے۔ گھوڑوں کے احکام کا ذکر سورۃ الانفال اور النحل میں آئے گا جو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: الْمُسَوَّمَةِ مراد چراگاہوں میں چرنے والے، حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: سامت الدابۃ والشاۃ جب گھوڑا اور بکری چرنے کے لئے جائے تسوم سوما فھی سائمۃ (5)۔ اور أسمتھا انا جب تو انہیں چرنے کے لئے چھوڑے فھی مسامۃ اور سوّمتھا تسویما فھی مُسوّمۃ۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب سے پہلے جانور چرانے سے اور دودھ والے جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے (6)۔ (اس حدیث میں السوم کا لفظ چرنے کے معنی میں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ (النحل) (جس میں تم (مویشی) چراتے ہو) اخطل نے کہا ہے:

مثل ابن بزعة أو كآخر مثله     أولى لك ابن مسيمةِ الاجمال

مراد اونٹ کو چرانے والے کا بیٹا ہے اور السوام سے مراد ہر چرنے والا جانور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ ابن زید نے یہی کہا ہے (7)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، ترمذی، باب کتاب الجہاد، حدیث 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131، حدیث نمبر 2433    3۔ سنن نسائی، کتاب الخیل والسبق والرمی، جلد 2، صفحہ 122

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السبق والرمی، جلد 10، صفحہ 15

صحیح بخاری، باب شرب الناس والدواب من الانہار، حدیث 2198، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ    6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 160

7۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ

حضرت مجاہد نے کہا ہے: المُسَوَّمَه وہ ہوتا ہے جو بہت موٹا تازہ اور خوبصورت ہو۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے: سومها الحسن (1) (اس نے اسے خوبصورت نشانات لگائے یا اس نے اسے اچھی طرح چرنے کے لئے چھوڑا۔) اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے، انہی کے قول سے ہے: رجل وسیم خوبصورت چہرے والا آدمی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: المسومه ایسے گھوڑے جن کے چہروں پر ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن سے ان کی پہچان ہو سکے (2)۔ یہ السیما سے ہے اور اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہی کسائی اور عبیدہ کا مذہب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ذکر کیا گیا ہے لفظ ان تمام کا احتمال رکھتا ہے، پس وہ گھوڑا جو چرنے والا ہو، اچھی طرح تیار کیا ہوا ہو اور اسے ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن کے سبب دوسروں سے اس کی پہچان ہو سکے (وہی) مراد ہوگا۔

ابو زید نے کہا ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ تو اس پر ایسی اون اور علامت بنا دے جو اس کے سارے بدن میں نمایاں ہو تا کہ چراگاہ میں وہ اسے ماسویٰ سے ممتاز اور الگ کر دے۔

ابن فارس اللغوی نے اپنی مجمل میں بیان کیا ہے: المسومة سے مراد وہ گھوڑا ہے جو چھوڑا جائے اور اس پر اس کا سوار بھی ہو۔ اور مورج نے کہا ہے: المسومه کا معنی ہے داغ دیا ہوا۔ مبرد نے کہا ہے: وہ جو شہروں میں معروف ہو۔ ابن کیسان نے کہا ہے: جس میں سیاہ و سفید داغ ہوں۔ یہ تمام معانی سیما کے متقارب ہیں۔ نابغہ نے کہا ہے:

و ضُمْرٍ كالقِدَاحِ مُسَوَّمَاتٍ عليها مَعْشَرٌ اشباهُ جِنِّ (3)

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَنْعَامِ ابن کیسان نے کہا ہے جب تو کہے نَعَمٌ تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے اور جب کہے انعامٌ تو اس میں اونٹ اور تمام چرنے والے جانور آ جاتے ہیں۔

فراء نے کہا ہے: یہ لفظ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هذا نَعَمٌ وارِدٌ (یہ اونٹ آ رہا ہے) اس کی جمع انعام آتی ہے۔ ہروی نے کہا ہے: نَعَمٌ مذکر و مونث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اور الأنعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ جانور ہیں اور جب کہا جائے: النَّعَم تو پھر صرف اونٹ مراد ہوتا ہے اور حسان نے کہا ہے:

و كانت لايزال بها انيس خِلَالَ مُروجِها نَعَم وَ شَاءُ

اس میں نَعَمٌ سے مراد اونٹ ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں عروہ البارقی سے مرفوع روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ''اونٹ اپنے مالکوں کے لئے (باعث) عزت ہے اور بکریاں باعث برکت ہیں اور خیر و بھلائی یوم قیامت تک گھوڑے کی پیشانی میں رکھ دی گئی ہے (4)''۔ اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بکری جنت کے جانوروں میں سے ہے (5)'' اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً صفحہ 410

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، صفحہ 168۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، صفحہ 168۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اغنیاء کو بکریاں رکھنے کا اور فقراء کو مرغیاں رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: اغنیاء کے مرغیاں رکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ شہروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت دے دیتا ہے (1)۔ اور اسی میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو بکریاں رکھ لے کیونکہ ان میں برکت ہے (2)''۔ انہوں نے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ عن وکیع عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن ام ھانی کی سند سے بیان کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْحَرْثِ یہاں حرث ہر اس شے کا نام ہے جسے کاشت کیا جاتا ہے اور یہ مصدر ہے جس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، تو کہتا ہے: حَرَثَ الرجل حَرْثاً جب وہ کھیتی باڑی کے لئے زمین کو پھاڑے (اس میں ہل چلائے) اور حراثہ کا اسم دانے کاشت کرنے، باغات لگانے اور دیگر کاشتکاری کی انواع پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: ''تو اپنی دنیا کے لئے کھیتی باڑی کر گویا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' کہا جاتا ہے حرثت اور احترثت (میں نے کھیتی باڑی کی) اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''تم اس قرآن میں خوب غور و فکر اور تحقیق کرو۔'' ابن عرابی نے کہا ہے: الحرث کا معنی تفتیش کرنا، تحقیق کرنا ہے۔

اور حدیث میں ہے: أصدق الاسماء الحارث (3) ناموں میں سے أصدق نام حارث ہے کیونکہ حارث وہ ہوتا ہے جو کمانے والا ہو اور احتراث المال کا معنی مال کی کمائی ہے اور المحراث: آگ کو بھڑکانے اور ہلانے والی سیخ ہے اور الحَرَاث قوس میں تانت کی جگہ ہے۔ اس کی جمع أحرثہ ہے۔ اور أحرث الرجل ناقتہ آدمی نے ناقہ کو خوب تھکا دیا، کمزور کر دیا۔

اور حضرت معاویہ کی حدیث میں ہے: ما فعلت نواضحکم؟ تمہارے پانی پلانے والے اونٹوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حرثناھا یوم بدر۔ ہم نے انہیں بدر کے دن خوب کمزور کیا اور تھکایا (اشارہ اس طرف ہے کہ ان کے اشیاخ کو قتل کیا ہے۔ النھایہ) ابوعبید نے کہا ہے: وہ اس سے ھزلناھا (ہم نے انہیں کمزور کیا ہے۔) کہا جاتا ہے: حرثت الدابۃ اور احرثتھا دونوں لغتیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ انہوں نے ہل کا لوہا (جس کے ساتھ زمین پھاڑی جاتی ہے) اور کوئی شے دیکھی تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''یہ کسی قوم کے گھر میں داخل نہیں ہوتی مگر ذلت اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے (4)''۔ کہا گیا ہے کہ اس ارشاد میں ذُل سے مراد زمین کے ان حقوق کی مشقت ہے جن کی ادائیگی ہل چلانے والوں پر لازم ہوتی ہے اور ائمہ اور سلاطین ان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اور مہلب نے کہا ہے: اس حدیث طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا حقیقی معنی تو واللہ اعلم بہرحال یہ بلند احوال اور باعزت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، حدیث نمبر 2297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ 2۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ البدایۃ والنہایہ، جلد 12، صفحہ 192

4۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشراف ترین کاموں سے رزق طلب کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ اس لئے ہوا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں ہل چلانے میں مشغول ہونے، گھوڑوں کی سواری اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ضائع کرنے کا خدشہ لاحق ہوا، کیونکہ اگر یہ ہل چلانے میں مشغول ہو گئے تو پھران پر وہ امم اور گروہ غالب آ جائیں گے جو گھوڑوں کی سواری ان کی کمائی سے اسباب زندگی تلاش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد سے اسباب زندگی تلاش کرنے پر ابھارا نہ کہ مسلسل زمین کی آبادی اور مشقت کو لازم پکڑنے سے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جوان بنو اور خوب مضبوط اور طاقتور بنو اور اونٹوں کی سواری چھوڑ دو اور گھوڑوں پر کود کر بیٹھو تم پر اونٹ چرانے والے غالب نہیں آئیں گے۔ پس آپ نے انہیں مسلسل گھوڑے رکھنے اور ان پر اچھل کر بیٹھنے کے لئے اپنے ابدان کی ورزش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا یا کوئی فصل کاشت کی اور اس سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو اس کے لئے وہ صدقہ ہوگا (1)''۔

علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور تمول ہوتی ہے۔ پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے لئے ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لئے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10۔** قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ سامان جس سے دنیا میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ باقی نہیں رہتا، اس میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور آخرت کے بارے ترغیب ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ دنیا سامان ہے اور سامان دنیا میں سے کوئی شے نیک اور صالحہ عورت سے افضل نہیں (2)''۔

اور ایک حدیث میں ہے: ''تو دنیا میں زہد اختیار کر اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا (3)'' یعنی دنیوی ساز و سامان میں جاہ وحشمت اور ضرورت سے زائد مال کو چھوڑ دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سوائے ان خصال کے ابن آدم (انسان) کا کوئی حق نہیں ہے۔ گھر جو اسے سکونت دیتا ہے، کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو چھپاتا ہے اور خشک روٹی اور پانی (4)''۔ ترمذی نے اسے مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 134۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 311۔ ایضاً، ابن ماجہ، صفحہ 4091، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کیا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ سے پوچھا گیا: بندے پر دنیا اور تمام شہوات کو چھوڑنا کیونکر آسان ہو جاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آدمی کے ان کاموں میں مشغول ہو جانے کے ساتھ جن کا اسے حکم دیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور المآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے، آب یؤوب ایابا کہا جاتا ہے جب کوئی لوٹ کر آئے۔ امرؤ القیس نے کہا:

و قد طوفت فی الآفاق حتی رضِیتُ من الغنیمة بِالاِیَابِ (1)

تحقیق میں آفاق میں گھوما پھرا یہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہو گیا۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

و کل ذی غیبة یؤوبُ و غائب الموت لایؤوب (2)

ہر غیب ہونے والا لوٹ آتا ہے (لیکن) موت کے سبب غائب ہونے والا لوٹ کر نہیں آتا۔ مآب کی اصل مَأْوَبٌ ہے واؤ کی حرکت نقل کر کے ماقبل ہمزہ کو دی اور واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ مَقَالٌ میں کہا گیا ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی قلت اور اس کی حقارت کو بیان کرنا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف حسین انداز میں لوٹنے کی ترغیب ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝15

"(اے میرے رسول!) آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز، ان کے لئے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں، رواں ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور حاصل ہو گی انہیں خوشنودی اللہ کی اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو۔"

سوال کی انتہاء مِّنْ ذٰلِكُمْ پر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا خبر مقدم ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوال کی انتہا عِنْدَ رَبِّهِمْ پر ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ذالك جنات (3) اور اس تاویل کی بنا پر جَنّٰتٌ کو خَيْرٍ سے بدل کر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ لیکن پہلی صورت میں یہ جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی مثل ہے: "عورت سے چار چیزوں کے سبب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ پس تو دین والی کو تلاش کر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں" تنکح المراۃ لاربع لمالها و حسبها و جمالها و دینها فاظفر بذات الدین تربت یداك۔ (4) اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فاظفر بذات الدین اس آیت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دارالکتب العلمیہ 2۔ ایضا 3۔ ایضا

4۔ صحیح بخاری، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 762

کی مثال ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس سے پہلی آیت کی مثال ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے دنیا سے تسلی دینے اور اسے چھوڑنے والے نفوس کو تقویت دینے کے لئے یہ ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں اس آیت کے الفاظ کے معانی گزر چکے ہیں۔ الرضوان رضا سے مصدر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا ''کیا تم کسی شے کا ارادہ رکھتے ہو کہ میں تمہارے لئے اس کا اضافہ کردوں؟'' تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اور کون سی شے اس سے افضل ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: ''میری رضا سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا(1)''۔

اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝ میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝

''یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما دے ہمارے لئے ہمارے گناہ اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ (یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت۔''

اس میں اَلَّذِيْنَ۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ اور اگر چاہو تو مرفوع پڑھ لو اور تقدیر کلام ہوگی ھم الذین یا پھر مدح کی بناء پر منصوب پڑھ لو۔ رَبَّنَآ اصل میں یا ربنا ہے۔ اِنَّنَآ اٰمَنَّا کا معنی ہے یقیناً ہم نے تصدیق کی۔ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ مغفرت کی دعا اور التجاء ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اَلصّٰبِرِيْنَ یعنی یہ گناہوں اور شہوات سے صبر کرنے والے ہیں اور بعض نے کہا کہ وہ طاعات پر صبر کرنے والے ہیں۔ وَالصّٰدِقِيْنَ اور افعال و اقوال میں سچ بولنے والے ہیں۔ وَالْقٰنِتِيْنَ اور وہ اطاعت و پیروی کرنے والے ہیں۔ وَالْمُنْفِقِيْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر یہ معانی گزر چکے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان متقی لوگوں کے احوال تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کے لئے جنات کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ کے معنی میں اختلاف ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مغفرت کی دعا اور التجا کرنے والے لوگ ہیں اور قتادہ نے کہا ہے: ان سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے، کیونکہ وہی نماز پڑھتے ہیں اور وہی استغفار کرتے ہیں۔ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103۔ ایضاً صحیح بخاری، باب صفة الجنة والنار، حدیث نمبر 6067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

سحری کا وقت خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بارے ظن غالب یہ ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ (میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا) "بلاشبہ آپ نے اس دعا کو سحری کے وقت تک موخر کر دیا (1)" اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دریافت فرمایا: "رات کے کون سے حصہ میں (دعا) زیادہ سنی جاتی ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سحری کے وقت عرش وجد کناں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے سَحَر اور سَحْر یعنی حا کے فتحہ اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: سحر سے مراد وہ وقت ہے جب رات واپس پلٹ رہی ہوتی ہے یہاں تک کہ فجر ثانی طلوع ہو جائے اور ابن زید نے کہا ہے: سحر سے مراد رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے ائمہ حدیث نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) ہر رات جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون ہے وہ جو مجھ سے دعا مانگ رہا ہو کہ میں اس کی دعا قبول کرلوں، کون ہے وہ جو مجھ سے سوال کر رہا ہو کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے وہ جو مجھ سے مغفرت طلب کر رہا ہو کہ میں اس کی مغفرت فرما دوں پس وہ اسی طرح ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔" اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں حتی ينفجر الصبح یہاں تک کہ صبح پھوٹ پڑتی ہے (2)۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں...... اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اولیٰ اور ارجح وہ ہے جو نسائی کی کتاب میں بطور مفسر موجود ہے۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف حصہ گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے پس وہ کہتا ہے: کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے اس کی دعا قبول کی جائے گی، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے اس کی مغفرت کر دی جائے گی، کیا کوئی سائل اور حاجتمند ہے اسے عطا کیا جائے گا" اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے (3)، اور یہ ارشاد اشکال کو رفع کر دیتا ہے اور ہر احتمال کو واضح کر دیتا ہے۔ اور بے شک پہلے ارشاد میں مضاف محذوف ہے یعنی عبارت اس طرح ہے ينزل مَلَكُ ربنا فيقول۔ اور يُنْزِلُ یا کو ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ و باللہ توفیقنا۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب الأسنى فى شرح أسماء الله الحسنى و صفاته العلى میں کیا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 196۔ ایضاً، ترمذی، حدیث نمبر 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، باب صلاۃ اللیل، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 258۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الدعاء فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1077، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الجواہر الحسان، جلد 1، صفحہ 239، دار الکتب العلمیہ بیروت

**مسئلہ:** استغفار کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مغفرت طلب کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اور کئی دوسری آیات میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری کے وقت ستر مرتبہ استغفار کریں (1)۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے: جب رات کا پہلا حصہ ہوتا ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے چاہیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سحری تک اسی طرح نماز پڑھتے رہتے ہیں اور جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: مغفرت طلب کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ مغفرت طلب کریں، پس دوسرا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: خبردار سنو! چاہیے کہ غافل لوگ اٹھ کھڑے ہوں پس وہ اپنے بستروں سے اسی طرح اٹھتے ہیں جیسا کہ مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں اپنے گھروں کو آباد کرنے والوں کی طرف، میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کی طرف اور سحری کے وقت تہجد پڑھنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کے سبب ان سے عذاب پھیر دیتا ہوں۔'' ان اللہ یقول انی لاھم بعذاب اھل الارض فاذا نظرت الی عمار بیوتی والی المتحابین فی والی المتھجدین والمستغفرین بالاسحار صرفت عنھم العذاب بھم۔ (2)

حضرت مکحول نے کہا ہے: جب امت میں پندرہ افراد موجود ہوں جو ہر روز پچیس مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ عام عذاب کے ساتھ اس امت کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اسے ابونعیم نے کتاب الحلیہ میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت نافع نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رات جاگتے رہتے تھے پھر فرماتے: اے نافع! کیا سحری کا وقت ہو چکا ہے؟ میں عرض کرتا: نہیں۔ پھر آپ دوبارہ نماز پڑھنے لگ جاتے، پھر آپ پوچھتے، پس جب میں کہتا: ہاں (سحری کا وقت ہو چکا ہے) تو آپ بیٹھ جاتے اور استغفار کرنے لگتے (3) اور ابراہیم بن حاطب نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سحری کے وقت مسجد کے ایک کونے میں آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری اطاعت و پیروی کی، یہ سحری کا وقت ہے تو میری مغفرت فرما دے۔ یا رب، امرتنی فأطعتك، وھذا سحر فاغفرلی پس میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد حضور قلب کے ساتھ زبان سے استغفار کرنا ہے، نہ کہ وہ جو ابن زید نے کہا کہ مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (5)۔ واللہ اعلم۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: اے میرے بیٹے! مرغ تجھ سے زیادہ دانا اور عقلمند نہ ہونے پائے، کہ وہ تو سحری کے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ　　2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 501، حدیث نمبر 9051

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ　　4۔ ایضاً　　5۔ ایضاً

وقت ندا دیتا ہے اور تو سویا ہی رہے''۔

استغفار کے الفاظ میں مختار اور پسندیدہ وہ ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شداد بن اوس سے روایت کیے ہیں اور آپ کی الجامع میں اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے کہ تو کہے: اللّٰھم انت ربی لا الہ الا انت خلقتنی و انا عبدك و انا علی عھدك و وعدك ما استطعتُ اعوذ بك من شر ما صنعتُ أبوءُ لك بنعمتك علی و أبوء بذنبی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت . . . (اے اللہ! تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا فرمایا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ پر ہوں جتنی مجھ میں قدرت اور استطاعت ہے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر اس عمل کے شر سے جو میں نے کیا تیری جو نعمتیں مجھ پر ہیں میں ان کے سبب تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔)

فرمایا...... جس کسی نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ دن کے وقت یہ پڑھا پھر اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا اور جس کسی نے رات کے وقت یہ پڑھا اور پھر اسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا (1)'' اور ابو محمد عبد الغنی نے سعید بن ابی لہیعہ کی حدیث عن ابی صخر عن ابی معاویہ عن سعید بن جبیر عن ابی الصہباء البکری عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا پھر ارشاد فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھا دوں (جب) تو انہیں کہے تو اگر تیرے گناہ چیونٹیوں کی گزرگاہ کی طرح بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ تیرے لئے انہیں معاف فرمادے اس بنا پر کہ اس نے تیری مغفرت فرمادی ہے: اللّٰھم لا الہ الا انت سبحانك عملت سوءا و ظلمت نفسی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت (2) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے میں نے برائی کے اعمال کیے ہیں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے سو تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا۔)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾

''شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بے شک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے۔ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے بھی یہی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے عدل و انصاف کو نہیں کوئی معبود سوائے اس کے (جو) عزت والا حکمت والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے جب

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 933۔ ایضاً، بخاری، صفحہ 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 677، حدیث نمبر 5052۔ ایضاً، بخاری، باب الدعاء قبل السلام، حدیث نمبر 790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ آیت نازل ہوئی تو وہ تمام سجدے میں گر گئے (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کے پاس اہل شام کے علماء میں سے دو عالم حاضر ہوئے، جب ان دونوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: یہ شہر اس نبی مکرم ﷺ کے شہر کے اوصاف کے ساتھ کتنی زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لائے گا! چنانچہ جب وہ دونوں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کی علامات اور صفات کو دیکھ کر آپ کو پہچان لیا، تو انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ محمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا ''ہاں'' پھر کہا: کیا آپ احمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ دونوں نے کہا: ہم آپ سے شہادت کے بارے پوچھتے ہیں پس اگر آپ نے ہمیں اس کے بارے بتا دیا تو ہم آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے اور ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: ''تم مجھ سے پوچھو'' تو انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کے بارے آپ ہمیں بتائیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ چنانچہ وہ دونوں اسلام لے آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کر دی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُولُوا الْعِلْمِ سے مراد حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: مہاجرین اور انصار ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے: اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے ہیں اور سدی اور کلبی نے کہا ہے: مراد تمام مومنین ہیں اور یہی قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے کیونکہ یہ عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں علم کی فضیلت اور علماء کے شرف و فضل پر دلیل ہے، کیونکہ اگر کوئی اور علماء سے اشرف و اعلیٰ ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اور ملائکہ کے نام کے ساتھ اسی طرح ملا کر ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے علم کے شرف و عظمت کے سبب ہی اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پس اگر کوئی اور شے علم کی نسبت زیادہ شرف والی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرماتا کہ اس میں زیادتی اور اضافہ کی التجا کریں جیسا کہ علم میں زیادتی اور اضافہ کی طلب کا حکم ارشاد فرمایا ...... اور آپ ﷺ نے فرمایا: ان العلماء ورثة الانبياء (3) (بلاشبہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) اور مزید فرمایا: العلماءُ أُمناء الله على خلقه (4) (علماء اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق پر امین ہیں) اور یہ علماء کے لئے عظیم شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور دین میں ان کے لئے بہت بڑا مقام اور بلند رتبہ ہے۔ ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے برکۃ ابن نشیط کی حدیث نقل کی ہے ...... اور یہ عنکل بن حکارک ہیں اور اس کی تفسیر برکۃ بن نشیط ہے ...... اور یہ حافظ ہیں۔

ہمیں عمر ابن مومل، محمد بن ابی الخصیب، عنکل، محمد بن اسحاق، شریک نے ابو اسحاق سے حدیث بیان کی کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: العلماء ورثة الانبياء يحبهم اهل السماء و يستغفر لهم

---

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294
2۔ اسباب النزول للنیشابوری، صفحہ 63
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157
4۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 134، حدیث نمبر 28675

الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامۃ (1) (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جب وہ فوت ہو جائیں گے تو یوم قیامت تک سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے مغفرت طلب کرتی رہیں گی۔) اس باب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ غالب القطان نے بیان کیا ہے: میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا اور میں حضرت اعمش کے قریب اترا۔ اور میں ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ پس جب رات ہوئی تو میں نے بصرہ میں نزول کا ارادہ کیا وہ اٹھے اور انہوں نے رات کے وقت نماز تہجد ادا کی اور یہ آیت تلاوت کی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اعمش نے کہا میں اس بارے شہادت دیتا ہوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور میں یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (فقط) اسلام ہے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا...... پس میں صبح کے وقت ان کی طرف گیا اور میں نے انہیں الوداع کہا پھر کہا: بلاشبہ میں نے تمہیں یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے بارے میں تمہیں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں ایک سال تک تمہارے پاس رہا ہوں تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: قسم بخدا! میں ایک سال تک اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بیان کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس میں اٹھا اور میں نے ان کے دروازے پر اس دن کے بارے لکھ دیا، پس جب سال گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابو محمد! سال گزر چکا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابووائل نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یجاء بصاحبھا یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالیٰ عبدی عھد الیّ وأنا احق من وفّی أدخلوا عبدی الجنۃ (3) اس آیت پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے نے میرے ساتھ عہد کیا ہے اور میں کسی بھی وفا کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہوں پس تم میرے بندے کو جنت میں داخل کردو۔)

ابوالفرج الجوزی نے کہا ہے: غالب القطان سے مراد غالب بن خطاف القطان ہے جو اعمش سے حدیث شَهِدَ اللّٰهُ روایت کرتا ہے اور یہ حدیث معضل ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: اس کی حدیث میں ضعف بین اور واضح ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا غالب بن خطاف القطان ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ابن معین نے کہا: ثقہ ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ صدوق اور صالح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تیرے لئے اس کی عدالت اور ثقاہت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے اپنی کتابوں میں اس کی حدیث نقل کی ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 135، حدیث نمبر 28679

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 440

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اپنے سونے کے وقت یہ آیت پڑھی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے پیدا فرما دے گا اور وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔" اور کہا جاتا ہے: جس نے اس شہادت کے بارے اپنے صحیح قلب سے اقرار کر لیا تحقیق اس نے عدل قائم کر لیا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت تھے قبائل عرب میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک یا دو بت تھے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام بت اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ ریز ہو گئے (1)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور آگاہ فرمایا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شهد فلان عند القاضی (اس کا معنی ہے) فلاں نے قاضی کے سامنے اس کے بارے بیان کیا جس کا حق ہے یا جس پر حق ہے۔ زجاج نے کہا ہے: شاہد وہ ہوتا ہے جو کسی شے کو جانتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر ایسی شے کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی ہے جسے اس نے تخلیق فرمایا اور بیان فرمایا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: شَهِدَ اللّٰهُ بمعنی قضى الله ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے (فیصلہ فرمایا) آگاہ فرمایا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کئی اعتبار سے مردود ہے (2)۔

امام کسائی نے قول باری تعالیٰ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور اِنَّ الدِّيْنَ میں أن کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے۔ مبرد نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے: ان الدين عند الله الاسلام بانه لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ پھر با کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا: امرتك الخير یہ اصل میں بالخیر ہے۔ کسائی نے کہا ہے تو ان دونوں کو اکٹھی نصب دے، اس معنی میں شهد الله انه كذا، وان الدين عند الله۔ ابن کیسان نے کہا ہے: دوسرا ان پہلے سے بدل ہے، کیونکہ اسلام ہی معنی توحید کی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی قرأت کی ہے جو کسائی نے بیان کیا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ یعنی اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان الدین اس میں انّ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (3) اور تقدیر کلام یہ ہے شهد الله ان الدين الاسلام پھر ابتدا کی اور فرمایا: اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اور ابو المہلب نے شَهِدَ اللّٰهُ حال ہونے کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے شُهَدَآءُ اللّٰهُ بھی مروی ہے (4)۔

اور شعبہ نے عاصم بن زر عن ابی کی سند سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ اس طرح پڑھتے تھے ان الدين عند الله الحنيفية لا اليهودية ولا النصرانية ولا المجوسية (5) ابو بکر انباری نے کہا ہے: کسی صاحب تمیز آدمی پر یہ مخفی نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کلام تفسیر کی حیثیت سے مروی ہے اور ناقلین حدیث میں سے کسی نے اسے قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور قائما قول باری تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ میں اسم جلالت سے یا قول باری تعالیٰ اِلَّا هُوَ سے حال مؤکدہ ہونے

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 412، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 132۔ ایضاً، ترمذی، باب مناقب اهل بيت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی بنا پر منصوب ہے(1)۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ قطع کی بنا پر منصوب ہے، اس کی اصل القائم ہے پس جب الف لام کو کاٹ دیا گیا تو اسے نصب دے دی گئی جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے وَلَهُ الدین واصبا اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں القائم بالقسط ہے لغت اور صفت ہونے کی بنا پر۔ اور القسط کا معنی عدل ہے(2)۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اسے دوبارہ لایا گیا ہے کیونکہ پہلا دعویٰ کے محل میں واقع ہے اور دوسرا شہادت حکم کے محل میں واقع ہے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلا وصف اور توحید ہے اور دوسرا رسم (حکم) اور تعلیم ہے۔ یعنی تم کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲

"بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آ گیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اس آیت میں دین سے مراد طاعت اور ملت ہے اور اسلام بمعنی ایمان اور طاعات ہے، ابو العالیہ نے یہی کہا ہے اور اسی پر جمہور متکلمین ہیں(3) اور حدیث جبریل(4) کے مطابق ایمان اور اسلام کے مسمیٰ میں دراصل تغایر ہے۔ (یعنی دونوں لفظوں کا اطلاق علیحدہ علیحدہ معنی پر ہوتا ہے۔) اور کبھی معنی مرادفہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کا نام دے دیا جاتا ہے، جیسا کہ وفد عبد القیس کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اللہ وحدہ لاشریک کے ساتھ ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: "کیا تم جانتے ہو ایمان کیا ہے؟" انہوں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة و صوم رمضان وان تؤدوا خمسا من المغنم الحدیث(5)۔ (یہ شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت سے خمس ادا کرو۔) اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں اور ان میں سے ادنیٰ تکلیف دہ شے کو راستے سے ہٹانا ہے اور اعلیٰ ترین باب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے۔" اسے ترمذی نے نقل کیا ہے(6) اور مسلم نے یہ زیادہ کیا ہے والحیاء شعبة من الایمان(7) (حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12۔ ایضاً، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب امور الایمان، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

اور یہ تداخل کے معنی میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بولا جاتا ہے اور اس سے مراد اس کا اپنا اصل مسمیٰ اور دوسرے کا مسمیٰ لیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس میں تصدیق اور اعمال دونوں داخل ہیں اور اسی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے۔ الایمان معرفة بالقلب و قول باللسان و عمل بالارکان (ایمان سے مراد دل سے معرفت حاصل کرنا، زبان سے قول کرنا اور ارکان کے مطابق عمل کرنا ہے) اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے(1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حقیقی معنی وضعاً اور شرعاً پہلا ہی ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ وسعت کے باب سے ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے خبر دی ہے کہ وہ حقائق کے بارے علم رکھتے تھے اور یہ کہ وہ دنیا کے خواہشمند اور طالب تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے (2) یہی کہا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اور نہیں جھگڑا کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی آپس میں حسد کرتے ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (صحیح) علم آ گیا۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: اس آیت سے مراد نصاریٰ ہیں اور یہ نجران کے عیسائیوں کے لئے جھڑک ہے(3)۔ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: اس سے مراد یہود ہیں اور الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا لفظ یہود و نصاریٰ تمام کو شامل ہے(4)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب عطا کی گئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں نہیں جھگڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس صحیح علم آ گیا تھا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور نبوت کا بیان ان کی کتابوں میں آ چکا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس آیت سے مراد یہ ہے) جنہیں انجیل عطا کی گئی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا نہیں کیا اور آپ کے بارے میں انہوں نے متفرق قول نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ یکتا اور منفرد معبود ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بَغْیًا مفعول من اجلہ ہونے کی وجہ سے یا الَّذِیْنَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(5)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

"پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہئے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم اسلام لائے پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔"

1۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، صفحہ 8۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ یعنی اگر وہ جھوٹے من گھڑت اقوال اور مغالطوں کے ساتھ آپ سے جھگڑا کریں، تو آپ اپنا معاملہ اس کی طرف منسوب کیجئے جس کا ایمان اور تبلیغ میں سے آپ کو مکلف بنایا گیا ہے اور آپ کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر رہی ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجْهِيَ بمعنی ذات ہے (یعنی میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا ہے) اور حدیث طیبہ میں بھی ہے: سجد وجھی للذی خلقہ و صورہ (2) (میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت عطا کی۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الوجہ بمعنی القصد ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں خرج فلان فی وجہ کذا (فلاں اس ارادے اور قصد میں نکلا) یہ معنی سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے، پہلا معنی زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور ساری ذات کو وجہ کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ (چہرہ) آدمی کے تمام اعضاء میں سے زیادہ شرف و عزت والا ہے اور حواس کو جمع کرنے والا ہے۔ اور کسی شاعر نے کہا:

اسلمت وجھی لمن اسلمت　　له المُزْنُ تحمل عذبًا زُلالًا

اس میں وجہ بمعنی ذات ذکر کیا گیا ہے۔

اور ماہر متکلمین نے اس ارشاد گرامی وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں کہا ہے کہ اس میں وجہ سے مراد ذات ہے (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ عمل ہے جس کے ساتھ اس کی ذات کا قصد کیا جاتا ہے اور قولہ: وَمَنِ اتَّبَعَنِ میں مَنْ محل رفع میں ہے اور یہ اَسْلَمْتُ کی تا پر معطوف ہے۔ یعنی جنہوں نے میری پیروی کی انہوں نے بھی (اپنا آپ) جھکا دیا۔ اور ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف جائز ہوتا ہے جبکہ دونوں کے درمیان فاصلہ آ جائے۔

حضرت نافع، ابو عمرو اور یعقوب نے اتبعنِ میں یا کو اپنے اصل پر ثابت رکھا ہے اور دوسروں نے مصحف کی اتباع میں اسے حذف کر دیا ہے کیونکہ یہ اس میں بغیر یاء کے ہے (4)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لیس تُخفی یَسارتی قدرَ یوم　　ولقد تُخْفِ شیمتی اِعساری

میری خوشحالی دن کی قدر کو نہیں چھپاتی بلکہ میری عادت و کردار میری تنگدستی کو چھپا دیتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اُمِّيّٖنَ سے مراد وہ ہیں جن کی کوئی کتاب نہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں۔ ءَاَسْلَمْتُمْ میں استفہام تقریری ہے۔ اور اس کے ضمن میں امر ہے۔ یعنی اسلموا (یعنی تم اسلام لے آؤ) علامہ طبری وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: ءَاَسْلَمْتُمْ یہ تہدید ہے اور یہی اچھا اور بہتر مفہوم ہے۔ کیونکہ معنی ہے: کیا تم اسلام لائے یا نہیں؟

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ

اور ارشاد گرامی فَقَدِ اهْتَدَوْا میں ماضی کا صیغہ ان کے لئے ہدایت کے وقوع اور اس کی تحصیل میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے (1)۔ اور الْبَلٰغُ بلغ کا مصدر ہے اس کے فعل میں عین کلمہ مخفف ہے۔ (بَلَغَ) یعنی بلاشبہ آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حکم ان میں سے ہے جو جہاد کے ساتھ منسوخ ہو چکا ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس آیت کی تاریخ نزول کی پہچان کا محتاج ہے۔ ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، کیونکہ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ آپ پر یہ لازم ہے کہ آپ کی طرف قتال وغیرہ احکام میں سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ وہ ان تک پہنچا دیں (2)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

''بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی۔ یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لئے کوئی مددگار۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ ابوالعباس المبرد نے کہا ہے: بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ تھے ان کے پاس انبیاء علیہم السلام انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لئے آئے تو انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور پھر ان کے بعد مومنین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے انہیں بھی قتل کر دیا، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اسی طرح معقل بن ابی مسکین نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات بغیر کتاب کے بنی اسرائیل کے پاس آتے رہے اور وہ انہیں قتل کرتے رہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کے متبعین میں سے ایک گروہ اٹھا اور وہ انہیں عدل و انصاف کا درس دینے لگا، تو وہ بھی قتل کئے جانے لگے (3) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بری قوم وہ قوم ہے جو ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں اور کتنی بری ہے وہ قوم جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور منکر سے منع نہیں کرتے اور کتنی بری قوم ہے وہ جس میں بندۂ مومن احتیاط اور پرہیز کے ساتھ چلتا ہے (4)''۔

اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی اسرائیل نے دن کے اول حصہ کی ایک ساعت میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، پھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ایک سو بارہ آدمی اٹھے اور انہوں نے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو اسی دن کے آخری حصہ میں وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور وہ وہی لوگ ہیں جن کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 253
4۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 23، حدیث نمبر 2145

ذکر الله تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے(1)''۔ اسے المہدوی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اور شعبہ نے ابو اسحاق عن ابی عبیدۃ عن عبد الله کی سند سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے پھر دن کے آخر میں ان کی سبزیوں کے بازار لگ گئے (2)۔ پس اگر کہنے والا کہے کہ وہ جنہیں یہ نصیحت کی گئی ہے انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان کے فعل کے ساتھ راضی ہیں جنہوں نے قتل کیا ہے پس یہ بھی انہیں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ قتال کیا اور انہوں نے ان کے قتل کا ارادہ اور قصد کیا، الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ (الانفال:30) (اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تا کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں۔)

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ الله تعالیٰ کی زمین میں الله کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے(3)''۔

اور درہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''(وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں الله تعالیٰ کے لئے ڈرایا اور الله تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا(4)''۔ اور قرآن کریم میں ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (التوبہ:67) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

پس الله تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق بنا دیا ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ مومن کے اوصاف میں سے خاص ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا سرخیل اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس پر قتال کرنا ہے۔ پھر امر بالمعروف ہر ایک کے لائق اور مناسب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اسے سلطان وقت قائم کرتا ہے کیونکہ حدود کا قیام اسی کے سبب ہوتا ہے، تعزیر اس کی رائے کے سپرد ہوتی ہے، قید کرنا اور چھوڑنا اسی کے حوالے ہوتا ہے اور جلا وطنی وغیرہ کے احکام اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس وہ ہر شہر میں نیک، صالح، طاقتور، عالم اور امانتدار آدمی مقرر کرے گا اور اسے ان احکام کے نفاذ کا حکم دے گا اور اس طرز پر حدود بغیر کسی زیادتی کے جاری رہتی ہیں۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج:41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو)

---

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 297

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ

3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 77، حدیث نمبر 5564

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 432

نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اہل السنت کے نزدیک ناہی کے لئے عادل ہونا شرط نہیں ہے بخلاف مبتدعہ کے وہ کہتے ہیں: کسی کو عادل کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ ساقط الاعتبار ہے، کیونکہ عدالت تو مخلوق میں سے قلیل لوگوں میں محصور ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے اور اگر وہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کریں، اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:44) (کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو) اور قول باری تعالیٰ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے۔ (الصف) (بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو) تو انہیں کہا جائے گا: ان آیات میں وہ عمل کرنے پر مذمت بیان کی گئی ہے جس سے منع کیا گیا ہے نہ کہ یہ مذمت نہی عن المنکر کرنے پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس عمل سے منع کیا گیا ہے اسے کرنے والا اس کی نسبت زیادہ قبیح ہے جو اسے نہیں کرتا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں اسی طرح گھومتا رہے گا جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گھومتا ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل سورۃ البقرہ میں قول باری تعالیٰ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کے تحت بیان کر دی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مسلمانوں نے اس بارے میں اجماع کیا ہے جو ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ منکر کو تبدیل کرنا ہر اس پر واجب ہے جو اس پر قادر ہو اور جبکہ اس فریضہ (تغییر منکر) کی ادائیگی میں اسے ایسی ملامت اور خوف لاحق ہو جو باعث اذیت نہ ہو پھر بھی اس فریضہ کی ادائیگی ا... پر واجب ہے اور اگر وہ قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے روکے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (برا جانے) اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں...... اور جب وہ اپنے دل سے برا جانے تو پھر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری ادا کرے جب وہ اس کے سوا کچھ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں بہت زیادہ احادیث مروی ہیں لیکن وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مقید ہیں۔ حسن نے کہا ہے: بلاشبہ مومن کو امید کے لیے اور جاہل کو تعلیم کے لیے کلام کی جاتی ہے۔ پس وہ جس نے اپنی تلوار یا کوڑا رکھ دیا اور پھر کہا: اِتَّقِنِي اِتَّقِنِي (مجھ سے تو بچ اور ڈر) تو اس میں نہ تیرے لئے کچھ (خطرہ) ہے اور نہ اس کے لئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے آدمی کے بارے میں جو منکر (برائی) کو دیکھے اور اسے تبدیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ اعتراف کرے کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے (1)۔ ابن لہیعہ نے اعرج سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اپنے آپ کو ذلیل کرنا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسی بلا اور مصیبت سے تعرض کرتا ہے جس کے لئے وہ استطاعت نہیں رکھتا (2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسے علی بن زید بن جدعان عن الحسن بن جندب عن حذیفہ عن النبی

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 28، حدیث نمبر 2178

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سند سے بیان کیا ہے (1)۔ اور ان دونوں میں کلام ہے۔ اور بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: آدمی جب کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تین بار یہ کہے اللّٰھم ان ھذا منکر (اے اللہ! بلاشبہ یہ منکر (برائی) ہے پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اس نے وہ کر دیا جو اس پر (لازم) تھا۔

ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ جسے برائی کے زوال کی امید ہو اور اس کی تبدیلی سے اسے اپنی ذات پر ضرب یا قتل کا خوف ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس خطرہ کے وقت اس کا اس مشقت میں پڑنا جائز ہے اور اگر برائی کے زوال کی امید نہ ہو تو پھر ان کے نزدیک کون سا فائدہ ہے۔ فرمایا: قسم بخدا! میرے نزدیک جب نیت خالص ہے تو اسے چاہیے وہ اس مشقت میں پڑ جائے کیفیت جو بھی ہو اور کسی کی پرواہ نہ کرے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو ابو عمر نے اجماع کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت قتل کا خوف ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ أْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ** (لقمان: 17) (نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔) اور یہ اشارہ اذیت پہنچانے کی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ائمہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنی زبان سے روک دے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے (3)''۔ علماء نے کہا ہے: ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف امراء (حکام وقت) پر لازم ہے اور زبان کے ساتھ امر بالمعروف علماء کے ذمہ ہے اور دل کے ساتھ ضعفاء یعنی عوام الناس پر لازم ہے۔ پس روکنے کے لئے برائی کا ازالہ کرنا جب زبان کے ساتھ ممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے۔ اور اگر اس کے لئے سزا یا قتال کے بغیر ازالہ ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ بھی کرے۔ اور اگر برائی قتال کے بغیر زائل ہو جائے تو پھر قتال جائز نہیں اور یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے: **فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ** (الحجرات: 9) (تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف)

اور اسی پر علماء نے اس کی بنیاد رکھی ہے کہ جب کوئی کسی ذات پر یا مال پر حملہ آور کو اپنی ذات سے یا اپنے مال سے یا کسی اور کی ذات سے دور ہٹائے تو اس کا تو حق ہے لیکن اس پر کوئی شے (بطور تاوان) لازم نہیں۔ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ اس نے بکر کا مال (اٹھانے یا ضائع کرنے کا) قصد کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے اسے روکے جبکہ مال کا مالک اس پر قادر نہ ہو

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 266

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 51۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، حدیث نمبر 4002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور نہ اس کے ساتھ راضی ہو۔ حتیٰ کہ علماء نے کہا: اگر ہم [ قصاص ] بھی فرض کرلیں۔ اور کہا گیا ہے: ہر شہر میں جس میں چار قسم کے لوگ ہوں تو اس کے رہنے والے آزمائش اور بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ امام عادل جو ظلم نہ کرتا ہو اور عالم جو راہ ہدایت پر گامزن ہو اور مشائخ جو نیکی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں اور علم کے حصول اور قرآن کریم کی تعلیم پر برانگیختہ کرتے ہوں۔ اور ان کی عورتیں پردے میں رہتی ہوں اور زمانہ جاہلیت کی طرح وہ زیب و آرائش کا اظہار نہ کرتی ہوں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''جب تم میں وہ ظاہر ہو جائے جو تم سے پہلی امتوں میں ظاہر ہوا۔'' ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پہلی امتوں میں کیا ظاہر ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: الملك فی صغارکم والفاحشة فی کبارکم والعلم فی رذالتکم (حکمرانی تمہارے چھوٹوں اور گھٹیا لوگوں میں ہو اور تمہارے بڑوں (اعلیٰ قسم کے لوگوں) میں فحاشی عام ہو جائے اور علم تمہارے رذیل (اور کمینے) لوگوں میں ہو۔) زید نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے والعلم فی رذالتکم یعنی جب علم فاسق لوگوں میں آ جائے۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے(1)، اس باب کا مزید بیان سورۃ المائدہ وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور فَبَشِّرْهُمْ اور وَحَبِطَتْ کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ کتاب کا (جب) بلائے جاتے ہیں کتاب الٰہی کی طرف تاکہ تصفیہ کردے ان کے باہمی جھگڑوں کا تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے درآنحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدراس میں یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کون سے دین پر ہیں؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلا شبہ میں ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔'' تو ان دونوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میرے پاس تورات لے آؤ پس وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کردے گی۔'' تو ان دونوں نے اس کا انکار کر دیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اور نقاش نے بیان کیا ہے: یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کیونکہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299

نبوت کا انکار کر دیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تم میرے پاس تورات لے آؤ اس میں میری صفات موجود ہیں۔'' تو انہوں نے انکار کر دیا(1)۔ جمہور نے لِيَحْكُمَ پڑھا ہے اور ابو جعفر یزید بن القعقاع نے لِيُحْكِمَ یا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے(2) اور پہلی قرأت احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ:29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جس کو دعوت دی جائے اس کا حاکم کے پاس پیش ہونا واجب ہے کیونکہ اسے کتاب اللہ کی طرف دعوت دی گئی ہے، پس اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو وہ مخالف ہو گیا اور مخالف اور مخالف کی قدر و منزلت کے مطابق اس پر ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کرنا متعین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکم ہمارے پاس اندلس اور بلاد عرب میں جاری ہے، لیکن دیار مصر میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ وہ حکم ہے جسے ہم نے سورۃ النور میں پوری تفصیل کے ساتھ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (النور) (اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تا کہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں روگردانی کرنے لگتی ہے...... (بلکہ درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں)

اور زہری نے حسن سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اس کے خصم نے مسلمان حکام میں سے کسی حاکم کے پاس بلایا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظالم ہو اور اس کا کوئی حق نہ ہو(3)''۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ حدیث باطل ہے اور رہا آپ کا یہ قول فَهُوَ ظَالِمٌ تو یہ کلام صحیح ہے اور جہاں تک فلا حق له کا تعلق ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو أنه علی غیر الحق (کہ وہ غیر حق پر ہو) ابن خویز منداد مالکی نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جسے حاکم کی مجلس کی طرف بلایا جائے اس پر واجب ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ حاکم فاسق ہے یا اسے مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان عداوت کا علم ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے بھی شریعت ہیں سوائے اس حکم کے جس کے منسوخ ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اور یہ کہ سابقہ انبیاء علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے، اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اور یہ کہ تورات نہ ہم پڑھیں گے اور نہ جو کچھ اس میں ہے اس پر ہم عمل کریں گے، کیونکہ وہ جن کے قبضہ میں ہے وہ اس پر امین نہیں ہیں اور انہوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور اگر ہم جان لیں کہ اس میں کوئی ایسی شے ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ہمارے لئے اس کی قرأت جائز ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ انہوں نے حضرت کعب کو فرمایا: ''اگر تو جان لے کہ یہ وہی تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416-415، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب آداب القاضی، جلد 10، صفحہ 140

نازل فرمایا ہے تو پھر تو اسے پڑھ۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے جانتے تھے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اسی لئے آپ نے انہیں اس کی طرف اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی۔ اس کا بیان عنقریب سورۃ المائدہ میں آئے گا اور ان اخبار کا بیان جو اس کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَّ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"اس (بیباکی) کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہ چھوڑے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے۔"

یہ (ان کے) پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور ان کے اپنے اس قول سے دھوکہ کھانے کی طرف: نحن ابناء اللہ و احباوہ اور اسی طرح کے ان کے دیگر اقوال۔ اور سورۃ البقرہ کے اس قول کے معنی میں کلام گزر چکی ہے: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ۔

فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ۫ وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

"تو کیا حال ہوگا (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

یہ توقیف اور تعجب کی جہت پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو خطاب ہے(1)، یعنی کیا حال ہوگا ان کا یا وہ کیا کریں گے جب قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور ان سے ان کے وہ حسن مضمحل ہو جائیں گے جن کا وہ دنیا میں دعویٰ کرتے تھے اور جو کچھ انہوں نے اپنے کفر، اپنی جرأت اور اپنے قبیح اعمال میں سے کمایا اس کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

قول باری تعالیٰ لِیَوْمٍ میں لام بمعنی فی ہے، کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے لحساب یوم۔ (اس دن کے حساب کے لئے) اور طبری نے کہا ہے: لما یحدث فی یوم۔(2) (اس کے لئے جو اس دن میں ظاہر ہوگا)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾

"(اے حبیب! یوں) عرض کرو اے اللہ! اے مالک مالکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شہد اللہ اور قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ نازل فرمائے، تو یہ عرش کے ساتھ معلق ہو گئیں (اس طرح کہ) ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا اور انہوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں دار الذنوب اور ان لوگوں کی طرف اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت و جلال کی قسم! کوئی بندہ ہر فرض نماز کے بعد تمہیں نہیں پڑھے گا مگر میں اسے حظیرۃ القدس میں اس کے اعلیٰ مقام پر سکونت عطا فرماؤں گا اور یہ کہ میں اس کی طرف ہر روز اپنی مخفی آنکھوں کے ساتھ ستر بار دیکھوں گا اور یہ کہ میں ہر روز اس کی ستر حاجات پوری فرماؤں گا ان میں سے سب سے ادنیٰ مغفرت ہے اور یہ کہ میں اسے ہر دشمن سے پناہ عطا فرماؤں گا اور اس کے خلاف اس کی مدد کروں گا اور جنت میں داخل ہونے سے کوئی شے اس کے لئے مانع اور رکاوٹ نہیں ہو گی مگر یہ کہ وہ فوت ہو جائے۔''

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں ایک دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک دیا گیا اور میں آپ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا نہ کر سکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! تجھے نماز جمعہ سے کس شے نے روکا ہے؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یوحنا بن باریا یہودی کا مجھ پر ایک اوقیہ چاندی قرض تھا اور وہ میرے دروازے پر میری تاک میں تھا، پس مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ مجھے آپ سے روک دے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا قرض ادا فرما دے؟'' میں نے عرض کی: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر روز یہ پڑھا کر قل اللھم مالک الملک... تا قولہ... بغیر حساب رحمن الدنیا و الآخرۃ رحیمھما تعطی منھما من تشاء و تمنع منھما من تشاء اقض عنی دینی (اے دنیا اور آخرت میں بہت زیادہ رحم فرمانے والے اور مہربان تو جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے تو مجھ سے میرا قرض ادا فرما دے) تو اگر تجھ پر اتنا سونا قرض ہو گا جس سے ساری زمین بھر جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھ سے اسے ادا فرمائے گا۔'' اسے ابو نعیم الحافظ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عطا خراسانی سے بھی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن کریم میں سے چند آیات یا کلمات سکھائے۔ زمین میں کوئی مسلمان نہیں ہے جو ان کے ساتھ دعا مانگے اور وہ ستایا ہوا ہو یا اس پر تاوان ہو یا وہ مقروض ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی حاجت کو پورا فرما دے گا اور اس کے غم اور پریشانی کو دور فرما دے گا، مجھے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک لیا گیا۔ پھر آگے مذکورہ روایت بیان کی۔ حضرت عطا کی حدیث غریب ہے انہوں نے اسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور اپنی امت کے ساتھ ملک فارس اور روم کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہودیوں نے کہا: یہ بعید از امکان ہے! ملک فارس اور روم کہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آ سکتے ہیں! وہ ان سے کہیں زیادہ عزت والے اور طاقتور ہیں، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کافی نہیں ہوا کہ یہ ملک فارس اور روم کا طمع کر رہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے اس قول میں باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی: ''بے شک عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں'' اور وہ اس طرح کہ یہ اوصاف ہر صحیح الفطرت آدمی کے لئے یہ واضح اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کوئی شے نہیں ہیں (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے عناد اور ان کے کفر کے بارے آگاہ کیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات اور معجزات عطا فرمائے ہیں جو ان کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ لیکن اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں منفرد اور یکتا ہے۔ ارشاد گرامی ہے: **تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ** مزید فرمایا: **تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝** پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہوتے تو یہ اختیار ان کے پاس بھی ہوتا۔ پس اس میں یہی قیاس ہے اور یہی واضح نشانی ہے۔

قولہ تعالیٰ: **قُلِ اللّٰهُمَّ** علمائے نحو نے لفظ **اللّٰهُمَّ** کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں ھا مضموم ہے اور میم مفتوح مشدد ہے اور یہ منادیٰ ہے (3) اور اعشیٰ کے قول میں میم مخفف بھی مذکور ہے۔

کدعوۃ من أبی رباح یسمعها اللّٰهُمَ الکُبار

جیسا کہ ابو رباح کی دعا اسے انتہائی عظمت وشان والا معبود حقیقی سن رہا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور تمام بصریوں نے کہا ہے: اللھم کی اصل یا اللہ ہے، پس جب کلمہ کو حرف نداء یا کے بغیر استعمال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بدل میم مشدد کو بنا دیا پس وہ دو حروف لائے اور وہ دو میمیں ہیں دو حرفوں کے عوض اور وہ دونوں یا اور الف ہیں۔ اور ھا پر ضمہ یہ اسم منادیٰ مفرد کا ضمہ ہے۔ اور امام فراء اور علمائے کوفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللھم میں اصل یا اللہ اُمُّنا بخیر۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا اور دو کلموں کو ملا دیا گیا اور ھا پر ضمہ یہ وہی ضمہ ہے جو اُمُّنا میں تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو حرکت منتقل ہوگئی (4)۔

نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی خطا ہے اور اس میں قول وہی ہے جو امام خلیل اور سیبویہ نے کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ محال ہے کہ وہ ضمہ چھوڑ دیا جائے جو ندا مفرد پر دلیل ہے اور یہ کہ لفظ اللہ میں اُمّ کا ضمہ رکھا جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اسم میں الحاد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ زجاج کی طرف سے انتہائی غلو اور زیادتی ہے (5)۔ اور انہوں نے

1۔ اسباب النزول الواحدی، صفحہ 63
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی یَا اللهُ اُمُّہُ نہیں سنا۔ اور نہ ہی عرب یہ کہتے ہیں: یا اَللّٰهُمَّ۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ کبھی کبھی حرف ندا اَللّٰهُمَّ پر داخل ہوجاتا ہے اور اس پر انہوں نے راجز کا یہ قول بیان کیا ہے۔ غفرتَ أو عذّبتَ یا اللّٰهمّا (اے اللہ! تو بخش دے یا تو عذاب دے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَ مَا علیكِ أن تقولِي كلّما　　سبّحْتِ أو هلّلتِ یا اللّٰهُمَّ ما

تجھ پر لازم نہیں کہ جب بھی تو سبحان اللہ یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہُ کہے تو کہے یا اللّٰهُمَّ ما (اے اللہ!)

أُردُد علینا شیخَنا مسلّما　　فَإنّنا من خیرہ لن نُعْدَما (1)

تو ہم پر ہمارے شیخ کو صحیح سالم لوٹا دے پس ہمیں ان کی خیر و برکت سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔

کسی اور نے کہا:

انی اذا ما حَدَث أَلَمّا　　اقول یا اللّٰهُم یا اللّٰهُمّا

بلاشبہ جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو میں کہتا ہوں اے اللہ! اے اللہ!

انہوں نے کہا ہے: اگر میم حرف ندا کا عوض ہوتی تو یہ دونوں جمع نہ ہوتے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ شاذ ہے اور اس کا قائل معروف نہیں اور اسے چھوڑا نہیں جاسکتا ہے جو کتاب اللہ میں ہے (2) اور یہ تمام دیوان العرب میں ہے اور اسی کی مثل اس قول میں بھی وارد ہے۔

هما نَفَثَا لی فِیَّ من فَمَوَیهِمَا　　علی النابِحِ العاوی أشدّ رِجَامِ

کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ فَم اور ابنم میں میم مخفف کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میم مشدد کا اضافہ نہیں کیا جاتا (3)۔ اور بعض نحویوں نے کہا ہے جو کچھ کوفیوں نے کہا ہے وہ خطا اور غلطی ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا ہے تو پھر یہ کہا جانا واجب اور ضروری ہے: اللّٰهم اور اسی پر اقتصار کیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ دعا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کہتے ہیں: انت اللّٰهم الرزاق۔ پس اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے تو تو نے مبتدا اور خبر کے درمیان دو جملوں کے ساتھ فاصلہ کردیا۔ نضر بن شمیل نے کہا ہے: جس نے اللّٰهم کہا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے جمیع اسماء کے ساتھ پکارا۔ اور حسن نے کہا ہے: اللّٰهم دعا کو جامع ہوتا ہے (4)۔

قولہ تعالیٰ: مٰلِكَ الْمُلْكِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ عزوجل سے عرض کی کہ وہ آپ کی امت کو ملک فارس عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ملک فارس اور روم آپ کی امت کو عطا فرمادے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ ایضاً　5۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 445

تعلیم دی کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور مٰلِكَ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہے اس بنا پر کہ یہ ندا ثانی ہے، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ اسے اللّٰهُمَّ کی صفت بنایا جائے کیونکہ اس کے ساتھ میم ملی ہوئی ہے، اور محمد بن یزید اور ابراہیم بن سری الزجاج نے ان سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: مالک ترکیب میں اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی طرح فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: یہی ابوالعباس المبرد کا مذہب ہے اور جو سیبویہ نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اسماء موصوفہ میں اللھم کی طرز پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ یہ اسم مفرد ہے اور اس کے ساتھ (اسم) صوت کو ملایا گیا ہے اور اصوات کی صفت نہیں لگائی جاتی جیسا غَاق اور اس کے مشابہ الفاظ۔ اور اسم مفرد کا حکم یہ ہے کہ اس کی صفت نہ لگائی جائے اگرچہ علمائے (نحو) نے کئی مقامات پر اس کی صفت لگائی ہے۔ اور جب یہاں وہ اسم ملا دیا گیا جس کی صفت نہیں لگائی جاتی تو پھر قیاس یہی ہے کہ صفت نہ لگائی جائے کیونکہ یہ صوت کے ساتھ ملنے کے سبب صوت کی طرح ہو گیا ہے۔ جیسا کہ حَيْهَل پس اس کی صفت نہیں لگائی گئی (1)۔ اور الْمُلْكِ یہاں مراد نبوت ہے (2)۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد غلبہ ہے، اور یہ بھی ہے کہ مراد مال اور غلام وغیرہ ہیں (3)۔ "زجاج نے کہا ہے: معنی ہے (اے) بندوں کے مالک اور اس (شے) کے مالک جس کے وہ مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی ہے اے دنیا اور آخرت کے مالک (4)۔ اور تُؤْتِي الْمُلْكَ کا معنی ہے: تو ایمان اور اسلام عطا کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ یعنی جسے تو چاہتا ہے کہ تو اسے وہ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح اس کا مابعد بھی ہے۔ اور اس میں محذوف (کلام) مقدر ماننا ضروری ہے۔ یعنی وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ آن تنزعه منه، پھر اسے حذف کر دیا گیا۔

اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

أَلاهل لهذا الدَّهر من مُتَعَلِّل على الناس مهما شاء بالناس يَفْعَلِ

زجاج نے کہا ہے: (اس میں اصل عبارت اس طرح ہے۔) مهما شاء ان يفعل بالناس يفعل (جب وہ لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا چاہے تو وہ کر دیتا ہے۔) اور قول باری تعالیٰ: وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ کہا جاتا ہے: عزّ کا معنی ہے جب وہ بلند ہو اور غالب ہو۔ اور اسی سے ہے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔) وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ذل يذل ذُلًّا (جب وہ غالب آئے اور مسلط ہو جائے۔)

طرفہ نے کہا ہے:

بطيئٍ عن الجُلَّى سريع إلى الْخَنَا ذليلٍ بأجماع الرجال مُلَهَّدِ

بِيَدِكَ الْخَيْرُ یعنی تیرے ہی قبضے میں ہے خیر اور شر اور اسے (یعنی شر کو) حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 8 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے: خیر کو اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ دعا اور اس کے فضل میں رغبت رکھنے کا محل ہے۔ نقاش نے کہا ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ کا مفہوم ہے مدد و نصرت اور غنیمت تیرے قبضہ میں ہے (1)۔ اور اہل الاشارات نے کہا ہے: ابوجہل بہت زیادہ مال پر ملکیت رکھتا تھا اور وہ غزوۂ بدر کے دن کنوئیں میں گر گیا۔ اور حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم فقراء تھے ان کے پاس کوئی مال نہ تھا اور ان کی ملکیت ایمان تھا قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ تو ابوطالب کے یتیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھڑا کرتا ہے کنوئیں کے کنارے پر، یہاں تک کہ وہ ان ابدان کو ندا دیتا ہے جو کنوئیں میں پھینک دیئے گئے ہیں: اے عتبہ، اے شیبہ۔ تو جسے چاہتا ہے عزت اور غلبہ عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اے صہیب، اے بلال تم یہ اعتقاد نہ رکھو کہ ہم نے تمہیں تمہارے بغض کے سبب دنیا سے روک دیا ہے۔ بيدك الخير۔ عجز میں سے کوئی شے تمہارے لئے رکاوٹ نہیں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ حق کا انعام عام ہے وہ جسے چاہتا ہے والی بنا دیتا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

"تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔"

حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی نے ارشاد باری تعالیٰ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کے معنی میں بیان کیا ہے کہ تو دونوں (رات اور دن) میں سے ایک کی کمی کو دوسرے میں داخل کر دیتا ہے (2)، یہاں تک کہ دن پندرہ ساعت کا ہو جاتا ہے اور وہ طویل ترین دن ہوتا ہے اور رات نو ساعت کی ہو جاتی ہے اور وہ چھوٹی ترین رات ہوتی ہے۔ اور اسی طرح تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کا معنی بھی ہے۔ اور یہ کلبی کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی رکھتے ہیں کہ اس میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا داخل ہو۔ اور ان میں سے ایک کا زوال دوسرے میں داخل ہونا ہو (3)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے نکالتا ہے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور معمر نے حضرت زہری سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عورتوں کے پاس تشریف لے گئے تو وہاں ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "یہ کون ہے؟" تو انہوں نے عرض کی: یہ آپ کی خالاؤں میں سے ایک ہے۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: "یہ کون ہے؟" انہوں نے عرض کی: یہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث ہے۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سبحان الذی یخرج الحیّ من المیّت (پاک ہے وہ ذات جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے) وہ عورت نیک اور صالحہ تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ تو اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ کافر کا دل مردہ ہے اور مومن کا دل زندہ ہے، پس موت اور حیات دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مستعار ہیں۔ اور اکثر علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آیت میں حیات اور موت دونوں حقیقت ہیں۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مرغی کو انڈے سے نکالنا ہے اس میں مرغی زندہ ہے اور انڈا مردہ ہے اور انڈا جو کہ مردہ ہے اسے مرغی سے نکالتا ہے جو کہ زندہ ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد نطفہ ہے جو آدمی سے خارج ہوتا ہے اور اس میں نطفہ مردہ ہے اور آدمی زندہ ہے اور آدمی نطفہ سے زندہ نکلتا ہے حالانکہ نطفہ مردہ ہے۔

اور حضرت عکرمہ اور سدی نے کہا ہے: مراد دانہ ہے جو بالی سے نکلتا ہے اور بالی دانے سے نکلتی ہے اور گٹھلی کھجور سے نکلتی ہے اور کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے اور کھجور اور بالی میں حیات تشبیہا موجود ہے (1)۔ پھر فرمایا: وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ گویا کہ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے اس کا حساب نہیں لے گا۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾

''نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام، پس نہ رہا (اس کا) الله سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔ اور ڈراتا ہے تمہیں الله تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) اور الله ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: الله تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور انہیں دوست بنائیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (2) اور وہاں اس معنی کا بیان آ رہا ہے۔ اور فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ کا معنی ہے پس وہ الله کے گروہ میں سے نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دوستوں میں سے ہے۔ (یعنی فلیس من حزب الله ولا من اولیائه فی شیئ) اور یہ وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ کی مثل ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے ھو منی فرسخین یعنی وہ میرے اور میرے ساتھیوں سے دو فرسخ پر ہے۔ (ای من اصحابی و معی) پھر استثناء کی اور وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً حضرت معاذ بن جبل اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تقیہ (بچاؤ) ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے قوی اور طاقتور ہونے سے پہلے پہلے تھا۔ پس آج الله تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے بچیں اور احتیاط برتیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ (تقیہ) یہ ہے کہ آدمی زبان سے قول کرے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو نہ وہ قتل کیا جائے گا اور نہ وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور حسن نے کہا ہے: تقیہ (اپنا بچاؤ کرنا) قیامت کے دن تک آدمی کے لئے جائز ہے اور قتل میں کوئی تقیہ نہیں ہے۔

حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 418　　2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 9

اور یہ بھی کہا گیا ہے: مومن جب کفار کے درمیان موجود ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ انہیں زبان کے ساتھ دھوکہ دیتا رہے جب اسے اپنی ذات پر خوف ہے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ اور تقیہ حلال نہیں ہوتا مگر تب جب قتل کا خوف ہو یا اعضائے بدن کٹنے کا خوف ہو یا انتہائی شدید اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اور جسے کفر پر مجبور کیا گیا تو اس کے لئے صحیح یہ ہے کہ وہ سولی چڑھ جائے اور کفریہ کلمات زبان پر نہ لائے۔ (یعنی اس پر کلمہ کفر کہنا واجب نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ۔ حمزہ اور کسائی نے تقاۃ میں امالہ کیا ہے(1) اور باقیوں نے اسے پر پڑھا ہے۔ اور تُقَاۃ اصل میں وُقَیَۃٌ بروزن فُعَلَۃٌ ہے جیسا کہ تُوَدَۃ اور تهمة ہیں پھر واؤ کو تا سے اور یا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بدری اور متقی صحابی تھے اور ان کا یہود کے ساتھ معاہدہ تھا۔ پس جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میرے ساتھ یہود کے پانچ سو آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ نکلیں، تو ہم ان کے سبب دشمن پر غالب آسکیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ الآیہ۔(2)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے وہ بعض گفتگو کی جس کا مشرکین نے ان سے ارادہ کیا، اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ زجاج نے کہا ہے: ای ویحذرکم اللہ ایاہ اور اللہ تعالیٰ ہی تمہیں ڈراتا ہے پھر تم اس سے (یعنی ایاہ سے) اس کے سبب (یعنی نفسہ کے سبب) مستغنی ہو گئے اور وہ مستعمل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك پس اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے اور جو میری حقیقت ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے اور نہ وہ جو تیری حقیقت ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی سزا سے ڈراتا ہے(3) (لہٰذا) یہ وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ کی مثل ہے اور فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ تو میری غیب اور چھپی ہوئی شی کو جانتا ہے۔ اور النفس کو ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اضمار نفس میں ہی ہوتا ہے۔ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ای والی جزاء اللہ، الْمَصِیْرُ اور اللہ تعالیٰ کی جزا کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے کا اقرار ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۹

''فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 419، دار الکتب العلمیہ
2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 420، دار الکتب العلمیہ

پس وہ سینوں میں مخفی اور چھپی چیزوں کو اور ان تمام کو جن پر وہ مشتمل ہیں جاننے والا ہے اور ان تمام کے بارے جاننے والا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور انہیں جاننے والا ہے جنہیں یہ گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ علام الغیوب ہے اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شے غائب ہے اس کی ذات پاک ہے لا الہ الا ھو عالم الغیب و الشھادۃ۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

''جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔''

يَوْمَ منصوب ہے اور اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منقطع ہو (یعنی مذکورہ ارشادات میں سے کسی کے ساتھ یہ متصل نہ ہو۔) اس بنا پر کہ اس سے پہلے اُذْکُر فعل مضمر ہو۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: ان اللہ عزیز ذو انتقام۔ یوم تبدل الارض۔

اور مُّحْضَرًا ما کے صلہ میں ضمیر محذوف سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یوم تجد کل نفس ما عملتہ من خیر محضرا اور یہ اس بنا پر ہے کہ تَجِدُ، وجدان الضالۃ (گمشدہ کو پانا) سے ماخوذ ہو۔ اور وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ میں ما پہلے ما پر معطوف ہو۔ اور تَوَدُّ دوسرے ما سے حال ہونے کے محل میں ہے۔ اور اگر تَجِدُ کو بمعنی تعلم بنایا جائے تو پھر مُّحْضَرًا مفعول ثانی ہے۔ اور اسی طرح تَوَدُّ بھی دوسرے مفعول کے محل میں ہوگا۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی یوم تجد کل نفس جزاء ما عملت محضرا اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ اور تَوَدُّ بھی مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ما بمعنی جزا ہو۔ کیونکہ تَوَدُّ مرفوع ہے۔ اور اگر یہ ماضی ہوتا تو اس کا جزا ہونا جائز ہوتا اور کلام کا معنی اس طرح ہوتا: و ما عملت من سؤ ودّت لو انّ بینھا و بینہ أمدا بعیدا (اور جو کچھ برائی اس نے کی تھی وہ تمنا کرتا ہے کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان مدت دراز حائل ہو جاتی) یعنی جیسا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بعد ہے۔ اور جب ما کو شرطیہ بنایا جائے تو فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے، مگر یہ کہ تو اسے حذف فا پر محمول کرے۔ اور تقدیر کلام یہ ہو: و ما عملت من سو فھی تود۔ ابوعلی نے کہا ہے: میرے نزدیک فراء کے قول کا یہی قیاس ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ میں کہا ہے کہ یہ حذف فا کی بنا پر ہے۔ اور الْاَمَدُ کا معنی غایت (انتہا) ہے اور اس کی جمع آماد ہے۔ اور کہا جاتا ہے استولی علی الأمد۔ ای غالب سابقا۔ وہ سبقت لیتے ہوئے غالب آ گیا۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

اِلّا لمثلك أو من انت سابقه　　سبق الجواد اذا استولى على الامد (1)

اور الامد کا معنی غضب بھی ہے۔ کہا جاتا ہے أمِدَ أمَدًا۔ اذا غضب غضباً۔ یعنی جب وہ شدید غصے ہو جائے تو یہ جملہ کہا جاتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"(اے محبوب!) آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

الحُبُّ کا معنی ہے محبت اور اسی طرح الحِبُّ بالکسر بھی ہے۔ اور الحِبُّ بمعنی الحبیب بھی ہے جیسا کہ الخِدن اور الخدین (دوست) ہے۔ کہا جاتا ہے أحبه فهو مُحِبٌّ اور حبه يَحِبه (بالکسر) فهو مَحْبُوْبٌ (یعنی پہلا محبت کرنے والا اور دوسرا جس سے محبت کی جائے) جوہری نے کہا ہے: یہ شاذ ہے، کیونکہ مضاعف میں یفعل بالکسر نہیں آتا۔
ابوالفتح نے کہا ہے: اس میں اصل حَبُبَ ہے جیسا کہ ظَرُفَ پھر با کو ساکن کیا گیا اور اسے دوسری با میں مدغم کر دیا گیا۔ ابن الدہان سعید نے کہا ہے: حَبَّ میں دو لغتیں ہیں: حَبَّ اور أحَبَّ اور اس بنا میں حَبَّ اصل میں حَبُبَ تھا جیسا کہ ظَرُفَ اس پر ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: حَبُبْتَ۔ اور فَعُلَ سے صفت کا صیغہ اکثر فَعِيْلٌ کے وزن پر آتا ہے۔ ابوالفتح نے کہا ہے: اور أحَبَّ پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحِبُّهُمْ و يُحِبُّوْنَهٗ یہ یا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور حُبَّ فَعُلَ کے وزن پر آتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے حبیب۔ اور فعل کے وزن پر آتا ہے جیسا کہ ان کا قول محبوب ہے: اور حب متعدی سے اسم فاعل نہیں آتا، پس یہ نہیں کہا جاتا: أنا حابّ۔ اور افعل سے اسم مفعول بہت کم آتا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے: مِنّي بمنزلة المُحَبِّ المُكْرَمِ (میرے نزدیک معزز محبوب کے قائم مقام ہے) اور ابوزید نے بیان کیا ہے: حَبَبْتُه أحِبُّه۔

اور شعر بیان کیا:

فواللّٰه لو لا تَمْرَة ما حببتُهُ　　ولا كان أدنىٰ من عُوَيف و هاشِم

لعمرك انني و طِلاب مِصْرٍ　　لَكَالْمُزْدادِ مِمّا حَبَّ بُعْدًا

اصمعی نے بیان کیا ہے: حرف مضارع کو فتحہ دیا گیا ہے درآنحالیکہ با اکیلی ہے۔ اور الحَبُّ الخابیہ فارسی سے عربی بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جمع حِباب اور حِبَبَةٌ آتی ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہوں نے جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہے، محمد بن جعفر بن زبیر نے یہی کہا ہے (2)۔
اور حسن اور ابن جریج نے بیان کیا ہے: یہ آیت اہل کتاب کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 421، دار الکتب العلمیہ
2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66

نحن الذين نحبُّ ربنا(1) ہم وہ ہیں جو اپنے رب سے محبت کرتے ہیں۔

اور روایت ہے کہ مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم واللہ انا لنُحب ربنا قسم بخدا! ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (2) ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک محبة کا معنی ہے ارادة الشئ علی قصد له کسی شے کا قصد کرتے ہوئے اس کا ارادہ کرنا۔ اور ازہری نے کہا ہے: بندے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کا معنی اس کا ان دونوں کی اطاعت کرنا اور ان کے حکم کی اتباع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت کا معنی اس کا ان پر غفران اور بخشش کے ساتھ انعام فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ لا یحب الکافرین یعنی وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن کی محبت ہے اور قرآن کریم کی محبت کی علامت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرآن کی محبت اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور سنت کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرے اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے بغض رکھے اور دنیا کے بغض کی علامت یہ ہے کہ وہ اس سے صرف زادراہ اور گزارے کی مقدار حاصل کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا: ''(کہ تم میری اتباع کرو) نیکی، تقویٰ، تواضع اور ذلة النفس میں'' اسے ابوعبداللہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (3)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: مَن اراد ان یحبه الله فعلیه بصدق الحدیث وأداء الامانة والا یؤذی جاره۔

جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ سچ بولے، امانت ادا کرے اور یہ کہ وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرمانے لگتا ہے تو وہ جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر (4)۔ پس حضرت جبریل امین بھی اس سے محبت فرمانے لگتا ہے: پھر وہ آسمان میں ندا دیتا ہے اور کہتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تم بھی اس سے محبت کرو تو پھر اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں فرمایا پھر اسے زمین میں قبول عام عطا فرما دیا جاتا ہے اور جب وہ کسی بندے کو مبغوض جانے تو جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پس تو بھی اسے ناپسند کر پھر جبریل امین علیہ السلام بھی اسے ناپسند کرتے ہیں پھر

1۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 4، صفحہ 272

3۔ نوادر الاصول فی معرفة احادیث الرسول، قل ان کنتم تحبون، صفحہ 199

4۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکة، حدیث نمبر 2970، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آسمان کے باسیوں میں اعلان کر دیتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو تم بھی اسے مبغوض جانو...... فرمایا...... پس وہ بھی اسے مبغوض جانتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے نفرت رکھ دی جاتی ہے(1)''۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ مریم کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو رجا العطاردی نے فَاتَّبِعُوْنِیْ با کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وَیَغْفِرْ لَكُمْ کا عطف یُحْبِبْكُمُ پر کیا ہے۔ اور محبوب نے ابو عمرو بن علاء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یغفر کی را کو لَكُمْ کی لام میں مدغم کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امام خلیل اور سیبویہ را کو لام میں ادغام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ابو عمرو نے اس طرح کی غلطی کرنے سے صرف نظر کیا ہے شاید وہ حرکت کو مخفی کر دیتے ہیں جیسا کہ وہ کثیر اشیاء میں ایسا کرتے ہیں۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

''آپ فرمایئے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا یہ شرط ہے، مگر چونکہ یہ ماضی ہے اسے اعراب نہیں دیا جا سکتا (یعنی یہ معرب نہیں ہے) اور تقدیر کلام یہ ہے فان تولوا علی کفرھم و اعرضوا عن طاعۃ اللہ و رسولہ۔ (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کر لیں) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے فعل کو پسند نہیں کرتا اور وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یہ نہیں کہا: فانہ کیونکہ عرب جب کسی شے کی عظمت بیان کرتے ہیں تو اس کے ذکر کا اعادہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ سیبویہ کے اس شعر میں ہے:

لا أری الموتَ یسبِقُ الموتَ شیٌ　　نَغَّصَ الموتُ ذَا الغِنَی وَالفقیرا

میں موت کو نہیں پاتا کہ کوئی شے موت سے سبقت لے جا سکتی ہے موت نے خوشحال اور فقیر آدمی کی زندگی کو مکدر اور بدمزہ کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۳

''بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم علیہم السلام کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان والوں پر۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا۔ اصْطَفٰۤى بمعنی اختار ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا۔ سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح آدم کا مادہ اشتقاق اور آپ کی کنیت کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ان اللہ اصطفی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، جلد 2، صفحہ 331

دینهم بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کا دین چن لیا اور وہ دین، دین اسلام ہے، سو مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے زمانے کے رہنے والوں پر نبوت کے لئے چن لیا اور وَنُوْحًا کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ نام ینوح سے مشتق ہے اور یہ عجمی اسم ہے مگر یہ منصرف ہے کیونکہ یہ سہ حرفی ہے (اور اس کا درمیان والا حرف ساکن ہے۔) اور آپ مرسلین کے شیخ ہیں اور آپ ہی پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا اور ساتھ ہی بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں اور تمام قرابت رکھنے والی عورتیں حرام قرار دیں۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے، اسے وہم ہی ہے اس کا بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اٰلَ کا معنی اور جس پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں ہو چکا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد وہ مومنین ہیں جو آل ابراہیم، آل عمران، آل یاسین اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے مومنین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (1) (آل عمران) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور یہ کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آل ابراہیم میں سے ہیں (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آل ابراہیم سے مراد ان کی اپنی ذات ہے۔ اور اسی طرح آل عمران ہے، اس کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (البقرہ: 248) (اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون (3))

اور حدیث میں ہے: ''مجھے آل داؤد کی دعاؤں میں سے ایک دعا عطا کی گئی'' (4)

اور شاعر نے کہا ہے:

ولا تبك مَيْتا بعد میت أحَبّه عليّ و عباس و آلُ ابی بکر (5)

اور تو نہ رو کسی میت پر اپنے سب سے زیادہ محبت کرنے والوں کے مرنے کے بعد یعنی حضرت علی، حضرت عباس اور آل ابی بکر۔ اس میں آل ابی بکر سے مراد ان کی ذات ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

يُلاقي من تذكُّرِ آلِ لَیْلٰی کما یَلقی التَسلِیمُ من العِدَادِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 488 — 2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 452

3۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 755 — 4۔ صحیح بخاری، باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن، حدیث 4660، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 423، دار الکتب العلمیہ

اس میں تذکر آل لیلیٰ سے مراد اس کی ذات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل عمران ہی آل ابراہیم ہے۔
جیسا کہ فرمایا: ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ آپ کی والدہ عمران کی بیٹی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی اپنی ذات مراد ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے باپ ہیں اور وہ عمران بن یصہر بن فاهاث بن لاوی بن یعقوب ہیں (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: وہ مریم کے باپ عمران ہیں اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور سہیلی نے بیان کیا ہے: وہ عمران ابن ماتان ہیں اور ان کی بیوی حنہ (بالنون) ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے کیونکہ تمام کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام انہیں کی نسل میں سے ہیں۔ اور عمران غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدتان ہے۔ اور قولہ تعالیٰ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ کا معنی ہے علی عالمی زمانھم۔ (یعنی انہیں اپنے زمانے کے باسیوں پر چن لیا)، یہ اہل تفسیر کے قول کے مطابق ہے اور ترمذی حکیم ابو عبداللہ محمد بن علی نے کہا ہے: جمیع الخلق کلھم یعنی تمام مخلوق پر۔ اور کہا گیا ہے: عَلَى الْعٰلَمِيْنَ صور پھونکنے کے دن تک تمام مخلوق پر (انہیں چن لیا) اور یہ اس لئے کہ یہ رسل اور انبیاء علیہم السلام تھے اور یہی مخلوق میں چنے ہوئے تھے۔

اور رہے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تو آپ کا مرتبہ (مقام) اصطفاء سے کہیں بلند ہے کیونکہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے حبیب اور رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ (الانبیاء) پس اور رسل علیہم السلام رحمت کے لئے پیدا کئے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو سراپا رحمت تخلیق فرمایا گیا۔ اسی لئے آپ مخلوق کے لئے امان بن گئے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تو مخلوق یوم قیامت تک عذاب سے محفوظ و مامون ہوگئی۔ اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام اس مقام پر فائز نہ ہوئے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انا رحمة مهداة (2) آپ خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے رحمت ہے۔ اور آپ کا قول مھداۃ کا معنی ہے: آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے ہدیہ اور تحفہ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے ساتھ چنا، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت کے ساتھ انتہائی حسین صورت میں تخلیق فرمایا، دوسری یہ ہے کہ انہیں تمام چیزوں کے اسماء سکھا دیئے، تیسری یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ انہیں سجدہ کریں، چوتھی یہ ہے کہ انہیں جنت میں سکونت عطا فرمائی اور پانچویں یہ ہے کہ انہیں ابوالبشر بنایا اور پانچ چیزوں کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کو منتخب فرمایا: پہلی یہ کہ آپ کو ابوالبشر بنایا کیونکہ پہلے تمام کے تمام لوگ غرق کر دیئے گئے اور صرف آپ کی ذریت اور اولاد ہی باقی رہی۔ اور دوسری یہ کہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائی اور کہا جاتا ہے: مبارک اور بشارت ہے اس کے لئے جس کی عمر طویل ہو اور اس کا عمل حسین اور اچھا ہو (3)۔ اور تیسری یہ کہ کفار اور مومنین کے بارے میں آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور چوتھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 453
2۔ شعب الایمان، کتاب حب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد 2، صفحہ 164، حدیث نمبر 1446
3۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی طول العمر للمومن، حدیث نمبر 2251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ ہے کہ آپ کو کشتی پر اٹھایا اور پانچویں یہ کہ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے احکام شرعیہ کو منسوخ کیا۔ آپ سے پہلے خالاؤں اور پھوپھیوں سے شادی کرنا حرام نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پانچ چیزوں کے ساتھ چنا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو الانبیاء بنایا، کیونکہ یہ روایت ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک آپ کی صلب سے ایک ہزار نبی تشریف لائے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا، تیسری یہ کہ آپ کو نار نمرود سے نجات عطا فرمائی (اور اسے آپ کے لئے گلزار بنا دیا) اور چوتھی یہ کہ آپ کو لوگوں کا امام بنایا اور پانچویں یہ کہ آپ کو کچھ کلمات کے ساتھ آزمایا اور آپ کو توفیق عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ نے انہیں مکمل فرمالیا۔ (یعنی آپ تمام آزمائشوں میں کامیاب و کامران ہوئے) پھر فرمایا وَاٰلَ عِمْرٰنَ اگر عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عالمین پر چن لیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم پر من وسلویٰ نازل فرمایا اور عالم میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر عمران حضرت مریم علیہا السلام کے باپ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مریم کو چن لیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے جنم دیا اور عالم میں کسی کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

## ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ذُرِّيَّةً کا معنی اور اس کا مادہ اشتقاق سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ ای فی حال کون بعضهم من بعض یعنی اس حال میں کہ وہ بعض بعض سے ہیں، ای ذریۃ بعضها من ولد بعض یعنی ایک نسل ہے درآنحالیکہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ کوفیوں نے کہا ہے: بالقطع یہی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ بدل ہے ای اصطفی ذریۃ بعضها من بعض (یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا ایک نسل کو جن میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں) اور بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے یعنی دین میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں (باہم معاون ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض یعنی ضلالت و گمراہی میں (وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں)، حسن اور قتادہ نے یہی کہا ہے (1) اور بعض نے کہا ہے: وہ اجتباء، اصطفاء اور نبوت میں ایک دوسرے کا بعض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے اور یہ (معنی) سب سے کمزور ہے۔

## اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 10

''جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے، سو قبول فرما لے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا، (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا اسے (تو حیرت و حسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور الله تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ ابوعبیدہ نے کہا ہے: اِذْ زائدہ ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے اُذکر اِذ۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اصطفی آل عمران اذ قالت امرأۃ عمران۔ الله تعالیٰ نے آل عمران کو چن لیا جب عمران کی بیوی نے عرض کی۔ اور یہ حنہ بنت فاقود بن قنبل حضرت مریم علیہا السلام کی ماں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دادی تھی۔ یہ عربی نام نہیں ہے اور نہ ہی عربی میں کسی عورت کا نام حنہ معروف ہے۔ عربی میں ابو حنہ البدری ہے۔ اور اس میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ابوحبہ ہے اور یہی اصح ہے اور اس کا نام عامر ہے۔ اور حنہ کی خانقاہ شام میں ہے اور ایک دوسری بھی ہے اسے بھی دیر حنہ ہی کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابونواس نے کہا ہے:

یا دَیْرَ حَنَّۃَ من ذات الاُکَیْرَاحِ　　مَن یَصْحُ عنك فانّی لستُ بالصاحِی

اس میں یا دَیْرَحَنَّہ سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اور عرب میں حبہ تو کثیر ہیں، ان میں سے ایک ابو حبہ انصاری ہیں اور ابو السنابل بن بعکک جو کہ حدیث سبیعہ میں مذکور ہیں (1)۔ وہ بھی حبہ ہیں اور خنہ خاء معجمہ کے ساتھ تو کوئی معروف نہیں سوائے بنت یحییٰ بن اکثم القاضی کے اور یہ محمد بن نصر کی ماں ہے اور جنہ تو کوئی معروف نہیں سوائے ابو جنہ کے اور یہ ذی الرمہ شاعر کا ماموں ہے یہ سب ابن ماکولا کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا، نذر کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہ (نذر) بندے پر لازم نہیں ہوتی مگر اس طرح کہ بندہ خود اسے اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ جب حاملہ ہوئیں تو انہوں نے کہا: اگر الله تعالیٰ نے مجھے نجات عطا فرمائی اور میں نے اسے جنا جو میرے پیٹ میں ہے تو میں اسے (سب کاموں سے) آزاد کر دوں گی۔ اور لَكَ کا معنی ہے لعبادتك یعنی تیری عبادت کے لئے اور مُحَرَّرًا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی انی نذرت لك ما فی بطنی غلامًا محررًا تفسیر، سیاق کلام اور اعراب (ترکیب) کے اعتبار سے پہلا مفہوم زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ جہاں تک ترکیب کا تعلق ہے تو نعت کو منعوت کے قائم

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من شهد بدرا، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقام رکھنا کئی مقامات پر جائز نہیں ہوتا اور کئی دوسرے مقامات پر مجازی طور پر جائز ہوتا ہے اور رہی تفسیر، تو کہا گیا ہے کہ عمران کی بیوی کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ عمر رسیدہ تھی بچے کو جنم نہ دے سکتی تھی۔

اور یہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں رہ رہے تھے اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے ایک پرندے کو دیکھا وہ اپنے بچے کو چوگ دے رہا تھا تو اس وجہ سے اس کے دل میں بھی اضطراب اور حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اسے بچہ عطا فرمائے اور نذر مانی کہ اگر اس نے (بچہ) جنا تو وہ اسے (ہر کام سے) آزاد کر دے گی۔ یعنی وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہوگا۔ عبادت گاہ کا خادم ہوگا اور اسی کے لئے وقف ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہوگا۔ اور ایسا کرنا ان کی شریعت میں جائز تھا اور ان کی اولاد پر لازم تھا کہ وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ پس جب اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو جنم دیا تو کہا: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى اے رب! میں نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ یعنی لڑکی تو کنیسہ کی خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کہا گیا ہے یا اس وجہ سے کہ اسے حیض اور دیگر تکلیفیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: (یا اس وجہ سے) کہ وہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور وہ امید کر رہی تھی کہ وہ بچہ ہوگا پس اسی وجہ سے اس نے اسے آزاد کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ابن عربی نے کہا ہے: ”اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عمران کی بیوی کے حمل تک نذر کوئی راستہ نہیں پاسکتی کیونکہ وہ آزاد تھی۔ اور اگر اس کی بیوی کنیز ہوتی تو بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لئے اپنے بچے کے بارے میں نذر ماننا صحیح نہیں ہوتا تو کیونکر اس نے اس کی حالت میں تصرف کر لیا، کیونکہ اگر نذر ماننے والا غلام ہو تو اس بارے میں اس کا کوئی قول مضبوط اور پختہ نہیں۔ اور اگر آزاد ہو تو یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کا مملوک ہو۔ اور عورت بھی اسی طرح ہے تو پھر اس بارے میں نذر کی وجہ کیا ہے؟ بلاشبہ اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے شک آدمی اپنے بچے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وہ اس سے انس حاصل کرے، اس سے مدد لے اور اس کے ساتھ اطمینان اور تسلی پائے۔ پس اس عورت نے بھی بچے سے انس حاصل کرنے اور سکون اور راحت پانے کے لئے بچے کی خواہش اور طلب کی تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرما دیا تو اس نے نذر مانی کہ وہ اس سے انس حاصل کرنے کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوتی ہے اور وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف ہوگا۔ اور یہ نیکوکار آزاد لوگوں کی نذر ہے۔ اور اس نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ وہ میری جانب سے آزاد ہوگا اور دنیا کی غلامی اور اس کی مشغولیت سے آزاد ہوگا۔ صوفیاء میں سے ایک آدمی نے اپنی ماں کو کہا: اے ماں! تو مجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دے میں اس کی عبادت کروں گا اور علم حاصل کروں گا تو ماں نے کہا: ہاں (میں نے تجھے چھوڑ دیا) پس وہ چلا گیا یہاں تک کہ اس نے غور و فکر کیا تو پھر ماں کی طرف واپس لوٹ کر آیا اور دروازے پر دستک دی تو ماں نے پوچھا: کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تیرا فلاں بیٹا ہوں۔ تو ماں نے کہا: ہم نے تجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور ہم تجھے واپس نہیں لوٹائیں گے (1)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: مُحَرَّرًا یہ ماخوذ ہے اس حریۃ (آزادی) سے جو عبودیۃ (غلامی) کی ضد ہے۔ اسی

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 270

سے تحریر الکتاب ہے اور وہ اسے اضطراب اور فساد سے خالص (خالی) کرنا ہے۔ اور خصیف نے حضرت عکرمہ اور حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ محرر وہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور امور دنیا میں سے کسی شے کی اس میں آمیزش نہ ہو۔ اور لغت میں یہ معروف ہے کہ ہر شے جو خالص ہو اسے حر (آزاد) کہا جاتا ہے۔ اور محرر اسی معنی میں ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

والقُرطُ فی حرّۃ الذِّفری مُعَلَّقُهٗ تباعد الحبلُ منه فهو یَضطرب

اور طین حُرٌ وہ مٹی جس میں ریت نہ ہو، باتت فلانة بلیلة حُرَّةٍ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پہلی رات خاوند عورت کے پاس نہ آئے اور اگر وہ اس پر قدرت پالے تو پھر اس کی رات لیلۃ شیباء کہلائے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس نے یہ کہا ہے کیونکہ نذر میں صرف مذکر قبول کیا جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو قبول فرمالیا۔ اور ترکیب کلام میں اُنْثٰی حال ہے اور اگر چاہے تو اسے بدل بنالے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس نے ان کی تربیت اور پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہوگئی تو اس وقت انہیں (آزاد) چھوڑ دیا، اشہب نے اسے مالک سے روایت کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور مسجد چھوڑ آئی اور اپنی نذر کو پورا کر دیا اور اس سے برأت اختیار کرلی۔ شاید ان میں حجاب (پردہ) نہیں تھا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا اور بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور وہ فوت ہوگئی۔ الحدیث۔ (1)

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ یہ اس کی قرأت کے مطابق ہے جس نے وَضَعْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ من جملہ اس کا کلام ہے، کیونکہ کلام متصل ہے اور یہ ابوبکر اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا اور اس کے لئے خضوع اور پاکی بیان کرنے کا معنی ہے۔ (اس سے کہ اس پر کوئی شے مخفی ہے۔) اور اس نے یہ بطریق اخبار نہیں کہا کیونکہ مومن کے دل میں یہ پختہ اور ثابت شدہ امر ہے کہ ہر شے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور تنزیہ بیان کرنے کے طریقہ پر کہا ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہے جو پہلے لایا گیا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے کہ یہ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ سے موخر ہو وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ، مہدوی نے یہی کہا ہے۔ اور مکی نے کہا ہے: یہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تثبیت کے طریقہ پر اطلاع ہے پس فرمایا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو مریم کی ماں نے جنا وہ اس کے بارے کچھ کہے یا نہ کہے۔ اور اسے اس سے بھی قوت حاصل ہوتی ہے کہ اگر یہ حضرت مریم کی ماں کے کلام سے ہوتا تو کلام کا انداز یہ ہوتا: وانت اعلم بما وضعتُ، (اور تو بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو میں نے جنا) کیونکہ اس نے اپنے قول میں پہلے کلام اس طرح پکارا ہے: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِمَا وَضَعْتِ تا کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی اسے یہ کہا گیا۔

1۔ صحیح بخاری، باب کنس المسجد والتقاط الخرق والقذی والعیدان، حدیث نمبر 438، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 7** ۔قولہ تعالیٰ: وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى بعض شافعیہ نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت وطی کے سلسلہ میں عورت اپنے خاوند کی پیروی اور مطاوعت اختیار کرے تو وجوب کفارہ میں مرد عورت کے مساوی نہیں ہوگا۔

ابن عربی نے کہا ہے: اور یہ ان کی طرف سے غفلت ہے، کیونکہ یہ خبر ہم سے پہلے والوں کی شریعت میں سے ہے اور وہ اس طرح کا قول نہیں کرتے تھے۔ اور اس صالحہ عورت نے اپنے کلام کے ساتھ اس کا قصد کیا ہے جس کے بارے اس کی ظاہر حالت اور اس کے کلام کا مقطع شہادت دیتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے بچے کے لئے مسجد کی خدمت کرنے کی نذر مانی تھی۔ پس جب اس نے اسے بچی دیکھا جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتی تو چونکہ وہ عورت ہے تو اس نے اپنے مقصود کے خلاف پائے جانے کی وجہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کی اور ''مریم'' غیر منصرف ہے کیونکہ یہ مونث معرفہ ہے اور یہ عجمی بھی ہے۔ نحاس نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 8** ۔قولہ تعالیٰ: وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ان کی لغت میں مریم کا معنی خادم الرب ہے۔ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ اس میں ھا ضمیر سے مراد مریم ہے۔ وَذُرِّيَّتَهَا مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کبھی ذریت کا اطلاق صرف بیٹے پر ہوتا ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اسے کچوکا لگاتا ہے اور وہ شیطان کے کچوکا لگانے سے چیخ کر روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔'' پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو۔ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس اس حدیث نے یہ فائدہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا کو قبول فرما لیا ہے۔ کیونکہ شیطان سوائے مریم اور ان کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے تمام اولاد آدم کو حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء کو بھی کچوکے لگاتا ہے۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پہلو میں کچوکا لگاتا ہے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کے، ان دونوں کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا پس اس کا کچوکا حجاب پر لگا اور دونوں کے لئے اس سے کوئی شے پار نہ ہوئی (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر اس طرح نہ ہو تو پھر ان دونوں کی خصوصیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیطان کے کچوکا لگانے سے جس کو مس کیا گیا ہے اس کو گمراہ کرنا اور بھٹکانا اس سے لازم آتا ہے، کیونکہ یہ ظن فاسد ہے۔ پس کتنے انبیاء اور اولیاء ہیں کہ شیطان نے فساد اور بھٹکانے کے طرح طرح کے طریقوں سے ان سے تعرض کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے محفوظ و مامون رکھا جو شیطان کا ارادہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: 42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) یہ اس کے باوجود ہے کہ بنی آدم میں سے ہر ایک کو شیاطین میں سے اس کے ساتھی کے حوالے کیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (3)

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب صفۃ ابلیس وجنودہ، حدیث نمبر 3044، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2323

پس حضرت مریم اور ان کا بیٹا اگرچہ دونوں شیطان کے کچوکے سے بچا لئے گئے ہیں لیکن ان دونوں کو اس کی ملازمت اور مقارنت سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

''پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنا دیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔ وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔''

قولہ تعالیٰ: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ اس کا معنی ہے: اسے سعداء کے راستے پر چلایا۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: تقبل کا معنی ہے تربیت میں کفیل بننا اور اس کے معاملات کو ادا کرنا۔ اور حسن نے کہا ہے تُقُبِّل کا معنی ہے کہ اس کے رب نے اسے رات، دن میں سے کبھی ایک ساعت بھی اذیت اور تکلیف نہیں دی۔ اور وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا سے مراد ہے اس کی خلقت کو بغیر کسی کمی وبیشی کے صحیح بنایا، پس وہ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا عام بچہ سال میں نشوونما پاتا ہے۔ قبول اور نبات دونوں مصدر ہیں لیکن اپنے فعل کے ہم وزن مصدر نہیں۔ فی الحقیقت مصدر تَقَبُّلًا اور اِنْبَاتًا ہیں۔

شاعر نے کہا:

أَكُفْرًا بعد ردّ الموت عنّي و بعدَ عطائكَ المائةَ الرِّتاعا

شاعر کی مراد بعدِ اعطائِك ہے۔ لیکن جب کہا اَنْۢبَتَهَا تو یہ نَبَتَ پر دلیل ہے (انبات بنت کو مستلزم ہے)

اسی طرح امرؤالقیس نے کہا ہے۔

فصِرنا الى الحسنى ورقّ كلامُنا و رُضتُ فذلّت صعبةً اىّ إذلالِ

بالشبہ ذَلّتْ کا مصدر ذُلٌّ ہے۔ لیکن اس نے اسے اَذْلَلْتُ کے معنی پر لوٹا دیا ہے اور اسی طرح ہر اس کا حال ہے جو اس باب میں آتا ہے۔ پس تَقَبَّلَ اور قَبِلَ کا معنی ایک ہے۔ پس معنی ہوا فقبلها رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ کہ اس کے رب نے اسے اچھی

طرح قبول کرلیا۔

اور اسی کی مثل روبہ کا قول ہے۔

وقد تَطَوَّيْتُ انطواءَ الحِضْب

اس میں تَطَوَّيْتُ اور انطویت کا معنی ایک ہے۔

اور اسی کی مثل القطامی کا قول ہے:

و خير الامر ما استقبلت منه و ليس بأن تَتَبَّعَهٗ اتباعا

کیونکہ تَتَبَّعْتُ اور اتبعت دونوں ہم معنی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وَاَنْزَلَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَنْزِيْلًا کیونکہ نزل اور اَنْزَلَ کا معنی ایک ہے۔ اور مفضل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے۔ وانبتها فنَبَتَتْ نباتًا حسنًا۔ (اس کے رب نے اسے پروان چڑھایا اور وہ خوب اچھی طرح پروان چڑھی۔) اور معنی کی رعایت کرنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور قبول میں اصل ضمہ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ دُخول اور خُرُوج۔ اور فتحہ قلیل حروف میں آیا ہے جیسا کہ وَلوع اور وَزوع۔ یہ تین ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ابوعمرو، کسائی اور ائمہ نے یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے ''قبول'' کو اصل کی بنا پر قاف کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ ملا دیا (سپرد کردیا)۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: وہ اس کی دیکھ بھال کے ضامن بن گئے۔ کوفیوں نے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وكفلها ربُّها زكريا، یعنی اس کی کفالت ان کے ذمہ لازم کردی۔ اور اس پر انہیں مقرر کردیا اور اسے ان کے لئے آسان بنادیا۔

اور مصحف ابی میں ہے واكفلها متعدی میں ہمزہ تشدید کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس سے پہلے فَتَقَبَّلَهَا اور اَنْۢبَتَهَا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں خبر دی اس کے بارے جو اس کے ساتھ کیا، پس اسی وجہ سے كَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقیوں نے فعل کی نسبت حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف کرنے کی بنا پر اسے مخفف پڑھا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس کی کفالت اور اس کے معاملات کے والی اور نگران بن گئے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (ان میں سے کون مریم کی نگرانی کرے گا؟) مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ تشدید بھی تخفیف کی طرف ہی لوٹتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ضامن اور نگران بنے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے کفیل بنے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کے ساتھ ہی بنے۔ پس اس بناء پر دونوں قرأتیں باہم متداخل ہیں۔

عمرو بن موسیٰ نے عبداللہ بن کثیر اور ابی عبداللہ المزنی سے وَكَفِلَهَا فا کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے كَفَلَ يَكْفُلُ اور كَفِلَ يَكْفَلُ (یعنی یہ دونوں باب ہیں) اور میں نے كَفُلَ نہیں سنا، حالانکہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اور مجاہد نے فَتَقَبَّلْهَا سوال اور طلب کی بنا پر لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رَبَّهَا کو نصب کے ساتھ اس لئے کہ اس کی نسبت (حرف) ندا کی طرف ہے۔ اور وَأَنْبَتْهَا میں تا کو سکون کے ساتھ و كَفَلْهَا میں لام کو سکون کے ساتھ، اور ''زکریا'' کو مد اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے ''زکریا'' کو بغیر مد اور ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز ''زکریا'' کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس میں قصر کرتے ہیں۔ اور اہل نجد اس سے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور اسے منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: زَکرِیٌّ۔

اخفش نے کہا ہے: اس میں چار لغات ہیں: مد اور قصر اور زَکرِیٌّ یا کی تشدید اور منصرف اور زَکرٍ اور رأیت زَکرِیا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: زکری غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمہ ہے اور یہ غلط ہے، کیونکہ جو اس میں ''یا'' ہے اس طرح کے الفاظ منصرف ہوتے ہیں مثلاً کرسی اور یحییٰ اور زکریا مد اور قصر کی صورت میں منصرف نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث، عجمہ اور تعریف ہے۔

قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يَٰمَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۞ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۞

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ لغت میں محراب سے مراد مجلس میں قابل تکریم جگہ ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ''(حضرت مریم) ایک کمرہ میں رہتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس سیڑھی سے چڑھ کر آتے تھے۔

جیسا کہ وضاح الیمن نے کہا ہے:

رَبَّةُ محرابٍ اذا جئتُها لم أَلقها حتى ارتقِي سُلَّما

محراب (مکان) میں رہنے والی، جب بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو میں اس سے ملاقات نہیں کر سکتا یہاں تک کہ میں سیڑھی چڑھتا ہوں۔

اس سے مراد رَبَّةُ غُرْفَةٍ ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: عمران کی بیوی عمر رسیدہ ہونے کے بعد حاملہ ہوئی تو اس نے نذر مانی کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے، تو عمران نے اسے کہا: تیری ہلاکت ہو! تو نے کیا کیا ہے؟ تیرا کیا خیال ہے اگر وہ بچی ہوئی؟ تو اس وجہ سے دونوں ہی مغموم ہو گئے۔ پھر عمران فوت ہو گئے اور حنہ حاملہ تھی اس نے بچی کو جنم دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خوب اچھی طرح قبول کر لیا اور وہ صرف بچوں کو آزاد چھوڑتے تھے، تو علماء نے ان قلموں کے ساتھ اس کے بارے قرعہ اندازی کی جن کے ساتھ وہ وحی لکھتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس زکریا علیہ السلام کو اس پر نگران مقرر کر دیا اور انہوں نے اس کے لئے ایک جگہ بنائی اور جب وہ تھوڑی بڑی عمر کی ہو گئی تو آپ نے اس کے لئے محراب بنا دیا اور اس جگہ کی طرف آپ سیڑھی کے ساتھ اوپر چڑھتے تھے اور آپ نے اس کے لئے ایک دایہ (دودھ

پلانے والی) اجرت پر رکھی اور آپ اس پر دروازہ بند کر جاتے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی اس کے پاس داخل نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔ پس جب وہ حائضہ ہوئی تو آپ اسے اپنے گھر کی طرف نکال کر لے گئے اور وہ اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی اور کلبی کے قول کے مطابق اس کی خالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی۔ مقاتل نے کہا ہے: اس کی بہن حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ تھی۔ اور جب وہ حیض سے پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر لیا تو آپ اسے محراب کی طرف لوٹا لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے حیض نہ آتا تھا اور وہ اس سے پاک رہتی تھی۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے پاس آتے تو آپ اس کے پاس موسم سرما کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل موسم سرما میں پاتے تھے، تو آپ نے فرمایا: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں تو اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کی خواہش کی اور کہا: بے شک وہ جو اس کے پاس پھل لاتا ہے وہ مجھے بچہ عطا کرنے پر بھی قادر ہے اور أنّٰی کا معنی ہے من أین۔ کہاں سے۔ ابو عبیدہ نے یہی کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس میں تساہل ہے، کیونکہ أینَ جگہ اور مکان کے بارے سوال کے لئے آتا ہے اور أنّٰی مذاہب اور جہات کے بارے سوال کے لئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کون سے مذاہب اور کون سی جہات سے تیرے لئے یہ ہیں۔ کمیت نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے:

أنّى و من أين آبك الطّرب　　　من حيث لا صبوة ولا رِيَب

اس میں أنّٰی جہات اور أین مکان کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور کلّما، وَجَدَ کے سبب منصوب ہے ای کل دَخلۃ (ہر بار داخل ہوتے وقت) اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ کہا گیا ہے: یہ مریم کے قول میں سے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور یہی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا اور بچے کی التجا کا سبب بن گیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ دَعَازَ كَرِيَّارَبَّهٗ۔ هُنَالِكَ محل نصب میں واقع ہے، کیونکہ یہ ظرف ہے اور اسے زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ظرف مکان ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: هُنَالِكَ ظرف زمان کے لئے ہے اور هناك ظرف مکان کے لئے آتا ہے اور کبھی اسے اس کی جگہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اور هَبْ لِيْ کا معنی ہے مجھے عطا فرما مِنْ لَّدُنْكَ اپنی بارگاہ سے ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً صالح اور نیک نسل (بچہ) ذُرِّيَّةً واحد اور جمع اور مذکر اور مونث تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں واحد کے لئے ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا دلالت کرتا ہے کیونکہ یہاں اولیاء نہیں فرمایا۔ اور طَيِّبَةً کو مونث لایا گیا ہے کیونکہ لفظ ذُرِّيَّةً مونث ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول:

ابوك خليفة ولدته أخرى　　　وانت خليفة ذاك الكمال

اس میں لفظ خلیفہ کے مونث ہونے کی وجہ سے ولدته کو مونث لایا گیا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ای رجل مات و ترك ذرية طيبة أجرى

الله له مثل أجر عملهم ولم ينقص من اجورهم شيئًا (جو کوئی آدمی فوت ہوا اور اس نے نیک اور صالح اولاد پیچھے چھوڑی تو اللہ تعالیٰ اسے ان کے اعمال کے اجر کی مثل اجر عطا فرمائے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی شی کم نہ ہوگی۔) سورۃ البقرۃ میں لفظ ذُرِّيَّةً کا مادہ اشتقاق گزر چکا ہے۔ اور طَيِّبَةً کا معنی ہے صالح، نیک اور بابرکت اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ بلاشبہ تو ہی دعا کو قبول فرمانے والا ہے اور اسی سے سمع الله لمن حمده بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت بچے کی طلب اور خواہش کرنے پر دلیل ہے اور یہ مرسلین اور صدیقین کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (الرعد: 38) (اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد۔)

اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تجرد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع فرما دیا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اس کی اجازت عطا فرما دیتے تو ہم خصی ہو جاتے اور ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت ہے پس جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور تم شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا اور جو کوئی قدرت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کر لے اور جو (قدرت) نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ یہی اس کے لئے وِجاء (شہوت نکاح کو کاٹنے کا ذریعہ) ہے۔(1)

اور اس میں ان بعض جاہل متصوفہ کا رد ہے جنہوں نے کہا ہے: جو بچے کی خواہش اور طلب رکھتا ہے وہ احمق ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کند ذہن اور بے وقوف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ (الشعراء) (اور بنادے میرے لئے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں)

اور مزید فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان: 74) (اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور امام بخاری نے تو اس عنوان سے باب باندھا ہے باب طلب الولد اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دن فرمایا جس وقت ان کا بیٹا فوت ہوا۔ ''کیا تم نے آج رات مباشرت کی ہے'' انہوں نے عرض کی۔ جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: بارك الله لكما في غابر ليلتكما (اللہ تعالیٰ تمہاری گزشتہ رات کے بارے میں تم دونوں کو برکت عطا فرمائے) فرمایا پس وہ حاملہ ہوگئی (2)۔ اور بخاری میں ہے: سفیان نے بیان کیا ہے انصار میں سے ایک آدمی نے کہا ہے: میں نے نو بچے پائے ہیں ان تمام نے قرآن کریم پڑھا ہے (3) اور یہ بھی عنوان ہے باب الدعاء بكثرة الولد مع البركة (برکت کے ساتھ اولاد کی کثرت کی دعا کا بیان) اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ام سلیم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا خادم انس

---

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر 1835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ صحیح بخاری، کتاب العقیقہ، حدیث 5048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من لم يظهر حزنه عند المصيبة، حدیث 1218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم اکثر مالہ وولدہ و بارک لہ فیما اعطیتہ (اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں کثرت عطا فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں اس کے لئے برکت عطا فرما)۔(1)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! ابو سلمہ کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اسے اچھا خلیفہ (نائب) عطا فرما۔'' اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی (عورت) سے شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا(2)''۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس معنی میں بہت سی روایات ہیں جو بچے کی طلب پر ابھارتی ہیں اور اس طرف متوجہ کرتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد اس کے نفع اور فوائد کا امیدوار ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا مات أحدکم انقطع عملہ الا من ثلاث جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے۔ اس میں ذکر فرمایا أوْ ولد صالح یدعولہ یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔ گر اس حدیث کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو تو اس میں یہی کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے بچے اور اپنی بیوی کی ہدایت کے لئے تضرع اور التجا کرتا رہے کہ وہ دونوں کو ہدایت، نیکی، پاکدامنی اور رعایت کی توفیق عطا فرمائے اور یہ کہ وہ دونوں دین اور دنیا میں اس کے معاون و مددگار رہوں یہاں تک کہ دونوں کے سبب اس کی منفعت اور فوائد دنیا اور آخرت میں عظیم ہو جائیں۔ کیا آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے قول میں غور نہیں کرتے وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (مریم) اور عرض کی ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اور کہا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی اور کہا: اللھم اکثر مالہ وولدہ و بارک لہ فیہ اسے بخاری (3) اور مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹

''پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین سے۔''

قولہ تعالیٰ: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ حمزہ اور کسائی نے فَنَادَاہُ مذکر ہونے کی بنا پر الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں اس میں امالہ کرتے ہیں کیونکہ یہ (الف) اصل میں یا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چوتھی جگہ ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود

---

1۔ صحیح بخاری، باب دعوۃ النبی لخادمہ بطول العمر و بکثرۃ مالہ، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث نمبر 1754، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من زار قوما ولم یفطر عندھم، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہم کی قرأت الف کے ساتھ ہی ہے اور یہی ابوعبید کی پسند ہے۔

اور جریر نے مغیرہ کے واسطہ سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پورے قرآن میں ملائکہ کو مذکر قرار دیتے ہیں۔ ابوعبید نے کہا ہے: ہم انہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے اسے مشرکین کے خلاف اختیار کیا ہے کیونکہ مشرکین نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

نحاس نے کہا ہے: یہ ایسا استدلال ہے جس سے کوئی شے حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ عرب کہتے ہیں: قالت الرجال اور قال الرجال اور اسی طرح النساء کے ساتھ بھی کرتے ہیں (یعنی مذکر و مونث دونوں طرح استعمال کر لیتے ہیں۔) اور ان پر قرآن کریم سے استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے کہ ان کے خلاف قرآن کریم سے اس طرح حجت لائی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کریں: وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ البتہ ان کے خلاف اس ارشاد میں حجت ہے: اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ یعنی انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا۔ پس وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ تحقیق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ظن اور محض خواہش ہے۔ اور رہا فَنَادَاهُ تو یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر جائز ہے اور نَادَتْهُ جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: الملائکۃ ذوی العقول میں سے جمع مکسر ہے اور یہ تانیث میں قائم مقام غیر ذوی العقول کے ہے۔ آپ کہتے ہیں: ھی الرجال و ھی الجذوع و ھی الجمال و قالت الاعراب۔ اور اسے یہ ارشاد اور تقویت دیتا ہے۔ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اور دوسری جگہ مذکور ہے: وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ پس اس جمع کو مذکر و مونث دونوں طرح لانا اچھا ہے اور سدی نے کہا ہے: اکیلے حضرت جبرائیل امین نے انہیں ندا دی۔ (ناداہ جبرائیل وحدہ) اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے اور قرآن کریم میں ہے: يُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور روح سے مراد وحی ہے۔ اور عربی میں یہ جائز ہے کہ واحد کے بارے جمع کے لفظ کے ساتھ خبر دی جائے اور قرآن کریم میں آیا ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں تمام ملائکہ نے ندا دی اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی ندا ان کی جانب سے آئی۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ اس میں وَهُوَ قَآئِمٌ مبتدا اور خبر ہے۔ اور يُّصَلِّيْ محل رفع میں ہے اور اگر چاہے تو ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں رکھ لے۔ اَنَّ اللّٰهَ اصل میں بان اللہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنَّ پڑھا ہے یعنی قالت ان اللہ۔ پس ندا بمعنی قول ہے۔ يُبَشِّرُكَ تشدید کے ساتھ اہل مدینہ کی قرأت ہے۔ اور حمزہ نے يَبْشُرُكَ مخفف پڑھا ہے۔ اسی طرح حمید بن قیس مکی نے کہا ہے مگر یہ کہ انہوں نے شین کو کسرہ یا ضمہ اور با کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ تینوں لغات ایک معنی میں ہیں۔

پہلی کی دلیل اور یہ ایک جماعت کی قرأت ہے کہ اس مادہ سے جو بھی فعل ماضی یا امر کا صیغہ قرآن کریم میں ہے وہ تثقیل

کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ۔ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ۔ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ۔ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ اور رہی دوسری تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اور وہ بَشَرَ يَبْشُرُ سے ہے اور وہ اہل تہامہ کی لغت ہے۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بشرت عَيالى اذ رأيتُ صحيفةً أتتك من الحجاج يُتلى كتابُها

اس میں محل استشہاد بشرت ہے۔

اور دوسرے نے کہا:

واذا رأيت الباهشين الى الندى غُبْرًا أكُفُّهُمْ بقاعٍ مُمْحِلِ

فأعِنْهُم وأبشَرْ ما بَشِرُوا به واذا هم نزلوا بضَنْكٍ فانْزِلِ

اس میں محل استشہاد بما بَشِرُوا بِه ہے۔

اور جہاں تک تیسری قرأت کا تعلق ہے تو وہ أَبْشَرَ يُبْشِرُ اِبْشَارًا سے ہے۔

شاعر نے کہا:

يا أُمّ عمرو أَبْشِرِى بالْبُشْرى موتٌ ذريعٌ وجَرَادٌ عَظْلَى

اس میں محل استشہاد أَبْشِرِى ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِيَحْيٰى پہلی کتاب میں ان کا نام حیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارہ کا نام یسارہ تھا۔ اور عربی میں اس کی تفسیر لاتلد (وہ بچہ نہ جنے گی) ہے۔ پس جب انہیں اسحاق کی بشارت دی گئی تو انہیں کہا گیا: سارہ اور انہیں یہ نام حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دیا، تو انہوں نے کہا: اے ابراہیم! علیہ السلام میرے نام سے ایک حرف کیوں کم کر دیا گیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی جبرائیل علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے کہا: ''بلاشبہ یہ حرف ان کے اس بیٹے کے نام میں زائد کر دیا گیا ہے جو افضل انبیاء میں سے ہے اس کا نام حیی ہے اور اس کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا ہے۔'' نقاش نے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ان کا نام یحییٰ رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان اور نبوت کے ساتھ پیدا فرمایا (اور زندہ رکھا) اور بعض نے کہا ہے: ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب لوگوں کو ہدایت کے ساتھ احیا عطا فرمایا اور مقاتل نے کہا ہے: ان کا اسم اللہ تعالیٰ کے اسم حیّ سے مشتق ہے پس یحییٰ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کیونکہ ان کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کی رحم کو زندہ کر دیا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق کلمة من الله سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے۔ پس وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ابوالسمال العدوی نے بِكَلِمَةٍ تمام قرآن میں کاف کو مکسور اور لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ فصیح لغت ہے جیسا کہ كِتْف اور فِخْذٌ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام کلمہ اس لئے ہے کیونکہ لوگ ان سے اسی طرح ہدایت پاتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہدایت اور راہنمائی پاتے تھے۔

اور ابوعبید نے کہا ہے: بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کا معنی ہے بکتاب من اللہ (یعنی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی۔) فرمایا: اور عرب کہتے ہیں انشدنی کلمۃ ای قصیدۃ اس نے میرے سامنے قصیدہ پڑھا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ الحُوَیدرہ کا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: لعن اللہ کلمتہ یعنی قصیدتہ۔ (اللہ تعالیٰ اس کے قصیدہ پر لعنت کرے) اور اس کے علاوہ بھی کئی اقوال کہے گئے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر علماء اسی پر ہیں اور یحییٰ علیہ السلام وہ پہلے فرد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چھ مہینے بڑے تھے۔ اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔

پس جب حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی شہادت سنی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اٹھے اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ ایک کپڑے میں (لپٹے) پڑے تھے اور علامہ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں تو اسی وقت ان کی بہن حضرت یحییٰ علیہ السلام سے حاملہ تھی، تو وہ اپنی بہن کی ملاقات کے لئے آئی اور کہا: اے مریم! کیا تجھے معلوم ہوا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو حضرت مریم علیہا السلام نے اسے کہا: کیا تو نے محسوس کیا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو اس نے آپ کو کہا: جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے پا رہی ہوں کہ وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تیرے پیٹ میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ روایت کیا گیا کہ انہوں نے اپنے جنین کو محسوس کیا کہ وہ اپنا سر حضرت مریم کے پیٹ کی طرف جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا ہے: پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اور مُصَدِّقًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَ سَيِّدًا اس کا معنی السید (سردار) وہ جو اپنی قوم کا سردار ہوتا ہے۔ اور اس کے قول پر (کسی کام کی) انتہا ہو جاتی ہے اور اس کی اصل سَيْوِدٌ ہے کہا جاتا ہے: فلان اسود من فلان۔ یہ افعل کے وزن پر صیغہ اسم تفضیل ہے اور السیادۃ سے بنایا گیا ہے اور اسی میں اس پر دلیل موجود ہے کہ انسان کا نام سید رکھنا جائز ہے جیسا کہ یہ جائز ہوتا ہے کہ اس کا نام عزیز یا کریم رکھا جائے۔ (1)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے بنی قریظہ (☆) کو فرمایا: (اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو۔) اور بخاری و مسلم میں ہے (2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: ان ابنی ھذا سید و لعل اللہ یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین (بلاشبہ میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اللہ تعالیٰ اس کے سبب مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔) اور پھر اسی طرح ہوا۔ کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور بہت سے ان میں سے تھے جو ان کے باپ سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے تھے جنہوں نے ان کی بیعت توڑ دی تھی، آپ تقریباً سات ماہ تک عراق اور اس کے بعد خراسان میں

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ تفسیر میں الفاظ یہی ہیں جبکہ اصل میں یہ ارشاد حضرت سعد بن معاذ کے حق میں انصار کو ہے۔

خلیفہ رہے، پھر آپ اہل حجاز اور اہل عراق کا لشکر ساتھ لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چلے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چلے۔ پس جب دونوں لشکر ایک جگہ آمنے سامنے ہوئے وہ انبار کی اطراف میں عراق کی زمین میں سے مَسْکِن کہلاتی ہے، تو امام حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک غالب نہیں آسکتا یہاں تک کہ دوسرے کا اکثر حصہ ہلاک ہو جائے۔ پس مسلمان ہلاک ہوں گے، تو آپ نے ان شرائط پر معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا جو شرائط آپ نے ان پر عائد کی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد امارت (حکمرانی) آپ کی ہوگی۔ پس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان تمام کا التزام کیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سچا ثابت ہوا اِنَّ ابنی هذا سيد بلاشبہ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور اس سے بڑا سردار کوئی نہیں ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول سردار بنائے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ وَسَيِّدًا کا مفہوم ہے کہ وہ علم و عبادت میں سردار ہیں۔ ابن جبیر اور ضحاک نے کہا ہے: علم اور تقویٰ میں سردار ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے: السید سے مراد کریم سخی ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: وہ جس پر غصہ غالب نہ آتا ہو۔ اور زجاج نے کہا ہے: سید وہ ہے جو اپنے ساتھیوں پر خیر اور نیکی کے کام میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور یہ لفظ (تمام) کو جامع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: السید کا معنی دو سال کی بھیڑ بھی ہے۔ اور حدیث میں ہے: ثنی من الضان خیر من السید المعز بھیڑوں میں دو ندی دو برس کی بھیڑ سے بہتر اور افضل ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

سواءٌ عليه شاةُ عامٍ دَنت له　　　ليذبحها للضيف أم شاةَ سيّد

وَحَصُوْرًا یہ اصل ہے الحصر سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے روکنا، قید کرنا، حَصَرنی الشیٔ و اَحْصَرنی جب کوئی شے مجھے روک لے۔

جیسا کہ ابن میادہ نے کہا ہے:

و ما هجرُ ليلى ان تكون تباعدت　　　عليكَ ولا أن احصَرتك شُغولَ

اور ناقة حصور: ضيقة الاحليل یعنی جس اونٹنی کے تھنوں (یا پیشاب) کا سوراخ تنگ ہو۔ اور حَصُور وہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس نہ آسکتا ہو (یعنی جماع کے قابل نہ ہو) گویا کہ اسے ان سے روک دیا گیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل حصور و حصير جب کہ وہ اپنی بخشش اور عطا کو روک لے اور وہ کچھ نہ نکالے جو کچھ اس کے ہم نشین نکال رہے ہیں کہا جاتا ہے: شرب القوم فحصر عليهم فلان ای بخل۔ (قوم نے شراب پی تو ان پر فلاں نے پابندی لگا دی، یعنی اس نے ان کے ساتھ بخل کیا۔) یہ ابوعمرو سے منقول ہے۔

اخطل نے کہا ہے:

و شاربٍ مُرْبِحٍ بالكأس نادمني　　　لا بالحَصور ولا فيها بِسوّارِ

اور قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا یعنی جہنم کو ہم نے کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے اور الحصیر سے مراد مِلِك ہے کیونکہ اسے روک لیا جاتا ہے۔

اور لبید نے کہا ہے:

وَ قُمَامِمٍ غُلْبِ الرِّقَابِ کانهم جِنٌّ لدی باب الحصیر قیام

اس میں باب الحصیر سے مراد مِلِك ہے۔

پس حضرت یحییٰ علیہ السلام حصور تھے یہ بروزن فعول بمعنی مفعول ہے یعنی آپ عورتوں کے ساتھ مباشرت نہ کر سکتے تھے۔ گویا کہ انہیں اس سے روک لیا گیا جو کچھ مردوں میں ہوتا ہے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور فعول بمعنی مفعول لغت میں کثیر الاستعمال ہے۔ اسی سے حلوب بمعنی محلوبۃ ہے۔

شاعر نے کہا:

فیها اثنتان واربعون حَلُوبَةً سُودًا كخافية الغراب الأسْحَم

اس میں حلوبۃ سے استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، قتادہ، عطا، ابو الشعثاء، حسن، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: (حصور) اس سے مراد وہ ہے جو عورتوں سے باز رہتا ہے اور قدرت کے باوجود وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ اور دو اعتبار سے یہی اصح قول ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ ان کی مدح اور تعریف ہے اور بلاشبہ تعریف اکثر فعل کسبی کے سبب ہوتی ہے نہ کہ فطری اور طبعی فعل پر اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فعول لغت میں فاعل کے صیغوں میں سے ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

ضَروبٌ بنصل السيف سُوقَ سِمانها اذا عَدِمو ازاد افانك عاقِرٌ

اس میں محل استشہاد لفظ ضروبٌ ہے۔

پس معنی یہ ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ اور شاید یہ ان کی شریعت میں تھا اور رہی ہماری شریعت تو اس میں نکاح ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حصور سے مراد وہ عنین ہے جس کا ذکر نہ ہو کہ وہ اس کے سبب وطی کر سکتا ہو اور نہ اسے انزال ہوتا ہو یہ حضرت ابن عباس سے بھی، حضرت سعید ابن مسیب اور ضحاک نے کہا ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہر انسان اللہ تعالیٰ سے گناہ کے ساتھ ملاقات کرے گا، درآنحالیکہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ اس کے سبب اسے عذاب دے گا یا پھر رحم فرمائے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے، کیونکہ وہ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ تھے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک زمین کے ایک تنکے کی طرف نیچے کیا اور اسے اٹھا لیا اور فرمایا: ''ان کا ذکر اس تنکے کی مثل تھا۔'' اور قول

بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے اور روکنے والا ہے۔ وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ زجاج نے کہا ہے: الصالح الذی یؤدی للہ ما افترض علیہ والی الناس حقوقهم۔ (کہ صالح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض ادا کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے حقوق عطا کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝

"زکریا کہنے لگے اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا حالانکہ آلیا ہے مجھے بڑھاپے نے اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی) لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔"

کہا گیا ہے: یہاں رب سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں یعنی انہوں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: رب، اے میرے سردار...... کیونکر میرے ہاں لڑکا ہوگا؟ یہ کلبی کا قول ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: رب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اَنّٰى بمعنی کیف ہے اور یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اس استفہام کے معنی میں دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا اس کے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ وہ اور اس کی بیوی اپنے اس حال پر ہیں یا انہیں اس حال پر لوٹا دیا جائے گا جس سے بچہ ہو سکتا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا انہیں اپنی اسی بانجھ بیوی سے بچہ عطا کیا جائے گا یا کسی اور سے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ کون سے درجہ کے سبب اس کا حقدار سمجھا گیا ہے حالانکہ میں اور میری بیوی اس حال پر ہیں۔ آپ نے یہ علی وجہ التواضع کہا۔

اور روایت ہے کہ آپ کی دعا اور جس وقت آپ کو اس کی بشارت دی گئی ان کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ اور جس دن آپ کو بشارت دی گئی تھی اس وقت آپ کی عمر نوے برس تھی اور آپ کی اہلیہ کی عمر بھی اس کے قریب تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک نے کہا: جب آپ کو خوشخبری دی گئی اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس برس تھی اور آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے برس تھی۔

پس اسی لئے یہ قول ہے وامراتی عاقر یعنی میری بیوی بانجھ ہے وہ بچہ نہیں جن سکتی۔ کہا جاتا ہے: رجل عاقر وامراۃ عاقر جس میں بانجھ پن واضح اور ظاہر ہو۔ اور (کہا جاتا ہے) عقُرت وعقِر (دونوں میں قاف مضموم ہے) تعقر عُقرا وہ بانجھ ہو گئی، مثلاً حسنت تحسن حسنا، یہ ابوزید سے منقول ہے اور عُقارۃ بھی ہے اور دونوں میں اسم فاعل فعُل سے فعیلة کے وزن پر ہے۔ کہا جاتا ہے: عظمت فهی عظیمة اور ظرفت فهی ظریفة اور عاقر کہا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد نسب کی بنا پر بانجھ پن والا ہے اور اگر یہ فعل کی بنا پر ہوتا تو کہتا: عقرت فهی عقیرة گویا کہ وہ اس کے سبب بانجھ ہے، یعنی عمر کے اعتبار سے بڑھاپا بچہ جننے سے اس کے لئے مانع ہے۔ اور عاقر سے مراد ریت کی وہ کثیر مقدار ہے جو کوئی شے اگنے نہ دے۔ اور عُقر عورت کے مہر کو بھی کہتے ہیں جب شبہ کے ساتھ اس سے وطی کی جائے۔ اور بیضة العقر، اس سے مراد مرغ کا انڈا ہے، کیونکہ یہ اس کی عمر میں طویل مدت تک ایک خاص سفیدی سی لے آتا ہے اور عُقر النار بھی ہے، یعنی آگ کا وسط اور اس کا بڑا حصہ۔

اور عقر الحوض حوض کا پچھلا حصہ جہاں اونٹ کھڑے ہوتے ہیں جب وہ اس پر آئیں، کہا جاتا ہے: عُقْر اور عُقُر مثلاً عُسْر اور عُسُر۔ اور اس کی جمع الاعقار ہے اور یہ لفظ مشترک ہے۔ اور کَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مثل جو چاہتا ہے کرتا ہے اور الغُلام، الغُلْمه سے مشتق ہے اور اس کا معنی نکاح کی طلب کا شدید ہونا ہے اور اغتلم الفعل غلمة وہ شھوة ضِراب سے بھڑک اٹھا۔

لیلی الاخیلیہ نے کہا ہے:

شفاها من الداء العُضال الذی بها　علام اذا هَزَّ القناة سقاها

اور الغلام سے مراد ایسا نوجوان جس کی لبیں نکل رہی ہوں اور وہ جس میں غُلُومة اور غلومية (جوانی) واضح ہو۔ اور اس کی جمع الغِلمة اور الغِلمان ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ان الغیلم الشاب و الجارية ایضا (یعنی جوان آدمی اور جوان لڑکی) اور الغَیلم کچھوے کو بھی کہتے ہیں اور الغیلم جگہ بھی ہے۔ اور اغتلم البحر کا معنی ہے: سمندر نے جوش مارا اور اس کی امواج تلاطم خیز ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

''عرض کی اے میرے رب! مقرر فرما دے میرے لئے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کرسکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت اور پاکی بیان کرو (اس کی) شام اور صبح''

اس میں تین، مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً یہاں جَعَلَ بمعنی صیّر ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اور لِیْ مفعول ثانی کے محل میں واقع ہے۔ جب انہیں بچے کی بشارت دی گئی اور ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں تو انہوں نے علامت کا مطالبہ کیا جس کے ساتھ وہ اس امر کی صحت اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کو پہچان لیں، تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ چونکہ انہوں نے علامت اور نشانی کا مطالبہ کیا ہے لہٰذا ملائکہ کے ان کے آمنے سامنے ہونے کے بعد لوگوں کے ساتھ کلام کرنے سے سکوت اور خاموشی انہیں آپہنچے گی۔ (یعنی وہ کلام نہ کرسکیں گے)

اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اور اسی طرح اگر مرض کے سبب گونگا پن یا اس طرح کی کوئی شے نہ ہو تو اس میں ہر حال پر کچھ نہ کچھ سزا ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: بے شک حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ جب ان کے سبب یحییٰ سے حاملہ ہوئی تو انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ کسی کے ساتھ کلام کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور وہ اس کے باوجود تورات پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جب وہ کسی اور سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتے تو نہ بول سکتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا رَمْزًا لغت میں الرمز سے مراد ہونٹوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور کبھی کبھی یہ بھنوؤں،

آنکھوں اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا اصل معنی حرکت ہے۔ اور کہا گیا ہے: آپ نے اس علامت کا مطالبہ طمانیت و راحت میں زیادتی اور اضافہ کے لئے کیا تھا۔ معنی یہ ہے: تو نعمت مکمل اور تمام فرما دے اس طرح کہ تو میرے لئے کوئی علامت اور نشانی بنا دے۔ اور وہ علامت مزید نعمت اور کرامت ہو جائے گی، تو آپ کو کہا گیا: اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ یعنی تم تین رات تک کلام نہ کر سکو گے۔ اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو ملائکہ کے آپ کو بشارت دینے کے بعد ہے۔

وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْـًٔا یعنی میں نے اپنی قدرت کے ساتھ تجھے پیدا کیا ہے تو اسی طرح تیرے لئے بچہ بھی پیدا فرما دیں گے۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ترک کلام کے ساتھ سزا دی گئی۔ یہ قول قابل التفات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی خبر نہیں دی کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے منع فرمایا ہے۔ اور اس میں کلام یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: تو میرے لئے ایسی علامت اور نشانی بنا دے جو بچہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، جبکہ وہ مجھ سے غائب ہے اور رَمْزًا استثنا منقطع کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے اور کسائی نے کہا ہے: رمزیرمز رَمَز یرمِز۔ اور اِلَّا رَمَزًا کو میم کے فتحہ اور رُمُزًا میم اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کی واحد رمزۃ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اشارہ کلام کے قائم مقام ہوتا ہے اور یہ کثیر احادیث میں موجود ہے اور اشارات کو اس امر نے موکد اور پختہ کر دیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوداء کے بارے میں اس کے ساتھ ہی فیصلہ فرمایا جبکہ آپ نے اسے کہا این اللہ۔ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے اپنے سر سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتقها فانها مؤمنة تو اسے آزاد کر دے کیونکہ یہ مومنہ ہے۔ تو آپ نے اشارہ کے ساتھ اس اسلام کی اجازت دے دی جو اس دین کی اصل ہے جو جان اور مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ساتھ جنت کا مستحق بنا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آتش جہنم سے نجات پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ایمان کا اسی طرح فیصلہ فرمایا جس طرح اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے جو زبان سے بول کر اقرار کرتا ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ اشارہ تمام دین میں قابل عمل ہے۔ اور یہی عام فقہاء کا قول ہے۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ گونگا آدمی جب طلاق کے لئے اشارہ کرے تو وہ لازم ہو جاتی ہے۔ اور امام شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جو بیمار ہوتا ہے اور اس کی زبان مختل ہو جاتی ہے تو وہ رجعت اور طلاق کے مسائل میں گونگے کی طرح ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے جبکہ اس کا اشارہ معروف ہو (یعنی اسے سمجھنے میں کوئی شبہ نہ ہو) اور اگر اس میں شک ہو تو پھر وہ باطل ہے، یہ قیاس نہیں ہے البتہ یہ استحسان ہے۔ ان تمام میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باطل ہو کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتا اور اس کا اشارہ سمجھا نہیں جا سکتا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے: اور انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اس قول پر محمول کیا ہے کہ انہیں ان احادیث کا علم نہیں ہوا جو دین کے مختلف احکام کے بارے میں اشارات کے جواز کے بارے وارد ہوئی ہیں۔ اور شاید امام بخاری

نے باب الاشارۃ فی الطلاق والامور کے عنوان سے ان کے رد کا قصد کیا ہے۔(1)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ سے تین دن کے روزے کا قصد کیا ہے اور وہ جب روزہ رکھتے تھے تو وہ صرف اشارے کے ساتھ ہی گفتگو کرتے تھے۔ اور یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4۔** بعض ان افراد نے کہا ہے جو سنت کے ساتھ قرآن کریم کا نسخ جائز قرار دیتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کلام کرنے سے روک دیا گیا حالانکہ وہ اس پر قادر تھے اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لا صَمتَ یوما الی اللیل (کسی دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں) اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں (2)۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کسی آفت کے سبب کلام سے روک دیا گیا جو انہیں لاحق ہوئی اور اس نے انہیں کلام سے روک دیا اور وہ آفت صحت کے باوجود کلام پر قادر نہ ہونا ہے، اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث طیبہ لاصمت یوماً الی اللیل کا معنی یہ ہے کہ پورا دن رات تک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی (جائز) نہیں ہے اور رہی فضول اور بے فائدہ گفتگو! تو اس سے تو خاموشی اچھی اور بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی زبان بند ہونے کے باوجود اپنے دل میں ذکر کبھی نہ چھوڑے، یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ذکر کا معنی گزر چکا ہے۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر کسی کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو وہ یقیناً حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب دی جاتی اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اس آدمی کو دی جاتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جہاد میں ہوتا ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

وَسَبِّحْ بمعنی صل ہے یعنی تو نماز پڑھ۔ اس میں صلاۃ (نماز) کو سُبْحَةٌ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی برائی اور نقص سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہ بیان کرنا ہے اور العشی، عشیۃ کی جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واحد ہے اور اس سے مراد سورج کے زوال پذیر ہونے کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے، یہ حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے۔ اور موطا میں قاسم بن محمد سے منقول ہے میں نے لوگوں کو نہیں پایا مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز عشی کے وقت ادا کرتے ہیں اور الْاِبْكَارِ سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا وقت ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے۔''

1۔ صحیح بخاری، باب الاشارۃ فی الطلاق والامور، قبل الحدیث 4883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب ما جاء متی ینقطع الیتم۔ حدیث نمبر 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اختیار کرلیا ہے (چن لیا ہے) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَطَهَّرَكِ اور تجھے خوب پاک کردیا ہے کفر سے۔

حضرت مجاہد اور حسن سے یہی مروی ہے اور زجاج نے کہا ہے: اور تمہیں پاک کردیا ہے تمام الائشوں سے مثلاً حیض، نفاس وغیرہما۔ اور تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دینے کے لئے پسند کرلیا ہے۔ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر، حسن اور ابن جریج وغیرہما نے یہی بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ قیامت قائم ہونے کے دن تک تمام جہان والی عورتوں کو شامل ہے اور یہی صحیح ہے ہم اسے بیان کریں گے اور یہی زجاج وغیرہ کا قول ہے۔

اصطفاء کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے کیونکہ پہلے کا معنی ہے کہ تمہیں چن لیا ہے اپنی عبادت کے لئے اور دوسرے کا معنی ہے کہ تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے چن لیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (1) ''مردوں میں سے کامل بہت سے ہیں اور عورتوں میں سے سوائے مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا کوئی کامل نہیں اور بلاشبہ عائشہ کی فضیلت دوسری عورتوں پر اسی طرح ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔''

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کمال سے مراد انتہا کو پہنچنا اور مکمل ہونا ہے۔ اور اس کا فعل ماضی کمل میم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ اور مضارع یکمُل میم کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے اور ہر شے کا کمال اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے اور کمال مطلق تو فقط اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نوع انسان میں سے کامل ترین حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں اور پھر ان کے بعد اولیاء مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر کہا گیا: بے شک وہ کمال جس کا ذکر حدیث طیبہ میں کیا گیا ہے اس سے مراد تو نبوت ہے تو اس پر یہ لازم آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اور آسیہ دونوں نبیہ ہوں اور اس طرح کہا گیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتہ کے واسطہ سے وحی فرمائی ہے جیسا کہ اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی فرمائی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس کا بیان سورۂ مریم میں بھی آئے گا اور رہی آسیہ تو کوئی ایسی شے بیان نہیں ہوئی جو واضح طور پر اس کی نبوت پر دلالت کرتی ہو بلکہ اس کے صدیقہ ہونے پر اور اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہو۔ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

صحیح اسناد سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور آپ سے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: ''سارے جہان کی عورتوں سے بہتر چار عورتیں ہیں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم جو فرعون کی بیوی ہے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے: ''اہل جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ہیں (2)''۔ اور آپ ہی سے ایک دوسری سند سے مروی ہے: ''مریم کے بعد اہل جنت کی عورتوں کی سردار

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3159 ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسند امام احمد، حدیث 2668

حضرت فاطمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما ہیں''۔

پس قرآن و احادیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہے حضرت مائی حواء علیہا السلام سے لے کر اس آخری عورت تک جس پر قیامت قائم ہوگی (سب سے افضل ہے) کیونکہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تکلیف اخبار، اور بشارت کے بارے میں وحی ان تک اسی طرح پہنچائی ہے جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام تک پہنچائی، پس اس طرح یہ نبیہ ہیں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے پس یہ تمام عورتوں سے افضل ہیں مطلقاً اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور پھر ان کے بعد آسیہ رضی اللہ عنہا۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سارے جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہے'' یہ حدیث حسن ہے اشکال کو دور کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو عورتوں میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا اور وہ یہ کہ روح القدس ان سے ہمکلام ہوئے، ان کے قریب ہوئے اور عورتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور جب انہیں بشارت دی گئی تو کسی نشانی کا مطالبہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نشانی کا مطالبہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مقدس میں صدیقہ کا نام دیا ہے اور فرمایا: وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ اور فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدیقہ ہونے کی شہادت دی اور ان کے لئے کلمات بشارت کی تصدیق کرنے کی شہادت دی اور ان کے لئے عجز و انکساری اور اطاعت شعاری کی شہادت دی۔ اور بلاشبہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کی طرف دیکھا اور کہا: کیونکر میرے لئے بچہ ہوسکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، سو نشانی طلب کی اور حضرت مریم کو بچے کی بشارت دی گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ وہ باکرہ ہے اور اسے کسی بشر (انسان) نے مس نہیں کیا تو اسے کہا گیا: كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے۔

پس انہوں نے اسی پر اقتصار کیا اور اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کر دی اور کوئی ایسی علامت اور نشانی طلب نہ کی جس سے اس امر کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہو۔ بنات آدم میں سے سارے جہان کی عورتوں میں کسی عورت کے لئے اس قسم کے مناقب نہیں ہیں، اسی لئے یہ روایت ہے کہ وہ جنت کی طرف رسل علیہم السلام کے ساتھ پہلے جانے والوں میں جائیں گی۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''اگر میں قسم کھاؤں کہ میری امت کے سابقین سے پہلے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے دس سے کچھ زائد افراد کے ان میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے تو میں یقیناً اپنی قسم میں سچا ہوں''۔

تحقیق اس پر یہ فرض اور لازم ہو جاتا ہے جس پر ظاہری علم کھلا اور اس نے اشیاء ظاہرہ سے اشیاء باطنہ پر استدلال کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو جان لے (1): انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔) لواء الحمد یوم القیامة بیدی و مفاتیح الکرم بیدی و أنا اول خطیب و اول شفیع و اول مبشر و اول و اول (قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور کرم کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں پہلا خطیب ہوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میں سب سے پہلے بشارت دینے والا ہوں گا اور میں (فلاں میں) اول ہوں گا اور (فلاں میں) اول ہوں گا) (2) اور رسل علیہم السلام کو دنیا میں یہ سرداری حاصل نہیں ہوئی مگر باطن میں کسی امر عظیم کے سبب (انہیں یہ مقام ملا) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی شان ہے کہ انہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صدیقہ اور کلمات کی تصدیق کرنے کی شہادت نصیب نہیں ہوئی مگر ایسے مرتبہ کے سبب جو انتہائی قرب عطا کرنے والا ہے۔

اور جنہوں نے یہ کہا کہ وہ نبیہ نہیں انہوں نے کہا ہے: ان کا فرشتے کو دیکھنا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو دحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا گیا جس وقت انہوں نے اسلام اور ایمان کے بارے سوال کئے تھے اور اس رؤیت کے باوجود صحابہ کرام انبیاء نہیں ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے اور اکثر اسی موقف پر ہیں۔ واللہ اعلم۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

مراد یہ ہے کہ اے مریم! نماز میں قیام طویل کر۔ یہ مجاہد سے منقول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تو اطاعت وعبادت پر دوام اختیار کر، قنوت کے بارے تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: جب ملائکہ نے انہیں یہ کہا تو وہ نماز میں کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ ان کے قدم ورم آلود ہو گئے۔ اور ان سے خون اور پیپ بہنے لگی۔ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ یہاں رکوع پر سجود کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور اس بارے میں اختلاف سورۃ البقرہ میں اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ پس جب تو کہے: قام زید و عمرو تو یہ مراد لینا جائز ہے کہ عمرو زید سے پہلے کھڑا ہوا ہو۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا وارکعی واسجدی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کہا گیا ہے اس کا معنی ہے افعلی کفعلهم تو ان کی طرح کا فعل کر اگرچہ تو ان کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز با جماعت ہے۔ یہ بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر الشفاعہ، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ یعنی یہ جو حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے واقعات ہم نے ذکر کئے ہیں یہ اخبار غیب میں سے ہیں۔ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے اس حیثیت سے کہ آپ نے حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کے واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا اور اہل کتاب نے اس بارے آپ کی تصدیق کی۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ میں ضمیر کو ذالك کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اسی کی یاد دلائی گئی ہے اور الایحاء یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ بھیجنے کے معنی میں ہے۔ اور وحی الہام، اشارہ اور کئی دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے۔ اور لغت میں اس کی اصل خفیۃً کسی شے سے آگاہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے الہام کو بھی وحی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے ہے وَاِذۡ اَوۡحَيۡتُ اِلَى الۡحَوَارِيّٖنَ اور قول باری تعالیٰ: وَاَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اور کہا گیا ہے: اَوۡحَيۡتُ اِلَى الۡحَوَارِيّٖنَ کا معنی ہے ''میں نے انہیں حکم دیا، کہا جاتا ہے: وحی اور اوحی، رمی اور ارمی یہ ہم معنی ہیں۔ عجاج نے کہا ہے: اوحی لها القرار فاستقرت یعنی اس نے زمین کو قرار پکڑنے کا حکم دیا پس وہ قرار پذیر ہوگئی۔

اور حدیث میں ہے: الوحی الوحی مراد انتہائی سرعت اور تیزی ہے اور اس سے فعل توحیت توحیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: الوحی کا معنی اشارہ، کتابت اور رسالۃ (بھیجنا) ہے۔ اور ہر وہ شے جسے تو کسی غیر کی طرف القاء کرے یہاں تک کہ وہ اسے جان لے وہی وحی ہے وہ جیسے بھی ہو۔ اور الوحیٰ کا معنی السریع ہے۔ اور اَلوَحَی کا معنی الصوت آواز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استوحیناهم یعنی ہم نے ان کی مدد طلب کی۔

کسی نے کہا:

اوحیت میمونا لها والأزراق

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ۔ اقلام قلم کی جمع ہے۔ یہ قَلَمَہٗ سے ہے اس کا معنی ہے: فلاں نے اسے کاٹ دیا۔ کہا گیا ہے: قداحهم و سهامهم یعنی مراد ان کے تیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی وہ قلمیں مراد ہیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے اور یہی عمدہ معنی ہے، کیونکہ ازلام (جوئے کے تیر) سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ذٰلِكُمۡ فِسۡقٌ۔

مگر وہ ان کی اجازت دیتا ہے اس طور پر کہ وہ انہیں اس طرز پر استعمال نہ کریں جس طرح دور جاہلیت میں کرتے تھے۔ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ یعنی کون مریم کی پرورش اور تربیت کرے گا؟ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ اور ان کے نکاح میں اشیع بنت فاقود تھی جو کہ مریم کی ماں حنہ بنت فاقود کی بہن

تھی۔ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے عالم کی بیٹی ہے۔ پس انہوں نے اس پر قرعہ اندازی کی اور ہر ایک اپنا قلم لے کر آیا۔ اور انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ قلم جاری پانی میں ڈالیں گے پس جس کا قلم ٹھہر گیا اور پانی اسے بہا کر نہ لے گیا تو وہ اس کی پرورش اور تربیت کرے گا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس قلم بہہ گئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اوپر بلند ہو گیا۔'' اور یہ آپ کی نشانی اور معجزہ تھا، کیونکہ آپ نبی تھے اور معجزات اور علامات آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔

اور اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ یہ مبتدا اور خبر اس فعل مضمر کے سبب محل نصب میں واقع ہیں جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام ہے: ینظرون أیھم یکفل مریم اور فعل لفظا اس میں کوئی عمل نہیں کرتا کیونکہ وہ برائے استفہام ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے قرعہ اندازی کے اثبات پر استدلال کیا ہے اور ہماری شریعت میں یہی اصل اور بنیاد ہے ہر اس کے لئے جو تقسیم میں عدل و انصاف کرنا چاہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک دو مساوی حجتوں میں یہی سنت ہے، تاکہ ان کے درمیان عدل ہو سکے اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور اس آدمی کے بارے میں وہم و گمان اٹھ جائے جو ان کی تقسیم کا والی بنتا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو اس کے ساتھی پر فضیلت نہ دی جائے گی جبکہ مقسوم ایک جنس سے ہو یہی کتاب و سنت کی اتباع ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے قرعہ اندازی پر عمل کرنے کو رد کر دیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث کو بھی رد کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ ان کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں اور یہ جوئے کے ان تیروں کے مشابہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور ابن منذر نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے اسے (قرعہ اندازی کو) جائز قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے: قیاس کے مطابق قرعہ صحیح نہیں ہوتا لیکن ہم نے اس مسئلہ میں قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے آثار اور سنت کو پکڑ لیا ہے۔

ابوعبید نے کہا ہے: قرعہ اندازی کے مطابق تین انبیاء نے عمل کیا ہے: مراد حضرت یونس علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ...... ابن منذر نے کہا ہے: جو شے شرکاء کے مابین تقسیم کی جاتی ہے اس میں قرعہ اندازی پر عمل کرنا ایسا ہے گویا اس پر اہل علم کا اجماع ہے اور جس نے اس کا رد کیا ہے اس کے قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں۔ امام بخاری نے کتاب الشہادات کے آخر میں یہ عنوان ذکر کیا ہے باب القرعۃ فی المشکلات و قول اللہ عزوجل، اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے: ''حدود اللہ پر قائم رہنے والے اور ان میں واقع ہونے والے کی مثال اس قوم کی مثل ہے جنہوں نے کشتی پر قرعہ اندازی کی (1) ...... الحدیث'' عنقریب اس کا بیان سورۃ الانفال اور سورۃ الزخرف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ام العلاء کی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون کا حصہ رہائش میں ان کے لئے تقسیم ہو گیا جب انصار نے مہاجرین کی رہائش کے لئے قرعہ اندازی کی (2)، الحدیث۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ

1۔ صحیح بخاری، باب القرعۃ فی المشکلات، حدیث 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2490

اندازی کرتے اور جس کسی کے نام پر قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے، آگے حدیث ذکر کی۔(1)

اس بارے میں حضرت امام مالک سے مختلف روایات ہیں۔ آپ نے ایک بار کہا حدیث کی وجہ سے وہ قرعہ اندازی کرے گا اور ایک بار کہا: ازواج میں سے جو سفر میں اس کے موافق ہوگی اسے وہ سفر پر لے جائے گا۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کے اجر و ثواب کو لوگ جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اس کا موقعہ نہ پاتے تو یقیناً وہ قرعہ اندازی کرتے (2)''۔ اس بارے میں احادیث کثیر ہیں۔ قرعہ اندازی کی کیفیت اور اختلاف کتب فقہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قرعہ اندازی ان میں سے ہے کہ اگر تم اس پر بغیر قرعہ اندازی کے راضی ہو جاؤ تو وہ جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ ضعیف ہے، کیونکہ قرعہ اندازی کا فائدہ ہی یہ ہے کہ باہم اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں کسی مخفی حکم کو نکالنا اور ظاہر کرنا اور رہا وہ حکم جو اس میں رضامندی کے ساتھ نکالا جاتا ہے وہ ایک دوسرا باب ہے۔ اور کسی کے لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قرعہ باہم رضامندی کے محل میں ڈالا جاتا ہے، کیونکہ یہ کبھی بھی باہم رضامندی کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' یہ ہوتا ہی ان چیزوں میں ہے جن میں لوگوں کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔

امام شافعی اور جنہوں نے اس کے بارے کہا ہے ان کے نزدیک قرعہ اندازی کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کے مساوی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں اور ہر ٹکڑے پر حصہ دار کا نام لکھ دیا جائے پھر انہیں مٹی کی ایسی گولیوں میں رکھ دیا جائے جو مساوی ہوں ان میں کوئی تفاوت نہ ہو۔ پھر وہ تھوڑی تھوڑی خشک کر لی جائیں پھر وہ کسی آدمی کے کپڑے میں ڈال دی جائیں جو وہاں حاضر نہ ہو۔ اور انہیں کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے پھر وہ اپنا ہاتھ اس میں داخل کرے اور ایک نکال لے اور جس آدمی کا نام لے اسے وہ جز اور حصہ دے دے جس پر قرعہ اندازی کی گئی۔

**مسئلہ نمبر 4۔** یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ سوائے دادی کے تمام قرابتداروں کی نسبت خالہ کے لئے حق پرورش زیادہ ہے۔ اور تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے فرمایا تھا اور ان کے نکاح میں ان کی خالہ تھی۔ اور فرمایا: ''بلاشبہ خالہ ماں کے قائم مقام ہے (3)''۔ یہ مسئلہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (4)۔ انہوں نے بیان فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے میں لوں گا، میں اپنے چچا کی بیٹی کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے پاس ہے اور بلاشبہ خالہ ماں ہی ہوتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے چچا کی بیٹی کا

1۔ صحیح بخاری، باب القرعۃ فی المشکلات، حدیث 2491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2492
3۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2501، ایضاً
4۔ ابی داؤد، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ میرے عقد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، کیونکہ میں اس کی طرف گیا، میں نے سفر کیا اور اسے ساتھ لے کر آیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حدیث ذکر کی فرمایا: ''جہاں تک بچی کا ذکر ہے تو میں حضرت جعفر کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔'' ابن ابی خیثمہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے وصی تھے۔ پس اس بنا پر خالہ وصی کی نسبت بھی زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور چچا کا بیٹا جب خاوند ہو تو وہ خالہ کے حق حضانت کو ختم نہیں کرتا اگرچہ وہ اس کا محرم نہ ہو۔

**اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾**

''جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔''

یہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کی دلیل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ کے متعلق ہو۔ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ابوالسمان نے اسے بِكِلْمَةٍ منه پڑھا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ اس میں اِسْمُهَا نہیں فرمایا کیونکہ کلمۃ بمعنی ولد ہے۔ اور المسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور اس کا معنی صدیق ہے، حضرت ابراہیم نخعی نے یہی کہا ہے اور یہ معرب الفاظ میں سے ہے۔ اور اس میں اصل شین ہے اور وہ مشترک ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے: مسیح کا معنی پسینہ ہے اور المسیح کا معنی الصدیق ہے اور مسیح کا معنی ایسا درہم بھی ہے جس پر نقش مٹا ہوا ہو۔ اور المَسْح کا معنی جماع ہے۔ کہا جاتا ہے مَسحها اور الامسح سے مراد نرم و ملائم جگہ بھی ہے۔ اور المسحاء وہ عورت جس کے کولہو اور ران کمزور ہوں۔ و بفلان مَسْحة من جِمال (فلاں کے پاس انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ ہے) اور المسائح انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ اس کی واحد مَسِيحة ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها مسائحُ زُوْر فی مراکِضها  لِینٌ و لیس بها وَهْن والارفق

اس میں لفظ مسائح اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور مسیح ابن مریم کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سے مادہ سے لیا گیا ہے؟ پس کہا گیا ہے: کیونکہ آپ نے زمین میں خوب سیاحت کی اور آپ نے حفاظت کے لئے کوئی گھر نہیں بنایا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ جب کسی کوڑھ زدہ کو پھونک مارتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا، تو اسی وجہ سے آپ کا نام مسیح پڑ گیا۔ اس بنا پر یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ آپ کو برکت کا تیل لگایا گیا تھا، انبیاء علیہم السلام کو جو تیل لگایا جاتا ہے وہ انتہائی خوشبودار ہوتا ہے، پس جب وہ لگایا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے چونکہ ان کے دونوں (پاؤں کے) تلوؤں کو مس کیا گیا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ''کیونکہ حسن و جمال نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ ان پر ظاہر اور عیاں تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ اور ابوالہیثم نے کہا ہے: مسیح، مسیخ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے مسحه الله یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی حسین اور مبارک پیدا فرمایا اور مسخه کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی ملعون اور قبیح پیدا کیا۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: المسيح الصديق یعنی مسیح کا معنی صدیق ہے۔ اور مسیخ کا معنی اعور (کانا) ہے۔ اور دجال کو یہی نام دیا گیا ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: مسیح دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اصل میں مشیخ یعنی شین کے ساتھ ہے اور پھر اسے عربی کی طرف منتقل کیا گیا ہے جیسا کہ موشی کو عربی میں موسیٰ بنا دیا گیا ہے اور رہا دجال تو اس کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ایک آنکھ مسخ کر دی گئی ہے اور دجال کے لئے مِسِّیح میم کے کسرہ اور سین کی شد کے ساتھ کہا گیا ہے اور بعض اسی طرح خا نقطے والی کے ساتھ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مَسِیخ یعنی میم مفتوح ہے خا نقطے والی اور سین مخفف ہے۔ پہلا زیادہ مشہور ہے اور اکثر کا قول اسی کے مطابق ہے۔ اور اس کا وہ نام اس لئے ہے کیونکہ وہ زمین میں گھومتا پھرتا رہے گا اور سوائے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس کے تمام شہروں میں داخل ہوگا اور یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ پس دجال زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے چکر لگائے گا، گھومے گا اور ابن مریم علیہ السلام بخشش و عطا کے لئے سیاحت کریں گے۔ اور اس بنا پر کہ اس کی ایک آنکھ بند کر دی گئی ہے فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔

اور شاعر نے کہا:

اِنَّ المسيح يقتل المسِيخا

بے شک مسیح علیہ السلام مسیخ (دجال) کو قتل کر دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سوا کوئی شہر نہیں ہے مگر دجال اس میں داخل ہوگا(1)''۔ الحدیث۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ''سوائے کعبہ اور بیت المقدس کے'' اسے ابو جعفر طبری نے ذکر کیا ہے اور ابو جعفر طحاوی نے ''مسجد طور'' کا اضافہ ذکر کیا ہے اور اسے انہوں نے جنادہ بن ابی امیہ عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے ''کہ وہ ساری زمین پر غالب آجائے گا سوائے حرم پاک اور بیت المقدس کے اور وہ مومنین کو بیت المقدس میں محصور کر دے

1۔ صحیح بخاری، باب لايدخل الدجال المدينه، حدیث نمبر 1748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا۔'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''پس ہمارے درمیان وہ اسی طرح ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق سے سفید منارہ کے پاس نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو اس سے چاندی کے جیسے گریں گے جو اپنی ہیئت و شکل میں موتیوں کی مثل ہوں گے۔ پس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگا کہ وہ آپ کی سانس کی ہوا کو پائے مگر وہ مر جائے گا۔ اور آپ کی سانس کی انتہا وہاں تک ہوگی جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی پس آپ اسے تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد (لد فلسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے) کے پاس پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، الحدیث۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے کسی سے مشتق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے، اس بنا پر عیسیٰ المسیح سے بدل کل ہوگا۔ اور عیسیٰ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے وہ غیر منصرف ہے۔ اور اگر آپ اسے عربی قرار دیں تو پھر اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے معرفہ یا نکرہ ہونے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث موجود ہے (اور یہ قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ مشتق ہوگا عاسہ یعوسہ سے یعنی جب کوئی کسی کے لئے تدبیر اور انتظام کرے اور اس پر ڈٹ جائے اور قائم رہے۔

**وَجِيْهًا** کا معنی ہے شریف، صاحب قدر و منزلت اور یہ لفظ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ **وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ** اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقربین میں سے ہوگا۔ یہ **وَجِيْهًا** پر معطوف ہے یعنی بمعنی مقربا اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور وجیہ کی جمع وُجہاء اور وِجہاء ہے۔ **وَيُكَلِّمُ النَّاسَ** اس کا عطف بھی وجیہا پر کیا گیا ہے۔ اخفش نے بھی یہی کہا ہے۔ اور **الْمَهْدِ** سے مراد بچے کی شیر خوارگی کا بچھونا ہے۔ اور مهدت الأمر کہا جاتا ہے جب تو اسے تیار کرے اور پھر اسے روندے...... اور قرآن کریم میں ہے: **فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ** (الروم) (تو وہ اپنے لئے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں) اور امتهد الشئ کا معنی ہے کسی شے کا اس طرح بلند ہونا جس طرح اونٹ کی کوہان بلند ہوتی ہے۔ **وَكَهْلًا**، الکہل سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جو بچپن اور شیخوخت کے درمیان ہوتا ہے (یعنی پکی عمر) اور امرأۃ کہلۃ پکی عمر کی عورت۔ اور اکتهلت الروضۃ جب باغ میں کلیاں عام ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ آپ گہوارے میں لوگوں سے بطور معجزہ اور علامت کے گفتگو کرتے تھے اور پکی عمر میں وحی اور رسالت کے سبب گفتگو کرتے تھے۔

ابو العباس نے کہا ہے: آپ نے گہوارے میں لوگوں سے اس وقت گفتگو کی جب آپ نے اپنی ماں کی برأت کا اظہار فرمایا اور کہا: **اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ** الآیہ۔ اور رہی حالت کہولت کی گفتگو! تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو آسمان سے نازل فرمائے گا تو اس وقت آپ کو تینتیس برس کی عمر والی حالت پر نازل فرمائے گا اور یہی کہل کی حالت ہے تو آپ انہیں فرمائیں گے: **اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ** جیسا کہ آپ نے گہوارے میں کہا تھا۔ پس یہ دونوں معجزے اور دلائل ہیں۔

مہدوی نے کہا ہے: آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ان سے گفتگو کریں گے اور کہولت کی حالت میں ان سے گفتگو کرنے تک وہ زندہ رہیں گے، جبکہ عادت یہ ہے کہ جس کسی نے گہوارے میں گفتگو کی وہ زندہ نہیں رہا۔

زجاج نے کہا ہے: وَ كَهْلًا بمعنی ویکلم الناس كَهْلًا ہے۔ اور فراء اور اخفش نے کہا ہے: یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے۔ اور کہا گیا ہے اس کا معنی ہے اور وہ لوگوں سے صغرسنی اور کہولت کی عمر میں گفتگو کریں گے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ الکھل کا معنی حلیم اور بردبار ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: لغت میں یہ معنی معروف نہیں۔ اہل لغت کے نزدیک الکھل سے مراد چالیس سال کے قریب کی عمر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: سولہ برس تک کی عمر کو حَدَث (لڑکپن) کہا جاتا ہے۔ پھر بتیس سال تک جوانی ہوتی ہے۔ اور پھر تینتیسویں سال میں کہولت شروع ہو جاتی ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اس کا عطف وَجِيْهًا پر کیا گیا ہے یعنی و ھو من العباد الصالحین۔ (اور وہ نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔) ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ادریس نے حصین سے اور انہوں نے ہلال بن یساف سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: گہوارے میں تین کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، صاحب یوسف اور صاحب جریج۔ اسی طرح کہا او صاحب یوسف۔

اور یہی صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گہوارے میں سوائے تین کے کسی نے کلام نہیں کی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور صاحب جریج اور صاحب الجبار اور یہ اس دوران ہوا جب بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔'' اور انہوں نے طویل حدیث بیان کی۔ اور حضرت صہیب کی حدیث میں اصحاب اخدود کے واقعہ میں یہ بھی آیا ہے ''کہ ایک عورت کو لایا گیا تاکہ اسے ایمان لانے کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک (شیرخوار) بچہ بھی تھا۔'' اور مسلم کے علاوہ میں ہے ''وہ شیرخوار تھا تو عورت آگ میں کودنے سے ذرا خوفزدہ ہوئی تو اس بچے نے کہا یا امہ اصبری فانك علی الحق اے میری ماں! تو صبر کر (یعنی آگ میں ڈالے جانے سے خوفزدہ نہ ہو) کیونکہ تو ہی حق پر ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: گہوارے میں چھ نے کلام کی ہے۔ شاہد یوسف، فرعون کی بیوی کی ماشطہ کا بچہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ، صاحب جریج اور صاحب جبار اور انہوں نے اخدود کا ذکر نہیں کیا اور انہوں نے صاحب الاخدود کو ساقط کر دیا ہے اور اس سمیت کلام کرنے والے سات ہو جائیں گے۔ اس کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے ''کہ گہوارے میں تین کے سوا کسی نے کلام نہیں کی'' آپ نے کلام حصر کے ساتھ فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے خبر دی جن کا علم آپ کو اس وقت بذریعہ وحی عطا فرمایا گیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے چاہا آپ کو آگاہ فرمایا اور آپ نے اس کے بارے خبر دی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا صاحب یوسف تو اس کے بارے کلام آگے آئے گا۔ اور صاحب جریج، صاحب الجبار اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، قبل الحدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صاحب الاخدود کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ اور عنقریب اصحاب اخدود کا قصہ ''سورۃ البروج'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جہاں تک فرعون کی بیوی کی ماشطہ کے بچے کا ذکر ہے تو اسے علامہ بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مجھے سفر معراج پر لے جایا گیا تو میں نے انتہائی طیب اور اچھی خوشبو میں سیر کی، تو میں نے کہا یہ خوشبو کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا: فرعون کی بیٹی کی ماشطہ اور اس کی اولاد کی اس کی کنگھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی تو اس نے کہا: بسم اللہ (اللہ تعالیٰ کے نام سے) تو اس پر فرعون کی بیٹی نے کہا: کیا وہ میرا باپ ہے؟ اس نے جواب دیا: ربی و ربك و رب ابيك (اس کے نام سے جو) میرا رب ہے اور تیرا رب ہے اور تیرے باپ کا بھی رب ہے۔ اس نے کہا: کیا میرے باپ کے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے ... اس نے کہا نہیں فرعون نے اسے بلایا اور کہا: کیا تیرا میرے سوا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں میرا اور تیرا رب اللہ ہے ... اس نے کہا..... پھر اس نے تانبے کے ٹکڑے پگھلانے کا حکم دیا پس اسے گرم کیا گیا پھر اس نے اسے اس میں پھینک دینے کا حکم دیا تو ماشطہ نے کہا: مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری اور میرے بچے کی ہڈیوں کو ایک ہی جگہ میں جمع کر دے گا۔ اس نے کہا: یہ تیرے لئے اس حق کے عوض میں ہے جو تیرے لئے ہم پر لازم ہے۔ پس اس نے ان کے بارے حکم دیا تو انہیں ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا یہاں تک کہ وہ ان میں شیر خوار بچے تک جا پہنچا، تو اس نے کہا: اے ماں! تو کود جا اور اس میں تاخیر نہ کر کیونکہ ہم حق پر ہیں..... راوی نے کہا..... چار بچوں نے صغر سنی میں گفتگو کی۔ ایک یہ بچہ ہے، دوسرا شاہد یوسف، تیسرا صاحب جریج اور چوتھا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔

**قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۷﴾**

''مریم بولیں اے میرے پروردگار! کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ؟ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے۔ فرمایا بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَتۡ رَبِّ مریم بولیں اے میرے سردار۔ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کو خطاب کر رہی ہیں، کیونکہ جب وہ اس کے پاس انسانی شکل میں آئے اور اسے کہا: بلاشبہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ وہ تجھے ایک پاکیزہ خوبرو بچہ عطا فرمائے تو جب مریم نے ان کا یہ قول سنا تو آپ نے ان سے بچہ کے طریقے کے بارے پوچھا اور کہا: میرے ہاں بچہ کیوں کر ہو سکتا ہے حالانکہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا؟ یعنی نکاح کے ساتھ (سورۃ مریم میں ہے) وَّ لَمۡ اَکُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾ (مریم) (اور نہ میں بدچلن ہوں)

انہوں نے یہ بطور تاکید ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کا یہ قول لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ (مجھے کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا) حرام اور حلال دونوں طریقوں کو شامل ہے۔ آپ کہتی ہیں: وہ عادت جاریہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جاری کر رکھی ہے وہ یہ ہے

کہ بچہ پیدا ہوتا ہے نکاح سے یا زنا سے۔ اور کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بھی بعید نہیں سمجھا، لیکن ارادہ یہ کیا کہ یہ بچہ کیسے ہوگا۔ کیا مستقبل میں خاوند کی جانب سے یا ابتداءً ہی اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرمائے گا؟ اور روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جس وقت مریم کو کہا: كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (بات یونہی ہے اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے) قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (اس نے کہا اسی طرح ہے تیرے رب نے فرمایا ہے وہ مجھ پر آسان ہے)

انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان اور ان کی آستین میں پھونک ماری۔ ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اپنی انگلی کے ساتھ ان کی قمیص کی آستین کو پکڑا اور وہ اسی ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے: جبریل امین کی پھونک مریم کے رحم پر پڑی پس وہ اس کے سبب حاملہ ہو گئی۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ تخلیق حضرت جبریل امین علیہ السلام کی پھونک سے ہو کیونکہ اس طرح جزوی طور پر بچہ ملائکہ میں سے ہو جائے گا اور اس کا بعض انسانوں میں سے ہوگا لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور ان کی اولاد سے عہد و پیمان لیا تو کچھ پانی باپوں کی صلبوں میں رکھ دیا اور کچھ ماؤں کی رحموں میں، پس جب یہ دونوں پانی جمع ہوں تو بچہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی اکٹھے مریم میں رکھ دیئے کچھ ان کی رحم میں اور کچھ ان کی صلب میں، پس جبریل امین نے اس میں پھونک ماری تاکہ ان کی شہوت بھڑک جائے، کیونکہ عورت کی شہوت میں جب تک ہیجان پیدا نہ ہو وہ حاملہ نہیں ہوتی، پس جب حضرت جبریل امین کی پھونک سے ان کی شہوت میں انگیخت پیدا ہوئی تو وہ پانی جو ان کی صلب میں تھا وہ رحم میں آ گرا اور اس طرح دونوں پانی آپس میں مل گئے تو اس طرح استقرار حمل ہو گیا۔ پس اسی کے بارے ارشاد باری تعالیٰ: اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا یعنی جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے کُنْ تو ہو جا...... تو وہ شے ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل۔ اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف (وہ انہیں آ کر کہے گا کہ) میں آ گیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان

صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور (لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایماندار ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ابن جریج نے کہا ہے: الکتاب سے مراد کتابت کرنا اور لکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات اور انجیل کے علاوہ کوئی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائی۔

وَرَسُوْلًا (یعنی) اور ہم اسے رسول بنائیں گے یا وہ ان سے رسول کی حیثیت سے ہمکلام ہوگا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے اور اخفش نے کہا ہے: اگر چاہے تو وَ رَسُوْلًا میں واؤ کو مقحم بنا دے اور رسولاً کو ہ ضمیر سے حال بنا لے تقدیر کلام ہوگی ویعلمہ الکتاب رسولاً (اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب سکھائے گا اس حال میں کہ وہ رسول ہوگا) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے ''انبیاء بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں'' اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ یعنی میں تمہارے لئے تصویر اور شکل سی بنا دیتا ہوں۔ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔةِ الطَّيْرِ اعرج اور ابو جعفر نے کھیۃ شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ۔

اور الطیر مذکر و مونث دونوں ہو سکتا ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ اور ان میں سے ایک میں پھونک مارتا ہوں یا کیچڑ میں پھونکتا ہوں تو وہ پرندہ اڑنے والا ہو جائے گا۔ اور طائر اور طیر یہ تاجر اور تجر کی مثل ہیں۔

وہب نے کہا ہے: وہ اڑتا رہا جب تک لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے اور جب وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گیا تو مردہ ہو کر گر پڑا تاکہ مخلوق کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل سے ممتاز ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے چمگادڑ کے سوا کوئی نہیں بنایا کیونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ کامل ترین پرندہ ہے تاکہ وہ قدرت میں انتہا کو پہنچ جائے، کیونکہ اس کے پستان بھی ہیں، دانت بھی اور کان بھی ہیں اور اسے حیض بھی آتا ہے، وہ پاک بھی ہوتا ہے اور بچے بھی جنتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ خلقت میں تمام سے عجیب تر ہے اور اس کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اس میں گوشت بھی ہے اور خون بھی، وہ بغیر پروں کے اڑتا ہے اور حیوانوں کی طرح بچوں کو جنم دیتا ہے اور وہ اس طرح انڈے نہیں دیتا جس طرح باقی تمام پرندے انڈے دیتے ہیں، اس کی کھیری ہوتی ہے اور اس سے دودھ نکلتا ہے، وہ نہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں، بلکہ وہ صرف دو ساعتوں میں دیکھ سکتا ہے، ایک ساعت سورج غروب ہونے کے بعد اور ایک ساعت طلوع فجر کے بعد اس سے پہلے کہ وہ خوب روشن ہو۔ اور وہ اس طرح ہنستا ہے جس طرح آدمی ہنستا ہے اور اسے اسی طرح حیض آتا ہے جس طرح عورت کو حیض آتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک ان کا آپ سے اس بارے میں سوال کرنا تعنت اور سرکشی کی بنا پر تھا تو انہوں نے کہا: ہمارے لئے

چمگادڑ بناؤ اور اس میں روح ڈال دو اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں، پس آپ نے مٹی لی اور اس سے چمگادڑ بنایا پھر اس میں پھونک ماری تو وہ زمین و آسمان کے درمیان اڑنے لگا، اس میں مٹی اور پھونک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے، جس طرح کہ پھونک جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔

قولہ تعالیٰ: وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ الاکمہ وہ جو اندھا اور نابینا پیدا ہوتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اسی طرح ابوعبیدہ نے کہا ہے: وہ جو اندھا پیدا کیا جاتا ہے اور رؤبۃ کے بارے کسی نے کہا:

فَارْتَدَّ ارتداد الاكمه

ابن فارس نے کہا ہے: الکمہ کا معنی نابینا (یعنی) انسان پیدا ہوتا ہے اس حال میں کہ اسے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ سوید نے کہا ہے: كَمِهت عيناه حتى ابيضتا (اس کی آنکھیں اندھی ہیں یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئیں)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ جو دن کے وقت تو دیکھتا ہے لیکن رات کے وقت نہیں دیکھ سکتا۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اعمش ہیں، البتہ لغت میں اس کا معنی عمیٰ اندھا پن ہے، کہا جاتا ہے كَمِهَ يَكْمَه كَمَهًا اور كَمَّهتها۔ أنا کا معنی ہے جب تو اسے اندھا کر دے۔ اور برص تو معروف بیماری ہے یعنی وہ سفید داغ جو ساری جلد پر چھا جاتے ہیں (اور اسے سفید کر دیتے ہیں) اور الابرص کا معنی قمر (چاند) بھی ہے اور سام اَبرص (چھپکلی) تو معروف ہے اور اس کی جمع ابا ریص آتی ہے ان دونوں بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں عاجز کر دینے والی ہیں (یعنی ان کا علاج انتہائی مشقت آمیز اور مشکل ہے گویا لاعلاج بیماریاں ہیں) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی جنس سے انہیں معجزہ دکھا دیا۔

وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا: عاذر کو وہ آپ کا دوست تھا، بڑھیا کے بیٹے کو، ابنۃ العاشر کو اور سام بن نوح کو۔ فاللہ اعلم، پس عاذر نے تو چند دن قبل وفات پائی تھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی چربی ٹپکنے کے قریب ہو گئی پس وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ اور رہا ابن العجوز! تو آپ اس کے پاس سے گزرے اسے چارپائی پر اٹھایا جا رہا تھا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے پہن لئے اور چارپائی اپنی گردن پر اٹھالی اور اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور جہاں تک بنت العاشر کا تعلق ہے تو آپ ایک رات اس کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اس کے بعد زندہ ہو گئی اور اس کی اولاد بھی ہوئی، پس جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: بلاشبہ آپ انہیں زندہ کرتے ہیں جن کی موت قریب قریب واقع ہوئی ہے تو شاید وہ ابھی نہ مرے ہوں بلکہ ان پر سکتہ طاری ہوا ہو، تو آپ ہمارے لئے سام بن نوح کو زندہ کریں۔ تو آپ نے انہیں فرمایا: تم اس کی قبر کے بارے میری راہنمائی کرو۔ چنانچہ آپ نکلے اور آپ کے ساتھ قوم بھی نکلی یہاں تک کہ اس کی قبر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اپنی قبر سے اس حال میں نکلا کہ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تیرا سر کیسے سفید ہو گیا ہے حالانکہ تمہارے زمانے میں بڑھاپا نہیں تھا؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ! بلاشبہ تو نے مجھے بلایا ہے اور میں نے یہ آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے: روح اللہ کو جواب دو، تو میں نے یہ گمان کیا کہ

قیامت قائم ہو چکی ہے، پس اس خوف کی وجہ سے میرا سر سفید ہو گیا ہے۔ پھر آپ نے اس سے نزع کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: اے روح اللہ! بلاشبہ نزع کی تلخی میری سانس کی نالی سے (نرخرہ سے) ابھی ختم نہیں ہوئی حالانکہ میری موت کے وقت سے (اب تک) چار ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، پھر اس نے قوم کو کہا: تم ان کی تصدیق کر لو کیونکہ یہ نبی ہیں، تو ان میں سے بعض آپ کے ساتھ ایمان لے آئے اور بعض نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور کہا: یہ سحر ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی حدیث سے مروی ہے کہ انہوں نے ذکر کیا مجھے محمد بن طلحہ نے ایک آدمی سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام جب کسی مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو آپ دو رکعت نماز ادا فرماتے پہلی رکعت میں تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ اور دوسری میں تنزیل السجدہ کی قرأت فرماتے اور جب فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے پھر ان سات اسماء کے وسیلہ سے دعا مانگتے: یا قدیمُ، یا خَفِیُّ، یا دائم، یا فردُ، یا وِترُ، یا اَحَدُ، یا صَمَدُ، اسے علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یعنی میں تمہیں اس کے بارے بتلاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ جب آپ نے ان کے لئے مردے زندہ کئے تو انہوں نے آپ سے ایک دوسرے معجزے کا مطالبہ کر دیا اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اس کے بارے بتائیے جو ہم اپنے گھروں میں کھاتے ہیں اور جو آنے والے کل کے لئے جمع کر کے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں آگاہ کیا اور فرمایا: اے فلاں! تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور فلاں فلاں چیز جمع کر کے رکھی۔ اسی کے بارے قولہ وَ اُنَبِّئُكُمْ الآیہ ہے۔

مجاہد، زہری اور سختیانی نے ذال معجمہ کے ساتھ وماتذخرون مخفف پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: آپ تعلیم گاہ میں بچوں کو ان چیزوں کے بارے بتلاتے تھے جو وہ جمع کر کے رکھ آتے تھے یہاں تک کہ ان کے والدین نے انہیں آپ کے پاس بیٹھنے سے روک دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: آپ نے انہیں اس کے بارے بتایا جو وہ دستر خوان سے کھا کر آتے اور جو وہ خفیۃً (چھپ کر) اس سے جمع کر آتے تھے۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

''اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے سو، ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں، سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے''۔

وَ مُصَدِّقًا اس کا عطف وَ رَسُوْلًا پر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ میں تمہارے پاس تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں۔ لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ اس کی جو مجھ سے پہلے آئی۔ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ اس میں حذف ہے، ای وَلأحل لکم جئتکم (اور تاکہ میں تمہارے لئے حلال کردوں میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں) بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ یعنی کھانے کی اشیاء میں سے بعض جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں۔

کہا گیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کردیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ تورات میں نہ تھیں، مثلاً تھوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کردیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کردیا تھا اور وہ تورات میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ بعض بمعنی کل ہو۔

اور لبید نے کہا ہے:

تَرَّاكُ اَمْكِنَةٍ اذا لم ارضها    أو يَرْتَبِطْ بعضَ النفوس حِمامُهَا

اس میں بعض بمعنی کل استعمال ہوا ہے۔

یہ قول اہل لغت میں سے اہل نظر وفکر کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ بعض اور جز اس جگہ پر بمعنی کل نہیں ہوسکتے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کیا جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حرام کیا تھا مثلاً تھوم کھانا وغیرہ۔ اور آپ نے ان کے لئے قتل، چوری اور فحاشی وغیرہ کو حلال نہیں کیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے پاس تشریف لائے ان چیزوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونٹوں کی تحریم اور تھوم وغیرہ اشیاء کی تحریم کا حکم لے کر ان کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے بعض کی حلت کا حکم لے کر آئے۔

نخعی نے بَعْضَ الَّذِیْ حَرُمَ عَلَیْكُمْ پڑھا ہے۔ یعنی یہ کَرُمَ کی مثل ہے بمعنی صَارَ حَرَامًا۔ یعنی وہ حرام ہوگیا کے معنی میں ہے۔ اور کبھی بعض کو بمعنی کل بھی رکھا جاتا ہے جبکہ وہاں ایسا قرینہ متصل ہو جو اس پر دلالت کرے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا:

أبا منذر افنيتَ فاستبقِ بعضنا    حَنَانَيْكَ بعضُ الشرّ اهون من بعض

اس میں بعض الشر اھون سے مراد کل ہے۔ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اس میں آیہ کو واحد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ آیات ہیں، اس وجہ سے کہ یہ آپ کی رسالت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے جنس واحد ہے۔

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۵۲

''پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (وانکار) (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار

اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کفر محسوس کیا۔ آیت میں اَحَسَّ بمعنی عَلِمَ اور وَجَدَ کے ہے (یعنی جانا اور پایا) زجاج نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: اَحس، عَرَفَ (آپ نے پہچانا) کے معنی میں ہے۔ اور اس کا اصل معنی کسی شے کو حاسہ کے ساتھ پانا ہے (وجود الشئ بالحاسة) اور احساس کا معنی کسی شے کو جاننا ہے (العلم بالشئ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ (مریم:98) (کیا آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں؟ اور الحس بمعنی قتل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران:152) (جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے) اور اسی معنی میں جراد (مکڑی) کے بارے میں حدیث بھی ہے اِذَا حَسَّتهُ البرد (جب سردی نے اسے ہلاک کر دیا) مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی ان کا اللہ کے ساتھ کفر و انکار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے ان سے کلمہ کفر سنا اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ فرمایا: کون ہے وہ جس سے میں ان کے خلاف مدد طلب کروں؟ سدی اور ثوری وغیرہما نے کہا: یہاں اِلَى اللّٰهِ بمعنی مع اللہ ہے یعنی الی بمعنی مع ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ یعنی مع اموالکم۔ (یعنی تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال نہ کھاؤ۔) واللہ اعلم۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مَن انصاری فی السبیل الی اللہ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون میرے مددگار ہیں؟) کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کون ہے جو اپنی نصرت اور مدد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کے ساتھ ملائے گا؟ ان دونوں قولوں کے مطابق اِلی اپنے اصل معنی پر ہے اور یہی جید اور عمدہ ہے۔ اور آپ نے نصرت اور مدد طلب کی تاکہ اس کے سبب آپ اپنی قوم سے حفاظت میں رہیں اور اعلانیہ دعوت دے سکیں، حسن اور مجاہد سے یہ معنی منقول ہے۔ اور انبیاء و اولیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ یہی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ۝ (ہود) (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی) یعنی خاندان اور اصحاب میری مدد کرتے۔ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ حواریوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کے دین کے مددگار ہیں۔ اور حواریوں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب ہیں اور وہ بارہ آدمی تھے، کلبی اور ابو روق نے یہی کہا ہے۔

ان کا یہ نام رکھنے میں اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے سفید کپڑوں کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا، وہ صیادین (شکاری) تھے۔ ابن ابی نجیح اور ابن ارطاۃ نے کہا ہے: وہ دھوبی تھے۔ تو انہیں یہ نام کپڑے خوب صاف کرنے کی وجہ سے دیا گیا۔ حضرت عطا نے کہا ہے: حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متفرق عمال کے سپرد کیا اور سب سے آخر میں آپ نے انہیں حواریوں کے حوالے کر دیا اور وہ دھوبی اور رنگساز تھے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معلم نے

سفر کا ارادہ کیا، تو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: میرے پاس مختلف رنگوں کے بہت سے کپڑے ہیں اور میں نے تمہیں رنگ کرنا سکھا دیا ہے پس تم انہیں رنگ دینا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مٹکا رنگ پکایا اور اس میں تمام کپڑے ڈال دیئے اور کہا: تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسی طرح ہو جا جو میں تجھ سے ارادہ رکھتا ہوں۔ پس حواری آیا اور سارے کپڑے مٹکے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو کہا: تو نے انہیں خراب کر دیا ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرخ، زرد اور سبز اور دیگر ان رنگوں میں کپڑے نکالے جو رنگ ان میں سے ہر کپڑے پر لکھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حواری بہت متعجب ہوا اور اس نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس نے لوگوں کو آپ کی طرف بلایا پس وہ آپ کے ساتھ ایمان لائے اور وہی حواری تھے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے اور وہ اس سے اپنے دلوں کی صفائی اور طہارت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بادشاہ تھے، اس طرح کہ بادشاہ نے کھانے کی دعوت کی اور لوگوں کو اس پر بلایا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو پیالہ تھا وہ ذرا کم نہ ہوا تو بادشاہ نے آپ کو کہا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، تو اس نے کہا میں اپنی یہ سلطنت چھوڑتا ہوں اور تمہاری اتباع کرتا ہوں۔ پس وہ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چل پڑا، تو وہی حواری ہیں، یہ ابن عون نے کہا ہے۔ لغت میں الحَوَر کا اصل معنی سفیدی ہے اور حوّرت الثیاب کا معنی ہے میں نے کپڑے کو خوب صاف کیا، سفید کیا اور الحُوّاری من الطعام ماحوّر یعنی جو کھانا خوب اچھی طرح پکایا جائے۔ اور احوَرّ کا معنی ابیض (سفید ہونا) ہے۔ اور الجفنة المحوّرة: سفید چمڑے سے بنی ہوئی نیام اور الحواری کا معنی مددگار بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لِکل نبیّ حواریّ وحواریّ الزبیر(1) (ہر نبی کا حواری (مددگار) ہے اور میرا حواری زبیر ہے) اور الحواریات سفید عورتیں۔

اور کسی نے کہا:

فقل للحواریات یبکین غیرنا ولا تبکنا الّا الکلابُ النوابحُ

پس تو ان سفید عورتوں سے کہہ دے وہ ہمارے سوا اوروں پر روئیں اور ہم پر نہ روئیں گے مگر بھونکنے والے کتے۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۵۳

''اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی، تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔''

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے بِمَآ اَنْزَلْتَ یعنی اس کے ساتھ جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اس پر جو تو نے اپنے حکم میں سے ظاہر اور بیان کیا۔ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ شاہدین سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، یہ

1۔ صحیح بخاری، باب فضل الطلیعة، حدیث نمبر 2634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے ہمارے اسماء ان کے اسماء کے ساتھ لکھ لے اور ہمیں من جملہ ان میں سے بنا دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق و سچائی کے ساتھ شہادت دی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

''اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور مؤثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَكَرُوْا مراد بنی اسرائیل کے وہ کفار ہیں جن سے آپ نے کفر محسوس کیا یعنی آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی قوم اور ان کی ماں نے اپنے درمیان سے نکال دیا تو آپ حواریوں کے ساتھ ان کی طرف لوٹ کر آئے اور ان میں اعلانیہ دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بنایا اور انہوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، پس یہی ان کا مکر اور خفیہ تدبیر ہے۔ اور مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے جسے وہ نہ جانتے ہوں، فراء وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب بھی انہوں نے کوئی گناہ اور غلطی کی تو ہم نے انہیں ایک تازہ اور اچھی نعمت عطا کر دی۔

اور زجاج نے کہا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر جزا اور بدلہ دینا ہے، پس جزا اور بدلے کو ابتدا کا نام دیا گیا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور وَهُوَ خَادِعُهُمْ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لغت میں مکر کا اصل معنی حیلہ کرنا اور دھوکہ دینا ہے۔ اور مکر کا معنی خدالۃ الساق (پنڈلی کا بھر جانا) ہے اور امرأۃ ممکورۃ الساقین (ایسی عورت جس کی دونوں پنڈلیاں گول اور بھری ہوئی ہوں) اور مکر کپڑوں کی ایک قسم بھی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے مراد گیرو اور سرخ مٹی ہے، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو دوسروں کے سامنے کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے اٹھا لیا اور وہ اس طرح ہوا کہ یہودی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تو آپ ان سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرائیل امین نے آپ کو روشندان سے آسمان کی طرف اٹھا لیا، تو ان کے بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث آدمی کو کہا اسے یہودا کہا جاتا تھا: تو ان پر داخل ہو اور انہیں قتل کر دے، پس وہ روشندان سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ مشابہ بنا دیا، پس جب وہ نکلا تو انہوں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ دیکھا چنانچہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا اور پھر اسے سولی دے دی۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چہرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا بدن ہمارے اپنے ساتھی کے بدن سے مشابہ ہے، پس اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں! اور اگر یہ عیسیٰ ہیں تو پھر ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ پس [illegible] کے درمیان جنگ

شروع ہوگئی اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ اس کے علاوہ بھی (بہت کچھ) کہا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ مَاكِرِين مَكَرَ يَمْكُرُ مَكْرًا سے اسم فاعل ہے اور بعض علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں شمار کیا ہے اور جب وہ اس کے ساتھ پکاریں تو اس طرح کہتے ہیں: یا خیر الماکرین امکرلی۔ (اے بہترین تدبیر کرنے والے میرے لئے تدبیر فرما) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی دعا میں کہتے تھے (1)۔ اللّٰھم امکرلی ولا تمکر علی (اے اللہ! میرے حق میں تدبیر فرما اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما) ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

''یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں سے) جنہوں نے (تیرا) انکار کیا اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک، پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ، اِذْ میں عامل یا تو مَكَرُوْا ہے یا فعل مضمر ہے۔ اہل معانی کی ایک جماعت جن میں ضحاک اور فراء بھی ہیں انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ کے بارے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور معنی یہ ہے: انی رافعك الی و مطهرك من الذين كفروا و متوفيك بعد ان تنزل من السماء (میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان لوگوں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے تیرا انکار کیا اور تمہیں آسمان سے اتارے جانے کے بعد تمہیں موت دوں گا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ (طٰہٰ) (اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔) اس میں تقدیر عبارت یہ ہے ولولا كلمة سبقت من ربك و اجل مسمى لكان لزاما۔

شاعر نے کہا ہے:

ألا يا نخلة من ذات عرق عليك و رحمة الله السلام

اس میں تقدیر عبارت، علیك السلام و رحمة الله۔ یعنی اس میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔

حسن اور ابن جریج نے کہا ہے: متوفيك کا معنی ہے: میں تمہیں قبضہ میں لینے والا ہوں اور بغیر موت کے آسمان کی طرف

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اٹھانے والا ہوں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: توفیت مالی من فلان یعنی میں نے فلاں سے اپنا مال قبضے میں لے لیا۔

اور وہب بن منبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دن کی تین ساعتوں کے لئے موت دی اور پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا۔ لیکن یہ قول بعید از حقیقت ہے۔ کیونکہ آپ کے آسمان سے اترنے اور دجال کو قتل کرنے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث مروی ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور اس کتاب میں بھی کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔

اور ابن زید نے کہا ہے: متوفیك بمعنی قابضك (میں تجھے قبضہ میں لینے والا ہوں) ہے اور متوفیك اور رافعك ایک ہی ہے اور اس کے بعد موت نہیں ہے۔

ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ متوفیك کا معنی ممیتك ہے (یعنی میں تجھے موت دینے والا ہوں) حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے کہ اس سے مراد نیند کی موت ہے، (جیسا کہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وھو الذی یتو فاکم باللیل یعنی تمہیں رات کے وقت سلا دیتا ہے کیونکہ نیند اخو الموت ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آپ سے پوچھا گیا کیا جنت میں نیند ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، نیند اخو الموت ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں'' اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر وفات اور بغیر نیند کے آسمان کی طرف اٹھالیا، جیسا کہ حسن اور ابن زید نے کہا ہے اور اسے ہی طبری نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے۔ اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے: واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، حواری ایک کمرے میں جمع ہوئے اور وہ بارہ آدمی تھے تو حضرت مسیح علیہ السلام کمرے کے طاق سے ان پر داخل ہوئے تو ابلیس نے یہود کی جماعت کو اس سے آگاہ کر دیا، چنانچہ ان میں سے چار ہزار آدمی سوار ہو کر آئے اور انہوں نے کمرے کے دروازہ کو گھیر لیا، تو حضرت مسیح نے حواریوں کو کہا: تم میں سے کون ہے جو نکلے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا؟ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں، پس آپ نے اون سے بنا ہوا ایک جبہ اور ایک عمامہ اس کی طرف پھینکا اور اسے اپنا نیزہ (مراد ایسا ڈنڈا جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہو) بھی عطا فرمایا اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا، وہ یہود کی طرف نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اسے سولی دے دی اور رہے حضرت مسیح علیہ السلام! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پر عطا فرمائے اور انہیں نور کا لباس پہنا دیا اور ان سے کھانے پینے کی لذت منقطع کر دی تو وہ ملائکہ کے ساتھ اڑ گئے۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اعمش نے منہال سے، انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے اصحاب کی طرف نکلے وہ بارہ آدمی تھے، ایک معین کمرے میں جمع تھے اور آپ کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے تو آپ نے انہیں کہا: خبردار! بلاشبہ تم میں سے وہ ہے جو عنقریب میرے بارے میں بارہ

مرتبہ انکار کرے گا اس کے بعد کہ وہ میرے ساتھ ایمان لا چکا ہے، پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے پھر وہ میری جگہ قتل کر دیا جائے تو وہ میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا؟ تو ان کے جوانوں میں سے ایک جوان اٹھا اور اس نے کہا میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا، پھر آپ نے دوبارہ بات کی تو وہی جوان اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا۔ آپ نے پھر اپنی بات کی تو وہی جوان پھر اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو اب کی بار آپ نے فرمایا: ہاں تو ہی وہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پرتاؤ ڈال دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سوراخ سے اوپر اٹھا لیا جو گھر میں آسمان کی طرف تھا۔ راوی نے بیان کیا: اور پھر تلاش کرنے والے یہودی آئے اور انہوں نے اس مشابہ شخص کو پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا اور پھر اسے سولی پر لٹکا دیا اور ان میں سے بعض نے آپ کا بارہ مرتبہ انکار کیا بعد اس کے کہ وہ آپ کے ساتھ ایمان لا چکے تھے، پس اس طرح وہ تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ رہا جب تک اس نے چاہا پھر وہ آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور وہ یعقوبیہ ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا: ہم میں ابن اللہ رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ نسطوریہ ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اور پھر اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ مسلمان ہیں۔ پھر دونوں کافر گروہ مسلمان گروہ پر غالب آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر اسلام مسلسل مٹتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ قتل کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الصف: 14) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے آباء ایمان لائے عَلٰى عَدُوِّهِمْ یعنی ہم نے اہل ایمان کے دین کو کفار کے دین پر غلبہ دینے میں ان کی تائید کی فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ پس وہ غالب ہو گئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم بخدا! ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے ضرور نازل ہوں گے وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ضرور قتل کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان پر کوئی کام نہ کیا جائے گا اور کینہ، باہم ایک دوسرے سے بغض رکھنا اور باہمی حسد سب ختم ہو جائے گا اور آپ مال کی طرف دعوت دیں گے اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا''۔

اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! ابن مریم کو (مکہ اور مدینہ کے درمیان) روحاء کے راستہ پر ڈالا جائے گا حج کے لئے یا عمرہ کرنے کے لئے یا اس لئے تا کہ وہ دونوں کو ایک ساتھ کریں۔''

وہ کسی نئی شریعت کے ساتھ نزول نہیں فرمائیں گے کہ اس سے ہماری شریعت منسوخ ہو جائے بلکہ وہ ان امور کی تجدید کے لئے نازل ہوں گے جو اس شریعت کے متبعین نے اس سے بوسیدہ کر دیئے ہیں اور مٹا ڈالے ہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم میں

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کیسی (شان سے) ہو گے جب ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا'' اور ایک روایت میں الفاظ فأمکم منکم ہیں۔ ابن ابی ذئب نے کہا: تم جانتے ہو تم میں سے امکم کیا ہے؟ میں نے کہا: آپ ہی مجھے بتائیے۔ تو انہوں نے کہا: پس تمہاری اصل (فأمکم) تمہارے رب تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے(1)۔ ہم نے ''کتاب التذکرہ'' میں اس بارے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور مُتَوَفِّیْكَ اصل میں مُتَوَفِّیُكَ ہے اور ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور یہ ان کی خبر ہے اور وَ رَافِعُكَ اس پر معطوف ہے، اور اسی طرح مُطَهِّرُكَ اور وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ بھی ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اصل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر وقف تام ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول حسن ہے۔ وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی اتباع کی۔ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حجت اور قیام دلیل کے ساتھ غالب ان پر جنہوں نے کفر کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: بالعزو الغلبة۔ یعنی عزت اور غلبے کے ساتھ کفر کرنے والوں پر غالب۔ اور ضحاک اور محمد ابن ابان نے کہا ہے: مراد حواری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝

''تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔ اور وہ جو ایمان لائے اور کئے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے۔ یہ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی۔''

قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ یعنی میں انہیں دنیا میں قتل، سولی، قید اور جزیہ کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ سخت عذاب دوں گا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ، ذٰلِكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اس کی خبر نَتْلُوْهُ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الامر ذالك ہو یعنی مبتدا مضمر ہو۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

''بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے،

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ یہ آیت قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ اور تشبیہ اس بناء پر واقع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک شے دوسری شے کے مشابہ ہوتی ہے جب وہ دونوں ایک وصف میں جمع ہوں اگرچہ فی الحقیقت دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے پیدا نہیں کیا گیا پس اس جہت سے دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن جس شے میں دونوں کو تشبیہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں کی خلقت کی اصل مٹی سے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نفس مٹی سے پیدا نہیں کئے گئے، بلکہ مٹی کو کیچڑ بنایا پھر اسے صلصال (سوکھی ہوئی بجنے والی مٹی) بنایا پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، تو اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرا، پھر آپ کو بغیر باپ کے بشر بنایا۔

اور یہ آیت وفد نجران کے سبب نازل ہوئی جبکہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے انکار کیا: ان عیسی عبداللہ و کلمتہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کوئی بندہ دکھائیں جو بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہو، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آدم علیہ السلام جو ان کے باپ تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تمہارے لئے تعجب خیز ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا صرف باپ نہیں لیکن آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں'' اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (وہ آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لائیں گے) اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ (مگر ہم آدم علیہ السلام کے بارے میں آپ کے پاس حق لے کر آئے)۔ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا (اور کتنی اچھی تفسیر بیان کی) اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم تم سے پہلے مسلمان تھے، تو آپ نے فرمایا: ''تم نے جھوٹ بولا ہے تین چیزیں تمہیں اسلام سے روک رہی ہیں۔ ایک تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور دوسرا تمہارا خنزیر کھانا اور تیسرا تمہارا صلیب کو سجدہ کرنا۔'' تو انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمۡ وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۶۱﴾ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بلایا، تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی۔ تب انہوں نے کہا: کیا اس کے سوا بھی کوئی شے آپ ہم پر پیش فرمائیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسلام یا جزیہ یا جنگ تو انہوں نے ان میں سے جزیہ کا اقرار کیا اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ اٰدَمَ پر کلام مکمل ہو گیا۔

پھر فرمایا: خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یہ بمعنی فکان ہے۔ جب معنی معلوم اور معروف ہو تو مستقبل ماضی کے محل میں واقع ہوسکتا ہے۔

فراء نے کہا: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ھو مبتدا مضمر ہے۔

اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کی خبر مِنْ رَّبِّكَ کے قول میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الحق فاعل ہے یعنی جاءت الحقُّ۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے قطعاً شک کرنے والے نہیں۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝61

"پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جو شخص آپ سے جھگڑا کرے فِيْهِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد کہ آپ کے پاس اس بارے میں یقینی علم آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یعنی تَعَالَوْا بمعنی أقبلوا ہے، تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ۔ یہ لفظ وضع تو اس کے لئے کیا گیا ہے جس کی کوئی قدر و منزلت اور رفعت و شان ہو اور پھر ہر آنے اور متوجہ ہونے کی دعوت دینے والے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کا مزید بیان سورۃ الانعام میں آئے گا۔ نَدْعُ یہ محل جزم میں ہے اَبْنَآءَنَا یہ اس پر دلیل ہے کہ بیٹیوں کے بیٹوں کو ابناء کا نام دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر آئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما رہے تھے: "اگر میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔" اور یہی اس ارشاد کا معنی ہے ثُمَّ نَبْتَهِلْ یعنی ہم دعا میں انتہائی عجز و انکساری اختیار کریں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ ابوعبیدہ اور کسائی نے کہا ہے کہ نبتھل بمعنی نلتعن ہے اور ابتہال کا اصل معنی یہی ہے کہ دعا میں لعن وغیرہ کے ساتھ انتہائی کوشش کرنا۔

لبید نے کہا ہے:

في كهولٍ سادة من قومه نظر الدهرُ اليهم فابتهل

یعنی زمانے نے انہیں ہلاک کرنے میں پوری کوشش کی۔

کہا جاتا ہے: بھلہ اللہ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ اور البھل کا معنی لعن ہے۔ اور البھل کا معنی ماء قلیل (تھوڑا پانی) بھی ہے اور ابھلتہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے اور اس کے ارادہ کو چھوڑ دے۔ اور بھلتہ کا بھی یہی معنی ہے۔ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے: بھلہ اللہ یبھلہ بھلۃ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل نجران تھے: ان کے رؤساء میں قابل ذکر، عاقب اور ابن حارث تھے۔ **فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ** (پھر ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں)

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی علامت میں سے ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اس کے بعد کہ ان کے بڑے سردار عاقب نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے آپ سے مباہلہ کیا تو پھر ان پر یہ وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی، کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی مرسل ہیں، اور تحقیق تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل لے کر آئے ہیں، تو انہوں نے مباہلہ ترک کر دیا اور اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے اس شرط پر کہ وہ ہر سال ایک ہزار حلہ صفر کے مہینہ میں اور ایک ہزار حلہ رجب کے مہینہ میں ادا کریں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے بدلے اسی پر ان سے صلح کر لی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مباہلہ کے وقت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے یہ قول نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے آپ کا یہ ارشاد ان ابنی ھذا سید (1) امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان دونوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹا ہونے کا نام دیا گیا، ان کے سوا کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''قیامت کے دن ہر سبب و نسب کٹ جائے گا سوائے میرے نسب و سبب کے'' اسی لئے بعض اصحاب شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے فلاں کے بیٹے کے لئے وصیت کی اور اس کا صلبی بیٹا نہ تھا اور اس کے بیٹے کا بیٹا اور بیٹی کا بیٹا تھا، بلاشبہ وہ وصیت بیٹے کے بیٹے کے لئے ہوگی نہ بیٹی کے بیٹے کے لئے اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الانعام اور زخرف میں آئے گا ان شاء اللہ۔

**اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝**

''بے شک یہی ہے واقعہ سچا اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ خوب جاننے والا ہے فساد برپا کرنے والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ** قول باری تعالیٰ اِنَّ هٰذَا میں اشارہ قرآن اور اس میں موجود قصص کی طرف ہے، انہیں قصص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ان میں معانی تسلسل کے ساتھ ہوتے ہیں اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلان یقص أثر فلان یعنی فلاں فلاں کی اتباع میں آرہا ہے۔

وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ اس میں مِنْ زائدہ تاکید کے لئے ہے اور معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں (وما الٰہ الا اللہ) الْعَزِیْزُ یعنی وہ جو مغلوب نہیں ہوتا۔ الْحَكِیْمُ اس کا معنی ہے صاحب حکمت اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ والحمدللہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝

"(میرے نبی!) آپ کہئے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنا لے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ حسن، ابن زید اور سدی کے قول کے مطابق یہ خطاب اہل نجران کو ہے اور قتادہ اور ابن جریج وغیرہما کے قول کے مطابق خطاب مدینہ کے یہودیوں کو ہے، انہیں اس لئے خطاب کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی اطاعت و پیروی کرنے میں رب کی طرح بنا رکھا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ تمام کے لئے ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کی طرف جو گرامی نامہ تحریر فرمایا اس میں ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ... من محمد رسول الله الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی [أما بعد فانی أدعوك بدعاية الاسلام] أسلم تسلم [و أسلم] يؤتك الله أجرك مرتين و ان توليت فان عليك اثم الاريسيين، و يا اهل الكتاب تعالوا الی كلمة سواء بيننا و بينكم ان لا نعبد الا الله... الی قوله: فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔ (1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ... (یہ خط) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شاہ روم ہرقل کی طرف ہے اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی اتباع اور پیروی کی [اما بعد میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں] تو اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا [اور تو اسلام لے آ] اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اعراض کیا تو تجھ پر اپنے جملہ لواحقین و متبعین کا گناہ ہوگا اور اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں ... تا قولہ "تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں) یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔

السواء کا معنی عدل اور نصف و نصف ہے، قتادہ نے یہی کہا ہے۔

اور زہیر نے کہا ہے:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2370

أروني　خُطّة　لا　ضَيم　فيها　يُسَوّى　بيننا　فيها　السَّوَاء

مجھے کوئی ایسا کام دکھاؤ جس میں ظلم نہ ہو اور اس میں ہمارے درمیان عدل کیا جاتا ہو۔

فراء نے کہا ہے: عدل کے معنی ادا کرنے کے لئے سِویٰ اور سُویٰ کہا جاتا ہے، پس جب تو سین کو فتحہ دے گا تو اسے مد کے ساتھ پڑھے گا اور جب تو سین پر کسرہ یا ضمہ پڑھے گا تو اسے قصر کے ساتھ پڑھے گا، جیسا کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَكَانًا سُوًى فرمایا: اور حضرت عبدالله کی قرأت میں ہے الی کلمة عدل بیننا و بینکم اور قعنب (ابوالسمال العدوی) نے كَلْمَة لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لام کی حرکت کاف کو دے دی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: كِبْد پس معنی یہ ہے تم اسے قبول کرو جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور وہی وہ کلمہ عادلہ مستقیمہ ہے جس میں حق سے کہیں اور ذرا میلان اور جھکاؤ نہیں اور اس کی تفسیر اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ کی ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں اَنْ، کلمة سے بدل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے یا مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر یہ محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے ھی أن لا نعبد الا الله۔ یا پھر یہ انْ مفسرہ ہے اور اس کا کوئی محل نہیں، اور اس کے ساتھ نَعْبُدُ اور جو اس پر معطوف ہے اس پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں: پس جزم اس بنا پر کہ انْ مفسرہ بمعنی ای ہو، جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: اَنِ امْشُوْا اور لا جازمہ ہو۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ نَعْبُدُ کو رفع دیا جائے اور یہ اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور بمعنی أنه لا نعبدُ رفع دینا جائز ہے اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ (طٰہٰ) (کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا)

اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ یعنی یہ جزم کے ساتھ ہیں اس وہم کی بنا پر کہ اول کلام میں انْ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ہم کسی شے کو حلال کرنے یا اسے حرام کرنے میں اس کی اتباع اور پیروی نہ کریں گے مگر اسی میں جسے الله تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور یہ الله تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون الله اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی حرام کردہ اور حلال کردہ چیزوں کو قبول کرنے میں اپنے رب کے رتبہ اور درجہ میں رکھا ان چیزوں کے بارے میں جنہیں الله تعالیٰ نے نہ حرام کیا اور نہ الله تعالیٰ نے انہیں حلال کیا۔

اور یہ ایسے استحسان کے بارے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کا انحصار کسی دلیل شرعی پر نہ ہو، الکیا الطبری نے کہا ہے: مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ کے وہ استحسانات جو ان اندازوں اور تقدیرات کے بارے ہیں جو انہوں نے بذات خود بغیر واضح دلائل کے مقرر کئے۔ اور اس میں ان روافض کا بھی رد ہے جو یہ کہتے ہیں: دلیل شرعی کا سہارا لئے بغیر بھی امام کا قول قبول کرنا واجب ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر سکتا ہے جسے الله تعالیٰ نے حرام کیا ہو بغیر اس کے کہ وہ کوئی مستند دلیل شرعی بیان کرے۔ ارباب رب کی جمع ہے اور یہاں دُوْنِ بمعنی غیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ اس سے اعراض کرلیں جس کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ تو تم کہہ دو گواہ رہنا ہم دین اسلام کے ساتھ متصف ہیں، اس کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں اور ہم ان احسانات اور انعامات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم پر ہیں ہم کسی کو رب بنانے والے نہیں ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی ملائکہ کو، کیونکہ وہ ہماری مثل بشر ہیں وہ ہمارے حدوث کی طرح حادث ہیں۔ اور راہبوں سے کسی ایسی شے کو قبول نہیں کریں گے جسے انہوں نے ہم پر حرام کیا ہو جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر حرام نہ کیا ہو، کہ ہم انہیں رب بنالیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: یَتَّخِذَ بمعنی یسجد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سجدہ (تعظیمی) جائز تھا پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو منع فرمادیا جب انہوں نے سجدہ کرنے کا ارادہ کیا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارے بعض بعض کے لئے جھک سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں'' پھر ہم نے عرض کی: کیا ہم آپس میں ایک دوسرے سے معانقہ کرسکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ تم ایک دوسرے سے مصافحہ کرو' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے (1)۔ اس بارے میں مزید بیان سورۂ یوسف میں آئے گا اور سورۂ واقعہ میں کہ قرآن یا اس کے جز کو بغیر طہارت کے چھونا کیسا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔''

قولہ تعالیٰ: يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ، لِمَ اصل میں لِمَا ہے، استفہام اور خبر کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے الف کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور یہ آیت یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب نازل ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی بایں طور کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہی آپ کے بعد ہوئے ہیں، سو اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ الآیہ۔

زجاج نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ تورات و انجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں میں ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم اپنی دلیل اور قول کے بطلان کو نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

---

1۔ ابن ماجہ، باب المصافحہ، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک) ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ یعنی تم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھگڑتے ہو، کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات کو جانتے تھے جو وہ اپنی کتاب میں پاتے تھے پس آپ کے بارے میں انہوں نے باطل اور غلط جھگڑا کیا۔ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس دعویٰ پر کہ وہ یہودی تھے یا عیسائی (کیوں جھگڑنے لگے ہو جبکہ تمہیں اس بارے کچھ علم ہی نہیں)

هٰۤاَنْتُمْ دراصل أأنتم تھا اس میں پہلے ہمزہ کو ھا سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ اس کی اُخت ہے، ابوعمرو بن العلاء اور اخفش سے یہی منقول ہے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین قول ہے۔ اور قنبل نے ابن کثیر سے **ھأنتم**، **ھعنتم** کی مثل نقل کیا ہے اور اس سے احسن یہ ہے کہ ھا ہمزہ سے بدل کر آئی ہو اور اس کی اصل أأنتم ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھا تنبیہ کے لئے ہو اور یہ انتم پر داخل ہوئی ہو اور الف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو۔ اور ھؤلاء میں دو لغتیں ہیں یعنی مد اور قصر اور عربوں میں سے بعض اسے قصر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

ابو حاتم نے کہا ہے:

لعمرك انا والأحاليف هاؤلا لفی محنة أظفارها لم تُقَلَّم

اس میں ھاؤلا کو قصر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور یہاں ھؤلاء محل ندا میں واقع ہے یعنی یا ھؤلاء۔ اور ھولاء کو انتم کی خبر بنانا بھی جائز ہے، اس بنا پر کہ أولاء بمعنی الذین ہو اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انتم کی خبر حاججتم ہو۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اس کے بارے جھگڑنا منع ہے جس کے بارے علم نہ ہو اور اس سے روکنے اور منع کرنے کے ممنوع ہونے پر دلیل موجود ہے جو اس کے نزدیک محقق اور ثابت نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔

اور اس کے بارے جھگڑنے کا حکم موجود ہے جس کے بارے علم اور یقین ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل: 125) (اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ اور (شائستہ ہو) اور حضور نبی

مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا، اس نے اپنے بچے کا انکار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟'' اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''ان کی رنگت کیسی ہے؟'' اس نے عرض کی: وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''وہ کہاں سے آیا؟'' اس نے عرض کی: شاید اصل اس کے مشابہ ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور یہ بچہ شاید اصل اس کے مشابہ ہو (1)''۔ یہی جھگڑے کی حقیقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے استدلال کو واضح اور ظاہر کرنے کی انتہا ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞

''نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے دعاوی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاکی اور برأت بیان فرمائی اور یہ بیان فرمایا کہ وہ حنیفیہ اسلامیہ (خالص اسلامی دین) پر تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ اور حنیف وہ ہوتا ہے جو توحید کا اقرار کرتا ہے، حج ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے، مختون ہوتا ہے اور قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے مادہ اشتقاق کے بارے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور لغت میں مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو اور اس کی اطاعت و پیروی کرنے والا ہو۔ اور اسلام کا معنی سورۃ البقرہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

''بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے کہ سرداران یہود نے کہا: قسم بخدا! اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم آپ اور آپ کے سوا کسی اور کی نسبت دین ابراہیمی کے نزدیک تر لوگ ہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے اور آپ کو سوائے حسد کے اور کچھ نہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَوْلٰی بمعنی اَحَق ہے (یعنی زیادہ حق رکھنا) یہ کہا گیا ہے: معونت (مدد) اور نصرت میں (یعنی مدد اور نصرت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وہ جو آپ کی ملت اور سنت پر تھے۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم (اور توقیر) کے

1۔ صحیح بخاری، باب اذا عرض بنفی الولد، حدیث نمبر 4893، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَ نَخْلٌ وَ رُمَّانٌ اور مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور لفظ هٰذَا محل رفع میں ہے اور الذین پر معطوف ہے، اور النبیّ۔ هٰذَا کی صفت ہے یا عطف بیان ہے اور اگر اسے محل نصب میں رکھا جائے تو بھی کلام میں جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اتبعوہ کی ھاضمیر پر ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کا مددگار ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان لکل نبیّ ولیاً من النبیین وان ولیّ منھم أبی وخلیل ربی۔ بے شک ہر نبی کا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی (نہ کوئی) مددگار ہے اور ان میں سے میرے مددگار میرے باپ (جد اعلیٰ حضرت ابراہیم) اور میرے رب کے خلیل ہیں (1)۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی...... اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران:68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم)۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾

"دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔"

یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت بنی نضیر، قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔ اور یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا (البقرہ:109) (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے۔) اس قول کی بنا پر مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد جمیع اہل کتاب ہیں، تو پھر مِنْ بیان جنس کے لئے ہوگا۔

اور لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ کا معنی ہے وہ تمہیں دین اسلام سے رجوع اور اس کی مخالفت کے سبب معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دیں۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: يُضِلُّوْنكم کا معنی ہے يُهْلِكُوْنكم یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔

اور اسی میں اخطل کا قول ہے:

كُنْتَ الْقَذَى فِي موجِ أَكْدَرَ مُزْبِدٍ	قذف الأتِيّ به فضلّ ضلالا

اس میں ضل ضلالا بمعنی هلك هلاكًا ہے۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ اس میں نفی اور اثبات ہے (یعنی اوروں سے ضلالت وگمراہی کی نفی ہے اور ان کی اپنی ذاتوں کے لئے اس کا اثبات ہے۔ یعنی وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو) وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

1۔ سنن ترمذی، باب و من سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ کا معنی ہے: وہ اسلام کی صحت کو نہیں جانتے حالانکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اسے جانیں اور سمجھیں، کیونکہ اس کی براہین ظاہر اور دلائل واضح ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

''اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ ہو۔''

یعنی ان آیات کے صحیح ہونے کے تم خود گواہ ہو جو تمہارے پاس تمہاری کتابوں میں ہیں، یہ حضرت قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اور تم ان کی مثل انبیاء علیہم السلام کی ان آیات و علامات کے گواہ ہو جن کے بارے تم خود اقرار کرتے ہو۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

اللبس کا معنی ہے الخلط یعنی ملا دینا (گڈمڈ کر دینا) سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اس آیت کا معنی اور جو آیت اس سے پہلے ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اسے جواب استفہام ہونے کی وجہ سے تَكْتُمُوْا پڑھنا بھی جائز ہے۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کر دو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔''

یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صیف وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے اپنی قوم کے سفلہ اور احمق لوگوں کو کہا کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو ایمان والوں پر اتاری گئی صبح کے وقت، وَجْهَ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور اول حصہ ہے۔ اور اس کے بہت حسین ہونے کی وجہ سے اسے وَجْهًا کا نام دیا گیا ہے اور اس کا اول وہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے (مراد صبح ہے۔)

شاعر نے کہا ہے:

و تُضِئُ فی وجه النهارِ منيرةً		كجمانة البحرى سُلّ نظامُها

دن کی صبح کو روشنی اس طرح منور کرتی ہے جیسا کہ موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔

اور ایک دوسرے نے کہا:

من كان مسروراً بمقتل مالك		فليأت نسوتنا بوجه نهار

جو مالک کے قتل سے مسرور ہے اسے چاہیے کہ وہ ہماری عورتوں کو صبح سویرے لے آئے اور وَجْهَ النَّهَارِ اور اسی طرح اٰخِرَهٗ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔

اور حضرت قتادہ کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ وہ مسلمانوں کو شک میں مبتلا کر دیں۔ اور الطائفہ کا معنی الجماعة ہے، یہ طاف یطوف سے ہے اور کبھی نفس طائفة کے معنی پر واحد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اور آیت کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں میں سے بعض نے بعض کو کہا: دن کے اول حصہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان کا اظہار کرو اور پھر دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو، کیونکہ جب تم اس طرح کرو گے تو جو ان کی اتباع اور پیروی کر رہے ہیں ان کے لئے اپنے دین میں شک پیدا ہو جائے گا پس وہ ان کے دین سے تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے اور یہ کہنے لگیں گے: بے شک اہل کتاب اس بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم صبح کے وقت آپ کی نماز کے ساتھ ایمان لے آؤ جس میں منہ بیت المقدس کی طرف ہے کیونکہ وہ حق ہے اور سر شام آپ کی نماز کا انکار کر دو جس میں منہ کعبہ کی طرف ہے، شاید وہ تمہارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ صبح کے وقت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے پاس سے لوٹ کر گئے تو انہوں نے سفلہ لوگوں کو کہا: وہ حق ہے تم اس کی اتباع اور پیروی کرو، بعد ازاں انہوں نے کہا: یہاں تک کہ ہم تورات دیکھ لیں، پھر وہ سر شام لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: تحقیق ہم نے تورات میں دیکھا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہے، وہ کہنے لگے: بلاشبہ وہ حق نہیں ہے اور اس سے انہوں نے ارادہ یہ کیا کہ وہ سفلہ لوگوں پر معاملہ مشتبہ کر دیں اور یہ کہ وہ اس بارے میں انہیں شک میں مبتلا کر دیں۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

''(ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی۔ فرمایئے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جا سکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس۔ (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) فرما دیجئے کہ فضل (و کرم) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ یہ نہی ہے اور یہ یہود کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام میں سے ہے، یعنی ان کے رؤساء نے سفلہ اور گھٹیا لوگوں کو کہا۔ اور سدی نے بیان کیا ہے: یہ خیبر کے یہودیوں کی مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے ساتھ گفتگو میں سے ہے۔ اور یہ آیت اس سورۃ میں مشکل ترین آیت ہے۔

اور حسن اور مجاہد سے مروی ہے کہ آیت کا معنی ہے: تم کسی کی بات نہ مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور تم یہ نہ مانو کہ وہ تم پر تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، پس دین کے اعتبار سے تم ان سے زیادہ صحیح ہو۔ أنْ اور یُحَآجُّوْكُمْ دونوں محل جر میں ہیں ای بأن یحاجوکم ای باحتجاجھم یعنی تم اس بارے میں ان کی تصدیق نہ کرو کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) کسی کو اتنا دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے مثلاً تورات، من و سلوی اور سمندر کا پھٹنا اور علاوہ ازیں دیگر علامات وفضائل۔

پس اَنْ یُّؤْتٰۤى۔ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ کے بعد مؤخر ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

اور اخفش نے کہا ہے: معنی یہ ہے اور تم مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور مت مانو یہ کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اور نہ اس کی تصدیق کرو کہ وہ تم پر کوئی حجت لا سکتے ہیں، یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام معطوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اور تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ پس استفہام پر مد بھی اس انکار کی تاکید کے لئے ہے جو انہوں نے کہا ہے: ''بے شک کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا انہیں دیا گیا ہے، کیونکہ علمائے یہود نے انہیں کہا ہے: تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، پس کلام اپنی ترتیب پر ہے اور أنْ محل رفع میں ہے ان کے قول کے مطابق جنہوں نے تیرے اس قول میں رفع دیا ہے۔ أزید ضربته، اور خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: أن یؤتی احد مثل ما أوتیتم تصدّقون أو تقرون، ای ایتاء موجود مصدَّقٌ أو مُقَرٌّ به، ای لا تصدّقون بذالك۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر أنْ محل نصب میں ہو، جیسا کہ تیرے اس قول میں جائز ہے أزیدا ضربته اور عربی میں یہ زیادہ قوی ہے کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی: أتقرون أن یؤتی او أتشیعون ذالك أو أتذکرون ذالك نحوه۔

اور ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: آن بمعنی أَلِأَنْ ہے پھر لام جر کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا اور اسے مد کے ساتھ بدل دیا گیا، جیسا کہ اس کی قراءت جس نے اس طرح پڑھا اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ یہ اصل میں أَلِأَنْ ہے۔ اور اس قراءت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ مومنین کو خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے، یا پھر أوْ بمعنی أنْ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں حرف شک اور جزا ہیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وأن یحاجوکم عند ربکم یا معشر المؤمنین،

پس تم فرما دیجئے! اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہدایت اور فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ہم اسی پر ہیں۔

اور جس نے بغیر مد کے پڑھا ہے اس نے کہا ہے: بے شک پہلی نفی ان کے قول وَلَا تُؤْمِنُوْٓا میں ان کے انکار پر دلالت کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان سے کہا: تم اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی نہ ان کے پاس ایمان ہے اور نہ ہی کوئی حجت، پس علم و حکمت، کتاب و حجت، من و سلویٰ اور سمندر کا پھٹنا وغیرہ فضائل و کرامات کا معنی پر عطف کیا گیا ہے، یعنی بلاشبہ یہ سب صرف تم ہی میں موجود ہیں پس تم یہ بات مت مانو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ پس اس قرأت کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور لام زائدہ ہے اور من استثنیٰ اول میں سے نہیں ہے، ورنہ کلام جائز نہیں ہوگا۔ اور اَحَدٌ داخل کیا گیا ہے کیونکہ اول کلام نفی ہے، پس اسے أَنْ کے صلہ میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ وہ فعل منفی کا مفعول ہے، اور جر دینے والا عامل نہ ہونے کی وجہ سے أَنْ محل نصب میں ہے اور خلیل نے کہا ہے: أَنْ محل جر میں ہے کیونکہ اس سے پہلے جر دینے والا لفظ محذوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام زائدہ نہیں ہے اور تُؤْمِنُوْٓا یہ تُقِرُّوا پر محمول ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ تم مت مانو سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: تم اس کے بارے مت خبر دو جو تمہاری کتاب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں تاکہ بتوں کی عبادت اور ان کی تصدیق کی طرف کوئی راہ نہ ہو۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہودیوں کا کلام اس ارشاد پر ختم ہو چکا ہو اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اور پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہو: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ یعنی بلاشبہ بیان حق ہی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ یہ (اس معنی میں) بالکل بین اور ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جاسکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔ اور لَا، أَنْ کے بعد مقدرہ ہے۔ یعنی لئلا یؤتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی لئلا تضلوا، تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔ پس اسی لئے کلام میں اَحَدٌ کا داخل ہونا صحیح ہے۔ اور أَوْ بمعنی حتّٰی اور اِلَّا اَنْ ہے۔

جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تَبْكِ عينُكَ انما نحاول مُلْكًا أو نموتَ فنُعذَرا

اس میں اَوْ نَمُوْتَ اِلَّا اَنْ نَمُوْتَ کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وكنت اِذَا غَمَزْتُ قناةَ قَوْمٍ كسرتُ كُعُوبَهَا أو تستقيما

اس میں اَوْ تَسْتَقِيْمَا حَتّٰى اَنْ تستقيما کے معنی میں ہے اور اس کی مثل ان کا یہ قول ہے: لا نلتقی أو تقوم الساعة،

اس میں أوْ بمعنی حتّٰی یا إلی أنْ کے ہے اور اسی طرح کسائی کا مذہب ہے۔

اور اخفش کے نزدیک یہ أو عاطفہ ہے اور یہ عطف وَلَا تُؤْمِنُوْٓا پر ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لا ایمان لھم ولا حجۃ (نہ ان کا ایمان ہے اور نہ ان کی کوئی دلیل) اور یہ عطف معنی پر کیا گیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ پوری آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو خطاب ہو ان کے دلوں کو ثابت قدم رکھنے کے لئے اور ان کی نگاہوں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، تاکہ وہ یہودیوں کی تلبیس اور ان کے اپنے دین کو آراستہ اور مزین کر کے پیش کرنے کے وقت کسی شک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور معنی یہ ہو: اے گروہ مومنین! تم بات نہ مانو مگر ان لوگوں کی جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ اس کی مثل فضل و کرم اور دین میں سے کسی کو نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے اور نہ یہ مانو کہ تمہارا کوئی مخالف تمہارے دین کے بارے میں تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتا ہے یا وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، کیونکہ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور بلاشبہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔

ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا ہم اپنے رب کے پاس اس پر حجت لائیں گے جس نے ہمارے دین میں ہماری مخالفت کی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ بے شک وہ پھسلائے گئے ہیں اور عذاب دیئے گئے ہیں اور مومنین غالب آنے والے ہیں۔ اور ان کی حجت ان کا قیامت کے دن جھگڑنا ہے۔ اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہود و نصاریٰ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت لائیں گے اور وہ کہیں گے تو نے ہمیں ایک اجر دیا ہے اور انہیں تو نے دو اجر دیئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں نے تمہارے ساتھ تمہارے حقوق کے بارے کسی قسم کی زیادتی کی ہے؟ وہ عرض کریں گے نہیں، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے عطا کرتا ہوں۔'' (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر وہ جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے تو وہ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت نہ لاتے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا کہ وہ قیامت کے دن تمہارے بارے میں تمہارے رب کے پاس حجت لائیں گے، پھر فرمایا! تم اب ان سے کہہ دو اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ بے شک فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ابن کثیر نے أن یؤتی کو استفہام کی بنا پر مد کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ اعشی نے بھی کہا ہے:

أأن رأت رَجُلاً أعْشَى أضَرَّ بِهِ ۔ رَيْبُ المنونِ ودهرٌ مُتْبِلٌ خَبِلُ

اور باقیوں نے خبر کی بنا پر بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے إن یؤتی ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس میں معنی نفی کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہو گا جیسا کہ فراء نے کہا ہے۔ اور معنی ہو گا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے: ''بے شک ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو کسی کو اس کی مثل عطا نہیں کیا جائے گا جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے یا نہ کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس'' یعنی یہودی باطل پر ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہم تم سے افضل ہیں۔ اور أو یُحَاجُّوکُمْ کو أن

1۔ صحیح بخاری، باب الاجارۃ الی صلوۃ العصر، حدیث نمبر 2108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مضمرہ اور أوْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور أوْ کے بعد أن کو مضمر کیا جاتا ہے جب وہ حتی اور إلا أن کے معنی میں ہو۔

اور حسن نے أن يؤتي یعنی تا کو کسرہ کے ساتھ اور یا کو مفتوح پڑھا ہے معنی یہ ہوگا أن يوتى احدٌ احدًا مثل ما اوتِيتُمْ (کہ کوئی کسی کو اتنا دے گا جتنا تمہیں دیا گیا ہے۔) اس میں سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اس میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ خیر اور نیکی کی طرف ہدایت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ اسے اپنے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو عطا فرماتا ہے، سو تم انکار نہ کرو کہ تمہارے سوا کسی کو اس کی مثل عطا کیا جائے جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے، پس اگر وہ اس کا انکار کریں تو ان سے فرما دیجئے اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے: آپ فرما دیجئے ہدایت تو وہی ہے جو اس اللہ کی ہدایت ہو جس نے جو مومنین کو حضرت محمد مصطفی ﷺ کی تصدیق کرنے کے بارے عطا فرمائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اور بعض اہل اشارات نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: تم (حسن) معاشرت نہ رکھو سوائے ان کے جو تمہارے احوال اور تمہارے طریقہ میں تم سے موافقت کرتے ہیں، کیونکہ جو تم سے موافقت نہیں کرتا وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

**يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝**

"خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔"

یعنی وہ اپنی نبوت اور ہدایت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے، یہ قول حسن اور مجاہد وغیرہما کا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: وہ خاص کر لیتا ہے اسلام اور قرآن کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ ابو عثمان نے کہا ہے: یہ حسین تر قول ہے جس کے ساتھ امیدوار کی امید اور خوفزدہ ہونے والے کا خوف باقی رہتا ہے۔ "اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔"

**وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝**

"اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، اس (بددیانتی) کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام (ان اہل کتاب میں سے تھے) وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اس سے مراد فنحاص بن عازوراء یہودی ہے، ایک آدمی نے اس کے پاس کچھ دینار امانت رکھے تو اس نے اس میں خیانت کی۔

اور یہ بھی قول ہے کہ ان سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ ابن وثاب اور اشہب عقیلی نے مَنْ اِنْ تِيْمَنْهُ قرأت کی ہے اور یہ ان کی لغت پر ہے جو نِستعین پڑھتے ہیں اور یہ بنی بکر اور بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں مالك تِيْمَنَّا على يوسف کے الفاظ ہیں، جبکہ باقیوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور کسائی نے يؤدِّهِي ادراج میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو، اعمش، عاصم اور حمزہ نے ابو بکر کی روایت میں ھا پر وقف کر کے پڑھا ہے یعنی يؤدّه اليك۔ نحاس نے کہا ہے: بعض نحویوں کے نزدیک ھا کو ساکن کرنا بغیر شعر کے جائز نہیں ہے اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ جنہوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ کہ انہیں وہم ہوا ہے کہ جزم ھا پر واقع ہوئی ہے اور ابو عمرو نے اس سے پاک قرار دیا کہ اس کی مثل اس پر جائز ہو اور ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ھا کو کسرہ دیتے ہیں اور یہی یزید بن قعقاع کی قرأت ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ بعض عربوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ ھا کو جزم دیتے ہیں جب اس کا ماقبل متحرک ہو، وہ کہتے ہیں: ضربته ضربا شديدا، جیسا کہ وہ انتم اور قمتم کی میم کو سکون دیتے ہیں اور اس کی اصل رفع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لما رأى ألاّ دَعَه ولا شِبَعْ　　مال الى ارطَاة حِقْفٍ فاضطَجَعْ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس مقام پر ھا کو ساکن کرنا جائز ہے کیونکہ وہ جزم کے محل میں واقع ہے اور یہ یا ختم ہو جانے والی ہے۔ ابو المنذر سلام اور زہری نے يؤدّهُ بغیر واؤ کے ھا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ، حمید اور مجاہد نے يؤدّهُو کو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے لئے واؤ کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ واؤ شفتہ سے ادا ہوتی ہے اور ھا بعیدۃ المخرج ہے۔ (یعنی اس کی ادائیگی کا محل بعید ہے)

سیبویہ نے کہا ہے: مذکر میں واؤ مؤنث میں الف کے قائم مقام ہے اور اسے یا سے بدل دیا جاتا ہے کیونکہ یا زیادہ خفیف ہے، جبکہ اس کا ماقبل کسرہ پایا ہو اور یا حذف ہو جاتی ہے اور کسرہ باقی رہتا ہے، کیونکہ یا کبھی حذف ہو جاتی ہے اور فعل مرفوع ہو تو اسے اپنے حال پر ثابت رکھا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں کچھ خائن ہیں اور کچھ امین ہیں اور مومنین ان میں تمیز نہیں کر سکتے، پس چاہیے کہ وہ ان تمام سے اجتناب کریں اور اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی اسی طرح ہیں، اس لئے کہ ان میں خیانت زیادہ پائی جاتی ہے، پس کلام غالب کے بارے میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قنطار کی تفسیر پہلے گزر

چکی ہے اور رہا دینار تو وہ چوبیس قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط درمیانے جو کے تین حبوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کا مجموعہ بہتر جے ہیں اور اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ جس نے کثیر کی حفاظت کی اور اسے ادا کر دیا تو (حفاظت اور ادائیگی) قلیل میں بدرجہ اولیٰ ہوگی اور جس نے تھوڑے میں خیانت کی یا اسے روک کر رکھا تو وہ کثیر میں اور زیادہ ہوگی۔ اور یہ مفہوم خطاب کے ساتھ قول پر انتہائی واضح دلیل ہے۔ اور اس میں علماء کے مابین بہت زیادہ اختلاف ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں جو ادا کرتا ہے اور وہ جو ادا نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کبھی لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ادا نہیں کرتا اگرچہ تو اس کے پاس ہمیشہ کھڑا رہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ غالب اور معتاد ہیں اور تیسری نادر ہے، لہٰذا کلام غالب کے بارے ہے اور طلحہ بن مصرف اور ابو عبدالرحمن السلمی وغیرہما نے دِمت دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور کسرہ ازدالسراۃ کی لغت ہے، یہ دِمت تدام سے ماخوذ ہے جیسا خفت تخاف ہے۔

اور اخفش نے دِمت تدوم بیان کیا ہے، اور یہ شاذ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ غریم (مقروض) کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا اور تمام علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض بغداد کے رہنے والوں نے بہت زیادہ قرض لینے والے کو حبس میں رکھنے پر اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا تو جب اسے لازم پکڑنا اور تصرف سے اسے روکنا جائز ہے تو اسے حبس میں رکھنا بھی جائز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا کا معنی ہے پس وہ تیری وجہ سے تجھ سے ڈرتا ہے اور تجھ سے حیاء محسوس کرتا ہے، کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے، کیا آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جانتے نہیں ہیں: لا تطلبوا من الاعمی حاجۃ فان الحیاء فی العینین تم اندھے سے حاجت کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اور جب تو اپنے بھائی سے حاجت کا مطالبہ کرے تو تو اپنے چہرے (کو متوجہ کر کے) اس کی طرف دیکھ یہاں تک کہ وہ حیاء محسوس کرنے لگے تو وہ اسے (حاجت کو) پورا کر دے گا۔ اور کہا جاتا ہے: قَآئِمًا بمعنی ملازم مالہ ہے (یعنی اسے لازم پکڑتے ہوئے) پس اگر تو نے اسے مہلت دی تو وہ تیرا انکار کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: قیام سے مراد مسلسل مطالبہ کرنا ہے نہ کہ عین قیام مراد ہے۔ اور دینار اصل میں دِنَّار ہے کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لئے دونونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع دنانیر آتی ہے اور تصغیر دُنَيْنِير بنائی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ دین میں امانت انتہائی عظیم المرتبت ہے اور اس کی عظمت وقدر میں سے یہ ہے کہ یہ اور رَحم (صلہ رحمی) پل صراط کی دونوں جانبوں پر کھڑے ہوں گے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور اسے عبور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا مگر وہی جو ان دونوں کی حفاظت اور پاسداری کرے گا۔

اور مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں رفع امانت کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے بیان فرمایا: ''آدمی نیند کی حالت میں سو جائے گا اور اس کے دل سے امانت قبض کر لی جائے گی'' الحدیث۔ یہ روایت سورۃ البقرہ کے اول میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن مصطفی، محمد بن حرب نے سعید بن سنان عن ابی الزاھریہ عن ابی شجرہ کثیر ابن مرہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء چھین لیتا ہے اور جب وہ اس سے حیاء چھین لیتا ہے تو اسے نفرت اور ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہیں ملتا اور جب اسے نفرت اور ناپسندیدگی آملتی ہے تو اس سے امانت چھین لی جاتی ہیں اور جب اس سے امانت چھین لی جاتی ہے تو پھر وہ خود خیانت کا ارتکاب کرتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے اور جب وہ خود خیانت کرنے لگتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے تو اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے اور جب اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے تو پھر اسے صرف دھتکار اور لعنت آپہنچتی ہے اور اسے دھتکار اور لعنت پڑنے لگتی ہے تو اس سے اسلام کا قلادہ اتار لیا جاتا ہے (1)''۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ادّ الامانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک اس کی امانت ادا کر جس نے تجھے امین بنایا اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تجھ سے خیانت کی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت میں تمام اہل کتاب کے لئے اور نہ ہی ان میں سے بعض کے لئے کوئی تبدیلی ہے، بخلاف ان کے جو اس طرف گئے ہیں، کیونکہ فاسق مسلمانوں میں بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو امانت ادا کرتے ہیں اور مال کثیر پر امین بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عادل نہیں ہوتے۔ پس عدالت و شہادت کے طریق میں امانت فی الحال کی ادائیگی کو معاملہ اور ودیعت کی جہت سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، کیا آپ ان کا قول جانتے نہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (آل عمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) پس وہ کیسے عدل کر سکتا ہے جو کوئی بغیر حرج کے اپنے اوپر ہمارے اموال اور ہماری عزتیں مباح سمجھنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور اگر ان کی تعدیل میں اتنا کافی ہوتا تو یقیناً ان کی شہادت مسلمانوں پر سنی جاتی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا یعنی یہودیوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ کہا گیا ہے کہ یہودی جب مسلمانوں سے خرید و فروخت کرتے تھے تو کہتے تھے: ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت نہیں ہے ...... یعنی ان کے ساتھ ظلم میں کوئی حرج نہیں ہے ...... اس لئے کہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی کتاب میں موجود ہے، پس اللہ عزوجل نے انہیں جھٹلایا اور ان کا رد کر دیا۔ اور فرمایا: بَلٰی یعنی کیوں نہیں ان پر ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے عربوں کے مال حلال سمجھنے کی وجہ سے عذاب کی راہ ہے۔

ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: کلام مکمل ہو گیا ہے، پھر فرمایا مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى اور کہا جاتا ہے: بے شک یہودی اعرابیوں سے اموال قرض لیتے تھے پس جب حقوق کے مالک اسلام لائے تو یہودیوں نے کہا: تمہارے لئے ہم پر کوئی شے واجب الادا نہیں، کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے لہٰذا ہم سے تمہارا قرض ساقط ہو چکا ہے۔

---

1۔ ابن ماجہ، باب ذہاب الامانۃ، حدیث نمبر 4043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ تورات کا حکم ہے سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بَلٰی یہ ان کے اس قول کا رد ہے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ یعنی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کہتے ہوں، پھر نئے سرے سے ارشاد فرمایا: مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى یعنی جس نے وعدہ پورا کیا اور شرک سے بچتا رہا تو وہ جھٹلانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت فرماتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: بے شک ہم ارادۃً اہل ذمہ کے اموال میں سے مرغیاں اور بکریاں پکڑ لیتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں ہم پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ تو آپ نے اسے فرمایا: یہ تو اسی طرح ہے جیسے اہل کتاب نے کہا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ بلاشبہ جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو تمہارے لئے ان کے اموال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہیں، عبدالرزاق نے اسے معمر عن ابی اسحاق الھمدانی عن صعصعۃ ان رجلا قال ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کافر کو قبولیت شہادت کا اہل قرار نہیں دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے فرمایا ہے کہ یہ کذاب ہے اور اس میں ان کافروں پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی تحریم کے بغیر (چیزوں کو) حرام قرار دیتے ہیں اور اس کی تحلیل کے بغیر (چیزوں کو) حلال قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسے شریعت میں سے قرار دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: اور اس سے ان کا رد نکلتا ہے جو بغیر دلیل کے استحسان کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں اور میں اہل قبلہ میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔ اور حدیث میں ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاہلیت کی کوئی شے نہیں ہے مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے امانت کے کیونکہ اسے نیکوکار اور فاجر تک پہنچایا گیا ہے (1)۔''

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

''ہاں کیوں نہیں جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیزگار رہا تو بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔''

مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ شرط ہے اور اَوْفٰى محل جزم میں ہے اور اتَّقٰى معطوف علیہ ہے، یعنی اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور وہ جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے اس شے کو حلال سمجھا جو اس پر حرام کی گئی۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ یعنی اللہ ان سے محبت فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء سے محبت کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے اور قول باری تعالیٰ بِعَهْدِهٖ میں ھا ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ اور اس کا ذکر اس ارشاد میں بھی ہے وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ وعدہ پورا کرنے والے اور کفر و خیانت اور نقض عہد سے پرہیز کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عہد مصدر ہے جسے فاعل اور مفعول (دونوں) کی طرف مضاف کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

1۔ تفسیر رازی، جلد 8، صفحہ 108 تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 511

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''بے شک جو لوگ خریدتے ہیں الله کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت، یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے الله تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ائمہ نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میرے اور ایک یہودی آدمی کے درمیان زمین کا تنازعہ ہوا تو اس نے میرے (حق کا) انکار کر دیا سو میں اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا، تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟'' میں نے عرض کی: نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو فرمایا: ''تو حلف دے دے۔'' میں نے عرض کی: ''تب یہ تو حلف دے دے گا اور میرا مال لے جائے گا، پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الی آخر الآیۃ۔(1)

اور ائمہ نے یہ بھی حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ساتھ کاٹ دیا تحقیق الله تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا'' تو ایک آدمی نے آپ سے عرض کی، یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ وہ تھوڑی سی شے بھی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ وہ درخت کی ایک ٹہنی ہی ہو'' اور لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ کا معنی ومفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اور احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کا حکم قضاء ظاہر کے ساتھ باطن میں مال کو حلال نہیں کرتا جبکہ محکوم لہ اس کے بطلان کو جانتا ہو اور ائمہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تم میرے پاس آ کر جھگڑتے ہو اور بلاشبہ میں تو بشر ہوں شاید تمہارے بعض اپنی دلیل اور حجت بیان کرنے میں بعض کی نسبت خطا کریں میں تمہارے درمیان اس کے بارے فیصلہ کرتا ہوں جو میں تم سے سنتا ہوں پس جس کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی شے کا میں فیصلہ کروں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ گویا میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہوں جس کے ساتھ وہ قیامت کے دن آئے گا۔''(2)

اس میں ائمہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: بلاشبہ حاکم کا وہ فیصلہ جس کا دارومدار شہادت باطلہ پر ہو اور وہ اس کے لئے اس شرمگاہ کو حلال کر دیتا ہے جسے اس پر حرام کیا گیا تھا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ اگر دو جھوٹے گواہوں نے ایک آدمی پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بارے شہادت دی اور حاکم نے ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا تو بلاشبہ اس کی شرمگاہ اس کے ساتھ اس شادی کرنے والے کے لئے حلال ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب کلام الخصوم بعضھم فی بعض، حدیث نمبر 2239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو یہ جانتا ہے کہ فیصلہ باطل ہے۔ اور آپ پر اس صحیح اور صریح حدیث سے اعراض کرنے کا عیب لگایا گیا ہے۔ اور اس طرح کہ آپ نے اموال کو بچالیا اور آپ نے احکام فاسدہ کے سبب انہیں مباح سمجھنے کی طرف غور نہیں فرمایا۔ اور اس سے آپ نے شرمگاہوں کی حفاظت نہیں کی حالانکہ شرمگاہیں زیادہ حق رکھتی ہیں کہ ان کے بارے احتیاط برتی جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ ان کے قول کا بطلان آیت لعان میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ (☆)۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞

''اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے جو مروڑتے ہیں اپنی زبان کو کتاب کے ساتھ تاکہ تم خیال کرنے لگو (ان کی) اس (الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر۔''

فریقاً سے مراد یہود کی ایک جماعت اور گروہ ہے۔ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ابوجعفر اور شیبہ نے (معنی) تکثیر کی بنا پر یُلَوّوْنَ پڑھا ہے۔ جب وہ اسے جھکا لے، مروڑ لے اور اسی سے یہ معنی ہے وہ کلام میں تحریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اسے مقصد سے پھیر دیتے ہیں، اللّیّ کا اصل معنی المیل (ایک طرف جھکنا) ہے۔ لَوی بیدہ (اس نے اپنا ہاتھ پھیر دیا) اور لوی برأسہ اور اس نے اپنا سر پھیر دیا۔ قولہ تعالیٰ: لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ یعنی حق سے عناد رکھتے ہوئے اور اس سے غیر کی طرف پھیرتے ہوئے (اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں) اور وَلَا تَلْوٗن علی احد کا معنی ہے لا تعرجون علیه (اس پر نہیں چڑھو گے)، کہا جاتا ہے لَوَی علیه جب وہ اس پر چڑھے اور مقیم ہو جائے۔ اور اللیّ کا معنی ہے المطل مروڑنا (لوہے کو بڑھانے کے لئے کاٹنا) ٹال مٹول کرنا۔ لواہ بدینہ یلویہ لیًّا و لِیانًا مطله یعنی اس نے اسے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی۔

شاعر نے کہا:

قد كنت داينت بها حسّانا　　مخافة الإفلاس والليانا
يحسن بيع الأصل والعيانا

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تريدين ليانى وانتِ مليّةٌ　　و أحسن يا ذات الوشاح التقاضِيا

اور حدیث میں ہے لَیُّ الواجدِ یُحِلّ عِرضَه و عقوبته (پانے والے کا ٹال مٹول کرنا اپنی عزت اور اپنی سزا کو حلال کر دیتا ہے۔)

☆۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ یہ امام اعظم کے نقطہ نظر میں عدم تدبر کی بنا پر ہے اس کی تفصیل ہدایہ کتاب النکاح میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور السنة، لِسَانٌ کی جمع ہے لغت میں جس نے مذکر قرار دیا ہے اور جس نے مونث قرار دیا ہے اس نے اَلسن کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے۔"

مَا كَانَ اس کا معنی ہے ما ینبغی یعنی نہیں چاہیے، جیسا کہ فرمایا: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا اور مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ اور مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا تمام میں مراد یہی ہے کہ نہیں چاہیے (مناسب نہیں) ورلفظ بشر واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے کیونکہ یہ قائم مقام مصدر کے ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کے مطابق یہاں مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکم سے مراد علم اور فہم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکم سے مراد احکام ہیں۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی نبوت کے لئے جھوٹوں کو نہیں چنتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ نبوت کی آیات وعلامات اس سے سلب کر لیتا۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اور يَقُوْلَ کے درمیان اشتراک کی بنا پر ثُمَّ يَقُوْلَ کو نصب دی گئی ہے یعنی کسی نبی کے لئے نبوت کا ہونا اور اس کا یہ قول: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جمع نہیں ہو سکتے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ یعنی البتہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی ان سے کہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ پوری سورۃ قول باری تعالیٰ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تک کا سبب نزول نجران کے نصاریٰ تھے، لیکن یہود کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، کیونکہ انہوں نے بھی انکار اور عناد انہیں کی طرح کیا۔

رَبّٰنِيّٖنَ اس کا واحد رَبَّانِیٌّ ہے یہ الرَّبّ کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی صغار علم کے ساتھ اپنے بڑا ہونے سے پہلے تربیت کرتا ہے، گویا کہ وہ امور کو آسان بنانے میں رب سبحانہ کی اقتدا کرتا ہے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض نے کہا ہے یہ اصل میں رَبِّی تھا پھر مبالغہ کے لئے اس میں الف اور نون داخل کر دیئے گئے، جیسا کہ عظیم اللحیہ کے لئے کہا جاتا ہے: لِحْيَانِی اور عظیم الجُمّہ (بہت ہی زیادہ) کے لئے جُمَّانِی اور غلیظ الرقبہ (موٹی گردن والا) کے لئے رَقَبَانِی کہا جاتا ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے: الربانیون سے مراد ارباب علم ہیں، ان کا واحد ربان ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے رَبَّهٗ يَرُبُّهٗ فهو ربان جب وہ اسے مدبر بنائے اور اسی کی اصلاح کرے، اس بنا پر اس کا معنی ہے یدبرون امور الناس ویصلحونها وہ لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور اس میں الف اور نون مبالغہ کے لئے ہیں جیسا کہ ان کا قول ریّان اور عطشان ہے پھر اس کے ساتھ یائے نسبت ملا دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لحیانی،

رَقبانی اور جنانی۔

شاعر نے کہا ہے:

لوکنت مرتھنًا فی الجو انزلنی　　منه الحدیث و رّبانی أحباری

پس ربانی کا معنی رب العالمین کے دین کا ایسا عالم ہے جو اپنے علم کے ساتھ ساتھ عمل کرتا ہے، کیونکہ جب وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے تو پھر عالم نہیں۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور ابورزین نے کہا ہے: ربانی سے مراد ایسا عالم ہے جو حکیم اور دانا بھی ہو۔

حضرت شعبہ نے حضرت عاصم سے، انہوں نے حضرت زر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ فرمایا مراد ایسے حکماء ہیں جو علماء ہوں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: مراد ایسے حکماء ہیں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہوں۔

اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ حفظ قرآن کے لئے بہت محنت اور جدوجہد کو چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ اور ابن زید نے کہا ہے: ربّانیون سے مراد ولی اور جید علماء ہیں۔

اور حضرت مجاہد نے فرمایا ہے: ربّانیون احبار (علماء) سے فائق اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول اچھا ہے، کیونکہ احبار تو علماء ہی ہیں اور ربانی وہ ہوتا ہے جو علم بصیرت کو سیاست و دانائی کے ساتھ جمع کرتا ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: رَبَّ اَمرَ النَاسِ يَرُبُّهٗ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ لوگوں کے معاملہ کی اصلاح کردے اور اس کے ساتھ قائم ہو جائے، فھو رابٌّ اور ربّانیٌ تکثیر پر دلالت کرتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: میں نے کسی عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ربانی سے مراد حلال و حرام اور امر و نہی کے بارے جاننے والا عالم ہے اور وہ جو امت کی اخبار اور جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا کے بارے جاننے والا ہو۔

جس دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال ہوا اس دن محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا: الیوم مات ربانی ھذہ الامۃ۔ (1) آج اس امت کے عالم ربانی کا وصال ہو گیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی مومن و مرد و عورت اور آزاد و غلام نہیں مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرے اور اس کے دین میں تفقہ حاصل کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ الآیہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ابوعمرو اور اہل مدینہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ علم سے ماخوذ ہے۔ اور ابوحاتم نے اسی قرأت کو پسند کیا ہے۔ ابوعمرو نے کہا ہے: اور اس کی تصدیق تَدْرُسُوْنَ کرتا ہے (کیونکہ) التدریس سے تشدید کے ساتھ تُدَرِّسُوْنَ نہیں کہا گیا۔ ابن عامر اور اہل کوفہ نے تعلیم سے تشدید کے ساتھ تُعَلِّمُوْنَ پڑھا ہے اور ابوعبید نے اسے اختیار کیا ہے (اور) کہا ہے: کیونکہ یہ دونوں معنوں (یعنی) تعلمون اور تدرسون کو جامع ہے۔

1۔ الکشاف زمخشری، جلد 1، صفحہ 440

مکی نے کہا ہے: تشدید ابلغ ہے، کیونکہ ہر معلم عالم بمعنی یَعْلَمُ ہوتا ہے لیکن ہر وہ جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلِّم نہیں ہوتا، پس تشدید علم اور تعلیم دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم ابلغ اور زیادہ قابل تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے۔ جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ فرمایا: تم حکماء علماء ہو جاؤ، پس یوں کہا جانا بعید ہے کونوا فقہاء حکماء علماء بتعلیمکم یعنی تم اپنی تعلیم کے ساتھ فقہاء حکماء علماء ہو جاؤ۔ حسن نے کہا ہے: تم اپنے علم کے ساتھ حکماء علماء ہو جاؤ۔ اور ابوحیوہ نے تُدْرِسُوْنَ۔ اَدْرَسَ یُدْرِس (یعنی باب افعال) سے پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے تَعَلَّمُوْنَ تا کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اصل میں تتعلّمون تھا۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

"اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو۔"

ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے اَنْ يُّؤْتِيَهُ پر عطف کرتے ہوئے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یہ قول تقویت دیتا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم آپ کو رب بنالیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اور اس میں ضمیر بشر کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں وہ انسان حکم نہیں دے گا بشر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور باقیوں نے اسے پہلے کلام سے جدا ہونے اور استئناف کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دے گا کہ تم بنالو اور اس قرأت کو یہ تقویت دیتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَلَنْ يَّاْمُرَكُمْ ہے پس یہ استئناف پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر بھی اللہ عزوجل کے لئے ہے، اسے مکی نے ذکر کیا ہے اور سیبویہ اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریج اور ایک جماعت نے کہا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم نہیں دیں گے۔ یہی قرأت ابوعمرو، کسائی اور اہل حرمین کی ہے۔

اَنْ تَتَّخِذُوا کہ تم ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو خدا بنالو، یہ نصاریٰ میں موجود تھا وہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی تعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں خدا بنالیا۔ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ انکار اور تعجب کے طریقہ پر ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر حرام قرار دیا کہ وہ لوگوں کو ایسے بندے بنادیں کہ وہ ان کے خدا بن جائیں البتہ مخلوق پر ان کی حرمت کو لازم کر دیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی وأمتی (اے میرے بندے اور اے میری بندی) بلکہ یہ کہنا چاہیے فتای و فتاتی (اے میرے جوان اور اے میری

دوشیزہ) اور تم میں سے کوئی کسی کو یہ نہ کہے ربی۔ (اے میرے رب) بلکہ یہ کہنا چاہئے سیدی (اے میرے آقا)(1) اور قرآن کریم میں ہے اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ اس کے معنی کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھا لیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔''

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ بعض بعض کی تصدیق کریں اور بعض بعض کو ایمان کا حکم دیں (یعنی وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایک دوسرے پر ایمان لائیں۔) سو تصدیق کے ساتھ مدد و نصرت کرنے کا یہی معنی ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر، قتادہ، طاؤس، سدی اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور یہی آیت کا ظاہر مفہوم ہے۔ طاؤس نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ لیا کہ وہ بعد میں آنے والوں کے ساتھ ایمان لائیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرأت کی ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ۔ کسائی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ بمعنی و اذ اخذ الله ميثاق الذين مع النبيين ہو۔

اور بصریوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا تو تحقیق یہ وعدہ انہیں سے لیا جو ان کے ساتھ تھے، کیونکہ انہوں نے ہی ان کی اتباع و پیروی کی اور انہوں نے ہی ان کی تصدیق کی۔ اور قول باری تعالیٰ لَمَاۤ میں ما بمعنی الذی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے میں نے خلیل ابن احمد سے قول باری تعالیٰ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: لَمَاۤ بمعنی الذی ہے۔

نحاس نے کہا ہے۔ خلیل کے قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے للذی آتیتکموہ، پھر اسم کے طویل ہونے کی وجہ سے ھا کو حذف کر دیا گیا۔ اور الذی مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ہے اور مِنْ بیان جنس کے لئے ہے اور یہ کہنے والے کے اس قول کی طرح ہے: لزید افضل منك اور یہی اخفش کا قول ہے کہ یہ لام ابتدا ہے۔

المبرد نے بیان کیا ہے: قولہ: ثُمَّ جَآءَكُمْ اور اس کا مابعد جملہ صلہ پر معطوف ہے اور اس سے موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ثم جآءکم رسول مصدق بہ۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، حدیث نمبر 2366، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس آیت میں رسول سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین فرد کی طرف ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ضَرَبَ اللهُ مثلا قرية كانت آمنة مطمئنة . . . تا قولہ: ولقد جاءهم رسول منكم فكذبوه۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں اگر وہ آپ کو پالیں اور انہیں یہ بھی حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یہی وعدہ اپنی اپنی امتوں سے لیں۔ اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں لام اس قسم کا جواب ہے جو وعدہ لینے کی صورت میں ہے کیونکہ یہ استحلاف (قسم لینے) کے قائم مقام ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کلام میں کہتے ہیں اخذت میثاقك لتفعلن كذا تو اس صورت میں گویا تو نے یہ کہا: میں تجھ سے حلف لیتا ہوں اور قسم اور جواب قسم کے درمیان فاصلہ اس حرف جار کے سبب ہے جو ابن کثیرہ کی قرأت میں لِمَا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے اسے فتحہ دیا ہے انہوں نے اسے اس قسم کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے جو اخذ میثاق ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں محذوف قسم کا جواب ہے یعنی اصل عبارت ہے۔ واللہ لتؤمنن به۔

مبرد۔ کسائی اور زجاج نے کہا ہے: ما شرط ہے اس پر لام تحقیق داخل ہوا ہے جیسا کہ یہ اِنْ پر داخل ہوتا ہے، اور اس کا معنی ہے [لمھما] آتیتکم، پس ما کا محل نصب ہے اور اٰتَیْتُكُمْ کا محل جزم ہے اور ثُمَّ جَآءَكُمْ معطوف علیہ ہے، لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ اس میں لام جواب وجزا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ (اسراء: 86) (اس میں لنذ هبَنّ جواب اور جزا ہے۔)

اور کسائی کا بیان ہے کہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ قسم کا معتمد ہے اور یہ کلام اول کے ساتھ متصل ہے اور جواب و جزا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ اور اس بنا پر ضمیر عائد مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔

اور اہل کوفہ نے لِمَا آتیتکم لام مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بمعنی الذی ہے اور یہ اَخَذَ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اس لئے کہ اس نے انہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی پھر اگر تمہارے پاس رسول آجائے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو اس وعدہ کے بعد تم ضرور ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا، کیونکہ اخذ المیثاق، استحلاف کے معنی میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: اس بارے میں ابوعبیدہ کا قول اچھا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کا معنی یہ ہے واذ اخذ الله میثاق الذین اوتوا الکتاب لتؤمنن به لما آتیتکم من ذکر التوراة۔

اور جب اللہ نے ان سے وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تو تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا کیونکہ میں نے تمہیں تورات کا ذکر عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ تم ضرور ضرور لوگوں کو اس کے بارے آگاہ کرو گے جو تمہارے پاس کتاب وحکمت لے کر آئے ا ضرور ضرور لوگوں پر یہ لازم کرو گے کہ وہ (اس کے ساتھ) ایمان لائیں۔ (واذ اخذ الله میثاق النبیین لتعلمن الناس لما جاء کم من کتاب وحکمة، ولتاخذن علی الناس ان یومنوا) اور اس حذف پر یہ ارشاد دال ہے وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ اور یہ بھی

کہا گیا ہے کہ جنہوں نے لِمَا میں لام کو کسرہ دیا ہے وہ لام بمعنی بعد ہے، یعنی بعد ما اتیتکم من کتاب وحکمۃ، (بعد اس کے کہ میں تمہیں کتاب وحکمت عطا کردوں۔)

جیسا نابغہ نے کہا ہے:

توھمت آیات لھا فعرفتُھا لستۃ أعوام وَ ذالعامُ سابعٗ

مجھے اس کی نشانیوں کا وہم ہوا تو میں نے اسے چھ سال بعد پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔ اس میں لستۃ اعوام بمعنی بعد ستۃ اعوام ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے لِمَا کو مشدد پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے حین اتیتکم یعنی جب میں تمہیں عطا کردوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں اصل تخفیف ہو۔ پھر مِن زائد کردیا گیا ہو ان کے مذہب کے مطابق جو اس کی زیادتی کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ لِمن ما ہو گیا اور پھر ادغام کے لئے نون کو میم سے بدل دیا گیا، پس تین میم جمع ہو گئے تو ان میں پہلے میم کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا۔ اور اہل مدینہ نے تعظیم کی بنا پر آتَیْنَاکُمْ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے آتَیْتُکُمْ صیغہ واحد پڑھا ہے۔

پھر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی بلکہ بعض کو عطا کی گئی ہے، لیکن غلبہ انہیں دیا گیا ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی ہے۔ اور مراد تمام انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لینا ہے پس جنہیں کتاب عطا نہیں کی گئی تو وہ بھی ان کے حکم میں ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے کیونکہ انہیں حکم اور نبوت عطا فرمائے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جنہیں کتاب نہیں دی گئی تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب لے لیں (اور اس کے احکام پر عمل کریں۔) نتیجتاً یہ بھی ان کی صفت کے تحت داخل ہو گئے جنہیں کتاب دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ، اَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ماخوذ ہے۔ اور الاِصر اور الاُصر دو لغتیں ہیں اور اس سے مراد عہد ہے۔ لغت میں الاصر کا معنی ثقل (بوجھ) ہے۔ اور عہد کو اِصر کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بہت بڑی رکاوٹ اور سختی ہے۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا بمعنی اعلموا۔ فرمایا پس تم جان لو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: تم بیان کرو کیونکہ شاہد وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعویٰ کی تصحیح کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم گواہ بنا لو اپنے آپ پر اور اپنے متبعین پر۔ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ اور میں بھی تم پر اور ان پر گواہوں میں سے ہوں۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا "پس تم ان پر گواہ رہنا" تو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

"پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔"

مَن شرطیہ ہے پس انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں سے جس نے وعدہ لئے جانے کے بعد ایمان سے منہ پھیرا فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس وہ ایمان سے خارج ہیں اور فاسق بمعنی خارج۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا
وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

''کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمائیے ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان ان میں سے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کلبی نے کہا ہے: کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نصاریٰ کے ساتھ اپنا جھگڑا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا اور عرض کی: ہم میں سے کون زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں فریق آپ کے دین سے بری ہیں'' (یعنی دونوں اس پر نہیں ہیں) تو انہوں نے کہا: نہ ہم آپ کے فیصلے پر راضی ہیں اور نہ ہی ہم آپ کا دین قبول کرتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) وہ تلاش کرتے ہیں۔ آیت میں غَیْرَ کو یَبْغُوْنَ فعل کے سبب نصب دی گئی ہے یعنی یبغون غیرَ دین اللہ۔ اور صرف عمرو نے یبغون کو خبر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھا ہے اور وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ کو خطاب کی بنا پر تا سے (پڑھا ہے) فرمایا: چونکہ پہلا خاص ہے اور دوسرا عام ہے لہٰذا معنی میں افتراق کے لئے ان کے درمیان فرق کیا گیا ہے اور حفص وغیرہ نے یبغون اور یرجعون دونوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اور باقیوں نے دونوں کو خطاب کی بنا پر تا سے پڑھا ہے، اس ارشاد کی وجہ سے لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ، واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهٗۤ اَسْلَمَ یعنی سر جھکا دیا، سر تسلیم خم کر دیا اور تمام مخلوق اطاعت و پیروی کرنے والی اور سر جھکانے والی ہے، کیونکہ وہ ایسی فطرت پر ہے جس سے نکلنے کی وہ قدرت نہیں رکھتی۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ مومن نے خوشی اور رضامندی سے سر تسلیم خم کر لیا ہے اور کافر نے اپنی موت کے وقت مجبوری سے (سر جھکایا) اور وہ اسے کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (المومن: 85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: کافر کا اسلام مجبوراً ہے کیونکہ اس کا سجدہ غیر اللہ کے لئے ہے اور اس کے سائے کا سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (النحل) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا

ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔) وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ (الرعد) (اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس صورت پر پیدا فرمایا جس کا ان سے ارادہ فرمایا، پس ان میں سے کچھ حسین ہے اور کچھ قبیح، کچھ طویل ہے اور چھوٹے قد کی، کچھ صحت مند ہے اور کچھ بیمار اور تمام کے تمام مجبوراً جھکے ہوئے ہیں۔ پس صحیح رضامندی اور خوشی سے اطاعت کرنے والے ہیں اور اسے پسند کرنے والے ہیں اور مریض جھکتے ہیں، اطاعت اختیار کرتے ہیں اگر وہ مجبور ہوں۔ اور الطوع کا معنی ہے سہولت کے ساتھ جھکنا اور اتباع کرنا۔ اور الکرہ وہ ہوتا ہے جو مشقت کے ساتھ ہو، مجبوراً ہو اور دل سے اس کا انکار ہو۔ اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں اور حال کے محل میں واقع ہیں، یعنی یہ طائعین اور مکرہین کے معنی میں ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے فرمایا: وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: ''ملائکہ نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور انصار اور عبدالقیس نے زمین میں'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میرے اصحاب کو گالی گلوچ نہ دو کیونکہ میرے اصحاب اللہ تعالیٰ کے خوف سے اسلام لائے اور لوگ تلوار کے خوف سے اسلام لائے''۔(1)

اور عکرمہ نے کہا ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جس نے بغیر کسی بحث مباحثہ کے اسلام قبول کیا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جسے حجت اور دلیل نے توحید کی جانب مجبور کر دیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: 61) (اور اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے)

حسن نے کہا ہے: یہ (لفظ) عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے۔ اور آپ سے مروی ہے اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ اور کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: مجبوری سے اطاعت کرنے والا منافق ہے جسے اس کا عمل کوئی نفع نہ دے گا، اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں، حال کے محل میں واقع ہیں۔ حضرت مجاہدؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی سواری سرکش ہو جائے یا وہ بدکنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے کان میں یہ آیت پڑھے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا الی آخر الآیہ۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلا، حدیث نمبر 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا۔''

**غَيْرَ يَبْتَغِ** فعل کا مفعول ہے اور **دِيْنًا** تفسیر کی بناء پر منصوب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دِيْنًا، يَبْتَغِ فعل کے سبب منصوب ہو اور **غَيْرَ**، الدّین سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔

حضرت مجاہد اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید کے بھائی حارث ابن سوید کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ انصار میں سے تھا وہ اور اس کے ساتھ بارہ افراد دین اسلام سے مرتد ہو گئے اور وہ مکہ میں کفار سے جا ملے، تو یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس نے اپنے بھائی کی طرف پیغام بھیجا جبکہ وہ توبہ کا طالب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ **وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ** ہشام نے بیان کیا ہے: یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ایک زیاں کار ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کی جاتی۔ اور مازنی نے کہا ہے: الخاسرین پر الف لام ایسے ہی ہے جیسے الرجل پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ: **وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ** ۞ کے تحت یہ گزر چکا ہے۔

## كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞

''کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد اور وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ انصار میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا، بعد ازاں وہ اپنے کیے پر نادم ہوا، تو اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا، تم میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرو کیا میرے لیے توبہ ہے؟ تو اس کی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا اس کی توبہ (قبول) ہو سکتی ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: **كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۞ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞** پس آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۞ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ**

تَابُوْا (آل عمران) (کیسے ہوسکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ایمان لے آنے کے بعد ..... مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کرلی)

پس اس کی قوم نے اسے اس کی طرف بھیج دیا، تو جب اس پر یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میری قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں کو سچا قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تائب ہوکر واپس لوٹ آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے توبہ کو قبول فرمالیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دیتے تھے اور کفر کرنے والوں کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعا مانگتے تھے، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے سرکشی کی اور کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ (آل عمران) (ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی، فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔)

پھر کہا گیا ہے: كَيْفَ لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے یعنی لا یھدی اللہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ و عند رسولہ یعنی لا یکون لھم عھد (ان کے لئے کوئی عہد نہیں ہوسکتا۔)

اور شاعر نے کہا ہے:

کیف نومی علی الفراش و لمّا　　یشمل القومَ غارةٌ شعواءُ

اس میں بھی کیف نومی سے مراد ہے لا نوم لی یعنی میرے لئے کوئی نیند نہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا اور جو کوئی ظالم ہوا، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا، حالانکہ ہم نے بہت سے مرتدین کو دیکھا کہ وہ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی اور کثیر ظالموں کو دیکھا انہوں نے اپنے ظلم سے توبہ کرلی۔ تو اسے کہا جائے گا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا جب تک وہ اپنے کفر اور اپنے ظلم پر قائم رہے اور انہوں نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور توبہ کرلی تو اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں توفیق دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی، اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کرلی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کرلی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)''۔

یعنی اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور لعنۃ اللہ و الناس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ یعنی نہ انہیں موخر کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی، پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی استثناء فرمائی اور ارشاد فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا امراد حارث بن سوید ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے معنوی طور پر آیت میں ہر وہ داخل ہے جس نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور اس کے لئے مخلص ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝۹۰

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔''

حضرت قتادہ، عطا خراسانی اور حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا اور پھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر لیا۔ اور ابوالعالیہ نے کہا ہے۔ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت وصفت کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا پھر اپنے کفر پر قائم رہ کر انہوں نے اس میں اور اضافہ کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ازْدَادُوْا كُفْرًا وہ کفر میں بڑھتے ہی گئے ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے کئے۔ اور یہ علامہ طبری کا اختیار کردہ ہے۔ اور یہ آیت ان کے نزدیک یہود کے بارے میں ہے۔

لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یہ اس آیت کی وجہ سے مشکل ہے: وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ:25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے۔)
سو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے موت کے وقت ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (النساء:18) اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب)
اور حضرت حسن، قتادہ اور عطا رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان (روح) حلقوم تک نہ پہنچے (1)''۔ اور اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی وہ حالت جس پر وہ کفر کرنے سے پہلے تھے (اس پر نہیں لوٹ سکتے) کیونکہ کفر نے اسے ضائع کر دیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی جب وہ اپنے کفر سے دوسرے کفر کی طرف رجوع کریں، بلاشبہ ان کی توبہ قبول

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جائے گی جب انہوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تکالیف زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں، پس اگر ہمارے لئے واپسی ممکن ہوئی تو ہم اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی درآنحالیکہ وہ کفر پر مقیم رہیں، پس اسے ہی توبہ غیر مقبولہ کا نام دیا ہے، کیونکہ قوم کا عزم صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ مکمل طور پر قبول فرماتا ہے بشرطیکہ عزم وارادہ صحیح ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾

”جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لئے) عوضانہ دے اتنا سونا، ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔“

المِلْءُ کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مقدار ہے جو کسی شے کو بھر دیتی ہے اور المَلْء فتحہ کے ساتھ مصدر ہے تیرا کسی شے کو بھر دینا اور کہا جاتا ہے: أعطنى مِلْأَهُ وَ مِلْأَيْه و ثلاثة أملائه۔ اور وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ میں واؤ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقحم اور زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے: فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ اور علماء نحو میں سے اہل نظر نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ واؤ مقحمہ ہو کیونکہ یہ معنی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: سو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا تبرعاً قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے بطور فدیہ دے۔ اور ذَهَبًا فراء کے قول کے مطابق بطور تفسیر منصوب ہے۔ مفضل نے کہا ہے: تفسیر کے لئے شرط یہ ہے کہ کلام تام ہو اور وہ مبہم ہو، جیسے تیرا یہ قول ہے: عندی عشرون، اس میں عدد معلوم ہے اور معدود مبہم ہے، پس جب تو نے درھما کہا تو تو نے تفسیر بیان کر دی۔ بلاشبہ اسے بطور تمیز نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو اسے کسرہ دے رہا ہو اور نہ ہی اسے کوئی رفع دینے والا عامل ہے۔ اور نصب خفیف ترین حرکت ہے اور یہ ہر اس کے لئے بنائی گئی ہے جس میں کوئی عامل نہ ہو۔ اور کسائی نے کہا ہے: اسے مِنْ کو مضمر کر کے نصب دی گئی ہے۔ یعنی اصل میں تھا مِنْ ذَهَبٍ، جیسا کہ اس قول میں ہے: أَوْ عدل ذٰلِكَ صِیَامًا۔ ای مِنْ صِیَامٍ۔

اور بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے لئے زمین بھر سونا ہو۔ کیا تو اسے بطور فدیہ دے سکتا ہے؟ تو وہ کہے گا۔ ہاں۔ پھر اسے کہا جائے گا: تحقیق تجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کیا تھا جو اس سے بہت زیادہ آسان تھی۔“ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے قد کنت کی بجائے کذبت، قد سئلت کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (تو نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ تجھ سے اس کا سوال کیا گیا تھا۔) (1)

1۔ صحیح بخاری، باب من نوقش الحساب عذب، حدیث نمبر 6057، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝

''ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ائمہ کرام نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا! ہمارا رب ہمارے مالوں کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے پس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کو گواہ بناتا ہوں اس پر کہ میں نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دے دی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے اپنے قرابتداروں حسان ابن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما میں تقسیم کر دے۔''(1)

اور الموطا میں ہے ''ان کے اموال میں سے ان کے نزدیک پسندیدہ مال بیر حاء تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا میٹھا اور طیب پانی نوش فرماتے تھے۔'' پھر آگے وہی حدیث ذکر کی۔ تو اس آیت میں خطاب کے ظاہر اور اس کے عموم کو عمل میں لانے پر دلیل موجود ہے، کیونکہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے اکوئی معنی مذکور کلام سے نہیں سمجھے۔ کیا آپ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں کہ جب انہوں نے آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا الآیۃ سنی تو انہوں نے توقف کی ضرورت محسوس نہیں کی یہاں تک کہ دوسری آیت کے ذریعہ اس کا بیان اور وضاحت آجائے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خرچ کریں یا کوئی سنت سامنے آجائے جو اس کی وضاحت کرنے والی ہو کیونکہ وہ تو بہت سی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا کہ آپ نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کا قصد کیا اسے سَبَل کہا جاتا تھا اور کہا: اے اللہ! یقیناً تو جانتا ہے کہ میرے نزدیک میرے اس گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ مال کوئی نہیں ہے، پس آپ اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آئے اور عرض کی: یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان ہے (اسے قبول فرمائیے) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''اسے قبضے میں لے لو'' تو گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے اپنے دل میں کچھ (وہم سا) پایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ قد قبلها منك بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول فرمالیا ہے۔ اسے اسد بن موسیٰ نے ذکر کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام نافع کو آزاد کیا اور اس میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے انہیں ہزار دینار عطا کئے۔ صفیہ بنت ابی عبید نے کہا ہے: میں ان کے بارے گمان کرتی ہوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

اور شبل نے ابونجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب الزکاۃ علی الاقارب، حدیث نمبر 1368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 577

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدائن کسریٰ کی فتح کے دن جلولاء کے قیدیوں سے ان کے لئے ایک لونڈی خریدیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا تو اس نے آپ کو بہت خوش کیا، تو انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور حضرت ثوری سے مروی ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ربیع بن خثیم کی ام ولد نے بیان کیا ہے کہ جب ان کے پاس کوئی سائل آتا تو وہ مجھے فرماتے اے فلانہ! سائل کو شکر دے دو، کیونکہ ربیع شکر بہت پسند کرتا تھا۔ سفیان نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی (یہی) تاویل کرتے ہیں: لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ شکر کی بوریاں خریدتے تھے اور انہیں صدقہ کر دیتے تھے تو آپ سے عرض کی گئی: آپ اس کی قیمت کیوں نہیں صدقہ کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا: کیونکہ شکر میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زیادہ پسندیدہ اور محبوب شے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کردوں۔

اور حسن نے کہا ہے: یقیناً تم اسے ہرگز نہیں پا سکو گے جسے تم پسند کرتے ہو مگر اسے چھوڑ کر جس کی خواہش اور چاہت تم رکھتے ہو اور تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے جس کی تم آرزو رکھتے ہو مگر اس پر صبر کرتے ہوئے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 2۔** الۡبِرَّ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے: اس سے مراد جنت ہے، یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، عمرو بن میمون اور سدی رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لن تنالوا ثواب البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم نیکی کا ثواب ہرگز نہیں پا سکتے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔) اور النَّوَال بمعنی عطا ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے نولتہ تنویلاً یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ اور نالنی من فلان معروف ینالنی، یعنی وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ سو معنی یہ ہوگا: تم ہرگز جنت تک نہ پہنچ سکو گے اور نہ تم اسے پا سکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں میں سے جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے: البر سے مراد عمل صالح (نیکی) ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی عمل صالح کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور عمل صالح جنت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (1)'' سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا ہے: الۡبِرَّ سے مراد طاعت ہے۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: تم ہرگز دین اور تقویٰ کا شرف و مرتبہ نہ پا سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو در آنحالیکہ تم صحت مند اور حریص ہو، تم زندگی کی آرزو رکھتے ہو اور فقر و افلاس سے ڈرتے ہو۔ اور حسن سے منقول ہے کہ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ مجاہد اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو خیر اور نیکی کی راہ میں مثلاً صدقہ یا علاوہ ازیں دیگر طاعات وغیرہ اور یہ جامع معنی ہے۔ اور نسائی نے صعصعہ بن معاویہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا تو میں نے کہا کوئی حدیث بیان فرمائیے تو انہوں نے کہا: ہاں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5629، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان آدمی اپنے ہر مال سے جوڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو جنت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور ان میں سے ہر کوئی اسے اس کی طرف بلائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: اگر تو وہ (مال) اونٹ ہیں تو پھر دو اونٹ (صدقہ کرے) اور اگر وہ گائیں ہیں تو پھر وہ دو گائیں (صدقہ کرے)۔ اور ابو بکر الوراق نے کہا ہے: (اللہ تعالیٰ نے) اس آیت کے ساتھ مکارم اخلاق پر ان کی راہنمائی کی ہے۔ یعنی تم ہرگز اپنے ساتھ میری نیکی کو نہیں پا سکو گے مگر اس طرح کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو اور اپنے اموال اور جاہ و حشمت میں سے ان پر خرچ کرو، پس جب تم اس طرح کرو گے تو پھر میری نیکی، احسان اور میرا لطف و مہربانی تمہیں آ پہنچے گی۔

حضرت مجاہد نے کہا: یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ یعنی جب وہ جانتا ہے تو اس پر جزا عطا فرمائے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

''سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ نازل کی گئی تورات۔ آپ فرماؤ: لاؤ تورات پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: حِلًّا یعنی حلال۔ (کھانے کی ہر چیز حلال تھی۔) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: آپ ہمیں بتائیے، کون سی شے اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کی تھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جنگل میں رہتے تھے اور وہ عرق النساء (کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے اور وہ اونٹوں کے گوشت اور ان کے دودھ کے سوا کوئی پسندیدہ اور مناسب شے نہ پاتے تھے۔'' انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ (1)

اور حدیث ذکر کی۔ اور کہا جاتا ہے: (بے شک آپ نے) نذر مانی کہ اگر آپ اس بیماری سے شفایاب ہو گئے تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور آپ کے نزدیک پسندیدہ کھانا پینا اونٹ کا گوشت اور ان کا دودھ تھا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام حران سے بیت المقدس کا ارادہ کرتے ہوئے آئے جبکہ آپ اپنے بھائی عیصو سے بھاگے، آپ انتہائی مضبوط اور قوی آدمی تھے، پس آپ کی ملاقات ایک

---

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرشتے سے ہوئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ ڈاکو ہے چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ لڑائی کی کہ آپ اس کو پچھاڑ دیں، تو فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ران پر کچوکا لگایا اور پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اور یعقوب علیہ السلام اس کی طرف دیکھتے رہے تو اس طرح آپ پر عرق النساء کی بیماری غالب آگئی اور اس کے سبب شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئے، درد کی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی بلکہ آپ چیختے ہوئے رات گزارتے تھے، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں شفا عطا فرمادی تو (ہڈی نہیں کھائیں گے) اور نہ ہی وہ ایسا کھانا کھائیں گے جس میں ہڈی ہوگی تو انہوں نے اسے اپنے اوپر حرام کرلیا، تو اس کے بعد ان کے بیٹے بھی ان کی پیروی کرنے لگے اور وہ گوشت سے ہڈیوں کو نکال دیتے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرشتے کا کچوکا لگانے کا سبب یہ تھا کہ وہ نذر مانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ بیٹے عطا فرمائے اور وہ صحیح سالم بیت المقدس آئے تو وہ ان میں سے آخری کو ذبح کریں گے۔ پس وہ ان کی نذر سے نکلنے کے لئے تھا، حضرت ضحاک سے یہی منقول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ تحریم حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اجتہاد سے تھی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے؟ تو اس میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ فرمایا اِلَّا مَا حَرَّمَ اور یہ کہ نبی کو جب اس کا اجتہاد کسی حکم تک پہنچادے تو وہ دین ہوتا ہے اور اس کی اتباع ہمارے اوپر لازم ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس پر پختہ فرما دیتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی اتباع لازم ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کو اجازت دی جاتی ہے اور وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد کا موجب متعین ہو جاتا ہے جب وہ اس پر قادر ہو اور اگر اس کے لئے اس کی تحریم کے بارے پہلے اجازت نہ ہو تو وہ تحلیل وتحریم کی جانب بغیر اجازت کے نہیں بڑھتا۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح روایت کے مطابق شہد کو حرام کیا(1) یا اپنی کنیز ماریہ کو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریم کی توثیق نہ کی اور یہ ارشاد نازل ہوا۔ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَكَ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق ارشاد لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ تقاضا کرتا ہے کہ یہ ماریہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

اور امام شافعی نے یہ رائے بیان کی ہے کہ اس صورت میں کفارہ کا واجب ہونا غیر معقول ہے، تو آپ نے اسے محل نص کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ دراصل کفارہ ہر مباح کو حرام قرار دینے کی صورت میں ہے اور آپ نے اسے قسم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء میں مبتلا ہوئے تو حکماء نے آپ کے لئے یہ تجویز کیا کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز کریں چنانچہ آپ نے اسے اپنے آپ پر حرام قرار دیا۔ پھر یہودیوں نے کہا: بلاشبہ ہم اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام

1۔ صحیح بخاری، باب لم تحرم ما احل اللہ لک، حدیث نمبر 4862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرار دیتے ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے حرام قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریم کا حکم تورات میں نازل فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی اور ان کا رد کر دیا اور فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ لیکن وہ نہ لائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ زجاج نے کہا ہے: ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لئے اس آیت میں بہت بڑی دلیل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ان کی کتاب میں نہیں ہے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تورات لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کیا۔ یعنی انہوں نے یہ پہچان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے سبب یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور عطیہ العوفی نے کہا ہے: بلاشبہ وہ ان پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے کی وجہ سے حرام ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اسرائیل نے اس وقت کہا جب انہیں عرق النساء کا مرض لاحق ہوا: قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے عافیت اور صحت عطا فرمائی تو کوئی بچہ اسے (گوشت کو) نہیں کھائے گا، حالانکہ وہ ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا۔ اور کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تورات میں ان پر حرام نہیں کیا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا۔ اور بنی اسرائیل جب بڑے بڑے گناہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر پاکیزہ اور طیب کھانا حرام کر دیا یا ان پر عذاب نازل کر دیا اور وہ موت ہے، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ الآیہ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لئے) اور ارشاد گرامی ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (الانعام) (اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور...... یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں۔)

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں یہ عنوان ذکر کیا ہے دواء عرق النساء ہشام بن عمار اور راشد ابن سعید الرملی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مسلم، ہشام بن حسان، انس بن سیرین تمام نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، عرق النساء کا علاج جنگلی بکری کی لاٹ ہے جسے پگھلایا جائے، پھر اسے تین اجزاء میں تقسیم کیا جائے، پھر ہر روز ایک جز نہار منہ پیا جائے۔" (1)

اور ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرق النساء کے بارے میں ارشاد فرمایا: "عربی مینڈھے کی لاٹ لی جائے نہ وہ چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت بڑا اور اسے چھوٹا چھوٹا کاٹ لیا جائے اور پھر اس کی چربی پگھلا کر نکال لی جائے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر روز ایک تہائی حصہ نہار منہ لے لیا جائے۔" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سو سے زیادہ افراد کو اس کے بارے بتایا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

1۔ ابن ماجہ، باب دواء عرق النساء، حدیث نمبر 3453، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تندرست ہو گئے۔

حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: حجاج بن یوسف کے زمانے میں عرق النساء کے متعلق ایک شیخ نے مجھے بتایا: میں تجھے عظمت وشان والے الله کی قسم دیتا ہوں اگر تو (اس سے) تندرست نہ ہوتو میں تجھے آگ کے ساتھ داغ دوں گا یا تجھے استرے کے ساتھ مونڈ دوں گا۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا: تحقیق میں نے اس کا تجربہ کیا، تو اسے کہہ، اور تو اس جگہ پر اسے مل دے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

''آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے الله نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے۔''

اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ فرما دیجئے: الله تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے، بلاشبہ وہ تورات میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی الله تعالیٰ نے آپ کے دین کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ ان کے باطل دعویٰ کو انہی پر رد کرنا اور لوٹانا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

''بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے، بڑا برکت والا، ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لئے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔ اور الله کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک الله بے نیاز ہے سارے جہان سے۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''مسجد حرام''۔ میں نے عرض کی پھر کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ؟ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''چالیس سال، پھر ساری زمین تیرے لئے مسجد بنا دی گئی جہاں کہیں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تو تو وہیں نماز پڑھ لے۔'' (1)

حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے پہلے کوئی عبادت خانہ نہیں بنایا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت سے پہلے بیوت تو کثیر تھے لیکن یہاں بیت سے مراد وہ ہے جو عبادت کے لئے سب سے

1۔ صحیح بخاری، باب یزفون النسلان فی المشی، حدیث نمبر 3115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اول بنایا گیا۔

اور حضرت مجاہد نے بیان کیا: مسلمان اور یہودی ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے پس یہودیوں نے کہا: بیت المقدس کعبہ سے افضل اور اعظم ہے، کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا: (نہیں) بلکہ کعبہ معظمہ افضل ہے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور سورۃ البقرہ میں بیت اللہ کی بناوٹ اور سب سے اول جس نے اسے بنایا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کی کسی شے کو تخلیق فرمانے سے دو ہزار برس پہلے اس بیت کی جگہ کو تخلیق فرمایا اور اس کی بنیادیں نیچے والی ساتویں زمین میں ہیں اور جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے، جیسا کہ اسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کو بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں اور اعزاز کا سوال کیا [انہوں نے اللہ تعالیٰ سے] حاکم بنائے جانے کی التجا کی کہ وہ انہیں حکومت عطا فرمائے۔ پس وہ انہیں عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملک کی التجا کی کہ آپ کے بعد کسی کے لئے ایسی بادشاہی نہ ہو پس وہ بھی آپ کو عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی جب وہ مسجد بنانے سے فارغ ہوئے کہ جو بھی اس میں آکر نماز ادا کرے تو وہ اسے گناہوں سے اسی طرح پاک کر دے جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا پس یہ اعزاز بھی انہیں عطا کر دیا گیا۔'' دونوں حدیثوں کے درمیان اشکال ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیان طویل مدت کا فاصلہ ہے اہل تواریخ نے کہا ہے: وہ مدت ہزار برس سے زیادہ ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا جس کی بنیاد ان کے سوا (کسی اور) نے رکھی تھی۔ اور یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس یہ جائز ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس کو تعمیر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ملائکہ نے ہی بیت اللہ کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسے بنایا ہو، یہ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو زمین میں گھر بنانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ کہ وہ اس کا طواف کریں اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے ہی بنایا جو پہلے بنایا جا چکا تھا اور اس کا طواف کیا، پھر ان کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بناوٹ کو مکمل کیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ یہ اِنَّ کی خبر ہے اور اس میں لام برائے تاکید ہے اور بَكَّة سے مراد وہ خاص جگہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے اور مکہ تو سارا شہر ہے، یہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور محمد بن شہاب نے کہا ہے کہ بَكَّة سے مراد مسجد ہے اور مکہ سے مراد سارا حرم ہے، اس میں گھر داخل ہوتے ہیں۔ اور مجاہد

نے کہا ہے: بکۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ پس اس میں میم کو با سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: طین لازب و لازم، حضرت ضحاک اور مورج نے یہی کہا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ بکۃ، البلك سے مشتق ہے اور اس کا معنی ازدحام اور بھیڑ ہے۔ جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تباك القوم۔ طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور اژدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکہ رکھا گیا ہے۔ اور البك کا معنی ہے دق العنق۔ گردن توڑنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس میں ظلم و زیادتی کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اور رہا مکہ! تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودا اور مغز کو خشک کر دیتی ہے، یہ معنی ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: مککت العظم اذا اخرجت ما فیہ۔ یعنی ہڈیوں میں جو کچھ ہے تو وہ سب نکال لے تب کہے گا مککتُ العظم (میں نے ہڈی کو خالی کر لیا) اور مَكَّ الفصیلُ ضرع امہ و امتکہ جب بچھڑا کھیری میں موجود سارا دودھ چوس لے اور اسے پی لے تب یہ کہا جاتا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مَكَّت فلم تُبقِ فی اجوافھا دِرَرا

انہوں نے دودھ چوسا اور ان میں کوئی دودھ نہ چھوڑا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اسے ہلاک اور تباہ کر دیتا ہے جو اس میں ظلم و زیادتی کرے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ لوگ اس میں تمسخر کرتے تھے اور ہنستے تھے اور یہ معنی اس ارشاد باری تعالیٰ سے لیا گیا ہے: وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً۔ یعنی وہ اس میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور یہ اس کے منصرف ہونے کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ مکۃ دوحرفی مضاعف ہے۔ اور مُکاءً سہ حرفی معتل ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: مُبٰرَكًا اسے مبارک بنایا کیونکہ اس میں عمل کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برکت کا معنی کثرۃ الخیر ہے۔ اور یہ لفظ وُضِعَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا بکۃ سے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور معنی یہ ہے: الذی استقر ببکۃ مُبارکًا (یعنی وہ جو مکہ میں قیام پذیر رہا جس میں برکت رکھ دی گئی۔)

اور غیر قرآن میں مبارك پڑھنا بھی جائز ہے یا تو اس لئے کہ یہ خبر ثانی ہے یا اس لئے کہ یہ الذی سے بدل ہے یا اس بنا پر کہ مبتدا مضمر ہے وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ اس پر معطوف ہے۔ اور یہ وھو ھدًی لِلعالَمِین کے معنی میں ہوگا۔ اور غیر قرآن میں اسے مبارکٍ جر کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں یہ البیت کی نعت اور صفت ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اسے مبتدا یا صفت ہونے کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اہل مکہ، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے آیۃ بینۃ واحد پڑھا ہے، یعنی مقام ابراہیم واحد اور ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقام

ابراہیم میں ان کے قدموں کا نشان ایک واضح اور ظاہر علامت ہے۔ اور حضرت مجاہد نے مقام ابراہیم کی تفسیر پورے حرم سے کی ہے۔ اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی آیات اور نشانیوں میں سے صفا اور مروہ، رکن اور مقام ابراہیم ہیں۔

اور باقیوں نے اسے جمع کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اس سے ارادہ مقام ابراہیم، حجر اسود، حطیم، زمزم اور دیگر تمام مشاعر کا کیا ہے۔

فرمایا: ابوجعفر النحاس نے کہا ہے: جنہوں نے آیات بینات پڑھا ہے تو ان کی قرأت زیادہ واضح اور بین ہے، کیونکہ صفا اور مروہ بھی آیات وعلامات میں سے ہیں۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ پرندہ صحیح سالم حالت میں بیت اللہ شریف سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی شکاری شکار کو تلاش کر رہا ہو تو جب وہ حرم پاک میں داخل ہو جائے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ بارش جب رکن یمانی کی جانب ہو تو ہریالی اور شادابی یمن میں ہوتی ہے۔ اور جب رکن شامی کی جانب ہو تو شادابی شام میں ہوتی ہے۔ اور جب پورے بیت اللہ پر ہو تو شادابی سارے شہروں میں آتی ہے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جمرات پر جس قدر اضافہ کیا جاتا ہے وہ ایک ہی مقدار پر دکھائی دیتے ہیں۔

اور المقام ان کے اس قول سے ہے قمت مقاماً اور یہ وہ جگہ جس میں کھڑا ہوا جاتا ہے اور المقام تیرے اس قول سے ہے اقمت مقاما اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مقام میں اختلاف بھی گزر چکا ہے اور اس میں صحیح یہ ہے اور المقام مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور خبر محذوف ہے اور تقدیر کلام ہے: منها مقام ابراهيم۔ اخفش نے یہی کہا ہے اور محمد بن یزید نے بیان کیا ہے کہ مقام، آیات سے بدل ہے اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے۔ یعنی بمعنی هي مقام ابراهيم ہے۔

اور کلام عرب میں اخفش کا قول معروف ہے جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

لها متاع و أعوان غَدَون بِهِ ۔ قِتبٌ و غرب اذا ما أُفرِغ انسَحَقا

یعنی اس کا بہاؤ دور ہو گیا اور ختم ہو گیا...... اور ابو العباس کا قول ہے۔ بے شک مقام بمعنی مقامات ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ۔

اور شاعر نے کہا:

اِنَّ العيون التی فی طرفها مرض

یعنی فی اطرافها۔

اور اسے وہ حدیث جو اس طرح مروی ہے اور تقویت دیتی ہے۔ الحج [كله] مقام ابراهيم (کہ حج سارے کا سارا مقام ابراہیم ہے۔)

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ بھی حرم پاک کی نشانیوں میں سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے، کیونکہ اس کے گردونواح سے لوگوں کو لوٹ لیا جاتا تھا، لیکن اس میں کوئی جابر اور ظالم نہیں داخل ہوتا تھا، حالانکہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اسے پامال کیا اور حرم پاک تک کسی کو نہ پہنچنے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ (الفیل) (کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔)

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: آیت صورۃً تو خبر ہے حالانکہ اس میں معنی امر کا ہے، تقدیر کلام یہ ہے و من دخلہ فأمنوہ (اور جو اس میں داخل ہو جائے تو تم اسے امن اور پناہ دے دو۔) جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (یعنی نہ تم برائی کی باتیں کرو اور نہ فسق کا ارتکاب کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد کرو۔) اسی معنی کی وجہ سے امام سابق حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس کے سبب وہ حد کا مستحق بن گیا پھر اس نے حرم پاک میں پناہ لے لی تو اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے امن اور پناہ کو واجب قرار دیا جو اس میں داخل ہو گیا اور یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر افراد ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے (1): ''ہر وہ جس نے یہ کہا ہے وہ دو اعتبار سے وہم میں مبتلا ہوا ہے۔'' ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آیت کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر ہے اور اس سے مستقبل کے حکم کا اثبات مقصود نہیں اور دوسرا یہ ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ امن اور پناہ گزر چکی ہے اور یہ کہ قتل و قتال اس کے بعد اس میں واقع ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبر واقع نہ ہوگی بخلاف اس کے جس کی خبر دی گئی ہے، پس یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: جب وہ حرم میں پناہ لے لے تو اسے نہ کھلایا جائے گا اور نہ پلایا جائے گا، نہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کلام اس سے کی جائے گی یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پس اسے نکلنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ اس کا امن میں ہونا اور محفوظ ہونا صحیح نہ ہوگا۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: حرم پاک میں اعضاء میں قصاص واقع ہو سکتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی امن صحیح نہیں ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ حرم پاک میں حدود قائم کی جا سکتی ہیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثوری نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس کسی نے حرم میں حد کا ارتکاب کیا تو اس پر حرم میں حد قائم کی جائے گی اور اگر حل میں اس کا ارتکاب کیا اور پھر حرم میں پناہ لے لی تو اس سے نہ کلام کی جائے اور نہ خرید و فروخت کی جائے یہاں تک کہ وہ حرم پاک سے نکل آئے تو پھر اس پر حد قائم کی جائے گی اور یہی امام شعبی کا قول ہے اور یہی کوفیوں کی حجت اور دلیل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت کے معنی سے یہی سمجھے ہیں اور وہ حبر الامۃ اور عالم الامۃ ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس سے ہر اس پر نعمتوں کے شمار کرنے کا ارادہ اور قصد کیا گیا ہے جو ان سے جاہل اور ناواقف ہے اور عرب میں اس کے منکر بھی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) (کیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 284

انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنادیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔)

پس وہ دور جاہلیت میں تھے جو کوئی اس میں داخل ہوتا اور اس میں پناہ لے لیتا تو وہ قتل و غارت سے امن میں ہو جاتا، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: جو کوئی دور جاہلیت میں اس میں داخل ہوا وہ امن پانے والا اور محفوظ ہو گیا ..... اور یہ حسن اور اچھا ہے (1)۔

اور روایت ہے کہ کسی ملحد نے بعض علماء کو کہا: کیا قرآن کریم میں نہیں ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس ہم اس میں داخل ہوئے اور ہم نے اس اس طرح کیا اور جو کوئی اس میں تھا وہ محفوظ نہیں ہوا۔ تو انہوں نے انہیں کہا: کیا تو عربوں میں سے نہیں ہے! جو کوئی یہ کہتا ہے من دخل داری کان امنا (جو کوئی میرے گھر میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہو گیا) وہ اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ کیا یہ اسی طرح نہیں کہ کوئی اپنی اطاعت اور پیروی کرنے والے کو کہے: کف عنه فقد أمّنته و كففت عنه؟ (تو اس سے رک جا تحقیق میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تو اس سے رک جائے؟ اس نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس اسی طرح یہ قول ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کا معنی ہے یعنی وہ آگ (کے عذاب) سے محفوظ ہو گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث شفاعت منقول ہے: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی قیامت کے دن حق کی بحث میں مومنین سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو قسم دلانے والا نہ ہو گا جو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اصرار کر رہے ہوں جو کہ جہنم میں ہوں گے اے ہمارے رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج ادا کرتے تھے، تو انہیں کہا جائے گا: اسے نکال لو جسے تم پہچانتے ہوں'' الحدیث (2)۔ بلاشبہ وہ آگ سے محفوظ ہو جائے گا جو مناسک ادا کرنے کے لئے اس میں داخل ہوا اس کی تعظیم کرتے ہوئے، اس کے حق کو پہچانتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: جو کوئی پورے اخلاص اور صفائے باطن کے ساتھ اس میں داخل ہوا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اس میں داخل ہوئے تو یقیناً وہ اس کے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: ''جس نے حج کیا اور برائی کے بارے کوئی گفتگو نہ کی اور نہ ہی فسق کا مرتکب ہوا تو وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح پاک ہو گیا جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا اور حج مبرور کی جزا سوائے جنت کے اور کوئی نہیں''۔

حسن نے بیان کیا ہے: حج مبرور یہ ہے کہ وہ دنیا سے دوری اختیار کرتے ہوئے اور آخرت میں رغبت رکھتے ہوئے واپس لوٹے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 601

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ اشعار بھی کہے:

یا کعبة الله دعوة اللاجی دعوة مستشعر و محتاج

اے کعبہ معظمہ! جو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے پناہ لینے والے کے لئے دعا ہے اور شعار پہننے والے اور محتاج کے لئے جائے دعا ہے۔

ودع احبابه و مسکنه فجاء ما بین خائف راجی

اپنے احباب اور اپنے مکینوں کو الوداع کہہ پس (ہر کوئی) بیم ورجا کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔

ان یقبل الله سعیه کرما نجاء والا فلیس بالناجی

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے ساتھ اس کی سعی قبول فرمالی تو وہ نجات پا گیا ورنہ کوئی نجات پانے والا نہیں۔

وانت ممن تُرجی شفاعتُه فاعطف علی وافد بن حجاج

اور تو ان میں سے ہے جن کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے پس تو وافد بن حجاج پر مہربانی فرما۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو کوئی عمرہ قضا کے سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اس میں داخل ہوا وہ امان میں آ گیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله آمنین۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہے اور یہ آیت شکار کے امان میں ہونے کے بارے ہے اور یہ شاذ ہے اور قرآن کریم میں ہے: فَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ الآیہ۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ اس میں لام ایجاب والزام کے لئے ہے پھر اسے ارشاد باری تعالیٰ: عَلَى کے ساتھ مؤکد کیا، یہ عربوں کے نزدیک الفاظ وجوب کی تاکید لگانے والے حروف میں سے ہے۔ پس جب کوئی عربی یہ کہے: لفلان علی کذا، تو تحقیق اس نے اسے مؤکد کر دیا اور اپنے اوپر واجب کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بلیغ ترین الفاظ وجوب کے ساتھ حج کا ذکر کیا اپنے حق کی تاکید لگاتے ہوئے اور اس کی حرمت کی تعظیم کرتے ہوئے۔ اور اس کے فرض ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور یہ ساری عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بیان کی ہے اور اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ حدیث باطل ہے، صحیح نہیں ہے اور ان کی وجوہ (اور دلائل) میں اجماع مدافعت کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں حضرت سفیان ثوری نے علاء بن مسیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رب کریم فرماتا ہے بلاشبہ میں نے اپنے بندے کو وسیع اور وافر رزق عطا فرمایا ہے اور اس نے ہر چار سال میں میری طرف محروم کے لئے کوئی

شے نہیں لوٹائی۔'' یہ علاء بن مسیب بن رافع کاہلی کوفی کی مشہور حدیث ہے اور آپ محدثین کی اولاد میں سے ہیں، اور ان سے کئی ایک نے روایت کیا ہے، ان میں سے بعض نے پانچ سال کا ذکر کیا ہے اور بعض نے سند اس طرح بیان کی ہے۔ عن العلاء عن یونس بن خباب عن ابی سعید، علاوہ ازیں بھی اس میں اختلاف ہے۔

اور ملاحدہ نے حج کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: چونکہ اس میں کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور یہ حیاء کے خلاف ہے اور سعی کرنا ہے اور یہ وقار کو ختم کر دیتی ہے اور بلا مقصد کنکریاں مارنا یہ خلاف عقل ہے، پس انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حج کے یہ تمام افعال باطل ہیں، کیونکہ وہ ان کی حکمت اور علت کو نہیں پہچان سکے اور وہ اس سے جاہل ہیں کہ مولیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسے ان تمام افعال کا مقصود اور مدعیٰ بھی سمجھائے گا جس کا وہ اسے حکم دے گا اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بندہ ہر اس فعل کے فائدہ سے آگاہ ہو جس کا وہ مکلف ہے، بلکہ اس پر تو اطاعت کرنا متعین ہو جاتا ہے اور فائدہ کا مطالبہ اور مقصود کے بارے سوال کئے بغیر پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے تھے لبیك حقا حقا تعبدا و رقا لبیك اله الحق۔ (1)

اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: ایها الناس قد فرض الله علیکم الحج فحجوا (اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو) تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہر سال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لو قلت نعم لوجبت و لما استطعتم (اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یقیناً وہ (ہر سال) واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھتے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم مجھے اس (شے) کے بارے چھوڑ دو جو میں تمہارے لئے چھوڑ دوں کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف رکھنے کے سبب ہی ہلاک اور برباد ہوئے ہیں۔ پس جب میں تمہیں کسی شے کے بارے میں حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور جب میں تمہیں کسی شے سے منع کر دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔'' یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس حدیث نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ جب خطاب مکلفین پر کسی شے کی فرضیت کے بارے ان کی طرف متوجہ ہو تو اسے ایک بار کرنا ہی کافی ہوتا ہے اور وہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ الاستاذ ابو اسحاق الاسفرائینی وغیرہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کے اصحاب نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہمارا حج ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔'' اور یہ ان کے رد کے بارے میں نص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے۔ (حج) ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے، حالانکہ حج عربوں کے نزدیک معلوم اور ان میں مشہور تھا اور یہ ان اعمال میں سے تھا جن میں وہ اپنی منڈیوں، اپنی طاعت و فرمانبرداری اور اپنے دین ابراہیمی پر قائم رہنے میں رغبت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ پس جب دین اسلام آیا تو انہیں اس کے بارے خطاب کیا گیا جسے وہ جانتے تھے اور وہ شے ان پر لازم کی گئی

1۔ ابن ماجہ، کتاب التلبیہ، حدیث نمبر 2910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جسے وہ پہچانتے تھے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرض حج سے پہلے حج ادا فرمایا(1) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرفات میں وقوف کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور دین میں کوئی تبدیلی نہ کی جسے انہوں نے تبدیل کر لیا تھا، جس وقت قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے: ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے نہیں نکلیں گے اور ہم مذہب میں بڑے سخت ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو میں جانتا ہوں اس میں عجیب ترین یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے پہلے دو بار حج ادا فرمایا اور آپ سے اس کے سبب فرض ساقط ہو گیا، کیونکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا پر لبیک کہی جب انہیں یہ کہا گیا: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (آپ لوگوں میں حج کے بارے اعلان کر دیں۔)

الکیا الطبری نے کہا ہے: یہ بعید ہے، کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں یہ موجود ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ پس آپ کی شریعت میں حکم خطاب کے ساتھ آپ پر اس کا واجب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب انہیں کیا ہے جنہوں نے حج ادا نہیں کیا، یہ ایسا فیصلہ اور تخصیص ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ اس پر حج واجب نہ ہو جس نے دین ابراہیمی کے مطابق حج کر لیا اور یہ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کتاب و سنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے نہ کہ علی الفور، یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے جو ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور متاخرین مالکیہ میں سے بعض اہل بغداد نے یہ کہا ہے کہ اس کی ادائیگی علی الفور واجب ہوتی ہے اور اس پر قدرت رکھتے ہوئے اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا (الحج: 27) (اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ) اور سورہ حج مکیہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ۔ اور یہ سورۃ غزوہ احد کے سال ۳ھ میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۰ھ تک حج ادا نہیں فرمایا۔

رہی سنت! تو ضمام بن ثعلبہ سعدی کی حدیث ہے جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اسلام کے بارے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر فرمایا۔ اسے حضرت ابن عباس (2)، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور ان تمام میں حج کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ فرض قرار دیا گیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اپنے سیاق کے اعتبار سے احسن اور اتم ہے۔ اور اس کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے، سو بعض نے کہا ہے ۵ھ، بعض نے کہا ہے ۷ھ اور بعض نے کہا ہے اس کا وقت ۹ھ ہے اور ابن ہشام

---

1۔ ابن ماجہ، باب حجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی العلم و قولہ تعالیٰ قل رب زدنی علما، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے ابوعبیدہ الواقدی سے جنگ احزاب سے واپسی کے بعد غزوۂ خندق کا سال ذکر کیا ہے۔

ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے: اس بات پر دلیل کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے اس پر اجماع علماء ہے کہ حج پر قدرت رکھنے والا فاسق نہیں جبکہ وہ اسے ایک یا دو سال یا اسی طرح کی کچھ مدت موخر کردے اور یہ کہ جب استطاعت رکھنے کے کئی سال بعد جب اس نے حج ادا کر دیا تو تحقیق اس نے وہ حج اپنے وقت میں ہی ادا کیا، ان تمام کے نزدیک وہ اس آدمی کی طرح نہیں جس کی نماز فوت ہو جائے یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور پھر وقت نکلنے کے بعد وہ اسے قضا کرے اور نہ اس کی طرح ہے جس کے بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے فوت ہو جائیں اور پھر وہ اس کی قضا کرے اور نہ اس کی طرح جس نے اپنا حج فاسد کر دیا ہو اور پھر وہ اس کی قضا کرے، پس جب علماء نے اس پر اجماع کر لیا کہ جس نے اپنی استطاعت کے وقت سے کئی سال بعد حج کیا اسے یہ نہیں کہا جائے گا: تو اسے قضا کرنے والا ہے جو تجھ پر واجب تھا، تو ہم نے یقینا جان لیا کہ حج کے وقت میں وسعت رکھی گئی ہے اور یہ کہ یہ علی التراخی واجب ہوتا ہے نہ کہ علی الفور...... ابوعمر نے کہا ہے: جس نے بھی بالتراخی کا قول کیا ہے وہ اس بارے میں کوئی حد بیان نہیں کرتا، مگر صرف یہ کہ سحنون سے روایت ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اتنی استطاعت پاتا ہے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہے اور پھر وہ اس پر قدرت رکھنے کے باوجود بہت سے سالوں تک اسے مؤخر کر دیتا ہے کیا حج میں اس تاخیر کے سبب اسے فاسق کہا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اگرچہ اس کی عمر کے ساٹھ سال گزر جائیں، البتہ جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر جائے گی تو اسے فاسق قرار دیا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ یہ توقیف اور حد ہے اور شرع میں حدود صرف اسی سے اخذ کی جاتی ہیں جسے ان کی وضاحت کا اختیار ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسے ابن خویز منداد نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے، ابن قاسم وغیرہ نے کہا ہے: اگر اس نے حج کو ساٹھ برس کی عمر تک مؤخر کیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا اور اگر اسے ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی مؤخر کیا تو اسے گنہگار قرار دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (1): ''میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہیں اور وہ کم ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے۔'' تو گویا اس عشرے میں اس پر خطاب تنگ ہو جاتا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: بعض لوگوں (جیسا کہ سحنون وغیرہ) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: معترك امتی بین الستین الی السبعین و قل من یجاوز ذالك (میری امت کی عمریں ساٹھ برس سے ستر برس تک کے درمیان ہیں اور وہ قلیل ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا کلام ہے جو آپ نے اپنی امت کی اغلب عمروں کے بارے میں بیان فرمایا ہے، اگر حدیث صحیح ہے اور اس میں ستر برس تک توسیع پر دلیل موجود ہے، کیونکہ اغلباً ایسا ہی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے اس جیسی کمزور تاویل کے ساتھ اس کو بالیقین فاسق قرار دیا جائے جس کی عدالت و امانت بالکل صحیح ہو۔ و باللہ التوفیق۔

1۔ ابن ماجہ، باب العمل والاجل، حدیث نمبر 4225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، روایۃ بالمعنی

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ الله تعالیٰ کے اس قول وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے ساتھ خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق تمام پر ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''اگرچہ لوگوں نے مطلق عمومات میں اختلاف کیا ہے مگر انہوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت تمام لوگوں مردوں اور عورتوں پر محمول ہے، سوائے صغیر (نابالغ) بچوں کے کیونکہ وہ بالا جماع اصول تکلیف سے خارج ہیں اور اسی طرح غلام بھی اس میں داخل نہیں، کیونکہ الله تعالیٰ کے اس ارشاد نے انہیں مطلق عموم سے خارج کر دیا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور غلام قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ آقا اسے اس عبادت سے اپنے حقوق کی وجہ سے روکتا ہے۔ اور الله تعالیٰ نے اپنے حق پر آقا کے حق کو بندوں کے ساتھ نرمی اور ان کی مصلحت کے لئے مقدم کیا ہے اور اس میں امت اور ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، پس ہم اس کے ساتھ تعریف نہیں کریں گے جسے ہم جانتے نہیں اور اس پر اجماع کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے سوائے ان کے جو ان سے جدا اور الگ رہے اور وہ ان میں سے ہیں جن کے اختلاف کی کوئی قدر و منزلت نہیں، کہ بچہ جب اپنی حالت صغر میں حج کرے اور غلام جب اپنی غلامی کی حالت میں حج کرے، پھر وہ بچہ بالغ ہو جائے اور غلام آزاد ہو جائے تو بلاشبہ ان دونوں پر حج اسلام فرض ہوگا جب وہ اس کی قدرت اور استطاعت پالیں گے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: داؤد نے فقہاء امصار، ائمہ اثر کی غلام کے بارے میں مخالفت کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک وہ حج کا مخاطب ہے اور وہ جمہور علماء کے نزدیک عام خطاب سے خارج ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور اس میں دلیل اس میں تصرف کی قدرت نہ ہونا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہ غلام کے لئے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر حج کرنا جائز نہیں ہوتا، جیسا کہ وہ جمعہ کے خطاب سے خارج ہے اور وہ الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ الآیہ (جمعہ: 9)۔ سوائے چند کے، عام علماء کے نزدیک یہی حکم ہے اور اسی طرح وہ ایجاب شہادت کے خطاب سے خارج ہے، الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (البقرہ: 282) (اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائیں جائیں۔) پس اس میں بھی غلام داخل نہیں اور جس طرح بچے کا نکلنا اس قول سے جائز ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ حالانکہ وہ بھی النَّاسِ میں سے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بچے سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ اور عورت اس ارشاد سے خارج ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ حالانکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اسم ایمان شامل ہے اور اسی طرح مذکورہ خطاب سے غلام بھی خارج ہے اور یہ حجاز، عراق، شام اور افریقہ کے فقہاء کا قول ہے اور ان کی مثل سے ان پر تاویل کتاب کی تحریف جائز نہیں۔

اور اگر کہا جائے: جب غلام مسجد حرام میں حاضر ہو اور اس کا آقا اسے اجازت بھی دے دے تو پھر حج کیونکر لازم نہ ہوگا؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال اجماع پر ہے اور بسا اوقات وہ اس کی علت بیان نہیں کرتا لیکن جب یہ حکم علی الا جماع ثابت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2030، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے تو ہم نے اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا کہ غلامی کی حالت میں اس کے حج کو حج اسلام شمار نہ کیا جائے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی بچے نے حج کیا پھر اس نے حج کی استطاعت پالی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی غلام نے حج کیا پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے۔'' ابن عربی نے کہا ہے: ''ہمارے بعض علماء نے نرمی سے کام لیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ غلام پر حج ثابت (لازم) نہیں اگرچہ آقا اسے اجازت دے دے کیونکہ وہ فی الاصل کافر تھا اور کافر کا حج کسی شمار میں نہیں اور پھر جب اس پر غلامی کی ضرب ہمیشہ کے لئے لگادی گئی تو وہ حکم حج کا مخاطب ہی نہ رہا۔

یہ تین وجوہ سے فاسد ہے پس تم انہیں جان لو:

(۱) بلاشبہ ہمارے نزدیک کفار فروعات شرعیہ کے مخاطب ہیں اور اس بارے میں امام مالک کے قول میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) تمام عبادات نماز، روزہ وغیرہ اس پر لازم ہوتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ غلام ہے اور اگر وہ یہی فعل اپنی حالت کفر میں کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حج بھی انہیں کی مثل ہے۔

(۳) یہ کہ کفر اسلام کے سبب ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کا ختم ہونا بھی ثابت ہے۔ پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں معتمد علیہ آقا کے حقوق کا مقدم ہونا ہے۔ واللہ الموفق۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: **مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** اس میں مِنْ بدل بعض من الکل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے، یہ اکثر نحویوں کا قول ہے۔

اور کسائی نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ من حج البیت کے سبب محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ان یحج البیت من۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرط ہے اور استطاع محل جزم میں ہے اور جواب شرط محذوف ہے یعنی من استطاع الیہ سبیلا فعلیہ الحج۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ صرف ایک بار حج کرنا فرض ہے۔'' پھر عرض کی گئی! یہ سبیل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زادراہ اور سواری'' اور انہوں نے اسے حضرت انس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم سے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** بیان فرمایا کہ اس کے بارے پوچھا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اونٹ کی پشت پالے''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ اپنی جامع میں ذکر کی ہے اور کہا ہے: حدیث حسن۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ آدمی جب زاد

راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج واجب ہے۔ اور ابراہیم بن یزید خوزی مکی کی قوت حفظ کے بارے میں بعض اہل حدیث نے کلام کیا ہے(1) اور ان دونوں نے اسے وکیع سے اور دار قطنی نے سفیان بن سعید سے اسے نقل کیا ہے...... اور انہوں نے کہا کہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سی شے حج کو واجب کر دیتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زادراہ اور سواری پر قدرت'' عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاجی کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غبار آلود بالوں والا جس نے خوشبو کا استعمال ترک کر دیا ہو۔'' اور پھر ایک دوسرا کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: العَجّ والثَّجُّ۔ وکیع نے کہا ہے: عج سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور ثج سے مراد قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے، یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ زادراہ اور سواری پر قادر ہونا حج واجب ہونے کے لئے شرط ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطا، اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی، حضرت ثوری، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور حضرت ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنایا ہے اور اسی کی مثل عبدوس نے سحنون سے ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: استطاعت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کے ساتھ قدرت رکھتا ہو اور وہ اتنا مال پاتا ہو جو اسے حج کے لئے پہنچا سکے گا۔ اور دوسری یہ ہے کہ وہ اپنے بدن میں کمزور ہو وہ اپنی سواری پر ثابت نہ رہ سکتا ہو اور وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی اطاعت و پیروی کرتا ہو (اس میں کہ) جب وہ اسے حکم دے کہ وہ اس کی جانب سے اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے حج کرے۔ (یعنی اپنی جانب سے کسی دوسرے کو حج پر بھیج سکتا ہو)

جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ رہا وہ جو اپنے بدن کے ساتھ استطاعت اور قدرت رکھتا ہے تو اس پر کتاب اللہ کے اس ارشاد کے ساتھ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا حج فرض لازم ہوتا ہے اور جو استطاعت بالمال رکھتا ہے تو اس پر سنت کے مطابق حج فرض لازم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث خثعمیہ آگے آرہی ہے۔

اور مستطیع بنفسہ سے مراد وہ قوی اور طاقتور آدمی ہے جسے سواری پر سوار ہونے کی مشقت کے بغیر کوئی مشقت لاحق نہ ہو، کیونکہ یہ آدمی جب زادراہ اور سواری کا مالک ہو تو اس کی ذات پر فرض حج لازم ہو جاتا ہے اور بلاشبہ زادراہ اور سواری دونوں کے نہ ہونے یا ان میں سے ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، پس اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہو تو وہ زادراہ پالے یا راستے میں زادراہ کمانے پر قادر ہو اپنے کاروبار اور پیشہ سے مثلاً نگینے اور منکے بیچنا اور حجامۃ (پچھ لگانا) یا اسی طرح کا کوئی کام، تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پیدل حج کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ امام شافعی نے کہا ہے: مرد عورت کے مقابلہ میں کم معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ زیادہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اور یہ حکم ان کے نزدیک بطریق

1۔ ابن ماجہ، باب مایوجب الحج، حدیث نمبر 2886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استحباب ہے نہ کہ بطریق وجوب پس اگر وہ راستے میں لوگوں سے مانگنے کے سبب زادراہ پر قادر ہو تو اس کے لئے حج کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بوجھ اور بھاری ہو جائے گا۔

اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ چلنے پر قادر ہو اور زادراہ پالے تو اس پر حج کرنا فرض ہے اور اگر وہ سواری کا مالک نہ ہو، البتہ وہ راستے میں چلنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے غور وفکر کی جائے گی اور اگر وہ زادراہ کا مالک ہو تو اس پر فرض حج کی ادائیگی واجب ہے اور اگر وہ زادراہ کا مالک نہ ہو لیکن وہ راستے میں اپنی حاجت کے مطابق کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے بھی غور وفکر کی جائے گی اور اگر وہ ایسے اہل مروت میں سے ہو جو بذات خود کمائی نہیں کر سکتے تو اس پر واجب نہ ہوگا اور اگر وہ ان میں سے ہو جو تجارت یا کسی کاروبار کے ذریعہ اپنی کفایت اور ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس پر فرض حج لازم ہے اور اسی طرح اگر اس کی عادت لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اس پر بھی فرض حج لازم ہے۔

اور اسی طرح امام مالک نے چلنے کی طاقت رکھنے والے پر حج کو واجب کیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ زادراہ اور سواری نہ بھی ہو۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اگر وہ جوان، طاقتور اور صحت مند ہو اور اس کا مال نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کھانے کے عوض اپنے آپ کو اجرت پر دے دے یا اپنے کسی بیٹے کو یہاں تک کہ وہ اپنا حج پورا کر لے۔

تو حضرت مقاتل نے انہیں کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل چل کر آئیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر ان میں سے کسی کی مکہ مکرمہ میں میراث ہو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بلکہ وہ تو اس کی طرف چلے گا اگرچہ سرین کے بل گھسٹ کر ہی آنا پڑے، اسی طرح اس پر حج بھی واجب ہوگا۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا اس میں رِجَالًا بمعنی مشاۃً ہے یعنی پیدل چلتے ہوئے۔

انہوں نے کہا ہے: کیونکہ فرائض اعیان میں سے حج عبادات بدنیہ میں سے ہے، لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرائط میں سے نہ زادراہ ہو اور نہ ہی سواری ہو جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔

انہوں نے کہا: اگر زادراہ اور سواری کے بارے خوزی کی حدیث صحیح ہے تو ہم نے اسے عوام الناس پر محمول کیا ہے اور ان میں سے اکثر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے ہیں..... اور مطلق کلام کو غالب احوال پر محمول کرنا شریعت میں بہت زیادہ ہے اور کلام عرب اور اس کے اشعار میں وافر ہے۔

ابن وہب، ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں لوگ اپنی طاقت اپنی سہولت اور اپنی مضبوطی کی مقدار پر ہیں۔ اشہب نے مالک کو کہا: کیا وہ زادراہ اور سواری ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں قسم بخدا، وہ نہیں ہے مگر لوگوں کی طاقت کی مقدار پر، کبھی آدمی زادراہ اور سواری پاتا ہے لیکن وہ چلنے پر قدرت نہیں رکھتا اور دوسرا پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جب استطاعت پائی جائے اور حج کا فرض متوجہ ہو تو کبھی ایسا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جو حج سے روک

دیتا ہے، مثلاً قرض خواہ اسے نکلنے سے روک دے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے۔ اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کے بچے ہوں اس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس پر حج لازم نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے لئے اتنا نفقہ ہو جو اس کے جانے سے لے کر واپس لوٹنے تک غائب رہنے کی مدت کے لئے کافی ہو، کیونکہ اہل وعیال کا یہ خرچہ تو علی الفور فرض ہے اور حج علی التراخی فرض ہے، پس عیال کو مقدم کرنا اولیٰ ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کے لئے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور اسی طرح والدین ہیں آدمی ان پر ہلاکت اور مصیبت لانے اور ان کی مہربانیوں اور شفقتوں کا عوض اور بدلہ نہ دینے سے خوفزدہ رہتا ہے، پس اس کے لئے حج کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر وہ اسے شوق ومحبت اور وحشت کی وجہ سے روک لیں تو اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

اور عورت کو اس کا خاوند روک سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ روکنا جائز ہے، بالخصوص جب ہم نے یہ کہا ہے کہ حج بالفور لازم نہیں ہوتا۔ اور سمندر اس کے وجوب کے مانع نہیں ہوتا جبکہ غالب گمان سلامتی کا ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ جانتا ہو کہ اس کا سر نہیں چکرائے گا۔ اور اگر اس پر غالب گمان ہلاکت یا سر چکرانے کا ہو یہاں تک کہ وہ نماز بھی معطل کر دے تو پھر نہیں۔ اور اگر وہ سواروں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کے سبب سجدہ کرنے کی جگہ نہ پائے تو امام مالک نے کہا ہے: جب وہ رکوع وسجود کی استطاعت نہ رکھے مگر اپنے بھائی کی پشت پر تو پھر وہ اس پر سوار نہ ہوگا۔ پھر کہا: کیا وہ وہاں سوار ہو سکتا ہے جہاں وہ نماز نہ پڑھ سکے؟ اس کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے جو نماز کو ترک کر دے۔ اور حج ساقط ہو جاتا ہے جب راستے میں ایسا دشمن ہو جو جانوں کو ضائع کرنے کا سبب ہو یا اموال کو لوٹتا ہو جبکہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے ساتھ دھمکائے یا وہ کسی برباد اور ہلاک کرنے والی مقدار کے ساتھ دھمکائے اور اگر دھمکی ہلاک وبرباد کرنے کی نہ ہو تو حج کے ساقط ہونے میں اختلاف ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا اور حج کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور مانگنے والے پر حج واجب ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی عادت ہو اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پالے گا جو اسے عطا کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر واجب نہ ہوگا، اس بنا پر کہ اس میں استطاعت کی رعایت لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب موانع زائل ہو جائیں اور اس کے پاس دراہم ودنانیر میں سے ایسی کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو اور اس کے پاس سامان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لئے اپنے سامان میں سے وہ بیچ دے جو اس حال میں بیچا جا سکتا ہے جب اس پر دین اور قرض ہو۔ اور ابن القاسم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مشکیزہ ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ نہ ہو، کیا وہ حج اسلام کے لئے اسے بیچ دے گا اور اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا درآنحالیکہ ان کے لئے کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ اس پر ہے اور وہ اپنی اولاد کو صدقہ میں چھوڑ دے گا۔ لیکن صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کے لئے گناہ کے اعتبار سے یہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے مذہب سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حج لازم نہیں ہوتا مگر

اس کے لئے جس کے پاس اتنے اخراجات موجود ہوں جو جانے سے لے کر لوٹنے تک کافی ہوں۔ آپ نے یہ الاملاء میں کہا ہے: اگر چہ اس کے اہل و عیال نہ ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: رجوع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر اپنے شہر کے قیام کو ترک کرنے میں کوئی بڑی مشقت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ اس کے اہل ہیں اور نہ کوئی عیال اور ہر شہر (ملک) اس کے لئے وطن ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ انسان اپنے وطن سے جدائی کے سبب اسی طرح وحشت سی محسوس کرتا ہے جس طرح وہ اپنے گھر والوں کے فراق میں مضطرب رہتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ باکرہ عورت جب زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اسے اس کے شہر سے جلاوطن کر دیا جاتا ہے چاہے وہاں اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

امام شافعی نے ''الام'' میں کہا ہے: جب آدمی کا گھر اور خادم ہو اور اس کے پاس اپنے گھر والوں کے لئے اتنا خرچہ موجود ہو جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کافی ہو جائے تو اس پر حج لازم ہوگا۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ اعتبار کیا ہے کہ حج کا مال خادم اور گھر سے فالتو اور زائد ہو، کیونکہ آپ نے اسے گھر والوں کے نفقہ پر مقدم کیا ہے، گویا کہ آپ نے کہا ہے: ان تمام کے بعد (اس کے پاس حج کا مال ہو)۔

اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس پر لازم ہے کہ گھر اور خادم فروخت کر دے اور اپنے گھر والوں کے لئے گھر اور خادم کرائے پر لے اور اگر اس کے پاس ایسا سامان ہو جس کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہو اور اس کا نفع علی الدوام اس کی ذاتی اور اہل و عیال کی کفایت کی مقدار ہو اور جب وہ اصل مال سے کچھ خرچ کر دے تو اس کا نفع مختل ہو جائے اور وہ اس کی حاجت و ضرورت کے لئے کافی نہ رہے، تو کیا اصل مال سے اس پر حج لازم ہوگا یا نہیں؟

اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح اور مشہور ہے، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اس کی زمین ہو اس کا غلہ اسے کافی ہو رہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حج میں اصل زمین فروخت کر دے، پس اسی طرح سامان بھی ہے اور ابن شریح نے کہا ہے: وہ اس پر لازم نہ ہوگا اور وہ سامان کو باقی رکھے گا اور اس کے اصل سے حج نہیں کرے گا، کیونکہ اس پر حج اس مال سے واجب ہوتا ہے جو اس کی کفایت اور حاجت سے فالتو ہو۔ پس یہ گفتگو استطاعت بالبدن والمال کے بارے میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مریض اور معضوب (جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو) اور العضب کا معنی کاٹنا ہوتا ہے اور اسی سے تلوار کا نام عضب رکھا گیا ہے، گویا کہ جو اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ وہ سواری کو نہ مضبوطی سے تھامنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اس پر مضبوطی سے بیٹھ سکتا ہو تو وہ اسی کی طرح ہے جس کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں، جبکہ وہ کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو، علماء نے ان دونوں کے حکم میں اختلاف کیا ہے اپنے اس اجماع کے بعد کہ حج کے لئے چلنا ان دونوں پر لازم نہیں، کیونکہ حج اللہ تعالیٰ نے قدرت رکھنے والے پر فرض کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور مریض اور معضوب دونوں میں استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: جب آدمی معضوب ہو تو اس سے حج کا فریضہ بالکل ساقط ہو جاتا ہے، چاہے وہ اس پر قادر ہو جو اس کی طرف سے مال کے عوض یا بغیر مال کے حج کر سکتا ہو اس پر حج فرض لازم نہ ہوگا۔ اور اگر اس پر حج واجب ہو گیا پھر اس کا

کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور وہ اپاہج ہو گیا تو اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور یہ جائز نہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی اس کی طرف سے حج کرے، بلکہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جائے اور اس کے ترکہ کے تیسرے حصہ سے حج کیا جائے تو یہ نفل ہوگا۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ پس اس میں یہ خبر ہے کہ اس کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس نے خود کوشش کی۔

پس جس نے کہا ہے: اس کے لئے اس کے سوا کسی اور نے سعی کی ہے تو اس نے ظاہر آیت کا خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ کے مطابق یہ استطاعت رکھنے والا نہیں ہے، کیونکہ حج سے مراد مکلف آدمی کا بذات خود بیت اللہ شریف کا قصد کرنا ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور اس سے عاجز ہونے کے ساتھ اس میں نیابت درست نہیں جیسا کہ نماز میں (نیابت درست نہیں ہوتی) اور محمد بن منکدر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ایک حج کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا (ایک) مرنے والے کو (دوسرا) اس کی طرف سے حج کرنے والے کو اور (تیسرا) اسے بھیجنے والے کو" اسے الطبرانی القاسم سلیمان بن احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح سند بیان کی ہے حدثنا عمرو بن حصین السدوسی قال حدثنا ابو معشر عن محمد بن المنکدر۔ اور آگے انہوں نے اسے بیان کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو معشر کا نام نجیح ہے اور وہ ان کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اپاہج مریض وہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو اور شیخ کبیر جو ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی بات ماننے اور پیروی کرنے کے لئے تیار ہو جب وہ اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دے تو وہ بھی من وجہ استطاعت رکھنے والا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اتنے مال پر قادر ہو کہ وہ اس کے عوض ایسے آدمی کو اجرت پر لے سکے جو اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ وہ اس پر حج کا فریضہ لازم کر رہا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے شیخ کبیر (انتہائی بوڑھا آدمی) کو فرمایا جو حج نہ کر سکے وہ ایک آدمی کو تیار کرے جو اس کی طرف سے حج کرے گا اور یہی موقف ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ابن مبارک، احمد اور اسحاق نے اختیار کیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو طاعت و نیابت اس کے لئے پیش کرے اور وہ اس کی طرف سے حج کرے، پس امام شافعی، امام احمد اور ابن راہویہ کے نزدیک اس پر بھی حج لازم ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: صرف طاعت و پیروی پیش کرنے کے ساتھ کسی حال میں حج لازم نہیں ہوگا۔

امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ بنی خثعم کی ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ حج اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر فرض ہے میں نے اپنے باپ کو انتہائی بوڑھا پایا ہے وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' اور یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا (1)۔ اور ایک روایت میں ہے: وہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اونٹ کی پیٹھ پر سکون سے بیٹھ سکے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے (2)''۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنا پر حج کو واجب قرار دیا کہ اس کی بیٹی نے اس کی اطاعت و پیروی کی اور اس نے اپنا آپ اس کے لئے پیش کیا کہ وہ اس کی طرف سے حج کرے گی۔ تو جب بیٹی کی پیروی کے سبب اس پر حج واجب ہے تو پھر بدرجہ اولیٰ اتنے مال پر قادر ہونے کی صورت میں حج واجب ہوگا جس کے عوض وہ کسی کو اجرت پر لے سکتا ہے۔

پھر اگر وہ طاعت کے بغیر مال اس کے لئے خرچ کرے تو صحیح یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا اس کے لئے لازم نہیں ہے اور اس کے ساتھ حج کرنا اس کی اپنی طرف سے ہوگا اور وہ اس کے لئے مال خرچ کرنے کے سبب مستطیع شمار نہ ہوگا۔

اور ہمارے علماء نے کہا ہے: خثعمیہ کی حدیث سے مقصود (حج کو) واجب کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کے دینی اور دنیوی مصالح کے بارے غور و فکر اور طبعاً اور شرعاً ان کے لئے جانب منفعت پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کے اپنے والد کے بارے میں خیر اور نیکی کے جذبات، ظاہری فرمانبرداری، رغبت صادقہ اور اسے نیکی اور ثواب پہنچانے کی حرص کو دیکھا اور یہ کہ وہ اس کے حج کی برکت سے محروم رہنے پر اظہار تاسف کر رہی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس طرح جواب دیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری عورت کو فرمایا جس نے یہ عرض کی: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئی کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر، تیری کیا رائے ہے اگر تیری ماں پر قرض ہوتا کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں (3)۔ تو اس میں جو کچھ ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ احسانات اور مردوں کو نیکی اور خیرات کا ثواب پہنچانے کے باب سے ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فعل حج کو قرضے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے اور اس پر قرض ہو تو اس کے ولی پر اسے اپنے مال سے ادا کرنا واجب نہیں اور اگر اس نے بطور احسان ادا کر دیا تو اس کی طرف سے قرض ادا ہو جائے گا۔

اور اس میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ اس حدیث میں حج اس کے باپ پر فرض نہیں جس کی تصریح اس عورت نے اپنے اس قول سے کی ہے لا یستطیع اور جو استطاعت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں ہوتا ...... اور یہ تصریح وجوب کی نفی اور فرض کے منع کے بارے میں ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا کہ جس کی حدیث کی ابتدا میں بالیقین نفی ہو وہی حدیث کے آخر میں ظناً ثابت ہو۔

اسے آپ کا یہ قول ثابت کر رہا ہے: فدین اللہ احق ان یقضی (پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے) کیونکہ یہ بالاجماع اپنے ظاہر پر نہیں ہے، کیونکہ بلاشبہ بندے کا قرض ادائیگی اور قضا کے زیادہ قریب ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ابن ماجہ، باب الحج عن المیت، حدیث 2899، ایضاً
3۔ صحیح بخاری، باب الحج والنذور ... الخ، حدیث 1720، ایضاً

بالاجماع اسی سے ابتدا ہوتی ہے کیونکہ بندہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ مستغنی ہے۔

ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک خثعمیہ کی حدیث اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں اضطراب ہے اور ابن وہب اور ابو مصعب نے کہا ہے: یہ صرف اولاد کے حق میں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ ایسے بوڑھے کے بارے میں ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہ ہو اور وہ حج نہ کر سکے، حج کی رخصت کے لئے ہے اور اس آدمی کے بارے میں رخصت ہے جو فوت ہو گیا اور وہ حج نہ کر سکا، کہ اس کی طرف سے اس کا بیٹا حج کرے اگر چہ وہ اسے اس بارے میں وصیت نہ بھی کرے اور یہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پس یہ معضوب اور اس کے ہم مثل کے بارے کلام ہے۔ اور خثعمیہ کی حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے اور یہ حسن کے اس قول کی تردید کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی جانب سے حج کرنا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب مکلف کے پاس ایسی خوراک نہ ہو جسے وہ راستے میں استعمال کرے گا تو اس پر حج لازم نہیں۔ اور اگر اسے کوئی اجنبی ایسا مال ہبہ کرے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو تو اسے قبول کرنا بالاجماع اس پر لازم نہیں، کیونکہ اس میں احسان کا احساس اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی آدمی نے اپنے باپ کو مال ہبہ کیا، تو امام شافعیؒ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ آدمی کا بیٹا اس کی اپنی کمائی ہے، اس میں اس پر کوئی احسان نہیں ہے۔

اور امام مالک اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس پر لازم نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرمت ابوت کا ساقط ہونا ہے، جب کہ کہا یہ جاتا ہے قد جزاہ و قد وفاہ تحقیق اس نے اسے جزا دی اور اس نے اس کے ساتھ وفا کی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کوئی فرض حج کا انکار کرے اور وہ اسے واجب نہ جانے۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: بے شک وہ جس نے حج کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے ترک کر دیا تو وہ کافر ہے۔

اور ترمذی نے حارث سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی مالک ہو زاد راہ کا اور ایسی سواری کا جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر (کوئی حرج) نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اور وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرما رہا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اس سند کے سوا نہیں پہچانتے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول راوی ہے اور حارث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے (1)'' اور اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور عبد خیر بن یزید نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں پر

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج، حدیث 740، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حج فرض کیا ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جس نے نہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ جس حال پر چاہے مر جائے اگر چاہے تو وہ یہودی یا نصرانی ہو یا مجوسی مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو بیمار ہو یا جابر سلطان (کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو) خبردار! جان لو نہ اس کے لئے میری شفاعت میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا۔'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے حج تک پہنچا سکتا ہو اور اس نے حج نہ کیا یا اس کے پاس اتنا مال ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی تو وہ موت کے وقت رجعت (واپسی کا سوال کرے گا۔'' تو کہا گیا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما بے شک ہم تو اسے کافروں کے لئے دیکھتے رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے تم پر قرآن کریم پڑھتا ہوں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (1) (المنافقون) (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔ اور خرچ کر لو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آ جائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔)

حسن بن صالح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: پس میں زکوٰۃ دوں گا اور میں حج کروں گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کسی آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: من حج لایرجو ثوابا او جلس لا یخاف عقابا فقد کفر بہ (جس نے حج کیا اور ثواب کی امید نہ رکھی یا بیٹھا رہا اور سزا کا خوف نہ رکھا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا۔)

اور حضرت قتادہ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں لوگوں کو شہروں کی طرف بھیجوں اور وہ ایسے آدمی پر نظر رکھیں جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا پس وہ اس پر جزیہ لگا دیں، پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۸ قُلْ

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المنافقین، حدیث 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

''آپ فرمایئے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ آپ فرمایئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی (اے اہل کتاب!) تم کیونکر اللہ تعالیٰ کے دین سے پھرتے ہو۔ مَنْ اٰمَنَ (اسے جو ایمان لا چکا) حسن نے تُصِدون تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (یعنی) صَدَّ اور اَصَدَّ، مثلاً صلّ اللحمُ اور أَصَلَّ جب گوشت بدبودار ہو جائے، اور خَتم اور اَختَمَ بھی ہے جب تغیر اور تبدیلی آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم اس کے لئے چاہتے ہو (یعنی تَبْغُوْنَهَا بمعنی تطلبون لها ہے) پھر اس سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ وَاِذَا كَالُوْهُمْ میں کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغیت له كذا یعنی طلبته میں نے اسے طلب کیا، چاہا۔ اور اُبغيته كذا یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ اور العوج کا معنی جھکنا اور ٹیڑھا ہونا ہے دین میں، قول میں اور عمل میں اور ہر وہ جو سیدھے راستے سے نکل جائے۔ (یہ معنی تب ہے جب عین مکسور ہو۔) اور اگر عین مفتوح ہو تو پھر معنی ہے دیوار کا ٹیڑھا ہونا اور ہر کھڑے ہونے والے شخص کا ٹیڑھا ہونا، یہ ابوعبیدہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد يتبعون الداعي لاعوج له کا معنی ہے وہ اس کی دعوت سے ٹیڑھا ہونے کی قدرت نہیں رکھتے اور عاج بالمكان و عوّج کا معنی ہے (سیدھا) کھڑا ہوا اور ٹھہرا۔ اور العائج ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں۔

شاعر کا قول ہے:

هل انتم عائجون بنا لَعَنّا نرى العَرَصاتِ أو اثر الخِيامِ

اس میں عائجون ٹھہرنے والے کے معنی میں ہے۔

اور الرجل الأعوج کا معنی ہے بداخلاق آدمی اور وہ جس کا ٹیڑھا پن واضح اور ظاہر ہو اور العُوج من الخيل سے مراد وہ گھوڑ ہے جس کی ٹانگوں میں ٹیڑھا پن اور دوری ہو۔ اور اعوجية من الخيل کی نسبت ایسے گھوڑے کی طرف کی جاتی ہے جو زما جاہلیت میں (تیز رفتار اور) دوسروں پر سبقت لے جانے والا ہوتا۔

اور کہا جاتا ہے: فرس مُحَنَّب یعنی جب گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بغیر پھیلاؤ کے دوری ہو اور یہ مدح ا تعریف ہے اور کہا جاتا ہے: الحَنَب یعنی دونوں پنڈلیوں میں ٹیڑھا پن ہونا۔ خلیل نے کہا ہے: التَّحْنيب جو شدت (ا قوت) سے متصف ہے اور یہ اعوجاج (ٹیڑھا پن) نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ حالانکہ تم عقلمند ہو (اور سمجھ بوجھ رکھتے ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے: حالانکہ تم تورات میں ا

لکھے ہوئے پر گواہ ہو کہ الله تعالیٰ کا وہ دین جس کے بغیر کوئی دین قبول نہ کیا جائے گا وہ اسلام ہے، کیونکہ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت (اور اوصاف کا بیان) ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں۔''

یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اوس اور خزرج کے درمیان اس فتنہ کو از سر نو اٹھانے کا ارادہ کیا جو ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ختم ہو چکا تھا پس وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا اور انہیں شعر سنائے دونوں قبیلوں میں سے ایک نے اسے اپنی جنگ کے بارے کہا، تو دوسرے قبیلے نے کہا: تحقیق ہمارے شاعر نے فلاں فلاں دن کہا، تو گویا اس طرح ان میں اختلاف اور شدت داخل ہوگئی، تو انہوں نے کہا: آؤ ہم جنگ کو پھر سے اسی طرح شروع کر دیں جس طرح پہلے تھی۔ تو انہوں نے آواز دی: اے آل اوس۔ اور دوسروں نے پکارا: اے آل خزرج، پس وہ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور لڑنے کے لئے صفیں باندھ لیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور خوب بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔ پس جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی تو وہ آپ کے لئے خاموش ہو گئے اور توجہ سے سننے لگے اور جب آپ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے اور رونے لگے، یہ حضرت عکرمہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور جس نے ایسا کیا وہ شاس بن قیس یہودی تھا، اس نے اوس اور خزرج کے خلاف سازش کی اور انہیں وہ جنگیں یاد دلانے لگا جو ان کے درمیان واقع ہوئیں تھیں اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور آپ نے انہیں نصیحت فرمائی، تو قوم نے پہچان لیا کہ یہ شیطان کا کچوکا ہے اور ان کے دشمن کا مکر ہے۔ پس انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے، پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ارشاد سنتے ہوئے اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا۔ مراد اوس و خزرج ہیں۔ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یعنی شاس اور اس کے ساتھی۔ (اگر تم کہا مانو گے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا) يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں)

حضرت جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کوئی ہماری طرف آنے والا نہ تھا جو ہمارے نزدیک رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، پس آپ نے ہماری طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ہم رک گئے، باز آ گئے اور الله تعالیٰ نے ہمارے معاملات کی اصلاح فرما دی۔ پس ہمارے نزدیک رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ کوئی شخص نہ تھا، سو میں نے

کوئی دن نہیں دیکھا جو اس دن کے اول حصہ سے زیادہ قبیح اور وحشت ناک ہو اور اس کے آخری حصہ سے زیادہ حسین اور پسندیدہ ہو۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۰۱

"اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگے حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ (کے دامن) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک۔"

اللہ تعالیٰ نے بطور تعجب یہ ارشاد فرمایا: وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم ہے وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ اور تم میں اس کا رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: زمانہ جاہلیت میں قبیلہ اوس اور خزرج کے درمیان جنگ و جدال جاری رہا تو انہوں نے اسی کا ذکر کیا جو ان کے درمیان ہوتا تھا، نتیجتاً ان میں سے بعض نے بعض پر تلواریں سونت لیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لایا گیا اور اس کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کیا گیا تو آپ ان کی طرف تشریف لے گئے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۰۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۰۲ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

اور اس آیت میں وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں سے جو بھی ان میں ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے کے قائم مقام ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کو ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں تشریف فرما تھے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خطاب ساری امت کو ہو، کیونکہ آپ کے آثار و علامات اور وہ قرآن کریم جو ہمیں عطا کیا گیا وہ ہم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ ہی ہے اگرچہ ہم نے آپ کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس آیت میں دو واضح علم ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا اور ایک نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پس نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو گزر گئے اور رہی کتاب اللہ تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت اور نعمت کے طور پر ان کے درمیان باقی رکھا اور اس میں اس کے حلال و حرام سے متعلقہ احکام اور طاعت و معصیت سبھی کا ذکر ہے۔ وَ كَيْفَ یہ محل نصب میں ہے اور التقائے ساکنین کی وجہ سے خلیل اور سیبویہ کے نزدیک فا کو فتحہ دیا گیا ہے اور فتحہ کی وجہ یہ ہے کیونکہ فا کا ماقبل یا ہے اور یا اور کسرہ کا جمع ہونا باعث ثقل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی طاعت کو مضبوطی سے تھامتا اور پکڑتا ہے۔ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو اسے ضرور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے اور اسے اس کی توفیق دی جاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: أعصم به و اعتصم اور تمسك و استمسك جب وہ اس کے ساتھ چمٹ جائے اور غیر کو چھوڑ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور اعتصمت فلانا (یعنی) میں نے اس کے لئے وہ تیار کیا جسے وہ مضبوطی سے پکڑ سکتا ہے اور ہر وہ جو کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو وہ مُعصم اور مُعْتصم ہے۔ اور جو کسی شے کو روکنے والا ہو تو وہ عاصم کہلاتا ہے۔

جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

أنا ابن العاصِمينَ بنی تميم اذا ما اعظَمُ الحدثانِ نابا

اس میں عاصمین (روکنے والے) کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

يظلّ من خوفه الملاح معتصِما بالخَيزُرانة بعد الأين والنَّجَد

اس میں معتصِم مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فَأشرط فيها نفسه و هو مُتعصِمٌ وألقى بأسباب له و توكَّلا

پس اس نے اس میں اپنی جان کو پیش کر دیا حالانکہ وہ اسے روکنے اور بچانے والا تھا اور اس نے اسباب (وسائل) پھینک دیئے اور توکل اپنالیا۔

اور عصمه الطعام: یعنی کھانے نے اس سے بھوک کو دور کر دیا، عرب کہتے ہیں: عصم فلاناً الطعامُ ای منعه من الجوع۔ پس اسی لئے انہوں نے سویق (ستو) کی کنیت ابو عاصم رکھی ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: عرب روٹی کو عاصم اور جابر کا نام دیتے ہیں۔

جیسا کہ شعر میں ہے:

فلاتلومينی و لُومی جابرًا فجابرٌ كلّفنی الهواجرا

پس تو مجھے ملامت نہ کر بلکہ تو روٹی کو ملامت کر پس روٹی نے ہی مجھے دوپہر کے وقت مشقت میں ڈال رکھا ہے۔

اور وہ اسے عامر کا نام بھی دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا:

ابو مالك يعتادنی بالظّهائر يجئ فيُلقى رحلَه عند عامر

بھوک کو دوپہر کے وقت میرے پاس آنے کی عادت ہے وہ آتی ہے اور روٹی کے پاس اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہے۔

ابو مالک بھوک کی کنیت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

امام بخاری (نحاس) نے مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حق تقاتہ ان یُطاع فلا یُعصیٰ وان یُذکر فلا یُنسیٰ وأن یَشکر فلا یُکفر (1) (حق تقاتہ کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اسے بھلایا نہ جائے اور شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر کون قادر ہوگا؟ اور یہ ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔) تو اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، یہ حضرت قتادہ، ربیع، اور ابن زید سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد گرامی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس آیت کا بیان ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ نسخ تب ہوتا ہے جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو اور جمع کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ نہیں ہے، البتہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم (ملامت کرنے والے کی ملامت) کی پرواہ نہ ہو۔ اور تم عدل و انصاف کو قائم کرو اگرچہ وہ تمہاری ذاتوں اور تمہارے بیٹوں کے خلاف ہی ہو۔

نحاس نے کہا ہے: جب بھی آیت میں مسلمانوں پر کسی واجب کا ذکر کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں تو اس میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔ اور قول باری تعالیٰ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے

1۔ ناسخ و منسوخ للنحاس، صفحہ 299؛ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 637

احسان سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچا لیا تمہیں اس (میں گرنے) سے۔ یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تا کہ تم ہدایت پر ثابت رہو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْتَصِمُوْا۔ العصمة کا معنی ہے المنعةُ (یعنی عزت اور قوت) اور اسی وجہ سے بَذْرَقه کو عِصمۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور بذرقه: قافلہ کی حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (یعنی محافظ ونگران) اور وہ یہ ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجے جو اس کی ان سے حفاظت کریں گے جو اسے اذیت اور تکلیف پہنچائیں گے۔ ابن خالویہ نے کہا ہے: البذرقه عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کلمہ ہے اور عربوں نے اسے عربی بنا لیا ہے، کہا جاتا ہے: بعث السلطان بذرقة مع القافلة (سلطان نے قافلہ کے ساتھ محافظ بھیجے۔)

اور لفظ الحَبْل مشترک ہے اور لغت میں اس کا اصلی معنی یہ ہے السبب الذی یوصل به الی البغیة والحاجة وہ سبب جس کے ذریعہ مقصد اور حاجت تک پہنچا جاتا ہے اور حبل کا معنی حبل العاتق (کندھے کا پٹھا) بھی ہے اور حبل سے مراد ریت کا ایک لمبا اور طویل قطعہ بھی ہے اور اسی معنی میں ایک حدیث ہے: و الله ما ترکت من حبل الا وقفت علیه، فهل لی من حج(1) (قسم بخدا میں نے کوئی ریت کا لمبا ٹکڑا نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا، تو کیا میرا حج ہو گیا؟)

اور حبل کا معنی رسی بھی ہے اور اس کا معنی عہد بھی ہے۔

اعشی نے کہا ہے:

وَاِذَا تُجَوِّزُهَا حِبَالُ قَبِیلَةٍ اَخَذَتْ مِنَ الْاُخْرٰی اِلَیْكَ حِبَالَهَا

اس میں حبل سے مراد امان اور پناہ ہے۔

اور حبل کا معنی مصیبت بھی ہے۔

کثیر نے کہا ہے:

فَلَا تَعْجَلِیْ یَا عَزُّ اَنْ تَتَفَهَّمِیْ بِنُصْحٍ اَتَی الْوَاشُوْنَ اَمْ بِحُبُوْلِ

اس میں حبول مصائب کے معنی میں ہے۔

اور حِبَالَةٌ کا معنی شکاری کا پھندا (اور جال) ہے۔ اور آیت میں سوائے عہد کے معنی کے کوئی معنی مراد نہیں ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حبل الله سے مراد قرآن کریم ہے اور اسے حضرت علی اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے(2) اور حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور ابو

1۔ ابن ماجہ، باب اتی عرفة قبل الفجر لیلة جمع، حدیث نمبر 3006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فضل القرآن، حدیث نمبر 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معاویہ نے هَجَری (مراد ابراہیم بن مسلم العبدی ہے) سے، انہوں نے ابوالاحوص سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ یہ قرآن ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔''

اور تقی بن مخلد نے اسی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حدثنا یحییٰ بن عبدالحمید حدثنا هشیم عن العوّام بن حوشب عن الشعبی عن عبداللہ بن مسعود وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا فرمایا: حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

اور آپ سے اور کئی دوسروں سے یہ کئی وجوہ سے مروی ہے اور تمام کا معنی باہم متقارب اور ایک دوسرے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ الفت و محبت کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور فرقت و جدائی سے منع فرما رہا ہے، کیونکہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت و اتفاق (باعث) نجات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے۔

اس نے کہا:

ان الجماعة حبل الله فاعتصموا منه بعروته الوثقى لمن دانا

اس میں حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تَفَرَّقُوْا یعنی تم اپنے دین میں جدا جدا نہ ہونا جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے ادیان میں جدا جدا ہو گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ مختلف اغراض اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلہ میں بھائی بھائی ہو جاؤ، تو وہ ان کے لئے باہمی قطع تعلقی اور باہمی عداوت و دشمنی سے ڈھال اور روکنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا مابعد ارشاد گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔

اور اس میں فروعات میں اختلاف کے حرام ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ وہ کوئی اختلاف نہیں، جبکہ اختلاف وہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا متعذر رہا اور رہا مسائل اجتہادیہ کا حکم، تو ان میں اختلاف فرائض اور معانی شرع کی باریکیاں اور لطائف نکالنے اور مستنبط کرنے کے سبب سے ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش آنے والے حوادث و واقعات کے احکام میں مسلسل اختلاف بھی کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے محبت اور الفت سے پیش آتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو جھگڑے اور فساد کا سبب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی اکہتر فرقوں میں یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اسی کی مثل (فرقوں میں تقسیم ہوئے) اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔''

ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔(1)

1۔ ابن ماجہ، باب افتراق الامم، حدیث نمبر 3980، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے (1)۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً میری امت پر بالکل برابر برابر وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی اپنی ماں کے پاس اعلانیہ (برائی کے لئے) آتا تھا تو یقیناً میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو اسی طرح کا فعل کرے گا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک گروہ کے وہ تمام کے تمام جہنم میں ہوں گے'' صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا انا علیہ و اصحابی جو اس (دین) پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ انہوں نے اسے عبداللہ بن زیاد الافریقی کی حدیث سے عبداللہ بن یزید عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے اس سند کے سوا سے نہیں پہچانتے۔ ابوعمر نے کہا ہے: عبداللہ افریقی ثقہ راوی ہے، اس کی قوم نے اس کی توثیق کی ہے اور انہوں نے اس کی تعریف کی ہے اور دوسروں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور ابوداؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! سنو تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور یہ ملت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور وہ الجماعۃ ہے۔ بلاشبہ عنقریب میری امت سے کچھ تجارتی گروہ نکلیں گے ان کے ساتھ خواہشات اس طرح ہوں گی جس طرح الکلب (باولا کتا کاٹے کی بیماری) اپنے مریض کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے بدن کی کوئی رگ اور روئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔'' (2)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ کے بارے میں اخلاص ہو، اس کی عبادت میں کوئی اور شریک نہ ہو، وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اور وہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جسے رسل علیہم السلام نے کر آئے اور انہوں نے اسے اپنے رب کی طرف سے پہنچایا اس سے پہلے کہ احادیث میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو اور اھواء وخواہشات میں اختلاف ہو اور اس کی تصدیق سب سے آخر میں نازل ہوئی کتاب اللہ میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنۡ تَابُوۡا فرمایا: پس اگر وہ بتوں اور ان کی عبادت کو چھوڑ دیں وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور دوسری آیت میں فرمایا: فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ (التوبہ: 11) (پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں۔)

انہوں نے اسے نصر بن علی جہضمی عن ابی احمد بن ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (3)

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: اگر کہا جائے یہ فرقے تو معروف ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم افتراق اور اصولی فرقوں کو

---

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ، حدیث نمبر 2565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، کتاب السنۃ، حدیث نمبر 3981، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ ابن ماجہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جانتے ہیں اور پھر فرقوں میں سے ہر گروہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اگرچہ ہم نے ان فرقوں کے اسماء اور ان کے مذاہب کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اصولی فرقوں میں سے یہ ہمارے لئے بالکل ظاہر ہیں حرورية، قدرية، جهمية، مرجئة، رافضة، اور جبرية۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: اصل گمراہ فرقے یہی چھ فرقے ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہے تو اس طرح بہتر فرقے ہو گئے۔

حرورية بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ازرقیہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو مومن نہیں جانتے۔ اور انہوں نے اہل قبلہ کو کافر قرار دیا سوائے ان کے جنہوں نے ان کے قول کو قبول کیا۔

(۲) اباضية: انہوں نے کہا ہے: جس نے ہمارے قول کو لے لیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اس سے اعراض کیا تو وہ منافق ہے۔

(۳) ثعلبية: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور نہ کوئی تقدیر بنائی۔

(۴) خازمية: انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے ایمان کیا ہے اور تمام مخلوق معذور ہے۔

(۵) خَلَفية: ان کا گمان ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس نے بھی جہاد ترک کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) کوزیہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مس کرے کیونکہ پاک چیز کو نجس سے نہیں پہچانا جا سکتا اور نہ کوئی اپنے ساتھ کسی کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے اور غسل کر لے۔

(۷) کنزیہ: انہوں نے کہا ہے: کوئی کسی کو یہ اختیار اور گنجائش نہ دے کہ وہ اپنا مال کسی کو دے دے، کیونکہ بسا اوقات وہ مستحق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے زمین میں جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اہل حق ظاہر ہو جائیں۔

(۸) شمراخیہ: انہوں نے کہا ہے: اجنبی عورتوں کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ خوشبودار پودے (پھول) ہیں۔

(۹) اخنسیہ: انہوں نے کہا ہے: میت کو اس کی موت کے بعد کوئی خیر و شر لاحق نہیں ہوتا۔

(۱۰) حکمیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے مخلوق کی طرف بلایا تو وہ کافر ہے۔

(۱۱) معتزلہ: انہوں نے کہا ہے: ہم پر حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا معاملہ مشتبہ ہے لہٰذا ہم دونوں فریقوں سے بری الذمہ ہیں۔

(۱۲) میمونیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے اہل محبت کی رضا کے بغیر کوئی امام نہیں ہو سکتا۔

اور قدریہ بھی بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

(۱) أحمرية: یہ وہ فرقہ ہے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عدل کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے امور کا مالک بنائے اور وہ ان کے اور ان کے گناہوں کے درمیان حائل رہے۔

(۲) ثنویہ: ان کا خیال ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔

(۳) معتزلہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور انہوں نے [صفات] ربوبیۃ کا انکار کیا ہے۔

(۴) کَیسانیہ: انہوں نے کہا ہے: ہم نہیں جانتے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے اور نہ ہم یہ

جانتے ہیں کہ کیا اس کے بعد لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا انہیں سزا دی جائے گی۔

(۵) شیطانیہ: ان کا کہنا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا ہے۔

(۶) شریکیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک کفر کے سوا تمام برائیاں مقدر ہیں۔

(۷) وھمیہ: انہوں نے کہا ہے: مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کے لئے کوئی ذات نہیں اور نہ ہی نیکی اور بدی کے لئے کوئی ذات ہے۔

(۸) زبریہ: انہوں نے کہا ہے: ہر کتاب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہے چاہے وہ ناسخ ہو یا منسوخ۔

(۹) مسعدیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۰) ناکثیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت توڑ دی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(۱۱) قاسطیہ: انہوں نے ابراہیم بن نظام کی اس کے اس قول میں اتباع اور پیروی کی ہے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ شے ہے تو وہ کافر ہے۔

اور جھمیہ بارہ فرقوں میں منقسم ہیں۔

(۱) معطلہ: انہوں نے خیال کیا ہے کہ ہر وہ شے جس پر انسان کا وہم واقع ہو سکتا ہے تو وہ مخلوق ہے اور یہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے تو وہ کافر ہے۔

(۲) مریسیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی اکثر صفات مخلوق ہیں۔

(۳) مکتزقہ: انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں موجود ہے۔

(۴) واردیہ: انہوں نے کہا ہے: وہ آتش جہنم میں داخل نہ ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جو اس میں داخل ہوا وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔

(۵) زنادقہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے رب ثابت کرے، کیونکہ حواس کے ادراک کے بغیر اثبات نہیں ہو سکتا اور جس کا ادراک نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۶) حرقیہ: انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ کافر کو ایک بار آگ جلا دے گی پھر وہ ہمیشہ جلا ہوا باقی رہے گا اور وہ آگ کی حرارت کو نہیں پائے گا۔

(۷) مخلوقیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔

(۸) فانیہ: ان کا گمان ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فناہ ہو جائیں گی اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ انہیں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

(۹) عبدیہ: انہوں نے رسل علیہم السلام کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حکماء تھے۔

(۱۰) واقفیہ: انہوں نے کہا: نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مخلوق ہے۔
(۱۱) قبریہ: یہ عذاب قبر اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔
(۱۲) لفظیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے۔

اور مرجئہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) تارکیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر کوئی فریضہ نہیں ہے سوائے اس کے ساتھ ایمان لانے کے، پس جو کوئی اس کے ساتھ ایمان لایا تو اسے چاہیے وہ جو چاہے کرے۔
(۲) سائبیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دیا ہے تا کہ وہ جو چاہیں کریں۔
(۳) راجیہ: انہوں نے کہا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے کو طائع اور گناہ کرنے والے کو عاصی نہیں کہا جائے گا کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کیا ہے۔
(۴) سالبیہ: انہوں نے کہا ہے کہ طاعت ایمان میں سے نہیں ہے۔
(۵) بہیشیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ایمان علم ہے اور جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے نہیں پہچان سکتا تو وہ کافر ہے۔
(۶) عملیہ: ان کا کہنا ہے کہ ایمان عمل کا نام ہے۔
(۷) منقوصیہ: انہوں نے کہا ہے: ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔
(۸) مستثنیہ: انہوں نے کہا ہے: استثناء ایمان میں سے ہے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہنا)
(۹) مشبّہ: انہوں نے کہا ہے: آنکھ آنکھ کی طرح ہے اور ہاتھ ہاتھ کی طرح ہے (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک)
(۱۰) حشویہ: انہوں نے کہا ہے: تمام احادیث کا حکم ایک ہے، پس ان کے نزدیک نفل کو ترک کرنے والا فرض کو چھوڑنے والے کی طرح ہے۔
(۱۱) ظاہریہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے قیاس کی نفی کی ہے۔
(۱۲) بدعیہ: وہ پہلا آدمی جس نے اس امت میں ان واقعات کا آغاز کیا۔

اور رافضیہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) علویہ: انہوں نے کہا کہ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا لیکن حضرت جبریل امین نے خطا کی (اور پیغام رسالت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچا دیا)۔
(۲) امریہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے کام میں شریک ہیں۔
(۳) شیعیہ: ان کا موقف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی ہیں اور آپ کے بعد آپ کے ولی ہیں۔ بلاشبہ امت نے دوسروں کی بیعت کے سبب کفر کیا ہے۔

(۴) اسحاقیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک نبوت یوم قیامت تک متصل ہے اور ہر وہ جو اہل بیت کا علم جانتا ہے تو وہ نبی ہے۔

(۵) ناؤوسیہ: انہوں نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ ساری امت سے افضل ہیں۔ اور جس کسی نے کسی غیر کو آپ پر فضیلت دی تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) امامیہ: انہوں نے کہا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی امام کے بغیر ہو، بلاشبہ امام کو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تعلیم دیتے ہیں۔ اور جب ایک فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو بدل دیتے ہیں۔

(۷) زیدیہ: انہوں نے کہا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد نمازوں میں ائمہ ہوں گے پس جب ان میں سے کوئی موجود ہو تو پھر کسی غیر کے پیچھے نماز جائز نہیں ان کے نیکوکار اور ان کے فاجر (سبھی برابر ہیں)

(۸) عباسیہ: ان کا گمان ہے کہ حضرت عباس کا کسی غیر کی نسبت خلافت کا حق زیادہ ہے۔

(۹) تناسخیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا رہتا ہے، پس جو کوئی محسن اور نیکوکار ہو اس کی روح نکلتی ہے اور ایسی مخلوق میں داخل ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی کے ساتھ سعادت اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔

(۱۰) رجعیہ: ان کا نظریہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب دنیا کی طرف لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

(۱۱) لاعنہ: یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاویہ، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم وغیرہ پر لعن کرتے ہیں۔

(۱۲) متربصہ: یہ زاہدوں کے لباس کی طرح لباس پہنتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک آدمی کھڑا کرتے ہیں جس کی طرف امر کی نسبت کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اس امت کا امام مہدی ہے اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیتے ہیں۔

پھر جبریہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) مضطریہ: انہوں نے کہا ہے: آدمی کا کوئی فعل (اور اختیار) نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

(۲) افعالیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے لئے افعال ہیں لیکن ہمارے پاس ان کے لئے کوئی استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم چوپاؤں کی مانند ہیں کہ ہم انہیں رسی ڈال کر ہانکتے اور چلاتے ہیں۔

(۳) مفروغیہ: انہوں نے کہا ہے: تمام اشیاء پیدا کر دی گئی ہیں اور اب کوئی شے پیدا نہیں کی جائے گی۔

(۴) نجاریہ: ان کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دے گا نہ کہ ان کے فعل پر۔

(۵) منانیہ: انہوں نے کہا ہے: تجھ پر اس کے بارے عمل کرنا لازم ہے جو تیرے دل میں کھٹکے پس تو وہ کام کر جس میں تجھے بھلائی اور خیر معلوم ہو۔

(۶) کسبیہ: انہوں نے کہا ہے: بندہ نہ ثواب طلب کرے گا نہ سزا۔

(۷) سابقیہ: ان کا کہنا ہے: جو چاہے وہ عمل کرے اور جو چاہے وہ عمل نہ کرے، کیونکہ سعید کو اس کے گناہ کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور شقی اور بد بخت کو اس کی نیکی کوئی فائدہ نہ دے گی۔

(۸) حِبّیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام پی لیا تو اس سے ارکان کی عبادت ساقط ہو گئی۔

(۹) خوفیہ: ان کا نظریہ ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اس کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس سے ڈرے، کیونکہ ایک دوست اپنے دوست سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

(۱۰) فکریہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے علم میں اضافہ کیا تو اس نے اپنی مقدار عبادت اس سے ساقط کر دی۔

(۱۱) خشبیہ: انہوں نے کہا ہے: دنیا بندوں کے درمیان برابر ہے، ان کے درمیان اس میں کوئی فضیلت نہیں جس کے لئے ان کے باپ آدم نے انہیں وارث بنایا ہے۔

(۱۲) منّیہ: انہوں نے کہا ہے: ہماری طرف سے فعل ہے اور ہمارے لئے استطاعت وقدرت ہے۔

وہ فرقے جو اس امت میں زائد ہوئے ان کا بیان عنقریب سورۃ الانعام کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک الحنفی کو کہا: اے حنفی، جماعت کو لازم پکڑ لے جماعت کو اختیار کر لے، کیونکہ سابقہ امتیں اپنے تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا**۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزیں پسند فرماتا ہے اور تین چیزیں ناپسند فرماتا ہے: وہ تمہارے لئے پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور یہ کہ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور وہ تمہارے لئے یہ تین چیزیں ناپسند کرتا ہے۔ قیل وقال، کثرۃ سوال اور مال کو ضائع کرنا''

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا واجب قرار دیا ہے اور اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرنا لازم قرار دیا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اعتقاداً اور عملاً کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے پر اجماع کریں اور یہی کلمات میں اتفاق لانے اور متفرقات کو منظم کرنے کا وہ سبب ہے جس کے ساتھ دنیا اور دین کے مصالح مکمل ہوتے ہیں اور (اسی میں) اختلاف سے بچاؤ اور سلامتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمع اور اکٹھا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس افتراق سے منع کیا ہے جو اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) میں موجود تھا۔ مکمل آیت کا یہی معنی ہے اور اس میں اس اجماع کے صحیح ہونے پر دلیل بھی موجود ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: **وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو یاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سب سے عظیم اور بڑی نعمت اسلام اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ہے، کیونکہ اس کے سبب عداوت اور نفرت وفرقت زائل ہو گئی اور باہمی محبت والفت پیدا ہو گئی۔ اور اس میں مراد قبیلہ اوس اور خزرج ہیں اور یہ آیت عام ہے۔

اور فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا کا معنی ہے کہ تم نعمت اسلام کے سبب دین میں بھائی بھائی ہو گئے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ''اَصْبَحْتُمْ'' ہے وہ بمعنی صِرْتُم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا۔ ای صار غَائِرًا۔

اخوان أخ کی جمع ہے اور اس کا نام أخا اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے بھائی کے مذہب کا قصد و ارادہ کرتا ہے، اور شفا ہر شے کی طرف اور اس کے کنارے کو کہتے ہیں۔ اور اسی طرح شفیر بھی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (التوبہ:109) (وادی کے کھوکھلے دھانے کے کنارے پر)

راجز نے کہا:

نحن حضرنا للحجيج سجلة نابتة فوق شفاها بقلة

اس میں بھی شفا طرف اور کنارہ کے معنی میں ہے۔

اور اشفی علی الشئی کا معنی ہے اشرف علیہ یعنی وہ اس پر جھانکا اور اسی سے ہے أشفی المریض علی الموت یعنی مریض موت پر جھانکنے لگا (مراد یہ ہے کہ وہ قریب الموت ہو گیا) اور مابقی منه الا شَفًا ای قلیل یعنی اس سے تھوڑا باقی رہ گیا۔ ابن السکیت نے کہا ہے: آدمی کے لئے اس کی موت کے وقت چاند کے لئے اس کی آخری راتوں میں اور سورج کے لئے اس کے غروب ہونے کے وقت کہا جاتا ہے: مابقی منه الاّ شفاً ای قلیل۔

عجاج نے کہا ہے:

و مَرْبَاء عالٍ لمن تشَرَفَا أشرفْته بلا شفيً أو بشَفَي

قولہ: بلا شفی۔ ای غابت الشمس یعنی مراد ہے سورج غروب ہو گیا او بشفی کا معنی ہے تحقیق اس سے تھوڑا سا باقی ہے۔ اور یہ لفظ ذوات الیاء (یائی) میں سے ہے اور اس میں ایک لغت یہ بھی ہے کہ یہ واوی ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: شفا اصل میں شَفَو ہے، اسی لئے اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس میں امالہ نہیں کیا جاتا۔ اور اخفش نے کہا ہے: جب اس میں امالہ جائز نہیں تو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ واوی کلمات میں سے ہے اور اس لئے بھی کہ امالہ یا کو واضح کرتا ہے اور اس کا تثنیہ شفوان ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ تمثیل ہے اس سے ان کا کفر سے ایمان کی طرف نکلنا مراد لیا جا رہا ہے۔

**وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝**

''ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں گفتگو اسی سورۃ میں گزر چکی ہے۔

اور مِّنْكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ حکم دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء ہوں اور تمام لوگ علماء

نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیان جنس کے لئے ہے اور معنی ہے چاہیے کہ تم تمام کے تمام اسی طرح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ انہیں معین کیا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ الآیۃ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔)

اور تمام لوگوں کو قدرت نہیں دی گئی اور ابن زبیر نے پڑھا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ويستعينون الله على ما اصابهم (اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں جو کچھ انہیں پہنچے) ابوبکر الانباری نے کہا ہے: یہ زیادتی ابن زبیر کی طرف سے تفسیر ہے اور یہ ان کا اپنا کلام ہے اس میں نقل کرنے والوں میں سے بعض نے غلطی کی ہے اور اس نے اسے الفاظ قرآن کے ساتھ ملا دیا ہے، جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس کی صحت پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو میرے باپ نے مجھے اس سند سے بیان کی ہے حدثنا [حسن] بن عرفة حدثنا وكيع عن أبي عاصم بن ابی عون عن صبیح انہوں نے کہا: میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس طرح پڑھتے ہوئے سنا: وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ويستعينون الله على ما اصابهم اور کوئی عقلمند اس میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس زیادتی کے قرآن میں سے ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے تھے، کیونکہ آپ نے اسے اپنے اس مصحف میں نہیں لکھا جو امام المسلمین ہے، بلکہ آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنے کے لئے اور ماقبل رب العالمین کے کلام کو موکد کرنے کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠٥

''اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے بہت بڑا۔''

جمہور مفسرین کے قول کے مطابق مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اس امت کے مبتدع (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) لوگ ہیں۔ اور ابوامامہ نے کہا ہے: وہ لوگ حروریہ ہیں، اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔ اور جابر بن عبداللہ نے کہا ہے: كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ جَآءَهُمُ جمع کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے اور جَآءَتْهُمُ جماعت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝١٠٦ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ۝١٠٧

''اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے اور کالے ہوں گے کئی منہ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے

گا) کہ کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد تو اب چکھو عذاب (کی اذیتیں) بوجہ اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ یعنی قیامت کے دن جب وہ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو مومنین کے چہرے روشن اور سفید ہوں گے اور کافروں کے منہ کالے ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا جب مومن اپنا نامہ عمل پڑھے گا اور اس میں اپنی نیکیاں دیکھے گا تو وہ انتہائی خوش ہوگا اور اس کا چہرہ چمک اٹھے گا اور جب کافر اور منافق اپنا نامہ عمل پڑھیں گے اور اس میں اپنی برائیاں اور گناہ دیکھیں گے تو ان کا چہرہ سیاہ کالا ہو جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک ایسا میزان کے پاس ہوگا کہ جب اس کی نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور جب (کافر) کے گناہ بھاری ہو جائیں گے تو اس کا منہ سیاہ ہو جائے گا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے وقت ہوگا وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۞ (یٰس)

اور کہا جاتا ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے معبود کے پاس جمع ہو جائیں، پس جب وہ اس تک پہنچیں گے تو پریشان اور غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، پس مومنین، اہل کتاب اور منافقین باقی رہ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں کو فرمائے گا: مَنْ رَّبُّکُمْ؟ تمہارا رب کون ہے؟ تو وہ عرض کریں گے: ربنا اللہ عزوجل ہمارا رب اللہ عزوجل ہے۔ تو وہ انہیں فرمائے گا: ''کیا تم اسے پہچان لو گے جب تم اسے دیکھو گے؟'' تو وہ عرض کریں گے: اس کی ذات پاک ہے! جب اس نے اعتراف کر لیا تو ہم اسے پہچان لیں گے، پس وہ اس کا دیدار کرنے لگیں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے لئے سجدے میں گر جائیں گے اور ان کے چہرے برف کی مثل سفید ہو جائیں گے اور منافقین اور اہل کتاب باقی رہ جائیں گے، وہ سجدہ کرنے پر قادر نہیں ہوں گے تو غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ اور اس کی قرأت میں تبیض و تسود دونوں تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں: اِبْیَضَّتْ، پس تا کو اسی طرح کسرہ دیا جاتا ہے جیسے اس میں الف کو...... اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور اسی کے مطابق یحییٰ بن وثاب نے پڑھا ہے اور زہری نے یوم تبیاض و تسواد پڑھا ہے۔ اور تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے اور یوم یبیض وجوہ جمع مذکر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اُقِّتَتْ کی مثل اُجُوْهٌ بھی جائز ہے۔ اور ابیضاض الوجوہ سے مراد ان کا نعمتوں کے ساتھ چمک اٹھنا اور روشن ہونا ہے اور ان کی سیاہی سے مراد وہ ہے جو دردناک عذاب میں سے ان پر چھا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور علماء نے تعیین میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل سنت کے چہرے روشن (اور منور) ہوں گے اور اہل بدعت کے منہ سیاہ کالے ہوں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو مالک بن سلیمان ہروی غسان کے بھائی نے مالک بن انس سے انہوں نے حضرت نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ کے بارے میں ارشاد فرمایا: یعنی تبیض وجوہ اهل السنة و تسود وجوہ اهل البدعة۔ اسے ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں کہا ہے: یہ مالک کی حدیث میں سے منکر ہے۔

حضرت عطا نے کہا ہے: مہاجرین و انصار کے چہرے روشن ہوں گے اور بنی قریظہ اور نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کفار ہیں اور ان کو کہا جائے گا: کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد کیونکہ تم نے اس وقت اقرار کیا تھا جب تم حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے چونٹیوں کی مثل نکالے گئے تھے۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے: حسن نے کہا ہے: یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ مرتدین کے بارے ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے۔ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے تھے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کی بھی تصدیق کرتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔ پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ اسے بھی زجاج نے اختیار کیا ہے۔ اور مالک بن انس نے کہا ہے: یہ اہل اھواء کے بارے ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ حروریہ کے بارے ہے۔ اور ایک دوسری خبر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قدریہ کے بارے ہے۔ اور ترمذی نے ابو غالب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابو امامہ رضی اللہ عنہ باب دمشق پر کھڑے کئے گئے سروں کو دیکھا (1)، تو حضرت ابو امامہ نے کہا: جہنمی کتے ہیں آسمان کی چھت کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، بہترین اور اچھے نیکوکار مقتول وہ تھے جنہیں انہوں نے قتل کیا تھا...... پھر آپ نے یہ آیت پڑھی یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ الی آخر الآیۃ۔ میں نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: اگر میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا سوائے ایک بار یا دو بار یا تین بار کے...... یہاں تک کہ انہوں نے سات بار تک گنا...... تو میں تمہیں یہ بیان نہ کرتا۔ (امام ترمذی نے) کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں تمہارے لئے حوض (کوثر) پر پہلے موجود ہوں گا جو کوئی میرے پاس سے گزرے گا وہ وہاں سے پیئے گا اور جس نے (ایک بار) پی لیا وہ کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا یقیناً کئی گروہ میرے پاس آئیں گے میں انہیں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان کچھ حائل کر دیا جائے گا۔''

ابو حازم نے کہا ہے: نعمان بن ابی عیاش نے مجھے سنا اور کہا: کیا تو نے سہل بن سعد سے اسی طرح سنا ہے؟ میں نے کہا:

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاں۔ تو اس نے کہا: میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا اور میں نے آپ سے سنا، وہ اس میں یہ اضافہ بیان کرتے تھے: ''تو میں کہوں گا بلاشبہ وہ تو میرے ہیں تو کہا جائے گا بلاشبہ آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے۔ اس کے لئے ہلاکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے جس نے میرے بعد (دین) تبدیل کرلیا۔'' (1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے پاس حوض پر آئے گا، تو انہیں حوض سے نکال دیا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار! میرے اصحاب ہیں تو وہ فرمائے گا آپ کے علم میں وہ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے بلاشبہ یہ لوگ الٹے پاؤں لوٹ کر مرتد ہو گئے۔'' (2)

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں تغیر و تبدل کیا یا ایسی بدعت کا ارتکاب کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو اور نہ اس کے بارے اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ حوض سے بھگائے جانے والوں میں سے ہو گا اور اس سے دور رہنے والوں میں سے ہو گا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ مطرود اور بعید وہ ہو گا جس نے جماعت مسلمین سے اختلاف کیا اور ان کے راستہ سے علیحدہ ہو گیا جیسا کہ خوارج اپنے مختلف فرقوں کی بنا پر اور روافض اپنی واضح گمراہی کی بنا پر اور معتزلہ طرح طرح کی خواہشات اور ہوس پرستی کی بنا پر، یہ تمام کے تمام دین میں تبدیلی لانے والے اور بدعت کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور اسی طرح وہ ظالم جو ظلم و ستم میں، حق کو مٹانے میں اور اہل حق کو قتل اور ذلیل و رسوا کرنے میں انتہائی زیادتی کرنے والے ہیں اور وہ جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کرنے والے ہیں اور جو معاصی اور گناہوں کو حقیر اور ہلکا سمجھنے والے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرنے والوں، خواہش پرستوں اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کی جماعت، ان تمام کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہی اس آیت سے مراد ہوں۔ اور مثال اسی طرح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے، کسی کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا سوائے اس انکار کرنے والے کافر کے جس کے دل میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہ ہو گا۔

اور ابن قاسم نے کہا ہے: کبھی اہل اھواء کے سوا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اہل اھواء کی نسبت زیادہ شریر ہوتا ہے یہ کہتے ہیں: اخلاص کی تکمیل گناہوں سے اجتناب کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ اس کلام میں حذف ہے یعنی فیقال لهم۔ (تو انہیں کہا جائے گا) اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِكُمۡ (کیا تم نے کفر اختیار کرلیا تھا ایمان لانے کے بعد) یعنی یوم میثاق کو جب انہوں نے کہہ دیا بلیٰ (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہود کے لئے ہے۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے (آپ کا انکار کیا اور) آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا: یہ خطاب منافقین کے لئے ہے کہا جائے گا: کیا تم نے سراً اور خفیۃً کفر کیا تھا اعلانیہ اقرار کرنے کے بعد۔ اور اہل عرب کا اس پر اجماع ہے کہ اَمَّا کے جواب میں فا لانا ضروری ہے کیونکہ اس کا معنی میرے اس قول میں ہے: أما زيد فمنطلق،

1۔ صحیح بخاری، باب فی الحوض و قول تعالیٰ انا اعطیناک الکوثر، حدیث نمبر 6097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 6098، ایضاً

مهمایکن من شیٔ فزید منطلق۔
اور قول باری تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے اور اس کے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہوں گے۔ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی وہ ہمیشہ اس کی جنت اور دار عزت و کرامت میں باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں میں سے بنائے اور بدعتوں اور ضلالتوں کی راہوں سے ہمیں بچائے اور محفوظ رکھے اور ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے۔ آمین۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

''یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام۔''

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور مراد قرآن کریم ہے۔ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ یعنی آپ پر جبریل امین کو نازل کرتے ہیں سو وہ آپ پر آیات پڑھتا ہے۔ بِالْحَقِّ یعنی صدق و سچائی کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور اس کے دلائل ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تِلْكَ بمعنی هذه ہے۔ لیکن جب یہ گزر گئیں تو اس طرح ہو گئیں گویا یہ دور اور بعید ہیں۔ لہٰذا تِلْكَ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اٰيٰتُ اللّٰهِ، تِلْكَ سے بدل ہو۔ اور وہ نعت اور صفت نہ ہو، کیونکہ مبہم مضاف کے ساتھ نعت نہیں بن سکتا۔ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی وہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہ دے گا۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ۔ مہدوی نے کہا ہے کہ اس کی ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کافرین کے احوال کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرے گا، تو اس کے متصل بعد اپنی قدرتوں کی وسعت اور ظلم سے اپنے مستغنی ہونے کا ذکر کیا، اس لئے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ابتدائے کلام ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان کیا ہے کہ زمین و آسمان میں سب کا سب اسی کا ہے یہاں تک کہ وہ اسی سے سوال کریں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو

برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لئے بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ ترمذی نے بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے بارے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تم ستر امتوں کو مکمل کرنے والے ہو تم ان میں بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ مکرم و محترم ہو'' اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔(1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم لوگوں کے لئے لوگوں کی نسبت بہترین (اور نفع بخش) ہیں ہم انہیں زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لا رہے ہیں (2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے ان کے کام کی طرح کام کیا وہ انہیں کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ہے یعنی جو ان میں سے صالحین اور اہل فضل ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن لوگوں پر شاہد ہوں گے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ''تم آیت میں ذکر کردہ شرائط کی بنا پر بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت و بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔''

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم لوح محفوظ میں ہو(3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جب سے ایمان لائے ہو بہترین امت ہو۔ اور کہا گیا ہے: یہ نبی مکرم ﷺ اور آپ کی امت کے ساتھ پہلے آنے والوں کے لئے بشارت کے طور پر آئی ہے۔ سو معنی یہ ہے کہ تم اپنے سے پہلے آنے والے اہل کتاب کے نزدیک بہترین امت ہو۔ اور اخفش نے کہا ہے: مراد اہل امت، یعنی بہترین دین والے ہیں۔

اور کسی شاعر نے کہا:

حلفتُ فلم اترك لنفسك ريبةً      وهل يأثَمَنْ ذواُمَّةٍ وهو طائع

میں نے قسم کھائی سو میں نے تیری ذات کے لئے کوئی شک نہیں چھوڑا اور کیا دیندار گناہ کرے گا حالانکہ وہ طاعت شعار اور فرمانبردار ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ کان تامہ ہے اور معنی ہے تم پیدا کئے گئے اور تم بہترین امت قرار پائے گئے۔ اور خَيْرَ اُمَّةٍ حال ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کان زائدہ ہے اور معنی ہے انتم خیر امۃ (تم بہترین امت ہو)۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من سورۃ آل عمران، جلد 2، صفحہ 125، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 4277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز    3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

اور سیبویہ نے کہا ہے:

و جیران لنا کانوا کرام

(اور ہمارے عزت واکرام والے پڑوسی ہیں) اس میں کان زائدہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (مریم) (ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن بچہ ہے۔) اور وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ (الاعراف:86) (اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھادیا) اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ (الانفال:26) (اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے۔) اور سفیان نے میسرہ اشجعی سے، انہوں نے ابو حازم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: تم لوگوں کو زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لاتے ہو(1)۔ نحاس نے کہا ہے: اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے کنتم للناس خیر امۃ تم لوگوں کے لئے بہترین امت ہو۔

اور حضرت مجاہد کے قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے: کنتم خیر امۃ اذ کنتم تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (تم بہترین امت ہو جبکہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔) اور یہ قول بھی ہے: حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت بہترین امت ہوگئی کیونکہ ان میں سے مسلمان زیادہ ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے لئے ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی۔ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن میں مجھے مبعوث کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** جب قرآن کی نص سے ثابت ہوگیا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہے۔ ائمہ نے عمران بن حصین سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تابعین) پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تبع تابعین)''(2) (الحدیث) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے پہلے لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، یہی موقف جید اور عظیم علماء نے اپنایا ہے اور یہ کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور آپ کو دیکھا اگرچہ عمر میں ایک ہی بار، وہ آپ کے بعد آنے والوں سے افضل ہے اور یہ کہ فضیلت صحبت کے برابر مساوی کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔

ابو عمر بن عبد البر اس طرف گئے ہیں کہ کبھی کوئی وصف صحابہ کرام کے بعد آنے والے میں اس سے افضل ہوسکتا ہے جو جملہ صحابہ کرام میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد: خیر الناس قرنی۔ اپنے عموم پر نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب فضل الصحابہ ثم الذین یلونھم، جلد 2، صفحہ 309، اسلام آباد۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فاضل اور مفضول دونوں قسم کے لوگ جمع تھے۔ آپ کے زمانہ میں منافقین کی وہ جماعت جو ایمان کا اظہار کرتے تھے اور وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے جن پر یا ان میں سے بعض پر حدود قائم کی گئیں سبھی جمع تھے۔ اور آپ نے ان کے لئے ہی کہا: جو تم چور، شرابی اور زانی کے بارے میں کہتے ہو۔ اور آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے فرمایا: لا تسبُّوا اصحابی (تم میرے صحابہ کرام کو گالی گلوچ نہ دو۔(1)) اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: لا تسبب من هو خير منك (تو اسے گالی نہ دے جو تجھ سے بہتر ہے) اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: طوبی لمن رآنی وآمن بی طوبی سبع مرات لمن لم یرنی و آمن بی (سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات بار سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا)

اور مسند ابی داؤد الطیالسی میں عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیه عن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے افضل ہے۔'' ہم نے عرض کی ''ملائکہ'' آپ نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے ان کے علاوہ کون ہیں؟'' ہم نے عرض کی انبیاء علیہم السلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے بلکہ ان کے علاوہ کون ہے'' بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان کے اعتبار سے مخلوق میں سے افضل وہ قوم ہے جو ابھی مردوں کی صلبوں میں ہے وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ ورق (کتاب) پائیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کریں گے پس وہی ایمان کے اعتبار سے افضل الخلق ہیں۔''

اور صالح بن جبیر نے ابو جمعہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم سے کوئی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور دو تختیوں کے درمیان ایک کتاب پائیں گے جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہ ایمان لے آئیں گے اور وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔'' اور ابو عمر نے کہا ہے: ابو جمعہ صحابی ہیں اور ان کا نام حبیب بن سباع ہے اور صالح بن جبیر ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تمہارے ایسے دن آنے والے ہیں کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا ان میں عمل کرنے والے کے لئے اس کی مثل عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا(2)'' (یعنی ان کے اجر کی مثل اسے اجر دیا جائے گا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ان میں سے (پچاس آدمیوں کی مثل)؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''(نہیں) بلکہ تم میں سے'' (پچاس آدمیوں کی مثل)۔

ابو عمر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض محدثین خاموش ہیں۔ اور انہوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** کی تاویل میں کہا ہے: جس نے تمہارے فعل کی مثل فعل کیا وہ تمہاری مثل ہے۔ احادیث کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی (روایات) خصوصیت کی بنا پر ہیں۔ واللہ الموفق۔

---

1۔ مسلم کتاب فضائل صحابہ، باب تحریم سب الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر 4003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس باب کی احادیث کی توجیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ ﷺ کے زمانے کو اس بنا پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ کفار کی کثرت، ان کی اذیتوں پر اپنے صبر کرنے اور اپنے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنے کے سبب اپنے ایمان میں غرباء تھے اور بلاشبہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں نے جب دین کو قائم کیا اور اسے مضبوطی سے تھام لیا اور جب شر، فسق، فتنہ وفساد، گناہ اور کبائر کے ظہور کے وقت وہ اپنے رب کی اطاعت وفرمانبرداری پر ثابت قدم رہے تو اس وقت وہ بھی غرباء ہو گئے اور اس وقت میں ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ رہے جس طرح پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے اور اس کی شہادت حضور نبی مکرم ﷺ کا ارشاد بھی دیتا ہے: بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (اسلام کا آغاز ہوا درآنحالیکہ وہ غریب تھا اور عنقریب اس حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسے شروع ہوا تھا پس غرباء کے لئے مبارکباد اور سعادتمندی ہے (1)''۔ اور ابوثعلبہ کی حدیث بھی اس کی شہادت دیتی ہے اور اس کی شہادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی دیتا ہے۔ ''میری امت بارش کی طرح ہے یہ معلوم نہیں ہوسکتا اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر۔'' اسے ابوداؤد طیالسی اور ابوعیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور اسے ہشام بن عبید اللہ رازی نے مالک سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مثلُ امّتی مثل المطر لایُدرَی أوّله خیرٌ أم اخره (2)۔ اسے دارقطنی نے مسند حدیث مالک میں ذکر کیا ہے۔ ابوعمر نے کہا ہے: ہشام بن عبید اللہ ثقہ راوی ہے محدثین اس میں اختلاف نہیں کرتے۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت کے والی بنے تو آپ نے حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا کہ میری طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سیرت لکھو تاکہ میں اس کے مطابق (عمل) کروں، تو حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اگر تم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر عمل کیا تو پھر تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہو کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آدمیوں کی طرح ہیں۔ راوی کا بیان ہے: اور آپ نے اپنے زمانہ کے فقہاء کی طرف لکھا، تو ان تمام نے بھی آپ کی طرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح ہی لکھا۔

بعض اجل علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد خیر الناس قرنی کا اس ارشاد کو معارض قرار دیا ہے: خیر الناس من طال عمرہ و حسن عمله و شر الناس من طال عمرہ و ساء عمله (3) (لوگوں میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل حسین وجمیل رہا۔ اور لوگوں میں سے شریر وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل برا رہا) ابوعمر نے کہا: یہ احادیث اپنی اسناد کے تواتر اور حسن ہونے کے ساتھ اس امت کے اول اور اس کے آخر کے درمیان مساوات اور

1۔ جامع الترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 547، اسلام آباد۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث 3975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84، اسلام آباد

2۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال باب ماجاء فی صلوات الخمس، جلد 2، صفحہ 110/577، اسلام آباد

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد
ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، حدیث نمبر 2252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

برابری کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور اس کا معنی وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایمان لانا اور عمل صالح کرنا ایسے زمانہ میں جو فاسد ہو چکا ہے اور اس میں اہل علم و دین کو اٹھالیا جائے گا اور اس میں فسق اور فتنہ وفساد وافر ہو جائے گا اور مومن کو ذلیل ورسوا کیا جائے گا اور فاجر کی عزت و تکریم کی جائے گی۔ اور دین غربت کی طرف لوٹ آئے گا جیسا کہ شروع میں غریب تھا ...... اور اس میں دین پر قائم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا۔ پس اس وقت اس امت کا اول عمل کی فضیلت میں اس کے آخر کے ساتھ برابر ہو جائے گا، سوائے اہل بدر اور حدیبیہ کے اور جس نے اس باب کے آثار میں تدبر اور غور وفکر کیا تو اس کے لئے یہ صحیح اور سیدھی راہ ہے۔ واللہ یوتی فضلہ من یشاء۔ (اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنا فضل عطا فرما دیتا ہے۔)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: **تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** یہ اس امت کی مدح ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہیں اور وہ اس کے ساتھ متصف ہیں۔ اور جب انہوں نے تبدیلی کو چھوڑ دیا اور منکر (گناہ کا عمل) پر اتفاق کر لیا تو ان سے مدح و تعریف کا اسم ختم اور زائل ہو گیا۔ اور انہیں ذم اور برائی کا نام لاحق ہو گیا ...... اور وہی ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن گیا ...... اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام سورۃ کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ**۔ یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا ان کے لئے بہتر تھا اور یہ خبر دی ہے کہ ان میں مومن اور فاسق دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ البتہ فاسق زیادہ ہیں۔

**لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ⑪**

"(کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی۔"

قولہ تعالیٰ: **لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى** یعنی ان کا جھٹلانا، تحریف کرنا اور ان کا بہتان لگانا (تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) اور نہ ہی ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔ یہ حسن اور قتادہ سے منقول ہے۔ اور استثنا متصل ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں سوائے معمولی ضرر اور تکلیف کے کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، پس الاذی مصدر کے محل میں واقع ہے اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ایک وعدہ ہے کہ اہل کتاب ان پر غالب نہ آسکیں گے اور یہ کہ ان کی ان کے خلاف مدد کی جائے گی اور انہیں ان کی طرف سے سوائے بہتان اور تحریف کی اذیت کے اور کوئی بگاڑ اور استیصال نہیں پہنچے گا اور رہا انجام (اور آخرت) تو وہ مومنین کے لئے ہی ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور معنی ہے وہ بالیقین تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، البتہ وہ تمہیں اس کے ساتھ اذیت دیں گے جو کچھ تمہیں سنائیں گے۔ مقاتل نے کہا ہے: سرداران یہود کعب، عدی، نعمان، ابو رافع، ابو یاسر، کنانہ اور ابن صوریا وہ اپنے میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف جاتے اور انہیں ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستاتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى** (1) یعنی سوائے زبانی اذیت کے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہاں کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا: **وَاِنْ**

1۔ اسباب النزول، صفحہ 78

يُقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو شکست خوردہ ہو کر بھاگ جائیں گے، یہ کلام بھی مکمل ہو گیا۔ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اسی لئے ان میں نون ثابت ہے۔ اور اس آیت میں نبی مکرم ﷺ کے لئے معجزہ ہے، کیونکہ یہودیوں میں سے جو بھی لڑا وہ اپنی پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت (ورسوائی) جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) اور یہ مستحق ہو گئے ہیں غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی، یہ اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق یہ (بے باکی) اس لئے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے۔ سب یکساں نہیں اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے گا اس کار خیر کا۔ اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو۔''

قولہ تعالیٰ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی جہاں کہیں یہ پائے گئے اور یہ ملے۔ کلام مکمل ہوا۔ اور ان پر ذلت مسلط کرنے کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ یہ استثنا منقطع ہے یہ اول کا جز نہیں ہے۔ یعنی بجز ان کے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کو مضبوط کرتے ہیں۔ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ مراد وہ ذمہ داری (معاہدہ) ہے جو لوگوں کی جانب سے ان پر ہے۔ اور النَّاسِ سے مراد حضرت محمد مصطفی ﷺ اور وہ مومنین ہیں جنہیں وہ خراج ادا کرتے ہیں اور وہ انہیں امن اور پناہ دیتے ہیں۔ کلام میں اختصار ہے اور معنی یہ ہے: الا ان یعتصموا بحبل من اللہ، پھر اس سے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے یہی کہا ہے۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ لوٹ آئے ہیں اللہ کے غضب کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ

بمعنی احتملوا ہے یعنی انہوں نے الله کا غضب اٹھایا، برداشت کیا۔ اور لغت میں اس کا اصل معنی ہے کہ ان پر غضب لازم ہو گیا۔ اور سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ پھر خبر دی کہ ان کے ساتھ یہ کیوں کیا گیا، تو فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ اس کی مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر خبر دی اور فرمایا: لیسوا سواء وہ سب برابر نہیں۔ اور کلام مکمل ہو گیا اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت برابر اور یکساں نہیں (1)۔ اور ابو خیثمہ زہیر بن حرب نے بیان کیا ہے حدثنا ھاشم بن القاسم حدثنا شیبان عن عاصم عن زر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ آپ نے فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے [ایک رات] عشاء کی نماز مؤخر فرمائی پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا لوگ نماز کے لئے انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ تمہارے سوا اہل ادیان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو اس وقت الله تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں۔'' فرمایا: اور یہ آیت نازل کی گئی لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (2) ابن وہب نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: الله تعالیٰ کا ارشاد مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے۔

اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے جب حضرت عبد الله بن سلام رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن سعیہ، اسید بن سعیہ اور اسید بن عبید اسلام لائے اور جو بھی یہود میں سے اسلام لایا، پس وہ ایمان لائے، انہوں نے تصدیق کی، اسلام کی طرف راغب ہوئے اور اس میں پختگی اور رسوخ حاصل کیا، تو یہودی علماء اور ان میں سے اہل کفر کہتے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نہ ایمان لائے اور نہ ہی آپ کی اتباع و پیروی کی مگر ہمارے شریر لوگوں نے، اگر وہ ہمارے اچھے اور نیک لوگوں میں سے ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین کو نہ چھوڑتے اور کسی غیر کی طرف نہ جاتے، تو ان کے اس قول کی وجہ سے الله تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا (3): لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے من اھل الکتاب ذو امۃ، ای ذو طریقۃ حسنۃ (4)۔ یعنی اچھے طریقے اور راستے والے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

و ھل یأثمن ذو أمۃ و ھو طائع

(کیا اچھے طریقے والا گناہ کرتا ہے حالانکہ وہ اطاعت و فرمانبرداری کر رہا ہے۔)

---

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 295　2۔ اسباب النزول، صفحہ 79　3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534　4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور تقدیر کلام ہے من اهل الکتاب امۃ قائمۃ و أخری غیر قائمۃ۔ پس پہلے پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابوذؤیب کا قول بھی ہے:

عصانی الیها القلبُ إنّی لأمرہٖ مطیعٌ فما ادری أرُشْدٌ طِلابُها (1)

اس کی طرف مائل ہونے میں دل نے میرا ساتھ نہ دیا بلاشبہ میں تو اس کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہوں سو میں نہیں جانتا کہ اس سے (حق کا) مطالبہ کرنا ہدایت ہے (یا گمراہی)۔ تو اس میں مراد أرُشْدٌ ام غَیٌ ہے اور اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے کہا ہے: امۃ، سواء کے سبب مرفوع ہے(2) اور تقدیر عبارت ہے: لیس یستوی امۃ من اهل الکتاب قائمۃ یتلون آیات اللہ و امۃ کافرۃ۔ (اہل کتاب میں سے ایک گروہ جو حق پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ اور کفر کرنے والا گروہ برابر نہیں ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کئی اعتبار سے غلط ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ امۃ کو سواء کے ساتھ رفع دیا گیا ہے تو اس میں لیس کے اسم کی طرف لوٹنے والی کوئی شے نہیں ہے اور رفع ایسی شے کے سبب دیا جا رہا ہے جو فعل کے قائم مقام نہیں ہے اور اسے مضمر مانا جائے گا جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کافر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لہٰذا اسے مضمر ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی مثل ہے: اکلونی البراغیثُ (3) اور ذهبوا اصحابُك۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور و أکلونی البراغیث ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

اور اٰنَآءَ الَّیۡلِ اس سے مراد رات کی ساعتیں ہیں (4)۔ اس کا واحد اِنًی و أَنًی اور اِنۡیٌ ہے۔ اور یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یَسۡجُدُوۡنَ بمعنی یصلون (وہ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔

یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے، کیونکہ تلاوت رکوع و سجود میں نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَهٗ یَسۡجُدُوۡنَ۔ ای یصلون۔ اور سورۃ الفرقان میں ہے: وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ اور سورۃ النجم میں ہے فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَ اعۡبُدُوۡا ۝ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد صرف معروف سجدہ ہی لیا جا رہا ہے۔ اور سبب نزول اسے رد کر رہا ہے اور یہ کہ مراد عشاء کی نماز ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، پس بتوں کی پوجا کرنے والوں پر جونہی رات چھا جاتی ہے تو وہ سو جاتے اور موحدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز عشاء کے لئے کھڑے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب ان کے قیام کا ذکر کیا تو فرمایا وَ هُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ یعنی (سجدوں کے) ساتھ قیام بھی تھا۔ اور ثوری نے کہا ہے: یہ مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہے(5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیام لیل کے بارے میں ہے۔ اور بنی شیبہ کے ایک آدمی سے روایت ہے وہ کتابیں پڑھتا تھا اس نے کہا: بلاشبہ ہم رب العالمین کے کلام میں سے ایک

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 492 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً

4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534 | 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 493

کلام پاتے ہیں۔ کیا اونٹ یا بکریاں چرانے والا گمان کرتا ہے جو کہ رات آتے ہی منفرد اور علیحدہ ہو (کر سو) جاتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو رات کے وقت قیام و سجود کرتا ہے؟ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں اور حضور نبی مکرم محمد ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں۔ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہا گیا ہے کہ یہ کلام عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی مکرم ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم ہے۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نہی عن المنکر سے مراد آپ کی مخالفت سے منع کرنا اور روکنا ہے۔ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ یعنی وہ نیکی کے اعمال بغیر کسی بوجھ اور ثقل کے جلدی سے کرتے ہیں اس لئے کہ وہ ثواب اور اجر کی مقدار سے واقف و آگاہ ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ فوت ہونے سے پہلے اعمال کرنے میں جلدی اور تیزی کرتے ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور یہ لوگ صالحین کے ساتھ ہوں گے جنت میں اور وہ حضور نبی رحمت ﷺ کے اصحاب ہیں۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ اعمش، ابن وثاب، حمزہ، کسائی، حفص اور خلف نے دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے، (اس لئے کہ یہ) امة قائمة کے بارے خبر ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو عبید کی پسند ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بنا پر دونوں کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اسے ابو حاتم نے اختیار کیا ہے اور ابو عمرو دونوں قرأتوں کو یعنی یا اور تا کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور آیت کا معنی ہے: تم جو بھی نیک عمل کرو گے تو ہرگز تمہیں اس کے ثواب سے انکار نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہاری قدر افزائی کی جائے گی اور اس پر تمہیں اجر و ثواب اور جزا دی جائے گی۔ (1)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہ اِنَّ کا اسم ہے اور اس کی خبر یہ ہے لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا مقاتل نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے مومنین کا ذکر کیا تو پھر ان کے کفار کا ذکر کیا اور وہ اس کا یہ قول ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور کلبی نے کہا ہے: اسے ابتداء بنایا اور فرمایا: بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے مال کی کثرت اور ان کی اولاد کی کثرت انہیں ہرگز اللہ کے عذاب سے ذرہ بھر نہیں بچا سکیں گے۔ اولاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا کیونکہ نسب کے اعتبار سے وہی ان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہ مبتدا اور خبر ہیں اور اسی طرح هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ بھی ہے ان تمام کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 535

ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷

''مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو (اور) لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہوا اپنے نفسوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اس میں مَا یہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ وہ مصدر یہ ہو اور یہ بھی کہ وہ بمعنی الذی ہو، اور ضمیر عائد محذوف ہو، یعنی مثل ماینفقونہ۔ اور کمثل ریح کا معنی ہے کمثل مھب ریح (ہوا چلنے کی طرح) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الصر کا معنی سخت ٹھنڈک ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل الصریر ہے جس کا معنی آواز ہے، پس مراد شدید ہوا کی آواز ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ اس آگ کے بھڑکنے کی آواز ہے جو اس ہوا میں ہو۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: بلاشبہ اس ٹکڑی کو کھانے سے منع کیا گیا ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا نے مار دیا ہو۔ اور آیت کا معنی ہے: کافروں کے خرچ کئے ہوئے مال کے باطل اور ضائع ہونے اور اس کے نفع بخش نہ ہونے کی مثال اس کھیتی اور فصل کی طرح ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا یا آگ لگی ہو اور اس نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا ہو۔ اور اس کے مالکوں کو ذرہ بھر فائدہ نہ ہو حالانکہ وہ اس سے نفع اور فائدہ کی امید رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان پر ظلم نہیں کیا وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ لیکن وہ خود ہی کفر و معصیت کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے حق کا انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے زراعت کے وقت کے بغیر اور اس کی جگہ کے بغیر کھیتی کاشت کی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ادب سکھایا، اس لئے کہ انہوں نے ایک شے کو غیر محل میں رکھا۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَ مَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۱۸

''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے، ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے سے منع کرنے اور اس پر زجر و توبیخ کرنے کو مؤکد

کیا ہے۔ اور اس کا تعلق سابقہ اس ارشاد کے ساتھ ہے۔ ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب اور البطانۃ مصدر ہے اور اس کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کا نام رکھا جا سکتا ہے اور بطانۃ الرجل سے مراد وہ خاص دوست اور افراد ہیں جو اس کے خفیہ معاملات پر بھی آگاہ ہوتے ہیں اور یہ اصل میں البطن سے ماخوذ ہے جو الظھر کے خلاف ہے۔ اور بطن فلان بفلان یبطن بطونا و بطانۃ جب کوئی کسی کے ساتھ خاص ہو اور اس کے اندرونی معاملات میں تہہ تک پہنچا ہوا ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اولئك خلصائی نعم و بطانتی و هم عیبتی من دون كل قریب

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کفار، یہود اور اہل اھواء کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں کہ وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کریں اور اپنے معاملات ان کے سپرد کر دیں۔ اور کہا جاتا ہے: کل من کان علی خلاف مذھبك و دینك فلا ینبغی لك ان تحادثہ۔ یعنی ہر وہ جو تیرے مذہب اور تیرے دین کے خلاف ہے اس کے ساتھ تیرا مشاورت اور گفتگو کرنا مناسب نہیں۔

شاعر نے کہا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرینه فكل قرین بالمقارن یقتدی

ہر آدمی سے سوال نہ کر بلکہ اپنے ساتھی سے سوال کر پس ہر ساتھی اپنے مصاحب کی ہی اقتدی کرتا ہے اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو اس کے بارے غور و فکر کرنی چاہیے جسے وہ دوست بنا رہا ہے۔''(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم لوگوں کو ان کے بھائیوں (دوستوں) پر قیاس کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس معنی اور سبب کو بیان فرمایا جس کے لئے اس نے اس تعلق اور دوستی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا، خبالا بمعنی فسادا ہے یعنی تمہارے فساد اور بربادی میں وہ کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑیں گے۔ یعنی بلا شبہ اگرچہ وہ ظاہر میں تمہارے ساتھ قتال اور جنگ نہیں کریں گے لیکن مکر و فریب اور دھوکہ دینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قول باری تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان سے مراد خوارج ہیں۔'' اور روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب باب من یومران یجالس، جلد 2، صفحہ 308۔

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی اخذ المال۔۔۔الخ، حدیث 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی اخذ المال، جلد 2، صفحہ 60/513، اسلام آباد

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ کو وہ پیش کیا اور آپ کو تعجب میں ڈال دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کتاب (تحریر) لائے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے؟ تو انہوں نے عرض کی: وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: کیوں! کیا وہ جنبی ہے؟ انہوں نے عرض کی: وہ نصرانی ہے، تو آپ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا۔ تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خائن قرار دیا ہے۔ (لا تُدْنهم و قد اقصاهم الله ولا تکرمهم و قد اهانهم الله ولا تأمنهم قد خونهم الله)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ (لا تستعملوا اهل الکتاب فانهم یستحلون الرشا واستعینوا علی امورکم و علی رعیتکم بالذین یخشون الله تعالیٰ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا: یہاں حیرہ کی عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے۔ کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ نے فرمایا: میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا (1)۔ پس اہل ذمہ کو کاتب بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا دیگر بیع و شراء کے معاملات، میں سے کسی میں ان کا تصرف کرنا اور انہیں نیابت کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس زمانے میں اہل کتاب کو کاتب اور امین بنانے کے سبب احوال بدل چکے ہیں اور وہ والیوں اور امراء کے کند ذہن اور جاہل ہونے کے سبب سردار بن گئے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے دو راز دان اور خواص ہیں ان میں سے ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسرا اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسے اس پر ابھارتا ہے پس معصوم (اور محفوظ) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا (اور بچا لیا)۔ (2)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں غریب نہ لکھواؤ (3)''۔ حسن بن ابی الحسن نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی اور فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے معاملات میں سے کسی کے بارے مشرکین سے مشاورت نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کندہ نہ کراؤ۔ حسن نے کہا: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ الآیہ۔ (4)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496

2۔ صحیح البخاری، کتاب الاحکام، جلد 2، صفحہ 1068، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث 6121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، کتاب مسند المکثرین، باب مسند جابر بن عبد اللہ، جلد 3، صفحہ 99، مطبوعہ دار صادر 4۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 296

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ ای من سواکم (یعنی تم اپنے سوا کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ)

فراء نے کہا: وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ بمعنی سوی ذالك۔ یعنی اس میں دُوۡنَ بمعنی سویٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِنۡ دُوۡنِکُمۡ یعنی سیرت اور حسن مذہب میں (کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ) اور لَا یَاۡلُوۡنَکُمۡ خَبَالًا کا معنی ہے وہ ایسے معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے جس میں تمہارے لئے فساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور یہ بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ کی صفت کے محل میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لا آلو جھدا یعنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا (کوئی کوتاہی نہیں کروں گا) اور اَلَوۡتُ اَلُوًا کا معنی ہے میں نے کوتاہی کی۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

وما المرءُ مادامت حُشاشةُ نفسه بمدرِكِ اطرافِ الخُطُوبِ ولاآلِ

اس میں ولاآل کا لفظ مذکورہ معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور الخَبَال، الخَبَل ہے اور الخَبَل کا معنی فساد اور بگاڑ ہے اور یہ افعال، ابدان اور عقول میں ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: من أُصیب بدم أو خَبَل (1) یعنی وہ جسے ایسا زخم لگا جو عضو کو ضائع اور فاسد کر دے۔ اور الخَبَل کا معنی اعضاء کا فاسد ہونا ہے اور رَجُلٌ خَبَلٌ و مُخۡتَبَلٌ (فاسد اور بگڑا ہوا آدمی) اور خَبَلَهُ الۡحُبُّ (یعنی محبت نے اسے بگاڑ دیا)

اوس نے کہا ہے:

أبنی لُبَیۡنَی لستُم بیَدٍ اِلاَّ یدًا مخبولَةَ العَضُدِ

یہ فاسدۃ العضد ہے۔ (یعنی کٹا ہوا فاسد بازو)

فراء نے کہا ہے:

نظَر ابنُ سعدٍ نظرةً و بَتَّ بھا کانت لصُحۡبِك والمِطِیِّ خَبالًا

اس میں بھی خبال بمعنی فساد ہے۔

اور خَبَالًا مفعول ثانی کے اعتبار سے منصوب ہے، کیونکہ الالُو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی حیثیت سے منصوب مان لے یعنی یخبلونکم خبالا۔ اور اگر چاہے تو حرف جر کے حذف کے سبب منصوب تصور کرلے یعنی اصل میں بالخبال تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا: اوجعته ضربا (یعنی بالضرب میں نے اسے مار کے ساتھ تکلیف دی۔) اور قول باری تعالیٰ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ میں ما مصدریہ ہے، یعنی ودوا عنتکم یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے (2) اور اس کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ یعنی تمہارے لئے عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات من قتل لہ قتیل فھو بالخیار بین احدی ثلاث

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 2613، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 537

(زبانوں) سے ظاہر ہو چکی ہے اور البغضاءُ بمعنی بغض ہے اور یہ حب (محبت) کی ضد ہے اور البغضاء مصدر مؤنث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مونہوں کا ذکر کیا ہے نہ کہ زبانوں کا یہ ان کے اپنی ان باتوں میں لغویات اور بے احتیاط گفتگو کرنے کی طرف اشارہ ہے، پس وہ اس چھپنے والے سے فوق اور اوپر تھے جس کی آنکھوں میں بغض ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس معنی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہی ہے "کہ آدمی اپنے بھائی کی عزت کے بارے میں اپنے منہ کو حیاء میں رکھے اس کا معنی منہ کھولنا ہے۔ کہا جاتا ہے: شحی الحمار فاہ بالنهیق (گدھے نے ہینگتے ہوئے اپنا منہ کھولا۔) اور شحی الفم نفسه (منہ بذات خود کھل گیا) اور شحی اللجامُ فم الفرس شَحْيًا (لگام نے گھوڑے کا منہ مکمل طور پر کھول دیا۔) اور جاءت الخیل شواحی۔ یعنی گھوڑے اپنے منہ کھولے ہوئے آئے۔ اس حدیث سے جواز پر دلیل خطاب نہیں سمجھی جاسکتی کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت میں خفیۃً داخل ہو جائے، کیونکہ باتفاق علماء وہ حرام ہے۔ (1)

اور قرآن کریم میں ہے ولا یغتب بعضکم بعضا الآیہ۔ (اور تم آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2)"۔ اور شحو کا ذکر بے احتیاطی اور بے تکلفی کی طرف اشارہ ہے۔ فاعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف جائز نہیں ہوتی اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل حجاز نے کہا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے اس کا جواز مروی ہے۔ ابن بطال نے ابن شعبان سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی دشمن کی شہادت اپنے دشمن کے خلاف کسی بھی شے میں جائز نہیں، اگرچہ وہ سراپا عدل ہو اور عداوت عدالت کو زائل کر دیتی ہے تو پھر کافر کی عداوت کا کیا حال ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ یہ خبر دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو بغض و حسد چھپائے رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے اظہار کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قد بدأ البغضاءُ پڑھا ہے۔ یعنی فعل کو مذکر ذکر کیا ہے، اس لئے کہ البغضاء بمعنی البغض ہے۔ (3)

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

"سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ فرمائیے: مر جاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496۔ 2۔ مسلم کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 397، اسلام آباد 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 497

قولہ تعالیٰ: هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ مراد منافقین ہیں (یعنی تم تو منافقین سے محبت کرتے ہو۔) اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا (جب وہ تمہیں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں)۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے یہی کہا ہے یہاں المحبة بمعنی مصافاة (یعنی خالص محبت کرنا) ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم تو ان کے ساتھ خالص محبت کرتے ہو اور وہ اپنے نفاق کی وجہ سے تمہارے ساتھ خالص محبت نہیں کرتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم تو ان کے لئے اسلام کا ارادہ رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے کفر چاہتے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد یہود ہیں۔ اکثر (علماء) نے یہی کہا ہے۔ الكتاب اسم جنس ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد کتابیں ہیں۔ اور یہودی بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ: 91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ۔)

وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا یعنی کہتے ہیں: ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ وَ اِذَا خَلَوْا اور جب وہ اپنوں کے درمیان ہوتے ہیں عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ انامل سے مراد انگلیوں کی اطراف (یعنی پورے) ہیں۔ مِنَ الْغَيْظِ یعنی وہ تم پر شدید غصہ سے انگلیوں کے پورے چباتے ہیں اور ان کے بعض بعض کو کہتے ہیں: کیا تم ان کی طرف دیکھتے ہو یہ ظاہر ہوئے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ اور العضّ کا مفہوم ہے شدید غصے کا اظہار کرنا (1) اس کے نفاذ کی قدرت نہ رکھتے ہوئے اور اسی معنی میں حضرت ابو طالب کا قول ہے:

يعضون غيظا خلفنا بالانامل

(وہ ہمارے پیچھے شدید غصہ کے سبب انگلیوں کو چباتے ہیں۔)

اور دوسرے نے کہا ہے:

إذَا رَأَونى ...... أطال الله غيظهم عَضُّوا من الغيظ اطراف الأباهيم

جب انہوں نے مجھے دیکھا تو وہ اپنے انگوٹھوں کے اطراف کو غصے سے کاٹنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کے غصہ میں اور اضافہ کرے۔

کہا جاتا ہے: عَضَّ يَعُضُّ عَضًّا وَ عَضِيْضًا اور العُضُّ (عین کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: اس نے اہل امصار کے چوپاؤں کو چارہ ڈالا۔ مثلاً الكسب (کمائی) اور النوى المرضوخ (توڑی ہوئی گٹھلی) اسی سے کہا جاتا ہے: أعَضَّ القوم، ... ان کے اونٹ گھاس کھانے لگیں۔ اور بعير عُضَاضِيٌّ، یعنی موٹا تازہ اونٹ گویا اسے اس طرف منسوب کیا گیا ہے اور ... (عین کے کسرہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: لوگوں میں سے انتہائی ہوشیار اور انتہائی چالاک۔ اور عض الأنامل یعنی ... کو کاٹنا سے مراد ایسا فعل ہے جس پر انتہائی غصہ ہو اور آدمی اسے کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا ایسے کام میں پڑنا جسے

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 538

تبدیل کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ دانتوں کے ساتھ کاٹنا اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قریب المرگ آدمی پر ہاتھ کو (دانتوں کے ساتھ) پکڑنا ہوتا ہے اور اسی طرح شرمندہ آدمی کا دانتوں کو ٹکرانا بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں غمزدہ اور پریشان حال آدمی کا زمین پر بیٹھ کر لکیریں لگانا اور کنکریوں کو گننا بھی اسی قبیلے سے ہے۔ اور یہ عض ضاد ساقطہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور عظ الزمان ظاء مشالہ کے ساتھ۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

دعظ زمانٍ یا بن مروان لم یَدَع　　من المال الاَمُسُحَتًا او مَجلَّفُ

اس میں عظ زمان عض الزمان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

الانامل کا واحد انملة (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ اور میم کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔

اور ابوالجوزاء نے جب یہ آیت تلاوت کی تو اس نے کہا: یہ اباضیہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صفت قیامت تک آنے والے بہت سے اہل بدعت میں پائی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اگر کہا جائے، وہ کیسے نہیں مرے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو فرمائے: کُنْ (تو ہو جا) فیکون (تو وہ ہو جاتی ہے)؟ تو اس کی طرف سے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے...... اس بارے میں مفسرین میں سے علامہ طبری اور کثیر نے کہا ہے: یہ ان کے لئے بددعا ہے۔

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم فرماؤ تم مسلسل اپنے غصہ میں جلتے رہو یہاں تک کہ تم مر جاؤ۔ اور اس پر توجیہ یہ ہے کہ آپ ان کے لئے ان کے سامنے اور پیچھے بددعا کرتے رہیں بخلاف لعنت کرنے کے۔(1)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہیں خبر دے دو کہ وہ اسے بالکل نہ پا سکیں گے جس کی آرزو اور خواہش رکھتے ہیں، کیونکہ موت اس کے قریب ہے تو اس معنی کی بنا پر دعا کا معنی زائل ہو گیا اور تقریع اور غصہ دلانے کا معنی باقی رہا اور یہ معنی مسافر بن ابی عمرو کے قول کے ساتھ بھی جاری ہوتا ہے:

و یتمنّی لی　أرومتنا　و نفقأ عین من حسدا

اور اسی معنی کی طرف یہ قول باری تعالیٰ بھی راہنمائی کرتا ہے: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ (الحج: 15) (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال کر) اسے کاٹ دے۔)

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

1۔ تفسیر طبری، کتاب آل عمران، جلد 4، صفحہ 87، اسلام آباد

''(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی۔ بےشک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ، سُلَمی نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تا کے ساتھ۔ اور یہ لفظ عام ہے ہر اس شے کو شامل ہے جو اچھی ہو سکتی ہے اور بری ہو سکتی ہے۔ اور مفسرین نے جو (خِصب) شادابی (جَدْب) خشک سالی، مومنین کا اجتماع اور ان کے درمیان فرقت کا ہونا اور دیگر ان جیسے اقوال مثالیں ذکر کی ہیں اور یہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور آیت میں معنی یہ ہے کہ ہر وہ جس کی یہ حالت ہو کہ اس میں شدید عداوت اور حقد و کینہ ہو اور مسلمانوں پر تکالیف آنے کے وقت اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہو وہ اس اہل نہیں کہ اسے رازدار بنایا جائے، بالخصوص جہاد جیسے اس امر عظیم میں جو کہ دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے۔

کسی کہنے والے نے کتنا خوب کہا ہے:

كل العداوة قد تُرجى افاقتها     الا عداوة مَن عاداك مِن حسد

ہر عداوت اور دشمنی کے ختم ہونے کی امید کی جاسکتی ہے سوائے اس کی عداوت کے جس نے تیرے ساتھ حسد کیا۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر تم ان کی اذیت رسانی پر صبر کرتے رہو(1) اور طاعت اور مومنین کی محبت و دوستی پر صبر کرتے رہو وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا کہا جاتا ہے: ضارہ یَضُورہ یَضِیْرُہ ضَیْرًا وَ ضَوْرًا، پس اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کے ضرر اور نقصان کی نفی کی شرط بیان کی ہے اور یہ مومنین کے لئے تسلی اور ان کے دلوں کے لئے باعث تقویت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں...... کہ حرمیان اور ابو عمرو نے لَا يَضِرْكُمْ پڑھا ہے یہ ضَارَ يَضِيْرُ سے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول لَا ضَيْرَ ہے۔ اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ جب را سے ضمہ کو حذف کر دیا گیا تو را اور یا دونوں ساکن باقی رہ گئیں لہٰذا یا کو حذف کر دیا گیا اور اسے ہی حذف کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ضَارَہ يَضُوْرُہ سنا ہے اور انہوں نے لَا يَضُرُّكُمْ کی اجازت دی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَا يَضْرُرْكُمْ ہے۔ [اور کوفیوں نے لَا يَضُرُّكُمْ را کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضَرَّ يَضُرُّ سے ہے۔] اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فا کو مضمر ماننے کی تقدیر پر مرفوع ہو اور معنی ہو: فلا یضرکم، (پس وہ تمہیں نقصان نہ دے گا)

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے:

مَن يفعلِ الحسناتِ اللهُ يشكرُها

(جو نیکیاں کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی قدر افزائی فرمائے گا۔) یہ کسائی اور فراء کا قول ہے، یا یہ تقدیم کی نیت پر مرفوع ہوگا۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اور سیبویہ نے کہا ہے:

انك اِن یُصْرَعْ اخوك تُصْرَعُ

(بلاشبہ تو پچھاڑ دیا جائے گا اگر تیرے بھائی کو پچھاڑ دیا گیا۔)

آیت کا مفہوم یہ ہو گا لا یضرکم ان تصبروا و تتقوا (تمہارا صبر کرنا اور تمہارا ڈرنا (اور تقویٰ اختیار کرنا) تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے جزم دی جائے اور دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے راء کو ضمہ دیا جائے کیونکہ وہ ضمہ کے بعد واقع ہے۔ اور اسی طرح فعل مجزوم ہونے کی بنا پر را کے فتحہ کی قرأت بھی ہے اور اجتماع ساکنین کی صورت میں فتحہ کے خفیف حرکت ہونے کی وجہ سے یَضُرَّ کُمْ کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اسے ابوزید نے مفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور مفضل ضبی نے عاصم سے لَا یَضُرِّ کُمْ گمان کیا ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے را کو کسرہ دیا گیا ہے۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

''اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ، اِذْ میں عامل فعل مضمر ہے اور تقدیر کلام ہے: واذکر اذ غدوت، یعنی اور آپ یاد کرو (اے محبوب!) جب آپ صبح سویرے چلے۔ مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یہ غزوہ احد تھا اور اسی کے بارے یہ مکمل آیت نازل ہوئی۔ اور مجاہد، حسن، مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ غزوہ خندق کے بارے ہے اور حسن سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بارے ہے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ احد کے بارے ہے (1) اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں۔) اور یہ بلاشبہ غزوہ احد میں ہوا تھا۔ اور مشرکین نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ طیبہ پر (چڑھائی کا) قصد کیا تاکہ وہ ان سے غزوہ بدر کی ناکامی اور شکست کا بدلہ و انتقام لیں، پس وہ احد پہاڑ کے نزدیک مدینہ طیبہ کے بالمقابل وادی کے کنارے جا اترے، یہ ۳ھ بارہ شوال بدھ کا دن تھا، ہجرت سے اکتیسواں مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ جمعرات کے دن وہاں مقیم ہو گئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مدینہ طیبہ میں تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی تلوار میں دندانے پڑ گئے ہیں اور یہ کہ آپ کے لئے بیل ذبح کیا جا رہا ہے اور یہ کہ آپ نے اپنا دست مبارک محفوظ اور مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کا ایک گروہ شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے خاندان میں سے ایک آدمی کو بھی شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ محفوظ زرہ مدینہ طیبہ ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اسے مسلم نے نقل کیا ہے(1)۔ اور یہ سب کچھ اسی کے مطابق ہے جو کچھ اس غزوہ میں سے معروف و مشہور ہے۔ اور تبوّؤ کا اصل معنی ہے گھر بنانا، (ٹھکانا بنانا) بوأته منزلا کہا جائے گا جب تو کسی جگہ سکونت اختیار کرے اور اسی معنی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار (2) (جس نے عمداً میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے) یعنی اس میں گھر بنالے۔ پس تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا معنی ہے آپ ان کے لئے صف بندی کی جگہیں بنا رہے تھے اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ ایک سونے والا دیکھتا ہے گویا کہ میں پے در پے مینڈھے لا رہا ہوں اور گویا میری تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو میں نے تعبیر یہ کی کہ میں قوم کے مینڈھے کو قتل کروں گا اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹنے کی تعبیر یہ کی کہ میری آل میں سے ایک آدمی شہید کر دیا جائے گا۔'' پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ کو قتل کیا اور وہ (کفار کا) علمبردار تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے بیان کیا ہے: مہاجرین کا علمبردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی تھا تو اس نے کہا: میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کروں گا جو میرے ساتھ ہے، تو طلحہ بن عثمان جو کہ سعید بن عثمان لخمی کا بھائی تھا اس نے اسے کہا: اے عاصم! کیا تیرے لئے مقابلے کی طاقت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پس وہ آدمی اس پر تیزی سے جھپٹا اور طلحہ کے سر پر تلوار دے ماری یہاں تک کہ تلوار اس کی داڑھی پر لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا تو علمبردار کا قتل ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق ہے کأنی مردف کبشا۔

**اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲**

''جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لئے اس نے اس لغزش سے بچالیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو۔''

اِذْ میں عامل تُبَوِّئُ یا سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہے۔ اور دو جماعتوں سے مراد خزرج میں سے بنو سلمہ اور اوس میں سے بنو حارثہ ہیں اور یہ دونوں غزوہ احد میں لشکر کے دو پہلو تھے(3)۔ اور اَنْ تَفْشَلَا کا معنی ہے کہ وہ بزدلی کا اظہار کریں (اور ہمت ہار دیں)۔ بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا فرمایا: ہمارے دو گروہ، بنو حارثہ اور بنو سلمہ تھے اور پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ نازل نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بنو حارث، بنو خزرج اور بنو نبیت تھے اور نبیت بنی اوس میں سے عمرو بن مالک تھے۔

اور فشل سے مراد بزدلی ہے، اس کا لغوی معنی یہی ہے اور دونوں گروہوں کا ارادہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب لشکر کے

1۔ بخاری کتاب المناقب، حدیث 3352، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ مسلم المقدمہ، جلد 1، صفحہ 7، اسلام آباد
3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 541　4۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کے بعد عبداللہ بن ابی اپنے منافق ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا (تو انہوں نے بھی ارادہ کیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی حفاظت فرمائی اور یہ واپس نہ لوٹے، اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرما رہا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہوں نے (لشکر کے ساتھ) نکلنے سے (پیچھے) بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا اور وہ ان میں سے صغیر (چھوٹے) تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے دلوں میں آنے والا خیال تھا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرما دیا تو ان کی بصیرت میں اضافہ ہو گیا اور اس بزدلی اور سستی کا مظاہرہ نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور ان میں سے بعض نے بعض کی مذمت کی اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے یہاں تک کہ آپ مشرکین کے قریب جا پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور پھر عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ آیا، کیونکہ اس کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا جب اس نے مدینہ طیبہ میں بیٹھے رہنے اور وہیں قتال کرنے کا اشارہ دیا تھا اگر دشمن ان پر حملہ آور ہو اور اس کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی (1) اور اکثر انصار نے اس کا انکار کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان میں سے وہ شہید ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ساتھ عزت و تکریم عطا فرمائی۔ امام مالک نے فرمایا ہے، غزوہ احد میں مہاجرین میں سے چار اور انصار میں سے ستر افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

المقاعد: مقعد کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیٹھنے کی جگہ اور یہ مواقف کے قائم مقام ہے لیکن لفظ قعود ثبوت پر دال ہے اور بالخصوص تیر انداز ثابت قدم تھے۔ مختصراً غزوہ احد کا یہی مفہوم ہے، اس کا تفصیلی اور شافی بیان آگے آئے گا۔

اس دن مشرکین کے ساتھ سو گھوڑ سوار تھے اور ان پر خالد بن ولید سربراہ تھے اور اس دن مسلمانوں کے ساتھ کوئی گھوڑا نہ تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور پتھر کے ساتھ نچلی طرف سے دائیں جانب کے چار دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کا خود توڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی امت اور دین کی جانب سے اس سے افضل و اعلیٰ جزا عطا فرمائی جو اپنے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کو اس کے صبر پر عطا فرمائی اور وہ جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن اعراض کیا تھا وہ عمرو بن قمیہ لیثی اور عتبہ بن ابی وقاص تھا اور کہا گیا ہے: فقیہ محمد بن مسلم بن شہاب کا دادا عبداللہ بن شہاب وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو زخمی کیا تھا۔ واقدی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک ثابت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو زخمی کرنے والا ابن قمیہ تھا۔ اور جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر پتھر مار کر آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تھا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ نافع بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے مہاجرین میں سے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں احد کے دن حاضر تھا اور میں

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 3، صفحہ 226

نے تیر دیکھے ہر جانب سے آ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان میں تھے اور ہر تیر آپ سے پھیر دیا جاتا تھا۔

تحقیق میں نے عبداللہ بن شہاب زہری کو اس دن یہ کہتے ہوئے سنا: محمد (ﷺ) پر میری راہنمائی کرو، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری راہنمائی کرو، اگر وہ بچ گئے تو میں نہیں بچ سکوں گا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اس کے پہلو میں تھے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ تھا پھر وہ آپ سے آگے گزر گیا، تو اس بارے میں صفوان نے اسے ڈانٹ پلائی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں، میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: بلا شبہ انہیں ہم سے محفوظ رکھا گیا ہے! ہم چار آدمی نکلے اور ہم نے آپ کے قتل کا آپس میں پختہ معاہدہ کیا [لیکن ہم آپ پر راہ نہ پا سکے۔] اور ایک پتھر رسول اللہ ﷺ کو آ لگا یہاں تک کہ آپ گڑھے میں گر گئے، اسے ابو عامر راہب نے مسلمانوں کے لئے بطور دھوکہ اور چال کے کھودا تھا پس آپ ﷺ اپنے پہلو کے بل گرے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو سہارا دیا یہاں تک کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن سنان نے رسول اللہ ﷺ کے زخم سے خون چوس لیا اور آپ کے خود کے دو حلقے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک میں پیوست ہو گئے اور انہیں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے نکالا۔ اور اپنے دانتوں کے ساتھ انہیں پکڑا تو وہ گر گئے، تو آپ نے انہیں جڑ سے توڑ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کو ان کا ٹوٹنا خوبصورت لگتا تھا اور اس غزوہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو وحشی نے قتل کیا تھا۔ وحشی جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور جبیر نے اس کو کہا: اگر تو نے محمد (ﷺ) کو قتل کیا تو ہم تجھے گھوڑوں کی لگام میں تھ یں گے اور اگر تو نے علی بن ابی طالب کو قتل کیا تو ہم تجھے ایک سو اونٹنیاں دیں گے وہ سب کی سب سیاہ ہوں گی اور اگر تو نے حمزہ کو قتل کیا تو تو آزاد ہو جائے گا، وحشی نے کہا: رہے محمد (ﷺ) ان پر نگران اور محافظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے کوئی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور جہاں تک علی (رضی اللہ عنہ) کا تعلق ہے تو انہیں جس نے بھی مقابلے کی دعوت دی ہے انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور رہا حمزہ! تو وہ بہادر آدمی ہیں، قریب ہے کہ میرا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو میں انہیں قتل کر دوں۔ اور وہاں ہند بھی تھی جب وحشی تیار ہوا یا وہ اس کے پاس سے گزری تو اس نے کہا: ہاں ابو دسمہ! تو (سینہ کو) ٹھنڈا کر تو تو بھی پرسکون اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پس وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی جماعت پر حملہ کر دیا، پس جب آپ اپنے حملہ سے کامیابی کے ساتھ واپس لوٹے اور وحشی کے پاس سے گزرے تو اس نے چھوٹے نیزے کے ساتھ آپ پر حملہ کر دیا اور وہ آپ کو جا لگا اور جان لیوا ثابت ہوا رحمۃ اللہ علیہ۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: پھر ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ باہر نکالا اور اسے دانتوں کے ساتھ چبایا لیکن اسے نگل نہ سکی اور پھر اسے پھینک دیا پھر ایک بلند چٹان پر چڑھ گئی اور بلند آواز سے چیخ کر یہ کہا:

نحن جزیناکم بیوم بدر والحرب بعد الحرب ذات سُعُرِ

(اے مسلمانو!) ہم نے یوم بدر کا بدلہ چکا دیا اور جنگ کے بعد جنگ آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی ہے:

ما کان عن عُتْبَۃ لی من صَبْرِ و لا أخی و عمّہ و بکری

مجھے (اپنے باپ) عتبہ، اپنے بھائی (ولید بن عتبہ)، اس کے چچا (شیبہ بن ربیعہ) اور اپنے پہلے بیٹے (حنظلہ بن ابی

سفیان) سے صبر نہیں آتا تھا۔

شفیت نفسی و قضیت نذری شفیتَ وحشی غلیلَ صدری

میں نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا اور اپنی نذر پوری کر لی۔ اے وحشی! تو نے میرے سینے کی جلن کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

فشکرُ وحشي علیّ عمری حتی ترمّ اعظُمِی فی قبری

پس مجھ پر ساری زندگی وحشی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے یہاں تک کہ میری ہڈیاں میری قبر میں بوسیدہ ہو جائیں۔

پھر اس کا جواب ہند بنت اثاثہ بن عباد بن عبد المطلب نے دیا اور کہا:

خَزِیت فی بدر و بعد بدر یابنت وَقّاعٍ عظیم الکفر

اے انتہائی گھٹیا اور پرلے درجے کے کافر کی بیٹی! تو بدر میں بھی رسوا ہوئی اور بدر کے بعد بھی۔

صبّحكِ اللهُ غداةَ الفجرِ مِلْهاشِمِيّين الطّوال الزُهُرِ

اللہ تعالیٰ علی الصبح دراز قد اور خوش اخلاق ہاشمیوں کو تیرے پاس لے آیا:

بکلِّ قَطّاعٍ حُسَامٍ یَفْرِی حمزةُ لیثی و علی صقری

میرے شیر حضرت حمزہ اور میرے شاہین حضرت علی رضی اللہ عنہما ہر تیز کاٹنے والی تلوار کے ساتھ تمہارے سر قلم کر رہے تھے،

اذ رَامَ شیبُ وابوكِ غدری فخضبا منه ضَواحِیَ النَّحْرِ

و نذرِكِ السوءَ فشرّ نَذْرِ

جب شیبہ اور تیرے باپ (عتبہ) نے میرے ساتھ بدعہدی کا ارادہ کیا تو ان دونوں نے (یعنی حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے) اس کے سینے کے کھلے اطراف کو لہولہان کر دیا اور تیرا بدی کی نذر ماننا بہت بری نذر ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر روتے ہوئے یہ اشعار لکھے:

بکت عینی و حُقّ لها بکاها و ما یغنی البکاء ولا العَوِیل

میری آنکھ رو پڑی اور رونا اس کا حق بنتا ہے لیکن رونے اور واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں:

علی أسَدِ الاله غداة قالوا أحمزة ذاکم الرّجل القتیل

(میری آنکھیں) شیر خدا پر اس روز (رو پڑیں) جب لوگوں نے کہا: کیا یہ مقتول آدمی حمزہ ہیں؟

أُصیبَ المسلمون به جمیعا هناك، و قد أصیب به الرّسول

آپ کے قتل سے سب مسلمانوں کو تکلیف پہنچی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی۔

أبا یَعْلَى لك الأركان هُدَّت وأنت الماجد البَرّ الوَصُول

اے ابو یعلیٰ! (یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) آپ کے تمام اعضاء کاٹ دیئے گئے حالانکہ آپ ایک شریف، نیک اور ہر ایک سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔

علیك سلامِ ربك فی جنان مخالِطھا نعیم لایزول

آپ پر آپ کے رب کی طرف سے ان جنتوں میں سلام پہنچے جن میں لازوال نعمتیں ملتی رہیں گی۔

ألا یا ھاشم الأخیار صبرا فکل فعالِکم حسن جمیل

اے قبیلہ ہاشم میں سب سے بہتر فرد صبر کر، تمہارا ہر کام نہایت حسین وجمیل ہے۔

رسولُ الله مصطبر کریم بأمر الله ینطق اذ یقول

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صابر اور کریم ہیں، وہ جب بھی کچھ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔

ألا مَنْ مُبْلِغٌ عنی لُؤَیًا فبعد الیومِ دائلَۃٌ تَدُول

ارے کون شخص ہے جو میری طرف سے قبیلہ لؤی کو یہ پیغام پہنچادے کہ آج کی جنگ کے بعد ایک دوسری جنگ کی نوبت آکر رہے گی۔

و قَبْلَ الیومِ ماعرفوا و ذاقوا وقائِعنا بھا یُشفی الغَلِیلُ

اور آج کی جنگ سے پہلے (غزوہ بدر میں) جو کفار نے ہمیں خوب پہچان لیا۔ اور ہمارے مقابلے کا مزہ چکھ لیا (وہ بھی پہنچا دے) اس جنگ میں ہمارے تصادم سے پیاسوں کی پیاس بجھائی جاتی رہی۔

نَسِیتم ضربَنا بقلیبِ بدر غداۃَ أتاکم الموتُ العَجِیل

قلیب بدر کے پاس تم ہماری شمشیر زنی کو بھول گئے ہو جس روز موت تمہارے پاس بڑی تیزی سے آرہی تھی۔

غداۃ ثوَیٰ أبوجھل صریعا علیه الطیر حَائِمَۃٌ تَجُول

جس روز ابوجہل دھڑام سے گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کے اوپر پرندے گھوم گھوم کر آجا رہے تھے۔

و عتبۃ وابنه خَرَّا جمیعا و شیبۃُ عضه السیف الصقیلُ

اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں زمین پر گر پڑے اور شیبہ کو بھی صیقل کی ہوئی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

و مَتْرُکْنَا أُمَیَّۃَ مُجْلَعِبًا و فی حیزومِہٖ لَدْنٌ نبیلُ

اور ہم نے امیہ کو بھی زمین پر دراز کر دیا در آنحالیکہ اس کے سینے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا نیزہ داخل تھا۔

و ھَامَ بنی ربیعۃ سائلوھا ففی اسیافنا منھا فلول

اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے پوچھو، ان کو کاٹنے کی وجہ سے ہماری تلواروں میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

ألَا یا ھندُ فابکی لا تَمَلِّی فَانتِ الوَالِہُ العَبرَی الھبول

ارے اے ہند! اب خوب رو اور رونے سے نہ اکتا کیونکہ تو ہی شدت غم کی وجہ سے بڑے بڑے آنسو بہانے والی اور اپنے عزیزوں کو کھو دینے والی ہے۔

ألَا یا ھندُ لاتُبْدِی شمَاتًا بحمزۃَ اِنَّ عِزَّکُمْ ذَلِیلُ

ارے اے ہند! تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کا اظہار نہ کر کیونکہ تمہاری عزت خاک میں مل چکی ہے۔
اور آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی مرثیہ کہا اور وہ کتب سیرت میں مذکور ہے۔ رضی اللہ عنہم۔
قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ توکل کا بیان ہے، توکل کا لغوی معنی: اظہار العجز و الاعتماد علی الغیر ہے (یعنی عجز کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد کرنا) اور وَاكَلَ فلان (کہا جاتا ہے) جب کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا کام ضائع کر دے۔
توکل کی حقیقت میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس حضرت سہل بن عبداللہ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: قالت فرقۃ۔ الرضا بالضمان، و قطع الطَّمَع من المخلوقین ایک جماعت نے کہا ہے: توکل سے مراد ضمان کے ساتھ راضی ہونا اور مخلوق سے کسی حرص اور لالچ کو ختم کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: التوکل ترك الأسباب و الرکون الی مسبب الأسباب کہ توکل سے مراد اسباب کو ترک کرنا ہے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جب کوئی سبب اسے مسبب سے مشغول کر دے گا تو اس سے توکل کا اسم بھی زائل ہو جائے گا۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ توکل سبب ترک کرنے کے ساتھ ہوتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں طعن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (پس تم اس سے کھاؤ جو تم نے حلال طیب (مال) کمایا) تو اس میں غنیمت بمعنی کمائی ہے اور مزید ارشاد فرمایا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (تو یہ بھی عمل ہے۔
اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰه يُحِبُّ العبدَ المحترِفَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی پیشہ (اور کام) کرنے والے بندے کو پسند فرماتا ہے۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سریہ پر قرض دیتے تھے اور آپ کے سوا کسی اور نے کہا ہے: یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا معنی یہ ہے ھو الثقۃ باللہ و الایقان بأن قضاء ہ ماض کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ یقین رکھنا اور یہ ایقان رکھنا کہ اس کی قضا اور فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور سعی اور محنت کرنے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا ایسے کاموں میں جن میں اسباب ضروری ہیں مثلاً کھانا، پینا، دشمن سے احتیاط اور بچاؤ کرنا، اسلحہ تیار کرنا اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کرتی ہے اور یہی موقف محققین صوفیہ نے اختیار کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اسم توکل ان اسباب کے ساتھ طمانینت و راحت کے حصول اور دلوں کو ان کی طرف ملتفت کرنے کا تقاضا نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ تو کوئی نفع لا سکتے ہیں اور نہ کوئی ضرر دور کر سکتے ہیں، بلکہ سبب اور مسبب دونوں ہی اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں اور سب اسی کی جانب سے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے اور متوکل کی جانب سے ان اسباب کی طرف جھکاؤ اور میلان واقع ہوتا ہے تو وہ اس اسم (کے مفہوم) سے نکل جاتا ہے پھر توکل کرنے والوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔
(۱) توکل کی قدرت رکھنے والے کی حالت! یہ تو ان اسباب میں سے کسی شے کی طرف اپنے دل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ حکم امر کے سوا ان میں مشغول ہوتا ہے۔
(۲) قدرت نہ رکھنے والے کی حالت: اور یہ وہ ہوتا ہے جس کی توجہ ان اسباب کی طرف وقتاً فوقتاً ہو جاتی ہے مگر وہ عملی

طریقوں اور دلائل قطعیہ اور حالیہ ذوق کے ساتھ ان کو اپنے آپ سے دور رکھتا ہے، پس وہ اسی طرح کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جود و عطا کے ساتھ قدرت رکھنے والے متوکلین کے مقام پر فائز فرما دیتا ہے اور اسے عارفین کے درجات کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو۔ (عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرما رہے تھے مومنوں سے: کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں۔ ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور (اگر) آدھمکیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک، بروز جمعہ ہجرت کے اٹھارہویں ماہ واقع ہوا، اور بدر، وہاں پانی کا ایک کنواں ہے اسی سبب سے اس جگہ کا نام بدر ہے اور شعبی نے کہا ہے: وہ پانی قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا تھا اس کا نام بدر تھا (1) اور اس وجہ سے اس جگہ کا نام بدر رکھا گیا۔ پہلا معنی زیادہ اور عام ہے۔ واقدی وغیرہ نے کہا ہے: بدر غیر منقول جگہ کا نام ہے اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر کے ضمن میں سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اَذِلَّةٌ کا معنی ہے بہت کم تھوڑے، کیونکہ وہ اس دن تین سو تیرہ یا چودہ آدمی تھے (2)۔ اور ان کے دشمن کی تعداد نو سو سے ہزار تک کے درمیان تھی۔ اور اَذِلَّة ذلیل کی جمع ہے۔ اور اس مقام پر ذل کا اسم استعارۃً استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنی ذاتوں میں تو یقیناً عزت والے اور غالب تھے، لیکن اپنے دشمنوں کی طرف اپنی نسبت کے اعتبار سے اور زمین کے مختلف حصص میں بسنے والے جمیع کفار کے مقابلے میں غور و فکر کے وقت ان کی قلت اور کمی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان پر غلبہ پا لیا جائے گا۔ اور النصر کا معنی عون (مدد کرنا) ہے، پس اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کے دن ان کی مدد فرمائی اور ان میں مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اسی دن پر اسلام کی بنیاد پڑی اور یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ غزوات میں شرکت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542

2۔ ایضاً

فرمائی اور ان میں سے آٹھ میں باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا(1)۔ اور اسی میں ابن اسحاق سے یہ روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے پوچھا: کتنے غزوات میں رسول اللہ ﷺ شریک ہوئے؟ تو انہوں نے فرمایا: انیس غزوات میں۔ پھر میں نے پوچھا: کتنے غزوات میں تم آپ ﷺ کے ساتھ تھے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: سترہ غزوات میں۔ پھر میں نے کہا: وہ کون سا پہلا غزوہ ہے جس میں آپ شریک ہوئے؟ انہوں نے فرمایا: ذات العُسیر یا ذات العشیر(2)۔ اور یہ سب کچھ اس کے خلاف ہے جو اہل تاریخ وسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کتاب الطبقات میں کہا ہے: بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کے غزوات ستائیس ہیں اور آپ کے سرایا چھپن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھیالیس ہیں اور وہ جن میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا ہے وہ بدر، احد، مریسیع، خندق، خیبر، قریظہ، الفتح، حنین اور طائف ہیں۔ ابن سعد نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس پر ہمارا اجماع ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے بنی نضیر میں، خیبر سے واپسی پر وادی القریٰ میں اور الغابہ (شام کی طرف مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے) میں قتال کیا ہے(3) اور جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک نے اس کے بارے خبر دی ہے جو اس کے علم یا اس کے مشاہدہ میں تھا۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''پہلا غزوہ جس میں آپ ﷺ شریک ہوئے وہ ذات العسیر ہ ہے''، یہ بھی اس کے خلاف ہے جو اہل التواریخ والسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کہا ہے: غزوہ عشیرہ سے پہلے تین غزوات ہوئے، یعنی آپ ﷺ بنفس نفیس ان میں شریک ہوئے۔ اور ابن عبدالبر نے ''کتاب الدرر فی المغازی والسیر'' میں کہا ہے: پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ ﷺ خود شریک ہوئے غزوہ ودان ہے اور یہ صفر میں واقع ہوا اور وہ یہ کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ پہنچے تو ماہ ربیع الاول کی بارہ راتیں گزر چکی تھیں، پھر آپ بقیہ ربیع الاول اور ۲ ھ کے صفر تک وہیں مقیم رہے، پھر آپ ﷺ مذکور صفر کے مہینے میں نکلے اور مدینہ طیبہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا حتیٰ کہ آپ ودان پہنچ گئے اور بنی ضمرہ سے مصالحت کرلی، پھر آپ ﷺ مدینہ طیبہ کی جانب لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی اور اسی کا نام غزوہ ابواء بھی ہے۔ پھر آپ ﷺ مذکورہ سال کے ربیع الثانی کے مہینے تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے، پھر آپ ﷺ وہاں سے نکلے اور سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ طیبہ پر عامل مقرر فرمایا، یہاں تک کہ آپ رَضویٰ (مدینہ طیبہ میں ایک پہاڑ ہے) کے قریب بوَاط (قبیلہ جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔) پہنچ گئے پھر آپ مدینہ طیبہ واپس تشریف لے گئے اور جنگ نہ ہوئی۔ بعد ازاں آپ ربیع الثانی کے بقیہ ایام اور کچھ ایام جمادی الاول کے وہیں رہے پھر آپ غزوہ کے ارادہ سے نکلے اور مدینہ طیبہ پر ابوسلمہ بن عبدالاسد کو خلیفہ مقرر کیا اور مِلل (مکہ مکرمہ کی ایک وادی ہے) کے راستے سے عسیرہ کی طرف چل دیئے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن اسحاق نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں اور حضرت علی

---

1۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 18، قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 118، قدیمی کتب خانہ کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، کتاب ذکر عدد مغازی رسول اللہ و سرایاہ، جلد 2، صفحہ 5، دار بیروت

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ینبع کے بطن میں ہونے والے غزوہ عشیرہ میں دونوں دوست (ایک ساتھ) تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں اترے تو ایک مہینہ تک وہیں مقیم رہے اور وہاں بنی مدلج اور ان کے حلفاء بنی ضمرہ وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان سے عداوت ترک کر دی، تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا: کیا تیرے لئے ممکن ہے (اے) ابا الیقظان کہ تو ان کے پاس آئے؟ بنی مدلج کی ایک جماعت بیدار رہ کر ان کے لئے کام کر رہی ہے ہم دیکھیں وہ کیسے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے اور ان کی طرف کچھ وقت تک دیکھتے رہے پھر ہم پر نیند غالب آ گئی تو ہم نے زمین کی مٹی میں کھجور کے چھوٹے درختوں کا قصد کیا اور ان میں آ کر سو گئے، پھر قسم بخدا! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر اپنے قدموں کے ساتھ جگایا، تو ہم بیٹھ گئے اور ہم اس مٹی سے لتھڑے پڑے تھے تو اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ما بالک یا ابا تراب تجھے کیا ہوا ہے اے ابا تراب! تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ہمیں پیش آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألا اخبرکم باشقی الناس رجلین (کیا میں تمہیں ایسے دو آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام لوگوں سے زیادہ بد بخت ہیں؟ ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قوم ثمود کا احیمر جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ) جو تجھے اے علی! اس پر مارے گا...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھا...... یہاں تک کہ یہ اس سے تر ہو گیا" اور (پھر) آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا(1)۔ پس ابو عمر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ کی کچھ راتیں وہیں مقیم رہے اور اس میں بنی مدلج سے مصالحت کی، پھر واپس لوٹ آئے اور جنگ تک نوبت نہ آئی، پھر اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں کے فاصلے کے ساتھ غزوہ بدر الاولیٰ ہوا، یہ وہ تفصیل ہے جس میں اہل التواریخ والسیر کوئی شک نہیں کرتے، پس حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے خبر دی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ واللہ اعلم۔

اور کہا جاتا ہے: ذات العسیر سین کے ساتھ بھی ہے اور شین کے ساتھ بھی اور اس پر ھا کا اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: العشیرۃ۔ پھر غزوہ بدر الکبریٰ ہوا اور جو بھی اس میں حاضر ہوئے ان کے لئے فضیلت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی اور عظیم جنگ ہے اس میں علماء کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی مدد فرمائی اور ظاہر آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ غزوہ احد میں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایسا غزوہ احد میں ہوا تو انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَصَرَ كُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ سے تا قولہ تَشْكُرُوْنَ کو دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ یہ عامر شعبی کا قول ہے۔ اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ ملائکہ غزوہ بدر کے دن حاضر ہوئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے اور اسی کے بارے ابو اسید مالک بن ربیعہ کا قول ہے اور یہ بدر میں حاضر تھے، اگر میں اب تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جس سے ملائکہ ظاہر ہوئے تھے مجھے اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں ہے۔ اسے عقیل نے زہری عن ابی حازم سلمہ بن دینار سے روایت کیا

1۔ مسند احمد بن حنبل کتاب اول مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 263، دار صادر

ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا ہے: اس ایک حدیث کے سوا زہری کی ابو حازم سے کوئی حدیث معروف نہیں اور ابو اسید کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ ہی بدری صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں فوت ہوئے، اسے ابو عمر نے الاستیعاب وغیرہ میں ذکر کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے آپ نے بیان فرمایا: غزوہ بدر کے دن جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو انیس ہے، تو نبی مکرم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگے: اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی اللھم آتِ ما وعدتنی اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃُ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (اے الله! میرے لئے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اے الله! وہ عطا فرما جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، اے الله! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہاتھ پھیلا کر مسلسل اپنے رب کریم سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی، پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر اسے ڈال دیا، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو پکڑ لیا اور عرض کی: یا نبی الله صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے مناجات کافی ہے، وہ تمہارا وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے تمہارے ساتھ فرمایا ہے، پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ (الانفال) (یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔) پس الله تعالیٰ نے ملائکہ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔

ابو زمیل نے کہا ہے کہ مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس دن مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی مشرک کے پیچھے تیز دوڑ رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے اس پر کوڑا پڑنے کی آواز اور شہسوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے: أقدم حیزوم (حیزوم آگے بڑھ) تو اس نے اپنے سامنے مشرک کی طرف دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، تو اس نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی ناک توڑ دی گئی ہے اور اس کا چہرہ اس طرح پھاڑ دیا گیا ہے [جس طرح کوڑے کی ضرب کے ساتھ۔] پس وہ تمام کے تمام اکٹھے ہو گئے تو ایک انصاری آیا اور اس نے اس کے بارے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت ذالك من مدد السمآء الثالثة (تو نے سچ کہا ہے وہ تیسرے آسمان سے مدد آئی ہے) پس اس دن وہ ستر مارے گئے اور ستر قیدی بنا لئے گئے۔ آگے حدیث ذکر کی (1) اور عنقریب سورہ الانفال کے آخر میں مکمل آئے گی ان شاء الله تعالیٰ۔ پس سنت اور قرآن نے اسی کی موافقت کی ہے جو کچھ جمہور نے کہا ہے، والحمدلله۔

خارجہ بن ابراہیم نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین علیہ السلام سے پوچھا: "بدر کے دن ملائکہ میں سے کون یہ کہہ رہا تھا اقدِم حیزوم؟ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے عرض کی:

1۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر و اباحۃ الغنائم، جلد 2، صفحہ 93، اسلام آباد

یا محمد (ﷺ) ما کل اهل السماء أعرف (اے محمد! ﷺ میں تمام اہل آسمان کو نہیں پہچانتا۔)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: اس اثنا میں کہ میں بدر کے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا تھا کہ تیز ہوا آئی جس کی مثل میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر وہ چلی گئی۔ پھر اتنی تیز ہوا آئی کہ میں نے اس کی مثل کبھی نہ دیکھی تھی مگر وہی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ راوی کا بیان ہے: میرا گمان ہے کہ انہوں نے ذکر کیا، پھر انتہائی تیز اور شدید ہوا آئی، پس پہلی ہوا کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اترے اور دوسری ہوا کے وقت حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اترے اور آپ ﷺ کی دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری ہوا کے وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب اترے اور میسرہ میں میں تھا۔

اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں نے بذات خود غزوہ بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنی تلوار کے ساتھ مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو تلوار اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا سر اس کے جسم سے کٹ کر گر پڑتا۔

اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ لوگ غزوہ بدر کے دن کفار کے ان مقتولوں کو پہچانتے تھے جنہیں فرشتوں نے قتل کیا تھا انہوں نے انہیں گردنوں کے اوپر ضرب لگا کر قتل کیا تھا اور پوروں پر آگ کے نشان کی مثل نشان تھے وہ اس کے ساتھ جلا دیئے گئے، یہ سب بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے: بے شک ملائکہ قتال کرتے رہے ہیں اور کفار میں ان کی ضرب کی علامت بالکل ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ ان کی ضرب لگی اس جگہ میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ابوجہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ بلاشبہ مجھے اس نے قتل کیا ہے جس کے گھوڑے کے سم تک میرا نیزہ بھی نہیں پہنچ سکا اگرچہ کوشش تو نے کی ہے۔ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوا کہ مومنین کے دلوں کو تسکین اور راحت نصیب ہوئی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو یوم قیامت تک مجاہدین بنا دیا، پس ہر لشکر جس نے صبر کیا اور اخلاص اپنایا فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد نے فرمایا: ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا کہیں جنگ نہیں لڑی۔ اور اس کے سوا میں وہ صرف حاضر ہوئے ہیں لیکن وہ قتال نہیں کرتے بلاشبہ وہ تعداد (میں اضافہ کا سبب) یا مدد ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دعا کرتے رہتے ہیں اور تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے (اجر و ثواب میں) اضافہ کا سبب بنتے ہیں جو اس دن قتال کرتے ہیں، پس اس بناء پر تو ملائکہ نے بدر کے دن بھی قتال نہیں کیا بلکہ وہ صرف ثابت قدم رہنے کی دعا کے لئے حاضر ہوئے، پہلا قول اکثر کا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ بدر کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کے ساتھ ان کی امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئے (1)، پس اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542

مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ اور بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ پس مومنین نے بدر کے دن صبر کیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی امداد فرمائی جیسا کہ ان سے وعدہ کیا تھا، پس یہ سب غزوہ بدر کے دن ہوا۔ اور حسن نے کہا ہے: پس یہ پانچ ہزار یوم قیامت تک مومنین کے لئے مدد و معاون رہیں گے۔

حضرت شعبی نے کہا ہے: بدر کے دن حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ خبر حضور نبی مکرم ﷺ اور مسلمانوں پر شاق گزری، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ ... تا قولہ ... مُسَوِّمِيْنَ پس کرز کو شکست اور ہزیمت کی خبر موصول ہوئی تو اس نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور واپس لوٹ گیا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار کے ساتھ ان کی مدد نہ کی، بلکہ ایک ہزار کے ساتھ ان کی مدد کی گئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مومنین سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی طاعت و فرمانبرداری پر ڈٹے رہے، اور اس کے محارم سے بچتے رہے تو وہ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا۔ لیکن جنگ احزاب کے سوا انہوں نے صبر کیا اور نہ ہی وہ محارم سے بچے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی جب انہوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کیا۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ جنگ احد کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد کا وعدہ فرمایا بشرطیکہ انہوں نے صبر کیا پس انہوں نے صبر نہ کیا اور نہ ہی ایک فرشتے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، اگر ان کی مدد کی جاتی تو پھر انہیں ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔

عکرمہ اور ضحاک نے یہی کہا ہے (2) اور اگر کہا جائے: تحقیق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کی دائیں اور بائیں جانب دو آدمیوں کو دیکھا وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ دونوں آپ کی جانب سے انتہائی شدید جنگ لڑ رہے تھے، میں نے ان دونوں کو کبھی نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ ہی اس کے بعد (3) (دیکھا)۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: شاید یہ حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ مختص ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے دو فرشتے خاص کر دیئے جو آپ کی طرف سے جنگ لڑیں گے اور یہ صحابہ کرام کے لئے امداد نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ملائکہ کا نازل ہونا مدد و نصرت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ رب العالمین اس کا محتاج اور ضرورت مند نہیں ہے، بلکہ مخلوق اس کی محتاج ہے پس چاہیے کہ دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اسی پر اعتماد اور توکل ہو، کیونکہ سبب اور بغیر سبب کے وہی ناصر اور مدد فرمانے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰسین) (اس کا کام کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) لیکن اس نے اس کے بارے خبر دی ہے تاکہ مخلوق اس کی پیروی کرے جس کا اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے ان اسباب میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں، وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542
2۔ ایضاً، صفحہ 543
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الاحزاب) (اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے) ور اس طرح توکل میں کوئی نقص اور عیب پیدا نہ ہوگا، اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اسباب تو ضعفاء اور کمزوروں کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ اقویاء اور طاقتوروں کے لئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام تو اقویا اور طاقتور تھے اور ان کے سوا دوسرے ضعفاء اور کمزور ہیں اور یہ بالکل واضح ہے۔ مدّ کا لفظ شر میں اور أمدّ کا لفظ خیر میں (مدد کے لئے استعمال ہوتا ہے) جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ابوحیوہ نے مُنْزِلِيْنَ زا کو کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے یعنی وہ مدد و نصرت اتارنے والے ہیں۔ اور ابن عامر نے کثرت کی بنا پر زا کو مشدد اور مفتوح پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: بَلٰۤى (ہاں کافی ہے) اور کلام مکمل ہوگئی۔ اِنْ تَصْبِرُوْا یہ شرط ہے یعنی اگر تم دشمن کے مقابلے میں صبر کرو وَ تَتَّقُوْا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی تم اس کی معصیت اور نافرمانی سے بچے رہو۔ يُمْدِدْكُمْ یہ جواب شرط ہے۔ (تو وہ تمہاری مدد کرے گا) اور مِّنْ فَوْرِهِمْ کا معنی ہے من وَجْهِهِمْ (یعنی اگر ان کی طرف سے تیزی ہو جائے) یہ عکرمہ، قتادہ اور حسن، ربیع، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: من غضبهم (یعنی اگر وہ آ جائیں اپنے غضب سے) یہ مجاہد اور ضحاک سے منقول ہے۔ وہ غزوہ احد کے دن ان حالات سے غضب میں تھے جن کا غزوہ بدر کے دن انہیں سامنا کرنا پڑا(1)۔ اور الفور کا اصلی معنی کسی شی کی طرف قصد کرنا اور اسے خوب محنت و مشقت کے ساتھ لینا ہے اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فارت القِدر تفور فورًا و فَوَرَانًا۔ جب ہانڈی خوب ابلنے لگے اور الفور کا معنی الغَلَيان (ابلنا) ہے۔ اور فار غضبُهٗ جب غصہ خوب بھڑک جائے (تو یہ کہا جاتا ہے) اور اس کا فعل فورہ سے ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ ساکن ہو۔ اور الفوارۃ جو کچھ ہانڈی میں سے ابلتا اور کھولتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (تنور ابل گیا) شاعر نے کہا ہے:

تفور علینا قِدرُهُمْ فَنُدِيْمُهَا

ہمارے خلاف ان کی ہنڈیاں ابلنے لگتی ہیں تو ہم انہیں ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: مُسَوَّمِيْنَ یہ واؤ کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول ہے۔ اور یہ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور نافع کی قرأت ہے یعنی جن کی علامت کے ساتھ پہچان کرائی گئی ہے۔ اور مُسَوِّمِيْنَ واؤ کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل ہے۔ اور یہ ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم کی قرأت ہے(2) اور یہ بھی سابقہ معنی کا احتمال رکھتا ہے یعنی انہوں نے علامت کے ساتھ اپنی اور اپنے گھوڑوں کی پہچان کرائی۔ علامہ طبری وغیرہ نے اس قرأت کو ترجیح دی ہے اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے: مُسَوِّمِيْنَ یعنی وہ اپنے گھوڑے جنگ میں بھیجنے والے ہیں۔ اور مہدوی نے مُسَوَّمِيْنَ بفتح واؤ میں یہ معنی ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے خلاف بھیجا...... اور ابن فورک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور پہلی قرأت کے مطابق انہوں نے ملائکہ کی نشانی میں اختلاف کیا ہے۔

پس حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ سے مروی ہے کہ ملائکہ سفید عمامے باندھے ہوئے تھے اور (ان کی طرف کو) اپنے کندھوں کے درمیان چھوڑ رکھا تھا(3) (یعنی ایک لڑ کندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا) اسے بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے اور مہدوی نے اسے زجاج سے بیان کیا ہے مگر حضرت جبرئیل امین علیہ

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 543    2۔ ایضاً، صفحہ 544    3۔ ایضاً

السلام حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرح زرد رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے اور ابن اسحاق نے اسے بیان کیا ہے۔ اور ربیع نے بیان کیا ہے کہ ان کی نشانی یہ تھی کہ وہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بیہقی نے حضرت سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے بدر کے دن زمین و آسمان کے درمیان ابلق گھوڑوں پر کچھ چمکتے اور روشن آدمی دیکھے درآنحالیکہ وہ نشان زدہ تھے وہ قتل کر رہے تھے اور قیدی بنا رہے تھے۔ پس ان کا قول: معلّمین اس پر دلیل ہے کہ ابلق گھوڑے کوئی نشانی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں اور پیشانیوں اور دموں پر رنگ برنگی اون کے ساتھ نشان لگے ہوئے تھے۔(1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: بدر کے دن ملائکہ سفید اون کے ساتھ گھوڑوں کی پیشانیوں اور ان کی دموں پر نشان لگائے ہوئے تھے(2) اور عباد بن عبداللہ بن زبیر، ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ہے: ملائکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانی میں نازل ہوئے وہ زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے درآنحالیکہ وہ ان کے کندھوں پر لٹک رہے تھے(3)۔ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادوں حضرت عبداللہ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: زرد رنگ کی چادر تھی جس کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بطور عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں: اور آیت اس پر دلیل ہے..... اور یہ چوتھا مسئلہ ہے..... (۴) یعنی یہ قبائل اور لشکروں کے لئے کوئی علامت اور کوڈ بنانے پر دلالت کرتی ہے جو ان کے لئے حاکم وقت متعین کرتا ہے تا کہ ہر قبیلہ اور ہر لشکر جنگ کے وقت دوسرے سے ممتاز اور الگ رہے اور یہ آیت ابلق گھوڑوں کی فضیلت پر بھی دلیل ہے کیونکہ ملائکہ نے ان پر نزول فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی موافقت میں ملائکہ ان پر نازل ہوئے، کیونکہ وہ تھوڑا ابلق تھا اور اس کے سوا ان کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا، پس ملائکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم میں ابلق گھوڑوں پر اترے، جس طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت جبرئیل امین علیہ السلام زرد عمامہ باندھ کر نزول فرما ہوئے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت اس پر بھی دلیل ہے..... اور یہی پانچواں مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ کہ اون کا لباس وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صالحین نے پہنا ہے۔ اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ انہی کے ہیں کہ حضرت ابو بردہ نے اپنے باپ سے روایت کیا اور کہا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا: اگر تو ہمارے ساتھ حاضر ہوتا درآنحالیکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے جب بارش ہم پر برستی تو یقیناً تو گمان کرتا کہ ہماری ہوا بھیڑوں کی ہوا کی طرح ہے(4)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنگ آستینوں والا اون کا بنا ہوا رومی جبہ زیب تن فرمایا۔

---

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 544

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، حدیث 3515، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب اللباس، حدیث 3551، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب اللباس، جلد 1، صفحہ 209، اسلام آباد

اسے ائمہ نے روایت کیا ہے (1) اور حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اسے پہنا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النحل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6۔** میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت مجاہد نے ذکر کیا ہے کہ ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں تو یہ بہت بعید ہے، کیونکہ مصنف ابی داؤد میں عتبہ بن عبد سلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تم گھوڑوں کی پیشانیاں نہ کاٹو (یعنی ان کے بال نہ کاٹو) اور نہ ہی ان کی کلغیاں اور نہ ہی ان کی دمیں، کیونکہ ان کی دمیں ان کی چربی ہے اور ان کی کلغیاں ان کے لئے حرارت ہیں اور ان کی پیشانیوں میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے۔ (2)'' پس حضرت مجاہد کا قول اس حکم توقیفی کا محتاج ہے کہ ملائکہ کے گھوڑے اس صفت پر تھے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت رنگوں میں سے سفید اور زرد رنگ کے حسن پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ ملائکہ انہی کے ساتھ نازل ہوئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جس نے زرد رنگ کے نعل پہن لئے اس کی حاجت پوری کر دی گئی (3)۔ ورآپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے کپڑوں میں سے سفید پہنو کیونکہ وہ تمہارے بہترین اور خیر و برکت والے کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑے میں کفن دو (4) اور رہے عمامے تو وہ عربوں کا تاج اور ان کا لباس ہے'' اور رکانہ نے روایت کیا ہے...... اس نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ کشتی لڑی تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے پچھاڑ دیا۔

رکانہ نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس (5) (کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپیوں پر عمامے باندھنا ہے) اسے ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے اس کی اسناد مجہول ہے اس کے بعض راویوں کا سماع بعض سے معروف نہیں۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآىٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب (اور) حکمت والا ہے۔ (یہ مدد اس لئے تھی) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ اس میں ہ ضمیر مدد کے لئے ہے اور وہ ملائکہ ہیں یا وعدہ ہے یا امداد ہے، اور

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ حدیث نمبر 350، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2180، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 344، اسلام آباد

3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، حدیث نمبر 3380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، باب العمائم علی القلانس، جلد 1، صفحہ 210، اسلام آباد۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس پر قول باری تعالیٰ یُمْدِدْكُمْ دلالت کرتا ہے یا پھر ضمیر تسویم (نشان لگانا) یا انزال (اتارنا) یا معنوی طور پر عدد کے لئے ہے، کیونکہ خمسۃ آلاف عدد ہے۔ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اس میں لام، لام کی ہے، یعنی ولتطمئن قلوبکم به جعله (تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ایسا کیا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حِفْظًا۔ ای حفظا لها جعل ذالك (اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اسے بنایا۔)

وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی مومنین کی مدد و نصرت نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس میں کافروں کی مدد داخل نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ بلاشبہ رسوائی، برے انجام اور خسارے سے بھرا اور گھرا ہوتا ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا (یعنی تا کہ وہ قتل کے ساتھ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے) اور نظم آیت اس طرح ہے: ولقد نصرکم الله ببدر لیقطع۔ (تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد فرمائی تا کہ وہ کاٹ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے وما النصر الا من عند الله لیقطع (مدد نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تا کہ وہ کاٹ دے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُمْدِدْكُمْ کے متعلق ہو، (یعنی وہ تمہاری مدد کرے گا تا کہ وہ کاٹ دے) اور معنی ہے: مشرکین میں سے جو بدر کے دن قتل کئے گئے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے۔ سدی نے کہا ہے: یعنی اس کے ساتھ جو مشرکین غزوہ احد کے دن قتل کئے گئے اور وہ اٹھارہ آدمی تھے۔

اور يَكْبِتَهُمْ کا معنی ہے یحزنهم (یا وہ انہیں پریشان اور غمزدہ کر دے)، اور المکبوت کا معنی محزون (غمگین) ہے۔ اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوطلحہ کے پاس آئے تو ان کے بیٹے کو پریشان اور غمزدہ دیکھا۔ تو فرمایا: ''اسے کیا ہوا ہے؟'' تو عرض کی گئی: اس کا اونٹ مر گیا ہے۔ اور اس کی اصل جو کہ بعض اہل لغت نے بیان کی ہے یکبدهم ہے ای یصیبهم بالحزن والغيظ فی أكبادهم (1) (یعنی وہ انہیں غم واندوہ اور غیظ وغضب ان کے دلوں (کلیجوں) میں پہنچائے۔) پھر دال کو تا سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سَبَتَ رأسه اور سبده میں دال کو تا سے بدلا گیا ہے یعنی اس نے اس کا سر مونڈ دیا (2)۔ کبت الله العدو کبتا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اللہ تعالیٰ دشمن کو پھیر دے اور اسے ذلیل و رسوا کر دے، اور کبده کا معنی ہے اصابه فی کبده (یعنی اس نے اس کے دل میں تکلیف پہنچائی) کہا جاتا ہے: قد احرق الحزن کبده (غم نے اس کے دل کو جلا دیا) اور احرقت العداوة كبِدَهُ (دشمنی نے اس کا جگر جلا دیا۔) اور عرب دشمن کے لئے کہتے ہیں: أسود الكبد۔ (جگر سیاہ ہو گیا)

اعشیٰ نے کہا ہے:

فما أجشمت من اتيانِ قوم　　هم الأعداءُ والأكباد سُودُ

اس میں الاکبادُ سُود جگر سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

گویا کہ شدت عداوت کے سبب جب جگر جل جاتا ہے تو وہ سیاہ ہو جاتا ہے اور ابو مجلز نے او یکبدهم دال کے ساتھ پڑھا

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 545　　2۔ ایضاً

ہے۔ اور الخائب سے مراد وہ ہے جس کی امید ٹوٹ چکی ہو (کچھ ہاتھ نہ آئے) خاب یخیب اذا لم ینل ما طلب یعنی جو طلب کیا جب وہ اسے نہ پائے تو اس کے لئے خاب یخیب کا لفظ کہا جاتا ہے۔ اور الخیّاب یعنی ایسا عیب ہے جسے وہ چھپا نہ سکتا ہو۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو الله ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو عذاب دے انہیں، پس بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور الله ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور الله بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ غزوہ احد میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا سر زخمی کر دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: "وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور اس کے دانت توڑ دیئے حالانکہ وہ انہیں الله تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔" تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ۔(1)

ضحاک نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے لئے بددعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو الله تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے استیصال اور بربادی کے بارے دعا مانگنے کی اجازت طلب کی، تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے جان لیا کہ ان میں سے بعض عنقریب اسلام قبول کر لیں گے، چنانچہ پھر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ان میں سے حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ افراد ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار آدمیوں کے لئے بددعا کرتے رہے، پھر الله تعالیٰ نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر الله تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت اور توفیق عطا فرما دی۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔(2)

اور قولہ تعالیٰ: اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یہ لِيَقْطَعَ طَرَفًا پر معطوف ہے اور معنی ہے تاکہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر دے یا انہیں شکست و ہزیمت کے ساتھ ذلیل و رسوا کر دے یا ان کی توبہ قبول فرمالے یا انہیں عذاب دے۔ اور یہاں اَوْ بمعنی حتّٰی اور اِلّا اَنْ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

... او نموت فنعذرا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 108، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 125، اسلام آباد

ہمارے علماء نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: کیف یفلح قوم شجوا رأس نبیھم یہ بعید سمجھنا ہے اس کے لئے توفیق کو جس نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ یہ اسے قریب کرنا ہے جسے آپ نے بعید سمجھا اور ان کے اسلام قبول کرنے میں حرص و طمع کا اظہار ہے۔

اور جب اس بارے میں آپ ﷺ کو طمع دلایا گیا تو آپ ﷺ نے اس طرح عرض کی: اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (1) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔) جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: گویا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ انبیاء میں سے کسی نبی علیہ السلام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ آپ کی قوم نے آپ کو مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ''اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حکایت کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں اور وہ محکی عنہ ہیں اور اس پر صریح اور واضح دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا گیا غزوہ احد میں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی شاک گزرا تو انہوں نے عرض کی: اگر آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے (2)، اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔'' گویا کہ آپ ﷺ کی طرف واقعہ احد پیش آنے سے پہلے اس کے بارے وحی کی گئی اور نبی مکرم ﷺ نے اسے اپنے لئے معین نہیں کیا اور جب آپ کو یہ واقعہ پیش آیا تو متعین ہو گیا کہ معنی یہی ہے اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض کلام میں اس بارے میں جو کہا ہے وہ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں بددعا کی اور یہ کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ الآیہ (نوح) (اے رب! زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔) اور اگر آپ ہمارے خلاف اس طرح کی دعا کرتے تو ہم اپنے آخر کی طرف سے ہلاک ہو جاتے، حالانکہ آپ کی پشت کو روندا گیا، آپ کا چہرہ خون آلود کیا گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید کئے گئے لیکن آپ نے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہا اور یہ دعا کی: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (3) اور آپ کا قول: اشتد غضب اللہ علی قوم کسروا رباعیۃ نبیھم (4) (اللہ تعالیٰ کا غضب شدید اور سخت ہوا اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے دندان مبارک شہید کر دیئے) یہ خالصۃً اس کے لئے ہے جس نے عملاً ایسا کیا اور ہم نے اس کا نام ذکر کر دیا ہے اگرچہ اس کے بارے اختلاف ہے اور ہم نے یہ کہا کہ یہ مباشر (عمل کرنے والے) کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ ان میں سے ایک جماعت نے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفطن باب الصبر علی البلاء، صفحہ 300۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث 3218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 323، اسلام آباد
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 208
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3765، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسلام قبول کر لیا جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور خوب اچھی طرح اسلام لائے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** بعض علماء کوفہ نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت اس قنوت کے لئے ناسخ ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فجر کی نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا: اللّٰھم ربنا ولك الحمد فی الآخرۃ ... پھر کہا ... اللّٰھم العن فلانا و فلانا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ الآیہ۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے(1) اور امام مسلم نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے یہ اس سے زیادہ مکمل اور اتم ہے(2) اور یہ نسخ کا محل نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ امر ان کے پاس نہیں ہے اور یہ کہ وہ غیب میں سے کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو میں انہیں بتاتا ہوں اور یہ کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ جسے چاہے گا اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور جس کے لئے چاہے گا اسے جلدی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: لیس لك من الامر شی و للّٰه ما فی السموات و ما فی الارض دونك و دونھم یغفر لمن یشاء و یتوب علی من یشاء (آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے نہ آپ کا ہے اور نہ ہی ان کا ہے وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرمالیتا ہے) پس اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ سے یہ بیان کیا ہے کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** نماز فجر اور اس کے علاوہ نمازوں میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس کوفیوں نے نماز فجر وغیرہا میں قنوت سے منع کیا ہے اور یہی مذہب لیث اور صاحب مالک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا ہے۔ اور شعبیؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ کسی نماز میں قنوت نہ پڑھتے تھے(3) اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ نے عن خلف عن ابی مالك اشجعی عن ابیه کی سند سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے دعائے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہ پڑھی، پھر فرمایا: اے بیٹے! یہ بدعت ہے(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام لکتاب اللہ، جلد 2، صفحہ 1091، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 6800، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، باب القنوت فی الصبح، صفحہ 143، اسلام آباد

4۔ سنن نسائی، باب ترک القنوت، جلد 1، صفحہ 164۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی ترک القنوت، حدیث نمبر 368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمیشہ قنوت پڑھی جائے گی اور تمام نمازوں میں (پڑھی جائے گی) جبکہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ امام شافعیؒ اور طبری نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز فجر میں مستحب ہے اور یہ امام شافعیؒ سے مروی ہے اور حسن اور سحنون نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اور یہی علی بن زیاد کی اس روایت کا تقاضا ہے جو امام مالکؒ سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر اسے چھوڑنے والا نماز کا اعادہ کرے گا اور علامہ طبری نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ اسے چھوڑ دینا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ اور حسن سے منقول ہے کہ قنوت کے ترک ہو جانے میں سجدۂ سہو لازم ہے اور یہی امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دارقطنی نے سعید ابن عبدالعزیز سے اس کے بارے بیان کیا ہے جو صبح کی نماز میں قنوت بھول گیا۔ فرمایا: وہ سہو کے دو سجدے کرے گا۔ اور امام مالک نے رکوع سے پہلے کو اختیار کیا ہے اور یہی اسحاق کا قول ہے اور یہی امام شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا بھی قول ہے۔ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے اس بارے میں اختیار مروی ہے (یعنی چاہے تو رکوع سے پہلے پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد) اور دارقطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں مسلسل قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ابوداؤد نے مراسیل میں خالد بن ابی عمران سے ذکر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضر کے خلاف دعا کر رہے تھے کہ اچانک جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، پھر انہوں نے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اس نے آپ کو رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اس نے آپ کو عذاب کے لئے نہیں بھیجا، لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا: پھر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعائے قنوت سکھائی پس فرمایا: اللهم انا نستعينك و نستغفرك و نؤمن بك و نخنع لك و نخلع و نترك من يكفرك اللهم اياك نعبد و لك نصلي و نسجد و اليك نسعى و نحفد و نرجو رحمتك و نخاف عذابك الجد ان عذابك بالكافرين ملحق۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ۚ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ۚ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ۚ

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سود کھانے سے یہ نہی قصہ احد کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مجھے اس بارے میں روایت کردہ کوئی شے یاد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے: وہ ایک مدت تک بیع کرتے تھے اور جب مدت مقررہ گزر جاتی تو وہ اسے مؤخر کرنے کی شرط پر ثمن میں اضافہ کر دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا

الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً [میں کہتا ہوں] تمام گناہوں میں سے ربا کو خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں جنگ کی اجازت دی ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرہ: 279) (اور تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) اور جنگ قتل کی خبر دیتی ہے، گویا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے: اگر تم سود سے نہ بچے تو تمہیں ہزیمت کا سامنا ہوگا اور تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں سود چھوڑنے کا حکم دیا، کیونکہ ان کے نزدیک اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔ اور اَضْعَافًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مُّضٰعَفَةً اس کی صفت ہے۔ اور اسے مُضَعَّفَةً بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ سود جس میں عرب قرض کو دو گنا کر لیتے تھے اور طالب کہتا تھا: کیا تو ادا کرے گا یا سود دے گا؟ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مُضَاعَفَةً یہ ایک سال کے بعد دوسرے سال دو گنا کو چار گنا کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ کرتے تھے، پس یہ عبارت موکدہ ان کے فعل کے انتہائی برا اور قبیح ہونے پر دلیل ہے، اسی لئے خاص طور پر تضعیف کی حالت ذکر کی گئی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو سود کے مالوں میں اور تم انہیں نہ کھاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ کیا(1) اور فرمایا: وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ بہت سے مفسرین نے کہا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے جس نے سود کو حلال سمجھا اور جس نے ربا کو حلال سمجھا وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ایسے عمل سے بچو جو تم سے ایمان کو چھین لیتا ہے کہ تم (اس کے سبب) آتش جہنم کو واجب کر لو گے، کیونکہ گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں کرنے والا ایمان کے چھن جانے کو واجب کر لیتا ہے اور اس پر خوف کیا جانے لگتا ہے، انہیں میں سے والدین کی نافرمانی بھی ہے۔ اور اس بارے میں ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین کا نافرمان تھا اسے علقمہ کہا جاتا تھا، تو موت کے وقت اسے کہا گیا کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، تو وہ اس پر قادر نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس کی ماں اس کے پاس آئی اور وہ اس سے راضی ہوئی۔ اور ایسے ہی گناہوں میں سے قطع تعلقی، سود خوری اور امانت میں خیانت کرنا ہے۔ ابوبکر وراق نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اکثر اوقات موت کے وقت بندے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے۔ پھر ابوبکر نے بیان کیا: پس ہم ایسے گناہوں میں غور و فکر کرتے رہے جو ایمان کو نکال دیتے ہیں تو ہم نے بندوں پر ظلم سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ کسی کو ایمان نکالنے والا نہیں پایا۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ آگ (جہنم) کو پیدا کیا گیا ہے یہ جہمیہ کا رد ہے، کیونکہ معدوم تیار شدہ نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ یعنی فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو وَالرَّسُوْلَ اور سنن میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو)

اور یہ قول بھی ہے کہ سود کی تحریم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور تحریم کے بارے میں جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں پہنچایا ہے (اس میں ان کی اطاعت کرو) لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَسَارِعُوْٓا حضرت نافع اور ابن عامر نے واؤ کے بغیر سَارِعُوْٓا پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل شام کے مصاحف میں ہے (1)۔ اور باقی سات نے وَسَارِعُوْٓا واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: دونوں قراءتیں رائج اور صحیح ہیں، پس جنہوں نے واؤ کے ساتھ قراءت کی ہے انہوں نے جملہ کا عطف جملہ پر کیا ہے اور جنہوں نے واؤ کو چھوڑ دیا ہے وہ اس لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کے ساتھ اس طرح ملتبس ہے کہ اسے حرف عطف واؤ کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں۔ اور المسارعة کا معنی المبادرة (جلدی کرنا، تیزی کرنا) ہے اور یہ باب مفاعلہ ہے۔ اور آیت میں حذف ہے، یعنی سارعوا الی مایوجب المغفرة وھی الطاعة (یعنی اس عمل کی طرف تیزی سے آؤ جو مغفرت و بخشش کو واجب کر دیتا ہے اور وہ طاعت و فرمانبرداری ہے۔

حضرت انس ابن مالک اور مکحول نے وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ کی تفسیر میں کہا ہے: اس کا معنی ہے تم دوڑو تکبیر تحریمہ کی طرف اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تیزی سے آؤ فرائض ادا کرنے کی طرف، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جلدی سے آؤ اخلاص کی طرف۔ اور کلبی نے کہا ہے: تم سود سے توبہ کی طرف دوڑو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میدان جنگ میں ثابت قدمی کی طرف آؤ اور ان کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اور آیت ان تمام کو شامل ہے اور اس کا معنی وہی ہے جو فاستبقوا الخیرات کا معنی ہے (کہ تم خیر اور نیکی کے کاموں کی طرف تیزی سے آگے بڑھو) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ تقدیر عبارت ہے کعرض السموات والارض۔ اور مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدة۔ ای الا کخلق نفس واحدة وبعثھا۔

شاعر نے کہا ہے:

حسبت بُغام رَاحِلَتي عناقاً و ما هي وَيْبَ غَيْرِكَ بالعناق

اس میں مراد صوت عناق (بھیڑ کے بچے کی آواز) ہے۔ اس کی نظیر سورۂ حدید میں ہے: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (2) (اور جنت اس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کی طرح ہے۔)

اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: آسمان و زمین آپس میں بعض بعض کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے جیسا کہ کپڑوں کو پھیلایا جاتا ہے اور بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے، پس یہ جنت کا عرض ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547
2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

اور اس کا طول سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے "کہ سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جیسے وہ دراہم جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دیئے جائیں اور کرسی عرش کے مقابلہ میں اس انگوٹھی کی طرح ہے جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دی گئی ہو۔" یہ مخلوقات سے آسمانوں اور زمین کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور عظیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے اعظم ہے۔

اور کلبی نے کہا ہے: جنتیں چار ہیں، جنة عدن، جنة المأوی، جنة الفردوس اور جنة النعیم اور ان میں سے ہر جنت زمین و آسمان کے عرض کی مثل ہے اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور اسماعیل السدی نے کہا ہے: اگر آسمانوں اور زمین کو توڑ دیا جائے اور وہ رائی کے دانے ہو جائیں اور پھر ہر دانے کے بدلے جنت ہو تو اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے: "بے شک اہل جنت میں سے رتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ وہ ہوگا جو تمنا کرے گا اور آرزو کرتا رہے گا یہاں تک کہ جب اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لك ذالك وعشرة أمثاله (تیرے لئے وہ بھی ہے اور اس کی مثل دس اور بھی ہیں۔) اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے اور یعلی بن ابی مرہ نے بیان کیا ہے۔ میں حمص میں تنوخی سے ملا جو کہ ہرقل کی طرف سے قاصد بن کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تھا وہ شیخ کبیر تھا۔ اس نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہرقل کا خط لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ صحیفہ اپنی بائیں طرف والے آدمی کو دیا، پھر میں نے پوچھا: تمہارا کون وہ ساتھی ہے جو اسے پڑھے گا؟ انہوں نے کہا: معاویہ، پس تب یہ میرے صاحب کی تحریر ہے۔ بلاشبہ آپ نے لکھا ہے آپ مجھے ایسی جنت کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو جہنم کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سبحان اللہ رات کہاں ہوتی ہے جب دن آ جاتا ہے۔" (1)

اور اسی طرح کی دلیل سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے خلاف استدلال کیا جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا تم نے اس قول کو دیکھا ہے **وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** تو جہنم کہاں ہے؟ اور انہوں نے آپ کو کہا: آپ وہ لائیں جو اس سے مشابہت رکھتا ہو جو تورات میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے عرض کے سبب طول پر آگاہ فرمایا کیونکہ اغلباً طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے اور طول جب ذکر کر دیا جائے تو وہ عرض کی مقدار پر دلالت نہیں کرتا۔ زہری نے کہا ہے: جنت کا عرض بیان کیا گیا ہے اور رہا اس کا طول تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2) اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: **مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ** (الرحمن: 54) (وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے۔) تو اس میں بطانۃ کو اس حسین ترین شے کے ساتھ متصف کیا گیا ہے جو زینت اور خوبصورتی سے جانی جاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ ظواہر باطن کے مقابلہ میں زیادہ حسین اور اتقن ہوتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: بلاد عریضة وفلاة عریضة یعنی وسیع شہر اور بیابان۔

شاعر نے کہا ہے:

---

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۃ آل عمران، جلد 1، صفحہ 318، دار القرآن بیروت

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

كأنّ بلادَ الله وهِيَ عَرِيضَةٌ　على الخائف المطلوب كِفّةُ حابِلِ

اس میں وھی عریضة وسیع وعریض ہونے کے معنی میں ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مقطع عرب پر کلام بطور استعارہ جاری ہے، پس جب جنت وسعت اور انفساح کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو پھر اسے آسمانوں اور زمین کے عرض کے ساتھ بیان کرنا انتہائی حسین عبارت ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کے لئے کہتا ہے: ھذا بحر (یہ تو سمندر ہے) اور حیوانوں میں سے کسی بڑے کے لئے یہ کہتا ہے: ھذا جبل یہ پہاڑ ہے تو آیت نے عرضاً حد بیان کرنے کا قصد نہیں کیا، البتہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہر اس شے سے وسیع تر ہے جسے تم نے دیکھا ہے، اور عام علماء کا نظریہ ہے کہ جنت تخلیق کر دی گئی ہے اور یہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ اور اس کا بیان حدیث اسراء وغیرہ میں ہے جو صحیحین وغیرہما میں بیان کی گئی ہے۔

اور معتزلہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں (جنت اور جہنم) ہمارے وقت میں موجود نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ جب آسمانوں اور زمین کو لپیٹ دے گا تو پھر وہ جنت اور جہنم کو جہاں چاہے گا بنا دے گا، کیونکہ یہ دونوں ثواب وعقاب کے لئے دار جزا ہیں، لہٰذا احکام کا مکلف بنائے جانے کے بعد جزا کے وقت میں انہیں بنایا جائے گا، تا کہ دار التکلیف اور دار الجزاء دنیا میں جمع نہ ہو جائیں۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: جنت میں قیامت کے دن اضافہ کر دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں منذر بن سعید وغیرہ کا تعلق قائم کیا گیا ہے ان سے جنہوں نے کہا: بلاشبہ ابھی تک جنت تخلیق نہیں کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن فورک کا یہ قول ''کہ اس میں اضافہ کیا جائے گا'' یہ جنت کے موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو زیادتی کے عذر میں قطعی ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس بارے میں سچ کہا ہے کہ جب انہوں نے کہا: جب ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ان دراہم کی طرح ہیں جو زمین کے وسیع بیابان میں ڈال دیئے گئے ہوں اور کرسی عرش کے سامنے اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع زمین میں رکھ دیا گیا ہے، تو جنت اب اسی حالت پر ہے جس پر وہ آخرت میں ہوگی کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، کیونکہ عرش اس کی چھت ہے، یہ اس کے مطابق ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ چھت اپنے نیچے آنے والی ہر شے کو گھیرے ہوتا ہے اور کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے اور جب تمام مخلوقات اس (عرش) کی نسبت ایک انگوٹھی کی طرح ہیں تو پھر کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہو اور اس کے طول وعرض کو جانتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ایسا خالق ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کی مملکت کی وسعت کی کوئی غایت اور حد ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾

''وہ (پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگزر کرنے

والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ یہ ان متقین کی صفت ہے جن کے لئے جنت تیار کی گئی ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ فعل مندوب الیہ کے ساتھ مدح اور تعریف ہے اور السَّرَّآءِ کا معنی آسانی اور وَالضَّرَّآءِ کا معنی تنگی ہے۔

یہ ابن عباس، کلبی اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور عبید بن عمیر اور ضحاک نے کہا ہے کہ السَّرَّآءِ اور الضَّرَّآءِ کا معنی خوشحالی اور تنگ دستی ہے۔ اور صحت و بیماری کی حالت میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فِي السَّرَّآءِ کا معنی ہے زندگی میں اور فی الضَّرَّاءِ سے مراد وہ ہے جس کی وہ موت کے بعد وصیت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد شادی اور ولیموں میں خرچ کرنا ہے اور فی الضراءِ سے مراد تکالیف اور ماتم میں خرچ کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ نفقہ ہے جو تمہیں خوش کرتا ہے مثلاً اولاد اور قرابتداروں پر خرچ کرنا اور ضراء سے مراد دشمنوں پر خرچ کرنا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ وہ جوان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اسے ہدیہ دیتا ہے اور ضرآء وہ ہے جس کو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں پر خرچ کرتا اور اس سے ان پر صدقہ کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں۔ یہ آیت عام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور یہ ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور كَظْم الغيظ کا معنی ہے غصے کو پیٹ میں لوٹانا، کہا جاتا ہے: كظم غيظه یعنی وہ اس پر خاموش رہا اور اس کا اظہار نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمن پر برسنے اور عملاً وہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اور كظمت السِقاء کا معنی ہے میں نے مشکیزہ بھرا اور اس کا منہ بند کر دیا اور الكظامة وہ شے جس کے ساتھ پانی کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اسی سے الكظام اس تسمہ (دھاگے) کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مشکیزے کا منہ بند کیا جاتا ہے اور كظم البعير جرته جب اونٹ جگالی کو اپنے پیٹ میں لوٹا دے، اور کبھی كظم اس معنی کے لئے بولا جاتا ہے کہ وہ جگالی سے رک گیا قبل اس کے کہ وہ اسے اپنے منہ کی طرف بھیجے۔ اسے زجاج نے بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: كظم البعير و الناقة جب یہ جگالی نہ کریں۔

اور اسی سے راعی کا قول ہے:

فَأَفَضْنَ بعد كُظومِهِن بجِرّة　　من ذی الأبارق اذرعين حَقِيلا

اس میں جگالی سے رکنے کے معنی میں لفظ کظوم استعمال ہوا ہے۔

الحقیل، ایک جگہ ہے۔ اور الحقیل ایک بوٹی بھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گھبراہٹ اور مشقت و تھکاوٹ کے وقت ایسا کرتا ہے اور وہ جگالی نہیں کرتا۔

اعشیٰ نے اونٹوں کو نحر کرنے والے آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا اور وہ اس سے گھبراتے ہیں:

قد تكظم البُزْلُ منه حين تبصره　　حتى تَقَطَّعَ فی أجوافها الجرر

طاقتور اونٹ بھی جب اسے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے یہاں تک کہ جگالی اس کے پیٹ میں ہی کٹ جاتی ہے۔ (یعنی جگالی کے لئے پیٹ سے باہر کوئی شے نہیں لاسکتا۔)

اور اسی سے ہے، رجل کظیم و مکظوم جب کوئی غم واندوہ اور حزن وملال سے بھرا ہوا ہو۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ (یوسف) (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے) اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ (القلم) (جب اس نے پکارا اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا) اور غیظ غضب کی اصل اور بنیاد ہے اور اکثر اوقات تو یہ دونوں لازم وملزوم ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ غیظ جوارح (اعضاء بدن) پر ظاہر نہیں ہوتا بخلاف غضب کے کیونکہ یہ جوارح میں ایسے فعل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے اسی لئے جب غضب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقصود وہ افعال ہوتے ہیں جو الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے غیظ کی تفسیر غضب سے کی ہے اور یہ عمدہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ لوگوں کو معاف کرنا نیکی اور خیر کے افعال میں سے انتہائی عظیم فعل ہے، اس حیثیت سے کہ آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دے اور یہ کہ وہ اپنے حق کی طرف متوجہ ہو اور ہر وہ جو سزا کا مستحق ہو لیکن اسے چھوڑ دیا جائے تو تحقیق اسے معاف کر دیا گیا اور عَنِ النَّاسِ کے معنی میں اختلاف ہے پس ابوالعالیہ، کلبی اور زجاج نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ سے مراد غلاموں کو معاف کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مثال کے طور پر یہ بہت اچھا ہے، کیونکہ وہ خادم ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں اور ان پر قدرت آسان ہوتی ہے اور سزا کو نافذ کرنا سہل ہوتا ہے، اسی لئے مفسر نے اس کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ اور میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ان کی ایک کنیز تھی وہ ایک دن ایک بڑا پیالہ لے کر آئی اس میں گرم شوربہ تھا اور آپ کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ پس وہ گر پڑی اور شوربہ آپ پر پڑ گیا، تو میمون نے اسے مارنا چاہا تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیجئے: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ تو اس نے کہا: تحقیق میں نے کر دیا، پھر اس سے کہا: جو اس کے بعد ہے اس پر بھی عمل کیجئے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ تو اس نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پھر اس لونڈی نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو میمون نے کہا: میں نے تجھ پر احسان کر دیا، پس تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد ہے۔ احنف بن قیس سے اسی طرح مروی ہے۔

اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کے ظلم اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں (1)۔ یہ حکم عام ہے اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مقاتل بن حیان نے اس آیت میں کہا ہے: ہم تک خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: "میری امت میں سے یہ قلیل (لوگ) ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ حالانکہ گزشتہ امتوں میں یہ کثیر لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف فرمائی ہے جو غصے کے وقت بخش دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ (الشوریٰ) (اور جب وہ غضبناک ہوتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 549

ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں) اور غصہ پی جانے والوں کی اس قول کے ساتھ تعریف فرمائی: وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ اور یہ خبر دی ہے کہ وہ انہیں ان کے اس احسان کے سبب پسند کرتا ہے۔

اور غصہ پی جانے، لوگوں سے درگزر کرنے اور غضب کے وقت نفس کا مالک ہونے کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔ اور یہی انتہائی عظیم عبادت اور جہاد بالنفس ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''طاقتور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے (1)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا ہے: ''جو گھونٹ بھی آدمی پیتا ہے وہ اس کے لئے خیر اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں غصہ کے گھونٹ سے بڑھ کر اجر والا کوئی نہیں (2)''۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہر شے سے زیادہ سخت اور شدید کون سی شے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا غضب'' پھر اس نے عرض کی: کون سی شے اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات دلاتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو غصہ نہ کر''۔

عرجی نے کہا ہے:

واذا غضبتَ فکن وَقُورًا کاظمًا　　للغیظ تَبْصُرُ ما تقول و تسمع

جب تجھے غصہ آئے تو انتہائی وقار کے ساتھ غصہ پینے والا ہو جا اور اسے غور سے دیکھ جو کہہ رہا ہے اور سن رہا ہے۔

فکفی بہ شرفا تصبُّر ساعةٍ　　یرضٰی بھا عنك الإلٰه و تُرفع

پس ایک ساعت کا صبر کرنا از روئے شرف کے کافی ہے جس کے سبب تجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور تو بلند مرتبہ کر دیا جائے اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عفو کے بارے کہا ہے:

لن یبلغ المجدَ اقوامٌ وان شرفوا　　حتیٰ یُذَلُّوْا وان عَزَوا الأقوام

قومیں ہرگز بزرگی کو نہ پا سکیں گی اگر چہ وہ شریف ہوں یہاں تک کہ انہیں ذلیل وخوار کر دیا جائے گا اگر چہ وہ قوموں پر غالب ہوں۔

و یُشْتَمُوا فتری الألوانَ مُشْرِقَةً　　لا عفو ذُلٍّ ولکن عَفْو اِکرامِ

اور انہیں گالی گلوچ نہیں دی جاتیں اور وہ کائنات کو روشن دیکھتی ہیں ان کی یہ عفو و درگزر ذلت و رسوائی کی نہیں ہوتی بلکہ عزت واکرام کی ہوتی ہے۔

ابو داؤد اور ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت سہل بن معاذ بن انس جہنی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غصہ پی لیا حالانکہ وہ اسے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے سامنے اسے بلائے گا یہاں تک کہ اسے حور کے بارے اختیار عطا فرما دے گا کہ جسے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب الحذر من الغضب، جلد 2، صفحہ 903، کراچی۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 5649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الزہد باب الحلم، صفحہ 319، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4178، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے لے لے۔'' فرمایا یہ حدیث حسن غریب ہے۔(1)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک نداد ینے والا ندا دے گا جس کسی کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اسے چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اور کہا جائے گا: یہ کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؟ تو لوگوں سے درگزر کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اور ابن مبارک نے کہا ہے: میں منصور کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے ایک آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا، تو میں نے کہا: اے امیر المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی ندا دے گا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی احسان ہو تو وہ آگے بڑھے پس کوئی آگے نہیں بڑھے گا سوائے اس کے جس نے گناہ اور غلطی سے درگزر کی۔'' پس یہ حکم اپنے اطلاق پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے احسان پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ تو امکان کے وقت احسان کرے، پس ہر وقت تیرے لئے احسان ممکن نہیں ہوگا۔ شاعر نے کہا ہے:

بادِرْ بخيرٍ اذا ما كنتَ مقتدرا　　فليس لى كل وقتٍ انت مقتدرُ

تو خیر اور نیکی کے عمل میں جلدی کر جب تو اس کی قدرت رکھتا ہو۔ ہر وقت میں تو اس پر قادر نہیں ہوگا۔

اور ابو العباس الجمانی نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

ليس فى كل ساعةٍ وأوانٍ　　تتهيّأ صنائعُ الاحسان

ہر ساعت اور ہر وقت میں احسان کرنے والا (اس کے لئے) تیار نہیں ہوتا۔

واذا أمكنتْ فبادِرْ اليها　　حذرًا من تعذُّرِ الامكانِ

اور جب امکان ہو تو پھر اس کی طرف جلدی کر اس خوف سے کہ کہیں امکان متعذر نہ ہو جائے۔ محسن اور احسان کے بارے میں قول سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵

''اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب من کظم غیظاً، جلد 2، صفحہ 303، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 4147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک صنف کا ذکر کیا ہے اور یہ پہلی صنف (کے لوگوں) سے (درجہ میں) کم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت اور احسان کے ساتھ ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور یہ توبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت نبهان التمار کے بارے میں نازل ہوئی ہے...... اس کی کنیت ابو مقبل تھی...... اس کے پاس ایک حسین و جمیل عورت آئی اور اس نے اسے کھجوریں فروخت کیں اور پھر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر اپنے اس عمل پر نادم اور شرمندہ ہوا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے اور ابوبکر نے سچ کہا ہے...... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بندہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر وضو کرتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ...... وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ... الآیہ۔

اور دوسری یہ آیت...... و من یعمل سوٓء او یظلم نفسہ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ عام ہے۔ تحقیق آیت کسی سبب خاص کے تحت نازل ہوتی ہے اور پھر وہ ان تمام کو شامل ہوتی ہے جو وہ کرے یا اس سے زیادہ فعل کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک ثقفی ایک غزوہ میں گیا اور اس نے اپنا ایک انصاری دوست اپنے گھر والوں کے پاس چھوڑا، تو اس نے اس میں خیانت کی کہ اس نے اسے دبوچ لیا اور وہ عورت اپنے لئے اسے دور ہٹاتی رہی لیکن اس نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا، پھر وہ اس پر نادم ہوا تو وہ زمین میں چیختے چلاتے نکل گیا وہ اپنے فعل پر انتہائی نادم تھا اور توبہ کر رہا تھا، پس وہ ثقفی واپس آیا تو اس کی زوجہ نے اس کے ساتھی کے فعل کے بارے اسے بتایا، تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا، پس وہ انصاری حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس اس امید سے آیا کہ وہ ان کے پاس کوئی وسعت اور گنجائش پالے گا لیکن انہوں نے اسے خوب جھڑکا اور ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اپنے فعل کے بارے میں عرض کی، تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ حدیث کے مطابق عموم ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم سے زیادہ مکرم تھے، اس حیثیت سے کہ ان میں سے گناہ کرنے والے کی سزا صبح کے وقت اس کے دروازے پر

1۔ اسباب النزول، صفحہ 81

2۔ جامع الترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، جامع ترمذی، کتاب التفسیر من سورۃ آل عمران، حدیث 2932، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ اسباب النزول، صفحہ 82

لکھی ہوئی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس کے گھر کی دہلیز پر لکھ دیا جاتا تھا "تو اپنی ناک توڑ دے، تو اپنا کان کاٹ لے، تو اس طرح کر"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور رحمت فرماتے ہوئے اور بنی اسرائیل کے اس فعل کے عوض یہ آیت نازل فرمائی۔

اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس رو پڑا۔ اور الفاحشۃ کا اطلاق ہر معصیت (گناہ) پر کیا جاتا ہے، حالانکہ اکثر طور پر یہ زنا کے ساتھ خاص ہے یہاں تک کہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور سدی نے اس آیت میں اس کی تفسیر زنا کے ساتھ ہی کی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ میں لفظ اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ واؤ کے معنی میں ہے اور مراد وہ (گناہ) ہیں جو کبائر میں شامل نہ ہوں۔

ذَكَرُوا اللّٰهَ اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے اور اس سے حیا کرتے ہوئے اس کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو ضحاک نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی پیشی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ فکر کرنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس کے بارے پوچھے گا، اسے کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔

اور مقاتل سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ یعنی وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہر وہ دعا جس میں یہ معنی ہو یا اس کے الفاظ ہوں تو وہ استغفار کہلاتا ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں سید الاستغفار کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ اس کا وقت سحری کا ہے۔ پس استغفار عظیم ہے اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، حتیٰ کہ ترمذی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے یہ کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ (1) تو اس کو بخش دیا جائے گا اگرچہ وہ میدان جہاد سے ہی بھاگا ہو۔"

اور مکحول نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔" اور حضرت مکحول نے کہا ہے: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ استغفار کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور حضرت مکحول خود بھی کثیر الاستغفار تھے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مطلوب استغفار وہ ہے جو اصرار کی گرہ کو کھول دیتا ہے اور اس کا معنی دل میں ثبت ہو جاتا ہے نہ کہ صرف زبان سے تلفظ کرنا ہے۔ پس جس نے اپنی زبان سے کہا: أستغفر اللہ، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی پر مصر رہا تو اس کا یہ استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ کبائر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہمارا استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آپ یہ قول اپنے زمانے میں کہتے تھے، تو ہمارے اس زمانے میں کیفیت کیا ہوگی جس میں انسان ظلم و ستم پر منہ کے بل گرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور اس پر ایسا حریص ہے کہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور تسبیح اس کے ہاتھ

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء الضیف، حدیث نمبر 3501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں ہوتی ہے درآنحالیکہ یہ گمان کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہا ہے اور یہ اس کی طرف سے استہزا اور استخفاف (حقیر سمجھنا) ہے اور قرآن کریم میں ہے وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر نہ بناؤ۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے جو گناہوں کی مغفرت فرمادے اور ان کی سزا کو زائل کر دے۔

**وَ لَمْ یُصِرُّوْا** یعنی جو کچھ انہوں نے کیا اس پر وہ ثابت قدم نہیں ہو جاتے اور نہ اس کا پختہ عزم کرتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: یعنی وہ اس پر ہمیشگی اور دوام اختیار نہیں کرتے۔ اور معبد بن صبیح نے کہا ہے: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ایک جانب علی رضی اللہ عنہ تھے، پس آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے پھر آپ گئے اور وضو کیا اور پھر نماز پڑھائی۔ **وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ** اصرار کا معنی ہے ھو العزم بالقلب علی الأمر و ترك الإقلاع عنه یعنی کسی کام پر دل سے پختہ عزم کرنا اور اس سے باز رہنے کو ترک کرنا۔ اور اسی سے صر الدنانیر ہے یعنی انہیں مضبوط باندھنا۔

حطیئہ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

عوابس بالشُّعثِ الكُماة اذا ابتغوا عُلَالَتها بالمُحصَدات أصَرَّتِ

یعنی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الاصرار الثبوت علی المعاصی۔ یعنی اصرار سے مراد گناہوں پر ثابت ہونا اور ڈٹ جانا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

یُصِرُّ باللیل ما تخفی شواکِلُهٗ یا ویحَ کل مصِرِّ القلبِ ختّار

اس میں اصرار کا لفظ مذکورہ معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: جاہل مردہ ہے، بھولنے والا سونے والا ہے، اور گناہ کرنے والا نشے میں ہے اور اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والا ہے اور اصرار کا معنی بار بار کرنا ہے۔ یعنی وہ یہ کہتا رہے کہ میں کل توبہ کروں گا؟ اور یہ نفس کا دعویٰ ہے، وہ آنے والے کل کیسے توبہ کرے گا جب کہ وہ اس کا مالک ہی نہ ہوگا۔

اور سہل کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اصرار کا معنی ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے کی نیت کرے اور جب وہ خالص توبہ کی نیت کرے گا تو اصرار سے نکل جائے گا۔ اور سہل کا قول احسن ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا توبة مع اصرار (یعنی (گناہ پر) اصرار کے ساتھ کوئی توبہ نہیں ہے۔)

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: توبہ پر ابھارنے والی اور اصرار کو حل کرنے والی (شے) کتاب اللہ العزیز

الغفار میں دائمی غور وفکر کرنا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت اور اطاعت کرنے والوں کے ساتھ وعدوں کی تفصیل ذکر کی ہے اور جو کچھ اس میں عذاب جہنم اور گنہگاروں کو ڈرانے کا بیان کیا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ غور وفکر کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا خوف اور امید قوی ہو جائے اور وہ رغبت رکھتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ رغبت اور رہبت ہی خوف اور رجاء کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ وہ سزا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی راہ صواب کی توفیق دینے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اس پر ابھارنے والی وہ تنبیہ الٰہی ہے جس کے ساتھ وہ اسے متنبہ کرتا ہے جس کے لئے وہ سعادت کا ارادہ کرے اور گناہوں کے قبح اور ضرر کا کیونکہ وہ تو ہلاک کرنے والا زہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اختلاف لفظ میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں اس کی تنبیہ کے بغیر غور وفکر نہیں کرتا، پس جب بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اپنے آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ان گناہوں سے بھرا ہوا پاتا ہے جو اس نے کمائے ہیں اور ان برائیوں سے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کوتاہی اور سستی پر اس میں ندامت اور شرمندگی کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے سابقہ اعمال کی مثل اعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے تو ایسے آدمی پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ تائب (توبہ کرنے والا) ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر وہ معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور ہلاکت کے اسباب کو لازم پکڑنے والا ہوگا۔

سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: تائب کی علامت یہ ہے کہ گناہ اسے کھانے پینے سے مشغول رکھے جیسا کہ وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يَعْلَمُونَ اس میں کئی اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مغفرت طلب کی تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان (چیزوں) کے بارے جانتے ہیں جو میں نے ان پر حرام کی ہیں، یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مقاتل اور کلبی تمام نے کہا ہے: اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اصرار تکلیف دہ ہے اور اسے چھوڑ دینا سرکشی کی نسبت بہتر ہے۔ اور حسن بن فضل نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ کو بخش دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: انہوں نے یہ معنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے لیا ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اپنے رب کریم سے اسے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے اللہ! میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے ایک گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو معاف فرما

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب ابن مالک، حدیث نمبر 4066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیتا ہے اور گناہ کے سبب وہ پکڑ لیتا ہے پھر وہ لوٹتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا گناہ بخش دے...... پس اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل دوبارہ ذکر کیا اور آخر میں فرمایا: اعمل ما شئت فقد غفرت لک تو جو چاہے عمل کر میں نے تجھے بخش دیا (1)۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دوبارہ گناہ کر کے توبہ کو توڑنے کے بعد دوبارہ توبہ کرنا صحیح ہے۔

کیونکہ پہلی توبہ طاعت ہے وہ گزر چکی ہے اور صحیح ہے اور دوسرا گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اب وہ دوسری نئی توبہ کا محتاج ہے اور گناہ کی طرف لوٹنا اگرچہ اس کی ابتدا سے زیادہ قبیح ہے، کیونکہ گناہ کی نسبت توبہ توڑنے کی طرف ہے، تو توبہ کی طرف لوٹنا اس کی ابتدا سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ اس کی طرف کریم اور سخی کے دروازے کو التجا کے اصرار کے ساتھ لازم پکڑنے کی نسبت ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

اور حدیث کے آخر میں یہ قول اِعْمَلْ مَا شِئْتَ یہ امر ہے اور اس کا معنی ایک قول کے مطابق اکرام (عزت کرنا) ہے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہو جائے گا: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ (ق: 34) (داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے) کلام کا آخر مخاطب کی حالت کے بارے خبر ہے کہ اس کے سابقہ گناہوں سے اس کی مغفرت کر دی گئی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے کاموں میں ان شاء اللہ محفوظ ہوگا۔

آیت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کے اعتراف اور اس سے استغفار کرنے کا عظیم فائدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان العبد اذا اعترف بذنبه ثم تاب الی اللہ تاب اللہ علیه (2) (بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔) اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔

اور کسی شاعر نے کہا ہے:

یستوجب العفو الفتی اذا اعترف     بما جنی من الذنوب و اقترف

نوجوان عفو و درگزر کو واجب کر لیتا ہے جب وہ ان گناہوں کا اعتراف کرے جن کا ارتکاب اس نے کیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

أَقْرِر بذنبك ثم اطلب تجاوُزَهُ     ان الجحودَ جُحودَ الذَّنْب ذنبان

اپنے گناہ کا اقرار کر پھر اس سے درگزر کرنے کا مطالبہ کر بلاشبہ گناہ کا انکار کرنا دو گناہ ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے (ختم کر دے) اور ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں گے اور استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ (والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذهب اللہ

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 357، کراچی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6953، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب حدیث الافک، جلد 2، صفحہ 596، اسلام آباد۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، حدیث 2467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بکم ولجاء بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفر لھم (1)) اور اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفار اور تواب کا یہی فائدہ ہے۔ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ گناہ وہ ہیں جن سے توبہ کی جاسکتی ہے چاہے وہ کفر ہو یا اس کے سوا کوئی اور پس کافر کی توبہ اس کا ایمان لانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ وہ اپنے سابقہ کفر پر نادم بھی ہو، صرف ایمان لانا نفس توبہ نہیں ہے اور اگر گناہ کفر کے علاوہ ہو تو پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا وہ کسی بندے کا حق ہوگا، پس حقوق اللہ میں سے ہونے کی صورت میں توبہ کے لئے اسے چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، سوائے ان کے جن میں شریعت نے صرف ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض کی طرف قضا کی نسبت کی ہے جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جن کی طرف کفارہ کی نسبت کی ہے جیسا کہ قسم توڑ دینا اور ظہار وغیرہ میں۔ اور رہے حقوق العباد تو انہیں ان کے مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پائے جائیں تو ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی تنگدستی کے سبب اس کی وسعت نہ پائے جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے تو پھر معاف فرمانا اللہ تعالیٰ کا معمول ہے اور اس کا فضل وافر ہے، پس کتنے تبعات کا وہ ضامن بنا ہے اور اس نے سیئات کو حسنات سے بدل دیا ہے۔ عنقریب اس کا مزید بیان آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب اسے اپنا گناہ یاد نہ ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو کہ وہ اس معین گناہ کی طرف سے توبہ کرے، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسے گناہ یاد آجائے تو وہ اس سے توبہ کر لے۔ اور بہت سے لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے جو ہمارے شیخ ابو محمد عبد المعطی الاسکندرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محاسبی رحمۃ اللہ علیہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اجناس معاصی سے توبہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور یہ کہ ان تمام پر نادم ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جوارح کے ہر فعل سے اور اپنے دل کے ہر عقیدہ سے معین طور پر توبہ کرے۔ انہوں نے ان کے قول سے یہی گمان کیا ہے، حالانکہ یہ ان کی مراد نہیں ہے اور نہ ان کا کلام اس کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ مکلف کا حکم یہ ہے کہ جب وہ اپنے افعال کا حکم پہچان لے اور معصیت کو غیر سے پہچان لے، تو اس کے لئے ان تمام سے توبہ کرنا صحیح ہے جنہیں اس نے پہچان لیا، کیونکہ اگر اس نے اپنے ماضی کے فعل کے گناہ ہونے کو نہ پہچانا تو اس کے لئے اس سے توبہ کرنا ممکن نہ ہوگا نہ انفراداً اور نہ تفصیلاً۔ اس کی مثال وہ آدمی ہے جو سود کے دروازوں میں سے کسی دروازے کو لے لیتا ہے اور وہ یہ نہیں پہچانتا کہ یہ ربوٰا ہے، پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ) (اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایماندار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)

تو اس پر یہ تہدید انتہائی شدید ثابت ہوئی اور اس کا گمان تھا کہ وہ سود سے سالم اور محفوظ ہے، لیکن اب جب اسے سود کی حقیقت کا علم ہوا پھر وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں متفکر ہوا یا اور اس نے جان لیا کہ وہ سابقہ دنوں میں سود میں

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 355، آرام باغ کراچی

سے بہت سی چیزیں لیتا رہا ہے، تو اب اس پر صحیح ہے کہ وہ ان تمام پر نادم ہو، اس کے اوقات کی تعیین اس پر لازم نہیں۔ اور اسی طرح ان تمام گناہوں اور برائیوں کا حکم ہے جن میں وہ واقع ہوتا رہا ہے مثلاً غیبت، چغلخوری اور ان کے علاوہ وہ محرمات جن کے حرام ہونے کا اسے علم نہیں تھا، پس جب فقاہت حاصل کر لے اور اس کے کلام میں سے جو گزر چکا ہے اسے تلاش کر لے تو وہ مجموعی طور پر اس سے توبہ کر لے، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے جس میں اس سے کوتاہی ہوئی ہے اس پر اظہار ندامت کرے، اور جب اس نے حلال سمجھا اسے جو اس پر ظلم تھا تو اس نے مجموعی طور پر اسے حلال قرار دیا اور اس کا نفس اپنا حق چھوڑنے کے ساتھ خوش رہا تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ مجہول شے ہبہ کرنے کے باب سے ہے، یہ بندے کے بخل اور اپنے حق کی طلب پر اس کی حرص کے ساتھ ساتھ ہے۔ تو پھر اس اکرم الاکرمین کے بارے کیفیت کیا ہوگی جو طاعات اور ان کے اسباب عطا فرمانے والا ہے اور صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے؟ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام کی مراد ہے اور یہی وہ معنی ہے جس پر ان کا کلام دلالت کرتا ہے اس کے لئے جس نے اس کی تلاش کی، اور جو یہ گمان کرنے والے نے گمان کر لیا ہے کہ ندامت صحیح نہ ہوگی مگر ہر معین اور ہر معینہ حرکات وسکنات پر تو یہ تکلیف مالا یطاق کے باب سے ہے، جو شرعاً واقع نہیں ہے اگرچہ عقلاً جائز ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ یہ پہچان رکھتا ہو کہ شراب پیتے وقت اس نے کتنے گھونٹ پیئے ہیں، اور زنا کرتے وقت اس نے کتنی بار حرکت کی ہے اور حرام کی طرف چلتے ہوئے اس نے کتنے قدم چلے ہیں، اور یہ ایسی شے ہے جس کی کوئی بھی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے تفصیلاً توبہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس بارے میں توبہ کے احکام اور اس کی شرائط کا مزید بیان سورۃ النساء وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قول باری تعالیٰ: وَلَمْ يُصِرُّوْا میں اس پر واضح حجت اور قطعی دلیل موجود ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو کچھ اس نے زبان سے کہا، اور لسان الامۃ القاضی ابوبکر بن طیب نے کہا ہے کہ انسان کا اس کے سبب بھی مواخذہ کیا جائے گا جس پر اس نے اپنے ضمیر کو ثابت اور پختہ کر لیا اور جس برائی کا اس نے اپنے دل سے عزم مصمم کر لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الحج) (اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب)۔

اور مزید فرمایا: فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ (القلم) (چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) پس انہیں ان کے پختہ عزم کے سبب ان کے فعل سے پہلے ہی سزا دے دی گئی اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور بخاری شریف میں ہے "جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔" صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس قاتل کے بارے میں تو سمجھ آئی، لیکن مقتول نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا۔" (1)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کو حرص کے ساتھ معلق کیا ہے اور یہ عزم اور پختہ ارادہ ہی ہے اور ہتھیار کے اظہار کو لغو کر دیا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1049، اسلام آباد

اور اس سے زیادہ نص وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے ابو کبشہ انماری کی حدیث سے، اور اسے صحیح مرفوع قرار دیا ہے۔ ''بے شک دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لئے ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا رہتا ہے اور اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو جانتا ہے تو یہ افضل ترین مقام و مرتبہ پر ہوگا، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اسے مال نہ دیا اور وہ [نیت کے اعتبار سے صادق اور سچا ہو] اور وہ یہ کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور اس نے اس کی نیت کی تو ان دونوں کا اجر برابر ہو گا۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اسے علم نہیں دیا اور وہ [اپنے مال میں بغیر علم کے تصرف کرتا ہے] اور اس میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی حق جانتا ہے تو وہ اخبث اور رذیل درجہ میں ہوگا، اور چوتھا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا فرمایا اور نہ ہی علم، اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یقیناً اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور وہی اس کی نیت ہو تو دونوں کا بوجھ برابر ہوگا۔ (1)''

اور یہ وہ ہے جس کی طرف قاضی گئے ہیں اور اسی پر عام سلف اور اہل علم فقہاء، محدثین اور متکلمین ہیں، اور اس کے خلاف جس نے یہ گمان کیا ہے کہ جس شے کا انسان قصد کرتا ہے اگرچہ وہ اس پر ثابت اور پختہ ہو جائے تو صرف ارادہ کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور اس کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کوئی حجت نہیں ہے: ''جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اس کے بارے کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کے مطابق عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا (2)''۔ کیونکہ فلم یعملها کا معنی ہے: اور اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ اور اس کی دلیل وہ ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، اور فان عملها کا معنی ہے: اگر اس نے اسے ظاہر کیا یا اس کا ارادہ کیا۔ اور اس کی دلیل بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ ٱلْعَٰمِلِينَ ﴿١٣٦﴾

''یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، ہمیشہ رہیں گے اور ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ گناہوں کی بخشش کو ان کے لئے لازم کیا ہے جو اپنی توبہ میں مخلص ہیں اور اپنے گناہ پر مصر نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ احد کے ساتھ متصل ہو، یعنی جو بھاگے پھر توبہ کر لی اور اصرار نہ کیا تو ان کے لئے مغفرت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ فَٱنظُرُوا۟ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد، صفحہ 507، لاہور

2۔ مسلم، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السموات وفرض الصلوات، جلد 1، صفحہ 91، آرام باغ کراچی

الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

''گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے لئے تسلی ہے، اور سنن سنة کی جمع ہے اور اس سے مراد صراط مستقیم ہے۔ (کہا جاتا ہے) فلان علی السنة یعنی فلاں سیدھے راستے پر ہے وہ خواہشات نفسانی میں سے کسی شے کی طرف جھکتا نہیں۔

ہذلی نے کہا ہے:

فلا تجزعن من سنة انت سِرتَها فأول راضٍ سُنَّةً مَن يَسيرها

تو اس راستے سے خوفزدہ اور پریشان نہ ہو جس پر تو چلا کیونکہ جو اس پر چلتا ہے وہ پہلے اس راستے سے راضی ہوتا ہے۔

اور سنة سے مراد وہ امام ہے جس کی اتباع اور اقتدا کی جائے، کہا جاتا ہے: سن فلان سنة حسنة و سيئة جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے اس میں خیر ہو یا شر۔

لبید نے کہا ہے:

مِن معشرٍ سَنّت لهم اباؤهم ولكلّ قومٍ سنةٌ وامامها

اہل خانہ کے لئے ان کے آباء نے طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر قوم کے لئے مقتدا اور ان کا امام ہے۔

اور سنة سے مراد امت، اور سنن سے مراد امم ہیں، یہ معنی مفضل سے منقول ہے۔

اور اس نے شعر کہا ہے:

ماعايَنَ الناسُ من فضلٍ كفضلِهم ولا رَأوا مِثلَهم في سالِف السُّنن

لوگوں نے ان کے فضل کی طرح کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ان کی مثل سابقہ امتوں میں کوئی دیکھا۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی اہل سنن ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور ابوزید نے کہا ہے: مراد امثال ہیں۔ عطا کا قول ہے: مراد شرائع ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ** یعنی ہلاکت کے ساتھ ان میں گزر چکی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے جھٹلایا ہے جیسا کہ قوم عاد اور ثمود اور العاقبة کا معنی ہے: کسی امر کا آخر یعنی انجام۔ اور یہ احد کے دن میں ہوا۔ وہ فرماتا ہے: پس میں انہیں مہلت دوں گا اور میں انہیں ڈھیل دیتا رہوں گا اور میں ان کے لئے تدبیر اپناتا رہوں گا یہاں تک کہ لکھی ہوئی تقدیر اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گی یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت و مدد کے ساتھ اور ان کے دشمن کافروں کو ہلاک کرنے کے ساتھ۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

''یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔''

یعنی یہ قرآن ایک بیان ہے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کی طرف اشارہ ہے: قَدْ

خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ اور الموعظة کا معنی وعظ (نصیحت) ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

''اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔''

غزوہ احد میں مومنین کو اپنے شہداء اور زخمی ہونے والے افراد کے سبب جو تکلیف اور غم لاحق ہوا اس آیت میں اس پر انہیں حوصلہ اور تسلی دلائی جا رہی ہے، اور اس میں انہیں اپنے دشمن کے خلاف جہاد پر ابھارا جا رہا ہے اور انہیں عجز اور بزدلی دکھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ پس فرمایا: وَلَا تَهِنُوْا یعنی اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے سے بزدلی کا اظہار نہ کرو اس تکلیف کی وجہ سے جو تمہیں پہنچی۔

وَلَا تَحْزَنُوْا اور اپنی پشتوں پر غم سوار نہ کرو، اور نہ ہی اس ہزیمت اور مصیبت کے سبب غمزدہ ہو جو تمہیں پہنچی۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم میرے وعدہ کی سچائی کے ساتھ ایمان رکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنْ بمعنی اِذْ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب احد کے دن شکست خوردہ ہوئے پس ہم ان کے درمیان اسی طرح تھے کہ اچانک خالد بن ولید مشرکین گھوڑ سواروں کے ساتھ آ گیا، وہ چاہتا تھا کہ وہ ان پر پہاڑ کی جانب سے حملہ آور ہو اور غالب آئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: ''اے اللہ! وہ ہم پر غالب نہ آئے اے اللہ! تیرے سوا ہماری کوئی قوت نہیں اے اللہ! اس جماعت کے سوا اس شہر میں کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور مسلمان تیراندازوں کا ایک گروہ اکٹھا ہوا اور وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور انہوں نے مشرک گھوڑ سواروں پر تیر برسائے یہاں تک کہ انہیں شکست سے دوچار کر دیا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (1) یعنی احد کے بعد تم ہی دشمن پر غالب رہو گے۔ پس اس کے بعد انہوں نے کوئی لشکر نہیں بھیجا مگر انہیں ہر اس جنگ میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی، اور ہر اس جنگ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی اور اس میں صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی ہوا تو ظفر و فتح ان کا مقدر بنی، اور یہ تمام شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے عہد میں ہی فتح ہوئے، پھر ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس طرح کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا جس طرح وہ اس وقت میں فتح کرتے تھے۔ اس آیت میں اس امت کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب فرمایا ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو خطاب فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا: اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ (طٰہٰ) (یقیناً تم ہی غالب رہو گے) اور اس امت کو فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الاعلیٰ سے مشتق ہے پس اس کی ذات پاک اور بلند ہے، اور مومنین کے لئے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83-82

الظّٰلِمِيْنَ ۝

"(احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنالے تم میں سے کچھ شہید اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ، قرح کا معنی زخم، چوٹ ہے اس میں کسائی اور اخفش سے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں منقول ہیں (یعنی قَرْحٌ اور قُرْحٌ) مثلاً عَقْرٌ اور عُقْرٌ۔ اور فراء نے کہا ہے: فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم کا درد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر احد کے دن تمہیں زخم لگا ہے تو بدر کے دن (تمہاری دشمن) قوم کو بھی اسی کی مثل زخم لگا ہے۔ اور محمد بن سمیقع نے مصدر کی بنا پر فا اور را کے فتحہ کے ساتھ قرح پڑھا ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ کہا گیا ہے: یہ جنگ میں ہوتا ہے، ایک بار مومنین کے لئے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائے، اور ایک بار کافروں کے لئے ہوتی ہے جب مومنین نافرمانیاں کرنے لگیں تاکہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالے اور ان کے گناہوں کو کم کرے، اور رہی یہ صورت کہ جب وہ نافرمانیاں نہ کریں تو پھر یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ہم پھراتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان خوشی اور غم، صحت اور بیماری، اور خوشحالی اور تنگدستی کو اور الدُّوْلَة کا معنی ہے ایک بار۔

شاعر نے کہا ہے:

فیوم لنا و یوم علینا و یومٌ نُسَاءُ و یَوْمٌ نُسَرّ

پس ایک دن ہمارے حق میں ہوتا ہے اور ایک دن ہمارے خلاف اور کبھی ہمیں اذیت دی جاتی ہے اور کبھی ہمیں خوش کیا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس کا معنی ہے: بلاشبہ یہ پھرنا اس لئے ہے تاکہ مومن کو منافق سے (جدا) دکھایا جائے اور ان میں سے بعض کو بعض سے ممتاز کیا جا سکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا (آل عمران) اور یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ وہ مومنین کے صبر کو جان لے، (یعنی) ایسا علم جس پر جزا واقع ہوگی جیسا کہ انہیں مکلف بنانے سے پہلے اس کا غیبی علم ہے۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یعنی وہ تمہیں شہادت کے ساتھ تکریم اور اعزاز عطا فرمائے، یعنی تاکہ ایک قوم (جماعت) قتل کی جائے اور وہ لوگوں پر اپنے اعمال کے سبب گواہ ہو جائیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اسی وجہ سے اسے شہید کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے شہید اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جنت اس کے لئے حاضر کر دی جاتی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا نام شہید اس لئے ہے کیونکہ ان کی ارواح دارالسلام میں حاضر ہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں،

اور ان کے سوا دوسروں کی ارواح جنت تک نہیں پہنچتی ہیں، پس شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جنت کے لئے حاضر ہونے والا، آنے والے بیان کے مطابق یہی صحیح معنی ہے۔ اور شہادت کی فضیلت بہت عظیم ہے، اور تیرے لئے اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ (التوبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے...... یہی بڑی کامیابی ہے۔)

اور صحیح البستی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف پاتا ہے جتنی تم میں سے کوئی پھوڑے سے پاتا ہے (1)۔" اور نسائی نے بیان کیا ہے کہ راشد بن سعد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین کو کیا ہوا ہے کہ سوائے شہید کے انہیں اپنی قبروں میں آزمائش اور فتنہ میں ڈالا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے سر پر تلواروں کی چمک فتنہ اور آزمائش کے لئے کافی ہے (2)" اور بخاری میں ہے۔ "مسلمانوں میں سے احد کے دن جو شہید کئے گئے" ان میں سے حضرت حمزہ، یمان، نضر بن انس، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ہیں، عمرو بن علی نے مجھے بیان کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے کہا: میرے باپ نے حضرت قتادہ سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم قبائل عرب میں سے کوئی ایسا قبیلہ نہیں جانتے جس میں انصار سے بڑھ کر شہید ہوں اور قیامت کے دن وہ ان سے زیادہ عزت والا ہو۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اور ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ ان میں سے احد کے دن ستر آدمی شہید کئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر اور یمامہ کے دن بھی ستر (آدمی شہید کئے گئے)۔ فرمایا: بئر معونہ کا واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوا، اور جنگ یمامہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی (3)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اور آپ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ساٹھ کے قریب زخم تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر دست مبارک پھیرنے لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس طرح جڑنے اور مندمل ہونے لگے گویا وہ تھے ہی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ارادہ امر کا غیر ہے۔ (یعنی

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، صفحہ 206، اسلام آباد　　2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 289، اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584، آرام باغ کراچی

دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔) جیسا کہ اہل السنہ یہی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنین کے قتل سے منع کیا ہے، یعنی حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کو رضی اللہ عنہم۔ اور ان کے قتل کا ارادہ فرمایا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے منع فرمایا اور کھانے کا ارادہ فرمایا پس آدم علیہ السلام اس میں واقع ہوئے۔ اور اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا ارادہ نہیں کیا پس وہ اس سے رک گیا، اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول حق کے ساتھ اشارہ بھی واقع ہے: وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبہ:46) (لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑا ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا انہیں)۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام کو جہاد کا حکم دیا ہے، لیکن سستی، کاہلی اور سفر سے رہ جانے والے اسباب بھی پیدا فرما دیئے پس وہ پیچھے بیٹھ رہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو عرض کی: ''آپ قیدیوں کے بارے میں اپنے اصحاب کو اختیار دے دیجئے اگر وہ چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان کے برابر ان میں سے قتل کئے جائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور ہم میں سے قتل کئے جائیں گے۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اپنے اولیاء کی شہادت کے ساتھ پورا کر دیا اس کے بعد کہ انہیں اختیار دیا تو انہوں نے قتل کو اختیار کیا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو دوست نہیں رکھتا یعنی اگر وہ مومنین کی جانب سے کفار کو کچھ دے تو وہ انہیں پسند نہیں کرتا ہے اور اگر وہ مومنین کے سبب کچھ تکلیف پہنچائے تو بلاشبہ وہ مومنین کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

''اور اس لئے کہ نکھارے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔''

اس میں تین اقوال ہیں: يُمَحِّص بمعنی يختبر (تا کہ وہ آزمائے) دوسرا ...... يطهر (تا کہ وہ انہیں گناہوں سے پاک کرے) اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو ختم کر دے جو ایمان لائے، فراء نے یہی کہا ہے اور تیسرا ...... يمحص بمعنی يخلص (تا کہ وہ انہیں نکھار دے اور صاف کر دے) یہ معنی زیادہ غریب ہے۔

خلیل نے کہا ہے: کہا جاتا ہے مَحِصَ الحبلُ يَمْحَص مَحْصًا جب رسی کی اون کٹ جائے، اور اسی سے ہے اللّٰهم مَحِّص عنا ذنوبنا اے اللہ! ہم سے ہمارے گناہوں کو صاف کر دے (ختم کر دے) یعنی ہمیں ان کی سزا سے نجات عطا فرما۔ اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: میں نے محمد بن یزید عن خلیل یہ قرأت کی: التمحيص (بمعنی) التخليص ہے۔ کہا جاتا ہے: مَحَصَهُ [يمحصه] محصا جب وہ اسے نجات دلا دے، صاف کر دے، پس معنی ہوگا: اس پر ہے کہ وہ مومنین کو آزمائے تا کہ وہ انہیں ثواب عطا فرمائے اور انہیں ان کے گناہوں سے نجات دلائے۔ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی وہ انہیں ہلاک

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 190، اسلام آباد

کر کے تباہ و برباد کر دے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ﴿١٤٢﴾

''کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنگ میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۔''

أَمْ بمعنی بل ہے۔ اور کہا گیا ہے: میم زائدہ ہے اور معنی ہے: اے وہ جو احد کے دن شکست خوردہ ہوئے کیا تم گمان رکھتے ہو کہ تم اسی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے جیسے وہ داخل ہوئے جو شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے زخم اور قتل کے درد پر صبر اختیار کیا اس کے بغیر کہ تم ان کے راستے پر چلو اور ان کے صبر کی طرح صبر کرو؟ نہیں، یہاں تک يَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ یعنی (تم میں سے جنہوں نے جہاد کیا اللہ تعالیٰ کے بارے) علم شہادت (حاصل کر لے) تاکہ اس پر جزا واقع ہو۔ اور معنی ہے: اور تم نے جہاد نہیں کیا کہ وہ تم سے اسے جان لے۔ اس میں لما بمعنی لم ہے اور سیبویہ نے لم اور لما کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ لم یفعل، فعل کی نفی ہے، اور لما یفعل، قد فعل کی نفی ہے۔ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ یہ أن مضمرہ کے سبب منصوب ہے، یہ خلیل سے روایت ہے، اور حسن اور یحییٰ بن یعمر نے يَعْلَمِ الصَّابِرِينَ عطف نسق کی بنا پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے قطع کی بنا پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی وھو یعلمُ۔ اور یہ قرأت عبدالوارث نے ابو عمرو سے روایت کی ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہاں واؤ بمعنی حتیٰ ہے، یعنی ولما یعلم الله الذین جاهدوا منکم حتی یعلم صبرهم کما تقدم آنفا۔

حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا یہاں تک کہ وہ ان کے صبر کو دیکھ لے جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿١٤٣﴾

''اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ یعنی تم تو شہادت کی آرزو کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو۔ اعمش نے مِنْ قَبْلِ أَنْ تُلَاقُوْهُ پڑھا ہے یعنی قتل سے پہلے اور یہ کہا گیا ہے: اس سے پہلے کہ تم اسباب موت سے ملاقات کرو۔'' اور یہ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے غزوہ بدر میں حاضر نہیں تھے تو وہ اس دن کی آرزو اور تمنا کر رہے تھے جس میں جنگ ہو گی، تو جب احد کا دن آیا تو وہ شکست کھا گئے، اور ان میں وہ بھی تھے جو مضبوط رہے اور ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے، اور ان میں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کیونکہ جب مسلمان بکھرے تو انہوں نے کہا: اے اللہ! میں تیری طرف اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو کچھ انہوں نے کیا ہے، اور پھر (پوری قوت کے ساتھ) لڑنے

لگے اور کہا: بلاشبہ یہاں تو جنت کی خوشبو ہے! میں اسے پالوں گا، اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے انہیں صرف انگلیوں کے پوروں سے پہچانا تھا اور ہم نے ان کے بدن پر اسی سے زائد زخم پائے۔ ان کے بارے میں اور ان جیسے دیگر افراد کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا، رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (1) (الاحزاب: 23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) پس یہ آیت شکست خوردہ ہونے والوں کے حق میں عتاب ہے، اور بالخصوص ان کے لئے جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے نکلنے پر ابھارا تھا، اور اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور موت کی تمنا مسلمانوں سے شہادت کی تمنا کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا دارومدار (میدان) جہاد میں صبر و ثبات پر ہے، نہ کہ اس سے مراد کفار کا انہیں قتل کرنا ہے، کیونکہ یہ تو معصیت اور کفر ہے اور معصیت کا ارادہ کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے یہ التجا اور دعا کرنے پر برانگیختہ کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں شہادت عطا فرمائے اور وہ جہاد میں صبر اختیار کرنے کی التجا کرتے ہیں اگرچہ وہ انہیں قتل تک ہی پہنچا دے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اخفش نے کہا: یہ تکریر بمعنی تاکید ہے اس قول: فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ کے لئے، جیسا کہ اس قول میں ہے ولا طائر یطیر بجناحیہ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور تم آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہو تمہاری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں ہے، [جیسا کہ] تو کہتا ہے: قد رأیت کذا و کذا و لیس فی عینیک علۃ، (تو نے اس اس طرح دیکھ لیا ہے اور تیری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں۔) یعنی تو نے اسے حقیقتاً دیکھ لیا ہے، اور یہ معنی تو کید کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہے ہو۔ آیت میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے۔ فقد رأیتموہ و انتم تنظرون فلم انہزمتم؟ (تحقیق تم نے اسے دیکھ لیا ہے اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو تو پھر تم نے شکست کیوں کھائی؟)

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

"اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ روایت ہے کہ یہ احد کے دن مسلمانوں کے شکست کھانے کے سبب نازل ہوئی اس وقت شیطان نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چیخ کر کہا: قد قتل محمد۔ (تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا۔) عطیہ العوفی نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے پس تم انہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ دو کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض نے کہا ہے: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے تو کیا تم اس حالت پر باقی نہیں رہو گے جس پر تمہارے انبیاء رہے یہاں تک کہ تم آپ سے جا ملو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَ سَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ ۝ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ ۝ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا (1)۔ اس میں ما نافیہ ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہے، اور ما کا عمل باطل ہو گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح قرأت کی ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهٖ رُسُلٌ یعنی بغیر الف لام کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر آگاہ فرمایا ہے کہ رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اپنی قوم میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کو مضبوطی سے تھامنا واجب ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے اگرچہ رسول موت یا قتل کے سبب مفقود ہو۔ اور اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم فرمائی [آپ کے دو وصفوں] دو اسموں کے ساتھ جو دونوں آپ کے اسم سے مشتق ہیں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کہتے ہیں: رَجُلٌ محمود و محمد جب اس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

الی الماجد القرم الجواد المحمد

تحقیق یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور عباس بن مرداس نے کہا ہے:

یا خاتم النُّبَآءِ انك مُرسَل بالخَیْر كلُّ هُدَی السَّبِیْلِ هُدَاكا

اے خاتم الانبیاء! بلاشبہ آپ خیر و بھلائی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہر راہ ہدایت آپ ہی کی ہدایت ہے۔

ان الاله بنَی علیك محبة لی خلقه و مُحمّدًا سَمّا كا

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تجھ پر محبت کی بنیاد رکھی ہے اور تیرا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا ہے۔

پس یہ آیت شکست کھانے والوں کے عتاب کا تتمہ ہے، یعنی ان کے لئے شکست کھانا نہیں ہے اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیئے جائیں، اور نبوت موت کو دور نہیں کر سکتی، اور ادیان انبیاء علیہم السلام کی موت سے زائل نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور آپ کی جرأت پر سب سے بڑھ کر دلیل ہے، کیونکہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

شجاعت اور جرأت کی تعریف اور حد مصائب و آلام آنے کے وقت دل کا ثابت رہنا ہے، اور حضور نبی مکرم ﷺ کی موت سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پس اسی وقت آپ کی شجاعت اور آپ کا علم ظاہر ہوا۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی (معاملہ) مخفی رکھا، اور معاملہ مضطرب ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کیا جب آپ اپنی رہائش گاہ سنح سے آئے۔

بخاری میں اسی طرح ہے(1) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ جو کہ خارجہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ عوالی میں تھے، تو لوگ کہنے لگے: حضور نبی مکرم ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ یہ انہیں حالات میں سے ایک حالت ہے جو وحی لیتے وقت آپ پر طاری ہوتی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے آپ ﷺ کے چہرہ اقدس سے (کپڑا) اٹھایا اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور دوبار کہا: انت اکرم علی اللہ من ان یُمیتك (آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں کہ وہ آپ کو موت دے)

قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک کونے میں کہہ رہے تھے: قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، اور نہ وہ فوت ہوں گے یہاں تک کہ منافقین میں سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: من کان یعبد اللہ فان اللہ حیّ لم یمت، و من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے وہ فوت نہیں ہوا۔ اور جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو محمد ﷺ تو فوت ہو چکے ہیں، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''گویا میں نے تو یہ آیت اس دن کے سوا پڑھی ہی نہیں (2)۔'' اور انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا جو پہلے انہوں نے کہا تھا۔ اسے وائلی ابونصر عبید اللہ نے اپنی کتاب ''الابانۃ'' میں ذکر کیا ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت سنا جب رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی اور آپ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے شہادت دی اور کہا: امابعد! میں نے کل تمہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اس طرح نہ تھی جیسے میں نے کہی تھی۔ اور قسم بخدا! میں نے وہ بات جو تمہیں کہی اسے اس کتاب میں نہیں پایا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور نہ ہی اس عہد میں پایا جو عہد رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، البتہ میں یہ امید کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے بعد آئیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1615، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے..... آپ کے کہنے کی مراد یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موت آخر میں آئے گی..... پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح دی، اور یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہنمائی فرمائی پس تم اسے پکڑ لو تم ہدایت پا جاؤ گے اس کی طرف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راہنمائی فرمائی۔(1)

وائلی ابو نصر نے کہا: وہ بات جو انہوں نے کہی پھر اس سے رجوع کر لیا وہ یہ ہے ''کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت نہیں ہوئے اور وہ ہرگز فوت نہیں ہوں گے یہاں تک کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور انہوں نے یہ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے کہا جو انہیں لاحق ہوا اور انہیں فتنہ اور منافقین کے ظہور کا خدشہ ہوا، اور جب انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوت یقین کا مشاہدہ کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ اور اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ۔ اور وہ جو انہوں نے اس دن کہا..... تو یہ آگاہ ہوئے اور یہ بات (ان کے ذہن میں) راسخ ہو گئی۔ اور انہوں نے کہا: گویا میں نے یہ آیت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے سنی ہی نہیں۔ اور لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نکل پڑے، گویا یہ آیت کبھی نازل نہیں ہوئی مگر اسی دن (2)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال بلا اختلاف پیر کے دن ہوا، اسی وقت میں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے وقت مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے جس وقت دھوپ خوب سخت ہو چکی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منگل کے دن دفن کیا گیا، اور یہ قول بھی ہے کہ بدھ کی رات کو (آپ کو دفن کیا گیا)(3)

صفیہ بنت عبد المطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

أَلا یا رَسُولَ اللهِ كُنتَ رَجاءَنا  و كُنتَ بِنا بَرًّا و لَم تَكُ جافِیا

خبردار! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہماری امید تھے اور آپ ہمارے محسن تھے اور کبھی اعراض نہ برتتے تھے۔

و كُنتَ رَحِیمًا هادِیًا و مُعَلِّمًا  لِیَبْكِ عَلَیكَ الیَومَ مَن كانَ باكِیا

اور بڑے مہربان، راہبر اور معلم تھے چاہیے کہ آج کے دن آپ پر ہر رونے والا روئے۔

لَعَمْرُكَ ما أَبكِی النَّبِیَّ لِفَقْدِهِ  و لٰكِن لِما أَخشَی مِنَ الهَرْجِ آتِیا

تیری عمر کی قسم میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مفقود ہونے کے سبب نہیں روؤں گی البتہ جب مجھے کسی حرج اور مصیبت آنے کا خدشہ ہو گا۔

كَأَنَّ عَلَی قَلبِی لِذِكرِ مُحَمَّدٍ  وَما خِفتُ مِن بَعدِ النَّبِیِّ المَكاوِیا

گویا میرے دل پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے اور مجھے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی گالیاں دینے والے کا کوئی خوف نہیں۔

أَفاطِمُ صَلَّی اللهُ رَبُّ مُحَمَّدٍ  عَلَی جَدَثٍ أَمسَی بِیَثرِبَ ثاوِیا

میں چھوڑتی ہوں اللہ تعالیٰ پر جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رب ہے کہ وہ اس قبر پر رحمتیں نازل فرمائے جو یثرب میں آباد ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1165، ایضاً
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فِدًی لرسول اللہ اُمّی و خالتی　　و عمی و آبائی و نفسی و مالیا

رسول اللہ ﷺ پر میری ماں، میری خالہ، میری پھوپھی، میری جان اور میرا مال سبھی نثار ہوں۔

صدَقتَ و بلّغتَ الرسالۃ صادقا　　و متَّ صلیبَ العود أبلَجَ صافِیا

آپ نے سچ بولا اور پیغام رسالت کو صداقت کے ساتھ پہنچایا اور آپ نے لکڑی کی صلیب کو ختم کر دیا اور خوب صاف کر دیا۔

فلو أن رب الناس أبقی نبینا　　سعِدنا، و لکن أمرہ کان ماضِیا

پس اگر رب العالمین ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی رکھتا تو ہماری سعادت مندی تھی لیکن اس کا امر فیصلہ کن ہے۔

علیك من اللہ السلام تحیۃً　　و أدخِلت جناتٍ من العَدْن راضِیا

آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ وسلام ہو اور آپ کو جنات عدن میں داخل کیا جائے اس حال میں کہ آپ راضی اور خوش ہوں۔

أری حسبنا أیتمتہ و ترکتہ　　یُبَکّی و یدعو جدہ الیوم ناعِیا

میں دیکھ رہی ہوں آپ نے ہی ہمارے حسب کو مکمل کیا ہے اور اسے رلاتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور آج یہ دورا اپنے دادا کو پکار رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو کیوں مؤخر کیا گیا حالانکہ آپ نے اہل بیت کو اپنی میتوں کی تدفین کو مؤخر کرنے پر کہا: ''اپنے مردوں کی تدفین میں جلدی کرو اور تم ان میں تاخیر نہ کرو'' (1)۔ تو اس کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے۔

(۱) ایک تو وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال فرمانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اتفاق نہ تھا۔

(۲) اس لئے کہ وہ اس مقام اور جگہ کو نہ جانتے تھے جہاں وہ آپ کو دفن کریں۔ پس ایک جماعت نے کہا: جنت البقیع میں دفن کیا جائے اور دوسرے گروہ نے کہا: مسجد میں، اور ایک قوم نے کہا: آپ کو روکا جائے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اٹھا لیا جائے، یہاں تک کہ عالم اکبر (مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں) نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ما دفن نبی الاحیث یموت (کسی نبی کو دفن نہیں کیا جاتا مگر اسی جگہ جہاں اس کا وصال ہوتا ہے) اسے ابن ماجہ اور مؤطا وغیرہما نے بیان کیا ہے۔ (2)

(۳) وہ اس اختلاف میں مشغول ہو گئے جو مہاجرین وانصار کے درمیان بیعت کے بارے میں واقع ہوا، پس وہ اس میں غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا اور کام منظم ہو گیا اور حالات پرسکون ہو گئے، اور خلافت اپنے نصاب میں پختہ ہو گئی پس انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر دوسرے دن ان میں سے ایک جماعت نے برضا و رغبت

---

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 108، کراچی۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 212، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری بیعت کی، پس الله تعالیٰ نے آپ کے سبب مرتدین کے فتنہ سے نجات دلائی اور آپ کے سبب دین کو تقویت حاصل ہوئی، والحمد لله رب العالمین۔ پھر اس کے بعد انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دفن کے بارے میں غور وفکر کی تب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا اور آپ کو کفن پہنایا۔ والله اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، پس بعض نے کہا ہے: کسی نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتا رہا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اس سے اشرف و اعلیٰ ہے کہ آپ پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اور علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ کلام ضعیف ہے، کیونکہ سنت یہی ہے کہ آپ پر نماز جنازہ میں کھڑے ہو کر درود پاک پڑھا جائے گا، جیسا کہ آپ پر دعا میں درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہے: اللّٰهم صلّ علی محمد الی یوم القیامة (اے الله! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یوم قیامت تک رحمتیں نازل فرما۔) اور یہ ہمارے لئے بھی باعث نفع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، کیونکہ وہاں کوئی امام نہ تھا۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ وہ جو انہیں فرض نماز پڑھا رہا تھا وہی اس نماز میں ان کی امامت کراتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انفرادی طور پر نماز پڑھی، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آخری عہد تھا، چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہر کوئی آپ کی مخصوص برکتیں حاصل کر لے نہ کہ وہ ان میں کسی غیر کے تابع ہو۔ والله اعلم بالصواب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسناد حسن بلکہ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے: جب لوگ منگل کے دن آپ کی تجہیز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھر میں چارپائی پر رکھا گیا، پھر لوگ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گروہ در گروہ داخل ہوئے اور آپ پر صلوٰۃ (درود) پڑھتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو وہاں حاضری کا موقع دیا، یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوئیں تو پھر بچوں کو حاضری کی اجازت دی گئی، اور کسی نے بھی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوگوں کی امامت نہیں کرائی۔ اس حدیث کو انہوں نے نصر ابن علی جہضمی سے اس سند کے ساتھ بیان کیا ہے أنبانا و هب بن جریر حدّثنا أبی عن محمد بن اسحاق قال حدثنی حسین ابن عبدالله عن عکرمة عن ابن عباس، الحدیث بطوله۔ (1)

**مسئلہ نمبر 5**۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: جس دن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ہر شے منور و روشن ہو گئی، اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں وصال ہوا تو وہاں کی ہر شے تاریک ہو گئی۔ اور ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہاتھ نہیں جھاڑے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کا انکار کر دیا۔

ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے (2) اور کہا ہے: محمد بن بشار، عبدالرحمن بن مہدی، سفیان نے عبدالله بن دینار سے اور

---

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اپنی عورتوں کے ساتھ کلام کرنے اور دل لگی کرنے سے بچتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نہ نازل ہو جائے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر ہم کلام کرنے لگے۔(1)

اور ام سلمہ بنت ابی امیہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسند روایت ہے (کہ انہوں نے کہا) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کسی نمازی کی نظر اپنے قدموں سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں میں سے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو ان میں سے کسی کی نظر پیشانی رکھنے کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی، پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو کسی کی نظر قبلہ کی سمت سے نہ پھرتی، پھر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (کا عہد) آیا تو فتنے برپا ہو گئے اور لوگ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔(2)

قولہ تعالیٰ: **اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ** اس میں **اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ** شرط ہے اور **اَوۡ قُتِلَ** اس پر معطوف ہے اور **انۡقَلَبۡتُمۡ** جواب شرط ہے اور حرف استفہام حرف جزا پر داخل ہے کیونکہ شرط اسی کے ساتھ منعقد ہے اور یہ ایک جملہ اور ایک خبر ہو گیا ہے اور معنی یہ ہے: أفتنقلبون علی اعقابکم ان مات أو قتل؟ (کیا تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) پھر جاؤ گے اگر آپ انتقال فرما جائیں یا آپ کو شہید کر دیا جائے) اور اسی طرح (حکم ہے) ہر استفہام کا جو حرف جزا پر داخل ہو، کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں ہوتا، اور اس کا محل یہ ہے کہ وہ جواب شرط سے پہلے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ: **انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ** ایک تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: تم اپنے ایمان کے بعد کفار کی طرف لوٹ جاؤ گے، حضرت قتادہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ اس کے بارے کہا جاتا ہے جو اس حالت کی طرف لوٹ آئے جس پر وہ پہلے تھا انقلب علی عقبیبه۔ اور اسی معنی میں نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيۡهِ بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں انقلاب (لوٹنے) سے مراد شکست کھانا ہے، اور یہ حقیقت ہے نہ کہ مجاز۔ اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم نے مرتدین کا فعل کیا ہے اگرچہ یہ ردۃ (مرتد ہونا) نہیں۔

قولہ تعالیٰ: **وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا** (اور جو الٹے پاؤں پھرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا) بلکہ اپنی ذات کا نقصان کرے گا اور مخالفت کے سبب اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسے کوئی طاقت نفع نہیں دے سکتی اور نہ کوئی معصیت اسے کوئی نقصان اور ضرر پہنچا سکتی ہے۔

**وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ** (اور اللہ تعالیٰ جلدی اجر دے گا شکر کرنے والوں کو) یعنی وہ جنہوں نے صبر کیا اور جہاد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ اور **وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ** قول باری تعالیٰ: **فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا** کے بعد آیا ہے اور یہ وعدہ کا وعید کے ساتھ اتصال ہے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1621، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز، صفحہ 119، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔ لکھا ہوا ہے (موت کا) مقررہ وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ، ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکر گزار بندوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا یہ جہاد پر ابھارتا ہے اور اس پر آگاہ کرتا ہے کہ موت لازم اور ضروری ہے اور ہر انسان مقتول ہو یا غیر مقتول وہ مرنے والا ہے جب وہ اپنی (موت کی) لکھی ہوئی مقررہ مدت تک پہنچ جائے کیونکہ مُّؤَجَّلًا کا معنی إلی أجل (مقررہ مدت تک) ہے۔ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر سے۔ اور كِتٰبًا مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی كتب الله كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (اللہ تعالیٰ نے موت کا مقررہ وقت لکھ دیا ہے۔) اور أجل الموت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے علم میں ہے، کہ زندہ کی روح اس کے جسم سے جدا ہوگی، اور جب بندہ قتل کیا جاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہی اس کی موت کا مقررہ وقت ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا۔ اور قول باری تعالیٰ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا پر دلیل فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ (النحل) (پس جب آجاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں) اور فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (العنکبوت:5) (تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے) اور لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (الرعد) (ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے)

اور معتزلی کہتا ہے: موت کا وقت متقدم اور متاخر ہوتا رہتا ہے اور یہ کہ جسے قتل کر دیا جائے وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ حیوان جو ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے مقرر وقت سے پہلے ہلاک ہو گیا، اسی لئے قاتل پر ضمان اور دیت واجب ہوتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نفس اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کا مزید بیان سورہ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں علم کے لکھنے اور اسے مدون کرنے پر دلیل موجود ہے اور اس کا بیان سورہ ''طٰہٰ'' میں اس قول کے تحت آئے گا۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (ثواب الدنیا) سے مراد غنیمت ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غنیمت کی طلب میں مرکز کو چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ہر اس کے بارے میں عام ہے جس نے آخرت کی بجائے صرف دنیا کا ارادہ کیا، اور معنی یہ ہے: ہم اس میں سے اسے وہ دیں گے جو اس کے لئے حصہ مقرر کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء:18) (جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں۔) وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا یعنی ہم اسے اس کے عمل کی جزا عطا فرمائیں گے، اسی طرز پر الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ جس کے لئے چاہے گا نیکیاں دوگناہ کردے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبدالله بن جبیر رضی اللہ عنہ اور آپ کے وہ ساتھی ہیں جو مرکز پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کردیئے گئے۔

وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ یعنی ہم انہیں ابدی ثواب عطا فرمائیں گے جو ان کے لئے ترک انہزام پر جزا اور بدلہ ہوگا اور یہ سابقہ بیان کی تاکید ہے کہ آخرت میں انہیں مزید عطا کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ اور ہم انہیں دنیا میں رزق عطا کریں گے تا کہ یہ وہم نہ کیا جائے کہ شکر گزار اپنے مقسوم سے محروم کردیا جاتا ہے اس میں سے جسے کافر پالیتا ہے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝

”اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے الله والوں نے سو نہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچی انہیں الله کی راہ میں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی اور الله تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے۔ اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر۔“

قولہ تعالیٰ: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ زہری نے بیان کیا ہے: غزوہ احد کے دن شیطان نے چیخ کر کہا: قتل محمد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کردیئے گئے) تو اس سے مسلمانوں کی ایک جماعت شکست خوردہ ہوگئی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں پہلا آدمی تھا جس نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، میں نے خود کے نیچے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کو چمکتے ہوئے دیکھا، تو میں نے اپنی بلند آواز کے ساتھ پکار کر کہا: یہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ تو خاموش رہ۔ پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا الآیہ۔ اور كَاَیِّنْ بمعنی کم ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: یہ ای ہے اس پر کاف تشبیہ داخل ہوا اور اس کے ساتھ اسے بنایا گیا۔ پس یہ کلام میں کم کے معنی میں ہے۔

اور اسے مصحف میں نون کے ساتھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے اسے اپنے اصل سے نقل کیا گیا ہے پس اس کے معنی کے تغیر کی وجہ سے اس کے لفظ کو بھی بدل دیا گیا ہے، پھر اس کا استعمال کثیر ہے اور عرب تو اس کے ساتھ کھیلتے رہے اور انہوں

نے اس میں قلب اور حذف کا تصرف کیا ہے۔ اور اس میں چار لغات ہیں جن کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے وکائن، وکاعِن کی مثل فاعل کے وزن پر پڑھا ہے اور اس کی اصل کَیْء ہے پھر یا کو الف سے بدل دیا گیا جیسا کہ یَیْاَس میں تبدیل کیا گیا اور کہا گیا ہے یاءَس۔

شاعر نے کہا ہے:

و کَائِنْ بالأَباطِحِ من صَدِیقٍ	یَرَانِی لَوْ أُصِبْتُ هو المُصَابَا

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وَ کَائِن رَدَدْنَا عنکم مِن مُدَجَّجٍ	یَجِیُٔ أمامَ الرَّکْبِ یَرْدِی مُقَنَّعَا

اور ایک اور نے کہا ہے:

وَ کَائِن فی المَعَاشِرِ من أُنَاس	أخوهم فَوْقَهم وهُم کِرامُ

مذکورہ تمام اشعار میں وکائن فاعل کے وزن پر پڑھا گیا ہے۔

اور ابن محیصن نے وکَیِنْ پڑھا ہے یعنی مہموز مقصور ہے جیسا کہ وَکَعِن اور یہ کَائِنْ سے بنایا گیا ہے اور اس کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے وَکَأْیِن بھی ہے جیسا کہ وکَعْیِنْ اور یہ کَیِّ مخفف کا مقلوب ہے۔ اور باقیوں نے وَکَأَیِّن کَعَیِّنْ کی مثل تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

کَعَأَیِّنْ مِنْ أُنَاسٍ لم یزالوا	أخوهم فوقهم و هُم کِرامُ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

کَأَیِّنْ أَبَدْنا من عدوّ بِعِزّنَا	و کَائِنْ أَجَرْنَا من ضَعِیف و خائِف

اور اسے دو لغتوں کے درمیان جمع کر دیا گیا ہے: کَأَیِّنْ وَ کَائِنْ، اور ایک پانچویں لغت ہے کَیْئِنْ جیسا کہ کَیْعِنْ گویا یہ کَیِّن سے مخفف ہے اور کَأَیِّنْ کا مقلوب ہے۔ علامہ جوہری نے سوائے دو لغتوں کے کوئی ذکر نہیں کی: کَائِنْ مثلاً کَاعِنْ، اور کَأَیِّنْ مثلاً کَعَیِّنْ، آپ کہتے ہیں کَأَیِّنْ رجلا لقیتُ، اس میں رجلاً تمیز کی بنا پر کَأَیِّنْ کے بعد منصوب ہے۔ اور آپ یہ بھی کہتے ہیں: کَأَیِّنْ مِن رجل لقیت، کَأَیِّنْ کے بعد مِنْ داخل کرنا نصب کی نسبت اکثر اور عمدہ ہے۔ اور بِکَأَیِّنْ تبیع هذا الثوب؟ بمعنی بکم تبیع ہے۔ (تم یہ کپڑا کتنے میں بیچو گے)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

و کَائِنْ ذَعَرْنَا من مَهَاةٍ وَرَامِحٍ	بِلَادُ العِدَا لَیْسَتْ له بِبِلادِ

اس میں کائِنْ بمعنی کم استعمال ہو رہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: ابوعمرو نے وقف کیا ہے اور وکأیْ بغیر نون کے پڑھا ہے، کیونکہ یہ تنوین ہے اور سورہ ابن مبارک نے

کسائی سے اسے روایت کیا ہے۔ اور باقیوں نے خط مصحف کی اتباع کرتے ہوئے نون کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اور آیت کا معنی مومنوں کو تشجیع دلانا اور انبیاء علیہم السلام کے بہترین متبعین میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی اقتداء اور پیروی کرنے کا حکم دینا ہے، یعنی کثیر انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ بہت سے الله والوں کو شہید کیا گیا یا انبیاء علیہم السلام میں سے کثیر شہید کر دیئے گئے اور ان کی امتیں مرتد نہیں ہوئیں، یہ دو قول ہیں: پہلا حسن اور سعید بن جبیر کا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کوئی نبی کسی جنگ میں کبھی شہید نہیں کیا گیا(1)۔ اور ابن جبیر نے کہا ہے: ہم نے نہیں سنا کہ کوئی نبی علیہ السلام جنگ میں شہید کر دیا گیا ہو(2)۔ اور دوسرا قول حضرت قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے۔ اس قول کی بنا پر قُتِلَ پر وقف کرنا جائز ہے، اور یہ قرأت (قُتِلَ) نافع، ابن جبیر، ابو عمرو اور یعقوب کی ہے۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ قُتِلَ صرف نبی پر واقع ہو رہا ہے، اور اس صورت میں قُتِلَ پر کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور کلام میں اضمار ہوگا یعنی و معہ ربیُّون کثیر، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قُتِلَ الامیرُ معہ جیش عظیم، یعنی و معہ جیش عظیم۔ اور خرجتُ معی تجارۃ، ای و معی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قتل نبی علیہ السلام اور اس کے ساتھ الله والوں کو بھی شامل ہو، اور کلام کی توجیہ یہ ہو گی کہ ان میں سے بعض شہید کر دیئے گئے جو اس (نبی علیہ السلام) کے ساتھ تھے، عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم و بنی سلیم، (یعنی) ان میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا ان میں سے ماںقی کی طرف راجع ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول نزول آیت کے ساتھ زیادہ مشابہت اور زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت شہید کی گئی۔ اور کوفیوں اور ابن عامر نے قَاتَلَ پڑھا ہے۔

اور یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے: بے شک الله تعالیٰ نے جب ان کی مدح اور تعریف کی جنہوں نے جہاد کیا تو جو شہید کر دیئے گئے وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور جب مدح ان کی ہو جو شہید کر دیئے گئے تو پھر ان کے سوا باقی اس میں داخل نہ ہوئے، پس قَاتَلَ اعم(3) اور زیادہ قابل مدح ہے، اور رِبِّيُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت را کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے را کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں تین لغات ہیں۔ اور رِبِّيُّوْنَ سے مراد بہت سی جماعتیں ہیں، یہ حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ سے منقول ہے(4)، ان کا واحد رِبِّی را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ رُبَّۃ کی طرف منسوب ہے یہ را کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی۔ اور اس کا معنی ہے جماعت، گروہ اور حضرت عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الرِّبِّيُّوْنَ سے مراد الوف کثیرہ (یعنی کئی ہزار) ہیں(5)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الربیون سے مراد اتباع و پیروی کرنے والے ہیں(6)۔ پہلا معنی لغت میں زیادہ معروف ہے، اور اسی معنی میں (کپڑے کا) وہ ٹکڑا ہے جس میں جوئے کے تیر جمع

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

کئے جاتے ہیں اسے رَبَّۃٌ اور رُبَّۃ کہا جاتا ہے۔ اور رِبَاب سے مراد وہ قبائل ہیں جو جمع ہوں۔ اور ابان بن ثعلب نے کہا ہے: الرِّبِّیّ دس ہزار ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد صبر کرنے والے علماء ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد الجمع الکثیر (بہت بڑا اجتماع) ہے۔

حسان نے کہا ہے:

وإذا مَعْشَرٌ تَجَافَوْا عن الحق حَمَلْنَا علیهم رُبِّیا

جب لوگ حق سے دور ہو گئے تو ہم نے ان پر جمع کثیر کو مسلط کر دیا۔

اور زجاج نے کہا ہے: یہاں دو قرأتیں ہیں رُبِّیُّوْنَ را کے ضمہ کے ساتھ اور رِبِّیُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ، رہا رُبِّیُّوْنَ تو اس کا معنی ہے جماعت کثیرہ اور کہا جاتا ہے: دس ہزار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رَبِّیُّوْنَ را کے فتحہ کے ساتھ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: الرِّبِّیّ ان بندوں میں سے ایک جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ڈٹے رہے اور صبر کیا اور وہی ربانیون ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت، عبادت اور الوہیت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَهَنُوْا وہ کمزور ہو گئے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ الوھن کا معنی ہے خوف کے سبب ہمت اور قوت کا ٹوٹ جانا۔ اور حسن اور ابوالسمال نے وَهِنُوْا ھا کے کسرہ اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ابوزید سے منقول ہیں۔ وھن الشئ یَھِن وھنا۔ اور أوھنته أنا و وَهَّنْتُهٗ اس کا معنی ہے میں نے اسے کمزور کر دیا۔ اور الواھنۃ کا معنی ہے پسلیوں کا نیچے آنا اور ان کا چھوٹا ہونا اور الوھن من الابل سے مراد اونٹ کا بوجھل اور موٹا ہونا ہے اور الوھن سے مرادرات کی وہ ساعت بھی ہے جو گزر جاتی ہے، اور اسی طرح المَوْھن بھی ہے۔ اور أَوْهَنَّا یعنی ہم اس ساعت میں ہو گئے، مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کے شہید ہونے کی وجہ سے یا ان کے قتل کی وجہ سے جو ان میں شہید کر دیئے گئے ہمت نہ ہاری یعنی ان کے باقی رہنے والوں نے ہمت نہ ہاری، پس اس میں مضاف محذوف ہے۔ وَمَا ضَعُفُوْا اور وہ اپنے دشمن کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئے۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا یعنی (انہوں نے ہار نہ مانی) اس تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے جو انہیں جہاد میں پہنچی۔ اور الاستکانۃ کا معنی ذلت اور خضوع ہے (یعنی نہ وہ جھکے اور نہ عجز کا اظہار کیا) اور اس کی اصل واسْتَكَنُوْا، افتعلوا کے وزن پر ہے، پھر کاف کے فتحہ میں اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہوا۔

اور جنہوں نے اسے کَوْن سے بنایا ہے تو پھر یہ استفعلوا کے وزن پر ہے۔ (یعنی باب استفعال ہے) اور پہلا آیت کے معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور فَمَا وَهْنُوْا وَمَا ضَعْفُوْا ھا اور عین کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور کسائی نے ضَعَفُوْا عین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی اس کے بعد کہ ان میں سے کچھ شہید کر دیئے گئے یا ان کے نبی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا یہ کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بھاگے نہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو موت پر

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562

پیش کر دیا، اور انہوں نے مغفرت طلب کی تا کہ ان کی سوت گناہوں سے توبہ ہو جائے اگر انہیں شہادت عطا فرما دی جائے، اور انہوں نے ثابت قدم رہنے کی التجا کی یہاں تک کہ وہ شکست خوردہ نہ ہوئے، اور اپنے دشمنوں کے خلاف فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ اور انہوں نے ثبات بالاقدام کو خاص کیا نہ کہ دیگر اعضائے بدن کو اس لئے کہ اعتماد اور انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم نے اس طرح کیوں کیا اور کہا؟ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور انہیں نصرت، فتح، دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں مغفرت عطا فرمائی جب وہ اس کی طرف چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مخلص، توبہ کرنے والے، سچ بولنے والے اور اپنے دین کی مدد و نصرت کرنے والے بندوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتا ہے۔ جو اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے سچے وعدہ اور سچے قول کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ یعنی (اللہ تعالیٰ ان سے پیار اور محبت کرتا ہے) جو جہاد میں صبر اختیار کرتے ہیں اور بعض نے وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس میں قول کو كَانَ کا اسم بنایا گیا ہے، سو اس کا معنی ہوگا و ما کان قولهم الا قولهم (اور ان کی کوئی گفتگو نہ تھی سوائے اس قول کے) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے) اس میں مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ وَاِسْرَافَنَا اور جو زیادتیاں ہم نے کی ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں۔ اور اسراف کا معنی ہے: الافراط فی الشیٔ و مجاوزۃ الحد یعنی کسی شے میں زیادتی کرنا اور حد سے تجاوز کرنا۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگتے تھے اللّٰهم اغفرلی خطیئتی و جھلی و اسرافی فی امری و اما انت أعلم به مِنّی (1) (اے اللہ! میری خطائیں، میری جہالت (میری عدم علم) میری اپنے معاملے میں زیادتی اور وہ جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے میری مغفرت اور بخشش فرما) اور آگے حدیث ذکر کی (2)۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اس دعا پر عمل کرے جو کتاب اللہ اور صحیح سنت میں ہے اور اس کے سوا کو چھوڑ دے اور یہ نہ کہے: میں اس طرح پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام اور اپنے اولیاء کے لئے پسند فرمایا اور انہیں تعلیم دی کہ وہ کیسے دعا مانگیں۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

”تو دے دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) اور عمدہ ثواب آخرت کا (یعنی نعیم جنت اور لذت وصل) اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکوکاروں سے۔“

قولہ تعالیٰ: فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کر دیا ثَوَابَ الدُّنْيَا یعنی دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت اور ان پر فتح کامرانی وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ یعنی جنت اور جحدری نے فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ پڑھا ہے یعنی یہ ثواب سے ماخوذ ہے۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوت، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰهم اغفرلی الخ، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعوات والتعوذ باب فی الادعیۃ، جلد 2 صفحہ 349، اسلام آباد

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الدعوات، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اقتدا کا حکم دیا جو انبیاء علیہم السلام کے انصار و معاونین میں سے پہلے گزر چکے ہیں تو کافروں کی طاعت و پیروی سے ڈرایا، کافروں سے مراد مشرکین عرب یعنی ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد منافقین ہیں انہوں نے مومنین کو ہزیمت کے وقت یہ کہا: تم اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف لوٹ آؤ(1)۔ یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ یعنی وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ تو تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم خسارے اور نقصان میں ہو گے۔ پھر فرمایا: بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار اور تمہارا محافظ ہے اگر تم اس کی اطاعت کرو گے۔ اور بَلِ اللّٰهَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت یہ ہے بل واطیعوا اللہ مولا کم۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

''ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لئے کہ انہوں نے شریک بنالیا اللہ کے ساتھ اس کو جس کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔''

اسی کی مثل ہے وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ابن عامر اور کسائی نے الرُّعُب عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الرُّعْب کا معنی خوف ہے، کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهٗ رُعْبًا و رُعُبًا، فهو مرعوب۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الرعب مصدر ہو اور الرُّعُب اسم ہو۔ اور اس کی اصل الملاء سے ہے (بھرنا) کہا جاتا ہے: سَیْل راعب یملأ الوادی (یعنی ایسا سیلاب جو وادی کو بھر دے) اور رعبت الحوض کا معنی ہے میں نے حوض کو بھر دیا۔

اور آیت کا معنی ہو گا: ہم عنقریب مشرکین کے دلوں کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیں گے۔ اور سختیانی نے سَیُلْقِیْ یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے نون عظمت کے ساتھ پڑھا ہے۔

سدی وغیرہ نے کہا ہے: جب ابوسفیان اور مشرکین احد کے دن مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہو کر چلے وہ چلتے رہے یہاں تک کہ جب وہ کچھ راستہ طے کر چکے تو نادم اور شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے: ہم نے کہا ہے وہ کتنا برا ہے! ہم نے انہیں قتل کیا ہے یہاں تک کہ جب بکھرے ہوئے چند افراد کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تو ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے، واپس چلو اور انہیں مکمل طور پر ہلاک کر دو۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 263

پس جب انہوں نے اس کا عزم و ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے جو قصد کیا تھا اس سے رجوع کر لیا(1)۔ اور القاء درحقیقت اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ (اور اس نے تختیاں پھینکیں) فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ (الشعراء: 44) (تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں میدان میں) فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا) شاعر نے کہا ہے:

فالقَتْ عصاها واستقرّ بها النّوَى

پس اس نے اپنا عصا پھینکا اور اس کے ساتھ گھر ساکن ہو گیا۔

پھر کبھی مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اور اس ارشاد میں: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ: 39) (اور (اے موسیٰ) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جانب سے) اور القى عليك مسألة (اور اس نے تجھ پر سوال کیا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ یہ علت بیان ہو رہی ہے، یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کا سبب ان کا شرک کرنا ہے، اور یہ ما مصدریہ ہے اور کہا جاتا ہے: اَشْرَكَ بِهٖ یعنی اس نے اس کے غیر کو اس کے مساوی قرار دیا تا کہ وہ اسے شریک بنالے۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا سلطان سے مراد حجۃ اور بیان ہے، اور عذر اور برہان (دلیل) ہے، اسی وجہ سے والی کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سلیط سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ہے جس سے چراغ روشن کئے جاتے ہیں، اور وہ تلوں کا تیل ہے۔

جیسا کہ امرؤالقیس نے کہا ہے:

أمَالَ السَّلِيطَ بالذُّبَال المُفَتَّلِ

پس سلطان (دلیل) کے ساتھ حق کے اظہار اور باطل کو مٹانے میں روشنی اور نور حاصل کیا جاتا ہے اور کہا گیا ہے: السّلیط کا معنی حدید (لوہا) ہے اور السلاطَة کا معنی الحدّة (غضب) ہے اور السلاطة تسلیط سے ہے اور اس کا معنی قہر اور غلبہ ہے اور سلطان اسی سے ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ پس سلطان کا اصل معنی قوت ہے، کیونکہ قوت کے ساتھ اسی طرح غلبہ پایا جاتا ہے جس طرح دلیل کے ساتھ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور السلیطة کا معنی ہے شور و شغب اور چیخ و پکار کرنے والی عورت۔ اور سلیط سے مراد فصیح اللسان آدمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ کسی دین میں بھی بتوں کی عبادت ثابت نہیں، اور اس کے جواز پر عقلی دلیل بھی کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام اور ان کے لوٹنے کی جگہ کے بارے خبر دی اور فرمایا: وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے) پھر اس کی مذمت بیان کی اور فرمایا: وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ اور المثوٰی، مراد وہ جگہ ہے جس میں انہیں رکھا جائے گا، کہا جاتا ہے: ثَوٰی يَثْوِی ثَوَاءً اور الماوی: اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس کی طرف کوئی شے رات یا دن کے وقت لوٹ کر آتی ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۵۲

''اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔''

محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے اس حال میں کہ انہیں تکلیف اور اذیت پہنچی تھی تو بعض نے بعض کو کہا: کہاں سے یہ اذیت ہمیں پہنچی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا تھا! تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ وہ ہے کہ انہوں نے مشرکوں کے علمبردار کو قتل کیا اور اس کے بعد علم پر ان میں سے سات افراد کو قتل کیا، اور ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی مگر یہ کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور بعض تیر اندازوں نے بھی مال غنیمت کی طلب میں اپنا مرکز چھوڑ دیا اور وہی ناکامی کا سبب بن گیا۔ بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب احد کا دن تھا اور ہمارا مشرکین سے آمنا سامنا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں میں سے کچھ لوگوں کو (ایک درہ میں) بٹھایا اور ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور آپ نے انہیں فرمایا: ''تم اپنی جگہ کو قطعاً نہ چھوڑنا [اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا] اور اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ رہے ہیں تو پھر بھی تم ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرنا۔'' راوی کا بیان ہے کہ جب جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا حتیٰ کہ ہم نے عورتوں کی طرف دیکھا وہ بڑی تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگ رہی ہیں، اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے پازیب ظاہر دکھائی دے رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: مال غنیمت لوٹ لو مال غنیمت لوٹ لو۔ تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ٹھہر جاؤ، رک جاؤ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا، لیکن وہ چلے گئے پس جب وہ ان کی طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو پھیر دیا (2) اور مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید کر دیئے گئے۔ پھر ابوسفیان بن حرب ایک بلند جگہ سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 565۔ ایضاً، اسباب النزول، صفحہ 83

2۔ بخاری کتاب المغازی باب غزوہ احد، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمارے اوپر جھانکا اور اس نے کہا: کیا قوم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' یہاں تک کہ اس نے تین بار پکارا۔ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ تین بار اس نے یہ پوچھا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر اس نے کہا: کیا قوم میں عمر [بن خطاب] ہیں؟ اس نے یہ بھی تین بار پوچھا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: یہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکے اور کہا: اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! تو نے جھوٹ بولا ہے! اللہ تعالیٰ نے تجھے باقی رکھا ہے تاکہ وہ اس طرح تجھے ذلیل و رسوا کرے، تو اس نے کہا: اُعل ھبل: اے ھبل تو بلند ہو گیا (غالب آ گیا) یہ جملہ اس نے دوبارہ کہا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کیا کہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم کہو اللہ اعلیٰ و اجل'' اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا: لنا عزی و لا عزی لکم (ہمارے لئے تو عزیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی عزیٰ نہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' صحابہ نے عرض کی: ہم کیا کہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: تم کہو اللہُ مولانا و لا مولیٰ لکم۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور جنگ تو ڈول کی مانند ہے (یعنی اس کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں ہوتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں جس طرح ڈول میں پانی کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم) بلاشبہ تم قوم میں ایسے مقتول پاؤ گے جن کا مثلہ کر دیا گیا ہے میں نے اس کے بارے حکم نہیں دیا لہٰذا تم مجھے برا نہ کہنا(1)۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شدید ترین جنگ لڑ رہے تھے اور حضرت سعد سے ایک روایت میں ہے، ان دونوں پر سفید لباس تھا میں نے ان دونوں کو نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ بعد میں۔ مراد حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (2)۔ اور دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: یقاتلان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد القتال ما رأیتھما قبل ذالک الیوم و لا بعدہ۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ملائکہ نے مسلمانوں کی معیت میں اس دن جنگ نہیں لڑی، اور نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد سوائے یوم بدر کے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: حضرت مجاہدؒ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ملائکہ نے احد کے دن اس قوم کی طرف سے جنگ نہیں لڑی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور وہ اس حکم پر قائم نہیں رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر و تقویٰ کی شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور وہ اس نے پورا کر دیا، اور جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد و قول اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 579، قدیمی کتب خانہ کراچی
ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 252، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اپنی صفوں کو چھوڑ دیا اور تیر اندازوں نے بھی اس عہد کو ترک کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں، اور انہوں نے دنیا کا ارادہ کیا تو ان سے ملائکہ کی مدد اٹھالی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا اور انہیں فتح دکھادی، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو اس کے بعد ان پر آزمائش اور بلا کو مسلط کر دیا۔

اور عمر بن اسحاق نے کہا ہے: جب احد کا دن تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بکھر گئے اور حضرت سعد آپ کے سامنے تیر پھینک رہے تھے اور ایک نوجوان انہیں تیر پکڑا رہا تھا جب بھی کوئی تیر چلا جاتا تو وہ تیر انہیں دیتا۔ اور کہتا: اے ابا اسحاق! تیر چلاؤ۔ پس جب فارغ ہوئے انہوں نے دیکھا وہ جوان کون ہے؟ تو نہ انہوں نے اسے دیکھا اور نہ اسے پہچانا۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: جب مشرکوں کا علمبردار قتل ہو گیا اور ان کا جھنڈا گر گیا، تو اسے عمرۃ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھایا تھا۔

اس بارے میں حضرت حسان کہتے ہیں:

فلولا لواءُ الحارثية أصبحوا يباعُون في الأسواق بيْعَ الجلائب

پس اگر عمرہ حارثیہ کا جھنڈا نہ ہوتا تو انہیں بازاروں میں سامان تجارت کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔

اور تَحُسُّوْنَهُمْ کا معنی ہے تم انہیں قتل کر رہے تھے اور تم ان کا نام و نشان مٹا رہے تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

حَسَسْناهم بالسَّيف حَسًّا فأصبحت بقيَّتهم قد شُرِّدُوا او تَبَدَّدُوْا

ہم نے تلوار کے ساتھ ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے پس ان کے بقیہ رہنے والوں کو بھگا دیا گیا ہے یا وہ بکھر گئے ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

تحُسُّهم السيوف كما تَسامَى حريق النار في الأجم الحصيد

اس میں بھی تَحُسُّهُمْ کلی طور پر ختم کر دینے اور نام و نشان مٹا دینے کے معنی میں ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: الحسّ کا معنی ہے قتل کے ساتھ ہلاک و برباد کر دینا(1)، کہا جاتا ہے: جراد محسوس جب سردی اسے قتل اور تباہ کر دے۔ اور البرد مَحَسَّةٌ للنبت یعنی سردی نباتات کو جلا کر ختم کر دینے والی ہے۔ اور سَنَةٌ حَسُوس یعنی خشک سالی ہر شے کو کھا جاتی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

اذا شكونا سَنَةً حَسُوسا تاكل بعد الأخضر اليَبِيسا

جب ہم شکوہ کرتے خشک سالی کا جو کہ سبزی کے بعد خشکی کو بھی کھا جاتی ہے اور اس کی اصل الحس سے ہے جس کا معنی ہے حاسہ کے ساتھ کسی شے کا ادراک کرنا۔ پس حَسَّهٗ کا معنی ہے اس نے اس کی حس کو قتل کے سبب ختم کر دیا۔ بِاِذْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے یا اس کی قضا اور امر سے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ یعنی جب تم بزدل ہو گئے اور تم کمزور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فَشِلَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

یَفْشَلُ فھو فَشِلٌ و فَشَل۔ اور حَتّٰی کا جواب محذوف ہے ای حتّٰی اذا فشلتم امُتُحِنتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے تو تم امتحان میں ڈال دیئے گئے) اور اس کی مثل جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ (الانعام: 35) فافعل۔ (تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ)

اور فراء نے کہا ہے: حَتّٰی کا جواب وَ تَنَازَعْتُمْ ہے اور واؤ مقحمہ زائدہ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ وَنَادَیْنٰہُ ای نادیناہ (یعنی اس میں بھی واؤ مقحمہ زائدہ ہے) اور امرؤالقیس نے کہا ہے:

فلمّا أجزْنا ساحَۃَ الحَیّ وانتَحَی ای اِنتَحَی

اس میں بھی واؤ زائدہ ہے۔ اور ان کے نزدیک وَ عَصَیْتُمْ میں بھی واؤ کو مقحمہ قرار دینا جائز ہے۔ یعنی حتی اذا فشلتم و تنازعتم عصیتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں تو تم نے نافرمانی کی۔) اور اس بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی حتی اذا تنازعتم و عصیتم فشلتم (یہاں تک کہ جب تم جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے۔)

اور ابوعلی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ جواب صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ہو، اور ثُمَّ زائدہ ہو، اور تقدیر کلام یہ ہو حتی اذا فشلتم و تنازعتم و عصیتم صرفکم عنھم (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو اس نے تم کو ان سے پھیر دیا۔)

اور بعض نحویوں نے اس کے زائدہ ہونے میں شاعر کا قول بیان کیا ہے:

أرانِی اذا ما بِتُّ بِتّ علی هَوًی فثُمّ اذا أصبحتُ اصبحتُ عادیا

اور اخفش نے اس کے زائدہ ہونے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ (التوبۃ: 118) (یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَتّٰی بمعنی الٰی ہے اور اس وقت اس کا کوئی جواب نہ ہوگا، یعنی صدقکم اللہُ وعدہ الی اَن فشلتم، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے) یعنی وہ وعدہ ثابت قدم رہنے کی شرط کے ساتھ تھا۔ اور تَنَازَعْتُمْ کا معنی ہے اختلفتم (تم اختلاف کرنے لگے) یعنی اس وقت تیراندازوں میں سے بعض نے کہا: ہم غنائم کو جا ملیں گے (یعنی مال غنیمت جمع کریں گے) اور بعض نے کہا: بلکہ ہم تو اسی جگہ ثابت قدم رہیں گے جہاں ثابت رہنے کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ یعنی وہ غلبہ جو احد کے دن مسلمانوں کو ابتدائی مرحلہ میں ہی حاصل ہو گیا، اور یہ اس وقت

حاصل ہوا جبکہ مشرکین کا علمبردار پچھاڑ (قتل کر) دیا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور اسے جونہی قتل کیا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب منتشر ہو گئے اور وہ متفرق گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے دشمن پر شدید حملے کئے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں اپنے ساز و سامان سے محروم کر دیا۔ اور مشرک گھوڑ سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا ہر بار تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا گیا پس وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹے اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور انہوں نے ان کو خوب قتل کیا۔ پس جب پچاس تیر اندازوں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائیوں کو فتح عطا فرما دی ہے تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! ہم یہاں کسی کام کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے اور ہمارے بھائی مشرکوں کے لشکر میں ہیں۔ اور ان میں سے کچھ گروہوں نے کہا: ہم کیونکر ٹھہرے رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دو چار کر دیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اپنے ان مقامات کو چھوڑ دیا جن کے بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں قطعاً نہ چھوڑیں۔ اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور بزدل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی پس گھوڑ سوار تیز رفتاری کے ساتھ قتال کرتے ہوئے ان میں آ پہنچے۔ آیت کے الفاظ ان کے لئے زجر و توبیخ کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان کو جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مدد و نصرت کی مبادی کو دیکھ لیا تھا، پس ان کے لئے یہ جاننا واجب تھا کہ فتح و نصرت کی تکمیل ثابت قدم رہنے میں ہے نہ کہ انہزام میں، پھر جھگڑے کا سبب بیان کیا اور فرمایا: مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا تم میں سے بعض دنیا یعنی مال غنیمت کے طلبگار ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم نہیں جانتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی دنیا اور اس کے ساز و سامان کی خواہش رکھتا ہے یہاں تک کہ احد کا دن آ گیا (تب ہمیں اس کا احساس ہوا) وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ اور تم میں سے بعض آخرت کے طلبگار ہیں (1) اور وہ وہ ہیں جو اپنے مرکز میں ثابت قدم رہے، اور انہوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے بارے میں اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مخالفت نہ کی، اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے ان پر حملہ کر دیا، اس وقت یہ دونوں کافر تھے اور انہوں نے آپ کو اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ رحمھم اللہ۔

اور یہ عتاب ان کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے مقام کو چھوڑا نہ کہ ان کے ساتھ جو ثابت قدم رہے کیونکہ جو ثابت رہے وہ تو ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران تھے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے جب کسی قوم پر عام عذاب نازل ہو تو نیکوکار اور بچے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن جو ان پر نازل ہوا وہ عذاب اور سزا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ (پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے) یعنی اس کے بعد کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے تمہیں ان سے ناکامی کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور معتزلہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر تم واپس لوٹ آئے، انصرفتم، پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب اور خوف نکالنے کے اعتبار سے ہے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کافروں کے دلوں سے رعب اور خوف نکالنا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

حقیر سمجھنے لگیں قبیح اور برا ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح (فعل) واقع ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا کوئی معنی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں ان کی طلب اور تعاقب کا پابند نہیں بنایا۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس نے تمہیں معصیت اور مخالفت کے بعد ہلاک اور تباہ نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب تمام کے لئے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ان تیر اندازوں کے لئے ہے جنہوں نے اس حکم کی مخالفت کی جو انہیں دیا گیا۔ اسے نحاس نے اختیار کیا ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کی نظیر یہ قول ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (البقرہ:52) (پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے) وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ عفو و مغفرت کے ساتھ مومنوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی جگہ ایسی مدد نہیں کی گئی جیسی احد کے دن مدد کی گئی، فرمایا: اور ہم نے اس کا انکار کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے اور اس کے درمیان جس نے انکار کیا یہ کتاب اللہ ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ یوم احد کے بارے فرماتا ہے: وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ الحس سے مراد قتل کرنا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۗ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بلاشبہ اس سے مراد تیر انداز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک جگہ میں کھڑا کیا پھر ارشاد فرمایا: "تم ہماری پشتوں کی حفاظت کرو پس اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم قتل کر رہے ہیں تو تم ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم مال غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو تم ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔" پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے اور مشرکین کے لشکر کو مباح قرار دیا تو تمام تیر انداز واپس لوٹ آئے اور لشکر میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے، تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی صفیں جڑ گئیں، پس وہ اس طرح ہو گئے اور آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا جال بنایا...... اور وہ آپس میں مل گئے (یعنی خلط ملط ہو گئے) پس جب تیر اندازوں نے اس درہ کو خالی کر دیا جس میں وہ تھے تو گھوڑ سوار اسی راستے سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہو گئے اور بعض نے بعض کو مارا اور آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لئے ابھی دن کی ابتدا تھی یہاں تک کہ مشرکین کے سات یا نو علمبردار قتل کر دیئے گئے اور مسلمان پہاڑ کی طرف چلے گئے، اور وہ وہاں تک نہ پہنچے جسے لوگ الغار کہتے ہیں، بلاشبہ وہ مہراس (جبل احد کے ساتھ پانی کا چشمہ) کے نیچے رہے اور شیطان چیخ اٹھا: قتل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا) اور اس میں کوئی شک نہ کیا گیا کہ وہ حق اور سچ ہے۔ پس ہم اسی طرح رہے اور ہم آپ کے شہید ہونے کے بارے شک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سعدوں (حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ) کے درمیان ہم پر ظاہر ہوئے جب آپ چلے تو ہم آپ

کو اپنے قدموں کی طرف جھکنے کے سبب پہچان گئے۔ تو ہم اتنا خوش ہوئے گویا ہمیں (اس میں سے) کوئی مصیبت پہنچی ہی نہیں جو مصیبت ہمیں آئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف چڑھے اور آپ فرما رہے تھے: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہو جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا(1)''۔ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں میں سے سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا تھا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو خود کے نیچے سے روشن اور ظاہر تھیں تو میں نے اپنی بلند آواز سے ندا لگائی: اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں بشارت ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ تشریف لا چکے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ کیا کہ تو خاموش رہ۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

''یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تا کہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

اِذْ قول باری تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ عام قرأت تُصْعِدُوْنَ تا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ابو رجا العطاردی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے تا اور عین دونوں کو مفتوح پڑھا ہے(2) یعنی تَصْعَدُوْنَ الجبل (تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے)۔ ابن محیصن اور شبل نے اذ یصعدون ولا یلوون دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن نے تلون ایک واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو بکر بن عیاش نے عاصم سے ولا تُلْوُوْنَ تا کو ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ لغت شاذہ ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اصعدت (کہا جائے گا) جب تو اپنے چہرے کو پھیرتے ہوئے گزر جائے، اور صعدت (کہا جاتا ہے) جب تو پہاڑ یا کسی اور پر چڑھے، بلند ہو(3)۔

پس الاصعاد کا معنی ہموار زمین میں اور وادیوں اور گھاٹیوں کے بطن میں چلنا ہے اور الصعود کا معنی پہاڑوں، چھتوں، سیڑھیوں اور راستوں پر چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا پہاڑ پر چڑھنا وادی میں چلنے کے بعد ہو، پس تُصْعِدُوْنَ اور تَصْعَدُوْنَ دونوں قرأتوں کے مطابق معنی صحیح ہوگا۔

حضرت قتادہ اور حضرت ربیع نے بیان کیا ہے کہ وہ احد کے دن وادی میں چلے۔ اور حضرت ابی کی قرأت اِذْ تُصْعِدُوْنَ فِی الْوَادِی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ احد میں فرار ہو کر چڑھے۔ نتیجتاً دونوں قرأتیں صحیح ہیں، اس دن شکست کھانے والے چلنے اور چڑھنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

مبرد اور قتبی نے کہا ہے: اَصعد کا معنی ہے جب وہ جانے میں خوب دور ہو جائے (4)، پس اصعاد زمین میں خوب دور

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب تفسیر باب آل عمران، جلد 2، صفحہ 325-324، دارالکتب العلمیہ

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

چلے جانے کو کہتے ہیں اور یہ بلندی کی جانب خوب چڑھنے کی طرح ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أَلا أیھذا السائلی أَیْنَ أَصْعدت　　فاِنَّ لها من بطن یثْرِبَ موعِدا

خبردار! اے مجھ سے سوال کرنے والے تو کہاں دور چلا گیا ہے کیونکہ اس کے لئے وادی یثرب جائے وعدہ ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اصعاد کا معنی سفر کو شروع کرنا اور اس کا آغاز کرنا ہے اور انحدار کا معنی سفر سے واپس لوٹنا ہے، کہا جاتا ہے: اصعدنا من بغداد الی مکۃ والی خراسان اور اسی کے مشابہ جبکہ ہم اس کی طرف نکلیں اور سفر شروع کر دیں۔ اور انحدرنا جب ہم واپس لوٹیں۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے:

قد کنتِ تبکین علی الاصعاد　　فالیوم سُرِّحْتِ و صاح الحادی

اس میں اصعاد سفر شروع کرنے کے معنی میں ہے۔

اور مفضل نے کہا ہے: صعد، اصعد اور صعّد تینوں کا معنی ایک ہے (1) اور تلوٗن کا معنی ہے تعرجون و تقیمون، یعنی تم میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بھاگتے ہوئے (یعنی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں۔) کیونکہ کسی شے کی طرف متوجہ ہونے والا اس کی طرف اپنی گردن کو موڑتا ہے یا اپنی سواری کی لگام کو موڑتا ہے۔ عَلٰۤی اَحَدٍ مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کلبی نے یہی کہا ہے۔ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ ای فی اخراکم (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں پیچھے سے بلا رہے تھے) کہا جاتا ہے: جاء فلان فی آخر الناس أُخرۃ الناس و أُخری الناس و أُخریات الناس (یعنی فلاں لوگوں کے آخر میں آیا، پیچھے آیا) اور بخاری میں ہے أُخْرٰىكُمْ آخرکم کی تانیث ہے: عمرو بن خالد، زہیر اور ابو اسحاق نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن کچھ لوگوں پر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور وہ بھاگ کر آ گئے جبکہ ان کے پیچھے رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بلاتے رہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوائے بارہ افراد کے کوئی باقی نہ رہا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پکار منکر (گناہ) کو تبدیل کرنے کے لئے تھی، کیونکہ یہ محال ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم منکر جو کہ بھاگنا ہے کو دیکھیں اور پھر اس سے منع نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس بنا پر ہے کہ انہزام معصیت ہو اور اس طرح ہے نہیں، اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**قولہ تعالیٰ: فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ** لغت میں غم کا معنی ہے التغطیۃ (ڈھانپنا) غممت الشیٔ کا معنی ہے میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اور یوم غَمّ و لیلۃ غمۃ (کہا جاتا ہے) جبکہ دن اور رات دونوں تاریک ہوں اور اسی سے غم الھلال بھی ہے جب چاند دکھائی نہ دے، اور غَمَّنِی الأمر یغُمّنی (کام نے مجھے ڈھانپ لیا [یعنی مجھ پر غالب آ گیا])

حضرت مجاہد اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے: پہلا غم تو مقتول ہونا اور زخمی ہونا تھا، اور دوسرا غم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567　　2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ والرسول یدعوکم، جلد 2، صفحہ 655، اسلام آباد

کی خبر نے ان میں اضطراب پیدا کر دیا، جبکہ شیطان نے اس کے بارے چیخ کر کہا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: پہلا غم وہ ہے جو فتح وکامرانی اور مال غنیمت ان سے کھو گیا اور دوسرا وہ جو قتل اور ہزیمت کا انہیں سامنا ہوا۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلا غم ہزیمت ہے، اور دوسرا ابوسفیان اور خالد بن ولید کا ان پر پہاڑ سے جھانکنا ہے۔ پس جب مسلمانوں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غمزدہ کر دیا، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان پر جھانک رہے ہیں اور وہ انہیں قتل کریں گے پس اس نے انہیں وہ کچھ بھلا دیا جو انہیں حاصل ہوا تھا، تو اس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی: اللّٰھم لا یَعلُنّ علینا (اے اللہ! کوئی ہم پر غالب نہ آئے) جب کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بنا پر بِغَمٍّ میں باء بمعنی علیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اپنے باب (اصل معنی) پر ہے اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مخالفت کے سبب غمزدہ کیا پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پہنچایا اس غم کے بدلے جو ان کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّا پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں احد کے دن غم پہنچایا بِغَمٍّ اس کے بدلے جو غم بدر کے دن مشرکین کو پہنچا۔ اور غم کو ثواب کا نام دیا گیا ہے جس طرح کہ گناہ کی جزا کو ذنب کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہ پر آگاہ کر دیا پس وہ اس کے سبب اس مصیبت میں مشغول ہو گئے جو انہیں پہنچی تھی۔ قولہ تعالیٰ: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ اس میں لام قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ کے متعلق ہے یعنی یہ غم اس غم کے بعد تھا تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو مال غنیمت تم سے کھو گیا، اور نہ اس مصیبت پر جو ہزیمت اور شکست کی صورت میں انہیں پہنچی۔

پہلا قول زیادہ اچھا ہے اور قول باری تعالیٰ: مَآ اَصَابَكُمْ میں مَا محل جر میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا صلہ ہے۔ یعنی لکی تحزنوا علی ما فاتکم و ما اصابکم عقوبة لکم علی مخالفتکم رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے (مال غنیمت) کھو گیا اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس بنا پر کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی)

اور یہ اس قول کی مثل ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) ای ان تسجد (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) اور اس قول کی مثل ہے لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (الحدید: 29) ای لیعلم (تم پر یہ خصوصی کرم اس لئے کیا تاکہ جان لیں اہل کتاب) یہ مفضل کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ سے مراد یہ ہے کہ تم پر لگاتار غم آئے تاکہ تم اس کے بعد غنائم کے بارے میں (کسی فکر میں) مشغول نہ ہو۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس میں تحذیر اور وعید کا معنی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ

يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۗ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۵۴﴾

''پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم و اندوہ کے بعد راحت (یعنی) غنودگی جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ بلاوجہ عہد جاہلیت کی بدگمانی، کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے آپ فرمائیے: اختیار تو سارا اللہ کا ہے چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر۔ کہتے ہیں: (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمائیے کہ اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے۔ (وہاں سے) وہ لوگ، لکھا جا چکا ہے جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سارے مصائب اس لئے تھے) تاکہ آزما لے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا اور صاف کر دے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا، أَمَنَةً اور أَمْنٌ دونوں مساوی اور ہم معنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أَمَنَةً (راحت) اسباب خوف کے ساتھ ہوتی ہے، اور امن خوف نہ ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ (أَمَنَةً) منصوب ہے۔ أَنْزَلَ کے سبب، اور نُّعَاسًا اس (أَمَنَةً) سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے مفعول لہ کی بنا پر نصب دی گئی ہے، گویا کہ یہ کہا ہے: انزل علیکم للأمنة نعاسا، (پھر تم پر راحت کے لئے غنودگی اتاری)۔ ابن محیصن نے اَمْنَةً میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احد کے دن ان غموں کے بعد مومنین پر غنودگی کے ساتھ فضل و احسان فرمایا یہاں تک کہ ان میں سے اکثر سو گئے، بلاشبہ سوتا وہی ہے جو امن و سکون میں ہوتا ہے اور خوفزدہ آدمی سو نہیں سکتا۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے اوپر غنودگی اور نیند طاری ہوگئی احد کے دن حالانکہ ہم اپنی صفوں میں تھے، انہوں نے بیان کیا: پس میری تلوار میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تو میں اسے اٹھا لیتا اور کبھی وہ گر جاتی اور میں اسے اٹھا لیتا۔(1)

يَغْشٰى اسے تا اور یا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اگر یا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع نعاس ہوگا، اور اگر تا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع امنۃ ہوگا۔ اور الطائفۃ کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ مراد منافقین ہیں یعنی معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی، وہ مال غنیمت کے طمع اور مومنین کے خوف میں نکلے تو نیند ان پر طاری نہ ہوئی اور وہ اپنی حاضری پر تاسف کرنے لگے، اور وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ کا معنی ہے اس نے انہیں غم پر ابھارا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ اَمَنَةً نُّعَاسًا، جلد 2، صفحہ 655

اور غم وہ ہے جس کا قصد کیا گیا، کہا جاتا ہے: أھتنی الشیٔ یعنی وہ میرا غم اور فکر ہے اور أمر مھمٌ: انتہائی سخت اور شدید معاملہ۔ اور اھمنی الأمر۔ أمر نے مجھے غم اور اضطراب میں ڈال دیا، اور ھَمَّنِیْ کا معنی ہے اذابنی اس نے مجھے پگھلا دیا۔ اور وَ طَائِفَۃٌ میں واؤ حالیہ ہے اور بمعنی اذ ہے۔ یعنی اذ طائفۃٌ یظنّون جبکہ ایک جماعت بدگمانی کرنے لگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امر باطل ہے اور یہ کہ ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ ظَنَّ الجاھلیۃ یعنی اہل جاہلیت کی بدگمانی۔ اور اس سے مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ اس میں لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے، یعنی ما لنا شیٔ من الامر، (ہمارا اس کام میں کوئی دخل نہیں) یعنی خروج کے معاملہ میں، بلاشبہ ہمیں تو بالا کراہ نکالا گیا ہے، اور اس پر ان کی طرف سے بطور خبر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی سے) نہ مارے جاتے۔) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس دن ہم پر نیند طاری کر دی گئی، اور میں معتب بن قشیر کا قول سن رہا تھا حالانکہ مجھ پر نیند غالب آ رہی تھی وہ کہہ رہا تھا: اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی کے ساتھ) نہ مارے جاتے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے قول کا معنی یہ ہے ہمیں اس کامیابی میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا جس کا وعدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ابو عمرو اور یعقوب نے کلّہٗ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور لِلّٰهِ اس کی خبر ہے۔ اور پھر پورا جملہ اس کی خبر ہے۔ اور یہ اس قول کی طرح ہے: وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَى الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (الزمر: 60) (اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)

اور باقیوں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ان الأمر اجمع للہ، اور یہ تاکید ہے اور یہ احاطہ اور عموم میں اجمع کے معنی میں ہے، اور اجمع صرف توکید کے لئے ہی ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر کی صفت ہے اور اخفش نے کہا ہے: یہ بدل ہے یعنی مدد و نصرت اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کی مدد کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے رسوا کر دیتا ہے، اور جویبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد تقدیر کو جھٹلانا ہے (2) اور یہ اس لئے کہ انہوں نے اس بارے میں کلام کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یعنی اچھی اور بری تقدیر سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں شرک، کفر اور تکذیب۔ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ وہ جو تمہارے لئے ظاہر نہیں کرتے۔ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا یعنی (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا) تو ہماری جماعت قتل نہ کی جاتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منافقین کہتے اگر ہماری عقل ہوتی تو ہم اہل مکہ کے ساتھ جنگ کے لئے نہ نکلتے، اور نہ ہمارے سردار قتل کئے جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ جواب لوٹایا اور کہا: قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 568　2۔ ایضاً، صفحہ 569

لَبَرَزَ آپ فرمائیے: اگر تم اپنے گھروں میں (بیٹھے) ہوتے تو (وہاں سے) ضرور نکل آتے (وہ لوگ) الَّذِيْنَ كُتِبَ جن کے بارے لکھا جا چکا ہے (یعنی جن کا مقدر بنا دیا گیا ہے) علیھم القتل، قتل یعنی لوح محفوظ میں۔ الی مضاجعھم یعنی اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتب علیھم القتل یعنی ان پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے پس اسے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اسے اس کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

ابوحیوہ نے لَبُرِّزَ با کے ضمہ اور را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی یُجعل یخرج (انہیں نکال لیا جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اے منافقین! اگر تم پیچھے رہ جاتے تو تم اس کے علاوہ کسی دوسرے میدان جنگ کی طرف نکل پڑتے اس میں تم قتل کر دیئے جاؤ گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آزمالے گا جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اسے مومنین کے لئے ظاہر کر دے گا۔

اور قول باری تعالیٰ وَلِيَبْتَلِيَ میں واؤ مقحمہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے: وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ یعنی لیکون۔ اور اس فعل کو حذف کر دیا گیا ہے جو لام کَیْ کے ساتھ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ نے تم پر قتال اور جنگ مقدر کر دی ہے اور احد کے دن اس نے تمہاری مدد نہیں کی تاکہ وہ تمہارے صبر کو آزمائے۔ اور تم سے تمہارے گناہ معاف کر دے اگر تم توبہ کر و اور مخلص ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لِيَبْتَلِيَ کا معنی ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ مختبر کا معاملہ کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: تاکہ تم سے مشاہدہ واقع ہو جس کا اسے غیباً علم ہے۔ اور کہا گیا ہے: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے ورتقدیر عبارت ہے لِيَبْتَلِيَ اولیاء اللہ تعالیٰ۔ تاکہ وہ اولیاء اللہ کو آزمالے۔ اور تمحیص کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی سینوں میں خیر و شر میں سے جو ہے (اللہ اسے جانتا ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ذات الصدور سے مراد سینے ہی ہیں، کیونکہ ذات الشئ سے مراد اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

''بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا یہ جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا کی خبر ہے۔ اور مراد وہ ہیں جو مشرکین سے احد کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو ہزیمت کے وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھاگ گئے نہ کہ وہ جو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس قوم کے ان معین افراد کے بارے ہے جو اپنی ہزیمت کے وقت میں تین دن تک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے اور پھر لوٹ گئے۔ اور اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے ان کے پھسلنے کا تقاضا کیا اس طرح کہ انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں، تو وہ ثابت رہنے پر مجبور ہو گئے تاکہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ اور بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کا یہی معنی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اَسْتَزَلَّهُمُ کا معنی ہے۔ اس نے انہیں پھسلاہٹ پر ابھارا، یہ باب استفعال ہے اور الزلۃ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی خطا اور گناہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زَلَّ اور اَزَلَّ دونوں کا معنی ایک ہے۔ پھر کہا گیا: انہیں اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے سے پہلے قتال (جنگ) پر مجبور کیا گیا تو اسی وجہ سے وہ پیٹھ پھیر گئے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کو چھوڑ کر اور مال غنیمت کی طرف مائل ہو کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔

اور حسن نے کہا ہے: مَا كَسَبُوْا (یعنی اس کے عوض) جو انہوں نے ابلیس کا قول قبول کیا جو اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ اور کلبی نے کہا ہے: شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال آراستہ اور مزین کئے اور یہ قول بھی ہے کہ انہزام معصیۃ نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہونے کا ارادہ کیا، پس دشمن نے ان میں اپنا طمع اور حرص ختم کر دی جب انہوں نے یہ سن لیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کہا جانا بھی جائز ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار کو اس خوف کی وجہ سے سنا ہی نہیں جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ دشمن کی تعداد کئی گناہ زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ سات سو تھے اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور ایسی حالت میں بھاگنا جائز ہوتا ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھاگنا خطا اور گناہ ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور شاید انہیں یہ وہم بھی ہو گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے پہلا قول احسن ہے۔ المختصر اگر معاملہ کو ثابت شدہ گناہ پر محمول کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔ اور اگر اسے انہزام جائز پر محمول کیا جائے تو آیت ان کے بارے میں ہے جو ہزیمت سے بہت دور ہیں اور اتنی مقدار پر زائد ہے جو جائز قرار دی گئی ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نصر بن محمد بن ابراہیم نے کہا ہے: خلیل بن احمد، سراج، قتیبہ، ابو بکر بن غیلان نے جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین گفتگو ہوئی، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کیا تم مجھے برا بھلا کہتے ہو حالانکہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، اور میں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی (یعنی بیعت رضوان میں میں حاضر تھا۔) اور تم نے بیعت نہیں کی۔ اور احد کے دن تم نے بھی پیٹھ پھیرنے والوں کے ساتھ پیٹھ پھیر لی تھی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا: جہاں تک تمہارا یہ قول ہے کہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، تو میں کسی ایسے کام سے غائب نہیں ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر ہوئے ہوں، مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی بیمار تھی اور میں ان کے پاس ان کی تیمارداری کے لئے رہا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مسلمانوں کے حصص کے ساتھ برابر کا حصہ دیا اور رہا بیعت الشجرہ کا مسئلہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مشرکین مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا ھذہ لعثمان یہ عثمان کے لئے ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دایاں اور آپ کا بایاں میرے دائیں اور بائیں سے میرے لئے انتہائی بہتر ہے اور رہا یوم الجمع (احد کا دن) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ تو میں بھی ان میں شامل ہو گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ نتیجتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دلیل سے غالب آ گئے۔ (1)

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل صحابہ، باب مناقب عثمان بن عفان، جلد 1، صفحہ 523، اسلام آباد

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے انہوں نے بیان کیا: عبدان، ابوحمزہ نے عثمان بن موہب سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی آیا اور اس نے بیت اللہ شریف کا حج کیا تو اس نے ایک قوم کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے پوچھا: یہ بیٹھنے والے لوگ کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ قریش ہیں۔ اس نے پوچھا: شیخ کون ہے؟ انہوں نے بتایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، پس وہ ان کے پاس آیا اور کہا: میں ایک شے کے بارے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا مجھے بتاؤ گے؟ اس نے کہا: میں تجھے اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں، کیا تم یہ جانتے ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد کے دن فرار ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا آپ ان کے بارے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بدر کے دن بھی میدان سے غائب تھے وہ اس میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

پھر اس نے پوچھا: کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بیعت رضوان سے بھی پیچھے رہ گئے اور اس میں حاضر نہ ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پس اس آدمی نے نعرہ تکبیر بلند کیا، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آؤ میں تجھے بتاؤں اور جن امور کے بارے تو نے مجھ سے سوال کیا ہے میں تیرے لئے اس کی وضاحت کروں، جہاں تک احد کے دن آپ کے فرار کا تعلق ہے تو میں یہ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا ہے اور رہا بدر سے ان کے غائب ہونے کا معاملہ! تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اِنَّ لک اَجرَ رجل ممن شَھِد بدرا و سھمہ (بلاشبہ تمہارے لئے اس آدمی کے برابر اجر اور (مال غنیمت سے) حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔) اور جہاں تک بیعت رضوان سے غائب ہونے کا تعلق ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ اگر بطن مکہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا کوئی موجود ہوتا تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا ھذہ ید عثمان یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: ھذہ لعثمان یہ بیعت عثمان کے لئے ہے۔ اب اسے تو اپنے ساتھ لے جا۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کرنا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے فحج آدم موسیٰ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام دلیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کے سبب اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے پر زجر و توبیخ اور ملامت کریں، تو حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے میرا مقدر بنا دیا تھا(2) اور اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اور جس

1۔ صحیح بخاری کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 581، اسلام آباد

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلم اللہ موسیٰ تکلیماً، جلد 2، صفحہ 119، اسلام آباد۔ مسلم کتاب القدر، باب تحاج آدم موسیٰ، جلد 2، صفحہ 335۔ کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب القدر، حدیث نمبر 6124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی توبہ قبول ہو جائے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی، اور اسی طرح وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور بلا شبہ وہ یہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اور ان دو کے سوا توبہ کرنے والے گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں، پس وہ اس پریشانی اور خوف میں ہوتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے، اور اگر قبول کر لی جائے تو بھی خوف ان پر غالب ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے بارے علم نہیں ہوتا۔ فاعلم۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۵۶

”اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تا کہ بنائے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (در حقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مراد منافقین ہیں۔

وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ یعنی جو نفاق میں یا نسب میں (ان کے بھائی تھے) اور ان سرایا میں گئے جنہیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بئر معونہ کی طرف بھیجا (انہیں کہتے تھے) لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے) تو اس میں مسلمانوں کو ان کی مثل قول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِذَا ضَرَبُوْا یہ زمانہ ماضی کے لئے ہے، یعنی اذ ضربوا، (جب انہوں نے سفر کیا) کیونکہ کلام میں شرط کا معنی ہے اس حیثیت سے کہ الَّذِيْنَ مبہم غیر موقت ہے، پس اِذَا، اِذْ کے محل میں واقع ہے۔ جیسا کہ ماضی جزا میں مستقبل کے محل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے انہوں نے زمین میں سفر کیا اور تجارت یا دیگر کاموں کے لئے چلے اور مر گئے۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى یا وہ جہاد میں گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ اور الغُزّٰی جمع منقوص ہے اس کا لفظ حالت رفعی اور جری میں تبدیل نہیں ہوتا، اور ان کا واحد غازٍ ہے، جیسا کہ راکع کی جمع رُکّع، صائم کی جمع صُوَّم، نائم کی جمع نُوَّم، شاہد کی جمع شُھَّد، اور غائب کی جمع غُیَّب ہے۔ اور جمع میں غُزَاۃٌ بھی جائز ہے جیسا کہ قُضَاۃٌ اور غُزَّاء مد کے ساتھ بھی مثلاً ضُرَّاب اور صوّام اور کہا جاتا ہے: غَزِیٌّ، الغزاۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قل للقوافل والغَزِیّ اذا غَزَوا

اس میں الغَزِیّ الغزاۃ کی جمع کے طور پر مذکور ہے۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے غُزًی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اَلْمُغْزِيَةُ ایسی عورت جس کا خاوند جہاد پر ہو۔

اور اَتَانٌ مُغْزِیَۃٌ یعنی ایسی گدھی جس کا بچہ مؤخر ہو جائے (پیچھے ہو جائے) اور پھر اسے نکالا جائے۔ اور اَغْزَتِ النَّاقَۃُ جب اس کی جان تنگ ہو جائے۔ اور اَلْغَزْوُ کا معنی ہے کسی شے کا قصد و ارادہ کرنا۔ اور المَغْزٰی سے مراد مقصد ہے۔ اور غزو کی طرف نسبت کی وجہ سے غَزَوِیٌّ کہا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ یعنی ان کے گمان اور ان کے قول کو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں باعث حسرت بنادے۔ اور لام قول باری تعالیٰ قَالُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گمان کو بنادے کہ اگر وہ نہ نکلتے تو قتل نہ کیے جاتے حَسْرَةً اس کا معنی ندامت ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ اور حسرت کا مفہوم ہے کھو جانے والی شے پر اظہار افسوس کرنا جس تک پہنچنا مقدر نہ ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فواحسرتی لم اقضِ منها لُبانتی و لم اتمتّع بالجوار و بالقُرْب

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف سے متعلق ہے اور معنی ہے تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ۔

تاکہ اللہ تعالیٰ بنائے اس قول کو ان کے دلوں میں (باعث) حسرت کیونکہ ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم ان کی تصدیق نہ کرو اور نہ تم ان کی طرف متوجہ ہو، پس یہی ان کے دلوں میں حسرت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: ''تاکہ اللہ تعالیٰ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنائے قیامت کے دن کیونکہ اس دن وہ رسوائی اور ندامت میں ہوں گے اور اس دن مسلمان نعمتوں اور کرامت میں ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھے جو جنگ کے لئے نکلتا ہے اور اسے مار دے جو اپنے اہل خانہ میں مقیم اور ٹھہرا ہوا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جانا اور اس میں مر جانا تمام دنیا سے بہتر ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور واقعی اگر تم قتل کیے جاؤ راہ خدا میں یا تم مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔''

جواب الجزاء محذوف ہے، اور یہ جواب قسم کے سبب اس سے مستغنی ہے اور جواب قسم اس قول میں ہے: لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ اور جواب قسم کے سبب مستغنی ہونا اولی اور بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے صدر کلام (ضروری) ہے، اور اس کا معنی ہے۔ لیغفرنّ لکم وہ ضرور بہ ضرور تمہاری مغفرت فرمادے گا۔

اور اہل حجاز کہتے ہیں: مِتُّم، میم کے کسرہ کے ساتھ جیسا کہ نِمْتُم ہے۔ یہ مَاتَ یَمَاتُ سے ماخوذ ہے جیسا کہ خفتُ یَخافُ ہے۔ اور سُفْلٰی مُضَر کہتے ہیں: مُتُّم، یہ میم کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ صُمْتُم، اور یہ مات یموت سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ

تیرا قول: کان یکون اور قال، یقول۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ یہ وعظ و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قول کے ساتھ نصیحت کی ہے، یعنی تم جنگ سے بھاگو نہیں اور نہ اس سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بلکہ تم اس کی سزا اور اس کے دردناک عذاب سے بھاگو، کیونکہ تمہیں اس کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارے لئے نہ نقصان اور ضرر کا مالک ہے اور نہ ہی نفع کا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ درگزر فرمائیے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔''

ما صلہ ہے اس میں تاکید کا معنی ہے، ای فبرحمۃ، جیسا کہ اس قول میں ہے: عَمَّا قَلِيْلٍ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ۔ اور یہ علی الاطلاق زائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر زائدہ ہونے کا اطلاق سیبویہ نے کیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کا عمل زائل ہو چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ما نکرہ ہے اور با کے سبب محل جر میں ہے وَرَحْمَةٍ اس سے بدل ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کے دن پیٹھ پھیرنے والوں سے نرمی کی اور ان سے کوئی سختی نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آپ نے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا کردہ توفیق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا استفہامیہ ہے اور معنی یہ ہے: پس کتنی رحمت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہ آپ ان کے لئے نرم ہو گئے ہیں، تو یہ بطور تعجب ہے۔ اور اس میں حقیقت سے دوری ہے، کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو یہ فَبِمَ بغیر الف کے ہوتا۔ لِنْتَ یہ لَانَ يَلِيْنُ لِيْنًا وَلَيَانًا فتحہ کے ساتھ سے ماخوذ ہے۔ اور الْفَظُّ الْغَلِيْظُ کا معنی ہے خشک مزاج۔ فَظِظْتَ تَفَظُّ فَظَاظَةً و فِظَاظاً فانت فَظٌّ۔ (تو تندخو ہے) اس کی مونث فَظَّةٌ ہے اور جمع أَفْظَاظٌ ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے یہ ہیں کہ نہ آپ تندخو ہیں، نہ سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھنے والے ہیں۔ (1)

مفضل نے اشعار کہے ہیں جن سے فظ کے مذکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

و لیس بفَظٍّ فی الأدانی والأولی یؤمُّونَ جدواہُ ولکنہ سَهْلُ
و فَظٌّ علی أعداہ یَحْذَرُوْنَہُ فَسَطْوَتُہُ حَتْفٌ وَ نائِلُہ جَزْلُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1981،، ایضاً، کتاب التفسیر، حدیث نمبر 4461، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں لفظ فظّ دونوں جگہ مذکر ذکر ہوا ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے اس کے مونث ہونے کے بارے کہا ہے:

أموت من الضُّرِ فی منزلی و غیری یموت من الکِظّة

و دُنْیَا اتجودُ علی الجاهلیـ ن و هی علی ذِی النُّهی فَظّه

اس میں لفظ فظة مونث ذکر کیا گیا ہے۔

اور غِلَظُ القلب سے مراد چہرے پر تیوری چڑھانا ہے (اور کرخت چہرے کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ ہونا ہے) رغائب سے بہت کم متاثر ہونا اور شفقت و رحمت کا بہت کم ہونا ہے۔

اور اسی کے بارے شاعر کا قول ہے:

یُبْکَی عَلَیْنَا ولا نَبْکِی علی أحَدٍ لنحن أغْلَظُ اکبادًا من الابل

ہم پر رویا جائے گا اور ہم کسی پر نہیں روئیں گے یقیناً ہم اونٹ سے زیادہ سخت دل ہیں۔

اور لَا نْفَضُّوْا کا معنی ہے لتفرّقوا، (تو وہ بکھر جاتے) فضضتهم فانفضوا، یعنی میں نے انہیں منتشر کیا پس وہ منتشر ہو گئے، اور اسی بارے میں ابوالنجم کا قول ہے۔

وہ اونٹ کا وصف بیان کرتا ہے:

مستعجلات القیض غیر جُرد ینفَضّ عنهن الحَصَی بالصَّمْد

الفض کا اصل معنی توڑنا ہے، اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: لا یَفْضُضِ الله فَاكَ۔

(اللہ تیرے منہ کو سلامت رکھے "یعنی نہ توڑے") اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ کی نرمی نہ ہوتی تو حیا (خجالت) اور خوف انہیں تمہارے قریب آنے سے روکتا اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر چکے تھے۔

قولہ تعالیٰ: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کاموں کا حکم فرمایا ہے جو انتہائی تدریج کے ساتھ اور آہستہ آہستہ ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں معاف فرما دیں جو خاص کر آپ کو متبعین کی طرف سے اذیت پہنچی ہے، پس جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اس فعل کے بارے مغفرت طلب کریں جو متبعین سے صادر ہوا، جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو وہ اس اہل ہو گئے کہ امور میں ان سے مشورہ لیا جائے، اہل لغت نے کہا ہے: الاستشارۃ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: شُرتُ الدابة و شوّرتها جب تو اس کے بارے دوڑنے وغیرہ کی خبر جان لے۔ اور وہ جگہ جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں اسے مشوار کہا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے اس قول سے ہوتا ہے: شُرتُ العسلَ و اشتَرْتُه فهو مَشُور و مُشْتار جیسا تو اسے اپنی جگہ سے لے لے، عدی بن زید نے کہا ہے:

وحديث مثلِ مَا ذِيَ مُشَار     فی سَمَاعٍ يَأذَنُ الشيخُ له

اس میں مشار مذکور معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شوریٰ (مشاورت) قواعد شریعت اور پختگی احکام میں سے ہے، جو اہل علم اور اہل دین سے مشاورت نہیں کرتا تو اس کا معزول ہونا واجب ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مومنین کی مدح اور تعریف کی ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔

اعرابی نے کہا ہے: ما غُبِنْتُ قَطُّ حتی يُغْبَنَ قومی، (مجھ سے کبھی غبن اور دھوکہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ میری قوم سے دھوکہ کیا جائے۔) کہا گیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں کوئی کام بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ میں ان سے مشاورت کرلوں۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: حکمرانوں پر علماء سے ان معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہے جنہیں وہ نہیں جانتے اور امور دین میں سے جن میں انہیں مشکل درپیش ہو اور فوجی ماہرین سے ان امور میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں سے جو مصالح سے تعلق رکھتے ہیں اور کتاب، وزراء اور عمال کے سربراہوں سے ان امور میں جو شہروں کے مصالح، منافع اور ان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے: ماندم من استشار (جس نے مشاورت کی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہوا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جو اپنی رائے پر اترایا وہ گمراہ ہوگیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ یہ آیت کاموں میں اجتہاد اور امکان وحی کے ساتھ ظنوں کو لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں اجازت عطا فرمائی ہے اور اہل تاویل نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں، پس ایک گروہ نے کہا ہے: یہ جنگوں کی تدبیر کے بارے میں ہے، دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کے وقت کے بارے ہے اور اپنے نفوس کو مطمئن اور پاکیزہ رکھنے کے لئے اور اپنی اقدار کو بلند کرنے کے لئے اور اپنے دین پر جمع کرنے کے لئے (مشاورت ہے) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ساتھ آپ کو ان کی رائے سے غنی کردیا ہے۔ یہ حضرت قتادہ، ربیع، ابن اسحاق، اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے: یہ اس قول کی طرح ہے والبکر تُستامَرُ (باکرہ عورت سے اس کے دل کی پاکیزگی کے لئے اجازت لی جائے گی)۔ (مشاورت کی جائے گی۔) یہ اس لئے نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اور مقاتل، قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: عربوں کے سرداروں سے جب کسی معاملہ میں مشاورت نہ کی جاتی تو وہ ان پر شاق اور گراں گزرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے معاملات میں مشاورت کریں، کیونکہ یہ ان کے لئے انتہائی مہربانی اور کرم ہے اور ان کے حسد و کینہ کو بہت دور کرنے والا ہے(1) اور ان کے دلوں کو پاک کرنے والا ہے۔ پس جب آپ ان سے مشاورت کریں گے تو وہ اپنے لئے آپ کی عزت و تکریم کو پہچان جائیں گے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ اس بارے میں ہے جس میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما سے یہی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی المشورۃ، جلد 2، صفحہ 343، اسلام آباد

مروی ہے، ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاورت کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ آپ کو ان کی رائے کی حاجت اور ضرورت ہے(1)، بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ انہیں مشاورت کی فضیلت سے آگاہ فرمائیں اور تا کہ آپ کے بعد آپ کی امت اس کی اقتدا اور پیروی کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ہے: وَ شَاوِرْهُمْ فی بعض الأمر (اور آپ بعض معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔)

اور کسی کہنے والے نے کتنا اچھا کہا ہے:

شاوِر صدیقك فی الخفیِّ المشکل واقبِلْ نصیحةَ ناصحٍ متفضّلِ

مشکل اور مخفی کاموں میں اپنے دوست سے مشورہ کر اور مہربان نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کر۔

فاللہ قد اوصَی بذاكَ نبیّه فی قولهٖ شَاوِرْهُمْ وَ توکّل

پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ آپ ان سے مشاورت کریں، اور توکل اختیار کریں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المستشار مؤتمَنٌ(2) جس سے مشورہ لیا جائے اسے اس پر امین بنایا جاتا ہے۔ علماء نے کہا ہے: مستشار کی تعریف یہ ہے کہ اگر مشورہ احکام کے بارے میں ہو تو وہ عالم اور دیندار ہو اور سوائے عاقل کے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کسی آدمی کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی عقل مکمل نہ ہو۔ اور جب اس سے مشورہ لیا جائے تو اس صفت سے متصف ہو اور وہ اصلاح کی پوری کوشش کرے اور وہ اپنی جد و جہد اور صلاحیت صرف کرے اور پھر اشارۃً خطا واقع ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ خطابی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ دنیوی امور میں مستشار کی تعریف یہ ہے کہ وہ عاقل ہو، تجربہ کار ہو اور مشورہ طلب کرنے والے سے محبت کرنے والا ہو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

شاور صدیقَك فی الخفِی المُشْکل

(تو مشکل اور مخفی کام میں اپنے دوست سے مشورہ کر۔) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

و اِنْ بَابُ أمرٍ علیك التَوَیٰ فَشَاوِرْ لبیبًا ، و تعصِهٖ

اور اگر کسی کام کا دروازہ تجھ پر بند ہو جائے تو کسی دانا اور عقلمند سے مشورہ کر لے اور تو اس کی نافرمانی نہ کر۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 572، دار فکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان والآداب، باب ان المستشار مؤتمن، حدیث 2747، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور مشاورت برکت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماندِمَ مَن استشار ولا خاب من استخار (وہ نادم نہ ہو گا جس نے مشورہ کیا اور وہ خائب و خاسر نہ ہو گا جس نے استخارہ کیا۔) اور حضرت سہل بن سعد الساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''کوئی بندہ کبھی مشورہ کے سبب شقی اور بدبخت نہیں ہوا اور کوئی رائے کے استغنا کے ساتھ سعید اور خوش بخت نہیں ہوا۔'' اور بعض نے کہا ہے: اس سے مشاورت کر جو امور کا تجربہ رکھتا ہو، کیونکہ وہ تجھے اپنی ایسی رائے دے گا جو اس پر انتہائی مہنگی واقع ہو گی اور تو اسے مفت حاصل کر لے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے مجلس شوریٰ مقرر فرمائی، حالانکہ یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ کرام اہل علم امناء سے امور مباحہ میں مشاورت کرتے تھے تاکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ وہ ان پر عمل پیرا ہو سکیں (1)۔ حضرت سفیان ثوری نے بیان کیا ہے: چاہیے کہ تمہارے مشیر متقی اور امانتدار ہوں اور ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔ اور حسن نے کہا ہے: قسم بخدا! جو قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو جو وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ ان کی راہنمائی افضل کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی قوم نہیں جن کا مشورہ ہو اور ان کے ساتھ احمد یا محمد نامی آدمی بھی حاضر ہو اور وہ اسے اپنے مشورہ میں شامل کریں مگر اسے ان کے لئے پسند کر لیا جائے گا۔''

**مسئلہ نمبر 6**۔ شوریٰ کی بنیاد اختلاف آراء پر ہے اور مشورہ لینے والا اس اختلاف میں غور و فکر کرتا ہے اور ایسے قول کو دیکھتا ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اگر اس لئے ممکن ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس میں سے جہاں تک چاہے راہنمائی فرما دے تو وہ اس پر پختہ ہو جائے اور اسے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نافذ کر دے، کیونکہ مطلوب تک پہنچنے کی یہی انتہائی کوشش ہے اور اس آیت میں اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ جب آپ کسی کام کا ارادہ کریں تو اس میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، نہ کہ آپ ان کی مشاورت کا ارادہ کریں۔ اور عزم سے مراد ایسا امر ہے جس میں خوب غور و فکر کی گئی ہو اور اسے مہذب بنا دیا گیا ہو، وہ بغیر نظر و فکر کے صرف رائے سے عزم نہیں بن سکتا، مگر عرب کے بہادروں کے بارے طویل قصائد کے قطعہ میں۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

اذا هم القى بين عينيه عزمه　　و نكب من ذكر العواقب جانبا

جب وہ قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور ہم انجام کے ذکر کو ایک جانب ڈال دیتے ہیں۔

و لم يستشر فى رأيه غير نفسه　　و لم يرض إلا قائم السيف صاحبا

اور وہ اپنی رائے میں اپنے سوا کسی سے مشورہ نہیں کرتا اور تلوار اٹھانے والے کے سوا کسی ساتھی سے راضی نہیں ہوتا۔

اور نقاش نے کہا ہے: العزم اور الحزم دونوں کا معنی ایک ہے، حاء کو عین سے بدلا گیا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1095، اسلام آباد

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، اور حزم سے مراد کسی کام میں عمدہ اور گہری غور و فکر کرنا اور اس کی کانٹ چھانٹ کرنا (یعنی مہذب بنانا) ہے اور اس میں خطا سے بچنا اور احتیاط کرنا ہے۔

اور العزم سے مراد کام کرنے کا قصد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ پس مشاورت اور جو اس کے معنی میں ہے وہ حزم ہے اور عرب کہتے ہیں: قد أَحْزِم لو أَعْزِم (میں احتیاط برتوں گا اگر میں قصد کروں گا) اور امام جعفر الصادق اور جابر بن عبداللہ نے فَإِذَا عَزَمْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عزم کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے کیونکہ وہی اس کی ہدایت اور توفیق عطا فرمانے والا ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال: 17) (اور اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔)

اور کلام کا معنی ہے یعنی میں نے آپ کا قصد کیا ہے اور میں نے آپ کو توفیق دی ہے اور میں نے آپ کی راہنمائی کی ہے فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (سو آپ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے) اور باقیوں نے تا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مہلب نے کہا ہے: اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب کے حکم سے اس کی پیروی کی ہے اور فرمایا ہے: ''کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہتھیار پہننے کے بعد پھر انہیں اتارے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے (1)'' یعنی اس کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ عزم کر لے تو پھر اس سے پھر جائے، کیونکہ اس سے اس توکل کو توڑنا لازم آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزیمت کے ساتھ شرط قرار دیا ہے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ہتھیار پہننے کا اشارہ احد کے دن نکلنے کی طرف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کے ساتھ مشرف و مکرم فرمایا اور وہ مومنین صلحاء تھے جو غزوہ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کی طرف نکلئے، یہ عزیمت پر دال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قعود (مدینہ منورہ میں ہی رہنے) کا اشارہ کیا اور اسی طرح عبداللہ بن ابی نے بھی اسی کا اشارہ دیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہیں مقیم رہئے اور لوگوں کے ساتھ ان کی طرف نہ نکلئے، پس اگر وہ ٹھہر گئے تو وہ بری مجلس کے ساتھ ٹھہریں گے اور اگر وہ ہماری طرف مدینہ طیبہ میں آئے تو ہم فناؤں اور گلیوں کے دھانوں پر ان سے جنگ لڑیں گے اور عورتیں اور بچے ٹیلوں پر چڑھ کر ان پر پتھر پھینکیں گے، قسم بخدا! اس شہر میں دشمن نے کبھی بھی ہمارے ساتھ جنگ نہیں لڑی مگر ہم اس پر غالب آئے اور جب بھی ہم اس سے نکل کر دشمن کی طرف گئے تو وہ ہم پر غالب آئے۔ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے انہوں نے اس رائے کا انکار کر دیا اور انہوں نے لوگوں کو تشجیع دلائی اور جنگ کی طرف دعوت دی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جمعہ پڑھائی اور نماز کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور اپنے ہتھیار پہنے۔ نتیجتاً وہ قوم نادم ہوئی اور انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجبور کیا ہے، پس جب آپ ہتھیار پہن کر ان کی طرف تشریف لائے تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اگر آپ کی خواہش ہے تو یہیں ٹھہر جائیں کیونکہ ہم آپ کو مجبور کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1095

اپنے ہتھیار پہن لے تو پھر انہیں قتال کرنے سے پہلے اتار دے۔''(1)

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ توکل کا معنی عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے اور اس کا اسم التكلان ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اتكلت عليه في امري (میں نے اپنے کام میں اس پر اعتماد کیا ہے) اور اس کی اصل اِوْ تكلت ہے واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدلا گیا ہے، پھر یا کو تا سے بدل دیا گیا اور پھر اسے تا افتعال میں مدغم کر دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: وَكلته بامري توكيلاً (میں نے اسے اپنے کام کا وکیل بنایا) اس کا اسم وَكالة ہے واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔

علماء نے توکل کے بارے میں اختلاف کیا ہے، متصوفہ میں سے ایک گروہ نے کہا ہے: اس کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کے دل میں غیر اللہ یعنی درندے یا کسی اور شے کا خوف نہ ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ضمان کی وجہ سے رزق کی تلاش میں سعی اور جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور عام فقہاء نے کہا ہے: وہ جس کا ذکر قول باری تعالیٰ: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ کے تحت ہو چکا ہے۔ اور وہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول میں خبر دی ہے لَا تَخَافَا اور فرمایا ہے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہٰ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو۔) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس قول سے خبر دی ہے: فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ھود: 70) (پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ فرشتوں نے کہا ڈریئے نہیں) پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام خوفزدہ ہوئے۔ تو یہ دونوں مثالیں تیرے لئے کافی ہیں..... تو ان دونوں کے سوا کا ڈرنا تو بدرجہ اولیٰ ہے۔ اور اس معنی کا بیان آگے آئے گا۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

''اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ یعنی تم اسی پر توکل کرو کیونکہ اگر وہ تمہاری مدد فرمائے اور تمہارے دشمن سے تمہاری حفاظت کرے تو تم ہرگز مغلوب نہ ہو گے۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور اگر وہ اپنا تعاون تمہارے ساتھ چھوڑ دے۔ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ یعنی اس کے بعد کوئی بھی تمہاری مدد نہ کرے گا، یعنی اس کے تمہیں چھوڑنے کے بعد، کیونکہ اس نے فرمایا ہے: وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور الخذلان کا معنی ہے مدد اور تعاون چھوڑ دینا۔ اور المخذول: جسے چھوڑ دیا گیا ہو، جس کی پرواہ نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 540

کی جائے۔ اور خذلت الوحشیة یعنی وحشی جانور چراگاہ میں اپنے بچے کے پاس ٹھہر گیا اور اس نے اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا، پس وہی خذول ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

خذول تُراعی رَبْرَبًا بِخَمیلة تناولُ اطراف البَرِیرِ و تَرْتَدِی

اور یہ بھی کہا ہے:

نظرت الیك بعین جاریة خَذَلت صواحبها علی طِفْلِ

اس نے تیری طرف جاری آنکھ کے ساتھ دیکھا اور اس نے بچے کے سبب اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مقلوب میں سے ہے، کیونکہ جب اسے چھوڑ دیا جائے تو یہ مخذولہ ہوتی ہے، اور تخاذلت رجلاہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ دونوں (ٹانگیں) کمزور ہو چکی ہوں۔ اور کسی نے کہا: و خَذُولِ الرّجل مِن غیرِ کَسَح (آدمی کی کمزوری جو بغیر عاجزی کے ہو) اور رجل خُذَلة ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ ساتھ چھوڑتا رہتا ہو۔ واللہ اعلم۔

**وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۱**

"اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** جب احد کے دن تیر اندازوں نے اپنے مرکز کو خالی کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس خوف سے کہ مسلمان مال غنیمت کے والی بن جائیں گے اور انہیں کوئی شے بھی نہیں دی جائے گی، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم میں زیادتی نہیں کریں گے، پس تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم انہیں متہم کرو۔ اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض غزوات میں لشکر بھیجے پھر ان کے آنے سے پہلے مال غنیمت حاصل کر لیا، پس اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور لشکریوں کے لئے تقسیم نہ کیا۔ (یعنی انہیں کوئی حصہ نہ دیا) تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ آیت نازل فرمائی: **وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ** یعنی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ بعض کو حصہ دے اور بعض کو چھوڑ دے۔ اور اس قول کی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس نے بھی، عکرمہ، ابن جبیر وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک سرخ کپڑے کے سبب نازل ہوئی جو بدر کے دن مال غنیمت میں سے گم ہوا (1)، تو وہ لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ان میں سے بعض نے کہا: شاید حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے لیا ہو، پس یہ آیت نازل ہوئی اسے ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 574 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث 3457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عطیہ نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ قول مومنین کی جانب سے تھا انہوں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول منافقین کی جانب سے تھا اور یہ روایت بھی ہے کہ گم ہونے والی شے تلوار تھی۔ یہ اقوال بیان کئے جاسکتے ہیں اس بنا پر کہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہو۔

ابو صخر نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ فرمایا: یہ آیت کہہ رہی ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ میں سے کوئی شے چھپائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں لام منقولہ ہے، یعنی وما کان نبیٌ لیغُل، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ای ما کان اللہ لیتخذ ولدا (یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لے۔) (تو اس میں بھی لام منقولہ ہے۔) اور یُغَلَّ یعنی یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: [ہم نے غنیمت کے بارے میں نہیں سنا مگر غَلَّ غُلولا، اور اسی طرح بھی پڑھا گیا ہے] وما کَانَ لِنَبِيٍّ اَن يَغُلَّ وَ يُغَلَّ۔ فرمایا: یَغُلَّ کا معنی ہے یخون خیانت کرنا اور یُغَلَّ کا معنی ہے یُخَوَّنُ اور یہ لفظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک یُخَانُ ہے، یعنی وہ شے جو مال غنیمت سے لی جاتی ہے اور دوسرا یُخَوَّن ہے۔ یعنی جسے غلول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: پھر کہا جاتا ہے ہر وہ جس نے کوئی شے چھپ کر لے لی تو اس نے غَلَّ یَغُلُّ غُلُوْلًا کا ارتکاب کیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے اس کا نام غلول اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا ہے، یعنی روک دیا گیا ہے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: الغُلُول (خیانت) مال غنیمت کے ساتھ ہی خاص ہے اور ہم اسے نہ خیانت گمان کرتے ہیں اور نہ ہی کینہ اور حقد۔ اور جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے خیانت کہا جائے وہ اَغَلَّ یُغِلَّ ہے اور اسے حقد کہا جائے اس کے لئے غَلَّ یَغِلَّ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسے غلول کہا جائے وہ غَلَّ یَغُلُّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور غَلَّ الْبَعِيْرُ بھی ہے۔ [یَغَلَّ غَلَّةً] بھی ہے جب وہ اپنا کثیر پانی پورا نہ کرے۔ اور اَغل الرجل کا معنی ہے آدمی نے خیانت کی۔ النمر نے کہا ہے:

جزی اللہ عنّا حَمزۃَ ابنۃ نوفل جزاءَ مُغِلٍّ بالأمانۃ کَاذِبِ

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے حمزہ بنت نوفل کو جزا دے (جیسا کہ) امانت میں خیانت کرنے والے جھوٹے کی جزا۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: لا اِغلالَ ولا اسلالَ (1) یعنی نہ کوئی خیانت ہے اور نہ کوئی سرقہ (چوری) ہے (2) اور کہا جاتا ہے: لا رشوۃَ (اور نہ ہی کوئی رشوت ہے۔)

اور شریح نے کہا ہے: خیانت کرنے والے کے سوا کسی مستعیر (ادھار لینے والا) پر ضمان نہیں ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین (چیزیں) ہیں جن پر مومن کا دل حقد و کینہ نہیں کرتا (3)۔'' جس نے اسے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کا معنی حقد اور کینہ ہے۔ اور غَلَّ [بمعنی دخل] کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا کہا جاتا ہے:

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 300

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك باب الخطبۃ یوم النحر، صفحہ 226، وزارت تعلیم، اسلام آباد

ایضاً، ابن ماجہ، کتاب فضائل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم باب من بلغ علما، حدیث 225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غَلَّ فلان المفاوز، یعنی فلاں جنگل میں داخل ہوا اور اس کے وسط تک پہنچا۔ اور غَلَّ من المغنم غلولا، یعنی اس نے مال غنیمت میں خیانت کی۔ اور غل الماء بین الأشجار (تب کہا جاتا ہے) جب پانی درختوں میں داخل ہو جائے (جاری ہو جائے)، ان تمام میں یَغُلُّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: الغُلُول کالغوی معنی یہ ہے کہ وہ مال غنیمت سے کوئی شے لے لے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے اور اسی سے تغلغل الماء فی الشجر بھی ہے جبکہ پانی اس میں داخل ہو جائے اور الغلل کا معنی درخت کی جڑوں میں جاری پانی ہے، کیونکہ وہ درختوں کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہوتا ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لعب السُّیُول به فأصبح ماؤہ　　غَلَلاً یُقطِّع فی اصول الخِروع

اور اس سے غِلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے اور الغالُّ، اس سے مراد درختوں والی ہموار زمین ہے۔ اور سلم اور طلع کے درخت اگنے کی جگہ کو غال کہا جاتا ہے اور غال بھی ایک بوٹی ہے۔ اور اس کی جمع غُلّان غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یُغَلَّ کا معنی ہے یوجد غالاً۔ (اسے غال پایا جاتا ہے)، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: احمدت الرجل وجدتہ محمودًا یعنی میں نے فلاں آدمی کی تعریف کی (تو) میں نے اسے محمود پایا) اس تاویل کی بنا پر یہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے اور یُغلّ کا معنی جمہور اہل علم کے نزدیک اس طرح ہے لیس لأحد أن یَغُلَّہ یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے۔

پس آیت میں مقصود لوگوں کو مال غنیمت میں خیانت کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ اور اس پر وعید سنانا ہے۔ اور جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ آپ کے سوا کسی اور سے خیانت کی جائے، لیکن ذکر خاص طور پر آپ کا کیا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کرنا ازروئے وقوع کے زیادہ شدید اور سخت ہے اور ازروئے بوجھ اور ثقل کے بہت بڑی اور بھاری ہے، کیونکہ آپ کی موجودگی میں معصیت کا ارتکاب کرنا بہت بڑا جرم ہے کیونکہ آپ کی عزت و توقیر کرنا لازم ہے اور ایسے والی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہوں تو ان کے لئے بھی عزت و توقیر میں سے حصہ ہے۔ اور کہا گیا ہے: یَغُلَّ کا معنی ہے نبی علیہ السلام نے کبھی بھی خیانت نہیں کی اور مقصود نہی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی وہ اس (خیانت کی ہوئی شے) کے ساتھ آئے گا درآنحالیکہ وہ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اور وہ اسے اٹھانے اور اس کے بوجھ کے سبب کبڑا ہوگا اور اس کی آواز سے خوفزدہ ہوگا اور تمام کے سامنے اس کی خیانت کا اظہار کر کے اسے زجر و توبیخ کی جائے گی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہی وہ رسوائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو واقع کرے گا اور یہ اس رسوائی اور ذلت کی مثل ہے جس میں وہ دھوکہ دینے اور عہد توڑنے والے کو واقع کرے گا، اس طرح کہ اس کی سرین (بیٹھنے کی جگہ) کے پاس اس کے غدر اور خیانت کی مقدار جھنڈا نصب کیا جائے گا (1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں ان کے بارے جن کا انسان اس سے عہد

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ، حدیث نمبر 2950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتا ہے اور وہ اسے سمجھتے ہیں۔

کیا آپ شاعر کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے:

أُسَمَیّ وَیْحَكِ هل سَمِعتِ بغَدْرَةٍ　رُفِعَ اللِّوَاءُ لنا بها فی المَجْمَعِ

اے سُمَیّ تیری ہلاکت ہو کیا تو نے غدر اور خیانت کے بارے سنا ہے کہ ہمارے لئے اس کے سبب جمع ہونے کی جگہ (میدان حشر) میں جھنڈا کھڑا کیا جائے گا۔

عرب لوگ معاہدہ توڑنے والے کے لئے جھنڈا بلند کرتے تھے اور اسی طرح جرم کرنے والے کو اس کی جنایت سمیت پھرایا جاتا تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور غلول (خیانت) کا ذکر کیا اور اسے بہت بڑا (جرم) قرار دیا اور اس کے امر کو عظیم اور شدید قرار دیا پھر فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر اونٹ اپنی آواز نکال رہا ہوگا وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر گھوڑا اپنی آواز نکال رہا ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اس کی گردن پر بکری اپنی آواز نکال رہی ہوگی تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر ایک آدمی چیخ و پکار کر رہا ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر لکھے ہوئے کاغذ حرکت کر رہے ہوں گے (مراد وہ کاغذ ہیں جن پر اس کے ذمے واجب الاداء حقوق لکھے ہوں گے اور وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھ تک (پیغام) پہنچا دیا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر سونا چاندی ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمائیے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا۔(1)'' اور ابو داؤد نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مال غنیمت پاتے تھے تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تو وہ لوگوں میں اعلان کر دیتے اور وہ اپنے غنائم لے کر آجاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا خمس نکالتے تھے اور اسے تقسیم کر دیتے، پس ایک دن اعلان کے بعد ایک آدمی بالوں کی رسی لے کر آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ اس مال میں سے تھی جو ہم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ تو آپ

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123-122، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو نے بلال کو سنا ہے وہ تین بار اعلان کرتا ہے؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے کس نے روکا ہے کہ تو اسے لے کر آئے؟'' تو اس نے معذرت پیش کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! تو قیامت کے دن اس کے ساتھ آئے گا اور میں اسے تجھ سے قبول نہ کروں گا۔'' (1)

بعض علماء نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اس بوجھ کا عوض پورا پورا دیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ۗ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ (الانعام) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: خبر امر کے مشہور ہونے پر محمول ہے، یعنی وہ قیامت کے دن آئے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس کے امر کی تشہیر کرے گا جیسا کہ تشہیر کی جاتی ہے اگر اس نے اونٹ کو اٹھایا اس کی آواز ہوگی یا گھوڑا اٹھایا (تو) اس کی آواز ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حقیقت سے مجاز اور تشبیہ کی طرف عدول ہے اور جب کلام حقیقت اور مجاز کے درمیان دائر ہو تو حقیقت اصل ہے جیسا کہ کتب اصول میں ہے۔ تحقیق نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت کے بارے خبر دی ہے'' شادی کے بعد عطر نہیں ہے''۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک جس نے دنیا میں کسی شے کی خیانت کی قیامت کے دن جہنم میں اس کی تمثیل بنائی جائے گی پھر اسے کہا جائے گا: اس کی طرف اترو اور اسے پکڑ لو، پھر وہ اس کی طرف اترے گا۔

پس جب وہ اس تک پہنچے تو اسے اٹھا لے گا، یہاں تک کہ جب دروازے تک پہنچے گا تو اس سے جہنم کے نچلے حصے کی طرف گر جائے گا، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اسے پکڑ لے گا، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسی طرح ہوتا رہے گا اور کہا جاتا ہے: ''وہ اس کے ساتھ آئے گا جس کی اس نے خیانت کی'' یعنی قیامت کے دن وہ خیانت اور غلول اس پر شہادت دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے بیان کیا ہے: غلول (خیانت کرنا) کبائر میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس پر دلیل یہ آیت اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے گا۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعم کے بارے میں فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک وہ چادر جو خیبر کے دن اس نے مال غنیمت سے اٹھائی اور وہ تقسیم میں شامل نہ ہوئی یقیناً وہ اس پر آگ بھڑکائے گی، فرمایا: پس جب لوگوں نے یہ سنا تو ایک آدمی ایک یا دو تسمے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک یا دو تسمے بھی آگ میں سے ہیں'' اسے مؤطا نے نقل کیا ہے (2)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: والذی نفسی بیدہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیانت کرنے والے پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے انکار کرنا غلول (خیانت) کے بہت بڑا ہونے اور اس میں بہت بڑا گناہ ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ کبائر میں سے ہے، اور یہ آدمیوں کے حقوق میں سے ہے اور اس میں نیکیوں اور بدیوں کے بارے میں قصاص ضروری ہے، پھر اس کے مالک کی مرضی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: شراك او شراكان من نار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی مثل ہے: ادوا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 475، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3908، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الخِیاط والمخیط (1) (دھاگہ اور سوئی ادا کرو) اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غزوہ میں تقسیم سے پہلے تھوڑا اور زیادہ مال لینا حلال نہیں ہے، مگر وہ جس پر تمام کا اجماع ہو جائے مثلاً جنگ کی زمین میں کھانے کی اشیاء، ایندھن کی لکڑیاں اور شکار وغیرہ۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: دشمن کی زمین میں امام کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی شے نہیں لی جائے گی۔ اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ آثار اس کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ حسن نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب کوئی شہر یا قلعہ فتح کرتے تھے تو ستو، آٹا، گھی اور شہد کھا لیا کرتے تھے۔ اور ابراہیم نے کہا ہے: وہ دارالحرب میں دشمن کی زمین سے خمس نکالنے سے پہلے کھانے کی اشیاء اور جانوروں کا چارہ وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ اور عطا نے کہا ہے: لشکری سریہ میں ہوتے تھے اور وہ گھی کے مشکیزے، شہد اور طعام پاتے تھے اور انہیں کھاتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا وہ اسے اپنے امام کے پاس لوٹا دیتے تھے اور جماعت علماء کا نظریہ یہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ غلول کرنے والے کا سامان جلایا نہیں جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کا سامان نہیں جلایا جس نے چادر اٹھائی تھی اور نہ ہی آپ نے اس موتیوں والے کا سامان جلایا تھا جس پر آپ نے نماز جنازہ چھوڑ دی تھی، اگر اس (خیانت کرنے والے) کا سامان جلانا واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقیناً اس پر عمل کرتے، اور اگر آپ ایسا کرتے تو یقیناً وہ حدیث میں نقل کیا جاتا (2)۔ اور رہی وہ روایت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی آدمی کو پاؤ اس حال میں کہ اس نے (مال غنیمت میں) خیانت کی ہو تو تم اس کا ساز و سامان جلا دو اور اسے مارو (3)''۔ تو اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صالح بن محمد بن زائدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ ضعیف راوی ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ترمذی نے کہا ہے: میں نے اس حدیث کے بارے محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اسے صرف صالح بن محمد نے روایت کیا ہے اور وہ ابو واقد اللیثی ہے اور وہ منکر الحدیث ہے اور ابوداؤد نے بھی اس سے روایت کیا ہے اس نے کہا ہے: ہم نے ولید بن ہشام کی معیت میں جنگ لڑی اور ہمارے ساتھ سالم بن عبد اللہ بن عمر اور عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم بھی تھے۔ پس ایک آدمی نے سامان (غنیمت) میں خیانت کی۔ پس ولید نے اس کے سامان کے بارے حکم دیا اور اسے جلا دیا، اور اسے پھرایا گیا اور اسے اس کا حصہ بھی نہ دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثوں میں سے زیادہ صحیح ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلا دیا اور انہوں نے اسے مارا (4)۔

---

1۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2335، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد باب فی عقوبۃ الغال، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوداؤد نے کہا ہے: اور اس میں علی بن بحر نے ولید سے یہ زیادہ کیا ہے...... ولم اسمعه منه (اور میں نے اسے اس سے نہیں سنا)...... و منعوه سهمه (اور انہوں نے اسے اپنے حصہ سے روک دیا) ابو عمر نے بیان کیا ہے: اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے: اور تم اس کی گردن مار دو اور اس کا ساز و سامان جلا دو۔ اور یہ حدیث صالح بن محمد کے ارد گرد گھومتی ہے اور یہ راوی ان میں سے نہیں ہے جنہیں حجت بنایا جا سکتا ہے۔

اور تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک کے ساتھ (1)۔" اور یہ روایت غلول کی صورت میں قتل کی نفی کرتی ہے۔ اور ابن جریج نے ابو الزبیر سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خیانت کرنے والے، چھیننے والے اور اچک کر لے جانے والے پر قطع (ید) نہیں ہے (2)۔" اور غال (مال غنیمت سے مال اٹھانے والا) لغت میں خائن (خیانت کرنے والا) ہی ہے اور شریعت نے اس سے جب قطع ید کی نفع کر دی ہے تو پھر قتل کی نفی بدرجہ اولی ہو گی۔

اور امام طحاوی نے کہا ہے: اگر صالح کی مذکورہ حدیث صحیح ہو تو پھر یہ احتمال ہے کہ اس وقت یہ مالوں میں سزا ہو، جیسا کہ زکوٰۃ کا انکار کرنے والے کے بارے میں فرمایا: "بے شک ہم زکوٰۃ اور اس کے مال کا نصف حصہ لیں گے، (کیونکہ) یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور واجبات میں سے ایک حق اور واجب ہے (3)۔" اور اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے چھپائے ہوئے اونٹ کے گم ہونے کی صورت میں کہا ہے: اس میں اس (اونٹ) کا تاوان بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل (اونٹ) بھی ہے (4)۔ اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے لٹکے ہوئے پھل کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس میں اس کی دو مثل تاوان ہے اور سزا کے کوڑے بھی ہیں (5)۔ یہ سب روایات منسوخ ہیں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5۔** جب کسی آدمی نے مال غنیمت سے خیانۃ کچھ لے لیا اور پھر وہ پایا گیا تو وہ اس سے لے لیا جائے، اور اسے ادب سکھایا جائے اور تعزیری سزا دی جائے۔ اور امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام لیث رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا سامان نہیں جلایا جائے گا۔ اور امام شافعی، لیث اور داؤد نے کہا ہے: اگر وہ نہی کو جانتا ہو (یعنی اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے) تو اسے سزا دی جائے گی۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا تمام سامان جلا دیا جائے گا سوائے اس کے ہتھیار اور ان کپڑوں کے جو وہ پہنے ہوئے ہو اور اس کی زین کے، اور اس کی سواری اس سے نہیں چھینی جائے گی، اور نہ ہی وہ شے جلائی جائے گی جو خیانۃ اٹھائی گئی اور امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ کا قول

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1016، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 3817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ باب فی زکوۃ السائمۃ، جلد 1، صفحہ 221، اسلام آباد

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللقطۃ، حدیث نمبر 1460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ابی داؤد، ایضاً، حدیث نمبر 1455، ایضاً

ہے، اور حسن نے یہی کہا ہے، مگر یہ کہ وہ حیوان یا مصحف ہو (تو پھر یہ سزا نہیں دی جائے گی۔) اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں نے غلول کرنے والے کو مارا اور اس کا سامان جلا دیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ غلول کرنے والے کا کجاوہ اور اس کا سامان سب جلا دیا جائے گا ان میں سے مکحول اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے ان کی دلیل صالح مذکور کی حدیث ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ ایسی حدیث ہے جس کے ساتھ تیرا کسی حرمت کو ختم کرنا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرنا (ثابت ہوتا ہے) کیونکہ اس کے معارض ایسے آثار ہیں جو اس کی نسبت زیادہ قوی ہیں۔ اور جو موقف امام مالک اور آپ کے متبعین نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ نظر و فکر اور اثر کے صحیح ہونے کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ بدنی سزا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مختلف نہیں ہے، اور رہی مالی سزا تو انہوں نے اس ذمی کے بارے میں کہا ہے جو شراب کسی مسلمان کو فروخت کرتا ہے کہ مسلمان کے پاس شراب کو بہا دیا جائے گا، اور ذمی سے بطور سزا ثمن چھین لئے جائیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو شراب کی فروخت نہ کرے تو اس بنا پر یہ کہنا جائز ہے کہ مال میں سزا دینا جائز ہوتا ہے۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ بہا دیا جس میں پانی ملایا گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ (مال غنیمت سے) خیانۃً مال لینے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام مال جو بطور خیانت اس نے اٹھایا اسے لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دے اگر وہ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ پالے، اور بلاشبہ جب اس نے ایسا کرلیا تو یہی اس کی توبہ ہوگی اور گناہ سے بچ نکلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور جب اہل لشکر منتشر ہو جائیں اور وہ اس تک نہ پہنچ سکے تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جائے گا اس میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ اس کا خمس امام کو دے دے اور باقی صدقہ کر دے گا۔ یہ امام زہری، مالک، اوزاعی، لیث اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے، اور حضرات عبادہ بن صامت، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ مال صدقہ کر دیا جائے جس کے مالک کا علم نہ ہو، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے غیر کا مال صدقہ کرنا درست نہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ایسی صورت میں ہے جب اس کے مالک کو پانا، اس تک پہنچنا یا اس کے ورثا تک پہنچنا ممکن ہو، اور اگر ان میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو اس صورت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی صدقہ کرنے کو مکروہ نہیں قرار دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ لقطہ (گری ہوئی چیز جو مل جائے) کو صدقہ کرنا جائز ہے جبکہ پہلے اس کی تشہیر کی جائے اور اس کے مالک کا علم نہ ہو سکے، اور پھر اس کے بارے یہ حکم لگایا ہے کہ اگر وہ (مالک) آجائے...... تو اسے اجرت اور ضمان کے درمیان اختیار دیا جائے گا، اور اسی طرح غصب کی ہوئی شے کا حکم بھی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اور غلول کے علیحدہ ذکر میں اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت میں تمام غانمین (لشکری) شریک ہیں، پس کسی کے لئے یہ

حلال نہیں کہ وہ اس میں سے کوئی شے دوسرے (کی اجازت) کے بغیر لے، پس جس نے بھی اس میں سے کوئی شے غصب کی تو بالاتفاق اسے تادیبی سزا دی جائے گی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اگر کسی نے کسی لونڈی کے ساتھ وطی کی یا نصاب کے برابر (دس درہم) مال چوری کیا تو اس پر حد قائم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس پر قطع ید نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ عمال کے ہدایا اور تحائف بھی غلول میں سے ہیں، اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے اعتبار سے اس کا حکم غلول کرنے والے کے حکم کی طرح ہے۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں (1) اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوحمید الساعدی سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا [ابن سرح نے ابن الاتبیہ کہا ہے]، پس وہ آیا اور اس نے کہا: یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ''عامل کو کیا ہو گیا ہے جسے ہم بھیجتے ہیں اور وہ آکر یہ کہتا ہے یہ تمہارے لئے ہے اور یہ (مال) مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے خبردار سنو! وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے اور پھر دیکھے کیا اسے کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں، تم میں سے کوئی بھی ان میں سے جو شے بھی لائے گا قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ آئے گا اگر وہ اونٹ ہوا تو اس کی آواز ہوگی، اور اگر وہ گائے ہوئی تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوئی تو وہ اس کی آواز نکالے گا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی۔ پھر آپ نے کہا: ...... اللّٰھم ھل بَلَغتُ اللّٰھم ھل بلغت (2) (اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے؟)

اور ابوداؤد نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ''جسے ہم کسی عمل پر عامل مقرر کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں پس اس کے بعد اس نے جو کچھ لیا تو وہ غلول (خیانت) ہوگا۔'' (3)

اور انہوں نے حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساعی (عامل) بنا کر بھیجا۔ اور پھر فرمایا: ابا مسعود! تو جا اور میں تجھے قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ تیری پشت پر صدقہ کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ آئے اور وہ اپنی آواز نکال رہا ہو کہ تو نے اسے بطور خیانت حاصل کیا تھا'' انہوں نے عرض کی: تب میں نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا: ''سو میں تجھے مجبور نہ کروں گا (4)۔'' جو روایت ابوداؤد نے ہی مستورد بن شداد سے نقل کی ہے اس نے ان احادیث کو مقید کر دیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو ہمارا عامل ہوا سے چاہیے کہ وہ بیوی حاصل کرلے (یعنی نکاح کرلے) اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم حاصل کرلے اور اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفییٔ، حدیث 2557، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6639، ایضاً
2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارة، جلد 2، صفحہ 123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفییٔ، جلد 2، صفحہ 53، اسلام آباد
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفییٔ، جلد 2، صفحہ 52، اسلام آباد　4۔ ایضاً صفحہ 53، اسلام آباد

کے پاس مسکن (رہنے کے لئے گھر) نہ ہوتو رہائش گاہ بنالے (1)''۔ فرمایا پس ابوبکر نے بیان کیا ہے: مجھے خبر دی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اس کے سوا کچھ لیا تو وہ غلول کرنے والا اور سارق (چوری کرنے والا) ہے۔'' واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ کتب کو ان کے مالکوں سے روک کر رکھنا بھی غلول میں سے ہے، اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں بھی ان کے معنی میں داخل ہیں۔ زہری نے کہا ہے: کتب کی خیانت سے بچ، پرہیز کر۔ تو انہیں کہا گیا: کتب کا غلول کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: انہیں ان کے اصحاب سے روک کر رکھنا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل میں کہا گیا ہے: **وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ** یعنی نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ بطور رغبت یا رہبت یا مداہنت کے وحی میں سے کوئی شے چھپالے۔ اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم میں ان کے دین کے عیب بیان کئے گئے ہیں اور ان کے معبودان باطلہ کو جو برا کہا گیا ہے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ تو انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ اسے لپیٹ دیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، محمد بن بشار نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کے بارے جو ابتدا میں بیان کیا ہے وہ جمہور کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: **ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ** اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔

**اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾**

''تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہوسکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: **اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ** یعنی جو غلول کو ترک کرنے کا اور جہاد پر صبر کرنے (ڈٹے رہنے) کا ارادہ کرتا ہے۔ **كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ** (اس کی طرح ہوسکتا ہے) جو کفر یا غلول یا جنگ میں حضور نبی مکرم ﷺ سے پیٹھ پھیرنے کا ارادہ کرتا ہے **وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ** یعنی اس کا ٹھکانا جہنم ہے، یعنی اگر اس نے توبہ نہ کی یا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف نہ کیا۔ **وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ** یعنی لوٹنے کی جگہ بہت بری ہے۔ اور **رِضْوَانُ** کو را کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ عُدْوان اور عِدْوان۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ** یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی اور اتباع کی وہ اس کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا ہے۔ کہا گیا ہے: **هُمْ دَرَجٰتٌ متفاوتۃٌ** یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات اور منازل مختلف ہیں، پس جس نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اس کے لئے عزت و کرامت اور ثواب عظیم ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا اس کے لئے ذلت، رسوائی اور دردناک عذاب ہے اور **هُمْ دَرَجٰتٌ** کا معنی ہے ذوو درجات (وہ صاحب درجات ہیں) یا علی درجات (وہ درجات پر ہیں) اولی درجات (یا وہ درجات میں ہیں) یا لھم درجات (یا ان کے لئے درجات ہیں) اور اہل نار بھی درجات والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: و جدتہ فی غمرات من النار

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفییٔ، جلد 2، صفحہ 53-52، اسلام آباد

فاخرجته الی ضحضاح(1) (میں نے اسے آگ کی تکالیف میں پایا تو میں نے اسے تھوڑے سے پانی کی طرف نکال دیا۔)

پس مومن اور کافر درجہ میں برابر اور مساوی نہیں ہوں گے، پھر مومنین بھی مختلف ہوں گے، پس ان میں سے بعض بعض سے بلند رتبہ پر ہوں گے اور اسی طرح کفار بھی۔ اور درجہ کا معنی رتبہ ہے اور اسی سے الدَّرجہ ہے (لکھا جانے والا کاغذ) کیونکہ اسے درجہ بدرجہ لپیٹا جاتا ہے۔ اور جہنم کے مراتب میں مشہور درکات ہیں۔

جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافقین جہنم کے نیچے والے درکہ (گڑھے) میں ہوں گے) پس جس نے غلول نہیں کیا اس کے لئے جنت میں درجات ہوں گے اور جس نے غلول کیا اس کے لئے جہنم میں درکات ہوں گے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: جہنم کی کئی منازل ہیں اور ان میں سے ہر منزل کو درک اور درک کہا جاتا ہے اور درک نیچے کی طرف ہوتا ہے اور درج اوپر، بلندی کی جانب ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں سے ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن و سنت۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ان پر اپنے احسان عظیم کو بیان فرمایا ہے اور اس میں احسان کرنے کے معنی میں کئی اقوال ہیں: ان میں ایک یہ ہے کہ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہو بَشَرٌ مثلھم۔ یعنی آپ ان کی مثل بشر ہیں۔ پس جب دلائل واضح ہیں کہ آپ ان کی مثل بشر ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ای منھم۔ یعنی آپ ان میں سے ہیں۔

پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرف و مکرم ہوئے ہیں پس یہ بھی ایک احسان ہے اور یہ قول بھی ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ تاکہ وہ آپ کی حالت کو پہچان سکیں اور ان پر آپ کا طریقہ اور سنت مخفی نہ رہے۔ اور جب ان میں آپ کا مقام یہ ہے تو وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قتال اور جنگ کریں اور قطعاً آپ سے دور نہ بھاگیں۔ اور قرأت شاذہ میں مِّنْ اَنْفُسِهِمْ فا کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ان میں اشرف و اعلیٰ (خاندان) میں سے ہیں، کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش بقیہ عربوں سے افضل ہیں اور عرب غیر عربوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔

لفظ مومنین عام ہے اور اس کا معنی عرب میں خاص ہے، کیونکہ عرب قبائل میں سے کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا ہے اور ان کی آپ کے ساتھ نسبت موجود ہے، سوائے بنی تغلب کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے اور اللہ تعالیٰ نے نصرانیت کی میل سے آپ کو پاک صاف رکھا اور اس تاویل کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 115، اسلام آباد

(الجمعہ: 2) (وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے)

اور ابو محمد عبد الغنی نے بیان کیا ہے کہ ابو احمد البصری، احمد بن علی بن سعید القاضی، ابوبکر المروزی، یحییٰ بن معین، ہشام بن یوسف نے عبداللہ بن سلیمان نوفلی سے انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ صرف عرب والوں کے لئے ہے (1) اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام کے تمام مومنین مراد لئے ہیں (2)۔ اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں سے ایک ہیں اور انہیں کی مثل بشر ہیں اور بلاشبہ آپ وحی کے سبب ان سے ممتاز ہیں اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے)۔ اور مومنین کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ وہی آپ سے نفع اٹھانے والے ہیں، پس ان پر احسان عظیم تر ہوا۔

اور قول باری تعالیٰ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ میں يَتْلُوْا۔ رَسُوْلًا کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا معنی ہے يقرءُ (وہ پڑھتا ہے) اور تلاوت بمعنی قراءت ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے: لقد كانوا من قبل محمد تحقیق وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے تھے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اِنْ بمعنی مَا ہے اور خبر میں لام بمعنی الا ہے یعنی وَ مَا كانوا من قبلُ الاَّ فی ضلالٍ مُّبِيْنٍ (وہ اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی وما كنتم من قبله الا من الضالين (اور تم اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور یہ کوفیوں کا مذہب ہے اور اس آیت کا معنی سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١٦٥

''کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آ پڑی یہ مصیبت؟ فرمایئے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس میں الف استفہام کے لئے ہے اور واؤ عطف کے لئے۔ مُّصِيْبَةٌ اس سے مراد غلبہ ہے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا یعنی بدر کے دن تم اس سے دگنی پہنچا چکے ہو، اس طرح کہ تم نے ان میں سے ستر افراد قتل کئے اور ستر کو تم نے قیدی بنایا۔ اور قیدی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ قید کرنے والا اگر چاہے تو اپنے قیدی کو قتل کر سکتا ہے، یعنی تم نے انہیں بدر کے دن اور احد کے دن بھی ابتدا میں شکست سے دوچار کیا اور اس میں تم نے تقریباً بیس افراد قتل کئے، (گویا) تم نے ان میں سے دونوں دنوں میں افراد قتل کئے اور انہوں نے تم سے احد کے دن (کچھ افراد) شہید کئے۔

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا یہ شکست اور قتل (کی مصیبت) ہمیں کہاں سے آ پہنچی ہے، حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے ہیں اور ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577　2۔ ایضاً

مسلمان ہیں اور ہم میں نبی مکرم ﷺ بھی ہیں اور وحی بھی ہیں اور وہ مشرک ہیں۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (فرمایئے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے) یعنی تیر اندازوں کی مخالفت کے سبب اور کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی جنگ میں اطاعت وفرمانبرداری کی مگران کی مدد کی گئی، کیونکہ جب وہ اطاعت کرتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اور حضرت قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: مراد ان کا حضور نبی کریم ﷺ سے مدینہ طیبہ سے (دشمن کے مقابلے کے لئے) باہر نکلنے کا سوال کرنا ہے اس کے بعد کہ آپ ﷺ وہاں مقیم رہنے کا ارادہ فرما چکے تھے اور آپ ﷺ نے یہ تاویل اس خواب کی فرمائی تھی جس میں آپ نے اسے محفوظ قلعہ دیکھا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا بدر کے دن (قیدیوں کے) قتل پر فدیہ لینے کو اختیار کرنا ہے(1)، حالانکہ انہیں کہا گیا تھا اگر تم نے قیدیوں کے بدلے فدیہ لیا تو ان کی تعداد کے برابر تم سے لوگ شہید کئے جائیں گے۔ اور بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دو اور اگر تم چاہو تو ان کا فدیہ لے لو اور تم نے فدیہ سے مفاد حاصل کیا اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید کر دیئے گئے۔'' اور سترھویں نمبر پر آخر میں شہید ہونے والے صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے انہیں جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا۔ پس مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا معنی پہلے دو قولوں کے مطابق بذنوبکم (یعنی تم اپنے گناہوں کے سبب اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو) اور آخری قول کے مطابق باختیارکم (یعنی یہ مصیبت تمہارے اپنے اختیار کے سبب آئی ہے۔)

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَىٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

''اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے اور کہا گیا ان سے آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''

یعنی (وہ مصیبت) جو احد کے دن قتل، زخم اور ہزیمت کی صورت میں پہنچی۔ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ پہنچی۔ قفال نے کہا ہے: پس وہ اللہ تعالیٰ کے تمہارے اور ان کے درمیان

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577

معاملہ آزاد چھوڑنے کے سبب پہنچی، نہ کہ اس نے اس کا ارادہ کیا اور یہ معتزلہ کی تاویل ہے۔ اور فَبِاِذْنِ اللّٰهِ میں فا داخل ہے کیونکہ مَا بمعنی الذی ہے۔ یعنی وہ مصیبت جو تمہیں اس دن پہنچی جب دونوں لشکر مقابلے کے لئے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور قضا سے پہنچی۔ پس کلام شرط کے معنی کے مشابہ ہو گیا، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے: الذی قام فلہ درھم (جو کھڑا ہوا تو اس کے لئے ایک درہم ہے) وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا یعنی تا کہ وہ (مومنین اور منافقین کو) الگ الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تا کہ مومنین کا ایمان جنگ میں ان کے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور تا کہ منافقین کا کفران کے (مصیبت پر) خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے پس وہ اسے جان لیں گے۔ اور قول باری تعالیٰ نَافَقُوْا ۚ وَ قِيْلَ لَهُمْ سے اشارہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کی طرف ہے جو اس کی معیت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت سے واپس لوٹ گئے تھے اور وہ تین سو تھے اور ان کے پیچھے عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری اور ابو جابر بن عبداللہ بھی چلے، تو آپ نے انہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے نبی کو نہ چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کرو یا بچاؤ کرو اور اسی طرح کی بات کہی۔ ابن ابی نے آپ کو کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ جنگ ہوگی اور اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہوتے۔ پس جب عبداللہ ان سے مایوس ہو گیا تو اس نے کہا: (اے) اللہ کے دشمنو! تم جاؤ پس اللہ تعالیٰ اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے مستغنی کر دے گا۔ اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا گیا اور شہید کر دیا گیا رضی اللہ عنہ۔ (1)

قول باری تعالیٰ: اَوِ ادْفَعُوْا کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے پس سدی اور ابن جریج وغیرہما نے کہا ہے: تم ہماری تعداد میں اضافہ کرو اگرچہ تم ہمارے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو۔ تو یہ دشمن کو روکنے اور اسے دور ہٹانے کا (سبب بن) جائے گا (2)، کیونکہ تعداد جب بڑھ جائے تو دشمن کو دور ہٹانے اور دفاع کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے جنگ قادسیہ کے دن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم الاعمی کو دیکھا وہ زرہ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اطراف کھینچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا جھنڈا ہے، تو ان کو کہا گیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن میں اپنی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اور انہی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا وجود کیسا ہے؟ (3)

اور ابو عون انصاری نے کہا ہے: اَوِ ادْفَعُوْا کا معنی ہے رابطوا (سرحد کے پاس دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو) اور یہ معنی پہلے کے قریب ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ مقابلے میں پڑاؤ ڈالنے والا دفاع کرنے والا ہی ہوتا ہے، کیونکہ اگر سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں کی جگہ نہ ہو تو یقیناً وہاں تک دشمن آ جائے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اَوِ ادْفَعُوْا یہ جنگ کی طرف دعوت ہے از روئے حمیت کے، کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے کی دعوت دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہوگا۔

پس جب آپ نے دیکھا کہ وہ اس پر نہیں آ رہے تو آپ نے ان پر ایک ایسی وجہ پیش کی جو انہیں غضب دلائے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539-538　2۔ معالم التنزیل، جلد، صفحہ 578　3۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539

اور خودداری کو ابھارے۔ یعنی یا سرحدوں کا دفاع کرتے ہوئے قتال کرو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ قزمان نے کہا ہے: قسم بخدا! میں نے قتال نہیں کیا مگر اپنی قوم کی عزوشرف اور محاسن و مفاخر کی وجہ سے۔ اور کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انصار میں سے کسی نے کہا احد کے دن جب اس نے قریش کو دیکھا: تحقیق میں نے سواری کو وادیٔ قناۃ کی کھیتیوں میں چھوڑ دیا، کیا بنی قیلہ کی کھیتیاں چرالی جائیں گی۔ اور ہم باہم نہیں لڑیں گے؟ اور معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہیں لڑتے تو اپنی جانوں اور عزت کو بچانے کے لئے لڑو۔

قولہ تعالیٰ: هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ یعنی انہوں نے اپنا حال بیان کردیا اور اپنے پردے چاک کر دیئے اور اپنے نفاق کو ظاہر کردیا ہر اس کے لئے جو یہ گمان رکھتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں، پس وہ ظاہر حال میں کفر کے زیادہ قریب ہو گئے، اگرچہ وہ فی الحقیقت کافر تھے اور قولہ تعالیٰ: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ یعنی انہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔ اور افواہ (مونہوں) کا ذکر بطور تاکید ہے، جیسا کہ یہ قول ہے يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

''جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے آپ فرمایئے ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اس کا معنی ہے لأجل اخوانهم یعنی اپنے بھائیوں کے واسطے اور یہ وہ شہداء تھے جو قبیلہ خزرج میں سے قتل کئے گئے تھے اور وہ نسب اور مجاورت کے اعتبار سے بھائی تھے نہ کہ دین کے اعتبار سے۔ یعنی انہوں نے ان شہداء کے بارے میں کہا: اگر وہ بیٹھے رہتے مدینہ طیبہ میں تو نہ مارے جاتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، یعنی یہ منافقین کی جانب سے ان کے بارے یہ اشکال اور اشتباہ ہے، وہ لوگ جو شہید کر دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے، تو وہ نہ قتل کئے جاتے۔

اور قول باری تعالیٰ: لَوْ اَطَاعُوْنَا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ قریش کی طرف نہ نکلتے۔

اور قولہ تعالیٰ: وَ قَعَدُوْا یعنی انہوں نے یہ قول کیا اس حال میں کہ وہ خود جہاد سے رک کر (گھروں میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کا رد کیا: قُلْ فَادْرَءُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے: اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو دور کر دکھاؤ۔ اور الدرء کا معنی الدفع (دور کرنا) ہے اس سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ احتیاط اور ڈر تقدیر سے نہیں بچا سکتے۔ اور یہ کہ مقتول اپنی اجل کے ساتھ ہی مارا جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جس کے بارے اس نے خبر دی ہے وہ بالیقین ہو کر رہنے والا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ جس دن یہ کہا گیا اس دن ستر منافقین فوت ہوئے۔ اور ابولیث سمرقندی نے کہا ہے: میں نے سمرقند کے بعض مفسرین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے جب یہ آیت قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ نازل ہوئی تو اس دن منافقین میں سے ستر افراد مرے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کئے گئے ہیں الله کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور) رزق دیئے جاتے ہیں۔ شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں الله نے اپنے فضل و کرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب الله تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ جو کچھ احد کے دن ہوا وہ امتحان تھا جو منافقین کو صادق (سچ بولنے والے) سے ممتاز اور الگ کرتا ہے، تو پھر اس نے یہ بیان فرمایا کہ جو شکست خوردہ نہیں ہوئے اور شہید کر دیئے گئے الله تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ معزز اور زندہ ہیں۔ اور یہ آیت شہداء احد کے بارے میں ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے نازل ہوئی ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام شہداء کے بارے میں عام ہے۔ اور مصنف ابی داؤد میں اسناد صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب میدان احد میں تمہارے بھائی شہید کئے گئے تو الله تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں رکھ دیا جو جنت کی نہروں پر آتے ہیں ان کے پھلوں میں سے کھاتے ہیں اور سونے کی ان قندیلوں میں رہتے ہیں جو عرش کے سائے میں معلق ہیں پس جب انہوں نے اپنا کھانا، پینا اور آرام کی جگہ کو اچھا پایا تو انہوں نے کہا: کون ہماری جانب سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور ہم رزق دیئے جا رہے ہیں تاکہ وہ جہاد سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور نہ وہ جنگ کے وقت بزدل بنیں تو الله سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا میں تمہاری جانب سے انہیں یہ پیغام پہنچا دوں گا''...... آپ نے فرمایا...... پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (2)... الی آخر الآیات۔

اور بقی بن مخلد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے ملے اور فرمایا: ''اے جابر! کیا ہے مجھے کہ میں تجھے ٹیڑھا ہونے والا اور مغموم دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے والد محترم شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے پیچھے اہل و عیال بھی چھوڑے اور ان پر قرض بھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے اس (حالت) کے بارے بشارت نہ دوں جس میں الله عزوجل نے تیرے باپ سے ملاقات کی ہے؟'' میں نے عرض کی: ہاں یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الله أحیا اباك و كلمه كفاحاً و ما كلم احد قط الامن

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3781، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 341۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2158، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وراء حجاب فقال له یا عبدی تمن اعطك قال یا رب فردنی الی الدنیا فاقتل فیك ثانیة فقال الرب تبارك و تعالیٰ انه قد سبق منّی انهم (الیها) لایرجعون قال یا رب فأبلغ من ورائی (اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے بلا حجاب شرف کلام عطا فرمایا اور کسی نے بھی کبھی بلا حجاب کلام نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اے میرے بندے! تو اپنی آرزو اور تمنا پیش کر میں تجھے وہ عطا کروں گا تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ میں تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا یہ تو پہلے ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو ان تک یہ خبر پہنچا دے جو میرے پیچھے ہیں) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الآیہ(1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اور وکیع نے سالم بن افطس سے اور انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ فرمایا: جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے اور انہوں نے وہ دیکھا جو خیر میں سے انہیں عطا کیا گیا تو انہوں نے کہا: کاش ہمارے بھائی اس خیر (اور انعام) کو جانتے جو ہمیں پہنچا ہے تاکہ جہاد میں ان کی رغبت (اور شوق) بڑھ جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے ان تک اسے پہنچا دوں گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور ابوالضحیٰ نے کہا ہے: یہ آیت خاص (2) اہل احد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور پہلی حدیث اس قول کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: یہ شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ چودہ افراد تھے آٹھ انصار میں سے تھے اور چھ مہاجرین میں سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے(3) اور ان کا قصہ مشہور ہے اسے محمد بن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: بے شک شہداء کے اولیاء (ورثاء) کو جب خیر و برکت اور فرحت و سرور حاصل ہوتا تو وہ افسوس کرتے اور کہتے: ہم تو نعمتوں اور خوشیوں میں ہیں اور ہمارے باپ، ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں(4)، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غم اور کرب کو دور کرنے کے لئے اور انہیں اپنے شہداء کے حال کی خبر دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: المختصر اگرچہ یہ احتمال ہے کہ نزول مجموعی سبب کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں شہداء کے بارے خبر دی ہے کہ وہ زندہ ہیں جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور لامحالہ وہ مر چکے ہیں اور ان کے اجسام مٹی میں ہیں اور ان کی

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 206۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 185، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ارواح زندہ ہیں جیسا کہ تمام مومنین کی ارواح اور انہیں قتل کے وقت سے جنت میں رزق دیئے جانے کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہاں تک کہ گویا ان کے لئے دنیوی حیات دائمی ہوگی۔

تحقیق علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے اور وہ معنی جس پر عظیم علماء ہیں وہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ کہ شہداء کی حیات محقق اور ثابت شدہ ہے پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں: ارواح ان کی طرف ان کی قبروں میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہ نعمتوں سے شادکام ہوتے ہیں، جیسا کہ کفار کو ان کی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور انہیں عذاب دیا جاتا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: انہیں جنت کے پھلوں سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی وہ اس کی ہوا پاتے ہیں حالانکہ وہ اس میں نہیں ہوتے (1)۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ مجاز ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جنت میں راحت وسکون اور نعمتوں کے مستحق ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ما مات فلان (فلاں نہیں مرا) یعنی زندہ اسے یاد کرتا رہا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:

موتُ التقی حیاةٌ لافناءَ لها ۔۔۔ قدمات قوم وهم فی الناس احیاء

متقی کی موت ایسی حیات ہے جس کے لئے فنا نہیں تحقیق قوم مرچکی ہے حالانکہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

پس معنی یہ ہے کہ انہیں اچھی تعریف کے ساتھ نوازا جاتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: ان کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں اور انتہائی آسودہ اور عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ اقوال میں سے یہی صحیح ہے، کیونکہ دلیل نقلی کے مطابق جو صحیح ہے وہی واقع ہونے والا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اختلاف کو اٹھا رہی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور ہم نے اس بارے میں واضح اور تفصیلی ذکر کتاب التذكرة بأحوال الموتى و امور الآخرة میں کیا ہے۔ والحمد للہ۔

تحقیق ہم نے وہاں ذکر کیا ہے کہ شہداء کتنے ہیں اور یہ کہ ان کا حال مختلف ہے اور رہے وہ جنہوں نے شہداء کے بارے میں یہ تاویل کی ہے کہ وہ زندہ ہیں اس معنی میں کہ وہ عنقریب زندہ کئے جائیں گے تو یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے اور قرآن و سنت اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَلْ اَحْيَآءٌ ان کی حیات پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور رزق نہیں دیا جاتا مگر زندہ کو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے لئے ہر سال میں غزوہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ ہر جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے جو بھی ان کے بعد یوم قیامت تک ہوگا کیونکہ وہ حکم جہاد پر عمل پیرا ہوئے (اور یہ سنت قائم کی) اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا (المائدہ: 32) (اسی وجہ سے (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو۔) اس کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ارواح یوم قیامت تک عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی رہیں گی ان زندہ مومنین کی ارواح کی طرح جو وضو کی حالت پر رات گزارتے ہیں۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ بیروت

اور یہ قول بھی ہے کیونکہ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے زمین کھا سکتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر بھی التذکرہ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ زمین انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، نیکوکار اور مخلص موذن اور حفاظ قرآن کو نہیں کھا سکتی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب شہید حکماً زندہ ہے تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ وہ زندہ جس میں قوت حس موجود ہو (اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی۔ علماء نے شہداء کے غسل اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے یہ کہا ہے کہ تمام شہداء کو غسل دیا جائے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے، سوائے اس کے جو خالصۃً دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے میدان جنگ میں قتل ہو جائے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں ان کے خون سمیت دفن کردو۔'' مراد احد کا دن ہے۔ اور آپ نے انہیں غسل بھی نہ دلایا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ ان سے ہتھیار اور زرہیں اتار لی جائیں اور انہیں خون اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے (2) اور اسی کے مطابق امام احمد، اسحاق، اوزاعی، داؤد بن علی، فقہاء امصار کی جماعت، اہل حدیث اور ابن علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب اور حسن نے کہا ہے: انہیں غسل دیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ہے: شہداء احد کو ان کی کثرت کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا اور (اسی زیادہ نے) اس سے مشغول رکھا۔ ابوعمر نے کہا ہے: حضرت سعید اور حسن کے اس قول کے مطابق عبیداللہ بن حسن عنبری کے سوا فقہاء امصار میں سے کسی نے بھی قول نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے شہداء احد کو غسل نہ دینے کی یہ علت ذکر کی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ولی اور وارث تھا جو اس کے ساتھ مشغول ہو کر اس کے معاملات کو سرانجام دے سکتا تھا۔ اس میں علت...... واللہ اعلم...... وہ ہے جو فی دمائھم والی حدیث میں ہے۔ ''کہ وہ (خون) قیامت کے دن کستوری کی خوشبو کی طرح ہوگا (3)۔'' تو اس سے ظاہر ہوا کہ (غسل نہ دینے کی) علت شغل نہیں ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے جس نے اس بارے میں کہا اور نہ ہی اس مسئلہ کا قیاس اور نظر وفکر میں کوئی دخل ہے، بلکہ یہ تو خالصۃً اس اثر کی اتباع اور پیروی کا مسئلہ ہے جسے تمام نے شہداء احد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ بعض متاخرین نے جنہوں نے حسن کا مذہب اختیار کیا ہے انہوں نے شہداء احد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: انا شهيد على هولاء يوم القيامة میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا) فرمایا (4): یہ ان کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ان کے سوا کوئی اور شریک نہ ہوگا۔ ابوعمر نے کہا ہے: یہ شذوذ سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کے غسل کو ترک کرنے کے بارے قول زیادہ اولیٰ ہے،

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1503، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 393۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2593، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ وہ شہداء احد اور ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کو اس کے سینہ یا اس کے حلق میں تیر مارا گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ جیسے تھا اسی طرح اسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ فرمایا: اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔(1)

**مسئلہ نمبر 3**۔ رہی شہداء پر نماز جنازہ! تو اس کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک، لیث، امام شافعی، امام احمد اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر آپ فرماتے: ''ان میں سے قرآن کریم زیادہ جمع کرنے والا کون ہے؟'' پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے رکھتے اور آپ نے فرمایا میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا۔''

اور آپ نے انہیں ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور انہیں غسل نہ دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (2)۔ اور کوفہ، بصرہ اور شام کے فقہاء نے کہا ہے: ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور انہوں نے بہت سے آثار روایت کئے ہیں ان میں سے اکثر روایات مرسل ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔(3)

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ شہید کو جب زندہ اٹھا لیا جائے اور وہ میدان جنگ میں نہ مرے اور کچھ دیر زندہ رہے اور کچھ کھائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے جسے ظلماً قتل کیا گیا جیسا کہ وہ جسے خارجیوں اور ڈاکوؤں وغیرہ نے قتل کر دیا ہو، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ہر وہ جسے ظلماً قتل کیا گیا اسے غسل نہ دیا جائے لیکن اس پر اور ہر شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور یہی قول تمام اہل عراق کا ہے۔ اور انہوں نے بہت سے صحیح طرق سے زید بن صوحان سے روایت کیا ہے اور یہ جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ تم مجھ سے کپڑے نہ اتارنا اور نہ ہی مجھ سے خون کو دھونا۔ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زید بن صوحان کے قول کی مثل ہی کہا ہے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید کئے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل نہیں دیا۔ اور امام شافعی کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے (شہید کو) دیگر تمام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا سوائے اس کے جسے اہل حرب نے قتل کیا ہو اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: اسے غسل نہیں دیا جائے گا جسے کفار نے قتل کیا اور وہ میدان جنگ میں ہی فوت ہو گیا۔ اور ہر وہ مقتول جو میدان جنگ میں قتل نہ کیا گیا ہو ...... لیکن اسے کفار نے قتل کیا ہو ...... تو اسے غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھی جائے گی اور یہی امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ باغیوں کے مقتول کو غسل نہیں دیا جائے گا اور امام مالک کا قول زیادہ صحیح ہے، بلا شبہ مردوں کو غسل دینا اجماع اور تمام کے نقل کرنے سے ثابت ہے۔ پس ہر میت کو غسل دینا واجب ہے سوائے اس کے جسے اجماع یا سنت ثابتہ نے (اس حکم سے) خارج کیا ہو۔ و باللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ دشمن جب صبح کے وقت کسی قوم پر ان کے گھروں میں حملہ کر دے اور انہیں اس کے بارے علم نہ ہو اور وہ ان میں سے بعض کو قتل کر دے تو کیا ان کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والوں کے حکم کی طرح ہوگا یا عام مردوں کے حکم کی مثل، یہ مسئلہ ہمیں قرطبہ میں پیش آیا (اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ ہمارے پاس لائے) دشمن...... اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے۔ نے تین رمضان المعظم ۶۲۷ھ کی صبح کو حملہ کیا لوگ اپنے گھروں میں ابھی غفلت میں تھے، تو اس نے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کر لیا، ان افراد میں سے جنہیں شہید کیا گیا میرے والد رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، تو میں نے اپنے شیخ المقری الاستاذ ابو جعفر احمد المعروف بابی حجۃ سے (یہ مسئلہ) پوچھا تو انہوں نے فرمایا، انہیں غسل بھی دو اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھو، کیونکہ تمہارے والد میدان جنگ میں دو لشکروں کی صفوں کے درمیان شہید نہیں کئے گئے۔ پھر میں نے اپنے شیخ ربیع بن عبد الرحمن بن احمد بن ربیع بن ابی سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلا شبہ اس کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والے کا ہی حکم ہے، پھر میں نے قاضی الجماعۃ ابا الحسن علی بن قطرال سے پوچھا اور ان کے پاس فقہاء کی ایک جماعت موجود تھی تو انہوں نے جواب دیا: اسے غسل دو اور کفن پہناؤ اور اس پر نماز جنازہ پڑھو، میں نے اسی طرح کیا۔ پھر اس کے بعد ''البقرۃ'' وغیرہا میں اس مسئلہ پر (صحیح طرح) واقف ہوا جو کہ ابو الحسن اللخمی کی کتاب ہے اور اگر میں اس سے پہلے اس پر واقف ہو جاتا تو میں انہیں غسل نہ دیتا اور میں انہیں خون سمیت انہی کپڑوں میں دفن کر دیتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے اور اس میں شہادت پانے کا ثواب عظیم اور بہت زیادہ ہونے پر دلالت کرتی ہے یہاں تک کہ یہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونا ہر شے کو مٹا دیتا ہے سوائے قرض کے اسی طرح مجھے جبریل امین علیہ السلام نے ابھی بتایا ہے(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ دین (قرض) کا ذکر اس پر تنبیہ ہے کہ وہ حقوق بھی اسی کے معنی میں ہیں جو ذمت سے متعلق ہیں۔ مثلاً غصب، باطل طریقے سے مال لینا، عمداً کسی کو قتل کرنا اور زخمی کرنا اور دیگر ایسے امور جو ان کے تابع ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرض کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے کہ اسے جہاد کے سبب نہ بخشا جائے کیونکہ وہ زیادہ شدید اور سخت ہے اور ان تمام میں قصاص نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ ہے جیسا کہ اس بارے میں سنۃ ثابتہ وارد ہیں۔

عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ بندوں کو یا فرمایا لوگوں کو اٹھائے گا، ہمام کو شک ہے (کہ آپ نے لفظ العباد کہا یا الناس کہا) اور اپنے دست مبارک کے ساتھ شام کی طرف اشارہ کیا...... ننگے بدن، غیر مختون اور بھم۔ ہم نے عرض کی: بُھم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کیساتھ کوئی شے نہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 135

ہوگی۔ پس انہیں ایسی آواز کے ساتھ ندا دی جائے گی جسے ہر قرب و بعد والا سنے گا میں بادشاہ ہوں، میں حاکم (اور) حساب لینے والا ہوں اہل جنت میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل نار میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو اور اہل نار میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جہنم میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل جنت میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو حتیٰ کہ ایک تھپڑ ہی ہو۔ راوی نے کہا ہم نے عرض کی: کیسے ممکن ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون۔

آپ نے فرمایا: ''نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ (1)'' اسے حارثہ بن ابی اسامہ نے نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ہی ساز و سامان۔ تو آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ (نیک اعمال) ساتھ لے کر آئے گا اور پھر ایک (آدمی) آئے گا (اور کہے گا) اس نے گالیاں دی ہیں (دوسرا آئے گا اور کہے گا) اس نے تہمت لگائی ہے (ایک اور آئے گا اور کہے گا) اس نے اس کا مال کھایا ہے، (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اس کا خون بہایا ہے۔ (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اسے مارا ہے۔ پس اسے اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر اس کی نیکیاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے وہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہو گئیں تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر اسے زندہ کیا جائے، پھر اسے قتل کیا جائے، پھر اسے زندہ کیا جائے پھر اسے قتل کیا جائے درآنحالیکہ اس پر قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔ (3)'' اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مومن کا نفس اس کے ساتھ معلق ہے جو اس پر قرض ہے۔ (4)'' اور احمد بن زہیر نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ اور اگر کہا جائے یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بعض شہداء قتل کے وقت سے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ان کی ارواح پرندے کے پیٹ میں ہوں گی جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے اور نہ ہی وہ اپنی قبور میں ہوں گے، تو پھر وہ کہاں ہوں گے؟ تو ہم نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے ساتھ ایک نہر پر ہوں گی اسے بارق کہا جاتا ہے۔ ان پر ان کا رزق صبح و شام جنت سے نکالا جاتا ہے (5)۔''

---

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 475، حدیث نمبر 3638　　2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 320،

3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 53

4۔ شعب الایمان، فی قبض الیدیان الأحوال المعرفۃ، جلد 4، صفحہ 401، حدیث نمبر 5543

5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عباس، جلد 1، صفحہ 266

شاید یہ وہی ہوں۔ واللہ اعلم۔ اسی وجہ سے امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ طبقات اور مختلف احوال ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں۔

اور امام ابوعبداللہ بن محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی نے اپنی سنن میں حضرت سلیم بن عامر سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''سمندر کا ایک شہید خشکی کے دوشہیدوں کی مثل ہے اور سمندر میں (دو آدمی جس کا) سر چکرار ہا ہو وہ خشکی میں اس کی طرح ہے جو اپنے خون میں لت پت ہو اور جو دو موجوں کے درمیان ہو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں دنیا سے منقطع ہونے والے کی طرح ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو قبض کرنے کے لئے ملک الموت کو مقرر فرمایا ہے سوائے سمندر میں شہید ہونے والوں کے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو خود قبض کرتا ہے اور خشکی کے شہید کے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دیتا ہے سوائے قرض کے اور سمندر میں شہید ہونے والے کے تمام گناہ اور قرض بھی بخش دیتا ہے (1)۔''

**مسئلہ نمبر 7۔** وہ قرض جس کے سبب مقروض کو جنت سے روک دیا جائے گا...... واللہ اعلم...... وہ وہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے مال چھوڑا اور اس کے بارے وصیت نہ کی ہو یا وہ ادائیگی پر قادر ہو لیکن اس نے ادا نہ کیا اس نے اسراف یا بیوقوفی کی بنا پر قرض لیا اور مر گیا اور اسے ادا نہ کیا۔ اور رہا وہ آدمی جس نے واجب حق کو پورا کرنے کے لئے فاقہ کشی اور تنگ دستی کی وجہ سے قرض لیا اور مر گیا اور اس نے اسے ادا کرنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت سے نہیں روکے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ سلطان وقت پر فرض ہے کہ وہ اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرے، چاہے تو جملہ صدقات میں سے یا غارمین کے حصہ سے یا اس مال فئ سے جو مسلمانوں کو (صلح کے ساتھ) کہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرض یا عیال (محتاج) چھوڑی تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے (2)۔'' ہم نے اس باب کی مزید وضاحت کتاب ''التذکرہ'' میں کی ہے۔ والحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ اس میں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت ہے عند کرامۃ ربہم۔ اور یہاں عِنْدَ غایت قرب کا تقاضا کرتا ہے، پس یہ ''لدی'' کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تصغیر نہیں بنائی گئی کہ کہا جائے! عُنَید، یہ سیبویہ نے کہا ہے۔ تو یہ غایت قرب (عندیہ) کرامت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مسافت اور قرب کے اعتبار سے۔ اور يُرْزَقُوْنَ سے مراد وہ رزق ہے جو عرف میں معروف ہے اور جس نے کہا ہے: اس سے مراد حیات الذکر ہے اس نے کہا ہے کہ انہیں ثنا جمیل (اچھی تعریف) کا رزق دیا جاتا ہے۔

اور پہلا معنی حقیقت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارواح جس حالت میں جنت کی ہواؤں، خوشبوؤں، نعمتوں اور اس کی

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 204۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176

ایضاً صحیح بخاری، باب من تکفل عن میت دینا فلیس لہ ان یرجع، حدیث 2133، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرحت وانبساط میں چلتی ہیں تو وہ ان چیزوں کا ادراک رکھتی ہیں جو ارواح کے لائق اور مناسب ہوتی ہیں، ان میں سے جن میں نفع اٹھایا جا سکتا ہے اور ان کے سبب زندہ اور بلند رہا جا سکتا ہے۔ اور رہیں لذات جسمانیہ تو ان ارواح کو جب ان کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ ان تمام نعمتوں سے پوری ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں۔ اور یہ اچھا قول ہے، اگرچہ اس میں مجاز کی نوع بھی ہے، اور یہ اس کے موافق ہے جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے۔ والموفق الا لہ اور فَرِحِيْنَ۔ يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور کلام میں أَحْيَاء کی صفت ہونے کی بنا پر ''فرحون'' بھی جائز ہے اور یہ فرح بمعنی سرور سے ماخوذ ہے۔ اور اس آیت میں فضل سے مراد وہی مذکورہ نعمتیں ہیں۔ اور ابن السمیقع نے فَارِحِين کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ الفرِہ اور الفارِہ، الحذِر اور الحاذِر، الطَمِع اور الطامِع اور البَخِلُ اور الباخِل۔ نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں اس کا رفع پڑھنا جائز ہے، کیونکہ یہ احیاءؒ کی صفت ہو سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس کا معنی ہے جو فضل میں ان سے نہیں آملے، اگرچہ ان کے لئے فضل (اور مرتبہ) ہے۔ اور (يَسْتَبْشِرُوْنَ) کی اصل البشارۃ سے ہے، کیونکہ انسان جب فرحت وانبساط میں ہوتا ہے تو خوشی اور سرور کا اثر اس کے چہرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: شہید کے پاس ایک کتاب لائی جاتی ہے جس میں اس کے بھائیوں میں سے اس کے پاس آنے والوں کا ذکر ہوتا ہے، تو وہ خوش ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل غائب دنیا میں اس کے آنے کے ساتھ خوش ہوتا ہے (1)۔

اور حضرت قتادہ، ابن جریج اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے: ان کا خوش ہونا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے وہ بھائی جنہیں ہم نے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑا وہ اپنے نبی کی معیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں پس وہ بھی ہماری طرح کی عزت وکرامت پا رہے ہیں، پس وہ اسی کے سبب مسرور اور خوش ہو رہے ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ لوگ ابھی پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کے لئے خوشی کے اظہار سے اشارہ تمام مومنین کی طرف ہے اگرچہ وہ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کو دیکھتے ہیں تو انہیں یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ دین اسلام ہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر وثواب عطا فرمائے گا، پس وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان پر خوش ہوتے ہیں جو اس نے انہیں عطا فرمایا ہے اور وہ مومنین کے لئے بھی خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس معنی کو زجاج اور ابن فورک نے اختیار کیا ہے (3)۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٧١﴾

''خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا۔''

یعنی وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت (کے

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 219　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 541، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

حصول) پر (خوش ہو رہے ہیں) وَ فَضْلٍ یہ بیان کی زیادتی کے لئے ہے اور فضل بھی نعمت میں داخل ہے، اور اس میں اس (نعمت) کے وسیع ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ نعمت دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نعمت کے بعد فضل کا ذکر بطور تاکید ہوا ہے، ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید کی چھ خصلتیں ہیں، اسی طرح ترمذی میں ہے اور ابن ماجہ میں ''ست'' (چھ) ہیں اور یہ تعداد میں سات ہیں۔ اس کی پہلی ہی بار (خون کا قطرہ زمین پر گرتے وقت) مغفرت کر دی جاتی ہے اور وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے اور اسے عذاب قبر سے بچا لیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے سر پر یاقوت سے بنا ہوا وقار کا تاج رکھا جائے گا جو دنیا اور اس کی جملہ نعمتوں سے بہتر (اور ذی قدر) ہوگا اور حور عین میں سے بہتر کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی اور اس کے ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔'' فرمایا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1) اور یہی نعمت اور فضل کی تفسیر ہے۔

اور اس معنی میں آثار بہت زیادہ ہیں اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کے ساتھ عزت و شرف عطا فرمایا ہے، اس نے ان کے ساتھ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو مشرف نہیں فرمایا اور نہ ہی مجھے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح ملک الموت نے قبض کی ہیں اور وہی عنقریب میری روح بھی قبض کرے گا اور رہے شہداء تو ان کی ارواح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ قبض کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور ان کی ارواح پر ملک الموت علیہ السلام کو مسلط نہیں کرتا اور دوسری یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو وصال کے بعد غسل دیا گیا ہے اور مجھے بھی وصال کے بعد غسل دیا جائے گا لیکن شہداء کو غسل نہیں دیا جاتا اور نہ انہیں دنیوی پانی کی حاجت اور ضرورت ہے اور تیسری یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو کفن دیئے گئے ہیں اور مجھے بھی کفن دیا جائے گا اور شہداء کو کفن نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے اور چوتھی یہ کہ انبیاء علیہم السلام جب فوت ہوئے تو انہیں اموات کا نام دیا گیا اور جب میرا وصال ہوگا تو کہا جائے گا قد مات (آپ فوت ہو گئے ہیں) لیکن شہداء کو موتی کا نام نہیں دیا جاتا اور پانچویں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قیامت کے دن شفاعت کا اختیار دیا جائے گا اور میری شفاعت بھی قیامت کے دن ہوگی لیکن شہداء ہر روز ان کے بارے میں شفاعت کرتے ہیں جن کی وہ شفاعت کر سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّاَنَّ اللّٰهَ کسائی نے اسے الف کے کسرہ کے ساتھ اِنَّ پڑھا ہے اور باقیوں نے نصب کے ساتھ، (2) پس جنہوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (تو اس کے مطابق) اس کا معنی یہ ہے یستبشرون بنعمة من الله و یستبشرون بأن الله لا یضیع أجر المؤمنین (وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اور اس پر وہ خوش ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا

---

1۔ جامع ترمذی، فضائل الجہاد، جلد 1، صفحہ 200-199۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب فضل الشہادة فی سبیل اللہ، حدیث 2788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 401

اجر ضائع نہیں کرتا) اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ابتدائے کلام میں آنے کی بنا پر ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وَاللّٰهُ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

''جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لئے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔''

اَلَّذِيْنَ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے، اور اس کی خبر مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو، اس صورت میں یہ الْمُؤْمِنِيْنَ سے یا بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا سے بدل ہوگا۔ اسْتَجَابُوْا یعنی اَجَابُوْا ہے اور اس میں سین اور تا دونوں زائدہ ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ قول بھی ہے۔

فلم يستجبه عند ذاك مُجيبُ

(پس اس وقت جواب دینے والے نے جواب نہ دیا)

اور صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا: مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تیرا باپ ان میں سے تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا یہ مسلم کے الفاظ ہیں (1)۔

اور انہی کی وساطت سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ...... یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما ...... ان میں سے تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا اور انہوں نے فرمایا: جب مشرک میدان احد سے واپس لوٹے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو وہ مصیبت اور اذیت پہنچی جو انہیں پہنچی تو آپ کو خوف لاحق ہوا کہ (ممکن ہے) وہ واپس پلٹ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کون ان کے مقابلہ کی دعوت پر لبیک کہے گا تا کہ یہ جان لیں کہ ہمارے پاس قوت ہے؟'' پس حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان ستر افراد میں تھے جو اس کے لئے تیار ہوئے، چنانچہ یہ اس قوم کے پیچھے نکلے اور انہیں اپنی آواز پہنچائی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو غزوہ حمراء الاسد میں پیش آیا۔ اور یہ مدینہ طیبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ جب اتوار کا دن تھا اور یہ غزوہ احد کا دوسرا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں میں مشرکین کا پیچھا کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: ''ہمارے ساتھ صرف وہی نکلے گا جو کل اس میں حاضر تھا۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مومنین میں سے دو سو آدمی اٹھے۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کون ان کے پیچھے جائے گا؟'' تو ان میں سے ستر آدمی تیار ہوئے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 282۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الذين استجابوا لله والرسول، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (1)، یہاں تک کہ آپ حمراء الاسد پہنچ گئے، دشمن کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے، ان میں ایسا بھی تھا جو زخم لگنے کے سبب شدید تکلیف میں تھا وہ چلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اور وہ کوئی سواری بھی نہ پاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور یہ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی پیروی اور جہاد کی رغبت میں تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی عبدالاشہل کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دونوں زخم لگنے کے سبب انتہائی کمزور اور نحیف تھے، ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی پر ٹیک اور سہارا لگا کر چلتا تھا اور یہ دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلے، پس جب حمراء الاسد پہنچے، تو نعیم بن مسعود ان سے ملا اور اس نے انہیں یہ خبر دی کہ ابوسفیان ابن حرب اور جو قریش کے افراد اس کے ساتھ ہیں وہ لشکر جرار کی صورت میں اکٹھے ہیں اور انہوں نے اپنی رائے کو اس پر پختہ کر لیا ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ کر آئیں اور وہاں کے باسیوں کو ہلاک و برباد کر دیں، تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے بارے خبر نہیں دی ہے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۞ اور اسی اثنا میں کہ قریش اس رائے پر جمع ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے پاس معبد الخزاعی آ گیا اور قبیلہ خزاعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیف اور آپ کی نصیحتوں کا رازداں تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کا حال اور جس کیفیت پر وہ تھے اسے دیکھ چکا تھا اور جب اس نے قریش کے واپس پلٹنے کے عزم کو دیکھا تاکہ وہ اہل مدینہ کو تباہ و برباد کر دے تو اسے اس کا خوف لاحق ہو گیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور آپ کے اصحاب کے لئے اس کے اخلاص نیت نے اسے اس سے برانگیختہ کیا کہ وہ قریش کو ڈرائے چنانچہ اس نے انہیں کہا: میں نے ابھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حمراء الاسد کے مقام پر بہت بڑے لشکر کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو کوئی ان سے پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ جمع ہو چکا ہے اور وہ تم پر (غصہ سے) جلے ہوئے ہیں، پس تم بچ جاؤ بچ جاؤ! پس میں تجھے اس سے روک رہا ہوں، قسم بخدا! جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے اس پر ابھارا ہے کہ میں اس کے بارے کچھ اشعار لکھوں۔

اس (ابوسفیان) نے پوچھا: تو نے کیا کہا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تُهَدُّ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِيْ إِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْأَبَابِيْلِ

قریب تھا کہ میری سواری کا جانور لشکروں کے شور و غل کی ہولناکی کی وجہ سے گر پڑتا جب زمین پر جوق در جوق کم مو گھوڑوں کا سیلاب آ گیا۔

تُرْدِي بِأُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ عند اللِّقَاءِ ولا مِيْلٍ مَعَازِيل

جو ایسے ذی شان شیروں کو اٹھائے دوڑ رہے تھے جو مقابلہ کے وقت نہ سست اور بزدل ہوں گے اور نہ ہتھیاروں سے خالی ہوں گے۔

فَظَلْتُ عَدْوًا أَظُنُّ الْأَرْضَ مَائِلَةً لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيسٍ غير مَخْذُولِ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جب وہ گھوڑے ایک ایسے سردار کے ساتھ بلند ہوئے جو بے یارومددگار نہیں چھوڑا گیا تھا۔

تو میں تیز دوڑنے لگا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جھکی جا رہی ہے۔

فقلتُ وَيْلَ ابنِ حرب مِنْ لَقَائِكُمْ اِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بالخيل

میں نے کہا تمہاری ملاقات سے ابوسفیان بن حرب کے لئے ہلاکت ہے جب وادی بطحاء گھوڑوں سے تھرتھرا اٹھے گی۔

انی نَذِيْرٌ لأهل البَسْلِ ضَاحِيَةً لِكُلِّ ذی إِرْبَةٍ منهم و معقولِ

بے شک میں سورج کی دھوپ میں چمکنے والی سرزمین کے رہنے والوں (یعنی قریش مکہ) میں سے ہر صاحب عقل و دانش کو ڈرانے والا ہوں۔

مِنْ جَيْشِ اَحْمَدَ لا وخش قَنَابِلُهُ و لَيْسَ يُوْصَفُ ما اَنْذَرْتُ بالْقِيلِ (1)

(سیدنا) احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکر سے جو ست اور کوتاہ قد نہیں ہیں اور جس بات سے میں نے ڈرایا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

پس اس طرح اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور وہ ڈرتے ہوئے تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس حال میں مدینہ منورہ کی طرف لوٹے کہ آپ کی مدد و نصرت فرمائی گئی تھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ اس میں سوء سے مراد قتال اور رعب ہے (آل عمران: 174) (''ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ'' واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کی معیت میں نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس واپس پلٹنے کے ساتھ انہیں اجر عظیم حاصل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ یہ غزوہ ہے۔''

یہی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما کا قول شاذ ہے ان دونوں نے کہا ہے: بے شک یہ آیت اس قول میں سے ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ...... تا قولہ ...... عَظِيْمٌ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدر صغریٰ کی جانب خروج کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلے ابوسفیان کے اس وعدہ کے مطابق جو اس نے میدان احد میں کیا تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: آنے والے سال ہمارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم جواباً کہو: ہاں (ہمیں منظور ہے۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت بڑی منڈی لگی ہوئی تھی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دراہم عطا فرمائے۔'' اور آپ بدر کے قریب جا پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نعیم بن مسعود اشجعی آیا اور اس نے آپ کو خبر دی کہ قریش جمع ہو چکے ہیں اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 224

ہوئے ہیں وہ اور جوان کی طرف منسوب ہیں، پس اس وجہ سے مسلمان خوفزدہ ہو گئے، لیکن انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ پس وہ چلتے رہے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کسی ایک کو بھی نہ پایا۔ اور انہوں نے منڈی اور بازار لگا ہوا پایا پس انہوں نے اپنے دراہم کے ساتھ کچھ چمڑہ اور سامان تجارت خریدا اور واپس لوٹ گئے۔ اور انہوں نے کوئی جنگ اور مکر نہ پایا اور اپنی تجارت میں نفع کمایا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ یعنی ان تجارات میں فضل و احسان کے ساتھ واپس لوٹے (1)۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے (جوش) ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔''

اس قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضرت مجاہد، مقاتل، عکرمہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ (کہنے والا) نعیم بن مسعود اشجعی تھا (2)۔ یہ لفظ عام ہے اور اس کا معنی خاص ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ یعنی (الناس سے مراد) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سدی نے کہا: وہ ایک اعرابی تھا جس کے لئے اس کام پر اجرت مقرر کی گئی تھی۔ اور ابن اسحاق اور ایک جماعت نے کہا ہے: الناس سے مراد عبدالقیس کے سواروں کا قافلہ ہے، وہ ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو اس نے انہیں مسلمانوں کی طرف ایک سازش کے تحت بھیجا تاکہ وہ انہیں اس سے باز رکھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد منافقین ہیں۔ سدی نے کہا ہے: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ابوسفیان کی مقرر کردہ میعاد کے مطابق بدر الصغریٰ کی طرف چلنے کے لئے تیار ہوئے تو ان کے پاس منافقین آئے اور انہوں نے کہا: ہم تمہارے وہی ساتھی ہیں جنہوں نے تمہیں ان کی طرف نکلنے سے منع کیا تھا اور تم نے ہماری تجویز نہ مانی تھی اور پھر انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں آ کر قتل کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور اگر تم ان کے پاس ان کے گھروں میں گئے تو تم میں سے کوئی ایک بھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) اور ابو معشر نے کہا ہے: اہل تہامہ میں سے قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ابوسفیان کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ تحقیق کافروں نے تمہارے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ فَاخْشَوْهُمْ پس تم ان سے ڈرو اور تم ان سے بچو، کیونکہ تمہارے پاس ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔ اس باب میں ان اقوال کی بنا پر ہی الناس جمع ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا یعنی لوگوں کے قول نے از روئے ایمان کے ان میں اضافہ کر دیا، یعنی اپنے دین کے بارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 543، دار الکتب العلمیہ　2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 402

میں تصدیق اور یقین، اپنی مدد و نصرت پر پختہ وثوق اور قوت و جرأت اور استعداد کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہو گیا۔ پس ان معنی کی بنا پر ایمان میں زیادتی سے مراد اعمال میں زیادتی ہے۔ علماء کا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں اور اس بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان جو کہ ایک تاج ہے اور کسی بھی شے کی ایک تصدیق ہے بلاشبہ یہ مفرد معنی ہے جب یہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی زیادتی اور اضافہ داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں سے کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جب یہ زائل ہو جائے۔ پس کچھ باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ زیادتی اور کمی ایمان کے متعلقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی ذات میں۔ پس علماء کی ایک جماعت نے یہ موقف اپنایا ہے کہ ایمان ان اعمال کے اعتبار سے زیادہ یا کم ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں، بالخصوص بہت سے علماء اسم ایمان کا اطلاق طاعات پر کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں ان میں سے اعلیٰ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے اور ان میں سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے (1)'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے: ''اور حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے (2)''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ایمان دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا قول لُمَظَة اس کے بارے اصمعی نے کہا ہے: نقطہ اور اس کی طرح کی سفیدی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے: فرس المظ جب گھوڑے کے ہونٹ میں سفیدی ہو اور محدثین کہتے ہیں لَمظة فتحہ کے ساتھ۔ البتہ کلام عرب میں یہ ضمہ کے ساتھ ہے، مثلاً شُبهة، دهمة اور حُمرة۔ اور اس میں ان کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ نہیں رہے وہ کہتے ہیں جب بھی ایمان بڑھتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفاق دل میں ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب بھی نفاق بڑھتا ہے تو دل سیاہ ہوتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان عرض ہے اور یہ دو زمانوں میں ثابت نہیں رہتا اور یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صلحاء کے لئے یکے بعد دیگرے قائم رہتا ہے، پس مومن کے دل میں اس کی امثال کے لگاتار اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے اعتبار سے اور بالدوام اس کے موجود رہنے کے اعتبار سے یہ بڑھتا ہے۔ اور مومن کے دل پر لگاتار اور مسلسل غفلتیں پڑنے کے سبب یہ کم ہو جاتا ہے، اس کی طرف ابو المعالی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یہ معنی حدیث شفاعت میں موجود ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اسے مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ اس میں ہے: ''پس مومنین عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے بھائی روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا جنہیں پہچانتے ہو نکال لاؤ پس ان کی صورآتش جہنم پر حرام کر دی جائیں گی اور خلق کثیر نکال لی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 2539، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6866، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گی درآنحالیکہ اسے آگ نصف پنڈلی اور اس کے گھٹنے تک پکڑے ہوئے تھی پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو رب کریم فرمائے گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں تم ایک دینار برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی اس میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ہے پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ کر جاؤ اور تم جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لو چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکالیں گے پھر عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا، پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم ذرہ برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ (1)۔'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس حدیث میں ایمان سے مراد دلوں کے اعمال ہیں، مثلاً نیت، اخلاص، خوف اور نصیحت اور ان کے مشابہ اعمال۔ اور ان کا نام ایمان رکھا ہے کیونکہ یہ محل ایمان میں ہیں یا ایمان سے مراد عادت عرب کے مطابق تسمیۃ الشئ باسم الشئ ہے جبکہ یہ اس کے مشابہ اور مجاور ہو یا یہ اس کے سبب ہو۔ اس تاویل کی دلیل شفاعت کرنے والوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو نکالنے کے بعد کہا جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی ہوگی: لم نذر فیھا خیرا (ہم نے اس میں کوئی خیر نہیں چھوڑی) باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان میں سے جمع کثیر کو نکالے گا جو لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے ہیں اور وہ قطعاً یقیناً مومن ہیں اور اگر وہ مومن نہ ہوتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں نہ نکالتا۔

پھر اگر وجود اول معدوم ہو جائے جس پر اس کی مثل مرتب ہوتا ہے تو یہ نہ زیادتی ہے اور نہ نقصان۔ اور اس کا اندازہ حرکت میں لگایا گیا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علم مفرد پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کی معلومات پیدا کیں تو اس کا علم زیادہ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ امثال کو معدوم کر دے تو وہ کم ہو گیا، یعنی زیادتی زائل ہو گئی اور اسی طرح جب اس نے حرکت کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کو پیدا کیا۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ایمان کی زیادتی اور کمی یہ ادلہ کے اعتبار سے ہے، پس ایک کے پاس دلائل زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: یہ ایمان میں زیادتی ہے، اس کے معنی کے مطابق ...... کئی اقوال پر ...... انبیاء علیہم السلام کو دوسری مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ وہ اسے وجوہ کثیرہ سے جانتے ہیں اور وہ ان وجوہ سے کہیں زیادہ ہیں جن کے سبب مخلوق اسے جانتی ہے اور یہ قول آیت کے مقتضیٰ سے خارج ہے، کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں زیادتی ادلہ کے اعتبار سے ہو۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ایمان میں زیادتی حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں فرائض و اخبار کے نزول کے اعتبار سے ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں جہالت کے بعد ان کی معرفت کے اعتبار سے ہے اور بلاشبہ یہی ایمان کی زیادتی ہے، پس اس بارے میں یہ قول کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے یہ قول مجازی ہے اور اس تعریف پر اس میں کمی کا تصور نہیں کیا جا سکتا،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103

بلکہ معلوم کی طرف اضافت کے اعتبار سے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ فاعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ یعنی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور حسب یہ احساب سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کفایت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فتملأ بيتنا إقطا و سمنا و حسبُكَ من غنی شِبَعٌ و رِیٌّ

اس میں حَسْبُكَ کا معنی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت کہا جب انہیں لوگوں نے کہا: بے شک کافر تمہارے لئے بہت سے لوگوں کو (لشکر جرار کو) جمع کئے ہوئے ہیں (1)۔ واللہ اعلم۔

**فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾**

''(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے: جب انہوں نے اپنے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اپنے دلوں سے اس پر اعتماد کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار طرح کی جزا عطا فرمائی: (یعنی) نعمت، فضل، برائی کو ان سے پھیر دینا اور رضا کی پیروی کرنا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا عطا فرمائی اور وہ ان سے راضی ہو گیا۔

**اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾**

''یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے پس نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یخوفکم اولیأہ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنے دوستوں سے (2)، اس سے حرف جر (با یا من) حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو اسم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسے (اسم کو) نصب دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا، ای لِيُنْذِرَكُمْ بِبَأْسٍ شَدِيْدٍ (تا کہ وہ تمہیں ڈرائے شدید قوت کے ساتھ) یعنی وہ مومن کو کافر سے ڈراتا ہے۔ اور حسن اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے، تا کہ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے بیٹھ جائیں (3) اور رہے اللہ تعالیٰ کے دوست تو وہ اس سے نہیں ڈرتے جب وہ انہیں ڈرائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ جو تمہیں کفار کے اجتماع سے ڈرا رہا ہے وہ انسانی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 655 2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 403 3۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 404

شیطانوں میں سے ایک شیطان ہے، چاہے وہ نعیم بن مسعود ہو یا کوئی اور، اس اختلاف کی بنا پر جو پہلے گزر چکا ہے۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ یعنی تم ان کافروں سے نہ ڈرو جن کا ذکر اس قول میں کیا گیا ہے: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ یا (هم ضمیر) اولیاء کی طرف لوٹ رہی ہے اگر تو کہے کہ معنی یہ ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈراتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ خَافُوْنِ یعنی میرا حکم چھوڑنے میں تم مجھ سے ڈرو اگر تم میرے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو اور کلام عرب میں خوف سے مراد گھبراہٹ ہے۔ اور خَاَوفَنِی فلان فَخُفْتُه (ڈرنے میں فلاں نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں اس پر ڈرنے میں غالب آ گیا) یعنی میں اس کی نسبت زیادہ ڈرا۔ اور الخوفاء ایسا جنگل جس میں پانی نہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے: ناقةٌ خَوْفاء یعنی ایسی اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو جائے اور الخافةُ مراد چمڑے کا وہ تھیلا ہے جس میں شہد حاصل کیا جاتا ہے۔ (یا چمڑے کا وہ لباس جو شہد اتارتے وقت پہنا جاتا ہے)

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس بعض صدیقین جمع ہوئے اور پوچھا: خوف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: تو امن و سکون نہ پائے یہاں تک کہ تو امن والی جگہ پر پہنچ جائے۔ حضرت سہل نے کہا ہے: حضرت ربیع بن خثیم جب لوہار کی بھٹی کے پاس سے گزرتے تو اس کو ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس بارے بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: جب وہ دہاں پہنچیں تو مجھے آگاہ کرنا۔ پس وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی، چنانچہ آپ وہاں آئے اور اپنا ہاتھ ان کی قمیص میں داخل کیا تو آپ نے ان کی (دل کی) حرکت کو بڑا تیز اور بلند پایا تو فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ تمہارے اہل زمانہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ وہ اس سے ڈرے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا چاہے دنیا میں یا آخرت میں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہو بلکہ ڈرنے والا وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس کے بارے وہ خوف رکھتا ہو کہ اس سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا ہے کہ وہ اس سے ڈریں چنانچہ ارشاد فرمایا: وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور فرمایا وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (البقرہ) (اور صرف مجھی سے ڈرا کرو) اور مومنین کی خوف کے سبب مدح کرتے ہوئے فرمایا: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (النحل:50) (ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے) اور ارباب اشارات کی خوف کے بارے میں کئی عبارات ہیں جن کا مرجع وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

الاستاذ ابوعلی الدقاق نے کہا ہے: میں ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کرنے کے لیے گیا، پس جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، تو میں نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت اور شفا عطا فرمائے گا، تو انہوں نے مجھے کہا: کیا تو یہ گمان کر رہا ہے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں؟ بلاشبہ میں تو موت کے بعد والی کیفیت سے ڈر رہا ہوں۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں جو سن رہا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ وہ چرچرائے اس میں چار انگلیاں رکھنے کے برابر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہوئے اپنی

پیشانی رکھے ہوئے ہیں قسم بخدا! اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت تھوڑا ہنسو اور تم بہت زیادہ رو۔ اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو اور یقیناً تم دشوار گزار گھاٹیوں کی جانب نکل جاؤ جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کرتے ہوئے دعا مانگو قسم بخدا! میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ہے(1)۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن غریب (یہ حدیث حسن غریب ہے) اور اس سند کے علاوہ اور سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: لَوَدِدْتُ أني كنت شجرة تُعْضَدُ، (2) واللہ اعلم۔

وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''اور (اے جان عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ یہ ایک قوم تھی جو اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے مشرکین کے خوف سے، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اور کلبی نے کہا ہے: اس سے مراد منافقین اور یہود کے سردار ہیں، انہوں نے کتاب میں موجود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپا لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جب اہل کتاب ایمان نہ لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شاق گزرا، کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے اور یہ کہتے: بلاشبہ یہ اہل کتاب ہیں، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہوتا تو یقیناً یہ آپ کی اتباع اور پیروی کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَا يَحْزُنْكَ حضرت نافع کی قرأت میں یاء مضموم اور زا مکسور ہے، جہاں بھی واقع ہو سوائے (سورۃ) انبیاء کے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ۔ کیونکہ اس میں یا مفتوح اور زا مضموم ہے(3)۔ اور ابوجعفر نے اس کا برعکس کیا ہے۔ ابن محیصن نے تمام جگہوں پر یا کو ضمہ کے ساتھ اور زا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے یا کو فتحہ اور زا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حَزَنَنِي الأمر يَحْزُنُنِي اور أَحْزَنَنِي بھی ہے اور یہ قلیل لغت ہے اور دونوں میں سے پہلی افصح ہے، نحاس نے یہی کہا ہے۔

اور شاعر نے أحزن کے بارے کہا ہے:

مَضَى صُحْبِي وَأَحْزَنَنِي الدِّيَارُ

(میرے ساتھی چلے گئے اور گھروں نے مجھے غمزدہ کر دیا)

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 319۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 404،

اور عام قرأت یُسَارِعُوْنَ ہے اور طلحہ نے یُسْرِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ پڑھا ہے۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں(1)۔ اور ان کے سوا نے کہا ہے: وہ منافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ تمام کفار کے لئے عام ہے۔ اور ان کا تیزی کے ساتھ کفر میں جانا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے، لیکن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے کفر پر بہت زیادہ غمزدہ ہوتے تھے، تبھی آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ** (فاطر:8) (پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے) اور فرمایا: **فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝** (الکہف) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔)

**اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا** یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی سلطنت اور اقتدار میں سے کسی شے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی ان کے کفر کے سبب کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان روایات میں نقل کی ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم اپنی ذات پر حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام گمراہ ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے ہدایت دی پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت عطا فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا پس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا (یعنی رزق عطا فرماؤں گا) اے میرے بندو! تم تمام کے تمام ننگے ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے لباس پہنایا پس تم مجھ سے لباس کا مطالبہ کیا کرو تا کہ میں تمہیں لباس پہناؤں۔

اے میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن گناہ اور خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت فرما دوں گا۔ اے میرے بندو! بلاشبہ تم میرے نقصان تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم میرے نفع تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول، تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن تمام تم میں سے ایک انتہائی متقی دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو اس طرح وہ میرے ملک میں کسی شے کا کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن سارے کے سارے ایک فاجر ترین دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو وہ میرے ملک اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی اور نقصان نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک ہی سرزمین میں کھڑے ہو جائیں اور وہ مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب اور حاجت کے مطابق عطا کروں تو جو کچھ

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

میرے پاس ہے اس میں کمی واقع نہ ہوگی مگر اسی طرح جیسے سوئی کمی کرتی ہے جب اسے سمندر میں داخل کیا جائے۔ اے میرے بندو! بلاشبہ یہ تمہارے اعمال ہیں میں انہیں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا اجر دوں گا پس جو کوئی خیر اور نیکی پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے (1)۔'' اسے مسلم نے اپنی صحیح میں اور ترمذی وغیرہما نے روایت کیا ہے اور یہ عظیم حدیث ہے اس میں طوالت ہے تمام کی تمام لکھی جاتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا کا معنی ہے یعنی وہ اولیاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب وہ ان کی مدد ترک کر دیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر اور مددگار ہے (2)۔

قولہ تعالیٰ: یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ حظا کا معنی حصہ ہے اور الحظ کا معنی النصیب والجدّ (حصہ) ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان احظّ من فلان، و هو محظوظ۔ فلاں فلاں کی نسبت حصہ کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اسے حصہ دیا گیا ہے اور حظ کی جمع خلاف قیاس أحاظِ آتی ہے۔ ابوزید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے جل حظیظ ای جدید جب وہ رزق میں حصہ دار ہو۔ اور حَظِظْتُ فی الأمر أحَظّ۔ میں نے کام میں خوب حصہ لیا۔ بسا اوقات حظّ کی جمع أحُظًّا بھی آتی ہے۔ (معنی یہ ہے) اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھے گا، اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۷﴾

''بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا اسے تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ایمان کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنا اور کفر کے عوض اسے بیچنا یہ اس کی بری تدبیر میں سے ہے، (اور اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) پس اسے اس کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تدبیر کا کوئی خوف ہے اور شَیْـًٔا دونوں آیتوں میں مصدر کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا: لن یضروا اللہ ضررا قلیلا و لا کثیرا (وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز تھوڑا یا زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ باکو حذف کرنے کی تقدیر پر منصوب ہو، گویا کہ فرمایا: لن یضروا اللہ بشئ۔

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 319۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2419، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

"اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل و خوار کرنے والا۔"

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ املاء سے مراد عمر کا طویل ہونا اور زندگی کا کشادہ اور خوشحال ہونا ہے اور معنی یہ ہے: وہ لوگ خیال نہ کریں جو مسلمانوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اور بلاشبہ وہ انہیں طویل عمریں عطا کر رہا ہے تا کہ وہ معاصی اور گناہ کے اعمال کریں اس لئے نہیں کہ وہ ان کے لئے باعث خیر و نفع ہے اور کہا جاتا ہے: اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ سے مراد وہ فتح اور کامیابی ہے جو انہوں نے غزوہ احد میں حاصل کی وہ ان کے نفسوں کے لئے باعث خیر و نفع نہیں، بلکہ وہ اس لئے ہے تا کہ وہ سزا میں اور اضافہ کر لیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوئی نیکوکار اور فاجر نہیں ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے، کیونکہ اگر وہ نیکوکار ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔

اور اگر وہ فاجر ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (1) (ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ اور زیادہ کر لیں) ابن عامر اور عاصم نے لَا يَحْسَبَنَّ یا کے ساتھ اور سین کے نصب کے ساتھ قرأت کی ہے (2)۔ اور حمزہ نے تا کے ساتھ اور سین کو منصوب پڑھا ہے (3) (یعنی لا تَحْسَبَنَّ) اور باقیوں نے یا کے ساتھ اور سین کو مکسور پڑھا ہے، پس جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے مطابق الذین فاعل ہے۔ یعنی کفار خیال نہ کریں۔ اور اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ما بمعنی الذی ہے، اور ضمیر عائد محذوف ہے، اور خیر، أن کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مقدر ہو اور فعل مصدر ہو، اور تقدیر کلام اس طرح ہو ولا یحسبن الذین کفروا أن املاءنا لهم خیر لانفسهم۔ (اور کافر لوگ خیال نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں فاعل ضمیر خطاب ہے، اور (مخاطب) حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور الذین کو تحسب کا مفعول اول ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور أنّ اور اس کا مابعد الذین سے بدل ہے، اور یہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہو جائے گا جیسا کہ یہ بدل نہ ہونے کی صورت میں قائم مقام ہے۔ اور ان اور اس کا مابعد تحسب کا مفعول ثانی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس باب میں مفعول ثانی ہی معنی میں اول ہوتا ہے، کیونکہ حسب اور اس کے اخوات مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ پس تقدیر کلام ہو گی: ولا تحسبن أنما نملی لهم خیر۔ یہ زجاج کا قول ہے اور ابوعلی کا قول ہے: اگر یہ صحیح ہوتا تو کہتا خیرا یعنی نصب کے ساتھ، کیونکہ أنّ، الذین کفروا سے بدل ہو جائے گا، تو گویا یہ کہا: لا تحسبن املاء الذین کفروا خیرا (یعنی تم کافروں کی مہلت کو بہتر اور خیر خیال نہ کرو) تو اس میں قولہ خیرا حسب کے لئے مفعول ثانی ہے۔ تب یہ جائز نہیں ہے کہ لا تحسبن تا کے ساتھ پڑھا جائے مگر اس صورت میں کہ أنّما میں إنّ کو کسرہ دیں اور خیرا کو نصب دیں (4)، اور حمزہ سے یہ مروی نہیں ہے اور حمزہ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545

قرأت تا کے ساتھ ہے، نتیجتاً یہ قرأت صحیح نہ ہوگی۔
اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: حمزہ کی قرأت تکریر کی بنا پر جائز ہے، اس کی تقدیر عبارت ہے ولا تحسبن الذین کفروا، ولا تحسبن أنما نملی لهم خیر، پس اس میں أن دوسرے تحسب کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، اور یہ اور جس نے عمل کیا ہے (مراد عامل تحسب ہے) وہ پہلے تحسب کا مفعول ثانی ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زجاج نے بدل کے دعویٰ میں ذکر کیا ہے، اور قرأت صحیح ہے، جبکہ ابو علی کا مقصود زجاج کو غلط قرار دینا ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ یہاں حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ ہے، اور ان کا قول: ولا یحسبن الذین یبخلون لحن (غلطی) ہے جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان کی اتباع ایک جماعت نے کی ہے۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ اس کا ترکیبی بیان پہلے گزر چکا ہے اور نقلاً قرأت کا صحیح ہونا اور اس کا ثابت ہونا بھی گزر چکا ہے اور یحییٰ بن وثاب نے اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ یعنی دونوں جگہ پر ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کہا ہے: یحیی کی قرأت اچھی ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: حسبت عمرا ابوہ خالد (اس میں عمرا مفعول اول اور ابوہ خالد مفعول ثانی ہے۔) ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے احنف سے سنا ہے وہ ان کو مکسور ذکر کرتے ہیں اور اس سے قدریہ کے لئے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان میں سے تھے اور وہ تقدیم و تاخیر پر معمول کرتے ہیں ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لهم لیزدادوا اثما انما نملی لهم خیر لانفسهم۔
بیان کیا: میں نے جامع مسجد میں ایک مصحف میں دیکھا انہوں نے اس میں ایک حرف زائد کیا تھا تو وہ اس طرح ہو گیا انما نملی لهم ایمانا پس اس کی طرف یعقوب القاری نے دیکھا تو غلطی واضح ہو گئی چنانچہ انہوں نے اسے مٹا دیا۔ اور یہ آیت قدریہ مذہب کے بطلان میں نص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی عمروں کو طویل کرتا ہے تاکہ وہ معاصی کا عمل کر کے کفر میں اضافہ کریں، اور اس کی امثال لگا تار دل پر مرتب ہوتی ہیں، جیسا کہ اس کی ضد جو کہ ایمان ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کوئی نیکوکار نہیں اور نہ ہی کوئی فاجر ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا اور یہ آیت پڑھی۔ وما عند الله خیر للابرار (1) اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

"نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کر

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 233

دے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے الله ( کی شان ) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ الله ( غیب کے علم کے لئے ) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ الله پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔"

ابو العالیہ نے کہا ہے: مومنین نے عرض کی کہ انہیں ایسی علامت اور نشانی عطا کی جائے جس کے ساتھ وہ مومن اور منافق کے درمیان فرق کر سکیں، تو الله عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ الآیہ(1)۔ اس آیت کا مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، مقاتل، کلبی اور اکثر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس میں خطاب کفار اور منافقین کو ہے(2)۔ یعنی الله تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو اس حال پر چھوڑے رکھے جس حال پر کفر، نفاق اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت میں سے تم اب ہو۔ کلبی نے کہا ہے: اہل مکہ میں سے قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ آتش جہنم میں ہے، اور یہ کہ جب اس نے ہمارا دین چھوڑ دیا اور تمہارے دین کی اتباع و پیروی کر لی تو تم نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہے! پس اس کے بارے ہمیں بتلایئے یہ کہاں سے ہوا؟ اور اس کی بھی خبر دیجئے ہم میں سے کون تمہارے پاس آئے گا؟ اور کون تمہارے پاس نہیں آیا؟ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی کفر اور نفاق میں سے جس حال پر تم ہو۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ( یہاں تک کہ وہ پلید کو پاک سے الگ الگ کر دے ) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور قول باری تعالیٰ: لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں مومنین سے مراد وہ ہیں جو ابھی صلبوں اور رحموں میں ہیں ان میں سے جو ایمان لائیں گے۔ یعنی الله تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہاری اس اولاد کو جن کے لئے ایمان کا حکم ہے اس حال پر چھوڑ دے جس حال پر شرک میں سے اب تم ہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے اور ان کے درمیان تفریق کر دے گا، اور اس بنا پر وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ نیا کلام ہوگا۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب مومنین کو ہے(3)، یعنی اور الله تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے اے گروہ مومنین! اس حال پر جس پر تم اب ہو کہ مومن اور منافق باہم مخلوط اور ملے جلے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے درمیان آزمائش اور (احکام کا) پابند بنا کر تفریق ڈال دے کہ تم پلید منافق اور پاک مومن کو پہچان لو۔ اور الله تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو احد کے دن الگ الگ کر دیا۔ یہ قول اکثر اہل معانی کا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اور نہیں ہے الله تعالیٰ کی شان کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے ) اے گروہ مومنین! یعنی نہیں ہے الله تعالیٰ کی شان کہ وہ تمہارے لئے منافقین کو معین کر دے تاکہ تم انہیں پہچان لو، البتہ وہ انہیں تمہارے لئے احکام کا پابند بنا کر اور آزمائش میں ڈال کر ظاہر کر دے گا، اور پھر وہ احد کے دن ظاہر ہو گئے، کیونکہ منافقین پیچھے رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تکلیف اور اذیت پر خوشی کا اظہار کیا، پس تم اس سے پہلے اس غیب کو نہ جانتے تھے، پس اب الله تعالیٰ نے حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405 | 2۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 407 | 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ

اور آپ کے اصحاب کو اس پر آگاہ فرما دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ لِيُطْلِعَكُمْ کا معنی ہے یعنی اور اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے جو ان سے ہوگا۔ پس قول باری تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اس قول کے مطابق (سابقہ کلام سے) متصل ہے، اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر منقطع ہے اور وہ یہ کہ کفار نے جب کہا: ہماری طرف وحی کیوں نہیں کی گئی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یعنی اس پر جو نبوت کا مستحق ہوتا ہے کہ وحی تمہارے اختیار (اور پسند) کے مطابق ہو (1)۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ البتہ اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے یعنی منتخب فرمالیتا ہے مِنْ رُّسُلِهٖ اپنے رسولوں میں سے اپنے غیب پر اطلاع اور آگاہی کے لئے مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے طلعت علی کذا اور اطلعت علیہ (میں اس پر آگاہ ہوا) اور اطلعت علیہ غیری (میں نے اس پر اپنے سوا دوسرے کو آگاہ کیا) پس یہ لازم اور متعدی (دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اور حَتّٰى يَمِيْزَ مَيِّزَ سے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے۔ اور یہی حمزہ کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے يَمِيْزَ تخفیف کے ساتھ مازیمیز سے پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: مزت الشئ بعضہ من بعض امیزہ میزا، اور میزتہ تمییزا (میں نے ایک شے کے بعض کو بعض سے الگ الگ کر دیا)

ابو معاذ نے کہا ہے: مزت الشئ امیزہ میزا (کہا جاتا ہے) جب تو دو چیزوں کو الگ الگ کرے، اور اگر اشیاء زیادہ ہوں تو تو کہے گا: فرقت بینھما، یعنی یہ تخفیف کے ساتھ ہوگا، اور اسی سے فرق الشعر (بالوں کی مانگ) بھی ہے اور اگر ایک شے کو دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کرے تو تو کہے گا: فرقتہ تفریقا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ اسی سے امتاز القوم ہے، یعنی ان کے بعض بعض سے جدا ہو گئے الگ ہو گئے، اور یکاد یتمیز کا معنی ہے یتقطع (قریب ہے کہ وہ کٹ جائے) اور اسی کے ساتھ اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر بیان کی گئی ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک: 8) (ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مارے غضب کے پھٹا چاہتی ہے) اور حدیث میں ہے: من ماز أذی من الطریق فھولہ صدقۃ (جس نے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کی تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ کہا جاتا ہے کہ کفار نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ انہیں ان کے بارے بتائیں جو ان میں سے ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ یعنی تم ایسے کاموں میں مشغول نہ ہو جو تمہارا مقصود نہیں ہیں، بلکہ تم ایسے کام میں مشغول ہو جو تمہارا مقصود ہے (اور تمہارے لئے نفع بخش ہے) اور وہ ایمان لانا ہے۔ فَاٰمِنُوْا یعنی تم تصدیق کرو۔ یعنی تم پر تصدیق کرنا واجب اور لازم ہے نہ کہ اطلاع غیب کی طرف جھانکنا (2) (اور اس سے آراستہ ہونا لازم ہے) وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم یعنی جنت ہے اور ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس نجومی تھا، پس حجاج نے اپنے ہاتھ میں چند کنکریاں لیں اور ان کی تعداد معلوم کر لی اور پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور نجومی اس تعداد تک پہنچ گیا، پھر حجاج نے اسے غافل رکھا اور کچھ کنکریاں ہاتھ میں لیں اور انہیں گنا نہیں اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور اس میں غلطی اور خطا کی، پھر اس نے حساب لگایا اور پھر غلطی کی۔ پس اس نے کہا: اے امیر! میرا خیال ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تعداد کو نہیں جانتا؟ اس نے کہا (ہاں) نہیں جانتا۔ تو اس نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر تو نے اسے گنا ہوتا تو یہ غیب کی تعریف سے نکل جاتا، اور میں حساب لگاتا تو اس تک پہنچ جاتا اور چونکہ تجھے اس کی تعداد معلوم نہیں اس لئے یہ غیب ہے، اور غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باب سورۃ الانعام میں عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

"اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں، جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے، بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن، اور اللہ کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ اس میں الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے اور مفعول اول محذوف ہے۔ خلیل، سیبویہ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے البخل خیرا لھم، یعنی بخل کرنے والے یہ گمان نہ کریں (کہ) بخل ان کے لئے بہتر ہے (1) اور چونکہ یبخلون بخل پر دلالت کر رہا ہے اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: من صدق کان خیرا لہ ای کان الصدق خیرا لہ (جس نے سچ بولا وہ سچ اس کے لئے بہتر ہے۔)

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

اذا نُهِيَ السَّفِيه جَرَى اليه وخالَفَ والسَّفِيهُ الى خِلافِ

پس معنی ہے: جری الی السفہ، پس سفیہ سفہ پر دلالت کرتا ہے۔

(جب سفیہ (احمق) کو منع کیا گیا تو وہ اسی کی طرف چلا اور اس نے مخالفت کی اور سفیہ خلاف کی طرف گیا۔)

اور رہی حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ تو وہ (حقیقت سے) بہت دور ہے، نحاس نے یہی کہا ہے اور اس کا جواز اس صورت میں ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: لا تحسبن بخل الذین یبخلون ھو خیرا لھم (2)۔ (تو ان لوگوں کے بخل کے بارے جو بخل کرتے ہیں گمان بھی نہ کر کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے۔)

زجاج نے کہا ہے: یہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کی مثل ہے (3) (یعنی مضاف محذوف ہے) اور قول باری تعالیٰ: هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ میں

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547

هُوَ بصریوں کے نزدیک ضمیر فاصلہ ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہی ضمیر عماد ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں مبتدا خبر ہونے کی حیثیت سے هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی البخل شرلھم (بخل ان کے لئے بہت برا ہے) اور سَيُطَوَّقُوْنَ میں سین وعید کی سین ہے، یعنی سوف یطوقون (انہیں طوق پہنایا جائے گا)، مبرد نے یہی کہا ہے۔ یہ آیت مال، انفاق فی سبیل اللہ، اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنے کے بارے نازل ہوئی ہے(1) اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الآیہ (التوبہ: 34)

تاویل کرنے والوں کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابووائل، ابو مالک، سدی اور شعبی رضی اللہ عنہم ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ کا معنی وہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے(2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی قیامت کے دن وہ اس کے لئے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے قیامت کے دن اسے اس کا طوق پہنایا جائے گا پھر وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں کے ساتھ پکڑ لے گا اور پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ (کنز) ہوں...... پھر یہ آیت تلاوت فرمائی...... وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الآیۃ۔(3)

اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: ''کوئی بھی جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے لئے اسے ایک زہریلے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی گردن میں اس کے ساتھ طوق پہنایا جائے گا'' پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم پر کتاب اللہ میں سے اس کا مصداق یہ آیت پڑھی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ الآیہ (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی ذی رحم (رشتہ دار) نہیں ہے جو اپنے ذی رحم کے پاس آتا ہے اور اس سے اس فضل واحسان (مراد مال) میں سے کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس ہے پس وہ اس کے بارے اس پر بخل کرتا ہے، مگر قیامت کے دن اس کے لئے جہنم سے ایک اژدھا نکالا جائے گا جو زبان (باہر نکال کر) ادھر ادھر پھیر رہا ہوگا تاکہ اسے اس کا طوق پہنائے (5)'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب اور ان کے بخل کے بارے میں اس کے بیان سے جو کچھ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے نازل ہوئی (6)۔ اور حضرت مجاہد، اور اہل علم کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے عنقریب وہ اس کی سزا برداشت کریں

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 343۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اثم مانع الزکاۃ، حدیث 1315، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 129۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1773، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 2343　　6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

گے جو انہوں نے آپ کے ساتھ بخل کیا اور یہ طاقتہ سے ماخوذ ہے، جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (البقرہ:184) (اور جو لوگ اسے مشکل سے ادا کر سکیں) اور یہ تطویق سے ماخوذ نہیں ہے(1)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے کہ ان کے لئے قیامت کے دن آگ کا طوق بنایا جائے گا(2) اور یہ پہلی تاویل کے ساتھ یعنی سدی کے قول کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اعمال کو ان کے ساتھ چمٹا دیا جائے گا جیسا کہ طوق گردن کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، کہا جاتا ہے: طُوِّق فلان عملَه طوقَ الحمامة، فلاں کو اس کے عمل کا طوق پہنایا گیا کبوتری کے طوق کی طرح، یعنی اسے اس کا عمل چمٹا دیا گیا۔ اور تحقیق الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء:13) (اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔)

اور اسی معنی میں ابوسفیان کے لئے حضرت عبدالله بن جحش رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:

أبلِغْ أبا سفيان عن أمرٍ عواقبُه ندامه

تو ابوسفیان کو اس امر کا پیغام پہنچا دے جس کا انجام ندامت اور شرمندگی ہے۔

دار ابن عمك بعتها تقضي بها عنك العرامه

تو نے اپنے چچا کے بیٹے کا گھر بیچ دیا ہے اس کے عوض تجھ سے تاوان لیا جائے گا۔

و حليفكم بالله رب الناس مجتهد القسامة

اور قسم ہے الله کی جو لوگوں کا رب ہے تمہارا حلیف قسامہ کی کوشش کر رہا ہے۔

اذهب بها اذهب بها طُوِّقْتَهَا طَوْق الحمامه

تو اسے لے جا تو اسے لے جا تجھے کبوتری کے طوق کی طرح اس کا طوق پہنایا جائے گا۔

اور یہ دوسری تاویل کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ بُخْل اور بَخَل کا لغت میں معنی یہ ہے کہ انسان کا اس حق کو (ادا کرنے) سے باز رہنا جو (حق) اس پر واجب ہو۔

پس جو کوئی اس سے باز رہا جو اس پر واجب نہیں ہوتا تو وہ بخیل نہیں ہے، کیونکہ اس پر مذمت نہیں کی جاتی ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: يَبْخلون وقد بَخلوا، (وہ بخل کرتے ہیں اور تحقیق انہوں نے بخل کیا۔ اور تمام عرب کہتے ہیں: بَخِلُوْا يَبْخُلُوْن۔ اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور بَخِلَ يَبْخَلُ بُخْلًا وَ بَخَلًا، یہ ابن فارس سے منقول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ تیسرا مسئلہ بخل کے ثمرہ اور اس کے فائدہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کی جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے۔ تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور کون سی بیماری (عیب) ہے جو بخل سے بڑھ کر ہو'' (یعنی جو بخل سے زیادہ قبیح ہو) انہوں نے عرض کی: وہ کیسے یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا: ''ایک قوم ساحل سمندر کے قریب اتری پس وہ اپنے بخل کے

---

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 409 | 2۔ ایضا

سب اپنے پاس مہمانوں کے آنے سے تنگ اور مجبور ہو گئے تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ ہم میں سے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں سے دور فاصلے پر رہیں تا کہ مرد عورتوں کے دور ہونے کے سبب مہمانوں کے سامنے معذرت کریں، اور عورتیں مردوں کے دور ہونے کے سبب ان سے معذرت کریں، پس انہوں نے ایسا کر لیا اور اسی طرح ان پر طویل وقت گزر گیا نتیجتاً مرد مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ (استمتاع کے لئے) مشغول ہو گئے (1)۔'' اسے الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** بخل اور شح میں اختلاف ہے، کیا یہ دونوں ایک معنی میں ہیں یا دو معنوں میں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: البخل الامتناع من اخراج ما حصل عندك (بخل سے مراد اس شے کو دینے اور نکالنے سے باز رہنا ہے جو تیرے پاس موجود ہو) اور الشح! الحرص علی تحصیل ما لیس عندك (شح سے مراد اس شے کو حاصل کرنے کی حرص رکھنا ہے جو تیرے پاس موجود نہیں۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شح سے مراد وہ بخل ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔ اور یہی صحیح ہے اس روایت کے مطابق جسے مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیرے اور تاریکیاں ہے اور شح (بخل) سے بچو کیونکہ اس نے انہیں تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے اس نے انہیں اس پر ابھارا ہے کہ وہ اپنے خون بہائیں اور اپنی محارم کو حلال سمجھیں (2)'' اور یہ ارشاد ان کے قول کی تردید کرتا ہے جنہوں نے کہا کہ بخل واجب کو روکنا (اور اسے ادا نہ کرنا) ہے اور شح مستحب کو روکنا ہے۔ کیونکہ اگر شح مستحب کو روکنا ہوتا تو وہ اس عظیم اور شدید وعید کے تحت داخل نہ ہوتا، اور شدید مذمت وہی ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ہلاکت ہو۔

اور اس معنی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں اڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں ایک مسلمان آدمی کے نتھنوں میں ہمیشہ کے لئے جمع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی شح (بخل) اور ایمان ایک مسلمان آدمی کے دل میں ہمیشہ جمع رہ سکتے ہیں (3)۔'' اور یہ اس پر دلیل ہے کہ شح مذمت میں بخل سے زیادہ شدید ہے، مگر بلاشبہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو ان دونوں کے مساوی اور برابر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہے...... آپ سے پوچھا گیا: أیکون المؤمن بخیلاً؟ کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: لا نہیں۔

اور الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو کہا: ''تمہارا سردار کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے، الحدیث۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باقی رہنے اور اپنی بادشاہی کے دائمی ہونے

---

1۔ المستدرک، معرفۃ الصحابۃ، جلد 3، صفحہ 242، حدیث نمبر 4965
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2
3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 55

کی خبر دی ہے اور یہ کہ وہ ابد میں اسی طرح ہے جیسے وہ ازل میں تھا اور وہ العالمین سے غنی (اور بے نیاز) ہے، پس وہ زمین کا وارث ہوگا اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور ان کی املاک زائل اور ختم ہونے کے بعد، پس املاک اور اموال باقی رہیں گے لیکن ان کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو یہ مخلوق کی عادت اور عرف کے مطابق وراثت کے جاری ہونے کی طرح ہی یہ (حکم) جاری ہوگیا، حالانکہ حقیقت میں یہ میراث نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں وارث وہ ہے جو کسی (ایسی) شے کا وارث بنتا ہے جس کا وہ اس سے قبل مالک نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ تو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کا ہے، اور اموال اپنے مالکوں کے پاس عاریۃً (ادھار) ہیں، پس جب وہ مرتے ہیں تو عاریہ کو اس کے اس مالک کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کا وہ اصل میں ہوتا ہے اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا الآیہ (مریم: 40) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔)

اور دونوں آیتوں میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خرچ کریں اور وہ بخل نہ کریں اس سے قبل کہ وہ مر جائیں اور وہ اسے بطور میراث اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ جائیں، اور انہیں کوئی نفع نہ دے گا سوائے اس کے جو انہوں نے خرچ کر دیا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

"بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ اللہ تعالیٰ نے کفار بالخصوص یہود کے قول کی قباحت (اور برائی) ذکر فرمائی۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن) تو یہودیوں میں سے ایک گروہ نے کہا ... ان میں سے حیی بن اخطب تھا، یہ حسن کے قول کے مطابق ہے اور حضرت عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ فنحاص بن عازوراء تھا ... اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) (بے شک اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم غنی (اور دولت مند) ہیں وہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے۔ بلاشبہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 548، دار الکتب العلمیہ

انہوں نے اپنے ضعفاء اور کمزوروں پر اظہار برتری کے طور پر سنانے کے لئے یہ کہا، نہ کہ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے، کیونکہ وہ اہل کتاب تھا۔ لیکن انہوں نے اس قول کے ساتھ کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اس سے اپنے ضعفاء کو اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو شک میں ڈالنے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا ارادہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے، کیونکہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا یعنی ہم انہیں اس پر جزا اور بدلہ دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال ناموں میں لکھ لیں گے، یعنی ہم کراماً کاتبین کو ان کا قول لکھ لینے اور ثابت رکھنے کا حکم دیں گے تا کہ وہ قیامت کے دن اپنے انہیں اعمال ناموں میں اسے پڑھیں جو انہیں دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ ان کے خلاف حجت کو اور پختہ اور مؤکد کرنے والا ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝ (الانبیاء) (اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لکھنے سے مقصود محفوظ رکھنا ہے، یعنی ہم اسے محفوظ رکھیں گے جو انہوں نے کہا تا کہ ہم انہیں بدلہ اور جزا دیں، اور مَا قَالُوْا میں مَا، سَنَكْتُبُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اور اعمش اور حمزہ نے سیکتب پڑھا ہے۔ یعنی یا کے ساتھ تو اس صورت میں ما، اسم ما لم یُسم فاعلہ (نائب الفاعل) ہوگا۔ اور حمزہ نے اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کا اعتبار کیا ہے: وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی ہم ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عمل کو لکھ لیں گے، یعنی ان کے قتل کے ساتھ رضامند ہونے کو۔ اور ان سے مراد ان کے اسلاف کا انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا ہے، لیکن جب وہ اس پر راضی اور خوش ہیں تو اس کی اضافت ان کی طرف کرنا صحیح ہے۔ ایک آدمی نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا اقدام قرار دیا تو حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کہا: تو بھی ان کے خون میں شریک ہے، پس آپ نے رضا بالقتل کو قتل ہی قرار دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس حیثیت سے کہ رضا بالمعصیت معصیت ہوتی ہے۔ ابوداؤد نے عرس بن عمیرہ الکندی سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تو نے زمین میں خطا اور گناہ کا عمل کیا تو جو وہاں حاضر تھا اس نے اسے ناپسند کیا...... اور ایک بار فرمایا پس اس نے اس کا انکار کیا...... تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ تھا اور جو وہاں سے غائب تھا لیکن اس نے اسے پسند کیا تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود اور حاضر تھا (1)۔'' اور یہ نص ہے۔ قولہ تعالیٰ: بِغَيْرِ حَقٍّ اسکا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ یعنی جہنم میں ان کو کہا جائے گا یا موت کے وقت یا حساب کے وقت یہ کہا جائے گا۔ پھر یہ قول یا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا یا فرشتوں کی جانب سے، دونوں قول ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ویقال ہے۔ اور الحریق شعلہ نکالنے والی آگ کا اسم ہے، اور النار کا لفظ شعلہ نکالنے والی اور شعلہ نہ نکالنے والی آگ دونوں کو شامل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یعنی وہ عذاب ان گناہوں کے عوض ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور الایدی کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے تا کہ وہ فعل کے بذات خود کرنے پر دلالت کرے، کیونکہ کبھی فعل کی نسبت انسان کی طرف

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 241

کردی جاتی ہے اس معنی میں کہ اس نے وہ کام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے یُذَبِّحُ ابناء ھم اور اَیۡدِیۡکُمۡ اصل میں آیدیکم تھا ضمہ کو یا پر ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ جَآءُوۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۱۸۴﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھالے اس کو آگ آپ فرمایئے آچکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو۔ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۔''

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیۡنَ محل جر میں ہے اور یہ اس الَّذِیۡنَ سے بدل ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا یا یہ لِلۡعَبِیۡدِ کی صفت ہے یا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ھم الذین قالوا۔ اور کلبی وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا، فنحاص بن عازوراء اور ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، حالانکہ اس نے ہم پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جو گمان کرتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھالے، پس اگر تم ہمارے لئے وہ (دلیل) لے آئے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تورات میں ہے، لیکن مکمل کلام یہ ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آجائیں پس جب وہ دونوں تمہارے پاس آئیں تو ان دونوں کے ساتھ بغیر قربانی کے ایمان لاؤ۔

اور یہ قول بھی ہے: قربانی دینے والوں کا امر ثابت اور قائم تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ ان میں سے نبی علیہ السلام قربانی ذبح کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے تو پھر سفید سی آگ نازل ہوتی، اس کی آواز ہوتی اور وہ گھیر لیتی، اس کا دھواں نہ ہوتا، اور وہ قربانی کو کھا جاتی۔ پس یہ قول یہود کی طرف سے دعویٰ ہے، اور جب وہاں استثنا ہوئی یا نسخ تو انہوں نے اسے چھپا دیا، اور وہ اس سے اپنے استدلال میں سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان کے دعویٰ کو باطل کرنے میں دلیل قاطع ہیں، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

اور جس کا صدق ثابت ہو اس کی تصدیق بھی ثابت ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجئے: قَدْ جَآءَكُمْ اے گروہ یہود! آ چکے تمہارے پاس رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ (رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ جو تم کہہ رہے ہو) یعنی قربانی فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو) یعنی حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا علیہم السلام اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام جو قتل کر دیئے گئے اور تم ان کے ساتھ ایمان نہ لائے۔ اس سے مراد ان کے اسلاف ہیں (1)۔ اور یہی وہ آیت ہے جسے عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت کیا، اور اس کے ساتھ اس پر حجت قائم کی جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا قرار دیا جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو قاتل کا نام دیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اگرچہ ان کے درمیان تقریباً سات سو برس کا فاصلہ اور فرق تھا۔ اور القربان سے مراد قربانی، صدقہ، اور عمل صالح میں سے وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ فعلان کے وزن پر ہے اور القربۃ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اسم اور مصدر ہو سکتا ہے، پس اسم کی مثال سلطان اور برہان ہے۔ اور مصدر کی مثال عدوان اور خسران ہے اور عیسیٰ بن عمر بِقُرُبَانٍ قاف کے ضمہ کی اتباع میں را کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے تھے (2)، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع میں ظُلُمات اور حُجرۃ کی جمع میں حُجُرات کہا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اور آپ کی غمخواری کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تحقیق آپ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے جو دلائل کے ساتھ آئے تھے۔ وَالزُّبُرِ یعنی اور لکھی ہوئی کتابیں۔ اور زبر یہ زبور کی جمع ہے اور یہ کتاب ہے۔ اور اس کی اصل زبرت ای کتبت سے ہے یعنی میں نے لکھا۔ اور ہر زبور پس وہ کتاب ہے۔

امرؤالقیس نے کہا ہے:

لِمَنْ طَلَلٌ ابصرتُه فشجانِی     كخط زبور فی عسیبِ یمانی

اس میں بھی زبور سے مراد کتاب ہے۔

اور انا أعرف تَزْبِرَتِی ای کتابتی۔ یعنی میں اپنی کتابت (لکھائی) کو پہچانتا ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبور زبر بمعنی زجر (جھڑکنا) سے ماخوذ ہے (3)۔ اور زبرتُ الرجلَ کا معنی ہے میں نے آدمی کو جھڑکا (ڈانٹ پلائی) اور زبرت البئر کا معنی ہے میں نے کنوئیں کو پتھروں سے بنایا۔ اور ابن عامر نے بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ دونوں کلموں کو با کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے (4) اور اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ یعنی واضح اور روشن کتاب لے کر آئے، یہ تیرے اس قول سے ہے: أنرت الشیٔ أنیرہ، یعنی میں نے

---

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 441
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ
3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 411
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

اسے واضح اور روشن کر دیا۔ کہا جاتا ہے: نار الشئ و أنارہ و تورہ و استنارہ یہ ہم معنی ہیں، اور ان دونوں میں سے ہر ایک لازم اور متعدی ہے۔ اور زبر اور کتاب کو جمع کیا..... حالانکہ یہ دونوں بھی ہم معنی ہیں ..... اس لئے کہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں اور ان کی اصل وہی ہے جیسے ہم نے ذکر کر دی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۱۸۵

''ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن پس جو شخص بچا لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب الله تعالیٰ نے بخل کرنے والوں اور ان کے کفر کے بارے ان کے اس قول میں خبر دی: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ اور مومنین کو ان کی اذیت پر صبر کرنے کے بارے اپنے اس قول میں حکم ارشاد فرمایا لَتُبْلَوُنَّ الآیہ ..... (تو پھر) بیان کیا کہ وہ ختم ہو جانے والی چیزوں میں سے ہے اور وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، کیونکہ دنیا کی انتہا اور اختتام قریب ہے اور قیامت کا دن یوم جزا (بدلے کا دن) ہے۔ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ یہ ذوق سے ماخوذ ہے اور یہ (موت) ایسی شے ہے جس سے انسان کو پناہ نہیں، اور نہ ہی اس سے کوئی حیوان الگ اور جدا ہے (یعنی ہر ذی روح کو موت آنا یقینی ہے۔)

امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

من لم یمت عبطة یمت ھَرَمًا     للموت کأس والمرُ ذائقھا

جو عین عالم شباب میں نہیں مرتا اسے بڑھاپے میں موت آجاتی ہے موت تو (شراب سے بھرا ہوا) ایک جام ہے اور آدمی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

الموت باب و کل الناس داخلہ     فلیت شعری بعد الباب ماالدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام لوگ اس سے داخل ہونے والے ہیں اے کاش مجھے علم ہوتا اس دروازے کے بعد گھر کون سا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ عام قرأت ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ اضافت کے ساتھ ہے اور اعمش، یحییٰ اور ابن ابی اسحاق نے ذائقة الموت یعنی ذائقۃ کو تنوین کے ساتھ اور الموت کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ موت کے بعد تو کوئی ذائقہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم فاعل کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بمعنی ماضی ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ بمعنی استقبال ہو، پس اگر تو پہلا معنی مراد لے گا تو اس میں تو صرف مابعد کی طرف اضافت ہی ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: ھذا ضَارِبُ زیدٍ امس اور قَاتِلُ بکرٍ امس، کیونکہ اسے اسم جامد کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور وہ علم ہے، جیسے غلامُ زیدٍ اور صاحب بکرٍ۔

شاعر نے کہا ہے:

الحافِظُو عورةِ العشیرة لایَأ　　تیھم من وَرَائھم وَکَفُ

(اس میں الحافظو اسم مابعد کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہو رہا ہے۔)

اور اگر دوسرا معنی مراد لیں تو جر جائز ہے اور نصب اور تنوین کی بھی یہی صورت ہے اور یہی اصل ہے، کیونکہ یہ (اسم فاعل) قائم مقام فعل مضارع کے ہوتا ہے اور اگر فعل غیر متعدی ہو، تو پھر یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے قائم زید اور اگر وہ متعدی ہو تو تو اسے متعدی بنائے اور اس کے ساتھ نصب دے اور یہ کہے: زیدٌ ضَاربٌ عمروا بمعنی یضرب عمروا۔ اور تخفیف کے لئے تنوین کا حذف اور اضافت جائز ہوتی ہے۔

جیسا کہ المراز نے کہا ہے:

سَلِّ الهمومَ بکل مُعطِی رأسه　　فاج مُخالِطِ صُهْبةٍ مُتَعَیِّس

مُغْتَالِ أَحْبُلِه مبینٍ عُنُقُه　　فی مَنْکِبٍ زَیَنَ المُطِیَّ عَمَنْدَسِ

تنوین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اصل میں: معطٍ رأسَه تنوین اور نصب کے ساتھ ہے، اور اس کی مثل قرآن کریم میں بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اور یہ اس کی مثل نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ پھر تو جان کہ موت کے کچھ اسباب اور اس کی کچھ علامات ہیں، پس بندۂ مومن کی موت کی علامات میں سے پیشانی پر پسینہ کا آنا ہے۔ اسے نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بندۂ مومن پیشانی کے عرق آلود ہونے کے ساتھ فوت ہوتا ہے (1)۔'' اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور جب وہ قریب المرگ ہو تو اسے شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ (2) (اپنے مرنے والوں کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو) تاکہ یہ اس کا آخری کلام ہو اور اس کی زندگی کا اختتام کلمہ شہادت کے ساتھ ہو، اور اس پر بار بار اس کا اعادہ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان اور تنگ نہ ہو جائے۔

اور اس وقت سورۃ یٰسین پڑھنا مستحب ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اقرؤا یٰس علی موتاکم (3) (اپنے مرنے والوں پر یٰسین پڑھو۔) اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور علامہ الآجری نے کتاب النصیحہ میں حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من میت یقرء عندہ سورۃ یٰس الاھون

---

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 259　2۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 300

3۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 89

علیہ الموت (1) (جس مرنے والے کے پاس سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے اس پر موت آسان کر دی جاتی ہے) پس جب روح قبض کی جاتی ہے اور نگاہ روح کی اتباع اور پیچھا کرتی ہے...... جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اور یہ صحیح مسلم میں ہے ..... اور عبادات اٹھ جاتی ہیں اور پابندی (تکلیف) ختم ہو جاتی ہے، تو زندوں پر کچھ احکام لازم ہوتے ہیں، ان میں سے اس کی آنکھیں بند کرنا، اور اس کے نیک اور صالح بھائیوں دوستوں کو اس کی موت کی خبر دینا ہے، اور ایک قوم نے اسے مکروہ کہا ہے اور کہا ہے یہ موت کی خبر اور اعلان ہے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، ہم نے اسے کسی دوسرے مقام پر بیان کیا ہے اور ان احکام میں سے غسل و دفن کے ساتھ اس کی تیاری کرنا بھی ہے تاکہ اس میں تغیر اور تبدیلی نہ آجائے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم سے کہا جنہوں نے اپنی میتوں کو دفن کرنے میں تاخیر کی: عجلوا بدفن جیفتکم اپنے مردوں کو دفن کرنے میں جلدی کرو) اور مزید فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ الحدیث (جنازہ لے جانے میں جلدی کرو) اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور رہا میت کے غسل کا مسئلہ تو یہ سوائے شہید کے تمام مسلمانوں کے لئے سنت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میت کو غسل دینا واجب ہے۔ قاضی عبدالوہاب نے یہی کہا ہے۔ اور پہلا کتاب کا مذہب ہے، اور ان دونوں قولوں پر علماء کا عمل ہے اور اختلاف کا سبب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے ام عطیہ کو اپنی بیٹی زینب کو غسل دینے کے بارے میں فرمایا، جیسا کہ وہ مسلم میں موجود ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ حضرت ام کلثوم تھیں، جیسا کہ ابوداؤد کی کتاب میں موجود ہے: ''تم انہیں تین یا پانچ یا اس سے زیادہ بار غسل دینا اگر تم اسے دیکھو (2)'' الحدیث۔ یہ حدیث علماء کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بارے میں اصل ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ اس امر سے مراد غسل کا حکم بیان کرنا ہے کہ وہ واجب ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مقصود غسل کی کیفیت کی تعلیم ہے لہٰذا اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو غسل کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ان رایتنّ ذالك دلالت کرتا ہے اور یہ امر کے ظاہر کو وجوب سے نکالنے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی نظر و فکر کے سپرد کر دیا۔

ان کو کہا گیا: اس میں یہ بعد اور دوری ہے، کیونکہ تمہارا اِنْ رَایتُنَّ کو امر کی طرف لوٹانا، یہ فہم میں جلدی آنے والا نہیں ہے بلکہ یہ بالفور اس شرط کو مذکورہ (مفہوم کے) اقرب کی طرف لوٹانے کا ذریعہ ہے، اور وہ ''اس سے اکثر اور زیادہ ہے'' یا پھر اعداد میں تخییر کی طرف لوٹاتا ہے۔

المختصر اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میت کو غسل دینا مشروع ہے شریعت میں اس پر عمل کیا گیا ہے اسے (کبھی) نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کا طریقہ غسل جنابت کے طریقہ کی طرح ہے جیسا کہ معروف ہے۔ اور بالاجماع ایک میت کو غسل دینے میں سات بار غسل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اسے ابوعمر نے بیان کیا ہے۔ اگر ساتویں بار غسل دینے کے بعد اس سے کوئی شے خارج ہو تو صرف اس مخصوص جگہ کو دھو ڈالا جائے گا، اور اس کا حکم جنبی کے حکم کی طرح ہے جبکہ اسے غسل کے بعد

---

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 4، صفحہ 32

2۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً صحیح بخاری، باب غسل المیت و وضوئه بالماء والسدر، حدیث نمبر 1175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدث لاحق ہو جائے، جب میت کے غسل سے فارغ ہو جائے تو اسے اس کے کپڑوں میں کفن دو اور وہ یہ ہیں۔
عام علماء کے نزدیک کفن دینا واجب ہے، پس اگر اس کا مال ہو تو پھر عام علماء کے نزدیک اس کے رأس المال سے کفن دیا جائے گا، مگر طاؤس نے یہ کہا ہے کہ اس کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے تیسرے حصہ سے ہی کفن دیا جائے گا۔
اور اگر میت ان میں سے ہو کہ اس کا نفقہ اس کی زندگی میں ہی کسی اور کے ذمہ لازم ہو مثلاً آقا کے ذمہ...... اگر وہ غلام ہو ...... یا باپ یا خاوند یا بیٹے کے ذمہ، تو بالاتفاق (کفن) ان پر ہی ہوگا، پھر بیت المال پر یا مسلمانوں کی جماعت پر کفن کفایہ ہوگا اور وہ شے جو اس میں سے تعیین فرض کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے وہ ستر عورت (شرمگاہ کو ڈھانپنا) ہے اور اگر اس میں فالتو اور اضافی کپڑا ہو لیکن وہ سارے بدن کو نہ ڈھانپ سکتا ہو تو پھر اس کے چہرہ کی تکریم میں اس کے سر اور چہرہ کو ڈھانپا جائے گا اور اس کے محاسن کی تبدیلی میں سے جو ظاہر ہوا سے ڈھانپ دیا جائے اور اس میں اصل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، کیونکہ انہوں نے احد کے دن ایک کمبل چھوڑا جب آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو آپ کے پاؤں اس سے نکل جاتے، اور جب آپ کے پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو آپ کا سر باہر نکل جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسے ان کے سر پر ڈال دو اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دو (1)۔'' اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔
اور تمام علماء کے نزدیک کفن میں کپڑوں کا طاق (وتر) ہونا مستحب ہے، اور تمام کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں کوئی مخصوص حد نہیں ہے اور پھر کپڑوں کا سفید ہونا مستحب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: البسوا من ثیابکم البیاض فانھا من خیر ثیابکم و کفنوا فیھا موتاکم (2) (تم اپنے سفید کپڑے پہنو کیونکہ یہ لباس تمہارے کپڑوں میں سے بہترین ہے اور اسی میں تم اپنے مردوں کو کفن دو) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سحول کے بنے ہوئے روئی کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا اور کسی اور رنگ کے کپڑے میں بھی کفن دینا جائز ہے مگر یہ کہ وہ خالص ریشم یا اون ملا ریشمی کپڑا نہ ہو۔ اور اگر ورثاء کفن میں بخل سے کام لیں تو پھر ان پر جمعہ اور عیدین کے دنوں میں پہنے جانے والے لباس کی مثل کپڑا لازم کر دیا جائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ (3) (جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اچھے کپڑے میں کفن دے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ مگر یہ کہ وہ اس سے کم کے بارے وصیت کرے۔ اور اگر اس نے اسراف (فضول خرچی) کی وصیت کی تو کہا گیا ہے: (ضرورت سے) زائد میں (اس کی وصیت) باطل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ (لیکن) پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم فضول خرچی نہ کرو) اور ابوبکر نے کہا ہے: بے شک یہ میت کے بدن سے نکلنے والی پیپ کے لئے ہے۔ اور جب وہ اس کے غسل اور اسے کفن پہنانے سے فارغ ہو جائے اور اسے چارپائی پر رکھ دیا جائے اور اسے آدمی اپنے کندھوں پر اٹھائیں تو اس کا حکم یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس کے لئے حکم تیز چلنے کا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ فان تک

---

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 305۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، الطب، جلد 2، صفحہ 185
3۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 306

صالحۃ فخیر تقدمونھا الیہ وان تکن غیر ذالک فشر تضعونہ عن رقابکم (1) (تم میت کو لے کر تیز چلو پس اگر وہ نیک اور صالح ہے تو اچھا اور بہتر ہے تم اسے اس تک جلدی پہنچا دو گے اور اگر وہ اس کے سوا ہے تو وہ برا ہے تم اسے جلدی اپنی گردنوں سے اتار دو گے) (2) اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آج جاہل لوگ آہستہ آہستہ لے کر چلتے ہیں، اور بار بار راستے میں ٹھہرتے ہیں، اور ایسی سر اور آواز کے ساتھ قرآن کریم کی قرآت کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے اور وہ بھی جائز نہیں ہے جو مصری شہروں کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ نسائی نے روایت کیا ہے کہ محمد بن عبدالاعلی نے ہمیں خبر دی ہے انہوں نے کہا کہ خالد نے اور اسے عیینہ بن عبدالرحمن نے خبر دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا ہے کہ میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں حاضر ہوا اور زیاد نکل کر چار پائی کے آگے آگے چلنے لگا اور عبدالرحمن کے خاندان کے لوگ اور ان کے موالی چار پائی اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر چل رہے تھے اور کہتے تھے: آہستہ آہستہ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے: پس وہ رینگ رینگ کر چل رہے تھے (یعنی انتہائی آہستہ رفتار سے) یہاں تک کہ جب ہم مربد کا کچھ راستہ طے کر چکے تو ہمیں پیچھے سے خچر پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ آکر ملے۔ پس جب آپ نے انہیں وہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان پر اپنے خچر سے حملہ کر دیا اور ان پر کوڑا برسایا اور فرمایا: تم چھوڑ دو! قسم ہے سب سے مکرم و محترم ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور ہم میت کو لے کر دوڑتے چلے جاتے تھے تو اس سے قوم خوش ہو گئی (3)۔

اور ابو ماجدہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے پوچھا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ دوڑ کی چال سے ذرا کم ہو اگر وہ میت نیک اور صالح ہوئی تو بہتر ہے اسے اس تک جلدی پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ اس کے سوا ہوئی تو پھر اہل نار سے دور رہو (4)۔" الحدیث۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں جس پر علماء کی جماعت ہے (وہ یہ ہے) کہ عام عادت سے چال تھوڑی تیز ہو، اور تیزی ان کے نزدیک آہستہ چال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ایسی تیزی جوان کمزور اور ضعیف لوگوں کے لئے باعث مشقت ہو جو جنازہ کے پیچھے چل رہے ہیں وہ مکروہ ہے اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: میت کو لے کر تھوڑا آہستہ چلو (لیکن) یہود و نصاریٰ کی طرح رینگ رینگ کر نہ چلو۔ اور ایک قوم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں الاسراع کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد دفن میں جلدی کرنا ہے نہ کہ چلنے میں، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ و باللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اور رہی میت پر نماز جنازہ تو یہ جہاد کی طرح واجب (فرض) علی الکفایہ ہے۔ یہی علماء کا مشہور مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کا بھی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے بارے میں فرمایا: قوموا فصلوا علیہ (تم اٹھو اور اس پر نماز پڑھو) اور اصبغ نے کہا ہے: نماز جنازہ سنت ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے، اس بارے میں مزید بیان سورۃ براۃ میں آئے گا۔

---

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 307-306

2۔ صحیح بخاری، باب السرعۃ بالجنازہ، حدیث 1231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 271

4۔ ابوداؤد، باب الاسراع بالجنازہ، حدیث 2769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 7**۔ میت کو مٹی میں دفن کرنا، اس میں چھپانا اور اسے مٹی کے ساتھ ڈھانپ دینا یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ (المائدہ: 31) (پس بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تاکہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی)

اس آیت کے تحت قبر بنانے کا حکم اور جو کچھ اس میں سے مستحب ہوتا ہے اور اس میں میت کو رکھنے کی کیفیت ذکر کی جائے گی اور اس پر مسجد بنانے کا حکم سورۃ ''الکہف'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس یہ مردوں سے متعلقہ احکام ہیں اور وہ جو زندوں پر ان کے لیے واجب ہوتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مردوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے (1)۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور سنن نسائی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ام المومنین نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک مرنے والے کا ذکر برائی کے ساتھ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے ہلاک ہونے والوں کا ذکر نہ کرو مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ (2)۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پس مومن کا اجر ثواب ہے، اور کافر کا اجر عقاب (سزا) ہے دنیا میں نعمتوں اور آزمائش و مصائب کو اجر اور جزا میں شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ فنا ہونے والی ہیں۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ پس جسے آتش جہنم سے دور رکھا گیا۔ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ اس کے ساتھ کامیاب ہو گیا جس کی وہ آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور اس سے وہ نجات پا گیا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اعمش نے زید بن وہب سے، انہوں نے عبدالرحمن بن عبد رب الکعبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من سرہ ان یزحزح عن النار وان یدخل الجنۃ فلتأتہ منیتہ وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ ویاتی الی الناس الذی یحب ان یوتی الیہ (3) (جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ اسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کیا جائے تو چاہیے کہ اس کی موت اسے اس حال میں آئے کہ وہ شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگوں کے پاس وہ (شے) لے کر آئے جسے وہ پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس لائی جائے۔) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں کوڑے (برابر) جگہ دینا اور اس میں موجود تمام چیزوں کی نسبت بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔ (4)

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی دنیا مومن کے ساتھ مکر کرتی ہے اور اسے دھوکہ دیتی ہے اور وہ اس کے طویل

---

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 274۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ماینھی من سب الاموات، حدیث 1306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً

3۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، البر والصلۃ، جلد 6، صفحہ 340، حدیث نمبر 13669

4۔ المستدرک التفسیر، جلد 2، صفحہ 327، حدیث نمبر 3170۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من رسول اللہ، حدیث 2939، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرصہ تک باقی رہنے کا گمان کرنے لگتا ہے حالانکہ دنیا فانی ہے۔ اور متاع سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے لطف اندوز ہوا جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے، جیسا کہ کلہاڑا، ہانڈی اور پیالہ پھر یہ زائل اور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔

حسن نے کہا ہے: جیسا کہ سرسبز و شاداب نباتات اور بچیوں سے دل بہلانا اس کا کوئی حاصل اور نتیجہ نہیں۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ چھوڑا ہوا ساز و سامان ہے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت برباد اور تباہ ہو جائے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس سامان سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے اتنا لے لے جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

تحقیق کسی نے کتنا خوب اور اچھا کہا ہے:

هي الدار دار الأذى والقذى و دار الفناء و دار الغِيَرْ

یہ (دنیا) اذیتوں اور تکلیفوں کا گھر ہے اور یہ فناء ہونے والا اور تکبر و نخوت کا گھر ہے۔

فلو نِلتَها بحذافيرها لُمُتَّ ولم تقض منها الوَطَرْ

پس اگر تو اسے مکمل طور پر بھی پالے تو یقیناً تجھے موت آئے گی اور تیرا مطلوب حاصل نہ ہوا ہوگا۔

أيامن يؤمّل طول الخلود و طُولُ الخلود عليه ضَرَرْ

اے وہ جو اس سے طویل آرزوئیں وابستہ رکھتا ہے اس پر ہمیشہ کی آرزو رکھنا باعث ضرر ہے۔

اذا انت شِبْت و بان الشباب ولا خير في العيش بعد الكِبَرْ

جب تو بوڑھا ہو جائے گا اور جوانی ڈھل جائے گی تو پھر بڑھاپے کے بعد زندگی میں کوئی مزہ اور خیر نہیں۔

اور **الْغُرُوْرِ** (عین کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی شیطان ہے، وہ لوگوں کو جھوٹے وعدوں اور تمناؤں کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے، ابن عرفہ نے کہا ہے: غرور سے مراد وہ شے ہے جسے تو ظاہراً دیکھے تو تو اسے پسند کرے، اور اس کا باطن مکروہ (ناپسندیدہ) یا مجہول ہو۔ اور شیطان کمزور ہے، کیونکہ وہ نفس کی محبت پر ابھارتا ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ برا ہوتا ہے۔ فرمایا: اس سے بیع الغَرَر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع کا ظاہر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔"

یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے اور معنی یہ ہے: تم آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تمہارا امتحان لیا جائے

گا اپنے مالوں میں مصائب کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تکلیف کے ساتھ اور تمام شرعی پابندیاں لگانے کے ساتھ۔ اور جانوں میں آزمائش موت، امراض میں مبتلا کرنے اور دوست احباب کے فوت ہونے کے ساتھ ہوتی ہے چونکہ مالوں کے سبب مصائب زیادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے ذکر اموال کا فرمایا وَلَتَسْمَعُنَّ اگر کہا جائے: لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کیوں ثابت رہی اور وَلَتَسْمَعُنَّ سے کیوں حذف کردی گئی، تو جواب یہ ہے کہ لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کا ماقبل مفتوح ہے پس اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دے دی گئی، اور حرکت بھی ضمہ دی گئی اس لئے کہ یہ واؤ جمع ہے، اور اس کا حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت نہیں کرتی، اور وَلَتَسْمَعُنَّ میں واؤ کو حذف کردیا گیا کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت کر رہی ہے۔ (اور وہ حرکت ماقبل کا ضمہ ہے) اور لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کو ہمزہ سے بدلنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کی حرکت عارضی ہے، نحاس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور واحد مذکر کے لئے کہا جائے گا: لَتُبْلَيَنَّ یا رَجُلُ اور تثنیہ کے لئے: لَتُبْلَيَانِّ یا رجلان اور جمع مذکر کے لئے لَتُبْلَوُنَّ کہا جائے گا، اور اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) اس نے یہ کلمات قرآن کریم کا رد کرتے ہوئے اور اس کو حقیر سمجھتے ہوئے اس وقت کہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے تھپڑ دے مارا، اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کی شکایت کی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ وہ کہنے والا فنحاص یہودی تھا، یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اور زہری نے کہا ہے: وہ کعب بن اشرف تھا اس کے سبب یہ آیت نازل ہوئی، وہ شاعر تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کفار قریش کو جمع کرتا تھا، اور مسلمان عورتوں کے ذکر سے اپنے قصیدہ کو مزین کرتا تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف حضرت محمد بن مسلم رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو بھیجا اور انہوں نے اسے قتل کردیا۔ کتب سیر اور صحیح اخبار میں اس کا قتل مشہور ہے، اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں (2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں یہودی اور مشرک تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام بہت زیادہ اذیت ناک باتیں سنتے تھے۔ اور صحیحین میں ہے (3) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن ابی کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گدھے پر سوار تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ابن ابی نے کہا: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہے تو آپ اس کے ساتھ ہماری مجالس میں ہمیں تکلیف اور اذیت نہ دیں! آپ اپنی سواری کی طرف لوٹ جائیں پس جو آپ کے پاس آئے تو اس پر اسے بیان کیجئے اور اس نے اپنی ناک پکڑ لی تاکہ گدھے کا غبار اس تک نہ پہنچے، تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیے کیونکہ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب قتل کعب بن الاشرف، حدیث نمبر 3731، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ مشرک جو ابن ابی کے پاس موجود تھے وہ اور مسلمان باہم گالی گلوچ کرنے لگے، اور حضور نبی کریم ﷺ مسلسل انہیں خاموش کراتے رہے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہ بیمار تھے اور فرمایا: ''کیا تم نے وہ سنا ہے جو فلاں نے کہا ہے؟'' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ اسے معاف فرما دیجئے اور اس سے درگزر کیجئے، قسم ہے اس کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے بالیقین اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حق کے ساتھ بھیجا ہے جو (آپ پر) نازل ہوا ہے، حالانکہ اس شہر کے باسیوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ اسے تاج پہنائیں اور اسے سردار بنالیں، تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس حق کے ساتھ رد کر دیا ہے جو آپ کو اس نے عطا فرمایا ہے تو اس کے سبب وہ تنگ اور پریشان ہے، اسی لئے اس نے وہ کیا ہے جو آپ نے دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر فرمائی، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے صبر اور تقویٰ کو مستحب قرار دیا اور یہ خبر دی کہ یہ عزم الامور (ہمت کے کاموں) میں سے ہے اور اسی طرح بخاری میں (1) سیاق حدیث میں ہے کہ یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اظہر یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ احسن انداز میں اور نرمی کے ساتھ جھگڑنا، مجادلہ کرنا ہمیشہ مستحب رہا ہے۔ اور آپ ﷺ باوجود اس کے کہ آپ پر قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا آپ یہود کے ساتھ صلح کرتے تھے اور ان سے نرمی برتتے تھے، اور منافقین سے درگزر فرماتے تھے، اور یہ بالکل بین اور ظاہر ہے اور عزم الامور کا معنی کاموں کا مضبوط اور پختہ اور سخت ہونا ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (الٹا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت سو بہت بری ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ یہود کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ انہیں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے اور آپ کی شان کے بیان اور وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا، تو انہوں نے آپ کی نعت اور تعریف کو چھپا لیا۔ پس یہ آیت ان کے لئے زجر و توبیخ ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عام خبر ہے۔ حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس کے بارے میں ہے جسے کتاب میں سے کسی شے کا علم دیا گیا پس جو کسی شے کا عالم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم دے، اور تم علم چھپانے سے بچو کیونکہ یہ

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 256-255

ہلاکت ہے (1) اور حضرت محمد بن کعب نے کہا ہے: کسی عالم کے لئے یہ حلال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علم پر خاموش رہے اور نہ کسی جاہل کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جہالت پر خاموش رہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اور ارشاد فرمایا: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (النحل) (پس دریافت کرلو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کتاب کا علم رکھنے والوں سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی شے نہ بتاتا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔(2)

اور حضرت حسن بن عمارہ نے کہا ہے: میں حضرت زہری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس کے بعد کہ انہوں نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا تھا، تو میں نے انہیں اپنے دروازے پر پالیا، میں نے عرض کی: اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو مجھے حدیث بیان فرمایئے۔

تو انہوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے؟ میں نے عرض کی: یا آپ مجھے حدیث بیان کریں اور یا میں تم سے حدیث بیان کروں گا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے بیان کرو۔ تو میں نے کہا: مجھے حکم ابن عتیبہ نے یحییٰ بن جزار سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے وعدہ نہیں لیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں بلکہ اس نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ وہ علم سکھائیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر انہوں نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ میں ھا ضمیر حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ آپ کا ذکر جاری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر) کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا بیان داخل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب میں ہے۔ اور فرمایا: وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ یہاں تَكْتُمُنَّهٗ نہیں فرمایا کیونکہ یہ حال کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اسے بغیر چھپائے کھول کر بیان کرتے ہو۔ اور ابو عمرو اور عاصم نے ابوبکر اور اہل مکہ کی ایک روایت میں لَتُبَیِّنُنَّهٗ خطاب کی حکایت کے طور پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ کیونکہ وہ غائب تھے (3)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے واذ اخذ الله میثاق النبیین لیبیننه پڑھا ہے اور قولہ تعالیٰ: فَنَبَذُوْهُ ان لوگوں کی طرف لوٹتے ہوئے آرہا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَیُبَیِّنُوْنَهٗ بغیر نون تاکید ثقیلہ کے ہے اور اَلنَّبْذُ کا معنی پھینکنا ہے اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ یہ پھینکنے میں اظہار مبالغہ ہے، اور اسی سے وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ہے۔ اور اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا کا معنی و مفہوم بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد لله۔

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 252　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾

''ہرگز آپ یہ خیال نہ کریں کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کئے ہی نہیں تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں عذاب سے ان کے لئے ہی تو دردناک عذاب ہے۔''

یعنی (وہ عذاب سے امن میں نہیں ہیں) اس فعل کے سبب جو انہوں نے غزوہ سے پیچھے رہ جانے اور گھر میں ہی بیٹھے رہنے کا کیا اور انہوں نے اس کے بارے عذر پیش کر دیئے۔ صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین میں سے کچھ لوگ تھے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ آپ سے پیچھے رہ جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہوتے، اور جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے تو آپ کے پاس عذر پیش کرتے اور حلف دے دیتے، اور یہ چاہتے اور پسند کرتے کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے نہیں کئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا الآیہ (1)۔

اور صحیحین میں یہ بھی ہے (2) کہ مروان نے اپنے دربان کو کہا: اے رافع! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا اور انہیں یہ کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر آدمی اس سے خوش ہو جو کچھ اسے عطا کیا گیا ہے اور یہ پسند کرے کہ اس کی اس کام کے عوض تعریف کی جائے جو اس نے نہیں کیا (اور اس پر) وہ عذاب دیا جائے تو یقیناً ہم تمام عذاب دیئے جائیں گے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہیں کیا ہے اس آیت کے ہوتے ہوئے بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کسی شے کے بارے پوچھا تو انہوں نے اسے چھپا لیا، اور انہوں نے آپ کو کسی اور شے کے بارے بتایا اور نکل گئے حالانکہ انہوں نے آپ کے سامنے ظاہر یہ کیا کہ انہوں نے آپ کو اسی کے بارے خبر دی ہے کہ جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا ہے اور اس پر انہوں نے آپ سے تعریف کی بھی خواہش کی، اور اس پر وہ بہت خوش ہوئے جو انہوں نے آپ سے اس شے کو چھپانے کا فعل کیا، اور جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا (4)۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: یہ آیت بنی اسرائیل کے ان علماء کے بارے نازل ہوئی ہے جنہوں نے حق کو چھپایا، اور

---

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 6، صفحہ 656۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4201، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۂ آل عمران، حدیث نمبر 4202، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 552، دار الکتب العلمیہ		4۔ ایضاً

وہ اپنے بادشاہوں کے پاس ایسی چیزوں کا علم لے کر آتے تھے جو ان کے ساتھ ان کے باطل نظریات میں موافقت کرتا تھا، وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور انہوں نے اس کے عوض تھوڑی سی قیمت خرید لی) یعنی اس کے عوض انہوں نے وہ دنیا خرید لی جو بادشاہوں نے انہیں عطا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس کے بدلے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں دین کے بارے فساد برپا کیا اور ضحاک نے کہا ہے: یہود بادشاہوں کو کہتے تھے بلاشبہ ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک نبی مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ (سلسلۂ) نبوت ختم ہو جائے گا، پس جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو بادشاہوں نے ان سے پوچھا: کیا یہی وہ نبی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ تو یہودیوں نے بادشاہوں کے اموال میں حرص اور لالچ رکھنے کی بنا پر کہا: وہ اس کے سوا ہے، (یعنی یہ وہ نہیں ہے) تو بادشاہوں نے انہیں خزانے عطا کر دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا یعنی وہ خوش ہوتے ہیں اس جھوٹ سے جو انہوں نے بادشاہوں کے سامنے بولا یہاں تک کہ انہوں نے دنیوی ساز و سامان حاصل کر لیا (1)۔ پہلی حدیث دوسری حدیث کے مقتضی کے خلاف ہے اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں سببوں کی بنا پر ہو کیونکہ وہ دونوں ایک ہی زمانہ میں جمع تھے اور یہ دونوں فریقوں کا جواب ہو۔ واللہ اعلم۔

اور آپ کا قول: واستحمدوا بذالك اليه کا معنی ہے انہوں نے آپ سے مطالبہ اور خواہش کی کہ ان کی تعریف کی جائے اور مروان کا قول: لئن کان کل امرئ منا الخ اس پر دلیل ہے کہ عموم کے لئے مخصوص صیغے ہیں، اور یہ کہ الَّذِيْنَ ان میں سے ہے (2)۔ اور یہ یقینی اور قطعی بات ہے جس نے اسے قرآن و سنت سے سمجھا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے نہ کہ پیچھے رہنے والے منافقین کے بارے میں، کیونکہ وہ کہتے تھے: ہم دین ابراہیم پر ہیں حالانکہ وہ آپ کے دین پر نہ تھے، اور وہ کہتے تھے: ہم نماز، روزے اور کتاب والے ہیں، وہ اس سے ارادہ رکھتے تھے کہ اس کے سبب ان کی تعریف کی جائے، اور الذین، یحسبن بالیاء سے فاعل ہے۔ اور یہی نافع، ابن عامر، ابن کثیر اور ابو عمرو کی قرأت ہے، یعنی خوش ہونے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی خوشی انہیں عذاب سے نجات دلانے والی ہے، اور کہا گیا ہے کہ پہلا مفعول محذوف ہے اور وہ انفسھم ہے۔ اور دوسرا بِمَفَازَةٍ ہے۔ اور کوفیوں نے تَحْسَبَنَّ تا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ گمان نہ کریں کہ خوش ہونے والے عذاب سے امن میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تا اور با کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ تاکید کے لئے دوبارہ مذکور ہے۔ اس کا پہلا مفعول هُمْ ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول محذوف ہے، اور وہ کذالک ہے، اور فا عاطفہ ہے یا زائدہ ہے اس بنا پر کہ دوسرا فعل پہلے سے بدل ہے۔ ضحاک اور عیسیٰ بن عمر نے تا کے ساتھ اور با

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 256

4۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 258

کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فَلَا تَحْسَبُنَّهُمْ اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو خطاب ہے۔ اور مجاہد، ابن کثیر، ابو عمرو اور یحییٰ بن یعمر نے یا کے ساتھ اور با کو ضمہ (1) کے ساتھ فارحین سے خبر بناتے ہوئے پڑھا ہے۔ یعنی فلا یَحْسَبُنَّ انفسهم، (اور وہ اپنے آپ کو گمان نہ کریں)، بِمَفَازَةٍ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور فَلَا یحسبنم تاکید ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الذین، یَحْسَبَنَّ سے فاعل ہے۔ اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ یحسبنهم اس پر دال ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

بأيّ كتاب أم بأيّة آية　　ترى حبّهم عارًا علىّ و تحسَبُ

اس میں ایک مفعول کے ذکر کے سبب دوسرے مفعول کے ذکر کی ضرورت نہ رہی، اور بمفازۃ مفعول ثانی ہے، اور یہ پہلے فعل سے بدل ہے اور اس نے اس سے بدل ہونے کے سبب اس کے دونوں مفعولوں کے ذکر سے غنی کر دیا ہے، اور فا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کبھی یہ افعال ملغی آتے ہیں جملہ مفیدہ کے حکم میں نہیں ہوتے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

و ما خِلْت أبقى بيننا من مودّة　　عِراض المَذَاكِي المُسْنِفاتِ القلائِصا

المَذَاکی سے مراد وہ گھوڑا ہے جس پر اس کے دانت نکلنے کے بعد ایک سال یا دو سال گزر جائیں اس کا واحد مُذَکٍّ ہے، جیسا کہ اونٹوں میں سے مُخْلف ہوتا ہے، اور مثال میں یہ جَرِی المذکیات غلاب (یعنی طاقتور گھوڑے غالب آتے ہیں) اور المسنفات اسم مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے: سنفت البعیر أسنفه سَنْفًا جب تو اونٹ کا اسی کی رسی کے ساتھ تنگ کس لے اور تو اس پر سوار ہو۔

اور أسنف البعیرَ لغة سنفه کی مثل ہے، اور اسنف البعیر بنفسه جب اونٹ چلنے کے لئے اپنا سر اوپر اٹھائے، یہ کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ اور عرب اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور گھوڑے سے اجتناب کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے: الحرب لا تُبقی مودۃ (جنگ محبت کو باقی نہیں رکھتی۔)

اور کعب بن ابی سلمی نے کہا ہے:

أرجو و آمل أن تدنو مَوَدّتُها　　وما اخالُ لَدَيْنَا منكِ تنويلُ

میں امید اور آرزو رکھتا ہوں کہ اس کی محبت قریب ہو اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ تیری طرف سے ہمارے پاس کوئی بخشش اور عطا ہو۔

جمہور قراء سبعہ وغیرہم نے أَتَوْا الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کے عوض جو وہ جھوٹ اور کتمان (چھپانا) میں سے لائے۔ اور مروان بن حکم، اعمش اور ابراہیم نخعی نے آتوا مد کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بمعنی اعطوا ہے۔ (یعنی جو انہوں نے دیا (مراد جو انہوں نے برتاؤ کیا)

اور سعید ابن جبیر نے أُوتُوا صیغہ مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے، بمعنی أعطوا اور المفازۃ بمعنی المنجاۃ (جائے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 417

نجات) ہے، یہ مفعلۃ کے وزن پر فاز یفوز سے ہے جب کوئی نجات پا جائے، یعنی وہ نجات پانے والے نہیں۔ اور خوف اور ڈر کی جگہ کو اچھی فال لینے کے طور پر مفازۃ کا نام دیا گیا ہے، اصمعی نے یہی کہا ہے (1)۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ یہ موت کی جگہ ہے اور ہلاکت کا ظن غالب ہے، عرب کہتے ہیں فوز الرجل جب آدمی مر جائے۔ ثعلب نے کہا ہے: میں نے ابن اعرابی کے سامنے اصمعی کا قول بیان کیا تو اس نے کہا: انہوں نے خطا کی ہے۔ مجھے ابوالمکارم نے کہا ہے: اسے مفازۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جس نے اسے طے کر لیا وہ کامیاب ہو گیا (2)، نجات پا گیا اور اصمعی نے کہا ہے: لدیغ (جس کو ڈس لیا جائے) کو بطور اچھی فال کے سلیم کا نام دیا گیا ہے (3)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: کیونکہ وہ اس تکلیف اور مصیبت سے بچ نکلنے والا ہے جو اسے پہنچی ہے (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے آپ انہیں عذاب سے کہیں دور جگہ میں گمان نہ کریں، کیونکہ فوز (کامیابی اور نجات) مکروہ (عذاب اور تکلیف) سے دور ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

یہ ان کے خلاف استدلال اور حجت ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور ان کی تکذیب ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے آپ خوش ہونے والوں کے بارے یہ گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور وہ قدرت رکھنے والے رب کے قبضہ میں ہیں، پس یہ پہلے کلام پر معطوف ہے، یعنی بلاشبہ وہ اس کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتے، وہ انہیں پکڑ لے گا جب چاہے گا۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے، اس پر بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾
الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ
مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا
مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا
سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 553، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾
لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۟ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَ
بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ
يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بے کار۔ پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔ اے ہمارے رب! سنا ہم نے منادی کرنے والے کو کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو قبول فرما لی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت بعض تمہارا اجز ہے بعض کی تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لئے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں مٹا دوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزا ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (اے سننے والے!) نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں۔ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ

تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکوں کے لئے۔ اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیازمندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔''

اس میں پچیس مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ان آیات میں نظر و استدلال کے حکم کے ساتھ کیا، کیونکہ یہ پیدا نہیں ہو سکتے مگر اسی کی جانب سے جو حی و قیوم ہے قدرت والا ہے، پاک ہے، سلامت و محفوظ ہے (ہر عیب اور کمزوری سے) اور کل جہاں سے بے نیاز اور غنی ہے، تا کہ ان کا ایمان یقین کے ساتھ مستند ہو جائے نہ کہ فقط تقلید (پر اس کا انحصار ہو)۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ یعنی ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقلوں کو دلائل میں غور و فکر کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی آپ اٹھے نماز پڑھنے لگے، تو اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے وہ آپ کو نماز کے بارے (مراد جماعت کے لئے) عرض کرنے لگے، تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ رو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے ہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آج کی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ پھر آپ نے فرمایا: اس کے لئے ہلاکت ہے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا (1)۔''

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے بیان کیا ہے، نیند سے بیدار ہونے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے چہرے پر (ہاتھ) پھیرے، اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے ان دس آیات کی قرأت سے اپنے قیام کا آغاز کرے، یہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ نماز ادا کرے جو اس کے ذمہ فرض ہے، تو اس طرح وہ تفکر اور عمل دونوں کو جمع کر لے گا، اور یہی افضل عمل ہے جیسا کہ اس کا بیان اس کے بعد اسی آیت میں آئے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رات سورہ ''آل عمران'' کی آخری دس آیات پڑھتے تھے، اسے حافظ ابو نصر وائلی سجستانی نے کتاب ''الابانہ'' میں سلیمان بن موسیٰ عن مظاہر بن اسلم مخزومی عن المقبری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور سورہ کی ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے آل

1۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 453، مکتب الاعلام الاسلامی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ الفتح، حدیث نمبر 4460، حدیث عائشہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمران کی آخری آیات ہررات پڑھیں اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کا ثواب لکھ دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِیۡنَ یَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ اللہ تعالیٰ نے تین ہیئتیں ذکر فرمائی ہیں انسان اپنے غالب معاملات میں ان سے خالی نہیں ہوتا، تو گویا کہ یہ کیفیات اس کے جملہ اوقات کو محیط ہیں۔ اور اس معنی کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل أحیانہ۔ (1)

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ پس اس میں بیت الخلا میں اور دوسرے مقامات پر ہونا بھی داخل ہے، حالانکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے، اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، ابن سیرین اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ آیت اور حدیث کے عام ہونے کی بنا پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: بیت الخلا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ملائکہ اس ذکر کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان کے صحف میں لکھا ہوتا ہے، پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ۝ (ق) (نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) اور مزید فرمایا: وَاِنَّ عَلَیۡكُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِیۡنَ ۝ (الانفطار) (حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں) اور اس لئے بھی کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو ہر حال میں ذکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور کوئی استثنیٰ نہیں کی۔ پس فرمایا: اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِیۡرًا ۝ (الاحزاب) (یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے) مزید فرمایا: فَاذۡكُرُوۡنِیۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ (البقرہ:152) (سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا) اور پھر فرمایا: اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ۝ (الکہف) ((تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے) پس یہ سب عام ہے۔ پس ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ماجور ہوگا اور اسے ثواب دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابونعیم نے ذکر کیا ہے کہ ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے ہمیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے میرے باپ (مراد احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) نے بتایا کہ وکیع نے بیان کیا کہ سفیان نے عطا بن ابی مروان سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا (کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: ''اے میرے پروردگار! کیا تو قریب ہے کہ میں تیرے ساتھ سرگوشی کروں یا تو بعید ہے کہ میں تجھے ندا دوں تو رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ أنا جلیس من ذکرنی (اے موسیٰ! علیہ السلام میں اس کا ہمنشین ہوتا ہوں جو میرا ذکر کرے) عرض کی: اے میرے رب! بلاشبہ ہم تو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں (اور اس میں) ہم تجھے اس سے برتر اور عظیم تر سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں تیرا ذکر کریں۔ رب کریم نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: وہ جنابت اور قضائے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 162۔

حاجت کی حالت ہے۔ رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ اذکرنی علی کل حال (☆) (اے موسیٰ! تو ہر حال میں میرا ذکر کر۔) اور جنہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک کراہیت کا سبب یا تو یہ ہے کہ الله تعالیٰ کا ذکر اس سے بلند اور منزہ ہے کہ وہ ایسی جگہوں میں کیا جائے جن میں اس کے ذکر سے اعراض برتا گیا ہے جیسے کہ حمام میں قرآن کریم کی قرأت کا مکروہ ہونا، یا پھر کراماً کاتبین پر اس بناء پر رحم کھانا ہے کہ وہ انہیں غلاظت اور نجاست کی جگہ پر اتارے تاکہ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لکھیں۔ واللہ اعلم۔

اور قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا ترکیب کلام میں حال ہونے کی بنا پر یہ منصوب ہیں۔ وَّعَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ یہ بھی حال کے محل میں ہے، یعنی بمعنی و مضطجعین ہے۔ اور اسی کی مثل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: دعانا لجنبه او قاعدا او قائما اس میں ترتیب پہلی آیت کے برعکس ہے، بمعنی دعانا مضطجعا علی جنبه۔ (اس نے ہم سے دعا مانگی اس حال میں کہ وہ اپنے پہلو کے بل لیٹے ہوئے تھا۔)

مفسرین کی ایک جماعت جن میں سے حسن وغیرہ ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ الله تعالیٰ کا قول يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ آخر تک اس میں ذکر سے مراد نماز ہے، یعنی وہ نماز ضائع نہیں کرتے، پس وہ عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا اپنے پہلوؤں کے بل لیٹ کر نماز پڑھتے ہیں (1)۔ اور یہ الله تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَاِذَا قَضَيۡتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو الله تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے))

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس کا بیان آرہا ہے اور جب آیت نماز کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے کھڑے ہو کر، اور اگر وہ استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھتا ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین سے ثابت ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے بواسیر تھی تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اور اگر تو اس کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر تو اس کی استطاعت بھی نہ رکھے تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر (نماز پڑھ لے۔) (2)'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وصال سے ایک سال پہلے نفل نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (3)۔ ابو عبدالرحمن نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو سوائے ابوداؤد حضری کے اور وہ ثقہ راوی ہے اور اس حدیث کو خطا گمان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے مریض اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، پس ابن عبدالحکم نے مالک سے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے قیام میں چار زانو بیٹھ سکتا ہے، البویطی نے امام شافعی سے یہی بیان کیا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ

2۔ سنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 87۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، فی قیام اللیل و تطوع [illegible] 245

☆ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم، جلد 6، صفحہ 42

ہے۔ اور جب وہ سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ جس قدر طاقت رکھتا ہو وہ سجدہ کرنے کی تیاری اور کوشش کرے، فرمایا: اسی طرح نفل پڑھنے والے کا حکم بھی ہے۔ اور اسی طرح ثوری کا قول بھی ہے، اور اسی طرح لیث، امام احمد، اسحاق، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے مزنی کی روایت میں کہا ہے: وہ اپنی ساری نماز میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے روایت کیا گیا ہے، پہلا قول مشہور ہے اور یہی مدونہ کا ظاہر ہے(1) اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے گا، اور اسی طرح وہ رکوع اور سجود بھی کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فرمایا: اگر وہ بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھے تو وہ اپنے پہلو کے بل یا اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے یہ اسے اختیار ہے، یہی مدونہ کا مذہب ہے اور ابن حبیب نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر (اور اگر اس پر قادر نہ ہو) تو پھر اپنے بائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور ابن المواز کی کتاب میں اس کے برعکس ہے، (یعنی) وہ اپنے دائیں پہلو پر نماز پڑھے ورنہ اپنے بائیں پہلو پر نماز پڑھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور سحنون نے کہا ہے: وہ دائیں پہلو پر نماز پڑھے گا جس طرح اسے اپنی لحد میں رکھا جائے گا، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنی پیٹھ پر لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر بائیں پہلو پر نماز پڑھے گا(2)۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جب وہ چت لیٹ کر نماز پڑھے تو اس کے دونوں پاؤں قبلہ سمت ہوں گے اور امام شافعی او ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اپنے پہلو پر نماز پڑھے گا اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اور اگر دہ مرض کم ہونے کی وجہ سے قوی اور طاقتور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نماز میں ہو، تو اس کے بارے ابن القاسم نے کہا ہے: وہ اپنی ماقبی نماز میں کھڑا ہو جائے گا اور اپنی پہلی نماز پر ہی اس کی بنا کرے گا، یہی قول امام شافعی، زفر اور طبری رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے ایک رکعت لیٹ کر نماز پڑھی پھر وہ تندرست ہو گیا وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے گا۔ اور اگر وہ بیٹھ کر رکوع و سجود کر رہا ہے پھر وہ تندرست ہو جائے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ اسی پر بنا کرے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ بنا نہ کرے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کسی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر وہ اشارے کی حد تک پہنچ گیا تو اسے بنا کر لینی چاہیے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مریض کے بارے میں کہا ہے جو رکوع اور سجود کی استطاعت نہ رکھتا ہو حالانکہ وہ کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اور رکوع کے لئے اشارہ کرے گا اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹھ جائے اور سجود کے لئے اشارہ کرے، اور یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور امام شافعی کے قول کا قیاس ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اور جہاں تک تندرست لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز کا تعلق ہے تو عمران بن حصین کی حدیث سے یہ نز

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

یادتی مروی ہے جو کسی اور کی روایت میں موجود نہیں، اور وہ یہ ہے صلاۃ الراقد مثل نصف صلاۃ القاعد(1) (لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے نصف کی مثل ہے۔) ابو عمر نے کہا ہے کہ جمہور اہل علم نفلی نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، اور وہ حدیث ہے جسے حسین المعلم کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا اور وہ حسین ابن ذکوان ہے جس نے عبداللہ بن بریدہ سے اور انہوں نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی سند اور متن میں حسین پر ایسا اختلاف کیا گیا ہے جو اس کے بارے توقف کو ثابت کرتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے، پس اگر اہل علم میں سے کسی ایک نے ایسے آدمی کے لئے نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت دی ہے جو بیٹھنے پر قادر ہو یا قیام پر قادر ہو تو پھر اس کی وجہ یہی زیادتی ہے جو اس حدیث میں ہے اور یہی اس کی حجت اور دلیل ہے جس نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اگر انہوں نے ایسے آدمی کے لئے جو بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو لیٹ کر نفل نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے پر اجماع کیا ہے، تو پھر حسین کی یہ حدیث یا غلط ہے یا پھر منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے اس پر استدلال کرتے ہیں کہ تبدیل ہونے والے کے لئے تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہے، اور اس تبدیلی لانے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قدرت کاملہ رکھتا ہو، اور اس کا اختیار ہو کہ وہ رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، پس اگر وہ کوئی رسول مبعوث فرمائے اور اس کی صداقت پر ایک معجزہ کے ساتھ دلیل بھی بیان کر دے تو پھر کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تحقیق ہم نے ویذ کرون کا معنی بیان کر دیا ہے اور اس سے مراد یا تو زبان کا ذکر ہے یا پھر فرضی اور نفلی نماز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دوسری عبادت کو ان میں سے ایک پر دوسری عبادت کے ساتھ عطف کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور لوگوں کی اس جماعت میں غور و فکر کرنا جو بکھری ہوئی ہے، تا کہ ان کی بصیرت میں اضافہ کرے:

و فی کل شیٔ لہ آیۃ تَدُلُّ علی أَنَّہُ واحِدُ

اور ہر شے میں اس کے لئے نشانی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ یکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَتَفَكَّرُوْنَ کا حال پر عطف ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ منقطع ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور فکر کا معنی ہے: تردد القلب فی الشیٔ (کسی شے میں دل کا متردد ہونا) کہا جاتا ہے: تفکر، اور رجل فکیر یعنی ایسا آدمی جو بہت زیادہ فکر کرنے والا ہو۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفکروا فی الخلق ولا تتفکروا فی الخالق فانکم لا تقدرون قدرہ(2) (تم مخلوق میں غور و فکر کرو

1۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 150۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، التفکر، جلد 3، صفحہ 108، حدیث نمبر 5706

اور خالق میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی قدرت اور عظمت (کو پہنچاننے) کی قدرت نہیں رکھتے۔) بلاشبہ تفکر مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور ذہن کو اس میں گھمانا ہے جیسا کہ فرمایا: وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے مقام کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، پھر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور جب ستاروں کو دیکھا تو آپ پر غشی طاری ہوگئی، اور انتہائی حزن و غم اور فکر کی وجہ سے پیشاب میں خون بہنے لگا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اثنا میں کہ آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہو اور وہ ستاروں اور آسمان کی طرف دیکھے اور پھر یہ کہے اشهد ان لك ربا و خالقا اللّٰهم اغفرلی فنظر الله اليه فغفرله (1) (میں شہادت دیتا ہوں کہ تمہارا رب اور خالق ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما پس اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرماتا ہے اور اسے بخشش دیتا ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاعبادة كتفكر (2) (فکر کرنے کی طرح کوئی عبادت نہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تفكر ساعة خير من عبادة سنة (3) (ایک ساعت کی غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے)

اور ابن القاسم نے حضرت امام مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا: ان کا اکثر عمل غور و فکر میں مشغول رہنا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا: کیا آپ تفکر کو اعمال میں سے ایک عمل گمان کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، یہ تو یقین ہے۔ حضرت ابن مسیب سے ظہر اور عصر کے درمیان نماز کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: یہ عبادت نہیں ہے، بلاشبہ عبادت اس عمل سے بچنا اور دور رہنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، در تفکر (غور و فکر کرنا) اللہ تعالیٰ کے امر میں داخل ہے۔

اور حسن نے بیان کیا ہے: ایک ساعت کی غور و فکر رات بھر قیام کرنے سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے (4)۔

اور حسن نے کہا ہے: فکر کرنا مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی نیکیوں اور اپنی برائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان میں سے جن میں وہ غور و فکر کرتا ہے آخرت کے خوف ہیں مثلاً حشر و نشر، جنت اور اس کی نعمتیں، اور جہنم اور اس کا عذاب اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن اٹھایا تا کہ آپ رات کی نماز کے لئے وضو کریں اور ان کے پاس ایک مہمان بھی تھا، تو اس نے آپ کو دیکھا کہ جب اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے کھڑے رہے یہاں تک فجر طلوع ہوگئی، تو اس نے ان سے کہا: اے ابا سلیمان یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب میں نے اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور و فکر کرنے لگا اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۟ (المومن) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا) تو میں اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگا میں طوق سے ملوں گا اگر قیامت کے دن میری گردن میں ڈال دیا گیا، پس میں یہی سوچتا رہا یہاں تک

---

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 454
2۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 221، دار المسیرہ بیروت
3۔ الاسرار المرفوعة الاخبار الموضوعة، صفحہ 175، حدیث نمبر 114
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ

کہ صبح ہوگئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ''یہ خوف کی انتہا ہے، اور امور میں بہتر میانہ روی ہے، اور امت کے علماء وہ نہیں ہیں جو اس راستے پر جحت ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے معانی اس کے لئے پڑھنا اور سیکھنا جو سمجھ سکتا ہو اور اس کے لئے نفع کی امید کی جاسکتی ہو اس سے افضل ہے'' ابن العربی نے کہا ہے: لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں عملوں میں سے کون سا افضل ہے فکر کرنا یا نماز پڑھنا، صوفیہ کا نظریہ یہ ہے کہ فکر کرنا افضل ہے، کیونکہ اس کا پھل اور نتیجہ معرفت ہے اور یہ مقامات شرعیہ میں سے افضل مقام ہے۔

اور فقہاء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز افضل ہے، کیونکہ حدیث طیبہ میں اس پر برانگیختہ کرنا، اس کی طرف دعوت دینے اور اس کی ترغیب دلانے کا ذکر موجود ہے اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزاری، اور آپ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اٹھے اور آپ نے اپنے چہرہ اقدس سے نیند جھاڑی پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، اور لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہوئے اور خفیف سا وضو فرمایا اور پھر تیرہ رکعتیں نماز ادا فرمائی (1)، الحدیث۔ تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے تم آپ ﷺ کے اس عمل کی طرف دیکھو تو یہ مخلوقات میں تفکر اور پھر اس کے بعد آپ کی نماز کی طرف متوجہ ہونے کا مجموعہ ہے، اور یہی وہ سنت ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پس رہا صوفیہ کا طریقہ کہ ان میں سے ایک شیخ دن، رات اور مہینہ فکر کرنے والا ہوتا ہے وہ ست اور ڈھیلا نہیں پڑتا، لیکن یہ طریقہ راہ صواب سے بہت دور ہے عام انسان کے لائق اور مناسب نہیں ہے اور نہ آدمی اس پر مسلسل عمل پیرا رہ سکتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ نے مجھے بعض علماء مشرق سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ایک رات مصر کی مسجد الاقدام میں تھا، میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اپنے اوپر ہر طرف سے کمبل لپیٹ کر لیٹا ہوا ہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اور ہم نے اس رات نماز (تہجد) پڑھی، پس جب صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو وہ آدمی اٹھا، قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔ میں نے یہ اس کی بہت بڑی جرأت قرار دی کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی ہے، چنانچہ جب میں نماز سے فارغ ہوا اور وہ باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا تاکہ میں اسے نصیحت کروں، پس جب میں اس کے قریب ہوا تو میں نے اسے یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

مستجی الجسم غائب حاضر　منتبه القلب صامت ذاكر

جسم کو ڈھانپنے والا غائب بھی ہے اور حاضر بھی اس کا دل بیدار ہے وہ خاموش بھی ہے اور ذاکر بھی۔

منقبض فی الغیوب منبسط　كذاك من كان عارفا ذاكر

وہ غیب کے پردوں میں سمٹنے والا بھی ہے اور پھیلنے والا بھی اسی طرح وہ ہوتا ہے جو عارف ذاکر ہو۔

يَبِيتُ فی لیلهِ أخا فِكَرٍ　فهو مَدَى اللیل نائمٌ ساهر

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 651۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ اپنی رات فکر کرتے ہوئے گزار دیتا ہے پس وہ رات کے وقت سونے والا جاگ رہا ہوتا ہے۔
انہوں نے بیان کیا: پس میں جان گیا کہ یہ ان میں سے ہے جو فکر کے ساتھ عبادت کرتے ہیں تو پھر میں اس سے واپس چلا گیا(1)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یعنی وہ عرض کرتے ہیں: تو نے کسی شے کو عبث اور بے کار پیدا نہیں کیا، بلکہ تو نے اسے اپنی قدرت اور اپنی حکمت پر بطور دلیل پیدا کیا ہے اور باطل کا معنی زائل ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔

اور اسی سے لبید کا قول ہے:

الا کل شیٔ مَا خلا الله باطل

خبردار جان لو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے فناہ ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔ اس میں باطل بمعنی زائل ہے۔
اور بَاطِلًا کو نصب دی گئی ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں خلقاً باطلاً ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرف جر کے حذف ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ ما خلقتہا للباطل تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور خلق بمعنی جعل ہوگا۔ سُبْحٰنَكَ نحاس نے موسیٰ بن طلحہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے سبحان اللہ کے معنی کے بارے عرض کی گئی، تو آپ نے فرمایا: تنزیہ اللہ عن السوء (2) (ہر عیب اور کمزوری سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔) اس کے بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے پناہ عطا فرما، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (اے ہمارے رب بے شک تو نے جسے آگ میں داخل کر دیا) تو تو نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور مفضل نے کہا ہے: تو تو نے اسے ہلاک و برباد کر دیا۔

اور انہوں نے یہ شعر بھی کہا ہے:

أخزى الإلٰهُ مِن الصَلِيب عبيدَه　　واللابِسِين قَلَانِس الرهبانِ

اللہ تعالیٰ نے صلیب سے اپنے بندوں کو ہلاک کیا ہے حالانکہ وہ راہبوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور بعض نے کہا ہے (کہ اَخْزَيْتَهٗ کا معنی ہے) تو نے اسے رسوا کر دیا ہے اور تو نے اسے دور کر دیا ہے، کہا جاتا ہے: أخزاه الله۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔

اور اس سے اسم الخِزْیُ ہے۔ ابن السکیت نے کہا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خِزْيًا جب کوئی کسی آزمائش اور مصیبت میں پڑ جائے، واقع ہو جائے۔ اصحاب وعید نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جسے آتش جہنم میں داخل کیا جائے گا (اس کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا) کہ وہ مومن نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ فرماتا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ　　2۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، الاذکار، جلد 10، صفحہ 102، حدیث نمبر 16849۔

ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (التحریم: 8) (اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے مردود ہے، کیونکہ اس پر دلائل قائم ہیں کہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اس سے ایمان کا اسم زائل نہ ہوگا۔ (یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن باقی رہتا ہے۔) جیسا کہ اس کے بارے کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔ لہٰذا قول باری تعالیٰ: مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ سے مراد وہ ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا (1)، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تدخل تخلد کا مقلوب ہے (2)، اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح اہل حروراء نے کہا۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے جنہیں آگ سے نہیں نکالا جائے گا (3)، اسی لئے یہ فرمایا ہے: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ یعنی کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے اور اہل معانی نے کہا ہے: الخزی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ حیاء کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خِزَايَةً جب وہ شرم اور حیا محسوس کرے، فھو خذیان (شرمندہ ہونے والا)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

خِزَايَةٌ　أدركته　عِنْد　جَوْلَتِه　　من جانب الحَبْلِ مخلوطا بها الغضبُ

اس میں خزایۃ شرم وحیاء کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

پس اس دن خزی المومنین سے مراد تمام اہل ادیان کے سامنے ان کا دخول نار میں شرم وحیاء محسوس کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے باہر نکل آئیں۔ اور خزی للکافرین سے مراد اللہ تعالیٰ کا انہیں بغیر موت کے جہنم میں ہلاک اور برباد کرنا ہے اور مومنین مر جائیں گے، تو اس طرح دونوں فریق جدا جدا ہو گئے۔ صحیح سنت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح ثابت ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اس میں منادی سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے (4)۔ اور حضرت قتادہ اور محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن ہے، کیونکہ ان تمام نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا (5)۔ اس قول کی دلیل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے جنوں کے بارے میں خبر دی ہے جبکہ انہوں نے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ (الجن:) (کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے راہ دکھاتا ہے ہدایت کی) اور پہلے قول والوں نے جواب دیا اور کہا: جنہوں نے قرآن کریم سنا گویا انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور یہ معنوی طور پر صحیح ہے۔

اور اَنْ اٰمِنُوْا میں اَنْ حرف جر حذف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی یہ اصل میں بِاَنْ اٰمِنُوْا ہے۔ اور کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی سمعنا منادیا للایمان ینادی، یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی الی ہے۔ یعنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ　2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 418　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 262
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ　5۔ ایضاً

لِلْاِیْمَانِ سے مراد الی الایمان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (المجادلہ: 8) اور یہ ارشاد گرامی: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؈ (الزلزلۃ: 5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف: 43) یعنی مراد الی ھذا ہے، اوراس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام اجل ہے یعنی مراد لأجل الایمان ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا یہ دعا میں تاکید اور مبالغہ ہے اور دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے، کیونکہ غفر اور کفر دونوں کا معنی ستر (ڈھانپنا اور چھپانا) ہے۔ و توفنا مع الابرار یعنی ہمیں موت دے نیکیاں کرنے والے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، یعنی ان کے گروہ اور زمرہ میں، ابرار کی واحد برٌّ اور بارٌّ ہے اور اس کی اصل الاتساع (وسعت ہونا) سے ہے۔ فکان البر متسع فی طاعۃ اللہ و متسعۃ لہ رحمۃ اللہ۔ یعنی گویا کہ نیکی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں وسیع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے لئے وسیع ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ یعنی علی السنۃ رسلك (اے ہمارے رب! ہمیں وہ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانوں سے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا۔) یعنی یہ وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) ای اھل القریۃ کی مثل ہے۔ اعمش اور زہری نے تخفیف کے ساتھ رُسْلِكَ پڑھا ہے (1)، اور اس سے مراد وہ ہے جو کچھ مومنین کے لئے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے، اور ملائکہ زمین میں رہنے والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور وہ مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا مومنین کے لئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لئے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔ وَ لَا تُخْزِنَا یعنی تو ہمیں عذاب نہ دے، اور تو ہمیں ہلاک نہ کر اور تو ہمیں رسوا نہ کر، اور تو ہمیں ذلیل نہ کر، اور تو ہمیں دور نہ کر اور تو ہمیں قیامت کے دن ناپسند نہ کر۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ اگر کہا جائے: ان کے اس قول کی وجہ کیا ہے ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلك حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، تو اس کے جواب کی تین وجوہ ہیں:

(۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے، پس انہوں نے سوال کیا کہ وہ ان میں سے ہو جائیں جن کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا ہے نہ کہ ان کے ساتھ جس سے رسوائی، ذلت اور سزا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۲) کہ انہوں نے یہ دعا عبادت اور خضوع کی جہت پر مانگی، اور دعا عبادت کا مغز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (الانبیاء: 112) (آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ) اگرچہ وہ حق کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

(۳) انہوں نے یہ التجا کی کہ انہیں وہ کچھ جلدی عطا کیا جائے جو دشمن کے خلاف ان کی مدد و نصرت کا وعدہ ان کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں یہ بیان ہے، کہ انہوں نے دین کے غلبے کے لئے یہ التجا کی۔ واللہ اعلم۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے تو وہ بطور رحمت کے اس کے لئے اسے پورا کرے گا اور جس کے لئے کسی عمل پر سزا کا وعدہ کیا ہے تو اس میں اس کا اختیار اور مرضی ہے (1)۔'' عرب وعدہ خلافی پر مذمت کرتے ہیں اور وعید خلافی میں مدح اور تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے کہا ہے:

ولا يرهَبُ ابن العم ما عِشتُ صَوْلَتِي　　ولا اختَفِي من خشيَة المتهدِّد

ابن العم کو کوئی خوف نہ ہوگا جب تک میں رعب و سطوت کے ساتھ زندہ رہا اور میں کسی ڈرانے والے کے خوف سے نہیں چھپتا۔

وانی متى أوعدتُه او وعدته　　لَمخلِفُ ايعادِی و مُنجِزُ مَوْعِدِی

اور میں نے جب اسے دھمکایا یا اس سے وعدہ کیا تو وہ میری وعید کے خلاف کرتا ہے اور وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول کرلیا۔

حسن نے کہا ہے: وہ مسلسل کہتے رہے ربنا ربنا (اے ہمارے رب، اے ہمارے رب) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جسے کوئی اہم درپیش ہو (یا کسی کو غم لاحق ہو) تو وہ پانچ مرتبہ کہے ربنا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے نجات عطا فرمادے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے اور وہ چھا سے عطا فرمادے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے آپ سے عرض کی گئی: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

**مسئلہ نمبر 15**۔ قولہ تعالیٰ: اَنِّیْ یہ اصل میں بأنی تھا۔ اور عیسیٰ بن عمر نے اِنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی پس کہا: انی۔ (2) اور حاکم ابو عبد اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ام سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بارے میں کسی شی کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى الآیہ (3) اور اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اور مِنْ تاکید کے لئے داخل ہے، کیونکہ اس سے پہلے حرف نفی ہے۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ تفسیر کے لئے ہے اور اس کا حذف

1۔ مسند ابو یعلیٰ، مسند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 180، حدیث نمبر 3303　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 328، حدیث نمبر 3174۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب من سورۃ النساء، حدیث 2949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اس معنی کے لئے داخل ہے جو اس کے بغیر کلام ادا نہیں کر سکتی اور اسے حذف کیا جا سکتا جب یہ نفی کی تاکید کے لئے ہوتا۔ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یہ مبتدا خبر ہے۔ یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میں سے بعض بعض کی جز ہیں ثواب میں، احکام میں، اور مدد و نصرت اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: تمہارے مرد طاعت میں تمہاری عورتوں کی مثل ہیں، اور تمہاری عورتیں طاعت (وعبادت) میں تمہارے مردوں کے مشابہ ہیں، اس کی نظیر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔) اور کہا جاتا ہے: فلان منی، یعنی فلاں میرے مذہب اور میرے اخلاق پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی جنہوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے۔ وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ اور وہ الله عزوجل کی طاعت و عبادت کے سبب اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ وَقٰتَلُوْا اور انہوں نے میرے دشمنوں کے خلاف جنگ کی۔ وَقُتِلُوْا اور میری راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ابن کثیر اور ابن عامر نے پڑھا ہے وقاتلوا و قتلوا(1) کثرت کی بنا پر۔ اور اعمش نے قرأت کی ہے وقتلوا و قاتلوا کیونکہ واؤ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں قد مضمر ہے یعنی قتلوا و قد قاتلوا۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تصابی و أمسی علاه الکبر

یہ اصل میں و قد علاہ الکبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: و قد قاتل من بقی منهم (جو ان سے باقی بچا اس نے قتال کیا۔) عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم، ہم نے بنی تمیم کو قتل کیا، اور بلاشبہ ان میں سے بعض قتل کئے گئے اور امرؤ القیس نے کہا ہے: فإن تقتلونا نقتلکم (پس اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے)

اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے و قتلوا و قتلوا بغیر الف کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ یعنی میں آخرت میں ان پر ان کے گناہوں کو چھپا دوں گا، پس میں انہیں ان کے سبب زجر و توبیخ نہ کروں گا اور نہ ان پر انہیں کوئی سزا دوں گا۔ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ ''میں انہیں ضرور داخل کروں گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی'' کا معنی یہ ہے میں انہیں ضرور ضرور ثواب عطا کروں گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ قطعاً منصوب ہے اور فراء نے کہا ہے: یہ بطور تفسیر منصوب ہے۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ یعنی یہ اچھی جزا ہے الله تعالیٰ کے پاس اور اس سے مراد وہ (اجر و ثواب) ہے جو عامل کی طرف اس کے عمل کی جزا کے طور پر لوٹے گا، اور یہ ثاب یثوب سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب تمام کو ہے اور وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے کہا: یہ کفار ہیں ان کے لئے سامان تجارت بھی ہے اور اموال بھی اور ان کا ملکوں میں گھومنا پھرنا بھی ہے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم بھوک سے ہلاک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 558

ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہیں ان کا سلامتی کے ساتھ اپنے سفروں میں گھومنا پھرنا دھوکہ میں نہ ڈالے۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ یعنی ان کا یہ گھومنا پھرنا تھوڑی مدت کے لئے ہے۔ اور یعقوب نے نون ساکنہ کے ساتھ يَغُرَّنْكَ پڑھا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لا يَغُرَّنْكَ عِشاءٌ ساكِنٌ قَدْ يُوَافِي بالمنيَاتِ السَّحَرْ

اس میں بھی لا يَغُرَّنْكَ نون ساکنہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ (المومن) (پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں) اور متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے جلدی نفع حاصل کیا جا سکتا ہو، اور اس کا نام قلیل اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ (سامان دنیا) فناہ ہونے والا ہے، اور ہر فناہ ہونے والی شے اگرچہ کثیر ہو وہ قلیل ہوتی ہے۔ اور صحیح ترمذی میں مستورفہری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''آخرت میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، پھر وہ اس (پانی) کی طرف دیکھے جو وہ اس کے ساتھ نکالتا ہے'' (یعنی اس انگلی کے ساتھ لگنے والے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے) کہا گیا ہے: کہ اس حدیث میں لفظ یرجع یا اور تا دونوں کے ساتھ ہے۔ (حدیث طیبہ کے الفاظ یہ ہیں)

ما الدنیا فی الآخرۃ الا مثل ما یجعل احد کم اصبعہ فی الیم، فلینظر بما ذا یرجع۔ (1)

وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی کتنا برا وہ ٹھکانا جو انہوں نے اپنے کفر کے سبب اپنے لئے بنایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جہنم میں سے ٹھکانا بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 18۔** اس آیت میں اور اس طرح کی دیگر آیات میں مثلاً قول باری تعالیٰ: اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ الآیہ (آل عمران: 178) (کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے) وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ۗ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (القلم) (اور میں نے (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری (خفیہ) تدبیر بڑی پختہ ہے۔) اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ (المومنون) (کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے) سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف) (تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اس پر دلیل موجود ہے کہ کفار پر دنیا میں کوئی انعام نہیں کیا گیا، کیونکہ حقیقی نعمت وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے ضرر کی آمیزش سے پاک ہو، اور کفار کی نعمتوں میں درد و آلام اور عذاب و سزا کی آمیزش ہے، پس یہ اس آدمی کی طرح ہیں جس کے سامنے کسی کی طرف سے شہد کا حلوہ رکھا جائے جس میں زہر کی آمیزش ہو، پس اگرچہ کھانے والا لطف اندوز ہو لیکن اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر انعام کیا گیا، کیونکہ اس میں اس کی جان کی ہلاکت ہے۔ علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہی شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ان میں سے ایک جماعت سیف السنۃ ولسان الامۃ القاضی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو بکر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: نعمت کا اصل نَعمۃ بفتح النون سے ہے، اور اس کا معنی ہے خوشحال زندگی، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ (الدخان) (اور بہت سارا ساز و سامان جس سے وہ عیش کیا کرتے تھے) کہا جاتا ہے: دقیق ناعم، جب آٹا بہت باریک پسا ہوا ہو اور اچھے طریقے سے گوندھا جا سکتا ہو۔ یعنی معنی صحیح ہو، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور تمام مکلفین پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور فرمایا ہے: فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ (اعراف: 69) (پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو) یعنی شکر ادا کرنے کے لئے۔ اور فرمایا واشکروا اللہ (اور تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو) اور شکر صرف نعمت پر ہی ہوتا ہے۔

اور فرمایا: وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص: 77) (اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے) یہ خطاب قارون کو ہے۔ اور ارشاد فرمایا: وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً (النحل: 112) (اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی۔) پس اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اس نے انہیں دنیوی نعمتیں عطا فرمائیں تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور مزید فرمایا: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (النحل: 83) (وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا) اور مزید فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (فاطر: 3) (اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی۔) یہ (حکم) کفار اور دوسروں کے لئے عام ہے۔ لیکن جب کوئی کسی دوسرے کو کھانا پیش کرے جس میں زہر کی آمیزش ہو تو فی الحال اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، کیونکہ اس نے اسے خالص زہر نہیں پلائی، بلکہ اس نے اسے حلاوۃ (مٹھاس) میں چھپا دیا، لہٰذا یہ بعید نہیں کہ یہ کہا جائے: تحقیق اس نے اس پر انعام کیا، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر نعمت کی دو قسمیں ہیں نفع پہنچانے والی نعمتیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں، پس نفع بخش نعمتیں وہ ہیں جو فنون لذات میں سے ان تک پہنچیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں وہ ہیں جو ان سے طرح طرح کی آفات کو پھیر دیں، تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کو دفاع کی نعمتیں عطا فرمائیں یہ ایک قول ہے، اور وہ یہ کہ ان سے درد و آلام اور بیماریوں کو دور ہٹا دیا گیا، اور ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو نعمت دینیہ عطا نہیں فرمائی۔ والحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 19** ۔ قولہ تعالیٰ: لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ یہ استدراک ہے اس کلام کے بعد جس میں نفی کا معنی پہلے گزر چکا ہے، کیونکہ سابقہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ملکوں کے چکر کاٹنے اور گھومنے پھرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے، لیکن متقی لوگوں کے لئے بہت بڑا نفع ہے اور ہمیشہ کی بقا ہے۔ لٰكِنِ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور یزید بن قعقاع نے لکنّ نون کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20** ۔ قولہ تعالیٰ: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک نزلًا ثوابًا کی مثل ہے اور کسائی کے نزدیک یہ مصدر ہوگا۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ مفسر ہے۔ اور حسن اور نخعی نے نُزْلًا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ دو ضمے ثقیل ہوتے ہیں اور باقیوں نے اسے ثقیل قرار دیا ہے، اور النُّزُلُ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ نزیل کا معنی

مہمان ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

نَزِیلُ القوم اعظمُھم حقوقا و حقُّ اللهِ فی حقِّ النزیلِ

قوم کا مہمان حقوق کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ کر ہے اور مہمان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

اس کی جمع انزال ہے اور حظ نزیل کا معنی اکٹھ اور اجتماع ہے اور النزل کا معنی بھی کثرت اور زیادتی ہے، کہا جاتا ہے، طعام کثیر النزل و النزُل۔ (وافر مقدار کھانا)

**مسئلہ نمبر 21۔** میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید النزل..... واللہ اعلم..... وہی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اس عالم کے قصہ میں آیا ہے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اس دن لوگ کہاں ہوں گے جس دن زمین کو غیر ارض سے اور آسمانوں کو بدل دیا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ پل کے قریب اندھیرے میں ہوں گے۔" تو اس نے پوچھا: لوگوں میں سے پہلے کس کو اجازت ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مہاجرین فقراء کو" یہودی نے کہا: "ان کا کیا تحفہ ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا" مچھلی کے جگر کی کثیر مقدار"۔ پھر پوچھا: اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو اس کی اطراف سے کھاتا رہتا ہے۔" پھر عرض کی: اس پر ان کا مشروب کیا ہوگا؟ فرمایا: "جنت کے ایک چشمہ سے (وہ سیراب ہوں گے) جس کا نام سلسبیل ہے (1)" اور آگے حدیث ذکر کی۔ اہل لغت نے کہا ہے: التحفۃ سے مراد وہ شے ہے جسے پھلوں وغیرہ میں سے انسان بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہے اور طرف سے مراد اس کے محاسن اور لطف اندوز ہونے کی جگہیں ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مطابق ہے جو ہم نے نزل کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اور زیادۃ الکبد سے مراد جگر کا ٹکڑا ہے جو انگلی کی طرح ہو۔ ہروی نے کہا ہے: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی رزق ہے۔ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس نیکوکاروں کے لئے ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ کفار دنیا میں لوٹ پوٹ (اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں)۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 22۔** قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ۔ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ فوت ہوا اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے اس کی موت کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ارشاد فرمایا: قوموا فصلوا علی اخیکم النجاشی (اٹھو اور اپنے بھائی نجاشی کی نماز جنازہ ادا کرو) تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم حبشہ کے کافروں میں سے ایک بڑے کافر پر نماز جنازہ پڑھیں (2)، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 609

مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ حضرت ضحاک نے کہا ہے: وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ سے مراد تورات اور انجیل ہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے: اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ (القصص: 54) (یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تین قسم کے (لوگ) ہیں جنہیں دو بار اجر دیا جائے گا..... پھر بیان فرمایا ... اہل کتاب میں سے ایسا آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایمان لایا پھر اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لے آیا اور آپ کی اتباع و پیروی کی اور آپ کی تصدیق کی تو اس کے لئے دو اجر ہوں گے (1)۔'' اور آگے حدیث ذکر کی اور نجاشی پر نماز کے بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور غائب میت پر نماز جنازہ کے بارے علماء کا اختلاف بھی گزر چکا ہے لہٰذا اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مجاہد، ابن جریج، اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ آیت اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی، اور یہ عام ہے اور نجاشی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کا نام اصحمہ تھا اور وہ عربی میں عطیہ ہے (2) اور خٰشِعِیْنَ کا معنی ہے عجز و انکساری کرنے والے۔ اور ترکیب کلام میں یہ یؤمن میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اِلَیْهِمْ یا اِلَیْكُمْ کی ضمیر سے حال ہے اور جو کچھ آیات میں ہے وہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اور پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23۔** قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ایسی نصیحت کے ساتھ کیا ہے جسے یہ دسویں آیت متضمن ہے اور یہ ان نصیحتوں میں سے ہے جو دنیا میں دشمنوں پر غالب آنے اور اخروی نعمتوں کے ساتھ کامیاب ہونے کو جامع ہے، اور طاعات پر ڈٹے رہنے اور شہوات سے اجتناب کرنے پر برانگیختہ کیا ہے اور صبر کا معنی رکنا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مصابرہ کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مصابرہ کا معنی ہے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور صبر میں ان پر غالب آنا، زید بن اسلم نے یہی کہا ہے (3)، اور حسن نے کہا ہے: پانچ نمازوں کی ادائیگی پر ثابت قدم رہنا اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمیشہ نفس کی مخالفت کرنا شہوات کی پیروی میں کہ وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے اور یہ ان سے دور ہے اور حضرت عطا اور قرظی نے کہا ہے: تم اس وعدہ پر ثابت قدم رہو جو تم سے کیا گیا ہے یعنی تم مایوس اور ناامید نہ ہو اور وسعت و خوشحالی کا انتظار کرو (4)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''صبر کے ساتھ کشادگی اور وسعت کا انتظار کرنا عبادت ہے (5)۔'' اس قول کو ابو عمر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور پہلا قول جمہور کا ہے۔

اور اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے:

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، حدیث نمبر 95، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197

فلم أرحيًا صابروا مثل صبرنا ولا كافحوا مثل الذين نكافحُ

میں نے کوئی زندہ نہیں دیکھا جنہوں نے ہمارے صبر کی مثل صبر کیا ہو اور نہ ہی (وہ دیکھے ہیں) جنہوں نے ان کی مثل کا دفاع کیا ہو جن کا دفاع ہم کرتے ہیں۔

ان کے قول صابروا مثل صبرنا کا معنی ہے وہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور ان میں کوئی بزدلی اور کمزوری ظاہر نہ ہوئی۔ اور مكافحة کا معنی ہے، جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا اور بالمقابل ہونا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ رَابِطُوْا کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس جمہور الامہ نے کہا ہے: تم اپنے دشمن کے سامنے مختلف حیلوں کے ساتھ کمر بستہ رہو، یعنی تم جنگ کے لئے اس طرح تیار رہو جس طرح تمہارا دشمن اس کی تیاری کرتا ہے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (1) (اور گھوڑے باندھنے کے ساتھ)

اور موطا میں امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور اس میں روم کے لشکر کا ذکر کیا اور اس کا جوان سے خوف اور خطرہ تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: امابعد، جہاں کہیں بندہ مومن پر اللہ تعالیٰ شدید تکلیف اور پریشانی نازل کرتا ہے تو اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کشادگی بھی عطا فرما دیتا ہے، کیونکہ ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی، اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۔ (2)

اور ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے بیان کیا ہے: یہ آیت ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کے بارے میں ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ نہ تھا جس میں لشکر سرحدوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوں، اسے حاکم ابو عبداللہ (3) نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ابو سلمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''کیا میں تمہاری اس پر راہنمائی نہ کروں جس کے سبب اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا ڈالتا ہے، اور درجات کو بلند فرماتا ہے (وہ) مشقت اور مصائب میں اچھے طریقہ سے وضو کرنا ہے، اور مساجد کی طرف کثرت سے چل کر جانا ہے، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے پس تم پر اسے پکڑنا لازم ہے'' آپ نے اسے تین بار فرمایا، اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ رباط کا معنی الملازمة فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ کو لازم پکڑنا) ہے۔ اس کی اصل ربط الخیل (گھوڑا باندھنا) سے ہے، پھر اسلام کی سرحدوں میں سے کسی سرحد کو ہر لازم پکڑنے والے کا نام مرابط رکھ دیا گیا ہے، چاہے وہ گھوڑ سوار ہو یا پیدل ہو۔ اور یہ لفظ الربط سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فذالکم الرباط بالا شبہ یہ رباط فی سبیل اللہ کے ساتھ تشبیہ ہے۔ اور رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: لیس الشدید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ

2۔ موطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 464

3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 329، حدیث نمبر 3177

4۔ موطا امام مالک، قصر الصلوٰۃ فی السفر، صفحہ 145

بالصرعۃ(1) (طاقتور پچھاڑ دینے کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا) اور اس قول کی طرح ہے: لیس المسکین بھذا الطواف(2) (اس چکر لگانے کے ساتھ مسکین ثابت نہیں ہوتا) اسی طرح کے اور اقوال بھی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کا قول ''رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہی ہے'' یہ مسلم نہیں ہے، کیونکہ خلیل بن احمد ائمہ لغت میں سے ایک ہیں اور ثقہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: رباط کا معنی سرحدوں کو لازم پکڑنا اور ان پر بیٹھے رہنا ہے اور نماز کے لئے مواظبت اختیار کرنا بھی ہے۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ نماز کا انتظار کرنا بھی حقیقتاً رباط کا لغوی معنی ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اس سے زیادہ وہ ہے جو شیبانی نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: ماءٌ مترابط ای دائم لاینزح۔ یعنی ماء مترابط اس ہمیشہ رہنے والے پانی کو کہا جاتا ہے جو ختم نہ ہوتا ہو، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ لغۃً رباط کے اس کے سوا معنی کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ اہل عرب کے نزدیک مرابطہ کسی شے پر ایسی گرہ لگانا ہے جو کھل نہ سکتی ہو، پس یہ اس کی طرف راجع ہے جس پر آدمی ڈٹ جائے اور صبر کرے، اور وہ دل کو اچھی نیت پر اور جسم کو فعل طاعت پر روک لینا اور لگا لینا ہے۔ اور اس کا عظیم تر اور اہم ترین معنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کے لئے) گھوڑے کو باندھنا (تیار کرنا) ہے۔ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے: ومن رباط الخیل اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نفس کو نمازوں پر لگانا اور متوجہ کرنا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے، اسے حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور شادی کے بعد خوشبو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ولا عِطرَ بعد عَرُوسٍ۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ فقہاء کے نزدیک المرابط فی سبیل وہ ہے جو سرحدوں میں سے ایک سرحد کو معین کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کی حفاظت کے لئے ایک مدت تک اس پر ثابت قدم رہے، اور اسے محمد بن مواز نے بیان کیا ہے [اور اسے روایت کیا ہے] اور رہے وہ لوگ جو سرحدوں پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں وہیں وہ آباد ہوتے ہیں اور وہیں کاروبار کرتے ہیں، پس اگر وہ وہاں محفوظ ہوں تو وہ مرابطین میں سے نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے یہی کہا ہے(3)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: رباط کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ سرحد مامون اور محفوظ ہوتی ہے اور وہاں اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کرنا جائز ہوتا ہے اور اگر وہ مامون و محفوظ نہ ہو تو پھر جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو وہیں کمر بستہ رکھے بشرطیکہ وہ جنگ لڑنے والوں میں سے ہو، اور وہ اپنے اہل وعیال کو وہاں منتقل نہ کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دشمن غالب آجائے اور وہ قید کر لے اور غلام بنا لے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ رباط کی فضیلت میں کثیر احادیث موجود ہیں، ان میں سے وہ ہے جسے امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن سرحد پر (حفاظت کے لئے) رہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہے(4)۔'' اور صحیح مسلم میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں

1۔ صحیح مسلم، البر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 326 2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 333

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 560، دار الکتب العلمیہ

4۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2678، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک دن اور ایک رات سرحد پر ثابت قدم رہنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کر رہا تھا اور اس کا رزق بھی اسے عطا کیا جائے گا اور شیاطین سے محفوظ رکھا جائے گا (1)۔''

ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت فضالہ بن عبید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے سوائے مرابط (سرحد پر ثابت قدم رہنے والے) کے کیونکہ اس کا عمل یوم قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون و محفوظ رہے گا (2)''۔ ان دونوں حدیثوں میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رباط ان افضل ترین اعمال میں سے ہے جن کا ثواب موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت علا بن عبدالرحمن کی حدیث میں ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا مات الانسان انقطع عنه عملُه الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله (3) (جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (اور) سوائے صدقہ جاریہ کے یا اس علم کے جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا نیک اور صالح بچے کے جو اس کے لئے دعا کرتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اور اسے روایت کرنے میں مسلم منفرد ہیں اور بلاشبہ صدقہ جاریہ، نفع دینے والا علم اور وہ صالح بیٹا جو اپنے والدین کیلئے دعا کرتا ہے یہ (اعمال) صدقات کے ختم ہونے، علم ضائع ہو جانے، اور بیٹے کی موت کے سبب منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور رباط کا اجر یوم قیامت تک کئی گناہ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ نماء کا معنی سوائے دو گناہ کرنے کے اور کوئی نہیں ہے، اور یہ کسی سبب پر موقوف نہیں کہ اس کے منقطع ہونے کے سبب یہ بھی منقطع ہو جائے، بلکہ یہ یوم قیامت تک الله تعالیٰ کی جانب سے دائمی فضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ نیکی کے تمام اعمال پر قدرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دشمن سے امن و سلامتی حاصل ہو اور دین کے نور کی حفاظت اور شعائر اسلام کو قائم کرنے کے سبب دشمن سے مکمل تحفظ اور بچاؤ حاصل ہو اور یہ وہ عمل ہے جس پر ثواب جاری رہتا ہے (اور) یہ ان اعمال صالحہ میں سے ہے جو وہ کرتا رہتا ہے، اسے ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من مات مرابطا فی سبیل الله اجری علیه اجر عمله الصالح الذین کان یعمل و اجری علیه رزقه و امن من الفتان و بعثه الله یوم القیامة امنا من الفزع (4) (وہ آدمی جو الله تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو گیا تو اس پر اس کے اس عمل صالح کا اجر جاری رہتا ہے جو وہ کرتا ہے اور اس پر اس کا رزق بھی جاری رکھا جاتا ہے اور اسے شیاطین سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور الله تعالیٰ قیامت کے دن اسے اٹھائے گا اس حال میں کہ وہ گھبراہٹ سے پر امن اور محفوظ ہو گا۔) اس حدیث میں ایک دوسری قید ہے اور وہ ہے حالت رباط میں موت کا آ جانا۔ والله اعلم۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 142
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، جلد 2، صفحہ 41
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 203

ہے: ''جس نے ایک رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری تو وہ اس کے لئے ہزار (دن اور) رات کے روزوں اور قیام کی مثل ہے (1)۔''

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن رمضان المبارک کے مہینے کے علاوہ پورے اخلاص کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہونا اجر و ثواب میں ایک سال کے روزوں اور قیام کی عبادت سے زیادہ اور افضل ہے اور رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن مسلمانوں کے خوف کی صورت میں پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد پر ڈٹ جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب میں ایک ہزار برس کے روزوں اور قیام کی عبادت سے افضل اور زیادہ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح سالم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا دیا تو اس پر ہزار برس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے اور اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے لئے رباط کا اجر قیامت کے دن تک جاری رکھا جائے گا (2)۔'' یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن (دشمن کے مقابلے میں) سرحد پر ڈٹ جانا دائمی ثواب کے حصول کا سبب بنتا ہے اگرچہ وہ اسی حال میں مرجائے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا ایک آدمی کے اپنے گھر میں ہزار برس روزے رکھنے اور قیام کرنے سے افضل ہے (ان میں) ایک سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور ایک دن ہزار برس کا ہے۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کے بارے میں بھی یہ موجود ہے کہ وہ بھی رباط ہے، اور نمازوں کا انتظار کرنے والے کو وہی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے ابونعیم الحافظ نے روایت نقل کی ہے کہ سلیمان بن احمد، علی بن عبدالعزیز، حجاج بن منہال دوسری سند ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا اور کہا کہ مجھے حسن بن موسیٰ نے بیان کیا ہے کہ حماد بن سلمہ نے ثابت بنانی سے اور انہوں نے ابو ایوب ازدی سے، انہوں نے نوف بکالی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مغرب کی نماز پڑھائی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی پس پیچھے رہ گیا جو پیچھے رہا اور واپس لوٹ گیا جو لوٹ گیا (یعنی کچھ لوگ وہیں پیچھے رہ گئے اور کچھ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز عشاء کے لئے تثویب کرنے سے پہلے تشریف لائے۔

پس آپ اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے آئے حالانکہ لوگ آپ کے پاس حاضر تھے اور آپ نے سبابہ انگلی کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتیس گنے اور اپنا کپڑا اپنے گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیا اور آپ کہنے لگے: ''اے مسلمانوں کے گر۔

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2755، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2759، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہیں بشارت ہو یہ تمہارا رب ہے اس نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ملائکہ پر اظہار فخر کر رہا ہے وہ کہہ رہا ہے اے میرے ملائکہ! تم میرے ان بندوں کی طرف دیکھو یہ ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں (1)۔'' اور اسے حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے اور انہوں نے مطرف بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نوف اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں اکٹھے ہوئے تو نوف نے تورات سے (یہ) بیان کیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تمہیں بغیر تقویٰ کے جہاد کے بارے حکم نہیں دیا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم فلاح وکامرانی کے امیدوار ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے: کہ لعل بمعنی لکی (تاکہ) ہے اور فلاح بمعنی بقاء (باقی رہنا) ہے۔ یہ سب سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل واحسان سے آج مورخہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء بمطابق ۲ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ بروز پیر دس بجے شب سورہ آل عمران کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ بندہ پر تقصیر اپنے کریم رب کی بارگاہ میں سراپا التجا ہے کہ اے میرے کریم پروردگار! اس کرم اور عنایت کو بار بار فرمانا، اپنی توفیقات سے نوازتے رہنا، اور تادم واپسیں اپنی بندگی کا ذوق، اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا شرف، اور اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے رکھنا۔ امین بجاہ نبیك الكريم عليه الصلوٰة والتسليم ثم الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين و على آله واصحابه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين۔

محمد انور مگھالوی

---

1۔ حلیۃ الاولیاء، طبقات الاصفیاء، جلد 6، صفحہ 54، مکتبۃ الخانجی مصر

حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرہ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

# ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی

بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

**کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

## ☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

**﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾**

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیرِ قرطبی

جلد سوم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی مولانا شوکت علی چشتی

زیرِ اہتمام:

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد سوم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

الحمد لله الذی انزل الکتاب علی نذیر للعالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین

# سورۃ النساء

(آیاتہا ۱۷۶) (۴ سورۃ النساء مدنیۃ ۹۲) (رکوعاتہا ۲۴)

یہ سورۃ، ایک آیت کے سوا باقی تمام مدنی ہے، وہ آیت فتح مکہ کے سال حضرت عثمان بن طلحہ الحجبی کے بارے میں نازل ہوئی، وہ آیت یہ ہے، اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ نقاش نے کہا: بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: (یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ) جہاں واقع ہو وہ مکی سورت ہے، یہ علقمہ وغیرہ کا قول ہے، یہ قرینہ ہے کہ اس سورت کا آغاز مکی ہو اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوا وہ مدنی ہو، نحاس نے کہا: یہ سورہ مکی ہے (1) میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرمایا:

> سورۂ نساء نازل ہوئی تو میں رسول کے پاس تھی اور اس میں علما کا اختلاف نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے حقوق زوجیت مدینہ طیبہ میں ادا کیے تھے۔ جو اس سورت کے احکام سے واقف تھے وہ جانتا ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے اور جن علماء نے یہ فرمایا کہ جس سورہ میں (یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ) واقع ہوا ہے وہ مکی ہے، صحیح نہیں ہے، سورہ بقرہ مدنی ہے اور اس میں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ دو جگہ آیا ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝۱

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں) اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے، وہ اللہ مانگتے ہو تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق) جس کے واسطہ سے اور (ڈرو) رحموں (کے قطع کرنے سے) بے شک اللہ تعالیٰ تم پر ہر وقت نگران ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ صحیح بخاری، فضائل قرآن، جلد 2، صفحہ 747، وزارت تعلیم اسلام آباد

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ سورہ بقرہ میں النَّاسُ کا اشتقاق، التقوی، الرب، الخلق، الزوج اور البث کا معنی گزر چکا ہے۔ اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں، اس آیت میں صانع (بنانے والا) پر تنبیہ اور آگاہی ہے فرمایا وَّاحِدَةٍ نفس کے لفظ کی تانیث کی بناء پر وَّاحِدَةٍ فرمایا۔ نفس کا لفظ مؤنث ہے اگرچہ اس سے مراد مذکر ہوتا ہے، کلام عرب میں من نفس واحد بھی جائز ہے یہ معنی کی رعایت کے اعتبار سے ہے، کیونکہ نفس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے اور یہ ابن ابی عبلہ کی قرأت میں بغیر (تا) کے واحد ہے (1)۔ وَبَثَّ اس کا معنی زمین میں بکھیر دینا اور پھیلا دینا ہے اسی سے ہے۔ وزرابی مبثوثة۔ وَبَثَّ کی تشریح سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مِنْهُمَا یعنی حضرت آدم اور حوا علیہما السلام۔ مجاہد نے کہا: حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کی چھوٹی پسلی سے پیدا کی گئی تھی۔ حدیث میں ہے: ''عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے'' (2)۔ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد کو دو قسموں میں محصور فرمایا۔ یہ اس کی مقتضی ہے کہ خنثی (ہیجڑا) کوئی نوع نہیں ہے لیکن اس کی حقیقت ہے جو اسے ان دو قسموں کی طرف لوٹا دیتی ہے اور وہ حقیقت اس کا یہ آدمی ہونا ہے پس یہ ان دو اسموں میں سے ایک کے ساتھ لاحق ہوگا جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے اعضاء کی کمی اور زیادتی کے اعتبار سے کسی ایک قسم سے ملحق ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ۔ اتَّقُوْا کو دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ جس کو حکم دیا جا رہا ہے ان کے نفوس کے لیے تنبیہ اور تاکید ہو جائے۔ الذین نعت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ الْاَرْحَامَ معطوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرو اور رحموں کے قطع کرنے سے ڈرو (یعنی رشتہ داروں سے قطع تعلقی سے ڈرو) اہل مدینہ نے تا اور سین کے ادغام کے ساتھ تسّاءلون پڑھا ہے (3) اور اہل کوفہ نے دو تاء کے اجتماع کی وجہ سے ایک تاء کے حذف کے ساتھ اور سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ معنی معروف ہے یہ اس قول کی طرح ہے وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ (مائدہ: 2) (نہ معاونت کرو گناہ پر) اور تنزل اور اس کے مشابہ الفاظ جس میں تا حذف ہوتی ہے۔

ابراہیم نخعی، قتادہ، اعمش اور حمزہ نے الْاَرْحَامِ کو جر کے ساتھ پڑھا ہے (4)۔ نحویوں نے اس کے متعلق گفتگو کی ہے۔ رہے بصری نحوی علماء تو ان کے رؤساء علماء نے کہا: یہ غلطی ہے اس کے ساتھ قرأت حلال نہیں اور رہے کوفی نحوی علماء انہوں نے فرمایا: یہ قبیح ہے اور انہوں نے اس پر مزید کچھ نہ کہا اور انہوں نے اس کے قبح کی علت ذکر نہیں کی۔ نحاس نے کہا: یہ میری معلومات کے مطابق ہے اور سیبویہ نے کہا: مضمر مجرور پر عطف نہیں ہوتا کیونکہ وہ تنوین کے قائم مقام ہوتا ہے اور تنوین پر عطف نہیں کیا جاتا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ ضمیر پر معطوف ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعے بھی سوال کرتے تھے۔ کوئی کہتا: میں تجھ سے اللہ تعالیٰ اور رحم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔ حضرت حسن، نخعی اور مجاہد نے اسی طرح تفسیر کی ہے (5) اور مسئلہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 3، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ تاریخ بغداد، ذکر النساء من اهل بغداد، جلد 14، صفحہ 431، مکتبہ العربیہ بغداد عراق

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت　4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت

5۔ جامع البیان، جلد 3-4، صفحہ 280، دار احیاء التراث العربیہ

میں صحیح یہی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ بعض علماء نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے ان میں سے زجاج بھی ہے، اسم ظاہر کا اسم ضمیر مجرور پر عطف قبیح ہوتا ہے مگر حرف جر کے اظہار کے ساتھ جائز ہوتا ہے مثلاً فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص: 81) لیکن مررت بہ وزید میں قبیح ہے۔ زجاج نے مازنی سے روایت کیا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں شریک ہیں ہر ایک دوسرے کی جگہ آتا ہے یعنی جس طرح مررت بزیدٍ وَكَ جائز نہیں ہے اسی طرح مررت بك وزید بھی جائز نہیں، رہا سیبویہ یہ اس کے نزدیک قبیح ہے اور یہ جائز نہیں ہے مگر شعر میں جائز ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فالیوم قربتَ تهجُونا وتشتِمُنا　　فاذهبْ فمابكَ والأيامِ من عَجَبِ

اس شعر میں ایام کا عطف ك پر ہے اور بغیر باء کے ہے اور یہ ضرورت شعری کے لیے ہے۔ اسی طرح ایک شاعر نے کہا:

تعلَّق فی مِثل السَّوَارِی سیوفنا　　وبینها والكَعْبِ مَهْوَی نَفَانِفُ

اس شعر میں الکعب کا عطف ھا ضمیر پر ہے اور ضرورۃً ہے ابوعلی نے کہا: یہ قیاس میں ضعیف ہے(1)۔ کتاب التذکرۃ المھدیہ میں فارسی سے مروی ہے کہ ابوالعباس المبرد نے کہا: اگر میں کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھوں جو مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ (ابراہیم: 22) اور اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ پڑھے تو میں اپنے جوتے اٹھا کر چلا جاؤں گا۔ زجاج نے حمزہ کی قرأت اپنے ضعف اور عربی میں قبح کی وجہ امر دین کے اصول میں عظیم خطا ہے(2)۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لا تحلفوا بابائکم (3)۔ اپنے آباء کی قسمیں نہ اٹھاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی قسم اٹھانا جائز نہیں تو رحم کی قسم اٹھانا کیسے جائز ہے۔ میں نے اسماعیل بن اسحاق کو دیکھا وہ غیر اللہ کی قسم کو ایک عظیم امر سمجھتے تھے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ نحاس نے کہا: بعض کا قول وَ الْاَرْحَامَ قسم ہے یہ اعراب اور معنی کے اعتبار سے خطا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث مروی ہے جو الْاَرْحَامَ کی نصب پر دلالت کرتی ہے شعبہ نے عون بن ابی جحیفہ سے انہوں نے منذر بن جریر سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے پاس تھے حتیٰ کہ ایک قوم مضر آئی برہنہ پا اور برہنہ جسم تھی میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ ان کے فاقہ کی کیفیت دیکھ کر آپ کا رنگ بدل گیا۔ پھر آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی اور لوگوں کو خطاب فرمایا اور یہ آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ تک تلاوت فرمائی پھر فرمایا: کسی نے دینار صدقہ کیا، کسی نے درہم صدقہ کیا، کسی نے کھجور کا صاع (چار کلو) صدقہ کیا(4)۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ یہ معنی نصب کے اعتبار سے ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے پر برانگیختہ کیا اور نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ جو قسم اٹھائے وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے(5)۔ یہ حدیث اس شخص کے قول

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 4
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 983
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327
5۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، جلد 2، صفحہ 368

کارد کرتی ہے جو کہتا ہے: اس کا معنی ہے اسالک باللہ وبالرحم۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ اور رحم کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں۔ ابو اسحاق نے کہا تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ کا معنی ہے تم اپنے حقوق ان کے واسطہ سے طلب کرتے ہو، اس کے ساتھ جر کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ ہے وہ جس پر میں آگاہ ہوا ہوں کہ علماء نے الْاَرْحَامَ کی قرأت جر کے ساتھ منع کی ہے۔ ابن عطیہ نے اس کو اختیار کیا ہے (1)۔ امام ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے اس کا رد کیا ہے اور عطف کو اختیار کیا ہے اور فرمایا ائمہ دین کے نزدیک اس کلام کی مثل مردود ہے کیونکہ وہ قرأتیں جو قراء ائمہ نے پڑھی ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ اہل صنعت اس کو جانتے ہیں جب کوئی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو پس جس نے اس کو رد کیا تو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر رد کیا اور اس نے آپ کی قرأت کو اچھا نہ سمجھا اور یہ مقام محذور ہے (یعنی ایسی بات سے بچا جاتا ہے) اس میں ائمہ لغت اور ائمہ نحو کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ عربی زبان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی گئی ہے اور کوئی شخص آپ کی فصاحت میں شک نہیں کرتا اور رہی حدیث جو ذکر کی گئی ہے اس میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو العشراء کو فرمایا: وابیک لو طعنت فی خاصرته (2)۔ تیرے باپ کی قسم اگر تو اسے پہلو میں نیزہ مارتا۔ پھر نہی تو غیر اللہ کی قسم کے بارے میں ہے اور یہ رحم کے حق کے ساتھ غیر کی طرف توسل ہے، اس میں نہی نہیں ہے قشیری نے کہا: بعض علماء نے فرمایا: یہ الرحم کے ساتھ قسم اٹھانا ہے یعنی اتقوا اللہ وحق الرحم جیسے تو کہتا ہے افعل کذا وحق ابیک میں ایسا کروں گا تیرے باپ کے حق کی قسم۔ قرآن میں ہے وَالنَّجْمِ، وَالطُّوْرِ، وَالتِّيْنِ، لَعَمْرُكَ اور یہ تکلف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی تکلف نہیں، کیونکہ کوئی بعید نہیں کہ وَالْاَرْحَامَ اس قبیل سے ہو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قسم اٹھائی ہو جیسے اس نے اپنی ان مخلوقات کے ساتھ قسم اٹھائی ہے جو اس کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرتی ہے اس کی تاکید کے لیے، حتی کہ اپنی ذات کے ساتھ انہیں ملایا اور اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے کہ وہ جس کے ساتھ چاہے قسم اٹھائے اور جو چاہے منع کرے اور جو چاہے مباح کرے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ قسم ہو اور عرب الرحم کی قسم اٹھاتے بھی ہیں اور با کا مراد ہونا بھی صحیح ہے پھر اس کو حذف کیا گیا ہو جس طرح اس شعر میں حذف کیا گیا ہے۔

مَشائِيمُ ليسوا مُصلِحِيْنَ عَشِيرَةً ولا ناعِبٍ إلّا بِبَيْنٍ غُرابُها

اس شعر میں ناعب کو جر دی گئی ہے اگرچہ با پہلے نہیں ہے۔ ابن الدہان ابو محمد سعید بن مبارک نے کہا: کوفی اسم ظاہر کا اسم مجرور پر عطف جائز قرار دیتا ہے، اس سے وہ منع نہیں کرتا اسی سے یہ قول ہے۔

اَبَكَ اَيَةٍ بِيَ أو مُصَدَّرِ من حُمُرِ الجِلّةِ جَأْبٍ حَشْوَرِ

اسی طرح یہ ہے۔ فَاذْهَبْ فمابِكَ والاَيّامِ مِنْ عَجَبِ

ایک اور کا قول ہے۔ وما بَيْنَها والكَعْبِ غُوْطٌ نَفانِفُ

ایک اور مصرعہ ہے۔ فحسبُكَ والضّحاكِ سَيْفٌ مُهَنَّدُ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 5، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ السنن الکبری للبیہقی، کتاب الصید والذبائح، جلد 9، صفحہ 246، دار الفکر

ایک اور کا قول ہے: ۔

قَدْ رامَ آفاقَ السَّماءِ فلم يَجِدْ　　له مَصعَداً فيها ولا الأرْضِ مَقْعَدَ

ایک اور قول ہے۔

ما إنْ بها والأمورِ مِنْ تَلَفٍ　　ماحُمَّ مِن امرِ غَيْبه وَقَعَا

ایک اور کا قول ہے۔

أمُرُّ على الكَتِيبَة لَسْتُ أدرِي　　أحَتْفِيَ كان فيها أمْ سواها

اسی شعر میں فسواھافی حرف جر کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرٰزِقِيْنَ ۝ (الحجر) کو اس پر محمول کیا ہے یعنی کاف اور میم پر عطف ہے۔ عبداللہ بن یزید نے وَالْاَرْحَامَ کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر مقدر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی والارحام اھلٌ ان توصل (1)۔ اور اس میں اغراء کا بھی احتمال ہے کیونکہ عربوں میں کچھ المغریٰ کو مرفوع پڑھتے ہیں۔ الفراء نے یہ دلیل دی ہے۔

إن قوما منهم عُمَيْرٌ وأشْبَا　　هُ عُمَيْرٍ ومنهم السفاحُ

لَجَديرون بالّلقاء إذاقا　　ل أخو النَّجْدَةِ السلاحُ السلاحُ

یہ بھی کہا گیا ہے کہ الْاَرْحَامَ، بِہٖ کے محل پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس کا محل نصب ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔

فلسنا بالجبال ولا الحديدا

وہ کہتے تھے: انشدك بالله وبالرحم۔ اظہر یہ ہے کہ اس کو نصب فعل کے اضمار کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ صلہ رحمی واجب ہے اور اس کا قطع کرنا حرام ہے۔ صحت کے ساتھ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء سے فرمایا: جب انہوں نے پوچھا تھا کہ میں اپنی ماں (جو کافرہ تھی) سے صلہ رحمی کروں؟ ہاں اپنی ماں سے صلہ رحمی کرو (2)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صلہ رحمی کا حکم دیا، حالانکہ اس کی ماں کافرہ تھی پس اس کی تاکید کی وجہ سے کافر سے صلہ رحمی کرنے میں بھی فضل داخل ہے، حتیٰ کہ یہاں تک معاملہ پہنچا کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ذوی الارحام کو میراث ملے گی اگر مرنے والے کا کوئی عصبہ اور متعین فرض والا وارث نہ ہو اور جو شخص اپنے ذی رحم کو خریدے گا حرمت رحم کی وجہ سے وہ آزاد ہو جائیں گے اور علماء احناف نے اس قول کی تائید ابوداؤد کی حدیث سے لی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ذی رحم محرم کا مالک ہوگا وہ غلام آزاد ہوگا (3)۔ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہی مروی ہے، اور صحابہ میں سے کوئی ان کا مخالف معروف نہیں ہے۔ یہی قول حسن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 3　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 324　　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، جلد 2، صفحہ 194

بصری، جابر بن زید، عطا، شعبی اور زہری کا ہے اور اس کی طرف ثوری، احمد اور اسحاق گئے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہمارے علماء (مالکیہ) کے تین اقوال ہیں (۱) یہ آباء اور اجداد کے ساتھ خاص ہے (۲) اس سے بھائی مراد ہیں اور تیسرا قول امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: خریدنے والے پر اس کی اولاد، آباء اور امہات آزاد ہو جائیں گی اور اس کے بھائی اور کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار آزاد نہ ہوگا، صحیح پہلا قول ہے اس حدیث کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے ذکر کیا ہے بہتر طریق نسائی ہے انہوں نے اس کو ضمرہ عن سفیان عن عبداللہ بن دینار عن ابی عمر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ذی رحم محرم کا مالک ہو گا وہ اس پر آزاد ہو جائے گا۔ اس حدیث کا ہر راوی عادل ہے اور اس میں کسی نے جرح قدح نہیں کی ہے، کسی ایسی علت کے ساتھ جو اس کے ترک کا موجب ہو مگر نسائی نے اس کے آخر میں کہا: یہ حدیث منکر ہے۔ دوسرے نے کہا: ضمرہ اس میں منفرد ہے۔ یہ اصطلاح محدثین میں شاذ اور منکر کا معنی ہے، ضمرہ، عادل اور ثقہ ہے۔ ثقہ کا منفرد ہونا حدیث کے لیے مضر نہیں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ رضاعی ذوی المحارم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اکثر اہل علم کا قول ہے کہ وہ حدیث کے مقتضی میں داخل نہیں۔ شریک القاضی نے ان کی آزادی کا کہا ہے۔ اہل ظاہر اور متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ باپ، بیٹے پر آزاد نہ ہوگا جب وہ اس کا مالک ہوگا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے ''بچہ اپنے والد کا احسان ادا نہیں کرے گا مگر جب وہ اسے غلام پائے پھر اسے خریدے اور آزاد کر دے'' (1)۔ ان علماء نے کہا: جب شرا (خریدنا) صحیح ہے تو ملک بھی ثابت ہوئی اور مالک کے لیے تصرف کا حق ہے۔ یہ مقاصد شرع سے ان کی جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بقرہ: 83) ''اپنے والدین سے احسان کرو''۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور والدین سے احسان کرنے کو وجوب میں اکٹھا فرمایا اور والد کا بیٹے کی ملکیت میں اور اس کی سلطنت کے تحت ہونا احسان میں نہیں ہے، پس اسی پر اس کا آزاد کرنا واجب ہے یا تو اس لیے کہ ملک کی وجہ سے حدیث پر عمل کرتے ہوئے (خریدے اور پھر اسے آزاد کر دے) یا احسان کی وجہ سے آیت پر عمل کرتے ہوئے۔ حدیث کا معنی جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ بچہ، باپ کی آزادی کا سبب بنا، جب اس نے اسے خریدا، تو شریعت نے آزاد کرنے کی نسبت اس کی طرف کر دی رہا علماء کا اختلاف تو وہ اس کے بارے میں ہے جو ملک کی وجہ سے آزاد ہوگا، پہلے قول کی وجہ وہی ہے جو ہم نے کتاب وسنت کے معنی سے بیان کر دی ہے اور دوسرے قول کی وجہ قرابت قریبہ محرمہ کو حدیث میں مذکور باپ کے ساتھ لاحق کرنا ہے اور انسان کے لیے اپنے بیٹے سے زیادہ کوئی قریبی نہیں، پس باپ پر محمول ہوگا اور بھائی اس میں اس کو قریب کرتا ہے کیونکہ ابوت کی وجہ اسے قریب کرتا ہے، پس وہ کہتا ہے: انا ابن ابیہ، میں اس کے باپ کا بیٹا ہوں۔ رہا تیسرا قول، اس کے متعلق ضمرہ کی حدیث ہے۔ وہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ الْاَرْحَامَ، الرحم، ہر قسم کے رشتہ دار کو کہا جاتا ہے خواہ وہ محرم ہو یا غیر محرم ہو۔ ابو حنیفہ ہبہ سے رجوع سے منع میں ذی رحم محرم کا اعتبار کرتے ہیں۔ چچوں کے بیٹوں کے حق میں رجوع جائز ہے حالانکہ قطعیت

1۔ صحیح مسلم، کتاب العتق، جلد 1 صفحہ 495

موجود ہے اور قرابت حاصل ہے، اسی وجہ سے میراث، ولایت اور دوسرے احکام اس کی وجہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ پس محرم کا اعتبار، نص کتاب پر، بغیر کسی دلیل کے زیادتی ہے، احناف اس کو مسخر خیال کرتے ہیں اور اس میں قطعیت کی علت کی طرف اشارہ ہے اور انہوں نے چچا کے بیٹوں، خالوؤں اور خالاؤں کے بیٹوں کے حق میں قطعیت کو جائز قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے رَقِيْبًا کا معنی حفیظاً (1) اور ابن زید سے علیما (1) معنی مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رَقِيْبًا کا معنی حفاظت کرنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعیل بمعنی فاعل ہے۔ الرقیب اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور الرقیب کا معنی حفاظت کرنے والا اور انتظار کرنے والا ہے۔ تو کہتا ہے: رقبت ارقب رقبة و رقبانا، جب تو انتظار کرے۔ المرقب بلند و بالا جگہ کو کہتے ہیں جس پر رقیب کھڑا ہوتا ہے۔ الرقیب سات تیروں میں سے تیسرے تیر کو کہتے ہیں جن کے لیے حصے ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ رقیب، سانپوں میں سے ایک سانپ ہے۔ پس یہ لفظ مشترک ہے واللہ اعلم۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

''اور دے دو یتیموں کو ان کے مال اور نہ بدلو (اپنی) ردی چیز کو (ان کی) عمدہ چیز سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے''۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ۔ یتامیٰ سے مراد یتیم لوگ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ (الاعراف) سجود کے ساتھ سحر نہیں تھا۔ اسی طرح بلوغ کے ساتھ یتیم نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہا جاتا ہے (2)، ان کی صحبت کی وجہ سے وَاٰتُوا کا مطلب ہے اعطوا اور ایتاء کا معنی الاعطاء ہے۔ لفلان اتو یعنی فلاں کے لیے عطا ہے۔ یہ ابو زید کا قول ہے اتوت الرجل آتوہ اتاوۃ یعنی میں نے اسے یہ رشوت دی۔ یتیم وہ ہوتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو۔ سورۃ بقرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ یہ خطاب اولیاء اور اوصیاء کو ہے۔ مقاتل اور کلبی کے قول میں غطفان کے ایک شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس کے پاس یتیم بھتیجے کا بہت سا مال تھا، جب یتیم بالغ ہوا تو اس نے مال کا مطالبہ کیا اس کے چچا نے اس کو منع کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ چچا نے کہا: ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں بڑے گناہ سے اور مال واپس کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو نفس کے بخل سے بچایا گیا اور اس طرح لوٹ آیا تو وہ اس کے گھر میں اترے گا'' یعنی جنت میں اترے گا جب اس نوجوان نے مال پر قبضہ کر لیا تو اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اجر ثابت ہوا اور بوجھ باقی ہوا، پوچھا گیا: یا رسول اللہ یہ کیسے ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غلام کے لیے اجر ثابت ہوا اور اس کے باپ پر بوجھ باقی ہے (3)''۔ کیونکہ وہ مشرک تھا۔

1۔ جامع البیان، جلد 3-4، صفحہ 283　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 5　3۔ جامع اسباب النزول، جلد 2، صفحہ 93، قدیمی کتب خانہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ یتیموں کو مال دینا دو اعتبار سے ہو سکتا ہے، ایک یہ ہے کھانا اور لباس جاری کرنا جب تک کہ ولایت ہو کیونکہ ممکن نہیں مگر یہ اس کے لیے ہے جو کلی طور پر لینے اور خود رائے رکھنے کا مستحق نہ ہو جیسے چھوٹا اور بڑا بے وقوف۔ دوسرا یہ کہ مال حوالے کر کے عطا کرنا اور یہ ابتلا اور ارشاد کے وقت ہوتا ہے، اس وقت اسے یتیم مجازاً کہا جاتا ہے معنی ہوگا جو یتیم تھا، یہ استصحاب الاسم (☆) ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ** (الاعراف) گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہا جاتا تھا اور جب ولی کو یتیم کی رشد کا یقین ہو جائے تو اس کا مال اس سے روکنا اس پر حرام ہے اور وہ گنہگار ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب وہ پچیس سال کا ہو جائے تو ہر حال میں اس کو مال دیا جائے گا کیونکہ اسی عمر میں وہ سنجیدہ ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رُشد کے محسوس کرنے کا ذکر نہیں کیا اور اس ارشاد میں ذکر فرمایا **وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ** ''اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال''۔ ابوبکر رازی حنفی نے ''احکام القرآن'' میں لکھا ہے کہ جب ایک جگہ رشد مقید نہیں ہے اور دوسری جگہ مقید ہے کہ ان دونوں مقامات کا استعمال واجب ہے۔ پس میں کہتا ہوں: جب پچیس سال کا ہو جائے اور وہ ابھی سفیہ (بے وقوف) ہو اور اس سے دانائی محسوس نہ ہو تو پھر بھی اس کو مال دینا واجب ہے اور اگر اس سے عمر میں کم ہو اور دانائی محسوس نہ ہو تو مال دینا واجب نہیں اس طرح دونوں آیتوں پر عمل ہو جائے گا (1)۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب یتیم دانائی کو پہنچ جائے تو وہ سنجیدہ ہونے کی صلاحیت میں ہوگا اور جب سنجیدہ ہونے کی صلاحیت میں ہوگا تو پھر یتیم کی علت اور یتیم اسم کی وجہ سے اس کو مال دینا کیسے صحیح ہوگا؟ یہ بہت بعید ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے خصوصاً ان کی اپنی اصل پر کہ مقدرات قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں بلکہ وہ نص کی جہت سے لی جاتی ہیں، اس مسئلہ میں کوئی نص نہیں ہے۔ حجر کے بارے میں علماء کے اقوال آگے ذکر ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ** یعنی یتیم کے مال سے موٹی بکری کو دبلی بکری سے مت بدلو، عمدہ درہم کو کھوٹے درہم سے مت بدلو۔ لوگ زمانہ جاہلیت میں دین کے نہ ہونے کی وجہ سے یتیموں کے مال کھانے سے نہیں ڈرتے تھے وہ یتیموں کے مال سے عمدہ اور بہتر لے لیتے تھے اور ردی اموال سے اسے بدل لیتے تھے اور کہتے اسم کے بدلے اسم، راس کے بدلے راس۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس برائی سے منع کیا۔ یہ سعید بن مسیب، زہری، سدی، ضحاک کا قول ہے اور یہی آیت کا ظاہر ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے یتیموں کے مال نہ کھاؤ یہ حرام اور خبیث ہے اور طیب و پاکیزہ کو نہ چھوڑو اور وہ تمہارے اپنے مال ہیں۔ مجاہد، ابو صالح اور باذان نے کہا: یتیموں کے مال میں خبیث کھانے میں جلدی نہ کرو اور اللہ کی طرف سے رزق حلال کے انتظار کو مت چھوڑو (3)۔ ابن زید نے کہا: زمانہ جاہلیت

---

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 49　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 284　　3۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 285

☆ یہ ایک اصطلاح ہے جس کی وضاحت ماقبل سے ہو رہی ہے یعنی بالغ ہونے سے کیونکہ یتیم تھا اسی وجہ سے یتیم کہا گیا۔

کے لوگ عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں بناتے تھے، بڑا میراث پر قبضہ کر لیتا (1)۔ عطا نے کہا: اس کا مطلب ہے تو اس یتیم پر نفع نہ اٹھا جو تیرے پاس ہے یہ چھوٹا دھوکا ہے۔ یہ دونوں قول آیت کے ظاہر سے خارج ہیں کیونکہ تبدل الشی بالشی کا مطلب ہے کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ لینا۔ اسی سے بدل ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت انفاق میں خلط سے منع کرنے والی ہے عرب اپنے نفقہ (خرچ) کو یتیموں کے نفقہ کے ساتھ ملا دیتے تھے تو انہیں اس سے منع کیا گیا پھر وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ:220) یعنی (اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) سے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ ابن فورک نے الحسن سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے اس آیت کی تاویل یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانے کی نہی سے کی اور خود بخود اس سے اجتناب کرنے لگے پس سورہ بقرہ کی آیت وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ میں ان سے تخفیف کی گئی (2)۔ متاخرین کی ایک جماعت نے کہا الی بمعنی مع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران:52) قتبی نے یہ دلیل پیش کی ہے:

يُسَدُّون أبوابَ القِبابِ بِضُمَّرٍ إلى عُنُنٍ مُسْتَوثِقَاتِ الأَوَاصِرِ

اس شعر میں الی بمعنی مع ہے۔

لیکن یہ قول درست نہیں، محققین نے فرمایا الی اپنے معنی میں ہے اور اضافت کو متضمن ہے یعنی ان کے اموال کو نہ ملاؤ اور کھانے میں اپنے اموال کے ساتھ جمع نہ کرو (3)۔ پس انہیں منع کیا گیا کہ وہ یتیموں کے اموال کو اپنے اموال کی طرح خیال کریں اور پھر ان پر کھانے یا نفع اٹھانے کے اعتبار سے مسلط ہو جائیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۝ ۔ اِنَّهٗ میں ہ ضمیر سے مراد کھانا ہے حُوْبًا كَبِيْرًا۔ بڑا گناہ۔ حضرت ابن عباس اور حسن وغیرہما سے مروی ہے (4): کہا جاتا ہے: حاب الرجل یحوب حوباً جب کوئی گناہ کرے اس کی اصل اونٹ کو جھڑکنا ہے پھر گناہ کو حوب کہا گیا، کیونکہ اسے اس کے ساتھ جھڑکا جاتا ہے۔ دعا میں کہا جاتا ہے: اللھم اغفر حوبتی یعنی اے اللہ میرا گناہ معاف فرما۔ الحوبۃ کا معنی حاجت بھی ہے دعا میں ہے الیک ارفع حوبتی۔ یعنی میں تیری بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرتا ہوں۔ الحوب کا معنی وحشت بھی ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ابو ایوب کے بارے میں ہے: ''ام ایوب کی طلاق وحشت ہے (5)''۔ اس لفظ میں تین لغات ہیں۔ حوبًا۔ بضم حاء۔ یہ عام قرأت ہے اور اہل حجاز کی لغت ہے حسن نے حوباً بفتحہ حا پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: یہ تمیم کی لغت ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ حبش کی لغت ہے۔ الحوب مصدر ہے اسی طرح العیابۃ بھی مصدر ہے الحوب اسم ہے ابی بن کعب نے حاباً پڑھا ہے مصدر کی بنا پر جسے القال مصدر ہے اسم ہونا بھی جائز ہے جیسے الزاد ہے۔ الحوأب (واؤ کے بعد ہمزہ) کھلے مکان کو کہتے ہیں۔ الحواب پانی کو

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6 2۔ ایضاً 3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 287
4۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 25، صفحہ 328-136 5۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 466

بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: الحق اللہ بہ الحوبۃ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسکنت اور حاجت لاحق کر دی۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: بات بحیبۃ سوء اس نے مسکنت میں رات گزاری۔ یا کی اصل واؤ ہے تحوب فلان یعنی گناہ کو اپنے نفس سے دور کیا اور عبادت کی۔ التحوب کا معنی پریشان ہونا بھی ہے۔ سخت چیخنا بھی ہے جیسے زجر و توبیخ ہوتی ہے لان یتحوب من کذا۔ فلاں نے تکلیف محسوس کی۔ طفیل نے کہا:

فذُوقوا کما ذُقْنا غَداۃَ مُحجّر ۔۔۔ مِن الغَیظِ فی أکبادِنا والتّحَوُّبِ

پس تم بھی مزا چکھو جس طرح ہم نے تکلیف اور غصہ کی وجہ سے اپنے جگروں میں فجر کی صبح مزا چکھا تھا۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

''اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِنْ خِفْتُمْ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَانْكِحُوْا ہے یعنی اگر تمہیں ان کے مہور اور ان میں خرچ کرنے میں عدل نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو ان سے نکاح کرو جو تمہیں (ان کے علاوہ) پسند ہیں۔ ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔ حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ کے تحت روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: اے میرے بھانجے! یہ اس یتیم بچی کے بارے ہے جو کسی ولی کی پرورش میں ہوتی تھی اور وہ اس کے مال میں شریک ہوتی تھی پس اس بچی کا مال اور جمال اس ولی کو اچھا لگتا تو وہ اس سے خود نکاح کرنا چاہتا مگر اس کے مہر میں انصاف اور جتنا کوئی دوسرا اسے مہر دیتا اتنا وہ دینے کا ارادہ نہ کرتا۔ پس انہیں ان عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا مگر یہ کہ ان سے انصاف کریں اور رواج کے مطابق انہیں مہر دیں۔ اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان عورتوں کے علاوہ جو انہیں پسند ہیں ان سے نکاح کریں۔ حدیث مکمل ذکر کی (1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہم نے کہا: وصی کو یتیم کے مال سے خود خریدنا جائز ہے جب کہ اس میں اس کا زیادہ فائدہ نہ ہو اور مؤکل کے لیے اس میں نظر کرنا جائز ہے جو وکیل اپنے لیے خریدے یا اپنے لیے بیچے اور سلطان کو نظر کی اجازت ہے جو وصی ایسا کرے، رہا باپ اس کے لیے نظر کرنا جائز نہیں جب تک کہ محابات ظاہر نہ ہو، اس وقت سلطان اس کے سامنے آئے۔ اس کے متعلق قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ضحاک اور حسن وغیرہما نے کہا: یہ آیت جو کچھ زمانہ جاہلیت

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی حدیث الھجرۃ ویقال لہ الرحل بالحاء، جلد 2، صفحہ 420

میں تھا اور جو ابتداء اسلام میں تھا اس کے لیے ناسخ ہے۔ ایک شخص کے لیے جائز ہوتا تھا کہ آزاد عورتوں میں سے جتنی عورتوں کے لیے چاہتا نکاح کرتا۔ اس آیت نے چار عورتوں پر محصور کر دیا(1)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن جبیر وغیرہما نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتامیٰ میں انصاف نہیں کر سکو گے، اسی طرح انہیں خوف ہو عورتوں کے بارے میں، کیونکہ وہ یتیموں کے بارے میں ڈرتے تھے اور عورتوں کے بارے میں نہیں ڈرتے تھے۔ خفتم اضداد میں سے ہے۔ کیونکہ جس چیز سے ڈرا جاتا ہے کبھی اس کا وقوع معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس کا وقوع مظنون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس خوف کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے(2)۔ ابوعبیدہ نے کہا: **خِفْتُمْ** بمعنی ایقنتم ہے(3)۔ اور دوسرے علماء نے فرمایا: **خِفْتُمْ** بمعنی ظننتم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس معنی کو محققین نے اختیار کیا ہے۔ یہ ظن کے باب سے ہے، نہ کہ یقین کے باب سے۔ تقدیر یہ ہے کہ جس کو یتیمہ کے لیے انصاف میں کوتاہی کا غالب گمان ہو تو وہ اس سے اعراض کرے اور **تُقْسِطُوْا** کا معنی تعدلوا ہے کہا جاتا ہے: اقسط الرجل، جب وہ عدل کرے۔ قسط جب کوئی دوسرے پر ظلم اور زیادتی کرے(4)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا** (الجن) اس آیت میں قاسطون سے مراد ظلم کرنے والے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: المقسطون فی الدین علی منابر من نور یوم القیامۃ(5)۔ یعنی دین میں عدل کرنے والے قیامت کے روز نور کے منبروں پر ہوں گے۔ ابن وثاب اور نخعی نے تقسطوا تاء کے فتحہ کے ساتھ قسط سے مشتق کر کے پڑھا ہے لاکی زیادتی کی تقدیر پر۔ گویا فرمایا: اگر تمہیں ظلم کرنے کا خوف ہو(6)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** اگر یہ سوال کیا جائے کہ آدمیوں کے لیے ما کیسے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ تو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ اس کے پانچ جواب ہیں (۱) من اور ما ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا** (الشمس) قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اسے بنایا یعنی و من بناھا۔ مذکورہ آیت میں مَا، مَنْ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا **فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ** (النور:45) اس آیت میں من، مَا کی جگہ استعمال ہوا ہے پس یہاں مَا ذوالعقول کے لیے ہے اور وہ عورتیں ہیں کیونکہ اس کے بعد **مِّنَ النِّسَآءِ** مبہم کو بیان کرنے والا ہے۔ ابن ابی عبلہ نے ذوالعقول کے ذکر کی بنا پر من طاب پڑھا ہے(7)۔ (۲) بصریوں نے کہا: مَا نعوت کے لیے واقع ہوتا ہے جس طرح غیر ذوالعقول کے لیے واقع ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ما عندك؟ کہا جاتا ہے: ظریف کریم۔ معنی یہ ہے کہ عورتوں میں سے جو حلال ہیں ان سے نکاح کرو اور جس کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ طیب نہیں ہے قرآن میں ہے **وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ** (الشعراء) موسیٰ علیہ السلام نے اسے اس کے سوال کے مطابق جواب دیا۔ (۳) بعض علماء نے حکایت کیا ہے کہ اس آیت میں ماظرفیۃ ہے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 292　2۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 290　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6
4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 7　5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ بن عمر، جلد 2، صفحہ 160
6۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6　7۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 7

یعنی جب تک تم نکاح کو اچھا سمجھتے ہو۔ اس میں ضعف ہے (1)۔ (۴) فراء نے کہا: مَا یہاں مصدریہ ہے، نحاس نے کہا: یہ بہت بعید ہے فانکحوا الطیبۃ صحیح نہیں ہے۔ جوہری نے کہا: طاب بالشی یطیب طیبۃ وتطیابا۔ علقمہ نے کہا۔

كأنَّ تَطْيَابَهَا فِي الأنفِ مَشْمُومُ

پانچواں جواب یہ ہے کہ ما سے مراد یہاں عقد ہے یعنی حلال نکاح کرو۔ ابن ابی عبلہ کی قرأت ان تین اقوال کا رد کرتی ہے۔ ابوعمرو بن العلاء نے حکایت کیا ہے کہ اہل مکہ جب کڑک کی آواز سنتے تو کہتے سبحان ما سبح له الرعد پاک ہے وہ ذات جس کے لیے کڑک نے پاکی بیان کی۔ اس میں ما بمعنی من ہے اس کی مثل ان کا قول ہے سبحان ما سخرکن لنا یعنی من سخرکن لنا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی۔ اس کے لیے مفہوم نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس کو یتامیٰ کے بارے ناانصافی کا خوف نہ ہو تو اس کے لیے ایک، دو، تین یا چار سے نکاح کرنا جائز ہے، جس طرح خوف والے کے لیے جائز ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی جس کو اس کا خوف تھا اور اس کا حکم اس سے اعم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام ابوحنیفہ نے اس آیت سے یتیمہ کے نکاح کا بلوغت سے پہلے جائز ہونے کا تعلق جوڑا ہے۔ فرمایا: بلوغ سے پہلے یتیمہ ہوتی ہے، بلوغت کے بعد مطلق عورت ہوتی ہے یتیمہ نہیں ہوتی اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بالغہ کا ارادہ کیا ہوتا تو اس کے مہر مثل سے کم کرنے کی نہی نہ کی جاتی کیونکہ اسے یہ اختیار ہوتا ہے، پس یہ تو اجماعاً جائز ہے۔ امام مالک اور جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا نکاح جائز نہیں حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے اور اس سے مشورہ لیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ اور نساء کا اسم اس کا اطلاق بڑی عورتوں پر ہوتا ہے جس طرح رجال کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے اور الرجل کا اسم چھوٹے بچے کو شامل نہیں ہوتا اسی طرح النساء کا اطلاق بچی کو شامل نہیں۔ المرأۃ کا لفظ چھوٹی بچی کے لیے نہیں بولا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فِیْ یَتٰمَى النِّسَآءِ۔ پس وہاں بھی وہی مراد ہے جو یہاں یَتٰمَى النِّسَآءِ سے مراد ہے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آیت میں بڑی یتیمہ داخل ہے پس اس کی اجازت کے بغیر اس سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور چھوٹی بچی سے نکاح کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے لیے اجازت نہیں ہے جب وہ بالغ ہوگی تو اس کا نکاح جائز ہوگا لیکن اس کی اجازت سے نکاح ہوگا جیسا کہ دارقطنی نے محمد بن اسحاق کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ محمد بن اسحاق نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: میرے خالو قدامہ بن مظعون نے میرا نکاح اپنے بھائی عثمان بن مظعون کی بیٹی سے کر دیا۔ مغیرہ بن شعبہ اس کی ماں کے پاس آیا اور اس کے مال میں رغبت کی اور اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا، معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا، قدامہ نے کہا: یا رسول اللہ! وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے اور میں اس کے باپ کا وصی ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی میں نے اس کا نکاح ایسے شخص سے کر دیا ہے جس کی فضیلت اور قرابت کو میں جانتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: وہ یتیمہ ہے اور یتیمہ اپنے معاملہ کی زیادہ حق دار ہے، وہ مجھ سے لی گئی اور اس کا نکاح مغیرہ بن شعبہ سے کر دیا (2)۔ دارقطنی نے کہا: محمد بن اسحاق نے نافع سے نہیں سنا ہے اس سے عمر بن حسین

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 7 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 230، حدیث نمبر 36

نے اور انہوں نے نافع سے سنا ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی ذئب نے عمر بن حسین سے انہوں نے نافع سے انہوں نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، انہوں نے اپنے خالو عثمان بن مظعون کی بیٹی سے نکاح کیا فرمایا: اس کی والدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی اور عرض کی: میری بیٹی اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر کو اسے جدا کرنے کا حکم دیا تو اس نے اسے جدا کر دیا اور فرمایا: ''یتیم بچیوں سے نکاح نہ کرو حتی کہ اس سے مشورہ کرلو جب وہ خاموش رہیں تو یہ اس کا اذن ہو گا'' (1)۔ حضرت عبد اللہ کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اس سے نکاح کر لیا۔ یہ امام ابو حنیفہ کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ عورت بالغ ہو جائے تو ولی کی محتاج نہیں اپنی اصل کی بنا پر کہ صحت نکاح میں ولی کی شرط نہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے اور ان کے اس قول کا کوئی معنی نہیں کہ یہ حدیث غیر بالغہ پر محمول ہے کیونکہ ''مگر اس کی اجازت سے'' کے الفاظ اس محمل کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ پھر یتیم کے ذکر کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس آیت کی حضرت عائشہ کی تفسیر سے وہ مسئلہ سمجھ آتا ہے جو امام مالک نے مہر مثل کے بارے میں فرمایا اور مہر کے فساد اور اس کی مقدار میں غبن واقع ہونے کی صورت میں مہر مثل کی طرف لوٹایا جائے گا کیونکہ حضرت عائشہ نے فرمایا: مہر جو کم از کم رائج ہے۔ پس لوگوں کے ہر طبقہ میں ان کے احوال کی حیثیت سے مہر مثل معروف ہونا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں کے لیے نکاح میں ان کے لیے وہ معروف ہیں اور وہ اسے جانتے ہیں یعنی وہ مہر اور کفو ہونا اسے معلوم ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے فقیر بھتیجے سے کر دیا تو اس کی ماں نے اس پر اعتراض کیا۔ تو اس نے کہا: میں اس کے لیے اس کے متعلق کلام کرنے والے کی گنجائش دیکھتا ہوں۔ پس اس کے لیے اس کلام میں جواز رکھا گیا حتی کہ اس نے ظاہر کیا ایسی چیز کو جس نے ماں کے اعتراض کو ساقط کر دیا اور اس میں یہ لفظ بھی مروی ہے کہ میں اس کے لیے کلام کرنے والے کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور غیر یتیمہ کے لیے جائز ہے کہ وہ مہر مثل سے کم پر نکاح کر لے کیونکہ یہ آیت یتامیٰ کے بارے میں ہے۔ یہ اس آیت کا مفہوم ہے اور غیر یتیمہ اس کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جب یتیمہ بالغ ہو جائے اور ولی اس کے مہر میں انصاف کا تقاضا پورا کرے تو اس کے لیے اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ کی تفسیر پر وہ خود نکاح کرنے والا اور جس کا نکاح کیا گیا دونوں طرف سے ہوگا۔ یہی امام ابو حنیفہ، اوزاعی ثوری اور ابو ثور کا قول ہے۔ تابعین میں سے حضرت حسن اور ربیعہ کا قول ہے۔ یہی امام لیث کا قول ہے۔ امام زفر اور امام شافعی نے فرمایا: اس کے لیے اس یتیمہ سے نکاح کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ سلطان اجازت دے یا ولی ابعد اس سے اس کا نکاح کر دے یا اس کی مثل قرابت کا جو اس کی مثل ہے وہ نکاح کر دے اور خود نکاح کرنے والا ہونا، اور اپنے ساتھ نکاح کرنا یہ جائز نہیں اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ ولایت، عقد کی شروط میں سے ایک شرط ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نکاح نہیں ہے مگر ولی کے ذریعے اور دو عادل گواہوں کے ذریعے'' (2)۔ نکاح کرنے والے اور نکاح کرانے والے اور گواہوں کی تعداد واجب ہے، جب ان میں سے دو ایک ہو جائیں تو ان میں سے ایک ساقط ہوگا، اس مسئلہ میں ایک

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 229، حدیث نمبر 35	2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 225، حدیث نمبر 21

تیسرا قول بھی ہے وہ یہ ہے عورت اپنا معاملہ کسی شخص کے سپرد کر دے وہ اس کا نکاح اپنے آپ سے کر دے۔ یہ مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ ابن منذر نے یہ ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اس کا معنی ہے جو تمہارے لیے حلال ہیں۔ حضرت حسن، حضرت ابن جبیر وغیرہما سے مروی ہے (1)۔ ان کے ذکر پر اکتفا کیا جس کے ساتھ نکاح جائز ہے، کیونکہ عورتوں میں سے محرمات کثیر ہیں۔ ابن اسحاق، جحدری اور حمزہ نے طاب کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں طیب یعنی یا کے ساتھ تھا یہ امالہ کی دلیل ہے۔ مِّنَ النِّسَآءِ دلیل ہے کہ نساء نہیں کہا جائے گا مگر اسے جو بالغ ہو النساء کا واحد نسوۃ ہے اور لفظ نسوۃ کا واحد نہیں ہے لیکن امرأۃ کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یہ ما سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یہ نکرہ ہیں اور غیر منصرف ہیں کیونکہ ان میں عدل اور صفت کے سبب پائے جاتے ہیں، ابو علی نے اسی طرح کہا ہے۔ طبری نے کہا: یہ معرفہ ہیں کیونکہ ان پر الف، لام داخل نہیں ہوتا یہ تعریف میں عُمَرُ کے قائم مقام ہیں۔ یہ کوفی کا قول ہے (2)۔ زجاج نے اس پر قول کو خطا کہا ہے بعض علماء نے فرمایا: یہ غیر منصرف ہیں، کیونکہ یہ اپنے لفظ اور معنی سے معدول ہیں، پس احاد، واحد واحد سے معدول ہے اور مثنی، اثنین، اثنین سے معدول ہے۔ ثلاث، ثلاثۃ ثلاثۃ سے معدول ہے۔ رباع، اربعۃ اربعۃ سے معدول ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں دو لغتیں ہیں فعال، مفعل، کہا جاتا ہے: احاد، موحد، ثناء، مثنٰی و ثلاث، مثلث، رباع، مربع اسی طرح معشر، عشار تک ہے۔ ابو اسحاق ثعلبی نے ایک تیسری لغت بھی بیان کی ہے احد وثنی، ثلث و ربع جیسے عمر و زفر، اسی طرح نخعی نے اس آیت میں پڑھا ہے۔ مہدوی نے نخعی اور ابن وثاب سے ثلاث و ربع بغیر الف کے ربع میں حکایت کیا ہے۔ یہ رباع سے تخفیف کی خاطر مقصود ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا

أقبل سَيْلٌ جاء من عنداللہ يَحْرِدُ حرد الجنةِ المُغِلة

ثعلبی نے کہا: اس وزن پر اربع سے زیادہ نہیں کہا جاتا مگر ایک شعر الکمیت سے مروی ہے۔

فلم يَسْتَرِ يثُوك حتى رميـ ـتَ فوق الرجالِ خِصالا عُشَارا

یعنی دس نیزے مارے، ابن الدہان نے کہا: بعض نے مسموع پر توقف کیا ہے یہ احاد سے رباع تک ہیں مذکورہ بیت کا شاذ ہونے کی وجہ سے کوئی اعتبار نہیں۔ ابو عمرو بن حاجب نے کہا: کہا جاتا ہے احاد، موحد، ثُناء، مثنی، ثلاث، مثلث، رباع، مربع، کیا اس کے علاوہ تسعہ (نو) تک اسی طرح کہا جائے گا یا نہیں اس میں اختلاف ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس پر نص قائم فرمائی ہے۔

اور اس کے معنی سے معدول ہونا یہ ہے کہ یہ اس جگہ میں استعمال نہیں ہوتا جس میں غیر معدولہ اعداد استعمال ہوتے ہیں تو کہتا ہے: جاء نی اثنان وثلاثۃ اور مثنی وثلاث کہنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس سے پہلے جمع ہو مثلاً جاءنی القوم احاد و ثناء و

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 293 2۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 294

ثلاث و رباع (بغیر تکرار کے)۔ یہ یہاں اور آیت میں حال کی جگہ میں ہیں اور صفت بھی ہوتے ہیں ان اعداد کی صفت ہونے کی مثال اس ارشاد میں واضح ہوتی ہے اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (فاطر:1) یہ الاجنحة کی صفت ہیں یہ نکرہ ہیں ساعدہ بن جؤیۃ نے کہا:

ولکنّما اھلی بوادٍ أنیسُه　　ذئابٌ تَبَغّی الناس مَثْنَی و مَوْحَدُ

اس میں مثنی اور موحد، ذئاب کی صفت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

فراء نے یہ شعر کہا ہے:

قتلنا به من بَین مَثْنَی و مَوْحَدٍ　　بأربعة منکم وآخَرَ خَامِسِ

اسی طرح اس شعر میں صفت میں یعنی قتلنا بہ ناساً یہ معرفہ اور نکرہ دونوں حالتوں میں غیر منصرف ہوتے ہیں، کسائی اور فراء نے عدد میں اس کو منصرف بنایا ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے، اخفش نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نام رکھا جائے تو معرفہ اور نکرہ دونوں صورتوں میں منصرف ہوتے ہیں کیونکہ ان سے عدل زائل ہو گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ**۔ نو عورتوں کی اباحت پر دلالت نہیں کرتے جیسا کہ اس شخص نے کہا ہے جو کتاب وسنت کے سمجھنے سے بہت دور ہے، اور اس نے امت کے سلف صالحین کے اقوال سے اعراض کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ واؤ جمع کے لیے ہے اور اپنے اس قول کو اس سے تائید دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو عورتوں سے نکاح کیا تھا اور اپنی عصمت میں ان کو جمع کیا تھا، جو لوگ اس جہالت کا شکار ہوئے اور یہ بات کہی وہ رافضی لوگ اور بعض اہل ظاہر ہیں انہوں نے **مَثْنٰى** کو اثنین کی طرح بنایا ہے اسی طرح ثلاث اور رباع کے بارے میں کہا ہے۔ بعض اہل ظاہر اس سے بھی قبیح نظریہ رکھتے ہیں انہوں نے کہا: اٹھارہ عورتوں کے درمیان تک جمع کرنا مباح ہے اور دلیل یہ مروی ہے کہ ان صیغوں میں عدل تکرار کا فائدہ دیتا ہے اور واؤ جمع کے لیے ہے۔ پس انہوں نے مثنی، مثنی کو اثنین، اثنین کے معنی میں کیا ہے، اسی طرح ثلاث اور رباع کے بارے میں کہا ہے۔ یہ حقیقت میں لغت عرب اور سنت سے جہالت ہے اور اجماع امت کی مخالفت ہے، کیونکہ کسی صحابی اور تابعی کے بارے میں نہیں سنا گیا کہ اس نے چار عورتوں سے زیادہ عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھی ہوں۔ امام مالک نے اپنے موطا، نسائی اور دارقطنی نے اپنی اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیلان بن امیہ الثقفی کو کہا جبکہ اس نے اسلام قبول کیا تو اس کے عقد میں دس عورتیں تھیں ''ان میں سے چار کو اختیار کر اور باقی سے جدا ہو جا'' (1)۔

ابوداؤد کی کتاب میں حارث بن قیس سے مروی ہے فرمایا: میں نے اسلام قبول کیا تو میرے پاس آٹھ عورتیں تھیں میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے چار کو اختیار کر'' (2)۔ مقاتل نے کہا: قیس بن حارث کے پاس آٹھ آزاد عورتیں تھیں، جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چار عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا اور چار کو اپنے پاس رکھنے کا حکم دیا۔ مقاتل نے قیس بن حارث سے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ حارث بن قیس اسدی تھا جیسا

1۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 3، صفحہ 270، حدیث نمبر 96　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 304

کہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح محمد بن حسن نے سیر کبیر میں روایت کیا ہے کہ یہ حارث بن قیس تھا اور یہی فقہاء کے نزدیک معروف ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مباح کیا گیا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے جیسا کہ سورۂ الاحزاب میں اس کا بیان آئے گا۔ رہا ان کا قول کہ واؤ جمع کے لیے ہے یہ کہا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے عربوں کو واضح لغت کے ساتھ خطاب فرمایا اور عرب یہ اجازت نہیں دیتے کہ تو تسعہ نہ کہے اور کہے اثنین و ثلاثۃ و اربعۃ۔ اسی طرح عرب اس کو قبیح سمجھتے ہیں جو کہتا ہے اعط فلانا اربعۃ ستۃ ثمانیہ اور ثمانیۃ عشرہ نہیں کہتا۔ اس آیت میں واؤ بدل ہے یعنی دو کا بدل تین سے نکاح کرلو اور تین کا بدل چار سے نکاح کرلو۔ اسی وجہ سے (واؤ) کے ساتھ عطف فرمایا (او) کے ساتھ عطف نہیں فرمایا، اگر او کے ساتھ ہوتا تو جائز ہوتا کہ دو عورتوں والے کے لیے تین عورتیں جائز نہ ہوں اور تین والے کے لیے چار عورتیں جائز نہ ہوں۔ ان کا قول کہ مثنی اثنین کا تقاضا کرتا ہے اور ثلاث، ثلاثۃ اور رباع اربعۃ کا تقاضا کرتی ہے یہ ایسا فیصلہ ہے جس پر اہل لغت ان کی موافقت نہیں کرتے اور یہ ان کی طرف سے جہالت ہے۔ اسی طرح دوسرے لوگوں کی جہالت ہے کیونکہ مثنی، اثنین، اثنین کا اور ثلاث، ثلاثۃ، ثلاثۃ کا رباع اربعۃ، اربعۃ کا تقاضا کرتا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اثنین، اثنین، ثلاثا ثلاثا، اربعا اربعا عدد کے لیے حصر ہیں جب کہ مثنی و ثلاث و رباع اس کے خلاف ہیں اور عربوں کے نزدیک معدول عدد میں معنی کی ایسی زیادتی ہوتی ہے جو اصل میں نہیں ہوتی۔ یہ اس طرح ہے کہ جب کہا: جاءت الخیل مثنی تو اس کا مطلب دو دو ہو کر گھوڑے آئے، یعنی ملے ہوئے آئے۔ جوہری نے کہا: اسی طرح عدد کا معدول ہے اور دوسرے علماء نے کہا: جب تو نے کہا: جاءنی قوم مثنی او ثلاث او احاد او عشار تو تیری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تیرے پاس ایک ایک یا دو دو یا تین تین یا دس دس ہو کر آئے۔ یہ معنی اصل میں نہیں ہے کیونکہ جب تو کہتا ہے: جاءنی قوم ثلاثۃ ثلاثۃ او قوم عشرۃ عشرۃ۔ تو تو نے قوم کی تعداد کو تیرہ کی تعداد میں منحصر کر دیا اور جب تو نے کہا: جاءنی رباع وثناء تو تو نے ان کی تعداد کو محصور نہیں کیا تیری مراد یہ ہوتی ہے کہ تیرے پاس چار چار یا دو دو آئے۔ خواہ ان کی تعداد زیادہ ہو یا کم ہو اور ہر صیغہ کو کم از کم پر اپنے گمان کے مطابق محصور کرنا ایک غیر پسندیدہ فیصلہ ہے۔ رہا علماء کا اختلاف اس شخص کے بارے میں جو پانچویں عورت سے نکاح کرتا ہے جبکہ اس کے پاس چار عورتیں پہلے موجود ہیں۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ امام مالک اور شافعی نے فرمایا: اگر تو وہ اس کی حرمت جانتا ہے تو اس پر حد ہوگی یہی ابوثور کا قول ہے۔ زہری نے کہا: اگر وہ جانتا ہے تو اسے رجم کیا جائے گا اگر وہ جاہل ہے تو دونوں حدوں میں سے ادنیٰ حد یعنی کوڑے اس پر ہوں گے اور اس عورت کو مہر ملے گا اور ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ کبھی جمع نہ ہوں گے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر کوئی حد نہیں ہوگی یہ نعمان کا قول ہے۔ یعقوب اور محمد نے کہا: دو محرم میں حد لگائی جائے گی اور اس کے علاوہ کسی سے نکاح کرنے کی صورت میں حد نہیں ہوگی۔ یہ اس کی مثل ہے جو مجوسی عورت سے نکاح کرتا ہے یا ایک عقد میں پانچ عورتوں سے نکاح کرتا ہے یا معتدہ سے نکاح کرتا ہے یا بغیر گواہوں کے نکاح کرتا ہے یا ایسی لونڈی سے نکاح کرتا ہے جس کے آقا کی اجازت نہیں ہے۔ ابوثور نے کہا: جب وہ جانتا ہو کہ یہ حلال نہیں ہے تو تمام صورتوں میں اس پر حد ہوگی مگر بغیر گواہوں کے

نکاح کرنے کی صورت میں حد نہ ہوگی۔ اس میں تیسرا قول بھی ہے۔ نخعی نے کہا: وہ شخص جو چوتھی عورت کی عدت گزارنے سے پہلے پانچویں عورت سے جان بوجھ کر نکاح کرتا ہے اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اسے جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہمارے علماء کا پانچویں عورت کے بارے میں فتویٰ ہے جیسا کہ ابن منذر نے یہ ذکر کیا ہے پھر جو اس سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرے گا اس کے بارے کتنا سخت قول ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ زبیر بن بکار نے ذکر کیا ہے کہ ابراہیم حزامی نے مجھے بتایا انہوں نے محمد بن معن الغفاری سے روایت کیا فرمایا: ایک عورت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور عرض کی: اے امیر المومنین! میرا خاوند دن کو روزہ رکھتا ہے رات کو قیام کرتا ہے اور اس میں اس کی شکایت کرنا بھی ناپسند کرتی ہوں، وہ اللہ کی اطاعت میں رہتا ہے حضرت عمر نے اسے کہا: تیرا خاوند بہت اچھا خاوند ہے وہ بار بار اپنی بات دہراتی رہی اور حضرت عمر اسے یہی جواب دیتے رہے۔ حضرت کعب اسدی نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! یہ عورت اپنے خاوند کی شکایت کر رہی ہے کہ وہ اس سے ہم بستر نہیں ہوتا حضرت عمر نے کہا: جیسا کہ تم نے اس کی بات سمجھی ہے پس فیصلہ بھی تم ہی کرو۔ حضرت کعب نے فرمایا: اس کے خاوند کو میرے پاس لایا جائے اسے لایا گیا تو حضرت کعب نے اسے کہا: تیری بیوی تیری شکایت کرتی ہے، خاوند نے کہا: کھانے کے بارے میں یا پینے کے بارے میں؟ حضرت کعب نے کہا: نہیں۔ عورت نے کہا اشعار کا ترجمہ: اے قاضی! اس کی دانش بڑی پختہ ہے میرے دوست کو اس کی مسجد نے میرے بستر سے غافل کر دیا ہے، اس کی عبادت نے میرے پہلو میں سونے سے عدم دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اے کعب! فیصلہ کر اور تردد کا شکار نہ ہو۔ یہ نہ دن کو سوتا ہے اور نہ رات کو سوتا ہے عورتوں کے معاملات میں میں اس کی تعریف نہیں کرتی۔

جواباً اس کے خاوند نے کہا: اس کے بستر اور اس کے حجلہ عروسی سے مجھے دلچسپی نہیں ہے کہ میں ایسا شخص ہوں کہ جو سورۃ النحل، سورۂ بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام اور اعراف میں نازل ہوا ہے اسی نے مجھے ہر چیز سے غافل کر دیا ہے اللہ کی کتاب میں بہت بڑا خوف دلایا گیا ہے۔

حضرت کعب نے فرمایا: اے شخص! تجھ پر اپنی بیوی کا حق ہے، ہر عقل مند کے لیے چار دنوں میں اس کا حصہ ہے اسے اپنا حق ادا کر اور علتیں بیان کرنا چھوڑ دے۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے عورتوں میں سے دو دو، تین تین اور چار چار حلال کی ہیں، تیرے لیے تین دن اور تین راتیں ہیں تو ان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں تیرے کس امر پر تعجب کروں ان کے معاملے کو سمجھنے پر یا تیرے ان کے درمیان فیصلہ پر، تم جاؤ میں نے تجھے بصرہ کی قضا کا عہدہ سونپا ہے۔ ابو ہدبہ ابراہیم بن ہدبہ نے کہا: ہمیں حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جو اپنے خاوند کی زیادتی کی شکایت کر رہی تھی اس نے کہا: میرے لیے وہ نہیں ہے جو عورتوں کے لیے ہوتا ہے، میرا خاوند ہمیشہ روزہ رکھتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لیے ایک دن ہے اور اس کے لیے ایک دن ہے، ایک دن عبادت کے لیے ہے اور ایک دن عورت کے لیے ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: اس کا مطلب ہے اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم میلان، محبت، جماع (1)، حسن معاشرت، چار، تین اور دو بیویوں کے درمیان تقسیم میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک عورت سے نکاح کرو۔ باری اور حسن معاشرت میں عدل کے ترک تک پہنچانے والی زیادتی (☆) سے منع کیا گیا ہے ایسی صورت میں ایک عورت سے نکاح کے وجوب کی دلیل ہے واللہ اعلم۔ واحدۃ کو مرفوع بھی پڑھا گیا ہے فواحدۃ فیھا کفایۃٌ او کافیۃ یعنی ایسی صورت میں ایک کافی ہے یا کفایت کرتی ہے کسائی نے کہا: فواحدۃ تقنع یعنی ایک پر قناعت کرے۔ فعل کے اضمار کے ساتھ واحدۃ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے یعنی فانکحوا واحدۃ یعنی پھر ایک سے نکاح کرو۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ اس سے مراد لونڈیاں ہیں اس کا عطف واحدۃ پر ہے یعنی اگر ایک میں بھی عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر لونڈیاں رکھو۔ اس میں دلیل ہے کہ وطی اور باری میں لونڈی کا حق نہیں ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم باری مقرر کرنے میں عدل نہ کرو تو ایک عورت سے نکاح کرو یا لونڈیاں رکھو۔ لونڈیوں کو ایک عورت کے قائم مقام بنایا پس وطی اور قسم میں لونڈیوں کا حق ہونے کی نفی ہوگئی، مگر یہ کہ دائیں ہاتھ کی ملک عدل میں حسن معاشرت اور غلام کے ساتھ نرمی کے وجوب کے ساتھ قائم ہے اللہ تعالیٰ نے ملک کو الیمین کی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ یہ مدح کی صفت ہے اور یمین محاسن کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ محاسن پر قادر ہوتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ دایاں ہاتھ ہی منفقہ (خرچ کرنے والا) ہے جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: حتی لا تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ (2) (یعنی جو دایاں ہاتھ خرچ کرے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو) یہ معاہدہ اور بیعت کرنے والا ہے اسی وجہ سے قسم کو بھی یمین کہا جاتا ہے۔ یہ بزرگی کے جھنڈوں کو پانے والا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

اذا ما رَايةٌ رُفعت لمجد　　تلقاها عَرَابةُ باليمين

جب بزرگی کے لیے جھنڈا بلند کیا گیا تو عرابۃ نے اسے دائیں ہاتھ سے پکڑا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ذٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا یعنی یہ زیادہ قریب ہے کہ تم حق سے انحراف نہ کرو اور تم ظلم نہ کرو۔ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہما سے یہی مروی ہے (3)۔ کہا جاتا ہے: عال الرجال یعول، جب کوئی ظلم کرے اور جھکاؤ کرے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: عال السھم عن الھدف یعنی تیر ہدف سے ادھر ادھر ہو گیا۔ ابن عمر نے کہا: وہ کیل اور وزن میں ظلم کرنے والا ہے۔ شاعر نے کہا:

قالوا اتَّبَعنا رسولَ اللہ واطّرحوا　　قولَ الرسولِ وعالُوا فی الموازین

انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی اور انہوں نے رسول مکرم کے قول کو پس پشت ڈال دیا اور وزن کرنے میں ظلم کیا۔

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 297　2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 62

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 299　☆ [illegible] عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت۔

ابو طالب نے کہا:

بِمِيزانِ صدقٍ لا يُغِلّ شعيرةً    له شاهدٌ من نفسه غيرُ عائِلِ

سچائی کا ترازو ہے ایک جو کی بھی خیانت نہیں کرتا اس کا نفس ہی گواہ ہے وہ ظلم کرنے والا نہیں ہے یعنی حق سے انحراف کرنے والا نہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ثلاثة أنفسٍ وثلاثُ ذَوْدٍ    لقد عال الزمانُ على عِيالي

تین افراد اور تین اونٹ، زمانے نے میرے عیال پر ظلم کیا۔

عال الرجل يعيل کا معنی ہے وہ محتاج ہو گیا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً (توبہ:28) (اگر تمہیں فقر و غربت کا اندیشہ ہو) اسی سے شاعر کا قول ہے:

وما يَدرِي الفقيرُ متى غِناهُ    وما يَدرِي الغنيّ متى يعيلُ

فقیر نہیں جانتا کہ اس کی غنا کب ہے اور غنی نہیں جانتا کہ وہ کب فقیر ہو جائے گا۔

العيلة و العالة کا معنی الفاقة (بھوک) ہے عالني الشیٔ يعولني۔ جب کوئی کسی پر غالب آجائے تو یہ بولا جاتا ہے۔ عال الامر، جب معاملہ سخت اور شدید ہو جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الا تعولوا یعنی تمہاری اولاد زیادہ نہ ہو۔ ثعلبی نے کہا: یہ اور کسی نے معنی بیان نہیں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: عال يعيل، جب کسی کے عیال زیادہ ہوں۔ ابن عربی نے کہا: عال کے صرف سات معانی ہیں، آٹھواں معنی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے: (۱) عال جھکنا (۲) انحراف کرنا (۳) زیادہ ہونا (۴) ظلم کرنا (۵) بوجھل ہونا۔ یہ ابن درید نے حکایت کیا ہے۔ خنساء نے کہا:

يكفي العشيرة ما اعالها

اس کا خاندان کفایت کرتا ہے جو اس پر بوجھل ہوتا ہے (۶) عیال کی مشقت اٹھانا۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وابدأ بمن تعول(1)، صدقہ اس سے شروع کرو جن کی تم کفالت کرتے ہو (۷) غالب ہونا، اسی سے ہے عيل صبره اس کا صبر مغلوب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: اعال الرجل اس کے عیال زیادہ ہیں اور رہا عال بمعنی کثر عياله یہ صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: رہا ثعلبی کا قول کہ (یہ کسی نے معنی بیان نہیں کیا) دار قطنی نے اپنی سنن میں یہ زید بن اسلم سے روایت کیا ہے یہ حضرت جابر بن زید کا بھی قول ہے۔ یہ دونوں مسلمانوں کے علماء اور ائمہ میں سے ہیں۔ یہ امام شافعی سے پہلے یہ معنی بیان کر چکے ہیں۔ رہا وہ جو ابن عربی نے حصر کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کا قول کیا ہے، ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عال الامر کا معنی سخت ہونا اور معاملہ کا ناہموار ہونا ہے۔ یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ہروی نے اپنی غریب میں ذکر کیا ہے ابوبکر نے کہا: عال الرجل فی الارض يعيل فيها۔ جب کوئی زمین میں سفر کرے۔ احمر نے کہا: کہا جاتا ہے: عالني الشي يعيلني

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806

عیلاً معیلاً جب کوئی چیز کسی کو عاجز کر دے۔ رہا عال کا معنی کثر عیالہ۔ یہ کسائی ابو عمر الدوری اور ابن اعرابی نے ذکر کیا ہے۔ کسائی ابو الحسن علی بن حمزہ نے کہا: عرب کہتے ہیں: عال یعول، اعال یعیل یعنی اس کے عیال زیادہ ہو گئے۔ ابو حاتم نے کہا: امام شافعی لغت عرب کو ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ شاید یہ بھی ایک لغت ہو۔ ثعلبی المفسر ہمارے استاد ابو القاسم بن حبیب نے کہا: ابو عمر الدوری سے میں نے اس کے متعلق پوچھا وہ لغت میں یقیناً امام تھے انہوں نے فرمایا: یہ حمیر کی لغت ہے اور انہوں نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

وإنّ الموتَ یأخذ کل حَیّ بلاشك وان أمْشَی وعالا

بلاشک موت ہر زندہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اگر چہ اس کے اہل وعیال زیادہ بھی ہوں۔

ابو عمرو بن علاء نے کہا: عرب کی وجوہ اتنی زیادہ ہوتیں کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ میں کسی غلطی کرنے والے سے کوئی غلطی نہ لے لوں۔ طلحہ بن مصرف نے الا تعیلوا پڑھا ہے۔ یہ امام شافعی کی حجت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: زجاج وغیرہ نے عال کی تاویل عیال سے کرنے میں اس طرح تنقید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی کثرت مباح کی ہے اور اس میں عیال کا زیادہ ہونا ہے پھر "عیال زیادہ نہ ہو جائیں" کے زیادہ قریب کیسے ہوگا۔ یہ تنقید صحیح نہیں ہے کیونکہ لونڈیاں ایسا مال ہیں جس میں خرید وفروخت کے ساتھ تصرف کیا جاتا ہے۔ عیال جس میں تنقید ہے وہ آزاد عورتیں ہیں جن کے حقوق واجب ہیں (1)۔ ابن الاعرابی نے حکایت کی ہے کہ عرب کہتے ہیں: عال الرجل جب کسی کے عیال زیادہ ہو جائیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اس آیت سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو غلام کے لیے بھی چار شادیاں کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ یعنی عورتوں میں سے جو تمہارے لیے حلال ہیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں غلام کی آزاد سے تخصیص نہیں فرمائی۔ یہ داؤد اور طبری کا قول ہے۔ یہی امام مالک سے مشہور قول ہے اور ان کے مؤطا میں موجود کلام کا ماحصل بھی یہی ہے۔ اسی طرح امام مالک سے ابن القاسم اور اشہب نے روایت کیا ہے۔ ابن المواز نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ غلام صرف دو عورتوں سے نکاح کرے۔ یہ لیث کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری، لیث بن سعد نے کہا: غلام دو عورتوں سے زیادہ عورتوں سے نکاح نہ کرے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ غلام دو عورتوں سے زیادہ سے نکاح نہ کرے۔ میں صحابہ میں سے ان کی مخالفت کرنے والا نہیں جانتا یہی امام شعبی، عطا، ابن سیرین، الحکم، ابراہیم اور حماد کا قول ہے اور اس قول کی حجت اس کی طلاق اور حد پر قیاس صحیح ہے وہ تمام علماء جو کہتے ہیں اس کی حد، آزاد کی حد سے نصف ہے، غلام کی طلاق دو طلاقیں ہیں، اس کا ایلا دو ماہ ہیں اور اس قسم کے دوسرا احکام، پس یہ بعید نہیں ہے کہ کہا جائے کہ اس کے قول "چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے" میں تناقض ہے۔ واللہ اعلم۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 8، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

''اور دیا کرو (اپنی) عورتوں کو ان کے مہر خوشی خوشی پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوش دلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے''۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ۔ الصدقات جمع ہے واحد صدقة ہے۔ اخفش نے کہا: بنوتمیم کہتے ہیں صدقة اور جمع صدقات اگر تو چاہے تو دال کو فتحہ دے دے اور چاہے تو ساکن کر دے۔ مازنی نے کہا: کہا جاتا ہے صداق المرأۃ (صاد کے کسرہ کے ساتھ) اور صاد کے فتحہ کے ساتھ نہیں بولا جاتا (1)۔ یعقوب اور احمد بن یحییٰ نے نحاس سے فتحہ کے ساتھ حکایت کی ہے۔ اس آیت میں خطاب خاوندوں کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ، حضرت ابن زید اور ابن جریج کا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ اپنی بیویوں کہ مہر خوشی خوشی دو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں خطاب اولیاء کو ہے۔ یہ ابو صالح کا قول ہے (2)۔ ولی، عورت کا مہر لیتا تھا اور اسے کچھ نہیں دیتا تھا پس اولیاء کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا اور انہیں ان کے مہر سپرد کرنے کا حکم دیا گیا، کلبی کی روایت میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اس طرح کرتے تھے کہ عورت کا ولی، جب اس کی شادی کر دیتا اگر وہ عورت اس کے خاندان میں قریب ہی بیاہی گئی ہوتی تو اسے مہر میں سے کچھ بھی نہ دیتا اور اگر وہ دور کہیں بیاہی جاتی تو اس کا ولی اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے اس کے خاوند کے پاس بھیجتا اور اسے اس اونٹ کے سوا کچھ نہ دیتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (عورتوں کو خوشی خوشی ان کے مہر دیا کرو)

معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرمی نے کہا: اس آیت میں مراد وہ لوگ ہیں جو ایک عورت کے بدلے میں دوسری عورت سے نکاح کرتے (وٹہ سٹہ کا نکاح) تو انہیں مہر مقرر کرنے کا حکم دیا گیا (3)۔ پہلا قول اظہر ہے، کیونکہ ایک میں یہ تمام ضمائر خاوندوں کے لیے ہیں اور وہی مراد ہیں، کیونکہ فرمایا: وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً۔ یہ ضمائر کے مرجع کے ایک ہونے کا موجب ہے اس میں پہلی ضمائر سے جو مراد ہیں دوسری سے بھی وہی مراد ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت عورت کے مہر کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور یہ اس پر اجماع ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر عراقی بعض علماء سے مروی ہے کہ لونڈی اور غلام کا آقا جب ان کا آپس میں نکاح کر دے تو اس میں مہر واجب نہیں لیکن یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً تو اس میں عام حکم فرمایا اور فرمایا: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (تو نکاح کر لو ان سے ان کے سرپرستوں کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 8 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 300 3۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 301

اجازت سے اور دوان کو مہران کے دستور کے موافق) علماء کا اجماع ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے اور کم از کم مہر کے متعلق علماء کا اختلاف ہے جس کا بیان وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا کے تحت آئے گا۔ اور جمہور علماء نے صَدُقاتهن (صاد کے فتحہ اور دال کے ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ قتادہ نے صُدْقاتهن صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ نخعی اور ابن وثاب نے دونوں کے ضمہ اور مفرد صیغہ پڑھا ہے یعنی صُدُ قتهن۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نِحْلَةً نون کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی عطا کرنا ہے۔ نحلت فلاناً شیئاً میں نے اسے چیز عطا کی۔ مہر عورت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: نِحْلَةً کا مطلب ہے خاوند بغیر جھگڑے کے خوش دلی سے دے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: نِحْلَةً کا مطلب ہے واجب فریضہ ہے (3)۔ ابن جریج اور ابن زید نے کہا: متعین فریضہ ہے (4)۔ ابو عبید نے کہا: نحلة نہیں ہوتا مگر متعین معلوم۔ زجاج نے کہا: نحلہ کا مطلب دین کے طور پر۔ النحلہ کا مطلب دیانۃ اور ملت سے کہا جاتا ہے (5): هذا نحلته یعنی یہ اس کا دین ہے۔ یہ مفہوم اچھا ہے جب کہ خطاب ان اولیاء کو ہو جو زمانہ جاہلیت میں مہر وصول کرتے تھے حتیٰ کہ کسی عورت نے اپنے خاوند کے بارے کہا:

لا یأخذ الحُلوانَ من بناتنا

''وہ ہماری بیٹیوں کا مہر نہیں لیتا''۔

وہ عورت کہتی ہے: وہ ایسا نہیں کرتا جیسا کہ دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مہر کی رقم لے لی اور عورتوں کو دینے کا حکم دیا۔ نحلة منصوب ہے کیونکہ یہ فعل کے اضمار کے ساتھ الازواج سے حال ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے انحلوهن نحلة۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حال کی جگہ میں مصدر ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا یہ خطاب بھی خاوندوں کے لیے ہے اور عموم کی وجہ سے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عورت اپنا مہر خاوند کو ہبہ کر سکتی ہے خواہ وہ باکرہ (کنواری) ہو یا ثیبہ (شوہر دیدہ) ہو۔ یہی جمہور فقہاء کا قول ہے۔ امام مالک نے باکرہ کے مہر بخشنے کو منع کیا ہے اور یہ انہوں نے ولی کے لیے مقرر کیا ہے جب کہ وہ ملکیت اس عورت کی ہوگا۔ فراء نے کہا: یہ اولیاء سے خطاب ہے۔ کیونکہ وہ مہر لیتے تھے اور عورت کو اس میں سے کچھ نہیں دیتے تھے، ان کے لیے مباح قرار نہ دیا مگر یہ کہ عورت اسے بخش دے۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ پہلے اولیاء کا ذکر نہیں ہوا ہے اور منه کی ضمیر کا مرجع صداق (مہر) ہے۔ اسی طرح عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے (6): اس آیت کے نزول کا سبب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس سے اجتناب کیا کہ جو انہوں نے اپنی بیویوں کو دیا ہے وہ انہیں واپس مل جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ ..... الخ۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا اتفاق ہے کہ عورت اپنے نفس کے معاملہ کی خود مالک ہے جب وہ اپنا مہر اپنے خاوند کو ہبہ کر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 8 — 2۔ ایضاً — 3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 300
4۔ ایضاً — 5۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 9 — 6۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 301

دے گی تو اس کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا اس کو اس میں رجوع کا حق نہ ہوگا مگر شریح کا خیال ہے کہ اس میں اس کے لیے رجوع کا حق ہے اور انہوں نے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا سے حجت پکڑی ہے جب وہ خاوند سے مطالبہ کرنے والی ہوگی تو اس کا دل خوش نہ ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے، کیونکہ وہ خوش تھی جب اس نے کھایا تھا پس اسے کلام کا حق نہیں، کیونکہ مراد کھانا نہیں یہ حلال کرنے اور حلال ہونے سے کنایہ ہے۔ اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر عورت نکاح کے وقت شرط لگائے کہ وہ اس پر کسی عورت سے نکاح نہیں کرے گا اور اس وجہ سے وہ اپنے مہر میں سے کچھ ساقط کر دے۔ پھر خاوند اس پر کسی دوسری عورت سے نکاح کرے گا تو ابن القاسم کی روایت میں اس عورت کے لیے اس خاوند پر کچھ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے خاوند پر ایسی شرط لگائی تھی جس کا لگانا جائز نہ تھا جیسا کہ اہل بریرہ نے شرط لگائی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے آزاد کر دے گی اور ولا اس کے بیچنے والوں کے لیے ہوگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد کو صحیح قرار دیا تھا اور شرط کو باطل قرار دیا تھا اسی طرح یہاں اس سے بعض مہر کا ساقط کرنا صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔ ابن عبدالحکم نے کہا: اگر تو اس کا مہر، مہر مثل کی مقدار یا اس سے زیادہ باقی رہتا ہے تو عورت اس پر رجوع نہیں کرے گی اور اگر خاوند سے اس نے اتنا مہر ساقط کر دیا کہ مہر مثل سے بھی کم رہ گیا ہے پھر اس خاوند نے اس پر دوسری عورت سے نکاح کر لیا تو وہ مہر مثل کی تکمیل کے لیے رجوع کرے گی، کیونکہ اس نے اپنے اوپر خود شرط قبول کی تھی اور اس کا عوض لیا تھا جو عورت کے لیے واجب تھا پس اس سے وہ لیا جائے گا اور خاوند پر اس کا پورا کرنا واجب ہوگا، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''مومنین کے معاملات اس کی شروط کے مطابق ہوں (1) گے''۔ (☆)

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ آزاد کرنا مہر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ مال نہیں ہے، کیونکہ عورت کا آزادی کو ہبہ کرنا اور خاوند کے لیے اس کا کھانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام زفر، امام محمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے امام احمد بن حنبل، اسحاق اور یعقوب نے کہا: حضرت صفیہ کی حدیث جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے، اس میں آزادی کو ہی مہر بنایا گیا ہے۔ آزاد کرنے کے علاوہ حضرت صفیہ کا کوئی مہر نہیں تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کیا تھا اور اس کی آزادی کو ہی اس کا مہر بنایا تھا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا کیا تھا اور حضرت انس حضرت صفیہ کی حدیث کے راوی ہیں۔ پہلے گروہ کے علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت صفیہ کی حدیث میں کوئی حجت نہیں۔ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح میں یہ خصوصیت تھی کہ آپ بغیر مہر کے بھی نکاح کر لیں آپ نے حضرت زینب سے نکاح کا ارادہ کیا تو وہ حضرت زید پر حرام ہو گئی تھیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بغیر ولی اور بغیر مہر کے داخل ہوئے تھی۔ پس اس جیسی حدیث سے استدلال مناسب نہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَفْسًا بعض علماء نے فرمایا: یہ بیان کی بنا پر منصوب ہے۔ سیبویہ اور کوفیوں نے اس اسم کا مقدم ہونا جائز قرار نہیں دیا جو بیان کی حیثیت سے منصوب ہو اور مازنی، ابوالعباد المبرد نے اس کو جائز قرار دیا ہے جب کہ اس کا عامل فعل ہو اور دلیل یہ مصرعہ دیا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303

☆ بشرطیکہ وہ کسی نص یا اصل شرعی کے منافی نہ ہوں۔

وما کان نفسا بالعراق تطیب

(یعنی فراق پر از روئے نفس کے خوش نہ تھا) قرآن حکیم میں ہے خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ (القمر:7) اس آیت میں بطور بیان خُشَّعًا مقدم ہے۔ اس بنا پر شحماً تفقأت اور وجھاً حسنت جائز ہے۔ سیبویہ کے اصحاب نے کہا: نَفْسًا فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے اغنی نفسا۔ تمیز کے طور پر منصوب نہیں ہے جب اس طرح ہو تو اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: وما کان نفسی اس میں تمام علماء نحو کا اتفاق ہے کہ ممیز کو مقدم کرنا جائز نہیں جب کہ اس کا عامل غیر مصرف ہو جیسے عشرین درھماً۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَكُلُوْهُ اس سے مقصود کھانے کی صورت نہیں بلکہ اس سے مراد مباح کرنا ہے خواہ کسی طریقہ پر ہو۔ بعد والی آیت میں بھی یہی مراد ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اس میں نفس کھانا مراد نہیں ہے مگر چونکہ کھانا مال سے متمتع ہونے کی ایک مکمل قسم ہے اس لیے تصرفات کو (کھانے) سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (جمعہ:9) اس آیت میں بیع کی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے مثلاً نکاح وغیرہ، لیکن بیع کا ذکر کیا گیا، کیونکہ ذکر الٰہی سے غافل کرنے والی چیزوں میں سے اہم ترین ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا، کلوہ میں جو منصوب ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے بعض علماء نے فرمایا: یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی اکلا ھنیئا بطیب الانفس۔ عرب کہتے ہیں: ھنأہ الطعام والشراب، یھنؤہ وما کان ھیئناً ولقد ھنؤ۔ اور مصدر الھنء۔ ہر وہ چیز جو مشقت اور تکلیف سے حاصل نہ ہو وہ ھنئ ہے۔ ھنئ یہ ھنؤ سے اسم فاعل ہے جیسے ظریف، ظرف سے اسم فاعل ہے ھنئ یہ فعل کے وزن پر ہے جیسے زمن، ھنأنی الطعام و مرأنی اکٹھے استعمال ہوتے ہیں اور جب ھنأنی استعمال نہ ہو تو امرأنی الطعام الف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یعنی کھانا ہضم ہو گیا۔ ابوعلی نے کہا: یہ اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے أرجعن مازورات غیر مأجورات (1)۔ موزورات سے واؤ کو ماجورات کے لفظ کی اتباع میں الف سے بدل دیا۔ ابوالعباس نے ابن اعرابی سے روایت کیا ہے کہا جاتا ہے: ھنئ وھنأنی ومرأنی امرأنی اور مرئنی نہیں کہا جاتا۔ یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ قشیری نے حکایت کیا ہے کہ ھنئنی ومرئنی (را کے کسرہ کے ساتھ) یھنأنی یمرأنی کہا جاتا ہے اور یہ قلیل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ھنیئا جس میں گناہ نہ ہو اور مریئا جس میں کوئی بیماری نہ ہو۔ کثیر نے کہا:

هَنِيئًا مَرِيئًا غيرَ داءٍ مُخامِرٍ لِعزّةَ من أعراضِنا ما استَحَلَّت

ایک شخص علقمہ کے پاس آیا جب کہ وہ کوئی چیز کھا رہے تھے جو اس کی بیوی نے اپنے مہر میں سے اسے ہبہ کی تھی تو اس نے اسے کہا: کل من الھنئ المرئ۔ بعض علماء نے کہا: الھنئ جو پاک ہو اور آسانی سے گلے سے اترنے والا ہو کسی چیز نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 114

اسے خراب نہ کیا ہو اور المری جس کا انجام اچھا ہو، مکمل ہضم ہونے والا ہو، نہ نقصان دے اور نہ اذیت دے۔ فرمایا: جس کے مطالبہ سے دنیا میں تم خوف نہ کھاتے ہو اور آخرت میں جو بوجھ نہ ہو۔ اس پر حضرت ابن عباس کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عورت خوشی سے اپنے خاوند کو عطیہ دے گی جب کہ وہ مجبور نہ ہوگی، سلطان اس کی وجہ سے تمہارے خلاف فیصلہ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے متعلق مواخذہ نہ کرے (1)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف ہو تو اپنی بیوی سے اس کے مہر میں سے ایک درہم مانگنا چاہیے پھر اس کے ساتھ شہد خرید ے پھر اسے بارش کے پانی کے ساتھ ملا کر پیے، پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے الھنی، المری اور مبارک پانی کو جمع کر دے گا۔ واللہ اعلم

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝

”اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے) لیے سہارا اور کھلاؤ انہیں اس مال سے اور پہناؤ انہیں اور کہو ان سے بھلائی کی بات“۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کو مال دینے، عورتوں کو مہر دینے کو بیان کر دیا تو وضاحت فرمائی کہ بے وقوف اور غیر بالغ کو مال دینا جائز نہیں۔ یہ آیت یتیموں کے لیے وصی، ولی اور کفیل کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ مسلمان، آزاد، معتبر، عادل شخص کو وصی بنانا جائز ہے اور آزاد عورت کو وصی بنانے میں اختلاف ہے۔ عوام اہل العلم نے کہا: آزاد عورت کو وصی بنانا جائز ہے۔ امام احمد نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت حفصہ کو وصی بنایا تھا۔ عطا ابن ابی رباح سے مروی ہے کہ انہوں نے اس شخص کو فرمایا جس نے اپنی عورت کو وصی بنایا تھا۔ عورت وصی نہیں ہو سکتی اگر عورت وصی بنائی گئی تو وہ اس کی قوم کے مرد کی طرف وصیت پھیر دی جائے گی غلام کو وصی بنانے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، ابوثور، امام محمد اور یعقوب نے اس سے منع فرمایا ہے۔ امام مالک، اوزاعی، ابن عبدالحکم نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ نخعی کا قول ہے، جب اپنے غلام کو وصی بنائے اس کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے السُّفَهَآءَ۔ سورۂ بقرہ میں السفہ کا لغوی معنی بیان ہو چکا ہے ان سفہاء سے کون مراد ہیں اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سالم الفطس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: اس سے مراد وہ یتیم بچے ہیں جن کو تم مال نہیں دیتے۔ نحاس نے کہا: یہ بہتر قول ہے جو اس آیت کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسماعیل بن ابی خالد نے ابو مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ چھوٹی اولاد ہے تم ان کو مال نہ دو تاکہ وہ خراب نہ کر دیں اور تم بغیر کسی چیز کے باقی نہ رہ جاؤ (2)۔ سفیان نے حمید اعرج سے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: اس سے مراد عورتیں ہیں (3)، نحاس وغیرہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 471
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 306
3۔ ایضاً

نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے عرب عورتوں کے بارے میں سفائة یا سفیہات کہتے ہیں، کیونکہ فعیلہ کی جمع اکثر اسی طرح آتی ہے۔ کہا جاتا ہے، تم اپنا مال نہ مضاربت پر دو اور نہ ایسے وکیل کو دو جو تجارت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو عقل نہ رکھتا ہو وہ ہمارے بازار میں تجارت نہ کرے پس اس کے متعلق فرمایا وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ یعنی جو احکام سے جاہل ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کفار کو مال نہ دو اسی وجہ سے علماء نے مکروہ قرار دیا ہے کہ مسلمان کسی ذمی کو خرید و فروخت کا وکیل بنائے یا اسے مضاربت پر مال دے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: السُّفَهَآءَ سے مراد یہاں ہر وہ شخص ہے (1) جو حجر کا مستحق ہے۔ یہ جامع قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: سفیہ پر حجر، تو سفیہ کے کئی احوال ہوتے ہیں اس پر اس کے عمر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے، جنون وغیرہ کی وجہ سے عقل نہ ہونے کی حالت میں حجر کیا جاتا ہے، اپنے مال میں اچھی سوچ نہ رکھنے کی حالت میں حجر کیا جاتا ہے۔ رہا وہ شخص جس پر غشی طاری ہوتی ہے امام مالک نے اس پر حجر نہ کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے، کیونکہ غشی جلد ختم ہو جاتی ہے، حجر کبھی انسان کے اپنے حق کے لیے ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کے حق کے لیے ہوتا ہے۔ جسے اپنی ذات کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے وہ ہے جس کا ذکر ہم نے کر دیا ہے اور جنہیں دوسروں کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے وہ غلام بہت زیادہ مقروض اور مریض جو دو ثلث میں وصیت کرتا ہے۔ مفلس خاوند والی عورت، جنہیں اپنے ساتھی کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے باکرہ کو اپنے نفس کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے، رہا چھوٹا بچہ اور مجنون ان پر حجر کے بارے کوئی اختلاف نہیں ہے، رہا بڑا آدمی جو اپنے مال میں اچھی نظر نہیں رکھتا اور اس سے مال کو بلا وجہ تلف کرنے سے امن نہیں ہوتا، تو وہ بچے کے مشابہ ہوتا ہے اس میں اختلاف ہے جو آگے آئے گا، اس میں فرق نہیں کہ وہ اپنے مال کو گناہوں میں تلف کرتا ہو یا قرب اور مباحات میں تلف کرتا ہو۔ ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے اس میں جو مال کو قرب میں خرچ کرتا ہو بعض نے اس پر حجر کیا ہے اور بعض نے اس پر حجر نہیں کیا۔ غلام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور مقروض کے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا وہ قرض خواہوں کے لیے لے لیا جائے گا، کیونکہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ حضرت عمر نے اسیفع جہینہ سے ایسا کیا تھا۔ امام مالک نے موطا میں یہ ذکر کیا ہے: وہی باکرہ جب تک وہ پردے میں ہے اس پر حجر ہوگا، کیونکہ وہ اپنے بارے صحیح نظر نہیں رکھتی حتیٰ کہ جب نکاح کرے اور لوگ اس پر داخل ہوں اور وہ باہر نکلے اور اس کا چہرہ ظاہر ہوگا اور منافع اور نقصان کو پہچان لے تو اس پر حجر ختم ہو جائے گا اور رہی خاوند والی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''کسی عورت کے لیے جائز نہیں جس کا خاوند اس کی عصمت کا مالک ہو کہ وہ اپنے مال میں فیصلہ کرے مگر تہائی میں اسے اجازت ہے (2)''۔

میں کہتا ہوں: رہا احکام سے جاہل شخص اگرچہ اس پر حجر تو نہیں کیا جاتا لیکن مال میں عدم تدبیر کی وجہ سے اسے مال دیا نہیں جائے گا، کیونکہ اسے فاسد بیوع اور صحیح بیوع کا علم نہیں ہے اور حل و حرمت سے ناواقف ہے، ذمی بھی بیوع کی جہالت میں اس کی مثل ہے، اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ وہ سودی معاملات کرے گا۔ واللہ اعلم۔ اس بنا پر مخاطبین کی طرف مال کی اضافت کی وجہ سے اختلاف ہے۔ یہ اضافت سفہاء کے لیے ہے۔ مال کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی، کیونکہ وہ ان کے

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 10　2۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ عمرو، جلد 2، صفحہ 221

قبضہ میں ہے اور وہ اس میں نگران ہیں پس وسعت کی بنا پر ان کی طرف نسبت کی گئی جیسے ارشاد ہے فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) اور فرمایا فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (بقرہ: 53) اور بعض علماء نے فرمایا: ان کی طرف اموال کی نسبت اس لیے کی، کیونکہ وہ ان کے اموال کی جنس سے ہے کیونکہ اموال مخلوق کے درمیان مشترک ہیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف منتقل ہوتے ہیں، ایک ملکیت سے دوسری ملکیت میں جاتے ہیں یعنی یہ مال ان کے لیے ہیں جب وہ ان کے محتاج ہوتے ہیں جس طرح تمہارے وہ مال ہیں جو تمہاری عزت کو بچاتے ہیں اور تمہاری حفاظت کرتے ہیں اور تمہاری اقدار کو بڑھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تمہارے معاملات زندگی کا قیام ہے۔ دوسرا قول حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور حضرت قتادہ کا ہے، مخاطبین کے مال حقیقۃً مراد ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تو اپنا وہ مال اپنی بیوی اور بیٹے کو نہ دے جو تیری معیشت کا سبب ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو فقیر ہو جائے اور تو ان کا منہ تکتا رہے اور ان کے ہاتھوں میں جو ہے اس کو تکتا رہے بلکہ تو خود ان پر خرچ کرنے والا ہو۔ اس مفہوم کی بنا پر السُّفَهَآءَ سے مراد عورتیں اور بچے ہوں گے، چھوٹی اولاد اور اس کی بیوی۔ مجاہد اور ابو مالک کا قول بھی سفہاء کے بارے میں یہی تھا (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت سفیہ پر حجر کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ اور فرمایا فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا (بقرہ: 282) سفیہ پر ولایت کو اسی طرح ثابت فرمایا جس طرح ضعیف پر ولایت کو ثابت فرمایا اور ضعیف کا معنی صغیر (چھوٹے) کی طرف راجع ہے اور سفیہ کا معنی بڑے بالغ کی طرف راجع ہے کیونکہ السفہ مذمت کا اسم ہے اور انسان کی اس پر مذمت نہیں کی جاتی جو اس نے کیا نہ ہو اور قلم غیر بالغ سے اٹھا لیا گیا ہے پس مذمت اور حرج اس سے منفی ہو گئے۔ یہ خطابی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ سفیہ پر حجر سے پہلے کے افعال کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ مالک اور ابن القاسم کے علاوہ ان کے تمام اصحاب نے کہا کہ سفیہ کا فعل اور اس کا امر تمام جائز ہے حتی کہ امام اس کے ہاتھ کو روک لے۔ یہی امام شافعی اور امام ابو یوسف کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: اس کے افعال جائز نہیں ہیں اگرچہ امام اس کو نہ بھی روکے۔ اصبغ نے کہا: اگر اس کی سفاہت ظاہر ہو تو اس کے افعال مردود ہیں اور اگر سفاہت ظاہر نہیں ہے تو اس کے افعال رد نہیں کیے جائیں گے حتی کہ امام اس پر حجر کر دے۔ سحنون نے امام مالک کے قول کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ اگر سفیہ کے افعال حجر کیے جانے سے پہلے مردود ہوں تو سلطان کو کسی پر حجر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن القاسم کی حجت بخاری میں حضرت جابر کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے غلام آزاد کیا جب کہ اس کے پاس اس غلام کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آزاد غلام کا آزاد کرنا رد کر دیا (3) جب کہ اس سے پہلے اس پر حجر نہیں کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ بالغ شخص پر حجر کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور جمہور علماء نے فرمایا: اس پر حجر کیا جائے گا (اگر وہ بے وقوف ہو گا) امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اس شخص پر حجر نہیں کیا جائے گا جو بالغ ہو دراں حالیکہ وہ عاقل ہو مگر جب

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 9　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 310　3۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، جلد 1، صفحہ 325

وہ اپنے مال کو خراب کرنے والا ہو (تو اس پر حجر کیا جائے گا) جب وہ ایسا ہوگا تو مال اس کے سپرد نہیں کیا جائے گا حتی کہ وہ پچیس سال کی عمر کو پہنچ جائے، جب اس عمر کو پہنچ جائے گا تو ہر حال میں مال اس کے سپرد کیا جائے گا خواہ وہ مفسد مال ہو یا نہ ہو، کیونکہ بارہ سال کی عمر میں اس سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ پچیس سال کی عمر میں وہ باپ دادا بن جائے گا اور میں اس شخص پر حجر کرنے سے حیا کرتا ہوں جو دادا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مال کو اس سے روکنے کی مدت میں جب وہ مفسد ہونے کی حالت میں بالغ ہو تو اس کا تصرف علی الاطلاق نافذ ہوتا ہے۔ مال صرف احتیاطاً اسے نہیں دیا جاتا۔ یہ نظر اور اثر کے اعتبار سے سب ضعیف ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ہمیں محمد بن حسن صواف نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حامد بن شعیب نے خبر دی انہوں نے کہا ہمیں شریح بن یونس نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں یعقوب بن ابراہیم (ابو یوسف القاضی) نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ہشام بن عروہ نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت زبیر کے پاس آئے اور کہا: میں نے اتنے اتنے کی بیع کے ساتھ خرید کی ہے اور حضرت علی چاہتے ہیں کہ وہ امیر المومنین کے پاس جائیں گے اور ان سے مجھ پر حجر کرنے کا سوال کریں گے حضرت زبیر نے کہا: میں بیع میں تمہارا شریک ہوں پس حضرت علی، حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا: ابن جعفر نے اتنے پیسوں میں خرید کیا ہے اس پر حجر کریں۔ حضرت زبیر نے کہا: میں اس بیع میں اس کا شریک ہوں۔ حضرت عثمان نے کہا: میں اس شخص پر ایسی بیع میں کیسے حجر کروں جس میں زبیر اس کا شریک ہے۔ یعقوب نے کہا: میں حجر پر عمل کرتا ہوں اور میرا یہی خیال ہے اور میں محجور کی بیع و شرا کو باطل کروں گا اور جب وہ حجر سے پہلے بیع و شرا کرے گا تو میں اس کو جائز قرار دوں گا، یعقوب بن ابراہیم (ابو یوسف) نے کہا: ابوحنیفہ حجر نہیں کرتے اور نہ حجر پر عمل کرتے ہیں اور حضرت عثمان کا قول کہ "میں اس پر کیسے حجر کروں" بڑے آدمی پر بھی حجر کرنے کی دلیل ہے، عبداللہ بن جعفر کو اس کی والدہ نے حبشہ کی زمین میں جنم دیا تھا یہ پہلا بچہ تھا جو اسلام میں پیدا ہوا تھا وہ فتح خیبر کے سال اپنے باپ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تھا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث سنی تھی اور یاد کی تھی اور خیبر سنہ 5 ہجری کو فتح ہوا تھا، اس کا قول امام ابوحنیفہ کے قول کو رد کرتا ہے۔ ان کی حجت آگے آئے گی ان شاء اللہ۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا** یعنی تمہاری معاش اور تمہارے دین کی اصلاح کے لیے بنایا ہے۔ الَّتِیْ میں تین لغات ہیں التی و اللت تا کے کسرہ کے ساتھ اللت تا کے سکون کے ساتھ، اس کے تثنیہ میں بھی تین لغات ہیں۔ اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتانّ، نون کی شد کے ساتھ اور اس کی جمع کی لغات اسی سورت میں اپنے موقع پر آ جائیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ القیام و القوام، معنی جو تجھے قائم کرے۔ کہا جاتا ہے: فلان قیام اھلہ و قوام بیتہ یعنی وہ شخص جو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے۔ جب قاف کو قوام میں کسرہ دیا گیا تو واؤ کو یا سے بدل دیا گیا۔ اہل مدینہ کی قرأت **قیما** بغیر الف کے ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا: **قیما** اور **قواما** کا معنی **قیاما** ہے۔ کسائی اور فراء کے نزدیک اس کی نصب مصدر کی بنا پر ہے یعنی تم اپنے وہ مال بے وقوفوں کو نہ دو جن کے ساتھ تمہارے امور درست ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ تمہارا قیام ہے۔ اخفش نے کہا: اس کا معنی ہے جو تمہارے امور کو قائم

کرنے والے ہیں، انہوں نے اس کو جمع خیال کیا ہے۔ بصریوں نے کہا: قیماً، قیمۃ کی جمع ہے جیسے دیمۃ اور دِیَمٌ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن اموال کو اشیاء کے لیے قیمت بنایا ہے۔ ابوعلی نے اس قول کو غلط کہا ہے اس نے کہا: یہ مصدر ہے جیسے قیام اور قوام مصدر میں اس کی اصل قوم ہے لیکن یا کی طرف لوٹانے میں شاذ ہے جیسے جواد کی جمع میں جیاد کا قول شاذ ہے۔ قوما و قواما و قیامًا اس کا معنی ہے اصلاح حال میں دوام اور ثبات۔ حسن اور نخعی نے اللاتی پڑھا ہے انہوں نے التی کی جمع بنایا ہے اور عام قرأت جماعت کے لفظ پر التی ہے۔ فراء نے کہا: اکثر کلام عرب میں النساء اللواتی اور الاموال التی استعمال ہوتا ہے اسی طرح اموال کے علاوہ میں بھی التی استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِيۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان مالوں میں ان کے لیے رکھو یا ان کے لیے ان مالوں میں حصہ مقرر کرو اور یہ اس شخص کا قول ہے جو انسان پر بیوی اور چھوٹے بچوں کا خرچ اور لباس لازم کرتے ہیں (1)۔ یہ بچے کے خرچ کا باپ پر واجب ہونے اور بیوی کے خرچ کا خاوند پر لازم ہونے کی دلیل ہے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جو غنا کو چھوڑے اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور صدقہ کا آغاز اس سے کرو جس کی تم کفالت کرتے ہو۔ عورت کہے گی: یا تم مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو۔ غلام کہے گا: مجھے کھلاؤ یا مجھے کام پر لگاؤ۔ بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ تم مجھے کس کے آسرا پر چھوڑ رہے ہو۔ صحابہ نے کہا: اے ابو ہریرہ! تو نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: نہیں یہ ابو ہریرہ کے ذہن سے ہے (2)۔ مہلب نے کہا: اہل وعیال پر خرچ کرنا بالاجماع واجب ہے۔ یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** ابن المنذر نے کہا: بالغ بچہ کے خرچ میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس مال نہ ہو اور اس کا کسب بھی نہ ہو۔ ایک گروہ کا خیال ہے والد کو اپنی مذکر اولاد پر خرچ کرنا لازم ہے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائیں اور مؤنث اولاد پر خرچ کرنا لازم ہے حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے اور ان کے ساتھ حقوق زوجیت ادا ہو جائیں۔ اگر خاوند نے حقوق زوجیت ادا کرنے کے بعد اسے طلاق دے دی یا خاوند مر گیا تو اس عورت کا خرچہ اس کے باپ پر نہ ہوگا، اگر حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دے دی تو اس کا خرچ باپ پر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 9۔** پوتے کا نفقہ دادا پر نہیں ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پوتے پر دادا خرچ کرے گا حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے اور عورتوں کو حیض آ جائے۔ پھر دادا پر نفقہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ پوتے پوتیاں اپاہج ہوں، برابر ہے کہ وہ مذکر ہوں یا مؤنث ہوں جب کہ ان کے پاس مال بھی نہ ہو، برابر ہے اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو اگرچہ کتنے ہی نیچے ہوں جبکہ ان کا باپ نہ ہو اور وہ ان پر خرچ کرنے پر قادر بھی ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے تمام بچوں اور بالغوں، مردوں اور عورتوں کا نفقہ واجب کیا ہے جب کہ ان کے پاس ایسے اموال نہ ہوں جن کے ساتھ وہ والد کے نفقہ سے مستغنی ہو جائیں دلیل کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہندہ کو یہ فرمانا پیش کیا ہے: خذی ما یکفیک وولدك بالمعروف (3) تو ابو سفیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 10　2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 808

کے مال سے اتنا لے لیا کر جو معروف طریقہ پر تجھے اور تیری اولاد کو کافی ہو اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ مجھے کس کے سپرد کر رہے ہو۔ یہ دلیل ہے کہ وہ یہ کہے گا جسے کسب اور پیشہ کی طاقت نہ ہو گی۔ اور جو بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے گا وہ یہ نہیں کہے گا کیونکہ وہ خود کمانے اور محنت کرنے کی عمر کو پہنچ چکا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ حتی کہ جب نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ نکاح کی عمر کو پہنچنے کو اس میں حد بنایا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے عورت کہے گی یا مجھے کھانا کھلا یا مجھے طلاق دے۔ یہ اس کے قول کا رد کرتا ہے جو کہتا ہے: تنگی کی وجہ سے تفریق نہیں کرتا ہے اور عورت پر صبر کو لازم کرتا ہے اور نفقہ خاوند کے ذمہ حاکم کے حکم سے کرتا ہے۔ یہ عطا اور زہری کا قول ہے اور کوفیوں کا نظریہ بھی یہی ہے وہ بطور دلیل یہ آیت پیش کرتے ہیں وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ (بقرہ:280) (اگر وہ تنگ دست ہو تو خوشحالی تک مہلت دو) وہ کہتے ہیں: خوشحال ہونے تک مہلت دینا واجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ (نور:32) وہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے پس فقر کو فرقت کا سبب بنانا جائز نہیں ہے۔ فقر کے ہوتے ہوئے نکاح کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس آیت میں ان کی کوئی حجت نہیں ہے اس کا بیان اپنی جگہ پر آئے گا اور حدیث اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: خطاب یتیم کے ولی کو ہے تاکہ وہ اس کے مال سے اس پر خرچ کرے جو مال ولی کی نگرانی میں ہے جیسا کہ پہلے مال کی اضافت میں اختلاف گزر چکا ہے۔ وصی اس یتیم کے مال اور حال کے مطابق اس پر خرچ کرے اگر وہ چھوٹا ہو اور اس کا مال کثیر ہو تو اس کے لیے دایہ کا بندوبست کرے اور اس کی پرورش کرنے والیوں کا اہتمام کرے اور اس پر خرچ میں وسعت کرے۔ اگر یتیم بڑا ہو تو اس کے لیے نرم لباس اور لذیذ کھانے اور خدام کا انتظام کرے۔ اگر اس کا مال کم ہو تو اس کے مطابق خرچ کرے۔ اگر مال بالکل تھوڑا ہو تو حاجت کی مقدار موٹا لباس اور سادہ کھانا مہیا کرے اگر یتیم فقیر ہو اس کا مال نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ بیت المال سے اس کا بندوبست کرے۔ امام اگر ایسا نہ کرے تو مسلمانوں پر یہ واجب ہے۔ جو اس کا زیادہ قریبی ہو گا اس پر واجب ہو گا پھر جو زیادہ قریبی ہو گا اس پر واجب ہو گا۔ ماں اس کی زیادہ قریبی ہے تو اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا واجب ہے اور نہ تو بچے پر رجوع کرے گی اور نہ کسی اور پر رجوع کرے گی یہ وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ:233) کے تحت گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یعنی ان سے نرم لہجہ میں بات کرنا اور خوبصورت وعدہ کرنا۔ قول معروف کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان کے لیے دعا کرو اللہ تعالیٰ تم میں برکت دے، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے اور تمہارے لیے نیک بندوبست فرمائے (1) اور میں تمہاری دیکھ بھال کروں گا یہ احتیاط ایسی ہے جس کا نفع تیری طرف لوٹے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان سے اچھا وعدہ کرو یعنی تم جب پختگی کی عمر کو پہنچ جاؤ گے تو ہم تمہارے مال تمہیں واپس کر دیں گے (2)۔ باپ بیٹے سے کہے: میرا مال تجھے ہی ملے گا ان شاء اللہ، تو ہی اس کا مالک ہو گا جب تو دانائی کا مالک ہو گا اور جب تو تصرف کرنے کو پہچان لے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 10، دار الکتب العلمیہ بیروت　　2۔ ایضاً

وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝

''اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال اور نہ کھاؤ انہیں فضول خرچی سے اور جلدی جلدی اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اور جو سرپرست غنی ہو تو اسے چاہیے کہ (یتیموں کے مال سے) پرہیز کرے اور جو سرپرست فقیر ہو تو وہ کھالے مناسب مقدار سے پھر جب لوٹاؤ تم ان کی طرف ان کے مال تو گواہ بنا لو ان پر اور کافی ہے الله حساب لینے والا''۔

اس آیت میں سترہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى، الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے یہ آیت یتیموں کو مال دینے کی کیفیت کے بیان میں تمام لوگوں کے لیے خطاب ہے۔بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثابت بن رفاعہ اور اس کے چچا کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ اس طرح ہے کہ رفاعہ فوت ہوا اور اس نے اپنا چھوٹا بچہ چھوڑا تو ثابت کا چچا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میرے بھائی کا بیٹا یتیم ہے وہ میری پرورش میں ہے اس کے مال سے میرے لیے کیا حلال ہے اور میں اسے کب مال دے دوں تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔اختیار کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔بعض علماء نے فرمایا: وصی، یتیم کے اخلاق میں غور وفکر کرے، اس کی اغراض کو سنے اور اس کی نجابت کا علم حاصل کرے اور اس کے مصالح میں اس کی کوشش اور مال کی حفاظت اور مال میں سستی کی معرفت حاصل کرے، جب اس میں خیر دیکھے تو ہمارے علماء وغیرہم نے فرمایا: اس کو اس کے مال میں سے کچھ دے دینے میں کوئی حرج نہیں، اس کے لیے اس میں تصرف مباح ہے اگر تو وہ اس مال میں اضافہ کرے اور اس میں بہتر انداز میں تصرف کرے تو اختیار پایا گیا اور وصی پر اس کا سارا مال دینا واجب ہو گیا اور اگر اس مال میں بہتر انداز میں تصرف نہ کرے تو وصی پر واجب ہے کہ اس کا مال اپنے پاس روکے رکھے۔علماء میں کوئی ایسا نہیں جو کہے کہ جب بچے کی آزمائش کی جائے اور وصی اسے دانا پائے تو اس سے ولایت اٹھ جاتی ہے اور اس کا مال اسے دینا واجب ہو جاتا ہے اور اس میں تصرف کی کھلی چھٹی ہوتی ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (حتیٰ کہ جب نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں) فقہاء کی ایک جماعت نے کہا: چھوٹا بچہ دو چیزوں سے خالی نہیں ہوتا یا وہ لڑکا ہو گا یا لڑکی ہو گی اگر وہ لڑکا ہو گا تو ایک مہینہ گھر کے اخراجات میں اسے اہتمام کرتے ہوئے دیکھا جائے گا یا وصی اسے تھوڑی سی چیز دے گا جس میں وہ تصرف کرے گا تاکہ اس کی تدبیر اور تصرف کو پہچان لے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ وصی اس کی نگرانی کرے گا تاکہ مال کو ضائع نہ کر دے۔اگر وہ اسے ضائع کرے گا تو وصی پر اس

کی ضمان نہ ہوگی اگر وہ اسے مال کی حفاظت میں پوری کوشش کرنے والا دیکھے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دے اور اس پر گواہ بنا لے۔ اگر وہ یتیم بچی ہوگی تو اس کو وہ چیزیں دی جائیں گی جن کا تعلق تدبیر و نظر کے اعتبار سے گھر کو بنانے سنوارے سے ہوتا ہے مثلاً اون کاتنے والیوں کو اون دینے اور پھر کپڑا واپس لینے، اس کی اجرت دینے اور عمدہ روٹی لینے اور عمدہ بنائی لینے وغیرہ کا کام دیکھے گا، اگر وصی اسے دانا دیکھے گا تو اس کا مال اس کے حوالے کر دے گا اور اس پر گواہ بنا لے گا ورنہ وہ حجر کے تحت رہیں گی حتیٰ کہ وہ ان کی دانائی محسوس کی جائے۔ حسن اور مجاہد وغیرہ نے کہا: اور ان کو ان کی عقول، ادیان اور مال بڑھانے میں آزماؤ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ یعنی جب بالغ ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ (نور: 59) یعنی جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں اور نکاح کی حالت کو پہنچ جائیں اور بلوغت پانچ چیزوں کے ساتھ ہوتی ہے تین چیزوں میں مرد اور عورتیں مشترک ہیں اور دو چیزیں عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور وہ دو چیزیں حیض اور حمل ہیں۔ حیض اور حمل کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ بلوغ ہے ان کے ہوتے ہوئے احکام و فرائض واجب ہوتے ہیں اور دوسری تین چیزوں میں عطا کا اختلاف ہے۔ رہا زیر ناف بالوں کا آنا اور عمر تو امام اوزاعی، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: پندرہ سال بلوغت کی عمر ہے جس کو احتلام نہ ہو۔ یہی قول ابن وہب، اصبغ، عبد الملک بن الماجشون، عمر بن عبد العزیز اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا ہے، ابن عربی نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ ان علماء کے نزدیک جو اس عمر کو پہنچ جائے اس پر حدود و فرائض واجب ہیں۔ اصبغ بن الفرج نے فرمایا: ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بلوغت کی حد جس کی وجہ سے فرائض اور حدود لازم ہوتے ہیں وہ پندرہ سال عمر ہے اس مسئلہ میں جو میرے پاس معلومات ہیں ان میں سے یہ قول مجھے زیادہ پسند ہے اور میرے نزدیک یہی عمدہ ہے، کیونکہ وہ عمر جس میں جہاد میں حصہ دیا جاتا ہے اور جو قتال (جنگ) میں شریک ہو سکتا ہے وہ یہی عمر ہے اور اس مسئلہ میں حضرت ابن عمر کی حدیث سے حجت پکڑی گئی ہے جب انہوں نے جنگ خندق میں اپنے آپ کو پیش کیا جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی تو انہیں شرکت کی اجازت دی گئی جب کہ جنگ احد میں انہیں اجازت نہیں ملی تھی، کیونکہ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (1)۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کی تاریخ پیدائش معلوم ہو اور رہا وہ جس کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو اور عمر کے سال کا علم نہ ہو یا وہ اس کا انکاری ہو تو اس صورت میں اس روایت کے مطابق عمل کیا جائے گا جو نافع نے اسلم سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر نے الاجناد کے امراء کو لکھا کہ جزیہ نہ لگاؤ مگر اس پر جس کے زیر ناف بال اگ آئے ہوں۔ حضرت عثمان نے چوری کرنے والے لڑکے کے بارے فرمایا: دیکھو اگر زیر ناف بال اگ آئے ہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ عطیہ القرظی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے ہر اس شخص کو حضرت سعد بن معاذ کے فیصلہ کے مطابق قتل کر دیا جس کے زیر ناف بال اگ آئے تھے اور جن کے بال نہیں اُگے تھے ان کو زندہ رکھا میں ان میں سے تھا جن کے بال ابھی نہیں اُگے تھے پس مجھے آپ نے چھوڑ دیا۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے کہا: جس کو احتلام نہیں ہوا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 317

اس پر بلوغت کا حکم نہیں لگایا جائے گا حتیٰ کہ وہ اس عمر کو پہنچ جائے کہ جس میں کسی کو احتلام ہوتا ہے اور یہ سترہ سال کی عمر ہے اس وقت اس پر حد ہوگی جب وہ کوئی ایسا فعل شنیع کرے گا جس پر حد واجب ہوتی ہے۔ کبھی امام مالک نے فرمایا: بلوغت کی حد یہ ہے کہ اس کی آواز بھاری ہو جائے اور اس کی بینی پھول جائے۔ امام ابوحنیفہ سے دوسری روایت انیس سال کی ہے۔ اور یہ زیادہ مشہور قول ہے اور یحییٰ کے متعلق فرمایا: اس کی بلوغت کی عمر سترہ سال ہے اور اس پر نظر حکم ہے۔ اللؤلؤی نے امام ابوحنیفہ سے اٹھارہ سال بھی روایت کیے ہیں۔ داؤد نے کہا: جب تک احتلام نہیں ہوتا عمر کے ساتھ بلوغت شمار نہ ہوگی اگرچہ چالیس سال بھی عمر ہو جائے، رہا زیر ناف بالوں کا پیدا ہونا، بعض علماء نے کہا: اس سے بلوغت پر استدلال کیا جائے گا۔ ابن القاسم اور سالم سے یہ مروی ہے۔ امام مالک کا بھی ایک قول یہ ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ احمد، اسحاق اور ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بلوغت کی علامت ہے لیکن اس کے ساتھ کفار پر حکم لگایا جائے گا پس جس کے زیر ناف بال پیدا ہو چکے ہوں گے اسے قتل کیا جائے گا اور جس کے زیر ناف بال نہ ہوں گے اسے بچوں میں شمار کیا جائے گا۔ یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے انہوں نے یہ استدلال عطیہ القرظی کی حدیث سے کیا ہے اور باریک بالوں اور روؤں کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ حکم بالوں پر مرتب ہوگا۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میرے نزدیک حضرت عمر بن خطاب کی حدیث پر عمل ہے۔ اگر زیر ناف بالوں پر استرا استعمال کرتا ہے تو میں اس پر حد لگاؤں گا۔ اصبغ نے کہا: مجھے ابن القاسم نے کہا میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ حد صرف بالوں کے اگنے اور بلوغت دونوں کے جمع ہونے کی صورت میں لگائی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: زیر ناف بالوں کی وجہ سے حکم ثابت نہ ہوگا نہ تو وہ بلوغ ہے اور نہ بلوغ پر دلالت ہے۔ زہری اور عطا نے کہا: جس کو احتلام نہ ہو اس پر حد نہیں ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور مالک کا ایک رجحان بھی ایک قول کے مطابق اسی طرح ہے، امام مالک کے بعض اصحاب کا یہی قول ہے اس کا ظاہر یہ ہے کہ بالوں کے اگنے اور عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب حضرت ابن عمر کی حدیث عمر میں دلیل نہیں ہے تو پھر ہر وہ عدد جو سالوں کے متعلق علماء ذکر کرتے ہیں وہ صرف دعویٰ میں ہے۔ وہ عمر جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا وہ اس عمر سے بہتر ہے جس کا اعتبار نہیں کیا اور شرع میں اس پر دلیل بھی قائم نہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ میں زیر ناف بال اگنے کا اعتبار کیا ہے۔ میں اس کا عذر تسلیم نہیں کرتا جس نے ان دو امروں کو ترک کر دیا جن کا اعتبار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس نے اس کی تاویل کی ہے اور اس مدت کا اعتبار کرتا ہے جس کا لفظاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتبار نہیں کیا ہے اور نہ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شریعت میں نظر بنائی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہاں تو اس کا یہ قول ہے اور سورۂ انفال میں اس کا دوسرا قول ہے، کیونکہ وہاں اس نے حضرت ابن عمر کی حدیث کو نہیں چھوڑا اور اسی طرح کی تاویل کی ہے جو ہمارے علماء نے کی ہے، کیونکہ اس کا موجب ان کے درمیان فرق ہے جو جنگ کی طاقت رکھتا ہے اور جس کے لیے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا جاتا ہے اور وہ پندرہ سال کی عمر کا شخص ہے اور جو جنگ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس کے لیے حصہ مقرر نہیں کیا جاتا اور وہ بچوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ مفہوم ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حدیث سے سمجھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ یعنی جب تم ان سے دانائی دیکھو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا (القصص: 29) (موسیٰ علیہ السلام نے طور کی جانب سے آگ دیکھی) ازہری نے کہا: عرب کہتے ہیں اذهب فاستانس هل تری احدا (جاؤ دیکھو کیا کوئی شخص دیکھتے ہو)

نابغہ نے کہا: علی مستأنس وحد۔

اس سے وہ وحشی بیل مراد لیتا ہے جو دیکھتا ہے کہ کیا اسے کوئی شکاری نظر آتا ہے تاکہ وہ اس سے محتاط ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا آنست واحسست ووجدت تمام کا ایک معنی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا یعنی تم ان سے دانائی جان لو۔ اس میں اصل ابصرتم ہے یعنی اس کا معنی دیکھنا ہے۔ عام قراءت رشدا را کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ ہے۔ سلمی، عیسیٰ، ثقفی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رشدا راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رشدا، رشد کا مصدر ہے اور رشدا، رشد کا مصدر ہے اسی طرح ارشاد ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء نے رُشْدًا کی تاویل میں اختلاف کیا ہے حضرت حسن اور حضرت قتادہ وغیرہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عقل اور دین میں اصلاح (1)، حضرت ابن عباس، سدی اور ثوری نے کہا: عقل اور مال کی حفاظت میں (2) اصلاح ہے سعید بن جبیر اور شعبی نے کہا: ایک شخص اپنی داڑھی پکڑتا ہے اور وہ دانائی کو نہیں پہنچا ہوتا (3)۔ پس یتیم کو اس کا مال نہیں دیا جائے گا اگرچہ وہ بوڑھا بھی ہو جائے حتیٰ کہ اس سے دانائی معلوم ہو جائے۔ ضحاک نے اسی طرح کہا ہے: یتیم کو مال نہیں دیا جائے گا اگرچہ وہ سو سال کو پہنچ جائے حتیٰ کہ اس سے مال کی اصلاح معلوم ہو جائے۔ مجاہد نے کہا: یعنی خاص عقل میں اصلاح مراد ہے (4)۔ اکثر علماء نے کہا: رشد، بلوغت کے بعد ہوتی ہے۔ اگر بلوغت کے بعد بھی دانا نہ ہو، اگرچہ بوڑھا بھی ہو جائے تو اس سے حجر کا حکم زائل نہ ہوگا۔ یہ امام مالک وغیرہ کا مذہب ہے۔ ابوحنیفہ نے فرمایا: آزاد بالغ پر حجر نہیں کیا جائے گا جب وہ مردوں کی حد کو پہنچ جائے اگرچہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ فاسق ہو اور سب سے زیادہ فضول خرچی کرنے والا ہو جب کہ وہ عقل مند ہو۔ امام زفر بن ہذیل کا یہی قول ہے اور یہی نخعی کا مذہب ہے اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت قتادہ نے حضرت انس سے روایت کی ہے کہ حبان بن منقذ (چیزیں) خریدتے تھے اور ان کی سوچ اور رائے میں کمزوری تھی، عرض کی گئی یا رسول اللہ! حبان پر حجر کر دیں، یہ چیزیں خریدتا ہے اور اس کی سمجھ میں ضعف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا: تو بیع نہ کیا کر اس نے کہا: حضور! میں بیع کیے بغیر رہ نہیں سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: جب تو بیع کیا کر تو کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہوگا اور تیرے لیے تین دن کا خیار ہوگا۔ احناف اور ان کے ہمنوا علماء فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر حجر کرنے کو کہا گیا، کیونکہ اس کے تصرفات میں نقصان ہوتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حجر نہیں کیا تھا پس ثابت ہوا کہ حجر کرنا جائز نہیں ہے۔ اس حدیث میں احناف کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ اس شخص کے ساتھ خاص تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ

---

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 314
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 11
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 314
4۔ ایضاً

بقرہ میں بیان کیا ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے حکم مختلف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر وہ شخص مال اور دین کو خراب کرنے والا ہو یا مال کو خراب کرنے والا ہو دین کو ضائع کرنے والا نہ ہو تو اس پر حجر کیا جائے گا اور اگر اپنے دین کو ضائع کرنے والا اور اپنے مال کی اصلاح کرنے والا ہو تو اس کے متعلق دو قول ہیں ایک یہ کہ اس پر حجر کیا جائے گا یہ ابوالعباس بن شریح کا اختیار ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر حجر نہ ہوگا یہ ابو اسحاق مروزی کا مختار قول ہے۔ امام شافعی کا بھی اظہر قول یہی ہے۔ ثعلبی نے کہا: جو ہم نے سفیہ (بےوقوف) پر حجر کے متعلق ذکر کیا ہے یہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور عبداللہ بن جعفر کا قول ہے اور تابعین میں سے شریح کا قول ہے اور فقہاء میں سے امام مالک، اہل مدینہ، اوزاعی، اہل شام، امام ابو یوسف، امام محمد، امام احمد، اسحاق اور ابوثور کا قول ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اس مسئلہ میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو تو جان لے کہ مال کا دینا دو شرائط پر ہے دانائی کا محسوس کرنا اور بالغ ہونا۔ اگر ایک شرط پائی جائے اور دوسری نہ پائی جائے تو مال یتیم کے حوالے کرنا جائز نہیں اسی طرح آیت کی نص ہے اور ابن القاسم، اشہب اور ابن وہب کی مالک سے اس آیت کے متعلق یہی روایت ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام زفر اور نخعی کے علاوہ فقہاء کا یہی قول ہے انہوں نے پچیس سال کی عمر کو پہنچنے کے ساتھ دانائی محسوس کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: اس عمر میں چونکہ وہ دادا ہو جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کے قول کے ضعف پر دلیل ہے اور اس کے ضعف پر دلیل ہے جس کے ساتھ ابوبکر رازی نے احکام القرآن میں ان دو آیتوں کے استعمال سے حجت پکڑی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہے اور اہل اصول کا اتفاق ہے کہ مطلق کو مقید کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اس کا دادا ہونا کیا فائدہ دے گا جب وہ غیر سنجیدہ ہو۔ مگر ہمارے علماء نے لڑکی میں بلوغت کے ساتھ خاوند کا اس سے دخول کرنا شرط قرار دیا ہے اس وقت رشد میں ابتلا واقع ہوگا جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اس کا خیال نہیں رکھتے اور وہ مذکر اور مونث میں مذکورہ اقوال کے مطابق اختیار کا اعتبار کرتے ہیں۔ ہمارے علماء نے مذکر اور مونث میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: عورت، مرد کے مخالف ہوتی ہے، کیونکہ وہ پردے میں ہوتی ہے بکارت کی وجہ سے وہ نہیں باہر نکلتی ہے اور نہ امور کا اسے تجربہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس میں نکاح کے وجود پر دانائی کو موقوف کیا گیا ہے۔ نکاح کے ساتھ تمام مقاصد سمجھتی ہے۔ جبکہ مرد اس کے خلاف ہوتا ہے وہ اپنے تصرف اور نشاۃ کے آغاز سے بلوغت تک لوگوں سے ملاقات کے ساتھ اس کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی عقل بلوغت کے ساتھ مکمل ہوتی ہے، پس اس کے لیے غرض حاصل ہو جاتی ہے اور جو امام شافعی نے کہا وہ زیادہ درست ہے، کیونکہ حشفۃ کے داخل کرنے کے ساتھ نفس وطی اس کی رشد و دانائی میں اضافہ نہیں کرتی جب کہ وہ تمام امور اور مقاصد کو جاننے والی ہو اور مال کو فضول خرچ کرنے والی نہ ہو پھر ہمارے علماء نے یہ زائد فرمایا ہے کہ خاوند کے دخول کے بعد اتنی مدت کا گزرنا بھی ضروری ہے جس میں احوال کی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے اس زمانہ کی تحدید میں کئی اقوال ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے پانچ، چھ اور سات سال باپ والی لڑکی کے بارے میں ہیں اور وہ یتیمہ جس کا باپ اور وصی نہ ہو اس کے لیے دخول کے بعد ایک سال مقرر کیا ہے اور جس پر والی مقرر کیا ہے اس پر ہمیشہ حجر ہوگا حتیٰ کہ اس کی دانائی ثابت ہو جائے۔ ان تمام اقوال

میں کوئی دلیل نہیں ہے باپ والی لڑکی میں سالوں کی حد بیان کرنا مشکل ہے اور یتیمہ میں ایک سال کی تحدید اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اور جس پر والی مقرر کیا گیا ہے اس پر ہمیشہ حجر ہو گا حتی کہ اس کی دانائی واضح ہو جائے، اس کو وصی حجر سے نکالتا ہے یا حکم اس سے نکالتا ہے۔ یہ قرآن کا ظاہر ہے اور اس تمام سے مقصود اس ارشاد کے تحت داخل ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا پس رشد و دانائی کا اعتبار تو متعین ہو گیا لیکن راشد کے حال کے مختلف ہونے کے سبب اس کا محسوس کرنا مختلف ہے، پس اس کو پہچان لے اور اس پر اپنی ترکیب کر اور وہ فیصلہ کرنے سے اجتناب کر جس پر دلیل نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء کا اختلاف ہے اس لڑکی کے بارے میں جو باپ والی ہو اور اس مدت میں کوئی کام کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: حجر کی بقا کی وجہ سے وہ رد پر محمول ہو گا اور جو کام اس مدت کے بعد کرے گی وہ جواز پر محمول ہو گا۔ بعض نے فرمایا: جو کام وہ اس مدت میں کرے گی وہ رد پر محمول ہو گا مگر جب کہ اس میں درستگی ظاہر ہو تو جواز پر محمول ہو گا اور جو کام اس مدت کے بعد کرے گی وہ جواز پر محمول ہو گا مگر یہ کہ اس میں سفاہت واضح ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جس پر حجر کیا گیا ہے اس کو مال دینے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا سلطان کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ ایک جماعت نے کہا: یہ معاملہ سلطان وقت کی طرف لے جانا ضروری ہے اور اس کے نزدیک اس کی دانائی ثابت ہو گی تو اس کا مال اس کو دیا جائے گا۔ ایک گروہ نے کہا: یہ وصی کے اجتہاد پر موقوف ہے سلطان کی طرف معاملہ لے جانے کی ضرورت نہیں (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہمارے زمانہ کے وصی میں درست یہ ہے کہ وہ سلطان کی طرف مسئلہ لے جائے اور اس کے پاس رشد کے ثبوت سے مستغنی نہ ہو کیونکہ اس میں حفاظت ہے اس سے کہ اوصیاء متفق ہو جائیں کہ بچہ دانا ہو گیا ہے اور وہ محجور علیہ (جس کو تصرف سے روکا گیا ہے) کو بری کر دے جس کو اس وقت میں تحصیل کی قلت اور نادانی کی وجہ سے تصرف سے روکا گیا تھا (2)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب دانائی کے پائے جانے کے ساتھ مال اس کے حوالے کیا جائے گا پھر اگر وہ قلت تدبیر اور فضول خرچی کے ظہور کے ساتھ بے وقوفی کی طرف لوٹ آئے تو ہمارے نزدیک اس کی طرف حجر پھر لوٹ آئے گا اور امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: حجر دوبارہ نہیں لوٹے گا، کیونکہ وہ بالغ عاقل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قصاص اور حدود میں اس کا اقرار جائز ہے اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (البقرہ: 282) (پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فرق نہیں فرمایا کہ محجور سفیہ ہو یا اطلاق کے بعد اس پر سفاہت طاری ہو۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ وصی کے لیے یتیم کے مال میں وہ سب کچھ کرنا جائز ہے جو باپ کے لیے کرنا جائز ہوتا ہے مثلاً تجارت کرنا، بضاعت پر دینا، بیع و شراء کرنا وغیرہ اور اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کے تمام اموال کی زکوٰۃ ادا کرے خواہ سونا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 11، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً

چاندی ہو، کھیتی ہو یا جانور ہوں اور فطرانہ بھی ادا کرے اور اس کی طرف سے جنایات کی دیت اور اگر وہ چیزیں ضائع کر دے اس کی قیمت ادا کرے، والدین کا نفقہ اور تمام لازمی حقوق ادا کرے۔ یتیم کا نکاح کرنا، اس کی طرف سے مہر ادا کرنا، اس کے لیے لونڈی خریدنا، جسے وہ لونڈی بنائے، اس کے مفاد میں تمام مصالح کا اہتمام کرنا، جب وصی بعض قرض خواہوں کو قرضہ ادا کر دے اور مال میں کچھ بچ جائے جو اس کا مزید قرضہ ادا کر دے تو وصی کا یہ فعل جائز ہے اور اگر باقی مال تلف ہو جائے تو وصی پر باقی قرض خواہوں کے لیے کچھ نہ ہوگا اور نہ ان پر جنہوں نے قرضہ وصول کر لیا۔ اگر قرض خواہوں نے تمام مال لے لیا پھر دوسرے قرض خواہ آ گئے، اگر تو وصی کو باقی قرض کا علم تھا یا میت باقی قرض کے ساتھ معروف تھا تو وصی ان عرفاء کے لیے اتنے پیسوں کا ضامن ہوگا جو ان کا حصہ بنتا ہے اور وصی ان لوگوں سے پیسے واپس لے گا جنہوں نے مکمل اپنا قرضہ وصول کر لیا تھا اور اگر وصی کو اس کا علم نہ ہو اور نہ میت قرضہ کے ساتھ معروف ہو تو وصی پر کچھ نہ ہوگا اور جب وصی نے میت کا قرضہ بغیر گواہی کے دے دیا تو وہی ضامن ہوگا۔ اگر اس نے گواہی قائم کی اور طویل زمانہ گزر گیا حتی کہ گواہ فوت ہو گئے تو اس پر کچھ نہیں ہوگا۔ سورۂ بقرہ میں وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ: 220) کے تحت وصی کے خرچ کرنے کے متعلق احکام گزر چکے ہیں جو کافی وشافی ہیں۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو بغیر اسراف کے کھایا جائے وہ جائز ہے۔ پس اس کے لیے دلیل خطاب ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے مال نہ کھاؤ، کیونکہ یہ اسراف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اوصیاء کو یتیموں کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے وہ اتنا کھا سکتے ہیں جو ان کے لیے کھانا ضروری اور مباح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اسراف کا لغوی معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ السرف کا مطلب خرچ کرنے میں خطا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

اَعْطَوْ هُنَيْدَة يَحْدُوها ثمانِيةٌ　　ما فی عطائهم مَنٌّ ولا سَرَفُ

یعنی وہ عطا کی جگہ میں خطا نہیں کرتے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وقال قائلهم والخيلُ تخبِطُهم　　اَسْرَفْتُمْ فاَجبنا اَنّنا سَرَفُ

نضر بن شمیل نے کہا: السرف کا معنی فضول خرچی کرنا ہے اور السرف کا معنی غفلت ہے، اسراف کا مزید معنی کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گا۔

وَّ بِدَارًا اس کا معنی ان کا جلدی بڑا ہونا ہے۔ وہ حالت بلوغ کو ہے۔ البدار، المبادرۃ یہ قتال اور مقاتلہ کی طرح ہے۔ اس کا اسرافاً پر عطف ہے اور اَنْ يَّكْبَرُوْا، بدار کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی جو تیری پرورش میں ہے اس کے مال کو غنیمت نہ سمجھ، کہ تو اسے کھائے اور کہے کہ میں اس کے بڑے ہونے کے لیے جلدی کر رہا ہوں، تا کہ دانا نہ ہو جائے اور اپنا مال لے نہ لے۔ یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: جو یتیموں کے مال

سے ان کے سرپرستوں کے لیے حلال ہے۔ غنی کو حکم دیا کہ وہ یتیم کے مال کے استعمال سے رک جائے اور فقیر وصی کے لیے مباح قرار دیا کہ وہ معروف طریقہ سے اس کے مال سے کھا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے: عف الرجل عن الشئ، واستعف جب کوئی کسی چیز سے رک جائے۔ الاستعفاف عن الشئ کا مطلب ہے چیز کو ترک کر دینا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (نور: 33) (اور چاہیے کہ پاک دامن بنے رہیں وہ لوگ جو نہیں کر پاتے شادی کرنے کی قدرت) العفة کا معنی ہے جو چیز حلال نہیں ہے اس سے رک جانا اور جس کا کرنا واجب نہیں اس سے رک جانا۔ ابو داؤد نے حسین المعلم عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ کی سند سے روایت فرمایا ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میں فقیر ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میرے پاس ایک یتیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے یتیم کے مال سے کھا جب کہ تو اسراف کرنے والا نہ ہو، فضول خرچی کرنے والا نہ ہو اور مال کو جمع کرنے والا نہ ہو۔(1)

**مسئلہ نمبر 13**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس آیت سے مراد کیا ہے؟ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کے تحت مروی ہے فرمایا: یہ یتیم کے اس ولی کے بارے نازل ہوئی جو اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے جب وہ محتاج ہو تو اس کے لیے یتیم کے مال سے کھانا جائز ہے۔ ایک روایت میں ہے: اس کے مال کی مقدار معروف طریقہ سے کھانا جائز ہے۔

بعض نے فرمایا: اس سے مراد یتیم ہے اگر وہ غنی ہو تو ولی پر وسعت کا مظاہرہ کرے اور اس کے مال سے اجتناب کرے اگر وہ فقیر ہو تو ولی پر اپنے مال کی مقدار اس پر خرچ کرے۔ یہ ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا قول ہے۔ پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح ہے کیونکہ یتیم اپنے مال میں اپنی صغر سنی اور سفاہت کی وجہ سے تصرف کرنے کے ساتھ مخاطب نہیں ہوتا واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ معروف طریقہ سے کھانے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ ایک قوم نے کہا: وہ یتیم کے مال سے قرض لے جب اسے ضرورت ہو پھر جب خوشحال ہو تو ادا کر دے۔ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن عباس، حضرت عبیدہ، حضرت ابن جبیر، شعبی، ابو العالیہ اور اوزاعی کا قول ہے اور اپنی حاجت سے زیادہ یتیم کے مال سے قرض نہ لے۔ حضرت عمر نے فرمایا: خبردار میں نے بیت المال سے اپنا معاملہ اس طرح کیا ہے جس طرح ولی کا معاملہ یتیم کے مال سے ہوتا ہے۔ اگر میں غنی ہوں گا تو میں اس مال سے پرہیز کروں گا اگر فقیر ہوں گا تو معروف طریقہ سے کھاؤں گا پھر جب خوشحال ہوں گا تو وہ مال واپس کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے عاصم سے انہوں نے ابو العالیہ سے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کے متعلق روایت کیا ہے کہ وہ قرض لے کر کھائے۔ پھر بطور دلیل یہ آیت پڑھی فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ۔

دوسرا قول: ابراہیم، عطا، حسن بصری، نخعی اور قتادہ سے مروی ہے کہ فقیر وصی نے جو معروف طریقہ سے کھایا اس کی اس پر قضا نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ یہی فقہاء کا نظریہ ہے۔ حسن نے فرمایا: یہ اللہ کی طرف سے وصی کے لیے کھانا ہے وہ اتنا کھائے جو اس کی بھوک کو مٹا دے اور اتنا کپڑا پہنے جو اس کی شرمگاہ کو ڈھانپ دے، روئی کے اعلیٰ کپڑے اور لباس نہ پہنے۔

---

1۔ ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فیما لولی الیتیم ان ینال من مال الیتیم، حدیث نمبر 2488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس قول کی صحت پر دلیل اجماع امت ہے کہ امام جو مسلمانوں کا نگران ہوتا ہے جو وہ بیت المال سے کھاتا ہے وہ اس پر بطور قرض واجب نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مال میں اس کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ پس حضرت عمر کے قول میں پہلے قول والوں کے لیے حجت نہیں ہے کہ ''جب میں خوشحال ہوں گا تو ادا کر دوں گا'' اگرچہ صحیح بھی ہو۔ حضرت ابن عباس، ابو العالیہ اور شعبی سے مروی ہے کہ معروف طریقہ سے کھانا سے مراد مویشیوں کے دودھ سے نفع حاصل کرنے، غلاموں سے خدمت لینے اور سواریوں پر سوار ہونے کی طرح ہے جبکہ اصل مال کو نقصان نہ ہو جس طرح خارش زدہ اونٹ کو تارکول لگاتا ہے، گمشدہ چیز کا اعلان کرتا ہے، حوض کی لپائی کرتا ہے اور کھجوریں توڑتا ہے۔ رہے اموال کے اعیان اور اصول تو ان کا لینا وصی کے لیے جائز نہیں۔ یہ تمام فقہاء کے قول سے نکالا گیا ہے۔ وہ اپنے عمل کی اجرت کی مقدار لے لے۔ ایک طائفہ نے یہ کہا ہے اور یہی معروف ہے، اس پر قضا نہیں ہے، لیکن اس سے زائد لینا حرام ہے۔ حسن بن صالح بن حی، (اس کو ابن حبان کہا جاتا ہے) نے باپ اور حاکم کے وصی کے درمیان فرق کیا ہے، باپ کے وصی کے لیے معروف طریقہ سے کھانا جائز ہے اور رہا حاکم کا وصی تو اس کے لیے مال لینا کسی صورت میں جائز نہیں۔ یہ تیسرا قول ہے اور چوتھا قول مجاہد سے مروی ہے۔ فرمایا: نہ وہ قرض لے اور نہ کسی اور اعتبار سے لے۔ مجاہد کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے)

اور یہ تجارت نہیں ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: اس آیت میں رخصت اس ارشاد سے منسوخ ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا (بے شک جو لوگ کھاتے ہیں یتیموں کا مال ظلماً) بشر بن الولید نے امام ابو یوسف سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری رضامندی سے)

پانچواں قول یہ ہے کہ حضر اور سفر کے درمیان فرق ہے پس جب مقیم ہو تو ممنوع ہے اور جب اس کی وجہ سے سفر کرنے کا محتاج ہو تو جتنی ضرورت ہے اتنا لے لے اور کوئی چیز جمع نہ کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے۔

چھٹا قول: ابو قلابہ نے کہا: غلہ میں سے جو چنے اس میں سے معروف طریقہ سے کھائے۔ رہا سونا، چاندی تو اس سے قرض لینا اور کسی اور اعتبار سے لینا جائز نہیں ہے۔ ساتواں قول عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَ مَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ جب محتاج اور مجبور ہو تو معروف طریقہ سے کھائے۔ شعبی نے کہا: جب ایسی کیفیت میں کہ وہ خون اور خنزیر کے گوشت کے قائم مقام ہو تو اس سے لے سکتا ہے اور اگر وہ اپنا مال پائے تو پھر اسے پورا کر دے۔ نحاس نے کہا: اس کا کوئی معنی نہیں، کیونکہ جب انسان ایسی اضطراری کیفیت میں ہو تو اس کے لیے یتیم اور کسی دوسرے کے مال سے لینا، خواہ وہ قریبی ہو یا دور ہو جائز ہے۔ حضرت ابن عباس اور نخعی نے یہ فرمایا ہے کہ اپنے مال سے وصی معروف طریقہ سے کھائے تاکہ

یتیم کے مال کی ضرورت ہی نہ رہے اور غنی اپنی غنا کی وجہ سے پرہیز کرے اور فقیر اپنے نفس پر کنجوسی کرے تاکہ یتیم کے مال کی ضرورت نہ رہے۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے، کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں بغیر کسی قطعی حجت کے ان میں کسی چیز کا استعمال جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں: اس قول کو الکیا طبری نے احکام القرآن میں پسند فرمایا ہے اور فرمایا: بعض سلف نے اس آیت کے حکم میں یہ وہم کیا ہے کہ وصی کے لیے بچے کے مال سے اتنی مقدار میں کھانا جائز ہے جو اسراف کی حد کو نہ پہنچے اور یہ جو اللہ تعالیٰ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے) کا حکم فرمایا ہے اس کے خلاف ہے۔ یہ یتیم کے مال میں ثابت نہیں ہوتا اور وَ مَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ کا ارشاد اپنے مال کے کھانے کی طرف راجع ہے نہ کہ یتیم کے مال کے کھانے کی طرف راجع ہے۔ پس اس کا معنی ہے یتیم کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ نہ کھاؤ بلکہ اپنے اموال کے کھانے پر اکتفا کرو اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝ (نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے) پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ظاہر ہو گیا کہ تھوڑی خوراک پر اکتفا کرے تاکہ وہ یتیم کا مال کھانے کا محتاج ہی نہ ہو۔ یہ آیت کا مکمل معنی ہے۔ ہم بہت سی ایسی محکم آیات پڑھتے ہیں جن میں غیر کا مال اس کی رضا کے بغیر کھانے سے منع فرمایا ہے خصوصاً یتیم کے حق میں۔ یہ آیت کئی معانی کا احتمال رکھتی ہے۔ پس محکم آیات کے موجب پر اس کو محمول کرنا متعین ہے۔ اگر سلف کے مذہب کی تائید کرنے والا کہے کہ قضاۃ، مسلمانوں کے لیے کام کرنے کی وجہ سے تنخواہیں لیتے ہیں تو پھر وصی جو یتیم کے لیے کام کرتا ہے وہ اپنے عمل کی مقدار اجرت کیوں نہ لے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سلف میں سے کسی نے وصی کے لیے بچے کے مال سے لینا جائز قرار نہیں دیا جبکہ وصی غنی ہو جبکہ قاضی کا حکم اس سے مختلف ہے پس دونوں مسئلوں میں فرق ہے وہ مال جو فقہاء، قضاۃ اور وہ خلفاء لیتے ہیں جو اسلام کے امور چلاتے ہیں ان کے لیے تیرا مال متعین نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ مال مختلف اوصاف کے مالک مختلف لوگوں کے لیے مقرر فرمایا ہے اور قضاۃ بھی ان اصناف میں سے ہیں اور وصی اپنے عمل کی وجہ سے شخص معین کے مال سے اس کی رضا کے بغیر لیتا ہے، اس کا عمل مجہول ہے اور اس کی اجرت بھی مجہول ہے اور یہ استحقاق سے بعید ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے شیخ امام ابو العباس فرماتے تھے کہ اگر یتیم کا مال اتنا زیادہ ہو کہ اس کی بہت زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہو حتیٰ کہ ولی اپنی حاجات اور مہمات سے بھی غافل ہو جائے تو اس میں ولی اپنے عمل کی اجرت مقرر کر لے اور اگر یتیم کا مال تھوڑا ہو وصی کو اپنی حاجات سے غافل نہ کرتا ہو تو وصی اس کے مال سے کچھ نہ کھائے مگر اس کے لیے تھوڑا دودھ پینا، تھوڑا سا کھانا اور گھی کھانا مستحب ہے یہ اس کے مال کو نقصان پہنچانے والا اور زیادہ لینے والا نہ ہو بلکہ اتنا مال لے جتنا کہ عادۃً کھانا یا لینا جائز و معاف ہوتا ہے۔ ہمارے شیخ نے فرمایا: جو میں نے اجرت کا ذکر کیا ہے اور تھوڑی سی کھجور اور دودھ لینے کا ذکر کیا ہے یہ تمام معروف میں آجاتا ہے آیت کو اس پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: بچے کے مال سے اجتناب کرنا افضل ہے انشاء اللہ تعالیٰ اور قاضی مال تقسیم کرنے والا جو لیتا ہے اور اسے رسم کا نام دیتا ہے اور اس کے حواری جو لوٹ مار عوام سے کرتے ہیں میں اس کے حلال ہونے اور جواز کی کوئی صورت نہیں جانتا یہ لینے والے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم میں داخل ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ)

**مسئلہ نمبر 15**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ اللہ تعالیٰ نے مال کی حفاظت کرنے اور لغزش کرنے پر تنبیہ کرنے کے لیے گواہ بنانے کا حکم دیا ہے اور بعض علماء کے نزدیک گواہ بنانا مستحب ہے۔ بے شک قول وصی کا معتبر ہے کیونکہ وہ امین ہے اور ایک جماعت کے نزدیک گواہ بنانا فرض ہے یہی آیت کا ظاہر ہے۔ وہ امین نہیں ہے کہ اس کا قول قبول ہو جیسا کہ وکیل ہے جب وہ کہے کہ جو اسے دیا گیا ہے وہ اس نے واپس کر دیا ہے یا مودع کو واپس کر دیا ہے۔ وہ باپ کے لیے امین ہے جب باپ نے اسے امین بنایا تھا تو غیر پر اس کا قول قبول کرنا نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وکیل اگر دعویٰ کرے کہ اس نے زید کو وہ دے دیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا تو اس کا قول بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح وصی کا حکم ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور ابن جبیر کا خیال ہے کہ یہ گواہی اس پر ہوگی جو وصی حالت یسر میں وہ مال واپس کرے گا جو اس نے حالت فقر میں یتیم کے مال سے قرض لے لیا تھا۔ عبیدہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کی ادائیگی کے وجوب پر دلیل ہے جو یتیم کے مال سے کھائے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم قرضہ لو یا تم کھاؤ تو واپسی کے وقت گواہ بنالو۔ صحیح یہ ہے کہ لفظ اس صورت کو اور اس کے علاوہ صورت کو عام ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جب تم اس یتیم پر خرچ کرو تو گواہ بنالو حتی کہ اگر اختلاف واقع ہو تو دلیل قائم کر سکے تمام مال جو امانت کے اعتبار سے گواہیوں کے ذریعہ قبضہ کیا جائے تو وہ اس سے بری نہ ہوگا مگر دیتے وقت گواہی قائم کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاَشْهِدُوْا۔ جب کسی نے بغیر گواہی کے مال پر قبضہ کیا ہو تو اسے واپس کرتے وقت بغیر گواہی کے بھی واپس کر سکتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جس طرح وصی اور کفیل پر یتیم کے مال کی حفاظت اور اس کے لیے اس میں زیادتی کرنا لازم ہوتی ہے اسی طرح وصی پر بچے کے بدن کی حفاظت کرنا بھی لازم ہوتا ہے مال کی حفاظت تو اس کو محفوظ کرنے کے ساتھ کرتا ہے اور بدن کی حفاظت اس کو ادب سکھانے کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری پرورش میں یتیم ہے کیا میں اس کے مال سے کھا سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جبکہ مال کو جمع کرنے والا نہ ہو اور اپنے مال کو یتیم کے مال کے ذریعے بچانے والا نہ ہو (1)۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اس کو سزا دے سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتنی سزا دے سکتا ہے جتنی تو اپنے بچے کو دیتا ہے ابن عربی نے کہا: اگرچہ یہ سنداً ثابت نہیں پھر بھی کسی کو اس حدیث سے مفر نہیں۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے اور

---

1۔ سنن ابی داؤد کتاب الوصایا، باب ما جاء فی مال الیتیم۔۔۔الخ حدیث نمبر 2488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان کی جزا دینے والا ہے اس میں ہر حق سے انکار کرنے والے کے لیے وعید ہے۔ اس میں باء زائدہ ہے اور اسم جلالت محل رفع میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ہیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس ترکہ سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے''۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے امر کا ذکر کیا تو ساتھ ہی مواریث کا ذکر فرمایا۔ اور یہ آیت اوس بن ثابت انصاری کے بارے میں نازل ہوئی وہ فوت ہوا اور ایک بیوی چھوڑی جس کو ام کجہ کہا جاتا ہے اور اس عورت سے تین بیٹیاں چھوڑیں دو آدمی کھڑے ہوئے، وہ دونوں میت کے چچا کے بیٹے تھے اور اس کے وصی تھے ان کو سوید اور عرفجہ کہا جاتا ہے ان دونوں نے مال لے لیا اور اس کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو کچھ نہ دیا اور وہ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو وارث نہیں بناتے تھے اور نہ چھوٹے کو وارث بناتے تھے اگرچہ وہ مذکر بھی ہوتا وہ کہتے: میراث صرف اسے ملے گی جو گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر جنگ کرے گا اور نیزہ زنی کر سکتا ہوگا اور تلوار چلا سکتا ہوگا اور غنیمت جمع کر سکتا ہوگا۔ ام کجہ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو بلایا، تو انہوں نے کہا: یارسول اللہ! اس کا بیٹا گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا، نہ تو وہ بوجھ اٹھا سکتا ہے اور نہ دشمن کو زخمی کر سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں واپس جاؤ حتیٰ کہ میں دیکھ لوں جو اللہ تعالیٰ میرے لیے ان کے بارے میں کوئی نیا حکم فرما دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی (1) اور ان کی جہالت کی وجہ سے جو تصرف اور قول تھا اسے باطل کر دیا، کیونکہ چھوٹے ورثا تو بڑوں کی نسبت مال کے زیادہ حق دار ہونے چاہیے تھے کیونکہ وہ تو نہ خود تصرف کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مصالح میں غور و فکر کر سکتے ہیں زمانہ جاہلیت کے لوگوں نے الٹ حکم جاری کیا ہوا تھا اور حکمت کو باطل کر دیا تھا اور اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے گمراہ ہو چکے تھے اور اپنی آراء اور تصرفات میں غلطی کی تھی (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء نے فرمایا اس آیت میں تین فوائد ہیں (۱) میراث کی علت کو بیان فرمایا، وہ قرابت ہے (۲) قرابت کا عموم جیسے بھی ہو قریبی ہو یا بعیدی ہو (۳) مقررہ حصہ کا اجمال۔ یہ حصہ آیت میراث میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں حکم کے لیے تمہید ہے اور اس فاسد رائے کا ابطال ہے حتیٰ کہ شافی بیان واقع ہوا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ابو طلحہ نے جب اپنا مال (بیرحاء) صدقہ کیا اور اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو اپنے قریبی رشتہ دار فقراء میں دے دے، تو حضرت ابو طلحہ نے وہ باغ حضرت حسان

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 137
2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 328

اور حضرت ابی کو دے دیا۔ حضرت انس نے فرمایا: یہ دونوں حضرات ابوطلحہ کے مجھ سے زیادہ قریبی تھے۔ ابوداؤد نے کہا: مجھے محمد بن عبداللہ انصاری سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا ابوطلحہ انصاری کا سلسلہ نسب یہ تھا زید بن سہل بن الاسود بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار۔ اور حضرت حسان کا سلسلہ نسب یہ تھا حسان بن ثابت بن المنذر بن حرام۔ دونوں تیسرے دادا میں جمع ہوتے ہیں اور وہ حرام ہے اور ابی بن کعب کا سلسلہ نسب یہ تھا ابی بن کعب بن قیس بن عبید بن زید بن معاویہ بن عمرو بن مالک بن النجار۔

انصاری نے کہا: ابوطلحہ اور ابی بن کعب کے درمیان چھ آباء تھے۔ فرمایا: عمرو بن مالک، حسان اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو جمع کرتا ہے ابوعمر نے کہا: اس میں ایسی چیز ہے جو قرابت کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس دوری میں بھی ہوتی ہے اور جو اس سے کم ہو وہ تو زیادہ اس لائق ہے کہ اسم القرابۃ اسے لاحق ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کے لیے مراث میں حصہ ثابت کیا ہے اور یہ نہیں بیان فرمایا کہ وہ کتنا ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوید اور عرفجہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اس کے مال سے کچھ بھی جدا نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کے لیے بھی حصہ مقرر فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ وہ حصہ کتنا ہے حتی کہ میں دیکھ لوں جو اللہ تعالیٰ نازل فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ پھر ان دونوں کو پیغام بھیجا کہ ام کجہ کو اس کے ترکہ سے آٹھواں حصہ دو اور بیٹوں کو دو ثلث۔ اور باقی مال تمہارا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ہمارے علماء نے اس آیت سے فرائض پر متروک مال کی تقسیم پر استدلال کیا ہے جب کہ اس میں اس کی حالت کی تبدیلی کرنا بھی ہو جیسے حمام، کمرہ، زیتون کا کھلوان اور وہ گھر جس میں حصہ داروں کے اقرار کے ساتھ منافع باطل ہوتے ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: متروکہ مال تقسیم کیا جائے گا اگرچہ کسی کے حصہ میں اتنا مال آئے جس سے نفع حاصل نہ کیا جا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 397

سکتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ہے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا یہ ابن کنانہ کا قول ہے اور یہی امام شافعی نے کہا ہے اور امام ابوحنیفہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: چھوٹا سا گھر دو آدمیوں میں مشترک ہو ایک تقسیم طلب کرے اور دوسرا انکار کرے تو اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ ابن ابی لیلی نے کہا: اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہو جو اپنے حصہ سے نفع نہ اٹھا سکتا ہو تو تقسیم نہیں کی جائے گی ہر وہ تقسیم جس میں کسی ایک پر نقصان وارد ہو تو مال تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ابو ثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ دونوں قول میں اصح قول ہے۔ ابن القاسم نے یہ مالک سے روایت کیا ہے جو ابن عربی نے ذکر کیا ہے ابن القاسم نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تقسیم نہیں ہوتی مثلاً گھر، منازل، حمامات اور اس کی تقسیم میں ضرر ہو اور جب تقسیم کیا جائے تو اس سے نفع حاصل نہ ہو تو اسے بیچا جائے اور اس میں شفعہ نہ ہوگا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شفعہ اس چیز میں ہے جس کو تقسیم نہ کیا گیا ہو جب حدود واقع ہوں تو شفعہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ اس چیز میں ثابت فرمایا جس میں حدود واقع کرنا ممکن ہو اور شفعہ کو غیر منقسم چیز میں معلق فرمایا ان چیزوں میں سے جن میں حدود کا واقع کرنا ممکن ہو۔ یہ حدیث کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو دارقطنی نے ابن جریج کی حدیث سے نقل کی ہے فرمایا: مجھے صدیق بن موسیٰ نے خبر دی انہوں نے محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ورثاء پر تقسیم نہ ہوگا مگر وہ مال جو تقسیم کا احتمال رکھتا ہو''۔ ابوعبید نے کہا: یہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص مر جائے اور کوئی ایسی چیز چھوڑ جائے کہ اگر اسے ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے تو اس میں تمام ورثاء یا بعض ورثاء کو نقصان ہوتا ہو۔ فرمایا: اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا جیسے جوہرہ، حمام، چادر اور اس کی مثل چیزیں (دارقطنی کی حدیث کے متن میں التعضية لفظ استعمال ہوا ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی شرح میں لکھا ہے) التعضية کا معنی ہے جدا جدا کرنا۔ کہا جاتا ہے: عضيت الشئ جب کسی چیز کو جدا جدا کیا جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۞ (الحجر) (جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا غَيْرَ مُضَآرٍّ تو اللہ تعالیٰ نے نقصان دینے کی نفی فرمائی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار۔ (نہ ابتداءً کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ بدلے میں نقصان پہنچائے)

نیز آیت کریمہ میں تقسیم کے متعلق کوئی ذکر نہیں یہ صرف چھوٹے اور بڑے کے لیے حصہ کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اور یہ زمانہ جاہلیت کے رواج کا رد کرتی ہے۔ فرمایا: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ، وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ (یعنی مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے) یہ بالکل ظاہر ہے اور اس حصہ کی مقدار دوسری دلیل سے ماخوذ ہے۔ وارث کہے کہ میرے لیے حصہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، پس تم مجھے اس مال سے حصہ دو۔ اسے اس کا شریک کہے: خاص طور پر تجھے دینا تو ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ میرے اور تیرے درمیان ضرر اور نقصان کا باعث ہوگا، کیونکہ اس طرح مال خراب ہو جائے گا، اس کی ہیئت بدل جائے گی اور اس کی قیمت کم ہو جائے گی پس ترجیح واقع ہوگی۔ اور اظہر یہ ہے کہ اس صورت میں تقسیم نہیں کرنی چاہیے جس میں منفعت باطل ہو جائے اور مال کم ہو جائے جیسا کہ ہم نے دلیل ذکر کی ہے۔ واللہ الموفق

فراء نے کہا: نَصِيبًا مَّفْرُوضًا یہ تیرے اس قول کی طرح ہے قسماً واجباً وحقا لازماً۔ یہ اسم مصدر کے معنی میں ہے اسی وجہ سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی ان کے لیے حصے فرضی حالت میں ہیں۔ اخفش نے کہا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حصہ مقرر فرمایا ہے۔ مفروض کا مطلب ہے واجب مقدر۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

''اور جب حاضر ہوں (ورثہ کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم بچے اور مسکین تو دو انہیں بھی اس سے اور کہو ان سے اچھی بات''۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو میراث میں کسی چیز کا مستحق نہیں ہے اور ورثہ کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا اور وہ قریبی رشتہ داروں سے ہو یا یتامیٰ اور فقراء سے ہو جو وارث نہیں ہیں تو ان کو احترام دو اور انہیں محروم نہ کرو اگر مال زیادہ ہو اور اگر مال زمین ہو یا اتنا تھوڑا ہو کہ تھوڑی سی بخشش کو بھی قبول نہ کرتا ہو تو ان سے معذرت کرنی چاہیے۔ اگر تھوڑا مال دے دیا جائے تو اس میں بہت بڑا اجر ہے۔ ایک درہم، ایک لاکھ سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔ اس قول کے مطابق یہ آیت محکم ہے یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ تابعین کی ایک جماعت نے اس کی پیروی کی ہے مثلاً عروہ بن زبیر وغیرہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بھی اس کا حکم دیا ہے اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا ہے يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے)

سعید بن مسیب نے فرمایا: آیت میراث اور وصیت نے اس آیت کو منسوخ کیا ہے۔ جن علماء نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے وہ ابو مالک، عکرمہ اور ضحاک ہیں اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ آیت ورثاء کے حصص کے استحقاق کو بیان کرتی ہے اور مشارکت کا استحباب اس کے لیے ہے جو حاضر ہوا ہے اور اس کا حصہ نہ ہو۔ ابن جبیر نے کہا: لوگوں نے اس آیت کو ضائع کر دیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: لیکن لوگوں نے بخل کیا ہے (1)۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ الخ کے تحت مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے فرمایا: لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے اللہ کی قسم یہ منسوخ نہیں ہے لیکن لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں سستی کی ہے۔ والی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو وارث ہوتا ہے یہ وہ ہوتا ہے جو عطا کرتا ہے اور دوسرا والی وہ ہوتا ہے جو وارث نہیں ہوتا وہ وہ ہے جو اچھی بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں تجھے عطا کرنے کا مالک نہیں ہوں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ میراث تقسیم کرتے وقت رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا مظاہرہ کریں۔ یتامیٰ اور مساکین سے صلہ رحمی کریں (اگر) وصیت میں سے ہو۔ اور اگر وصیت نہ ہو تو میراث میں سے ان کو کچھ دو۔ نحاس نے کہا: یہ بہتر ہے جو کچھ اس آیت کے بارے میں کہا گیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 12

ہے یہ بطور استحباب اور خیر کے فعل کی ترغیب اور اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کے لیے ہے۔ ایک گروہ نے کہا: یہ تھوڑا سا دینا فرض کی حیثیت سے واجب ہے ورثاء اصناف کو عطا کریں جب کہ اس پر ان کے نفوس خوش ہوں جیسے چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزیں، پرانے کپڑے اور جو ہلکی پھلکی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس قول کو ابن عطیہ اور قشیری نے روایت کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ بطور استحباب ہے، کیونکہ اگر یہ فرض ہوتا تو ترکہ میں استحقاق ہوتا اور میراث میں اشتراک ہوتا۔ ایک جہت کے لیے معلوم ہے اور دوسری کے لیے مجہول ہے اور یہ حکمت کے منافی ہے اور یہ جھگڑے اور قطع تعلقی کا سبب ہے۔ ایک فرقہ کا خیال ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو وصیت کے مطابق مال تقسیم کرتے ہیں۔ ورثاء مخاطب نہیں ہیں۔ حضرت ابن عباس، سعید بن مسیب اور ابن زید سے مروی ہے کہ جب مریض وصایا کے ذریعے مال تقسیم کرے اور وہ لوگ حاضر ہوں جو وارث نہیں ہیں تو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ انہیں محروم نہ کرے۔ یہ حکم اس وقت نازل ہوا تھا جب وصیت واجب تھی اور آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی۔ صحیح پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب وارث اتنا چھوٹا ہو کہ اپنے مال میں تصرف نہ کرسکتا ہو تو ایک گروہ نے فرمایا: چھوٹے وارث کا ولی مجور کے مال سے اتنی مقدار موجود لوگوں کو دے جو مناسب سمجھے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: وہ انہیں نہ عطا کرے بلکہ انہیں کہے کہ اس مال میں سے میرے لیے کچھ نہیں ہے یہ یتیم کا مال ہے جب یہ بالغ ہوگا تو میں اسے تمہارا حق بتادوں گا۔ یہ معروف قول ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب میت نے اس کے لیے کسی چیز کی وصیت نہ کی ہو اگر اس نے اسے وصی بنایا ہو تو وصیت کے مطابق تصرف کرے۔ عبیدہ اور محمد بن سیرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں رزق سے مراد یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائیں اور ان دونوں حضرات نے ایسا کیا تھا ترکہ میں سے ایک بکری ذبح کی تھی۔ عبیدہ نے کہا: یہ آیت اگر نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے تھا۔ قتادہ نے یحییٰ بن یعمر سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیات محکم ہیں لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے ایک یہ آیت، آیت استیذان، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (نور:58) اور یہ آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (حجرات:13)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِّنْهُ ضمیر قسمت کے معنی کی طرف راجع ہے کیونکہ یہ مال اور میراث کے معنی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ (یوسف:76) اس آیت میں ھا ضمیر ذکر کی گئی ہے اور اس سے مراد سقایۃ ہے کیونکہ الصواع مذکر ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینہ وبین اللہ حجاب (1)۔ دعوۃ کی طرف مذکر ضمیر لوٹائی دعا کے معنی کی بنا پر۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سوید بن طارق جعفی کو کہا تھا، جب اس نے شراب کے متعلق پوچھا تھا۔ انہ لیس بدواء ولکنہ داء۔ شراب کے معنی کی بنا پر مذکر ضمیر لوٹائی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے: قاسمہ المال وتقاسماہ واقتسماہ اور اسم القسمۃ مونث ہے۔ اور القسم قسمت الشیٔ فانقسم کا مصدر ہے اسم ظرف مقسم ہے جیسے مجلس، تقسمھم الدھر فتقسموا یعنی زمانہ نے انہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم، حدیث نمبر 2268، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جدا جدا کیا تو وہ جدا جدا ہو گئے۔ التقسیم سے مراد التفریق ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** سعید بن جبیر نے کہا: انہیں کہا جائے کہ لے لو تمہارے لیے برکت ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں دینے کے ساتھ کہو کہ میں پسند کرتا تھا کہ اگر اس سے زیادہ ہوتا (تو میں تجھے زیادہ دیتا) بعض علماء نے فرمایا: ان کو دینے کے ساتھ عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہاں اگر انہیں کچھ نہ دے تو کم از کم اچھی کلام کرے اور ایک قسم کا عذر پیش کرے۔

وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

''اور چاہیے کہ ڈریں جو (یتیموں کے سرپرست ہیں اور سوچیں) کہ اگر چھوڑ جاتے وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے تو وہ کتنے فکر مند ہوتے ان کے متعلق پس چاہیے کہ وہ ڈریں اللہ سے اور کہیں ایسی بات جو بالکل درست ہو''۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَ لْيَخْشَ**، لیخش سے الف حذف کیا گیا ہے لام امر کی وجہ سے، جزم ہونے کی وجہ سے اور سیبویہ کے نزدیک لام امر کا اضمار حروف جر پر قیاس کرتے ہوئے جائز نہیں مگر ضرورت شعری کے لیے جائز ہے اور کوفیوں نے جزم کے ساتھ لام کے حذف کو جائز قرار دیا ہے اور تمام نے یہ شعر پڑھا ہے:

محمدُ تَفْدِ نفسَكَ كلُّ نفس إذا ما خِفْتَ مِنْ شئٍ تَبالا

اے پیارے محمد! ہر نفس کو تیری ذات پر فدا ہونا چاہیے جب آپ کسی چیز سے اندیشہ محسوس کریں۔

اس شعر میں تفد سے مراد لتفد لیا ہے۔ اور یخش کا مفعول، دلالت کلام کی وجہ سے محذوف ہے اور خافوا، لو کا جواب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لو ترکوا لخافوا، لو کے جواب میں لام کا حذف جائز ہے اور اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ اوصیاء کے لیے وعظ ہے یعنی تم یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد کے ساتھ تمہارے بعد کیا جائے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا** اور ایک طائفہ نے کہا: اس سے مراد تمام لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یتیموں اور لوگوں کی اولاد کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا ہے۔ اس وجہ سے شیبانی نے حکایت کیا ہے کہ ہم قسطنطنیہ پر مسلمہ بن عبدالملک کے لشکر میں تھے ہم ایک دن اہل علم کی ایک جماعت میں بیٹھے تھے ان میں ابن الدیلمی بھی تھے آخری زمانہ کی ہولناکیوں کا ذکر ہوا میں نے ابن الدیلمی سے کہا: اے ابو بشر! میری خواہش ہے کہ میری اولاد نہ ہو، اس نے مجھے کہا: یہ تیرے ذمہ نہیں ہے جس شخص سے جس روح کے پیدا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما رکھا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی خواہ وہ پسند کرے یا ناپسند کرے۔ لیکن اگر تو ان پر امن کا خواہش مند ہے تو دوسروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ایک

روایت میں ہے انہوں نے فرمایا: کیا میں تیری ایسے امر پر دلالت نہ کروں کہ تو اگر اس سے دو چار ہوگا تو اللہ تعالیٰ تجھے اس سے نجات عطا فرمائے گا اور اگر تو اپنے بعد اولاد چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے ان کی حفاظت فرمائے گا؟ میں نے کہا: ضرور بتایئے، تو انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا ...... الخ (1)۔

میں کہتا ہوں: یہی معنی محمد بن کعب القرظی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جو اچھا صدقہ کرے گا وہ پل صراط سے گزر جائے گا اور جو کسی بیوہ کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے باقی ماندہ لوگوں کے لیے بہتر خلیفہ بنا دے گا'' (2)۔ تیسرا قول وہ ہے جو اکثر مفسرین کا ہے یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس پر موت آتی ہے تو وہ اپنی وصیت کے وقت پاس موجود آدمی کو کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تجھے اولاد عطا فرمائے گا تو اپنے لیے اس کا خیال رکھنا، اپنے مال کی اللہ کے راستہ میں وصیت کر اور صدقہ کر اور غلام آزاد کر حتی کہ وہ اپنے عام مال پر پہنچ جاتا ہے یا اس کو وصیت کے ساتھ گھیر لیتا ہے پھر وہ اپنے ورثاء کو نقصان پہنچاتا ہے پس انہیں اس سے منع کیا گیا گویا یہ آیت انہیں کہہ رہی ہے کہ جس طرح تم اپنے ورثاء اور اپنی اولاد کے بارے میں اپنے بعد خوف کرتے ہو اسی طرح اپنے غیر کے ورثاء پر خوف کرو اسے مال میں فضول خرچی پر نہ ابھارو۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ، سدی، ابن جبیر، ضحاک اور مجاہد کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب آدمی وصیت کے وقت حاضر ہو تو اسے یہ کہنا مناسب نہیں کہ وہ مرنے والے کو کہے کہ تو اپنے مال کی وصیت کر اللہ تعالیٰ تیری اولاد کا رازق ہے لیکن وہ یہ کہے کہ تو اپنے نفس کے لیے نیک اعمال آگے بھیج اور اپنی اولاد کے لیے (کچھ) چھوڑ۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ سے یہی مراد ہے۔ مقسم اور حضرمی نے کہا: یہ آیت اس کے برعکس میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والے کے قریب موجود شخص اسے کہے کہ اپنے ورثاء کے لیے مال محفوظ کر لے اور اپنے بچوں کے لیے باقی رکھ کوئی دوسرا تیرے مال کا تیری اولاد سے زیادہ حق دار نہیں ہے اور وہ اسے وصیت سے منع کرے پس اس سے قریبی رشتہ داروں اور ہر شخص کو نقصان ہوگا جس کے لیے وصیت کرنے کا حق ہے انہیں کہا گیا کہ جس طرح تم اپنی اولاد کے متعلق خوف کھاتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ان سے اچھا سلوک ہو۔ پس اسی طرح مساکین، یتامیٰ کی جہت سے بھی اچھی بات کرو اور ان کو نقصان پہنچانے میں اللہ سے ڈرو۔ یہ دونوں قول آیت میراث کے نزول سے پہلے وصیت کے وجوب کے وقت پر مبنی ہیں یہ سعید بن جبیر اور ابن مسیب سے مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ دونوں قول تمام لوگوں میں عام نہیں ہیں بلکہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک صنف کے لیے ایک قول بہتر ہے اور دوسری صنف کے لیے دوسرا قول بہتر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی جب ایسے ورثاء چھوڑ جائے جو خود کفیل ہوں، غنی ہوں تو پھر اسے وصیت کی طرف بلانا چاہیے اور اپنے لیے آگے بھیجنے پر ابھارنا چاہیے اور جب ایسے ورثاء چھوڑے جو ضعیف اور کمزور ہوں اور مفلس ہوں تو ان کے لیے مال چھوڑے اور احتیاط کرنے کی طرف بلانا بہتر ہے، کیونکہ اس ارادہ میں بھی اس کا اجر مساکین کو مال دینے کی اجر کی طرح ہے اور رعایت کا دارومدار ضعف اور کمزوری ہے پس اس کے ساتھ میلان واجب ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 452	2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 220

میں کہتا ہوں: یہ تفصیل صحیح ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو فرمایا تھا: ''تو اپنے ورثاء کو غنی چھوڑے تو یہ انہیں غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں'' (2)۔ اگر انسان کی اولاد نہ ہو یا وہ غنی اور خود کفیل ہو اور اس کا مال اس کے باپ کی طرف سے ہو اور اس پر اسے امن ہے تو اس وقت انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو آخرت کے ذخیرہ کے لیے آگے بھیجے تا کہ اس کے بعد اس کی اولاد اس کے بعد برے کاموں میں خرچ نہ کرے اور پھر وہ اس پر بوجھ ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا، السدید کا معنی ہے عدل پر مبنی اور درست قول۔ یعنی مریض کو حکم دو کہ وہ اپنے مال سے واجبی حقوق ادا کرے پھر اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے اتنی مقدار وصیت کرے جس کی وجہ سے چھوٹے ورثاء کو نقصان نہ پہنچے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میت کو عدل پر مبنی قول کہو، وہ یہ ہے کہ اسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرے اور اسے اس کے پڑھنے کا حکم نہ کرے۔ بلکہ آہستہ آہستہ خود پڑھے تا کہ وہ سن لے اور اسے تلقین کرے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے قریب المرگ لوگوں کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ انہیں کلمہ پڑھنے کا حکم دو، کیونکہ اگر اس کا اسے حکم دیا گیا تو ہوسکتا ہے وہ غصہ میں آ جائے اور اس کا انکار کر دے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یتیم ہے یعنی اسے نہ جھڑکو اور نہ اسے حقیر سمجھو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

''بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی آگ میں''۔

اس آیت میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا روایت ہے کہ یہ آیت غطفان کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس کو مرثد بن زید کہا جاتا تھا اور وہ اپنے بھتیجے کے مال کا والی تھا جو یتیم تھا اور چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کا مال کھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ مقاتل بن حیان نے کہا ہے۔ اسی وجہ سے جمہور علماء نے کہا: اس سے مراد اوصیاء ہیں جو یتیم کے مال سے وہ کھاتے ہیں جو ان کے لیے مباح نہیں ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ ان کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو عورتوں اور بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے۔ ہر اعتبار سے مال لینے کو کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ مقصود کھانا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر اشیاء کو تلف کیا جاتا ہے۔ ذکر میں پیٹ کو خاص کیا ہے ان کے نقص کو بیان کرنے کے لیے اور مکارم اخلاق کی ضد کے ساتھ اس پر طعن و تشنیع کی ہے۔ مال اور انجام کے اعتبار سے کھائی گئی چیز کو آگ کہا گیا ہے (2) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا (یوسف: 36) اس آیت میں خمر سے مراد عنبا (انگور) ہے بعض علماء نے فرمایا: نارا سے مراد حراما ہے کیونکہ حرام آگ کا سبب بنتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے حرام کو آگ کا نام دے دیا۔ حضرت

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1524

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 14

ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معراج کی رات کے متعلق بتایا کہ میں نے ایک قوم دیکھی جن کے ہونٹ، اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے ان پر ایک ایسا فرشتہ متعین تھا جو ان کے ہونٹوں سے پکڑتا تھا پھر ان کے مونہوں میں آگ کی چٹانیں ڈالتا تھا جو ان کے نیچے سے نکل جاتی تھیں، میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں (1)۔ کتاب و سنت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یتیم کا مال کھانا کبائر میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ ان سات چیزوں میں یتیم کا مال کھانے کا بھی ذکر فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ابن عامر اور عاصم نے حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں یاء کے ضمہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اصلاہ اللہ حر النار اصلاء سے مشتق کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ (مدثر) ابو حیوہ نے فعل کی کثرت کی وجہ سے تصلیة سے مشتق کر کے یا کے ضمہ، صاد کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ (الحاقہ) (پھر اسے دوزخ میں جھونک دو)

اسی سے مشتق عربوں کا قول ہے صلیتہ مرۃ بعد مرۃ و تصلیت۔ آگ کے ساتھ گرمی چاہی۔ شاعر نے کہا:

وقد تَصلَّيتُ حَرَّ حربهم　كما تَصَلَّى المقرُورُ من قَرَسِ

باقی قراء نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اسے صلی النار، یصلاھا، صلی و صلاءً سے مشتق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ (اللیل) الصلاء کا معنی آگ کے قرب کی وجہ سے گرم ہونا ہے یا آگ لگنے سے گرم ہونا ہے۔ اسی سے حارث بن عباد کا قول ہے:

لم اکنْ من جُناتها عَلِمَ اللهُ　واِنِّي لِحَرِّها اليومَ صَالِ

السعیر کا معنی بھڑکنے والا انگارہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت، وعید کی آیات میں سے ہے۔ اس آیت میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے جو گناہوں کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بعض گنہگاروں پر نافذ ہوگا، پس وہ آگ میں داخل ہوں گے پھر جل جائیں گے اور مر جائیں گے۔ دوزخیوں کا حکم اس سے مختلف ہے وہ نہ مریں گے اور نہ زندہ ہوں گے (بلکہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے) گویا یہ کتاب و سنت کا جامع قول ہے تاکہ دونوں کے متعلق خبر مخبر کے خلاف واقع نہ ہو اور بعض سے اس کی مشیت سے عذاب ساقط ہونے والا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) یہی جواب ہوگا جو بھی اس مفہوم و معنی میں سے تم پر وارد ہوگا۔ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہے دوزخی تو وہ اس طرح رہیں گے وہ نہ تو دوزخ میں مریں گے اور نہ زندہ رہیں گے لیکن کچھ لوگوں کو آگ ان کے گناہوں کے سبب لاحق ہوگی یا فرمایا: ان کی خطاؤں کے سب لاحق ہوگی پھر انہیں اللہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 454

تعالیٰ موت دے گا حتیٰ کہ وہ جب کوئلہ بن جائیں گے تو اذن شفاعت ہوگا پھر انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر وہ جنت کی نہروں پر پھیلا دیے جائیں گے پھر ارشاد ہوگا اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگ آئیں گے جیسے دانہ سیلاب کی مٹی میں اگتا ہے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیہات میں بکریاں چراتے تھے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۚ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ
اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ
وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ
فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ
اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

"حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے۔ پھر اگر ہوں صرف لڑکیاں دو سے زائد تو ان کے لیے دو تہائی ہے جو میت نے چھوڑا اور اگر ہو ایک ہی لڑکی تو اس کے لیے نصف ہے اور میت کے ماں، باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس سے جو میت نے چھوڑا بشرطیکہ میت کی اولاد ہو اور اگر نہ ہو اس کی اولاد اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا تیسرا حصہ ہے (باقی سب باپ کا) اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے (اور یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو میت نے کی اور قرض ادا کرنے کے بعد۔ تمہارے

باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کون ان میں سے زیادہ قریب ہے تمہیں نفع پہنچانے میں؟ یہ حصے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جاننے والا ہے، بڑا دانا ہے۔ اور تمہارے لیے نصف ہے جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں بشرطیکہ نہ ہو ان کی اولاد اور اگر ہو ان کی اولاد تو تمہارے لیے چوتھائی ہے اس سے جو وہ چھوڑ جائیں (یہ تقسیم) اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہے جو وہ کر جائیں اور قرض ادا کرنے کے بعد اور تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے اس سے جو تم چھوڑو بشرطیکہ نہ ہو تمہاری اولاد اور اگر ہو تمہاری اولاد تو ان کا آٹھواں حصہ ہے اس سے جو تم پیچھے چھوڑ جاؤ (یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو تم نے کی ہو اور (تمہارا) قرض ادا کرنے کے بعد اور اگر ہو وہ شخص جس کی میراث تقسیم کی جانے والی ہے کلالہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ہر ایک کے لیے ان میں سے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب شریک ہیں تہائی میں (یہ تقسیم) وصیت پوری کرنے کے بعد ہے جو کی گئی ہے اور قرض ادا کرنے کے بعد بشرطیکہ اس سے نقصان نہ پہنچایا گیا ہو (یہ نظام وراثت) حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے، والا بڑا بردبار ہے۔ یہ حدیں اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا اسے اللہ تعالیٰ باغوں میں، بہتی ہوں گی جن کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تجاوز کرے گا اللہ کی (مقررہ) حدوں سے داخل کرے گا اسے اللہ آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا''۔

ان آیات میں پینتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ اس لیے پہلے لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ اور وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ میں جو اجمال تھا اس میں اس کا بیان ہے۔ پس یہ سوال کے وقت سے بیان کے تاخیر کے جواز کی دلیل ہے اور یہ آیت دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور احکام کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے امہات الایات میں سے ایک ہے، کیونکہ فرائض عظیم القدر ہیں حتی کہ علم کا یہ تیسرا حصہ ہے (1) اور علم الفرائض کا نصف علم ہونا بھی مروی ہے۔ یہ پہلا علم ہے جو لوگوں سے چھین لیا جائے گا اور بھلا دیا جائے گا۔ دارقطنی نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فرائض سیکھو اور یہ لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ یہ نصف علم ہے اور یہ پہلی چیز ہے جو بھلائی جائے گی اور یہ پہلی چیز ہے جو میری امت سے اٹھائی جائے گی (2)۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن سیکھو اور یہ لوگوں کو سکھاؤ اور فرائض سیکھو اور لوگوں کو یہ سکھاؤ، علم حاصل کرو اور لوگوں کو علم سکھاؤ میں ایک ایسا شخص

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 328

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب الحث علی تعلیم الفرائض، حدیث نمبر 2709، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوں جس کی روح قبض کی جائے گی اور علم اٹھا لیا جائے گا اور فتن ظاہر ہوں گے حتیٰ کہ دو آدمی فریضہ (میراث کا مسئلہ) میں جھگڑیں گے تو کوئی ایسا شخص نہیں پائیں گے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لو کہ فرائض صحابہ کا عظیم علم تھا اور ان کی عظیم مباحث میں سے تھا لیکن لوگوں نے اس علم کو ضائع کر دیا ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے فرمایا، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: جس نے فرائض، طلاق اور حج کا علم حاصل نہیں کیا وہ اہل دیہات پر فضیلت کیسے پائے گا۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: میں ربیعہ کو یہ کہتے ہوئے سنتا تھا کہ جس نے فرائض کا علم سیکھا قرآن نے جو فرائض کا بیان کیا ہے اس کے سیکھے بغیر تو وہ انہیں جلدی بھول جائے گا۔ امام مالک نے کہا: انہوں نے سچ کہا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابوداؤد اور دارقطنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم صرف تین ہیں ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ فضیلت ہے (۱) محکم آیات (۲) سنت قائمہ (۳) فریضۃ عادلۃ (1)۔

خطابی ابوسلیمان نے کہا: محکم آیات سے مراد کتاب اللہ ہے۔ ان آیات میں احکام بیان ہوئے ہیں مگر قرآن کی جو آیات منسوخ ہیں ان پر عمل نہیں کیا جاتا اور صرف ناسخ پر عمل کیا جاتا ہے اور سنت قائمہ سے مراد سنت ثابتہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی سنن ثابتہ میں سے مروی ہے اور فریضہ عادلۃ دو احتمال رکھتا ہے (۱) تقسیم میں عادل کا ہونا پس کتاب وسنت میں مذکورہ حصص میں عدل کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کتاب وسنت اور جو ان کے ہم معنی ہے ان سے مستنبط مسائل۔ پس یہ فریضۃ کتاب وسنت سے ماخوذ مسائل کے برابر ہوگا، کیونکہ وہ کتاب وسنت سے ماخوذ معنی میں نص ہوگا۔ عکرمہ سے مروی ہے فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا وہ ان سے ایک ایسی عورت کے متعلق مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے جس نے خاوند اور والدین چھوڑے تو حضرت زید بن ثابت نے کہا: خاوند کے لیے نصف ہوگا اور ماں کے لیے مابقی کا تہائی ہوگا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: تم یہ مسئلہ کتاب اللہ میں پاتے ہو یا اپنی رائے سے بیان کر رہے ہو۔ حضرت زید نے کہا: میں اپنی رائے سے کہتا ہوں، میں ماں کو باپ پر فضیلت نہیں دیتا۔ ابوسلیمان نے کہا: یہ فریضۃ کے تعدیل کے باب سے ہے جب کہ اس فریضہ کے متعلق نص نہ ہو یہ انہوں نے منصوص علیہ کا اعتبار کیا ہے اور وہ یہ ارشاد ہے وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ وارث ہوں تو ماں کے لیے تہائی حصہ ہے جب ماں کا حصہ تہائی پایا گیا اور باقی مال وہ دو تہائی ہے وہ باپ کے لیے ہے، خاوند کو حصہ دینے کے بعد باقی مال سے بچے ہوئے نصف مال کو کل مال پر قیاس کیا جبکہ والدین کے ساتھ بیٹا یا ذوسہم (حصہ لینے والا) نہ ہو تو والدین کے درمیان وہ مال تین حصوں میں تقسیم ہوگا ایک حصہ ماں کے لیے اور دو حصے باپ کے لیے اور وہی باقی ہے، یہ تقسیم میں زیادہ عدل ہے بنسبت اس کے کہ باقی نصف میں سے تمام مال کا تہائی ماں کو دیا جائے اور مابقی باپ کو دیا جائے جو چھٹا حصہ بنتا ہے۔ پس اس طرح ماں کو باپ پر فضیلت ہوگی، حالانکہ وہ مفضولہ ہے اصل میراث میں اور ماں کے لیے باپ کے حصہ سے زیادہ ملے گا، حالانکہ اصل میراث میں باپ مقدم اور مفضل ہے۔ اس میں زیادہ عدل ہے بنسبت اس کے جو

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب ما جاء فی تعلیم الفرائض، حدیث نمبر 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس کا نظریہ یہ ہے کہ ماں کو کل مال سے تہائی ملے گا اور باپ کا حصہ چھٹے حصہ کی طرف لوٹا کر کم کرتے ہیں پس حضرت ابن عباس کا قول چھوڑ دیا گیا اور عام فقہاء نے حضرت زید کے قول کو اپنایا۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس نے خاوند اور والدین کے بارے میں کہا: خاوند کے لیے نصف ہے اور ماں کے لیے تمام مال کا ثلث 1/3 ہے اور باقی باپ کے لیے ہے۔ قاضی شریح، محمد بن سیرین، داؤد بن علی اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے۔

ان علماء میں سے ابو الحسن، محمد بن عبداللہ، فرضی مصری المعروف با بن اللبان نے دونوں مسئلوں میں یہی کہا ہے اور کہا انہوں نے کہ مسئلہ المشترکۃ میں حضرت علی کا قول یہی ہے اور ایک مقام پر کہا: حضرت علی سے یہی مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت علی، حضرت زید، حضرت عبداللہ، تمام صحابہ اور عام علماء سے مشہور اور معروف وہی قول ہے جو امام مالک نے لکھا ہے اور حضرت ابن عباس پر ان کی حجت یہ ہے کہ ابوین جب ورثہ میں شریک ہوں ان کے ساتھ اور کوئی شریک نہ ہو تو ماں کے لیے ایک تہائی اور دو تہائی باپ کے لیے ہوگا اور اسی طرح جب اس نصف میں والدین شریک ہوں جو خاوند سے زائد ہوتا ہے، تو دونوں اس میں اسی طرح حصہ پائیں گے (یعنی) ماں کے لیے تہائی اور باپ کے لیے دو تہائی ہوگا۔ نظر و قیاس میں یہی صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آیت مواریث کے نزول کے سبب میں روایات مختلف ہیں، پس ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دار قطنی نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی نے کہا: یا رسول اللہ! سعد فوت ہوگیا ہے اور اس نے دو بیٹیاں اور ایک بھائی چھوڑا ہے، اس کے بھائی نے سعد کا سارا ترکہ قبضہ میں کرلیا ہے، عورتوں سے ان کے مال کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجلس میں جواب نہ دیا، پھر وہ عورت آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! سعد کی بیٹیاں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے بھائی کو میرے پاس بلاؤ، وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی دو اور اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ دو اور باقی مال تیرے لیے ہے (1)۔ ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آیت مواریث نازل ہوئی۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔ حضرت جابر نے بھی روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر بنی سلمہ میں پیدل چل کر میری عیادت کے لیے تشریف لائے، انہوں نے مجھے بے ہوش پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور وضو کیا پھر اس پانی سے مجھ پر چھڑ کا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنے مال میں کیا کروں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی **یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ**۔ ان دونوں احادیث کو صحیحین میں بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اس میں ہے میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! میں اپنے مال کو اپنے بچوں میں تقسیم کروں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی **یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ** (الآیۃ) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2) اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا نزول اس وجہ سے ہوا کہ مال سارا بیٹے کے لیے ہوتا اور والدین کے لیے وصیت تھی، پس ان آیات سے اس حکم کو منسوخ کیا گیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب فرائض الصلب، حدیث نمبر 2710، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض من رسول اللہ، باب میراث البنین مع البنات، حدیث نمبر 2022، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقاتل اور کلبی نے کہا: یہ آیت ام کجہ کے متعلق نازل ہوئی اس کا واقعہ ذکر ہو چکا ہے۔ سدی نے کہا: یہ حضرت حسان بن ثابت کے بھائی عبدالرحمن بن ثابت کی بیٹیوں کے سبب نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ میراث صرف ان لوگوں کو دیتے جو جنگوں میں شریک ہوتے اور جو دشمن سے قتال کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی جس نے ہر چھوٹے بڑے کا حصہ بیان کیا۔ یہ بھی بعید نہیں کہ یہ تمام کا جواب ہو اس وجہ سے اس کا نزول موخر ہوا۔ واللہ اعلم۔ الکیا الطبری نے کہا: بعض آثار میں وارد ہے کہ جو کچھ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ وہ چھوٹے بچے کو میراث سے محروم کرتے تھے تو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہی ہوتا رہا یہاں تک کہ اس آیت نے حکم منسوخ کر دیا۔ اور ہمارے نزدیک اس پر شریعت کا مشتمل ہونا ثابت نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے، کیونکہ یہ آیت سعد بن ربیع کے ورثہ کے متعلق نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ثابت بن قیس بن شماس کے ورثہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اہل النقل کے نزدیک پہلا قول اصح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے چچا سے میراث واپس لی۔ اگر ہماری شریعت میں اس سے پہلے یہ حکم ثابت ہوتا تو رسول اللہ ﷺ میراث واپس نہ لیتے کبھی بھی ہماری شریعت میں یہ ثابت نہیں ہوا کہ بچے کو میراث نہیں دی جائے گی حتیٰ کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کرے اور اپنے حریم کا دفاع کرے۔ میں کہتا ہوں: قاضی ابو بکر بن عربی نے اسی طرح کہا ہے۔ اس آیت کا نزول ایک بدیع نکتہ پر دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ مال بڑے لے لیتے تھے، اسلام کے ابتدائی دور میں شریعت خاموش نہ تھی اور نہ اس کو ثابت کرنے والی تھی، کیونکہ اگر یہ شریعت ہوتا اور ثابت ہوتا تو نبی کریم ﷺ چچے کی دو بچیوں پر مال واپس کرنے کا حکم نہ لگاتے، کیونکہ جب احکام جاری ہو چکے ہوں پھر بعد میں نسخ آئے تو وہ مستقبل میں موثر ہوتا ہے۔ سابقہ فیصلوں کو ختم نہیں کرتا یہ ایک زمانہ جاہلیت کا ظلم تھا۔ شریعت اسلامیہ نے اسے اٹھا دیا یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ۔ شوافع نے کہا ہے کہ یہ ارشاد صلبی اولاد میں حقیقت ہے اور رہا پوتا وہ اس میں بطریق مجاز داخل ہے۔ جب کوئی قسم اٹھائے کہ اس کی اولاد نہیں ہے اور اس کا پوتا ہو تو وہ حانث نہ ہو گا۔ جب فلاں کی اولاد کے لیے وصیت کرے تو اس میں پوتے داخل نہ ہوں گے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: اگر اس کی صلبی اولاد نہ ہو گی تو پوتا داخل ہو گا اور یہ معلوم ہے کہ الفاظ تبدیل نہیں ہوتے اس سے جو علماء کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن المنذر نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ فرمایا تو آیت کے ظاہر سے یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ میراث تمام اولاد کے لیے ہے خواہ مومن ہو یا کافر ہو، لیکن جب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اولاد کا ارادہ کیا ہے اور بعض کا نہیں۔ پس مسلم کافر کا وارث نہ ہو گا اور کافر، مسلمان کا وارث نہ ہو گا یہی حدیث کا ظاہر ہے۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ فرمایا تو ان میں وہ قیدی بھی داخل ہے جو کفار کے قبضہ میں ہے پس وہ بھی وارث ہو گا جب تک اس کی زندگی اسلام پر معلوم ہو۔ یہی اکثر اہل علم کا قول ہے مگر نخعی نے کہا: قیدی وارث نہ ہو گا اور جب اس کی زندگی کا علم نہ ہو تو اس کا حکم مفقود کا حکم ہو گا اور آیت کے عموم میں نبی کریم ﷺ کی میراث داخل نہ ہو گی کیونکہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں، صدقہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۂ مریم میں آئے گا۔ اسی طرح اپنے باپ یا دادے، اپنے بھائی یا اپنے چچا کا قاتل بھی اسی عموم میں داخل نہ ہوگا کیونکہ سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ اپنے مقتول کے مال اور اس کی دیت سے وارث نہ ہوگا۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اگر وہ اسے خطاً قتل کر دے تو اس کی دیت سے اسے میراث نہیں ملے گی اور اس کے مال سے امام مالک کے قول کے مطابق وارث ہوگا اور امام شافعی، امام احمد، سفیان اور اصحاب الرائے کے قول میں نہ مال سے وارث ہوگا اور نہ دیت سے وارث ہوگا، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے۔ یہی قول اسحاق اور ابوثور کا ہے۔ اور یہی قول سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، زہری، اوزاعی، ابن المنذر کا ہے، کیونکہ میراث ایسی چیز ہے جس کا وارث اللہ نے اسے اپنی کتاب میں بنایا ہے اس سے سنت اور اجماع کے ساتھ استثنا نہیں کی گئی۔ ہر مختلف فیہ مسئلہ ظاہر آیات کی طرف لوٹایا جائے گا جن میں میراث کا بیان ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اسلام کے ابتدائی دور میں میراث کا حق کئی اسباب سے ہوتا تھا۔ ان میں سے حلف، ہجرۃ اور معاقدۃ ہے۔ پھر یہ تمام اسباب منسوخ ہو گئے جیسا کہ اسی سورت میں **وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ** کے تحت تفصیل آئے گی ان شاء اللہ۔

علماء کا اجماع ہے کہ اولاد کے ساتھ ایسے افراد وارث ہوں جن کے لیے حصہ متعین ہے تو پہلے اسے حصہ مفروضہ کے مطابق حصہ دیا جائے گا پھر جو مال بچے گا وہ مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر حصہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فرائض ان کے اہل کے حوالے کرو (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے یعنی وہ فرائض جو کتاب اللہ میں واقع ہیں اور یہ فرائض چھ ہیں۔ 1/2 -1/4 -1/8 -2/3 -1/3 -1/6 -1/2 پانچ کا حصہ مقرر ہے صلبی بیٹی، پوتی، سگی بہن، باپ کی طرف سے بہن اور خاوند۔ یہ حصص اس صورت میں ہیں جب یہ علیحدہ ہوں کوئی انہیں اپنے حصہ سے محجوب کرنے والا نہ ہو۔ حاجب کے ہوتے ہوئے خاوند کا حصہ 1/4 ہوگا اور ایک بیوی اور زیادہ بیویوں کے لیے 1/4 ہو کا جب کہ حاجب نہ ہو اور 1/8 حصہ ہوگا ایک بیوی اور زیادہ بیویوں کے لیے جب کہ حاجب ہوگا اور 2/3 حصہ چار افراد کا ہے صلبی بیٹیوں میں سے دو یا زیادہ ہوں اور پوتیاں، سگی بہن یا باپ کی طرف سے بہنیں جب دو یا دو سے زیادہ ہوں یہ حصص اسی صورت میں ہیں جب ان کو محجوب کرنے والا نہ ہو اور 1/3 حصہ دو افراد کا ہے ماں کا حصہ ہے جب میت کا بیٹا اور پوتا نہ ہو اور دو یا دو سے زیادہ اس کے بھائی اور بہنیں نہ ہوں اور یہ حصہ ماں کی طرف سے دو یا دو سے زیادہ اولاد کا ہو۔ اور یہ کل مال کا تیسرا حصہ لیں گے اور ماتقی کا ثلث 1/3 یہ ماں کے لیے ہے۔ اس مسئلہ میں جب کہ میت کے وارث خاوند یا بیوی اور والدین ہوں تو اس صورت میں ماں کو ماتقی کا ثلث 1/3 ملے گا۔ اس کا بیان پیچھے گزر چکا ہے اور بھائیوں کے ہوتے ہوئے دادا کے مسائل میں جب ان کے ساتھ ذوسہم ہو اور ماتقی کا تیسرا حصہ اس کے لیے ہو۔

اور 1/6 حصہ سات افراد کے لیے ہے۔ ابوان، دادا جب اس کے ساتھ میت کا بیٹا اور پوتا ہو ایک دادی اور بہت سی

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2657

دادیاں جب وہ جمع ہوں اور صلبی بیٹی کے ساتھ پوتی، سگی بہن کے ساتھ باپ کی طرف سے بہنیں، ماں کی اولاد میں سے ایک خواہ مذکر ہو یا مونث ہو۔ یہ تمام فرائض کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں مگر ایک دادی اور بہت سی دادیوں کا حصہ سنت سے ماخوذ ہے ان فرائض کے لیے میراث کو ثابت کرنے والے اسباب تین ہیں۔ ثابت نسب، منعقد نکاح اور آزاد کرنے کی ولاء۔ کبھی یہ تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک شخص عورت کا خاوند بھی ہوتا ہے، اس کا آزاد کرنے والا بھی ہوتا ہے اور اس کے چچا کا بیٹا بھی ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص میں دو چیزیں جمع ہوتی ہیں مثلاً عورت کا خاوند اور اس کا آزاد کرنے والا ہوتا ہے یا اس کا خاوند اور اس کے چچا کا بیٹا ہوتا ہے پس وہ دو وجہوں سے وارث ہوتا ہے اس کے لیے تمام مال ہوتا ہے جب کہ وہ ایک ہوتا ہے نصف مال زوجیت کی وجہ سے اور نصف ولاء یا نسب کی وجہ سے مل جاتا ہے۔ مثلاً ایک عورت ایک شخص کی بیٹی بھی ہوتی ہے اور اس کو آزاد کرنے والی بھی ہوتی ہے تو اس عورت کو تمام مل جاتا ہے جب کہ یہ ایک وارث ہو، نصف مال نسب کی وجہ سے اور نصف ولاء کی وجہ سے مل جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ میراث نہیں ہوگی مگر قرضہ اور وصیت ادا کرنے کے بعد۔ جب کوئی شخص فوت ہوگا تو پہلے اس کے متعین حقوق نکالے جائیں گے پھر اس کے کفن، دفن کا انتظام کیا جائے گا پھر اس کے مراتب کے مطابق قرضے ادا کیے جائیں گے پھر تہائی حصہ سے اس کی وصیتیں پوری کی جائیں گی اور وہ چیزیں جو وصیت کے معنی میں ہوں گی، باقی مال ورثاء کے درمیان تقسیم ہو گا اور جملہ ورثاء سترہ ہیں۔ دس مرد ہیں، بیٹا، پوتا، چچا، چچا کا بیٹا، خاوند اور آزاد کرنے والا۔ اور عورتوں میں سے سات ہیں بیٹی، پوتی اگرچہ نیچے کی ہو، ماں، دادی اگرچہ بہت اوپر کی ہو، بہن، بیوی، آزاد کرنے والی عورت، بعض فضلاء نے انہیں نظم کیا ہے:

والوارثون إن اردت جمعهم مع الإناث الوارثات معهم
عشرةٌ من جملة الذكرانِ وسبعُ أشخاصٍ من النّسوانِ
وهُمْ وقد حصرتهم فى النظم الأبنُ، أبنُ الأبن وأبنُ العمّ
والأبُ منهم وهولى الترتيب والجدُّ من قَبْلِ الأخِ القريب
وأبنُ الأخِ الأدنَى أجَلْ والعمُّ والزوجُ والسيِّد ثم الأمُّ
وأبنةُ الأبن بعدها والبنتُ وزوجةٌ وجدّة وأختُ
والمرأةُ المولاةُ أعتِق المعتقه خُذْها إليك عِدّةً محققةً

**مسئلہ نمبر 8**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ تو اس میں ساری اولاد شامل ہے خواہ وہ موجود ہو یا ماں کے پیٹ میں ہو قریبی ہو یا بعید ہو، مذکر ہو یا مونث ہو سوائے کافر کے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ حکم قریبی اولاد میں حقیقت ہے، دور والوں میں مجاز ہے اور بعض نے کہا: تمام اولاد میں حقیقت ہے، کیونکہ یہ پیدا ہونے سے ہے۔ مگر وہ میت کے قرب کی مقدار کے اعتبار سے وارث ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ (الاعراف: 35) (اے آدم کے بیٹو!) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انا سید ولد آدم۔ میں آدم کی اولاد کا سردار ہوں اور فرمایا: اے بنی اسرائیل! تیر

اندازی کرو کیونکہ تمہارا باپ (اسماعیل علیہ السلام) تیر انداز تھا، لیکن اس اطلاق میں عرف کا استعمال، اس حقیقت پر قریبی افراد پر غالب ہے۔ اگر صلبی اولاد میں مذکر موجود ہو تو پوتے کو کچھ نہیں ملے گا اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔ اگر صلبی اولاد میں سے مذکر نہ ہو اور اولاد کی اولاد میں مذکر ہو (یعنی پوتا موجود ہو) تو پہلے صلبی بیٹیوں کو حصہ دیا جائے گا اور وہ 2/3 حصہ تک پہنچے گا، پھر باقی 1/3 پوتوں کو ملے گا اگر وہ میت سے تعلق میں برابر ہوں یا مذکر لڑکیوں سے اسفل ہو تو یہ اس طرح تقسیم کریں گے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہوگا۔ یہ امام مالک، امام شافعی اور اصحاب رائے کا قول ہے اور یہی عام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اہل علم کا قول ہے۔ مگر حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر مذکر پوتا ہو اور اس کے مقابلے میں مؤنث اولاد ہو تو مؤنث پر ہی ترکہ رد ہوگا۔ اگر اس مؤنث سے وہ اسفل ہو تو پھر اس مؤنث اولاد پر رد نہ ہوگا اس میں انہوں نے اس قول کا خیال رکھا ہے فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ۔ لڑکیوں کے لیے 2/3 حصہ سے زیادہ نہیں بنایا اگرچہ زیادہ بھی ہوں۔ میں کہتا ہوں: ابن عربی نے یہ تفصیل حضرت ابن مسعود سے اسی طرح ذکر کی ہے، ابن المنذر اور الباجی نے بھی ان سے یہی ذکر کیا ہے۔ جو صلبی بیٹیوں سے بچے وہ پوتوں کے لیے ہے، پوتیوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ ان دونوں حضرات نے تفصیل نہیں کی۔ ابن المنذر نے ابوثور سے یہ حکایت کیا ہے۔ اسی طرح ابو عمر نے حکایت کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت ابن مسعود نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب بیٹیاں 2/3 حصہ مکمل کر لیں گی تو باقی پوتوں کے لیے ہوگا ان کی بہنوں کے لیے نہیں ہوگا اور نہ ان سے اوپر والی پوتیوں کے لیے ہو اور نہ نیچے والیوں کے لیے ہوگا۔ ابوثور اور داؤد بن علی کا یہی مذہب ہے۔ اس کی مثل علقمہ سے مروی ہے اور اس مذہب والوں کی حجت حضرت ابن عباس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال کو فرائض والوں میں کتاب اللہ کے مطابق تقسیم کرو اور جو فرائض سے بچ جائے تو قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے(1)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے اور جمہور کی حجت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہے۔ نظر اور قیاس کی حجت سے یہ ہے کہ جو تمام مال میں اپنے درجہ والوں کو عصبہ بناتا ہے تو واجب ہے کہ وہ فاضل مال میں بھی اسے عصبہ بنائے، جس طرح صلبی اولاد ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ پوتا اپنی بہن کو میراث میں شریک کرے جس طرح صلبی بیٹا بہن کو میراث میں شریک کرتا ہے، ابوثور اور داؤد کی طرف سے حجت پکڑنے والے نے حجت پکڑی ہے کہ پوتی 2/3 حصہ کے بعد فاضل مال میں علیحدہ وارث نہیں بنتی اس کا بھائی اسے عصبہ نہیں بناتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کے ساتھ اس کا بھائی ہو تو وہ اس کی وجہ سے قوی ہو جاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ عصبہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی اولاد میں سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی کے لیے نصف مقرر فرمایا اور دو سے زیادہ کے لیے 2/3 مقرر فرمایا اور دو کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ منصوص نہیں فرمایا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الولد من ابیہ وامہ، حدیث نمبر 6235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

علماء نے اس دلیل پر کلام فرمائی ہے جو دو کے لیے 2/3 حصہ کا موجب ہے وہ دلیل کیا ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ اجماع ہے۔ یہ مردود ہے کیونکہ حضرت ابن عباس سے صحیح قول مروی ہے کہ دو بیٹیوں کو نصف 1/2 ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ یہ شرط اور جزا ہے۔ فرمایا: پس دو بیٹیوں کو دو تہائی 2/3 نہیں دیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: دو بہنوں پر قیاس کے ساتھ دو بیٹیوں کو 2/3 حصہ دیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کے آخر میں فرمایا: وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ اور پھر فرمایا: فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ۔ پس دو بیٹیاں 2/3 کے اشتراک میں دو بہنوں کے ساتھ ملحق ہوں گی اور بہنیں جب دو سے زیادہ ہوں گی تو 2/3 میں اشتراک میں بیٹیوں کے ساتھ ملحق ہوں گی۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ اخوات کے بارے میں حکم منصوص ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے اور اس کے ساتھ یہ تسلیم شدہ حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت میں ایسی چیز موجود ہے جو دلالت کرتی ہے کہ دو بیٹیوں کے لیے 2/3 ہے وہ یہ ہے کہ جب بیٹی ایک ہو تو اپنے بھائی کے ساتھ 1/3 حصہ لیتی ہے تو معلوم ہوا کہ دو بیٹیوں کے لیے 2/3 ہوگا۔ اس دلیل سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے اور یہ قول قاضی اسماعیل، ابوالعباس المبرد کا ہے۔ نحاس نے کہا: اہل نظر کے نزدیک یہ حجت غلط ہے، کیونکہ اختلاف ایک لڑکی میں نہیں دو لڑکیوں میں ہے۔ پس ان کا مخالف کہتا ہے جب وہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑے تو بیٹیوں کے لیے نصف ہوتا ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ یہ ان کا فرض ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَوْقَ کا لفظ زائد ہے یعنی ان کن نساء اثنتین یعنی عورتیں دو ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (الانفال: 12) مراد اعناق ہے۔ اس قول کو نحاس اور ابن عطیہ نے رد کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غلط ہے، کیونکہ ظروف اور تمام اسماء کا کلام عرب میں بغیر معنی کے زائد ہونا جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ۔ یہ فصیح کلام ہے فوق زائد نہیں ہے بلکہ یہ معنی کے لیے محکم ہے کیونکہ عنق (گردن) کو مارنا ثابت ہوتا ہے جب وہ جوڑ کی ہڈی سے اوپر ہو نہ کہ دماغ میں مارنا مراد ہے، جیسا کہ درید بن الصمۃ نے کہا: میں دماغ سے نیچے سے اور ہڈی سے اوپر کی جگہ مارتا ہوں پس میں جوانوں کی گردنوں کو مارتا ہوں۔ اور قوی ترین حجت بیٹیوں کے لیے 2/3 حصہ ہونے میں سبب نزول میں مروی صحیح حدیث ہے۔ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت الثلث، الربع، عشر تک عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے اور بنی تمیم اور ربیعہ کی لغت الثلث لام کے سکون کے ساتھ ہے اسی طرح عشر تک عین کلمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے: ثلثت القوم اثلثهم وثلثت الدراهم اثلثها جب تو انہیں تین مکمل کر دے۔ واثلثت هي۔ لیکن وہ مائۃ اور الف میں کہتے ہیں اَمْاَیْتُها وآلفتُها وامْاَث، آلفتْ۔

**مسئلہ نمبر 10** ۔ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ نافع اور اہل مدینہ نے واحدۃ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس کا معنی ہے وقعت وحدثت واحدۃ۔ اور یہ کان تامہ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إذا كان الشتاء فأدفِئوني　فإن الشيخ يُهرِمه الشتاءُ

جب موسم سرما ہو تو مجھے گرم کرو کیونکہ بوڑھے آدمی کو سردیوں کا موسم مزید بوڑھا کر دیتا ہے۔

اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ واحدۃً پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قرأت بہتر ہے یعنی وان كانت المتروكة او

المولودة (واحدۃً) اگر میت کے پیچھے ایک بچی ہو۔ جیسے ارشاد ہے فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً۔ جب صلبی بیٹیوں کے ساتھ، پوتیاں بھی ہوں اور صلبی بیٹیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ پوتیوں کو میراث سے محروم کر دیں گی کیونکہ پوتیوں کے لیے 2/3 حصہ کے علاوہ میں بطور فرض میراث نہیں ملتی۔ اگر صلبی بیٹی ایک ہو ایک پوتی ہو یا بہت سی پوتیاں ہوں تو وہ صلبی بیٹی کے ساتھ مل کر 2/3 حصہ مکمل کریں گی، کیونکہ دو بیٹیاں یا زائد اسی فرض 2/3 کی وارث ہوتی ہیں اور پوتیاں، بیٹیوں کے قائم مقام ہوتی ہیں جب بیٹیاں نہ ہوں اور اسی طرح پوتے حجب اور میراث میں بیٹیوں کے قائم مقام ہوتے ہیں جب ان عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ ہو جو سدس 1/6 کی مستحق ہے تو یہ سدس 1/6 پوتی کے لیے ہوگا اور متوفی کی سگی بہن کی نسبت یہ 1/6 حصہ کی زیادہ مستحق ہے۔ جمہور فقہاء صحابہ اور تابعین کا یہی نظریہ ہے مگر ابوموسیٰ، سلیمان بن ابی ربیعہ سے مروی ہے کہ بیٹی کے لیے نصف ہے اور نصف ثانی بہن کے لیے ہے اور ایسی صورت میں پوتی کا کوئی حق نہیں ہے (1)۔ ابوموسیٰ سے صحیح یہ مروی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ سے رجوع کر لیا تھا۔ یہ بخاری نے روایت کیا ہے۔ آدم نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو قیس نے بتایا کہ میں نے ہزیل بن شرحبیل کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوموسیٰ سے بیٹی، پوتی اور بہن کے درمیان میراث کی تقسیم کے بارے پوچھا گیا تو ابوموسیٰ نے کہا: بیٹی کے لیے 1/2 حصہ ہے، بہن کے لیے 1/2 ہے۔ اور حضرت ابن مسعود کے پاس جاؤ وہ بھی میری متابعت کریں گے۔ حضرت ابن مسعود سے پوچھا گیا اور انہیں ابوموسیٰ کے قول کے متعلق خبر دی گئی تو حضرت ابن مسعود نے کہا: پھر میں تو گمراہ ہو گیا اور میں ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں (اگر میں ایسا فیصلہ کروں) میں تو اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کروں گا بیٹی کے لیے نصف ہوگا اور پوتی کے لیے 1/6 ہوگا دو ثلث مکمل کریں گے اور باقی بہن کے لیے ہوگا۔ ہم پھر ابوموسیٰ کے پاس آئے انہیں حضرت ابن مسعود کے قول کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا: جب تک یہ عالم اجل تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ نہ پوچھا کرو۔ اگر پوتی یا پوتیوں کے ساتھ ان کے درجہ میں یا ان سے نیچے لڑکا ہو تو وہ انہیں عصبہ بنا دے گا۔ اور دوسرا نصف ان کے درمیان ہوگا۔ مذکر کے لیے دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہوگا جتنی مقدار کو بھی پہنچ جائے، جب کہ حضرت ابن مسعود کا قول اس کے خلاف ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ جب صلبی بیٹیاں یا صلبی بیٹی اور پوتیاں دو ثلث (2/3) مکمل کر لیں اور اسی طرح وہ سگی بہن اور بہنوں اور باپ کی طرف سے بھائیوں کے متعلق فرماتے ہیں: سگی بہن کے لیے نصف ہے اور باقی بھائیوں اور بہنوں کے لیے ہے جب تک کہ انہیں تقسیم کی وجہ سے 1/6 سے زیادہ نہ پہنچے اگر اس 1/6 سے زیادہ پہنچے تو انہیں 2/3 حصہ مکمل کرتے ہوئے 1/6 حصہ دیا جائے گا اور اس سے زائد انہیں نہیں دیا جائے گا۔ یہی ابوثور نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جب کوئی شخص مر جائے اور اپنی حاملہ بیوی چھوڑ جائے تو مال کی تقسیم میں توقف کیا جائے گا حتیٰ کہ بچی یا بچہ پیدا ہو جائے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے اور اس کی بیوی حاملہ ہو تو ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ وارث ہوگا اور اس کی میراث جاری ہوگی جب وہ زندہ پیدا ہوگا اور آواز نکالے گا اور عام علماء کا قول ہے کہ جب مردہ پیدا ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب فرائض الصلب، حدیث نمبر 2711، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا تو وارث نہ ہوگا۔ اگر زندہ پیدا ہوا اور آواز نہ نکالے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس کے لیے میراث نہ ہوگی اگرچہ وہ حرکت بھی کرے یا چھینک مارے جب تک کہ آواز نہ نکالے اور ایک طائفہ نے کہا: جب حرکت کرنے، آواز نکالنے یا دودھ پینے یا سانس لینے کے ساتھ بچے کی زندگی معلوم ہو جائے گی تو اس کے احکام، زندہ کے احکام ہوں گے۔ یہ امام شافعی، سفیان، ثوری اور اوزاعی کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ امام شافعی نے جو کہا ہے وہ نظر کا احتمال رکھتا ہے مگر خبر اس سے مانع ہے اور وہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "جو بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اسے چوک دیتا ہے وہ شیطان کی چوک کی وجہ سے روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی والدہ کے۔ یہ خبر ہے اور خبر پر نسخ واقع نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 12۔** جب الله تعالیٰ نے فرمایا: فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ یہ حکم خنثیٰ (ہیجڑا) کو بھی شامل ہے جس کی دونوں آگے والی شرمگاہیں ہوتی ہیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اسے پیشاب کرنے کے اعتبار سے وارث بنایا جائے گا اگر وہ مرد والی شرمگاہ سے پیشاب کرتا ہے تو وہ مرد کی میراث کا وارث ہوگا، اگر وہ عورت والی شرمگاہ سے پیشاب کرتا ہے تو عورت کی میراث کا وارث ہو گا۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک سے میں نے اس کے متعلق کوئی چیز یاد نہیں کی، بلکہ ابن القاسم نے ذکر کیا ہے کہ وہ امام مالک سے اس کے متعلق پوچھنے سے ڈر گئے۔ اگر وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرتا ہو تو جس جگہ سے پہلے پیشاب کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا یہ سعید بن مسیب، امام احمد اور اسحاق کا قول ہوگا یہ اصحاب الرائے سے حکایت کیا گیا ہے۔ قتادہ نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے خنثیٰ کے متعلق فرمایا: اس کی میراث کا اعتبار اس کے پیشاب کرنے کی جگہ کے اعتبار سے ہوگا اگر وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرتا ہوگا تو نصف مذکر اور نصف مونث ہوگا۔ یعقوب اور محمد نے کہا: جس شرمگاہ سے زیادہ پیشاب کرتا ہوگا اس کے اعتبار سے وارث ہوگا۔ اوزاعی سے یہی حکایت ہے۔ نعمان نے کہا: جب وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرے تو وہ خنثیٰ مشکل ہے۔ میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ کس طرف سے زیادہ پیشاب کرتا ہے۔ نعمان سے یہ بھی روایت ہے کہ جب ایسا ہوگا تو توقف کیا جائے گا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب خنثیٰ مشکل ہوگا تو دونوں حصوں میں سے کم حصہ دیا جائے گا۔ یحییٰ بن آدم نے کہا: جب وہ مرد کی حیثیت سے پیشاب کرتا ہوگا اور اسے عورت کی طرح حیض بھی آتا ہوگا تو وہ پیشاب کرنے کے اعتبار سے وارث ہوگا کیونکہ اثر میں ہے "پیشاب کرنے کی جگہ کے اعتبار سے وارث ہو گا" اور امام شافعی کے قول میں ہے جب اس کے دونوں طرفوں سے پیشاب اکٹھا نکلتا ہوگا اور ایک سے دوسری کی نسبت پہلے نہیں نکلتا ہوگا تو وہ خنثیٰ مشکل ہوگا اسے مونث کی میراث کی طرح میراث دی جائے گی اور اس کے اور دوسرے ورثاء کے درمیان مال موقوف ہوگا حتیٰ کہ اس کا امر واضح ہو جائے یا ورثاء صلح کر لیں۔ یہی ابو ثور کا قول ہے۔ شعبی نے کہا: مذکر کی نصف میراث اور مونث کی نصف میراث دی جائے گی۔ اوزاعی کا یہی مذہب ہے اور یہ مالک کا مذہب ہے۔ ابن شاس نے جواھر ثمینۃ میں، امام مالک عالم مدینہ کے مذہب پر کہا ہے کہ خنثیٰ کی جب دونوں شرمگاہیں ہوں گی یعنی مرد کی شرمگاہ اور عورت کی شرمگاہ جن کے ذریعے پیشاب کیا جاتا ہے تو جس کے ذریعے پیشاب کرتا ہوگا اس کا حکم اس کے مطابق ہوگا اگر دونوں سے پیشاب کرتا ہوگا تو اعتبار کثرت کا ہوگا یعنی جس شرمگاہ سے زیادہ پیشاب کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اگر برابر پیشاب کرتا ہوگا تو

جس شرمگاہ سے پہلے کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اگر دونوں سے اکٹھا کرتا ہوگا تو پھر داڑھی اگنے یا پستانوں کے بڑا ہونے اور عورتوں کے پستانوں کے مشابہ ہونے کا اعتبار ہوگا، جب دونوں امر برابر ہوں تو پھر بلوغت کے وقت کی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اگر حیض آتا ہوگا تو عورت کے حکم میں ہوگا اگر احتلام پایا جاتا ہوگا تو اس کا حکم ہوگا اگر دونوں پائے جاتے ہوں گے تو مشکل ہو گا۔ اسی طرح اگر پیشاب کرنے کی جگہ نہ ہو یعنی نہ وہ ہو جو مردوں کے ساتھ خاص ہے اور نہ وہ ہو جو عورتوں کے ساتھ خاص ہے بلکہ اس کی ایک جگہ ہو جس سے پیشاب کرتا ہو تو پھر بلوغت کا انتظار کیا جائے گا اگر کوئی تمیز دینے والی صورت ہوگی تو فبہا ورنہ مشکل ہوگا پھر جہاں اشکال کا حکم ہم لگائیں گے تو اسے مذکر اور مونث دونوں کے حصوں کا نصف ملے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ علماء نے خنثیٰ مشکل کی علامات ذکر کی ہیں۔ ہم سورۂ بقرہ اور اس سورت کے آغاز میں ایک علامت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جس کے ذریعے وہ ایک قسم کے ساتھ لاحق کیا جائے گا۔ یہ علامت ہے پسلیوں کے اعتبار کا (اگر پسلیاں زیادہ ہیں تو عورت ہے اگر کم ہیں تو مرد ہے)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی علامت مروی ہے اس کے ساتھ آپ نے فیصلہ فرمایا تھا۔ بعض فضلاء نے بہت سے اشعار میں خنثیٰ کا حکم نظم کیا ہے: خنثیٰ میں پستان، داڑھی اور پیشاب کی جگہ کا اعتبار ہے اگر اس کے تمام حالات برابر ہوں اور کوئی ایک صورت واضح نہ ہو اور اس کی نشانیاں مشکل ہوں تو 6/8 حصہ ملے گا یہ اس کا حصہ ہے جو اشکال کی وجہ سے مستحق ہے۔ اس میں عبرت ہے۔ واجب ہے کہ وہ دنیا میں جب تک زندہ ہے نہ خود نکاح کرے اور نہ کسی کا نکاح کرائے۔ جب عیال والا نہ ہو تو میں اسے مردوں میں شمار نہیں کرتا۔ یہ تمام جو میں نے نظم میں ذکر کیا ہے بڑے بڑے علماء کے اقوال ہیں۔ ایک قوم نے خنثیٰ پر کلام کرنے سے انکار کیا تو اس کو کوئی ملامت نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس کے ذکر میں شناعت ظاہر ہے اور بشاعت بالکل واضح ہے۔ اس کی مخفی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ گزر چکا ہے کہ اگر اس کی پسلیاں کم ہوں تو وہ میراث، نکاح، احرام، حج، نماز اور احکام میں مردوں کی طرح ہوگا۔ اگر مردوں سے ایک پسلی زیادہ ہو تو وہ عورتوں میں سے ہوگا، کیونکہ عورتوں کی ایک پسلی زیادہ ہوتی ہے۔ اس فائدہ کو غنیمت جان، کیونکہ حوا کی تخلیق کی وجہ سے آدم کی ایک پسلی کم ہوئی یہ قول حق ہے اور اس پر دلیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ابوالولید بن رشد نے کہا: خنثیٰ مشکل نہ خاوند ہوتا ہے، نہ بیوی، نہ باپ اور نہ ماں۔ بعض نے کہا کہ ایسے خنثے پائے گئے ہیں جن کے پیٹ سے بچے ہوئے اور جن کی پیٹھ سے اولاد ہوئی۔ ابن رشد نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو اپنے صلبی بیٹے سے باپ کی مکمل میراث پائے گا اور بطن سے پیدا ہونے والی اولاد سے ماں کی مکمل میراث پائے گا۔ یہ بعید ہے۔ واللہ اعلم۔

سنن دارقطنی میں ابوہانی عمر بن بشیر سے مروی ہے فرمایا: عامر شعبی سے ایک ایسے بچے کے بارے میں پوچھا گیا جو نہ مذکر ہے، نہ مونث ہے، نہ اس کے لیے وہ شرمگاہ ہے جو مذکر کی ہوتی ہے اور نہ وہ ہے جو عورت کے لیے ہوتی ہے اس کی ناف سے پیشاب، پاخانہ کی ہیئت سے مواد نکلتا ہے۔ عامر سے اس کی میراث کے بارے پوچھا گیا تو عامر نے کہا: مذکر کے حصہ کا نصف اور مؤنث کے حصہ کا نصف اسے دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لِاَبَوَیْهِ یعنی میت کے والدین۔ یہ ضمیر بغیر مرجع کے ہے اور جائز ہے،

کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حتی توارت بالحجاب اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ (ان دونوں قرآنی الفاظ میں ضمیر بغیر مرجع کے ہے)۔ السُّدُسُ اس کا رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ اسی طرح الثلث اور السدس ہیں اسی طرح نِصْفُ مَا تَرَكَ اور فَلَكُمُ الرُّبُعُ۔ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ اور فَلَهُنَّ الثُّمُنُ اور فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ کی ترکیب ہے۔ اور الابوان الاب اور الابۃ کا تثنیہ ہے۔ الام کے لفظ کی وجہ سے اسے ابۃ نہیں کہا جاتا۔ اور عرب دو مختلف چیزوں کو متفق چیزوں کے قائم مقام کر دیتے ہیں اور ایک کو دوسری پر غلبہ دے دیتے ہیں اس کی خفت یا اس شہرت کی وجہ سے اور یہ اسماء صالحہ میں مسموع ہے مثلاً اب اور الام کے لیے ابوان۔ الشمس و القمر کے لیے القمران اللیل و النہار کے لیے الملوان، اسی طرح العمران، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے لیے بولا جاتا ہے۔ تذکیر کی خفت کی وجہ سے قمر کو شمس پر غلبہ دیا۔ عمر کو ابوبکر پر غلبہ دیا، کیونکہ حضرت عمر کا زمانہ طویل اور مشہور تھا اور جنہوں نے العمرین سے عمر بن خطاب اور عمر بن عبدالعزیز کا ارادہ کیا ہے، اس کا قول درست نہیں، کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے بھی العمرین بولا جاتا تھا۔ یہ ابن الشجری کا قول ہے۔ اور وَ لِاَبَوَيْهِ میں اوپر والے آباء داخل نہیں ہیں جس طرح نیچے والے ابناء اَوْلَادِكُمْ میں داخل ہیں۔ کیونکہ لِاَبَوَيْهِ کا لفظ تثنیہ ہے اور یہ عموم اور جمع کا احتمال نہیں رکھتا بخلاف اَوْلَادِكُمْ کے قول کے (کہ یہ جمع ہے) اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اوپر والی ام، دادی ہے اور اس کے لیے بالاجماع ثلث مفروض نہیں ہے۔ پس جدۃ کا اس لفظ سے خارج ہونا قطعی ہے اور دادا کا شامل ہونا مختلف فیہ ہے۔ جن علماء نے کہا: وہ باپ کی طرح ہے اور اس کے ساتھ بھائی محجوب ہوتے ہیں ان میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کی زندگی کے ایام میں کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی اور ان کی وفات کے بعد اس مسئلہ میں اختلاف ہوا اور جنہوں نے کہا: وہ باپ ہے ان میں حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابو ہریرہ ہیں یہ تمام علماء باپ کی عدم موجودگی میں دادا کو باپ کی طرح سمجھتے تھے اور اس کے ہوتے ہوئے بھائیوں کو محروم کرتے تھے اور بھائی دادا کے ہوتے ہوئے ان کے نزدیک کسی چیز کے وارث نہیں بنتے تھے۔ یہ عطا، طاؤس، حسن اور قتادہ کا قول ہے اور یہی نظریہ امام ابوحنیفہ، ابوثور اور اسحاق کا ہے اور ان کی حجت یہ ارشاد ہے مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج: 78) اور يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ (الاعراف: 35) یہاں ابراہیم کو باپ اور آدم کی اولاد کہہ کر پکارا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا بنی اسماعیل ارموا فان اباکم کان رامیاً اے اسماعیل کی اولاد تیر اندازی کرو، کیونکہ تمہارا باپ بھی تیر انداز تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زید، حضرت ابن مسعود کا خیال یہ ہے کہ بھائیوں کے ساتھ دادا کو میراث ملے گی۔ اور سگے بھائیوں کے ہوتے ہوئے یا باپ کی طرف سے بھائیوں کے ہوتے ہوئے اس کی میراث ثلث 1/3 سے کم نہ ہوگی مگر ذوی الفرائض کے ساتھ، کیونکہ ان کے ساتھ زید کے قول کے مطابق سدس سے کچھ کم ہو جاتا ہے۔ یہ امام مالک، امام اوزاعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھائیوں اور دادا کو سدس 1/8 میں شریک کرتے تھے اور ذوی الفرائض اور دوسرے ورثاء کے ساتھ سدس 1/6 سے دادا کا حصہ کم نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن ابی لیلی اور ایک جماعت کا

قول ہے۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ دادا، باپ کے ہوتے ہوئے وارث نہیں ہوتا اور بیٹا باپ کو محجوب کرتا ہے اور دادے کو باپ کے قائم مقام رکھا ہے حجب اور میراث میں جبکہ مرنے والا قریبی باپ نہ چھوڑے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ دادا، بھتیجوں کو میراث سے محروم کرے گا، مگر شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مقاسمہ میں بھتیجوں کو بھائیوں کے مقام پر رکھا ہے۔ جمہور کے قول کی حجت یہ ہے کہ یہ ایسا مذکر ہے جو اپنی بہن کو عصبہ نہیں بناتا چچا اور چچا کے بیٹے کی طرح دادا تقسیم نہیں کرتا۔ شعبی نے کہا: اسلام میں پہلا وارث دادا حضرت عمر بن خطاب تھے۔ حضرت عاصم بن عمر کا بیٹا فوت ہوا اور دو بھائی چھوڑے۔ حضرت عمر نے پوتے کا سارا مال لینے کا ارادہ کیا، پھر حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہما سے اس مسئلہ میں مشورہ کیا تو دونوں نے ایک مثال دی، حضرت عمر نے فرمایا: اگر تم دونوں کی رائے جمع نہ ہوتی تو میں اسے اپنا بیٹا اور اپنے آپ کو اس کا باپ نہ دیکھتا۔ دارقطنی نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اجازت طلب کی تو زید نے اجازت دی جب کہ حضرت زید کا سر ان کی لونڈی کے ہاتھ میں تھا وہ انہیں کنگھی کر رہی تھی حضرت زید نے اپنا سر کھینچا۔ حضرت عمر نے اسے کہا: وہ تجھے کنگھی کرتی رہے حضرت زید نے کہا: اے امیر المومنین! اگر آپ مجھے بلاتے تو میں خود تمہارے پاس آجاتا۔ حضرت عمر نے کہا: مجھے آپ سے ایک کام ہے میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ دادا کی میراث کے بارے میں غور کریں۔ حضرت زید نے کہا: وہی ہوگا جو آپ کہیں گے حضرت عمر نے کہا: یہ وحی نہیں ہے حتیٰ کہ ہم زیادتی اور کمی کر کے نص قرآنی کی مخالفت کرنے والے ہوں گے۔ یہ تو ایک تمہاری رائے ہے اگر میں اسے اپنے موافق دیکھوں گا تو میں اس کی پیروی کروں گا ورنہ تم پر کوئی حرج نہیں ہوگی۔ حضرت زید نے اپنی رائے دینے سے انکار کیا۔ حضرت عمر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے باہر نکلے اور فرمایا: میں تو اس لیے آیا تھا کہ تم میرا مسئلہ حل کرو گے۔ پھر ایک مرتبہ اسی وقت میں حضرت عمر، حضرت زید کے پاس آئے جس وقت پہلے آئے تھے، حضرت عمر ٹھہرے رہے حتیٰ کہ حضرت زید نے کہا: میں تمہارے لیے اس کے متعلق لکھتا ہوں تو حضرت زید نے انتڑیوں کے ٹکڑے پر لکھا اور اس کی مثال بیان فرمائی۔ اس کی مثال درخت کی مثل ہے جو ایک تنے پر اگتا ہے پھر اس میں ایک ٹہنی نکلتی ہے پھر اس ٹہنی میں دوسری ٹہنی نکلتی ہے تنا پہلی ٹہنی کو سیراب کرتا ہے اگر پہلی ٹہنی تو کاٹ دے تو پانی دوسری ٹہنی کی طرف لوٹے گا اگر تو دوسری ٹہنی کاٹ دے تو پانی پہلی ٹہنی کی طرف لوٹے گا۔ حضرت عمر وہ تحریر لے کر آئے اور خطبہ دیا پھر وہ تحریر ان پر پڑھی پھر فرمایا: زید بن ثابت نے دادا کے متعلق ایک قول کیا ہے میں اسے جاری کرتا ہوں۔ فرمایا: حضرت عمر پہلے دادا تھے (جو اسلام میں میراث پانے والے تھے) انہوں نے سارا مال لینے کا ارادہ کیا تھا یعنی اپنے پوتے کا سارا مال لینے اور میت کے بھائیوں کو کچھ نہ دینے کا ارادہ کیا تھا اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب نے مال کو تقسیم فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ رہی دادی تو اہل علم کا اجماع ہے کہ دادی کے لیے 1/6 حصہ ہے جب میت کی والدہ نہ ہو اور علماء کا اجماع ہے کہ ماں نانی اور دادی کو محروم کر دیتی ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ باپ، میت کی نانی کو محروم کر دیتا ہے اور دادی کی میراث میں اختلاف ہے جب اس کا بیٹا زندہ ہو۔ ایک جماعت نے کہا: دادا کی وارث نہ ہوگی جب دادی کا بیٹا زندہ ہو۔ حضرت زید بن ثابت، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے اور امام مالک، ثوری، امام اوزاعی، ابوثور اور

اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ ایک جماعت نے کہا: دادی اپنے بیٹے کے ساتھ وارث ہوگی۔ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے اور شریح، جابر بن زید، عبید اللہ بن حسن، شریک، احمد، اسحاق اور ابن المنذر کا بھی یہی قول ہے۔ اور فرمایا: جس طرح دادے کو باپ کے سوا کوئی محروم نہیں کرتا اسی طرح دادی کو ماں کے سوا کوئی محروم نہیں کرتا۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: دادی اپنے بیٹے کے ساتھ وہ پہلی دادی ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں 1/6 حصہ عطا فرمایا جب کہ اس کا بیٹا زندہ تھا (1)۔

**مسئلہ نمبر** 15۔ بہت سی جدات کو میراث دینے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: صرف دو دادیاں وارث ہوں گی، ماں کی ماں اور باپ کی ماں اور ان دونوں کی مائیں۔ اسی طرح ابو ثور نے امام شافعی سے روایت کیا ہے اور یہی تابعین کی جماعت کا قول ہے۔ اگر ان میں سے ایک ہو تو اس کے لیے 1/6 حصہ ہوگا اگر دو جمع ہو جائیں اور ان کی قرابت برابر ہو تو دونوں کو 1/6 حصہ ملے گا اسی طرح اگر زیادہ ہوں جب کہ وہ رشتہ میں برابر ہوں اور اس پر اجماع ہے اگر وہ قریب ہو جو ماں سے پہلے ہے تو اسے 1/6 حصہ ملے گا، دوسریوں کو نہیں ملے گا اگر وہ قریب ہو جو باپ سے پہلے ہے جو اس کے اور ماں سے پہلے والی کے درمیان 1/6 حصہ ہوگا اگرچہ بہت دور کی ہو اور ماں سے پہلے والی ایک جدہ وارث ہوگی اور ماں کے باپ کی ماں جو جدۃ ہے وہ کسی صورت میں وارث نہ ہوگی یہ حضرت زید بن ثابت کا مذہب ہے اور اس مسئلہ میں جو ان سے مروی ہے اس میں سے یہی زیادہ محفوظ ہے۔ یہی امام مالک اور اہل مدینہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جدات مائیں ہیں جب یہ جمع ہوں تو 1/6 حصہ قریبی کو ملے گا جس طرح آباء جمع ہوں تو میراث کا حق دار وہی ہوتا ہے جو زیادہ قریبی ہوتا ہے، اسی طرح بیٹے اور بھائی اور بھتیجے اور چچا کے بیٹے میراث میں جب جمع ہوں تو میراث کے حق دار وہ ہوں گے جو زیادہ قریبی ہوں گے۔ اسی طرح امہات کا حکم ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ اصح ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ امام اوزاعی تین جدات کو وارث بناتے تھے۔ ایک ماں سے پہلے والی اور دو باپ سے پہلے والیاں، یہی امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔ دارقطنی نے یہ مرسلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے اس کا برعکس مروی ہے وہ تین جدات کو وارث بناتے تھے۔ دو ماں کی جہت سے اور ایک باپ کی طرف سے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی حضرت زید کے قول کی طرح ہے یہ دونوں قریبی کے لیے 1/6 حصہ مقرر فرماتے تھے خواہ وہ ماں کی طرف سے ہو یا باپ کی طرف سے ہو۔ اور جو دور کا رشتہ دار ہے وہ اس میں اس کا شریک نہ ہوگا۔ یہ ثوری، امام ابو حنیفہ ان کے اصحاب اور ابو ثور کا قول ہے۔ رہے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس تو یہ چار جدات کو وارث بناتے تھے یہ حسن بصری، محمد بن سیرین اور جابر بن زید کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہر جدہ جب متوفی (مرنے والا) کی طرف منسوب ہو اس کے نسب میں دو ماؤں کے درمیان ایک باپ واقع ہو تو وہ وارث نہ ہوگی۔ یہ اہل علم کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر** 16۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ بچے کے ہوتے ہوئے والدین میں سے ہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض من رسول اللہ، باب ما جاء فی میراث الجدۃ مع ابنها، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک کے لیے 1/6 حصہ ہے۔ ولد کو مبہم فرمایا پس اس میں مذکر، مؤنث برابر ہوگا، کوئی شخص مرے اور ایک بیٹا اور والدین چھوڑے تو والدین میں سے ہر ایک کے لیے 1/6 حصہ ہوگا اور باقی بیٹے کے لیے ہوگا اگر وہ ایک بیٹی اور والدین چھوڑے تو بیٹی کے لیے نصف ہوگا اور والدین کے لیے 2/6 حصہ ہوگا اور باقی اقرب عصبہ کے لیے ہوگا اور وہ باپ ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ما ابقت الفرائض فلِاَوْلَی رجل ذکر یعنی فرائض سے جو بچے وہ قریبی مرد کے لیے ہوگا۔ باپ کے لیے استحقاق دو اعتبار سے ہے ایک عصبہ ہونے اور دوسرا فرض کے اعتبار سے۔

فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا کہ والدین جب وارث ہوں تو ماں کے لیے 1/3 حصہ ہے اس کی دلیل وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ ہے یہ خبر دینا ہے کہ ماں کے لیے 1/3 حصہ ہے اور باقی دو ثلث 2/3 باپ کے لیے ہے یہ اس طرح ہے جیسے تو دو شخصوں کو کہتا ہے: یہ مال تم دونوں کے لیے ہے پھر تو ایک کو کہتا ہے: اے فلاں! تیرے لیے اس میں سے 1/3 ہے تو دوسرے کے لیے اس میں اپنی نص کے ساتھ 2/3 مقرر کر دیا کیونکہ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ میں کلام کی قوت دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں تمام حصہ داروں میں سے منفرد ہیں اپنی اولاد کی طرف سے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بناء پر 2/3 باپ کے لیے بطور فرض متعین ہوگا جبکہ وہ عصبہ نہ ہو۔ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ مذکر اولاد کے نہ ہونے کے وقت باپ کو ثلث کی زیادتی نصرت اور مشقت کے وجوب کی وجہ سے ہے اور ماں کے لیے ایک سہم (حصہ) ہوگا قرابت کی وجہ سے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حکمت درست ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو اس کی زندگی میں بھی موجود ہیں پھر وہ سدس کی طرف کیوں لوٹایا گیا اور وہ چیز جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں سدس 1/6 کی طرف لوٹانا بچے پر نرمی کرنے کے لیے ہے اور اس کے مال کی اچھی دیکھ بھال کے لیے ہے، کیونکہ اس کے مال سے جز کا نکالنا اس کو مال سے بانجھ کرنا ہے یا یہ حکم تعبدی ہے یہ سب سے اولیٰ قول ہے۔ واللہ الموفق

**مسئلہ نمبر 17**۔ اگر کہا جائے کہ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ میں واو کی زیادتی کا کیا فائدہ ہے کلام کا ظاہر یہ تھا فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زیادتی سے اس بات کی خبر دینا مقصود ہے کہ یہ امر مستقل اور ثابت ہے پس اس کے ثبوت اور استقرار کی خبر دی گئی ہے پس والدین کے انفراد کے وقت والدین کا حال بچوں کے حال کی طرح سے مذکر کے لیے عورتوں کے دو حصوں کے برابر ہے۔ باپ کے لیے اسی وجہ سے دو فرض جمع ہو جاتے ہیں ایک مفروض حصہ اور دوسرا عصبہ ہونے کے اعتبار سے، کیونکہ بچے کی طرح یہ بھی بھائیوں کو محجوب کر دیتا ہے یہ حکم میں عدل اور حکمت میں یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اہل کوفہ نے فلامة الثلث پڑھا ہے۔ یہ لغت سیبویہ نے حکایت کی ہے کسائی نے کہا: یہ ہوازن اور ہذیل میں سے اکثر لوگوں کی لغت ہے، کیونکہ لام جب مکسور ہو اور وہ حرف کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 338

متصل ہو تو کسرہ کے بعد ضمہ کو ناپسند کرتے ہیں پس انہوں نے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیا، کیونکہ کلام میں فعل نہیں تھا اور جنہوں نے ضمہ پڑھا ہے انہوں نے اصل پر پڑھا ہے، کیونکہ لام منفصل ہے کیونکہ وہ اسم پر داخل ہے۔ یہ تمام گفتگو نحاس نے کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ بھائی ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب کر دیتے ہیں اور یہ حجب نقصان ہے خواہ بھائی سگے ہوں یا باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ہوں اور ان کا حصہ نہ بھی ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں: سدس 1/6 حصہ بھائیوں نے ماں کو جس سے محجوب کیا وہ بھائیوں کے لیے ہے اور ان سے دوسرے علماء کی طرح کا قول بھی مروی ہے کہ وہ باپ کے لیے ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ سدس باپ کو ملے گا بھائیوں کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ باپ ہی ان کا کفیل ہے اور ان کے نکاح کا متولی ہے اور ان کے اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ دو بھائی یا زیادہ ہوں مذکر ہوں یا مؤنث ہوں، سگے ہوں یا باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ہوں ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب کریں گے مگر حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ بھائیوں میں سے دو ایک کے حکم میں ہیں ماں کو تین بھائیوں سے کم محجوب نہیں کریں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہنیں، ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب نہیں کریں گی، کیونکہ کتاب اللہ بھائیوں کے بارے میں ہے۔ عورتوں کی میراث کی قوت، مردوں کی میراث کی قوت کی مثل نہیں ہے حتیٰ کہ الحاق کا اعتبار کیا جائے۔ الکیا الطبری نے کہا: ان کے اقوال کا تقاضا یہ ہے کہ بہنیں بھائیوں کے ساتھ داخل نہیں ہیں، کیونکہ اخوۃ کا لفظ مطلق ہے یہ بہنوں کو شامل نہیں ہے جس طرح البنین کا لفظ البنات کو شامل نہیں ہے یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ماں کو ایک بھائی اور ایک بہن ثلث سے سدس کی طرف محجوب نہیں کرے گی اور یہ مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ جب آیت میں بھائیوں کے ساتھ بہنیں مراد ہیں تو انفرادی طور پر بھی مراد ہوں گی اور تمام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جمع کا کم از کم فرد تثنیہ (2) ہے کیونکہ تثنیہ کا معنی ایک چیز کو اس کی مثل کے ساتھ جمع کرنا ہے پس معنی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ جمع ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: دو اور اس سے اوپر جماعت ہیں (1)۔ سیبویہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے خلیل سے ما احسن وجوھما کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے کہا: دو جماعت ہیں۔

شاعر کا قول صحیح ہے:

ومَهْمَهَين قَذَفَيْنِ مَرَّتَيْنِ ظهراهما مِثْلُ ظُهورِ التُّرْسَيْنِ

خوفناک چٹیل دو میدان بہت دور ایسی زمینیں جن پر نہ پانی ہے نہ نبات ان کی بلند جگہیں ڈھالوں کی بلند جگہوں کی مثل ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لما أتتنا المرأتان بالخَبَرْ فقلن إن الأمر فينا قد شُهِرْ

جب دو عورتیں ہمارے پاس خبر لائیں تو انہوں نے کہا: ہمارے متعلق معاملہ شہرت پا چکا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب الاثنان جماعۃ، حدیث نمبر 961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُحيىَ بالسلام غِنيَ قومٍ ويُبْخَل بالسلام على الفقيرِ

أليس الموت بينهما سواء إذا ماتوا وصاروا في القبورِ

غنی شخص کو سلام کیا جاتا ہے اور فقیر پر سلام کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔ کیا ان دونوں میں موت برابر نہیں ہوگی جب مریں گے اور قبور میں جائیں گے؟

جب حضرت عثمان اور حضرت ابن عباس کے درمیان کلام واقع ہوئی تو حضرت عثمان نے حضرت ابن عباس سے کہا: ان قومك حجبوها تیری قوم نے انہیں (قریش) محجوب کر دیا ہے۔ وہ اہل فصاحت و بلاغت تھے اور جن علماء نے جمع کا کم از کم فرد تین کو بنایا ہے۔ اگر چہ یہاں انہوں نے بھی نہیں کہا۔ وہ حضرت ابن مسعود، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم وغیرہم ہیں۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور عاصم نے یوصیٰ (صاد کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور باقی قراء نے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح دوسرے کو بھی پڑھا گیا ہے اور دونوں جگہ يُوۡصِىۡ کے متعلق عاصم سے مختلف اقوال ہیں۔ صاد پر کسرہ ابو عبیدہ اور ابو حاتم کا اختیار ہے، کیونکہ میت کا ذکر اس سے پہلے جاری ہے۔ اخفش نے کہا: اس کی تصدیق یہ ارشاد کر رہا ہے یوصین اور توصون۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرض کے ذکر پر وصیت کے ذکر کو مقدم کرنے میں کیا حکمت ہے حالانکہ دین بالا جماع مقدم ہے۔ ترمذی نے حارث عن علی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض کو وصیت سے پہلے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور تم قرض سے پہلے وصیت کو ثابت کرتے ہو (1)۔ فرمایا: عام اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے کہ وصیت سے پہلے قرض کو پورا کیا جائے گا۔ دار قطنی نے عاصم بن ضمرہ عن علی رضی اللہ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دین (قرض) وصیت سے پہلے ہے اور وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابو اسحاق ہمدانی نے روایت کیا ہے اس کا جواب پانچ وجوہ سے ہے۔

(۱) ان دو فصلوں کو میراث پر مقدم کرنے کا قصد کیا ہے اور ان کی ذوات میں ترتیب کا قصد نہیں کیا اسی وجہ سے لفظ میں وصیت مقدم ہے۔

(۲) جب وصیت لزوم کے اعتبار سے قرضہ کی نسبت کم تھی تو اس کے اہتمام کے لیے اسے مقدم فرمایا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً (الکہف: 49)

(۳) وصیت کے وجود اور وقوع کی کثرت کی وجہ سے اسے مقدم فرمایا۔ پس یہ ہر میت کے لیے لازم کی طرح ہوگی جب کہ اس پر شرع کی نص بھی موجود ہے اور دین (قرضہ) کو اس کے کم ہونے کی وجہ سے اسے مؤخر فرمایا، کیونکہ قرض کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے پس اس کے ذکر سے آغاز کیا جو ضروری تھا اور اس کا عطف کیا جو کبھی کبھی واقع ہوتا ہے اور او کے ساتھ عطف اس کو مزید قوت دیتا ہے اگر قرض بھی ضروری ہوتا تو عطف واؤ کے ساتھ ہوتا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا من رسول اللہ، باب ماجاء یبدأ بالدین قبل الوصية، حدیث نمبر 2048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۴) وصیت کو مقدم فرمایا، کیونکہ یہ مساکین اور کمزور لوگوں کا حصہ ہے اور قرض کو مؤخر فرمایا، کیونکہ وہ قرض خواہ کا حصہ ہے وہ سلطان کی طاقت کے ذریعے طلب کر سکتا ہے اور اسے اس میں کلام کی گنجائش ہے۔

(۵) وصیت کا منشاء انسان کی اپنی ذات سے ہے اس لیے اسے مقدم فرمایا اور قرض تو ادا کیا ہی جاتا ہے خواہ اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو امام شافعی نے میراث پر حج اور زکوۃ کے قرض کو مقدم فرمایا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب کوئی شخص زکوۃ میں سستی کرے تو اس کے راس المال سے زکوۃ لینا واجب ہے۔ یہ بادی النظر میں ظاہر ہے، کیونکہ یہ بھی حقوق میں سے ایک حق ہے پس موت کے بعد اس سے اس کی ادائیگی لازم ہے جس طرح انسانوں کے حقوق کا حکم ہے خصوصاً زکوۃ کا مصرف بھی آدمی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے کہا: اگر میت نے اس کی وصیت کی ہو تو اس کے تہائی مال سے زکوۃ ادا کی جائے گی اگر خاموش رہا تو کوئی چیز اس کے مال سے نہیں نکالی جائے گی۔ یہ علماء فرماتے ہیں: کیونکہ یہ تو ورثاء کو فقراء چھوڑنے کے مترادف ہے مگر اس نے جان بوجھ کر تمام حقوق ترک کیے ہوں حتی کہ جب وہ فوت ہو تو یہ اس کے تمام مال کو گھیر لیں تو پھر ورثاء کے لیے کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ مبتدا کی وجہ سے ان پر رفع پڑھا گیا ہے اور خبر مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ھم المقسوم علیھم وھم المعطون ان پر مال تقسیم ہوگا اور انہیں دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا بعض علماء نے فرمایا: تم نہیں جانتے کہ دعا اور صدقہ کے اعتبار سے دنیا میں کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ان الرجل لیرفع بدعاء ولدہ من بعدہ انسان کا مرتبہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کی دعا کی وجہ سے بلند کیا جاتا ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے جب انسان مرتا ہے تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا اجر اور فائدہ اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ اس حدیث میں ہے ''اور نیک بیٹا جو باپ کے لیے دعا کرتا ہے'' اور بعض علماء نے فرمایا: آخرت میں جو زیادہ نفع بخش ہے تم اسے نہیں جانتے۔ کبھی بیٹا افضل ہوتا ہے پس وہ اپنے باپ کی سفارش کرے گا۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے کہ بعض مفسرین نے کہا: بیٹا جب آخرت میں باپ کے درجہ سے افضل درجہ میں ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے باپ کو اس کی طرف بلند کر دے گا اسی طرح باپ جب اپنے بیٹے سے بلند درجہ ہوگا تو وہ بھی سوال کرے گا تو اللہ تعالیٰ بیٹے کو باپ کے پاس پہنچا دے گا۔ اس کی مزید تفصیل سورۃ الطور میں آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: دنیا و آخرت کے اعتبار سے ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے لفظ اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَرِيْضَةً اس کو مصدر مؤکد کی بنا پر نصب ہے، کیونکہ يُوْصِيْكُمْ کا معنی ہے یفرض علیکم۔ مکی وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہے اور اس میں عامل یوصیکم ہے اور یہ ضعیف قول ہے۔ امت ماقبل سے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بتایا کہ وہ قرابت کی وجہ سے خود حکم کرنے کی مشقت سے بچائے گئے ہیں جب کہ تمہارے رشتہ دار قرابت میں جمع ہو جائیں یعنی آباء، ابناء دنیا میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور آخرت میں شفاعت

کرتے ہیں جب یہ آباء اور ابناء میں ثابت ہو گیا تو تمام اقارب میں ثابت ہو گیا اگر تقسیم اجتہاد پر موقوف ہوتی تو رشتہ داروں میں سے ہر ایک کے غنا میں نظر کرنا واجب ہوتا اور اس وقت امر ضبط سے خارج ہو جاتا، کیونکہ امر مختلف ہو جاتا پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ بندے کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو مواریث کی مقدار میں استعمال نہ کرے بلکہ شرعی مقادیر کو بیان کرے۔ پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا اللہ تعالیٰ مواریث کی تقسیم کو جاننے والا ہے۔ حَكِيْمًا اس نے مواریث کی تقسیم کو پختہ فرمایا اور اس کے اہل کو بیان فرمایا۔ زجاج نے کہا: عَلِيْمًا یعنی اشیاء کو ان کی تخلیق سے پہلے جانتا ہے۔ حَكِيْمًا ہر چیز کو مقدر کرنے میں اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ماضی اور مستقبل برابر ہیں۔ اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے حکمت و علم کو دیکھا تو انہیں کہا گیا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اسی طرح تھا جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ یہ خطاب مردوں کو ہے اور یہاں الولد سے مراد صلبی بیٹے اور پوتے ہیں اگرچہ نیچے کے ہوں مذکر ہوں یا مؤنث ہوں ایک ہو یا زائد ہوں یہ بالاجماع ثابت ہے۔ اور علماء سے اس پر بھی اجماع ہے کہ بیٹے یا پوتے نہ ہوں تو خاوند کے لیے نصف ہے اور بیٹے یا پوتے کے ہوتے ہوئے 1/4 ہے۔ بیوی اپنے خاوند سے 1/4 کی وارث ہوگی جب کہ اس کی اولاد نہ ہو اور اولاد کے ہوتے ہوئے بیوی کو 1/8 ملے گا اور علماء کا اجماع ہے کہ ایک بیوی ہو، دو ہوں، تین ہوں، چار ہوں تمام کا حکم ایک بیوی کا ہے اگر خاوند کی اولاد نہ ہوگی تو سب کو 1/4 حصہ ملے گا اور ایک بیٹا بھی ہوگا تو 1/8 حصہ ملے گا۔ تمام 1/8 میں شریک ہوں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور تمام کے حکم میں کوئی فرق نہیں کیا، جس طرح کہ ایک بیٹی اور ایک بہن اور بہت سی بیٹیوں اور بہنوں کے درمیان فرق کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً، الکلالہ مصدر ہے۔ تکللہ النسب یعنی احاط بہ۔ اسی سے الاکلیل ہے۔ یہ چاند کی منزلوں میں ایک منزل ہے وہ چاند کو گھیر لیتی ہے۔ اسی سے الاکلیل ہے۔ اس کا مطلب تاج، پگڑی ہے جو سر کو گھیر لیتی ہے جب انسان فوت ہو اور اس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو تو اس کا ورثہ کلالہ ہے یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔ یحییٰ بن آدم نے شریک، زہیر اور ابوالاحوص سے انہوں نے ابواسحاق سے انہوں نے سلیمان بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے علماء کو اس پر متفق دیکھا ہے کہ کلالہ وہ ہے جو فوت ہو اور اس کی اولاد اور والد نہ ہو۔ اسی طرح کتاب العین کے مصنف ابومنصور اللغوی، ابن عرفہ، قتبی، ابوعبید، ابن الانباری نے کہا ہے: الاب، الابن دونوں انسان کی طرفیں ہیں جب وہ دونوں نہ ہوں تو اس کا نسب اس کو گھیر لیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: روضة مكللة جب روضہ نور سے گھیرا گیا ہو۔ بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

سكنهٗ روضةٌ مُكَلَّلَةٌ عمّ بها الأَيْقَان و الذُّرَق

اس کا مسکن نورانی روضہ ہے اس کے اردگرد گھاس اور بوٹیاں ہیں۔

امرؤالقیس نے کہا:

أصاحِ ترى بَرْقا أُرِيك وميضَة   كلمعِ اليَدينِ فى حُبِّى مُكَلَّل

قرابت کو کلالۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے میت کو تمام جوانب سے گھیر لیا ہوتا ہے وہ نہ ان سے ہوتے ہیں اور نہ وہ ان سے ہوتا ہے۔ وہ اسے گھیر لیتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ منسوب ہوتے ہیں جیسا کہ اعرابی نے کہا: مالی کثیر و یرثنی کلالہ متراخ نسبھم۔ میرا مال کثیر ہے اور میرے رشتہ دار میرے وارث ہیں۔ جن کا نسب متاخر ہے۔

فرزدق نے کہا:

وَرِثتم قناة المجد لاعن كلالةٍ   عن ابنى منافٍ عبدِ شمسٍ و هاشِم

اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

إنّ أبا الْمَرْءِ أحْمَى له   ومَوْلَى الكلالة لا يغضبَ

بعض علماء نے فرمایا: کلالہ، کلال سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے تھکانا، گویا وہ میراث کو وارث کی طرف دور سے تھکا کر لوٹاتا ہے۔ اعشی نے کہا:

فآليت لا أرثى لها من كلالة   ولا من وَجَى حتى تلاقِى محمدا

ابوحاتم اور الاثرم نے ابوعبیدہ سے روایت کیا ہے فرمایا: کلالۃ وہ ہوتا ہے جس کا نہ باپ، نہ بیٹا اور نہ بھائی وارث ہو۔ ابو عمر نے کہا: ابوعبیدہ کا باپ اور بیٹے کے ساتھ کلالہ کی شرط میں بھائی کا ذکر غلط ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کلالہ کی شرط میں بھائی کو ذکر نہیں کیا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ حضرت ابوبکر سے یہ مروی تھا پھر ان دونوں حضرات نے اس سے رجوع کر لیا۔ ابن زید نے کہا: کلالہ زندہ اور میت دونوں ہوتے ہیں۔ عطاء سے مروی ہے کہ الکلالۃ سے مراد مال ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ عجیب قول ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی وجہ ہے اعراب سے ابھی یہ واضح کیا گیا ہے۔ ابن اعرابی سے مروی ہے کہ کلالہ دور کے چچا کے بیٹے ہیں۔ سدی سے مروی ہے کہ کلالہ میت ہے اور ان سے جمہور کے قول کی مثل مروی ہے۔ یہ اقوال ان کی وجوہ بھی اعراب سے واضح ہوئی ہیں بعض کوفیوں نے یورّث کلالۃ یعنی را کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن اور ایوب نے یورث را کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اصحاب المعانی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا ورث سے اور دوسرا اورث سے مشتق ہے۔ کلالہ مفعول ہے اور کان بمعنی وقع ہے اور جنہوں نے یورث را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے نزدیک بھی کلالہ سے مراد مال ہونے کا احتمال ہے۔ تقدیر ہوگی یورث ورثۃ کلالۃ۔ اس صورت میں یہ مصدر محذوف کی صفت ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ کلالہ ورثاء کا اسم ہو اور یہ کان کی خبر ہو۔ تقدیر یوں ہوگی ذا ورثۃ۔ اور کان کا تامہ ہونا بھی جائز ہے۔ یورث، رجل کی صفت ہے۔ رجل کو رفع کان کی وجہ سے ہے اور کلالۃ تفسیر یا حال کی بنا پر منصوب ہے اس بنا پر کہ کلالہ سے مراد میت ہو۔ تقدیر یوں ہوگی وان کان رجل یورث متکلل النسب الی المیت۔

**مسئلہ نمبر 28**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کلالہ کا دو جگہوں پر ذکر فرمایا ہے۔ سورہ کے آخر میں اور یہاں۔ اور

دونوں جگہوں میں بھائیوں کے علاوہ کسی وارث کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور رہی یہ آیت تو علماء کا اجماع ہے کہ اس میں بھائیوں سے مراد ماں کی طرف سے بھائی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ (اگر وہ زیادہ ہوں اس سے تو وہ تہائی میں شریک ہیں) اور حضرت سعد بن ابی وقاص ولہ اخ واخت من امہ پڑھتے تھے اور اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ سگے بھائی یا باپ کی طرف سے بھائی ان کی میراث اس طرح نہیں ہے پس ان کا اجماع دلیل ہے کہ سورۃ کے آخر میں جن بھائیوں کا ذکر ہے وہ متوفی کے سگے بھائی ہیں یا باپ کی طرف سے بھائی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ اور اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ماں کی طرف سے بھائیوں کی میراث اس طرح نہیں۔ پس یہ دونوں آیتیں دلالت کرتی ہیں کہ تمام بھائی کلالۃ ہیں۔ شعبی نے کہا: اولاد اور والد کے علاوہ ورثاء کلالۃ ہیں خواہ وہ بھائی ہوں یا دوسرے عصبہ ہوں۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت زید اور حضرت ابن عباس نے بھی یہی فرمایا ہے اور پہلا قول بھی یہی ہے جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ طبری نے کہا: درست بات یہ ہے کہ کلالۃ وہ لوگ ہیں جو میت کے وارث ہوتے ہیں سوائے اولاد اور والد کے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خبر صحیح میں ہے۔ ”میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کلالہ میرے وارث ہوں گے کیا میں سارے مال کی وصیت کر دوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں“۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ اہل لغت نے کہا: کہا جاتا ہے رجل کلالۃ و امرأۃ کلالۃ۔ اس کا نہ تثنیہ ہوتا ہے اور نہ جمع، کیونکہ یہ مصدر ہے جیسے وکالۃ، دلالۃ، سماحۃ، شجاعۃ۔ اس کی طرف ضمیر مفرد لوٹائی فرمایا: ولہ اخ، لھما کی ضمیر نہیں ذکر فرمائی۔ عربوں کی عادت پر مرد اور عورت پہلے ذکر ہو چکے ہوں تو جب وہ دو اسم ذکر کرتے ہیں پھر ان کے متعلق خبر دیتے ہیں اور وہ دونوں ایک حکم میں ہوتے ہیں تو کبھی ایک اسم کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے اور کبھی دونوں کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے۔ عرب کہتے ہیں: جس کے پاس غلام اور لونڈی ہوں تو کہتے ہیں: فلیحسن الیہ والیھما والیھم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (بقرہ:45)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (النساء:135)

اور اَوْلٰى بِهِمَا جائز ہے۔ یہ فراء وغیرہ سے مروی ہے۔ اور امرأۃ کے لیے مرأۃ بھی کہا جاتا ہے یہ اس کی اصل ہے۔ اخ کی اصل اَخَوٌ ہے اس پر دلیل اخوان ہے۔ اخ سے واؤ کو حذف کیا گیا اور بغیر قیاس کے اس میں یہ تبدیلی کی گئی۔ فراء نے کہا: اخت کے ہمزہ کو ضمہ دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے واؤ کو حذف کیا گیا ہے اور بنت کے پہلے حرف کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے یاء حذف کی گئی ہے اور یہ حذف اور تعلیل غیر قیاسی ہے۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ۔ یہ تشریک مذکر اور مؤنث کے درمیان برابری کا تقاضا کرتی ہے اگرچہ زیادہ بھی ہوں، جب وہ ماں کی وجہ سے حصہ پائیں گے تو مؤنث پر مذکر کو ترجیح نہ ہوگی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے اور فرائض میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مذکر اور مؤنث برابر ہوں مگر ماں کی طرف سے بھائیوں کی میراث میں یہ برابر ہوتے ہیں۔ جب کوئی عورت فوت ہو جائے اور اپنا خاوند، ماں اور ماں کی طرف سے بھائی

چھوڑ جائے تو خاوند کو نصف حصہ ملے گا، ماں کو 1/3 حصہ ملے گا اور 1/6 حصہ ماں کی طرف سے بھائی کو ملے گا۔ اور اگر دو بھائی اور دو بہنیں چھوڑے تو مسئلہ پھر بھی اسی طرح ہوگا خاوند کے لیے 1/2 ماں کے لیے 1/6 اور بھائیوں اور بہنوں کے لیے 1/3 حصہ ہوگا۔ اس طرح فریضہ مکمل ہو گیا۔ اسی پر عام صحابہ کا مسلک ہے۔ کیونکہ انہوں نے ماں کو بھائی اور بہن کی وجہ سے ثلث سے سدس کی طرف مجوب کر دیا ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عول کا اعتبار نہیں کیا۔ اگر ماں کے لیے 1/3 ہوں تو مسئلہ میں عول ہوگا اور وہ عول کا نظریہ نہیں رکھتے۔ عول کی وضاحت دوسرے مقام پر آئے گی یہ اس کا مقام نہیں ہے۔ اگر عورت اپنے خاوند، ماں کی طرف سے بہت سے بھائی اور سگا ایک بھائی چھوڑ کر جائے تو خاوند کے لیے 1/2 حصہ ہوگا ماں کی طرف سے بھائیوں کو 1/3 حصہ ملے گا اور باقی مال سگے بھائیوں کے لیے ہوگا۔ اسی طرح جس کے لیے مقررہ حصہ ہوگا وہ اسے دیا جائے گا اور باقی اگر بچے گا تو عصبہ کے لیے ہوگا۔ اگر عورت چھ متفرق بھائی چھوڑ جائے تو یہ مسئلہ حماریہ ہے اسے مشترکہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک قوم نے کہا: ماں کی طرف سے بھائیوں کے لیے 1/3 ہے اور خاوند کے لیے 1/2 ہے اور ماں کے لیے 1/6 ہے۔ سگے بھائی اور بہن اور باپ کی طرف سے بھائی اور بہن محروم ہو جائیں گے۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوموسیٰ، شعبی، شریک اور یحییٰ بن آدم سے یہی مروی ہے اور یہی قول امام احمد بن حنبل کا ہے اور ابن المنذر نے اس کو اختیار کیا ہے، کیونکہ خاوند، ماں اور ماں کی طرف سے بھائی اصحاب فرائض ہیں اور عصبہ کے لیے کچھ نہیں بچا ہے۔ ایک قوم نے کہا: ماں ایک ہے اور ان کا باپ گدھا تھا اور انہوں نے ان کے درمیان ثلث میں اشتراک کی ہے اسی وجہ سے اسے مشترکہ اور حماریہ مسئلہ کہتے ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود، مسروق اور شریح سے یہی مروی ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ مسئلہ درست نہیں رہتا اگر میت مرد ہو۔ یہ علم الفرائض کے مسائل تھے جن کو یہ آیت متضمن تھی واللہ الموفق۔

زمانہ جاہلیت میں وراثت مرد ہونے اور قوت والا ہونے کی حیثیت سے جاری ہوتی تھی اور لوگ صرف مردوں کو وارث بناتے تھے عورتوں کو وارث نہیں بناتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ، وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ کے ارشاد کے ساتھ اس باطل نظریہ کو ختم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ورثاء زمانہ جاہلیت میں اسی طرح تھے اور اسلام کے آغاز میں حلیف ہونے کے اعتبار سے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ حلیف ہونے کے بعد ہجرت کی وجہ سے ورثہ ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (الانفال: 72) اس کی تفصیل آئندہ آئے گی وہاں ذوی الارحام اور ان کی میراث کے متعلق قول آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۃ النور میں ملاعنۃ کے لڑکے ولد الزنا (حرامی) اور مکاتب کی میراث کا ذکر توفیق الٰہی سے ہو گا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: وہ قیدی جس کی زندگی معلوم ہو اس کی میراث ثابت ہے، کیونکہ وہ بھی ان مسلمانوں میں داخل ہے جن پر احکام اسلام جاری ہوتے ہیں اور سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ جو دشمن کے ہاتھ میں قیدی ہے وہ وارث نہیں ہے اور مرتد کی میراث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

**مسئلہ نمبر** 31۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے غَيْرَ مُضَآرٍّ اس کو نصب حال کی بنا پر ہے اور اس کا عامل یوصی ہے۔ ای یوصی بھا غیر مضار۔ یعنی ورثاء پر ضرر (نقصان) کو داخل کرنے والا نہ ہو یعنی اسے اپنے اوپر ایسے قرض کی وصیت کرنا مناسب نہیں جو اس پر نہیں ہے، تاکہ ورثاء کو ضرر نہ ہو اور نہ قرض کا اقرار کرے۔ الاضرار کا تعلق وصیت اور دین سے (قرض) ہے۔ رہا وصیت کی طرف اس کا مرجع تو وہ یہ ہے کہ وہ 1/3 حصہ سے زائد کی وصیت کر دے یا کسی وارث کے لیے وصیت کر دے اگر وہ 1/3 سے زائد کی وصیت کرے گا تو اسے لوٹایا جائے گا مگر یہ کہ ورثاء اسے جائز قرار دیں، کیونکہ زیادہ وصیت سے روکنا ورثاء کے حقوق کی وجہ سے ہے نہ کہ حق اللہ کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ وارث کے لیے وصیت کرے گا تو وہ میراث کی طرف لوٹے گا۔ علماء کا اجماع ہے کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ رہا اضرار کو قرض کی طرف لوٹانا تو وہ یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں قرض کا اقرار کرے جس میں اس کے لیے اقرار جائز نہیں ہے جیسا کہ اگر وہ مرض میں وارث کے لیے یا مہربان دوست کے لیے قرض کا اقرار کرے تو یہ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے غیر مضار وصیة من اللہ پڑھا ہے یعنی مضار کو وصیت کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ اسم فاعل مصدر کی طرف مضاف نہیں ہوتا اور حذف پر قرأت بہتر ہے اور معنی یہ ہے غیر مضار ذی وصیة۔ یعنی وہ وصیت کی وجہ سے اپنے ورثاء کو ان کی میراث میں نقصان دینے والا نہ ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ حالت مرض میں غیر وارث کے لیے قرض کا اقرار جائز ہے جبکہ صحت کی حالت میں اس پر قرض نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر** 32۔ اگر صحت کی حالت میں قرض اس پر دلیل سے ثابت ہو اور وہ اجنبی کے لیے قرض کا اقرار کرے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ صحت کے دین سے ادائیگی کا آغاز کیا جائے گا۔ یہ نخعی اور کوفیوں کا قول ہے۔ فرماتے ہیں: حالت صحت میں قرض دینے والا جب اپنا قرض وصول کر لے گا تو مرض میں جن لوگوں کے لیے اس نے قرض کا اقرار کیا ہے پھر وہ حصہ لیں گے۔ ایک طائفہ نے کہا کہ حالت صحت میں قرض دینے والے اور حالت مرض میں جن کے لیے اس میت نے اقرار کیا ہے دونوں برابر ہوں گے جب کہ وہ اقرار غیر وارث کے لیے ہو۔ یہ امام شافعی، ابو ثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ یہ اہل مدینہ کا قول ہے اور انہوں نے حسن سے یہ روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 33۔ سورۂ بقرہ میں وصیت میں اضرار کے بارے میں وعید اور اس کی وجوہ گزر چکی ہیں۔ ابوداؤد نے شہر بن حوشب (اس پر طعن کیا گیا ہے) کی حدیث سے روایت کیا ہے شہر بن حوشب نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مرد یا عورت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عمل ساٹھ سال کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے تو وہ وصیت میں نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لیے آگ ثابت ہو جاتی ہے(1)۔ فرمایا: حضرت ابوہریرہ نے مجھ پر یہ آیت مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ سے لے کر ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ تک پڑھی۔ حضرت

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی کراھیۃ الاضرار فی الوصیۃ، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عباس نے فرمایا: وصیت میں اضرار، کبیرہ گناہوں میں سے ہے یہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے مگر امام مالک اور ابن القاسم کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وصیت کرنے والے کا فعل 1/3 حصہ میں نقصان دینے والا شمار نہ ہوگا، کیونکہ تہائی میں تصرف کرنا اس کا حق ہے جیسے چاہے تصرف کرے۔ اور المذہب میں یہ قول ہے کہ نقصان کی صورت میں اسے لوٹایا جائے گا۔ وباللہ التوفیق

**مسئلہ نمبر 34۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَصِيَّةً اس کو حال کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے، یہ مصدر ہے اس کا عامل يُوْصِيْكُمُ ہے۔ اس میں مضار کا عمل کرنا بھی صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کے ساتھ ضرر واقع ہو یا اس کے سبب واقع ہو اس پر ضرر کا وقوع مجازاً ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے غَيْرَ مُضَآرِّ وَصِيَّةٍ کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے جیسے تو کہتا ہے: شجاع حرب وبغضة المتجرد۔ یہ طرفہ بن العبد کے شعر میں استعمال ہوا ہے اور معنی کی صحت کی وجہ سے لفظ میں مجاز ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر فرمایا: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ یعنی اہل میراث کو جاننے والا ہے اور تم میں جاہل لوگوں کو جاننے والا ہے اور بعض متقدمین نے واللہ علیم حکیم پڑھا ہے یعنی میراث اور وصیت کی تقسیم کو پختہ کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 35۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، تلك، هذه کے معنی میں ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جن کو اس نے تمہارے لیے بیان کیا ہے تاکہ تم ان کو پہچان لو اور ان کے مطابق عمل کرو۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جو میراث کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور اس کا اقرار کرے گا اور ان کے مطابق عمل کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے: يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، تَجْرِيْ جنت کی نعت کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی جو میراث کی تقسیم نہیں کرتا اور ان پر عمل نہیں کرتا وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ اور اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کرتا ہے يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا۔ اگر نافرمانی سے مراد کفر ہے تو آگ میں ہمیشہ رہنا اپنے مفہوم پر صحیح ہوگا، اگر اس سے مراد گناہ کبیرہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے اوامر سے تجاوز ہو تو ہمیشہ رہنا ایک مدت تک کے لیے ہوگا۔ جیسے تو کہتا ہے: خلد الله ملكه (اللہ تعالیٰ اس کا ملک ہمیشہ رکھے) زہیر نے کہا:

ولا خالداً الا الجبال الرواسیا

(یعنی گاڑھے ہوئے پہاڑوں کے علاوہ کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں) یہ مفہوم بہت سے مقام پر گزر چکا ہے۔ نافع اور ابن عامر نے ندخله اور دونوں جگہ نون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت فرمائی ہے اور باقی علماء نے دونوں جگہ یا کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے داخل کرے گا۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮

''اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بند کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کرے

ان ( کی زندگی ) کو موت یا بنا دے الله تعالیٰ ان ( کی رہائی ) کے لیے کوئی راستہ''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ نے اس سورت میں عورتوں سے حسن سلوک کرنے اور انہیں مہر دینے کا ذکر فرمایا تو پھر مردوں کے ساتھ ان کی میراث کا بھی ذکر فرمایا اور وہ اگر غلط کاری کریں تو ان پر سختی کرنے کا ذکر فرمایا تا کہ عورت کو یہ وہم نہ ہو کہ اس کے لیے پاکدامنی کا ترک بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰتِیْ یہ التی کی جمع ہے یہ مؤنث کے لیے مبہم اسم ہے اور یہ معرفہ ہے نکرہ بنانے کے لیے اس سے الف، لام کو دور کرنا جائز نہیں ہے اور یہ صلہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ اس میں تین لغات ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس کی جمع اللاتِ یعنی یا کے حذف اور کسرہ کے باقی رکھنے کے ساتھ بھی بنائی جاتی ہے اور اللائی ہمزہ اور یا کے اثبات کے ساتھ بھی جمع آتی ہے اور اللاء ہمزہ کے کسرہ اور یا کے حذف کے ساتھ بھی آتی ہے اللا ہمزہ کے حذف کے ساتھ بھی جمع آتی ہے اگر تو جمع کی جمع بنائے تو اللاتی کی جمع اللواتی اور اللاء کی جمع اللوائی بنائے گا۔ عربوں سے اللوات یعنی تا کے حذف اور کسرہ کے اثبات کے ساتھ بھی مروی ہے۔ یہ ابن الشجری کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ابو عبیدہ نے یہ شعر کہا ہے:

من اللّواتِی والتِی واللاّتِ　　زَعَمْن أنْ قد كَبُرتُ لِداتِ

اللوا، تا کے اسقاط کے ساتھ ہے۔ التی کی تصغیر اللّتَیّا فتحہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔ راجز نے کہا:

بعد اللُّتیا واللّتیا والتی

بعض شعراء نے التی پر حرف ندا داخل کیا ہے جب کہ حروف ندا اس اسم پر داخل نہیں ہوتے جس پر الف لام ہو سوائے ہمارے قول: یا الله کے۔ گویا التی کو اس اسم جلالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس حیثیت سے کہ الف، لام اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

من أجلِك یالتِی تَیَمّتِ قلبِی　　وأنتِ بَخِیلَةٌ بِالوَدِّ عَنِّی

کہا جاتا ہے: یہ اللّتیا اور اللّتی یہ دونوں داھیۃ ( مصیبت ) کے اسماء میں سے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ یہاں فاحشۃ سے مراد زنا ہے اور الْفَاحِشَةَ برے فعل کو کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے جیسے عاقبۃ اور عافیۃ مصدر ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے با جارہ کے ساتھ بالفاحشۃ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اسلام کے معنی میں اضافت ہے اور مومن عورتوں کی حالت کا بیان ہے جیسے ارشاد فرمایا: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ( بقرہ: 282 ) کیونکہ کافرہ کبھی نسب کی وجہ سے مسلمانوں کی عورتوں سے ہوتی ہے اس کو یہ حکم لاحق نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ یعنی مسلمانوں میں سے ان پر چار گواہ بناؤ۔ الله تعالیٰ نے زنا پر خصوصی طور پر چار گواہ مقرر فرمائے، مدعی پر تغلیظ اور بندوں کی پردہ پوشی کے لیے اور زنا پر چار

گواہوں کی تعدیل کا حکم تورات، انجیل اور قرآن میں ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً (النور: 4)

اور یہاں فرمایا: فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: یہود اپنے ایک مرد اور عورت کو لے آئے جنہوں نے زنا کیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے پاس اپنے دو عالم آدمی لے آؤ، تو وہ صوریا کے دو بیٹے لے آئے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: تم تورات میں ان دونوں کا معاملہ کیسے پاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم تورات میں دیکھتے ہیں کہ جب چار آدمی گواہی دیں کہ انہوں نے اس کا آلہ تناسل، عورت کی شرمگاہ میں اس طرح دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سرچو ہوتا ہے تو ان دونوں کو رجم کیا جائے گا۔ فرمایا: تم لوگوں کو کون سی چیز ان کے رجم کرنے سے مانع تھی؟ انہوں نے کہا: ہماری سلطانی چلی گئی، پس ہم قتل کو ناپسند کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے گواہوں کو بلایا وہ آئے اور گواہی دی کہ انہوں نے اس کا ذکر اس کی فرج میں سرمہ دانی میں سرچو کی طرح دیکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا حکم دیا (1)۔ ایک قوم نے کہا: زنا میں چار گواہ ہیں تا کہ زنا کرنے والوں میں سے ہر ایک پر دو دو گواہ گواہی دیں جس طرح دوسرے حقوق میں گواہ گواہی دیتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا حق ہے جو ان میں سے ہر ایک سے لیا جائے گا۔ یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ قسم، اموال میں داخل ہوتی ہے اور اللوث، قسامت میں داخل ہے اور ان میں سے یہاں کسی ایک کا دخل نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ گواہوں کے لیے مذکر ہونا ضروری ہے، کیونکہ ارشاد ہے مِّنْكُمْ اس میں امت کا کوئی اختلاف نہیں اور گواہ عادل ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیوع اور رجعت میں عدالت شرط قرار دی ہے۔ یہ بڑا معاملہ ہے اور یہ اس کے لیے اولیٰ ہے اور یہ دلیل کے ساتھ مقید پر مطلق کو حمل کرنے سے ہے جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔ گواہ ذمی نہ ہوں گے اگرچہ حکم، ذمیہ پر بھی لگایا ہو۔ سورۂ مائدہ میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور امام ابوحنیفہ نے اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ کے قول سے اس مسئلہ میں دلیل پکڑی ہے کہ قذف میں جب ایک گواہ خاوند ہو تو لعان نہ ہوگا اس کا بیان ان شاء اللہ، سورۂ نور میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ یہ زنا کرنے والوں کی پہلی سزا ہے اور یہ ابتداء اسلام میں تھا۔ یہ حضرت عبادہ بن صامت، حسن اور مجاہد کا قول ہے حتیٰ کہ بعد والی اذیت کے ساتھ یہ سزا منسوخ ہوگئی پھر وہ اذیت سورۂ نور کی آیت کے ساتھ اور ثیبہ میں رجم کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ ایک فرقہ نے کہا: اذیت پہلی سزا تھی پھر امساک کے ساتھ وہ منسوخ ہوگئی لیکن تلاوت مؤخر مقدم کی گئی۔ یہ ابن فورک کا قول ہے اور یہ گھروں میں امساک اور حبس ابتداء اسلام میں تھا جب کہ ایسا جرم کرنے والے کم تھے، جب زیادہ ہوگئے اور ان کی قوت کا خدشہ ہوا تو ان کے لیے قید بنائی گئی۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ قید حد تھی یا حد کی وعید دی تھی؟ دو قول ہیں (۱) حد کی دھمکی دی گئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔ ابن زید نے یہ زائد کہا ہے کہ انہیں نکاح کرنے سے منع کیا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب فی رجم الیہودیین، حدیث نمبر 3862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا حتی کہ وہ مر جائیں یہ ان کے لیے بطور سزا ہے جب انہوں نے نکاح کو بغیر وجہ کے طلب کیا۔ یہ دلیل ہے کہ وہ حد تھی بلکہ اس سے بھی سخت تھی مگر یہ حکم ایک حد تک محدود تھا اور وہ دوسری آیت میں اذیت ہے، دونوں تاویلوں کے اختلاف پر کہ کون سی آیت پہلے ہے۔ دونوں سزائیں ایک حد تک محدود تھیں۔ اور وہ غایت حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث میں موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ سے حاصل کرو، مجھ سے حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راستہ بنایا ہے کنوارے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ کی سزا سو کوڑے اور رجم ہے"۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (بقرہ: 187) جب رات آئے گی تو اس کی غایت کی انتہا کی وجہ سے روزے کا حکم اٹھ جائے گا نہ کہ اس کے منسوخ ہونے کی وجہ سے حکم اٹھ جائے گا۔ یہ متاخرین محققین اصولین کا قول ہے۔ نسخ دو متعارض قولوں میں ہوتا ہے جن کو کسی اعتبار سے جمع کرنا ممکن نہ ہو اور قید، تعزیر، کوڑے اور رجم کو جمع کرنا ممکن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اذیت اور تعزیر، کوڑوں کے ساتھ باقی ہے، کیونکہ یہ متعارض نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں ایک شخص پر لاگو کیے جائیں گے، رہا قید کرنا، تو یہ اجماع کے ساتھ منسوخ ہے اور متقدمین کا ایسی صورت میں نسخ کا اطلاق مجازاً ہے۔

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ⑯

"جو مرد عورت ارتکاب کریں بدکاری کا تم میں سے تو خوب اذیت دو انہیں پھر اگر دونوں توبہ کرلیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں تو چھوڑ دو انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذٰنِ یہ الذی کا تثنیہ ہے اور قیاس یہ تھا کہ اللذیان کہا جاتا جیسے رحیان، مصطفیان، شجیان۔ سیبویہ نے کہا: یا کو حذف کیا گیا ہے تا کہ اسماء متمکنہ اور اسماء مبہمات میں فرق ہو جائے۔ ابوعلی نے کہا: یا کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے، کیونکہ اللذان میں التباس کا امن ہے کیونکہ نون حذف نہیں ہوتی۔ اسماء متمکنہ میں تثنیہ کا نون اضافت کے ساتھ حذف ہوتا ہے جیسے رحیان، **مصطفیا القوم**۔ اگر یا حذف ہو تو تثنیہ کے ساتھ مفرد مشتبہ ہو جائے گا۔ ابن کثیر نے اللذان کو نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قریش کی لغت ہے اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ تشدید، زا کے الف کا بدل ہے اس کی وضاحت سورۃ القصص میں فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ کے تحت آئے گی۔ اس میں دوسری لغت ہے اللذا یعنی نون کے حذف کے ساتھ ہے۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا: نون کو حذف کیا گیا ہے، کیونکہ صلہ کی وجہ سے اسم طویل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ھذان اور فذانك برھان پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے صرف فذانك برھانان پڑھا ہے۔ اللذان ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ سیبویہ نے کہا: اس کا معنی ہے **فیما یتلی علیکم اللذان یاتیانھا**۔ **ھا** ضمیر سے مراد **فاحشۃ** ہے۔ **فآذوھما** میں فا داخل کیا گیا ہے، کیونکہ کلام میں امر کا معنی ہے، کیونکہ جب الذی فعل کے ساتھ ملایا گیا تو اس میں شرط کا معنی پایا گیا، کیونکہ اس پر کوئی معین شی واقع نہیں ہوئی۔ جب

شرط اور ابہام اس میں پایا گیا تو شرط کے قائم مقام ہوا پس فا داخل ہوئی۔ ماقبل مضمر اس پر عمل نہیں کرتا جس طرح اس کا ماقبل شرط میں عمل نہیں کرتا جب ان سے پہلے فعل کا اضمار اچھا نہیں تاکہ دونوں کو نصب دے تو ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا۔ یہ سیبویہ کا اختیار ہے۔ فعل کے اضمار کی تقدیر پر نصب جائز ہے یہ مختار ہے جب کلام میں امر، نہی کا معنی ہو جیسے تیرا قول ہے الذی عندك فاكرمها۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰذُوْهُمَا قتادہ اور سدی نے کہا: اس کا مطلب توبیخ اور عار دلانا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ بغیر عار دلائے جفا اور سب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ زبان سے تنبیہ اور جوتوں سے مارنا ہے۔ نحاس نے کہا: ایک قوم نے کہا: یہ منسوخ ہے۔ میں کہتا ہوں: ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ۔ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا یہ ابتدا میں حکم تھے پھر سورۃ النور کی آیت نے ان دونوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولیٰ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے یہ ان کو توبیخ کے ساتھ ادب سکھانا واجب ہے۔ انہیں کہا جائے گا: تو نے فجور کیا تم نے فسق کیا اور تم نے اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الّٰتِیْ اور الَّذٰنِ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: سورۃ النساء کی پہلی آیت عام ہے شادی شدہ عورتیں ہوں یا غیر شادی شدہ ہوں اور دوسری آیت مردوں کے متعلق خاص ہے۔ تثنیہ کے لفظ نے مردوں کی دونوں قسموں کو بیان کیا جو شادی شدہ ہیں اور جو غیر شادی شدہ ہیں عورتوں کی سزا قید کرنا ہے اور مردوں کی سزا اذیت ہے۔ لفظ اس قول کا مقتضی ہے اور کلام کی نص زانیوں کی تمام اقسام کو شامل ہے اور پہلی آیت میں مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اور دوسری آیت میں مِنْكُمْ کا ارشاد لفظ کی جہت سے اسی قول کی تائید کرتا ہے۔ نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اور انہوں نے یہ قول حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ سدی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: المحصنات کا لفظ جو پہلی آیت میں ہے اس میں مردوں میں سے جو شادی شدہ ہیں وہ بھی ان کے ساتھ داخل ہیں، دوسری آیت میں مرد اور عورت جو کنوارے ہیں وہ داخل ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس قول کا معنی مکمل ہے مگر آیت کا لفظ اس سے پوری مناسبت نہیں رکھتا۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے اور نحاس نے اس کا انکار کیا ہے اور فرمایا: مذکر پر مؤنث کو غلبہ دینا بعید ہے، کیونکہ کوئی چیز مجاز کی طرف نہیں نکالی جاتی جب کہ حقیقت میں اس کا معنی صحیح ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: زانیہ کو روکنا ہے جبکہ زانی کو روکنا نہیں ہے۔ روکنے میں عورت خصوصی طور پر ذکر کی گئی ہے پھر اذیت میں دونوں جمع کیے گئے ہیں۔ قتادہ نے کہا: عورت کو قید کیا جائے گا اور دونوں کو اکٹھی اذیت دی جائے گی۔ یہ اس لیے ہے، کیونکہ مرد محنت و مزدوری کا محتاج ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مقتضیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس میں زانیوں کے احکام کا بیان ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے مقتضی کے مطابق عمل کیا ان سے اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے اور انہوں نے شراحہ ہمدانیہ کو سو کوڑے لگائے تھے اور اس کے بعد اسے رجم کیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے کتاب اللہ کے حکم سے اسے کوڑے لگائے ہیں اور سنت رسول کی وجہ سے اسے رجم کیا ہے۔ یہ قول حسن بصری، حسن بن صالح

بن حیی اور اسحاق کا ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا شادی شدہ زانیہ پر بغیر کوڑوں کے رجم ہوگا۔ یہ حضرت عمر سے مروی ہے اور یہ قول زہری، نخعی، مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، اصحاب رائے، امام احمد، ابوثور کا ہے۔ ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے فعل سے دلیل پکڑی ہے کہ آپ ﷺ نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا تھا اور دونوں کو کوڑے نہیں لگائے تھے اور نبی کریم ﷺ نے حضرت انیس سے کہا تھا: تم اس کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ بھی اپنے جرم کا اعتراف کرلے تو اسے رجم کردو۔ دونوں نے کوڑے مارنے کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر یہ مشروع ہوتے تو آپ ﷺ خاموش نہ رہتے۔ ان کو کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ اس لیے خاموش رہے، کیونکہ وہ کتاب اللہ سے ثابت تھے شہرت اور قرآن میں تنصیص کی وجہ سے خاموش رہنا ممتنع نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور:2) یہ تمام زانیوں کو عام ہے واللہ اعلم۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فعل خلفاء راشدین سے ماخوذ تھا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ اسے کہا گیا: تو نے منسوخ پر عمل کیا اور ناسخ کو چھوڑ دیا۔ یہ تو واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ کنوارے آدمی کو کوڑے لگانے کے ساتھ جلاوطن کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ کوڑوں کے ساتھ اسے جلاوطن بھی کیا جائے گا۔ یہ خلفاء راشدین حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن عمر کا بھی یہی قول ہے۔ عطا، طاؤس، سفیان، امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور کا قول ہے اور حماد بن ابی سلیمان، امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن نے جلاوطنی کے ترک کا قول کیا ہے۔ جمہور کی حجت حضرت عبادہ کی حدیث ہے اور حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد کی حدیث ہے اور العسیف (نوکر) والی حدیث ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، رہی بکریاں اور لونڈی، تو وہ تجھے واپس کی جائے گی۔ آپ ﷺ نے اس کے بیٹے کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال جلاوطن کیا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے نقل کیا ہے اور جو علماء جلاوطن کرنے کا نظریہ نہیں رکھتے وہ لونڈی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں، اس میں کوڑوں کا ذکر ہے جلاوطنی کا ذکر نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے زہری سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حضرت عمر نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب کی حد میں خیبر کی طرف جلاوطن کیا تو وہ ہرقل سے جا ملا اور نصرانی ہوگیا۔ حضرت عمر نے کہا: اس کے بعد کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر جلاوطن کرنا اللہ تعالیٰ کی حد ہوتی تو اس کے بعد حضرت عمر اسے ترک نہ کرتے۔ پھر کتاب میں جو نص ہے وہ کوڑے ہیں اور نص پر زیادتی نسخ ہے۔ پس اس سے ایک قطعی حکم کا خبر واحد کے ساتھ نسخ لازم آتا ہے۔ جمہور علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں حضرت ابوہریرہ کی حدیث لونڈیوں کے متعلق ہے، نہ کہ آزاد لوگوں کے متعلق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے لونڈی کو زنا کی وجہ سے مارا اور اسے جلاوطن بھی کیا۔ اور رہی حضرت عمر کی حدیث اور ان کا قول کہ میں اس کے بعد کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا، یہ شراب کے بارے میں ہے۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ نافع نے حضرت ابن عمر سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

مارا اور جلاوطن کیا۔ حضرت ابوبکر نے مارا اور جلاوطن کیا، حضرت عمر نے مارا اور جلاوطن کیا(1)۔ یہ ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کی ہے اور نسائی نے اپنی سنن میں ابو کریب محمد بن علا ہمدانی عن عبداللہ بن ادریس عن عبیداللہ بن عمر عن نافع کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ دارقطنی نے کہا: عبداللہ بن ادریس اس حدیث کو روایت کرنے میں منفرد ہیں، ابو کریب کے علاوہ کسی ثقہ راوی نے اسے مسند روایت نہیں کیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ جلاوطنی مروی ہے، پس اس کے ہوتے ہوئے کلام کی گنجائش نہیں اور جس نے سنت کی مخالفت کی، سنت ہی اس سے مخاصمت کرے گی۔ وباللہ التوفیق۔

رہاان کا یہ قول کہ نص پر زیادتی نسخ ہے۔ یہ مسلم نہیں ہے، بلکہ اصل کے ساتھ دوسرے حکم کی زیادتی ہے۔ پھر وہ خبر واحد صحیح کے ساتھ پانی پر نبیذ کے وضو کرنے کی زیادتی کرتا ہے اور قربیٰ میں فقر کی شرط لگاتا ہے، اس کے علاوہ بہت سی چیزیں ہیں جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں خبر واحد کے ساتھ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جلاوطنی کے قائل علماء کا مذکر آزاد کو جلاوطن کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ غلام اور لونڈی کو بلا وطن کرنے میں اختلاف ہے۔ جو علماء غلام اور لونڈی کو جلاوطن کرنے کی رائے رکھتے ہیں ان میں حضرت ابن عمر بھی ہے۔ حضرت ابن عمر نے اپنی لونڈی کو زنا کی وجہ سے کوڑے لگائے اور فدک کی طرف جلاوطن کیا۔ امام شافعی، ابوثور، ثوری، طبری اور داؤد کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول غلام کی جلاوطنی کے بارے میں مختلف ہے۔ کبھی تو انہوں نے کہا: میں غلام کو جلاوطن کرنے میں اللہ سے استخارہ کروں گا، اور کبھی فرمایا: نصف سال جلاوطن کروں گا، کبھی فرمایا: ایک سال دوسرے شہر کی طرف بھیج دوں گا۔ یہی طبری کا قول ہے۔ لونڈی کی جلاوطنی کے بارے میں بھی دو قول ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: مرد کو جلاوطن کیا جائے گا عورت اور غلام کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا اور جس کو جس شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے اس میں اسے قید کر دیا جائے گا۔ مصر سے حجاز، شغب، اسوان اور اس جیسے شہروں کی طرف جلاوطن کیا جائے گا مدینہ سے خیبر اور فدک کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسی طرح کیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے بصرہ کی طرف جلاوطن کیا تھا۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے۔ ابن عربی نے کہا: جلاوطنی کی اصل یہ ہے کہ بنی اسماعیل نے اجماع کیا تھا کہ جو حرم میں کوئی گناہ کرے گا اسے حرم سے جلاوطن کر دیا جائے گا پس یہ سنت ہوگی وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سنت بن گئی کہ جب کوئی جرم کرے گا اسے اس کے شہر سے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ جاری رہا حتی کہ اسلام آگیا۔ پس اسلام نے زنا میں اس کو خصوصی طور پر برقرار رکھا۔ اور جو علماء غلام پر جلاوطنی کا نظریہ نہیں رکھتے وہ لونڈی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ غلام کو جلاوطن کرنا اس کے مالک کو سزا دینا ہے، کیونکہ جلاوطنی کی مدت میں اس کے منافع سے اسے روکنا ہے۔ یہ شرع کا تصرف مناسب نہیں پس غیر مجرم کو سزا نہیں دی جاتی۔ اسی وجہ سے جمعہ، حج اور جہاد اس سے سردار کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا، کیونکہ وہ حق اللہ ہے۔ اسی طرح جلاوطنی ہے۔ 1

عورت جب جلاوطن کی جائے گی تو اکثر اس کا فاحشہ سبب ہوتا ہے اور یہ جلاوطنی اس کی شرمگاہ کے کھولنے اور اس کی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود عن رسول اللہ، باب ما جاء فی النفی، حدیث نمبر 1358، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حالت کو ضائع کرنے کا سبب ہے، کیونکہ اصل اس کو گھر سے نکلنے سے منع کرنا ہے اور اس کی نماز بھی گھر میں افضل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کو خروج کے لباس سے علیحدہ کرو وہ گھر کو لازم پکڑیں۔ پس اس سے تغریب کی حدیث کے عموم کی تخصیص حاصل ہو گی۔ اس مصلحت کی وجہ سے جس کی شہادت اعتبار کے ساتھ دی گئی ہے۔ اصولیین اور اہل نظر کے نزدیک اس میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے شاذ قول کیا ہے کہ کوڑوں اور رجم کو شیخ پر جمع کیا جائے گا، جوان کو کوڑے لگائے جائیں گے انہوں نے حضرت زید بن ثابت کی حدیث میں لفظ الشیخ سے دلیل پکڑی ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة۔ اس حدیث کو نسائی نے نقل کیا ہے۔ اس طائفہ کا یہ قول فاسد ہے، کیونکہ دوسری حدیث میں الثیب کا ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ تَابَا یعنی اگر وہ زنا سے توبہ کریں وَ اَصْلَحَا یعنی اس کے بعد عمل کی اصطلاح کریں۔ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا یعنی ان کی اذیت اور تعییر چھوڑ دو۔ یہ حدود کے نزول سے پہلے کا حکم تھا۔

جب حدود نازل ہوئیں تو اس آیت کو منسوخ کر دیا۔ اعراض سے مراد ہجرت نہیں ہے، لیکن ہجرت برائی کو چھڑانے والی ہے، اعراض کرانے والی ہے اس میں سابقہ معصیت کے سبب ان کے لیے حقارت ہے اور دوسری آیت میں جہالت کے مطابق احتقار ہے۔ واللہ تواب یعنی اپنے بندوں کے گناہوں سے رجوع کرنے والا ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓىِٕكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ وَ لَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

''توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے ان کی توبہ ہے جو کر بیٹھتے ہیں گناہ بے سمجھی سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے پس یہی لوگ ہیں (نظر رحمت سے) توجہ فرماتا ہے اللہ ان پر اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا۔ اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لیے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آجائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب اور نہ ان لوگوں کی توبہ جو مرتے ہیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں انہیں کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے عذاب دردناک''۔

اس آیت میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ہر اس شخص کو شامل ہے جس نے کوئی گناہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن سے جہالت کی بنا پر گناہ ہوا اور توبہ ہر اس شخص کے

لیے ہے جس نے دوسری جگہ میں گناہ کیا۔ اور امت کا اتفاق ہے کہ مومنین پر توبہ کرنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ (نور: 31) رجوع کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو!۔

اور ایک گناہ سے توبہ کرنا صحیح ہے جب کہ کسی دوسرے گناہ پر قائم بھی ہو جو اس پہلے گناہ کی نوع سے نہ ہو۔ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں: وہ توبہ کرنے والا شمار نہ ہوگا جو کسی بھی گناہ پر قائم ہو، دو معصیتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ (پہلا) مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے اگر چاہے تو اس کی توبہ قبول فرمالے چاہے تو قبول نہ فرمائے۔ عقل کے طریق سے بھی اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا واجب نہیں، جیسا کہ مخالف کا قول ہے، کیونکہ واجب کی شرط میں سے ہے کہ وہ موجب علیہ سے اعلیٰ مرتبہ ہو، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوق کا خالق اور مالک ہے اور ان کو مکلف بنانے والا ہے۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس پر کوئی چیز واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود خبر دی ہے۔ اور وہ اپنے وعدہ میں سچا ہے۔ کہ وہ اپنے گناہگار بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ: 25) وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (توبہ: 104) (کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) (اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی چیزوں کے متعلق خبر دی ہے کہ اس نے وہ چیزیں اپنے اوپر واجب کی ہیں، یہ ان چیزوں کے وجوب کا مقتضی ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ عقلاً اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ رہی نقلی دلیل تو اس کا ظاہر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرنا ہے۔ ابوالمعالی وغیرہ نے کہا: یہ ظواہر ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں۔ توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعی واجب نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ابوالمعالی وغیرہ کی اس معنی میں مخالفت کی گئی ہے۔ جب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خالص توبہ کی جس میں توبہ کی مکمل شرائط موجود تھیں تو ابوالمعالی نے کہا: اس کی توبہ کی قبولیت کا ظن غالب ہوتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق خبر دی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرا والد اسی قول کی طرف میلان رکھتا تھا اور اس کو راجح قرار دیتا تھا اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اس کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ اس توبہ کرنے والے کے بارے میں یہ معنی ختم کردے جو اس کے اس ارشاد میں ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (شوریٰ: 25) اور ارشاد ہے وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ (طٰہٰ: 82)

جب یہ ثابت ہوگیا تو تو جان لے کہ عَلَى اللّٰهِ کے کلمات میں حذف ہے یہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے، اس کا مطلب ہے علی فضل اللہ و رحمتہ بعبادہ۔ یہ اس طرح ہے جیسے حضرت معاذ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اتدری ما حق العباد علی اللہ؟۔ کیا تجھے معلوم ہے اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق کیا ہے؟ حضرت معاذ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان یدخلھم الجنۃ کہ انہیں جنت میں داخل کرے۔ ان تمام آیات اور احادیث کا مطلب یہ ہے کہ

اس کے فضل اور اس کی رحمت پر سچا وعدہ ہے اور اس کا قول سچا ہے اس کی دلیل یہ ارشاد ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام: 12) (واجب کرلیا ہے اس نے اپنے آپ پر رحمت فرمانا)

یعنی اس نے رحمت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں علی بمعنی عند ہے اور تقدیر عبارت عند اللہ ہے یعنی یہ اس کا وعدہ ہے اور اس کے وعدہ میں خلاف نہیں ہے وہ توبہ قبول فرماتا ہے جب وہ ایسی شرائط کے ساتھ ہو جو اسے درست کرنے والی ہیں۔ توبہ کی شرائط چار ہیں۔ دل سے شرمندہ ہونا، فی الحال معصیت کو ترک کرنا، دوبارہ وہ برائی نہ کرنے کا عزم کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ سے حیا کی وجہ سے ہو نہ کسی دوسرے کی وجہ سے ہو۔ جب ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ ہوگی تو توبہ صحیح نہ ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی شرائط میں سے یہ بھی ہے گناہ کا اعتراف کرنا، کثرت سے استغفار کرنا۔ سورۂ آل عمران میں توبہ کے بہت سے معانی اور اس کے احکام گزر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق توبہ حد کو ساقط نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا: چور مرد، چور عورت اور تہمت لگانے والا جب یہ توبہ کریں جب کہ ان کے خلاف گواہی قائم ہو چکی ہو تو ان پر حدود قائم کی جائیں گی۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں علی بمعنی من ہے یعنی انما التوبة من اللہ للذین ...... الخ یہ ابو بکر بن عبدوس کا قول ہے واللہ اعلم۔ توبۃ النصوح کے بارے میں کلام اور وہ اشیاء جن کی وجہ سے توبہ کی جاتی ہے ان پر گفتگو ان شاء اللہ سورۃ التحریم میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ اس آیت میں اور سورۂ انعام میں اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ میں سوء کا لفظ کفر اور گناہوں کو شامل ہے۔ جس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ جاہل تھا حتیٰ کہ وہ اپنے اس گناہ سے علیحدہ ہو جائے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اجماع ہے کہ ہر معصیت جہالت کی وجہ سے ہوتی ہے خواہ وہ عمداً ہو یا بے سمجھی کی وجہ سے ہو۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ ضحاک اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ یہاں جہالت سے مراد عمد (جان بوجھ کر) ہے۔ عکرمہ نے کہا: دنیا کے تمام امور جہالت ہیں ان کی مراد وہ دنیا کے اعمال ہیں جو اللہ کی اطاعت سے خارج ہیں۔ یہ قول اس ارشاد کے ساتھ جاری ہے اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (محمد: 36) (دنیوی زندگی کھیل اور تماشا ہے) زجاج نے کہا: بِجَهَالَةٍ کا مطلب ہے وہ فانی لذت کو باقی لذت پر ترجیح دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: بِجَهَالَةٍ کا مطلب ہے وہ عقوبت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ یہ ابن فورک نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ان کا یہ قول ضعیف قرار دیا گیا ہے اور رد کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے مرض اور موت سے پہلے (توبہ کرتے ہیں) ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: ہر وہ کام جو موت سے پہلے ہے وہ قریب ہے۔ ابو مجلز، ضحاک، عکرمہ اور ابن زید وغیرہ نے کہا: ملائکہ اور نزع کو دیکھنے سے پہلے اور انسان کے مغلوب ہونے سے پہلے وہ توبہ کرتے ہیں۔ محمود الوراق نے کتنا عمدہ کہا تھا:

قَدِّم لِنفِسكَ توبةً مرجوّةً　　قبلَ المَماتِ وقبلَ حبسِ الألسُنِ

بادِربها غَلقَ النفوسِ فإنّها　　ذُخرٌ وغُنمٌ لِلمُنِيبِ المُحسنِ

موت سے پہلے اور زبان پر قفل لگنے سے پہلے اپنے لیے توبہ آگے بھیجو جس کی امید کی جاسکتی ہو اور توبہ کرنے میں جلدی کرو فرصت کے ضیاع سے پہلے، کیونکہ محسن، منیب شخص کے لیے ذخیرہ اور غنیمت ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: انسان سے اس وقت بھی توبہ صحیح ہے، کیونکہ امید باقی ہے اس سے شرمندگی فعل کے ترک پر عزم صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی روح اس کے حلقوم تک نہیں پہنچ جاتی'' (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حدیث کا یہ معنی ہروی نے بیان کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے بغیر اصرار کے قریب زمانہ میں گناہ سے توبہ کرتے ہیں۔ صحت میں جلدی توبہ کرنے والا افضل ہے اور زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے عمل صالح کی امید ہے اور بعد سے مراد موت ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وأین مکانُ البُعدِ إلاّ مکانیا

صالح مری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسے گناہ کی وجہ سے عار دلائی جس سے وہ توبہ کر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس گناہ میں مبتلا کرے گا۔ حسن نے کہا: ابلیس جب زمین پر اترا تو اس نے کہا: مجھے تیری عزت کی قسم میں ابن آدم سے جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ روح اس کے جسم میں باقی ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ابن آدم کو توبہ سے محروم نہیں کروں گا جب تک کہ اس کی روح گلے تک نہیں پہنچ جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تائبین کے حکم میں داخل ہونے سے نفی کی ہے جن پر موت کا وقت قریب آجائے اور وہ مایوسی کے عالم میں پہنچ جائیں جیسا کہ فرعون تھا جب وہ پانی میں غرق ہونے لگا تو اس نے ایمان لانے کا اظہار کیا تو اس اظہار ایمان نے اسے کچھ فائدہ نہ دیا، کیونکہ اس وقت میں توبہ نفع نہیں دیتی، کیونکہ وہ تکلیف کے زوال کی حالت ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زید اور جمہور مفسرین کا قول ہے۔ رہے کفار تو وہ اپنے کفر پر مرتے ہیں، پس آخرت میں ان کے لیے توبہ نہیں ہے۔ اس کی طرف اس ارشاد میں اشارہ ہے أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا اس عذاب میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اگر اس ارشاد سے اشارہ تمام لوگوں کی طرف ہو تو نافرمانوں کی جہت سے وہ عذاب دائمی نہ ہوگا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ گناہ کفر سے کم ہوں یعنی توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو کفر سے کم درجہ کے گناہ کرتے ہیں پھر موت کے وقت توبہ کرتے ہیں اور نہ ان کے لیے توبہ ہے جو کافر ہو کر مرتے ہیں پھر قیامت کے دن توبہ کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں سیئات سے مراد کفر ہے تو معنی یہ ہوگا جو حالت کفر میں مرتے ہیں۔ ابو العالیہ نے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ باب فی فضل التوبة والاستغفار، حدیث نمبر 3460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: پہلی آیت مومنین کے بارے میں نازل ہوئی اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ...... الخ اور دوسری آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی ان لوگوں کے لیے توبہ کی قبولیت نہیں ہے جو اپنے فعل پر اصرار کرتے ہیں حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ یعنی جب نزع کی حالت میں ہو جاتا ہے اور حضرت عزرائیل کو دیکھ لیتا ہے۔ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ اس کے لیے توبہ نہیں ہے پھر کفار کی توبہ کا ذکر کیا فرمایا: وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا یعنی کفار کے لیے دردناک دائمی عذاب ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

''اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لیے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی اور نہ روکے رکھو انہیں تاکہ لے جاؤ کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے انہیں بجز اس صورت کے کہ ارتکاب کریں کھلی بدکاری کا اور زندگی بسر کرو اپنی بیویوں کے ساتھ عمدگی سے پھر اگر تم ناپسند کرو انہیں (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لیے) خیر کثیر''۔

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا اس کا تعلق پہلے مذکور بیویوں کے ذکر سے ہے۔ اس سے مقصود ان سے ظلم اور تکلیف کو دور کرنا ہے اور خطاب اولیاء کو ہے ان، یحلّ کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یعنی تمہارے لیے عورتوں کا وارث بنا صحیح نہیں ہے۔ کرھا مصدر ہے حال واقع ہو رہا ہے۔ اس آیت کے نزول کے سبب میں روایات اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کے ورثاء اس کی بیوی کے زیادہ حق دار ہوتے اگر کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا، اگر وہ چاہتے تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دیتے، اگر چاہتے تو اس کا نکاح نہ کرتے وہ اس عورت کے اس کے گھر والوں کی نسبت زیادہ حق دار ہوتے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابو داؤد نے بھی اس کی ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ زہری اور ابو مجلز نے کہا: عربوں کی عادت سے تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس شخص کا دوسری بیوی سے جو بیٹا ہوتا وہ یا مرنے والے کا عصبہ اس شخص کی بیوی پر اپنا کپڑا اڈالتا تو وہ اس عورت کا اس کی اپنی ذات اور اس کے اولیاء سے زیادہ حق دار بن جاتا، اگر وہ چاہتا تو بغیر مہر کے اس سے نکاح کر لیتا اور وہی مہر جو میت نے اس عورت کو دیا ہوتا (اس پر اکتفا کرتا) اگر وہ چاہتا تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دیتا اور اس کا مہر خود لے لیتا اور اس عورت کو کچھ نہ دیتا، اگر وہ چاہتا تو اس کو روک لیتا حتیٰ کہ وہ فدیہ دے وہ مال جو اس کو میت کی طرف سے ملا ہے یا وہ عورت مر جائے اور وہ اس کا وارث ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 140

پس معنی یہ ہوگا کہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم ان عورتوں کے وارث ہو ان کے خاوندوں کی طرف سے پھر تم ان کے خاوند بن جاؤ۔ بعض علماء نے فرمایا: وارث اگر جلدی کرتا اور اس عورت پر کپڑا ڈال دیتا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہوتا اگر عورت جلدی کرتی اور اپنے میکے چلی جاتی، تو وہ عورت اپنے نفس کی خود حق دار ہوتی، یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک شخص کے عقد میں بوڑھی عورت ہوتی جب کہ اس کا نفس جوان عورت کی خواہش کرتا، تو وہ بوڑھی عورت کے فراق کو اس کے مال کی وجہ سے ناپسند کرتا پس وہ اسے روکے رکھتا اور اس کے قریب بھی نہ جاتا حتیٰ کہ وہ اسے اپنا مال فدیہ دے یا وہ مر جائے اور اس کے مال کا وہ وارث بن جائے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ خاوند کو حکم دیا گیا کہ وہ اگر بیوی کی صحبت کو پسند نہیں کرتا تو اسے طلاق دے دے اور اس کو ناپسند کرتے ہوئے روکے نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا اس آیت سے مقصود زمانہ جاہلیت کی رسم کا قلع قمع کرنا ہے۔ یعنی عورتوں کو مال کی طرح نہ بنایا جائے تاکہ مال کی طرح ان میں بھی میراث جاری ہو۔ كُرْهًا (کاف کے ضمہ کے ساتھ) حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے اور فتحہ کے ساتھ باقی قراء کی قرأت ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قتبی نے کہا: الكرہ کاف کے فتحہ کے ساتھ اکراہ کے معنی میں ہے اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مشقت کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لتفعل ذالك طوعا او كرها یعنی تجھے یہ کرنا چاہیے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے۔ یہ خطاب اولیاء کے لیے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب عورتوں کے خاوندوں کے لیے ہے جب وہ انہیں روکے رکھیں اور ان سے برتاؤ بھی اچھا نہ کریں اور یہ ان کی میراث کے لالچ کی خاطر ہو یا وہ اپنے بعض مہر فدیہ دے دیں۔ یہ قول اصح ہے اور ابن عطیہ نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے کہا: اس کی دلیل یہ ارشاد ہے اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ جب وہ برائی کا ارتکاب کرے تو والی کے لیے اس کو روکنا جائز نہیں تاکہ اس کا مال لے جائے اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ خاوند کے لیے ہے۔ اس کا بیان بعد والے مسئلہ میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ، عضل کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور وہ ہے روکنا اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ، الفاحشة کے معنی میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد زنا ہے۔ جب کنواری زنا کرے تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال جلاوطن کی جائے گی اور اپنے خاوند کو وہ رقم لوٹا دے گی جو بطور مہر لے چکی ہوگی۔ ابو قلابہ نے کہا: جب کسی مرد کی بیوی زنا کرے تو کوئی حرج نہیں کہ خاوند اسے تکلیف پہنچائے اور اس پر سختی کرے تاکہ وہ اس سے لیا ہوا مال واپس کر دے۔ سدی نے کہا: جب عورتیں ایسے فعل کا ارتکاب کریں تو ان کے مہر واپس لے لو۔ ابن سیرین اور ابو قلابہ نے کہا: خاوند کے لیے بیوی سے فدیہ لینا جائز نہیں مگر یہ کہ اس کے پیٹ پر کسی غیر مرد کو پائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ضحاک اور قتادہ نے کہا: فاحشة مبينه سے مراد اس آیت میں بغض اور نافرمانی ہے۔ ان علماء نے فرمایا: جب عورت نافرمان ہو تو مرد کے لیے اس کا مال لینا جائز اور حلال ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں اس آیت میں فاحشة کے متعلق خاوند کے لیے کوئی نص نہیں پاتا۔ ایک قوم نے کہا: اس سے مراد بد زبانی کرنا اور قول اور فعل سے برا سلوک کرنا ہے۔ یہ نشوز کا معنی ہے۔

بعض اہل علم بطور خلع نافرمان عورت سے مال لینا جائز قرار دیتے ہیں مگر وہ یہ خیال رکھے کہ جو اس نے دیا ہے اس سے تجاوز نہ کرے، اس قول پر عمل کرے لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ۔ امام مالک اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا: خاوند کے لیے جائز ہے کہ نافرمان بیوی سے سب کچھ لے لے جس کی وہ مالک ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: زنا خاوند پر نافرمانی اور اذیت سے زیادہ برداشت کرنا مشکل ہے یہ تمام فاحشۃ کے حکم میں ہے مال کا لینا یہ حلال کر دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: ابن سیرین اور ابو قلابہ نے کہا: میرے نزدیک یہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ فاحشۃ کبھی بدزبانی اور اذیت سے ہوتی ہے، اسی وجہ سے بدزبان کو فاحش اور متفحش کہتے ہیں اس بنا پر اگر وہ اس بیوی کی فاحشۃ پر مطلع ہو تو اس کے لیے لعان کرنا ہوگا اور اگر چاہے تو اسے طلاق دے دے۔ اور رہا اسے تکلیف دینا حتیٰ کہ وہ اسے اپنے مال کا فدیہ دے تو یہ خاوند کے لیے جائز نہیں۔ میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جس نے کہا ہو کہ اسے تکلیف دینا اور اس کے ساتھ برا سلوک کرنا خاوند کے لیے جائز ہے حتیٰ کہ وہ اس سے خلع کر لے جب وہ اسے زنا کرتے ہوئے پائے، سوائے ابو قلابہ کے۔ واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقرہ: 229) یعنی حسن معاشرت اور خاوند کے حق کا قیام اور بیوی کے حق کے قیام میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں تو فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (بقرہ: 229) پس کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کو کچھ فدیہ دے کر جان چھڑائے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۝ پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوش دلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔

یہ آیات اس باب میں اصل ہیں۔ عطا خراسانی نے کہا: جب کسی مرد کی بیوی برائی کا ارتکاب کرے تو وہ اس سے وہ مال لے لے جو اس نے اسے دیا تھا اور اسے باہر نکال دے۔ پھر یہ حکم حدود کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ چوتھا قول اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ مگر یہ کہ وہ بدکاری کریں تو وہ گھروں میں روکی جائیں گی۔ یہ نسخ سے پہلے تھا۔ یہ عطا کے قول کے معنی میں ہے اور یہ ضعیف ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب ہم اس قول کو اختیار کریں کہ عضل میں خطاب اولیاء کو ہے تو اس کا فقہ یہ ہے کہ جب ولی میں یہ صحیح ثابت ہو کہ وہ عضل کرنے والا ہے تو قاضی عورت اور مرد کے بارے میں غور کرے گا مگر باپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ایسا کرے تو اس کے لیے یہ حکم نہیں۔ اگر اس عضل میں اصلاح ہو تو پھر اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ اور یہ ایک اور بہت سے نکاح کا پیغام دینے کے اعتبار سے ہے، روکنا صحیح ہو تو اس میں امام مالک کے مذہب میں دو قول ہیں۔ وہ تمام اولیاء کی طرح ہے۔ قاضی اس کی بیٹیوں میں سے جس کا نکاح چاہے گا کر دے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ بھی جائز ہے کہ تَعْضُلُوْهُنَّ نہی کی بنا پر مجزوم ہو اور واؤ عاطفہ ہو جملہ کلام پہلے جملہ سے جدا ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ تَرِثُوا پر عطف کی بنا پر منصوب ہو اور واؤ مشترکہ ہو، فعل کا فعل پر عطف ہو۔ حضرت ابن مسعود نے ولا ان تعضلوھن پڑھا ہے۔ یہ قرأت نصب کے احتمال کو قوت دیتی ہے۔ اور روکنا ان احکام میں سے ہے جو نص کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مُّبَيِّنَةٍ** یا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ نافع اور ابو عمرو کی قرأت ہے۔ باقی قراء نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے با کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ابان الشئ سے مشتق ہوگا۔ کہا جاتا ہے: ابان الامر بنفسه، ابنته وبین وبینت۔ یہ تمام قرأت فصیح لغات ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** یعنی ان سے اچھا سلوک کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے ہر ایک کے لیے حسن معاشرت ضروری ہے خواہ وہ خاوند ہو یا ولی ہو لیکن اغلب طور پر اس امر سے مراد خاوند ہوتے ہیں۔ یہ اس ارشاد کی مثل ہے **فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ** (بقرہ: 229) یہ ان کو پورا مہر اور خرچ دینا ہے۔ اس کی غلطی کے بغیر اس کے سامنے منہ نہ بسورے۔ اچھے انداز میں اس سے گفتگو کرے، نہ بدخلقی سے، نہ سخت کلام کرے اور نہ اپنا میلان دوسری بیوی کی طرف ظاہر کرنے والا ہو۔ العشرۃ کا معنی مخالطت اور ممازجۃ ہے اسی سے طرفہ کا قول ہے:

فلئن شَطَّتْ نَوَاها مرّةً لعلَى عهدِ حَبِيبٍ مُعْتَشِرٍ

شاعر نے حبیب کو جمع کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے خلیط اور غریق استعمال ہوتے ہیں۔ عاشرہ معاشرۃ، تعاشر القوم واعتشروا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے جب ان سے عقد نکاح کریں بہتر انداز میں آپس میں تعلق باقی رہے۔ اس سے انسان کا نفس پر سکون ہوتا ہے اور زندگی خوشگوار رہتی ہے۔ یہ خاوند پر واجب ہے قضا اس پر لازم نہ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: مرد عورت کے لیے اسی طرح اپنے آپ کو مزین رکھے جس طرح عورت مرد کے لیے اپنے آپ کو مزین رکھتی ہے۔ یحییٰ بن عبدالرحمٰن الحنظلی نے کہا: میں محمد بن حنفیہ کے پاس آیا، وہ میرے پاس آئے تو انہوں نے ایک سرخ چادر اوڑھی ہوئی تھی اور ان کی داڑھی سے خوشبو کے قطرے گر رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ محمد بن حنیفہ نے کہا: یہ چادر مجھ پر میری بیوی نے ڈالی ہے اور اس نے مجھے خوشبو لگائی ہے وہ ہم سے ایسی ہی خواہش کرتی ہیں جیسی ہم ان سے رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اپنی بیوی کی خاطر اپنے آپ کو مزین کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح میں پسند کرتا ہوں کہ بیوی میرے لیے مزین ہو۔

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس میں داخل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: آیت کے مفہوم کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد رہنمائی کرتا ہے: فاستمتع بها وفيها عوج(1) یعنی تو اس سے بدسلوکی نہ کر جب کہ اس میں ٹیڑھا پن موجود بھی ہو، عورت سے مخالفت شروع ہوتی ہے اور اس کے ذریعے ناچاقی واقع ہوتی ہے اور یہ خلع کا سبب ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ہمارے علماء نے: **وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** کے قول سے استدلال کیا ہے کہ عورت کے لیے ایک خادمہ کافی نہ ہو تو خاوند پر اس کی کفالت کی مقدار خدمت کرنا ضروری ہے جیسے بادشاہ اور خلیفہ کی بیٹی اگر کسی کی بیوی ہو تو انہیں ایک خادمہ کفایت نہیں کرتی۔ یہ معاشرۃ بالمعروف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے فرمایا: خاوند پر ایک خادمہ لازم ہے یہ اس کی ذات کی خدمت کے لیے کافی ہے، دنیا میں ایک عورت کے لیے ایک خادمہ کافی ہوتی ہے یہ اس جنگجو کی طرح ہے جس

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المدارۃ مع النساء، حدیث نمبر 4786، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے بہت سے گھوڑے ہوں تو اسے ایک گھوڑے کا حصہ ملتا ہے، کیونکہ قتال ایک گھوڑے پر ہی ممکن ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ غلط ہے، کیونکہ بادشاہوں کی بیٹیوں کی بہت سی خادمائیں ہوتی ہیں انہیں ایک خادمہ کفایت نہیں کرتی، کیونکہ وہ کپڑے دھونے، آرام وغیرہ کے خیال کرنے اور دوسرے کاموں کے لیے ایک خادمہ کافی نہیں ہوتی ہے۔ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ بدصورت یا بدخلق ہونے کی وجہ سے اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو جب کہ وہ فاحشہ اور نافرمان نہیں ہے۔ یہ سارے احتمال ہو سکتے ہیں، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس عورت سے نیک صالح اولاد عطا فرمادے ان کو رفع عسی کی وجہ سے ہے ان اور فعل مصدر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مفہوم صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی مومن، مومنہ کو جدا نہ کرے اگر اس سے ایک خلق کو ناپسند کرے گا تو اس کی دوسری عادت سے خوش ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ عورت سے کلی طور پر بغض نہ رکھے جو اسے اس کے فراق پر برانگیختہ کردے۔ یعنی اس کے لیے یہ مناسب نہیں بلکہ اس کی برائی کو اس کی اچھائی کی وجہ سے معاف کردے اور اس کی ناپسندیدہ بات کو اس کی پسندیدہ باتوں کی وجہ سے برداشت کرے۔ مکحول نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتا ہے پس اسے خیر دی جاتی ہے پس وہ اپنے رب پر شکوہ کرتا ہے پھر تھوڑے عرصہ بعد وہ دیکھتا ہے کہ اسے خیر دی گئی ہوتی ہے۔ ابن عربی نے ذکر کیا فرمایا: مجھے ابو القاسم بن حبیب نے خبر دی، انہوں نے ابو القاسم السیوری سے روایت کیا انہوں نے ابو بکر بن عبد الرحمن سے روایت کیا فرمایا: الشیخ ابو محمد بن ابی زید علم اور دین میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بڑی بدسلوکی کرتی تھی، اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتی تھی اور اپنی زبان کے ساتھ اسے اذیت دیتی تھی۔ شیخ صاحب کو بیوی کے معاملہ میں کہا گیا اور اس پر اتنا صبر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں ایک ایسا شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بدن کی صحت، اپنی معرفت اور غلاموں کی نعمتیں کی ہیں شاید میرے گناہوں کی سزا اس کی صورت میں دی گئی ہو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس کو جدا کروں تو مجھ پر اس سے سخت سزا اور عقوبت نازل ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں طلاق کی کراہت کی دلیل ہے اگرچہ مباح ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مباح چیزوں میں سے کسی چیز کو ناپسند نہیں فرماتا سوائے طلاق اور کھانے کے۔ اللہ تعالیٰ معدہ کو ناپسند فرماتا ہے جب وہ بھر جاتا ہے۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

''اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو ایک بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے؟ اور کیوں کر (واپس) لیتے

ہو تم مال کو حالانکہ مل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ''۔

ان آیات میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ گزشتہ آیات میں اس جدائی کا حکم گزر چکا جس کا سبب عورت ہے اس صورت میں خاوند کے لیے اپنا مہر واپس لینا جائز تھا اب اس جدائی کا ذکر ہو رہا ہے جس کا سبب خاوند ہے۔ یہاں فرمایا کہ جب مرد، عورت کو بغیر بدخلقی اور سوء معاشرت کے اسے طلاق دینے کا ارادہ کرے تو اس سے مال طلب نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جب میاں، بیوی آپس میں جدائی کا ارادہ کرتے ہوں اور دونوں کی طرف سے نافرمانی اور سوء معاشرت کا مظاہرہ ہو، تو امام مالک نے فرمایا: خاوند کے لیے اس سے مال لینا جائز ہے جب جدائی کا سبب عورت بھی ہو، مرد کے سبب ہونے کا اعتبار نہ ہوگا۔ ایک جماعت علماء کا قول ہے کہ اس کے لیے مال لینا جائز نہیں مگر یہ کہ عورت ہی خود نافرمانی کرتی ہو اور جدائی چاہتی ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا** اس آیت میں مہر زیادہ رکھنے کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مثال نہیں دیتا مگر مباح چیز کے ساتھ۔ حضرت عمر نے خطاب فرمایا اور کہا: خبردار! عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو اگر مہر کی زیادتی دنیا میں باعث عزت ہوتی یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعث تقویٰ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سب سے زیادہ اس کے مستحق ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی کسی بیوی اور کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں رکھا (1)۔ ایک عورت کھڑی ہوئی اور کہا: اے عمر اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرماتا ہے اور تو ہمیں محروم کرتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: **وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا**۔ حضرت عمر نے فرمایا: اس عورت نے ٹھیک کہا، عمر نے غلطی کی۔ ایک روایت میں ہے حضرت عمر نے سر جھکا دیا پھر فرمایا: اے عمر! تجھ سے تمام لوگ زیادہ فقیہ ہیں۔ ایک روایت ہے: عورت نے ٹھیک کہا، مرد نے غلطی کی اور انکار کو ترک فرما دیا۔ اس حدیث کو ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں ابو العجفاء سلمی سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عمر نے خطبہ دیا آگے بارہ اوقیہ تک روایت ذکر کی۔ عورت کے کھڑے ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ابو العجفاء سے روایت کیا ہے اور بارہ اوقیہ کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ مرد کو عورت کا مہر بوجھل کرتا ہے حتی کہ اس کے دل میں اس عورت کے لیے عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے: قد کلفتُ الیکِ علق القربة او عرق القربه۔ مجھے تیری طرف سے مشکیزہ کے پانی کی تکلیف دی گئی ہے۔ میں پیدائشی عربی تھا میں علق القربة او عرق القربة کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ جوہری نے کہا: علق القربة، عرق القربة میں ایک لغت ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: علق القربة سے مراد مشکیزہ کی وہ رسی ہے جس کے ساتھ مشکیزہ کو لٹکایا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے: کلفت الیک حتی عصام القربة۔ مجھے تیری مشقت میں ڈالا گیا ہے حتی کہ مشکیزہ کی رسی بھی میرے ذمہ ہے اور اس کا پانی بھی میری ذمہ داری ہے۔ کہتا ہے: حشِمت الیکِ حتی سافرت واحتجت الی عرق القِربة۔ اس جملہ میں عرق القربة سے مراد مشکیزہ کا پانی ہے اور یہی لفظ پانی کے بہاؤ کے لیے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق، حدیث نمبر 1801، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 340

بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لوگ پانی سفر میں ساتھ لے جاتے تھے اور اسے اونٹ پر لٹکا دیتے تھے اور اسے بانٹتے تھے تو سواری پر وہ شاق ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ العرق اور العلق دونوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اصمعی نے کہا: عرق القربۃ ایسا کلمہ ہے جس کا معنی شدت ہے اور فرمایا: میں نہیں جانتا کہ اس کی اصل کیا ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے ابن ابی طرفہ سے سنا، میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں سے یہ زیادہ فصیح ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لقیت من فلان عرقۃ القربۃ۔ یعنی میں نے فلاں سے تکلیف پائی اور اس نے ابن الاحمر کا یہ شعر پڑھا:

لَیْسَتْ بِشْتَمَۃٍ تُعَدُّ وَ عَفْوُھا عَرَقُ السّقاءِ علی القَعُود اللّاغِبِ

ابوعبیدہ نے کہا: شاعر کی مراد یہ ہے کہ وہ ایک کلمہ سنتا ہے جو اسے غضب ناک کرتا ہے وہ گالی بھی نہیں ہے کہ ایسے کہنے والے کا مؤاخذہ کیا جائے، حالانکہ مجھے اس حد تک پہنچایا گیا ہے جیسا کہ عرق القربۃ۔ شاعر نے عرق السقا کہا، کیونکہ شعری وزن درست نہیں رہتا تھا پھر کہا علق القعود واللاغب۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سفروں میں لوگ پیٹھ پر مشکیزہ لٹکاتے تھے۔ یہ معلی اور فراء کے حکایت کردہ معنی کے مشابہ ہے۔ اس نے کہا: لوگ جنگلوں میں سفر کرتے تھے اور پانی ساتھ لے جاتے تھے اور اسے اونٹ پر لٹکا دیتے تھے اور اسے تقسیم کرتے تھے۔ یہ سواری پر مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہوتا تھا۔ فراء نے یہ علق کی تفسیر کی ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ آیت زیادہ مہر رکھنے کے جواز کو مہیا نہیں کرتی کیونکہ قنطار کے ساتھ تمثیل یہ مبالغہ کی جہت سے ہے گویا یوں فرمایا و آتیتم ھذا القدر العظیم الذی لا یؤتیہ احد یعنی تم اتنی مقدار میں دو کہ کسی نے اتنی مقدار میں نہ دیا ہو۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے: من بنی للہ مسجدا ولو کمفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ (جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ کونج کے گھونسلے کی طرح ہو تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے گھر بنا دے گا) اور یہ معلوم شدہ بات ہے کہ کونج کے گھونسلے کی مقدار مسجد نہیں ہوتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوحدرد کو فرمایا تھا جب کہ وہ مہر کے سلسلہ میں مدد طلب کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مہر کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ دو سو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: گویا تم سونا چاندی پتھریلی زمین یا پہاڑ سے کاٹتے ہو۔ بعض لوگوں نے مہر زیادہ رکھنے سے منع فرمایا۔ یہ لازم نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس نکاح کرنے والے پر انکار مہر زیادہ رکھنے کی وجہ سے نہ تھا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ اس حالت میں فقیر تھا اور مدد طلب کرنے اور سوال کرنے کا محتاج تھا اور یہ بالاتفاق مکروہ ہے۔ حضرت عمر نے ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کو جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، چالیس ہزار درہم مہر دیا تھا۔ ابو داؤد نے عقبۃ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا: کیا تو خوش ہے کہ میں تیرا نکاح فلاں عورت سے کر دوں؟ اس شخص نے کہا: ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے کہا: کیا تجھے پسند ہے کہ میں فلاں سے تیرا نکاح کر دوں؟ اس عورت نے کہا: ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح کر دیا۔ اس شخص نے اس عورت سے حقوق زوجیت ادا کیے اور اس کے لیے مہر مقرر نہ کیا اور نہ اسے کچھ دیا (1)۔ یہ حدیبیہ میں موجود لوگوں میں سے تھا اس کو خیبر سے حصہ ملا تھا جب وہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح باب فیمن تزوج ولم یسم صداقا..... حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شخص فوت ہونے لگا تو اس نے کہا: رسول الله ﷺ نے فلاں عورت سے میرا نکاح کیا تھا اور میں نے اس کا مہر مقرر نہیں کیا تھا اور نہ میں نے اسے کوئی اور چیز دی تھی، میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بطور مہر خیبر کا حصہ دیا، اس عورت نے وہ حصہ لے لیا اور اسے ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ علماء کا اجماع ہے کہ مہر کی زیادتی کی کوئی حد نہیں، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا اور کم از کم مہر کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس کی وضاحت ان شاء الله اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ کے تحت آئے گی۔ سورۂ آل عمران میں قِنْطَارًا کی تحدید کا قول گزر چکا ہے۔ ابن محیصن نے وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ کے الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے یہ ایک لغت ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

تسمع من تحت العجاج لها اَزْمَلا

اور ایک اور کا قول ہے۔

إن لم أقاتلْ فألبسونی بُرْقُعا

**مسئلہ نمبر 4**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا بکر بن عبدالله المزنی نے کہا: خلع کرنے والی عورت سے خاوند کچھ واپس نہ لے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْخُذُوْا اور اس کو سورۂ بقرہ کی آیت کے لیے ناسخ بنایا ہے۔ ابن زید وغیرہ نے کہا: یہ سورۂ بقرہ کی آیت وَ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا (بقرہ: 229) سے منسوخ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیات محکمہ ہیں نہ ان میں کوئی ناسخ ہے اور نہ کوئی منسوخ ہے، بلکہ ایک دوسرے پر مبنی ہیں۔ طبری نے کہا: یہ آیت محکمہ ہے بکر کے قول کا کوئی معنی نہیں۔ اگر عورت خود دینے کا ارادہ کرے تو نبی کریم ﷺ نے ثابت کے لیے جائز قرار دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے وہ لے لے جو اس نے اسے دیا تھا۔ بُهْتَانًا مصدر ہے حال واقع ہو رہا ہے۔ اِثْمًا اس کا عطف بُهْتَانًا پر ہے۔ مُّبِیْنًا، اِثْمًا کی نعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ خلوت اختیار کرنے کے بعد مال لینے سے منع کی علت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الافضاء کا مطلب ہے مرد کا ایک لحاف میں عورت کے ساتھ ہونا خواہ اس نے حقوق زوجیت ادا کیے ہوں یا نہ کیے ہوں۔ یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ اور کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ فراء نے کہا الافضاء کا معنی مرد اور عورت کا خلوت اختیار کرنا اور جماع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور سدی وغیرہ نے کہا: اس آیت میں افضاء سے مراد جماع ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الله تعالیٰ کریم ہے وہ کنایہ فرماتا ہے۔ اور لغت میں الافضاء کی اصل مخالطت ہے ملی جلی چیز کو فضا کہا جاتا ہے، شاعر نے کہا:

فقلتُ لها یا عمّتی لکِ ناقتی　　وتمْرٌ فَضا فی عَیْبَتِی وزَبِیب

کہا جاتا ہے: القوم فَوْضَی فَضا یعنی لوگ ملے جلے ہیں ان کا کوئی امیر نہیں ہے۔ اَفْضَی کا معنی خلوت اختیار کی ہے اگرچہ جماع نہ کیا ہو، تو کیا خلوت کی وجہ سے مہر ثابت ہو جائے گا یا نہیں؟ ہمارے علماء کے اس کے متعلق مختلف چار اقوال ہیں (۱) مہر صرف خلوت سے ثابت ہو جاتا ہے (۲) وطی سے مہر ثابت ہوتا ہے (۳) جس گھر میں عورت بھیجی گئی ہے اس میں خلوت سے

ثابت ہوتا ہے (۴) مرد اور عورت کے گھروں کے درمیان جدائی سے ثابت ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مطلقاً خلوت سے ثابت ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب کا یہی قول ہے۔ یہ فرماتے ہیں: جب خلوت صحیحہ ہو جائے تو پورا مہر اور عدت واجب ہو جاتی ہے، خواہ مرد نے عورت سے دخول کیا ہو یا دخول نہ کیا ہو۔ کیونکہ دارقطنی نے ثوبان سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے عورت کا دوپٹہ کھولا اور اس کی طرف دیکھا تو مہر واجب ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: جب دروازہ بند کیا، پردہ لٹکا دیا اور شرمگاہ کو دیکھا تو مہر واجب ہو گیا (2)۔ امام مالک نے فرمایا: جب وہ عورت کے ساتھ ایک طویل عرصہ ٹھہرا رہا مثلاً ایک سال وغیرہ۔ اور وہ دونوں متفق ہوں کہ جماع نہیں ہوا اور عورت پورا مہر طلب کرے تو اس کے لیے یہ ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اس عورت پر عدت نہ ہوگی اور اسے نصف مہر ملے گا سورۂ بقرہ میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا اس کے متعلق تین اقوال ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے ذریعے حاصل کیا ہے اور تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے ساتھ ان کی فروج کو حلال کیا ہے''۔ یہ عکرمہ اور ربیع کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ارشاد مراد ہے فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (بقرہ: 229) یہ حسن، ابن سیرین، قتادہ، ضحاک اور سدی کا قول ہے تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نکاح کا عقد ہے۔ مرد کہتا ہے: میں نے نکاح کیا اور میں نکاح کی عقد کا مالک ہوا۔ یہ مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ میثاق غلیظ سے مراد بچہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

''اور نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا مگر جو ہو چکا (اس سے پہلے سو وہ معاف ہے) بے شک یہ فعل بہت بے حیائی اور نفرت کا فعل اور بہت برا طریقہ تھا''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لیے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی) کے نزول کے بعد اپنے باپ کی بیوی سے اس کی رضا سے نکاح کر لیتے تھے حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی وَ لَا تَنْكِحُوْا الخ پس یہ تمام احوال میں حرام ہو گیا، کیونکہ نکاح کا اطلاق جماع اور نکاح کرنے پر ہوتا ہے۔ اگر باپ کسی عورت سے نکاح کرے یا اس سے وطی کرے بغیر نکاح کے بیٹے پر وہ عورت حرام ہو جائے گی۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَكَحَ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: عقد ہے یعنی جو تمہارے آباء نے نکاح فاسد کیا جو اللہ کے دین کے مخالف تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کی وجہ کو پختہ کیا اور اس کی

1۔ سنن دارقطنی، 3824 2۔ ایضاً، 3819

شرائط کو واضح کر دیا ہے۔ یہ طبری کا مختار قول ہے۔ من، تَنۡكِحُوا کے متعلق ہے اور مَا نَكَحَ مصدر ہے۔ فرمایا: اگر اس کا معنی یہ ہو کہ ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا تو پھر ما کی جگہ من کا ہونا واجب تھا۔ اس بناء پر نہی اس پر واقع ہوئی کہ وہ اپنے باپ دادا کے فاسد نکاح کی طرح نکاح نہ کریں۔ پہلا قول اصح ہے۔ اور ما بمعنی الذی اور من ہو گا اس پر دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام نے اس آیت کو اس معنی پر محمول کیا اور بیٹوں کے لیے اپنے باپ دادا کی بیویوں سے نکاح کرنے سے استدلال کیا ہے۔ عرب میں ایسے قبائل تھے جن کی عادت تھی کہ باپ مر جاتا تو بیٹا اس کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح کر لیتا۔ یہی طریقہ انصار میں بھی تھا اور قریش میں یہ طریقہ باہم رضامندی پر مباح تھا، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ عمرو بن امیہ نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیا پھر اس سے مسافر یا ابو معیط کو اس نے جنم دیا اور پہلے امیہ سے اس کے بیٹے ابو العیص وغیرہ تھے۔ بنو امیہ، مسافر اور ابو معیط کے بھائی تھے اور ان کے چچے بھی تھے۔ اسی سے ہے کہ صفوان بن امیہ بن خلف نے اپنے باپ کے بعد اپنی سوتیلی ماں فاختہ بنت اسود بن مطلب بن اسد سے نکاح کیا تھا۔ امیہ قتل ہوا تھا جب کہ وہ اس کے عقد میں تھی۔ اس میں سے یہ ہے منظور بن زبان نے ملیکہ بنت خارجہ سے نکاح کیا تھا اور یہ پہلے اس کے باپ زبان بن سیار کے عقد میں تھی۔ حصن بن ابی قیس نے اپنے باپ کی بیوی کُبیشہ بنت معن سے نکاح کیا تھا۔ اسود بن خلف نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا۔ اشعث بن سوار نے کہا: ابو قیس فوت ہوا اور یہ انصار کے نیک افراد میں سے تھا، اس کے بیٹے قیس نے اپنے باپ کی بیوی کو نکاح کا پیغام بھیجا، اس عورت نے کہا: میں تجھے اپنا بیٹا شمار کرتی ہوں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں اور آپ سے مشورہ طلب کرتی ہوں۔ وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور صورت حال عرض کی پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ عربوں میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں سے نکاح کیا تھا وہ حاجب بن زرارہ تھا، وہ مجوسی ہو گیا تھا اس نے یہ فعل شنیع کیا تھا اس کا ذکر نضر بن شمیل نے اپنی "کتاب المثالب" میں کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا اس سے جس طریقہ پر ان کے آباء نکاح کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ یعنی جو گزر چکا اور جو ہو چکا یعنی جو تمہارے باپ دادا اور قرابتداروں سے جو ہو چکا وہ معاف ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے یعنی جو کچھ پہلے ہو چکا تم اس سے اجتناب کرو اور اسے چھوڑ دو۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّا بمعنی بعد ہے یعنی بعد ما سلف۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَةَ الۡاُوۡلٰى (الدخان: 56) اس آیت میں اِلَّا بمعنی بعد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب لا ما سلف یعنی وہ نہیں جو ہو چکا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا۔ یعنی ولا خطا۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا معنی ہے: وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا اور بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں اضمار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ یعنی نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا) اگر تم ایسا کرو گے تو تم سے مواخذہ ہو گا اور تمہیں سزا دی جائے گی مگر جو ہو چکا وہ معاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا اس عمل کی مذمت فرمائی اس میں مبالغہ فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ اس نے جو فعل کیا وہ انتہائی قبیح اور برا ہے۔ ابوالعباس نے کہا: میں نے ابن عربی سے نکاح المقت کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا: وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح کرے جب باپ اسے طلاق دے یا باپ مر جائے۔ ایسے شخص کو الضیزن کہا جاتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: عربوں میں جب کوئی شخص اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرتا اور پھر اس عورت سے بچہ پیدا ہوتا تو اس بچے کو مقتی کہا جاتا تھا۔ المقت کی اصل البغض ہے۔ یہ مقت یمقت مقتاً فھو ممقوت و مقیتٌ سے مشتق ہے۔ اور باپ کی بیوی سے بچہ پیدا کرنے والے کو مقیت کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو مقتا فرمایا ہے، کیونکہ یہ مقت والا ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے کو وہ بچہ لاحق ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے مراد نہی ہے اس بات سے کہ آدمی ایسی عورت سے وطی کرے جس سے اس کا باپ یا دادا وطی کر چکا ہو مگر جو زمانہ جاہلیت میں ان کے آباء جن عورتوں سے زنا کر چکے وہ معاف ہے، جب کہ وہ مناکحت کے اعتبار سے صحبت نہ تھی، کیونکہ تمہارے لیے ان سے نکاح جائز ہے اور تم عقد نکاح کے ذریعے وطی کر سکتے ہو جن سے تمہارے آباء نے زنا کے اعتبار سے وطی کی ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہوگی اور اس میں اصل ہوگی کہ زنا حرام نہیں کرتا جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ ؗ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۟ۙ

''حرام کر دی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں رضاعت سے اور مائیں تمہاری بیویوں کی اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں اور (حرام کی گئیں) بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور (یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو مگر جو گزر چکا (سو وہ معاف ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ یعنی تم پر اپنی ماؤوں سے نکاح کرنا اور اپنی بیٹیوں سے نکاح کرنا

حرام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن سے نکاح کرنا حلال ہے اور جن سے نکاح کرنا حرام ہے جیسا کہ باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کی حرمت ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سات عورتیں نسب کی وجہ سے اور چھ عورتیں حرمت رضاعت اور حرمت مصاہرت کی وجہ سے حرام کی ہیں اور سنت متواترہ نے ساتویں عورت کو اس کے ساتھ لاحق کیا ہے وہ ہے پھوپھی، بھتیجی کو جمع کرنا۔ اس پر اجماع ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک روایت ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا: نسب کی وجہ سے سات عورتیں حرام ہیں اور حرمت مصاہرت کی وجہ سے سات عورتیں حرام ہیں پھر یہ آیت تلاوت کی۔ عمرو بن سالم مولی الانصار نے اس کی مثل کہا ہے اور فرمایا: ساتویں صورت اس ارشاد میں ہے وَّالْمُحْصَنٰتُ۔ اور وہ سات عورتیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ یہ ہیں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور وہ عورتیں جن کی حرمت کا سبب مصاہرت اور رضاعت ہے وہ سات ہیں رضاعی مائیں، رضاعی بہنیں، عورتوں کی مائیں۔ کسی دوسرے مرد سے بیوی کی بیٹیاں، بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا اور ساتویں وہ عورت جن سے تمہارے باپ دادا نکاح کر چکے ہوں۔

امام طحاوی نے فرمایا: یہ تمام محکم اور متفق علیہ طور پر حرام ہیں ان میں سے کسی عورت سے بالا جماع نکاح کرنا جائز نہیں ہے مگر ان عورتوں کی مائیں جن کے ساتھ دخول نہیں ہوا۔ جمہور علماء سلف کا نظریہ یہ ہے کہ بیٹی سے عقد کرنے سے ماں حرام ہو جاتی ہے اور ماں، بیٹی کو حرام نہیں کرتی مگر جب ماں سے دخول ہو چکا ہو۔ تمام ائمہ فتویٰ کا یہی قول ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے کہا: ماں اور ربیۃ (بیوی کی بیٹی جو دوسرے خاوند سے ہے) برابر ہیں ان میں سے کوئی ایک حرام نہیں ہوتی مگر دوسری سے صحبت کر لینے کے بعد۔ یہ علماء کہتے ہیں: اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔ یہ علماء کہتے ہیں: دخول کی شرط امہات اور ربائب تمام کی طرف راجع ہے۔ خلاس نے حضرت علی بن ابی طالب سے یہ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر، حضرت زید بن ثابت سے بھی مروی ہے۔ یہی ابن زبیر اور مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: دونوں میں دخول مراد ہے۔ جمہور کا قول اس کا مخالف ہے۔ حکم اور فتویٰ جمہور کے قول پر ہے۔ اہل عراق نے اس میں سختی کی ہے حتیٰ کہ انہوں نے کہا: اگر عورت سے زنا سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ بوسہ دیا یا چھوا تو اس عورت کی بیٹی اس شخص پر حرام ہو جائے گی۔ مالکیوں اور شوافع کے نزدیک نکاح صحیح کے ساتھ حرام ہوگی۔ حرام، حلال کو حرام نہیں کرتا جیسا کہ آگے آئے گا اور خلاس کی حدیث جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ علماء حدیث کے نزدیک اس کی روایت صحیح نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح، جمہور کے قول کے مثل مروی ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے پوچھا ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرتا ہے پھر نہ اسے دیکھتا ہے نہ اس سے مجامعت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے طلاق دے دیتا ہے کیا اس شخص کے لیے اس عورت کی ماں حلال ہوگی؟ عطا نے کہا: نہیں۔ یہ مطلق ہے خواہ اس نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ میں نے عطا سے پوچھا کیا حضرت ابن عباس وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا: نہیں نہیں۔ سعید نے قتادہ سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت مبہم ہے بیٹی پر عقد کی وجہ سے ماں حلال نہیں ہوگی۔ اسی طرح

مالک نے اپنے مؤطا میں حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے زید نے کہا: نہیں الام (ماں) مبہم ہے اس میں شرط نہیں ہے۔ شرط صرف ربائب میں ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ صحیح ہے، کیونکہ اُمَّھٰتُ نِسَآىِٕكُمْ کے ارشاد میں تمام عورتوں کی مائیں داخل ہیں۔ اس قول کی تائید اعراب کی جہت سے بھی ہوتی ہے جب دو خبریں عامل میں مختلف ہوں تو ان کی نعت ایک نہیں ہوتی اور نحویوں کے نزدیک مررت بنسائك وهربت من نساء زيد الظريفات اس بنا پر جائز نہیں کہ الظريفات، نسائك اور نساء زید کی نعت ہو۔ اسی طرح اس آیت میں اللاتی کا دونوں کی نعت ہونا جائز نہیں، کیونکہ دونوں خبریں مختلف ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے جائز ہے خلیل اور سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

إنّ بِها أكْتَلَ أو رِزامَا خُوَيْرِبَيْنِ يَنْقُفَانِ الْهَامَا

یعنی اکتل اور رزام یعنی خویر بان کھوپڑی کو توڑتے ہیں۔

اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کے سلسلہ سے صراحۃً مروی ہے کہ ''جب کوئی شخص عورت سے نکاح کرے تو اس کے لیے اس عورت کی ماں سے نکاح کرنا حلال نہیں خواہ بیٹی سے صحبت کر چکا ہو یا صحبت نہ کی ہو اور جب ماں سے نکاح کرے اور اس نے ابھی دخول نہ کیا ہو پھر اسے طلاق دے دے تو پھر اگر چاہے تو اس کی بیٹی سے نکاح کر لے''۔ اس حدیث کو صحیحین میں نقل کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب یہ ثابت ہو گیا، تو تو جان لے کہ تحریم، اعیان کی صفت نہیں اور نہ اعیان تحلیل وتحریم کا مورد ہیں نہ مصدر ہیں، امر و نہی کے ساتھ تکلیف کا تعلق مکلفین کے افعال کے ساتھ ہے، لیکن اعیان جب افعال کا مورد ہیں تو امر و نہی اور حکم کو ان کی طرف منسوب کیا گیا اور مجازاً ان کے ساتھ معلق کیے گئے محل کے اعتبار سے کہ فعل یہاں پایا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُمَّھٰتُكُمْ امہات کی حرمت ہر حال کو شامل ہے کسی وجہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اسی وجہ سے اہل علم اسے المبہم کہتے ہیں یعنی اس میں نہ باب ہے، نہ اس کی تحریم کو روکنے کا کوئی راستہ ہے۔ اسی طرح بیٹیوں اور بہنوں اور محرمات کی حرمت ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ امہات، امہۃ کی جمع ہے کہا جاتا ہے۔ ام و امھۃ کا ایک معنی ہے۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ آئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ام کی اصل امھۃ ہے فعلة کے وزن پر جیسے قبرة و حمرة یہ دو پرندوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پہلے ۃ ساقط ہو گئی پھر جمع میں واپس آ گئی شاعر نے کہا:

أُمَّهتِي خِنْدِفُ والدَّوْسُ أبي

بعض علماء نے فرمایا: ام کی اصل امة ہے، انہوں نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

تقبلتها عن أمّةٍ لك طالما تَثُوبُ إليها لى النوائب أجمعا

اور اس کی جمع امات ہوگی۔ جرواہے نے کہا تھا۔

كانت نَجائِبُ مُنْذِرٍ و مُحَرِّقٍ أُمَاتِهِنَّ وطَرْقُهُنَّ فَحِيلا

پس الام کا لفظ ہر مونث کا اسم ہے جس کے لیے تجھ پر ولادت کا رشتہ ہو۔ پس اس میں قریبی والدہ اس کی والدہ اور اس کی

دادی، باپ کی والدہ اور دادی سب داخل ہیں اگر چہ بہت اوپر کی ہوں اور البنت ہر اس مؤنث کا نام ہے تیرے لیے اس پر ولادت کا رشتہ ہو۔ اگر تو چاہے تو کہہ سکتا ہے: ہر وہ مؤنث جس کا نسب تیری طرف ولادت کی وجہ سے لوٹے خواہ ایک درجہ ہو یا زیادہ درجات ہوں، پس اس میں صلبی بیٹی، اس کی بیٹیاں، بیٹوں کی بیٹیاں اگر چہ بہت نیچے کی ہوں سب داخل ہیں۔ الاخت ہر اس مؤنث کا اسم ہے تیرے دونوں اصلوں میں تیری پڑوسی ہو یا ایک اصل میں تیری پڑوسی ہو۔ بنات، جمع ہے بنت کی اس کی اصل بنية ہے اور مستعمل ابنة اور بنت ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: بنت کی با کو کسرہ دیا گیا ہے تا کہ یا پر دلالت کرے اور اخت میں ہمزہ پر ضمہ دیا گیا ہے تا کہ واؤ کے حذف پر دلالت کرے، کیونکہ اخت کی اصل اخوۃ ہے اور جمع اخوات ہے اور العمة ہر مونث کا اسم ہے جو تیرے باپ یا تیرے دادا کے ساتھ اس کی دونوں اصل میں شریک ہو یا ایک اصل میں شریک ہو اگر تو چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے ہر مذکر جس کا نسب تیری طرف لوٹے تو اس کی بہن تیری پھوپھی ہے کبھی پھوپھی ماں کی جہت سے ہوتی ہے یہ تیری ماں کے باپ کی بہن ہے۔ خالہ ہر اس مونث کا اسم ہے جو تیری ماں کے ساتھ دونوں اصلوں میں شریک یا ایک اصل میں شریک ہو۔ اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے ہر وہ مونث جس کا نسب تیری طرف ولادت کے ساتھ لوٹے تو اس کی بہن تیری خالہ ہے کبھی خالہ باپ کی جہت سے ہوتی ہے وہ تیرے باپ کی ماں کی بہن ہے اور بنت الاخ ہر اس مونث کا اسم ہے تیرے بھائی کا اس پر ولادۃ کا رشتہ ہو بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ ہو۔ اور اسی طرح بنت الاخت (بھانجی) ہے۔ یہ سات عورتیں ہیں جن کی حرمت کا سبب نسب ہے نافع نے اور ایک روایت میں ابو بکر بن ابی اویس نے الاخ کی وجہ سے خا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جب اس میں الف، لام ہو حرکت کے نقل کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ یہ تحریم میں ان کی طرح ہیں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رضاعت کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ عبد اللہ نے وامهاتكم الائی بغیر تا کے پڑھا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ الّٰٓئِیْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ (الطلاق: 4) شاعر نے کہا:

من اللَّاءِ لم يحجُجْنَ يَبْغِين حِسْبَةً　　ولكن ليقتُلنَ البَرِیَّ المغفَّلا

اَرْضَعْنَكُمْ جب عورت بچے کو دودھ پلا دے تو وہ اس پر حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی ماں بن جاتی ہے اور اس کی بیٹی حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی بہن ہو جاتی ہے اور اس کی بہن حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی خالہ بن جاتی ہے اس کی ماں حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی نانی بن جاتی ہے اور اس کے خاوند کی بیٹی حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی بہن بن جاتی ہے اور اس خاوند کی بہن حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی پھوپھی بن جاتی ہے اور اس خاوند کی ماں حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی دادی بن جاتی ہے اور اس عورت کے بیٹوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں حرام ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ اس کے بھائیوں اور بہنوں کی بیٹیاں بن جاتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابو نعیم عبید اللہ بن ہشام الحلبی نے کہا: امام مالک سے پوچھا گیا: کیا عورت حج کرے اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ؟ امام مالک نے فرمایا: ہاں۔ ابو نعیم نے کہا: امام مالک سے پوچھا گیا: ایک عورت نے شادی کی اس کے خاوند

نے اس کے ساتھ صحبت کی پھر ایک عورت آئی اور اس نے کہا: میں نے ان دونوں (میاں، بیوی) کو دودھ پلایا تھا۔ امام مالک نے فرمایا: انہیں جدا کر دیا جائے اور جو کچھ عورت نے مرد سے مہر لیا تھا وہ اس کا ہوگا اور جو باقی ہے وہ اس خاوند پر باقی نہ رہے گا۔ پھر امام مالک نے کہا: نبی کریم ﷺ سے اس کی مثل مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے یہی کہا تھا۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! یہ بوڑھی عورت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ فلاں نے اپنی بہن سے نکاح کیا ہے؟

**مسئلہ نمبر 6**۔ رضاع سے حرمت تب ثابت ہوتی ہے جب کہ دو سال کے دوران دودھ پلایا جائے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ہمارے نزدیک قلیل دودھ پلانے یا زیادہ دودھ پلانے کے درمیان کوئی فرق نہیں جب معدہ تک دودھ پہنچ جائے گا اگرچہ ایک گھونٹ بھی ہوگا تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ امام شافعی نے دودھ پلانے میں دو شرائط کا اعتبار کیا ہے ایک شرط پانچ چسکیاں، کیونکہ حضرت عائشہ کی حدیث میں ہے ”جو اللہ نے نازل فرمایا اس میں تھا کہ دس معلوم چسکیاں حرام کر دیتی ہیں پھر پانچ چسکیوں کے ساتھ دس والا حکم منسوخ ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا جب کہ یہ قرآن سے پڑھی جاتی تھیں“۔ اس سے استدلال یہ ہے کہ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دس چسکیاں، پانچ کے ساتھ منسوخ ہو گئیں اگر تحریم پانچ سے کم چسکیوں کے ساتھ معلق کریں تو یہ پانچ کے لیے نسخ ہوں گی اور اس میں خبر واحد اور قیاس قبول نہیں ہوتا، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ نسخ واقع نہیں ہوتا اور سہلہ کی حدیث میں ہے ”تو اسے (سالم) پانچ چسکیاں دودھ پلا دے وہ ان کی وجہ سے حرام ہو جائے گا“۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دودھ پلانا دو سال میں ہو۔ اگر دو سال سے زائد عمر میں دودھ پلایا جائے گا تو حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (بقرہ: 233) تمام اور کمال کے بعد کوئی چیز نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہ نے اڑھائی سال کا اعتبار کیا ہے اور امام مالک نے ایک ماہ زائد کا اعتبار کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: جب تک وہ دودھ پیتا ہے اور اس کا دودھ چھڑایا نہیں گیا تو وہ رضاع ہے اگرچہ اس پر تین سال بھی گزر چکے ہوں۔ اوزاعی نے کہا: جب ایک سال بعد دودھ چھڑا دیا گیا ہو پھر متواتر دودھ چھوٹا ہی رہے تو اس کے بعد رضاع ثابت نہ ہوگا۔ لیث بن سعد علماء کے درمیان منفرد ہیں۔ وہ کہتے ہیں: بڑے کو دودھ پلانا بھی حرمت کا موجب ہے۔ یہ حضرت عائشہ کا قول ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے بھی روایت ہے اور حضرت ابوموسیٰ سے اس سے رجوع بھی مروی ہے۔ یہ ابوحصین نے ابوعطیہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ایک شخص مدینہ طیبہ سے اپنی بیوی کے ساتھ آیا اس نے بچہ جنم دیا اور اس کے پستان پھول گئے تھے۔ پس اس کے خاوند نے اسے چوسنا شروع کر دیا اور کلی کرنا شروع کر دیا تو دودھ کا گھونٹ اس کے پیٹ میں چلا گیا اس نے حضرت ابوموسیٰ سے مسئلہ پوچھا تو حضرت ابوموسیٰ نے کہا: تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی اور تو حضرت ابن مسعود کے پاس جا اور اسے یہ مسئلہ بتا۔ اس شخص نے ایسا کیا حضرت ابن مسعود اس اعرابی کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ کے پاس آئے اور کہا: کیا تم اس سفید، سیاہ بالوں والے کو رضیع خیال کرتے ہو! حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب دودھ گوشت اور ہڈیوں کو بڑھاتا ہے اشعری نے کہا: تم مجھ سے کوئی مسئلہ نہ پوچھا کرو جب کہ تمہارے درمیان یہ بہت بڑا عالم موجود ہے۔ پس ”پس تم نہ پوچھا کرو“ کے الفاظ دلیل ہیں کہ آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سالم مولیٰ ابن

حذیفہ کے واقعہ سے حجت پکڑی ہے کہ وہ اس وقت مرد تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہلہ بنت سہیل کو کہا تھا کہ تو اسے دودھ پلا دے۔ اس حدیث کو مؤطا وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔ ایک طائفہ نے شاذ قول کیا ہے اور دس چسکیاں پینے کا اعتبار کیا ہے انہوں نے عشر رضعات جو قرآن میں تھا اس کا اعتبار کیا ہے گویا انہیں ناسخ نہیں پہنچا تھا۔ داؤد نے کہا: حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی مگر تین چسکیاں پینے کے ساتھ اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے حجت پکڑی ہے ''ایک چسکی اور دو چسکیاں حرمت رضاعت کو ثابت نہیں کرتی ہیں'' اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عائشہ اور حضرت ابن زبیر سے مروی ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابوثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ یہ دلیل الخطاب سے تمسک (دلیل پکڑنا) ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ان علماء کے علاوہ ائمہ فتویٰ کا یہ نظریہ ہے کہ ایک گھونٹ بھی حرام کر دیتا ہے جب یقین ہو جائے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے انہوں نے کم از کم مقدار جس پر رضاع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اس سے حجت پکڑی ہے۔ اس کی تائید، اہل مدینہ کے عمل سے اور مصاہرت پر قیاس کے ساتھ کی گئی ہے، اس علت کے ساتھ کہ یہ لاحق ہونے والا معنی ابدی تحریم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اس میں عدد شرط نہیں ہے جس طرح مصاہرت میں عدد شرط نہیں ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دودھ تھوڑا پینا اور زیادہ پینا، پنگھوڑے میں حرام کر دیتا ہے جو روزہ دار کے روزہ کو افطار کر دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث اس کے خلاف پر آگاہ نہیں تھے۔ میں کہتا ہوں: اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لا تحرم المصة ولا المصتان (ایک اور دو چسکیاں حرام نہیں کرتی ہیں) نص ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ کی تفسیر کرتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں تین چسکیاں پلائیں یا زیادہ مگر یہ ممکن ہے کہ اسے اس پر محمول کیا جائے جب دودھ کا بچے کے پیٹ میں پہنچنا متحقق نہ ہو، کیونکہ دس معلوم چسکیوں اور پانچ معلوم چسکیوں کا ارشاد موجود ہے پس معلوم کے ساتھ وصف ذکر فرمایا یہ پیٹ میں دودھ کے پہنچنے میں شک اور وہم سے بچنے کے لیے ہے۔ دلیل خطاب اس کو فائدہ دیتی ہے کہ چسکیاں جب غیر معلوم ہوں تو حرام نہیں کرتیں۔ واللہ اعلم۔ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ املاجۃ والا ملاجتین والی حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن زبیر کبھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، کبھی حضرت عائشہ سے روایت فرماتے ہیں، کبھی اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں اس قسم کا اضطراب حدیث کو حجت ہونے سے ساقط کر دیتا ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ صرف سات چسکیاں پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی بہن حضرت ام کلثوم کو حکم دیا کہ وہ سالم کو دس چسکیاں پلا دے۔ حضرت حفصہ سے اس کی مثل مروی ہے ان سے تین چسکیاں پلانا بھی اور پانچ چسکیاں پلانا بھی مروی ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ اسحاق سے یہ حکایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ جن علماء نے نر کے دودھ کی نفی کی ہے انہوں نے اس جملہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، ابوسلمہ بن عبدالرحمن کا قول ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: نر کا دودھ مرد کی طرف سے کسی چیز کو حرام نہیں کرتا۔ اور جمہور علماء فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ دلیل ہے کہ نر باپ ہے، کیونکہ دودھ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے سبب دودھ دیتا ہے یہ ضعیف ہے، کیونکہ بچہ مرد

اور عورت دونوں کے پانی سے پیدا ہوا ہوتا ہے اور دودھ عورت سے ہوتا ہے مرد سے دودھ نہیں نکلتا اور مرد کی طرف سے وطی ہوتی ہے جو مرد سے پانی کے نزول کا سبب ہے۔ جب بچہ ماں سے جدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دودھ پیدا فرماتا ہے کسی اعتبار سے مرد کی طرف مضاف نہیں ہوتا اسی وجہ سے مرد کو دودھ میں کوئی حق نہیں ہے۔ دودھ عورت کے لیے ہوتا ہے پانی پر قیاس سے اس کو لینا ممکن نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب(1) (جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ رضاع سے بھی حرام ہوتے ہیں) یہ رضاع کی وجہ سے تحریم کا تقاضا کرتا ہے اور مرد کی طرف رضاع کی نسبت کی وجہ اس طرح ظاہر نہیں ہوتی جس طرح پانی کی نسبت مرد کی طرف اور رضاع کی نسبت عورت کی طرف ظاہر ہوتی ہے ہاں اس میں اصل زہری، ہشام بن عروہ عن عائشہ کے سلسلہ سے مروی حدیث ہے کہ افلح ابی قعیس کا بھائی حضرت عائشہ کے پاس آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا، وہ حضرت عائشہ کا رضاعی چچا تھا یہ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہ نے کہا: میں اسے اجازت نہیں دیتی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے مسئلہ عرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تیرے پاس آنا چاہیے، کیونکہ وہ تمہارا چچا ہے تربت یمینک، ابو القعیس اس عورت کا خاوند تھا جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دودھ پلایا تھا۔ یہ بھی خبر واحد ہے یہ بھی احتمال ہے کہ افلح نے حضرت ابوبکر کے ساتھ دودھ پیا ہو اسی وجہ سے آپ نے فرمایا ہو: وہ تیرے پاس داخل ہو، کیونکہ وہ تمہارا چچا ہے۔ بہرحال اس میں حتمی قول کرنا مشکل ہے اور حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن عمل اس پر ہے اور تحریم میں احتیاط بہتر ہے جبکہ یہ ارشاد بھی موجود ہے وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (اس کے علاوہ عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں) یہ مخالف کے قول کو تقویت دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ اس سے مراد سگی بہن ہے اور وہ بہن ہے جس کو تیرے باپ کے دودھ سے تیری ماں نے دودھ پلایا ہے خواہ اس کو تیرے ساتھ دودھ پلایا ہو یا وہ تجھ سے پہلے پیدا ہوئی ہو یا بعد میں اور وہ جو صرف باپ کی طرف سے تیری بہن ہے اور وہ وہ ہے جس کو تیرے باپ کی بیوی نے دودھ پلایا ہے اور صرف ماں کی طرف سے بہن یہ وہ ہے جس کو تیری ماں نے کسی دوسرے مرد کے دودھ سے دودھ پلایا ہے پھر حرمت مصاہرت کا ذکر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ تمہاری بیویوں کی مائیں۔ مصاہرت کے سبب حرام ہونے والی عورتیں چار ہیں، بیوی کی ماں، بیوی کی بیٹی، باپ کی بیوی، بیٹے کی بیوی اور بیوی کی ماں، بیٹی سے عقد صحیح سے حرام ہو جاتی ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ۔ یہ ایک مستقل کلام ہے اور مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ کا ارشاد پہلے فریق کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ یہ ربائب کی طرف راجع ہے، کیونکہ یہ قریب مذکور ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ربیبة خاوند کی بیوی کی بیٹی جو پہلے خاوند سے ہو اس کو ربیبة اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی گود میں اس کی تربیت کرتا ہے پس یہ مربوبة ہے۔ فعیلة بمعنی مفعولة ہے۔ فقہاء نے اتفاق کیا ہے کہ ربیبة اپنی ماں کے خاوند پر حرام ہوتی ہے جب وہ ماں سے صحبت کر لیتا ہے اگرچہ ربیبة اس کی پرورش میں نہ بھی ہو۔ بعض متقدمین اور اہل ظواہر نے شاذ

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح باب مایحرم من الرضاع، حدیث نمبر 3248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قول کیا ہے کہ ربیبۃ اس مرد پر حرام نہیں ہوتی مگر جب کہ وہ اس شخص کی پرورش میں ہو جس نے اس کی ماں سے نکاح کیا ہے اگر وہ بچی دوسرے شہر میں ہو اور ماں کو وہ دخول کے بعد جدا کر دے تو اس شخص کے لیے اس بچی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ انہوں نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ربیبۃ کو دو شرطوں کے ساتھ حرام کیا ہے (۱) وہ ماں سے نکاح کرنے والے کی پرورش میں ہو، دوسری یہ کہ وہ ماں سے دخول کر چکا ہو۔ جب ان دو شرطوں میں سے ایک مفقود ہو تو تحریم نہیں پائی جائے گی اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی حجت پکڑی ہے کہ "اگر یہ میری گود میں پرورش نہ پاتی تب بھی میرے لیے حلال نہ تھی، کیونکہ یہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے" (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں پرورش کو شرط قرار دیا ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی اجازت روایت کی ہے۔ ابن المنذر اور طحاوی نے کہا کہ رہی حضرت علی کی حدیث تو وہ ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کا راوی ابراہیم بن عبید غیر معروف ہے اور اکثر اہل علم نے اس کو دور کیا ہے اور اس کے خلاف قول کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کو فلا تعرضن علی بنٰتکن ولا اخوتکن دور کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عام فرمایا ہے اور آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنی وہ بیٹیاں پیش نہ کرو جو میری گود میں ہیں بلکہ تحریم میں سب کو برابر کیا۔ امام طحاوی نے فرمایا: گود میں ہونے کی اضافت غالب طور پر ہے کہ وہ ربائب ہوتی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گود میں پرورش نہ پا رہی ہوں تو حرام ہی نہیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ یعنی ماں کے ساتھ دخول نہ کیا ہو تو اس کی بیٹی سے نکاح کرنے میں تجھ پر کوئی حرج نہیں ہے جب تم انہیں طلاق دے دو یا وہ مر جائیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرے پھر اسے طلاق دے دے یا وہ دخول سے پہلے مر جائے تو اس آدمی کے لیے اس عورت کی بیٹی سے نکاح کرنا حلال ہے، امہات کے ساتھ دخول میں اختلاف ہے جس سے ربائب کی تحریم واقع ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا دخول سے مراد جماع ہے۔ طاؤس اور عمرو بن دینار وغیرہما کا یہی قول ہے۔ امام مالک، ثوری، امام ابوحنیفہ، اوزاعی اور لیث کا اتفاق ہے کہ جب عورت کو شہوت کے ساتھ چھو لے تو اس پر اس عورت کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی اور وہ عورت اس کے باپ اور اس کے بیٹے پر حرام ہو جائے گی۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ دیکھنے میں اختلاف ہے امام مالک نے فرمایا: جب اس کے بالوں یا سینے کو یا دوسرے محاسن کو لذت کے لیے دیکھا تو اس پر اس کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی۔ کوفیوں نے کہا: جب اس کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھے گا تو یہ شہوت سے چھونے کے قائم مقام ہوگا۔ ثوری نے کہا: جب وہ اس کی فرج کی طرف جان بوجھ کر دیکھے گا یا اسے چھوئے گا تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ انہوں نے شہوت کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ابی لیلیٰ نے کہا: دیکھنے سے حرام نہ ہوگی حتیٰ کہ چھو لے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے: دلیل اس پر کہ دیکھنے سے تحریم واقع ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ اس میں استمتاع کی ایک قسم ہے پس یہ نکاح کے قائم مقام ہوگا کیونکہ احکام معانی سے متعلق ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے۔ یہ کہنے کا بھی احتمال ہے کہ یہ استمتاع کے ساتھ جمع ہونے کی ایک نوع ہے، کیونکہ دیکھنا اجتماع اور ملاقات ہے اس میں محبت کرنے والوں کے درمیان استمتاع ہے۔ شعراء نے اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب امہاتکم التی ارضعنکم، حدیث نمبر 4711، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں مبالغہ کیا ہے:

أليس الليل يجمع أم عمرو وإيانا فذاك بنا تدانِ

نعم ترى الهلال كما أراهٗ ويعلوها النهار كما علانِ

تو پھر دیکھنے، مل کر بیٹھنے، باتیں کرنے اور لذت میں یہ کیفیت کیسے نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ، الحلائل جمع ہے حلیلۃ کی۔ اس سے مراد بیوی ہے بیوی کو حلیلہ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ تحل مع الزوج حیث حل یعنی یہ خاوند کے ساتھ اترتی ہے جہاں وہ اترتا ہے یہ فعیلہ بمعنی فاعلۃ ہے۔ زجاج اور ایک اور قوم کا یہ نظریہ ہے کہ یہ لفظ الحلال سے ہے یہ حلیلۃ بمعنی محللہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نام اس کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ میاں، بیوی سے ہر ایک دوسرے کا ازار کھولتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ علماء کا اجماع ہے باپ، دادا جن عورتوں سے نکاح کرتے ہیں وہ بیٹوں پر حرام ہو جاتی ہیں اور جس سے بیٹے نکاح کرتے ہیں وہ باپ، دادا پر حرام ہو جاتی ہیں خواہ نکاح کے ساتھ وطی ہو یا نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک نکاح فاسد کرے تو دوسرے پر اس سے عقد کرنا حرام ہوگا جس طرح عقد صحیح سے حرام ہوتا ہے، کیونکہ نکاح فاسد یا تو ایسا ہوگا کہ اس کے فساد پر اتفاق ہوگا یا اس میں اختلاف ہوگا۔ اگر اس کے فساد پر اتفاق ہو تو وہ حکم کو ثابت نہیں کرتا اور اس کا وجود نہ ہونے کی طرح ہوتا ہے اگر اس میں اختلاف ہے تو اس کے ساتھ وہ حرمت متعلق ہوتی ہے جو نکاح صحیح کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، کیونکہ احتمال ہے کہ وہ نکاح صحیح ہو پس وہ مطلق اللفظ کے تحت داخل ہوگا۔ اور فروج جب ان میں تحریم و تحلیل کا تعارض ہو تو تحریم کو غلبہ دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن المنذر نے کہا: علماء امصار کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص نکاح فاسد کے ساتھ عورت سے وطی کرے تو اس کے باپ اور بیٹے پر وہ عورت حرام ہو جاتی ہے اور ذیل کے مسئلہ پر علماء کا اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ لونڈی کو کسی کا خریدنا اسے اس کے باپ اور بیٹے پر حرام نہیں کرتا، جب کوئی شخص لونڈی خریدے پھر اسے چھوئے یا بوسہ دے تو وہ اس کے باپ اور بیٹے پر حرام ہو جائے گی۔ میں ان علماء کو نہیں جانتا جو اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہوں۔ ابن المنذر نے کہا: جو کچھ ہم نے کہا کسی صحابی رسول اللہ ﷺ سے اس کے خلاف صحیح مروی نہیں۔ یعقوب اور محمد نے کہا: جب کوئی شخص کسی عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو وہ عورت اس کے باپ اور اس کے بیٹے پر حرام ہو جائے گی اور اس شخص پر اس عورت کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی۔ امام مالک نے فرمایا: جب لونڈی سے وطی کرے یا وطی کے لیے اس کے پاس بیٹھے اور اس کا پردہ بکارت نہ پھاڑے یا اسے بوسہ دے یا اس کے جسم کے ساتھ جسم لگائے یا اسے ہاتھ لگائے اور یہ بطور تلذذ ہو تو اس کے بیٹے کے لیے وہ حلال نہ ہوگی۔ امام شافعی نے فرمایا: چھونے سے حرام ہوگی نظر سے حرام نہ ہوگی۔ یہی قول اوزاعی کا بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ زنا سے وطی میں اختلاف ہے کہ کیا وہ حرام کرے گا یا نہیں؟ اکثر علماء کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی

عورت سے زنا کرے تو اس پر اس سے اس کی وجہ سے نکاح کرنا حرام نہ ہوگا اسی طرح اس پر اس کی بیوی حرام نہ ہوگی جب وہ بیوی کی ماں یا بیٹی سے زنا کرے گا اور اس پر حد لگائی جائے گی پھر وہ اپنی بیوی سے صحبت کرے گا اور جس نے ایک عورت سے زنا کیا پھر اس کی ماں یا بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو وہ دونوں اس وجہ سے اس پر حرام نہ ہوں گی اور ایک جماعت نے کہا کہ وہ حرام ہو جائے گی۔ یہ قول عمران بن حصین سے مروی ہے یہی قول امام شعبی، عطا، حسن، سفیان ثوری، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے کا ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ زنا ماں اور بیٹی کو حرام کر دیتا ہے اور یہ حلال وطی کے قائم مقام ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے اور امام مالک اور اہل حجاز کا صحیح قول یہ ہے کہ زنا کا کوئی حکم نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ اور جس سے زنا ہوا ہے وہ اس کی عورتوں کی ماؤں سے نہیں ہے نہ اس کی ربائب بیٹیوں میں سے ہے۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے، کیونکہ جب زنا کی وجہ سے مہر، عدت کا وجوب، میراث، لحوق الولد کا حکم اٹھ گیا اور حد واجب ہوئی تو اس کے لیے جائز نکاح کا حکم بھی اٹھ گیا۔ دارقطنی سے زہری عن عروہ عن عائشہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا پھر وہ اس عورت سے یا اس کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حرام۔ حلال کو حرام نہیں کرتا حرام وہ وطی کرتی ہے جو نکاح سے ہو۔

اور دوسرے قول کی حجت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جریج کے متعلق خبر دینا ہے جب جریج نے اس بچے سے پوچھا اے بچہ! تیرا باپ کون ہے؟ تو بچہ بول پڑا اس نے کہا: فلاں چرواہا۔ یہ دلیل ہے کہ زنا بھی حرام کرتا ہے جس طرح حلال وطی حرام کرتی ہے پس جس عورت سے زنا کیا گیا وہ اور اس کی بیٹی زانی کے باپ، دادا اور اس کے بیٹوں کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم کی روایت المدونہ میں ہے۔ اس سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ زانی کے پانی سے ہونے والی اس کی ماں سے زنا کرنے والے کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہ مشہور ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے عورت اور اس عورت کی بیٹی کی فرج کو دیکھا۔ آپ نے حلال اور حرام کے درمیان فرق نہیں فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے عورت (ماں) اور بیٹی دونوں کا پردہ کھولا"۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہم نے کہا کہ بوسہ اور استمتاع کی تمام صورتیں حرمت کو پھیلاتی ہیں۔ عبدالملک الماجشون نے کہا: وہ حلال ہے اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا (الفرقان: 54) یعنی نکاح صحیح کے ساتھ نسب اور سسرال بنائے اس کی تفصیل سورۂ الفرقان میں آئے گی۔ ان دو مسئلوں پر حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جریج کے بارے میں حکایت کی کہ اس نے زانی کے بیٹے کو زانی کی طرف منسوب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت کی تصدیق فرمائی کہ اس نے خلاف عادت بچہ کو اس کی شہادت دینے کے لیے قوت گویائی عطا فرمائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جریج سے مدح اور اظہار کرامت کے طور پر بیان فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ کی تصدیق اور اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے کے ساتھ یہ نسبت صحیح ہے پس بنوت اور اس کے احکام ثابت ہوئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ زنا کی صورت میں بنوت، ابوت کے احکام جاری ہوں گے مثلاً توارث،

ولایات وغیرہ، جب کہ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان کے درمیان توارث نہیں ہے تو پھر یہ نسبت کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کا موجب ہے اور وہ احکام جن پر اجماع ہے ہم نے ان کی استثنا کی ہے اور دوسروں کو باقی رکھا ہے اس دلیل کی اصل پر۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ لواطت کرنے والے کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا ہے کہ لواطت کرنے والے سے نکاح حرام نہیں۔ ثوری نے کہا: جب کسی لڑکے سے کوئی ملاعبت کرے تو اس پر اس کی ماں حرام ہوگی۔ یہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے اپنی عورت کے بیٹے، عورت کے باپ یا عورت کے بھائی سے لواطت کی تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ امام اوزاعی نے کہا: جو کوئی کسی لڑکے سے لواطت کرے پھر جس سے لواطت کی گئی ہے اس کی لڑکی پیدا ہو تو لواطت کرنے والے کے لیے اس لڑکی سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کی بیٹی ہے جس کے ساتھ وہ دخول کر چکا ہے یہ امام احمد کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ یہ تخصیص ہے تا کہ اس سے ہر وہ شخص خارج ہو جائے جس کو عرب متبنیٰ بتاتے ہیں جو صلب سے نہیں ہوتا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی (مطلقہ) بیوی سے نکاح کیا تو مشرکین نے کہا: اس نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ رضاعی بیٹے کی بیوی حرام ہے اگرچہ وہ بھی صلب سے نہیں ہوتا۔ اس پر اجماع ہے اور اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب۔ (1) رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ۔ اس کا عطف حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ پر ہے اس وجہ سے اَنْ محل رفع میں ہے اور دو بہنوں کا لفظ تمام صورتوں کو شامل ہے خواہ انہیں نکاح کے ساتھ جمع کیا جائے یا ملک یمین کے ساتھ جمع کیا جائے اور امت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی وجہ سے ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنا ممنوع ہے، اور اس کی دوسری دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تعرض علی بناتکن ولا اخواتکن (2) تم مجھ پر اپنی بیٹیاں اور اپنی بہنیں پیش نہ کرو۔ اور ملک یمین میں دو بہنوں کو جمع کرنے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ ملکیت کے ذریعے وطی میں جمع کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ ملکیت میں ویسے جمع کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اسی طرح ماں اور بیٹی کو ایک سودے میں خریدنا جائز ہے، لیکن جس لونڈی سے وطی کی گئی ہو اس کی بہن سے نکاح کرنے میں اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: جب وہ اپنی لونڈی سے ملک یمین کی وجہ سے وطی کر چکا ہو تو اس کے لیے اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ملک یمین، بہن کے نکاح سے مانع نہیں۔ ابو عمر نے کہا: جنہوں نے عقد نکاح کو شرا (خریدنا) کی طرح بنایا انہوں نے اس کی اجازت دی اور

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، باب مایحرم من الرضاع، حدیث نمبر 3248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب وربائبکم اللاتی فی حجورکم الخ، حدیث نمبر 4715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جنہوں نے اس کو وطی کی طرح بنایا تو انہوں نے جائز قرار نہیں دیا۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ یعنی دونوں کو عقد نکاح کے ذریعے جمع کرنا حرام ہے پس تم ٹھہر جاؤ جس پر علماء نے اجماع کیا اور جس میں اختلاف کیا ان شاء اللہ درست نظریہ تیرے لیے واضح ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اہل ظواہر نے ایک علیحدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا: وطی میں ملک یمین کے ذریعے دو بہنوں کو جمع کرنا جائز ہے جس طرح ملکیت میں ان کو جمع کرنا جائز ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو ملک یمین سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے متعلق حضرت عثمان سے مروی ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: ایک آیت نے ان دونوں کو حرام کیا اور ایک آیت نے دونوں کو حلال کیا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق نے کہا: ہمیں معمر نے بتایا انہوں نے زہری سے روایت کیا انہوں نے قبیصہ بن ذویب سے روایت کیا کہ حضرت عثمان سے ان دو بہنوں کے متعلق پوچھا گیا جو ملک یمین میں جمع کی جائیں، تو حضرت عثمان نے فرمایا: نہ میں اس کا تجھے حکم دیتا ہوں اور نہ تجھے منع کرتا ہوں، ایک آیت نے انہیں حلال کیا اور ایک آیت نے انہیں حرام کیا۔ پس وہ سائل وہاں سے نکلا اور صحابہ کرام میں سے کسی شخص سے ملا۔ معمر نے کہا: میرا خیال ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس شخص نے کہا: تو نے عثمان سے کیا پوچھا ہے؟ اس نے جو پوچھا تھا اور جو حضرت عثمان نے بتایا تھا سب کچھ بتایا۔ اس صحابی نے کہا: لیکن میں تجھے منع کرتا ہوں، اگر مجھے تجھ پر گرفت کا اختیار ہوتا پھر تو ایسا کرتا تو میں تجھے سخت سزا دیتا (1)۔ امام طحاوی اور دارقطنی نے حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت عثمان کے قول کی مثل ذکر کیا ہے اور وہ آیت جو انہیں حلال کرتی ہے وہ یہ ہے وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ان کے علاوہ تمہارے لیے عورتیں حلال کی گئی ہیں۔ لیکن فتویٰ دینے والے ائمہ نے اس قول کو لائق التفات نہیں سمجھا، کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کی تاویل سے اس کا خلاف سمجھا ہے اور ان پر تاویل کی تحریف جائز نہیں۔ اور صحابہ کرام میں سے جن کا یہ نظریہ تھا ان میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس، حضرت عمار، حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر۔ پس یہ کتاب اللہ کو جاننے والے تھے جو ان کی مخالفت کرنے والا ہے وہ تاویل میں ہٹ دھرمی کرنے والا ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے وطی کے ساتھ جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ جمہور اہل علم نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ امام مالک کو بھی ان میں شمار کیا جنہوں نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ صرف ملکیت میں جمع کرنے کے جواز میں اختلاف نہیں۔ اسی طرح ماں اور بیٹی کو ملکیت میں جمع کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اسحاق کا قول ہے کہ وطی میں دونوں کو جمع کرنے والے کو رجم کیا جائے گا۔ امام مالک کے قول سے کراہیت ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا: جب وہ ایک سے وطی کرے پھر دوسری سے وطی کرے تو دونوں سے توقف کرے حتیٰ کہ ایک کو حرام کرے، پس اس پر حد لازم نہ ہوگی، ابو عمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ "میں اسے سزا دیتا"۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے زانی کی حد لگاتا، کیونکہ اس نے یہ فعل آیت یا سنت کی تاویل سے کیا ہے اور اس نے از خود حرام وطی نہیں کی پس بالاجماع وہ زانی نہیں ہے اگرچہ وہ خطا کرنے والا ہے مگر وہ

1۔ مصنف عبدالرزاق، 12728

صورت جس میں وہ ایسا دعویٰ کرتا ہے جس میں جہالت کی وجہ سے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ اور ملک یمین کی وجہ سے دو بہنوں کو جمع کرنے میں بعض سلف کا قول انہیں ایک آیت حلال کرتی ہے اور ایک آیت حرام کرتی ہے۔ معلوم محفوظ ہے، پس جو اتنے قوی شبہ کی موجودگی میں کوئی ایسا فعل کرتا ہے تو اسے زانی کی حد کیسے لگائی جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ علماء کا اختلاف ہے جب ایک سے وطی کر چکا تھا پھر دوسری سے وطی کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عمر، حسن، بصری، اوزاعی، شافعی، امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: دوسری سے اس کا وطی کرنا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ پہلی کو اپنی ملکیت سے نکال کر اس کی فرج کو حرام کر دے مثلاً اسے بیچ دے یا آزاد کر دے یا اس کا کسی اور سے نکاح کر دے۔ ابن المنذر نے کہا: اس میں دوسرا قول قتادہ کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ایک سے وطی کر چکا ہو اور دوسری سے وطی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ پہلی کو اپنے اوپر حرام کرنے کی نیت کر لے اور اس کے قریب نہ جانے کی نیت کرے، پھر دونوں سے رکا رہے حتیٰ کہ پہلی جس کو حرام کیا تھا اس کا رحم صاف ہو جائے۔ پھر دوسری سے صحبت کرے۔ اس میں تیسرا قول بھی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کے پاس دو بہنیں ہوں تو وہ کسی کے بھی قریب نہ جائے۔ حکم اور حماد نے اسی طرح کہا ہے۔ اس کا مفہوم نخعی سے بھی مروی ہے۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی شخص کی ملکیت میں دو بہنیں ہوں، تو اس کے لیے جائز ہے جس سے چاہے وطی کرے اور دوسری سے رکنا اس کی امانت کے سپرد ہے اگر وہ دوسری سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اوپر پہلی کی فرج کو حرام کر دے اپنے کسی فعل سے جو اسے اس کی ملکیت سے نکال دے مثلاً اس کا کسی دوسرے سے نکاح کر دے یا اسے فروخت کر دے یا اسے ایک مدت تک آزاد کر دے یا اسے مکاتبہ بنا دے یا طویل خدمت کرنے کے لیے کسی کو دے دے۔ اگر ایک سے وطی کر چکا تھا پھر فوراً دوسری سے وطی کر دی جب کہ پہلی کو حرام نہیں کیا تھا تو دونوں سے رک جائے۔ اس کے لیے کسی کے قریب جانا جائز نہیں حتیٰ کہ دوسری کو حرام کر دے اور یہ اس کی امانت کے سپرد نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ اب متہم ہو چکا ہے اور پہلے وہ متہم نہ تھا جب اس نے صرف ایک سے وطی کی تھی۔ اس باب میں کوفیوں، ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ وہ اگر لونڈی سے وطی کر چکا ہے تو دوسری سے وطی نہ کرے۔ اگر پہلی کو بیچ دے یا اس کا نکاح کر دے، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے تو دوسری سے رک جائے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سے وطی کرے جب تک اس کی بہن طلاق کی یا وفات کی عدت میں ہے اور عدت کے گزرنے کے بعد نہیں، حتیٰ کہ اس عورت کی فرج کا کسی دوسرے کو مالک بنا دے جس سے وہ وطی کر چکا ہے۔ یہ مفہوم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: کیونکہ ملک جو ابتداء میں لونڈی کی وطی سے مانع تھی وہ اب بھی موجود ہے کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ اس کی طرف دوبارہ لوٹ کر آئے یا اس کی ملک میں باقی رہے۔ امام مالک کا قول عمدہ ہے کیونکہ یہ فی الحال صحیح تحریم ہے، مآل کی رعایت کو لازم نہیں اور یہ کافی ہے کہ جب وہ بیع یا آگے نکاح کرنے کے ساتھ اس کی فرج اپنے اوپر حرام کر دے گا تو وہ اس پر فی الحال حرام ہوگی اور آزاد کرنے میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ وہ اس میں کسی حالت میں تصرف نہیں کر سکتا، رہا اس لونڈی کو مکاتبہ بنانا کبھی وہ زر کتابت ادا کرنے سے عاجز آ جاتی ہے اور پھر اس کی ملک کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس لونڈی ہو جس سے وہ وطی کرتا ہو پھر وہ اس کی

بہن سے نکاح کرے تو اس کے نکاح کے بارے میں تین اقوال ہیں، تیسرا قول مدونہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں سے رک جائے جب عقد نکاح واقع ہو حتیٰ کہ ایک کو حرام قرار دے، کیونکہ اس نکاح کی وجہ سے وطی میں کراہت آ گئی ہے، کیونکہ یہ ایسی جگہ میں عقد ہے جس میں وطی جائز نہیں ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ ملک یمین نکاح سے مانع نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی سے گزر چکا ہے۔ اس باب میں ایک اور قول بھی ہے کہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا اور یہی اوزاعی کے قول کا معنی ہے۔ اشہب نے کتاب الاستبراء میں لکھا ہے کہ ایک میں نکاح کی عقد مملوکۃ (لونڈی) کی فرج کو حرام کر دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ایسی طلاق دے جس سے رجوع کر سکتا ہے تو اس کے لیے اس مطلقہ عورت کی بہن سے یا اس کے علاوہ چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ مطلقہ کی عدت گزر جائے اس میں اختلاف ہے کہ جب ایسی طلاق دے جس میں رجوع کا مالک نہیں ہے تو ایک جماعت نے کہا کہ نہ اس کی بہن سے اور نہ چوتھی سے نکاح کرنا جائز ہے حتیٰ کہ مطلقہ کی عدت گزر جائے۔ یہ حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے۔ اور مجاہد، عطا بن ابی رباح، نخعی، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل اور اصحاب الرائے کا یہی مذہب ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا: اس کے لیے اس کی بہن سے اور اس کے سوا چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ عطا سے مروی ہے اور عطا سے یہ اثبت روایت ہے۔ یہ حضرت زید بن ثابت سے بھی مروی ہے۔ اور یہی سعید بن مسیب، حسن، قاسم، عروہ بن زبیر، ابن ابی لیلی، امام شافعی، ابوثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک کا قول میں بھی یہی خیال کرتا ہوں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اس میں احتمال ہے کہ اس کا مطلب بھی وہی ہو جو وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ میں جو اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا معنی ہے اور یہ زائد کا بھی احتمال رکھتا ہے اور وہ ہے گزشتہ فعل کا جواز۔ زمانہ جاہلیت میں جمع کرنا دو بہنوں کو جائز تھا اور یہ نکاح صحیح تھا جب اسلام آیا تو دو بہنوں میں اختیار دیا گیا جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے مگر اسلام کے موجب اور شرع کے مقتضی پر کفار کی عقود کو جاری کیے بغیر خواہ ان دونوں بہنوں کو ایک عقد سے جمع کیا ہو یا دو عقدوں سے جمع کیا ہو۔ امام ابو حنیفہ دونوں کے نکاح کو باطل قرار دیتے ہیں اگر ایک عقد میں جمع کی گئی ہوں۔ ہشام بن عبداللہ نے محمد بن حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ ان تمام محرمات کو جانتے تھے جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہیں سوائے دو کے، ایک باپ کی عورت سے نکاح کرنا اور دوسرا دو بہنوں کو جمع کرنا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اور فرمایا وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اور باقی تمام محرمات میں اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا ذکر نہیں فرمایا۔ واللہ اعلم۔

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ

الْفَرِيْضَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

''اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہارے ملک میں آجائیں فرض کیا ہے اللہ نے (ان احکام کو) تم پر اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لیے ماسوا ان کے تا کہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعہ پاک دامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کیے ہوئے مہر کے بعد بے شک اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَّ الْمُحْصَنٰتُ اس کا عطف محرمات اور پہلے ذکر کی گئی عورتوں پر ہے۔ التحصن کا معنی بچنا ہے اس سے الحصن (قلعہ) ہے، کیونکہ اس میں حفاظت کی جاتی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (الانبیاء:80) (اور ہم نے سکھادیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے تا کہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے) اسی سے گھوڑے کے لیے حصان (بکسر الحاء) استعمال ہوتا ہے، کیونکہ گھوڑا بھی اپنے مالک کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ الحصان (بفتح الحاء) پاک دامن عورت جو اپنے آپ کو ہلاکت سے بچاتی ہے۔ حصنت المرأة تحصن فهي حصان۔ جیسے جبنت فهي جبان۔ حضرت حسان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا تھا:

حَصَانٌ رَزَانٌ ما تُزَنّ بِريبةٍ وتُصبِح غَرْثَیٰ من لحُومِ الغَوَافِل

مصدر الحصانة (بفتح الحاء) اور الحِصن جیسے العلم ہے۔ الْمُحْصَنٰتُ سے یہاں مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرأ محصنة یعنی شادی شدہ عورت اور محصنة آزاد عورت کو بھی کہتے ہیں اسی سے ہے الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ:5) (پاک دامن، مومن عورتیں اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) اور محصنة سے مراد پاک دامن عورت بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (پاک دامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے) اور فرمایا: مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (پاک باز بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے) مُحصَنة، مُحصِنة وحَصان اس کا معنی پاک دامن عورت ہے یعنی فسق سے رکنے والی، آزادی آزاد عورت کو ایسے کام سے روکتی ہے جو غلام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (نور:4) یعنی جو آزاد عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں لونڈی کا عرف زنا تھا۔ کیا آپ نے ہند بنت عتبہ کا قول ملاحظہ نہیں کیا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا جب اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی: کیا آزاد عورت زنا کرتی ہے (1)۔ خاوند اپنی بیوی کو کسی غیر سے نکاح کرنے سے روکتا ہے؟ ح، ص اور نون کی بنا کا معنی روکنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اسلام میں الاحصان استعمال ہوتا ہے، کیونکہ یہ حافظ اور مانع ہے یہ قرآن میں اس معنی میں وارد نہیں ہوا اور سنت میں وارد ہوا ہے۔ اسی سے نبی کریم

1۔ المحرر الوجیز، الحدیث اخرجہ ابو یعلی

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الایمان قید الفتك۔ ایمان دھوکے سے قتل کرنے کی قید ہے۔ اسی سے ہذلی کا قول ہے:

فلیس کعهد الدّار یا اُمّ مالكٍ ولکن احاطتْ بالرّقاب السلاسِلُ

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت هَلُمّ الی الحدیث فقلت لا یأبی علیكِ الله والاِسلامُ

اسی سے سحیم کا قول ہے:

کفی الشیبُ والاِسلامُ للمرءِ ناهِیا

''انسان کو بڑھاپا اور اسلام روکنے کے لیے کافی ہے''۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو پھر اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، ابوقلابہ، ابن زید، مکحول، زہری اور حضرت ابوسعید خدری نے کہا: یہاں اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد قیدی خاوندوں والی عورتیں ہیں یعنی وہ حرام ہیں مگر دارالحرب سے قیدی بن کر آنے کی وجہ سے تمہاری مملوکہ بن جائیں تو حلال ہیں اور یہ عورت اس کے لیے حلال ہوگی جس کے حصہ میں آئے گی اگرچہ اس کا خاوند بھی ہوگا۔ یہ امام شافعی کا قول ہے کہ قیدی ہونا عصمت کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ ابن وہب، ابن عبدالحکم کا قول ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ اس پر صحیح مسلم کی روایت کردہ حدیث دلالت کرتی ہے حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ کیا۔ پس وہ دشمن سے ملے ان سے جنگ کی اور ان پر غالب آ گئے۔ ان کو قیدی عورتیں ملیں تو صحابہ کرام ان سے ہم بستری کرنے سے بچنے لگے، کیونکہ ان کے مشرک خاوند موجود تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وہ تمہارے لیے حلال ہیں جب ان کی عدت گزر جائے یہ صریح اور صحیح نص ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صحابہ کرام خاوندوں والی قیدی عورتوں سے وطی کرنے سے بچنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کا ارشاد نازل فرمایا۔ یہی قول امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور کا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ استبراء رحم کیسے ہوگا۔ حسن نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک حیض کے ساتھ قیدی عورت کا استبراء کرتے تھے یہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث سے اوطاس کی قیدی عورتوں کے متعلق مروی ہے اور حاملہ سے وطی نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ بچہ جنم دے دے اور دوسری عورت سے وطی نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ اسے حیض آ جائے۔ اور سابق خاوند کے فراش کا کوئی اثر نہیں ہوگا حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ قیدی عورت مملوکہ ہے لیکن وہ بیوی تھی اس کا نکاح زائل ہوگیا پس وہ لونڈیوں والی عدت گزارے گی۔ جیسا کہ حسن بن صالح سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: اس پر عدت دو حیض ہیں جب اس کا دارالحرب میں خاوند تھا۔ اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا استبراء اور اس کا استبرا جس کا خاوند نہیں ہے، ایک جیسا ہے تمام کا استبرا ایک حیض ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ میاں بیوی اکٹھے قیدی ہوں یا علیحدہ علیحدہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ابن بکیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ میاں بیوی اگر اکٹھے

قیدی کیے جائیں اور مرد کو زندہ رکھا گیا ہے تو دونوں اپنے نکاح پر قائم رکھے جائیں گے اس روایت میں انہوں نے یہ دیکھا کہ اسے زندہ باقی رکھنا اس کی ملکیت باقی رکھنا ہے، کیونکہ اس کے لیے عہد ہو گیا اور اس کی بیوی بھی اس کی ملکیت سے ہے ان کے درمیان کوئی حائل نہ کیا جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ثوری کا قول ہے اور ابن القاسم کا یہی قول ہے اور انہوں نے یہ امام مالک سے روایت کیا ہے اور صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ پس ملک یمین پر اس کو پھیر دیا اور اسے موثر بنایا پس عموم اور تعلیل دونوں کے اعتبار سے حکم اس کے ساتھ معلق ہو گا مگر دلیل جس کو خاص کر دے تو اس کا حکم علیحدہ ہو گا۔ اس آیت کے بارے میں دوسرا قول بھی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بن ابی الحسن، حضرت ابی بن کعب، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن عباس کا قول ہے اور ایک روایت میں عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس آیت سے مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں یعنی وہ حرام ہیں مگر آدی خاوند والی عورت کا استبرا کرے۔ لونڈی کا بیچنا اس کی طلاق ہے، اس کو صدقہ کرنا اس کی طلاق ہے، اس کو میراث میں دینا اس کی طلاق ہے اور خاوند کا اسے طلاق دینا اس کی طلاق ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جب لونڈی بیچی جائے اور اس کا خاوند ہو تو مشتری کو اس کے بضع کا زیادہ حق ہے اسی طرح دار الحرب سے قیدی ہو کر آنے والی عورت کا حکم ہے۔ یہ تمام اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان جدائی کا موجب ہے۔ علماء نے فرمایا: جب معاملہ اس طرح ہو گا تو لونڈی کا بیچنا لونڈی کے لیے ضرور طلاق ہو گا، کیونکہ ایک شرمگاہ ایک حال میں دو شخصوں پر بالا جماع حرام ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث بریرہ اس کو رد کرتی ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت بریرہ کو خریدا تھا اور آزاد کر دیا تھا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اختیار دیا اور وہ خاوند والی تھی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ حضرت بریرہ کو حضرت عائشہ کے خریدنے اور آزاد کرنے کے بعد اپنے خاوند مغیث کے پاس رہنے کا اختیار دیا گیا تھا یہ دلیل ہے کہ لونڈی کو بیچنا اس کی طلاق نہیں ہے۔ اس پر فقہا اور ائمہ حدیث کا اجماع ہے۔ لونڈی کی طلاق نہیں ہے مگر طلاق۔ بعض ائمہ نے اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کے عموم سے اور قیدی عورتوں پر قیاس سے حجت پکڑی ہے اور ہم نے جو حدیث بریرہ ذکر کی ہے وہ اسے خاص کرتی ہے اور اسے رد کرتی ہے۔ وہ حضرت ابو سعید کی حدیث کی بنا پر مسبیات (قیدی عورتوں) کے ساتھ خاص ہے۔ انشاء اللہ یہی قول حق اور درست ہے۔ اور اس آیت میں تیسرا قول بھی ہے ثوری نے مجاہد سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ سے مراد مسلمانوں اور مشرکوں کی بیویاں ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: مشرکوں کی بیویاں ہیں۔ اور موطا میں سعید بن میسب سے مروی ہے کہ اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں۔ یہ اس طرف راجع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا حرام کیا ہے ایک جماعت نے کہا اس آیت میں اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد پاک دامن عورتیں ہیں یعنی تمام عورتیں حرام ہیں جن پر احصان کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ خاوند والی ہے یا خاوند والی نہیں ہے، کیونکہ شرائع اسی بات کا تقاضا کرتی ہیں۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے نکاح کے ساتھ یا خریدنے کے ساتھ جن کے تمہارے دائیں ہاتھ

مالک ہوئے۔ یہ ابوالعالیہ، عبیدہ السلمانی، طاؤس، سعید بن جبیر، علاء کا قول ہے۔ یہ عبیدہ نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے پس انہوں نے ملک یمین کے تحت نکاح کو داخل کیا ہے ان کے نزدیک اس ارشاد اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا معنی یہ ہوگا کہ تم جن کی عصمت کے نکاح کے ساتھ مالک ہوتے ہو اور جن کی گردن کے خریدنے کے ساتھ مالک ہوتے ہو، گویا وہ تمام ملک یمین ہیں اور اس کے علاوہ زنا ہے یہ حسن قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد مسلمانوں اور اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس تاویل سے آیت کا معنی زنا کی تحریم کی طرف لوٹتا ہے۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت سعید بن جبیر سے کہا: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت ابن عباس سے جب اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا؟ حضرت سعید نے کہا: حضرت ابن عباس اس کو نہ جانتے تھے۔ اور مجاہد سے سنداً روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اگر میں کوئی ایسا شخص جانتا جو اس آیت کی تفسیر کرتا تو میں اس کی طرف اونٹوں کے جگر پگھلاتا (یعنی مشقت کے ساتھ سفر کر کے جاتا) اَلْمُحْصَنٰتُ سے حَكِيْمًا تک کا قول مراد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابن عباس کی طرف کیسے یہ قول منسوب کیا اور میں نہیں جانتا کہ مجاہد اس قول تک کیسے پہنچے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ مصدر مؤکد کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے یعنی یہ عورتیں حرام کی گئی ہیں اللہ کی طرف سے تم پر یہ فرض کیا گیا ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ کا معنی كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ہے۔ زجاج اور کوفیوں نے کہا: اس کو نصب اغرا کی بنا پر ہے۔ یعنی الزموا الله یا علیکم کتاب الله (یعنی اللہ کی کتاب کو لازم پکڑو) اس میں نظر ہے جیسا کہ ابوعلی نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اغراء میں، حرف اغراء پر منصوب کو مقدم کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہا جاتا: زیداً علیك، یا زیداً دونك بلکہ علیك زیداً و دونك عمراً کہا جاتا ہے۔ علیکم سے منصوب ہونے کی بنا جو انہوں نے کہا یہ صحیح ہے، رہا فعل کے حذف کی تقدیر پر تو وہ جائز ہے اور ھذا کتاب الله وفرضه کے معنی پر رفع بھی جائز ہے۔ ابوحیوہ، محمد بن سمیقع نے کتب الله علیکم یعنی فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور اسم جلالت کو فاعل بنایا ہے۔ معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو تحریم بیان فرمائی ہے وہ اللہ نے تم پر فرض کی ہے۔ عبیدہ السلمانی وغیرہ نے کہا: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ یہ قرآن میں موجود ارشاد مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ کی طرف اشارہ ہے۔ اس قول میں بعد ہے اور اظہر یہ ہے کہ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یہ اس تحریم کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کے درمیان اور عرب جو کچھ کرتے تھے اس کے درمیان آڑ تھی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ حمزہ، کسائی، عاصم اور ایک روایت میں حفص نے واُحل لکم پڑھا ہے اور حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ پر عطف کیا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ پر عطف کیا ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عورتوں کو حرام نہ کرے مگر جن کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان کے ذریعے ایسی عورتوں کو حرام کیا ہے جن کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے، پس انہیں بھی اس کے ساتھ ملایا جائے گا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) (جو تمہیں رسول (مکرم ﷺ) عطا کرے تو اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کرے تو اس سے رک جاؤ) مسلم وغیرہ نے

حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع نہ کرے اور عورت اور اس کی خالہ کو جمع نہ کرے''۔ ابن شہاب نے کہا: ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے باپ کی خالہ اور اس کے باپ کی پھوپھی اس کے مقام پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع کرنے کی حرمت آیت سے پائی گئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو جمع کرنا حرام کیا ہے اور عورت اور اس کی پھوپھی، جمع بین الاختین (دو بہنوں کو جمع کرنے) کے حکم میں ہے یا خالہ والدہ کے معنی میں ہے اور پھوپھی والد کے معنی میں ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ کتاب اور سنت ایک چیز کے حکم میں ہیں یا فرمایا: جو ہم نے کتاب میں ذکر کی ہیں اور جن کا بیان محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان سے میں نے مکمل کیا ہے ان کے علاوہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ اور ابن شہاب کا قول کہ ہم عورت کے باپ کی خالہ اور عورت کے باپ کی پھوپھی کو اس کے قائم مقام دیکھتے ہیں۔ یہ انہوں نے اس لیے کہا ہے کہ انہوں نے خالہ اور پھوپھی کو عموم پر محمول کیا ہے اور اس کے لیے یہ تمام ہوا ہے، کیونکہ عمۃ ہر اس مؤنث کا اسم ہے جو تیرے باپ کے ساتھ دونوں اصلوں میں یا ایک اصل میں شریک ہے اور خالہ بھی اسی طرح ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور مصنف ابوداؤد وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: پھوپھی پر بھتیجی اور بھتیجی پر پھوپھی سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور خالہ پر اس کی بھانجی سے اور بھانجی پر اس کی خالہ سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور چھوٹی پر بڑی سے اور بڑی پر چھوٹی سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پھوپھی اور خالہ کو جمع کرنا اور دو پھوپھیوں اور دو خالاؤں کو جمع کرنا ناپسند فرمایا(1)۔ لا یجمع کو عین کے رفع کے ساتھ خبر کی بنا پر پڑھنا جائز ہے اور نہی اس کے ضمن میں ہوئی۔ اس حدیث پر عمل میں اجماع ہے کہ جن کا پیچھے ذکر ہوا ہے ان کا جمع کرنا نکاح میں حرام ہے۔ خوارج نے دو بہنوں کو جمع کرنا اور پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرنا اور خالہ اور بھانجی کو جمع کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ان کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ دین سے نکل گئے ہیں اور دین سے خارج ہو گئے ہیں، کیونکہ یہ ثابت سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور حدیث کے الفاظ لا یجمع بین العمتین و الخالتین۔ بعض علماء کے لیے سمجھنا مشکل ہو گیا وہ اس کے مفہوم میں متحیر ہوئے حتیٰ کہ انہوں نے اسے ایسا مفہوم پہنایا جو بہت بعید ہے یا جائز ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا: بین العمتین کا معنی مجاز پر ہے یعنی پھوپھی اور بھانجی کو جمع کرنا، ان دونوں کو عمتان کہا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: سنة العمرین۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سنت کے لیے اور بین الخالتین کے بارے میں بھی اسی طرح کہا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ ایسا تعسف ہے جس کو سنا بھی نہیں جا سکتا۔ اس میں واقعی تعسف کے ساتھ ساتھ بغیر فائدہ کے کلام میں تکرار ہے، کیونکہ جب معنی یہ ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرنا منع ہے اور پھر اگر العمتین کا بھی یہی معنی کیا جائے تو کلام میں بغیر فائدہ کے تکرار ہو گا۔ اگر اس طرح ہوتا جس طرح اس نے کہا ہے تو وبین الخالة ہونا واجب ہوتا، حالانکہ حدیث اس طرح نہیں ہے، کیونکہ حدیث یہ ہے کہ پھوپھی اور خالہ کو جمع کرنے سے منع فرمایا۔ پس حدیث کے لفظ پر واجب ہے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع نہ کیا جائے جبکہ ایک دوسری کی پھوپھی ہو اور دوسری کی خالہ ہو۔ نحاس

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1878

نے کہا: یہ صحیح معنی پر نکل سکتا ہے مثلاً ایک شخص اور اس کا بیٹا ہو باپ بیٹی سے نکاح کر لے اور بیٹا اس عورت کی ماں سے نکاح کرے۔ پھر باپ کی بھی بیٹی پیدا ہو اور بیٹے کی بھی بیٹی پیدا ہو۔ پس باپ کی بیٹی، بیٹے کی بیٹی کی پھوپھی ہوگی اور بیٹے کی بیٹی باپ کی بیٹی کی خالہ ہوگی۔ اور رہا دو خالاؤں کو جمع کرنا، یہ ثابت کرتا ہے کہ دو عورتیں ہوں ان میں سے ہر ایک دوسری کی خالہ ہو۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص، دوسرے شخص کی بیٹی سے نکاح کرے اور دوسرا شخص پہلے شخص کی بیٹی سے نکاح کرے، ہر ایک کی بیٹی پیدا ہو، تو ان میں سے ہر ایک کی بیٹی دوسری کی خالہ ہوگی۔ اور رہا دو پھوپھیوں کو جمع کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی دو عورتیں نہ جمع کی جائیں جن میں سے ہر ایک دوسری کی پھوپھی ہو۔ یہ اس طرح ہے ایک شخص، دوسرے شخص کی ماں سے نکاح کرے دوسرا اس کی ماں سے نکاح کرے ہر ایک کی بیٹی پیدا ہو تو ان میں سے ہر ایک دوسری کی پھوپھی ہوگی۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حرام قرار دیا جو قرآن میں سے نہیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو جن دو عورتوں کو جمع کرنا حرام ہے ان کے لیے ایک عمدہ کلیہ بنایا ہے۔ معتمر بن سلیمان نے فضیل بن میسرہ سے انہوں نے ابو جریر سے انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو ایسی عورتیں جب ان میں سے ایک کو مذکر تصور کیا جائے تو دوسری سے اس کا نکاح نہ ہو سکے تو ان دونوں کا جمع کرنا باطل ہے۔ میں نے شعبی سے پوچھا یہ کن سے مروی ہے؟ شعبی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے۔ سفیان ثوری نے کہا: ہمارے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ وہ نسب سے ہو اور وہ عورت اور اس کے خاوند کی بیٹی کی طرح نہ ہو، ان کو اگر چاہے تو جمع کر سکتا ہے۔ ابو عمر نے کہا امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، اوزاعی اور محدثین وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس اصل میں ان کا اختلاف نہیں ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے کہ ایک شخص، کسی شخص کی بیٹی اور اس کی بیوی کو جمع کرے، کیونکہ اگر ان میں سے ایک کو مذکر بنایا جائے تو دوسری سے نکاح جائز نہ ہوگا اور جس پر علماء کا مدار ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس میں رعایت نسب کی ہے، مصاہرت کی نہیں ہے۔ پھر بعض اخبار میں جمع نہ کرنے کی علت پر تنبیہ کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں جمع کرنا قطع رحمی کا باعث بنتا ہے، کیونکہ غیرت کی وجہ سے سوکنوں کے درمیان دشمنی اور شر واقع ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی پر اس کی بھتیجی سے اور خالہ پر اس کی بھانجی سے نکاح کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا: جب تم ایسا کرو گے تو قطع رحمی کرو گے۔ یہ ابو محمد اصیلی نے فوائد میں اور ابن عبد البر وغیر ہما نے اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد کی مراسیل سے، حسین بن طلحہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع رحمی کے خوف کی وجہ سے بہن پر بہن سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ بعض علماء نے اس علت کو عام کیا ہے پس انہوں نے ہر دو قریبی عورتوں کو جمع کرنے سے منع کیا ہے پہلی بیوی کی خواہ وہ چچا کی بیٹی ہو یا پھوپھی کی بیٹی ہو یا خالو کی بیٹی ہو یا خالہ کی بیٹی ہو۔ یہ اسحاق بن طلحہ، عکرمہ، قتادہ اور عطا سے مروی ہے۔ اور ایک روایت ابن ابی نجیح سے بھی یہی ہے۔ ابن جریج نے ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہی صحیح ہے۔ حضرت حسن بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے ایک رات میں محمد بن علی کی بیٹی اور عمر بن علی کی بیٹی سے نکاح کیا تھا پس انہوں نے چچا کی بیٹیوں کو جمع کیا تھا۔ یہ روایت عبدالرزاق نے ذکر کی

ہے۔ ابن عیینہ نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ عورتیں نہیں جانتی تھیں کہ کس کے پاس جائیں۔ امام مالک نے ایسی صورت کو ناپسند کیا ہے لیکن ان کے نزدیک یہ حرام نہیں۔

ابن القاسم کی سماع میں ہے امام مالک سے پوچھا گیا دو چچوں کی بیٹیوں کو جمع کیا جائے گا؟ امام مالک نے فرمایا: میں اسے حرام نہیں جانتا، پوچھا گیا کیا آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں؟ امام مالک نے فرمایا: لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ ابن القاسم نے کہا: یہ حلال ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن المنذر نے کہا: میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جس نے اس نکاح کو باطل قرار دیا ہو۔ یہ دونوں عورتیں ان عورتوں میں داخل ہیں جن سے نکاح مباح کیا گیا ہے یہ ان سے کتاب وسنت اور اجماع سے خارج نہیں ہیں۔ اسی طرح پھوپھیوں اور خالاؤں کی بیٹیوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ سدی نے **وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ** کے متعلق فرمایا: یعنی نکاح کرنا حلال ہے۔ بغیر نکاح کے فرج حلال نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تمہارے قریبی محارم عورتوں کے علاوہ عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔ قتادہ نے کہا: ملک یمین اس کے ساتھ خاص ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ** یہ لفظ نکاح کرنے اور خریدنے کو شامل ہے۔ اَنْ محل نصب میں ہے ما سے بدل ہے اور حمزہ کی قرأت پر محل رفع میں ہے۔ یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ لِاَنْ یا بِاَنْ کے معنی میں ہو پھر لام اور با کو حذف کیا گیا ہو، پھر یہ محل نصب میں ہو گیا ہو۔ **مُّحْصِنِيْنَ** حال کی بنا پر منصوب ہے، اس کا معنی ہے زنا سے بچنے والے۔ **غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ** زنا نہ کرنے والے۔ السفاح کا معنی زنا ہے یہ سفح الماء سے مشتق ہے جس کا معنی پانی کا بہنا ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جب آپ نے شادی کے موقع پر دف بجانے والے کی آواز سنی: ''یہ نکاح ہے زنا نہیں ہے، نہ خفیہ نکاح ہے'' (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: **مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ** دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے (ا) جو ہم نے ذکر کی ہے وہ نکاح کی عقد کے ساتھ احصان ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ بضع کے منافع اپنے اموال کے ذریعے نکاح کے طریقہ پر حاصل کرو نہ کہ زنا کے طریقہ پر۔ اس وجہ پر آیت کے لیے عموم ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے **مُّحْصِنِيْنَ** یعنی احصان عورتوں کی صفت ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ تم ان میں احصان کی شرط پر ان سے نکاح کرو۔ پہلی وجہ اولیٰ ہے، کیونکہ جب آیت کو اس کے عموم پر جاری کرنا اور اس کے مقتضی کے تعلق پر جاری کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہوتا ہے، کیونکہ دوسری وجہ کا مقتضی یہ ہے کہ جو بدکارہ ہیں ان سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِاَمْوَالِكُمْ** اللہ تعالیٰ نے فروج کو اموال کے ساتھ مباح کیا ہے اور کوئی فرق نہیں فرمایا ہے۔ پس جب بغیر مال کے واقع ہو تو اباحت واقع نہ ہوگی، کیونکہ وہ اس شرط کے بغیر پایا گیا ہے جس میں اجازت دی گئی ہے جیسے اگر شراب یا خنزیر پر یا ایسی چیز پر نکاح کرے جس کا مالک ہونا ہی صحیح نہیں ہے۔ یہ قول امام احمد کا رد کرتا ہے جو انہوں نے فرمایا کہ آزاد کرنا مہر ہوگا، کیونکہ اس میں مال کا حوالے کرنا نہیں ہے، اس میں ملک کو ساقط کرنا ہے بغیر اس کے وہ اس کے ساتھ اس بات کی مستحق ہو کہ مال اس کے حوالے کیا جائے۔ مالک اپنی طرف سے جس کا مالک ہوتا ہے وہ اس کی طرف منتقل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 36

نہیں ہوتا وہ سقوط ہے پس جب خاوند اس کے حوالے کوئی چیز نہیں کرے گا تو وہ اس پر کسی چیز کی مستحق نہیں ہوگی۔ اس نے اس کے ساتھ خود اپنی ملک کو تلف کیا ہے۔ یہ آزاد کرنا مہر نہ ہوگا۔ یہ واضح ہے نیز یہ ارشاد بھی ہے کہ وَاٰتُوا النِّسَآءَ عورتوں کو دو۔ یہ حکم ایجاب کا تقاضا کرتا ہے اور آزادی کا عطا کرنا صحیح نہیں ہے اور الله تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ۔ اور یہ چیز عتق میں محال ہے پس مہر صرف مال ہی ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَمْوَالِكُمْ پھر مہر کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے بِاَمْوَالِكُمْ کے عموم سے ہر قلیل و کثیر کو مہر ہونے کے جواز پر دلیل پکڑی ہے اور یہ صحیح ہے اور اس کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کرتا ہے: ولو خاتما من حدید (1) اگر لوہے کی انگوٹھی ہی ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بیواؤں کا نکاح کرو، پوچھا گیا: یا رسول الله! ان کے درمیان کیا مہور ہوں؟ فرمایا: جس پر ان کے اہل راضی ہو جائیں اگرچہ کیکر کی ٹہنی ہی ہو''۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: ہم نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مہر کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر ان کے اہل صلح کر لیں۔ جابر نے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص کسی عورت کو ہاتھ بھر کھانا دے تو اس کی وجہ سے وہ حلال ہو جائے گی۔ ان دونوں حدیثوں کو دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ہر وہ چیز جس کے لیے کسی شئ کی قیمت بننا جائز ہے یا اس کا اجرت ہونا جائز ہو تو وہ مہر بن سکتی ہے۔ یہ جمہور اہل علم کا قول ہے اور اہل مدینہ میں سے محدثین کی ایک جماعت وغیرہ نے قلیل اور کثیر مال سے مہر مقرر کرنا جائز قرار دیا ہے۔ یہ عبدالله بن وہب، صاحب مالک کا قول ہے۔ اور ابن المنذر وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: اگر اسے کوڑا مہر کے طور دے تو اس کے ساتھ حلال ہو جائے گی۔ سعید بن مسیب نے اپنی بیٹی عبدالله بن وداعہ کو دو دراہم کے مہر کے عوض نکاح کر دی۔ ربیعہ نے کہا: ایک درہم کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ ابو الزناد نے کہا: جس پر ان کے اہل راضی ہو جائیں۔ مالک نے کہا: دینار کی چوتھائی یا تین دراہم سے کم مہر نہ ہوگا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس کی یہ علت بیان کی ہے یہ قطع ید کے مشابہ ہے، کیونکہ بضع بھی عضو ہے اور ہاتھ بھی عضو ہے۔ مقدر مال کے ساتھ مباح کیا جاتا ہے اور وہ دینار کی چوتھائی ہے یا تین دراہم کیلا ہیں۔ امام مالک نے ہاتھ پر قیاس کرتے ہوئے بضع کو اس مقدار کی طرف لوٹایا ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام ابو حنیفہ کا اس سے پہلے یہ قول تھا مہر کو انہوں نے قطع ید پر قیاس کیا اور ہاتھ امام ابو حنیفہ کے نزدیک نہیں کاٹا جاتا مگر ایک دینار سونا یا دس دراہم کے بدلے میں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے اس پر ان کے اصحاب کی جماعت کا قول ہے۔ اور ان کے اہل مذہب کا قول ہے ان کے شہر کے اکثر علماء کا یہی قول قطع ید کے بارے میں ہے۔ کم از کم مہر کے بارے میں نہیں ہے۔ دراوردی نے مالک سے کہا: جب انہوں نے کہا کہ چار دینار سے کم مہر نہیں ہے اے ابا عبدالله! اس مسئلہ میں تم عراقی ہو گئے ہو یعنی تم اہل عراق کے راستہ پر چلے ہو۔ امام ابو حنیفہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حضرت جابر نے روایت کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں مبشر بن عبید ہے وہ متروک ہے داؤد الاودی سے مروی ہے انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دس

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراءة عن ظهر القلب، حدیث نمبر 4642، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: غیاث بن ابراہیم نے داؤد الاودی کو تلقین کی انہوں نے شعبی سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ پس یہ حدیث ہوگئی۔ نخعی نے کہا: اس کی کم از کم مقدار چالیس دراہم ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: 50 دراہم ہیں ابن شبرمۃ نے کہا: پانچ دراہم ہیں۔ یہ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پانچ دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً۔ استمتاع سے مراد تلذذ ہے۔ الاجور سے مراد مہور ہیں۔ مہر کو اجر اس لیے کہا گیا ہے، کیونکہ یہ استمتاع کا اجر ہے یہ نص ہے کہ مہر کو اجر کہا جاتا ہے یہ دلیل ہے کہ یہ بضع کے مقابلہ میں ہے، کیونکہ جو منفعت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اسے اجر کہا جاتا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ نکاح میں معقود علیہ (جس پر عقد کی گئی ہے) کیا ہے، عورت کا بدن، یا بضع کی منفعت یا تمام حلال ہونا؟ یہ تین اقوال ہیں مجموع (تمام) ہے، کیونکہ عقد تمام کا تقاضا کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن اور مجاہد وغیرہما نے کہا: جو تم نے نکاح صحیح کے ذریعے عورتوں سے جماع کر کے نفع اور لطف اٹھایا ہے فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ تو انہیں ان کے مہر دو۔ جب کوئی ایک مرتبہ جماع کر لے گا تو پورا مہر واجب ہوگا اگر وہ متعین ہوگا، اگر متعین نہ ہوگا تو مہر مثل واجب ہوگا۔ اگر نکاح فاسد ہوگا تو نکاح فاسد میں امام مالک سے روایت مختلف ہے کیا وہ مہر مثل یا مہر مسمی کی مستحق ہوگی جب کہ مہر صحیح ہوگا؟ کبھی تو امام مالک نے فرمایا: مہر مسمی دینا ہوگا یہی امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جس پر وہ راضی ہوئے ہیں وہ یقینی ہے اور مہر مثل میں اجتہاد ہے پس یقین کی طرف رجوع واجب ہے، کیونکہ شک کے ساتھ اموال کا استحقاق نہیں ہوتا اور مہر مثل کا قول اس لیے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی اس کا نکاح باطل ہوگا اگر مرد نے اس سے صحبت کر لی ہے تو اسے مہر مثل ملے گا، کیونکہ اس کی فرج حلال کی گئی ہے'' (1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت کو متعہ کے جواز پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے نکاح سے منع فرمایا اور اسے حرام قرار دیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ تم نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اہل کی اجازت سے نکاح وہ نکاح شرعی ہے جو ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہو اور نکاح متعہ اس طرح نہیں ہے۔ جمہور علماء نے کہا: نکاح متعہ ابتداء اسلام میں جائز تھا۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابی اور حضرت ابن جبیر نے **فما استمتعم به منهن الی اجل مسمی** فآتوهن اجورهن پڑھا ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا تھا۔ سعید بن مسیب نے کہا: **اية الميراث** نے اس کو منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ متعہ میں میراث نہیں تھی۔ حضرت عائشہ اور قاسم بن محمد نے کہا: متعہ کی حرمت اور اس کا نسخ قرآن میں ہے اور وہ اس ارشاد میں ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ (المومنون) (اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جوان کی ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بے شک انہیں ملامت نہیں کی جائے گی) اور متعہ نہ نکاح ہے اور نہ ملک یمین ہے۔ دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ سے منع فرمایا۔ فرمایا: یہ پہلے اس شخص کے لیے تھا جو نکاح نہیں پاتا تھا جب نکاح، طلاق، عدت، میاں، بیوی کے درمیان میراث کے احکام نازل ہوئے تو متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا: رمضان کے روزہ نے ہر روزہ کو منسوخ کر دیا، زکوٰۃ نے ہر صدقہ کو منسوخ کر دیا، طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو منسوخ کر دیا اور قربانی نے ہر ذبح کو منسوخ کر دیا۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: متعہ منسوخ ہے اس کو طلاق، عدت اور میراث نے منسوخ کیا ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: متعہ اللہ کی طرف سے رحمت تھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا تھا اگر حضرت عمر نے اس سے منع نہ کیا ہوتا تو کوئی زنا نہ کرتا مگر بد بخت شخص۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ متعہ کتنی مرتبہ مباح ہوا اور کتنی مرتبہ منسوخ ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ سے مروی ہے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ہمارے پاس عورتیں نہیں ہوتی تھیں، ہم نے کہا: کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خصی ہونے سے منع فرمایا، پھر ہمیں رخصت دی کہ ہم ایک مدت تک کے لیے کپڑے کے بدلے میں کسی عورت سے نکاح کر لیں (1)۔ ابو حاتم البستی نے اپنی صحیح میں کہا: صحابہ کرام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنا کہ کیا خصی نہ ہو جائیں؟ یہ دلیل ہے کہ متعہ سے ان کے لیے استمتاع مباح ہونے سے پہلے ممنوع تھا اگر متعہ ممنوع نہ ہوتا تو ان کے اس سوال کا کوئی معنی نہ تھا۔ پھر انہیں جہاد میں ایک مدت تک ایک کپڑے کے عوض عورت سے نکاح کرنے کی رخصت دی۔ پھر متعہ سے خیبر کے سال منع کر دیا پھر فتح مکہ کے سال متعہ کی اجازت دی گئی پھر تین سال بعد حرام کر دیا۔ پس متعہ قیامت تک حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: عورتوں سے متعہ شریعت کے غرائب سے ہے، کیونکہ یہ اسلام کے ابتدائی دور میں مباح کیا گیا پھر خیبر کے دن حرام کیا گیا پھر غزوۂ اوطاس میں مباح کیا گیا پھر اس کے بعد حرام کیا گیا اور تحریم پر اس کا امر قرار پا گیا سوائے مسئلہ قبلہ کے شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، کیونکہ اس پر دو مرتبہ نسخ طاری ہوا پھر اس کے بعد قرار پا گیا۔ اور دوسرے علماء جنہوں نے متعہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا انہوں نے کہا: یہ سات مرتبہ تحلیل و تحریم کا تقاضا کرتی ہیں۔ ابن ابی عمرہ سے مروی ہے کہ یہ ابتداء اسلام میں جائز تھا حضرت سلمہ بن اکوع نے روایت کیا ہے کہ یہ اوطاس کے سال حلال تھا اور حضرت علی کی روایت میں اس کی حرمت خیبر کے دن ہوئی۔ حضرت ربیع بن سمرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے دن اس کی اباحت تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام طرق صحیح مسلم میں ہیں اور مسلم کے علاوہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے غزوۂ تبوک میں اس کی نہی مروی ہے۔ اس کو اسحاق بن راشد نے زہری سے انہوں نے عبد اللہ بن محمد بن علی سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس روایت پر اسحاق بن رشد کا ابن شہاب سے روایت کرنے میں کوئی متابع نہیں ہے اور مصنف

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3650

ابی داؤد میں ربیع بن سبرہ کی حدیث سے حجۃ الوداع کے موقع پر متعہ سے نہی ثابت ہے۔ ابو داؤد کا نظریہ یہ ہے کہ جتنا اس کے متعلق روایت کیا گیا ہے اس میں یہ قول اصح ہے۔ عمرو نے حسن سے روایت کیا ہے: متعہ کبھی حلال نہیں ہوا مگر عمرۃ القضاء میں صرف تین دن حلال ہوا، نہ اس سے پہلے حلال ہوا، نہ اس کے بعد حلال ہوا۔ یہ بھی سبرہ سے روایت کیا گیا ہے یہ سات جگہیں ہیں جن میں متعہ حلال کیا گیا اور حرام کیا گیا۔ ابو جعفر طحاوی نے کہا: تمام لوگ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعہ کا اطلاق روایت کیا انہوں نے بتایا کہ یہ سفر میں تھا۔ اس کے بعد سفر میں اس کو نہی لاحق ہوئی اور اس سے منع فرمایا کسی نے یہ نہیں بتایا کہ متعہ حضر میں حلال تھا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ رہی حضرت سبرہ کی وہ حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حجۃ الوداع میں اس کی اباحت کا ذکر ہے وہ ان تمام معانی سے خارج ہے اور ہم نے اس حرف کے بارے میں خوب غور و فکر کیا تو ہمیں یہ صرف عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز کی روایت میں ملا۔ اور اسے اسماعیل بن عیاش نے عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز سے روایت کیا اور ذکر کیا کہ یہ فتح مکہ کے موقع پر تھا کہ لوگوں نے آپ کی بارگاہ میں عورتوں سے جدائی کی شکایت کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں متعہ کی رخصت دی اور حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کا عورتوں سے جدائی کی شکایت کرنا محال ہے، کیونکہ انہوں نے عورتوں کے ساتھ حج کیا تھا اور مکہ میں عورتوں سے نکاح کرنا بھی انہیں ممکن تھا اس وقت وہ اس طرح نہیں تھے جیسا کہ وہ پہلے غزوات میں تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ اس قسم کا حکم مغازی میں اور جامع مواقع پر بار بار بیان فرماتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی تحریم کا ذکر حجۃ الوداع میں اس لیے کیا، کیونکہ لوگ جمع تھے تا کہ انہیں بھی سنا دیں جنہوں نے پہلے اس کے متعلق نہیں سنا تھا آپ نے اسے مؤکد فرمایا تا کہ کسی ایسے شخص کے لیے شبہ نہ رہے جو اس کی حلت کا دعویٰ کرتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ متعہ کو کثرت سے استعمال کرتے تھے (اس لیے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحریم کا ذکر کیا)

**مسئلہ نمبر 11**۔ لیث بن سعد نے بکیر بن اشج سے انہوں نے عمار مولی شرید سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس سے متعہ کے متعلق پوچھا: کیا یہ زنا ہے یا نکاح ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہ زنا ہے، نہ نکاح ہے۔ میں نے کہا: پھر کیا ہے؟ فرمایا: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ میں نے کہا: کیا اس عورت پر عدت ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: ہاں ایک حیض۔ میں نے کہا: متعہ کرنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: نہیں۔ ابو عمر نے کہا: سلف و خلف علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ متعہ ایک مدت تک نکاح ہے جس میں میراث نہیں ہے اور مدت کے پورا ہونے کے وقت بغیر طلاق کے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: متعہ کے پورا ہونے کے وقت بغیر طلاق کے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: متعہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے دو گواہوں کی موجودگی میں اور عورت کے ولی کی اجازت سے مقرر مدت تک نکاح کرے اس بنا پر کہ ان دونوں کے درمیان میراث نہ ہوگی اور مرد عورت کو وہ مال دے گا جس پر ان میں اتفاق ہوا تھا۔ جب مدت گزر جائے گی تو مرد کو اس عورت پر کوئی راہ نہ ہوگی اور وہ استبراء رحم کرے گی، کیونکہ بلاشک اس میں بچہ لاحق ہوگا اور اگر وہ حاملہ نہ ہوگی تو وہ دوسرے کے لیے حلال ہوگی۔ نحاس کی کتاب میں

ہے کہ اس میں خطا ہے بچہ نکاح متعہ میں لاحق نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں: یہ نحاس کی عبارت کا مفہوم ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ متعہ یہ ہے کہ مرد عورت کو کہے: میں تجھ سے ایک دن کے لیے (یا اس کی مثل کوئی مدت متعین کرے) نکاح کرتا ہوں اس شرط پر کہ تجھ پر عدت نہ ہوگی اور نہ ہمارے درمیان میراث ہوگی اور نہ طلاق ہوگی اور نہ گواہ ہوگا جو اس پر گواہی دے گا یہ بعینہ زنا ہے اور اسلام میں یہ کبھی مباح نہیں تھا اسی وجہ سے حضرت عمر نے کہا تھا: میرے پاس متعہ کے ذریعے نکاح کرنے والا شخص نہیں لایا جائے گا مگر میں اسے پتھروں کے نیچے غائب کر دوں گا(1)۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ جب نکاح متعہ میں مباشرت کرے گا تو کیا حد لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہ ہوگا یا حد شبہ کی وجہ سے نہ لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق ہوگا، اس شخص کو تعزیر لگائی جائے گی اور اسے سزا دی جائے گی، جب آج بچہ بعض علماء کے قول میں نکاح متعہ میں لاحق ہوگا جبکہ تحریم متعہ کا قول بھی موجود ہے۔ تو پھر اس وقت بچہ اس مرد کے ساتھ کیسے لاحق نہ ہوگا جبکہ متعہ مباح تھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ نکاح متعہ نکاح صحیح کے حکم پر تھا اور نکاح متعہ، نکاح صحیح سے جدا ہوتا ہے مدت میں اور میراث میں۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس سے حکایت کیا ہے کہ نکاح متعہ بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے ہوتا تھا۔ جو اس نے حکایت کیا ہے کہ نکاح متعہ بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے ہوتا تھا، اس میں ضعف ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس متعہ کے جواز کے قائل تھے۔ پھر ان کا متعہ کے جواز کے قول سے رجوع ثابت ہے۔ پس متعہ کی حرمت پر اجماع منعقد ہے جب کوئی نکاح متعہ کرے گا تو اسے مشہور مذہب میں رجم کیا جائے گا۔ اور دوسری روایت امام مالک سے یہ ہے کہ اسے رجم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نکاح متعہ حرام نہیں ہے لیکن ہمارے علماء کے لیے ایک دوسری غریب اصل ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے تمام علماء سے منفرد ہو گئے وہ یہ ہے کہ جو سنت کی وجہ سے حرام کیا جاتا ہے کیا وہ قرآن سے حرام کیے گئے کی مثل ہے یا مثل نہیں ہے؟ بعض مدنی علماء کی امام مالک سے روایت یہ ہے کہ وہ برابر نہیں ہیں۔ یہ ضعیف ہے۔ ابو بکر طرطوسی نے کہا: نکاح متعہ کی رخصت صرف حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن عباس، بعض صحابہ اور اہل بیت کی ایک جماعت نے دی۔ حضرت ابن عباس کے قول کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

أقول لِلرَّكب إذْ طال الثَّواءَ بنا يا صاح هل لك فى فُتْيَا ابن عباس

فى بَضَّةٍ رَخْصة الأطراف ناعمةٍ تكون مَثْواكَ حتى مَرجعَ الناس

علماء، فقہاء، صحابہ، تابعین اور سلف صالحین میں سے تمام کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور متعہ حرام ہے۔ ابو عمر نے کہا: اہل مکہ اور یمن سے حضرت ابن عباس کے ساتھی حضرت ابن عباس کے مذہب پر متعہ کو حلال سمجھتے تھے اور تمام لوگوں نے اس کو حرام قرار دیا۔ معمر نے کہا: زہری نے کہا ہے کہ لوگ متعہ سے زیادہ ناراض ہونے لگے حتیٰ کہ شاعر نے کہا:

قال المحدِّث لما طال مجلسه يا صاحِ هل لك فى فُتْيَا ابن عباس

1۔ الناسخ والمنسوخ، جلد 2، صفحہ 193

جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُجُوۡرَهُنَّ یہ مال وغیرہ کو شامل ہے پس اعیان کے منافع کا مہر ہونا جائز ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، مزنی، لیث، امام احمد، امام ابوحنیفہ اوران کے ساتھی اس سے منع کرتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ نے کہا: جب وہ اس پر نکاح کرے گا تو نکاح جائز ہوگا اور اس کے حکم میں ہوگا جس کا مہر متعین نہ کیا گیا ہو اور عورت کو مہر مثل ملے گا اگر وہ اس سے دخول کر چکا ہوگا اور اگر دخول نہ کر چکا ہو تو اسے متعہ (تین کپڑے) ملے گا۔ ابن القاسم نے محمد کی کتاب میں ناپسند کیا ہے اور اصبغ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن شاس نے کہا: نکاح واقع ہو جائے تو وہ اکثر اصحاب کے قول میں نکاح ہو جائے گا۔ یہ اصبغ کی ابن القاسم سے روایت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: نکاح ثابت ہے اور اس پر لازم ہے کہ جو اس کے لیے شرط ہے وہ اس کو تعلیم دے اگر وہ دخول سے پہلے طلاق دے گا تو اس میں امام شافعی کے دو قول ہیں ایک یہ کہ عورت کو اس سورت کی تعلیم کے اجر کا نصف ملے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو مہر مثل کا نصف ملے گا۔ اسحاق نے کہا: نکاح جائز ہے۔ ابوالحسن لخمی نے کہا: اور اس تمام کے جواز کا قول بہتر ہے۔ اجارہ اور حج وغیرہ اموال کی طرح ہیں جو ملکیت دیئے جاتے ہیں، بیچے جاتے ہیں اور خریدے جاتے ہیں۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے، کیونکہ مستحب ہے کہ مہر معجل ہو، اجارہ اور حج مؤجل کے معنی میں ہیں اور پہلے قول والوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِاَمۡوَالِكُمۡ سے حجت پکڑی ہے اور مال کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے ساتھ طمع متعلق ہو اور نفع حاصل کرنے کے لیے شمار کیا جائے گا اور اجارہ میں رقبہ کی منفعت اور علم کے لیے تعلیم کی منفعت یہ تمام مال نہیں ہیں۔ امام طحاوی نے فرمایا: وہ اصل جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے اس شرط پر کہ وہ اسے قرآن کی فلاں سورت ایک درہم کے بدلے سکھائے گا تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اجارات جائز نہیں ہیں مگر دو معانی میں سے ایک معنی کے لیے یا تو متعین عمل پر اسے لے گا جیسے کپڑا سینے کے لیے یا کسی اور متعین کام کے لیے یا وقت معلوم پر لے گا اور جب کسی سورت کی تعلیم پر اجرت پر لے گا تو یہ اجارہ نہ وقت معلوم پر ہوگا اور نہ عمل معلوم پر ہوگا اس نے اس کو تعلیم دینے پر اجرت پر لیا ہے جب کہ تھوڑی تعلیم اور زیادہ تعلیم تھوڑے وقت میں اور زیادہ وقت میں سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنا گھر کسی کو اس شرط پر بیچے کہ وہ اسے قرآن کی ایک سورت سکھائے گا تو مذکورہ معانی کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ جب تعلیم کے ذریعے منافع اور اعیان الاموال کی ملکیت حاصل نہیں کی جاسکتی تو نظر سے ثابت ہوا کہ تعلیم کے ذریعے بضع کی ملکیت بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ واللہ الموفق۔

اور جنہوں نے اس کی اجازت دی ہے انہوں نے حدیث الموهوبة میں حضرت سہل کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جا میں نے تجھے اس کا مالک بنا دیا اس کے عوض جو تیرے پاس قرآن ہے''(1)۔ ایک روایت میں ہے ''تو جا میں نے تیرا اس کے ساتھ نکاح کر دیا تو اسے قرآن میں سے سکھا دے''۔ علماء فرماتے ہیں: اس حدیث میں یہ نکاح کے انعقاد اور مہر (جو تعلیم تھی) کو مؤخر کرنے کی دلیل ہے اور یہ بما معك من القرآن سے ظاہر الفاظ پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب القراءة عن ظهر القلب، حدیث نمبر 4642، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ کیونکہ باعوض کے لیے ہے جس طرح تو کہتا ہے: خذ ھذا، بھذا یعنی اس چیز کے بدلے یہ چیز لے۔ اور دوسری روایت میں ہے: **فعلمہا** ''تو اسے سکھا'' یہ تعلیم دینے کے حکم میں نص ہے اور کلام کا سیاق گواہی دیتا ہے کہ یہ نکاح کے لیے تھا، اس شخص کے قول کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا جو کہتا ہے کہ یہ اس شخص کے اکرام کے لیے تھا، کیونکہ اس نے قرآن یاد کیا ہوا تھا اور با بمعنی لام ہے، کیونکہ دوسری حدیث اس کے خلاف کی تصریح کرتی ہے فرمایا: **فعلمہا من القرآن**۔ اور ابوطلحہ سے جو مروی ہے اس میں بھی حجت نہیں ہے کہ انہوں نے ام سلیم کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے کہا کہ تو اسلام قبول کر میں نکاح کرلوں گی انہوں نے اسلام قبول کیا پھر اس سے نکاح کیا، پس کوئی مہر اس کے مہر سے معزز نہ تھا۔ اس کا مہر اسلام تھا، کیونکہ یہ اس کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ ام سلیم کو ابوطلحہ کی طرف سے کچھ نہیں ملتا تھا بخلاف تعلیم اور دوسرے منافع کے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح موسیٰ علیہ السلام سے اس شرط پر کیا تھا کہ وہ اس کے مہر میں شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائے گا۔ اس کا بیان سورۃ القصص میں آئے گا اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: اے فلاں! کیا تو نے شادی کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں میرے پاس کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے جس کے عوض میں نکاح کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے پاس **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** سورۃ نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں یہ تو ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ثلث القرآن (قرآن کا تہائی) ہے۔ کیا تیرے پاس اٰیۃ الکرسی نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ قرآن کا چوتھائی ہے۔ کیا تیرے پاس **اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ** نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ قرآن کا چوتھائی ہے، کیا تیرے پاس **اِذَا زُلْزِلَتِ** (سورہ) نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! فرمایا وہ قرآن کا چوتھائی ہے۔ نکاح کر، نکاح کر (1)۔

میں کہتا ہوں: دارقطنی نے حضرت سہل کی حدیث، حضرت ابن مسعود کی حدیث سے روایت کی ہے اس میں اس چیز کی زیادہ وضاحت ہے جس سے امام مالک وغیرہ نے حجت پکڑی ہے، اس میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس عورت سے کون نکاح کرے گا؟ ایک شخص کھڑا ہوا اس نے کہا: میں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تیرے پاس مال ہے؟ عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے قرآن میں سے کچھ پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں سورۂ بقرہ اور سورۂ مفصل۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تیرا اس سے نکاح کر دیا اس پر کہ تو اسے پڑھائے گا اور اسے تعلیم دے گا اور جب اللہ تعالیٰ تجھے عطا فرمائے گا تو تو اس کو عوض دے گا۔ پس اس شخص نے اس عورت سے اس شرط پر نکاح کرلیا۔ یہ نص ہے۔ اگرچہ صحیح ہے کہ تعلیم مہر نہیں ہوگی۔ دارقطنی نے کہا: اس حدیث کو روایت کرنے میں عتبۃ بن سکن منفرد ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ فریضۃ مصدر کی بنا پر منصوب ہے حال بن رہا ہے یعنی مفروضۃ۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ** یعنی مہر میں کمی بیشی کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ فریضۃ کے استقرار کے بعد باہم رضامندی سے کمی بیشی کرنا جائز ہے۔ مقصود مہر سے عورت

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی اذا زلزلت، حدیث نمبر 2820، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا بری کرنا ہے یا مرد کا پورا مہر ادا کرنا ہے اگر وہ اسے دخول سے پہلے طلاق دے دے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آیت متعہ کے بارے میں ہے وہ کہتے ہیں: یہ اشارہ ہے جس پر متعہ کی مدت میں زیادتی کرنے میں راضی ہو جاتے تھے ابتداء اسلام میں (مثلاً) ایک شخص کسی عورت سے ایک دینار کے بدلے میں ایک مہینہ کے لیے نکاح کرتا تھا جب مہینہ مکمل ہو جاتا تھا تو وہ اسے کہتا: مدت میں میرے لیے زیادتی کر میں تیرے لیے مہر میں زیادتی کروں گا پس ظاہر ہوا کہ یہ تراضی کے وقت جائز تھا۔

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت کہ نکاح کرے آزاد عورتوں سے، تو وہ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو بعض تمہارے بعض (کی جنس) سے ہے، تو نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور دو ان کو مہر دستور کے موافق (تاکہ نکاح سے) وہ پاک دامن بن جائیں نہ اعلانیہ زنا کار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہو جائیں پھر اگر وہ ارتکاب کرے بدکاری کا تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کے لیے ہے جسے خطرہ ہو بدکاری میں مبتلا ہونے کا تم سے۔ اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس آیت میں اکیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تخفیف پر آگاہ فرمایا اور وہ لونڈی سے نکاح کرنا ہے اس کے لیے جو طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد عورت سے نکاح کرے۔ طول کے معنی میں علماء کے تین مختلف اقوال ہیں پہلا معنی یہ ہے السعة و الغنی یعنی خوشحالی اور غنیٰ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، سدی، ابن زید۔ اور امام مالک کا مدونہ میں قول ہے کہا جاتا ہے: طال یطول طولاً یعنی فضل کرنے اور قدرت میں طاقت رکھتا ہے۔ فلان ذو طول یعنی وہ مال میں قدرت والا ہے۔ یہ طا کے فتحہ کے ساتھ ہے اور طا کے ضمہ کے ساتھ ہو تو وہ قصر (پست) کی ضد ہے۔ یہاں اکثر علماء کے قول میں مہر پر قدرت مراد ہے۔ یہی امام شافعی، امام احمد، ابو ثور اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد بن المعدل نے کہا: عبد الملک نے کہا ہے کہ الطول سے مراد ہر وہ نقدی یا سامان یا مالدار شخص پر قرض ہے جو نکاح پر مقرر کیا جاتا ہے اور فرمایا:

ہر وہ چیز جس کا بیچنا اور اجارہ کرنا ممکن ہے وہ طول ہے۔ اور فرمایا: ایک بیوی، دو بیویاں اور تین بیویاں طول نہیں ہیں۔ اور فرمایا: میں نے امام مالک سے سنا کہ عبد الملک نے کہا: بیوی کے ذریعے نکاح نہیں کیا جاتا اور نہ اس کے ذریعے غیر تک پہنچا جاتا ہے، کیونکہ وہ مال نہیں ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جس نے لونڈی سے نکاح کیا جب کہ وہ طاقت رکھتا ہے تو امام مالک نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ان کے درمیان تفریق کی جائے۔ پھر کہا گیا: وہ بدکاری کا خوف رکھتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اسے کوڑے سے مارا جائے گا پھر اس کے بعد تخفیف فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے: الطول سے مراد آزاد عورت ہے۔ امام مالک کا قول آزاد عورت کے بارے میں مختلف ہے کہ کیا وہ طول ہے یا نہیں؟ المدونہ میں فرمایا: آزاد عورت طول نہیں ہے جو لونڈی کے نکاح سے روکتی ہے جب وہ دوسری کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے بدکاری کا خوف ہو اور کتاب محمد میں جو ہے وہ تقاضا کرتا ہے کہ آزاد عورت طول ہے۔ لخمی نے کہا: یہی ظاہر قرآن ہے۔ یہی ابن حبیب سے مروی ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جس کے پاس آزاد عورت ہو اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں اگرچہ وہ طاقت نہ رکھتا ہو اور بدکاری کا خوف بھی ہو، کیونکہ وہ شہوت طلب کرتا ہے اور اس کے پاس عورت موجود ہے۔ یہی طبری کا قول ہے۔ اور اس قول کی تائید میں حجت قائم کی ہے امام ابو یوسف نے فرمایا: الطول سے مراد پہلے آزاد عورت کا عقد میں موجود ہونا ہے۔ جب اس کے عقد میں آزاد عورت ہوگی تو وہ ذوالطول ہوگا اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ الطول سے صبر اور جبر ہے اس شخص کے لیے جو کسی لونڈی سے محبت رکھتا ہے اور اتنی محبت رکھتا ہے کہ وہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ لونڈی سے نکاح کرے جب کہ وہ اس کی محبت پر ضبط نہیں رکھتا اور اسے اس کے ساتھ بدکاری کا خوف ہے اگرچہ وہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کے لیے مال میں وسعت بھی رکھتا ہو۔ یہ قتادہ، نخعی، عطا، سفیان ثوری کا قول ہے۔ اس تاویل پر لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ کا ارشاد صبر نہ کرنے کی صفت میں ہوگا اور پہلی تاویل پر لونڈی سے نکاح کرنا دو شرطوں کے ساتھ معلق ہوگا مال میں وسعت نہ رکھنا اور بدکاری کا خوف، پس یہ حکم صحیح نہ ہوگا مگر دونوں شرطوں کے جمع ہونے کے ساتھ۔ یہ امام مالک کے مذہب کی مدونہ میں ابن نافع، ابن القاسم، ابن وہب اور ابن زیاد کی روایت سے نص ہے۔ مطرف اور ابن ماجشون نے کہا: انسان کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا حلال نہیں۔ اور یہ دونوں ثابت نہیں کرتے مگر یہ کہ دونوں شرطیں جمع ہو جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اصبغ نے بھی یہی کہا ہے اور یہ قول حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، عطا، طاؤس، زہری اور مکحول سے مروی ہے اور یہی قول امام شافعی، ابوثور، امام احمد، اسحاق کا ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ پس اگر مہر پائے اور نفقہ نہ پائے تو امام مالک نے کتاب محمد میں فرمایا: اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ اصبغ نے کہا: یہ جائز ہے، کیونکہ لونڈی کا خرچہ اس کے مالکوں پر ہے جب خاوند اس کو اپنے ساتھ نہ رکھے۔ اور اس آیت میں چوتھا قول بھی ہے۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس لونڈی پر دوسری لونڈی اور نصرانیہ عورت سے نکاح کرنے کی وسعت دی ہے اگر وہ شخص خوشحال ہو امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔ اور انہوں نے بدکاری کے خوف کی شرط نہیں رکھی جب کہ پہلے اس کے نکاح میں آزاد عورت نہ ہو۔ یہ علماء فرماتے ہیں:

ہر وہ مال جس کے ساتھ لونڈی سے شادی کرنا ممکن ہے، اس کے ساتھ آزاد عورت سے شادی کرنا بھی ممکن ہے پس اس بنا پر مطلقاً لونڈی سے نکاح کے جواز میں یہ آیت اصل ہے۔

مجاہد نے کہا: اس کے مطابق سفیان بھی عمل کرتے تھے۔ میں نے ان سے لونڈی کے نکاح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے ابن ابی لیلیٰ عن المنہال عن عباد بن عبداللہ عن علی رضی اللہ عنہ کی سند سے بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کیا جائے تو آزاد کے لیے دو دن ہوں گے اور لونڈی کے لیے ایک دن ہوگا۔ فرمایا: حضرت علی اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے، اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور ارشاد باری تعالیٰ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ کا عموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی) علماء کا اتفاق ہے کہ آزاد آدمی چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اسے عدل نہ کرنے کا خوف بھی ہو۔ علماء نے فرمایا: اسی طرح اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے اگرچہ وہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا بھی ہو اور اسے بدکاری کا خوف بھی نہ ہو۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو وہ آزاد عورت پر قدرت کے باوجود لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے اور یہ ان کا ضعیف قول ہے۔ اور کبھی امام مالک نے فرمایا: یہ واضح حرام نہیں ہے اور میں اس کو جائز کہتا ہوں اور صحیح یہ ہے کہ آزاد مسلمان مرد کے لیے کسی غیر مسلمہ لونڈی سے نکاح کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے مسلمان لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے مگر دو شرطوں کے ساتھ جن کو نص قرآنی میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے العنت سے مراد زنا ہے۔ اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور زنا کا خدشہ بھی نہ ہو تو لونڈی سے نکاح کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے اسی طرح اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور زنا کا اندیشہ ہو (تو پھر بھی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں) اگر آزاد کتابیہ سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو پھر یہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کیا لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے؟ اس کے متعلق ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے، کیونکہ مسلمان لونڈی، کافرہ لونڈی سے ملحق نہیں ہے مومنہ لونڈی، مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کتابیہ سے نکاح کرے، کیونکہ لونڈی ایمان کی وجہ سے اگرچہ کافرہ آزاد پر فضیلت رکھتی ہے تو کافرہ حریت (آزادی) کی وجہ سے اس پر فضیلت رکھتی ہے۔ یہ بیوی ہے اگر اس کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ آزاد ہوگا غلام نہیں بنایا جائے گا اور لونڈی کا بچہ غلام ہوگا۔ وہ اپنے مذہب پر مسئلہ بیان کر رہے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کرتا ہے، جبکہ آزاد عورت کو اس کا علم نہیں ہے (کہ پہلے اس کا لونڈی سے نکاح ہے)۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ نکاح ثابت ہے۔ سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آزاد عورت کو جب علم ہو تو اسے اختیار ہے۔ پھر اسے کس چیز میں اختیار ہے؟ زہری، سعید بن مسیب، امام مالک، امام احمد اور اسحاق نے کہا: چاہے تو اپنے خاوند کے ساتھ رہے، چاہے تو اسے جدا کر دے۔ عبدالملک نے کہا: لونڈی کے نکاح کو قائم رکھنے یا اسے فسخ کرنے میں اسے اختیار ہے۔ نخعی نے کہا: جب لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کرے تو لونڈی کو جدا کر دے مگر یہ کہ لونڈی سے اس کی اولاد ہو چکی ہو تو پھر وہ لونڈی کو جدا نہ کرے۔ مسروق نے کہا: لونڈی کا نکاح فسخ کیا جائے گا، کیونکہ یہ ضرورت کے لیے مباح کیا گیا تھا جس طرح مردار ضرورت کے لیے مباح ہوتا ہے جب ضرورت اٹھ گئی تو اباحت بھی اٹھ گئی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر کسی کے نکاح میں دو لونڈیاں ہوں جبکہ آزاد عورت کو ان میں سے ایک کا علم ہو دوسری کا علم نہ ہو تو آزاد عورت کو اختیار ہوگا کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اگر آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح کرے پھر وہ راضی ہو پھر اس پر ایک اور لونڈی سے نکاح کرے پھر وہ راضی ہو، پھر اس پر ایک اور لونڈی سے نکاح کرے، پھر وہ انکار کرے تو اس کے لیے یہ اختیار ہے۔ اسی طرح اس کو دو لونڈیوں سے نکاح کا علم نہیں تھا اور ایک کے بارے میں علم تھا (تو اسے اختیار ہے)۔ ابن القاسم نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ان مسائل میں ہم نے آزاد عورت کے لیے اختیار رکھا ہے، کیونکہ مجھ سے پہلے علماء نے یہی فرمایا ہے۔ ان علماء سے مراد سعید بن مسیب، ابن شہاب وغیرہ ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مذکورہ علماء کے اقوال نہ ہوتے تو میں اسے حلال سمجھتا، کیونکہ یہ کتاب اللہ میں حلال ہے۔ اگر مرد کو ایک آزاد عورت کفایت نہ کرے اور اسے دوسری عورت کی ضرورت ہو اور وہ اس کے مہر پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے حتیٰ کہ ظاہر قرآن کی وجہ سے چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس کا نکاح رد کیا جائے گا، ابن عربی نے کہا: دلیل میں پہلا قول اصح ہے، اسی طرح قرآن میں ہے، کیونکہ جو سبب محقق کی وجہ سے راضی ہے وہ سبب مرتب کی وجہ سے راضی ہے، اسے اختیار نہ ہوگا، کیونکہ وہ جان چکی ہے کہ مرد کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کا اختیار ہے، وہ جان چکی ہے کہ اگر وہ آزاد عورت سے نکاح پر قادر نہ ہوگا تو لونڈی سے نکاح کرے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر شرط نہیں لگائی ہے جس طرح اس نے اپنے اوپر شرط لگائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی شرط میں اس کے علم کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس باب میں یہی تحقیق کی انتہا ہے اور اس میں انصاف کا پہلو ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ اس سے مراد آزاد عورتیں ہیں اس کی دلیل آزاد اور لونڈیوں کے درمیان تقسیم ہے جو اس ارشاد میں ہے: مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا معنی پاک دامن عورتیں ہیں اور یہ ضعیف قول ہے، کیونکہ لونڈیاں بھی اس کے تحت واقع ہوتی ہیں، پس اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے اور

بدکارہ مومنات اور کتابیات کو حرام کیا ہے۔ یہ ابن میسرہ اور سدی کا قول ہے۔ علماء کا اختلاف ہے لونڈیوں سے نکاح کرنے کے جواز میں اس آزاد کے لیے جو آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہیں رکھتا اور اسے بدکاری کا خطرہ ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، ابن شہاب زہری اور حارث عکلی نے کہا کہ اس کے لیے چار لونڈیوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: دو لونڈیوں سے زیادہ سے نکاح کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ امام شافعی، ابوثور، امام احمد، اسحاق نے کہا کہ صرف ایک لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور مسروق اور ایک جماعت کا قول ہے اور انہوں نے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ اور یہ خدشہ ایک کے نکاح سے زائل ہو جاتا ہے (یعنی ایک سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے)

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی غیر کی لونڈی سے نکاح کرے اور علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اپنی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں حقوق کا تعارض ہے اور اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ یعنی لونڈیاں فتیات، جمع ہے فتاۃ کی اور عرب غلام کو فتی اور لونڈی کو فتاۃ کہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے تم میں کوئی عبدی اور امتی (میرا غلام، میری لونڈی) نہ کہے بلکہ فتای و فتاتی کہے (1)۔ الفتی اور الفتاۃ کا اطلاق جوان آزاد مرد اور عورت پر ہوتا ہے لیکن غلاموں کے لیے جوانوں اور بوڑھے دونوں صورتوں میں بولے جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمُؤْمِنٰتِ اس لفظ کے ساتھ بیان فرمایا کہ کتابیہ لونڈی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ صفت امام مالک، امام شافعی اور ان کے متبعین کے نزدیک اور ثوری، اوزاعی، حسن بصری، زہری، مکحول اور مجاہد کے نزدیک شرط ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: جن میں اصحاب الرائے بھی ہیں، کہ کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز ہے۔ ابوعمر نے کہا: میں ان سے پہلے کسی کا قول نہیں جانتا، سوائے ابوعمرو بن شرحبیل کے قول کے اس نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیاں، ان کی آزاد عورتوں کے قائم مقام ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: الْمُؤْمِنٰتِ کا لفظ یہ فاضل وصف کی جہت سے ہے یہ ایسی شرط نہیں ہے کہ اس کے علاوہ جائز ہی نہیں۔ یہ اس قول کی طرح ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی) اگر کسی کو عدل نہ کرنے کا خوف ہو پھر وہ ایک سے زیادہ سے نکاح کرے تو بھی جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ زیادہ عورتوں سے نکاح نہ کرے۔ اسی طرح یہاں بھی افضل یہ ہے کہ وہ نکاح نہ کرے مگر مومنہ عورت سے، اگر غیر مومنہ سے نکاح کرے گا تو جائز ہوگا اور انہوں نے آزاد عورتوں پر قیاس سے حجت پکڑی ہے۔ جب آزاد عورتوں میں مومنات کی صفت نے کتابیات سے نکاح کرنے سے منع نہیں کیا تو اسی طرح لونڈیوں میں مومنات کا قول، کتابی لونڈیوں سے نکاح کرنے سے مانع نہ ہوگا۔ اشہب نے المدونہ میں کہا ہے کہ مسلمان غلام کے لیے کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے اور ان کے نزدیک خاوند کو حریت اور دین دونوں میں فضیلت ہے۔ اور اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ مجوسیہ اور بت پرست لونڈی سے مسلمان کا نکاح جائز نہیں اور جب ان کا نکاح بالاجماع حرام ہے تو اسی

1۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراهية التطاول على الرقيق وقوله عبدی او امتی، حدیث نمبر 2366، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرح ملک یمین کی وجہ سے وطی کرنا بھی قیاساً اور نظراً حرام ہے۔ طاؤس، مجاہد، عطا اور عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ملک یمین کی وجہ سے مجوسیہ لونڈی سے وطی میں کوئی حرج نہیں۔ یہ شاذ اور متروک قول ہے۔ فقہاء امصار میں سے کسی نے اس کی طرف التفات نہیں کیا۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ ایسی لونڈی سے وطی کرنا حلال نہیں حتیٰ کہ مسلمان ہو جائے۔ اس مسئلہ میں تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ امور کے بواطن کو جاننے والا ہے۔ جبکہ تم امور کے ظاہر کو جانتے ہو۔ تم تمام آدم کی اولاد ہو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے اور ضرورت کے وقت لونڈی سے نکاح کرنے کو عار نہ سمجھو اگرچہ ان کے قیدی ہونے کا زمانہ قریب ہو یا دونسی ہو یا اسی جیسی کسی اور صورت میں ہو۔ اس لفظ میں تنبیہ ہے کہ بعض اوقات لونڈی کا ایمان بعض آزاد عورتوں کے ایمان سے افضل ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یہ مبتدا خبر ہیں جیسے تیرا قول ہے: زید فی الدار مطلب یہ ہے کہ تم آدم کے بیٹے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مومن ہو۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے کہ جو تم میں سے آزاد مومنات سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو تم میں سے بعض، بعض سے نکاح کر لے۔ یہ اس کی لڑکی سے، یہ اس کی لڑکی سے پس اس تقدیر پر بَعْضُكُمْ، فعل فلینکح کی وجہ سے مرفوع ہوگا، اور اس کلام سے مقصود ان عربوں کے نفوس کو مطمئن کرنا ہے جو لونڈی کی اولاد کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس کو عار دلاتے تھے اور اس کو الھجین کہتے تھے۔ جب شریعت اسلامیہ نے لونڈی سے نکاح کے جواز کا حکم دیا تو انہوں نے جان لیا کہ اس تھجین کا کوئی معنی نہیں۔ لونڈی کا مرتبہ جب کم ہو گیا تو آزاد مرد کے لیے بغیر ضرورت کے اس سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ بچے کی غلامی کا سبب بنتی ہے اور لونڈی ہمیشہ اپنے خاوند کے لیے فارغ بھی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ یعنی ان کے ارباب ولایت کی اجازت سے نکاح کرو اسی طرح غلام بھی اپنے آقا کی اجازت سے نکاح کرے گا، کیونکہ غلام مملوک ہوتا ہے اس کا کوئی امر نہیں ہوتا اور اس کا پورا بدن مستغرق ہوتا ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ غلام جب آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گا پھر اس کا آقا اس کی اجازت دے گا تو نکاح جائز ہوگا۔ یہ امام مالک اور اصحاب الرائے کا مذہب ہے۔ اور یہی قول حسن بصری، عطا بن ابی رباح، سعید بن مسیب، شریح اور شعبی کا قول ہے اور لونڈی جب اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو وہ نکاح فسخ ہو جائے گا آقا کی اجازت سے جائز نہ ہوگا، کیونکہ لونڈی میں اُنوثت کا نقصان قطعی طور پر اس کے نکاح کے انعقاد سے مانع ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جب غلام بھی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گا تو اس کا نکاح بھی فسخ ہوگا۔ یہ امام شافعی، اوزاعی، داؤد بن علی کا قول ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: آقا کی اجازت جائز نہیں کرتی اگر وہ نکاح میں موجود نہ ہو، کیونکہ فاسد عقد کو اس کی اجازت صحیح نہیں کرتی۔ اگر وہ نکاح کا ارادہ کرے گا تو دوبارہ نکاح کرے گا۔ مسلمانوں کے علماء کا اجماع ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر غلام کا نکاح جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر ایسے غلام کو زانی شمار کرتے تھے اور اسے حد لگاتے تھے۔ یہی ابو

ثور کا قول ہے۔ عبدالرزاق نے عبداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر اور عن معمر عن ایوب، عن نافع عن ابن عمر کی دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر نے اپنے ایک غلام کو پکڑا جس نے ان کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تھا پھر اسے حد لگائی اور انہیں (میاں، بیوی کو) جدا کر دیا اور اس عورت کے مہر کو باطل قرار دیا۔ عبدالرزاق نے کہا: ہمیں ابن جریج نے بتایا انہوں نے موسیٰ بن عتبہ سے روایت کیا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ ابن عمر، آقا کی اجازت کے بغیر غلام کے نکاح کو زنا خیال کرتے تھے اور اس کو حد لگانے کا نظریہ رکھتے تھے اور انہیں بھی سزا دیتے تھے جو ان دونوں کا نکاح کرتے تھے (1)۔ عبدالرزاق نے فرمایا ہمیں ابن جریج نے عبداللہ بن محمد بن عقیل سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت جابر بن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ زانی ہے'' (2)۔ اور حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے: یہ نکاح حرام ہے۔ اگر آقا کی اجازت سے نکاح کرے گا تو طلاق اس کے ہاتھ میں ہوگی جو فرج کو حلال کرے گا۔ ابو عمر نے کہا: اس پر حجاز اور عراق کے علماء کا مذہب ہے اور حضرت ابن عباس سے بلا اختلاف مروی ہے کہ طلاق آقا کے ہاتھ میں ہے اس پر حضرت جابر بن عبداللہ اور ایک فرقہ نے ان کی متابعت کی ہے۔ یہ علماء کے نزدیک شاذ قول ہے اس پر توجہ نہیں دی جائے گی، میرا خیال ہے حضرت ابن عباس نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ (النحل:75) اللہ تعالیٰ نے عبد مملوک کی مثال بیان فرمائی جو کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا۔ اور اہل علم کا اجماع ہے کہ غلام کا نکاح، آقا کی اجازت سے جائز ہے۔ اگر اس نے نکاح فاسد کیا تو امام شافعی نے فرمایا: اگر اس نے مصاحبت نہیں کی تو عورت کے لیے کچھ نہ ہوگا اور اگر مصاحبت کر چکا ہوگا تو اس پر مہر ہوگا جب وہ آزاد ہوگا یہ صحیح مذہب ہے یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے، اس پر مہر نہ ہوگا حتیٰ کہ وہ آزاد ہو جائے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اگر اس سے مصاحبت کرے گا تو اس عورت کے لیے مہر ہوگا۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: جب غلام دو شخصوں کا ہو اور ایک مالک اسے نکاح کی اجازت دے دے اور وہ نکاح کرے تو نکاح باطل ہوگا، رہی لونڈی جب اپنے مالک سے نکاح کی اجازت طلب کرے اور وہ اسے نکاح کی اجازت دے دے تو جائز ہے اگرچہ وہ خود عقد نہ بھی کرے لیکن اس کو عقد کا ولی بنایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ نکاح میں مہر کے وجوب پر یہ جملہ دلیل ہے اور یہ مہر لونڈی کے لیے ہوگا۔ بِالْمَعْرُوْفِ اس کا معنی ہے شرع اور سنت کے مطابق۔ یہ کلام تقاضا کرتا ہے کہ لونڈیاں اپنے مہر کی اپنے مالکوں کی نسبت خود زیادہ حق دار ہیں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ کتاب الرہون میں ہے: آقا کے لیے لونڈی کا مہر لینا اور بغیر جہیز (سامان) کے اسے چھوڑ دینا جائز نہیں (3)۔ امام شافعی نے فرمایا: مہر آقا کے لیے ہے، کیونکہ وہ عوض ہے پس مہر لونڈی کے لیے نہ ہوگا۔ اس کی اصل لونڈی سے منفعت اٹھانے کی اجازت ہے۔ لونڈی کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ مہر

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی نکاح العبد بغیر اذن سیدہ، حدیث نمبر 1779، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 132۔ ایضاً، حدیث نمبر 1090، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 38

اس کے سبب واجب ہوا ہے۔ قاضی اسماعیل نے احکام میں ذکر کیا ہے کہ بعض عراقیوں نے خیال کیا ہے کہ جب مالک اپنی لونڈی کا نکاح اپنے غلام سے کر دے تو مہر نہیں ہوگا۔ یہ قول کتاب و سنت کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مُحْصَنٰتٍ** یعنی پاک دامن عورتیں۔ کسائی نے اسے محصِنات سارے قرآن میں صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے اس ارشاد کے **وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ** اور باقی قراء نے پورے قرآن میں صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: غیر مسافحات اعلانیہ زنا کرنے والی نہ ہوں، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں علانیہ زنا کرنے والی ہوتی تھیں۔ ان کے لیے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہوتے تھے بیطار کے جھنڈے کی طرح۔

**وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ** (نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار) برائی پر دوست نہ بنانے والی ہوں۔ اخدان کا واحد خدن اور خدین ہے۔ وہ جو تمہیں دوست بنائے۔ رجل خدنۃٌ جب کوئی دوست بنائے۔ یہ ابوزید سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مسافحہ کا معنی اعلانیہ زنا کرنے والی ہے یعنی جو عورت کرائے پر زنا کرتی ہے۔ ذات الخدن جو پوشیدہ زنا کرتی ہے بعض علماء نے فرمایا: المسافحہ سے مراد ہر شخص سے بدکاری کرنے والی اور ذات الخذن جو کسی ایک سے زنا کرتی ہے عرب اعلانیہ زنا کو معیوب سمجھتے تھے اور پوشیدہ یار بنانے کو معیوب نہیں جانتے تھے۔ اسلام نے یہ تمام صورتیں اٹھا دیں اس کے متعلق یہ ارشاد نازل ہوا۔ **وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ** (الانعام: 151) یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اُحْصِنَّ**۔ عاصم، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے (1) اور باقی قراء کی قرأت ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے، ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: جب وہ اسلام قبول کریں اور جب ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: جب ان کا نکاح کیا گیا ہو۔ جب مسلمان لونڈی زنا کرے گی تو اسے آزاد عورت کے کوڑوں سے نصف کوڑے لگائیں جائیں گے۔ اس کا مسلمان ہونا اس کا محصن ہونا ہے یہ جمہور، حضرت ابن مسعود، شعبی، زہری وغیرہم کے قول میں ہے اور کافرہ لونڈی کو حد نہیں لگائی جائے گی جب وہ زنا کرے گی۔ یہ امام شافعی کا قول ہے جو ابن المنذر نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: لونڈی کا احصان اس کا آزاد شخص سے نکاح کرنا ہے جب غیر شادی شدہ مسلمان لونڈی زنا کرے گی تو اس پر حد نہ ہوگی۔ یہ سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابو الدرداء سے مروی ہے اور ابوعبید نے بھی یہی کہا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت عمر بن الخطاب کی حدیث میں ہے کہ ان سے لونڈی کی حد کے بارے پوچھا گیا تو حضرت عمر نے فرمایا: إنّ الأمة ألقت فَرْوَةَ راسها من وراء الدار۔ اصمعی نے کہا: الفروۃ سر کی جلد کو کہتے ہیں۔ ابوعبید نے کہا: حضرت عمر نے فروہ سے مراد سر کی جلد نہیں لی ہے اسے کیسے گھر کے پیچھے پھینک سکتی ہے۔ لیکن یہ مثال ہے فروہ سے مراد پردہ ہے۔ یعنی اس پر کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہوتا وہ ہر جگہ جاتی ہے جہاں اس کے مالک اسے بھیجتے ہیں وہ اس سے بچنے پر قادر نہیں ہوتی۔ پس وہ اس وجہ سے برائی سے بچنے پر قادر نہیں ہوتی مثلاً اسے بکریاں چرانا ہوتی ہیں، ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گویا حضرت عمر نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اس پر اس وجہ سے حد نہیں ہے اگر وہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 47

زنا کرے۔ ایک فرقہ نے کہا ہے کہ لونڈی کا احصان اس کا نکاح کرنا ہے مگر غیر شادی شدہ مسلمان لونڈی پر حد سنت سے واجب ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! لونڈی جب زنا کرے اور شادی شدہ نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر حد کو واجب کیا(1)۔ اور زہری نے کہا: شادی شدہ مسلمان لونڈی کی حد قرآن نے متعین فرمائی ہے اور غیر شادی شدہ کی حد، حدیث سے متعین ہے(2) اور جن علماء نے اذا احصن کا معنی اسلام لانا کیا ہے۔ قاضی اسماعیل نے کہا: اس میں بُعد ہے، کیونکہ ایمان کا ذکر تو ان سے پہلے مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اور رہے وہ علماء جنہوں نے اُحْصِنَّ کا معنی تزوجن کیا ہے اور کہا ہے کہ لونڈی پر حد نہیں ہے حتیٰ کہ وہ شادی کر لے۔ یہ علماء ظاہر قرآن پر گئے ہیں میرا خیال ہے انہیں یہ حدیث معلوم نہیں تھی ہمارے نزدیک معاملہ یہ ہے کہ لونڈی جب زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو تو کتاب اللہ کے ساتھ اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور جب زنا کرے جب شادی شدہ نہ ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی وجہ سے کوڑے لگائے جائیں گے، لونڈی پر رجم نہ ہوگا کیونکہ رجم کا نصف نہیں ہوتا۔ ابو عمر نے کہا: قرآن کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی پر حد نہیں ہے اگرچہ وہ مسلمان بھی ہو مگر شادی کے بعد۔ پھر سنت نے اس کے کوڑوں کو بیان کیا اگرچہ شادی شدہ نہ ہو پس یہ اس کے بیان کی زیادتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مومن کی پیٹھ محفوظ ہے اسے مباح نہیں کیا جائے گا مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا، تو پھر صحیح سنت میں اس کی کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے اسے کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ واللہ اعلم

ابن المنذر نے ابو ثور کا قول ذکر کیا ہے کہ اگر علماء کا غلام اور لونڈی کو، زنا کی صورت میں رجم کرنے میں اختلاف ہوگا تو جب وہ محصن ہوں گے تو انہیں رجم کیا جائے گا اور اگر اجماع ہوگا تو پھر اجماع اولیٰ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ غلام اور لونڈی زنا کریں گے تو ان پر حد کون لاگو کرے گا؟ ابن شہاب نے کہا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ زنا کی صورت میں انہیں ان کے مالک حد لگائیں گے مگر ان کا مقدمہ سلطان تک پہنچایا جائے گا تو پھر کسی کے لیے اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام کرنا جائز نہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا بھی یہی مقتضیٰ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو وہ اسے حد لگائے''(3)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: اپنے غلاموں پر حد قائم کرو جو ان میں سے محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لونڈی نے زنا کیا تو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کوڑے لگانے کا حکم فرمایا، اس کا قریب ہی بچہ پیدا ہوا تھا مجھے اندیشہ ہوا کہ میں اسے کوڑے لگاؤں گا تو اسے قتل کر دوں گا، میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اچھا کیا(4) (کہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع العبد الزانی، حدیث نمبر 2009، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 39

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المدبر، حدیث نمبر 2080، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 173

اسے کوڑے نہیں لگائے)'' اس حدیث کو مسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوف نقل کیا ہے، نسائی نے اسے مسند ذکر کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر (زنا کرنے کی صورت میں) حد قائم کرو جوان میں محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں''۔ یہ نص ہے کہ سردار ہی اپنے غلاموں پر حدود قائم کریں گے ان میں سے جو محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: آقا اپنے غلام کو حد لگائے گا زنا، شراب پینے اور قذف لگانے میں جب کہ گواہ اس کے پاس گواہی دیں اور چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹے گا بلکہ امام اس کا ہاتھ کاٹے گا۔ یہ لیث کا قول ہے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے غلاموں پر حدود قائم کیں، ان صحابہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما ہیں۔ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ان کا مخالف نہیں۔ ابن ابی لیلی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے انصار کے بقیہ لوگوں کو پایا کہ وہ اپنی لونڈیوں میں سے اس لونڈی کو اپنی مجالس میں مارتے تھے جب وہ زنا کرتی تھی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: غلاموں او رلونڈیوں پر زنا اور تمام حدود میں سلطان حدود قائم کرے گا، آقا یہ نہیں کرے گا۔ یہی حسن بن حیی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: آقا ہر حد لگائے گا اور ہاتھ کاٹے گا اور امام شافعی نے ان احادیث سے حجت پکڑی ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں، ثوری اور اوزاعی نے کہا: زنا میں آقا اسے حد لگائے گا اور یہی احادیث کا مقتضیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی سورت میں غلام کو جلاوطن کرنے کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر16**۔ اگر لونڈی زنا کرے پھر آقا کے حد لگانے سے پہلے وہ آزاد کردی گئی تو آقا کو اس کو حد لگانے کا اختیار نہ ہوگا اور سلطان اسے کوڑے لگائے گا جب زنا اس کے سامنے ثابت ہوجائے گا۔ اگر لونڈی زنا کرے پھر نکاح کرلے تو پھر بھی آقا کو اسے کوڑے مارنے کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ خاوند کے حق کو نقصان پہنچے گا یہ امام مالک کا مذہب ہے جب کہ خاوند بھی اس آقا کا غلام نہ ہو، اگر خاوند بھی اسی مالک کا غلام ہوگا تو پھر آقا کے لیے حد لگانا جائز ہوگا، کیونکہ ان دونوں کا حق اس کا حق ہے۔

**مسئلہ نمبر17**۔ اگر غلام زنا کا اقرار کرے اور آقا اس کا انکار کرے تو غلام پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد واجب ہو گی اور آقا کے انکار کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ اس پر علماء کا اجماع ہے اسی طرح مدبر، ام ولد، مکاتب اور جس کا بعض حصہ آزاد ہے، ان تمام کا حکم ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ لونڈی جب زنا کرے پھر آزاد کی جائے تو اسے لونڈیوں والی حد لگائی جائے گی اور جب وہ زنا کرے جب کہ اسے اپنی آزادی کا علم نہیں تھا، پھر اسے علم ہوا تو اس پر آزاد عورت کی پوری حد لگائی جائے گی، ابن المنذر نے یہ ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر18**۔ غلام اور لونڈی جب زنا کریں تو آقا کے ان کو معاف کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں: اسے معاف کرنے کا اختیار ہے۔ ان کے علاوہ علماء نے کہا: اسے حد قائم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، جیسا کہ سلطان کو حد کے ثبوت کے متعلق علم ہونے کے بعد معاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح آقا کو اپنی لونڈی کو معاف کرنے کی گنجائش نہیں جب اس پر حد واجب ہوجائے۔ یہ ابوثور کے مذہب پر ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ یعنی کوڑوں کی سزا نصف

ہوگی لونڈیوں پر، یہاں الْمُحْصَنٰتِ سے مراد کنواری آزاد عورتیں ہیں، کیونکہ شادی شدہ پر رجم ہے اور رجم کا نصف نہیں ہوتا۔ کنواری کو محصنہ کہا گیا ہے اگرچہ وہ شادی شدہ نہیں ہے، کیونکہ احصان شادی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قربانی کو اس کو قربان کرنے سے پہلے کہا جاتا ہے اور اسی طرح بقرۃ (بیل) کو مثیرہ (ہل چلانے والی) کہا جاتا ہے اس کے زمین میں ہل چلانے سے پہلے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمُحْصَنٰتِ سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں، کیونکہ ان پر حدیث میں ضرب اور رجم ہے اور رجم کا نصف نہیں ہوتا پس ان پر نصف کوڑوں کی سزا ہوگی۔ لونڈیوں کی حد میں کمی اس وجہ سے ہے کہ وہ آزاد عورتوں سے کمزور ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: وہ (لونڈیاں) اپنی مراد کو نہیں پہنچتی ہیں جس طرح آزاد عورتیں پہنچتی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: سزا نعمت کی مقدار کے مطابق واجب ہوتی ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی ہوئی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا) جب ازواج مطہرات کی نعمت زیادہ تھی تو اس کی سزا کو بھی سخت فرمایا: اسی طرح لونڈیوں کی نعمت جب کم تھی تو اس کی سزا کو کم کیا۔ اس آیت میں خاص لونڈیوں کی حد کا ذکر فرمایا اور غلاموں کی حد کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن غلاموں اور لونڈیوں کی سزا برابر ہے زنا میں پچاس کوڑے اور حد قذف اور شراب پینے کی حد چالیس کوڑے ہے، کیونکہ لونڈی کی حد غلامی کے نقصان کی وجہ سے کم ہوئی تو غلامی کی علت کی وجہ سے اس میں غلام بھی داخل ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من اعتق شرکا له فی عبد (1) (جس نے غلام میں اپنا حصہ آزاد کیا) میں لونڈیاں بھی داخل ہیں، اس کو علماء قیاس فی معنی الاصل کا نام دیتے ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (النور: 4) اس آیت میں محصن مرد بھی قطعاً داخل ہیں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ، سورۃ النور میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ علماء کا اجماع ہے کہ زانیہ لونڈی کو بیچنا مالک پر لازم نہیں ہے اگر وہ اس کو اپنے لیے پسند کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور اس کا زنا واضح ہو جائے تو اسے آقا حد لگائے اور اسے ملامت نہ کرے، پھر اگر زنا کرے تو آقا اسے حد لگائے اور اسے ملامت نہ کرے، پھر اگر تیسری مرتبہ زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے تو اسے بیچ دے اگرچہ بالوں کی رسی سے (بیچ دے) (2)" اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اہل ظاہر نے چوتھی مرتبہ زنا کرنے کی صورت میں اسے بیچنے کے وجوب کا قول کیا ہے، ان علماء میں داؤد وغیرہ ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: فلیبعها (اسے بیچ دے) اور فرمایا: ثم بیعوها ولو بضفیر (پھر اسے بیچو اگر بالوں کی رسی کے ساتھ (بیچو)۔ ابن شہاب نے فرمایا: میں نہیں جانتا تیسری یا چوتھی مرتبہ کے بعد بیچنے کا حکم دیا۔ الضفیر سے مراد رسی ہے۔ جب اسے فروخت کرے تو اس کے زنا کی وضاحت کرے، کیونکہ یہ عیب ہے اور اسے چھپانا حلال نہیں

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 53
ایضاً صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا أعتق عبدا بین اثنین او امة بین الشرکاء، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70

ہے۔ اگر کہا جائے کہ حدیث کا مقصود زانیہ کو دور کرنا تھا اور بائع پر اس کے زنا کو بتانا واجب تھا تو کسی کے لیے اس کا خریدنا بھی مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ہمیں اس کے دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لونڈی مال ہے اور اسے ضائع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ مال کو ضائع کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نہ اسے ہمیشہ کے لیے روکا جائے گا، کیونکہ یہ چیز اس کے لیے زنا پر ابھارنے والی ہے اور یہ اسے زنا پر قدرت دینا ہے اور نہ اسے ہمیشہ کے لیے محبوس کیا جائے گا، کیونکہ اس میں اس کے آقا کی منفعت کو معطل کرنا ہے پس اس کا بیچنا ہی باقی رہ جاتا ہے شاید دوسرا آقا وطی کے ذریعے اسے زنا سے بچالے یا وہ اس کے بچاؤ میں مبالغہ کرے اور اس طرح وہ اسے اس برائی سے محفوظ کرلے۔ علی الجملہ مالکوں کے تبدیل ہونے کے وقت اس کے احوال تبدیل ہوجائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی لونڈی سے نکاح کرنے کی نسبت کنوارہ رہ کر صبر کرنا بہتر ہے، کیونکہ یہ بچے کو غلام بنانے تک پہنچاتا ہے۔ نفس کو روکنا اور مکارم اخلاق پر صبر کرنا گھٹیا چیز سے بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس آزاد مرد نے لونڈی سے نکاح کیا اس نے اپنا نصف غلام بنالیا۔ یعنی وہ اپنی اولاد کو غلام بنانے والا ہے پس اس سے صبر افضل ہے تاکہ اولاد کو غلام نہ بنائے۔ سعید بن جبیر نے کہا: لونڈی سے نکاح زنا نہیں مگر قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی لونڈیوں کے نکاح سے صبر کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ضحاک بن مزاحم سے مروی ہے فرمایا: میں نے انس بن مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”جو اللہ تعالیٰ سے طاہر مطہر ملنا چاہتا ہے تو وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے“ (1)۔ ابو اسحاق ثعلبی نے یونس بن مرداس کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ حضرت انس کا خادم تھا اور اس نے یہ زائد کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ ”آزاد عورتیں گھر کے لیے صلاح (بہتر) ہیں اور لونڈیاں گھر کے لیے ہلاکت ہیں یا فرمایا گھر کے لیے فساد ہیں“۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

”چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ کھول کر بیان کردے (اپنے احکام) تمہارے لیے اور چلائے تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے“۔

یعنی تمہارے لیے تمہارے دین کے معاملات اور معاملات کے مصالح بیان کردے اور جو تمہارے لیے حلال ہے اور جو تمہارے لیے حرام ہے اسے بیان کردے۔ یہ کسی بھی واقعہ کے حکمت سے خالی نہ ہونے پر دلیل ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 135۔ ایضاً حدیث نمبر 1851، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کی مزید وضاحت آگے آئے گی۔ اس کے بعد فرمایا: یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ۔ اللہ چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) یہ اَنۡ کے ساتھ آیا ہے اور پہلا ارشاد لام کے ساتھ تھا۔ فراء نے کہا: عرب لام، کَیۡ اور اَنۡ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اَنۡ کی جگہ کَیۡ کے معنی پر لام کو امرت اور اردت میں ذکر کیا جاتا ہے،، عرب کہتے ہیں: اردت ان تفعل، اردت لتفعل، کیونکہ یہ دونوں مستقبل کو طلب کرتے ہیں اور ظننت لتفعل جائز نہیں ہے کیونکہ تو کہتا ہے: ظننت ان قد قمت۔ اور قرآن حکیم میں ہے وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ (الشوریٰ:15) وَ اُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۱﴾ (الانعام) یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ (الصف:8) یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ (التوبہ:32)

شاعر نے کہا:

أرید لِأنسَی ذکرها　فکأنما　تُمَثَّلُ لی لَیلَی بکل سبیلِ (1)

اس شعر میں یرید أن انسی مراد ہے۔ نحاس نے کہا: زجاج نے اس قول میں غلطی کی ہے اور کہا: اگر لام بمعنی أن ہوتا تو اس پر دوسرا لام داخل ہوتا ہے جیسے تو کہتا ہے: جئت کی تکرمنی۔ پھر تو کہتا ہے: جئت لکی تکرمنی اور ہم نے یہ شعر بطور دلیل پڑھا:

أردتُ لکیما یعلم الناس أنها　سراویل قَیۡسٍ والوُفُودُ شُهود

اس کی تقدیر یہ ہے اردته لیبین لکم۔ نحاس نے کہا: اس پر امرا تنا بڑھا کہ بعض قراء نے کہا: لام أن، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اس سے ارادہ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے لیے بیان فرمائے۔

وَ یَهۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ۔ یعنی اہل حق میں سے۔

بعض علماء نے فرمایا: یَهۡدِیَکُمۡ کا معنی ہے وہ تمہارے لیے تم سے پہلے اہل حق اور اہل باطل لوگوں کے طرق کو بیان کرتا ہے۔ بعض اہل نظر نے کہا: اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس آیت سے پہلے جو حرام کیا وہ ہم سے پہلے لوگوں پر بھی حرام تھا۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ معنی ہوگا وہ تمہارے لیے تم سے پہلے لوگوں کا امر بیان کرتا ہے۔

اور کبھی معنی ہوگا وہ تمہارے لیے بیان فرماتا ہے جس طرح کہ اس نے تم سے پہلے انبیاء کے لیے بیان فرمایا، پس بعینہ اس کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یُرِیۡدُ اللّٰہُ کا قول قصہ کی ابتدا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ تمہارے لیے اپنی طاعت کی کیفیت بیان کرے۔ یَهۡدِیَکُمۡ یعنی تمہیں پہلے لوگوں کے طرق بیان کرے۔ انہوں نے جب میرے احکام کو ترک کیا تو میں نے انہیں کیسے سزا دی اور تم جب ایسا کرو گے تو میں تمہیں سزا نہیں دوں گا بلکہ میں تم پر نظر رحمت کروں گا وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ اللہ اسے جانتا ہے جو توبہ کرتا ہے اور حَکِیۡمٌ توبہ کی قبولیت میں اس کی حکمت کارفرما ہے۔

وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ۟ وَ یُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّہَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا ﴿۲۷﴾ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ ۚ وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾

''اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کر رہے ہیں اپنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40

خواہشوں کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ یہ مبتدا خبر ہے اور اَنْ، يُرِيْدُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اسی طرح يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ میں بھی اَنْ، يُرِيْدُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ کو قبول کرنے، تمہارے گناہوں سے تجاوز کرنے اور تم سے تخفیف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تمام احکام شرع میں ہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تخفیف سے مراد لونڈی سے نکاح کرنا ہے یعنی جب ہم نے جان لیا کہ تم عورتوں پر صبر کرنے میں کمزور ہو تو ہم نے لونڈیوں سے نکاح کرنے کی تخفیف کر دی۔ یہ مجاہد، ابن زید اور طاؤس کا قول ہے۔ طاؤس نے کہا: انسان عورتوں کے معاملہ میں انتہائی کمزور ہے (1)۔ شہوات کی اتباع کرنے والوں کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد زنا کرنے والے ہیں۔ سدی نے کہا: یہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ ایک جماعت نے کہا: یہ صرف یہود ہیں، کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مسلمان، باپ کی طرف سے بہنوں سے نکاح کرنے میں ان کی پیروی کریں۔ ابن زید نے کہا: یہ عموم پر ہے اور یہ اصح ہے (2)۔ المیل کا معنی سیدھے راستہ سے پھر جانا ہے۔ پس جو سیدھے راستے پر ہوتا ہے وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے ساتھی بھی اس راستہ پر ہوں تاکہ اسے فساد لاحق نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا، ضَعِيْفًا کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی خواہش نے اس کو راہ حق سے ہٹایا اور اس کی شہوت اور غضب نے اسے حقیر بنایا، یہ انتہائی ضعف ہے پس وہ تخفیف کا محتاج ہوا۔ طاؤس نے کہا: یہ خاص عورتوں کے معاملہ میں ضعف کا ذکر ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے خَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيْفًا (4) یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ضعیف پیدا فرمایا یعنی وہ عورتوں کے سلسلہ میں صبر نہیں کر سکتا۔ ابن مسیب نے کہا: مجھ پر اسی سال گزر گئے اور میری ایک آنکھ چلی گئی اور میں دوسری سے بھی کم دیکھتا ہوں اور میرا ساتھی (شرمگاہ) نابینا اور بہرہ ہے اور مجھے عورتوں کے فتنہ سے اندیشہ ہے۔ اور حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: کیا تم مجھے نہیں دیکھتے کہ میں سہارا کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور میں نہیں کھاتا مگر جو میرے لیے نرم کیا جاتا ہے اور گرم کیا جاتا ہے اور میرا ساتھی ایک عرصہ سے مر چکا ہے، پھر بھی مجھے پسند نہیں کہ میں کسی ایسی عورت سے خلوت کروں جو میرے لیے حلال نہیں، ہر روز مجھے خوف ہوتا ہے کہ کہیں میرے پاس شیطان نہ آ جائے اور اسے مجھ پر حرکت دے دے۔ میرے ساتھی (شرمگاہ) کے لیے نہ سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 5، صفحہ 39　4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے''۔

اس آیت میں نو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ یعنی بغیر حق کے۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور سورۂ بقرہ میں اس کا معنی بیان کیا ہے اور باطل طریقہ سے مال کھانے کی ایک صورت بیع العُریان بھی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص تجھ سے کوئی سامان لے یا تجھ سے جانور کرائے پر لے اور تجھے ایک درہم یا اس سے زیادہ رقم دے اس شرط پر کہ اگر وہ اس چیز کو خریدے گا یا سواری پر سوار ہوگا تو وہ سامان کی قیمت یا جانور کے کرایہ سے ہوگا اور اگر سامان نہیں خریدے گا یا سواری کرائے پر نہیں لے گا تو جو اس نے تجھے دیا ہے وہ تیرا ہوگا، یہ جائز نہیں ہے اور حجازی علماء اور عراقی علماء کے نزدیک یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ جوئے اور دھوکے اور خطرے کی بیع سے ہے اور یہ بغیر عوض اور بغیر ہبۃ کے مال کھانا ہے اور یہ بالاجماع باطل ہے۔ بیع عریان فسخ ہوگی جب اس طرح بیع واقع ہوگی خواہ وہ قبضہ سے پہلے ہو یا قبضہ کے بعد ہو۔ اگر سامان موجود ہوگا تو وہ واپس کیا جائے گا اور اگر سامان ضائع ہو چکا ہوگا تو قبضہ کے دن کی قیمت لوٹائی جائے گی۔ ابن سیرین، مجاہد، نافع بن عبد الحارث اور زید بن اسلم نے بیع العریان کو جائز قرار دیا ہے اور زید بن اسلم کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو جائز قرار دیا۔ ابو عمرو نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ عبد الرزاق نے اسلمی عن زید بن اسلم کے سلسلہ سے مرسل روایت کی ہے اور اس جیسی روایت حجت نہیں ہوتی۔ اور یہ احتمال ہے کہ بیع العریان جو جائز ہے وہ اس تاویل پر ہو جو امام مالک اور ان کے ساتھ فقہاء نے کی ہے۔ وہ تاویل یہ ہے کہ پہلے تو وہ اسے رقم دے دے پھر اس پہلی رقم کو ثمن سے شمار کیا جائے جب بیع کی تکمیل کو اختیار کرے۔ امام مالک اور دوسرے علماء کے نزدیک اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ مؤطا امام مالک میں عن الثقة عندہ عن عمرو بن شعیب علی ابیه عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیع العربان سے منع فرمایا (1)۔ ابو عمر نے کہا: علماء نے اس مقام میں الثقة عندہٗ میں کلام کی ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ انہوں نے ابن لہیعہ سے یہ حدیث لی یا ابن وہب عن ابن لہیعہ کے سلسلہ سے روایت کی۔ ابن لہیعہ علماء میں سے ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اس کی کتابیں جل گئی تھیں پھر جب اس کے بعد وہ اپنے حافظہ سے بیان کرتا تھا تو غلطی کرتا تھا اور جو ابن لہیعہ سے ابن مبارک اور ابن وہب نے روایت کیا ہے وہ بعض علماء کے نزدیک صحیح ہے اور بعض علماء ابن لہیعۃ کی تمام احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس کے پاس وسیع علم تھا اور وہ کثرت سے احادیث رکھتا تھا مگر علماء کے نزدیک یہی حال تھا جو ہم نے پہلے بیان کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ یہ استثنا منقطع ہے یعنی وہ تجارت جو باہمی رضامندی سے ہو۔ تجارت سے مراد خرید و فروخت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ: 275) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور تجارۃ کو رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی الا ان تقع تجارۃ۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب البیوع، صفحہ 568

اس پر سیبویہ نے یہ شعر دلیل دیا ہے:

فِدىً لبني ذُهْلِ بنِ شَيبانَ ناقتي  إذا كان يومٌ ذو كواكِب أشهبُ

اس کان کو تامہ کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ فاعل کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے اور اسے مفعول کی احتیاج نہیں ہوتی۔ تجارۃ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں ناقصہ ہوگا، کیونکہ بغیر خبر کے اسم کے ساتھ مکمل نہیں ہوتا پس اسم اس میں مضمر ہوگا اور اگر چاہے تو اس کو مقدر کر لے یعنی الا ان تکون الاموال تجارۃ، پس مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی سے یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ (بقرہ: 280)

**مسئلہ نمبر3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِجَارَةً لغت میں تجارت سے مراد معاوضہ ہے اسی سے وہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کو ان اعمال صالحہ کے عوض دیتا ہے جو اس کے فعل کا بعض ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچائے تمہیں دردناک عذاب سے)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ (فاطر) (وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال)۔

ان تمام صورتوں میں بیع وشرا کا ذکر مجازاً ہے۔ بیع وشرا کو عقود کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن کے ساتھ اغراض حاصل ہوتی ہیں۔ تجارت کی دو قسمیں ہی بغیر نقل اور سفر کے حضر میں پھیرنا ہے۔ یہ تربص اور احتکار ہے۔ اور معزز لوگوں نے اس سے اعراض کیا ہے، متقین نے اس سے دلچسپی نہیں رکھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سفر کے ساتھ مال گھمانا اور دوسرے شہروں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یہ اہل مروت کے لائق ہے اور اس میں منفعت عام ہے، مگر اس میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور دھوکا بھی بڑا ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرمایا: مسافر اور اس کا مال ہلاکت پر ہوتا ہے مگر جو اللہ تعالیٰ بچا لے۔ یعنی خطرے پر ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تورات میں ہے: اے آدم کے بیٹے! سفر کر میں تیرے لیے رزق پیدا کروں گا۔ طبری نے کہا: یہ آیت متصوفین کے قول کے فساد پر بڑی دلیل ہے۔

**مسئلہ نمبر4**۔ ہر معاوضہ تجارت ہے خواہ وہ عوض کسی اعتبار سے ہو، مگر بِالْبَاطِلِ کا ارشاد اس سے ہر اس عوض کو خارج کر دیتا ہے جو شرعاً جائز نہیں مثلاً سود، یا جہالت یا فاسد عوض کو مقدر کرنا جیسے شراب، خنزیر وغیرہ۔ اور اس سے ہر وہ عقد بھی خارج ہو جاتا ہے جو جائز تو ہوتا ہے، لیکن اس میں عوض نہیں ہوتا جیسے قرض، صدقہ، ہبہ لیکن ثواب اس سے ملتا ہے اور تبرعات کی عقود دوسرے دلائل کے ساتھ جائز ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر آئیں گے یہ دونوں طرفیں متفق علیہما ہیں اور اس سے وہ دعوت بھی خارج ہوگئی جس کی طرف تمہارا بھائی تمہیں بلاتا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ

بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ ایک شخص اس آیت کے نزول کے بعد کسی کے پاس کھانا کھانے سے اجتناب کرتا تھا، تو اس آیت کو سورۂ نور کی آیت سے منسوخ کر دیا، فرمایا: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: 61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں میں الخ)

ایک امیر آدمی اپنے کھانے کی طرف اپنے اہل میں سے کسی شخص کو بلاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ میں اس سے کھانے میں حرج دیکھتا ہوں اور وہ کہتا: مجھ سے اس کا مسکین زیادہ حق دار ہے پس اس ارشاد میں اس چیز کا کھانا حلال فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اور اہل کتاب کا کھانا حلال فرمایا(1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر تو بازار سے کوئی چیز خریدے پھر اس چیز کا مالک تجھے خریدنے سے پہلے کہے: تو اس کو چکھ لے تیرے لیے حلال ہے۔ پس تو اس سے نہ کھا، کیونکہ اس کا کھانے کی اجازت دینا خریدنے کی وجہ سے ہے۔ بعض اوقات تمہارے درمیان سودا واقع نہیں ہوتا پس اس کا کھانا مشتبہ ہوگا، لیکن اگر وہ تیرے لیے اس چیز کی صفت بیان کرے پھر تو اس سے خریدے اور تو اسے اس صفت پر نہ پائے تو تجھے اختیار ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جمہور علماء تجارت میں غبن کے جواز کے قائل ہیں مثلاً کوئی شخص ایک یاقوت ایک درہم میں بیچے، حالانکہ وہ سو درہم کے مساوی ہو تو یہ تیرے لیے جائز ہے، کیونکہ مالک جس کی ملکیت صحیح ہے اس کے لیے اپنے بہت سے مال کو تھوڑے مال کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے جب کہ اس کی قدر معروف ہو، جس طرح ہبہ جائز ہے اگر ہبہ کیا جائے۔ اور اس میں اختلاف ہے جب اس کی قدر معروف نہ ہو۔ ایک قوم نے کہا: اگر اس کی قدر معروف ہو یا نہ ہو یہ بیع جائز ہے جب کہ بیچنے والا دانا، آزاد اور بالغ ہو۔ اور ایک جماعت نے کہا: جب غبن تہائی سے تجاوز کر جائے(2) تو مردود ہے اس سے قریب قریب اور تجارت میں متعارف غبن مباح ہے لیکن بہت زیادہ غبن جائز نہیں ہے۔ یہ ابن وہب کا قول ہے جو امام مالک کے اصحاب میں سے ہیں، پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ زانیہ لونڈی کی حدیث میں ہے ''اس کو بیچ دو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدل ہو(3)'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے کہا تھا: ''اس کو نہ خرید اگرچہ وہ تجھے ایک درہم میں ہی بیچ دے'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کو چھوڑ و اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے رزق دیتا ہے(4)'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی شہری دیہاتی کے لیے بیع نہ کرے(5)''۔ ان ارشادات میں قلت و کثرت، تہائی وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

1۔ سنن ابوداؤد، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 171
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 258
4۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 4
5۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ یعنی تم جو باہم رضامندی سے کرو۔ یہاں تراض بمعنی رضاً ہے لیکن باب مفاعلہ اس لیے ذکر کیا۔ کیونکہ تجارت دو شخصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ علماء کا تراضی کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: بیع کا تمام اور جزم بیع کی عقد کے بعد ابدان کے جدا ہونے کے ساتھ ہے یا ایک دوسرے کو کہے: تو اختیار کر لے۔ دوسرا کہے: میں نے اختیار کر لیا۔ اس صورت میں عقد کے بعد سودا پختہ ہو جائے گا اگرچہ ابدان کے ساتھ جدا ابھی نہ ہوں (1) یہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور امام شافعی، ثوری، اوزاعی، لیث، ابن عیینہ، اسحاق وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام اوزاعی نے کہا: بائع اور مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں مگر تین بیوع میں اختیار نہیں سلطان کا مال غنیمت کی بیع کرنا، میراث میں شرکت کی بیع کرنا اور تجارت میں شرکت کرنا جب ان تین بیوع کا سودا ہوگا تو بیع واجب ہو جائے گی اور دونوں کو اختیار نہیں ہوگا اور فرمایا: جدائی کی حد یہ ہے کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک دوسرے سے چھپ جائے یہ اہل شام کا قول ہے۔ اور لیث نے کہا: جدائی یہ ہے کہ ایک کھڑا ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے: دونوں کو اختیار ہے جب تک جسموں کے ساتھ جدا جدا نہ ہو جائیں خواہ انہوں نے کہا ہو کہ اختیار کر لو یا نہ کہا ہو، حتیٰ کہ ابدان کے ساتھ اپنی اپنی جگہ سے جدا ہو جائیں۔ یہ بھی امام شافعی کا قول ہے اور اس باب میں یہی صحیح ہے، کیونکہ اس کے متعلق احادیث وارد ہیں، یہ حضرت ابن عمر، حضرت ابو برزہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے کہا: بیع کا تمام یہ ہے کہ زبان سے بیع کرنا۔ اس سے بیع پختہ ہو جائے گی اور اختیار اٹھ جائے گا۔ امام محمد بن حسن نے کہا: البیعان بالخیار مالم یتفرقا (2) کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بائع جب کہے: میں نے تجھے (یہ چیز) بیچی تو اس کے لیے رجوع کا حق ہے جب تک کہ مشتری نے یہ نہ کہا ہو کہ میں نے قبول کیا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ امام مالک نے اس پر نص قائم فرمائی۔ یہ ابن خویز منداد نے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو رجوع کا حق نہیں۔ یہ قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پہلے قول کے قائلین نے حضرت سمرہ بن جندب، حضرت ابو برزہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، حضرت ابو ہریرہ، حضرت حکیم بن حزام وغیرہم کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے روایت کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیع کرنے والوں کو خیار ہے جب تک جدا نہ ہو جائیں یا ایک دوسرے کو کہے: اختیار کر لے (3)۔ یہ دوسری روایت الا بیع الخیار اور الا ان یکون بیعھما عن خیار کا معنی ہے یعنی بیع کے مکمل ہونے کے بعد ایک دوسرے کو کہے: بیع کا نفاذ یا بیع کا فسخ اختیار کر لے، اگر وہ بیع کو قائم رکھنا اختیار کرے تو بیع مکمل ہو جائے گی اگرچہ ایک دوسرے سے جدا بھی نہ ہوں حضرت ابن عمر جو حدیث کے راوی ہیں وہ جب کسی سے بیع کرتے اور اس بیع کو نافذ کرنا پسند کرتے تو تھوڑا سا چل پڑتے پھر لوٹ آتے۔ ''الاصول'' میں ہے: جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل کو زیادہ جانتا ہے خصوصاً صحابہ کرام، کیونکہ وہ بات کو زیادہ جاننے والے تھے اور حالات سے زیادہ واقف تھے۔ ابو داؤد، دارقطنی نے ابو الوضیٔ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک لشکر میں سفر پر تھے تو ایک شخص آیا جس کے ساتھ ایک گھوڑا تھا ہم میں سے ایک شخص نے اسے کہا: کیا تو یہ گھوڑا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41 2۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 279 3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 213

اس غلام کے عوض بیچے گا؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے گھوڑا غلام کے عوض بیچ دیا پھر اس نے ہمارے ساتھ رات گزاری، جب صبح ہوئی تو وہ اپنے گھوڑے کی طرف گیا، تو خریدنے والے نے اسے کہا: اب تجھے گھوڑے سے کیا غرض؟ کیا تو نے مجھے یہ فروخت نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے اس بیع کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر خریدنے والے نے کہا: تجھے اس سے کیا غرض؟ تو مجھے یہ بیچ چکا ہے، ان دونوں کو لوگوں نے کہا: یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو برزہ موجود ہیں تم دونوں ان کے پاس جاؤ، حضرت ابو برزہ نے ان دونوں سے کہا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی ہو؟ ان دونوں نے کہا: ہاں، ابو برزہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں بیع کرنے والوں کو اختیار ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں۔ اور میں نہیں دیکھتا کہ تم جدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں صحابی ہیں اور حدیث کے مخرج کو انہوں نے جان لیا اور اس کے مقتضا پر عمل کیا بلکہ یہ صحابہ کا عمل تھا سالم نے کہا: حضرت ابن عمر نے کہا: ہم جب بیع کرتے تھے تو ہم میں سے ہر ایک کو خیار ہوتا تھا جب تک کہ بیع کرنے والے دونوں جدا نہ ہو جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: میں نے اور حضرت عثمان نے بیع کی میں نے انہیں وادی کی زمین دی اور ان کی خیبر کی زمین لی۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: جب میں نے سودا کر دیا تو میں الٹے پاؤں چلنے لگا اس خوف سے کہ کہیں حضرت عثمان میرے جدا ہونے سے پہلے مجھے سودا لوٹا نہ دیں۔ یہ روایت دار قطنی نے نقل کی ہے، پھر فرمایا: اہل لغت نے فَرَقت اور فَرَّقت میں فرق کیا ہے؟ فرقت کو کلام کے اعتبار سے اور فرّقت ابدان کے اعتبار سے جدائی کو لیا ہے۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: مجھے ابن اعرابی نے مفضل سے روایت کر کے بتایا کہ فرقت دو کلاموں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے اور فرّقت دو شخصوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے یعنی میں نے دو کلاموں کے درمیان فرق کیا تو دونوں جدا ہو گئیں اور فرقت کا مطلب ہے: دو آدمیوں کے درمیان جدائی کی تو دونوں جدا ہو گئے۔ افتراق کلام کے لیے استعمال کیا اور التفرق ابدان کے لیے استعمال کیا۔ مالکی علماء نے آیۃ الذین سے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد **اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ** (المائدہ: 1) سے حجت پکڑی ہے۔ یہ دونوں شخص عقد کر چکے ہیں اور اس حدیث میں الوفاء بالعقود کا ابطال ہے۔ انہوں نے فرمایا: کبھی التفرق قول کی تفریق میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے عقد نکاح اور اس طلاق کا وقوع جس کو اللہ تعالیٰ نے فراق کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ**۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا** (آل عمران: 105) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفترق امتی (میری امت جدا ہو جائے گی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم ابدانہا نہیں فرمایا۔ دار قطنی وغیرہ نے عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے شعیب کو یہ کہتے ہوئے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: ''جو شخص کسی دوسرے سے کوئی چیز خریدے تو ان میں سے ہر ایک کو اختیار ہو گا حتیٰ کہ اپنی جگہ سے جدا ہو جائیں مگر یہ کہ خیار کا سودا ہو پس ان میں سے کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے جدا ہو جائے اس خوف سے کہ اس کا ساتھی سودا واپس نہ کر دے (1)''۔ ان علماء نے فرمایا: یہ چیز دلیل ہے کہ افتراق سے پہلے ان کے درمیان بیع مکمل ہو چکی ہے، کیونکہ سودا واپس کرنا صحیح نہیں ہوتا مگر اسی صورت میں جب بیع مکمل ہو چکی ہو۔ فرماتے ہیں: المتبایعان بالخیار (2) کا معنی ہے کہ دونوں خیار

1۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 50 2۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 213

میں برابر ہیں جب تک کہ انہوں نے عقد نہیں کیا جب دونوں نے عقد کر لیا تو اس میں خیار باطل ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو انہوں نے افتراق بالکلام سے اس کی علت بیان کی ہے اس سے مراد ابدان ہیں جس طرح ہم نے سورۂ آل عمران میں بیان کیا ہے اگرچہ بعض جگہ میں افتراق بالکلام صحیح ہوتا ہے، لیکن اس جگہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ ہمیں اس کلام کے متعلق خبر دیں جس کے ساتھ اجتماع واقع ہو اور اس کے ساتھ بیع مکمل ہو گئی کیا یہ وہ کلام ہے جس سے افتراق یا اس کے علاوہ کا ارادہ کیا گیا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ اس کے علاوہ ہے تو وہ پھر گئے اور ایسی بات لائے جو غیر معقول ہے، کیونکہ وہاں اس کلام کے علاوہ کوئی کلام تھی ہی نہیں۔ اگر وہ کہیں کہ یہ بعینہ وہ کلام ہے تو انہیں کہا جائے گا: یہ کیسے جائز ہے کہ وہ کلام جس کے ساتھ وہ جمع ہوئے اور جس کے ساتھ ان کی بیع مکمل ہو، اسی کلام کے ساتھ جدا ہوئے؟ یہ عین محال ہے اور فاسد قول ہے۔ رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہ کسی کے لیے اپنے ساتھی سے جدا ہونا حلال نہیں اس خوف سے کہ کہیں وہ سودا واپس نہ کر دے (1)۔ اس کا معنی استحباب پر محمول ہے، اگر یہ قول صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: من اقال مسلما اقالہ اللہ عثرتہ (2) (جو کسی مسلمان کو سودا واپس کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی لغزش معاف کر دے گا) اور مسلمانوں کے اجماع سے حجت پکڑی ہے کہ ظاہر حدیث کے خلاف پر ایسا کرنے والے کے لیے یہ حلال ہے اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے جدا ہو جائے تا کہ اس کی بیع کو نافذ کر دے اور وہ واپس نہ کر سکے مگر یہ کہ جب وہ چاہے اور اس وجہ سے انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے جس نے لایحل روایت کیا ہے اس کی روایت رد ہے اگر اس خبر کی وجہ استحباب نہ ہو ورنہ بالا جماع یہ باطل ہے۔ اور رہی یہ تاویل کہ المتبایعان سے مراد المتساویان ہے یہ لفظ کے ظاہر سے عدول ہے، اس کا معنی ہے ان دونوں کے عقد کے بعد انہیں اختیار ہے جب تک کہ وہ دونوں اپنی مجلس میں ہیں مگر ایسی بیع جس میں ایک اپنے ساتھی سے کہے کہ تو اختیار کر لے، پس وہ اختیار کر لے۔ ایسی صورت میں دونوں کا اختیار ختم ہو جائے گا اگرچہ وہ جدا نہ بھی ہوں۔ اگر خیار فرض کیا جائے تو معنی ہوگا: مگر بیع الخیار، پھر خیار جسموں کے ساتھ جدا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گا، اس باب کی تتمیم اختلافی کتب میں موجود ہے اور عمرو بن شعیب کے قول میں سمعت ابی یقول حدیث کی صحت کے لیے دلیل ہے۔ دارقطنی نے کہا: ہمیں ابو بکر نیساپوری نے کہا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن علی الوراق نے بیان کیا کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے کہا شعیب نے اپنے باپ سے کوئی چیز سنی ہے انہوں نے کہا: وہ کہتے تھے: مجھے میرے باپ نے بتایا میں نے پوچھا اس کے باپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے سنا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: ہاں میرا خیال ہے اس نے اس سے سنا ہے۔ دارقطنی نے کہا: میں نے ابو بکر نیساپوری کو یہ کہتے ہوئے سنا وہ عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص ہے عمرو بن شعیب کا اپنے باپ شعیب سے سماع صحیح ہے اور شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے سماع صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سچا امانت دار

1۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 150　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 134

مسلمان تاجر قیامت کے روز انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا'' (1)۔ اور تاجر کے لیے اپنے سامان کی ترویج اور تزیین کے لیے قسم اٹھانا مکروہ ہے یا سامان پیش کرتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا مکروہ ہے مثلاً وہ اس طرح کہے: صلی اللہ علی محمد! یہ کتنا عمدہ سامان ہے، اور تاجر کے لیے مستحب ہے کہ فرائض کی ادائیگی سے تجارت اسے مشغول نہ رکھے جب نماز کا وقت آجائے تو اسے تجارت کو چھوڑ دینا مناسب ہے تاکہ وہ اس آیت کے مصداق لوگوں میں سے ہوجائے۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37) (ایسے مرد جنہیں تجارت اور بیع ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرتی) مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ یہ آیت اور مذکورہ احادیث صوفیاء میں سے ان لوگوں کا رد کرتی ہیں جو تجارت اور صنعت کے ذریعے خوراک حاصل کرنے کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باطل ذرائع سے مال کھانے کو حرام کیا ہے اور تجارت کے ذریعے مال کو حلال کیا ہے اور یہ بالکل واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اس میں ایک مسئلہ ہے حضرت حسن نے کثرت پر دلالت کی بنا پر تُقَتِّلُوا پڑھا ہے۔ اس پر اہل تاویل کا اجماع ہے کہ اس آیت سے مراد بعض کے بعض کو قتل کرنے سے نہی ہے۔ پھر لفظ اپنے آپ کے قتل کو بھی شامل ہے یعنی دنیا پر حرص اور طلب مال کے لالچ میں اس کو قتل نہ کرے (2)، یعنی اپنے آپ کو ایسے دھوکوں میں نہ ڈالے جو اسے تلف تک پہنچانے والے ہوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ تنگی اور غضب میں اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ ان تمام صورتوں کو نہی شامل ہے۔ حضرت عمرو بن العاص نے اس آیت سے حجت پکڑی تھی جب انہوں نے غزوۂ ذات السلاسل میں اپنے نفس پر خوف کی وجہ سے جنبی ہونے کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل نہیں کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے احتجاج کو قائم رکھا تھا اور ان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے اور مزید کچھ نہ کہا تھا۔ اس حدیث کو ابوداؤد وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

**وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝**

''اور جو شخص کرے گا یوں سرکشی اور ظلم سے تو ڈال دیں گے ہم اسے آگ میں اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے''۔

ذٰلِكَ کا اشارہ قتل کی طرف ہے، کیونکہ وہ قریب مذکور ہے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا اشارہ باطل ذریعے سے مال کھانے اور قتل نفس کی طرف ہے، کیونکہ ان دونوں کے متعلق نہی متواتر آئی ہے پھر نہی کے مطابق وعید وارد ہوئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سورت کے آغاز سے جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان تمام کی طرف یہ اشارہ ہے۔ طبری نے کہا: ذٰلِكَ کا اشارہ ان چیزوں کو شامل ہے جو آخری وعید کے بعد منع کی گئی ہیں اور وہ یہ ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔

کیونکہ سورت کے آغاز میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان کے ساتھ وعید متصل ہے مگر يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 7 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 42

تَلُمْ کے قول کے بعد وعید نہیں ہے مگر یہ آیت کریمہ: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا۔

العدوان، حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں (1) اور الظلم کسی چیز کو اس کی مناسب جگہ پر نہ رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وعید کو عدوان اور ظلم کے ذکر کے ساتھ مقید فرمایا تا کہ اس سے سہو اور غلطی کا فعل نکل جائے۔ عدوان اور ظلم دونوں کا ذکر فرمایا، حالانکہ ان کے معانی قریب قریب ہیں، ان کی وجہ ان کے الفاظ کا اختلاف ہے اور کلام میں یہ حسن ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

والفی قولها کذِبًا و مَیْنًا

اس جملہ میں کذبا اور مینا کا ذکر کیا، حالانکہ دونوں کا معنی جھوٹ ہے۔

اور الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے عطف عمدہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: بُعْدًا و سُحْقًا اس سے یعقوب علیہ السلام کا قول ہے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (یوسف: 86) لفظ کے اختلاف کی وجہ سے یہ عمدہ ہے۔

نُصْلِيْهِ۔ اس کا معنی ہے ہم اسے آگ کی گرمی مس کریں گے (2)۔ ہم ان آیات اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث کو جمع کرنے کا مفہوم نافرمانوں اور گناہ کبیرہ کرنے والوں میں بیان کیا ہے جن کے لیے وعید نافذ ہو گی پس اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اعمش اور نخعی نے نصلیہ کو نون کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ صلی نارا سے منقول ہے یعنی میں نے اس کو گرم کیا۔ اور حدیث میں ہے: شاۃ مصلیۃ۔ بھونی ہوئی بکری۔ اور جنہوں نے نون کو ضمہ دیا ان کے نزدیک ہمزہ سے منقول ہے، مثلاً طعمت اور اطعمت۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ۝۳۱

"اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (نامہ اعمال) سے تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں"۔

اس آیت کے ضمن میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں بڑے بڑے گناہوں سے منع فرمایا چھوٹے گناہوں سے اجتناب پر تخفیف کا وعدہ فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ گناہ چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی ہوتے ہیں۔ یہی اہل تاویل اور فقہاء کی جماعت کا نظریہ ہے، چھونا اور دیکھنا یقینی طور پر بڑے گناہوں سے اجتناب کے ساتھ معاف ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور اس کا قول حق ہے لیکن اس پر یہ چیز واجب نہیں۔ اس کی نظیر پہلے اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ کے ارشاد میں توبہ کی قبولیت کے بارے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے گناہوں سے اجتناب کی وجہ سے چھوٹے گناہ معاف فرما دیتا ہے لیکن ایک اور چیز بھی اجتناب کبائر کے ساتھ متصل ہو تو یہ صغیر گناہ معاف ہوں گے اور وہ ہے فرائض کا قائم کرنا۔ امام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 43-42 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 43

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے پانچ نمازیں، جمعہ سے جمعہ تک، رمضان سے رمضان تک گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جب کبائر سے اجتناب کرے (1)۔ ابو حاتم البستی نے مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر بیٹھے پھر تین مرتبہ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! (2) پھر خاموش ہو گئے ہم میں سے ہر شخص رسول اللہ ﷺ کی قسم کی وجہ سے سر جھکا کر رو رہا تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ پانچ نمازیں ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور سات بڑے گناہوں سے اجتناب کرے تو قیامت کے روز اس کے لیے جنت کے آٹھ دروازے کھولے جائیں گے حتیٰ کہ انہیں زور سے بند کیا جائے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ کتاب وسنت سے چھوٹے گناہوں کی تکفیر کی تائید ملتی ہے مثلاً غیر محرم کو دیکھنا اور اس کے مشابہ گناہ۔ اور سنت نے بیان فرمایا کہ تَجْتَنِبُوْا سے مراد تمام بڑے گناہوں سے کامل اجتناب نہیں ہے واللہ اعلم۔ اصولیوں نے فرمایا: کبیرہ گناہوں سے اجتناب کے ساتھ چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہونا قطعی طور پر واجب نہیں بلکہ یہ غلبہ ظن، قوت رجا پر محمول ہے اور مشیت ثابت ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والے کے لیے اور فرائض ادا کرنے والے کے لیے ہم قطعی طور پر صغیر گناہوں کے کفارہ کا حکم لگائیں تو یہ اس کے لیے اس مباح کے حکم میں ہوں گے جس میں قطعی طور پر گناہ نہیں ہوتا اور یہ شریعت میں نقص ہے۔ اور ہمارے نزدیک کوئی صغیر نہیں ہوگا۔ قشیری عبد الرحیم نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ کبائر ہیں، لیکن بعض دوسروں سے بڑے گناہ ہیں۔ تمییز نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بندہ تمام گناہوں سے اجتناب کرے۔

میں کہتا ہوں: جس نے نفس کی مخالفت کی طرف دیکھا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا تو گناہ کے چھوٹا ہونے کی طرف نہ دیکھ بلکہ تو اس کی طرف دیکھ جس کی تو نے نافرمانی کی۔ اس نسبت سے تمام گناہ بڑے ہیں اس طریقہ پر قاضی ابو بکر، استاذ ابو اسحاق اسفرائینی، ابو المعالی، ابو النصر عبد الرحیم قشیری کا کلام اسی پر محمول کیا جائے گا۔ انہوں نے فرمایا: بعض گناہوں کو دوسروں کی نسبت سے صغیرہ گناہ کہا جاتا ہے جس طرح زنا کو کفر کی نسبت صغیرہ کہا جاتا ہے بلکہ یہ تمام کبیرہ ہیں اور کفر کے علاوہ جس کے لیے وہ چاہے گا اسے معاف کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

اور انہوں نے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ کی قرأت سے بھی حجت پکڑی ہے اور بڑا گناہ شرک ہے اور علماء اصول نے فرمایا: کبائر کی صورت میں اس سے مراد کفر کی اجناس ہوگی۔ وہ آیت جس نے حکم کو مقید کیا ہے تمام مطلقات کو اس کی طرف پھیرا جائے گا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ اسی طرح علماء اصول نے مسلم وغیرہ کی اس روایت سے بھی حجت پکڑی ہے جو ابو امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آگ کو واجب کر دے گا اور اس پر جنت حرام کر دے گا''۔ ایک شخص نے عرض کی یا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 122　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 44

رسول اللہ! اگر چہ وہ حق تھوڑا سا بھی ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر چہ وہ کیکر کی چھڑی ہی ہو'' (1)۔ پس تھوڑے سے گناہ پر بھی شدید وعید آئی ہے جس طرح زیادہ گناہ پر آئی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آگ یا غضب یا لعنت یا عذاب کی وعید سنائی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں سے منع فرمایا ہے وہ تینتیس تک ہیں اور اس کی تصدیق یہ ارشاد ہے: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ۔ طاؤس نے کہا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا گناہ کبیرہ سات ہیں؟ فرمایا: یہ ستر کے قریب ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا: ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے کہا: کبیرہ گناہ سات ہیں؟ فرمایا: یہ سات سو تک ہیں ان میں بڑے سات ہیں مگر استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں اور اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی فرمایا: کبیرہ گناہ چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی اور رحمت الٰہیہ سے قنوط اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے امن میں ہونا (2) اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، اس پر قرآن دلیل ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ گناہ کبیرہ نو ہیں اور وہ یہ ہیں (1) کسی نفس کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، محصنہ پر تہمت لگانا، جھوٹی گواہی دینا، والدین کی نافرمانی کرنا، میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، جادو کرنا اور بیت الحرام میں الحاد کرنا (3)۔ اور علماء کے نزدیک مندرجہ ذیل گناہ بھی کبائر میں سے ہیں جوا، چوری، شراب پینا، سلف صالحین کو گالی دینا، شرعی احکام سے عدول کرنا، خواہش کی اتباع کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، انسان کا اپنے والدین کو گالی دینا۔ آدمی کسی کے والدین کو گالی دیتا ہے پھر وہ اس کے والدین کو گالی دیتا ہے۔ زمین میں فساد کی کوشش کرنا۔ اس کے علاوہ بھی کثرت سے گناہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں اور احادیث میں آیا ہے جن کو ائمہ نے تخریج کیا ہے۔ مسلم نے کتاب الایمان میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے۔ کبائر کے متعلق آثار کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد اور حصر میں علماء کا اختلاف ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کبائر کے متعلق صحیح اور حسن احادیث وارد ہیں ان میں حصر اور شمار کا قصد نہیں کیا گیا ہے، لیکن بعض دوسروں کی نسبت بڑے ہیں جن کا ضرر و نقصان زیادہ ہے۔ شرک تمام کبائر سے بڑا ہے یہ وہ ہے جس کی بخشش نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص قائم فرمائی ہے اور اس کے بعد بڑا گناہ رحمت الٰہیہ سے مایوسی ہے، کیونکہ اس میں قرآن کی تکذیب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا قول حق ہے وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (الاعراف: 156) پس جو کہتا ہے کہ وہ اسے نہیں بخشے گا تو اس نے ایک وسیع چیز کو محدود کر دیا۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہو۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ (یوسف) اس کے بعد بڑا گناہ قنوط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ (الحجر) اس کے بعد بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے امن میں ہونا ہے پس وہ گناہوں میں لگا رہتا ہے اور بغیر عمل کے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ (الاعراف) (تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ہیں اللہ کی خفیہ تدبیر سے، پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) اور فرمایا: ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 80 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 43 3۔ ایضاً

الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (حم السجدہ) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم ہو گئے نقصان اٹھانے والوں سے) اس کے بعد بڑا گناہ کسی کو قتل کرنا ہے، کیونکہ نفس کا ضیاع اور وجود کو ختم کرنا ہے، لواطت، اس میں نسل کو ختم کرنا ہے، زنا، اس میں نسب کا اختلاط ہے، شراب پینا، اس میں عقل کا چلا جانا ہے جس پر تکلیف کا مدار ہے، نماز کا ترک کرنا اور آذان کو ترک کرنا اس میں شعائر اسلام کے اظہار کا ترک ہے، جھوٹی گواہی دینا، اس میں خونوں، شرمگاہوں اور اموال وغیرہ کا مباح کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے امور جن کا نقصان واضح ہے۔ ہر وہ گناہ جس کو شرع نے برا کہا اس پر عقاب کی دھمکی دی اور اس پر سختی فرمائی یا اس کا نقصان وجود میں زیادہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے تو وہ گناہ کبیرہ ہے اس کے علاوہ گناہ صغیرہ ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ابو عمرو اور اکثر کوفیوں نے مُّدْخَلًا کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس میں احتمال ہے کہ مصدر ہو یعنی ادخالاً اور مفعول محذوف ہے یعنی ہم تمہیں جنت میں داخل کریں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مُّدْخَلًا مکان کے معنی میں ہو، تو اس صورت میں مفعول ہوگا۔ اہل مدینہ نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دخل کا مصدر ہو اور فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ندخلکم فتدخلون مدخلاً اور کلام اس پر دلیل ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اسم مکان ہو پھر اس کو نصب مفعول بہ کی حیثیت سے ہوگی یعنی ہم تمہیں معزز جگہ یعنی جنت میں داخل کریں گے۔ یہ ابو سعید بن اعرابی نے کہا: میں نے ابو داؤد سجستانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابو عبد اللہ احمد بن حنبل کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مسلمان تمام جنت میں جائیں گے، میں نے پوچھا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ یعنی اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (نامہ اعمال) سے تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں یعنی جنت میں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ذخیرہ کیا ہے" (1)۔ جب اللہ تعالیٰ کبائر کے علاوہ معاف فرما دے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبیرہ گناہوں کی سفارش کریں گے تو پھر مسلمانوں پر کون سا گناہ باقی رہے گا۔ اور ہمارے علماء نے فرمایا: اہل سنت کے نزدیک کبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے ہر اس شخص کے لیے جو موت سے پہلے انہیں ترک کر دے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور مسلمانوں میں سے جو ان پر مرے گا اسے بھی بخش دیا جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ یعنی شرک کے علاوہ گناہ معاف فرما دے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہوں پر مرا ہو اگر موت سے پہلے توبہ کرنے والا مراد ہو تو پھر شرک اور دوسرے گناہوں میں فرق کا کوئی معنی نہیں رہے گا، کیونکہ شرک سے توبہ کرنے والے کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: سورۂ نساء کی پانچ آیات ایسی ہیں جو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں (۱) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ (۲) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ

1۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 4، صفحہ 282، دار المسیرہ بیروت

يُشْرَكَ بِهٖ (۳) وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (۴) وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا (۵) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ۔ ابن عباس نے فرمایا: سورۂ نساء میں آٹھ آیات ہیں جو اس امت کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن پر سورج طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے (۱) يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ (۲) وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ (۳) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (۴) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۷) وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (۸) مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ (الآیۃ)

**وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۳۲**

''اور نہ آرزو کرو اس چیز کی بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر، مردوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا، اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور مانگتے رہو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (وکرم) کو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مرد جہاد کرتے ہیں اور عورتیں جہاد نہیں کرتی ہیں، ہمارے لیے نصف میراث ہے (اس کی کیا حکمت ہے؟) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ اور مجاہد نے کہا: اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ الخ (الاحزاب: 35) اور حضرت ام سلمہ پہلی سفر کرنے والی عورت تھی جو مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آئی تھی۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث مرسل ہے، بعض نے اس حدیث کو ابن ابی نجیح عن مجاہد کے سلسلہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ حضرت ام سلمہ نے اس طرح کہا ہے (1)۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں لوگ عورتوں اور بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے، جب انہیں وارث بنایا گیا تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصوں کے برابر حصہ رکھا گیا عورتوں نے خواہش کی کہ کاش ان کے حصے بھی مردوں کے حصوں کی طرح ہوتے اور مردوں نے کہا: ہم امید کرتے ہیں کہ آخرت میں ہماری نیکیوں کی وجہ سے ہمیں عورتوں پر فضیلت دی جائے گی جس طرح میراث میں ہمیں ان پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَتَمَنَّوْا، التمنی ارادہ کی ایک قسم ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے جس طرح التلھف اس کی ایک قسم ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو التمنی (آرزو) سے منع فرمایا،

1۔ جامع الترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127

کیونکہ اس میں تعلق خاطر ہے اور موت کو بھولنا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اس تمنی کی نہی میں رشک داخل ہے یا نہیں؟ رشک یہ ہے کہ ایک شخص خواہش کرے کہ اس کے پاس فلاں آدمی جیسی حالت ہو اگرچہ اس سے اس حالت کے زوال کی خواہش نہ کرے۔ جمہور علماء رشک کی اجازت دیتے ہیں مثلاً امام مالک وغیرہ اور بعض علماء کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے ارشاد: لاحسد الا فی اثنتین (1) رشک نہیں ہے مگر دو شخصوں میں ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن عطا فرمایا ہو وہ اسے دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو وہ اسے دن، رات کے اوقات میں اس سے لوگوں کو نفع دیتا ہو۔ اور لاحَسَدَ کا معنی ہے کوئی رشک ان دو امور میں رشک سے اعظم و افضل نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس مفہوم پر متنبہ کیا ہے، کیونکہ انہوں نے باب ان الفاظ میں باندھا ہے باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ مہلب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا جو تمنا جائز نہیں ہے اور یہ دنیا کے ساز و سامان کی خواہش کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اعمال صالحہ کی تمنا یہ اچھی چیز ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ پر تمنا کرے مگر اپنی تمنا کو ایسی چیزوں سے نہ ملائے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے تو یہ جائز ہے یہ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں موجود ہے: وَدِدْتُ ان أُحْیَا ثم أُقْتَل میں خواہش کرتا ہوں کہ میں زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔

میں کہتا ہوں: حدیث جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب التمنی میں ذکر کی ہے وہ خیر کی تمنا نیک افعال اور ان میں رغبت پر دلیل ہے اس میں نیکی کے تمام اعمال پر شہادت کی فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے شہادت کی تمنا کی، کسی دوسری چیز کی تمنا نہ کی، یہ شہادت کا بلند مرتبہ ہے اور اہل شہادت کی کرامت و عزت ہے، رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شہادت عطا فرمائی تھی، کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: خیبر کا کھانا زہر کی تکلیف کو مجھ پر لوٹاتا ہے یہ وہ وقت ہے کہ میری رگ جان (اس کی وجہ سے) کٹ گئی۔ اور صحیح میں ہے شہید کو کہا جائے گا تو تمنا کر، پس وہ کہے گا: میں تمنا کرتا ہوں کہ میں دنیا کی طرف لوٹ جاؤں حتیٰ کہ تیرے راستہ میں دوبارہ شہید کیا جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ ابو طالب کے ایمان اور ابولہب اور قریش کے سرداروں کے ایمان کی تمنا کرتے تھے، حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: ہائے میرا شوق ان بھائیوں کی طرف جو میرے بعد آئیں گے مجھ پر ایمان لائیں گے جب کہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ یہ تمام احادیث دلیل ہیں کہ ایسی تمنا سے منع نہیں کیا گیا جو حسد اور بغض کی داعی نہ ہو۔ اور اس آیت میں جس تمنا سے نہی کی گئی ہے وہ اسی قبیل سے ہے اور اس میں وہ تمنا داخل ہے جس میں انسان دوسرے کی حالت کی تمنا کرتا ہے خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے ہو اور ساتھ یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمت دوسرے سے چھن جائے، برابر ہے تو نے اس کے ساتھ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ چیز لوٹ آئے یا نہیں۔ یہ بعینہ حسد ہے اس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے ارشاد فرمایا: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے) اور اس میں داخل ہے اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح بھیجنا، یا اس کی بیع پر بیع کرنا، کیونکہ یہ حسد اور ناراضگی کی داعی ہے۔ بعض علماء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 272

رشک کو بھی مکروہ کہا ہے ان کے نزدیک یہ بھی نہی میں داخل ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دینے والا ہے۔ ضحاک نے کہا: کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کے مال کی تمنا کرے کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں سنا جنہوں نے کہا تھا: یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ...... وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ (القصص: 79 تا 82) (اے کاش ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ وجلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو...... اور صبح کی ان لوگوں نے جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے۔ جب اسے زمین میں اپنے محل اور مال کے ساتھ دھنسا دیا گیا۔ لَوْ لَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا (القصص: 82) اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا۔

کلبی نے کہا: کوئی شخص اپنے بھائی کے مال، عورت، خادم اور سواری کی تمنا نہ کرے بلکہ اسے یوں کہنا چاہیے: یا اللہ! مجھے بھی اس کی طرح یہ نعمتیں عطا فرما۔ اسی طرح تورات میں ہے اور اسی طرح قرآن میں ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی کے مال اور اہل کی تمنا سے منع فرمایا ہے اور اپنے مومنین بندوں کو حکم فرمایا کہ اس کا فضل اس سے طلب کرو۔ اور جمہور کی حجت نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''دنیا چار افراد کے لیے ہے ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا ہو پھر وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا ہو اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس میں حق جانتا ہو یہ افضل ترین مرتبہ ہے، دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہو اور مال عطا نہ فرمایا ہو پس وہ سچی نیت سے یہ کہتا ہو: ''اگر میرے لیے مال ہوتا تو میں فلاں کی طرح اسے خرچ کرتا پس اس کی اس نیت کی وجہ سے دونوں کا اجر برابر ہوگا'' (1)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ حسن نے کہا: تم میں سے کوئی مال کی تمنا نہ کرے اسے کیا معلوم کہ اس کی ہلاکت اس میں ہو۔ یہ اس صورت میں صحیح ہے جب وہ دنیا کے لیے تمنا کرے۔ مگر جب وہ کسی خیر کے لیے تمنا کرے تو شریعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے پس بندہ تمنا کرے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے رب کا قرب حاصل کرے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا اس سے مراد ثواب اور عقاب ہے۔ وَ لِلنِّسَآءِ اسی طرح عورتوں کے لیے ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ عورت کے لیے بھی ایک نیکی کا بدل دس نیکیاں ہیں جس طرح مردوں کے لیے ایک نیکی کا بدل دس نیکیاں ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد میراث ہے۔ اس قول کے مطابق اکتساب بمعنی الاصابۃ ہوگا۔ مرد کے لیے حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بنا پر تمنا سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں حسد کے دواعی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مصالح کو زیادہ جانتا ہے پس اس نے ان کے مصالح کو جانتے ہوئے ان کے درمیان میراث کی تقسیم میں فرق رکھا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو وہ سوال کرنے کو پسند فرماتا ہے اور افضل عبادت کشادگی کا انتظار

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 56

کرنا ہے''۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے'' (1)۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کا حکم واجب ہے۔ بعض علماء نے اس معنی کو لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

الله يغضب إن تركت سؤاله ... وبني آدمَ حين يُسأل يَغضبُ

اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے اور انسان سے جب سوال کیا جاتا ہے تو ناراض ہوتا ہے۔

احمد بن المعذل ابو الفضل الفقیہ المالکی نے کیا خوب کہا ہے:

ألتمِس الأرزاقَ عندَ الذی ... مادُونَه إن سِيلَ مِن حاجِبِ

مَنْ يُبغِض التاركَ تَسْأَلَهُ ... جوداً ومن يَرضَى عن الطالبِ

ومَنْ إذا قال جَرَى قولُه ... بغير تَوْقِيعٍ إلى كاتبِ

ہم نے اپنی کتاب ''قمع الحرص بالزهد والقناعة'' میں اس کے قریب مفہوم میں کلام ذکر کی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی عبادت کا سوال کرو۔ فضل سے مراد امر دنیا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد پسندیدہ عمل کی توفیق طلب کرنا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں: اپنے رب سے سوال کرو حتیٰ کہ سیر ہو کر کھانے کا بھی اسی سے سوال کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر وہ عطا نہیں فرمائے گا تو کبھی بھی میسر نہ آئے گا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سوال کا حکم نہیں دیا مگر اس لیے کہ وہ عطا کرے۔

کسائی اور ابن کثیر نے وَسَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ پڑھا ہے یعنی تمام قرآن میں بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے وَسْئَلُوا اللّٰهَ اس کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہے مگر تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

''اور ہر ایک کے لیے بنا دیئے ہیں ہم نے وارث اس مال سے جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد و پیمان تو دو انہیں ان کا حصہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے''۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہر انسان کے ورثاء اور موالی ہیں، ہر ایک کو اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے اس کے لیے تقسیم فرمایا ہے اور غیر کے مال کی خواہش نہ کرے۔ بخاری نے کتاب الفرائض میں حضرت سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا...... الخ کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کے تحت فرمایا مہاجرین جب مدینہ طیبہ آئے تو انصار کا مہاجر وارث ہوتا تھا، حالانکہ وہ اس کا ذی محرم نہیں ہوتا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن الرسول، جلد 2، صفحہ 173

تھا۔ یہ اس اخوت کی وجہ سے تھا جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان قائم فرمائی تھی پھر جب لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کی آیت نازل ہوئی تو اسے وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے منسوخ کر دیا (1)۔ ابو الحسن بن بطال نے کہا: تمام نسخوں میں یہی ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کو وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ نے منسوخ کر دیا جب کہ صحیح یہ ہے کہ ناسخ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ ہے اور منسوخ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ ہے۔ اس طرح طبری نے اپنی روایت میں ذکر کیا ہے۔

سلف جمہور سے مروی ہے کہ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ کو منسوخ کرنے والی آیت 75 سورۂ انفال میں ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ یہ انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے۔ ابو عبیدہ نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں اسی چیز کو ثابت کیا ہے۔ اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جسے زہری نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے فرمایا: جن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے بیٹوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اپنے متبنیٰ بنایا تھا اور اسلام میں وہ وارث بنتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ وصیت میں ان کے لیے حصہ مقرر کرو اور میراث کو اللہ تعالیٰ نے ذوی الرحم اور عصبہ ورثاء کی طرف لوٹا دیا۔ ایک جماعت نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ، محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا کہ اپنے حلیفوں کو نصرت ونصیحت وغیرہ کے اعتبار سے کچھ دو اور ان کے لیے وصیت کرو جب کہ میراث ختم ہو چکی ہے۔ یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور یہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے اور نسخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جمع کرنا ممکن ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا جو طبری نے ذکر کیا ہے۔ بخاری نے یہ مفہوم "کتاب التفسیر" میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ذوی الارحام کی میراث کا ذکر سورۂ انفال میں آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کل کا لفظ عرب کلام میں احاطہ اور عموم کے لیے استعمال ہوتا ہے جب یہ مفرد آئے تو تمام نحویوں کے نزدیک یقینا کلام میں حذف ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے قبل اور بعد کی طرح مررت بکل جائز قرار دیا حذف کی تقدیر یہ ہوگی۔ ولکل احدٍ جعلنا موالی۔ یعنی ورثاء بنائے۔ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلف کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہیں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص کسی سے عہد و پیمان کرتا تھا اور کہتا تھا: میرا خون، تیرا خون، مدد و نصرت میں ہم ایک چیز ہوں گے اور میرا بدلہ اور تیرا بدلہ ایک ہوگا، میری جنگ اور تیری جنگ ایک ہوگی، میری صلح اور تیری صلح ایک ہوگی، تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہوں گا، تو میری وجہ سے طلب کیا جائے گا میں تیری طرف سے طلب کیا جاؤں گا، تو میری طرف سے دیت دے گا میں تیری طرف سے دیت دوں گا، پس حلیف کو اپنے دوسرے حلیف کی میراث میں چھٹا حصہ ملتا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ موالی کا لفظ مشترک ہے کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ آزاد کرنے والا، آزاد کیا گیا، آزاد کرنے والے کو مولی اعلی اور آزاد کیے گئے کو مولی اسفل کہا جاتا ہے۔ مددگار کو بھی مولی کہا جاتا ہے: وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ⑪

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 999

(محمد) یعنی کافروں کا کوئی مددگار نہیں۔ چچا کے بیٹے کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ پڑوسی کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ۔ اس سے مراد عصبہ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "فرائض سے جو بچ جائے وہ قریبی مذکر عصبہ کے لیے ہے"(1) اور عصبات میں سے مولی اعلیٰ ہے، نہ کہ مولی اسفل۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے، کیونکہ معتق (آزاد کرنے والا) معتق (آزاد کیا گیا) پر انعام کرنے والا ہے جیسے اس کا موجد ہے اس معنی کی وجہ سے اس کو میراث کا حق دیا جاتا ہے۔

طحاوی نے حسن بن زیاد سے روایت کیا ہے کہ مولی اسفل، مولی اعلی کا وارث ہوگا اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے کہ ایک شخص نے اپنا غلام آزاد کیا، پھر آزاد کرنے والا فوت ہوگیا اور اس نے اپنے آزاد کیے گئے غلام کے علاوہ کوئی وارث نہ چھوڑا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی میراث اس کے آزاد کردہ غلام کو دے دی(2)۔ امام طحاوی نے فرمایا: اس حدیث کی کوئی معارض حدیث نہیں ہے، پس اس پر عمل واجب ہے، کیونکہ جب آزاد کرنے والے کے لیے میراث کا ثابت کرنا ممکن ہے اس تقدیر پر کہ وہ اس کے لیے موجد کی طرح ہے تو وہ باپ کے مشابہ ہے اور مولی اسفل، بیٹے کے مشابہ ہے یہ چیز میراث میں برابری کا تقاضا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اتصال عام ہوتا ہے اور حدیث میں ہے قوم کا مولی، ان میں سے ہے۔ اور جنہوں نے اس کی مخالفت کی وہ جمہور علماء ہیں وہ فرماتے ہیں: میراث قرابت کا تقاضا کرتی ہے اور یہاں کوئی قرابت نہیں ہے، مگر ہم نے معتق پر انعام کے حکم کی وجہ سے معتق کے لیے میراث کو ثابت کیا ہے اور انعام کا مقابلہ، مجازاۃ کا تقاضا کرتا ہے اور یہ مولی اسفل میں منعکس نہیں ہوتا۔ رہا بیٹا تو وہ سب لوگوں سے زیادہ میراث کا مستحق ہے، کیونکہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اس کے قائم مقام ہوتا ہے اور معتق اس کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے معتق (آزاد کرنے والا) کے قائم مقام ہو، معتق نے اس پر انعام کیا ہوتا ہے پس شرع نے اسے معتق کی میراث کا حق دار بنا دیا۔ پس یہ صفت مولی اسفل (آزاد کردہ غلام) میں نہیں پائی جاتی۔ پس ان کے درمیان فرق ظاہر ہوگیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ علی بن کبشہ نے حمزہ سے روایت کیا ہے عقدت یعنی کثرت پر دلالت کرنے کے لیے قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ سے مشہور قرأت عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ (قاف کی تخفیف) کے ساتھ ہے۔ یہی قرأت عاصم اور کسائی کی ہے۔ یہ قرأت بعید ہے، کیونکہ عہد و پیان نہیں ہوتا مگر دو یا زیادہ شخصوں کے درمیان پس اس کا باب فاعل ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: حمزہ کی قرات عربی میں غموض پر تجوز ہے اس تقدیر میں وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد قسم اٹھانا اور پختہ عہد و پیان ہوگا۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اس کی تقدیر یوں ہوگی عقدت لهم ایمانكم الحلف۔ پھر لام کو حذف کیا گیا ہے جس طرح کہ اس ارشاد میں ہے: وَاِذَا كَالُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی كَالُوْهُمْ اور دوسرے مفعول کو حذف کیا گیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: كِلْتك یعنی كِلْت لَكَ بر۔ مفعول اول حذف کیا گیا، کیونکہ وہ صلہ میں متصل ہے۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2657

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض عن رسول الله، باب میراث العصبه، حدیث نمبر 2024، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ان کے ساتھ عہد و پیمان دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ وفا کو پسند کرتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

''مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر، اس وجہ سے کہ فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت و آرام کے لیے) تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں، حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (مردوں کی) غیر حاضری میں اللہ کی حفاظت سے اور وہ عورتیں اندیشہ ہو تمہیں جن کی نافرمانی کا تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور (پھر) الگ کر دو انہیں خواب گاہوں سے اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو انہیں پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تمہاری تو نہ تلاش کرو ان پر (ظلم کرنے کی) راہ یقینا اللہ تعالیٰ (عظمت و کبریائی میں) سب سے بالا سب سے بڑا ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی مرد عورتوں کا خرچ اٹھاتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں اسی طرح مردوں میں حکام، امراء اور جہاد کرنے والے ہوتے ہیں، جب کہ یہ فرائض عورتوں پر نہیں۔ کہا جاتا ہے قوام و قیم (نگران)۔ یہ آیت حضرت سعد بن ربیع کے حق میں نازل ہوئی ان کی بیوی حضرت حبیبہ بنت زید بن خارجہ بن ابی زہیر نے نافرمانی کی تو انہوں نے اسے طمانچہ مارا، حضرت حبیبہ کے والد نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیٹی سعد کو دی، اس نے اسے طمانچہ مارا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اپنے خاوند سے قصاص لے، وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس لوٹی تا کہ اپنے خاوند سے قصاص لے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوٹ آؤ میرے پاس جبریل آیا ہے''۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم نے ایک امر کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے امر کا ارادہ فرمایا''۔ دوسری روایت میں ہے: ''میں نے ایک چیز کا ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا وہ بہتر ہے''۔ آپ نے پہلا حکم ختم کر دیا(1)۔

بعض علماء نے فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ: 114) اسی حکم کے بارے میں نازل ہوا۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا اور فرمایا: حجاج بن منہال اور عارم بن فضل نے ہمیں بتایا۔ یہ الفاظ حجاج بن منہال کے

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 144

ہیں۔ فرمایا: ہمیں جریر بن حازم نے بتایا فرمایا میں نے حسن کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: میرے خاوند نے میرے چہرے پر مارا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے درمیان قصاص ہوگا''۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤى اِلَیْكَ وَحْیُهٗ۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ ابوروق نے کہا: یہ جمیلہ بنت ابی اور ان کے خاوند ثابت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی۔ کلبی نے کہا: یہ عمیرہ بنت محمد بن مسلمہ اور اس کے خاوند سعد بن ربیع کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا سبب ام سلمہ کا پہلا قول ہے۔ وجہ النظم یہ ہے کہ عورتوں نے میراث میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کے بارے میں بات کی تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَمَنَّوْا، پھر اللہ تعالیٰ نے میراث میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کو بیان فرمایا، کیونکہ مردوں پر مہر اور خرچ کی ذمہ داری ہے پھر مردوں کی فضیلت کا فائدہ عورتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مردوں کو عقل اور تدبیر میں زائد فضیلت حاصل ہے، پس مردوں کو عورتوں پر قیام کا حق دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفس اور طبع میں مردوں کے لیے زیادہ قوت ہے، جو عورتوں میں نہیں ہے، کیونکہ مردوں کی طبیعت پر حرارت اور سختی غالب ہے، پس اس میں قوت اور شدت ہوگی جب کہ عورتوں کی طبیعت میں رطوبت اور برودت غالب ہے، پس اس میں نرمی اور ضعف کا معنی ہوگا۔ پھر مردوں کے لیے عورتوں پر قیام کا حق اسی لیے رکھا گیا۔ اور دوسری وجہ یہ ارشاد ہے: وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مرد، عورتوں کو ادب سکھائیں۔ جب وہ مردوں کے حقوق کی حفاظت کریں تو پھر مرد کو ان کے ساتھ غیر مناسب طرز معاشرت نہیں اپنانا چاہیے۔ قوام، فعال کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا مطلب ہے کسی چیز کی نگرانی کرنا، خود اس چیز میں غور و فکر کرنا اور اجتہاد کے ساتھ اس چیز کی حفاظت کرنا، پس مردوں کا عورتوں پر قیام اس حد تک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تدبیر، تادیب، گھر میں انہیں روکے رکھنے اور زیب و زینت ظاہر کرنے سے منع کرنا ہے اور عورت پر مرد کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کو قبول کرنا ہے جب تک کہ معصیت نہ ہو، اس کی علت فضیلت، نفقہ، امر جہاد میں قوت و عقل، میراث، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے ہے۔ بعض نے تفضیل میں داڑھی کی رعایت کی ہے حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں ہے، کیونکہ کبھی داڑھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسری صفت نہیں ہوتی جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، اس کا رد سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ کے ارشاد سے علماء نے یہ سمجھا کہ جب مرد اس کے خرچہ سے عاجز ہوگا تو اس پر قوام نہیں ہوگا اور جب قوام نہیں ہوگا تو عورت کے لیے عقد کا فسخ کرنا جائز ہوگا، کیونکہ وہ مقصود زائل ہے جس کے لیے نکاح مشروع کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ نفقہ اور لباس سے عاجزی کے وقت نکاح کو فسخ کرنے کا ثبوت ہے۔ یہی امام مالک و امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ایسی صورت میں نکاح فسخ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ (بقرہ:280) اس پر کلام اسی سورت میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ یہ تمام خبر ہے اس سے مقصود خاوند کی

اطاعت، اس کے مال کے حق کو قائم کرنے اور خاوند کی عدم موجودگی میں اپنے نفس کی حفاظت کرنے کا حکم ہے۔ مسند ابی داؤد طیالسی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''بہتر عورت وہ ہے جسے جب تو دیکھے تو تجھے وہ خوش کرے، جب تو اسے حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس سے غائب ہو تو وہ اپنی عصمت کی اور تیرے مال کی حفاظت کرے''۔ فرمایا: پھر یہ آیت تلاوت کی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ...... الخ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: ''کیا میں تجھے مرد کے خزانہ میں سے بہتر چیز نہ بتاؤں، وہ نیک صالحہ بیوی ہے جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کرے، جب وہ اسے حکم دے تو وہ اطاعت کرے، جب وہ اس سے غائب ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے'' (1)۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: کیا میں تجھے اس بہترین چیز کے بارے میں نہ خبر دوں ایک مرد جسے خزانہ کرتا ہے؟ وہ صالح عورت ہے الخ، پھر سابقہ حدیث ذکر کی۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں فالصوالح قوانت حوافظ کے الفاظ ہیں۔ یہ وزن مؤنث کے ساتھ مختص ہیں۔ ابن جنی نے کہا: جمع مکسر از روئے لفظ کے معنی کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ وہ کثرت کا معنی دیتی ہے اور یہاں یہی مقصود ہے۔ اور بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ میں ما مصدریہ ہے یعنی بحفظ الله لهن۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ما بمعنی الذی ہو اور حفظ میں عائد ضمیر منصوب ہوگی۔ اور ابوجعفر کی قرأت میں بما حفظ الله (2) اسم جلالت نصب کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا: رفع زیادہ واضح ہے یعنی حافظات لمغیب ازواجهن بحفظ الله و معونته و تسدیده وہ اپنے خاوندوں کی غیر حاضری کے وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت، معونت اور درستگی کے ساتھ حفاظت کرنے والی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: بما حفظهن الله فی مهورهن وعشرتهن، یعنی اللہ ان کی حفاظت کرتا ہے ان کے مہور میں اور معاشرت میں۔ بعض علماء نے اس کا معنی یہ کیا ہے: بما استحفظهن الله ایاه من اداء الامانات الی ازواجهن۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے خاوندوں تک ان کی امانات کی ادائیگی کے لیے ان عورتوں کی حفاظت کی اور نصب کی قرأت کا معنی یہ ہے: بحفظهن الله۔ یعنی انہوں نے اللہ کے امر اور دین کی حفاظت کرنے کی وجہ سے۔ بعض نے یہ تقدیر بیان کی بما حفظن الله پھر فعل واحد ذکر کیا گیا جس طرح کہا گیا ہے: فان الحوادث أودى بها۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے بحفظِ الله جیسے حفظتُ الله۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ، الّٰتِیْ، التی کی جمع ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تَخَافُوْنَ کا معنی علم اور یقین ہے۔ بعض نے فرمایا: اپنے معنی خوف پر ہے۔ النشوز کا معنی نافرمانی ہے۔ یہ النشز سے ماخوذ ہے۔ النشز زمین کی بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نشز الرجل ینشز جب کوئی بیٹھا ہو پھر سیدھا کھڑا ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ: 11) یعنی اٹھو اور جنگ کی طرف یا اللہ کے امور میں سے کسی امر کی طرف اٹھو۔ معنی یہ ہے کہ تمہیں ان کی نافرمانی کا خوف ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان پر خاوندوں کی اطاعت واجب کی تھی اس کے ادا نہ کرنے کا خوف ہو۔ ابو منصور اللغوی نے کہا: النشوز کا معنی ہے میاں، بیوی میں سے ہر ایک کا دوسرے کو ناپسند کرنا۔ کہا جاتا ہے: نشزت تنشز فهی ناشز (بغیر تاء کے) نشصت تنشص یہ معاشرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 423　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 47، دار الکتب العلمیہ بیروت

کے لیے برائی ہے۔ ابن فارس نے کہا: نشہت المرأۃ یعنی عورت نے اپنے خاوند پر سختی کی اور نشز بعلھا علیھا جب خاوند عورت کو مارے اور ظلم کرے۔ ابن درید نے کہا: نشزت المرأۃ و نشست و نشصت کا ایک معنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَعِظُوْهُنَّ** یعنی الله کی کتاب کے ساتھ انہیں نصیحت کرو یعنی انہیں خاوند کے ساتھ حسن صحبت اور حسن معاشرت میں سے جو ان پر الله نے واجب کیا ہے وہ انہیں یاد دلاؤ اور انہیں خاوند کا وہ بلند مرتبہ کا اعتراف کراؤ جو الله نے اسے ان پر عطا فرمایا ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو خاوند کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا'' اور فرمایا: ''عورت اپنے خاوند کو اپنے پاس آنے سے نہ روکے اگرچہ وہ پالان پر ہی ہو''۔ اور فرمایا: ''جو عورت اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑ کر رات گزارتی ہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں''۔ ایک روایت میں ہے ''حتیٰ کہ وہ واپس آجائے اور اپنا ہاتھ اپنے خاوند کے ہاتھ میں رکھ دے۔ اور ایسا کام کرے جو اس کی مثل ہو''۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** ابن مسعود اور نخعی وغیرہما نے فی المضجع پڑھا ہے گویا اسم جنس ہے جو جمع کا مفہوم دیتا ہے۔ الھجر فی المضاجع کا مطلب ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہم بستر ہو اور پیٹھ پھیر کر سوئے اور اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کرے۔ یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ اور مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے بستروں سے دور ہو جاؤ۔ اس کلام پر حذف مقدر ہوگا اور اس کی تائید **اهْجُرُوْهُنَّ** کا لفظ کرتا ہے جو الھجران سے مشتق ہے جس کا معنی دوری ہے۔ کہا جاتا ہے: ہجرہ اس سے دور ہو جا اور اس سے علیحدہ ہو جا اور دور ہونا ممکن نہیں مگر ان کا بستر چھوڑنے کے ساتھ۔ یہ معنی ابراہیم نخعی، شعبی، قتادہ اور حسن بصری نے بیان کیا ہے۔ اور یہی معنی ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن عربی نے اس کو پسند کیا ہے۔ ان علماء نے امر کو اکثر اور مکمل معنی پر محمول کیا یہ اس طرح ہوگا جیسے تو کہتا ہے: اھجرہ فی الله۔ الله کے لیے اس کو چھوڑ دے۔ یہ امام مالک کی اصل ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول عمدہ ہے۔ خاوند جب اس کے بستر سے اعراض کرے گا پھر اگر عورت کو خاوند سے محبت ہوگی تو اس پر یہ چیز شاق ہوگی اور وہ اصلاح کی طرف لوٹ آئے گی اگر وہ بغض رکھنے والی ہوگی تو اس سے نافرمانی ظاہر ہوگی پھر ظاہر ہوگا کہ نشوز (نافرمانی) اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **اهْجُرُوْهُنَّ** یہ الھجر سے مشتق ہے اور اس سے مراد قبیح کلام ہے یعنی کلام میں ان سے سختی کرو اور جماع وغیرہ کے لیے ان سے ہم بستر ہو۔ یہ معنی سفیان نے بتایا فرمایا: یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کو ان کے گھروں میں پابند کردو۔ یہ ان کے قول **ھجر البعیر** سے مشتق ہے یعنی رسی کے ساتھ اونٹ کو باندھ دیا۔ الھجار اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اونٹ کو باندھا جاتا ہے۔ یہ طبری کا مختار مذہب ہے اور انہوں نے تمام کلام پر جرح کی ہے اور ان کے کلام میں اس جگہ نظر (اعتراض کی گنجائش) ہے۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے ''احکام'' میں ان کا رد کیا ہے اور کہا ہائے قرآن وسنت کے عالم کی لغزش! اور اس مفہوم پر جس حدیث نے انہیں ابھارا وہ غریب حدیث ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق، حضرت زبیر بن عوام کی بیوی تھی

وہ باہر نکلتی تھی حتیٰ کہ انہیں عتاب کیا گیا فرمایا: حضرت زبیر بن عوام نے اسے اور اس کی سوکن کو عتاب کیا پھر ایک کے بال دوسری کے بالوں کے ساتھ باندھ دیئے پھر انہیں سخت سزا دی سوکن بہت زیادہ بچنے والی تھی اور اسماء زیادہ بچنے والی نہ تھی پس اسے ضربیں بھی زیادہ لگیں۔ حضرت اسماء نے اپنے باپ حضرت ابوبکر سے شکایت کی، حضرت ابوبکر نے اسے کہا: اے بیٹی! صبر کر زبیر صالح آدمی ہے شاید تیرا خاوند جنت میں ہوگا، اور مجھے خبر پہنچی ہے کہ جب مرد بیوی سے ابتکار کرتا ہے تو جنت میں اس سے نکاح کرے گا۔ پس **اهْجُرُوْهُنَّ** کا ان علماء نے ربط اور عقد (باندھنا) معنی لیا کیونکہ لفظ میں احتمال تھا اور ساتھ ساتھ حضرت زبیر کا فعل تھا تو اس نے یہ تفسیر بیان کر دی۔ اور ان کے بستر کو چھوڑنے کا زیادہ سے زیادہ عرصہ علماء کے نزدیک ایک مہینہ ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ سے راز کی بات کی تھی تو انہوں نے حضرت عائشہ کو بتا دی تھی اور انہوں نے اس پر ایکا کر لیا تھا اور ان چار مہینوں تک یہ چھوڑنا نہ پہنچے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایلاء کی مدت بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاضْرِبُوْهُنَّ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مرد عورت کی اصلاح کے لیے پہلے انہیں وعظ و نصیحت کرے، پھر اس کے بستر سے جدا ہو جائے پھر اگر یہ دونوں صورتیں کارگر نہ ہوں تو پھر مارنا ہے، کیونکہ یہ چیز اس کے لیے اس کی اصلاح کرے گی اور اسے اس کا حق پورا کرنے پر ابھارے گی اور اس آیت میں مارنے سے مراد اس طرح مارنا ہے کہ وہ زخمی نہ کر دے اور وہ اس کی ہڈی نہ توڑ دے اور نہ زخم سے اس کو عیب لگا دے جیسے مکا مارنا وغیرہ، کیونکہ اس سے مقصود اصلاح ہے (نہ کہ اسے زخمی کرنا ہے) پس جب وہ اسے اتنی سزا دے گا کہ اسے ہلاک کر دے تو اس پر ضمانت واجب ہوگی۔ اور اسی طرح بچے کو تعلیم دینے اور ادب سکھانے میں سزا کا حکم ہے۔ صحیح مسلم میں ہے: ''عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امانت سے تم نے انہیں حاصل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے ساتھ ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے بستر پر کسی کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو اگر وہ ایسا کریں تو انہیں سزا دو مگر ایسی نہیں جو زخمی کر دے'' (1)۔ امام مسلم نے حضرت جابر کی طویل حدیث کتاب الحج میں ذکر کی ہے یعنی وہ تمہارے گھروں میں ایسے رشتہ داروں اور اجنبی عورتوں کو داخل نہ کریں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اسی مفہوم پر اس روایت کو محمول کیا جائے گا جو امام ترمذی نے عمرو بن الاحوص سے روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ وہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر وعظ و نصیحت فرمائی پھر فرمایا: ''عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت حاصل کرو، کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں اس کے علاوہ تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو مگر یہ کہ وہ واضح برائی کا ارتکاب کریں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کے بستروں سے جدا ہو جاؤ اور انہیں مارو مگر ایسی مار جو زخمی نہ کر دے۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پھر انہیں اذیت دینے کی راہ تلاش نہ کرو۔ خبردار تمہارے لیے تمہاری عورتوں پر حقوق ہیں اور تمہارے عورتوں کے لیے تم پر حقوق ہیں، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے گھروں میں ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور انہیں تمہارے گھروں میں

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 397

اجازت نہ دیں جنہیں تم اچھا نہیں سمجھتے۔ خبردار ان کا حق تم پر یہ ہے کہ لباس اور طعام کے سلسلہ میں تم ان سے حسن سلوک کرو"(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور **بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ** کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو گھر میں داخل نہ کریں جن کو ان کے خاوند ناپسند کرتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اس سے مراد زنا نہیں ہے، کیونکہ زنا تو حرام ہے اور اس پر حد لازم ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کو مارو جب وہ کسی نیکی میں تمہاری نافرمانی کریں لیکن وہ مار زخمی کرنے والی نہ ہو"۔ عطا نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: نہ زخمی کرنے والی سزا کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: مسواک وغیرہ سے مارنا(2)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اپنی بیوی کو مارا تو انہیں اس سے منع کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مرد جو اپنی بیوی کو سزا دیتا ہے اس کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ** یعنی وہ نافرمانی چھوڑ دیں۔ **فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا** یعنی قول یا فعل کے ساتھ ان پر زیادتی نہ کرو۔ یہ ان پر ظلم کرنے سے نہی ہے اس کے بعد کہ ان پر مردوں کی فضیلت کو ثابت فرمایا اور ان کو ادب سکھانے کی قدرت عطا فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تم انہیں اپنے ساتھ محبت کرنے کی تکلیف نہ دو، کیونکہ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا** یہ خاوندوں کو اشارہ ہے کہ نرمی اختیار کریں اور تواضع کا مظاہرہ کریں یعنی اگر تم عورتوں پر قادر ہو تو تم اللہ کی قدرت کو یاد کرو، اس کا دست قدرت، ہر ہاتھ سے بلند ہے پس کوئی شخص اپنی بیوی پر بلندی نہ چاہے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ تاڑ رہا ہے یہاں علو اور کبر کی صفات کا ذکر کرنا بہتر ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی چیز کو مارنے کا صراحۃً حکم نہیں دیا سوائے اس مقام کے اور حدود میں۔ تو معلوم ہوا کہ ان کے خاوند کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ کام ان کے خاوندوں کے سپرد ہے ائمہ کے سپرد نہیں ہے۔ یہ خاوندوں کے لیے روا رکھا جب کہ قاضیوں کے بغیر گواہوں اور دلائل کے کسی کو سزا دینا جائز نہیں۔ خاوند اللہ کی طرف سے عورتوں کے امین بنائے گئے ہیں۔ مہلب نے کہا: عورتوں کو مارنا جائز ہے جب وہ اپنے خاوندوں کو مباشرت سے منع کریں اور خدمت نہ کرنے کی صورت میں سزا دینے میں اختلاف ہے۔ قیاس اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے کہ جب مباشرت کے منع کرنے پر سزا دینا جائز ہے تو معروف طریقہ پر خاوند کی ایسی خدمت نہ کرنے پر بھی سزا دینا جائز ہو، جو خدمت عورت پر مرد کے لیے واجب تھی۔ ابن خویز منداد نے کہا: نافرمانی، نفقہ اور تمام حقوق زوجیت کو ساقط کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے خاوند کو تادیبی کارروائی کرنا جائز ہے جب کہ وہ سزا اسے زخمی کرنے والی نہ ہو اور اسے وعظ ونصیحت ہو اور اس کے بستر کو ترک کر دے حتیٰ کہ وہ نافرمانی سے باز آ جائے۔ جب وہ لوٹ آئے گی تو اس کے حقوق بھی لوٹ آئیں گے۔ اسی طرح ادب جس سزا کا تقاضا کرتا ہے خاوند کے لیے ایسی سزا دینا جائز ہے اور ارفع اور ادنیٰ ادب میں حالت مختلف ہوتی ہے۔ رفیع ادب کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 139 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 48، دار الکتب العلمیہ بیروت

لیے جدائی ہے اور ادنیٰ ادب کے لیے کوڑا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جس نے اپنا کوڑا لٹکائے رکھا اور اپنے گھر والوں کو ادب سکھایا'' اور فرمایا: ''ابوجہم اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے اتارتا ہی نہیں'' (1)۔ بشار نے کہا:

الحرُّ یُلحَی والعصا للعبدِ آزاد آدمی کو صرف ملامت کی جاتی ہے اور غلام کے لیے چھڑی ہے۔

ابن درید نے کہا:

واللَّوْمُ للحرّ مُقیمٌ رادِعٌ والعبد لا یَرْدَعُه الا العَصَا

آزاد آدمی کو ملامت ہی روکنے والی ہوتی ہے جب کہ غلام کو صرف ڈنڈا ہی باز رکھتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اہل علم کا عورت کے اخراجات کا خاوندوں پر واجب ہونے پر اتفاق ہے جب کہ وہ بالغ ہوں مگر عورتوں میں سے جو نافرمان اور اپنے نفس سے روکنے والی ہو اس کا نفقہ واجب نہیں۔ ابوعمر نے کہا: جو عورت دخول کے بعد اپنے خاوند کی نافرمان ہو تو اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا مگر یہ کہ وہ حاملہ ہو۔ ابن القاسم نے نافرمان کے نفقہ میں فقہاء کی جماعت کی مخالفت کی ہے انہوں نے نافرمان کا نفقہ بھی واجب کیا ہے جب نافرمان اپنے خاوند کی طرف لوٹ آئے تو پھر مستقبل کا نفقہ واجب ہوگا اور نافرمانی کے علاوہ کسی صورت میں عورت کا نفقہ خاوند سے ساقط نہ ہوگا نہ مرض سے، نہ حیض سے، نہ نفاس سے، نہ روزے سے، نہ حج سے، نہ اس کے خاوند کے غائب ہونے سے اور نہ کسی حق یا ظلم کی وجہ سے خاوند کے قیدی ہونے سے سوائے اسی صورت کے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۝۳۵

''اور اگر خوف کرو تم ناچاقی کا ان کے درمیان تو مقرر کرو ایک پنچ مرد کے کنبہ سے اور ایک پنچ عورت کے کنبہ سے اگر وہ دونوں (پنچ) ارادہ کریں گے صلح کرانے کا موافقت پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اہر بات سے خبردار ہے''۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا، الشقاق کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ گویا میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنی اپنی طرف لیتا ہے۔ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا مصدر کو ظرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسا کہ تیرا قول یعجبنی سیر اللیلۃ المقمرۃ۔ صوم یوم عرفۃ اور قرآن حکیم میں ہے: بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ (سبا:33) بعض علماء نے فرمایا: بین اسماء کے قائم مقام ہے اور اس سے ظرفیت زائل کی گئی ہے، کیونکہ بینھما حالھما و عشرتھما کے معنی میں ہے یعنی اگر خوف کرو تم ان کی عشرت اور صحبت کا فابعثوا تو مقرر کرو۔ و خفتم گزشتہ اختلاف پر ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حکم یہ ہے کہ پہلے خاوند اسے نصیحت کرے اگر اس کو قبول کرے تو فبہا ورنہ اس کا بستر چھوڑ دے، اگر وہ ایسی صورت میں اطاعت

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 74

کرے تو فبہا ورنہ خاوند اسے مارے، اگر وہ ایسی صورت میں قبول کرے تو فبہا ورنہ حاکم وقت ایک پنچ مرد کی طرف سے اور ایک پنچ عورت کی طرف سے مقرر کرے وہ دونوں ان کے ضرر کو دیکھیں اگر صلح کی کوئی صورت نہ ہو تو خلع ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: خاوند کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے وعظ و نصیحت سے پہلے بھی سزا دے۔ لیکن آیت میں جو ترتیب ہے وہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور علماء نے کہا: وَاِنْ خِفْتُمْ کا مخاطب حکام اور امراء ہیں اور اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا سے مراد حکمین یعنی پنچ ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہما کا قول ہے یعنی اگر پنچ اصلاح کا ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرمادے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: مخاطب میاں، بیوی ہیں یعنی اگر میاں بیوی اصلاح کا ارادہ کریں جو کچھ انہوں نے پنچوں کو بتایا اس میں سچ بولیں تو اللہ تعالیٰ ان میں مصالحت کی صورت پیدا فرمادے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب اولیاء کو ہے یعنی تم میاں بیوی کے درمیان اختلاف جان لو تو پھر مرد کی طرف سے ایک پنچ اور عورت کی طرف سے ایک پنچ مقرر کرو اور وہ پنچ مرد اور عورت کی طرف سے ہوں، کیونکہ وہ دونوں میاں بیوی کے احوال بگاڑ کی طرف جانے سے روکیں گے اور وہ دونوں عادل ہوں حسن بصیرت اور حسن نظر کے حامل ہوں اگر ان کے اہل میں سے ایسے دو شخص نہ ہوں تو پھر کوئی اور دو شخص جو عادل اور عالم ہوں یہ اس وقت ہے جب معاملہ سمجھنا مشکل ہو جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ زیادتی کس کی طرف سے ہے۔ اگر ظالم کا علم ہو جائے تو دوسرے کے لیے اس کا حق لیا جائے گا اور ضرر کو دور کرنے کے لیے ظالم کو مجبور کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے: خاوند کی طرف کا پنچ خاوند سے علیحدگی میں پوچھے کہ تم مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ کیا تم اس سے محبت کرتے ہو یا نہیں تا کہ میں تیری مراد جان لوں؟ اگر وہ کہے کہ مجھے اس عورت کی کوئی ضرورت نہیں میرے لیے اس سے وہ لے لو جس کی تو طاقت رکھتا ہے اور میرے اور اس کے درمیان تفریق کر دو، پس معلوم ہو جائے گا کہ مرد کی طرف سے زیادتی ہے اور اگر وہ کہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میرے مال سے اس کو خوش کرو جو تو چاہتا ہے اور میرے اور اس کے درمیان تفریق نہ کرو، پس معلوم ہو جائے گا کہ مرد زیادتی کرنے والا نہیں۔ اور عورت کی طرف والا حکم عورت سے علیحدگی میں پوچھے اسے کہے: کیا تو اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ میرے اور اس کے درمیان تفریق کر دو اور جو وہ ارادہ کرتا ہے میرے سے اسے دے دو۔ معلوم ہو جائے گا کہ زیادتی عورت کی طرف سے ہے۔ اگر وہ کہے کہ ہمارے درمیان تفریق نہ کرو بلکہ اسے اس بات پر ابھارو کہ وہ میرے خرچ میں اضافہ کرے اور میرے ساتھ حسن سلوک کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ زیادتی عورت کی طرف سے نہیں ہے۔ اگر دونوں پنچوں کے لیے ظاہر ہو جائے کہ زیادتی مرد کی طرف سے تھی تو دونوں پنچ اسے نصیحت کریں، اسے زجر و توبیخ کریں اور انہیں زیادتی سے منع کریں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَابْعَثُوْا حَكَمًا الایہ سے یہی مراد ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے فرمایا: اس آیت نے عورتوں کی عقلی تقسیم کی، کیونکہ وہ یا تو اطاعت شعار ہوتی ہیں یا نافرمان ہوتی ہیں۔ پھر نافرمانی اور زیادتی اطاعت شعار کی طرف لوٹے گی یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ نسائی نے روایت کیا ہے کہ عقیل بن ابی طالب نے فاطمہ بنت عتبۃ بن ربیعہ سے نکاح کیا جب عقیل اپنی بیوی

کے پاس گیا تو وہ کہنے لگی: اے بنی ہاشم! اللہ کی قسم میرا دل تم سے محبت نہیں کرتا وہ لوگ کہاں جن کی گردنیں چاندی کے لوٹے کی طرح ہیں! جن کے ناک، ان کے ہونٹوں کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ عتبہ بن ربیعہ کہاں، ابن شیبہ بن ربیعہ کہاں۔ عقیل یہ سب کچھ سن کر خاموش رہے حتیٰ کہ وہ ایک دن اس کے پاس گئے جب کہ وہ پریشان و تنگ دل تھا۔ فاطمہ نے کہا: کہاں ہے عتبہ بن ربیعہ؟ عقیل نے کہا: تیری بائیں جانب آگ میں، جب تو داخل ہوگی۔ فاطمہ نے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور حضرت عثمان کے پاس آئی اور ان کے سامنے یہ سب ذکر کیا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ کو بلایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں ان کے درمیان تفریق کروں گا۔ حضرت معاویہ نے کہا: میں بنی عبد مناف کے دو شیخوں کے درمیان تفریق نہیں کروں گا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ ان دونوں (میاں بیوی) کے پاس آئے تو انہوں نے انہیں پایا کہ انہوں نے اپنے اوپر دروازہ بند کیا ہوا ہے اور دونوں اپنے معاملہ میں صلح کر چکے ہیں۔ اگر پنچ میاں بیوی کو اختلاف پر پائیں اور صلح نہ کریں اور ان کا معاملہ ناہموار ہو تو پہلے وہ ان دونوں میں محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات یاد دلائیں اور ایک دوسرے سے تعاون پر برانگیختہ کریں اگر وہ واپس آ جائیں اور رجوع کر لیں تو انہیں چھوڑ دیں اگر دوسری صورت ہو اور دونوں پنچ جدائی کی رائے قائم کریں تو ان کے درمیان جدائی کر دیں اور ان پنچوں کو جدائی کرنا میاں بیوی پر جائز ہے، خواہ شہر کے قاضی کا حکم اس فیصلہ کے موافق ہو یا مخالف ہو۔ میاں بیوی نے یہ معاملہ ان کے سپرد کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اور ان کے درمیان طلاق واقع نہ ہوگی جب تک کہ وہ دونوں انہیں اپنے پنچ نہ بنائیں اور وہ دونوں ان کے حالات سے امام وقت کو آگاہ نہ کریں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ دونوں رسول پیغام رساں اور گواہ ہیں۔ پھر امام اگر ارادہ کرے تو ان میں تفریق کرے اور تفریق کا حکم دے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور یہی ابوثور کا قول ہے اور صحیح پہلا قول ہے۔ پنچوں کے لیے طلاق دینا ہے نہ وکالت کرنا ہے۔ یہ امام مالک، اوزاعی اور اسحاق کا قول ہے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس سے اور شعبی اور نخعی سے مروی ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص ہے کہ وہ دونوں پنچ قاضی ہیں، وکیل نہیں ہیں اور گواہ ہیں۔ وکیل کے لیے شریعت میں ایک نام اور معنی ہے اور شریعت میں پنچ کے لیے علیحدہ اسم اور معنی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو بیان فرمایا تو شاذ کے لیے مناسب نہیں تو پھر عالم کے لیے کیسے ہوگا کہ ایک کے معنی کو دوسرے پر جوڑے۔ دارقطنی نے محمد بن سیرین کی حدیث سے، عبیدہ سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے، وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا۔ فرمایا: ایک شخص اور ایک عورت حضرت علی کے پاس آئے ہر ایک کے ساتھ لوگوں کا ایک گروہ تھا، حضرت علی نے انہیں حکم دیا کہ ایک مرد کی طرف پنچ اور ایک عورت کی طرف سے پنچ مقرر کرو۔ پھر آپ نے ان پنچوں سے فرمایا: تم جانتے ہو تم پر کیا لازم ہے؟ تم پر یہ ہے کہ اگر تم ان کی جدائی کا نظریہ رکھو تو انہیں جدا کر دو۔ عورت نے کہا: میں اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر راضی ہوں جو مجھ پر مرد کے لیے لازم ہوتا ہے اور جو میرا حق بنتا ہے۔ خاوند نے کہا میں جدائی نہیں چاہتا۔ حضرت علی نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا ہے اللہ کی قسم! تو اس جگہ سے نہیں جائے گا حتیٰ کہ تو بھی اس عورت کی طرح اقرار کر لے۔ یہ سند صحیح ہے اور

ثابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کئی وجوہ سے ابن سیرین عن عبیدہ کے سلسلہ سے ثابت ہے۔ یہ ابو عمر کا قول ہے اگر یہ دونوں وکیل اور گواہ ہوتے تو حضرت علی انہیں یہ نہ کہتے کہ کیا تم جانتے ہو تم پر کیا واجب ہے؟ آپ فرماتے: کیا تم جانتے ہو جس کا تمہیں وکیل بنایا گیا ہے؟ یہ واضح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے حجت پکڑی ہے جو آپ نے خاوند سے کہا تھا: ''تو اپنی جگہ سے نہیں جائے گا حتیٰ کہ تو راضی ہو جائے گا جس سے وہ راضی ہوئی''۔ پس یہ دلیل ہے کہ حضرت علی کا مذہب یہ ہے کہ وہ پنچ جدائی نہیں کریں گے مگر خاوند کی رضا سے۔ امام ابو حنیفہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے یا مرد جس کے سپرد یہ اختیار کر دے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے اس کو اس باب سے شمار کیا ہے کہ سلطان، غلام اور عنین کی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر دونوں پنچ مختلف ہو جائیں تو ان کا قول نافذ نہ ہوگا اور اس سے کچھ لازم نہ ہوگا مگر یہ کہ جس معاملہ پر دونوں پنچ متفق ہو جائیں۔ اسی طرح ہر پنچ کسی ایک معاملہ میں فیصلہ کرے، اگر ایک فرقت کا فیصلہ کرے اور دوسرا یہ فیصلہ نہ کرے یا ایک مال کا فیصلہ کرے اور دوسرا اس کا انکار کرے، کچھ بھی نہ ہوگا حتیٰ کہ دونوں متفق ہو جائیں۔ امام مالک نے پنچوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ تین طلاقیں دے دیں تو ایک لازم ہوگی اور ان دونوں کے لیے جدائی ایک طلاق بائنہ سے زیادہ کے ساتھ نہ ہوگی۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: تینوں طلاقیں بھی واقع ہو جائیں گی اگر دونوں پنچ ان پر جمع ہو جائیں۔ یہ مغیرہ، اشہب، ابن الماجشون اور اصبغ کا قول ہے۔ ابن المواز نے کہا: اگر ایک پنچ ایک طلاق کا فیصلہ کرے اور دوسرا تین طلاق کا فیصلہ کرے تو ایک ہوگی۔ ابن حبیب نے اصبغ سے حکایت کیا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ایک شخص کو میاں، بیوی کی طرف بھیجنا بھی جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زنا میں چار گواہوں کا فیصلہ کیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زانیہ عورت کی طرف انیس کو اکیلا بھیجا تھا اور اسے فرمایا کہ اگر وہ عورت زنا کا اعتراف کرے تو اسے سنگسار کر دو۔ عبد الملک نے ''المدونۃ'' میں اسی طرح کہا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: جب ایک آدمی کو بھیجنا جائز ہے تو پھر میاں، بیوی ایک پنچ مقرر کر لیں تو جائز ہوگا یہ جواز کے اعتبار سے اولیٰ ہے جب دونوں اس پر راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم بھیجنے کا حکم، حکام کو دیا ہے نہ کہ میاں، بیوی کو دیا ہے۔ اگر میاں بیوی دو پنچ مقرر کریں اور وہ کوئی فیصلہ کریں تو ان کا فیصلہ نافذ ہوگا، کیونکہ ہمارے نزدیک تحکیم جائز ہے اور پنچ کا فیصلہ ہر مسئلہ میں نافذ ہوگا جب ہر پنچ عادل ہو۔ اگر عادل نہ ہو تو عبد الملک نے کہا: اس کا فیصلہ ٹوٹ جائے گا، کیونکہ انہیں دھوکے کا خطرہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، کیونکہ وہ وکیل بنایا گیا تھا اور وکیل کا فعل نافذ ہوتا ہے۔ اگر وہ حکم بنایا گیا تھا تو انہوں نے خود اسے اپنے نفسوں پر مقدم کیا اور دھوکا اس میں موثر نہیں جس طرح توکیل کے باب میں موثر نہیں۔ قضا کا باب تمام دھوکے پر مبنی ہے اس میں محکوم علیہ کا اس کو جاننا لازم نہیں جس کی وجہ سے فیصلہ اس کی طرف لوٹا ہے(2)۔ ابن عربی نے کہا پنچوں کا مسئلہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نص ہے اور میاں بیوی کے درمیان ناچاقی اور اختلاف کے ظہور کے وقت پنچ کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 427 2۔ ایضاً

فیصلہ ہوگا یہ ایک عظیم مسئلہ ہے۔ اس کی اصل پر امت کا اجماع ہے کہ حکم مقرر کیے جائیں گے اگر چہ اس پر جو مسائل مرتب ہوتے ہیں ان کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ ہمارے شہر کے اہل علم پر تعجب ہے جو کتاب وسنت کے حکم سے غافل رہے اور انہوں نے کہا: ان دونوں کو ایک امین شخص کے سپرد کیا جائے گا اس قول میں نص کی مخالفت ہے جو تم پر مخفی نہیں ہے، نہ تو انہوں نے کتاب اللہ کے مطابق حکم دیا اور نہ قیاس سے یہ جسارت کی، میں نے اس کو حقیقت کی طرف بلایا تو اس نے مجھے ناچاقی کے وقت دو پنچوں کو بھیجنے کا جواب نہ دیا۔ مگر ایک قاضی کی طرف بھیجنے کو کہا اور نہ ایک گواہ کے ساتھ قسم کے ذریعے فیصلہ کرنے کو تسلیم کیا مگر دوسرے گواہ کی موجودگی ضروری قرار دی جب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس امر پر قدرت دی تو میں نے سنت کو اس طرح جاری کیا جس طرح مناسب تھا۔ ہمارے علاقہ کے علماء پر تعجب نہ کرو، کیونکہ انہیں جہالت نے گھیر رکھا ہے لیکن امام ابوحنیفہ پر تعجب ہے جن کے پاس دو پنچوں کے بارے کوئی خبر نہیں بلکہ اس سے دو گنا تعجب امام شافعی پر ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: وہ چیز جو ظاہر آیت کے مشابہ ہے وہ یہ ہے جس میں دونوں میاں، بیوی برابر ہوں حتیٰ کہ اس میں دونوں کے حالات مشابہ ہوں۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے کہ میں نے پایا کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کی زیادتی کی صورت میں صلح کی اجازت دی اور حدود الٰہیہ کو قائم نہ کرنے کی صورت میں خلع کی اجازت دی اور یہ عورت کی رضا کے مطابق ہونے کے مشابہ ہے اور منع فرمایا کہ مرد نے جو کچھ عورت کو دیا تھا اس میں سے واپس لے جب خاوند اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ جب میاں بیوی کی ناچاقی کی صورت میں دو پنچوں کو مقرر کرنے کا حکم دیا تو یہ دلیل ہے کہ ان کا فیصلہ میاں کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہوگا تو ایک پنچ خاوند کی طرف سے اور ایک پنچ عورت کی طرف سے مقرر کیا جائے گا اور دونوں پنچ میاں بیوی کی رضا پر متعین ہوں گے اور ان کے سپرد ہوگا ان کا جمع کرنا اور ان میں جدائی کرنا، جب وہ جدائی کو ہی بہتر دیکھیں یہ دلیل ہے کہ دونوں پنچ میاں بیوی کے وکیل ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ امام شافعی کے کلام کی انتہا ہے اور ان کے اصحاب اس پر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی چیز قابل التفات نہیں ہے اور نہ اس کا نصاب علم میں بہتر ہے۔ قاضی ابو اسحاق نے ان کا رد کیا ہے لیکن اکثر کلام میں انہوں نے انصاف نہیں کیا۔ رہا امام شافعی کا قول کہ "ظاہر آیت جس کے مشابہ ہے وہ یہ ہے کہ میاں بیوی برابر ہیں" حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ واضح طور پر قرآن حکیم میں ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ اور جس کو اپنی بیوی سے زیادتی کا اندیشہ ہو تو وہ اسے وعظ کرے اگر وہ اطاعت کی طرف لوٹ آئے تو فبہا ورنہ اس کے بستر سے علیحدہ ہو جائے اگر وہ مان جائے تو فبہا ورنہ اسے سزا دے اگر پھر بھی عورت اپنی زیادتی پر قائم رہے تو دو پنچ ان کی طرف جائیں۔ یہ اس صورت میں ہے اگر نص نہ ہو اور قرآن میں بیان نہ ہو اور اس کو چھوڑ دے جو نص نہ ہو۔ وہ ظاہر ہوگا۔ رہا امام شافعی کا قول کہ "ظاہر کے مشابہ ہے" ہم نہیں جانتے کہ ظاہر کے مشابہ کیا ہے پھر امام شافعی نے کہا: جب انہیں حدود الٰہیہ کو قائم نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو خلع کا حکم فرمایا۔ یہ عورت کی رضا کے مشابہ ہے بلکہ ایسا ہونا واجب ہے۔ یہی اس حکم کی نص ہے۔ پھر فرمایا: جب دو پنچوں کا حکم دیا تو ہم نے جان لیا کہ پنچوں کا حکم خاوندوں کے حکم کے علاوہ ہے اور واجب ہے کہ وہ اس کا غیر ہو اس طرح کہ ان پر ان کا حکم بغیر اختیار کے نافذ ہو۔ پس غیریت متحقق ہوگی اور جب وہ ان پر وہ نافذ کریں جن کا میاں بیوی نے انہیں وکیل بنایا

تھا تو وہ میاں، بیوی کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ نہ کریں تو غیریت متحقق نہ ہوئی۔ رہا امام شافعی کا یہ قول کہ ''میاں بیوی کی رضا اور ان کی توکیل کے ساتھ''۔ یہ واضح خطا ہے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے علاوہ کو خطاب فرمایا ہے جب میاں بیوی کے درمیان پنچوں کو بھیجنے کے ساتھ بھی ناچاقی کا اندیشہ ہو اور جب مخاطب ان دونوں کے علاوہ ہوں تو یہ ان کی توکیل سے کیسے ہوگا؟ اور ان دونوں کے لیے حکم صحیح نہ ہوگا مگر جس پر دونوں پنچ جمع ہو جائیں (1)۔ یہ انصاف کی صورت ہے اور رد کی تحقیق ہے۔ آیت میں تحکیم کے اثبات پر دلیل ہے، اس طرح نہیں جس طرح خوارج کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے تحکیم نہیں ہے۔ یہ کلمہ حق ہے مگر وہ اس سے باطل مراد لیتے ہیں۔

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۟ۙ

''اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی کو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو نیز رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پڑوسی جو رشتہ دار ہے اور پڑوسی جو رشتہ دار نہیں اور ہم مجلس اور مسافر اور جو (لونڈی، غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں (ان سب سے حسن سلوک کرو) بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو''۔

اس آیت میں اٹھارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت محکم ہے اس میں سے کوئی چیز منسوخ نہیں ہے، یہ تمام کتب میں اسی طرح ہے اگر یہ اس طرح نہ بھی ہوتی تو یہ عقل کی جہت سے معلوم ہو جاتی، اگر اس کے ساتھ کتاب نازل نہ بھی ہوتی۔ عبودیت کا معنی تذلل اور افتقار پہلے گزر چکا ہے اور یہ فقط اس ذات کے لیے ہے جس کے لیے حکم اور اختیار ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے لیے عبادت کرنے اور عبادت میں اخلاص کا حکم دیا ہے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے لیے خالص اعمال کرنے اور اعمال کا ریا کاری سے پاک ہونے کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا** (الکہف) حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: جس نے ٹھنڈک کی خاطر طہارت کی یا معدہ کی اصلاح کے لیے روزہ رکھا اور ساتھ ساتھ تقرب کی بھی نیت کی تو یہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ تقرب کی نیت میں اس نے دنیوی نیت کو ملا دیا اور اللہ کے لیے صرف وہ عمل ہوتا ہے جو خالص ہو جیسا کہ اللہ نے فرمایا: **اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ** (الزمر:3) (خبردار! صرف اللہ کے لیے ہے دین خالص) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (البینہ:5) (حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے) اسی طرح جب کوئی امام رکوع میں ہو اور کسی کی آمد محسوس کرے تو اس کا انتظار نہ کرے کیونکہ رکوع میں اس کا انتظار اس کے رکوع کو خالص اللہ کے لیے ہونے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 422

سے نکال دے گا۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول الله ﷺ نے فرمایا: الله تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: میں شرکاء کے شرک سے غنی ہوں، جس نے ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا تو میں نے اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیا ہے(1)۔ دار قطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا فرمایا کہ رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز صحیفوں کو لایا جائے گا جن پر مہر لگائی گئی ہوگی پھر انہیں الله تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا، الله تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کو پھینک دو اور اس کو قبول کرلو۔ فرشتے عرض کریں گے: تیری عزت کی قسم! ہم نے نہیں دیکھا مگر خیر کو۔ الله تعالیٰ فرمائے گا۔ حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے۔ یہ میرے غیر کے لیے تھا آج میں قبول نہیں کروں گا مگر صرف وہی عمل جو میری رضا کے لیے کیا گیا ہوگا'' (2)۔ ضحاک بن قیس فہری سے مروی ہے فرمایا: رسول الله ﷺ نے فرمایا: الله تعالیٰ فرماتا ہے: میں شریک سے بہتر ہوں جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ میرے شریک کے لیے ہے۔ اے لوگو! خالص الله تعالیٰ کے لیے اعمال کرو کیونکہ الله تعالیٰ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خاص اس کے لیے ہو اور یہ نہ کہو: یہ الله کے لیے ہے اور رحم کے لیے ہے۔ وہ عمل رحم کے لیے ہے الله کے لیے اس میں سے کچھ نہیں ہے۔ یہ نہ کہو کہ یہ الله کے لیے ہے، یہ تمہارے لیے ہے، یہ تمہارے لیے ہے اس میں سے الله کے لیے کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ:** جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لو کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں: شرک کے تین مراتب ہوتے ہیں اور تمام حرام ہیں۔ شرک کی اصل یہ ہے کہ الوہیت میں الله تعالیٰ کے شریک کا اعتقاد رکھنا۔ یہ شرک اعظم ہے اور یہ جاہلیت کا شرک ہے الله تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ سے یہی مراد ہے اور پھر اس سے متصل فعل میں الله تعالیٰ کے شریک کا اعتقاد رکھنا ہے۔ یہ اس کا قول ہے جو کہتے ہیں: الله تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا موجود ہے جو فعل کے کرنے اور ایجاد میں مستقل ہے اگرچہ وہ اس کے الٰہ ہونے کا اعتقاد نہ بھی رکھتا ہو جیسے قدریہ فرقہ جو اس امت کے مجوسی ہیں۔ حضرت ابن عمر نے ان سے براءت کا اظہار کیا جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے۔ اور پھر اس سے متصل شرک فی العبادۃ ہے اور یہ ریاکاری ہے۔ یعنی کوئی شخص ان عبادات میں سے کوئی عبادت غیر الله کے لیے کرے جن کا الله تعالیٰ نے اپنے لیے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی حرمت کے لیے آیات اور احادیث بیان کی گئی ہیں۔ یہ اعمال کو باطل کرنے والا ہے اور یہ مخفی ہے جس کو ہر جاہل کند ذہن نہیں پہچانتا۔ الله تعالیٰ محاسبی سے راضی ہو انہوں نے اپنی کتاب (الرعایۃ) میں اس کو اعمال کو فاسد کرنے والا بیان کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو سعید بن ابی فضالہ انصاری سے مروی ہے اور یہ صحابہ میں سے تھے فرمایا: رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''جب قیامت کے روز الله تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: جس نے کسی عمل میں الله تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرایا تھا وہ اپنا بدلہ اس غیر الله سے طلب کرے، کیونکہ الله تعالیٰ شرکاء کے شرک سے مستغنی ہے'' (3)۔ سنن ابوداؤد میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا: ہمارے پاس رسول الله

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، جلد 2، صفحہ 411 2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 51

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 320

صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ ہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس چیز کے متعلق نہ بتاؤں جو تم پر مسیح دجال سے بھی زیادہ خوفناک ہے؟ ہم نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور کرم فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شرک خفی یہ ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو اور اپنی نماز کو اس کے لیے مزین کرے جو اسے دیکھ رہا ہے'' (1)۔ حضرت شداد بن اوس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سب سے زیادہ خوف اپنی امت پر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے میں نہیں کہتا کہ وہ سورج کی پوجا کریں گے یا چاند کی پوجا کریں گے یا بت کی پوجا کریں گے، لیکن وہ غیر اللہ کے لیے اور خفیہ شہوت کے لیے اعمال کریں گے'' (2)۔ اس حدیث کو حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے۔ سورۃ الکہف کے آخر میں مزید بیان آئے گا۔ اس میں خفیہ شہوت کا بیان ہے۔ ابن لہیعہ نے یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہوت خفیہ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ''وہ شخص جو علم حاصل کرے جو پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس بیٹھا جائے''۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: ریا کی تین صورتیں ہیں (۱) جو اپنے فعل میں غیر اللہ کی نیت کرتا ہے اور اس سے ارادہ یہ کرتا ہے کہ یہ جانا جائے کہ یہ اللہ کے لیے ہے، یہ نفاق کی ایک قسم ہے اور ایمان میں تشکک ہے (۲) کسی عمل میں اللہ کے لیے داخل ہوتا ہے جب کوئی شخص اس پر مطلع ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ یہ جب توبہ کرے تو سابقہ تمام عمل کا اعادہ کرے۔ (۳) کسی عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہوا اور اس سے فارغ بھی اللہ کے لیے ہو پھر اس کا یہ عمل جانا گیا اور اس پر مدح کی گئی اور وہ لوگوں کی مدح پر خاموش رہا۔ یہ ریا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ سہل نے کہا: لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ریا یہ ہے کہ تو اپنے عمل کا ثواب دنیا میں طلب کرے، قوم کا عمل آخرت کے لیے تھا۔ لقمان سے پوچھا گیا: ریا کا علاج کیا ہے؟ لقمان نے کہا: عمل کا چھپانا۔ پھر پوچھا گیا: عمل کیسے چھپایا جائے گا؟ فرمایا: تو عمل کے ظاہر کرنے کا مکلف نہیں کیا گیا پس تو ہر عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہو اور جس کے اظہار کے ہم مکلف نہیں میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کے سوا کوئی مطلع نہ ہو۔ فرمایا: ہر وہ عمل جس پر مخلوق مطلع ہو جائے اس کو عمل سے شمار نہ کر۔ ایوب سختیانی نے کہا: وہ عقل مند نہیں جو اپنے عمل کی وجہ سے اپنا مقام پہچانا پسند کرے۔

میں کہتا ہوں: سہل کا قول کہ ''عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہوا الخ''۔ اگر اس کا سکون اور سرور اس لیے ہوتا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہوگی پھر وہ اس کی تعریف کریں گے اور اس کا عزت و احترام کریں گے اور وہ ان سے مال وغیرہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو یہ مذموم ہے، کیونکہ اس کا دل ان کے اطلاع پانے کی وجہ سے خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد مطلع ہوئے ہوں اور اللہ تعالیٰ اس پر مخلوق کو مطلع کر دے جب کہ وہ لوگوں کی اس پر اطلاع کو پسند نہیں کرتا تھا پھر وہ اللہ کی صنع اور اللہ کے فضل کے ساتھ خوش ہو تو اللہ کے فضل پر اس کا خوش ہونا اطاعت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝** (یونس) (اے حبیب! فرمایئے یہ کتاب محض اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں یہ بہتر ہے ان تمام

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 320　　2۔ ایضاً

چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں) اس کی تفصیل اور تتمیم محاسبی کی ''الرعایۃ'' میں ہے جو تفصیل پڑھنا چاہتا ہے وہ وہاں سے آگاہی حاصل کرے۔

سہل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے متعلق پوچھا گیا: ''میں عمل کو مخفی کرتا ہوں پھر اس پر اطلاع ہو جاتی ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے'' سہل نے فرمایا: وہ اللہ کے شکر کی وجہ سے خوش ہوتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ظاہر کر دیا۔ یہ کلام ریا میں اور اعمال میں خلوص کے بارے میں کافی ہے اور سورۂ بقرہ میں اخلاص کی حقیقت گزر چکی ہے۔ والحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اس سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ والدین سے احسان کا مطلب ان کو آزاد کرنا ہے اور سورۂ سبحان الذی میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم تفصیل سے آئے گا۔ ابن ابی عبلۃ نے احسانٌ یعنی رفع کے ساتھ پڑھا ہے یعنی واجب الاحسان الیھما۔ باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی کی بنا پر کہ احسنوا الیھما احساناً ان سے حسن سلوک کرو۔

علماء نے فرمایا: خالق اور احسان کرنے والے کے شکر کے بعد سب سے زیادہ احسان کرنے، حسن سلوک کرنے اور طاعت کے حق دار انسان کے والدین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت، اطاعت اور شکر کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کو ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (لقمان: 14) (کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا)

شعبۃ اور ہشیم الواسطیان نے یعلی بن عطا سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رب کی رضا والدین کی رضا ہے اور والدین کی ناراضگی میں رب کی ناراضگی ہے'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ۔ اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ اللہ تعالیٰ نے پڑوسی کی حفاظت کے حقوق کا قیام، اس کے ذمہ کی رعایت کا حکم اپنی کتاب میں اور اپنے نبی کی زبان پر حکم دیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقرباء کے ذکر کے بعد پڑوسی کا ذکر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى یعنی قریبی پڑوسی اور الجار الجنب سے مراد دور کا پڑوسی ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اسی طرح لغت میں ہے اسی سے ہے فلان اجنبی۔ اسی طرح الجنابۃ کا معنی دوری ہے اہل لغت نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

فلا تحرِمَنّي نائلاً عن جَنابةٍ　　فإني امرؤٌ وسْطَ القِبابِ غريبُ (2)

اور اعشی نے کہا:

أتيتُ حُرَيثا زائراً عن جَنابةٍ　　مكان حُرَيثٌ عن عطائِ جَامِداً (3)

---

1۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 1، صفحہ 440　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت

اعمش اور مفضل نے والجار الجنب کو جیم کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: جَنب و جُنُب، اجنب واجنبی۔ جب کہ ان دونوں کے درمیان رشتہ داری نہ ہو اور اس کی جمع اجانب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے یعنی والجار ذی الجنب یعنی طرف والا۔ نوف الشامی نے کہا: الجار ذی القربی سے مراد مسلمان ہے اور الجار الجنب سے مراد یہودی و نصرانی ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر پڑوسی کے متعلق وصیت جس کا حکم دیا گیا ہے وہ مستحب ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر ہو۔ یہی صحیح ہے۔ الاحسان کبھی، مواساۃ (ہمدردی) کے معنی میں ہوتا ہے کبھی حسن معاشرت، اذیت کو روکنا اور حفاظت کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل مجھے پڑوسی کے متعلق وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے گمان ہوا کہ یہ اسے وارث بنا دے گا'' (2)۔ ابوشریح سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم مومن نہیں، اللہ کی قسم مومن نہیں، اللہ کی قسم مومن نہیں، عرض کی گئی یا رسول اللہ! کون؟ فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہیں'' (3)۔ یہ ہر پڑوسی میں عام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ قسم اٹھا کر پڑوسی کی اذیت کو ترک کرنے کو مؤکد فرمایا۔ جو اپنے پڑوسی کو اذیت دیتا ہے وہ مومن نہیں۔ مومن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی اذیت سے اجتناب کرے اور اس سے بچ جائے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے اور اس چیز اور عمل میں رغبت رکھے جس پر اللہ اور اس کا رسول راضی ہیں اور جس پر برانگیختہ کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''پڑوسی تین ہیں پھر ایک پڑوسی کے تین حقوق ہیں اور ایک پڑوسی کے دو حق ہیں اور ایک پڑوسی کا ایک حق ہے۔ وہ پڑوسی جس کے تین حقوق ہیں وہ قریبی مسلمان پڑوسی ہے، اس کے لیے پڑوس کا حق ہے، قرابت کا حق ہے اور اسلام کا حق ہے اور وہ پڑوسی جس کے دو حق ہیں وہ مسلمان پڑوسی ہے اس کے لیے حق الاسلام اور پڑوس کا حق ہے اور وہ پڑوسی جس کا ایک حق ہے وہ کافر پڑوسی ہے اس کے لیے صرف پڑوس کا حق ہے''۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں میں کس کو ہدیہ بھیجوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو از روئے دروازے کے تمہارے زیادہ قریب ہو'' (4)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد **وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى** کی مراد کی تفسیر کرتی ہے یعنی وہ شخص جس کا مسکن تیرے قریب ہو۔ **وَالْجَارِ الْجُنُبِ** جس کا مسکن تجھ سے دور ہو۔ اس سے پڑوسی کے لیے شفعہ کے ثبوت پر حجت پکڑی گئی ہے اور نبی کریم کے اس ارشاد: **الجار احق بصقبه** (5) (یعنی پڑوسی پڑوس کی وجہ سے شفعہ کا حق دار ہے) سے تائید دی ہے۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ تحفہ دینے میں آغاز

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الشفعہ، جلد 1، صفحہ 300
5۔ ایضاً

کس پڑوسی سے کروں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کا دروازہ تمہارے زیادہ قریب ہو وہ دوسروں سے زیادہ حق دار ہے''۔ ابن المنذر نے کہا: یہ حدیث دلیل ہے کہ جار کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کا گھر ملا ہوا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث کے ظاہر سے یہ نکالا ہے کہ متصل پڑوسی جب شفعہ چھوڑ دے اور اس سے ملا ہوا پڑوسی شفعہ طلب کرے جب کہ اس کی نہ دیوار اس گھر کے ساتھ متصل ہے نہ اس کا راستہ متصل ہے تو اس میں اس کے لیے شفعہ کا حق نہیں۔ عام علماء کہتے ہیں: جب کوئی شخص اپنے پڑوسیوں کے لیے وصیت کرے تو متصل پڑوسی اور دوسرے پڑوسیوں کو اس کا مال دیا جائے گا مگر امام ابو حنیفہ کا قول عام علماء سے جدا ہے فرمایا: انہوں نے فرمایا: صرف متصل پڑوسی کو وہ وصیت ملے گی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ پڑوس کی حد میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی فرماتے تھے: ہر طرف سے چالیس گھر (1)۔ یہ ابن شہاب کا بھی قول ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میں ایک قوم کے محلہ میں اترا ہوں ان میں سے جو میرا زیادہ قریبی ہے وہ مجھے زیادہ اذیت دینے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی کو بھیجا کہ مساجد کے دروازوں پر اعلان کرو کہ ''خبردار چالیس گھر پڑوسی ہیں وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہیں''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے آذان سنی وہ پڑوسی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جس نے نماز کی تکبیر سنی وہ مسجد کا پڑوسی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جس نے کسی شخص کو کسی محلہ یا شہر میں ٹھہرایا وہ پڑوسی ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (الاحزاب) اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں ان کے اجتماع کو جوار (پڑوس) بنایا ہے۔ پڑوس کے مراتب میں بعض بعض سے زیادہ قریبی ہیں۔ قریب ترین پڑوسی زوجہ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أيا جارتا بيني فإنك طالقة

**مسئلہ نمبر 7**۔ پڑوسی کے اکرام کے متعلق مسلم میں حضرت ابوذر سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوذر! جب تو شوربا پکائے تو اس کا پانی زیادہ بنا اور اپنے پڑوسیوں کا خیال کر'' (3)۔ نبی کریم ﷺ نے مکارم اخلاق پر برانگیختہ کیا، کیونکہ ان پر محبت، حسن معاشرت، حاجت دور کرنے اور فساد دور کرنے کا دارو مدار ہے، کیونکہ پڑوسی اپنے پڑوسی کی ہنڈیا کی بو سے اذیت پاتا ہے بعض اوقات اس کے بچے ہوتے ہیں اور ان کی شہوت کو وہ ابھارتی ہے اور جوان بچوں کی کفالت کرنے والا ہوتا ہے اس پر الم اور کلفت زیادہ ہو جاتی ہے خصوصاً اگر کفالت کرنے والا کمزور ہو یا غریب ہو تو اس پر مشقت اور زیادہ ہوتی ہے اور اس پر تکلیف اور حسرت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی عقوبت تھی جیسا کہ کہا گیا ہے جس چیز میں ان کی پکانے وغیرہ میں شرکت ہوتی ہے وہ ان کو دینی چاہیے اسی معنی کی وجہ سے قریبی پڑوسی کو ہدیہ دینے پر ابھارا ہے، کیونکہ وہ اپنے پڑوسی کے گھر میں داخل ہونے والی اور خارج ہونے والی چیز کو دیکھتا ہے جب وہ اسے دیکھتا ہے تو وہ اس میں شرکت کو پسند کرتا ہے، نیز پڑوسی اپنے پڑوسی کی غفلت و دھوکا کے وقت جلدی ضرورت کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50 | 2۔ ایضاً | 3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 329

پہنچتا ہے اسی وجہ سے اس سے ہدیہ کا آغاز کرے اور انہیں بعد میں دے جن کا دروازہ دور ہے اگرچہ ان کا گھر قریب ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاکثر ماءھا یعنی سالن کا شوربا زیادہ کر۔ اس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل پر معاملہ کو آسان کرنے کی تنبیہ لطیف فرمائی اور ایسی چیز کو زیادہ کرنے کا حکم فرمایا جس کی کوئی قیمت نہیں ہے یعنی پانی۔ اسی وجہ سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تو سالن بنائے تو گوشت زیادہ کر۔ کیونکہ یہ ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

کسی شاعر نے کتنا اچھا کہا ہے:

قِدْرِی وقِدْرُ الجار واحدۃٌ　　والیه قَبْلِی تُرفع القِدر

میری اور میرے پڑوسی کی ہانڈی ایک ہے مجھ سے پہلے ہانڈی اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

اور کوئی حقیر گھٹیا تھوڑی سی چیز ہدیہ نہ دی جائے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اپنے پڑوسیوں کے گھر والوں کو دیکھ پھر انہیں ایسی چیز بھیجو جو عرفاً بھیجی جاتی ہے'' (1)۔ تھوڑی چیز اگر وہ ایسی چیزوں میں سے ہے جو ہدیہ کے طور پر بھیجی جاتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر میسر نہ آئے مگر تھوڑی سی چیز تو وہ بھیج دو اسے حقیر نہ سمجھو اور وہ چیز اسے بھی قبول کرنی چاہیے جسے وہ بھیجی گئی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یا نساء المؤمنات لا تحتقرن احدا کن لجارتها ولو کُراع شاۃٍ مُحرقًا (2)۔ اے ایمان والیو! تم میں سے کوئی اپنی پڑوسن کو حقیر نہ جانے اگرچہ وہ بکری کا جلا ہوا کھر بھی ہو۔ اس حدیث کو امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔ ہم نے اس طرح اس کو ضبط کیا ہے یا نساء المومنات بغیر اضافت کے رفع کے ساتھ اور تقدیر اس طرح ہوگی یایھا النساء المومنات جیسے تو کہتا ہے: یا رجال الکرام۔ پس منادی محذوف ہے اور وہ یایھا ہے اور اس تقدیر میں النساء ایھا کی صفت ہے اور المومنات، النساء کی صفت ہے۔ اس میں یا نساء المومنات اضافت کے ساتھ بھی کہا گیا ہے لیکن پہلا قول زیادہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ پڑوسی کے اکرام میں سے یہ ہے کہ اسے اپنی دیوار میں شہتیر رکھنے سے منع نہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے''۔ پھر حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: کیا وجہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم اس سے اعراض کرنے والے ہو؟ اللہ کی قسم! میں اس عمل کو تمہارے کندھوں کے درمیان ماردوں گا (3) (یعنی تمہیں اس پر عمل کرنے پر مجبور کروں گا)۔ حدیث میں خُشُبه اور خَشَبه یعنی جمع اور مفرد دونوں طرح مروی ہے (جس کا معنی لکڑی ہے) اور اکتافکم تا کے ساتھ اور اکنافکم نون کے ساتھ بھی مروی ہے اور بھا ضمیر کا مرجع کلمہ اور قصہ ہے۔ پس کیا یہ وجوب یا ندب کا تقاضا کرتا ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا خیال ہے کہ یہ پڑوسی سے نیکی کرنے، اس سے درگزر کرنے اور اس سے احسان کرنے کے استحباب کے لیے ہے۔ اس میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 329　　2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 717

3۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 333

وجوب نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ''کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر یہ کہ وہ خوشی سے عطا کرے''(1)۔ یہ علماء فرماتے ہیں: لا یمنع احد کم جارہ (2) کا معنی نبی کریم ﷺ کے اس قول کی مثل ہے اذا استاذنت احد کم امراتہ الی المسجد لا یمنعھا(3) تمام علماء کے نزدیک اس کا معنی استحباب ہے جب کہ آدمی اس میں صلاح اور خیر دیکھے۔ امام شافعی، اور ان کے اصحاب اور امام ابن حنبل، اسحاق، ابوثور، داؤد بن علی اور جماعت اہل حدیث کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد وجوب کے لیے ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے وجوب نہ سمجھا ہوتا تو وہ لوگوں پر غیر واجب کو واجب نہ کرتے۔ یہی حضرت عمر بن خطاب کا مذہب ہے۔ انہوں نے محمد بن مسلمہ پر ضحاک بن خلیفہ کے لیے خلیج (نالہ) کے بارے میں فیصلہ فرمایا تھا کہ وہ محمد بن مسلمہ کی زمین سے گزارے گا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! وہ اسے گزارے گا اگرچہ تیرے پیٹ پر سے گزارے گا۔ حضرت ضحاک کو وہ نالہ گزارنے کا حکم دیا تو ضحاک نے وہ نالہ گزارا۔ اس کو امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے کتاب ''الرد'' میں کہا ہے کہ امام مالک نے کسی صحابی سے حضرت عمر کی اس مسئلہ میں مخالفت روایت نہیں کی۔ امام شافعی نے امام مالک پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے خود اس واقعہ کو روایت کیا اور اپنی کتاب میں داخل کیا لیکن اس پر خود عمل نہیں کیا بلکہ اپنی رائے سے اسے رد کیا۔ ابوعمر نے کہا: یہ اس طرح نہیں ہے جس طرح امام شافعی نے کہا ہے، کیونکہ محمد بن مسلمہ کی رائے حضرت عمر کی رائے کے خلاف تھی اور انصار کی رائے بھی حضرت عمر کی رائے کے خلاف تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے بھی نالی کو پھیرنے کے سلسلے میں حضرت عمر کی رائے سے مختلف تھی۔ جب صحابہ کرام کا اختلاف ثابت ہوا تو نظر کی طرف رجوع واجب ہوا اور نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مسلمانوں کے خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں مگر یہ کہ وہ خوش دلی سے دیں۔ یہی چیز نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہ کا قول بھی دلالت کرتا ہے مالی اراکم عنھا معرضین الخ کیا وجہ ہے کہ تم اس مسئلہ سے اعراض کرنے والے ہو؟ اللہ کی قسم! میں تمہیں اس مسئلہ پر مجبور کروں گا۔ پہلے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سہارا دینے کا فیصلہ سنت سے اس ارشاد لا یحل مالُ امرا مسلم إلاعن طیب نفس منه(4) سے خارج ہے، کیونکہ اس کا معنی مالک بنانا، ہلاک کرنا ہے جب کہ لکڑی کا سہارا اس سے نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکم میں ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ پس اس چیز کو جمع کرنا واجب نہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے جدا جدا کیا ہے۔ امام مالک نے حکایت کیا ہے کہ مدینہ میں ایک قاضی تھا جو اس کے ساتھ فیصلہ کرتا تھا اسے ابوالمطلب کہا جاتا تھا۔ ان علماء نے اعمش عن انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا: جنگ احد میں ہم میں سے ایک نوجوان شہید ہوگیا۔ اس کی والدہ اس کے چہرے سے مٹی جھاڑ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: تجھے جنت مبارک ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''تجھے کیا معلوم؟ شاید یہ لایعنی کلام کرتا ہو اور ایسی چیز کو روکتا ہو جو اس کو نقصان دینے والی نہ ہو''۔ اعمش کا حضرت انس سے سماع ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔ یہ ابوعمرو کا قول ہے۔

---

1۔ مسند امام احمد حنبل، جلد 5، صفحہ 72
2۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 333
3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 183
4۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 72

**مسئلہ نمبر 10**۔ ایک حدیث وارد ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کے منافع کو جمع فرمایا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا: ہم نے کہا: یارسول اللہ! پڑوسی کا حق کیا ہے؟ فرمایا: ''اگر وہ تجھ سے قرضہ طلب کرے تو اسے تو قرضہ دے، اگر وہ تجھ سے مدد طلب کرے تو اس کی مدد کر، اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے عطا کر، اگر وہ مریض ہو تو اس کی عیادت کر، اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ چل، اگر اسے خبر پہنچے تو وہ تجھے خوشی دے اور تو اسے مبارک دے، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تجھے بھی تکلیف ہو اور تو اس کی تعزیت کر اور اپنی ہانڈی کی خوشبو سے اسے اذیت نہ دے مگر یہ کہ تو اسے اس سے کچھ دے دے اور اس پر اپنی عمارت بلند نہ کر تا کہ تو اس پر جھانکے اور اس پر ہوا کو بند کر دے مگر یہ کہ اس کی اجازت سے، اگر تو پھل خریدے تو اس سے پڑوسی کو بھی ہدیہ دے ورنہ وہ پھل آہستہ سے اپنے گھر میں داخل کر، تیرا بچہ ایسی چیز کو باہر نہ لے جائے، جس سے پڑوسی کے بچے پریشان ہوں۔ کیا جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں تم اسے سمجھ رہے ہو؟ پڑوسی کا حق ادا نہیں کرتے مگر بہت تھوڑے جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے''۔ یا اس طرح کا کلمہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ ایک جامع حدیث ہے اس کی سند میں ابوالفضل بن مظہر الشیبانی ہے جو غیر پسندیدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ علماء نے فرمایا: پڑوسی کے اکرام میں احادیث مطلق ہیں مقید نہیں ہیں حتیٰ کہ کافر (بھی ان میں داخل ہے) جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ حدیث میں ہے صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا ہم قربانیوں کا گوشت ان کو کھلائیں؟ فرمایا: ''مسلمانوں کی قربانیوں سے مشرکوں کو مت کھلاؤ'' اور مسلمانوں کی قربانیوں سے مشرکوں کو کھلانے کی نہی یہ احتمال رکھتی ہے کہ یہ واجبی قربانیاں ہوں وہ قربانی کرنے والے کے ذمہ لازم ہوتی ہیں اور اس قربانی سے قربانی کرنے والے کے لیے خود کھانا اور دوستوں کو کھلانا جائز نہیں ہوتا۔ رہا غیر واجب جس کا اغنیاء کو کھلانا جائز ہوتا ہے تو ان کا اہل ذمہ کو کھلانا بھی جائز ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قربانی کے گوشت کی تقسیم کے وقت فرمایا: ''ہمارے یہودی پڑوسی سے شروع کر''۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی، جب حضرت عبداللہ آئے تو کہا: کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو یہ ہدیہ دیا ہے؟ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے ''جبریل مجھے پڑوسی کے بارے وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ میں گمان کرنے لگا کہ وہ اسے وارث بنا دے گا''(1)۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ یعنی سفر کا رفیق۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ میں سے ایک شخص تھا، رسول اللہ ﷺ اور وہ شخص سواریوں پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ ایک درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے، وہاں سے دو چھڑیاں کاٹیں، ان میں سے ایک ٹیڑھی تھی، آپ ﷺ اس جھنڈ سے باہر آئے تو سیدھی چھڑی اپنے ساتھی کو دی، اس شخص نے کہا: یارسول اللہ! آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے فلاں! ایسا ہرگز نہیں ہر آدمی جو دوسرے کے ساتھ سنگت اختیار کرتا ہے اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے پوچھا جائے گا اگرچہ دن کی ایک گھڑی (2) (بھی سنگت اختیار کرے)'' ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے کہا: سفر کے لیے مروت ہے اور

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 51، دارالکتب العلمیہ بیروت

حضر کے لیے مروّت ہے، سفر میں مروءت یہ ہے کہ زادراہ خرچ کرے اور اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرے اور کثرت سے مزاح کرے جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہ ہو۔ اور حضر میں مروءت یہ ہے کہ ہمیشہ مساجد کی طرف جانا، کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنا اور کثرت سے اللہ کی رضا میں بھائی بنانا۔ بنی اسد کے ایک شاعر نے کہا: بعض علماء نے کہا: وہ حاتم طائی تھا۔

إذا ما رفيقي لم يكن خلفَ ناقتي له مركب فضلاً فلا حمِلت رِجلي
ولم يك من زادي له شطرُ مِزوَدي فلا كنت ذا زادٍ و كنت ذا فضلِ
شريكان فيما نحن فيه وقد أرى علي له فضلاً بما نال من فضلي

جب میرا ساتھی میری اونٹنی کے پیچھے اپنی سواری پر سوار نہ ہو تو میں اپنا پاؤں سواری پر نہیں رکھتا اور میرے زادراہ میں اس کے لیے نصف حصہ نہ ہو تو میں نہ زادراہ والا ہوتا ہوں، نہ میں فضل والا ہوتا ہوں، اس مال میں ہم دونوں شریک ہوتے ہیں میں اس کے لیے فضیلت دیکھتا ہوں اس وجہ سے جو اس نے میرے فضل (مال) سے پایا ہوتا ہے۔

حضرت علی اور حضرت ابن مسعود اور ابن ابی لیلی نے فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ سے مراد بیوی ہے (1)۔ ابن جریج نے کہا: وہ جو تیری سنگت اختیار کرتا ہے اور تیرے نفع کی امید پر تجھے لازم پکڑتا ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن جبیر، عکرمہ، مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔ آیت کریمہ ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ابْنِ السَّبِيْلِ۔ مجاہد نے کہا: جو تجھ سے گزرتا ہے۔ السبیل سے مراد راستہ ہے مسافر کو ابن السبیل اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ راستہ سے گزرتا ہے اور اسے لازم پکڑتا ہے۔ اسی سے احسان یہ ہے کہ اسے کچھ عطا کیا جائے، اس سے مہربانی کی جائے، اس کی راہنمائی کی جائے اور اسے صحیح راستہ بتایا جائے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اللہ تعالیٰ نے غلاموں سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بیان کیا ہے۔ مسلم وغیرہ نے معرور بن سوید سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ربذہ کے مقام پر ابوذر کے پاس سے گزرے، ان پر ایک چادر تھی اور اسی قسم کی چادر ان کے غلام پر تھی، ہم نے کہا: اے ابوذر! اگر تم یہ دونوں چادریں لے لیتے تو تمہارا سوٹ بن جاتا۔ ابوذر نے کہا: میرے اور میرے ساتھیوں میں سے ایک کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی، اس کی ماں عجمی تھی میں نے اسے ماں کی عار دلائی۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری شکایت کر دی، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! تو ایک ایسا شخص ہے جس میں ابھی جاہلیت کی خصلت ہے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جو آزاد مردوں کو گالیاں دیتا ہے وہ اس کے باپ اور ماں کو گالی دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! تو ایک ایسا شخص ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے۔ یہ (غلام) تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنایا ہے تم انہیں وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور انہیں وہ پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور انہیں ایسے کام کا مکلف نہ کرو جو انہیں مغلوب کر دے اگر انہیں ایسا مشکل کام دو تو ان کی مدد کرو'' (2)۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 51، دارالکتب العلمیہ بیروت
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 52

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ وہ ایک دن اپنے خچر پر سوار تھے اور ان کا غلام ان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، کسی نے حضرت ابوہریرہ سے کہا: اگر تم اس غلام کو اتار دو اور وہ پیچھے سے تمہاری سواری کو چلائے (تو بہتر ہوگا)۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: میرے ساتھ آگ کے دو شعلے ہوں میرے پیچھے وہ ہر چیز کو جلا دیں تو میرے نزدیک ان کا جلانا اس سے بہتر ہے کہ میرے غلام میرے پیچھے دوڑ رہا ہو، ابوداؤد نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تمہارے غلاموں میں سے تمہاری موافقت کرے اسے وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور اسے وہ پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور جو ان میں سے تمہاری موافقت نہ کرے تو اسے بیچ دو اور اللہ کی مخلوق کو عذاب نہ دو'' (1)۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غلام کے لیے کھانا اور لباس ہے اور اسے کسی ایسے عمل کی تکلیف نہیں دی جائے گی جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی عَبدی اور أَمتی نہ کہے بلکہ اسے فَتایَ و فَتَاتی کہنا چاہیے'' (3)۔ اس کی مزید وضاحت سورۂ یوسف میں آئے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند و بالا مکارم اخلاق کی طرف بلایا اور ان پر امت کو ابھارا اور احسان کی طرف راہنمائی فرمائی اور تواضع کی روش اختیار کرنے کی راہنمائی فرمائی تا کہ وہ اپنے غلاموں پر اپنے آپ میں کوئی فضیلت نہ دیکھیں، کیونکہ تمام لوگ اللہ کے عبید (غلام) ہیں اور مال اللہ کا مال ہے، لیکن بعض کو بعض کے لیے مسخر کر دیا حکمت کے نفاذ اور نعمت کے اتمام کے لیے، بعض کو بعض کا مالک بنا دیا اگر لوگ انہیں وہ کھلائیں یا پہنائیں جو صفت و مقدار میں اس سے کم ہو جو وہ خود کھاتے اور پہنتے ہیں تو یہ بھی جائز ہے جب کہ وہ اس کے واجبات کو پورا کرتا ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے واللہ اعلم۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے جب اس کا ملازم آیا اور داخل ہوا تو آپ نے پوچھا: غلاموں کو ان کی خوراک دے دی ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: جاؤ اور انہیں خوراک دے آؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کے لیے یہی گناہ کے طور پر کافی ہے کہ وہ اپنے غلاموں سے خوراک روک لے'' (4)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غلام کو ایسی حد لگائی جس کا موجب اس نے جرم نہیں کیا تھا یا اس نے اسے طمانچہ مارا تو اس کا کفارہ اس کو آزاد کرنا ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غلام کو حد کی مقدار سزا دے حالانکہ اس پر حد واجب نہ تھی۔ کسی صحابہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے خادم کے لیے قصاص لیا اور خادم کو آزاد کر دیتے جب قصاص (بدلہ) کا ارادہ نہ کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائی تو اس پر قیامت کے روز اسی کوڑے حد قائم کی جائے گی'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے غلام سے اچھا سلوک نہ کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بد خلقی برائی ہے اور غلاموں سے حسن سلوک بڑھوتری ہے اور صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے اور صدقہ بری موت سے بچاتا ہے''۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 52
3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 316
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 322

**مسئلہ نمبر 16**۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آزاد افضل ہے یا غلام افضل ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مصلح غلام کے دو اجر ہیں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابو ہریرہ کی جان ہے! اگر اللہ کے راستہ میں جہاد، حج اور والدین سے حسن سلوک نہ ہوتا تو میں پسند کرتا کہ مجھے موت آئے تو میں غلام ہوں (1)۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "غلام جب اپنے سردار سے خلوص کا اظہار کرے اور اچھی طرح اللہ کی عبادت کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں" (2)۔ ایسی احادیث سے غلام کی فضیلت ظاہر ہوئی، کیونکہ وہ دو جہتوں سے مخاطب ہے ایک اس سے اللہ کی عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور دوسرا سردار کی خدمت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ابو عمر و یوسف بن عبدالبر النمری، ابو بکر محمد بن عبداللہ بن احمد الغامری البغدادی الحافظ کا یہی نظریہ ہے۔

اور آزاد کو فضیلت دینے والے علماء اس سے استدلال کرتے ہیں کہ دنیا و دین کے امور میں مستقل آزاد ہوتا ہے۔ امور دنیا آزاد سے حاصل ہوتے ہیں اور غلام عدم استقلال کی وجہ سے مفقود کی مانند ہے، جس طرح آلہ ہوتا ہے جسے جبر کے ساتھ پھیرا جاتا ہے، جیسے جانور جبر کے ساتھ مسخر کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے شہادت کا منصب عظیم اور ولایت کا مرتبہ رفیع غلاموں سے چھینا گیا ہے اور ان کی حدود آزاد افراد کی حدود سے کم رکھی گئی ہیں تاکہ یہ شعور ملے کہ ان کی مقدار و منزلت کم ہے۔ آزاد سے اگر ایک جہت سے مطالبہ کیا گیا ہے تو اس میں اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور اس کا اہتمام عظیم ہے پس اس کا ثواب بھی زیادہ ہے اسی چیز کی طرف حضرت ابو ہریرہ نے اشارہ کیا ہے کہ وہ اگر جہاد، حج نہ ہوتا الخ۔ اگر وہ نقص نہ ہوتا جو ان امور کے فوت ہونے کی وجہ سے غلام کو لاحق ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جبریل مجھے متواتر پڑوسی کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ یہ اسے وارث بنا دے گا اور مجھے عورتوں کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ یہ ان کی طلاق کو حرام کر دے گا اور مجھے غلاموں کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا وہ ان کے لیے ایک مدت متعین کر دے گا جب وہ اس مدت کو پہنچیں گے تو آزاد ہو جائیں گے اور جبریل مجھے مسواک کی وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ میرا منہ گھسا دے گا۔ روایت ہے قریب تھا کہ وہ میرا منہ گھسا دے۔ اور جبریل مجھے قیام اللیل کے متعلق وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ میری امت کے نیک لوگ رات کو نہیں سوئیں گے۔ اس حدیث کو سمرقندی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ یعنی اللہ پسند نہیں فرماتا مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۟ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور رضا کی اس شخص سے نفی کر دی جو ان صفات سے متصف ہے یعنی اللہ تعالیٰ آخر میں اپنی نعمت کے آثار اس پر ظاہر نہیں فرمائے گا۔ اس میں ایک قسم کی دھمکی ہے۔ المختال تکبر کرنے والے کو کہتے ہیں اور الفخور جو تکبر کی وجہ سے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 53　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 52

اپنے مناقب شمار کرتا ہے۔ الفخر سے مراد تکبر کرنا اور بڑائی بیان کرنا ہے۔ ان دو صفات کو ذکر میں خاص کیا، کیونکہ یہ دونوں صفات انسان کو قریبی فقیر اور پڑوسی فقیر وغیرہ سے دوری پر ابھارتی ہیں۔ پس ان سے احسان کرنے کے امر الٰہی کو ضائع کر دیتا ہے۔ عاصم نے اسے الجار الجنب جیم کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مفضل نے عاصم سے روایت کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے۔ یعنی الجار ذی الجنب، دور والا پڑوسی۔

اخفش نے یہ کہا ہے:

النَّاسُ جَنْبٌ والأَمیرُ جَنْب

الجنب الناحیہ یعنی قرابت سے دور ہونے والا۔ واللہ اعلم

**الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾**

''جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں لوگوں کو بھی بخل کرنے کا اور چھپاتے ہیں جو عطا فرمایا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ، الَّذِيْنَ، من کان سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ صفت نہیں ہے۔ کیونکہ من اور ما نہ صفت بنتے ہیں نہ ان کی صفت بیان کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فخور میں مضمر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ محل رفع میں ہو اور اس پر عطف کیا گیا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو۔ یعنی الذین یبخلون لھم کذا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خبر یہ ہو اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یہ بھی جائز ہے کہ اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو۔ پس پھر یہ آیت مومنین کے متعلق ہو گی اور یہ آیت اس تاویل پر ہو گی کہ بخل کرنے والوں سے اللہ کی محبت کی نفی کی گئی ہے پس اے مومنو! جس کا ذکر کیا گیا ہے ان سے احسان کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں فرماتا جس میں ایسی خصلتیں ہوں جو احسان سے مانع ہوں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ، بخل شرع میں مذموم ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان پر واجب کیا ہے اسے ادا نہ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 180) یہ آیت سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے اور بخل اور اس کی حقیقت کے متعلق کلام بھی ہو چکی ہے اور بخل اور شح کے فرق پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کے قول میں اس آیت سے مراد یہود ہیں، کیونکہ انہوں نے تکبر، فخر، مال پر بخل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تورات میں نازل شدہ صفات کو چھپانے کی قبیح صفات جمع کی ہوئی تھیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ منافق ہیں جن کا خرچ کرنا اور ایمان تقیہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے اور بخل کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ ان تمام اعرابی

صورتوں کی بنا پر ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والے مومنین کی دھمکی کو کافروں کی دھمکی سے جدا فرمایا ہے پہلے (مومنین) لوگوں کے لیے محبت کے نہ ہونے کی دھمکی دی اور کافروں کو عذاب مہین کی دھمکی دی۔

وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۝

''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور وہ (بدقسمت) ہو جائے شیطان جس کا ساتھی پس وہ بہت برا ساتھی ہے''۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ اس کا الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ پر عطف فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا الکافرین پر عطف ہے اس صورت میں محل جر میں ہوگا اور جو واؤ کی زیادتی کی رائے رکھتے ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ دوسرا ان کے نزدیک پہلے کی خبر ہو۔ جمہور علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے بارے نازل ہوئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِئَآءَ النَّاسِ اور رِئَآءَ نفاق سے ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ یہود کے بارے نازل ہوئی۔ طبری نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس طائفہ سے ایمان باللہ اور یوم آخرت پر ایمان کی نفی کی ہے جب کہ یہودی ایسے نہ تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: مجاہد کا قول مبالغہ اور الزام پر مبنی ہے، کیونکہ آخرت کے متعلق ان کا ایمان، ایمان نہ ہونے کے مترادف تھا، کیونکہ ان کے لیے وہ نفع بخش نہیں تھا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بدر کے دن کھلانے والے لوگوں کے متعلق نازل ہوئی اور یہ مکہ کے رؤساء تھے جو لوگوں پر اس لیے خرچ کرتے تھے تاکہ وہ بدر کی طرف نکلیں۔ ابن عربی نے کہا: ریا کے طور پر خرچ کرنا احکام میں اس حیثیت سے داخل ہے کہ یہ کفایت نہیں کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ (توبہ: 53) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا کلام میں اضمار ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے ولا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر فقرینھم الشیطان ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا۔ اور قرین، ساتھی اور دوست کو کہتے ہیں یہ الاقتران سے فعیل کے وزن پر ہے۔ عدی بن زید نے کہا:

عن المرء لا تسألْ وسَلْ عن قَرِينه فكلُّ قَرِينٍ بالمقارِن يَقْتَدِي

آدمی کے متعلق مت پوچھ، اس کے دوست کے بارے میں پوچھ ہر دوست اپنے دوست کی پیروی کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں شیطان کی بات کو قبول کیا اس نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 52، دار الکتب العلمیہ بیروت

کہ جس کا ساتھی آگ میں شیطان بنایا گیا وہ بہت برا ساتھی ہے۔ یعنی شیطان برا ساتھی ہے قرینا کو نصب تمیز کی بناء پر ہے۔

وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹

''کیا نقصان ہوتا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور روز آخرت پر اور خرچ کرتے اس سے جو دیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے''۔

اس آیت میں ما مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور ذا اس کی خبر ہے۔ اور ذا بمعنی الذی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما اور ذا ایک اسم ہو۔ پہلی صورت میں تقدیر یوں ہوگی وما الذی علیھم اور دوسری صورت میں تقدیر یوں ہوگی ای شئ علیھم (لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ) یعنی وہ واجب الوجود کی اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کی تفاصیل میں سے لے کر آئے تھے اس کی تصدیق کرتے اور خرچ کرتے اس سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا تھا۔ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا اس کا معنی و مفہوم کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰

''بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دو گنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے عمل کے ثواب میں کچھ کمی نہیں فرمائے گا اگر چہ ذرہ برابر عمل ہوگا، بلکہ وہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا اور انہیں اعمال پر ثواب دے گا۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تھوڑے اور زیادہ عمل کے ثواب میں کمی نہیں فرمائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا (یونس: 44) (اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر) ذرۃ کا معنی سرخ چیونٹی ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے: یہ چیونٹیوں میں سے چھوٹی چیونٹی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ چیونٹی کا سر ہے۔ یزید بن ہارون نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ سرخ چیونٹی کا وزن نہیں ہوتا اور حکایت کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے روٹی رکھی حتیٰ کہ اس پر اتنی مقدار میں چیونٹیاں چڑھ گئی کہ انہوں نے روٹی کو ڈھانپ لیا پھر اس نے اس کا وزن کیا تو روٹی کے وزن پر کوئی اضافہ نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: قرآن و سنت چیونٹی کا وزن ہونے پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ دینار اور نصف دینار کا وزن ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: الذرۃ سے مراد رائی کا دانہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا (الانبیاء: 47) (پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو اسے بھی ہم لا حاضر کریں گے)

بعض علماء نے اس کے علاوہ قول کیے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے سے چھوٹے عمل کی بھی جزا دے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کسی مومن کی نیکی میں کمی نہیں فرماتا حتیٰ کہ دنیا میں بھی اس کی برکت عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جزا عطا فرمائے گا۔ رہا کافر تو وہ اپنے اعمال خیر کے بدلے میں دنیا میں خوراک کھاتا ہے حتیٰ کہ جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی نہ ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے گی''(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا یعنی نیکی کا ثواب زیادہ فرمائے گا۔ اہل حجاز نے حسنةٌ یعنی رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عام قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے رفع کی صورت میں تَكُ بمعنی تحدث ہوگا اور تامہ ہوگا اور دوسری صورت میں یہ ناقصہ ہوگا۔ یعنی ان تلك فعلته حسنة یعنی اگر تیرا عمل نیکی ہوگا۔ اور حسن نے نضاعفها نون کے ساتھ پڑھا ہے جو عظمت پر دلالت کرتی ہے اور باقی قراء نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اصح ہے، کیونکہ آگے دیؤت آیا ہوا ہے۔ ابو رجاء نے یضعفها پڑھا ہے اور باقی قراء نے یضاعفها پڑھا ہے ان دونوں لغتوں کا معنی کثرت ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا یضاعفها اس کا معنی ہے وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور یضعفها (تشدید کے ساتھ) اس کا معنی ہے وہ اسے دوگنا فرما دے گا۔

مِنْ لَّدُنْهُ یعنی من عندہ اس میں چار لغات ہیں لَدُن، لُدْن، لَدُ اور لَدَی۔ جب عرب اس کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں تو نون کو مشدد کرتے ہیں اور اس پر من داخل ہوتا ہے جہاں من ابتدائے غایت کے لیے ہوتا ہے۔ لُدُنْ بھی اسی طرح ہے۔ جب دونوں میں برابر ہو تو اس پر من کا دخول عمدہ ہے اسی وجہ سے سیبویہ نے کہا: لدن میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ابتدائے غایت کے لیے آتا ہے۔ اَجْرًا عَظِیْمًا۝ یعنی جنت۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری سے ایک طویل حدیث شفاعت مروی ہے جس میں ہے کہ ''جب مومنین آگ سے نجات پائیں گے، فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ سے حق کا زیادہ مطالبہ کرنے والا نہیں جتنا کہ مومنین قیامت کے روز اپنے ان بھائیوں کے لیے کریں گے جو آگ میں ہوں گے۔ مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! وہ لوگ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، حج کرتے تھے۔ انہیں کہا جائے گا: جنہیں تم پہچانتے ہو انہیں نکالو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی وہ بہت سے لوگوں کو نکالیں گے آگ جن کی نصف پنڈلی تک اور گھٹنے تک پہنچی ہوگی، پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! آگ میں اب کوئی ایسا آدمی نہیں رہا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم دوبارہ لوٹ جاؤ تم جس کے دل میں دینار کے برابر نیکی پاؤ اسے نکالو، وہ پھر ایک جم غفیر کو نکالیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ان میں سے کوئی نہیں چھوڑا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر پاؤ اسے نکالو، وہ خلق کثیر کو نکالیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے کوئی نہیں چھوڑا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم واپس جاؤ جس کے دل میں ذرہ برابر نیکی پاؤ اسے نکالو وہ پھر ایک خلق کثیر کو نکالیں گے، پھر کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے آگ میں کوئی نیکی نہیں چھوڑی''۔

1۔ صحیح مسلم، صفات المنافقین، جلد 2، صفحہ 374

حضرت ابوسعید خدری فرماتے تھے: اگر تم میری اس حدیث پر یقین نہ کرو تو یہ پڑھ لو اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ...... الخ (1) حضرت ابن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز ایک بندے کو لایا جائے گا اور اسے کھڑا کیا جائے گا، پھر ایک نداد ینے والا لوگوں کے سروں پر ندا دے گا، یہ فلاں بن فلاں ہے جس کا اس پر کوئی حق ہے وہ اس سے اپنا حق لے لے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: انہیں اپنے حقوق ادا کر۔ وہ عرض کرے گا: یارب! میں کہاں سے لوں؟ جب کہ دنیا تو ختم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کے اعمال صالحہ کو دیکھو اور ان میں سے کچھ ان پر حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو دے دو، اگر ایک ذرہ برابر نیکی بچ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے: یارب! حالانکہ وہ ان سے زیادہ جانتا ہے۔ ہر صاحب حق کو اپنا حق دے دیا گیا ہے اور ذرہ برابر نیکی بچ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس ایک نیکی کو میرے بندے کے لیے کئی گناہ کر دو اور اسے میری رحمت کے فضل کے طفیل جنت میں داخل کر دو۔ اس کا مصداق یہ آیت ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا۔

اگر وہ بندہ بدبخت ہوگا تو فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے الٰہ! اس کی نیکیاں ختم ہو گئی ہیں اور اس کی برائیاں باقی ہیں اور مطالبہ کرنے والے بہت سے باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: مطالبہ کرنے والوں کی برائیوں میں سے لے کر اس کی برائیوں کے ساتھ ملا دو، پھر اس کے لیے دوزخ کا پروانہ لکھ دو، اس تاویل پر آیت جھگڑنے والوں کے متعلق ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کسی خصم کے لیے کسی خصم پر ذرہ برابر حق نہیں چھوڑے گا، اس کے لیے اس سے حق وصول کرے گا اور ذرہ برابر کمی نہیں کرے گا جو اس کے لیے باقی ہوگی بلکہ اس کو اس پر ثواب دے گا اور اسے اس کے لیے کئی گنا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا سے یہی مراد ہے (2)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے بدلے میں بیس لاکھ نیکیاں عطا کرے گا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا عبیدہ نے کہا: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَجْرًا عَظِيْمًا تو کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے؟ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

''تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب!) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ''۔

فاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے فتحہ دیا گیا ہے اور (اِذَا) ظرف زمان ہے اور اس میں عامل جِئْنَا ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں خلیل بن احمد نے بتایا فرمایا: ہمیں ابن منیع نے بتایا فرمایا: ہمیں ابو کامل نے بتایا فرمایا: ہمیں فضیل نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103-102
2۔ تفسیر طبری، جلد 7، صفحہ 32

بتایا، انہوں نے یونس بن محمد بن فضالہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس بنی ظفر میں تشریف لائے، آپ اس چٹان پر بیٹھ گئے جو بنی ظفر میں تھی اور آپ کے ساتھ حضرت ابن مسعود، حضرت معاذ اور دوسرے چند صحابہ تھے آپ نے ایک قاری کو قرآن پڑھنے کا حکم دیا حتیٰ کہ جب وہ اس آیت پر پہنچا فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا...... تو رسول اللہ ﷺ رونے لگ گئے حتیٰ کہ آپ کے رخسار تر ہو گئے، آپ ﷺ نے عرض کی: یا رب! یہ ان پر ہے جن کے درمیان میں ہوں، ان کی کیا حالت ہوگی جن کو میں نے نہیں دیکھا؟ بخاری نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ پر قرآن پڑھو، میں نے عرض کی: کیا میں آپ پر پڑھوں جب کہ آپ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں۔ میں نے آپ ﷺ پر سورہ نساء پڑھی حتیٰ کہ میں فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا...... الخ پر پہنچا تو فرمایا: ٹھہر جا، جبکہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو تھے'' (1)۔ مسلم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے لیکن اس میں امسك (ٹھہر جا) کے الفاظ کی جگہ رفعت راسی (میں نے اپنا سر اٹھایا) ہے یا فرمایا: غمزنی رجلٌ الی جنبی میرے پہلو میں ایک شخص تھا جس نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے اپنا سر اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کا رونا اس ہولناکی اور شدت کی وجہ سے تھا جس کا بیان اس آیت میں ہے، کیونکہ انبیاء کو اپنی اپنی امتوں پر تصدیق و تکذیب کے لیے بطور گواہ لایا جائے گا اور نبی کریم ﷺ کو قیامت کے روز بطور گواہ لایا جائے گا اور عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ سے اشارہ قریش کے کفار اور دوسرے کفار کی طرف ہے، کفار قریش کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ دوسروں کی بنسبت ان پر عذاب شدید ہوگا، کیونکہ معجزات کو دیکھنے کے وقت ان کا انکار عناد کی بنا پر تھا، وہ معجزات جو اللہ تعالیٰ نے آپ سے عادت کے خلاف ظاہر فرمائے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز ان کفار کا کیا حال ہوگا جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب!) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ۔ کیا یہ عذاب دیئے جائیں یا انعام کیے جائیں؟ یہ استفہام بمعنی توبیخ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ تمام امت کی طرف ہے۔ ابن المبارک نے ذکر کیا کہ ہمیں ایک انصاری شخص نے بتایا اس نے منہال بن عمرو سے روایت کیا، اس نے اسے بتایا کہ اس نے سعید بن مسیب کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: لیس من یوم الا تعرض علی النبی ﷺ امته غدوة وعشية فيعرفهم بسيماهم واعمالهم فلذالك يشهد عليهم۔ یعنی نبی کریم ﷺ پر ہر صبح و شام آپ کی امت پیش کی جاتی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہر امتی کے چہرہ اور اس کے اعمال کو پہچانتے ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ لوگوں کے متعلق گواہی دیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ۔ یعنی اس امت کے نبی کو ہم گواہ لائیں گے۔ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا اور آپ کو ان پر گواہ لائیں گے۔ کیف مضمر فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فکیف یکون حالهم۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور کبھی فعل مضمر کے قائم مقام اذا کو رکھا جاتا ہے اور إِذَا میں عامل جِئْنَا ہے اور شَهِيدًا حال ہے اور حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ طالب کا شیخ پر پڑھنا اور اس پر کتاب پیش کرنا جائز ہے اور اس کا برعکس بھی جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

ہے اس کا بیان سورہ لم یکن میں حضرت ابی کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شَہِیْدًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۟

''اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات''۔

عَصَوُا میں واؤ کو التقاء ساکنین کی وجہ سے ضمہ دیا گیا ہے اور اس کو کسرہ دینا جائز ہے۔ نافع، ابن عامر نے تَسَّوّٰی تا کے فتحہ اور سین کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے(1) اور باقیوں نے تا کے ضمہ اور سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جس کے فاعل کا ذکر نہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر زمین کو برابر کر دیتا۔ یعنی انہیں اور زمین کو برابر کر دیتا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ خواہش کریں گے کاش اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ نہ اٹھاتا اور ان پر زمین برابر رہتی، کیونکہ وہ مٹی سے نقل کیے گئے تھے پہلی اور دوسری قرأت پر الارض فاعل ہوگی معنی یہ ہوگا کہ وہ خواہش کریں گے اگر زمین ان کے لیے کھلتی اور وہ اس کے اندر چلے جاتے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: با بمعنی علی ہے یعنی کاش ان پر زمین پھٹتی اور پھر ان پر ہموار کر دی جاتی، یہ ابو الحسن سے مروی ہے۔ تشدید کی قرأت اور ادغام کی بنا پر ہے اور تخفیف تا کے حذف کی بنا پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ یہ تمنا کریں گے جب وہ دیکھیں گے کہ جانور مٹی ہو گئے ہیں اور وہ جان لیں گے کہ انہوں نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۟ (النباء) کا یہی معنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ یہ تمنا کریں گے جب یہ امت انبیاء کو دیکھے گی جیسا کہ پہلے سورہ بقرہ آیت 143 میں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے تحت گزر چکا ہے، تو گزشتہ امتیں کہیں گی۔ ان میں زنا کار اور چور ہیں ان کی شہادت قبول نہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے امتیوں کا تزکیہ فرمائیں گے، پھر مشرک کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۟ (الانعام)

پس ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا... کا یہی مطلب ہے یعنی انہیں دھنسا دیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا زجاج نے کہا: بعض نے کہا: یہ جملہ مستانفہ ہے، کیونکہ جو انہوں نے اعمال کیے وہ اللہ کی بارگاہ میں ظاہر ہیں وہ انہیں چھپانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معطوف ہے معنی ہے وہ خواہش کریں گے کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپائی نہ ہوتی، کیونکہ اس نے ان کے جھوٹ کو ظاہر کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے اس آیت کے متعلق اور وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۟ کے متعلق پوچھا گیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب وہ دیکھیں گے کہ جنت میں تو صرف اہل اسلام داخل ہوں گے، تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! ہم مشرک نہ تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 55، دار الکتب العلمیہ بیروت

کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔ حسن اور قتادہ نے کہا: آخرت کے بعض مقام پر وہ بولیں گے اور بعض مقام پر نہیں بول سکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے لیے ان کے اعمال ظاہر ہوں گے اور ان کا محاسبہ کیا جائے گا تو وہ کچھ نہیں چھپائیں گے۔ مزید بیان سورۂ انعام میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

”اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو (زبان سے) کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو یہاں تک کہ تم غسل کر لو اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے یا ہاتھ لگایا ہو تم نے (اپنی) عورتوں کو پھر نہ پاؤ تم پانی تو (اس صورت میں) تیمم کر لو پاک مٹی سے اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) ہاتھ پھیرو اپنے چہروں پر اور اپنے بازوؤں پر بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا بڑا بخشنے والا ہے“۔

اس میں چوالیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى اللہ تعالیٰ نے اس خطاب کے ساتھ مومنین کو خاص فرمایا، کیونکہ وہ نماز پڑھتے تھے اور انہوں نے شراب پی تھی اور اس نے ان کے ذہنوں کو ختم کر دیا تھا پس وہ اس خطاب سے خاص کیے گئے، کیونکہ کفار تو نہ ہوش میں نماز پڑھتے تھے، نہ حالت نشہ میں۔ ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو حضرت عمر نے دعا کی: اے اللہ! شراب کے بارے میں ہمارے لیے واضح حکم بیان فرما، تو سورہ بقرہ کی آیت یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ (بقرہ:219) نازل ہوئی۔ فرمایا: حضرت عمر کو بلایا گیا ان پر یہ آیت پڑھی گئی۔ پھر حضرت عمر نے کہا: اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے متعلق واضح حکم بیان فرما۔ تو سورۂ نساء کی آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کا منادی ندا دیتا تھا جب نماز کھڑی ہوتی تھی کہ خبردار کوئی نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جائے۔ حضرت عمر کو بلایا گیا اور ان پر یہ آیت پڑھی گئی، حضرت عمر نے کہا: اللہ ہمارے لیے شراب کے متعلق کوئی شافی حکم بیان فرما، تو یہ آیت نازل ہوئی فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ) حضرت عمر نے کہا: ہم رک گئے (1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: لوگ زمانہ جاہلیت کے امر پر تھے حتیٰ کہ انہیں کسی کا حکم دیا گیا یا منع کیا گیا۔ وہ ابتدائے اسلام میں شراب پیتے تھے حتیٰ کہ یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ المائدہ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 378

الْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (بقرہ:219) کا ارشاد نازل ہوا۔ لوگوں نے کہا: ہم منفعت کے لیے پیتے ہیں گناہ کے لیے نہیں پیتے۔ پھر ایک شخص نے شراب پی اور آگے بڑھ کر نماز پڑھانے لگا اس نے قل یایھا الکافرون اعبد ما تعبدون پڑھ دیا، تو یہ آیت نازل ہوئی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ لوگوں نے کہا: عین نماز کے علاوہ وقت میں ہم پئیں گے۔ حضرت عمر نے دعا کی: اے اللہ! ہم پر شراب کے بارے شافی بیان فرما، تو اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ (المائدہ:91) کا ارشاد نازل ہوا۔ حضرت عمر نے کہا: انتھینا انتھینا ہم رک گئے، ہم رک گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے منادی نے چکر لگایا اور کہا: خبردار شراب حرام کی گئی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمارے لیے حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کھانا تیار کیا ہمیں بلایا اور ہمیں شراب پلائی۔ شراب نے ہمیں مدہوش کر دیا۔ نماز کا وقت ہوا تو لوگوں نے مجھے آگے کیا۔ میں نے پڑھا قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝، ونحن نعبد ما تعبدون۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔(1)

ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال کی وجہ اور مقابل سے ترتیب کی وجہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا پھر ایمان کے بعد نماز کا ذکر فرمایا جو عبادت کی اصل ہے اسی وجہ سے نماز کے تارک کو قتل کیا جاتا ہے اور اس کا فرض ساقط نہیں ہوتا۔ کلام اس کی شروط میں جاری ہوئی جن کے بغیر یہ صحیح نہیں ہوتی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور علماء اور فقہاء کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ سکر سے مراد شراب کا نشہ ہے مگر ضحاک نے کہا: سکر سے مراد نیند کا نشہ اور غلبہ ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اذا نعس احدکم فی الصلاۃ فلیرقد حتی یذھب عنه النوم فانه لا یدری لعله یستغفر وفیسب نفسه (2)۔ جب تم میں سے نماز میں کسی پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو اسے سو جانا چاہیے حتیٰ کہ اس سے نیند کا غلبہ دور ہو جائے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ وہ تو استغفار کرنا چاہتا ہو اور وہ اپنے نفس کو (نیند کے غلبہ کی وجہ سے) گالی دے رہا ہو۔ عبیدہ سلیمانی نے کہا: وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى کا مطلب ہے جب تم پیشاب کو روکے ہوئے ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی پیشاب روک کر نماز نہ پڑھے'' (3)۔ ایک روایت میں ''جبکہ وہ اپنی رانوں کو ملائے ہوئے ہو'' (4)۔

میں کہتا ہوں: ضحاک اور عبیدہ کا قول صحیح ہے، کیونکہ نماز سے مطلوب دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے اور غیر اللہ کی طرف التفات کو ترک کرنا ہے اور نیند، حقنہ اور بھوک میں جو اس کی توجہ کو مشغول کرتی ہے اور اس کے دل کو اللہ تعالیٰ سے جدا کرتی ہے اور حالت کو تبدیل کرتی ہے اس سے خالی ہونا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب شام کا کھانا حاضر ہو اور نماز بھی کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا کھاؤ'' (5)۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر تشویش پیدا کرنے والی چیز کے زوال کی رعایت فرمائی ہے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127 2۔ صحیح بخاری، کتاب الوضو، جلد 1، صفحہ 34 3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، صفحہ 48
4۔ موطا امام مالک، کتاب قصر الصلوٰۃ فی سفر، صفحہ 144 5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 208

جس سے دل متعلق ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے رب کی عبادت کی طرف خالص دل کے ساتھ متوجہ ہو اور نماز میں خشوع کرے۔ اس آیت میں یہ ارشاد قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (المومنون) بھی داخل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰی سورۂ مائدہ کی آیت اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا (مائدہ: 6) کے ساتھ منسوخ ہے۔ اس قول پر انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھیں پھر انہیں ہر حال میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ تحریم سے پہلے ہے۔ مجاہد نے کہا: شراب کی تحریم کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ اسی طرح عکرمہ اور قتادہ نے کہا ہے حضرت علی کی مذکور حدیث کی وجہ سے اس باب میں یہی صحیح ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: نماز کھڑی ہوگئی۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے ندا دی: نشہ والا شخص نماز کے قریب نہ جائے (1)۔ یہ نحاس نے ذکر فرمایا ہے۔ ضحاک اور عبیدہ کے قول پر یہ آیت محکمہ ہے، اس میں نسخ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْرَبُوْا۔ جب کہا جاتا ہے: لا تقرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) تو اس کا معنی ہوتا ہے یہ فعل نہ کر اور جب راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوتا ہے فعل کے قریب نہ جا۔ یہ حکم تمام امت کے غیر مدہوش لوگوں کے لیے ہے اور رہا نشہ والا، وہ چونکہ نشہ کی وجہ سے عقل ہی نہیں رکھتا تو وہ عقل نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت اس کا مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس کی پیروی کا مخاطب ہے جو اس پر واجب ہے اور نشہ کے وقت جو احکام اس نے ضائع کیے جن کا وہ نشہ سے پہلے مکلف تھا ان کا کفارہ دینے کے ساتھ مخاطب ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصَّلٰوةَ یہاں الصَّلٰوةَ سے کیا مراد ہے؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس سے مراد عبادت معروفہ ہے (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد نماز کی جگہیں ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ (الحج: 40) اس میں نماز کی جگہوں کو صلاۃ کہا گیا ہے اس تاویل پر دلیل یہ قول ہے وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جنبی شخص کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے نہ اس میں نماز جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے مراد مسافر ہے جب وہ پانی نہ پائے تو وہ تیمم کرے اور نماز پڑھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک جماعت نے کہا: الصلاۃ سے نماز اور نماز کی جگہیں دونوں مراد ہیں، کیونکہ وہ مسجد میں نہیں آتے تھے مگر نماز کے لیے اور وہ نماز نہیں پڑھتے تھے مگر اکٹھے ہو کر اور وہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰی یہ مبتدا خبر ہیں اور تَقْرَبُوْا سے حال ہے۔ سُكٰرٰی، سکران کی جمع ہے جیسے کسلان کی جمع کسالیٰ ہے۔ نخعی نے سکری سین کے فتح کے ساتھ فعلیٰ کے وزن پر پڑھا ہے یہ سکران کی جمع مکسر ہے سکری پر اس کی جمع مکسر بنائی گئی، کیونکہ سکر ایک آفت ہے جو عقل کو لاحق ہوتی ہے پس یہ صرعی کے قائم مقام جاری ہوا اور اس کے باب پر جاری ہوا۔ اعمش نے اسے حُبلیٰ کے وزن پر سُكْرٰی پڑھا ہے اور یہ صفت مفردہ ہے اور جمع کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، جلد 2، صفحہ 161 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57

خبر صفت مفردہ جائز ہے جس طرح جمع کے متعلق خبر واحد کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

السکر یہ صحو کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: سکر یسکر سکراً یہ باب حمد یحمد سے ہے سکرت عین تسکر یعنی اس کی آنکھ حیران ہوئی۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا (الحجر:15) سکرت الشق کا مطلب ہے میں نے اسے بند کر دیا۔

پس نشہ والا شخص اس سے رک جاتا ہے جو عقل کی وجہ سے اس پر ثابت ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اس آیت میں دلیل ہے بلکہ نص ہے کہ ابتداء اسلام میں شراب کا پینا حلال تھا حتیٰ کہ وہ پینے والے کو نشہ تک پہنچا دیتا۔ ایک قوم نے کہا: نشہ عقلاً حرام ہے اور کسی دین میں یہ مباح نہیں کیا گیا اور انہوں نے السکر کو اس آیت میں نیند پر محمول کیا ہے۔ قفال نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے لیے شراب مباح کی گئی تھی، کیونکہ یہ طبیعت میں سخاوت، شجاعت اور حمیت پیدا کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی عربوں کے اشعار میں موجود ہے، حضرت حسان نے کہا:

ونشربها فتترکنا ملوکا

ہم شراب پیتے ہیں یہ ہمیں بادشاہ بنا دیتی ہے۔ ہم نے اس معنی کا اشارہ سورۂ بقرہ میں کیا تھا۔ قفال نے کہا: جب وہ شراب جو عقل کو زائل کر دے حتیٰ کہ پینے والا جنون اور غشی کی حد کو پہنچ جائے تو قصداً اس کا پینا مباح نہیں کیا گیا اور اگر بغیر قصد کے اس حد تک پہنچ جائے تو وہ معاف ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اس کا بیان سورۂ المائدہ میں حضرت حمزہ کے قصہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمان نماز کے اوقات میں شراب سے اجتناب کرتے تھے اور جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو پھر شراب پیتے وہ ہمیشہ اسی معمول پر رہے حتیٰ کہ سورۂ مائدہ میں شراب کی حرمت نازل ہوئی فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ)

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یعنی حتیٰ کہ تم یقین رکھتے ہو کہ اس میں غلطی نہیں ہے اور نشہ والا شخص نہیں جانتا جو وہ کہتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: نشہ والے شخص کی طلاق لازم نہیں ہوتی (1)۔ حضرت ابن عباس، طاؤس، عطا، قاسم اور ربیعہ سے یہ مروی ہے یہی قول لیث ابن سعد، اسحاق، ابوثور، مزنی کا ہے، طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے فرمایا: علماء کا اجماع ہے کہ معتوہ کی طلاق جائز نہیں اور سکران معتوہ (نیم پاگل) ہے، جس طرح وسواس میں مبتلا شخص وسواس کی وجہ سے معتوہ ہے اور اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ جس نے بھنگ پی اور اس کی عقل ضائع ہو گئی تو اس کی طلاق جائز نہیں اسی طرح شراب کی وجہ سے جو مدہوش ہو گیا اس کا حکم ہے۔ ایک جماعت نے نشہ والے شخص کی طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت معاویہ اور تابعین کی جماعت سے مروی ہے یہی قول امام ابو حنیفہ، ثوری اور اوزاعی کا ہے۔ اس میں امام شافعی کا قول مختلف ہے۔ امام مالک نے طلاق، زخم میں دیت اور قتل میں قصاص کو لازم کیا ہے اور نکاح اور بیع کو لازم نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: نشہ والے شخص کے افعال اور اس کی عقود تمام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57، دار الکتب العلمیہ بیروت

ثابت ہوں گی جس طرح غیر مدہوش کے ثابت ہوتے ہیں، سوائے ارتداد کے، کیونکہ جب وہ مرتد ہوگا تو اس کی بیوی اس سے جدا نہ ہوگی مگر استحساناً۔ امام ابو یوسف نے کہا: وہ نشہ کی حالت میں مرتد ہو جائے گا۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، لیکن اسے نشہ کی حالت میں نہ قتل کیا جائے گا اور نہ اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام ابوعبداللہ مازری نے کہا: ہمارے پاس ایک شاذ روایت ہے کہ نشہ والے کی طلاق لازم نہیں ہوتی۔ محمد بن عبدالحکم نے کہا: نشہ والے کی نہ طلاق لازم ہے، نہ آزادی۔ ابن شاس نے کہا: شیخ ابوالولید نے مخلط کے متعلق اختلاف ذکر کیا ہے جس کے پاس کچھ عقل باقی ہوتی ہے مگر وہ اختلاط پر ضبط کی قدرت نہیں رکھتا وہ کبھی غلط بات کرتا ہے اور کبھی درست بات کرتا ہے۔ فرمایا: نشہ والا وہ ہے جو آسمان اور زمین میں، مرد اور عورت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ تمام افعال اور احوال میں بندوں کے ساتھ معاملات میں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملات میں مجنون کی طرح ہے مگر اس صورت میں جب اس کی نمازوں کا وقت نکل جائے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے احکام ساقط نہیں ہوتے بخلاف مجنون کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نشہ اپنے اوپر خود داخل کیا جس طرح جان بوجھ کر نماز کو ترک کرنے والا ہوتا ہے حتیٰ کہ نماز کا وقت نکل جاتا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: نشہ کی حد، عقل کا اختلال ہے جب اس سے قرآن پڑھایا جائے تو قرأت میں خلط ملط کرے ایسی باتیں کرے جو معروف نہ ہوں تو اسے کوڑے لگائیں جائیں گے۔ امام احمد نے فرمایا: جب صحت کی حالت سے اس کی عقل بدل جائے تو وہ نشہ والا ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: جب اس کی قرأت میں خلط ملط ہو تو وہ نشہ والا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے استدلال کیا ہے۔ جب وہ ایسی حالت میں ہو کہ وہ نہ جانتا ہو جو وہ کہہ رہا ہو تو وہ تلویث مسجد کے خوف سے مسجد سے دور رہے اور اس کی نماز صحیح نہ ہوگی اگر وہ نماز پڑھے گا تو اسے پھر قضا کرے گا اور اگر وہ ایسی حالت میں ہو کہ وہ جانتا ہو جو وہ کہہ رہا ہو تو اسے نماز کے لیے لایا جائے گا اور اس کا حکم صحیح کا حکم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا جُنُبًا اس کا عطف، حَتّٰى تَعْلَمُوْا میں جملہ منصوبہ کی جگہ پر ہے، یعنی تم نماز نہ پڑھو جب کہ تم جنبی ہو۔ کہا جاتا ہے: تجنبتم اجنبتم، جنبتم تمام کا ایک معنی ہے۔ الجنب کے لفظ کی نہ مونث آتی ہے، نہ تثنیہ، نہ جمع۔ چونکہ یہ مصدر کے وزن پر ہے جیسے بَعُدَ اور قَرُبَ ہیں۔ کبھی اس میں تخفیف کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جنب۔ ایک قوم نے اس طرح بھی پڑھا ہے، فراء نے کہا، کہا جاتا ہے: جنب الرجل و اجنب یہ جنابت سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنب کی جمع ایک لغت میں اجناب آئی ہے جیسے عنق و اعناق، طنب و اطناب اور جس نے واحد کے لیے جانب کہا اس نے جمع میں جناب کہا جیسے راکب کی جمع رکاب۔ اس کا اصل معنی البعد ہے گویا جنبی آدمی ٹپک کر نکلنے والے پانی کی وجہ سے نماز سے دور ہوگیا۔ شاعر نے کہا:

فلا تَحْرِمَنِّي نائلاً عن جنابةٍ   فإنّي امْرُؤٌ وَسْطَ القِبَابِ غَرِيبٌ

رجل جنبٌ۔ مسافر آدمی۔ الجنابہ مرد کا عورت سے ملنا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جمہور علماء امت فرماتے ہیں: انزال کی وجہ سے یا شرمگاہ کے شرمگاہ میں تجاوز کی وجہ سے آدمی ناپاک ہو جاتا ہے مگر یہ کہ وہ غسل کرلے۔ بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انزال سے آدمی ناپاک ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انما الماء من الماء (1)۔ غسل صرف انزال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ بخاری میں ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب مرد، عورت سے جماع کرے اور اسے انزال نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اس حصہ کو دھودے جو عورت سے مس ہوا ہے پھر وضو کرے اور نماز پڑھے''۔ ابو عبداللہ (امام بخاری) نے کہا: غسل کرنا احوط ہے (2)۔ دوسری صورت ہم نے علماء کے اختلاف کے اظہار کے لیے بیان کی ہے۔ مسلم نے اس کے ہم معنی اپنی صحیح میں حدیث نقل کی ہے اور آخر میں فرمایا: ابو العلاء بن شخیر نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بعض احادیث کو بعض سے منسوخ کرتے تھے جس طرح قرآن، بعض قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ منسوخ ہے۔ ترمذی نے کہا: یہ حکم اسلام کے ابتدائی دور میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں: اسی مسئلہ پر صحابہ، تابعین اور فقہاء کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ التقاء ختانین (شرمگاہ کا شرمگاہ میں داخل ہونے) سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پہلے صحابہ کرام کا اختلاف تھا پھر تمام نے حضرت عائشہ کی اس حدیث کی طرف رجوع کیا جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا: ''جب مرد اپنی بیوی کی رانوں اور پنڈلیوں کے درمیان بیٹھے اور شرمگاہ، شرمگاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہے'' (3)۔ یہ مسلم نے روایت کی ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب مرد اپنی بیوی کی رانوں اور پنڈلیوں کے درمیان بیٹھے پھر شرمگاہ کو شرمگاہ میں داخل کر دے تو اس پر غسل واجب ہے''۔ مسلم نے یہ زائد نقل کیا ہے ''اگرچہ اسے انزال نہ بھی ہو''۔ ابن قصار نے کہا: تابعین اور بعد والے علماء کا التقاء ختانین (شرمگاہوں کا ملنا) والی حدیث پر عمل میں اجماع ہے، اس کے بعد کہ پہلے لوگوں میں اختلاف تھا۔ اختلاف کے بعد جب اجماع صحیح ہے تو یہ اختلاف کو ساقط کرنے والا ہوگا۔ قاضی عیاض نے فرمایا: ہم کسی کو نہیں جانتے صحابہ کے اختلاف کے بعد اس نے یہ کہا ہو مگر جو اعمش سے حکایت کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد داؤد اصبہانی سے حکایت کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو (الماء من الماء) والی حدیث کو چھوڑنے پر ابھارا جب لوگوں نے اس مسئلہ پر اختلاف کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس حدیث کو احتلام پر محمول کیا ہے یعنی احتلام میں پانی کے انزال سے پانی کے ساتھ غسل کرنا واجب ہوتا ہے جب انزال نہ ہو اگرچہ وہ خواب میں دیکھے کہ وہ جماع کر رہا ہے تو اس پر غسل نہیں ہے اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کہا جاتا ہے: عبرت الطریق یعنی ایک جانب سے دوسری جانب تک راستہ طے کیا۔ عبرت النھر عبورا میں نے نہر کو عبور کیا۔ ھذا عبر النھر یہ نہر کا کنارہ ہے۔ کہا جاتا ہے: مُعْبر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 155
2۔ صحیح بخاری، کتاب الغسل، جلد 1، صفحہ 43
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 156

(عین کے ضمہ کے ساتھ) اور المعبر کشتی یا پل جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جاتا ہے۔ ھذا عابر السبیل یعنی راستہ سے گزرنے والا۔ ناقة عُبْرُ أسفار ایسی اونٹنی جس پر ہمیشہ سفر کیا جاتا ہے اور اس کے تیز چلنے کی وجہ سے صحراؤں اور گرمی کے وقت کو عبور کیا جاتا ہے۔

عَیْرَانَةٌ　سُرُحُ　الیَدَیْنِ　شِمِلَةٌ　عُبْرُ الهَوَاجِرِ کالهِزَفّ الخاضِب (1)

اونٹنی تیز رفتار، چاک و چوبند ہے گرمی کے لمحات کو عبور کرنے والی ہے جیسے لمبے پروں والے اور سرخ پنڈلیوں والی ہے۔
عبر القوم، قوم مر گئی۔ اور شاعر نے شعر کہا:

قضاء　الله　یغلب　کلّ　شئٍ　ویلعب　بالجَزُوع　و　بالصَبُورِ
فان　نَعْبَرْ　فإنّ　لنا　لُمَاتٍ　وإن　نَغْبُرْ　فنحن　على　نُذُورِ

شاعر کہتا ہے: اللہ کی قضا ہر چیز پر غالب ہے جزع فزع کی جائے یا صبر کیا جائے وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اگر ہم فوت ہو گئے تو ہمارے دوست ہیں اور اگر ہم بچ گئے تو بھی ہمیں ضرور موت آنے والی ہے گویا ہم نے اس کے آنے کی نذر مانی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، مجاہد اور حکم نے فرمایا: عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے مراد مسافر ہے۔ اور نماز کے قریب جانا کسی کے لیے صحیح نہیں ہے جب کہ وہ جنبی ہو مگر غسل کے بعد مگر مسافر تیمم کرے (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے، کیونکہ عام طور پر حضر میں پانی معدوم نہیں ہوتا اور گھر میں مقیم شخص پانی کے پائے جانے کی وجہ سے غسل کر لیتا ہے اور مسافر جب پانی نہیں پاتا تو تیمم کرتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اصحاب الرائے نے مسافر جنبی کے بارے میں کہا: جو ایسی مسجد سے گزرتا ہے جس میں پانی کا چشمہ ہے تو وہ پاک مٹی سے تیمم کرے پھر مسجد میں داخل ہو، چشمے سے پانی بھرے پھر مسجد کو پانی سے باہر لے آئے۔ اور ایک جماعت نے جنبی آدمی کو مسجد میں داخل ہونے پر رخصت دی ہے۔ اور بعض نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد: المومن لیس بنجیس مومن ناپاک نہیں ہے سے دلیل پکڑی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے بھی یہ کہا ہے۔ حضرت ابن مسعود، عکرمہ اور نخعی نے کہا: عابر السبیل سے مراد خطرے والا (3) جو مسجد سے گزرنے والا ہے۔ یہ عمرو بن دینار، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جنبی آدمی مسجد سے نہ گزرے مگر یہ کہ مسجد کے علاوہ کوئی چارہ نہ پائے تو تیمم کرے اور اس میں سے گزر جائے، اسی طرح ثوری، اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے جنبی کے بارے میں کہا: جب وضو کرے تو مسجد میں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے آیت کے سبب میں روایت کیا ہے کہ انصار کی ایک قوم تھی جن کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جب ان میں سے کسی کو جنابت لاحق ہوتی تو وہ مسجد سے گزرنے پر مجبور ہوتے (4)۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے، اس کی تائید ابوداؤد کی روایت سے ہوتی ہے جو جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کی ہے فرماتی ہیں:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جبکہ ان کے اصحاب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹا دو''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو لوگوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس امید سے کہ ان کے لیے رخصت نازل ہو جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹا دو میں حیض والی عورت اور جنبی کے لیے مسجد کو حلال نہیں کرتا'' (1)۔ اور صحیح مسلم میں ہے ''مسجد میں کوئی کھڑکی باقی نہ رہے سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دروازے بند کرنے کا حکم دیا، کیونکہ یہ مسجد کو گزرگاہ بنانے اور اس کو عبور کرنے کا موجب تھے حضرت ابوبکر کے اکرام اور خصوصیت کی خاطر ان کی کھڑکی کی استثناء فرمادی۔ کیونکہ عام طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جدا جدا نہیں ہوتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''کسی کے لیے مسجد سے گزرنے اور مسجد میں بیٹھنے کی اجازت نہیں مگر علی بن ابی طالب کو اجازت ہے''۔ اس روایت کو عطیہ العوفی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں اور کسی کے لیے درست نہیں کہ وہ مسجد میں جنبی حالت میں ہو سوائے میرے اور حضرت علی کے''۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس طرح ہونا جائز ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کمرہ مسجد میں تھا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمرہ مسجد میں تھا اگرچہ وہ کمرے مسجد میں نہ تھے لیکن مسجد سے متصل تھے اور ان کے دروازے مسجد میں تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد میں شمار کیا فرمایا: ''مسلمان کے لیے مناسب نہیں''...... الخ۔ وہ روایت جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد میں تھا ابن شہاب کی روایت ہے جو انہوں نے سالم بن عبداللہ سے روایت کی ہے فرمایا: ایک شخص نے میرے باپ سے حضرت علی اور حضرت عثمان کے بارے پوچھا کہ ان میں سے کون بہتر ہے۔ عبداللہ نے اسے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے اور اس کے پہلو میں حضرت علی کے گھر کی طرف اشارہ کیا مسجد میں ان کے علاوہ کوئی گھر نہیں تھا۔ آگے حدیث ذکر کی۔ یہ دونوں حضرات مسجد میں جنبی نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے اپنے گھر میں جنبی ہوتے تھے۔ ان کے گھر مسجد میں سے تھے، کیونکہ ان کے دروازے مسجد میں تھے جب وہ حالت جنابت میں گھروں سے نکلتے تھے تو مسجد کے راستہ سے گزرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان دونوں حضرات کی تخصیص ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزوں کے ساتھ خاص کیا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ خاص احکام میں سے یہ بھی ہو۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص کیا ہو پس ان کے لیے وہ رخصت ہو جو دوسروں کے لیے نہ ہو اور اگر ان کے گھروں کے دروازے مسجد میں تھے حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے دروازے کے علاوہ سب دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عمرو بن میمون نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سدوا الابواب الاباب علی (3)۔ سب دروازے بند کر دو سوائے حضرت علی کے دروازہ کے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 30
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 272
3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، جلد 2، صفحہ 214

فرمایا کہ ان کا دروازہ مسجد میں رہنے دیا۔ وہ اپنے گھر میں جنبی ہوتے تھے اور ان کا گھر مسجد میں تھا۔ رہا یہ قول کہ ''مسجد میں کسی کا دروازہ نہ رہے سوائے ابوبکر کے دروازہ کے''۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسجد میں کئی دروازے کھلتے تھے اور گھروں کے دروازے مسجد سے باہر تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کھڑکیوں کو بند کرنے کا حکم فرمایا لیکن حضرت ابوبکر کے اکرام کی خاطر اس کو چھوڑ دیا۔ الخوخات، سوراخ اور کھڑکی وغیرہ کو کہتے ہیں۔ حضرت علی کا دروازہ وہ مراد ہے جس سے آپ داخل ہوتے تھے اور نکلتے تھے۔ حضرت ابن عمر نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے علاوہ مسجد میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عطا بن یسار سے ثابت ہے کہ وہ فرماتے تھے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو جنابت لاحق ہوتی تھی وہ وضو کرتے تھے پھر مسجد میں آتے تھے اور اس میں باتیں کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ جنبی آدمی کے لیے مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے جب وہ وضو کرے اور امام احمد اور اسحاق کا مذہب بھی یہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وضو، جنابت کی حدث کو دور نہیں کرتا۔ ہر جگہ جو عبادت کے لیے متعین کی جاتی ہے وہ نجاست ظاہرہ سے پاک رکھی جاتی ہے مناسب ہوتا ہے کہ وہ شخص اس جگہ داخل نہ ہو جو اس عبادت کے لیے پسندیدہ نہیں اور اس کے لیے اس عبادت سے ملتبس ہونا صحیح نہیں۔ ان کے منقولہ احوال میں سے غالب یہ ہے کہ وہ گھروں میں غسل کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ محدث (بے وضو) کا پھر کیا حکم ہے؟ ہم کہیں گے اس کا وقوع زیادہ ہوتا ہے اور ہر وقت وضو کرنا شاق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں وہ ہے جو کفایت کرتا ہے۔ جب مسجد میں جنبی حالت میں ٹھہرنا جائز نہیں تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس کے لیے قرآن کو چھونا اور اس میں قرأت کرنا بھی جائز نہ ہو، کیونکہ اس کی زیادہ حرمت ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ واقعہ میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ ہمارے علماء کے نزدیک قرأت قرآن سے جنبی کو روکا جائے گا مگر یہ کہ تھوڑی سی آیات تعوذ کے لیے پڑھی جائیں (تلاوت قرآن کی نیت سے نہ ہوں)۔

موسیٰ بن عقبہ نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنبی اور حائض قرآن میں سے کوئی چیز نہ پڑھے'' (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے سفیان عن مسعر و شعبہ عن عمرو بن مرہ عن عبداللہ بن سلمہ عن علی کے سلسلہ سے روایت کی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت قرآن سے کسی کو نہیں روکتے تھے مگر یہ کہ وہ جنبی ہوتا۔ سفیان نے کہا: مجھے شعبہ نے کہا: میں نے اس سے بہتر حدیث بیان نہیں کی۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے فرمایا: حدثنا محمد بن بشار حدثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبہ عن عمرو بن مرہ۔ پھر اس کی ہم معنی حدیث روایت کی۔ یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس عن عبداللہ بن رواحہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی حالت میں ہر ایک کو قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ عکرمہ سے مروی ہے فرمایا: ابن رواحہ اپنی بیوی کے پہلو میں سوئے ہوئے تھے پھر وہ اپنی اس لونڈی کے پاس گئے جو حجرہ کے ایک کونہ میں تھی پھر اس سے مجامعت کی ان کی عورت گھبرا گئی اس نے اپنے بستر پر نہ پایا، ان کی بیوی اٹھی باہر نکلی تو اسے اپنی لونڈی پر پایا وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہاں سے چھری اٹھائی اور

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 49

نکل پڑی، اتنی دیر میں حضرت ابن رواحہ فارغ ہو چکے تھے وہ اسے ملے جب کہ وہ چھری اٹھائے ہوئے تھی۔ ابن رواحہ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ کیا ہے؟ اگر میں تجھے ایسی حالت میں پاتی جس میں پہلے میں نے تجھے دیکھا تھا تو میں تیرے کندھوں کے درمیان یہ چھری مارتی۔ ابن رواحہ نے کہا: تو نے مجھے دیکھا تھا؟ اس نے کہا: میں نے تجھے لونڈی پر دیکھا تھا۔ حضرت ابن رواحہ نے کہا: تو نے مجھے نہیں دیکھا، رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ ہم میں سے کوئی قرآن پڑھے جب کہ وہ جنبی ہو۔ بیوی نے کہا: تو پڑھ (وہ قرآن نہیں پڑھی ہوئی تھی) حضرت ابن رواحہ نے قرآن کی جگہ یہ اشعار پڑھ دیئے:

أتانا رسولُ الله يَتْلُو كتابَه　كما لاحَ مشهورٌ من الفجر ساطِعُ

أتى بالهدى بعد العمى فقلوبُنا　به موقناتٌ أنّ ما قال واقِعُ

يَبِيتُ يُجافي جنبَه عن فراشه　إذا اسْتَثْقَلَتْ بالمشركين المضاجِعُ

ہمارے پاس رسول اللہ تشریف لائے جب کہ وہ کتاب کی تلاوت کرتے تھے جس طرح فجر طلوع ہوتی ہے ہماری گمراہی کے بعد آپ ہدایت لے کر آئے ہمارے دل یقین رکھتے ہیں کہ جو آپ نے فرمایا ہے وہ یقیناً واقع ہونے والا ہے، وہ اپنے بستر سے جدا ہو کر رات گزارتا ہے جب کہ مشرکین پر بستر بھاری ہوتے ہیں۔

حضرت ابن رواحہ کی بیوی (سمجھ نہ سکی کہ یہ قرآن ہے یا اشعار ہیں) نے کہا: میں اللہ پر ایمان لائی اور میں نے آنکھ کو جھٹلایا۔ صبح ابن رواحہ رسول اللہ کے پاس گئے اور اپنا رات کا واقعہ ذکر فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے حتیٰ کہ آپ کی داڑھیں مبارک ظاہر ہو گئیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا اللہ تعالیٰ نے نماز سے منع فرمایا ہے مگر غسل کرنے کے بعد اور اغتسال کا معنی معقول ہے اور عربوں کے نزدیک اس کا لفظ معلوم ہے اس سے مراد مغسول پر پانی کے ساتھ ہاتھ ملنا ہے اسی وجہ سے عربوں نے اپنے قول غسلت الثوب اور أفضتُ عليه الماء و غمسته في الماء میں فرق کیا ہے جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لے کہ علماء کا جنبی کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ صرف اپنے جسم پر پانی انڈیل دے یا پانی میں غوطہ لگائے اور جسم کو ملے نہیں۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جسم کو ملے بغیر غسل کافی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنبی کو اغتسال کا حکم دیا ہے جس طرح وضو کرنے والے کو چہرہ اور ہاتھ دھونے کا حکم دیا ہے اور متوضی کے لیے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ پانی کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں پر ملے، اسی طرح جنبی آدمی کا جسم اور اس کا سر متوضی کے چہرہ اور ہاتھوں کے حکم میں ہے۔ یہ مزنی کا قول ہے اور اس کا اختیار ہے۔ ابو الفرج عمرو بن محمد مالکی نے فرمایا: یہ غسل کے لفظ سے معقول ہے، کیونکہ لغت میں اغتسال باب افتعال ہے اور جس نے اپنے ہاتھوں کو جسم پر نہیں مارا اور جس نے صرف پانی انڈیلا اور ہاتھ کو جسم پر نہیں مارا تو اہل زبان اسے غسل کرنے والا نہیں کہتے بلکہ اسے پانی کو انڈیلنے والا اور پانی میں غوطہ لگانے والا کہتے ہیں۔ فرمایا: اسی مفہوم پر نبی کریم سے آثار مروی ہیں، فرمایا: ''ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے پس تم اپنے بالوں کو دھوؤ اور اپنی کھال کو صاف کرو'' (1)۔ فرمایا:

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 16

انقاء (صاف کرنا) نہیں ہوتا مگر اس پر پانی گزارنے کے ساتھ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ دو اعتبار سے حجت نہیں (۱) اس کی تاویل میں مخالفت کی گئی ہے سفیان بن عیینہ نے کہا: وانقوا البشرۃ سے مراد شرمگاہ کو دھونا اور اسے صاف کرنا ہے۔ البشرۃ سے مراد شرمگاہ ہے۔ ابن وہب نے کہا: احادیث کی تفسیر میں ابن عیینہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

(۲) اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور اس میں فرمایا: یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسی طرح ابن داسہ کی روایت میں ہے اور اللولی کی روایت جوان سے مروی ہے اس میں حارث بن وجیہ ضعیف راوی ہے اور اس کی حدیث منکر ہے پس حدیث سے استدلال ساقط ہوا اور صرف زبان (لغت) پر اعتماد باقی رہ گیا جس طرح کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور اس کی تائید وہ قول کرتا ہے جو صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ لایا گیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور پیشاب کے پیچھے بہا دیا اور اسے دھویا نہیں (1)۔ یہ حضرت عائشہ نے روایت کیا ہے، اور اسی طرح ام قیس بنت محصن سے مروی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ جمہور علماء اور فقہاء کی ایک جماعت نے کہا: جنبی کے لیے پانی بہانا اور پانی میں غوطہ لگانا کافی ہے جب کہ پانی پورے جسم پر پہنچ جائے اگرچہ ہاتھوں سے نہ بھی ملے، کیونکہ حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ کی حدیث، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے متعلق یہی تقاضا کرتی ہے ان کی احادیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم پر پانی بہاتے تھے۔ محمد بن عبد الحکم نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوالفرج نے اس کی طرف رجوع کر لیا تھا اور اس کو امام مالک نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہاتھوں کو غسل میں جسم پر پھیرنے کا حکم دیا، کیونکہ ہوسکتا ہے جو ہاتھوں کو نہیں پھیرتا اس کے جسم کے اس حصہ تک پانی نہ پہنچے جہاں تک پانی پہنچانا واجب تھا۔ ابن عربی نے کہا: تعجب ہے ابوالفرج پر جس نے صاحب مذہب سے روایت کیا ہے کہ ہاتھ ملنے کے بغیر غسل نہیں ہوتا، حالانکہ امام مالک نے یہ نہ کبھی نصاً کہا ہے نہ تخریجاً، یہ ابوالفرج کے اوہام میں سے ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک سے نصاً روایت کیا گیا ہے۔ مروان بن محمد ظاہری نے کہا: جب کہ وہ شامی لوگوں میں ثقہ شخص ہے، فرماتے ہیں: میں نے مالک بن انس سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جس نے پانی میں غوطہ لگایا جب کہ وہ جنبی تھا اور اس نے وضو نہیں کیا تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کی نماز ہوگئی۔ ابوعمر نے کہا: اس روایت میں ہے کہ اس نے نہ ہاتھ سے جسم کو ملا اور نہ وضو کیا جب کہ امام مالک کے نزدیک غسل جائز ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ غسل جائز نہیں حتیٰ کہ وہ جسم کو ملے۔ انہوں نے چہرے اور ہاتھوں کو دھونے پر قیاس کیا ہے۔ اور جماعت کی حجت یہ ہے کہ جس نے اپنے اوپر پانی انڈیل دیا اس نے غسل کر لیا۔ عرب کہتے ہیں: بارش نے مجھے غسل دیا۔ حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا طریقہ بیان فرمایا تو انہوں نے ملنے کا ذکر نہیں فرمایا، اگر ملنا واجب ہوتا تو آپ ترک نہ فرماتے، کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں اگر آپ نے جسم کو ملا ہوتا تو آپ سے منقول ہوتا جیسا کہ پانی کے ساتھ بالوں کا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 139

خلال کرنا منقول ہے اور سر پر چلو ڈالنا منقول ہے اس کے علاوہ غسل کا طریقہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو کرنا منقول ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اس میں کوئی تعجب نہیں کہ عرب زبان میں ایک دفعہ ملنے، ایک دفعہ پانی انڈیلنے اور ایک دفعہ پانی بہانے سے غسل شمار کیا جاتا ہے جب ایسا ہے تو کوئی مانع نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وضو میں اپنے بندوں کو پانی کے ساتھ اپنے چہروں پر ہاتھوں کو گزارنے کا مکلف کیا ہو اور یہ اس کا غسل ہو اور وہ غسل جنابت اور حیض میں اپنے جسموں پر پانی بہا دینے کا مکلف ہو اور یہ اس کا غسل ہو جو سنت کے مطابق ہو اور لغت سے خارج نہ ہو اور ان دونوں امروں میں سے ہر امر فی نفسہ اصل ہو، ایک کو دوسرے کی طرف لوٹانا واجب نہ ہو، کیونکہ قیاساً اصول کو ایک دوسرے کی طرف نہیں لوٹایا جاتا۔ اس میں علماء امت کا کوئی اختلاف نہیں قیاساً اصول پر فروع کو لوٹایا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ کی حدیث اس کو رد کرتی ہے جو شعبہ مولیٰ ابن عباس نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب وہ غسل جنابت کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو سات مرتبہ اور اپنی شرمگاہ کو بھی سات مرتبہ دھوتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے فرمایا: نمازیں پچاس فرض تھیں، غسل جنات سات مرتبہ تھا، کپڑے سے پیشاب کا دھونا سات مرتبہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سوال کرتے رہے حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں، غسل جنابت ایک مرتبہ اور کپڑے سے پیشاب کو دھونا بھی ایک مرتبہ رہ گیا(1)۔ ابن عبد البر نے کہا: اس حدیث کی سند ابن عمر سے ہے اور اس میں ضعف اور لین ہے۔ اگرچہ ابو داؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور اس سے پہلے شعبہ مولیٰ ابن عباس مروی ہے اور شعبہ قوی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ کی حدیث ان دونوں احادیث کو رد کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ جو اپنے جسم پر اپنے ہاتھ نہ مار سکتا ہو تو سحنون نے کہا: قریب والا شخص اس کے جسم پر ہاتھ ملے یا وہ کپڑے کے ساتھ اس کے جسم کو ملے۔ اور ''الواضحہ'' میں ہے جہاں تک اس کے ہاتھ پہنچتے ہوں وہاں تک ہاتھوں کو گزارے پھر پانی بہائے یہاں تک کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے جہاں تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچے تھے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جنبی آدمی کا اپنی داڑھی میں خلال کرنا۔ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ اس پر واجب نہیں ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اس پر داڑھی کا خلال واجب ہے۔ ابن عبد الحکم نے کہا: ہمارے نزدیک یہ محبوب ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت میں اپنے بالوں کا خلال کرتے تھے اور یہ عام ہے اگرچہ اس میں ظاہر سر کے بالوں کا خلال ہے۔ علماء کے یہی دو قول ہیں۔ معنی کے اعتبار سے غسل میں پورے جسم کو گھیرنا واجب ہے اور داڑھی کے نیچے کی جلد بھی جسم میں سے ہے پس اس تک پانی کا پہنچانا واجب ہے اور ہاتھ سے اس کو ملنا واجب ہے فرض طہارت صغریٰ میں بالوں کی طرف منتقل ہوا، کیونکہ وہ تخفیف پر مبنی ہے بدل کی نیابت کی ضرورت نہیں اسی وجہ سے خفین پر مسح جائز ہے لیکن غسل میں جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں نبی کریم کا یہ قول اس کی تائید کرتا ہے: ''ہر بال کے نیچے جنابت ہے''(2)۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 33　2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 16

**مسئلہ نمبر 17**۔ ایک قوم نے مبالغہ کیا اور کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو واجب قرار دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ان علماء میں سے امام ابوحنیفہ بھی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناک اور منہ چہرہ سے ہیں ان کا حکم چہرے کے ظاہر کا حکم ہے جیسے رخسار اور پیشانی ہے۔ جو کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کو ترک کرے گا اور نماز پڑھے گا تو وہ نماز اعادہ کرے گا جس طرح جو شخص اعضاء کو دھوتے وقت کوئی جگہ دھونے سے چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن وضو میں جو کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو ترک کر دے اس پر اعادہ نہیں۔ امام مالک نے فرمایا: کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا نہ جنابت میں فرض ہیں، نہ وضو میں، کیونکہ یہ دونوں جگہیں پوشیدہ ہیں پس ان کا دھونا واجب نہیں جس طرح جسم کے اندر کے حصہ کو دھونا واجب نہیں۔ اسی وجہ سے محمد بن جریر طبری، لیث بن سعد، اوزاعی اور تابعین کی ایک جماعت نے بھی کہا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، حماد بن ابی سلیمان نے کہا: یہ دونوں وضو اور غسل میں فرض ہیں۔ یہ اسحاق، امام احمد بن حنبل اور بعض اصحاب داؤد کا قول ہے۔ زہری اور عطا سے اس قول کی مثل مروی ہے۔ امام احمد سے یہ بھی مروی ہے کہ کلی کرنا سنت ہے اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے۔ بعض اصحاب داؤد نے یہ بھی کہا ہے۔ اور ان علماء کی حجت جو ان کو واجب نہیں کہتے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا ذکر نہیں کیا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واجب کیا ہے اور نہ تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے۔ اور فرائض صرف ان صورتوں میں ثابت ہوتے ہیں۔ اور جنہوں نے ان دونوں کو واجب کیا، انہوں نے آیت کریمہ اور فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (المائدہ: 6) سے دلیل پکڑی ہے، جو چیز دھونے میں ایک میں واجب ہوتی ہے دوسرے میں بھی واجب ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی محفوظ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو وضو میں یا غسل جنابت میں ترک کیا ہو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قولاً اور فعلاً اس کی مراد کو بیان کرنے والے ہیں اور جنہوں نے کلی اور ناک میں پانی ڈالنے میں فرق کیا ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے دلیل پکڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل تو کیا لیکن اس کا حکم نہیں دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال مستحب ہیں واجب نہیں مگر دلیل کے ساتھ اور ناک میں پانی ڈالنے کا فعل کیا بھی ہے اور اس کا حکم بھی دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہمیشہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: غسل جنابت میں نیت کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا یہ نیت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحق اور ابوثور کا ہے۔ اسی طرح وضو اور تیمم میں بھی نیت کرنے کا حکم ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینہ: 5) سے تائید حاصل کی ہے اور اخلاص کا مطلب تقرب الی اللہ کی نیت کرنا ہے اور مومن بندوں پر جو اللہ نے فرض کیا ہے اس کی ادائیگی کا اللہ کی رضا کے لیے ارادہ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما الاعمال بالنیات (1) اور یہ عمل ہے۔ اوزاعی اور حسن نے کہا: بغیر نیت کے وضو اور تیمم جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: پانی کے ساتھ جو طہارت حاصل کی جاتی ہے وہ بغیر نیت کے بھی جائز ہے اور تیمم نیت کے ساتھ جائز ہے۔ انہوں نے اس کو نجاست کے ازالہ پر قیاس کیا ہے کہ وہ بالا جماع بغیر

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2

نیت کے بدنوں اور کپڑوں سے دور کی جائے تو وہ پاک ہوجاتے ہیں۔ اس کو ولید بن مسلم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ پانی کی وہ مقدار جس سے غسل کیا جائے امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ بن زبیر سے انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل جنابت ایک فرق سے کرتے تھے (1)۔ الفرق را کے سکون اور حرکت کے ساتھ ہے۔ ابن وہب نے کہا: الفرق لکڑی کا یہ ایک برتن ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں: اس میں پانچ اقساط آتے تھے جو بنی امیہ کے اقساط تھے۔ محمد بن عیسیٰ اعشی نے الفرق کی تفسیر تین صاع سے کی ہے اور یہ پانچ اقساط ہیں اور فرمایا: پانچ میں نبی کریم ﷺ کے بارہ مد آتے ہیں اور صحیح مسلم میں ہے سفیان نے فرمایا: الفرق، تین صاع ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم ﷺ ایک مد کے ساتھ وضو کرتے تھے اور ایک صاع سے لے کر پانچ مد پانی سے غسل کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے ''پانچ مکا کیک سے غسل کرتے تھے اور ایک مکوک سے وضو کرتے تھے'' (2)۔ یہ احادیث مخصوص کیل اور وزن کے بغیر پانی کے کم استعمال کے استحباب پر دلالت کرتی ہیں۔ انسان اتنا پانی استعمال کرے جو اسے کفایت کرے اور زیادہ پانی استعمال نہ کرے، کیونکہ زیادتی میں اسراف ہے اور اسراف مذموم ہے اور الاباضیہ کا مذہب زیادہ پانی کا استعمال کرنا ہے اور یہ شیطان کی طرف سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ...... الخ۔ یہ آیت تیمم ہے یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں نازل ہوئی انہیں جنابت لاحق ہوئی جب کہ وہ زخمی تھے، تو انہیں تیمم کرنے کی رخصت دی گئی۔ پھر یہ عام لوگوں کے لیے ہوگئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب غزوہ المریسیع میں صحابہ کو پانی کا نہ ملنا تھا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار ٹوٹ گیا تھا۔ اس حدیث کو امام مالک نے عبدالرحمٰن بن القاسم عن ابیہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اس آیت کو عنوان بنایا ہے۔ پھر یہ حدیث ذکر کی گئی ہے حدثنا محمد اخبرنا عبدة عن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشه قالت هلكت قلادة لاسماء فبعث النبي صلى الله عليه وسلم فى طلبها رجالاً فحضرت الصلاة وليسوا على وضوء ولم يجدوا ماء وصلوا وهم على غير وضوء فانزل الله تعالى آية التيمم (3)۔ یعنی حضرت عائشہ نے فرمایا حضرت اسماء کا ہار گم ہوگیا (جو حضرت عائشہ نے عاریۃً ان سے لیا ہوا تھا) تو نبی کریم ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اس کی تلاش میں بھیجا، نماز کا وقت ہوگیا جب کہ وہ وضو کیے ہوئے نہیں تھے انہوں نے پانی نہ پایا پس انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی، تو اللہ تعالیٰ نے آیت التیمم نازل فرمائی۔

میں کہتا ہوں: اس روایت کے ذکر کی جگہ نہیں اس میں ہے کہ حضرت اسماء کا ہار تھا۔ یہ امام مالک کی حدیث کے خلاف ہے۔ نسائی نے علی بن مسہر عن ہشام بن عروہ بن ابیہ عن عائشہ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے وہ حضرت اسماء سے عاریۃً لیا ہوا تھا حضرت عائشہ سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھیں، وہ ہار آہستہ سے ٹوٹ کر گر گیا یہ وہ مقام تھا جس کو الصلصل کہا جاتا تھا۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اس روایت میں ہشام سے مروی ہے کہ ہار حضرت اسماء کا تھا اور حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 148 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 149 3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

عائشہ نے ان سے عاریۃً لیا ہوا تھا۔ یہ امام مالک کی حدیث کا بیان ہے، کیونکہ انہوں نے فرمایا: حضرت عائشہ کا ہار گر گیا تھا۔ اور بخاری کی حدیث میں ہے: اسماء کا ہار گم ہو گیا تھا۔ اس میں ہے کہ اس جگہ کو الصلصل کہا جاتا تھا۔ ترمذی نے یہ حدیث اس طرح ذکر کی ہے حدثنا الحمیدی حدثنا سفیان حدثنا ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشہ انھا سقطت قلادتھا لیلۃ الابواء فارسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلین فی طلبھا۔ یعنی حضرت عائشہ کا ہار لیلۃ الابواء میں گر گیا آپ نے اس کی تلاش کے لیے دو آدمیوں کو بھیجا۔ اس روایت کو جو ہشام سے مروی ہے ہار کی نسبت حضرت اسماء کی طرف ہے لیکن حدیث نسائی کی وجہ سے یہ اضافت مستعیر ہے اور مکان کے بارے میں فرمایا: وہ الابواء تھا جیسا کہ امام مالک نے فرمایا ہے، لیکن اس میں بغیر شک کے ہے اور امام مالک کی حدیث میں فرمایا: ہم نے وہ اونٹ اٹھایا جس پر میں تھی تو ہم نے ہار اس کے نیچے پایا۔ بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہار پایا۔ ان تمام روایات کا معنی صحیح ہے۔ عقد اور قلادہ کے بارے میں نقل کرنے والوں کا اختلاف نہیں ہے اور نہ جگہ میں اختلاف ہے جو حدیث میں قدح کا باعث ہو اور نہ یہ حدیث کو کمزور کرتا ہے، کیونکہ حدیث سے مقصود اور مراد تیمم کا نزول ہے اور روایات قلادہ (ہار) کے بارے میں ثابت ہیں۔ رہا امام ترمذی کی حدیث میں یہ قول کہ آپ نے دو آدمی اس ہار کی تلاش میں بھیجے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک اسید بن حضیر تھا۔ شاید بخاری کی حدیث میں الرجال سے مراد یہی دو شخص ہوں اور انہیں جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو، کیونکہ جمع کا کم از کم فرد تثنیہ ہے یا ان دو کے پیچھے کسی اور کو بھیجا ہو پس لفظ کا اطلاق صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ وہ گئے انہوں نے تلاش کیا تو انہیں کوئی چیز نہ ملی جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اونٹ کو اٹھایا تو وہ ہار اس کے نیچے سے پا لیا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو زخم لگے وہ پھیل گئے پھر وہ جنابت سے دوچار ہوئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ اس کے خلاف نہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ صحابہ کرام کو غزوات میں زخم لگے تھے جن سے وہ واپس آئے تھے، کیونکہ ان میں جنگ ہوتی تھی تو صحابہ نے شکایت کی اور ہار بھی گم ہوا تھا تو آیت تیمم نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: ہار کا گم ہونا بنی مصطلق کے غزوہ میں تھا یہ اس کے قول کے مخالف نہیں جس نے کہا کہ مریسیع کے غزوۂ میں یہ معاملہ پیش آیا تھا، کیونکہ یہ ایک ہی غزوہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق کا غزوہ شعبان 6ھ میں لڑا تھا جیسا کہ خلیفہ بن خیاط اور ابوعمرو بن عبداللہ نے کہا ہے اور مدینہ پر حضرت ابوذر غفاری کو مقرر فرمایا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت نمیلۃ بن عبداللہ اللیثی کو مدینہ پر مقرر فرمایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق پر حملہ کیا تھا جب کہ وہ حملہ کرنے والے تھے۔ وہ پانی پر تھے جس کو المریسیع کہا جاتا تھا یہ قدید کی طرف سے تھا جو ساحل سے متصل ہے پس آپ نے قتل کر دیا جن کو قتل کر دیا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا اور اس دن مسلمانوں کا شعار تھا اَمِتْ اَمِتْ۔ بعض علماء نے کہا: بنی مصطلق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جمع ہوئے تھے اور انہوں نے آپ کا ارادہ کیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ان کی طرف نکلے اور انہیں پانی پر ملے۔ یہ تیمم کے آغاز اور اس کے سبب میں احادیث وارد ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: سورہ مائدہ کی آیت تیمم ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابوعمر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آیت تیمم نازل فرمائی اور یہی آیت وضو ہے جو سورۂ المائدہ میں ہے یا وہ آیت جو سورۃ

النساء میں ہے ان دو آیتوں کے علاوہ ہیں تیمم ذکر نہیں ہے اور یہ دونوں آیتیں مدنی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّرْضَىٰ مرض سے مراد بدن کا حد اعتدال سے نکل کر، اعوجاج اور شذوذ کی طرف چلا جانا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں زیادہ اور تھوڑا۔ جب مرض اتنی سخت ہو کہ پانی کی ٹھنڈک کی وجہ سے موت کا اندیشہ ہو یا اس بیماری کی وجہ سے جو اسے لاحق ہے پانی کے استعمال سے موت کا خطرہ ہو یا بعض اعضاء کے ضیاع کا خوف ہو تو بالا جماع تیمم کر سکتا ہے مگر حسن اور عطا سے مروی ہے کہ وہ طہارت حاصل کرے اگرچہ فوت بھی ہو جائے۔ یہ مردود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:78) (اور نہیں رکھی اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

دار قطنی نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ کے تحت روایت کیا ہے کہ جب آدمی کو اللہ کے راستے میں زخم لگے اور پھر وہ جنبی ہو جائے، پھر اسے خوف ہو کہ غسل کرے گا تو فوت ہو جائے گا (1) تو تیمم کرلے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: تیمم کی مریض کو رخصت دی گئی ہے۔

حضرت عمرو بن العاص نے تیمم کیا تھا جب انہیں سردی کی شدت سے ہلاک ہونے کا خوف ہوا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ غسل کا حکم دیا تھا اور نہ اعادہ کا حکم دیا تھا۔ اور اگر مرض تھوڑی ہو مگر اسے پانی کے استعمال سے مرض کے پیدا ہونے یا بڑھنے یا زخم کے آہستہ ٹھیک ہونے کا اندیشہ ہو تو بالا جماع ایسے لوگ بھی تیمم کریں۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے یہی محفوظ کیا ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: الباجی نے اس میں اختلاف ذکر کیا ہے۔ قاضی ابو الحسن نے کہا: جیسے صحیح شخص کو نزلہ یا بخار کا اندیشہ ہو اور اسی طرح مریض کو مرض کی زیادتی کا اندیشہ ہو۔ امام ابو حنیفہ نے اس کی مثل کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: پانی کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہیں مگر اسے تلف ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر جائز ہے۔ یہ قاضی ابو الحسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام شافعی نے کہا: مریض کے لیے تیمم مباح نہیں ہے مگر جب تلف ہونے کا خوف ہو، کیونکہ مرض کی زیادتی متحقق نہیں ہے، کیونکہ مرض زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی زیادہ نہیں ہوتی یقینی فرض کو مشکوک خوف کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں۔ ہم نے کہا: آپ کے قول میں تناقض ہے آپ نے کہا: سردی سے تلف ہونے کا خوف ہو تو تیمم کر لے، پس جس طرح تلف ہونے کے خوف سے تیمم مباح ہے اسی طرح مرض کا خوف تیمم کو مباح کرتا ہے، کیونکہ مرض سے بچاؤ ضروری ہے جس طرح تلف سے بچاؤ ضروری ہے۔ فرمایا: امام شافعی پر تعجب ہے فرماتے ہیں: اگر پانی اپنی قیمت سے ایک حبہ (دانہ) زائد پر ملے تو اس کا خریدنا لازم نہیں تاکہ مال محفوظ رہے اور اسے تیمم کرنا لازم ہے جب کہ یہاں اسے اپنے بدن پر مرض کا خوف ہے۔ یہ ان کا ایسا کلام نہیں ہے جس کا سننا درست ہو (3)۔

میں کہتا ہوں: قشیری ابو نصر عبد الرحیم نے اپنی تفسیر میں امام شافعی کا صحیح قول ذکر کیا ہے۔ وہ مرض جس کے لیے تیمم مباح ہوتا ہے وہ ہے جس میں روح کے فوت ہونے یا بعض اعضاء کے ضائع ہونے کا خوف ہو اگر وہ پانی استعمال کرے۔ اور اگر

1۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 177 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 441

مرض کے لمبے ہونے کا خوف ہو تو صحیح قول امام شافعی کا یہ ہے کہ اس کے لیے تیمم جائز ہے۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے یحییٰ بن ایوب عن یزید بن ابی حبیب عن عمران بن ابی انس عن عبدالرحمٰن بن جبیر عن عمرو بن العاص کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: مجھے غزوہ ذات السلاسل میں ایک ٹھنڈی رات کو احتلام ہو گیا مجھے ڈر لگا کہ اگر میں غسل کروں گا تو ہلاک ہو جاؤں گا، میں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھا دی، پس انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمرو! "تو نے اپنے ساتھیوں کو جنبی حالت میں نماز پڑھا دی ہے"؟ میں نے غسل نہ کرنے کی وجہ عرض کی اور میں نے کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے سنا ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ نبی کریم ﷺ ان کی بات سن کر مسکرا دیئے اور اسے کچھ بھی نہ فرمایا(1)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ خوف کی حالت میں تیمم مباح ہے اگرچہ یقین نہ بھی ہو۔ اس میں تیمم پر جنبی اسم کا اطلاق ہے اور اس میں یہ بھی جواز ہے کہ وضو کرنے والوں کو تیمم کرنے والا نماز پڑھا سکتا ہے۔ یہ ہمارے نزدیک دو اقوال میں سے ایک قول ہے اور یہ صحیح ہے۔ امام مالک نے اس کو مؤطا میں پڑھا ہے، موت تک اس آپ پر پڑھا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نماز نہ پڑھائے، کیونکہ وہ وضو کرنے والے سے فضیلت میں کم ہے اور امام کا حکم یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مرتبہ ہو۔ دارقطنی حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیمم کرنے والا، وضو کرنے والوں کو نماز نہ پڑھائے۔ اس کی سند ضعیف ہے(2)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک سفر میں نکلے ہم میں سے ایک شخص پر پتھر لگا اور اس کا سر زخمی کر دیا پھر اس زخمی کو احتلام ہو گیا اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: کیا تم میرے لیے تیمم میں رخصت دیکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم تیرے لیے رخصت نہیں پاتے جب کہ تو پانی پر قدرت رکھتا ہے۔ اس شخص نے غسل کیا اور وہ فوت ہو گیا۔ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو ہم نے آپ کو بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "انہوں نے اسے قتل کیا ہے اللہ انہیں قتل کرے"۔ انہوں نے کیوں نہ پوچھا جب وہ جانتے نہ تھے؟ جہالت کی شفا سوال ہے، اسے تیمم کرنا کافی تھا اور زخم پر پٹی باندھنا، پھر اس پر مسح کرنا اور اپنے پورے جسم کو دھونا کافی تھا۔

دارقطنی نے کہا: حضرت ابوبکر نے کہا: یہ سنت ہے اس کے ساتھ اہل مکہ منفرد ہیں اور اہل جزیرہ نے اسے حاصل کیا اور اس کو عطا عن جابر کے سلسلہ سے زبیر بن خریق کے علاوہ کسی سے روایت نہیں کیا اور وہ قوی نہیں ہے۔ اوزاعی نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے یہ عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور یہی درست ہے۔ اوزاعی سے مختلف صورتوں میں مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اوزاعی عن عطاء۔ بعض نے فرمایا: اوزاعی سے مروی ہے کہ مجھے عطا سے یہ خبر پہنچی۔ آخر میں اوزاعی نے عطا سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے مرسلاً روایت کی ہے اور یہی درست ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا: میں نے ابی اور ابوزرعہ سے اس کے متعلق پوچھا تو ان دونوں نے کہا: اس کو ابن ابی العشرین نے اوزاعی سے انہوں نے اسماعیل بن مسلم سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ حدیث کو مسند ذکر فرمایا(3)۔ داؤد نے فرمایا: ہر شخص جس پر مریض کا اطلاق ہوتا ہو اس کے لیے تیمم کرنا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 178 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 185 3۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 190

مَّرْضٰۤى (اگر تم بیمار ہو) ابن عطیہ نے کہا: یہ ایسا قول ہے جس کی مخالفت کی گئی ہے۔ علماء امت کے نزدیک تیمم اس کے لیے جائز ہے جس کو پانی کے استعمال سے موت کا خطرہ ہو یا پانی کا استعمال اسے اذیت دیتا ہو جیسے مجدور اور محصوب شخص۔ اور وہ دوسری بیماریاں جن پر پانی کے استعمال میں خوف ہوتا ہے (1) جیسا کہ حضرت ابن عباس سے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى سَفَرٍ، سَفَرٍ کے سبب تیمم جائز ہے خواہ سفر لمبا ہو یا مختصر ہو جب کہ پانی موجود نہ ہو۔ ایسے سفر کی کوئی شرط نہیں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ یہ امام مالک اور جمہور علماء کا مذہب ہے۔ ایک قوم نے کہا: وہ تیمم نہ کرے مگر اس سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے اور دوسرے علماء نے سفر طاعت کی شرط لگائی ہے یہ تمام اقوال ضعیف ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ سفر میں تیمم کے جواز پر علماء کا اجماع ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضر میں علماء کا تیمم کے جواز میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ تیمم سفر و حضر میں جائز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: صحیح مقیم کے لیے تیمم کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اسے تلف ہونے کا اندیشہ ہو یہی قول طبری کا ہے۔ امام شافعی، لیث اور طبری نے کہا: جب حضر میں پانی نہ ہو اور وقت کے ختم ہونے کا خوف بھی ہو تو صحیح اور بیمار تیمم کرے اور نماز پڑھے اور پھر نماز کا اعادہ کرے۔ ابو یوسف اور زفر نے کہا: حضر میں تیمم کرنا جائز نہیں نہ مرض کے لیے، نہ خوف وقت کے لیے۔ حسن اور عطا نے کہا: مریض تیمم نہ کرے جب وہ پانی پائے اور غیر مریض تیمم کرے اس اختلاف کا سبب آیت کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تیمم کی شرط میں مریضوں اور مسافروں کا ذکر کیا ہے، کیونکہ اغلب طور پر یہ وہ لوگ ہیں جو پانی نہیں پاتے جب کہ مقیم لوگ اغلب طور پر پانی پاتے ہیں اسی وجہ سے ان پر نص نہیں فرمائی۔ ہر وہ شخص جو پانی نہ پائے یا پانی کا استعمال اسے مانع ہو یا اسے نماز کے وقت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو مسافر نص کی وجہ سے تیمم کرے اور مقیم معنی کی وجہ سے تیمم کرے، اسی طرح مریض نص کی وجہ سے تیمم کرے اور صحیح معنی کی وجہ سے تیمم کرے، اسی طرح مریض نص صریح کی وجہ سے تیمم کرے اور صحیح معنی کی وجہ سے۔ اور جنہوں نے حضر میں تیمم سے منع کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیمم کی رخصت مریض اور مسافر کے لیے رکھی ہے جس طرح روزہ کا افطار اور نماز کی قصر بیمار اور مسافر کے لیے ہے اور تیمم صرف دو شرطوں کے ساتھ مباح ہے اور وہ مرض اور سفر ہیں صحیح مقیم اس میں داخل نہیں ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی شرط سے خارج ہے۔ رہا حسن اور عطا کا قول وہ پانی کے ہوتے ہوئے تمام لوگوں کو تیمم کرنے سے منع کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے پانی نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا تیمم کسی کے لیے مباح نہیں فرمایا مگر پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ ابو عمرو نے کہا: اگر جمہور کا قول نہ ہوتا اور مروی اثر نہ ہوتا تو حسن اور عطا کا قول صحیح ہوتا۔ واللہ اعلم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص کے لیے تیمم جائز فرمایا جب کہ وہ مسافر تھے، کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ پانی سے غسل کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے، پس مریض تیمم کا زیادہ مستحق ہے۔ میں کہتا ہوں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58

حضر میں تیمم کے جواز پر دلیل کتاب وسنت ہے جب کہ نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو جب وہ پانی کی طرف جائے۔

کتاب اللہ میں یہ ارشاد ہے: اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ یعنی مقیم جب پانی نہ پائے تو تیمم کرے۔ اس پر قشیری عبدالرحیم نے نص قائم کی انہوں نے کہا: قضا کے وجوب میں نظر قطعی ہے، کیونکہ حضر میں پانی کا عدم نادر عذر ہے اور قضا میں دو قول ہیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے اصحاب نے اس شخص کے بارے میں اسی طرح واضح فرمایا ہے جو حضر میں تیمم کرتا ہے۔ پس کیا جب وہ پانی پالے گا تو وہ نماز کا اعادہ کرے گا؟ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا اور یہی صحیح ہے۔ ابن حبیب اور محمد بن عبدالحکم نے فرمایا: وہ اعادہ کرے گا۔ یہ ابن المنذر نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ولید نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ غسل کرے اگرچہ سورج طلوع بھی ہو جائے۔

اور رہی سنت تو اس میں بخاری کی روایت ہے جو انہوں نے ابوالجہیم بن حارث صمۃ انصاری سے روایت کی ہے فرمایا: نبی کریم ﷺ بئر جمل کی طرف سے آئے انہیں ایک شخص ملا اس نے آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے اسے سلام کا جواب نہ دیا حتیٰ کہ آپ دیوار پر آئے، اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا پھر اسے سلام کا جواب دیا (1)۔ اس کو مسلم نے بھی نقل کیا ہے، اس میں بئر کا لفظ نہیں ہے۔ اس کو دار قطنی نے حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے اس میں ہے ثم رد علی الرجل السلام۔ یعنی پھر اس شخص پر سلام لوٹایا اور فرمایا: ''مجھے تجھ پر سلام لوٹانے سے کوئی چیز مانع نہ تھی مگر میں باوضو نہ تھا'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 24۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ، الْغَآىِٕطِ کا اصل معنی زمین کی پست جگہ ہے اور اس کی جمع الغیطان یا الاغواط آتی ہے، اسی وجہ سے غوطۃ دمشق کہتے ہیں۔ عرب قضاء حاجت کے لیے پست جگہ کا قصد کرتے تھے تا کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جائیں انسان سے نکلنے والے حدث کو بھی اتصال کی وجہ سے الغائط کہتے ہیں۔ غاط فی الارض یغوط بولا جاتا ہے زمین میں کوئی چیز غائب ہو جائے۔ زہری نے اسے الغیط سے مشتق کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ اس کی اصل الغیط ہو پھر تخفیف کی گئی ہو۔ الغوط کی واؤ کو یاء سے بدل دیا گیا۔ جس طرح لاحول میں لاحیل کہتے ہیں۔ اور او بمعنی واؤ ہے یعنی اگر تم مریض ہو یا سفر پر ہو اور تم میں سے کوئی پاخانہ سے آئے تو تیمم کرے پس تیمم کا موجب سبب حدث ہے نہ کہ مرض اور سفر۔ پس یہ حضر میں تیمم کے جواز کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور ''او'' میں صحیح یہ ہے کہ یہ اہل نظر کے نزدیک اپنے معنی میں ہے۔ ''او'' کا اپنا معنی ہے اور واؤ کا اپنا معنی ہے۔ یہ ان کے نزدیک حذف پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تم ایسے مرض میں مبتلا ہو جس میں تم پانی کو چھونے پر قدرت نہیں رکھتے یا سفر پر ہو اور پانی نہ پاؤ اور تمہیں پانی کی ضرورت ہو۔

**مسئلہ نمبر 25۔** الغائط کا لفظ طہارت صغری کو توڑنے والے تمام احداث کو شامل ہے۔ علماء کا ان احداث کے حصر میں اختلاف ہے۔ ان کے بارے میں عمدہ قول جو کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تین اقسام ہیں، ہمارے مذہب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے (۱) عقل کا زائل ہونا (۲) جسم سے عادۃً خارج ہونے والی اشیاء (۳) عورت کو چھونا۔ اور امام ابوحنیفہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 48
2۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 177

کے نزدیک جسم سے جو نجاست خارج ہوتی ہے۔ امام صاحب مخرج کی رعایت نہیں رکھتے اور لمس کو بھی ناقص وضو نہیں سمجھتے۔ اور امام شافعی اور محمد بن عبدالحکم کے مذہب پر وہ چیز جو سبیلین (شرمگاہیں) سے خارج ہو۔ وہ بھی معتاد کی رعایت نہیں کرتے اور یہ لمس کو ناقص شمار کرتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس کی عقل، اغماء یا جنوں یا سکر (نشہ) کی وجہ سے زائل ہو جائے اس پر وضو ہے اور نیند کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ دوسرے احداث کی طرح حدث ہے یا حدث نہیں ہے یا حدث کے گمان کی جگہ ہے؟ تین اقوال ہیں دو اطراف اور ایک وسط۔

طرف اول: مزنی ابو ابراہیم اسماعیل کا خیال ہے کہ نیند حدث ہے۔ دوسرے احداث کی طرح نیند کم ہو یا زیادہ اس کی وجہ سے وضو واجب ہوتا ہے۔ امام مالک کے قول کا مقتضیٰ بھی یہی ہے انہوں نے فرمایا: وہ وضو نہ کرے مگر اس حدث کی وجہ سے جو ذکر، دبر سے نکلے یا نیند کی وجہ سے۔ حضرت صفوان بن عسال کی حدیث کا مقتضیٰ بھی یہی ہے، نسائی، دارقطنی، ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے(1)۔ اور تمام سے عاصم بن ابی النجود کی حدیث سے زر بن جیش سے روایت کیا ہے فرمایا: میں صفوان بن عسال مرادی کے پاس آیا، میں نے کہا: میں آپ سے خفین پر مسح کے متعلق پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت صفوان نے فرمایا: ہاں میں ایک لشکر میں تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خفین پر مسح کرنے کا حکم دیا جب ہم پاؤں دھو کر ان میں داخل کریں جب سفر میں ہوں تو تین دن مسح کریں اور جب مقیم ہوں تو ایک دن مسح کریں اور ہم پیشاب، پائخانہ اور نیند کی وجہ سے خفین کو نہ اتاریں مگر جنابت کی وجہ سے۔ اس حدیث میں اور امام مالک کے قول میں الغائط، البول اور النوم میں برابری ہے۔ علماء نے فرمایا: قیاس یہ ہے کہ نیند جب زیادہ ہو اور عقل پر غالب آ جائے تو وہ حدث ہوتی ہے پس کم نیند کا بھی یہی حکم ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دُبر کا دھاگہ آنکھیں ہیں پس جب کوئی سو جائے تو وہ وضو کرے''(2)۔ یہ حکم عام ہے۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت معاویہ بن سفیان کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

دوسری طرف۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے وہ دلیل ہے کہ نیند ان کے نزدیک کسی حال میں بھی حدث نہیں ہے حتیٰ کہ سونے والے کو نیند کے علاوہ کوئی حدث لاحق ہو جائے، کیونکہ وہ اس کے سپرد ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے جب وہ سو جاتا ہے۔ اگر اس سے حدث نہ نکلے تو وہ نیند سے اٹھے اور نماز پڑھے۔ عبیدہ، سعید بن مسیب، اوزاعی اور ایک روایت میں محمود بن خالد سے یہ مروی ہے۔ جمہور علماء ان دونوں اطراف کے مخالف ہیں۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ہر سونے والا جو نیند کی وجہ سے بوجھل ہو جائے اور اس کی نیند لمبی ہو جائے تو اس پر وضو واجب ہے خواہ نیند کی حالت میں بھی ہو۔ یہی قول زہری، ربیعہ، اوزاعی اور ایک روایت میں ولید بن مسلم کا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا: اگر نیند ہلکی پھلکی ہو اس کے دل پر غالب نہ آئے تو وہ مضر نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: وضو نہیں ہے مگر اس پر جو پہلو کے بل سو جائے یا سرین کے بل سو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن الرسول۔ ایضاً حدیث نمبر 3458، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 27

جائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو بیٹھے ہوئے سو جائے اس پر وضو نہیں۔ ابن وہب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ ان اقوال میں سے صحیح امام مالک کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات عشاء کی نماز سے مشغول رہے آپ نے اسے مؤخر کر دیا حتیٰ کہ ہم مسجد میں سو گئے، پھر ہم بیدار ہوئے، پھر سو گئے پھر بیدار ہوئے، پھر ہمارے پاس نبی کریم ﷺ تشریف لائے پھر فرمایا: ''اہل زمین میں سے کوئی ایسا نہیں جو تمہارے علاوہ نماز کا انتظار کر رہا ہو۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے (1)'' اور یہ لفظ بخاری کے ہیں اور اسناد اور عمل کی جہت سے اس باب میں یہ حدیث واضح ہے۔ رہا مؤطا میں امام مالک کا قول اور حضرت صفوان بن عسال کا قول ان کی حدیث میں ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بھاری نیند جو نفس پر بھاری ہو جائے۔ اس حدیث کی دلیل کی وجہ سے اور اس کے ہم معنی احادیث کی وجہ سے یہی معنی مناسب ہے۔ حضرت صفوان کی حدیث کو وکیع نے مسعر سے انہوں نے عاصم بن ابی النجود سے روایت کیا ہے اس میں او نوم کی جگہ او ریح کے الفاظ ہیں۔ دار قطنی نے کہا: وکیع عن مسعر کے علاوہ کسی نے اس حدیث میں او ریح کے الفاظ روایت نہیں کیے۔

میں کہتا ہوں: وکیع امام ہے، ثقہ ہے۔ بخاری، مسلم اور دوسرے ائمہ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، پس حدیث حضرت صفوان سے اس شخص کا استدلال ساقط ہو گیا جس نے کہا کہ نیند حدث ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ضعیف ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو گئے جب کہ آپ سجدہ میں تھے حتیٰ کہ آپ نے خراٹے لیے پھر آپ اٹھے اور نماز پڑھی۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ تو سو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وضو اس پر ہے جو پہلو کے بل سو جائے جب وہ پہلو کے بل سو جائے گا تو اس کے مفاصل ڈھیلے ہو جائیں گے''۔ ابو خالد، قتادہ سے روایت کرنے میں اس میں منفرد ہے اور یہ صحیح نہیں ہے (2)۔ یہ دار قطنی کا قول ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ قول کہ ''وضو اس پر ہے جو پہلو کے بل سو جائے (3)'' یہ حدیث منکر ہے، اس کو ابو یزید دالانی کے علاوہ قتادہ سے کسی نے روایت نہیں کیا اس کا ابتدائی حصہ ایک جماعت نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس میں سے کوئی چیز ذکر نہیں فرمائی۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: یہ حدیث منکر ہے۔ قتادہ کے ثقہ اصحاب میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ابو خالد الدالانی اس میں منفرد ہے، علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور جو کچھ ان سے نقل کیا گیا ہے وہ حجت نہیں ہے۔ رہا امام شافعی کا قول کہ ہر سونے والے پر وضو ہے مگر جو تنہا بیٹھا ہو اور ہر وہ شخص جو استوا کی حد سے زائل ہو جائے اور سو جائے تو اس پر وضو ہے۔ یہ طبری اور داؤد کا قول ہے۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ بیٹھنے والا نیند سے بوجھل نہیں ہوتا وہ خفیف نیند کے معنی میں ہوتا ہے اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بیٹھ کر سو جائے اس پر وضو نہیں ہے اور جس نے پہلو رکھا اس پر وضو ہے'' (4)۔ رہا خارج ہونے والا عارضہ تو ہم کہتے ہیں امام

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 81　　2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 160
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 27۔ ایضاً حدیث نمبر 173، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 161

بخاری نے حدثنا قتیبه قال حدثنا یزید بن زریع عن خالد عن عکرمه عن عائشه کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک زوجہ محترمہ نے اعتکاف کیا، اس نے خون اور زردی دیکھی جب کہ تھال ان کے نیچے تھا اور وہ نماز پڑھ رہی تھی (1)، یہ نکلنے والا مواد غیر معتاد تھا، یہ ایک رگ تھی جو مرض کی وجہ سے پھٹ گئی تھی، جو اس طرح سبیلین سے نکلے ہمارے نزدیک اس کی وجہ سے وضو واجب نہیں ہوتا، جب کہ امام شافعی کا قول اس کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور ہماری توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حنفی پر رد ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ نجس خارج کی رعایت کرتا ہے پس امام مالک بن انس کا مذہب واضح اور صحیح ہے نفس میں کوئی تردد نہیں۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ، نافع، ابن کثیر، ابوعمرو، عاصم اور ابن عامر نے لامستم پڑھا ہے، حمزہ اور کسائی نے لمستم پڑھا ہے (2)۔ اس کے معنی میں تین اقوال ہیں (۱) تم جماع کرو (۲) تم مباشرت (جسم کا جسم کو چھونا) کرو (۳) یہ دونوں امر جمع ہوں۔ اور اکثر علماء کے نزدیک لامستم کا بھی یہی معنی ہے مگر محمد بن یزید سے حکایت کیا جاتا ہے کہ اس نے کہا: لغت میں لامستم کا معنی قبلتم تم نے بوسہ دیا یا اس کی مثل کوئی فعل ہے، کیونکہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کے لیے فعل ہوتا ہے اور فرمایا: لمستم کا معنی چھا جانا اور جماع کرنا ہے، اس میں عورت کے لیے کوئی فعل نہیں ہے۔

علماء کے اس آیت کے حکم میں پانچ مذاہب ہیں (۱) ایک جماعت نے کہا: یہاں ملامست، ہاتھ کے ساتھ چھونے کے ساتھ مختص ہے اور جنبی کا ذکر نہیں ہے مگر پانی کے ساتھ معنی مراد میں وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى کی وجہ سے وہ اس میں داخل نہیں پس اسے تیمم کی کوئی گنجائش نہیں وہ غسل کرے گا یا نماز کو چھوڑ دے گا حتیٰ کہ وہ پانی پالے گا۔ یہ قول حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ کے قول کے ساتھ اس مسئلہ میں کسی مجتہد اور حاملین آثار میں سے کسی نے فتویٰ نہیں دیا۔ اس کی وجہ حضرت عمار، حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوذر کی حدیث ہے جو نبی کریم ﷺ سے جنبی کے تیمم کے بارے مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس قول کے برعکس قول کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ملامست سے مراد یہاں جماع ہے پس جنبی تیمم کرے گا اور ہاتھ کے ساتھ چھونے والے کا یہاں کوئی ذکر نہیں اور ہاتھ کے ساتھ چھونا نہ حدث ہے، نہ وضو کے لیے ناقص ہے۔ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو لذت کے لیے بوسہ دے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا (3) اور انہوں نے اس کو تائید دارقطنی کی حضرت عائشہ کی روایت سے دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو بوسہ دیتے تھے پھر نماز کے لیے نکلتے تھے اور وضو نہیں فرماتے تھے۔ عروہ نے کہا: میں نے کہا: وہ نہیں ہوگی مگر تم؟ تو حضرت عائشہ ہنس پڑیں (4)۔ امام مالک نے کہا: جماع کرنے والا تیمم کرے گا اور جب ہاتھ سے چھوئے جب کہ لذت محسوس کرے تو تیمم کرے گا اور جب بغیر شہوت کے چھوئے گا تو اس پر وضو نہیں ہے۔ امام احمد اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ یہی آیت کا مقتضی ہے۔ علی بن زیاد نے کہا: اگر عورت پر موٹا کپڑا ہو تو مرد پر کچھ نہیں ہے، اگر باریک کپڑا ہو تو مرد پر وضو ہے۔ عبد الملک بن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 45　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 59　4۔ سنن دارقطنی، کتاب الوضو، جلد 1، صفحہ 138

الماجشون نے کہا: جس نے اپنی بیوی کو ملاعبت کے لیے چھوا تو وہ وضو کرے خواہ لذت محسوس ہو یا نہ ہو۔ القاضی ابو الولید الباجی نے ''المنتقی'' میں فرمایا: امام مالک اور ان کے اصحاب کے مذہب کی تحقیق یہ ہے کہ وضو لذت کے قصد کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اس کے بغیر نہیں اور جس نے چھونے سے لذت کا قصد کیا اس پر وضو واجب ہے، اس سے اسے لذت آئے یا لذت نہ آئے یہی معنی ہے جو ''العتبیہ'' میں عیسیٰ عن ابن القاسم کی روایت سے ہے۔ اور صرف حرکت کا ہونا تو ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر وضو واجب نہیں ہوتا اور ذکر کا دھونا بھی نہیں ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ لمس یا مذی ہو۔ شیخ ابو اسحاق نے کہا: اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ یہی قول امام مالک کا ''مدونہ'' میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب مرد اپنے جسم کو عورت کے جسم کے ساتھ لگائے خواہ وہ ہاتھ ہو یا کوئی اور عضو ہو تو اس کی طہارت ٹوٹ جائے گی۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، زہری اور ربیعہ کا یہی قول ہے۔ اوزاعی نے کہا: جب ہاتھ کے ساتھ لمس ہو تو طہارت ٹوٹ جائے گی اور اگر بغیر ہاتھ کے ہو تو طہارت نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلمسوہ بایدیھم یہ پانچ مذاہب ہیں۔ ان میں سے مضبوط امام مالک کا مذہب ہے اور یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول ہے کہ ملامست جماع کے علاوہ ہے اور اس سے وضو واجب ہوتا ہے اس کی طرف کثیر علماء کی رائے ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہی آیت کے معنی سے ظاہر ہے، کیونکہ اس آیت کی ابتدا میں ہے: وَ لَا جُنُبًا۔ یہ جماع کا فائدہ دیتا ہے اور اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ یہ حدث کا فائدہ دیتا ہے اور لامستم، لمس اور بوسہ دینے کا فائدہ دیتا ہے پس یہ تین جملے تین احکام کے لیے ہیں یہ علم اور اعلام میں غایت ہے۔ اگر لمس سے مراد جماع ہوتا تو کلام میں تکرار ہوتا (1)۔

میں کہتا ہوں: امام ابو حنیفہ نے جس حضرت عائشہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ مرسل ہے اس کو وکیع نے اعمش سے انہوں نے حبیب بن ابی ثابت سے انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ یحییٰ بن سعید نے کہا: اعمش عن حبیب عن عروہ کی حدیث کو ذکر کیا اور فرمایا: سفیان ثوری اس کو تمام لوگوں سے زیادہ جاننے والے تھے۔ انہوں نے کہا: حبیب نے عروہ سے کچھ نہیں سنا ہے۔ یہ دارقطنی نے کہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ تم مرسل کو بیان کرتے ہو تمہیں اس کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ ہم کہتے ہیں ہم نے آیت کے ظاہر اور صحابہ کے عمل کی وجہ سے اس حدیث کو چھوڑ دیا۔ اگر کہا جائے کہ ملامست سے مراد جماع ہے اور یہ حضرت ابن عباس سے مروی بھی ہے۔ ہم کہیں گے ان کی حضرت عمر، حضرت ابن عمر نے مخالفت کی ہے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود جو کوفی ہیں انہوں نے بھی حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کی متابعت کی ہے پھر تم کیوں ان کی مخالفت کرتے ہو؟ اگر کہا جائے کہ ملامسۃ باب مفاعلہ ہے اور باب مفاعلہ دو آدمیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ہاتھ سے چھونا تو ایک شخص کی طرف سے ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ ملامست سے مراد جماع ہے۔ ہم کہیں گے ملامست کا مقتضیٰ دونوں جسموں کا ملانا ہے خواہ وہ ایک کی طرف سے ہو یا دونوں کی طرف سے ہو، کیونکہ ان میں سے ہر ایک لامس اور ملموس ہوتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ملامست کبھی ایک کی طرف سے بھی ہوتی ہے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملامسہ سے منع

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 444

فرمایا۔ کپڑا ملموس (چھوا گیا) ہوتا ہے لامس (چھونے والا) نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عمر نے اپنے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: انا یومئذ قد ناهزت الاحتلام (میں اس وقت قریب البلوغ تھا) اس میں باب مفاعلہ ایک کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگر کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حدث کا سبب ذکر فرمایا اور وہ ہے پائخانہ سے آنا تو جنابت کا سبب بھی ذکر فرمایا اور وہ ہے ملامست۔ پس پانی کے نہ ہونے کے وقت حدث اور جنابت کا حکم بیان فرمایا جس طرح کہ پانی کے موجود ہونے کے وقت ان دونوں کا حکم بیان فرمایا۔ تو ہم کہیں گے ہم لفظ کو جماع اور لمس پر محمول کرنے سے منع نہیں کرتے۔ یہ دونوں حکموں کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور لمستم بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا امام شافعی کا مذہب کہ جو عورت کو اپنے بعض اعضاء سے چھوئے جب کہ اس کے اور عورت کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو شہوت کے لیے ہو یا بغیر شہوت کے ہو اس پر وضو واجب ہے۔ یہ قرآن کا ظاہر ہے۔ اس طرح اگر عورت نے مرد کو چھوا تو پھر بھی مرد پر وضو واجب ہے، لیکن بالوں کو چھوا تو وضو واجب نہ ہوگا، کیونکہ جس نے عورت کے بالوں کو چھوا اس پر وضو نہیں خواہ اس نے شہوت سے چھوا ہو یا بغیر شہوت کے۔ اسی طرح دانتوں اور ناخنوں کو چھونے کا حکم ہے، کیونکہ یہ جسم کے مخالف ہیں اگر احتیاطاً بالوں کو چھونے والا وضو کر لے تو اچھا ہے۔ اگر مرد نے ہاتھ سے چھوا یا عورت نے مرد کو اپنے ہاتھ سے چھوا کپڑے کے اوپر سے، پھر لذت محسوس کی یا لذت محسوس نہ کی تو اس پر کچھ نہیں ہوگا حتیٰ کہ دوسرے جسم تک جسم کو پہنچائے، خواہ عمداً ایسا کرے یا بھول کر کرے، عورت زندہ ہو یا مردہ ہو جب کہ وہ اجنبیہ ہو۔ جب کوئی چھوٹی بچی کو چھوئے یا بوڑھی کے ہاتھ سے چھوئے یا اپنی کسی محرم عورت کو چھوئے جس سے اس کا نکاح حلال نہیں ہے، اس کے متعلق ان کا قول مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: وضو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ اس میں بچی، بوڑھی کی کوئی تفریق نہیں فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وضو نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ ان میں شہوت کا کوئی دخل نہیں۔ مروزی نے کہا: امام شافعی کا قول ظاہر کتاب کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ شہوت اور غیر شہوت کا ذکر نہیں فرمایا۔ اسی طرح جن صحابہ نے وضو کو واجب کہا ہے انہوں نے بھی شہوت کی شرط نہیں لگائی۔ فرمایا: یہی عام تابعین کا قول ہے۔ مروزی نے کہا: امام مالک جو کپڑے کے اوپر سے لذت اور شہوت کی رعایت کرتے ہیں اور وضو کو واجب کرتے ہیں اس پر ان کی موافقت لیث بن سعد نے کی ہے۔ ہم نہیں جانتے ان کے علاوہ کسی نے ایسا کہا ہو۔ فرمایا: یہ نظر میں بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس نے ایسا کیا وہ عورت کے کپڑے کو چھونے والا ہے۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر چھونے سے اسے لذت محسوس ہو تو اس پر وضو واجب نہیں اسی طرح کپڑے کے اوپر سے جس نے چھوا وہ عورت کو چھونے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: مروزی نے جو ذکر کیا ہے کہ امام مالک کی صرف لیث بن سعد موافقت کرنے والے ہیں۔ حافظ ابوعمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ یہی قول اسحاق اور امام احمد کا ہے۔ امام شعبی اور امام نخعی سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: جب چھوئے اور لذت محسوس ہو تو وضو واجب ہے اگر لذت محسوس نہ ہو تو وضو واجب نہیں رہا۔ یہ قول کہ نظر میں یہ صحیح نہیں۔ یہ بھی ان کا قول صحیح نہیں۔ حضرت عائشہ سے صحیح خبر میں آیا ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سوئی ہوئی تھی اور میرے پاؤں آپ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ سے اشارہ

کرتے تو میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی اور جب آپ کھڑے ہوتے تو میں پھر پاؤں پھیلا دیتی، فرمایا: اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے(1)۔ یہ نص ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ کو چھوتے تھے، کیونکہ آپ حضرت عائشہ کے پاؤں چھوتے، جیسا کہ قاسم کی روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے، ''جب آپ سجدہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو میرے پاؤں کو چھوتے تو میں پاؤں سکیڑ لیتی (2)'' اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ اَوْ لٰمَسْتُمُ کے قول کے عموم کو خاص کرتی ہے۔ آیت کے ظاہر کی وجہ سے ہر چھونے والے کا وضو ٹوٹ جانا واجب ہے خواہ وہ جیسے بھی چھوئے۔ سنت اور کتاب اللہ کا بیان ہے کہ وضو بعض چھونے والوں پر ہے اور بعض پر نہیں ہے اور جن پر وضو نہیں ہے وہ ایسے افراد ہیں جو لذت محسوس نہ کریں اور نہ لذت کا قصد کریں۔ اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ شاید حضرت عائشہ کے قدموں پر کپڑا ہو یا آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کے پاؤں کو اپنی آستین ماری ہو۔ ہم کہیں گے الغمز کی حقیقت ہاتھ مارنا ہے۔ اسی سے ہے: غمزت الکبش۔ یعنی تو مینڈھے کو روک لیتا ہے تاکہ تو دیکھے کہ کیا وہ موٹا ہے یا نہیں؟ آستین کے ساتھ مارنا غمز نہیں کہلاتا۔ عام طور پر سونے والے آدمی کا پاؤں ظاہر ہوتا ہے خصوصاً اس کے پاؤں لمبے کرنے اور اس کو سکیڑنے کی حالت میں۔ یہی حالت اس وقت بھی تھی۔ کیا آپ نے حضرت عائشہ کا عمل ملاحظہ نہیں فرمایا کہ جب آپ کھڑے ہوتے تو حضرت عائشہ ٹانگیں پھیلا دیتیں اور آپ کا قول کہ ''اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے''۔ حضرت عائشہ سے صراحۃً مروی ہے فرماتی ہیں میں اپنی ٹانگیں نبی کریم ﷺ کی سمت کیے ہوئے ہوتی تھی جب کہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے، جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے اپنا ہاتھ مارتے تو میں ٹانگیں سکیڑ لیتی جب آپ کھڑے ہوتے تو اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غمز حقیقت میں ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کو بستر پر نہ پایا میں نے آپ کو تلاش کیا تو میرے ہاتھ آپ ﷺ کے قدموں کے بطن پر پڑے جب کہ آپ مسجد (سجدہ) میں تھے اور آپ کے پاؤں سیدھے کھڑے تھے(3)۔ (الحدیث) جب حضرت عائشہ نے آپ ﷺ کے قدموں پر ہاتھ رکھا جب کہ آپ ﷺ سجدہ میں تھے تو آپ ﷺ نے سجدہ کو لمبا کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا مگر بعض چھونے والوں کا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کے قدموں پر کوئی چیز موجود ہو جیسا کہ مزنی نے کہا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قدم، قدم تب کہلاتا ہے جب کوئی چیز حائل نہ ہو حتیٰ کہ حائل ثابت ہو جائے۔ اصل یہی ہے کہ ہر چیز ظاہر پر محمول ہوتی ہے بلکہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے نص کی مانند مواد جمع ہو جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کو مجبور کرے اور مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ سے مل جائے جب کہ عورت کو لذت نہ ہوئی ہو یا وہ سوئی ہوئی ہو اور لذت محسوس نہ کرے اور اسے شہوت نہ ہو تب بھی عورت پر غسل واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کا حکم ہے جس نے شہوت کے ساتھ بغیر شہوت کے بوسہ دیا یا چھوا تو اس کی طہارت ٹوٹ گئی اور اس پر وضو واجب ہے، کیونکہ ٹٹولنے، چھونے اور بوسہ دینے میں فعل ہے نہ کہ لذت۔ ہم کہیں گے ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اعمش وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے جس اجماع کا تم نے دعویٰ کیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 56	2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 74	3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 192

تھا ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ اجماع سے استدلال محل نزاع ہے پس یہ لازم نہیں ہوگا اور ہم نے اپنے مذہب کی صحت پر احادیث صحیحہ سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے کہا: جیسا کہ تم نے کہا ہے کہ اس قول کی طرف پہلے کوئی نہیں گیا، حالانکہ ان کے شیخ امام مالک کا یہی قول ہے جیسا کہ ہمارے نزدیک مشہور ہے۔ ''جب حدیث صحیح ہے تو تم اس کو لازم پکڑو اور میرے قول کو چھوڑ دو''۔ جب حدیث اس کے متعلق ثابت ہے تو پھر تم اس کا اقرار کیوں نہیں کرتے پس تمہارے مذہب کے مطابق جو شخص اپنی بیوی کو مارے اور اسے ادب سکھانے کے لیے ہاتھ سے طمانچہ مارے اور اس پر سختی کرنے کے لیے ایسا کرے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ مقصود فعل کا وجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق کوئی بھی ایسا نہیں کہتا۔ امام مالک اور دوسرے ائمہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نواسی امامہ بنت ابی العاص کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے نماز پڑھی جب آپ رکوع فرماتے تو اسے اتار دیتے اور جب سجدہ سے اٹھتے تو اسے پھر سے اٹھا لیتے (1)۔ یہ امام شافعی کے ایک قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا ہے کہ اگر کسی نے چھوٹی بچی کو چھوا تو اس کی طہارت ٹوٹ گئی آپ نے النساء کے لفظ سے دلیل پکڑی ہے۔ یہ ضعیف ہے، کیونکہ چھوٹی بچی کا چھونا دیوار کو چھونے کی مانند ہے اور ذوات المحارم کے بارے میں امام شافعی کا قول مختلف ہے، کیونکہ اس میں لذت کا اعتبار نہیں کرتے۔ ہم لذت کا اعتبار کرتے ہیں جہاں لذت پائی جائے گی وہاں حکم پایا جائے گا اور یہ وضو کا وجوب ہے۔ رہا اوزاعی کا قول کہ وہ خاص ہاتھ سے چھونے کا اعتبار کرتے ہیں، کیونکہ چھونا اکثر ہاتھ سے ہوتا ہے، پس اس نے ہاتھ سے چھونے کو خاص کیا ہے دوسرے اعضاء کا اعتبار نہیں کیا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے پاؤں اپنی عورت کے کپڑوں میں داخل کرے اور اس کی شرمگاہ یا اس کے بطن کو مس کرے تو اس سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور جو اپنی بیوی کو بوسہ دیتا ہے اس کے بارے میں فرمایا: اگر وہ مجھ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے گا تو میں اسے وضو کرنے کو کہوں گا اور اگر وہ وضو نہیں کرے گا تو میں اس کو عیب نہیں لگاؤں گا۔ ابو ثور نے کہا: اس پر وضو نہیں جس نے اپنی بیوی کو بوسہ دیا یا جسم سے جسم لگایا یا اسے چھوا۔ یہ امام ابو حنیفہ کے مذہب پر مسئلہ تخریج کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 27**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً یعنی تم وہ اسباب نہ پاؤ جن کے ساتھ مسافر پانی پاتا ہے اور وہ یا تو سارے اسباب نہ پائے یا بعض اسباب نہ پائے یا اسے دوست کے فوت ہونے کا خوف ہو یا پانی طلب کرنے کی صورت میں سواری پر خوف ہو یا اسے چوروں یا درندوں کا خطرہ ہو یا وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا اپنے اوپر پیاس کا اندیشہ ہو یا دوسروں کی پیاس کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح اسے شوربا کی ضرورت ہو جو وہ اپنے نفس کی مصلحت کے لیے پکاتا ہے۔ ان مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت پائی جائے تو وہ تیمم کرے اور نماز پڑھے اور مریض کے لیے پانی کا نہ ہونا سمجھا جائے گا اگر وہ ایسا شخص نہ پائے جو اسے پانی دے یا اسے پانی کے استعمال سے نقصان کا خدشہ ہو اور صحیح مقیم کے لیے پانی کا نہ ہونا سمجھا جائے گا جب کہ وہ بہت مہنگا ملتا ہو اور یہ مہنگائی تمام صورتوں کو شامل ہے یا وہ مقیم شخص قید کیا گیا ہو یا باندھا گیا ہو۔ حسن نے کہا: آدمی اپنے تمام مال سے پانی کو خریدے اور خود مال سے محروم رہ جائے۔ یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ دین آسان

1۔ موطا امام مالک، کتاب جامع الصلوٰۃ، صفحہ 156

ہے۔ایک گروہ نے کہا: وہ شخص مال کے ساتھ پانی خریدے جب اسے قیمت سے تہائی یا کچھ زائد قیمت نہ دینی پڑے۔ایک طائفہ نے کہا: درہم کی قیمت کا پانی دو اور تین دراہم کے ساتھ خریدے۔ یہ تمام امام مالک کے مذہب میں اقوال ہیں۔اشہب سے پوچھا گیا: کیا ایک مشکیزہ دس دراہم میں خریدا جائے گا؟ انہوں نے کہا: میں لوگوں پر یہ تکلیف نہیں دیکھتا۔امام شافعی نے فرمایا: بغیر زیادہ قیمت کے خریدے۔

**مسئلہ نمبر 28**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کیا صحت تیمم میں پانی کا طلب کرنا شرط ہے یا نہیں؟ امام مالک کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ یہ شرط ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔قاضی ابو محمد بن نصر کا نظریہ ہے کہ پانی طلب کرنا صحت تیمم کے لیے شرط نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ان کے راستہ سے دو غلوۃ (600 سو ہاتھ سے لے کر 800 ہاتھ) تک کے فاصلے پر سفر میں پانی ہوتا تو وہ اپنے راستہ سے نہ پھرتے۔اسحاق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی طلب کرنا لازم نہیں مگر اپنی جگہ میں (جہاں وہ ہے) اور انہوں نے حضرت ابن عمر کی حدیث ذکر کی ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔اور مؤطا میں امام مالک کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ تیمم کا استعمال کرنا جائز نہیں مگر پانی طلب کرنے کے بعد۔اور قیاس کی جہت سے بھی یہی درست ہے، کیونکہ یہ بدل ہے اس کا حکم دیا گیا ہے مبدل سے عجز کی صورت میں اور اس کا فعل جائز نہیں مگر مبدل کے یقینی طور پر نہ ہونے کے ساتھ جس طرح کفارہ میں غلام آزاد کرنے کے ساتھ روزہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا اور پانی معدوم ہوگا تو مندرجہ ذیل صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔مکلف وقت کے اندر پانی ملنے سے مایوس ہوگا یا اسے پانی ملنے کا گمان غالب ہوگا اور اسے پانی ملنے کی قوی امید ہوگی یا دونوں صورتیں برابر ہوں گی۔ یہ تین احوال ہیں (۱) اس کے لیے اوّل وقت میں تیمم کرنا اور نماز پڑھنا مستحب ہے، لیکن جب پانی کی فضیلت فوت ہوگی تو اس کے لیے اوّل وقت کی فضیلت بچانا مستحب ہے۔

(۲) وقت کے درمیان تیمم کرے یہ امام مالک کے اصحاب نے امام مالک سے حکایت کیا ہے پس وہ پانی کی فضیلت کے ادراک کی امید پر نماز کو مؤخر کرے جب تک کہ پہلے وقت کی فضیلت فوت نہ ہو، کیونکہ پہلے وقت کی فضیلت درمیانے وقت میں پائی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ پہلے وقت کے قریب ہے

(۳) نماز کو آخر وقت میں پانی ملنے تک مؤخر کرے، کیونکہ پانی کی فضیلت اوّل وقت کی فضیلت سے اعظم ہے، کیونکہ اول وقت کی فضیلت مختلف فیہ ہے اور پانی کی فضیلت متفق علیہ ہے اور اوّل وقت کی فضیلت کا بغیر ضرورت کے ترک کرنا جائز نہیں اور پانی کی فضیلت کا ترک کرنا ضرورت کے لیے جائز ہے اور اس میں وقت، آخری وقت مختار ہے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔

اگر وقت کے آخر میں پانی کو پالینا جان لے پھر وقت کی ابتدا میں تیمم کرے اور نماز پڑھ لے تو ابن قاسم نے کہا: یہ جائز ہوگا اگر پانی پالے گا تو وقت میں اعادہ کرے گا۔عبدالملک بن الماجشون نے کہا: اگر پانی اس کے بعد پالے گا تو اعادہ کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 30**۔اس پانی کے پانے کا اعتبار ہوگا جو طہارت کے لیے کافی ہو، کیونکہ اگر کفایت سے کم پانی پائے تو تیمم

کرے اور جو تھوڑا سا پانی پائے اس کو وضو کے لیے استعمال نہ کرے۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا ایک قول یہی ہے۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو فرض کیا ہے پانی یا مٹی۔ اگر پانی اتنا نہ ہو جو تیمم سے مستغنی کر دے تو اس پانی کا شرعاً موجود نہ ہونا سمجھا جائے گا، کیونکہ اس کے پائے جانے سے مراد اس کا کفایت کرنا ہے۔ امام شافعی نے دوسرے قول میں فرمایا: جو پانی موجود ہے اس کو استعمال کرے اور تیمم بھی کرے، کیونکہ وہ پانی پانے والا ہے اور تیمم کی شرط متحقق نہیں ہے، جب وہ اس کو استعمال کر دے گا تو پھر پانی مفقود ہو جائے گا اب وہ پانی نہ پانے والا ہوگا۔ امام شافعی کا قول اس صورت میں مختلف ہے جب کوئی شخص اپنے کجاوہ میں پانی بھول جائے اور تیمم کرے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کرے، کیونکہ جب اس کے پاس پانی موجود تھا تو وہ پانی پانے والا تھا اس نے خود کوتاہی کی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ نہ کرے یہ امام مالک کا قول ہے، کیونکہ اسے معلوم نہ تھا تو اس نے پانی (گویا) پایا ہی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 31**۔ امام ابو حنیفہ نے متغیر پانی کے ساتھ وضو کرنا جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً** (پانی نہ پاؤ) فرمایا: نکرہ نفی کے تحت آیا ہے اور لغت میں یہ عموم پر دلالت کرتا ہے پس یہ متغیر اور غیر متغیر پانی کے ساتھ وضو کے جواز میں مفید ہوگا اس لیے کہ متغیر پانی پر بھی ماء کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکرہ نفی کے تحت عموم پر دلالت کرتا ہے ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں جس طرح تم کہتے ہو لیکن جنس میں اور یہ ہر پانی میں عام ہے خواہ وہ آسمان کا پانی ہو یا نہر کا پانی ہو یا میٹھا چشمہ ہو یا نمکین چشمہ ہو لیکن رہا جنس کے علاوہ تو وہ متغیر پانی ہے وہ اس میں داخل نہیں جس طرح بیگن اور پھول کا پانی اس میں داخل نہیں۔ پانیوں کا حکم سورۂ فرقان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 32**۔ علماء کا اجماع ہے کہ وضو اور غسل پانی کے نہ ہونے کے وقت نبیذ کے علاوہ کسی مشروب سے جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا** اس کا رد کرتا ہے۔ اور وہ حدیث جس میں نبیذ سے وضو کرنے کا ذکر ہے اس کو حضرت ابن مسعود نے روایت کیا ہے وہ ثابت نہیں ہے، کیونکہ جو ابو زید نے روایت کیا ہے وہ مجہول ہے۔ حضرت عبداللہ کی صحبت سے معروف نہیں ہے یہ ابن المنذر وغیرہ کا قول ہے مزید بیان سورۃ الفرقان میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 33**۔ وہ پانی جس کی عدم موجودگی تیمم کو مباح کرتی ہے وہ ایسا پانی ہے جو پاک ہو، پاک کرنے والا ہو اور اپنے خلقی اوصاف پر باقی ہو۔ اور بعض علماء جنہوں نے قرآن کے احکام میں تالیفات کیں انہوں نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا** تو اللہ تعالیٰ نے پانی کے ہر جز کے نہ ہونے کے وقت تیمم مباح فرمایا، کیونکہ یہ لفظ نکرہ ہے پانی کے ہر جز کو شامل ہے خواہ وہ کسی دوسری چیز سے ملا ہوا ہو یا اکیلا ہو۔ نبیذ تمر کو ماء کہنا ممنوع نہیں جب معاملہ اس طرح ہے تو کسی بھی پانی کے موجود ہوتے ہوئے تیمم جائز نہ ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے اور انہوں نے اخبار ضعیفہ سے استدلال کیا ہے جن کا ذکر سورۃ الفرقان میں آئے گا اور وہاں ان شاء اللہ پانی کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 34**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَتَيَمَّمُوْا** تیمم اس امت کے ساتھ خاص ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت پر وسعت کے لیے اس کی رخصت دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہمیں دوسرے لوگوں پر تین چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے (ا) ہمارے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنایا گیا ہے اور اس کی مٹی ہمارے لیے باعث طہارت بنائی گئی ہے'' (1)۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اس کے نزول کا ذکر آچکا ہے اور یہ ہار کے سبب سے رخصت ملی تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، وہ اسباب جو تیمم کو مباح کرتے ہیں ان کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔ یہاں اس کے لغوی اور شرعی معنی، اس کی صفت، اس کا طریقہ اور جن چیزوں کے ساتھ اور جن کے لیے تیمم کیا جائے گا اور کس کے لیے تیمم جائز ہے اور تیمم کی شرائط وغیرہ پر کلام ہوگی۔

تیمم کا لغوی معنی قصد کرنا ہے، تیممت الشئ کا معنی ہے میں نے فلاں کا قصد کیا۔ تیممت الصعید میں نے مٹی کا قصد کیا۔ تیممته برمحی و سھمی میں نے اپنے نیزے اور تیر کے ساتھ صرف اس کا قصد کیا۔

خلیل نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

یممته الرّمح شزراً ثم قلت له　　هذی البَسَالة لالِعُب الزَّحاليقِ

خلیل نے کہا: جس نے اس بیت میں امممته کہا اس نے غلطی کی، کیونکہ اس نے کہا: شزراً اور الشزر ایک طرف سے ہوتا ہے اس کے ساتھ سامنے کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔

امروٗالقیس نے کہا:

تیممتها من أذرِعاتٍ واهلُها　　بیَثرِب أدْنَی دارِها نظرٌ عالِ

امرءالقیس کا دوسرا شعر ہے:

تیَممتِ العینَ التی عند ضارِجٍ　　یَفِئ علیها الظلُّ عَرْمَضُها طامِ (2)

ایک اور نے کہا:

إنِّی کذالك اذا ما ساء نی بلدٌ　　یممتُ بعیری غیره بلداً

اعشیٰ نے کہا:

تیممتُ قَیْسًا دکم دونه　　من الأرض من مَهْمَةٍ ذی شَزَنْ (3)

حمید بن ثور نے کہا:

سل الرّبعَ أنّی یممّتْ أمُّ طارقٍ　　وهل عادةٌ للرّبعِ أن یتکلّما

امام شافعی نے فرمایا:

عِلمی معِی حیثما یممتُ أحِمله　　بطنِی وِعاءٌ له لا بطن صُندوق

ان تمام اشعار میں تیممت کا معنی قصد کرنا ہے۔

ابن السکیت نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا یعنی تم قصد کرو۔ پھر اس کلمہ کا استعمال بہت زیادہ ہوگیا حتیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 59، دار الکتب العلمیہ بیروت　　3۔ ایضاً

کہ تیمم چہرے اور ہاتھوں کا مٹی سے مسح کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ابن الانباری نے کہا: عربوں کے قول میں تیمم الرجل کا معنی ہے مٹی سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرنا۔

میں کہتا ہوں: یہ تیمم شرعی ہے جب اس سے قربت مقصود ہو۔ یممت المریض فتیمم للصلاۃ۔ رجل مُیَمَّم۔ وہ شخص جو طلب کرے اس میں کامیاب ہو جائے۔ شیبانی سے مروی ہے:

إنا وجدنا أعْصَرَ بن سعد مَيَمَّم البيتِ رفيعَ المجدِ

ایک اور شاعر نے کہا:

أزْهَر لم يولَد بنَجْمِ الشُّحِّ مُيَمَّم البيت كريم السِّنْخِ

**مسئلہ نمبر 35**۔ لفظ تیمم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سورۂ بقرہ میں، سورۂ مائدہ میں اور اس سورۃ میں ذکر کیا ہے اور اس سورۃ میں یہ آیۃ التیمم ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے کہا: یہ ایک مشکل مسئلہ ہے، میں نے کسی کے پاس اس کا حل نہیں پایا یہ دو آیتیں ہیں ان میں تیمم کا ذکر ہے۔ ایک سورۃ النساء میں ہے اور دوسری مائدہ میں ہے ہمیں معلوم نہیں حضرت عائشہ نے اپنے قول انزل اللہ آیۃ التیمم سے کونسی آیت مراد لی ہے۔ پھر فرمایا: حضرت عائشہ کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ تیمم اس سے پہلے معلوم نہ تھا اور نہ صحابہ اس پر عمل کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر ابن عربی کا یہ قول کہ ہم نہیں جانتے کہ حضرت عائشہ نے کون سی آیت مراد لی ہے۔ یہ یہی آیت ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

قاضی کا یہ کہنا کہ اس کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس سے پہلے تیمم معلوم نہ تھا اور اس پر عمل نہ تھا۔ یہ صحیح ہے سیرت نگاروں میں اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ غسل جنابت وضو سے پہلے فرض نہ تھا جس طرح کہ تمام سیرت نگاروں کے ہاں معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب نماز مکہ میں فرض ہوئی تو آپ نے آج کے وضو کی طرح وضو کر کے نماز پڑھی۔ پس یہ دلیل ہے کہ وضو کی آیت نازل ہوئی، کیونکہ اس کا پہلا فرض قرآن میں متصل ہے اور فرمایا کہ آیت التیمم نازل ہوئی، آیت الوضو نہیں فرمایا۔ یہ بیان ہے کہ اس وقت جو ان کو علم ہوا وہ تیمم کا حکم تھا نہ کہ وضو کا حکم تھا یہ بالکل واضح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 36**۔ تیمم ہر مکلف پر لازم ہوتا ہے جس پر نماز لازم ہوتی ہے جب پانی نہ ہو اور نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ اور صاحبین اور مزنی جو امام شافعی کے پیروکار ہیں فرماتے ہیں: وقت سے پہلے بھی تیمم کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کے نزدیک پانی کا طلب کرنا شرط نہیں ہے۔ یہ انہوں نے نوافل پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے۔ جب پانی تلاش کیے بغیر نوافل کے لیے تیمم کرنا جائز ہے تو فرائض کے لیے بھی جائز ہے اور ان علماء نے حدیث سے استدلال کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا: ''پاکیزہ مٹی مسلمان کا وضو ہے اگرچہ دس سال بھی پانی نہ پائے'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹی کو

1۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 187

وضو کہا ہے جس طرح پانی کو وضو کہا جاتا ہے پس تیمم کا حکم پانی کا حکم ہے۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً** اور یہ نہیں کہا جاتا۔ اس نے پانی نہیں پایا مگر جو طلب کرے اور پانی نہ پائے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ تیمم ضرورۃً طہارت ہے جس طرح مستحاضہ ہوتی ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تیمم کر لے اور نماز پڑھ لے'' (1)۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے یہی حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 37**۔ علماء کا اجماع ہے کہ تیمم جنابت اور حدث کو نہیں اٹھاتا ہے، جنابت اور حدث کے لیے تیمم کرنے والا جب پانی پالے گا تو پھر جنبی یا محدث شمار ہو جائے گا جس طرح پہلے تھا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا: ''جب تو پانی پائے تو اپنی جلد پر پانی بہا'' (2)۔ مگر ایک چیز جو ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے اسے ابن جریج اور عبدالحمید بن جبیر بن شیبہ نے ان سے روایت کیا ہے اور ابن ابی ذئب نے عبدالرحمٰن بن حرملہ سے اور انہوں نے بھی ان سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: جنبی تیمم پانی پالے تو بھی طہارت پر رہتا ہے وہ نہ غسل کا محتاج ہے، نہ وضو کا حتیٰ کہ اسے حدث لاحق ہو جائے۔ ابو سلمہ سے اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو تیمم کرے اور نماز پڑھے پھر وقت میں پانی پالے تو وہ وضو کرے اور نماز کا اعادہ کرے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ تناقض ہے اور قلت رویت ہے، ابو سلمہ ان کے نزدیک اس طرح فقیہ نہ تھے جس طرح مدینہ کے تابعین فقیہ تھے۔

**مسئلہ نمبر 38**۔ علماء کا اجماع ہے کہ جس نے تیمم کیا پھر نماز میں داخل ہونے سے پہلے پانی پالیا تو اس کا تیمم باطل ہو جائے گا اور اس پر پانی کا استعمال واجب ہوگا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: جس نے تیمم کیا اور نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہوا جب کہ اس نے پانی کی تلاش میں کوشش کی تھی اور اس کی سواری میں بھی پانی نہ تھا تو اس کی نماز مکمل ہے، کیونکہ اس نے فرض ادا کیا جس طرح اس کو حکم دیا گیا تھا پس اس پر اعادہ کا بغیر حجت کے واجب کرنا جائز نہیں۔ بعض علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جب وضو کرے اور غسل کرے تو وقت کے اندر اعادہ کرنا مستحب ہے۔ طاؤس، عطا، قاسم بن محمد، ابن سیرین، زہری اور ربیعہ یہ تمام علماء فرماتے ہیں: نماز کا اعادہ کرے۔ اوزاعی نے بھی اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: نماز کا اعادہ واجب نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا: دو آدمی ایک سفر پر نکلے نماز کا وقت ہو گیا ان کے ساتھ پانی نہیں تھا ان دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھی پھر وقت کے اندر پانی پالیا پس ان میں سے ایک نے نماز کا وضو کر کے اعادہ کیا اور دوسرے نے اعادہ نہ کیا پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا مسئلہ ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کا اعادہ نہ کرنے والے کو کہا: تو ''سنت کو پہنچا اور تیری نماز درست ہے'' اور جس نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کیا تھا اسے فرمایا: ''تیرے لیے دوہرا اجر ہے'' (3)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور فرمایا: ابن نافع کے علاوہ نے یہ حدیث لیث سے انہوں نے عمیرہ بن ابی ناجیۃ سے انہوں نے بکر بن سوادہ سے انہوں نے عطا سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ حضرت ابو سعید کا ذکر اس حدیث میں محفوظ نہیں ہے دارقطنی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس میں فرمایا: پھر وقت میں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7068　　2۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 187　　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 189

بعد میں پانی پالیا(1)۔

**مسئلہ نمبر 39**۔ علماء کا اختلاف ہے جب نماز میں داخل ہونے کے بعد پانی پالے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر نماز کا توڑنا اور پانی کا استعمال کرنا واجب نہیں بلکہ وہ اپنی اس نماز کو مکمل کرے اور آئندہ نماز کے لیے وضو کرے۔ امام شافعی نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ابن المنذر نے اس کو اختیار فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل اور مزنی کا قول ہے کہ وہ نماز کو توڑ دے اور وضو کرے اور پانی کے پائے جانے کی وجہ سے نماز کو نئے سرے سے شروع کرے اور ان کی حجت یہ ہے کہ تیمم جس طرح نماز سے پہلے پانی کی موجودگی کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے اسی طرح بقیہ نماز بھی پانی کے وجود کی وجہ سے باطل ہو جائے گی، جب بعض نماز باطل ہو گی تو تمام نماز باطل ہو گی، کیونکہ علماء کا اجماع ہے وہ عورت جو مہینوں کے ساتھ عدت گزار رہی ہو اور اس کی تھوڑی سی عدت باقی ہو پھر اسے حیض آ جائے تو اپنی عدت نئے سرے سے حیض کے ساتھ گزارے گی۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جس کو پانی میسر آ جائے جب کہ وہ نماز میں ہو تو اس کے لیے بھی قیاساً اور نظراً یہی حکم ہے یعنی نئے سرے سے نماز پڑھے۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) اور پانی کی عدم موجودگی کے وقت تیمم کے ساتھ نماز میں داخل ہونے کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے اور نماز توڑنے میں اختلاف ہے جب پانی دیکھا جائے اور نماز کا توڑنا نہ تو سنت ثابت کرتی ہے نہ اجماع۔ اور کبھی حجت میں سے یہ بھی ہے کہ جس پر ظہار میں یا قتل میں روزہ واجب ہو پھر وہ اکثر روزے رکھ چکا ہو پھر وہ غلام پالے تو اس کے روزے لغو نہ ہوں گے اور نہ غلام آزاد کرنے کی طرف رجوع کرے گا اسی طرح جو تیمم کے ساتھ نماز میں داخل ہو تو وہ نہ نماز کو توڑے گا اور نہ پانی کے ساتھ وضو کی طرف رجوع کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 40**۔ علماء کا اختلاف ہے کیا ایک تیمم کے ساتھ بہت سی نمازیں پڑھ سکتا ہے یا ہر نماز فرض اور نفل کے لیے تیمم لازم ہے؟ شریک بن عبداللہ القاضی نے کہا: ہر نفلی اور فرضی نماز کے لیے تیمم کرے۔ اور امام مالک نے فرمایا: ہر فرض کے لیے تیمم کرے، کیونکہ اس پر ہر نماز کے لیے پانی تلاش کرنا ضروری ہے اور جو پانی تلاش کرے اور اسے نہ پائے تو وہ تیمم کرے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری، لیث، حسن بن حی اور داؤد نے فرمایا: ایک تیمم کے ساتھ جتنی نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے جب تک کہ اسے حدث لاحق نہ ہو، کیونکہ وہ پاک ہے جب تک کہ وہ پانی نہ پائے اور اس پر پانی طلب کرنا واجب نہیں جب وہ پانی سے مایوس ہو چکا ہو۔ اور جو ہم نے کہا ہے: وہ اصح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نماز قائم کرنے والے پر پانی کا طلب کرنا واجب کیا ہے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں وقت نکلنے سے پہلے نماز کی استباحت کے لیے تیمم کو واجب کیا ہے۔ یہ طہارت ضروریہ ناقصہ ہے، کیونکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ پانی کے پائے جانے کے وقت تیمم باطل ہو جاتا ہے اگرچہ اسے حدث لاحق نہ بھی ہو جب کہ پانی کی طہارت ایسی نہیں ہے۔ وقت کے داخل ہونے سے پہلے تیمم کے جواز میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی اور پہلے مقالہ والے اس کو جائز قرار نہیں دیتے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا** اس سے تیمم کا جواز حاجت سے ثابت ہوا اور وقت سے پہلے کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس بنا پر ایک تیمم کے ساتھ دو فرض نہیں پڑھے گا۔ یہ واضح ہے۔

---

1۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 189

ہمارے علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے ایک تیمم کے ساتھ دو نمازیں پڑھیں۔ یحییٰ بن یحییٰ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ وہ دوسری نماز کا اعادہ کرے جب تک وقت کے اندر ہے۔ ابوزید بن ابی الغمر نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ ہر صورت میں اعادہ کرے گا۔ اسی طرح مطرف، ابن ماجشون سے مروی ہے کہ وہ ہر صورت میں دوسری نماز کا اعادہ کرے گا۔ اس پر ہمارے علماء جھگڑتے ہیں، کیونکہ پانی کا طلب کرنا شرط ہے۔ ابن عبدوس نے ذکر کیا ہے کہ نافع نے امام مالک سے اس شخص کے متعلق روایت کیا ہے جو دو نمازوں کو جمع کرتا ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے علیحدہ تیمم کرے۔ ابو الفرج نے اس شخص کے بارے فرمایا: جس نے اپنی بہت سی نمازیں یاد کیں پھر اگر وہ انہیں ایک تیمم کے ساتھ قضا کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں اور یہ اس کے لیے جائز ہے، یہ اس لیے کہ پانی کا طلب کرنا شرط نہیں۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 41**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **صَعِيْدًا طَيِّبًا**، صعید زمین کی اس سطح کو کہتے ہیں جس پر مٹی ہو یا نہ ہو۔ یہ خلیل، ابن الاعرابی اور زجاج کا قول ہے۔ اس کے متعلق اہل لغت کا کوئی اختلاف میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا** ۝ (الکہف) یعنی ایسی سخت زمین جو کوئی چیز نہ اگاتی ہو اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا** ۝ (الکہف) اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

كأنّه بالضُّحٰى تَرْمِي الصعِيدَ به دَبَّابةٌ فى عظام الرأس خُرْطُومُ (1)

اس کو صعید کہا جاتا ہے۔، کیونکہ وہ زمین کی بلند جگہ ہوتی ہے۔ الصعید کی جمع صعدات ہے۔ اسی سے حدیث شریف ہے ایاکم والجلوس فی الصعدات راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ الصعید کو طیب سے مقید کرنے کی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ زمین کی ہر سطح کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے خواہ وہ مٹی ہو یا ریت ہو یا پتھر ہو یا کان ہو یا شور یلی ہو۔ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، ثوری اور طبری کا مذہب ہے اور طَيِّبًا کا معنی پاک ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: طَيِّبًا کا معنی حلال ہے۔ یہ تشویش کن قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو یوسف نے فرمایا: الصعید سے مراد وہ مٹی ہے جو اگاتی ہے وہ طیب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ** (الاعراف: 58) ان علماء کے نزدیک اس کے علاوہ مٹی کے ساتھ تیمم جائز نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: الصعید کے لفظ کا اطلاق صرف ایسی مٹی پر ہوتا ہے جو غبار والی ہو۔ عبد الرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کون سی مٹی پاک ہے؟ فرمایا: الحرث (کھیت) ابوعمر نے فرمایا: حضرت ابن عباس کے قول میں دلیل ہے کہ الصعید سے مراد کھیت کی زمین کے علاوہ جگہ ہے۔ حضرت علی نے فرمایا: خاص طور پر مٹی مراد ہے۔ خلیل کی کتاب میں ہے تیمم بالصعید یعنی اس کے غبار سے لو۔ یہ ابن فارس نے حکایت کیا ہے۔ یہ قول مٹی کے ساتھ تیمم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ سخت پتھر پر غبار نہیں ہوتا۔ الکیا طبری نے فرمایا: امام شافعی نے شرط قرار دیا ہے کہ مٹی ہاتھ سے لگے اور اس کے ساتھ تیمم کرے اعضاء تیمم کی طرف اسے نقل کرے۔ جس طرح پانی اعضاء وضو کی طرف نقل کیا جاتا ہے۔ الکیا نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ الصعید امام شافعی کے قول میں نص نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جعلت لی الارض

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 59

مسجداً و ترابہا طھوراً (1) نے اس کو بیان فرمایا۔

میں کہتا ہوں: اس مقالہ والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے وجعلت تربتہا لنا طھوراً (2) یہ علماء فرماتے ہیں: اس کا تعلق مطلق اور مقید کے باب سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمٰن) ہم نے سورۂ بقرہ میں وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ (بقرہ: 98) کے تحت اس بحث کو ذکر کیا ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے کہ الصعید سطح زمین کا نام ہے جس طرح کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ قرآن کی نص ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنبی کے بارے میں فرمایا: علیك بالصعید فانه یکفیك (3) تجھ پر مٹی سے تیمم کرنا لازم ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ اسی بناء پر صعیداً ظرف مکان ہوگا اور جنہوں نے اس کو مٹی کے لیے بنایا ان کے نزدیک باء کے حذف کی تقدیر کے ساتھ مفعول بہ ہے۔ یعنی بصعیدٍ اور طَيِّبًا اس کی صفت ہے اور جنہوں نے طَيِّبًا بمعنی حلال کیا ہے انہوں نے اسے حال یا مصدر کی بناء پر منصوب کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 42**۔ جب یہ مسلم ہو گیا تو جان لو کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے اس میں سے جامع بات یہ ہے کہ آدمی ایسی مٹی پر تیمم کرے جو اگانے والی ہو، پاک ہو، منقول اور مغصوب نہ ہو اور منع میں اجماع یہ ہے کہ آدمی خالص سونے، چاندی، یاقوت، زمرد اور کھانے والی چیزوں، روٹی، گوشت وغیرہ پر یا نجاسات پر تیمم نہ کرے اس کے علاوہ میں اختلاف ہے جیسے معدن (کانیں)۔ بعض علماء نے ان پر تیمم جائز قرار دیا۔ یہی امام مالک وغیرہ کا مذہب ہے اور بعض نے منع فرمایا۔ یہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے۔ ابن خویز منداد نے فرمایا: امام مالک کے نزدیک گھاس پر تیمم جائز ہے جب کہ وہ زمین سے جدا ہو اور برف پر تیمم کرنے کے بارے میں امام مالک سے مختلف قول مروی ہے۔ مدونہ اور مبسوط میں اس کا جواز مروی ہے اور دوسری کتب میں منع مروی ہے لکڑی پر تیمم کرنے کے بارے میں مذاہب مختلف ہیں۔ جمہور علماء منع فرماتے ہیں اور ''مختصر الوقار'' میں ہے کہ جائز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمین سے متصل اور منفصل لکڑی کے بارے میں فرق ہے متصل پر جائز ہے اور منفصل پر جائز نہیں۔ ثعلبی نے کہا: امام مالک نے فرمایا: اگر درخت پر ہاتھ مارا پھر اس سے مسح کیا تو جائز ہوگا۔ فرمایا: اوزاعی اور ثوری نے کہا: زمین پر اور ہر اس چیز پر جو زمین پر ہے تیمم جائز ہے خواہ وہ درخت ہو، پتھر ہو، روڑا وغیرہ ہو حتیٰ کہ ان دونوں حضرات نے کہا: اگر برف اور اولوں پر بھی تیمم کیا تو جائز ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا: منقول مٹی کے بارے میں جمہور کا فتویٰ جواز پر ہے اور المذہب میں منع ہے اور غیر المذہب میں یہ زیادہ ہے۔ رہا وہ جو پکایا گیا ہو جیسے کانچ، پکی اینٹ اس کے بارے مذہب میں دو قول ہیں اجازت اور منع۔ اور دیوار پر تیمم کے بارے اختلاف ہے (4)۔

میں کہتا ہوں صحیح جواز ہے، کیونکہ ابوجہیم بن حارث بن ضمہ انصاری کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بئر جمل سے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 43
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199
3۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 49
4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 60

تشریف لائے آپ کو ایک شخص ملا اس نے آپ پر سلام کیا، نبی کریم ﷺ نے جواب نہ دیا حتیٰ کہ آپ دیوار کے پاس آئے اور اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں پر مسح کیا پھر سلام کا جواب دیا(1)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ بغیر مٹی کے تیمم کی صحت پر دلیل ہے جس طرح امام مالک اور ان کے موافق علماء نے کہا اور یہ رد ہے امام شافعی اور ان کے موافق علماء کا جو کہتے ہیں کہ جس چیز پر مسح کیا جائے گا وہ غبار والی پاک مٹی ہوگی جو ہاتھ کے ساتھ لگے گی۔ نقاش نے ابن علیہ اور ابن کیسان سے روایت کیا ہے کہ وہ دونوں کستوری اور زعفران کے ساتھ تیمم کو جائز قرار دیتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ کئی جہات سے خالص خطا ہے(2)۔ ابوعمر نے کہا: علماء کی جماعت شور یلی زمین پر تیمم کی اجازت دیتی ہے مگر اسحاق بن راہویہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت ابن عباس سے اس شخص کے بارے مروی ہے جس کو تیمم کی ضرورت تھی جب کہ وہ گیلی مٹی پر ہے فرمایا: وہ گیلی مٹی میں سے کچھ لے لے اسے اپنے جسم کے کسی حصہ پر مل لے پھر جب وہ خشک ہو جائے تو اس سے تیمم کر لے۔ ثوری اور امام احمد نے کہا: نمدہ کے غبار سے تیمم کرنا جائز ہے۔ ثعلبی نے کہا: امام ابوحنیفہ نے سرمہ، ہڑتال، چونا حص پسے ہوئے جوہر سے تیمم جائز قرار دیا ہے، جب سونے، چاندی، تانبا، نحاس اور شیشہ کے برادہ سے تیمم کرے تو جائز نہ ہوگا، کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 43**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ** مس لفظ مشترک ہے۔ جماع کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: مسح الرجل المرأۃ۔ مرد نے عورت سے جماع کیا۔ اور مسح الشیٔ بالسیف۔ چیز کو تلوار سے کاٹا۔ مسحت الابل یومھا۔ اونٹ پورا دن چلا۔ المسحاء ایسی عورت جس کی سرین نہ ہو۔ بفلان مسحۃ من جمال۔ جمال والا شخص۔ یہاں مسح سے مراد ممسوح چیز پر ہاتھ کو کھینچنا۔ اگر وہ آلہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد آلہ کو ہاتھ کی طرف نقل کرنا اور پھر ممسوح چیز پر اسے کھینچنا۔ سورۂ مائدہ کی آیت **فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ** (المائدہ:6) سے یہی مراد ہے۔ اور منہ کا قول دلیل ہے کہ محل تیمم کی طرف مٹی کا نقل کرنا ضروری ہے اور یہ امام شافعی کا مذہب ہے اور ہم یہ شرط نہیں لگاتے، کیونکہ نبی کریم ﷺ جب اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے تھے اور پھر انہیں اٹھاتے تھے تو ہاتھوں پر پھونک مارتے تھے۔ ایک روایت میں نفخ (پھونک مارنا) کی جگہ نفض (جھاڑنا) ہے یہ دلیل ہے کہ آلہ شرط نہیں ہے اور آپ کا دیوار پر تیمم اس کی وضاحت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب پانی کے ساتھ سر کا مسح کرنا ضروری ہے جس میں پانی کی تری کو سر کی طرف نقل کیا جاتا ہے تو اسی طرح مٹی سے مسح کرنے کے وقت مٹی کا نقل کرنا بھی ضروری ہو۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تیمم اور وضو میں چہرے کا حکم اس کو ڈھانپ لینا ہے اور ہر ہر جگہ کی تلاش ہے۔ بعض نے جائز قرار دیا ہے کہ ہر ہر جگہ پر ہاتھ مسح میں پہنچانا ضروری نہیں جس طرح خفین پر مسح کے وقت دراڑوں کا حکم ہے اور جو حصہ انگلیوں کے درمیان ہے۔ یہ المذہب میں محمد بن مسلمہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے اس کو حکایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ** ہاتھوں سے پہلے چہرے کا مسح کرے یہی جمہور کا قول ہے۔ بخاری نے باب التیمم ضربۃ میں عمار کی حدیث لکھی ہے اس میں چہرے سے پہلے ہاتھوں کا ذکر ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 48 | 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 60

بعض اہل علم نے وضو کی تنکیس (الٹ کرنا) پر قیاس کرتے ہوئے یہ قول کیا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 44**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ہاتھوں میں تیمم کہاں تک کرے؟ ابن شہاب نے کہا: کندھوں تک کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے۔ مصنف ابوداؤد میں اعمش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نصف ذراع (بازو) تک مسح کیا (☆)۔ ابن عطیہ نے کہا: میری یاداشت میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے (2)۔ بعض علماء نے وضو پر قیاس کرتے ہوئے کہنیوں تک مسح کرنے کو کہا ہے یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان دونوں کے اصحاب، ثوری، ابن ابی سلمہ اور لیث کا قول ہے تمام کہنیوں تک مسح کرنے کو فرض، واجب خیال کرتے ہیں۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم اور ابن نافع کا یہی قول ہے۔ اسماعیل القاضی کا یہی نظریہ ہے۔ ابن نافع نے کہا: جس نے ہاتھ کی کلائی تک تیمم کیا وہ ہر حال میں نماز کا اعادہ کرے۔ امام مالک نے مدونہ میں کہا ہے: وقت کے اندر اعادہ کرے۔ کہنیوں تک تیمم کو نبی کریم ﷺ سے حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر یہی کہتے تھے۔ دارقطنی نے کہا: قتادہ سے سفر میں تیمم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر کہنیوں تک تیمم کرنے کو کہتے تھے۔ حسن اور ابراہیم نخعی دونوں کہنیوں تک مسح کرنے کا کہتے تھے۔ فرمایا: مجھے ایک محدث نے شعبی سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابزی سے انہوں نے حضرت عمار بن یاسر سے روایت کر کے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کہنیوں تک مسح کرنے کو فرمایا۔ ابواسحاق نے کہا: میں نے اس کا ذکر امام احمد بن حنبل سے کیا تو انہیں اس سے تعجب ہوا اور فرمایا: یہ کتنا خوبصورت قول ہے (3)۔ ایک جماعت نے کہا: وہ کلائیوں تک مسح کرے۔ حضرت علی بن ابی طالب، اوزاعی، عطاء ایک روایت میں شعبی سے یہی مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، داؤد بن علی اور طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے یہی مروی ہے اور امام شافعی کا قدیم قول یہی ہے اور مکحول نے کہا: میں اور زہری جمع ہوئے ہم نے تیمم پر گفتگو کی زہری نے کہا: بغلوں تک مسح ہے۔ میں نے پوچھا: تم نے یہ کہاں سے لیا ہے؟ اس نے کہا: کتاب اللہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ۔ یہ پورا ہاتھ ہے۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا (المائدہ: 38) چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا؟ اس نے کہا: کنارہ سے۔ دراودی سے حکایت کیا جاتا ہے کہ کلائیوں تک مسح کرنا فرض ہے اور بغلوں تک فضیلت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ایسا قول ہے جس کی نہ قیاس تائید کرتا ہے اور نہ دلیل۔ ایک قوم نے لفظ ید کو عام کیا اور کندھے تک مسح کو واجب کیا۔ ایک قوم نے وضو پر قیاس کیا اور انہوں نے کہنیوں تک مسح کو واجب کیا۔ یہی جمہور علماء امت کا قول ہے۔ ایک قوم حدیث کے باوجود کلائیوں تک مسح کرنے کو کہتی ہے اور انہوں نے اس کو چور کے ہاتھ کاٹنے پر قیاس کیا ہے، کیونکہ وہ حکم شرعی ہے اور تطہیر ہے جس طرح یہ تطہیر ہے۔ ایک قوم نے حضرت عمار کی حدیث کے ساتھ کفین ہتھیلیوں پر مسح کرنے کو کہا ہے (4)۔ یہی شعبی کا قول ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 60، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً
3۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم جلد 1، صفحہ 182
4۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 182
☆ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 275، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 45**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ تیمم میں ایک ضرب کافی ہے یا نہیں؟ مالک کا مدونہ میں یہ نظریہ ہے کہ تیمم دو ضربیں ہیں۔ ایک ضرب چہرہ کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے۔ یہ اوزاعی، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا قول ہے اور ثوری، لیث اور ابن ابی سلمہ کا نظریہ ہے۔ یہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن عمر نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی جہم نے کہا: تیمم ایک ضرب ہے۔ اوزاعی سے مشہور قول یہی مروی ہے۔ عطا اور شعبی کا ایک روایت میں یہی قول ہے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق، داؤد اور طبری کا یہی نظریہ ہے۔ جو حدیث حضرت عمار سے اس کے متعلق مروی ہے اس سے یہ زیادہ ثابت ہے۔ امام مالک نے کتاب محمد میں کہا: تیمم ایک ضرب سے کرنا جائز ہے۔ ابن نافع نے کہا: ایسی صورت میں نماز کا اعادہ کرے گا۔ ابوعمرو نے کہا، ابن ابی لیلی اور حسن بن حی نے کہا: دو ضربیں ہیں، ایک ضرب کے ساتھ چہرے کا مسح کرے اور ایک ضرب کے ساتھ دونوں ہاتھ اور کہنیوں کا مسح کرے۔ ان دو علماء کے علاوہ کسی صاحب علم نے یہ نہیں کہا۔ ابوعمر نے کہا: جب تیمم کی کیفیت میں آثار مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے متعارض ہیں تو ظاہر کتاب کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے۔ یہ دو ضربوں پر دلالت کرتی ہے ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔ انہوں نے وضو پر قیاس کیا ہے اور حضرت ابن عمر کے غسل کی اتباع کی ہے۔ ان کا علم کتاب اللہ کے حکم کو دور نہیں کرسکتا۔ اگر اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے کوئی چیز ثابت ہوتی تو اس پر وقوف واجب تھا۔ وباللہ التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا اللہ تعالیٰ ہمیشہ عفو کو قبول فرماتا ہے۔ عفو سے مراد سہل ہے۔ یغفر الذنب وہ گناہ کو بخشتا ہے یعنی اپنی عقوبت کو ڈھانپ دیتا ہے اور سزا نہیں دیتا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۤ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۤءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝50 اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ
الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝51 اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝52 اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝53

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ مول لے رہے ہیں گمراہی کو اور (یہ بھی) چاہتے ہیں کہ بہک جاؤ تم بھی راہ راست سے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ حمایتی اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ تعالیٰ مددگار۔ کچھ لوگ جو یہودی ہیں پھیر دیتے ہیں اللہ کے کلام کو اس کی اصلی جگہوں سے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور (کہتے ہیں:) سنو تم نہ سنائے جاؤ اور (کہتے ہیں:) راعنا بل دیتے ہوئے اپنی زبانوں کو اور طعنہ زنی کرتے ہوئے دین میں اور اگر وہ (یوں) کہتے: ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اسے) مان لیا اور (ہماری عرض) سنیے اور نگاہ (کرم) فرمائیے ہم پر تو ہوتا بہت بہتر ان کے لیے اور بہت درست۔ لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے۔ اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب! ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے تاکہ تصدیق کرے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم مسخ کر دیں چہرے پھر پھیر دیں انہیں پشتوں کی طرف یا لعنت کریں ان پر جس طرح ہم نے لعنت کی سبت والوں پر۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا۔ کیا نہیں دیکھا آپ نے لوگوں کی طرف جو پاکباز بتلاتے ہیں اپنے آپ کو بلکہ (یہ تو) اللہ (کی شان ہے کہ) پاکباز بنا دے جسے چاہے اور وہ نہیں ظلم کیے جائیں گے کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔ دیکھیے کیسے گھڑتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور کافی ہے (انہیں رسوا کرنے کے لیے) یہ کھلا گناہ۔ کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ (اب) اعتقاد رکھنے لگے ہیں جبت اور طاغوت پر اور کہتے ہیں ان کے بارے میں جنہوں نے کفر کیا کہ یہ کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ان سے جو ایمان لائے ہیں۔ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ تعالیٰ نے اور جس پر لعنت بھیجے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار۔ کیا ان کے لیے کوئی حصہ ہے حکومت میں اگر ایسا ہوتا تو نہ دیتے یہ لوگوں کو تل برابر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ** سے لے کر **فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ** تک۔ یہ آیات کریمہ مدینہ طیبہ اور اس کے قریب رہنے والے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا: رفاعۃ بن زید بن التابوت یہود کے علماء میں سے تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتا تو اپنی زبان کو ٹیڑھا کرتا اور کہتا:

ارعنا سمعك يا محمد حتى نفهمك اے محمد! ہمارے سننے کی رعایت کریں تا کہ آپ کی بات سمجھ جائیں، پھر اس نے اسلام میں طعن کیا اور اسلام کو عیب لگایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۞ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ٝ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۞ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ (1) اور يَشْتَرُوْنَ کا معنی تبدیل کرنا ہے۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے يشترون الضلاله بالهدى۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ:16) یہ قتبی وغیرہ کا قول ہے۔

وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ اس کا يَشْتَرُوْنَ پر عطف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تم حق کے راستہ سے گمراہ ہو جاؤ۔ حسن نے تَضَلُّوا ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ یعنی اللہ تم سے جانتا ہے پس تم اپنے دشمنوں (یہود) کی سنگت اختیار نہ کرو وہ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعلم بمعنی علیم ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم:27) یہاں اھون بمعنی ھین ہے (وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا) الباء زائدہ ہے۔ یہ اس لیے زائدہ کی گئی ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے اكتفوا بالله تم اللہ پر بھروسہ کرو وہ تمہارے دشمنوں کو کافی ہے وَلِيًّا اور نَصِيْرًا کو نصب بیان کی بناء پر ہے۔ اگر تو چاہے تو حال کی بنا پر منصوب پڑھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا۔ زجاج نے کہا: اگر من کا تعلق ما قبل سے ہو تو پھر نَصِيْرًا پر وقف نہیں کیا جائے گا اگر من کو ما قبل کلام کے متعلق نہ کیا جائے تو پھر نَصِيْرًا پر وقف جائز ہو گا تقدیر عبارت اس طرح ہے من الذين هادوا قوم يحرفون الكلم۔ پھر حذف کیا گیا (2)۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ نحویوں نے اس کی یہ دلیل دی ہے:

لو قلت ما فی قومها لم تيثَمِ يفضُلها فی حسبٍ و مَيْسِمِ

فرماتے ہیں: اس کی تقدیر اس طرح ہے لو قلت ما فی قومها احدٌ يفضلها۔ پھر حذف کیا گیا۔ فراء نے کہا: محذوف مَنْ ہے مطلب یہ ہے من الذين هادوا من يحرفون۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ مَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۞ (الصافات) یعنی من له اور ذوالرمۃ نے کہا:

فظلّوا ومنهم دَمْعُه سابقٌ له وآخر يُذرِی عَبْرَةَ العَيْنِ بالهَمْلِ (3)

اس سے مراد ومنهم من دمعه ہے، پس موصول حذف کیا گیا، مبرد اور زجاج نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ موصول کا

---

1۔ سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 189، مطبعہ حجازی بالقاہرہ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 62

3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 141

حذف بعض کلمہ کے حذف کی طرح ہے۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی اور ابراہیم نخعی نے ''الکلام'' پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہاں ''الکلم'' اولیٰ ہے، کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے کلمات کو بدلتے تھے یا جو ان کے پاس تورات میں تھا وہ تمام کلام میں تحریف کرتے تھے۔ یحرفون کا معنی ہے وہ غلط تاویل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ان کی مذمت کی ہے، کیونکہ وہ اعتماد سے ایسا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَنْ مَّوَاضِعِهٖ یعنی نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدلتے تھے۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے تمہاری بات سنی اور تمہارے حکم کی نافرمانی کی وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ نبی کریم ﷺ کو کہتے تھے تم سنو، تم کبھی نہ سن سکو۔ یہ ان کی مراد تھی۔ اللہ ان پر لعنت کرے۔ وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ وہ چاہتے ہیں تم سنو اور مکروہ واذیت نہ سنو۔ حسن اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے تجھ سے نہ سنا جائے یعنی تمہاری بات مقبول نہ ہو اور تمہاری بات کا جواب نہ دیا جائے۔ نحاس نے کہا: اگر یہ معنی ہوتا تو عبارت اس طرح ہوتی غیر مسموع منك۔ رَاعِنَا کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وہ اپنی زبانوں کو حق سے پھیرتے ہیں یعنی وہ اس کی طرف پھیرتے ہیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ اللی کا اصل معنی بٹنا ہے اس کو نصب مصدر کی بنا پر ہے اگر تو چاہے تو اسے مفعول لاجلہ بنا دے اس کی اصل لویا تھی پھر واؤ کو یا میں ادغام کیا گیا۔ وَطَعْنًا یہ لَيًّا پر معطوف ہے یعنی وہ دین میں طعن کرتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کو کہتے ہیں: اگر یہ نبی ہوتے تو جان لیتے کہ ہم انہیں برا کہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بتلا دیا۔ پس یہ علامات نبوت سے تھا اور انہیں اس بات سے منع کیا۔ اَقْوَمَ کا معنی ہے ان کے لیے رائے میں درست تھا۔ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ یعنی اتنا تھوڑا ایمان لائے ہیں کہ اس کی وجہ سے ایمان کے اسم کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ایمان نہیں لائے مگر ان میں سے تھوڑے (1)۔ یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا۔ ابن اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے یہود کے علماء سے بات کی جن میں عبداللہ بن صوریا الاعور اور کعب بن اسد بھی تھا۔ آپ نے انہیں فرمایا: اے یہود کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرلو، اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ جو میں لے کر آیا ہوں وہ حق ہے۔ انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) ہم یہ نہیں جانتے انہوں نے اس کا انکار کیا جس کو وہ جانتے تھے اور کفر پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے نازل فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... الخ (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس کو نصب حال کی بنا ہے: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا، الطمس کا معنی ہے کسی چیز کے اثر کو بالکل مٹا دینا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ (المرسلات) نطمس اور نطمس میم کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ کلام میں کہا جاتا ہے: طمسم، یطمسم اور یطمسم بمعنی طمس ہے۔ کہا جاتا ہے: طمس الاثر و طمسم اس کا معنی مٹا دینا ہے۔ یہ تمام لغات ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ (یونس: 88) یعنی ان کے اموال کو ہلاک کر دے۔ ابن عرفہ سے مروی ہے کہا جاتا ہے: طمسته فطمس، لازم اور متعدی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 63
2۔ سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 189

استعمال ہوتا ہے۔ طمس اللہ بصرہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مٹا دیا۔ وھو مطموس البصر وہ جس کی آنکھ کا اثر ہی ختم ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ (یٰسین: 66) یعنی ہم انہیں نابینا کر دیں۔

علماء کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے کیا یہ حقیقت ہے اور چہرہ کو گدی کی طرح کر دیا جائے گا، ناک، منہ، ابرو، آنکھ سب مٹ جائیں گے یا یہ ان کی گمراہی مراد ہے جو ان کے دلوں میں ہوگی اور ان سے توفیق سلب کر لی جائے گی؟ یہ دو قول ہیں۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ یعنی ہم تمہیں ایسا گمراہ کر دیں گے کہ تم اس کے بعد ہدایت نہ پاؤ گے۔ حضرت ابی بن کعب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمثیل ہے اور وہ اگر ایمان نہیں لائیں گے تو ان کے ساتھ یہ بطور سزا ہوگا۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ان کے چہروں کو گدیوں کی طرح کر دیں گے، یعنی ناک، ہونٹ، آنکھیں اور ابرو ختم کر دیئے جائیں گے۔ اہل لغت کے نزدیک یہی معنی ہے۔ حضرت ابن عباس اور عطیہ العوفی سے مروی ہے کہ الطمس کا معنی ہے آنکھیں زائل کر دی جائیں گی اور گدی میں لوٹا دی جائیں گی۔ آنکھیں پیچھے لگا دی جائیں گی وہ الٹے پاؤں چلے گا (1)۔ امام مالک نے کہا: ابتدائے اسلام کا زمانہ تھا کعب الاحبار رات کے وقت ایک شخص کے پاس سے گزرے اور وہ یہ آیت پڑھ رہا تھا یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا۔ پس کعب نے اپنے چہرے پر اپنے ہاتھ رکھ لیے اور اپنے گھر کی طرف الٹے چلنے لگے پھر اسی جگہ اسلام قبول کیا اور فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے خوف ہوا کہ میں اپنے گھر نہیں پہنچ سکوں گا حتیٰ کہ میرا چہرہ مٹا دیا جائے گا (2) (تو پھر کیا حالت ہوگی)۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن سلام نے کیا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور اسے سنا تو اپنے گھر جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نہیں جانتا تھا کہ میں آپ تک پہنچوں گا جب کہ میرا چہرہ میری گدی کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اگر کہا جائے: یہ کیسے جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں چہروں کے مٹانے کی دھمکی دے اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے پھر وہ ایمان نہ لائے تو ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے جب یہ ایمان لائے اور ان کے متبعین ایمان لائے تو باقی لوگوں سے وعید اٹھالی گئی تھی۔ مبرد نے کہا: وعید باقی ہے اور اس کا انتظار باقی ہے اور فرمایا: یہود میں یہ طمس ہوگا اور قیامت کے دن سے پہلے ان کا مسخ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ نَلْعَنَهُمْ یعنی جن کے چہرے مٹائے جائیں گے ہم ان پر لعنت کریں گے۔ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ یعنی ہم انہیں بندروں اور خنازیر میں مسخ کر دیں گے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب سے غائب کی طرف خروج ہے۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا یعنی اللہ کا امر موجود ہے یہاں امر بمعنی مامور ہے۔ یہ مصدر ہے مفعول کی جگہ واقع ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے تو اسے پیدا کر دیتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے ہر کام جس کی اللہ نے ہونے کی خبر دی ہے وہ ایسا ہی ہوگا جس طرح اس نے بتایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ تلاوت فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر: 53) ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! شرک بھی؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 63 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 150

بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (1)۔

یہ آیت محکم، متفق علیہ ہے۔ اس میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ متشابہ میں سے ہے جس میں علماء نے کلام کی ہے۔ محمد بن جریر طبری نے کہا: اس آیت نے ظاہر کیا کہ ہر گناہ کبیرہ کرنے والا اللہ کی مشیت میں ہے اگر چاہے گا تو اس کا گناہ معاف کر دے گا اور اگر چاہے گا تو اس کو سزا دے گا جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ اللہ کے ساتھ شرک نہ ہوگا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ۔ تو جان لو کہ وہ اس شخص کے صغیرہ گناہ معاف فرما دے گا جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے گا اور اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف نہیں فرمائے گا جو کبیرہ گناہ کرے گا۔ بعض اہل تاویل کا یہ نظریہ ہے کہ یہ آیت اس آیت کی ناسخ ہے جو سورۃ الفرقان میں ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے کہا: سورۂ نساء سورۂ فرقان کے چھ ماہ بعد نازل ہوئی۔ صحیح یہ ہے کہ نسخ نہیں ہے، کیونکہ اخبار میں نسخ محال ہوتا ہے۔ ان آیات کی جمع کا بیان اس سورت میں اور سورۂ فرقان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرمایا: "قرآن میں مجھے اس آیت سے زیادہ کوئی محبوب آیت نہیں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہ لفظ اپنے ظاہر میں عام ہے اور کسی مفسر کا اختلاف نہیں کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ اس مفہوم میں اختلاف ہے جس کے ساتھ وہ اپنی تعریف کرتے تھے۔ قتادہ اور حسن نے کہا: ان کا یہ قول ہے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں) اور ان کا یہ قول ہے: لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (بقرہ:111) نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو کہ یہودی ہیں یا عیسائی۔ اور ضحاک اور سعدی نے کہا: ان کا یہ قول ہے ہمارا کوئی گناہ نہیں ہے، جو ہم دن کے وقت کرتے ہیں وہ رات کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جو ہم رات کو کرتے ہیں وہ دن کو معاف کر دیئے جاتے ہیں، ہم گناہوں کے نہ ہونے میں بچوں کی طرح ہیں۔ مجاہد، ابو مالک اور عکرمہ نے کہا: ان کا نماز کے لیے چھوٹے بچوں کا آگے کرنا اس لیے تھا، کیونکہ ان پر گناہ نہیں ہیں۔ یہ آیت کے مقصد سے بعید ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ ان کا قول ہے کہ جو ہمارے آباء فوت ہو گئے ہیں وہ ہمارے لیے شفاعت کریں گے اور ہمارا تزکیہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: یہ ان کی ایک دوسرے پر ثنا ہے (4)۔ جو کچھ کہا گیا ہے یہ قول اس سے بہتر ہے، کیونکہ یہ آیت کے معنی سے ظاہر ہے۔ التزکیۃ کا معنی

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 152
2۔ ایضاً
3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 65

گناہوں سے پاک کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت اور فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النجم:32) کا ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ مزکی اپنی تعریف سے اپنی زبان کو روکے اور کسی کو اپنے اعمال کے بارے نہ بتائے، کیونکہ حقیقت میں قابل ستائش وہ ہے جس کے افعال اچھے ہوں اور الله تعالیٰ اس کا تزکیہ فرمائے (1)۔ انسان کے اپنے تزکیہ کا کوئی اعتبار نہیں اصل اعتبار الله تعالیٰ کا اپنے بندے کا تزکیہ کرنا ہے۔ صحیح مسلم میں محمد بن عمرو بن عطا سے مروی ہے فرمایا: میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ رکھا، مجھے زینب بنت ابی سلمہ نے کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام سے منع کیا ہے اور تو نے اس کا نام برہ رکھا ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنی تعریف خود نہ کرو الله تعالیٰ تم سے نیکو کاروں کو بہتر جانتا ہے''۔ صحابہ نے کہا: ہم اس کا کیا نام رکھیں۔ فرمایا: ''اس کا نام زینب رکھو'' (2)۔ کتاب وسنت دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنا تزکیہ نہ کرے۔ اس طرح اب مصری شہروں میں کثرت سے اپنی صفات لوگ ذکر کرتے ہیں جو تزکیہ کا تقاضا کرتی ہیں مثلاً زکی الدین، محی الدین اور اس کے مشابہ القاب لیکن جب ان اسماء کے ساتھ مسلمانوں کی قباحتیں زیادہ ہو گئیں تو ان صفات کا اپنے اصل سے دور ہونا ظاہر ہو گیا اور یہ اس طرح ہو گئیں کہ اب کوئی فائدہ نہیں دیتیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** کسی دوسرے کا تزکیہ کرنا اور اس کی مدح کرنا، بخاری میں ابوبکرہ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ذکر کیا گیا اور ایک شخص نے اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس تو نے اپنے بھائی کی گردن توڑ دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کئی مرتبہ فرمایا۔ اگر تم میں سے کوئی لامحالہ کسی کی تعریف کرنے والا ہو تو اسے کہنا چاہیے میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں اگر وہ اسے اس طرح دیکھتا ہو اور اسے الله تعالیٰ کافی ہے اور کوئی شخص الله تعالیٰ پر کسی کا تزکیہ نہ کرے'' (3)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی ایسی تعریف کرنے سے منع فرمایا جو اس میں نہ ہو ورنہ اس میں اعجاب و کبر داخل ہو جائے گا اور گمان کرے گا کہ وہ حقیقت میں اس مقام پر فائز ہے اور یہ چیز اسے عمل کے ضائع کرنے اور فضیلت کی زیادتی کو ترک کرنے تک پہنچا دے گی۔ اسی وجہ سے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ویحك قطعت عنق صاحبك تجھ پر افسوس تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔ اور دوسری حدیث میں ہے: قطعتم ظهر الرجل (4)۔ تم نے آدمی کی پیٹھ توڑ دی۔ یہ آپ نے اس وقت فرمایا جب لوگوں نے ایک شخص کی ایسی تعریف کی جو اس میں نہیں تھی۔ اس بناء پر علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: احثوا التراب فی وجوہ المداحین (5) (تعریف کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی ڈالو) کی تاویل کی ہے۔ یہاں ایسے تعریف کرنے والے مراد ہیں جو باطل طریقہ سے مدح کریں اور ایسی صفات بیان کریں جو انسان میں نہ ہوں حتیٰ کہ اس کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہوں۔ اس کے ذریعے ممدوح سے کھانا حاصل کرتے ہوں اور اسے فتنہ میں مبتلا کرتے ہوں۔ رہا کسی کا کسی کی ایسے اچھے عمل اور محمود امر پر تعریف کرنا جو واقعی اس میں ہے تاکہ اس میں مزید

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 66-65　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 208

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 895　　4۔ ایضاً　　5۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 7، صفحہ 214

اچھے اعمال کی ترغیب ہو اور لوگوں کو اس کی اقتدا پر ابھارا جائے تو یہ وہ مدح نہیں ہو گی (جس کی مذمت کی گئی ہے) اگر چہ وہ انسان کے اچھے افعال و اقوال کی تعریف کرنے والا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار، خطبوں اور کلام کی خود تعریف فرمائی اور تعریف کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی نہ ڈالی اور نہ اس کا حکم دیا جیسے ابو طالب کا قول ہے:

وأبیض یُستسقَى الغمامُ بوجهه ثِمال الیتامى عِصمة للأرامل

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس اور حضرت حسان کی ان کے اشعار کی وجہ سے تعریف فرمائی، حضرت کعب بن زہیر کی مدح فرمائی اور اپنے صحابہ کی مدح فرمائی فرمایا: ''تم طمع کے وقت کم ہو گے اور گھبراہٹ کے وقت زیادہ ہو گے'' صحیح حدیث میں رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسی بن مریم وقولوا عبداللہ ورسولہ(1) (یعنی تم میری اس طرح تعریف میں مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا اور تم کہو عبداللہ ورسولہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میری ایسی صفات بیان نہ کرو جو مجھ میں نہیں ہیں جن کے ذریعے میری مدح تلاش کرتے ہو، جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایسی صفات بیان کی تھیں جو ان میں نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، پس اس طرح انہوں نے کفر کیا اور گمراہ ہوئے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جس کسی کو اس کی حد سے بلند کیا اور اس کی ایسی صفات بیان کیں کہ اس کی قدر سے تجاوز کیا تو وہ شخص حد سے بڑھنے والا گنہگار ہے، کیونکہ یہ اگر کسی میں جائز ہوتا تو سب مخلوق سے زیادہ اس کے مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا، يُظْلَمُوْنَ میں ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو اپنا تزکیہ کرتے ہیں اور جن کا اللہ تعالیٰ تزکیہ فرماتا ہے اور ان دو اصناف کے علاوہ جو لوگ ہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرنے والا نہیں۔ الفتیل کھجور کی گٹھلی کی شق میں جو سفید دھاگا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں: یہ حضرت ابن عباس، عطا اور مجاہد کا قول ہے(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ باریک پردہ ہے جو گٹھلی کے اردگرد ہوتا ہے جب کھجور پکی اور کچی کیفیت کے درمیان ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابو مالک اور سدی کا قول ہے جب تو اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں کو ملتا ہے تو جو میل نکلتی ہے اس کو فتیل کہتے ہیں(3)۔ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ تمام مفہوم کسی شے کی تحقیر اور تصغیر سے کنایہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اسی تحقیر کی مثال یہ ارشاد ہے: ولا یظلمون نقیرا، نقیر اس نکتہ کو کہتے ہیں جو گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے۔ اسی سے کھجور پیدا ہوتی ہے۔ شاعر نے کسی بادشاہ کی مذمت میں کہا:

تَجمعُ الجَیْشَ ذا الألوف و تغزُو ثم لا تَرزأ العدوّ فَتیلاً

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے تعجب کرایا، فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (دیکھیے کیسے اللہ پر افترا باندھتے ہیں) اپنے اس قول میں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اپنی ستائش خود کرتے ہیں(4)۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی گناہ نہیں سوائے اس کے جس طرح

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 490	2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 66	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

ہمارے بیٹوں کے گناہ ہیں جس دن کی پیدائش ہوتی ہے۔ الافتراء کا معنی جھوٹ گھڑنا ہے۔ اسی سے ہے: افتریٰ فلان علی فلان یعنی اس نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی۔ فریت الشئ۔ میں نے اسے کاٹ دیا۔ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا بیان کی بنا پر منصوب ہے مطلب گناہ کی بڑائی اور اس کی مذمت ہے۔ عرب اس کی مثل مدح اور مذمت میں استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یعنی یہود۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ۔ اہل تاویل کا الجبت اور الطاغوت کی تاویل میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور ابو العالیہ نے کہا: حبشی زبان میں الجبت جادوگر کو کہتے ہیں اور الطاغوت کاہن کو کہتے ہیں (1)۔ حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر نے فرمایا: الجبت سے مراد جادو ہے اور الطاغوت سے مراد شیطان ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود سے فرمایا: الجبت اور الطاغوت سے مراد یہاں کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب ہے۔ عکرمہ نے کہا: الجبت سے مراد حیی بن اخطب ہے اور الطاغوت سے مراد کعب بن اشرف ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ۔ قتادہ نے کہا: الجبت سے مراد شیطان ہے اور الطاغوت سے مراد کاہن ہے (3)۔ ابن وہب نے حضرت مالک بن انس سے روایت کیا ہے الطاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔ فرمایا: میں نے کسی شخص کو یہ کہتے سنا کہ جبت سے مراد شیطان ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ دونوں اللہ کے سوا ہر معبود کے لیے استعمال ہوتے ہیں یا وہ جس کی اللہ کی معصیت میں اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ احسن ہے۔ الجبت کا اصل الجبس ہے وہ جس میں خیر نہ ہو، تا سین کا بدل ہے۔ یہ قطرب کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجبت سے مراد ابلیس ہے اور الطاغوت سے مراد اس کے اولیاء ہیں۔ اس باب میں امام مالک کا قول بہتر ہے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل: 36) اور فرمایا: وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا (الزمر: 17) قطن بن المخارق نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الطرق والطیرۃ والعیافۃ من الجبت (4)، الطرق سے مراد جھڑکنا ہے اور العیافۃ سے مراد خط ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے بعض علماء نے فرمایا: الجبت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو اللہ نے حرام کیا اور الطاغوت سے مراد ہر سرکش انسان ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہود، قریش کے کفار کو کہتے: تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ کعب بن اشرف ستر سوار لے کر مکہ کی طرف جنگ احد کے بعد نکلا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ پر قریش سے معاہدہ کرے۔ کعب ابوسفیان کے پاس اترا اس نے اسے اچھا ٹھکانا دیا اور باقی یہود دوسرے قریش کے گھروں میں ٹھہرے سب نے معاہدہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑیں گے۔ ابوسفیان نے کہا: تو ایک ایسا شخص ہے جو کتاب پڑھتا ہے اور جانتا ہے اور ہم امی (ان پڑھ) لوگ ہیں، ہم نہیں جانتے ہم میں سے کون حق کے زیادہ قریب اور

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 66
2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 158
3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 158
4۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 477

ہدایت یافتہ ہے، ہم یا محمد؟ کعب نے کہا: اللہ کی قسم! تم محمد ﷺ سے زیادہ راہ راست پر ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ۔ ام متصلہ ہے، نصیبٌ کا معنی حصہ ہے۔ مِّنَ الْمُلْكِ، ملک سے ہے۔ یہ بطور انکار ہے یعنی ان کے لیے کوئی ملک نہیں ہے اگر اس میں سے ان کے لیے کچھ ہوتا تو اپنے بخل اور حسد کی وجہ سے کسی کو کچھ نہ دیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے بلکہ کیا ان کے لیے حصہ ہے(1)؟ اس صورت میں اَم منقطعہ ہوگا اس کا معنی پہلی بات سے اضراب اور دوسری کے لیے آغاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عاطفہ ہے، محذوف پر عطف ہے کیونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی اتباع سے نفرت کرتے تھے۔ تقدیر اس طرح ہے أهم اولی بالنبوۃ ممن ارسلته ام لهم نصیب من الملك۔

فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا یعنی وہ لوگوں کے حقوق روکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق ان کے عمل کی خبر دی جو ان کے متعلق وہ جانتا ہے۔ النقیر گٹھلی کی پیٹھ پر نکتہ کو کہتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ النقیر جو انسان اپنی انگلی سے کریدتا ہے جس طرح وہ زمین کو کریدتا ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا میں نے حضرت ابن عباس سے النقیر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اپنے انگوٹھے کی طرف اپنی شہادت کی انگلی کے باطن پر رکھی پھر دونوں کو بلند کیا اور کہا یہ نقیر ہے(2)۔ النقیر اصل میں وہ لکڑی ہے جس کو کریدا جاتا ہے اور اس میں نبیذ بنائی جاتی ہے۔ اس کے استعمال میں پہلے نہی وارد ہوئی تھی پھر منسوخ ہوگئی۔ فلان کریم النقیر یعنی کریم الاصل ہے۔ اذا یہاں ملغہ ہے، غیر عاملہ ہے، کیونکہ اس پر فا عاطفہ داخل ہے اور اگر نصب دیتا تو جائز ہوتا۔ سیبویہ نے کہا: اذا افعال کے عوامل میں اس طرح ہے جس طرح اسماء کے عوامل میں اظن ہے۔ یعنی جب کلام کا اعتماد اس پر نہ ہو تو لغو ہوتا ہے اور اگر کلام کی ابتدا میں ہو تو اس کے بعد فعل مستقبل ہو تو یہ نصب دیتا ہے جیسے تیرا قول ہے: انا ازورك میں تیری زیارت کو آؤں گا۔ وہ تجھے جواباً کہے: اذا اکرمك۔ عبداللہ بن عنمہ الضبی نے کہا:

اُرْدُدْ حِمَارَكَ لا يرتع بَرَوْضَتِنَا اِذَنْ يُرَدّ وَقَيْدُ الْعَيْرِ مكروبُ

یہاں اذن نے نصب دی ہے، کیونکہ اذن سے پہلے جو کلام ہے وہ مکمل ہے اور یہ ابتدائے کلام میں واقع ہوا ہے اگر یہ دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جیسے تیرا قول ہے، زید اذا یزورك تو لغو ہوتا ہے۔ اگر اس پر یا عاطفہ یا واؤ عاطفہ داخل ہو تو اس میں اعمال اور الغا جائز ہے۔ اعمال اس لیے کہ واؤ کے بعد نئی کلام ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ اور غیر قرآن میں فاذا لا یوتوا جائز ہے۔ قرآن میں ہے: وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ (الاسراء: 76) اور مصحف ابی میں تھا: واذا لا یلبثوا۔ اور الغا اس لیے کہ واؤ کے بعد جو ہوتا ہے وہ اس کلام کے بعد ہوتا ہے جس پر عطف کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک فعل کے لیے ناصب اذن ہے اور خلیل کے نزدیک اذن کے بعد ان مضمرہ ناصب ہے۔ فراء نے کہا: اذا الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور یہ منون ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ابوالعباس محمد بن یزید کو یہ کہتے سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اس شخص کے ہاتھ کو داغ دوں جو اذا کو الف کے ساتھ لکھتا ہے کیونکہ یہ لن اور ان کی مثل ہے اور حروف میں تنوین داخل نہیں ہوتی۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 67 2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 165

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

''کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (وہ حسد کی آگ میں جلا کریں) ہم نے تو مرحمت فرمادی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرمادی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت، تو ان سے کوئی ایمان لائے اس کے ساتھ اور کسی نے منہ پھیر لیا اس سے اور کافی ہے (انہیں جلانے کے لیے) جہنم کی دہکتی ہوئی آگ''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ اس سے مراد یہود ہیں۔ النَّاسَ سے مراد خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد وغیر ہما سے روایت ہے (1) یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نبوت ملنے پر حسد کیا تھا اور آپ کے صحابہ پر حسد کیا تھا ان کے ایمان لانے پر۔ قتادہ نے کہا: ''الناس'' سے مراد عرب ہیں (2)، یہود نے نبوت کی وجہ سے ان سے حسد کیا۔ ضحاک نے کہا: یہود نے قریش سے حسد کیا، کیونکہ ان میں نبوت تھی۔ حسد مذموم ہے اور حسد کرنے والا مغموم ہے حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھاتی ہے۔ حضرت انس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: میں نے حاسد سے زیادہ کوئی ظالم نہیں دیکھا جو مظلوم کے زیادہ مشابہ ہو جس کا نفس ہمیشہ قلق میں رہتا ہے۔ غم لاحق رہتا ہے اور اس کے آنسو ختم ہی نہیں ہوتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اللہ کی نعمتوں سے دشمنی نہ کرو۔ ان سے کہا گیا: کون اللہ کی نعمتوں سے دشمنی کرتا ہے؟ فرمایا: وہ لوگ جو لوگوں سے حسد کرتے ہیں ان نعمتوں پر جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی بعض کتب میں فرماتا ہے: حسد کرنے والا میری نعمتوں کا دشمن ہے، میری قضا سے ناراض ہے اور میری تقسیم پر خوش نہیں ہے۔ منصور الفقیہ نے کہا:

ألا قُلْ لمن ظَلَّ لی حاسداً — أ تدرِی علی مَن أساءتَ الأدَبْ

اساتَ علی اللہ فی حکمہ — إذا أنتَ لم ترضَ لی ما وَهَبْ

''خبردار میرے حاسد کو کہو: کیا تو جانتا ہے تو نے کس کی بے ادبی کی؟ تو نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سلسلہ میں اس کی بے ادبی کی جب تو مجھ سے خوش نہیں جو اس نے مجھے عطا فرمایا''۔

کہا جاتا ہے: حسد پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ آسمان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی اور پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ زمین میں نافرمانی کی گئی۔ آسمان میں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اور زمین میں قابیل نے ہابیل سے حسد کیا۔ ابو العتاہیہ نے لوگوں کے بارے میں کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً

فیاربِ إن الناس لا یُنصفونَنِی　　فکیف ولو أنصفتُهم ظلَمونِی
وإن کان لی شیْءٌ تصدّوا لأخذه　　وإن شئتُ أبغی شیئهم منعونِی
وإن نالهم بذْلی فلا شُکْرَ عندهم　　وإن أنا لم أبذُلْ لهم شتمونِی
وإن طَرَقَتْنِی نکبةٌ فکِهُوا بها　　وإن صَحِبتنِی نعمةٌ حسدونِی
سأمنع قلبی ان یَحِن إلیهمو　　وأحجب عنهم ناظری و جُفونِی (1)

بعض علماء نے فرمایا: جب تجھے پسند ہو کہ تو حاسد سے سلامت رہے تو اس پر اپنا معاملہ ظاہر نہ کر۔ قریش سے ایک شخص نے کہا:

حسدوا النعمةَ لما ظهرتْ　　فرموها بأباطیل الکَلِمْ
وإذا ما الله أسدی نعمه　　لم یَضِرْها قولُ أعداءِ النِّعَمْ

اور کتنا خوب کہا ہے:

إصبر علی حسدِ الحسودِ　　فإن صبرك قاتلهُ
فالنار تأکل بعضها　　إن لم تجد ما تأکلهُ

بعض اہل تفسیر نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡہُمَا تَحۡتَ اَقۡدَامِنَا لِیَکُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ۝ (حم السجدہ) کے تحت فرمایا کہ الذین سے مراد جنوں میں سے ابلیس ہے اور انسانوں میں سے قابیل ہے۔ کیونکہ ابلیس پہلا فرد ہے جس نے کفر کا طریقہ جاری کیا اور قابیل پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ جاری کیا۔ اس کی اصل حسد ہے۔ شاعر نے کہا:

إن الغُرابَ وکان یمشی مشیةً　　فیما مضی من سالف الأحوال
حسد القَطاةَ فرامَ یمشی مشیَها　　فأصابه ضربٌ من التَّعقالِ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی اور انہیں ملک عظیم بخشا۔ ہمام بن حارث نے کہا: ان کی فرشتوں کے ذریعے تائید کی گئی (2)۔ بعض نے فرمایا: یہاں ملک سے مراد حضرت سلیمان کی بادشاہی ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کیا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرتے ہیں اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عورتیں حلال کیں؟ پس اس بنا پر ملک عظیم سے مراد یہ ہوگا کہ اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ننانوے عورتیں حلال کیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس سے بھی زائد عورتیں حلال کیں۔ طبری نے فرمایا: اس سے مراد جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہی اور عورتوں کی حلت عطا فرمائی تھی۔ اور مراد یہود کی تکذیب اور ان پر رد ہے انہوں نے جو کہا تھا کہ اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہوتے تو زیادہ عورتوں میں رغبت نہ رکھتے

1۔ دیوان ابی العتاہیۃ، صفحہ 308　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68　　3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 169

اور نبوت انہیں ان سے علیحدہ رکھتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے لیے تھا۔ انہیں (یہود) توبیخ فرمائی پس یہود نے اقرار کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ہزار عورتیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں کہا کہ ان کی ہزار عورتیں تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، تین سو مہر والی اور سات سو لونڈیاں اور حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس سو عورتیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا: ''ایک شخص کے پاس ہزار عورتیں تھیں ایک شخص کے پاس سو عورتیں تھیں یہ زیادہ ہیں یا نو عورتیں زیادہ ہیں''۔ یہود خاموش ہو گئے۔ اس وقت آپ ﷺ کی نو ازواج مطہرات تھیں۔

**مسئلہ نمبر3**۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تمام انبیاء سے زیادہ بیویاں تھیں۔ کثرت ازواج میں فائدہ یہ تھا کہ ان میں چالیس انبیاء کی قوت تھی، جو جتنا طاقت ور ہوتا ہے وہ زیادہ نکاح کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: نکاح سے آپ نے زیادہ تعلقات قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ ہر عورت کے دو قبیلے ہوتے ہیں ایک باپ کی طرف سے، ایک ماں کی طرف سے۔ پس جب کوئی کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو دو قبیلے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ہر قبیلہ اس کے لیے اس کے دشمنوں کے خلاف مددگار ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: جو متقی ہوتا ہے اس کی شہوت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ جو متقی نہیں ہوتا وہ نظر اور لمس کے ذریعے اپنی شہوت کم کرتا رہتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جو حدیث میں مروی ہے کہ ''آنکھیں زنا کرتی ہیں، ہاتھ زنا کرتے ہیں'' (1)۔ جب دیکھنا اور چھونا شہوت کے پورا کرنے کی ایک قسم ہے تو جماع کم ہوتا ہے اور متقی نہ کسی کی طرف دیکھتا ہے، نہ چھوتا ہے تو اس کی شہوت اس کے نفس میں جمع ہوتی ہیں پس وہ زیادہ جماع پر قادر ہوتا ہے۔ ابو بکر الوراق نے کہا: ہر شہوت دل کو سخت کرتی ہے مگر جماع دل کو صاف کرتا ہے اسی وجہ سے انبیاء زیادہ نکاح کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر4**۔ **فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ** یعنی جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے۔ کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ سے حسد کیا جاتا تھا۔ **وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ** یعنی جس نے اعراض کیا اور آپ ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔ بعض علماء نے فرمایا: بہ کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (2)۔ معنی یہ ہوگا کہ آل ابراہیم میں سے جو حضرت ابراہیم پر ایمان لایا اور جنہوں نے اس سے روکا۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الکتاب ہے۔

**اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝**

''بے شک جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا ہم ڈال دیں گے انہیں آگ میں جب بھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دے دیں گے ہم انہیں کھالیں دوسری تا کہ وہ (مسلسل) چکھتے رہیں عذاب کو۔ بے شک اللہ

---

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 412　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68، دار الکتب العلمیہ بیروت

تعالیٰ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے عنقریب ہم داخل کریں گے انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں تا ابد، ان کے لیے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم داخل کریں گے انہیں گھنے سایہ میں''۔

الاصلاء کا معنی اس سورہ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ حمید بن قیس نے نون کے فتحہ کے ساتھ نصليهم پڑھا ہے یعنی ہم انہیں بھون دیں گے، کہا جاتا ہے: شاة مصلية (بھونی ہوئی بکری)۔ نادراً اس قرأت پر حرف جر کے حذف کے ساتھ ہے تقدیر عبارت بنار ہو گی۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ کہا جاتا ہے: نضج الشيء نُضجاً ونَضَجاً فلان نضيج الراء یعنی وہ پختہ رائے والا ہے۔ آیت کا معنی ہے ہم انہیں دوسری کھالیں تبدیل کر دیں گے۔ زنادقہ میں سے جو قرآن پر طعن کرتے ہیں اگر وہ کہیں کہ جلد کو کیسے عذاب دیا جائے گا جب اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اسے کہا جائے گا: جلد کو عذاب وعقاب نہیں کیا گیا حقیقت تکلیف نفوس پر واقع ہے، کیونکہ یہی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور کھالوں کی تبدیلی نفوس کے عذاب میں زیادتی ہے۔ اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اور ارشاد ہے كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (الاسراء)

پس مقصود ابدان کو عذاب دینا اور روحوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اگر کھالوں کا ارادہ ہوتا تو یوں کہا جاتا: ليذقن العذاب۔ مقاتل نے کہا: آگ اسے ہر روز سات مرتبہ کھائے گی۔ حسن نے کہا: ستر مرتبہ کھائے گی۔ جب وہ انہیں کھا لے گی تو انہیں کہا جائے گا: دوبارہ اسی طرح ہو جاؤ جس طرح پہلے تھے، تو وہ پہلی کیفیت میں ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جب وہ جل جائیں گے تو کاغذوں کی طرح سفید کھالیں ان کے لیے بدل جائیں گی (1)۔ بعض نے فرمایا: کھالوں سے مراد ان کے لباس ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (ابراہیم)

لباس کو کھال کہا گیا ہے، کیونکہ لباس کھالوں کو قرب کی وجہ سے لازم ہوتا ہے جس طرح جو چیز انسان کے ساتھ خاص ہوتی ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے: هو جلدة ما بين عينيه۔ حضرت ابن عمر نے یہ شعر کہا تھا:

يلومونني في سالمٍ وألومهم وجِلدةُ بَيْنَ العينِ والأنفِ سالمُ

وہ مجھے سالم کے بارے ملامت کرتے ہیں اور میں انہیں ملامت کرتا ہوں سالم تو میرے ساتھ خاص ہے۔

جب ایک لباس جل جائے گا تو پھر دوبارہ دے دیا جائے گا۔ شاعر نے کہا:

كسا اللؤمُ تَيْماً خضرةً في جلودها فويلٌ لتَيم مِن سرابيلها الخُضرِ

پس جلود، سرابیل سے کنایہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم انہیں پہلی کھالیں نئی کر کے لوٹا دیں گے جس طرح تو کاری گر کو کہتا ہے: تو میرے لیے اس انگوٹھی سے نئی انگوٹھی بنا دے۔ پس وہ اسے توڑتا ہے اور اس سے تیرے لیے نئی انگوٹھی بنا دیتا ہے۔ انگوٹھی جو بنائی گئی حقیقت میں وہی پہلی انگوٹھی ہے، لیکن بناوٹ بدل گئی جب کہ چاندی ایک تھی۔ یہ نفس کی طرح ہے جب وہ مٹی بن جائے گا تو وہ لاشئ ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا جیسے تیرا اپنے صحیح بھائی کے لیے عہد تھا پھر تو اسے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 69، دار الکتب العلمیہ بیروت

بعد میں بیمار کمزور دیکھتا ہے تو تو اسے کہتا ہے: تو کیسا ہے؟ وہ کہتا ہے: میں اس کے علاوہ ہوں جس کے ساتھ تیرا عہد تھا، حالانکہ وہ وہی ہے لیکن اس کی حالت بدل گئی ہے۔ قائل کا قول کہ میں وہ نہیں جس کا تیرا عہد تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد غَيْرَهَا مجاز ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ (ابراہیم: 48) اس دن زمین، دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، حالانکہ بعینہ یہ وہی زمین ہوگی مگر ان کے لیے ٹیلے، پہاڑ، انہار، اشجار بدل جائیں گے اس کی وسعت میں اضافہ کر دیا جائے گا اور اس کو برابر کر دیا جائے گا۔ مزید بیان سورۃ ابراہیم میں آئے گا۔ اس معنی سے شاعر کا قول ہے:

فما النّاسُ بالنّاس الذين عهدتم ولا الدار بالدار التي كنتُ أعرِفُ

اور شعبی نے کہا: ایک شخص حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور کہا: کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے عائشہ نے کیا کہا؟ اس نے اپنے زمانہ کی مذمت کی۔ اور انہوں نے لبید کے دو بیت پڑھے ہیں۔

ذهب الذين يُعاشِ فی آکنافِهم وبقِيتُ فی خَلْفٍ كجِلْدِ الأجْربِ

يَتلذّذون مجانَةً و مَذلةً ويُعاب قائلهم وإن لم يَشْغَبِ

حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ لبید پر رحم فرمائے، یہ اگر وہ ہمارے زمانہ کو دیکھتا تو وہ کیسے کہتا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اگر حضرت عائشہ نے اپنے زمانہ کی مذمت کی ہے تو عاد نے اپنے زمانہ کی مذمت کی، کیونکہ عاد کی ایک الماری میں ان کے ہلاک ہونے کے طویل زمانہ بعد ایک تیر پایا گیا وہ اس زمانہ کے نیزہ سے بھی لمبا تھا اس پر لکھا ہوا تھا:

بلاد بهاكُنّا و نحن بأهلها إذِ النّاسُ ناسٌ والبلادُ بِلادُ

شہر تو اسی طرح باقی تھے مگر ان کے احوال اور ان کے رہنے والوں کے احوال بدل گئے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا یعنی کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرتی نہ اس سے کوئی چیز فوت ہوتی ہے۔ حَكِيْمًا اپنے بندوں کو لوٹانے میں اس کی حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی صفت میں فرمایا: وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا یعنی اتنے گھنے سائے کہ ان میں دھوپ نہیں لگے گی۔ حسن نے کہا: ظلا کی صفت ظليلا لگائی گئی۔ کیونکہ اس میں وہ چیزیں داخل نہ ہوں گی جو دنیا کے سایہ میں داخل ہوتی ہیں مثلاً گرم ہوا وغیرہ۔ ضحاک نے کہا: درختوں کے سائے اور محلات کے سائے۔ کلبی نے کہا: ظِلًّا ظَلِيْلًا سے مراد دائمی سایہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝

”بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جوان کے اہل ہیں اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو انصاف سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، ہر چیز کو دیکھنے والا ہے“۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ یہ آیت اہم ترین احکام سے ہے یہ اپنے ضمن میں دین وشرع کی تمام تفصیلات کی جامع ہے نہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس آیت کا مخاطب کون ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب، زید بن اسلم، شہر بن حوشب اور ابن زید نے کہا: یہ خطاب مسلمانوں کے والیوں کو ہے(1)۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے امراء کے لیے ہے پھر بعد کے تمام امراء کو شامل ہے۔ ابن جریج وغیرہ نے کہا: یہ خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ کی چابی کے بارے میں خطاب ہے جب آپ نے عثمان بن ابی طلحہ اور اس کے چچازاد شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ سے وہ چابی لی تھی۔ یہ دونوں حضرات فتح مکہ کے وقت کافر تھے، حضرت ابن عباس بن عبدالمطلب نے چابی کو طلب کیا تاکہ پانی پلانے کے عمل کے ساتھ سدانہ کے عمل کو بھی ساتھ ملالیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے اور اس میں جو بت تھے انہیں توڑ دیا اور مقام ابراہیم کو نکالا، تو جبریل امین اس آیت کے ساتھ نازل ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ سے نکلے تو یہ آیت پڑھ رہے تھے، میں نے اس سے پہلے آپ سے یہ نہیں سنی تھی۔ عثمان اور شیبۃ کو بلایا اور کہا: یہ کعبہ کی چابی لے لو ہمیشہ ہمیشہ یہ تمہارے پاس رہے گی تم سے کوئی نہیں چھینے گا مگر ظالم۔ کسی نے حکایت کیا ہے کہ شیبۃ نے چابی نہ دینے کا ارادہ کیا پھر چابی اس نے پیش کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''یہ اللہ کی امانت لے لے''(2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت والیوں کے ساتھ خاص ہے کہ وہ عورتوں کو نافرمانی وغیرہ سے بچنے کی نصیحت کریں اور ان عورتوں کو اپنے خاوندوں کی طرف لوٹا دیں(3)۔ اس آیت میں ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ یہ ولاۃ کو شامل ہے کہ ان کے پاس جو امانات ہیں انہیں تقسیم کرنے میں اور ظلم کو دور کرنے میں اور فیصلوں میں عدل کرنے میں امانت کا مظاہرہ کریں۔ یہ طبری کا اختیار ہے۔ دوسرے لوگوں کو شامل ہے کہ وہ ودیعتوں کی حفاظت کریں، جھوٹی شہادت سے اجتناب کریں وغیرہ۔ جس طرح ایک شخص کسی نازل شدہ معاملہ میں فیصلہ کرتا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ یہ معنی حضرت ابن مسعود کی حدیث سے مرفوعاً بھی مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستہ میں شہید ہونا سارے گناہوں کا کفارہ ہے'' یا فرمایا: ''ہر چیز کا کفارہ ہے سوائے امانت کے۔ نماز میں امانت، روزے میں امانت، بات میں امانت اور سب سے سخت ودیعتیں ہیں''(4)۔ یہ حدیث ابونعیم حافظ نے الحلیۃ میں روایت کی ہے۔ جن علماء نے کہا کہ یہ آیت تمام لوگوں کو شامل ہے ان میں حضرت براء بن عازب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہر چیز میں امانت ہے وضو، نماز، زکوٰۃ، جنابت، روزہ، کیل، وزن اور ودائع۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی تنگ دست اور خوشحال کو امانت روکنے کی رخصت نہیں دی(5)۔

میں کہتا ہوں: یہ اجماع ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ امانتیں، ان کے حق داروں کو لوٹائی جائیں گی خواہ نیکوکار ہوں یا فجار ہوں۔ یہ ابن المنذر کا قول ہے۔ امانت مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے اسی وجہ سے اس کی جمع بنائی گئی ہے۔ نظم یہ کہ پہلے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 70، دار الکتب العلمیہ بیروت  2۔ ایضاً  3۔ ایضاً
4۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 10، صفحہ 219، حدیث نمبر 10627  5۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 70

گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی شان کو چھپایا تھا اور انہوں نے مشرکوں کو کہا: تم زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ یہ ان کی طرف سے خیانت تھی۔ پس کلام تمام امانات کے ذکر تک جاری ہوئی۔ پس یہ آیت اپنے نظم کی وجہ سے ہر امانت کو شامل ہے یہ بہت زیادہ ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ بڑی بڑی امانتیں احکام میں ہیں: ودیعت، لقطہ، رہن، عاریۃ۔ حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ أدّ الأمانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک(1)۔ جس نے تیرے پاس امانت رکھی تھی اسے امانت ادا کرو اور اس کے ساتھ بھی خیانت نہ کرو جو تم سے خیانت کرے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس اور حضرت ابوہریرہ نے یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا مفہوم گزر چکا ہے۔

حضرت ابوامامہ نے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں یہ فرماتے سنا: ''عاریۃ لی ہوئی چیز واپس کی جائے گی، دودھ والا جانور جو تمہیں دودھ پینے کے لیے دیا گیا ہے وہ لوٹایا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے'' (2)۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے اس کو نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے یہ زائد روایت کیا ہے: ایک شخص نے کہا: اللہ کا عہد (اس کا کیا حکم ہے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا حق ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے'' (3)۔ اس آیت اور حدیث کی بنا پر ودیعت لوٹائی جائے گی اور ہر حال میں یہ لوٹائی جائے گی خواہ اس کو چھپایا گیا ہو یا نہ چھپایا گیا ہو۔ اس میں تعدی کی گئی ہو یا تعدی نہ کی گئی ہو۔ یہ عطا، امام شافعی، امام احمد اور اشہب کا قول ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے حیوان یا کوئی اور چیز عاریۃ لی اور وہ ایسی چیزوں میں سے ہو جس کو چھپایا نہ جا سکتا ہو پھر وہ عاریۃ لینے والے شخص کے پاس تلف ہو گئی تو اس شخص کی تلف میں تصدیق کی جائے گی اور وہ ضامن نہ ہوگا مگر تعدی کے ساتھ یہ حسن بصری اور نخعی کا قول ہے اور یہی قول کوفیوں اور اوزاعی کا قول ہے۔ ان علماء نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کے ارشاد: العاریۃ مؤداۃ (عاریۃ لی گئی چیز واپس کی جائے گی) کا معنی اس ارشاد الٰہی کے معنی کی طرح ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا۔ جب امانت تلف ہو جائے گی تو امین پر اس کی چٹی لازم نہ ہوگی، کیونکہ اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اسی طرح عاریۃ لی گئی چیز بغیر تعدی کے تلف ہو جائے تو اس کی ضمانت نہیں لی جائے گی اور جب تعدی کے ساتھ تلف کرے گا تو اس پر خیانت کی وجہ سے اس کی قیمت اس پر لازم ہوگی۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ عاریۃ لی گئی چیز میں ضمانت نہیں ہے۔ دارقطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس پر ضمانت نہیں'' (4)۔ امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں حضرت صفوان نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا، جب آپ نے اس سے زرہیں عاریۃ لی تھیں۔ کیا یہ عاریۃ مضمونۃ ہیں یا عاریۃ مؤداۃ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عاریۃ مؤداۃ ہیں (5)۔

1۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 35، حدیث نمبر 141　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 41، حدیث نمبر 166
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 165　4۔ ایضاً، حدیث نمبر 167　5۔ ایضاً، حدیث نمبر 160

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ ضحاک نے کہا: اس کا مطلب ہے مدعی پر دلیل اور منکر پر قسم کے اصول کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یہ خطاب والیوں، امراء اور حکام کو ہے اور معنی کے اعتبار سے تمام مخلوق کو شامل ہے جیسا کہ ہم نے اداء امانات میں ذکر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انصاف کرنے والے قیامت کے روز رحمٰن کی دائیں جانب نور کے منبروں پر ہوں گے اور رحمٰن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں وہ لوگ جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل کے بارے میں اور جن کے والی ہوتے ہیں، ان کے بارے میں عدل کرتے ہیں'' (1) اور فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا، امام نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا، آدمی اپنے اہل پر نگران ہے اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا، عورت اپنے خاوند کے گھر پر نگران ہے اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا، غلام اپنے آقا کے مال پر نگران ہے اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ خبردار! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے پوچھا جائے گا'' (2)۔ ان احادیث صحیحہ میں یہ تمام نگران اور حکام ہیں اپنے اپنے مراتب پر۔ اسی طرح عالم اور حاکم بھی نگران ہے، کیونکہ جب وہ فتویٰ دیتا ہے تو حکم لگاتا ہے اور وہ حلال اور حرام، فرض اور ندب، صحت اور فساد کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ تمام امانت ہے جو ادا کی جاتی ہے اور حکم ہے جس کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ نعما کے بارے میں سورۂ بقرہ میں کلام گزر چکی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت سمیع و بصیر کو بیان فرمایا وہ سنتا اور دیکھتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾ (طٰہٰ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔ یہ سمع کا طریق ہے اور عقل اس پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ سمع اور بصر کا انتفاع اس کی نقیض اندھے پن اور بہرے پن پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ دو ضدوں کو قبول کرنے والا محل ایک چیز سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نقائص سے پاک ہے اور یہ محال ہے کہ جو نقائص سے متصف ہو اس سے افعال کاملہ کا صدور ہو جیسے سننے اور دیکھنے کی تخلیق اس سے جس کے لیے سمع و بصر نہیں ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نقائص سے پاک ہے یہ دلیل سمعی ہے اصل قرآن کے ساتھ ان لوگوں کے مناظرہ میں اس پر اکتفا کیا جائے گا جن کو کلمہ اسلام جمع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہم کرنے والوں کے وہم سے اور جھوٹ گھڑنے والوں کے افترا سے بلند و بالا ہے۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (الصافات)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذی شان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 121
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 122

ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر، یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کا انجام"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب پہلی آیت میں ولاۃ کو خطاب فرمایا اور انہیں اداء امانات کا حکم دیا اور انہیں لوگوں کے درمیان عدل کا حکم دیا، تو اس آیت میں رعیت کو خطاب فرمایا، انہیں پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا۔ اس سے مراد اس کے احکام کی پیروی کرنا، اس کی نواہی سے اجتناب کرنا ہے پھر رسول کی اطاعت کا حکم دیا۔ یعنی جو حکم دیا اور جو نہی فرمائی اس کی اطاعت کرنا۔ پھر امراء کی اطاعت کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: سات چیزوں میں سلطان کی اطاعت کرو، دراہم و دنانیر بنانے میں، کیل اور وزن میں، احکام، حج، جمعہ، عیدین اور جہاد میں۔ سہل نے کہا: جب کوئی سلطان عالم کو فتویٰ دینے سے منع کر دے تو اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے اگر وہ فتویٰ دے گا تو گناہگار ہوگا اگرچہ امیر ظالم بھی ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: سلطان کی اطاعت ایسے امر میں واجب ہوتی ہے جس میں اللہ کی اطاعت ہو، اللہ کی معصیت میں اطاعت واجب نہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ہمارے زمانہ کے والیوں کی اطاعت، معاونت اور تعظیم جائز نہیں اور ان کے ساتھ جہاد ثابت ہوگا اگر وہ ہمیں نماز پڑھائیں تو ان کے ساتھ نماز جائز ہوگی جب کہ وہ گناہوں کے اعتبار سے فاسق بھی ہوں۔ اگر وہ بدعتی ہوں تو ان کے ساتھ نماز جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ ان کا خوف ہو تو ان کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے گی اور نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرمایا: امام پر حق ہے کہ وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے جب وہ ایسا کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اداء امانت اور عدل کا حکم دیا پھر امام کی اطاعت کا حکم دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ اور مجاہد نے کہا: اولو الامر سے مراد اہل قرآن اور اہل علم ہیں۔ یہی قول امام مالک کا مختار ہے اور یہی ضحاک کا قول ہے۔ اس سے مراد ہیں فقہاء اور علماء دین۔

مجاہد سے حکایت ہے کہ اس سے مراد خالص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں (1)۔ اور عکرمہ سے حکایت ہے کہ یہ خاص حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی طرف اشارہ ہے (2)۔ سفیان بن عیینہ نے حکم بن ابان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عکرمہ سے امہات الاولاد کے بارے پوچھا: عکرمہ نے کہا: وہ آزاد ہیں۔ میں نے کہا: کس چیز سے؟ انہوں نے کہا: قرآن سے۔ میں نے کہا: قرآن میں کس آیت سے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ اور حضرت عمر اولی الامر میں سے تھے۔ حضرت عمر نے فرمایا: ام الولد آزاد ہوگئی اگرچہ بچہ گرا دے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ الحشر میں وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ الخ (الحشر: 7) کے تحت آئے گا۔ ابن کیسان نے کہا: اس سے مراد عقل والے اور اہل الرائے ہیں جو لوگوں کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: ان اقوال میں صحیح ترین قول پہلا اور دوسرا ہے۔ پہلا قول اس لیے کہ اہل قرآن سے امر کی اصل ہے اور حکم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 71　2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 180

ان کی طرف لوٹتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کا ارشاد حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیس بن عدی السہمی کے بارے نازل ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (چھوٹا سا لشکر) میں اسے امیر بنا کر بھیجا(1)۔ ابوعمر نے کہا: حضرت عبداللہ بن حذافہ کا مزاح معروف تھا ان کے مزاح سے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک لشکر میں امیر بنایا۔ انہوں نے اپنے لشکریوں کو کہا: لکڑیاں اکٹھی کرو اور آگ جلاؤ، جب انہوں نے آگ جلا دی تو انہیں آگ میں گھسنے کا حکم دیا۔ پھر انہیں کہا: کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ وہ صحابہ کہنے لگے: ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تاکہ ہم آگ سے بچ جائیں (اور تم پھر ہمیں آگ میں گھسنے کا حکم دے رہے ہو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے فعل کو درست کہا اور فرمایا: ''خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت (کا حکم) نہیں ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ مشہور ہے۔

محمد بن عمرو بن علقمہ عن عمر بن حکم بن ثوبان کے سلسلہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی اصحاب بدر میں سے تھے اور ان کی طبیعت میں مزاح تھا۔ اور حضرت زبیر نے ذکر کیا فرمایا: مجھے عبدالجبار بن سعید نے بتایا انہوں نے عبداللہ بن وہب سے انہوں نے لیث بن سعد سے روایت کیا۔ فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حزام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کو کسی سفر میں بٹھایا قریب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گر پڑتے۔ ابن وہب نے کہا: میں نے لیث سے پوچھا یہ انہوں نے آپ کو ہنسانے کے لیے کیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہاں ان میں خوش طبعی تھی۔ میمون بن مہران، مقاتل اور کلبی نے کہا اُولِی الْاَمْرِ سے مراد اصحاب السریہ، (جہاد کرنے والے) ہیں۔ اور رہا دوسرا قول تو اس کی صحت پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ اللہ تعالیٰ نے متنازع فیہ معاملہ کو کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹانے کا حکم دیا ہے اور علماء کے علاوہ کسی کو کتاب وسنت کی طرف لوٹانے کی طاقت نہیں۔ علماء سے سوال کرنے کے وجوب کی صحت پر یہ دلیل ہے اور ان کے فتویٰ کی پیروی کے لزوم کی صحت پر دلیل ہے۔ سہل بن عبداللہ نے فرمایا: لوگ خیر پر رہیں گے جب تک سلطان اور علماء کی تعظیم کرتے رہیں گے اور جب لوگ ان دو شخصیات کی تعظیم کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح فرما دے گا اور جب لوگ اپنے سلطان اور علماء کی تحقیر کریں گے تو ان کی دنیا و آخرت کو وہ خراب کر دے گا۔ رہا تیسرا قول تو وہ خاص ہے اور چوتھا قول اس سے بھی خاص ہے اور رہا پانچواں قول ظاہر لفظ اس کی تائید نہیں کرتے، اگرچہ معناً صحیح ہے، کیونکہ عقل پر فضیلت کی بنیاد ہے اور ہر ادب کا سرچشمہ ہے عقل کو ہی اللہ تعالیٰ نے دین کے لیے اصل دنیا کے لیے سہارا بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقل کے کمال کے ساتھ تکلیف کو واجب کیا ہے اور عقل کے احکام کے ساتھ دنیا کی تدبیر بنائی ہے اور ایک عقل مند کوشش کرنے والوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ معنی حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اولی الامر سے مراد حضرت علی اور ائمہ معصومین

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

ہیں۔ اگر یہ معاملہ ہوتو پھر **فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ** کا کوئی معنی نہیں رہتا بلکہ اللہ فرماتا: فردوہ الی الامام و اولی الامر۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ کتاب وسنت پر حکم لگانے والا ہے۔ یہ قول متروک ہے اور جمہور کے نظریہ کے مخالف ہے۔

اطاعت کی حقیقت، حکم کی پیروی کرنا ہے جس طرح کہ معصیت اس کی ضد ہے اور معصیت کا مطلب حکم کی مخالفت کرنا ہے اطاعت یہ اطاع سے ماخوذ ہے جب کوئی پیروی کرے اور معصیت، عصی سے ماخوذ ہے جب کوئی سخت ہو جائے۔ اولو اس کا واحد ذو ہے یہ بغیر قیاس کے ہے جس طرح النساء، الابل اور الخیل بغیر قیاس کے جمع ہیں ان میں سے ہر ایک اسم جمع ہے اس کا اس کے لفظ سے واحد نہیں ہے۔ بعض نے الخیل کا واحد خائل کہا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ** یعنی تم جھگڑو اور اختلاف کرو گویا ہر فریق دوسرے کی حجت کو کھینچتا اور ختم کرتا ہے۔ النزع کا معنی کھینچنا ہے المنازعة کا معنی حجتوں کا کھینچنا ہے اسی سے حدیث ہے(1) وانا اقول مالی ینازعنی القرآن۔ میں کہتا ہوں: مجھے کیا ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جارہا ہے۔ اعشی نے کہا:

نازعتُهم قُضُبَ الرَّيحان مُتَّكئاً وقهوةً مُزَّةً رَاوُوقها خَضِلُ

الخضل نرم بوٹیوں کو کہتے ہیں الخضیلة باغ کو کہتے ہیں۔ فی شیء یعنی تمہارے دینی معاملہ میں۔ **فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ** یعنی یہ حکم کتاب اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی رسول کریم کی ظاہری حیات میں تو آپ سے سوال کرو اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی سنن میں غور وفکر کے ساتھ مسئلہ کا حل نکالو۔ یہ مجاہد، اعمش اور قتادہ کا قول ہے(2) اور یہ صحیح ہے۔ جس نے ایسا نظریہ نہیں دیکھا اس کے ایمان میں خلل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ** بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے تم کہو اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ یہ رد کا مطلب ہے(3)۔ یہ اس طرح ہے جیسے حضرت عمر بن خطاب نے کہا تھا: حق کی طرف رجوع، باطل پر ڈٹے رہنے سے بہتر ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ہمارے پاس وہ ہے جو کتاب اللہ میں ہے اور جو اس صحیفہ میں ہے یا وہ فہم ہے جو کسی مسلمان آدمی کو عطا کیا جاتا ہے۔ اگر اس طرح ہوتا جس طرح اس قائل نے کہا ہے تو وہ اجتہاد باطل ہو جائے گا جو اس امت کی خصوصیت ہے اور وہ استنباط بھی باطل ہو جائے گا جو ایک مسلمان کو عطا کیا جاتا ہے۔ لیکن مثالیں دی جاتی ہیں اور مثال تلاش کی جاتی ہے تا کہ درست نتیجہ نکالا جائے۔

ابو العالیہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ** اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور بااقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ مگر وہ چیزیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں فرمایا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے: اللہ اعلم یعنی اللہ بہتر جانتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا** (الاحقاف: 15)۔ اور **وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ**

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 119
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 71
3۔ ایضاً

حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (بقرہ:233) سے استنباط کی ہے جب ہم نے تیس مہینوں سے دو سال جدا کیے تو باقی چھ ماہ رہ گئے۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى الرَّسُوْلِ میں دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا جائے گا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی پیروی کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں جس چیز سے منع کروں اس سے اجتناب کرو اور جس کا میں تمہیں حکم دوں اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو، تم سے پہلے لوگوں کو اپنے انبیاء پر اختلاف کرنے اور کثرت سے سوال کرنے نے ہلاک کیا تھا'' (1)۔

اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے ابورافع سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے صوفے پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اس کے پاس میرے امر میں سے کوئی امر آئے جس کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے میں نے منع کیا ہے اور وہ کہے: ہم نہیں جانتے ہم جو کتاب اللہ میں پائیں گے اس کی اتباع کریں گے'' (2)۔ حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جب کہ آپ لوگوں کو خطاب فرما رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے ''کیا تم میں سے کوئی اپنے صوفے پر ٹیک لگائے ہوئے گمان کرتا ہے کہ اللہ نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا مگر جو اس قرآن میں ہے، خبردار! میں نے اللہ کی قسم حکم بھی دیا، وعظ بھی کیا اور کچھ چیزوں سے منع بھی کیا وہ قرآن کی مثل ہیں یا اس سے بھی زیادہ ہیں''۔ یہ حدیث ترمذی نے مقدام بن معدیکرب سے اس کے ہم معنی روایت کی ہے، فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (3)۔ اور قطعی اس میں یہ ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ (النور:63) (پس ڈرنا چاہیے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ خَيْرٌ مختلف فیہ مسئلہ کو کتاب وسنت کی طرف لوٹانا، اس میں جھگڑنے سے بہتر ہے۔ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا تاویل کا معنی مرجع ہے یہ آل یئول الی کذا سے مشتق ہے یعنی وہ ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ألت الشئ سے مشتق ہے جب تو اسے جمع کرے اور اس کی اصلاح کرے۔ تاویل کا معنی ان الفاظ کے معانی کو جمع کرنا ہے، جن کا سمجھنا مشکل ہے، ایسے لفظ کے ساتھ جس میں کوئی مشکل نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: اول اللہ علیك امرك۔ یعنی اللہ نے تجھ پر تیرا عمل جمع کر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ معنی ہو تمہاری تاویل سے بہتر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ

---

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 215

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، جلد 2، صفحہ 279۔ ایضاً، حدیث نمبر 3989، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، جلد 2، صفحہ 91

اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا۝ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۝

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا کہ انکار کریں طاغوت کا اور چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک۔ اور جب کہا جائے انہیں کہ آؤ اس (کتاب) کی طرف جو اتاری ہے اللہ نے اور (آؤ) رسول (پاک) کی طرف تو آپ دیکھیں گے منافقوں کو کہ منہ موڑ لیتے ہیں آپ سے روگردانی کرتے ہوئے''۔

یزید بن زریع عن داؤد بن ابی ھند عن الشعبی کے سلسلہ سے مروی ہے شعبی نے فرمایا: ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا ہوا۔ یہودی نے منافق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کرانے کی طرف بلایا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رشوت قبول نہیں کرتے۔ منافق نے یہودی کو یہود کے حکام سے فیصلہ کرانے کی طرف بلایا، کیونکہ جانتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں رشوت لیتے ہیں۔ جب اختلاف ہوا تو دونوں نے جہینہ قبیلہ میں ایک کاہن کو اپنا حکم بنانے پر اتفاق کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ یعنی منافق اور وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی یہودی یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ ...... وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۝

ضحاک نے کہا: یہودی نے منافق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا اور منافق نے کعب بن اشرف کی طرف بلایا۔ طاغوت یہی ہے۔ ابوصالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: منافقین میں سے ایک شخص جس کو بشر کہا جاتا تھا اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا تھا یہودی نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو اور منافق نے کہا: بلکہ کعب بن اشرف کے پاس چلو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام طاغوت رکھا، یعنی سرکشی کرنے والا۔ یہودی نے انکار کیا اس لیے کہ فیصلہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائیں گے جب اس منافق نے یہ دیکھا تو وہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ جب وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس آئے تو منافق نے کہا میں اس پر راضی نہیں ہوں۔ تم ہمارے ساتھ ابوبکر کے پاس چلو۔ حضرت ابوبکر نے بھی یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ منافق اس سے بھی راضی نہ ہوا۔ زجاج نے ذکر کیا ہے اس منافق نے کہا: عمر کے پاس چلو۔ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے تو یہودی نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے پھر ابوبکر کے پاس گئے تھے لیکن یہ ان کے فیصلوں سے راضی نہیں ہوا۔ حضرت عمر نے منافق کو کہا: واقعی مسئلہ اسی طرح ہے؟ منافق نے کہا: ہاں۔ حضرت عمر نے کہا: تم دونوں یہاں ٹھہرے رہو حتیٰ کہ میں تمہارے پاس آجاؤں۔ حضرت عمر گھر میں داخل ہوئے تلوار پکڑی (باہر آئے) اور منافق کو ماردی حتیٰ کہ منافق مر گیا۔ حضرت عمر نے فرمایا: جو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا میں اس کا فیصلہ اس طرح کرتا ہوں۔ یہودی بھاگ گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انت الفاروق (1) (تو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے) جبریل امین نازل ہوئے اور کہا: حضرت عمر نے حق و باطل کے درمیان فرق کر دیا۔ پس آپ کو فاروق کا نام دیا گیا۔ یہ تمام آیات وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿۶۵﴾ تک اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔ ضلالاً معنی کی بنا پر منصوب ہے یعنی فیضلون ضلالاً۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴿﴾ (نوح) یہ معنی پہلے تفصیلاً گزر چکا ہے صُدُوْدًا خلیل کے نزدیک مصدر کا اسم ہے اور مصدر الصد ہے۔ کوفی علماء کہتے ہیں: یہ دونوں مصدر ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا﴿۶۳﴾

"پس کیا حال ہوتا ہے جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے پھر حاضر ہوتے ہیں آپ کے پاس قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی (کہتے ہوئے بخدا) نہیں قصد کیا تھا ہم نے مگر بھلائی اور باہمی مصالحت کا۔ یہ لوگ ہیں خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے (اے حبیب!) چشم پوشی فرمایئے ان سے اور نصیحت کرتے رہیے انہیں اور کہیے انہیں تنہائی میں ایسی بات جو مؤثر ہو"۔

یعنی فَكَيْفَ کیا حال ہوگا یا فکیف، یصنعون یعنی وہ کیا کریں گے۔ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ یعنی صحابہ کرام سے استعانت ترک کرنے کی وجہ سے جب انہیں کوئی مصیبت آپہنچتی ہے اور جو ذلت انہیں لاحق ہوتی ہے اس ارشاد میں: فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا (توبہ:83) بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ان کے اپنے سردار کا قتل ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یہاں تک کلام مکمل ہے پھر ان کے فعل کے متعلق خبر دی۔ یہ اس طرح ہے کہ حضرت عمر نے جب ان کے ساتھی کو قتل کر دیا تو ان کی قوم اس کی دیت کا مطالبہ کرنے کے لیے آئی اور قسمیں اٹھانے لگے کہ ہم دیت طلب نہیں کر رہے ہیں مگر احسان کے لیے اور موافقت حق کے لیے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ میں آپ سے عدول نہیں کیا مگر جھگڑے میں مصالحت کے لیے اور فیصلہ میں بھلائی کے لیے۔ ابن کیسان نے کہا: اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا﴿۶۲﴾ کا معنی عملاً اور حقاً ہے۔ اس کی مثال یہ ہے وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى (توبہ:107) اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ منافق ہیں اور ہمارے لیے فائدہ ہے کہ تم جان لو کہ یہ منافق ہیں۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ان کی سزا سے اعراض فرمائیں۔ بعض نے فرمایا: ان کے عذر قبول کرنے سے اعراض فرمائیں۔ وَعِظْهُمْ ان کو خوف دلائیں۔ بعض نے فرمایا: بھرے مجمع میں انہیں ڈرائیں۔ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا یعنی انہیں خلوت و اندرون خانہ خوب زجر و توبیخ کریں۔ حسن نے کہا: انہیں کہو اگر تم نے اپنے دلوں کی بات ظاہر کر دی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ عرب کہتے

1۔ تفسیر الکشاف تفسیر سورۂ نساء، جلد 1، صفحہ 525

ہیں: بلغ القول بلاغة، رجل بليغ يبلغ بلسانه كنه ما فی قلبه یعنی زبان کے ساتھ اپنے دل کی حقیقت تک پہنچا۔ عرب کہتے ہیں: احمق بلغ و بلغ یعنی وہ حماقت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ چاہتا ہے اس کو پہنچتا ہے اگرچہ وہ احمق تھا۔ کہا جاتا ہے: فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ مسجد ضرار بنانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کو ظاہر فرمادیا اور ان کی مسجد گرانے کا حکم دیا تو انہوں نے اپنے دفاع میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے قسمیں اٹھائیں ہم نے مسجد کی تعمیر فقط اللہ کی اطاعت اور کتاب کی موافقت میں کی ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے اللہ سے نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لیے رسول (کریم) بھی تو وہ ضرور پاتے اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول فرمانے، والا نہایت رحم کرنے والا''۔

اِلَّا لِيُطَاعَ جس کا حکم دے اور جس سے منع کرے۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ، اللہ کے علم کے مطابق۔ بعض نے اس کا معنی کیا ہے اللہ کی توفیق سے۔ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ۔ ابو صادق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمارے پاس ایک اعرابی آیا جب کہ ہم تین دن سے رسول اللہ ﷺ کو دفن کر چکے تھے۔ اس اعرابی نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر ڈال دیا اور قبر انور کی مٹی اپنے سر پر ڈالنے لگا اور کہا: یا رسول اللہ! آپ نے کہا تو ہم نے آپ کا قول سنا، آپ نے اللہ تعالیٰ سے کلام یاد کیا اور ہم نے آپ سے کلام یاد کیا۔ جو اس نے تجھ پر نازل کیا اس میں ہے: وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ (الآیۃ) میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تا کہ آپ میرے لیے استغفار کریں تو قبر انور سے آواز آئی ''تجھے بخش دیا گیا ہے'' (☆)۔

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا پائیں گے۔ یہ دونوں مفعول ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵

''پس (اے مصطفیٰ!) تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان پھر نہ بنائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کر لیں دل و جان سے''۔

☆۔ المجالس لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 275۔ المجموع للنووی، جلد 8، صفحہ 217

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے جنہوں نے طاغوت کے پاس فیصلہ لے جانے کا ارادہ کیا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ طبری نے کہا: فلا کا قول پیچھے جو ذکر ہو چکا ہے اس کا رد ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ کہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ پھر قسم سے آغاز فرمایا: وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2)۔ دوسرے ائمہ نے فرمایا: قسم پر لا کو نفی کے ساتھ اہتمام اور اس کو قوت کے اظہار کے لیے مقدم کیا گیا ہے پھر قسم کے بعد دوبارہ نفی کے ساتھ اہتمام کی تاکید کے لیے ذکر فرمایا اور دوسرے (لا) کا ساقط کرنا صحیح تھا اور پہلے لا کی تقدیم کے ساتھ اکثر اہتمام باقی تھا اور پہلے لا کو ساقط کرنا صحیح تھا اور نفی کا معنی باقی ہوگا لیکن اہتمام کا معنی ختم ہو جائے گا (3)۔ شجر اس کا معنی اختلاف کرنا اور خلط ملط ہونا ہے۔ درخت کو شجر اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ اس کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہوتی ہیں ہودج کی لکڑیوں کو شجار کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں۔ شاعر نے کہا:

نفسی فداءك والرّماح شَوَاجِر　　والقوم ضُنك لِلقاءِ قیام

میرا نفس تجھ پر فدا تھا جب نیزے گتھم گتھم تھے

طرفہ نے کہا:

وهُمُ الحكام اربابُ الهدیٰ　　وسعاة الناس فی الأمر الشّجر

حکام ارباب الھدیٰ اور ایک مختلف امر میں کوشش کر رہے تھے۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ آیت حضرت زبیر اور ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی ان کا باغ کو پانی پلانے میں جھگڑا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر کو کہا: تو اپنی زمین کو پانی پلا، پھر پانی اپنے پڑوسی کی زمین کی طرف چھوڑ دے۔ انصاری کہنے لگا: میں تیری طرف دیکھتا ہوں کہ آپ اپنی پھوپھی کے بیٹے سے محبت کرتے ہیں۔ یہ جملہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ سے رنگ بدل گیا اور آپ نے پھر حضرت زبیر سے کہا: تو اپنی زمین کو پانی پلا، پھر پانی روک لے حتیٰ کہ پانی وٹوں تک پہنچ جائے۔ اور پھر یہ آیت نازل ہوئی فَلَا وَ رَبِّكَ الخ۔ یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے (4)۔ امام بخاری کی سند یہ ہے عن علی بن عبد الله عن محمد بن جعفر عن معمر۔ اور مسلم نے قتیبہ سے پھر دونوں نے زہری سے روایت کی ہے۔ انصاری شخص کے بارے اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: وہ اہل بدر میں سے ایک انصاری تھا۔ مکی اور نحاس نے کہا: وہ حاطب بن ابی بلتعہ تھا۔ ثعلبی، وحدی اور مہدوی نے کہا: وہ حاطب تھا۔ بعض نے کہا: ثعلبہ بن حاطب تھا۔ اس کے علاوہ بھی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 75، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 74
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، جلد 1، صفحہ 373

اقوال میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ وہ غیر متعین اور غیر مسمی ہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم میں بھی رجل من الانصار ذکر ہے۔ طبری نے منافق اور یہودی میں اس کے نزول کو اختیار کیا ہے(1) جیسا کہ مجاہد نے کہا: یہ اپنے عموم کے ساتھ حضرت زبیر کے واقعہ کو شامل ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے پس جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی فیصلہ میں متہم کیا وہ کافر ہے لیکن انصاری سے لغزش ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور اس کی لغزش کو معاف کر دیا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے یقین کی صحت کا علم تھا۔ ان سے یہ لغزش عجلت میں ہوگئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے یہ حکم نہیں ہے ہر وہ شخص جو حاکم کے حکم سے راضی نہ ہوگا اور وہ اس میں طعن کرے گا اور اسے رد کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور جو حاکم میں طعن کرے اس کے فیصلہ میں طعن نہ کرے تو اس کو تعزیر لگانے اور اسے معاف کرنے کا حق ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ اعراف کے آخر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اس آیت کے نزول کا سبب وہ ہے جو ہم نے حدیث سے ذکر کیا تو اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر اور اس کے خصم کے بارے فیصلہ دیا وہ بطور صلح تھا۔ آپ نے فرمایا: ''اے زبیر تو پانی پلا''۔ کیونکہ پانی اس کے قریب تھا۔ ''پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دے'' یعنی اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور پورا پورا حق نہ لے اور اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑنے میں جلدی کر (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر کو مسامحت اور آسانی کرنے پر ابھارا جب انصاری نے یہ سنا اور اس سے راضی نہ ہوا اور ناراض ہوا، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حضرت زبیر بالکل پانی کو نہ روکے۔ تو اس نے اپنی زبان سے غلط ہلاک کرنے والا، شان رسالت کے جو لائق نہ تھا وہ کلمہ بولا۔ اس نے کہا: یہ اس لیے فیصلہ فرمایا ہے کہ زبیر تمہاری پھوپھی کا بیٹا ہے۔ اس کے جملہ میں آن ہے یہ ان مفتوحہ انکار کی جہت پر ہمزہ کی مد کے ساتھ ہے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ کی وجہ سے چہرہ متغیر ہوگیا، پھر آپ نے حضرت زبیر کے لیے پورا پورا حق لینے کا فیصلہ دیا وہ کسی قسم کی مسامحت کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت غضب میں کیسے فیصلہ فرمایا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے'' (3)۔ ہم کہیں گے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ اور احکام میں خطا سے معصوم تھے۔ عقل کی دلیل کے ساتھ جو دلالت کرتی ہے کہ آپ جو اللہ کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اس میں سچے ہیں۔ دوسرا کوئی آپ کی مثل نہیں ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حاکم جھگڑنے والوں کے درمیان اصلاح کا راستہ اختیار کرے اگرچہ اس پر حق ظاہر بھی ہو جائے۔ امام مالک نے اس سے منع کیا ہے، امام شافعی کا قول اس میں مختلف ہے۔ اس حدیث میں جواز پر واضح حجت ہے۔ اگر وہ صلح کرلیں تو فبہا ورنہ صاحب حق اپنا پورا حق وصول کرے گا اور حکم ثابت ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام مالک کے اصحاب کا اوپر والے کا نیچے والے کی طرف پانی چھوڑنے کی صفت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے کہا: اوپر والا تمام پانی اپنے باغ میں داخل کرے گا اس سے اپنے باغ کو سیراب کرے گا حتی کہ پانی باغ میں

---

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 190　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، جلد 1، صفحہ 373

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، جلد 2، صفحہ 149

اتنا ہو جائے کہ کھڑا ہونے والے کے ٹخنوں تک پہنچ جائے تو پھر پانی کا راستہ بند کرے اور ٹخنوں سے جو زائد مقدار میں پانی ہو وہ اپنے قریبی کی طرف چھوڑے معاملہ اسی طرح چلتا جائے حتیٰ کہ پانی آخری کھیت والے کو پہنچ جائے میرے لیے مطرف اور ابن الماجشون نے اسی طرح تفسیر بیان کی ہے۔ یہ ابن وہب کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: جب پانی باغ میں ٹخنوں کی مقدار تک پہنچ جائے تو تمام پانی نیچے والے کی طرف چھوڑ دے اور اپنے باغ میں کچھ بھی نہ روکے۔ ابن حبیب نے کہا: مطرف اور ابن الماجشون کا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے وہ اسے زیادہ جانتے تھے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں ان دونوں کا گھر تھا وہاں یہ واقعہ پیش آیا اور وہاں یہ عمل جاری تھا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام مالک نے حضرت عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہزور اور مذینب (مدینہ طیبہ کی دو وادیاں جن میں بارش کا پانی بہتا تھا) کے پانی کے بارے میں فرمایا: "(پہلے باغ والا) پانی کو ٹخنوں تک روک لے پھر وہ نیچے والے کی طرف چھوڑ دے" (1)۔ ابو عمر نے کہا: میں یہ حدیث نہیں جانتا کہ کسی طریق سے نبی کریم ﷺ سے متصل مروی ہو اس کی ارفع سند یہ ہے محمد بن اسحاق عن ابی مالك بن ثعلبة عن ابيه۔ نبی کریم ﷺ کے پاس مہزور والے آئے تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ پانی جب ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اوپر والا پانی کو نہ روکے (2)۔ عبدالرزاق نے ابو حازم قرطبی سے انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ "مہزور کے پانی میں یہ فیصلہ فرمایا کہ ہر کھیت میں پانی کو روک لیا جائے گا حتیٰ کہ ٹخنوں تک پہنچ جائے گا تو پھر چھوڑ دیا جائے گا اس کے علاوہ پانیوں کا یہی حکم ہوگا"۔ ابو بکر البزار سے اس حدیث کے بارے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے میں حدیث محفوظ نہیں کی جو ثابت ہو۔ ابو عمر نے کہا: اس معنی میں اگرچہ اس لفظ کے ساتھ حدیث ثابت نہیں ہے جس کی صحت پر اجماع ہے، اسے ابن وہب نے لیث بن سعد اور یونس بن یزید سے، ان دونوں نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ عروہ بن زبیر نے انہیں بیان فرمایا کہ انہیں حضرت عبداللہ بن زبیر انہیں حضرت زبیر سے روایت کر کے بتایا کہ ان کا ایک انصاری شخص سے پانی کی نالی میں جھگڑا ہوا دونوں اس نالی سے اپنے کھجوروں کے باغات کو سیراب کرتے تھے۔ یہ انصاری شخص نبی کریم کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوا تھا۔ انصاری نے کہا: "تو پانی چھوڑ دے"۔ زبیر نے انکار کیا۔ دونوں اپنا جھگڑا نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئے۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ ابو عمر نے کہا: ایک حدیث میں یرسل کے الفاظ ہیں اور دوسری میں اذا بلغ الماء الكعبين لم يحبس الاعلى (جب پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اوپر والا نہ روکے) یہ ابن القاسم کے قول کی تائید کرتے ہیں۔ نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اوپر والا اگر پانی نہیں چھوڑے گا مگر جو ٹخنوں سے زائد ہوگا تو وہ پانی تھوڑی مدت میں ختم نہیں ہوگا اور وہ نہیں پہنچے گا وہاں تک جہاں اس نے پہنچنا ہے جب تمام پانی چھوڑے اور اوپر والا اگر ٹخنوں تک پانی لینے کے بعد چھوڑ دے تو اس میں عام فائدہ ہے اور زیادہ نفع ہے اس صورت میں تمام لوگوں کو شریک بنایا گیا ہے پس ہر حال میں ابن القاسم کا قول اولیٰ ہے جب کہ اسفل (نیچے والا) کے

1۔ موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 643 2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 86، حدیث نمبر 1386

لیے اس کی اصل ملک نہ ہو جو اس کے ساتھ خاص ہو اگر کوئی کسی عمل کی وجہ سے یا ملک صحیح کی وجہ سے یا قدیمی استحقاق اور ملک کے ثبوت کی وجہ سے پانی کا مستحق ہو تو ہر ایک اپنے حق پر قائم رہے گا جیسا کہ اس کا قبضہ ہے اور اصل مسئلہ ہے۔ و باللہ التوفیق

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ، حَرَجًا کا معنی تنگی اور شک ہے اسی وجہ سے گھنے درخت کو حرج و حرجۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع حراج ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے جو اب آپ نے فیصلہ فرمایا اس کا انکار کر کے گناہ نہ پائیں۔ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا یعنی فیصلہ میں آپ کے امر کی اطاعت کریں۔ زجاج نے کہا: تَسْلِيْمًا مصدر مؤکد ہے اور جب تو کہتا ہے: ضربت ضربًا تو گویا تو کہتا ہے: میں اس میں شک نہیں کرتا، اسی طرح وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا یعنی وہ آپ کے فیصلہ کو اس طرح تسلیم کریں کہ ان کے نفسوں میں کوئی شک نہ ہو۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

''اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کرو اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے تو نہ بجالاتے اس کو مگر چند آدمی ان میں سے اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہوتا بہتر ان کے لیے اور (اسی طرح) سختی سے (اللہ کے احکام پر) ثابت قدم ہو جاتے، تو اس وقت ہم بھی عطا فرماتے انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم۔ اور ضرور پہنچاتے انہیں سیدھے راستے تک''۔

ان آیات کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس اور ایک یہودی نے باہم تفاخر کیا، یہودی نے کہا: اللہ کی قسم! ہم پر اپنے آپ کو قتل کرنا فرض کیا گیا تھا ہم نے اپنے آپ کو قتل کیا (1)، اور ہمارے مقتول ستر ہزار تک پہنچ گئے۔ ثابت نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ ہم پر فرض کرتا کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو تو ہم ایسا کرتے۔ ابو اسحاق السبیعی نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ تو ایک شخص نے کہا: اگر ہمیں حکم دیا جاتا تو ہم ایسا کرتے، سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے ہمیں عافیت دی۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من امتی رجالا الایمان أثبت فی قلوبھم من الجبال الرواسی (2)۔ میری امت کے کچھ ایسے لوگ ہیں ایمان ان کے دل میں مستحکم پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوطی سے موجود ہے۔ ابن وہب نے کہا: مالک نے کہا: یہ کہنے والے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، اسی طرح مکی نے کہا: وہ حضرت ابو بکر تھے۔ نقاش نے ذکر کیا کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر ہم پر یہ فرض کیا جاتا تو میں اپنے نفس اور اپنے گھر والوں سے اس حکم کی تعمیل کا آغاز کرتا (3)۔ ابو اللیث سمرقندی نے ذکر کیا ہے کہ وہ قائل حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ثابت بن قیس تھے، انہوں نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 75، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کہا: اگر الله تعالیٰ ہمیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیتا یا ہمیں اپنے گھروں سے نکلنے کا حکم دیتا تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ان لوگوں کے دلوں میں ایمان مستحکم پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوطی سے موجود ہے''۔ (لو) حرف ہے، کسی دوسری چیز کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے، پس الله تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اس نے ہم پر مہربانی کرتے ہوئے ہم پر یہ فرض نہیں کیا تا کہ ہماری معصیت ظاہر نہ ہو کتنے ایسے احکامات ہیں جن کے خفیف ہونے کے باوجود ہم نے کوتاہی کی تو اتنا بھاری حکم آجاتا تو کیا حالت ہوتی۔ لیکن الله کی قسم! مہاجرین نے اپنے گھروں کو خالی چھوڑ دیا اور وہ ان کے ذریعے پسندیدہ زندگی کی تلاش میں نکلے۔ مَّا فَعَلُوْهُ انہوں نے اپنے آپ کو قتل نہ کیا اور نہ انہوں نے گھروں کو چھوڑا۔ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ، قليلٌ، واو سے بدل ہے تقدیر اس طرح ہے ما فعله احدٌ الا قليل۔ اہل کوفہ کہتے ہیں یہ تکریر پر ہے ما فعلوه ما فعله الا قليل منهم۔ عبدالله بن عامر اور عیسیٰ بن عمر نے استثنا کی بنا پر الا قليلاً پڑھا ہے، اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔ اور باقی قراء نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع تمام نحویوں کے نزدیک عمدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: نصب فعل کے اضمار پر ہے تقدیر اس طرح ہوگی الا ان يكون قليلاً منهم۔ رفع بہتر ہے، کیونکہ لفظ معنی سے اولیٰ ہوتا ہے اور وہ معنی پر بھی مشتمل ہے اور ان قلیل میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ثابت بن قیس تھے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ حسن اور مقاتل نے حضرت عمار اور حضرت ابن مسعود کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہم نے بھی پہلے ان کا ذکر کیا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یعنی اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہوتا۔ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا یعنی حق پر مضبوطی سے ثابت قدم ہو۔ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا یعنی آخرت میں ثواب۔ بعض نے فرمایا: لام، لام الجواب ہے اور اذا جزا پر دال ہے، معنی یہ ہے لو فعلوا ما يوعظون به لاتيناهم۔ اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تو ہم انہیں عطا فرماتے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

''اور جو اطاعت کرتے ہیں الله کی اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر الله تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔ یہ (محض) فضل ہے الله تعالیٰ کا اور کافی ہے الله تعالیٰ جاننے والا''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ جب الله تعالیٰ نے اس امر کا ذکر کیا کہ اگر منافقین اس امر کو بجالاتے جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اور وہ اس کی طرف رجوع کرتے تو الله تعالیٰ ان پر انعام فرماتا۔ اس کے بعد ان کا ثواب ذکر

فرمایا جو ایسا کرتا ہے۔ یہ آیت اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ کی تفسیر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے وصال کے وقت کہا تھا: اللهم الرفيق الاعلى (1)۔ اے الله رفیق اعلیٰ کی سنگت عطا فرما۔ اس سے یہی مراد ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرمایا: میں نے رسول الله ﷺ کو یہ فرماتے سنا تھا: ما من نبی یمرض الا خیر بین الدنیا والاخرۃ۔ جو نبی مریض ہوتا ہے اسے دنیا اور آخرت میں اختیار دیا جاتا ہے۔

وہ تکلیف جس میں آپ مریض تھے آپ کو بولنے میں سخت دقت محسوس ہو رہی تھی تو میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ان لوگوں کی معیت جن پر الله نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ تو میں جان گئی کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے (2)۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عبدالله بن زید عبدربہ انصاری جسے اذان دکھائی گئی تھی نے کہا: یا رسول الله! جب آپ کا وصال ہو جائے گا اور ہم بھی فوت ہو جائیں گے تو آپ علیین میں ہوں گے ہم آپ کو دیکھ نہیں سکیں گے اور نہ آپ کے ساتھ جمع ہوں گے۔ حضرت عبدالله نے اس پر اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مکی نے اس عبدالله سے ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا تو انہوں نے دعا کی تھی: اللهم اعمنی فلا اریٰ شیئا بعدہ (3)۔ اے الله مجھے نابینا کر دے تا کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو نہ دیکھوں۔ فعمی مکانہ تو وہ اسی جگہ نابینا ہو گئے۔ قشیری نے اس کو حکایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللهم اعمنی فلا اریٰ شیئا بعد حبیبی حتی القی حبیبی، فعمی مکانہ۔ اے الله مجھے اندھا کر دے میں اپنے حبیب کے بعد کسی کو نہ دیکھوں حتیٰ کہ میں اپنے حبیب سے ملاقات کروں پس وہ اس جگہ نابینا ہو گئے۔ ثعلبی نے حکایت کیا ہے کہ یہ ثوبان مولیٰ رسول الله ﷺ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ نبی کریم ﷺ سے شدید محبت رکھتے تھے اور آپ کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے جب کہ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور جسم کمزور ہو چکا تھا اور حزن ان کے چہرے پر عیاں تھا آپ ﷺ نے پوچھا: اے ثوبان! تمہارا رنگ کیوں متغیر ہے۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول الله! ﷺ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے مگر میں جب آپ کو نہیں دیکھتا تو میرا اشتیاق بڑھ جاتا ہے اور مجھے انتہائی وحشت لاحق ہوتی ہے تو میں آپ سے ملاقات کرتا ہوں (اپنے عشق کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہوں) پھر میں نے آخرت کو یاد کیا اور مجھے خوف ہوا کہ میں وہاں تو آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا میں جانتا ہوں کہ آپ کا مرتبہ تو انبیاء کے ساتھ بلند ہو گا اور میں اگر جنت میں داخل بھی ہوا تو آپ سے نیچے درجے پر ہوں گا اور اگر میں جنت میں داخل نہ ہوا تو پھر کبھی بھی آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (4)۔

واحدی نے یہ کلبی سے ذکر کیا ہے اور مسروق سے سند اروایت کیا ہے فرمایا: صحابہ کرام نے کہا: ہمارے لیے مناسب نہیں کہ دنیا میں ہم آپ سے جدا ہوں لیکن جب آپ ہم سے جدا ہوں گے تو آپ کا مرتبہ ہم سے بلند ہو گا تو الله تعالیٰ نے یہ آیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 939
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 660
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 76
4۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 3، صفحہ 383

نازل فرمائی۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ...... الخ۔ اور اللہ کی اطاعت میں اللہ کے رسول کی اطاعت ہے لیکن آپ ﷺ کا ذکر آپ کے اسم کی قدر و منزلت کے اظہار کے لیے کیا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ یعنی وہ ان کے ساتھ ایک گھر میں اور ایک جیسی نعمتوں میں ہوں گے وہ ان کی زیارت سے متمتع ہوں گے اور ان کے ساتھ حاضر ہوں گے لیکن وہ درجہ میں ان کے مساوی نہ ہوں گے وہ درجہ میں تو مختلف ہوں گے لیکن دنیا میں اتباع اور اقتدا کی وجہ سے ایک دوسرے کی زیارت کریں گے۔ جو بھی جنت میں ہوگا اسے اس کے حال کے مطابق رضا ملے گی، تو اس سے مفضول ہونے کا اعتقاد ختم ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ونزعنا ما فی صدورھم من غل۔ صدیق فعیل کا وزن ہے صدق یا تصدیق میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ صدیق وہ ہوتا ہے جو اپنے فعل سے اس کو ثابت کرتا ہے جو وہ زبان سے کہتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انبیاء کی اتباع کرنے والے فضلاء ہیں جنہوں نے تصدیق میں سبقت کی جیسے حضرت ابوبکر صدیق، سورۂ بقرہ میں صدیق کا اشتقاق اور شہید کا معنی گزر چکا ہے۔ شہداء سے یہاں مراد حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی ہیں اور صالحین سے تمام صحابہ کرام ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الشُّهَدَآءِ سے مراد اللہ کے راستہ میں شہید ہونے والے ہیں۔ صالحین سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے نیک لوگ ہیں۔

میں کہتا ہوں: لفظ ہر صالح اور شہید کو شامل ہے۔ واللہ اعلم۔ رفیق نرم پہلو والے کو کہتے ہیں، ساتھی کو رفیق کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی صحبت کے ساتھ تجھ سے نرمی کرتا ہے۔ اسی سے الرفقة ہے۔ بعض، بعض سے مہربانی اور نرمی کرتے ہیں اور وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞ بھی جائز ہے۔ اخفش نے کہا: رَفِيْقًا حال کی بنا پر منصوب ہے یہ بمعنی رفقاء ہے اور کہا کہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے اسی وجہ سے واحد کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے گویا معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک رفیق ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثم نخرجکم طفلا یعنی تم میں سے ہر ایک کو نکالیں گے بطور بچہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ینظرون من طرف خفی۔

اس کا معنی نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ظاہر کرتا ہے خیر الرفقاء اربعة بہتر رفیق (دوست) چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہاں چار کا ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ہے یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب میں اپنے اولیاء کے مراتب کا ذکر کیا تو پہلے ان سے آغاز فرمایا جو صدیقین سے اعلیٰ ہیں اور وہ انبیاء ہیں پھر صدیقین کا ذکر فرمایا اور ان کے درمیان واسطہ نہیں بنایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام صدیق رکھنے پر مسلمانوں کا اجماع ہے جس طرح محمد ﷺ کا نام رسول رکھنے پر اجماع ہے جب یہ ثابت ہو گیا اور صحیح یہ ہے کہ آپ صدیق ہے اور رسول اللہ ﷺ دوسرے ہیں تو ان کے بعد کسی کا مقدم ہونا جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ذٰلِكَ الْفَضْلُ، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انہوں نے اپنی طاعت سے یہ مرتبہ نہیں پایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ مرتبہ پایا۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے کہ بندہ یہ مقام اپنے فعل سے حاصل کرتا ہے

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء پر احسان کا اظہار فرمایا اس کے ساتھ جو اس نے ان پر نوازشات فرمائی تھیں اور کسی کے لیے اس کام پر اپنی تعریف کرنا جائز نہیں ہوتا جو اس نے کیا نہیں ہوتا تو یہ معتزلہ کے قول کے بطلان کی دلیل ہے۔

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ۝

''اے ایمان والو! ہوشیار رہو پھر (وقت آ جائے تو) نکلو ٹولیاں بن کر یا نکلو سب مل کر''

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ، یہ امت محمدیہ میں سے مخلص مومنین کو خطاب ہے اور انہیں کفار سے جہاد کرنے، اللہ کے راستہ میں نکلنے اور شرع کی حمایت کرنے کا خطاب ہے ماقبل آیت سے اس کی نظم اور اتصال کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کی طاعت کا ذکر کیا تو اہل طاعت کو دین کے احیاء، اپنی دعوت کے اعلاء کے قیام کا حکم دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ بلا سوچے سمجھے دشمن کی صفوں میں گھس نہ جائیں حتیٰ کہ جو ہتھیار، سامان جنگ ان کے پاس ہے اس کا خوب پتا لگا لیں اور جان لیں کہ وہ ان پر کیسے حملہ کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ مضبوطی کا باعث ہے فرمایا خُذُوْا حِذْرَكُمْ تو جنگ کرنے کا اسلوب سکھایا اور یہ توکل کے منافی نہیں بلکہ یہ عین توکل کا مقام ہے جیسا کہ پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے اور مزید آگے آئے گا۔

الحِذر، الحَذَر دونوں لغتیں ہیں جیسے مِثل اور مَثل۔ الفراء نے کہا اکثر کلام میں الحذر استعمال ہوتا ہے الحِذر بھی مسموع ہے کہا جاتا ہے خذ حذرک یعنی احذر (احتیاط کر) اور کہا جاتا ہے خذوا السلاح حذرا کیونکہ ہتھیار کے ساتھ احتیاط ہوتی ہے اور احتیاط تقدیر کو دور نہیں کرتی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قدریہ اپنے اس قول میں کہ احتیاط دشمن کے مکائد اور سازشوں کو دور کرتا ہے۔ اہل سنت سے مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر احتیاط فائدہ نہ دیتی تو لوگوں کو احتیاط کا حکم دینے کا کوئی معنی نہیں تھا پس معتزلہ کو کہا جائے گا کہ آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں کہ احتیاط تقدیر سے کچھ فائدہ دیتی ہے لیکن ہمیں مکلف کیا گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ اسی سے یہ حدیث ہے اونٹ کو باندھو اور توکل کرو (1)۔ اگرچہ تقدیر پر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق جاری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس سے مراد دل کا اطمینان ہے نہ کہ یہ کہ احتیاط تقدیر سے کچھ فائدہ دیتی ہے اسی طرح احتیاط کرنا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبہ: 51) سے اپنے نبی کریم ﷺ کی تعریف کی ہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا جو ان پر فیصلہ تھا اس کے خلاف نہیں پہنچتا تو اس کلام کا کوئی معنی نہیں رہتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ کہا جاتا ہے نفر ینفر نفیراً فا کے کسرہ کے ساتھ، نفرت الدابۃ نفر نفوراً (فا کے ضمہ کے ساتھ) اس کا مطلب ہے دشمن سے جنگ کرنے کے لیے اٹھو، استنفر الامام الناس،

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام نے لوگوں کو نضر کی طرف بلایا یعنی دشمن سے لڑنے کی دعوت دی۔ النفیر اس قوم کو کہتے ہیں جو جنگ کے لیے نکلتے ہیں اس کی اصل النفار اور النفور سے ہے اور اس کا معنی گھبراہٹ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولوعلی ادبارھم نفورا یعنی وہ اسی سے ہے نفر الجلد یعنی جلد سوج گئی۔ تخلل رجل بالقصب فنفر فمہ یعنی آدمی نے سرکنڈے کے ساتھ حلال کیا تو اس کا منہ سوج گیا۔ ابوعبید نے کہا یہ نفار الشی من الشی سے مشتق ہے اور یہ ایک چیز کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے۔ ابن الفارس نے کہا النفر تین سے لے کر دس تک لوگوں کو کہتے ہیں النفیر اور النفر بھی ہے اسی طرح النفر اور النفرۃ بھی ہے۔ الفراء نے اس کو ہا کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ یوم النفر جس دن لوگ منیٰ سے نکلتے ہیں وثبات اس کا معنی ہے متفرق جماعتیں۔ کہا جاتا ہے ثبین جمع مذکر سالم اور جمع مونث سالم بنائی جاتی ہے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

فاما یوم خشیتنا علیھم فتصبح خلینا عصبا ثبینا

پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثُبَاتٍ یہ سرایا سے کنایہ ہے اس کا مفرد ثبۃ ہے۔ اس سے مراد لوگوں کا گروہ ہے اصل میں یہ الثبیۃ ہے۔ قد ثبیت الجیش کا مطلب ہے تو نے لشکر کو گروہ گروہ بنا دیا۔ الثبۃ حوض کے وسط کو کہتے ہیں جس کی طرف پانی لوٹتا ہے۔ النحاس نے کہا عربی میں کمزور کا گمان ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں اور ہر ایک دوسرے سے ہے حالانکہ ان کے درمیان فرق ہے۔ ثبۃ الحوض کی تصغیر میں کہا جاتا ثویبۃ کیونکہ یہ ثاب یثوب سے مشتق ہے اور ثبۃ جس کا معنی جماعت ہے اس کی تصغیر میں ثبیۃ کہا جاتا ہے۔ نحاس کے علاوہ نے کہا ثبۃ الحوض میں واؤ محذوف ہے۔ اور واؤ عین کلمہ ہے اور ثبۃ الجماعۃ، معتل اللام ہے یہ ثبا یثبو جیسے خلا یخلو سے مشتق ہے اور الثبۃ بمعنی الجماعت کا ثبۃ الحوض سے مشتق ہونا بھی جائز ہے۔ کیونکہ پانی جب لوٹتا ہے تو جمع ہوتا ہے اس بناء پر ایک جماعت نے اس کی تصغیر ثویبہ بنائی ہے پس ایک یا کو دوسری یا میں داخل ہو گئی۔ حالانکہ کہا گیا ہے کہ ثبۃ الجماعۃ یہ ثبیت علی الرجل سے مشتق ہے جب تو اس کی زندگی میں اس کی تعریف کرے اور تو نے اس کے ذکر کے محاسن جمع کیے پس وہ اجتماع کی طرف لوٹتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا اس کا معنی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کثیر تعداد میں لشکر بن کر نکلو یہ حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ سرایا، غلائم اور لشکروں کے احکام اور وجوب النفیر کے احکامات سورۃ الانفال اور سورہ برأت میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے کہا یہ آیت اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (توبہ:31) اور اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ (توبہ:39) کے ارشادات سے منسوخ ہے اور اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (کا منسوخ ہونا فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا اور وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (توبہ:122) کے ارشادات کے ساتھ اولیٰ ہے۔ کیونکہ جہاد فرض کفایہ ہے جب بعض مسلمان سرحدوں پر ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دونوں آیتیں محکم ہیں ایک اس وقت کے بارے میں ہے جب تمام پر جج فرض ہو جاتا ہے اور دوسری اس وقت کے بارے میں ہے جب کچھ لوگ ادا کر رہے ہوں تو کافی ہوتا ہے۔

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

''اور بے شک تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ضرور دیر لگائیں گے پھر اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ کہے: احسان فرمایا ہے اللہ نے مجھ پر کہ میں نہیں تھا ان کے ہمراہ (جنگ میں) حاضر۔ اور اگر ملے تمہیں فضل (فتح اور مال غنیمت) اللہ کی مہربانی سے تو ضرور کہے جیسے نہیں تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی کاش میں بھی ہوتا ان کے ہمراہ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ اس سے مراد منافقین ہیں۔ التبطئة اور الابطاء کا معنی ہے پیچھے رہنا۔ تو کہتا ہے: ما أبطأك عنا تمہیں ہم سے کس چیز نے پیچھے رکھا۔ یہ لازم ہے اور بطأت فلانا عن کذا بھی جائز ہے یعنی میں نے اس کو پیچھے کر دیا تو یہ متعدی ہے۔ اس آیت میں دونوں معانی مراد ہیں۔ منافقین خود بھی جہاد کے لیے نہیں نکلتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے اندر سے ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور ان میں سے ہیں جس نے تمہارے لیے اپنا ایمان ظاہر کیا۔ منافقین ظاہر حال میں مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان پر مسلمانوں کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں اور لمن میں لام تاکید کے لیے ہے اور دوسرا لام، لام قسم ہے اور من محل نصب میں ہے اور اس کے لیے صلہ لیبطئن ہے۔ کیونکہ اس میں قسم کا معنی ہے خبر منکم ہے۔ مجاہد، نخعی اور کلبی نے وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ یعنی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں قرأتوں میں معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ سے مراد بعض مومنین ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَ اِنَّ مِنْكُمْ کے ساتھ خطاب کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین اور منافقین کے درمیان وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ (توبہ:56) کے قول کے ساتھ فرق کیا ہے۔ کلام کا سیاق اور ظاہر اس قول کی تائید نہیں کرتا اور ان کو جنس اور نسب کے اعتبار سے خطاب میں جمع فرمایا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے نہ کہ ایمان کے اعتبار سے جمع کیا ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر دلیل یہ آیت ہے فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ یعنی قتل اور شکست تمہیں پہنچے۔ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے پیچھے رکھ کر مجھ پر احسان فرمایا اور یہ عمل اور قول منافق سے ہی صادر ہوتا ہے خصوصاً اس مقدس دور میں مومن کا یہ کہنا تو بعید ہے۔ اس آیت کی تفسیر وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ائمہ حدیث نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: ''منافقوں پر بھاری ترین نماز عشاء اور فجر کی نماز ہے اگر وہ جانتے جو ان دو نمازوں میں فضیلت ہے تو وہ ان نمازوں کی طرف آتے خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑتا''۔ ایک روایت میں آیا ہے ''اگر انہیں معلوم ہو کہ انہیں موٹی ہڈی ملے گی تو یہ عشاء کی نماز میں حاضر ہوتے'' (1)۔ یعنی اگر دنیا کی کوئی چیز ظاہر ہو تو اس کو لے سکتے ہیں اور انہیں اس کے ملنے کا یقین ہو تو وہ اس کی طرف دوڑ کر آئیں گے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232

وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غنیمت اور فتح تمہیں ملے۔ لَيَقُوْلَنَّ تو یہ منافق، حاسد اور نادم کے قول جیسا قول کرے گا۔ يّٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو میں عظیم کامیابی حاصل کرتا۔ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ یعنی اس نے تم سے جہاد پر کوئی عہد نہیں کیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن نے لیقولنّ (من) کے معنی کے اعتبار سے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) کیونکہ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ کے قول کا معنی کسی ایک خاص شخص کے لیے نہیں ہے اور جنہوں نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، لفظ (من) کے اعتبار سے واحد کی ضمیر لوٹائی ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے عاصم سے کان لم تکن، مودۃ کے لفظ کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے اور جس نے یا کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے مودۃ کو الودّ کے معنی میں تصور کیا ہے۔ اور منافقین کا قول يّٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ مَعَهُمْ مال غنیمت کے فوت ہونے پر تاسف اور حسد کی بنا پر اللہ کی جزا میں شک کے ساتھ یہ کہے گا۔ فافوز تمنی کا جواب ہے اسی وجہ سے نصب دیا گیا ہے۔ حسن نے فافوز رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ فوز کی تمنا ہے گویا یوں کہا: یالیتنی افوز فوزاً عظیما اور نصب جواب کی بنا پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو کامیاب ہوتا، اس میں نصب ان کے اضمار کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ مصدر کی تاویل پر محمول ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: یالیتنی کان لی حضور ففوزٌ کاش میرے لیے حاضری اور کامیابی ہوتی۔

فَلْيُقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

”پس چاہیے کہ لڑا کریں اللہ کی راہ میں (صرف) وہ لوگ جنہوں نے بیچ دی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض اور جو شخص لڑے اللہ کی راہ میں پھر (خواہ) مارا جائے یا غالب آئے تو (دونوں حالتوں میں) ہم دیں گے اسے اجر عظیم“۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيُقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ مومنین کو خطاب ہے یعنی اللہ کے راستہ میں لڑیں کفار سے الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ جنہوں نے بیچ دیں اپنی جانیں اور اپنے اموال اللہ کے لیے بِالْاٰخِرَةِ یعنی آخرت کے ثواب کے بدلے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ شرط ہے فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ اس پر معطوف ہے اور جزا فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ہے۔ فَيُقْتَلْ کا معنی ہے جو شہید ہوگا یا کامیاب ہوگا اور مال غنیمت لے گا۔ ایک جماعت نے من یقاتل اور فلیقاتل (لام امر کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے: فلیقاتل (لام امر کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والے کی دونوں حالتوں کا ذکر فرمایا اور جو ان دونوں کے درمیان غایتیں تھیں ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 78

پر اکتفا کیا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آیت کا ظاہر تقاضا کرتا ہے جو شہید کیا جائے گا یا مال غنیمت لے کر لوٹے گا ان کے درمیان برابری ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کفیل ہوتا ہے اس شخص کا جو اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے اور اسے نہیں نکالتا مگر اللہ کے راستہ میں جہاد، مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق، تو وہ میری کفالت ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں گا یا اسے اپنے مسکن کی طرف لوٹاؤں گا جس سے وہ نکلا اجر یا غنیمت حاصل کرتے ہوئے'' (1)۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مجاہدین اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں پھر وہ مال غنیمت حاصل کرتے ہیں وہ اپنے آخرت کے اجر میں سے دو ثلث (2/3) جلدی حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے لیے 1/3 حصہ باقی رہتا ہے، اگر انہیں غنیمت نہ ملی تو ان کے لیے اجر مکمل ہوگا'' (2)۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد: نائلا ما نال من اجر او غنیمۃ (اجر یا مال غنیمت حاصل کرتے ہوئے) یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو مجاہدین سے شہید ہوتا ہے وہ دو امور میں سے ایک امر پائے گا یا اجر اگر مال غنیمت نہ پایا یا مال غنیمت پائے گا اور اجر نہیں ہوگا۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث اس کے خلاف مفہوم رکھتی ہے۔ جب صورت حال اس طرح ہو تو ایک قوم نے کہا حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث کوئی حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ اس کی سند میں حمید بن ہانی ہے وہ مشہور نہیں ہے اور انہوں نے پہلی حدیث کو اس کی شہرت کی وجہ سے ترجیح دی۔ اور دوسرے ائمہ نے کہا: ان کے درمیان اور اختلاف نہیں ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں او بمعنی واؤ ہے جیسا کہ کوفی علماء کہتے ہیں۔ اس پر ابوداؤد کی روایت دلالت کرتی ہے اس میں من اجر و غنیمۃ (3) کے الفاظ ہیں یعنی واؤ ہے جو جمع پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض مسلم کے راویوں نے واؤ جمع بھی روایت کی ہے۔ اور حمید بن ہانی مصری ہیں انہوں نے ابوعبدالرحمٰن الحبلی اور عمرو بن مالک سے سنا ہے حیوہ بن شریح اور ابن وہب نے ان سے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث جہاد میں اخلاص اور مجرد نیت پر محمول ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ضمانت دی ہے یا تو اسے شہادت ملے گی یا وہ اپنے گھر والوں کے لیے مال غنیمت اور اجر حاصل کر کے لوٹے گا۔ اور دوسری کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ جب وہ جہاد کی نیت کرتا ہے لیکن مال غنیمت پانے کے ساتھ۔ جب اس کی نیت تقسیم ہوگئی تو اس کا اجر کم ہوگا۔ اور سنت اس پر دلالت کرتی ہے مال غنیمت پانے والے کے لیے اجر ہے جیسا کہ قرآن کریم اس پر دال ہے پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ پھر کہا گیا کہ مال غنیمت پانے والے کے اجر کی کمی اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا اس سے وہ متمتع ہوتا ہے اور اس زندگی کی سختی زائل فرما دیتا ہے اور جو مال غنیمت سے محروم ہوتا ہے تو اس نے کچھ نہ پایا اور وہ اپنی زندگی کی سختی پر باقی ہوتا ہے اور اپنی حالت پر صبر کرتا ہے تو اس کا پورا اجر باقی رہتا ہے بخلاف پہلے شخص کے۔ اس کی مثال دوسری حدیث میں ہے۔ **فمنا من مات لم یاکل من اجرہ شیئا ...... منھم مصعب بن عمیر ...... ومنا من اینعت لہ ثمرتہ فھو یھد بھا۔** جو ہم میں سے فوت ہوا اور اپنے اجر میں سے کچھ نہیں کھایا ان میں سے مصعب بن عمیر ہے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 133 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 337

......اور ہم میں سے کچھ لوگوں کا پھل پک چکا ہے وہ اسے چن رہا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۞

''کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو راہ خدا میں حالانکہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ جہاد پر برانگیختہ کرنا ہے۔ یہ اپنے ضمن میں اس بات کو لیے ہوئے ہے کہ کمزور لوگوں کو ان مشرکوں کے ہاتھوں سے آزاد کرانا ہے جو ان کمزور لوگوں کو سزا دیتے ہیں اور انہیں دین کے سلسلہ میں فتنہ میں ڈالتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ، دین کے غلبہ اور کمزور مومنین کو نجات دلانے کے لیے جہاد کو واجب فرمایا اگرچہ اس میں نفوس کا تلف بھی ہو۔ اور قیدیوں کا چھڑانا مسلمانوں کی جماعت پر واجب ہے، خواہ وہ جہاد سے ہو یا اموال خرچ کرنے کے ساتھ ہو۔ اور یہ ضروری ہے، کیونکہ یہ نفس سے کم درجہ رکھتے ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے تمام اموال کے ذریعے قیدیوں کا فدیہ دیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فُكُّوا العانی (1) قیدی کو چھڑاؤ۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ اسی طرح علماء نے فرمایا: ان پر لازم ہے کہ وہ قیدیوں سے غم خواری کریں، کیونکہ مواسات (غم خواری) فدیہ دینے سے کم ہے۔ اگر قیدی غنی ہو تو وہ فدیہ دینے والے کو مال لوٹائے یا نہیں اس میں علماء کے دونوں قول ہیں لیکن اصح یہ ہے کہ وہ رجوع کرے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ اسم جلالت اللہ پر معطوف ہے یعنی وفی سبیل المستضعفین۔ کیونکہ مستضعفین (کمزور لوگوں) کو خلاصی دینا بھی فی سبیل اللہ میں سے ہے۔ یہ زجاج کا اختیار ہے اور یہی زہری کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: میرا پسندیدہ قول ہے کہ اس کا معنی ہے فی المستضعفین، اس صورت میں السبیل پر عطف ہوگا یعنی وفی المستضعفین یعنی وہ جہاد کریں کمزور لوگوں کو بچانے کے لیے۔ پس یہ دونوں راستے مختلف ہیں۔ یعنی مکہ میں مومنین میں سے جو لوگ کفار قریش کی تکلیف میں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہی معنی ہے: اللهم انج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش بن ابی ربيعه و المستضعفين من المومنين (2)۔ اے اللہ ولید بن ولید، سلمۃ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو نجات عطا فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اور میری والدہ کمزور لوگوں میں سے تھے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے الا المستضعفين من الرجالِ و النِساءِ و الوِلدانِ۔ میں اور میری والدہ

---

1۔ شعب الایمان، کتاب فی الزکوۃ، جلد 3، صفحہ 215　2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 661

ان میں سے تھے جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور میں بچوں میں سے تھا اور میری والدہ عورتوں میں سے تھی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں قریۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ ظالم کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا اگرچہ یہ فعل مکہ والوں کا تھا، کیونکہ ضمیر کے ساتھ تعلق ہے یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: مررت بالرجل الواسعة دارہ، الکریم ابوہ الحسنة جاریتہ۔ اس کے ساتھ آدمی کا وصف بیان کیا گیا ان کے درمیان لفظی تعلق ہے اگر تو کہے: مررت بالرجل الکریم عمرو تو یہ جائز نہیں کیونکہ کرم، عمرو کے لیے ہے پس اس کو رجل کی صفت بنانا جائز نہیں مگر تعلق کے ساتھ اور وہ ضمیر ہے اس صفت کا نہ تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع، کیونکہ یہ فعل کے قائم مقام ہوتی ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ شہر جس کے بسنے والوں نے ظلم کیا اسی وجہ سے الظالمین نہیں فرمایا۔ تو کہتا ہے: مررت برجلین کریم ابواھما حسنة جاریتاھما و برجال کریم اباء ھم حسنة جواریھم۔ یعنی دو آدمیوں کے پاس سے گزرا جن کے باپ کریم تھے ان کی لونڈی خوبصورت تھی اور ایسے مردوں کے پاس سے گزرا جن کے آباء کریم تھے ان کی لونڈیاں خوبصورت ہیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ، لَّدُنْكَ بمعنی عندك ہے۔ وَلِيًّا جو ہمیں بچائے۔ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا جو ہماری ان کے خلاف مدد کرے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

''جو ایمان لائے ہیں وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں وہ جنگ کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں تو (اے ایمان والو) لڑو شیطان کے حامیوں سے بےشک شیطان کا فریب کمزور ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد فی طاعتہ ہے یعنی جو اللہ کی اطاعت میں جنگ کرتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ۔ ابوعبیدہ اور کسائی نے کہا: طاغوت مذکر اور مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ مذکر، مونث استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ کاہن اور کاہنہ کو طاغوت کہتے تھے۔ فرمایا ہمیں حجاج نے بتایا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں ابوالزبیر نے بتایا کہ انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے سنا ان طاغوتوں کے بارے میں پوچھا گیا جن کے پاس لوگ فیصلے کےلیے جاتے تھے، تو انہوں نے فرمایا: ایک طاغوت جہینہ میں تھا ایک اسلم میں تھا اور ہر قبیلہ میں ایک طاغوت تھا۔ ابواسحاق نے کہا: اس پر دلیل کہ وہ شیطان ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ یعنی شیطان کا مکر اور اس کے پیروکاروں کا مکر۔ کہا جاتا ہے: اس سے مراد بدر کا دن ہے جب مشرکین کو شیطان نے کہا تھا: لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ (الانفال: 48) تو جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا میں بری الذمہ ہوں تم سے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں جب کہا گیا کہ روکو اپنے ہاتھوں کو اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ (ان باتوں کو تو مان لیا) پھر جب فرض کیا گیا ان پر جہاد تب ایک گروہ ان میں سے ڈرنے لگ گیا لوگوں سے جیسے ڈرا جاتا ہے خدا سے یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے: اے ہمارے پروردگار! کیوں فرض کر دیا تو نے ہم پر جہاد اور کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک؟ (اے ترجمان حقیقت انہیں) کہو: دنیا کا سامان بہت قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہے اور نہیں ظلم کیا جائے گا تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر“۔

عمرو بن دینار نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ میں آئے اور کہا: اے اللہ کے نبی! ہم عزت میں تھے جب کہ ہم مشرک تھے جب ہم ایمان لائے تو ہم ذلیل ہو گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انی امرت بالعفو فلا تقاتلوا القوم (1)۔ مجھے عفو کا حکم دیا گیا ہے پس تم قوم سے نہ لڑو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ طیبہ کی طرف جانے کا حکم دیا تو آپ کو قتال کرنے کا حکم دیا پس وہ لوگ اس وقت جہاد سے رک گئے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حدیث کو نسائی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ اور یہ کلبی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ یہود تھے (2)۔ حسن نے کہا: یہ مومنین کے بارے میں ہے (3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَخْشَوْنَ النَّاسَ، النَّاسَ سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یہ بشری تقاضا کے مطابق خوف تھا نہ مخالفت کی وجہ سے تھا۔ سدی نے کہا: یہ وہ لوگ تھے جو جہاد کے فرض ہونے سے پہلے اسلام لائے تھے جب جہاد فرض کیا گیا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کا وصف بیان کیا گیا ہے (4) معنی یہ ہے کہ وہ مشرکین کی طرف سے قتل سے ڈرتے تھے جس طرح وہ اللہ کی طرف سے موت سے ڈرتے تھے۔ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً یعنی وہ اپنے اعتقاد میں اس سے بھی زیادہ ڈرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت کے سیاق کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ یعنی لَوْ لَاۤ، ھلا کے معنی میں ہے اس سے متصل فعل ہوتا ہے۔ اللہ کی پناہ کہ کسی معزز صحابی سے یہ قول صادر ہو جو جانتا ہو کہ یہ زندگی کی عمر محدود ہے اور رزق تقسیم شدہ ہے بلکہ صحابہ تو اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پیروی کرنے والے،

1۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 51
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 79
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 80
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 79

سننے اور اطاعت کرنے والے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں رہنے کی نسبت آخرت کے گھر میں پہنچنا بہتر ہے جیسا کہ ان کی سیرت سے ظاہر ہے مگر یہ کہ اس کا قائل ایسا شخص ہو جس کا ایمان ابھی راسخ نہ ہوا اور ابھی اس کا دل اسلام کی عظمتوں کے ساتھ کشادہ نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اہل ایمان ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے تھے ان میں سے کچھ کامل تھے اور کچھ ناقص تھے۔ یہ وہ تھے جس کا نفس متنفر تھا اس حکم سے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا جس میں اسے مشقت لاحق ہوتی تھی اور شدت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ۔ یہ مبتدا خبر ہے اسی طرح وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ یعنی جو گناہوں سے بچا۔ اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا دنیا کی منفعت اور اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا مراد ہے۔ دنیا کی منفعت کو قلیل کہا کیونکہ اس کے لیے بقا نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری مثال اور دنیا کی مثال سوار کی طرح ہے جس نے ایک درخت کے نیچے قیلولہ کیا'' (1)۔ پھر وہ پچھلے پہر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں تفصیلی مفہوم کے ساتھ گزر چکا ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝

''جہاں کہیں تم ہو گے آلے گی تمہیں موت اگرچہ (پناہ گزین) ہو تم مضبوط قلعوں میں اور اگر پہنچے انہیں کوئی بھلائی تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے انہیں کوئی تکلیف تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے۔ (اے میرے رسول) آپ فرمائیے سب اللہ کی طرف سے ہے۔ تو کیا ہو گیا اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے؟''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ شرط اور جزا ہے اور ما زائدہ ہے یہ خطاب عام ہے اگرچہ مراد منافقین یا وہ کمزور مومن ہیں جنہوں نے کہا تھا: لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ یعنی تو نے ہمیں کیونکہ ڈھیل نہ دی تاکہ ہم اپنی عمریں پوری کر کے فوت ہوتے۔ یہ منافقین کے زیادہ مشابہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انہوں نے کہا: لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا (آل عمران: 156) اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے، ابو صالح نے ان سے روایت کیا ہے البروج کا واحد برج ہے، بلند عمارت اور عظیم محل کو کہتے ہیں۔ طرفہ نے اپنی اونٹنی کی تعریف میں کہا:

كأنها بُرْجُ رُومِيٍّ تكنفها بانٍ بشِيدٍ وآجُرٍّ و أحجار

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 312۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 2299، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اونٹنی کو شاعر نے بلند روی محل سے تشبیہ دی ہے۔

طلحہ بن سلیمان نے یُدْرِکُکُمْ، کاف کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور فا کے اضمار کا اعتبار کیا ہے۔ یہ بہت قلیل ہے، یہ صرف اشعار میں ہوتا ہے۔

من یفعلِ الحسناتِ اللہُ یشکُرُھا

اس میں لفظ اللہ سے پہلے فا مضمر ہے۔

علماء تفسیر کا بروج کی مراد میں اختلاف ہے۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ زمین میں جو قلعے بنے ہوئے تھے وہ مراد ہیں۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ بچاؤ اور حفاظت میں انسان کی غایت ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی مثال دی۔ قتادہ نے کہا: قصورٌ محصنة۔ محفوظ قلعے۔ یہ ابن جریج اور جمہور کا قول ہے(1)۔ اسی سے ہے عامر بن طفیل کا قول جو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا ھل لك فی حصن حصین و منعة؟ کیا آپ کے لیے کوئی محفوظ قلعہ ہے؟ مجاہد نے کہا: البروج سے مراد محلات ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: البروج سے مراد حصون، قلعے اور محلات ہیں اور مُّشَیَّدَةٍ کا معنی بلند و بالا ہے۔ یہ زجاج اور قتبی کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: جو جص کے ساتھ بنائے گئے ہوں۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے محفوظ۔ المشید اور المشَیَّد دونوں کا ایک معنی ہے۔ اسی سے ہے قصر مشید اور تشدید تکثیر کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: الشیَّد سے مراد بلند و بالا ہے۔ الشید سے مراد وہ جو جس کے ساتھ لپائی کیے گئے ہوں۔ کہا جاتا ہے: شاد البنیان واشاد بنذ کرہ۔ سدی نے کہا: البروج سے مراد آسمان دنیا میں بنائے گئے بروج ہیں۔ یہ قول مکی نے امام مالک سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: کیا تم نے ملاحظہ نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ (البروج) جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا (فرقان: 61) وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا (الحجر: 16) ابن عربی نے ابن القاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ نقاش نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ کا معنی ہے وہ لوہے کے محلات میں ہیں(2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس قول کی تائید ظاہر لفظ نہیں کرتے(3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت عمروں کے بارے میں قدریہ کا رد کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِکْكُّمُ الْمَوْتُ ...... الایۃ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جب عمر ختم ہو جاتی ہے تو روح کا جسم سے جدا ہونا ضروری ہوتا ہے خواہ وہ بذریعہ قتل ہو یا طبعی موت ہو یا کوئی اور طرح ہو جس کو اللہ تعالیٰ جاری فرمائے تاکہ روح جسم سے نکل جائے۔ معتزلہ نے کہا: مقتول کو اگر قاتل قتل نہ کرتا تو وہ زندہ رہتا۔ سورۂ آل عمران میں ان کا رد گزر چکا ہے مزید آگے آئے گا۔ انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ کفار اور منافقین کی موافقت کی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ شہروں کا بنانا اور ان کی تعمیر کرنا تاکہ ان کے ذریعے اموال اور نفوس کی حفاظت کی جائے یہ بندوں میں اللہ کی سنت ہے۔ اس میں اس کی رد کی بہت بڑی دلیل ہے جو کہتے ہیں: توکل ترک اسباب کا نام ہے۔ شہروں کا بنانا بہت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 80	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 81

بڑا سبب ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ انبیاء کرام نے قلعے بنائے اور اپنی حفاظت میں اضافہ کرنے کے لیے شہروں کے اردگرد خندقیں کھودیں۔ احنف سے پوچھا گیا: دیواروں کی کیا حکمت ہے؟ اس نے کہا: تا کہ وہ سفیہ (بے وقوف) کو روکے، تا کہ حکیم آئے اور وہ اس کی حفاظت کرے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر ہم امام مالک اور سدی کے قول کو تسلیم کریں کہ یہ آسمان کے بروج ہیں تو پھر فلک کے بروج بارہ ہیں اور اس سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ان ستاروں کے لیے بروج ہیں تا کہ وہ ظاہر ہوں۔ یہ برج یبرج سے مشتق ہے جب کوئی چیز ظاہر ہو اور بلند ہو اسی سے ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (الاحزاب: 33)

ان کو اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کے لیے منازل بنایا اور ان میں اس کو مقدور کیا اور ان پر زمانوں کو مرتب کیا اور ان کو جنوبی اور شمالی بنایا، مصالح پر دلیل بنایا اور قبلہ پر علامت بنایا اور رات اور دن کے اوقات کے تحصیل کا راستہ بنایا تا کہ تہجد اور احوال معاش وغیرہ کے اوقات کی معرفت حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ یعنی منافقین کو جب خوشحالی اور شادابی میسر آتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ یعنی قحط سالی اور خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے یعنی یہ سب کچھ آپ کی، آپ کے صحابہ کی وجہ سے بے برکتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد سلامتی اور امن ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد امراض اور خوف ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد غنا ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد فقر ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد بدر کے دن کی نعمت فتح اور غنیمت ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد جنگ احد کی مصیبت، شدت اور قتل ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد خوشی ہے، سَيِّئَةٌ سے مراد تکلیف ہے۔ یہ تمام مفسرین اور علماء تاویل کے اقوال ہیں جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ۔

یہ یہود اور منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ ان کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے کہا: جب سے یہ شخص اور اس کے صحابہ ہمارے پاس آئے ہیں اس وقت سے ہمارے پھلوں اور کھیتوں میں کمی آگئی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مِنْ عِنْدِكَ کا معنی ہے تمہاری بے تدبیری کی وجہ سے۔ بعض نے فرمایا: تمہاری نحوست کی وجہ سے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تمہاری نحوست کی وجہ سے جو ہمیں لاحق ہوئی۔ یہ انہوں نے فال کی جہت سے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ یعنی شدت، خوشحالی، کامیابی، ناکامی سب اللہ کی طرف سے ہے یعنی اس کے فیصلہ اور قدرت سے ہے۔ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ یعنی منافقین۔ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا یعنی کیا وجہ ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾

"جو پہنچے آپ کو بھلائی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے آپ کو تکلیف سو وہ آپ کی طرف سے ہے اور بھیجا

ہے ہم نے آپ کو سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کا) گواہ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ٘ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ یعنی اے پیارے محمد! جو آپ کو شادابی، صحت اور سلامتی میسر آئے تو وہ تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے اور جو انسان کو قحط سالی اور شدت لاحق ہو وہ اس کے گناہ کی وجہ سے ہے جس پر اسے عقاب کیا گیا ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے یعنی اے لوگو! تمہیں جو شادابی، وسعت رزق میسر آئے تو وہ تم پر اللہ کا فضل ہے اور جو قحط سالی اور تنگی رزق پہنچے تو تمہاری اپنی طرف سے ہے یعنی تمہارے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ یہ حسن اور سدی وغیرہما کا قول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (طلاق:1) بعض علماء نے فرمایا: خطاب ایک انسان کو ہے اور مراد پوری جنس ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ (العصر) یعنی لوگ خسارے میں ہیں۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ان سے استثنا کی فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور استثنا جملہ یا جماعت سے ہوئی ہے۔ اس تاویل پر مَاۤ اَصَابَكَ نئی کلام ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے یقولون۔ اس پر کلام متصل ہوگی۔ معنی یہ ہوگا تو کیا ہو گیا اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے حتیٰ کہ کہتے ہیں، جب پہنچے آپ کو بھلائی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف استفہام مضمرہ ہے معنی ہے فَمِنْ نَّفْسِكَ کیا آپ کی طرف سے ہے؟ اس کی مثل ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ (الشعراء:22) معنی یہ ہے او تلك نعمة اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ (الانعام:77) ای اھذا ربی (یہ تمام مثالیں ہمزہ استفہام کی تقدیر کے ساتھ ہیں)۔

ابو الخراش الہذالی نے کہا:

رَمَوْنِی وقالوا یا خُوَیلد لم تُرَع فقلت وأنکرتُ الوجوهَ هُمُ هُمُ

شاعر نے أهم کا ارادہ کیا ہے۔ ہمزہ استفہام مضمر ہے۔ یہ کثرت سے ہوتا ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔ اخفش نے کہا: ما بمعنی الذی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شرط ہے۔ نحاس نے کہا: درست اخفش کا قول ہے، کیونکہ یہ قحط سالی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کا گناہوں سے کوئی تعلق نہیں اگر اس کا تعلق گناہوں سے ہوتا تو عبارت یوں ہوتی وما اصبت من سیئة۔ عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے: ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سیئة فمن نفسك وانا کتبتها علیك۔ یہ قرأت تفسیر کی بنا پر ہے۔ بعض کج رو لوگوں نے اس کو قرآن سے ثابت کیا ہے اور اس کے متعلق حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی سے مروی حدیث منقطع ہے، کیونکہ مجاہد نے نہ حضرت عبداللہ بن مسعود کو دیکھا اور نہ حضرت ابی کو دیکھا۔ اور جنہوں نے کہا: الحسنة سے مراد جنگ بدر کی فتح اور غنیمت ہے اور السیئة سے مراد جنگ احد کی شکست ہے۔ صحابہ کرام کو سزا ملی جب ان تیر اندازوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ پیچھے سے حفاظت کریں اور اپنی جگہ کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑیں، پس ان صحابہ نے قریش کی ہزیمت کو دیکھا اور مسلمانوں کو مال غنیمت اکٹھا کرتے ہوئے دیکھا تو

انہوں نے اپنی صفیں چھوڑ دیں۔ خالد بن ولید جو اس وقت کفار کے ساتھ تھے انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی پیٹھ تیر اندازوں کے گروہ سے خالی ہے، تو انہوں نے گھوڑوں کا ایک دستہ لیا اور مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صرف صاحب علم موجود تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی حفاظت کی تھی پس وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا اور شہید ہو گیا جیسا کہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی مثال نازل فرمائی۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ (آل عمران:165) یعنی جنگ احد میں جو تمہیں مصیبت پہنچی۔ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا (آل عمران:165) یعنی بدر کے روز اس کی دو مثل حاصل کر چکے ہو۔ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (آل عمران:165)

اور یہاں حَسَنَةٍ سے مراد اطاعت اور سَيِّئَةٍ سے مراد معصیت لینا جائز نہیں جیسا کہ قدریہ نے کہا اگر یہ اس طرح ہوتا تو ما اصبت ہوتا جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ فعل کے معنی میں ہے اور ہمارے نزدیک کسب کے معنی میں ہے۔ حَسَنَةٍ طاعت کے معنی میں اور سَيِّئَةٍ معصیت کے معنی میں ہے اسی قول میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (الانعام:160) لیکن اس آیت میں یہ خوشحالی، قحط سالی، راحت و شدت کے معنی میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کی ہے اور اسی طرح سورۂ اعراف میں آیا ہے وہ یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ ، السنین سے مراد یکے بعد دیگرے قحط سالی ہے، ان سے بارش روک لی اور پھلوں میں کمی ہو گئی اور قیمتیں بہت چڑھ گئیں۔ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (الاعراف:131) تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور) تو کہتے: ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے۔

یعنی وہ ان سے بری فال پکڑتے تھے اور کہتے تھے: یہ مہنگائی اور قحط سالی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے تیری اتباع کی اور تیری پیروی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس آیت سے رد فرمایا: اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ (الاعراف:131) یعنی برکت کی فال اور شؤم کی فال خیر اور شر، نفع و ضرر یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس میں مخلوق کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف ان چیزوں کو منسوب کیا فرمایا: وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران:166) اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور علم کے ساتھ۔ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لاتا ہے وہ شک نہیں کرتا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور اس کے ارادہ و مشیت سے ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء:35) اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝ (الرعد) اور جب

ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی ان کے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔

**مسئلہ**: بعض اہل سنت کے جہال نے اس آیت سے اسی طرح حجت پکڑی ہے جس طرح قدریہ نے اس سے حجت پکڑی ہے ان کے احتجاج کی وجہ یہ ہے کہ قدریہ کہتے ہیں: یہاں الحسنۃ بمعنی اطاعت ہے اور السیئۃ بمعنی معصیت ہے اور انہوں نے کہا: معصیت کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ میں انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ یہ اس آیت سے ان کے تعلق کی وجہ ہے۔ دوسرے علماء کے تعلق کی وجہ یہ ارشاد ہے: قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ان علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں الحسنۃ اور السیئۃ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، نہ کہ مخلوق کی طرف۔ یہ آیت ہے دونوں فریق کے جہال اس کے متعلق ہیں، کیونکہ انہوں نے اس کی بنیاد اس پر رکھی کہ سیئۃ یہاں معصیت کے معنی میں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ واللہ اعلم۔ قدریہ اگر کہیں کہ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ یعنی طاعت میں سے فَمِنَ اللّٰهِ تو اللہ کی طرف سے تو ان کا یہ عقیدہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ جس پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ نیکی، نیکی کرنے والے کا فعل ہے اور برائی، برائی کرنے والے کا فعل ہے۔ اسی طرح اگر ان کی اس آیت میں حجت ہوتی تو کلام اس طرح ہوتا ما اصبت من حسنۃ وما اصبت من سیئۃ۔ کیونکہ وہ نیکی اور برائی کا فاعل ہے اس کی طرف مضاف نہیں کیا جاتا مگر ان دونوں افعال کے کرنے کے ساتھ جن کو کسی غیر نے نہ کیا ہو۔ اس مقالہ پر امام ابوالحسن شبیب بن ابراہیم بن محمد بن حیدرہ نے اپنی کتاب احز الغلاصم فی إفحام المخاصم میں نص قائم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا مصدر مؤکد ہے یہ معنی بھی جائز ہے کہ ذا رسالۃ۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۝ بیان کی بنا پر نصب ہے اور با زائد ہے یعنی وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی رسالت کی سچائی پر گواہ ہے اور وہ گواہ ہے کہ وہ سچا ہے۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ۝

''جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جس نے منہ پھیرا تو نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس کی اطاعت ہے۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''(1)۔ اور ایک روایت میں ہے: ''جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 124

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ تَوَلّٰی جس نے منہ پھیرا۔ فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے اعمال کا پاسبان بنا کر نہیں بھیجا، آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ قتبی نے کہا: حَفِيْظًا کا معنی ہے محاسبًا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو آیۃ السیف سے منسوخ کر دیا اور اس سے جنگ کرنے کا حکم دیا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝

”اور کہتے ہیں: ہم نے حکم مان لیا اور جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ان میں سے اس کے برعکس جو آپ نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ راتوں کو سوچا کرتے ہیں پس رخ (انور) موڑ لیجئے ان سے اور بھروسہ کیجئے اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز۔ تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ یعنی أمرنا طاعةٌ اور طاعة پر نصب بھی جائز ہے یعنی نطیع طاعةً۔ یہ نصر بن عاصم، حسن اور حجدری کی قرأت ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی وہ جب آپ کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہمارا معاملہ اطاعت ہے یا ہم پوری طرح اطاعت کرتے ہیں اور ان کا یہ قول نفع بخش نہیں، کیونکہ جو اطاعت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو حقیقتہً مطیع نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس اطاعت کو ثابت نہیں کیا جو انہوں نے ظاہر کی تھی اگر بغیر اعتقاد طاعت اگر ہوتی تو ان کے لیے اس کا حکم کیا جاتا، پس ثابت ہوا کہ اعتقاد کے ساتھ اطاعت کا ثبوت ہے۔ فَاِذَا بَرَزُوْا جب وہ نکلتے ہیں۔ مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ طائفہ کا ذکر فرمایا، کیونکہ وہ رجال کے معنی میں ہے۔ کوفیوں نے تا کو طا میں ادغام کیا، کیونکہ دونوں ایک مخرج سے ہیں۔ کسائی نے فعل میں اس کو قبیح سمجھا ہے جب کہ بصریوں کے نزدیک یہ قبیح نہیں ہے اور بیت کا معنی ملمع سازی کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تبدیلی کرنا اور بدلنا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو انہوں نے بدلا جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا اور جس کا انہیں حکم دیا تھا۔ التبییت کا معنی تبدیل کرنا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

أتَوْنِي فلم أرْضَ ما بَيَّتُوا　وكانوا أتَوْنِي بأمرٍ نُكُرْ (1)

لِأُنْكِحَ أَيِّمهم مُنْذِراً　وهل يُنكح العبدَ حرٌّ لحُرّ

ایک اور شاعر نے کہا:

بيّت قولِيَ عبدُ المليـ　ـك قاتلة الله عبداً كفوراً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 83، دار الکتب العلمیہ بیروت

ان اشعار میں بیت کا معنی تبدیل کرنا ہے۔

وبیّت الرجل الامر جب کوئی رات کے وقت پھر جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ۔ اور عرب کہتے ہیں: أمر بیت بلیل جب کوئی امر پختہ کیا جائے۔ رات کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ فارغ وقت ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أجمعوا أمرهم بليل فلما أصبحوا أصبحت لهم ضَوضَاء

اس سے ہے بیّت الصیام و البیوت: الماء یبیت لیلاً و البیُوت: الامر یُبَیّت علیه صاحبُه مُهتَماً به۔

ہذلی نے کہا:

وأجعلُ فُقْرتها عُدّةً إذا خِفتُ بيُوتَ أمْرٍ عُضالِ

والتَّبیِتُ والبیات دشمن کا رات کے وقت آنا۔ بات یفعل کذا جب کوئی رات بھر کام کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ظل بالنہار، وبیّت الشیء یعنی کسی چیز کا اندازہ لگایا۔ اگر کہا جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ ابتدا میں تمام کا ذکر کیا پھر بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ فرمایا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کی حالت سے تعبیر فرمایا جس کے متعلق اسے علم ہے کہ وہ کفر اور نفاق پر باقی رہا اور اس سے درگزر فرمایا جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے واپس آجائے۔ بعض نے فرمایا: اس کی حالت کو بیان کیا جو حاضر ہوا اور اپنے معاملہ میں حیران ہوا اور جس نے سنا اور خاموش رہا تو اس کا ذکر نہ کیا۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ یعنی وہ ان کے اعمال کے صحیفوں میں ان کی سازش کو لکھ رہا ہے تا کہ انہیں اس پر سزا دی جائے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے وہ تجھ پر کتاب میں نازل کرے گا(1)۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ صرف قول کچھ مفید نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: طَاعَةٌ اور صرف یہ لفظ کہا اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کو ثابت نہیں فرمایا اور ان کی اطاعت کی صحت کا حکم نہ لگایا، کیونکہ وہ اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مطیع، اطاعت شعار نہیں ہوگا مگر اطاعت کے اعتقاد کے ساتھ جب کہ اطاعت ساتھ ساتھ بالفعل پائی بھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ یعنی ان کے اسماء کی خبر نہ دو(2)۔ ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے انہیں سزا نہ دو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور دشمن پر مدد میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنے کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے: یہ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (توبہ: 73) کے ارشاد سے منسوخ ہے، پھر منافقین پر عیب لگایا کہ وہ قرآن میں غور و فکر سے اعراض کرتے ہیں اور اس کے معانی میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ تدبرت الشیء۔ کسی چیز کے انجام میں غور و فکر کرنا۔ حدیث میں ہے لا تدابروا(3)۔ یعنی ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ واد بر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 83، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً

3۔ شعب الایمان، باب حفظ اللسان، جلد 4، صفحہ 199، حدیث نمبر 4783

القوم یعنی اس کا امر آخر تک پہنچا۔ والتدبیر انسان کا اپنے معاملہ میں غور وفکر کرنا گویا وہ اس کی عاقبت وانجام کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ آیت اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ (محمد) قرآن میں غور وفکر کرنے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے تا کہ اس کے معنی کو جان لیا جائے۔ یہ ان علماء کے قول کے فساد پر رد ہے جو کہتے ہیں: تفسیر سے کچھ نہیں لیا جائے گا مگر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور لغت عرب کی بنا پر جو سمجھ آئے اس کی تاویل سے منع کیا۔ اس میں غور وفکر اور استدلال کرنے کی دلیل ہے اور تقلید کے ابطال کی دلیل ہے، نیز اس میں قیاس۔ کے اثبات پر دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا یعنی اگر یہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں وہ بہت زیادہ تفاوت اور تناقض پاتے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ابن زید سے مروی ہے۔ اس اختلاف میں قرأت کے الفاظ اور امثال، دلالات کے الفاظ اور سور اور آیات کی مقادیر داخل نہیں بلکہ تناقض وتفاوت کا اختلاف مراد لیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم جس کے متعلق خبر دیتے ہو کہ یہ غیر اللہ سے ہے اگر ایسا ہوتا تو اس میں اختلاف ہوتا۔ بعض نے فرمایا: جو متکلم زیادہ کلام کرتا ہے اس کی کلام میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے یا تو وصف اور لفظ کے اعتبار سے یا جودت معنی کے اعتبار سے یا تناقض کے اعتبار سے یا جھوٹ کے اعتبار سے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور لوگوں کو اس میں غور وفکر کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ اس میں نہ تو وصف کے اعتبار سے اختلاف پائیں گے، نہ معنی کے اعتبار سے رد پائیں گے نہ تناقض پائیں گے اور جو غیوب کی خبریں انہیں دی گئی ہیں، جو راز کی باتیں انہیں بتائی گئی ہیں ان میں اختلاف نہیں پائیں گے۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا۝

''اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا خوف کی تو چرچا کرنے لگتے ہیں اس کا اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور بااقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں بات کا ان میں سے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور (نہ ہوتی) اس کی رحمت تو ضرور تم اتباع کرنے لگتے شیطان کا سوائے چند آدمیوں کے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ، اِذَا میں شرط کا معنی ہے اور اس کی جزا نہیں لگائی جاتی اگر چہ اس پر ما زائدہ کیا گیا ہو اور یہ بہت قلیل الاستعمال ہے۔ سیبویہ نے کہا: اور عمدہ ہے جو کعب بن زہیر نے کہا۔

وإذا ما تشاء تبعثْ منها مغربَ الشمسِ ناشِطًا مذعورًا

یعنی عمدہ یہ ہے کہ اذا ما کے ساتھ جزم نہ دی جائے جس طرح اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں یہ گزر چکا ہے مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا امر سنتے ہیں جس میں امن ہوتا ہے جیسے مسلمانوں کی کامیابی اور ان کے دشمن کا قتل

(اَوِالْخَوْفِ) یا اس کی ضد (اَذَاعُوْابِهٖ) تو اس کا خوب چرچا کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کمزور مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ حسن سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو افشا کرتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ان پر اس میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ضحاک اور ابن زید نے کہا: یہ منافقین کے بارے میں ہے پس انہیں اس سے منع کیا گیا، کیونکہ اس سے انہیں جھوٹی افواہ پھیلانا لازم آتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ یعنی اس پر گفتگو نہ کرتے اور اس کا چرچا نہ کرتے حتیٰ کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بیان کرتے اور اس کا اظہار کرتے۔ اُولِى الْاَمْرِ سے مراد اہل علم وفقہ ہیں۔ یہ حسن اور قتادہ وغیرہما سے مروی ہے۔ سدی اور ابن زید نے کہا: اس سے مراد والی ہیں (1)۔ بعض نے فرمایا: لشکروں کے امراء ہیں۔ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ یعنی وہ اسے نکالتے یعنی ہ جان لیتے جس کا افشاء کرنا مناسب تھا اور جس کا چھپانا مناسب تھا۔ الاستنباط یہ استنبطت الماء سے مشتق ہے جب پانی کو کوئی نکالے۔ النبط وہ پانی جو کنواں کھودتے وقت ابتدا میں نکلتا ہے اسے الماء المستنبط کہتے ہیں۔ نبطیوں کو نبط اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ زمین میں جو کچھ تھا اسے نکالتے تھے۔ لغت میں الاستنباط کا معنی الاستخراج (نکالنا) ہے۔ یہ اجتہاد کی دلیل ہے جب کسی معاملہ میں نص اور اجماع نہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ سیبویہ کے نزدیک فضل پر رفع مبتدا کی وجہ سے ہے اور اس کی خبر کا ظاہر کرنا جائز نہیں۔ اور کوفی کہتے ہیں: لولا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا اس آیت میں تین اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کا چرچا کیا مگر ان میں سے تھوڑے لوگوں نے یہ چرچا نہ کیا اور افشا نہ کیا۔ یہ نحویوں کی ایک جماعت کا قول ہے۔ کسائی، اخفش، ابو عبید، ابو حاتم اور طبری وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس کو جان لیا، ان لوگوں نے جنہوں نے ان میں سے استنباط کیا مگر ان میں سے تھوڑے لوگوں نے۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ زجاج کا مختار قول بھی یہی ہے۔ اس نے کہا: استنباط کو زیادہ لوگ جانتے تھے، کیونکہ اس کا مطلب ہے خبر کا علم حاصل کرنا۔ پہلے قول کو فراء نے اختیار کیا۔ اس نے کہا: سرایا کو مان لیا جب اس کا مستنبط علم غالب ہوا۔ الاذاعۃ (افشا) بعض میں ہوتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ کلبی نے فراء سے روایت کیا ہے اسی وجہ سے میں اذاعت سے استثنا کو اچھا سمجھتا ہوں۔ نحاس نے کہا: یہ دونوں قول مجاز پر ہیں مراد یہ ہے کہ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے اور تیسرا قول بغیر مجاز کے ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، یہ کہ اس نے تم میں اپنا (ذی شان) رسول بھیجا جس نے تم میں حجت قائم کی، تو تم کفر کرتے اور شرک کرتے مگر تھوڑے تم میں سے وحدانیت کا اظہار کرتے۔ اس میں چوتھا قول بھی ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے تم شیطان کی اتباع کرتے مگر تھوڑے۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خود شیطان کے امر کو بیان کرتے مگر تھوڑے (2)، یعنی جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ خالص فرما دیا۔ اس قول کی بنا پر اِلَّا قَلِيْلًا کا استثناء لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ کے قول سے ہوگا۔ مہدوی نے کہا: اس قول کا اکثر علماء نے انکار کیا ہے جب تم پر اللہ کا فضل اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 85، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 218

اس کی رحمت نہ ہوتی تو تمام لوگ شیطان کی پیروی کرتے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

"تو (اے محبوب!) جہاد کرو اللہ کی راہ میں نہ تکلیف دی جائے گی آپ کو سوائے اپنی ذات کے اور ابھاریں آپ ایمان والوں کو (جہاد پر) عجب نہیں کہ اللہ روک دے زور ان لوگوں کا جو کفر کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے نیز وہ سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ فا، وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ سے متعلق ہے یعنی اس وجہ سے جہاد کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے قول سے متعلق ہے گویا یہ معنی ہے دشمن سے جہاد کو نہ چھوڑ اور مومنین میں سے جو کمزور ہیں اس کی مدد کرنے کو ترک نہ کر اگرچہ تو تنہا بھی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تیری مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا اگرچہ وہ تنہا بھی جہاد کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت کی ضمانت دی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ لفظ کا ظاہر ہے (1)، مگر کسی خبر میں ایسا نہیں آیا کہ جہاد کسی مدت کے لیے آپ پر فرض کیا ہو اور امت پر فرض نہ ہو۔ معنی یہ ہے کہ لفظاً خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یہ مثال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: یہ ہر ایک کے لیے خاص ہے۔ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت میں سے ہر شخص کو یہ حکم ہے۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ۔ یہ ہر مومن کے لیے مناسب ہے کہ وہ جہاد کرے اگرچہ تنہا بھی ہو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: واللہ لا قاتلنھم حتی تنفرد سالفتی (2)۔ اللہ کی قسم میں ان سے جہاد کروں گا حتیٰ کہ میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔ حضرت ابوبکر نے لوگوں کے ارتداد کے وقت کہا تھا: ولو خالفتنی یمینی لجاھدتھا بشمالی اگر میرا دایاں ہاتھ میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں بائیں ہاتھ سے جہاد کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت بدر الصغریٰ کے موسم میں نازل ہوئی۔ ابوسفیان جب جنگ احد سے واپس گیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر الصغریٰ کے موسم کا وعدہ لیا۔ جب وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ستر شہسواروں کے ساتھ اس کی طرف نکلے لیکن ابوسفیان نہ آیا اور جنگ نہ ہوئی۔ یہ مجاہد کے قول کے معنی کے اعتبار سے ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اس کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہے کہ منافقین کا وصف بیان کیا گیا کہ وہ معاملے کو خلط ملط کرتے ہیں اور جھوٹی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اعراض کرنے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا اگرچہ اس پر کوئی بھی مددگار نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ تکلف مرفوع ہے، کیونکہ مستقبل کا صیغہ ہے اس کو جزم نہیں دی گئی، کیونکہ یہ پہلے کی علت نہیں ہے۔ اخفش نے کہا کہ اس کو جزم بھی جائز ہے اور اِلَّا نَفْسَكَ۔ مجہول کی خبر ہے معنی یہ ہے کہ کسی دوسرے کا فعل تم پر لازم نہیں ہوگا اور تم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 86

2۔ مسند احمد بن حنبل، مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 329

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال پر مومنین کو برانگیختہ کیا۔ کہا جاتا ہے: حرضت فلانا علی کذا۔ جب تو کسی کو کسی کا حکم دے۔ حارض فلان علی الامر واکبّ وواظب، سب کا ایک معنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، عَسٰی امید کے لیے ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے وجوب کے معنی میں ہوتا ہے، کیونکہ طمع (امید) کلام عرب میں وجوب کے معنی میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (الشعراء)

ابن مقبل نے کہا:

ظنّي بهم كعسى وهم بِتَنُوفةٍ يتنازعون جوائز الأمثال

اس میں عسٰی یقین کے معنی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا یعنی اللہ تعالیٰ کی صولت، سلطنت بہت زیادہ ہے اور گرفت کرنے پر زیادہ قادر ہے جس کا ارادہ کرتا ہے۔ وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ حسن وغیرہ کا قول ہے۔ ابن درید نے کہا: رماہ اللہ بنکلۃ یعنی رماہ بما ینکلہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر اسی چیز کو پھینکا جس کے ساتھ اس نے اسے سزا دی۔ نکلت بالرجل تنکیلاً یہ النکال سے مشتق ہے۔ المنکل وہ چیز جو انسان کو سزا دیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

ارم علی اقفائهم بمنكل

یعنی ان کی گردنوں پر عبرت ناک سزا دو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار شدت اور تکلیف میں ہیں اور تم نے کہا تھا کہ عَسٰی بمعنی یقین ہے تو پھر یہ وعدہ کیسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے یہ وعدہ پایا گیا، اس کا وجود استمرار اور دوام کے ساتھ لازم نہیں، جب ایک دفعہ یہ پایا گیا اگرچہ یک لحظہ کے لیے ہو تو وعدہ سچا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بدر الصغریٰ میں مشرکین سے ان کی تکلیف کو روک لیا اور جو انہوں نے جنگ اور قتال کا عہد کیا تھا اس سے وہ پیچھے رہ گئے۔ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (الاحزاب: 25) مومنین سے اللہ تعالیٰ نے قتال کو روک لیا اور حدیبیہ میں جب انہوں نے عذر کیا اور فرصت کو غنیمت جانا تو مسلمان ان کو سمجھ گئے۔ پس وہ نکلے اور انہوں نے انہیں قیدی بنا لیا یہ سفیر تھے جو صلح کرانے کے لیے چلے تھے۔ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (الفتح: 24) سے یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ نے ان گروہوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا وہ بغیر قتل وقتال کے واپس لوٹ گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ اور یہودی اپنے گھروں کو مومنین سے لڑے بغیر چھوڑ کر چلے گئے یہ سب باس ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنین سے روک لی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہود ونصاریٰ اور بہت سے دشمن رسوائی کے ساتھ جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اور ذلیل وخوار ہو کر جنگ کا راستہ ترک کر دیا پس اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی شدت روک لی۔ والحمد للہ رب

العالمین۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

''جو کرے گا سفارش اچھی، ہوگا اس کا حصہ اس میں سے اور جو کرے گا سفارش بری، تو ہوگا اس کے لیے بوجھ اس سے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّشْفَعْ، الشفاعۃ اور الشفعۃ وغیرہ الشفع سے مشتق ہیں اور اس کا معنی جفت عدد ہے۔ اسی سے الشفیع (شفعہ کرنے والا)، کیونکہ وہ صاحب حاجت کے ساتھ شفع (جفت) ہو جاتا ہے۔ اس سے ناقۃ شفوع ہے جب ایسی اونٹنی جو ایک بچہ جنم دینے کے بعد پھر حاملہ ہو جائے۔ الشفع، ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا۔ الشفعۃ شریک کی ملکیت کو اپنی ملکیت کے ساتھ ملانا۔ الشفاعۃ کسی دوسرے کو اپنی جاہ اور وسیلہ کے ساتھ ملانا۔ یہ حقیقۃ شفیع کی قدر و منزلت کا مشفع کے پاس اظہار کرنا ہے اور جس کے لیے سفارش کی گئی ہے اس کو نفع پہنچانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کی تاویل میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ مجاہد، حسن، ابن زید وغیرہم نے کہا: یہ لوگوں کا اپنی ضروریات کے لیے آپس میں سفارش کرنا ہے پس جو اس لیے سفارش کرے گا تا کہ وہ کسی کو نفع پہنچائے تو اس کے لیے حصہ ہوگا اور جو کسی کو ضرر اور نقصان پہنچانے کے لیے سفارش کرے گا اس کے لیے بوجھ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: شفاعت حسنہ وہ ہے جو نیکی اور اطاعت میں ہو اور سیئۃ سفارش وہ ہے جو معاصی (گناہوں) میں ہو (1)۔ جو اچھی سفارش کرے گا تا کہ دو آدمیوں کے درمیان صلح کرائے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا اور جو چغلی اور غیبت کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ یہ پہلی کے قریب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: شفاعت حسنہ سے مراد مسلمانوں کے لیے دعا کرنا ہے اور سیئۃ سے مراد مسلمانوں کے لیے بددعا کرنا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جس نے کسی کی غیر موجودگی میں اس کے لیے دعا کی تو اس لیے دعا قبول کی جاتی ہے اور فرشتہ کہتا ہے آمین اور تیرے لیے اس کی مثل ہے'' (2)۔ یہ ہے وہ حصہ جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو کسی کے لیے برائی کی دعا کرتا ہے تو اس کی نحوست اس کی اپنی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ یہود مسلمانوں کے لیے بددعا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو جہاد میں اپنے ساتھی کے ساتھ ملے گا اس کے لیے اجر میں سے حصہ ہوگا اور جو باطل میں اپنے ساتھی سے ملے گا اس کے لیے گناہ کا بوجھ ہوگا۔ حسن سے بھی مروی ہے الحسنۃ جو دین میں جائز ہو اور السیئۃ جو دین میں جائز نہ ہو۔ گویا یہ جامع قول ہے۔ الکفل کا مطلب بوجھ اور گناہ ہے۔ حسن، قتادہ، سدی اور ابن زید سے مروی ہے کہ اس سے مراد نصیب (حصہ) ہے۔ یہ کفل البعیر سے مشتق ہے وہ کپڑا جو سوار اونٹ کی کوہان کے اردگرد لپیٹتا ہے تا کہ وہ گر نہ جائے۔ کہا جاتا ہے: اکتفلت البعیر۔ جب کوئی اونٹ کی کوہان کے اردگرد کپڑا لپیٹے اور اس پر سوار ہو اس کو کہا جاتا ہے اکتفل کیونکہ اس نے ساری پیٹھ کو استعمال نہیں کیا بلکہ پیٹھ کا ایک حصہ استعمال کیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 86، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر، جلد 2، صفحہ 352

یہ خیر وشر کے حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: یُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَیۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ (الحدید:28)

سفارش کرنے والے کو اجر ملتا ہے جب وہ جائز کام کی سفارش کرتا ہے اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ بھی کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنۡ یَّشۡفَعۡ (جو سفارش کرے گا) مَنۡ یُّشَفَّعۡ (جس کی سفارش قبول کی جائے گی) نہیں فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے ''سفارش کرو تمہیں اجر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ جو چاہے گا اپنے نبی کی زبان پر فیصلہ فرمائے گا'' (1)۔

**مسئلہ نمبر**3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ مُّقِیۡتًا، مُّقِیۡتًا کا معنی ہے قدرت والا۔ اسی سے زبیر بن عبد المطلب کا شعر ہے:

وذی ضِغَنٍ كففتُ النفسَ عنه وكنتُ على مَساءته مُقِيتًا (2)

اس میں شاعر نے مقیتاً کو قدیراً کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو روزی دینے والا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: كفى بالمرء إثمًا أن يُضيع من يقيت (3)۔ انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے عیال وغیرہ کو ضائع کر دے یعنی جن کو وہ خوراک دیتا ہے جو اس کی قدرت میں ہیں اور قبضہ میں ہیں۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ اسی سے وہ کہتا ہے: قُتُّه أقوته قوتاً و أَقَتُّه أقِيتُه أقاتةً فأنا قائت و مُقيت۔ ان تمام کا معنی روزی دینا اور رزق دینا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے: أقات، يقيت۔ شاعر کا قول ہے۔

إنّی علی الحساب مُقِيتُ (4)

''میں حساب سے خوراک دینے والا ہوں''۔

طبری نے اس کے بارے کہا: یہ مذکورہ معنی سے نہیں ہے بلکہ یہ موقوف کے معنی میں ہے (5)۔ ابو عبیدہ نے کہا: المقیت کا معنی الحافظ (حفاظت کرنے والا) ہے۔ کسائی نے کہا: المقیت کا معنی المقتدر ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبیدہ کا قول اولیٰ ہے، کیونکہ یہ القوت سے مشتق ہے اور القوت کا معنی ہے وہ مقدار جو انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ الفراء نے کہا المقیت وہ ہوتا ہے جو ہر شخص کو رزق اور خوراک دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: كفى بالمرء اثماً أن يضيع من يقوت (6) انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کو وہ خوراک دیتا ہے۔ ثعلبی نے ذکر کیا ہے: ابن الفارس نے ''المجمل'' میں حکایت کیا ہے: المقيت المقتدر، المقيت الحافظ والشاهد، وما عنده قِيتُ ليلة وقوت ليلة۔ یعنی المقیت کا معنی قدرت والا ہے اور اس کا معنی حافظ وشاہد بھی ہے اور وہ بھی جس کے پاس رات کی خوراک ہو۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ حَسِیۡبًا ۝

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 330
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 86
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 238
4۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 223
5۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 87
6۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 238

''جب سلام دیا جائے تمہیں کسی لفظ دعا سے تو سلام دو تم ایسے لفظ سے جو بہتر ہو اس سے یا (کم از کم) دوہرا دو وہی لفظ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے''۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ، التحية یہ حییت کا مصدر ہے۔ اصل میں تحيية تھا جیسے ترضية اور تسمية ہے یا کو یا میں ادغام کیا گیا۔ التحية کا معنی سلام ہے۔ التحية کی اصل زندگی کی درازی کی دعا کرنا ہے۔ التحيات لله یعنی آفات سے سلامتی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ملک بھی ہے۔ عبداللہ بن صالح العجلی نے کہا: میں نے کسائی سے التحيات لله کے متعلق پوچھا کہ اس کا معنی کیا ہے؟ انہوں نے کہا: التحيات، برکات کی مثل ہے۔ میں نے کہا: برکات کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا میں نے اس کے متعلق محمد بن حسن سے پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ ایسی چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکلف کیا ہے پھر میں کوفہ میں آیا تو میں نے عبداللہ بن ادریس سے پوچھا۔ میں نے کہا: میں نے کسائی اور امام احمد سے التحيات لله کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مجھے ایسا ایسا کہا۔ عبداللہ بن ادریس نے کہا: ان دونوں کو اشعار اور ان اشیاء کا علم نہیں؟

التحية کا معنی الملک ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

أؤم بها أباقابوس حتى أنيخَ على تحيتة بجندِى

ابن خویز منداد نے کہا:

أسِير به الى النعمان حتى أنيخ على تحيتة بجُندِى

تحیۃ سے مراد ان اشعار میں ملک ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ولَكُلُّ ما نال الفتى قد نِلْتهُ إلا التَّحِيَّة

قتبی نے کہا: التحيات لله جمع کا صیغہ ذکر فرمایا، کیونکہ زمین میں بہت سے بادشاہ ہیں جو مختلف ملکیتیں رکھتے ہیں، پس بعض کو کہا گیا ابيت اللعن، اور بعض کو کہا گیا: اسلم وانعم بعض کو کہا گیا: عش الف سنة۔ اور ہمیں کہا گیا: تم کہو التحيات لله۔ یعنی وہ الفاظ جو ملک پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے ملکیت سے کنایہ ہیں۔ اس آیت کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہے کہ فرمایا: جب تم جہاد کے لیے نکلو جیسا کہ اس کا امر پہلے ہو چکا ہے تو تم پر سلام کے ساتھ سلام کیا جائے تو تم سلام کرنے والے کو یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے بلکہ تم سلام کا جواب لوٹاؤ، کیونکہ اسلام کے احکام ان پر جاری ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا آیت کے معنی اور تفسیر میں اختلاف ہے۔ ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت چھینک مارنے والے کا جواب دینے اور جواب دینے والے کے جواب کے بارے میں ہے۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ کلام میں اس پر کوئی دلالت نہیں ہے اور چھینک کا جواب دینے والے پر جواب لوٹانا قیاساً سلام لوٹانے کے معنی میں داخل ہے۔ اگر یہ قول امام مالک سے صحیح ہے تو امام مالک کا میلان اس طرف اس بنا پر ہوگا۔ اور ابن خویز منداد نے

کہا: اس آیت کو ہبہ پر محمول کرنا بھی جائز ہے جب وہ لوٹانے کے لیے ہو جس کو لوٹانے کے لیے ہبۃ کیا گیا اسے اختیار ہے چاہے تو واپس کر دے، چاہے تو اسے قبول کر لے اور اس پر اس کی قیمت لوٹا دے۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا: التحیۃ یہاں ہدیہ کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ رُدُّوْهَا۔ بعینہ سلام لوٹانا تو ممکن ہی نہیں ہے اور ظاہر کلام بعینہ تحیۃ ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ ہدیہ ہے اگر قبول کرے تو اسے عوض دینے کا حکم ہے یا بعینہ وہ ہدیہ لوٹا دے۔ یہ سلام میں تو ممکن ہی نہیں۔ لوٹانے کے لیے ہبہ اور ہدیہ کا حکم سورۂ روم میں: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا کے تحت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صحیح یہ ہے کہ یہاں التحیۃ سلام کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَیَّوْكَ بِمَا لَمْ یُحَیِّكَ بِهِ اللّٰهُ (المجادلہ: 8)

نابغہ ذبیانی نے کہا:

تُحَيِّيهم بيض الولائدِ بينهم وأكسيةُ الإِضريج فوق المشاجبِ

یہاں انہیں سلام کرنے کا شاعر نے ارادہ کیا ہے۔

اس مفہوم پر مفسرین کی ایک جماعت ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو آیت کی فقہ یہ ہو گی کہ کہا جائے کہ علماء کا اجماع ہے کہ سلام سے ابتدا کرنا مرغوب سنت ہے اور اس کا لوٹانا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک سلام کا جواب دے دے تو کافی ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ یہ ہے کہ کافی ہے جو سلام کرنے والا ہے اس پر اس کی مثل قول لوٹایا جائے گا۔ کوفیوں نے کہا: سلام کا لوٹانا فروض متعینہ میں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں: سلام کرنا، اس کا حکم سلام لوٹانے کے برعکس ہے، کیونکہ سلام کرنا تطوع اور نفل ہے اور اس کا لوٹانا فرض ہے اگر جن پر سلام کیا گیا ہے ان کے علاوہ کسی نے سلام کا جواب دیا تو ان سے فرض ساقط نہ ہو گا۔ پس یہ دلیل ہے کہ سلام کا لوٹانا ہر انسان پر لازم ہے حتیٰ کہ قتادہ اور حسن نے کہا: نمازی کو جب سلام کیا جائے تو بھی کلام کے ساتھ سلام کا جواب دے اور اس سے اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اس نے وہ فعل کیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے، جب کہ لوگوں کا عمل اس کے خلاف ہے۔ پہلے علماء نے ابوداؤد کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ایک جماعت گزرے تو ان میں سے ایک کا سلام کرنا کافی ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک کا ان کے سلام کا جواب دینا کافی ہے'' (1)۔ یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ ابوعمر نے کہا: یہ حدیث حسن ہے، اس کا کوئی معارض نہیں، اس کی سند میں سعید بن خالد ہے۔ یہ سعید بن خالد خزاعی مدنی ہے۔ بعض کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض نے اس کو ضعیف کہا ہے، ان میں ابوزرعہ، ابوحاتم اور یعقوب بن شیبہ ہیں ان محدثین نے اس کی حدیث کو منکر بنایا ہے، کیونکہ اس سند کے ساتھ اس میں وہ منفرد ہے، کیونکہ عبداللہ بن فضل نے عبیداللہ بن ابی رافع سے نہیں سنا ہے، ان کے درمیان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 352

اس حدیث کے علاوہ احادیث میں اعرج ہے۔ واللہ اعلم۔ نیز اس ارشاد گرامی سے حجت پکڑی ہے: یسلم القلیل علی الکثیر(1) تھوڑے زیادہ پر سلام کریں۔ جب اس بات پر اجماع ہے کہ ایک شخص پوری جماعت کو سلام کر سکتا ہے تو تکرار کی ضرورت نہیں اسی طرح ایک شخص جماعت کی طرف سے لوٹا دے وہ دوسروں کے قائم مقام ہو جائے گا جیسے فرض کفایہ ہوتے ہیں۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سوار، پیدل چلنے والے پر سلام کرے اور جب قوم میں سے ایک سلام کرے تو تمام کی طرف سے کافی ہوگا'' (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ دلیل ہے کہ ایک کا جواب دینا کافی ہے اور ایک شخص کے جواب دینے کے جواز میں اس کو حجت بنایا ہے۔ اس میں قلق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا بہتر لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زائد الفاظ کہے۔ وہ کہے: وعلیك السلام و رحمۃ اللہ۔ یہ اس کے جواب میں کہے جس نے سلام علیك کہا اگر وہ کہے: سلام علیك و رحمۃ اللہ تو تم وبرکاتہ جواب میں زائد کرو۔ یہ انتہا ہے اس پر مزید کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے البیت الکریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا و رحمۃ اللہ و برکاتہ، جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ اگر اس کا سلام غایت پر ختم ہو تو اس کے لوٹانے میں ابتدا میں واؤ کا اضافہ کر دے اور تو کہے وعلیك السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ! اور بالمثل لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ جو تجھے کہے: السلام علیك تو اس کے جواب میں علیك السلام کہہ دے مگر مناسب یہ ہے کہ سلام جمع کے صیغہ کے ساتھ کیا جائے اگرچہ جس کو سلام کیا گیا ہے وہ ایک ہی ہو۔ اعمش نے ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب تو ایک شخص کو سلام کرے تو السلام علیکم کہہ، کیونکہ اس کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں اسی طرح جواب بھی جمع کے صیغہ کے ساتھ ہو۔ ابن ابی زید نے کہا: سلام کرنے والا السلام علیکم کہے اور جواب دینے والا وعلیکم السلام کہے یا کہے السلام علیکم جیسا اسے کہا گیا ہے۔ اَوْ رُدُّوْهَا کا معنی ہے کہ تم اس کے جواب میں سلام علیك نہ کہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ سلام کرنے میں بہتر اور ادب یہ ہے کہ مخلوق کے اسم پر اللہ تعالیٰ کے اسم کو مقدم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ (الصافات) حضرت ابراہیم کے قصہ میں فرمایا: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ہود: 73) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا (سلام علیک)۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ہے (3) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا، ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا پھر جب انہیں تخلیق فرمایا: تو فرمایا تم جاؤ اور ان لوگوں پر سلام کرو، وہ فرشتوں کا گروہ تھا جو بیٹھا ہوا تھا، پھر جو تجھے وہ جواب دیں وہ تیرا اور تیری اولاد کا سلام ہوگا''۔ فرمایا۔ ''حضرت آدم علیہ السلام چلے گئے اور کہا: السلام علیکم تو جواب میں فرشتوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ''۔ فرمایا: ''انہوں نے ورحمۃ اللہ زیادہ کہا''۔ فرمایا: ''ہر وہ شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوگا اس کا قد لمبائی میں ستر ہاتھ ہوگا حضرت آدم علیہ السلام کے بعد مخلوق

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 212　　2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 724
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلہا، جلد 2، صفحہ 380

کم ہوتی رہی حتیٰ کہ اب تک کم ہوتی رہی''۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ فوائد کی جامع ہے۔

(۱) آدم کی تخلیق کی صفت کے متعلق خبر دینا (۲) ہم اللہ کے فضل سے اس صفت پر جنت میں داخل ہوں گے (۳) تھوڑے لوگوں کا زیادہ لوگوں پر سلام کرنا (۴) اللہ تعالیٰ کے اسم کو مقدم کرنا (۵) سلام بالمثل لوٹانا کیونکہ فرشتوں کو آپ نے کہا: السلام علیکم (۶) لوٹانے میں زیادتی کرنا (۷) تمام لوگوں کا جواب دینا جیسا کہ کوفیوں کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر کوئی سلام کا جواب دے اور جو سلام کرنے والے کے اسم کو مقدم کر دے تو یہ حرام اور مکروہ نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے جس شخص نے اچھی طرح نماز نہیں پڑھی تھی اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: وعلیك السلام ارجع فصل فإنك لم تصل (1) تم پر سلام ہو تو لوٹ جاؤ اور پھر نماز پڑھ کیونکہ تو نے صحیح نماز نہیں پڑھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ جب انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ جبریل انہیں سلام کہہ رہا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ کی حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو سلام بھیجے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے سلام کا اسی طرح جواب دے جس طرح سامنے والے شخص کو سلام کا جواب دیتا ہے۔ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میرا والد آپ کو سلام عرض کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیك وابیك السلام (2)۔ تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام۔

نسائی اور ابو داؤد نے حضرت جابر بن سلیم کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا میں نے کہا: علیک السلام یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیک السلام نہ کہو، کیونکہ علیک السلام تو میت کا سلام ہے۔ بلکہ تم کہو: السلام علیک (3)۔ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ مگر عربوں کی عادت ہے کہ وہ جس کے خلاف دعا کرتے ہیں اس کا اسم پہلے ذکر کرتے ہیں مثلاً علیہ لعنۃ اللہ وغضب اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (ص)

شعراء کی مردوں کو سلام کرنے کی یہی عادت ہے جیسے

علیك سلام الله قیس بن عاصم ورحمتہ ماشاء ان یترحما

شماخ نے کہا:

علیك سلام من أمیر و بارکت ید الله فی ذاك الأدیم الممزق

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس سے منع فرمایا اس لیے نہیں کہ وہ مردوں کے حق میں مشروع لفظ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 170

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 351۔ ایضاً، حدیث نمبر 4554، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 287۔ ایضاً سنن ابی داؤد، حدیث 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے ثابت ہے کہ مردوں پر اس طرح سلام کیا جس طرح آپ نے زندوں کو سلام کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: السلام علیکم دار قوم مومنین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون (1)۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیف أقول اذا دخلت المقابر؟ میں جب قبور میں داخل ہوں تو کیسے کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قولی السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین (2)۔ مزید ان شاء اللہ سورۃ الھاکم میں تفصیل آئے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ کی حدیث تمام اہل قبور پر سلام کرنے میں ہو جب کوئی ان میں داخل ہو اور ان کے پاس جائے۔ اور حضرت جابر بن سلیم کی حدیث اس گزرنے کے ساتھ خاص ہو جس سے زیارت مقصود ہو۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6**۔ سنت ہے کہ سوار، پیدل چلنے والے کو سلام کرے، کھڑا شخص بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، تھوڑے زیادہ کو سلام کریں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوار سلام کرے'' (3)۔ پہلے سوار کا ذکر کیا اس کے علو مرتبہ کی وجہ سے نیز کیونکہ وہ اس سے تکبر کو دور کرے گا۔ اسی طرح پیدل چلنے والے کے بارے میں کہا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب بیٹھنے والا، وقار، سکون اور ثبوت کی حالت پر ہے تو اس کو چلنے والے پر فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اس کا حال اس کے برعکس ہے۔ تھوڑے لوگوں کا زیادہ لوگوں کو سلام کرنا مسلمانوں کی جمعیت اور اکثریت کے شرف کی رعایت رکھی گئی ہے۔ بخاری نے اس حدیث میں ویسلم الصغیر علی الکبیر (4) (چھوٹا بڑے کو سلام کرے) کا اضافہ کیا ہے۔ رہا بڑے کا چھوٹے کو سلام کرنا تو وہ اشعث نے حسن سے روایت کیا ہے وہ بچوں پر سلام کرنے کا نظریہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا: سلام کا جواب دینا فرض ہے اور بچے پر سلام کا جواب دینا لازم نہیں پس ان کو سلام کرنا مناسب نہیں۔ ابن سیرین سے مروی ہے کہ وہ بچوں کو سلام کرتے تھے لیکن ان کا سلام سنتے نہیں تھے۔ اکثر علماء نے کہا بچوں کو سلام کرنا ان کو ترک کرنے سے افضل ہے۔ صحیحین میں حضرت سیار سے مروی ہے فرمایا: میں ثابت کے ساتھ چلتا تھا وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں سلام کرتے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ وہ حضرت انس کے ساتھ چلتے تھے وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں سلام کرتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلتے تھے آپ بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں سلام کرتے (5)۔ یہ مسلم کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم میں سے ہے۔ اس میں چھوٹے بچے کے لیے تہذیب و تدریب ہے اور سنن کی تعلیم پر انہیں ابھارنا ہے اور اس میں شریعت کے آداب پر ان کی ریاضت ہے، پس اس کی تقلید کرو۔ رہا عورتوں کو سلام کرنا تو یہ جائز ہے مگر نوجوان عورتیں جن سے بات کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو شیطان، وسوسہ یا آنکھ کی خیانت کی وجہ سے ان سے بات کرنے میں فتنہ کا خوف ہو تو انہیں سلام نہیں کرنا چاہیے۔ رہی بوڑھی عورتیں تو ان کا سلام کرنا اچھا ہے، کیونکہ وہاں امن ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ عطا اور قتادہ

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 287۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، صفحہ 399
3۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 212
4۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، جلد 2، صفحہ 921
5۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 214

کا قول ہے۔ امام مالک اور علماء کا ایک گروہ یہی نظریہ رکھتا ہے، کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے جب ان میں ذوات محرم نہ ہوں۔ یہ علماء کہتے ہیں: جب عورتوں سے اذان، اقامت، جہری قرأت نماز میں ساقط ہے تو ان سے سلام کا جواب دینا بھی ساقط ہوگا پس انہیں سلام کیا ہی نہیں جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ہم جمعہ کے دن خوش ہوتے تھے۔ میں نے کہا: کیوں (خوش ہوتے تھے)؟ انہوں نے کہا: ہماری ایک بوڑھی عورت تھی وہ بضاعہ کی طرف جاتی تھی ابن مسلمۃ نے کہا: مدینہ میں بضاعہ کھجور کا ایک باغ ہے۔ وہ وہاں سے چقندر کی جڑیں لیتی تھی انہیں ہانڈی میں ڈالتی تھی اور پھر جو کے دانے پیس کر ان پر ڈالتی تھی جب ہم جمعہ پڑھتے تھے اور واپس آتے تھے تو اسے سلام کرتے تھے، وہ ہمیں کھانا پیش کرتی تھی، تو اس وجہ سے ہم خوش ہوتے تھے اور ہم نہ قیلولہ کرتے تھے نہ کھانا کھاتے تھے مگر جمعہ کے بعد (1)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ سلام اور جواب میں سنت بلند آواز سے کرنا اور جواب دینا ہے انگلیوں اور ہتھیلی سے اشارہ کرنا امام شافعی کے نزدیک کافی نہیں اور ہمارے نزدیک کافی ہے جب وہ دوری پر ہو۔ ابن وہب نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرمایا: السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین پر رکھا ہے پس تم اسے آپس میں پھیلاؤ۔ انسان جب کسی قوم پر سلام کرتا ہے اور وہ اسے جواب دیتے ہیں تو اس شخص کو ان پر فضیلت ہوتی ہے، کیونکہ اس نے انہیں یاد دلایا۔ اگر وہ اسے سلام کا جواب نہ دیں تو اس کو وہ جواب دیتا ہے جو ان سے بہتر ہے اور پاکیزہ ہے۔ اعمش نے عمرو بن مرۃ سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: جب کوئی شخص کسی قوم پر سلام کرتا ہے تو اسے فضیلت ہوتی ہے، اگر وہ اسے جواب نہ دیں تو فرشتے اسے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جواب نہ دینے والوں پر لعنت کرتے ہیں۔ جس کو سلام کیا جائے وہ سلام کا جواب سنا کر دے، کیونکہ جب وہ سلام نہیں سنائے گا تو وہ اس کا جواب شمار نہ ہوگا کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا؟ جب کوئی شخص سلام کرے اور جس کو سلام کیا ہے وہ اسے نہ سنے تو اس کی طرف سے وہ سلام شمار نہ ہوگا۔ اسی طرح جو اس طرح جواب دے جو سنا نہ جائے تو وہ جواب شمار نہ ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم سلام کرو تو سناؤ اور جب تم جواب دو تو سناؤ اور جب تم بیٹھو تو امانت کے ساتھ بیٹھو اور تم میں سے کوئی کسی کی بات کو نہ اٹھائے''۔ ابن وہب نے کہا: مجھے اسامہ بن زید نے نافع سے روایت کر کے بتایا کہ میں شام کے ایک فقیہ کے ساتھ چل رہا تھا جس کو عبداللہ بن زکریا کہا جاتا تھا میری سواری پیشاب کرنے لگی تو اس نے مجھے روک لیا پھر میں اسے ملا اور میں نے اسے سلام نہ کیا، انہوں نے پوچھا: تم نے سلام کیوں نہیں کیا؟ میں نے کہا: میں ابھی تمہارے ساتھ تھا۔ انہوں نے فرمایا: اگرچہ صحیح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ چلتے تھے پھر درمیان میں درخت آ جاتا تھا پھر جب ملتے تھے تو ایک دوسرے پر سلام کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ کافر کو سلام کا جواب دینے کا حکم یہ ہے کہ اسے ''وعلیکم'' کہا جائے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے اور آیت وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ سے مراد یہ ہے مومن کی طرف سے جب سلام ہو فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ تو اس سے بہتر جواب

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، جلد 2، صفحہ 923

دو۔ اور اگر کافر کی طرف سے ہو تو اس طرح لوٹاؤ جس طرح رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں ''وعلیکم'' (1) کہا جائے۔ عطا نے کہا: یہ آیت مومنین کے ساتھ خاص ہے اور جو غیر مسلم سلام کرے تو اسے ''وعلیک'' کہا جائے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں واؤ کا اثبات اور اسقاط آیا ہے۔ ''علیک'' (2) بغیر واؤ کے یہ روایت بالکل واضح ہے۔ رہا واؤ کا اثبات تو انہیں اشکال ہے، کیونکہ واؤ عاطفہ تشریک کا تقاضا کرتی ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ ان کے ساتھ وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ ہمارے لیے موت کی دعا کی یا ہمارے دین کی موت کی دعا کی۔ اس کے متعلق علماء کے کئی اقوال ہیں (۱) واؤ اپنے باب پر عطف سے ہے، مگر ہماری دعا ان کے خلاف قبول ہوگی، ان کی بددعا ہمارے حق میں قبول نہیں ہوگی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ زائدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ استیناف کے لیے ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔ واؤ کے حذف کی روایت معنی کے اعتبار سے احسن ہے اور اس کا اثبات روایت کے اعتبار سے اصح و اشہر ہے۔ یہی اکثر علماء کا نظریہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ ذمیوں کو سلام کا جواب دینے میں اختلاف ہے۔ کیا وہ مسلمانوں کے جواب کی طرح واجب ہے؟ حضرت ابن عباس، شعبی اور قتادہ نے آیت کے عموم اور حدیث صحیح میں ان پر سلام لوٹانے کے امر سے استدلال کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ جواب دینا واجب ہے، جب کہ اشہب اور ابن وہب کی روایت کے مطابق امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ واجب نہیں اگر تو جواب دے تو کہہ: علیک۔ ابن طاؤس نے یہ پسند کیا ہے کہ انہیں جواب میں علاك السلام کہا جائے۔ یعنی تجھ سے سلام اوپر ہو۔ بعض علماء نے السلام (سین کے کسرہ کے ساتھ) کہنا پسند کیا ہے یعنی اس کے ساتھ پتھر ہو۔ امام مالک وغیرہ کا قول اس سلسلہ میں کافی وشافی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

سورۂ مریم میں سَلٰمٌ عَلَيْكَ (مریم: 47) کے تحت ابتداءً کرتے ہوئے انہیں سلام کرنے کے متعلق گفتگو آئے گی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جنت میں داخل نہ ہو گے حتیٰ کہ تم ایمان لاؤ اور تم ایمان نہیں لاؤ گے حتیٰ کہ تم آپس میں محبت کرو۔ کیا میں تمہاری ایک عمل پر راہنمائی نہ کروں جس کو تم کرو تو تم آپس میں محبت کرنے لگو، اپنے درمیان سلام پھیلاؤ'' (3)۔ یہ حدیث مسلمانوں میں سلام پھیلانے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ مشرکین میں۔ والله اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ نمازی پر سلام نہیں کیا جائے گا، اگر اسے سلام کیا جائے تو اختیار ہے اگر چاہے تو انگلی کے اشارے سے جواب دے، اگر چاہے تو جواب نہ دے حتیٰ کہ نماز سے فارغ ہو جائے تو سلام کا جواب دے اور جو قضاء حاجت میں ہو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے اگر اسے سلام کیا جائے تو اس پر جواب دینا واجب نہیں۔ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسی حالت میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تو مجھے اس حالت میں پائے تو مجھ پر سلام نہ کر اگر تو مجھ پر سلام کرے گا تو میں تجھے جواب نہیں دوں گا'' (4)۔ اور جو قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اسے سلام نہ دیا جائے ورنہ وہ اس کی قرأت کو قطع کرے گا،

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 213　　2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 54　　4۔ سنن ابن ماجہ، باب الرجل یسلم وھو یبول، صفحہ 30

قرآن پڑھنے والے کو اختیار ہے اگر چاہے تو جواب دے، چاہے تو جواب نہ دے حتی کہ تلاوت سے فارغ ہو جائے تو جواب دے۔ اور جو حمام میں ہو اسے سلام نہ دیا جائے جب کہ وہ شرم گاہ کھولے ہوئے ہو یا ایسے عمل میں مشغول ہو جس کے لیے وہ حمام میں داخل ہوا۔ اس کے علاوہ پر سلام کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 11** ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا اس کا معنی حفاظت کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: کفایت کرنے والا۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے احسبنی کذا۔ یعنی اس نے میری کفایت کی اور اس کی مثل حسبك الله ہے۔ قتادہ نے کہا: محاسباً، جیسے کہا جاتا ہے: اکیل بمعنی مواکل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حساب سے فعیل ہے یہاں یہ صفت اچھی ہے، کیونکہ آیت کا معنی انسان کی زیادتی یا کمی یا پوری مقدار کے بارے میں ہے۔ نسائی نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے ایک شخص آیا اس نے سلام کیا اس نے السلام علیکم کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور فرمایا: ''بیس (نیکیاں حاصل کیں)'' پھر وہ بیٹھ گیا اور ایک دوسرا شخص آیا اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور فرمایا: تیس (نیکیاں حاصل کیں) (1) یہ خبر تفسیر کے ساتھ بھی آئی ہے وہ اس طرح کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی سے کہا: سلام علیکم تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اگر کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اگر کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تو اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح جو جواب میں اس طرح کہے اس کے لیے اجر ہے۔ واللہ اعلم۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ۠

''اللہ نہیں کوئی معبود بغیر اس کے وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن ذرا شک نہیں اس (کے آنے) میں اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کہنے میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور لَیَجْمَعَنَّكُمْ میں لام قسم ہے یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے قیامت کے روز دوبارہ اٹھنے کے بارے میں شک کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قسم اٹھائی۔ ہر وہ لام جس کے بعد نون مشددہ ہو وہ لام قسم ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ موت میں اور زمین کے نیچے تمہیں ضرور جمع کرے گا۔ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں الی صلہ ہے اس کا معنی ہے لیجمعنکم یوم القیمۃ۔ قیامت کو قیامت اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (مطففین)

بعض نے فرمایا: یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ لوگ اس کی طرف اپنی قبور سے کھڑے ہوں گے، اللہ تعالیٰ

1۔ سنن ابی داود، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 350، حدیث 4521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا (المعارج: 43) قیامة کی اصل واو سے ہے۔

وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ بیان کی بنا پر حَدِيْثًا کو نصب ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ومن ازدق زا کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل صاد ہے لیکن مخرج کے قرب کی وجہ سے اس کی جگہ زا پڑھی گئی ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

''سو کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ منافقوں کے بارے میں (تم) دو گروہ بن گئے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا ہے انہیں بوجہ ان کرتوں کے جو انہوں نے کیے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسے راہ دکھاؤ جسے گمراہ کر دیا اللہ نے اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے (ہدایت کا) راستہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ یعنی تم دو مختلف گروہ کیوں بن گئے۔ مسلم نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احد کی طرف نکلے تو کچھ لوگ واپس آ گئے جو آپ کے ساتھ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ان کے معاملہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض نے کہا: ہم انہیں قتل کریں گے۔ بعض نے کہا: نہیں۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ۔ (1) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ زائد فرمایا ہے کہ (مدینہ) طیبہ ہے اور فرمایا یہ خبیث کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح آگ لوہے کے خبث کو دور کرتی ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ امام بخاری نے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں ''مدینہ طیبہ ہے یہ خبث کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح آگ چاندی کے کھوٹ کو دور کرتی ہے'' (3)۔ یہاں منافقین سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا اور جنگ کی طرف نکلنے کے بعد واپس آ گئے جس طرح کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو مکہ میں ایمان لائے تھے اور ہجرت نہیں کی تھی (4)۔ ضحاک نے کہا: انہوں نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم غالب آ جائیں گے تو ہم جان لیں گے اگر ہماری قوم غالب آ جائے گی تو وہ ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے صحابہ ان سے دوستی رکھتے تھے اور کچھ ان سے برأت کا اظہار کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ یہ ایک ایسی قوم کے متعلق نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ میں آئے، اسلام کا اظہار کیا اور انہیں مدینہ طیبہ کی وبا اور بخار نے آلیا تو وہ واپس چلے گئے اور مدینہ سے نکل گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ انہیں راستہ میں ملے تو پوچھا: تم کیوں واپس آ گئے؟ وہ کہنے لگے: ہمیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامہم، جلد 2، صفحہ 369

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127، حدیث نمبر 2954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 660

4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 88

مدینہ کی وبا نے آلیا ہے اور ہمیں مدینہ کی ہوا راس نہ آئی۔ صحابہ کرام نے کہا: کیا تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں نمونہ نہیں؟ بعض صحابہ نے کہا: یہ منافق ہیں۔ بعض نے کہا: منافق نہیں، یہ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ...... الایۃ۔ حتیٰ کہ وہ مدینہ طیبہ آئے تھے تو وہ کہتے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں پھر وہ اس کے بعد مرتد ہو گئے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ کی طرف جانے کی اجازت طلب کی تا کہ وہ اپنے سامان کے پاس آئیں اور اس میں تجارت کریں۔ پس مومنوں نے اس کے بارے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا: یہ منافق ہیں۔ بعض نے کہا: مومن ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کو بیان فرمادیا یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیا۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں اقوال کی آیت کے آخر کا سیاق تائید کرتا ہے ارشاد ہے: حَتّٰى يُهَاجِرُوْا اور پہلا قول نقل کے اعتبار سے اصح ہے۔ وہ بخاری، مسلم اور ترمذی کا مختار ہے۔ فئتین کو حال کی بنا پر نصب دی گئی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: مالك قائما۔ اخفش سے یہ مروی ہے۔ اور کوفی علماء نے کہا: یہ مالکم کی خبر ہے جس طرح کان اور ظننت کی خبر ہوتی ہے انہوں نے الف، لام کا اس میں داخل کرنا جائز قرار دیا۔ فراء نے کہا: ارکسھم اور رکسھم دونوں کا معنی ہے کفر کی طرف انہیں لوٹا دیا اور انہیں اوندھا کر دیا۔ یہ نضر بن شمیل اور کسائی کا قول ہے۔ الرکس اور النکس کا معنی ہے کسی کو سر کے بل اوندھا گرا دینا یا اول کو آخر پر لوٹا دینا۔ المرکوس کا معنی ہے المنکوس اوندھا گرایا گیا۔ حضرت عبداللہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہما کی قرأت میں واللہ رکسھم تھا (1)۔ ابن رواحہ نے کہا:

أُرْكِسوا فى فِتْنَةٍ مُظْلِمَةٍ كَسَوَادِ الليل يَتْلُوها فِتَنٌ

یعنی وہ تاریک فتنہ میں اوندھے کیے گئے۔ ارتکس فلان فی امر کان نجا منه۔ یعنی آدمی اس کام میں اوندھا ہو گیا جس سے پہلے نکل چکا تھا۔ الرکوسیۃ ایک قوم ہے جو نصاریٰ اور صابئین کے درمیان ہے۔ الراکس اس بیل کو کہتے ہیں جو کھلیان کے وسط میں ہوتا ہے اور دوسرے بیل گاہنے کے وقت اس کے ارد گرد ہوتے ہیں۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ یعنی تم اس کی ثواب کی طرف راہنمائی کرو گے کہ وہ ان کے لیے مومنین کا حکم لگائے۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ یعنی رشد و ہدایت اور حجت طلب کرنے کا راستہ۔ اس میں قدریہ کا رد ہے جو اپنی ہدایت کی تخلیق کے قائل ہیں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 227

شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝۹۰

''وہ دوست رکھتے ہیں اگر تم بھی کفر کرنے لگو جیسے انہوں نے کفر کیا تاکہ تم سب یکساں ہو جاؤ پس نہ بناؤ تم ان سے اپنے دوست یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں گے اللہ کی راہ میں پس اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑیں تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں کہیں پاؤ ان کو اور نہ بناؤ ان سے (کسی کو) اپنا دوست اور نہ مددگار۔ مگر ان کو (قتل نہ کرو) جو تعلق رکھتے ہیں اس قوم سے کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ ہے یا آ گئے ہوں تمہارے پاس اس حال میں کہ تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے کہ جنگ کریں تم سے یا جنگ کریں اپنی قوم سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو مسلط کر دیتا انہیں تم پر تو وہ ضرور لڑتے تم سے پھر اگر وہ کنارہ کر لیں تم سے اور نہ جنگ کریں تمہارے ساتھ اور بھیجیں تمہاری طرف صلح کا پیغام تو نہیں بنائی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر (زیادتی کرنے کی) راہ''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ یعنی وہ خواہش کرتے ہیں کہ تم ہو ان کی طرح کفر و نفاق میں۔ شرع برابر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان سے برأت کرنے کا حکم دیا ہے فرمایا: فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (الانفال: 72) نہیں تمہارے لیے ان کی وراثت سے کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔ ہجرت کی کئی قسمیں ہیں (ا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنا اور یہ ابتدائے اسلام میں واجب تھی حتیٰ کہ فرمایا: لا هجرة بعد الفتح (1) (فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقین کا غزوات میں ہجرت کرنا اور اس شخص کا ہجرت کرنا جو دار الحرب میں اسلام لایا۔ یہ ہجرت واجب ہے۔ مسلمان کا ان کاموں سے ہجرت کرنا جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو چھوڑ دے'' (2)۔ یہ دونوں ہجرتیں اب بھی ثابت ہیں اور مجرموں کی تادیب کے لیے ان سے نہ کلام کرنا اور نہ مخاطب ہونا حتیٰ کہ وہ گناہوں سے توبہ کر لیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کیا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ یعنی اگر وہ توحید اور ہجرت سے اعراض کریں تو انہیں قیدی بنا لو اور انہیں قتل کرو۔ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یہ حکم عام ہے حل و حرم کی جگہوں میں۔ واللہ اعلم۔ پھر استثنا فرمائی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ جو ان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اندر داخل ہوئے جوار اور حلف کے اعتبار سے۔ معنی یہ ہے کہ تم اس قوم کو قتل نہ کرو جن کے ساتھ تمہارا عہد تھا وہ عہد پر ہیں پھر عہود منسوخ ہوئے تو یہ بھی منسوخ ہو گیا۔ یہ مجاہد اور ابن زید وغیرہم کا قول ہے۔ جو اس آیت کے متعلق کیا گیا ہے اس میں سے یہ اصح قول ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: يَصِلُوْنَ کا معنی ہے جو منسوب ہیں۔ اس سے اعشیٰ کا قول ہے:

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 131	2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6، مفہوم

إذا اتَّصَلَتْ قالت لبكرِ بن وائلٍ وَبَكْرٌ سَبَتْها والأنوفُ رواغِمُ (1)

یہاں اتصلت بمعنی انتسبت ہے۔

مہدوی نے کہا: علماء نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ نسبت اور تعلق کفار کے قتال اور ان کے قتل سے مانع نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ عظیم غلطی ہے، کیونکہ معاملہ تو اللہ تعالیٰ پر جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کوئی شخص اسے قتل کرے مسلمانوں میں سے جس کے ساتھ اس کا نسب ہے۔ مشرکین اور سابقین اولین کے درمیان انساب تھے۔ اور اس سے بھی سخت یہ جہالت ہے کہ یہ پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا، کیونکہ علماء تفسیر کا اجماع ہے کہ اس کا ناسخ (برأت) ہے، برأت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور جنگوں کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ یہ معنی طبری نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں بعض علماء نے ینتسبون کا معنی الامان پر محمول کیا ہے یعنی اہل امان کی طرف جو منسوب ہے وہ امن والا ہے جب تمام لوگوں نے امان دی ہو یہ نسب بمعنی قرابت کے مفہوم پر محمول نہیں۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جن لوگوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عہد تھا وہ کون تھے؟ بعض نے فرمایا: وہ بنو مدلج تھے۔ حسن سے مروی ہے کہ بنو مدلج کا اور قریش کا عہد تھا اور قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد تھا۔

عکرمہ نے کہا: یہ ہلال بن عویمر، سراقۃ بن جعشم اور خزیمۃ بن عامر بن عبد مناف کے حق میں نازل ہوئی، ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد تھا، اور بعض علماء نے فرمایا: وہ خزاعۃ قبیلہ تھا۔ ضحاک نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس سے مراد وہ قوم ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ تھا یعنی بنی بکر بن زید بن مناۃ یہ صلح اور امن کا معاہدہ کیے ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اہل حرب اور اہل اسلام کے درمیان صلح کے اثبات کی دلیل ہے جب کہ صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو۔ جیسا کہ سورۂ انفال اور براۃ میں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ یعنی تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے۔ لبید نے کہا:

أسهلْت وانتصَبتْ كجِذْعِ مُنِيفةٍ جَرْداءَ يَحْصَرُ دونها جُرَّامُها

یعنی اس نخلہ کے طول سے ان کے سینے تنگ ہوئے۔ اسی سے الحصر فی القول ہے۔ متکلم پر کلام کا تنگ ہونا۔ الحصر کا معنی ہے راز کو چھپانا۔ جریر نے کہا:

ولقد تَسَقَّطنِي الوُشاةُ فصادفوا حَصِراً بِسِرِّكِ يا أُمَيمُ ضَنِينا

حصرت کا معنی قد حصرت فاضمرت ہے۔ فراء نے کہا: یہ جاء وکم میں ضمیر مرفوع سے حال ہے جیسے تو کہتا ہے: جاء فلان ذهب عقله یعنی قد ذهب عقله۔ بعض نے فرمایا: یہ خبر کے بعد خبر ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے، یعنی جَآءُوْكُمْ وہ تمہارے پاس آئے (2) پھر خبر دی اور کہا: حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ۔ اس صورت میں حصرت، جاء وکم سے بدل ہے۔ بعض نے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 90

2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 233

فرمایا: حصرت قوم کی صفت کی بنا پر محل جر میں ہے اور حضرت ابی کی قرأت میں الا الذین یصلون الی قوم بینکم و بینھم میثاق حصرت صدورھم۔ اس میں اَوْ جَآءُوْكُمْ نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے: او جاء وکم رجالا او قوما حصرت صدورھم۔ یہ موصوف کی صفت ہے حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن نے اس طرح پڑھا ہے: او جاء وکم حصرۃ صدورھم۔ حال کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور اس کو مبتدا اور خبر کے اعتبار سے رفع جائز ہے اور جاء وکم حصرات صدورھم حکایت کیا گیا ہے اور رفع جائز ہے۔ محمد بن یزید نے فرمایا: حصرت صدورھم یہ ان کے خلاف دعا ہے جیسے تم کہتے ہو: لعن اللہ الکافر۔ یہ مبرد کا قول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کو کمزور قرار دیا ہے۔ فرمایا: یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے قتال نہ کریں۔ یہ فاسد ہے، کیونکہ وہ کفار ہیں اور ان کی قوم کفار ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ معنی صحیح ہے مسلمانوں کے حق میں قتال نہ ہونا ان کو عاجز کرنے کے لیے ہے اور ان کی قوم کے حق میں ان کی تحقیر کے لیے ہے بعض نے فرمایا: او بمعنی واؤ ہے گویا فرمایا: الی قوم بینکم و بینھم میثاق وجاء وکم ضیقۃ صدورھم عن قتالکم والقتال معکم فکرھوا قتال الفریقین یعنی جس قوم کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے وہ تمہارے پاس آئے اس حال میں کہ ان کے دل تنگ تھے تم سے لڑنے سے اور تمہارے ساتھ مل کر لڑنے سے پس انہوں نے دونوں فریقوں سے لڑنے کو ناپسند کیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس پر ان سے معاہدہ کیا گیا ہو یہ عہد کی ایک قسم ہے یا فرمایا: ہم اسلام لاتے ہیں اور جہاد نہیں کرتے۔ یہ احتمال ہے کہ ابتدائے اسلام میں ان سے یہ بات قبول کی گئی ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل تقویٰ کے لیے کھول دیئے اور اسلام کے لیے منشرح کر دیئے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

اَوْ یُقَاتِلُوْا۔ یہ محل نصب میں ہے یعنی عن ان یقاتلوکم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ۔ اللہ تعالیٰ مشرکوں کو مومنین پر مسلط فرما دے گا وہ مشرکوں کو ان پر قادر کر دے گا اور انہیں تقویت دے گا۔ یہ یا تو بطور سزا ہوگا یا برائی اور معاصی کے ظہور کے وقت بطور انتقام ہوگا یا یہ بطور ابتلا و اختیار ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِیْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ۝ (محمد) اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم جان لیں جہاد کرنے والوں کو تم میں سے اور صبر کرنے والوں کو اور ہم آزمالیں تمہاری خبریں۔ یا یہ گناہوں کو مٹانے کے لیے ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (آل عمران: 141) اور اللہ کی شان کے لائق ہے جو چاہے کرے اور جس کو جس پر چاہے مسلط کر دے اور جب چاہے مسلط کر دے۔ ماقبل کلام سے اس کا تعلق یہ ہے کہ منافقین سے قتال کرو جن کے بارے میں تمہارا اختلاف ہوا مگر یہ کہ وہ ہجرت کریں مگر یہ کہ جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو پس وہ داخل ہوں گے اس میں جس میں داخل ہوئے تھے، ان کے لیے ان کا حکم ہوگا مگر جو لوگ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے تنگ ہوں اس سے کہ وہ تم سے لڑیں یا وہ اپنی قوم سے لڑیں، پس وہ تم میں داخل ہوئے پس تم ان سے قتال نہ کرو۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ

أُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۚ وَأُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾

''تم پاؤ گے چند اور لوگ جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور امن میں رہیں اپنی قوم سے (لیکن) جب کبھی پھیرے جاتے ہیں فتنہ کی طرف تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں اس میں سو اگر نہ کنارہ کریں تم سے یا نہ بھیجیں تمہاری طرف صلح کا پیغام اور نہ روک لیں اپنے ہاتھ تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں اور یہی لوگ ہیں کر دیا ہے ہم نے تمہیں ان پر کھلا اختیار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔ اس کا معنی پہلی آیت کے معنی کی طرح ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ تہامہ سے ایک قوم کے بارے نازل ہوئی تھی جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے امان طلب کی تھی تا کہ وہ آپ کے پاس اور اپنی قوم کے پاس امن پائیں۔ مجاہد نے کہا: یہ اہل مکہ سے ایک قوم تھی۔ سدی نے کہا: یہ نعیم بن مسعود کے بارے نازل ہوئی وہ مسلمانوں اور مشرکوں کو امن دیتا تھا۔ حسن نے کہا: یہ منافقین کی ایک قوم تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ اسد اور غطفان کے بارے میں نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ میں آئے تھے اور اسلام قبول کیا تھا پھر اپنے گھروں کو لوٹ کر گئے اور کفر کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے ردوا کو را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل رددوا ہے ادغام کیا گیا اور را پر کسرہ کو لوٹایا گیا۔ اِلَى الْفِتْنَةِ سے مراد الی الکفر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسے لوگ پاؤ گے جو تمہارے لیے صلح ظاہر کریں گے تا کہ وہ تمہیں امن دیں۔ جب ان کے لیے کوئی فتنہ ظاہر ہوتا ہے اس فتنہ کا اثر ان کے ساتھ ساتھ تم پر بھی ہوتا ہے۔ اُرْكِسُوْا فِيْهَا۔ یعنی اس عہد سے پھر جاتے ہیں جو انہوں نے کیا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یعنی جب انہیں شرک کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾

''اور نہیں (جائز) کسی مومن کے لیے کہ قتل کرے کسی مومن کو مگر غلطی سے اور جس نے قتل کیا کسی مومن کو غلطی سے تو (اس کی سزا یہ ہے کہ) آزاد کرے مسلمان غلام اور خون بہا ادا کرے مقتول کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ خود

ہی (خون بہا) معاف کر دیں پھر اگر ہو (مقتول) اس قوم سے جو دشمن ہے تمہاری لیکن وہ (مقتول) خود مومن ہو تو (قاتل) آزاد کرے ایک مسلمان غلام اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ ہو چکا ہے تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ تو (قاتل) خون بہا دے دے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کر دے ایک مسلمان غلام تو جو شخص غلام نہ پا سکے تو روزے رکھے دو ماہ لگا تار (اس گناہ کی) توبہ اللہ کی طرف سے (یہی مقرر ہے) اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا"۔

اس آیت میں بیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَئًا۔ یہ اہم احکامات کے متعلق ہے اس کا معنی یہ ہے کہ مومن کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر خطا سے۔ وَمَا كَانَ یہ نفی کے معنی پر نہیں بلکہ یہ تحریم اور نہی کے معنی میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) اگر یہ نفی کی بنا پر ہوتا تو کبھی کوئی مومن نہ پایا جاتا جو کسی مومن کو قتل کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کی نفی کر دے اس کا وجود جائز نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: 60) بندے کبھی بھی درخت کے اگانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے عہد میں اس کے لیے یہ نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: گزشتہ زمانہ میں اس کے لیے یہ جائز نہیں تھا جس طرح اب کسی وجہ سے جائز نہیں پھر استثنیٰ منقطع فرمائی یہ پہلے میں سے نہیں ہے یہاں الا معنی لکن ہے تقدیر یوں ہوگی کبھی بھی اس کے لیے مومن کو قتل کرنا جائز نہیں مگر اسے خطاً قتل کر دے تو اس پر یہ یہ ہوگا۔ یہ سیبویہ اور زجاج کا قول ہے۔ اور استثنا منقطع میں سے یہ ہے مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ انہیں اس کی کچھ خبر نہیں مگر گمان کی پیروی۔

نابغہ نے کہا:

وَقَفْتُ فِيها أُصَيْلَاناً أسائلها　عَيَّتْ جوابا وما بالرَّبعِ من أحَد

إِلَّا الأَوَارِيَّ لَأيًا ما أبَيِّنُها　والنُّؤيُ كالحوضِ بالمظلومةِ الجَلَدِ

جب الاواری حقیقتاً احد کی جنس سے تھیں تو اس کے لفظ میں داخل نہیں۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

أمسى سُقَامٌ خَلاءً لا أنيس به　إلا السباعَ و مر الريح بالغُرَفِ (1)

ایک اور شاعر نے کہا:

وبلدةٍ ليس بها انيس　إلا اليعافيرُ وإلا العيس

ایک اور شاعر نے کہا:

وبعضُ الرجال نخلةٌ لا جَنَى لها　ولا ظَلَّ إلا ان تُعَدَّ من النخل

سیبویہ نے یہ شعر اسی مثال کے لیے دیا ہے کہ مستثنیٰ منقطع بھی ہوتا ہے جو مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہوتا۔ اس کی بہت سی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 92، دار الکتب العلمیہ بیروت

مثالیں ہیں۔ جریر کا قول کتنا انوکھا ہے:

مِن البِیضِ لم تَظْعن بعیداً ولم تطأ علی الأرض إلّا ذَیْلَ مِرْطٍ مُرَحَّلِ (1)

گو یا یوں کہا: لم تطأ علی الأرض الا ان تطأ ذیل البُرْد۔ یہ آیات کریمہ عیاش بن ابی ربیعہ کے حارث بن یزید کو قتل کرنے کے سبب نازل ہوئیں ان دونوں کے درمیان کینہ اور بغض تھا جب حضرت حارث نے مسلمان ہو کر ہجرت کی تو حضرت عیاش اسے ملا اور اس نے اسے قتل کر دیا اسے حضرت حارث کے اسلام لانے کا علم نہیں تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ حضرت حارث تو مسلمان تھا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میرا اور حارث کا یہ معاملہ ہوا مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا مجھے اس کے اسلام کا علم نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے اسے قتل کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ استثنا متصل ہے یعنی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر وہ قتل خطاء ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا لیکن ایسی ایسی صورت میں دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں کان بمعنی استقر اور وجد مقرر کیا جائے۔ گویا فرمایا: مومن کا مومن کو قتل کرنا جائز نہیں مگر جو خطاء ہو، کیونکہ کبھی وہ اس میں مغلوب ہوتا ہے۔ ان دونوں تاویلوں پر استثنا غیر منقطع ہوگا۔ یہ آیت اپنے ضمن میں قتل عمد کی بڑائی اور اس کی برائی کو لیے ہوئے ہے جیسے تو کہتا ہے: اے فلاں تجھے یہ کلام کرنی جائز نہیں مگر یہ کہ بھول کر۔

یعنی عمداً تو ایسی کلام بہت بڑا گناہ ہے اور یقینی طور پر ایسی کلام کرنا ممنوع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ولا خطاءً یعنی خطاءً بھی یہ جائز نہیں۔ نحاس نے کہا: الا بمعنی واؤ ہونا جائز نہیں۔ یہ کلام عرب میں معروف نہیں اور معنی میں یہ صحیح نہیں کیونکہ خطا ممنوع نہیں۔ دلیل خطاب سے کافر کے مسلمان کو قتل کرنے کا جواز نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ مسلمان کا خون محترم ہے مومن کا ذکر خاص طور پر تاکیداً کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے محبت، بھائی چارہ، شفقت اور عقیدت ہوتی ہے۔ اعمش نے خطاء کو تینوں جگہ ممدود پڑھا ہے۔ خطاء کی بہت سی صورتیں ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا سب میں قدر مشترک قصد کا نہ ہونا ہے مثلاً کسی نے مشرکین کی صفوں پر تیر پھینکا تو کسی مسلمان کو جا لگا اسی طرح جو کسی زانی یا محارب یا مرتد کو قتل کرنے کی سعی کر رہا تھا اسے طلب کیا تا کہ اسے قتل کرے کوئی دوسرا اسے ملا اس نے اسے وہی سمجھا اور اسے قتل کیا تو یہ بھی خطا ہے، اسی طرح کسی نے کسی شکار پر نشانہ لگایا وہ کسی انسان یا کسی اور چیز کو لگ گیا تو یہ بھی خطا ہے۔ ان تمام صورتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ الخطأ، الخطأ، خطأ واخطأ سے اسم ہے جب کہ جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو۔ الخطأ، الخطأ کے قائم مقام ہے۔ اخطأ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے کہ جو کسی کام کا ارادہ کرتا ہے پھر وہ دوسرا کام کر بیٹھے۔ اور جو غیر درست کام کرے اس کے لیے اخطأ بولا جاتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ** ۔ جو خطاء کسی کو قتل کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق دیت کا حکم دیا ہے۔ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت ثابت ہے، اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 92، دار الکتب العلمیہ بیروت

**مسئلہ نمبر 2**۔ داؤد کا نظریہ ہے کہ نفس کے ضیاع میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص ہوگا اور ہر اس عضو میں قصاص ہوگا جس کا قصاص لیا جا سکتا ہے اور انہوں نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ: 45) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت پکڑی ہے المسلمون تتکافأ دماءھم (1)۔ مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ یہ ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: آزاد اور غلام کے درمیان قصاص نہیں مگر نفس کے ضیاع میں، پس آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح آزاد کے بدلے غلام کو قتل کیا جائے گا اور زخموں اور اعضاء میں سے کسی چیز میں ان کے درمیان قصاص نہ ہوگا۔ علماء کا اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا کے متعلق اجماع ہے کہ اس میں غلام داخل نہیں اس سے آزاد مراد ہیں غلام مراد نہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد المسلمون تتکافأ دماءھم (2) سے مراد بھی آزاد ہیں۔ جمہور علماء کا یہی نظریہ ہے جب غلاموں اور آزاد لوگوں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص نہیں تو نفس اس کا زیادہ حق دار ہے۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی اس پر غلام کا آزاد کرنا ہے۔ یہ وہ کفارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفارہ قتل اور کفارہ ظہار میں واجب فرمایا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کون سا غلام کافی ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن، شعبی، نخعی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: وہ رقبہ (غلام) مومنہ ہے، یہ وہ ہے جس نے نماز پڑھی ہو اور ایمان کو سمجھا ہو۔ اس میں چھوٹا غلام کافی نہیں اس باب میں یہی صحیح ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا: مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والا چھوٹا بچہ بھی کافی ہے (3)۔ ایک جماعت نے کہا: ان میں سے امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں، ہر وہ غلام جائز ہے جس کی نماز جنازہ پڑھنے اور اسے دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا وہ میرے نزدیک محبوب ہے (4)۔ اور تمام علماء کے نزدیک اندھا، اپاہج جس کے ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے ہوں یا جس کے ہاتھ، پاؤں شل ہوں ایسا غلام جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک لنگڑا اور کانا جائز ہے مالک نے کہا: مگر بہت زیادہ لنگڑا ہو جائز نہیں۔ اور امام مالک، امام شافعی اور اکثر علماء کے نزدیک جس کا ایک ہاتھ یا ایک پاؤں کٹا ہوا ہو جائز نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ جائز ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک دائمی مجنون جائز نہیں۔ امام مالک کے نزدیک وہ غلام جائز نہیں جس کو جنون لاحق ہوتا ہے اور پھر ٹھیک ہو جاتا ہو۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالک کے نزدیک ایسا غلام جائز نہیں جو دو سال تک آزاد کیا جائے گا۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے مدبر غلام امام مالک، اوزاعی اور اصحاب الرائے کے نزدیک جائز نہیں۔ امام شافعی اور ابو ثور کے قول میں جائز ہے۔ ابن المنذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے کہا: وہ صحیح نہیں جس کا بعض آزاد ہو چکا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اور جس کا بعض آزاد ہو چکا ہو اس کے آزاد کرنے والے کو یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الدیات، صفحہ 197
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2674، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93
4۔ ایضاً

رقبۃ (غلام) آزاد کیا بلکہ کہا جاتا ہے: غلام کا بعض آزاد کیا۔ اس کے معنی میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: گناہ سے پاک کرنے اور قاتل کے گناہ کی طہارت کے لیے یہ کفارہ واجب کیا گیا ہے اور اس کا گناہ احتیاط کا ترک اور تحفظ کا ترک ہے حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں ایک ایسا شخص ہلاک ہوا جس کا خون محفوظ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: مقتول میں جو اللہ تعالیٰ کا حق تھا اس کو معطل کرنے کی وجہ سے بطور بدل یہ کفارہ واجب کیا ہے اس کے لیے اس کے حق میں ایک حق تھا اور وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا تھا اور حلال کرنا چیزوں میں تصرف ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس میں حق تھا وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اس کے لیے عبودیت کا اسم ثابت تھا، خواہ وہ بڑا تھا یا چھوٹا تھا، آزاد تھا یا غلام تھا، مسلمان تھا یا ذمی تھا، جس کے ذریعے وہ جانوروں اور بہائم سے ممتاز ہوتا تھا اور اس کے ساتھ اس سے امید تھی کہ اس کی نسل سے کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اطاعت کرے گا۔ اور قاتل اس سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے اس سے وہ اسم (نام) فوت کیا جس کا ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے۔ اور وہ معنی جس کو ہم نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کفارہ کا وہ ضامن ہے یعنی ان دونوں معانی میں سے ایک معنی ہو۔ پس اس میں بیان ہے کہ نص اگرچہ خطاءً قاتل پر واقع ہے اور عمداً قتل کرنے والا بھی اس کی مثل ہے بلکہ اس نفس کے قتل کی وجہ سے اس پر کفارہ کا وجوب اولیٰ ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ دیت اس مال کو کہا جاتا ہے جو مقتول کے ولی کو مقتول کے خون کے عوض دیا جاتا ہے۔ مُّسَلَّمَةٌ جو دیا گیا ہو، ادا کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دیت کے طور پر جو مال دیا جائے گا اس کی تعیین نہیں فرمائی آیت میں مطلقاً دیت کے وجوب کا ذکر ہے؛ اس میں دیت کے عاقلہ پر ہونے یا قاتل پر ہونے کا ذکر نہیں فرمایا یہ حدیث پاک سے لیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مواسات کا ایجاب عاقلہ، غرامات (جرمانہ) اور تلف شدہ چیزوں کے اصول کے خلاف ہے اور جو عاقلہ پر واجب ہے وہ تغلیظاً واجب نہیں اور نہ قاتل کا بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے بلکہ یہ محض ہمدردی اور مواسات ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نظریہ ہے کہ یہ نصرت کے اعتبار سے ہے، پس انہوں نے اہل دیوان (وہ محکمہ والے جس میں وہ کام کرتا ہے) پر اس کو واجب کیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے کہ دیت سو اونٹ ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سہل کی دیت، جو خیبر میں قتل کیے گئے تھے حویصہ، محیصۃ اور عبدالرحمٰن کو، سو اونٹ عطا فرمائی۔ یہ کتاب کے مجمل کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بیان ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ اونٹوں والوں پر سو اونٹ ہیں اور جو اونٹوں والے نہیں ہیں ان کی دیت میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: سونے والوں پر ہزار دینار ہیں اور وہ اہل شام اور اہل مصر اور اہل مغرب ہیں۔ یہی قول امام مالک، امام احمد، اسحاق، اصحاب الرائے کا ہے اور یہی امام شافعی کا پہلا قول ہے اور یہ حضرت عمر، حضرت عروہ بن زبیر اور قتادہ سے مروی ہے اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں۔ یہ اہل عراق، فارس اور خراسان کا قول ہے یہی امام مالک کا مذہب ہے اس بنا پر کہ حضرت عمر سے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے اہل القریٰ (شہریوں) پر دیت کی قیمت لگائی جو سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: چاندی کی دیت دس ہزار دراہم ہے۔ اور شعبی نے عبیدہ سے اور انہوں نے

حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سونے والوں پر ہزار دینار دیت مقرر فرمائی اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر فرمائے اور گائیوں والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر ہزار بکریاں اور اونٹوں والوں پر سو اونٹ مقرر فرمائے اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے مقرر فرمائے۔ ابو عمر نے کہا: اس حدیث میں دلیل ہے کہ دنانیر اور دراہم، دیت کی اصناف میں ایک صنف ہے، بطور بدل اور قیمت نہیں ہیں یہی حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے ظاہر ہے۔ امام ابو حنیفہ نے حضرت عمر سے مروی گائیوں اور بکریوں اور کپڑوں کے جوڑوں میں اختلاف کیا ہے اور یہی قول عطا، طاؤس اور تابعین کی ایک جماعت کا ہے اور یہی قول مدینہ طیبہ کے ساتوں فقہاء کا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ایک طائفہ نے کہا: آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے علاوہ کوئی دیت نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی ہے۔ یہی قول امام شافعی کا ہے اور یہی قول طاؤس کا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: آزاد مسلمان کی دیت ہر زمانہ میں سو اونٹ ہوگی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی اور حضرت عمر سے دراہم کی تعداد کے بارے میں روایات مختلف ہیں اور ان روایات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام مراسیل ہیں۔ میں نے تجھے امام شافعی کا مذہب بتایا اور ہم اس کے مطابق کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فقہاء کا دیت کے اونٹوں کی عمروں میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی دیت کا فیصلہ سو اونٹ فرمایا جو خطاءً قتل کیا گیا ہو۔ تیس بنت مخاض، تیس بنت لبون، تیس حقے اور دس ابن لبون۔ خطابی نے کہا: میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کے مطابق قول کیا ہو۔ اکثر علماء نے فرمایا: قتل خطا کی دیت کے پانچ حصے ہیں۔ اسی طرح اصحاب الرائے اور ثوری نے کہا ہے۔ اسی طرح امام مالک، ابن سیرین اور امام احمد بن حنبل نے کہا ہے، مگر انہوں نے اصناف میں اختلاف کیا ہے۔ اصحاب الرائے اور امام احمد نے کہا: پانچواں حصہ ابن مخاض، پانچواں حصہ بنت مخاض۔ پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ حقے، پانچواں حصہ جذعے، پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ بنت مخاض۔ پانچواں حصہ ابن لبون۔ یہ قول حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: پانچواں حصہ حقاق، پانچواں حصہ جذاع، پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ بنات مخاض اور پانچواں حصہ بنو لبون۔ یہ قول عمر بن عبد العزیز، سلیمان بن یسار، زہری، ربیعہ اور لیث بن سعد کا ہے۔ خطابی نے کہا: اصحاب الرائے کے لیے اثر ہے مگر اس کا راوی عبد اللہ بن خشف بن مالک ہے جو مجہول ہے اس حدیث کے علاوہ وہ معروف نہیں ہیں۔ امام شافعی نے اپنے قول سے عدول کیا اس کی وجہ راوی کی علت ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، کیونکہ اس میں بنی مخاض کا ذکر ہے اور صدقات کے اونٹوں کی عمروں میں بنی مخاض کا کوئی دخل نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ سے قسامت کے واقعہ میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خیبر کے قتیل کی دیت صدقہ کے اونٹوں میں سے اونٹ دیئے اور صدقہ کے اونٹوں میں ابن مخاض نہیں ہوتا۔ ابو عمر نے کہا: زید بن جبیر نے خشف بن مالک عن عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قتل خطا میں دیت پانچ قسم کی بیان فرمائی۔ مگر اس حدیث کو مرفوع کسی نے روایت نہیں کیا سوائے خشف بن مالک کوفی طائی کے یہ مجہول ہے، کیونکہ ان سے روایت نہیں کیا مگر زید بن جبیر بن حرمل طائی جشمی جو بنی جشم بن معاویہ، کوفی

ثقات میں سے ایک تھا۔

میں کہتا ہوں: دار قطنی نے اپنی سنن میں خشف بن مالک کی حدیث کو ذکر کیا ہے حجاج بن ارطاۃ عن زید بن جبیر عن خشف بن مالک عن عبداللہ بن مسعود کی روایت سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل خطا کی دیت میں سو اونٹ کا فیصلہ فرمایا، ان میں سے بیس حقے تھے، بیس جذعے تھے، بیس بنت لبون تھے، بیس بنت مخاض تھے، بیس بنو مخاض تھے۔ دار قطنی نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اور علماء فن حدیث کے نزدیک کئی وجوہ سے ثابت نہیں ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ روایت اس روایت کے مخالف ہے جو ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود نے اپنے باپ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے، جس میں کوئی طعن نہیں ہے، نہ اس کی کوئی تاویل ہے۔ ابوعبیدہ اپنے باپ کی حدیث، ان کے مذہب اور فتویٰ کو خشف بن مالک اور ان جیسے دوسرے لوگوں سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والے تھے اور اپنے دین پر زیادہ حریص تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کریں کہ آپ نے ایسا فیصلہ فرمایا اور پھر وہ اس کے خلاف فتویٰ دیں یہ حضرت عبداللہ بن مسعود پر تصور نہیں کیا جا سکتا اور حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس کے متعلق انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بات نہ سنی ہوتی تھی اور نہ انہیں اس کے متعلق کوئی قول پہنچا ہوتا تو وہ کہتے: میں اس کے متعلق اپنی رائے دیتا ہوں اگر تو وہ درست ہے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے ہے، پھر اس کے بعد انہیں یہ بات پہنچتی کہ ان کا فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کے موافق ہے تو آپ کے ساتھی آپ کو بہت خوش دیکھتے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق ان کا فتویٰ نکلا ہے۔ جس شخص کی یہ صفت ہو اور یہ حالت ہو اس سے کیسے یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز روایت کریں اور پھر اس کی مخالفت کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خبر مرفوع جس میں بنی مخاض کا ذکر ہے وہ ہم خشف بن مالک عن ابن مسعود کے سلسلہ سے جانتے ہیں اور خشف مجہول شخص ہے ان سے صرف زید بن جبیر بن حرمل الجشمی نے روایت کیا ہے۔ اور علماء حدیث ایک غیر معروف شخص کی منفرد روایت سے حجت نہیں پکڑتے۔ ان کے نزدیک اس خبر سے ثابت ہوتا ہے جب اس کا راوی عادل مشہور ہو یا ایسا شخص ہو جس سے جہالت کا اسم زائل ہو اور اسم جہالت کا زائل ہونا اس طرح ہے کہ اس سے دو یا دو سے زیادہ آدمی روایت کریں، جب یہ صفت ہو تو اس سے جہالت کا اسم زائل ہو جائے گا اور اس وقت وہ معروف ہو جائے گا اور جس سے صرف ایک شخص روایت کرے اور خبر کے ساتھ منفرد ہو تو اس کی خبر پر توقف واجب ہے حتیٰ کہ کوئی اور اس کی موافقت کرے۔ واللہ اعلم۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خشف بن مالک کی حدیث کو زید بن جبیر سے حجاج بن ارطاۃ نے روایت کیا ہے اور وہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہے یعنی وہ اس سے حدیث بیان کرتا ہے جس سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی اور جس سے سنا نہیں ہوتا، اس سے سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید القطان اور عیسیٰ بن یونس نے روایت کو ترک کیا، حالانکہ وہ اس کے پاس بیٹھتے تھے اور اسے جانتے تھے۔ پس کسی شخص کے متعلق ان کا علم تمہارے لیے کافی ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا: حجاج بن ارطاۃ کی حدیث سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ عبداللہ بن ادریس نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آدمی فضیلت حاصل نہیں کرتا حتیٰ

کہ جماعت سے نماز چھوڑ دے۔ عیسیٰ بن یونس نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے سنا کہ میں نماز کی طرف نکلتا ہوں، مجھے بوجھ اٹھانے والے، سبزیاں بیچنے والے روک لیتے ہیں، جریر نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے مال اور شرف کی محبت نے ہلاک کر دیا۔

اس کے مخالف بھی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ثقات کی ایک جماعت نے یہ حدیث حجاج بن ارطاۃ سے روایت کی ہے، پس اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ بھی وجوہ ہیں جن کا ذکر بہت طویل ہو جائے گا جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ دیت کے بارے میں کوفیوں کے مذہب کے ضعف پر دلالت کرتا ہے اگرچہ ابن المنذر نے اپنی جلالت کے ساتھ اس کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔ حماد بن سلمہ نے روایت کیا ہے، ہمیں سلیمان تیمی نے بیان کیا انہوں نے ابو مجلز سے روایت کیا، انہوں نے ابو عبیدہ سے روایت کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: خطا کی دیت میں پانچ قسم کے اونٹ ہیں، بیس حقے، بیس جذعے، بیس بنات مخاض، بیس بنات لبون اور بیس بنی لبون۔ دار قطنی نے کہا: یہ سند حسن ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں علقمہ عن عبد اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک اور امام شافعی کا مذہب ہے کہ دیت میں پانچ قسم کے اونٹ ہوں گے۔ خطابی نے کہا: بہت سے علماء سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: خطا کی دیت میں چار قسم کے اونٹ ہیں۔ یہ امام شعبی، نخعی اور حسن بصری ہیں اور اسی کی طرف اسحاق بن راہویہ کا خیال گیا ہے مگر یہ کہتے ہیں پچیس جذعے، پچیس حقے، پچیس بنات لبون اور پچیس بنات مخاض۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے (1)۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور امام شافعی کا قول سلیمان بن یسار سے مروی ہے اس کے متعلق کسی صحابی سے کچھ مروی نہیں ہے لیکن اس پر اہل مدینہ کا عمل ہے۔ اسی طرح ابن جریج نے ابن شہاب سے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے حضرت ابن مسعود سے ایسی بات روایت کی ہے جو امام مالک اور امام شافعی کے قول کے موافق ہے۔ ابو عمر نے کہا: دیات میں اونٹوں کی عمریں نہ قیاساً لی گئی ہیں نہ نظراً بلکہ یہ اتباعاً اور تسلیماً لی گئی ہیں اور یہ اثر کی جہت سے نہیں لی گئیں اور اس میں نظر کا کوئی دخل نہیں۔ پس ہر مجتہد نے یہی کہا جو اس کے نزدیک سلف صالحین سے صحیح مروی تھا۔

میں کہتا ہوں: خطابی نے جو کہا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کسی نے عمرو بن شعیب کی حدیث کے مطابق قول کیا ہو۔ ابن المنذر نے طاؤس اور مجاہد سے یہ قول حکایت کیا ہے مگر مجاہد نے بنت مخاض کی جگہ تیس جذعوں کا ذکر کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں ان کی مراد حضرت عبد اللہ اور اصحاب الرائے کا قول ہے جس کو دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی مرفوع حدیث اس قول کے موافق ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن المنذر کے لیے تعجب ہے، حالانکہ بڑا مجتہد اور نقاد ہے اس نے ایسی حدیث کے ساتھ قول کیسے لیا اہل نقد جس کی صحت پر اس کی موافقت ہی نہیں کرتے؟ لیکن ذہول اور نسیان، انسان کو لاحق ہوتا ہے کمال تو فقط اللہ تعالیٰ کی ذات

1۔ ابوداؤد، کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطاء، حدیث نمبر 3944، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو ہے جو عزت والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ نبی مختار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی اخبار سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل خطا کی دیت کا فیصلہ عاقلہ پر فرمایا اور اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ عاقلہ کی دیت میں علماء کے اجماع میں دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو رمثہ سے جو کہا تھا، جب وہ اور اس کا بیٹا آئے تھے: ''نہ تجھ پر زیادتی کی جائے گی اور نہ اس پر زیادتی کی جائے گی(1)''۔ اس سے قتل عمد مراد ہے نہ کہ قتل خطا۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ جو دیت کے ثلث سے زائد ہوگا وہ عاقلہ پر ہوگا اور ثلث (1/3) میں اختلاف ہے اور جو علماء جمہور کا نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ عاقلہ پر نہ عمد کی صورت میں، نہ اعتراف کی صورت میں اور نہ صلح کی صورت میں دیت ہوگی اور خطا کی دیت بھی نہ ہوگی مگر جو ثلث (1/3) سے تجاوز کر جائے اور جو ثلث سے کم ہوگی وہ مجرم کے مال سے ہوگی۔ ایک طائفہ نے کہا: خطا کی دیت مجرم کی عاقلہ پر ہوگی خواہ جنایت تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، کیونکہ زیادہ چٹی سے تھوڑی چٹی ہے جس طرح کہ قتل عمد کی دیت مجرم کے مال سے ہوتی ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ دیت کا حکم یہ ہے کہ یہ عاقلہ (خاندان) پر قسط وار ہوگی، عاقلہ سے مراد عصبی رشتہ دار ہیں۔ عورت کی اولاد اس میں شامل نہیں جب کہ وہ عاقلہ کے عصبہ سے نہ ہو اور ماں کی طرف سے بھائی بھی اس میں شامل نہیں کیوں کہ ماں اور باپ کی طرف سے بھائیوں کے وہ عصبہ نہیں ان سے دیت وصول نہیں کی جائے گی اس طرح اہل حجاز کے جمہور علماء کے قول میں دفتر والوں کو عاقلہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ کوفیوں نے کہا: اگر وہ کسی دفتر میں کام کرتا ہوگا تو وہ دفتر والے اس کے عاقلہ ہوں گے۔ دیت کو تین سالوں میں تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمر اور حضرت علی نے فیصلہ فرمایا تھا، کیونکہ اونٹ کبھی حاملہ ہوتے ہیں پس وہ اسے نقصان دیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند اغراض کے لیے ایک ہی مرتبہ دیت دی تھی۔ کبھی آپ بطور صلح اور تسدید دیتے تھے، کبھی تالیف قلب کے لیے جلدی عطا فرما دیتے تھے۔ جب اسلام کا علم بلند ہو گیا تو صحابہ کرام نے اس نظام پر اس کو مقرر کیا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: علماء قدیم وجدید کا اجماع ہے کہ دیت عاقلہ پر ہوگی اور یہ تین سال میں ہوگی اس سے کم میں نہ ہوگی اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ مردوں میں سے بالغوں پر ہوگی، سیرت نگاروں اور اہل علم کا اجماع ہے کہ دیت زمانہ جاہلیت میں بھی عاقلہ ادا کرتے تھے، اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا اور وہ مدد کے لیے دیتے تھے پھر اسلام آیا تو معاملہ اس پر جاری رہا حتیٰ کہ حضرت عمر نے دفتر والوں پر دیت کو مقرر کیا۔ فقہاء نے اس کی روایت پر اتفاق کیا اور اس قول پر اتفاق کیا۔ علماء کا اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دفتر (ملازم جن کے نام کا اندراج ہوتا) پر دیت نہ تھی، حضرت عمر نے دیوان (دفتر) کو متعین کیا اور لوگوں کو اس پر جمع کیا اور ہر طرف والوں کو مددگار بنایا اور ان پر دشمنوں سے لڑنے کو متعین فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ میں کہتا ہوں: ان مسائل میں سے جو اس باب کی لڑی میں گر جاتا ہے اور جو اس نظام میں داخل ہوتا ہے وہ ماں کے بطن میں بچے کا قتل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ پر ضرب لگائی جائے پھر وہ زندہ بچہ گرا دے، پھر وہ بچہ مر

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 250۔ سنن ابی داؤد، باب فی النصاب، حدیث نمبر 3675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے۔ تمام علماء نے فرمایا: قتل خطا میں پوری دیت ہے اور قسامت کے بعد قتل عمد میں بھی پوری دیت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بغیر قسامت کے ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس سے زندگی جانی جائے گی، علماء کا اتفاق ہے کہ جو بچہ چیخا یا دودھ پیا یا آہستہ سے سانس لیا تو وہ زندہ ہے، اس میں پوری دیت ہے۔ اگر بچے نے حرکت کی تو امام شافعی اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: حرکت اس کی زندگی پر دلالت کرتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: حرکت کرنا زندگی کی دلیل نہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ دیر رہے۔ تمام علماء کے نزدیک حکم میں مذکر اور مونث برابر ہیں۔ اگر عورت نے مردہ بچہ گرا دیا تو اس میں غرہ ہے یعنی غلام یا لونڈی ہے۔ اگر اس نے بچہ نہ گرایا اور مرگئی اور وہ بچہ اس کے پیٹ میں تھا اور نکلا نہیں تھا تو اس میں کچھ نہیں ہوگا اس پر اجماع ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیث بن سعد اور داؤد سے مروی ہے انہوں نے عورت کے بارے میں کہا: جب وہ پیٹ پر ضرب کی وجہ سے مرجائے پھر اس کے مرنے کے بعد مردہ بچہ نکلے تو اس میں غرہ ہے خواہ اس نے وہ مرنے سے پہلے یا مرنے کے بعد گرایا ہو، ضرب لگنے کے وقت ماں کی زندگی کا اعتبار ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ تمام فقہاء نے کہا: اس میں کوئی چیز نہیں جب وہ ماں کے مرنے کے بعد زندہ نکلے۔ امام طحاوی نے فقہاء کی جماعت کے لیے حجت پیش کرتے ہوئے کہا: علماء کا اجماع ہے اور لیث بھی اس بات میں ان کے ساتھ ہے کہ اگر اس کے پیٹ پر مارا گیا جب کہ وہ زندہ تھی پھر وہ مرگئی جب کہ جنین (بچہ) اس کے پیٹ میں تھا اور وہ نہیں گرا تو اس میں کچھ نہیں اسی طرح جب ماں کے مرنے کے بعد گرے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اور غرہ سفید ہوگا، ابو عمرو بن علاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: فی الجنین غرۃ عبد او امۃ(1) کے بارے میں کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرہ کا معنی مراد نہ لیا ہوتا تو آپ فرماتے: جنین میں غلام یا لونڈی ہے، لیکن آپ نے سفیدی کا ارادہ فرمایا۔ پس دیت میں سفید غلام یا سفید لونڈی قبول کی جائے گی، کالا غلام اور کالی لونڈی قبول نہیں کی جائے گی۔ علماء کا غرۃ کی قیمت میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کی قیمت پچاس دینار ہو یا چھ ہزار دراہم ہو آزاد مسلمان کی دیت کا بیسواں حصہ ہو اور اس کی آزاد ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہو یہی قول ابن شہاب، ربیعہ اور تمام اہل مدینہ کا ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اس کی قیمت پانچ سو دراہم ہو۔ امام شافعی نے کہا: غرۃ کی عمر سات سال یا آٹھ سال ہو اور اس پر واجب نہیں کہ وہ عیب دار غرہ قبول کرے۔ امام مالک کے مذہب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسے اختیار ہے کہ وہ غرۃ دے یا ماں کی دیت کا دسواں حصہ دے سونے میں سے دس دینار اگر وہ سونے والے ہوں اور چاندی میں سے چھ سو دراہم اگر وہ چاندی والے ہوں یا پانچ اونٹ دے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: یہ مجرم کے مال سے دیت ہوگی۔ یہی قول حسن بن حی کا ہے، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا: یہ دیت عاقلہ پر ہوگی اور یہی اصح ہے، کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبۃ کی حدیث ہے کہ دو عورتیں تھیں جو دو انصاری مردوں کی بیویاں تھیں ایک روایت میں ہے ان دونوں عورتوں کا جھگڑا ہوا تو ایک عورت نے دوسری کو لوہے کے ڈنڈے کے ساتھ مارا اور اسے قتل کر دیا، ان کے خاوند یہ مسئلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے اور عرض کی: ہم اس کی دیت دیں جو نہ چیخا، نہ اس نے کھایا، نہ پیا، نہ آواز دی اس قسم کا شخص تو رائیگاں ہوتا

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 348

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا بدوؤں کی سجع کی طرح سجع ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کے بارے میں غرہ کا فیصلہ فرمایا اور مارنے والی عورت کے عاقلہ پر اسے مقرر فرمایا(1)۔ یہ حدیث صحیح ثابت ہے، اختلاف کی جگہ میں نص ہے، حکم کو ثابت کرتی ہے۔ جب اس عورت کی دیت جس کو ضرب لگائی ہے عاقلہ پر ہے تو گرنے والے بچے کی بھی قیاس ونظر میں دیت عاقلہ پر ہوگی۔ ہمارے علماء نے اس کے قول سے حجت پکڑی ہے جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا تھا وہ معین ہے اور وہ مجرم ہے اگر گرنے والے کی دیت کا فیصلہ عاقلہ پر ہوتا ہے تو کلام اس طرح ہوتی کہ فقال الذی قضی علیھم اور قیاس اس بات کا تقاضا کرتا ہے ہر مجرم پر اس کی جنایت کا وبال ہوتا ہے مگر وہ مسئلہ جس کے خلاف دلیل قائم ہو جس کا کوئی معارض نہ ہو اجماع ہو جس کا خلاف جائز نہ ہو یا کوئی نص سنت سے موجود ہو جس کے ناقل عادل ہوں اور اس کا کوئی معارض نہ ہو تو اس کے ساتھ حکم ثابت ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام:164) اور نہیں کمائے گا کوئی نفس مگر وہ اس کے ذمہ ہوگا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ گرنے والا بچہ جب زندہ نکلے تو اس میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی ہے اور جب مردہ نکلے تو کفارہ میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: اس میں غرہ اور کفارہ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: اس میں غرة ہے کفارہ نہیں ہے۔ جنین (گرنے والا بچہ) کی طرف سے جو غرة دیا جائے گا اس کی میراث کے بارے اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے کہا: جنین کی طرف سے غرہ میراث میں تقسیم ہوگا جیسا کتاب اللہ کا حکم ہے، کیونکہ وہ دیت ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: غرہ صرف ماں کو ملے گا، کیونکہ وہ جنایت ہے جو عورت پر کی گئی ہے اس کے کسی عضو کو کاٹنے کے ساتھ اور یہ دیت نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس میں مذکر اور مونث کا اعتبار نہیں جس طرح کہ دیات میں لازم ہوتا ہے پس یہ دلیل ہے کہ وہ عضو کی طرح ہے۔ ابن ہرمز کہتے ہیں کہ اس کی دیت خاص اس کے والدین کے لیے ہے۔ 2/3 والد کے لیے اور 1/3 والدہ کے لیے ہے، والدین میں سے جو زندہ ہوگا وہ اس کے لیے ہوگا اگر ان میں سے ایک مر چکا ہو تو وہ دوسرے کے لیے ہوگا خواہ وہ باپ ہو یا ماں ہو۔ بھائی کسی چیز کے وارث نہ ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا اس کی اصل ان یتصدقوا ہے تا کو صاد میں مدغم کیا گیا ہے۔ التصدق کا معنی عطا کرنا ہے یعنی مگر یہ کہ اولیاء، قاتلین کے ورثاء کو معاف کر دیں وہ جو اللہ نے ان کے لیے، ان پر دیت واجب کی ہے۔ یہ پہلے سے استثنا نہیں۔ ابوعبدالرحمٰن اور نبیح نے الا ان تصدقوا صاد اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے(2)، اسی طرح ابوعمرو نے پڑھا ہے مگر انہوں نے صاد کو شد کے ساتھ پڑھا ہے، اس قرأت پر دوسری تا کا حذف جائز ہے اور یا کی قرأت پر اس کا حذف جائز نہیں اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں الا ان یتصدقوا ہے۔ اور وہ کفارہ جو اللہ کے لیے ہے وہ ورثاء کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا، کیونکہ اس نے ایک شخص کو تلف کیا جو اللہ کی عبادت میں تھا پس اس پر واجب ہے کہ ایک دوسرا شخص اپنے رب کی عبادت کے لیے خاص کرے۔ اور دیت ساقط ہو جاتی ہے وہ ان کا حق

1۔ صحیح مسلم، باب القسامۃ، جلد 2، صفحہ 62		2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93، دارالکتب العلمیہ بیروت

ہے اور مجرم کے مال میں کفارہ واجب ہے وہ نہیں اٹھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 12۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ۔ یہ اس مومن کا مسئلہ ہے جو کفار کے شہروں میں قتل ہو جاتا ہے یا ان کی جنگوں میں قتل ہو جاتا ہے، اس بنا پر کہ وہ کفار سے ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، سدی، عکرمہ، مجاہد اور نخعی کے نزدیک معنی یہ ہے کہ اگر یہ مقتول مومن ہوا ایمان لایا ہوا اور اپنی کافر قوم میں باقی رہا ہو جو تمہاری دشمن ہے تو اس میں دیت نہیں ہے اور اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے (1)۔ امام مالک کا مشہور قول یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ دیت دو وجوہ سے ساقط ہوتی ہے (۱) مقتول کے اولیاء کفار ہیں پس انہیں دیت دینا صحیح نہیں، کیونکہ وہ اس سے قوت حاصل کریں گے (۲) جو شخص ایمان لائے اور ہجرت نہ کرے تو اس کی حرمت کم ہے پس اس کی دیت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَايَتِهِمۡ مِّنۡ شَيۡءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا (الانفال:72) اور وہ جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی نہیں ہے ان کی میراث سے کچھ بھی حتیٰ کہ وہ ہجرت کریں۔

علماء کی ایک جماعت نے کہا: دیت کے سقوط کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء فقط کفار ہیں برابر ہے کہ قتل خطا مسلمانوں کے درمیان ہو یا اس کی قوم کے درمیان ہو، ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ آیا ہو تو اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے اور اس میں دیت نہیں ہے، کیونکہ کفار کو دیت دینا صحیح نہیں (2)۔ اگر دیت واجب ہوتی تو بیت المال کے لیے بیت المال پر واجب ہوتی، اس جگہ میں دیت واجب نہیں اگرچہ بلاد اسلام میں قتل جاری ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اوزاعی، ثوری اور ابو ثور کا یہی قول ہے۔ پہلے قول کے مطابق اگر مومن مسلمانوں کے شہروں میں قتل کیا گیا اور اس کی قوم مسلمانوں سے جنگ کرتی تھی، تو اس کی دیت بیت المال کے لیے ہوگی اور کفارہ بھی ہوگا (3)۔

میں کہتا ہوں: اس باب سے وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت اسامہ سے مروی ہے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگی مہم پر بھیجا تو ہم نے جہینہ کے حرقات (جگہ کا نام) پر صبح حملہ کیا، میں ایک شخص پر غالب آ گیا تو اس نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں نے اسے نیزہ مارا، پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے، میں نے یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تھا اور تو نے اسے قتل کر دیا۔ حضرت اسامہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے یہ ہتھیار کے خوف کی وجہ سے کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو نے اس کا دل چیرا تا کہ تو جان لیتا کیا اس نے صحیح کلمہ پڑھا ہے یا نہیں؟'' (4)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس کے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور نہ دیت کا۔ حضرت اسامہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد میرے لیے تین مرتبہ استغفار فرمایا: اور فرمایا غلام آزاد کرو اور آپ نے قصاص و دیت کا فیصلہ نہ فرمایا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قصاص کا سقوط واضح ہے، کیونکہ قتل دشمنی کی بنا پر نہ تھا اور رہا دیت کا سقوط تو اس کی تین وجوہ ہیں (۱) اسے اصل قتال میں اجازت دی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93 3۔ ایضاً

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 68۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 3935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گئی تھی پس اس سے محترم نفس کا اتلاف غلطی سے ہوا ہے جیسے ختنہ کرنے والے یا طبیب سے غلطی ہو جاتی ہے (۲) کیونکہ وہ دشمن قوم سے تھا اور مسلمانوں میں سے کوئی ولی نہیں تھا جس کو دیت دی جاتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ۔ جیسا کہ پہلے ہم نے ذکر کیا ہے۔ (۳) حضرت اسامہ نے قتل کا اعتراف کیا تھا اور اس کے لیے بینہ (گواہی) قائم نہیں ہوئی تھی۔ اور عاقلہ سے دیت اعتراف کی صورت میں نہیں لی جاتی، شاید حضرت اسامہ کے لیے مال ہی نہ ہو جس میں دیت جاری کی جاتی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ یہ ذمی اور معاہد کے بارے میں ہے جو خطاءً قتل ہو جائے تو دیت اور کفارہ واجب ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، شعبی، نخعی اور امام شافعی کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا ہے اور وھو مومن نہیں فرمایا جس طرح کہ مومنین اور اہل حرب میں سے مقتول کے بارے میں فرمایا۔ اس سے پہلے جو تھا مقید تھا پھر اس کا مطلق ذکر کرنا دلیل ہے کہ یہ اس کے خلاف ہے۔ حسن، جابر بن زید اور ابراہیم نے بھی یہی کہا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شخص جو خطا قتل کیا گیا ہے وہ مومن ہے اور تمہاری معاہد قوم میں سے ہے تو ان کا عہد ثابت کرے گا کہ وہ اپنے ساتھی کی دیت کے زیادہ حق دار ہیں پس اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا اور دیت ادا کرنا ہے حسن نے اس کو اس طرح پڑھا ہے: وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وھو مومنٌ (1)۔ اور حسن نے کہا: جب مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو اس پر کفارہ نہیں۔ ابو عمر نے کہا: اہل حجاز کے نزدیک آیت کا معنی اس آیت پر لوٹایا گیا ہے وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ اس سے مراد مومن ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک جملہ محمول ہے جس طرح مطلق، مقید پر محمول ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی وہ ہے جو حسن نے کہا ہے اور ابو عمر نے یہ معنی اہل حجاز سے نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ دیت نکرہ ہے جو معین دیت ہونے کا تقاضا نہیں کرتا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مشرکین عرب کے بارے میں ہے ان کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان عہد تھا کہ وہ اسلام قبول کریں یا ان سے اعلان جنگ کیا جائے گا یہ ایک مدت تک تھا۔ پس جو ان میں سے قتل کیا جاتا اس میں دیت اور کفارہ واجب ہوتا تھا پھر یہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (توبہ) کے ارشاد سے منسوخ ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ علماء کا اجماع ہے کہ عورت کی دیت، مرد کی دیت سے نصف ہے، ابو عمر نے کہا: اس کی دیت نصف اس لیے رکھی گئی، کیونکہ اس کے لیے میراث بھی نصف ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ یہ قتل خطا کی دیت میں ہے رہا قتل عمد تو اس میں مردوں اور عورتوں کے درمیان قصاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ: 45) اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ (بقرہ: 178) جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ دار قطنی نے موسیٰ بن علی بن رباح لخمی کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93

والد کو یہ کہتے سنا کہ ایک اندھا حضرت عمر بن خطاب کے دور خلافت میں یہ شعر پڑھ رہا تھا:

یا ایُّھا النّاسُ لیقت منکراً ھل یَعْقِل الأعمیٰ الصحیحَ المبصرا

خرّا معاً کلاھما تکسّرا

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک اندھے کی قیادت ایک بینا شخص کر رہا تھا تو وہ دونوں کنوئیں میں گر گئے اندھا، بینا شخص کے اوپر گرا تو بینا شخص مر گیا حضرت عمر نے بینا شخص کی دیت کا فیصلہ نابینے شخص پر کیا۔ علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو دوسرے کے اوپر گرا پھر ان میں سے ایک مر گیا، حضرت ابن زبیر سے مروی ہے کہ اوپر والا نیچے والے کا ضامن ہوگا، نیچے والا اوپر والے کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ شریح نخعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام مالک نے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں کہا: جن میں سے ایک نے دوسرے کو کھینچا حتیٰ کہ دونوں گرے اور دونوں مر گئے تو دیت اس کے عاقلہ پر ہوگی جس نے کھینچا تھا۔ ابو عمر نے کہا: میں اس میں کوئی خلاف گمان نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔ مگر ہمارے بعض متاخرین اور اصحاب شافعی نے کہا کہ کھینچنے والے کے عاقلہ نصف دیت کے ضامن ہوں گے، کیونکہ وہ اپنے فعل سے اور اوپر گرنے والے کی وجہ سے مرا۔ حکم اور ابن شبرمہ نے کہا: اگر کوئی شخص کسی کے اوپر، مکان کے اوپر سے گرے پھر ایک مر جائے تو ان میں سے جو زندہ ہوگا وہ دوسرے کا ضامن ہوگا۔ امام شافعی نے کہا: وہ دو شخص جو آپس میں ٹکرائے اور دونوں مر گئے تو جس سے ٹکرایا گیا اس کی دیت ٹکرانے والے کے عاقلہ پر ہوگی اور ٹکرانے والے کی دیت رائیگاں جائے گی اور دو شہسواروں کے بارے فرمایا: جب وہ ٹکرائے اور دونوں مر گئے تو ان میں سے ایک پر دوسرے کی نصف دیت ہوگی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے فعل اور اپنے ساتھی کے فعل سے مرا ہے۔ یہ عثمان البتی اور امام زفر کا قول ہے۔ امام مالک، اوزاعی، حسن بن حیی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے شہسواروں کے بارے کہا: جو ٹکرا کر مر گئے ہر ایک کی دیت دوسرے کے عاقلہ پر ہوگی۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی طرح ہمارے نزدیک دو ٹکرانے والی کشتیوں کا حکم ہے جو ٹکرا جائیں جب کہ ملاح کشتی کو پھیرنے والا نہ ہو اور نہ سوار گھوڑے کو پھیرنے والا ہو۔ امام مالک سے دو کشتیوں اور سواروں کے بارے مروی ہے کہ ہر ایک اپنے ساتھی کی تلف شدہ چیز کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ علماء کا اہل کتاب کی دیت کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا: یہ مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔ اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے اور ان کی عورتوں کی دیت اس سے نصف ہے۔ یہ قول عمر بن عبد العزیز، عروہ بن زبیر اور عمرو بن شعیب سے مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی یہی فرمایا ہے۔ یہ مفہوم سلیمان بن ہلال عن عبد الرحمٰن بن الحارث بن عیاش بن ابی ربیعہ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی اور نصرانی کی دیت، مسلمان کی دیت سے نصف مقرر فرمائی (1)۔ اور اسے عبد الرحمٰن سے

1۔ ابن ماجہ، باب دیۃ الکافر، حدیث نمبر 2633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ثوری نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس، شعبی اور نخعی نے فرمایا: معاہدین میں خطأ مقتول خواہ وہ مومن ہو یا کافر ہو اپنی قوم کے عہد پر ہو گا اس کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہو گی (1) یہ امام ابوحنیفہ، ثوری، عثمان، بتی اور حسن بن حی کا قول ہے انہوں نے تمام دینوں کو برابر بنایا ہے مسلمان ہو یا یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی ہو معاہد ہو اور ذمی ہو سب برابر ہیں یہ عطا، زہری اور سعید بن مسیب کا قول ہے ان کی حجت یہ ارشاد ہے: فَدِيَةٌ یہ مسلمان کی دیت کی طرح کامل دیت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور انہوں نے اپنی بات کو اس روایت سے تائید دی ہے جسے محمد بن اسحاق نے داؤد بن حصین سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے بنی قریظہ اور نضیر کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دیت برابر کامل مقرر فرمائی۔ ابو عمر نے کہا اس حدیث میں کمزوری ہے اس جیسی حدیث میں حجت نہیں ہوتی۔ امام شافعی نے فرمایا: یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمان کی دیت کا تہائی ہے (2)، اور مجوسی کی دیت آٹھ سو دراہم ہیں ان کی حجت یہ ہے کہ یہ کم از کم مقدار ہے جو اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ذمہ سے برأت یقین یا حجت سے ہوتی ہے۔ یہ قول عمر اور عثمان سے مروی ہے۔ یہی قول ابن مسیب، عطا، حسن، عکرمہ، عمرو بن دینار، ابوثور اور اسحاق کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ یعنی جو غلام نہ پائے اور نہ غلام خریدنے کی اس کے مال میں وسعت ہو تو فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ تو اس پر دو ماہ کے متواتر روزے ہیں، حتیٰ کہ اگر ایک دن بھی افطار کر دیا تو نئے سرے سے شروع کرنے ہوں گے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ مکی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ دو ماہ کے روزے دیت اور غلام آزاد کرنے کی طرف کفایت کرتے ہیں اس شخص کے لیے جو غلام نہ پائے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول وہم ہے، کیونکہ دیت عاقلہ پر ہوتی ہے قاتل پر نہیں ہوتی۔ طبری نے یہ قول مسروق سے حکایت کیا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ حیض، تتابع کے مانع نہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں، حیض سے عورت جب پاک ہو اور تاخیر نہ کرے پچھلے روزوں کے ساتھ روزوں کو ملا لے۔ اس پر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ فجر کی نماز سے پہلے پاک ہوئی اس دن کا روزہ ترک کر دیا جب کہ اسے اپنی طہارت کا علم تھا۔ اگر وہ ایسا کرے تو علماء کی جماعت کے نزدیک نئے سرے سے روزے رکھے۔ یہ ابو عمر نے کہا ہے۔ اس مریض میں اختلاف ہے جس نے دو ماہ میں سے بعض روزے متواتر رکھے۔ اس میں دو قول ہیں۔ امام مالک نے کہا: کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ جس پر کتاب اللہ میں متواتر روزے واجب کیے گئے ہوں پھر وہ افطار کرے مگر عذر یا مرض یا حیض کی صورت میں افطار کرنا جائز ہے۔ اس کے لیے سفر کرنا اور پھر افطار کرنا درست نہیں۔ مرض میں جنہوں نے بنا کرنے کا کہا ہے ان میں سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، حسن، شعبی، عطا، مجاہد، قتادہ اور طاؤس ہیں۔ سعید بن جبیر، نخعی، حکم بن عیینہ اور عطا خراسانی نے کہا: مرض میں نئے سرے سے روزے شروع کرے۔ یہ امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب حسن بن حی اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ وہ بنا کر سکتا ہے۔ ابن شبرمہ نے کہا: اگر اسے غالب عذر ہو تو ایک دن کی قضا کرے جس طرح رمضان کے روزے کی قضا کی جاتی ہے۔ ابو عمر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

نے کہا: جن علماء نے بنا کا کہا ہے ان کی حجت یہ ہے کہ وہ مرض کی وجہ سے تتابع (متواتر) کو توڑنے میں معذور ہے وہ عمداً ایسا نہیں کر رہا اور الله تعالیٰ نے بغیر ارادہ کے کوئی کام کرنے والے سے تجاوز فرمایا ہے۔ اور جنہوں نے نئے سرے سے روزے رکھنے کو کہا ہے ان کی حجت یہ ہے کہ تتابع فرض ہے عذر کی وجہ سے ساقط نہ ہوگا، گناہ کو عذر ساقط کرتا ہے جس طرح نماز ہے اس کی رکعات متواتر ہوتی ہیں جب اسے عذر قطع کر دے تب بھی نئے سرے سے شروع کرنی ہوتی ہے بنا نہیں کی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَوْبَةً مِّنَ اللهِ نصب مصدر کی بنا پر ہے۔ اس کا معنی رجوع کرنا ہے (1)۔ خطا کرنے والے کو توبہ کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ وہ گناہ سے بچا نہیں اور اس کے حق میں سے تھا کہ وہ اپنی حفاظت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ وہ روزے رکھے یہ الله کی طرف سے تخفیف ہے کہ اس نے غلام کے عوض روزے کو قبول فرمالیا۔ اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اللهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (بقرہ: 187) یعنی اس نے تخفیف کی۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (المزمل: 20)

**مسئلہ نمبر 20**۔ وَ كَانَ اللهُ یعنی وہ ہمیشہ سے تھا عَلِيْمًا تمام معلومات کو جاننے والا ہے۔ حَكِيْمًا۝ اس کے ہر کام میں پختگی اور حکمت ہے۔

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۝

"اور جو شخص قتل کرے کسی مومن کو جان بوجھ کر تو اس کی سزا جہنم ہے، ہمیشہ رہے گا اس میں اور غضب ناک ہوگا الله تعالیٰ اس پر اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اسے اور تیار کر رکھا ہے اس نے اس کے لیے عذاب عظیم"۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّقْتُلْ، مَنْ شرطیہ ہے اور اس کا جواب فَجَزَآؤُهٗ ہے۔ جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی صفت کے بارے میں اختلاف ہے۔ عطا اور نخعی وغیرہما نے کہا: جس نے لوہے کے ساتھ قتل کیا جیسے تلوار، خنجر، نیزے کی انی اور اس قسم کی دوسری کوئی تیز چیز جو کاٹنے کے لیے تیار کی گئی ہو یا ایسی چیز جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کے استعمال میں موت ہے جیسے بھاری پتھر وغیرہ۔ ایک جماعت نے کہا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا وہ ہے جس نے لوہے کے ساتھ قتل یا پتھر کے ساتھ قتل کیا یا ڈنڈے کے ساتھ قتل کیا یا اس کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ قتل کیا۔ یہ جمہور کا قول ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الله تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر فرمایا اور شبہ العمد کا ذکر نہیں فرمایا۔ علماء کا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک نے اس کا انکار کیا، انہوں نے کہا: کتاب الله میں صرف عمد اور خطا کا ذکر ہے۔ خطابی نے بھی امام مالک سے یہ ذکر کیا اور یہ زائد ذکر کیا رہا شبہ عمد تو ہم اس کو نہیں جانتے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور لیث بن سعد نے شبہ العمد کا انکار کیا پس جو ان کے نزدیک ایسی چیز سے قتل کیا گیا جس کے ساتھ عام طور پر قتل نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94

کیا جاتا مثلاً دانتوں سے کاٹا، طمانچہ مارا، کوڑا مارا، چھڑی ماری وغیرہ تو یہ عمد ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ ابو عمر نے کہا: ان دونوں کے قول کے موافق صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے جمہور فقہائے امصار کا یہ نظریہ ہے کہ یہ تمام صورتیں شبہ عمد کی نہیں۔ امام مالک سے یہ ذکر کیا گیا ہے اور یہ ابن وہب اور صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہمارے نزدیک شبہ عمد پر عمل کیا جائے گا۔ جن علماء نے شبہ عمد کو ثابت کیا ہے ان میں شعبی، حکم، حماد، نخعی، قتادہ، سفیان ثوری، اہل عراق اور امام شافعی ہیں۔ ہم نے یہ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے، خون کے سلسلہ میں احتیاط کرنی ضروری ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ خون کی جلد میں حفاظت کی جائے، پس خون بہانا مباح نہیں مگر ایسی صورت میں جو بالکل واضح ہو جس میں کسی قسم کا اشکال نہ ہو اور اس صورت میں اشکال ہے، کیونکہ جب حکم عمد اور خطا میں متردد تھا تو اس کے لیے شبہ عمد کا حکم لگایا گیا، ضرب (مارنا) مقصود تھا۔ قتل مقصود نہیں تھا قتل بغیر ارادہ کے ہوا تھا، پس قصاص ساقط ہوگا اور دیت بھاری ہوگی۔ اسی کی مثال احادیث میں آئی ہے ابوداؤد نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار خطا کی دیت، شبہ عمد جو کوڑے اور لاٹھی سے ہو سو اونٹ ہیں جن میں چالیس ایسی اونٹنیاں ہوں جن کے بطنوں میں بچے ہوں'' (1)۔ دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قتل عمد میں قصاص ہے اور قتل خطا میں دیت ہے۔ اس میں قصاص نہیں ہے اور جو نا معلوم پتھر یا ڈنڈے یا کوڑے سے قتل کیا گیا ہو تو وہ اونٹوں کی دیت مغلظہ ہے'' (2)۔ سلیمان بن موسیٰ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی طرح مغلظ ہے، شبہ عمد والے کو قتل نہیں کیا جائے گا'' (3)۔ یہ نص ہے۔ طاؤس نے اس شخص کے بارے میں کہا جو جنگ میں ڈنڈے، کوڑے یا پتھر کے ساتھ مارا گیا ہو تو اس کی دیت دی جائے گی اور اس کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ معلوم نہیں اس کا قاتل کون ہے؟ امام احمد بن حنبل نے کہا: العمیا وہ امر جس کا معاملہ پوشیدہ ہو اس کی وجہ معلوم نہ ہو۔ اسحاق نے کہا: یہ قوم میں تخارج (☆) اور بعض کو بعض کے قتل کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی اصل التعمیۃ (☆☆) سے ہے جس کا معنی تلبیس ہے۔ یہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ**۔ شبہ عمد کو تسلیم کرنے والوں کا دیت مغلظہ میں اختلاف ہے۔ عطا اور امام شافعی نے کہا: یہ تیس حقے، تیس جذعے اور چالیس خلفہ ہیں۔ یہ قول حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کا ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے جب وہ شبہ عمد کا قول کرتے ہیں۔ اور امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا مگر مدلجی نے اپنے بیٹے کے ساتھ جو کچھ کیا اس جیسے مسئلے میں شبہ عمد کا قول کرتے ہیں جب اس نے اپنے بیٹے کو تلوار سے مارا۔ بعض علماء نے کہا: یہ چار قسم کے اونٹ ہوں گے چوتھائی بنات لبون، چوتھائی حقاق، چوتھائی جذاع اور چوتھائی بنات مخاض۔ یہ نعمان اور یعقوب کا قول ہے۔ ابوداؤد نے یہ سفیان عن ابی اسحاق عن عاصم بن ضمرہ عن علی کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ پانچ قسم کے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 269

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحدود والدیات، جلد 3، صفحہ 94، حدیث نمبر 47

3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 95، حدیث نمبر 53

☆ شرکاء کا جائیداد کو آپس میں تقسیم کرنا

☆☆ پوشیدہ رکھنا

اونٹ ہوں گے، بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس ابن لبون، بیس حقے اور بیس جذعے۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: چالیس جذعے بازل (☆) عام تک، تیس حقے، تیس بنت لبون۔ یہ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔ اور یہی حسن بصری، طاؤس اور زہری کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: چونتیس خلفۃ بازل عام تک تینتیس حقے، تینتیس جذعے۔ اور یہی شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ یہ ابوداؤد نے ابوالاحوص عن ابی اسحاق عن عاصم بن ضمرہ عن علی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ان میں اختلاف ہے جن میں شبہ عمد کی دیت لازم ہوتی ہے۔ حارث عکلی، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، قتادہ اور ابوثور نے کہا: قتل کرنے والے پر اس کے مال میں ہوگی۔ شعبی، نخعی، حکم، امام شافعی، ثوری، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے نے کہا: وہ عاقلہ پر ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: شعبی کا قول اصح ہے، کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنین کی دیت مارنے والی کے عاقلہ پر جاری کی تھی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کا اجماع ہے کہ قتل عمد کی دیت عاقلہ پر نہ ہوگی بلکہ وہ مجرم کے مال میں ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ قتل خطا کرنے والے پر کفارہ ہے اور قتل عمد میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ یہ ہے کہ قتل عمد والے پر اسی طرح کفارہ ہے جس طرح قتل خطا میں کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قتل خطا میں جب کفارہ واجب ہے تو قتل عمد میں بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔ اور فرمایا: جب سہو میں سجدہ مشروع ہے تو عمد میں بدرجہ اولیٰ مشروع ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ نے قتل عمد میں ذکر فرمایا وہ قتل خطا میں جو واجب ہے اس کو ساقط کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والے پر کفارہ واجب ہوگا جب اسے معاف کیا جائے اور اسے قتل نہ کیا جائے مگر جب اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا تو اس پر کفارہ نہ ہوگا جو اس کے مال سے لیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: کفارہ واجب ہوگا جس نے خودکشی کی اس پر کفارہ اس کے مال سے ہوگا۔ ثوری، ابوثور اور اصحاب الرائے نے کہا: کفارہ واجب نہ ہوگا مگر وہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے کفارہ واجب کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں، کیونکہ کفارات عبادات ہیں اور تمثیل جائز نہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی فرض اللہ کے بندوں پر لازم کردے مگر کتاب اللہ یا سنت یا اجماع سے اور جنہوں نے عمداً قتل کرنے والے پر کفارہ لازم کیا ان کے پاس حجت نہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس جماعت کے بارے اختلاف ہے جنہوں نے خطاءً ایک شخص کو قتل کردیا۔ ایک جماعت نے کہا: ہر ایک پر کفارہ ہوگا۔ حسن، عکرمہ، نخعی، حارث، عکلی، امام مالک، ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور اور اصحاب الرائے نے بھی یہی کہا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: ان تمام پر ایک کفارہ ہوگا۔ ابوثور نے یہی کہا ہے، اوزاعی سے یہی حکایت کیا گیا ہے۔ زہری نے غلام آزاد کرنے اور روزہ رکھنے میں فرق کیا ہے۔ ایک جماعت کے بارے میں فرمایا: جو منجنیق پھینکتے ہیں اور ایک شخص کو قتل کردیتے ہیں، تمام پر ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر وہ غلام نہ پائیں تو ہر ایک پر دو ماہ کے متواتر روزے ہوں گے۔

---

☆ بازل اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کی عمر آٹھ سال ہو چکی ہو اور نویں سال میں شروع ہو چکا ہو اس وقت اس کی طاقت مکمل ہو جاتی ہے اس کے بعد اسے بازل عام اور بازل عامین کہا جاتا ہے۔ نہایہ

**مسئلہ نمبر 6۔** نسائی نے روایت کیا ہے ہمیں حسن بن اسحاق المروزی نے بتایا وہ ثقہ ہے فرمایا مجھے خالد بن خداش نے بتایا، انہوں نے فرمایا ہمیں حاتم بن اسماعیل نے بتایا، انہوں نے بشیر بن مہاجر سے روایت کیا، انہوں نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک زوال دنیا سے بھی بڑا ہے''۔ حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے پہلے جس کا بندے سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے اور سب سے پہلے بندوں کے درمیان جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خونوں کے متعلق ہو گا'' (1)۔ اسماعیل بن اسحاق نے نافع بن جبیر بن مطعم سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک سائل نے ان سے کہا: اے ابو العباس! کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ حضرت ابن عباس نے اسے مسئلہ پر تعجب کرنے والے کی طرح کہا: تو کیا کہتا ہے؟ دو یا تین مرتبہ یہ کہا، پھر حضرت ابن عباس نے فرمایا: تجھ پر افسوس اس کے لیے توبہ کہاں! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''مقتول آئے گا جب کہ اس کا سر اس کے ایک ہاتھ میں لٹکا ہوا ہوگا وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنے قاتل کو بلا رہا ہوگا، اس کی رگیں خون آلود ہوں گی حتیٰ کہ دونوں رو کے جائیں گے، مقتول اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گا: اے رب! اس نے مجھے قتل کیا اللہ تعالیٰ قاتل کو فرمائے گا: تو نیست و نابود ہو جائے پھر اسے آگ کی طرف لے جایا جائے گا''۔ حسن سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے کسی چیز کے بارے اتنا سوال نہیں کیا جتنا کہ میں نے مومن کے قتل کے بارے میں کیا تو مجھے جواب نہ ملا''۔

**مسئلہ نمبر 7۔** جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کیا اس کے لیے توبہ ہے؟ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: اس میں اہل کوفہ نے اختلاف کیا پھر میں حضرت ابن عباس کے پاس گیا ان سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ۔ یہ سب سے آخر میں نازل ہوا اور اسے کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔ نسائی نے حضرت ابن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: کیا اس شخص کے لیے توبہ ہے جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں میں نے ان پر سورۂ فرقان کی آیت 68 پڑھی: وَ الَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت مکی ہے، اسے مدنی آیت: وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ نے منسوخ کیا ہے۔

زید بن ثابت سے اسی طرح روایت ہے اور سورۂ نساء کی آیت، سورۂ فرقان کی آیت سے چھ ماہ بعد نازل ہوئی اور ایک روایت میں آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی۔ نسائی نے ان دونوں روایات کو حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔ حضرت زید اور حضرت ابن عباس سے مروی روایات کو دیکھ کر معتزلہ نے آیت کے عموم کا نظریہ قائم کیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ کے عموم کا مخصص ہے۔ انہوں نے کہا کہ وعید ہر قاتل پر نافذ ہوگی انہوں نے دونوں

---

1۔ صحیح بخاری، باب القصاص، حدیث نمبر 6052، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء ان اول ما یحاسب بہ العبد الخ، حدیث نمبر 378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیتوں کو جمع کیا ہے کہ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ یغفر ما دون ذالك لمن یشاء الا من قتل عمداً۔ علماء کی ایک جماعت جن میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہیں۔ حضرت زید اور حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قاتل کے لیے توبہ ہے۔ یزید بن ہارون نے کہا: ہمیں ابو مالک اشجعی نے بتایا انہوں نے سعد بن عبیدہ سے روایت کیا انہوں نے فرمایا: ایک شخص حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور کہا: کیا جان بوجھ کر مومن کو قتل کرنے والے کے لیے توبہ ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں مگر آگ۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت ابن عباس سے ساتھیوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اس طرح فتویٰ دیتے تھے ہمیں تو آپ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ قاتل کی توبہ قبول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں اسے گمان کرتا تھا کہ یہ بہت غصہ میں ہے کسی مومن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا: لوگ اس شخص کے پیچھے گئے تو انہوں نے اسے ویسا ہی پایا۔ یہ اہل السنت کا مذہب ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور یہ آیت مخصوصہ ہے اور تخصیص کی دلیل آیات اور اخبار ہیں۔

علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت مقیس بن ضبابہ کے بارے میں نازل ہوئی ان کا واقعہ اس طرح ہے کہ وہ اور ان کا بھائی ہشام بن ضبابہ مسلمان ہوئے۔ پھر مقیس نے اپنے بھائی ہشام کو بنی نجار میں مقتول پایا۔ اس واقعہ کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ نے بنی نجار کو لکھا کہ ''اس کے بھائی کا قاتل اس کے حوالے کر دو'' اور آپ نے مقیس کے ساتھ ایک شخص کو بھیجا جس کا تعلق بنی فہر سے تھا۔ بنو النجار نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس کا قاتل نہیں جانتے لیکن ہم دیت دیں گے، پس انہوں نے سو اونٹ دیت دیئے پھر وہ دونوں مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ آئے، راستہ میں مقیس نے فہری شخص پر حملہ کر کے اسے اپنے بھائی کے بدلے قتل کر دیا۔ اونٹ لے لیے اور مرتد ہو کر مکہ چلا گیا۔ اور وہ شعر پڑھتا تھا:

قتلت به فِهرا و حملت عقله سراة بني النجار أرباب فارِعِ (1)

حَلَلتُ به وترِي وأدركت ثورتي وكنت إلى الأوثان أوّلَ رَاجِعِ

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اسے حل و حرم میں امن نہیں دیتا'' (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے قتل کا حکم دیا جب کہ وہ کعبہ کے ساتھ متعلق تھا۔ جب اہل تفسیر اور علماء دین کی نقل سے یہ ثابت ہے تو اسے مسلمانوں پر محمول کرنا مناسب نہیں پھر اس آیت کے ظاہر کو اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: 114) اور وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (الشوریٰ: 25) اور وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ کے ظاہر کو لینے سے اولیٰ نہیں ہے۔ ان دونوں آیات کے ظاہر کو لینے میں تناقض ہے، پس تخصیص ضروری ہے پھر سورۂ فرقان کی آیت اور اس آیت کو جمع کرنا ممکن ہے، نہ نسخ ہے اور نہ تعارض ہے۔ سورۂ نساء کی مطلق آیت کو سورۂ فرقان کی مقید آیت پر محمول کیا جائے گا معنی یہ ہوگا کہ اس کی جزا یہ ہے کہ مگر جو توبہ کر لے خصوصاً جب کہ موجب یعنی قتل اور موجب یعنی عقاب کی دھمکی متحد ہیں۔ رہی اخبار تو وہ بہت سی ہیں جیسے حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جس میں فرمایا: ''تم میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے اور نہ زنا کرو گے اور نہ چوری کرو گے اور اس نفس کو قتل نہیں کرو گے جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ جو تم میں سے ان احکام کو پورا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 95، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 257

کرے گا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان باتوں میں سے کسی کا ارتکاب کرے گا اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا، اگر چاہے گا تو اسے عذاب دے گا'' (1)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے مروی ہے جس نے سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں، ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے (2)۔ اس کے علاوہ بھی اخبار ثابت ہیں پھر ہمارے ساتھ ان کا اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جس کے خلاف قتل کی گواہی دی گئی اور وہ اقرار کرتا ہو کہ اس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ پھر اس کے اولیاء سلطان کے پاس آئیں اور اس پر حد قائم کی جائے اور قصاصاً قتل کیا جائے تو آخرت میں اس کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عبادہ کی حدیث کے مقتضیٰ پر بالا جماع اس پر وعید نافذ نہ ہو گی، تو انہوں نے وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا کے عموم سے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ ان پر ٹوٹ گئی اور جو ہم نے ذکر کیا اس کے ساتھ تخصیص داخل ہو گئی۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو معلوم ہوا کہ یہ آیت مخصوص ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا یا یہ اس قول پر محمول ہو گی جو حضرت ابن عباس سے حکایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مُّتَعَمِّدًا کا معنی ہے جو اس کے قتل کو حلال سمجھنے والا ہے۔ یہ بالا جماع کفر کی طرف لوٹتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: قاتل کا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہے خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ۔ یہ اس کے کفر پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ غضب نہیں فرماتا مگر کافر پر جو ایمان سے خارج ہوتا ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے یہ وعید ہے اور وعید میں خلف کرم ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

وانّی متیٰ اوعدته او وعدته لَمُخلِف إیعادی وَ مُنجِزُ مَوعِدِی

یہ پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ اسے یہ جزا دے یعنی وہ اپنے بڑے گناہ کی وجہ سے اس گناہ کا مستحق اور سزاوار ہے۔ ابو مجلز لاحق بن حمید اور ابو صالح وغیرہما نے اس پر نص قائم کی ہے۔ حضرت انس بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ بندے کے لیے ثواب کا وعدہ فرماتا ہے تو وہ اسے پورا کرتا ہے اور اگر اس کے لیے عقوبت مقرر فرماتا ہے تو اس کے لیے مشیت ہے اگر چاہے گا تو اسے عتاب دے گا اور اگر چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا''۔ ان دونوں تاویلوں میں نظر ہے۔ رہی پہلی تاویل، قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کا کلام خلف کو قبول نہیں کرتا مگر یہ کہ اس سے عام کی تخصیص مراد لی جائے اور یہ کلام میں جائز ہے اور رہی دوسری تاویل۔ اگرچہ روایت کیا گیا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں غلطی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا (کہف: 106) کسی نے یہ نہیں کہا: ان جازاهم (اگر وہ انہیں جزا دے گا) یہ عربی جاننے میں خطا ہے، کیونکہ اس کے بعد غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ ہے وہ جازاہ کے معنی پر محمول ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس کی جزا جہنم ہے اگر وہ توبہ نہ کرے اور گناہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 73۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 17، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ، باب هل لقاتل المؤمن توبة، حدیث نمبر 2611، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر اصرار کرے حتیٰ کہ وہ اپنے رب سے معاصی کی نحوست کے ساتھ کفر پر ملاقات کرے۔ ہبۃ اللہ نے اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ہے اور فرمایا: اس پر لوگوں کا اجماع ہے مگر حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر نے کہا یہ آیت محکمہ ہے۔ ہبۃ اللہ کے قول میں نظر ہے، کیونکہ یہ عموم اور تخصیص کا مقام ہے، نہ کہ نسخ کا مقام۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حسن ہے، کیونکہ نسخ اخبار میں نہیں ہوتا معنی یہ ہے کہ وہ اسے جزادے گا۔ نحاس نے ''معانی القرآن'' میں کہا: علماء اہل نظر کے نزدیک یہ حکم محکم ہے وہ اسے جزادے گا جب وہ توبہ نہیں کرے گا۔ اگر وہ توبہ کرے گا تو اس کا حکم بیان کردیا۔ وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ:82) پس قاتل اس سے خارج نہیں ہے اور الخلود، دوام پر دلالت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (الانبیاء:34)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ۔ (الہمزہ:3)

زہیر نے کہا:

ولا خالدا إلا الجبال الرواسیا

یہ تمام شواہد دلالت کرتے ہیں کہ خلد کا لفظ تابید کے معنی کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے، کیونکہ پہاڑ بھی اور مال بھی دنیا کے زوال کے ساتھ زائل ہو جائیں گے اسی طرح عرب کہتے ہیں: لأ خلدنّ فلاناً في السجن (میں فلاں کو ہمیشہ قید خانہ میں رکھوں گا) السجن ختم ہو جائے گی اور فنا ہو جائے گی اسی طرح مسجون بھی۔ اس کی مثل دعا میں ہے: خلد اللہ ملکہ وأبد أیامہ۔ یہ لفظاً اور معنی تمام گزر چکے ہیں۔

**یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۹۴﴾**

''اے اہل ایمان جب تم سفر پر نکلو اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) تو خوب تحقیق کر لو اور نہ کہو اسے جو بھیجتا ہے تم پر سلام کہ تم مومن نہیں ہو، تم تلاش کرتے ہو سامان دنیوی زندگی کا، پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں (وہ تمہیں غنی کردے گا) ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے اس سے پہلے پھر احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے ہو خبردار ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا۔ یہ جہاد اور قتل کے

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ الضرب کا معنی زمین پر چلنا ہے، عرب کہتے ہیں: ضربت فی الارض جب کوئی تجارت یا جنگ یا کسی اور غرض سے سفر کرے۔ یہ ''فی'' کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور بغیر ''فی'' کے بھی۔ مثلاً ضربت الارض جب آدمی قضاء حاجت (1) کا قصد کرے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: لا یخرج الرجلان یضربان الغائط یتحدثان کاشفین عن فراجیهما فان الله یمقت علی ذالك (2)۔ کوئی دو شخص قضاء حاجت کے لیے نکلیں تو وہ اپنی شرمگاہیں کھولے ہوئے باتیں نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ یہ آیت کریمہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی وہ اپنے سفر میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کے پاس اونٹ اور بکریاں تھیں جنہیں وہ بیچنا چاہتا تھا اس نے مسلمانوں پر سلام کیا اور کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ ایک مسلمان نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا گیا تو آپ پر بہت ناگوار گزرا، پھر یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ بخاری نے عطاء عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایک شخص اپنی بکریوں میں تھا اسے مسلمان ملے، اس نے کہا: السلام علیکم۔ مسلمانوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی بکریاں پکڑ لیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تک نازل فرمائی۔ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سے مراد یہ غنیمت ہے۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے السلام پڑھا ہے یہ بخاری کے علاوہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اہل کو دیت اور بکریاں بھی لوٹا دیں۔ اس واقعہ میں قاتل اور مقتول کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا جو قول ہے وہ وہ ہے جو ابن اسحاق کی سیرت میں مصنف ابو داؤد میں اور الاستیعاب لابن البر میں ہے کہ یہ قاتل محلم بن جثامہ تھا اور مقتول عامر بن اضبط تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محلم کے خلاف دعا کی تو وہ بعد میں صرف سات دن زندہ رہا پھر وہ دفن کیا گیا تو زمین نے اسے قبول نہ کیا پھر دفن کیا گیا تو پھر بھی زمین نے قبول نہ کیا پھر تیسری مرتبہ دفن کیا گیا تو زمین نے قبول نہ کیا جب لوگوں نے دیکھا کہ زمین اسے قبول نہیں کر رہی تو لوگوں نے اسے گھاٹیوں میں پھینک دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمین تو اسے بھی قبول کر لیتی ہے، جو اس سے بھی بدتر ہوتا ہے'' (4)۔ حسن نے کہا: اس بدترین شخص کو زمین لے لیتی ہے، لیکن قوم کو یہ نصیحت کی گئی کہ وہ اس کام کی طرف نہ لوٹیں۔ سنن ابن ماجہ نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا ایک لشکر مشرکین کی طرف بھیجا تو انہوں نے سخت جنگ کی اور انہوں نے انہیں کندھے دیے پھر میرے ایک قریبی شخص نے مشرکین کے ایک شخص پر نیزے سے حملہ کر دیا جب وہ اس پر غالب آیا تو پھر اس نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں مسلمان ہوں۔ مسلمان نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ پھر وہ مسلمان شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تو نے کیا کیا ہے؟ آپ نے ایک یا دو مرتبہ پوچھا۔ اس نے اپنا واقعہ عرض کیا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اس کا پیٹ کیوں نہ چاک کیا تا کہ تو اس کی کیفیت جان لیتا''۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اگر میں اس کا پیٹ چاک کرتا تو کیا میں اس کے دل کی کیفیت جان لیتا؟

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 36۔ ایضاً، ابو داؤد، حدیث نمبر 14، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96
4۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، صفحہ 290

آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں تو نے نہ اس کی بات کو قبول کیا اور نہ تو اس کے دل کی کیفیت جانتا"۔ پھر رسول اللہ ﷺ اس سے خاموش ہو گئے تھوڑی دیر گزری حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا پس ہم نے اسے دفن کیا، صبح وہ زمین پر باہر پڑا تھا۔ ہم نے کہا: شاید دشمن نے اس کی قبر کو کھودا ہو، پھر ہم نے دفن کیا پھر ہم نے اپنے نوجوانوں کو حفاظت کرنے کا حکم دیا، پھر بھی وہ صبح زمین پر پڑا تھا۔ ہم نے کہا: شاید نوجوان سو گئے ہوں۔ پھر ہم نے اسے دفن کیا، پھر ہم نے خود نگرانی کی لیکن صبح پھر وہ زمین کے اوپر تھا، پھر ہم نے اسے گھاٹیوں میں پھینک دیا (1)۔ بعض علماء نے کہا: قاتل اسامہ بن زید تھا اور مقتول مرداس بن نہیک غطفانی ثم الفزاری من بنی مرۃ من اہل فدک تھا۔ یہ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے مرداس نے رات کو اسلام قبول کیا اور اس کے متعلق اپنے گھر والوں کو بتایا۔ جب اسامہ پر نبی کریم ﷺ نے معاملہ کی سختی کا ذکر فرمایا تو اسامہ نے قسم اٹھائی کہ وہ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرے گا جو لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے گا اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قاتل ابوقتادہ تھا۔ بعض نے فرمایا: ابودرداء تھا۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زمین نے جس کو پھینک دیا تھا وہ محلم تھا جو ہم نے ذکر کیا ہے شاید یہ تمام واقعات قریب قریب واقع ہوئے تو تمام کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس مسلمان کو بکریاں اور اونٹ واپس کر دیا اور اس کے تلف ہونے کی وجہ سے دیت بھی دی۔ واللہ اعلم۔ ثعلبی نے ذکر کیا ہے اس لشکر کا امیر ایک شخص تھا جس کو غالب بن فضالہ لیثی کہا جاتا تھا بعض نے کہا: مقداد نام تھا۔ یہ سہیلی نے حکایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَبَیَّنُوْا یعنی غور کرو۔ تبینوا جماعت کی قرأت ہے اور یہ ابوعبیدہ اور ابوحاتم کا مختار ہے ان دونوں حضرات نے کہا: جو خوب غور و فکر اور تثبت سے کام کرے تو کہا جاتا ہے: تبینت الامر و تبین الامر بنفسہ۔ یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ حمزہ نے فتثبتوا یعنی ثا کے ساتھ اور اس کے بعد با کے ساتھ پڑھا ہے۔ تبینوا میں زیادہ تاکید ہے، کیونکہ انسان کبھی کسی کام کو مضبوط تو کرتا ہے، لیکن اس میں غور نہیں کرتا۔ اذا میں شرط کا معنی ہے اسی وجہ سے فَتَبَیَّنُوْا پر فا داخل ہوئی ہے، جزا پر فا لگائی جاتی ہے جیسے شاعر نے کہا:

وإذا تُصِبْكَ خَصاصةٌ فَتَجَمَّل

اور بہتر یہ ہے کہ فا نہ لگائی جائے جیسا کہ شاعر نے کہا:

والنفس راغِبةٌ إذا رغَّبتها وإذا تُرَدّ إلى قليل تقنعُ

سفر و حضر میں قتل سے پہلے غور و غوض ضروری ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں سفر کو خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ وہ حادثہ سفر میں واقع ہوا تھا جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ السَّلَم، السِّلْم اور السلام تینوں کا ایک معنی ہے۔ یہ بخاری کا قول ہے تینوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ ابوعبید قاسم بن سلام نے السلام کو اختیار کیا اور اہل نظر نے اس کی مخالفت کی انہوں نے کہا: السلم بہتر ہے، کیونکہ اس کا معنی پیروی کرنا اور تسلیم کرنا ہے جیسا کہ اللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 290۔ ایضاً، حدیث نمبر 3919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡٓءٍ (النحل: 28)

السَّلَمَ کا معنی تسلیم کرنا ہے یعنی تم اسے نہ کہو جس نے اپنے ہاتھ ڈال دیے اور سر تسلیم خم کر دیا اور تمہاری دعوت کو ظاہر کیا ہے کہ تو مومن نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: السلم سے مراد السلام علیکم کا قول ہے یہ پہلے مفہوم کی طرف راجع ہے۔ اسلام کے سلام کے ساتھ سلام کرنا اطاعت اور انقیاد کی دلیل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی انحیاز اور ترک ہو۔ اخفش نے کہا: فلاں سلام جب کوئی کسی سے خلط ملط ہوتا ہے (1)۔ السِلم سین کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو اس کا معنی صلح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابو جعفر سے مروی ہے کہ انہوں نے لَسۡتَ مُؤۡمَنًا دوسری میم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آمنتہ سے مشتق ہوگا جب تو اسے پناہ دے۔ فھو مؤمن وہ پناہ دیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مسلمان جب کافر سے ملے جس کا کوئی عہد نہیں ہے تو مسلمان کے لیے اس کو قتل کرنا جائز ہے اگر وہ کہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو پھر اس کا قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اسلام کے ساتھ وہ محفوظ ہو گیا جو اسلام اس کے خون، مال اور اہل کی حفاظت کرے۔ اگر وہ اس کے بعد اس کو قتل کر دے گا تو بدلے میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ اور مذکورہ واقعات میں جو صحابہ کرام سے قتل ساقط ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے ابتدائی دور میں تھے انہوں نے سمجھا کہ یہ اس نے ہتھیار کے خوف سے اور قتل سے بچنے کے لیے کہا ہے، اس کو بچانے والا اس کا قول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو بچانے والا ہوگا اس نے جیسا بھی کہا ہو۔ اسی وجہ سے اسامہ کو فرمایا: ''کیا تو نے اس کے دل کو نہیں چیرا تھا تا کہ تو جان لیتا کہ کیا اس نے یہ کیا ہے یا نہیں'' (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یعنی غور و فکر کیا جائے گا کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے اور یہ ممکن نہیں۔ اور صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے بیان کرے۔ اس میں بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ احکام کا دارومدار ظن غالب پر ہوتا ہے نہ کہ قطعیت پر اور باطن کے رازوں پر آگاہی کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر کوئی کہہ دے: سلام علیکم۔ تو اسے قتل کرنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس کے پیچھے جو کچھ ہے وہ جان لے، کیونکہ یہ اشکال کی جگہ ہے۔ امام مالک نے کافر کے بارے فرمایا: جو پایا گیا تو اس نے کہا: میں امن طلب کرتے ہوئے آیا ہوں، میں امان طلب کرتا ہوں۔ یہ مشکل امور ہیں۔ میرا خیال ہے اس کو اس کی پناہ کی طرف لوٹایا جائے گا اور اس پر اسلام کا حکم نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے کفر تو ثابت ہے۔ پس اسے وہ چیز ظاہر کرنی ضروری ہے جو اس کے قول پر دلالت کرے، صرف یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں اور میں مومن ہوں کافی نہیں ہے نہ نماز پڑھنا کافی ہے حتیٰ کہ وہ ایسا کلمہ کہے جس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو معلق کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (3) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں حتیٰ کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر نماز پڑھے یا کوئی ایسا فعل کرے جو اسلام کے خصائص میں سے ہے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے خیال میں اس سے وہ مسلمان نہ ہوگا مگر اس سے پوچھا جائے گا اس نماز کے پیچھے کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 68 3۔ ایضاً، صفحہ 37

ہے اگر وہ کہے: مسلمان کی نماز تو اسے کہا جائے گا تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ، اگر وہ یہ کہے تو اس کا صدق ظاہر ہو جائے گا اگر وہ انکار کرے گا تو ہم جان لیں گے کہ وہ مزاح کر رہا ہے اور جو اس کا یہ فعل اسلام خیال کرتا تھا اس کے نزدیک یہ انکار ردت ہو گیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ کفر اصلی ہے ردت نہیں ہے۔ یہی حکم ہے جس نے سلام علیکم کہا، اسے کلمہ پڑھنے کا مکلف کیا جائے گا اگر وہ کلمہ پڑھ لے تو اس کی ہدایت ثابت ہو جائے گی اگر وہ انکار کرتا ہے تو اس کا عناد ظاہر ہو جائے گا اور اسے قتل کیا جائے گا۔ فَتَبَيَّنُوْا کے قول کا یہی معنی ہے یعنی مشکل امر میں خوب غور و خوض کر لو۔ او تثبتوا یعنی جلد نہ کرو۔ دونوں کا معنی برابر ہے اگر کسی نے اسے قتل کر دیا تو وہ ایک ممنوع کام کا ارتکاب کرنے والا ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محلم پر سختی کرنا اور قبر سے اس کا باہر آ جانا اس کا مخرج کیسا ہے؟ ہم کہیں گے: کیونکہ اس کی نیت سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اسلام کی کوئی پرواہ نہیں کرتا پس اس نے اسے زمانہ جاہلیت کے بغض و دشمنی کی وجہ سے جان بوجھ کر قتل کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی جو مال لینا چاہتے ہیں۔ دنیا کے سامان کو عرض کیا جاتا ہے کیونکہ وہ عارضی ہے، زائل ہونے والا ہے اور ثابت نہیں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: دنیا کے تمام سامان کو عرض (را کے فتحہ کے ساتھ) کہا جاتا ہے۔ اسی سے ہے: الدنیا عرض حاضر یاکل منها البر والفاجر (1)۔ دنیا موجود سامان ہے جس سے نیک اور فاجر کھاتا ہے۔ اور العرض (را کے سکون کے ساتھ) دنانیر اور دراہم کے سوا چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ ہر عرْض، عرَض ہے لیکن ہر عرَض، عرْض نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''غنا کثرت عرض (سامان، دولت) سے نہیں ہوتی بلکہ غنا حقیقۃً نفس کا غنا ہے'' (2)۔ بعض علماء نے اس معنی کو نظم میں بیان کیا ہے۔

تقنع بما يكفيك واستعمل الرضا	فإنك لا تدری أتصبح أم تمسی

فليس الغنى عن كثرة المال إنما	يكون الغنى والفقر من قبل النفس

یہ ابو عبیدہ کے قول کی تصحیح کرتا ہے کہ مال ہر اس چیز کو شامل ہے جو متمول ہونے کا باعث ہو۔ ''کتاب العین'' میں ہے العرض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو دنیا سے پائی گئی ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (الانفال: 67) تم دنیا کے سامان کا ارادہ کرتے ہو۔ عرض کی جمع عروض ہے۔ ابن الفارس کی ''المجمل'' میں ہے العرَض وہ مرض وغیرہ جو انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ عرض الدنیا جو دنیا کے مال سے تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ اور العرض سے مراد وہ سامان ہے جو نقدی کے علاوہ ہے۔ اعرض الشئ کا مطلب ہے جب ظاہر اور ممکن ہو۔ العرض جو طول کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ جو شخص احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے آئے گا اور ممنوع چیزوں کا ارتکاب نہیں کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سی غنیمتیں تیار کر رکھی ہیں پس تم ان نعمتوں کو گراؤ نہیں (3)۔ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یعنی تم بھی اپنے ایمان کو اپنی قوم کے خوف سے چھپاتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو

---

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 415، حدیث نمبر 3151

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 336۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5965، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96

عزت دینے اور دین کو غالب کرنے کے ساتھ تم پر احسان فرمایا۔ اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنی قوم میں تمہارے ساتھ نماز پڑھنے کے انتظار میں ہے پس یہ درست نہیں کہ جب وہ تمہارے پاس پہنچے تو تم اسے قتل کر دو حتیٰ کہ معاملہ بالکل واضح ہو جائے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے اسی طرح تم کافر تھے۔ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ۔ تم پر اللہ نے احسان فرمایا کہ تم اسلام لے آئے پس تم انکار نہ کرو کہ وہ اس طرح ہو پھر وہ اسلام کا اظہار کرے جب وہ تم سے ملے پس تم اس کے معاملہ میں خوب تحقیق کرلو(1)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اس آیت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام زبان سے اقرار کا نام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا یہ علماء فرماتے ہیں: جب لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والے کو "مومن نہیں ہے" کہنے سے منع کیا گیا ہے، تو صرف اس قول سے اسے قتل کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اگر ایمان صرف زبان سے اقرار نہ ہوتا تو ان کے قول پر عیب نہ لگاتے۔ ہم نے کہا: قوم نے اس حالت میں شک کیا کہ یہ قول ان سے بچنے کے لیے کہا ہو پس انہوں نے اسے قتل کر دیا اللہ تعالیٰ نے ظاہر شریعت کے علاوہ بندوں کے لیے کوئی حکم نہیں بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أمرت ان أقاتل الناس حتی یقولوا لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔(2) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں حتیٰ کہ وہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیں۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کہ ایمان فقط اقرار کا نام ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ منافقین یہ قول کہتے تھے، حالانکہ وہ مومن نہیں تھے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے اس کی مزید وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان نے کر دی۔ أفلا شققت عن قلبه(3)۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان صرف اقرار نہیں۔ ایمان کی حقیقت تصدیق بالقلب، دل سے تصدیق کرنا ہے اور بندے کے لیے اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مگر جو کچھ اس سے سنے۔ اس سے انہوں نے بھی استدلال کیا جنہوں نے کہا: زندیق کی توبہ قبول کی جائے گی جب وہ اسلام کو ظاہر کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زندیق اور دوسرے کافروں میں کوئی فرق نہیں کیا جب وہ اسلام کو ظاہر کرے۔ اس پر گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس آیت میں قدریہ کا رد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس نے مومنین پر تمام مخلوق کے درمیان سے احسان فرمایا انہیں توفیق کے ساتھ خاص فرمایا۔ اور قدریہ کہتے ہیں: اس نے تمام مخلوق کو ایمان کے لیے تخلیق کیا۔ اگر معاملہ اس طرح ہوتا جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے تو مومنین کو احسان کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَبَیَّنُوۡا تاکید کے لیے، پھر غور و خوض کے امر کو ذکر فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۹۴﴾ یہ احکام الٰہیہ کی مخالفت سے ڈرانا ہے۔ یعنی اپنے آپ کی حفاظت کرو اور اپنے نفسوں کو ایسی لغزشوں سے بچاؤ جو تمہیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔

لَا یَسۡتَوِی الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ غَیۡرُ اُولِی الضَّرَرِ وَ الۡمُجٰہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ؕ فَضَّلَ اللّٰہُ الۡمُجٰہِدِیۡنَ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 97　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 37　3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 264

دَرَجَةً ۭ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

''نہیں برابر ہو سکتے (گھروں میں) بیٹھنے والے مسلمان سوائے معذوروں کے اور جہاد کرنے والے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، بزرگی دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا لیکن فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے۔ (ان کے لیے) بلند درجے ہیں اللہ (کی جناب) سے اور (نوید) بخشش اور رحمت ہے اور ہے اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا بدر سے پیچھے رہنے والے اور بدر کی طرف نکلنے والے برابر نہیں (1)، پھر فرمایا: غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ، الضَّرَرِ سے مراد اپاہج ہونا ہے۔ ائمہ حدیث سے مروی ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں تھا آپ پر سکینت چھا گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران میری ران پر تھی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سے زیادہ بھاری بوجھ کبھی کسی چیز کو نہیں پایا۔ پھر جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا: ''لکھو'' میں نے شانے کی ہڈی پر لکھا لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ ...... الایۃ۔ ابن ام مکتوم کھڑے تھے وہ نابینا آدمی تھی جب انہوں نے مجاہدین کی فضیلت سنی تو عرض کی: یارسول اللہ! جو مومنین میں سے جہاد کر ہی نہیں سکتا وہ کیسے جہاد کرے؟ جب کلام مکمل ہوئی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سکینت چھا گئی آپ کی ران میری ران پر تھی میں نے دوبارہ بوجھ محسوس کیا جس طرح پہلے محسوس کیا تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا: ''اے زید پڑھو''، میں نے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ پڑھا تو رسول اللہ نے فرمایا: غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ ...... الایۃ (2) ''پڑھو''۔ حضرت زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تنہا نازل فرمایا پھر میں نے اس کو لاحق کیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! گویا میں اب اس کے ملحق کو دیکھ رہا ہوں جب کندھے کی ہڈی میں دراڑ پیدا ہوئی تھی (3)۔

بخاری میں مقسم مولیٰ عبداللہ بن حارث سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ کا ارشاد بدر کی جنگ میں پیچھے رہنے والوں اور بدر کی طرف نکلنے والوں کے متعلق ہے۔ علماء نے فرمایا: اہل الضرر سے مراد معذور لوگ ہیں، کیونکہ ان کے عذروں نے انہیں نقصان پہنچایا حتیٰ کہ جہاد سے انہیں روک دیا۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کہ آپ کسی غزوہ سے واپس آرہے تھے ''مدینہ میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 269 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 339۔ ایضاً، حدیث نمبر 2146، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 553

کچھ لوگ ہیں تم نے جو وادی طے کی اور تم جس جگہ چلے وہ تمہارے ساتھ تھے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عذر نے روک لیا تھا''۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صاحب العذر کو غازی کا اجر ملتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ احتمال ہے کہ اس کا اجر برابر ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل میں وسعت ہے اور اس کا ثواب اس کا فضل ہے نہ کہ استحقاق ہے۔ سچی نیت پر وہ ثابت ہوتا ہے جو فعل پر ثابت نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: معذور کو بغیر تضعیف کے اجر ملے گا جب کہ غازی کو تضعیف کے ساتھ اجر ملے گا، کیونکہ اس نے خود بالفعل شرکت کی۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ۔ کیونکہ اس کے لیے صحیح حدیث موجود ہے کہ ''مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ ہیں'' اور ابو کبشہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''دنیا چار لوگوں کے لیے ہے''۔ یہ حدیث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے اس معنی سے مراد وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے ''جب بندہ مریض ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لیے وہ لکھو جو یہ صحت میں کرتا تھا حتیٰ کہ ٹھیک ہو جائے یا میں اس کی جان قبض کر لوں'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے اہل دیوان، اجر میں نوافل پڑھنے والوں سے زیادہ ہیں، کیونکہ اہل دیوان، عطا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور تکالیف میں مال کو خرچ کرتے ہیں اور لشکروں اور اوامر کو خوش کرتے ہیں پس وہ نوافل پڑھنے والوں سے عظیم ہوتے ہیں، کیونکہ بڑی بڑی جنگوں میں ان کے دل سکون میں ہوتے ہیں اور دل خوش ہوتے ہیں۔ ابن محیریز نے کہا: عطیہ دینے والے نفل پڑھنے والوں سے افضل ہوتے ہیں، کیونکہ وہ خوف دور کرتے ہیں۔ مکحول نے کہا: لشکروں کا خوف، قیامت کے خوف کو دور کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس سے اس شخص نے بھی دلیل پکڑی ہے جو کہتا ہے کہ غنا فقر سے افضل ہے (2)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کا ذکر فرمایا جس کے ذریعے نیک اعمال تک پہنچا جاتا ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے جب کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ فقر کی وجہ سے زیادہ محتاج بن جانا مکروہ ہے اور غنا کی وجہ سے اکڑ نا مذموم ہے۔ ایک قوم نے غنا کو فضیلت دی ہے، کیونکہ غنی قادر ہوتا ہے اور فقیر عاجز ہوتا ہے اور قدرت، عجز سے افضل ہوتی ہے۔ ماوردی نے کہا: یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جن پر شہرت غالب تھی۔ دوسرے علماء فقر کو فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ فقیر تارک ہوتا ہے غنی ملابس ہوتا ہے اور دنیا کا ترک اس کی ملابست سے افضل ہے۔ ماوردی نے کہا: یہ ان کا مذہب ہے جس پر سلامتی کی محبت غالب ہے۔ بعض دوسرے دونوں امر میں توسط کو فضیلت دیتے ہیں کہ حد فقر سے غنا کے ادنیٰ مراتب کی طرف نکلے تا کہ دو امروں کی فضیلت کو پائے اور دونوں حالتوں کی مذمت سے سلامت ہو جائے۔ ماوردی نے کہا: یہ اس کا مذہب ہے جو اعتدال کو فضیلت دیتے ہیں۔ خیر الامور اوسطھا بہتر امر متوسط ہے۔ شاعر نے کتنا خوبصورت کہا:

الا عائذا باللہ من عدم الغنی ومن رغبۃ یوما الی غیر مرغب

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ یہ اہل کوفہ اور ابو عمرو کی قرأت غَيْرُ (رفع کے ساتھ) ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 1، صفحہ 420۔ ایضاً، حدیث نمبر 2774، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 98

اخفش نے کہا: یہ قاعدین کی صفت ہے، کیونکہ اس سے کسی متعین قوم کا ارادہ نہیں کیا گیا پس یہ نکرہ کی طرح ہو گئے ان کا غیر سے وصف بیان کرنا جائز ہے معنی یہ ہے کہ لا یستوی القاعدون غیر اولی الضرر یعنی لا یستوی القاعدون الذین هم غیر اولی الضرر اور یہ معنی ہے لا یستوی القاعدون الاصحاء۔ یعنی صحیح بیٹھ رہنے والے برابر نہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ ابوحیوہ نے غیر پڑھا ہے اور مومنین کی صفت بنایا ہے یعنی من المومنین الذین هم غیر اولی الضرر من المومنین الاصحاء۔ اہل الحرمین نے غیر کو القاعدین یا المومنین سے استثنا کی بنا پر منصوب پڑھا ہے یعنی الا اولی الضرر۔ پس وہ مجاہدین کے ساتھ برابر نہیں اگر تو چاہے تو القاعدین سے حال کی بنا پر منصوب پڑھے یعنی لا یستوی القاعدون من الاصحاء یعنی فی حال صحتهم۔ یعنی حالت صحت میں بیٹھنے والے برابر نہیں اور القاعدون سے اس کا حال ہونا جائز ہے، کیونکہ ہم کا لفظ معرفہ کا لفظ ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: جاءنی زید غیر مریض اور جو ہم نے نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ بھی نصب کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً۔ اس کے بعد فرمایا: دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً پہلے درجہ کے ساتھ فضیلت دینا پھر درجات کے ساتھ فضیلت دینا یہ مبالغہ، بیان اور تاکید ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو معذور لوگوں میں سے بیٹھنے والوں پر ایک درجہ فضیلت دی او بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والوں پر کئی درجات فضیلت دی۔ یہ ابن جریج اور سدی وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: درجة کا معنی علو (بلندی) ہے یعنی ان کا ذکر بلند کیا اور ثنا، مدح اور تعریف کے ساتھ ان کو رفعت عطا فرمائی۔ یہ درجہ اور درجات کا معنی ہے یعنی جنت میں ان کو مدح و تعریف کے ساتھ شان رفیع عطا فرمائے گا۔ ابن محیریز نے کہا: ستر درجات ہیں اور ہر دو درجات کے درمیان ستر سال عمدہ گھوڑے کے دوڑنے کی بلندی ہے (1)۔ درجات، اجر سے بدل ہے اور اس کی تفسیر ہے، ظرف کی تقدیر پر اس کو نصب دینا بھی جائز ہے یعنی فضلهم بدرجات اور اس کا اَجْرًا عَظِيْمًا کی تاکید ہونا بھی جائز ہے، کیونکہ اجر عظیم ہی درجات، مغفرت اور رحمت ہے اور اس پر رفع بھی جائز ہے یعنی ذالك درجات، اجرا کو نصب فضل کی وجہ سے ہے اگر تو چاہے تو مصدر بنادے او یہ احسن ہے پھر اسے فضل کی وجہ سے نصب نہ ہوگی، کیونکہ وہ اپنے دو مفعول پورے کر چکا ہے اور وہ المجاهدین اور علی القاعدین ہیں۔ اور اسی طرح درجة کا حکم ہے۔ الدرجات سے مراد منازل ہیں جو ایک دوسرے سے بلند ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح میں مروی ہے کہ ''جنت میں سو درجات اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے تیار فرمائے ہیں ہر دو درجات کے درمیان آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے'' (2)۔

وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، كُلًّا کو نصب وعد کی وجہ سے ہے اور الْحُسْنٰى سے مراد جنت ہے یعنی وعد الله كلا الحسنى اللہ تعالیٰ نے سب سے جنت کا وعدہ فرمایا، پھر بعض علماء نے فرمایا: كلا سے مراد خاص مجاہدین ہیں۔ بعض نے فرمایا: مجاہدین اور معذور لوگ ہیں۔ واللہ اعلم۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 2، صفحہ 64

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 1، صفحہ 391۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 2581، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

''بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا: تم کس شغل میں تھے؟ (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا: ہم تو بے بس تھے زمین میں۔ فرشتوں نے کہا: کیا نہیں تھی اللہ کی زمین کشادہ تاکہ تم ہجرت کرتے اس میں؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے مگر واقعی کمزور و بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو نہیں کر سکتے تھے (ہجرت کی) کوئی تدبیر اور نہیں جانتے تھے (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ، تو یہ لوگ ہیں جن کے بارے امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا ان سے اور اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا، بہت بخشنے والا ہے''۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل مکہ سے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ظاہر کیا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو وہ اپنی قوم کے ساتھ ٹھہرے رہے اور ان میں سے ایک جماعت فتنہ میں مبتلا کی گئی تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے جب جنگ بدر کا موقع آیا تو ان میں کچھ لوگ کفار کے ساتھ نکلے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے جب مسلمانوں کی تعداد کو حقیر سمجھا تو ان کے دین میں شک داخل ہوا پس وہ مرتد ہو گئے اور ردت پر ہی قتل کیے گئے۔ مسلمانوں نے کہا: یہ ہمارے مسلمان ساتھی تھے انہیں خروج پر مجبور کیا گیا تھا پس انہوں نے ان کے لیے مغفرت طلب کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلا قول اصح ہے۔ امام بخاری نے محمد بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے فرمایا: اہل مدینہ سے ایک لشکر تیار کیا گیا میرا نام بھی اس میں لکھا گیا پھر میں حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ سے ملا، میں نے یہ ذکر کیا تو انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا پھر فرمایا: مجھے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ تھے جو مشرکوں کے ساتھ تھے اور عہد رسالت میں وہ مشرکین کی جمعیت میں زیادتی کرتے تھے۔ کوئی تیر آتا جو پھینکا جاتا تھا ان میں سے کسی کو لگتا اور اسے قتل کر دیتا یا اسے مارا جاتا اور وہ قتل ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یہ احتمال ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو۔ علامت تانیث کے ساتھ اس کی نسبت ذکر نہیں کی گئی، کیونکہ ملائکہ کے لفظ کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ فعل مستقبل ہو تتوفاھم کے معنی پر۔ پھر ایک تا حذف کی گئی۔ ابن فورک نے حسن سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے فرشتے انہیں ہانک کر آگ کی طرف لے جائیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 661۔ ایضاً، حدیث نمبر 4230، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے(2)۔ یہ قول اظہر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الملائکۃ سے مراد ملک الموت ہے(3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدۃ: 11)

اور ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی فی حال ظلمھم انفسھم مراد ظالمین اَنْفُسِهِمْ ہے نون کو استخفافاً حذف کیا گیا اور مضاف کیا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ: 95) (ہدی جو کعبۃ تک پہنچنے والی ہو) اور فرشتوں کا قول فِيْمَ كُنْتُمْ یہ زجر و توبیخ کے لیے سوال ہے یعنی کیا تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں تھے یا مشرکین میں تھے اور ان کا قول كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ، الْاَرْضِ سے مراد مکہ ہے یہ غیر صحیح عذر پیش کرتا ہے، کیونکہ حیلوں کی طاقت رکھتے تھے اور راستہ حاصل کر سکتے تھے پھر فرشتوں نے انہیں اپنے دین پر ہی سمجھا، کیونکہ فرشتوں نے انہیں اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً یہ سوال و جواب اس بات کو مفید ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے تھے جبکہ وہ اپنی جانوں پر ہجرت ترک کرنے کی وجہ سے ظلم کرنے والے تھے ورنہ اگر وہ کافر ہو کر مرتے تو انہیں یہ نہ کہا جاتا۔ ان کے اپنے عمل کی وجہ سے ان کا صحابہ میں ذکر نہیں کیا اور ایمان کے عدم تعین اور ردت کے احتمال کی وجہ سے صحابہ میں ذکر نہیں فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے مَاْوٰىهُمْ میں جو ھم ضمیر تھی اس سے ان کی استثنا فرمائی جو مردوں میں حقیقۃً اپاہج تھے اور عورتوں اور بچوں میں سے کمزور و بے بس تھے جیسے عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام وغیرہم جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں اور میری والدہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارادہ فرمایا ہے(4)۔ اس وقت حضرت ابن عباس بچوں میں سے تھے اور ان کی والدہ ام الفضل بنت حارث تھی، اس کا نام لبابہ تھا یہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھی ان کی دوسری بہن لبابۃ الصغریٰ تھی یہ نو بہنیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے فرمایا: الاخوات مومنات سب بہنیں مومنہ تھیں۔ ان میں سے سلمیٰ، عصماء اور حفیدہ تھیں۔ حفیدہ کو ام حفید کہا جاتا تھا۔ اس کا نام ہزیلۃ تھا۔ یہ چھ سگی بہنیں تھیں اور تین ماں کی طرف سے بہنیں تھیں وہ سلمیٰ اور سلامۃ اور اسماء بن عمیس خثعمیہ جو جعفر بن ابی طالب کی بیوی تھی پھر حضرت ابوبکر صدیق کی زوجہ بنیں پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ بنی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْمَ كُنْتُمْ یہ توبیخ کے لیے سوال ہے یہ پہلے گزر چکا ہے فیم اصل میں فیما تھا الف کو حذف کیا گیا ما استفہامیہ اور خبریہ میں فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور اس پر وقف کی صورت میں فیمہ ہو جائے گا تاکہ الف اور حرکت حذف نہ ہو۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً سے مراد مدینۃ ہے یعنی کیا تم ہجرت کرنے پر اور جو تمہیں بے بس کرتے تھے ان سے دور ہونے پر قادر نہ تھے؟ اس آیت میں اس زمین کو چھوڑنے پر دلیل ہے جس میں گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا جب کسی جگہ گناہ ہوتے ہوں تو تو اس جگہ سے نکل جا۔ اور پھر یہ آیت تلاوت کی: اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے دین کو بچانے کی خاطر زمین سے دوسری زمین کی طرف

---

1۔ تفسیر الحسن بصری، جلد 2، صفحہ 360
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 100
3۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 2، صفحہ 106
4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 277

نکلا اگر چہ ایک بالشت بھی ہو تو وہ جنت کا مستحق ہوگا اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق ہوگا"۔

فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ہر مسلمان پر اس وقت ہجرت کرنا فرض تھا۔ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً حیلہ کا لفظ عام ہے خلاصی کے لیے تمام اسباب کو شامل ہے۔ السبیل سے مراد مدینہ طیبہ کا راستہ ہے۔ یہ مجاہد اور سدی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ تمام راستوں میں عام ہے۔

فَاُولٰٓئِکَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ یہ وہ ہیں جن کے لیے ہجرت کرنے کا کوئی سبب نہ تھا ان کے لیے کوئی گناہ نہیں حتیٰ کہ انہیں معاف کیا گیا۔ معنی یہ ہے کہ یہ متوہم تھا کہ ہجرت میں انتہائی مشقت برداشت کرنا واجب ہے حتیٰ کہ جو اس مشقت کو برداشت نہیں کرے گا اسے سزا ملے گی، تو اللہ تعالیٰ نے اس وہم کا بھی ازالہ فرما دیا، کیونکہ انتہائی مشقت اٹھانا واجب نہیں، بلکہ زادراہ اور سواری کے نہ ہونے کی صورت میں بھی ہجرت کو ترک کرنا جائز تھا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر محاسبہ میں سختی نہیں کی جائے گی اسی وجہ سے فرمایا: وَکَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا اللہ تعالیٰ کے لیے ماضی، مستقبل برابر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِکْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾

"اور جو شخص ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں پائے گا زمین میں پناہ کے لیے بہت جگہ اور کشادہ روزی اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آلے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا، المراغم کی تاویل میں اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا: المراغم سے مراد بچنے کی جگہ ہے (1)۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور ربیع وغیرہم نے کہا: اس سے مراد گھومنے کی جگہ اور راستہ ہے (2)۔ ابن زید نے کہا: المراغم سے مراد ہجرت گاہ ہے (3)۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ تمام اقوال ہم معنی ہیں۔ المراغم ہجرت کی حالت میں چلنا ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جس میں سفر کیا جاتا ہے۔ یہ الرغام سے مشتق ہے۔ رغم انف فلان یعنی اس کا ناک خاک آلود ہوا۔ راغمت فلاناً میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے دشمنی کی اور اس کی ناک خاک آلود ہونے کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہجرت گاہ کو مہاجر اور مراغم اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ جب آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ اپنی قوم سے دشمنی کرتا ہے اور انہیں چھوڑ دیتا ہے پس اس کے نکلنے کو

1۔ تفسیر مجاہد، جلد 1، صفحہ 57، دارالکتب العلمیہ 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522، دارالکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

مراغماً کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی طرف جانے کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ سدی نے کہا: المراغم وہ جگہ جہاں معیشت کو تلاش کیا گیا ہو(1)۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ المراغم کا معنی زمین میں چلنا ہے(2)۔ یہ تمام تفسیر بالمعنی ہے اور ایک دوسرے کے قریب قریب معانی ہیں اور لفظ کے اعتبار سے خاص مراغم، ناک کو خاک آلود کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ہر دو جھگڑنے والے اپنے مخالف کی ناک کو خاک آلود کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے اپنی مراد کے سلسلہ میں مغلوب کر دیتا ہے۔ کفار قریش گویا محبوسین کی ناکوں کو مکہ میں خاک آلود کیے ہوتے تھے پھر اگر ان میں سے کوئی ہجرت کرتا تو وہ قریش کی ناک کو خاک آلود کرتا، کیونکہ وہ ان سے محفوظ ہو جاتا تھا یہ منفعت وحفاظت مراغمة کی جگہ ہے۔

اسی سے نابغہ کا قول ہے:

كَطَوْدٍ يُلاذُ بِأَرْكَانِهِ عَزِيزِ الْمُرَاغَمِ وَالْمَهْرَبِ (3)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّسَعَةً یعنی رزق میں کشادگی۔ یہ حضرت ابن عباس، ربیع اور ضحاک کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی گمراہی سے ہدایت کی طرف اور مفلسی سے غنا کی طرف جانے میں کشادگی ہے۔ امام مالک نے کہا: اس سے مراد شہروں کی وسعت ہے۔ یہ فصاحت عرب کے زیادہ مشابہ ہے۔ کیونکہ زمین کی وسعت اور کثرت سے پناہ گاہوں کی وجہ سے رزق میں وسعت ہوتی ہے اور سینہ رزق کے ارادہ اور فکر کے لیے کشادہ ہو جاتا ہے اس کے علاوہ کشادگی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی مفہوم میں شاعر کا قول ہے:

وَكُنْتُ إِذَا خَلِيلٌ رَامَ قَطْعِي وَجَدْتُ وَرَاءَ مُنْفَسَحًا عَرِيضًا (4)

ایک اور شاعر نے کہا:

لَكَانَ لِي مُضْطَرَبٌ وَاسِعٌ فِي الْأَرْضِ ذَاتِ الطُّولِ وَالْعَرْضِ (5)

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام مالک نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ کسی کے لیے وہاں ٹھہرنا جائز نہیں جہاں سلف صالحین کو گالی دی جاتی ہوں اور ناجائز اعمال کیے جاتے ہوں۔ فرمایا: المراغم، زمین میں چلنا مراد ہے۔ السعة سے مراد شہروں کی وسعت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مجاہد جب جہاد کے لیے نکلے پھر قتال سے پہلے مر جائے تو اس کے لیے مال غنیمت میں حصہ ہوگا اگرچہ وہ جنگ میں شریک نہ بھی ہو۔ یہ ابن لہیعة نے یزید بن ابی حبیب سے اور انہوں نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے اور یہ ابن المبارک سے بھی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ نے کہا: میں نے اس ہجرت کرنے والے کا چودہ سال نام تلاش کیا حتیٰ کہ میں نے وہ پالیا۔ عکرمہ کے اس قول میں اس علم کے شرف پر دلیل ہے اور اس کا اہتمام عمدہ ہے اور اس کی معرفت فضیلت ہے۔ اسی طرح کا قول حضرت ابن عباس کا

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522، دار الکتب العلمیہ 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 483

3۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522 4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 101 5۔ ایضاً

ہے: میں کئی سال ٹھہرا رہا میں حضرت عمر سے ان دو عورتوں کے نام پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایکا کر لیا تھا اور مجھے پوچھنے سے مانع حضرت عمر کی ہیبت تھی۔ اور عکرمہ نے جس کا ذکر کیا ہے وہ ضمرہ بن عیص یا عیص بن ضمرہ بن زنباع ہے۔ طبری نے یہ سعید بن جبیر سے حکایت کیا ہے (1)۔ اسے ضمیرہ بھی کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے: جندع بن ضمیرہ بنی لیث سے تھا اور یہ مکہ میں بے بس لوگوں میں سے تھا اور یہ مریض تھا جب اس نے ہجرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنا تو کہا: مجھے نکالو۔ اس کے لیے بستر تیار کیا گیا پھر اس کو اس پر ڈالا گیا، اسے نکالا گیا تو وہ راستہ میں تنعیم کے مقام پر فوت ہو گیا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا۔ ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ اس کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ خالد بن حزام بن خویلد بن اخی خدیجہ تھا۔ اس نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی راستے میں اسے ایک سانپ نے ڈس لیا تھا تو وہ حبشہ پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: وہ حبیب بن ضمرہ تھا۔ بعض نے کہا: وہ ضمرہ بن جندب ضمری تھا۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ عکرمہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ جندب بن ضمرہ جندعی تھا (2)۔ ابن جابر سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ ضمرہ بن بغیض تھا جو بنی لیث سے تھا۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ وہ ضمرہ بن ضمرہ بن نعیم تھا (3)۔ بعض نے فرمایا: ضمرہ بن خزاعہ تھا۔ واللہ اعلم۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ کا ارشاد نازل ہوا تو مسلمانوں میں سے ایک مریض شخص نے کہا: اللہ کی قسم! میرے لیے کوئی عذر ہے؟ میں راستہ جاننے والا ہوں، میں خوشحال بھی ہوں مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔ پس لوگ اسے اٹھا کر چلے تو راستے میں اسے موت آ گئی (4)۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب نے کہا: اگر وہ ہم تک پہنچتا تو اس کو اجر مکمل ہوتا وہ تنعیم میں فوت ہو گیا تھا، اس کے بیٹے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے سارا واقعہ عرض کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ یَّخْرُجْ ...... الخ اس کا نام ضمرہ بن جندب تھا، جندب بن ضمرہ بھی کہا جاتا ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا جو پہلے شرک کیا تھا اسے بخشنے والا ہے رَّحِیْمًا۝ توبہ قبول فرما کر رحمت کا مظاہرہ فرماتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن عربی نے کہا: علماء نے زمین میں سفر کرنے کی دو قسمیں بنائی ہیں (۱) بھاگ جانا (۲) طلب کرنا۔ پہلی قسم چھ قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

(۱) ہجرت یہ دار الحرب سے دار السلام کی طرف نکلنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں یہ فرض تھی۔ یہ ہجرت قیامت تک فرض باقی ہے اور جو ہجرت فتح مکہ کے ساتھ ختم ہو گئی وہ نبی کریم ﷺ کا قصد کرنا ہے۔ انسان جہاں بھی ہو اس کو دار الحرب سے دار السلام کی طرف ہجرت کرنا فرض ہے۔ اگر وہ دار الحرب میں باقی رہے گا تو گنہگار ہوگا۔ اس کی حالت مختلف ہوتی ہے۔

(۲) ایسی زمین سے نکلنا جہاں بدعات ہوتی ہوں۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ فرماتے سنا کہ کسی کے لیے ایسی جگہ ٹھہرنا حلال نہیں جہاں سلف صالحین کو برا بھلا کہا جاتا ہو۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے برائی کو بدلنے پر جب تو قادر نہ ہو تو

---

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 107
2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 281
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 101
4۔ تفسیر طبری، جلد 5 صفحہ 280

وہاں سے چلا جائے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۞ (الانعام) اور جب تو دیکھے انہیں جو پڑھیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے الخ۔

(۳) ایسی جگہ سے نکلنا جہاں حرام غالب ہو، کیونکہ حلال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(۴) ایسی جگہ سے نکلنا جہاں جسمانی اذیت ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے اس نے اس میں رخصت دی۔ جب اسے اپنے اوپر خوف ہو تو اللہ تعالیٰ نے وہاں سے نکلنے کی اجازت دی ہے اور اسے بھاگ جانے کی اجازت دی ہے کہ ممنوع سے اپنے آپ کو بچا لے۔ سب سے پہلے یہ فعل حضرت ابراہیم نے کیا تھا جب انہیں اپنی قوم سے اذیت دینے کا اندشہ ہوا آپ نے کہا تھا: اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ (العنکبوت:26) اور فرمایا: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۞ (الصافات)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ (القصص:21) تو وہ نکلا اس شہر سے ڈرتے ہوئے، انتظار کرتے ہوئے۔

(۵) مضر صحت ہوا والے شہروں میں مرض کا خوف ہو اور ان شہروں سے پر فضا مقام کی طرف جانا۔ نبی کریم ﷺ نے چرواہوں کے لیے اجازت دی تھی جب انہیں مدینہ طیبہ کی ہوا راس نہ آئی تھی کہ وہ چراگاہ کی طرف جائیں اور ٹھیک ہونے تک وہاں رہیں۔ اس خروج سے طاعون کی وجہ سے نکلنے سے استثنا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے طاعون کی جگہ سے نکلنے منع فرمایا ہے حدیث صحیح نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے مگر ہمارے علماء فرماتے ہیں یہ مکروہ ہے۔

(۶) مال میں اذیت کے خوف سے فرار ہونا، کیونکہ مسلمان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے اور اہل کی حرمت اس کی مثل مزید مؤکد ہے، اور رہی طلب کی قسم تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ دین کی طلب اور دنیا کی طلب، دین کی طلب۔ اپنی انواع کے متعدد ہونے کی وجہ سے سات قسموں کی طرف منقسم ہوتی ہے (۱) عبرت حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (الروم:9) (کیا انہوں نے سفر نہیں کیا زمین میں کہ دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے) یہ بہت زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ذوالقرنین نے زمین کا چکر لگایا تھا تا کہ اس کے عجائبات کو دیکھے۔ بعض نے فرمایا: تا کہ اس میں حق کا نفاذ کرے۔

(۲) سفر حج۔ پہلی صورت مستحب تھی۔ یہ فرض ہے۔ (۳) جہاد کا سفر، اس کے لیے احکام ہیں (۴) معاش کے لیے سفر۔ کبھی انسان کے ایک جگہ ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے پس وہ اس کی طلب میں نکلے، اس پر زیادتی نہ کرے۔ خواہ وہ شکار کے لیے جائے یا لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے جائے یا گھاس کے لیے جائے یہ اس پر فرض ہے (۵) تجارت اور قوت سے زائد کمائی کے لیے نکلنا یہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ:198) نہیں ہے تم پر کوئی حرج کہ تم تلاش کرو فضل اپنے رب کا۔

یہ نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سفر حج میں احسان فرمایا۔ انفرادی طور پر کیسے جائز نہ ہوگی (جب حج میں جائز ہے (٦) علم کے طلب کرنے کے لیے سفر کرنا یہ مشہور ہے (٧) مخصوص مقامات شریفہ کا قصد کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد (1)۔ سفر نہ کیا جائے مگر تین مساجد کی طرف (٨) سرحدوں کی حفاظت کے لیے سفر کرنا (٩) رضاء الٰہی کے لیے بھائیوں کی زیارت کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی کسی شہر میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اس کے راستہ پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا۔ اس نے پوچھا: تو کہاں کا ارادہ کرتا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا اس شہر میں بھائی ہے میں اس کا ارادہ کرتا ہوں۔ فرشتے نے کہا: کیا تیرے لیے کوئی نعمت ہے جس کی تو لجپالی کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں مگر میں اس سے اللہ کی رضا کے لیے محبت کرتا ہوں۔ اس فرشتے نے کہا: میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ایسی ہی محبت فرمائی جیسی تو نے اپنے بھائی سے محبت کی'' (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝

''اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کچھ حرج اگر تم قصر کرو نماز میں اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ضَرَبْتُمْ تم سفر کرو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ سفر میں قصر کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت سے مروی ہے کہ قصر کرنا فرض ہے۔ یہ عمر بن عبد العزیز، کوفی علماء، قاضی اسماعیل، حماد بن ابی سلیمان کا مسلک ہے انہوں نے حضرت عائشہ کی حدیث: فرضت الصلاة رکعتین رکعتین (3) (نماز دو دو رکعت فرض کی گئی) سے حجت پکڑی ہے۔ اس میں اس کے مخالف کے لیے حجت نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ خود سفر میں نماز مکمل پڑھتی تھیں ان کا یہ عمل اس حجت کو کمزور کر دیتا ہے۔ فقہاء امصار کا اس پر اجماع ہے کہ یہ ایسی اصل نہیں کہ مقیم کے پیچھے مسافر کی نماز کا اعتبار کیا جائے۔ حضرت عائشہ کے علاوہ صحابہ جیسے حضرت عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت جبیر بن مطعم نے روایت کیا ہے کہ ان الصلوٰۃ فرضت فی الحضر اربعاً وفی السفر رکعتین وفی الخوف رکعۃ (4) (یعنی نماز حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت فرض کی گئی) اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ پھر حضرت عائشہ کی حدیث جسے ابن عجلان نے صالح بن کیسان سے انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز دو دو رکعت فرض کی۔ اوزاعی نے ابن شہاب سے، انہوں نے عروہ سے،

1۔ صحیح مسلم، المفضل المساجد الثلاثة، جلد 1، صفحہ 447

2۔ صحیح مسلم، البر والصلة والأدب، جلد 2، صفحہ 317۔ صحیح بخاری، حدیث 1115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 148

4۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 241

انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو دو رکعت نماز فرض کی'' (الحدیث) یہ اضطراب ہے۔ پھر حضرت عائشہ کا قول فرضت الصلوٰۃ اپنے ظاہر پر نہیں ہے اس سے نماز مغرب اور صبح خارج ہیں، کیونکہ مغرب میں کمی بیشی نہیں کی جاتی اسی طرح صبح میں بھی۔ یہ تمام اس حدیث کے متن کو ضعیف کرتا ہے نہ کہ اس کی سند کو۔ ابن الجہم نے حکایت کیا ہے کہ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ قصر کرنا فرض ہے۔ اور امام مالک کا مشہور مذہب اور ان کے عظیم ساتھیوں اور اکثر علماء خلف وسلف کا مذہب یہ ہے کہ قصر کرنا سنت ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور یہی صحیح ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مالکیوں میں سے عام بغدادی علماء کا مذہب یہ ہے کہ فرض اختیار ہے۔ یہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے پھر اختلاف ہے کہ کون سی صورت افضل ہے؟ بعض نے فرمایا: قصر کرنا افضل ہے۔ یہ ابہری وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: مکمل پڑھنا افضل ہے۔ یہ امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے۔ ابو سعید الفروی المالکی نے حکایت کیا ہے کہ امام مالک کے مذہب میں صحیح اتمام اور قصر میں مسافر کے لیے تخییر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی حکم اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر امام مالک کے نزدیک قصر کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح وقت کے اندر نماز کے اعادہ کا نظریہ رکھتے ہیں اگر مکمل پڑھ لی ہو۔ ابو مصعب نے اپنی ''مختصر'' میں امام مالک اور اہل مدینہ سے حکایت کیا ہے فرمایا: سفر میں مردوں اور عورتوں کے لیے قصر کرنا سنت ہے۔ ابو عمر نے کہا: تیرے لیے مذہب مالک میں یہی کافی ہے اور اس میں ان کا قول مختلف نہیں کہ جو سفر میں مکمل نماز پڑھ لے تو جب تک وقت موجود ہے اس نماز کا اعادہ کر لے۔ سمجھداروں کے نزدیک یہ استحباب ہے، ایجاب نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: خوف کے علاوہ بھی قصر کرنا سنت ہے۔ رہا سفر کے ساتھ خوف میں تو قرآن وسنت میں قصر کرنا ثابت ہے جس نے چار رکعتیں پڑھ لیں اس پر کچھ نہیں ہے میں کسی کے لیے پسند نہیں کرتا کہ وہ سنت کو چھوڑ کر سفر میں مکمل نماز پڑھے۔ ابو بکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا: آدمی سفر میں چار رکعتیں پڑھ سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، مجھے یہ پسند نہیں، سنت دو رکعتیں ہیں۔ موطا امام مالک میں ابن شہاب سے، انہوں نے آل خالد بن اسید کے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا: اے ابا عبدالرحمٰن! ہم صلاۃ خوف اور صلاۃ حضر کا ذکر تو قرآن میں پاتے ہیں لیکن سفر کی نماز کا ذکر نہیں پاتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: اے میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جبکہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے، ہم اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم نے آپ کو کرتے دیکھا (1)۔ حدیث پاک میں بغیر خوف کے سفر میں نماز قصر کرنے کا ذکر ہے یہ سنت ہے؟ فرض نہیں ہے، کیونکہ اس کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ قرآن میں مذکور قصر کا ذکر اس صورت میں ہے جب وہ سفر میں ہو، خوف میں ہو دونوں صورتیں جمع ہوں۔ کتاب اللہ میں صرف ان دو شرطوں کے ساتھ قصر مباح ہے اور اس کی مثل قرآن میں ہے وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الایۃ یہ پہلے گزر چکی

1۔ صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 4، صفحہ 301

ہے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ۔ یعنی جب تمہیں اطمینان حاصل ہو تو نماز کو مکمل کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے چار رکعتوں والی نماز سے دو رکعتیں ادا فرمائیں مگر مغرب کی نماز مکمل پڑھتے تھے۔ تمام اسفار میں آپ قصر کرتے تھے جب کہ آپ امن میں ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی مسنون سنت ہے اور یہ اللہ کے احکام میں زیادتی ہے جس طرح کہ آپ نے تمام وہ چیزیں جن میں سنت قائم فرمائی اور انہیں بیان فرمایا جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول کما رئیناہ یفعل (ہم نے آپ کو جیسے کرتے دیکھا) اور اس کے ساتھ حضرت عمر کی حدیث جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بغیر خوف کے سفر میں قصر کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تلك صدقة تصدق الله علیکم فاقبلوا صدقته (1)۔ یہ صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے تم اس کو قبول کرو۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ایک چیز کو شرط کے ساتھ مباح فرماتا ہے پھر اسی چیز کو اپنے نبی ﷺ کی زبان پر بغیر شرط کے مباح فرماتا ہے۔ حضرت حنظلہ بن عمر سے سفر کی نماز کے بارے پوچھا تو فرمایا: دو رکعتیں ہیں۔ میں نے کہا: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا میں تو خوف کا ذکر ہے، جب کہ ہم تو امن میں ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ حضرت ابن عمر نے اس پر سنت کا اطلاق کیا اسی طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ ان دونوں حضرات کا مذہب، مسلک کیا ہے؟ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے اس حدیث کی اسناد ذکر نہیں کی، کیونکہ انہوں نے اس شخص کا نام ذکر نہیں کیا جس نے حضرت عبداللہ بن عمر سے سوال کیا تھا، سند میں ایک شخص کو ساقط کر دیا اور وہ شخص جس کا ذکر نہیں کیا وہ امیہ بن عبداللہ بن خالد بن اسید بن ابی العیص بن امیہ بن عبدالشمس بن عبدالمناف تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مسافت کی حد میں اختلاف ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ داؤد نے کہا: ہر سفر میں نماز قصر کی جائے گی خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر ہو اگرچہ وہ تین میل ہو جہاں سے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انہوں نے دلیل مسلم کی حدیث سے پکڑی جو انہوں نے یحییٰ بن یزید الھنائی سے روایت کی ہے، فرمایا میں نے حضرت انس بن مالک سے نماز کی قصر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کے سفر پر نکلتے تو دو رکعتیں نماز ادا فرماتے (2)۔ تین میل اور فرسخ میں شعبہ کو شک ہے۔ اس میں حجت نہیں، کیونکہ اس میں شک ہے ایک تقدیر پر شاید مسافت کی حد ہو جس سے قصر کا آغاز ہو اور سفر اس سے زائد طویل ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا: ایک قوم نے دین کے ساتھ استہزا کیا، انہوں نے کہا: جو شخص اپنے شہر سے باہر نکلے وہ قصر کرے اور افطار کرے۔ اس کا قائل ایک عجمی ہے جو عربوں کے نزدیک سفر کی جو تعریف ہے اسے جانتا ہی نہیں یا دین کی تحقیر کرنے والا ہے۔ اگر علماء نے یہ ذکر نہ کیا ہوتا تو میں راضی نہ ہوتا کہ میں اسے ایک نظر کو دیکھوں اور میں اپنے دل کے فضول کے ساتھ اس میں غور ہی نہ کرتا (3)۔ اس سفر کی حد جس سے قصر واقع ہوئی ہے اس کا ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ سنت میں ہے۔ معاملہ اس

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 241
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 242
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 488

طرح ہے، کیونکہ یہ لفظ عربی ہے اس کا علم ان عربوں کے نزدیک ثابت ہے جن کو اللہ نے قرآن کے ساتھ مخاطب فرمایا اور ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ جو کسی کام کے لیے شہر سے نکلتا ہے تو وہ نہ لغۃً مسافر ہوتا ہے اور نہ شرعاً۔ اگر وہ تین دن سفر کرے تو وہ قطعاً مسافر ہوتا ہے جس طرح کہ ہم حکم لگاتے ہیں کہ جو ایک دن اور رات سفر کرے تو وہ بھی مسافر ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے والی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ ایک دن کی مسافت کا سفر کرے مگر اپنے محرم کے ساتھ'' (1)۔ یہ صحیح ہے یہ دونوں حالتوں کے درمیان متوسط حالت ہے، امام مالک کا اعتماد اسی پر ہے لیکن یہ حدیث متفق علیہ نہیں ''کبھی ایک دن اور رات'' کو روایت کیا اور کبھی ''تین دن'' (2) کو روایت کیا۔

پھر وہ حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف آئے اور ان کے فعل پر اعتماد کیا، وہ مدینہ طیبہ کی رئم وادی تک نماز قصر کرتے تھے یہ چار برد کے فاصلہ پر ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت شدت سے اقتدا کرنے والے تھے۔ دوسرے علماء نے کہا: اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ قصر تخفیف کے لیے مشروع کی گئی ہے، لمبے سفر میں ہی غالباً مشقت لاحق ہوتی ہے۔ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، لیث، اوزاعی، فقہاء اصحاب حدیث، امام احمد مکمل ایک دن کا اعتبار کرتے ہیں۔ امام مالک کا قول یوما ولیلۃ پورے ایک دن کی طرف راجع ہے، کیونکہ انہوں نے مسیرۃ یوم ولیلۃ پورا دن اور پوری رات چلنا مراد نہیں لیا، انہوں نے ایسا سفر مراد لیا ہے جس میں وہ اپنے اہل سے دور ہے اور ان کی طرف لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ بخاری میں ہے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما چار برد کی مسافت میں افطار کرتے تھے اور قصر کرتے تھے۔ چار برد سے مراد سولہ فرسخ ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور طبری نے کہا: یہ چھیالیس میل ہے (3)۔ امام مالک سے عتبیۃ میں اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو اپنی زمین کی طرف پینتالیس میل کے فاصلہ پر نکلا تو وہ قصر کرے۔ یہ متقارب امر ہے۔ امام مالک سے کتب منثورہ میں مروی ہے کہ وہ چھتیس میل کی مسافت میں قصر کرے۔ یہ ایک دن اور ایک رات کے قریب ہے۔ یحییٰ بن عمر نے کہا: ہمیشہ اعادہ کرے۔ ابن الحکم نے کہا: وقت میں اعادہ کرے (اگر نماز مکمل پڑھ لی ہے) کوفیوں نے کہا: تین دن کی مسافت سے کم میں قصر نہ کرے۔ یہ حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود اور حضرت حذیفہ کا قول ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت تین دن سفر نہ کرے مگر اپنے محرم کے ساتھ'' (4)۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: تین دن کی مسافت اونٹ کی چال کے ساتھ یا پیدل چلنے کے ساتھ (قصر کا باعث ہے)۔ حسن اور زہری نے کہا: دو دن کی مسافت میں نماز قصر کرے۔ یہ قول امام مالک سے مروی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت دو دن کی مسافت کا سفر نہ کرے مگر اپنے خاوند کے ساتھ یا ذی محرم کے ساتھ''۔ حضرت ابن عمر نے تیس میل کی مسافت میں قصر کی۔ حضرت انس نے پندرہ میل میں قصر کی۔ اوزاعی نے کہا: عام علماء قصر میں ایک مکمل دن کا اعتبار کرتے ہیں، ہم بھی اسی قول کو لیتے ہیں۔ ابو عمر نے کہا: اس

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 433
2۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 147۔ ایضاً، حدیث 1026، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 142
4۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 147

باب میں مرفوع آثار میں اضطراب ہے جیسا کہ تو نے ان کے الفاظ میں ملاحظہ کیا۔ میرے نزدیک اس کا محمل یہ ہے کہ یہ مختلف سائلین کے جواب میں وارد ہوئے۔ پس جس صحابی نے جو سنا اسے بیان کیا گویا کبھی رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کیا عورت ایک دن بغیر محرم کے سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، پھر کبھی پوچھا گیا: کیا عورت بغیر محرم کے دو دنوں کا سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ پھر کسی نے پوچھا: تین دن کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے کر سکتی ہے؟ فرمایا: نہیں، اسی طرح رات اور برید کا مطلب ہے جو روایت کیا گیا ہے۔ ہر ایک نے وہ ادا کیا جو اس نے سنا۔ واللہ اعلم۔ اسی باب میں آثار کے معانی کو جمع کیا جا سکتا ہے اگرچہ ان کا ظاہر مختلف ہے۔ عورت کو بغیر محرم کے ایسا سفر کرنا ممنوع ہے جس میں فتنہ کا خوف ہو خواہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ سفر کی نوعیت میں اختلاف ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا جہاد حج، عمرہ اور ان کے مشابہ سفر مثلاً صلہ رحمی، احیاء نفس وغیرہ کے سفر میں قصر کرنے پر اجماع ہے۔ اس کے علاوہ سفر میں قصر کرنے پر اختلاف ہے۔ جمہور علماء مباح سفر میں قصر کے جواز کے قائل ہیں جیسے تجارت وغیرہ۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: سوائے حج یا جہاد کے نماز قصر نہ کرے (1)۔ عطا نے کہا: قصر نہ کرے مگر سفر طاعت میں اور کسی خیر کے راستہ میں۔ عطا سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر سفر مباح میں قصر کرے جس طرح کہ جمہور کا قول ہے۔ علماء سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر سفر مباح میں قصر کرے جس طرح کہ جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا: اگر شکار کے لیے نکلا معاش کے لیے نہیں بلکہ تنزہ کے طور پر یا کسی شہر کی سیر کے لیے نکلا تو قصر نہ کرے۔ جمہور علماء نے کہا: معصیت کے سفر میں قصر نہیں جیسے باغی، ڈاکو وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ اور اوزاعی سے ہر سفر میں قصر کرنا مباح مروی ہے (2)۔ یہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ امام احمد سے مختلف قول مروی ہیں کبھی تو انہوں نے جمہور کے قول کے مطابق کہا اور کبھی فرمایا: صرف حج یا عمرہ کے سفر میں قصر کرے۔ صحیح وہ ہے جو جمہور نے کہا، کیونکہ قصر مسافر سے ان مشقات کی تخفیف کے لیے مشروع کی گئی ہے جو انسان کو سفر میں لاحق ہوتی ہیں اور ان امور پر معاونت کے لیے جو اسے درپیش ہوتے ہیں جو امور جائز ہوتے ہیں اور اس میں ہر سفر برابر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ یعنی جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو۔ پس یہ عام ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں سے بہتر وہ ہیں جو جب سفر کرتے ہیں تو قصر کرتے ہیں اور افطار کرتے ہیں''۔

امام شعبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصت پر عمل کیا جائے جس طرح وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے عزائم (فرائض و واجبات) پر عمل کیا جائے۔ رہا سفر معصیت سو اس میں قصر جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی معصیت پر مدد ہوگی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۖ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (المائدہ:2) نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو اور گناہ اور عدوان پر معاونت نہ کرو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 103، دار الکتب العلمیہ بیروت　　2۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 4**۔ علما کا اختلاف ہے کہ کب قصر کرے؟ جمہور کا نظریہ ہے کہ مسافر قصر نہ کرے حتیٰ کہ اپنے دیہات و شہر کے گھروں سے نکل جائے، اس وقت وہ سفر کرنے والا ہوگا، ''المدونہ'' میں امام مالک کا قول یہی ذکر ہے (1)۔ امام مالک نے قرب میں کوئی حد بیان نہیں فرمائی۔ امام مالک سے مروی ہے جب شہر کے لوگ اکٹھے رہتے ہوں تو وہ اپنے گھر والوں کو نماز قصر نہ پڑھائے حتیٰ کہ اپنے شہر سے تین میل تجاوز کر جائے یہی حکم لوٹنے کا بھی ہے۔ اگر اس کے اہل اکٹھے نہ رہتے ہوں تو وہ قصر کریں جب اس شہر کے باغوں سے تجاوز کر جائیں۔ حارث بن ابی ربیعہ سے مروی ہے کہ جب وہ سفر کا ارادہ کرتے تو اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کو دو رکعتیں پڑھاتے۔ ان میں اسود بن یزید اور دوسرے حضرت ابن مسعود کے شاگرد بھی تھے۔ عطا بن ابی رباح اور سلیمان بن موسیٰ کا بھی یہی قول ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ کا معنی اس بناء پر یہ ہوگا کہ جب تم زمین میں سفر کرنے کا ارادہ کرلو۔ واللہ اعلم۔ مجاہد سے مروی ہے فرمایا: پہلے دن رات تک نماز قصر نہ کرے۔ یہ شاذ قول ہے (3)۔ حضرت انس بن مالک کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور عصر کی ذی الحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں (4)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ ذی الحلیفہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان چھ یا سات میل کا فاصلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مسافر پر لازم ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت قصر کی نیت کرے۔ اگر قصر کی نیت سے نماز شروع کی پھر نماز کے درمیان قیام کا ارادہ کرلیا تو اپنی نماز کو نفل بنادے۔ اگر ایک رکعت پڑھنے کے بعد نیت بدل گئی تو دوسری رکعت ساتھ ملالے اور سلام پھیر دے پھر مقیم والی نماز ادا کرے۔ ابہری اور ابن الجلاب نے کہا: یہ مستحب ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر اس نے اپنی نماز پر بناء کرلی اور نماز کو مکمل پڑھ لیا تو نماز جائز ہو جائے گی۔ ابوعمر نے کہا: میرے نزدیک اسی طرح ہے جس طرح ابہری اور ابن الجلاب نے کہا: کیونکہ یہ ظہر کی نماز ہے خواہ سفری ہو یا حضری ہو۔ اسی طرح پانچوں نمازوں کا حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا اس مدت میں اختلاف ہے جس کی مسافر نیت کرے تو نماز کو مکمل پڑھے گا۔ امام مالک، شافعی، لیث بن سعد، طبری اور ابوثور نے کہا: جب چار دن اقامت کی نیت کرلے تو نماز مکمل کرے۔ اور سعید بن مسیب سے یہی مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: جب پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو نماز مکمل پڑھے۔ اگر اس سے کم دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو قصر کرے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے صحابہ میں سے کوئی ان کا مخالف نہیں۔ سعید سے یہ بھی مروی ہے امام احمد نے کہا: جب مسافر نے اکیس نمازیں ایک جگہ پڑھنی ہوں تو قصر کرے۔ اگر اس سے زائد بنتی ہوں تو مکمل کرے۔ داؤد کا بھی یہی قول ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام مالک نے کہا: کیونکہ ابن حضرمی کی حدیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کے لیے مکہ میں حج، عمرہ ادا کرنے کے بعد تین دن ٹھہرنا جائز قرار دیا ہے، پھر وہ واپس آجائے اس حدیث کو امام طحاوی اور ابن ماجہ وغیرہما نے روایت کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 103، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 209۔ ایضاً، حدیث نمبر 1446، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چونکہ حج فتح مکہ سے پہلے فرض تھا اور مکہ میں ٹھہرنا جائز نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کے لیے تین دن متعین فرمائے تا کہ وہ اپنی حوائج کو پورا کرے اور سفر کے اسباب تیار کر لے۔ آپ نے ٹھہرنے کا حکم بیان نہیں کیا اور نہ اقامت کی جگہ کا حکم لگایا اس پر اس میں مسافر کا حکم باقی رکھا اور چوتھے دن ٹھہرنے سے منع فرمایا اور اس کے لیے ٹھہرنے والے پر مقیم کا حکم لگایا یہ ایک اصل ہے جس پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہود کو جلا وطن کیا تھا ان کے لیے تین دن متعین فرمائے تا کہ اپنے امور سمیٹ لیں۔ ابن عربی نے کہا: میں نے بعض مالکی علماء کو سنا کہ تین دن اقامت کے حکم سے خارج ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن پر عذاب نازل کرنا تھا اور جن کا دنیا سے خروج یقینی تھا ان میں تین دن تاخیر فرمائی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ۞ (ہود)

اس مسئلہ میں اور بھی کئی اقوال ہیں وہ یہ کہ مسافر ہمیشہ قصر کرتا رہے حتیٰ کہ اپنے وطن واپس آجائے اور اپنے شہر میں اتر جائے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ وہ دو سال نیشا پور میں ٹھہرے رہے اور نماز قصر کرتے رہے۔ یہ ابومجلز نے کہا میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں مدینہ طیبہ آتا ہوں اور وہاں سات آٹھ مہینے اپنی حاجت طلب کرنے کے لیے قیام کرتا ہوں (میں نماز میں کیا کروں) حضرت ابن عمر نے فرمایا: دو رکعت نماز پڑھ۔ ابو اسحاق سبیعی نے کہا: ہم سجستان میں ٹھہرے ہمارے ساتھ حضرت ابن مسعود کے شاگرد بھی تھے ہم دو سال ٹھہرے رہے اور ہم دو رکعتیں پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عمر آذربائیجان میں قیام کے وقت دو دو رکعتیں پڑھتے رہے، برف ان کی واپسی میں حائل ہوگئی تھی۔ ابوعمر نے کہا: ہمارے نزدیک ان احادیث کا محل یہ ہے کہ اس مدت میں ان مقیم لوگوں میں سے کسی کی قیام کی نیت نہیں تھی۔ وہ اس طرح کہتے تھے: آج چلا جاؤں گا، کل چلا جاؤں گا جب مسئلہ اس طرح ہو تو وہاں اقامت کی پختہ نیت نہیں ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مسلم نے، عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نماز کو دو رکعت فرض کیا جب اس کو فرض کیا پھر حضر میں اسے مکمل فرمایا اور سفر کی نماز پہلے فریضہ پر قائم رکھی تھی (1)۔ زہری نے کہا: میں نے عروہ سے کہا: حضرت عائشہ سفر میں نماز مکمل کیوں پڑھتی تھیں؟ انہوں نے کہا: وہ وہی تاویل کرتی تھیں جو حضرت عثمان کرتے تھے۔ اور یہ جواب مکمل نہیں۔ حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کی نماز مکمل پڑھنے کی تاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان منیٰ میں چار رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ آپ نے حج کے بعد اقامت کی نیت کر لی تھی اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت عثمان نے چار رکعت نماز پڑھی، کیونکہ آپ نے اس جگہ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔

یونس نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے طائف میں مال لیا تھا اور وہاں قیام کا ارادہ کیا تھا اس لیے چار رکعت پڑھتے تھے پھر ان کے بعد ائمہ نے اس عمل کو اپنایا۔ ایوب نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے بدوؤں کی وجہ سے نماز کو مکمل فرمایا، کیونکہ اس سال ان کی کثرت تھی تو آپ نے چار رکعتیں پڑھائیں تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ نماز کی چار رکعتیں ہیں۔ ابوداؤد نے اپنی مصنف میں ''کتاب المناسک'' میں باب الصلوٰۃ بمنی میں یہ تمام اقوال ذکر کیے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 241

ابوعمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیے ہیں۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عثمان نے منیٰ میں چار رکعتیں مکمل پڑھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اعرابی نے مسجد الخیف میں بلند آواز سے کہا: امیر المومنین! میں نے پہلے سال سے جب آپ کو دو رکعتیں پڑھتے دیکھا تو میں اس وقت سے دو رکعت نماز پڑھتا ہوں۔ حضرت عثمان کو اندیشہ ہوا کہ جاہل نماز کو دو رکعت گمان کریں گے۔ ابن جریج نے کہا: حضرت عثمان نے صرف منیٰ میں چار رکعتیں پڑھی تھیں۔ ابوعمر نے کہا: حضرت عائشہ کے مکمل نماز پڑھنے کی تاویلات کے بارے کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو ان سے روایت کی گئی ہو۔ یہ سب ظنون اور تاویلات ہیں جن کے ساتھ کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور سب سے کمزور ترین بات یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تمام لوگ آپ کے بیٹے تھے اور ان کے مکانات آپ کے مکانات تھے۔ (یہ اس لیے درست نہیں) حضرت عائشہ مومنین کی ماں اس لیے بنی تھی کہ وہ نبی کریم کی زوجہ تھیں جو مومنین کے باپ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام سفروں میں، حج اور عمرہ میں اور غزوات میں قصر کی سنت قائم فرمائی۔

حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں اور ان کے مصحف میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وهواب لهم ہے۔ مجاہد نے هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (ہود: 78) کے تحت فرمایا: وہ آپ کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ وہ آپ کی امت کی بیٹیاں تھیں۔ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت کو بیان فرمانے والے تھے۔ حضرت عائشہ ایسی نہیں تھیں پس ان دونوں کا حکم جدا ہوا۔ اور اس سے بھی کمزور ترین قول یہ ہے کہ جہاں آپ نے نماز مکمل کی تھی وہاں آپ کا سفر جائز نہ تھا۔ یہ قطعاً باطل ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ خوف رکھتی تھیں اور بہت زیادہ پرہیز کرنے والی تھی ایسے سفر سے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھا۔ یہ تاویل شیعہ بدعتی گروہ کے جھوٹوں میں سے ہے اور ان کی تشنیعات میں سے ہے۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

آپ اجتہاد کرتے ہوئے اور ثواب کی امید سے نکلی تھیں آپ فتنہ کی آگ کو بجھانا چاہتی تھیں، کیونکہ آپ زیادہ حق دار تھیں کہ آپ کا حیا کیا جائے اور امور ضبط کے ساتھ انجام پذیر ہوں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

بعض لوگوں نے کہا: آپ نے نماز مکمل کی، کیونکہ آپ صرف حج، عمرہ اور جنگ میں قصر کا نظریہ رکھتی تھیں۔ یہ بھی باطل ہے کیونکہ حضرت عائشہ سے یہ منقول نہیں ہے اور نہ آپ کے مسلک سے یہ جانا گیا ہے۔ پھر آپ نے اپنے سفر میں نماز کو مکمل فرمایا جب آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف چلی تھیں۔ سب سے بہتر قول جو آپ کی نماز کی تکمیل میں کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی رخصت کو لیا تاکہ لوگوں کو دکھائیں کہ نماز کو مکمل پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ قصر افضل ہے۔ عطا نے کہا: قصر سنت اور رخصت ہے۔ وہ حضرت عائشہ سے روایت کرنے والے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا، نماز مکمل بھی کی اور قصر بھی کی۔ اس حدیث کو حضرت طلحہ بن عمر نے روایت کیا اور ان سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سب کرتے تھے روزہ بھی رکھتے تھے اور افطار بھی کرتے تھے، نماز میں قصر بھی کرتے تھے اور مکمل بھی پڑھتے تھے۔ نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عمرہ

کیا، حتی کہ جب مکہ پہنچیں تو عرض کی: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے نماز قصر کی اور میں نے مکمل کی، آپ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! تو نے اچھا کیا'' (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر کوئی اعتراض نہ کیا، اسی طرح قصرت، تا مفتوحہ کے ساتھ اور أتممت تا مضمومہ کے ساتھ مقید ہے۔

اسی طرح افطرت اور صمت میں ہے۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر کرتے تھے اور نماز مکمل بھی پڑھتے تھے، افطار بھی کرتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ اس کی سند صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ اَنْ محل نصب میں ہے یعنی فی ان تقصروا۔ ابو عبید نے کہا: اس میں تین لغات ہیں قَصَرتُ الصلوٰة، قصرتها و أقصرتها۔ علماء کا اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتیں قصر ہوں گی خوف میں اور اس کے علاوہ سفر میں بھی۔ کیونکہ حدیث حضرت یعلی بن امیہ سے یہی ثابت ہوتا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسرے علماء فرماتے ہیں: دو رکعتوں والی نماز میں ایک رکعت قصر ہوگی اور سفر میں دو رکعتیں مکمل نماز ہے جیسا کہ حضرت عمر نے کہا تھا۔ یہ تمام ہے قصر نہیں ہے اور اس کا قصر ایک رکعت ہونا ہے۔ سدی نے کہا: جب تو سفر میں دو رکعت پڑھے تو وہ مکمل ہے اور قصر جائز نہیں مگر جب کہ تجھے خوف ہو۔ یہ آیت مباح کرنے والی ہے کہ ہر طائفہ ایک رکعت پڑھے اور اس پر زائد کچھ نہ پڑھے۔ اور امام کے لیے دو رکعتیں ہو جائیں گی (2)۔ حضرت ابن عمر اور حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت کعب سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت حذیفہ نے طبرستان میں ایسا ہی کیا تھا جب کہ امیر حضرت سعید بن العاص سے اس کے متعلق ان سے پوچھا تھا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذی قرد میں اسی طرح ہر طائفہ کو ایک رکعت پڑھائی تھی اور انہوں نے مکمل نہیں کی تھی (3)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محارب خصفہ اور بنی ثعلبہ سے جنگ کے دن اپنے اصحاب کو اسی طرح نماز پڑھائی تھی (4)۔ حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضجنان اور عسفان کے درمیان اسی طرح نماز پڑھائی تھی۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے (5)۔ یہ قول اس کی تائید کرتا ہے۔ مگر قاضی ابوبکر بن عربی نے اپنی کتاب القبس میں ذکر کیا ہے کہ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث بالا جماع متروک ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عربی وغیرہ نے اختلاف اور نزاع کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے درست نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

ابوبکر رازی حنفی نے ''احکام القرآن'' میں حکایت کیا ہے کہ یہاں قصر سے مراد رکوع و سجود کو اشارہ کے ساتھ ادا کرنا ہے

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 1، صفحہ 558
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 592
4۔ ایضاً
5۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 241

یعنی صفت نماز میں قصر ہے۔ اور قیام کو رکوع کے ساتھ ترک کرنا مراد ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ آیت کریمہ جنگ میں مشغول ہونے اور تلواروں کے چلنے کے وقت نماز کی حدود اور ہیئت میں قصر کو مباح کرتی ہے۔ اس حالت میں سر کے اشارہ کے ساتھ نماز پڑھنے کو مباح کیا گیا ہے اور جس طرف بھی منہ ہو ایک رکعت کو ایک تکبیر کی طرف کرنے کو مباح کیا گیا ہے (1) جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے کہا: اس کی تائید یہ ارشاد کرتا ہے: **فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ**۔ یعنی جب اطمینان ہو تو نماز کو اس کی حدود اور کامل ہیئت کے ساتھ ادا کرو۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام احوال قریب المعنی ہیں۔ یہ اس پر مبنی ہیں کہ مسافر کا فرض قصر ہے اور اس کے حق میں نماز صرف دو رکعتیں ہی نازل ہوئی ہیں پس قصر نہیں ہے نہ عزیمت میں کہا جائے گا کہ کوئی گناہ نہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: اس نے قصر کی جس پر شروع ہی دو رکعتیں تھیں جس طرح صبح کی نماز میں اس طرح نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے قصر کا دو شرطوں کے ساتھ ذکر کیا اور جس میں یہ دونوں شرطیں معتبر ہیں وہ صلاۃ خوف ہے۔ اس کو ابو بکر رازی نے ''احکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے اور اس پر حدیث حضرت یعلی بن امیہ سے رد کیا گیا ہے۔ ابھی ان شاء اللہ قریب ہی وہ آجائے گی۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنْ خِفْتُمْ** یہ غالب اعتبار سے کلام ذکر کی گئی ہے، کیونکہ مسلمان پر سفروں میں عام طور پر خوف ہوتا ہے، اسی وجہ سے یعلی بن امیہ نے کہا: میں نے حضرت عمر کو کہا: ہم قصر کیوں کریں جب کہ ہم امن میں ہیں؟ حضرت عمر نے کہا: مجھے بھی اسی طرح تعجب ہوا تھا جس طرح تجھے ہوا ہے میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صدقہ ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر صدقہ کیا ہے پس تم اس کا صدقہ قبول کرو'' (2)۔

میں کہتا ہوں: اصحاب شافعی نے احناف کے خلاف حضرت یعلی بن امیہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، انہوں نے کہا: حضرت یعلیٰ کا قول کہ ہم قصر کیوں کریں جب کہ ہم امن میں ہیں؟ یہ قطعی دلیل ہے کہ آیت کا مفہوم رکعات میں قصر ہے۔ الکیا طبری نے کہا: امام ابو حنیفہ کے اصحاب نے اس پر کوئی ایسی تاویل پیش نہیں کی جو قابل ذکر ہو۔ پھر صلاۃ خوف میں دو شرطوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا، کیونکہ اگر ہم سفر نہ کریں اور سفر نہ پایا جائے، بلکہ ہمارے اوپر کفار حملہ آور ہو جائیں اور ہمارے شہروں میں آکر لڑیں تو صلاۃ خوف جائز ہوگی اس میں دونوں شرطوں کا وجود معتبر نہیں جس طرح کہ انہوں نے کہا ہے۔ حضرت ابی کی قرأت میں ان تقصروا من الصلوة ان یفتنکم الذین کفروا ہے یعنی ان کی قرأت (3) میں **اِنْ خِفْتُمْ** کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی قرأت پر معنی یہ ہوگا ناپسند ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں اور حضرت عثمان کے مصحف میں **اِنْ خِفْتُمْ** کے الفاظ موجود ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ آیت سفر میں قصر کو مباح کرنے والی ہے ایسے شخص کے لیے جسے دشمن کا خوف ہو اور جو امن میں ہو اس کے لیے قصر نہیں۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ وہ سفر میں فرماتی تھیں ''اپنی نماز کو مکمل کرو''۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ تو قصر کرتے تھے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: آپ ﷺ جنگ اور خوف میں ہوتے تھے، کیا تم خوف میں ہو (4)؟ عطا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104　2۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 360

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104　4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 287

نے کہا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے مکمل نماز پڑھنے والے حضرات یہ تھے (1) حضرت عائشہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عثمان نے بھی مکمل پڑھی تھی لیکن اس کی مخصوص وجوہ تھیں جو پہلے گزر چکی ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قصر کو مباح نہیں فرمایا مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ (۱) سفر (۲) خوف۔ اور خوف نہ ہونے کی صورت میں قصر سنت سے ثابت ہے۔ ان علماء میں سے امام شافعی ہیں ان کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ خِفْتُمْ ماقبل کلام سے متصل نہیں۔ کلام مِنَ الصَّلٰوةِ پر مکمل ہو چکی ہے پھر اِنْ خِفْتُمْ سے کلام کا آغاز ہو رہا ہے۔ پس اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو نماز خوف پڑھاؤ اور اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ کا قول جملہ معترضہ ہے۔ یہ جرجانی کا قول ہے۔ اور مہدوی وغیرہم نے یہی ذکر کیا ہے۔ قشیری اور قاضی ابوبکر بن عربی نے اس قول کا رد کیا ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: اس حمل میں شدید تکلف ہے اور خواہ مخواہ کلام میں اطناب کیا ہے، انہوں نے جرجانی پر تنقید کی ہے کلام کو مقدر کرنے اور امثلہ بیان کرنے میں۔ ابن عربی نے کہا: ان تمام تاویلات کے حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور حضرت یعلی بن امیہ محتاج نہیں ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ جرجانی نے کہا ہے اس کے مطابق ایک حدیث آئی ہے جسے قاضی ابو الولید بن رشد نے مقدمات میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ایک تاجر گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے پوچھا: ہم زمین میں سفر کرتے ہیں تو ہم نماز کیسے پڑھیں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ پھر کلام ختم ہوئی۔ اس کے بعد جب ایک سال گزر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے جہاد کیا آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی تو مشرکین نے کہا: محمد اور آپ کے اصحاب نے تمہیں پیچھے سے حملہ کرنے کا موقع دیا ہے تم ان پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: ان کے پیچھے دوسرے لوگ موجود ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ نے دو نمازوں کے درمیان یہ ارشاد: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا نازل فرمایا (2)۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس میں بغیر خوف کے قصر پر قرآن سے دلیل موجود ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ سفر میں نماز کے بارے میں نازل ہوا پھر اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ایک سال بعد نماز خوف کے بارے نازل ہوا، اس بنا پر آیت اپنے ضمن میں دو قضیے اور دو حکم رکھتی ہے۔ پس اِذَا ضَرَبْتُمْ سفر کے متعلق ہے یہاں پر کلام مکمل ہے پھر ایک دوسرے فریضہ کی ابتدا ہوئی اور شرط کو مقدم کیا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوۃ اور واؤ زائدہ ہے اور جواب فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ ہے اور اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا جملہ معترضہ ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ خوف کا ذکر سنت سے منسوخ ہے وہ حضرت عمر کی حدیث ہے جو اس کی ناسخ ہے، کیونکہ انہوں نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 286

انہیں فرمایا: ''یہ صدقہ ہے اس کے ساتھ تم پر اللہ تعالیٰ نے صدقہ کیا ہے تم اس کا صدقہ قبول کرو''۔

نحاس نے کہا: جس نے بغیر خوف کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کرنا تسلیم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو آیت کا ناسخ بنایا یہ غلط ہے، کیونکہ آیت میں امن کی حالت میں قصر سے منع نہیں ہے اس میں خوف کی حالت میں قصر کی اباحت ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ فراء نے کہا: اہل حجاز کہتے ہیں فتنت الرجل اور ربیعہ، قیس، اسد اور تمام نجدی کہتے ہیں افتتنت الرجل۔ خلیل اور سیبویہ نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: فتنتہ کا مطلب ہے میں نے اس میں فتنہ ڈالا جیسے اکحلتہ ہے اور افتتنتہ کا مطلب ہے میں نے اسے فتنہ والا بنایا۔ اصمعی نے کہا: وہ افتتنتہ نہیں جانتے۔ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا یہاں عدو بمعنی اعداء ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ١۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ١۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ١ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً١ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ١ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا۝۱۰۲

''اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز تو چاہیے کہ کھڑا ہو ایک گروہ ان سے آپ کے ساتھ اور وہ پکڑ رکھیں اپنے ہتھیار پس جب سجدہ کر چکیں تو وہ ہو جائیں تمہارے پیچھے اور آ جائے دوسرا گروہ جس نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی پس (اب) وہ نماز پڑھیں آپ کے ساتھ اور لیے رہیں اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار، تمنا کرتے ہیں کافر اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے اسلحہ سے اور اپنے ساز و سامان سے تو وہ ٹوٹ پڑیں تم پر یک بارگی اور نہیں کوئی حرج تم پر اگر ہو تمہیں تکلیف بارش کی وجہ سے یا ہو تم بیمار تو اتار دو اپنے ہتھیار مگر (دشمن کی نقل و حرکت سے) ہوشیار رہو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ دار قطنی نے ابو عیاش زرقی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عسفان میں تھے، مشرکین سے ہمارا مقابلہ ہوا ان کے جرنیل خالد بن ولید تھے اور ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی مشرکین نے کہا: مسلمان اس حالت پر ہیں کہ ہم ان پر حملہ کریں۔ فرمایا: پھر کہا: ابھی مسلمانوں پر ایسی نماز کا وقت ہونے والا ہے جو انہیں اپنے بیٹوں اور

اپنے نفسوں سے زیادہ عزیز ہے۔ فرمایا: جبریل امین ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیت کریمہ لے کر آئے (1): وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ آگے حدیث پوری ذکر کی۔ مکمل حدیث ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

یہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اسلام کا سبب تھا یہ آیت سابقہ جہاد کے ذکر سے متصل ہے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نماز سفر اور جہاد اور دشمن کے قتال کے عذر سے بھی ساقط نہیں ہوتی لیکن اس میں رخصت ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ اور اس سورت میں علماء کے اختلاف کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور قیامت تک بعد کے امراء کو شامل ہے اس کی مثل یہ ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ:103) (ان کے اموال سے صدقہ لو) یہ تمام علماء کا قول ہے۔ امام ابو یوسف اور اسماعیل بن علیہ نے شاذ قول کیا ہے یہ دونوں حضرات کہتے ہیں: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صلاۃ خوف نہیں پڑھیں گے (2)، کیونکہ خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے کیونکہ فرمایا: وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ جب آپ ان میں نہ ہوں گے تو نماز خوف بھی ان کے لیے نہ ہوگی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ تمام لوگ پسند کرتے تھے کہ آپ کی اقتدا کریں اور آپ کے پیچھے نماز پڑھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کے لیے فضیلت میں اس مقام پر فائز ہونا ممکن نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد لوگوں کے احوال برابر اور متقارب ہیں، اسی وجہ سے امام ایک فریق کو نماز پڑھائے گا اور دوسرے فریق کے لیے کسی دوسرے کو نماز پڑھانے کا حکم دے گا۔ رہا یہ کہ تمام ایک امام کے پیچھے نمازیں پڑھیں یہ نہیں ہوگا۔

جمہور علماء نے کہا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیں دوسری آیت اور حدیث میں آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ (النور:63) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صلوا کما رأیتمونی أصلی (3) تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع مطلقاً لازم ہے حتیٰ کہ خصوص پر کوئی واضح دلیل دلالت کرے اگر معاملہ اس طرح ہوتا جو انہوں نے خصوص کی دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے تو پھر خطابات کا ان کے ساتھ خاص ہونا لازم ہوتا جن کی طرف خطابات متوجہ تھے، اس وقت شریعت کا ان کے ساتھ منحصر ہونا لازم ہوگا جن سے خطاب کیا گیا۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نماز میں خصوص کے توہم کو ترک کیا اور انہوں نے غیر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی اس کو جائز قرار دیا جب کہ صحابہ کرام حرام اور حلال کو زیادہ جاننے والے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (الانعام:68) اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جو پڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے اعراض کرلے حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں پڑیں۔

یہ خطاب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور آپ کی امت بھی اس میں داخل ہے، اس کی بہت سی مثالیں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ:103) یہ تمام ان احکام کو آپ کے ساتھ خاص کرنے کا موجب نہیں بلکہ بعد والے

1۔ المستدرک للحاکم، صلوٰۃ الخوف، جلد 1، صفحہ 486، حدیث نمبر 1252
2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 110
3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 888

بھی آپ کے قائم مقام ہیں۔ اسی طرح وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ میں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا حضرت ابو بکر صدیق صحابہ کی جماعت میں تھے انہوں نے جنگ کی ان لوگوں سے جنہوں نے زکوٰۃ میں تاویل کی جس طرح صلاۃ خوف میں تم نے تاویل کی۔ ابو عمر نے کہا: زکوٰۃ لینے میں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد والے خلفاء برابر تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے والے اور دوسروں کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی نماز میں مشابہت نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ لینے کا فائدہ مساکین کو فائدہ پہنچانا ہے اس میں عطا کرنے والے کو اس طرح فضیلت نہیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے والے کو فضیلت ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ یعنی ایک گروہ آپ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو۔ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ یعنی جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دشمن کے مقابلہ میں ہیں وہ ہتھیار اٹھائیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر طائفہ کے لیے صرف ایک رکعت کا ذکر کیا ہے لیکن احادیث میں ہے کہ انہوں نے اس کے ساتھ دوسری رکعت ملائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔ فَلْتَقُمْ اور فَلْيَكُوْنُوْا کے قول سے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اخفش، فراء اور کسائی نے حکایت کیا ہے کہ لام امر، لام مجرور کو فتحہ دیا جاتا ہے۔ سیبویہ علت موجبہ کی وجہ سے اس سے منع کرتے ہیں اور وہ علت لام جر اور لام تاکید کے درمیان فرق ہے اس امر سے مراد تقسیم ہونا ہے یعنی تمام کا دشمن کے سامنے ہونا ہے کہ ان کے حملہ سے بچا جائے۔

نماز خوف کی ہیئت میں روایات مختلف ہیں۔ روایات کے اختلاف کی وجہ سے علماء کے مذاہب میں بھی اختلاف ہے۔ ابن القصار نے ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ مقامات پر صلاۃ خوف پڑھی۔ ابن عربی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوبیس مرتبہ صلاۃ خوف پڑھی (1)۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: جو اہل حدیث کے امام ہیں اور حدیث میں نقل کی علل کی معرفت میں متقدم ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ صلاۃ خوف میں کوئی حدیث مروی ہے مگر وہ حدیث ثابت ہے۔ یہ تمام احادیث صحیح ثابت ہیں جس حدیث کی بنا پر کوئی صلاۃ خوف پڑھے گا اس کے لیے جائز ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اسی طرح ابو جعفر طبری نے کہا: امام مالک اور ان کے تمام اصحاب، سوائے اشہب، کا نظریہ صلاۃ خوف میں سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کے مطابق ہے۔ وہ حدیث امام مالک نے موطا میں یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے قاسم بن محمد سے، انہوں نے صالح بن خوات انصاری سے روایت کی ہے کہ سہل بن ابی حثمہ نے انہیں بیان کیا کہ صلاۃ خوف میں امام کھڑا ہو اور اس کے ساتھ اس کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کھڑا ہو اور ایک گروہ دشمن کے سامنے ہو۔ امام اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائے اور سجدہ کرائے جو اس کے ساتھ ہیں پھر امام کھڑا ہو جب امام سیدھا کھڑا ہو جائے تو ٹھہر جائے اور باقی رکعت مقتدی خود مکمل کریں پھر وہ سلام پھیر دیں پھر وہ چلے جائیں اور امام کھڑا رہے، اب یہ گروہ جو نماز پڑھ چکا ہے دشمن کے سامنے چلا جائے پھر وہ آ جائیں جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ امام کے پیچھے تکبیر کہیں، امام انہیں ایک رکعت پڑھائے، سجدہ کرے پھر سلام پھیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 491

دے، وہ کھڑے ہو جائیں اور دوسری رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں۔

ابن القاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں انہوں نے کہا: امام مالک کے نزدیک عمل قاسم بن محمد عن صالح بن خوات کی حدیث کے مطابق ہے۔ ابن القاسم نے کہا: وہ یزید بن رومان کی حدیث پر عمل کرتے تھے پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ ابو عمر نے کہا: قاسم کی حدیث اور یزید بن رومان کی حدیث دونوں صالح بن خوات سے مروی ہیں مگر ان کے درمیان سلام میں فرق ہے۔ قاسم کی حدیث میں ہے کہ امام دوسرے طائفہ کو سلام پھیرائے پھر وہ کھڑے ہوں اور خود اپنی رکعت کو قضا کریں اور یزید بن رومان کی حدیث میں ہے کہ وہ انتظار کرے اور انہیں سلام پھیرائے۔

امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا رجحان ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یزید بن رومان کی حدیث صالح بن خوات سے جو مروی ہے وہ صلاۃ خوف میں مروی احادیث میں سے کتاب اللہ کے ظاہر کے زیادہ مشابہ ہے اور میں بھی کہتا ہوں: امام مالک نے قاسم کی حدیث کو اختیار کرنے کی حجت تمام نمازوں پر قیاس کو بنایا ہے، کیونکہ تمام نمازوں میں امام کسی کا انتظار نہیں کرتا جو پہلے گزر چکا ہوتا ہے۔ اور سنت جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ مقتدی امام کے سلام کے بعد اپنی بقیہ نماز کی قضا کریں گے۔ ابو ثور کا قول اس مسئلہ میں امام مالک کے قول کی طرح ہے اور امام احمد نے امام شافعی کے قول کی طرح کہا جو ان کا مختار قول ہے وہ کسی پر عیب نہیں لگاتے تھے جو صلاۃ خوف کے متعلق کسی بھی طریقہ پر عمل کر لیتا تھا۔ اصحاب مالک میں سے اشہب کا اختیار حضرت ابن عمر کی حدیث ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور دوسرا طائفہ دشمن کے سامنے تھا پھر وہ واپس آئے وہ اپنے ساتھیوں کی جگہ دشمن کے سامنے آئے اور وہ لوگ آئے جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھائی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر دیا پھر ہر ایک گروہ نے اپنی اپنی رکعت خود ادا کی (1)۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جب خوف اس سے زیادہ ہو تو سوار ہو کر یا کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھیں۔ یہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک وغیرہم نے تخریج کیا ہے۔ اس طریقہ کو اوزاعی نے اختیار کیا۔ اس کو ابو عمر بن عبد البر نے پسند کیا ہے فرمایا: یہ سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور یہ اہل مدینہ کے نقل کے ساتھ وارد ہے اور ان کے مخالف پر حجت قائم ہے، کیونکہ اصول کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ پہلا اور دوسرا گروہ انہوں نے اپنی رکعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد قضا کیا اور متفق علیہ سنت سے معروف ہے بقیہ تمام نمازوں میں۔ رہے کوفی علماء، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب سوائے امام ابو یوسف کے، ان کا نظریہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث کے مطابق ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز خوف پڑھائی صحابہ کرام نے دو صفیں بنائیں ایک صف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھی اور دوسری دشمن کے سامنے تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور پھر دوسرا گروہ آیا وہ پہلے ساتھیوں کی جگہ کھڑے ہوئے اور پہلا گروہ دشمن کے سامنے چلا گیا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھائی پھر سلام پھیر دیا پھر یہ لوگ کھڑے ہوئے اور ایک رکعت خود پڑھی پھر سلام پھیر دیا وہ چلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 592

گئے اور ان ساتھیوں کی جگہ کھڑے ہوئے جو دشمن کے سامنے تھے وہ پہلا گروہ ان کی جگہ آیا اور اپنی ایک رکعت پڑھی اور سلام پھیر دیا (1)۔ یہ طریقہ اور پہلا طریقہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے مگر ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ان کی قضا ایک حالت میں ظاہر ہوتی ہے اور امام اکیلا نگران کی طرح باقی رہتا ہے اور یہاں ان کی قضا ان کی نماز کی صفت پر متفرق ہے۔ بعض علماء نے حضرت ابن عمر کی حدیث کی حضرت ابن مسعود کی حدیث میں مروی طریقہ پر تاویل کی ہے حضرت ابن مسعود کی حدیث پر ثوری، اشہب بن عبدالعزیز کا مسلک قائم ہے جیسا کہ ابوالحسن لخمی نے ان سے روایت کیا ہے اور پہلا قول ابوعمر، ابن یونس اور ابن حبیب نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت حذیفہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طائفہ کو ایک رکعت پڑھائی اور انہوں نے قضا نہیں کی (2)۔ یہ حضرت ابن عباس کی حدیث کا مقتضیٰ ہے کہ صلاۃ خوف میں ایک رکعت ہے یہ اسحاق کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے، نماز اس کے مطابق اولیٰ ہے جس میں احتیاط ہو اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے حجت قائم نہیں ہوتی اور حدیث حذیفہ وغیرہ کی حدیث میں لم یقضوا اس پر محمول ہوگی کہ جن لوگوں نے روایت کیا ان کے علم میں ہے کہ انہوں نے بقیہ رکعت ادا نہیں کی، کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس نماز میں ایک رکعت بعد میں ادا کی اور جنہوں نے زیادتی کی شہادت دی وہ اولیٰ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ لم یقضوا سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے قضا نہ کی جب وہ امن میں ہوئے۔

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ خوف زدہ کو جب امن ہو جائے تو خوف کی نمازیں جو وہ پہلے ادا کر چکا ہے ان کی قضا نہیں کرے گا۔ یہ تمام اقوال ابوعمر نے ذکر کیے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر وہ پیچھے چلے گئے اور پھر دوسرے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار رکعتیں تھیں اور مقتدیوں کے لیے دو دو رکعتیں تھیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارقطنی نے حسن عن ابی بکرہ کی حدیث سے تخریج کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرا (3)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حسن عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا پھر دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا۔

ابوداؤد نے کہا: حضرت حسن اس کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ امام شافعی سے بھی یہ مروی ہے۔ اس سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو نماز میں امام اور مقتدی کی نیت کے اختلاف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ امام شافعی، اوزاعی، ابن عطیہ، امام احمد بن حنبل اور داؤد کا مذہب ہے۔ انہوں نے حضرت جابر کی حدیث سے تائید حاصل کی ہے کہ حضرت معاذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم کے پاس آتے تھے اور اپنی قوم کی امامت کراتے تھے۔ (الحدیث) امام طحاوی نے فرمایا: یہ ابتداء اسلام میں تھا، کیونکہ ابتدائے اسلام میں ایک فریضہ دو مرتبہ ادا کرنا جائز تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ یہ صلاۃ خوف کے بارے علماء کے اقوال ہیں۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 176　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 177　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ نماز ہے جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اس کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مسلمانوں کی قبلہ کی طرف پیٹھ ہو اور دشمن کا قبلہ کی طرف منہ ہو۔ ذات الرقاع میں ایسا اتفاق ہوا تھا۔ عسفان اور دوسری جگہوں پر مسلمانوں کا رخ قبلہ کی جانب تھا اور جو ہم نے خالد بن ولید کے قصہ میں نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ قوم کو دو حصوں میں تفریق کرنے کے مناسب نہیں، کیونکہ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ کے قول کے بعد حدیث میں فرمایا: نماز کا وقت ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دو صفیں بنائیں، پھر آپ نے رکوع کیا تو ہم تمام نے رکوع کیا۔ فرمایا: پھر آپ نے سر اٹھایا تو ہم نے بھی سر اٹھایا۔ فرمایا: پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صفت کے ساتھ سجدہ کیا جو آپ سے متصل تھی اور دوسرے لوگ ان کی حفاظت کرتے ہوئے کھڑے رہے، جب انہوں نے سجدہ کیا اور کھڑے ہوئے تو دوسرے بیٹھے اور اپنی جگہ سجدہ کیا۔ فرمایا: پھر یہ ایک دوسرے کی جگہ چلے گئے۔ فرمایا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری رکعت کا رکوع کیا اور سب لوگوں نے رکوع کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا تو سب لوگوں نے سر اٹھایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور اس صف نے سجدہ کیا جو آپ کے ساتھ متصل تھی اور دوسرے نگرانی کرتے ہوئے کھڑے رہے، پھر وہ بیٹھے سجدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سلام کیا (1)۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ صلاۃ خوف پڑھی ایک مرتبہ عسفان میں اور ایک مرتبہ بنی سلیم کی زمین میں اس کو ابوداؤد نے ابوعیاش زرقی کی حدیث سے تخریج کیا ہے۔ یہ ثوری کا قول ہے اور زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔ ابوعیسیٰ نے ترمذی میں یہ طریقہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے اس حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا ہر گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور ہر طائفہ کے لیے ایک ایک رکعت تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو رکعتیں تھیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس، حضرت جابر، حضرت ابوعیاش زرقی، ان کا نام زید بن صامت ہے، حضرت ابن عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابوبکر اور حضرت سہل بن حثمہ سے بھی مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ان روایات کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اکٹھی نماز پڑھائی ہو جس طرح حضرت ابوعیاش کی حدیث میں ہے اور ان کو دوسری نماز پڑھائی ہو جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں آیا ہے اس میں اس شخص کے لیے حجت ہے جو کہتے ہیں نماز خوف ایک رکعت ہے۔ خطابی نے کہا: صلاۃ خوف کی کئی صورتیں ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ایام میں مختلف اشکال میں ادا فرمائی آپ نے ہر اس طریقہ کو اختیار فرمایا جس میں نماز کے لیے احتیاط بھی تھی اور حراست وحفاظت کے لیے بھی زیادہ بلیغ تھا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مغرب کی نماز کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ دارقطنی نے حسن عن ابی بکرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو مغرب کی تین رکعتیں پڑھائیں، پھر وہ چلے گئے اور دوسرے لوگ آئے انہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی تین رکعتیں پڑھائیں، پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھ رکعت ہوئیں اور مقتدیوں کیلئے تین تین رکعتیں ہوئیں (2)۔

---

1۔ سنن ابی داود، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 177

2۔ المستدرک للحاکم، صلوٰۃ الخوف، جلد 1، صفحہ 486، حدیث نمبر 1251

حسن کا یہی قول ہے۔ جمہور علماء صلاۃ مغرب میں اس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: وہ پہلے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائے اور دوسرے طائفہ کو ایک رکعت پڑھائے۔

پھر اس میں علماء کے اصول کے اختلاف کی بنا پر بقیہ نماز کب قضا کی جائے گی؟ کیا سلام سے پہلے یا سلام کے بعد؟ یہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا نظریہ ہے، کیونکہ اس میں نماز کی ہیئت کی زیادہ حفاظت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: پہلے گروہ کو ایک رکعت پڑھائے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین میں ایسا ہی کیا تھا (1)۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ سخت جنگ اور شدت قتال اور وقت کے خروج کے خوف میں نماز خوف ادا کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ثوری، اوزاعی، امام شافعی اور عام فقہاء فرماتے ہیں: جیسے ممکن ہو نماز ادا کرے، کیونکہ حضرت عمر کا قول ہے: اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو سوار ہو کر یا کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھے۔ موطا میں ہے خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو۔ سورۂ بقرہ میں ضحاک اور اسحاق کا قول گزر چکا ہے۔ اوزاعی نے کہا: اگر فتح تیار ہو اور وہ نماز پر قادر نہ ہوں تو ہر شخص خود اشارہ سے نماز پڑھے اور اگر اشارہ سے بھی ادا کرنے پر قادر نہ ہوں تو نماز کو موخر کر دیں حتیٰ کہ جنگ ختم ہو جائے اور امن میں ہو جائیں تو دو رکعتیں ادا کریں۔ اگر وہ قادر نہ ہوں تو ایک رکوع اور دو سجدے ادا کریں، اگر اس پر بھی قادر نہ ہوں تو ان کے لیے تکبیر کافی ہو گی وہ نماز کو مؤخر کریں حتیٰ کہ امن میں ہو جائیں۔ یہی مکحول کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ الکیا طبری نے ''احکام القرآن'' میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے حکایت کیا ہے۔ الکیا نے کہا: جب خوف اس سے زیادہ ہو اور جنگ اپنے عروج پر ہو تو مسلمان قبلہ یا غیر قبلہ کی طرف جیسا بھی ممکن ہو نماز پڑھیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب ثلاثہ اس پر متفق ہیں کہ وہ نماز نہ پڑھیں جب کہ یہ حالت ہو بلکہ نماز مؤخر کر دیں، اگر وہ نماز کے اندر جنگ لڑیں گے تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے طعن اور ضرب پے در پے لگائی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حضرت انس کے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: تستر قلعہ کی فتح فجر کی روشنی کے وقت ہوئی سخت جنگ ہوئی تو ہم نماز نہ پڑھ سکے مگر سورج بلند ہونے کے بعد ہم نے نماز پڑھی جب کہ حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ تھے اور ہمیں فتح حاصل ہو چکی تھی۔ حضرت انس نے کہا: مجھے اس نماز کے عوض دنیا و مافیہا محبوب نہیں۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے۔ اس کی طرف ہمارے شیخ الاستاد ابو جعفر بن محمد بن محمد القیسی القرطبی المعروف بابی حجۃ کا میلان ہے۔ یہی ظاہراً امام بخاری کا مختار ہے، کیونکہ انہوں نے اس کے پیچھے حدیث جابر کو ذکر کیا ہے فرمایا: جنگ خندق کے دن حضرت عمر آئے وہ کفار قریش کو گالی دے رہے تھے اور عرض کر رہے تھے: یا رسول اللہ! میں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی حتیٰ کہ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ فرمایا: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطحان وادی میں اترے، وضو کیا اور سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر پڑھی پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی (2)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی جلد 1، صفحہ 494
2۔ صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83

**مسئلہ نمبر 6**۔ حملہ آور اور جس کا پیچھا کیا گیا ہے اس کی نماز میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ دونوں برابر ہیں، ہر ایک اپنی سواری پر نماز پڑھے گا۔ اوزاعی، امام شافعی اور فقہاء اصحاب الحدیث اور ابن عبدالحکم نے کہا: پیچھا کرنے والا (حملہ آور) زمین پر نماز پڑھے یہ صحیح ہے، کیونکہ پیچھا کرنا نفل ہے اور فرض نماز کا زمین پر ادا کرنا فرض ہے جہاں ممکن ہو اور سوار سواری پر نماز نہ پڑھے مگر جب اسے شدید خوف ہو، جب کہ پیچھا کرنے والا ایسا نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ چھاونی میں لشکر موجود تھا انہوں نے ایک تاریکی دیکھی انہوں نے اسے دشمن گمان کیا انہوں نے صلاۃ خوف پڑھ لی پھر ظاہر ہوا کہ وہ کوئی دشمن نہیں ہے۔ ہمارے علماء کی ایسی صورت میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ دوسری یہ کہ ان پر اعادہ نہیں ہے یہ امام شافعی کا اظہر قول ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے خطا ظاہر ہوگئی ہے پس وہ درست عمل کی طرف لوٹیں جیسا کہ حاکم کا حکم ہوتا ہے۔ دوسرے قول کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا تو ان کے لیے یہ جائز تھا جیسا کہ اگر قبلہ کی سمت میں خطا کر بیٹھیں اور نماز پڑھ لیں تو ان پر اعادہ نہیں ہوتا۔ یہ اولیٰ ہے، کیونکہ انہوں نے وہی کچھ کیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کے اندر لوٹائیں اور اگر وقت نکل چکا ہو تو نہ لوٹائیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ اور فرمایا: وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ یہ احتیاط اور ہتھیار اٹھانے کی صفتیں ہیں تاکہ دشمن اپنی آرزو پوری نہ کرلے اور فرصت کو نہ پائے۔ السلاح اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان جنگ میں اپنا دفاع کرتا ہے۔ عنترہ نے کہا:

کَسَوْتُ الجَعْدَ جعدَ بني أبانٍ سلاحِی بعد عُرْيٍ و أفتضاحٍ

کہتا ہے: میں نے اسے اپنے ہتھیار دیئے تاکہ ان کے ساتھ وہ اپنی حفاظت کرے اس کے بعد کہ وہ ہتھیاروں سے خالی ہو چکا تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ یعنی وہ طائفہ ہتھیار اٹھائے جو دشمن کے سامنے ہے، کیونکہ نماز پڑھنے والا طائفہ جنگ نہیں کر رہا۔ حضرت ابن عباس کے علاوہ علماء نے کہا: نماز پڑھنے والا طائفہ ہتھیار اٹھائے۔ یعنی جو پہلے نماز پڑھنے والے ہیں وہ اپنے ہتھیار اٹھائیں۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے اس نے کہا: یہ احتمال ہے کہ وہ گروہ جس کو نماز میں ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور انہیں اپنے ہتھیار لینے چاہئیں، کیونکہ اسے دشمن کا زیادہ خوف ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم تمام کے لیے ہو، کیونکہ اس میں دشمن کے لیے ہیبت ہوگی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حکم صرف اس گروہ کو ہو جو دشمن کے سامنے ہے۔ ابو عمر نے کہا: اکثر اہل علم اس نماز کے لیے ہتھیار اٹھانا مستحب قرار دیتے ہیں جو خوف میں نماز پڑھ رہا ہو۔ اور وہ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ کے قول کو ندب پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر خوف نہ ہوتا تو اس کا اٹھانا واجب نہ ہوتا پس اس کا امر استحبابی ہے۔ اہل ظاہر نے کہا: نماز خوف میں ہتھیار اٹھانا واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے مگر جسے بارش وغیرہ کی وجہ سے اذیت ہو تو اس کے لیے

واجب نہیں۔ اگر بارش وغیرہ ہو تو اس کے لیے ہتھیار اتارنا جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب وہ نماز پڑھیں تو خوف کے وقت اپنے ہتھیار اٹھائیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور یہ قرآن کی نص ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: وہ ہتھیار نہ اٹھائیں، کیونکہ اگر ان پر ہتھیار اٹھانا واجب ہوتا تو ہتھیار نہ اٹھانے کی صورت میں نماز باطل ہوتی۔ ہم کہتے ہیں: نماز کی وجہ سے ہتھیار اٹھانا واجب نہیں بلکہ ان پر قوت ونظر کی خاطر ہتھیار اٹھانا واجب ہے (1) (یعنی کفار کے سامنے قوت وطاقت کا مظاہرہ ہو)

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا سَجَدُوْا اس میں ضمیر اس گروہ کے لیے ہے جو نماز پڑھ رہا ہے پھر وہ لوٹ جائیں۔ یہ بعض مروی بیانات پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب وہ قضا رکعت کا سجدہ کرلیں اور یہ حضرت سہل بن ابی حثمہ کی ہیئت پر ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ نماز کو کبھی سجدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے اذا دخل احد کم المسجد فلیسجد سجدتین (2) یعنی جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھے۔ یہ سنت ہے اور فَلْيَكُوْنُوْا میں ضمیر احتمال رکھتی ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے سجدہ کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس طائفہ کے لیے ہو جو پہلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑا تھا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کافر خواہش کرتے ہیں کہ تم ہتھیار اٹھانے سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہتھیار اٹھانے کے امر میں حکمت بیان فرمائی اور دوسرے طائفہ میں احتیاط کا ذکر فرمایا جب کہ پہلے کے ساتھ یہ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ دوسرا ہوشیار رہنے اور احتیاط کرنے کا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ دشمن اپنا قصد اس وقت سے مؤخر نہیں کرے گا، کیونکہ یہ نماز کا آخر ہے۔ نیز دشمن کہے گا کہ ہتھیار ان پر بھاری ہوں گی اور وہ تھک چکے ہوں گے۔ اس آیت میں اسباب کو اختیار کرنے کی بہت واضح دلیل موجود ہے اور ہر اس چیز کو اختیار کرنے کی دلیل ہے جو صاحب عقل لوگوں کو نجات دینے والی ہے اور سلامتی تک پہنچانے والی ہے اور دار کرامت تک وصال بخشنے والی ہے۔ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً یعنی ایسا حملہ جو جڑ سے اکھیڑ دے اور اس کے ساتھ دوسرے حملہ کی ضرورت بھی نہ رہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ نماز میں ہتھیار اٹھانے کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے ہم نے پہلے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر واجب نہیں تو احتیاط کے لیے مستحب ہے پھر بارش میں ہتھیار رکھنے کی رخصت دی، کیونکہ اس طرح اندرونی ہتھیار گیلے اور بھاری ہو جائیں گے اور لوہے کو زنگ آلود کردے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: نخلہ وادی کے بطن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے جب مشرکوں کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو مال غنیمت ملا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، وہ بارش والا دن تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیار اتار کر قضا حاجت کے لیے باہر نکل گئے تھے، کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے جدا دیکھا تو غورث بن حارث نے آپ کا قصد کیا وہ اپنی تلوار کے ساتھ پہاڑ سے آپ کی طرف اترا اس نے آپ سے کہا: آج آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ'' دعا کی اللھم اکفنی الغورث بما شئت۔ غورث نے اپنی تلوار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھکایا تاکہ آپ کو مارے تو وہ فوراً پھسل کر منہ کے بل گر پڑا (3)۔ واقدی نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 494 2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 63 3۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 168

ذکر کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے غورث کو سینے پر دھکا دیا جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آئے گا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھائی اور فرمایا: اے غورث! تجھے اب مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: کوئی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو میرے لیے حق کی گواہی دے تو میں تجھے تیری تلوار دے دوں گا۔ غورث نے کہا: نہیں لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اس کے بعد آپ سے نہیں لڑوں گا اور نہ میں آپ کے خلاف کسی دشمن کی مدد کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تلوار دے دی اس وقت بارش میں ہتھیار اٹھانے کی رخصت میں یہ نازل ہوئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک زخم کی وجہ سے بیمار ہو گئے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ہتھیار ترک کرنے اور بارش کے عذر کی وجہ سے دشمن کے لیے تیاری چھوڑنے کی صحابہ کرام کو رخصت دی، پھر انہیں حکم دیا اور فرمایا: وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ یعنی ہوشیار رہو تم نے ہتھیار رکھ دیئے ہوں یا نہ رکھے ہوں۔ یہ تمام حالات میں دشمن سے ہوشیار رہنے اور تیاری کی تاکید پر دلیل ہے، کیونکہ لشکر کو ہمیشہ اسی صورت میں مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ ہوشیاری میں کوتاہی کرتے ہیں۔ ضحاک نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے تحت فرمایا: یعنی اپنی تلواریں لٹکاؤ، کیونکہ یہ جنگ کی ہیئت ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَ لَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۰۴﴾

"جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) پھر جب مطمئن ہو جاؤ (دشمن کی طرف سے) تو ادا کرو نماز (حسب دستور) بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر۔ اور نہ کمزوری دکھاؤ (دشمن) قوم کی تلاش میں اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے اور تم تو امید رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے اس (ثواب) کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، بڑا دانا ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قَضَیْتُمْ اس کا معنی ہے تم نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ قضا کا لفظ اس فعل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو وقت کے اندر کیا جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ** (بقرہ: 200) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز خوف کے بعد ہے (1)، یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو دل اور زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 107، دار الکتب العلمیہ بیروت

خواہ کسی حال میں ہو کھڑے ہو یا بیٹھے ہو یا پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہو۔ تکبیر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور فتح و نصرت کی دعا ہمیشہ کرتے رہو خصوصاً جنگ کی حالت میں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الانفال) جب تم ملو کسی گروہ سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ کا کثرت سے تا کہ تم فلاح پاؤ۔

کہا جاتا ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ کا معنی ہے جب تم دارالحرب میں نماز پڑھو تو سواریوں پر نماز پڑھو یا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پہلو پر لیٹے ہوئے اگر تم قیام کی طاقت نہیں رکھتے، جب خوف ہو یا مرض ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (بقرہ: 239)

اور ایک قوم نے کہا: اس آیت کی مثال آل عمران میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مسجد میں چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ شور کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فرمایا: اس سے مراد فرضی نماز ہے یعنی اگر وہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر نماز پڑھیں اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھو، مراد نفس صلاۃ ہے، کیونکہ نماز اللہ کا ذکر ہے۔ یہ اذکار مفروضہ اور اذکار مسنونہ پر مشتمل ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ جب تم امن میں ہو۔ الطمانینۃ کا معنی ہے خوف سے نفس کا سکون حاصل کرنا۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ تو نماز کو اس کے ارکان کے ساتھ اور سفر میں اس کی کمال ہیئت کے ساتھ اور حضر میں کمال تعداد کے ساتھ ادا کرو۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا یعنی نماز مقررہ وقت پر فرض کی گئی ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: موقوتاً کا معنی ہے تم اسے علیحدہ علیحدہ اپنے وقت میں ادا کرو (1)۔ اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی ہے مخصوص وقت میں فرض کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقته فهو موقوتٌ ووقّته، فهو مؤقت یہ بعینہ زید بن اسلم کا قول ہے یعنی وقت پر کسی کام کو کرنا اور فرمایا: كِتٰبًا مصدر مذکر ہے اسی وجہ سے فرمایا مَّوْقُوْتًا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَهِنُوْا یعنی تم کمزور نہ ہو۔ سورہ آل عمران میں یہ گزر چکا ہے۔ فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ دشمن قوم کی تلاش میں۔ بعض علماء نے کہا: یہ جنگ احد میں نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے مشرکین کا پیچھا کرنے کا حکم دیا، جب کہ مسلمانوں کو زخم لگ چکے تھے۔ یہ امر تھا کہ اس کے ساتھ نہ نکلے مگر جو جنگ میں تھا جیسا کہ سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے بعض نے فرمایا: یہ ہر جہاد کے بارے میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ یعنی تم زخموں کی وجہ سے دکھ محسوس کرتے ہو تو وہ بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں ان زخموں سے جو انہیں پہنچے تھے، لیکن تمہیں فضیلت حاصل ہے تم اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہو وہ اس کی امید نہیں رکھتے، یہ اس لیے کہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی امید نہیں رکھتا اس آیت کی مثال یہ ہے: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (آل عمران: 140) یہ آیت پہلے گزر چکی ہے۔ عبدالرحمن اعرج

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 526

نے اسے ان تکونوا یعنی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی لان۔ منصور بن المعتمر نے ان تکونوا تسلمون پڑھا ہے یعنی تا کے کسرہ کے ساتھ۔ بصریوں کے نزدیک تا میں کسرہ کے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو جائز قرار نہیں دیا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: الرجاء بمعنی خوف ہے کیونکہ جو کسی چیز کی امید رکھتا ہے اس کے حصول کا اسے یقین نہیں ہوتا، پس جس کی وہ امید رکھتا ہے اس کے فوت ہونے کے خوف سے خالی نہیں ہوتا۔ فراء اور زجاج نے کہا: الرجاء بمعنی خوف استعمال نہیں ہوتا(1) مگر نفی کے ساتھ جیسے، الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح) یعنی الله تعالیٰ کی عظمت سے خوف نہیں کرتے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ (الجاثیہ:14) یعنی وہ خوف نہیں کرتے۔ قشیری نے کہا: کلام میں نفی کے بغیر بھی خوف کا ذکر بعید نہیں ہوتا لیکن ان دونوں نے دعویٰ کیا ہے۔ یہ نہیں پایا جاتا مگر نفی کے ساتھ۔ والله اعلم

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ۙ﴿۱۰۵﴾

”بے شک ہم نے نازل کی ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ تاکہ فیصلہ کریں آپ لوگوں میں اس کے مطابق جو دکھا دیا آپ کو الله نے اور نہ بنیے بد دیانت، لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے“۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف، تکریم اور تعظیم کا ذکر ہے اور آپ کو احکام شریعت کے تفویض ہونے کا ذکر ہے اور حکم میں سیدھے راستہ پر چلنے کا حکم ہے اور بنی ابیرق کا معاملہ جو آپ کے پاس لایا گیا تھا اس پر تنبیہ کا ذکر ہے۔ بنی ابیرق یہ تین بھائی تھے بشر، بشیر اور مبشر اور اسیر بن عروہ ان کے چچا کا بیٹا تھا، انہوں نے رات کے وقت حضرت رفاعہ بن زید کے مکان کو نقب لگائی تھی اور اس کی زرہیں اور کھانے کا سامان چرا لیا تھا، پس اس پر آگاہی ہو گئی تھی۔ بعض علماء نے کہا: چور صرف بشیر تھا اس کی کنیت ابو طعمہ تھی اس نے زرہ چوری کی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: زرہ ایک بوری میں تھی جس میں آٹا تھا، آٹا بوری کے سوراخ سے گرتا گیا حتیٰ کہ اس کے گھر تک پہنچ گئے، اس کے بھائی کا بیٹا رفاعہ آیا اس کا نام قتادہ بن نعمان تھا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کی شکایت کی پھر حضرت اسیر بن عروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے ایک اچھے گھرانے کو بدنام کرنے کا قصد کیا ہے، حالانکہ وہ دین دار لوگ ہیں انہوں نے ان مسلمانوں پر بغیر دلیل کے چوری کا الزام لگایا ہے اور چوری میں ملوث کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے جھگڑنے لگے حتیٰ کہ قتادہ اور رفاعہ پر ناراض ہوئے الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔(2) الایۃ۔ آپ ان کی طرف سے نہ جھگڑا کریں جنہوں نے اپنے آپ سے خیانت کی۔ اور یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ مَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓــٴَـةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓــٴًـا جو شخص کمائے کوئی خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو۔

وہ شخص جس پر چوری کی انہوں نے تہمت لگائی تھی وہ لبید بن سہل تھا۔ بعض نے کہا: زید بن سمین تھا۔ بعض نے کہا: ایک

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 112	2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 128

انصاری شخص تھا(1)۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو ابن ابیرق جو چور تھا مکہ کی طرف بھاگ گیا وہ سلافہ بنت سعد بن شہید کے پاس ٹھہرا۔ حضرت حسان بن ثابت نے سلافۃ کے بارے ایک بیت کہا ہے جس میں وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وقد أنزلتْه بنتُ سعد وأصبحتْ ينازعها جلْدَ آستها وتنازعه

ظننتم بأن يَخْفَى الذى قد صنعتمو وفينا نبىُّ عنده الوَحْىُ واضعه

جب سلافۃ کو حضرت حسان کے یہ شعر پہنچے تو اس نے ابن ابیرق کو کہا: تو نے مجھے حسان کے شعر دیے ہیں اس نے اس کا سامان گھر سے باہر پھینک دیا پھر وہ خیبر کی طرف بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا۔ پھر اس نے ایک رات ایک گھر کو نقب لگائی تو اس کی دیوار اس پر گر پڑی اور وہ مرتد ہو کر مر گیا (☆)۔ اس حدیث کو کثیر الفاظ کے ساتھ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو مسند ذکر کیا ہو سوائے محمد بن سلمہ حرانی کے۔ لیث اور طبری نے مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کی موت کا واقعہ یحییٰ بن سلام نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح قشیری نے ذکر کیا ہے اور اس کی ردت کا ذکر کیا ہے۔ پھر بعض نے کہا: زید بن سمین اور لبید بن سہل یہودی تھے۔ بعض نے کہا: لبید مسلمان تھا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ابو عمر نے اسے ''کتاب الصحابہ'' میں داخل کیا ہے۔ یہ چیز ابو عمر کے نزدیک اس کے اسلام پر دلالت کرتی ہے اور بشیر منافق شخص تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور دوسروں کے اشعار کو اپنی طرف منسوب کرتا تھا اور مسلمان کہتے تھے: اللہ کی قسم! یہ خبیث کا شعر ہے اس نے ایک شعر کہا جس میں وہ اسی چیز کا اظہار کرتا ہے:

أو كلما قال الرجالُ قصيدةً نُحلت وقالوا ابنُ الأُبَيْرِقَ قالها(2)

ضحاک نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا اور وہ تسلیم کر چکا تھا یہود ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آئے انہوں نے اسے پکڑا اور اسے بھگا کر لے گئے پس ان کے بارے میں نازل ہوا: هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ۔ یعنی یہود۔

**مسئلہ نمبر2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اس کا معنی شرع کے قوانین پر یہ ہے کہ آپ کو اللہ نے دکھایا یا وحی اور نص کے ذریعے یا اس نظر سے جو وحی کے طریقوں پر جاری ہے۔ یہ قیاس میں اصل ہے یہ دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی رائے قائم فرمائیں تو وہ درست ہو گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ دکھائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی عصمت کا ضامن ہے، ہم میں سے جو کوئی کسی چیز کے بارے کوئی خیال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے گمان ہوتا ہے تو جو اس نے رائے قائم کی ہوتی ہے اس میں قطعیت نہیں ہوتی اور یہاں آنکھ سے دیکھنا مراد نہیں، کیونکہ حکم آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا اور اس کلام میں اضمار ہے یعنی بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اور اس میں دوسرا اضمار ہے اور آپ اس علم کے مطابق احکام جاری فرمائیں جو ہم نے آپ کو عطا کیا لوگوں کے استدلال سے دھوکا کھائے بغیر۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 310

☆ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ اسم فاعل کے معنی میں ہے جیسے تیرا قول ہے جالستہ فانا جلیسہ یہاں فعیل بمعنی مفعول نہیں ہے اس پر دلیل وَ لَا تُجَادِلْ ہے۔ الخصیم جھگڑا کرنے والا۔ خصیم کی جمع خصماء ہے۔ بعض نے فرمایا: خصیم مخاصمًا اسم فاعل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل تہمت کی مدد اور ان کا دفاع کرنے سے منع فرمایا جب کہ ان کے خصم حجت سے بات کر رہے ہیں۔ اس میں دلیل ہے کہ مبطل اور متہم کی طرف سے خصومت میں نیابت جائز نہیں اور کسی کے لیے کسی کی طرف سے جھگڑنا جائز نہیں مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ حق پر ہے۔ پہلے اسی سورت میں یتیموں اور لوگوں کے مال کی حفاظت کے متعلق کلام گزر چکی ہے، اس میں بیان فرمایا کہ کافر کا مال بھی مسلمان کے مال کی طرح محفوظ ہے مگر اس جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے مباح فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** علماء نے فرمایا: جب مسلمانوں کے لیے کسی قوم کا نفاق ظاہر ہو جائے تو مسلمانوں میں سے کسی فریق کا اس منافق قوم کے لیے جھگڑنا مناسب نہیں تاکہ ان کی حمایت کریں اور ان کا دفاع کریں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں واقعہ پیش آیا تھا اور ان کے بارے میں یہ نازل ہوا: وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا اور یہ نازل فرمایا: لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں سے ایسا کرتے ہیں۔ آپ کی ذات مراد نہیں ہے اس کی دو وجوہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا جو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ذکر فرمایا: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان فیصلہ فرمانے والے تھے اسی وجہ سے آپ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا جاتا تھا آپ کسی دوسرے کی طرف عذر پیش نہیں کرتے تھے۔ پس یہ دلیل ہے کہ کسی غیر کا قصد کیا گیا ہے۔

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾

''اور مغفرت طلب کیجئے اللہ سے بےشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

طبری اس معنی کی طرف گئے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس خیال سے استغفار کریں جو آپ نے بددیانت لوگوں کے لیے جھگڑنے کا کیا تھا (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا، کیونکہ آپ نے ان کا دفاع کرنے اور یہودی کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ان کا مذہب ہے جو انبیاء پر صغائر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ گناہ نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر پر دفاع کرنے والے تھے اور آپ ان کی برأت کا نظریہ رکھتے تھے اور معنی یہ ہے کہ آپ اپنی امت کے گنہگاروں کے لیے اور باطل کے لیے جھگڑنے والوں کے لیے استغفار کریں اس کا مقام لوگوں میں اس طرح ہے کہ آپ دعویٰ کرنے والوں کی بات سنیں اور جو دلائل سنیں ان کے مطابق فیصلہ کریں اور آپ گنہگار کے لیے استغفار کریں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تسبیح کے طریقہ پر استغفار کا حکم ہے جیسے کوئی شخص کہتا ہے: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ یہ بطور تسبیح ہوتا ہے اس میں گناہ سے توبہ کا ارادہ نہیں ہوتا۔ بعض

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 309　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 110

نے فرمایا: خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد بنو ابیرق ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب: 1) اور فرمایا: فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ (یونس: 94)

وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًاۚ۝۱۰۷

''اورمت جھگڑیں آپ ان کی طرف سے جو خیانت کرتے ہیں اپنے آپ سے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا اسے جو بڑا بددیانت (اور) بدکار ہے''۔

یعنی آپ ان کی طرف سے نہ جھگڑیں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں یہ اسیر بن عروہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ المجادلۃ کا معنی مخاصمہ (جھگڑنا) ہے۔ یہ جدل سے مشتق ہے اس کا معنی کسی چیز کو بٹنا ہے اسی سے مجدول الخلق مضبوط اور لطیف جسم والا ہے اسی سے ہے الأجدل شکرے کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالۃ سے مشتق ہے اور یہ زمین کی سطح ہے۔ جھگڑنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مخالف کو زمین کی سطح پر پھینکنا چاہتا ہے۔

قد أرکب الحالة بعد الحاله　　وأترُك العاجز بالجَدَاله

مُنْعَفِراً ليست له محاله

الجداله سے مراد زمین ہے اس سے عربوں کا قول ہے ترکتہ مجدلا یعنی زمین پر ڈالا ہوا چھوڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ یعنی اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں فرماتا اور اس کا ذکر بلند نہیں کرتا۔ مَنْ كَانَ خَوَّانًا خود خیانت کرنے والا ہے خوانًا مبالغہ کا وزن ذکر فرمایا ہے یہ صیغہ اس لیے ذکر فرمایا تاکہ اس خیانت کی بڑائی کا ذکر ہو۔

یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا۝۱۰۸ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا۝۱۰۹

''وہ چھپا سکتے ہیں (اپنے ارادے) لوگوں سے لیکن نہیں چھپا سکتے اللہ تعالیٰ سے اور وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی باتوں کا جو پسند نہیں اللہ تعالیٰ کو اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے گھیرے ہوئے ہے۔ سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو کہ جھگڑتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں پس کون جھگڑے گا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی طرف سے قیامت کے دن یا کون ہوگا (اس روز) ان کا وکیل؟''۔

ضحاک نے کہا: جب اس نے چوری کی تو اس نے اپنے گھر میں ایک گڑھا کھودا اور زرہ کو پرنالے کے نیچے رکھ دیا تو یہ آیت نازل ہوئی یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ پر زرہ کی جگہ مخفی نہیں ہے۔ وَ هُوَ مَعَهُمْ یعنی وہ ان کو تاڑنے والا اور ان پر نگہبان ہے۔ بعض نے فرمایا: یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ کا معنی ہے وہ لوگوں سے چھپتے ہیں جیسا کہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ (الرعد:10) یعنی وہ چھپنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ لوگوں سے حیا کرتے ہیں یہ اس لیے، کیونکہ حیا کرنا چھپنے کا سبب ہے۔

وَ هُوَ مَعَهُمْ یعنی علم، رویت اور سمع کے اعتبار سے وہ ان کے ساتھ ہے۔ یہ اہل سنت کا قول ہے۔ جہمیۃ، قدریہ اور معتزلہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، انہوں نے اس آیت سے اور اس کی مثل دوسری آیات سے استدلال کیا ہے، انہوں نے کہا: جب فرمایا: وَ هُوَ مَعَهُمْ تو ثابت ہوا کہ وہ ہر جگہ ہے، کیونکہ اس نے ان کے ساتھ ہونا ثابت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے، کیونکہ یہ اجسام کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ کیا آپ نے بشر (بن غیاث) کے مناظرہ کو اللہ کے قول مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ:7) میں ملاحظہ نہیں کیا جب اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ ہے، تو اس کے مقابل نے اسے کہا: وہ تیری ٹوپی میں، تیری پوستین میں اور تیرے گدھے کے پیٹ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ بلند و بالا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں۔ یہ وکیع نے حکایت کیا ہے۔ يُبَيِّتُوْنَ کا معنی يقولون ہے۔ یہ معنی کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ مَا لَا يَرْضٰى یعنی اللہ تعالیٰ جس کو اپنے اہل طاعت کے لیے پسند نہیں کرتا۔ مِنَ الْقَوْلِ رائے اور اعتقاد میں سے۔ جیسے تیرا قول ہے مذہب امام مالک و امام شافعی۔ بعض نے فرمایا: الْقَوْلِ بمعنی مقول ہے کیونکہ نفس قول کا تو، رات کو مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ اس سے بشیر چور کی قوم ہے جو اسے بھگا کر لے گئے تھے اور اس کی طرف سے جھگڑے تھے۔ زجاج نے کہا: هٰۤؤُلَآءِ بمعنی الذین ہے (1)۔ جٰدَلْتُمْ کا معنی ہے تم جھگڑے۔

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ استفہام ہے اس کا معنی انکار اور توبیخ ہے۔ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا وکیل وہ ہوتا ہے جو امور کی تدبیر کو قائم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تدبیر کو قائم کرنے والا ہے معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عذاب کے ساتھ گرفت میں لے لے گا اور انہیں دوزخ کی آگ میں داخل کر دے گا تو کوئی ان کے معاملہ کو قائم کرنے والا نہ ہوگا۔

وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم والا''۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی ابیرق پر اس آیت کے ساتھ توبہ پیش فرمائی وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا یعنی جو چوری کر بیٹھے اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ یا شرک کر بیٹھے۔ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ زبان سے استغفار بغیر توبہ کے نفع مند نہیں۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ آل عمران میں بیان کر دیا ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ آیت وحشی کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت حمزہ کا قاتل تھا اس نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا تھا اور حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1 صفحہ 115

اور کہا: میں شرمندہ ہوں، کیا میرے لیے توبہ ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ الایہ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے مراد عموم ہے اور تمام مخلوق کو شامل ہے۔ سفیان نے ابواسحاق سے انہوں نے اسود اور علقمہ سے روایت کی ہے ان دونوں حضرات نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: جس نے سورۂ نساء کی یہ دو آیتیں پڑھیں پھر استغفار کیا تو اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ (1) وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۲) وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کے ساتھ نفع دیتا تھا جتنا وہ چاہتا تھا اور جب میں کسی دوسرے سے کوئی بات سنتا تھا تو میں اس سے حلف لیتا تھا اور مجھے حضرت ابوبکر نے بیان کیا اور حضرت ابوبکر نے سچ کہا، انہوں نے فرمایا: جس شخص سے کوئی گناہ ہو جائے پھر وہ وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو اسے بخش دیا جائے گا پھر یہ آیت تلاوت کی (1)۔ وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا الخ۔

وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

''اور جو کمائے گناہ کو تو وہ کماتا ہے اسے اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے۔ اور جو شخص کمائے کوئی خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو تو اس نے اٹھالیا (بوجھ) بہتان کا اور کھلے گناہ کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا یعنی جس نے گناہ کیا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ اس کا انجام اس کی طرف لوٹنے والا ہے۔ الکسب کا مطلب ہر وہ عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو نفع پہنچاتا ہے یا اس کے ذریعے کسی ضرر کو دور کرتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فعل کو کسب نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا۔ بعض علماء نے فرمایا: خَطِيْٓئَةً اور اِثْمًا دونوں کا ایک معنی ہے۔ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکیداً مکرر فرمایا۔ طبری نے کہا: الخطیئۃ اور الاثم کے درمیان فرق ہے۔ خطیئۃ کبھی ارادۃً ہوتی ہے اور کبھی بغیر ارادہ کے ہوتی ہے اور اثم عمداً ہوتا ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: الخطیئۃ وہ ہوتی ہے جس میں ارادہ نہ ہو جیسے قتل خطا۔ بعض نے فرمایا: الخطیئۃ چھوٹا گناہ ہوتا ہے اور الاثم بڑا گناہ ہوتا ہے۔ اس آیت کا لفظ عام ہے اس کے تحت تمام لوگ شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا البری کا اسم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بِهٖ کی ضمیر الاثم یا الخطیئۃ کے لیے ہے، کیونکہ اس کا معنی بھی الاثم ہے یا دونوں کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الکسب کی طرف راجع ہے فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ یہ تشبیہ ہے، کیونکہ گناہ بوجھ اور ثقل ہوتے ہیں یہ محمولات کی طرح ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت:13)

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب الاستغفار، حدیث نمبر 1300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 319

البھتان، البھت سے ہے، اس کا مطلب ہے تو اپنے بھائی پر کوئی تہمت لگائے جب کہ وہ اس سے بری ہو۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے''؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بھائی کا ایسی چیز کے ساتھ ذکر کرنا جو اسے ناپسند ہے''۔ کسی نے کہا: اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو پھر؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اس میں وہ بات ہے جو تو کہتا ہے تو یہ غیبت ہے اور اگر اس میں وہ بات نہ ہو اور تو اسے کہے تو وہ بہتان ہے'' (1)۔ یہ نص ہے، بری کو تہمت لگانا یہ بہتان ہے۔ کہا جاتا ہے: بَھَتَہ، بَھْتا و بُھتانا جب کوئی کسی کے بارے میں ایسی بات بیان کرے جب کہ اس نے کی نہ ہو۔ وہ شخص بہات ہوگا اور جس کے لیے بات کی گئی وہ مبہوت ہے۔ کہا جاتا ہے: بھت الرجل جب کوئی حیران و ششدر ہو جائے۔ اور بہت (عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ) اس کی مثل ہے اور ان دونوں سے افصح بہت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (بقرہ: 258) کیونکہ کہا جاتا ہے: رجلٌ مبہوت، اور باہِت اور بَہِیت نہیں کہا جاتا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر اور اس کی رحمت تو تہیہ کر لیا تھا ایک گروہ نے ان سے کہ غلطی میں ڈال دیں آپ کو اور نہیں غلطی میں ڈال رہے مگر اپنے آپ کو اور نہیں ضرر پہنچا سکتے آپ کو کچھ بھی اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ، لَوْلَا کے بعد سیبویہ کے نزدیک مبتدا مرفوع ہوتا ہے اور خبر محذوف ہوتی ہے ظاہر نہیں ہوتی معنی یہ ہے کہ اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی کہ ہم نے تجھے حق پر آگاہ کیا۔ بعض نے فرمایا: نبوت اور عصمت عطا کر کے رحمت و فضل نہ کیا جاتا، تو ایک گروہ نے تجھے حق سے ہٹانے کا قصد کر لیا تھا، کیونکہ سوال کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ ابن ابیرق کو تہمت سے بری کر دیں اور وہ تہمت یہودی پر ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل فرمایا کہ انہیں اس واقعہ کی حقیقت پر آگاہ فرمایا اور اس کا علم عطا فرمایا۔ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ کیونکہ وہ گمراہوں جیسے اعمال کرتے تھے۔ ان کے اعمال کا وبال ان پر لوٹے گا۔ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ کیونکہ آپ معصوم ہیں۔ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ اس سے کلام کا آغاز ہو رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: واؤ حال کے لیے ہے جیسے تیرا قول ہے: جئتك والشمس طالعة میں تیرے پاس آیا جب کہ سورج طلوع ہو چکا تھا اسی سے امرء القیس کا قول ہے:

وقد أغتدي والطير في وكناتها

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، جلد 2، صفحہ 322

پس کلام متصل ہے یعنی وہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اس کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے۔ وَالْحِكْمَةَ وحی کے ذریعے فیصلہ۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ یعنی شرائع اور احکام اور تعلم محل نصب میں ہے، کیونکہ وہ کان کی خبر ہے اور جزم کی وجہ سے نون سے ضمہ حذف کیا گیا ہے اور واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

''نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا صلح کرانے کا لوگوں میں اور جو شخص کرے یہ کام اللہ کی رضامندیاں حاصل کرنے کے لیے تو ہم عطا فرمائیں گے اسے اجر عظیم''۔

اس سے مراد بنی ابیرق کی قوم ہے جس نے جو تدبیر کی تھی۔ اور انہوں نے وہ تدبیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تھی۔ النجوی دو آدمیوں کے درمیان سرگوشی کرنا ہے۔ تو کہتا ہے: ناجیت فلاناً مناجاۃ و نجاء وھم ینتجون و یَتَناجَوْن و نَجَوْت فلاناً أنجوہ نَجْواً اس کا معنی ہے سرگوشی کرنا۔ نجوی یہ نجوت الشی سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے خاص کیا، میں نے اسے علیحدہ کیا۔ النجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے اردگرد کی زمین سے بلند ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَمَنْ　بِنَجْوتِه　كمن　بِعَقْوتِهِ　　والمُسْتَكِنِ كمن يَمْشِي بِقِرْواحِ(1)

پس نجوی کا معنی سرگوشی کرنا ہے۔ یہ مصدر ہے جماعت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: قوم عدل و رضاً۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ (الاسراء: 47) پہلی صورت میں غیر جنس سے استثنا ہوگی اور وہ استثنا منقطع ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ من محل رفع میں ہوگا یعنی إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔ لیکن جو صدقہ کا حکم دے یا نیکی کا حکم دے یا لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور نیکی کی طرف بلائے تو ایسی سرگوشی میں بھلائی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ من محل جر میں ہو تقدیر کلام اس طرح ہو: لا خیر فی کثیر من نجواھم إلا نجوی من أمر بصدقۃ پھر اس کو حذف کیا گیا۔ دوسری صورت میں یعنی جب نجوی علیحدہ جماعت کا اسم ہو تو من بدل کی حیثیت سے محل جر میں ہوگا۔ یعنی: لا خیر فی کثیر من نجواھم الا فیمن امر بصدقۃ۔ یا جس نے کہا: ما مررت باحد إلا زیداً اس کے قول پر محل نصب میں ہوگا۔ بعض مفسرین نے کہا: ان میں سے زجاج بھی ہے۔ نجوی پوری جماعت کا کلام ہے یا دو آدمیوں کا کلام ہے خواہ وہ سرگوشی سے ہو یا جہراً ہو(2)۔ اس میں بعد ہے۔ واللہ اعلم۔ المعروف کا لفظ تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔ مقاتل نے کہا: المعروف سے یہاں مراد فرض ہے(3)۔ اور پہلا قول اصح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نیکی صدقہ ہے اور یہ بھی نیکی میں سے ہے کہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معروف اپنے اسم کی طرح ہے، سب سے پہلے قیامت کے روز جنت میں معروف (نیکی) اور معروف والے (نیکی کرنے والے) داخل ہوں گے''۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ناشکرے کی ناشکری تجھے نیکی سے دور نہ کرے، کبھی ناشکرے کے کئی گنا انکار کے باوجود شکر گزار شکر کرتا ہے۔ حطیئۃ نے کہا:

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 119　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 120

من يفعل الخير لا يعدم جوازِيَه لا يذهبُ العُرْفُ بين الله والناسِ

اورریاشی نے یہ شعر کہا ہے:

يَدُ المعروفِ غَنَمٌ حيث كانت تحتملها كَفورٌ او شكورُ

ففي شكر الشكور لها جزاء وعند الله ما كفر الكفوُر

ماوردی نے کہا: جو شخص نیکی کرسکتا ہے وہ نیکی کرنے میں جلدی کرے اور اس سے محروم ہونے سے بچے اور اس سے عجز کے خوف سے نیکی کرنے میں جلدی کرے اور اسے جاننا چاہیے کہ یہ اس کے زمانہ کی فرصتوں میں سے ہے اور اس کے امکان کی غنیمتوں سے ہے، کوئی قادر شخص نیکی میں سستی نہ کرے، کتنے ہی قدرت پر اعتماد کرنے والے لوگوں سے نیکی فوت ہوگئی اور پھر اس نے شرمندگی کا وارث بنایا، اس پر قدرت کے باوجود زائل ہوگئی اور خجالت کا وارث بنادیا، جیسا کہ شاعر نے کہا:

ما زلت أسمع كم من واثق خجل حتى أبتليت فكنت الواثق الخجلا

اگر اپنے زمانہ کے مصائب کو بھانپ لیا جاتا اور اپنے امر کے عواقب سے محفوظ ہوا جاتا تو اس کی غنیمتیں ذخیرہ شدہ ہوتیں اور اس کے واجبات ضرور ادا کیے جاتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس پر نیکی کا دروازہ کھولا گیا تو وہ اس کو غنیمت جانے، کیونکہ اسے معلوم نہیں کب بند ہوجائے؟'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر چیز کا پھل ہوتا ہے اور نیکی کا پھل جلدی کرنا ہے'' (2)۔ نوشیروان سے کہا گیا: تمہارے نزدیک بڑی سے بڑی مصیبت کیا ہے؟ اس نے کہا: تجھے نیکی پر قدرت ہو اور اسے نہ کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہوجائے۔ عبدالحمید نے کہا: جس نے فرصت کو اس کے وقت سے مؤخر کیا تو اسے اس کے فوت ہونے کا یقین ہونا چاہیے۔ بعض شعراء نے کہا:

اذا هبّتْ رياحُكَ فاغْتَنِمها فإنّ لكل خافِقة سُكُون

ولا تغفل عن الإحسان فيها فما تدرى السكون متى يكون

جب تیری صحت وخوشحالی کی ہوائیں چل رہی ہوں تو اس کو غنیمت جان، کیونکہ ہر حرکت کرنے والی چیز کے لیے سکون ہے اور اسی حالت میں احسان سے غافل نہ ہو تجھے معلوم نہیں کہ سکون کب ہوجائے گا؟۔

بعض ذوی المحرمات نے ایک والی کو لکھا جس نے اپنی حرمت کی رعایت میں سستی کی تھی:

أعَلَى الصراط تريد رعْية حرمتى أم فى الحساب تمنّ بالإنعام

للنفع فى الدنيا أريدك فانتبه لحوائجى من رقدة النوام

کیا تو اپنی حرمت کی رعایت کا پل صراط پر ارادہ رکھتا ہے یا تو حساب کے دن انعام کے ساتھ احسان کرے گا۔ میں تجھ سے دنیا میں نفع لینے کا ارادہ کرتی ہوں تو میری حاجات کو پورا کرنے کے لیے نیند سے بیدار ہو۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نیکی مکمل نہ ہوگی مگر تین خصلتوں کے ساتھ: اس کو جلدی کرنا اور اس کو تھوڑا سمجھنا اور اس کو

---

1۔ ابن مبارک، الزہد، صفحہ 117 2۔ ماوردی ادب الدنیا والدین، صفحہ 186

پوشیدہ رکھنا۔ جب تو نیکی کو جلدی کرے گا تو تو اسے بہتر کرے گا، جب تو اسے چھوٹا سمجھے گا تو تو اسے عظیم کرے گا، جب تو اسے چھپائے گا تو تو اسے مکمل کرے گا۔ کسی شاعر نے کہا:

زاد معروفك عندی عظما إنه عندك مستور حقیر

تتناساه كأنْ لم تأته وهو عند الناس مشهور خطیر

میرے نزدیک تیری نیکی نے تیری عظمت کو زیادہ کیا، وہ تیرے نزدیک پوشیدہ اور حقیر ہے، تو اسے بھول جا گویا تو نے وہ نیکی کی ہی نہیں جب کہ وہ لوگوں کے نزدیک مشہور اور عظیم ہو۔

نیکی کی شرط میں یہ ہے کہ اس پر احسان نہ جتلایا جائے اور اپنے اچھے فعل پر تکبر نہ کیا جائے، کیونکہ ان دونوں صورتوں میں شکر کا اسقاط ہے اور اجر کا ضیاع ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَیْنَ النَّاسِ یہ خونوں کے تنازعے ختم کرنے اور مال اور عزت کے جھگڑے سب کو شامل ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور فتنہ وفساد بھڑکانے کا باعث ہو اور ہر اس کلام کو شامل ہے جس سے مراد رضا الٰہی ہو۔

حدیث پاک میں ہے: ''ابن آدم کا سارا کلام اس کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف حجت ہے مگر جو نیکی کا حکم دینے، برائی سے منع کرنے اور اللہ کے ذکر کے لیے ہو'' (1)۔ جس نے ریاکاری اور سردار بننے کو طلب کیا وہ ثواب نہیں پائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا: جھگڑے والوں کو لوٹاؤ حتیٰ کہ وہ آپس میں صلح کر لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ ان کے درمیان کینہ پیدا کرتا ہے۔ مزید سورۂ مجادلہ میں مناجات کی حرام صورتوں کا ذکر آئے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جس نے دو شخصوں کے درمیان صلح کرائی اللہ تعالیٰ اسے ہر کلمہ کے عوض ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوایوب سے فرمایا: ''کیا میں تمہاری ایسے صدقہ پر راہنمائی نہ کروں جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں؟ (وہ یہ ہے) لوگوں کے درمیان صلح کرانا جب وہ ان میں فساد پیدا ہو جائے اور ان کے درمیان قرب پیدا کرنا جب وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں'' (2)۔ اوزاعی نے کہا: اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدم، اس قدم سے زیادہ محبوب نہیں جو جھگڑنے والوں کے درمیان صلح کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ اور جس نے دو آدمیوں کے درمیان صلح کرائی اللہ تعالیٰ اس کے لیے آگ سے برأت لکھ دے گا۔ محمد بن منکدر نے کہا: دو آدمی مسجد کے کونے میں جھگڑے، میں ان کی طرف مائل ہوا اور میں ان کے ساتھ صلح کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ انہوں نے صلح کر لی۔ حضرت ابوہریرہ نے کہا: جو کہ مجھے دیکھ رہے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ''جو دو شخصوں کے درمیان صلح کرائے گا وہ شہید کے ثواب کا مستحق ہوگا''۔ یہ تمام اخبار ابو مطیع مکحول بن مفضل نسفی نے اپنی کتاب ''اللؤلئیات'' میں ذکر کی ہیں، میں

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 64۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان فی اصلاح بین الناس، جلد 7، صفحہ 490، حدیث نمبر 11094

نے اس کو مصنف کے خط سے ایک ورقہ میں پایا انہوں نے ان کے اصل پر آگاہ نہیں کیا۔

ابْتِغَآءَ مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

''اور جو شخص مخالفت کرے (اللہ کے) رسول کی اس کے بعد کہ روشن ہوگئی اس کے لیے ہدایت کی راہ اور چلے اس راہ پر جو الگ ہے مسلمانوں کی راہ سے تو ہم پھرنے دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے اور ڈال دیں گے اسے جہنم میں اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا جتنے جرائم ہوں جس کے لیے چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہرائے (کسی کو) اللہ کے ساتھ وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے فرمایا: یہ دونوں آیات ابن ابیرق چور کے سبب سے نازل ہوئیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا اور وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا تھا اور مرتد ہوگیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب وہ مکہ میں گیا تو مکہ میں ایک گھر کو نقب لگائی اسے مشرکین نے پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

ضحاک نے کہا: قریش کے چند لوگ مدینہ طیبہ آئے اور اسلام قبول کیا، پھر مرتد ہو کر مکہ کی طرف لوٹ گئے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ۔ المشاقة کا معنی دشمنی کرنا ہے۔ یہ آیت اگرچہ زرہ چوری کرنے والے یا اس کے علاوہ کے بارے میں نازل ہوئی لیکن یہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو مسلمانوں کے طریق کی مخالفت کرتا ہے۔ الْهُدٰى سے مراد رشد اور بیان ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کہا جاتا ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو مرتد ہوا تھا۔ اس کا معنی ہے ہم اسے اور جس کی وہ عبادت کرتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ مجاہد سے مروی ہے کہ ہم اسے ان بتوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو نہ نفع دیتے ہیں، نہ نقصان دیتے ہیں۔ اور یہ مقاتل کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کا ارشاد ابن ابیرق کے بارے میں نازل ہوا۔ جب اس کا حال اور اس کی چوری ظاہر ہوگئی تو وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا اور مرتد ہوگیا، اس نے مکہ میں ایک شخص کی دیوار میں نقب لگائی جسے حجاج بن علاط کہا جاتا تھا، پس اس پر دیوار گرگئی اور وہ نقب میں موجود تھا حتیٰ کہ وہ اسی حال میں پایا گیا، لوگوں نے اسے مکہ سے نکالا وہ شام کی طرف چلا گیا۔ اس نے قافلہ کے اموال چوری کیے انہوں نے اسے پتھر مار مار کر قتل کر دیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

عاصم، حمزہ اور ابو عمرو نے نُوَلِّهٖ و نُصْلِهٖ کو ھا کے جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ کے ارشاد میں علماء نے فرمایا: اجماع کے قول کی صحت پر دلیل ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ میں خوارج کا رد ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس مفہوم پر کلام گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: قرآن میں کوئی آیت مجھے اس آیت سے زیادہ محبوب نہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ ابن فورک نے کہا: ہمارے اصحاب کا اجماع ہے کہ دوزخ میں ہمیشہ رہنا صرف کافر کے لیے ہے اور اہل قبلہ میں سے فاسق جب بغیر توبہ کے مرجائے گا تو اسے آگ کا عذاب دیا جائے گا، پھر وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے یا ابتداءً اللہ کی رحمت سے آگ سے نکل جائے گا۔ ضحاک نے کہا: ایک بوڑھا بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! میں بوڑھا ہوں گناہوں اور خطاؤں میں غرق ہوں لیکن میں نے جب سے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کیا اور اس پر ایمان لایا میں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ میرا اللہ کی بارگاہ میں کیا حال ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔(1)

اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾

''نہیں عبادت کرتے یہ مشرک اللہ کے سوا مگر دیویوں کی اور نہیں عبادت کرتے مگر شیطان سرکش کی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ یعنی من دون اللہ، اِلَّاۤ اِنٰثًا یہ اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان نافیہ بمعنی ما ہے۔ اِنٰثًا سے مراد بت ہیں یعنی لات، عزیٰ اور مناۃ۔ ہر قبیلہ کا ایک بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے اور کہتے تھے: انثی بنی فلاں یہ حسن اور حضرت ابن عباس کا قول ہے (2)، ہر بت کے ساتھ اس کا شیطان ہوتا تھا وہ بتوں کے مجاوروں اور کاہنوں کو نظر آتا اور ان سے کلام کرتا۔ یہ کلام بطور تعجب ذکر کی گئی ہے، کیونکہ ہر جنس سے مونث کمزور اور گھٹیا ہوتی ہے۔ پس یہ ان لوگوں کی جہالت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پتھروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کا نام مونث رکھتے ہیں یا اس کے بارے عقیدہ مونث کا رکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّاۤ اِنٰثًا سے مراد موات (مردے) ہیں، کیونکہ مردوں میں روح نہیں ہوتی (3)، جس طرح لکڑی اور پتھر ہوتا ہے۔ موات کے متعلق اسی طرح خبر دی جاتی ہے جس طرح مونث کے متعلق خبر دی جاتی ہے، کیونکہ قدر و منزلت میں یہ برابر ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: الاحجار تعجبنی اور اسی طرح تو کہتا ہے: المرأۃ تعجبنی۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّاۤ اِنٰثًا سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ مشرکوں نے کہا: ملائکہ (نعوذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں ہیں یہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارشی ہیں۔ یہ ضحاک سے مروی ہے (4)۔ حضرت

---

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 121　2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 365
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529

ابن عباس کی قرأت الا وثنا واؤ اور ثا کے فتحہ کے ساتھ اسم جنس کے افراد کی بنا پر ہے۔ وثنا واؤ اور ثا کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے یہ وثن کی جمع ہے اور اوثان بھی وثن کی جمع ہے جیسے اسد اور آساد ہے۔ نحاس نے کہا: میری معلومات کے مطابق اس کے ساتھ نہیں پڑھا گیا۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے ذکر فرمایا، ہمیں میرے باپ نے بتایا، انہوں نے کہا ہمیں نصر بن داؤد نے بتایا، انہوں نے کہا ہمیں ابوعبید نے بتایا اور انہوں نے کہا ہمیں حجاج نے بتایا، انہوں نے جریج سے روایت کیا، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے وہ اس طرح پڑھتی تھیں: اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنْثًا۔ (1) حضرت ابن عباس نے اسے الا أُثُنًا پڑھا ہے گویا وثن کی جمع وثان بنائی گئی جیسے تو کہتا ہے: حمل و حمال پھر وثن کی جمع وثان بنائی گئی جیسے تو کہتا ہے: مثال اور مُثُل۔ پھر واؤ کو ہمزہ سے بدلا گیا جب اسے ضمہ دیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ (المرسلات) یہ الوقت سے ہے پس اثن جمع الجمع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الا أُنُثًا جمع أَنِيث پڑھا ہے جیسے غَدِیر وغُدُر۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ یہ اناث کی جمع ہے جیسے ثمار کی جمع ثُمُر ہے (2)۔ یہ قرأت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوعمر والدانی نے حکایت کی ہے اور فرمایا: حضرت ابن عباس، حسن اور ابوحیوہ نے اس کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾ اس سے مراد ابلیس ہے، کیونکہ انہوں نے اس کی اطاعت کی جو اس نے انہیں مزین کر کے دیا پس انہوں نے گویا اس کی عبادت کی۔ اس کی مثال معنی میں یہ ہے: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: 31) یعنی جو انہوں نے انہیں حکم دیا اس کی انہوں نے اطاعت کی یہ مطلب نہیں کہ بلاواسطہ ان کی عبادت کی۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

شیطان کے لفظ کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ المرید سے مراد سرکش اور نافرمان ہے۔ یہ فعیل کا وزن ہے یہ مَرَدَ سے مشتق ہے جس کا معنی نافرمانی کرنا ہے۔ المرید اطاعت سے نکلنے والا۔ مرد الرجل یمرد مرودا جب کوئی نافرمانی کرے اور اطاعت سے نکل جائے، فھو مارد، مرید و متمرد۔ ابن عرفہ نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا شر ظاہر ہو۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شجرۃ مرداء وہ درخت جس کے پتے جھڑ جائیں اور اس کی لکڑیاں ظاہر ہو جائیں اور اسی سے رجل امرد کہا جاتا ہے جس کے رخساروں سے بالوں کی جگہ ظاہر ہو۔

## لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

"لعنت کی ہے اس پر اللہ نے اور اس نے کہا تھا کہ میں ضرور لوں گا تیرے بندوں سے (اپنا) حصہ مقرر"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَّعَنَهُ اللّٰهُ، اللعن کا اصل معنی دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور عرف میں ایسا دور کرنا ہے جو ناراضگی اور غضب کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ ابلیس پر تعیین کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے اسی طرح وہ کفار جو مر چکے ہیں مثلاً فرعون، ہامان اور ابوجہل ان پر تعیین کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے اور رہے زندہ لوگ تو ان کے بارے میں کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 121 2۔ تفسیر طبری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۝ یہ شیطان نے کہا تھا یعنی میں اپنی گمراہ کن چالوں کے ساتھ ان کو تیری اطاعت سے نکالوں گا اور اپنی گمراہی کے ساتھ انہیں گمراہ کروں گا۔ یہ کفار اور نافرمان لوگ ہیں۔ خبر میں ہے" ہر ہزار میں سے ایک اللہ کے لیے ہوگا باقی شیطان کے لیے ہوں گے" (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے۔ اس کی تائید کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا قیامت کے روز حضرت آدم کو یہ کہنا کہ" آگ کا حصہ نکالو"۔ حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے، آگ کا حصہ کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے" (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ بعث النار وہ شیطان کا حصہ ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد لوگوں کا بہت سی اشیاء میں شیطان کی اطاعت کرنا ہے مثلاً بچے کی ولادت کے وقت وہ ایک کیل لگاتے تھے اور ساتویں دن اسے گھماتے تھے اور کہتے تھے: یہ اس لیے ہے تاکہ گھروں میں رہنے والے جن اسے جان لیں۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا۝

"میں ضرور انہیں گمراہ کردوں گا اور میں ضرور انہیں جھوٹی امیدوں میں رکھوں گا اور میں ضرور حکم دوں گا انہیں پس وہ ضرور چیریں گے جانوروں کے کان اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ بدل ڈالیں گے اللہ کی مخلوق کو اور جو شخص بنا لے شیطان کو (اپنا) دوست اللہ کو چھوڑ کر تو نقصان اٹھایا اس نے کھلا نقصان"۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ یعنی میں انہیں ہدایت کے راستہ سے پھیروں گا۔ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ یعنی ان کے لیے جھوٹی امیدیں مزین کروں گا۔ یہ کسی ایک تمنا پر منحصر نہیں، کیونکہ ہر ایک اپنی رغبت اور قرائن حال کے اعتبار سے خواہش و تمنا کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میں انہیں لمبی زندگی کی امید دلاؤں گا کہ خیر تو بہ اور معرفت حاصل کرنے کا بڑا وقت باقی ہے نیز انہیں گناہوں پر اصرار کی امید دلاؤں گا۔ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ، البتك کا معنی کاٹنا ہے اسی سے ہے سیف باتك کاٹنے والی تلوار۔ یعنی شیطان نے کہا: میں انہیں بحیرہ، سائبہ اونٹنیوں کے کان کاٹنے پر برانگیختہ کروں گا جیسے بتکہ و بتّکہ۔ مخففاً و مشدداً وفی یدہ بِتْكَةٌ یعنی اس کے ہاتھ میں ٹکڑا ہے، اس کی جمع بِتَك ہے۔ زہیر نے کہا:

طارت وفی کفه من ریشها بِتَكُ

وہ اڑی جب کہ اس کی ہتھیلی میں اس کے پروں کے ٹکڑے تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ یہ تمام لام قسم کے لیے ہیں۔ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ تبدیلی اور تغیر کس طرف راجع ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد خصی کرنا، آنکھ پھوڑنا اور کان کاٹنا ہے۔ یہ معنی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 159
2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، جلد 2، صفحہ 967۔ حدیث نمبر 3099، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس، حضرت انس، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو صالح نے بیان کیا ہے (1)۔ ان تمام صورتوں میں حیوان کو تکلیف دینا ہے اور سرکشی کے ساتھ حلال کرنا اور حرام کرنا ہے اور یہ قول بغیر حجت اور دلیل کے ہے۔ جانوروں میں کان باعث جمال اور منفعت ہیں، اسی طرح دوسرے اعضاء ہیں۔ اسی وجہ سے شیطان نے دیکھا کہ وہ اس کے ذریعے اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرے۔ عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے "میں نے اپنے بندوں کو حق کی پیروی کرنے والا پیدا کیا پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہیں اپنے دین سے دور کر دیا، میں نے جن چیزوں کو ان کے لیے حلال کیا تھا اسے انہوں نے حرام کر دیا اور شیاطین نے انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرائیں جس کے متعلق میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور شیاطین نے انہیں حکم دیا کہ وہ تخلیق کو بدل دیں" (2)۔ اس حدیث کو قاضی اسماعیل نے اور مسلم نے تخریج کیا ہے۔ اور اسماعیل نے روایت کیا کہ ہمیں ابوالولید اور سلیمان بن حرب نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے بیان کیا، انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا، انہوں نے ابوالاحوص سے روایت کیا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جب کہ میری ہیئت بڑی خراب تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تیرے پاس مال ہے؟" اس نے کہا: میں نے عرض کی: میرے پاس مال تو ہے۔ آپ نے کہا: "کون سا مال ہے"؟ میں نے کہا: گھوڑے، اونٹ، غلام ہر قسم کا مال ہے۔ ابوالولید نے کہا: اس نے بکریوں کا بھی ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے تجھے مال عطا کیا ہے تو تجھ پر اس کا اثر دکھائی دینا چاہیے"۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تیری قوم کی اونٹنیاں صحیح کانوں والے بچے جنم دیتی ہیں پھر تو نشتر کا قصد کرتا ہے اور اس سے ان کے کان کاٹ دیتا ہے اور تو کہتا ہے: یہ بحر ہے۔ اور تو ان کی کھالوں کو چیرتا ہے اور تو کہتا ہے: صرم ہے۔ یہ اس لیے کرتا ہے تاکہ تو انہیں اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر حرام کر دے"؟ اس نے کہا: ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جو تجھے عطا فرمایا وہ حلال ہے اور اللہ تعالیٰ کا نشتر تیرے نشتر سے زیادہ تیز ہے اور اللہ تعالیٰ کی کلائی تیری کلائی سے زیادہ سخت ہے"۔ اس نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ بتایئے ایک شخص کے پاس میں جاتا ہوں، وہ میری مہمان نوازی نہیں کرتا، پھر وہ میرے پاس آتا ہے کیا میں اس کی مہمان نوازی کروں یا میں بھی اس جیسا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "(نہیں) بلکہ تو اس کی مہمان نوازی کر" (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب یہ شیطان کے فعل اور اس کے اثر سے تھا تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ "ہم جانور کی آنکھوں اور کانوں کو خصوصی طور پر دیکھیں اور ہم کانا جانور قربانی کے لیے نہ دیں اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان کی طرف کٹی ہوئی ہو اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان کا آخری حصہ کٹا ہوا ہو۔ اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کانوں کو نشان لگانے والے آلے نے کاٹا ہو اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان چیرے گئے ہوں" (4)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 530

2۔ صحیح مسلم، الجنۃ و صفۃ نعیمھا و اھلھا، جلد 2، صفحہ 385

3۔ المستدرک للحاکم، کتاب اللباس، جلد 4، صفحہ 201، حدیث نمبر 64

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، جلد 2، صفحہ 32

کانوں میں عیب کا علماء کے نزدیک اعتبار ہے۔ امام مالک اور لیث نے کہا: اگر ایسا جانور ہو جس کے کان کٹے ہوئے ہوں یا زیادہ کٹے ہوئے ہوں تو اس کی قربانی جائز نہیں اور نشان لگانے والے آلے سے جو تھوڑا سا چیرا گیا ہو وہ جائز ہے۔ یہ امام شافعی اور فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اگر ایسا جانور ہو جس کے پیدائشی کان نہ ہوں تو امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اس کی قربانی جائز نہیں اگر چھوٹے چھوٹے کان ہوں تو جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر4**۔ جانوروں کو خصی کرنا اس کی اہل علم میں سے ایک جماعت نے اجازت دی ہے جب کہ اس سے منفعت کا قصد کیا گیا ہو خواہ وہ موٹاپے کی غرض سے ہو یا کوئی اور غرض ہو۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ خصی کی قربانی دینے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے جب کہ وہ دوسرے جانوروں سے زیادہ موٹا ہو(1)۔ اور گھوڑوں کو خصی کرنے کی رخصت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دی تھی حضرت عروہ بن زبیر نے اپنے خچر کو خصی کیا تھا۔

امام مالک نے بکرے کو خصی کرنے کی رخصت دی ہے۔ یہ جائز ہے، کیونکہ اس سے حیوان کو ایسے بت کے دین کے ساتھ معلق کرنے کا قصد نہیں کیا جاتا جس کی عبادت کی جاتی ہے اور نہ اس میں ایسے رب کے دین کی وجہ سے معلق کرنے کا قصد کیا جاتا ہے جس کی توحید بیان کی جاتی ہے اس میں تو صرف عمدہ گوشت حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے اور مذکر کو تقویت دینے کا قصد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس سے مونث کی اس کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ بعض علماء نے خصی کرنے کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''خصی وہ لوگ کرتے ہیں جو بے علم ہیں'' (2)۔ ابن المنذر نے اس کو پسند کیا ہے اس نے کہا: کیونکہ یہ ارشاد حضرت ابن عمر سے ثابت ہے وہ فرماتے ہیں: یہ اللہ کی تخلیق میں سے ہے۔ عبدالملک بن مروان نے اس کو ناپسند کیا ہے۔

اوزاعی نے کہا: لوگ ہر اس چیز کو خصی کرنا مکروہ جانتے تھے جس کی نسل چلتی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اس میں دو حدیثیں ہیں: ایک حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بکرے، بیل اور گھوڑے کو خصی کرنے سے منع فرمایا(3)، اور دوسری حدیث حضرت ابن عباس کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زندہ چیز کو باندھ کر اس پر تیر اندازی کرنے اور جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرمایا(4)۔ مؤطا میں اس باب سے وہ ہے جو امام مالک نے نافع عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے کہ وہ خصی کرنے کو ناپسند کرتے تھے فرماتے تھے: اس میں تخلق کی تکمیل ہے۔ ابو عمر نے کہا: خصی نہ کرنے میں تخلیق کا تمام ہے اور تخلیق کا بڑھنا بھی روایت ہے(5)۔

میں کہتا ہوں: ابو محمد نے عمر بن اسماعیل عن نافع عن ابن عمر سے مسند روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ''ان جانوروں کو خصی نہ کرو جو اللہ کی تخلیق کو بڑھاتے ہیں'' (6)۔ اس حدیث کو دار قطنی نے اپنے شیخ سے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں ابو عبداللہ معدل نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں عباس بن محمد نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں ابو مالک نخعی نے بیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 114 — 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 314

3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب کراھیة خصاء الغنم والبہائم، جلد 10، صفحہ 24 — 4۔ ایضاً

5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 502 — 6۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کراھیة خصاء الغنم والبہائم، جلد 10، صفحہ 24

کیا، انہوں نے عمر بن اسماعیل سے روایت کیا پھر یہ حدیث ذکر کی۔ دار قطنی نے کہا: اس کو عبد الصمد بن نعمان نے ابو مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ آدمی کو خصی کرنا مصیبت ہے، کیونکہ جب اسے خصی کیا جائے گا تو اس کا دل اور اس کی قوت ختم ہو جائے گی جب کہ حیوان کا حکم اس کے برعکس ہے اور انسان کی نسل ختم ہو جائے گی جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں حکم دیا گیا ہے: تناکحوا تناسلوا فانی مکاثر بکم الامم۔ نکاح کرو، نسل بڑھاؤ میں تمہارے ذریعے دوسری امتوں پر کثرت کو بیان کرنے والا ہوں گا۔

پھر اس میں سخت تکلیف بھی ہے بعض اوقات انسان ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں مال کا ضیاع اور نفس کا ہلاک کرنا ہوتا ہے اور ان تمام چیزوں سے منع کیا گیا ہے پھر یہ مثلة ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع کیا ہے(1) اور یہ صحیح ہے۔ حجازی اور کوفی فقہاء کی ایک جماعت نے صقالبہ وغیرہم سے خصی غلام خریدنا ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اگر وہ ان سے خریدے نہیں جائیں گے تو ان کو خصی نہیں کیا جائے گا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ انسان کا خصی کرنا حلال اور جائز نہیں، کیونکہ یہ مثلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی ہے۔ اسی طرح تمام اعضاء کا بغیر حد اور قصاص کے کاٹنے کا حکم ہے یہ ابو عمر کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ ثابت ہو گیا تو تو جان لے کہ نشان لگانا اور شعار کرنا اس نہی سے مستثنیٰ ہے جو شیطان کے شریط کے متعلق ہے اور یہ آگ کے ساتھ حیوان کو عذاب دینے کی نہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ الوسم کا معنی آگ سے داغ لگانا ہے اس کا اصل معنی علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: وسم الشئ یسمہ جب کوئی ایسی علامت لگائے جس سے وہ چیز پہچانی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ (الفتح: 29) السیما علامت کو کہتے ہیں۔ المیسم داغ لگانے کا آلہ۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے ثابت ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں نشان لگانے کا آلہ دیکھا آپ صدقہ اور فئی وغیرہ کے اونٹوں کو نشان لگا رہے تھے تا کہ ہر مال پہچانا جائے اور اس کے حق میں ادا کیا جائے اور کسی دوسرے مال کی طرف تجاوز نہ ہو(2)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ چہرے کے علاوہ تمام اعضاء میں نشان لگانا، داغنا جائز ہے، کیونکہ حضرت جابر نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے اور چہرے پر داغ لگانے سے منع فرمایا ہے(3)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ چہرے کو باقی تمام اعضاء پر شرف حاصل ہے، کیونکہ وہ حسن و جمال کا مقر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ حیوان کا قوام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے وہ اپنے غلام کو مار رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: چہرے پر مارنے سے اجتناب کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق اپنی صورت پر کی ہے"(4)۔ یعنی مضروب کی صورت پر، یعنی اس مضروب کا چہرہ حضرت آدم کے چہرہ کے مشابہ ہے، پس اس کی مشابہت کی وجہ سے اس کا احترام لازم

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 336
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 203
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 202
4۔ ایضاً، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 327

ہے۔ یہ سب سے بہتر ہے جو کچھ اس کی تاویل میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ایک جماعت نے کہا: یہ وشم اور جو حسن کے لیے تصنع کیا جاتا ہے اس تبدیلی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حسن کا قول ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے جو حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسم پر نشان بنانے والیاں اور نشان بنوانے والیاں، چہرے سے بال نوچنے والیاں اور نوچوانے والیاں اور حسن کی خاطر دانت کھلے کرانے والیاں اللہ کی تخلیق کو بدلنے والیاں (ان سب پر) اللہ کی لعنت ہے''(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، مکمل بیان سورۃ الحشر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

الوشم ہاتھوں میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی ہتھیلی کی پیٹھ اور اس کی کلائی کو سوئی کے ساتھ کریدا جاتا ہے پھر اس میں سرمہ یا کوئلے کا دھواں بھر دیا جاتا ہے پھر وہ سبز ہو جاتا ہے۔ قد وشمت وشماً فھی واشمۃ یعنی نشان بنانا اور المستوشمہ۔ ایسا نشان بنوانے والی۔ یہ ہروی کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: صقلی اور افریقی لوگ ایسا کرتے ہیں(2) تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی جوانی میں اپنی طاقت پر دلالت کرے۔ قاضی عیاض نے کہا: ہروی کی روایت میں جو مسلم کے رواۃ میں سے ہے۔ الواشمۃ والموشمہ کی جگہ والوشیۃ والمستوشیۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی میم کی جگہ یا ہے۔ یہ الوشی سے مشتق ہوگا جس کا معنی مزین ہونا ہے اور الوشی کی اصل دو رنگوں پر کپڑے کو بننا ہے ثور موشی ایسا بیل جس کے چہرے اور پیروں میں سیاہی ہو۔ یعنی عورت بال نوچ کر، دانت کھلے کر کے، دانت باریک کر کے زینت حاصل کرتی ہے۔ المتنمصات یہ متنمصۃ کی جمع ہے اس سے مراد وہ عورت ہے جس کے چہرے سے بال اکھیڑنے والے آلہ سے بال اکھیڑے گئے ہوں۔ ابن عربی نے کہا: مصری لوگ زیر ناف بال اکھیڑتے ہیں وہ اسی سے ہے، کیونکہ سنت زیر ناف بالوں کا حلق کرنا ہے اور بغلوں کے بال نوچنا ہے اور فرج کے بال نوچنا یہ اسے ڈھیلا کر دیتا ہے اور تکلیف دیتا ہے اور بہت ساری منفعت کو ضائع کر دیتا ہے(3)۔ المُتَفَلِّجات یہ متفلجۃ کی جمع ہے، وہ عورت جو اپنے دانتوں کو کھلا کرتی ہے یعنی خلقۃً اس کے دانت ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنے عمل سے انہیں کھلا کرتی ہے۔ مسلم کی کتاب کے علاوہ میں ہے۔ الواشرات یہ واشرۃ کی جمع ہے جو اپنے دانتوں کو تیز کرتی ہے یعنی وہ شگاف جو جوان عورتوں کے دانتوں میں ہوتا ہے، بڑی عمر کی عورت نوجوان لڑکی سے مشابہت کے لیے ایسا کرتی ہے۔ یہ تمام امور احادیث کی رو سے گناہ کبیرہ ہیں۔ اس معنی میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے یہ نہی کی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ تدلیس کے باب میں ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی تخلیق کی تغییر کے باب سے ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: یہ اصح ہے یہ پہلے معنی کو بھی متضمن ہے۔

پھر بعض نے فرمایا: یہ منع اب بھی باقی ہے، کیونکہ یہ اللہ کی تخلیق کی تبدیلی کے باب سے ہے اور جو تزئین باقی رہنے والی نہ ہو جیسے سرمہ لگانا یا میک اپ کرنا، عورتوں کے لیے علماء نے جائز قرار دیا ہے لیکن مردوں کے لیے امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ امام مالک نے عورت کے لیے ہاتھوں پر مہندی لگانا جائز قرار دیا ہے۔ حضرت عمر سے اس کا انکار بھی مروی ہے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 205 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 501 3۔ ایضاً

یا تو اپنے دونوں ہاتھوں کو مہندی لگائے یا ترک کر دے۔ امام مالک نے حضرت عمر سے مروی روایت کا انکار کیا ہے کہ عورت مہندی سے خضاب لگانا ترک نہ کرے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو دیکھا جس نے مہندی نہیں لگائی ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم (عورتوں) میں سے کوئی اپنے ہاتھ کو اس طرح نہ چھوڑے کہ وہ مرد کا ہاتھ معلوم ہو''۔ وہ عورت پھر ہمیشہ مہندی لگاتی رہی حتیٰ کہ اس کی عمر نوے سال سے بڑھ گئی تھی اور پھر وہ فوت ہوگئی۔

قاضی عیاض نے کہا: کالی مہندی کے متعلق منع کرنے کی حدیث مروی ہے۔ صاحب المصابیح نے اس کا ذکر کیا ہے اور عورت بغیر زیور کے نہ ہو اس کی گردن میں موتیوں کا ہار ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے کہا: ''بغیر ہار کے ہونا تیرے لیے مناسب نہیں خواہ وہ دھاگے کا ہو یا چمڑے کا ہو''۔ حضرت انس نے کہا: عورت کے لیے مستحب ہے کہ وہ نماز میں اپنے ہار کو اپنی گردن سے لپیٹ دے اگر وہ چمڑے کا ہو۔

ابو جعفر طبری نے کہا: حضرت ابن مسعود کی حدیث میں دلیل ہے کہ خاوند یا کسی اور کے لیے جس کی خاطر کمی یا زیادتی کے ساتھ اللہ کی تخلیق کو بدلنا جائز نہیں ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے خواہ وہ دانتوں کو کھلا کرے یا دانتوں کو تیز کرے یا اس کا دانت لمبا ہو تو وہ اسے اکھیڑ دے یا بہت سے لمبے دانت ہوں تو اس کی اطراف کو کاٹ دے۔ اسی طرح داڑھی یا مونچھوں کا حلق کرنا یا نیچے والے ہونٹ کے بالوں کا حلق کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ تمام صورتیں اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرنا ہے۔ عیاض نے کہا: جس کی زائد انگلی ہو یا کوئی عضو زائد ہو تو اس کا کاٹنا اور اس کا اکھیڑنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اللہ کی تخلیق کی تبدیلی سے ہے مگر یہ زائد عضو تکلیف دیتا ہو تو ابو جعفر وغیرہ کے نزدیک اس کو اکھیڑنے میں حرج نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8۔** میں کہتا ہوں: اس باب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لعن الله الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة(1)، بال جوڑنے والی اور بال جڑوانے والی، نشان بنانے والی اور نشان بنوانے والی پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنے بالوں میں دوسرے بال جوڑنے سے منع فرمایا تاکہ بال زیادہ نظر آئیں، واصلة وہ عورت جو ایسا کرتی ہے اور المستوصلہ جو بال لگواتی ہے۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنے بالوں میں کوئی چیز ملانے سے زجر و توبیخ فرمائی(2)۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے فرمایا: ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے اسے بیماری لگ گئی ہے جس کی وجہ سے اس کے بال جھڑ گئے ہیں، کیا میں اس کو دوسرے بال لگوا دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بال لگانے والی اور بال لگوانے والی پر لعنت کی ہے''(3)۔ یہ بال جوڑنے کی تحریم میں نص ہے۔

امام مالک اور عطا کی جماعت نے یہی کہا ہے: انہوں نے ہر قسم کے بال خواہ وہ اون سے ہوں یا کپڑے سے ہوں سب سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں بھی بال جوڑنے کا معنی پایا جاتا ہے۔ لیث بن سعد نے شاذ قول کیا ہے اس نے اون اور کپڑے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، جلد 2، صفحہ 204۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 205

3۔ ایضاً

اور ایسی چیز جو بال نہیں، کے ملانے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ اہل ظاہر کے مذہب کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور دوسرے علماء نے سر پر بال رکھنے کو مباح قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: نہی صرف ملانے کے متعلق ہے۔ یہ محض ظاہر ہے اور معنی سے اعراض ہے۔ ایک قوم نے شاذ قول کیا ہے: انہوں نے مطلقاً وصل (بال لگانے) کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ قطعاً باطل قول ہے، احادیث اس کا رد کرتی ہیں۔ حضرت عائشہ سے وہ مروی ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن سیرین سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا: میری والدہ عورتوں کو کنگھی کرتی ہے، کیا میں اس کے مال سے کھا سکتا ہوں؟ ابن سیرین نے کہا: اگر وہ بال لگاتی ہے تو نہیں اور نہی میں وہ داخل نہیں جو زینت اور خوبصورتی کے لیے رنگ برنگ ریشم کے دھاگوں سے باندھا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ ایک گروہ نے کہا: اللہ کی تخلیق کی تغییر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند، پتھروں اور آگ وغیرہ کو اس لیے پیدا فرمایا تا کہ ان سے نفع حاصل کیا جائے، کفار نے ان کو معبود بنا دیا۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو پیدا فرمایا تا کہ ان پر سواری کی جائے اور ان کا گوشت کھایا جائے، لیکن کفار نے ان کو اپنے او پر حرام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور پتھروں کو لوگوں کے لیے مسخر کیا لیکن لوگوں نے انہیں معبود بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ پس انہوں نے اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالا۔ مفسرین کی ایک جماعت مجاہد، ضحاک، سعید بن جبیر اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: **فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ** سے مراد اللہ کے دین کو بدلنا (1)۔ یہ نخعی کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اگر یہ معنی ہو تو وہ تمام صورتیں اس میں داخل ہوں گی جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے مثلاً خصی ہونا، جسم پر سوئی سے بیل بوٹے بنانا اور دوسرے گناہ، کیونکہ شیطان ان تمام گناہوں کی طرف بلاتا ہے یعنی وہ بدل دیں گے اسے جو اللہ نے اپنے دین میں حکم فرمایا۔ مجاہد نے بھی یہ کہا ہے: **فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ** یعنی وہ اللہ کی اس فطرت کو بدل دیں گے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا فرمایا یعنی وہ اسلام پر پیدا کیے گئے تھے شیطان نے انہیں اس کو تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہی معنی ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ و ینصرانہ ویمجسانہ (2) ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس خلق کا معنی اس طرف لوٹے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے چیونٹیوں کی شکل میں حضرت آدم کی پیٹھ سے انہیں نکالا اور ان میں ایمان پیدا فرمایا جس کا ذکر: **اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى** (الاعراف: 172) میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: طاؤس سے مروی ہے کہ وہ کالی عورت کا سفید مرد سے نکاح ہوتا یا سفید عورت کا کالے مرد سے نکاح ہوتا تو وہ اس میں حاضر نہ ہوتے تھے۔ وہ کہتے: یہ بھی **فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ** سے ہے۔ قاضی نے کہا: اگرچہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے مگر یہ مخصوص ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام زید کا نکاح جو سفید رنگت والے تھے، اپنی دایہ برکہ حبشیہ سے کر دیا جو حضرت اسامہ کی والدہ تھی اور حضرت اسامہ سفید سے کالے پیدا ہوئے تھے۔ طاؤس کے علم کے باوجود یہ مسئلہ ان سے مخفی رہا (3)۔

---

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 123 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 185۔ ایضاً، حدیث نمبر 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 502

میں کہتا ہوں: پھر حضرت اسامہ نے فاطمہ بنت قیس سے نکاح کیا تھا وہ عورت سفید تھی اور قریشی تھی اور حضرت بلال کے نکاح میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی بہن زہریہ تھی۔ یہ خاص ہے اور طاؤس پر یہ معاملہ مخفی رہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی جو شیطان کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کے حکم کو چھوڑتا ہے۔ فَقَدْ خَسِرَ اس نے اپنے اجر میں کمی کی اور اپنا ہی نقصان کیا، کیونکہ اس نے اللہ کا حق شیطان کو دیا اور شیطان کے لیے اللہ کا حق چھوڑ دیا۔

يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲

''شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر فریب کا۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور نہ پائیں گے اس سے بچ نکلنے کی جگہ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، داخل کریں گے ہم انہیں ان باغوں میں، رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کرنے میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعِدُهُمْ یعنی وہ جھوٹے وعدے کرتا ہے، مال وجاہ اور ریاست کے سبز باغ دکھاتا ہے اور انہیں کہتا ہے، نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ کوئی سزا ہے، وہ انہیں فقر و غربت سے ڈراتا ہے تاکہ وہ بھلائی میں مال خرچ نہ کریں۔ وَ يُمَنِّيْهِمْ اس کا بھی یہی مفہوم ہے وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ یعنی دھوکا۔ ابن عرفہ نے کہا: الغرور ہر وہ چیز جس کے ظاہر کو تو دیکھے تو تو اس سے محبت کرے جب کہ اس کا باطن مکروہ ہو یا مجہول ہو۔ شیطان کو غرور کہا جاتا ہے، کیونکہ نفس کی محبت کی جگہوں پر ابھارتا ہے جب کہ اس کے پیچھے تکلیف دہ چیزیں ہوتی ہیں۔ اُولٰٓئِكَ یہ مبتدا ہے مَاْوٰىهُمْ دوسرا مبتدا ہے جَهَنَّمُ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور پھر جملہ پہلے مبتدا کی خبر ہے۔ مَحِيْصًا ۝۱۲۱، ملجأ۔ اس سے فعل خاص یحیص آتا ہے۔ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲ مبتدا خبر ہیں۔ قِيْلًا، قال قيلاً و قولاً و قالاً تمام کا ایک معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی سچا نہیں۔ جو معانی اس آیت کے ضمن میں ہیں ان پر کلام گزر چکی ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝۱۲۳

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (نجات کا انحصار) نہ تمہاری جھوٹی امیدوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی جھوٹی امیدوں پر (بلکہ) جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی اس کی اور نہ پائے گا اپنے لیے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور نہ مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ابو جعفر مدنی نے: لَيْسَ بِاَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ یعنی دونوں جگہ یا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا۔ اس کے نزول کے بارے میں بہتر قول وہ ہے جو حکم بن ابان نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: یہود و نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو ہم میں سے ہوگا۔ قریش نے کہا: ہم دوبارہ زندہ نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ قتادہ اور سدی نے کہا: مومنین اور اہل کتاب نے باہم فخر کیا، اہل کتاب نے کہا: ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے تھے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے کی ہے اور ہم اللہ کے تم سے زیادہ حق دار ہیں، مومنوں نے کہا: ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب تمام کتب پر غالب ہے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ یہاں سوء سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا: یہ آیت کافر کے بارے میں ہے اور انہوں نے هَلْ يُجَازَى إِلَّا الْكَفُورُ پڑھا ہے۔ اور ان سے یہ بھی مروی ہے مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ فرمایا: یہ اس کے لیے ہے جس کی رسوائی کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کی عزت و اکرام کا ارادہ فرمایا اس کے لیے رسوائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا ذکر کیا (2) اور فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝ (الاحقاف) یہی وہ (خوش نصیب) ہیں قبول کرتے ہیں ہم جن کے بہترین اعمال کو اور درگزر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے، یہ جنتیوں میں سے ہوں گے یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اہل ایمان سے) کیا گیا ہے۔

ضحاک نے کہا: اس سے مراد یہود، نصاریٰ، مجوس اور کفار عرب ہیں (3)۔ جمہور علماء نے کہا: آیت کا لفظ عام ہے کافر، مومن ہر ایک کو اس کے برے عمل کی جزا ملے گی۔ کافر کی جزا آگ ہے، کیونکہ اس کا کفر اسے ہلاک کرتا ہے اور مومن کو اس کی جزا دنیا کی تکالیف کی صورت میں دی جاتی ہے (4)، جس طرح کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم صحت کے قریب قریب اعمال کرو اور درست عمل کرو۔ ہر تکلیف جو مسلمان کو پہنچتی ہے وہ اس کے لیے کفارہ ہوتی ہے حتیٰ کہ چھوٹی سی مصیبت جو اسے پہنچتی ہے اور کانٹا جو اسے چبھتا ہے'' (5) (یہ سب چیزیں کفارہ ہوتی ہیں) حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں فصل نمبر 95 میں تخریج کیا ہے کہ ہمیں ابراہیم بن مستمر البذلی نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں عبدالرحمٰن بن سلیم بن حیان ابوزید نے بیان کیا فرمایا: میں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے سنا انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف چلا، تو حضرت عمر نے حضرت نافع سے کہا: تو مجھے مصلوب (جس کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا)

---

1۔ اسباب النزول، جلد 1، صفحہ 199، قدیمی کتب خانہ کراچی
2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 370-369
3۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 340
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 114
5۔ صحیح مسلم، البر والصلۃ والاداب، جلد 2، صفحہ 319

یعنی ابن زبیر کے پاس سے نہ گزار یا فرمایا: اچانک آدھی رات کے وقت سولی کی لکڑی حضرت عبداللہ بن عمر کے محل سے لگی، تو وہ بیٹھ گئے اپنی آنکھوں کو ملا پھر کہا: اے ابوخبیب! اللہ تجھ پر رحم کرے تو تھا، تو تھا! میں نے تیرے باپ زبیر کو یہ کہتے سنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ فی الدنیا او فی الاخرۃ (جو برائی کرے گا اسے اس کی جزا دنیا میں ملے گی یا آخرت میں ملے گی) اگر تو یہ تیرا قتل تیرے اس فعل کے بدلے میں ہے تو یہ اس کی جزا ہے (1)۔

ابو عبداللہ ترمذی نے کہا: جو قرآن میں ہے وہ مجمل ہے فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا الخ۔ اس سے نیک، فاجر، دشمن، دوست اور مومن، کافر سب داخل ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو جگہوں کے درمیان فرق کیا فرمایا: یجزیہ فی الدنیا او فی الاخرۃ یعنی اس پر دونوں جگہ جزا جمع نہیں ہوگی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ حضرت ابن عمر نے کہا: اگر یہ تیرا قتل، تیرے فعل کے بدلے میں ہے تو یہ جزا ہے، یعنی اس نے حرم میں قتال کیا۔ اس میں ایک عظیم واقعہ صادر کیا حتیٰ کہ بیت اللہ کو جلا دیا گیا اور منجنیق کے ذریعے حجر اسود کو مارا گیا حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تھا پھر چاندی کے ساتھ اس کو جوڑا گیا تھا، وہ ابھی تک اسی حالت میں ہے عبداللہ نے بیت اللہ کے رونے کی آواز سنی تھی آہ آہ۔ جب حضرت ابن عمر نے عبداللہ کا فعل دیکھا پھر اسے سولی پر مقتول دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ذکر کیا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: اگر یہ قتل اس فعل کے بدلے ہے تو گویا اس فعل کی جزا یہ قتل اور پھانسی دی گئی ہے اللہ تعالیٰ ابن زبیر پر رحم فرمائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کے درمیان دوسری حدیث میں تفریق کی ہے۔ ہمیں میرے باپ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابونعیم نے بتایا فرمایا ہمیں محمد بن مسلم نے بتایا انہوں نے یزید بن عبداللہ بن اسامۃ بن الہاد لیثی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تو ہم میں سے کسی کو باقی چھوڑنے والی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! مومن کو اس کی جزا دنیا میں دی جائے گی اور کافر کو اس کی جزا قیامت کے روز دی جائے گی۔ ہمیں جارود نے بتایا فرمایا ہمیں وکیع، ابومعاویہ اور عبدہ نے بتایا انہوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے انہوں نے ابوبکر بن ابی زہیر ثقفی سے روایت کیا فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اس کے ہوتے ہوئے صلاح کیسے ہوگی ہر کام جو ہم نے کیا ہمیں اس کی جزا ملے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ نے تجھے معاف کر دیا ہے، کیا تو تھکتا نہیں ہے؟ کیا تو غمگین نہیں ہوتا ہے؟ کیا تجھے محنت و مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ حضرت ابوبکر نے عرض کی: کیوں نہیں۔ فرمایا: اس کے ذریعے تمہیں جزا دی جاتی ہے۔ قرآن میں مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ میں اجمال تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان کر دی۔

ترمذی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے فرمایا: ''اے ابوبکر! تجھے اور مومنین کو برائی کی جزا دنیا میں دے دی جاتی ہے حتیٰ کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے ملو گے تو تمہارا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ رہے دوسرے لوگ (کافر) ان کے لیے وہ جزا کو جمع کرے گا حتیٰ کہ وہ قیامت کے روز اس کی جزا دیے

1۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 132، فصل نمبر 95

جائیں گے"(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور اس کی سند میں مقال ہے۔ موسیٰ بن عبیدہ کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان اور امام احمد بن حنبل نے ضعیف قرار دیا ہے اور مولیٰ بن سباع مجہول ہے۔ یہ حدیث ایک اور طریق سے حضرت ابوبکر سے مروی ہے لیکن اس کی صحیح سند نہیں ہے اور یہ حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کو اسماعیل بن اسحاق قاضی نے نقل کیا ہے فرمایا ہمیں سلیمان بن حرب نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں حماد بن سلمہ نے بیان کیا، انہوں نے علی بن زید سے روایت کیا، انہوں نے اپنی ماں سے روایت کیا کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کے بارے پوچھا: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ (بقرہ: 284) اور اس آیت کے متعلق پوچھا: مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ تو حضرت عائشہ نے کہا: جب سے میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہے مجھ سے کسی نے اس کے متعلق نہیں پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "اے عائشہ! انسان کو جو تکلیف پہنچتی ہے مثلاً بخار، مصیبت، کانٹا چبھتا ہے حتیٰ کہ وہ سامان جو انسان اپنی آستین میں رکھتا ہے پھر وہ اسے تلاش کرتے ہوئے پریشان ہو جاتا ہے پھر وہ اسے اپنے صندوق میں پالیتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو بدل دیتا ہے حتیٰ کہ مومن گناہوں سے اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح سونے کی پتری بھٹی سے صاف وشفاف نکلتی ہے"(2)۔ لیس کا اسم ان تمام اقوال میں مضمر ہے تقدیر اس طرح ہے لیس الکائن من امورکم ما تتمنونہ بل من یعمل سوء یجزبہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ثواب تمہاری امیدوں کے ساتھ نہیں ہے، کیونکہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا﴿۱۲۳﴾ یعنی مشرکین۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴿۵۱﴾ (غافر) بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی) دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو برائی کرے گا اسے جزا ملے گی مگر یہ کہ وہ توبہ کرلے۔ ایک جماعت کی قرأت وَ لَا یَجِدْ لَهٗ ہے۔ یجز پر عطف کی بنا پر جزم دی گئی ہے۔

ابن بکار نے ابن عامر سے روایت کیا ہے وَلَا یَجِدُ رفع کے ساتھ نئے کلام کے اعتبار سے ہے۔ اگر آیت کو کافر پر محمول کیا جائے تو کل اس کے لیے ولی ونصیر نہ ہوگا۔ اگر مومن پر محمول کی جائے تو اللہ کے علاوہ اس کا کوئی مددگار ونصیر نہ ہوگا۔

وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا﴿۱۲۴﴾

"اور جس نے عمل کیے اچھے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو سو وہی لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور نہ ظلم کیے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129

2۔ تفسیر درمنثور، جلد 2، صفحہ 402۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائیں گے تل بھر''۔

ایمان کو شرط قرار دیا، کیونکہ مشرکین کعبۃ کی خدمت، حاجیوں کو کھانا کھلانے اور مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے پر اتراتے تھے اور اہل کتاب اپنی سبقت اور اپنے قول نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) کے ساتھ ڈینگیں مارتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ بغیر ایمان کے اچھے اعمال قبول نہیں۔ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ کو ابو عمرو اور ابن کثیر نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے باقی لوگوں نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے یعنی وہ اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔ نقیر کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اس سے مراد وہ نکتہ ہے جو گٹھلی کی پیٹھ میں ہوتا ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾

''اور کون بہتر ہے دینی لحاظ سے اس شخص سے جس نے جھکا دیا ہوا اپنا چہرہ اللہ کے لیے اور وہ احسان کرنے والا ہو اور پیروی کی ملت ابراہیم کی اس حال میں کہ وہ ہر باطل سے منہ موڑے ہوئے ہو اور بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل''۔

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو تمام ادیان پر فضیلت دی ہے۔ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اس کا معنی ہے اس نے اپنے دین کو اللہ کے لیے خاص کیا اور عبادت کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جھکے اور متوجہ ہوئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں دینا کو نصب بیان کے اعتبار سے ہے۔ وَ هُوَ مُحْسِنٌ مبتدا خبر ہیں اور حال ہے یعنی وہ موحد ہو۔ اس میں اہل کتاب داخل نہیں، کیونکہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو ترک کیا۔ الملۃ سے مراد دین ہے۔ الحنیف سے مراد مسلم ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾ ثعلب نے کہا: خلیل کو خلیل اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ محبوب کی محبت اس کے دل میں راسخ ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی خلل نہیں چھوتی مگر اسے بھر دیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

تخللتَ مسلك الروح منّي وبه سُمّيَ الخليلُ خليلاً

اے محبوب! ہاں جہاں جہاں میری روح کا گزر ہے وہاں تیرا عشق سمایا ہوا ہے اس وجہ سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔

خلیل فعیل کا وزن ہے بمعنی فاعل ہے جیسے علیم بمعنی عالم ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ معنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے تھے اور اللہ کے محبوب بھی تھے۔ بعض نے فرمایا: الخلیل اختصاص کے معنی سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس نے ابراہیم کو ان کے دور میں رسالت کے لیے خاص فرمایا۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا اور فرمایا: اس پر دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے وقد اتخذ الله صاحبكم خليلاً (1) یعنی اللہ

1۔ صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، جلد 2، صفحہ 273

تعالیٰ نے تمہارے ساتھی کو خلیل بنایا۔ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو کنت متخذا خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلاً۔(1) یعنی اگر میں کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرتا تو ابو بکر کو کرتا۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو دین کی کسی چیز کے ساتھ خاص فرمایا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: الخلیل کا معنی محتاج ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کا معنی ہوگا وہ اللہ کی بارگاہ کے محتاج اور فقیر ہیں گویا وہ جس کو حاجت ہو۔ زہیر نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا:

وان أتاه خلیل یوم مَسْغَبَةٍ یقول لا غائبٌ مالی ولا حَرِمُ

یعنی اگر بھوک کے دن کوئی محتاج اس کے پاس آتا ہے تو وہ کہتا ہے: نہ میرا مال غائب ہے اور نہ کوئی ممانعت ہے۔

زجاج نے کہا: خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت میں خلل نہ ہو۔ یہ جائز ہے کہ ان کو اللہ کا خلیل کہا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے محبت کی تھی اور اسے چن لیا تھا اور اس سے مکمل محبت کی تھی۔ اور اس اعتبار سے خلیل اللہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ اللہ کے فقیر تھے، کیونکہ انہوں نے فقر و فاقہ اختیار نہیں کیا تھا مگر اللہ کے لیے، وہ اس میں مخلص تھے۔ الاختلال کا معنی فقر ہے روایت ہے کہ جب انہیں منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا اور وہ ہوا میں تھے تو جبریل امین ان کے پاس آئے اور کہا کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟ ابراہیم نے کہا: تجھ سے تو نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی حضرت ابراہیم کے لیے خلت، اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیم کی مدد کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خلیل کو خلیل اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے دوست سے ملنے گئے تھے جو مصر میں تھا۔ بعض نے کہا: وہ موصل میں تھا آپ اس لیے اس کے پاس گئے تھے تاکہ اس کے پاس سے کھانا لے آئیں آپ نے اپنے ساتھی کو نہ پایا، آپ نے اپنی زنبیل میں ریت بھر لی اور گھر کی طرف چل پڑے، آپ نے وہ زنبیل رکھ دی اور خود سو گئے، گھر والوں نے اسے کھولا تو انہوں نے اس میں آٹا پایا اس نے اس سے روٹی حضرت ابراہیم کے لیے تیار کی۔ جب کھانا پیش کیا تو آپ نے پوچھا: یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے۔ گھر والوں نے کہا: یہ وہی ہے جو تم اپنے مصری دوست سے لائے ہو۔ آپ نے فرمایا: یہ میرے خلیل یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو خلیل اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض نے فرمایا: آپ نے کفار کے روساء کی مہمان نوازی کی اور انہیں تحائف دیئے اور ان سے حسن سلوک کیا، روساء نے پوچھا: تمہاری کیا حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: میری حاجت یہ ہے کہ تم سجدہ کرو، انہوں نے سجدہ کیا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے اللہ! میرے لیے جو ممکن تھا وہ میں نے کر دیا اب تو وہ کر جو تیری شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق دی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔ کہا جاتا ہے: جب ملائکہ حضرت ابراہیم کے پاس انسانوں کی شکل میں آئے اور آپ ان کے لیے بھونا ہوا موٹا بچھڑا لائے تو انہوں نے اسے نہ کھایا اور کہا: ہم بغیر قیمت کے کوئی چیز نہیں کھاتے، آپ نے انہیں فرمایا: اس کی قیمت دو اور کھاؤ۔ انہوں نے پوچھا: اس کی قیمت کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی ابتدا میں تم بسم اللہ کہو اور اس کے آخر میں الحمد للہ کہو۔ فرشتوں نے آپس میں کہا: اللہ تعالیٰ کو اس کو اپنا

1۔ صحیح مسلم، فضائل صحابہ، فضائل ابی بکر الصدیق، جلد 2، صفحہ 273۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 3381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خلیل بنانا چاہیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنا دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا، کیونکہ وہ کھانا کھلاتے تھے اور سلام پھیلاتے تھے اور رات کو نماز پڑھتے تھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے تھے"۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے جبریل! اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل کیوں بنایا؟ اے پیارے محمد! (ﷺ) کھانا کھلانے کی وجہ سے (1)۔

بعض نے فرمایا: خلیل وہ ہوتا ہے جو اللہ کے لیے دوستی رکھتا ہے اور اللہ کے لیے دشمنی رکھتا ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلت کا مطلب دوستی ہے یہ تخلل الاسرار بین المتخالین سے مشتق ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الخلة سے ہے دونوں دوستوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حاجت پوری کرتا ہے۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الرجل علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل (2)۔ انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

من لم تکن فی الله خُلّتُهُ　　فخلیلة منه علی خطر

جس کی دوستی اللہ کی رضا کے لیے نہیں اس کا دوست اس سے خطرے میں ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إذا ما کنت متّخذاً خلیلاً　　فلا تَثِقَنْ بکلِّ أخی إخاءِ

فإن خیّرت بینهُم فألصِق　　بأهل العقل منهم والحَیاءِ

فإن العقل لیس له اذاما　　تفاضلَت الفضائلُ من کِفاءِ

جب تو کسی کو خلیل بنانے والا ہو تو ہر بھائی چارہ رکھنے والے پر وثوق نہ کر، جب تو ان میں سے چناؤ کرے تو ان میں اہل عقل اور حیا داروں کا چناؤ کر، کیونکہ عقل کا کوئی ہم پلہ نہیں جب فضائل کا مقابلہ ہوتا ہے۔

حضرت حسان نے کہا تھا:

أخِلّاء الرجل هُم کثیرٌ　　ولکن فی البلاء هُم قلیلُ

فلا تغررْك خُلّةُ من تواخی　　فمالك عند نائبةٍ خلیل

وکل أخٍ یقول أنا وفیّ　　ولکن لیس یفعل ما یقول

سوی خلٍ له حسبٌ و دینٌ　　فذاك لما یقول هو الفَعُول

مردوں کے دوست بہت ہوتے ہیں لیکن مصیبت میں وہ کم ہوتے ہیں۔ جس کو تو بھائی بنائے ہوئے ہے اس کی دوستی تجھے دھوکے میں نہ ڈالے۔ تیرا مالِ مصیبت کے وقت خلیل ہوتا ہے۔ ہر بھائی کہتا ہے کہ میں وفادار ہوں لیکن جو وہ کہتا ہے کرتا

1۔ شعب الایمان، باب اکرام الضیف، جلد 7، صفحہ 98　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 308

نہیں ہے، سوائے اس دوست کے جو حسب والا اور دین دار ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اسے کرنے والا ہوتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

''اور اللہ کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے میں لینے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ملک اور ایجاد کے اعتبار سے سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا اس کے حسن طاعت کی وجہ سے، نہ اسے اس کی دوستی کی حاجت تھی، نہ کثرت کے لیے اور نہ مدد کے لیے۔ اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہے جب زمین و آسمانوں کا سب کچھ اس کا ہے اس نے تو حضرت ابراہیم کو اس کے امتثال امر پر عزت و شرف بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کا اپنے علم سے احاطہ کیا ہوا ہے۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

''اور فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے عورتوں کے بارے میں۔ آپ فرمائیے: اللہ فتویٰ دیتا ہے تمہیں ان کے بارے میں اور وہ آیتیں جو پڑھی جاتی ہیں تم پر اس کتاب (قرآن) میں (ان میں احکام ہیں) ان یتیم بچیوں کے متعلق جنہیں تم نہیں دیتے ہو جو (حق) مقرر کیا گیا ہے ان کے لیے اور خواہش کرتے ہو کہ خود نکاح کر لو ان کے ساتھ (ان کا مال دبوچنے کے لیے) اور (قرآن میں احکام ہیں) کمزور بچوں کے متعلق اور (وہ یہ) کہ قائم رہو یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر اور جو کرو گے بھلائی (کے کاموں) سے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے''۔

یہ آیت کریمہ صحابہ کرام کے عورتوں کے متعلق سوال اور میراث میں ان کے احکام وغیرہ کے سبب سے نازل ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے یعنی جس کے متعلق تم نے پوچھا اس کا تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ یہ آیت ان احکام کی طرف راجع ہے جو اس سورت کے آغاز میں عورتوں کے امر کے متعلق گزر چکے ہیں اور ان کے لیے کچھ احکام باقی تھے جن کو ابھی تک لوگوں نے سمجھا نہیں تھا تو انہوں نے سوال کیا، انہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا جاتا تھا تو آپ جواب نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وحی نازل ہوتی تھی۔ اور وہ کتاب اللہ میں ہے: وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ...... وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ...... يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ...... وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ۔ (1)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 503

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ، ما محل رفع میں ہے اس کا عطف اسم جلالت پر ہے معنی یہ ہے کہ قرآن تمہیں ان کے بارے فتویٰ دیتا ہے اور وہ یہ ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ ارشاد ہے: وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ یعنی وہ ان سے نکاح کرنے کی رغبت نہیں رکھتے پھر عَنْ کو حذف کیا گیا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے یرغبون فی ان تنکحوھن یعنی وہ ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے تھے۔ پھر فی کو حذف کیا گیا۔ سعید بن جبیر اور مجاہد نے کہا: اس یتیم بچی سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتے تھے جب ان کا مال زیادہ ہوتا تھا (1)۔

حضرت عائشہ کی حدیث میں ہے: وترغبون ان تنکحوھن رغبۃ احدکم عن یتیمۃ التی تکون فی حجرہ حتی تکون قلیلۃ المال والجمال (2)۔ یعنی جس کا مال اور جمال کم ہوتا تو اس سے نکاح میں رغبت نہیں رکھتے تھے۔ سورۃ کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے۔

وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۲۸﴾

”اور اگر کوئی عورت خوف کرے اپنے خاوند سے (اس کی) زیادتی یا روگردانی کی وجہ سے تو نہیں کوئی حرج ان دونوں پر کہ صلح کر لیں آپس میں اور صلح ہی (دونوں کے لیے) بہتر ہے اور موجود رکھا گیا ہے نفسوں میں بخل اور اگر تم احسان کرو اور متقی بنو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے“۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِ امْرَاَةٌ فعل مضمر کی وجہ سے مرفوع ہے، مابعد فعل اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ خافت بمعنی توقعت یعنی اسے توقع ہو اور جنہوں نے خافت بمعنی تیقنت کہا ہے وہ غلط ہے۔ زجاج نے کہا: وان امراۃ خافت من بعلھا دوام النشوز۔ یعنی عورت کو اگر اپنے خاوند سے ہمیشہ زیادتی کا خوف ہو۔ نحاس نے کہا: نشوز اور اعراض کے درمیان فرق نہیں ہے۔ یہ نشوز کا مطلب دور ہونا ہے اور اعراض کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بات نہ کرے اور نہ اس سے محبت کرے۔ یہ آیت حضرت سودہ بنت زمعہ کے سبب نازل ہوئی۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت سودہ کو اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اسے طلاق دے دیں گے تو حضرت سودہ نے عرض کی (حضور!) آپ مجھے طلاق نہ دیں اور مجھے اپنے پاس رکھیں اور میری باری آپ عائشہ کے لیے کر دیں تو آپ ﷺ نے ایسا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ جس پر صلح کر لیں وہ جائز ہے۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن عیینہ نے زہیر سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت رافع بن خدیج کی بیوی خولہ بنت محمد بن

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 348　　2۔ ایضاً　　3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129

مسلمہ تھی حضرت رافع نے اسے ناپسند کیا۔ اس کے بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے تو اس نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو خولہ نے کہا: تو مجھے طلاق نہ دے اور میرے لیے جو چاہے باری مقرر کر۔ پس اس کے ساتھ سنت جاری ہوئی اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَاِنِ امْرَاَةٌ الخ۔

بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا کے متعلق آپ نے فرمایا: ایک شخص کے پاس ایک عورت ہوتی تھی جس سے وہ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا وہ اسے جدا کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو وہ اسے کہتی: جو تو میرے متعلق فیصلہ کرے وہ مجھے منظور ہے (1)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عام قراء کی قرأت: ان یصالحا ہے۔ اکثر کوفیوں نے ان یُصلحا پڑھا ہے۔ جحدری اور عثمان البتی نے ان یصّلحا پڑھا ہے اس کا معنی یصطلحا ہے طاکو ص میں ادغام کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت سے ان جہلاء کا رد بھی سمجھ آتا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مرد جب عورت کی جوانی سے لطف اٹھا لے اور وہ بوڑھی ہو جائے تو اسے اس کے بدلے دوسری عورت تبدیل کرنا مناسب نہیں۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: حضرت سودہ بنت زمعہ جب بوڑھی ہوگئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند کیا، اس نے آپ سے عرض کی: آپ مجھے اپنے پاس رکھیں اور میری باری عائشہ کو دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ان کا وصال ہوا تو آپ کی ازواج میں سے تھیں (2)۔

میں کہتا ہوں: محمد بن مسلمۃ کی بیٹی نے بھی ایسا ہی کیا۔ امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے حضرت رافع بن خدیج سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے محمد بن مسلمۃ کی بیٹی سے نکاح کیا وہ ان کے پاس رہی حتیٰ کہ بوڑھی ہوگئی تو انہوں نے اس پر نوجوان لڑکی سے نکاح کر لیا اور نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی اور محمد بن مسلمہ کی بیٹی نے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس نے اسے ایک طلاق دے دی پھر اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ جب وہ حیض سے پاک ہوئی تو اس سے رجوع کر لیا پھر نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی، پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تو پھر ایک طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا، پھر نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔ حضرت رافع نے کہا: اب تیری ایک طلاق باقی ہے اگر تو چاہے تو اس ترجیح کے باوجود ٹھہری رہے اگر تو چاہے تو میں تجھے جدا کر دوں۔ اس عورت نے کہا: میں اس ترجیح کے باوجود ٹھہری رہوں گی۔ پس حضرت رافع نے اسے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ حضرت رافع نے اپنے اوپر کوئی گناہ نہ دیکھا جب وہ اس ترجیح کے باوجود ان کے پاس ٹھہری رہی۔ اس کو معمر نے زہری سے ان الفاظ اور معانی کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ زائد ذکر کیا ہے کہ جو ہم تک خبر پہنچی ہے یہ وہ صلح ہے جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا: فاثر الشابۃ علیھا (رافع نے نوجوان لڑکی کو اس بوڑھی پر ترجیح دی) اس سے مراد نوجوان عورت کی طرف نفس کا میلان اور اس کے لیے نشاط ہے یہ مراد نہیں کہ حضرت رافع نے کھانے، پینے اور رات گزارنے میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 331		2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 504

اس پر ترجیح دی تھی، کیونکہ حضرت رافع جیسے عظیم صحابی کے متعلق ایسا گمان نہیں کیا جاتا۔ ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے فرمایا ہمیں ابو الاحوص نے بتایا، انہوں نے سماک بن حرب سے روایت کیا ہے، انہوں نے خالد بن عرعرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس آیت کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا: یہ وہ عورت تھی جو کسی مرد کے نکاح میں ہوتی پھر وہ اس کی بدصورتی یا فقر یا کبر یا بدخلق ہونے کی وجہ سے اس سے آنکھیں پھیر لیتا اور وہ عورت اس سے جدائی کو پسند نہ کرتی، پھر اگر وہ اپنے مہر میں سے کچھ اس کے لیے معاف کر دیتی تو اس کے لیے وہ مال لینا حلال ہوتا اور اگر وہ اپنے ایام میں سے کچھ اس کے لیے کر دیتی تو کوئی حرج نہ ہوتا (1)۔ ضحاک نے کہا: وہ اپنے حق سے کچھ کم کر دے تو کوئی حرج نہیں جب وہ کسی نوجوان اور خوبصورت عورت سے نکاح کرے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وہ مرد جس کی بیوی بڑی عمر کی ہوتی پھر وہ اس پر ایک نوجوان عورت سے نکاح کر لیتا تو وہ اپنی بڑی بیوی کو کہتا: میں تجھے اپنے مال میں سے دوں گا اس شرط پر کہ میں اس نوجوان لڑکی کے لیے تیری نسبت زیادہ دن مقرر کروں گا وہ اس صلح پر راضی ہو جاتی، اگر وہ انکار کرتی اور راضی نہ ہوتی تو باری میں عدل کرنا مرد پر لازم ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ایسے حالات میں صلح کی تمام صورتیں جائز ہیں مثلاً مرد عورت کو کچھ مال دے اس شرط پر کہ وہ صبر سے رہے یا عورت کچھ دے اس شرط پر کہ خاوند کے اس پر ترجیح دینے کے باوجود وہ اس کے پاس ٹھہری رہے یا وہ ترجیح دے اور عصمت کے ساتھ اسے روکے رکھے یا صبر پر یا ترجیح پر بغیر کچھ عطا کیے صلح واقع ہو جائے، یہ سب صورتیں مباح ہیں (3)۔ اور یہ بھی جائز ہے کوئی عورت اپنی سوکن سے کسی چیز کے بدلے اپنی باری کے متعلق صلح کر لے جو وہ اسے عطا کرے گی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے کیا تھا۔

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ پر ناراض ہوئے تو اس نے حضرت عائشہ سے کہا: میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صلح کرا میں نے اپنی باری تجھے ہبہ کر دی۔ یہ ابن خویز منداد نے احکام میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ پر ناراض ہوئے تو مجھے صفیہ نے کہا: کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرے اور میری باری تیرے لیے ہو؟ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے زعفران سے رنگا ہوا دوپٹہ اوڑھا جو میرے پاس تھا اور میں نے اس پر مزید زعفران چھڑکا پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ کے قریب بیٹھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھ سے دور ہو جا یہ تیرا دن نہیں ہے"۔ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، پھر میں نے سارا واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ سے راضی ہو گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے درمیان مساوات کو ترک کرنا اور بعض کو بعض پر ترجیح دینا جائز نہیں مگر یہ کہ مفضولہ کی اجازت اور رضا سے ترجیح جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ کوفیوں نے یُصلحا پڑھا ہے اور باقی قراء نے ان یصالحا پڑھا ہے۔ جحدری نے یصلحا پڑھا ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 355 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 167-166 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 119

جنہوں نے یصالحا پڑھا ہے اس کی وجہ یہ کہ عرب کی کلام میں معروف ہے کہ جب کسی قوم کے درمیان جھگڑا ہو تو کہا جاتا ہے: تصالح لقوم یہ نہیں کہا جاتا: اصلح القوم۔ اگر اصلح ہوتا تو اس کا مصدر اصلاحا ہوتا اور جنہوں نے یصلحا پڑھا ہے اس نے جھگڑے اور تنازع میں اس کی مثل استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فاصلح بینھم اور صلحاً کو نصب اس قرأت کی بنا پر مفعول کی حیثیت سے ہے اور عطا کی مثل اسم ہے جیسے وہ اعطیت سے اسم ہے اصلحت صلحاً، اصلحت امراً کی مثل ہے اسی طرح یصّلحا پڑھنے والے کی قرأت پر بھی مفعول ہوگا، کیونکہ باب تفاعل کبھی متعدی آتا ہے اور یہ مصدر ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے اس کے زوائد کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے یصّلحا پڑھا تو اس کی اصل یصتلحا ہے پھر یصطلحا بن گیا پھر طاء کو صاد سے بدلا گیا پھر صاد کو صاد میں بدلا گیا صاد کو طا سے نہیں بدلا، کیونکہ اس میں آواز لمبی ہو جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یہ لفظ عام مطلق ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ حقیقی صلح جس سے نفوس کو سکون ملے اور اس سے اختلاف زائل ہو، وہ طلاق سے بہتر ہے۔ اور اس معنی میں داخل ہیں وہ تمام صورتیں جس پہ مرد اور عورت کے درمیان صلح قائم ہو، مال میں ہو یا وطی میں ہو یا کسی اور اعتبار سے ہو۔ خَيْرٌ یعنی جدائی سے بہتر ہے، اختلاف، کینہ، ناراضگی پر قائم رہنا شر کے قواعد میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنی کے بارے فرمایا: انها الحالقة (1) یعنی یہ دین کو ختم کرنے والی ہے نہ کہ بالوں کو مونڈنے والی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ یہ خبر دی گئی ہے کہ بخل ہر نفس میں رکھا گیا ہے، انسان اپنی جبلت اور خلقت کی وجہ سے بخل کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بخل اسے ناپسندیدہ چیزوں سے نفرت کرنے پر ابھارتا ہے۔ کہا جاتا ہے: شح یشِح۔ ابن جبیر نے کہا: یہ عورت کا اپنے خاوند سے نفقہ کے بارے بخل کرنا اور اپنی باری کے ایام کے بارے بخل کرنا ہے۔ ابن زید نے کہا: بخل سے یہاں مراد مرد اور عورت کا بخل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ بہتر ہے، کیونکہ غالب طور پر عورت اپنے خاوند سے اپنے حصہ کے لیے بخل کرتی ہے اور خاوند غالب طور پر نوجوان عورت سے اپنے حصہ پر بخل کرتا ہے۔ الشح کا مطلب ہے اپنے نظریات وعقائد پر اور ارادہ پر ضبط کرنا۔ ہم اور اموال میں ضبط کرنا وغیرہ۔ یہ دین کے معاملہ میں ہو تو محمود ہے اس کے علاوہ ہو تو مذموم ہے اس کے متعلق اللہ نے فرمایا: وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الحشر) اور وہ جو حقوق شرعیہ کی ادائیگی سے مانع ہو یا ایسی چیز کے کرنے سے جس کا مروت تقاضا کرتی ہو وہ بخل رزیل ہے (2)۔ جب بخل ان اخلاق مذمومہ اور خصائل لئیمہ کی طرف راجع ہو تو اس کے ساتھ امید افزا خیر اور کوئی نیک صلاح باقی نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں: روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو کہا: "تمہارا سردار کون ہے"۔ انہوں نے کہا: جد بن قیس، اس بخل کے باوجود جو اس میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أیّ داءٍ أدوی من البخل کون سی بیماری بخل سے بڑی ہے؟ انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! یہ کیسے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک قوم سمندر کے ساحل پر اتری انہوں نے اپنے بخل کی وجہ سے مہمانوں کے پاس آنا ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا: ہم میں سے مرد عورتوں سے جدا ہو جائیں تاکہ مرد، مہمانوں سے

---

1۔ المستدرک للحاکم، معرفۃ الصحابہ، جلد 3، صفحہ 242　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 120

عورتوں کی دوری کا عذر پیش کریں اور عورتیں مردوں سے دوری کا عذر پیش کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، ان پر زمانہ لمبا ہو گیا تو ان کے مرد، مردوں اور عورتیں عورتوں سے مشغول ہو گئیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یہ شرط ہے اور فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ جواب ہے۔ یہ مردوں کو خطاب ہے اس حیثیت سے کہ خاوند کے لیے بخل کرتا ہے اور یہ اچھا نہیں ہے یعنی اگر تم عورتوں سے حسن سلوک کرو گے اس طرح کہ ان کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کے ساتھ رہو گے اور ان پر ظلم نہیں کرو گے تو یہ تمہارے لیے افضل ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

”اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی بیویوں کے درمیان اگرچہ تم اس کے بڑے خواہش مند بھی ہو تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ (ایک بیوی کی طرف) بالکل اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ (درمیان میں) لٹک رہی ہو اور اگر تم درست کر لو (اپنا رویہ) اور پرہیز گار بن جاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ تم عورتوں کے درمیان عدل و مساوات کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ طبعی محبت، جماع اور قلبی لگاؤ کے اعتبار سے ہے پس اللہ تعالیٰ نے بشری حالت کو بیان فرمایا اور یہاں فرمایا کہ خلقت کے اعتبار سے وہ کسی ایک کی طرف میلان قلب پر قابو نہیں رکھتے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی تھی: اللهم ان هذه قسمتی فيما املك فلا تلمنی فيما تملك ولا املك (1)۔ اے اللہ یہ میری تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں اور مجھے اس میں ملامت نہ کرنا جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں۔ پھر نہی فرمائی اور فرمایا: فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ۔ مجاہد نے کہا: تم برائی کا ارادہ نہ کرو بلکہ باری مقرر کرنے میں اور خرچہ میں برابری کو لازم پکڑو، کیونکہ اس کی انسان کو طاقت ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۂ احزاب میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قتادہ نے نضر بن انس سے انہوں نے بشیر بن نہیک سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کی دو بیویاں ہوں گی اور وہ ان کے درمیان عدل نہیں کرے گا تو وہ قیامت کے دن آئے گا جب کہ اس کی ایک طرف جھکی ہوئی ہو گی“ (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ یعنی وہ نہ مطلقہ ہو، نہ خاوند والی ہو (3)۔ یہ حسن کا قول ہے۔ یہ کسی معلق چیز سے تشبیہ ہے، کیونکہ وہ چیز نہ زمین پر قرار پذیر ہوتی ہے اور نہ اس پر ہوتی ہے جس سے لٹکائی گئی ہوتی ہے۔ یہ قول ان کی ضرب الامثال میں عام ہے: ارض من المركب بالتعليق اور نحویوں کے عرف میں یہ فعل کی تعلیق سے ہے۔ اسی سے ام زرع کی حدیث میں عورت کا قول ہے زوجی العشنق میرا خاوند لمبا تڑنگا ہے اگر میں بولوں تو مجھے طلاق دی جائے اور اگر میں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 290 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 168 3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 373

خاموش رہوں تو میں معلق رہوں گی (1)۔

قتادہ نے کہا: وہ قیدی عورت کی طرح ہے (2)۔ حضرت ابی نے فَتَذَرُوْهَا كَالْمَسْجُوْنَةِ (3) پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فَتَذَرُوها كَأَنَّهَا معلقة پڑھا ہے اور فتذروھا کا محل نصب ہے کیونکہ نہی کا جواب ہے اور کالمعلقۃ میں کاف بھی محل نصب میں ہے۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

''اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے۔ اور اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بے شک ہم نے حکم دیا ان لوگوں کو جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور (حکم دیا) تمہیں بھی کہ ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور اگر کفر کرو تو بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ یعنی اگر صلح نہ کریں بلکہ جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے متعلق اچھا گمان کریں، اللہ تعالیٰ مرد کو ایسی بیوی دے گا جس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور عورت کو ایسا مرد عطا فرمائے گا جو اس پر کشادگی کرے گا۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے غربت کی شکایت کی تو انہوں نے اسے نکاح کرنے کا حکم دیا، وہ شخص گیا اس نے نکاح کر لیا پھر وہ آیا اور غربت کی شکایت کی، انہوں نے اسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا پھر ان سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے اسے نکاح کا حکم دیا کہ شاید وہ اس آیت والوں سے ہو: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: 32) جب وہ اس آیت کے مصداق لوگوں سے نہیں تھا تو میں نے اس کو طلاق کا حکم دیا میں نے کہا: شاید یہ اس آیت کے مصداق لوگوں سے ہو: وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی تقویٰ کا حکم تمام امتوں میں عام تھا، تقویٰ کے متعلق قول گزر چکا ہے وَ اِيَّاكُمْ کا عطف الذین پر ہے۔ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ محل نصب میں ہے الاخفش نے کہا یعنی بان اتقوا اللہ۔ بعض عارفین نے کہا۔ یہ آیت قرآن کی آیات کا مدار ہے کیونکہ تمام قرآن اس پر گھومتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، یعنی تقویٰ کا حکم یہ تمام امتوں کو عام ہے اور تقویٰ

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 779 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 367 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 168

کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَ اِيَّاكُمْ الَّذِيْنَ پر اس کا عطف ہے۔ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی بأن اتقوا الله اور بعض عارفین نے کہا: یہ آیت قرآن کریم کی چکی ہے کیونکہ سارا قرآن اس پر گھومتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟ تو اس کے دو جواب ہیں۔

(۱) تاکید کے لیے تکرار فرمایا تا کہ بندے متنبہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی ملک و ملکوت میں جو کچھ ہے اس میں غور و فکر کریں وہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ تکرار کے کئی فوائد ہیں پہلے میں یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے غنی کر دے گا، کیونکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے پھر فرمایا: ہم نے تمہیں اور اہل کتاب کو تقویٰ کا حکم دیا اگر تم انکار کرو گے تو وہ تم سے بے نیاز ہے، کیونکہ اسی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ پھر تیسری مرتبہ ذکر کرنے میں اپنی تخلیق کی حفاظت اور ان کی تدبیر کے متعلق آگاہ کیا فرمایا: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا یعنی اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے، کیونکہ اسی کا ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ فرمایا: مَا فِي السَّمٰوٰتِ اور من فی السماوات نہیں فرمایا، کیونکہ جنس کا اعتبار کیا گیا اور آسمانوں اور زمینوں میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں ہیں۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝

''اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر چاہے تو لے جائے تمہیں موت کے ساتھ اَيُّهَا النَّاسُ یہ خطاب مشرکین و منافقین کو ہے۔ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ اور تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کو لے آئے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلیمان فارسی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ہم قوم هذا وہ اس کی قوم ہے۔ بعض نے فرمایا: آیت عام ہے یعنی اگر تم انکار کرو گے تو وہ تمہیں لے جائے گا اور ایسی مخلوق لے آئے گا جو تم سے زیادہ اللہ کی اطاعت گزار ہوگی۔ یہ اس طرح ہے جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝ (محمد) اس آیت میں ہر اس شخص کو تنبیہ کی گئی ہے اور ڈرایا گیا ہے جس کو کوئی ولایت، امارت اور ریاست حاصل ہے اور وہ اپنی رعیت سے انصاف نہیں کرتا یا وہ عالم ہے اور اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا اور لوگوں کو نصیحت نہیں کرتا وہ اسے لے جائے اور کوئی دوسرا لے آئے۔

وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ قدرت اللہ تعالیٰ کی ازلی صفت ہے اس کی مقدورات لامتناہی ہیں جس طرح اس کی معلومات لامتناہی ہیں، اس کی صفات میں ماضی اور مستقبل ایک جیسا ہے۔ ذکر میں ماضی کو خاص کیا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ وہ اپنی ذات اور صفات میں حادث ہے۔ قدرت سے مراد وہ قدرت ہے جس کے ساتھ فعل ہوتا ہے اس کے ہوتے ہوئے عجز کا وجود جائز نہیں ہوتا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا

بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

''جو شخص ارادہ کرتا ہو صرف ثواب دنیا کا (تو یہ اس کی اپنی کم نظری ہے) الله کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے''۔

یعنی جو آخرت کی طلب کے لیے الله تعالیٰ کے فرائض پر عمل کرے گا الله تعالیٰ اسے آخرت میں اس کا ثواب عطا فرمائے گا اور جو دنیا طلب کرنے کے لیے عمل کرے گا تو الله تعالیٰ اسے وہ عطا فرمائے گا جو اس نے دنیا میں اس کے لیے کیا ہے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی ثواب نہ ہوگا، کیونکہ اس نے غیر الله کے لیے عمل کیا جیسا کہ الله نے فرمایا: وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ (الشوریٰ) اور نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔

اور الله تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ (ہود: 16) یہ وہ لوگ ہیں نہیں ان کے لیے آخرت میں بجز آگ کے۔

اس مفہوم کی بناء پر سابقہ آیت سے مراد منافقین و کفار نہ ہوں گے۔ یہ طبری کا اختیار ہے۔ روایت ہے کہ مشرکین قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور وہ الله تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے تاکہ دنیا میں وہ ان پر وسعت فرمائے اور ان سے مصائب کو دور کرے، تو الله تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ یعنی جو وہ کہتے ہیں اسے وہ سنتا ہے اور جو وہ پوشیدہ کرتے ہیں اسے دیکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

''اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر، گواہی دینے والے محض الله کے لیے چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف (جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے) وہ دولت مند ہو یا فقیر۔ پس الله زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا۔ تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک الله تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے''۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ۔ مبالغہ کا صیغہ ذکر فرمایا یعنی تمہاری طرف سے عدل کا قیام بار بار ہو اور وہ تمہاری شہادت میں عدل ہے خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہو۔ اور انسان کا اپنے خلاف گواہی دینے کا مطلب ہے اپنے اوپر حقوق کا اقرار کرنا ہے پھر والدین کا ذکر فرمایا، کیونکہ ان کے ساتھ نیکی کرنا واجب ہے اور ان کی قدر بہت عظیم ہے پھر قریبی رشتہ داروں کا ذکر فرمایا، کیونکہ وہ مودت اور تعصب کی جگہ ہیں، اجنبی شخص تو زیادہ اس بات کا لائق ہے کہ اس پر انصاف کو قائم کیا جائے اور اس کے خلاف سچی گواہی دی جائے۔ اسی سورت میں مخلوق کے حقوق جو اموال میں ہیں ان کی حفاظت پر

کلام آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کے احکام کی صحت میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور بچے کی شہادت والدین کے خلاف نافذ ہے اور والدین سے حسن سلوک اس سے مانع نہیں ہے بلکہ ان کے خلاف گواہی دینا اور انہیں باطل سے بچانا ان سے حسن سلوک کرنے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:6) اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ کا یہی معنی ہے۔ اگر بیٹا والدین کے لیے گواہی دے یا والدین بیٹے کے لیے گواہی دے تو یہ صورت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس میں قدیم و جدید علماء میں اختلاف ہے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: سلف صالحین والدین اور بھائی کی شہادت کو جائز قرار دیتے تھے اور بطور دلیل یہ آیت پیش کرتے تھے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ سلف صالحین میں سے کوئی ایک بھی اس سلسلہ میں متہم نہیں کیا گیا۔

پھر لوگوں سے ایسے امور ظاہر ہوئے جنہوں نے والیوں کو ان کے اتہام پر ابھارا پس جس پر اتہام ہو سکتا ہے اس کی شہادت کو ترک کیا گیا اور یہ اس طرح ہو گیا کہ بچے، والد، بھائی، خاوند اور بیوی میں گواہی جائز نہیں۔ یہ حسن، نخعی، شعبی، شریح، امام مالک، امام ثوری، امام شافعی اور امام ابن حنبل کا مذہب ہے۔ اور ایک قوم نے ان کی آپس میں گواہی کو جائز قرار دیا جب کہ یہ عادل ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے اور اسحاق، ثوری اور مدنی کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا مذہب بھائی کی بھائی کے حق میں شہادت کے جواز کا مذہب ہے جب کہ وہ عادل ہو مگر نسب کے جھگڑا میں نہیں۔ ابن وہب نے ان سے روایت کیا ہے کہ بھائی کی بھائی کے حق میں گواہی جائز نہیں جب کہ وہ اس کے عیال میں ہو یا مال کے حصہ میں ہو جس کا وہ وارث ہو (1)۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا: خاوند کی بیوی کے حق میں گواہی قبول نہ ہو گی، کیونکہ ان کے درمیان املاک کے منافع جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یہ محل شہادت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میاں، بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی قبول ہے، کیونکہ دونوں اجنبی ہیں، ان کے درمیان زوجیت کا عقد ہے جو زائل ہونے والا ہے اور اصل شہادت کا قبول کرنا ہے مگر جہاں کسی مخصوص سے خاص کیا ہو پس یہ اصل پر باقی ہے۔ یہ ضعیف ہے کیونکہ زوجیت محبت، مواصلت، الفت، محبت کا موجب ہے (2)، پس اس میں تہمت قوی اور ظاہر ہے۔

ابو داؤد نے سلیمان بن موسیٰ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خائن مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی شہادت رد فرمائی اور جس کی اپنے بھائی سے دشمنی تھی اس کی شہادت اپنے بھائی کے خلاف رد فرمائی اور قانع (سائل) کی اپنے مالکوں کے حق میں گواہی رد فرمائی اور دوسرے لوگوں کے لیے جائز فرمائی (3)۔ خطابی نے کہا: ذوالغمر وہ ہوتا ہے جس کی اپنے مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی گئی ہے) سے دشمنی ظاہر ہو پس تہمت کی وجہ سے اس کی شہادت رد کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: دشمن کے خلاف اس کی گواہی قبول ہے جب کہ وہ عادل ہو۔ قانع سے مراد سائل اور کھانا طلب کرنے والا ہے۔ القنوع کی اصل سوال ہے۔ القانع کے بارے میں کہا جاتا ہے: جو قوم سے جدا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 507 2۔ ایضاً، صفحہ 508 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 151

ہو اور ان کی خدمت کرتا ہو اور ان کی ضروریات میں سے ہو۔ یہ اجیر یا وکیل کی طرح ہے۔ اس کی شہادت کے رد کی وجہ اپنی منفعت کی وجہ سے تہمت ہے، کیونکہ قانع اپنے مالکوں، موکلوں سے نفع پائے گا اس نفع سے جو انہیں پہنچے گا۔ ہر وہ شخص جو اپنی شہادت سے اپنی ذات کے لیے نفع حاصل کرے اس کی شہادت مردود ہے، جیسے کوئی شخص کسی کے حق میں گھر خریدنے کی گواہی دے جب کہ وہ خود شفیع ہو یا جس طرح کسی کے لیے کسی پر قرض کا فیصلہ کیا گیا جب کہ وہ مفلس ہے پھر وہ مفلس ایک شخص پر دین (قرض) وغیرہ کی گواہی دے۔ خطابی نے کہا: جس نے قانع کی شہادت کا مالکوں اور موکلوں کے حق میں رد ہونا منفعت کے حصول کی وجہ سے ہے، پس اس پر قیاس کر کے خاوند کی بیوی کے حق میں بھی شہادت رد ہونی چاہیے، کیونکہ ان کے درمیان منفعت کے حصول کی تہمت اس سے زیادہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہی نظریہ ہے۔ اور حدیث ان علماء کے خلاف حجت ہے جو باپ کی بیٹے کے حق میں شہادت کو جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ فطری محبت اور جبلی میلان کی وجہ سے وہ ان سے نفع حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کے مال کا مالک ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انت و مالك لابيك (1) تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک جن کی گواہی مردود ہے ان میں سے بدوی کی شہری کے خلاف گواہی ہے فرمایا: مگر یہ کہ وہ دیہات یا شہر میں ہو اور وہ جو شہر میں دیہاتی کو گواہ بناتا ہے اور اپنے پڑوسی شہریوں کو چھوڑتا ہے تو میرے نزدیک مشکوک ہے۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ بدوی (دیہاتی) کی گواہی شہری کے خلاف جائز نہیں'' (2)۔ محمد بن عبدالحکم نے کہا: امام مالک نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ یہاں حقوق اور اموال میں شہادت مراد ہے لیکن خونوں میں اور جو معاملات اس کے ہم معنی ہیں جن کو مخلوق طلب کرتی ہے ان کے بارے اس کی شہادت رد نہ ہوگی۔ عام اہل علم نے کہا: بدوی کی شہادت جب کہ وہ عادل ہو تو وہ جو شہادت بھی دے جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور مزید سورۂ براۃ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** اس کو نصب **قَوّٰمِيْنَ** کی نعت کے اعتبار سے ہے اگر تو چاہے تو خبر کے بعد خبر بنا دے۔ نحاس نے کہا: ان دونوں تراکیب سے بہتر یہ ہے کہ نصب حال کی بنا پر ہو اور ذوالحال وہ ہو جو **قَوّٰمِيْنَ** میں ایمان والوں کے ذکر میں سے ہے، کیونکہ وہ نفس معنی ہے یعنی: كونوا قوامين بالعدل عند شهادتكم۔ یعنی تم اپنی گواہی کے عدل کو قائم کرنے والے ہو۔ ابن عطیہ نے کہا: اس معنی میں اس میں حال ضعیف ہے، کیونکہ یہ شهادتكم کے معنی کی طرف عدل کو قائم کرنے کی تخفیف ہے۔ شہداء غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث ہے۔

**مسئلہ نمبر5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لِلّٰهِ**۔ اس کا معنی ہے اللہ کی ذات کے لیے اور اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے ثواب کے لیے۔ **وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ**۔ یہ شہداء کے متعلق ہے۔ یہ وہ ظاہر مفہوم ہے جس کے ساتھ مفسرین نے تفسیر کی ہے اور یہ مذکورہ شہادت حقوق میں ہے پس اس شہادت کے ذریعے حقوق والوں کے حقوق کو وہ قریب کرے گا۔ اپنے نفس پر شہادت کے قیام کا یہی معنی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس کے ساتھ ادب سکھایا ہے، جیسا کہ حضرت ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مالرجل من مال ولدہ، صفحہ 167　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام صفحہ 173-172

عباس نے فرمایا: انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ حق بات کہیں اگرچہ اپنے ہی خلاف ہو(1)۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کا معنی ہو اللہ کی وحدانیت کے گواہ بنو۔ اور وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ کا تعلق قَوّٰمِیْنَ کے ساتھ ہو۔ پہلی تاویل زیادہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ کلام میں اضمار ہے اور وہ کان کا اسم ہے یعنی ان یکن الطالب او المشھود علیه غنیا۔ یعنی اگر گواہی طلب کرنے والا یا جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے وہ غنی ہو تو اس کی غنا کا خیال نہیں کیا جائے گا اور اس سے ڈرا نہیں جائے گا اور اگر وہ فقیر ہو تو اس پر مہربانی کرنے کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ (فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا) یعنی جو اس نے ان کے لیے فقر اور غنا میں سے جو اختیار کیا ہے وہ ان کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ سدی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک غنی اور فقیر نے جھگڑا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان فقیر کے ساتھ ہوا اور آپ نے خیال کیا کہ فقیر غنی پر ظلم نہیں کرتا تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے بِهِمَا فرمایا بہ نہیں فرمایا اگرچہ او ایک کے حصول پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں میں سے ہر ایک کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ اخفش نے کہا: او کبھی بمعنی واو ہوتا ہے۔ یعنی ان یکن غنیا و فقیرا فالله اولی بالخصمین کیفما کانا۔ اگر وہ غنی ہو یا فقیر ہو اللہ تعالیٰ جھگڑنے والوں کا زیادہ خیر خواہ ہے جیسے بھی ہوں۔ اس میں ضعف ہے۔ بعض نے فرمایا: بِهِمَا فرمایا، کیونکہ ان دونوں کا ذکر پہلے گزرا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ یہ ہلاک کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (ص: 26) پس فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی، وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے۔

کیونکہ خواہش نفس کی اتباع ناحق شہادت پر ابھارتی ہے اور حکم میں ظلم پر برانگیختہ کرتی ہے۔ شعبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حکام سے تین چیزوں کا عہد لیا (۱) کہ وہ خواہشات نفس کی پیروی نہ کریں (۲) لوگوں سے نہ ڈریں اور صرف اللہ سے ڈریں (۳) اللہ تعالیٰ کی آیات کو قلیل ثمن کے عوض نہ بیچیں۔ اَنْ تَعْدِلُوْا محل نصب میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا۔ وان تلووا بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ لویت فلانا حقہ لیاً سے مشتق ہو گا جس کا معنی ہے میں نے اسے اس کا حق دیا۔ اس سے فعل لوی ہے اصل میں لَوَیَ تھا یا کو الف سے بدلا، کیونکہ یا متحرک ما قبل مفتوح تھا۔ اور مصدر لیا ہے اصل میں لَوْیا تھا اور لیانا اصل میں لویانا تھا پھر واو کو یا میں ادغام کیا گیا۔ قتبی نے کہا: تلووا، اللیی سے ہے یعنی شہادت میں ہیر پھیر کرنا اور کسی ایک خصم کی طرف میل ہونا۔ ابن عامر اور کوفیوں نے تلوا پڑھا ہے اس نے ارادہ کیا کہ اس کے امر کے لیے کھڑے ہو اور پھر اعراض کرو۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: ولیت الامر۔ میں نے کام سپرد کیا۔ اس صورت میں کلام میں امر کے قیام سے اعراض کی وجہ سے توبیخ کا معنی ہو گا۔ بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 373　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 535

تلوا کا معنی ہے اعراض کرنا۔ پس لام کے ضمہ کے ساتھ قرأت دو معانی کو مفید ہے ولایت اور اعراض اور دو واؤ کی قرأت ایک معنی کے لیے مفید ہے اور وہ اعراض کرنا ہے۔ بعض نحویوں نے کہا: جس نے تَلُوا پڑھا اس نے غلطی کی، کیونکہ یہاں ولایت کے معنی کے لیے نہیں ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا: یہ لازم نہیں آتا بلکہ تَلُوا بمعنی تَلْوُوْا ہوگا۔ اور تَلُوْا کی اصل تَلْوُوْا ہے ضمہ اس واؤ پر دشوار تھا جس کے بعد دوسری واؤ ہے تو اس کی حرکت لام کو دی گئی اور التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک واو حذف کی گئی۔ یہ لام ساکن اور دو واؤ کی قرأت کی طرح ہے یہ مکی نے ذکر کیا ہے۔

زجاج نے کہا: یہ اپنی قرأت پر دان تلودا تھا۔ پھر پہلی واؤ کو ہمزہ دیا پھر لام پر اس کی حرکت دینے کی وجہ ہمزہ میں تخفیف کی گئی تو تلوا ہو گیا اصل میں تلودا تھا۔ اس تقدیر پر دونوں قرأتیں متفق ہو گئیں۔ یہ نحاس، مکی اور ابن عربی وغیرہم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا یہ معنی ہے دو خصم قاضی کے سامنے بیٹھیں پھر قاضی ایک کی طرف میلان کرے اور دوسرے سے اعراض کرے (1)۔ اس اعتبار سے اللیّ کا معنی ہوگا کلام میں ٹال مٹول کرنا اور اس کو کھینچنا تا کہ حق کا فیصلہ فوت ہو جائے اور فیصلہ اس کے حق میں نافذ کرے جس کی طرف قاضی کا میلان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے بعض قاضیوں کو دیکھا وہ ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کے لیے کافی ہے (2)۔

حضرت ابن عباس، سدی، ابن زید، ضحاک اور مجاہد نے کہا: یہ گواہوں کے بارے میں ہے، گواہ اپنی زبان سے ہیر پھیر کرے اور سچی گواہی نہ دے یا حق کی ادائیگی سے اعراض کرے۔ آیت کا لفظ عام ہے قاضیوں اور گواہوں کو شامل ہے ہر انسان کو عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے ''مال والے کا حق کی ادائیگی سے ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور عقوبت کو حلال کرتا ہے'' (3)۔ ابن اعرابی نے کہا: عقوبت سے مراد اس کو قید کرنا ہے اور عرض سے مراد اس کی شکایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ بعض علماء نے اس آیت سے غلام کی شہادت رد کرنے سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حاکم کو شاہد (گواہ) بنایا ہے اور یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ غلام اہل شہادت میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس سے مقصود اس مہم کے ساتھ مستقل ہونا ہے جب حاجت اس کا تقاضا کرے اور یہ غلام سے اصلاً ممکن نہیں ہے پس اس کی شہادت رد ہوگی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے اور جو کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی

1۔ تفسیر ابن عباس، جلد 1، صفحہ 289، دار التراث الاسلامی
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 123
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 155

کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا یہ تمام مومنین کے متعلق نازل ہوئی معنی یہ ہے کہ اے تصدیق کرنے والو! اپنی تصدیق پر قائم رہو اور اس پر ڈٹے رہو۔ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ، الْكِتٰبِ سے مراد قرآن ہے۔ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ اس سے کتاب مراد ہے جو انبیاء کرام پر نازل ہوئی۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے نُزِّلَ اور اُنْزِلَ (ضمہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ نَزَّلَ اور انزل پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو حضرت محمد ﷺ سے پہلے انبیاء پر ایمان لائے تھے۔ بعض نے فرمایا: یہ منافقین کو خطاب ہے(1)، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اے ظاہراً ایمان لانے والو اللہ کے لیے اخلاص کا مظاہرہ کرو۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مشرکین ہیں معنی یہ ہے اے لات و عزیٰ اور طاغوت پر ایمان لانے والو! اللہ پر ایمان لاؤ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کی کتب کی تصدیق کرو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر بڑھتے گئے کفر میں نہیں ہے سنت الٰہی ان کے متعلق کہ بخش دے انہیں اور نہ (یہ) کہ پہنچائے انہیں راہ (راست) تک''۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عزیز علیہ السلام کا انکار کیا پھر حضرت عزیز علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا پھر حضرت محمد ﷺ کے انکار میں بڑھتے گئے۔ بعض علماء نے کہا: وہ لوگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان پھر حضرت عزیر علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضرت عزیر علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، نصاریٰ نے اس کا انکار کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضرت محمد ﷺ اور جو آپ لے کر آئے تھے اس کے انکار میں بڑھتے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کفر کو تو بخشتا ہی نہیں پھر کیسے فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر جب ایمان لاتا ہے تو اس کے کفر کو معاف کر دیا جاتا ہے پھر جب وہ کفر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر اس کے پہلے کفر کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہ اس طرح ہے جس طرح مسلم میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا: کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہم سے ان اعمال کا مواخذہ ہوگا جو ہم زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے تم میں سے اسلام میں اچھے اعمال کیے تو اس سے زمانہ جاہلیت کے اعمال کا مواخذہ نہ کیا جائے گا اور جو پھر کفر کرے گا تو اس سے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کے اعمال کا مواخذہ کیا جائے گا''(2)۔ ایک روایت میں ہے من اساء فی الاسلام اخذ بالاول والاخر(3) جو اسلام میں کفر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 75

3۔ صحیح بخاری، باب اثم من اشرک باللہ، حدیث نمبر 6410، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرے گا اس سے پہلے زمانہ اور پچھلے زمانہ کے اعمال کا مواخذہ ہوگا۔

یہاں الاساءۃ (برائی) کا معنی کفر ہے کیوں کہ برائی کا ارتکاب مراد لینا یہاں صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسلام اپنے سے پہلے گناہوں کو ساقط نہیں کرتا ہے مگر جو تمام گناہوں سے محفوظ رہا مگر موت کے وقت۔ اور یہ بالا جماع باطل ہے۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا کا معنی ہے کفر پر اصرار کیا۔ لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ۔ یعنی الله تعالیٰ ان کی راہنمائی نہیں کرتا۔ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ جنت کا راستہ۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ انہیں توفیق سے خاص نہیں کرتا جس طرح اپنے اولیاء کو خاص کرتا ہے۔ اس آیت میں اہل قدر پر رد ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ کافروں کو خیر کے راستہ کی ہدایت نہیں دیتا تا کہ انسان جان لے کہ وہ ہدایت الله تعالیٰ کی توفیق سے حاصل کرتا ہے اور الله تعالیٰ کے ارادہ سے ہدایت سے محروم ہوتا ہے۔ یہ آیت مرتدین کے حکم کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ مرتدین کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ (بقرہ: 217) کے تحت گزر چکی ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾

''خوشخبری سنا دو منافقوں کو کہ بلاشبہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

التبشیر اس خبر کو کہتے ہیں جس کا اثر چہرے پر ظاہر ہو اس کا بیان پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور نفاق کا معنی بھی گزر چکا ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

''وہ منافق جو بناتے ہیں کافروں کو (اپنا) دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو (وہ سن لیں) عزت تو صرف الله کے لیے ہے سب کی سب''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

الَّذِيْنَ، المنافقین کی صفت ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسلمانوں میں جو معصیت کا ارتکاب کرے وہ منافق نہیں ہے، کیونکہ وہ کفار کو دوست نہیں بناتا۔ اس آیت کے ضمن میں کفار سے دوستی کی ممانعت بھی ہے اور وہ اعمال جو دین سے متعلق ہیں ان پر کافروں سے مدد لینا بھی منع ہے۔ صحیح میں حضرت عائشہ رضی الله عنہا سے مروی ہے کہ مشرکوں میں سے ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ وہ آپ کی معیت میں جہاد میں شریک ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تو واپس چلا جا ہم مشرک سے مدد حاصل نہیں کرتے'' (1)۔ العزۃ اس کا معنی غلبہ ہے۔ عزّہ یعُزّہ عزاً جب کوئی کسی پر غالب آ جائے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ غلبہ اور قوت الله کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: يَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ اس سے مراد بنی قینقاع ہیں، کیونکہ ابن ابی نے بنی قینقاع سے دوستی لگائی تھی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 118

وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جا رہا ہے ان کا اور مذاق اڑایا جا رہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (کفر و استہزاء کرنے والوں) کے ساتھ یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں، ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں۔ وہ جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے (انجام) کا تو اگر ہو جائے تمہیں فتح اللہ کی طرف سے (تو) کہتے ہیں: کیا نہیں تھے ہم بھی تمہارے ساتھ؟ اور اگر ہو کافروں کے لیے کچھ حصہ (کامیابی سے) کہتے ہیں: کیا نہیں غالب آ گئے تھے ہم تم پر؟ اور (اس کے باوجود) کیا نہیں بچایا تھا ہم نے تم کو مومنوں سے؟ پس (اے اہل نفاق!) اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ''۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا۔ یہ ان تمام لوگوں کو خطاب ہے جس نے ایمان کا اظہار کیا خواہ وہ سچا مسلمان ہے یا منافق ہے، کیونکہ جب اس نے ایمان کا اظہار کیا تو اسے کتاب اللہ کے احکام کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (انعام: 68) یہ اس لیے نازل ہوا کہ منافقین یہودی علماء کے پاس بیٹھتے تھے اور قرآن کا مذاق اڑاتے تھے، عاصم اور یعقوب نے وقد نزّل نون اور زا کے فتحہ کے ساتھ اور زا کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اسم جلالت پہلے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ میں گزر چکا ہے۔ حمید نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے زا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے نُزِّلَ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ عاصم اور یعقوب کی قرأت پر محل نصب میں ہے، کیونکہ اس پر فعل واقع ہے اور باقی قراء کی قرأت پر محل رفع میں ہے، کیونکہ یہ فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے۔ يُكْفَرُ بِهَا یعنی جب تم آیات الٰہی کا استہزا اور کفر سنو۔ سماع کو آیات پر واقع کیا ہے مراد کفر اور استہزا کا سماع ہے جیسے تو کہتا ہے: سمعت عبد اللہ یلام یعنی میں نے عبداللہ کی ملامت سنی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ۔ کفر کے علاوہ۔ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ برائی کا

ارتکاب کرنے والوں سے اجتناب کرنے کی یہ دلیل ہے، جب ان سے کسی برائی کا ظہور ہو، کیونکہ جس نے ان سے اجتناب نہیں کیا وہ ان کے فعل سے راضی ہے اور کفر پر رضا بھی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ جو کسی بری مجلس میں بیٹھا اور ان پر انکار نہ کیا تو گناہ میں ان سے برابر کا شریک ہوگا اور جب وہ برا کلام کریں اور برائی کا عمل کریں تو ان پر انکار کرنا چاہیے اگر انکار کی طاقت نہیں ہے تو ان سے اٹھ جانا چاہیے تاکہ اس آیت کے مصداق سے نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک قوم کو شراب پیتے ہوئے پکڑا، تو انہیں ایک شخص کے بارے بتایا گیا کہ وہ روزہ دار ہے آپ نے اسے بھی تادیب کا حکم دیا اور پھر یہ آیت پڑھی (1): اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ یعنی معصیت (برائی) پر رضا بھی معصیت ہے اسی وجہ سے برائی کرنے والے اور اس پر راضی سب سے مواخذہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ تمام ہلاک ہو گئے۔ یہ مماثلت تمام صفات میں نہیں ہے بلکہ اتصاف کی وجہ سے ظاہر حکم کے ساتھ مشابہت کا الزام ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فکل قرین بالمقارن یقتدی (2)

یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ جب ثابت ہو گیا کہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں سے اجتناب کرنا چاہیے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، تو تمام بدعتی اور گمراہ فرقوں سے اجتناب اولیٰ ہے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ منسوخ ہے اس ارشاد سے مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانعام: 69) نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے ان کفاروں کے حساب سے کچھ بوجھ۔

عام مفسرین نے فرمایا: یہ محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔ جو یبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے فرمایا: اس آیت میں قیامت تک ہر دین میں بدعت نکالنے والا داخل ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ اصل میں جامع تنوین کے ساتھ تھا۔ استخفافاً تنوین کو حذف کیا گیا۔ یہ بمعنی یجمع ہے۔ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ اس سے مراد منافقین ہیں یعنی منافقین تم پر گردش زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ یہود پر تمہیں غلبہ مل جائے اور مال غنیمت حاصل ہو تو قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ ہمیں بھی مال غنیمت عطا کرو۔ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ اگر کافروں کو کامیابی ملے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ تو کہتے ہیں: کیا ہم غالب نہیں آ گئے تھے تم پر؟ حتیٰ کہ مسلمان تم سے ڈر گئے تھے اور ہم نے انہیں تم سے رسوا کیا تھا۔ کہا جاتا ہے: استحوذ علی کذا۔ یعنی وہ اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے ہے: استحوذ علیهم الشیطان یعنی شیطان ان پر غالب آ گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الاستحواذ کا اصل معنی گھیرنا ہے۔ حاذہ یحوز حوزاً جب کوئی کسی کا احاطہ کر لے۔ یہ فعل اپنی اصل پر آیا ہے اگر اس میں تعلیل کی جاتی تو یہ الم نستحذ ہوتا۔ اور اعلال کی صورت میں فعل استحاذ یستحیذ ہوتا ہے اور بغیر اعلال کے استحوذ یستحوذ ہوتا ہے۔

وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی ہم نے انہیں تم سے دور کیا اور ہم نے انہیں تمہارے ارادے سے جدا کر دیا۔ یہ آیت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124　　2۔ ایضاً　　3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 175

دلالت کرتی ہے کہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں نکلتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ (الحدید:14) اور یہ دلالت کرتی ہے کہ مسلمان انہیں غنیمت نہیں دیتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے مال غنیمت طلب کیا اور کہا: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ مسلمان پر بطور احسان جتلانا ہو یعنی ہم تمہیں ان کی باتیں بتاتے تھے اور ہم تمہارے مددگار تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾ اس میں علماء کی پانچ تاویلات ہیں۔(۱) یسیع خضرمی سے روایت ہے اس نے کہا: میں حضرت علی بن ابی طالب کے پاس حاضر تھا، ایک شخص نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا۔ یہ کیسے ہے؟ بعض اوقات ہم سے جنگ کرتے ہیں اور ہم پر غالب آجاتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا معنی قیامت کے دن اور فیصلہ کا دن ہے(1)۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ قیامت کے دن ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا: تمام اہل تاویل نے یہ کہا ہے(2)۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ اس میں خبر کا فائدہ نہیں ہے اگرچہ کلام کی ابتدا میں اس مفہوم کا ذکر ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ حکم کو قیامت تک مؤخر فرمایا اور دنیا میں معاملہ اسی طرح فرمایا کہ کبھی کفار غالب آتے ہیں اور کبھی مسلمان غالب آتے ہیں، جیسی اس کی حکمت ہوتی ہے اور جیسا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا: وَ لَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا اس نے وہم کیا ہے جس نے کہا ہے کہ آخری کلام پہلے کلام کی طرف راجع ہے، یہ اس کے فائدہ کو گرادیتی ہے، کیونکہ یہ تکرار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے کوئی ایسا راستہ نہیں بنائے گا کہ وہ مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر دیں اور ان کے آثار ختم کر دیں اور ان کی ملت کو مباح کر دیں جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرمایا: ''میں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کرے اور ان پر اپنے سوا دشمن کو مسلط نہ کرے کہ وہ ان کی ملت کو مباح کر دے اور میرے رب نے فرمایا: اے محمد (ﷺ) میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو اسے رد نہیں کیا جاتا اور میں نے تجھے تیری امت کے لیے یہ عطا کیا کہ میں انہیں قحط سالی میں مبتلا کر کے ہلاک نہیں کروں گا اور میں ان پر، ان کے اپنے سوا دشمن کو مسلط نہیں کروں گا کہ وہ ان کی ملت کو مباح کر دے اگرچہ ان پر ہر طرف کے لوگ بھی جمع ہو جائیں حتیٰ کہ یہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور یہ ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مومنین پر غلبہ کی کوئی راہ نہیں بنائے گا مگر یہ کہ باطل کا حکم دینا شروع کر دیں برائی سے نہ رکیں اور توبہ نہ کریں تو دشمن ان کی اپنی طرف سے ان پر غالب آئے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (الشوریٰ:30) اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ بہت نفیس قول ہے۔

---

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 139　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124

میں کہتا ہوں: اس پر دلیل حضرت ثوبان کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: حتی یکون بعضهم یهلك بعضا ویسبی بعضهم بعضا یعنی حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ (حتیٰ) غایت کے لیے ہے پس ظاہر کلام اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دشمن ان پر غالب نہیں آئے گا کہ وہ انہیں مباح کر دے مگر یہ کہ جب مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے۔ اس زمانہ میں جو مسلمانوں کے درمیان جنگیں واقع ہوئی ہیں اس میں یہ پایا گیا ہے کافروں کی شوکت سخت ہوگئی ہے اور وہ مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگئے حتیٰ کہ بہت کم شہر (ملک) ایسے ہیں جن پر کافروں کا معنوی طور پر غلبہ نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے عفو، نصرت اور لطف کے ساتھ ہم پر کرم فرمائے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ نے مومنین پر کافروں کے لیے کوئی شریعت نہیں بنائی۔ جو کافروں کی طرف سے ہوگا وہ شرع کے خلاف ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مومنین پر کوئی حجت عقلیہ اور شرعیہ نہیں بنائی جس کے ذریعے وہ غالب آ جائیں مگر اللہ تعالیٰ اسے باطل کردے گا اور اس حجت کو نیست و نابود کردے گا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ کافر مسلمان غلام کا مالک نہیں ہوتا یہی قول اشہب اور امام شافعی کا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر کے لیے مسلمان پر سبیل کی نفی فرمائی ہے اور خریدنے کے ساتھ ملکیت بھی سبیل ہے پس یہ اس کے لیے جائز نہ ہوگا اس کی عقد منعقد نہ ہوگی۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ...... الخ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے دائمی ملک کا راستہ نہیں بنایا، کیونکہ دیکھتے ہیں کہ کافر کو ابتداءً مسلمان پر ملکیت ہوتی ہے اور وہ میراث کے لیے ذریعے ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کافر غلام، کافر کی ملکیت میں مسلمان ہو جائے تو اس پر بیع کا فیصلہ لازم ہوتا ہے اور اس کی بیع کا حکم قبول کیا جاتا ہے، کوئی شخص فوت ہو اور کافر کا وارث، مسلمان غلام کا وارث ہو جائے۔ یہ ایسا سبیل ہے جو قہراً ثابت ہے، اس میں قصد و ارادہ نہیں ہے اور خریدنے کے ساتھ ملکیت نیت کے قصد کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، اس میں کافر نے اپنے اختیار سے ملک کا ارادہ کیا ہے اگر اس کی بیع کے عقد کا حکم لگایا جائے اور اس کی ملکیت کے ثبوت کا حکم لگایا جائے تو اس میں اس کا قصد ثابت ہوگا اور اس نے اس پر سبیل بنالیا (1)۔ ابوعمر نے کہا: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نصرانی اور یہودی کا مسلمان غلام کو آزاد کرنا صحیح ہے اور اس پر نافذ ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جب کسی کافر کا غلام مسلمان ہو جائے تو اسے بیچا جائے گا اور اس کی قیمت کافر کو دی جائے گی۔ یہ دلیل ہے کہ یہ اس کی ملک پر بیع ہے اور اس کی ملک پر آزادی ثابت ہوئی ہے مگر یہ ملکیت غیر مستقر ہے، کیونکہ اس پر اس کا بیچنا واجب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا اس سے مراد غلام بنانا، ملکیت حاصل کرنا اور عبودیت ہے جو دائمی اور مستقل ہو۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 510

علماء کا اختلاف ہے کہ کافر کا مسلمان غلام کو خریدنے کا حکم کیا ہے؟ اس میں دو قول ہیں (۱) اس کی بیع فسخ ہے (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بیع صحیح ہے اور مشتری پر اس کو بیچا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ ایک نصرانی نے اپنے نصرانی غلام کو مدبر بنایا پھر وہ غلام مسلمان ہو گیا۔ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ اس کے اور غلام کے درمیان حائل ہوا جائے گا اور وہ اپنے نصرانی سردار پر نکالا جائے گا اور اسے اس پر بیچا نہیں جائے گا حتیٰ کہ اس کا امر واضح ہو جائے۔ اگر نصرانی ہلاک ہو گیا اور اس پر قرضہ تھا تو مدبر غلام کی ثمن سے اس کا قرضہ ادا کیا جائے گا مگر یہ کہ اس نے اتنا مال چھوڑا ہو جس سے اس کا قرضہ اتارا جا سکتا ہو تو مدبر آزاد ہو جائے گا۔

امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اسے اس پر بیچا جائے گا جب وہ مسلمان ہو گا۔ اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے، کیونکہ مدبر وصیت ہے اور مسلمان کو مشرک کی ملکیت میں چھوڑنا جائز نہیں کہ وہ اسے ذلیل کرے اور اسے میراث میں نکالے۔ اسلام کی وجہ سے وہ اس کا دشمن بن گیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: نصرانی غلام مسلمان سے بیچا گیا پھر مسلمان نے اسے آزاد کر دیا اور ولاء اس کی ہوگی جس نے اس کو خریدا اور آزاد کیا اور نصرانی کو غلام کی قیمت دی جائے گی۔ سفیان اور کوفیوں نے کہا: جب نصرانی کا مدبر غلام مسلمان ہو جائے تو اس کی قیمت لگائی جائے گی اور وہ غلام اپنی قیمت کما کر دے گا اگر نصرانی مدبر کی سعایت (مال کی ادائیگی کے لیے کوشش) سے فارغ ہونے سے پہلے مر گیا تو غلام آزاد ہو جائے گا اور سعایت باطل ہو جائے گی۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾

"بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (وہ بھی عبادت کی نیت سے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑی دیر"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ۔ الخدع کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ کی طرف سے خداع کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور رسل کو دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس کی سزا دیتا ہے حسن نے کہا: مومن، منافق ہر شخص کو قیامت کے دن نور دیا جائے گا منافقین خوش ہوں گے اور یہ گمان کریں گے کہ وہ نجات پا گئے لیکن جب وہ پل صراط پر آئیں گے تو ہر منافق کا نور بجھ جائے گا (1)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اسی کا ذکر ہے: اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید: 13)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یعنی وہ ریا کاری کے لیے نماز پڑھتے ہیں، وہ سستی اور کاہلی میں نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ نماز کے ترک پر سزا کا اعتقاد رکھتے ہیں، کیونکہ عشاء کی نماز کا وقت ہوتا تو وہ دن کے کام سے تھک چکے ہوتے تھے اور ان پر اس کا قیام ثقیل ہوتا تھا اور صبح کی نماز کا وقت ہوتا تو انہیں نیند بہت پیاری ہوتی (2)۔ اگر

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 374
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 511

انہیں تلوار کا ڈر نہ ہوتا تو وہ کبھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔

ریا کا معنی خوبصورتی کا اظہار ہے تاکہ لوگ اسے دیکھیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کے لیے نہیں اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وصف بیان کیا کہ خوف اور ریا کاری کے ساتھ ساتھ ذکر بھی بہت کم کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے نماز میں تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ منافقین کی نماز ہے''۔ تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا۔ ''ان میں سے کوئی بیٹھا ہوا سورج کو تاڑتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے یا فرمایا شیطان کے دو سینگوں کے اوپر ہوتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے۔ (مرغ کی طرح) چار چونچیں مارتا ہے اور اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر بہت تھوڑا'' (1)۔ اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے منافقین کا وصف قلت ذکر کے ساتھ کیا، کیونکہ وہ قرأت اور تسبیح کے ساتھ اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے وہ تکبیر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قلت کے ساتھ ان کا وصف بیان فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا۔ بعض نے فرمایا: اس میں اخلاص نہیں ہوتا اس لیے قلت سے تعبیر فرمایا۔

یہاں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی نماز کو بیان فرمایا اور اس کے رسول مکرم حضرت محمد ﷺ نے بھی ان کی نماز کو بیان فرمایا، فرمایا: ''جو ان کی نماز کی طرح نماز پڑھے گا اور جس نے ان کے ذکر کی طرح ذکر کیا وہ عدم قبولیت میں ان کے ساتھ لاحق ہوگا''۔ یہ اس ارشاد، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (المومنون) کے مقتضی سے خارج ہے اس کا بیان آگے آئے گا مگر جس کو عذر ہو اور وہ صرف فرض کی ادائیگی پر اکتفا کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اعرابی کو سکھایا جب آپ نے اسے نماز صحیح نہ پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو مکمل وضو کر پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر جو قرآن پڑھنا ممکن ہو وہ پڑھ پھر رکوع کر حتیٰ کہ مطمئن ہو کر رکوع کرے پھر سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ اطمینان سے سجدہ کرے پھر سر اٹھا حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جائے پھر پوری نماز میں اس طرح کر'' (2)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لا صلاۃ لمن لم یقرء بام القرآن (3) اس کی نماز (مکمل) نہیں جس نے الحمد شریف نہ پڑھی اور فرمایا: ''نماز جائز نہیں جس میں آدمی اپنی پیٹھ کو رکوع اور سجود میں سیدھا نہ کرے'' (4)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور بعد والے علماء کا اس پر عمل ہے۔ عطا فرماتے ہیں: آدمی رکوع و سجود میں پیٹھ کو سیدھا کرے۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: جو رکوع و سجود میں پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نماز جائز نہیں جس میں آدمی رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا'' (5)۔ ابن عربی نے کہا: ابن القاسم اور امام ابو

---

1۔ صحیح مسلم، المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 225　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 170
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 169　4۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 36　5۔ ایضاً

حنیفہ نے کہا: طمانینت فرض نہیں، یہ عراقی روایت ہے، مالکیوں میں سے کسی کے لیے اس سے مشغول ہونا مناسب نہیں۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی تاکہ وہ اسے دیکھیں اور اس کے لیے ایمان کی گواہی دیں یا اس نے شہادت کی قبولیت اور امامت کے جواز کے لیے مرتبہ اور ظہور کو طلب کرنے کا ارادہ کیا تو یہ وہ ریا نہیں ہوگا جس سے منع کیا گیا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریا جو گناہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو شکار کرے اور اس کے ذریعے خوراک حاصل کرے۔ یہ نیت جائز نہیں ہے اور اس پر اعادہ لازم ہے۔

میں کہتا ہوں: شہادت کی قبولیت کے لیے ظہور اور مرتبہ طلب کرنے کا ارادہ کیا ہو، اس قول میں نظر ہے۔ اس کا بیان سورۂ نساء میں گزر چکا ہے۔ وہاں اس میں غور کرو۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ریا فرض اور نفل میں داخل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا یہ عام ہے۔ ایک قوم نے کہا: خاص نفل میں داخل ہے، کیونکہ فرض تمام لوگوں پر واجب ہے اور نفل اس کی اپنی طرف سے ہے۔ بعض نے اس کے برعکس فرمایا، کیونکہ نوافل نہ بھی پڑھے تو اس پر مؤاخذہ نہیں۔

مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾

''ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان نہ ادھر کے نہ ادھر کے اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے ہدایت کا راستہ''۔

المذبذب وہ شخص جو دو امروں کے درمیان متردد ہو۔ الذبذبة کا معنی اضطراب ہے۔ کہا جاتا ہے: ذبذبته فتذبذب۔ اسی سے نابغہ کا قول ہے:

ألم تر أنّ الله أعطاك سَوْرَة ترى كلّ مَلْك دو نها يَتَذَبْذَبُ(1)

ایک اور شاعر نے کہا:

خيال لأم السَلْسَبِيل ودونها مَسيرة شَهْر للبريد المذَبْذِبِ(2)

اسی طرح دوسرے ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ابن جنی نے کہا: یعنی حرکت کرنے والا پریشان جو ٹھہرتا نہ ہو، نہ آرام کرتا ہو، یہ منافقین، مومنین اور مشرکین کے درمیان متردد تھے نہ خالص ایمان لانے والے تھے اور نہ صراحتاً کفر کا اقرار کرنے والے تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر کی حدیث سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان متردد ہوتی ہے کبھی ایک کی طرف جاتی ہے کبھی دوسرے کی طرف جاتی ہے''(3)۔ ایک روایت میں تعیر کی جگہ تکر ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 389 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 127 3۔ صحیح مسلم، صفات المنافقین و احکامھم، جلد 2، صفحہ 370

جمہور علماء نے مذبذبین میم کے ضمہ اور دونوں ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے دوسری ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت ابی کے حرف میں متذبذبین ہے (1)۔ اس قرأت پر ادغام جائز ہے یعنی مذبذبین پہلی ذال کی تشدید کے ساتھ اور دوسری کے کسرہ کے ساتھ۔ ابوالحسن سے میم کے فتحہ اور دو ذالوں کے ساتھ مروی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

''اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنا دو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف واضح دلیل؟''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ، الکافرین اور اولیاء دو مفعول ہیں یعنی کافروں کو اپنے خاص دوست اور راز دان نہ بناؤ۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿﴾ یعنی کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے عذاب دینے کے لیے خود ہی اپنے خلاف حجت قائم کرو؟ جب کہ اس نے تمہیں منع کیا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

''بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے اور پر ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الدَّرْكِ کوفیوں نے را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے لیکن پہلا قول افصح ہے، کیونکہ جمع میں ادراک کہا جاتا ہے جیسے جمل کی جمع اجمال ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ ابوعلی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الشَّمَع اور الشمع اور اس کی جمع ادراک ہے۔ بعض نے فرمایا: الدرک کی جمع ادرُک ہے جیسے فلس کی جمع افلس ہے۔ دوزخ کے سات طبقات ہیں مگر پستی کی جانب درجات کو عرب ادراک کہتے ہیں: کہا جاتا ہے: کوئیں کے لیے ادراک ہیں اور بلندی کی جانب درجات کو درجات کہتے ہیں۔ جنت کے لیے درجات ہیں اور آگ کے لیے درکات ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

منافق نچلے طبقہ میں ہوں گے یہ ہاویہ ہے۔ کیونکہ ان کا کفر زیادہ غلیظ ہے اور ان کا دھوکا بہت زیادہ ہے اور مومنین کو اذیت دینا بہت کثیر ہے۔ اوپر والا آگ کا درجہ جہنم ہے پھر لظی ہے پھر حطمہ ہے پھر سعیر ہے پھر سقر ہے پھر جحیم ہے پھر ہاویہ ہے۔ ان تمام کو پہلے طبقہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے احسان اور کرم سے ہمیں ان تمام طبقات سے محفوظ فرمائے۔ حضرت ابن مسعود سے فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کی تفسیر یہ مروی ہے کہ آگ میں لوہے کے تابوت ہیں جو منافقین پر بند کیے جائیں گے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: قیامت کے روز سخت عذاب تین قسم کے لوگوں کو ہوگا۔ (۱) منافقین (۲) اصحاب مائدہ میں سے جنہوں نے انکار کیا (۳) آل فرعون۔ اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ اور اصحاب مائدہ کے بارے فرمایا: فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 127

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ (المائدہ) اور آل فرعون کے بارے فرمایا: اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (غافر) (داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَ سَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۴۶﴾

"مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ کے لیے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور عطا فرمائے گا اللہ تعالیٰ مومنوں کو اجر عظیم"۔

یہ منافقین سے استثنا ہے۔ نفاق سے توبہ کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل کی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے یعنی ذات باری تعالیٰ کو ملجا و معاذ بنائے اور اپنے دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرے جیسا کہ اس آیت نے واضح کیا ہے ورنہ توبہ کرنے والا نہ ہوگا۔ اس وجہ سے منافقین کے مومنین سے ملنے کی وجہ سے ان کا اجر مومنین کے اجر کے برابر ذکر فرمایا۔ بخاری میں اسود سے مروی ہے فرمایا: ہم عبداللہ کے حلقہ میں بیٹھے تھے حضرت حذیفہ آئے حتیٰ کہ ہمارے اوپر کھڑے ہوئے پھر سلام کیا پھر کہا: نفاق تم سے بہتر قوم پر نازل ہوا تھا۔ اسود نے کہا: سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں۔ حضرت عبداللہ مسکرائے اور حضرت حذیفہ مسجد کے ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت عبداللہ اٹھے تو ان کے شاگرد بکھر گئے حضرت حذیفہ نے مجھے کنکری ماری تو میں ان کی طرف آیا حضرت حذیفہ نے کہا: مجھے حضرت عبداللہ کے ہنسنے سے تعجب ہوا ہے جو میں نے کہا تھا وہ جان گئے تھے، بے شک اس قوم پر نفاق نازل ہوا تھا جو تم سے بہتر تھی، پھر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی (1)۔

فراء نے کہا: فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ کا معنی ہے من المومنین۔ یہ نہیں فرمایا: هم المومنون (وہ مومن ہیں)۔ یُؤْتِ سے جس طرح یا بولنے میں حذف ہوتی ہے لکھنے میں بھی حذف کی گئی، کیونکہ یا بھی ساکن ہے اور اس کے بعد لام بھی ساکن ہے، اس کی مثال: یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ، سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ اور یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ ہے۔ واو اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف کی گئی ہے۔

مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۷﴾

"کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان ہے سب کچھ جاننے والا ہے"۔

استفہام بمعنی تقریر ہے منافقین کے لیے۔ تقدیر یہ ہے تمہیں عذاب دینے میں اس کے لیے کیا منفعت ہے اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ وہ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا۔ اس کا اپنے بندوں کو عذاب دینا اس کی بادشاہی میں اضافہ نہیں کرتا اور ان کے برے افعال پر ان کو عذاب نہ دینا اس کی سلطنت میں کمی نہیں کرتا۔ مکحول نے کہا: جس

1۔ صحیح بخاری تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 662

میں یہ چار چیزیں ہوں اس کے حق میں یہ ہیں اور جس میں یہ تین چیزیں ہوں وہ اس کے خلاف ہیں۔ چار چیزیں جو انسان کے حق میں ہوتی ہیں (۱) شکر (۲) ایمان (۳) دعا (۴) استغفار۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (الانفال) اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ تشریف فرما ہیں ان میں اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:77) آپ فرمائیے: کیا پروا ہے تمہاری میرے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔

اور وہ تین چیزیں جو انسان کے خلاف ہوتی ہیں وہ یہ ہیں (۱) دھوکا (۲) بغاوت (۳) عہد شکنی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ (الفتح:10) پس جس نے توڑ دیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر:43) نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے۔ اور فرمایا: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (یونس:23)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قدردانی فرماتا ہے جب وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ یشکرھم کا معنی ہے وہ انہیں ثواب دیتا ہے اور تھوڑے سے عمل کو قبول فرماتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔ یہ اطاعت پر اس کی طرف سے شکر ہے۔ لغت میں شکر کا معنی ظہور ہے۔ کہا جاتا ہے: دابة شکور۔ جو اپنے چارے سے زیادہ موٹا پا ظاہر کرے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیلاً گزر چکا ہے۔ عرب ضرب المثل کے طور پر کہتے ہیں: أَشْكَرُ مِنْ بَرْوَقَه وہ تو زمین کے پہلے سبزہ سے بھی زیادہ ظاہر ہونے والا ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: پہلا سبزہ بادل کے سایہ سے ہی سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے بغیر بارش کے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

”نہیں پسند کرتا اللہ تعالیٰ کہ برملا کہی جائے بری بات مگر (اس سے) جس پر ظلم ہوا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ اگر تم ظاہر کرو کوئی نیکی یا پوشیدہ رکھو اسے یا درگزر کرو (کسی کی) برائی سے تو بے شک اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا قدرت والا ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کلام یہاں مکمل ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا مَنْ ظُلِمَ یہ استثنا پہلی کلام سے نہیں ہے۔ یہ محل نصب میں ہے یعنی جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے یہ کہنا جائز ہے کہ فلاں نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو تقدیر کلام اس طرح ہو: لا یحب اللہ ان یجھر احد بالسوء الا من ظلم۔

جمہور علماء کی قرأت ظُلِمَ ظاء کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ اور لام کا ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ اور جن علماء نے ظَلَمَ ظا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ زید بن اسلم، ابن ابی اسحاق وغیرہما ہیں اور فتحہ کی خفت کی وجہ سے لام کو ساکن کرنا جائز نہیں پس پہلی قرأت پر ایک طائفہ نے کہا: اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ کوئی برملا بری بات کہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو تو اس کے لیے اپنی مظلومیت کی داستان سنانا مکروہ نہیں۔ پھر برملا بری بات کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں سے جو مباح ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: ایک شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف دعا نہ کرے بلکہ اس طرح کہے: اللهم أعِنّي عليه، اللهم أستخرج حقي، اللهم حُلْ بينه و بين ما يريد من ظلمي (1) اے اللہ اس کے خلاف میری مدد فرما، اے اللہ میرا حق نکال دے، اے اللہ اس کے اور جو وہ مجھ پر ظلم کا ارادہ کرتا ہے اس کے درمیان حائل ہو جا۔ یہ مدافعت کی دعا ہے اور یہ سوء کی کم سے کم منزل ہے۔

حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس کے لیے مباح ہے جس پر ظلم کیا گیا ہے کہ وہ ظالم کے خلاف بددعا کرے (2)، اگر وہ صبر کرے تو اس کے لیے بہتر ہے، یہ ظالم کے خلاف دعا کی نوع میں اطلاق ہے۔ سدی اور حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی ہے کہ جس پر ظلم کیا گیا ہے اس کے لیے ظالم پر اس کے ظلم کی مثل ظلم کرنا اور اس کی برائی بیان کرنا جائز ہے (3)۔ ابن مستنیر نے کہا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ کا معنی ہے جس کو کفر یا اسی جیسی بری بات پر مجبور کیا گیا ہو۔ یہ مباح ہے۔ اس مفہوم پر آیت اکراہ کے بارے میں ہوگی (4)۔ اور اسی طرح قطرب نے کہا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ سے مراد مکرہ (جس کو مجبور کیا گیا ہو) ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہوتا ہے، وہ اگرچہ کفریہ کلمہ بھی کہہ دے تو اس پر گرفت نہیں ہے۔ فرمایا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ کا معنی بدل کی حیثیت سے بھی جائز ہے گویا یوں فرمایا: لایحب الله الا من ظلم۔ یعنی اللہ تعالیٰ ظالم کو پسند نہیں کرتا گویا وہ فرماتا ہے: وہ مظلوم کو اجر دیتا ہے۔ اس قول پر تقدیر اس طرح ہوگی: لایحب الله ذا الجهر بالسوٓ الا من ظلم یہ بدل کے اعتبار سے ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ ضیافت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسے یہ کہنے کی رخصت دی گئی ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو صحرا میں کسی شخص کا مہمان بنا تو اس نے اس کی مہمان نوازی نہ کی تو یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ۔ اس روایت کو ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیت ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کسی کے پاس سے گزرا تو اس نے اس کی مہمان نوازی نہ کی تو اسے یہ کہنے کی رخصت دی گئی کہ اس نے میری اچھے طریقہ سے ضیافت نہیں کی (5)۔ جن علماء نے ضیافت کو واجب قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: کیونکہ ظلم ممنوع ہے پس یہ ضیافت کے وجوب پر دلیل ہے۔ لیث بن سعد کا یہی قول ہے۔

جمہور علماء کہتے ہیں: ضیافت (مہمان نوازی) یہ مکارم اخلاق میں سے ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ ہود میں آئے گا۔

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 375
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 539
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 540
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 129
5۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 540

ظاہر آیت کا مقتضا یہ ہے کہ مظلوم مناسب حد تک ظالم سے بدلہ لے سکتا ہے اگر وہ مومن ہے جیسا کہ حضرت حسن نے فرمایا: قذف کے مقابلہ میں قذف ہو تو یہ درست نہیں۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اگر وہ کافر ہے تو پھر اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دے اور اس کے لیے ہلاکت، ہر دعا جو چاہے مانگ لے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی ''اے اللہ! مضر قبیلہ کو روند ڈال، ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ جیسے قحط میں مبتلا کر دے (1)'' اور عرض کی: ''اے اللہ! فلاں کو اپنی گرفت میں لے لے، فلاں کو اپنی گرفت میں لے لے''۔ آپ نے قریش کے نام لیے۔ اگر وہ سر عام ظلم کرنے والا ہے تو اس کے خلاف بدعا بھی جہراً ہوگی، نہ اس کی عزت محترم ہوگی، نہ اس کا بدن محترم ہوگا، نہ اس کا مال محترم ہوگا۔ ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ان کی کوئی چیز چوری کی گئی تھی میں چور کے خلاف دعا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''اپنی بددعا کے ساتھ اس کی سزا میں تخفیف نہ کر'' (2)۔

عمرو بن شرید نے اپنے باپ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''قرض کی ادائیگی پر قادر شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کرتا ہے'' (3)۔ ابن مبارک نے کہا: اس کی عزت کو حلال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے سخت کلامی کی جاتی ہے اور اس کی سزا کے حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قید کیا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے ''غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (4)'' خوشحال قادر شخص سے جب ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے اور وہ ٹال مٹول کرے تو یہ ظلم ہے یہ اس کی عزت کو مباح کر دیتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے: فلاں لوگوں سے ٹال مٹول کرتا ہے، لوگوں کے حقوق روکتا ہے۔ امام کے لیے اس کو ادب سکھانا اور اس کو تعزیر لگانا مباح کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عمل سے اجتناب کرے۔ یہی معنی سفیان سے بھی مروی ہے۔ یہی ابن المبارک کے قول کا معنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس باب سے وہ نہیں ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عباس کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہما کے متعلق ہے جو انہوں نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی موجودگی میں کہا تھا: اے امیر المومنین! میرے اور اس جھوٹے گنہگار، غادر خائن کے درمیان جو جھگڑا ہے اس کا فیصلہ کیجئے۔ کسی نے بھی ان پر بات کو لوٹایا نہیں، کیونکہ یہ فیصلہ تھا اور حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک اپنے آپ کو سچا اور صحیح سمجھتا تھا حتیٰ کہ حضرت عمر نے ان پر جو واجب تھا وہ نافذ کر دیا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ اس صورت میں ہے جب مقامات و مراتب برابر ہوں، لیکن جب مراتب میں فرق ہو تو کمتر لوگوں کو فضلاء پر زبان کھولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی (5)، بلکہ ان کا حق صرف دعویٰ کے ساتھ طلب کیا جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عباس کی طرف سے جو گفتگو تھی وہ غصے میں تھی کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ قول اپنے چچا ہونے کی حیثیت سے بولا، کیونکہ چچا باپ کی مثل ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں باپ جب بیٹے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 946
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 316۔ ایضاً، حدیث 1279، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 155
4۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 513

کے بارے میں ان الفاظ کا اطلاق کرتا ہے تو اس میں سختی اور جھڑکنے میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے نہ کہ بیٹا واقعی ان امور سے موصوف ہوتا ہے، نیز وہ ایک دینی ولایت کے جھگڑے میں تھے حضرت عباس کا خیال تھا کہ ان کی اس میں مخالفت جائز نہیں اور ان کی اس مسئلہ میں مخالفت کو مخالف ان امور سے متصف کر دیتا ہے پس آپ نے ان وجوہ کی بنا پر غصہ کی وجہ سے ایسا کہا تھا، جب حاضرین نے یہ جان لیا تھا تو کسی نے حضرت عباس پر انکار نہ کیا۔ یہ مازری اور قاضی عیاض وغیرہما کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نے ظَلَمَ پڑھا یعنی ظاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ زید بن اسلم کی قرأت ہے یہ محمد بن کعب قرظی کے بعد مدینہ میں قرآن جاننے والے علماء میں سے تھے اور یہ ابن ابی اسحاق، ضحاک، حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور عطا السائب کی قرأت ہے یعنی جس نے قول یا فعل میں ظلم کیا تو اس کی سرعام برائی بیان کرو۔ معنی میں فعل سے نہی ہے اور اسے زجر و توبیخ کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا کہ جو نفاق سے توبہ کرے پھر اسے کہا جائے کہ کیا تو پہلے منافق نہیں تھا؟ الا ظلم مگر جو نفاق پر قائم رہے۔ اس پر دلیل یہ قول ہے۔ الا الذین تابوا۔ ابن زید نے کہا: یہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق خبر دی کہ دوزخ کے نچلے طبقہ میں، پس تو جہراً ان کی برائی کا بیان تھا پھر اس کے بعد ان کے متعلق فرمایا: ما یفعل اللہ بعذابکم یہ ان کو مانوس کرنا اور شکر و ایمان کی طرف بلاتا ہے پھر مومنین کو فرمایا: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ یعنی جو مسلمان ہو جائے تو اسے منافق نہ کہو مگر وہ جو نفاق پر قائم ہو اسے کہا جائے گا کیا تو منافق، کافر نہیں ہے، تیرے لیے آگ کا نچلا طبقہ ہے اس جیسا اور کوئی قول۔ ایک قوم نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا کہ کسی کی سرعام برائی بیان کی جائے پھر استثنا منقطع ذکر فرمایا لیکن جو ظلم کرے وہ ظلم و زیادتی کرتے ہوئے مظلوم کی عزت کو بھی تار تار کرے جب کہ وہ ہے بھی ظالم۔

میں کہتا ہوں: یہ اکثر ظالموں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے ظلم کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے گالی گلوچ بھی دیتے ہیں اور مظلوم کی عزت کو بھی تار تار کرتے ہیں جس کو ان پر حرام کیا گیا تھا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: اِلَّا مَنْ ظَلِمَ جس نے بری بات کہی مناسب ہے کہ ہم اس کے ہاتھ کو پکڑیں۔ یہ پہلی کلام سے استثنا نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں: اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں ایک حدیث یہ ہے خذوا علی ایدی سفھائکم (1)۔ تم اپنے بے وقوفوں کے ہاتھوں کو پکڑو۔ اور ارشاد ہے ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو'' (2)۔ صحابہ نے کہا: یہ مظلوم ہم اس کی تو مدد کریں گے، ظالم کی مدد کیسے کریں؟ فرمایا: ''تم اسے ظلم سے روکو''۔ فراء نے کہا: اِلَّا مَنْ ظُلِمَ یعنی ولا من ظلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ظالم کو ڈرایا گیا ہے تاکہ وہ ظلم نہ کرے اور مظلوم کو اس جملہ سے ڈرایا گیا ہے کہ وہ انتقام لینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ پھر اس کے بعد فرمایا: اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ۔ عفو و درگزر کی رغبت دلائی۔ العفو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس کا مطلب ہے انتقام پر قدرت ہوتے ہوئے معاف کرنا۔ آل عمران میں وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: 134) کے تحت یہ مفہوم گزر چکا ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ان

1۔ شعب الایمان، فی الامر بالمعروف، جلد 6، صفحہ 92
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، جلد 2، صفحہ 1028

تھوڑے سے الفاظ میں بہت سے معانی موجود ہیں۔ بعض نے کہا: اگر تو معاف کرے گا تو اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے گا۔ ابن المبارک نے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے اس نے بتایا جس نے حسن سے سنا تھا کہ جب ساری امتیں قیامت کے روز رب العالمین کے سامنے گری پڑی ہوں گی تو آواز دی جائے گی: وہ کھڑا ہو جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، تو وہ کھڑا ہو گا جس نے دنیا میں معاف کیا ہوگا۔ اس حدیث کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے: فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ: 40)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

”بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں بعض رسولوں پر اور ہم کفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ اختیار کر لیں کفر و ایمان کے درمیان کوئی (تیسری) راہ، یہی لوگ کافر ہیں حقیقت میں اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا“۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ پہلے مشرکین و منافقین کا ذکر فرمایا تو اب اہل کتاب میں سے کفار کا ذکر فرمایا، کیونکہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار تمام انبیاء کا انکار ہے۔ کیونکہ ہر نبی نے اپنی قوم کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کا حکم فرمایا۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے رسل پر ایمان لانے میں فرق کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسل پر ایمان لانے میں فرق کرنا کفر ہے۔ یہ اس لیے کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اس طریقہ پر عبادت کرنا فرض کیا جو اس نے اپنے رسل کی زبانوں پر شروع کیا تھا، جب انہوں نے رسولوں کا انکار کیا اور ان کی شریعتوں کو رد کیا اور ان سے ان کی شریعتوں کو قبول نہ کیا تو وہ عبودیت کے التزام سے انکاری ہو گئے جس کے التزام کا انہیں حکم دیا گیا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے انکاری کی طرح ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کا انکار کفر ہے، کیونکہ اس میں عبودیت اور طاعت کے التزام کا ترک کفر ہے اور اسی طرح رسولوں پر ایمان لانے میں تفریق کرنا بھی کفر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ اس سے مراد یہود ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ یہ قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ وہ اپنی عوام سے کہتے تھے: ہم اپنی کتب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں پاتے۔ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ یعنی وہ ایمان اور کفر کے درمیان راستہ بنانا چاہتے ہیں یعنی اسلام اور یہودیت کے درمیان نیا دین بنانا چاہتے ہیں،

ذالک فرمایا، ذینک نہیں فرمایا، کیونکہ ذالک تثنیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اگر ذینک ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا جب پہلے ذکر فرمایا کہ وہ کہتے ہیں: نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں، تو اس سے ان کے ایمان کا شبہ ہوتا تھا تو اس شبہ کو زائل کر دیا تاکید اً فرمایا کہ یہ کافر ہیں۔ بعض پر ایمان لانا انہیں کچھ مفید نہیں جب کہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا جب انہوں نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا تو انہوں نے الله تعالیٰ کی ذات کا بھی انکار کیا اور اس رسول کا بھی انکار کیا جس نے اس رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اسی وجہ سے یقینی طور پر یہ کافر ہیں۔ لِلْكٰفِرِیْنَ یہ اعتدنا کے مفعول ثانی کے قائم مقام ہے یعنی کافروں کی تمام اقسام کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۠﴿۱۵۲﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے الله تعالیٰ اور اس کے (تمام) رسولوں کے ساتھ اور نہیں فرق کیا انہوں نے کسی میں ان سے یہی لوگ ہیں دے گا انہیں الله تعالیٰ ان کے اجر اور الله تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت ہے۔

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَیْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۵۳﴾

''مطالبہ کرتے ہیں آپ سے اہل کتاب کہ آپ اتروا دیں ان پر کتاب آسمان سے سو وہ تو سوال کر چکے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کا۔ انہوں نے کہا تھا: (اے موسیٰ!) دکھاؤ ہمیں الله کھلم کھلا تو پکڑ لیا تھا انہیں بجلی کی کڑک نے بسبب ان کے ظلم کے پھر بنالیا انہوں نے بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد کہ آچکی تھیں ان کے پاس کھلی دلیلیں پھر بھی ہم نے بخش دیا ان کا یہ (سنگین) جرم اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو واضح غلبہ''۔

یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور یکبارگی کتاب لے آئیں جو آپ کی سچائی کی مدعی ہو جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لائے تھے، یہ انہوں نے آپ سے مطالبہ حجت بازی کے لیے کیا تھا۔ الله تعالیٰ نے اپنے محبوب کو آگاہ کیا کہ ان کے آباء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بڑی حجت بازی کی تھی انہوں نے کہا تھا: ہمیں الله کھلم کھلا دکھاؤ۔ یہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ **جهرة** مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی **رؤية جهرة** تو انہیں بجلی کی کڑک کے ساتھ سزا دی گئی، کیونکہ انہوں نے معجزات دیکھنے کے بعد بڑا سوال کیا اور اپنے اوپر ظلم کیا۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ کلام میں حذف ہے اس کی تقدیر یوں ہے پھر ہم نے انہیں زندہ کیا اور زندہ

رہے پھر انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ تفصیلاً گزر چکا ہے مزید ذکر سورۂ طٰہٰ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ براہین، دلائل، ظاہری معجزات، ید بیضا، عصا، سمندر کا پھٹنا وغیرہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پھر یہ سارے دلائل دیکھنے کے بعد۔ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ اس ہٹ دھرمی کے باوجود ہم نے انہیں معاف کر دیا۔

وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا۝ یعنی واضح حجت۔ یہ وہ آیات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ ان کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ جو ان آیات کو لے کر آیا تھا وہ حجت کے ساتھ غالب آیا تھا اور یہ آیات دلوں کو غالب کرنی والی تھیں یعنی وہ جانتے تھے کہ انسان کی قوت میں اس کی مثل لانا ممکن نہیں۔

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا۝

''اور ہم نے بلند کیا ان کے اوپر طور کو ان سے پختہ وعدہ لینے کیلئے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ داخل ہو جاؤ اس دروازہ سے سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ حد سے نہ بڑھنا سبت میں اور ہم نے لیا تھا ان سے پختہ وعدہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ یعنی ان کے میثاق توڑنے کے سبب ہم نے ان پر طور کو بلند کیا اور وہ میثاق تورات پر عمل کرنا تھا۔ پہاڑ کے بلند کرنے اور ان کے دروازہ سے داخل ہونے کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ سُجَّدًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ ورش نے وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ میں عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عدا یعدو عدوًا وعُدوانا وعدوا وعداء سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ یعنی مچھلیاں پکڑنے کے ساتھ حد سے نہ بڑھو، جیسا کہ سورہ میں گزر چکا ہے۔ اصل میں تعتدوا تھا۔ تا کو دال میں ادغام کیا گیا۔ نحاس نے کہا: عین کا ساکن کرنا جائز نہیں، اس میں دو ساکنوں کو جمع نہ کیا جائے گا۔ اور جس نے اس طرح پڑھا ہے اس نے خطا کی ہے۔ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا۝ یعنی وہ عہد جو ان سے تورات کے بارے میں لیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عہد قسم کے ساتھ مؤکد ہے اس لیے اس کو غلیظ کہا گیا ہے۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا۝ وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا۝ۙ

''(ان پر پھٹکار کی) وجہ یہ تھی کہ انہوں نے توڑ دیا اپنے وعدہ کو۔ اور انہوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا۔ اور انہوں نے قتل کیا انبیاء کو ناحق انہوں نے یہ (گستاخانہ) بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں (یوں نہیں) بلکہ مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ ان کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑی سی تعداد اور ان کے کفر کے باعث اور مریم پر بہتان عظیم باندھنے کے باعث''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ، نَقۡضِهِمۡ کو جر باکی وجہ سے ہے اور (ما) زائدہ موکدہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران:159) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ با محذوف کے متعلق ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: فبنقضھم میثاقھم لعناھم۔ یہ قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ سامع کے علم کی وجہ سے فعل کو حذف کیا گیا۔ ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی نے کہا: یہ ماقبل کے متعلق ہے معنی یہ ہے انہیں بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے۔ فرمایا: ان کے ظلم کی تفسیر بیان فرمائی جس کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے انہیں پکڑ لیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے عہد کو توڑا اور انبیاء کو قتل کیا اور باقی تمام ان کے اعمال قبیحہ جن میں انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ان تمام افعال کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے انہیں پکڑ لیا۔ طبری وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ بجلی کی کڑک میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں گرفتار ہوئے تھے اور جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا اور حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بعد تھے، پس جنہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا وہ بجلی کی کڑک میں گرفتار نہیں ہوئے تھے۔

مہدوی وغیرہ نے کہا: یہ لازم نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے خبر ان کے متعلق دی ہو اور مراد ان کے آباء ہوں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ کا معنی ہے ہم نے ان کے پختہ عہد توڑنے کی وجہ سے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو ان کے لیے حلال تھیں، کیونکہ یہ قصہ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا تک طویل ہے اور وہ میثاق جو انہوں نے توڑا تھا وہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات بیان کریں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے عہد توڑنے، ان کے ایسا ایسا کرنے کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے۔ اور فاء مقحمہ ہے۔ كُفْرِهِمْ اور قَتْلِهِمُ اس پر معطوف ہیں۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد ان کی کتب کی آیات ہیں جن میں انہوں نے تبدیلی کی۔ غُلْفٌ، غلاف کی جمع ہے یعنی انہوں نے کہا: ہمارے دل پہلے ہی علم کے برتن ہیں، ہمارے پاس جو علم ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی علم کی ضرورت ہی نہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ اغلف کی جمع ہے جو غلاف کے ساتھ ڈھانپا گیا یعنی ہمارے دل پردوں میں ہیں جو آپ کہتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ (حم السجدہ:5) یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے ان کا مقصود رسولوں کی حجت کو دور کرنا ہے۔ طبع کا معنی مہر لگانا ہے۔ یہ بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بِكُفْرِهِمْ یعنی ان کے کفر پر ان کے لیے جزا ہے جس طرح فرمایا: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ) یعنی ایمانا قلیلا تھوڑا ایمان یعنی بعض انبیاء پر ایمان لائے اور یہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے پھر دوبارہ فرمایا: بِكُفْرِهِمْ یہ اس لیے تاکہ وہ خبر دے کہ انہوں نے کفر کے بعد کفر کیا۔ بعض نے فرمایا: وَّبِكُفْرِهِمْ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے، مابعد کی دلالت کی وجہ سے اس کو حذف کیا گیا۔ بِكُفْرِهِمْ میں عامل وہ ہے جو فَبِمَا نَقْضِهِمْ کا ہے کیونکہ یہ اس پر معطوف ہے، اس میں عامل طَبَعَ ہونا جائز نہیں۔ اور بہتان عظیم جو انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر باندھا کہ یوسف نجار سے وہ ملی ہیں، حالانکہ یوسف نجار نیک لوگوں میں سے تھے۔ بہتان ایسے جھوٹ کو کہتے جس سے تعجب ہو یہ پہلے گزر چکا ہے واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَ

وَّلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۞ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۞

''اوران کے اس قول سے کہ ہم نے قتل کر دیا ہے مسیح عیسیٰ علیہ السلام فرزند مریم کو جو اللہ کا رسول ہے، حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھا سکے بلکہ مشتبہ ہوگئی ان کے لیے (حقیقت) اور یقیناً جنہوں نے اختلاف کیا ان کے بارے میں وہ بھی شک وشبہ میں ہیں ان کے متعلق نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی اور نہیں قتل کیا انہوں نے اسے یقیناً، بلکہ اٹھا لیا ہے اسے اللہ نے اپنی طرف۔ اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ، اِنَّ کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ قول کے بعد اس سے ابتدا کی گئی ہے اور لغۃً اس سے کلام شروع ہو رہی ہے۔ سورۂ آل عمران میں لفظ الۡمَسِيۡحَ کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ رَسُوۡلَ اللّٰهِ بدل ہے اگر تو چاہے تو اس سے پہلے اعنی کا اعتبار کر لے۔ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ یہ ان کے قول کا رد ہے۔ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ یعنی ان کی شبیہ کسی دوسرے پر ڈالی گئی جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو نہیں جانتے تھے انہوں نے اسے قتل کر دیا جسے قتل کیا جب کہ انہیں اس میں شک تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ۔ بعض نے فرمایا: ان کے علماء کا اختلاف تھا۔ بعض نے فرمایا: تمام کی طرف سے اختلاف تھا۔ بعض نے فرمایا: صرف عوام کا اختلاف تھا، ان کے اختلاف کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہیں۔ بعض نے کہا: وہ ابن اللہ ہے۔ یہ حسن کا قول ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ ان کی عوام نے کہا: ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ اور جنہوں نے آسمان کی طرف بلند ہوتا انہیں دیکھا انہوں نے کہا: ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ بعض نے کہا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ نسطوریہ نصاریٰ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناسوت کی جہت سولی چڑھایا گیا، لاہوت کی جہت سے نہیں۔ ملکانیہ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سولی اور قتل ناسوت ولاہوت دونوں جہتوں سے جاری ہوا۔ بعض نے کہا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ انہوں نے کہا: اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں اور اگر یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہمارا ساتھی کہاں ہے (2)؟ بعض نے فرمایا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہود نے کہا: ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے، کیونکہ یہوذا جو یہود کا سردار تھا یہ وہ شخص تھا جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سعی کی تھی۔ نصاریٰ کے ایک طائفہ نے کہا: بلکہ ہم نے اسے قتل کیا ہے، ان میں سے ایک طائفہ نے کہا: بلکہ انہیں اللہ نے آسمان کی طرف اٹھا لیا ہے اور ہم اس کی طرف دیکھ رہے تھے (3)۔

مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ من زائدہ ہے اور کلام یہاں مکمل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ یہ پہلے سے استثنا نہیں یہ محل نصب میں ہے اور بدل کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے یعنی مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 376 2۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 148 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 184

سیبویہ نے یہ شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے

وبلدة ليس بها أنيسُ إلاَّ اليعافير ولا العِيسُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے ما قتلوا ظنهم يقينا جس طرح تیرا قول ہے: قتلته علما جب تجھے مکمل طور پر علم ہو (1)۔ (ہ) ضمیر کا مرجع الظن ہے۔ ابوعبید نے کہا: اگر یہ معنی ہوتا وما قتلوعیسی یقینا تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وما قتلوه۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وما قتلوا الذی شبه لهم انه عیسی یقینا اس مفہوم پر يَقِيْنًا پر وقف ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وما قتلوا عیسی اس مفہوم پر وَ مَا قَتَلُوْهُ پر وقف ہوگا اور يَقِيْنًا مصدر محذوف کی صفت ہوگا اس میں دو تقدیریں ہوں گی (1) قالوا هذا قولاً یقینا یا قال الله هذا قولا یقینا (۲) معنی ہوگا وما علموه علما یقینا۔ نحاس نے کہا: اگر تم یہ معنی مقدر کرو بل رفعه الله اليه يقينا تو یہ خطا ہے، کیونکہ بل کا مابعد اس کے ضعف کی وجہ سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ ابن انباری نے مَا قَتَلُوْهُ پر وقف کی اجازت دی ہے اس بنا پر کہ يَقِيْنًا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جو جواب قسم ہے تقدیر اس طرح ہوگی ولقد صدقتم یقینا یعنی صدقا یقینا اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ نئی کلام ہے یعنی اللہ نے انہیں آسمان کی طرف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ مکان سے پاک اور بلند ہے۔ اس کے اٹھانے کی کیفیت سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا یعنی اللہ تعالیٰ یہود سے انتقام لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطرس بن اُستیسانوس رومی کو ان پر مسلط کر دیا، اس نے ان سے بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ حَكِيْمًا اس نے یہود پر لعنت اور غضب کا فیصلہ فرمایا۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ﴿۱۵۹﴾

''اور کوئی ایسا نہیں ہوگا اہل کتاب سے مگر وہ ضرور ایمان لائے گا مسیح پر ان کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوں گے ان پر گواہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہر کتابی اپنی موت سے پہلے مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا (2)، پہلی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور دوسری ضمیر کا مرجع کتابی ہے۔ ہر یہودی اور نصرانی جب موت کے فرشتے کو دیکھتا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے، لیکن ایسا ایمان نفع بخش نہیں ہوتا، کیونکہ یہ مایوسی کے وقت کا ایمان ہے اور موت کی حالت سے متصل ایمان ہے۔ ہر یہودی اس وقت اقرار کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں اور ہر نصرانی اقرار کرتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول تھے۔

روایت ہے کہ حجاج نے شہر بن حوشب سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: میں ایک یہود و نصاریٰ سے قیدی لاتا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 544 2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 378

ہوں اور اس کی گردن مارنے کا حکم دیتا ہوں پھر میں اس وقت اسے دیکھتا ہوں تو میں اس سے ایمان نہیں دیکھتا۔ شہر بن حوشب نے اسے کہا: جب وہ آخرت کے امر کو دیکھتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، وہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے لیکن ایمان اسے فائدہ نہیں دیتا۔ حجاج نے شہر بن حوشب سے پوچھا: تو نے یہ قول کہاں سے لیا ہے۔ شہر نے کہا: میں نے یہ محمد بن حنیفہ سے لیا ہے، تو حجاج نے کہا: تو نے یہ چشمہ صافی سے لیا ہے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ ان سے پوچھا گیا: اگر وہ غرق ہو جائے یا جل جائے یا اسے درندے کھا جائیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ بعض علماء نے فرمایا: دونوں ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں، معنی یہ ہیں کہ قرب قیامت کے وقت جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو جو عیسائی زندہ ہوگا وہ آپ پر ایمان لے آئے گا۔ یہ قتادہ، ابن زید وغیرہما کا قول ہے۔ اور طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔

یزید بن زریع نے ایک شخص سے، انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ سے مراد قبل موت عیسیٰ ہے۔ اللہ کی قسم! اب وہ اللہ کی بارگاہ میں زندہ ہیں لیکن وہ زمین پر اتریں گے تو سب ان پر ایمان لے آئیں گے (1)۔ ضحاک اور سعید بن جبیر سے اسی طرح مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ، ہ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے، کیونکہ یہ تمام واقعات آپ پر نازل ہوئے اور مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو متضمن ہے، کیونکہ ان کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی ہر کتابی موت سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا لیکن حقیقت دیکھنے کے وقت ایمان اسے نفع نہیں دے گا۔ پہلی دو تاویلیں زیادہ ظاہر ہیں۔ زہری نے سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے، دجال کو قتل کریں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے اور سجدہ صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہوگا'' (2)۔ پھر حضرت ابوہریرہ نے کہا: اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔

حضرت ابوہریرہ نے کہا: اس سے مراد قبل موت عیسیٰ ہے۔ آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔ سیبویہ کے نزدیک آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وان من اهل الكتاب احد الا ليومنن به اور کوفیوں کی تقدیر اس طرح ہے: وان من اهل الكتاب الا مَنْ ليومنن به۔ اس میں قبح ہے، کیونکہ اس میں موصول کا حذف ہے اور صلہ موصول کا بعض ہوتا ہے گویا بعض اسم حذف کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۞ یعنی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرے گا اس کی تکذیب کی گواہی دیں گے اور جو تصدیق کرے گا اس کی تصدیق کی گواہی دیں گے۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 378 2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل انبیاء، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

''سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کردیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کیلئے اور بوجہ روکنے یہود کے اللہ کے راستے سے بہت لوگوں کو اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے اور بوجہ ان کے کھانے کے لوگوں کے مال ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کیلئے ان میں سے عذاب دردناک''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا۔ زجاج نے کہا: یہ فَبِمَا نَقْضِهِمْ سے بدل ہے۔ اور طَيِّبٰتٍ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (الانعام:146) اور ظلم کو تحریم پر مقدم فرمایا، کیونکہ ظلم کے متعلق خبر دینے کا مقصود یہی بیان کرنا ہے کہ یہ تحریم کا سبب ہے۔ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سے روکتے ہیں۔ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ یہ سب اس ظلم کی تفسیر ہے جو وہ کیا کرتے تھے، اور اسی طرح جو پہلے گزر چکا ہے کہ وہ عہد کو توڑتے تھے اور جو بعد میں آئے گا۔ آل عمران میں گزر چکا ہے کہ تحریم کے سبب میں علماء کے مختلف تین اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ کفار مخاطب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ انہیں سود کھانے سے اور لوگوں کے ناحق مال کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ اس کے متعلق خبر ہے جو قرآن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ خطاب میں داخل ہیں تو بھی بہتر ہے اور اگر یہ خبر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات میں نازل فرمایا اور انہوں نے احکامات کو بدلا، اور تحریف کی اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت اور نافرمانی کی تو کیا ہمارے لیے ان کے معاملات جائز ہیں جب کہ وہ قوم اپنے دین میں اپنے اموال کو خراب کر چکی ہے یا نہیں؟ ایک طائفہ نے کہا: ان کا معاملہ جائز نہیں، کیونکہ ان کے اموال میں یہ فساد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے سود اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، اس پر قرآن وسنت سے قطعی دلیل قائم ہو چکی ہے وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدہ:5) یہ نص ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود سے معاملات کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی جو اپنے عیال کے لیے جو لینے کے لیے رہن رکھی تھی۔

شک اور خلاف کی بیماری کو جڑ سے ختم کرنے والی چیز امت کا اہل حرب کے ساتھ تجارت کرنے کے جواز پر اتفاق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کی خاطر ان کی طرف سفر کیا تھا، اس سفر سے قطعی طور پر ثابت ہوا کہ ان کی طرف سفر کرنا اور ان کے ساتھ تجارت کرنا جائز ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ نبوت سے پہلے کا سفر تھا تو ہم کہیں گے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان نبوت سے پہلے بھی کسی حرام کا ارتکاب نہیں کیا اور یہ تواتر سے ثابت ہے اور نہ بعثت کے بعد آپ نے کوئی عذر پیش کیا اور نہ اعلان نبوت

کے بعد آپ سے منع ثابت ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اور نہ آپ کے وصال کے بعد کسی نے اہل کتاب کی طرف سفر کو ترک کیا بلکہ صحابہ کرام قیدیوں کو چھڑانے کے لیے سفر کرتے تھے اور یہ واجب ہے اور صلح میں حضرت عثمان کو بھیجا گیا تھا۔ اور کبھی یہ سفر واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب، رہا صرف تجارت کی خاطر اہل کتاب کی طرف سفر کرنا تو وہ مباح ہے (1)۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

"لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان سے (وہ بھی) اور (جو) مسلمان ہیں ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور صحیح ادا کرنے والے نماز کے اور دینے والے زکوۃ کے اور ایمان لانے والے اللہ اور روز آخرت کے ساتھ یہی ہیں جنہیں عنقریب ہم دیں گے اجر عظیم"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ اہل کتاب کے مومنوں کی استثنا فرمائی۔ یہود انکار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ اشیاء اصل میں حرام تھیں اور آپ انہیں حلال کرتے ہیں اور یہ ہمارے ظلم کی وجہ سے حرام نہیں ہوئی ہیں تو یہ ارشاد نازل ہوا: لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ، الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ سے مراد کتاب کا علم رکھنے والا ہے۔ الرسوخ سے مراد ثبوت ہے۔ یہ آل عمران میں گزر چکا ہے، اس سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام، کعب الاحبار اور ان جیسے دوسرے علماء ہیں۔ والمومنون سے مراد مہاجرین وانصار ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے۔

وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ حسن، مالک بن دینار اور ایک جماعت نے الْمُؤْمِنُوْنَ پر عطف کی بنا پر المقیمون پڑھا ہے اسی طرح حضرت عبد اللہ کی قرأت میں ہے اور ابی کی قرأت میں والمقیمین ہے جیسا کہ مصاحف میں ہے۔ اس کے نصب میں چھ اقوال ہیں اصح قول سیبویہ کا ہے کہ مدح کی بنا پر منصوب ہے یعنی اعنی المقیمین اور سیبویہ نے کہا: تعظیم کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ المقیمین الصلوۃ اسی بنا پر منصوب ہے۔

وكل قومٍ أطاعوا أمر سيدِهم إلا نميرا أطاعت أمر غاويها

أمر مرشدهم بھی مروی ہے۔

الظاعنين ولما يُظْعِنُوا أحداً والقائلون لِمَن دارٌ نُخَلِّيها

ایک اور شاعر نے کہا:

ولا يَبْعَدَنْ قومي الّذين هُمُ سُمُّ العُداةِ وآفَةُ الجُزْرِ
النّازِلِين بكُلِّ مُعْتَرَكٍ والطَّيِّبُونَ مَعَاقِدَ الأُزُرِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 515

نحاس نے کہا: المقیمین میں جو کہا گیا ہے اس میں سے اصح قول یہی ہے کہ تعظیم کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ کسائی نے کہا: المقیمین کا عطف (ما) پر ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش کا قول ہے کہ یہ بعید ہے، کیوں کہ معنی یہ ہو جائے گا یومنون بالمقیمین۔ یعنی وہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں پر ایمان لاتے ہیں۔ محمد بن جریر نے حکایت کیا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ یہاں المقیمین سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ وہ ہمیشہ نماز، تسبیح اور استغفار میں رہتے ہیں۔ جریر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اس نے حکایت کیا ہے مدح کی بنا پر نصب بعید ہے، کیونکہ مدح خبر کے مکمل ہونے کے بعد ہوتی ہے اور الرّٰسِخُوْنَ کی خبر اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ہے پس الْمُقِيْمِيْنَ کو نصب مدح پر نہیں ہے، نحاس نے کہا: الْمُؤْتُوْنَ میں سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اور دوسرے علماء نے کہا: مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے یعنی وہ زکوٰۃ دینے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: المقیمین کا عطف قبلك کی کاف پر ہے یعنی من قبلك و من قبل المقیمین۔ بعض نے فرمایا: الیك میں جو کاف ہے اس پر عطف ہے۔ بعض نے فرمایا: منھم میں ھا اور میم پر عطف ہے یعنی منھم و من المقیمین یہ تینوں جوابات جائز نہیں، کیونکہ ان میں اسم ظاہر کا عطف مجرور مضمر اسم پر ہے۔ چھٹا جواب وہ ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ سے اس آیت کے متعلق اور اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ اور الصّٰبِئُوْنَ جو سورہ مائدہ میں ہے، ان کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سائل سے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کاتبوں نے غلطی کی ہے۔ ابان بن عثمان نے کہا: کاتب کو لکھایا جاتا تھا پس وہ لکھتا تھا، اس نے لکھا: لکن الراسخون فی العلم منھم والمومنون پھر اس نے کہا: اب کیا لکھوں؟ تو اسے کہا گیا: تم لکھو وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ پھر یہاں اسی طرح واقع ہوا (☆)۔

قشیری نے کہا: یہ مسلک باطل ہے، کیونکہ جنہوں نے کتاب کو جمع لکھا وہ لغت میں اسوۃ تھے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرآن میں وہ داخل کرتے تھے جو نازل نہیں ہوا تھا۔ ان اقوال میں سے اصح ترین قول سیبویہ کا ہے اور وہی خلیل کا قول ہے اور کسائی کا قول وہ ہے جسے قفال اور طبری نے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

"بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے وحی بھیجی ہم نے نوح کی طرف اور ان نبیوں کی طرف جو نوح کے بعد آئے اور (جیسے) وحی بھیجی ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے عطا فرمائی داؤد کو زبور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ یہ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ

☆ باقلانی نے کہا جس طرح نکت الانتصار لنقل القرآن کے صفحہ 129 پر ہے "حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ قول کہ یہ کاتب کی غلطی ہے تو ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں" کیونکہ قرآن وہ ہے جو نقل متواتر سے ثابت ہے۔

السَّمَآءِ کے کلام سے متصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حضرت محمد ﷺ کا معاملہ بھی پہلے انبیاء کے معاملہ کی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ یہ یہود کی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سکین اور عدی بن زید تھا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی کی طرف وحی نہیں کی پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کی۔ وحی کا معنی خفیہ طور آگاہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: وحی الیه بالکلام یحی وحیاً، واوحی یوحی ایحاءً (اِلٰی نُوْحٍ) ان کو مقدم فرمایا کیونکہ یہ پہلے نبی تھے ان کی زبان پر شریعت جاری ہوئی بعض کے اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

زبیر بن بکار نے ذکر کیا ہے کہ مجھے ابوالحسن علی بن مغیرہ نے بیان کیا، انہوں نے ہشام بن محمد بن سائب سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: پہلے نبی جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر مبعوث فرمایا وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے ان کا اسم اخنوخ ہے، پھر رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے نوح بن لمک بن متوشلخ بن اخنوخ کو مبعوث فرمایا۔ سام بن نوح نبی تھا، پھر رسولوں کا سلسلہ ختم ہوا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی مبعوث فرمایا اور اسے خلیل بنایا۔ وہ حضرت ابراہیم بن تارخ ہے اور تارخ کا اسم آزر ہے پھر حضرت اسماعیل بن ابراہیم کو مبعوث فرمایا پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کا وصال مکہ میں ہوا پھر حضرت اسحق بن ابراہیم مبعوث ہوئے، پس وہ شام میں فوت ہوئے پھر حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے چچا تھے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام مبعوث ہوئے وہ حضرت اسرائیل بن اسحق ہے۔ پھر حضرت یوسف بن یعقوب مبعوث ہوئے پھر حضرت شعیب بن یوبب پھر ہود بن عبداللہ مبعوث ہوئے پھر حضرت صالح بن آسف مبعوث ہوئے پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون، ابنا عمران مبعوث ہوئے۔ پھر حضرت ایوب پھر حضرت خضر یہ خضرون ہیں پھر حضرت داؤد بن ایشا مبعوث ہوئے پھر حضرت سلیمان بن داؤد پھر حضرت یونس بن متی پھر حضرت الیاس، پھر حضرت ذوالکفل مبعوث ہوئے۔ اور ان کا اسم عویدنا ہے یہ یہوذا ابن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ حضرت زبیر نے کہا حضرت موسیٰ بن عمران اور حضرت مریم بنت عمران ام عیسیٰ کے درمیان سترہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اور یہ دونوں سبط میں سے نہیں تھے۔ پھر حضرت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب النبی ﷺ مبعوث ہوئے۔ حضرت زبیر نے کہا: ہر نبی جن کا قرآن میں ذکر ہے وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے سوائے حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کے۔ عربوں میں سے صرف پانچ انبیاء تھے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت شعیب اور حضرت محمد ﷺ وعلیہم اجمعین۔ ان کو عرب کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے علاوہ کسی نے عربی نہیں بولی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یہ تمام انبیاء کو شامل ہے پھر فرمایا: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ۔ بعض لوگوں کا ذکر فرمایا ان کے شرف کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ (بقرہ: 98) پھر فرمایا: وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان انبیاء سے مقدم فرمایا جو ان سے پہلے تھے، کیونکہ واو ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص یہود کا رد ہے۔ اس آیت میں ہمارے نبی مکرم ﷺ کی شان اور شرف پر تنبیہ ہے، کیونکہ انبیاء پر آپ کے ذکر کو مقدم فرمایا۔ اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ

(الاحزاب:7) نُوۡحٍ، النوح سے مشتق ہے۔ آل عمران میں ان کا ذکر گزر چکا ہے یہ منصرف ہے یہ عجمی اسم ہے اس کے تین حروف ہیں پس تخفیف کی گئی۔ ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق یہ عجمی اسماء ہیں یہ معرفہ بھی ہیں اس لیے غیر منصرف ہیں اسی طرح یعقوب، عیسیٰ اور موسیٰ ہیں مگر عیسیٰ اور موسیٰ جائز ہے کہ ان میں الف تانیث کے لیے ہو پس یہ نہ معرفہ میں منصرف ہوں گے اور نہ نکرہ میں منصرف ہوں گے۔ یونس اور یوسف، حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے نون کے کسرہ کے ساتھ یونِس پڑھا ہے اسی طرح یوسِف پڑھا ہے ان کو آنس اور آسف سے بنایا ہے۔ اس بنا پر ان کا منصرف ہونا اور ہمزہ سے ہونا واجب ہے اور ان کا جمع یآنس اور یآسف ہوگا اور جنہوں نے ہمزہ نہیں دیا انہوں نے یوانس و یواسف۔ ابوزید نے حکایت کیا ہے کہ یونس اور یوسف نون اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مہدوی نے کہا: یونَس گویا اصل میں معروف کا صیغہ ہے اور یونُس مجہول کا صیغہ ہے، ان کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾، الزبور، حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب تھی اس میں ایک سو پچاس سورتیں تھیں اس میں نہ حکم تھا، نہ حلال تھا، نہ حرام تھا۔ اس میں حکمتیں اور مواعظ تھے۔ زبیر کا معنی کتابت ہے اور زبور بمعنی مذبور ہے یعنی المکتوب جیسے الرسول، الرکوب، الحلوب بمعنی المفعول ہیں۔ حمزہ نے زبوراً زا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ زبر کی جمع ہے جیسے فلس اور فلوس اور زبر بمعنی المذبور ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ھذا الدرھم ضرب الامیر۔ یہاں ضرب بمعنی مضروب ہے اصل میں توثیق کے کلمہ میں استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: بئر مزبورۃ یعنی پتھروں کے ساتھ لپٹا ہوا کنواں۔ کتاب کو زبور کہا جاتا ہے اس پر وثوق کی وجہ سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی بہت خوبصورت آواز تھی جب آپ زبور کی قرأت شروع کرتے تھے تو ان کی آواز کی خوبصورتی کی وجہ سے انسان، جن، پرندے اور وحشی جمع ہو جاتے تھے۔ آپ متواضع تھے اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتے تھے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں ابواسامہ نے بتایا، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام لوگوں کو خطاب کرتے تھے جب کہ ان کے ہاتھ میں کھجور کے پتوں کی گٹھڑی ہوتی تھی جب وہ فارغ ہوتے تو قریب والا شخص ان سے لے لیتا اور اسے بیچتا، آپ زرہیں بناتے تھے اور حدیث میں ہے ''آنکھ میں نیلا رنگ برکت ہے'' اور داؤد علیہ السلام کی آنکھیں نیلی تھیں۔

## وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَكۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾ۚ

''اور (جیسے وحی بھیجی) دوسرے رسولوں پر جن کا حال بیان کر دیا ہے ہم نے آپ سے اس سے پہلے اور ان رسولوں پر جن کا ذکر ہم نے اب تک آپ سے نہیں کیا اور کلام فرمایا اللہ نے موسیٰ سے خاص کلام''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ یعنی مکہ میں اور رُسُلًا کی نصب فعل مضمر کی وجہ سے ہے یعنی وارسلنا رسلاً۔ کیونکہ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ کا معنی ہے وارسلنا نوحا۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر قَصَصۡنٰهُمۡ دلالت کر رہا ہے یعنی قصصنا رسلاً اس کی مثل سیبویہ نے اس شعر سے دی ہے:

أصبحتُ لا أحملُ السّلاحَ ولا　　أملكُ رأسَ البعيرِ إنْ نفرا

والذِّئبَ أخشاه إن مررتُ به　　وَحْدِي وأخشى الرياحَ والمطرا

یعنی اخشی الذئب۔ اور حضرت ابی کی قرأت میں و رُسُلٌ رفع کے ساتھ ہے اس کی تقدیر یہ ہے منهم رسلٌ۔ پھر فرمایا گیا: اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب میں بعض انبیاء کے اسماء ذکر فرمائے اور بعض کے ذکر نہ فرمائے تو جن کا ذکر فرمایا ان کو فضیلت ہے ان پر جن کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہود نے کہا: محمد نے انبیاء کا ذکر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ⁽¹⁶⁴⁾، تَكْلِيْمًا مصدر ہے اس کا معنی تاکید ہے یہ اس کے قول کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جو کہتا ہے: اس نے درخت میں اپنے لیے کلام تخلیق کی پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے سن لیا۔ بلکہ یہ وہ حقیقی کلام ہے جس کے ساتھ متکلم، متکلم ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: نحویوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب فعل مصدر کے ساتھ مؤکد ہوتا ہے تو وہ مجاز نہیں ہوتا اور شاعر کے قول میں یہ جائز نہیں:

امتلأ الحوضُ وقال قَطْنِي

کہ قال قولاً اسی طرح جب تَكْلِيْمًا فرمایا تو یہ اس حقیقی کلام پر محمول ہوگا جو سمجھی جاتی ہے۔

وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا رب! مجھے تو نے کیوں کلیم بنایا؟ انہوں نے وہ عمل طلب کیا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں سعادت عطا فرمائے تاکہ وہ اس عمل کو زیادہ کریں، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: کیا تجھے یاد ہے جب کوئی بکری کا بچہ بھاگ جاتا ہے پھر تو دن کا اکثر حصہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور وہ تجھے تھکا دیتا ہے پھر تو اسے پکڑتا ہے اور اسے بوسہ دیتا ہے پھر اسے اپنے سینے سے لگاتا ہے اور تو اسے کہتا ہے: تو نے مجھے بھی تھکایا اور اپنے آپ کو بھی تھکایا اور تو اس پر غصے نہیں ہوتا اس وجہ سے میں نے تجھے کلیم بنایا۔

## رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ⁽¹⁶⁵⁾

"(بھیجے ہم نے یہ سارے) رسول خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں کوئی عذر رسولوں کے (آنے کے) بعد اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ، رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ سے بدل کی بنا پر منصوب ہے اور فعل کے اضمار پر منصوب ہونا جائز ہے اور حال کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ رسلا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ تو نے ہماری طرف کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ تو نے ہم پر کوئی کتاب نازل کی۔ اور قرآن حکیم میں ہے: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⁽¹⁵⁾ (بنی اسرائیل) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طہٰ: 134) ان تمام آیات میں دلیل ہے کہ عقل کی طرف سے کوئی چیز واجب نہیں۔ کعب الاحبار سے مروی

ہے فرمایا کہ بارہ لاکھ انبیاء کرام تشریف لائے تھے۔ مقاتل نے کہا: چودہ لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تھے۔ حضرت انس بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''میں آٹھ ہزار انبیاء کے بعد مبعوث کیا گیا ان میں سے چار ہزار بنی اسرائیل سے تھے'' (1)۔ یہ ابو اللیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے، پھر شعبہ عن ابی اسحٰق عن الحارث الاعور بن ابی ذر الغفاری کی سند سے ذکر فرمایا کہ حضرت ابوذر نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! انبیاء کتنے تھے اور رسول کتنے تھے؟ فرمایا: ''انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے اور تین سو تیرہ رسول تھے'' (2)۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ترین قول ہے۔ الاجری، ابو حاتم البستی نے اپنی مسند صحیح میں اس قول کو ذکر کیا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶

''(کوئی تسلیم نہ کرے تو اس کی مرضی) لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس کتاب کے ذریعے جو اس نے آپ کی طرف اتاری کہ اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ بطور گواہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے اگر تو چاہے تو نون کو شد دے اور اسم جلالت کو نصب دے۔ کلام میں حذف ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہا ہے گویا کفار نے کہا: اے محمد! ہم تیرے لیے گواہی نہیں دیتے اس کے بارے میں جو تو کہتا ہے تو پھر تیرے لیے کون گواہی دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لیکن اللہ گواہی دیتا ہے۔ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کے اہل ہے کہ تجھ پر قرآن نازل ہو۔ یہ آیت دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ جانتا ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ملائکہ کی شہادت کا ذکر فرمایا تا کہ اس کے ساتھ کفار کی شہادت کی نفی ہو جائے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶ ۔ اس میں با زائدہ ہے معنی ہے کفی اللہ شاھداً۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۶۷

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہی میں بہت دور نکل گئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی یہود۔ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سے لوگوں کو اپنے اس قول سے روکا کہ ہم اپنی کتاب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو نہیں پاتے، نبوت، حضرت داؤد اور حضرت ہارون کی اولاد میں ہے اور تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہ ہوگی۔ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۶۷ کیونکہ انہوں نے کفر کیا اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو انہوں نے اسلام سے منع کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝۱۶۸ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۶۹

---

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 482، حدیث نمبر 32276　　2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 482، حدیث نمبر 32280

"بے شک جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ بخش دے انہیں اور نہ یہ کہ دکھائے انہیں (سیدھی) راہ۔ بجز جہنم کی راہ کے ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا یعنی یہودی۔ یعنی حضرت محمد ﷺ کی شان چھپا کر انہوں نے محمد ﷺ پر ظلم کیا اور اپنے نفسوں پر ظلم کیا جب کفر کیا اور لوگوں پر ظلم کیا جب انہیں چھپایا۔ لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ یہ اس کے بارے میں ہے جو اپنے کفر پر مرا اور توبہ نہ کی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

"اے لوگو! تحقیق آ گیا تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے پس تم ایمان لاؤ یہ بہتر ہے تمہارے لیے، اور اگر تم انکار کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ یہ تمام لوگوں کو خطاب ہے۔ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ اس سے مراد حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ بِالْحَقِّ سے مراد قرآن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دین حق ہے۔ بعض نے کہا: بِالْحَقِّ سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے بعض نے فرمایا: با تعدیہ کے لیے ہے یعنی جاء کم و معہ الحق اور یہ حال کی جگہ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ کلام میں اضمار ہے یعنی وأتوا خیرا لکم یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور فراء کے قول پر یہ محذوف کی صفت ہے یعنی ایمانا خیرا لکم۔ ابوعبیدہ کے قول پر یکن خیراً لکم ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ٘ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۱۷۱

"اے اہل کتاب نہ غلو کرو اپنے دین میں نہ کہو اللہ تعالیٰ کے متعلق مگر سچی بات بے شک مسیح عیسیٰ پسر مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف، اور ایک روح تھی اس کی طرف سے، پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور نہ کہو تین (خدا ہیں) باز آ جاؤ (ایسا کہنے سے) یہ بہتر ہے تمہارے لیے بے شک اللہ تعالیٰ تو معبود واحد ہی ہے پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کا کوئی لڑکا اسی کا (ملک) ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غلو سے منع کیا گیا ہے۔ الغلو کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

اسی سے ہے: غلا السعر یغلو غلاء قیمت حد سے بڑھ گئی۔ وغلا الرجل فی الامر غلواً آدمی معاملہ میں حد سے بڑھ گیا۔ غلا بالجاریہ لحمھا وعظمھا۔ جب عورت جلدی جوانی چڑھی اور دوسرے بچوں سے تجاوز کر گئی۔

مفسرین نے جو ذکر کیا ہے وہ یہ ہے: یہود کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے یہ غلو تھا کہ انہوں نے حضرت مریم پر تہمت لگائی اور نصاریٰ کا غلو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنا دیا، افراط اور تفریط گناہ اور کفر ہے، اسی وجہ سے مطرف بن عبداللہ نے کہا: نیکی دونوں برائیوں (افراط و تفریط) کے درمیان ہے۔ شاعر نے کہا

أوفِ ولا تستوفِ حقّك كلّه　　وصافح فلم يستوف قَطُّ كريمُ

ولا تَغْلُ فی شئ من الأمر واقتصدْ　　كِلَا طرفَيْ قصدِ الأمورِ ذَمِيمُ

پورا حق دو اور اپنا حق پورا نہ لو اور درگزر کر، کریم کبھی پورا وصول نہیں کرتا۔ کسی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کر اور میانہ روی اختیار کر میانہ روی کی دونوں طرفیں مذموم ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

عليك بأوساطِ الأمور فإنها　　نَجاةٌ ولا تركَبْ ذَلولاً وصَعْباً

درمیانی امر کو لازم پکڑو کیونکہ یہ نجات ہے اور نہ بالکل نرم اور نہ بالکل سخت ہو کر سوار ہو۔

صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''میری تعریف میں حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں حد سے تجاوز کیا تم کہو عبداللہ ورسولہ'' (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ یعنی یہ نہ کہو کہ اس کا شریک ہے یا اس کے بیٹے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی حالت اور صفت کو بیان فرمایا اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ ابتدا کی وجہ سے مسیح کو رفع دیا گیا ہے اور عیسیٰ اس سے بدل ہے اسی طرح ابن مریم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا کی خبر ہو۔ یہ معنی ہو المسیح ابن مریم، مسیح مریم کے فرزند ہیں۔ اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یعنی جو اپنی والدہ کی طرف منسوب ہو وہ الٰہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الٰہ کا حق یہ ہے کہ وہ قدیم ہو، حادث نہ ہو۔ اور رسول اللہ خبر کے بعد خبر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کا ذکر نہیں کیا اور کسی عورت کو اس کے نام کے ساتھ اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا سوائے مریم بنت عمران کے۔ تقریباً تیس جگہوں پر خاص حکمتوں کی وجہ سے حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا جن حکمتوں کا بعض مشائخ نے ذکر کیا ہے۔ ملوک اور اشراف اپنی آزاد عورتوں کا مجمع میں ذکر نہیں کرتے تھے اور ان کے اسماء استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ عرس، اہل اور عیال کے لفظ استعمال کرتے تھے اگر لونڈیوں کا ذکر کرتے تو کنایۃً نہ کرتے اور نہ ان کے صراحۃً

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 490۔ ایضاً، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسماء کے ذکر سے حفاظت کرتے تھے۔ جب حضرت مریم کے بارے میں نصاریٰ نے کہا جو انہوں نے کہا اور ان کے بیٹے کے بارے میں کہا تو اللہ تعالیٰ نے صراحۃً حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا، امومت اور عبودیت جو ان کی صفت تھی ان کا ذکر نہیں کیا اور لونڈیوں کے ذکر میں عربوں کی جو عادت تھی اس پر کلام کو جاری فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں ہے۔ جب ان کا اسم ماں کی طرف منسوب کر کے بار بار ذکر فرمایا تو دلوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باپ کی نفی کا عقیدہ کا واجب ہونا محسوس کر لیا اور یہود کی طرف سے لگائی گئی تہمت سے ان کی والدہ کی پاکیزگی کا عقیدہ دلوں میں راسخ ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ** وہ کن کے کلمہ سے بنائے گئے تھے گویا آپ بغیر باپ کے بشر تھے۔ عرب کسی چیز کو اس چیز سے تعبیر کر دیتے ہیں جب وہ اس سے صادر ہو۔ بعض نے فرمایا: **كَلِمَتُهٗ** سے مراد اللہ کی طرف سے حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی بشارت تھی جو جبریل کے ذریعے دی گئی۔ اس سے یہ مراد ہے: **اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ** (آل عمران: 45) بعض علماء نے فرمایا: الكلمة سے یہاں مراد الآیة ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا** (التحریم: 12) **مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ** (لقمان: 27) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار اسماء تھے۔ (۱) مسیح (۲) عیسیٰ (۳) کلمۃ (۴) روح۔ اس کے علاوہ بھی نام ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ **اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ** کا معنی ہے مریم نے اس کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ رُوْحٌ مِّنْهُ**۔ اس چیز نے نصاریٰ کو گمراہی میں ڈالا۔ انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جز ہیں پس وہ جاہل بنے اور گمراہ ہوئے۔ اس کے آٹھ جواب ہیں (۱) حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ارواح کو پیدا فرمایا جب ان سے پختہ عہد لیا پھر ان روحوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ کی طرف لوٹایا اور حضرت عیسیٰ کی روح کو اپنے پاس روک لیا جب ان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو اس روح کو حضرت مریم کی طرف بھیجا پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے تھے۔ اسی وجہ سے فرمایا: **وَ رُوْحٌ مِّنْهُ**۔ بعض نے فرمایا: یہ اضافت تفضیل کے لیے ہے اگرچہ تمام روحیں اس کی تخلیق سے ہیں یہ اس طرح ہے جیسے فرمایا: **وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ** (الحج: 26) بعض نے فرمایا: جس سے عجیب چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اسے روح کہا جاتا ہے اور اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: ھذا روح من اللہ یعنی وہ اللہ کی تخلیق سے ہے، جس طرح نعمت کے بارے کہا جاتا ہے: انھا من اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کے مریض کو درست کرتے تھے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے پس یہ اس اسم کے مستحق ہوئے۔ بعض نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے جبریل کے روح پھونکنے کے سبب۔ نفخ (پھونکنا) کو روح کہا جاتا ہے، کیونکہ ریح (ہوا) روح سے نکلی ہے۔ شاعر نے کہا:

فقلتُ له ارْفَعْها إلَيكَ وأحْيِها بِرُوحِكَ واقتَتْهُ لها قِيتَةً قَدْرا

وارد ہے کہ حضرت جبریل نے حضرت مریم علیہا السلام کی قمیص میں پھونک ماری تو وہ اللہ کے اذن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہو گئیں اسی وجہ سے **وَ رُوْحٌ مِّنْهُ** اس مضمر پر معطوف ہو گا جو اللہ کا اسم **اَلْقٰىهَاۤ** میں ہے تقدیر عبارت اس طرح

ہوگی: القی اللہ و جبریل الکلمۃ الی مریم۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ رُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد ہے اس کی تخلیق سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) یعنی من خلقه۔ بعض نے فرمایا: رُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد اس کی طرف سے رحمت۔ حضرت عیسیٰ اپنے متبعین کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت تھے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ: 22) یعنی اپنی رحمت سے۔ پڑھا گیا ہے فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ (الواقعہ: 89) بعض علماء نے فرمایا: رُوْحٌ مِّنْهُ کا مطلب ہے برهان منه۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم پر برہان اور حجت تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ یعنی ایمان لاؤ کہ اللہ ایک ہے، مسیح کا خالق اور اس کو بھیجنے والا ہے اور اللہ کے رسل پر ایمان لاؤ اور ان میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں پس ان کو الٰہ نہ بناؤ۔ وَ لَا تَقُوْلُوْا یہ نہ کہو کہ ہمارے خدا ثَلٰثَةٌ ہیں۔ پس یہ زجاج سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: تثلیث سے مراد اللہ تعالیٰ، حضرت مریم اور ان کا بیٹا ہے، فراء اور ابوعبیدہ نے کہا: تم یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ (الکہف: 22) ابو علی نے کہا: اس کی تقدیر یہ ہے ولا تقولوا هو ثالث ثلاثة۔ یعنی یہ نہ کہو کہ وہ تین میں سے تیسرا ہے، پس مبتدا اور مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ نصاریٰ کے سارے فرقے اس پر جمع ہیں کہ تین خدا ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایک جوہر ہے اور اس کے تین اقانیم ہیں اب، ابن اور روح القدس، اب سے مراد وجود لیتے تھے، روح سے مراد جنات اور ابن سے مراد مسیح لیتے تھے۔ ان کے کلام میں اس مسئلہ میں تخبط ہے جس کا بیان اصول دین میں ہے۔ ان کی کلام کا خلاصہ یہ ہے وہ سب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ پر خوارق للعادت کام جاری فرمائے جیسا کہ اس کا ارادہ اور مقتضیٰ تھا۔ انہوں نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ یہ امور انسانی قدرت سے خارج ہیں پس جو ان پر قادر ہے وہ الوہیت سے موصوف ہوگا۔ ان کو کہا جائے گا: اگر یہ ان کی قدرت میں ہوتا اور مستقل ہوتا تو پھر دشمنوں سے اپنے نفس کو بچانے اور اپنے آپ سے شر کو دور کرنا ان کی مقدورات سے ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے اگر نصاریٰ اس کا اعتراف کریں تو ان کا قول اور دعویٰ ساقط ہو جائے گا کہ وہ مستقل بالذات ایسا کرتے تھے۔ اگر وہ اس کو تسلیم نہ کریں تو ان کے لیے کوئی حجت نہ ہوگی، کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جو ان کے ہاتھوں پر بڑے بڑے امور جاری ہوئے تھے اس سے معارض تھے مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، سمندر کا پھٹنا، ید بیضا، من وسلویٰ وغیرہ، اسی طرح انبیاء کے ہاتھوں پر جو معجزات جاری ہوئے تھے۔ اگر وہ ان کا انکار کریں تو ہم بھی اس کا انکار کریں گے جو وہ دعویٰ کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئے تھے۔ پس پھر تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کسی چیز کا ثابت کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک اثبات کا طریق قرآن کی نصوص ہیں جب کہ وہ قرآن کا انکار کرتے ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں جو وہ لے کر آیا پس ان کے لیے اخبار تواتر کے ساتھ اس کا ثبوت ممکن نہ ہوگا۔

بعض علماء نے کہا: نصاریٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے اکیاسی سال بعد تک دین اسلام پر قائم رہے، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، رمضان کے مہینہ کے روزے رکھتے تھے حتیٰ کہ ان کے اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی، یہود میں ایک بہادر شخص تھا جس کو بولس کہا جاتا تھا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کی ایک جماعت کو قتل کر

دیا اور کہا: اگر حق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو ہم نے کفر کیا اور ہم نے انکار کیا اور آگ کی طرف ہمارا لوٹنا ہے، ہم خسارے میں ہوں گے، اگر وہ جنت میں داخل ہوئے اور ہم آگ میں داخل ہوئے، میں ان میں ایک سازش کرتا ہوں میں انہیں گمراہ کروں گا پس وہ دوزخ میں داخل ہوں گے، اس کا ایک گھوڑا تھا جس کو عقاب کہا جاتا تھا اس نے ندامت کا اظہار کیا اور اپنے سر پر مٹی ڈالی، اس نے نصاریٰ کو کہا: میں تمہارا دشمن بولس ہوں، آسمان سے آواز آئی کہ تیرے لیے توبہ نہیں ہے مگر یہ کہ نصرانی ہو جائے۔ نصاریٰ نے اسے کنیسہ کے ایک کمرے میں داخل کیا پس وہ اس میں سے باہر نکلا اور کہا: آسمان سے مجھے ندا آئی کہ اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول کر لی ہے۔ نصاریٰ نے اس کی تصدیق کی اور اس سے محبت کی پھر وہ بیت المقدس کی طرف چلا گیا اس نے ان پر نسطورا کو خلیفہ بنایا اور اسے بتایا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم خدا تھا پھر روم کی طرف گیا اور انہیں لاہوت اور ناسوت سکھایا اور کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان نہیں تھے پھر وہ انسان بنے اور نہ جسم تھے پھر وہ جسم بنے لیکن وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ اس نے ایک شخص کو سکھایا جس کو یعقوب کہا جاتا تھا، پھر اس نے ایک شخص کو بلایا جس کو الملک کہا جاتا تھا، اس نے اسے کہا: الٰہ ہمیشہ سے تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہمیشہ رہیں گے جب ان پر اس نے مکمل قدرت حاصل کر لی تو اس نے ان تینوں افراد کو علیحدہ علیحدہ بلایا، اس نے ہر ایک کو کہا: تو میرا خالص ساتھی ہے۔ میں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو نیند میں دیکھا وہ مجھ سے راضی تھے، اس نے ان میں سے ہر ایک کو کہا: میں کل اپنے آپ کو ذبح کر ڈالوں گا اور اس طرح میں قرب حاصل کروں گا پھر وہ مذبح میں داخل ہوا اور اپنے آپ کو ذبح کر دیا، جب تیسرا دن تھا تو ہر ایک نے اپنے نحلۃ (مذہب) کی طرف بلایا، پس ان میں سے ہر ایک کی ایک طائفہ نے اتباع کی، پس وہ آپس میں جھگڑنے لگے اور آج تک اختلاف کر رہے ہیں، تمام نصاریٰ تین فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں یہ ان کے شرک کا سبب تھا۔ واللہ اعلم۔ یہ واقعہ: فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (المائدہ: 14) کے تحت روایت کیا گیا ہے۔ مزید ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ سیبویہ کے نزدیک فعل مضمر کے ساتھ خیراً منصوب ہے، گویا فرمایا: أئتوا خیراً لکم (1)، کیونکہ جب اس نے انہیں شرک سے منع کیا تو انہیں اس چیز کے لانے کا حکم دیا جو ان کے لیے بہتر تھی۔ سیبویہ نے کہا: اس کو فعل کے اضمار پر نصب دی جاتی ہے جس کا اظہار متروک ہوتا ہے۔ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ کیونکہ جب تو کہتا ہے: أمتہ، تو تو ایک امر سے اسے نکالتا ہے اور دوسرے امر میں اسے داخل کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فواعِدِيه سَرْحَتَيْ مَالِكٍ أو الرُّبَا بينهما أسْهَلَا (2)

اور ابو عبیدہ کا مذہب ہے: انتھوا یکن خیراً لکم محمد بن یزید نے کہا: یہ خطا ہے، کیونکہ وہ شرط اور جواب شرط کو مضمر کرتا ہے اور یہ کلام عرب میں نہیں پایا جاتا۔ اور فراء کا مذہب ہے کہ یہ محذوف مصدر کی نعت ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ فحش غلطی ہے، کیونکہ معنی ہوگا انتھوا الانتھاء الذی ھو خیر لکم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یہ مبتدا خبر ہے اور واحد، الٰہ کی صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اللہ اسم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 137

2۔ ایضاً

جلالت سے بدل ہو اور واحد خبر ہو تقدیر اس طرح ہو گی انما المعبود واحدٌ۔ معبود ایک ہے۔

سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ۔ اللہ تعالیٰ بیٹے سے پاک ہے، جب عن ساقط ہو گیا تو أن حرف جر کے نزع کے ساتھ محل نصب میں ہو گا یعنی اس کے لیے بیٹا کیسے ہو گا؟ آدمی کا بیٹا اس کے مشابہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کوئی شبیہ نہیں ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام بھی ان چیزوں میں سے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان میں ہے مخلوق ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ کیسے ہوں گے جب کہ وہ مخلوق ہیں؟ اگر اس کا بچہ جائز ہو تو اس کی اولاد جائز ہونی چاہیے حتیٰ کہ جس کے ہاتھ سے معجزہ ظاہر ہو وہ اس کا بیٹا ہو۔ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا۠ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے لیے کافی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا۝ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا۝

''ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔ پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اجر اور زیادہ بھی دے گا انہیں اپنے فضل (وکرم) سے لیکن جنہوں نے عار سمجھا (بندہ بننے کو) اور تکبر کیا تو عذاب دے گا انہیں دردناک عذاب۔ اور نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ۔ یعنی ہرگز عار نہیں سمجھیں گے۔ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔ اللہ کا بندہ ہونے سے۔ یہ محل نصب میں ہے۔ حسن نے اِن یکون پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، ان نافیہ ہے بمعنی ما ہے معنی یہ ہے اس کے لیے بیٹا نہیں ہے یکون کو رفع مناسب ہے، رواۃ نے یہ ذکر نہیں کیا ہے۔

وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ یعنی اللہ کی رحمت اور رضا سے۔ یہ دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں اسی طرح وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ (الانعام: 50) سورۂ بقرہ میں اس مفہوم کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ جو عار سمجھے گا۔ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ اس کی عبادت کو اور اس کی عبادت نہیں کرے گا۔ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ یعنی محشر کی طرف انہیں اللہ جمع کرے گا۔ جَمِیْعًا۝ سب کو۔ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا دے گا جیسا کہ اس کے بعد آیت میں فرمایا: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا۝ پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا

انہیں ان کے اجر اور زیادہ بھی دے گا انہیں اپنے فضل (وکرم) سے۔ یَسْتَنْكِفُ کی اصل نکف ہے یا سین اور تا زائد ہیں۔
کہا جاتا ہے: نكفت من الشئ واستنكفت منه، وانكفته۔ میں نے اسے اس سے پاک کیا جس سے اسے عار تھی۔
اسی سے حدیث ہے: سبحان اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر برائی سے اللہ تعالیٰ کو پاک کرنا یعنی انداد اور اولاد سے اسے پاک کرنا'' (1)۔ زجاج نے کہا: استنکف یعنی عار سمجھا، یہ نكفت الدمع سے ماخوذ ہے جب تو اپنی انگلی سے اپنے رخسار سے آنسو کو دور کرے۔ اسی سے حدیث ہے: جاء بجيش لا ينكف اخره (2)۔ وہ لشکر کے ساتھ آیا جس کا آخر ختم نہیں ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ النکف سے ہے جس کا معنی عیب ہے۔ کہا جاتا ہے: ما عليه في هذا الامر نكف ولا وكف اس معاملہ میں اس پر کوئی عیب نہیں ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز عبادت سے نہیں رکیں گے، عبودیت سے کبھی دور نہ ہوں گے کبھی اس سے جدا نہ ہوں گے اور ہرگز اس کو عیب نہیں سمجھیں گے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۝

''اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس ایک (روشن) دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف نور درخشاں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ ثوری سے مروی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برہان فرمایا، کیونکہ آپ کے ساتھ برہان تھی اور وہ معجزہ تھا۔ مجاہد نے کہا: یہاں برہان سے مراد حجت ہے، معنی متقارب ہے کیونکہ معجزات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت تھے اور النور جو نازل کیا گیا وہ قرآن ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اس کو اللہ نے نور فرمایا، کیونکہ اس کے ساتھ احکام واضح ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہی سے ہدایت ملتی ہے وہ نور مبین ہے یعنی بالکل واضح ہے۔

فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِٱللَّهِ وَٱعْتَصَمُوا۟ بِهِۦ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِى رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَٰطًا مُّسْتَقِيمًا ۝

''تو جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ (کی رسی) کو تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچائے گا انہیں اپنی طرف لے جانے والی سیدھی راہ پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِٱللَّهِ وَٱعْتَصَمُوا۟ بِهِۦ یعنی گناہوں سے اجتناب کیا اور قرآن کو مضبوطی سے پکڑا جب کتاب کو مضبوطی سے پکڑا تو کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے پکڑا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑا۔ العصمة کا معنی رکنا ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ يَهْدِيهِمْ یعنی وہ انہیں ہدایت دے گا ھو کو مضمر کر دیا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ کلام کا ماقبل سے تعلق نہیں ہے۔ اليه یعنی اس کے ثواب کی طرف۔ بعض علماء نے فرمایا: حق کی طرف تا کہ وہ اس کو پہچان لیں۔ صِرَٰطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ یعنی دينا مستقيما۔ صراطاً فعل کے اضمار کی وجہ منصوب ہے جس پر

1۔ اخرجہ الخطابی فی غریبہ، جلد 1، صفحہ 140
2۔ الفائق للزمخشری، جلد 1، صفحہ 264

یھدیھم دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ویعرفھم صراطا مستقیما یعنی وہ انہیں صراط مستقیم کی پہچان کراتا ہے۔ بعض نے فرمایا: یھدیھم الی ثوابہ صراطا مستقیما کی تقدیر پر دوسرا مفعول ہوگا۔ بعض نے فرمایا: یہ حال ہے اور الیہ میں ضمیر بعض علماء نے فرمایا: قرآن کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: فضل کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: رحمت کے لیے ہے، کیونکہ یہ دونوں ثواب کے معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: مضاف کے حذف پر الله کے لیے ہے جیسا کہ گزر چکا ہے کہ اس کا معنی ہے یھدیھم الی ثوابہ۔ ابوعلی نے کہا: اسم جلالت جو پہلے گزر چکا ہے اس کی طرف راجع ہے، معنی ہے یھدیھم الی صراطہ جب ہم صراطاً مستقیما کو حال کی بنا پر نصب دیں گے تو اس محذوف سے حال ہوگا اور وفضل میں دلیل ہے کہ الله تعالیٰ اپنے بندوں پر ثواب کے ساتھ فضل فرماتا ہے، کیونکہ اگر یہ عمل کے مقابلہ میں ہوتا تو فضل نہ ہوتا۔ والله اعلم

یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

”(اے میرے رسول) فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے، آپ فرمایئے: الله تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں کلالہ (کی میراث) کے بارے میں اگر کوئی ایسا آدمی فوت ہو جائے، نہ ہو جس کی کوئی اولاد اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ سے اور وہ وارث ہوگا اپنی بہن کا اگر نہ ہو اس کی بہن کی کوئی اولاد۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا اور اگر وارث ہوں بہن، بھائی مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصہ کے برابر ہے، صاف صاف بیان کرتا ہے الله تمہارے لیے (اپنے) احکام تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ اور الله ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت براء بن عازب نے فرمایا: یہ آخری آیت ہے جو قرآن سے نازل ہوئی۔ اسی طرح مسلم کی کتاب میں ہے (1) اور یہ آیت نازل ہوئی جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کی تیاری کر رہے تھے اور یہ حضرت جابر کے سبب نازل ہوئی۔ حضرت جابر بن عبدالله نے کہا: میں بیمار تھا تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی الله عنہ میری عیادت کے لیے تشریف لے آئے، مجھ پر غشی طاری تھی۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا، پھر اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا تو مجھے افاقہ ہوگیا۔ میں نے عرض کی: یارسول الله! میں اپنے مال کا کیسے فیصلہ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہ دیا حتیٰ کہ آیت میراث نازل ہوئی: یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2)، اور فرمایا: آخری آیت یہ نازل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، باب میراث الاخوات والاخوۃ، حدیث نمبر 6247، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الفرائض، حدیث نمبر 6228، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوئی: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللهِ (بقرہ: 281) یہ پہلے گزر چکی ہے۔ سورت کی ابتدا میں کلالہ کے متعلق تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور یہاں الاخوۃ سے مراد سگے بھائی ہیں یا باپ کی طرف سے بھائی ہیں اور حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ یعنی جس کا نہ بیٹا ہو، نہ باپ ہو۔ ایک کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ جرجانی نے کہا: الولد کے لفظ کا اطلاق والد اور مولود دونوں پر ہوتا ہے۔ والد کو والد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پیدا کرتا ہے اور مولود کو ولد کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ پیدا کیا جاتا ہے جیسے ذریۃ یہ ذرا سے مشتق ہے پھر اس کا اطلاق مولود اور والد پر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ (یٰسین)

**مسئلہ نمبر 3**۔ صحابہ اور تابعین میں سے جمہور علماء بہنوں کو بیٹوں کا عصبہ بناتے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ بھائی نہ ہو۔ سوائے حضرت ابن عباس کے وہ بہنوں کو بیٹیوں کا عصبہ نہیں بناتے۔ یہی نظریہ داؤد اور ایک گروہ کا ہے اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظاہر ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ الخ اور بہن وارث نہ ہوگی مگر جب میت کی اولاد نہ ہو۔ یہ عطا فرماتے ہیں: یہ معلوم ہے کہ بیٹی، اولاد سے ہے پس بیٹی کے ہوتے ہوئے بہن وارث نہ ہو۔ حضرت ابن زبیر اس مسئلہ میں حضرت ابن عباس کے موافق تھے حتیٰ کہ اسود بن یزید نے اس کے متعلق خبر دی کہ حضرت معاذ نے بیٹی اور بہن میں فیصلہ فرمایا اور مال کو نصف، نصف ان کے درمیان تقسیم کیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس آیت کو آیۃ الصیف بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ الصیف (گرمی) کے زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! میں کوئی چیز نہیں چھوڑتا جو کلالہ کے امر سے زیادہ اہم ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ نے مجھ پر اتنی کسی چیز میں سختی نہیں فرمائی جتنی کہ اس کے بارے فرمائی حتیٰ کہ اپنی انگلی سے میرے پہلو میں یا میرے سینے میں ٹھوکا دیا، پھر فرمایا: "اے عمر! کیا تیرے لیے آیت الصیف کافی نہیں (1) جو سورۂ نساء کے آخر میں نازل ہوئی"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں بیان فرماتے تو میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھیں: کلالہ، سود، خلافت، ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں روایت کیا ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ بعض رافضیوں نے حضرت عمر کے اس قول واللہ لا ادع پر طعن کیا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے یبین اللہ لکم لئلا تضلوا۔ ابوعبید نے کہا: میں نے کسائی سے وہ حدیث بیان کی جو حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی اپنی اولاد کو بددعا نہ دے کہیں اللہ کی طرف سے قبولیت موافق نہ ہو جائے"۔ تو کسائی نے اس کو اچھا سمجھا۔ نحاس نے کہا: ابوعبید کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے قبولیت کی موافقت نہ ہو جائے۔ یہ قول بصریوں کے نزدیک خطا ہے، کیونکہ وہ لا کا اضمار جائز قرار نہیں دیتے ان کے نزدیک اس کا معنی ہے یبین اللہ لکم کراھۃ ان تضلوا پھر حذف کیا گیا۔ جیسے فرمایا: واسال القریۃ اس حدیث کا معنی ہے کراھیۃ ان یوافق من اللہ اجابۃ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ یہ کئی دفعہ گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ سورۃ النساء مکمل ہوئی۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفرائض، جلد 1، صفحہ 201 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

# سورۃ المائدہ

آیاتہا ۱۲۰ — ۵ سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۲ — رکوعاتہا ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس سورت کا آغاز کرتا ہوں۔ یہ سورہ مدنی ہے اس پر اجماع ہے، روایت ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے لوٹ رہے تھے۔ نقاش نے حضرت ابوسلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے لوٹے تو فرمایا: ''اے علی! کیا تجھے معلوم ہے مجھ پر سورۂ مائدہ نازل ہوئی اور بہت اچھا فائدہ ہے''(1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ حدیث موضوع ہے، کسی مسلمان کو اس کا اعتقاد جائز نہیں مگر ہم کہتے ہیں سورۃ المائدہ اور نعمت الفائدہ۔ ہم اس کو کسی سے روایت نہیں کرتے لیکن یہ عمدہ کلام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: سورۃ المائدہ کو اللہ کی ملکوت میں المنقذہ کہا جاتا ہے، یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب کے فرشتوں کے ہاتھوں سے نجات دلاتی ہے(2)۔ اس سورت سے کچھ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوا کچھ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا، وہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ قرآن کا وہ حصہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد نازل ہوا وہ مدنی ہے خواہ مدینہ میں نازل ہوا یا کسی سفر میں نازل ہوا اور جو ہجرت سے پہلے نازل ہوا اسے مکی کہا جاتا ہے۔

ابو میسرہ نے کہا: المائدہ یہ آخر میں نازل ہونے والی ہے اس میں نسخ نہیں ہے، اس میں اٹھارہ فرائض ہیں جو کسی دوسری سورت میں نہیں ہیں (3) وہ یہ ہیں: الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ۔ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ۔ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور مکمل طہارت۔ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ۔ لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ۔ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىِٕبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ۔ الآیۃ۔

میں کہتا ہوں: انیسواں فریضہ یہ ہے وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ اذان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر اس سورت میں اور جو سورہ جمعہ میں آیا ہے وہ جمعہ کے ساتھ خاص ہے، اس سورت میں اذان کا ذکر تمام نمازوں کے لیے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے سورۃ المائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر پڑھی، فرمایا: ''اے لوگو! سورۂ مائدہ آخری نازل ہونے والی سورت ہے پس اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو''(4)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 143 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 523 4۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 311

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے موقوفا مروی ہے جبیر بن نفیر نے فرمایا میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا تو آپ نے فرمایا: کیا تو سورۂ مائدہ پڑھتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے آخر میں نازل فرمایا اس میں جو تم حلال پاؤ اسے حلال جانو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو (1)۔ شعبی نے کہا: اس سورت سے کچھ منسوخ نہیں ہوا سوائے اس ارشاد کے وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ منسوخ کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۣ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

''اے ایمان والو! پورا کرو (اپنے) عہدوں کو حلال کیے گئے ہیں تمہارے لیے بے زبان جانور سوائے ان کے جن کا حکم پڑھ کر سنایا جائے گا تمہیں نہ حلال سمجھو شکار کو جب کہ تم احرام باندھے ہو بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے جو چاہتا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ علقمہ نے کہا: قرآن میں جو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا آیا ہے وہ مدنی ہے اور جو يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ آیا ہے وہ مکی ہے (2)۔ یہ اکثر کے اعتبار سے ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ آیت ان آیات میں سے ہے قلت الفاظ کے باوجود معانی کی کثرت اور فصاحت پر کلام میں بصیرت رکھنے والے کے لیے ظاہر ہے، یہ آیت پانچ احکام اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے (۱) عہدوں کو پورا کرنے کا حکم (۲) بے زبان جانوروں کا حلال کرنا (۳) اس کے بعد جو ہے اس کی استثنا (۴) احرام کی حالت میں شکار کرنے کی حالت کی استثنا (۵) اور جو محرم نہیں ہے اس کے لیے شکار کی اباحت۔

نقاش نے حکایت کیا ہے کہ اصحاب کندی (☆) نے اسے کہا: اے حکیم! ہمارے لیے قرآن کی مثل لکھ دے۔ اس نے کہا: ہاں میں اس کے بعض کی مثل لکھوں گا، وہ (کندی) کئی دن پوشیدہ رہا پھر ظاہر ہوا اور کہا: اللہ کی قسم! میں قدرت نہیں رکھتا اور کوئی بھی اس کی طاقت نہیں رکھتا، میں نے قرآن کو کھولا تو سورۂ مائدہ نکلی، میں نے اس میں دیکھا تو اس نے وفا کا حکم دیا اور عہد توڑنے سے منع کیا، عام حلت فرمائی پھر استثنا کے بعد استثنا فرمائی پھر دو سطروں میں اپنی حکمت وقدرت کے متعلق خبر دی ان تمام احکام کو کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا مگر کئی جلدوں میں (3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْفُوْا کہا جاتا ہے: وفی اور اوفی دونوں لغتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (توبہ: 111) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝ (النجم) شاعر نے کہا:

أَمّا ابنُ طوق فقد أَوْفَى بِذِمّتِهِ كما وَفَى بِقِلاصِ النَّجْمِ حَادِيها

دونوں لغتوں کو اس میں جمع کیا۔ بِالْعُقُوْدِ اس کا معنی باندھنا ہے، اس کا واحد عقد ہے کہا جاتا ہے: عقدت العهد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 143 — 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 145 — 3۔ ایضاً

☆ کندی سے مراد یعقوب بن اسحاق ابو یوسف ہے یہ اپنے دور کا ایک بے مثل فلسفی تھا کندہ کے خاندان سے تھا، یہ طب، فلسفہ، موسیقی اور علم ہندسہ میں مشہور ہوا۔

والحبل، وعقدت العسل۔ یہ معانی اور اجسام دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حطیئہ نے کہا:

قَوْمٌ إذا عقدوا عقدا لجارهم	شَدّوا العِنَاجَ وشَدّوا فوقه الكَرَبا(1)

اللہ تعالیٰ نے عہدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ حسن نے کہا: اس سے مراد دین کے عہد ہیں، یہ وہ پختہ وعدہ ہے جو انسان اپنے اوپر باندھتا ہے۔ بیع، شراء، اجارہ، کرایہ، مناکحہ، طلاق، مزارعت، مصالحت، تملیک، تخییر، عتق، تدبیر وغیرہ وہ تمام عقود جو شریعت سے خارج نہیں ہیں، اسی طرح وہ عقود بھی شامل ہیں جو طاعات میں سے انسان اللہ کے لیے اپنے اوپر باندھتا ہے جیسے حج، روزہ، اعتکاف، صیام، نذر اور اس کے علاوہ ملت اسلام کی طاعات۔ مباح نذر لازم نہیں ہوتی۔ اس پر امت کا اجماع ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (آل عمران: 187)

ابن جریج نے کہا: یہ اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے اور اس کے بارے نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: یہ عام ہے اور یہی قول صحیح ہے، کیونکہ مومنین کا لفظ اہل کتاب کے مومنین کو بھی شامل ہے، کیونکہ ان کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اداء امانت کا عہد تھا جو ان کی کتاب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں سے تھا، کیونکہ انہیں اس کا حکم دیا گیا تھا اس ارشاد میں: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اور دوسرے مقامات پر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کا معنی ہے جو اللہ نے حلال کیا، جو حرام کیا، جو فرض کیا اور جو تمام اشیاء میں حد مقرر کی۔ اسی طرح مجاہد وغیرہ نے کہا(2): ابن شہاب نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا جو آپ نے حضرت عمرو بن حزم کے لیے لکھا تھا جب انہیں نجران کی طرف بھیجا تھا اس کے آغاز میں تھا ھذا بیان للناس من اللہ و رسولہ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اس میں اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ تک آیات لکھیں(3)۔

زجاج نے کہا: اَوْفُوْا کا معنی ہے اللہ کے ساتھ جو عہد کیے ہیں ان کو پورا کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ جو عہد ہیں ان کو بھی پورا کرو۔ یہ تمام عموم کے قول کی طرف راجع ہیں اور یہی صحیح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومنوں کے معاملات ان کی شرائط کے مطابق ہیں(4)'' اور فرمایا: ''ہر وہ شرط جو اللہ کی کتاب کے موافق نہیں وہ باطل ہے اگرچہ سو شرائط بھی ہوں''(5)۔ پس بیان فرمایا کہ شرط یا عقد جس کا پورا کرنا واجب ہے وہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے موافق ہو۔ اگر اس میں مخالفت ظاہر ہو تو وہ مردود ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد ہے''(6)۔ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ قریش کے قبائل عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور آپس میں عہد کیا کہ وہ مکہ میں جس مظلوم کو پائیں گے اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے حتیٰ کہ اس سے ظلم کو دور کریں گے، قریش نے اس معاہدہ کو حلف الفضول کہا۔ اس معاہدہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں عبداللہ کے گھر میں معاہدہ میں شریک ہوا تھا میرے نزدیک وہ سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب تھا، اگر مجھے اسلام میں اس کے لیے بلایا جاتا تو میں قبول کرتا''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 144	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 527	5۔ ایضاً	6۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 77

یہی حلف مراد ہے: ایما حلف کان فی الجاھلیۃ لم یزدہ الاسلام الا شدۃ (1) وہ حلف جو زمانہ جاہلیت میں تھا اس میں اسلام نے شدت کی ہے۔ کیونکہ وہ شرع کے موافق تھا کیونکہ ظالم سے انصاف لینے کا حکم تھا اور جو عقود فاسد ہوں اور جو عقود باطل ہوں ان کو اسلام نے ساقط کر دیا۔ والحمدللہ

ابن اسحاق نے کہا: ولید بن عتبہ نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر ان کے مال کے بارے میں سلطان الولید کے لیے زیادتی کی جب کہ ولید بن عتبہ مدینہ کا امیر تھا۔ حضرت حسین نے اسے کہا: میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں! تو میرے حق میں انصاف کرے گا ورنہ میں اپنی تلوار اٹھاؤں گا، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں کھڑا ہوں گا، پھر میں حلف الفضول کی دعوت دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں! اگر مجھے اس نے بلایا تو میں اپنی تلوار پکڑوں گا، پھر حضرت حسین کے ساتھ کھڑا ہوں گا حتیٰ کہ وہ ان کا حق دے گا یا ہم سب مر جائیں گے۔ حضرت مسور بن مخرمہ کو یہ بات پہنچی تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ التیمی کو خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا، ولید کو جب یہ بات پہنچی تو اس نے انصاف کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ۔ یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جس نے علی وجہ کمال ایمان کو لازم پکڑا۔ عربوں کے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے متعلق طریقے تھے ان کا بیان آگے آئے گا۔ یہ آیت اوہام خیالیہ اور آراء فاسدہ کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے معنی میں اختلاف ہے۔ البھیمۃ ہر چوپائے کو کہا جاتا ہے۔ ان کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے، کیونکہ ان میں بولنے، سمجھنے اور عدم تمیز کی طاقت نہیں ہوتی اور کم عقلی کا نقص پایا جاتا ہے، اسی سے ہے باب مبھم، بند دروازہ، لیل بھیم۔ تاریک رات۔ بہادر جس کا علم نہ ہو کہ اس کا وار کہاں سے آئے گا اس کو بھمۃ کہتے ہیں الانعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں ہیں۔ ان کو یہ نام ان کے آہستہ چلنے کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ (النحل) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا (الانعام: 142) یعنی بڑے اور چھوٹے۔ پھر ان کو بیان کیا ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ (الانعام) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا (النحل: 80) یعنی بکریاں۔ اَوْبَارِهَا یعنی اونٹ۔ اَشْعَارِهَا یعنی بھیڑیں۔

یہ تین دلائل ہیں جو انعام کے اسم کے ضمن میں ہیں۔ ان تین اجناس کا شعور ملتا ہے یعنی اونٹ، گائے، بکریاں (2)۔ یہ حضرت ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔ ہروی نے کہا: جب البھم بولا جاتا ہے تو اس سے خاص اونٹ مراد ہوتے ہیں۔ طبری

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 49　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 144

نے کہا: ایک قوم نے کہا: بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ سے مراد وحشی جانور ہیں جیسے ہرن، وحشی گائیں، وحشی گدھے وغیرہ ذالک۔ طبری کے علاوہ نے سدی، ربیع، قتادہ اور ضحاک سے روایت کیا ہے، گویا فرمایا: احلت لکم الانعام۔ تمہارے لیے بے زبان جانور حلال کیے گئے، پھر جنس کو اس سے خاص کی طرف منسوب کیا گیا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حسن کا قول ہے۔ انعام کے آٹھ جوڑے ہیں جو بقیہ تمام حیوان ان کی طرف منسوب ہیں اس کو انعام ہی کہا جاتا ہے گویا چیرنے والا جیسے شیر اور ہر ذی ناب انعام کی حد سے خارج ہے پس بهيمة الانعام سے مراد وہ چوپائے ہیں جو چرنے والے ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: اس طرح تو اس میں تمام کھروں والے جانور داخل ہیں، کیونکہ وہ چرنے والے ہیں چیرنے پھاڑنے والے نہیں، حالانکہ بات اس طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ (النحل: 5) پھر اس پر عطف فرمایا: وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ (النحل: 8) جب ان کو علیحدہ ذکر فرمایا اور الانعام پر اس کا عطف فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ یہ ان میں سے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: بهيمة الانعام سے مراد وہ جانور ہیں جو شکار نہ ہو، کیونکہ شکار کو وحشی کہا جاتا ہے بہیمہ نہیں کہا جاتا۔ یہ پہلے قول کی طرف راجع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے فرمایا: بهيمة الانعام سے مراد وہ بچے ہیں جو ذبح کے وقت ماؤں کے پیٹوں سے نکلتے ہیں یہ بغیر ذبح کے کھائے جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (2) اس میں بعد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ، الاجنۃ (ماں کے پیٹوں سے نکلنے والے بچے)۔ سے استثنا نہیں کی گی۔ امام مالک نے فرمایا: ذبیحہ کی ذکاۃ اس کے بچے کی ذکاۃ ہے جس کی زندگی معلوم نہ ہو اور اس کے بال اگ چکے ہوں اور اس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو۔ اگر اس کی تخلیق مکمل نہ ہو اور اس کے بال نہ اگے ہوں تو اسے نہیں کھایا جائے گا مگر یہ کہ وہ زندہ پایا گیا ہوں اور اسے ذبح کیا گیا ہو۔ اگر انہوں نے اسے ذبح کرنے میں جلدی کی اور وہ خود بخود مر گیا تو بعض علماء نے فرمایا: وہ پاک ہے۔ اور بعض نے فرمایا: پاک نہیں۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ یعنی جو قرآن وسنت میں تم پر پڑھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ: 3) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وكل ذی ناب من السباع حرام (3)۔ ہر کچلیوں والا درندہ حرام ہے (4)۔ اگر کہا جائے: جو ہم پر کتاب نے تلاوت کیا وہ سنت نہیں ہے؟ ہم کہیں گے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت یہ کتاب اللہ سے ہے، اس پر دلیل دو امر ہیں (۱) حدیث العسیف (نوکر والی حدیث) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا'' اور رجم کتاب اللہ میں منصوص نہیں ہے (۲) حضرت ابن مسعود کی حدیث آپ نے فرمایا: مجھے کہا گیا ہے کہ میں اس پر لعنت نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی وہ کتاب اللہ میں ہے، الحدیث۔ مزید بیان سورہ الحشر میں آئے گا۔ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ الان او مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کا احتمال رکھتا ہے، مستقبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوگا، اس میں بیان کی تاخیر کے جواز پر دلیل ہے جب کہ اس کی ضرورت نہ ہو۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 144 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 147

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 981۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اکل کل ذی ناب من السباع، حدیث 5104، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ یعنی جو حالت احرام میں حلال نہیں اور غیر احرام میں حلال ہے اور جو شکار نہ ہو وہ دونوں حالتوں میں حلال ہے۔ اِلَّا مَا یُتۡلٰی کے بارے میں نحویوں کا اختلاف ہے کہ یہ استثنا ہے یا نہیں۔ بصریوں نے کہا یہ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ سے استثنا ہے اور غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ اس سے دوسری استثنا ہے۔ پھر دونوں استثنا بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ سے ہیں اور یہ مستثنیٰ منہ ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا ما یتلیٰ علیکم الا الصید و انتم محرمون بخلاف اس ارشاد کے: اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿﴾ اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ (الحجر) جیسا کہ آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مستثنیٰ ہے اس سے جو اس سے متصل ہے پس یہ اس قول کے قائم مقام ہو جائے گا اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ۔ اگر یہ اس طرح ہوتا تو احرام میں شکار کی اباحت واجب ہوتی۔ کیونکہ یہ ممنوع سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا مَا یُتۡلٰی، اباحت سے مستثنیٰ ہے اور یہ وجہ ساقط ہے پھر یہ معنی ہوگا کہ تمہارے لیے بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ حلال کیے گئے ہیں شکار کو حلال نہ سمجھو جب کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو مگر جو تم پر تلاوت کیا جائے گا سوائے شکار کے۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ عقود کو پورا کرو مگر شکار کو حلال نہ سمجھو اور تمہارے لیے بے زبان جانور حلال کیے گئے ہیں مگر جو تم پر تلاوت کیے جائیں گے۔ فراء نے اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ کا الا کے ساتھ عطف کی بنا پر بدل کی حیثیت سے مرفوع ہونا جائز قرار دیا ہے جیسا کہ لا کے ساتھ عطف کیا جاتا ہے۔

بصری علماء اس کو جائز قرار نہیں دیتے مگر نکرہ میں یا جو اسماء اجناس نکرہ کے قریب ہوں جیسے جاء القوم الا زید، ان کے نزدیک غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ کی نصب حال کی بنا پر ہے اور ذوالحال اَوۡفُوۡا میں ضمیر ہے۔ اخفش نے کہا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ (المائدہ: 1) دوسرے علماء نے کہا: لکم میں ضمیر سے حال ہے تقدیر اس طرح ہوگی احلت لکم بهیمة الانعام غیر محلی الصید۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ احلال لوگوں کی طرف راجع ہو یعنی حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھو اور اللہ کی طرف راجع ہونا بھی جائز ہے یعنی تمہارے لیے جانور حلال کیے گئے مگر جو شکار ہو احرام کے وقت میں، جیسے تو کہتا ہے: احللت لك كذا غیر مبیح لك یوم الجمعة۔ میں نے یہ تیرے لیے حلال کیا مگر تیرے لیے جمعہ کے دن مباح نہیں ہے۔ جب تو کہے گا کہ لوگوں کی طرف حلال کرنا راجع ہے تو معنی ہوگا غیر محلین الصید پس نون تخفیفاً حذف کی گئی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ یعنی جب تم حج اور عمرہ کے احرام میں ہو۔ کہا جاتا ہے: رجل حرام، قوم حُرُم جب حج کا احرام باندھ لیں۔ اسی سے شاعر کا قول ہے۔

فقلتُ لها فِیئی إلیكِ فإنّنی   حرامٌ وإنّی بعد ذاك لَبِیبُ (1)

یعنی میں تلبیہ کہنے والا ہوں۔ اس کو احرام اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ جو اس میں داخل ہوتا ہے وہ اپنے اوپر عورتیں اور خوشبو وغیرہ حرام کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے: احرم وہ حرم میں داخل ہوا۔ پس حرم کا شکار حرام ہو جاتا ہے۔ حسن، ابراہیم اور یحییٰ بن وثاب نے حرم (را کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے یہ لغت تمیمیہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: رُسُل رُسْل، کُتُب و کُتْب۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 145

**مسئلہ نمبر 7**۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۝ ان احکام شریعۃ کو تقویت دینا ہے جو عربوں کے معہود احکام کے مخالف ہیں۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے احکام کا نسخ سننے والے ہیں جو مالک الملک ہے، جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ جو چاہتا ہے، جیسے چاہتا ہے شروع فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝۲

''اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ عزت والے مہینہ کی اور نہ حرم کو بھیجی ہوئی قربانیوں کی اور نہ جن کے گلے میں پٹے ڈالے گئے ہیں اور نہ (بے حرمتی کرو) جو قصد کیے ہوئے ہیں بیت حرام کا طلب کرتے ہیں اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا۔ اور جب احرام کھول چکو تو شکار کر سکتے ہو اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کا بغض بوجہ اس کے کہ انہوں نے روکا تھا تمہیں مسجد حرام سے اس پر کہ تم زیادتی کرو اور ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں اور باہم مدد نہ کرو گناہ اور زیادتی پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ۔ یہ مومنین کو خطاب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے امور میں حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو۔ الشعائر فعیلۃ کے وزن پر شعیرۃ کی جمع ہے(1)۔ ابن فارس نے کہا: واحد کو شعارۃ کہا جاتا ہے، یہ احسن ہے۔ الشعیرۃ اس جانور کو کہتے ہیں جو قربانی کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور اشعار سے مراد یہ ہے کہ اس کی کھال کو چیر دیا جائے تا کہ اس سے خون بہہ جائے اور جان لیا جائے کہ یہ ہدی ہے۔ اشعار کا معنی احساس کے طریق سے آگاہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: اشعر هديۃ۔ یعنی اس نے ہدی کے لیے علامت بنائی تا کہ پہچانا جائے کہ یہ ہدی ہے، اسی سے شعائر ہے جس کا معنی نشانیاں ہیں اس کا واحد مشعر ہے وہ جگہ جہاں علامات لگائی جاتی ہیں اسی سے الشعر ہے کیونکہ یہ وہ ہوتا ہے جہاں شعور واقع ہوتا ہے اسی سے الشاعر ہے جو اپنی فطانت سے اس چیز کا شعور حاصل کر لیتا ہے جس کو کوئی دوسرا نہیں پہچان سکتا۔ اسی سے الشعیر ہے ان بالوں کی وجہ سے اسے کہا جاتا ہے جو اس کے سر میں ہوتے ہیں۔ الشعائر ایک قول کے مطابق وہ حیوانات جن کو علامات لگائی جاتی ہیں تا کہ انہیں بیت اللہ کی طرف بھیجا جائے اور ایک قول کے مطابق تمام مناسک حج کو شعائر کہا جاتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 145

ہے، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: صفا، مروہ، ہدی، بدن یہ سب شعائر ہیں۔ شاعر نے کہا:

نُقَتِّلهم جِيلاً فِجيلاً تراهُمُ شَعَائِرَ قُرْبَانٍ بها يُتَقَرَّبُ

مشرک حج کرتے تھے، عمرہ کرتے تھے اور ہدایا دیتے تھے مسلمانوں نے ان پر تبدیلی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ**۔(1) عطا ابن ابی رباح نے کہا: شعائر اللہ ان تمام احکام کو کہتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جن سے منع فرمایا۔ حسن نے کہا: اس سے مراد تمام دین ہے جیسے ارشاد ہے: **ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ** ﴿ (الحج:32) یعنی دین اللہ۔

میں کہتا ہوں: یہ قول راجح ہے اس کو دوسرے اقوال سے مقدم کیا جائے گا، کیونکہ اس میں عموم ہے۔ علماء کا ہدی کے اشعار میں اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ جمہور علماء نے اشعار کو جائز قرار دیا ہے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ کس جہت سے اشعار کیا جائے گا؟ امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور نے کہا: وہ دائیں جانب میں ہوگا، یہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کی کہان کی دائیں جانب پر اشعار کیا۔ مسلم وغیرہ نے اس کو تخریج کیا ہے یہ صحیح ہے(2)۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنے اونٹ کو بائیں جانب سے اشعار کیا۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: یہ حدیث میرے نزدیک منکر ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: کسی غیر سے یہ صحیح نہیں ہے۔ صفحۃ السنام سے مراد کہان کی ایک طرف ہے اور السنم اونٹ کی پیٹھ کا اوپر والا حصہ ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: وہ دائیں جانب ہوتا ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور فرمایا: دائیں جانب میں اشعار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مجاہد نے کہا: جس طرف چاہے اشعار کرلے امام کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے ان تمام صورتوں سے منع کیا ہے انہوں نے فرمایا: یہ حیوان کو عذاب دینا ہے۔ حدیث امام ابو حنیفہ کے خلاف حجت ہے۔ پس یہ اس داغ کی مثل ہے جس کے ساتھ ملکیت کی پہچان ہوتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے امام ابو حنیفہ پر بہت شدید رد اور انکار کیا ہے انہوں نے کہا: امام ابو حنیفہ نے شریعت میں اس شعیرہ کے متعلق نہیں سنا، حالانکہ یہ علماء میں مشہور ہے۔

میں کہتا ہوں: میں نے علماء احناف کی کتب میں یہ منصوص دیکھا ہے کہ اشعار امام ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور سنت نہیں بلکہ مباح ہے، کیونکہ اشعار جب اعلام تھا تو تقلید کے قائم مقام سنت تھا اور جب اس کو زخمی کیا گیا اور مثلہ کیا گیا تو حرام۔ پس یہ سنت اور بدعت پر مشتمل تھا تو اس کو مباح کیا گیا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اشعار مثلہ ہے اور یہ حرام ہے، کیونکہ اس میں حیوان کو تکلیف دینا ہے پس یہ مکروہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مروی ہے وہ ابتدائے اسلام میں تھا جب عرب مال لوٹ لیتے تھے لیکن جو جانور ہدی ہوتا اسے نہ لوٹتے تھے اور وہ ہدی کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 146

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 407۔ ایضاً، ابو داؤد، کتاب المناسک، باب فی الاشعار، حدیث 1490 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں پہچانتے تھے مگر اشعار کے ساتھ، پھر اس عذر کے زوال کے ساتھ یہ زائل ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے الشیخ الامام ابو منصور ماتریدی سے حکایت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ احتمال ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اشعار کو مکروہ کہا ہو، کیونکہ سوراخ کرنے میں اتنا مبالغہ کیا جاتا تھا کہ جانور کے مرنے کا خوف ہوتا تھا مگر جو اس حد تک تجاوز نہ کرے جس طرح کہ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا جاتا تھا تو وہ بہتر ہے۔ ابوجعفر طحاوی نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ یہ علماء حنفیہ کا امام ابوحنیفہ کے لیے اعتذار ہے اس حدیث کی وجہ سے جو اشعار کے متعلق وارد ہے، انہوں نے اشعار کے متعلق سنا اور انہیں یہ مسئلہ پہنچا اور انہوں نے جانا، انہوں نے کہا: یہ قول کی بنا پر کہ یہ مکروہ ہے اس کے ساتھ کوئی پھر محرم نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ کی مباشرت مناسک سے شمار نہیں کی جاتی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ یہ اسم مفرد ہے جو تمام اشہر حرم میں جنس پر دلالت کرتا ہے۔ اشہر حرام چار ہیں ایک علیحدہ ہے اور تین متواتر ہیں، ان کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ اس کا معنی ہے جنگ اور حملہ کے لیے ان مہینوں کو مباح نہ سمجھو اور نہ ان کو بدلو، کیونکہ ان کا بدلنا بھی ان کو حلال سمجھنا ہے یہ وہ کرتے تھے مہینہ کو مؤخر کرنے کے ساتھ۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ یعنی اس کو حلال نہ سمجھو اور یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے یعنی ولا ذوات القلائد یہ قلادۃ کی جمع ہے ہدی کو حلال سمجھنے سے منع فرمایا، قلادہ ڈالے گئے جانور کا ذکر فرمایا، حرمت پر تنبیہ میں مبالغہ اور تاکید کے لیے (1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ ہدی سے مراد وہ جانور ہے جو اونٹ، گائے اور بکری میں سے بیت اللہ کی جانب بھیجا جاتا ہے اس کا واحد هدیة اور هدیٌ ہے جس نے کہا: کہ الشعائر سے مراد تمام مناسک ہیں اس نے کہا: ہدی کا ذکر اس کی تخصیص کی تنبیہ ہے اور جنہوں نے کہا کہ الشعائر سے مراد ہدی ہے تو انہوں نے کہا: الشعائر سے مراد وہ جانور ہیں جن کی کہان سے خون بہا کر نشان لگایا گیا ہو اور الهدی سے مراد وہ جانور ہیں جن کو اشعار نہ کیا گیا ہو اس میں تقلید پر اکتفا کیا گیا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: ان میں فرق یہ ہے کہ الشعائر سے مراد اونٹ ہیں اور ہدی سے مراد گائیں، بکریاں اور کپڑے ہیں اور دوسری تمام چیزیں بھی جو بھیجی جاتی ہیں۔

جمہور علماء نے کہا: ہدیٰ عام ہے ہر چیز جس سے قربت حاصل کی جاتی ہے۔ ذبائح، صدقات تمام کے لیے بولا جاتا ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ''جمعہ کی طرف جلدی جانے والا، بدنہ قربانی دینے والے کی طرح ہے'' یہاں تک کہ فرمایا: ''آخر میں آنے والا انڈا ہدی دینے والے کی طرح ہے(2)'' انڈے کو بھی ہدی فرمایا۔ انڈے کو ہدی فرمانا اس کا کوئی محل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ صدقہ کا ارادہ فرمایا ہو، اسی طرح علماء نے فرمایا: جب کسی نے کہا جعلت ثوبی هدیا تو اس پر کپڑا صدقہ کرنا واجب ہے مگر مطلق بولا جائے تو اونٹ، گائے اور بکری میں سے کسی ایک صنف کی طرف راجع ہوتا ہے اور اس کو حرم کی طرف لے جانا اور اس کو حرم میں ذبح کرنا مراد ہے۔ یہ عرف شرع سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 146

2۔ صحیح بخاری، کتاب، جمعہ، باب فضل الجمعة، حدیث 832، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرہ:196) اس سے مراد بکری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ:95) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرہ:196) فقہاء کے نزدیک کم از کم ہدی بکری ہے۔ امام مالک نے فرمایا: کہا شوں ھدی تو اس کی قیمت ہدی میں ہوگی۔ الْقَلَآىِٕدَ لوگ اپنے امن کے لیے جانوروں کو ہار پہناتے تھے، یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے یعنی ولا اصحاب القلائد پھر یہ منسوخ کیا گیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: سورۃ المائدہ سے دو آیتیں منسوخ کی گئیں۔ آیۃ القلائد اور یہ ارشاد: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ (المائدہ:42)

رہا قلائد کا حکم تو اس کو اس حکم نے منسوخ کر دیا جس میں مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ جہاں بھی ہوں اور جس مہینہ میں ہوں اور دوسرا ارشاد اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا: وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدہ:49) جیسا کہ آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: القلائد سے مراد نفس قلائد ہے۔ یہ حرم کے درخت کا چھلکا اتارنے سے نہی ہے حتیٰ کہ امن طلب کرنے کے لیے اس کے ساتھ قلادہ پہنایا جائے۔ یہ مجاہد، عطا، مطرف بن الشخیر کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

ہدی کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو دی گئی ہو اور اس کے ساتھ عوض کا ذکر نہ ہو۔ فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس نے کہا: ثلہ علی ھدی تو وہ اس کی ثمن مکہ کی طرف بھیجے گا۔ رہے القلائد، تو ہر وہ چیز جو ہدایا کی کہانوں پر اور ان کی گردنوں میں بطور علامت لٹکائی گئی ہو کہ یہ اللہ سبحانہ کے لیے ہے خواہ وہ جوتا ہو یا کوئی دوسری چیز ہو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے زمانہ جاہلیت میں باقی رہی اور اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا۔ یہ گائے اور بکری میں سنت ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بیت اللہ کی طرف بکریاں بھیجیں تو انہیں ہار پہنائے (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے (مثلاً) امام شافعی، امام احمد، اسحٰق، ابوثور اور ابن حبیب اور امام مالک اور اصحاب الرائے نے اس کا انکار کیا ہے گویا انہیں بکریوں کو قلادہ پہنانے کی یہ حدیث نہیں پہنچی یا انہیں پہنچی تو ہے لیکن انہوں نے اس کو رد کر دیا کہ اسود، حضرت عائشہ سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ رہی گائے اگر تو اس کی کہان ہو تو اسے اونٹ کی طرح شعار کیا جائے گا یہ حضرت ابن عمر کا قول ہے اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: مطلقاً ہار پہنایا جائے گا اور اشعار کیا جائے گا انہوں نے کوئی فرق نہیں کیا۔ سعید بن جبیر نے کہا: اسے قلادہ پہنایا جائے گا اور شعار کیا جائے گا۔ یہ قول اصح ہے، کیونکہ اس کی کہان نہیں ہوتی، یہ اونٹ کی نسبت بکری کے زیادہ مشابہ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا اتفاق ہے کہ جس نے احرام کی نیت سے بدنہ کو قلادہ پہنایا اور اس کو چلایا تو وہ محرم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 230۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 425
ایضاً صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب تقلید الغنم، حدیث 1588-1586، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رِضۡوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا۔ احرام کا ذکر نہیں فرمایا لیکن جب تقلید کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ وہ احرام کے قائم مقام ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر ہدی کو بھیجا اور خود ہانک کر نہ لے گیا تو وہ محرم نہیں ہوگا، کیونکہ حضرت عائشہ کی حدیث ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایا کے ہار اپنے ہاتھوں سے تیار کیے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے انہیں وہ ہار پہنائے، پھر انہیں میرے باپ (ابوبکر) کے ساتھ انہیں بھیجا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز حرام نہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی تھی حتیٰ کہ ہدی کو نحر کیا گیا۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا (1)۔ یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور جمہور علماء کا مذہب ہے حضرت ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ہدی بھیجنے والا محرم ہو جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جس نے ہدی بھیجی اس پر وہ چیزیں حرام ہو جائیں گی جو حاجی پر حرام ہوتی ہیں حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا جائے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ یہ حضرت ابن عمر، عطا، مجاہد اور سعید بن جبیر کا مذہب ہے۔

خطابی نے اصحاب الرائے سے بھی یہ قول حکایت کیا ہے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اپنی قمیص کو گریبان سے پھاڑا پھر اسے ٹانگوں سے نکالا لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے ان بدنوں کو قلادہ پہنانے اور شعار کرنے کا فلاں جگہ پر حکم دیا تھا جنہیں میں نے حرم کی طرف بھیجا تھا اور اسی طرح میں نے قمیص پہنی ہوئی تھی اور میں بھول گیا تھا پس میں نے اپنے سر سے اس لیے قمیص کو نہیں نکالا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدنہ کو بھیجا تھا اور خود مدینہ میں ٹھہرے رہے تھے۔ اس حدیث کی سند میں عبدالرحمٰن بن عطا بن ابی لبیبۃ ہے وہ ضعیف ہے۔ اگر بکری کو قلادہ پہنایا اور اس کو حرم کی طرف بھیجا تو کوفیوں نے کہا: وہ محرم نہ ہوگا، کیونکہ مسنون نہیں ہے اور نہ شعائر میں سے ہے، کیونکہ اس پر بھیڑیا کا خوف ہے پس وہ حرم تک نہیں پہنچے گی بخلاف اونٹ کے اسے چھوڑ دیا جائے گا وہ خود پانی پر وارد ہوگا، درخت کھائے گا اور حرم تک پہنچ جائے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ ام المومنین سے مروی ہے فرمایا: میں نے اس اون سے ہار بٹے جو میرے پاس تھی (3)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝ (القارعہ)

**مسئلہ نمبر 7**۔ جب ہدی کو قلادہ پہنایا جائے یا اشعار کیا جائے تو اسے نہ بیچنا جائز ہے اور نہ ہبہ کرنا جائز ہے، کیونکہ وہ واجب ہو چکی ہے اگر اس کا واجب کرنے والا مر جائے تو وہ میراث میں شمار نہ ہوگی بلکہ وہ نافذ ہوگی بخلاف قربانی کے جانور کے وہ امام مالک کے نزدیک خاص ذبح کے ساتھ واجب ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ اپنے قول کے ساتھ واجب کر دے۔ اگر ذبح کے پہلے قول سے ساتھ واجب کر دیا اور کہا: جعلت هذه الشاة اضحية تو وہ متعین ہو جائے گی اور اس پر ذبح کرنا واجب ہو گا، اگر وہ گم ہو جائے پھر ایام ذبح میں اسے پالے یا اس کے بعد پالے اسے ذبح کرے اور اس کا بیچنا جائز نہیں، اگر کسی نے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المناسك، حدیث 1585، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 1590، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اپنی پہلی قربانی کے علاوہ قربانی خریدی تو امام احمد اور اسحاق کے قول میں دونوں کو ذبح کرے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر گم ہو جائے یا چوری ہو جائے تو اس پر بدل واجب نہیں، بدل واجب میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب گم ہو جائے تو وہ جائز ہو جائے گی۔ جو شخص دسویں ذی الحجہ کے دن قربانی کرنے سے پہلے مر جائے تو وہ وراثت میں جاری ہوگی، جیسا کہ دوسرا مال ہے بخلاف ہدی کے۔ امام احمد اور ابو ثور نے کہا: ہر حال میں اسے ذبح کیا جائے گا۔

امام اوزاعی نے فرمایا: اسے ذبح کیا جائے گا مگر یہ کہ اس پر اتنا قرضہ ہو کہ اس کو ادا کرنا ممکن نہ ہو مگر اسی قربانی سے تو اسے قرضہ میں بیچا جائے گا، اگر ذبح کرنے کے بعد مر جائے تو اس کی طرف سے اس میں وارثت جاری نہ ہوگی وہ اسے کھائیں یا صدقہ کریں جو چاہیں کریں اس کے گوشت کو بطور میراث تقسیم نہیں کریں گے۔ ذبح سے پہلے قربانی کو جو عیوب لاحق ہو جائیں تو مالک پر بدل ہوگا بخلاف ہدی کے۔ یہ امام مالک کے مذہب کی تحصیل ہے۔ بعض علماء نے کہا: ہدی میں مالک پر بدل ہوگا، پہلا قول زیادہ درست ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یعنی جو بیت اللہ کا قصد کرنے والے ہیں۔ یہ ان کے قول سے ہے: امیت کذا۔ میں نے اس کا قصد کیا، اعمش نے ولا آمی البیت الحرام یعنی اضافت کے ساتھ پڑھا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ۔ معنی یہ ہے کہ کفار کو نہ روکو جو تعبد اور قربت کی جہت سے بیت حرام کا قصد کرنے والے ہیں۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: ان آیات میں مشرک کو روکنے کی نہی ہے اور اس کی قلادہ کی وجہ سے حرمت کی رعایت ہے یا اس نے بیت اللہ کا قصد کیا ہے یہ تمام احکام آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (توبہ:28)

مشرک کو حج کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ اشہر حرم میں اسے امن دیا جائے گا اگرچہ اس نے ہدی بھیجی ہو، اسے قلادہ پہنایا ہوا اور حج کا ارادہ کیا ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ابن زید نے یہی فرمایا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ ایک قوم نے کہا: یہ آیت محکمہ ہے، یہ منسوخ نہیں ہے یہ مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ مسلمانوں میں جو بیت اللہ کا قصد کرنے والا ہو اسے ڈرایا جائے۔ یہ نہی شہر حرام اور دوسرے مہینوں میں عام ہے، لیکن شہر حرام کا ذکر تعظیماً اور تفصیلاً فرمایا۔ یہ عطا کے قول پر چلتا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ کے معالم کو حلال نہ سمجھو۔ اس سے اللہ کا امر اور اس کی نہی ہے جو اس نے لوگوں کو بتایا اسے حلال نہ سمجھو۔ اسی وجہ سے ابو میسرہ نے کہا: یہ آیت محکمۃ ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے منسوخ نہیں ہے مگر صرف القلائد۔ کوئی شخص حرم کے درخت کے چھلکے سے قلادہ پہناتا تھا تو وہ قربت حاصل نہیں کرتا تھا پس اس کو منسوخ کیا گیا۔ ابن جریج نے کہا: یہ آیت اس بات سے نہی ہے کہ حاجیوں سے سامان نہ چھینا جائے (1)۔

ابن زید نے کہا: یہ آیت فتح مکہ کے سال نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے، مشرکین حج اور عمرہ کرنے کے لیے آئے تو مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ان مشرکین کو ہم نہیں چھوڑیں گے، ہم ان پر حملہ کریں گے تو قرآن

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 147

نازل ہوا: وَ لَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ۔(1) بعض علماء نے فرمایا: یہ شریح بن ضبیعہ البکری کے معاملہ کے لیے تھا اسے الحطم سے لقب دیا جاتا تھا اسے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر نے پکڑ لیا جب کہ وہ عمرہ میں تھا تو یہ آیت نازل ہوئی، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ حطم مرتد ہو گیا تھا اور مرتد ہو کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کی خبر سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ میں آیا اور اس نے مدینہ سے باہر اپنے گھوڑے پیچھے چھوڑ آیا، اس نے کہا: تم کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دینا، نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا''۔ اس نے کہا: اچھا ہے مگر میرے کچھ امراء ہیں ان کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، شاید میں اسلام قبول کروں اور انہیں آپ کے پاس لے آؤں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو کہا تھا: تم پر ایک آدمی داخل ہوگا جو شیطان کی زبان بولے گا پھر وہ آپ کے پاس سے نکلا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کافر چہرہ کے ساتھ داخل ہوا اور غادر گدی کے ساتھ باہر نکلا وہ شخص مسلمان نہیں ہے''۔ وہ حطم شخص مدینہ طیبہ کی چراگاہ سے گزرا تو چوپائے ہانک کر لے گیا، صحابہ کرام نے اسے تلاش کیا تو وہ عاجز آ گئے وہ یہ کہتے ہوئے نکلا:

قد لفّها الليل بسوّاقٍ حُطَم　　ليس براعي إبلٍ ولا غَنَمْ

ولا بجزّارٍ على ظهر وَضَمْ　　باتُوا نياما وابن هندٍ لم ينَمْ

بات يقاسيها غلام كالزُّلَمْ　　خَدَلَّج الساقين خَفّاق القَدَمْ

جب عام القضیہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپ نے یمامہ کے حجاج کا تلبیہ سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ حطم اور اس کے ساتھی ہیں اس نے جو مدینہ طیبہ سے جانور لوٹے تھے اس نے انہیں ہار پہنا دیئے تھے اور مکہ کی طرف بھیجا تھا، صحابہ کرام اس کی طلب میں نکلے تو یہ آیت نازل ہوئی ان کو حلال نہ سمجھو الله کے لیے اشعار کیا گیا ہے اگرچہ وہ مشرک ہی ہوں۔ یہ حضرت ابن عباس نے ذکر کیا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس بنا پر کہ یہ آیت محکمۃ ہے الله تعالیٰ کا ارشاد: لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ۔ امور مناسک کو مکمل کرنے کا تقاضا کرتا ہے اسی وجہ سے علماء نے فرمایا: آدمی جب حج میں داخل ہو پھر اسے فاسد کر دے تو اس پر افعال حج ادا کرنا لازم ہے اور اس میں سے کسی فعل کا ترک جائز نہیں اگرچہ اس کا حج فاسد ہو چکا ہے پھر آئندہ سال اس پر اس حج کی قضا لازم ہے، ابو اللیث سمرقندی نے کہا الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ، منسوخ ہے الله تعالیٰ کے اس قول سے: قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (توبہ:36) اور الله تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ (المائدہ:2) محکم منسوخ نہیں ہے، پس جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا اور احرام کی نیت کی تو وہ محرم ہو گیا اس کے لیے اس آیت کی دلیل کے ساتھ احرام باندھنا جائز نہیں۔ یہ احکام ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ بعض منسوخ ہیں اور بعض غیر منسوخ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا۔ جمہور علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ تجارت میں نفع اور فضل تلاش کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اپنے ظن اور امید میں الله تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں۔ بعض

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 147　　2۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 181

علماء نے فرمایا: ان میں بعض تجارت طلب کرتے تھے، بعض حج کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے تھے اگرچہ وہ اس کو پا نہیں سکتے تھے اور عربوں میں سے کچھ مرنے کے بعد جزا کا عقیدہ رکھتے تھے اور مرنے کے بعد اٹھنے کا نظریہ رکھتے تھے، کوئی بعید نہیں کہ انہیں آگ میں تخفیف حاصل ہو۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف عربوں کے لیے الفت کا اظہار ہے اور ان پر مہربانی کا مظاہرہ ہے تاکہ ان کے نفوس خوش ہوں اور لوگ دین میں داخل ہوں اور حج کے موقع پر آئیں قرآن کو سنیں اور ان کے دلوں میں ایمان داخل ہو اور ان کے پاس وہ حجت قائم ہو جائے جیسی کہ وہ تھی یہ آیت فتح مکہ کے سال نازل ہوئی، پھر اس آیت کو سن 9 ہجری کے بعد منسوخ کر دیا جب حضرت ابوبکر نے حج کیا تھا اور سورۂ برأت کا لوگوں میں اعلان کیا گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا یہ امر اباحت کے لیے ہے، اس پر علماء کا اجماع ہے احرام کی وجہ سے شکار حرام تھا اس حرمت کو اٹھایا گیا ہے۔ اکثر علماء نے یہ بیان کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ افعل کا صیغہ جو منع کے بعد وارد ہوتا ہے وہ اپنی اصل یعنی وجوب کے لیے وارد ہوتا ہے یہ قاضی ابو الطیب وغیرہ کا مذہب ہے، کیونکہ وجوب کا مقتضا قائم ہے اور منع پہلے گزر چکا ہے جو مانع کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ (توبہ: 5) یہ افعل کا صیغہ وجوب کے لیے ہے اس سے مراد جہاد ہے یہاں اور اس کی مثل اباحت جو سمجھی گئی ہے مثلاً فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا (الجمعہ: 10) فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ (بقرہ: 222) یہ معنی اجماع کی وجہ سے ہے نہ کہ امر کے صیغہ کے اعتبار سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی تمہیں کسی قوم کی دشمنی نہ ابھارے۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے اور یہ کسائی اور ابو العباس کا قول ہے یہ دونوں مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے (1)، کہا جاتا ہے: جرمنی کذا علی بغضك یعنی حملنی علیہ۔

شاعر نے کہا:

ولقد طَعَنْتَ اباعُیَیْنَةَ طَعْنَةً جَرَمَت فَزَارَةَ بَعْدَهَا أن یَغْضَبُوا (2)

اخفش نے کہا: اس کا معنی ہے لا یُحِقَّنَّکم تمہیں کینہ اور بغض میں مبتلا نہ کرے۔ ابو عبیدہ اور فراء نے کہا: لا یجرمنکم کا معنی ہے تمہیں کسی قوم کا بغض حق سے باطل کی طرف تجاوز کرنے تک نہ پہنچائے اور عدل سے ظلم کی طرف نہ پہنچائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تجھے امین بنائے اس کی امانت ادا کر اور جو تجھ سے خیانت کرے اس سے خیانت نہ کر''۔ اس کے متعلق کلام گزر چکا ہے اس آیت کی مثال یہ ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ (بقرہ: 194) اس پر تفصیلی کلام گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان جریمة اهله یعنی فلاں ان کا کمانے والا ہے۔ الجریمة اور الجارم کا معنی کمانے والا ہے۔ اجرم فلان کا معنی ہے فلاں نے گناہ کیا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

جَرِیمَةُ نَاهِضٍ فِی رَأْسِ نِیقٍ (3) تَرَى لعظامِ ما جَمَعَتْ صَلِیبَا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 148 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 149 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 148

اس کا معنی ہے خوراک کمانے والا۔ الصلیب سے مراد چربی ہے یہ اصل ہے ج، را اور میم کی بنا میں۔ ابن الفارس نے کہا: جرم، اجرم اور ولا جرم یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہے لا بدّ ولا محالۃ اس کی اصل جرم سے ہے جس کا معنی ہے کھانا۔ شاعر نے کہا:　　جَرَمَتْ فَزَارَةَ بعدها أن يَغْضَبُوا

ایک اور شاعر نے کہا:

يأيها المشتكِي عُكْلًا وما جَرَمَتْ　　إلَى القبائِلِ من قَتْلٍ و إِبَاسِ

کہا جاتا ہے: جرم، یجرم جرماً اس کا معنی ہے کاٹنا، الرمانی علی بن عیسیٰ نے کہا: یہ اصل ہے پس جرم کا معنی ہے کسی چیز پر ابھارنا تا کہ اسے دوسرے سے جدا کر دے اور جرم بمعنی کسب اس لیے ہے، کیونکہ وہ اسے سب کی طرف منقطع کر دیتا ہے جرم بمعنی حق بھی ہے، کیونکہ حق اس پر قطعی ہو جاتا ہے۔ خلیل نے کہا: لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ (1) (النحل:62) کا معنی ہے ان کے لیے عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ کسائی نے کہا: جرم اور اجرم دونوں لغتوں کا ایک معنی ہے یعنی اکتسب۔

حضرت ابن مسعود نے یجرمنکم یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کا معنی ہے وہ تمہیں اکسائے نہیں۔ بصری علماء یا کے ضمہ کو نہیں جانتے وہ کہتے ہیں: جرم لا غیر، الشنان کا معنی بغض ہے نون کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: شنئت الرجل اشنئوۃ شنئا و شناۃ و شنآنا و شنآنا، نون کے جزم کے ساتھ سب کا معنی ہے ناراض ہونا۔ یعنی کسی قوم کا بغض تمہیں حق سے تجاوز کرنے پر نہ اکسائے۔ اس سے مراد بغضکم قوماً ہے۔ مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: جب مسلمانوں کو حدیبیہ کے سال بیت اللہ سے روکا گیا تو مسلمانوں کے پاس سے کچھ مشرک گزرے جو عمرہ کرنا چاہتے تھے، مسلمانوں نے کہا: ہم انہیں روکیں گے جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو روکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی یعنی ان پر تجاوز نہ کرو اور انہیں نہ روکو۔

اَنْ صَدُّوْكُمْ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مفعول لاجلہ ہے یعنی لان صدّوکم۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے إن صدّوکم یہ ابو عبید کا مختار ہے۔ اعمش سے مروی ہے ان یصدّوکم۔ ابن عطیہ نے کہا: فان جزا کے لیے ہے یعنی اگر اس فعل کی مثل مستقبل میں واقع ہو۔ پہلی قرأت معنی کے اعتبار سے بہتر ہے۔ نحاس نے کہا ان صدوکم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو علماء نحو اور محدثین اس قرأت سے منع کرتے ہیں اس کی کئی وجوہ ہیں (1) یہ آیت فتح مکہ کے سال 8 ہجری کو نازل ہوئی جب کہ مشرکوں نے مسلمانوں کو چھ ہجری میں حدیبیہ کے سال روکا تھا پس روکنا آیت سے پہلے تھا جب ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا مگر اس کے بعد جیسے تو کہتا ہے: لا تعط فلاناً شیئا ان قاتلك اور یہ نہیں ہو سکتا مگر مستقبل میں اور اگر آپ ہمزہ کو فتحہ دیں گے تو یہ ماضی کے لیے ہوگا پس اس بنا پر جائز نہ ہوگا مگر اَنْ صَدُّوْكُمْ اگر یہ حدیث صحیح نہ بھی ہوتی تو بھی فتحہ واجب ہوتا، کیونکہ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ ...... الخ۔ دلیل ہے کہ مکہ ان کے قبضہ میں تھا وہ اس سے نہیں روک سکتے تھے مگر جب کہ وہ بیت اللہ سے روکنے پر قادر تھے اس وجہ سے بھی فتحہ واجب ہے، کیونکہ یہ ماضی کے لیے ہے۔ اَنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 148، دار الکتب العلمیہ بیروت

تَعْتَدُوْا محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ مفعول بہ ہے یعنی تمہیں کسی قوم کی دشمنی حد سے بڑھنے پر نہ اکسائے۔ ابو حاتم اور ابو عبید نے شنئان کو نون کے اسکان کے ساتھ پڑھنے کا انکار کیا ہے، کیونکہ اس کی مثل مصادر متحرک ہوتے ہیں۔ دوسرے علماء نے ان کی مخالفت کی ہے۔ فرمایا: یہ مصدر نہیں ہے، لیکن یہ کسلان اور غضبان کے وزن پر اسم فاعل ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى۔ اخفش نے کہا: یہ پہلی کلام سے علیحدہ ہے یہ تمام مخلوق کو نیکی اور تقویٰ پر تعاون کا حکم ہے یعنی تمہیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس پر گفتگو کرو اس کے مطابق عمل کرو اور اس سے رک جاؤ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور اس سے بچو۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث کے موافق ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیکی پر راہنمائی کرنے والا نیکی کرنے والے کی طرح ہے'' (1)۔ کہا جاتا ہے کہ برائی پر راہنمائی کرنے والا برائی کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر بعض علماء نے فرمایا: البر اور التقوی دونوں ہم معنی ہیں تاکید اور مبالغہ کے لیے لفظ کے اختلاف کے ساتھ مکرر فرمایا، کیونکہ ہر نیکی تقویٰ ہے اور ہر تقوی نیکی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کچھ تسامح ہے ان دو لفظوں کی دلالت میں عرف یہ ہے کہ البر واجب اور مندوب سب کو شامل ہے التقوی واجب کی رعایت ہے۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ مجازاً ہوتا ہے۔ ماوردی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نیکی پر تعاون کرنے کی دعوت دی ہے اور تقویٰ کو اس کے ساتھ ملایا، کیونکہ تقویٰ میں اللہ کی رضا ہے اور نیکی میں لوگوں کی رضا ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ اور لوگوں کی رضا کو جمع کیا اس کی سعادت مکمل ہوئی اور اس کی نعمت عام ہوئی۔

ابن خویز منداد نے احکام میں کہا: نیکی اور تقویٰ پر تعاون کئی وجوہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ عالم پر واجب ہے کہ وہ اپنے علم کے ساتھ لوگوں کی مدد کرے اور انہیں تعلیم دے۔ غنی اپنے مال کے ساتھ لوگوں کی مدد کرے۔ شجاع اپنی شجاعت کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کرے، مسلمان ایک دوسرے کے معاون ہوں جس طرح ایک ہاتھ ہوتا ہے۔ ''مومنوں کے خون برابر ہیں ان کے ادنی کے امان کا خیال رکھا جائے گا دوسرے لوگوں پر ان کا غلبہ ہے'' (2)۔ حد سے تجاوز کرنے والے سے اعراض کرنا اور اس کی مدد نہ کرنا واجب ہے اور جس غلط روش پر ظالم ہے اس سے اسے پھیرنا واجب ہے۔ پھر منع فرمایا: وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ، الْاِثْمِ سے مراد وہ حکم ہے جو جرائم کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے اور الْعُدْوَانِ سے مراد لوگوں پر ظلم کرنا ہے پھر تقوی کا حکم دیا اور مجملاً دھمکی دی فرمایا: وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۔

**حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا**

1۔ کنز العمال، کتاب الاحادیث والاقوال، جلد 6، صفحہ 359، حدیث نمبر 16052

2۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الدیات، جلد 1، صفحہ 197۔ ایضاً، حدیث نمبر 2672-2673، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

''حرام کیے گئے ہیں تم پر مردار، خون، سور کا گوشت اور جس پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام لیا جائے اور گلا گھونٹنے سے مرا ہوا، چوٹ سے مرا ہوا، اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا، سینگ لگنے سے مرا ہوا اور جسے کھایا ہو کسی درندے نے سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور (حرام ہے) جو ذبح کیا گیا ہو تھانوں پر اور (یہ بھی حرام ہے) کہ تم تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ سب نافرمانی کے کام ہیں۔ آج مایوس ہو گئے ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا تمہارے دین سے سو نہ ڈرو تم ان سے اور ڈرو مجھ سے آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پس جو لاچار ہو جائے بھوک میں درآں حالیکہ نہ جھکنے والا ہو گناہ کی طرف تو یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں چھبیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَلْمُنْخَنِقَةُ وہ جانور جو دم گھٹنے سے مر جائے۔ خنق کا معنی ہے دم گھٹنا خواہ اس کے ساتھ عمل کسی آدمی نے کیا ہو یا اس کے لیے عمل کسی پہاڑ میں ہوا ہو یا دو لکڑیوں کے درمیان ہوا ہو وغیرہ۔ قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بکری وغیرہ کا گلہ دباتے تھے جب وہ مر جاتی تھی تو اسے کھاتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمَوْقُوْذَةُ وہ جانور جسے پتھر اور ڈنڈے سے مارا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ بغیر ذبح کے مر جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن، قتادہ، ضحاک اور سدی سے مروی ہے، کہا جاتا ہے: وقذہ یقذہ وقذا وھو وقیذ۔ الوقذ کا معنی زور سے مارنا ہے فلان وقیذ سخت ضرب لگانے والا۔ قتادہ نے کہا: زمانہ جاہلیت کے لوگ ایسا کرتے تھے اور پھر اس جانور کو کھاتے تھے۔ اس سے مراد وہ مقتول جانور ہے جو غلیل سے مارا جائے۔ فرزدق نے کہا:

شَغَّارَة تَقِذ الفصيل برجلها فَطَّارَةٌ لِقَوادِمِ الأَبْكَارِ (1)

صحیح مسلم میں عدی بن حاتم سے مروی ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں معراض تیر کے ساتھ شکار کرتا ہوں وہ شکار کو لگ جاتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تو معراض تیر پھینکے اور وہ اسے چیر دے (اور خون بہا دے) تو اسے کھا اور اگر وہ تیر عرضاً لگے (اسے چیرے نہیں صرف اسے چوٹ دے) تو اسے نہ کھا'' (2)۔ ایک روایت میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 151

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 145

ہے فرمایا ''وہ وقیذ ہے'' ابوعمر نے فرمایا: غلیل، پتھر اور معراض تیر سے شکار کیے ہوئے جانور کے بارے میں علماء قدیم و جدید کا اختلاف ہے پس جن کا خیال ہے کہ وہ وقیذ ہے اس کا کھانا جائز نہیں مگر جب اس کو ذبح کیا جائے جیسا کہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ یہی امام مالک، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب، ثوری اور امام شافعی کا قول ہے۔ شامی علماء نے اس میں ان علماء کی مخالفت کی ہے۔ اوزاعی نے معراض تیر کے بارے میں کہا: اس کو کھاؤ خواہ اسے چیرے یا نہ چیرے۔

حضرت ابوالدرداء، حضرت فضالہ بن عبید، حضرت عبداللہ بن عمر اور مکحول اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے۔ ابوعمر نے کہا: اوزاعی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اسی طرح ذکر کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر سے معروف وہ ہے جو امام مالک نے نافع سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے۔ اس باب میں اصل، جس پر عمل ہے اور اس میں جو حجت ہے جس نے اس کو اختیار کیا ہے وہ عدی بن حاتم کی حدیث ہے اس میں ہے ''جو معراض عرضاً لگے اسے نہ کھا وہ وقیذ (چوٹ سے مرنے والا) ہے''۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُتَرَدِّيَةُ وہ جانور جو اوپر سے نیچے کی طرف گر کر مر جائے، خواہ وہ پہاڑ سے گرے یا کنویں وغیرہ میں مرے یہ الردی سے متفعلۃ کے وزن پر ہے جس کا معنی ہلاکت ہے خواہ وہ خود گرا ہو یا کسی دوسرے نے اسے گرایا ہو۔ جب تیر شکار کو لگے اور وہ پہاڑ سے زمین کی طرف گرے تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ ٹکرانے یا گرنے سے مرا ہے نہ کہ تیر سے مرا ہے۔ اسی سے حدیث ہے ''اگر تو اسے پانی میں غرق پائے تو اسے نہ کھا، کیونکہ تجھے معلوم نہیں پانی نے اسے قتل کیا ہے یا تیرے تیر نے اسے قتل کیا ہے'' (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں گر کر مرنے والے جانور کو کھایا جاتا تھا وہ مردہ تصور نہیں کیا جاتا تھا مگر جو تکلیف وغیرہ سے مرتا تھا جس کا سبب معلوم نہ ہوتا تھا۔ رہے یہ اسباب تو یہ ان لوگوں کے نزدیک ذبح کی طرح تھا شرع شریف نے ذبح کو مخصوص صفت پر محصور کر دیا مزید بیان آگے آئے گا اور یہ تمام مردار شمار کیے گئے یہ تمام محکم متفق علیہ سے ہے اسی طرح جو سینگ لگنے سے مرا ہو اور درندے کے کھانے سے مرا ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالنَّطِيحَةُ، فعيلةٌ بمعنی مفعولہ ہے یہ وہ بکری ہے جسے دوسری بکری نے سینگ مارا ہو یا کسی اور چیز نے مارا ہو پھر وہ ذبح کرنے سے پہلے مر گئی ہو۔ ایک قوم نے النَّطِيحَةُ سے مراد الناطحہ (سینگ مارنے والا) لیا ہے کیونکہ دونوں بکریاں ایک دوسرے کو سینگ مارتی ہیں پھر دونوں مر جاتی ہیں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: نطیحۃ۔ فرمایا: نطیح نہیں فرمایا: فعیل کا حق یہ ہے کہ اس میں ہا ذکر نہیں کی جاتی جیسے کہا جاتا ہے: کف خضیب ولحیۃ دھین (خضاب شدہ ہتھیلی اور تیل لگی ہوئی داڑھی) لیکن یہاں ہا کو ذکر فرمایا، کیونکہ ہا کو اس فعیلۃ سے حذف کیا جاتا جب وہ منطوق موصوف کی صفت ہو۔ کہا جاتا ہے: شاۃ نطیح وامرأۃ قتیل اگر موصوف ذکر نہ ہو تو ہا قائم ہوتی ہے۔ تو کہتا ہے: رایت قتیلۃ بنی فلان وھذہ نطیحۃ الغنم۔ کیونکہ اگر تو ہا کو ذکر نہیں کرے گا تو تو کہے گا: رایت قتیل بنی فلان، معلوم نہیں ہوگا کہ وہ مرد ہے یا عورت ہے۔ ابومیسرہ نے المنطوحۃ پڑھا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 146۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الصید اذا غاب عنہ یومین او ثلاثۃ، حدیث 5062، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 151

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اس سے مراد وہ جانور ہے جسے کچلیوں والے اور ناخنوں والے درندے نے چیرا پھاڑا ہو جیسے شیر، چیتا، لومڑ، بجو وغیرہ، یہ تمام درندے ہیں کہا جاتا ہے: سبع فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو اپنے دانتوں کے ساتھ کاٹا۔ سبعہ یعنی اس نے اسے عیب لگایا اور وہ عیب میں واقع ہوا۔ اس کلام میں اضمار ہے یعنی وہ جانور جس سے درندے نے کھایا ہو، کیونکہ جس کو درندے نے کھایا وہ فنا ہو گیا۔ کچھ عرب صرف السبع کا اطلاق شیر پر کرتے ہیں، عرب جب درندہ بکری پکڑ لیتا پھر وہ اس سے بچ جاتی تو اسے کھاتے تھے، اسی طرح اگر وہ اس کا بعض حصہ کھالیتا تو بقیہ عرب کھا لیتے تھے یہ قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔ حسن اور ابو حیوہ نے السبع با کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اہل نجد کی لغت ہے حضرت حسان نے عتبہ بن ابی لہب کے بارے میں کہا:

مَن يَرجع العامَ الى أهله فما أكِيلُ السَّبْع بالرّاجِع

حضرت ابن مسعود نے وأكِيلَةُ السَّبُعِ پڑھا ہے۔ عبد اللہ بن عباس نے وأكِيل السَّبُع (1) پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ جمہور علماء اور فقہاء کے نزدیک مستثنیٰ متصل کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ مذکورہ تمام جانوروں کی طرف راجع ہے جس کو ذبح کر دیا گیا ہو جب کہ اس میں ابھی زندگی ہو۔ کیونکہ اس میں ذبح عامل ہو گی، کیونکہ استثنا کا حق یہ ہے کہ وہ متقدم کلام کی طرف پھیری گئی ہو اور مستثنیٰ کو منقطع نہیں بنایا جاتا مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو واجب التسلیم ہو۔ ابن عیینہ شریک اور جریر نے رکین بن ربیع سے انہوں نے ابو طلحہ اسدی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس سے اس بھیڑیے کے متعلق پوچھا جس نے بکری پر حملہ کیا پھر اس کے پیٹ کو چیر دیا حتیٰ کہ اس کی انتڑیاں باہر آ گئیں پھر اس کی ذبح کو میں نے پالیا اور میں نے اسے ذبح کر دیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: اسے کھاؤ اور اس کے پیٹ میں سے جو باہر آ گیا ہے وہ نہ کھا۔

اسحٰق بن راہویہ نے کہا: بکری میں سنت وہی ہے جو حضرت ابن عباس نے بیان کی ہے اگر بکری کے پیٹ کا مواد باہر آ جائے اور وہ ابھی تک زندہ ہے اور ذبح کی جگہ سلامت ہے تو ذبح کے وقت دیکھا جائے گا کہ کیا وہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ فعل کی طرف نہیں دیکھا جائے گا کہ کیا اس کی مثل زندہ ہوتی ہے؟ اسی طرح مریضہ کا حکم ہے۔ اسحاق نے کہا: جس نے اس کی مخالفت کی اس نے جمہور صحابہ اور عامۃ العلماء کی سنت کی مخالفت کی۔

میں کہتا ہوں: ابن حبیب کا بھی یہی نظریہ ہے اور اصحاب مالک سے یہ ذکر کیا جاتا ہے اور یہی ابن وہب کا قول ہے اور امام شافعی کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ مزنی نے کہا: میں امام شافعی کے لیے ایک اور قول بھی یاد کرتا ہوں: اسے نہیں کھایا جائے گا جب درندہ یا اس کا گرنا اسے اس حد تک پہنچا دے کہ ایسے جانور کی حیات نہیں ہوتی۔ یہ مدنی علماء کا قول ہے اور امام مالک کا مشہور قول وہ ہے جو عبد الوہاب نے اپنی تلقین میں ذکر کیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے اسے امام مالک نے موطا میں ذکر کیا ہے۔ اسماعیل قاضی اور بغدادی مالکیوں کی جماعت کا یہی نظریہ ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 151

اس قول کی بنا پر استثنا منقطع ہے یعنی تم پر یہ اشیاء حرام کی گئی ہیں لیکن جس کو تم ذبح کر دو وہ حرام نہیں۔ ابن عربی نے کہا: ان اشیاء کے بارے امام مالک کا قول مختلف ہے ان سے مروی ہے ایسے جانور کو نہیں کھایا جائے گا مگر جو صحیح طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو اور جو مؤطا میں ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس نے اسے ذبح کیا جب کہ اس کا سانس جاری رہا جب کہ وہ حرکت کر رہی تھی تو اسے کھایا جائے گا۔ یہ امام مالک کا صحیح قول ہے۔ وہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور ان کی زندگی میں ہر شہر میں لوگوں پر پڑھا جاتا رہا۔ یہ نادر روایات سے اولیٰ ہے۔ مریض جانور پر مطلق ذبح کے جواز کا مذہب ہے اگر وہ موت کے قریب ہو جب کہ اس میں زندگی باقی ہو۔ ہائے میرا شعور مریض جانور کی زندگی کی بقا میں اور درندے کے کھائے ہوئے کی زندگی کی بقا میں کون سا فرق ہے۔ کاش نظر مناسب ہوتی اور شبہ سے فکر سلامت ہوتی۔ ابوعمر نے کہا: اس مریض جانور میں علماء کا اجماع ہے جس کی زندگی کی امید نہ ہو کہ اس کو ذبح کرنا اس کی ذکاۃ ہے جب کہ اس میں زندگی ہو جب اسے ذبح کر رہا ہو اور اس سے اس کے ہاتھوں کا یا پاؤں کا یا دم وغیرہ کا حرکت کرنا اس کی زندگی کی علامت ذکر کی ہے علماء کا اجماع ہے کہ جب وہ جانور حالت نزع میں ہو اور نہ اس کا ہاتھ حرکت کرے اور نہ پاؤں حرکت کرے تو اس میں ذکاۃ نہیں ہے اسی طرح قیاس کا تقاضا میں متردیہ کا حکم ہے اور جو اس آیت میں اس کے ساتھ دوسرے جانور ذکر کیے گئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذَكَّيْتُمْ کلام عرب میں ذکاۃ کا معنی ذبح ہے، یہ قطرب کا قول ہے۔ ابن سیدہ نے "المحکم" میں کہا: عرب کہتے ہیں "جنین (مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہوتا ہے) کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ ہے" (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حدیث ہے حیوان کی ذکاۃ اس کا ذبح کرنا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

یذکیھا الاسل　　　نیزے اور تیر اسے ذبح کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: وہ حدیث جس کی طرف ابن عطیہ نے اشارہ کیا ہے اسے دارقطنی نے حضرت ابوسعید، حضرت ابوہریرہ، حضرت علی اور حضرت عبداللہ کی حدیث سے روایت کیا ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا: زکاۃ الجنین ذکاۃ امہ۔ یعنی جنین کی ذبح اس کی ماں کی ذبح (سے) ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت یہی کہتی ہے مگر امام ابوحنیفہ سے مروی ہے فرمایا: جب جنین اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ نکلے تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے، کیونکہ ایک نفس کی ذبح دو نفسوں کی ذبح نہیں ہوتی۔ ابن المنذر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ میں دلیل ہے کہ جنین ماں کے علاوہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر حاملہ لونڈی آزاد کی گئی تو اس کی آزادی اس کی ماں کی آزادی (سے) ہے یہ اس کو لازم ہے کہ اس کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ (سے) ہے، کیونکہ جب ایک کی آزادی کے ساتھ دو کی آزادی جائز ہے تو ایک کی ذکاۃ کے ساتھ دو کی ذکاۃ بھی جائز ہے۔ خبر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور جو صحابہ سے مروی ہے اور جس پر بڑے بڑے علماء کا مذہب ہے وہ ہر قول سے مستغنی کر دیتا ہے۔

اہل علم کا اجماع ہے کہ جنین جب زندہ نکلے تو اس کی ماں کی ذکاۃ اس کی ذکاۃ نہیں ہے۔ اور اس میں علماء کا اختلاف ہے

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصید، جلد 1، صفحہ 178

کہ جب ماں کو ذبح کیا گیا ہو اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو۔ تو امام مالک اور تمام ان کے اصحاب نے کہا: اس کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ ہے جب کہ اس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو اور اس کے بال نکل آئے ہوں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ مردہ نکلے یا اس حالت میں نکلے کہ اس میں زندگی کی کچھ رمق باقی ہو مگر مستحب ہے کہ اسے ذبح کیا جائے اگر وہ نکلے تو حرکت کر رہا ہو، اگر وہ پہلے خود ہی مر جائے تو اسے کھایا جائے گا۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے ایک بھیڑ قربانی دی جب میں نے اسے ذبح کیا تو اس کا بچہ اس کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا: اسے چھوڑ دو حتی کہ وہ بچہ اس کے پیٹ میں مر جائے پھر میں نے انہیں کہا کہ اس کا پیٹ چاک کرو اس کے پیٹ سے بچہ نکالا گیا میں نے اسے ذبح کیا اور اس سے خون بہہ نکلا میں نے اپنے گھر والوں کو اسے بھوننے کا حکم دیا۔ حضرت عبد اللہ بن کعب بن مالک نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کہتے تھے: جب جنین کے بال نکل آئیں تو اس کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ سے ہے۔ ابن المنذر نے کہا: جن علماء نے کہا کہ اس کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ ہے انہوں نے بال نکلنے یا نہ نکلنے کا ذکر نہیں کیا۔ ان علماء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق ہیں۔ قاضی ابو الولید الباجی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ذکاۃ الجنین ذکاۃ امه اشعر ولم یشعر جنین کی ذبح اس کی ماں کی ذبح (سے) ہے خواہ اس کے بال نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام مالک کا مذہب جو اقوال میں سے صحیح ہے وہ ہے جس پر فقہاء امصار کا نظریہ ہے۔ وباللہ التوفیق

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذَكَّيْتُمْ الذکاۃ کا لغوی معنی التمام ہے اس سے تمام السن۔ الفرس المذکی وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کے دانت مکمل ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ قوت کا مکمل ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: ذکی یذکی عرب کہتے ہیں جری المذکیات غلاب۔ کامل گھوڑوں کا چلنا غالب ہوتا ہے۔ ذکاء دل کی حدت کو کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

یُفَضِّلُه إذا اجتهدوا علیه تَمَامُ السِّنِّ منه والذَّكَاءُ

ذکاء، سرعت فطنت کو کہتے ہیں اس سے فعل ذکی یذکی ذکاء والذکوۃ جس کے ساتھ آگ جلائی جاتی ہے۔ اذکیت الحرب والنار میں نے جنگ اور آگ کو بھڑکایا۔ ذکاء سورج کا نام بھی ہے، کیونکہ یہ بھی آگ کی طرح جلاتا ہے۔ الصبح ابن ذکاء۔ صبح سورج کا بیٹا ہے۔ کیونکہ یہ سورج کی روشنی سے ہوتی ہے۔ ذَكَّيْتُمْ کا معنی ہے میں نے اس کی ذبح کو مکمل پایا۔ ذکیت الذبیحۃ اذکیھا۔ یہ پاک کرنے کے معنی سے مشتق ہے۔ کہا جاتا ہے رائحۃ ذکیۃ حیوان جب اس کا خون بہایا جاتا ہے تو وہ پاک ہو جاتا ہے تخفیف اس میں جلدی جاری ہوتی ہے۔ محمد بن علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ ذکاۃ الارض یبسھا، (1) زمین کی طہارت اس کا خشک ہونا ہے۔ اس سے مراد نجاست سے طہارت ہے پس ذبیحہ میں ذکاۃ اس کو پاک کرنا ہے اور اس لیے کھانے کے لیے مباح کرنا ہے زمین کے خشک ہونے کو نجاست کے بعد اس کے لیے طہارت بنایا ہے اور اس میں نماز مباح کرنا، ذبیحہ کی ذکاۃ کے قائم مقام ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لو کہ ذکاۃ شرع میں خون کا بہانا ہے اور مذبوح کی رگوں کو کاٹنا ہے۔ منحور میں نحر ہے اور جس پر قدرت نہ ہو اس میں زخمی کرنا ہے جب کہ

1۔ اخرجہ ابن ابی شیبہ، جلد 1 صفحہ 57

اللہ تعالیٰ کے قصد کی نیت متصل ہو اور اس پر اللہ کا ذکر مقرون ہو۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جس چیز کے ساتھ ذبح کیا جائے گا اس میں علماء کا اختلاف ہے جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو رگوں کو کاٹ دے اور خون بہادے وہ ذکاۃ کے آلات میں سے ہے سوائے دانت اور ہڈی کے۔ اس پر آثار متواتر ہیں یہی فقہاء امصار کا نظریہ ہے، دانت اور ناخن سے ذبح کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد ایسا دانت اور ناخن ہے جو جسم سے علیحدہ نہ کیا گیا ہو، کیونکہ ان سے ذبح کرنا خنق (گلا دبا کر مارنا) میں شمار ہوگا اسی طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ یہ خنق ہے مگر جو دانت اور ناخن جسم سے علیحدہ کیے گئے ہوں جب وہ رگوں کو کاٹ دیں تو اس کے ساتھ ذبح جائز ہے۔ ایک قوم نے دانت، ناخن اور ہڈی سے ہر حال میں ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے خواہ وہ جسم سے علیحدہ کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں ان میں سے ابراہیم، حسن اور لیث بن سعد ہیں۔ امام شافعی سے مروی ہے اور ان کی حجت ظاہر حضرت رافع بن خدیج کی حدیث ہے فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کل دشمن سے ملیں گے اور ہمارے پاس چھریاں نہیں ہوں گی (1)۔ ایک روایت میں ہے ہم سرکنڈے کے چھلکے کے ساتھ ذبح کر سکتے ہیں (2)؟ موطا امام مالک میں نافع عن رجل من الانصار عن معاذ بن سعد او سعد بن معاذ سے مروی ہے کہ حضرت کعب بن مالک کی لونڈی سلع پہاڑ پر بکریاں چرا رہی تھی ان میں سے ایک بکری مرنے لگی اس لونڈی نے اسے پکڑا اور پتھر کے ساتھ ذبح کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں اور اسے کھاؤ (3)'' اور مصنف ابی داؤد میں ہے: کیا ہم پتھر کے ساتھ اور لاٹھی کی ایک طرف کے ساتھ ذبح کر دیں (4)؟ فرمایا: جلدی کرو جو خون بہادے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو اور کھاؤ۔ لیکن دانت اور ناخن سے ذبح نہ ہو میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں دانت، ہڈی ہے اور ناخن، حبشیوں کی چھری ہے'' (5)۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے فرمایا: جو سرکنڈے کے چھلکے، لکڑی کے چھلکے اور پتھر کے ٹکڑے سے ذبح کیا گیا ہو وہ حلال اور پاک ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ امام مالک اور ایک جماعت نے کہا: ذکاۃ (ذبح) صحیح نہیں ہے مگر حلقوم اور ودجین کے کاٹنے کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا: حلقوم اور مری کے کاٹنے کے ساتھ صحیح ہے اور ودجین کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ کھانے اور مشروب کی گزرگاہ ہیں ان کے ساتھ زندگی نہیں ہے اور یہی موت سے مقصود ہے (6)۔ امام مالک وغیرہ نے اس حیثیت سے موت کا اعتبار کیا جس کے ساتھ گوشت اچھا ہو اور اس میں حلال حرام سے جدا ہوتا ہے جو اوداج کے کاٹنے کے ساتھ نکلتا ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے اس پر حضرت رافع بن خدیج کی حدیث دلالت کرتی ہے جس میں ہے ''جو خون بہا دے'' (7)۔ بغدادی علماء نے امام مالک سے روایت کیا ہے وہ چار رگوں کو کاٹنا شرط قرار دیتے ہے۔ حلقوم، ودجین اور

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 156۔ ایضاً صحیح بخاری، باب قسمہ الغنم، حدیث 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 157 3۔ موطا امام مالک، کتاب الذبائح، صفحہ 489

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا والصید، جلد 2، صفحہ 34۔ ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا والصید، حدیث 2438، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 156 6۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 522 7۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 156

مری۔ یہ ابوثور کا قول ہے مشہور جو گزرا ہے وہ لیث کا قول ہے پھر ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے جب ودجین میں سے ایک رگ کاٹی اور حلقوم کاٹا جائے۔ کیا وہ ذبح شمار ہوگی یا نہیں؟

**مسئلہ نمبر 12**۔ علماء کا اجماع ہے کہ ذبح جب حلق میں عقدہ کے نیچے ہو تو ذبح مکمل ہے اس میں اختلاف ہے جو عقدہ سے اوپر ذبح ہو اور بدن تک پہنچ جائے کیا وہ ذبح ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں: امام مالک سے مروی ہے کہ عقدہ سے اوپر ذبح کیا جانے والا جانور نہیں کھایا جائے گا اسی طرح اگر گدی سے ذبح کیا اور پورا کاٹا اور خون بہہ پڑا اسے نہیں کھایا جائے گا اسی طرح اگر گدی سے ذبح کیا اور پورا کاٹا اور خون بہہ پڑا احلقوم اور ودجین بھی کاٹ ڈالیں تو نہیں کھایا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: کھایا جائے گا، کیونکہ مقصود حاصل ہو گیا ہے، یہ اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ ذبح سے اگرچہ مقصود خون بہانا ہے، اس میں ایک قسم کا تعبد (مکلف بنانا) ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق میں ذبح کیا اور لبہ میں نحر کیا۔ اور فرمایا: ذبح حلق اور لبہ میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبح کا محل بیان کیا اور اس کی جگہ کو متعین فرمایا اور اس کا فائدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”جو خون بہادے اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اسے کھاؤ“ (1)۔ جب یہ اہتمام نہ کیا گیا ہو اور نہ نیت کے ساتھ واقع ہو نہ شرط کے ساتھ اور نہ مخصوص صفت کے ساتھ واقع ہو تو اس سے تعبد کا خط زائل ہو گا پس اسے نہیں کھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اس میں اختلاف ہے جو ذکاۃ (ذبح) مکمل کرنے سے پہلے ہاتھ اٹھالے پھر فوراً ذبح کرنا شروع کر دے اور ذبح کو مکمل کرے۔ بعض علماء نے کہا: یہ جائز ہے۔ بعض نے فرمایا: جائز نہیں۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ اس سے اسے زخمی کیا پھر اسے بعد میں ذبح کیا جب کہ اس میں ابھی زندگی باقی تھی۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ مستحب ہے کہ ذبح نہ کرے مگر وہ جس کی حالت پسندیدہ ہو اور جو اس کی طاقت رکھتا ہو اور سنت طریقہ پر ذبح کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، بالغ ہو یا نابالغ ہو اس کا ذبح کرنا جائز ہے جب وہ مسلمان ہو یا کتابی ہو مسلمان کا ذبح کرنا، کتابی کے ذبح کرنے سے افضل ہے۔ قربانی کو صرف مسلمان ذبح کرے۔ قربانی کو کتابی ذبح کرے تو اس میں اختلاف ہے۔ تحصیل المذہب میں یہ جائز نہیں اور اشہب نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ پالتو جانوروں میں سے جو وحشی ہو جائے اس کی ذکاۃ میں سے جائز نہیں مگر جو پالتو جانور میں جائز ہے۔ یہ امام مالک اور اس کے اصحاب، ربیعہ اور لیث بن سعد کے قول کے مطابق ہے۔ اسی طرح کنویں میں گرنے والے کی ذکاۃ نہ ہوگی مگر ذبح کی سنت پر حلق اور لبہ کے درمیان۔ ان دونوں مسئلوں میں بعض اہل مدینہ نے مخالفت کی ہے اس باب میں دلیل حضرت رافع بن خدیج کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے، اس کا تمام اس قول کے بعد ہے فہدی الحبشۃ۔ حضرت رافع نے کہا: ہم نے اونٹ اور بکریاں چھینیں تو اس مال غنیمت میں سے ایک اونٹ بھاگ گیا، ایک شخص نے اسے تیر مارا تو اس نے اسے روک لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اونٹوں میں کچھ وحشی بن جاتے ہیں جس طرح وحشی جانور ہوتے ہیں جب تم پر ان میں سے کوئی چیز غالب آجائے تو اس کے ساتھ اسی طرح کرو“ (2)۔ ایک روایت میں ہے ”اسے کھاؤ“۔ یہی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 156	2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 157

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس فعل پر نبی کریم ﷺ کا غالب کرنا دلیل ہے کہ ذکاۃ ہے۔ انہوں نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ابوداؤد اور ترمذی نے ابوالعشراء سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ذبح نہیں ہوگی مگر حلق اور لبۃ میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو اس کی ران میں نیزہ مارے تو بھی جائز ہے'' (1)۔ یزید بن ہارون نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے، امام احمد بن حنبل نے اسے پسند کیا اور اسے انہوں نے ابوداؤد سے روایت کیا اور ان پر جو حفاظ داخل ہوتے انہیں اس حدیث کے لکھنے کا اشارہ کیا۔ ابوداؤد نے کہا: یہ درست نہیں مگر گرنے والے اور وحشی بننے والے جانور میں۔ ابن حبیب نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے جو کسی گہرائی میں گر جائے اور اس کی ذبح تک نہ پہنچا جاسکتا ہو مگر ذکاۃ کی جگہ کے علاوہ جگہ میں نیزہ مارنے کے ساتھ۔ یہ ایک قول ہے جو امام مالک اور اس کے اصحاب سے مروی ہے۔ ابوعمر نے کہا: اہل علم میں امام شافعی کا قول اظہر ہے اسے کھایا جائے گا جس کے ساتھ وحشی کو کھایا جاتا ہے اس کی وجہ حضرت رافع بن خدیج کی حدیث ہے۔ یہی حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے۔ اور قیاس کی جہت سے جب وحشی پر ذبح کی قدرت ہو تو وہ حلال نہیں ہوتا مگر اس طرح ذبح کے ساتھ جس طرح پالتو جانور کو ذبح کیا جاتا ہے، کیونکہ اب اس پر قدرت حاصل کی گئی ہے اسی طرح قیاس میں مناسب تھا کہ جب پالتو جانور وحشی بن جائے یا پکڑائی نہ دینے میں وحشی کی طرح ہو جائے تو وہ بھی حلال نہ ہوگا مگر اسی طریقہ پر جس طریقہ پر وحشی حلال ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا غالب کرنا وہ اس کو روکنے پر ہے نہ کہ ذکاۃ پر ہے۔ یہی حدیث کا مقتضی اور ظاہر ہے، کیونکہ فرمایا: فحبسہ۔ پس اس نے اسے روک لیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تیر نے اسے قتل کر دیا۔ اسی طرح اس کا حکم ہے جس پر غالب احوال میں قدرت ہوتی ہے پس اس سے نادر کا خیال نہیں کیا جائے گا اور یہ شکار میں ہوتا ہے حدیث نے صراحت کی کہ تیر نے اسے روک لیا۔ محبوس ہونے کے بعد اس پر قدرت حاصل ہوگی پس اسے نہیں کھایا جائے گا مگر ذبح اور نحر کے ساتھ۔ واللہ اعلم۔

رہی ابوالعشراء کی حدیث اس کے بارے میں ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں جانتے مگر حماد بن سلمہ کی حدیث سے اور ابوالعشراء عن ابیہ کی سند کو نہیں جانتے مگر اس حدیث میں۔ ابوالعشراء کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: اس کا اسم اسامہ بن قہطم ہے۔ کہا جاتا ہے اس کا اسم یسار بن برز ہے۔ کہا جاتا ہے: بلز نام تھا۔ کہا جاتا ہے: اس کا نام عطارد تھا اپنے دادا کی طرف منسوب تھا۔ یہ سند مجہول ہے اس میں حجت نہیں ہے اگر اس کی صحت کو تسلیم کیا جائے جیسے یزید بن ہارون نے کہا تو پھر بھی اس میں حجت نہ ہوتی، کیونکہ اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ کسی عضو میں بھی ذبح جائز ہے خواہ اس پر قدرت ہو یا نہ ہو اور مقدور میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں پس اس کا ظاہر قطعاً مراد نہیں ہے۔ ابوداؤد اور ابن حبیب کی تاویل متفق علیہ نہیں ہے پس اس میں حجت نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

ابوعمر نے کہا: امام مالک کی حجت یہ ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ اگر پالتو جانور بھاگ نہ جائے تو اس کی ذبح اسی طریقہ پر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی ذبیحۃ المتردیۃ، حدیث 2442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوگی جو مقدور علیہ جانور کی ہے۔ پھر اختلاف ہے پس وہ اپنے اصل پر ہوگی حتی کہ وہ اتفاق کرلیں۔ پس اس میں حجت نہیں ہے کیونکہ ان کا اجماع مقدور علیہ پر منعقد ہے اور یہ غیر مقدور پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اس باب کے تمام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے پس جب تم قتل کرو تو بہتر انداز میں قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو بہتر انداز میں ذبح کرو تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنی چھری کو تیز کرے اور ذبیحہ کو راحت دے" (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت شداد بن اوس سے روایت کیا ہے فرمایا: دو چیزیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد کی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الله كتب۔ پھر مکمل حدیث ذکر فرمائی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چوپائیوں میں ذبح کا احسان یہ ہے کہ ان سے نرمی کرنا، اسے سختی سے نہ گرائے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک کھینچ کر نہ لے جائے اور آلہ کو تیز کرنا، اباحت کی نیت کو حاضر کرنا اور قربت کی نیت کرنا اور انہیں قبلہ کی طرف متوجہ کرنا اور اسے جلدی قتل کرنا۔ ودجین اور حلقوم کو کاٹنا اور اسے آرام دینا اور اسے ٹھنڈا ہونے تک چھوڑے رکھنا۔ اور اللہ تعالیٰ کے احسان کا اعتراف کرنا اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرنا کہ اس نے ہمارے لیے اسے مسخر کیا اگر وہ چاہتا تو اسے ہم پر غالب کر دیتا۔ اور ہمارے لیے مباح فرمایا، اگر وہ چاہتا تو اسے ہم پر حرام کر دیتا۔ ربیعہ نے کہا: ذبح کے احسان میں سے یہ ہے کہ دوسرے جانور کے سامنے جانور کو ذبح نہ کیا جائے۔ امام مالک سے اس کا جواز حکایت کیا گیا ہے، پہلا قول احسن ہے۔ اور رہا قتل میں احسان تو وہ ہر چیز ذبح، قصاص اور حدود وغیرہ میں عام ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شريطة الشيطان سے منع فرمایا ہے (2)، ابن عیسیٰ نے اپنی حدیث میں یہ زائد کیا ہے۔ "شريطة الشيطن یہ ہے کہ جانور کو ذبح کیا جائے اور کاٹا جائے اور اس کی اوداج رگیں نہ کاٹی جائیں پھر اسے چھوڑ دیا جائے حتی کہ وہ مر جائے"۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ** ابن فارس نے کہا: نصب پتھر تھے جو نصب کیے جاتے تھے اور ان کی عبادت کی جاتی تھی اور ان پر ذبح شدہ جانوروں کا خون ڈالا جاتا تھا اور یہی النصب بھی ہے۔ النصائب وہ پتھر جو کنویں کے کناروں کے اردگرد لگائے جاتے ہیں پھر ان کے آخری پتھروں کو رنگ کیا جاتا ہے اور اٹھنے والا اغبار۔ بعض علماء نے فرمایا: النصب جمع ہے اس کا واحد نصاب ہے جیسے حمار کی جمع حمر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم مفرد ہے اور اس کی جمع انصاب ہے اور یہ تین سو ساٹھ پتھر تھے۔ طلحہ نے اسے النصب صاد کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے النصب نون کے فتحہ اور صاد کے جزم کے ساتھ ہے۔ جحدری نے کہا: نون اور صاد کے فتحہ کے ساتھ ہے اس نے اسے مفرد اسم بنایا ہے جیسے الجبل اور الجمل اس کی جمع انصاب ہے جیسے اجمال اور اجبال۔ مجاہد نے کہا: یہ وہ پتھر ہیں جو مکہ کے اردگرد تھے لوگ ان پر اپنے جانور ذبح کرتے تھے۔ ابن جریج نے کہا: عرب جانور مکہ میں ذبح کرتے تھے اور ان کا خون بیت اللہ کے سامنے والی دیوار پر مل دیتے تھے اور گوشت کو کاٹتے تھے اور اسے ان پتھروں پر رکھ دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 152
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، جلد 2، صفحہ 34

مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم زیادہ حق دار ہیں کہ بیت اللہ کی تعظیم کریں ان افعال کے ساتھ۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند نہیں فرمایا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا (الحج: 37) اور وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا ارشاد نازل ہوا۔ معنی یہ ہے کہ اس میں نصب کی تعظیم کی نیت تھی (اس لیے حرام ہیں) نہ کہ ان پر ذبح کرنا جائز نہیں۔ اعشیٰ نے کہا:

وَذَا النُّصُبَ المنصوبَ لا تَنْسُكَنَّهُ لِعافيةٍ واللهَ رَبَّكَ فَاعْبُدَا

بعض علماء نے فرمایا: علی بمعنی لام ہے یعنی ان کی خاطر۔ قطرب نے کہا: ابن زید نے کہا: مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ اور وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ایک چیز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا جز ہے لیکن اس کی جنس کے بعد امر کی شہرت اور موضع کے شرف اور نفوس کا اس کی تعظیم کرنے کی وجہ سے خصوصی اس کا ذکر فرمایا (1)۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ یہ ماقبل پر معطوف ہے (أنْ) محل رفع میں ہے یعنی جوئے کے تیروں کو تقسیم کرنا تم پر حرام کیا گیا ہے۔ الازلام، جوئے کے تیر۔ اس کا واحد زَلَمٌ اور زُلَم ہے، فرمایا:

بات يُقَاسِيها غلامٌ كالزَّلَمْ

دوسرے نے کہا:

فَلَئِنْ جَذِيمة قَتَلت سَرَواتها فنساءها يَضْرِبن بالأزْلامِ

محمد بن جریر نے ذکر کیا ہے کہ ابن وکیع نے انہیں بیان کیا اور انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے شریک سے انہوں نے ابی حصین سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ الأزلام سفید پتھر تھے جن کو لوگ مارتے تھے۔ محمد بن جریر نے کہا: ہمیں سفیان بن وکیع نے فرمایا: یہ شطرنج ہے۔ رہا لبید کا قول:

تَزِلَّ عن الثرى أزلامُها

علماء فرماتے ہیں: شاعر نے یہاں أزلام سے مراد وحشی گایوں کے کھر لیے ہیں۔ عربوں کے لیے ازلام کی تین اقسام تھیں ان میں سے تین وہ ہیں جو ہر انسان اپنے لیے استعمال کرتا تھا ایک تیر پر لکھا ہوتا افعل (تو کر) اور دوسرے پر لکھا ہوتا لا تفعل (تو نہ کر) اور ایک تیر خالی ہوتا اس پر کچھ نہ لکھا ہوتا۔ وہ ان تیروں کو اپنی زنبیل میں رکھتا۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا تو اس زنبیل میں ہاتھ ڈالتا اگر افعل والا تیر نکلتا تو وہ کام کر لیتا اور اگر لا تفعل والا تیر نکلتا تو کام کو نہ کرتا اور اگر وہ تیر نکلتا جس پر کچھ نہ لکھا ہوتا تو دوبارہ ہاتھ ڈالتا۔ سراقۃ بن جعشم نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کا ہجرت کے وقت پیچھا کیا تو اس نے اس طرح تیر نکالے۔ اس فعل کو استقسام کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس سے رزق تقسیم کرتے تھے اور جس چیز کا ارادہ کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے۔ الاستقساء کا معنی ہے پانی کو طلب کرنا۔ اس کی مثال جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے وہ نجومی کا قول ہے وہ کہتا ہے: فلاں ستارے کی وجہ سے تو نہ نکل اور فلاں ستارے کی وجہ سے تو نکل۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 153

تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (لقمان: 34) آگے اس کا بیان تفصیل سے آئے گا۔

دوسری قسم تیروں کی یہ تھی کہ جوف کعبۃ میں ہبل (بت) کے پاس سات تیر ہوتے تھے جن پر وہ سارے معاملات لکھے ہوتے تھے جو لوگوں کے درمیان واقع ہوتے ہیں ان تیروں میں سے ہر تیر پر ایک تحریر تھی، ایک تیر میں دیات کا ذکر ہوتا تھا دوسرے پر لکھا ہوتا منکم (تم سے) ایک پر لکھا ہوتا تھا (من غیر کم) تمہارے غیر سے۔ایک پر لکھا ہوتا ملصق اور باقی تمام میں پانی وغیرہ کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ان تیروں کا استعمال عبدالمطلب نے اپنے بیٹوں پر کیا تھا جب اس نے ایک کو ذبح کرنے کی نذر مانی تھی جب وہ دس مکمل ہو جائیں گے۔یہ مشہور واقعہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یہ سات تیر عربوں کے کاہنوں اور حکام میں سے ہر ایک کے پاس ہوتے تھے جیسا کہ کعبہ میں ہبل کے پاس ہوتے تھے۔

تیسری قسم تیروں کی یہ تھی کہ جوئے کے تیر۔یہ دس تیر ہوتے تھے اس میں سے سات پر حصے لکھے ہوتے تھے اور تین پر کچھ نہیں لکھا ہوتا تھا یہ وہ بطور لہو ولعب جوئے کے لیے استعمال کرتے تھے اور ان کے عقلاء ان سے مسکینوں اور ناداروں کو سخت دن اور سردیوں میں کھانا کھلانے کا قصد کرتے تھے۔مجاہد نے یہاں اَلازلام سے مراد وہ گوٹیاں لی ہیں جن کے ساتھ رومی اور فارسی لوگ جوا کھیلتے تھے۔سفیان اور وکیع نے کہا: یہ شطرنج ہے۔الاستقسام سے مراد حصہ اور نصیب طلب کرنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔یہ باطل ذریعے سے مال کھانا ہے اور یہ حرام ہے ہر جوا جو کبوتروں کے ساتھ، تاش کے ساتھ یا شطرنج کے ساتھ یا اس طرح دوسری کھیلوں کے ساتھ کھیلا جائے تو وہ استقسام کے معنی میں ہے اور یہ سب حرام ہیں۔یہ کہانت کی ایک قسم ہے اور علم غیب کا دعویٰ پیش کرنا ہے۔ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان امور سے منع کیا ہے جو نجومی راستوں پر تیروں سے کرتے تھے جو تیر ان کے پاس ہوتے تھے اور اسی طرح فال کے پتے ہوتے تھے۔الکیا طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے منع کیا ہے جو امور غیب سے متعلق ہوتے ہیں، کیونکہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا۔المغیبات کی تعریف میں تیروں کا کوئی اثر نہیں۔بعض لوگوں نے امام شافعی پر رد کا اس سے استنباط کیا ہے جو وہ آزاد کرنے میں غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی کا کہتے ہیں، اس شخص نے یہ نہیں جانا کہ جو امام شافعی نے کہا اس کی بنیاد اخبار صحیحہ پر ہے۔اس کا استقسام بالازلام کی نہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ آزاد کرنا حکم شرعی ہے۔ہوسکتا ہے کہ شرع نے قرعہ کے نکلنے کو آزادی کے حکم کے اثبات پر علامت بنایا ہوتا کہ خصومت ختم ہو جائے یا کوئی مصلحت ہو جو شریعت کے پیش نظر ہو۔پس مذکورہ قائل کا قول اس کے مساوی نہیں ہوسکتا ''جب تو ایسا کرے گا یا تو ایسے کہے گا'' تو یہ ہوگا یہ مستقبل کے کسی کام پر دلالت کرتا ہے۔پس تیر کا نکلنا کسی چیز پر علامت بنانا جائز نہیں جو مستقبل میں ہونا ہوتی ہے اور قرعہ کے نکلنے کو آزادی پر قطعی طور پر علامت بنانا جائز ہے پس دونوں بابوں کے درمیان جدائی ظاہر ہوگئی۔

**مسئلہ نمبر19**۔فال کا طلب کرنا اس باب سے نہیں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا راشد، یا نجیح سننا پسند تھا(1)۔اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم فال کو پسند کرتے تھے، کیونکہ امید پوری ہونے

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث 1541، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور حاجت پانے کے ساتھ آپ کے نفس کو خوشی ہوتی تھی اور انشراح حاصل ہوتا تھا، پس اللہ تعالیٰ پر حسن ظن اچھی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں جو وہ میرے متعلق رکھتا ہے (1)۔ نبی کریم ﷺ برے شگون کو ناپسند کرتے تھے، کیونکہ یہ شرکیہ اعمال میں سے تھے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے متعلق برے گمان کو کھینچتا ہے۔ خطابی نے کہا: فال اور برے شگون کے درمیان فرق یہ ہے کہ فال اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کے طریق سے ہے اور برا شگون اس کے علاوہ کسی چیز پر بھروسہ کرنے کے طریق سے ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے ابن عون سے فال کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: کوئی شخص مریض ہو اور یا سالم کا کلمہ سنے یا کوئی شخص گم شدہ چیز کو تلاش کرنے والا ہو اور وہ سنے یاواجد۔ یہ ترمذی کی حدیث کا معنی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے ''بدشگونی کچھ نہیں اور اس سے بہتر فال ہے'' پوچھا گیا: یا رسول اللہ! ﷺ فال کیا ہے؟ فرمایا: ''اچھا کلمہ جو تم میں سے کوئی سنتا ہے'' (2)۔ الطیرۃ (بدشگونی) کا مزید مفہوم ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: علم سیکھنے سے آتا ہے اور حلم برداشت کرنے سے آتا ہے، جو خیر کو تلاش کرتا ہے وہ اسے عطا کی جاتی ہے اور جو شر سے بچتا ہے اسے اس سے بچایا جاتا ہے تین شخص ایسے ہیں جو بلندیاں نہیں پاتے جس نے کہانت کی یا تیر نکالے اور بدشگونی کی وجہ سے سفر سے واپس آ گیا۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ذٰلِكُمْ فِسْقٌ** یہ تیر نکالنے کی طرف اشارہ ہے۔ الفسق کا معنی نکلنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مذکورہ تمام چیزوں کی طرف راجع ہے، جو حرام تھیں ان کو حلال سمجھنا ہے، ان میں سے ہر چیز فسق ہے اور حلال سے حرام تک نکلنا ہے، ان محرمات سے عقود کو پورا کرنے سے رکنا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ**۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ** یعنی تمہارا ان کے دین کی طرف لوٹنا کافر ہو کر، اس سے کافر مایوس ہو چکے ہیں۔ ضحاک نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی جب مکہ فتح ہوا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو ہجری 22 رمضان کو مکہ فتح کیا۔ بعض نے فرمایا: آٹھ ہجری کو فتح ہوا۔ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے منادی نے ندا دی: خبردار! جس نے **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کہا وہ امن میں ہوگا اور جس نے ہتھیار ڈال دیا وہ امن میں ہے، جس نے دروازہ بند کر لیا وہ امن میں ہے۔ یئس میں دو لغتیں ہیں یَىِٕسَ یَیْئَسُ یأساً، أیس یایئس أیاساً و أیاسۃ یہ نضر بن شمیل نے کہا ہے: **فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ** یعنی تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو میں تمہاری مدد پر قادر ہوں۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ** نبی کریم ﷺ جب مکہ میں تھے تو اس وقت صرف نماز فرض تھی جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے حج کرنے تک حلال اور حرام نازل کیا۔ جب آپ ﷺ نے حج فرمایا اور دین مکمل فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1117۔ ایضاً، حدیث نمبر 6856، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 231

اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ ائمہ حدیث نے طارق بن شہاب سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک یہودی حضرت عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے امیر المومنین! تمہاری کتاب میں ایک آیت ہے جسے تم پڑھتے ہو اگر ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ حضرت عمر نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا: اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا۔ حضرت عمر نے کہا: میں اس دن کو جانتا ہوں جس دن میں نازل ہوئی اور (اس مکان کو جانتا ہوں جس میں وہ نازل ہوئی) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عرفہ کے دن جمعہ کے دن نازل ہوئی (1)۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں اور نسائی کے ہاں جمعہ کی رات کا ذکر ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ حج اکبر میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا تو حضرت عمر رونے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم کیوں رو رہے ہو؟ حضرت عمر نے عرض کی: مجھے اس چیز نے رلایا ہے کہ ہمارے دین میں زیادتی ہو رہی تھی اب جب ہمارا دین مکمل ہو گیا ہے تو کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی مگر وہ کم ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے سچ کہا ہے''۔ مجاہد نے روایت کیا ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے دن نازل ہوئی (2)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے، یہ جمعہ کے دن نازل ہوئی اور سن دس ہجری حجۃ الوداع کے موقع پر عصر کے بعد عرفہ کا دن تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی عضباء پر عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اونٹنی کا بازو وحی کے بوجھ کی وجہ سے ٹوٹنے کے قریب تھا تو وہ اونٹنی بیٹھ گئی تھی۔ الیوم سے مراد دن کا بعض حصہ بھی لیا جاتا ہے۔ اسی طرح الشہر سے مراد بعض مہینہ لیا جاتا ہے۔ تو کہتا ہے: ہم نے مہینہ میں یہ یہ کیا اور سال میں یہ یہ کیا۔ یہ تو معلوم ہے کہ تو نے پورے مہینہ اور پورے سال میں یہ نہیں کیا یہ عرب و عجم کی لغت میں استعمال ہوتا ہے۔ الدین سے مراد وہ شرائع ہیں جو ہمارے لیے مشروع اور مفتوح ہوئیں، کیونکہ یہ شرائع تھوڑی تھوڑی نازل ہوئیں اور آخر میں یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی کا قول ہے۔ جمہور علماء نے کہا: اس سے مراد بڑے بڑے فرائض اور تحلیل و تحریم ہیں۔ فرمایا: اس کے بعد بھی بہت سا قرآن نازل ہوا اور اس کے بعد آیت ربا نازل ہوئی۔ اور آیت کلالۃ نازل ہوئی۔ پس دین کا بڑا حصہ اور حج کا امر مکمل ہوا، کیونکہ اس سال میں مسلمانوں کے ساتھ کسی مشرک نے طواف نہ کیا اور نہ بیت اللہ کا کسی برہنہ شخص نے طواف کیا تمام لوگ عرفہ میں ٹھہرے۔ بعض علماء نے فرمایا: اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ یعنی تمہارے لیے تمہارے دشمنوں کو میں نے ہلاک کر دیا اور تمہارے دین کو تمام ادیان پر غلبہ دیا جیسے تو کہتا ہے: ہمارے لیے وہ مکمل ہوا جو ہم چاہتے تھے جب تیرے دشمن کا کام تمام کر دیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ شرائع اور احکام کی تکمیل کر کے اور دین اسلام کو غلبہ دے کر تم پر اپنی نعمت کو مکمل کیا جیسا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، کیونکہ میں نے کہا تھا: وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكُمۡ (بقرہ: 150) یہ مکہ میں امن اور اطمینان سے داخل ہونا ہے اور اس کے علاوہ نعمتیں ہیں جو اس ملت حنیفہ کو جنت کے دخول تک میسر آئی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ شاید کوئی کہنے والا کہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے یہ دین کامل نہ تھا۔ یہ اس بات کا موجب ہے کہ پہلے جتنے مہاجرین و انصار فوت ہو گئے ہیں اور وہ لوگ جو بدر اور حدیبیہ میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 11۔ ایضاً، حدیث 43، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 154

حاضر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی دونوں بیعتیں کی تھیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے نفسوں کی قربانی دی تھی اور ساتھ ساتھ بڑی بڑی مشقتیں برداشت کی تھیں وہ لوگ ناقص دین پر فوت ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ ناقص دین کی طرف اس عرصہ میں دعوت دیتے رہے اور یہ مسلم ہے کہ نقص عیب ہے اور اللہ کا دین قیم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دینا قیماً۔ ان تمام باتوں کا جواب یہ ہے کہ تو نے یہ کیوں کہا کہ ہر نقص عیب ہے اس پر تمہاری دلیل کیا ہے۔ پھر کہا جائے گا: کیا مہینہ کا کم ہونا کیا یہ عیب ہے اور مسافر کی نماز کا کم ہونا کیا یہ اس کے لیے عیب ہے اور عمر کا نقصان جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ (فاطر: 11) سے ارادہ فرمایا کیا یہ اس کے لیے عیب ہے، عادت سے کم دنوں میں حیض کا ختم ہونا اور حمل کے ایام کا کم ہونا اور چوری کے ساتھ یا جلنے کے ساتھ یا غرق ہونے کے ساتھ مال کا کم ہونا جب کہ اس کا مالک محتاج نہ ہو؟ پس تو نے انکار نہیں کیا کہ شرع میں دین کے اجزاء کی کمی اس کے باقی اجزاء کے لاحق ہونے سے پہلے جو اللہ کے علم میں باقی ہیں یہ عیب اور شین نہیں ہے اور تو نے انکار نہیں کیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے ارشاد کا معنی دو اعتبار سے ہے۔

(۱) اس سے مراد یہ ہوگا کہ میں نے اس دین کو اس انتہائی حد تک پہنچایا جو میرے نزدیک تھی جس کا میں نے فیصلہ کیا اور جس کا میں نے اندازہ کیا اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے اس میں ایسا نقص تھا جو عیب شمار ہوتا، لیکن یہ نقصان مقید کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔ کہا جائے گا کہ اس اعتبار سے ناقص تھا جو اللہ تعالیٰ کے پاس تھا جو اس کو لاحق ہونے والا اور اس سے ملنے والا تھا مثلاً ایک شخص جس کو اللہ تعالیٰ سو سال تک پہنچانے والا تھا پس کہا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر کو مکمل کیا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی عمر جب ساٹھ سال تھی تو وہ ناقص تھی جو قصور اور خلل کا نقص تھا، کیونکہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: جس کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال کی عمر تک پہنچایا تو اب اس کی عمر میں عذر کا محل نہیں رہا (1) لیکن نقصان مقید کے ساتھ موصوف کرنا جائز ہے۔ پس کہا جائے گا: جو اس کی عمر اللہ کے پاس تھی اس اعتبار سے ناقص تھی اللہ تعالیٰ اسے اس عمر تک پہنچانے والا ہے اور اسے لمبی عمر دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعتیں مکمل فرمائیں اگر اس کے لیے اکمال کا لفظ بولا جائے تو کلام صحیح ہوگی۔

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جب دو رکعتیں ہوتی ہیں تو وہ ناقص ہوتی ہیں اور قصور اور خلل کا نقص ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ کے نزدیک ناقص تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اور چیز ملا دی اور اس پر کچھ زائد کر دیا تو اس طرح صحیح ہوگا۔ اسی طرح شرائع اسلام کا حکم ہے۔ شریعت کے احکام جو آہستہ آہستہ تھوڑے تھوڑے آئے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو اس منتہیٰ تک پہنچا دیا جو اس کے پاس تھی۔

دوسری وجہ یہ ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ سے مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس حج کی توفیق بخشی جس کے علاوہ ان پر اور ارکان دین باقی نہ تھے۔ پس صحابہ کرام نے حج کیا تو ان کے لیے دین جمع ہوا، اس لیے ارکان کی ادائیگی کے اعتبار سے اور فرائض کے قیام کے اعتبار سے آپ ﷺ فرماتے تھے۔ ''اسلام کی بنیاد پانچ احکام پر ہے'' (2)۔ صحابہ کرام نے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب من بلغ ستین سنة، الخ، حدیث نمبر 5940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 32۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 7، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کلمہ کی شہادت بھی دی، نماز بھی پڑھی، زکوۃ بھی دی، روزے بھی رکھے، جہاد بھی کیا اور عمرہ بھی کیا، لیکن حج نہیں کیا تھا۔ جب انہوں نے اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا جب کہ وہ عرفہ کی شام موقف میں تھے۔ اس سے مراد یہ لیا کہ ان کے لیے دین کی وضع کو مکمل کیا۔ اس میں دلالت ہے کہ تمام طاعات، دین ایمان اور اسلام ہیں۔

**مسئلہ نمبر 25۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا** یعنی میں نے تمہیں بتایا کہ میری رضا تمہارے لیے دین میں ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمارے لیے دین کو پسند کیا، پس اس دن کے ساتھ رضا کے خاص ہونے کا فائدہ نہ ہوگا اگر ہم اس کو اپنے ظاہر پر محمول کریں۔ دِيْنًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو مفعول ثانی بنا دے۔ اگر کہا جائے کہ اس کا معنی ہے میں نے تمہارے لیے پسند کیا جب تم نے میرے لیے اس دین کا اقرار کیا جو تمہارے لیے میں نے شروع کیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا سے مراد یہ ہو کہ میں نے تمہارے اسلام کو پسند کیا بطور دین جس پر تم آج ہو یہ اپنے کمال کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گا، اس سے کوئی چیز منسوخ نہیں کروں گا۔ واللہ اعلم

اسلام اس آیت میں وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ان الدین عند اللہ الاسلام میں ہے جبریل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے متعلق سوال کیا تھا اس کی جو اس میں تفسیر کی گئی تھی وہ ایمان، اعمال اور دوسرے احکام کا نام ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 26۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ** یعنی جس کو مردار اور دوسری تمام محرمات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں ان کے کھانے کی ضرورت ہو، المخمصۃ کا معنی بھوک ہے اور طعام سے پیٹ کا خالی ہونا ہے۔ الخمص پتلے پیٹ والا، رجل خمیص و خمصان، امرأۃ خمیصۃ و خمصانۃ پتلے پیٹ والا مرد اور پتلے پیٹ والی عورت۔ اسی سے ہے: اخمص القدم نیچے سے پاؤں کی خالی جگہ۔ اکثر یہ بھوک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الاعشیٰ نے کہا:

تبیتون فی المشتی ملاء بُطُونکم     وجارُاتکم غَرْثَی یَبِتْنَ خَمَائِصا

یعنی تمہاری لونڈیاں بھوک پر رات گزارتی ہیں جب کہ ان کے پیٹ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ نابغہ نے کہا:

والبطن ذُو عُکَنٍ خَمِیص لیّن     والنَّحْر تَنْفُجه بِثَدْیٍ مُقْعَدِ

حدیث شریف میں: خِمَاص البطون خِفافُ الظُّھور۔ خالی پیٹوں والے ہلکی پیٹھوں والے۔ الخماص، الخمیص کی جمع ہے، ملے ہوئے پیٹ والا یعنی وہ لوگوں کے اموال سے آنکھیں بند کرنے والے ہیں۔ اسی سے حدیث ہے انّ الطیر تَغدو خِمَاصا و تَروح بِطانًا(2) پرندے صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے ہوئے پیٹوں سے واپس آتے ہیں۔ الخمیصۃ کپڑے کو بھی کہتے ہیں۔ اصمعی نے کہا: الخمائص ریشمی کپڑے یا بیل بوٹوں والے اونی کپڑے، یہ کالے کپڑے ہیں اور یہ لوگوں کے لباس سے تھے۔ اضطرار کا معنی اور اس کا حکم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ** یعنی وہ حرام کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو۔ یہ غَيْرَ

1۔ صحیح بخاری، باب سوال الجبرائیل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ایمان، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ، باب التوکل والیقین، حدیث نمبر 4153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (بقرہ:173) کے معنی میں ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ الجنف کا معنی میل ہونا ہے الاثم سے مراد حرام ہے۔ اسی سے حضرت عمر کا قول ہے ماتجانفنا فیہ لاثم یعنی ہم جان بوجھ کر گناہ اور حرام کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ ہر مائل ہونے والا متجانف ہے۔ نخعی، یحییٰ بن وثاب اور سلمی نے متجنف بغیر الف کے پڑھا ہے۔ یہ معنی میں زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ عین کلمہ کا مشدد ہونا معنی میں مبالغہ اور توغل کا اور حکم کے ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ تفاعل کا معنی کسی چیز کی حکایت کرنا اور اس سے قریب ہونا ہے کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا جب تو کہتا ہے: تمایل الغصن یہ اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کہ ٹہنی کا جھکنا اور میل ہونے کے قریب ہونا اور جب تو یہ کہتا ہے تمیل تو میل کا حکم ثابت ہوتا ہے، اسی طرح تصاون الرجل اور تصون الرجل ہے تعاقل اور تعقل ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں معصیت کا قصد کرنے والا نہیں۔ یہ قتادہ اور امام شافعی نے کہا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے لیے غفور و رحیم ہے، پس اس میں حذف ہے۔ سیبویہ نے کہا:

قد أصبحتْ أمُّ الخيارِ تدّعي علَيّ ذنبا كلُّه لم أصنَعِ

اس میں مراد لم اصنعہ ہے پس ضمیر کو حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"پوچھتے ہیں آپ سے کہ کیا کیا حلال کیا گیا ہے ان کے لیے؟ آپ فرمائیے: حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے پاک چیزیں اور (شکار) ان کا سکھایا ہے تم نے جنہیں شکاری جانوروں سے شکار پکڑنے کی تعلیم دیتے ہوئے، تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے تو کھاؤ اس میں سے جسے پکڑے رکھیں تمہارے لیے اور لیا کرو اللہ کا نام اس جانور پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت تیز ہے حساب لینے میں"۔

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ یہ آیت حضرت عدی بن حاتم اور حضرت زید بن مہلہل کے سبب نازل ہوئی اور یہ زید الخیل ہے جس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیر رکھا تھا ان دونوں صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم کتوں اور بازوں کے ساتھ شکار کرتے ہیں، کتے گائیوں، جنگلی گدھوں اور ہرنوں کو پکڑتے ہیں پھر کچھ تو ذبح کر لیے جاتے ہیں اور بعض کو کتے مار ڈالتے ہیں ہم ان کو ذبح نہیں کر سکتے جب کہ اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام کیا ہے پس ہمارے لیے کیا حلال ہوگا؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔ ما محل رفع میں مبتدا ہے اور اس کی خبر اُحِلَّ لَكُمْ ہے اور ذا زائدہ ہے اگر تو چاہے تو ذَاۤ کو بمعنی الذی بنا دے اور پھر خبر قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ہوگی۔ الطَّيِّبٰتُ

1۔ الجامع لاسباب النزول، جلد 1، صفحہ 124

سے مراد حلال ہے ہر حرام چیز طیب نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الطَّیِّبٰتُ سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا کھانا، پینا اچھا لگے اور دنیا میں اور آخرت میں اس کے استعمال میں ضرر نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: الطَّیِّبٰتُ سے مراد ذبائح ہیں، کیونکہ وہ ذبح کرنے کے ساتھ پاک ہو جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا عَلَّمْتُمْ یعنی ان چیزوں کا شکار جن کو تم نے سکھایا۔ اس کلام میں اضمار ضروری ہے اگر اضمار نہ ہو تو معنی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حلت جس کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ معلم درندوں کو شامل ہے اور یہ کسی کا بھی مذہب نہیں ہے، کیونکہ وہ جو کتے کے گوشت کو حلال کرتا ہے تو وہ معلم کی اباحت کی تخصیص نہیں کرتا۔ مزید کتے کے کھانے کے بارے میں علماء کا جو اختلاف ہے وہ ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گا۔

بعض علماء جنہوں نے قرآن کے احکام میں کتب تصنیف کی ہیں انہوں نے کہا ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اباحت ان چیزوں کو شامل ہے جن کو ہم نے سکھایا شکاری جانوروں میں سے، اس میں کتا اور چیر نے پھاڑنے والے تمام پرندے شامل ہیں یہ تمام وجوہ انتفاع کی اباحت کا موجب ہے پس یہ شکاری کتے کے جواز پر اور تمام وجوہ انتفاع کے ساتھ ان سے نفع حاصل کرنے کے جواز پر دلیل ہے مگر جس کو دلیل خاص کر دے اور وہ شکاری کتوں اور چیر نے پھاڑنے والے پرندوں میں سے کھانا ہے۔ حضرت عدی کے پانچ کتے تھے جن کے اس نے نام رکھے ہوئے تھے ان کے کتوں کے نام یہ تھے۔ سلہب، غلاب، المختلس، المتناعس۔ سہیلی نے کہا: پانچویں میں مجھے شک ہے فرمایا: اخطب تھا یا فرمایا: وثاب تھا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امت کا اجماع ہے کہ کتا جب کالا ہو اور مسلمان نے اسے سکھایا ہو اور جب اسے شکار پر ابھارا جائے تو وہ بھاگے اور جب اسے بلایا جائے تو وہ آجائے، شکار کو پکڑنے کے بعد اسے جھڑکا جائے تو وہ شکار چھوڑ دے اور اس شکار میں سے کچھ نہ کھائے جس کو شکار کرے اور اپنے ناخنوں اور دانتوں سے شکار میں نشان ڈالا ہے اور اس کے ساتھ مسلمان شکار کرے اور اسے چھوڑتے وقت مسلمان اللہ کا نام ذکر کرے تو اس کا شکار صحیح ہے اور بلا اختلاف اسے کھایا جائے گا۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو اختلاف داخل ہو جائے گا اگر کتے کے علاوہ مثلاً چیتا اور اس جیسا جانور اور باز، شکرا وغیرہ پرندے سے شکار کیا گیا ہو تو جمہور امت کا خیال یہ ہے کہ تعلیم کے بعد جو شکار کرے وہ جارح کا سبب ہے۔ کہا جاتا ہے: جرح فلان واجترح جب وہ کوئی چیز حاصل کرے، اسی سے الجارحۃ ہے، کیونکہ اس کے ذریعے کمایا جاتا ہے، اسی سے اجتراح السیأت ہے گناہوں کا ارتکاب کرنا۔ اعشی نے کہا:

ذا جُبَارٍ مُنْضِجا مِیسَمُہ یُذْکر الجارح ما کان اجترح

اور قرآن حکیم میں ہے: وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ۔ (انعام: 60)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ۔ (الجاثیہ: 21)

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُكَلِّبِیْنَ اس سے مراد کتوں کے مالک ہیں وہ مودب کی طرح ہوتے ہیں جو تادیب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کہ وہ شکار پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے کتے جھپٹتے ہیں۔ رمانی نے کہا:

اس میں سے ہر قول کا احتمال ہے مُكَلِّبِيْنَ میں اس بات پر دلیل نہیں کہ صرف کتے کا شکار مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ''مومنین'' کے قول کی طرح ہے اگرچہ جنہوں نے کتے پر اباحت کو خاص کیا ہے انہوں نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے جس کو ابن المنذر نے حکایت کیا ہے فرمایا: جو باز اور دوسرے پرندوں سے شکار کیا جاتا ہے جس کو تو ذبح کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے ذبح کر دے وہ تیرے لیے حلال ہے ورنہ تو اسے نہ کھا (1)۔ ابن المنذر نے کہا: ابوجعفر سے باز کے متعلق پوچھا گیا کہ اس کا شکار حلال ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں مگر یہ کہ تم اسے ذبح کرلو (2)۔ ضحاک اور سدی نے کہا: وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ سے مراد کتے ہیں اگر کتا کالا سیاہ ہو تو حسن، قتادہ اور نخعی نے اس کا شکار مکروہ قرار دیا ہے۔ امام احمد نے کہا: میں کوئی ایسا شخص نہیں جانتا جس نے رخصت دی ہو جب کہ کتا کالا سیاہ ہو۔ اسحٰق بن راہویہ نے بھی یہی کہا ہے۔ رہے مدینہ طیبہ کے عوام اور کوفہ کے عوام یہ سکھائے گئے کتے کے شکار کو جائز قرار دیتے ہیں (3)۔ اور جنہوں نے کالے کتے کے شکار سے منع فرمایا اس کی وجہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: الکلب الاسود شیطان (4) کالا کتا شیطان ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ جمہور علماء نے آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے اور باز کے شکار کے جواز پر سبب نزول سے استدلال کیا ہے۔ اور جو ترمذی نے حضرت عدی بن حاتم سے حدیث روایت کی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے باز کے شکار کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو وہ تیرے لیے روک لے وہ کھا'' (5)۔ اس کی سند میں مجالد ہے جو غیر معروف ہے۔ سوائے اس ایک سند کے معروف نہیں اور یہ راوی ضعیف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کتے کا حکم ہے وہ چیتے کا حکم ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے مگر ایسی صورت میں جس کا تاثیر میں کوئی دخل نہیں۔ یہ اصل معنی میں قیاس ہے، تلوار کو چھری پر قیاس کرنے کی طرح ہے اور لونڈی کو غلام پر قیاس کرنے کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو جان لو کہ شکاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتے کو چھوڑتے وقت ذبح اور اباحت کی نیت کرے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تو اپنے کتے کو چھوڑے اور اس پر اللہ کا نام لے تو تو کھا'' (6)۔ یہ ارشاد نیت اور بسم اللہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر کتا چھوڑتے وقت لہو ولعب کا قصد کیا ہوگا تو امام مالک کے نزدیک مکروہ ہوگا۔ ابن عبد الحکم نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ لیث کے قول کا ظاہر ہے۔ لیث نے کہا: میں نے کوئی ایسا حق نہیں دیکھا جو باطل کے زیادہ مشابہ ہے یعنی شکار۔ اگر کوئی تذکیہ (ذبح) کی نیت کے بغیر کتا چھوڑے تو وہ شکار حرام ہوگا، کیونکہ وہ فساد اور بغیر منفعت کے حیوان کے اتلاف کے باب سے ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حیوان کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے مگر کھانے کے لیے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ کتا یا باز چھوڑتے وقت زبان سے بسم اللہ کہنا ضروری ہے، کیونکہ آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 156　　2۔ ایضاً

3۔ ایضاً　　4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 197

5۔ جامع ترمذی، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 177۔ ایضاً، حدیث نمبر 1387، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ جامع الترمذی، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 177۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 5054، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ کا نام ذکر کرے"۔ اللہ تعالیٰ کا نام اگر کسی اعتبار سے ذکر نہ کیا تو شکار نہیں کھایا جائے گا یہ اہل ظاہر اور اہل حدیث کی جماعت کا مذہب ہے۔ ہمارے اصحاب اور دوسرے علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان جس چیز کو شکار کرے اور اسے ذبح کرے اگرچہ بسم اللہ عمداً بھی ترک کردے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ ان علماء نے بسم اللہ کے امر کو ندب پر محمول کیا ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب، عمداً یا سہواً بسم اللہ ترک کرنے کے درمیان فرق ہے فرمایا: عمداً بسم اللہ ترک کرنے کی وجہ سے نہیں کھایا جائے گا اور سہواً ترک کرنے کی وجہ سے کھایا جائے گا۔ یہ فقہاء الامصار کا قول ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے یہ مسئلہ سورۃ الانعام میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پھر شکاری کے ہاتھ سے کتا چھوڑتے وقت اس کا بھاگنا ضروری ہے جب کہ اس کی زمام اس کے ہاتھ میں ہو۔ وہ اس کو چھوڑ دے اور اسے ابھارے اور وہ بھاگے یا کتا شکار کو دیکھنے کے وقت ساکن کھڑا ہوا اور اس کے لیے حرکت نہ ہو مگر شکاری کے ابھارنے کے ساتھ یہ اسی صورت کے قائم مقام ہے جب اس کی زمام اس کے ہاتھ میں ہو پھر اس نے اسے ابھارتے ہوئے چھوڑا ہو یہ ایک قول کے مطابق ہے اگر کتا بغیر چھوڑے اور بغیر ابھارے خود ہی شکار کے پیچھے لگ جائے تو اس کا شکار جائز نہیں اور نہ اس کا کھانا حلال ہے۔ یہ جمہور، امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کا نظریہ ہے، کیونکہ اس نے بغیر چھوڑے اپنے لیے شکار کیا ہے اور اپنے لیے پکڑا ہے، اس میں شکاری کا کوئی دخل نہیں ہے، اس کا چھوڑنا شکاری کی طرف منسوب نہیں ہے کیونکہ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: اذا ارسلت کلبك المعلم (1) "جب تو اپنے سکھائے ہوئے کتے کو چھوڑے"۔ صادق نہیں آتا۔ عطا بن ابی رباح اور اوزاعی نے کہا: اس کا شکار کھایا جائے گا جب اسے شکار کے لیے نکالا ہو۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جمہور علماء نے عَلَّمْتُمْ عین اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن حنفیہ نے عین کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی جوارح کے عمل اور ان کے ساتھ شکار کرنے سے (2) جو تم نے کھایا الجوارح سے مراد، الکواسب (کمانے والے) ہے۔ انسانی اعضاء کو بھی جوارح کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے ذریعے کسی چیز کو حاصل کیا جاتا ہے اور تصرف کیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کو جوارح اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ یہ زخمی کرتے ہیں اور خون بہاتے ہیں۔ یہ ضعیف ہے اہل لغت کا قول اس کے خلاف ہے۔ ابن المنذر نے ایک قول یہ حکایت کیا ہے۔ مکلبین جمہور کی قرأت کاف کے فتحہ اور لام کے شد کے ساتھ ہے۔ المکلِّب کتوں کو سکھانے والا اور انہیں شکار پر برانگیختہ کرنے والا جو کتے کے علاوہ کو سکھاتا ہے اسے مکلِّب کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ حیوان کو روکتا ہے جیسے کتا۔

بعض علماء نے حکایت کیا ہے کہ شکار کو مکلب کہا جاتا ہے اس بنا پر مکلبین کا معنی شکاری لوگ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: المکلب کتوں کے مالک کو کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: کلب فھو مکلب و کلابٌ۔ حسن نے مکلبین کاف کے سکون اور لام کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے اصحاب کلاب۔ کہا جاتا ہے: امشی الرجل۔ جب کسی کے جانور زیادہ ہوں: اکلب۔ جس کے کتے زیادہ ہوں۔ اصمعی نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 145　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 157

كلّ فَتىً وإن أمسَى فأثرىٰ سَتُخلِجه عن الدنيا مَنُونَ

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ مونث ضمیر لفظ جوارح کی رعایت کرتے ہوئے ذکر کی گئی ہے، کیونکہ جوارح، جارحۃ کی جمع ہے۔ اور علماء کے درمیان تعلیم میں دو شرطوں میں کوئی اختلاف نہیں وہ دونوں شرطیں یہ ہیں کہ جب اسے شکار پر حملہ کا حکم دیا جائے تو وہ بھاگ پڑے اور جب اسے منع کیا جائے تو وہ رک جائے۔ کتوں میں ان دو شرطوں میں کوئی اختلاف نہیں اور اسی طرح کتے جیسے دوسرے درندوں کا حکم ہے۔ پرندے جو شکار کرتے ہیں ان میں اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک ان کی تعلیم میں بھی یہ دونوں شرطیں ہیں۔ ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ جھڑکنے سے رک جائے۔ پرندوں میں یہ شرط نہیں، کیونکہ پرندہ غالباً ایسا نہیں کرتا۔ اس میں یہ کافی ہے کہ تو اسے حکم دے تو وہ اطاعت کرے۔ ربیعہ نے کہا: جب اسے بلایا جائے تو وہ آجائے تو وہ معلم ضاری ہے اکثر حیوان طبعاً جب انہیں ابھارا جائے تو وہ بھاگ پڑتے ہیں۔ امام شافعی اور جمہور علماء نے تعلیم میں یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اپنے مالک کے لیے چیز کو پکڑے۔

امام مالک کے مشہور مذہب میں یہ شرط نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: المعلم وہ ہے جب اس کا مالک اسے ابھارے تو وہ بھاگ پڑے اور جب اسے واپس بلائے تو وہ واپس آجائے اور شکار کو مالک کے لیے پکڑ لے اس میں سے خود کچھ نہ کھائے۔ جب وہ کئی مرتبہ اس طرح کرے اہل عرف نے کہا: وہ معلم شمار ہوگا۔ امام شافعی اور کوفیوں سے مروی ہے جب وہ اسے شکار پر ابھارے تو وہ بھاگ پڑے، جب شکار کو پکڑے تو رک جائے اور جب وہ دو مرتبہ اسی طرح کرے تو تیسری مرتبہ اس کا شکار کھایا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تین مرتبہ ایسا کرے اور چوتھی مرتبہ اس کا شکار کھایا جائے گا۔ بعض نے فرمایا: ایک مرتبہ ایسا کرے تو وہ معلم ہے دوسری مرتبہ اس کا شکار کھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 9۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وہ تمہارے لیے شکار کو پکڑیں۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، نخعی، قتادہ، ابن جبیرو، عطا بن ابی رباح، عکرمہ، امام شافعی، امام احمد، اسحق، ابوثور، نعمان اور اس کے اصحاب نے کہا: وہ نہ کھائے۔ اگر شکاری جانور خود کھالے تو بقیہ جانور نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ اس نے وہ اپنے لیے پکڑا ہے اپنے مالک کے لیے نہیں پکڑا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک چیتا کتے کی طرح ہے اور پرندوں میں یہ شرط نہیں لگائی بلکہ وہ جب شکار سے کھا بھی لے تو پھر بھی بقیہ جانور کھایا جائے گا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اس کا معنی ہے اگر وہ کھالے۔ جب شکاری جانور شکار سے کھالے خواہ کتا ہو یا چیتا ہو یا پرندہ ہو اس کا باقی شکار کھایا جائے گا اگرچہ صرف ایک ٹکڑا بھی بچا ہو۔ یہ امام مالک اور ان کے ساتھیوں کا قول ہے اور امام شافعی کا دوسرا قول یہی ہے اور یہی قیاس ہے۔ اس باب میں دو احادیث ہیں، جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث حضرت عدی بن حاتم کی جو کلب معلم میں ہے "جب وہ کھالے تو تو نہ کھا، کیونکہ یہ اس نے اپنے لیے پکڑا ہے (1)" اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ دوسری

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 145

حدیث ابو ثعلبہ خشنی کی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتے کے شکار کے بارے میں فرمایا: ''جب تو اپنے کتے کو چھوڑے اور اس پر اللہ کا نام لے تو کھا اگر چہ اس سے کتے نے کھایا ہو اور جو تیرا ہاتھ تجھ پر لوٹا دے اسے کھا'' (1)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عدی سے جو روایت کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ ان سے صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ جب دونوں روایتیں متعارض ہیں تو ہمارے اصحاب نے ان کو جمع کرنے کا ارادہ کیا انہوں نے نہی والی حدیث کو تنزیہ اور تقویٰ پر محمول کیا اور اباحت کی حدیث کو جواز پر محمول کیا، انہوں نے فرمایا: حضرت عدی چونکہ خوشحال تھا اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رکنے کا اور ورع کا فتویٰ دیا اور حضرت ابو ثعلبہ محتاج تھے تو انہیں جواز کا فتویٰ دیا۔ واللہ اعلم

اس تاویل کی صحت پر دلیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو حضرت عدی کی حدیث میں ہے۔ ''مجھے خوف ہے کہ اس نے اپنے لیے پکڑا ہو''۔ یہ ہمارے علماء کی تاویل ہے۔ ابو عمر نے الاستذکار کتاب میں فرمایا: حضرت عدی کی حدیث، حضرت ابو ثعلبہ کی حدیث کے معارض ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابو ثعلبہ کی حدیث اس کی ناسخ ہے پس ان کا یہ کہنا: اگر چہ وہ کھا بھی لے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر چہ کھا بھی لے''۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، کیونکہ تاریخ مجہول ہے اور جب تاریخ معلوم نہ ہو تو دونوں احادیث کو جمع کرنا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اصحاب شافعی نے کہا: اگر کتا انتہائی بھوک کی وجہ سے کھا گیا تو جانور کھایا جائے گا ورنہ نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ یہ سوء تعلیم سے ہے۔ ایک قوم سے مروی ہے: جس شکار سے کتا اور چیتا کھا لے اس کے درمیان اور باز کے کھانے کے درمیان فرق کیا ہے۔ کتے اور چیتے کے کھانے کے بعد انہوں نے منع کیا ہے اور باز کے کھانے کے بعد اس کی اجازت دی ہے۔ یہ نخعی، ثوری، اصحاب الرائے اور حماد بن ابی سلیمان کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے حکایت ہے انہوں نے کہا: کتے اور چیتے کو مارنا اور جھڑکنا ممکن ہے اور پرندے میں یہ ممکن نہیں اور پرندے کی تعلیم کی حد یہ ہے کہ اسے بلایا جائے تو وہ آ جائے اور اسے شکار پر ابھارا جائے تو وہ اڑ جائے، اس میں اس سے زیادہ ممکن نہیں، مارنا اسے اذیت دے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ درندہ یا کتا جب شکار کا خون پی لے تو شکار کھایا جائے۔ عطا نے کہا: خون کا پینا، کھانا نہیں ہے۔ شعبی اور سفیان ثوری نے اس کا کھانا مکروہ قرار دیا ہے۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ شکار کی اباحت کا سبب کتے یا درندے کا شکار کو کاٹنا ہے اور اس کاٹنے کا یقینی ہونا ضروری ہے اس میں کسی قسم کا شک نہ ہو اور شک کی صورت میں اس کا کھانا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اگر شکاری اپنے کتے کے ساتھ دوسرا کتا پائے تو وہ اس پر محمول ہوگا کہ وہ کسی دوسرے شکاری کی طرف سے نہیں چھوڑا گیا۔ یہ شکار کی طلب میں خود طبعی طور پر بھاگا ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر دوسرے کتے اس کے ساتھ مل جائیں تو پھر نہ کھا'' (2)۔ ایک روایت میں ہے ''تو نے اپنے کتے پر بسم اللہ پڑھی اور دوسرے کتے پر بسم اللہ نہیں پڑھی'' (3)۔ اگر دوسرے شکاری نے کتا چھوڑا ہو پھر دونوں کتے اس شکار میں شریک

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، جلد 2، صفحہ 38　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 145　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 146

ہو گئے ہوں تو وہ شکار دونوں شکاریوں کے لیے ہو گا دونوں اس میں شریک ہوں گے۔ اگر ایک کتے نے اپنے شکار کو چیر پھاڑ دیا ہو پھر دوسرا کتا آجائے تو شکار اس کا ہو گا جس کے کتے نے اسے پہلے پکڑ کر چیر دیا تھا، اسی طرح وہ شکار نہیں کھایا جائے گا جس کو تیر مارا گیا پھر وہ پہاڑ سے نیچے گرا یا پانی میں غرق ہوا تو اسے بھی نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی کو کہا تھا ''اگر تو اپنا تیر پھینکے اور الله کا نام ذکر کرے اگر وہ تجھ سے پورا دن غائب ہو جائے اور تو اس میں اور کچھ نہ پائے مگر اپنے تیر کا اثر تو کھا اگر تو اسے پانی میں غرق پائے تو اسے نہ کھا تجھے معلوم نہیں پانی نے اسے قتل کیا یا تیرے تیر نے'' (1)۔ یہ نص ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اگر شکار کتوں کے منہ میں مر جائے جب کہ انہوں نے اسے زخمی نہ کیا ہو تو اسے نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ وہ دبانے سے مرا ہے یہ کند چھری سے ذبح کرنے کے مشابہ ہے جس میں جانور ذبح میں مر جاتا ہے رگوں کے کاٹنے سے پہلے۔ اگر جوارح سے اس کو لے لینا اور اسے ذبح کرنا ممکن تھا پھر اس نے ذبح نہ کیا حتی کہ شکار مر گیا تو وہ شکار نہیں کھایا جائے گا۔ وہ ذبح میں کوتاہی کرنے والا تھا، وہ ذبح پر قدرت رکھتا تھا اور جو قادر ہو اس کی ذبح، غیر مقدور کی ذبح کے مخالف ہے اگر اس نے شکار کو پکڑا اور چھری نکالنے سے پہلے فوت ہو گیا یا اس نے اسے پکڑا جب کہ چھری اس کے ہاتھ میں تھی پھر بھی اس کا کھانا جائز ہے اگر اس کے ساتھ چھری نہ ہو اور وہ اس کی تلاش میں مشغول ہو تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: شکار کرنے والے جانوروں نے شکار کو پکڑا اور اسے زخمی نہیں کیا تو اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اسے نہیں کھایا جائے گا حتی کہ اسے زخمی کر دیا جائے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ الْجَوَارِحِ یہ ابن القاسم کا قول ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ یہ اشہب کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: اگر کتے کے ٹکرانے سے مر گیا تو بھی کھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر پورا دن شکار غائب رہے پھر تو اس میں کوئی اثر نہ پائے سوائے اپنے تیر کے اثر کے تو تو کھا''۔ اسی طرح ابو ثعلبہ کی حدیث میں ہے جس کو ابو داؤد نے نکالا ہے مگر اس میں زائد ہے، ''تین دن کے بعد کھا جب کہ اس میں بدبو پیدا نہ ہوئی ہو'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کے مخالف ہے كُلْ مَا أَصْمَيْتَ وَدَعْ مَا أَنْمَيْتَ (3) تو کھا جو جلدی سے قتل ہو جائے جب کہ تو اس کو دیکھ رہا ہو اور تو اسے چھوڑ دے جو تجھ سے غائب ہو جائے اور مر جائے جب کہ تو اسے نہ دیکھ رہا ہو۔ کہا جاتا ہے: قد أَنْمَيْتُ الرَّمِيَّةَ فَنَمَت، تَنْمِي۔ جب جانور غائب ہو کر مر جائے۔ امراء القیس نے کہا:

فهو لا تَنْمِي رَمِيَّتُهُ مَالَهُ لَاعُدَّ مِنَ نَفَرِهِ

علماء کا اختلاف ہے غائب شکار کے کھانے میں۔ اس کے متعلق تین اقوال ہیں۔

(۱) اسے کھایا جائے گا خواہ اسے تیرنے قتل کیا ہو یا کتے نے قتل کیا ہو (۲) اس سے کچھ نہیں کھایا جائے گا جب وہ غائب ہو جائے، کیونکہ آپ کا ارشاد ہے: كُلْ ما أصميت و دَعْ ما أَنْمَيْتَ۔ اس کو نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ اندیشہ ہے کہ اس کے قتل پر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 146
2۔ ایضاً۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 12، صفحہ 27

تیر کے علاوہ حشرات الارض نے مدد کی ہو (۳) تیر اور کتے کے شکار میں فرق ہے تیر لگا ہوا گم ہو جائے اور پھر مل جائے تو اسے کھایا جائے گا اور کتے کا شکار ایسی صورت میں نہیں کھایا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیر ایک جہت سے قتل کرتا ہے پس اس میں کوئی اشکال نہیں ہے اور درندہ یا کتا کئی جہات سے قتل کرتا ہے اس میں اشکال ہوتا ہے ہمارے علماء کے تین اقوال ہیں۔ امام مالک نے موطا کے علاوہ میں کہا: جب شکار رات گزارے پھر وہ اسے مردہ پائے تو بازی یا کتا یا تیر نے شکار کو چیر پھاڑ نہ دیا ہو تو اسے نہ کھایا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا: یہ تیری راہنمائی کرتا ہے کہ جب شکار کو پہنچ جائے تو ان کے نزدیک حلال ہے وہ اسے کھائے اگرچہ رات بھی گزر جائے مگر وہ مکروہ فرماتے تھے جب رات گزار لے، کیونکہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اگر تجھ سے شکار ایک رات غائب ہو جائے تو تو نہ کھا۔ اسی طرح ثوری سے مروی ہے فرمایا: جب تجھ سے ایک دن غائب ہو جائے تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قیاس یہ ہے کہ وہ اسے نہ کھائے جب اس سے اس کا گرنا غائب ہو جائے۔ اوزاعی نے کہا: اگر دوسرے دن وہ اسے مردہ پائے اور اس میں اپنے تیر یا کتے کا اثر پائے تو اسے کھائے اسی طرح اشہب، عبدالملک اور اصبغ نے کہا: علماء نے فرمایا: شکار کا کھانا جائز ہے اگرچہ رات گزر جائے جب کہ وہ اپنے شکار کو قتل کر دے۔ حدیث شریف میں ہے "جب تک کہ وہ بدبودار نہ ہو"۔ یہ علت ہے، کیونکہ جب وہ بدبودار ہو جائے تو اسے مستقذرات لاحق ہو جاتی ہیں جن کو طبیعتیں ناپسند کرتی ہیں پس اس کا کھانا مکروہ نہیں ہے اگر اس کو کھالے تو جائز ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متغیر کھانا کھایا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معلل ہے جس سے اس کے کھانے پر ضرر کا خوف ہوتا ہے اس تعلیل پر اس کا کھانا حرام ہوتا ہے اگر خوف محقق ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ یہودی اور نصرانی کے کتے کے ساتھ شکار کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن بصری نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ مجوسی کا کتا، باز اور شکرا اس کے ساتھ شکار کو حضرت جابر بن عبداللہ، حسن، عطا، مجاہد، نخعی، ثوری اور اسحاق نے مکروہ کہا ہے اور ان کے کتوں کے ساتھ شکار کو امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے جائز قرار دیا ہے جب کہ شکار کرنے والا مسلمان ہو۔ ان علماء نے فرمایا: یہ اس کی چھری کی مثل ہے، اور اگر اہل کتاب میں سے شکاری ہو تو امام مالک کے علاوہ جمہور امت اس کے شکار کے جواز کے قائل ہیں اس کے اور اس کے ذبیحہ کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ تلاوت کی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ (المائدہ:94) فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس میں یہودی اور نصرانی کا ذکر نہیں کیا۔ ابن وہب اور اشہب نے کہا: یہودی اور نصرانی کا شکار ان کے ذبیحہ کی طرح حلال ہے اور امام محمد کی کتاب میں صابی کا نہ شکار جائز ہے اور نہ اس کی ذبح جائز ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کے درمیان قوم ہے اور ان کا دین نہیں ہے۔ اور اگر شکاری مجوسی ہو تو اس کے کھانے سے امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور جمہور علماء نے منع کیا ہے۔ ابوثور کے اس میں دو قول ہیں (۱) ان علماء کے قول کی طرح (۲) مجوسی اہل کتاب سے ہے اور ان کا شکار جائز ہے۔ اگر نشہ والا شخص شکار کرے یا ذبح کرے تو اس کا شکار نہیں کھایا جائے گا اور نہ اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا ذبح میں قصد کی ضرورت ہوتی ہے اور نشہ والے کا کوئی قصد نہیں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرھن، باب الرھن فی الحضر، حدیث نمبر 2325، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 15۔** مِمَّاۤ اَمۡسَكۡنَ عَلَيۡكُمۡ کے ارشاد میں من کے بارے میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ اخفش نے کہا: یہ زائدہ ہے جیسے كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ (الانعام: 141) میں ہے۔ بصریوں نے اس کو خطا کہا ہے۔ انہوں نے کہا: من اثبات میں زائد نہیں ہوتا نفی اور استفہام میں زائد کیا جاتا ہے۔ مِنۡ ثَمَرِهٖۤ، يُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ، يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ میں تبعیض کے لیے ہے، اس کا جواب دیا اور کہا: يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ (الصف: 12) (من) کے اسقاط کے ساتھ ہے۔ یہ ایجاب میں اس کی زیادتی پر دلالت کرتا ہے اس کا جواب دیا گیا ہے کہ من یہاں تبعیض کے لیے ہے، کیونکہ شکار میں سے گوشت حلال ہے نہ گوبر اور خون۔

میں کہتا ہوں: یہ مراد نہیں ہے اور کھانے میں معہود نہیں ہے اور جو انہوں نے کہا ہے اس پر اعتراض کیا گیا ہے اور مِمَّاۤ اَمۡسَكۡنَ سے مراد یہ کہ تمہارے لیے جوارح جو باقی چھوڑیں۔ یہ اس کے قول پر ہے جس نے کہا: اگر کتا شکار کھالے تو کوئی نقصان نہیں، اس احتمال کے سبب شکار کے کھانے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے جب شکار سے شکاری جانور کھا بھی لے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16۔** یہ آیت کریمہ کتوں کے رکھنے اور شکار کے لیے کتا پالنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ صحیح سنت میں یہ ثابت ہے اور کھیتی اور جانوروں کی حفاظت کے لیے کتوں کے رکھنے کا سنت نے اضافہ کیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا حتی کہ اس عورت کے پیچھے آنے والے کتے کو قتل کیا جاتا تھا جو عورت دیہات سے آتی تھی۔ مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''جس نے شکاری کتے یا جانوروں کی حفاظت کرنے والے کتے کے علاوہ کتا رکھا ہر روز اس کے اجر سے دو قیراط کم ہوتے ہیں'' (1)۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جانوروں کی حفاظت والے، شکار والے یا کھیتی کی حفاظت کرنے والے کتے کے علاوہ کتا رکھا اس کے اجر سے روزانہ ایک قیراط کم ہوگا'' (2)۔ الزہری نے کہا: حضرت ابن عمر کے لیے حضرت ابوہریرہ کا قول ذکر کیا گیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت ابوہریرہ پر رحم فرمائے۔ وہ کھیتی والے تھے، جو ہم نے ذکر کیا اس پر سنت دلالت کرتی ہے۔ جس نے ان منافع کے علاوہ کے لیے کتا رکھا اس کے اجر سے کمی ہوگی، خواہ مسلمانوں کو کتے کا ڈرانے، بھونکنے کے ساتھ انہیں تشویش میں ڈالنے کی وجہ سے ہو جس طرح بصرہ کے بعض شعراء نے کہا جب کہ وہ عمار میں اترے اور اس کے کتے کی آواز سنی تو کہا:

نزلنا بعمار فأشلى كلابه　　علينا فكدنا بين بيتيه نؤكلُ

فقلت لأصحابي أسِرّ إليهم　　اذا اليومُ أم يومُ القيامهِ أطولُ

یا جس گھر میں کتے ہوتے ہیں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور یا اس کی نجاست کی وجہ سے جیسا کہ امام شافعی کا خیال ہے یا ایسی چیز کے متعلق نہی ہے جس میں منفعت نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

دونوں روایتوں میں سے ایک روایت میں فرمایا ''قیراطان'' (دو قیراط) اور دوسری روایت میں ہے ''قیراط'' (ایک

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقات، جلد 2، صفحہ 21　　2۔ ایضاً

قیراط) اس (2) اس احتمال ہے کہ کتوں کی دو قسمیں ہوں ایک دوسری سے زیادہ سخت قسم ہو جیسے وہ کالا کتا جس کے قتل کرنے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا اور استثنا میں اسے داخل نہیں کیا جب اس کے قتل سے منع فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم پر کالے کتے دو نقطوں والے کو قتل کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ شیطان ہے'' (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جگہ کے اختلاف کی بنا پر ہو مثلاً مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں کتا رکھنا دو قیراط کی کمی کا باعث ہو اور دوسری جگہوں پر ایک قیراط کمی کا باعث ہو۔ واللہ اعلم

اور جو کتا رکھنا مباح ہے اس کے رکھنے سے اجر کم نہیں ہوتا جیسے گھوڑا، بلی، اس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہے حتیٰ کہ سحنون نے کہا: اس کی ثمن کے ساتھ حج کر سکتا ہے۔ اور جانوروں کی حفاظت والا کتا جس کا رکھنا جائز ہے امام مالک کے نزدیک وہ کتا ہے جو جانوروں کے ساتھ چلتا ہے وہ کتا مراد نہیں ہے جو گھر میں چوروں سے حفاظت کرتا ہے اور کھیتی کا کتا اس سے مراد وہ ہے جو رات اور دن میں وحوش سے حفاظت کرتا ہے نہ چوروں سے حفاظت کرنے والا کتا مراد ہے۔ امام مالک کے علاوہ علماء نے جانوروں اور کھیتی کے چوروں سے حفاظت کے لیے کتا رکھنا جائز قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ عالم کے لیے وہ فضیلت ہے جو جاہل کے لیے نہیں ہے، کیونکہ کتا جب سکھایا جاتا ہے تو اسے تمام کتوں پر فضیلت ہوتی ہے پس انسان کو جب علم ہو تو اس کو تمام لوگوں پر فضیلت کا ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا خصوصاً جب وہ اپنے علم کے مطابق عمل کرے۔ یہ اس طرح ہے جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ہر چیز کی قیمت ہے اور انسان کی قیمت وہ ہے جو اسے خوبصورت بنائے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ اس میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: شکار پر کتا چھوڑنے اور شکار کو آگاہ کرنے اور ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا ایک ہے اس کا بیان سورۂ انعام میں آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھنا مراد ہے اور یہ قول اظہر ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر بن ابی سلمہ سے کہا: ''اے غلام! بسم اللہ پڑھ اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اپنے سامنے سے کھا'' (2)۔ حضرت حذیفہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان کھانے کو حلال سمجھتا ہے مگر یہ کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے'' (3)۔ اگر کھانے کی ابتدا میں بسم اللہ بھول جائے تو آخر میں بسم اللہ پڑھے۔ نسائی نے حضرت امیہ بن مخشی سے روایت کیا ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو کھانا کھاتے دیکھا جب کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی جب وہ آخری لقمہ میں تھا تو اس نے کہا: بسم اللہ اولہ وآخرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا رہا پھر جب اس نے بسم اللہ پڑھی تو جو اس نے کھایا تھا اسے قئی کر دیا'' (4)۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ تقویٰ کا حکم دیا اور قریبی اشارہ ان اوامر کی طرف ہے جن کو یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقات والمزارعة، جلد 2، صفحہ 22
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمة، جلد 2، صفحہ 809
3۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، جلد 2، صفحہ 172
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، حدیث 3276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیات اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں اور حساب کی سرعت اس حیثیت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے از روئے علم ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے اور ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے، اسے شمار کرنے اور عقد کی ضرورت نہیں ہے جیسے حساب کرنے والے کرتے ہیں اسی وجہ سے فرمایا: وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝ (انبیاء) اللہ تعالیٰ ایک دفعہ ہی خلائق کا حساب کرلے گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قیامت کے دن کی وعید ہو گویا فرمایا: تمہارے لیے اللہ کا حساب جلدی ہونے والا ہے، کیونکہ قیامت قریب ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حساب سے مراد جزا دینا ہو گویا دنیا میں جلد قریب جزا دینے کی دھمکی دی اگر انہوں نے اللہ کا خوف نہ کیا۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''آج حلال کر دی گئیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں اور کھانا ان لوگوں کا جنہیں دی گئی کتاب حلال ہے تمہارے لیے اور تمہارا کھانا حلال ہے ان کے لیے اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے جب دے دو تم انہیں مہر ان کے پاکباز بنتے ہوئے نہ بدکاری کرتے ہوئے اور نہ چوری چھپے آشنا بناتے ہوئے اور جو انکار کرتا ہے ایمان کا تو بس ضائع ہو گیا اس کا عمل اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا''۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ یعنی الیوم اکملت لکم دینکم و الیوم احل لکم الطیبات۔ تاکید کے لیے اعادہ فرمایا یعنی تمہارے لیے ان پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا جن کا تم نے سوال کیا اور پاکیزہ چیزیں اس آیت کے نزول سے پہلے مسلمانوں کے لیے مباح کی گئی تھیں۔ یہ ان کے سوال کا جواب ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: ہمارے لیے کیا حلال کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلْيَوْمَ کے ذکر سے اشارہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کی طرف ہے جیسے کہا جاتا ہے: ھذہ ایام فلاں یہ فلاں کے ایام ہیں یعنی یہ تمہارے ظہور اور اسلام کے پھیلنے کا وقت ہے، میں نے اس کے ساتھ تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کر دیا۔ اس سے پہلے آیت میں الطیبات کا ذکر گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ یہ مبتدا خبر ہیں۔ الطعام سے مراد ہر وہ چیز جو کھائی جاتی ہے ذبائح اس سے ہیں، اکثر علماء تفسیر کے نزدیک یہاں خاص ذبائح مراد ہیں اور ان کے طعام سے جو ہم پر حرام ہیں وہ عموم الخطاب کے تحت داخل نہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام: 121) نہ کھاؤ اس سے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو پھر استثنیٰ فرمائی۔ فرمایا: وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ

اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ۔ یعنی یہودی اور نصرانی کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے اگرچہ نصرانی ذبح کے وقت مسیح علیہ السلام کا نام اور یہودی یا عزیر کہے۔ کیونکہ وہ اپنی ملت پر ذبح کرتے ہیں۔ عطا نے کہا: نصرانی کے ذبیحہ سے کھاؤ اگرچہ وہ مسیح علیہ السلام کا نام لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذبائح کو مباح قرار دیا اور جو وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ قاسم بن مخیمرہ نے کہا: اس کے ذبیحہ سے کھاؤ اگرچہ وہ سرجس کا نام لے، یہ ان کے کنیسہ کا نام ہے۔ یہ زہری، ربیعہ، شعبی اور مکحول کا قول ہے، اور دو صحابہ حضرت ابودرداء اور حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا: جب تم سنو کہ کتابی اللہ تعالیٰ کے علاوہ ذبح کے وقت کوئی نام لے رہا ہے تو پھر نہ کھاؤ۔ یہی قول صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر کا ہے اور یہی قول طاؤس، حسن کا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الانعام: 121)

امام مالک نے فرمایا: میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ انہوں نے اس کو حرام قرار نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں: تعجب ہے الکیا طبری پر جس نے اہل کتاب کے ذبیحہ کے جواز پر اتفاق حکایت کیا ہے اس نے اس سے استدلال کیا ہے کہ بسم اللہ ذبیحہ میں شرط نہیں ہے، اس نے کہا: اس میں شک نہیں کہ یہودی، نصرانی ذبیحہ پر بسم اللہ نہیں پڑھتے مگر اس معبود کا جو مسیح اور عزیر کی طرح حقیقۃً معبود نہیں ہے اگر وہ حقیقۃً معبود کا نام لیتے تو پھر بھی ان کا یہ نام لینا عبادت کے طریق پر نہ تھا بلکہ وہ ایک دوسرے طریق پر تھا اور بسم اللہ کا شرط ہونا، بغیر عبادت کے سمجھ نہیں آتا اور کافر سے تسمیہ کا وجود اور اس کا عدم برابر ہے، کیونکہ اس سے عبادت کا تصور بھی نہیں، کیونکہ نصرانی مسیح کے نام پر ذبح کرتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً ان کے ذبائح کی حلت کا حکم فرمایا ہے پس اس میں دلیل ہے کہ بسم اللہ اصلاً شرط نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا۔ مزید علماء کے اختلاف کا ذکر سورۂ انعام میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ایسی چیزیں جن میں ذبح کی ضرورت نہیں جیسے کھانا جس میں ذبح نہیں ہوتی اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے جیسے پھل، گندم ان کا کھانا جائز ہے، کیونکہ کسی ایک کا مالک ہونا اس میں مضر نہیں۔ اور وہ کھانا جس میں کسی کا عمل دخل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں اس میں صنعت کی گردش ہوگی اس کے ساتھ دین کا کوئی تعلق نہ ہوگا جیسے آٹے کی روٹی، زیتون کا تیل وغیرہ اگر ذمی سے دور کرے تو یہ اضطراب کی بنا پر ہوگا اور دوسری قسم یہ تذکیہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا یہ دین اور نیت کا محتاج ہے جب قیاس یہ تھا کہ ان کے ذبائح جائز نہیں ہیں جیسے تو کہتا ہے نہ ان کی نماز ہے اور نہ ان کی مقبول عبادت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ان کے ذبائح میں رخصت دی ہے نص نے قیاس سے خارج کر دیا جیسا کہ ہم نے حضرت ابن عباس کے قول سے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جس چیز کو وہ ذبح کریں اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ کیا جو چیز ان پر حرام ہے ان میں ذبح کا عمل ہو گا یا نہیں؟ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ ذبح ہر ذبیحہ میں عامل ہے اس میں سے جو حلال ہے اور جو اس پر حرام ہے، کیونکہ وہ ذبح کرنے والا ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے کہا: ہمارے لیے ان کے ذبیحہ سے وہ حلال ہے جو ان کے لیے حلال ہے،

کیونکہ جوان کے لیے حلال نہیں ہے اس میں ان کا ذبح کرنا بھی عمل نہیں کرتا۔ اس گروہ نے ایسے جانور کو کھانے سے منع کیا ہے جس کا گردہ خراب ہو اور خالص چربی جو اہل کتاب کے ذبائح سے ہو لفظ طعام کو انہوں نے بعض طعام پر مقصور کیا ہے اور پہلے طائفہ نے عموم پر اس کو محمول کیا ہے وہ تمام چیزیں جو کھائی جاتی ہیں سب کو طعام کا لفظ شامل ہے یہ اختلاف امام مالک کے مذہب میں بھی موجود ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے یہود کی چربی کو مکروہ کہا ہے اور اونٹوں میں جو وہ نحر کریں اسے کھانا بھی مکروہ کہا ہے۔ اکثر علماء اس میں حرج نہیں دیکھتے سورۂ انعام میں مزید بیان آئے گا۔ امام مالک اہل کتاب کے ذبیحہ کو مکروہ قرار دیتے تھے جب مسلمان کا ذبیحہ موجود ہو اور ان کے لیے ایسے بازاروں کا ہونا بھی مکروہ قرار دیا ہے جن میں وہ اپنے ذبائح فروخت کریں۔ یہ ان کی طرف سے تنزہ اور تقویٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مجوس کے بارے میں علماء کا اجماع ہے سوائے ان علماء کے جو جماعت سے جدا ہوئے کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا نہ ان سے نکاح کیا جائے گا، کیونکہ علماء کے مشہور مذہب پر یہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں جن کے لیے کتاب نہیں ہے جیسے مشرکین، بت پرست جب کہ وہ کھانا ان کے ذبائح سے نہ ہو اور اس کے تزکیہ کی ضرورت نہ ہو سوائے جبن (پنیر) کے، کیونکہ اس میں مردار کا اوجھ ہوتا ہے۔ اگر بچے کا باپ مجوسی ہو اور ماں کتابی ہو تو اس کا حکم امام مالک کے نزدیک اس کے باپ والا ہوگا اور دوسرے علماء کے نزدیک بچہ کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا جب اس کے والدین میں سے کوئی ایک ایسا ہو جس کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ نصاریٰ بنی تغلب کا ذبیحہ اور ہر وہ شخص جو یہودیت اور نصرانیت میں داخل ہے ان کے ذبائح کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ منع کرتے تھے، کیونکہ بنی تغلب عرب تھے، آپ فرماتے تھے: انہوں نے نصرانیت سے سوائے شراب پینے کے کچھ نہیں لیا۔ یہ امام شافعی کا قول ہے، اس بنا پر نصاریٰ کے ذبائح سے منع نہیں کیا جاتا جو ان میں سے یقینی نصرانی ہیں۔ جمہور علماء نے کہا: ہر نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ وہ بنی تغلب سے ہو یا کسی اور قبیلہ سے ہو۔ اسی طرح یہود کا حکم ہے۔ حضرت ابن عباس نے **وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ** (المائدہ: 51) سے حجت پکڑی ہے اگر بنی تغلب نصاریٰ میں سے نہ ہوتے مگر ان کی دوستی کی وجہ سے تو ان کے ذبائح کھائے جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ تمام کفار کے برتنوں میں کھانے، پینے، پکانے میں کوئی حرج نہیں جب کہ وہ سونے، چاندی اور خنزیر کی جلد سے نہ ہوں، لیکن ان کے برتن دھونے کے بعد استعمال کیے جائیں گے، کیونکہ وہ نجاستوں سے نہیں بچتے اور مردار کھاتے ہیں، جب وہ ان ہانڈیوں میں پکاتے ہیں تو وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے اور بعض اوقات نجاسات مٹی کی ہانڈیوں کے اجزاء میں سرایت کر جاتی ہیں جب اس کے بعد اس ہانڈی میں کوئی چیز پکائی جائے گی تو اس نجس اجزاء کے ہانڈی میں پکائی جانے والی چیز سے ملنے کا اندیشہ ہے پس تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے بچا جائے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اگر برتن نحاس (تانبے) یا لوہے کا ہو تو اسے دھویا جائے گا اور اگر برتن مٹی کا ہو تو اس میں پانی ابال کر دھویا جائے گا یہ اس صورت میں ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ اور وہ

برتن جو پکانے کے لیے استعمال نہیں ہوتے ان کو بغیر دھوئے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ دار قطنی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نصرانی کے گھر میں لکڑی کے برتن میں وضو کیا اور یہ صحیح ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۃ الفرقان میں آئے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ثعلبہ خشنی سے مروی ہے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم اہل کتاب قوم کی زمین میں ہوتے ہیں ہم ان کے برتنوں میں کھاتے ہیں اور شکار والی زمین میں ہوتے ہیں میں اپنی کمان کے ساتھ شکار کرتا ہوں اور اپنے سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ شکار کرتا ہوں اور اپنے اس کتے کے ساتھ شکار کرتا ہوں جو سدھایا ہوا نہیں ہوتا آپ مجھے بتائیں ان میں سے کون سی چیز میرے لیے حلال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو تو نے اہل کتاب کی قوم کی زمین کا ذکر کیا ہے کہ تم وہاں ہوتے ہو اور ان کے برتنوں میں کھاتے ہو، اگر تو تم ان کے برتنوں کے علاوہ کوئی چیز پاؤ تو تم ان میں نہ کھاؤ اگر کوئی اور برتن نہ پاؤ تو ان کے برتنوں کو دھوؤ پھر ان میں کھاؤ“ (1)۔ پھر مکمل حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ** یہ آیت دلیل ہے کہ وہ ہماری شرع کی تفصیل کے مخاطب ہیں یعنی جب وہ ہم سے گوشت خریدیں تو ان کے لیے وہ حلال ہے اور ہمارے لیے ان کی ثمن حلال ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ** اس آیت کا معنی سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ **وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ** سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مملکت اسلامیہ میں ہوں نہ کہ دار الحرب میں ہوں پس یہ اہل کتاب کی ان عورتوں کے ساتھ خاص ہوگا جو مملکت اسلامیہ میں ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت کے عموم کی وجہ سے ذمیہ، حربیہ ہر ایک سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: **اَلْمُحْصَنٰتُ** سے مراد پاک دامن، عقل مند عورتیں ہیں۔ شعبی نے کہا: جو اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتی ہو اور بدکاری نہ کرتی ہو اور غسل جنابت کرتی ہو۔ شعبی نے **اَلْمُحْصِنٰتُ** صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور کسائی نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ مجاہد نے کہا: **اَلْمُحْصَنٰتُ** سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ ابو عبید نے کہا: ان کا نظریہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح کرنا حلال نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ** (النساء: 25) یہ وہ قول ہے جس پر بڑے بڑے علماء کا نظریہ قائم ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ**۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ** تو اہل کتاب کی عورتوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ ہمارے دین سے راضی نہ ہوتا تو ہمارے لیے ہمارے نکاح مباح نہ فرماتا، تو یہ آیت نازل ہوئی **وَمَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ** یعنی جس نے اس کا انکار کیا جو حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔ ابو الہیثم نے کہا: الباء صلہ ہے یعنی ومن یکفر الایمان یعنی یجحدہ۔ جس نے ایمان کا انکار کیا **فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ** (المائدہ: 5) ابن السمیقع نے فقد حبط با کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب فرائض اور احکام ذکر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 146۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 5065، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیے گئے تو ان کا قیام لازم تھا اور اس کی مخالفت پر وعید ذکر کی گئی، کیونکہ ان کے ضائع کرنے پر زجر کی تاکید اس میں ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ معنی یہ ہے ومن یکفر باللہ جس نے اللہ کا انکار کیا۔ حسن بن فضل نے کہا: اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا معنی ہے برب الایمان۔ شیخ ابوالحسن اشعری نے کہا: اللہ تعالیٰ کو ایمان کہنا جائز نہیں مگر حشویہ اور سالمیہ فرقوں کا قول اس کے خلاف ہے، کیونکہ ایمان آمن، یومن ایمانا کا مصدر ہے اور اس سے اسم فاعل مومن ہے الایمان کا معنی تصدیق ہے اور تصدیق نہیں ہوتی مگر کلام اور باری تعالیٰ کا کلام ہونا جائز نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لیے تو (پہلے) دھولو اپنے چہرے اور اپنے بازو کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور دھولو اپنے پاؤں ٹخنوں تک اور اگر ہو تم جنبی تو سارا بدن پاک کرلو اور اگر ہو تم بیمار یا سفر پر یا آئے کوئی تم میں سے قضاء حاجت کے بعد یا صحبت کی ہو تم نے عورتوں سے پھر نہ پاؤ تم پانی تو تیمم کرو پاک مٹی سے یعنی مسح کرلو اپنے چہروں اور اپنے بازوؤں پر اس سے نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ کہ رکھے تم پر کچھ تنگی بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ خوب پاک صاف کرے تمہیں اور پوری کردے اپنی نعمت تم پر تاکہ تم شکریہ ادا کرتے رہو''۔

اس میں بتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قشیری اور ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عائشہ کے واقعہ میں نازل ہوئی جب غزوہ المریسیع میں آپ کا ہار گم ہوگیا تھا، یہ آیت وضو ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: لیکن اس حیثیت سے کہ وضو ان کے نزدیک ثابت تھا اور مستعمل تھا تو اس آیت نے اس میں ان کے لیے کچھ زیادتی نہ کی مگر اس کی تلاوت، انہیں تیمم میں رخصت کا فائدہ دیا (1)۔ ہم نے سورۃ النساء کی آیت میں اس کے خلاف ذکر کیا۔ واللہ اعلم۔

اس آیت کا مضمون داخل ہے جو عہد کی وفا اور احکام شرع کی تابعداری کا حکم دیا گیا ہے اور جو اس میں نعمت کو مکمل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے یہ رخصت نعمت کی تکمیل سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کے مراد میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک جماعت نے کہا: یہ لفظ نماز کے ہر قیام کو شامل ہے خواہ وہ قائم پاک ہو یا محدث ہو، پس اس کے لیے مناسب ہے کہ جب نماز کے قیام کے لیے کھڑا ہو تو وضو کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے۔ ابو محمد دارمی نے اپنی مسند

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 160

میں یہ ذکر کیا ہے، اس کی مثل عکرمہ نے روایت کیا ہے۔ ابن سیرین نے کہا: خلفاء ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت محکمہ ہے اس میں نسخ نہیں ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ حضرت عبد اللہ بن حنظلہ بن ابی عامر نے کہا: نبی کریم ﷺ کو ہر نماز کے وقت وضو کرنے کا حکم دیا گیا تھا، پس آپ پر یہ شاق گزرا تو آپ کو مسواک کا حکم دیا گیا وضو کا حکم اٹھالیا گیا مگر حدث کی صورت میں۔ حضرت علقمہ بن فغواء نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے وہ صحابہ میں سے تھے اور یہ تبوک کی طرف دلیل (راہنما) تھے یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی رخصت کے لیے نازل ہوئی کیونکہ آپ کوئی عمل نہیں کرتے تھے مگر باوضو ہو کر، نہ کسی سے بغیر وضو کے کلام کرتے تھے، نہ کسی کو بغیر وضو کے سلام کا جواب دیتے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے آگاہ فرمایا کہ وضو صرف نماز کے قیام کے لیے ہے دوسرے اعمال کے لیے وضو نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس آیت سے مراد فضیلت طلب کرنے کے لیے ہر نماز کے لیے وضو ہے۔ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے حتیٰ کہ فتح مکہ کے روز ایک وضو کے ساتھ پانچوں نمازوں کو جمع کیا تا کہ امت کے لیے مسئلہ بیان ہو جائے کہ ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھنا جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ نسخ کے ورود سے پہلے ہر نماز کے لیے وضو مستحب تھا واجب نہ تھا حالانکہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جب کوئی امر وارد ہوتا ہے تو اس کا مقتضا وجوب ہوتا ہے خصوصاً صحابہ کرام کے نزدیک جیسا کہ ان کی سیرت سے معروف ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: پہلے ہر نماز کے لیے وضو فرض تھا پھر فتح مکہ کے موقع پر منسوخ ہو گیا۔ یہ حضرت انس کی حدیث کی وجہ سے غلط ہے انہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے اور آپ ﷺ کی امت کا حکم اس سے مختلف تھا۔ یہ حدیث آگے آئے گی۔

اور حضرت سوید بن نعمان کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صہباء کے مقام پر ایک وضو کے ساتھ عصر اور مغرب کی نمازیں پڑھیں اور یہ غزوہ خیبر میں تھا اور یہ سن 6 ہجری تھا۔ بعض نے کہا: سات ہجری تھا اور فتح مکہ آٹھ ہجری میں تھا۔ یہ حدیث صحیح ہے جسے امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا تھا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے بھی تخریج کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے ظاہر ہو گیا کہ فتح مکہ سے پہلے ہر نماز کے لیے وضو فرض نہیں تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلم نے حضرت بریدہ بن الحصیب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے جب فتح مکہ کا دن تھا تو آپ نے ایک وضو کے ساتھ (پانچ) نمازیں پڑھیں اور خفین پر مسح کیا، حضرت عمر نے کہا: حضور! آج آپ نے ایسا کام کیا ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! یہ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے (1)۔ حضرت عمر نے یہ سوال کیوں کیا تھا اور یہ استفسار کیوں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ خیبر کی نماز سے لے کر آج تک جو نماز پڑھتے تھے اس کی عادۃً مخالفت تھی۔ ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے خواہ آپ طاہر ہوتے یا غیر طاہر ہوتے، حمید نے کہا: میں نے حضرت انس سے پوچھا: تم کیسے کرتے تھے؟ حضرت انس نے کہا: ہم ایک وضو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارات، جلد 1، صفحہ 135

کرتے تھے(1)۔ ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''وضو پر وضو نور ہے(2)'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے۔ ایک شخص نے آپ پر سلام کیا جب کہ آپ پیشاب کر رہے تھے آپ نے اسے جواب نہ دیا حتی کہ تیمم کیا پھر سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''میں ناپسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کا ذکر کروں مگر طہارت پر''۔ اس حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ سدی اور زید بن اسلم نے کہا: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کا معنی یہ ہے کہ جب تم بستروں سے اٹھ کر نماز کا ارادہ کرو۔ اس تاویل سے مقصود تمام احداث کو شامل کرنا ہے خصوصاً نیند جس کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ فی نفسہ حدث ہے یا نہیں۔ اس تاویل پر آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے یایھا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوۃ من النوم او جاء احد منکم من الغائط اولا مستم النساء فاغسلوا۔ اے ایمان والو جب تم نیند سے نماز کی طرف کھڑے ہو یا تم میں سے کوئی پائخانہ سے آئے یا عورتوں کو چھوئے، تو غسل کرو۔ محدث جسے حدث اصغر لاحق ہوتا ہے اس کے احکام مکمل ہوئے پھر فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا یہ ایک دوسرا حکم ہے پھر دونوں نوعوں کے لیے اکٹھا فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ یہ تاویل محمد بن مسلمہ نے کی ہے جو امام مالک کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اور جمہور علماء نے فرمایا: آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم نماز کی طرف کھڑے ہو جب کہ تم حدث کی حالت میں ہو۔ آیت میں اس بنا پر تقدیم و تاخیر نہیں ہے بلکہ آیت میں پانی پانے والے پر حکم مرتب ہوا ہے فَاطَّهَّرُوْا کے قول تک ملامست صغریٰ محدثین (حدث والے) میں داخل ہے پھر وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا کے قول کے بعد دونوں قسموں میں سے پانی نہ پانے والے کا حکم ذکر کیا۔ ملامست سے مراد جماع ہے ایسا جنبی جو پانی کو نہ پانے والا ہو جس طرح اس کا ذکر ضروری ہے اسی طرح پانی پانے والے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ تاویل امام شافعی وغیرہ کی ہے اس کے مطابق صحابہ کے اقوال ہیں جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابن عباس، حضرت ابو موسیٰ اشعری وغیرہم (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں تاویلیں ان تمام تاویلات سے بہتر ہیں جو اس آیت کے متعلق کی گئی ہیں، واللہ اعلم۔ اِذَا قُمْتُمْ کا معنی ہے جب تم ارادہ کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ (النحل:98) یعنی جب تو ارادہ کرے۔ کیونکہ نماز کی طرف قیام کی حالت میں وضو کرنا ممکن نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ اللہ تعالیٰ نے چار اعضاء کا ذکر فرمایا: چہرہ، اس کا فرض دھونا ہے اور اسی طرح دونوں ہاتھوں کا حکم ہے، سر، اس کا فرض مسح ہے، اس پر اتفاق ہے۔ پاؤں کے بارے اختلاف ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کے علاوہ کچھ ذکر نہیں کیا۔ یہ دلیل ہے کہ اس کے علاوہ سب آداب اور سنن ہیں۔ واللہ اعلم۔ چہرے کے دھونے میں چہرے کی طرف پانی کا نقل کرنا ضروری ہے اور چہرے پر ہاتھوں کا گزارنا ضروری ہے ہمارے نزدیک یہی غسل

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارات، جلد 1، صفحہ 10　　2۔ اتحاف السادۃ المتقین، اسرار الطہارۃ، جلد 2، صفحہ 595

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 160

کی حقیقت ہے۔ ہم نے سورۃ النساء میں اس کو بیان کیا ہے۔ ہمارے علاوہ دوسرے علماء نے کہا: اس پر پانی کا بہانا واجب ہے اور ہاتھ سے ملنا واجب نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی شخص پانی میں غوطہ لگائے چہرہ اور ہاتھ ڈوب جائیں اور وہ اسے ملے نہیں، تو کہا جائے گا: اس نے چہرے اور ہاتھوں کو دھویا۔ معلوم ہے کہ اسم کے حصول کے علاوہ کا اس میں اعتبار نہیں جب وہ حاصل ہو جائے تو کافی ہوتا ہے۔ لغت میں الوجہ، المواجهة سے ماخوذ ہے یہ ایک عضو ہے جو کئی اعضاء پر مشتمل ہے اس کا طول اور عرض ہے طول میں اس کی حد پیشانی کی سطح کی ابتدا سے جبڑوں کی انتہا تک ہے اور عرضا ایک کان سے دوسرے کان تک ہے۔ یہ تو امرد (بے ریش) کے لیے ہے، رہا داڑھی والا جب اس کی ٹھوڑی پر بال ہوں تو وہ یا تو خفیف ہوں گے یا کثیف ہوں گے اگر داڑھی خفیف ہو جس سے جلد ظاہر ہوتی ہو تو جلد تک پانی پہنچانا واجب ہے اور اگر داڑھی گھنی ہو تو فرض اس کی طرف منتقل ہوگا جیسے سر کے بال ہیں پھر وہ بال جو ٹھوڑی سے زائد ہیں اور داڑھی سے لٹکے ہوئے ہیں۔ سحنون نے ابن القاسم سے روایت کیا کہ میں نے امام مالک سے سنا ان سے پوچھا گیا: کیا آپ نے کسی اہل علم سے سنا ہے کہ داڑھی چہرے سے ہے اس پر پانی گزارنا چاہیے؟ امام مالک نے کہا: ہاں اور وضو میں اس کا خلال کرنا لوگوں کے امر سے نہیں ہے اس پر عیب لگایا جس نے ایسا کیا۔ ابن القاسم نے امام مالک سے یہ بھی روایت کیا ہے فرمایا: وضو کرنے والا اپنی داڑھی کے ظاہر کو حرکت دے اس میں ہاتھ داخل کیے بغیر۔ فرمایا: یہ پاؤں کی انگلیوں کی مثل ہے۔ ابن عبد الحکم نے کہا: داڑھی کا خلال کرنا وضو اور غسل میں واجب ہے۔ ابو عمر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داڑھی کا وضو میں خلال کیا۔ اس حدیث کے تمام طرق ضعیف ہیں۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ علماء کا اتفاق ہے یہ وضو میں داڑھی کا خلال کرنا واجب نہیں ہے مگر ایک روایت سعید بن جبیر سے مروی ہے ان کا قول ہے: کیا وجہ ہے کہ داڑھی اگنے سے پہلے داڑھی کو دھوتا ہے اور جب داڑھی اگ آتی ہے تو اسے نہیں دھوتا؟ کیا وجہ ہے کہ مرد اپنی ٹھوڑی کو دھوتا ہے اور داڑھی والا نہیں دھوتا؟ امام طحاوی نے فرمایا: تیمم واجب ہے اس میں جلد کا مسح کرنا ہے چہرے میں بال اگنے سے پہلے۔ پھر تمام علماء کے نزدیک داڑھی اگنے کے بعد جلد کا مسح ساقط ہو جاتا ہے، اسی طرح وضو کا حکم ہے۔ ابو عمر نے کہا: جس نے تمام داڑھی کا دھونا واجب قرار دیا ہے اس نے اسے چہرے میں شمار کیا ہے، کیونکہ وجہ، المواجہہ سے ماخوذ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مطلقاً وجہ (چہرہ) دھونے کا حکم دیا ہے اس سے امرد سے داڑھی والے کو خاص نہیں کیا پس ظاہر قرآن کے مطابق اس کا دھونا واجب ہے، کیونکہ وہ جلد کا بدل ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول کو ابن عربی نے اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: اور میں بھی یہی کہتا ہوں کیونکہ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داڑھی مبارک کو دھوتے تھے (1)۔ اس کو ترمذی وغیرہ نے تخریج کیا ہے، فعل کے ساتھ محتمل متعین ہو گیا۔ ابن المنذر نے اسحاق سے روایت کیا ہے کہ جس نے داڑھی کا خلال جان بوجھ کر ترک کیا وہ اعادہ کرے۔ ترمذی نے حضرت عثمان بن عفان سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داڑھی مبارک کا خلال کرتے تھے۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ ابو عمر نے کہا: اور جنہوں نے داڑھی کے لٹکے ہوئے بالوں کا دھونا واجب قرار نہیں دیا ان کا نظریہ یہ ہے کہ اصل جس کا حکم دیا وہ ہے جلد

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 563
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارات، جلد 1، صفحہ 6

کا دھونا۔ پس جلد کے اوپر جو ظاہر ہے اس کا دھونا بھی واجب ہے اور داڑھی سے جو لٹکے ہوئے بال ہیں اس کے نیچے والے حصہ کا دھونا واجب نہیں ہے، پس داڑھی کا دھونا اس کا بدل ہے۔ ان کے سامنے رخسار پر جو کان تک بال ہیں ان کے دھونے میں اختلاف ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: جو کان پٹی سے پیچھے جو داڑھی کے بالوں کے پیچھے بال ہیں وہ چہرے سے نہیں ہیں۔ ابو عمر نے کہا: میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے ایسا قول کیا ہو جو ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: کان اور اس کے مقابل رخسار کے بالوں کے درمیان جو سفیدی ہے وہ چہرے سے ہے اس کا دھونا واجب ہے، اسی طرح امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سفیدی کا دھونا مستحب ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس کا دھونا واجب نہیں مگر امرد کے لیے نہ کہ داڑھی والے کے لیے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ قاضی عبد الوہاب کا مختار قول ہے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کیا اس پر مواجہۃ کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ واللہ اعلم۔ اس احتمال کے سبب علماء کا اختلاف ہے کیا چہرہ دھونے کا امر ناک اور منہ کے اندر کو دھونے کو شامل ہے یا نہیں؟ امام احمد بن حنبل اور اسحق وغیرہما کا نظریہ یہ ہے کہ وضو اور غسل میں منہ اور ناک کے اندر کا دھونا واجب ہے مگر امام احمد نے کہا: جو وضو میں ناک میں پانی ڈالنے کو ترک کر دے وہ اعادہ کرے اور جس نے کلی کو ترک کیا وہ اعادہ نہ کرے۔ عامۃ الفقہاء کا نظریہ یہ ہے کہ وضو اور غسل میں یہ دونوں سنت ہیں، کیونکہ دھونے کا حکم ظاہر کو شامل ہے باطن کو شامل نہیں اور عرب وجہ اس کو کہتے ہیں جو سامنے ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کو اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا اور نہ مسلمانوں سے ان کو واجب کہا ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے اور فرائض صرف ان صورتوں میں ثابت ہوتے ہیں۔ یہ معنی سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

اور رہی آنکھیں تو ان پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آنکھوں کے اندر کا حصہ کا دھونا لازم نہیں مگر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں میں پانی چھڑکتے تھے (2)، ان کا دھونا ساقط ہے تکلیف کی وجہ سے اور حرج کی وجہ سے (3)۔ ابن عربی نے کہا: اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن عمر جب نابینا ہو گئے تھے تو وہ اپنی آنکھوں کو دھوتے تھے، کیونکہ اس سے ان کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ جب چہرہ کے حکم سے یہ ثابت ہو گیا تو سر میں سے کچھ حصہ بھی چہرہ کے ساتھ دھونا ضروری ہے جس طرح سر کے عموم کے وجوب کے قول پر چہرے میں سے سر کے ساتھ کسی جز کا مسح کرنے سے مقدر نہیں ہوتا، اصول فقہ میں سے ایک اصل پر مبنی ہے وہ یہ کہ جس چیز کے بغیر واجب مکمل نہ ہوتا ہو اس کا حکم بھی واجب ہوتا ہے واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وضو میں نیت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: انما الاعمال بالنیات (4)۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور احکام داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل: 84) یعنی ہر شخص اپنی نیت پر عمل کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیکن جہاد اور نیت باقی ہے'' (5)۔ اکثر شوافع نے فرمایا: نیت کی ضرورت نہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 563 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 161 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 563
4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 2 5۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2575، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ احناف کا قول ہے انہوں نے کہا: نیت واجب نہیں ہے مگر ان فروض میں جو مقصود بالذات ہیں اور کسی غیر کا سبب نہیں، پس رہی وہ چیزیں جو کسی دوسرے فعل کی صحت کے لیے شرط ہیں پس وہ امر کے ورود سے واجب نہیں مگر اس دلالت سے جو اس سے متصل ہے۔ طہارت شرط ہے، کیونکہ جس پر نماز فرض نہیں اس پر طہارت کا فرض بھی واجب نہیں جیسے حیض اور نفاس والی عورتیں۔ ہمارے علماء اور بعض شوافع نے اس ارشاد: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ سے دلیل پکڑی ہے پس جب غسل کا فعل واجب ہوا تو نیت فعل کی صحت میں شرط تھی، کیونکہ اللہ کی طرف سے فرض تھا پس جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اس فعل کا واجب ہونا مناسب ہے۔ جب ہم کہتے ہیں: اس پر نیت واجب نہیں اس پر اس فعل کا قصد واجب نہیں جس کا اللہ نے اسے حکم دیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرے کسی اور غرض کے لیے غسل کرے اس نے واجب کی ادائیگی کا قصد کیا۔ حدیث میں صحیح ہے کہ وضو گناہوں کو مٹاتا ہے اگر یہ بغیر نیت کے صحیح ہوتا تو گناہوں کو نہ مٹاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینہ: 5) نہیں حکم دیا گیا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن عربی نے کہا: بعض علماء نے کہا: جو شخص غسل کی نیت سے نہر کی طرف نکلا تو یہ نیت اس کے لیے کافی ہوگی اگر راستے میں اس کی نیت جدا ہو گئی۔ اگر حمام کی طرف نکلا اور راستہ میں اس کی نیت جدا ہو گئی تو اس کی نیت باطل ہوگی۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: کم سمجھ مفتیوں نے اس پر یہ قائم کیا کہ نماز کی نیت ہم دو قولوں پر نکالتے ہیں اور انہوں نے اس میں ایک نص ان سے ذکر کی ہے جو ظن اور یقین میں فرق نہیں کرتا اس نے کہا: تکبیر پر نیت کو مقدم کرنا جائز ہے۔ تعجب ہے اس گروہ پر جس نے مفتی اور مجتہد ہونے کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اسے نہ توفیق دی اور نہ درست سمت لگایا۔ جان لو اللہ تم پر رحم فرمائے۔ وضو میں نیت کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے جب یہ اتفاق کے مرتبہ سے گر گئی تو بعض مواقع میں اس کی تقدیم کو چھوڑا گیا ہے، رہی نماز تو اس میں ائمہ میں سے کسی کا اختلاف نہیں۔ یہ اصل مقصود ہے پس اصل مقصود متفق علیہ کو فرع تابع مختلف فیہ پر کیسے محمول کیا جائے گا یہ تو انتہائی عبادت ہے اور رہا روزہ شرع نے اس میں حرج کو اٹھا دیا ہے جب اس کی ابتدا نیت کی تقدیم سے غفلت کے وقت میں ہو (1)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ علماء کا مرافق کے تحدید میں داخل ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک قوم نے کہا: مرافق (کہنیاں) داخل ہیں، کیونکہ (الی) کا مابعد جب ماقبل کی جنس سے ہو تو وہ اس میں داخل ہوتا ہے یہ سیبویہ وغیرہ نے کہا ہے۔ سورۃ البقرہ میں واضح طور پر گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دھونے میں کہنیاں داخل نہیں ہیں۔ دونوں روایتیں امام مالک سے مروی ہیں، دوسری روایت اشہب کی ہے، پہلی روایت اکثر علماء کا نظریہ ہے اور وہ صحیح ہے، کیونکہ دارقطنی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر پانی پھیرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: الی بمعنی مع ہے جیسے عربوں کا قول ہے الذود الی الذود ابل۔ اس میں الی بمعنی مع ہے۔ یہ اس کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 567

محتاج نہیں جیسا کہ ہم نے سورۃ النساء میں بیان کیا ہے۔ ہاتھ عربوں کے نزدیک انگلیوں سے لے کر کندھے تک ہے، اسی طرح پاؤں انگلیوں سے لے کر ران تک ہے اور کبھی الید (ہاتھ) کے اسم کے تحت داخل ہے اگر مع المرافق کا معنی ہوتو مفید نہیں جب الی فرمایا کبھی قطعی طور پر غسل میں داخل ہوگئی اور کبھی ناخنوں تک مغسولۃ رہی۔ یہ کلام صحیح ہے لغت اور معنی اصول پر جاری ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: مسئلہ کو قاضی ابو محمد نے علیحدہ سمجھا ہے کہ انہوں نے کہا: الی المرافق ہاتھوں میں سے متروک کی حد ہے نہ کہ مغسول کے لیے حد ہے اسی وجہ سے کہنیاں غسل میں داخل ہیں۔

میں کہتا ہوں: جب ہاتھ اور پاؤں کا اطلاق لغت میں اس پر ہوتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ بغلوں تک ہاتھ اور پنڈلیوں تک پاؤں دھوتے تھے۔ فرماتے ہیں: میں نے اپنے خلیل ﷺ کو یہ کہتے سنا ''مومن کا زیور وہاں تک ہوگا جہاں تک وضو پہنچتا ہے'' (1)۔ قاضی عیاض نے کہا: لوگوں کا اس کے خلاف پر اجماع ہے کہ وضو میں اس کی حدود سے تجاوز نہ کرے، کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''جس نے زیادہ کیا اس نے تعدی اور ظلم کیا'' (2)۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ حضرت ابو ہریرہ کا فعل ان کا مذہب تھا اور وہ اس کے ساتھ منفرد تھے انہوں نے یہ نبی کریم ﷺ سے حکایت نہیں کیا ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد انتم الغر المحجلون اور تبلغ الحلیۃ سے استنباط کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے کہ مسح لفظ مشترک ہے، رہا سر اس عضو سے عبارت ہے جس کو لوگ ضرورۃً جانتے ہیں اس میں سے چہرہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے وضو میں اس کا ذکر فرمایا اور چہرہ کو غسل کے لیے متعین فرمایا تو باقی حصہ مسح کے لیے بچ گیا اگر غسل کا ذکر نہ ہوتا تو سر اور چہرہ سب کا مسح کرنا لازم ہوتا یعنی سر کے بال، آنکھیں، ناک، منہ سب کا مسح لازم ہوتا۔ امام مالک نے سر کے مسح کے وجوب میں اس چیز کی طرف اشارہ کیا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو وضو میں سر کا بعض حصہ ترک کر دیتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر کوئی چہرہ کا بعض حصہ دھونے سے چھوڑ دے تو کیا جائز ہوگا؟ اسی سے واضح ہوا جو ہم نے ذکر کیا کہ دونوں کان سر سے ہیں اور ان کا حکم، سر کا حکم ہے۔ زہری کا قول اس کے خلاف ہے انہوں نے کہا: یہ دونوں چہرہ سے ہیں چہرہ کے ساتھ ان کو دھویا جائے گا۔ امام شعبی کا قول اس کے خلاف ہے اس نے کہا: کانوں کا جو آگے والا حصہ ہے وہ چہرہ سے ہے اور کانوں کا ظاہر سر سے ہے۔ الرأس (سر) کو راس اس کے علو کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور اس میں بالوں کے اگنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اسی سے راس الجبل (پہاڑ کی چوٹی) ہے ہم نے کہا کہ سر جملہ اعضاء کا نام ہے کیونکہ شاعر کا قول ہے:

إذا احتملوا رأسی وفی الرأس أکثری وغُودِر عند المُلْتَقَی ثم سَائِرِی

**مسئلہ نمبر 8**۔ سر کے مسح کی تقدیر میں علماء کے گیارہ اقوال ہیں۔ تین اقوال امام ابوحنیفہ کے ہیں، دو قول امام شافعی کے ہیں اور چھ اقوال ہمارے علماء کے ہیں۔ ان سے صحیح ایک ہے اور وہ پورے سر کے مسح کا وجود ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 127

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 34۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 415، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا بہتر ہے اور جس نے ایسا کیا اس نے وہ کیا جو اس پر لازم تھا۔ با مؤکدہ زائدہ ہے، تبعیض کے لیے نہیں ہے اس کا معنی ہے وَامْسَحُوْا رُءُوْسَكُمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا دخول یہاں تیمم میں اس کے دخول کی طرح ہے فرمایا: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ اگر اس کا معنی تبعیض ہوتا تو اس جگہ بھی تبعیض کا فائدہ دیتی۔ یہ قطعی بات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: با داخل ہوئی ہے تا کہ بدیع معنی کا فائدہ دے، غسل لغۃً مغسول بہ کا تقاضا کرتا ہے اور مسح لغۃً ممسوح بہ کا تقاضا نہیں کرتا اگر وامسحوا رؤسکم ہوتا تو سر پر کسی چیز کے بغیر ہاتھ کو گزارتے ہوئے مسح کرنا جائز ہوتا پس با داخل ہوئی تا کہ ممسوح بہ کا فائدہ دے اور وہ پانی ہے گویا فرمایا: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ الماء اور یہ لغت دو اعتبار سے فصیح ہے، یا تو قلب کے اعتبار سے جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

كَنَواحِ رِيشِ حَمامة نَجْدِيَةٍ ومسحت باللِّثتين عَصْفَ الأَثْمِدِ

اثمد کے عصف کے ساتھ ممسوحۃ، اللثۃ ہے پھر قلب کیا گیا۔ یا فعل میں اشتراک کی بنا پر اور اس کی نسبت تساوی کی بنا پر جیسے شاعر کا قول ہے:

مثل القَنافذ هَدّاجون قد بَلَغت نَجران أو بلغت سَوْءاتهم هَجَرُ

یہ ہمارے علماء کی با کے معنی کے بارے میں گفتگو ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے قول وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ میں بعض سر اور تمام سر کا احتمال ہے اور سنت دلالت کرتی ہے کہ بعض سر کا مسح کافی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانی پر مسح کیا(1)۔ دوسری جگہ فرمایا: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ تیمم میں کیا بعض چہرہ پر مسح کرنا کافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تیمم میں چہرے کا مسح، غسل کا بدل ہے، پس غسل کی پوری جگہ پر مسح کرنا ضروری ہے۔ سر کا مسح اصل ہے۔ یہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ ہمارے علماء نے حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید یہ کسی عذر کی وجہ سے کیا ہو خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل سفر میں کیا تھا اور یہ اعذار کی جگہ ہے اور جلدی اور اختصار کا مقام ہے اور اکثر فرائض مشقت اور خطرے کی وجہ سے حذف ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ نے پیشانی پر اکتفا نہیں کیا حتیٰ کہ عمامہ پر مسح کیا، مسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث سے نقل کیا ہے(2)، اگر پورے سر کا مسح واجب نہ ہوتا تو عمامہ پر مسح نہ کرتے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پورے سر کا مسح کرنا کافی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اپنے سر کا تین مرتبہ مسح کرے۔ حضرت انس، سعید بن جبیر اور عطا سے مروی ہے۔ ابن سیرین دو مرتبہ مسح کرتے تھے۔ ابو داؤد نے کہا: حضرت عثمان کی تمام احادیث جو صحیح ہیں دلالت کرتی ہیں کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ وضو کا ذکر کیا انہوں نے کہا: سر کا مسح کیا اور عدد کا ذکر نہیں کیا(3)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ مسح کا آغاز کہاں سے کرے؟ امام مالک نے کہا: سر کے اگلے حصہ سے شروع

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 134 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 15۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 155، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرے پھر اپنے ہاتھوں کو پیچھے کی طرف لے جائے پھر آگے کی طرف لے آئے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن زید کی حدیث کے مطابق ہے جس کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ امام شافعی اور احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ حسن بن حی فرماتے تھے: سر کے پچھلے حصہ سے شروع کرے۔ انہوں نے ربیع بنت معوذ بن عفراء کی حدیث کی بنا پر یہ کہا ہے، اس حدیث کے الفاظ مختلف ہیں اس کا دارومدار عبد اللہ بن محمد بن عقیل پر ہے اور محدثین کے نزدیک یہ حافظ نہیں ہے۔ ابوداؤد نے بشر بن مفضل عن عبد اللہ عن الربیع کی روایت سے تخریج کیا ہے، ابن عجلان نے عنہ عن الربیع کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے پاس وضو کیا اور سارے سر کا مسح کیا بالوں کی چوٹی سے ہر طرف سے۔ آپ ﷺ بالوں کو اپنی ہیئت سے حرکت نہیں دیتے تھے (1)۔ یہ صفت حضرت ابن عمر سے مروی ہے وہ سر کے درمیان سے مسح شروع کرتے تھے اور اس باب میں اصح ترین حدیث حضرت عبد اللہ بن زید کی حدیث ہے۔ اور جو بعض سر کے مسح کو جائز قرار دیتے ہیں وہ آگے والے بعض حصہ کا نظریہ رکھتے ہیں، ابراہیم اور شعبی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اپنے سر کی دونوں اطراف میں جس طرف کا بھی مسح کرے جائز ہوگا۔ حضرت ابن عمر نے صرف الیافوخ کا مسح کیا اور اجماع منعقد ہے کہ دونوں ہاتھوں کے ساتھ اکٹھا مسح کرنا بہتر ہے اور اجزاء پر مسح جائز ہے اگر ایک ہاتھ سے مسح کرے۔ اور اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے ایک انگلی سے مسح کیا حتیٰ کہ اس کا نظریہ ہے سر کے کسی حصہ پر مسح جائز ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے سفیان نے کہا: اگر ایک انگلی کے ساتھ سر کا مسح کیا تو جائز ہے۔ بعض نے فرمایا: جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ مسح کی سنت سے خروج ہے گویا وہ کھیلنے والا ہے مگر یہ کہ مرض کی وجہ سے ضرورت ہو، پس مناسب ہے کہ اجزاء میں مختلف نہ ہو امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا: تین انگلیوں سے کم انگلیوں کے ساتھ سر کا مسح کرنا جائز نہیں۔ پھر سر کے بالوں پر ہاتھوں کو لوٹانے میں اختلاف ہے کیا یہ فرض ہے یا سنت ہے؟ اس بات پر اجماع ہونے کے بعد کہ پہلا مسح فرض ہے اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے بعض علماء نے فرمایا: یہ فرض ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اگر متوضی مسح کی جگہ سر کو دھو دے تو ابن عربی نے کہا: ہم اس میں کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ یہ جائز ہے مگر ہمیں امام فخر الاسلام الشاشی نے اپنے درس میں ابو العباس بن القاص سے روایت کر کے بتایا کہ یہ جائز نہیں ہے، یہ داؤد کے مذہب میں غلو ہے، ظاہر کی اتباع کی وجہ سے فاسد ہے اور شریعت کو باطل کرنے والا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے فرمایا: **یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ** (الروم: 7) اور فرمایا: **اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ** (الرعد: 33)

حالانکہ یہ غسل کرنے والا وہ بھی کرنے والا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اور زیادتی بھی اس نے کی۔ اگر کہا جائے کہ یہ زیادتی اس لفظ سے خارج ہے جس کا مکلف کیا گیا تھا، ہم کہیں گے: فعل کو محل تک پہنچانے کے معنی سے خارج نہیں۔ اسی طرح اگر سر کا مسح کیا پھر حلق کرا لیا تو اس پر مسح کا اعادہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ دونوں کان امام مالک، امام احمد، ثوری اور امام ابوحنیفہ وغیرہم کے نزدیک سر سے ہیں پھر نئے پانی سے ان کے مسح میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام احمد نے کہا: نئے پانی کے ساتھ کانوں کا مسح کرے، اس پانی کے سوا جس

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 17۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الوضوء، حدیث نمبر 179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے ساتھ سر کا مسح کیا تھا، جیسا کہ حضرت ابن عمر نے کہا تھا، اسی طرح امام شافعی نے نئے پانی کا کہا ہے انہوں نے فرمایا: ان کا مسح کرنا سنت ہے نہ یہ چہرہ سے ہیں اور نہ سر سے ہیں، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ کانوں پر جو بال ہیں حج میں ان کا حلق نہیں ہے۔ ابوثور کا قول اس مسئلہ میں امام شافعی کے قول کی طرح ہے۔ ثوری اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا: سر کے ساتھ ایک پانی کے ساتھ کانوں کا مسح کیا جائے گا۔ سلف صالحین کی جماعت سے صحابہ اور تابعین سے اس قول کی مثل مروی ہے۔ داؤد نے کہا: اگر کانوں کا مسح کیا تو بہتر ہے ورنہ اس پر کچھ واجب نہیں، کیونکہ قرآن میں دونوں کا ذکر نہیں۔ اسے کہا جائے گا: راس کا اسم ان دونوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ نسائی اور ابوداؤد وغیرہما کی کتابوں میں احادیث صحیحہ وارد ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کانوں کے ظاہر اور باطن کا مسح کیا اور اپنی انگلیوں کو کانوں کے سوراخوں میں داخل کیا(۱)۔ اور کتاب اللہ میں ان کا عدم ذکر دلالت کرتا ہے کہ یہ فرض نہیں ہے جیسا کہ چہرے اور ہاتھوں کا ذکر ہے اور کانوں کے مسح کی سنت حدیث سے ثابت ہے اہل علم متوضی کے لیے اپنے کانوں کے مسح کے ترک کو ناپسند کرتے ہیں کانوں کو ترک کے سنت کا ترک بناتے ہیں اور اس پر اعادہ کو واجب نہیں کرتے مگر اسحاق نے کہا: اگر کانوں کا مسح ترک کرے تو جائز نہیں۔ احمد نے کہا: اگر کانوں کا مسح جان بوجھ کر ترک کرے تو میں اعادہ پسند کرتا ہوں۔ علی بن زیاد مالکی سے مروی ہے انہوں نے کہا: جس نے وضو یا نماز کی سنت میں کسی سنت کو جان بوجھ کر ترک کیا تو وہ اعادہ کرے۔ یہ فقہاء کے نزدیک ضعیف ہے۔ سلف میں سے اس کا کوئی قائل نہیں اور نظر اس کا تقاضا کرتی ہے اگر اس طرح ہوتا تو اس کے علاوہ فرض واجب معروف نہ ہوتا۔ جس نے کہا: کان چہرے سے ہیں انہوں نے اس حدیث سے حجت پکڑی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سجدہ میں یہ کہتے تھے سجد وجهی للذی خلقه وصوره وشق سمعه وبصره (1)۔ میرے چہرے نے سجدہ کیا اس ذات کے لیے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تصویر بنائی اور اس کی سمع و بصر کو بنایا۔ سمع کی نسبت چہرہ کی طرف کی پس ثابت ہوا کہ ان کے لیے چہرہ کا حکم ہے۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت عثمان کی حدیث میں ہے کہ یکبارگی کانوں کے ظاہر و باطن کو دھویا پھر اپنے پاؤں کو دھویا پھر فرمایا: وضو کے متعلق سوال کرنے والے کہاں ہیں؟ میں نے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا ہے (2)۔ جنہوں نے کہا: کانوں کو چہرہ کے ساتھ دھویا جائے گا اور ان کے باطن کا سر کے ساتھ مسح کیا جائے گا انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چہرہ کو دھونے کا حکم دیا اور سر کے مسح کا حکم دیا پس جو کانوں میں سے سامنے ہے اس کا دھونا واجب ہے، کیونکہ وہ چہرہ سے ہے اور جو سامنے نہیں ہے اس کا مسح واجب ہے، کیونکہ وہ سر سے ہے۔ اس قول کو آثار رد کرتے ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کانوں کے ظاہر اور کانوں کے باطن کا مسح کرتے تھے۔ یہ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس اور حضرت ربیع وغیرہم کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور جنہوں نے کہا: وہ دونوں سر سے ہیں انہوں نے اس حدیث

1۔ جامع الترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 179۔ ایضاً، حدیث نمبر 529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 15 ایضاً، حدیث نمبر 105-106، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت

سے حجت پکڑی ہے جو صنابحی سے مروی ہے: ''جب سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر سے خطائیں نکل جاتی ہیں حتی کہ کانوں سے خطائیں نکل جاتی ہیں'' (1)۔ اس حدیث کو امام مالک نے تخریج کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَرْجُلَكُمْ نافع، ابن عامر اور کسائی نے اَرْجُلَكُمْ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ولید بن مسلم نے نافع سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ارجلکم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ حسن، اعمش سلیمان کی قرأت ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور حمزہ نے وارجلکم کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان قرأتوں کی وجہ صحابہ اور تابعین کا اختلاف ہے، جس نے نصب کے ساتھ پڑھا انہوں نے فَاغْسِلُوْا کو عامل بنایا، انہوں نے پاؤں میں دھونا فرض کیا ہے نہ کہ مسح۔ یہ جمہور علماء کا مذہب ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے قول سے بطور لازم ثابت ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو وضو کرتے دیکھا جب کہ ان کی ایڑیاں (خشکی کی وجہ سے) چمک رہی تھیں تو آپ نے بلند آواز سے فرمایا: ''خشک ایڑیوں کے لیے آگ کی ہلاکت ہے، مکمل وضو کرو'' (2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی حد بیان فرمائی فرمایا: اِلَى الْكَعْبَيْنِ ٹخنوں تک۔ جیسا کہ ہاتھوں کے بارے میں فرمایا: اِلَى الْمَرَافِقِ یہ ٹخنوں کے دھونے کے وجوب پر دلیل ہے۔ واللہ اعلم۔ اور جنہوں نے جر کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے با کو عامل بنایا ہے۔ ابن عربی نے کہا: پاؤں کے دھونے کے وجوب پر علماء کا اتفاق ہے اور مجھے معلوم نہیں کسی نے اس کو رد کیا ہو، سوائے طبری کے جو مسلمانوں کے فقہاء سے ہیں اور رافضیوں اور طبری نے جر کی قرأت سے استدلال کیا ہے۔

میں نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے کہا: وضو میں دو چیزیں دھوئی جاتی ہیں اور دو پر مسح کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ حجاج نے الاہواز میں خطبہ دیا اور وضو کا ذکر کیا، اس نے کہا: اپنے چہروں اور ہاتھوں کو دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو دھوؤ، کیونکہ کوئی چیز ابن آدم سے اس کے قدموں کی نسبت خبث کے قریب نہیں ہے پس تم اس کے بطون، ظہور ایڑھی کے اوپر کے حصہ کو دھوو۔ یہ حضرت انس بن مالک نے سنا اور کہا: اللہ نے سچ فرمایا اور حجاج نے غلط کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلِكُمْ۔ فرمایا: جب وہ پیروں کا مسح کرتے تھے تو انہیں پانی سے تر کرتے تھے۔ حضرت انس سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: قرآن مسح کے ساتھ نازل ہوا اور سنت غسل کے ساتھ وارد ہوئی۔ عکرمہ اپنے پاؤں پر مسح کرتے تھے انہوں نے کہا: پاؤں میں غسل نہیں ان کے بارے میں مسح نازل ہوا۔ عامر شعبی نے کہا: جبریل مسح کے ساتھ نازل ہوئے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ تیمم میں اس کا مسح کیا جاتا ہے جن کو دھویا جاتا ہے اور جن پر مسح کیا جاتا ہے انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے دو غسل اور دو مسح فرض کیے۔ ابن جریر طبری کا نظریہ یہ ہے کہ پاؤں میں فرض غسل اور مسح کے درمیان اختیار ہے اور انہوں نے دونوں قرأتوں کو دو روایتوں کی طرح بنایا ہے۔ نحاس نے کہا: جو کچھ اس مسئلہ میں کہا گیا ہے اس میں سے بہتر یہ ہے کہ مسح اور غسل دونوں واجب ہیں، مسح جر کی قرأت کرنے والے کی قرأت پر

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 31

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 13۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب العلم، حدیث نمبر 58، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

واجب ہے اور غسل نصب کی قرأت کرنے والے کی قرأت پر واجب ہے دونوں قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ایک قوم جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کا نظریہ یہ ہے کہ پاؤں میں مسح سے مراد دھونا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے، کیونکہ مسح کا لفظ مشترک ہے مسح اور دھونے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہروی نے کہا: ہمیں زہری نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابوبکر محمد بن عثمان بن سعید دارمی نے بتایا انہوں نے ابو حاتم سے انہوں نے زید انصاری سے روایت کیا ہے فرمایا: مسح کلام عرب میں کبھی غسل کے لیے اور کبھی مسح کے لیے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے جب آدمی وضو کرے اور اعضاء کو دھوئے، قد تمسح اس نے مسح کیا۔ کہا جاتا ہے: مسح الله مالك۔ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے گناہوں سے پاک کیا۔ جب عربوں سے نقل کے ساتھ ثابت ہے کہ مسح غسل کے معنی میں ہوتا ہے پس اس کا قول راجح ہوا جس نے کہا: جر کی قرأت سے مراد غسل ہے۔ نصب کی قرأت جس میں کوئی احتمال نہیں ہے اس سے مراد بھی غسل ہے اور کثرت احادیث سے ثابت بھی غسل ہے اور ان کے دھونے کے ترک پر وعید اخبار صحیحہ میں وارد ہے جن کی کثرت کو شمار نہیں کیا جا سکتا، ان احادیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے، پھر سر میں مسح ان کے درمیان داخل ہے جو چیزیں دھوئی جاتی ہیں ترتیب کے بیان کے لیے اس بنا پر کہ رجلین سے پہلے مفعول ہے، تقدیر عبارت یہ ہے فاغسلوا وجوهكم وايديكم الى المرافق وارجلكم الى الكعبين وامسحوا برؤسكم۔

جب الرأس (سر) الرجلین (پاؤں) سے پہلے مفعول تھا تلاوت میں ان پر مقدم کیا گیا۔ واللہ اعلم۔ نہ یہ کہ دونوں سر کے ساتھ مشترک ہیں، کیونکہ تطہیر کی صفت میں ان پر اس کو مقدم کیا۔

عاصم بن کلیب نے ابو عبد الرحمن سلمی سے روایت کیا ہے فرمایا: حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے مجھ پر وارجلكم پڑھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا جب کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر رہے تھے فرمایا: وَ اَرْجُلَكُمْ یہ کلام میں مقدم اور مؤخر میں سے ہے۔

ابو اسحاق نے حارث سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: اغسلوا الاقدام الى الكعبين اپنے قدموں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے ارجلكم نصب کے ساتھ پڑھا۔ بعض علماء نے فرمایا: الرجلين میں جر ان کے مسح کی قید کے لیے آئی ہے لیکن جب کہ ان پر خفین ہوں اور یہ قید ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسح کرنا صحیح ثابت نہیں مگر جب ان پر خفین تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فعل سے اس حالت کو بیان کیا جس میں پاؤں دھوئے جاتے ہیں اور اس حالت کو بیان کیا جس میں مسح کیا جاتا ہے۔ یہ بہتر قول ہے۔ اگر کہا جائے کہ خفین پر مسح سورۃ المائدہ کے ساتھ منسوخ ہے(2)۔ یہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مسح کو حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے رد کیا اور امام مالک نے بھی اس کا ایک روایت میں انکار کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے کسی چیز کی نفی کی اور دوسرے نے اس کا اثبات کیا تو نافی کے لیے حجت نہیں۔ خفین پر مسح کو بہت سے صحابہ اور تابعین نے ثابت کیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مجھے ستر صحابہ نے بتایا کہ وہ خفین پر مسح کرتے تھے اور نقل صحیح کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 163
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 14

ساتھ ہمام سے ثابت ہے فرمایا: جریر نے پیشاب کیا پھر وضو کیا اور خفین پر مسح کیا۔ ابراہیم نخعی نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور خفین پر مسح کیا۔ ابراہیم نخعی نے فرمایا: اس حدیث کو وہ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ جریر کا اسلام سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد تھا (1)۔ یہ نص ہے اس کو رد کرتی ہے جو انہوں نے ذکر کیا اور انہوں نے جس روایت سے حجت پکڑی ہے وہ یہ ہے واقدی عن عبدالحمید بن جعفر عن ابیہ جریر نے سولہ رمضان کو اسلام قبول کیا اور المائدہ ذی الحجہ میں یوم عرفات کو نازل ہوئی۔ یہ حدیث اپنے ضعف کی وجہ سے ثابت نہیں۔ اس سورۃ میں سے عرفہ کے دن اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں مسح علی الخفین میں جریر کی حدیث کو بہتر سمجھتا ہوں، کیونکہ ان کا اسلام سورہ مائدہ کے نزول کے بعد ہے اور جو حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور حضرت عائشہ کے پاس اس کا علم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ نے سائل کو حضرت علی کی طرف لوٹایا تھا اور ان کی طرف سائل کو پھیرا تھا، حضرت عائشہ نے سائل کو فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ الحدیث (2)

اور رہے امام مالک جو ان سے انکار مروی ہے وہ منکر ہے، صحیح نہیں ہے، صحیح وہ ہے جو انہوں نے اپنی موت کے وقت ابن نافع کو کہا: میں اپنے لیے طہارت کو پسند کرتا ہوں اور جس نے مسح پر اکتفا کیا اس میں حرج نہیں دیکھتا۔ اسی پر محمول کیا امام احمد بن حنبل نے جو ابن وہب نے ان سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں سفر و حضر میں مسح نہیں کرتا۔ امام احمد نے کہا: جس طرح حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خفین پر مسح کرنے کا حکم دیا اور خود خفین اتار کر وضو کیا اور فرمایا: مجھے وضو محبوب ہے۔ اسی طرح حضرت ابوایوب سے مروی ہے، احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے اس بنا پر مسح کو ترک کیا جس بنا پر حضرت ابن عمر، حضرت ابوایوب اور امام مالک نے ترک کیا تو میں اس پر انکار نہیں کروں گا، ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور اس پر عیب نہیں لگائیں گے مگر یہ کہ وہ اس کو ترک کردے اور وہ اس طرح اس کو نہ دیکھے جس طرح اہل بدعت نے کیا ہے، پس اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے کہا: ارجلکم لفظ پر معطوف ہے معنی پر معطوف نہیں یہ غسل پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ معنی کی رعایت ہوتی ہے نہ لفظ کی۔ جر، جوار کی وجہ سے ہے جس طرح عربوں نے کہا ہے اور قرآن میں اور دوسری عرب کلام میں یہ پایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ (الرحمٰن: 35) جر کے ساتھ ہے (☆)۔ کہا: نحاس دھواں ہے اور فرمایا: هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج) امراء القیس نے کہا:

كبيرُ أناسٍ في بِجَادٍ مُزَمَّلِ

مزمل کو جر، جوار کی وجہ سے ہے مزمل مرد ہے اس کا اعراب رفع ہے۔ زہیر نے کہا:

لَعِب الزمان بها وغَيَّرها　　بعدی سَوَا فِي المُورِ والقَطْرِ

ابوحاتم نے کہا: القطر پر رفع تھا لیکن المور کے جوار کی وجہ سے اس کو جر دی گئی ہے جس طرح عربوں نے کہا ہے: ھذا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 133-132　2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 135

☆ یعنی ایک قراءت میں نحاس جر کے ساتھ ہے۔

جحر ضب خرب۔ انہوں نے اس (خرب) کو جر دی ہے حقیقۃً اس کا اعراب رفع ہے یہ اخفش، ابو عبیدہ کا مذہب ہے۔ نحاس نے اس کو رد کیا ہے، فرمایا: یہ قول غلط ہے، کلام میں جواز نہیں ہوتا کہ اس پر قیاس کیا جائے یہ غلط ہے اس کی مثال الاقواء ہے۔

میں نے کہا: اس میں قطعی باب یہ ہے کہ پاؤں میں فرض غسل ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے ''خشک ایڑیوں کے لیے ہلاکت ہے اور قدموں کے پیٹ آگ سے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کی مراد کی مخالفت پر ہمیں ڈرایا گیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ آگ کا عذاب نہیں دیا جاتا مگر واجب کے ترک پر اور یہ معلوم ہے کہ مسح میں استیعاب (گھراؤ احاطہ) نہیں ہوتا اور مسح کے قائلین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسح ظاہر پر ہوتا ہے بطون پر نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے اس شخص کا بطلان واضح ہو گیا جس نے مسح کا قول کیا، کیونکہ ان کے نزدیک پاؤں کے بطون میں مسح کا دخل نہیں اور غسل کے ساتھ پاؤں کے بطن کو دھویا جاتا ہے مسح باطن کا نہیں ہوتا۔ اور دوسری دلیل اجماع کی جہت سے ہے علماء کا اتفاق ہے جس نے اپنے قدموں کو دھویا اس نے واجب کو ادا کیا اور قدموں کا مسح کرنے والے کے بارے علماء کا اختلاف ہے یقین اس سے حاصل ہوتا ہے جس پر علماء کا اجماع ہوتا ہے نہ اس سے جس میں اختلاف ہوتا ہے۔ کثرت سے علماء ایک دوسرے سے روایت کرتے آئے ہیں اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں ایک مرتبہ دو مرتبہ اور تین مرتبہ اپنے پاؤں دھوتے تھے حتیٰ کہ انہیں صاف کرتے تھے، تیرے لیے پاؤں دھونے میں یہ حجت کافی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، پس واضح ہو گیا کہ جر کی قرأت میں غسل ہے نہ کہ مسح جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور وَ اَرْجُلَكُمْ میں عامل فَاغْسِلُوْا ہے اور عرب ایک شے کا دوسری شے پر ایک فعل کے ساتھ عطف کرتے ہیں جس کے ساتھ ایک شے منفرد ہوتی ہے تو کہتا ہے: اکلت الخبز واللبن۔ یعنی میں نے دودھ پیا یعنی اللبن سے پہلے فعل محذوف ہے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے: عَلَفْتُها تبْنًا و ماءً بارداً

ایک اور نے کہا:

ورأيتُ زوجكِ فی الوغی مُتَقَلِّداً سَيْفًا ورُمْحًا

ایک اور نے کہا:

وأطْفَلَت بِالجَلْهَتَيْن ظِباءُها ونَعامُها

ایک اور نے کہا:

شَرَابُ أَلْبانٍ وتمرٍ وأَقِط (1)

ان اشعار میں تقدیر یہ ہے: علفتها تِبنًا وسَقَيتُها ماءً، متقلِّدًا سيفا وحامِلا رُمحًا۔ وأطْفَلَتْ بالجَلْهَتَيْنِ ظباءها وفرخت نعامها (النعام لا يُطفل انما يُفرخ) اطفلت اس کے بچے تھے اور الجَلْهَتان سے مراد وادی کے کنارے ہیں۔ شراب ألبان وآكل تمر پس وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ، غسل کا عطف مسح پر ہے معنی پر محمول کرتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 578

ہوئے۔ مراد غسل ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ بخاری نے روایت کیا ہے مجھے موسیٰ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں وہب نے بتایا انہوں نے عمرو سے روایت کیا ہے یہ ابن یحییٰ ہے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا عمرو بن ابی حسن کے پاس گیا انہوں نے حضرت عبداللہ بن زید سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے پانی کا ایک برتن منگوایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کی طرح وضو کیا، پہلے اس برتن سے ہاتھوں پر پانی انڈیلا، پھر اپنے ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا، پھر اپنے ہاتھوں کو برتن میں داخل کیا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، پھر ناک سے پانی جھاڑا یہ عمل تین چلوؤں سے کیا، پھر اپنے ہاتھ کو پانی میں داخل کیا اور تین مرتبہ اپنے چہرے کو دھویا، پھر اپنے ہاتھوں کو داخل کیا اور تین مرتبہ کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھویا، پھر اپنے ہاتھوں کو پانی میں داخل کیا اور اپنے سر کا مسح کیا، پھر اپنے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے لے گئے، پھر پیچھے سے آگے لے آئے یہ عمل ایک مرتبہ کیا، پھر اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوئے (1)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اَمْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ میں با زائدہ ہے، کیونکہ مسح راسہ فرمایا اور براسہ نہیں فرمایا۔ سر کا مسح ایک مرتبہ ہے مسلم کی کتاب میں حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث میں واضح طور پر اس کی تفسیر آئی ہے کہ پہلے آپ ہاتھوں کو آگے سے پیچھے لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے لے آئے۔ سر کے اگلے حصہ سے مسح شروع کیا، پھر انہیں پیچھے گدی کی طرف لے گئے، پھر انہیں لوٹایا حتی کہ اس تک واپس لے آئے جس سے آغاز کیا تھا (2)۔ علماء کا کعبین کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں کے پہلو میں اٹھی ہوئی ہوتی ہیں (3)۔ اصمعی نے علماء کے قول کا انکار کیا ہے کہ کعب، قدم کی پیٹھ پر ہے۔ یہ اس نے ''الصحاح'' میں کہا ہے۔ اور ابن القاسم روایت کرتے ہیں محمد بن حسن نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس نے وضو کی حد یہاں تک مقرر کی ہو لیکن عبدالوہاب نے ''التلقین'' اس کے بارے ایسے الفاظ لکھے ہیں جن میں تخلیط اور ابہام ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میں اس کی مخالفت کرنے والا نہیں جانتا کہ کعبین پنڈلی کے جوڑ کی دو ہڈیاں ہیں جو اٹھی ہوئی ہیں۔ طبری نے یونس سے انہوں نے اشہب سے انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: الکعبان وہ حد ہے جس تک دھونا واجب ہے یہ دو ہڈیاں ہیں جو پنڈلی کے ساتھ ملی ہوئی ہیں ایڑی کے سامنے ہیں اور کعب، قدم کے اوپر ظاہر نہیں۔

میں کہتا ہوں: لغت اور سنت میں یہی صحیح ہے۔ کعب عرب کلام میں العلو سے ماخوذ ہے، اسی وجہ سے کعبہ کہا جاتا ہے۔ کعبت المراۃ کہا جاتا ہے جب عورت کے پستان گول ہو جائیں اور ابھر جائیں۔ کعب القناۃ نیزہ کی گرہ پر دو جوڑوں کے درمیان کی جگہ کو کعب کہتے ہیں۔ کبھی یہ شرف اور مجد کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی سے حدیث ہے واللهِ لا يزالُ كَعْبكِ عاليًا اللہ کی قسم تیری بزرگی ہمیشہ بلند رہے گی۔

سنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جس کو ابو داؤد نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے اللہ کی قسم! اپنی صفوں کو

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوضو، جلد 1، صفحہ 31۔ ایضاً، حدیث نمبر 180، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 123　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 164

درست کرو ورنہ تمہارے دلوں کے درمیان اللہ تعالیٰ مخالفت پیدا کر دے گا، فرمایا: میں نے ایک شخص کو دیکھا وہ اپنا کندھا اپنے ساتھی کے کندھے سے، اپنا گھٹنا اپنے ساتھی کے گھٹنے سے، اپنا ٹخنہ اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ملائے ہوئے تھا(1)۔ العقب، ایڑی کے ہڈی کے نیچے پاؤں کا پچھلا حصہ ہے۔ اور العرقوب پنڈلی اور پاؤں کا جوڑ ہے، اسی سے حدیث ہے ''خشک عراقیب (ایڑیوں) کے لیے آگ سے ہلاکت ہے''(2)۔ یعنی جب ایڑیوں کو دھویا نہ گیا ہو جیسا کہ ارشاد ہے ''(خشک) ایڑیوں اور قدموں کے لیے آگ کا عذاب ہے''(3)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے، کسی پر وضو میں اور غسل میں پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا نہیں ہے، جفاء اور علق میں خیر نہیں ہے، ابن وہب نے کہا: پاؤں کی انگلیوں کے خلال کرنے کی رغبت دی گئی ہے، ہاتھوں کی انگلیوں میں خلال ضروری ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کا خلال نہیں کیا اس پر کچھ نہیں ہے۔ محمد بن خالد نے ابن القاسم سے انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے: جس نے نہر پر وضو کیا اور اپنے پاؤں کو پانی میں حرکت دی تو جائز نہ ہوگا حتیٰ کہ پاؤں کو ہاتھوں سے دھوئے۔ ابن القاسم نے کہا: اگر ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے دھونے پر قادر ہو تو جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان کی جگہ کو دھویا جائے گا، کیونکہ وہ بھی پاؤں سے ہیں جیسا کہ ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان کی جگہ ہاتھ سے ہے، ہاتھوں کی انگلیوں کے کھلا ہونے اور پاؤں کی انگلیوں کا ملا ہوا ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، انسان کو پورے پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے جس طرح پورے ہاتھوں کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ جب وضو فرماتے تو اپنی انگلیوں کو اپنی چھوٹی انگلی سے ملتے تھے(4)، یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاؤں دھوتے تھے۔ یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ امام مالک آخری عمر میں اپنے پاؤں کی تمام انگلیوں کو یا بعض انگلیوں کو اپنی چھوٹی انگلی سے ملتے تھے اس حدیث کی بنا پر جو انہیں ابن وہب نے بیان کی انہوں نے ابن لہیعہ اور لیث بن سعد سے روایت کی انہوں نے یزید بن عمرو غفاری سے روایت کی انہوں نے ابو عبدالرحمن حبلی سے روایت کی انہوں نے مستورد بن شداد قرشی سے روایت کی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا اپنے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان کی جگہ کا اپنی چھوٹی انگلی سے خلال کرتے تھے۔ ابن وہب نے کہا: مجھے امام مالک نے فرمایا: یہ اچھا ہے۔ میں نے ان سے یہ صرف اس گھڑی سنا۔ ابن وہب نے کہا: میں نے ان سے سنا اس کے بعد وضو میں انگلیوں کے خلال کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا حکم دیا۔ حضرت حذیفہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَلِّلُوا بین الاصابع لا تُخَلِّلُهَا النار(5)۔ انگلیوں کا خلال کرو تاکہ آگ ان کا خلال نہ کرے۔ یہ خلال کے ترک پر وعید ہے پس جو ہم نے کہا وہ ثابت ہو گیا۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 96۔ ایضاً، حدیث نمبر 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 125　3۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 8۔ ایضاً، حدیث نمبر 39، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 7　5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 580

**مسئلہ نمبر16**۔ آیت کے الفاظ متواتر وضو کرنے کا تقاضا کرتے ہیں یعنی اعضاء کو لگاتار دھوئے، درمیان میں وقفہ نہ کرے اور درمیان میں کوئی ایسا فعل نہ کرے جو وضو سے نہ ہو۔ علماء کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن ابی سلمہ اور ابن وہب نے کہا: پے درپے وضو کرنا، ذکر ونسیان میں وضو کے فرائض سے ہے جس نے اپنے وضو کے اعضاء کے درمیان جان بوجھ کر یا بھول کر وقفہ کیا تو جائز نہ ہوگا۔ ابن عبدالحکم نے کہا: بھول کر وقفہ کرے یا جان بوجھ کر کرے وضو جائز ہوگا۔ امام مالک نے ''المدونہ'' میں اور کتاب محمد میں ہے کہ پے درپے کا حکم ساقط ہے یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام مالک اور ابن القاسم نے کہا: اگر جان بوجھ کر فرق کیا تو پھر جائز نہ ہوگا بھول کر کیا تو جائز ہوگا۔ ابن حبیب کی روایت میں امام مالک نے فرمایا: مغسول میں وقفہ جائز ہے ممسوح میں جائز نہیں۔ یہ پانچ اقوال ہیں جو دو اصلوں پر قائم ہیں (۱) اللہ تعالیٰ نے مطلق حکم دیا ہے متواتر وضو کرے یا وقفہ کرے (تیری مرضی مقصود تمام اعضاء میں نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت غسل کا وجود ہے (۲) یہ عبادات ہیں جو مختلف ارکان والی ہیں، پس اس میں توالی اور تواتر واجب ہے جس طرح نماز ہے، یہ اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر17**۔ آیت کے الفاظ ترتیب کو بھی اپنے ضمن میں رکھتے ہیں۔ ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابہری نے کہا: ترتیب سنت ہے ظاہر مذہب یہ ہے کہ بھولنے والے کے لیے ترتیب کا نہ ہونا جائز ہے اور جان بوجھ کر ترتیب چھوڑنے والے کے بارے اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جائز ہے اور مستقبل میں ترتیب کو قائم رکھے۔ ابو بکر القاضی وغیرہ نے کہا: یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ کھیلنے والا ہے۔ امام شافعی اور ان کے تمام اصحاب کا نظریہ یہ ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو عبید قاسم بن سلام، اسحاق، ابوثور کا یہی قول ہے۔ ابومصعب مالکی کا بھی یہ نظریہ ہے، اس نے اس کو اپنی مختصر میں ذکر کیا ہے۔ اس کو اس نے اہل مدینہ سے حکایت کیا ہے اور امام مالک بھی ان کے ساتھ ہیں کہ جس نے وضو میں ہاتھوں کو دھونے میں چہرہ سے مقدم کیا اور آیت کی ترتیب کے مطابق وضو نہ کیا تو جس نے اس وضو کے ساتھ نماز پڑھی اس کا اعادہ لازم ہے۔ امام مالک سے اکثر روایات یہ ہیں کہ واؤ نہ تعقیب کا موجب ہے اور نہ ترتیب کا موجب ہے۔ یہی قول امام مالک کے اصحاب کا ہے اور یہی قول امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ اور یہی ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، مزنی اور داؤد بن علی کا نظریہ ہے۔ الکیا طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ** کا ظاہر اجزاء کا تقاضا کرتا ہے وہ علیحدہ علیحدہ وقفہ سے اعضاء کو دھوئے یا متواتر وضو کرے جیسا کہ صحیح مذہب شافعی سے ہے اور یہ اکثر علماء کا مذہب ہے۔ ابوعمر نے کہا: مگر امام مالک فرماتے ہیں: آئندہ نماز کے لیے ترتیب سے نیا وضو کرنا مستحب ہے یہ اس پر وہ واجب خیال نہیں کرتے تھے، یہ ان کے مذہب کا ماحاصل ہے۔ علی بن زیاد نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے اپنے بازوؤں کو دھویا، پھر اپنے چہرے کو دھویا، پھر اسے اسی جگہ یاد آ گیا تو وہ بازوؤں کو دھونے کا اعادہ کرے اور اگر اسے یاد نہ آئے حتی کہ اس نے نماز پڑھ لی تو وہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے۔ علی نے کہا: پھر اس کے بعد امام مالک نے کہا: نماز کا اعادہ نہ کرے اور آئندہ نماز کے لیے وضو کا اعادہ کرے۔ اختلاف کا سبب وہ ہے جو بعض علماء نے کہا کہ **فَاغْسِلُوْا** میں فا تعقیب کا موجب ہے، کیونکہ جب یہ جواب شرط ہے تو اس نے مشروط مربوط کر دیا پس یہ تمام میں ترتیب کا تقاضا کرتی ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ چہرے سے آغاز کرنے کا تقاضا کرتی ہے، کیونکہ یہ شرط کی جزا اور جواب ہے یہ تمام میں ترتیب کا تقاضا کرتی ہے اگر جواب شرط ایک معنی ہوتا جب جواب شرط تمام جملے ہیں تو پھر کوئی پروا نہیں جس سے آغاز کیا جائے، کیونکہ مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ترتیب واؤ کی وجہ سے آتی ہے لیکن حقیقۃً ایسا نہیں کیونکہ تو کہتا ہے: تقاتل زید و عمرو، تخاصم بکر و خالد پس باب مفاعلہ میں اس کا دخول اسے ترتیب سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے۔ ترتیب چار وجوہ سے ہے (۱) اس سے آغاز کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب آپ نے حج فرمایا: ہم اس سے شروع کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا (۲) سلف کا اجماع ہے وہ ترتیب سے وضو کرتے تھے (۳) وضو کو نماز کی تشبیہ کی وجہ سے (۴) اس ترتیب پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبت اختیار فرمائی۔ اور جنہوں نے اجازت دی انہوں نے اس پر حجت پکڑی ہے کہ جنابت کے اعضاء کے دھونے میں ترتیب کے نہ ہونے پر اجماع ہے، اسی طرح وضو کے اعضاء کے دھونے میں ترتیب نہیں ہے، کیونکہ اس سے مراد غسل ہے نہ کہ آغاز کرنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: مجھے کوئی پرواہ نہیں، جب میں مکمل وضو کروں، اپنے جس عضو سے آغاز کروں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا: اپنے ہاتھوں کو دھونے سے پہلے اپنے پاؤں سے آغاز کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ دار قطنی نے کہا: یہ روایت مرسل ہے، ثابت نہیں ہے، اولیٰ ترتیب کا وجوب ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 18۔** جب وضو میں مشغولیت سے نماز کا وقت فوت ہو جائے تو اکثر علماء کے نزدیک آدمی تیمم نہیں کر سکتا۔ امام مالک ایسی صورت میں تیمم کو جائز کہتے ہیں، کیونکہ تیمم اصل میں نماز کے وقت کی حفاظت کے لیے ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نماز کو پانی ملنے تک مؤخر کرنا واجب ہوتا۔ جمہور علماء نے اس ارشاد: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا** سے حجت پکڑی ہے اور یہ پانی پانے والا ہے تیمم کی صحت کی شرط نہیں پائی جاتی پس تیمم نہیں کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 19۔** بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نجاست کا زائل کرنا واجب نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ** استنجا کا ذکر نہیں فرمایا اور وضو کا ذکر فرمایا، اگر نجاست کا زائل کرنا واجب ہوتا تو پہلے اس کا ذکر کیا جاتا۔ یہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب کا قول ہے اور امام مالک سے اشہب کی روایت بھی یہی ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ذکر اور نسیان میں نجاست کا زائل کرنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: یاد ہوتے ہوئے نجاست کا ازالہ ضروری ہے اور نسیان کی صورت میں اس کا زائل کرنا ساقط ہو جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: نجاست کا زائل کرنا واجب ہے جب وہ بغلی درہم کی مقدار سے زائد ہو، مراد بڑا درہم ہے جو مثقال کی ہیئت پر ہوتا ہے یہ مخرج معتاد کے منہ پر قیاس کیا ہے جو معاف ہے۔ صحیح ابن وہب کی روایت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دو قبروں والوں کے متعلق فرمایا: ''انہیں عذاب ہو رہا ہے اور (تمہارے نزدیک) کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا(1)'' اور عذاب ہمیشہ واجب کے ترک پر ہوتا ہے ظاہر قرآن میں کوئی حجت نہیں،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 141

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت وضو میں خاص وضو کا طریقہ بیان فرمایا ہے، نجاست کے ازالہ وغیرہ سے تعرض نہیں فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 20۔** آیت کریمہ خفین پر مسح پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ میں امام مالک کی تین روایات ہیں۔ (۱) مطلقاً انکار جیسا کہ خوارج کہتے ہیں یہ روایت منکرہ ہے صحیح نہیں ہے یہ پہلے گزر چکی ہے (۲) سفر میں مسح کرے حضر میں نہ کرے، کیونکہ مسح کی اکثر روایات سفر میں ہیں اور سباطۃ (کوڑے کا ڈھیر) والی حدیث حضر میں مسح کے جواز پر دلالت کرتی ہے اس حدیث کو مسلم نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے تخریج کیا ہے فرمایا: میں اور رسول اللہ ﷺ چل رہے تھے آپ ﷺ ایک قوم کے کوڑے کے ڈھیر پر آئے دیوار کے پیچھے آپ کھڑے ہوئے جس طرح تم میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے پس آپ نے پیشاب کیا، میں آپ سے تھوڑا دور ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے میری طرف اشارہ فرمایا، میں آیا، آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا حتیٰ کہ آپ پیشاب سے فارغ ہو گئے۔ ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ پھر آپ نے وضو فرمایا اور خفین پر مسح کیا۔ اسی کی مثل شریح بن ہانی کی حدیث ہے فرمایا: میں حضرت عائشہ کے پاس آیا میں نے ان سے خفین پر مسح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: تم حضرت ابن ابی طالب کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسافر کے لیے تین دن تک مسح ہے اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات تک مسح ہے (1)۔ یہ تیسری روایت ہے۔ سفر و حضر میں مسح کرے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 21۔** امام مالک کے نزدیک مسافر خفین پر مسح بغیر کسی وقت کی قید کر سکتا ہے۔ یہ لیث بن سعد کا قول ہے۔ ابن وہب نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ فرماتے سنا ہمارے شہر والوں کے نزدیک اس میں کوئی وقت کی تعیین نہیں۔ ابو داؤد نے حضرت ابی بن عمارہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں خفین پر مسح کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' اس نے عرض کی: ایک دن۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دن'' اس نے پوچھا: دو دن۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دو دن'' اس نے پوچھا: تین دن۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اور جتنا چاہے''۔

ایک روایت میں ہے ''ہاں جو تیرے لیے ظاہر ہو''۔ ابو داؤد نے کہا: اس کی سند میں اختلاف ہے یہ قوی نہیں ہے (2)۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، نعمان اور طبری نے کہا: مقیم ایک دن اور ایک رات مسح کرے اور مسافر تین دن مسح کرے۔ یہ انہوں نے شریح کی حدیث اور اس کی مثل احادیث کی بنا پر کہا ہے، امام مالک سے ہارون اور بعض خلفاء کی طرف آپ کے خطوط میں یہ روایت کیا گیا ہے ان کے اصحاب نے ان کا انکار کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 22۔** تمام علماء کے نزدیک مسح کرنا اس کے لیے ہے جس نے طہارت پر خفین کو پہنا ہو، کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث ہے فرمایا: میں ایک رات ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ الحدیث۔ اس حدیث میں ہے میں جھکا تا کہ آپ کے جوڑے اتار دوں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو رہنے دو میں نے طہارت کی حالت میں پہنے تھے (3)''

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 135
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 21
3۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 134

آپ نے دونوں پر مسح فرمایا۔ اصبغ کا خیال ہے کہ یہ تیمم کی طہارت ہے۔ یہ بنا ہے کہ تیمم حدث کو اٹھا دیتا ہے۔ داؤد اس مسئلہ میں منفرد ہے۔ اس نے کہا: ہاں طہارت سے مراد صرف نجاست سے طہارت ہے جب پاؤں نجاست سے پاک ہوں تو خفین پر مسح کرنا جائز ہے۔ اختلاف کا سبب طہارت کے اسم میں اشتراک ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ امام مالک کے نزدیک خفین پر مسح جائز ہے جب ان میں تھوڑی سی پھٹن ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھٹن انتفاع اور پہننے سے مانع نہ ہو، اس میں چلنا ممکن ہو۔ امام مالک کے قول کی طرح، لیث، ثوری، امام شافعی اور طبری کا قول ہے۔ ثوری اور طبری سے پھٹی ہوئی خف پر مسح کی اجازت مروی ہے۔ اوزاعی نے کہا: خف پر اور قدم کا جو حصہ ظاہر ہے اس پر مسح کرے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر پاؤں کا جو حصہ ظاہر ہو وہ تین انگلیوں سے کم ہو تو مسح کرے اور جب تین انگلیوں کی مقدار پاؤں ظاہر ہو تو اس پر مسح نہ کرے یہ تحدید ہے جو توقیف کی محتاج ہے۔ یہ معلوم ہے کہ صحابہ اور تابعین کے موزے تھوڑی پھٹن سے سلامت نہیں ہوتے تھے۔ جمہور کے نزدیک یہ معاف ہے۔ امام شافعی سے مروی ہے جب پاؤں کے اگلے حصہ میں پھٹن ہو تو اس پر مسح جائز نہیں۔ حسن بن حیی نے کہا: خف پر مسح کرے جب جو حصہ ظاہر ہو جوراب نے اسے ڈھانپ رکھا ہو اگر قدم کا کوئی حصہ ظاہر ہو تو مسح نہ کرے۔ ابوعمر نے کہا: یہ ان کے مذہب پر ہے کہ مسح جورابوں پر جائز ہے جب وہ موٹی ہوں۔ یہ ثوری، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک جورابوں پر مسح جائز نہیں مگر جب کہ وہ چمڑے کی ہوں۔ یہ امام مالک کا ایک قول ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ جورابوں پر مسح جائز نہیں اگرچہ وہ مجلد ہوں۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور جورابین اور نعلین پر مسح کیا۔ ابوداؤد نے کہا: عبدالرحمن بن مہدی اس حدیث کو بیان نہیں کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہ سے معروف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خفین پر مسح کیا۔ اس حدیث کو حضرت ابوموسیٰ سے روایت کیا گیا ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے یہ قوی نہیں اور نہ متصل ہے۔ ابوداؤد نے کہا: حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابو مسعود، حضرت براء بن عازب، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو امامہ، حضرت سہل بن سعد، حضرت عمرو بن حریث نے جورابوں پر مسح کیا۔ یہ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: رہا نعلین پر مسح تو ابو محمد دارمی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابونعیم نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں یونس نے بتایا انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے عبد خیر سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت علی کو دیکھا انہوں نے وضو کیا اور نعلین پر مسح کیا۔ پھر وسعت فرمائی اور فرمایا: اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے نہ دیکھا ہوتا جیسے تم نے مجھے دیکھا تو میرے خیال میں قدموں کا باطن مسح کا ظاہر سے زیادہ حقدار ہے۔ ابو محمد دارمی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ سے منسوخ ہے (2)۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 21۔ ایضاً سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 137، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الصلوٰۃ والطہارت، جلد 1، صفحہ 147

میں کہتا ہوں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ''میرے خیال میں قدموں کا باطن مسح کا ظاہر سے زیادہ حق دار ہے''۔ اس کو ابوداؤد نے حضرت علی سے روایت کیا ہے فرمایا: اگر دین رائے کے ساتھ ہوتا تو خف کا باطن مسح کا اوپر والے حصہ سے زیادہ حق دار تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خفین کے ظاہر پر مسح کرتے دیکھا۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: جس نے خفین کے ظاہر پر مسح کیا اور باطن پر مسح نہ کیا تو یہ جائز ہے مگر امام مالک نے فرمایا: جس نے ایسا کیا وہ وقت میں اعادہ کرے اور جس نے خفین کے باطن پر مسح کیا، ظاہر پر مسح نہ کیا تو یہ جائز ہے اس پر وقت کے اندر اور وقت کے بعد اعادہ ہے اسی طرح اصحاب امام مالک نے فرمایا، مگر ایک چیز اشہب مالکی سے مروی ہے فرمایا: خفین ظاہر و باطن میں برابر ہے جس نے باطن کا مسح کیا ظاہر کا نہ کیا تو اس پر صرف وقت میں اعادہ ہے۔ امام شافعی سے مروی ہے فرمایا: باطن کا مسح جائز ہے بغیر ظاہر کے مسح کے۔ امام شافعی کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جس نے صرف باطن کا مسح کیا تو جائز نہ ہوگا اور وہ مسح کرنے والا شمار نہ ہو گا۔ امام ابوحنیفہ اور ثوری نے کہا: خفین کے ظاہر پر مسح کرے باطن پر نہیں۔ یہی امام احمد بن حنبل، اسحاق اور ایک جماعت کا قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب کا مختار مذہب یہ ہے کہ اعلیٰ و اسفل کا مسح کرے۔ حضرت ابن عمر، ابن شہاب کا یہی قول ہے، کیونکہ ابوداؤد، دارقطنی نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ تبوک میں وضو کرایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خف کے اوپر، نیچے سے مسح کیا۔ ابوداؤد نے کہا: روایت ہے کہ یہ حدیث ثور نے رجاء بن حیوہ سے نہیں سنی (1)۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ اس شخص کے بارے اختلاف ہے جس نے خفین اتارے جب کہ اس نے ان پر مسح کیا ہوا تھا۔ علماء کے تین اقوال ہیں۔

(۱) اسی جگہ اپنے پاؤں دھوئے اگر تاخیر کی تو نئے سرے سے وضو کرے یہ امام مالک اور لیث کا قول ہے اسی طرح امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اوزاعی اور نخعی سے مروی ہے اور انہوں نے اس مکان کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) نئے سرے سے وضو کرے یہ حسن بن حی کا قول ہے، اوزاعی اور نخعی سے مروی ہے۔

(۳) اس پر کچھ نہیں ہے اور جیسے ہے نماز پڑھے۔ ابن ابی لیلیٰ اور حسن بصری کا یہ قول ہے۔ یہ ابراہیم نخعی سے روایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا، الجنب کا معنی سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ فَاطَّهَّرُوْا پانی سے غسل کرنے کا حکم ہے اسی وجہ سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا خیال ہے کہ جنبی کبھی بھی تیمم نہیں کر سکتا بلکہ وہ نماز چھوڑے رکھے حتی کہ پانی پالے۔ جمہور علماء نے کہا: یہ عبارت پانی پانے والے کے لیے ہے، پانی نہ پانے والے کے احکام کے بعد جنبی کا ذکر اس ارشاد: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کے ساتھ کیا۔ ملامست سے یہاں مراد جماع ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود سے صحیح مروی ہے کہ انہوں نے لوگوں کے قول کی طرف رجوع کیا کہ جنبی تیمم کرے اور حضرت عمران بن حصین کی حدیث اس میں نص ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علیحدہ (بیٹھا ہوا) دیکھا جس نے لوگوں کے ساتھ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 22۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 141، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نماز نہیں پڑھی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے فلاں! تجھے قوم کے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے منع کیا''، اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے جنابت لاحق ہوئی ہے اور پانی موجود نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو مٹی کو استعمال کر وہ تیرے لیے کافی ہے'' (1)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ یہ تفصیلاً سورۃ النساء میں گزر چکا ہے ہم یہاں ایک اصولی مسئلہ ذکر کرتے ہیں جو سورۃ النساء میں ہم سے رہ گیا تھا یہ غالبی عادت کے عموم کی تخصیص ہے کیونکہ الْغَآىِٕطِ ان احداث سے کنایہ ہے جو مخرجین سے نکلتے ہیں جیسا کہ سورۃ النساء میں ہم نے بیان کیا یہ عام ہے مگر ہمارے جلیل القدر علماء نے اس کو ان احداث کے ساتھ خاص کیا ہے جو عادۃً خارج ہوتے ہیں معتاد طریق پر۔ اگر غیر معتاد طریقہ پر نکلے مثلاً کنکریاں یا کیڑے نکلیں یا سلسل اور مرض کے طریقہ پر معتاد طور پر نکلے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، علماء لفظ کا خیال کرتے ہیں، کیونکہ لفظ جب اپنے مدلول کے لیے ثابت ہوتا ہے تو وہ غالب استعمال میں معروف ہوتا ہے اطلاق کی حالت میں سامع کے فہم کے لیے وہ غالب مفہوم ذہن سے بعید ہوتا ہے پس وہ اس کا غیر مدلول لہ بن جاتا ہے اور حال اس میں اس طرح ہوتا ہے جیسے دابۃ میں ہے جب یہ مطلق بولا جاتا ہے تو ذہن ذوات اربع (چار ٹانگوں) والے جانوروں کی طرف جاتا ہے سننے والے کے ذہن میں چیونٹی کا تصور نہیں آتا ہے پس وہ غیر مراد ہو گئی اور اس لفظ کے لیے ظاہر مدلول نہیں۔ مخالف کہتا ہے: غالبی معنی کی سبقیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ نادر غیر مراد ہو اور لفظ کا دو معانی کے لیے ایک وضع کے اعتبار سے ہے یہ ان دونوں کے ساتھ متکلم کے شعور پر قصداً دلالت کرتا ہے۔ پہلا قول اصح ہے اور مکمل کلام کتب اصول میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 28**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ عبیدہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: قبلہ (بوسہ) لمس سے ہے اور جماع کے علاوہ سب کچھ لمس سے ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر نے کہا: محمد بن یزید نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے کہا: آیت کی ابتدا میں اس کا ذکر کیا جو جماع کرنے والے پر واجب ہے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا: اللمس، المس اور الغشیان سب کا معنی جماع ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے کنایہ فرمایا۔ مجاہد نے وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۝ (الفرقان) کے تحت فرمایا: اس کا مطلب ہے جب وہ نکاح کا ذکر کرتے ہیں تو اسے کنایہ کرتے ہیں سورۃ النساء میں اس باب میں قول تفصیلاً گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً سورۃ النساء میں گزر چکا ہے پانی کے نہ ہونے کا حکم صحیح حاضر کے لیے بھی مرتب ہوتا ہے کہ وہ قیدی ہو یا باندھا ہوا ہو، وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس نے نہ پانی پایا نہ مٹی اور اسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو تو اس کے حکم میں فقہاء کے مختلف چار اقوال ہیں۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ نہ نماز پڑھے اور نہ اس پر کچھ اور ہے۔ مدنی علماء نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ مذہب صحیح ہے۔ ابن القاسم نے کہا: نماز پڑھ لے اور اعادہ کرے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: نماز پڑھے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 50

اعادہ نہ کرے۔ اصبغ نے کہا: نہ نماز پڑھے اور نہ قضا کرے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابوعمر بن عبدالبر نے کہا: میں نہیں جانتا کہ ابن خویز منداد نے مذہب صحیح کا کیسے قول کیا ہے۔ اس کے بارے میں جو اس نے ذکر کیا ہے اس کے خلاف جمہور سلف، عامۃ الفقہاء اور مالکی علماء کی جماعت کا قول ہے۔ میرا خیال ہے وہ امام مالک کی حدیث کے ظاہر قول: لیسوا علی ماء کی طرف گئے ہیں اور انہوں نے انھم صلوا انہوں نے نماز پڑھی کا ذکر نہیں کیا اور اس میں حجت نہیں ہے۔ ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے اس حدیث میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی اور انہوں نے اعادہ کا ذکر نہیں کیا اس نظریہ کی طرف فقہاء کی ایک جماعت کا خیال گیا ہے۔ ابوثور نے کہا: یہی قیاس ہے۔

میں کہتا ہوں: جو الکیا طبری نے ذکر کیا ہے اس سے مزنی نے حجت پکڑی ہے۔ طبری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہار کا واقعہ روایت کیا ہے جب وہ گم ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار کی طلب کے لیے بھیجا تھا انہوں نے بغیر تیمم اور بغیر وضو کے نماز پڑھی تھی اور انہوں نے اس بات کی خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی پھر آیت تیمم نازل ہوئی ان پر بغیر وضو اور تیمم کے نماز پڑھنے پر انکار نہ فرمایا۔ تیمم جب مشروع ہی نہیں تھا تو انہوں نے بغیر طہارت کے نماز پڑھی تھی، اسی وجہ سے مزنی نے کہا: اس پر اعادہ نہیں ہے یہ بغیر طہارت کے نماز کے جواز میں نص ہے جب طہارت دینے والی چیز تک پہنچنا ممکن نہ ہو۔ ابوعمر نے کہا: اس کو مغمی علیہ (جس پر غشی طاری ہو) پر محمول کرنا مناسب نہیں مغمی علیہ کی عقل نہیں ہوتی جب کہ یہ عقل کے ساتھ ہے۔ ابن القاسم اور تمام علماء نے کہا: نماز انسان پر واجب ہے جب تک اس کی عقل موجود ہو، جب عقل موجود ہو تو وضو کرے یا تیمم کرے اور نماز پڑھے۔ امام شافعی سے دو روایات مروی ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ جس حالت میں ہے نماز پڑھے اور اعادہ کرے۔ مزنی نے کہا: جب کوئی شخص محبوس ہو اور پاک مٹی پر قادر نہ ہو تو نماز پڑھے اور اعادہ کرے یہ امام ابو یوسف، امام محمد، ثوری اور طبری کا قول ہے۔ زفر بن ہذیل نے کہا: حضر میں محبوس نماز نہ پڑھے اگرچہ وہ پاک مٹی پائے بھی۔ یہ ان کی اصل پر ہے کہ ان کے نزدیک حضر میں نمازی تیمم نہ کرے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابوعمر نے کہا: جس نے کہا نماز پڑھے جیسا بھی ہے اور اعادہ کرے جب طہارت پر قادر ہو تو انہوں نے بغیر طہارت کے نماز کے لیے احتیاط کی انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ بغیر طہارت کے نماز کو قبول نہیں کرتا" (1)۔ یہ اس کے لیے ہے جو طہارت پر قادر ہو اور جو طہارت پر قادر نہ ہو اس کے لیے یہ حکم نہیں، کیونکہ وقت فرض ہے وہ اس پر قادر ہے پس وہ نماز پڑھے جیسا وہ وقت میں قادر ہے پھر اعادہ کرے پس اس نے وقت اور طہارت میں احتیاط کو لیا۔

اور جن علماء نے کہا وہ نماز نہ پڑھے انہوں نے ظاہر حدیث کے اعتبار سے کہا: یہ مالک ابن نافع اور اصبغ کا قول ہے انہوں نے کہا: جو پانی اور مٹی نہ پائے وہ نماز نہ پڑھے اور نہ قضا کرے اگر نماز کا وقت گزر جائے کیونکہ عدم قبولیت عدم شروط کی وجہ سے ہے یہ دلیل ہے کہ عدم قبولیت عدم شروط کی وجہ سے ہے یہ دلیل ہے کہ عدم شروط کی حالت میں وہ نماز کا مخاطب نہیں ہے اس کے ذمہ کوئی چیز مرتب نہ ہوگی پس وہ قضا نہ کرے۔ ابوعمر کے علاوہ علماء کا یہ قول ہے اس بناء پر طہارت وجوب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 24

کی شرط سے ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا، صَعِيْدًا کے متعلق علماء کا اختلاف سورۃ النساء میں گزر چکا ہے اور امام مالک کے قول پر حضرت عمران بن حصین کی حدیث نص ہے اگر صَعِيْدًا سے مراد تراب (مٹی) ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آدمی کو کہتے علیك بالتراب فانه یکفیك۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیك بالصعید(1) فرمایا تو آپ نے اسے سطح زمین کی طرف پھیرا۔ واللہ اعلم۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ اس پر تفصیلی کلام سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 31**۔ یہاں تک ہم نے آیات کے متعلق گفتگو کی، اب تو جان لے کہ علماء نے وضو اور طہارت کی فضیلت میں کلام کی ہے۔ یہ باب کا خاتمہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الطهور شطر الایمان(2)، طہارت ایمان کا حصہ ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو مالک اشعری کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس پر کلام گزر چکی ہے۔ ابن عربی نے کہا: وضو دین میں اصل ہے اور مسلمانوں کی طہارت ہے خصوصاً اس امت کے لیے۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا اور فرمایا: ''یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء کا وضو ہے اور میرے باپ ابراہیم کا وضو ہے'' یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول لکم سیما لیست لغیرکم(3) تمہارے لیے علامت ہے، تمہارے غیر کے لیے نہیں ہے وہ وضو کرتے تھے جس چیز کے ساتھ یہ امت خاص ہے وہ غرہ (پیشانی کا روشن ہونا) اور التحجیل (ہاتھ اور پاؤں کا چمک والا ہونا) ہے وضو نہیں ہے، یہ دونوں اللہ کی طرف سے فضل ہیں اس امت کے شرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شرف کے لیے اس امت کے ساتھ خاص فرمایا ہے جس طرح تمام امتوں پر اس کو دوسری فضیلتیں دی ہیں، جس طرح اس امت کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقام محمود کے ساتھ اور دوسرے کمالات کے ساتھ تمام انبیاء پر فضیلت دی۔ واللہ اعلم۔ ابو عمر نے کہا: جائز ہے کہ انبیاء وضو کرتے ہوں اور اس سے وہ غرہ و تحجیل حاصل کرتے ہوں اور ان کے متبعین وضو نہ کرتے ہوں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے انہوں نے کہا: یا رب! میں ایک امت دیکھتا ہوں جو سب انبیاء کی طرح ہیں اس کو میری امت بنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔ اس حدیث میں طوالت ہے۔ سالم بن عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ لوگ حساب کے لیے جمع ہیں پھر انبیاء کو بلایا گیا ہر نبی کے ساتھ اس کی امت تھی، اس نے ہر نبی کے لیے دو نور دیکھے جن کے درمیان وہ چل رہا تھا اور اس کی اتباع کرنے والے کے لیے ایک نور تھا جس کے ساتھ وہ چل رہا تھا حتیٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا گیا جب آپ کا سر اور چہرہ ظاہر ہوا تو نور ہی نور تھا ہر ایک کو وہ نور نظر آتا جو آپ کی طرف دیکھتا اور ہر ایک کی امت کے ہر فرد کے لیے دو نور تھے جس طرح انبیاء کے نور تھے، کعب نے اسے کہا: جب کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خواب ہے تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی اور تجھے کس نے یہ سکھایا؟ اس شخص نے بتایا کہ یہ خواب ہے۔ کعب نے اسے کہا: اَللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (الحشر: 22) واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے۔ کعب نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 50　2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارات، جلد 1، صفحہ 118　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 126

کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، یہ صفت احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی امت کی ہے اور انبیاء کی صفت کتاب میں ہے گویا جو تو کہہ رہا ہے تورات سے ہے۔ کتاب ''التمہید'' میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ کہا گیا ہے کہ تمام امتیں وضو کرتی تھیں۔ واللہ اعلم۔ یہ میں صحیح سند سے نہیں جانتا۔

مسلم نے اس کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بندہ مومن یا مسلم وضو کرتا ہے اور اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے ہر خطا نکل جاتی ہے جس کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ، جب ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے ہر خطا نکل جاتی ہے جس کو اس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا، پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ، جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو ہر خطا نکل جاتی ہے اس کے قدم جس کی طرف چلے تھے پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ حتیٰ کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے'' (1)۔ امام مالک نے عبد اللہ صنابحی سے جو حدیث روایت کی ہے وہ اکمل ہے، درست ابو عبد اللہ ہے نہ کہ عبد اللہ۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں امام مالک کو وہم ہوا اس کا نام عبد الرحمن بن عسیلۃ تھا یہ تابعی شامی کبیر ہے، کیونکہ اس نے حضرت ابو بکر کی خلافت کا آغاز پایا۔ حضرت ابو عبد اللہ صنابحی نے کہا: میں یمن سے ہجرت کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جب ہم جحفۃ پہنچے وہاں ایک سوار موجود تھا، ہم نے اس سے پوچھا: کیا خبر ہے؟ اس نے کہا: ہم تین دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر چکے ہیں۔ یہ احادیث اور اس کے ہم معنی حضرت عمرو بن عبسہ وغیرہ کی احادیث تجھے یہ فائدہ دیتی ہیں کہ وضو مشروع ہے اور یہ عبادت ہے، گناہوں کو مٹانے کے لیے۔ یہ چیز نیت شرعیہ کی احتیاج کا تقاضا کرتی ہے، کیونکہ یہ گناہوں کو مٹانے اور اللہ کی بارگاہ میں درجات بلند کرنے کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 32**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ یعنی دین میں تنگی نہیں رکھی اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) من صلہ ہے یعنی لیجعل علیکم حرجاً۔

وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ یعنی تاکہ وہ تمہیں گناہوں سے پاک کر دے جیسا کہ ہم نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اور صنابحی کی احادیث ہم نے ذکر کی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حدث اور جنابت سے تمہیں پاک کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: تاکہ تم اس طہارت کے وصف کے مستحق ہو جاؤ جس کے ساتھ اہل طاعت موصوف ہوتے ہیں۔ سعید بن مسیب نے لیطھرکم پڑھا ہے۔ معنی ایک ہی ہے، جیسے کہا جاتا ہے نجاہ وانجاہ۔

وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ۔ مرض اور سفر کے وقت تیمم کی رخصت دے کر تم پر نعمت مکمل کرے۔ بعض علماء نے کہا: شرائع کے بیان کے ساتھ نعمت کو مکمل کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: گناہوں کی بخشش فرما کر تم پر نعمت کو مکمل کرے۔ حدیث میں ہے ''نعمت کا تمام جنت کا دخول اور آگ سے نجات ہے'' (2)۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ یعنی تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو اور اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہو۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 125 2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 191، ایضاً، حدیث 3450، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''اور یاد رکھو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ لیا تھا تم سے جب کہا تھا تم نے، سن لیا اور مان لیا۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ۔ بعض علماء نے فرمایا: میثاق سے مراد وہ ہے جو اس ارشاد میں ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ (الاعراف: 172) یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے اگرچہ ہم نے اس کو یاد نہیں رکھا جو ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمیں وفا کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ یہود کو خطاب ہے کہ وہ عہد جو ان سے تورات میں لیا گیا ہے اس کی حفاظت کریں۔ اور جمہور مفسرین جیسے حضرت ابن عباس اور سدی کا نظریہ یہ ہے کہ وہ عہد اور میثاق مراد ہے جو ان کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خوشی اور پریشانی میں سمع وطاعت کا جاری ہوا تھا جب انہوں نے کہا تھا: ہم نے آپ کا ارشاد سنا اور ہم نے اطاعت کی جیسا کہ لیلۃ العقبہ اور تحت الشجرۃ جاری ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح فرمایا: اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح: 10) حالانکہ انہوں نے عقبہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے جس سے وہ اپنے نفسوں، اپنی عورتوں اور اپنے بیٹوں کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ اور ان کے اصحاب ان کی طرف ہجرت کریں گے، سب سے پہلے حضرت براء بن معرور نے اس پر بیعت کی تھی، اس کو اس رات مقام محمود حاصل تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پختہ عہد کرتے اور آپ کے امر کو شدت سے پکڑنے کی وجہ سے۔ یہی وہ تھے جنہوں نے کہا تھا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! ہم اس چیز سے آپ کی حفاظت کریں گے جس سے ہم اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں، یا رسول اللہ! آپ ہماری بیعت کریں۔ اللہ کی قسم! ہم جنگوں کے بیٹے ہیں، اہل حلقہ میں ہم ان چیزوں کے نسل در نسل وارث بنے ہیں، سیرت ابن اسحاق میں خبر مشہور موجود ہے۔ بیعت الرضوان کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کے ساتھ متصل ہے جو صحابہ کرام نے کہا تھا اس کو پورا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ رضی اللہ عنہم وارضاهم۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی اللہ کی مخالفت سے ڈرو، کیونکہ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

''اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے انصاف کے ساتھ اور

ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ اس کا معنی سورۃ النساء میں گزر چکا ہے معنی یہ ہے کہ میں نے تم پر اپنی نعمت مکمل کی پس ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے۔ اللہ کے ثواب کے لیے اس کے حق کو قائم کرو، اور اپنے اقارب کی طرف جھکاؤ کیے بغیر حق کی گواہی دو اور دشمن پر ظلم کیے بغیر حق کی گواہی دو۔

وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عدل کے ترک اور حق پر ظلم و زیادتی کو ترجیح پر کسی قوم کی عداوت تمہیں نہ اکسائے۔ اس میں دلیل ہے کہ دشمن کا حکم دشمن پر نافذ ہوگا جب کہ وہ اللہ کی رضا میں کسی سے دشمنی کرنے والا ہو اور اس کی شہادت اس کے خلاف نافذ ہوگی، کیونکہ اس نے عدل کے ساتھ فیصلہ کیا اگرچہ وہ اس سے بغض رکھتا ہے، اگر بغض کے ہوتے ہوئے اس کا حکم اور اس کے خلاف شہادت جائز نہ ہوتی تو اسے عدل کا حکم دینے کا کوئی مطلب نہ رہتا۔ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ کافر کا کفر اس پر عدل کرنے سے مانع نہیں اور قتال اور غلام بنانے میں سے جس کے وہ مستحق ہوں گے اس پر اکتفا کیا جائے گا، کافر کا مثلہ کرنا جائز نہیں اگرچہ انہوں نے ہماری عورتوں، ہمارے بچوں اور ہمارے بچوں کو قتل کیا ہو۔ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم انہیں غم اور حزن پہنچانے کے لیے قصداً ان کو مثلہ کے ساتھ قتل کریں، اسی کی طرف حضرت عبداللہ بن رواحہ نے اپنے قول سے مشہور واقعہ میں اشارہ کیا ہے۔ یہ آیت کا معنی ہے اور اس صورت کے آغاز میں لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ کا معنی گزر چکا ہے، یہ لَا یُجْرِمَنَّكُمْ بھی پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ زجاج نے کہا: لَا یَجْرِمَنَّكُمْ کا معنی ہے تمہیں جرم میں داخل نہ کرے جیسے تو کہتا ہے: آثمنی، اس نے مجھے گناہ میں داخل کیا۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تمہارا آگ سے ڈرنا۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے حق میں فرمایا اس کی حقیت کو مخلوق کا فہم سمجھ نہیں سکتا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدہ: 17) جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَجْرٌ عَظِیْمٌ، اَجْرٌ كَرِیْمٌ، اَجْرٌ كَبِیْرٌ تو پھر اس کی مقدار کون جان سکتا ہے؟ جب وعدہ، قول سے پہلے تھا تو لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ میں لام کا داخل کرنا ہی بہتر تھا یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ موعود بہ کی جگہ واقع ہے اس معنی کی بنا پر وعدھم ان لھم مغفرۃ یا وعدھم مغفرۃ مگر جملہ مفرد کی جگہ واقع ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وجدْنا الصّالحین لھم جزاء وجَنّاتٍ وعینًا سَلْسَبِیلًا

جملہ نصب کی جگہ پر ہے اسی وجہ سے نصب کے ساتھ اس پر عطف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: محل رفع میں ہے اس بنا پر کہ موعود بہ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہوگی: لھم مغفرۃ و اجر عظیم فیما وعدھم بہ۔ یہ معنی حسن سے مروی ہے۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ یہ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تمام کفار کے بارے میں نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ

اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ۧ

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہوئی جب پختہ ارادہ کر لیا تھا ایک قوم نے کہ بڑھائیں تمہاری طرف اپنے ہاتھ تو اللہ نے روک دیا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ غزوہ ذات الرقاع میں اعرابی کے فعل کے سبب نازل ہوئی جب اس نے نبی کریم ﷺ پر تلوار سونت لی تھی اور کہا تھا: اے محمد! (ﷺ) تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ بخاری میں ہے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلایا وہ جمع ہوئے جب کہ وہ شخص نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، آپ ﷺ نے اسے کوئی سزا نہ دی۔ واقدی اور ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے کہ اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ ایک قوم نے ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنا سر درخت کے تنے پر مارا حتیٰ کہ مر گیا۔ بخاری نے غزوہ ذات الرقاع میں اس کا نام غورث بن حارث ذکر کیا ہے غین مفتوحہ، واؤ ساکن اس کے بعد را اور ثا ہے، بعض نے غین کو ضمہ دیا ہے، مگر فتحہ اصح ہے۔ ابو حاتم محمد بن ادریس رازی، ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نام دعثور بن حارث تھا انہوں نے ذکر کیا ہے کہ اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ اس شخص کا نام عمرو بن جحاش تھا یہ بنی نضیر سے تھا۔ بعض نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن جحاش کا واقعہ اس واقعہ کے علاوہ ہے۔ واللہ اعلم۔ قتادہ اور مجاہد وغیرہما نے کہا: یہ آیت یہود کے متعلق نازل ہوئی، نبی کریم ﷺ ان کے پاس دیت میں مدد طلب کرنے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان سے محفوظ کر لیا۔ قشیری نے کہا: کبھی کوئی آیت ایک واقعہ کے لیے نازل ہوتی ہے پھر سابقہ بات کو یاد دلانے کے لیے دوبارہ اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ۔ یعنی برائی کے ساتھ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں: فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ اس نے انہیں روکا۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱۲

''اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوۃ اور ایمان لائے میرے رسولوں پر اور مدد کرتے رہے ان کی اور قرض دیتے رہے اللہ کو قرض حسن تو میں ضرور دور کردوں گا تم سے تمہارے گناہ اور میں داخل کروں گا تمہیں باغات میں، رواں ہیں جن کے نیچے نہریں تو جس نے کفر کیا اس کے

بعد تم میں سے تو یقیناً وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ آیات اس خبر کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد وں کو توڑا۔ یہ آیت تائید کرتی ہے کہ سابقہ آیت کف الایدی، بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی۔ اہل تاویل کا ان سرداروں کے بھیجنے کی کیفیت میں اختلاف ہے، اس بات پر تو اجماع ہے کہ النقیب سے مراد قوم کا بڑا ہے ان کے حالات سے پوری طرح باخبر ہو اور ان کے امور و مصالح کا ذمہ دار ہو۔ النقاب وہ عظیم شخص جو لوگوں میں اس طریقہ پر ہوتا ہے، اسی وجہ سے حضرت عمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نقاب تھے۔ النقباء، ضمان، اس کا واحد نقیب ہے جو قوم کا شاہد اور ضامن ہو، کہا جاتا ہے: نقب علیهم، وهو حسن النقیبة یعنی حسن الخلیقه، النقب والنُقب۔ پہاڑی راستہ کو کہتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو نقیب اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوم کے معاملات میں دخیل ہوتا ہے اور ان کے مناقب کو جانتا ہے وہی ان کے امور کی معرفت کا راستہ ہوتا ہے۔ ایک قوم نے کہا: النقباء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی قوم پر امین ہوتے ہیں۔ یہ تمام معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ نقیب کا مرتبہ عریف سے بڑا ہوتا ہے۔ عطا بن یسار نے کہا: حاملین قرآن اہل جنت کے عرفاء (سردار) ہیں۔ دارمی نے اپنی مسند میں یہ ذکر کیا ہے۔ قتادہ وغیرہ نے کہا: یہ نقباء ہر قبیلہ سے بڑے سردار تھے، ہر ایک اپنے قبیلہ کا کفیل بنا تھا کہ وہ ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے۔ اسی طرح نقباء عقبہ کی رات تھے، اس میں ستر مردوں اور دو عورتوں نے بیعت کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ستر میں سے بارہ کا چناؤ کیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں ان کا نام نقباء رکھا تھا۔ ربیع اور سدی وغیرہما نے کہا: بنی اسرائیل سے نقباء بھیجے جنہیں جابر اور بڑے لوگوں کی طاقت پر اطلاع دینے پر امین بنایا وہ چلے تا کہ وہ آزمائیں انہیں جو ان کے ساتھ ہیں اور انہیں بتائیں جس پر وہ مطلع ہیں تا کہ ان سے جنگ کرنے کے متعلق غور و خوض کیا جائے، پس وہ جابر لوگوں کی قوت پر مطلع ہوئے اور انہوں نے گمان کیا کہ انہیں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ وہ اس چیز کو بنی اسرائیل سے چھپائیں اور اس کے متعلق صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ کریں جب وہ بنی اسرائیل کی طرف لوٹے تو ان میں سے دس نے خیانت کی اور انہوں نے اپنے قریبی رشتہ داروں اور جو ان پر اعتماد کرنے والے تھے انہیں بتادیا۔ پس خبر پھیل گئی حتیٰ کہ بنی اسرائیل کا معاملہ ٹیڑھا ہو گیا اور انہوں نے کہا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝ (المائدہ)(1) پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو (ان سے) ہم تو یہاں بیٹھیں گے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں ایسی خبر واحد کی قبولیت میں دلیل ہے جس میں انسان کو ضرورت ہو اور حاجات دینیہ اور دنیویہ میں سے کسی پر مطلع ہونے کا محتاج ہو پس اس پر احکام مرکب کیے جاتے ہیں اور اس پر حلال و حرام کا دارومدار ہوتا ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 168

اس کی مثال اسلام میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کو کہا تھا: ''تم واپس جاؤ حتیٰ کہ ہمارے پاس تمہارے عرفاء (سردار) تمہارا معاملہ پیش کریں'' (1)۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس میں جاسوس بنانے کی دلیل ہے۔ التجسس کا معنی ہے تلاش و بحث کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسبسۃ کو جاسوس بنا کر بھیجا تھا (2)۔ جاسوس کا حکم سورۃ الممتحنۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ رہے بنی اسرائیل کے نقباء کے اسماء تو محمد بن حبیب نے المحبر میں ان کے اسماء ذکر کیے ہیں۔ انہوں نے کہا: رومیل قبیلہ کا سردار شموع بن رکوب تھا، شمعون قبیلہ کا سردار شوقوط بن حوری تھا، یہوذا قبیلہ کا سردار کالب بن یوقنا تھا، الساحر قبیلہ کا سردار یوغول بن یوسف تھا، افرائیم قبیلہ کا سردار یوشع بن نون تھا، بنیامین قبیلہ کا سردار یلنطی بن روقو تھا اور ربالون قبیلہ کا سردار کرابیل بن سودا تھا، منشا بن یوسف قبیلہ کا سردار کدی بن سوشا تھا، دان قبیلہ کا سردار عمائل بن کسل تھا، شبیر قبیلہ کا سردار ستور بن میخائیل تھا، نفتال قبیلہ کا سردار یوحنا بن وقوشا تھا اور کاذ قبیلہ کا سردار کوال بن موخی تھا ان میں سے دو مومن تھے یوشع اور کالب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو کے علاوہ کے خلاف دعا کی تو وہ سارے ہلاک ہو گئے جب کہ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض تھا۔

یہ ماوردی کا قول ہے۔ اور لیلۃ العقبہ کے نقباء سیرت ابن اسحاق میں مذکور ہیں وہاں دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ

ربیع بن انس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ نقباء کو کہا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ تمام بنی اسرائیل کو فرمایا: ان کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے کلام کا آغاز کیا گیا ہے۔ مَعَكُمْ منصوب ہے، کیونکہ ظرف ہے یعنی بالنصر والعون۔ پھر کلام کا آغاز فرمایا، فرمایا: لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ یعنی اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہیں باغات میں داخل کروں گا۔ لئن میں لام، لام توکید ہے، اس کا معنی قسم ہے، اسی طرح لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ اور لَاُدْخِلَنَّكُمْ میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اگر تم نماز قائم کرو گے تو میں تمہارے گناہ تم سے مٹا دوں گا اور دوسری شرط کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے، کیونکہ ارشاد ہے: لَّاُكَفِّرَنَّ یعنی اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہارے گناہ مٹا دوں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ کا قول اِنِّیْ مَعَكُمْ کی جزا ہے اور لَّاُكَفِّرَنَّ کے قول کی شرط ہے۔ التعزیر کا معنی تعظیم و توقیر ہے، ابوعبیدہ نے کہا:

وکم من ماجد لهم كريم ومن ليث يُعَزَّر في النَّدی

یعنی وہ تعظیم و توقیر کرتا ہے۔ الضرب وہ سزا ہے جو حد سے کم ہوتی ہے، تو کہتا ہے: عزرت فلانا جب تو نے اسے ادب سکھایا اور برائی سے اسے روکا۔ پس عزرتموهم کا مطلب ہے تم نے ان سے ان کے دشمنوں کو روکا۔

وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی صدقات دے۔ اقراضا نہیں فرمایا۔ یہ مصدر، فعل کے مصدر کے خلاف آیا ہے جیسے وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ (نوح) اور فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ (آل عمران: 37) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 618
2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 138

حسناً فرمایا یعنی اس صدقہ پر تمہارے دل خوش ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس سے وہ اللہ کی رضا چاہتے ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے حلالاً۔ بعض نے فرمایا: قرضاً اسم ہے مصدر نہیں ہے۔ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ یعنی میثاق کے بعد۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ یعنی وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳

"تو بوجہ ان کی عہد شکنی کے ہم نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور کر دیا ان کے دلوں کو سخت، وہ بدل دیتے ہیں (اللہ کے) کلام کو اپنی اصلی جگہوں سے اور انہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اور ہمیشہ آپ آگاہ ہوتے رہیں گے ان کی خیانت پر بجز چند آدمیوں کے ان سے تو معاف فرماتے رہیے ان کو اور درگزر فرمائیے بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ یعنی ان کے عہد کو توڑنے کی وجہ سے۔ ما تاکید کے لیے زائدہ ہے۔ یہ قتادہ اور تمام اہل علم سے مروی ہے یہ کلام کو مؤکد کرتا ہے اس معنی سے کہ حسن نظم کی جہت سے نفس میں معنی راسخ ہو جاتا ہے اور کثرت کی جہت سے تاکید کے لیے ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

لشیٔ ما یسود من یسود

پس تاکید علامت موضوعہ کے ساتھ تکریر کے ساتھ تاکید کی طرح ہے۔

لَعَنّٰهُمْ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہم نے انہیں جزیہ کے ساتھ عذاب دیا۔ حسن اور مقاتل نے کہا: ہم نے مسخ کے ساتھ انہیں عذاب دیا۔ عطا نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں دور کر دیا۔ اللعن کا معنی رحمت سے دور کر دینا ہے۔ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ہم نے ان کے دلوں کو ایسا سخت بنا دیا ہے کہ نہ وہ خیر کو یاد رکھتے ہیں اور نہ نیکی کرتے ہیں۔ القاسیۃ اور العاتیۃ کا ایک معنی ہے۔ کسائی اور حمزہ نے قسیّۃ بغیر الف کے یا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابن مسعود، نخعی اور یحییٰ بن وثاب کی قرأت ہے العام القسی الشدید اس سال کو کہتے ہیں جس میں بارش نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الدراھم القسیات سے ہے یعنی فاسد اور ردی دراہم۔ قسیہ کا معنی اس بنا پر یہ ہوگا کہ وہ ایمان کے ساتھ خالص نہیں یعنی ان میں نفاق ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ قول ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے درھم قسی جب اس میں نحاس وغیرہ کے ساتھ کھوٹ ملایا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے درھم قسی سین مخفف اور یا مشدد کے ساتھ جیسے شقی گھٹیا درہم۔ یہ ابو عبیدہ نے ذکر کیا ہے:

لها صَوَاهِلُ فی صُمّ السِّلامِ كما صاحَ القَسِيَّاتُ فی أيدی الصَّيَارِيفِ

شاعر ان کسیوں کی تعریف کر رہا ہے جو پتھروں میں واقع ہوتے ہیں۔

اصمعی اور ابو عبید نے کہا: درہم قسی گویا یہ قاشی سے معرب بنایا گیا ہے۔ قشیری نے کہا: یہ بعید ہے، کیونکہ قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو لغت قرآن سے نہیں ہے، بلکہ الدرهم القسی، القسوۃ اور الشدۃ سے ہے، کیونکہ جس میں چاندی کم ہوتی ہے وہ سخت ہوتا ہے۔ اعمش نے کہا: قسية یا کی تخفیف کے ساتھ فعلة کے وزن پر جیسے عمية و شجية یہ قسی یقسی سے ہے نہ کہ قسا یقسو سے ہے۔ باقی قراء نے فاعلةٌ کے وزن پر پڑھا ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے العلية اور العالية، الزكية، الزاكية۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس میں اولیٰ یہ ہے کہ قسية بمعنی قاسية ہو۔ مگر فعليةٌ فاعلة سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے، معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا ہے وہ میرے طاعت کی توفیق اور ایمان سے دور ہیں، کیونکہ کوئی قوم ایمان سے موصوف نہیں ہوتی جب کہ ان کے دل اس سے موصوف ہوں کہ ان کے ایمان کے ساتھ کفر ملا ہوا ہو۔ جیسے الدراهم القسية جن میں کھوٹ ملا ہوا ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

قد قسوت و قست لِداتی

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ غیر مناسب تاویل کرتے ہیں اور پھر عوام کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ حروف کو بدلتے ہیں۔ یُحَرِّفُوْنَ محل نصب میں ہے یعنی ہم نے ان کے دل کو سخت کر دیا ہے جب کہ وہ بدلنے والے ہیں۔ سلمی اور نخعی نے الكلام، الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی صفت کو اور آیت رجم کو بدلا۔ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا یعنی اللہ کے عہد کو بھول گئے جو انبیاء نے ان سے لیا تھا کہ وہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور ان کی صفات کو بیان کریں گے۔ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ یعنی اے پیارے محمد! آپ ہمیشہ آگاہ ہوتے رہیں گے آپ بھی آگاہ رہیں۔ عَلٰى خَآىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ، الخائنه کا معنی ہے خیانت۔ قتادہ نے کہا: یہ لغت میں جائز ہے اس کی مثال عربوں کا قول ہے قائلةٌ بمعنی قیلولة۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ محذوف کی لغت ہے، تقدیر فرقةٌ خائنة ہے کبھی خائنةٌ واحد کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل نسابة و علامةٌ۔ اس بنا پر خائنة مبالغہ کے لیے ہوگا کہا جاتا ہے: رجل خائنةٌ جب تو کسی کے وصف خیانت میں مبالغہ کرے۔ شاعر نے کہا:

حدّثت نفسك بالوفاءِ ولم تكن　　لِلغَدْرِ خائِنةً مغِلَّ الأَصْبَعِ(1)

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عَلٰى خَآىِٕنَةٍ کا مطلب ہے معصیت پر (2)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد جھوٹ اور فجور ہے۔ ان کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے اس عہد کو توڑا جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تھا اور یہود کا مشرکین کی مدد کرنا تھا جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے جنگ لڑی تھی جیسے جنگ احزاب وغیرہ اور اس کے علاوہ ان کا رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ تھا اور آپ ﷺ کی گستاخیاں کرنا تھا۔ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ مگر ان میں سے تھوڑے تھے جنہوں نے خیانت نہیں کی تھی یہ خَآىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ میں ضمیر سے مستثنیٰ متصل ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ اس کے معنی میں دو قول ہیں: یعنی ان کو معاف کیجئے اور ان سے درگزر کیجئے جب تک ان کے اور تمہارے درمیان عہد ہے اور وہ اہل ذمہ ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 6، صفحہ 188　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 227

آیت السیف سے منسوخ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس قول سے منسوخ ہے: وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً (الانفال: 58)

وَ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ سَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ﴿ۙ۱۵﴾ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۶﴾

''اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا: ہم نصرانی ہیں ہم نے لیا تھا پختہ وعدہ ان سے بھی، سو انہوں نے بھی بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے بھڑکا دی ان کے درمیان عداوت اور بغض (کی آگ) روز قیامت تک اور آگاہ کر دے گا انہیں اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ اے اہل کتاب! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں تم چھپایا کرتے تھے کتاب سے اور درگزر فرماتا ہے بہت سی باتوں سے بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک کتاب ظاہر کرنے والی، دکھاتا ہے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انہیں جو پیروی کرتے ہیں اس کی خوشنودی کی سلامتی کی راہیں اور نکالتا ہے انہیں تاریکیوں سے اجالے کی طرف اپنی توفیق سے اور دکھاتا ہے انہیں راہ راست''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ یعنی ہم نے نصاریٰ سے توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا، کیونکہ وہ انجیل میں مکتوب ہے۔ فَنَسُوْا حَظًّا سو انہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے یعنی جو انہیں حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اور انہوں نے اس خواہش نفس اور تحریف کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کا سبب بنایا۔ اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ کا معنی اس طرح ہے جیسے تیرا قول ہے: اخذت من زید ثوبه و درهمه، میں نے زید سے کپڑا اور درہم لیا۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ الَّذِیْنَ کا مقام اَخَذْنَا کے بعد ہے اور میثاق سے پہلے ہے تقدیر اس طرح ہوگی: اخذنا من الذین قالوا انا نصاری میثاقهم کیونکہ یہ اَخَذْنَا کا مفعول ثانی ہے۔ کوفیوں کے نزدیک اس کی تقدیر اس طرح ہے: ومن الذین قالوا انا نصاری من اخذنا میثاقهم، هم ضمیر کا مرجع من محذوفہ ہے اور پہلے قول کی بنا پر هم ضمیر کا مرجع الَّذِیْنَ ہے۔ اور نحوی علماء اخذنا میثاقهم من الذین قالوا انا نصاری جائز قرار نہیں دیتے اور نہ الینها لبست من الثیاب کو جائز قرار دیتے ہیں تاکہ مضمر ظاہر پر مقدم نہ ہو اور ان کے قول اِنَّا نَصٰرٰی...... من النصاری نہیں کہا

میں دلیل ہے کہ انہوں نے نصرانیت کو گھڑا تھا اور انہوں نے یہ نام خود رکھا تھا۔ یہ معنی حسن سے مروی ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ یعنی ہم نے ابھارا۔ بعض نے فرمایا: ہم نے ان کے ساتھ چمٹا دی۔ یہ الغراء سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا، جیسے گوند وغیرہ۔ کہا جاتا ہے: غری بالشی یغری غراً (غین کے فتحہ کے ساتھ مقصور) اور غراء غین کے کسرہ کے ساتھ ممدود جب کوئی کسی کا حریص ہو جائے گویا وہ اس کے ساتھ چمٹ گیا ہے۔ رمانی نے حکایت کیا ہے کہ الاغراء کا معنی، بعض کو بعض پر مسلط کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الاغراء کا معنی ابھارنا ہے اس کا اصل معنی ملانا ہے کہا جاتا ہے: غریت بالرجل غراً مقصور، ممدود غین کے فتحہ کے ساتھ، جب تو کسی کے ساتھ چمٹ جائے۔ کثیر نے کہا:

إذا قيل مهلا قالت العين بالبكا　غِرَاء　مدّتها　حوافِلُ　نُهّل

أَغْرَيْتُ زيداً بكذا حتى غَرِيَ به۔ اس سے الغراء ہے جس کے ساتھ کسی چیز کو چمٹایا جاتا ہے۔ پس الاغراء بالشئ کا معنی ہے تسلط کی جہت سے کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ چمٹانا ہے۔ أغریت الکلب یعنی میں نے کتے کو شکار پر ابھارا۔ بَيْنَهُمُ، الْعَدَاوَةَ کے لیے ظرف ہے اور البغضاء سے مراد بغض ہے، اس کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے(2)۔ سدی اور قتادہ سے مروی ہے کہ بعض بعض کے لیے دشمن ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نصاریٰ کے افتراق کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ربیع بن انس کا قول ہے، کیونکہ وہ قریب مذکور ہیں، کیونکہ وہ یعاقبۃ، نسطوریہ اور ملکانیہ فرقوں میں بٹ گئے تھے یعنی بعض نے بعض کو کافر کہا(3)۔ نحاس نے کہا: فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الخ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے بہتر قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی عداوت اور ان سے بغض رکھنے کا حکم دیا یا ہر فرقہ کو دوسرے فرقہ سے عداوت کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ وہ کفار ہیں۔ اور وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ یہ انہیں دھمکی ہے یعنی وہ میثاق کو توڑنے کی جزا پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ، الْكِتٰبِ اسم جنس ہے بمعنی الکتب ہے، تمام اہل کتاب مخاطب ہیں۔ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ یعنی من کتبکم یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا، آیت رجم اور اصحاب السبت کا واقعہ جنہیں بندروں میں مسخ کر دیا گیا تھا وہ انہیں چھپاتے تھے۔ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ یعنی وہ چھوڑ دیتا ہے اور بیان نہیں فرماتا اس کی نبوت پر جو اس میں حجت ہے اسے بیان کرتا ہے اور اس کی صداقت اور رسالت کی شہادت پر جو دلالت ہے اسے بیان کرتا ہے اور جس چیز کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی اسے وہ چھوڑ دیتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ یعنی بہت سی چیزوں سے درگزر فرماتا ہے اور اس کے متعلق تمہیں خبر نہیں دیتا، ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کے علماء میں سے ایک شخص تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا کہنے لگا: اے شخص! تو نے ہم سے درگزر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور کچھ بیان نہ کیا۔ یہودی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ آپ کی کلام میں تناقض ظاہر کرے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کچھ بیان نہ کیا تو وہ اٹھ کر چلا گیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: میرا خیال ہے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 186　2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 6، صفحہ 190　3۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 186

وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں وہ سچا ہے، کیونکہ اس نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ وہ اسے بیان نہیں کرتا جو اس سے پوچھتا ہے۔
قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ روشنی۔ بعض علماء نے فرمایا: نور سے مراد اسلام ہے۔ بعض نے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ زجاج سے مروی ہے(1)۔ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ یعنی قرآن، کیونکہ قرآن احکام کو بیان کرتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ جسے پسند کرتا ہے۔ سُبُلَ السَّلٰمِ سلامتی کا راستہ جو دار السلام تک پہنچانے والا ہے۔ ہر آفت سے پاک ہے اور ہر خوف سے امن والا ہے اور وہ جنت ہے۔ حسن اور سدی نے کہا: السلام سے مراد اللہ تعالیٰ ہے(2)، معنی ہوگا اللہ کا دین اور وہ اسلام ہے جیسے فرمایا: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ( آل عمران:19 )
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ یعنی کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نور اسلام اور ہدایات کی طرف نکالتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنی توفیق اور ارادہ سے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''یقیناً کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہے (اے حبیب!) آپ فرمایئے کون قدرت رکھتا ہے اللہ کے حکم میں سے کوئی چیز روک دے (یعنی) اگر وہ ارادہ فرمائے کہ ہلاک کر دے مسیح بن مریم کو اور اس کی ماں کو اور جو کوئی بھی زمین میں ہے سب کو ( تو اسے کون روک سکتا ہے ) اور اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ سورۃ النساء کے آخر میں اس کا بیان گزر چکا ہے، اس کلام کی دلالت میں نصاریٰ کا کفر ثابت ہوا یہ ان کے اس قول کی وجہ سے تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ یعنی اللہ تعالیٰ تو مسیح بن مریم ہے دین کی جہت سے، کیونکہ اگر انہوں نے یہ حکایت کی جہت سے کہا ہوتا اس بات کا انکار کرتے ہوئے تو وہ کافر نہ ہوتے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا یعنی اللہ کے امر سے۔ يَّمْلِكُ کا معنی یقدر ہے۔ یہ عربوں کے قول: ملکت علی فلان امرہ یعنی میں اس پر قادر ہوا، یعنی کوئی اللہ کے امر کو روکنے پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو وہ اس چیز کو دور کرنے پر قادر ہوتے جو ان پر اترتی اور جو دوسروں پر اترتی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کو موت دی وہ اپنی والدہ سے موت کو دور نہ کر سکے اگر اللہ تعالیٰ انہیں موت دیتا تو کون اس کا دفاع کرتا یا کون اسے رد کر سکتا؟ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ مخلوق میں محدود ہیں محصور ہیں ان کو حد اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 22
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 187

نہایت نے گھیرا ہوا ہے وہ البیت کی صلاحیت نہیں رکھتے اور فرمایا: وَ مَا بَيْنَهُمَا، و ما بینهن نہیں فرمایا کیونکہ دونوعوں اور صنفوں کا ارادہ کیا جیسا کہ راعی نے کہا:

طَرَقَا فتلك هَمَاهِمِي أَقْرِيهما قُلُصا لَوَاقِحَ كَالقِسِيِّ و حُولا (1)

اس نے طرقا کہا: پھر کہا: هماهمی۔ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

''کہا یہود اور نصاریٰ نے کہ ہم الله کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں آپ فرمائیے (اگر تم سچے ہو) تو پھر کیوں عذاب دیتا ہے تمہیں تمہارے گناہوں پر بلکہ تم بشر ہو اس کی مخلوق سے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور الله ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی ایک قوم کو سزا سے ڈرایا تو انہوں نے کہا: ہم نہیں ڈرتے، کیونکہ ہم الله کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نعمان بن اضا، بحری بن عمرو اور شاس بن عدی آئے انہوں نے آپ سے بات چیت کی اور آپ نے بھی ان سے کلام کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں الله تعالیٰ کی طرف بلایا اور انہیں الله تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا انہوں نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ ہمیں ڈراتے ہیں؟ ہم الله کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں جس طرح نصاریٰ نے کہا تھا پس الله تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ الخ (3)۔ انہیں حضرت معاذ بن جبل، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت عقبہ بن وہب نے کہا: اے یہودیو! الله تعالیٰ سے ڈرو۔ الله کی قسم! تم جانتے ہو کہ وہ رسول الله ہیں تم خود ہمارے سامنے ان کی بعثت سے پہلے ان کا تذکرہ کرتے تھے اور ہمارے سامنے ان کی صفات بیان کرتے تھے۔ رافع بن حریملہ اور وہب بن یہوذا نے کہا: ہم نے تو تمہیں یہ نہیں کہا اور نہ الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی کتاب نازل کی ہے اور نہ الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے پس الله تعالیٰ نے فرمایا: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ الخ۔ سدی نے کہا: یہود کا گمان ہے کہ الله تعالیٰ نے اسرائیل علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تیرا بیٹا، بکری، اولاد سے ہے (4)۔ سدی کے علاوہ علماء نے کہا: نصاریٰ نے کہا: ہم الله کے بیٹے ہیں، کیونکہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 6، صفحہ 196
2۔ اسباب النزول، صفحہ 128
3۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 197
4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 188

حکایت ہے کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کی طرف جا رہا ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اللہ کے رسل کے بیٹے ہیں یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے انہوں نے اپنے نفسوں میں فضیلت دیکھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد کیا اور فرمایا: فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ پس وہ دو وجہوں سے خالی نہ تھے یا وہ کہیں کہ وہ ہمیں عذاب دے گا تو انہیں کہا جائے گا پھر تم اس کے بیٹے اور محبوب نہیں ہو، کیونکہ حبیب اپنے حبیب کو عذاب نہیں دیتا جب کہ تم اس کے عذاب کا اقرار کرتے ہو یہ تمہارے جھوٹ پر دلیل ہے۔ اس کو جھگڑے کے وقت برہان الخلف کا نام دیا جاتا ہے۔ یا وہ کہیں کہ وہ ہمیں عذاب نہیں دے گا، تو انہوں نے اسے جھٹلایا جو ان کی کتب میں ہے اور جو ان کے رسول لے کر آئے اور انہوں نے معاصی کو مباح کیا جب کہ وہ اپنے میں سے نافرمانوں کے عذاب کا اعتراف کرنے والے ہیں، اسی وجہ سے ان کی کتب کے احکام لازم کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یُعَذِّبُكُمْ کا معنی ہے عذبکم۔ یہ ماضی کے معنی میں ہے یعنی تمہیں کیونکہ بندروں اور خنازیر میں مسخ کیا (1) اور تم سے پہلے یہود و نصاریٰ کو مختلف قسم کے عذاب میں گرفتار کیا وہ بھی تمہاری مثل تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی ایسی چیز سے حجت قائم نہیں کی جو ابھی تک نہیں ہوئی تھی، کیونکہ وہ بعض اوقات کہتے کہ ہم کل عذاب نہیں دیئے جائیں گے بلکہ اس سے حجت پیش کی جس کو وہ جانتے تھے پھر فرمایا: بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ یعنی دوسری مخلوق کی طرح تم بھی بشر ہو وہ تمہاری طاعت اور معصیت پر تمہارا محاسبہ کرے گا اور ہر ایک کو جزا دے گا جس نے جو عمل کیا۔ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ یہود میں سے جس نے توبہ کی۔ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ جو یہودیت پر مرا۔ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں جو اس سے معارضہ کرے۔ وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ۝ یعنی آخرت میں بندوں کا عمل اس کی طرف لوٹ جائے گا۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"اے اہل کتاب! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول صاف بیان کرتا ہے تمہارے لیے (احکام الٰہی) بعد اس کے رسولوں کا آنا مدتوں بند رہا تھا تاکہ تم یہ نہ کہو کہ نہیں آیا تھا ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور نہ کوئی ڈرانے والا اب تو آ گیا ہے تمہارے پاس خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (2)۔ یُبَیِّنُ لَكُمْ ان کی حجت کو ختم کرنے کے لیے تاکہ کل تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی رسول نہیں آیا۔ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ، فَتْرَةٍ کا معنی ہے سکون، کہا جاتا ہے: فتر الشی، چیز سکون کر گئی۔ بعض علماء نے فرمایا: عَلٰى فَتْرَةٍ انبیاء کے درمیان انقطاعی دور، یہ ابو علی اور اہل علم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ یہ رمانی نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا: اس میں اصل، اس عمل کا انقطاع ہے جس پر پہلے تھا یہ عربوں کے اس قول سے ہے۔ فتر عن عملہ و فترتہ عنہ وہ اپنے عمل سے رک گیا اور میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے ہے فتر الماء، جب اس

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 230 2۔ ایضاً

کی گرمی ختم ہو جائے اور ٹھنڈا ہو جائے۔ امرأة فاترة الطرف جس کی نظر ختم ہو جائے۔ فتور البدن کفتور الماء اور سبابہ اور انگوٹھے کا درمیانی حصہ جب تو ان کو کھلا کرے۔ معنی یہ ہے اس سے پہلے کی مدت رسولوں کے لیے گزر گئی، اس فترت کی مدت کی مقدار میں اختلاف ہے۔ محمد بن سعد نے کتاب ''الطبقات'' میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت موسیٰ بن عمران بن مریم علیہما السلام کے درمیان سترہ سو سال کا عرصہ تھا اور ان کے درمیان فترہ نہ تھا ان کے درمیان بنی اسرائیل سے ہزار نبی مبعوث فرمائے اور یہ ان کے علاوہ تھے جو دوسری قوموں سے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پانچ سو انہتر سال کی مدت تھی۔ اس کی ابتدا میں تین انبیاء مبعوث فرمائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (یٰسین: 14) اور تیسرے جن کے ساتھ دو کو قوت بخشی وہ شمعون تھے، یہ حواریین سے تھے اور فترہ جس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول مبعوث نہیں فرمایا وہ چار سو چونتیس سال کا عرصہ تھا(1)۔ کلبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد علیہ السلام کے درمیان پانچ سو انہتر سال کا عرصہ تھا، ان کے درمیان چار انبیاء تھے ایک بنی عبس سے عرب سے تھا وہ خالد بن سنان تھا۔ قشیری نے کہا: اس جیسا حکم ثابت نہیں ہوتا مگر سچی خبر کے ساتھ۔ قتادہ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد علیہ السلام کے درمیان چھ سو سال کا عرصہ تھا، یہ مقاتل، ضحاک اور وہب بن منبہ کا قول ہے مگر وہب نے بیس سال کا اضافہ کیا ہے، ضحاک سے یہ بھی مروی ہے کہ چار سو تیس سے کچھ زائد سال کا عرصہ تھا۔ ابن سعد نے عکرمہ سے ذکر کیا ہے فرمایا: حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس صدیاں تھیں، تمام لوگ اسلام پر تھے۔ ابن سعد نے کہا: ہمیں محمد بن عمرو بن واقد اسلمی نے کئی راویوں سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرون کا وقفہ تھا اور ایک قرن کے سو سال ہوتے ہیں۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے درمیان دس قرون کا عرصہ تھا اور قرون کے سو سال ہوتے ہیں، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ بن عمران کے درمیان دس قرون تھے اور ایک قرن کے سو سال ہوتے ہیں، اس طرح حضرت آدم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کئی صدیاں اور سال تھے۔ اَنْ تَقُوْلُوْا یعنی لئلا یا کراھیة ان تقولوا یہ محل نصب میں ہے۔ مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ یعنی ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا نہیں آیا۔ وَّ لَا نَذِیْرٍ یعنی کوئی ڈرانے والا نہیں آیا اور مِنْ بَشِیْرٍ اور لَا نَذِیْرٌ بھی جائز ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: حضرت معاذ بن جبل، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت عقبہ بن وہب نے یہود سے کہا: اے یہود کے گروہ! اللہ سے ڈرو اللہ کی قسم تم جانتے ہو کہ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں اور تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہمارے لیے آپ کا ذکر کرتے تھے اور تم ان کا وصف بیان کرتے تھے، پس انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نہ کوئی کتاب نازل کی، نہ ان کے بعد کوئی بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا بھیجا پس یہ آیت نازل ہوئی وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جس کو رسول بنا کر بھیجنا چاہے اس پر قادر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جس کی اس نے بشارت دی جس سے اس نے ڈرایا اس پر وہ قادر ہے۔

1۔ الطبقات الکبریٰ ابن سعد، جلد 1، صفحہ 53

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝

''جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اے میری قوم! یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران اور عطا فرمایا تمہیں جو نہیں عطا فرمایا تھا کسی کو سارے جہانوں میں۔ اے میری قوم! داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور نہ پیچھے ہٹو، پیٹھ پھیرتے ہوئے ورنہ تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے، کہنے لگے اے موسیٰ! اس زمین میں تو بڑی جابر قوم (آباد) ہے اور ہم ہرگز داخل نہ ہوں گے اس میں جب تک وہ نکل نہ جائیں وہاں سے اور اگر وہ نکل جائیں اس سے تو پھر ہم ضرور داخل ہوں گے۔ (اس وقت) کہا دو آدمیوں نے جو (اللہ سے) ڈرنے والے تھے انعام فرمایا اللہ نے جن پر کہ (بے دھڑک) داخل ہو جاؤ ان پر دروازہ سے اور جب تم داخل ہو گے دروازہ سے تو یقینا تم غالب آ جاؤ گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر ہو تم ایماندار۔ کہنے لگے اے موسیٰ! ہم تو ہرگز داخل نہ ہوں گے اس میں قیامت تک جب تک وہ وہاں ہیں پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو (ان سے) ہم تو یہاں ہی بیٹھیں گے۔ موسیٰ نے عرض کیا: اے میرے رب! میں مالک نہیں ہوں بجز اپنی ذات کے اور اپنے بھائی کے بس جدائی ڈال دے ہمارے درمیان اور نافرمان قوم کے درمیان۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو یہ سرزمین حرام کر دی گئی ہے ان پر چالیس سال تک سرگرداں پھریں گے زمین میں سو نہ غمگین ہوں آپ اس نافرمان قوم (کے انجام) پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان ہے کہ ان کے اسلاف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سرکشی کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اسی طرح انہوں نے حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر سرکشی کی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، یعنی اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو یاد کرو۔ حضرت عبداللہ بن کثیر سے مروی ہے کہ انہوں نے یا قوم اذ کہ دا (میم کے ضمہ کے ساتھ) پڑھا ہے اسی طرح جو اس کے مشابہ ہیں تقدیر یا ایھا القوم ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ انبیاء غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث ہے۔ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا یعنی تم پہلے فرعون کے غلام اور ان کے ہاں مجبور تھے اس کے بعد اب تم اپنے معاملہ کے مالک ہو اس معاملہ میں تم پر کوئی غالب نہیں ہے، اس نے تمہیں غرق سے نجات دی، پس وہ اس وجہ سے بادشاہ ہیں۔

سدی، حسن وغیرہ نے اسی طرح تفسیر کی ہے۔ سدی نے کہا: ان میں سے ہر ایک اپنے نفس، اہل اور مال کا مالک ہوا (1)۔ قتادہ نے کہا: وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا فرمایا ہم بیان کرتے تھے کہ بنی آدم میں سے یہ پہلے تھے جن سے خدمت لی گئی تھی (2)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ قبطی لوگ بنی اسرائیل سے خدمت لیتے تھے۔ بنی آدم کے امر کا ظاہر یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے مسخر تھے جب سے ان کی نسل بڑھی اور ان کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ تملیک کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس نے تمہیں منازل والا بنایا، تم پر بغیر اجازت کے کوئی داخل نہیں ہوتا یہ مفہوم اہل علم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوتا تو وہ اس گھر کا مالک ہے۔ حسن اور زید بن اسلم سے بھی یہ مروی ہے کہ جس کا گھر، بیوی اور خادم ہو وہ مالک ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرو کا قول ہے جیسا کہ علم میں ابو عبدالرحمن حبلی سے مروی ہے فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو سنا جب کہ ان سے ایک شخص نے پوچھا۔ اس نے کہا: کیا ہم فقراء مہاجرین میں سے نہ تھے؟ حضرت عبداللہ نے اسے کہا: کیا تیری بیوی ہے جس کے پاس تو رات گزارتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا تیرے لیے کوئی منزل ہے جس میں تو رہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: انت من الاغنیاء تو غنی لوگوں میں سے ہے۔ اس نے کہا: میرا خادم بھی ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: تو ملوک میں سے ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب آدمی پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور وہ گھر اور خادم کا مالک ہوتا ہے تو ان دونوں چیزوں کو کفارہ میں بیچا جائے گا اس کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ رقبہ (غلام) پر قادر ہے اور ملوک روزہ کے ساتھ کفارہ ادا نہیں کر سکتے اور غلام آزاد کرنے سے عاجز تصور نہیں ہوتے (4)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: ان کو من و سلویٰ کے ساتھ ملوک بنایا اور پتھر سے پانی نکالنے اور بادل سے سایہ کرنے کے ساتھ انہیں ملوک بنایا (5)، یعنی وہ ملوک کی طرح مخدوم تھے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ خادم اور منزل کے ساتھ ملوک بنایا۔ مجاہد، عکرمہ اور حکم بن عیینہ کا یہی قول ہے اور انہوں نے زوج کا اضافہ کیا ہے، اسی طرح زید بن اسلم نے فرمایا: مگر انہوں نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس کا گھر ہو یا فرمایا منزل ہو وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہو، بیوی ہو، خادم ہو (6) جو اس کی خدمت کرتا ہو تو وہ ملک ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: جو غیر سے مستغنی ہو وہ ملک ہے یہ اس طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 190　　2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 202　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 173
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 588　　5۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 190　　6۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 25

فرمایا: من اصبح آمنا فی سربہ معافی فی بدنہ ولہ قوت یومہ فکأنما حیزت لہ الدنیا بحذافیرھا (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰتٰىكُمْ یعنی اس نے تمہیں عطا کیا۔ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۝ جمہور مفسرین کے قول میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کو خطاب ہے۔ یہی کلام کی وجہ ہے۔ مجاہد نے کہا: ایتاء سے مراد من و سلویٰ، پتھر سے پانی نکالنا اور بادلوں سے سایہ کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان میں انبیاء کی کثرت تھی، اور وہ آیات جو ان کے پاس آئیں وہ مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا: کھوٹ اور غش سے پاک دل مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: غنائم کا حلال کرنا اور ان سے نفع اٹھانا مراد ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول مردود ہے، کیونکہ مال غنیمت کسی امت کے لیے حلال نہیں تھا، سوائے اس امت محمدیہ کے جیسا کہ صحیح میں ثابت ہے اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کلام ہے ان کے نفوس کو مطمئن کرنے کے لیے تاکہ قوت حاصل کریں اور جبارین کی زمین میں داخل ہونے کے امر کو مضبوطی سے پکڑیں اور اس شخص کی طرح ان کا نفوذ ہو جس کو اللہ تعالیٰ عزت دیتا ہے اور اس کی شان کو بلند کرتا ہے۔ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمہارے زمانہ کے لوگ۔ حسن سے مروی ہے، ابن جبیر اور ابو مالک نے کہا: یہ خطاب حضرت محمد ﷺ کی امت کو ہے (2)، یہ ظاہر کلام سے عدول ہے جو مستحسن نہیں ہے، اخبار متفق ہیں کہ دمشق جبارین کا مکان تھا۔ الْمُقَدَّسَةَ اس کا معنی مطھرۃ ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی مبارکہ ہے۔ البرکۃ قحط اور بھوک سے پاک کرنا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ شام کا ملک ہے۔ مجاہد نے کہا: طور اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی اور ابن زید نے کہا: یہ اریحاء ہے۔ زجاج نے کہا: دمشق، فلسطین اور اردن کا بعض علاقہ ہے (3)۔ قتادہ کا قول ان تمام کا جامع ہے۔ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی تم پر اس میں داخل ہونا فرض کیا ہے اور تمہارے اس میں داخل ہونے کا وعدہ کیا ہے، تمہارے لیے اس میں ٹھہرنے کا وعدہ کیا ہے، جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو انہیں اہل اریحاء سے جہاد کرنے کا حکم ملا جو فلسطین کے شہروں میں سے ہے تو انہوں نے کہا: ہمیں تو ان شہروں کا علم ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے امر کے ساتھ بارہ نقیب (سردار) بھیجے ہر قبیلہ سے ایک شخص تھا وہ اخبار کو تلاش کرتے تھے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، پس انہوں نے عمالقہ میں جبارین کو دیکھا وہ بڑے خوفناک جسموں والے تھے، حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ بعض نے ان نقباء کو دیکھا تو انہیں اپنی آستین میں لے لیا جب کہ ایک پھل بھی ساتھ تھا جو اس نے اپنے باغ سے توڑا تھا وہ ان نقباء کو لے کر آیا اور اپنے بادشاہ کے سامنے بکھیر دیا اور کہا: یہ لوگ ہم سے لڑنے کا ارادہ کرتے ہیں، بادشاہ نے انہیں کہا: تم اپنے ساتھی کی طرف لوٹ جاؤ اور انہیں ہماری خبر بتاؤ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: جب وہ لوٹ کر گئے تو انہوں نے اس علاقہ کے انگوروں میں سے ایک گچھا لیا۔ بعض علماء نے کہا: اسے ایک شخص نے اٹھایا۔ بعض نے کہا: اسے بارہ نقباء نے اٹھایا۔

میں کہتا ہوں: یہ اشبہ ہے۔ کہا جاتا ہے: جب وہ جبارین تک پہنچے تو انہوں نے انہیں دیکھا ان میں سے دو آدمی ان کے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 58۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 191

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 174

ایک آدمی کی آستین میں داخل ہوتے ان کے انگوروں کا گچھا نہ اٹھایا جاتا مگر پانچ آدمی لکڑی میں اٹھاتے تھے اور انار کا دانہ جب وہ اندر سے خالی کیا جاتا تو پانچ یا چار آدمی داخل ہوتے۔ (علامہ آلوسی نے کہا: یہ سب خرافات ہیں)

میں کہتا ہوں: اس میں اور پہلے قول میں تعارض نہیں۔ کیونکہ وہ جابر جس نے انہیں آستین میں لیا تھا، کہا جاتا ہے: گود میں لیا تھا۔ وہ عوج بن عناق تھا۔ وہ سب سے دراز قامت تھا اور بڑے جسم والا تھا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ تمام لوگوں کا طول ساڑھے چھ ہاتھ تھا۔ کلبی نے کہا: ان میں سے ہر ایک کا طول اسی ہاتھ تھا جب ان نقباء نے خبر پھیلا دی سوائے یوشع اور کالب بن یوقنا کے، تو بنی اسرائیل جہاد سے رک گئے انہیں چالیس سال تیہ میں عذاب دیا گیا یہاں تک کہ نافرمان مر گئے اور ان کی اولاد بڑھی پھر انہوں نے جبارین سے قتال کیا اور وہ ان پر غالب آ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ یعنی تم میری طاعت سے نہ لوٹو اور جو میں نے تمہیں جبارین سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے اس سے نہ لوٹو۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کی طاعت سے معصیت کی طرف نہ لوٹو، معنی ایک ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ یعنی بڑے بڑے جسموں والے، لمبے لمبے قد والے ہیں، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے: نخلة جبارة یعنی طویل کھجور۔ الجبار جو عظمت والا ہو، فقر اور ذلت سے محفوظ ہو۔ زجاج نے کہا: آدمیوں میں جبار اسے کہتے ہیں جو سرکش ہو جو لوگوں پر اپنے ارادہ کے مطابق جبر کرتا ہو۔ اس بنا پر اس کی اصل الاجبار سے ہوگی جس کا معنی مجبور کرنا ہے، کیونکہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق دوسروں کو مجبور کرتا ہے اجبرہ اس نے اسے مجبور کیا۔ بعض نے فرمایا: یہ جبر العظم سے مشتق ہے پس اس بنا پر جبار کی اصل اپنے امر کی اصلاح کرنے والا ہوگا پھر ہر اس شخص کے لیے استعمال ہونے لگا جو اپنے لیے نفع حاصل کرتا ہے خواہ حق کے ساتھ ہو یا باطل کے ساتھ ہو۔ بعض نے فرمایا: جبر العظم بھی اکراہ کے معنی کی طرف راجع ہے۔ فراء نے کہا: میں نے فعال، افعل سے نہیں سنا مگر دو حرفوں سے جبار، من اجبر، دراک من ادرک۔ پھر کہا گیا یہ بقایا عاد سے تھے۔ بعض نے فرمایا: یہ عیصو بن اسحاق کی اولاد سے تھے اور یہ روم سے تھے اور ان کے ساتھ عوج اعنق تھا۔ اس کا قد تین ہزار تین سو، تینتیس ہاتھ تھا۔ یہ حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ وہ اپنی کھونٹی سے بادل میں سوراخ کرتا تھا اور اس سے پانی پیتا تھا اور وہ سمندر کی تہہ سے مچھلی پکڑتا تھا اور سورج کے قریب کر کے اسے بھون لیتا تھا اور پھر کھاتا تھا۔ طوفان نوح آیا تو وہ اس کے گھٹنے سے اوپر نہ ہوا تھا۔ اس کی عمر تین ہزار چھ سو سال تھی۔ اس نے جب اتنی بڑی چٹان اکھیڑی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کی مقدار تھی تا کہ وہ ان پر مارے تو اللہ تعالیٰ نے ایک پرندہ بھیجا جس نے اس چٹان کو کاٹ دیا وہ چٹان اس کی گردن پر گری اور اسے گرا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جب کہ ان کا قد دس ہاتھ تھا ان کا عصا دس ہاتھ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دس ہاتھ اور بلند ہوئے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام عوج کے ٹخنے تک پہنچے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اسے لگا تو وہ مقتول ہو گیا۔ بعض نے کہا: آپ کا عصا اس کے ٹخنے کے نیچے والی رگ پر لگا تو وہ گر گیا اور مر گیا اور وہ مصر کے دریائے نیل پر گرا، ایک سال لوگوں نے اسے بطور پل استعمال کیا۔ اس مفہوم کو مختلف الفاظ کے ساتھ محمد بن اسحاق، طبری اور مکی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ کلبی نے کہا: عوج، ہاروت و ماروت کی اولاد سے تھا جب انہوں نے

عورت سے برائی کی تھی اور وہ عورت حاملہ ہوگئی تھی۔(۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا یعنی ایلیاء کا شہر۔ اور کہا جاتا ہے: اریحاء۔ حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا حتیٰ کہ وہ شہر بغیر قتال کے ہمارے حوالے کر دیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ انہوں نے جبارین کے خوف کی وجہ سے کہا تھا اور انہوں نے نافرمانی کا قصد نہیں کیا تھا، کیونکہ انہوں نے کہا تھا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۞

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: یہ یوشع اور کالب بن یوقنا تھے (1)، ابن قانیا بھی کہا جاتا تھا یہ دونوں بارہ نقیبوں میں سے تھے۔ یَخَافُوْنَ یعنی وہ جبارین سے ڈرتے تھے۔ قتادہ نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے۔ ضحاک نے کہا: وہ دونوں افراد جبارین کے شہر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے (2)۔ اس بنا پر یَخَافُوْنَ کا معنی ہوگا وہ عمالقہ سے ڈرتے تھے طبعی حیثیت سے تاکہ وہ ان کے ایمان پر مطلع نہ ہو جائیں اور وہ انہیں فتنہ میں مبتلا کریں لیکن وہ اللہ پر یقین رکھتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ بنی اسرائیل کے ضعف اور ان کی بزدلی کا خوف رکھتے تھے۔ مجاہد اور ابن جبیر نے یُخافون یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے نہ تھے۔

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا اللہ تعالیٰ نے ان پر اسلام یا یقین اور صلاح کا انعام فرمایا۔ ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ان دونوں نے بنی اسرائیل کو یہ کہا کہ ان کے جسموں کی بڑائی تمہیں خوف میں نہ ڈالے، ان کے دل تمہاری وجہ سے رعب سے بھرے ہوئے ہیں، ان کے اجسام بڑے ہیں اور دل کمزور ہیں، وہ جان چکے تھے کہ جب وہ اس دروازہ سے داخل ہوں گے تو غلبہ انہیں ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان دونوں نے یہ اللہ کے وعدہ پر یقین کی بنا پر کہا تھا پھر ان دونوں نے کہا: وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنے والے ہو کہ وہ تمہاری مدد کرے گا، پھر پہلے قول کی بنا پر کہا گیا کہ جب ان دونوں نے یہ کہا تو بنو اسرائیل نے ان دونوں کو رجم کرنے کا ارادہ کیا، انہوں نے کہا: ہم تمہاری تصدیق کریں اور ہم دس افراد کا قول چھوڑ دیں، پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا یہ قتال سے خالص عناد ہے اور نصرت سے مایوسی ہے۔ پھر وہ رب تبارک و تعالیٰ کی صفت سے جاہل تھے۔ انہوں نے کہا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا آنے جانے کے ساتھ وصف بیان کیا، اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے یہ دلیل ہے کہ وہ مشبہۃ تھے۔ یہ حسن کے قول کا معنی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: یہ ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا انکار ہے۔ اس کلام کے معنی میں یہ ظاہر ہے۔ بعض علماء نے کہا: یعنی تیرے رب کا تیری مدد کرنا، ہماری مدد کرنے سے زیادہ احق ہے اور اس کا تیرے ساتھ قتال کرنا۔ اگر تو اس کا رسول ہے۔ ہمارے قتال سے اولیٰ ہے۔ یہ ان کی طرف سے کفر تھا، کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں شک کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے کہ تو جا اور قتل کر اور تیرا رب تیری مدد

(۱) یہ قول علم کلام کی تحقیقات کے خلاف ہے۔ مترجم

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 193

2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 214

کرے۔ بعض نے کہا: انہوں نے رب سے مراد حضرت ہارون علیہ السلام لیے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اطاعت کرتے تھے، بہر حال انہوں نے اپنے قول سے فسق کا ارتکاب کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ یعنی ان پر غمگین نہ ہوں۔ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ ہم یہاں رہیں گے اور ہم قتال نہیں کریں گے، قاعدین حال کی بنا پر جائز ہے، کیونکہ کلام اس سے پہلے مکمل ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ کیونکہ وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں، پھر کلام کی ابتدا فرمائی اور فرمایا: وَ اَخِيْ یعنی میرا بھائی (1) صرف اپنے نفس کا مالک ہے۔ اَخِيْ پہلے قول کی بنا پر نفسی پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہے اور دوسرے قول کی بنا پر محل رفع میں ہے اگر تو چاہے تو ان کے اسم پر عطف کرے اور وہ یا ضمیر ہے یعنی میں اور میرا بھائی ہم صرف اپنے نفسوں کے مالک ہیں اگر تو چاہے تو املك میں جو ضمیر مضمر ہے اس پر عطف کرے گویا فرمایا: لا املك انا واخی الا انفسنا میں اور میرا بھائی صرف اپنے نفسوں کے مالک ہیں۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ کہا جاتا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اور اس قوم کے درمیان جدائی کا سوال کیوں کیا؟ اس کے کئی جوابات ہیں۔ (۱) کیونکہ وہ حق سے بہت دور تھے اور انہوں نے جو عصیاں کا ارتکاب کیا تھا اس کی وجہ سے وہ صواب سے بہت دور چلے گئے تھے، اسی وجہ سے وہ تیہ میں ڈالے گئے (۲) تمیز طلب کرنے کے لیے یعنی ہمیں ان کی جماعت سے علیحدہ کر دے اور ہمیں ان کے ساتھ عقاب میں لاحق نہ کر۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہمارے درمیان اور ان کے درمیان فیصلہ فرما، یا ہمیں اپنی عصمت کے ساتھ اس نافرمانی سے محفوظ کر لے جس میں تو نے انہیں مبتلا کیا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ (الدخان) يُفْرَقُ بمعنی یقضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا جب انہیں تیہ میں مار ڈالا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے آخرت میں یہ فیصلہ کرنے کا ارادہ فرمایا یعنی ہمیں جنت میں کر دے اور ہمیں ان کے ساتھ آگ میں نہ ڈال، فرق جو احوال میں مباعدہ (دوری) پر دلالت کرتا ہے اس پر شاہد شاعر کا قول ہے:

یا ربِّ فافرق بینه و بینی	أشدّ ما فَرَّقتَ بین اثنین

ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے انہوں نے عبید بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فافرق را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انہیں تیہ میں چالیس سال سزا دی۔ التیه کا اصل معنی لغت میں حیرت ہے۔ تاہ یتیه تیہاً وتوهاً حیران ہونا۔ توهته یا اور واؤ کے ساتھ ہے اور یا زیادہ ہے۔ الارض التیهاء ایسی زمین جس میں ہدایت وراستہ نہ ملے۔ ارض تیه وتیهاء اس سے شاعر کا قول ہے:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 176، دار الکتب العلمیہ بیروت

تِیہٌ أتاوِیہُ علی السُّقّاطِ

ایک اور شاعر نے کہا:

بِتَیہَاء قَفْرٍ والمَطِیُّ کأنّها قَطَا الحَزْن قد کانت فِراخا بُیُوضها

بنی اسرائیل تھوڑے سے فراسخ چلتے تھے۔ بعض نے فرمایا: چھ فراسخ کی مقدار چلتے تھے، دن اور رات میں۔ صبح وہیں ہوتے تھے جہاں شام کو ہوتے تھے اور وہ شام کو وہاں ہوتے جہاں وہ صبح کو ہوتے تھے وہ چلتے رہتے تھے انہیں قرار نہیں تھا اس میں اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ان کے ساتھ تھے یا نہیں؟ بعض نے فرمایا: وہ ساتھ نہیں تھے، کیونکہ تیہ سزا تھی اور تیہ کے سال بچھڑنے کے ایام کی تعداد کے برابر تھے۔ ہر دن کے مقابلہ میں ایک سال رکھا گیا فرمایا: فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۞ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر معاملہ آسان کر دیا تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا کر دیا تھا۔ اور محرمۃ کا معنی ہے انہیں اس میں داخل ہونے سے روکا گیا تھا جیسے کہا جاتا ہے: حرم اللہ وجھك علی النار۔ اللہ تعالیٰ تیرے چہرے کو آگ سے محفوظ کرے۔ حرمت علیك دخول الدار تجھ پر گھر میں داخلہ ممنوع ہے۔ یہ تحریم منع ہے نہ کہ تحریم شرع یہ اکثر اہل تفسیر سے مروی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

جَالَتْ لتصرعنی فقلتُ لها اقصِری إنّی امرؤٌ صَرْعِی علیكِ حرامُ

یعنی میں شہسوار ہوں مجھے پچھاڑنا ممکن نہیں۔

ابوعلی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ تحریم تعبد ہو۔ کہا جاتا ہے: یہ عقلاء کی ایک جماعت کے بارے میں کہنا کیسے جائز ہے کہ وہ چند فرسخ چلیں اور وہ اس سے نکلنے کی راہ نہ پائیں؟ اس کا جواب ابوعلی نے یہ دیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس زمین کو پھیر دیتا ہو جس پر وہ تھے جب وہ سوتے ہوں اور انہیں وہ اسی جگہ کی طرف لوٹا دیتا ہو جس سے انہوں نے آغاز کیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور معجزہ اشتباہ اور خروج سے مانع اسباب پیدا کر دیے ہوں۔

اربعین، التیہ کے لیے ظرف زمان ہے۔ یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے اور انہوں نے کہا: ان میں سے کوئی وہاں اس عرصہ میں داخل نہ ہوا، اس صورت میں علیھم پر وقف ہوگا۔ ربیع بن انس وغیرہ نے کہا کہ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً تحریم کی ظرف ہے(1)۔ اس بنا پر اربعین سنۃ پر وقف ہوگا پہلی صورت میں معنی ہوگا کہ ان کی اولاد وہاں داخل ہوئی۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور ان میں سے کوئی نہ بچا مگر یوشع اور کالب۔ یوشع ان کی اولاد کے ساتھ اس شہر کی طرف نکلا اور اس شہر کو فتح کیا۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ چالیس سال بعد جو ان میں سے باقی تھے وہ اس شہر میں داخل ہوئے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام تیہ میں ہی فوت ہوگئے تھے(2)۔ دوسرے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یوشع کو نبوت بخشی اور انہیں جبارین سے قتال کرنے کا حکم دیا اس پر سورج کو روک دیا گیا تھا حتیٰ کہ وہ شہر میں داخل

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 195

2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 220

ہوئے اس میں وہ جلایا گیا جس کے پاس مال غنیمت پایا گیا تھا پہلے لوگ جب مال غنیمت حاصل کرتے تو آسمان سے ایک سفید آگ نازل ہوتی اور وہ مال غنیمت کو کھا جاتی یہ اس کی قبولیت کی دلیل ہوتی تھی اگر جس مال غنیمت میں خیانت ہوتی تھی تو آگ اس مال کو نہ کھاتی تھی، درندے اور وحشی آتے تھے اور وہ اسے کھاتے تھے پس آگ نازل ہوئی اور اس نے مال غنیمت کو نہ کھایا۔ یوشع نے کہا: تم میں خیانت ہے۔ ہر قبیلہ میری بیعت کرے پس ہر قبیلہ نے اس کی بیعت کی، ان میں سے ایک شخص کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ آپ نے فرمایا: تیرے پاس خیانت کا مال ہے اس نے گائے کے سر کی مقدار سونا نکالا پھر آگ نازل ہوئی اور مال غنیمت کو کھا گئی وہ آگ چاندی کی مثل سفید ہوتی تھی اس کی آواز ہوتی تھی جیسے درخت کی آواز ہوتی ہے اور پرندے کے پروں کی آواز ہوتی ہے اور علماء بیان کرتے ہیں کہ اس ہوا نے اس خیانت کرنے والے اور اس کے مال کو جلا دیا اب اسے غور عاجز کہا جاتا ہے وہ غال (خیانت کرنے والے) کے نام سے پہچانا گیا، اس کا نام عاجز تھا۔

میں کہتا ہوں: اس سے ہم سے پہلے خیانت کرنے والے کی سزا استفاد ہوتی ہے۔ ہماری ملت میں مال غنیمت کا حکم گزر چکا ہے۔ صحیح حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس میں اس نبی کا اسم اور مال غنیمت کا بیان نہیں ہے، حدیث میں ہے غزا نبیٌ من الانبیاء ایک نبی نے جنگ لڑی۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے اس میں ہے فرمایا: ''انہوں نے حملہ کیا پس وہ اس شہر کے قریب عصر کی نماز کے وقت پہنچے یا اس کے قریب وقت تھا، اس نبی نے سورج کو فرمایا: تو بھی حکم کا پابند ہے اور میں بھی پابند ہوں۔ اے اللہ! تھوڑا اسے مجھ پر روک لے پس سورج اس پر روک لیا گیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی۔ فرمایا: انہوں نے مال غنیمت جمع کیا تو آگ اسے کھانے کے لیے نہ آئی اور آگ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اس نبی نے فرمایا: تم میں خیانت ہے ہر قبیلہ سے ایک شخص میری بیعت کرے۔ انہوں نے بیعت کی۔ فرمایا: دو یا تین آدمیوں کا ہاتھ چمٹ گیا۔ یوشع نے فرمایا: ''تم میں خیانت ہے'' (1)۔ پہلے کی طرح ذکر کیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اہل اریحاء کے ساتھ جنگ کے وقت سورج کو روکنے اور جمعہ کے دن پچھلے ٹائم فتح کے قریب ہونے، فتح سے پہلے سورج کے غروب ہونے سے حضرت یوشع علیہ السلام کے ڈرنے میں حکمت یہ تھی کہ اگر ان پر سورج نہ روکا گیا تو ہفتہ کی وجہ سے ان پر جنگ حرام ہو جائے گی۔ ان کے دشمن کو ان کی خبر ہو جائے گی پس انہوں نے ان میں تلوار چلائی اور انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا۔ یہ حضرت یوشع علیہ السلام کی نبوت کی علامت تھی اس کے بعد کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر سے ان کی نبوت ثابت ہو چکی تھی۔ واللہ اعلم

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم سے پہلے کسی امت کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا'' (2)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ضعف اور عجز کو دیکھا پھر ہمارے لیے اسے حلال کر دیا۔ یہ اس شخص کے قول کا رد ہے جو وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝ کی تاویل میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد مال غنیمت کو حلال کرنا اور ان سے نفع اٹھانا ہے۔

ان علماء سے جنہوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تیہ میں فوت ہوئے تھے ان میں عمرو بن میمون اودی ہے، اس نے حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی زائد ذکر کیا ہے دونوں حضرات تیہ میں کسی غار کی طرف نکلے، حضرت ہارون علیہ السلام کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 85　2۔ ایضاً

وصال ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دفن کر دیا اور پھر بنی اسرائیل کی طرف لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا: حضرت ہارون کا کیا ہوا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ فوت ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل نے کہا: تم نے جھوٹ بولا ہے، لیکن تو نے قتل کیا ہے، کیونکہ ہم اس سے محبت کرتے تھے وہ بنی اسرائیل میں محبوب تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ لوگوں کو حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر کی طرف لے چلو، میں انہیں اٹھاؤں گا حتیٰ کہ وہ خود انہیں بتائیں گے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور تو نے اسے قتل نہیں کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر کی طرف لے گئے، پھر ندا دی: اے ہارون! وہ قبر سے نکل آئے جب کہ اپنے سر کو جھاڑ رہے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا میں تمہارا قاتل ہوں؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: نہیں، لیکن میں فوت ہو گیا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اپنی آرام گاہ کی طرف لوٹ جا۔ تو وہ واپس چلے گئے۔ حسن نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیہ میں وصال نہیں فرمایا تھا۔ ان کے علاوہ علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اریحاء فتح کیا تھا اور یوشع لشکر کے مقدمہ پر تھے، پس انہوں نے وہاں کے جابر لوگوں سے قتال کیا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ اریحاء میں داخل ہوئے اور وہاں ٹھہرے رہے جتنا کہ اللہ نے ان کا ٹھہرنا چاہا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض فرمائی ان کی قبر کو کوئی نہیں جانتا۔ ثعلبی نے کہا: یہ قول اصح ہے۔

میں کہتا ہوں: مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ملک الموت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیجا گیا جب عزرائیل علیہ السلام آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں طمانچہ مارا اور ان کی آنکھ پھوڑ دی، ملک الموت اپنے رب کی بارگاہ میں لوٹ آئے اور عرض کی: تو نے مجھے ایسے بندے کی طرف بھیجا ہے جو موت کا ارادہ نہیں کرتا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو آنکھ لوٹا دی اور فرمایا: ان کی طرف دوبارہ جاؤ اور انہیں کہو کہ بیل کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھو ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے ہر بال کے بدلے ایک سال عمر ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے پروردگار! پھر کیا ہوگا؟ فرمایا: پھر موت ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: پھر ابھی موت دے دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ اسے بیت المقدس کے پتھر پھینکنے کی مقدار قریب کر دے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں وہاں ہوتا تو میں تمہیں موسیٰ علیہ السلام کی قبر راستہ کی جانب سرخ ٹیلے کے نیچے دکھاتا'' (1)۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر معلوم تھی آپ نے اس کی جگہ بیان فرمائی۔ اور آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا جیسا کہ حدیث الاسراء میں ہے مگر یہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قبر کو آپ کے علاوہ مخلوق سے مخفی رکھا ہو اور لوگوں کے لیے اس کو مشہور نہ کیا ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی عبادت شروع ہو جائے۔ طریق (راستہ) سے مراد بیت المقدس کا راستہ ہے اور طریق کے لفظ کی جگہ جانب الطور کے الفاظ ہیں، علماء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ملک الموت کو طمانچہ مارنے اور ان کی آنکھ پھوڑنے کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ آنکھ خیالی ہے حقیقی نہیں۔ یہ باطل ہے، کیونکہ یہ نظریہ اس طرف لے جاتا ہے کہ انبیاء کرام جو ملائکہ کی صورتیں دیکھتے ہیں ان کی حقیقت نہیں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 267

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ معنوی آنکھ تھی، حجت کے ساتھ اس کو پھوڑا۔ یہ مجاز ہے حقیقت نہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو نہیں پہچانا، انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جو بغیر اجازت کے ان کے گھر میں داخل ہوا ہے وہ ان کی جان کا ارادہ کرتا ہے پس آپ نے اپنے نفس کا دفاع کیا اور اسے طمانچہ مارا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی ہر ممکن کے ساتھ ایسی صورت مدافعت واجب ہے۔ یہ بہتر قول ہے، کیونکہ آنکھ اور طمانچہ میں حقیقت ہے۔ یہ قول امام ابوبکر بن خزیمہ نے کہا: مگر ان پر اعتراض کیا گیا اس قول کی بنا پر جو حدیث میں ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملک الموت جب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر گئے تو کہا: یا رب! تو نے مجھے ایسے بندے کی طرف بھیجا ہے جو موت کو نہیں چاہتا (1)۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں نہ پہچانا ہوتا تو ملک الموت کا قول سچا نہ ہوگا۔ اس طرح دوسری روایت میں ہے عزرائیل علیہ السلام نے کہا تھا اپنے رب کے حکم کا جواب دو، یہ دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو پہچانا تھا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت جلد غصہ میں آنے والے تھے، جب وہ غصہ میں ہوتے تھے تو ان کی ٹوپی سے دھواں نکلتا تھا اور ان کے بدن کے بال کھڑے ہو جاتے تھے۔ سرعت غضب کی وجہ سے انہوں نے ملک الموت کو طمانچہ مارا۔ ابن عربی نے کہا: یہ اس طرح ہے جس طرح تو نے ملاحظہ کیا، کیونکہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں اس سے کہ ابتداء ان سے حالت رضا اور غضب میں اس کی مثل واقع ہو۔ چوتھا قول یہ ہے اور یہ ان تمام اقوال سے صحیح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو پہچانا تھا کہ وہ ان کی روح قبض کرنے کے لیے آئے ہیں لیکن وہ پختہ کام کرنے والے کی طرح آئے تھے کہ بغیر تخییر کے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ بات تھی جس پر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص قائم فرمائی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح قبض نہیں فرماتا حتیٰ کہ اسے اختیار دیتا ہے (2)'' جب عزرائیل علیہ السلام اس طریقہ سے ہٹ کر آئے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے تو انہوں نے قوت نفس اور اپنے جذبہ کی وجہ سے جلدی کی اور ادب سکھایا اور اسے طمانچہ مارا اور آنکھ پھوڑ دی۔ یہ ملک الموت کی آزمائش تھی، کیونکہ انہوں نے صراحۃً اختیار کا ذکر نہیں کیا تھا اور اس کی صحت پر دلیل یہ ہے کہ جب ملک الموت دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہیں زندگی اور موت کے درمیان اختیار دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موت کو اختیار کیا اور حکم الٰہی کو تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے غیب کے ساتھ احکم واعلم ہے۔ یہ قول اصح ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بارے میں کہا گیا ہے۔ مفسرین نے اس کے بارے میں قصص واخبار لکھی ہیں جن کی صحت کے بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ صحیح میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام کو ان کے وصال کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا: آپ نے موت کو کیسا پایا؟ انہوں نے کہا: ایسی بکری کی طرح جس کی کھال اتاری گئی ہو جب کہ وہ زندہ ہو۔ یہ معنی صحیح ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں فرمایا: ''موت کے لیے سختیاں ہیں (3)'' جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 267 2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 638، معنا 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 840

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ آپ پریشان نہ ہوں۔ الأسی کا معنی حزن وملال ہے۔ آسی یاسٰی اَسیً یعنی غمگین ہونا۔ شاعر نے کہا:

يقولون لا تهلك أسىً و تحمّلْ

لوگ کہتے ہیں: غمگین ہو کر ہلاک نہ ہو اور برداشت کر۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

''اور آپ پڑھ سنائیے انہیں خبر دو فرزندان آدم کی ٹھیک ٹھیک جب دونوں نے قربانی دی تو قبول کی گئی ایک سے اور نہ قبول کی گئی دوسروں سے (اس دوسرے نے) کہا: قسم ہے! میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔ (پہلے نے) کہا: (تو بلا وجہ ناراض ہوتا ہے) قبول فرماتا ہے اللہ تعالیٰ صرف پرہیزگاروں سے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اس آیت کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہود کا ظلم کرنا اور ان کا عہود اور مواثیق کو توڑنا ابن آدم کے اپنے بھائی پر ظلم کی طرح ہے معنی یہ ہے کہ اگر انہوں نے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیرے ساتھ زیادتی کی ہے تو انہوں نے تجھ سے پہلے انبیاء کو قتل کیا ہے قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔ شر بہت پرانا ہے انہیں یہ قصہ یاد دلایا اور یہ سچا واقعہ ہے جھوٹی احادیث کی طرح نہیں ہے۔ اس میں اسلام کے مخالف کو خاموش کرنا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ حضرت آدم کے ان بیٹوں کے بارے اختلاف ہے۔ حسن بصری نے کہا: یہ حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے نہ تھے، یہ دونوں بنی اسرائیل سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے حسد کو ظاہر کرنے کے لیے مثال بیان فرمائی، ان دونوں کے درمیان جھگڑا تھا، پس ان دونوں نے دو قربانیاں کیں اور قربانیاں صرف بنی اسرائیل میں تھیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ وہم ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا کوئی شخص دفن کرنے کی صورت سے واقف نہ تھا حتیٰ کہ اس نے کوے کی اقتدا کی (1)۔ صحیح یہ ہے کہ وہ دونوں حضرت آدم کی صلب سے تھے۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمرو غیرہما نے یہی کہا ہے، یہ دونوں ہابیل اور قابیل تھے (2)۔ قابیل کی قربانی سنبل کی لکڑیوں کا گٹھا تھا، کیونکہ وہ صاحب زرع (کھیتی باڑی کرنے والا) تھا، اس نے اپنے کھیت سے گھٹیا مال چنا تھا پھر اس میں ایک عمدہ شہ پایا تو اسے بھی صاف کر کے کھا لیا اور ہابیل کی قربانی مینڈھا تھا، کیونکہ وہ ریوڑ والا تھا۔ اس نے اپنی بھیڑوں سے ایک عمدہ جانور لیا۔ فَتُقُبِّلَ پس اسے جنت کی طرف اٹھایا گیا وہ جنت میں چرتا رہا حتیٰ کہ اس کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ دیا گیا۔ یہ سعید بن جبیر وغیرہ کا قول ہے جب ہابیل کی قربانی قبول کی گئی۔ کیونکہ وہ مومن تھا تو قابیل نے حسد کی بنا پر اسے کہا کیونکہ وہ کافر تھا۔ کیا تو زمین پر چلے گا جب کہ لوگ تجھے مجھ سے افضل دیکھیں گے!

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 178　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 197

لَاَقۡتُلَنَّكَ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس قربانی کا سبب یہ تھا کہ حضرت حواء علیہا السلام ہر بطن میں ایک مذکر اور ایک مونث جنم دیتی تھیں مگر حضرت شیث علیہ السلام اکیلے پیدا ہوئے یہ ہابیل کے عوض تھے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کا نام ہبۃ اللہ ہے، کیونکہ جبرئیل علیہ السلام نے حضرت حوا سے کہا جب انہوں نے اس کو جنم دیا۔ یہ تیرے لیے ہابیل کا بدل ہبۃ اللہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سوتیس سال تھی جب حضرت شیث علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام ایک بطن کے لڑکے کی دوسرے بطن کی لڑکی سے شادی کرتے تھے۔ کسی کے لیے اس کی جڑواں بہن حلال نہیں تھی قابیل کے ساتھ اس کی خوبصورت بہن پیدا ہوئی جس کا نام اقلیمیا تھا اور ہابیل کے ساتھ بہن پیدا ہوئی وہ ایسی خوبصورت نہ تھی اس کا نام لیوذا تھا جب حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل اور اقلیمیا کا نکاح کرنا چاہا تو قابیل نے کہا: میں اپنی بہن کا زیادہ حق دار ہوں، حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کو حکم دیا تو اس نے حکم نہ مانا، حضرت آدم علیہ السلام نے اسے منع کیا تو وہ نہ رکا، انہوں نے قربانی پر اتفاق کر لیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں حضرت ابن مسعود بھی ہیں روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس وقت حاضر تھے۔ واللہ اعلم۔

اس کے متعلق حضرت جعفر صادق سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی بیٹی کا اپنے بیٹے سے نکاح نہیں کرتے تھے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے ایسا کیا ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے انحراف نہ کرتے اور حضرت آدم علیہ السلام کا دین ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم و حوا کو زمین پر اتارا اور انہیں جمع فرمایا تو حضرت حواء علیہا السلام نے ایک لڑکی کو جنم دیا اس کا نام عناق رکھا اس نے بے حیائی کی، یہ پہلی بے حیائی کرنے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک قاتل کو مسلط کر دیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں حضرت حوا نے قابیل کو جنم دیا پھر ہابیل کو جنم دیا، جب قابیل بالغ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ایک مونث جن کو اس کے لیے ظاہر کیا جس کو جمالہ کہا جاتا تھا وہ انسانی شکل میں تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ اس کا نکاح قابیل سے کر دو، آپ نے اس کا نکاح قابیل سے کر دیا، جب ہابیل بالغ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ایک انسانی شکل میں حوریہ (حور) اتاری اور اس کے لیے رحم پیدا کیا، اس کا نام بزلۃ تھا جب ہابیل نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اس سے محبت کرنے لگا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ بزلۃ کا نکاح ہابیل سے کر دو، تو حضرت آدم علیہ السلام نے ایسا کر دیا۔ قابیل نے کہا: اے والد محترم! کیا میں اپنے بھائی سے بڑا نہیں ہوں؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ قابیل نے کہا: میں اس کا زیادہ حق دار ہوں جو آپ اس کے ساتھ کر رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے کہا: اے بیٹا! اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔ فضل اللہ کے دست قدرت میں ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ قابیل نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا نہیں، لیکن آپ نے اسے مجھ پر ترجیح دی ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: تم دونوں قربانی دو جس کی قربانی قبول ہوگی وہ اس فضل کا زیادہ حق دار ہوگا۔

میں کہتا ہوں: حضرت جعفر سے یہ قصہ صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قول جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک بطن کے لڑکے کا نکاح دوسرے بطن کی لڑکی سے کرتے تھے، یہ درست ہے اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ

الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً (النساء:1) اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد اور عورتیں (کثیر تعداد میں)۔ یہ نص کی مانند ہے پھر یہ منسوخ ہو گیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت حوا نے بیس بطنوں سے چالیس جوڑے جنم دیئے ان میں سے پہلا قابیل تھا اور اس کی جڑواں بہن اقلیمیا تھی اور ان کا آخری عبد المغیث پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی نسل میں برکت ڈال دی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کا وصال نہ ہوا حتیٰ کہ ان کی اور ان کی اولاد کی اولاد چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور حضرت جعفر سے جو مروی ہے کہ حضرت حوا نے بیٹی جنم دی اور اس نے بے حیائی کی، پھر کہا گیا: کس کے ساتھ بے حیائی کی؟ کیا جن کے ساتھ جو اس کے پاس آیا؟ اس جیسا قول نقل صحیح کا محتاج ہوتا ہے جو عذر کو قطع کر دے اور نقل صحیح معدوم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہابیل کے قول میں اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ۞ ہے اس سے پہلے کلام محذوف ہے، کیونکہ جب قابیل نے اسے کہا: لَاَقۡتُلَنَّکَ میں تجھے ضرور قتل کروں گا، تو ہابیل نے اسے کہا: تو مجھے کیوں قتل کرے گا جب کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور اللہ نے میری قربانی قبول کی ہے تو اس میں گناہ نہیں ہے میں نے تقویٰ اختیار کیا اور میں واضح حق پر تھا اور اللہ تعالیٰ متقین سے قبول فرماتا ہے (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: تقویٰ سے یہاں مراد شرک سے بچنا ہے۔ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے جس نے شرک سے اجتناب کیا وہ موحد ہے اور اس کے اعمال جن میں اس کی نیت سچی ہے وہ مقبول ہیں، شرک اور گناہوں سے بچنے والے کے لیے بلند درجہ ہے قبولیت اور رحمت کے ساتھ خاتمہ ہے۔ اللہ کے خبر دینے سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر رحمت کرنا اور قبول کرنا واجب نہیں۔ حضرت عدی بن ثابت نے کہا: اس امت کے متقی کی قربانی نماز ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: یہ عبادات میں سے خاص نوع ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے دوست سے دشمنی کی میرا اس سے اعلان جنگ ہے اور بندہ کسی ایسی چیز سے میرا قرب حاصل نہیں کرتا جتنا کہ فرائض ادا کر کے حاصل کرتا ہے اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی قوت سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی قوت بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کی قوت ید بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اس کے پاؤں میں میری قوت آ جاتی ہے جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے ضرور عطا کروں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے گا تو میں اس کو ضرور پناہ دوں گا اور مجھے کسی چیز سے اتنا تردد نہیں ہوتا جسے میں کرنا چاہتا ہوں جتنا کہ مومن کے نفس سے تردد ہوتا ہے وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی برائیوں کو ناپسند کرتا ہوں'' (3)۔

لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۞ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 178 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب الرقائق، جلد 2، صفحہ 963

النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

''تو اگر تو بڑھائے میری طرف اپنا ہاتھ تا کہ تو قتل کرے مجھے (جب بھی) میں نہیں بڑھانے والا اپنا ہاتھ تیری طرف تا کہ میں قتل کروں تجھے، میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو مالک ہے سارے جہانوں کا۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو اٹھالے میرا گناہ اور اپنا گناہ تا کہ تو ہو جائے دوزخیوں سے اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ یعنی تو اگر میرے قتل کا قصد کرے گا تو میں تیرے قتل کا قصد نہیں کروں گا، اس کی طرف سے تسلیم کرنا ہے۔ خبر میں ہے ''جب فتنہ ہو تو ابن آدم کے بہتر بیٹے کی طرح ہو جا'' (1)۔ ابو داؤد نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر کوئی مجھ پر میرے گھر میں داخل ہو اور میری طرف وہ اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لیے بڑھائے تو؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو آدم کے بیٹوں میں بہتر بیٹے کی طرح ہو جا''۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ۔ (2) مجاہد نے کہا: ان پر اس وقت فرض تھا کہ کوئی تلوار نہ سونتے اور نہ روکے اسے جو اسے قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہے (3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ بطور تعبد جائز تھا، مگر ہماری شریعت میں بالاجماع دفاع جائز ہے، اس کے وجوب میں اختلاف ہے اور اصح اس کا وجوب ہے، کیونکہ اس میں برائی سے منع کرنا ہے۔ حشویہ میں ایک گروہ ہے جو اس کے لیے دفاع جائز قرار نہیں دیتے جس پر حملہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوذر کی حدیث سے احتجاج کیا ہے اور علماء نے اس کو فتنہ میں قتال کے ترک پر محمول کیا ہے اور شبہ کے وقت ہاتھ روکنے پر محمول کیا ہے جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو اور جمہور علماء نے کہا: ہابیل، قابیل سے زیادہ طاقتور تھا لیکن وہ قتال سے بچا رہا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اظہر قول ہے اس سے تائید ملتی ہے کہ قابیل گنہگار تھا کافر نہیں تھا، کیونکہ اگر وہ کافر ہوتا تو ہابیل اسے قتل کرنے سے نہ بچتا۔ بچنے کی وجہ یہی ہے کہ بچنے والا کسی موحد کو قتل کرنے سے اجتناب کرتا ہے اور وہ اس پر راضی ہوتا ہے کہ وہ ظلم کرے تا کہ آخرت میں (اسے سزا ملے اور) اسے جزا ملے۔ حضرت عثمان نے یہی کہا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں تیرے قتل کا قصد نہیں کرتا بلکہ میں اپنے نفس کے دفاع کا قصد کرتا ہوں۔ اس بنا پر بعض علماء نے کہا: ہابیل سویا ہوا تھا تو قابیل آیا اور پتھر سے اس کا سر کچل دیا جیسا کہ آگے آئے گا: اور آدمی کا ظالم سے دفاع کرنا جائز ہے اگرچہ وہ دشمن کو دفاع میں قتل بھی کر دے۔

بعض علماء نے فرمایا: اگر تو میرے قتل سے ابتدا کرے گا تو میں تجھے کبھی قتل نہیں کروں گا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اگر تو ظلماً میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں ظلم کرنے والا نہیں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی نبی کریم

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 229۔ ایضاً، حدیث نمبر 3715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 228۔ ایضاً، حدیث نمبر 3714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 179

صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اذا التقی المسلمان بسیفیھما فالقاتل والمقتول فی النار۔ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں ہیں۔ کے معنی کی طرح ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! یہ قاتل (اس کے دوزخ میں ہونے کی سمجھ آتی ہے) مقتول کے دوزخ میں ہونے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: ''وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا'' (1)۔ گویا ہابیل نے ارادہ کیا کہ میں تیرے قتل پر حریص نہیں ہوں مجھے گناہ لاحق ہوتا اگر میں تیرے قتل پر حریص ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے گناہ کے ساتھ میرا گناہ بھی اٹھائے۔ بعض نے فرمایا: باثمی کا مطلب ہے میرا وہ گناہ جو میرے ساتھ خاص ہے جس میں مجھ سے کوتاہی ہوئی، یعنی میرے گناہوں میں سے لیا جائے اور تیرے مجھ پر ظلم کرنے کے سبب وہ گناہ تجھ پر ڈالا جائے اور تو اپنے گناہ کے ساتھ میرے گناہ کو اٹھائے اس کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کرتا ہے ''قیامت کے روز ظالم اور مظلوم کو لایا جائے گا، تو ظالم کی نیکیاں لی جائیں گی اور مظلوم کی نیکیوں میں اضافہ ہوگا حتیٰ کہ انصاف دیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی برائیوں سے لے کر ظالم پر ڈال دی جائیں گی''۔ مسلم نے اس کا مفہوم تخریج کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے: وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: 13) اور ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ۔

یہ واضح ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا گناہ اٹھائے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل: 15) اور کھڑے کر دیئے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ زمین ڈولتی نہ رہے تمہارے ساتھ۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) یعنی لئلا تضلوا پس لا کو حذف کیا گیا۔

میں کہتا ہوں: یہ ضعیف ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''کوئی نفس ظلماً قتل نہیں کیا جائے گا مگر اس کے خون کا بوجھ حضرت آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) پر ہوگا، کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل کی سنت قائم کی تھی'' (2)۔ اس سے ثابت ہوا کہ قتل کا گناہ حاصل ہے اسی وجہ سے اکثر علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ میرے قتل کا گناہ اور تیرا گناہ جو تو نے میرے قتل سے پہلے کیا اس کے ساتھ تو لوٹے گا۔ ثعلبی نے کہا: یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ استفہام ہے یعنی کیا میں ارادہ کرتا ہوں؟ یہ انکار کی جہت پر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ (الشعراء: 22) یعنی او تلك نعمة یہ اس لیے ہے، کیونکہ قتل کا ارادہ معصیت ہے۔ قشیری نے اس کو حکایت کیا ہے ابو الحسن ابن کیسان سے پوچھا گیا: مومن کیسے ارادہ کرتا ہے کہ اس کا بھائی گنہگار ہو اور وہ دوزخ میں جائے۔ تو ابو الحسن نے کہا: یہ ارادہ اس کی طرف قتل کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد واقع ہوا۔ معنی یہ ہے کہ تو نے میری طرف مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، میں تجھے اس سے ثواب کے ارادہ سے ضرور روکوں گا۔ ان سے کہا گیا: پھر اس نے باثمی واثمك کیسے کہا؟ اس کا کیا گناہ تھا جب وہ قتل کیا گیا؟ تو ابو الحسن نے کہا: اس کے تین جواب ہیں (۱) تو اٹھائے میرے قتل کا گناہ اور اپنے گناہ کو جس کی وجہ سے اس نے تیری قربانی قبول نہیں کی۔ یہ قول مجاہد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 9
2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامہ، جلد 2، صفحہ 60

سے مروی ہے(1)۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تو اٹھائے میرے قتل کا گناہ اور مجھ پر تجاوز کرنے کا گناہ، کیونکہ وہ تجاوز کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوا تھا اگرچہ اس نے (ابھی) قتل بھی نہ کیا تھا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو گناہگار ہوتا جب وہ اس سے رک گیا تو اس کا گناہ اس کے مخالف کی طرف لوٹا، یہ تیرے اس قول کی مثل ہو گیا۔ المال بینه و بین زید یعنی مال دونوں کے درمیان ہے معنی یہ ہے کہ تو ہمارا گناہ اٹھائے۔ با کا معنی ہے وہ اپنی منزل کی طرف لوٹا۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: 112) یعنی وہ لوٹے۔ سورۂ بقرہ میں اس پر تفصیلاً گفتگو گزر چکی ہے۔

شاعر نے کہا:

أَلَا تَنْتَهِي عَنَّا مُلُوكٌ و تَتَّقِي　　مَحارِمَنا لا يَبُوءُ الدَّمُ بالدَّمِ

یعنی قصاص میں خون کے ساتھ خون نہیں لوٹتا۔

فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔ یہ دلیل ہے کہ وہ اس وقت دونوں مکلف تھے انہیں وعدہ اور وعید لاحق ہوا۔ ہابیل نے اپنے بھائی قابیل سے کہا: فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ قابیل کافر تھا، کیونکہ اَصْحٰبُ النَّارِ کا لفظ قرآن میں جہاں بھی واقع ہوا ہے کفار کے بارے میں واقع ہوا ہے۔ یہ قول یہاں مردود ہے اس بنا پر جو ہم نے اس آیت کی تاویل میں مفسرین سے ذکر کیا ہے۔ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ کا معنی ہے تیرے دوزخ میں ہونے کی مدت۔ واللہ اعلم۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''پس آسان بنا دیا اس کے لیے اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل سو قتل کر دیا اسے اور ہو گیا سخت نقصان اٹھانے والوں سے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ یعنی اس کے نفس نے اس پر قتل کا معاملہ آسان کر دیا نفس نے اسے تشجیع کی اور اپنے بھائی کو قتل کرنے کی صورت آسان بنا دی۔ کہا جاتا ہے: طاع الشی یطوع یعنی آسان کر دیا، اطاعت کی۔ طوعه فلان له، یعنی اس نے اس کے لیے معاملہ آسان کر دیا۔ ہروی نے کہا: طوعت و اطاعت کا ایک معنی ہے۔ کہا جاتا ہے: طاع له كذا، جب کوئی کسی کے پاس خوشی سے آئے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے طاوعته نفسه فی قتل اخیه۔ حرف جر کو ہٹا دیا اور قتل اخیه منصوب ہو گیا۔ روایت ہے کہ وہ ناواقف تھا کہ وہ اپنے بھائی کو کیسے قتل کرے۔ ابلیس ایک پرندہ یا کوئی حیوان لے کر آیا اور اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تا کہ قابیل اس کی اقتداء کرے تو قابیل نے بھی ایسا کیا۔ یہ ابن جریج اور مجاہد وغیرہما نے کہا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود نے کہا: قابیل نے ہابیل کو سویا ہوا پایا تو اس نے پتھر کے ساتھ اس کا سر کچل دیا(2) اور یہ مکہ کے پہاڑ ثور میں ہوا تھا یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حرا کے عقب میں ہوا۔ محمد بن

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 241　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 200

جریر طبری نے یہ حکایت کیا ہے امام جعفر صادق نے کہا: بڑی مسجد کی جگہ بصرہ میں ہوا تھا۔ ہابیل کی عمر اس وقت بیس سال تھی جب قابیل نے اسے قتل کیا تھا۔ کہا جاتا ہے: قابیل اپنی طبع کی وجہ سے قتل کو جانتا تھا، کیونکہ انسان اگرچہ قتل کو نہ بھی دیکھے پھر بھی وہ طبعی طور پر اس کو جانتا ہے کہ نفس فانی ہے اور اس کا تلف کرنا ممکن ہے پس اس نے ایک پتھر اٹھایا اور ہند کی زمین میں اسے قتل کر دیا۔ واللہ اعلم

جب اپنے بھائی کو قابیل نے قتل کر دیا تو شرمندہ ہوا اور اس کے سر کے پاس روتے ہوئے بیٹھ گیا، پھر دو کوے آئے وہ آپس میں لڑنے لگے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا پھر اس قاتل کوے نے مقتول کوے کے لیے گڑھا کھودا اور اسے دفن کر دیا، تو قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کے لیے بھی ایسا ہی کیا۔ السوۃ سے مراد شرمگاہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مقتول جسم ہے پھر وہ عدن کی زمین کی طرف بھاگ گیا، پھر ابلیس اس کے پاس آیا اور کہا: آگ نے تیرے بھائی کی قربانی کو کھا لیا ہے، کیونکہ وہ آگ کی عبادت کرتا تھا تو بھی آگ کی عبادت کر یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہو جائے گی، پس اس نے آگ کے لیے ایک مکان بنایا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے آگ کی عبادت کی۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس سے مروی ہے جب اس نے قتل کیا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام مکہ میں تھے درخت خشک ہوئے، کھانوں کا ذائقہ بدل گیا، پھل کھٹے ہوئے اور پانی نمکین ہو گیا اور زمین کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: زمین پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے وہ ہند میں آئے تو ہابیل کو قابیل قتل کر چکا تھا (1)۔ بعض نے فرمایا: قابیل وہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف لوٹا، جب وہ حضرت آدم کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا: ہابیل کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں جانتا، گویا تو نے مجھے اس کی حفاظت پر مقرر کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے کہا: کیا تو نے ایسا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! اس کا خون ندا دے رہا ہے۔ اے اللہ! اس زمین پر لعنت کر جس نے ہابیل کے خون کو پیا۔ روایت ہے کہ اس وقت سے زمین خون کو نہیں پیتی، پھر حضرت آدم علیہ السلام سو سال زندہ رہے اور مسکرائے نہیں حتیٰ کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور کہا: حضرت آدم اللہ نے تجھے سلام کیا اور تجھے ہنسایا۔ یہ مجاہد اور سالم بن ابی الجعد کا قول ہے۔ حضرت آدم کی عمر سے ایک سو تیس سال گزر گئے یہ ہابیل کے قتل کے پانچ سال بعد ہوا تو ان کے لیے ایک چیز پیدا ہوئی اس کی تفسیر ہبۃ اللہ ہے یعنی ہابیل کا بدل (2)۔ مقاتل نے کہا: قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے سے پہلے درندے اور پرندے حضرت آدم علیہ السلام سے انس رکھتے تھے، جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو وہ بھاگ گئے اور پرندے ہوا میں چلے گئے اور وحشی جنگل میں چلے گئے اور درندے پوشیدہ جگہوں میں چلے گئے۔ روایت ہے کہ حضرت آدم نے کہا: جب حالت تبدیل ہو گئی:

تَغَيَّرَتِ البلادُ ومَنْ عليها   فوجهُ الأرض مُغبَرٌّ قَبِيحُ
تَغَيَّرَ كُلُّ ذى طَعْمٍ ولونٍ   وقلَّ بشاشةَ الوجهُ المَلِيحُ

بہت سے اشعار ہیں جن کو ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ہر شعر بشاشۃ کی نصب کے ساتھ ہے اور بغیر تنوین

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 243 2۔ ایضاً

کے ہے (1)۔ قشیری وغیرہ نے کہا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام نے شعر نہیں کہا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیاء شعر سے نہی میں برابر ہیں لیکن جب ہابیل کو قتل کیا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا مرثیہ کہا، وہ سریانی تھے وہ مرثیہ بھی سریانی زبان میں ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کو اس کی وصیت کی تھی فرمایا: تو میرا وصی ہے، مجھ سے یہ کلام محفوظ کر لے تاکہ وراثت چلتی رہے، پس یہ یعرب بن قحطان کے زمانہ تک محفوظ رہی پھر یعرب نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور اسے شعر بنا دیا (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت انس سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منگل کے دن کے متعلق پوچھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ خون کا دن ہے اس میں حضرت حوا کو حیض آیا اور اس میں ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کیا'' (☆)۔ صحیح مسلم وغیرہ سے حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نفس ظلماً قتل نہیں کیا جاتا مگر اس کے خون کا بوجھ حضرت آدم کے پہلے بیٹے پر ہوتا ہے، کیونکہ اس نے قتل کا آغاز کیا تھا'' (3)۔ یہ تعلیل پر نص ہے، اس اعتبار سے ابلیس پر ہر اس شخص کی معصیت کا بوجھ ہوگا جس نے سجدہ کی نافرمانی کی، اسی طرح جس نے اللہ کے دین میں ایسی بدعت کا آغاز کیا جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام شروع کیا اس کے لیے اس کا اجر ہوگا اور ان لوگوں کا اجر بھی ہوگا جو قیامت تک اس پر عمل کریں گے اور جس نے اسلام میں کوئی برا کام شروع کیا اس کے لیے اس کا گناہ ہوگا اور ان کا گناہ ہوگا جو قیامت تک اس کے مطابق عمل کریں گے'' (۱) یہ خیر و شر میں نص ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف گمراہ ائمہ کا ہے'' (4)۔ یہ تمام صریح ہے اور آیت کے معنی میں صحیح نص ہے۔ یہ اس وقت تک ہے جب تک اس معصیت سے وہ توبہ نہ کرے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام وہ پہلے تھے جنہوں نے اس چیز کے کھانے میں مخالفت کی جس سے منع کیا گیا تھا۔ اور ان پر ان لوگوں کا بوجھ نہ ہوگا جو اس چیز کے کھانے پینے میں نافرمانی کریں گے جس سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے توبہ کر لی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی تھی، پس وہ ایسے ہو گئے جیسے جس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے بھول کر کھایا تھا جیسا کہ صحیح قول ہے، ہم نے سورہ بقرہ میں بیان کر دیا ہے اور بھولنے والا گنہگار نہیں ہوتا اور نہ اس کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت حاسد کی حالت کے بیان کو متضمن ہے حتیٰ کہ حسد نے اسے اپنے قریبی رشتہ دار کو اور مہربان شخص کو، اذیت دور کرنے والے کو ہلاک کرنے پر ابھارا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ یعنی ان سے ہو گیا جس نے نیکیاں کم کر دیں۔ مجاہد نے کہا: قاتل کا ایک پاؤں اس کی پنڈلی سے ران تک باندھ دیا جاتا ہے اور یہ قیامت تک ایسا ہی رہے گا اور اس کا چہرہ سورج

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 180	2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 243	3۔ صحیح مسلم، کتاب القسامہ، جلد 2، صفحہ 60

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 278	☆ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3364، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۱) ریاض الصالحین، باب فیمن سن سنة حسنة أو سيئة، صفحہ 126، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی طرح ہوتا ہے سورج جدھر بھی گھومتا ہے گرمیوں میں اس پر آگ کا گھراؤ ہوتا ہے اور سردیوں میں اس پر برف کا گھراؤ ہوتا ہے(1)۔ ابن عطیہ نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو وہ اس گھاٹے سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے ورنہ خسران (گھاٹا) تو دنیا و آخرت کے خسران کو عام ہے(2)۔

میں کہتا ہوں: شاید یہ عقوبت اسے اس قول پر ہو کہ وہ گنہگار تھا، کافر نہ تھا۔ تو معنی ہوگا وہ دنیا میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے تھا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾

''پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تا کہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی، کہنے لگا: ہائے افسوس! کیا قاصر رہا میں کہ ہوتا اس کوے کی مانند تو چھپا دیتا لاش اپنے بھائی کی، غرض وہ ہو گیا سخت پچھتانے والوں سے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے وہ آپس میں لڑے حتیٰ کہ ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا پھر گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا(3)۔ ابن آدم پہلا تھا جو قتل کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: کوے نے زمین کو اپنی خوراک کے لیے کھودا تا کہ وہ ضرورت کے وقت تک اسے چھپائے رکھے، کیونکہ ایسا کرنا کوے کی عادت ہے پس اس کے ذریعے قابیل اپنے بھائی کو پوشیدہ کرنے پر آگاہ ہو گیا۔ اور روایت ہے کہ قابیل نے جب ہابیل کو قتل کیا تو اسے ایک بوری میں رکھ دیا اور اسے سو سال اپنی گردن میں اٹھائے پھرتا رہا(4)۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس نے اسے ایک سال اٹھائے رکھا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اس میں بدبو پیدا ہو گئی وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے، یہاں تک کہ اس نے کوے کی اقتدا کی جیسا کہ گزر چکا ہے۔ خبر میں حضرت انس سے مروی ہے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی اولاد پر تین احسان فرمائے تین چیزوں کے بعد، روح نکلنے کے بعد اس میں بدبو کا واقع ہونا، اگر روح نکلنے کے بعد بدبو نہ ہوتی تو کوئی دوست کسی دوست کو دفن نہ کرتا اگر جسم میں کیڑے پیدا نہ ہوتے تو بادشاہ جسموں کو خزانہ کر لیتے اور یہ ان کے لیے دراہم و دنانیر سے بہتر ہوتا اور بڑھاپے کے بعد موت کا احسان فرمایا، آدم بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ سے اکتا جاتا ہے اس کے اہل، اس کی اولاد اور اس کے قریبی رشتہ دار اکتا جاتے ہیں، پس موت اس کے لیے زیادہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 180 2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 237 4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 201

پردہ کا باعث ہوتی ہے (1)''۔ ایک قوم نے کہا: قابیل دفن کو جانتا تھا لیکن اس نے اسے میدان میں تحقیر کرتے ہوئے چھوڑ دیا، پس اللہ تعالیٰ نے کوا بھیجا وہ ہابیل پر مٹی ڈالنے لگا تا کہ اسے دفن کر دے اس وقت قابیل نے کہا: یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۝ جب اس نے ہابیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرم نوازی دیکھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک کوا مقرر فرما دیا حتیٰ کہ اس نے اسے چھپا دیا، یہ شرمندگی توبہ کے طور پر نہ تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس کے مفقود ہونے پر شرمندہ ہوا اس کے قتل پر شرمندہ نہ ہوا اگرچہ وہ توبہ کی شروط کو پورا کرنے والا نہ تھا یا وہ شرمندہ ہوا لیکن ہمیشہ کے لیے شرمندہ نہ ہوا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اگر اس کی ندامت قتل پر ہوتی تو یہ اس کی ندامت بطور توبہ ہوتی۔ کہا جاتا ہے حضرت آدم اور حضرت حوا ہابیل کی قبر پر آئے اور کئی دن تک اس پر روتے رہے، پھر قابیل ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا اسے ایک بیل نے سینگ مار کر نیچے گرا دیا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کے خلاف دعا کی تو زمین اسے نگل گئی۔ کہا جاتا ہے: قابیل، ہابیل کے قتل کے بعد وحشی بن گیا اور اس نے جنگل کو لازم پکڑ لیا۔ وہ صرف وحشی جانور کھاتا تھا جب وہ کسی وحشی پر غالب آتا تو اسے زور سے ضرب لگاتا حتیٰ کہ وہ مر جاتا پھر اسے کھاتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ضرب سے مارا ہوا جانور ہابیل کے وقت سے حرام تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جو آدمیوں میں سے آگ کی طرف چلایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ الآیۃ (حم السجدہ: 29)

ابلیس جنوں میں سے کافروں کا سردار ہے اور قابیل انسان میں خطا کاروں کا سردار ہے، جیسا کہ آگے بیان سورۂ حم فصلت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس وقت میں شرمندگی توبہ نہ تھی۔ اللہ سب کچھ بہتر جانتا ہے اور پختہ کرتا ہے۔

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ہابیل، اولاد آدم سے پہلا میت ہے، اسی وجہ سے چھپانے کا طریقہ مخفی تھا اور اسی طرح طبری نے ابن اسحاق سے حکایت کیا ہے اور انہوں نے بعض اہل علم سے روایت کیا ہے جو پہلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔ اور یبحث کا معنی ہے مٹی کو چونچ سے کریدنا اور اسے اڑانا، اسی وجہ سے سورۂ براءۃ کو البحوث بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے منافقین کی تفتیش کی۔ اس سے شاعر کا قول ہے:

إن الناس غطّوني تغطّيتُ عنهم وإن بحثوني كان فيهم مباحثُ

ضرب المثل ہے: لا تکن کالباحث علی الشفرۃ۔

شاعر نے کہا:

فكانت كعَنْزِ السُّوء قامت برجلِها إلى مُدْيَة مدفونه تَسْتَثِيرُها

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے کوے کو حکمت کی خاطر بھیجا تا کہ ابن آدم چھپانے کی کیفیت دیکھ لے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ (عبس) کا یہی معنی ہے پس چھپانے میں کوے کا فعل مخلوق میں سنت باقیہ بن گیا اور لوگوں پر

1۔ موسوعہ اطراف الحدیث، جلد 2، صفحہ 332

فرض کفایہ بن گیا جس نے ایسا کر دیا دوسرے لوگوں سے فرض ساقط ہو گیا۔ یہ حکم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ خاص ہے، پھر پڑوسیوں کے لیے ہے، پھر تمام مسلمانوں پر ہے۔ رہے کفار تو ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ کا چچا، بوڑھا گمراہ فوت ہو گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جاؤ اور اپنے باپ کو مٹی میں چھپا دو پھر کچھ بیان نہ کرنا حتیٰ کہ تم میرے پاس آ جاؤ (1)'' میں گیا اسے مٹی میں چھپا دیا پھر آپ کے پاس آیا تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا میں نے غسل کیا اور مجھے دعا دی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قبر میں کشادگی اور عمدگی مستحب ہے، کیونکہ ابن ماجہ نے حضرت ہشام بن عامر سے روایت کیا ہے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبر کھودو، اسے کھلا کرو اور بہتر کرو (2)۔ ادرع سلمی سے مروی ہے فرمایا میں ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے کے لیے آیا وہاں ایک شخص بلند آواز سے قرأت کر رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! یہ ریاکار ہے پھر وہ شخص مدینہ طیبہ میں فوت ہو گیا لوگ اس کے کفن اور غسل سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اس کی نعش کو اٹھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس پر مہربانی اور نرمی کرو اللہ نے اس پر نرمی فرمائی ہے، کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا تھا'' فرمایا: اس کی قبر کھودی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے لیے قبر کو وسیع کرو اللہ تعالیٰ نے اس پر وسعت فرمائی ہے''۔ کسی صحابی نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اس پر حزین ہوئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا تھا'' (3)۔ اس حدیث کو انہوں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے انہوں نے زید بن حباب سے انہوں نے موسیٰ بن عبیدہ سے انہوں نے سعید بن ابی سعید سے روایت کیا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا: حضرت ادرع سلمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے، ان سے سعید بن ابی سعید مقبری نے روایت کی ہے، رہا ہشام بن عامر بن امیہ بن حساس بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار انصاری اس کو زمانہ جاہلیت میں شہاب کہا جاتا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام تبدیل کیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام ہشام رکھا تھا۔ اس کا باپ عامر جنگ احد میں شہید ہوا تھا ہشام بصرہ میں رہا اور وہاں ہی ان کا وصال ہوا یہ کتاب الصحابہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ پھر کہا گیا ہے کہ لحد، شق سے افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کو اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو اس وقت مدینہ طیبہ میں دو شخص تھے ایک لحد بناتا تھا اور دوسرا لحد نہیں بناتا تھا۔ صحابہ نے مشورہ سے کہا: ان میں سے جو پہلے آئے گا وہ اپنا کام کرے گا، پس وہ پہلے آیا جو لحد بناتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے لحد بنائی گئی (4)۔ امام مالک نے موطا میں ہشام بن عروہ عن ابیہ کے واسطہ سے یہ ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس اور حضرت

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 102۔ ایضاً، حدیث نمبر 2799، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 113۔ ایضاً، حدیث نمبر 1548، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 113۔ ایضاً، حدیث 1547، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ موطا امام مالک، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 213

عائشہ سے یہ روایت کیا ہے۔ یہ دو شخص ابوطلحہ اور ابو عبیدہ تھے ابوطلحہ لحد بناتے تھے اور ابو عبیدہ شق بناتے تھے (1)۔ لحد کا مطلب وہ شق ہے جو قبر کی ایک طرف میں بنایا جاتا ہے، اگر زمین سخت ہو اس میں میت کو رکھا جاتا ہے، پھر اس پر کچی اینٹیں لگائی جاتی ہیں، پھر مٹی ڈالی جاتی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اپنی مرض موت میں فرمایا: میرے لیے لحد بنانا اور کچی اینٹیں لگانا جس طرح رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا گیا تھا (2)۔ مسلم نے اس کو روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لیے لحد ہے اور دوسروں کے لیے شق ہے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن ماجہ نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے فرمایا میں حضرت ابن عمر کے ساتھ ایک جنازہ میں آیا جب لحد میں میت کو رکھا گیا تو حضرت عبدالله بن عمر نے کہا: بسم الله وفی سبیل الله وعلی ملة رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم جب لحد پر اینٹیں برابر کرنا شروع کیں تو کہا: اللهم اجرها من الشیطان وعذاب القبر، اللهم جاف الارض عن جنبیها وصعد روحها ولقها منك رضوانا۔ میں نے کہا: اے ابن عمر! کیا تم نے یہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے یا تم نے یہ اپنی رائے سے کہا ہے؟ حضرت عبدالله بن عمر نے کہا: پھر تو میں اس قول پر قادر رہوں۔ بلکہ میں نے یہ چیز رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے (4)۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی پھر میت کی قبر پر آئے اس کے سر کی جانب سے تین مرتبہ مٹی ڈالی (5)۔ یہ اس آیت کے متعلق احکام تھے۔ یٰوَیْلَتٰۤى اصل میں یا وَیْلَتِی تھا پھر یا کو الف سے بدلا گیا۔ حسن نے اصل پر یا سے پڑھا ہے، پہلا قول اصح ہے، کیونکہ ندا میں یا کا حذف اکثر ہے۔ عرب یہ کلمہ ہلاکت کے وقت بولتے ہیں۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ اصمعی نے کہا: ویلٌ کا معنی بعدٌ ہے۔ حسن نے أَعَجِزْتُ جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (6)۔ نحاس نے کہا: یہ شاذ لغت ہے۔ کہا جاتا ہے عجزت المرأة جب عورت اپنا پچھلا حصہ ڈھانپ دے۔ عجزت عن الشئ عجزاً و معجزة و معجزةً۔ والله اعلم

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

''اسی وجہ سے (حکم) لکھ دیا ہے ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو سوائے قصاص کے اور زمین میں فساد برپا کرنے کے تو گویا اس نے قتل کر دیا تمام انسانوں کو اور جس نے بچالیا کسی جان کو تو گویا بچایا

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 113۔ ایضاً، حدیث 1546، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 311
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 112۔ ایضاً، حدیث 1542، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 113 6۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 181

اس نے تمام لوگوں کو اور بے شک آئے ان کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ پھر بھی بہت سے لوگ ان میں سے اس کے بعد بھی زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ یعنی قاتل کی اس جرأت کی وجہ سے۔ زجاج نے کہا: اس کی جنایت کی وجہ سے، کہا جاتا ہے: اجل الرجل علی اهله شرا، یا جل اجلاً۔ جب کوئی زیادتی کرے مثلاً اخذ، یاخذ اخذاً۔

خنوت نے کہا:

واهلِ خباءٍ صالحٍ كنتُ بَيْنَهُمْ قد احتربُوا لى عاجلٍ أنا آجلُه

یعنی میں خیانت کرنے والا ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: میں ان پر زیادتی کرنے والا ہوں۔ عدی بن زید نے کہا:

أَجْلَ الله قد فَضَّلَكم فوقَ مَنْ أَحكأ صُلبا بازارِ

اس کی اصل الجر ہے، اسی سے الاجل مدت ہے، کیونکہ وہ وقت ہوتا ہے جس کی طرف پہلی عقد کھینچی جاتی ہے۔ اسی سے الاجل نقیض العاجل ہے یعنی متقدم امر اس کی طرف کھینچا جاتا ہے اسی سے اجل بمعنی نعم ہے، کیونکہ یہ انقیاد ہے اس کی طرف جس کی طرف کھینچا گیا ہے اسی سے الاجل، جنگلی گائیوں کا ریوڑ ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں۔ یہ رمانی کا قول ہے یزید بن القعقاع ابو جعفر نے مِن اجْل ذالك پڑھا ہے یعنی نون کے کسرہ اور ہمزہ کے حذف کے ساتھ۔ یہ بھی ایک لغت ہے اصل من اجل ذالك ہے ہمزہ کا کسرہ نون کو دیا گیا ہے اور ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا تعلق مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝ کے ساتھ ہو اور وقف مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ پر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مابعد کے متعلق ہو وہ كَتَبْنَا ہے اور مِنْ اَجْلِ کلام کا ابتدا ہے اور اس کی تکمیل مِنَ النّٰدِمِيْنَ ہے۔ یہ اکثر لوگوں کا نظریہ ہے یعنی اس کے سبب ہم نے فرض کیا۔ بنی اسرائیل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، ان سے پہلے بھی امتیں گزر چکی تھی ان میں سے کسی نفس کا قتل ممنوع تھا، کیونکہ بنی اسرائیل پہلی امت تھی جن پر لکھی ہوئی نفس کو قتل کرنے کی وعید نازل ہوئی، اس سے پہلے مطلقاً قول تھا پس بنی اسرائیل کی سرکشی اور خونریزی کی وجہ سے کتاب کے ساتھ حکم کو سخت کیا گیا۔

بِغَيْرِ نَفْسٍ یعنی اس نے قتل نہ کیا ہو کہ وہ قتل کا مستحق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمام شرائع میں قتل کو حرام کیا تھا مگر تین صورتوں میں (۱) ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا (۲) احصان کے بعد زنا کرنا (۳) ظلماً کسی نفس کو قتل کرنا۔

اَوْ فَسَادٍ یہاں فساد سے مراد شرک ہے۔ بعض نے فرمایا: ڈاکہ ڈالنا ہے۔ حسن نے او فساداً پڑھا ہے فعل کے حذف کی تقدیر پر جس پر پہلی کلام دلالت کرتی ہے تقدیر عبارت ہے: او احدث فساداً اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ کیونکہ یہ بہت بڑا فساد ہے۔ عام قراء نے فسادٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے او بغیر فسادٍ کے معنی پر ہے۔

فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا اس تشبیہ کی ترتیب میں مفسرین کے اقوال میں اضطراب ہے، کیونکہ تمام لوگوں کو قتل کرنے کی سزا ایک قتل کی سزا سے زیادہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے کسی نبی کو قتل

کیا یا عادل امام کو قتل کیا گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا اور جس نے اس کو زندہ کیا ان کی مدد و نصرت سے تو اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کیا(1)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے فرمایا: جس نے ایک نفس کو قتل کیا اور اس کی حرمت کو توڑا وہ تمام لوگوں کو قتل کرنے والے کی مثل ہے اور جس نے ایک نفس کے قتل کو ترک کیا اور اس کی حرمت کی حفاظت کی اور الله کے خوف کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا وہ اس کی مانند ہے جس نے تمام لوگوں کو زندہ کیا(2)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے گویا مقتول کے پاس اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک شخص کو زندہ کیا اور اسے ہلاکت سے بچایا تو اس نے بچائے گئے شخص کے نزدیک تمام لوگوں کو زندہ کیا(3)۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے جس نے مومن نفس کو جان بوجھ کر قتل کیا الله تعالیٰ نے اس کی جزا جہنم بنائی ہے اور اس پر غضب کیا ہے اور اس پر لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا ہے(4)۔ اگر وہ تمام لوگوں کو قتل کرتا تو اس پر زیادہ نہ کیا جاتا اور جس نے قتل نہیں کیا اس سے تمام لوگ زندہ ہوئے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے جس نے کسی نفس کو قتل کیا اس پر وہی قصاص لازم ہوتا ہے جو تمام لوگوں کو قتل کرنے والے پر لازم ہوتا ہے فرمایا: **وَ مَنْ اَحْیَاهَا** جس نے اس کو معاف کر دیا جس کا قتل کرنا اس کے لیے واجب تھا۔ یہ حسن کا بھی قول ہے، یعنی قدرت کے بعد معاف کر دینا(5)۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے کسی نفس کو قتل کیا تو تمام مسلمان اس کے خصم ہیں، کیونکہ اس نے تمام کو ہلاک کیا اور جس نے اس کو زندہ کیا گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کیا، یعنی تمام پر اس کا شکر واجب ہے۔ بعض نے فرمایا: ایک شخص کے قاتل کے گناہ کو تمام لوگوں کے قاتل کا گناہ بنایا، اس کی شان ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بعض نے فرمایا: یہ بنی اسرائیل کے ساتھ مختص ہے ان پر یہ سختی کرنے کے لیے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: جو کچھ کہا گیا ہے تشبیہ تمام پر واقع ہے ایک شخص کی حرمت کو تار تار کرنے والا تمام لوگوں کی حرمت کو تار تار کرنے والا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ دو شخص قسم اٹھائیں کہ وہ ان دو درختوں کے پھلوں سے کچھ نہیں کھائیں گے، پھر ان میں سے ایک درخت کے پھل سے کھالیا اور دوسرے نے دوسرے درخت کے پھل سے کھالیا تو وہ قسم توڑنے کے گناہ میں برابر ہیں(6)۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے ایک شخص کے قتل کو حلال سمجھا اس نے تمام کے قتل کو حلال سمجھا، کیونکہ اس نے شرع کا انکار کیا۔

وَ مَنْ اَحْیَاهَا میں تجوز ہے۔ اس سے مراد ہلاکت سے بچانا ہے ورنہ زندہ کرنا حقیقت میں اختراع کے معنی میں ہے اور یہ کام الله تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے یہ احیا، نمرود لعین کے قول کی طرح ہے: انا احی و امیت۔ ترک کو احیا فرمایا پھر بنی اسرائیل کے متعلق الله تعالیٰ نے خبر دی کہ ان کے پاس رسل بینات کے ساتھ آئے اور ان میں اکثر حد سے تجاوز کرنے والے تھے اور الله کے حکم کو چھوڑنے والے تھے۔

**اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ**

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 241　2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 242　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 243　5۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 182　6۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 183-182

یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے کہ انہیں (چن چن کر) قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلاوطن کر دیئے جائیں یہ تو ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لیے آخرت میں (اس سے بھی) بڑی سزا ہے، مگر جنہوں نے توبہ کر لی اس سے پہلے کہ تم قابو پالو ان پر (ان کو معاف کر دیا جائے گا) اور خوب جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت کے سبب نزول میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ عرنیین کے بارے میں نازل ہوئی۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ ابوداؤد کے ہیں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ عکل قبیلہ یا عرینۃ قبیلہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو انہیں مدینہ طیبہ کی ہوا راس نہ آئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اونٹوں کے پاس جانے کا حکم دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان کے پیشاب اور ان کے دودھ پئیں، وہ چلے گئے، جب وہ ٹھیک ہو گئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خبر دن کے آغاز میں پہنچی، آپ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجے دن چڑھنے کے ساتھ ہی انہیں پکڑ کر لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق حکم دیا تو ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے اور ان کی آنکھوں میں لوہے کی سلاخیں ڈالی گئیں اور پتھریلے ٹیلے پر ڈالے گئے وہ پانی طلب کرتے رہے لیکن انہیں پانی نہ دیا گیا۔ ابوقلابہ نے کہا: یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چوری کی، قتل کیا اور ایمان لانے کے بعد کفر کیا اور اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی (1)۔ ایک روایت میں ہے ان کی آنکھوں میں کیل گرم کر کے لگانے کا حکم دیا تو ان کی آنکھوں میں گرم سلاخیں لگائی گئیں اور ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے اور انہیں داغا نہ گیا (2)۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے پیروں کے نشان دیکھنے والے بھیجے، پس انہیں لایا، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ نازل کیا: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا، الآیۃ (3)۔ ایک روایت میں ہے حضرت انس نے فرمایا: میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے زمین چاٹ رہا تھا حتیٰ کہ وہ مر گئے (4)۔ بخاری میں ہے حضرت جریر بن عبداللہ نے اپنی حدیث میں فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ایک گروہ میں بھیجا حتیٰ کہ میں نے انہیں پالیا جب کہ وہ اپنے شہر کے قریب پہنچ چکے تھے ہم انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 244 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

حضرت جریر نے کہا: وہ کہتے تھے پانی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: آگ۔ اہل سیرت و تواریخ نے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے چرواہے کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے تھے اور اس کی آنکھوں میں کانٹے چبھوئے تھے حتیٰ کہ وہ مر گیا تھا، اسے مدینہ طیبہ میں مردہ داخل کیا گیا تھا، اس کا نام یسار تھا اور وہ نوبیا تھا۔ یہ مرتدین کا فعل چھ ہجری میں ہوا تھا۔ بعض روایات میں حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں قتل کرنے کے بعد آگ سے جلا دیا تھا(1)۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک سے مروی ہے کہ یہ اہل کتاب کی ایک قوم کے سبب نازل ہوئی ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان عہد تھا، انہوں نے عہد کو توڑا تھا اور ڈاکہ ڈالا تھا اور زمین میں فساد برپا کیا تھا(2)۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مشرکین کے بارے نازل ہوئی ان میں سے جو توبہ کرلے گا اس سے پہلے کہ اس پر قدرت حاصل ہو جائے، اس پر حد قائم کرنے سے مانع نہ ہوگا اس جرم کی وجہ سے جو اس نے کیا تھا(3)۔ جن علماء نے فرمایا یہ آیت مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی وہ عکرمہ اور حسن ہیں۔ یہ ضعیف ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال:38) اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد: الاسلام یھدم ما قبلہ (4) (مسلم) اس کا رد کرتا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ احادیث کی نصوص اس کے بارے میں ثابت ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے نے کہا: یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی جو مسلمانوں میں سے نکلیں، ڈاکہ ڈالیں اور زمین میں فساد برپا کریں۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک کا قول صحیح ہے۔ ابوثور نے اس قول کے لیے حجت قائم کرتے ہوئے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ یہ مشرکوں کے علاوہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ یہ ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ۔ علماء کا اجماع ہے کہ مشرکین جب ہمارے ہاتھوں میں آجائیں اور وہ اسلام قبول کرلیں تو ان کے خون حرام ہوں گے، پس یہ دلیل ہے کہ یہ آیت اہل اسلام کے بارے میں نازل ہوئی۔ طبری نے بعض اہل علم سے حکایت کیا ہے اس آیت نے نبی کریم ﷺ کے عرنیین کے بارے میں فعل کو منسوخ کر دیا(5)، پس حدود پر امر موقوف ہو گیا۔ محمد بن سیرین نے روایت کیا ہے فرمایا: یہ حدود کے نزول سے پہلے تھا، یعنی حضرت انس کی حدیث۔ ابوداؤد نے یہ ذکر کیا ہے ان میں سے ایک قوم نے کہا: جن میں سے لیث بن سعد بھی ہے رسول اللہ ﷺ نے عرینہ کے وفد کے ساتھ جو کیا تھا وہ منسوخ ہو گیا، کیونکہ مرتد کا مثلہ جائز نہیں۔ ابوالزناد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے جب اونٹ چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹے اور ان کی آنکھوں میں آگ سے گرم کر کے سلائیں لگائیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر عتاب فرمایا اس بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 249 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 245-244
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 76 5۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 251

فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا الآیۃ۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (1)۔ ابو الزناد نے کہا: جب مثلہ سے منع کیا گیا تو دوبارہ کبھی ایسا نہ کیا۔ ایک جماعت سے حکایت ہے کہ یہ آیت اس فعل کے لیے ناسخ نہیں، کیونکہ وہ مرتدین کے بارے واقع ہوا خصوصاً صحیح مسلم میں اور کتاب النسائی وغیرہما میں ثابت ہے فرمایا: ان لوگوں کی آنکھوں میں سلائیں پھیریں کیونکہ انہوں نے چرواہے کے آنکھوں میں سلائیں پھیری تھیں (2)۔ یہ قصاص تھا۔ یہ آیت محارب مومن کے بارے میں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے۔ امام مالک و امام شافعی کے نظریہ کا بھی یہی معنی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ یہ معلوم ہے کہ کفار کے احکام قدرت کے بعد توبہ کے ساتھ ان سے عقوبت کے زوال میں مختلف نہیں ہوتے جس طرح قدرت سے پہلے ساقط ہوتے ہیں اور مرتد نفس ردت کے ساتھ قتل کا مستحق ہوتا ہے بغیر محاربت کے...... اسے نہ جلاوطن کیا جاتا ہے، نہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں اور نہ اس کا راستہ چھوڑا جاتا ہے بلکہ اسے قتل کیا جاتا ہے اگر وہ اسلام قبول نہ کرے۔ اور اسے سولی پر بھی نہیں چڑھایا جاتا پس یہ دلیل ہے کہ آیت جس پر مشتمل ہے اس سے مراد مرتد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کے حق میں فرمایا: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: 38) اور محاربین کے بارے میں فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا یہ واضح ہے جو کچھ ہم نے باب کی ابتدا میں ثابت کیا ہے اس میں نہ کوئی اشکال ہے نہ لوم ہے اور نہ عتاب ہے کیونکہ وہ کتاب کا مقتضیٰ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (بقرہ: 194) پس انہوں نے مثلہ کیا تھا تو ان کا مثلہ کیا گیا مگر یہ احتمال ہے کہ عتاب اس وجہ سے ہو۔ اگر صحیح ہے۔ کہ قتل میں زیادتی ہوئی تھی اور وہ سلائیں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں ڈالنا تھا اور انہیں پیاسا چھوڑ دینا تھا حتیٰ کہ وہ مر گئے۔ واللہ اعلم۔

طبری نے سدی سے حکایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرنیین کی آنکھوں میں سلائیں نہیں ڈالی تھیں، اس کا ارادہ فرمایا تھا۔ پس اس سے منع کے بارے میں یہ آیت نازل ہو گئی (3)۔ یہ بالکل ضعیف ہے، کیونکہ اخبار ثابت کرتی ہیں کہ سلائیں ان کی آنکھوں میں ڈالی گئی تھیں۔ بخاری میں ہے: سلائیں گرم کی گئیں اور ان کی آنکھوں میں لگائی گئیں (4)۔ علماء کے درمیان اختلاف نہیں کہ اس آیت کا حکم اہل اسلام میں سے محاربین میں مرتب ہے اگرچہ مرتدین یا یہود کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ میں استعارہ اور مجاز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے نہ محاربہ کیا جاتا ہے اور نہ اس پر غلبہ پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ صفات کمال کا حامل ہے اس کے لیے اضداد و انداد سے تنزیہ واجب ہے معنی یہ ہے کہ وہ اولیاء اللہ سے محاربہ کرتے ہیں۔ اپنے اولیاء کو اپنی ذات سے تعبیر فرمایا ان کی ذات کی بڑائی بیان کرنے کیلئے۔ جس طرح الفقراء الضعفاء کو اپنی ذات سے تعبیر فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ: 245)

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 244
2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامہ، جلد 2، صفحہ 58
3۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 252
4۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1105

یہ فقراء پر مہربانی پر برانگیختہ کرنے کے لیے فرمایا اس کی مثال سنت میں ہے: استطعمتك فلم تُطْعِمی (1) میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا ان کے بارے میں اختلاف ہے جو محاربہ کے اسم کے مستحق ہیں۔ امام مالک نے کہا: ہمارے نزدیک محارب وہ ہے جو لوگوں پر شہر میں یا جنگل میں حملہ کرے اور ان کے نفسوں اور ان کے اموال کی وجہ سے انہیں مشقت میں ڈالے نہ بدلہ کے طور پر ہو، نہ عداوت کے طور پر ہو۔ ابن المنذر نے کہا: اس مسئلہ میں امام مالک سے مختلف اقوال مروی ہیں انہوں نے ایک مرتبہ مصر میں محاربہ کو ثابت کیا اور ایک مرتبہ نفی کی۔ ایک طائفہ نے کہا: اس کا حکم شہر یا گھروں میں، راستوں میں، دیہاتوں میں برابر ہے اور ان کی حدود ایک ہیں۔ یہ امام شافعی، ابوثور کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اسی سے یہ ہے، کیونکہ تمام پر محاربۃ کا اسم واقع ہوتا ہے۔ کتاب عموم پر دلالت کرتی ہے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی قوم کو آیت سے بغیر حجت کے نکالے۔ ایک طائفہ نے کہا: شہر میں محاربہ نہ ہوگا، بلکہ شہر سے باہر ہوگا، یہ سفیان ثوری، اسحاق، نعمان کا قول ہے۔ دھوکہ دینے والا محارب کی طرح ہے دھوکہ دینے والا وہ ہے جو مال حاصل کرنے کے لیے کسی انسان کو قتل کرتا ہے۔ اگر ہتھیار کو نہ لہرایا لیکن اس پر اس کے گھر میں داخل ہوا یا سفر میں اس کو ملا اور اسے زہر کھلا دیا، پھر اسے قتل کیا تو اس کو حداً قتل کیا جائے گا، نہ کہ قصاصاً قتل کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ محارب کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے، ایک جماعت نے کہا: اس کے فعل کی مقدار اس پر سزا ہوگی۔ جس نے لوگوں کو ڈرایا اور مال لیا تو اس کے ہاتھ اور پاؤں برعکس کاٹے جائیں گے، اگر مال لیا اور قتل کیا تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے اور پھر اسے سولی پر لٹکایا جائے گا، جب قتل کرے اور مال نہ لوٹے تو اسے قتل کیا جائے گا اگر نہ مال لوٹا ہو اور نہ قتل کیا ہو تو اسے جلاوطن کیا جائے گا (2)۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔

ابومجلز، نخعی، عطا خراسانی وغیرہم سے مروی ہے امام ابو یوسف نے کہا: جب مال بھی لوٹا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو اسے سولی پر لٹکایا جائے گا اور اسے سولی پر قتل کیا جائے گا (3)۔ لیث نے کہا: نیزہ کے ساتھ سولی پر لٹکا ہوا قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب قتل کرے گا تو اسے قتل کیا جائے گا اور جب مال لے گا اور قتل نہیں کرے گا تو اس کے ہاتھ اور پاؤں برعکس کاٹے جائیں گے جب مال لے گا اور قتل بھی کرے گا تو سلطان کو اس میں اختیار ہوگا اگر چاہے تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دے اگر چاہے تو ہاتھ پاؤں نہ کاٹے اور اسے قتل کر دے اور سولی پر لٹکا دے (4)۔ امام ابو یوسف نے کہا: ہر صورت میں قتل ہوگا، اسی طرح کا قول اوزاعی کا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب مال لوٹے گا تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور اسے داغا جائے گا، پھر بایاں پاؤں کاٹا جائے گا اور اسے داغا جائے گا اور اسے چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ یہ جنایت حرابۃ کی وجہ سے چوری پر زائد ہے۔ جب قتل کرے گا تو اسے قتل کیا جائے گا، جب مال لوٹے گا اور قتل کرے گا تو اسے قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکایا جائے گا (5)۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 316
2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 256
3۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 409
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

امام شافعی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تین دن سولی پر لٹکایا جائے گا۔ فرمایا: اگر کوئی شخص آیا ڈرایا دھمکایا اور دشمن کے لیے معاون تھا تو اسے قید کیا جائے گا۔ امام احمد نے فرمایا: اگر قتل کرے گا تو اسے قتل کیا جائے گا اگر مال لے گا تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے جیسا کہ امام شافعی کا قول ہے۔ ایک قوم نے کہا: قتل سے پہلے سولی پر لٹکانا مناسب نہیں اس طرح تو اس کے اور اس کی نماز، کھانے، پینے کے درمیان حائل ہوا جائے گا۔ شافعی سے حکایت کیا گیا ہے کہ سولی پر لٹکا کر قتل کرنا ناپسند سمجھتا ہوں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع کیا تھا۔ ابوثور نے کہا: ظاہر آیت پر امام کو اختیار دیا گیا ہے اسی طرح مالک نے فرمایا اور یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور یہ سعید بن مسیب، عمر بن عبدالعزیز، مجاہد، ضحاک، نخعی کا قول ہے، تمام نے فرمایا: امام کو محاربین کے حکم میں اختیار ہے وہ ان پر ان احکام میں سے جو چاہے لگائے جو قتل اور سولی پر لٹکانے، ہاتھ پاؤں کاٹنے اور جلاوطن کرنے میں واجب کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: قرآن میں جہاں ''او'' آیا ہے اس میں اختیار ہے یہ قول ظاہر آیت کے زیادہ قریب ہے اور پہلے قول والے جنہوں نے کہا: ''او'' ترتیب کے لیے ہے اگرچہ ان کا اختلاف ہے۔ مگر تو ان کے اقوال کو پائے گا کہ وہ محارب پر دو حدوں کو جمع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: اسے قتل کیا جائے گا اور اسے سولی پر لٹکایا جائے گا۔ بعض نے کہا: اسے سولی پر لٹکایا جائے گا اور قتل کیا جائے گا۔ بعض نے کہا: اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے اور جلاوطن کیا جائے گا۔ اس طرح نہ آیت ہے اور نہ ''او'' کا معنی لغت میں اس طرح ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ پہلے قول والوں نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو طبری نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے محارب کا حکم پوچھا تو جبریل نے کہا: جو لوگوں کو ڈرائے، مال لوٹے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس کے مال لوٹنے کی وجہ سے اور اس کا پاؤں کاٹا جائے گا اس کے ڈرانے کی وجہ سے اور جو قتل کرے اسے قتل کرو اور جو ان جرموں کو جمع کرے اسے سولی پر لٹکاؤ۔ ابن عطیہ نے کہا: صرف ڈرانے والے کے لیے جلاوطنی باقی ہے (1) اور ڈرانے والا قاتل کے حکم میں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں استحسانا امام مالک ہلکا عذاب وعقاب دیکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: اسے گھوڑوں اور پیدل لوگوں کے ساتھ تلاش کیا جائے گا حتیٰ کہ اسے لایا جائے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم کی جائے گی یا وہ طلب کرنے والوں سے دارالسلام سے بھاگ کر نکل جائے۔ حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک اور مالک بن انس، حسن، سدی، ضحاک، قتادہ، سعید بن جبیر، ربیع بن انس اور زہری سے یہ مروی ہے۔ رمانی نے اپنی کتاب میں اس کو بیان کیا ہے۔ امام شافعی سے مروی ہے وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکالے جائیں گے اور انہیں تلاش کیا جائے گا تاکہ ان پر حدود قائم کی جائیں۔ یہ لیث بن سعد اور زہری کا بھی قول ہے۔ امام مالک نے یہ بھی کہا: اسے شہر سے نکالا جائے گا جس میں اس نے ایسی حرکت کی اور دوسرے شہر کی طرف بھیجا جائے گا اس کو زانی کی طرح قید کیا جائے گا۔ امام مالک نے یہ بھی کہا اور کوفیوں نے کہا: ان کی نفی سے مراد انہیں قید کرنا ہے پس اسے دنیا کی وسعت سے، دنیا کی تنگی کی طرف جلاوطن کیا جائے گا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 185

وہ اس طرح ہو جائے گا گویا جب وہ قید کیا گیا ہے تو زمین سے جلاوطن کیا گیا ہے مگر اپنی قرار گاہ سے۔ انہوں نے بعض قیدیوں کے ان اشعار سے حجت پکڑی ہے:

خرجنا من الدنیا و نحن من اھلِھا فلسنا من الأمواتِ فیھا ولا الأحْیَا

إذا جاء نا السَّجَّانُ یوماً لحاجةٍ عَجِبنا وقلنا جاء ھذا من الدنیَا

مکحول نے حکایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب پہلے شخص ہیں جنہوں نے جیلوں میں قید کیا۔ فرمایا: میں اسے قید رکھوں گا حتیٰ کہ میں اس سے توبہ جان لوں اور میں انہیں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جلاوطن نہیں کروں گا کہ یہ انہیں اذیت دے گا (1)۔ ظاہر یہ ہے کہ الارض سے مراد ایسی زمین ہے جس میں مصیبت نازل ہوتی ہے پہلے زمانہ میں بھی لوگ اس زمین سے اجتناب کرتے تھے جس میں گناہ ہوتے تھے۔ اسی سے حدیث ہے "جو شخص اپنے سینے کے ساتھ مقدس زمین کی طرف جھکا"۔

امام کے لیے مناسب ہے کہ اگر اس محارب کا خوف ہو کہ وہ دوبارہ ڈاکہ اور فساد کی طرف لوٹے گا تو وہ اسے اس شہر میں قید کر دے جس کی طرف جلاوطن کیا گیا ہے اگر یہ خوف نہیں ہے کہ وہ جنایت کی طرف لوٹے گا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ امام مالک کا صریح مذہب ہے کہ اسے جلاوطن کیا جائے گا اور جہاں جلاوطن کیا جائے گا وہاں اسے قید کر دیا جائے گا۔ یہ اغلب ہے اس کے بارے میں جس کا دوبارہ ڈاکہ کرنے کا اندیشہ ہو۔ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور یہ واضح ہے، کیونکہ جس زمین میں مصیبت نازل ہوئی ہے یہ آیت کی نص ہے اور خوف کی بناء پر اس کے بعد اسے قید کیا جائے گا اگر وہ توبہ کر لے اور اس کی حالت بہتر سمجھی جائے تو چھوڑ دیا جائے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ نفی کا معنی ہلاک کرنا ہے اس سے اثبات اور نفی ہے، نفی کا معنی ختم کرنے کے ساتھ ہلاک کرنا ہے۔ اسی سے النفایہ ہے جو ردی مال کے لیے بولا جاتا ہے اسی سے النفی اس پانی کو کہتے ہیں جو ڈول سے نکل جاتا ہے۔

راجز نے کہا:

كَأنَّ مَتْنَيْهِ من النَّفِيِّ مَوَاقِعُ الطَّيْرِ على الصُّفِيِّ

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابن خویز منداد نے کہا: محارب جو مال لے گا اس میں نصاب کا اعتبار نہیں ہوگا جس طرح چوری کرنے والے میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نصاب میں (1/4) دینار کی رعایت رکھی جائے گی۔ ابن عربی نے کہا: امام شافعی اور اصحاب الرائے نے فرمایا: ڈاکو کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر جب وہ اتنا مال لے جس پر چور کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔ امام مالک نے کہا: اس پر محارب کے حکم کے ساتھ حکم لگایا جائے گا۔ یہ صحیح قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان پر 1/4 دینار کی چوری میں قطع ید مقرر فرمائی اور حرابۃ میں کوئی چیز متعین نہیں فرمائی بلکہ محارب کی جزا کا ذکر فرمایا پس یہ اس بات کا تقاضا ہے کہ ایک دانہ پر بھی محاربہ کی جزا مکمل ہے۔ یہ اصل پر اصل کا قیاس ہے اس میں اختلاف ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 248
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 185

اعلی کا ادنی کے ساتھ قیاس اور ادنی کا اعلی کے ساتھ قیاس ہے اور یہ عکس القیاس ہے یہ کیسے صحیح ہے کہ محارب کو چور پر قیاس کیا جائے وہ چوری مال لیتا ہے اگر محسوس کرے کہ کوئی بیدار ہو گیا ہے تو بھاگ جاتا ہے حتی کہ اگر چور ہتھیار کے ساتھ کسی کے گھر میں داخل ہوا اگر اسے منع کیا جائے یا شور مچایا جائے اور وہ اس پر لڑے تو وہ محارب ہے اس پر محارب کا حکم جاری ہوگا۔ قاضی ابن عربی نے کہا: میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے ایام میں تھا تو ایک شخص ایک چور کو پکڑ کر لے آیا وہ چھری کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا وہ گھر کے مالک کے دل پر چھری لے کر اسے روکے رہا جب کہ وہ سویا ہوا تھا اور اس کے ساتھی مال لوٹتے رہے، میں نے ان پر محاربین کا حکم لگایا، یہ اصل دین سے ہے تم علم کی بلندی کی طرف بڑھو اور جاہلین کی پستی سے نکلو (1)۔

میں کہتا ہوں: الیفع کا مطلب پہاڑ کی چوٹی ہے اس سے غلام یفعۃٌ ہے جب بچہ بلوغت کی طرف بلند ہو۔ الحضیض، وادی کی نچلی سطح کو کہتے ہیں، اسی طرح اہل لغت نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر7**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرابہ میں قتل کیا جائے گا جو قتل کرے گا اگرچہ مقتول قاتل کا ہم پلہ نہ بھی ہو۔ امام شافعی کے دو قول ہیں:

(۱) مکافات کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ اس نے قتل کیا ہے پس اس میں مکافات کا اعتبار ہوگا جس طرح قصاص ہے۔ یہ ضعیف قول ہے، کیونکہ قول یہاں صرف قتل پر نہیں ہے وہ فساد عام پر ہے لوگوں کو اس نے ڈرایا اور مال چھینا تھا (2)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا۔ اللہ تعالیٰ نے محارب پر حدود قائم کرنے کا حکم دیا جب دو چیزیں جمع ہیں محاربۃ اور فساد فی الارض اور شریف وضیع، رفیع ودنی کا فرق نہیں۔

**مسئلہ نمبر8**۔ جب ڈاکو نکلیں اور قافلہ سے قتال کریں اور بعض ڈاکو قتل ہو جائیں اور بعض قتل نہ ہوں تو سب کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا جس نے قتل کیا۔ یہ بھی ضعیف ہے، کیونکہ جو جنگ میں حاضر ہوتے ہیں وہ مال غنیمت میں شریک ہوتے ہیں اگرچہ تمام جنگ کرتے نہیں ہیں۔ قتل پر جو معاون ہوتا ہے اس پر بھی اتفاق ہے اور وہ جاسوسی کرنے والا ہے تو محارب اولی اس جرم میں شامل ہوگا (3)۔

**مسئلہ نمبر9**۔ جب محارب (ڈاکو) لوگ لوگوں کو ڈرائیں اور ڈاکہ ڈالیں تو انہیں دعوت اسلام دیئے بغیر امام کا انہیں قتل کرنا واجب ہے اور مسلمانوں پر ان کے قتل پر تعاون واجب ہے اور مسلمانوں سے ان کی اذیت روکنا واجب ہے، اگر وہ شکست کھا جائیں تو ان کا پیچھا نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ انہوں نے قتل کیا ہو اور مال لوٹا ہو۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوگا تو اس کو پکڑنے کے لیے اور جنایت کی حد قائم کرنے کے لیے ان کا پیچھا کیا جائے گا اور زخمیوں کا تعاقب نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ اس نے قتل کیا ہو۔ اگر ڈاکو پکڑے گئے اور ان کے پاس مال تھا جو کسی خاص شخص کا تھا تو وہ مال اسے واپس کیا جائے گا یا اس کے ورثاء کو دیا جائے گا، اگر اس کا مالک نہ ملے تو وہ بیت المال میں رکھا جائے اور جنہوں نے کسی کا مال تلف کیا ہوگا تو وہ اس کے ضامن ہوں گے اور ان کے لیے دیت نہ ہوگی جنہوں نے قتل کیا جب توبہ سے پہلے ان پر قدرت ہو جائے گی اگر وہ توبہ کریں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 601　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 602　3۔ ایضاً

گے اور توبہ کرتے ہوئے آئیں گے تو یہ صورت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام کو ان پر کوئی اختیار نہیں اور ان سے وہ حد ساقط ہوگی جو اللہ کے لیے ان پر تھی۔ وہ آدمیوں کے حقوق کے بدلے پکڑے جائیں گے ان سے نفس اور زخم کا قصاص لیا جائے گا اور ان پر وہ ہوگا جو انہوں نے مال اور خون میں سے ضائع کیا ہوگا وہ مقتول کے اولیاء کے لیے ہوگا۔ ان کے لیے عفو اور ہبہ جائز ہوگا جس طرح محاربین کے علاوہ دوسرے مجرموں کے لیے ہوتا ہے یہ امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کا مذہب ہے۔

جو مال ان کے پاس ہوگا وہ لے لیا جائے گا اور جس کو وہ ہلاک کر چکے ہوں گے اس کی قیمت کی ضمانت دیں گے، کیونکہ یہ غصب ہے اس کی ملکیت ان کے لیے جائز نہیں وہ مال مالکوں کو دیا جائے گا یا امام اپنے پاس رکھے گا حتیٰ کہ وہ اس کا مالک جان لے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک قوم نے کہا: مال طلب نہیں کیا جائے گا مگر وہ جو موجود ہوگا اور جو ہلاک ہو چکا ہوگا وہ طلب نہیں کیا جائے گا۔ یہ طبری نے ولید بن مسلم کی روایت سے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فعل سے یہی ظاہر ہے جو انہوں نے حارثہ بن بدر غدانی سے کیا تھا وہ محارب تھا پھر اس نے پکڑے جانے سے پہلے توبہ کر لی تھی تو آپ نے اس کے لیے اموال اور خون کے سقوط کی تحریر لکھی (1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: محارب کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس پر حد قائم کی جائے گی اور اس کے لیے مال نہ ہوگا تو کیا جو اس نے لیا تھا اس کا بطور دین پیچھا کیا جائے گا یا ساقط ہو جائے گا جیسے چور سے ساقط ہو جاتا ہے؟ مسلمان اور ذمی اس میں برابر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ سلطان اس کا والی ہوتا ہے جس پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ اگر محارب کسی شخص کا بھائی یا باپ ڈاکہ میں قتل کرتا ہے تو خون طلب کرنے والے کے لیے محارب (ڈاکو) کے امر سے کچھ نہیں ہے، ولی کے لیے معاف کرنا جائز نہیں، امام اس پر حد قائم کرے گا۔ علماء نے اس کو اللہ کی حدود کے قائم مقام بنایا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ محاربین کے احکام تھے ہم نے بڑے بڑے احکام جمع کر دیئے اور عجیب اقوال جو اس آیت کی تفسیر میں کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ مجاہد نے کہا: اس آیت میں محاربہ سے مراد زنا اور چوری ہے اور یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی کی زبان پر بیان فرمایا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور زانی کو کوڑے لگائے جائیں گے اور اسے جلاوطن کیا جائے گا اگر وہ کنوارہ ہوگا، اور زانی کو رجم کیا جائے گا اگر وہ شادی شدہ مسلمان ہوگا۔ اور محارب کے احکام اس آیت میں اس کے مخالف ہیں مگر جو ہتھیار کے لہرانے کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے کا ارادہ کرے تاکہ فروج پر غلبہ پائے یہ بہت بڑا ڈاکہ ہے اور مال لینے سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا کے معنی میں داخل ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چور سے اللہ کی قسم اٹھوائی جائے گی اگر وہ چوری سے باز آجائے گا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا اگر وہ انکار کرے گا تو قتل کیا جائے گا، اگر تو نے چور کو قتل کر دیا تو وہ برا مقتول ہے اور اس کا خون رائیگاں ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 186

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! بتائیے اگر میرے مال پر تجاوز کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے اللہ کی قسم لے''۔ اس شخص نے کہا: اگر وہ مجھ سے انکار کریں؟ فرمایا: ''اللہ کی قسم لے''۔ اس نے کہا: اگر وہ مجھ پر انکار کریں؟ فرمایا: ''اللہ کی قسم لے''۔ اس نے کہا: اگر وہ مجھ پر انکار کریں؟ فرمایا: ''تو اس سے لڑ اگر تو قتل ہو جائے گا تو جنت میں ہوگا اور اگر تو اسے قتل کرے گا تو وہ آگ میں ہوگا'' (1)۔ بخاری و مسلم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے لیکن اس میں قسم کا ذکر نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! بتائیے اگر کوئی شخص میرا مال لینے کے ارادہ سے آئے؟ فرمایا: ''تو اسے اپنا مال نہ دے''۔ اس نے کہا: بتائیے اگر وہ مجھے قتل کر دے؟ فرمایا: ''تو شہید ہے''۔ اس نے کہا: اگر میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا: ''وہ دوزخ میں ہے''۔ ابن المنذر نے کہا: ہم نے اہل علم کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے وہ چوروں سے لڑنے اور ان سے اپنے نفسوں اور اپنے اموال کا دفاع کرنے کا نظریہ رکھتے تھے۔ یہ حضرت ابن عمر، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، نعمان کا مذہب ہے۔ عوام اہل علم کا بھی یہی قول ہے کہ ایک شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے نفس، اہل اور مال کے دفاع میں لڑے جب ظلم کا ارادہ کیا گیا ہو۔ یہ ان اخبار کی وجہ سے ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں جن میں آپ ﷺ نے کسی وقت کو خاص نہیں فرمایا اور نہ کسی حال کو خاص فرمایا ہے، مگر سلطان اگر ظلم کرے تو بھی خروج نہ کرے۔ اہل حدیث کی جماعت کا اجماع ہے کہ اگر اپنے نفس اور مال کا دفاع ممکن نہ ہو مگر سلطان پر خروج کے ساتھ اور اس سے جنگ کے ساتھ تو سلطان سے نہ لڑے اور نہ اس پر خروج کرے۔ یہ ان اخبار کی وجہ سے ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں جن میں ظلم و جور کے باوجود صبر کا حکم ہے اور ان سے نہ لڑنے اور ان سے خروج نہ کرنے کا حکم ہے جب تک وہ نماز قائم کریں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے مذہب میں اختلاف ہے جب کوئی خفیف چیز طلب کی جائے جیسے کپڑا، کھانا وغیرہ تو کیا وہ انہیں دی جائے گی یا ان سے جنگ کی جائے گی؟ یہ اختلاف ایک اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کیا ان سے قتال کا حکم ہے، کیونکہ یہ برائی کو روکنا ہے یا ضرر کے دفع کرنے کے باب سے ہے؟ اس بنا پر قتال سے پہلے ان کو دعوت دینے میں اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا۔ محاربت کی شفاعت اور اس کے ضرر کے عظیم ہونے کی وجہ سے دنیا میں ان کے لیے رسوائی ہے۔ محاربت کا نقصان بہت بڑا ہے، کیونکہ اس میں لوگوں پر کسب کا راستہ مسدود کرنا ہے، کیونکہ اکثر لوگوں کی معیشت تجارت ہوتی ہے اور تجارت کا رکن اور ستون، زمین میں سفر کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (المزمل: 20) جب راستہ پر ڈرایا جائے گا تو لوگ سفر سے رک جائیں گے اور وہ گھروں کو لازم پکڑنے کے محتاج ہوں گے اور تجارت کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اس کی معیشت رک جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکوؤں پر سخت حدود کو مشروع فرمایا یہ دنیا میں رسوائی ہے تاکہ انہیں برے فعل سے روکا جائے اور تجارت کا باب کھولا جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مباح فرمایا ہے جو تجارت کرنا چاہے اور

1۔ سنن نسائی، کتاب المحاربہ، جلد 2، صفحہ 172

آخرت میں محاربت پر عذاب عظیم کی وعید سنائی ہے یہ معصیت دوسری معصیتوں سے خارج اور مستثنیٰ ہوگی۔ حضرت عبادہ کی حدیث کی وجہ سے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے ان جرموں کا ارتکاب کیا پھر اسے دنیا میں اس کی سزا دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے'' (1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رسوائی اس کے لیے ہو جس کو سزا دی گئی اور آخرت کا عذاب اس کے لیے ہو جو دنیا میں سزا سے بچ گیا اور یہ گناہ دوسرے گناہوں کے قائم مقام ہو۔ اور مومن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا جیسا کہ گزر چکا ہے لیکن جتنا گناہ بڑا ہوگا سزا اتنی بڑی ہوگی پھر وہ شفاعت یا قبضہ کے ذریعے وہ نکلے گا پھر یہ وعید، مشیت کے نفاذ کے ساتھ مشروط ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: 48) خوف ان پر وعید کے حساب سے اور معصیت کی برائی کے اعتبار سے ان پر غالب ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ اللہ تعالیٰ نے ان توبہ کرنے والوں کی استثنا فرمائی جو قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کرلیں اور ان سے اپنے حق کے سقوط کی خبر دی فرمایا: فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ رہا قصاص اور انسانوں کے حقوق تو وہ ساقط نہیں ہوتے۔ اور جو قدرت کے بعد توبہ کرلے آیت کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کو توبہ نفع نہ دے گی اور اس پر حدود قائم کی جائیں گی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول ہے کہ ہر حد توبہ سے ساقط ہو جاتی ہے (2)۔ اس کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جس کا تعلق انسانوں کے حقوق سے ہے خواہ وہ قصاص ہو یا کوئی اور ہو قدرت پائے جانے سے پہلے توبہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: استثنا سے مراد مشرک ہے جب وہ قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کرے اور ایمان لے آئے، تو اس سے حدود ساقط ہو جائیں گی۔ یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ وہ قدرت پائے جانے کے بعد ایمان لائے گا تو بالاجماع اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ بعض نے فرمایا: محاربین سے حد ساقط نہ ہوگی ان پر قابو پائے جانے کے بعد۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ وہ توبہ میں جھوٹ کے ساتھ اور اس میں تصنع کے ساتھ متہم ہیں جب امام کا ہاتھ انہیں پکڑ لے گا یا اس لیے کہ جب ان پر قابو پایا گیا تو وہ ایسے مقام پر ہو گئے کہ انہیں سزا دی جائے اور ان کی توبہ قبول نہ کی جائے جیسا کہ پہلی امتوں میں جو عذاب کے ساتھ متلبس تھا یا وہ غرغرہ کی حالت تک پہنچ گیا ہے پھر اس نے توبہ کی ہے جب قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کرلیں تو ان پر کوئی تہمت نہیں ہے یہ اسے نفع بخش ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ یونس میں آئے گا۔ رہے شرابی، زانی اور چور جب وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور ان سے توبہ معروف ہو جائے پھر انہیں امام کی طرف لے جایا جائے تو امام کے لیے اسے حد لگانا مناسب نہیں۔ اگر انہیں امام کے پاس لے جایا جائے پھر وہ کہیں: ہم نے توبہ کی، تو وہ نہیں چھوڑے جائیں گے وہ اس حالت میں محاربین کی طرح ہیں جب ان پر غلبہ پا یا گیا۔ واللہ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1004 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 206

لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ اور جدوجہد کرو اس کی راہ میں تا کہ فلاح پاؤ۔ بے شک وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر انہی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تا کہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) عذاب سے روز قیامت، نہ قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کے لیے عذاب دردناک ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ وسیلہ سے مراد قربت ہے۔ ابو وائل، حسن، مجاہد، قتادہ، عطا، سدی، ابن زید، عبداللہ بن کثیر سے یہ مروی ہے۔ یہ توسلت الیہ سے فعیلۃ کے وزن پر ہے یعنی میں نے اس کا قرب حاصل کیا (1)۔ عنترہ نے کہا:

إنّ جالَ لهم إليكَ وسيلة   أنْ يأخذوكِ تكحّلي وتخضّبي

وسیلۃ کی جمع الوسائل ہے شاعر نے کہا:

إذا غَفَلَ الواشون عُدْنا لوصلنا   وعَادَ التّصافي بيننا والوسَائلُ

کہا جاتا ہے: اسی سے ہے سِلتُ، أسال یعنی میں نے طلب کیا، وھما یستاولان یعنی ہر ایک اپنے ساتھی سے طلب کرتا ہے۔ اصل معنی طلب کرنا ہے۔ الوسیلہ سے مراد وہ قربت ہے جس کو طلب کرنا مناسب ہے۔ وسیلۃ، جنت میں ایک درجہ ہے۔ صحیح حدیث میں اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جس نے میرے لیے وسیلۃ کا سوال کیا اس کے لیے شفاعت ثابت ہے'' (2)۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞

''بہت چاہیں گے کہ نکلیں اس آگ سے اور وہ نہیں نکل سکیں گے اس سے اور ان کیلئے عذاب ہوگا ہمیشہ رہنے والا''۔

یزید الفقیر نے کہا: حضرت جابر بن عبداللہ سے کہا گیا: اے اصحاب محمد! تم کہتے ہو کہ ایک قوم آگ سے نکلے گی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا جابر نے کہا: تم عام کو خاص بناتے ہو اور خاص کو عام بناتے ہو۔ یہ کفار میں خاص ہے میں نے یہ آیت اول سے آخر تک پڑھی یہ کفار میں خاص ہے۔ مُقِيْمٌ اس کا معنی دائم ثابت ہے جو نہ زائل ہوگا نہ پھرے گا۔ شاعر نے کہا:

فإنّ لكم بيومِ الشّعْبِ منّي   عذاباً دائماً لكم مُقيما

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۞ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 272   2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 166

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۹﴾

''اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی (کی سزا یہ ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ بدلہ دینے کے لیے جو انہوں نے کیا اور عبرتناک سزا اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اس میں ستائیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا جب اللہ تعالیٰ نے زمین میں کوشش اور فساد کے ذریعے اموال لینے کا ذکر کیا تو چور کے حکم کا ذکر بغیر حراب (جنگ) کے کیا جیسا کہ اس کا بیان باب کے درمیان آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد چور کا ذکر عورت چور کے ذکر سے پہلے کیا جب کہ زانیہ کا ذکر زانی سے پہلے کیا اس کا بیان آخر میں آئے گا۔ زمانہ جاہلیت میں چور کا ہاتھ کاٹا گیا زمانہ جاہلیت میں جس نے چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا وہ ولید بن مغیرہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اسلام میں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا مردوں میں سے اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چور کے ہاتھ پہلے کاٹنے کا حکم دیا وہ خیار بن عدی بن نوفل بن عبدالمناف تھا اور عورتوں میں سے مرۃ بنت سفیان بن عبدالاسد تھی جو بنی مخزوم سے تھی۔ حضرت ابوبکر نے یمنی شخص کا ہاتھ کاٹا جس نے ہار چوری کیا تھا۔ حضرت عمر نے ابن سمرہ کا ہاتھ کاٹا جو عبدالرحمن بن سمرہ کا بھائی تھا۔ اس میں اختلاف نہیں آیت کا ظاہر ہر چور میں عام ہے، حالانکہ یہ اس طرح نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر دینار کی چوتھائی میں یا اس سے زائد میں'' (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ سے مراد بعض چور ہیں پس چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر دینار کی چوتھائی میں یا دینار کی چوتھائی کی قیمت میں۔ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، لیث، امام شافعی، ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: دینار کی چوتھائی یا تین دراہم کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا اگر دو درہم چوری کیے جو دینار کی چوتھائی کے برابر ہیں تو ان میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ سامان میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر یہ کہ وہ تین دراہم کو پہنچ جائے خواہ ان کی مالیت کم ہو یا زیادہ ہو (2)۔ امام مالک نے سونا، چاندی میں سے ہر ایک کو اصل بنایا ہے اور سامان کی قیمت دراہم سے لگائی ہے یہ ان کا مشہور قول ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے کہا: اگر سونا چوری کیا تو دینار کی چوتھائی کا اعتبار ہوگا اگر سونے، چاندی کے علاوہ کوئی چیز چوری کی تو اس کی قیمت دینار کا چوتھائی یا تین دراہم کے برابر ہوگی تو حکم ثابت ہوگا۔ یہ امام مالک کا دوسرا قول ہے۔ پہلے قول کی حجت حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے ڈھال چوری کی، اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال کی قیمت لگانے کا حکم دیا، اس کی قیمت تین دراہم سے لگائی گئی (3)۔ امام شافعی نے حضرت عائشہ کی حدیث کو چوتھائی دینار میں اصل بنایا اور سامان کی قیمت کو بھی اس کی طرف لوٹایا نہ کہ تین دراہم کی طرف سونے کے مہنگے اور سستے ہونے کی وجہ سے ابن عمر کی حدیث کو چھوڑ دیا، کیونکہ اس ڈھال میں

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود و القصاص، جلد 3، صفحہ 189
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 188
3۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود و القصاص، جلد 3، صفحہ 190

صحابہ کا اختلاف دیکھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کاٹا تھا۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں: تین دراہم کی تھی (1)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: دس دراہم کی تھی (2)۔ حضرت انس کہتے ہیں: پانچ دراہم کی تھی (3) اور حضرت عائشہ کی حدیث دینار کی چوتھائی میں صحیح ثابت ہے اس میں حضرت عائشہ سے مروی میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر بعض نے اسے موقوف بنایا ہے اور جو علماء آپ کے قول پر اس کے حفظ وعدالت کی وجہ سے عمل کو واجب سمجھتے ہیں وہ اس کو مرفوع کہتے ہیں۔

یہ ابوعمر وغیرہ کا قول ہے اس بنا پر اگر چوری شدہ مال کی قیمت دینار کی چوتھائی کو پہنچ جائے گی تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ اسحاق کا قول ہے۔ ان دو اصلوں پر توقف کر اور یہ دونوں اس باب میں ستون ہیں اور جو کچھ اس کے بارے کہا گیا ہے اس میں سے یہ اصح ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین اور ثوری نے کہا: چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر دس دراہم (4) میں کیلاً یا دینار سونا میں یا وزن کے اعتبار سے جو اس کی مقدار کو پہنچ جائے گی اور ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حتیٰ کہ وہ آدمی کی ملک سے مال کو نکال لے اور ان کی حجت حضرت ابن عباس کی حدیث ہے فرمایا: وہ ڈھال جس میں نبی کریم ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا (5) اس کی قیمت دس دراہم تھی۔

اس حدیث کو عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے فرمایا: اس وقت ڈھال کی قیمت دس دراہم تھی۔ ان دونوں احادیث (6) کو دارقطنی وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔ اس مسئلہ میں چوتھا قول بھی ہے اسے دارقطنی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر پانچ دراہم میں (7)۔ یہ سلیمان بن یسار، ابن ابی لیلی اور ابن شبرمہ کا قول ہے حضرت انس بن مالک نے کہا: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ڈھال میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت پانچ دراہم تھی۔ پانچواں قول یہ ہے کہ ہاتھ چار دراہم یا اس سے زائد میں کاٹا جائے گا۔ یہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے۔

چھٹا قول یہ ہے کہ ایک درہم اور اس سے اوپر میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ عثمان البتی کا قول ہے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے ایک درہم میں ہاتھ کاٹا۔ ساتواں قول یہ ہے کہ آیت کے ظاہر کے مطابق ہر اس چیز کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا جس کی قیمت ہوگی یہ خوارج کا قول ہے۔ حسن بصری سے مروی ہے یہ ان سے مروی تین روایات میں سے ایک ہے۔ دوسری روایت اس طرح ہے جس طرح حضرت عمر سے مروی ہے۔ تیسری وہ ہے جس کو قتادہ نے حسن بصری سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نے قطع ید کا تذکرہ کیا کہ زیاد کے عہد میں کتنے مال پر ہوگا ہماری رائے دو درہموں پر متفق ہوئی۔ یہ اقوال ایک دوسرے کے مقابل ہیں، صحیح وہ ہے جو ہم نے تمہارے لیے ذکر کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس چور پر لعنت کی ہے جو انڈہ چوری کرتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور

---

1۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 191-190 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 416 5۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود، جلد 3، صفحہ 191

6۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 190 7۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 186

جو رسی چوری کرتا ہے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ ظاہر آیت کے موافق ہے کہ قلیل وکثیر کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا(1)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تحذیر کے طور پر فرمایا کثیر کی جگہ قلیل ذکر کیا جس طرح ترغیب کے لیے کثیر کی جگہ قلیل کا ذکر فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ کونج کے گھونسلے کی مثل ہو، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا''(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وجہ آخر سے مجاز ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب تھوڑی چیز کی چوری کی وجہ سے تکلیف دیا گیا تو اس نے زیادہ چیز چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ خوبصورت قول اعمش کا ہے۔ بخاری نے اس کو حدیث کے آخر میں تفسیر کے طور پر ذکر فرمایا: وہ لوہے کا انڈا خیال کرتے ہیں اور رسی سے مراد وہ ہے جو درہم کے مساوی ہو۔ میں کہتا ہوں: یہ کشتی کی رسی کی طرح اور اس کے مشابہ ہے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ قطع ید اس پر ہوگی جو محفوظ جگہ سے اس چیز کو نکالے گا جس میں قطع ید ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے فرمایا: جب کپڑے ایک گھر میں جمع کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا(3)۔ حسن بن ابی الحسن نے ایک دوسرے قول میں دوسرے اہل علم کے قول کی مثل کہا ہے۔ پس صحیح اتفاق ہو گیا۔ الحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر3**۔ حرز سے مراد وہ جگہ ہے جو لوگوں کے اموال کی حفاظت کے لیے عادۃً بنائی جاتی ہے۔ یہ ہر چیز میں حالت کے مطابق مختلف ہوتی ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابن المنذر نے کہا: اس باب میں کوئی خبر ثابت نہیں جس میں اہل علم کی کلام نہ ہو۔ یہ اہل علم کے اجماع کی طرح ہے۔ حسن اور اہل ظاہر سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ حرز کی شرط نہیں لگاتے۔ موطا میں امام مالک نے حضرت عبداللہ بن عبدالرحمن بن ابی حسین المکی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''درختوں پر لٹکے ہوئے پھلوں میں اور پہاڑ کے ذریعے محفوظ کی گئی چیز کی چوری میں قطع ید نہیں پس جب کھلیان میں اسے رکھے تو قطع ید اس میں ہے جو ڈھال کی قیمت کو پہنچے''(4)۔

ابو عمر نے کہا: یہ حدیث وہ ہے جس کا معنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث کے ہم معنی ہے۔ یہ عبداللہ تمام محدثین کے نزدیک ثقہ ہے، امام احمد اس کی تعریف کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے درخت پر لٹکے ہوئے پھلوں کے بارے پوچھا گیا تو فرمایا: ''جو ضرورت میں اس میں سے کچھ توڑے جب کہ وہ اپنا تھیلا نہ بھرے تو اس پر کوئی چیز نہیں ہے اور جو وہاں سے پھل توڑ کر لے گیا اس پر قطع ید ہے اور جس نے اس کے علاوہ کوئی چوری کی اس پر اس کی مثل چٹی ہے اور سزا ہے''(5)۔ ایک روایت میں عقوبت کی جگہ ''جلدات نکال'' کے الفاظ ہیں۔ عطا نے فرمایا: کوڑے منسوخ کیے گئے اور اس کی جگہ قطع ید کو رکھا گیا۔ ابو عمر نے کہا: دو مثل چٹی کا قول منسوخ ہے، میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے ایسا کہا ہو مگر جو حضرت عمر سے حاطب بن ابی بلتعہ کے آنے کے بارے میں مروی ہے جس کو امام مالک نے تخریج کیا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1004
2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 275
3۔ البحر المحیط، جلد 2، صفحہ 188
4۔ موطا امام مالک، کتاب السرقۃ، صفحہ 689
5۔ سنن نسائی، کتاب قطع السارق، جلد 2، صفحہ 259

ایک روایت امام احمد بن حنبل سے مروی ہے جس پر لوگوں کا نظریہ ہے وہ بالمثل کے ساتھ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (بقرہ: 194) تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔

ابوداؤد نے حضرت صفوان بن امیہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں مسجد میں ایک چادر پر سویا ہوا تھا اس کی قیمت تیس درہم تھی، ایک شخص آیا اس نے آہستہ سے وہ اٹھالی، وہ شخص پکڑا گیا، اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صفوان نے کہا: میں آیا اور عرض کی: حضور! آپ تیس دراہم کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹیں گے، میں اسے وہ بیچتا ہوں اور اس کی قیمت ادھار کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو نے میرے پاس مقدمہ آنے سے پہلے کیوں نہ کیا تھا (1)؟

نظر کی جہت سے اموال تمام مخلوق کے انتفاع کے لیے تیار کیے گئے ہیں، پھر حکمت اولیت جس میں اختصاص کے ساتھ فیصلہ کیا گیا ہے وہ شرعاً ملکیت ہے اور اطماع اس کے متعلق باقی ہیں اور انجام اس پر گھومتے ہیں مروت اور دیانت تھوڑے لوگوں کو روکتی ہے، حفاظت اور حرز بہت سے لوگوں کو روکتی ہے جب مالک اپنی چیز کی حفاظت کرتا ہے تو اس میں حفاظت و حرز جو انسان کے لیے غایت الامکان ہے وہ جمع ہو جاتی ہیں جب ان دونوں کو توڑا جاتا ہے تو جرم بڑا ہوتا ہے اور عقوبت بھی بڑی ہوتی ہے، جب ایک حفاظت توڑی جاتی ہے اور وہ ملک ہے تو ضمانت اور ادب سکھانا واجب ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب ایک جماعت حرز (حفاظت کی جگہ) سے نصاب کے نکالنے پر شریک ہو جائے پھر بعض اس کے نکالنے پر قادر ہوں گے یا نہیں مگر ان کے معاون ہوں گے جب پہلی صورت ہو تو اس میں ہمارے علماء کے دو قول ہیں: ایک میں ہاتھ کاٹا جائے گا، دوسرے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ یہی قول امام ابوحنیفہ اور شافعی کا ہے فرمایا: یہ دونوں مجتہد فرماتے ہیں مشترک لوگوں کا چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر جب ہر ایک کے حصہ میں نصاب آئے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا مگر دینار کی چوتھائی میں یا اس سے زائد'' (2)۔ میں ان میں سے ہر ایک نے نصاب چوری نہیں کی پس ان پر قطع ید نہ ہوگی۔ اور ایک روایت میں ہاتھ کاٹنے کی وجہ یہ ہے کہ جنایت میں اشتراک اس کی سزا کو ساقط نہیں کرتا جس طرح قتل میں اشتراک سزا کو ساقط نہیں کرتا۔

ابن عربی نے کہا: ان کے درمیان کتنا ہی قرب ہے کہ ہم خونوں کی حفاظت کے لیے ایک کے بدلے جماعت کو قتل کرتے ہیں تاکہ خون ریزی پر معاون نہ ہو جائیں اسی طرح اموال میں ہے خصوصاً ہم نے امام شافعی کی مدد کی کہ جماعت جب قطع ید میں شریک ہو تو تمام کے ہاتھ کاٹے جائیں گے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور اگر دوسری صورت ہو وہ یہ ہے کہ اس کا نکالنا تعاون کے بغیر ممکن ہی نہ ہو تو بالاتفاق تمام کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 247۔ ایضاً، حدیث نمبر 3819، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ سنن دارقطنی، جلد 3 صفحہ 189

یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر چوری میں بہت سے لوگ شریک ہوں مثلاً ایک نقب لگائے دوسرا مال باہر نکالے اگر وہ دونوں معاون ہیں تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے اگر ان میں سے کوئی اپنے فعل میں منفرد ہو دونوں میں اتفاق نہ ہو (مثلاً) دوسرا آئے اور مال نکالے تو کسی پر بھی قطع ید نہ ہوگی۔ اگر نقب میں دونوں معاون ہوں اور ایک مال نکالنے میں منفرد ہو تو قطع ید نکالنے والے پر ہوگی۔ امام شافعی نے فرمایا: قطع ید نہیں ہے، کیونکہ اس نے نقب لگائی ہے اور چوری نہیں کی دوسرے نے ایسی حرز سے چوری کی ہے جس کی حرمت ختم ہو چکی تھی۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر نقب میں شریک ہوا اور داخل ہوا اور مال اٹھایا تو ہاتھ کاٹا جائے گا نقب میں اشتراک میں آلہ اٹھانا شرط نہیں بلکہ مارنے میں تعاقب ہے جس سے شرکت حاصل ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر دونوں میں سے ایک داخل ہوا اور حرز کے دروازے تک مال باہر نکالا پھر دوسرے نے ہاتھ داخل کیا اور مال لے لیا تو اس پر قطع ید ہوگی، اور پہلے کو سزا دی جائے گی۔ اشہب نے کہا: دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اگر اس نے حرز سے باہر سامان کو رکھا تو قطع ید اس پر ہوگی نہ کہ اٹھانے والے پر اور اگر نقب کے درمیان میں رکھا اور دوسرے نے وہ اٹھا لیا اور دونوں کے ہاتھ نقب میں اکٹھے تھے تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قبر اور مسجد حرز ہیں کفن چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ اکثر علماء کا نظریہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اس پر قطع ید نہیں کیونکہ اس نے غیر حرز سے مال چوری کیا ہے جو تلف کی جگہ پر تھا اس کا کوئی مالک نہیں تھا، کیونکہ میت مالک نہیں ہوتا اور ایسا شخص نہیں ہوتا جو اسے چوری سے منع کرتا، کیونکہ وہاں کوئی رہنے والا نہیں۔ چوری وہاں تصور ہوتی ہے جہاں آنکھوں سے بچا جائے اور لوگوں سے بچا جائے۔ چوری کی نفی پر ماوراء النہر کے علماء نے تائید کی ہے۔ جمہور علماء نے کہا: وہ چور ہے، کیونکہ وہ رات کا لباس پہنتا ہے اور لوگوں سے چھپتا ہے اور ایسے وقت کا قصد کرتا ہے جس میں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں اور نہ اس پر کوئی گزرنے والا ہے یہ اس شخص کی مانند ہے جس میں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں اور نہ اس پر کوئی گزرنے والا ہے، یہ اس شخص کی مانند ہے جو ایسے وقت میں چوری کرتا ہے جب لوگ عید کے لیے نکلے ہوئے ہیں اور شہر لوگوں سے خالی ہے۔ رہا ان کا قول کہ قبر حرز نہیں ہے یہ باطل ہے، کیونکہ ہر چیز کا حرز اس کے حسب حال پر ہوتا ہے، رہا ان کا قول کہ میت مالک نہیں ہوتا یہ بھی باطل ہے، کیونکہ میت کو برہنہ چھوڑنا جائز نہیں یہ حاجت تقاضا کرتی ہے کہ قبر حرز ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر اس قول سے تنبیہ فرمائی: اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ۝ (المرسلات) تاکہ وہ زندگی میں اس زمین میں سکونت اختیار کرے اور مردہ حالت میں اس میں دفن کیا جائے، رہا ان کا قول کہ وہ تلف کی جگہ پر ہے تو وہ چیز جس کو زندہ بھی پہنتا ہے وہ بھی تلف کی جگہ ہوتا ہے اور پہننے کے ساتھ پرانا ہونے کے مقام پر ہوتا ہے (2)۔ مگر ایک امر دوسرے سے جلدی ہوتا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا اور فرمایا: ''تو اس وقت کیسا ہوگا جب لوگوں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 611
2۔ ایضاً

پر موت آئے گی اور موت اتنی زیادہ ہوگی کہ بندے کے لیے قبر کی جگہ خریدی جائے گی''۔ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھے صبر لازم ہے''(1)۔ حماد نے کہا: اسی وجہ سے جنہوں نے کہا کہ قبر سے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ میت کے پاس میت کے گھر میں داخل ہوا ہے۔

رہی مسجد تو جس نے مسجد کی چٹائی چوری کی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس کو عیسیٰ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ اگرچہ مسجد کا دروازہ نہ بھی ہو، انہوں نے اس کو محرز خیال کیا ہے اگر دروازے سے چوری کرے تو بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ابن القاسم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر دن کے وقت چٹائیاں چوری کیں تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر اس نے رات کو دیوار پھلانگی تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ سحنون سے مروی ہے: اگر اس کی چٹائیاں ایک دوسرے پر سلی ہوئی ہیں تو ہاتھ کاٹا جائے گا ورنہ نہیں کاٹا جائے گا۔ اصبغ نے کہا: مسجد کی چٹائیاں چوری کرنے اور اس کی قندیلیں اور اس کے پتھر چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا جیسا کہ اگر اس کا دروازہ چوری کیا یا چھت سے لکڑی چوری کی یا وہ لکڑی چوری کی جو مکان کی لکڑیوں کو اٹھاتی ہے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اشہب نے کتاب محمد میں کہا: مسجد کی چٹائیاں قندیلیں اور پتھر چوری کرنے سے قطع ید نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء کا اختلاف ہے قطع ید کے ساتھ چٹی ہوگی یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ نے کہا: قطع ید اور چٹی کو کسی کے لیے جمع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جرمانے کا ذکر نہیں کیا(2)۔ امام شافعی نے فرمایا: خواہ خوشحال ہو، خواہ تنگ دست ہو اسے چوری کیے ہوئے مال کی قیمت دینی ہوگی اور وہ اس پر قرض ہوگا جب خوشحال ہوگا تو ادا کرے گا۔ یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ رہے ہمارے علماء امام مالک اور ان کے اصحاب تو انہوں نے فرمایا: اگر مال قائم ہے تو وہ لوٹا دے گا اور اگر مال تلف ہو چکا ہے تو پھر اگر خوشحال ہے تو قیمت دے گا اگر تنگ دست ہے تو قرض کی حیثیت سے اس کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ امام مالک نے زہری سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔

شیخ ابو اسحاق نے فرمایا: بعض علماء نے فرمایا: قطع ید کے ساتھ دین کی حیثیت سے اس کا پیچھا کیا جائے گا خواہ وہ خوشحال ہوگا یا تنگ دست ہوگا۔ فرمایا: یہ بہت سے علماء مدینہ کا قول ہے اور اس کی صحت پر اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ یہ دو حق ہیں جو دو مستحقوں کے لیے ہیں ایک دوسرے کو ساقط نہیں کرے گا جیسے دیت اور کفارہ ہیں پھر فرمایا: میں بھی یہی کہتا ہوں۔ قاضی ابو الحسن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے استدلال کیا ہے: ''جب چور پر حد قائم کی جائے گی تو اس پر ضمانت نہ ہوگی''(3)۔

اس نے اسے اپنی کتاب میں اپنی سند میں ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چٹی کے ساتھ پیچھا کرنا بھی عقوبت ہے اور قطع ید بھی عقوبت ہے اور دو عقوبتیں جمع نہیں ہوتیں۔ قاضی عبد الوہاب نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح قول امام شافعی اور ان کے موافقین کا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: چور اس مال کی چٹی دے گا جو اس نے چوری کیا خواہ وہ خوشحال ہو یا تنگ دست ہو خواہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 229
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 612
3۔ سنن نسائی، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 262

اس کا ہاتھ کاٹا گیا ہو یا نہ کاٹا گیا ہو(1)، اسی طرح جب ڈاکہ ڈالا تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی جو حد ہے وہ بندوں کے تلف شدہ مال کو ساقط نہیں کرتی اور رہی وہ حدیث جس سے ہمارے علماء نے استدلال کیا ہے: ''جب وہ تنگ دست ہو'' اس میں کوفیوں کی حجت ہے اور یہی طبری کا قول ہے اس میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو نسائی اور دار قطنی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے فرمایا: یہ حدیث قوی نہیں اور اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی۔ ابن عربی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے۔ طبری نے کہا: قیاس یہ ہے کہ اس پر ہلاک شدہ مال کی چٹی ہو، لیکن ہم نے اس میں اثر کی وجہ سے اس کو ترک کر دیا۔ ابو عمر نے کہا: ضعیف اثر کی وجہ سے قیاس کا ترک کرنا جائز نہیں، کیونکہ ضعیف کسی حکم کو ثابت نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ چور سے چور، چوری کر لے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟ ہمارے علماء نے فرمایا: اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ اس نے غیر مالک سے اور غیر حرز سے مال چوری کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مالک کی حرمت اس مال پر باقی ہے اس سے اس کی حرمت ختم نہیں ہوئی اور چور کا ہاتھ (ملکیت) نہ ہونے کی طرح ہے جس طرح غاصب ہوتا ہے اگر اس سے مال مغصوب چوری کیا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا حرز حرز نہ ہونے کی طرح بناؤ؟ ہم کہیں گے: حرز قائم ہے اور ملکیت قائم ہے اس میں ملکیت باطل نہ ہوگی، تاکہ وہ ہمیں کہیں کہ حرز باطل کرو(2)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اگر مسروقہ مال میں ہاتھ کاٹے جانے کے بعد پھر اگر وہی مال چوری کرے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے؟ اکثر علماء کہتے ہیں: اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا(3)۔ قرآن کا عموم اس پر ہاتھ کاٹنے کو ثابت کرتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کے قول کو رد کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: قطع ید سے پہلے چور خریدنے یا ہبہ کے ساتھ مسروق مال کا مالک بن جائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا، جب قطع بطور حق اللہ واجب ہے تو اسے کوئی چیز ساقط نہیں کرے گی۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جمہور علماء نے وَالسَّارِقُ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: اس کا معنی ہے جو تم پر چور مرد اور چور عورت کے متعلق فرض کیا گیا ہے۔ بعض نے فرمایا: ان میں رفع مبتدا کے اعتبار سے ہے اور خبر فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ہے۔ اس میں معین کا قصد نہیں ہے اگر معین کا قصد ہوتا تو نصب واجب ہوتا۔ تو کہتا ہے: زیداً اضربہ بلکہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے۔ من سرق فاقطع یدہ، جو چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ زجاج نے کہا: یہ قول مختار ہے۔ السارق نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے تقدیر یہ ہے: اقطعوا السارق والسارقۃ، یہ سیبویہ کا مختار ہے، کیونکہ امر کے ساتھ فعل اولیٰ ہے۔ سیبویہ نے کہا: کلام عرب میں وجہ نصب ہے جیسے تو کہتا ہے: زیداً اضربہ۔ لیکن عام لوگ رفع ہی پڑھتے ہیں۔ سیبویہ نے السَّارِقُ کی نوع کو معین شخص بنایا۔ حضرت ابن مسعود نے پڑھا: والسارقون والسارقات فاقطعوا ایمانھم۔ جماعت کی قرأت کو یہ قول تقویت دیتا ہے۔ السرق والسرقۃ را میں کسرہ کے ساتھ، مسروق چیز کا نام ہے اور سرق یسرق کا مصدر کے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 208 | 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 613 | 3۔ ایضاً

فتح کے ساتھ ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ اس لفظ کی اصل آنکھوں سے خفیہ کسی چیز کو لینا ہے، اسی سے استرق السمع ہے۔ سارقہ النظر ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: عربوں کے نزدیک سارق وہ ہے جو چھپ کر حرز کی طرف جائے اس سے وہ چیز اٹھا لے جو اس کی اپنی نہیں ہے۔ اگر ظاہراً لے تو اسے مختلس، مستلب، منتھب، محترس کہتے ہیں اور جو کسی کے ہاتھ میں ہو اور نہ دے تو غاصب ہے۔

میں کہتا ہوں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''بدترین چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرتا ہے'' صحابہ نے پوچھا: نماز کی کیسے چوری کرتا ہے؟ فرمایا: ''وہ رکوع وسجود مکمل نہیں کرتا'' (1)۔ اس کو موطا وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اس کو سارق (چور) کہا ہے اگرچہ یہ سارق نہیں ہے، تو یہ اشتقاق کی حیثیت سے ہے، کیونکہ اس میں غالب طور پر آنکھوں سے چوری نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاقْطَعُوْٓا**، القطع کا معنی ہے علیحدہ کرنا اور زائل کرنا ہے۔ اور قطع ثابت نہ ہوگا مگر ان تمام اوصاف کے جمع ہونے کے ساتھ جو چور میں، چوری شدہ چیز میں اور چوری کی جگہ میں اور چوری کی جگہ کی صفت میں معتبر ہیں۔ چور میں پانچ اوصاف معتبر ہیں: بالغ ہونا، عاقل ہونا، چوری کی گئی چیز کا مالک نہ ہونا اور اس کو اس پر ولایت نہ ہو۔ غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر وہ اپنے مالک کا مال چوری کرے، اسی طرح مالک کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر وہ غلام کا مال لے لے۔ ان میں کسی حال میں قطع ید نہیں ہے، کیونکہ غلام اور اس کا مال مالک کے لیے ہے اور اپنے غلام کا مال لینے سے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ اس نے اپنا مال لیا ہے اور غلام کے قطع ید کا سقوط اجماع صحابہ سے ہے اور خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب کے قول سے ہے۔

حضرت عمر نے کہا تھا: تمہارے غلام نے تمہارا مال چوری کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بھاگنے والے غلام پر قطع ید نہیں جب وہ چوری کرے اور نہ ذمی پر قطع ید ہے'' (2)۔ فرمایا: اس حدیث کو فہد بن سلیمان کے علاوہ کسی نے مرفوع نہیں بیان کیا۔ صواب یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب غلام چوری کرے تو اس کو بیچ دو اگرچہ بیس درہم میں ہو'' (3)۔

یہ حدیث ابوبکر بن ابی شیبہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: ہمیں اسامہ نے بیان کیا، انہوں نے ابو عوانہ سے روایت کیا انہوں نے عمر بن ابی سلمہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا۔ ابن ماجہ نے کہا: ہمیں جبارہ بن مغلس نے بیان کیا، انہوں نے ہمیں حجاج بن تمیم نے بیان کیا، انہوں نے میمون بن مہران سے۔ انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ ایک خمس کے غلام نے خمس سے چوری کی، مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ نہ کاٹا۔ اور فرمایا: **مال اللہ سرق بعضہ بعضا** (4)۔ اللہ کا مال ہے بعض نے بعض کی چوری کی۔ جبارہ بن مغلس متروک ہے، ابو زرعہ رازی نے کہا بچے اور مجنون پر قطع ید نہیں۔ ذمی، مجاہد اور حربی پر

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 153
2۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 86
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، صفحہ 189
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، صفحہ 189

واجب ہے جب وہ امان کے ساتھ داخل ہو۔

اور چوری شدہ چیز میں چار اوصاف معتبر ہیں: نصاب اس پر گفتگو گزر چکی ہے، وہ چیز کسی کی ملکیت ہو اور اس کا بیچنا جائز ہو اگر اس کا بیچنا جائز نہ ہو اور اس سے آدمی مال دار نہ ہوتا ہو جیسے شراب، خنزیر ان میں بالاتفاق قطع ید نہیں ہے، مگر امام مالک اور ابن القاسم کے نزدیک چھوٹا آزاد آدمی چوری کیا گیا تو اس میں قطع ید ہوگی۔ بعض نے فرمایا: اس پر قطع ید نہ ہوگی۔ یہی قول امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا ہے، کیونکہ وہ مال نہیں ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: وہ تو بڑا مال ہے چور کا ہاتھ مال کی وجہ سے نہیں کاٹا جاتا بلکہ نفوس کے ساتھ اس کے تعلق کی وجہ سے کاٹا جاتا ہے اور آزاد کے ساتھ نفوس کا تعلق، غلام سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ان چیزوں سے ہو جن کا مالک ہونا جائز ہے اور اس کا بیچنا جائز نہ ہو جیسے کتا جس کے رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور قربانی کا گوشت اس میں ابن القاسم اور اشہب میں اختلاف ہے۔

ابن القاسم نے کہا: کتا چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اشہب نے کہا: یہ اس کتے کے بارے میں ہے جس کا رکھنا منع ہے۔ رہا وہ کتا جس کے رکھنے کی اجازت ہے اس کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ فرمایا: جس نے قربانی کا گوشت چوری کیا یا اس کی کھال چوری کی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جب کہ اس کی قیمت تین دراہم ہو۔ ابن حبیب نے کہا: اصبغ نے کہا: اگر ذبح سے پہلے قربانی چوری کی تو ہاتھ کاٹا جائے گا، اگر ذبح کے بعد چوری کی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اگر وہ ایسی چیز ہو جس کی اصل کا بنانا اور اس کا بیچنا جائز ہو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا گیا جس کا استعمال جائز نہیں جیسے طنبور اور مزمار، کنگ وغیرہ آلات لہو تو اس میں دیکھا جائے گا اگر اس کی صورت کے فساد اور اس کی منفعت کے چلے جانے کے بعد چار دینار قیمت باقی رہتی ہے یا اس سے زائد باقی رہتی ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یہی حکم سونے اور چاندی کے برتنوں کا ہے جن کا استعمال جائز نہیں اور ان کے توڑنے کا حکم دیا جاتا ہے ان میں جو سونا چاندی ہے اس کی قیمت لگائی جائے گی نہ کہ ان کی صنعت کی۔ اسی طرح سونے اور چاندی کی صلیب اور ناپاک تیل کا حکم ہے اگر اس کی قیمت نجاست پر نصاب کو پہنچے تو اس میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔

تیسرا وصف یہ ہے کہ اس میں چور کی ملکیت نہ ہو۔ مثلاً جو اپنی رہن شدہ چیز کو چوری کرے یا جو اس نے اجرت پر طلب کی ہے اس کو چوری کر لیا۔ اور نہ اس میں شبہ ملک ہو۔ ہمارے علماء کا شبہ ملک کی رعایت میں اختلاف ہے جیسے کوئی شخص مال غنیمت سے چوری کرے یا بیت المال سے چوری کرے، کیونکہ اس میں اس کا حصہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے خمس سے ایک خود چوری کیا تھا، تو آپ نے اس پر قطع ید کا فیصلہ نہ فرمایا۔ فرمایا: اس میں اس کا حصہ ہے۔ یہی مذہب ہے جماعت علماء کا بیت المال کے بارے میں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر قطع ید ہے انہوں نے آیت سرقہ کے لفظ کے عموم کا اعتبار کیا ہے۔ چوری شدہ چیز ایسی ہو جس کا چوری کرنا صحیح ہو جیسے چھوٹا غلام، بڑا عجمی، کیونکہ جس کا چوری کرنا صحیح نہیں جیسے فصیح غلام تو اس میں قطع ید نہیں ہے۔

وہ جگہ جہاں سے چوری کی گئی ہو اس میں ایک وصف معتبر ہے اور وہ حرز ہو اس چوری شدہ چیز کی مثل کے لیے۔ اس میں بہرحال قول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے لیے مکان معروف ہو وہ مکان اس کے لیے حرز ہے۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ محافظ ہے تو

اس کا محافظ اس کا حرز ہے۔ گھر، مکانات، دوکانیں اس چیز کے لیے حرز ہیں جو ان میں ہے خواہ ان کے مالک حاضر ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح بیت المال، مسلمانوں کی جماعت کے لیے حرز ہے چور اس میں کسی چیز کا مستحق نہیں ہوتا اگر چہ وہ چوری سے پہلے ان لوگوں سے ہے جس کو امام کے لیے دینا جائز ہے، ہر مسلمان کا حق عطیہ سے متعین ہوتا ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ امام کے لیے تمام مال کو مصالح کی وجوہ میں سے ایک وجہ میں خرچ کرنا جائز ہے اور اسے لوگوں میں تقسیم کرنا ضروری نہیں ہوتا یا اس کے لیے جائز ہوتا ہے کہ وہ ایک شہر میں خرچ کرے اور دوسرے میں نہ کرے، ایک قوم کو نہ دے اور دوسری قوم کو دے۔ اس تقدیر میں کہ یہ چور ان لوگوں میں سے ہے جن کا اس میں کوئی حق نہیں ہے، اسی طرح مال غنیمت بھی دو حیثیتوں سے خالی نہیں ہوتا تقسیم کے ساتھ متعین ہوتا ہے وہ وہ ہے جو ہم نے بیت المال کے بارے میں ذکر کیا یا صرف لینے سے متعین ہو جاتا ہے جو جنگ میں حاضر ہوتا ہے، پس اس میں رعایت رکھی جائے گی جو اس نے چوری کی اگر اس نے اپنے حق سے زیادہ چوری کی تو ہاتھ کاٹا جائے گا ورنہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ جانوروں کی پیٹھیں اس مال کے حرز ہیں جو ان پر لادا گیا ہے اور دوکانوں کے صحن اس چیز کے لیے حرز ہیں جو ان میں رکھی گئی ہیں بیچنے کی جگہ میں اگر چہ وہاں دکان نہ بھی ہو، خواہ اس کے پاس اس کا مالک ہو یا نہ ہو، رات کو چوری کی گئی ہو یا دن کو۔ اسی طرح بازار میں بکریوں کے ٹھہرنے کی جگہ خواہ وہ باندھی ہوئی ہو یا باندھی ہوئی نہ ہو اور جانور اپنے باڑوں میں محفوظ ہوتے ہیں خواہ ان کے مالک پاس ہوں یا نہ ہوں۔ اگر سواری مسجد کے دروازے یا بازار میں ہو تو وہ محرز نہ ہوگی مگر یہ کہ اس کے ساتھ محافظ ہوں۔ جس نے اپنے صحن میں سواری کو باندھا یا جانوروں کے لیے کوئی باڑا بنایا تو وہ ان کے لیے حرز ہوگا اور کشتی میں جو کچھ ہے کشتی اس کے لیے حرز ہے خواہ چل رہی ہو یا باندھی ہوئی ہو اگر کشتی چوری کی گئی تو اس کا حکم جانوروالا ہے اگر وہ کھلی ہو تو وہ محرزۃ (محفوظ) نہیں ہے اگر اس کے مالک نے اسے کسی جگہ باندھا ہو اور اس کو اس میں ٹھہرایا ہو اور اسے باندھا ہو تو وہ محفوظ ہے، اسی طرح اگر اس کے ساتھ کوئی ہے تو وہ کشتی جہاں بھی ہے محفوظ ہے جیسے جانور مسجد کے دروازے پر ہو اور اس کے ساتھ محافظ ہو مگر یہ کہ وہ کشتی کو اپنے سفر میں کسی جگہ اتاریں اور پھر اسے باندھ دیں تو وہ جگہ اسکے لیے حرز ہوگی اس کے ساتھ ملک ہو یا نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایک گھر میں رہنے والے لوگ جیسے ہوٹل جس میں ہر شخص علیحدہ اپنے کمرے میں رہتا ہے، تو جو ان میں سے کسی کے کمرے سے چوری کرے گا جب وہ مال لے کر گھر کے صحن میں آجائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اگر چہ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوا ہے اور نہ اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلا ہے۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ جو ہوٹل کے صحن سے کوئی چیز چوری کرے گا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر چہ وہ اپنے کمرے میں لے گیا ہو یا اسے ہوٹل سے باہر لے گیا ہو، کیونکہ ہوٹل کا صحن تمام کے لیے بیع وشرا کے لیے مباح ہے مگر یہ کہ سواری اپنے مربط میں ہو یا جو اس کے مشابہ مال محفوظ جگہ پر ہو تو اس کے چوری کرنے پر سزا ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ والدین بیٹے کا مال چوری کر لیں تو ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے(1)'' اور بیٹا والدین کا مال چوری کرے گا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ یہ قول ابن وہب اور اشہب کا ہے، کیونکہ بیٹا عادۃً باپ کے مال میں بڑھتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ غلام کا ہاتھ آقا کے مال کی وجہ سے نہیں کاٹا جاتا پس باپ کے مال کو چوری کرنے سے بیٹے کا ہاتھ نہ کاٹنا اولیٰ ہے اور دادا کے چوری کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور ابن القاسم نے کہا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اشہب نے کہا: کاٹا جائے گا۔ امام مالک کا قول اصح ہے، کیونکہ وہ بھی باپ ہے۔

امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک محبوب یہ ہے کہ باپ اور ماں کی طرف سے نانا، دادا کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگرچہ ان کا نفقہ واجب نہیں ہوتا۔ ابن القاسم اور اشہب نے کہا: ان کے علاوہ رشتہ داروں کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ذوی المحارم مثلاً پھوپھی، خالہ، بہن وغیرہم میں سے کسی پر قطع ید نہیں ہے۔ ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: ان میں سے جو چوری کرے گا اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ابوثور نے کہا: ہر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا جس نے اتنی مقدار چوری کی جس کی وجہ سے ہاتھ کاٹا جاتا ہے مگر یہ کہ وہ کسی چیز پر جمع ہو جائیں تو اجماع کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قرآن چوری کرنے والے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف اور ابوثور نے کہا: اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جب اس کی قیمت اتنی ہو کہ جس میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ ابن القاسم نے بھی یہی کہا ہے۔ نعمان نے کہا: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جو قرآن چوری کرے گا(2)۔ ابن المنذر نے کہا: قرآن چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور جیب کترے کے بارے میں اختلاف ہے جو جیب سے پیسے جیب کو کاٹ کر نکال لیتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جس نے جیب کے اندر سے یا باہر سے کاٹا۔ یہ امام مالک، اوزاعی، ابوثور اور یعقوب کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن اور اسحاق نے فرمایا: اگر دراہم آستیں (جیب) کے ظاہر میں تھے پھر چور نے اس آستین کو کاٹ کر انہیں چوری کر لیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر آستین کے اندر دراہم تھے اس نے ہاتھ اندر داخل کر کے چوری کیے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ سفر میں قطع ید کے بارے میں اختلاف ہے اور دار الحرب میں حدود قائم کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، لیث بن سعد نے کہا: دار الحرب میں بھی حدود قائم کی جائیں گی۔ دار الحرب اور دار الاسلام میں کوئی فرق نہیں۔ اوزاعی نے کہا: جو لشکر کا امیر ہے اگرچہ وہ کسی شہر کا امیر نہیں ہے وہ قطع ید کے علاوہ حدود کو اپنے لشکر میں قائم کرے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب لشکر دار الحرب میں جنگ لڑ رہا ہو اور ان کا کوئی امیر ہو تو وہ اپنے لشکر میں حدود کو قائم نہیں کرے گا مگر یہ کہ مصر، شام یا عراق یا اس کے مشابہ کسی مملکت کا امام ہو تو وہ لشکر میں حدود قائم کرے گا۔ اوزاعی اور اس کے ہم نظریہ علماء نے حضرت جنادہ بن ابی امیہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے فرمایا: ہم بسر بن ارطاۃ کے ساتھ سمندر میں تھے ایک چور کو لایا گیا جس کو مصدر کہا جاتا تھا اس نے بختی اونٹنی چوری کی تھی، اس نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''جنگ میں ہاتھ نہیں کاٹے جائیں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، صفحہ 167
2۔ اختلاف ائمۃ العلماء، جلد 2، صفحہ 278

گے (1)''۔ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔ اس بسر کے بارے میں کہا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا اس کی حضرت علی اور ان کے اصحاب کے متعلق بری اخبار ہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے حضرت عبداللہ بن عباس کے دو بچے ذبح کیے تھے، ان کی والدہ کی عقل ضائع ہوگئی تھی اور وہ بے چاری گھومتی رہتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف بد دعا کی کہ اللہ اس کی عمر زیادہ کرے اور اس کی عقل ضائع ہو جائے، تو اسی طرح ہوا۔ یحییٰ بن معین نے کہا: بسر بن ارطاۃ برا شخص تھا۔ جس نے قطع ید کا کہا ہے انہوں نے قرآن کے عموم سے استدلال کیا ہے اور وہ صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جنہوں نے دار الحرب میں قطع ید سے منع کیا ہے ان کی بہترین حجت یہ ہے کہ اس کا شرک سے لاحق ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ جب ہاتھ پاؤں کاٹا جائے گا تو کہاں تک کاٹا جائے گا؟ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ ہاتھ کلائی تک اور پاؤں مفصل (جوڑ) تک کاٹا جائے گا، کاٹنے کے بعد پنڈلی کو داغ دیا جائے گا (2)۔ بعض نے فرمایا: کہنی تک کاٹا جائے گا۔ بعض نے کہا: کندھے تک کاٹا جائے گا، کیونکہ ہاتھ کا اسم اس کو شامل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پاؤں قدم کے نصف سے کاٹا جائے گا اور ایڑی کو چھوڑ دیا جائے گا یہی امام احمد اور ابوثور کا قول ہے۔

ابن المنذر نے کہا: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا پھر فرمایا: ''اس کو داغ دو'' (3)، اس کی سند میں کلام ہے۔ امام شافعی، ابوثور وغیرہما کے نزدیک داغنا مستحب ہے۔ یہ احسن ہے اور زخم ٹھیک ہونے کے زیادہ قریب ہے اور تلف سے بعید ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ پہلے دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا پھر دوبارہ اگر چوری کرے تو اختلاف ہے امام مالک، اہل مدینہ، امام شافعی اور ابوثور وغیرہم نے کہا: بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، پھر اگر تیسری مرتبہ چوری کرے گا تو بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا پھر چوتھی مرتبہ چوری کرے گا تو دایاں پاؤں کاٹا جائے گا پھر اگر پانچویں مرتبہ چوری کرے گا تو اسے تعزیر لگائی جائے گی اور قید کر دیا جائے گا۔ ابومصعب نے کہا: چوتھی مرتبہ کے بعد قتل کیا جائے گا، انہوں نے نسائی کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے حضرت حارث بن حاطب سے روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور لایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو قتل کر دو''۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے چوری کی ہے۔ فرمایا: ''اسے قتل کر دو'' لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے چوری کی ہے۔ فرمایا: ''اس کا ہاتھ کاٹ دو''۔ پھر اس نے چوری کی تو اس کا پاؤں کاٹا گیا پھر اس نے حضرت ابوبکر کے عہد میں چوری کی حتیٰ کہ اس کے تمام ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر اس نے پانچویں مرتبہ چوری کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو زیادہ جانتے تھے جب آپ نے کہا تھا کہ اسے قتل کر دو، پھر اسے قریش کے جوانوں کی طرف بھیجا تا کہ وہ اسے قتل کر دیں، ان میں حضرت عبداللہ بن زبیر بھی تھے وہ امارت کو پسند کرتے تھے انہوں نے کہا: تم مجھے اپنے اوپر امیر بناؤ تو لوگوں نے انہیں امیر بنا دیا، پس جب حضرت عبداللہ نے مارا تو لوگوں نے بھی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175

2۔ اختلاف ائمۃ العلماء، جلد 2، صفحہ 283

3۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 422

اسے مارا حتیٰ کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا (1)۔ اور حضرت جابر کی حدیث سے حجت پکڑی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچویں مرتبہ چوری کرنے والے کے لیے حکم دیا فرمایا: ''اسے قتل کر دو''۔ حضرت جابر نے کہا: ہم اسے لے کر چلے اور ہم نے اسے قتل کر دیا پھر ہم نے اسے گھسیٹا اور اسے کنویں میں پھینک دیا اور ہم نے اس پر پتھر پھینکے (2)۔

ابو داؤد نے اسے روایت کیا ہے اور نسائی نے اسے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث منکر ہے، ایک راوی قوی نہیں ہے اور میں اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں جانتا۔ ابن المنذر نے کہا: حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ہاتھ کے بعد ہاتھ اور پاؤں کے بعد پاؤں کاٹا۔ بعض نے فرمایا: دوسری مرتبہ بایاں پاؤں کاٹا جائے گا پھر اس کے بعد قطع نہیں ہے پھر اگر چوری کرے گا تو تعزیر دی جائے گی اور قید کیا جائے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور زہری، حماد بن ابی سلیمان اور امام احمد بن حنبل کا یہی قول ہے (3)۔ از ہری نے کہا: ہمیں سنت نہیں پہنچی مگر ہاتھ اور پاؤں کا کاٹنا۔ عطا نے کہا: خاص دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور پھر کوئی عضو نہیں کاٹا جائے گا۔ یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: رہا عطا کا قول صحابہ کرام نے اس سے پہلے اس کے خلاف کیا ہے (4)۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حاکم چور کا دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے اور اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ قتادہ نے کہا: اس پر حد قائم کی جائے گی اور اس پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے جب کاٹنے والا غلطی کرے اور اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دے۔ اصحاب الرائے بھی استحسانا یہی کہتے ہیں۔ ابو ثور نے کہا: کاٹنے والے پر دیت ہے، کیونکہ اس نے خطا کی، اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جاتا لیکن اجماع کی وجہ سے پھر اس کا دایاں ہاتھ کاٹنا ممنوع ہے۔ ابن المنذر نے کہا: چور کا بایاں ہاتھ کاٹنا دو معنوں میں سے ایک سے خالی نہ ہوگا یا تو کاٹنے والا جان بوجھ کر بایاں ہاتھ کاٹ دے گا اس صورت میں اس پر قصاص ہوگا یا خطاء کاٹے گا تو اس کی دیت کاٹنے والے کی عاقلہ (خاندان) پر ہوگی اور چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا واجب ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ثابت کیا ہے اس کو کسی زیادتی کرنے والے کی زیادتی اور کسی خطا کرنے والے کی خطا کی وجہ سے زائل کرنا درست نہیں۔ ثوری نے کہا: جس سے دائیں ہاتھ میں قصاص لینا تھا اسی نے بایاں ہاتھ آگے کر دیا اور اسے کاٹ دیا گیا، فرمایا: اس کا دایاں ہاتھ بھی کاٹا جائے گا۔ ابن المنذر نے کہا: یہ صحیح ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جب وہ ٹھیک ہوگا تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا یہ اس لیے ہے کہ اس نے خود اپنا بایاں ہاتھ تلف کیا ہے اور کاٹنے والے پر اصحاب الرائے کے قول میں کوئی چیز واجب نہیں۔ امام شافعی کے قول کے قیاس میں قاطع پر کوئی چیز نہیں اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا جب وہ ٹھیک ہوگا۔ قتادہ اور شعبی نے کہا: کاٹنے والے پر کوئی چیز نہیں اور چور کا جو ہاتھ کاٹا گیا ہے وہ کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ چور کا ہاتھ کاٹ کر اس کے گلے میں لٹکانے کے متعلق پوچھا: کیا یہ سنت سے ہے؟ انہوں نے کہا:

---

1۔ سنن نسائی، کتاب قطع السارق، جلد 2، صفحہ 261
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 249
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 189
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 616

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک چور لایا گیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا، پھر آپ نے اس کا ہاتھ گلے میں لٹکانے کا حکم دیا۔ اس حدیث (1) کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے بھی تخریج کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ جب چوری کی حد ثابت ہوئی پھر چور نے کسی کو قتل کر دیا، امام مالک نے فرمایا: قتل کیا جائے گا اور قطع ید اس میں داخل ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: ہاتھ کاٹا جائے گا اور قتل کیا جائے گا، کیوں کہ دونوں دو مستحقوں کے حق ہیں ان میں سے ہر ایک کے لیے حق کو پورا کرنا واجب ہے۔ یہ صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، یہ ابن عربی کا اختیار ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَیْدِیَهُمَا فرمایا یدیھما نہیں فرمایا۔ اس میں علماء لغت نے کلام کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: فقہاء نے ان پر حسن ظن کرتے ہوئے ان کی متابعت کی ہے۔ خلیل بن احمد اور فراء نے کہا: ہر چیز جو انسان کی تخلیق سے پائی جاتی ہے جب تثنیہ کی طرف مضاف کی جاتی ہے تو جمع ذکر کی جاتی ہے تو کہتا ہے: ھشمت رؤوسھما، أشبعت بطونھما۔ قرآن کریم میں ہے: اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) اسی وجہ سے یہاں فرمایا: فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا، یدیھما نہیں فرمایا۔ یعنی اس کا دایاں ہاتھ کاٹو۔ لغت میں فاقطعوا ایدیھما جائز ہے۔ یہ اصل ہے شاعر نے دونوں لغتوں کو جمع کیا ہے:

مَهْمَهَيْنِ قَذَفَيْنِ مَرَّتَيْنِ ظُهراهما مِثْلُ ظُهورِ التُّرْسَيْنِ

بعض علماء نے فرمایا: یہ ایسا کیا گیا: کیونکہ مشکل نہیں۔ سیبویہ نے کہا: جب منفرد ہو تو کبھی جمع ذکر کیا جاتا ہے جب اس سے مراد تثنیہ ہو۔ عربوں سے حکایت ہے وضعا رحالھما اس سے مراد رحلی راحلتیھما ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ اس بنا پر ہے کہ صرف دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے گا، لیکن حقیقۃً ایسا نہیں بلکہ ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے۔ اَيْدِيَهُمَا کا قول چار کی طرف لوٹے گا یہ تثنیہ میں جمع ہے یہ دونوں تثنیہ ہیں۔ اس کی فصاحت پر کلام آگے آئے گی، اگر فاقطعوا ایدیھم ہوتا تو کوئی وجہ ہوتی کیونکہ السَّارِقُ اور السَّارِقَةُ کے خاص دو شخص مراد نہیں بلکہ اسم جنس مراد ہے جو لاتعداد کو شامل ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا یہ مفعول لاجلہ ہے۔ اگر تو چاہے تو مصدر بنا دے اسی طرح نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ہے۔ کہا جاتا ہے: نکلت بہ، جب تو اس کو وہ سزا دے جو اس فعل پر واجب ہوتی ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ اس پر غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ حَكِيْمٌ ۝ اس کے ہر فعل میں حکمت ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ یہ شرط اور جواب شرط فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ہے اور مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ کا معنی ہے چوری کے بعد، اللہ تعالیٰ توبہ کی صورت میں اس سے تجاوز فرمائے گا۔ قطع ید توبہ سے ساقط نہ ہوگی۔ عطا اور ایک جماعت نے کہا: چوری پر قدرت پائے جانے سے پہلے چور توبہ کرے تو توبہ سے قطع ید ساقط ہو جائے گی۔ یہ بعض شوافع نے کہا اور اس کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے اور اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ کے ساتھ اس کا تعلق جوڑا ہے۔ یہ وجوب سے استثنا ہے، پس تمام حدود کو اس پر محمول کرنا واجب ہے۔ ہمارے علماء

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 618 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 616

نے کہا: یہی ہماری دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محارب کی حد کا ذکر کیا تو فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ۔ اور اس پر چور کی حد کو معطوف کیا اور فرمایا: فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ۔ اگر یہ حکم میں محارب کی طرح ہوتا تو ان کے درمیان حکم مختلف نہ ہوتا (1)۔

ابن عربی نے کہا: اے معشر شافعیہ، سبحان اللہ! کہاں دقائق فقہیہ اور حکم شرعیہ جن کو تم مسائل کے غوامض سے استنباط کرتے ہو؟ کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ محارب خودرائے ہوتا ہے اپنے ہتھیار کے ساتھ تجاوز کرتا ہے، جس کو روندنے کے لیے امام گھوڑے اور اونٹ دوڑانے کا محتاج ہوتا ہے، اسے اس حالت پر اتارتے ہوئے توبہ کے ساتھ اس کی جزا کیسے ساقط کرے گا، جس طرح کافر کے تمام گناہ معاف کیے جاتے ہیں اسے اسلام کی الفت دلانے کے لیے۔ رہا چور اور زانی وہ دونوں مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں امام کے حکم کے تحت ہوتے ہیں کون ہے وہ جو ان سے وہ حکم ساقط کرے جو ان پر ثابت ہو چکا ہے؟ یہ کہنا کیسے جائز ہے کہ محارب پر قیاس کیا جائے گا حالانکہ ان کے درمیان حکمت اور حالت جدا جدا ہے۔

اے محققین کے گروہ تم جیسے لوگوں کے لیے یہ مناسب نہیں جب ثابت ہو گیا کہ حد توبہ کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے تو توبہ مقبول ہے اور قطع ید اس کا کفارہ ہے۔

وَ اَصْلَحَ یعنی جیسے چوری سے توبہ کی اسی طرح ہر گناہ سے توبہ کرے۔ بعض نے فرمایا: وَ اَصْلَحَ کا مطلب ہے اس نے معصیت کو کلیۃً ترک کر دیا اور جس نے زنا کے ساتھ چوری کو ترک کیا اور نصرانیت کے ساتھ یہودیت کو ترک کیا تو یہ توبہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کی نسبت ہو تو اس کا معنی ہے اللہ بندے کو توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے السَّارِقَةُ سے پہلے اس آیت میں السَّارِقُ کا ذکر فرمایا ہے اور آیت زنا میں زانیہ کا لفظ زانی سے پہلے ذکر کیا اس میں حکمت کیا ہے؟ جواباً یہ کہا جائے گا جب مال کی محبت مردوں پر زیادہ غالب ہوتی ہے اور لطف اندوز ہونے کی شہوت عورتوں پر غالب ہوتی ہے اسی وجہ سے دونوں جگہ اس انداز میں ذکر کیا۔ یہ ایک وجہ ہے عورت میں، جس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا کہ زانی سے پہلے اس کا ذکر کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے چوری کی حد قطع ید فرمائی تاکہ مال کو شامل ہو اور زنا کی حد ذکر کا قطع کرنا نہیں فرمایا، حالانکہ برائی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی تین وجوہ ہیں (1) چور کے لیے اس کی مثل ہاتھ موجود ہے جو کاٹا گیا ہے اگر ایک کاٹا گیا ہے تو دوسرا اس کا بدل موجود ہے جب کہ زانی کے لیے اس کی مثل ذکر نہیں ہے جب وہ کاٹا جائے گا تو اس کا بدل نہیں ہے (۲) حد، محدود وغیرہ کو روکنے کے لیے ہوتی ہے، چوری میں ہاتھ کاٹنا ظاہر ہے اور زنا میں ذکر کاٹنا باطن ہے (۳) ذکر کے کاٹنے میں نسل کا ابطال ہے اور قطع ید میں نسل کا ابطال نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 614

''کیا تو نہیں جانتا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں کی، زمین کی سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ کو خطاب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور کسی کے درمیان قرابت نہیں جو باہمی محبت کو ثابت کرے حتی کہ کوئی یہ کہے: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں حد ہر اس شخص پر قائم کی جائے گی جو حد کے موجب کا ارتکاب کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ جو چاہے حکم کرے اسی وجہ سے محارب اور سارق غیر محارب کے درمیان فرق کیا۔ اس آیت کی نظائر پہلے گزر چکی ہیں اور ان میں کلام بھی تفصیلاً ہو چکی ہے پس اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ واللہ الموفق۔ یہ احکام تھے جو آیت سرقہ کے متعلق تھے۔ واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''اے رسول! نہ غمگین کریں آپ کو وہ جو تیز رفتار ہیں کفر میں ان لوگوں سے جنہوں نے کہا: ہم ایمان لائے (صرف) اپنے منہ سے حالانکہ نہیں ایمان لائے تھے ان کے دل اور ان لوگوں سے جو یہودی ہیں جاسوسی کرنے والے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے وہ جاسوس ہیں دوسری قوم کے جو نہیں آئی آپ کے پاس بدل دیتے ہیں اللہ کی باتوں کو اس کے صحیح موقعوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں دیا جائے یہ حکم تو مان لو اسے اور اگر نہ دیا جائے تمہیں یہ حکم تو بچو اور جس کو ارادہ فرمالے اللہ تعالیٰ فتنہ میں ڈالنے کا تو نہیں طاقت رکھتا تو اس کے لیے اللہ سے کسی چیز کی یہ وہی لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ پاک کرے ان کے دلوں کو ان کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ اس آیت کے سبب نزول میں تین اقوال ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے بارے نازل ہوئی ایک قریظی نے نضیری کو قتل کر دیا۔ بنو نضیر جب بنی قریظہ کا قتل کرتے تو وہ انہیں قصاص نہ دیتے بلکہ وہ انہیں دیت دیتے تھے جیسا کہ آگے بیان آئے گا پس وہ فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس لائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرظی اور نضیری کے درمیان برابری کا فیصلہ کیا، بنو نضیر کو یہ اچھا نہ لگا اور انہوں نے اسے قبول نہ کیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ابولبابہ کے بارے میں نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بنی قریظہ کی طرف بھیجا تو انہوں نے خیانت کی جب اس نے ان کی طرف ذبح کا اشارہ کیا(2)۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ یہودی مرد عورت کے زنا اور رجم کے قصہ میں نازل ہوئی۔ یہ اصح قول ہے۔ اس کو ائمہ حدیث امام مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے کہا: حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تم میرے پاس دو شخص اپنے میں سے پیش کرو جو زیادہ علم والے ہوں'' تو وہ صوریا کے بیٹوں کو لائے آپ نے ان سے اللہ کے واسطہ سے سوال کیا: ''تم تورات میں ان کے امر کو کیسے پاتے ہو'' انہوں نے کہا: ہم تورات میں پاتے ہیں کہ جب چار آدمی گواہی دیں کہ انہوں نے اس کا ذکر اس کی فرج میں اس طرح دیکھا ہے جیسے سرمہ دانی میں سرمچو ہوتا ہے تو انہیں رجم کیا جائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تمہیں ان کو رجم کرنے سے کیا مانع ہے'' انہوں نے کہا: ہمارا سلطان چلا گیا ہے پس ہم قتل کو ناپسند کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گواہوں کو بلایا وہ آئے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے اس کا ذکر اس کی فرج میں سرمہ دانی میں سرمچو کی طرح دیکھا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رجم کا حکم دیا(3)۔

صحیحین کے علاوہ میں شعبی سے مروی ہے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: اہل فدک میں سے ایک شخص نے زنا کیا، تو اہل فدک نے مدینہ کے یہود کی طرف لکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھو اگر وہ تمہیں کوڑوں کا حکم دے تو اسے قبول کرو اور اگر وہ تمہیں رجم کا حکم دے تو اسے قبول نہ کرو، انہوں نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے ابن صوریا کو بلایا وہ ان کا عالم تھا اور وہ کانا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کہا: ''میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں تم اپنی کتاب میں زنا کی حد کیسے پاتے ہو''۔ ابن صوریا نے کہا: چونکہ آپ نے اللہ کے واسطہ سے سوال کیا ہے، ہم تورات میں یہ پاتے ہیں کہ دیکھنا زنا ہے، گلے ملنا زنا ہے، بوسہ دینا زنا ہے، اگر چار آدمی گواہی دیں کہ انہوں نے اس کا ذکر اس کی فرج میں سرمہ دانی میں سرمچو کی طرح دیکھا ہے تو رجم واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اسی طرح ہے، صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے ایک یہودی گزارا گیا اس کا منہ کالا کیا گیا تھا اور کوڑے لگائے گئے تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بلایا فرمایا: ''کیا تم زانی کی حد اپنی کتاب میں اس طرح پاتے ہو؟'' انہوں نے کہا: ہاں، پھر آپ نے ان کے ایک عالم کو بلایا فرمایا: ''میں تجھ سے اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی حد اس طرح پاتے ہو''، اس نے کہا: نہیں اگر آپ نے مجھے اللہ کا واسطہ نہ دیا ہوتا تو میں تجھے نہ بتاتا۔ ہم اس کی سزا رجم پاتے ہیں لیکن زنا ہمارے اشراف میں بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی شریف کو پکڑتے تھے تو چھوڑ دیتے تھے اور جب کسی کمزور کو پکڑتے تھے تو اس پر حد قائم کرتے تھے۔ ہم نے کہا: آؤ ہم ایک

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 211　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 210

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 256۔ ایضاً، حدیث نمبر 3862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چیز پر جمع ہو جائیں کہ ہم شریف اور وضیع پر حد قائم کریں گے پھر ہم نے رجم کی جگہ منہ کالا کرنا اور کوڑے لگانا شروع کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اے اللہ! میں پہلا ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جب کہ وہ اسے ختم کر چکے تھے۔ اس کے متعلق رجم کا حکم دیا تو اللہ تعالیٰ نے یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ ؕ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ نازل فرمایا۔ انہوں نے کہا: حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ اگر وہ تمہیں منہ کالا کرنے اور کوڑوں کا حکم دیں تو قبول کر لو اگر وہ تمہیں رجم کا فتویٰ دیں تو اسے چھوڑ دو پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ۔ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۔ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ یہ تمام کفار کے بارے میں ہے (1)۔ اس روایت میں اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک شخص گزارا گیا اور حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے ایک یہودی رد اور ایک یہودی عورت کو لایا گیا جنہوں نے زنا کیا تھا، رسول اللہ ﷺ چلے حتیٰ کہ یہود کے پاس آئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم تورات میں زانی کی کیا سزا پاتے ہو'' (2)۔ (الحدیث)

ایک روایت میں ہے یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مرد اور ایک عورت کو لے کر آئے جنہوں نے زنا کیا تھا، اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے ان کا ایک گروہ آیا، رسول اللہ ﷺ کو انہوں نے قف وادی کی طرف بلایا آپ ان کے پاس بیت المدراس میں آئے، انہوں نے پوچھا: اے ابوالقاسم! ہمارے ایک مرد نے ایک عورت سے زنا کیا ہے ہمارے درمیان فیصلہ فرمایئے (3)۔ ان تمام روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے بہت عمدہ ذکر کی ہے، انہوں نے کہا: یہود کے ایک مرد اور عورت نے زنا کیا وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے: ہمیں اس نبی کے پاس لے جائیں، کیونکہ وہ نبی تخفیفات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے، اگر تو وہ رجم سے کم کا فتویٰ دے تو ہم اسے قبول کر لیں گے اور اس کے ساتھ ہم اللہ کی بارگاہ میں حجت پیش کریں گے ہم کہیں گے: تیرے انبیاء میں سے ایک نبی نے فتویٰ دیا ہے۔ فرمایا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے جب کہ آپ مسجد میں صحابہ میں بیٹھے تھے انہوں نے عرض کی اے اباقاسم! آپ ایسے مرد اور عورت کے بارے کیا کہتے ہیں جنہوں نے بدکاری کی حضور ﷺ نے ان سے کلام نہ کی حتیٰ کہ بیت المدراس میں آئے، پس آپ دروازے پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں تمہیں اس اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم تورات میں زانی کی کیا سزا پاتے ہو جب کہ وہ شادی شدہ ہو؟'' انہوں نے کہا: اس کا منہ کالا کیا جائے گا اس مرد اور عورت کو گدھے پر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بٹھایا جائے گا اور انہیں شہر کا چکر لگوایا جائے گا۔ ان میں سے ایک نوجوان خاموش تھا جب نبی کریم ﷺ نے اسے خاموش دیکھا تو اس سے پھر اللہ کا واسطہ دے کر سوال کیا۔ تو اس نے کہا: جب آپ اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں تو ہم تورات میں رجم پاتے ہیں۔ یہاں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 254 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 255

تک حدیث کو چلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تورات کے مطابق فیصلہ کروں گا'' پس آپ نے رجم کرنے کا حکم دیا (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ان روایات کا حاصل یہ ہے کہ یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کے مطابق فیصلہ کیا اور اس کو صوریا کے بیٹوں کی طرف منسوب کیا۔ آپ نے یہود کی شہادت سنی اور اس کے مطابق عمل کیا۔ اسلام، احصان میں شرط نہیں۔ یہ چار مسائل ہیں: جب ذمی لوگ امام کے پاس فیصلہ لے آئیں اگر انہوں نے کوئی ظلم و زیادتی کی ہے یا غصب کیا ہے تو وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور انہیں اس ظلم و زیادتی سے منع کرے گا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر ایسا مسئلہ نہ ہو تو امام کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کا اختیار ہے اور فیصلہ نہ کرنے کا بھی اختیار ہے۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ ہے لیکن امام مالک ان سے اعراض کو اولیٰ سمجھتے ہیں اگر وہ فیصلہ کرے گا تو اسلام کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: حدود میں ان کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ہر حال میں ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ یہی زہری، عمر بن عبدالعزیز اور حکم کا قول ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہی امام شافعی کا ایک قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ** کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔ امام مالک نے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے: **فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ**۔ یہ تخییر میں نص ہے۔ ابن القاسم نے فرمایا: جب ان کے بشپ اور زنا کرنے والے آئیں تو حاکم کو اختیار ہے، کیونکہ حکم کا نافذ کرنا بشپ کا حق ہے۔ اور مخالف کہتا ہے بشپ کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ قول اصح ہے، کیونکہ دو مسلمان اگر اپنے درمیان کسی کو حکم بنا دیں تو اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، حاکم کی رضا کا اعتبار نہیں کیا جاتا، پس کتابی اس کے اولیٰ مستحق ہیں۔ عیسیٰ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے وہ اہل ذمہ نہ ہوں بلکہ وہ اہل حرب ہوں۔ ابن عربی نے کہا ہے: وہ جو عیسیٰ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے اور انہوں نے یہ اس روایت سے لیا ہے جو طبری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ دو زنا کرنے والے اہل خیبر یا فدک سے تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے والے تھے، زانیہ کا نام بسرہ تھا اور انہوں نے مدینہ کے یہود کی طرف پیغام بھیجا کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھو۔ اگر وہ تمہیں بغیر رجم کے فیصلہ سنائیں تو وہ قبول کر لو اور اگر وہ تمہیں رجم کا فیصلہ سنائیں تو اس سے اجتناب کرو (2)۔ ابن عربی نے کہا: اگر یہ صحیح ہوتا تو ان کا زانیوں کو لانا اور ان کا سوال کرنا عہد و امان ہوتا اگر عہد اور ذمہ نہ ہوتا تو ان کے متعلق آپ کو رکنے کا حکم ہوتا اور ان میں عدل کا حکم ہوتا ہے، پس عیسیٰ کی روایت کے لیے کوئی جہت نہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی: **سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ**۔ (3) جاسوسی کرنے والے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے، وہ جاسوس ہیں دوسری قوم کے جو نہیں آئی آپ کے پاس۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے حکم بنایا تو آپ کا فیصلہ ان میں نافذ ہوگا ان کے لیے رجوع کی گنجائش نہیں پس جو کسی کو دین میں حکم بناتا ہے تو یہ مسئلہ بنتا ہے (4)۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 255　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 621　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 622　4۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس کی اصل یہ آیت ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کو حکم بنالے تو اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اگر وہ قاضی کے پاس فیصلہ جائے گا تو وہ اسے قائم رکھے گا مگر یہ کہ وہ فیصلہ صراحۃً ظلم ہو(1)۔ سحنون نے کہا: اگر قاضی اسے درست دیکھے گا تو وہ اسے قائم رکھے گا(2)۔ ابن عربی نے کہا: یہ اموال اور ان حقوق میں ہوگا جو طالب کے ساتھ خاص ہیں رہی حدود تو اس میں حکم کا فیصلہ نہ ہوگا مگر سلطان کا فیصلہ نافذ ہوگا، ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ حق جس کے ساتھ دو جھگڑے والے خاص ہیں اس میں تحکیم جائز ہے اور محکم کی اس میں تحکیم نافذ ہوگی(3)، اس کی تحقیق یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان تحکیم وہ ان کا حق ہے حاکم کا حق نہیں ہے مگر تحکیم کی اجازت، ولایت کے قاعدہ کو ختم کرنا ہے اور یہ لوگوں کو لڑانے تک پہنچانے والا ہے جس طرح گدھے لڑتے ہیں، کسی فاصل کا ہونا ضروری ہے، شرع نے والی کو قائم کرنے حکم دیا تا کہ جنگ کا قاعدہ ختم ہو جائے اور والی سے تخفیف کرتے ہوئے تحکیم میں اجازت دی گئی اور لوگوں کو مقدمہ لے جانے کی مشقت میں تخفیف کی خاطر تحکیم کی اجازت دی گئی تا کہ دونوں مصلحتیں مکمل ہو جائیں اور فائدہ حاصل ہو جائے۔

امام شافعی وغیرہ نے کہا: تحکیم جائز ہے اور یہی فتویٰ ہے(4)۔ بعض علماء نے کہا: یہود پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ان کی کتاب کے حکم کو قائم کرنا تھا، کیونکہ انہوں نے اس میں تحریف کی تھی اور اس کو چھپا دیا تھا اور ان پر عمل ترک کر دیا تھا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: اے اللہ! میں تیرے امر کو پہلا زندہ کرنے والا ہوں جب کہ وہ (یہود) اسے مردہ کر چکے تھے(5)'' یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اسی وجہ سے آپ نے صوریا کے بیٹوں سے تورات کے حکم کے متعلق پوچھا اور آپ نے اس سے قسم طلب کی۔ حدود میں کفار کے اقوال اور ان پر ان کی شہادت بالاجماع غیر مقبول ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بطریق الزام یہ فیصلہ کیا جس کا انہوں نے التزام کیا ہوا تھا اور اس پر عمل پیرا تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ علم کے طریق کا حصول وحی کے ساتھ ہوا تھا اور اس پر عمل پیرا تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ علم کے طریق کا حصول وحی کے ساتھ ہو یا اللہ تعالیٰ نے صوریا کے بیٹوں کی تصدیق آپ کے دل میں ڈال دی ہو یہ فیصلہ آپ نے ان کے قول پر نہ فرمایا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیان فرمایا اور رجم کی مشروعیت کی خبر دی اس کا آغاز اس وقت سے ہے، پس تورات کا حکم جو آپ نے قائم فرمایا اس سے یہ فائدہ ملتا ہے اور آپ نے بیان فرمایا کہ یہ شریعت کا حکم ہے اور تورات اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا** آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ نے آپ سے روایت کیا ہے ''میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا جو تورات میں ہے''(6)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جمہور علماء ذمی کی شہادت کو رد کرتے ہیں، کیونکہ وہ شہادت کا اہل نہیں اس کی شہادت نہ کافر کے مخالف قبول ہوگی اور نہ مسلمان کے مخالف مقبول ہوگی۔ اور تابعین وغیرہم کی ایک جماعت نے ان کی شہادت قبول کی ہے جب کوئی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 622 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً
5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، صفحہ 187 6۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 255

مسلمان گواہ موجود نہ ہو اس کا بیان سورہ کے آخر میں آئے گا۔ اگر کہا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت پر فیصلہ کیا تھا اور زانیوں کو رجم کیا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان پر نافذ ہوا جو آپ نے جانا کہ یہ تورات کا حکم ہے اور ان پر اس کے مطابق عمل کرنے کو لازم کیا جس کے مطابق بنی اسرائیل عمل کرتے تھے یہ ان پر حجت کو لازم کرنے کے لیے تھا اور ان کی تحریف اور تبدیلی کے اظہار کے لیے تھا آپ نافذ کرنے والے تھے نہ کہ فیصلہ کرنے والے تھے۔ یہ پہلی تاویل پر ہے اور جو احتمال ذکر کیا گیا ہے اس تاویل پر ہے اس صورت میں یہ اس واقعہ کے ساتھ خاص ہوگا، کیونکہ صدر اول میں کوئی ایسا نہیں سنا گیا جس نے ان کی شہادت قبول کی ہو۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَحْزُنْكَ نافع نے یا کے ضمہ اور زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یا کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الحُزن اور الحَزَن، سرور (خوشی) کی ضد ہے حَزِن الرجلُ فھو حَزِن و حزین و احزنہ غیرہ و حزنہ۔ اسی طرح اَسْلَکَہ اور سَلَکَہ ہے۔ محزون اس پر بنایا گیا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنہ قریش کی لغت ہے احزنۃ تمیم کی لغت ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے احتزن و تحزن کا ایک ہی معنی ہے۔ آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے یعنی کفر کی طرف ان کی جلدی سے پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ یہ منافق ہیں۔ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہے جیسا کہ ان کی زبانیں ایمان کا اقرار کر رہی ہیں۔ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یہود مدینہ۔ یہاں کلام مکمل ہے، پھر آغاز کیا فرمایا: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ یعنی وہ جاسوسی کرنے والے ہیں اس کی مثل ہے طوافون علیکم بعض نے فرمایا: کلام کی ابتدا مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا سے ہے یعنی یہود میں سے ایک قوم ہے جو جھوٹ سنتے ہیں یعنی اپنے رؤسا کے جھوٹ کو قبول کرتے ہیں، یعنی تورات میں جو وہ تحریف بیان کرتے ہیں اسے قبول کرتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ کا کلام سنتے ہیں تاکہ آپ پر جھوٹ بولیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تھے پھر عام لوگوں کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ لکھتے تھے، ان کے سامنے آپ کی توہین کرتے تھے۔ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ کا یہ معنی ہے منافقین میں ایسے لوگ تھے جو ایسا کرتے تھے۔ فراء نے کہا: سماعین اور طوافین جائز ہے جیسے فرمایا: ملعونین اینما ثقفوا اور اسی طرح فرمایا: اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ۝ (طور) پھر فرمایا فٰكِهِیْنَ، اٰخِذِیْنَ۔

سفیان بن عیینہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جاسوس کا اس آیت میں ذکر کیا سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے تعرض نہیں فرمایا، حالانکہ آپ کو ان کے متعلق علم تھا، کیونکہ اس وقت احکام پختہ نہیں ہوتے تھے اور اسلام کو قوت حاصل نہ تھی جاسوس کا حکم سورۃ الممتحنہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ وہ آپ سے کلام کو سمجھنے کے بعد دوسری

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 192

تاویلیں کرتے ہیں، حالانکہ اس محمل کو جانتے ہیں جس کا الله تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے اور احکام کو بیان فرمایا ہے۔ پس انہوں نے کہا: شریعت رجم کا ترک ہے اور انہوں نے رجم کا بدل چالیس کوڑے بنادیئے یہ الله کے حکم میں تبدیلی تھی۔

یُحَرِّفُوْنَ، سَمّٰعُوْنَ کی صفت ہے یَاْتُوْكَ میں جو ضمیر ہے اس سے حال نہیں ہے، کیونکہ جب وہ نہ آئے تو نہ سنا۔ تحریف یہ ہے کہ وہ موجود ہو، سنے پھر تبدیلی کرے۔ تبدیلی کرنے والے بعض یہود تھے سب نہیں تھے۔ اسی وجہ سے مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا کا معنی فریق سماعون زیادہ درست ہے۔ یَقُوْلُوْنَ یہ یُحَرِّفُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں کوڑوں کا قول لائیں تو قبول کرو ورنہ نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ۔ فتنہ سے مراد دنیا میں اس کی گمراہی اور آخرت میں سزا ہے (2)۔ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا تو تو اسے نفع نہیں پہنچائے گا۔ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ یہ الله تعالیٰ کی طرف سے بیان ہے کہ اس نے ان پر کفر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ ضلال، الله کی مشیت سے ہے۔ ان لوگوں کا رد ہے جو اس کے خلاف کہتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یعنی ان کے دلوں پر مہر لگانے کی وجہ سے الله تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا جس طرح اس نے مومنین کو ثواب دینے کے لیے مومنین کے دلوں کو پاک کیا ہے۔ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ بعض علماء نے فرمایا: ان کی یہ رسوائی تھی جب انہوں نے رجم کا انکار کیا پھر تورات لائی گئی اور اس میں رجم کا حکم پایا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: دنیا میں ان کی رسوائی یہ ہے کہ ان سے جزیہ لیا گیا اور ذلت ان پر مسلط کی گئی۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝

"قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو، بڑے حرام خور ہیں تو اگر وہ آئیں آپ کے پاس تو چاہے فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان یا منہ پھیر لیجئے ان سے (آپ کو اختیار ہے) اور اگر آپ منہ پھیر لیں ان سے تو نہ نقصان پہنچا سکیں گے آپ کو کچھ بھی۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ فرمائیے ان میں انصاف سے بے شک الله تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں سے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ تاکید اور تفخیم کے لیے مکرر ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ یعنی کثرت سے رشوت کھاتے ہیں۔ سحت کا لغوی معنی ہلاکت اور شدت ہے۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: فَیُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ (طٰہٰ: 61) وہ تمہارا نام ونشان مٹادے گا کسی عذاب سے۔

فرزدق نے کہا:

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 256 2۔ ایضاً

وعَضُّ زمانٍ یا بنَ مَرْوان لم یَدعْ    من المال إلّا مُسْحَتاً أو مُجَلَّفُ

اس طرح روایت ہے۔ أو مُجَلَّفُ مرفوع ہے معنی پر عطف کی بنا پر، کیونکہ لم یدع کا معنی ہے لم یبق حالق (مونڈنے والے) کو کہا جاتا ہے: اسحت یعنی اس نے اسے جڑ سے اکھیڑ دیا حرام مال کو سحت کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ نیکیوں کا صفایا کر دیتا ہے اور انہیں کلیۃً ختم کر دیتا ہے۔ فراء نے کہا: اس کی اصل کلب الجوع ہے کہا جاتا ہے: رجل مسحوت المعدۃ۔ یعنی جس کا معدہ ہی نہ ہو۔ گویا وہ رشوت لینے والا ہے اور حرص کی وجہ سے حرام کھانے والا ہے جو اسے دیا جاتا ہے، اس شخص کی مانند ہے جو حرص کی وجہ معدہ ہی نہیں رکھتا۔ حرام کو سحت کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ انسان کی مروت کو ختم کر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اولیٰ ہے، کیونکہ دین کے جانے کے ساتھ مروّت بھی چلی جاتی ہے اس کی مروّت نہیں جس کا دین نہیں۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے کہا: السحت سے مراد رشوت ہے (1)۔ حضرت عمر بن خطاب نے کہا: حاکم کی رشوت سحت سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''ہر وہ گوشت جو السحت سے پیدا ہوتا ہے آگ اس کی مستحق ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم السحت کیا ہے؟ فرمایا: فیصلہ میں رشوت لینا'' (2)۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: السحت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی کوئی حاجت پوری کرے، پھر وہ اسے ہدیہ دے تو وہ اسے قبول کر لے۔ ابن خویز منداد نے کہا: السحت یہ ہے کہ آدمی اپنے مرتبہ کی وجہ سے مال کھائے۔ یہ اس طرح ہے کہ سلطان کی بارگاہ میں مرتبہ ہو، پھر کوئی انسان اس سے حاجت طلب کرے تو وہ اس کی حاجت پوری نہ کرے مگر رشوت لے کر۔ سلف صالحین کا کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کے حق کو باطل کرنے کے لیے رشوت لینا جائز نہیں اس پر رشوت لینا سخت حرام ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب حاکم رشوت لے گا تو وہ اسی وقت معزول ہو جائے گا اگرچہ اسے معزول نہ بھی کیا جائے اور رشوت لینے کے بعد اس کا ہر فیصلہ باطل ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں اختلاف کرنا جائز نہیں ان شاء اللہ، کیونکہ رشوت لینا فسق ہے اور فاسق کا فیصلہ جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے'' (3)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: سحت سے مراد رشوت، کاہن کی کمائی اور فیصلہ پر مال لینا ہے (4)۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے ان سے پوچھا گیا: کیا رشوت ہر چیز میں حرام ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں رشوت وہ ناپسندیدہ ہے جو تو اس لیے دے تاکہ تجھے وہ مل جائے جو تیری نہیں ہے یا تو اس حق کو دور کرنے کے لیے دے جو تجھ پر لازم ہے، لیکن جو رشوت تو اپنے دین، اپنے خون اور اپنے مال کو بچانے کے لیے دے وہ حرام نہیں۔ ابو اللیث سمرقندی نے کہا: ہم اسی پر عمل کرتے ہیں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے نفس اور اپنے مال کی حفاظت کے لیے دے۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود سے یہ مروی ہے وہ حبشہ میں تھے تو انہوں نے دو دینار رشوت دیئے اور فرمایا: گناہ رشوت لینے والے پر ہے نہ کہ دینے والے پر۔ مہدوی نے کہا: جس نے حجام (سینگی لگانے والا) کی کمائی کے ساتھ سحت کا ذکر کیا اس کا مطلب ہے کہ رشوت لینے والے کی مروءت کو ختم کر دیتا ہے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 288    2۔ ایضاً

3۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، جلد 1، صفحہ 159۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 2303، ضیاء القرآن پبلی کیشنز    4۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 289

میں کہتا ہوں: حجام (پچھنے لگانے والا) کی کمائی پاک ہے جس نے کوئی پاک چیز لی اس کی مروت ساقط نہیں ہوتی اور اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا۔ امام مالک نے حمید الطویل سے انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور ابوطیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنے لگائے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک صاع کھجور دینے کا حکم دیا تھا اور اس کے مالکوں کو اس کے خراج میں کمی کرنے کی سفارش کی تھی (1)۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ دلیل ہے کہ پچھنے لگانے والے کی کمائی پاک ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ ثمن بنایا، جعل (انعام) بنایا نہ کسی باطل چیز کا عوض بنایا۔ حضرت انس کی حدیث اس حدیث کے لیے ناسخ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کی کمائی کو حرام قرار دیا اور پچھنے لگانے والے کے اجارہ سے جو مکروہ فرمایا اس کے لیے بھی ناسخ ہے۔ بخاری، ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور پچھنے لگوانے والے کو اجرت دی، اگر یہ حرام ہوتی تو آپ اسے عطا نہ فرماتے (2)۔ السُحُت اور السُحت دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ابوعمرو، ابن کثیر اور کسائی نے دونوں ضموں کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے صرف سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عباس بن فضل نے خارجہ بن مصعب سے انہوں نے نافع سے اَكّٰلُوْنَ لِلسَّحْتِ سین کے فتحہ اور حا کے سکون کے ساتھ روایت کیا ہے۔ زجاج نے کہا: سحتہ کا معنی تھوڑا تھوڑا لے جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخییر ہے۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے اس کا معنی گزر چکا ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جن سے معاہدہ تھا، ذمی نہیں تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ آئے تو یہود کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ ہم پر کفار کے درمیان فیصلہ کرنا واجب نہیں جب کہ وہ ذمی نہ ہوں بلکہ فیصلہ کرنا جائز ہے اگر ہم چاہیں۔ رہے اہل ذمہ تو کیا ان کے درمیان فیصلہ کرنا واجب ہے جب وہ ہمارے پاس معاملہ لے آئیں؟ اس میں امام شافعی کے دو قول ہیں: اگر تو کسی ذمی کا مسلمان سے جھگڑا ہے تو فیصلہ کرنا واجب ہے۔ مہدوی نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ حاکم پر واجب ہے کہ وہ مسلمان ذمی کے درمیان فیصلہ کرے اور دو ذمیوں کا فیصلہ ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: آیت محکمہ ہے اور حاکم کو اختیار دیا گیا ہے، یہ نخعی اور شعبی وغیرہما سے مروی ہے (3)، یہ امام مالک اور امام شافعی وغیرہما کا مذہب ہے (4)۔ مگر امام مالک سے مروی ہے کہ زنا میں اہل کتاب پر حد قائم نہیں کی جائے گی، اگر مسلمان نے ذمیہ سے زنا کیا تو اسے حد لگائی جائے گی اور عورت پر حد نہ ہوگی۔ اگر دونوں زنا کرنے والے ذمی ہوں تو دونوں پر حد نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: انہیں کوڑے لگائیں جائیں گے اور انہیں رجم نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعی، امام ابویوسف اور ابوثور وغیرہم نے کہا: ان دونوں پر حد ہوگی اگر وہ ہمارے فیصلہ پر راضی ہو کر آئیں۔

ابن خویز منداد نے کہا: جب وہ ایک دوسرے پر تعدی کریں تو امام انہیں نہیں بلائے گا اور خصم کو امام کی مجلس میں حاضر نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ اس معاملہ کا تعلق ایسے مظالم سے ہو جن کی وجہ سے فساد پھیلتا ہو جیسے قتل ہے اور منازل کا چھیننا وغیرہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 283 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 130۔ ایضاً، حدیث 2969، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 258 4۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 436

ہے، رہے قرض، طلاق اور باقی تمام معاملات تو ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر ان کی باہمی رضامندی کے ساتھ۔ قاضی کو اختیار ہے کہ وہ ان کا فیصلہ نہ کرے اور انہیں ان کے حکام کی طرف لوٹا دے۔ اگر وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا تو اسلام کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے گا اور رہا مسلمانوں کے قانون پر انہیں مجبور کرنا جن کی وجہ سے انتشار پھیلتا ہو تو ہمارے اور ان کے معاہدہ کے فساد پر نہیں ہے بلکہ فساد کو ان سے اور دوسرے لوگوں سے دور کرنا واجب ہے، کیونکہ اس میں ان کے اموال اور خون کی حفاظت ہے، شاید ان کے دین میں اس کی اباحت ہو لیکن اس سے ہمارے درمیان انتشار پھیلتا ہو۔ اسی وجہ سے ہم نے انہیں سرعام شراب بیچنے سے منع کیا اور زنا اور دوسری برائیوں کے اظہار سے منع کیا تاکہ ان کے ذریعے مسلمانوں کے بے وقوف لوگ خراب نہ ہوں۔ رہا وہ حکم جو ان کے دین کے متعلق ہے مثلاً طلاق، زنا وغیرہ ان پر لازم نہیں کہ وہ ہمارے دین کی پیروی کریں ایسی صورت میں ان کے احکام کو نقصان دینا اور ان کی ملت کو تبدیل کرنا ہے، لیکن دیون اور معاملات اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ ان میں مظالم اور قطع فساد کی وجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

آیت میں ایک دوسرا قول بھی ہے وہ جو حضرت عمر بن عبدالعزیز اور نخعی سے مروی ہے کہ مذکورہ تخییر اس ارشاد سے منسوخ ہے: وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ حاکم پر واجب ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ یہ عطاء خراسانی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے، عکرمہ سے مروی ہے فرمایا: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ کو دوسری آیت وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ نے منسوخ کر دیا۔ مجاہد نے کہا: سورۃ المائدہ سے صرف دو آیتیں منسوخ ہیں۔ ایک یہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ اس کو وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ نے منسوخ کر دیا اور دوسری یہ آیت لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ اس کو فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) نے منسوخ کر دیا۔

زہری نے کہا: سنت گزر چکی ہے کہ اہل کتاب اپنے حقوق اور مواریث میں اپنے علماء کی طرف لوٹائے جائیں لیکن اگر وہ اللہ کے فیصلہ میں رغبت کرتے ہوئے آئیں تو ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ سمرقندی نے کہا: یہ قول امام ابوحنیفہ کے قول کے موافق ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا جائے گا جب تک وہ ہمارے فیصلہ پر راضی نہ ہوں۔ نحاس نے ''الناسخ والمنسوخ'' میں فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ منسوخ ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو آغاز میں یہ حکم نازل ہوا، اس وقت مدینہ میں یہود بہت تھے۔ ان کی اصلاح اسی میں تھی کہ انہیں اپنے علماء کی طرف لوٹایا جائے جب اسلام طاقتور ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور زہری، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور سدی کا قول ہے۔ یہ امام شافعی کے قول سے صحیح یہی ہے انہوں نے کتاب الجزیۃ میں فرمایا: حاکم کو کوئی اختیار نہیں جب وہ اس کے پاس اپنا فیصلہ لے آئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۠ (توبہ) یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں۔

نحاس نے کہا: یہ احتجاجات میں صحیح ترین ہے، کیونکہ جب وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ کے ارشاد کا یہ معنی ہو کہ ان پر مسلمان کے احکام

جاری ہوں گے تو واجب ہے کہ انہیں ان کے احکام کی طرف نہ لوٹایا جائے اور یہ واجب ہے تو آیت منسوخ ہوئی۔ یہی امام ابو حنیفہ، امام زفر، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ جب اہل کتاب امام کے پاس فیصلہ لے آئیں تو اسے ان سے اعراض کرنا جائز نہیں، مگر امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عورت اور اس کا خاوند آئیں تو ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے اگر صرف عورت آئے اور اس کا خاوند نہ ہو تو ان کا فیصلہ نہیں کرے گا۔

باقی علماء نے کہا: فیصلہ کیا جائے گا۔ پس اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ آیت منسوخ ہے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابن عباس کی توقیف اس میں ثابت ہے اگر حضرت ابن عباس سے حدیث مروی نہ ہوتی تو پھر ثابت ہوتا کہ یہ منسوخ ہے، کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ جب وہ امام کے پاس فیصلہ لے آئیں تو اس کے لیے ہے کہ وہ ان کے درمیان غور کرنے کے بعد ان کے درمیان غور کرے اگر وہ ان کے درمیان کوئی صحیح فیصلہ کرنے والا پائے تو اس کے پاس بھیج دے ورنہ ان سے اعراض نہ کرے بعض علماء کے نزدیک وہ فرض کا تارک ہوگا اور ایسا کام کرنے والا ہوگا جو اس کے لیے حلال اور جائز نہیں تھا۔ نحاس نے کہا: جنہوں نے کہا: یہ آیت منسوخ ہے ان کا ایک دوسرا قول بھی ہے۔ بعض نے کہا: امام پر واجب ہے جب وہ اہل کتاب سے ایک کی حدود میں سے کسی حد کو جانے تو اسے قائم کرے اگرچہ وہ اس کے پاس فیصلہ نہ بھی لے آئیں۔ ان علماء نے وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے حجت پکڑی ہے کہ دو احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں جب وہ آپ کے پاس فیصلہ لے آئیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں اگرچہ وہ آپ کے پاس فیصلہ نہ بھی لائیں جب کہ آپ ان سے مسئلہ خود جان لیں۔ انہوں نے کہا: ہم نے کتاب و سنت میں پایا ہے کہ ان پر حد قائم کی جائے گی اگرچہ وہ ہمارے پاس فیصلہ نہ بھی لائیں۔ کتاب اللہ میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء: 135) اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر گواہی دینے والے محض اللہ کے لیے۔

اور سنت میں حضرت براء بن عازب کی حدیث ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی گزرا جس کو کوڑے لگائے گئے تھے اور منہ کالا کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا تمہارے ہاں زنا کرنے والے کی یہی حد ہے؟'' انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علماء میں سے ایک شخص کو بلایا فرمایا: ''میں تجھ سے اللہ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں'' کیا تم میں زنا کرنے والے کی یہی حد ہے'' اس نے کہا: نہیں (1)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

نحاس نے کہا: انہوں نے حجت پکڑی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا فیصلہ فرمایا وہ ان کے پاس فیصلہ نہیں لائے تھے۔ اس حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر کی حدیث میں ہے کہ یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے۔ اس کو کہا جائے گا: امام مالک کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ جنہوں نے زنا کیا تھا وہ فیصلہ پر راضی ہوئے تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجم کیا تھا۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: جنہوں نے حضرت براء کی حدیث سے حجت پکڑی ہے اگر وہ غور کرتے تو اس سے حجت نہ پکڑتے، کیونکہ حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، صفحہ 187

فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا کی تفسیر ہے اس نے کہا: اگر وہ تمہیں کوڑوں کا اور منہ کالا کرنے کا فتویٰ دیں تو اسے قبول کرلو، اگر وہ رجم کا فیصلہ کریں تو اجتناب کرو۔ یہ دلیل ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنایا تھا۔ یہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں واضح ہے اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں نہیں ہے کہ زانیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنایا تھا اور وہ آپ کے فیصلے سے راضی نہیں ہوئے تھے۔ اسے کہا جائے گا کہ زانی کی حد، اللہ کے حقوق میں سے ہے حاکم پر اس کا قائم کرنا لازم ہے اور یہ معلوم ہے کہ یہود کے لیے حاکم تھا جو ان کے درمیان فیصلہ کرتا تھا اور ان پر حدود کو قائم کرتا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنایا تھا۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: قریظہ اور نضیر دو قبائل تھے۔ نضیر، قریظہ سے زیادہ معزز تھا، جب قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کا کوئی شخص قتل کر دیتا تو اس کے بدلے اسے قتل کیا جاتا اور جب بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو وہ سو وسق کھجور دیت دیتا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو بنی نضیر کے ایک شخص نے بنو قریظہ کا ایک شخص قتل کر دیا۔ انہوں نے کہا: اپنا آدمی ہمیں دو تا کہ ہم اسے قتل کر دیں۔ انہوں نے کہا: ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ۔ یعنی نفس کے بدلے نفس ہوگا اور یہ نازل ہوا (1) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ۔

وَ كَیْفَ یُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِیْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ یَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۳﴾

''اور کیسے منصف بناتے ہیں آپ کو حالانکہ ان کے پاس تورات ہے اس میں اللہ کا حکم ہے پھر وہ منہ پھیرتے ہیں (اس سے) اس کے بعد بھی اور نہیں ہیں وہ ایماندار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَیْفَ یُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِیْهَا حُكْمُ اللّٰهِ۔ حسن نے فرمایا: اس سے مراد رجم ہے۔ قتادہ نے کہا: قصاص ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: فِیْهَا حُكْمُ اللّٰهِ کا قول دلالت کرتا ہے کہ وہ منسوخ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے ابوعلی نے کہا: ہاں اگر یہ منسوخ ہوتا تو نسخ کے بعد اس پر انه حكم الله (یہ اللہ کا حکم ہے) کا اطلاق نہ ہوتا جیسا کہ شراب کی تحلیل یا ہفتہ کی تحریم پر اللہ کا حکم ہونے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۳﴾ یعنی تیرے حکم سے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ابوعلی نے کہا: جس نے اللہ کے حکم کے علاوہ کو طلب کیا جب کہ وہ اس سے راضی نہیں تو وہ کافر ہے یہی یہود کی حالت تھی۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ

1۔ سنن نسائی، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 239 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 214

یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝

”بے شک اتاری ہم نے تورات، اس میں ہدایت اور نور ہے حکم دیتے رہے اس کے مطابق انبیاء جو (ہمارے) فرمانبردار تھے یہودیوں کو اور (اسی کے مطابق حکم دیتے رہے) اللہ والے اور علماء اس واسطے کہ محافظ ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب کے اور وہ تھے اس پر گواہ، پس نہ ڈرا کرو لوگوں سے اور ڈرا کرو مجھ سے اور نہ بیچا کرو میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت سے اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے نازل فرمایا اللہ نے تو وہی لوگ کافر ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ یعنی بیان اور روشنی اور تعریف کہ حضرت محمد ﷺ حق ہیں۔ هُدًى محل رفع میں ہے مبتدا کی حیثیت سے اور نُوْرٌ اس پر معطوف ہے۔ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا۔ بعض علماء نے فرمایا: النَّبِیُّوْنَ سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں آپ کو جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ نبی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تورات کی اقامت کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا۔ یہود نے کہا: انبیاء یہود تھے۔ نصاریٰ نے کہا: انبیاء نصاریٰ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹ بیان فرمایا۔ اَسْلَمُوْا کا معنی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک انہوں نے تورات کی تصدیق کی اور ان کے درمیان ہزار نبی تھے۔ کہا جاتا ہے: چار ہزار نبی تھے۔ کہا جاتا ہے: اس سے بھی زیادہ تھے، وہ تورات میں جو احکام تھے اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اَسْلَمُوْا کا معنی ہے انہوں نے اللہ کے امر کی اطاعت کی جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے تھے۔ بعض نے فرمایا: وہ انبیاء اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے، معنی ایک ہی ہے۔ لِلَّذِیْنَ هَادُوْا یہ علی الذین ھادوا کے معنی میں ہے لام بمعنی علی ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس کے مطابق وہ انبیاء فیصلے کرتے رہے جو فرمانبردار تھے یہود کے حق میں تھے اور جو ان کے خلاف تھے۔ پس علیہم حذف کیا گیا ہے۔ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا یہاں مدح کے معنی میں نعت ہے جیسے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں ہے۔

هَادُوْا یعنی انہوں نے کفر سے توبہ کی (2)۔ بعض نے فرمایا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی ہم نے تورات کو نازل کیا اس میں ہدایت اور نور ہے یہود کے لیے، اس کے مطابق حکم دیتے رہے انبیاء اور اللہ والے اور علماء۔ یعنی اس کے مطابق اللہ والے فیصلے کرتے رہے یہ وہ لوگ تھے جو لوگوں کو اپنے علم کے ذریعے چلاتے تھے اور بڑے بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل کے ساتھ ان کی تربیت کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ آل عمران میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

ابو رزین نے کہا: الرَّبّٰنِیُّوْنَ سے مراد علماء، حکماء اور احبار ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس سے مراد فقہاء ہیں۔ الحِبر اور الحَبر عالم آدمی کو کہتے ہیں۔ یہ التحبیر سے ماخوذ ہے جس کا معنی التحسین ہے۔ فھم یحبرون العلم یعنی وہ علم کو بیان کرتے ہیں اور اس کو مزین کرتے ہیں وھو محبر فی صدورھم اور وہ ان کے سینوں میں مزین ہے۔ مجاہد نے کہا:

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 214　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 215

الرَّبّٰنِيُّوْنَ، علماء سے بلند مرتبہ ہوتے ہیں(1)۔ اس پر الف لام مبالغہ کے لیے ہے۔ جوہری نے کہا: الحِبر اور الحَبر کا ایک معنی ہے۔ یہود کے علماء۔ اور کسرہ کے ساتھ افصح ہے، کیونکہ اس کی جمع افعال کے وزن پر آتی ہے، مفعول کے وزن پر نہیں آتی۔ فراء نے کہا: حِبر کسرہ کے ساتھ عالم کو کہا جاتا ہے۔ ثوری نے کہا: میں نے فراء سے پوچھا حِبر کو حِبر کیوں کہا جاتا ہے؟ انہوں نے کہا: عالم کو حِبر اور حِبر کہا جاتا ہے مراد مداد الحبر ہے یعنی عالم کی سیاہی ہے، پھر مداد کو حذف کیا گیا جیسا کہ فرمایا: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) یعنی اهل القریة۔ فرمایا: میں نے اصمعی سے پوچھا انہوں نے فرمایا: یہ درست نہیں ہے۔ حِبر کو حَبر اس کی تاثیر کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: علی اسنانه حبر۔ یعنی اس کے دانتوں پر زردی یا سیاہی ہے۔ ابو العباس نے کہا: حَبر وہ ہے جس کے ساتھ حَبر لکھتا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ وہ تحقیق کرتا ہے۔ ابوعبید نے کہا: میرے نزدیک احبار کا واحد حَبر ہے اس کا معنی ہے جو کلام کی تحبیر، علم کی معرفت و تحسین کو جانتا ہے۔ انہوں نے کہا: تمام محدثین اسی طرح خیال کرتے ہیں یعنی فتح کے ساتھ۔ حِبر جس کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کی جگہ المِحبرۃ ہے یعنی دواۃ۔ حِبر کا معنی اثر ہے اور اس کی جمع حبور ہے۔ یہ یعقوب سے مروی ہے۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ یعنی اس کو علم ودیعت کیا گیا۔ الباء، الربانین اور الاحبار کے متعلق ہے گویا فرمایا: علماء جو محافظ ٹھہرائے گئے۔ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ یعنی وہ کتاب پر گواہ ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ نبی کریم کے حکم پر گواہ ہیں کہ یہ تورات میں ہے(2)۔ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ یعنی حضرت محمد ﷺ کی شان کے اظہار میں لوگوں سے نہ ڈرو اور رجم کے اظہار میں وَاخْشَوْنِ بلکہ اس کے چھپانے میں مجھ سے ڈرو۔ یہ خطاب یہود کے علماء کے لیے ہے اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے واجب حق کو چھپایا اور اسے ظاہر نہ کیا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کا معنی تفصیلاً گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ، کافرون، ظالمون اور فاسقون یہ سب کفار کے حق میں نازل ہوئے۔ یہ صحیح مسلم کی حدیث سے ثابت ہے جو حضرت براء سے مروی ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ رہا مسلمان تو وہ کافر نہیں ہوتا اگرچہ وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اضمار ہے یعنی جو قرآن کو رد کرتے ہوئے اللہ کے نازل شدہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا اور رسول اللہ ﷺ کے قول کے انکار کی وجہ سے اللہ کے نازل شدہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: اس پر یہ آیت عام ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حسن نے فرمایا: یہ ہر اس شخص کو عام ہے جو مسلمان، یہود اور کفار میں سے اللہ کے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا یعنی وہ یہ اعتقاد رکھتا ہو اور قرآن کے فیصلہ کے خلاف کرنا حلال سمجھتا ہو، مگر وہ شخص جس نے ایسا کیا لیکن یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ وہ حرام کا ارتکاب کر رہا ہے تو وہ فاسق مسلمانوں میں سے ہے اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے تو اسے عذاب دے چاہے تو اسے معاف کر دے۔ حضرت ابن عباس نے ایک روایت میں فرمایا: جس نے اللہ کے نازل شدہ کے مطابق فیصلہ نہیں کیا اس

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 215	2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 216

نے ایسا فعل کیا جو کفار کے افعال کے مشابہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو اللہ نے تمام نازل کیا اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا وہ کافر ہے اور جس نے توحید کا فیصلہ کیا اور بعض شرائع کا فیصلہ نہ کیا تو وہ اس آیت میں داخل نہیں صحیح پہلا قول ہے مگر شعبی نے کہا: یہ یہود کے ساتھ خاص ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا فرمایا: اس پر تین چیزیں دلالت کرتی ہیں (۱) یہود کا پہلے لِلَّذِیۡنَ هَادُوۡا میں ذکر کیا گیا ضمیر کا مرجع وہ ہیں (۲) کلام کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اس کے بعد وَ كَتَبۡنَا عَلَیۡهِمۡ ہے، یہ ضمیر بالاجماع یہود کی طرف راجع ہے، نیز یہود وہ ہیں جنہوں نے رجم اور قصاص کا انکار کیا۔ اگر کوئی کہنے والا یہ کہے: من جب مجازاۃ کے لے ہو تو عامۃ ہوتا ہے مگر جب اس کی تخصیص پر کوئی دلیل واقع ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں من بمعنی الذی ہے اس کی ہم نے ادلہ ذکر کی ہیں۔ یہود وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل شدہ کے مطابق فیصلہ نہ کیا یہ لوگ کافر ہیں، یہ عمدہ ہے اس میں سے جو کچھ اس کے بارے کہا گیا ہے۔

روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت حذیفہ سے ان آیات کے بارے میں پوچھا گیا: کیا یہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں ان کے حق میں ہیں لیکن تم ان کے راستہ پر برابر چلو گے جس طرح جوتا، جوتے کے برابر ہوتا ہے۔ بعض نے فرمایا: الکافرون مسلمانوں کے لیے الظالمون، یہود کے لیے ہے اور الفاسقون نصاریٰ کے لیے ہے۔ یہ ابو بکر بن عربی کا اختیار ہے (1)۔ فرمایا: کیونکہ یہ آیات کا ظاہر ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن زید، ابن ابی زائدہ، ابن شبرمہ اور شعبی کا مختار قول ہے۔ طاؤس وغیرہ نے کہا: کفر صرف ملت اسلامیہ (2) سے انکار نہیں ہوتا بلکہ کفر کے مراتب ہیں، کفر مختلف ہوتا ہے اگر وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جو اس کے پاس ہے اس بنا پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے پس وہ اس کو تبدیل کرتا ہے جو موجب کفر ہے۔ اگر وہ خواہش نفس اور معصیت کی بنا پر ایسا فیصلہ کرتا ہے تو وہ گناہ ہے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے یہ اہل سنت کی اصل پر ہے کہ گناہگاروں کی مغفرت ہے۔ قشیری نے کہا: خوارج کا مسلک یہ ہے کہ جو رشوت لے اور اللہ کے حکم کے علاوہ فیصلہ کرے وہ کافر ہے۔ یہ قول حسن اور سدی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حسن نے یہ بھی کہا: اللہ تعالیٰ نے حکام سے تین عہد لیے ہیں (۱) وہ خواہش کی پیروی نہیں کریں گے (۲) وہ لوگوں سے نہیں ڈریں گے اور اس سے ڈریں گے (۳) اللہ تعالیٰ کی آیات کے عوض تھوڑی سی قیمت نہیں لیں گے۔

وَ كَتَبۡنَا عَلَیۡهِمۡ فِیۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَ الۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ وَ الۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَ الۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝

"اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لیے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے لیے قصاص، تو جو شخص معاف کر دے بدلا تو یہ معافی کفارہ بن جائے گی اس کے گناہوں کا اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 305　2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 306

جسے اتارا اللہ نے تو وہی لوگ ظالم ہیں''۔

اس آیت میں تیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے تورات میں نفسوں کے درمیان برابری کی ہے۔ پس یہود نے اس کی مخالفت کی اور گمراہ ہوئے۔ نضیری کی دیت زیادہ کر دی تھی اور نضیری کو، قرظی کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاتا تھا اور قرظی کو نضیری کے بدلے قتل کیا جاتا، جب اسلام آیا تو اس مسئلہ میں بنو قریظہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع کیا آپ نے برابری کا حکم فرمایا۔ بنو نضیر نے کہا: آپ نے ہمارا مرتبہ کم کر دیا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ كَتَبْنَا کا معنی ہے، ہم نے فرض کیا۔ یہ پہلے گزر چکا ہے ان کی شریعت میں قصاص یا معافی تھی، ان میں دیت نہیں تھی جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور دوسرے علماء نے اس آیت کی بنا پر فرمایا کہ مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا، کیونکہ نفس کے بدلے نفس ہے (1)۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو کسی چیز کے ساتھ خاص کیا تھا؟ فرمایا: نہیں مگر جو اس میں ہے، انہوں نے اپنی تلوار کی نیام سے ایک تحریر نکالی اس میں یہ تھا۔ مومنین کے خون برابر ہیں غیر مسلموں پر ان کا غلبہ ہے کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور کسی ذمی کو اس کے عہد میں قتل نہیں کیا جائے گا(ا)۔ نیز یہ آیت یہود کے رد کے لیے ہے کہ وہ قبائل میں فرق کرتے تھے وہ ایک قبیلہ سے ایک شخص کے بدلے ایک شخص کو پکڑتے تھے اور دوسرے قبیلہ سے دو شخصوں کے بدلے ایک شخص کو پکڑتے تھے۔ شافعی علماء نے کہا: یہ ہم سے پہلے کی شریعت کی خبر ہے (2) اور ہم سے پہلے کی شریعت ہمارے لیے شریعت نہیں۔ سورۂ بقرہ میں ان کے رد میں اتنا کلام گزر چکا ہے جو کافی ہے، وہاں مطالعہ کریں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ یہ اہل تورات پر فرض تھا وہ ایک ملت ہیں اور ان کے لیے ذمی لوگ اس طرح نہیں تھے جس طرح مسلمانوں کے لیے ذمی لوگ ہیں، کیونکہ جزیہ، فئی اور غنیمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو عطا فرمائی اس امت سے پہلے فئی کسی کے لیے نہ تھا۔ پہلے ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، پس اس آیت نے حکم کو بنی اسرائیل پر ثابت کیا، کیونکہ ان کے خون برابر تھے۔ یہ ہم میں سے کسی کے قول کی طرح ہے کہ مسلمانوں کے برابر ہیں کہ نفس کے بدلے نفس ہے، کیونکہ وہ ایک معین قوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ان لوگوں میں حکم ہے کہ ان کے نفس کے بدلے نفس ہے پس اس آیت کے حکم سے اہل قرآن پر یہ کہنا ثابت ہوتا ہے کہ ان کے لیے آپس میں معاملہ اس طرح ہوگا نفس کے بدلے نفس۔ قرآن میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ملت کے اختلاف کے باوجود نفس کے بدلے نفس ہوگا۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 225 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 627

(ا) سنن ابی داؤد، باب ایقاد المسلم بالکافر، حدیث نمبر 3927، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے کہا: جب کسی کو زخمی کیا جائے گا یا کان یا ہاتھ کاٹا جائے گا اور پھر اسے قتل کیا جائے گا تو ایسا کرنے والے کے ساتھ بھی ایسا کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ پس جو کچھ اس نے کیا اس کے ساتھ وہی کیا جائے گا اس سے وہ لیا جائے گا جو اس نے لیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اگر تو نے اس سے مثلہ کا قصد کیا تھا تو اس کا بھی مثلہ کیا جائے گا اگر لڑائی کے دوران ناک، کان کٹ گئے تو قاتل کو تلوار کے ذریعے قتل کیا جائے گا (1)۔ وہ یہ مثلہ کے بارے میں ثابت کرتے ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے عرنیین کی آنکھوں میں لوہے کی سلائیں پھیری تھیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ۔ نافع، عاصم، اعمش اور حمزہ نے تمام میں نصب پڑھی ہے اور ان کی تخفیف جائز ہے اور تمام کو عطف اور ابتدا کی وجہ سے رفع جائز ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر، ابوعمرو اور ابوجعفر نے الجروح کے علاوہ سب کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ کسائی اور ابوعبید وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ (3)۔ تمام میں رفع پڑھتے تھے۔ ابوعبید نے کہا: ہمیں حجاج نے بتایا انہوں نے ہارون سے انہوں نے عباد بن کثیر سے انہوں نے عقیل سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ پڑھا۔ رفع تین جہات سے ہے: مبتدا اور خبر کی جہت سے اس معنی پر کہ ان کا عطف اَنَّ النَّفْسَ کے مقام پر ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ ہم نے کہا النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ تیسری وجہ زجاج نے کہا: فی النفس میں مضمر پر عطف کی بنا پر ہوگا، کیونکہ النَّفْسَ میں ضمیر محل رفع میں ہے، کیونکہ تقدیر یہ ہے ان النفس هي ماخوذة بالنفس پس اسماء ہی پر معطوف ہیں۔ ابن المنذر نے کہا: جس نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اس کو کلام کا آغاز بنایا ہے یعنی یہ مسلمانوں میں حکم ہے۔ یہ اصح قول ہے، کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت ہے وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ اسی طرح مابعد کے کلمات میں خطاب مسلمانوں کو ہے اس کا انہیں حکم دیا گیا ہے جنہوں نے رفع کے ساتھ جروح کو خاص کیا ہے انہوں نے اس کا ماقبل سے تعلق نہیں جوڑا اور اس سے نئی کلام شروع کی ہے گویا اس کا خاص طور پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اور اس کا ماقبل ان کی طرف متوجہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ آیت قصاص کے جاری ہونے پر دلالت کرتی ہے اور ابن شبرمہ نے الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ کے عموم کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے کہ دائیں آنکھ، بائیں آنکھ کے بدلے میں پھوڑی جائے گی اس طرح اس کا عکس ہوگا اور انہوں نے اس کو دائیں اور بائیں ہاتھ میں جاری کیا، انہوں نے کہا: سامنے والے دانت کو داڑھ کے بدلے میں اور داڑھ کو سامنے والے دانت کے بدلے میں توڑا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ۔ اور جنہوں نے اس کی مخالفت کی ہے وہ امت کے علماء ہیں وہ کہتے ہیں: دائیں آنکھ، دائیں آنکھ کے بدلے میں پھوڑی جائے گی اگر وہ موجود ہوگی، رضا کے ساتھ بائیں آنکھ کی طرف تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے لیے یہ بیان کرتا ہے کہ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ سے مراد مجرم سے پوری مماثلت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 625 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 217 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 197

لینا ہے دوسری چیز کی طرف تعدی جائز نہیں جس طرح پاؤں سے ہاتھ کی طرف تعدی جائز نہیں اس میں کوئی شک نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5۔** علماء کا اجماع ہے کہ جب وہ دونوں خطاءً ضائع کی جائیں گی تو ان میں دیت ہوگی، اور ایک آنکھ میں نصف دیت ہوگی (1)، اور کالے شخص کی آنکھ جب پھوڑی جائے گی تو اس میں کامل دیت ہوگی (2) یہ حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مروی ہے۔ یہی قول عبدالملک بن مروان، زہری، قتادہ، مالک، لیث بن سعد، احمد اور اسحاق کا ہے۔ بعض نے فرمایا: نصف دیت ہوگی۔ یہ حضرت عبدالله بن مغفل، مسروق، نخعی سے مروی ہے۔ یہی قول ثوری، شافعی اور نعمان کا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی قول کرتے ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے ''دونوں آنکھوں کو ضائع کرنے میں دیت ہے'' (3)۔ معقول بھی اسی طرح ہے کیونکہ ایک آنکھ میں نصف دیت ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ظاہر قیاس ہے، لیکن علماء نے کہا: کانے شخص کی منفعت ایک آنکھ کے ساتھ سلامت شخص کی منفعت کی طرح ہے پس اس پر دیت بھی اس کے مطابق ہو۔

**مسئلہ نمبر 6۔** کانے شخص کے بارے میں اختلاف ہے جب اس کی صحیح آنکھ پھوڑ دی گئی۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی سے مروی ہے کہ اس پر قصاص نہیں اس پر دیت کامل ہے (4)۔ یہی قول عطا، سعید بن مسیب اور امام احمد بن حنبل کا ہے۔ امام مالک نے کہا: اگر وہ چاہے تو قصاص لے اور اسے اندھا کر دے اگر چاہے تو پوری دیت لے لے (کانے کی آنکھ کی دیت)۔ نخعی نے کہا: اگر چاہے تو قصاص لے لے، اگر چاہے تو نصف دیت لے لے (5)۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ثوری نے کہا: اس پر قصاص ہے۔ یہ حضرت علی سے بھی مروی ہے یہ حضرت مسروق، ابن سیرین اور ابن معقل کا قول ہے۔ ابن المنذر اور ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں آنکھوں میں دیت رکھی ہے اور ایک آنکھ میں نصف دیت رکھی ہے (6)۔ صحیح آنکھ والے اور کانے کے درمیان قصاص دوسرے لوگوں کے مابین قصاص کی ہیئت پر ہوگا۔ امام احمد بن حنبل کا قول یہ ہے کہ اس سے قصاص میں بعض کے بدلے میں تمام آنکھ لینا ہے اور یہ مساوات نہیں ہے اور جو حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی سے اس کے بارے میں مروی ہے امام احمد نے اس سے استدلال کیا ہے اور امام مالک کا متمسک یہ ہے کہ دلائل جب متعارض ہوں تو جس پر جنایت کی گئی ہے اسے اختیار دیا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: قرآن کے عموم کو لینا اولیٰ ہے، کیونکہ یہ الله کے نزدیک زیادہ محفوظ و قبول ہے (7)۔

**مسئلہ نمبر 7۔** کانے کی اس آنکھ کے بارے میں اختلاف ہے جس کے ساتھ وہ دیکھتا نہیں ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے کہ اس میں سو دینار ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ اس میں آنکھ کی دیت کا تہائی ہے۔ اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس میں نصف دیت ہے، مسروق، زہری، امام مالک، امام شافعی، ابوثور، نعمان نے کہا: اس میں قاضی کا فیصلہ ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں، کیونکہ جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے وہ کم از کم ہے۔

---

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الدیۃ، جلد 9، صفحہ 222
2۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 225
3۔ سنن نسائی، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 251
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629
5۔ ایضاً
6۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الدیات، جلد 9، صفحہ 222
7۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629

**مسئلہ نمبر 8**۔ نظر کو ضائع کر دیا جب کہ آنکھ کے ڈھیلے باقی ہیں تو پوری دیت ہوگی اس میں اعمش و اخفش برابر ہیں۔ ایک آنکھ کی نظر ضائع کرنے میں نصف دیت ہے۔ ابن المنذر نے کہا: وہ بہتر ہے جو حضرت علی بن ابی طالب نے کہا ہے، انہوں نے صحیح آنکھ کو ڈھانپنے کا حکم دیا ایک شخص کو انڈا دیا وہ اسے لے کر گیا اور پیچھے وہ دیکھتا رہا حتی کہ اس کی نظر کی انتہا ہوگئی پھر آپ نے اس جگہ ایک خط کھینچنے کا حکم دیا پھر دوسری آنکھ کو ڈھانپنے کا حکم دیا اور صحیح آنکھ کھولی گئی، ایک شخص کو انڈا دیا وہ اسے لے کر گیا وہ اسے دیکھتا رہا حتی کہ اس کی نظر کی انتہا ہوگئی وہاں بھی خط کھینچنے کا حکم دیا پھر دوسری جگہ اس کے ساتھ ایسا کیا گیا تو برابر پایا گیا۔ پس اس کی آنکھ میں سے جتنی نظر کم ہوگئی تھی اتنا دوسرے کے مال سے دیا(1)۔ یہ امام شافعی کے مذہب پر ہے یہ ہمارے علماء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بعض آنکھ پھوڑنے میں قصاص نہیں، کیونکہ اس کا پورا کرنا ممکن نہیں آنکھ میں قصاص کی کیفیت اس طرح ہوگی کہ شیشہ گرم کیا جائے گا، پھر دوسری آنکھ پر روئی رکھی جائے گی، پھر وہ شیشہ اس آنکھ کے قریب رکھا جائے گا حتی کہ اس کی پتلی بہ جائے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کو مہدوی اور ابن ربی نے ذکر کیا ہے(2)، آنکھ کی پلکوں میں اختلاف ہے، حضرت زید بن ثابت نے کہا: اس میں چوتھائی دیت ہے(3)، یہ شعبی، حسن، قتادہ، ابو ہاشم، ثوری، شافعی اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ شعبی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اوپر والی پلکوں میں تہائی دیت ہے اور نیچے والی میں 2/3 (دو تہائی) دیت ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ناک کو جب اصل سے کاٹ دیا جائے تو دیت ہے''(4)۔ ابن المنذر نے کہا: اس قول پر اہل علم کا اجماع ہے۔ ناک میں قصاص اس صورت میں ہے جب جنایت عمداً ہو تو تمام اعضاء کی طرح قصاص ہوگا جیسا کہ کتاب اللہ کا ارشاد ہے۔ ناک توڑنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک عمداً ایسے کرنے میں قصاص کا نظریہ رکھتے ہیں اور خطاء میں اجتہاد کا نظریہ رکھتے ہیں۔ ابن نافع نے روایت کیا ہے کہ ناک کے لیے دیت نہیں حتیٰ کہ وہ اسے اصل سے ختم کر دے۔ ابو اسحاق تونسی نے کہا: یہ شاذ ہے، پہلا قول معروف ہے جب ہم معروف قول پر تفریع کریں گے تو بعض بینی میں اس کے حساب سے دیت ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: ناک میں سے جو کاٹا جائے گا اس کے حساب سے دیت ہوگی۔ یہ حضرت عمر بن عبد العزیز اور شعبی سے مروی ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔

ابو عمر نے کہا: ناک کی بینی میں اختلاف ہے جب کاٹی جائے اور ناک اصل سے نہ کاٹے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا کہ اس میں مکمل دیت ہے پھر اگر اس کے بعد اس میں سے کوئی چیز کاٹی گئی تو اس میں قاضی کا فیصلہ ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: ناک میں اس صورت میں دیت ہے جب کہ اس کی بینی کاٹی جائے یہ ہڈی سے کم ہے۔ ابن القاسم نے کہا: جو ہڈی سے بینی کاٹی جائے یا ہڈی سے ناک اصل سے کاٹ دی جائے آنکھوں کے نیچے سے تو اس میں دیت

---

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الدیات، جلد 8، صفحہ 87
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 628
3۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 9، صفحہ 218
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 9، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 3955، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوگی جیسے حشفہ (ذکر کا اگلا حصہ) میں دیت ہے۔ ذکر اصل سے کاٹنے میں دیت ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ ابن القاسم نے کہا: ناک چیری گئی یا توڑی گئی پھر وہ ٹیڑی ٹھیک ہوگئی تو اس میں اجتہاد ہے اس میں معلوم دیت نہیں ہے، اگر وہ بالکل صحیح لگ گئی تو اس میں کچھ نہیں۔ فرمایا: ناک میں کچھ نہیں ہے جب وہ چھیدی گئی، پھر وہ صحیح ٹھیک لگ گئی تو وہ موضحہ زخم کی طرح ہے اگر غلط ٹھیک ہوئی تو اس میں دیت ہوگی، کیونکہ اس میں سنت موجود ہے ناک چھیدنے میں کوئی اثر نہیں۔ فرمایا: ناک علیحدہ ہڈی ہے اس میں موضحہ نہیں ہے۔

امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: اس میں جائفہ نہیں ہے۔ علماء کے نزدیک جائفہ زخم اس میں ہوتا ہے جس میں جوف (خلا) ہو۔ اور المارن (ناک بینی) اس جگہ کو کہتے ہیں جو ناک میں سے نرم ہوتی ہے، اسی طرح خلیل وغیرہ نے کہا۔ ابوعمر نے کہا: روثت سے مراد بینی ہے اور ارنب سے مراد اس کی طرف ہے۔ بعض نے فرمایا: ارنبۃ، الروثۃ اور العرتمۃ ناک کی طرف کو کہتے ہیں اس پر امام مالک، امام شافعی اور کوفی علماء کا نظریہ ہے۔ اور سونگھنے کی قوت جب کم ہو جائے یا ختم ہو جائے تو قاضی کا فیصلہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ۔ ہمارے علماء نے فرمایا: جس نے کسی کے دونوں کان کاٹ دیئے تو اس پر قاضی کا فیصلہ ہوگا، دیت اس پر قوت سماعت ضائع کرنے پر ہے اس کے نقصان میں اسی طرح قیاس کیا جائے گا جس طرح آنکھ میں قیاس کیا جاتا ہے۔ ایک کان کے ضائع کرنے میں نصف دیت ہے اور اگرچہ وہ صرف اسی کان سے سنتا ہو، بخلاف کانی آنکھ کے اس میں کامل دیت ہے۔ اشہب نے کہا: اگر کان کا مسئلہ ہو تو اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا تو دونوں کانوں سے جتنا سنتا ہے اتنا ہی اگر ایک کان سے سنتا ہے تو وہ میرے نزدیک آنکھ کی طرح ہے اگر سننے میں شک ہو تو مختلف جگہوں سے آواز دے کر تجربہ کیا جائے گا اس سے قیاس کیا جائے گا اگر برابر ہو یا قریب قریب ہوں تو اسے اتنا دیا جائے گا جتنا اس کی قوت سماعت کو ضائع کیا گیا اور اس پر اس سے قسم اٹھائی جائے گی۔ اشہب نے کہا: درمیانہ درجہ کی قوت سماعت کا اندازہ لگایا جائے اگر آزمایا جائے اور اس کا قول مختلف ہو تو اس کے لیے کچھ بھی نہ ہوگا۔ عیسیٰ بن دینار نے کہا: جب اس کا قول مختلف ہوگا تو اس کے لیے کم از کم دیت ہوگی قسم کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ۔ ابن المنذر نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے دانت کا قصاص لیا اور فرمایا: کتاب اللہ میں قصاص (کا حکم) ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے فرمایا: ''دانت میں پانچ اونٹ ہیں'' (1)۔ ابن المنذر نے کہا: ہم ظاہر حدیث کے مطابق کہتے ہیں ثنایا دانتوں کو انیاب، اضراس رباعیات دانتوں پر کوئی فضیلت نہیں، کیونکہ تمام ظاہر حدیث میں داخل ہیں اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ جنہوں نے ظاہر حدیث کو لیا انہوں نے کسی دانت کو دوسرے دانت پر کوئی فضیلت نہیں دی۔ ان علماء میں عروہ بن زبیر، طاؤس، زہری، قتادہ، امام

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث نمبر 2640، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک، ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، نعمان اوز ابن الحسن ہیں۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ سے مروی ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے ہم نے حضرت عمر بن خطاب سے اس کو روایت کیا انہوں نے سامنے والے دانتوں میں پانچ فرائض کا فیصلہ فرمایا یہ پچاس دینار ہیں اور ہر فریضہ کی قیمت دس دینار ہے اور داڑھوں میں ایک ایک اونٹ کا فیصلہ کیا۔ عطا کہتے ہیں: دانتوں، رباعیات، نابین میں پانچ پانچ اونٹ ہیں اور باقی میں دو دو اونٹ ہیں اوپر والے اور نیچے والے دانت برابر ہیں، داڑھیں برابر ہیں۔

ابوعمر نے کہا: موطا میں امام مالک نے جو یحییٰ بن سعید نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے داڑھوں میں ایک ایک اونٹ کا فیصلہ کیا ہے تو اس کا مطلب ہے داڑھیں بیس ہیں، دانت بارہ ہیں۔ چار ثنایا ہیں، چار رباعیات ہیں، چار انیاب ہیں۔ حضرت عمر کے قول پر دیت اسی اونٹ ہوں گے، دانتوں میں پانچ پانچ اونٹ ہیں، داڑھوں میں ایک ایک اونٹ ہے۔ حضرت معاویہ کے قول پر داڑھوں اور دانتوں میں پانچ پانچ اونٹ ہیں اس طرح دیت ایک سو ساٹھ اونٹ ہو جائے گی۔ سعید بن مسیب کے قول پر داڑھوں میں دو دو اونٹ ہیں یہ بیس داڑھیں ہیں ان کے لیے چالیس اونٹ واجب ہوں گے۔ دانتوں میں پانچ پانچ اونٹ ہیں، یہ ساٹھ اونٹ ہو جائیں گے یہ سو اونٹوں کا تتمہ ہے یہ اونٹوں سے کامل دیت ہے۔ علماء کے درمیان اختلاف داڑھوں میں ہے نہ کہ دانتوں میں ہے۔ ابوعمر نے کہا: صحابہ اور تابعین میں سے علماء کا اختلاف دانتوں کی دیت میں ہے۔ ایک دوسرے پر ان کی تفضیل بھی بہت زیادہ ہے۔

حجت، امام مالک، ابوحنیفہ اور ثوری کے نظریہ کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”اونٹوں میں سے پانچ دانت کی دیت ہیں (1)“ اور داڑھ بھی دانتوں میں سے دانت ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”انگلیاں برابر ہیں، دانت برابر ہیں، ثنیہ اور داڑھ برابر ہیں، یہ اور یہ برابر ہیں“ (2)۔ یہ نص ہے جسے ابو داؤد نے تخریج کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو برابر لیا (3)۔ ابوعمر نے کہا: ان آثار پر فقہاء اور جمہور اہل علم کا نظریہ ہے کہ دیت میں انگلیاں تمام برابر ہیں دیت میں، تمام دانت برابر ہیں، ثنایا اور داڑھیں، انیاب، ان میں سے کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں جیسا کہ عمرو بن حزم کی کتاب میں ہے۔ ثوری نے ازہر بن محارب سے روایت کیا ہے فرمایا: شریح کے پاس دو شخص جھگڑا لے کر آئے ایک نے دوسرے کے ثنیہ کو مارا تھا اور دوسرے نے اس کی داڑھ پر مارا تھا، شریح نے کہا: ثنیہ اور اس کا جمال، داڑھ اور اس کی منفعت دانت کے بدلے دانت ہے۔ ابوعمر نے کہا: آج تمام شہروں میں اسی پر عمل ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اگر کسی کا کسی نے دانت پر مارا اور وہ سیاہ ہو گیا تو اس میں پوری دیت ہوگی، یہ امام مالک، لیث بن سعد کے نزدیک ہے اور امام ابوحنیفہ نے یہی کہا ہے (4)۔ حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا گیا ہے اور یہی سعید بن

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث نمبر 2639، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 271۔ ایضاً، حدیث نمبر 3952، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629

مسیب، زہری، حسن، ابن سیرین اور شریح کا قول ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ اس میں دیت کا ثلث 1/3 ہے(1)۔ یہی قول احمد اور اسحاق کا ہے۔ امام شافعی اور ابوثور نے کہا: اس میں قاضی کا فیصلہ ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک یہ خلاف ہے اس لیے اتفاق کی طرف رجوع کیا جائے گا، اگر اس کا سیاہ ہونا اس کی منفعت کو بھی ضائع کر چکا ہے اور صرف اس کی صورت باقی ہے جیسے شل ہاتھ ہوتا ہے اور اندھی آنکھ ہوتی ہے، دیت کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں پھر اگر اس کی منفعت میں سے کچھ باقی ہو یا کل منفعت باقی ہو تو منفعت میں سے جتنی کمی ہوئی ہے حکومت اتنی مقدار ثابت کرے گی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو اس میں ثلث دیت مروی ہے وہ فقہ اور سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ بچے کے دانت اکھیڑنے میں اختلاف ہے جب کہ وہ دودھ والے دانت گرنے سے پہلے ہو۔ امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے کہتے ہیں: جب بچے کا دانت اکھیڑا جائے گا اور وہ پھر پیدا ہو جائے گا تو اکھیڑنے والے پر کچھ نہ ہوگا مگر امام مالک اور امام شافعی نے کہا: جب وہ اس سے لمبائی میں کم پیدا ہو جو اس کے قریب والا ہے تو جتنا کم ہے اس کی مقدار اس سے چٹی وصول کی جائے گی۔ ایک جماعت نے کہا: اس میں قاضی فیصلہ کرے گا، یہی شعبی سے مروی ہے اور یہی نعمان کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اس وقت تک تاخیر کی جائے گی یہاں تک کہ اہل معرفت کہیں کہ اب دانت نہیں اگے گا، جب ایسا ہوگا تو اس میں دیت کی مکمل مقدار ہوگی جیسا کہ ظاہر حدیث ہے۔ اگر وہ اگ آئے گا تو چٹی واپس کر دی جائے گی۔ اکثر اہل علم فرماتے ہیں ایک سال تک تاخیر کی جائے گی۔ یہ حضرت علی، حضرت زید، حضرت عمر بن عبدالعزیز، شریح نخعی اور قتادہ، امام مالک، اصحاب الرائے سے مروی ہے۔ امام شافعی نے اس کے لیے کوئی مدت متعین نہیں کی۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جب بڑے شخص کا دانت اکھیڑا گیا، پھر اس کی دیت لی گئی، پھر وہ دانت اگ آیا تو امام مالک نے کہا: جو اس سے لیا گیا تھا وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ کوفیوں نے کہا: جب دانت اگ آئے گا تو اسے دیت واپس کی جائے گی(3)۔ امام شافعی کے دو قول ہیں: واپس کی جائے گی اور واپس نہیں کی جائے گی، کیونکہ یہ اس کا اگنا عادۃً جاری نہیں ہے اور نادر کے ساتھ حکم ثابت نہیں ہوتا یہ ہمارے علماء کا قول ہے۔ کوفیوں نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ اس کا عوض اگ آیا ہے، پس دیت واپس کی جائے گی اس کی اصل چھوٹے کا دانت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر اگر کسی دوسرے محرم نے جنایت کی حالانکہ وہ صحیح پیدا ہو چکا تھا تو اس میں مکمل چٹی ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: یہ اصح قول ہے، کیونکہ ان سے ہر ایک دانت کو اکھیڑنے والا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانت میں پانچ اونٹوں کا فیصلہ فرمایا(4)۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اگر کسی آدمی نے کسی کا دانت اکھیڑ دیا، پھر اس نے دانت والے کو دانت لوٹا دیا، پھر وہ لگ گیا تو اس میں ہمارے نزدیک کچھ نہیں ہے(5)۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کے لیے دانت کو لوٹانا جائز نہیں، کیونکہ وہ نجس ہے۔ یہ ابن

1۔ السنن الکبری للبیہقی، کتاب الدیات، جلد 8، صفحہ 91
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، صفحہ 194
5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 629

مسیب اور عطا کا قول ہے۔ اگر وہ اسے لوٹا دے اور اس نے اس کے ساتھ نمازیں پڑھیں تو وہ ہر نماز کا اعادہ کرے جو اس نے اس کے ساتھ پڑھی تھیں کیونکہ وہ دانت مردار تھا، اسی طرح اگر کسی کا کان کاٹا گیا پھر خون کی حرارت کی وجہ سے وہ لوٹ گیا اور چمٹ گیا۔ عطا نے کہا: سلطان اسے اس کے اکھیڑنے پر مجبور کرے، کیونکہ وہ مردار اس نے چمٹایا ہے (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ غلط ہے، وہ شخص جاہل رہا جس پر یہ مخفی رہا کہ اس کا دوبارہ اس صورت میں لوٹنا اس حکم کے ساتھ لوٹنے کا موجب نہیں، کیونکہ نجاست انفصال کی وجہ سے تھی اور وہ متصل لوٹ گیا اور احکام شریعت اعیان کے لیے صفات نہیں بلکہ یہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قول کی طرف لوٹتے ہیں اور ان کے متعلق اس کے خبر دینے کی طرف لوٹتے ہیں (2)۔

میں کہتا ہوں: جو ابن عربی نے عطا سے حکایت کیا ہے وہ اس کے خلاف ہے وہ ابن المنذر نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اس دانت میں اختلاف ہے جو قصاصاً اکھیڑا گیا پھر وہ اسی جگہ لوٹا دیا گیا اور وہ اگ آیا۔ عطا خرسانی اور عطا بن ابی رباح نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ ثوری، احمد اور اسحاق نے کہا: اسے اکھیڑا جائے گا، کیونکہ قصاص عیب کے لیے ہوتا ہے۔ امام شافعی نے کہا: اس پر دوبارہ لگانا جائز نہیں، کیونکہ وہ نجس ہے سلطان اسے اکھیڑنے پر مجبور کرے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اگر اس کے لیے زائد دانت ہو اور وہ اکھیڑ دیا گیا تو اس میں قاضی کا فیصلہ ہوگا، فقہاء الامصار کا یہی قول ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے کہا: اس میں دیت کا تہائی ہے۔ ابن عربی نے کہا: تقدیر میں اس کی کوئی دلیل نہیں پس فیصلہ زیادہ عدل ہے (3)۔ ابن المنذر نے کہا: جو حضرت زید سے روایت کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: دانت جب اس کا بعض توڑا جائے گا تو مالک کو اس کے حساب سے دیا جائے گا (4)۔ یہ امام مالک اور امام شافعی وغیرہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: جو اللہ تعالیٰ نے بطور نص اعضاء ذکر فرمائے وہ تو یہاں تک ختم ہو گئے اور ہونٹوں اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ جمہور علماء نے فرمایا: ہونٹوں میں دیت ہے اور ہر ایک ہونٹ میں نصف دیت ہے اوپر والے کو نیچے والے پر کوئی فضیلت نہیں۔ حضرت زید بن ثابت، سعید بن مسیب اور زہری سے مروی ہے کہ اوپر والے ہونٹ میں ثلث 1/3 دیت ہے اور نیچے والے ہونٹ میں 2/3 دو ثلث دیت ہے ابن المنذر نے کہا: میں پہلے قول کا قائل ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''ہونٹوں میں دیت ہے (5)'' نیز دونوں ہاتھوں میں دیت ہے اور ان کے منافع مختلف ہیں اور ہونٹوں میں سے جتنا کاٹا جائے گا اس کے حساب سے دیت ہوگی۔ رہی زبان تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''زبان میں دیت ہے (6)'' اس قول پر اہل مدینہ، اہل کوفہ، اصحاب حدیث اور اہل الرائے میں سے اہل علم کا اجماع ہے، یہ ابن المنذر نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو کسی کی زبان پر جنایت کرتا ہے اور اس کی زبان میں

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 630 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الدیات، جلد 8، صفحہ 91 — 5۔ موطا امام مالک، کتاب العقول، صفحہ 671 — 6۔ ایضاً

سے کچھ کاٹ دیتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ بعض کلام نہیں کر سکتا ہے۔ اکثر اہل علم نے کہا: اٹھائیس حروف ہیں جتنے وہ ادا نہیں کر سکتا اس کی مقدار کو دیکھا جائے گا اس کے مطابق دیت ہوگی، اگر وہ بالکل کلام نہیں کر سکتا تو اس میں مکمل دیت ہوگی یہ امام مالک، امام شافعی، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا: زبان میں قصاص نہیں، کیونکہ قصاص کو پوری طرح حاصل کرنا ممکن نہیں اگر ممکن ہو تو قصاص اصل ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ گونگے کی زبان کاٹ دی گئی ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ شعبی، امام مالک، اہل مدینہ، اہل عراق، امام شافعی، ابوثور، نعمان اور ان کے ساتھیوں نے کہا: اس میں فیصلہ ہے (2)۔ ابن المنذر نے کہا: اس میں دو پختہ قول ہیں (۱) نخعی کا قول ہے کہ اس میں دیت ہے (3) (۲) قتادہ کا قول ہے کہ اس میں دیت کا تہائی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: پہلا قول اصح ہے، کیونکہ جو اس کے متعلق کہا گیا ہے وہ کم از کم ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے اعضاء کا ذکر فرمایا اور باقی کو ان پر قیاس کے لیے چھوڑ دیا۔ ہر عضو میں قصاص ہوتا ہے جب قصاص لینا ممکن ہو اور اس پر موت کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح ہر عضو جس کی منفعت باطل ہو اور اس کی صورت باقی ہو تو اس میں قصاص نہیں ہے اس میں دیت ہے، کیونکہ اس میں قصاص ممکن نہیں (4)۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ زخموں میں قصاص ہے سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے اس میں قصاص نہیں جس میں جسم کے ضیاع کا اندیشہ ہو اور جو قصاص تک نہ پہنچتا ہو مگر یہ کہ مارنے والا خطا کرے یا زیادتی یا کمی کر دے۔ جان بوجھ کر زخم لگانے کی وجہ سے قصاص ہوگا اگر ممکن ہو۔ یہ تمام قتل عمد میں ہے، رہا خطا تو اس میں دیت ہوتی ہے اسی طرح خطاءً زخم لگا تو اس میں دیت ہوگی۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک انسان کو زخمی کر دیا اور وہ جھگڑا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قصاص ہوگا، قصاص ہوگا''۔ ام الربیع نے کہا: یا رسول اللہ! کیا فلانہ سے قصاص لیا جائے گا؟ اللہ کی قسم! ان سے قصاص نہیں لیا جائے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ! اے ام الربیع! کتاب اللہ کا حکم قصاص ہے''۔ ام الربیع نے کہا: نہیں اللہ کی قسم اس سے کبھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔ وہ یہی کہتی رہی حتی کہ انہوں نے دیت قبول کر لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم اٹھا دیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتا ہے'' (5)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں زخمی عورت جاریہ تھی اور زخم اس کے دانت کا توڑنا تھا۔ نسائی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ ان کی پھوپھی نے جاریہ کا دانت توڑ دیا تو اللہ کے نبی نے قصاص کا فیصلہ کیا، ان کے بھائی انس بن نضر نے کہا: کیا فلانی کا دانت توڑا جائے گا؟ نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ فرمایا: پہلے اس کے اہل سے وہ عفو اور دیت کا سوال کر رہے تھے جب اس کے بھائی انس کے چچا نے قسم اٹھائی۔ جنگ احد میں یہ شہید ہوئے تھے۔ تو قوم معاف کرنے پر راضی ہو گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 630 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 631 5۔ صحیح مسلم، کتاب القسامہ، جلد 2، صفحہ 59

ہوتے ہیں اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم اٹھائیں تو اللہ اسے پورا کر دیتا ہے"۔ ابوداؤد نے اس کو تخریج کیا ہے میں نے امام احمد بن حنبل کو سنا ان سے پوچھا گیا: دانت کا کیسے قصاص لیا جائے گا؟۔ انہوں نے کہا: ٹھنڈا کیا جائے گا (1)۔

میں کہتا ہوں: دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے ان میں سے ہر ایک نے قسم اٹھائی ہو اور اللہ نے ان کی قسم پوری کی ہو۔ اس میں کرامات اولیاء کا ثبوت ہے جیسا کہ اس کا بیان حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اولیاء کی کرامات پر ایمان لانے پر ثابت رکھے اور بغیر محنت اور فتنہ ان کی لڑی میں پرودے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ علماء کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ یہ عمداً ہو تو پھر ہے، جس نے عمداً کسی کا دانت توڑ دیا تو حضرت انس کی حدیث کے مطابق اس میں قصاص ہے (2)۔ باقی جسم کی ہڈیوں میں علماء کا اختلاف ہے جب وہ عمداً توڑی گئی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: جسم کی تمام ہڈیوں میں قصاص ہے مگر جو نفس کو ضائع کر دے مثلاً ران، صلب، دماغ کا زخم منقلہ (جو ہڈی منتقل کر دے) ہاشمہ (جو ہڈی توڑ دے) ان میں دیت ہے۔ کوفیوں نے کہا: سوائے دانت کے کسی ہڈی میں قصاص نہیں ہے جو توڑی جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ۔ یہ لیث اور امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے کہا: کبھی توڑنا، توڑنے کی طرح نہیں ہوسکتا پس یہ ممنوع ہے۔ طحاوی نے کہا: علماء کا اتفاق ہے کہ سر کی ہڈی میں قصاص نہیں ہے، اسی طرح تمام ہڈیوں میں قصاص نہیں ہے۔ امام مالک کی حجت دانت میں حضرت انس کی حدیث ہے، اسی طرح تمام ہڈیوں کا حکم ہے سوائے ایک ہڈی کے علماء کا اجماع ہے کہ اس میں قصاص نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نفس کے ضیاع کا اندیشہ ہے۔ ابن المنذر نے کہا: جس نے کہا ہڈی میں قصاص نہیں وہ حدیث کی مخالفت کرنے والا ہے اور نظر کی طرف خروج خبر کے ہوتے ہوئے جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس پر فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (بقرہ: 194) اور یہ ارشاد: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) دلالت کرتا ہے اور جس پر علماء کا اجماع ہے وہ ان آیات میں داخل نہیں۔ (و باللہ التوفیق)

**مسئلہ نمبر 24**۔ ابوعبید نے کہا: نبی کریم ﷺ کی موضحہ کے بارے میں حدیث ہے (ا) اور دوسرے زخموں کے بارے میں غیر سے مروی ہے۔ اصمعی وغیرہ نے کہا: اس کی کلام کا بعض، بعض میں داخل ہے۔ زخموں میں سے پہلا حارصہ زخم ہے جو جلد کو تھوڑا سا چیر دیتا ہے، اسی سے ہے حرص القصار الثوب ہے جس کا معنی اس نے کپڑے کو چیر دیا اس کو الحرصہ بھی کہا جاتا ہے، پھر الباضعۃ ہے جو جلد کے بعد گوشت کو کاٹ دیتا ہے پھر المتلاحمہ ہے جو صرف جلد میں لگتا ہے اور اس جھلی تک نہیں پہنچتا جو گوشت اور ہڈی کے درمیان ہوتی ہے۔ واقدی نے کہا: یہ ہمارے نزدیک الملطی ہے۔ دوسروں نے کہا: یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 275　2۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1018

(ا) سنن ابن ماجہ، باب الموضحۃ، حدیث نمبر 2644، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الملطاۃ ہے فرمایا: یہ وہ ہے جس کے بارے میں حدیث ہے: یُقْضَی فِی المِلْطَاۃ بِدَمِهَا پھر الموضحۃ زخم ہے یہ وہ زخم ہے جس سے ہڈی بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ابو عبید نے کہا: زخموں میں قصاص نہیں ہے مگر صرف موضحہ میں، کیونکہ اس کے علاوہ کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ دوسرے زخموں میں دیت ہے پھر الھاشمۃ ہے جو ہڈی کو توڑ دیتا ہے پھر المنقلۃ ہے جو ہڈی کو توڑ دیتا ہے۔

پھر الآمۃ ہے اس کو المامومۃ بھی کہا جاتا ہے یہ وہ ہے جو دماغ تک پہنچتا ہے۔ ابو عبید نے کہا: یقضی فی الملطاۃ بدمھا جب زخم لگانے والا زخم لگائے گا تو اس پر زخمی کے لیے زخم لگانے کے وقت فیصلہ کیا جائے گا اور اس میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔ اور فرمایا: اور ہمارے نزدیک تمام زخموں میں تاخیر کی جائے گی حتی کہ اس کے انجام کو دیکھا جائے گا پھر اس وقت اس میں حکم لگایا جائے گا۔ ابو عبید نے کہا: ہمارے نزدیک تمام زخموں میں تاخیر کی جائے گی۔ ہمیں ہشیم نے بتایا انہوں نے حصین سے روایت کیا فرمایا: حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: موضحہ سے جو کم زخم ہے وہ خدوش ہے اور اس میں صلح ہے (1)۔ حسن بصری نے کہا: موضحہ سے کم میں قصاص نہیں ہے۔ امام مالک نے کہا: موضحہ سے کم میں یعنی ملطی، دامیہ، باضعہ میں قصاص ہے اسی طرح کوفیوں نے کہا: اور انہوں نے سمحاق کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ابن المنذر نے حکایت کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا: الدامیۃ وہ زخم ہے جس سے خون نکلے۔ الدامعہ وہ ہے جس سے خون بہے۔

موضحہ سے کم میں قصاص نہیں۔ جوہری نے کہا: دامیہ وہ زخم ہے جس سے خون نہیں بہتا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دامیہ وہ ہے جس سے خون بہتا ہے موضحہ کے بعد قصاص نہیں ہے ہاشمہ ہڈی کے لیے ہے اور منقلۃ میں خاص اختلاف ہے۔ الامہ جو دماغ تک پہنچتا ہے۔ دامغۃ جو دماغ کے پردے کو پھاڑنے والا ہے اور جسم کے ہاشمۃ زخم میں قصاص ہے مگر جو مخوف ہو جیسے ران وغیرہ کا زخم رہا، ھاشمۃ الراس (سر کا زخم)۔ تو ابن القاسم نے کہا: اس میں قصاص نہیں ہے، کیونکہ وہ ضروری طور پر منقلہ ہو جاتا ہے۔ اشہب نے کہا: اس میں قصاص ہے مگر یہ ہے وہ منقلہ ہو جائے جس میں قصاص نہیں ہے۔ رہے اطراف تو تمام جوڑوں میں قصاص ہے مگر ان میں سے جس سے نفس کے ضیاع کا خدشہ ہو۔ جوڑوں سے مراد ناک کی بینی کا بعض، کانوں کا بعض، ذکر کا بعض، پلکوں کا بعض، ہونٹوں کا بعض ہے، کیونکہ یہ تقدیر کو قبول کرتے ہیں۔

زبان کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ہڈیوں کو توڑنے میں قصاص ہے مگر جو انسان کو تلف کرنے والی ہوں جیسے سینے، گردن، پیٹھ، ران وغیرہ کی ہڈیاں۔ بازو کی ہڈی توڑنے میں قصاص ہے۔ ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اس شخص کی ران توڑنے کا فیصلہ فرمایا جس نے کسی کی ران توڑی تھی۔ عبد العزیز بن عبد اللہ بن خالد بن اسید نے مکہ میں اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا کیا تھا یہ امام مالک کا مذہب ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: علماء کے نزدیک اس پر اجماع ہے اور ہمارے شہروں میں اس شخص کے بارے میں معمول یہ ہے جو کسی کو مارتا ہے پھر ہاتھ سے اس کی ہڈی کو توڑ دیتا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ علماء نے فرمایا: سر میں زخم اور بدن میں زخم جو ہوتے ہیں ان میں اہل علم کا اجماع ہے کہ موضحہ سے کم

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الدیات، جلد 8، صفحہ 83

میں چٹی ہے جیسا کہ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے اور اس چٹی میں اختلاف ہے۔ موضحہ سے جو کم زخم ہیں وہ پانچ ہیں:۔ دامیہ، دامعۃ، باضعہ، متلاحمہ اور السمحاق۔ امام مالک، امام شافعی، احمد اور اسحاق اور اصحاب الرائے نے کہا: دامیۃ میں قاضی کا فیصلہ ہے اور باضعہ میں فیصلہ ہے اور متلاحمہ میں بھی فیصلہ ہے۔ عبدالرزاق نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے فرمایا: دامیۃ میں اونٹ ہے، باضعۃ میں دو اونٹ ہیں، متلاحمۃ میں تین اونٹ ہیں، سمحاق میں چار اونٹ ہیں، موضحۃ میں پانچ اونٹ ہیں، ہاشمۃ میں دس اونٹ ہیں، منقلۃ میں پندرہ اونٹ ہیں، مامومۃ میں دیت کا تہائی ہے اور جو شخص جو کسی کو مارتا ہے حتی کہ اس کی عقل ضائع ہو جائے تو اس میں پوری دیت ہے یا وہ اسے مارے حتی کہ اس کے ناک سے آواز نکل جائے اور بات نہ سمجھا سکے تو اس میں پوری دیت ہوگی یا آنکھ کی پلکوں میں دیت کا چوتھائی ہے اور پستان کے منہ میں چوتھائی دیت ہے (1)۔ ابن المنذر نے کہا: حضرت علی سے سمحاق (وہ زخم جو ہڈی اور گوشت کے درمیانی جھلی تک پہنچ جائے) میں زید کے قول کی مثل مروی ہے۔

حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ان میں موضحہ کا نصف ہے۔ حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز اور نخعی نے کہا: اس میں فیصلہ ہوگا (2)، اسی طرح امام مالک، امام شافعی اور احمد نے کہا ہے۔ علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ موضحۃ میں پانچ اونٹ ہیں جیسا کہ عمرو بن حزم کی حدیث میں ہے اس میں موضحہ میں پانچ اونٹ ہیں۔ اور اہل علم کا اجماع ہے کہ موضحہ سر اور چہرے میں ہوگا اور چہرے کے موضحہ کو سر کے موضحہ پر فضیلت میں اختلاف ہے (3)۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ دونوں برابر ہیں ان کے قول کے مطابق تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام شافعی اور اسحاق کا قول ہے۔ سعید بن مسیب سے چہرے کے موضحہ کی سر کے موضحہ پر دو گنا دیت مروی ہے۔ احمد نے کہا: چہرے کا موضحہ اس لائق ہے کہ اس میں زیادہ دیت رکھی جائے۔ امام مالک نے کہا: المامومہ، المنقلہ اور الموضحہ صرف سر اور چہرے میں ہوتے ہیں اور مامومہ خاص سر میں ہوتا ہے جب وہ دماغ تک پہنچ جائے۔ فرمایا: موضحہ وہ ہوتا ہے جو سر کی کھوپڑی میں ہوتا ہے اور جو اس سے نیچے ہے وہ گردن سے ہے اور وہ موضحہ نہیں ہے۔ امام مالک نے کہا: ناک سر میں سے نہیں ہے اس میں موضحہ نہیں ہے اسی طرح نیچے جو ٹھوڑی پر زخم ہے اس میں موضحہ نہیں ہے۔ جو سر اور چہرہ کے علاوہ موضحہ ہے اس میں اختلاف ہے۔ اشہب اور ابن القاسم نے کہا: جس کے موضحہ، منقلہ، مامومۃ میں اجتہاد ہے اس میں مخصوص چٹی نہیں ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ امام مالک، ثوری، امام شافعی، احمد، اسحاق کا قول ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ عطا خراسانی سے مروی ہے کہ موضحہ جب انسان کے جسم میں ہو تو اس میں پچیس دینار ہیں ابو عمر نے کہا: امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب کا اتفاق ہے کہ جس نے کسی کو دو مامومہ اور دو موضحہ یا تین مامومۃ یا موضحات لگائے یا ایک ضرب میں اس سے زیادہ زخم لگائے اگر وہ پھٹ کر ایک زخم بن گئے ہوں تو ان تمام میں ایک کامل دیت ہوگی۔ رہا ہاشمۃ (زخم) ہمارے نزدیک اس میں دیت نہیں بلکہ فیصلہ ہے۔

ابن المنذر نے کہا: میں نے مدنی علماء کی کتب میں ہاشمۃ کا ذکر نہیں پایا بلکہ امام مالک نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے کسی کا ناک توڑ دیا اگر وہ خطأ تھا تو اس میں اجتہاد ہے۔ حسن بصری نے کہا: ہاشمۃ میں کوئی چیز مقرر نہیں۔ ابو ثور نے کہا: اگر ان

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب العقول، جلد 9، صفحہ 207　　2۔ ایضاً، صفحہ 206　　3۔ ایضاً

میں اختلاف ہو تو اس میں فیصلہ ہے۔ ابن المنذر نے کہا: نظر اس پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اس میں نہ سنت ہے اور نہ اجماع۔ قاضی ابوالولید الباجی نے کہا: اس میں وہی ہوگا جو موضحہ میں ہوتا ہے، اگر منقلہ بن جائے تو پندرہ اونٹ ہیں، اگر مامومہ بن جائے تو تہائی دیت ہے، ہم نے اکثر علماء کو پایا اور ہمیں اہل علم کی رائے پہنچی وہ ہاشمۃ میں دس اونٹ مقرر کرتے ہیں۔ ہم نے یہ قول حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا۔ یہی قتادہ اور عبید اللہ بن الحسن اور امام شافعی کا قول ہے۔ ثوری اور اصحاب الرائے نے کہا: اس میں ہزار درہم ہے اور ان کی مراد دیت کا دسواں ہے۔ رہا منقلہ تو ابن المنذر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''منقلہ میں پندرہ اونٹ ہیں (1)'' اس قول پر علماء کا اجماع ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اہل علم نے کہا: منقلہ وہ ہے جس سے ہڈیاں منتقل ہو جاتی ہیں۔ امام مالک اور امام شافعی، احمد اور اصحاب الرائے نے کہا۔ یہی قتادہ اور ابن شبرمہ کا قول ہے کہ منقلہ میں قصاص نہیں ہے، ہم نے حضرت ابن زبیر سے روایت کیا۔ ان سے ثابت نہیں ہے۔ کہ انہوں نے منقلہ کا قصاص لیا۔

ابن المنذر نے کہا: پہلا قول اولیٰ ہے، کیونکہ میں کسی ایک کو نہیں جانتا جو اس میں مخالفت کرتا ہو۔ رہا مامومۃ تو ابن المنذر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''مامومۃ میں دیت کا تہائی ہے'' (2)۔ اس پر علماء کا اجماع ہے سوائے مکحول کے کسی کو نہیں جانتا جس نے اس میں مخالفت کی ہو۔ مکحول نے کہا: جب مامومۃ عمداً ہو تو اس میں دو تہائی دیت ہے، جب خطأً ہو تو اس میں ایک تہائی دیت ہے۔ یہ شاذ قول ہے۔ میں بھی پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں: مامومۃ میں قصاص کے بارے میں اختلاف ہے اکثر اہل علم نے فرمایا: اس میں قصاص نہیں ہے۔ حضرت ابن زبیر سے مروی ہے کہ انہوں مامومۃ کا قصاص لیا تو لوگوں نے اس پر انکار کیا۔ عطا نے کہا: ہم نے کوئی ایسا آدمی نہیں جانا جس نے حضرت ابن زبیر سے پہلے قصاص لیا ہو۔ رہا جائفہ تو اس میں دیت کا تہائی ہے جیسا کہ عمرو بن حزم کی حدیث ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں سوائے اس روایت کے جو مکحول سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب یہ عمداً ہو تو اس میں دو تہائی دیت ہے، اگر خطا ہو تو ایک تہائی دیت ہے۔ جائفہ وہ ہے جو جوف تک پھٹ جائے اگرچہ سوئی کے داخل ہونے جتنا ہو اگر دو جہتوں سے آر پار ہو جائے تو وہ دو جائفے شمار ہوں گے اس میں دو تہائی دیت ہے۔ اشہب نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق نے آر پار ہونے والے جائفہ کی دیت، دو جائفہ کے برابر فرمائی۔ عطا، امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے کہتے ہیں: جائفہ میں قصاص نہیں ہے۔ ابن المنذر نے کہا: میں بھی یہی کہتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 26۔** اللطمہ (طمانچہ) اور اس کے مشابہ کے قصاص کے بارے اختلاف ہے۔ بخاری نے حضرت ابوبکر، حضرت علی حضرت ابن زبیر اور حضرت سوید بن مقرن رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے طمانچہ کا قصاص لیا (3)۔ حضرت عثمان اور حضرت خالد بن ولید سے اسی کی مثل مروی ہے۔ یہ شعبی اور اہل حدیث کی جماعت کا قول ہے۔ لیث نے کہا: اگر طمانچہ آنکھ میں ہو تو اس میں قصاص نہیں کیونکہ آنکھ کے ضیاع کا اندیشہ ہے اور سلطان اس کو سزا دے۔ اگر رخسار پر ہو تو اس میں قصاص ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: طمانچہ میں قصاص نہیں ہے۔ حسن اور قتادہ سے یہ مروی ہے اور امام مالک، کوفیوں اور امام

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب العقول، جلد 9، صفحہ 214
2۔ مؤطا امام مالک، کتاب العقول، صفحہ 668
3۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1018

شافعی کا یہی قول ہے۔امام مالک نے اس میں حجت پکڑتے ہوئے کہا: مریض، کمزور کا طمانچہ قوی کے طمانچہ کی طرح نہیں ہے۔ کالے غلام کو ایک عظیم شخص کی مثل طمانچہ نہیں مارا جائے گا، ان میں اجتہاد ہے، کیونکہ ہم طمانچہ کی مقدار سے ناواقف ہیں۔

**مسئلہ نمبر 27**۔کوڑے مارنے کی وجہ سے قصاص میں اختلاف ہے۔لیث اور حسن نے کہا: اس سے قصاص لیا جائے گا اور تعدی کے لیے اس پر زیادہ بھی کیا جائے گا۔ابن القاسم نے کہا: اس سے قصاص لیا جائے گا اور کوفیوں اور امام شافعی کے نزدیک قصاص نہیں لیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اسے زخمی کر دے۔امام شافعی نے فرمایا: اگر کوڑے نے زخمی کر دیا تو اس میں فیصلہ ہوگا۔ابن المنذر نے کہا: کوڑے یا لاٹھی یا پتھر میں سے جو لگا اور وہ عمداً تھا تو اس میں قصاص ہے۔یہ اصحاب الحدیث کی ایک جماعت کا قول ہے۔بخاری میں ہے حضرت عمر نے درہ مارنے کی وجہ سے قصاص لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین کوڑوں کی وجہ سے قصاص لیا شریح نے کوڑے اور خموش (خراش) کی وجہ سے قصاص لیا(1)۔

ابن بطال نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھر والوں کو دوائی پلانے کی حدیث اس کے لیے حجت ہے جس نے کہا: ہر تکلیف میں قصاص ہے اگرچہ زخمی نہ بھی ہو۔

**مسئلہ نمبر 28**۔عورتوں کے زخموں کی دیت میں اختلاف ہے۔مؤطا میں ہے امام مالک نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: مرد کی دیت کے تہائی تک تو عورت کی دیت برابر ہے، عورت کی انگلی، مرد کی انگلی کی طرح ہے، اور اس کا دانت مرد کے دانت کی طرح ہے، اس کا موضحہ، مرد کے موضحہ کی طرح ہے، اس کا منقلہ مرد کے منقلہ کی طرح ہے(2)۔ابن بکیر نے کہا: امام مالک نے کہا: جب کوئی ایسی جنایت عورت پر کی جائے جو مرد کی دیت کی تہائی تک پہنچ جائے تو وہ مرد کی دیت سے نصف ہوگی(3)۔ابن المنذر نے کہا: ہم نے یہ قول حضرت عمر اور حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔اور سعید بن مسیب، عمر بن عبدالعزیز، حضرت عروہ بن زبیر، زہری، قتادہ، ابن ہرمز، امام مالک، امام احمد بن حنبل، عبدالملک بن الماجشون کا بھی یہی قول ہے۔ایک جماعت نے کہا: عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے خواہ وہ زیادہ ہو یا کم ہو، ہم نے یہ قول حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے(4)۔ثوری، شافعی، ابوثور، نعمان اور ان کے شاگردوں نے بھی یہی کہا ہے انہوں نے یہ حجت پکڑی ہے کہ کثیر دیت پر جب اجماع ہے تو قلیل بھی اس کی مثل ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 29**۔قاضی عبدالوہاب نے کہا ہر وہ عضو جس میں صرف جمال ہے منفعت کوئی نہیں ہے تو اس میں فیصلہ ہوگا جیسے ابرو، داڑھی کے بالوں کا ضائع کر دینا، سر کے بالوں کو ضائع کر دینا، مرد کے پستان وغیرہ۔اور فیصلہ کا طریقہ یہ ہوگا کہ جس پر جنایت کی گئی ہے اس کی قیمت لگائی جائے گی قیمت میں سے جتنی کم ہوگی وہ دیت کی جزا ہوگی خواہ وہ کہیں تک پہنچ جائے۔یہ ابن المنذر نے اہل علم سے حکایت کیا ہے۔فرمایا: اس میں اہل معرفت میں سے دو ثقہ آدمیوں کا قول قبول کیا جائے

1۔صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1018
2۔مؤطا امام مالک، کتاب العقول، صفحہ 670
2۔ایضاً
4۔السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الدیات، جلد 8، صفحہ 96

گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک عادل شخص کا قول قبول کیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ اللہ علم۔

یہ زخموں اور اعضاء کے تمام احکام تھے جو اس آیت کے معنی کے ضمن میں تھے، اکتفا کرنے والے کے لیے یہ کافی ہیں، اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ شرط اور جواب شرط ہے یعنی جس نے قصاص کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا یعنی معاف کرنے والے کے لیے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: زخمی کرنے والے کے لیے کفارہ ہوگا اور اس سے آخرت میں جنایت کا مواخذہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ اس مقام پر کھڑا ہوگا کہ اس سے حق لیا جائے گا اور اس پر معاف کرنے والے کا اجر ہوگا۔ حضرت ابن عباس نے یہ دو قول ذکر کیے ہیں: پہلا قول اکثر صحابہ اور بعد والے لوگوں کا ہے۔ دوسرا قول حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے اور ابراہیم نخعی اور شعبی سے اس کے خلاف مروی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے، کیونکہ ضمیر عائد مذکور کی طرف لوٹتی ہے اور وہ ''من'' ہے۔ حضرت ابو درداء نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے ''جس مسلمان کو جسم میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے پھر وہ اسے معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور ایک گناہ معاف کر دیتا ہے'' (2)۔ ابن عربی نے کہا: جو کہتا ہے جب مجروح (زخمی) زخمی کرنے والے کو معاف کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، پس اس کا کوئی معنی نہیں (3)۔

وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم نے پیچھے بھیجا ان کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو تصدیق کرنے والا جو اس کے سامنے موجود تھا یعنی تورات اور ہم نے دی اسے انجیل اس میں ہدایت اور نور تھا اور تصدیق کرنے والی تھی جو اس سے پہلے تھا یعنی تورات اور (یہ انجیل) ہدایت اور نصیحت تھی پرہیزگاروں کے لیے۔ اور ضرور فیصلہ کیا کریں انجیل والے اس کے مطابق جو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس میں اور جو فیصلہ نہ کریں اس کے مطابق جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو وہ لوگ فاسق ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ یعنی ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انبیاء کرام کے پیچھے بھیجا۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی تورات، تورات کو انہوں نے حق دیکھا اور اس پر عمل کے وجوب کو دیکھا حتیٰ کہ ناسخ آ گیا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 218
2۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 167
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 632

مُصَدِّقًا عیسیٰ سے حال کی بنا پر منصوب ہے۔ فِیۡہِ هُدًى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ نُوۡرٌ، هُدًى پر معطوف ہے مُصَدِّقًا اس میں دو وجہیں ہیں یہ بھی جائز ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہو اور پہلے مُصَدِّقًا پر معطوف ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ الۡاِنۡجِیۡلَ سے حال ہو۔ تقدیر اس طرح ہوگی: وآتیناہ الانجیل مستقرا فیہ ھدیٰ و نور و مصدقاً۔

هُدًى وَّمَوۡعِظَةً یہ مُصَدِّقًا پر عطف ہے یعنی ھادیاً و واعظاً۔ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ خصوصی طور پر متقین کا ذکر کیا، کیونکہ وہی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کا رفع فِیۡہِ هُدًى وَّنُوۡرٌ پر معطوف ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلۡیَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِیۡهِ۔ اعمش اور حمزہ نے فعل کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ لام، لام (1) کی ہے اور باقی قراء نے امر کی بنا پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی صورت میں لام وَاٰتَیۡنٰهُ کے متعلق ہوگا پس وقف جائز نہ ہوگا، یعنی ہم نے اسے انجیل عطا کی تا کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے اس میں اتارا اور جنہوں نے امر کی بنا پر پڑھا ہے تو وہ اس قول کی طرح ہے وَاَنِ احۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ یہ حکم نئے سرے سے لازم کیا گیا تھا اس سے آغاز کیا گیا تھا یعنی تا کہ انجیل والے اس وقت اس کے مطابق فیصلہ کریں، لیکن اب یہ منسوخ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اب بھی نصاریٰ کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم ہے، کیونکہ انجیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے وجوب کا ذکر ہے، نسخ فروع میں متصور ہوتا ہے اصول میں نہیں ہوتا۔ مکی نے کہا: اختیار جزم ہے، کیونکہ جماعت کا خیال یہی ہے بعد والی وعید اور تہدید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اہل انجیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ لازم کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: میرے نزدیک درست یہ ہے کہ یہ دونوں قرأتیں عمدہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے وہ اس لیے ہے تا کہ اس پر عمل کیا جائے، اس میں جو احکام ہیں ان پر عمل کا حکم دیا، پس دونوں صحیح ہیں۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ﴿۴۸﴾

"(اے حبیب) اتاری ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے (آسمانی) کتاب ہے اور (یہ قرآن) محافظ ہے اس پر تو آپ فیصلہ فرمادیں ان کے درمیان اس سے جو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور آپ نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آیا ہے، ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تم (سب کو) ایک

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 219

ہی امت لیکن آزمانا چاہتا ہے تمہیں اس چیز میں جو اس نے دی ہے تم کو۔ تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو نیکیوں میں، اللہ کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم سب نے پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جن باتوں میں تم جھگڑا کرتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ** یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور **الْكِتٰبَ** سے مراد قرآن ہے(1)۔ **بِالْحَقِّ** سے مراد امرحق ہے۔ **مُصَدِّقًا** حال ہے۔ **لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ** یعنی جنس کتاب سے۔ **مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ** یعنی اس پر بلند۔ یہ اس کی تاویل پر دلیل ہے جو کثرت ثواب میں تفضیل کا قول کرتا ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں اشارہ گزر چکا ہے۔ شرح السنۃ میں ابن حصار کا یہی اختیار ہے۔ اور ہم نے یہ سب کچھ اپنی کتاب "شرح الاسماء الحسنیٰ" میں ذکر کیا ہے۔ الحمدللہ۔

قتادہ نے کہا: المھیمن کا معنی شاہد (گواہ) ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی حفاظت کرنے والا ہے(2)۔ حسن نے کہا: اس کا معنی تصدیق کرنے والا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

إنّ الکتاب مُھیمن لِنبیّنا والحق یعرفہٗ ذووالألباب

حضرت ابن عباس نے کہا: **مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ** یعنی اس پر امین بنایا گیا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: قرآن پہلی کتب کا امین ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حسن سے بھی مروی ہے۔ المھیمن الامین۔ مبرد نے کہا: اس کی اصل مؤیمن ہے ہمزہ کو ھا سے بدل دیا گیا ہے جس طرح ارقت الماء میں ھرقت بولا جاتا ہے۔ یہ زجاج اور ابو علی نے بھی کہا ہے۔ بعض نے فرمایا: ھیمن، یھیمن، ھیمنہ کا معنی ہے وہ امین تھا۔ جوہری نے کہا: اس کا معنی ہے غیر کو خوف سے امن دینا۔ اصل میں أأمن فھو مؤامِنٌ (دو ہمزوں کے ساتھ) پھر دو ہمزوں کے اجتماع کو ناپسند کرنے کی وجہ سے دوسرے ہمزہ کو یا سے بدلا گیا ہے۔ پس یہ مؤیمنٌ بن گیا ہے پھر پہلے ہمزہ کو ھا سے بدلا دیا گیا جیسے انہوں نے کہا: ھراق الماء وأراقہ۔ کہا جاتا ہے: ھیمن علی الشیٔ یھیمن جب کوئی کسی شے کی حفاظت کرنے والا ہو فھو مھیمنٌ ابو عبید سے مروی ہے: مجاہد اور ابن محیصن نے مھیمنا علیہ میم کی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجاہد نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے محافظ ہیں(3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ** حکم کو واجب کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ **فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ** میں جو تخییر تھی اس کے لیے ناسخ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ وجوب نہیں ہے معنی یہ ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرو اگر تم چاہو، کیونکہ ہم پر اہل کتاب کے درمیان فیصلہ کرنا واجب نہیں جب وہ ذمی نہ ہوں۔ اور اہل ذمہ میں تردد ہے، اس میں کلام گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مخلوق کے درمیان فیصلہ کرو۔ یہ آپ پر واجب تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ** یعنی جو تمہارے پاس حق آ چکا ہے اس پر ان کی خواہشات اور ان کے مراد کے مطابق عمل نہ کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو احکام بیان فرمائے ہیں ان کے مطابق فیصلہ کرنے کو ترک نہ کرو۔

**اَهْوَآءَ** جمع ہے ھوی کی اور اس کی جمع اھویۃ نہیں بنائی جاتی۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی خواہشات کی پیروی سے منع فرمایا۔ یہ اس شخص کے قول کے بطلان پر دلیل ہے جو کہتا ہے: جو اہل کتاب کے شراب کو

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 219 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 220 3۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 320

تلف کرے گا اس پر شراب کی قیمت لگائی جائے گی، کیونکہ ان کے لیے مال ہے پس ضائع کرنے والے پر ضمانت ہو گی۔ یہ ضائع کرنے والے پر اس کی ضمانت کا واجب کرنا یہود کی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرنے کے مترادف ہے اور ہمیں اس کے خلاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عَمَّا جَآءَكَ کا معنی ہے عن ما جاءك۔ یعنی جو تیرے پاس آیا اس پر۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا یہ پہلی شریعتوں سے تعلق نہ ہونے پر دلیل ہے۔ الشرعة اور الشریعة سے مراد وہ راستہ جو نجات کی طرف پہنچا دے اور لغت میں شریعت سے مراد وہ راستہ ہے جس کے ذریعے پانی تک پہنچا جائے اور الشریعة وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے شروع کیا۔ شرع لهم یشرع شرعا اس کا معنی ہے سن۔ سنت قائم کرنا۔ الشارع بڑے راستہ کو کہتے ہیں۔ الشرعة وتر کو بھی کہتے ہیں۔ جمع شِرَعٌ و شِرْعٌ و شراعٌ جمع الجمع ہے۔ ابو عبید سے مروی ہے یہ مشترک ہے۔ المنهاج وہ راستہ جو مستمر ہو، النهج و المنهج کا معنی ہے واضح۔ راجز نے کہا:

مَن يكُ ذاشَكٍّ فهذا فَلْجُ　ماءٌ رَوَاءٌ و طريق نَهْجُ

ابو العباس محمد بن یزید نے کہا: الشریعة، راستہ کا آغاز، المنہاج (1)، متواتر راستہ حضرت ابن عباس اور حسن وغیرہما سے مروی ہے شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا سنت اور راستہ (2)۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اس نے تورات کو تورات والوں کے لیے اور انجیل کو انجیل والوں کے لیے اور قرآن کو قرآن والوں کے لیے بنایا۔ یہ شرائع اور عبادات میں ہے۔ اصل توحید میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہی معنی قتادہ سے مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: الشرعة اور المنہاج سے مراد حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین ہے اس کے ساتھ باقی تمام ادیان کو منسوخ کر دیا گیا (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہاری شریعت کو ایک بنا دیتا اور تم حق پر ہوتے پھر بیان فرمایا کہ اختلاف سے مراد ایک قوم کا ایمان اور ایک قوم کا کفر ہے۔ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ کلام میں حذف ہے اس کے ساتھ لام کی متعلق ہے یعنی اس نے تمہاری شرائع کو مختلف بنایا تا کہ وہ تمہیں آزمائے۔ ابتلا کا معنی اختبار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی طاعات کی طرف جلدی کرو۔ یہ دلیل ہے کہ واجبات کو مقدم کرنا، ان کی تاخیر سے افضل ہے۔ یہ تمام عبادات میں حکم ہے مگر نماز کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا خیال ہے کہ اس کی تاخیر اولیٰ ہے اور آیت کا عموم اس کے خلاف دلیل ہے۔ الکیا نے یہ کہا ہے اس میں دلیل ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا، افطار سے افضل ہے۔ یہ تمام سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ جس میں تم نے اختلاف کیا، اور شکوک زائل ہوں گے۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝۴۹

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 220　2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 323　3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 322

''اور یہ کہ فیصلہ فرمائیں آپ ان کے درمیان اس کے مطابق جو نازل فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اور آپ ہوشیار رہیں ان سے کہ کہیں برگشتہ نہ کردیں آپ کو اس کے کچھ حصہ سے جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ بے شک ارادہ کرلیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ سزا دے انہیں ان کے بعض گناہوں کی اور بے شک بہت لوگ نافرمان ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس پر کلام گزر چکی ہے اور یہ تخییر کے لیے ناسخ ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ایک عریض دعویٰ ہے، کیونکہ نسخ کی چار شرائط ہیں، ایک ان میں سے متقدم و متاخر کی تاریخ کا معلوم ہونا ہے اور یہ شرط ان دو آیتوں میں مجہول ہے پس یہ دعویٰ کرنا ممتنع ہے کہ ایک دوسری کے لیے ناسخ ہے، پس حکم اپنے حال پر باقی ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: ہم نے ابوجعفر نحاس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نزول میں متاخر ہے پس یہ آیت ناسخ ہے مگر یہ کہ کلام میں ان شئت مقدر کیا جائے، کیونکہ اس کی تخییر کا ذکر گزر چکا ہے اور کلام کے آخر سے تخییر کو حذف کیا گیا، کیونکہ پہلی کلام اس پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ یہ اس پر معطوف ہے، تخییر کا حکم، معطوف علیہ کے حکم کی طرح ہے۔ یہ دونوں شریک ہیں، دوسرا پہلے سے جدا نہیں ہے، کیونکہ اس کا کوئی معنی نہیں ہے اور یہ صحیح نہیں ہے پس وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے قول کا وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اور فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ پر معطوف ہونا ضروری ہے۔ پس وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں اگر آپ فیصلہ کریں اور حکم کرنا اختیار کریں یہ سب محکم ہے منسوخ نہیں ہے کیونکہ ناسخ منسوخ کے ساتھ معطوف علیہ کی حیثیت سے مرتب نہیں ہوتا۔ پس اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تخییر محکم ہے، منسوخ نہیں ہے، یہ مکی نے کہا ہے۔ وَ اَنِ احْكُمْ الکتاب پر عطف کی وجہ سے محل نصب میں ہے یعنی ہم نے تیری طرف نازل کیا کہ تم ان کے درمیان فیصلہ کرواسکیں اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا۔ یعنی اللہ کے حکم سے جو اس نے آپ کی طرف اپنی کتاب میں اتارا۔ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ، وَ احْذَرْهُمْ میں ھا اور میم سے (ان) بدل اشتمال ہے یا مفعول لاجلہ ہے یعنی آپ کو برگشتہ کرنے کی وجہ سے۔ ابن اسحاق سے مروی ہے حضرت ابن عباس نے کہا: یہود کے چند علماء جن میں ابن صوریا، کعب بن اسد، ابن صلوبا اور شاس بن عدی بھی تھے یہ جمع ہوئے اور کہا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چلیں شاید ہم انہیں ان کے دین سے برگشتہ کردیں وہ بشر ہی تو ہے۔ وہ آپ کے پاس آئے اور کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء ہیں اگر ہم آپ کی اتباع کریں گے تو کوئی یہودی ہماری مخالفت نہیں کرے گا ہمارا ایک قوم کے ساتھ تنازع ہے ہم آپ کے پاس فیصلہ لے آئیں گے آپ ہمارے حق میں فیصلہ کردینا حتی کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکار کردیا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اور فتنہ کی اصل اختیار ہے جیسا کہ گزر چکا ہے پھر اس کا معنی مختلف ہے پس یہاں يَفْتِنُوْكَ کا معنی ہے وہ آپ کو روکیں گے اور تمہیں دور کریں گے۔ الفتنہ بمعنی الشرک ہوگا اسی سے ہے وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (بقرہ: 217) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (بقرہ: 193) کبھی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 632
2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 266

الفتنۃ بمعنی العبرۃ ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (الممتحنہ :5) ہمیں نہ بنا دے فتنہ کافروں کے لیے۔

لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (یونس) اور ہمیں نہ بنادے فتنہ ظالم قوم کے لیے۔

اور کبھی الفتنۃ کا معنی راستہ سے روکنا ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اور وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ تاکید کے لیے ہے یا یہ احوال اور احکام ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ہر ایک کے متعلق آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا۔ آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نسیان کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ فرمایا: اَنْ يَّفْتِنُوْكَ یہ نسیان سے ہوگا عمداً نہیں ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: خطاب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کا غیر ہے۔ اس کا بیان سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ کا معنی ہے عن کل ما أنزل اللہ الیک۔ بعض کا لفظ کل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أو يَعْتَبِطْ بعضَ النَّفوسِ حِمامُها

أو یَرتَبِطْ بھی مروی ہے کل النفوس کا ارادہ کیا ہے۔ اسی پر محمول کیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو: لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (الزخرف:63)

ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ بعض اس آیت میں اپنی حالت پر ہے۔ اس سے مراد رجم ہے یا حکم سے مراد وہ ہے جس کا یہود نے ارادہ کیا تھا انہوں نے کل سے برگشتہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ تیرے حکم کا انکار کریں یا اس سے اعراض کریں۔ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جلاوطنی، جزیہ اور قتل کا عذاب دے گا۔ اسی طرح ہوا تھا۔ فرمایا: (بِبَعْضِ) بعض کے ساتھ سزا ان کی تباہی کے لیے کافی تھی۔ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اس سے مراد یہود ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

”تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کس کا حکم ہوسکتا ہے اس قوم کے نزدیک جو یقین رکھتی ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ، اَفَحُكْمَ پر نصب يَبْغُوْنَ کی وجہ سے ہے معنی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ شریف کا حکم، وضیع (گھٹیا) کے حکم کے خلاف کرتے تھے جیسا کہ کئی جگہ گزر چکا ہے۔ یہود ضعیف اور فقراء پر حدود قائم کرتے تھے اور طاقتور اغنیاء پر حدود قائم نہیں کرتے تھے، پس وہ اس فعل میں جاہلیت کے مشابہ تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سفیان بن عیینہ نے ابن ابی نجیح سے انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: جب ان

سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا کہ وہ اپنی بعض اولاد کو بعض پر ترجیح دیتا ہے تو وہ یہ آیت پڑھتے تھے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ۔ طاؤس کہتے تھے: کسی کے لیے جائز نہیں کہ بعض اولاد کو بعض پر ترجیح دے، اگر وہ ایسا کرے گا تو نافذ نہ ہوگا اور فسخ ہوگا۔ اہل ظاہر نے یہی کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل سے اسی طرح مروی ہے۔

ثوری، ابن المبارک اور اسحاق نے اس کو مکروہ کہا ہے، اگر کوئی ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور رد نہیں کیا جائے گا۔ امام مالک، ثوری، لیث، امام شافعی اور اصحاب الرائے نے اس کی اجازت دی ہے اور انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق کے فعل سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ کو دوسروں سے زیادہ دیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: فارجعه (اس بیٹے سے واپس لے لے) اور فاشهد على هذا غيري میرے علاوہ کسی دوسرے کو گواہ بنا۔ سے استدلال کیا ہے اور پہلے مسلک کے علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر کو جو فرمایا تھا اس سے استدلال کیا ہے آپ نے فرمایا تھا: ''اس کے علاوہ تیری اولاد ہے'' اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ''کیا تو نے سب کو اس طرح ہبہ کیا ہے'' اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: ''پھر مجھے گواہ نہ بنا میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا''۔ ایک روایت میں ہے ''میں گواہ نہیں بنتا مگر صرف حق پر''۔ علماء نے فرمایا: جو ظلم اور غیر حق ہو وہ باطل ہے جو جائز نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنا'' یہ شہادت کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس سے زجر کیا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جور کہا ہے اور اس میں گواہ بننے سے اجتناب کیا ہے پس مسلمانوں میں کسی کو اس پر گواہ بنانا بھی ممکن نہیں۔ رہا حضرت ابوبکر کا فعل، تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے معارض نہیں ہوسکتا شاید انہوں نے اپنی دوسری اولاد کو عطیہ دیا ہو جو اس کے برابر ہو۔

اگر کہا جائے کہ اصل انسان کا اپنے مال میں مطلقاً تصرف کرنا ہے، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا اصل کلی اور معینہ واقعہ اس اصل کے مخالف ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے جیسے عموم اور خصوص ہوتا ہے اصول میں ہے کہ صحیح خاص پر عام کی بنا ہے، پھر یہ اس نافرمانی کا باعث ہوتا ہے جو بہت بڑا گناہ ہے اور یہ حرام ہے اور جو حرام تک لے جائے وہ ممنوع ہے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو''۔ نعمان نے کہا: میرے باپ نے رجوع کیا اور وہ صدقہ لوٹا دیا۔ اور صدقہ کو باپ بالاتفاق واپس نہیں کرسکتا اور فارجعه کا ارشاد فاردده کے معنی پر محمول ہے اور فسخ میں لوٹانا ظاہر ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد ہے یعنی مردود اور منسوخ ہے'' یہ ظاہر اور قوی ہے اور منع میں واضح ترجیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن وثاب اور نخعی نے کہا: اَفَحُكْمُ کو رفع يَبْغُوْنَ کے معنی کی بنا پر ہے ضمیر کو حذف کیا گیا جس طرح ابوالنجم نے اپنے قول میں حذف کیا ہے:

قد اصبحت أُمُّ الخِيارِ تَدَّعِي عليَّ ذنبًا كلُّه لم أَصْنَعِ

كله کو رفع کے ساتھ روایت کیا گیا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہونا بھی جائز ہے افحكم الجاهلية حكم يبغونه پھر موصوف کو حذف کیا گیا۔

حسن، قتادہ، اعرج اور اعمش نے اَفَحُكْمَ کو حا اور کاف کے نصب اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جماعت کی قرأت کے معنی کی طرف راجع ہے، کیونکہ نفس حکم مراد نہیں ہے اس سے مراد حکم ہے گویا فرمایا: أفحكم حكم الجاهلية يبغون کبھی حکم اور حاکم لغت میں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں وہ اس سے مراد کاہن اور دوسرے جاہلیت کے حکام لیتے ہیں حکم سے مراد عموم اور جنس ہے، کیونکہ اس سے متعین حاکم مراد نہیں لیا گیا۔ مضاف کا جنس واقع ہونا جائز ہے جیسا کہ ان کے قول میں جائز ہے: منعت مصر اردبها و شبهه۔

ابن عامر نے تبغون تا کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۝ یہ انکار کی جہت سے استفہام ہے یعنی لا احد احسن۔ یہ مبتدا خبر ہے حکما پر نصب بیان کی بنا پر ہے۔ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ یعنی عند قوم یوقنون۔

**یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ ؔۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝**

''اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود اور نصاریٰ کو (اپنا) دوست (مددگار) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے، سو وہ انہیں میں سے ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ یہ تَتَّخِذُوا کے دونوں مفعول ہیں یہ شرعاً تعلقات ختم کرنے پر دلیل ہے اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں یعنی اے وہ لوگو! جو ظاہراً ایمان لائے وہ مشرکین سے دوستی رکھتے تھے اور انہیں مسلمانوں کے راز بتاتے تھے۔ بعض نے فرمایا: یہ ابولبابۃ کے بارے میں نازل ہوئی جب مسلمان خوفزدہ ہوئے تھے حتی کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ یہود و نصاریٰ سے دوستی لگالیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت عبادہ بن صامت، عبداللہ بن ابی بن سلول کے بارے میں نازل ہوئی پھر حضرت عبادہ نے تو یہود کی دوستی سے برات کر لی اور ابن ابی نے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اس نے کہا: مجھے گردش کا خوف ہے۔

بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یہ مبتدا خبر ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ شرع ان کی آپس میں موالات کو ثابت کرتی ہے حتی کہ یہود و نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ یعنی جو تم میں سے مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کرے گا۔ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس کا حکم ان کے حکم کی طرح ہے۔ یہ مرتد سے مسلمان کے میراث بانٹنے کے اثبات کو مانع ہے جس سے ان سے دوستی کی تھی وہ ابن ابی تھا پھر یہ حکم قطع دوستی کا قیامت تک باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود: 113) اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ اور آل عمران میں فرمایا: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ

(آل عمران: 28) وہ منافق جو بناتے ہیں کافروں کو (اپنا) دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران: 118) اس پر کلام گزر چکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ یہ شرط اور جواب شرط ہیں، یعنی اس نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی جس طرح انہوں نے مخالفت کی اور اس سے دشمنی واجب ہے جس طرح ان سے دشمنی واجب ہے اس کے لیے آگ واجب ہے جس طرح ان کے لیے واجب ہے، پس وہ ان سے ہو گیا۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

''سو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے کہ وہ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں یہود و نصاریٰ کی طرف، کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آجائے۔ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دیدے فتح کامل یا (ظاہر کردے کامیابی کی) کوئی بات اپنی طرف سے تو پھر ہو جائیں گے اس پر جو انہوں نے چھپا رکھا تھا اپنے دلوں میں نادم۔ اور (اس وقت) کہیں گے ایمان والے کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قسمیں اٹھائی تھیں اللہ کی سخت سے سخت کہ وہ یقیناً تمہارے ساتھ ہیں؟ اکارت کیے گئے ان کے اعمال اور ہو گئے وہ (سراسر) نقصان اٹھانے والے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد شک اور نفاق ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے اس سے مراد عبد اللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی ہیں۔ يُسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ یعنی وہ ان کی محبت و معاونت میں جلدی کرتے ہیں۔ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ۔ کہتے ہیں: ہمیں اندیشہ ہے ہم پر کوئی گردش زمانہ آئے خواہ وہ قحط کی صورت میں آئے تو وہ یہود ہمیں نوازیں گے نہیں اور وہ ہم پر مہربانی نہیں کریں گے یا ایسی صورت ہو جائے کہ یہود مسلمانوں پر غالب آجائیں تو معاملہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں رہے گا نہیں، اس لیے ہم یہود سے رشتہ الفت رکھتے ہیں۔ یہ قول معنی کے زیادہ قریب ہے گویا یہ دارت تدور سے ہے یعنی ہمیں گردش زمانہ کا اندیشہ ہے اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے: فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ۔ شاعر نے کہا:

يَرُدّ عنك القَدَرَ المقدورا و دائراتِ الدهر أن تَدورا

یعنی گردش زمانہ ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف پھر گئی۔ الفتح کے معنی میں اختلاف ہے الفتح کا معنی فیصلہ اور حکم بھی ہے۔ یہ قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ کا فیصلہ آیا تو بنی قریظہ کے جنگ جوؤں کو قتل کر دیا گیا ان کی

عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا اور بنی نضیر کو جلاوطن کیا گیا۔ ابوعلی نے کہا: یہ مسلمانوں کو مشرکین کے شہروں کی فتح عطا کرنا ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ۔ سدی نے کہا: اس سے مراد جزیہ ہے۔ حسن نے کہا: منافقین کے امر کا اظہار کرنا اور ان کے نام بتانا اور ان کے قتل کا حکم دینا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: شادابی اور خوشحالی کا مسلمان کے لیے اظہار ہے۔ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ یعنی وہ کفار سے دوستی کرنے پر شرمندہ ہوں گے جو وہ مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھیں گے اور جب وہ موت کو دیکھیں گے اور انہیں عذاب کی بشارت دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا سے مراد اہل مدینہ اور اہل شام ہیں۔ یقول بغیر واؤ کے پڑھا ہے ابوعمرو اور ابن ابی اسحاق نے ویقول واؤ کے ساتھ اور اَنْ یَّاْتِیَ پر عطف کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اکثر نحویوں کے نزدیک ہے تقدیر اس طرح ہے: فعسی اللہ أن یاتی بالفتح وأن یقول۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معنی پر عطف ہے، کیونکہ عسی أن یاتی بالفتح کا معنی ہے وعسی أن یاتی اللہ بالفتح، کیونکہ عسی زید أن یاتی و یقوم عمرو۔ جائز نہیں ہے، کیونکہ معنی صحیح نہیں ہوتا جب تو کہتا ہے: وعسی زید أن یقوم عمرو لیکن اگر تو کہتا ہے: عسی أن یقوم زید و یاتی عمرو تو یہ عمدہ تھا اور جب تو اَنْ یَّاْتِیَ میں تقدیم کو مقدر کرتا تو اچھا ہوتا، کیونکہ تقدیر اس طرح ہوگی: عسی أن یاتی و عسی أن یقوم اور یہ اس قول کے باب سے ہوگا:

ورأیت زوجك فی الوغی مُتقلِّدا سیفاً ورُمحا

اس سے تیسرا قول بھی ہے کہ تو اسے الفتح پر عطف کرے جیسا کہ شاعر نے کہا:

لَلُبس عَباءۃٍ و تَقَرَّ عینی

اور اَنْ یَّاْتِیَ کو اسم جلالت سے بدل بنانا بھی جائز ہے تقدیر اس طرح ہوگی: عسی أن یاتی اللہ ویقول الذین آمنوا اور کوفیوں نے وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا پہلے سے منقطع کر کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَهٰۤؤُلَآءِ منافقین کی طرف اشارہ ہے۔ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ انہوں نے قسمیں اٹھائیں اور قسموں میں سختی پیدا کی۔ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اِنَّهُمْ، اَقْسَمُوْا کی وجہ سے منصوب ہو، یعنی مومنوں نے یہود کو توبیخ کی جہت سے کہا: کیا انہوں نے سخت سے سخت قسمیں اٹھائیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمہاری مدد کریں گے؟ یہ بھی احتمال ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے معاون ہوں گے یعنی یہ قسمیں اٹھاتے ہیں کہ وہ مومن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آج ان کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ یعنی ان کا نفاق باطل ہے۔ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ یعنی ثواب میں گھاٹا پانے والے ہیں۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے یہود کی دوستی میں خسارہ اٹھایا اور یہود کے قتل اور ان کے جلاوطن کیے جانے کے بعد انہیں کوئی ثمرہ نہ ملا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ۫ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۴﴾

''اے ایمان والو! جو پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے (تو اس کی بدنصیبی) سو عنقریب لے آئے گا اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے، جو نرم ہوں گے ایمانداروں کے لیے، بہت سخت ہوں گے کافروں پر، جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے یہ محض اللہ کا فضل (وکرم) ہے نوازتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی کشادہ رحمت والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ شرط اور جواب شرط فَسَوْفَ الخ ہے اہل مدینہ اور شام کی قرأت میں من یرتدد یعنی دو دالوں کے ساتھ ہے اور باقی قراء نے مَنْ يَّرْتَدَّ پڑھا ہے۔ یہ قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعجاز میں سے ہے، کیونکہ اس نے ان کے ارتداد کی خبر دی اور یہ آپ کے عہد میں نہ تھا اور یہ غیب تھا۔ جو آپ نے خبر دی وہ مدت کے بعد ہوا تھا اور اہل ردت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو عرب مرتد ہو گئے سوائے تین مساجد کے لوگوں کے۔ مسجد مدینہ، مسجد مکہ اور مسجد جوًاثی اور ان کی ردت دو قسم کی تھی، ایک قسم وہ تھی جنہوں نے پوری شریعت کو پھینک دیا تھا اور اس سے نکل گئے تھے۔ دوسری قسم وہ تھی جنہوں نے زکوٰۃ کے وجوب کو تسلیم نہیں کیا تھا اور اس کے علاوہ اسلام کے احکام کا اعتراف کیا تھا، انہوں نے کہا: ہم نماز، روزہ کریں گے اور زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد کیا اور حضرت خالد بن ولید کو لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا پس انہوں نے ان سے قتال کیا اور انہیں قیدی بنایا جیسا کہ ان کی اخبار سے مشہور ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ، يُحِبُّهُمْ محل نعت میں ہے۔ یہ حسن، قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔ یہ حضرت ابوبکر اور ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی۔ سدی نے کہا: یہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: یہ ایسی قوم کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت موجود نہیں تھی حضرت ابوبکر نے اہل ردت سے ایسی قوم کے ساتھ مل کر جہاد کیا جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود نہ تھے اور وہ یمن کے قبائل ہیں کندہ، بجیلہ اور اشجع۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اشعریین کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد اشعریین کی کشتیاں آئیں اور سمندری راستہ سے یمن کے قبائل آئے ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام میں آزمائش تھی۔ عراق کی اکثر فتوحات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یمنی قبائل کے ہاتھوں ہوئیں (1)۔ جو اس آیت کے نزول میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے اصح ہے۔ واللہ اعلم

حاکم ابو عبداللہ نے مستدرک میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف اشارہ فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی تو فرمایا: یہ اس کی قوم ہے (2)۔ قشیری نے کہا: ابوالحسن کے متبعین اس کی قوم سے

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 253
2۔ مستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 313

ہیں، کیونکہ ہر جگہ جہاں قوم کو اس کے نبی کی طرف مضاف کیا گیا ہے اس سے مراد اس کے متبعین ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، اَذِلَّةٍ قوم کی صفت ہے اسی طرح اَعِزَّةٍ بھی صفت ہے یعنی وہ مومنین سے نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ دابة ذلول جو آسانی سے مطیع بنایا گیا ہو۔ الذل میں سے کسی شے کا دخل نہیں اور وہ کافروں پر بڑے سخت ہیں اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ مومنین کے لیے اس طرح ہیں جس طرح باپ، بیٹے کے لیے ہوتا ہے اور سردار، غلام کے لیے ہوتا ہے، وہ کفار پر اس طرح شدید ہیں جیسے شیر اپنے شکار کے لیے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: 29)

یہ بھی جائز ہے کہ اَذِلَّةٍ کی نصب حال کی بنا پر ہو یعنی یُحبھم و یحبّونه فی هذه الحال اس سے پہلے اللہ کا اپنے بندے سے محبت کرنا اور بندوں کا اللہ سے محبت کرنے کا معنی گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وہ صفت کی جگہ میں ہے۔ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ یعنی وہ منافقین کے برعکس ہیں جو گردش زمانہ سے ڈرتے ہیں۔ اس سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی امامت کے ثبوت پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جہاد کیا اور آپ کے بعد مرتدین سے قتال کیا پس معلوم ہوا کہ جن میں یہ صفات ہوں وہ اللہ کے ولی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت عام ہے ہر اس شخص کو شامل ہے جو قیامت تک کفار سے جہاد کرے گا۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ مبتدا خبر ہیں۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ یعنی وسیع فضل والا ہے اپنی مخلوق کی مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

''تمہارا مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (پاک) ہے اور ایمان والے ہیں جو صحیح صحیح نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور (ہر حال میں) وہ بارگاہ الٰہی میں جھکنے والے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: عبد اللہ بن سلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہماری قوم قریظہ اور نضیر نے ہمیں چھوڑ دیا ہے اور انہوں نے قسمیں اٹھائیں ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہم مجلس نہیں ہوں گے۔ اور ہم دور رہنے کی وجہ سے آپ کے اصحاب سے بھی مجلس نہیں کر سکتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عبد اللہ بن سلام نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مومنین کے مددگار رہنے پر راضی ہیں (1)۔ وَالَّذِيْنَ یہ تمام مومنین کو شامل ہے۔ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب سے اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ الخ کا معنی پوچھا گیا: کیا اس سے مراد حضرت علی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 47

رضی اللہ عنہ ہیں؟ فرمایا: علی بھی مومنین میں سے ہیں۔ یہ قول دلیل ہے کہ یہ تمام مومنین کے لیے ہے۔
نحاس نے کہا: یہ واضح قول ہے، کیونکہ الذین جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسری روایت میں ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی، یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ اس قول پر برانگیختہ کیا ہے الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ نے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک سائل نے مسجد نبوی میں سوال کیا تو اسے کسی نے کوئی چیز عطا نہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز میں رکوع میں تھے اور آپ کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی آپ نے ہاتھ سے سائل کی طرف اشارہ کیا حتی کہ اس نے وہ انگوٹھی لے لی۔ الکیا طبری نے کہا: یہ دلیل ہے کہ عمل قلیل سے نماز باطل نہیں ہوتی، کیونکہ رکوع میں انگوٹھی کا صدقہ کرنا یہ نماز میں عمل کیا اور اس سے حضرت علی کی نماز باطل نہ ہوئی اور يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ یہ دلالت کرتا ہے کہ نفلی صدقہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رکوع میں انگوٹھی کو صدقہ کیا یہ اس ارشاد کی مثل ہے وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ (الروم) فرض اور نفل ایک نظم میں ہیں پس زکوٰۃ کا اسم فرض اور نفل کو شامل ہے جیسے صدقہ کا اسم، نماز کا اسم فرض اور نفل کو شامل ہے۔

میں کہتا ہوں: اس جگہ زکوٰۃ سے مراد انگوٹھی صدقہ کرنا ہے اور انگوٹھی صدقہ کرنے پر زکوٰۃ کے لفظ کا حمل، اس میں بعد ہے کیونکہ زکوٰۃ کا لفظ مختص ہے زکوٰۃ کے ساتھ جو فرض ہے اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اس سے پہلے يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ بھی ہے جو قرینہ ہے کہ اس سے مراد یہاں زکوٰۃ ہے۔ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کا معنی ہے وہ نماز کو اپنے حقوق کے ساتھ ان کے اوقات میں ادا کرتے ہیں۔ یہاں مراد فرضی نماز ہے۔ پھر فرمایا: وَهُمْ رٰكِعُوْنَ یعنی نفل ادا کرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: رکوع کا علیحدہ ذکر شرف کے اظہار کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: مومنین اس آیت کے نزول کے وقت ایسی حالت میں تھے کہ بعض نماز کو مکمل کرنے والے تھے اور بعض رکوع میں تھے۔ ابن خویز منداد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ نماز میں تھوڑے سے عمل کے جواز کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اور یہ مدح کے طور پر ذکر ہے مدح کے باب میں کم از کم یہ ہے کہ وہ مباح ہو(1)۔ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سائل کو عطا فرمایا جب کہ آپ نماز میں تھے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ نفلی نماز ہو اور یہ فرض نماز میں مکروہ ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مدح دونوں حالتوں کے اجتماع پر متوجہ ہو گویا اس کا وصف بیان کیا گیا ہے جو نماز اور زکوٰۃ کے وجوب کا اعتقاد رکھتا ہے پس نماز کو رکوع سے تعبیر فرمایا اور وجوب کے اعتقاد کو فعل سے تعبیر فرمایا جیسے تو کہتا ہے: المسلمون هم المصلون تو یہ ارادہ نہیں کرتا کہ اس حال میں وہ نماز پڑھ رہے تھے مدح حالت نماز کو متوجہ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو یہ فعل کرتا ہے اور اس کا اعتقاد رکھتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

''اور (یاد رکھو) جس نے مددگار بنایا اللہ کو اور اس کے رسول کریم کو اور ایمان والوں کو (تو وہ اللہ کے گروہ سے

---

1۔ احکام القرآن للجصاص

ہیں اور) بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی جس نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے والی کے حکم کی پیروی کی وہ اللہ کا گروہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے قیام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت کو مددگار بنایا۔ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۠ ﴿۵۶﴾ حسن نے کہا: حزب اللہ سے مراد اللہ کا لشکر ہے۔ ان کے علاوہ نے کہا: وہ اللہ کے انصار ہیں۔ شاعر نے کہا: کیف أضوى و بلال حِزْبی

یعنی میں کیسے کمزور سمجھا جاتا ہوں جب کہ بلال میرا مددگار ہے۔

مومنین اللہ کا حزب ہیں یقیناً وہ یہود پر غالب آئے انہیں قیدی بنا کر قتل کر کے اور جلاوطن کر کے اور جزیہ لگا کر۔ الحزب لوگوں کا گروہ، اس کا اصل معنی النائبہ مصیبت زدہ لوگ مصیبت پر جمع ہوتے ہیں۔ حزب الرجل سے مراد اس کے اصحاب ہیں الحزب سے مراد ورد بھی ہے اسی سے حدیث ہے: فمن فاته حزبه من الليل (1) جس سے رات کا وظیفہ او ورد رہ جائے۔ قد حزبت القرآن میں نے قرآن کا ورد کیا۔ الحزب سے مراد گروہ بھی ہے۔ تحزبوا کا معنی ہے جمع ہوئے۔ الاحزاب وہ گروہ جو انبیاء کے ساتھ جنگ کرنے پر جمع ہوئے۔ حزبه امر اس کو کوئی حادثہ پہنچا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾

''اے ایمان والو! مت بناؤ ان لوگوں کو جنہوں نے بنا رکھا ہے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور کفار سے (اپنے) دوست اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اگر ہو تم ایماندار''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہود اور مشرکین مسلمانوں پر ہنستے تھے جب مسلمان سجدہ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا، الهزأ کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ۔ ابوعمرو اور کسائی نے جر کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی میں من الکفار۔ کسائی نے کہا: حضرت ابی کے نسخہ میں من الکفار تھا اور یہاں ''من'' جنس کے بیان کے لیے ہے۔ نصب زیادہ واضح ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ قریب ترین عامل پر معطوف ہے اور وہ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ہے پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع فرمایا کہ یہود و مشرکین کو اپنا مددگار بنائیں اور انہیں بتایا کہ دونوں فریق مومنین کے دین کو مزاق اور کھیل بناتے ہیں، اور جنہوں نے نصب پڑھی ہے انہوں نے الذین پر عطف کیا ہے جو لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا میں ہے یعنی ان کو اور ان کو دوست نہ بناؤ اور اس قرأت میں الهزء اور اللعب سے موصوف یہود

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب نام عن حزبہ، حدیث نمبر 1118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی من نام عن حزبہ من اللیل، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں کوئی دوسرا نہیں اور جن کو دوست بنانے سے منع کیا گیا ہے وہ یہود و مشرکین ہیں اور دونوں قرأت میں جر کے ساتھ ہیں ھزء اور لعب سے موصوف ہیں۔ مکی نے کہا: نصب پر جماعت کا اتفاق نہ ہوتا تو میں جر کو اختیار کرتا، کیونکہ اعراب میں معنی میں تفسیر اور معطوف علیہ سے قرب میں یہ قوی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مشرکین و منافقین کو مددگار نہ بناؤ اس کی دلیل یہ ہے اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ (بقرہ:14) اور مشرکین تمام کفار ہیں لیکن کفار کا لفظ غالب طور پر مشرکین کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے اہل کتاب کا ذکر کافروں سے علیحدہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت اس ارشاد لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ نہ بناؤ یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست (و مددگار) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران:118) نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو۔

منع اپنے ضمن میں مشرکین کی تائید، ان کی مدد وغیرہ کو شامل ہے۔ حضرت جابر نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو یہود کی ایک قوم آئی اور کہا: ہم آپ کے پاس چلیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم اپنے معاملہ میں مشرکین سے مدد حاصل نہیں کرتے''۔ یہ مذہب شافعی میں سے صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے مشرکین کے خلاف یہود سے مدد لینے کو مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا ہے اور کتاب اللہ اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے نیز حدیث میں بھی ایسا موجود ہے۔ واللہ اعلم (1)

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''جب تم بلاتے ہو نماز کی طرف (یعنی آذان دیتے ہو) تو وہ بناتے ہیں اسے مذاق اور تماشہ یہ (حماقت) اس لیے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے''۔

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الکلبی نے کہا: جب موذن اذان دیتا اور مسلمان نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یہود کہتے: وہ کھڑے ہوئے کبھی کھڑے نہ ہوں، وہ ہنستے تھے جب مسلمان رکوع اور سجدہ کرتے تھے وہ اذان کے بارے میں کہتے: انہوں نے یہ بدعت نکالی ہے ہم نے گزشتہ قوموں میں ایسی چیز نہیں سنی، یہ تیرے لیے قافلہ کے چیخنے کی طرح چیخنا کہاں سے آیا ہے، یہ کتنی قبیح آواز ہے اور یہ معاملہ کتنا برا ہے (2)۔ بعض علماء نے کہا: جب موذن نماز کے لیے اذان دیتا تھا تو وہ آپس میں ہنستے تھے اور بطور استہزا اشارے کرتے تھے اور مسلمانوں کو بے وقوف اور جاہل قرار دیتے تھے اور لوگوں کو اس سے نفرت دلاتے تھے اور نماز کی طرف بلانے والے سے دور کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ نماز کی طرف دعوت دینے والے کو نماز کے ساتھ استہزا اور مذاق کرنے والے کی طرح دیکھتے تھے، کیونکہ وہ نماز کی قدر و منزلت سے ناواقف تھے پس یہ آیت نازل ہوئی اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (حم السجدہ:33)

1۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 85 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 48

النداء کا معنی بلند آواز سے پکارنا ہے اس کو ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے الدعاء، الرغاء، ناداہ، مناداۃ و نداء اس کا معنی ہے اس نے اسے آواز دی۔ تنادوا یعنی ایک دوسرے کو پکارا۔ تنادوا کا معنی ہے وہ مجلس میں بیٹھے۔ ناداہ اس نے اسے مجلس میں بٹھایا۔ قرآن میں اذان کا ذکر صرف اسی جگہ ہے لیکن سورۂ جمعہ میں بطور اختصاص ذکر کیا گیا ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے فرمایا: ہجرت سے پہلے مکہ میں اذان نہیں تھی وہ اس طرح آواز دیتے تھے الصلوٰۃ جامعۃ۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور قبلہ، کعبہ کی طرف پھیرا گیا تو اذان کا حکم دیا گیا اور الصلوٰۃ جامعۃ کی صدا کسی ایسے امر کے لیے باقی رہی جو پیش آ جاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان کے امر نے پریشان کیا حتی کہ حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابوبکر صدیق کو خواب میں اذان دکھائی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات آسمان میں اذان سنی تھی (2)۔ حضرت عبداللہ بن زید خزرجی انصاری اور حضرت عمر بن خطاب کے خواب مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے متعلق رات کو ہی بتادیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھنے کے بعد کہا: جب صبح ہوگی تو آپ کو بتاؤں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا تو انہوں نے اذان دی جس طرح آج اذان دی جاتی ہے۔

حضرت بلال نے صبح کی اذان میں یہ زیادتی کی الصلوٰۃ خیر من النوم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کو قائم رکھا اور یہ انصاری کے خواب میں نہیں تھے۔ ابن سعد نے یہ حضرت ابن عمر سے ذکر کیا ہے (3)۔ دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کو اذان خواب میں دکھائی گئی انہوں نے اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری کے خبر دینے سے پہلے حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا تھا۔ یہ انہوں نے اپنی کتاب ''المدبج'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ذکر کیا ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکر سے روایت کی ہے اور حضرت ابوبکر کی حدیث میں جو انہوں نے ان سے روایت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اذان اور اقامت کے وجوب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اذان مساجد میں جماعت کے لیے واجب ہے جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ موطا میں امام مالک نے اس پر نص قائم کی ہے۔ امام مالک کے متاخرین اصحاب میں اختلاف ہے ان کے دو قول ہیں (۱) شہر اور جو قصبہ شہر کی طرح ہے ان پر اس کا ادا کرنا سنت مؤکدہ واجب علی الکفایہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ فرض علی الکفایہ ہے۔ اسی طرح اصحاب شافعی کا اختلاف ہے۔ طبری نے امام مالک سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر شہر والے اذان جان بوجھ کر چھوڑ دیں تو وہ نماز کا اعادہ کریں۔ ابوعمر نے کہا: میں شہر والوں پر اذان کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں جانتا ہوں، کیونکہ اذان دارالاسلام اور دارالکفر کے درمیان جدائی اور تفریق کرنے والی علامت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اسے فرماتے تھے: ''جب تم اذان سنو تو رک جاؤ اور جب تم اذان نہ سنو تو حملہ کردو'' اور صحیح مسلم میں ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلوع فجر کے وقت حملہ کرتے تھے جب اذان سن لیتے تو حملہ نہ کرتے تھے ورنہ حملہ کر دیتے تھے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی — 2۔ طبرانی، الاوسط، حدیث نمبر 9243

3۔ ابن ماجہ، کتاب الاذان والسنۃ فیہ، حدیث نمبر 698، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عطا، مجاہد، اوزاعی اور داؤد نے کہا: اذان فرض ہے انہوں نے فرض کفایہ نہیں کہا۔ طبری نے کہا: اذان سنت ہے، واجب نہیں ہے، انہوں نے اشہب عن مالک کے سلسلہ سے یہ روایت کیا ہے اگر مسافر جان بوجھ کر اذان چھوڑ دے تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ کوفیوں نے مکروہ کہا ہے کہ مسافر بغیر اذان اور اقامت کے نماز پڑھے انہوں نے کہا: رہا شہر میں رہنے والا تو اس کے لیے اذان اور اقامت کہنا مستحب ہے اگر لوگوں کی اذان اور اقامت کو کافی سمجھا تو بھی جائز ہوگا۔ ثوری نے کہا: سفر میں اذان کے قائم مقام اقامت ہو جاتی ہے اگر تو چاہے تو اذان دے اور اقامت بھی کہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: مسافر اذان دے، کیونکہ حضرت مالک بن حویرث کی حدیث اس پر دلیل ہے (1)۔ داؤد نے کہا: اذان اور اقامت ہر مسافر پر واجب ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن حویرث کو اور ان کے ساتھی کو فرمایا: ''جب تم دونوں سفر میں ہو تو اذان دو اور تکبیر کہو اور تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے''۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے اور یہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن حویرث اور اس کے چچا کے بیٹے کو کہا: ''جب تم سفر میں ہو تو اذان دو اور تکبیر کہو اور تم میں سے بڑا امامت کرائے'' (2)، ابن المنذر نے کہا: اذان اور اقامت سفر و حضر میں ہر جماعت پر واجب ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کا حکم دیا اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

ابوعمر نے کہا: امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری، احمد، اسحاق، ابوثور اور طبری کا اتفاق ہے کہ مسافر جب جان بوجھ کر یا بھول کر اذان ترک کر دے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اسی طرح ان کے نزدیک حکم ہے جب اقامت کو ترک کر دیں اقامت ترک کرنے میں زیادہ کراہت ہے۔ امام شافعی نے حجت پکڑی ہے کہ اذان واجب نہیں اور نہ نماز کے فرائض میں سے فرض ہے، کیونکہ مزدلفہ اور عرفہ میں نمازوں کے جمع کرنے کے وقت ایک نماز کے لیے اذان ساقط ہو جاتی ہے۔ امام مالک کا مذہب سفر میں اذان کے بارے میں امام شافعی کے مذہب کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام مالک اور امام شافعی اور ان کے اصحاب کا اتفاق ہے کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ ہیں اور تکبیر (اقامت) کے کلمات ایک ایک مرتبہ ہیں مگر امام شافعی پہلی تکبیر کو چار مرتبہ کہتے ہیں۔ یہ حضرت ابو محذورہ کی حدیث میں ثقہ راویوں سے محفوظ ہے اور حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث میں بھی اسی طرح ہے (3) فرمایا: یہ ایسی زیادتی ہے جس کا قبول کرنا واجب ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ اہل مکہ کی اذان ہمیشہ حضرت ابو محذورہ کی آل میں رہی، اسی طرح ان کے زمانہ تک ہے۔ ان کے اصحاب نے کہا: اب بھی ان کے نزدیک اسی طرح ہے۔ اور امام مالک کا جو نظریہ ہے وہ حضرت ابو محذورہ کی اذان میں اور حضرت عبداللہ بن زید کی اذان میں احادیث صحاح میں موجود ہے ان کے نزدیک مدینہ طیبہ میں آل سعد قرظی میں ابھی تک موجود ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا اذان میں ترجیع پر اتفاق ہے اور یہ موذن کا اشهد ان لا اله الا الله دو مرتبہ کہنا اور اشهد ان محمدا رسول الله دو مرتبہ کہنا ہے۔ پھر دو دو مرتبہ آواز کو بلند اور لمبا کر کے کہنا ہے۔ امام مالک، امام شافعی کا اقامت میں کوئی اختلاف نہیں مگر قد قامت الصلوٰۃ میں اختلاف ہے۔ امام مالک اس کو ایک مرتبہ کہتے ہیں اور امام

1۔ الاستذکار، جلد 4، صفحہ 80 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، باب کیف الاذان، حدیث نمبر 421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شافعی دو مرتبہ کہتے ہیں: اکثر علماء کی رائے امام شافعی کے قول پر ہے، آثار بھی اس کے متعلق مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری اور حسن بن حی نے کہا: اذان اور اقامت دونوں کے کلمات دو دو مرتبہ کہنے ہیں ان کے نزدیک ابتدا میں تکبیر اور اذان میں اللہ اکبر چار چار مرتبہ ہے۔ ان علماء کے نزدیک اذان میں ترجیع (ایک مرتبہ کلمہ شہادت کہنا اور دوبارہ بلند آواز سے کہنا) نہیں ہے ان کی حجت حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی حدیث ہے فرمایا: ہمیں اصحاب محمد نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن زید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے گویا ایک شخص کھڑا ہے اور اس پر دو سبز چادریں ہیں وہ دیوار کے ایک کونے پر کھڑا ہے اس نے اذان کے کلمات دو دو مرتبہ کہے اور اقامت کے کلمات بھی دو دو مرتبہ کہے اور اذان اور اقامت کے درمیان وہ بیٹھا حضرت بلال نے اس کو سنا اور کھڑے ہوئے دو دو مرتبہ اذان کے کلمات کہے اور پھر تھوڑا سا بیٹھے اور پھر اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہے۔ اس حدیث کو اعمش وغیرہ نے حضرت عمرو بن مرۃ سے انہوں نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے یہی تابعین اور فقہاء عراق کا قول ہے(1)۔ ابو اسحاق سبیعی نے کہا: اصحاب حضرت علی او حضرت عبداللہ اذان اور اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہتے تھے یہ کوفیوں کی اذان ہے۔

نسل در نسل یہ طریقہ چلا آرہا ہے جیسا کہ حجازیوں میں متوارث ہے ان کی اذان میں تکبیر چار مرتبہ ہے جیسا کہ مکیوں کے ہاں ہے پھر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ایک مرتبہ ہے اور اشھد ان محمد رسول اللہ ایک مرتبہ ہے پھر حی علی الصلوٰۃ ایک مرتبہ ہے پھر حی علی الفلاح ایک مرتبہ ہے پھر موذن آواز کو اونچا کر کے کلمہ شہادت کہے اور اشھد ان لا الہ الا اللہ آگے مکمل اذان کہے آخر تک دو دو مرتبہ۔ ابو عمر نے کہا: امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، داؤد بن علی، محمد بن جریر طبری کا خیال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس کے مطابق اذان و اقامت جائز ہے انہوں نے اس کو اباحت اور تخییر پر محمول کیا ہے انہوں نے فرمایا: ہر صورت جائز ہے، کیونکہ ہر صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ان کے صحابہ نے اس پر عمل کیا ہے جو چاہے اذان کی ابتدا میں اللہ اکبر دو مرتبہ کہے اور جو چاہے یہ چار مرتبہ کہے، جو چاہے ترجیع کرے اور جو چاہے ترجیع نہ کرے، جو چاہے اقامت دو مرتبہ کہے، جو چاہے ایک مرتبہ کہے سوائے قد قامت الصلوٰۃ کے کلمات کے یہ ہر حال میں دو دو مرتبہ کہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ صبح کی نماز کے لیے تثویب میں اختلاف ہے اور تثویب سے مراد موذن کا قول ہے الصلوٰۃ خیر من النوم۔ امام مالک، ثوری اور لیث نے کہا: صبح کی اذان میں موذن حی علی الفلاح دو مرتبہ کہنے کے بعد دو مرتبہ الصلوٰۃ خیر من النوم کہے یہ امام شافعی کا عراق میں قول تھا اور مصر میں یہ ہے کہ یہ نہ کہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر چاہے تو اذان سے فارغ ہونے کے بعد یہ کہے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ کلمہ نفس اذان سے ہے اور فجر کی نماز میں لوگوں کا یہی معمول ہے۔ ابو عمر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت ابومحذورہ کو حکم دیا کہ وہ صبح کی اذان میں

---

1۔ الاستذکار، جلد 4، صفحہ 14 2۔ شرح معانی الآثار میں اس پر مفصل بحث موجود ہے۔

الصلوٰۃ خیر من النوم کہے۔ ان سے حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث میں مروی ہے(1)۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا سنت سے ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ یہ کہتے تھے۔ رہا موطا میں امام مالک کا قول کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ موذن حضرت عمر کو صبح کی نماز کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے آیا تو اس نے آپ کو سویا ہوا پایا، موذن نے کہا: الصلوٰۃ خیر من النوم تو حضرت عمر نے کہا: یہ صبح کی اذان میں کہا کرو، میں یہ نہیں جانتا کہ یہ حضرت عمر سے اس جہت سے مروی ہے کہ اس سے حجت پکڑی جائے اور اس کی صحت کو جانا جائے اس میں ہشام بن عروہ کی حدیث ہے جو ایک شخص سے مروی ہے جسے اسماعیل کہا جاتا ہے میں اس کو جانتا ہوں۔

ابن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں عبدہ بن سلیمان نے بیان کیا انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے ایک شخص سے روایت کیا جس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اس نے کہا: موذن آیا اس نے حضرت عمر کو صبح کی نماز کے متعلق آگاہ کیا، اس نے کہا: الصلوٰۃ خیر من النوم، حضرت عمر کو اس پر تعجب ہوا، حضرت عمر نے موذن کو کہا: اس کو اپنی اذان میں رکھ۔ ابو عمر نے کہا: میرے نزدیک اس میں معنی یہ ہے کہ انہوں نے موذن کو کہا: صبح کی اذان اس قول کی جگہ ہے یہ اس کا مقام نہیں ہے گویا حضرت عمر نے امیر کے دروازے پر اس سے دوسری ندا کو ناپسند کیا جیسا کہ امراء نے بعد میں اس کو ایجاد کرلیا۔ ابو عمر نے کہا: مجھے اس تاویل پر ایک مخصوص وجہ نے ابھارا اگرچہ خبر کا ظاہر اس کے خلاف ہے، کیونکہ صبح کی نماز میں تثویب علماء کے نزدیک مشہور ہے اور عام لوگ یہ خیال کریں گے کہ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ناواقف تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں حضرت بلال کو اور مکہ میں حضرت ابومحذورہ کو اس کا حکم دیا تھا یہ حضرت بلال اور حضرت ابومحذورہ کی اذان میں محفوظ اور معروف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صبح کی نماز کے لیے اذان دی جاتی تھی۔ یہ علماء کے نزدیک مشہور ہے۔ وکیع نے سفیان سے انہوں نے عمران بن مسلم سے انہوں حضرت سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے مؤذن کی طرف پیغام بھیجا کہ جب توحی علی الفلاح پر پہنچے تو پھر کہہ الصلوٰۃ خیر من النوم کیونکہ یہ حضرت بلال کی اذان ہے اور یہ معلوم ہے کہ حضرت بلال نے حضرت عمر کے لیے اذان نہیں دی تھی اور نہ رسول اللہ کے بعد انہوں نے اس کو سنا تھا مگر ایک مرتبہ جب وہ شام میں داخل ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ سنت یہ ہے کہ اذان وقت داخل ہونے کے بعد دی جائے گی سوائے فجر کی اذان کے۔ فجر کی اذان امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق اور ابوثور کے قول میں طلوع فجر سے پہلے دی جائے گی ان کی حجت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ حضرت بلال رات کو اذان دیتے ہیں تم (اس وقت) کھاؤ پیو حتی کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم اذان دے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری اور امام محمد بن حسن نے کہا: صبح کی نماز کے لیے اذان اس کے وقت کے داخل ہونے کے وقت دی جائے گی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن حویرث اور اس کے ساتھی کو فرمایا: ''جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہنا اور اقامت کہنا اور تم میں سے بڑا امامت کرائے'' اور ان علماء نے بقیہ نمازوں پر اس کو قیاس کیا ہے۔ اہل حدیث کہتے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف الاذان، حدیث نمبر 422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں: جب مسجد کے لیے دو مؤذن ہوں تو ایک طلوع فجر سے پہلے اذان دے اور دوسرا طلوع فجر کے بعد اذان دے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس میں اختلاف ہے کہ موذن جو اذان دیتا ہے تکبیر اس کے علاوہ کوئی اور کہے۔ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت محمد بن عبداللہ بن زید عن ابیہ کے سلسلہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا، کیونکہ انہوں نے خواب میں اذان دیکھی تھی کہ وہ حضرت بلال کو اذان کے کلمات سکھائیں۔ حضرت بلال نے اذان دی پھر حضرت عبداللہ بن زید کو اقامت کہنے کا حکم دیا تو اس نے اقامت کہی (1)۔ ثوری، امام شافعی اور لیث نے کہا: جو اذان دے وہی اقامت کہے، کیونکہ عبدالرحمن بن زیاد بن انعم کی حدیث ہے جو انہوں نے زیاد بن نعیم سے انہوں نے حضرت زیاد بن حرث صدائی سے روایت کی ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جب صبح کا آغاز ہوا تو آپ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا میں نے اذان کہی پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت بلال اقامت کہنے کے لیے آئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(تمہارے بھائی) صدائی نے اذان دی ہے جو اذان دے وہی اقامت کہے" (2)۔ ابوعمر نے کہا: عبدالرحمن بن زیاد افریقی ہے اکثر علماء اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، یہ حدیث ان کے علاوہ کسی سے مروی نہیں ہے، پہلی حدیث سند کے اعتبار سے احسن ہے۔ اگر افریقی کی حدیث صحیح ہو، کیونکہ بعض اہل علم نے ان کی توثیق کی ہے اور ان کی تعریف کی ہے تو اس کا قول اولیٰ ہے، کیونکہ اختلاف کے موقع میں وہ نص ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن زید کا واقعہ جو حضرت بلال کے ساتھ ہوا اس سے یہ مؤخر ہے اور رسول اللہ ﷺ کے آخری امر کی اتباع اولیٰ ہے۔ نیز میں پسند کرتا ہوں کہ جب مؤذن ایک متعین ہو تو وہی تکبیر کہے، اگر کسی دوسرے نے اقامت کہہ دی تو نماز بالاجماع ہوجائے گی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ موذن کے لیے حکم ہے کہ وہ اذان کو آہستہ آہستہ دے اور اس میں راگ نہ لگائے جس طرح آج اکثر جہلاء کرتے ہیں بلکہ اکثر لوگوں نے اسے گانے اور راگ سے بھی آگے نکال دیا ہے اس میں کئی ترجیعات کرتے ہیں اور کثرت سے تقطیعات کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے دارقطنی نے ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا ایک موذن تھا جو اذان میں گانے کی طرز لگاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: "اذان آسان نرم ہے جب تیری اذان آسان نرم ہو تو فبہا ورنہ تو اذان نہ دے"۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک موذن قبلہ کی طرف منہ کرے اور حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے وقت دائیں بائیں اپنے سر کو پھیرے یہ اکثر اہل علم کے نزدیک ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اپنے سر کو نہ پھیرے مگر یہ کہ وہ منارہ میں ہو اور وہ لوگوں کو آواز سنانا چاہتا ہو یہی اسحاق کا قول ہے۔ افضل یہ ہے کہ موذن باوضو اذان دے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اذان سننے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ شہادتین کے آخر تک اذان کے کلمات کو دوہرائے اگر مکمل اذان کے کلمات دوہرائے تو بھی جائز ہے، کیونکہ حضرت ابوسعید کی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عمر بن

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی الرجل یوذن ویقیم آخر، حدیث نمبر 430، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ، باب السنۃ فی الاذان، حدیث نمبر 708، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خطاب سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب موذن اللہ اکبر، اللہ اکبر کہے، تو تم میں سے ہر سننے والا شخص کہے: اللہ اکبر، اللہ اکبر پھر موذن اشھد أن لا الہ إلا اللہ کہے تو وہ بھی اشھد أن لا الہ إلا اللہ کہے پھر موذن اشھد أن محمدا رسول اللہ کہے تو وہ بھی کہے اشھد أن محمدا رسول اللہ پھر موذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو سننے والا لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے پھر موذن حی علی الفلاح کہے تو وہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہے پھر وہ اللہ اکبر، اللہ اکبر کہے تو وہ بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کہے پھر موذن لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو وہ بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے۔ دل سے جو یہ کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کہا جب وہ موذن کو سنے اشھد أن لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك له وأن محمداً عبدہ ورسولہ رضیت باللہ ربا وبمحمد رسولاً وبالاسلام دینا تو اس کے پہلے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اذان اور موذن کی فضیلت: اس کے متعلق بہت سے صحیح آثار مروی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ کر کے بھاگتا ہے اس کی بآواز بلند ہوا خارج ہو رہی ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ اذان نہیں سنتا''۔ تیرے لیے یہ کافی ہے کہ اذان اسلام کا شعار ہے، ایمان پر علامت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، رہا موذن تو مسلم نے حضرت معاویہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سب سے لمبی گردنوں والے موذن ہوں گے، یہ اس دن کی ہولناکی سے امن کی طرف اشارہ ہے واللہ اعلم۔ عرب گردن کی طوالت سے مراد قوم کا معزز و معتبر شخص لیتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا:

طوال أَنْضِيَةِ الأَعْنَاقِ واللِمَمِ

مؤطا میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''موذن کی اذان کو جن وانس اور جو چیز بھی سنتی ہے وہ قیامت کے روز اس کے لیے گواہی دے گی'' اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ثواب کی نیت سے سات سال اذان دی اس کے لیے آگ سے برأت لکھی جاتی ہے'' (1)۔ اس میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے بارہ سال اذان دی اس کے لیے جنت واجب ہوگی اور اس کے لیے اذان کے عوض ہر روز ساٹھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں، ہر اقامت کی وجہ سے تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں'' (2)۔ ابو حاتم نے کہا: یہ سند منکر ہے اور حدیث صحیح ہے حضرت عثمان بن ابی العاص سے مروی ہے فرمایا: ''مجھے جو آخری وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ میں کوئی ایسا موذن نہ لوں جو اذان پر اجرت لے'' (3)۔ یہ حدیث ثابت ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اذان پر اجرت لینے میں علماء کا اختلاف ہے، قاسم بن عبد الرحمٰن اور اصحاب الرائے نے اس کو مکروہ

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاذان، حدیث نمبر 718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 719
3۔ سنن ابن ماجہ، باب السنۃ فی الاذان، حدیث نمبر 705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے اور امام مالک نے اس میں رخصت دی ہے، فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے کہا: یہ مکروہ ہے اور بیت المال سے اس کی اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: موذن کو وظیفہ خمس کے خمس سے یعنی نبی کریم ﷺ کے حصہ سے دیا جائے گا۔ ابن المنذر نے کہا: اذان پر اجرت لینا جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے اجرت لینے پر حضرت ابو محذورہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں نظر ہے اس حدیث کو نسائی اور ابن ماجہ وغیرہما نے روایت کیا ہے فرمایا: میں ایک جماعت کے ساتھ نکلا ہم کسی راستہ میں تھے تو رسول اللہ ﷺ کے موذن نے آپ ﷺ کے سامنے اذان دی، ہم نے موذن کی آواز سنی جب کہ ہم اس سے اعراض کرنے والے تھے، ہم اس کا مذاق اڑاتے ہوئے چیخے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ نے کچھ لوگوں کو ہماری طرف بھیجا آپ ﷺ کے سامنے انہوں نے ہمیں بٹھا دیا آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم میں سے کون تھا جس کی میں نے بلند آواز سنی'' تمام لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا اور سچی بات کہی۔ آپ ﷺ نے سب کو جانے کی اجازت دے دی اور مجھے روک لیا آپ نے مجھے فرمایا: ''تم اٹھو اور اذان دو'' میں اٹھا تو میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے امر سے کوئی چیز زیادہ ناپسندیدہ نہ تھی اور جس کا مجھے آپ نے حکم دیا تھا اس سے زیادہ ناگوار امر نہ تھا، میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہوا تو خود رسول اللہ ﷺ نے مجھے اذان کے کلمات سکھائے فرمایا: ''کہو اللہ اکبر اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد أن لا الہ الا اللہ، اشھد ان محمداً رسول اللہ، اشھد أن محمداً رسول اللہ پھر مجھے فرمایا: اپنی آواز کو بلند کر اور لمبا کر کے کہہ اشھد أن لا الہ الا اللہ، أشھد أن لا الہ الا اللہ، اشھد أنّ محمدا رسول اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ، حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح حی علی الفلاح، اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ۔ پھر مجھے بلایا جب میں نے اذان مکمل کر لی آپ نے مجھے ایک تھیلی عطا فرمائی جس میں کچھ چاندی تھی پھر آپ نے حضرت ابو محذورہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پھر اسے اس کے چہرے پر گزارا پھر اس کے سینہ پر گزارا پھر جگر پر گزارا حتی کہ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ حضرت ابو محذورہ کی ناف تک پہنچ گیا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تیرے لیے برکت دے، اللہ تیرے لیے برکت دے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے مکہ میں اذان دینے کا حکم فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تجھے حکم دیا'' تو میرے دل میں رسول اللہ ﷺ کے لیے جو کراہیت تھی وہ سب ختم ہو گئی اور اس کی جگہ رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا ہو گئی میں مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے عامل عتاب بن اسید کے پاس آیا میں نے رسول اللہ ﷺ کے امر سے ان کے ساتھ نماز کے لیے اذان دی (1)۔ یہ ابن ماجہ کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ یعنی یہ عقل سے محروم ہیں جو عقل قبائح سے منع کرتی ہے، گویا یہ ان کی طرح ہیں جن کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ روایت ہے کہ ایک نصرانی تھا جو مدینہ طیبہ میں رہتا تھا جب اس نے موذن کو اشھد ان محمدا رسول اللہ کہتے سنا تو اس نے کہا: حرق الکاذب جھوٹا آگ سے جلایا گیا۔ پس اس عیسائی کے گھر میں آگ کا ایک شعلہ گرا جب کہ وہ سویا ہوا تھا اس شعلہ نے اس کے گھر اور اس کافر کو جلا دیا۔ یہ مخلوق کے لیے عبرت تھی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف الاذان، حدیث نمبر 422, 425، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آزمائش کلام کے سپرد کی گئی ہے کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ڈھیل دی جاتی تھی حتی کہ انہیں فتح ہوتی تھی پس اس کے بعد ان کو موخر نہیں کیا جائے گا، یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝

''آپ فرمایئے: اہل کتاب! تم کیا ناپسند کرتے ہو ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور جو اتارا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا اس سے پہلے اور بلا شبہ بہت سے تم میں سے فاسق ہیں۔ آپ (انہیں) فرمایئے: کیا میں آگاہ کروں تمہیں کہ کون برا ہے ان سے باعتبار جزا کے اللہ کے نزدیک؟ وہ لوگ (برے ہیں) جن پر لعنت کی اللہ نے اور غضب فرمایا ان پر اور بنایا ان سے بعض کو بندر اور بعض کو سؤر اور (وہ برے ہیں) جنہوں نے پوجا کی شیطان کی وہی لوگ بدترین ہیں بلحاظ درجہ کے اور دوسروں سے زیادہ بھٹکنے والے ہیں راہ راست سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کا ایک گروہ آیا، جن میں ابو یاسر بن اخطب اور رافع بن ابی رافع بھی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کن رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ آیت پڑھی: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (بقرہ) جب آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تو یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرتے ہوئے کہا: بخدا ہم کوئی ایسے دین والے نہیں جانتے جو دنیا و آخرت میں تم سے زیادہ کم حصہ والے ہوں اور تمہارے دین سے برا دین نہیں جانتے تو یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی یہ اس آیت کے ساتھ متصل ہے جس میں انہوں نے اذان کا انکار کیا تھا۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت کی جامع ہے اور اس کے دین کے نہ ہونے کو بیان کرنے والی ہے جو انبیاء کے درمیان فرق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا دین نہیں جو تمام انبیاء پر ایمان لاتا ہے اور تا میں لام کو ادغام کرنا جائز ہے ان کے قرب کی وجہ سے تَنْقِمُوْنَ کا معنی ہے تم ناراض ہوتے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم ناپسند کرتے ہو۔ بعض نے فرمایا: تم انکار کرتے ہو۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ کہا جاتا ہے: نقم من کذا، ينقِمُ، نقم ينقم۔ پہلا مادہ زیادہ ہے۔ عبداللہ بن قیس نے کہا:

مانَقَمُوا من بنی أُمَيَّةَ إلّا أنهم يحلُمون إن غَضِبُوا

قرآن میں ہے: وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ (البروج: 8) کہا جاتا ہے: نقمت علی الرجل فانا ناقم جب تو کسی پر ناراض ہو کہا جاتا ہے: ما نقمت علیہ الاحسان۔ کسائی نے کہا: نقمت قاف کے کسرہ کے ساتھ ایک لغت ہے نقمت الامر و نقمتہ جب تو کسی کو ناپسند کرے۔ انتقم اللہ منہ اللہ نے اس سے انتقام لیا، اسے سزا دی، اس سے اسم النقمۃ ہے اس کی جمع نقمات اور نقم ہے جیسے کلمۃ کی جمع کلمات اور کلم ہے اگر تو چاہے تو قاف کو ساکن کر دے اور اس کی حرکت نون کی طرف منتقل کر دے اور تو کہے: نقمۃ اور جمع نقم جیسے نعمۃ جمع نعم۔

اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ یہ محل نصب میں ہے اس کا ناصب تَنْقِمُوْنَ ہے اور تَنْقِمُوْنَ بمعنی تعیبون (تم عیب لگاتے ہو) ہے یعنی کیا تم ہمیں عیب لگاتے ہو بجز اس کے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ ہم حق پر ہیں۔ (1)

وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۝ یعنی تم میں سے اکثر ایمان کو ترک کیے ہوئے ہو اور اللہ کے امر کی پیروی سے نکلے ہوئے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس کہنے والے کے قول کی مثل ہے ھل تنقم منی الا انی عفیف وانک فاجر تو مجھے عیب نہیں لگا رہا مگر اس لیے کہ میں پاک دامن ہوں اور تو فاجر ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے، کیونکہ اکثر تم میں سے فاسق ہیں اس وجہ سے ہمیں عیب لگاتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ یعنی میں تمہیں اس سے بھی برے لوگوں کے متعلق آگاہ کروں جو تمہیں عیب لگاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے برا جو مکروہ چیز تم ہمارے لیے ارادہ کرتے ہو، یہ ان کے قول کا جواب ہے جو انہوں نے کہا تھا: ہم کوئی تمہارے دین سے برا دین نہیں جانتے۔

مَثُوْبَةً بیان کے اعتبار سے منصوب ہے اس کی اصل مفعولۃ ہے واؤ کی حرکت تا کو دی گئی، پھر واؤ ساکن ہو گئی اور اس کے بعد واؤ ساکن ہے پس ایک واؤ کو حذف کر دیا گیا جیسے مقولہ، مجوزہ، مضوفہ، مصدر کے معنی پر ہے جیسے شاعر نے کہا:

وكنتُ إذا جارِي دَعَا لِمَضُوفةٍ  أشَمِّرُ حتى يَنْصُفَ السَّاقَ مِئْزَرِي

بعض علماء نے فرمایا: مفعلۃ جیسے تیرا قول: مکرمۃ، معقلۃ۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ، مَنْ یہ محل رفع میں ہے جیسے فرمایا: بشر من ذالکم النار۔ تقدیر عبارت ہے: ھو من لعن من لعنہ اللہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ محل نصب میں ہو، معنی یہ ہوگا: ھل انبئکم بمن لعنہ اللہ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ شر سے بدل کی بنا پر محل جر میں ہو تقدیر یوں ہوگی: ھل انبئکم بمن لعنہ اللہ۔ اس سے مراد یہود ہیں (2): الطَّاغُوْتَ کے متعلق قول گزر چکا ہے یعنی جنہوں نے پوجا کی شیطان کی۔ فراء کے نزدیک موصول محذوف ہے۔ بصریوں نے کہا: موصول کا حذف جائز نہیں ہے معنی یہ ہے: من لعنہ اللہ وعبد الطاغوت۔

ابن وثاب اور نخعی نے أنبئکم تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے عبد الطاغوت با کے ضمہ اور تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کو فعل کے وزن پر اسم بنایا جیسے عضد یہ مبالغہ اور کثرت کے لیے وزن ہے جیسے یقظ، تدس، حذر اصل میں یہ

1۔ المحرر الوجیز 2۔ تفسیر بغوی

صفت ہے اسی سے نابغہ کا شعر ہے:

مِنْ وَحْشِ وَجْرَة مَوْشِي أَكَارِعُه　　طَاوِي المَصِيرِ كَسيف الصَّيْقَل الفَرد

را کے ضمہ کے ساتھ اور اس کو نصب جعل کی وجہ سے ہے یعنی جعل منهم عبد اللطاغوت عبد کو الطاغوت کی طرف مضاف کیا اور اسے جر دی اور جعل بمعنی خلق ہے۔ اس کا معنی ہے وجعل منهم من يبالغ في عبادة الطاغوت۔ باقی قراء نے با اور تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے عبد کو فعل ماضی بنایا ہے اور غضب اور لعن فعل ماضی پر عطف کیا ہے۔ معنی یہ ہے: من لعنه الله و من عبد الطاغوت۔ یا جعل کی وجہ سے منصوب ہے یعنی جعل منهم القردة والخنازير و عبد الطاغوت، لفظ من پر حمل کرنے کی وجہ سے عبد میں ضمیر واحد ذکر کی۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے عبدوا الطاغوت پڑھا ہے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے۔

حضرت ابن عباس نے عبد الطاغوت پڑھا ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ عبد کی جمع ہو جیسے کہا جاتا ہے: رَهْن و رُهُن، سَقْف و سُقُف اور عباد کی جمع ہونا بھی جائز ہے جیسے کہا جاتا ہے: مثال ومثل۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ عبید کی جمع ہو جیسے رغیف و رغف۔ یہ عابد کی جمع ہونا بھی جائز ہے جیسے نازل کی جمع نزل ہے معنی ہے شیطان کے خادم، حضرت ابن عباس سے عبد الطاغوت بھی مروی ہے اس کو عابد کی جمع بنایا ہے جیسے کہا جاتا ہے: شاهد کی جمع شهد، غائب کی جمع غيب، ابی واقد سے مروی ہے عباد الطاغوت مبالغہ کے لیے۔ یہ عابد کی جمع بھی ہے جیسے عامل کی جمع عمال ہے اور ضارب کی جمع ضراب ہے۔ محبوب نے ذکر کیا ہے کہ بصریوں نے عباد الطاغوت پڑھا ہے یہ بھی عابد کی جمع ہے جیسے قائم کی جمع قیام ہے یہ بھی جائز ہے کہ عبد کی جمع ہو(1) اور ابو جعفر رؤاسی نے عبد الطاغوت پڑھا ہے یہ مفعول کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: عبد الطاغوت فيهم، عون عقیلی اور ابن بریدہ نے عابد الطاغوت مفرد پڑھا ہے یہ جماعت کی تعبیر کے لیے ہے۔ حضرت ابن مسعود نے عبد الطاغوت پڑھا ہے اور حضرت ابی نے عبدت الطاغوت پڑھا ہے یہ جماعت کی تانیث کی بنا پر پڑھا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ (الحجرات: 14) عبید بن عمیر نے اعبد الطاغوت پڑھا ہے جیسے کلب کی جمع اکلب آتی ہے یہ کل بارہ وجوہات قرأت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا کیونکہ ان کا مکان دوزخ ہے، رہے مومنین ان کے مکان میں کوئی شر نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اولئك شر مكانا على قولكم۔ تمہارے قول پر برے ٹھکانے والے ہیں۔ نحاس نے کہا: جو اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے بہتر یہ قول ہے اولئك لعنهم الله شر مكانا في الاخرة من مكانكم في الدنيا لما لحقكم من الشر۔ دنیا میں جو تمہیں شر لاحق ہے اس کی بنسبت آخرت میں ان کا درجہ بہت برا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اولئك الذين لعنهم شر مكانا من الذين نقموا عليكم یعنی ان کا درجہ اُن سے برا ہوگا جنہوں نے تم پر عیب لگایا۔ بعض نے فرمایا: اولئك الذين نقموا عليكم شر مكانا من الذين لعنهم الله۔ یعنی جن پر اللہ نے لعنت کی ان سے ان کا برا درجہ ہوگا

1۔ المحرر الوجیز

جنہوں نے تم پر عیب لگایا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے انہیں کہا: یا اخوۃ القردۃ والخنازیر اے بندروں اور خنازیر کے بھائیو! تو انہوں نے رسوائی کی وجہ سے سر جھکا لیے (1)۔ اس کے متعلق شاعر نے کہا:

فلعنۃُ اللہ علی الیہودِ إنَّ الیہودَ إخوۃُ القُرودِ

وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا یَكْتُمُوْنَ ۝ وَ تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْ لَا یَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ۝

”جب آتے ہیں تمہارے پاس تو کہتے ہیں: ہم ایمان لا چکے حالانکہ وہ (یہاں) داخل بھی ہوئے کفر کے ساتھ اور وہ نکلے بھی کفر کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپا رہے تھے اور آپ دیکھتے ہیں بہتوں کو ان میں سے کہ بڑے تیز رفتار ہیں گناہ اور زیادتی کرنے میں اور حرام خوری میں بے شک یہ بہت ہی برے کام کرتے رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے بے شک بہت برے ہیں وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ منافقین کی صفت ہے معنی ہے کہ جو کچھ انہوں نے سنا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ وہ کافر ہوتے ہوئے داخل ہوئے کافر ہوتے ہوئے خارج ہوئے (2) وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا یَكْتُمُوْنَ ۝ یعنی ان کے نفاق کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں جنہوں نے کہا تھا: تم اس پر ایمان لاؤ جو ایمان والوں پر نازل کیا گیا، دن کے آغاز کے وقت جب تم مدینہ میں داخل ہو اور دن کے آخر میں انکار کرو، جب تم گھروں کو لوٹ کر آؤ (3)۔ اس پر دلیل یہود کا پہلے ذکر ہے اور بعد میں بھی ان کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یعنی یہود میں سے بہتوں کو تو دیکھتا ہے۔ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ گناہ اور ظلم میں جلدی کرتے ہیں اور حرام خوری میں جلدی کرتے ہیں۔ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ لَا یَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ، لَوْ لَا بمعنی افلا ہے یَنْهٰىهُمْ یعنی انہیں روکتے نہیں ہیں۔ الرَّبّٰنِیُّوْنَ، نصرانیوں کے علماء، الْاَحْبَارُ یہود کے علماء۔ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سب یہود میں ہے، کیونکہ یہ آیات ان کے متعلق ہیں پھر ان کے علماء کو توبیخ فرمائی، کیونکہ انہوں نے برائی سے منع کرنا ترک کیا۔ فرمایا: لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ۝ جیسے انہیں توبیخ فرمائی جو گناہ میں جلدی کرتے ہیں فرمایا: لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ یہ آیت دلیل ہے کہ برائی سے منع نہ کرنے والا بھی برائی کرنے والے کی طرح ہے۔ اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے کی وجہ

1۔ تفسیر کشاف 2۔ المحرر الوجیز 3۔ تفسیر بغوی

سے علماء کو توبیخ ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں یہ مفہوم گزر چکا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے روایت کیا ہے فرمایا سفیان بن سعید نے مسعر سے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک فرشتہ کو ایک شہر کے برباد کرنے کا حکم ملا، اس نے عرض کی: یا رب! اس میں فلاں عابد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اس سے ہلاکت کا آغاز کر، کیونکہ احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بھی کبھی نہیں بدلا تھا۔ صحیح ترمذی میں ہے کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھوں کو نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو سزا دے دے جو اس کے پاس ہوں (1)۔ الصنع بمعنی العمل ہے مگر یہ جودت کا تقاضا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے سیف صنیع جب اس کا کام اچھا کیا گیا ہو۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

''اور کہا یہود نے کہ اللہ کا ہاتھ جکڑا ہوا ہے جکڑے جائیں گے ان کے ہاتھ اور پھٹکار ہو ان پر بوجہ اس (گستاخانہ) قول کے بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور ضرور بڑھا دے گا اکثر کو ان میں سے جو نازل کیا گیا آپ کی طرف آپ کے رب سے سرکشی اور انکار میں اور ہم نے ڈال دی ہے ان میں دشمنی اور بغض روز قیامت تک جب کبھی وہ بھڑکاتے ہیں آگ لڑائی کی بجھا دیتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور یہ کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی اور اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا فسادیوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ عکرمہ نے کہا: یہ جملہ فنحاص بن عازوراء (لعنہ اللہ) اور اس کے ساتھیوں نے کہا تھا ان کے بہت سے اموال تھے جب انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا تو ان کا مال کم ہو گیا انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ بخیل ہے، اس کا ہاتھ ہمیں عطا کرنے سے باندھا ہوا ہے۔ یہ آیت ان کے بعض لوگوں میں خاص ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو ایک قوم نے یہ کہا اور باقی لوگوں نے اس کا انکار نہ کیا تو وہ تمام برابر ہو گئے گویا سب نے یہ کہا (2): حسن نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمیں عذاب دینے سے روکا گیا ہے۔ بعض نے فرمایا: جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر و فاقہ اور مال کی قلت میں دیکھا اور انہوں نے مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ: 245) کا ارشاد سنا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دیات میں مدد طلب کرتے ہیں تو انہوں نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا الہ فقیر ہے، کبھی انہوں نے کہا: بخیل ہے۔ ان کے قول يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ کا یہی معنی ہے یہ بطور تمثیل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ (الاسراء: 29)

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ المائدہ، حدیث نمبر 2983، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر بغوی

بخیل کو جَعْدُ الْأَنامل اور مقبوض الکف اور کَزّ الْأَصابع اور مغلول الید کہا جاتا ہے شاعر نے کہا:

کانت خُراسان أرضا إذْ یَزِیدُبها　　وکلُّ باب من الخیرات مفتوح

فاستبدلت بعدہ جَعْداً أناملہ　　کأنَّما وجهه بالخلِّ منضوح

عرب کلام میں الید کا لفظ کبھی کام کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے: خُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا (ص: 44) یہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے، کبھی نعمت کے لیے استعمال ہوتا ہے، عرب کہتے ہیں: کم یدلی عند فلان یعنی میرے کتنے احسانات اس پر ہیں کبھی یہ قوت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَیْدِ (ص: 17) یعنی ذا القوۃ۔ کبھی ملک اور قدرت کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران: 73) کبھی صلہ کے معنی میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا (یٰسین: 71) یعنی مما عملنا نحن اور فرمایا: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ: 237) یعنی وہ جس کے لیے نکاح کی گرہ ہے، کبھی تائید اور نصرت کے معنی میں ہوتا ہے، اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ید اللہ مع القاضی حتی یقضی و القاسم حتی یقسم اللہ کی تائید و نصرت قاضی کے ساتھ ہوتی ہے حتی کہ وہ فیصلہ کرلے اور قاسم کے ساتھ ہوتی ہے حتی کہ وہ تقسیم کرے۔ کبھی فعل کی مخبر عنہ کی طرف اضافت کے لیے ہوتا ہے اس کو تشریف و تکریم دینے کے لیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (ص: 75) اس کو کام کرنے کے معنی پر محمول کرنا جائز نہیں کیونکہ باری تعالیٰ واحد ہے اس پر بعضیت جائز نہیں اور اسے قوت، ملک، نعمت، صلہ پر محمول کرنا درست نہیں، کیونکہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے ولی آدم اور اس کے دشمن ابلیس کے درمیان اشتراک واقع ہوگا اور جو اس نے اس پر تفضیل ذکر کی ہے وہ باطل ہو جائے گی، کیونکہ تخصیص کا معنی باطل ہو جائے گا اور صرف یہ باقی رہ جائے گا کہ اسے دو صفتوں پر محمول کیا جائے جن کا تعلق حضرت آدم اور ابلیس کی تخلیق کے ساتھ ہے حضرت آدم کو شرف دینے کے لیے جب کہ ابلیس تخلیق میں ایسا نہیں اور یہ تعلق ایسا ہے جیسے مقدور کے ساتھ قدرت کا تعلق ہوتا ہے نہ کہ مباشرت کے طریق سے اور نہ مماست (چھونا) کے طریق سے ہے اس کی مثل وہ ہے جو روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا، اس سے اہل جنت کے لیے دار الکرامۃ اپنے ہاتھ سے لگایا۔ اس کے علاوہ صفت کا تعلق اپنے مقتضا سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا یا پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے ضمہ کو حذف کیا گیا یعنی آخرت میں باندھے ہوں گے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان پر بددعا ہو۔ اسی طرح لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ہے اس سے مقصود ہمیں تعلیم دینا ہے جیسا کہ فرمایا: لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ (الفتح: 27) ہمیں استثنا سکھائی جس طرح ہمیں ابولہب پر بددعا سکھائی تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ساری مخلوق سے زیادہ بخیل ہیں تو ہر یہودی تجھے لئیم اور کمینہ نظر آئے گا اس قول کی بنا پر کلام میں واو کا اضمار ہوگا یعنی انہوں نے کہا: یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ، اللعن کا معنی دور کرنا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ مبتدا خبر ہیں یعنی اس کی نعمت تو پھیلی ہوئی ہے الید بمعنی نعمت ہے۔ بعض

نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ پس اللہ کی نعمتیں شمار سے زیادہ ہیں پھر یہ کیسے ہوگا کہ اس کی دو نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں؟ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جنس کا تثنیہ ہو، مفرد کا تثنیہ نہ ہو۔ پس یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: مثل المنافق کالشاۃ العائرۃ بین الغنمین کی طرح ہے۔ ایک جنس دنیا کی نعمت ہے اور دوسری جنت، آخرت کی نعمت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دنیا کی ظاہری اور باطنی نعمت ہے جیسے فرمایا: وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان: 20) (1) اور تمام کر دی ہیں اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں ظاہری بھی اور باطنی بھی۔

حضرت ابن عباس نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: نعمت ظاہرۃ سے مراد تیری خوبصورت تخلیق ہے اور نعمت باطنہ سے مراد اس کا تیرے برے اعمال پر پردہ ڈالنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دو نعمتوں سے مراد بارش اور نبات ہیں جن کے ساتھ اور جن سے نعمت میسر آتی ہے۔ بعض نے فرمایا: نعمت مبالغہ کے لیے ہے جیسے عرب کہتے ہیں: لبیک وسعدیک، صرف دو مرتبہ پر اکتفا کا ارادہ نہیں ہے، کبھی قائل کہتا ہے: مالی بھذا الامر ید یعنی مجھے اس معاملہ کی قوت نہیں۔ سدی نے کہا: یداہ کا معنی اس کی ثواب اور عقاب کی قوتیں ہیں بخلاف اس کے جو یہود نے کہا: بے شک اس کا ہاتھ ان کو عذاب دینے سے بند ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں دن، رات کا خرچ کرنا اس میں کمی نہیں کرتا۔ بتاؤ جو اس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے خرچ کیا ہے اس نے اس میں کچھ کمی نہیں کی جو اس کے دائیں ہاتھ میں ہے''۔ فرمایا: ''اس کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں موت ہے وہ بلند کرتا ہے اور نیچے کرتا ہے''۔ السح سے مراد کثرت سے بہانا ہے یغیض کا معنی کم کرنا ہے اس حدیث کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ (بقرہ: 245) رہی یہ آیت تو حضرت ابن مسعود کی قرأت میں بل یداہ بسطان ہے، یہ اخفش نے حکایت کیا ہے انہوں نے کہا: کہا جاتا ہے: ید بسطۃ یعنی کھلا ہاتھ۔ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت میں الید سے مراد قدرت ہو یعنی اس کی قدرت شامل ہے اگر چاہے تو وسیع کر دے اگر چاہے تو تنگ کر دے۔ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ۔ لام قسم ہے۔

مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اس میں ما موصولہ ہے یعنی الذی انزل الیک۔

طُغْيَانًا وَّكُفْرًا یعنی جب قرآن سے کوئی چیز نازل ہوتی ہے تو وہ انکار کرتے ہیں اور ان کا کفر زیادہ ہوا۔ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ مجاہد نے کہا: یعنی یہود و نصاریٰ کے درمیان، کیونکہ اس سے پہلے فرمایا: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم نے یہود کے گروہوں کے درمیان عداوت و بغض ڈال دیا جیسا کہ فرمایا: تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (الحشر: 14) پس یہودی آپس میں بغض رکھتے ہیں متفق نہیں ہیں۔ وہ لوگوں سے اللہ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بغض رکھنے والے ہیں۔ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اس سے مراد یہود ہیں۔ كُلَّمَاۤ ظرف ہے یعنی وہ جمع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ تفسیر رازی ایضاً المحرر الوجیز

ان کی جمعیت کو بکھیر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہود نے جب فساد کیا اور کتاب الله (تورات) کی مخالفت کی تو الله تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو بھیجا پھر انہوں نے فساد کیا تو الله تعالیٰ نے ان پر بطرس رومی کو بھیجا، پھر انہوں نے فساد برپا کیا تو اس پر مجوسیوں کو مسلط کیا پھر انہوں نے فساد کیا تو الله تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر غالب کیا، جب بھی ان کا معاملہ قائم ہوا الله تعالیٰ نے ان کا شیرازہ بکھیر دیا، جب بھی انہوں نے آگ جلائی یعنی شر کو ابھارا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنگ مسلط کرنے کے لیے جمع ہوئے تو الله تعالیٰ نے اسے بجھا دیا ان پر جبر فرمایا اور ان کے معاملہ کو کمزور کر دیا، آگ کا ذکر مستعار ہے۔ قتادہ نے کہا: الله تعالیٰ نے ان کو ذلیل کیا الله تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو یہودی مجوسیوں کے ماتحت تھے، پھر فرمایا: وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا یعنی وہ اسلام کے ابطال کے لیے کوشش کرتے ہیں یہ بہت بڑا فساد ہے۔ والله اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: آگ سے مراد غضب کی آگ ہے یعنی جب انہوں نے اپنے نفسوں میں غضب کی آگ جلائی اور اپنے بدنوں اور قوت نفس کے ساتھ غضب کی آگ کی گرمی کو جمع کیا تو الله تعالیٰ نے اس آگ کو بجھا دیا حتیٰ کہ وہ کمزور ہو گئے یہ اس طرح ہوا کہ الله تعالیٰ نے اپنے نبی کو رعب کے ساتھ مدد دی۔ (1)

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو ہم ضرور دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ہم ضرور داخل کرتے انہیں نعمت کے باغوں میں۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو (اپنے عمل سے) اور جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے (تو فراخ رزق دیا جاتا انہیں حتیٰ کہ) وہ کھاتے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی ان میں ایک جماعت اعتدال پسند بھی ہے اور اکثر ان میں سے بہت برا ہے جو کر رہے ہیں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ أَنْ محل رفع میں ہے، اسی طرح وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ ہے۔ اٰمَنُوْا تصدیق کی۔ وَاتَّقَوْا شرک اور گناہوں سے اجتناب کیا۔ لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ لام، لو کا جواب ہے۔ لَكَفَّرْنَا کا مطلب ہے ہم نے ڈھانپ دیا۔ یہ پہلے گزر چکا ہے تورات اور انجیل کو قائم کرنے کا مطلب ہے ان کے مقتضیٰ کے مطابق عمل کرنا اور ان میں تحریف و تبدیلی نہ کرنا یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ یعنی قرآن۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ان کے انبیاء کی کتب ہیں (2)۔ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس سے مراد بارش اور نبات ہیں یہ دلیل ہے کہ وہ قحط میں مبتلا تھے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم ان کے رزق میں

1۔ تفسیر طبری 2۔ تفسیر بغوی

وسعت پیدا کرتے اور وہ متواتر کھاتے رہتے۔ فوق اور تحت کا ذکر دنیا کے جو خزانے ان پر کھولے جائیں گے ان میں مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔ اس آیت کی مثال وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (طلاق) اور جو (خوش بخت) ڈرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ سے بنا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کا راستہ اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ (الجن) اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر تو ہم انہیں سیراب کریں گے کثیر پانی سے۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (الاعراف:96) اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی۔

اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو رزق کے اسباب میں سے بنایا ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے اور مزید کا وعدہ ہے اس شخص کے لیے جس نے شکر ادا کیا۔ فرمایا: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم:7) اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان میں سے بعض اعتدال پسند ہیں وہ ان میں سے ایمان لانے والے ہیں جیسے نجاشی، سلمان اور عبداللہ بن سلام۔ یہ اعتدال پسند تھے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد کے بارے میں صرف وہ کہا ہے جو ان کی شان کے لائق ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اقتصاد سے مراد وہ قوم لی ہے جو ایمان نہیں لائے تھے لیکن وہ اذیت دینے والے اور استہزا کرنے والے نہ تھے۔ واللہ اعلم۔

الاقتصاد سے مراد عمل میں اعتدال ہے۔ یہ القصد سے ہے القصد کا معنی ہے کسی چیز کو کرنا تو کہتا ہے: قصدته وقصدت له، وقصدت اليه اس کا معنی ہے میں نے اس کا قصد کیا۔ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ یعنی بہت برا ہے جو انہوں نے کیا ہے انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا، کتب میں تحریف کی اور حرام کھایا۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

''اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے یقیناً اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافروں کی قوم کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تبلیغ کو ظاہر کرو، کیونکہ اسلام کے آغاز میں مشرکین کے خوف سے آپ تبلیغ مخفی طریقہ سے کرتے تھے پھر اس آیت میں

تبلیغ کے اظہار کا حکم دیا اور الله تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا کہ وہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا (1)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے اسلام کو ظاہر کیا اور فرمایا: ہم اللہ تعالیٰ کی سرأ عبادت نہیں کریں گے، اس کے بارے میں یہ نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (الانفال) اے نبی مکرم! کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے۔

یہ آیت ان کے قول کا رد ہے، جو کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے امر میں سے کوئی چیز تقیۃً چھپائی ہے۔ یہ آیت ان کے قول کے بطلان پر دلالت کر رہی ہے اور یہ رافضی لوگ ہیں۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر دین میں سے کوئی چیز کسی سے خفیہ نہیں کہی، کیونکہ بلّغ کا معنی ہے جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اس تمام کو ظاہراً پہنچاؤ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ میں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے حضرت زینب بنت جحش کے معاملہ کے بارے میں جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ صحیح قول عموم کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس تمام کو پہنچائیں جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اگر آپ اس میں سے کچھ چھپائیں گے تو آپ نے نہیں پہنچایا الله کا پیغام۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی گئی ہے اور آپ کی امت کے اہل علم حضرات کی تادیب ہے کہ وہ امر شریعت میں سے کچھ نہ چھپائیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔

صحیح مسلم میں مسروق نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو تجھے یہ بیان کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں سے کوئی چیز چھپائی تو اس نے جھوٹ بولا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ، الایہ۔ اللہ تعالیٰ رسوا کرے رافضیوں کو جنہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں سے کوئی چیز چھپائی ہے جس کی لوگوں کو حاجت تھی۔ (2)

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود خبر دی کہ آپ معصوم ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے عصمت کی ضمانت دی، پس یہ جائز نہیں کہ اس نے کوئی ایسی چیز ترک کی ہو جس کا انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو۔ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے، ایک اعرابی آیا اس نے اپنی تلوار سونت لی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا: تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "اللہ"۔ اعرابی کا ہاتھ کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی، اس نے اپنا سر درخت پر مارا حتیٰ کہ اس کا دماغ بکھر گیا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ قاضی عیاض نے کتاب الشفاء میں یہ ذکر کیا ہے فرمایا: یہ واقعہ صحیح میں روایت کیا گیا ہے۔ غورث بن حارث تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معاف کر دیا تھا، پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آیا اور کہا: میں تمہارے پاس ایک ایسے شخص سے ہو کر آیا ہوں جو تمام لوگوں سے بہتر ہے۔ اس سورت میں اس معنی میں کلام اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ (المائدہ: 11) کے قول کے تحت تفصیلاً گزر چکی ہے اور سورۃ النساء میں بھی صلاۃ خوف کے ذکر میں۔

1۔ تفسیر بغوی
2۔ احکام القرآن للکیا الطبری

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کی طرف ایک غزوہ میں شرکت کی ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایسی وادی میں پایا جس میں بہت زیادہ کانٹوں والے درخت تھے۔ رسول اللہ ﷺ ایک درخت کے نیچے اترے اور اپنی تلوار اس کی ٹہنی سے لٹکا دی فرمایا: لوگ وادی میں بکھر گئے تاکہ سایہ حاصل کریں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص میرے پاس آیا جب کہ میں سویا ہوا تھا اس نے تلوار پکڑ لی، میں بیدار ہوا تو وہ میرے سر پر کھڑا تھا میں نے محسوس نہ کیا مگر وہ تلوار سونتے ہوئے تھا''۔ اس نے مجھے کہا: تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ فرمایا: میں نے کہا: ''اللہ''۔ فرمایا: اس نے تلوار نیام میں ڈال لی، یہ ہے وہ شخص جو بیٹھا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر کچھ تعرض نہ فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ نے مجھے رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا تو میں کچھ تنگ دل ہوا اور میں جانتا تھا کہ لوگوں میں سے کچھ میری تکذیب کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی'' (1)۔ حضرت ابو طالب ہر روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بنی ہاشم کے چند لوگ بھیجتے تھے جو آپ کی حفاظت کرتے تھے حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے میرے چچا! اللہ نے مجھے جن و انس کی اذیت سے محفوظ فرمایا ہے، مجھے ان حفاظت کرنے والوں کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ مکہ تھا اور یہ آیت مکی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے پہلے گزر چکا ہے کہ بالاجماع یہ سورہ مدنی ہے۔ اور اس سورہ کے مدنی ہونے پر دلیل وہ حدیث ہے جو مسلم نے صحیح میں حضرت عائشہ سے روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو ایک رات جاگتے رہے اور فرمایا: ''کاش میرے اصحاب میں سے کوئی نیک صالح شخص اس رات کو میری حفاظت کرتا''۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: اسی اثنا میں ہم نے ہتھیار کی آواز سنی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کون ہے''؟ اس نے کہا: حضرت سعد بن ابی وقاص۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''تم کیسے آئے ہو؟'' اس نے کہا: میرے دل میں آپ کے متعلق خوف واقع ہوا میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ کی حفاظت کروں۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی اور سو گئے۔

صحیح کے علاوہ میں ہے حضرت عائشہ نے فرمایا: ہم اسی اثنا میں تھے کہ ہتھیار کی آواز سنی گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: سعد اور حذیفہ، ہم آپ کی حفاظت کرنے کے لیے آئے ہیں حتی کہ میں نے آپ ﷺ کے خراٹے کی آواز سنی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے چمڑے کے قبہ سے اپنا سر باہر نکالا اور فرمایا: ''اے لوگو! واپس چلے جاؤ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت فرمائی ہے''۔

اہل مدینہ نے رسالاتہ یعنی جمع پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو اور اہل کوفہ نے رسالتہ واحد پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں قراٗتیں بہتر ہیں اور جمع زیادہ واضح ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ پر تھوڑی تھوڑی وحی نازل ہوتی تھی پھر آپ اسے بیان کرتے تھے، افراد، کثرت پر دلالت کرتا ہے یہ مصدر کی طرح ہے اور مصدر کا اکثر کلام میں جمع اور تثنیہ نہیں بنایا جاتا، کیونکہ وہ اپنے لفظ کے ساتھ اپنی نوع پر دلالت کرتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 51

اگر تم گننا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ کافروں کی راہنمائی نہیں فرماتا۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ تبلیغ کر دیں، رہی ہدایت تو وہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"آپ فرمایئے اہل کتاب! نہیں ہو تم کسی چیز پر (ہدایت سے) یہاں تک کہ (عمل سے) قائم کرو تورات اور انجیل کو اور جو اتارا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور ضرور بڑھا دے گا اکثر کو ان میں سے جو نازل کیا گیا آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے سرکشی اور انکار میں، پس آپ نہ افسوس کریں قوم کفار پر"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کی ایک جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: کیا آپ تسلیم نہیں کرتے کہ تورات اللہ کی طرف سے حق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیوں نہیں"، یہود نے کہا: ہم اس تورات پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں، پس یہ آیت نازل ہوئی یعنی تم دین میں سے کسی چیز پر نہیں ہو حتی کہ ان دونوں کتابوں میں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور ان پر عمل کرو۔ ابو علی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ حکم تورات و انجیل کے نسخ سے پہلے ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا۔

یعنی وہ رب کی طرف سے نازل شدہ کا انکار کرتے ہیں اور کفر پر کفر میں بڑھتے جاتے ہیں۔ الطغیان کا معنی ظلم اور غلو میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ ظلم میں سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے، کچھ بڑا ہوتا ہے پس جو چھوٹے ظلم سے تجاوز کرتا ہے اس نے حد سے تجاوز کیا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۝ (العلق) یعنی حق سے خروج میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ یعنی آپ ان کافروں پر افسوس نہ کریں۔

أسی یأسی أسّی کا معنی ہے غمگین ہونا۔ شاعر نے کہا:

وَانْحَلَبَتْ عیناہ من فَرْطِ الأَسَی — فرط غم سے ان کی آنکھیں بہہ پڑیں۔

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان اور تسلی دینے کے لیے مطلق غمگین ہونے سے نہی نہیں ہے، کیونکہ انسان اس پر قادر نہیں ہوتا بلکہ یہ تسلی دینا ہے اور حزن کی وجہ سے تعرض سے نہی ہے۔ یہ مفہوم سورۂ آل عمران کے آخر میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصرانی جو بھی (ان میں سے ایمان لایا) اللہ پر اور روز قیامت پر اور نیک عمل کیے تو نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اس آیت پر پہلے کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا یہ معطوف ہے، اسی طرح الصّٰبِئُوْنَ، هَادُوْا کی ضمیر پر معطوف ہے۔ یہ کسائی اور اخفش کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے زجاج کو یہ کہتے سنا، اس کے سامنے اخفش اور کسائی کا قول ذکر کیا گیا تھا یہ دو جہتوں سے غلط ہے ایک یہ کہ ضمیر مرفوع پر عطف قبیح ہوتا ہے حتی کہ پہلے ضمیر کی تاکید لگائی جائے۔ دوسری یہ کہ معطوف، معطوف علیہ کا شریک ہوتا ہے معنی یہ ہو جائے گا کہ صائبین یہودیت میں داخل ہیں اور یہ محال ہے۔ فراء نے کہا: الصّٰبِئُوْنَ میں رفع جائز ہے، کیونکہ ان ضعیف عامل ہے یہ صرف اسم میں عمل کرتا ہے خبر میں عمل نہیں کرتا اور الذین میں یہاں اعراب واضح نہیں ہے پس ایک جہت پر دونوں امر جاری ہیں۔ پس صائبین پر رفع اصل کلام کی طرف رجوع کے اعتبار سے جائز ہے۔ زجاج نے کہا: جس میں اعراب ظاہر ہوتا ہے اور جس میں اعراب ظاہر نہیں ہوتا ان کی جہت ایک ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: رفع، تقدیم و تاخیر پر محمول ہے تقدیر یوں ہو گی: ان الذین آمنوا والذین ھادوا من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون والصابئون اسی طرح نصاریٰ ہے۔ سیبویہ نے اس کی مثال اس شعر سے دی ہے:

والاَّ فاعلموا أنَّا وانتم بُغَاة ما بَقِينَا فى شِقَاقِ

ضابی برجمی نے کہا:

فمن يكُ أمسى بالمدينة رَحْلُه فإنّي وَقَيّارٌ بها لَغَرِيبُ

بعض علماء نے فرمایا: ان بمعنی نعم ہے الصابئون مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے، کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کر رہا ہے پس اس تقدیر پر عطف کلام کے مکمل ہونے اور اسم اور خبر کے مکمل ہونے کے بعد ہوگا۔ قیس رقیات کہا:

بَكَرَ العواذِلُ فى الصَّبا ح يَلُمْنَنى وألُومُهُنَّهْ

وَيَقُلْنَ شَيْبٌ قد عَلَا كَ و قد كبِرت فقلت إنَّهْ

اخفش نے کہا: انہ بمعنی نعم ہے اور اس کے آخر میں ھا سکتہ کے لیے ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۟

''بے شک ہم نے لیا تھا پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے بھیجے تھے ان کی طرف رسول جب کبھی آیا ان کے پاس کوئی رسول وہ حکم لے کر جسے ناپسند کیا ان کے نفسوں نے تو (انبیاء کے) ایک گروہ کو تو انہوں نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کر دیا''۔

یہ آیت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مِیۡثَاقَ کا معنی یہ ہے کہ وہ عبادت نہ کریں مگر اللہ کی اور ان احکام کی پیروی کریں جن کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ ان کافروں پر غمگین نہ ہوں ہم نے ان کا عذر ختم کر دیا ہے ہم نے ان کی طرف رسل کو بھیجا انہوں نے عہود کو توڑا، یہ اس کی طرف راجع ہے جس کے ساتھ سورۃ کا آغاز کیا گیا تھا اور وہ یہ قول ہے: اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ۔

كُلَّمَا جَآءَهُمۡ، هُمۡ ضمیر کا مرجع یہود ہیں۔ رَسُوۡلٌ بِمَا لَا تَهۡوٰۤى اَنۡفُسُهُمۡ یعنی جو ان کی خواہشات کے مطابق نہ تھا فَرِيۡقًا كَذَّبُوۡا وَفَرِيۡقًا يَّقۡتُلُوۡنَ یعنی ایک فریق کو جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کیا جن کو انہوں نے جھٹلایا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان جیسے دوسرے انبیاء کرام ہیں اور انہوں نے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ وغیرہما کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے يَقۡتُلُوۡنَ۝ مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا تو یہ آیت کے قافیہ کو ملانے کے لیے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اصل میں اس طرح تھا فَرِيۡقًا كَذَّبُوۡا، وفریقاً قتلوا و فریقا یکذبون و فریقا یقتلون۔ یہ عربوں کی عادت اور طریقہ ہے پھر مختصر کر دیا۔ بعض نے فرمایا: فریقا کذبوا لم یقتلوھم و فریقا قتلوا فکذبوا اور يَقۡتُلُوۡنَ۔ فریق کی نعت ہے۔ واللہ اعلم

وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ۝

''اور یہ فرض کر لیا کہ نہیں ہوگا (انہیں) عذاب تو اندھے بن گئے اور بہرے بن گئے پھر نظر رحمت فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان پر پھر وہ اندھے بن گئے اور بہرے بن گئے بہت ان میں سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ یعنی ان لوگوں نے گمان کیا جن سے میثاق لیا گیا تھا کہ اللہ کی طرف سے ان پر کوئی آزمائش اور ابتلا نہ ہوگی انہیں اپنے قول سے دھوکا ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں اور انہوں نے طویل مدت مہلت ملنے کی وجہ سے دھوکا کھایا۔ ابوعمرو اور حمزہ اور کسائی نے (تکون) رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع اس بنا پر ہے کہ حسب معنی علم اور تیقن ہے اور ان مخففہ ہے اور لا کا دخول، تخفیف کے عوض ہے ضمیر کو حذف کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ناپسند کیا کہ اس سے فعل متصل ہو اور اس کے حکم سے نہیں ہے کہ اس پر داخل ہو پس ان کے درمیان لا کا فاصلہ کر دیا۔ اور جنہوں نے نصب پڑھی ہے انہوں نے ان کو ناصبہ بنایا ہے اور حسب کو اپنے باب پر باقی رکھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: حسبت الا یقول ذالك یعنی حسبت انه قال ذالك اگر تو چاہے تو یقول کو نصب دے دے نحاس نے کہا: نحویوں کے نزدیک حسب اور اس کے اخوات میں رفع عمدہ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أَلَا زَعَمَت بَسۡبَاسَةُ اليوم أنَّنِي     كَبِرتُ وأَلَّا يَشۡهَدُ اللهوَ أمثالي

رفع عمدہ ہے، کیونکہ حسب اور اس کے اخوات، علم کے قائم مقام ہیں کیونکہ وہ ثابت چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَمُوْا وہ ہدایت سے اندھے ہو گئے۔ صَمُّوْا حق سننے سے بہرے ہو گئے، کیونکہ جو انہوں نے دیکھا اور انہوں نے سنا اس سے نفع نہ اٹھایا۔ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اس کلام میں اضمار ہے یعنی ان پر آزمائش واقع ہوئی تو انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی ان سے قحط کو دور کر دیا یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر نظر رحمت فرمائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ اللہ ان پر نظر کرم فرمائے گا اگر وہ ایمان لے آئیں گے۔ یہ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان پر نظر رحمت فرمائے گا اگر وہ ایمان لے آئیں گے اور تصدیق کریں گے یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے حقیقۃً توبہ کی۔ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کے لیے حق واضح ہونے کے بعد بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہوئے۔

كَثِيْرٌ کا رفع واؤ جمع سے بدل ہونے کی بنا پر ہے۔ اخفش سعید نے کہا: جیسے تو کہتا ہے: رایت قومك ثلثیهم اگر تو چاہے تو مبتدا مضمر مان لے یعنی العمی والصم کثیر منهم۔ اگر تو چاہے تو تقدیر یوں کرے: العمی والصم منهم کثیر۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی لغت پر ہے جو کہتے ہیں: أكلوني البراغيث۔ اس بنا پر شاعر نے کہا:

ولٰكِن دِيَافِيٌّ أبوه وأمُّه بِحَوْرَانَ يَعْصِرْنَ السَّلِيطَ أقارِبُه

(اس شعر میں أقاربه فاعل ہے پھر بھی یعصرن جمع مونث کا صیغہ ذکر ہوا ہے)

اسی طرح ہے وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (الانبیاء: 3) اور غیر قرآن میں کثیراً پر نصب بھی جائز ہے یہ محذوف مصدر کی صفت ہوگا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۗ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۗ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ۗ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

"بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی تو ہے حالانکہ کہا تھا خود مسیح نے، اے بنی اسرائیل! عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ یقیناً جو بھی شریک بنائے گا اللہ کے ساتھ تو حرام کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور نہیں ظالموں کا کوئی مددگار"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ یہ یعقوبیہ فرقہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قطعی حجت کے ساتھ ان کا رد کیا جس کا وہ خود اقرار کرتے تھے فرمایا: مسیح نے خود کہا: اے بنی اسرائیل! عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے یعنی جب مسیح علیہ السلام خود کہتے ہیں: یارب! یا اللہ! تو وہ کیسے اپنی ذات کو پکار رہے ہیں اور کیسے اپنی ذات سے سوال کر رہے ہیں یہ محال ہے۔ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی طرف سے نئی کلام ہے۔ الاشراک کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کے موجد ہونے کا عقیدہ رکھنا۔ سورۂ آل عمران میں المسیح کے اشتقاق کے بارے میں کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞

''بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ تیسرا ہے تین (خداؤں) سے اور نہیں ہے کوئی خدا مگر ایک اللہ اور اگر باز نہ آئے اس (قول باطل) سے جو وہ کہہ رہے ہیں تو ضرور پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے دردناک عذاب، تو کیا نہیں رجوع کرتے اللہ کی طرف اور کیا نہیں بخشش طلب کرتے اس سے اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یعنی تین میں سے ایک۔ اور زجاج وغیرہ سے روایت ہے کہ ثالث میں تنوین جائز نہیں۔ اور اس میں عربوں کا ایک اور مذہب بھی ہے کہتے ہیں رابع ثلاثۃ اس بنا پر جر اور نصب جائز ہے، کیونکہ وہ جس نے تین کو چار بنایا ان میں سے ہونے کی وجہ سے۔ اسی طرح جب تو نے کہا: ثالث اثنین تو تنوین جائز ہے۔ یہ نصاریٰ کے تینوں فرقوں ملکیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ کا قول تھا وہ کہتے تھے: اب، ابن اور روح القدس ایک خدا ہے وہ تین خدا نہیں کہتے تھے۔ یہ ان کے مذہب کا مفہوم ہے، وہ عبادت سے انکار کرتے تھے حالانکہ وہ ان کو لازم ہے جو اس طرح ہوا سے عبارت لازمہ سے حکایت کرنا صحیح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ابن الہ ہے باپ الہ ہے اور روح القدوس الہ ہے۔ سورۃ النساء میں اس پر گفتگو گزر چکی ہے اس قول کی وجہ سے اللہ نے انہیں کافر کہا فرمایا: وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی الٰہ متعدد نہیں ہیں تین خداؤں کا قول ان کو لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اگرچہ انہوں نے صراحۃً تین خداؤں کا لفظاً اظہار نہیں کیا تھا۔ سورۂ بقرہ میں واحد کا معنی گزر چکا ہے۔ ''من'' زائدہ ہے غیر قرآن میں الهاً واحداً استثنا کی بنا پر جائز ہے۔ کسائی نے بدل کی بنا پر جر کو جائز قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا یعنی اگر وہ تثلیث کے قول سے باز نہ آئے تو انہیں دنیا و آخرت میں دردناک عذاب چھوئے گا۔ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ تقریر اور توبیخ ہے یعنی وہ اس کی بارگاہ میں رجوع کریں اس سے سوال کریں وہ ان کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ لعن سے مراد ان کے کافر لوگ ہیں کافروں کا خصوصی ذکر کیا، کیونکہ وہ اس کے قائل تھے، مومنین نہیں تھے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۞

''نہیں مسیح بن مریم مگر ایک رسول گزر چکے ہیں اس سے پہلے بھی کئی رسول اور ان کی ماں بڑی راست باز تھیں دونوں کھایا کرتے تھے کھانا۔ دیکھو کیسے ہم کھول کر بیان کرتے ہیں ان کے لیے دلیلیں پھر دیکھو وہ کیسے الٹے پھر رہے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی مسیح علیہ السلام اگرچہ ان کے ہاتھوں پر بہت سے معجزات ظاہر ہوئے ہیں یہ ان معجزات کو اسی طرح لائے ہیں جیسے دوسرے رسل لائے تھے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں تو پھر ہر رسول کو الٰہ ہونا چاہیے۔ یہ ان کے قول کا رد ہے اور ان پر حجت قائم کرنا ہے پھر حجت میں مبالغہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا: وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ یہ مبتدا خبر ہیں۔ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مولود اور مربوب ہیں جس کو عورتیں جنم دیں کھانا کھائے وہ مخلوق اور حادث ہے جس طرح دوسری مخلوق ہے۔ ان میں سے کسی نے اس کا دفاع نہیں کیا پس جس کی تربیت کی گئی ہو وہ رب ہونے کی کیسے صلاحیت رکھتا ہے اور ان کا قول کہ وہ ناسوت سے کھاتا ہے لاہوت سے نہیں کھاتا یہ ان کے اختلاط کا مرجع ہے ایک الٰہ کا غیر الٰہ سے اختلاط متصور نہیں ہوتا، اگر حادث کے ساتھ قدیم کا اختلاط جائز ہوتا تو قدیم کا حادث ہونا جائز ہوتا اگر یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں جائز ہوتا تو دوسروں کے حق میں بھی جائز ہوتا حتیٰ کہ کہا جاتا: لاہوت پر حادث کو مخالط ہے۔ بعض مفسرین نے كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ کی تفسیر میں کہا: یہ غائط اور بول سے کنایہ ہے اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ وہ دونوں بشر ہیں۔ جنہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کے نبیہ نہ ہونے کا قول کیا ہے انہوں نے امہ صدیقہ کے ارشاد سے استدلال کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، کیونکہ، نبیہ ہونے کے ساتھ صدیقہ ہونا جائز ہے جیسے حضرت ادریس علیہ السلام تھے۔ سورۂ آل عمران میں وہ گزر چکا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کو صدیقہ اس لیے کہا گیا وہ اپنے رب کی آیات کی کثرت سے تصدیق کرنے والی تھی اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تصدیق کی تھی جس کی اس نے انہیں خبر دی۔ یہ حسن وغیرہ کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ آیات سے مراد دلالات ہیں۔ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ یعنی وہ اس بیان کے بعد حق سے کیسے پھرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: أفكه یأفکه جب کوئی کسی کو پھیر دے۔ اس میں قدریہ اور معتزلہ کا رد ہے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''آپ فرمائیے کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اس کی جو نہیں مالک تمہارے نقصان کا اور نہ نفع کا اور اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا۔ بیان میں زیادتی اور ان پر حجت کا قائم کرنا ہے یعنی تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں جنین تھے وہ کسی کے نفع اور نقصان کے مالک نہیں تھے اور جب تم نے اقرار کر لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کبھی ایسی حالت میں بھی تھے کہ نہ سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے، نہ جانتے تھے، نہ نفع دیتے تھے نہ نقصان دیتے تھے، پھر تم نے اسے کیسے الٰہ بنا لیا؟ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ سے سمیع علیم ہے نقصان اور نفع کا مالک ہے جس کی یہ صفت ہو وہ حقیقت میں الٰہ ہوتا ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۠

''آپ فرمائیے: اے اہل کتاب! نہ حد سے بڑھو اپنے دین میں ناحق اور نہ پیروی کرو اس قوم کی خواہشوں کی جو گمراہ ہو چکی ہے پہلے سے اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ۔ یعنی اس طرح حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا۔ یہود کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو اور افراط یہ تھا کہ انہوں نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر نکاح کے پیدا ہوئے ہیں اور نصاریٰ کا غلو یہ تھا کہ انہوں نے کہا: وہ الہ ہے، الغلو کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے سورۂ نساء میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ، اَهْوَآءَ جمع ہے هوی کی سورۂ بقرہ میں یہ لفظ گزر چکا ہے الھویٰ و یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے، کیونکہ ھوی (خواہش) انسان کو آگ میں گراتی ہے۔ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ مجاہد اور حسن نے کہا: اس سے مراد یہود ہیں۔ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا یعنی لوگوں میں سے اکثر کو گمراہ کیا۔ وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستہ سے بھٹک چکے ہیں۔ ضَلُّوْا کا تکرار اس معنی پر ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی گمراہ ہوئے اور بعد میں بھی گمراہ ہوئے مراد ان کے اسلاف ہیں جنہوں نے گمراہی کا آغاز کیا اور اس پر عمل پیرا ہوئے یعنی یہود و نصاریٰ کے رؤسا۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۝

''لعنت کیے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل سے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ پسر مریم کی زبان پر یہ بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے اور زیادتیاں کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا......الخ۔

اس میں ایک مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کافروں پر لعنت کرنا جائز ہے اگرچہ وہ انبیاء کی اولاد سے ہوں، کیونکہ نسب کا شرف ان کے حق میں لعنت کے اطلاق کو مانع نہیں۔ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ کا معنی یہ ہے کہ وہ زبور اور انجیل میں لعنت کیے گئے، کیونکہ زبور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان تھی اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان تھی یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کتابوں میں ان پر لعنت کی۔ ان دونوں کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ مجاہد اور قتادہ وغیرہ نے کہا: لعنھم کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں اور خنازیر میں مسخ کر دیا۔ ابو مالک نے کہا: جو حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان پر لعنت کیے گئے تھے وہ بندروں کی شکل میں مسخ کیے گئے تھے اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت کیے گئے تھے وہ خنزیروں کی شکل میں مسخ کیے گئے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان پر لعنت کیے گئے تھے وہ اصحاب سبت تھے اور جو حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت کیے گئے تھے وہ مائدہ کا اس کے نزول کے بعد انکار کرنے والے تھے، اسی طرح نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے سلف وخلف پر لعنت کی گئی ہے جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا، کیونکہ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں نے انہیں بتایا تھا کہ یہ حضرت محمد ﷺ مبعوث ہونے والے ہیں۔

پس جس نے حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا اس پر ان دونوں نے لعنت کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا**، **ذٰلِكَ** مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی یہ لعنت ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہے، یہ بھی جائز ہے کہ ذالک سے پہلے مبتدا محذوف ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو یعنی ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کی بنا پر ہم نے ان کے ساتھ ایسا کیا۔

**كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝**

''نہیں منع کیا کرتے تھے ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ** یعنی ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے۔ **لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝** منع کرنے کو ترک کرنے کی وجہ سے ان کی مذمت کی گئی ہے، اسی طرح اس کی بھی مذمت ہے جس نے ان جیسا فعل کیا۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے پہلے بنی اسرائیل کی بے دینی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک شخص پہلی مرتبہ کسی بدکار سے ملتا تو اسے کہتا: اے فلاں! اللہ سے ڈر اور جو تو کر رہا ہے اسے چھوڑ، کیونکہ یہ تیرے لیے حلال نہیں، پھر دوسرے دن اسے ملتا تو اسے اس سے منع نہ کرتا وہ اس کے ساتھ کھانے پینے اور بیٹھنے والا ہوتا جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل آپس میں ٹکرا دیئے، پھر یہ آیت پڑھی **لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** الایۃ، پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! تم نیکی کا حکم دو گے، برائی سے منع کرو گے، ظالم کا ہاتھ پکڑ لو گے اور اسے حق کی طرف لوٹاؤ گے اور اسے حق کا جبراً پابند کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو آپس میں ٹکرا دے گا اور پھر تم پر بھی ایسی پھٹکار ہو گی جو پہلے لوگوں پر ڈالی گئی تھی'' (1)۔

اس حدیث کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اس پر اجماع ہے کہ برائی سے منع کرنا اس کے لیے فرض ہے جو اس کی طاقت رکھتا ہو اور اسے اپنے اوپر اور مسلمانوں پر ضرر کا خوف نہ ہو اگر اسے خوف ہو تو وہ اسے دل سے برا جانے اور اس برائی کرنے والے سے میل جول ترک کر دے۔ ماہرین علم نے کہا: برائی سے منع کرنے والے کے لیے خود معصیت سے سلامت ہونا شرط نہیں بلکہ نافرمان ایک دوسرے کو منع کریں۔ بعض علماء اصول نے کہا: جو شراب پیتے ہیں وہ ایک دوسرے کو منع کریں۔ انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ **كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ** کا قول فعل میں ان کے اشتراک کا تقاضا کرتا ہے اور انہیں منع نہ کرنے کے ترک پر ان کی مذمت کی آیت میں دلیل ہے کہ مجرموں کے ساتھ بیٹھنا منع

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 65　　2۔ المحرر الوجیز

ہے اوران کو چھوڑنے کا حکم ہے اور یہود پر انکار میں اس قول سے تاکید پیدا کی گئی ہے۔ تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ مَا كَانُوْا میں ما محل نصب میں ہے اور اس کا مابعد اس کی صفت ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۝ یا یہ محل رفع میں ہے یہ بمعنی الذی ہے۔

**تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝**

''آپ دیکھیں گے بہتوں کو ان میں سے کہ وہ دوستی رکھتے ہیں کافروں سے بہت ہی برا ہے جو آگے بھیجا ان کے لیے ان کے نفسوں نے یہ کہ ناراض ہو گیا اللہ تعالیٰ ان پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یعنی یہود میں سے۔ بعض علماء نے فرمایا: کعب بن اشرف اور ان کے ساتھی۔

مجاہد نے کہا: یعنی منافقین۔

یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یعنی مشرکین سے دوستی رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ان کے دین پر نہیں ہیں۔

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی ان کے نفسوں نے ان کے لیے ان کاموں کو مزین کیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے برا ہے وہ جو انہوں نے اپنے نفسوں اور آخرت کے لیے آگے بھیجا۔ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مبتدا کے اضمار کی بنا پر ان محل رفع میں ہے جیسے تیرا قول ہے: بئس رجلاً زید۔ بعض نے فرمایا: ما سے بدل ہے جو بئس کے بعد ہے۔ اس بنا پر ما نکرہ ہوگا اور مرفوع ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان محل نصب میں ہو اس معنی کی وجہ سے لان سخط اللہ علیھم۔ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝ یہ مبتدا خبر ہیں۔

**وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝**

''اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو (اپنا) دوست لیکن اکثر ان میں سے فاسق ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ۔

اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ جس نے کافر کو ولی بنایا وہ مومن نہیں جب وہ اس کے اعتقاد پر یقین رکھتا ہے اور اس کے افعال سے خوش ہو۔ وَ لٰكِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ یعنی اپنے نبی پر ایمان لانے سے خارج ہیں، کیونکہ انہوں نے تحریف کی یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے خارج ہو گئے ہیں، کیونکہ یہ ان کی منافقت ہے۔

**لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ**

وَّ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

”ضرور پائیں گے آپ سب لوگوں سے زیادہ دشمنی رکھنے والے مومنوں سے یہود کو اور مشرکوں کو اور پائیں گے آپ سب سے زیادہ قریب دوستی میں ایمان والوں سے انہیں جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لیے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور وہ غرور نہیں کرتے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ۔ یہ لام، لام قسم ہے اور نون داخل ہوا حال اور مستقبل کے درمیان فرق کرنے کے لیے۔ یہ خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق ہے۔ عَدَاوَةً پر نصب بیان کے لیے ہے۔ اسی طرح وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى کی آیت ہے۔ یہ آیت نجاشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی، جب مسلمان پہلی ہجرت میں ان کے پاس آئے، جیسا کہ سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں مشہور ہے، مشرکین کے خوف اور فتنہ کی وجہ سے یہ بہت سے افراد ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو وہ آپ کے پاس پہنچنے پر قادر نہ ہوئے ان کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان جنگ حائل ہو گئی جب جنگ بدر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے سرداروں کو قتل کیا، تو کفار قریش نے کہا: تمہارا بدلہ حبشہ کی زمین سے لیں گے، پس نجاشی کی طرف انہوں نے تحائف اور دو صاحب عقل لوگ بھیجے شاید وہ تمہیں وہ مسلمان دیدے جو اس کے پاس ہیں پس تم انہیں ان کے بدلے میں قتل کر دینا جو تمہارے افراد جنگ بدر میں قتل کیے گئے ہیں کفار قریش نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو نجاشی کی طرف ہدایا دے کر بھیجے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا اور اسے نجاشی کی طرف خط دے کر بھیجا۔ عمرو بن امیہ ضمری نجاشی کے پاس آیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط پڑھا پھر نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب اور مہاجرین کو بلایا اور راہبوں اور درویشوں کو بلایا پھر انہیں جمع کیا، پھر حضرت جعفر کو کہا کہ ان پر قرآن پڑھو، حضرت جعفر بن ابی طالب نے سورۂ مریم پڑھی، پس وہ کھڑے ہوئے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۔ (1) اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں محمد بن سلمہ مرادی نے بیان کیا فرمایا ہمیں ابن وہب نے بیان کیا فرمایا مجھے یونس نے بیان کیا انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا انہوں نے ابوبکر بن عبدالرحمن بن حرث بن ہشام سے روایت کیا۔ اور سعید بن مسیب سے اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ پہلی ہجرت مسلمانوں کی حبشہ کی زمین کی طرف تھی۔ طویل حدیث چلائی ہے۔ بیہقی نے ابن اسحاق سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نصاریٰ کے بیس افراد آئے جب کہ آپ مکہ میں تھے یا مکہ کے قریب تھے جب آپ کی خبر حبشہ کے متعلق پھیلی۔ پس ان نصاریٰ نے آپ کو مسجد میں پایا اور انہوں نے آپ سے سوال کیے، قریش کے

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 197

افراد کعبہ کے اردگرد اپنی مجالس میں تھے جب وہ رسول اللہ ﷺ سے سوالات کرنے سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اللہ کی طرف بلایا اوران پر قرآن پڑھا جب انہوں نے قرآن سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی اور انہوں نے آپ کے متعلق جان لیا جو آپ کے متعلق ان سے بیان کیا گیا تھا جب وہ نصاریٰ آپ کے پاس اٹھ کھڑے ہوئے تو ابوجہل نے ان پر اعتراض کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ اس قافلہ والوں کو رسوا کرے، تمہارے دین والوں نے تمہیں بھیجا تھا تا کہ تم اس شخص کی خبر لاؤ تم ان کی مجلس سے نہ اٹھے حتیٰ کہ تم اپنے دین کو چھوڑ چکے ہو اور تم نے اس کی تصدیق کی ہے جو اس نے تمہیں کہا ہے ہم نے تم سے زیادہ احمق قافلہ نہیں دیکھا یا اس جیسا کہ اس نے کہا۔ انہوں نے جواباً کہا تم پر سلام ہو ہم تمہارے ساتھ جہالت امیز گفتگو نہیں کرتے۔

ہمارے اپنے اعمال ہیں اور تمہارے اپنے اعمال ہیں ہم اپنے نفسوں کے بارے میں بھلائی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے: یہ گروہ اہل نجران سے تھا اور کہا جاتا ہے: ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ٘ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ٘ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝ (القصص)

کہا جاتا ہے کہ حضرت جعفر اور ان کے اصحاب نبی کریم ﷺ کے پاس ستر افراد کے ساتھ آئے جنہوں نے صوف کے کپڑے پہنے ہوئے تھے ان میں باسٹھ افراد حبشہ سے تھے اور آٹھ افراد شام سے تھے اور وہ یہ تھے بحیراء راہب، ادریس، اشرف، ابرہہ، ثمامہ، قثم، درید اور ایمن ان پر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ یاسین پڑھی، جب انہوں نے قرآن سنا تو وہ رونے لگے اور ایمان لے آئے اور کہا: یہ کلام، کتنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے کلام کے مشابہ ہے۔ پس ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا٦ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى۔ یعنی نجاشی کا وفد اور ان کے گرجوں والے۔ سعید بن جبیر نے کہا: ان کے متعلق یہ بھی نازل ہوا۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ الخ (القصص)(1)

مقاتل اور کلبی نے کہا: چالیس آدمی اہل نجران سے بنی حرث بن کعب سے تھے اور بتیس آدمی حبشہ سے تھے، اڑسٹھ آدمی اہل شام سے تھے۔ قتادہ نے کہا: یہ اہل کتاب کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی یہ اس شریعت پر گامزن تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تو آپ پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا، قسیین کا واحد قس اور قسیس ہے یہ قطرب کا قول ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 600

القسیس کا معنی عالم ہے۔ یہ قس سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو طلب کیا اور اس کا پیچھا کیا۔ راجز نے کہا:

یُصْبِحْنَ عن قَسِّ الأذی غَوَافِلَا　وتَقَسّست أصواتَهم بالليل تَسَمَّعتها

القس کا معنی چغلی بھی ہے۔ القس دین اور علم میں نصاریٰ کا رئیس، سردار، اس کی جمع قسوس ہے اسی طرح القسیس، جیسے الشر اور الشریر، القسیسون وہ لوگ جو علماء اور عبادت گزاروں کی پیروی کرتے ہیں، قسیس کی جمع مکسر قساوسۃ آتی ہے ایک سین کو واؤ سے بدل دیا گیا۔ قساوسۃ جسے مھالبۃ اصل میں قساسۃ تھا ایک سین کو واؤ سے بدل دیا گیا اور القسیس کا لفظ یا تو عربی ہے یا یہ رومی لغت ہے لیکن عربوں نے اسے اپنے کلام کے ساتھ پالیا پس یہ ان کی لغت سے ہو گیا کیونکہ کتاب اللہ میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو عرب کی لغت سے نہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: میرے باپ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں نصر بن داؤد نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو عبید نے بتایا فرمایا: میں نے معاویہ بن ہشام عن نصیر طائی عن الصلت عن حامیہ بن رباب کے سلسلہ سے روایت کیا فرمایا: میں نے سلمان سے بان منھم قسیسین ورھبانا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: القسیین کو صوامع اور محراب میں چھوڑ دو۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا: بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَ رُهۡبَانًا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے کہا: نصاریٰ نے انجیل کو ضائع کر دیا اور انہوں نے اس میں ایسی چیز کو داخل کر دیا جو اس میں سے نہ تھا وہ چودہ افراد تھے جنہوں نے اس کو تبدیل کر دیا، لوقاس، مرقوس، یحنس، مقبوس اور قسیس حق پر باقی رہا اور استقامت پر رہا، پس جو اس کے دین اور ہدایت پر تھا وہ قسیس تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رُهۡبَانًا راہب کی جمع ہے جیسے راکب کی جمع رکبان ہے۔ نابغہ نے کہا:

لو أنها عَرَضتْ لِاَشْمط راهِبِ　عَبَدَ الإلٰه صَرُورَةٍ متَعَبِّدِ

لَرَنا لِرؤيتها و حُسنِ حديثِها　ولَخالَه رَشَداً وإن لم يَرْشُدِ

اس سے فعل رَهِبَ اللہ یَرْهبه ہے یعنی وہ اللہ سے ڈرا۔ رَهَبًا و رَهْبًا و رَهْبَةً الرهبانية والترهب، گرجا میں عبادت کرنا۔ ابو عبید نے کہا: کبھی رہبان واحد کے لیے، کبھی جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: رہبان مفرد کے لیے ہو تو اس کی جمع رھابنۃ و رَهَابِين آتی ہے جیسے قربان و قرابین۔ جریر نے جمع میں استعمال کیا:

رُهْبَانَ مَدْيَنَ لوراوْكِ تَنَزَّلُوا　والعُصْمُ من شَعَفِ العُقُولِ الفَادِرُ

الفادر...... عظیم کو بھی کہا جاتا ہے اسی طرح الفدور جمع فدر اور فدور ہے اسم ظرف المفدرۃ ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے اور التوحید کے بارے میں ایک اور نے کہا۔

لو أَبْصَرَتْ رُهْبَانَ دَيرٍ في الجَبَل　لانحَدَرَ الرُّهبانُ يَسْعَى وُيَصِلْ

یصل، الصلوۃ سے ہے، الرھابۃ، السحابۃ کے وزن پر ہے، سینے کی ہڈی جو زبان کی طرح پیٹ پر ابھری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی مدح ہے جو کہ کفر پر اصرار کرنے والے نہ تھے (1) اسی وجہ سے کہا: وَّ اَنَّهُمۡ

1۔ تفسیر بغوی

لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ وہ حق کی تابعداری سے انکار کرنے والے نہیں۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۳﴾

''جب سنتے ہیں (قرآن) جو اتارا گیا رسول کی طرف تو تو دیکھے گا ان کی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ پہچان لیا انہوں نے حق کو۔ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے پس تو لکھ لے ہمیں (اسلام کی صداقت کی) گواہی دینے والوں میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ، مِنَ الدَّمْعِ سے مراد بالدمع ہے یعنی آنسوؤں کے ساتھ۔ یہ حال واقع ہو رہا ہے اسی طرح یَقُوْلُوْنَ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا:

ففاضت دموع العینِ مِنّی صبابۃً ... علی النَّحرِ حتی بَلَّ دَمْعِی مِحْمَلِی

خبر مستفیض، مشہور خبر کو کہتے ہیں جب وہ پھیل جائے اور مشہور ہو جائے۔ جیسے پانی کی کثرت ہو تو کہتے ہیں: فاض الماء۔ یہ علماء کے احوال ہیں جو روتے ہیں اور چنگھاڑتے نہیں، سوال کرتے ہیں اور چلاتے نہیں، پریشان ہوتے ہیں اور مرنے کا تکلف نہیں کرتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ (الزمر: 23) اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں اور کانپنے لگتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جو ڈرتے ہی اپنے پروردگار سے پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال: 2) صرف وہی سچے ایماندار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل۔ مزید اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمایا کہ مسلمانوں کے سخت ترین دشمن یہود ہیں اور ان کے مشابہ مشرکین ہیں اور مسلمانوں سے محبت کرنے والے نصاریٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۳﴾ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں لکھ لے جو حق کی گواہی دیتے ہیں۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ: 143) یہ حضرت ابن عباس اور ابن جریج سے مروی ہے، حسن نے کہا: جو ایمان کی گواہی دیتے ہیں۔ ابو علی نے کہا: جو تیرے نبی اور تیری کتاب کی تصدیق کے ساتھ گواہی دیتے ہیں۔ فَاكْتُبْنَا کا معنی اجعلنا ہے پس یہ ماقد کتب و دون کے قائم مقام ہے۔

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾

''اور کیا وجہ ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور جو آچکا ہے ہمارے پاس حق حالانکہ ہم امید کرتے ہیں کہ داخل فرمائے ہمیں ہمارا رب نیک گروہ میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ دین میں ان لوگوں کی بصیرت کو بیان فرمایا یعنی وہ

کہتے ہیں: کیا وجہ ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں؟ یعنی ہم ایمان کو ترک کریں۔ نُؤْمِنُ حال واقع ہو رہا ہے۔ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (الانبیاء) اس سے مراد بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، اس کلام میں اضمار ہے یعنی نطمع ان یدخلنا ربنا الجنة۔ اور بعض علماء نے فرمایا: مع بمعنی فی ہے جیسا کہ فی بمعنی مع ہوتا ہے تو کہتا ہے: کنت فیمن لقی الامیر یعنی مع من لقی الامیر۔

السمع کبھی مخفف اور کبھی غیر مخفف ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: طمع فیه طمعا و طماعة و طماعية فهو طمع یہ مخفف ہے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۸۶﴾

''تو عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ بعوض اس قول کے باغات رواں ہیں اس کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی معاوضہ ہے نیکی کرنے والوں کا اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو وہی دوزخی ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ یہ ان کے ایمان کے اخلاص اور ان کے کلام کی سچائی کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب دیا اور ان کے طمع (امید) کو ثابت کیا۔ اسی طرح جس نے ایمان کو خاص کیا اور اس کے یقین کو سچا کیا اس کا ثواب جنت ہے پھر فرمایا: وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اس سے مراد یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۸۶﴾، الْجَحِیْمِ سے مراد ایسی آگ ہے جس کا جلانا سخت ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: جحم فلان النار جب اس کا جلانا سخت ہو، شیر کی آنکھ کو جحمہ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کی چمک سخت ہوتی ہے۔ جنگ کو بھی کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

والحربُ لا يبقى لجا حِمها التخيل والمراحُ
إلا الفتى الصبّار في النجدات والفرس الوقاحُ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۸۷﴾

''اے ایمان والو! نہ حرام کرو پاکیزہ چیزوں کو جنہیں حلال فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور نہ حد سے بڑھو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا حد سے تجاوز کرنے والوں کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ طبری نے حضرت ابن عباس تک سند ذکر فرمائی ہے کہ آیت ایک شخص کے سبب نازل ہوئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! جب میں گوشت کھاتا ہوں تو میری شہوت ابھرتی ہے، پس میں نے گوشت اپنے اوپر حرام کر دیا ہے (1)، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی جماعت کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 130۔ ایضاً، حدیث نمبر 2980، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے میں نازل ہوئی جن میں حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عبدالله بن عمرو، حضرت ابوذر غفاری، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ، حضرت مقداد بن الاسود، حضرت سلمان فارسی اور حضرت معقل بن مقرن رضی اللہ عنہم تھے۔ یہ تمام حضرات حضرت عثمان بن مظعون کے گھر جمع ہوئے اور اس پر اتفاق کیا کہ وہ دن کو روزہ رکھیں گے، رات کو قیام کریں گے اور بستروں پر نہیں سوئیں گے اور گوشت اور گھی نہیں کھائیں گے اور عورتوں اور خوشبو کے قریب نہیں جائیں گے اور اونی لباس پہنیں گے اور دنیا کو ترک کر دیں گے، زمین میں سفر کریں گے، رہبانیت اختیار کریں گے اور شرمگاہوں کو کاٹ دیں گے، الله تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔ اس مفہوم میں احادیث کثیر ہیں اگرچہ ان میں نزول کا ذکر نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے چند لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہائی کے اعمال کے بارے میں پوچھا، ان میں بعض صحابہ نے کہا: میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔ بعض نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ بعض نے کہا: میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الله تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور فرمایا: ''اس قوم کا کیا حال ہوگا جنہوں نے ایسا ایسا کیا لیکن میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے مقاربت بھی کرتا ہوں، جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ میری جماعت سے نہیں'' (1)۔ اس حدیث کو بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: تین افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حجروں کے پاس آئے جب کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کے متعلق سوال کر رہے تھے جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے آپ کی عبادت کو قلیل سمجھا، انہوں نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ کو کیسے پا سکتے ہیں؟ الله تعالیٰ نے آپ کو پہلے اور پچھلے گناہوں سے محفوظ فرمایا ہے۔ ایک نے کہا تھا: میں ہمیشہ ساری ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔

ایک نے کہا: میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا اور میں کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ پس رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور کہا: تم نے ایسا ایسا کہا ہے، ''الله کی قسم! میں تم سب سے زیادہ الله تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے مقاربت بھی کرتا ہوں، جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میری جماعت سے نہیں''۔ ان دونوں محدثین نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عثمان بن مظعون نے تبتل کا ارادہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع فرمایا اگر آپ انہیں اس کی اجازت دیتے تو ہم خصی ہو جاتے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حدثنا ابو المغیرہ قال حدثنا معان بن رفاعہ قال حدثنی علی بن یزید عن القاسم عن ابی امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک سریہ میں نکلے، فرمایا: ایک شخص ایک غار سے گزرا جس میں پانی تھا اس نے سوچا کہ وہ اس غار میں قیام کرے اور اس پانی سے خوراک حاصل کرے اور اردگرد جو

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 757۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449

سبزیاں ہیں وہ کھائے اور دنیا سے کنارہ کش ہو جائے، پھر اس نے کہا: اگر میں نبی کریم ﷺ کے پاس جاؤں اور آپ کے سامنے اس پروگرام کا ذکر کروں اگر آپ مجھے اس کی اجازت دیں تو میں ایسا کروں گا ورنہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں ایک غار سے گزرا جس میں میری خوراک کے لیے پانی اور سبزیاں تھیں پس میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس میں رہوں اور دنیا سے قطع تعلق کرلوں۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''میں نہ یہودیت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں اور نہ نصرانیت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں میں تو خالص شریعت حنیفیہ کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اللہ کے راستہ میں صبح کے وقت نکلنا یا شام کے وقت نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور کسی کا جہاد کی صف میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی نماز سے بہتر ہے''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے اس آیت اور اس کے مشابہہ آیات اور وہ احادیث جو اس مفہوم میں وارد ہیں ان کے بارے میں فرمایا: یہ غالی صوفیاء اور باطل متصوفین کا رد کرتی ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر گروہ شریعت کے راستہ سے ہٹ گیا اور حق سے دور ہو گیا۔ طبری نے کہا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی چیز کو حرام کرے جو اللہ نے حلال کی ہے اپنے مومن بندوں کے لیے، خواہ وہ کوئی کھانے کی چیز ہو یا پہننے کی چیز ہو یا نکاح میں سے ہو جب کہ اسے اپنے نفس پر اس کے حلال کرنے کے ساتھ گناہ اور مشقت کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون پر تبتل کا انکار فرمایا، پس ثابت ہوا کہ کسی حلال چیز کو ترک کرنے میں کوئی فضیلت نہیں ہے اور فضل اور نیکی اس میں ہے جس کے کرنے کی طرف اس نے بندوں کو بلایا ہے اور جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا تھا اور امت کے لیے جس کام کو سنت بنایا تھا اور جس طریقہ پر ائمہ راشدین نے اتباع کی تھی، کیونکہ بہتر ہدایت نبی مکرم ﷺ کی ہدایت ہے۔ جب اس طرح معاملہ ہے تو ان لوگوں کی خطا ظاہر ہو گئی جنہوں نے روئی کے لباس پر اون اور بالوں کے لباس کو ترجیح دی جب کہ وہ دوسرے حلال لباس کے استعمال پر قادر ہو اور جس نے سخت کھانے کو ترجیح دی اور گوشت وغیرہ کو ترک کر دیا اس خوف سے کہ عورتوں کی حاجت لاحق نہ ہو۔

اگر کوئی گمان کرنے والا یہ گمان کرے کہ خیر اور فضیلت اس میں ہے جو ہماری گفتگو کے علاوہ ہے، کیونکہ موٹا لباس پہننے اور سخت کھانا کھانے میں نفس پر مشقت ہے اور جو رقم بچ جائے گی وہ غریبوں پر تقسیم ہو جائے گی تو یہ اس کا گمان غلط ہے، کیونکہ انسان کے لیے بہتر وہ ہوتا ہے جس میں انسان کے نفس کی فلاح ہو اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طاعت پر معاونت ہو اور جسم پر کوئی چیز ردی کھانوں سے زیادہ نقصان دہ نہیں ہے، کیونکہ یہ عقل کو خراب کر دیتے ہیں اور قوت کو کمزور کرتے ہیں جو طاعت الٰہیہ کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت حسن بصری کے پاس کوئی شخص آیا اور کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو فالودہ نہیں کھاتا، حضرت انس نے فرمایا: کیوں؟ اس نے کہا: وہ کہتا ہے وہ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ حسن نے کہا: کیا وہ ٹھنڈا پانی پیتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: تیرا پڑوسی جاہل ہے، کیونکہ اس پر ٹھنڈے پانی کی نعمت فالودہ کی نعمت سے زیادہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے فرمایا: یہ اس صورت میں ہے جب دین کے معاملات درست ہوں اور مال حرام نہ ہو، لیکن جب دین کے

معاملات خراب ہوں اور حرام عام ہو تو پھر متبتل افضل ہے اور لذات کا ترک کرنا اولیٰ ہے اور جب حلال موجود ہو تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت پر عمل کرنا افضل اور اعلیٰ ہے۔ مہلب نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متبتل اور ترہب سے اس لیے منع فرمایا، کیونکہ قیامت کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ساتھ دوسری امت پر کثرت کا اظہار کرنے والے ہوں گے اور دنیا میں آپ اپنی امت کے ساتھ کفار سے جہاد کرنے والے ہیں اور آخر زمانہ میں دجال سے لڑیں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل کی کثرت کرنے کا ارادہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَعْتَدُوْا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے حد سے نہ بڑھو ورنہ تم اس کو حلال کرو گے جو اللہ نے حرام فرمایا پس اس بنا پر دونوں نہی اپنے ضمن میں دونوں طرفوں کو لیے ہوئے ہیں یعنی سختی نہ کرو ورنہ حلال کو حرام کر دو گے اور بہت زیادہ رخصت نہ دو ورنہ حرام کو حلال کر دو گے۔ یہ حسن بصری نے کہا ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تُحَرِّمُوْا کے قول کی تاکید ہے۔ یہ سدی اور عکرمہ وغیرہ کا قول ہے یعنی اس کو حرام نہ کرو جس کو اللہ نے حلال اور مشروع کیا۔ پہلا قول بہتر ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ جس نے اپنے اوپر کوئی کھانا یا پینا یا لونڈی کو حرام کیا یا کسی بھی ایسی چیز کو حرام کیا جس کو اللہ نے حلال کیا تھا تو اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک اس وجہ سے کوئی کفارہ نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس نے لونڈی کی تحریم سے اس کو آزاد کرنے کی نیت کی ہوگی تو وہ آزاد ہو جائے گی اور اس پر ان سے وطی کرنا حرام ہو جائے گا مگر نئے نکاح کے ساتھ پھر وہ حلال ہو جائے گی، اسی طرح کسی نے اپنی بیوی کو کہا: تو مجھ پر حرام ہے، تو اس کو تین طلاقیں ہو جائیں گی یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اپنی بیوی کو طلاق کنایہ کے ساتھ حرام کرنا مباح کیا ہے اور حرام، طلاق کے کنایات سے ہے۔ مزید علماء کے اقوال سورۃ التحریم میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جس نے کسی چیز کو حرام کیا تو وہ اس پر حرام ہو جائے گی جب وہ اس کام کو کرے گا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا، یہ بعید ہے (2) اور آیت اس کے خلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: یمین لغو حلال کو حرام کرنا ہے، یہی امام شافعی کے قول کا معنی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

''اور کھاؤ اس سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حلال (اور) پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان لائے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا اس میں ایک مسئلہ ہے۔ الاکل سے مراد کھانے، پینے، پہنے اور سونے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اکل (کھانے) کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ مقصود اعظم ہے اور انسان کے انتفاعات میں سے خاص ہے۔ کھانے، پینے اور پہننے کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رہی لذت آمیز اشیاء کی شہوت، اور شہوت والی چیزوں کی طلب میں نفس کا جھگڑنا ان پر لوگوں کے نفس کو قدرت دینے میں

1۔ المحرر الوجیز 2۔ احکام القرآن، للکیا طبری

مذاہب مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نفس کو شہوات کی اتباع سے روکنا بہتر ہے تا کہ وہ انسان کا مطیع ہو جائے اور اس کے عناد کو روندنا آسان ہو جائے، کیونکہ جب وہ نفس کو اس کی مراد عطا کرے گا تو بہت زیادہ شہوات میں چلنے والا ہوگا اور شہوات کا مطیع ہوگا۔ حکایت ہے کہ ابو حازم پھلوں کے اوپر سے گزرے تو نفس نے اس کی خواہش کی، ابو حازم نے نفس کو کہا: تیرے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: نفس کو لذات پر قدرت دینا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کے ارادہ کو پانے کے ساتھ نشاط اور چستی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: توسط اولیٰ ہے۔

کیونکہ کبھی نفس کی خواہش پوری کرنا اور کبھی پوری نہ کرنا دونوں امروں کو جمع کرنا ہے اور یہ بغیر کسی عیب کے نصف ہے۔ اعتدا اور رزق کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

''نہ باز پرس کرے گا تم سے اللہ تعالیٰ تمہاری فضول قسموں پر لیکن باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کر چکے ہو تو اس (کے توڑنے) کا کفارہ یہ ہے کہ کھلایا جائے دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا جو تم کھلاتے ہو اپنے گھر والوں کو یا کپڑے پہنائے جائیں انہیں یا آزاد کیا جائے غلام اور جو نہ پائے (ان میں سے کوئی چیز) تو وہ روزے رکھے تین دن، یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم اٹھاؤ اور حفاظت کیا کرو اپنی قسموں کی اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتیں تا کہ تم شکریہ ادا کرو''۔

اس میں سنتالیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ، اللغو کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ کا معنی من ایمانکم ہے (1)۔ ایمان جمع ہے یمین کی (جس کا معنی ہے قسم) بعض علماء نے فرمایا: یمین، یمن سے فعیل کے وزن پر ہے اس سے مراد برکت ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے یمین سے اس لیے تعبیر فرمایا، کیونکہ یہ حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ یمین کا لفظ مذکر، مونث استعمال ہوتا ہے اس کی جمع ایمان اور ایمن آتی ہے زہیر نے کہا:

فتجمع أيمن منا و منكم

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کے نزول کے سبب میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب وہ لوگ ہیں جنہوں نے کھانے، پینے اور پہننے اور نکاح میں سے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کیا، انہوں نے اس پر قسمیں اٹھائی تھیں جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ تو انہوں نے کہا: ہم اپنی قسموں کا کیا کریں؟ تو یہ

1۔ احکام القرآن للکیا طبری

آیت نازل ہوئی۔ اس قول کی بناء پر معنی یہ ہوگا جب تم قسم اٹھاؤ پھر اسے لغو کر دو یعنی اس کے حکم کو کفارہ دینے کے ساتھ ساقط کر دو اور کفارہ دے دو تو اللہ اس کی وجہ سے تم سے مواخذہ نہیں کرے گا بلکہ مواخذہ تو اس پر ہوگا جس پر تم قائم رہے اور اسے لغو نہ کیا یعنی کفارہ نہ دیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قسم کسی چیز کو حرام نہیں کرتی۔ یہ امام شافعی کی دلیل ہے کہ قسم کے ساتھ حلال کی تحریم متعلق نہیں ہوتی حلال کو حرام کرنا لغو ہے جیسا کہ حرام کو حلال کرنا لغو ہے جیسے کوئی کہتا ہے: استحللت شرب الخمر میں نے شراب پینے کو حلال کیا۔ پس اس قول کی بنا پر یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حلال کو حرام کرنا لغو قرار دیا ہے، کیونکہ وہ خود حرام نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ یعنی حلال کو حرام کرنے کے ساتھ۔

روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے یتیم بچے بھی تھے اور مہمان بھی تھا۔ وہ رات کے وقت اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد لوٹے تو پوچھا: کیا تم نے میرے مہمان کو کھانا کھلا دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہم تو تمہارے انتظار میں تھے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس رات کھانا نہیں کھاؤں گا، مہمان نے کہا: میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ یتیموں نے کہا: ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ جب حضرت عبداللہ نے سب کا انکار دیکھا تو کھانا کھایا اور دوسرے لوگوں نے بھی کھایا پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صورت حال عرض کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے الرحمٰن کی اطاعت کی اور شیطان کی نافرمانی کی''۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 3**۔ شریعت میں قسم کی چار صورتیں ہیں: دو میں کفارہ ہے اور دو میں کفارہ نہیں ہے۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں حدثنا عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز حدثنا خلف بن ہشام حدثنا عبثر عن لیث عن حماد عن ابراہیم عن علقمۃ عن عبداللہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ نے فرمایا: قسمیں چار ہیں دو میں کفارہ ہے اور دو میں کفارہ نہیں، وہ دو قسمیں جن میں کفارہ ہے وہ اس طرح ہیں کہ کوئی شخص قسم اٹھائے کہ اللہ کی قسم! میں ایسا ایسا نہیں کروں گا، پھر وہ ایسا کر دے۔ کوئی شخص کہے: اللہ کی قسم! میں ایسا ایسا کروں گا، پھر وہ نہ کرے۔ اور وہ دو قسمیں جن کا کفارہ نہیں ہے وہ اس طرح ہیں کہ کوئی شخص قسم اٹھائے: اللہ کی قسم! میں نے ایسا ایسا نہیں کیا، حالانکہ اس نے کیا تھا۔ کوئی شخص قسم اٹھائے میں نے ایسا کیا تھا، حالانکہ اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ ابن عبدالبر نے کہا: سفیان ثوری نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے۔ مروزی نے ان سے یہ ذکر کیا ہے، سفیان نے کہا: ایمان (قسمیں) چار ہیں دو کا کفارہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کہے: اللہ کی قسم! میں ایسا نہیں کروں گا پھر وہ ایسا کرے یا کہے: اللہ کی قسم! میں ایسا کروں گا پھر وہ ایسا نہ کرے۔ وہ دو قسمیں جن کا کفارہ نہیں دیا جاتا وہ یہ ہیں کہ کوئی شخص کہے: اللہ کی قسم! میں نے ایسا نہیں کیا، حالانکہ اس نے ایسا کیا تھا یا کہے: میں نے ایسا کیا تھا، حالانکہ ایسا کیا نہیں تھا۔ مروزی نے کہا: پہلی دو قسموں میں علماء کا اختلاف نہیں ہے جیسا کہ سفیان نے کہا اور دوسری دو قسمیں ان کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اگر قسم اٹھانے والے نے قسم اٹھائی کہ اس نے ایسا ایسا نہیں کیا یا اس نے ایسا ایسا کیا تھا وہ اپنے گمان میں سچا ہے تو اس پر گناہ نہیں اور امام مالک، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے کے قول کے مطابق اس پر کفارہ نہیں۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 613

اسی طرح احمد اور ابوعبید نے کہا ہے: امام شافعی نے فرمایا: اس پر گناہ نہیں اور اس پر کفارہ ہے۔ مروزی نے کہا: اس میں امام شافعی کا قول قوی نہیں، فرمایا: مگر قسم اٹھانے والے نے قسم اٹھائی کہ اس نے ایسا ایسا نہیں کیا تھا، حالانکہ اس نے ایسا کیا تھا اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا تو وہ گناہگار ہے۔ اور اکثر علماء امام مالک، سفیان ثوری، اصحاب الرائے، امام احمد بن حنبل، ابوثور اور ابوعبید کے قول میں اس پر کفارہ نہیں ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے: اس پر کفارہ ہے۔ فرمایا: بعض تابعین سے امام شافعی کے قول کی مثل مروی ہے۔ مروزی نے کہا: میرا میلان امام مالک اور امام احمد کے قول کی طرف ہے، فرمایا: رہی یمین لغو، اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ یمین لغو انسان کا یہ قول ہے: لا واللہ، بلی واللہ۔ وہ اپنی بات میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے جب کہ نہ وہ قسم کو منعقد کرنے والا ہوتا ہے اور نہ اس کا قسم کا ارادہ ہوتا ہے۔ امام شافعی نے کہا: یہ جھگڑنے، غصہ اور جلدی کے وقت کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ یہ قاف کی تخفیف کے ساتھ العقد سے مشتق ہے۔ عقد کی دو قسمیں ہیں حسی جیسے رسی کا باندھا۔ حکمی جیسے عقد بیع، شاعر نے کہا:

قوم إذا عَقَدوا عَقْدًا لجارِهم　　شَدُّوا العِنَاجَ و شَدُّوا فوقه الكَرَبَا

اور یمین منعقدہ، یہ العقد سے منفعلۃ کے وزن پر ہے(1) اس سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں کسی کام کے نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے پھر وہ کام کر لے یا کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرے اور پھر وہ نہ کرے، جیسا کہ پہلے گزرا ہے یہ وہ قسم ہے جس کو استثنا اور کفارہ حلال کرتا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

عَقَّدْتُّمْ عین کے بعد الف بھی پڑھا گیا ہے فاعل کے وزن پر، یہ نہیں ہوتا مگر اکثر دو میں۔ کبھی دوسرا وہ ہوتا ہے جس کے لیے کلام میں قسم اٹھائی جاتی ہے جس کے ساتھ کلام واقع ہوتی ہے یا اس کا معنی ہے: ما عاقدتم علیہ الایمان، کیونکہ عاقد، معنی میں عاہد کے قریب ہے پس حرف جر کے ساتھ متعدی کیا گیا، کیونکہ یہ عاہد کے معنی میں ہوتا ہے۔ عاہد دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، دوسرا حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ (الفتح: 10) یہ اس کی طرح ہے جیسے: نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کو الی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا باب یہ ہے کہ تو کہتا ہے: نادیت زیداً۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ (مریم: 52)

جب نادینا دعوت کے معنی میں ہو تو الی کے ساتھ متعدی کیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ (حم السجدہ: 33) پھر عاقدتم علیہ الایمان کے قول میں وسعت کی گئی تو حرف جر حذف کیا گیا پس فعل مفعول کے ساتھ مل گیا اور عاقدتموہ بن گیا۔ پھر ھاء کو حذف کیا گیا جیسے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: 94) میں حذف کیا گیا یا فاعل بمعنی فَعَلَ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ (توبہ: 30) یعنی قتلھم اللہ کبھی باب مفاعلہ کلام عرب میں فاعلت کے معنی کے بغیر واحد کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے تیرا قول ہے: سافرت، ظاہرت، عقدتم۔ قاف کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے تعمدتم یعنی قصدتم۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ تشدید تکرار کا تقاضا کرتی ہے پس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 653

اس پر کفارہ نہیں مگر جب تکرار کرے۔ اس کا وہ حدیث رد کرتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں ان شاء اللہ قسم نہیں اٹھاؤں گا۔ پھر اس کے علاوہ کام کو بہتر دیکھوں گا مگر میں وہ کام کروں گا جو بہتر ہوگا اور میں قسم کا کفارہ دے دوں گا''۔ اس حدیث میں قسم کے کفارہ کے وجوب کا ذکر فرمایا جس میں تکرار نہیں ہے۔ ابو عبید نے کہا: تشدید بار بار قسم اٹھانے کا تقاضا کرتی ہے۔ میں امن میں نہیں ہوں کہ جو اس قرأت کے ساتھ پڑھے اس پر ایک قسم میں کفارہ لازم نہ ہو حتیٰ کہ وہ تکرار کرلے۔ یہ قول اجماع کے خلاف ہے۔ نافع نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر جب مؤکد قسم کے علاوہ بھی قسم توڑتے تو دس مساکین کو کھانا کھلاتے اور جب قسم کو مؤکد کرتے تو غلام آزاد کرتے، کسی نے نافع سے پوچھا: قسم مؤکد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: کسی چیز پر بار بار قسم اٹھانا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ یمین غموس میں اختلاف ہے کیا یہ منعقدہ ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کے نزدیک یہ جھوٹ، فریب اور مکر کی قسم ہے یہ منعقد نہیں ہوتی اور نہ اس پر کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ یمین منعقدہ ہے، کیونکہ یہ دل کا فعل یہ خبر کے ساتھ معقود ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسم کے ساتھ متصل ہے اور اس میں کفارہ ہے۔ صحیح پہلا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ امام مالک بن انس اور ان کے متبعین مدنی علماء کا قول ہے، یہی امام اوزاعی اور اہل شام میں سے ان کے ہمنوا علماء کا قول ہے یہی قول ثوری اور اہل عراق کا ہے۔ یہی قول امام احمد، اسحاق، ابوثور اور ابوعبید، اصحاب الحدیث اور اہل کوفہ میں سے اہل الرائے کا ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد من حلف علی یمین فرای غیرھا خیراً منھا فلیأت الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینه(1) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فلیکفر عن یمینه ویاتی الذی ھو خیر۔ دلالت کرتا ہے کہ کفارہ اس شخص پر واجب ہوتا ہے جو کسی فعل کی مستقبل میں کرنے کی قسم اٹھاتا ہے، پھر اسے نہیں کرتا ہے یا کسی فعل کے نہ کرنے کی قسم اٹھاتا ہے، پھر وہ اسے کردیتا ہے۔ مسئلہ میں دوسرا قول بھی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کفارہ دے اگرچہ وہ گناہگار ہوگا اگر اس نے جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی ہوگی۔ یہ امام شافعی کا قول ہے: حضرت ابوبکر نے کہا: ہم کوئی خبر نہیں جانتے ہیں جو اس قول پر دلالت کرتی ہو اور کتاب وسنت پہلے قول پر دلالت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (بقرہ: 224)

حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ شخص جو قسم اٹھاتا ہے کہ وہ قرابتداروں سے صلہ رحمی نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے کفارہ میں اس کے لیے نکلنے کی سبیل پیدا فرمائی اور اسے حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کو نیکی نہ کرنے کا سبب نہ بنائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے اخبار اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ جس کے ساتھ انسان کسی کا حرام مال لیتا ہے تو یہ قسم کے کفارہ سے زیادہ گناہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: قسم کی دو قسمیں ہیں: لغو اور منعقدہ۔ غالب طور پر لوگوں میں قسموں میں یہی ہوتی ہیں اس کے علاوہ کو چھوڑ (خواہ) وہ سو قسمیں بھی ہوں، کیونکہ اس پر کفارہ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 48

اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بڑے گناہ کون سے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا''۔ اس نے کہا: پھر کون سا گناہ ہے؟ فرمایا: ''والدین کی نافرمانی کرنا''۔ اس نے پوچھا: پھر کون سا ہے۔ فرمایا: ''یمین غموس'' میں نے کہا: یمین غموس کیا ہے؟ فرمایا: ''جس کے ساتھ کسی کا مال حاصل کر لے جب کہ اس قسم میں جھوٹا ہو''۔ مسلم نے حضرت ابو امامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کا حق قسم کے ذریعے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آگ واجب کر دے گا اور اس پر جنت حرام کر دے گا''۔ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! اگرچہ وہ مال تھوڑا سا بھی ہو؟ فرمایا: ''اگرچہ وہ کیکر کی چھڑی بھی ہو''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایسی مضبوط لازم قسم اٹھائی جس کے ساتھ اس نے کسی مسلمان کا مال حاصل کیا جب کہ وہ اس میں جھوٹا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے جب کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الخ (آل عمران: 77) اس پر کفارہ کا ذکر نہیں فرمایا اگر ہم اس پر کفارہ واجب کریں گے تو اس کا جرم ساقط ہو جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا جب کہ وہ اس سے راضی ہوگا اور وہ اس وعید کا مستحق نہیں ہوگا جس کی دھمکی دی گئی ہے اور یہ کیسے نہ ہوگا جب کہ اس قسم اٹھانے والے نے جھوٹ اور غیر کے مال کو حلال سمجھنے کا فعل جمع کیا ہے اور اس نے اللہ تعالیٰ کی قسم کی تخفیف کی ہے اور اس کے ساتھ استہزا کیا ہے اور دنیا کی تعظیم کی۔ اللہ تعالیٰ نے جس کی بڑائی بیان کی اس کی اس نے اہانت کی اور جس کی اللہ نے تحقیر کی اس کی اس نے تعظیم کی، تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا: یمین غموس کو غموس کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ قسم اٹھانے والے کو آگ میں غوطہ دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر کوئی شخص کسی نیکی کے نہ کرنے کی قسم اٹھائے، پھر اگر وہ اس نیکی کو کرے گا تو وہ حانث ہو جائے گا اور اس پر کفارہ لازم ہوگا۔ کیونکہ قسم کی مخالفت پائی گئی ہے۔ اسی طرح جب کسی نے کہا: اگر میں یہ کروں پھر نہ کرے تو کفارہ لازم ہوگا۔ جب قسم اٹھائے کہ وہ ضرور ایسا کرے گا تو وہ فی الحال ایسا نہیں کرے گا تو وہ حانث ہوگا مخالفت کے پائے جانے کی وجہ سے اگر وہ فعل کر دے گا تو وہ قسم کو پورا کرنے والا ہوگا، اسی طرح اگر کہا: اگر میں ایسا نہ کروں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قسم اٹھانے والے کا قول: ''میں ایسا ضرور کروں گا اور اگر میں ایسا نہ کروں''۔ یہ امر کے قائم مقام ہے اور ''میں ایسا نہیں کروں گا اور اگر میں ایسا کروں'' یہ نہی کے قائم مقام ہے۔ پہلی صورت میں وہ قسم کو پورا کرنے والا نہیں ہوگا حتیٰ کہ تمام وہ کام کرے جس پر قسم اٹھائی گئی تھی اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی کہے: میں روٹی ضرور کھاؤں گا۔ پھر اس نے بعض روٹی کھائی تو وہ قسم کو پورا کرنے والا نہ ہوگا حتیٰ کہ تمام روٹی کھائے، کیونکہ روٹی کے ہر جز پر قسم اٹھائی گئی تھی۔ اگر کہا: اللہ کی قسم! میں کھاؤں گا۔ مطلقاً کہا، تو وہ تھوڑی سی روٹی کھا کر بھی قسم کو پورا کرنے والا ہوگا جس پر روٹی کے اسم کا اطلاق ہوتا ہوگا، کیونکہ وجود میں اکل کی ماہیت کو داخل کرنے کی وجہ سے اور نہی کی صورت میں وہ حانث ہو جائے گا اس کم از کم روٹی کے استعمال سے جس پر روٹی کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ اس کا مقتضا یہ ہے کہ وجود میں منہی عنہ کے افراد میں سے کوئی فرد

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4212

داخل نہ ہو۔ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوگا پھر اس نے ایک پاؤں داخل کیا تو وہ حانث ہو جائے گا اس پر دلیل یہ ہے کہ ہم نے شارع کو پایا کہ پہلے اسم کے ساتھ تحریم کی جہت کو مغلظ کیا ارشاد فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ (النساء:22) پس جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تو وہ اس کے باپ اور بیٹے پر حرام ہو جائے گی، پہلے اسم کے ساتھ تحلیل کی جہت میں اکتفا نہیں کیا فرمایا: لاحتی تذوقی عسیلته نہیں حتیٰ کہ تو اس کا ذائقہ چکھ لے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء حسنیٰ کے ساتھ قسم اٹھائی جائے گی جیسی الرحمن، الرحیم، السمیع، العلیم، الحلیم اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات علیا کے ساتھ قسم اٹھائی جائے گی جیسے اس کی عزت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کا ارادہ، اس کی کبریائی، اس کی عظمت، اس کا عہد، اس کا میثاق اور دوسری اس کی ذاتی صفات، کیونکہ ان کے ساتھ قسم بھی غیر مخلوق قدیم کے ساتھ قسم ہے، اس کے ساتھ قسم اٹھانے والے ذات کے ساتھ قسم اٹھانے والے کی طرح ہیں۔ ترمذی، نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے جب جنت کو دیکھا اور اللہ کی طرف واپس آئے تو کہا: تیری عزت کی قسم! کوئی اس جنت کے متعلق نہیں سنے گا مگر وہ اس میں داخل ہوگا۔ اسی طرح آگ کے بارے میں کہا: وعزتك تیری عزت کی قسم! ایسا نہیں کہ کوئی اس کے بارے میں سنے اور پھر اس میں داخل ہو(1)۔ ترمذی اور نسائی وغیرہما نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کے قسم اٹھاتے تھے لا و مقلب القلوب(2) ایک روایت میں ہے لا و مصرف القلوب(3)۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو قسم اٹھائے اور کہے واللہ یا باللہ یا تاللہ پھر حانث ہو جائے تو اس پر کفارہ ہے۔ ابن المنذر نے کہا: مالک، شافعی، ابوعبید، ابوثور، اسحاق اور اصحاب الرائے کہتے ہیں: جس نے اللہ کے اسماء میں سے کسی اسم کے ساتھ قسم اٹھائی اور پھر حانث ہو جائے تو اس پر کفارہ ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں اور میں اس کے خلاف نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں: باب ذکر الحلف بالقرآن میں نقل ہے، یعقوب نے کہا: جس نے الرحمٰن کے ساتھ قسم اٹھائی پھر قسم توڑ دی تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: الرحمٰن اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے، اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 9۔** علماء کا وحق اللہ وعظمة اللہ وقدرة اللہ وعلم اللہ ولعمر اللہ و ایم اللہ میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: یہ تمام قسمیں ہیں ان میں کفارہ واجب ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: وحق اللہ و جلال اللہ وعظمة اللہ وقدرة اللہ۔ قسم ہے، اگر اس سے قسم کی نیت کرے اگر قسم کی نیت نہ کرے تو قسم نہیں، کیونکہ اس میں احتمال ہے اس کا مطلب ہوگا اللہ کا حق واجب ہے اور اس کی قدرت ظاہر ہونے والی ہے۔ اور فی امانة اللہ میں فرمایا: یہ قسم نہیں ہے۔ ولعمر اللہ و ایم اللہ اگر ان سے قسم مراد نہ لے تو قسم نہ ہوگی۔ اصحاب الرائے نے کہا: اگر کہا: وعظمة اللہ و عزة اللہ و جلال اللہ و کبریاء اللہ و امانة اللہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب النذور والأیمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 1460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، حدیث نمبر 2082، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر قسم توڑ دی تو اس پر کفارہ ہوگا۔ حسن نے کہا: وحق اللہ قسم نہیں ہے اور اس پر کفارہ بھی نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے جو رازی نے ان سے حکایت کیا ہے، اسی طرح عهد الله و میثاقه و امانته قسم نہیں ہے۔ امام صاحب کے بعض اصحاب نے کہا: یہ قسم ہے۔ امام طحاوی نے کہا: یہ قسم نہیں ہے، اسی طرح جب کہا: وعلم اللہ تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک قسم نہ ہو گی۔ امام ابو یوسف کا قول اس سے مختلف ہے انہوں نے کہا: یہ قسم ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام صاحب نے یہ قول اس لیے فرمایا: کیونکہ علم کبھی معلوم کے معنی میں ہوتا ہے اور وہ محدث ہے پس وہ قسم نہ ہوگی اور وہ اس سے غافل رہے کہ قدرت بمعنی مقدور بھی استعمال ہوتی ہے ہر جواب جو وہ مقدور کے بارے میں کہیں گے وہی ہمارا معلوم کے بارے میں جواب ہوگا۔

ابن المنذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وایم الله ان کان لخلیقا للامارة اللہ کی قسم! وہ امارت کا حق دار تھا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ کے واقعہ میں فرمایا تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے تھے وایم اللہ۔ اسی طرح حضرت ابن عمر نے فرمایا: اسحاق نے کہا جب ایم اللہ سے مراد قسم لے گا تو ارادہ اور دل کی عقد کے ساتھ قسم ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قرآن کی قسم اٹھانے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: ہر ایک کے عوض اس پر قسم ہو گی۔ حسن بصری اور ابن المبارک کا یہی قول ہے، امام احمد نے فرمایا: میں کوئی ایسی دلیل نہیں جانتا جو اس کا رد کرے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ ایک قسم ہوگی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے۔ قتادہ قرآن کے ساتھ قسم اٹھاتے تھے۔ احمد اور اسحاق نے کہا: ہم اس کو ناپسند نہیں کرتے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے اسماء اور صفات کے علاوہ قسم منعقد نہ ہوگی، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم اٹھائے گا تو قسم منعقد ہو جائے گی، کیونکہ اس نے ایسی ذات کی قسم اٹھائی کہ ایمان کی تکمیل ان کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہوتی ہے اس پر کفارہ لازم ہوگا جس طرح اگر اللہ کی قسم اٹھاتا تو کفارہ لازم ہوتا۔ اس کو وہ حدیث رد کرتی ہے جو صحیحین وغیرہما میں ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب کو ایک قافلہ میں پایا جب کہ حضرت عمر اپنے باپ کی قسم اٹھا رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آواز دی ”خبردار اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آباء کی قسمیں اٹھانے سے منع کرتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے“ (1)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے اسماء اور اس کی صفات کے علاوہ ہر چیز کی قسم نہ اٹھانے میں حصر ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اس کو مزید ابوداؤد اور نسائی وغیرہما کی روایت ثابت کرتی ہے جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے آباء، اپنی امہات اور انداد کی قسم نہ اٹھاؤ اور قسم نہ اٹھاؤ مگر اللہ کی اور اللہ کی قسم نہ اٹھاؤ مگر جب تم سچے ہو“ (2)۔ پھر اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے جو کہتا ہے حضرت آدم و حضرت ابراہیم کی قسم تو وہ بھی کہتا ہے: اس پر کفارہ نہیں، حالانکہ یہاں بھی اس نے ایسی ذات کی قسم اٹھائی جن کے ساتھ ایمان مکمل ہوتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 46 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور، حدیث 2827، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 12**۔ ائمہ نے روایت کی ہے اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے تم میں سے قسم اٹھائی اور اس نے لات کی قسم اٹھائی تو وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے (یعنی دوبارہ کلمہ پڑھے) اور جس نے اپنے ساتھی کو کہا: آؤ میں تمہارے ساتھ جوا کھیلتا ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ کرے۔ نسائی نے حضرت مصعب بن سعد عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم کسی معاملہ کا ذکر کر رہے تھے جب کہ میرا زمانہ جہالت قریب تھا میں نے لات وعزیٰ کی قسم اٹھائی۔ مجھے کسی صحابی نے کہا: تو نے بہت برا کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے ''تو نے جھوٹ کہا ہے''۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس واقعہ کا ذکر کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کہو لا الٰه الا الله وحده لا شریك له له الملك وله الحمد وهو علی كل شیء قدیر اور تین مرتبہ اپنی بائیں جانب تھوک دے اور اللہ تعالیٰ سے شیطان کی پناہ مانگ اور پھر کبھی ایسا نہ کہنا''۔ علماء نے فرمایا: جس نے ایسا کلمہ کہا اس کو رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد کلمہ پڑھنے کا حکم اس لفظ کے کفارہ کے لیے اور غفلت سے تذکیر کے لیے اور نعمت کی تکمیل کے لیے دیا تھا۔ لات کا ذکر خصوصی طور پر کیا، کیونکہ یہ اکثر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوتا تھا۔ ان کے دوسرے بتوں کے ناموں کا بھی یہ حکم ہے، کیونکہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح جس نے اپنے ساتھی کو کہا: آؤ میں تمہارے ساتھ جوا کھیلوں گا تو اس کو صدقہ کرنا چاہیے۔ اس کے بارے کلام اسی طرح ہے جس طرح لات کے بارے میں ہے، کیونکہ وہ جوا کھیلنے کے عادی بن چکے تھے اور یہ باطل ذریعہ سے مال کھانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ امام ابوحنیفہ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو کہتا ہے وہ یہودی ہے یا نصرانی ہے یا اسلام سے بری ہے یا نبی سے بری ہے یا قرآن سے بری ہے یا اس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا یا اللہ تعالیٰ سے کفر کیا، تو یہ قسم ہے اس میں کفارہ لازم ہے اور جب اس نے کہا: والیهودیة والنصرانیة والنبی والكعبة اگرچہ قسم کے صیغہ پر کہا تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہوتا اور ان کی دلیل دارقطنی کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت ابو رافع سے روایت کی ہے کہ ان کی سردار عورت نے ارادہ کیا کہ وہ ان کے اور ان کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دے اس نے کہا: وہ ایک دن یہودیہ ہو گی، ایک دن نصرانیہ ہو گی اس کا ہر مملوک آزاد ہے اس کا جو مال ہے وہ اللہ کے راستہ میں ہے اور اس پر اللہ کے گھر کی طرف چل کر جانا ہے اگر اس نے ان کے درمیان جدائی نہیں کی، اس نے یہ مسئلہ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ام سلمہ سب سے پوچھا تو انہوں نے اسے کہا: تو ہاروت و ماروت کی مثل ہونا چاہتی ہے انہوں نے اسے قسم کا کفارہ دینے اور انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دینے کو کہا، انہوں نے حضرت رافع سے روایت کیا ہے فرمایا: میری مالکن نے کہا: میں تمہارے اور تمہاری بیوی کے درمیان جدائی کراؤں گی۔ اس کا ہر مال کعبہ کی چوکھٹ کے لیے ہے۔ وہ ایک دن یہودیہ، ایک دن نصرانیہ، ایک دن مجوسیہ ہے، اگر میں تیرے اور تیری بیوی کے درمیان جدائی نہ کراؤں۔

حضرت رافع نے فرمایا: میں ام المومنین ام سلمہ کی طرف گیا، میں نے کہا: میری مالکن چاہتی ہے کہ وہ میرے اور میری بیوی کے درمیان جدائی ڈال دے۔ حضرت ام سلمہ نے کہا: تو اپنی مالکن کے پاس جا اور اسے کہہ کہ یہ تیرے لیے حلال نہیں،

حضرت رافع نے کہا: میں مالکن کے پاس واپس آیا۔ فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے پاس گیا انہیں یہ سارا واقعہ سنایا۔ پس وہ آئے حتیٰ کے دروازے پر پہنچ گئے فرمایا: یہاں ہاروت و ماروت ہیں۔ اس عورت نے کہا: میں نے تمام مال کعبہ کی چوکھٹ کے لیے کر دیا ہے فرمایا: پھر تو کس چیز سے کھائے گی۔ اس عورت نے کہا: میں نے کہا ہے میں ایک دن یہودیہ ہوں، ایک دن نصرانیہ ہوں، ایک دن مجوسیہ ہوں۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: اگر تو یہودی ہوگی تو تجھے قتل کیا جائے گا، اگر تو نصرانی ہوگی تو تجھے قتل کیا جائے گا، اگر تو مجوسی ہوگی تو تجھے قتل کیا جائے گا۔ اس عورت نے کہا: پھر تم مجھے کیا حکم دیتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: تو اپنی قسم کا کفارہ دے اور اپنے غلام اور لونڈی کو جمع کر۔

علماء کا اجماع ہے کہ قسم اٹھانے والا جب کہے: اقسم باللہ۔ تو یہ قسم ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے جب کہے: اقسم یا کہے: اشھد لیکونن کذا و کذا اور باللہ نہ کہے تو امام مالک کے نزدیک ایمان ہوگی۔ جب باللہ کا ارادہ کیا ہو، اگر باللہ کا ارادہ نہ کیا ہو وہ قسمیں نہ ہوں گی جن کا کفارہ دیا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ، اوزاعی، حسن اور نخعی نے کہا: یہ دونوں صورتوں میں قسمیں ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم نہ ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا اسم کا ذکر کرے۔ یہ مزنی کی امام شافعی سے روایت ہے۔ ربیع نے امام شافعی سے مالک کے قول کی مثل روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ جب کہے: تجھے میں قسم دیتا ہوں تو ایسا ضرور کرے گا اگر تو اس کا ارادہ سوال ہے تو کفارہ نہیں ہے اور یہ قسم نہیں اور اگر قسم کا ارادہ ہے تو وہی حکم ہے جو بھی ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ جو ایسی چیز کی قسم اٹھائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے لیکن اس کی صفات سے نہیں ہے جیسے وخلق اللہ و رزق اللہ و بیت اللہ۔ تو اس پر کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ یہ قسمیں جائز نہیں ہیں اس نے اللہ کے علاوہ کی قسم اٹھائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جب قسم منعقد ہو جائے گی تو اسے کفارہ حلال کرے گا یا استثنا۔ ابن الماجشون نے کہا: استثنا کفارہ کا بدل ہے وہ قسم کو حلال کرنے والا نہیں۔ ابن القاسم نے کہا: یہ قسم کو حلال کرنے والا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ فقہاء امصار کا مذہب ہے اور یہی صحیح ہے اس میں شرط ہے کہ وہ متصل ہو تلفظ کے ساتھ ہو، اس کی دلیل نسائی اور ابوداؤد کی روایت ہے جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی اور استثنا کر دی تو پھر اگر وہ چاہے تو اس کام کو کرے چاہے تو ترک کر دے وہ قسم کو توڑنے والا نہ ہوگا۔

اگر بغیر لفظ کے نیت کی یا متصل نہ کہا جب کہ کوئی عذر بھی نہ تھا تو استثنا اسے فائدہ نہ دے گی۔ محمد بن المواز نے کہا: استثنا قسم کے ساتھ اعتقاداً متصل ہوگی اگر چہ آخری حرف کے ساتھ ہو۔ فرمایا: اگر وہ قسم سے فارغ ہو گیا پھر استثنا کی تو اسے نفع نہ دے گی، کیونکہ قسم مکمل ہو چکی تھی اور وہ استثنا سے خالی تھی، پس اس کے بعد استثنا کا وارد ہونا مؤثر نہ ہوگا جیسے بہت دیر کے ساتھ کہے تو مؤثر نہیں ہوتا۔ اس کو حدیث **من حلف فاستثنی** رد کرتی ہے، فاتعقیب کے لیے ہے اس پر جمہور اہل علم ہیں۔ نیز یہ تو اس تک پہنچاتا ہے کہ قسم حلال نہ ہو جس کو اس نے اٹھایا ہے اور یہ باطل ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: ہمارے اصحاب

کا اختلاف ہے کہ جب وہ اپنے نفس میں محلوف علیہ کی تخصیص کی استثنا کرے۔ ہمارے بعض اصحاب نے کہا: اس کا استثنا کرنا صحیح ہے جب محلوف لہ ظالم ہو۔ بعض نے فرمایا: استثنا صحیح نہیں ہے حتیٰ کہ محلوف لہ اس کو سن لے۔ بعض نے فرمایا: جب استثنا کے ساتھ زبان اور ہونٹوں کو حرکت دے تو صحیح ہے اگرچہ محلوف لہ (جس کے لیے قسم اٹھائی) نہ بھی سنے۔ ابن خویز منداد نے کہا: ہم نے کہا: دل میں اس کی استثنا صحیح ہے، کیونکہ قسموں کا اعتبار نیتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم نے کہا: یہ صحیح ہے حتیٰ کہ وہ استثنا کے ساتھ اپنی زبان اور ہونٹوں کو حرکت دے، کیونکہ جس نے زبان اور ہونٹوں کو حرکت نہ دی تو وہ کلام کرنے والا نہ ہو گا۔ استثنا کلام سے شمار ہوتی ہے جو کلام کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ ہم نے کہا: یہ کسی حال میں صحیح نہیں، کیونکہ یہ محلوف لہ کا حق ہے یہ اس کے مطابق واقع ہوتی ہے جو اس کے لیے حاکم پورا کرتا ہے جب قسم مخالف کے لیے اختیار پر نہ ہو بلکہ وہ اس سے حاصل کی گئی ہو تو واجب ہے کہ اس کے لیے اس میں حکم نہ ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایک سال کے بعد بھی قسم کا استثنا پایا جائے گا۔ ابو العالیہ اور حسن نے اس میں ان کی متابعت کی ہے اور انہوں نے اس قول کے ساتھ حجت قائم کی ہے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (الفرقان: 68) کیونکہ اس کے سال بعد اِلَّا مَنْ تَابَ (الفرقان: 70) نازل ہوا تھا۔ مجاہد نے کہا: جس نے دو سال بعد (ان شاء اللہ) کہا، تو بھی جائز ہوگا۔ سعید بن جبیر نے کہا: اگر چار مہینے بعد استثنا کی تو جائز ہو گی۔ طاؤس نے کہا: وہ استثنا کر سکتا ہے جب تک مجلس میں ہے۔ قتادہ نے کہا: اگر کھڑے ہونے یا کلام کرنے سے پہلے استثنا (ان شاء اللہ) کر دی تو استثنا شمار ہو گی۔ امام احمد بن حنبل اور اسحاق نے کہا: جب تک اس معاملہ میں ہے استثنا (ان شاء اللہ) کر سکتا ہے۔ عطا نے کہا: اس کے لیے اونٹنی کا دودھ دوہنے کی مقدار ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس نے جس آیت سے حجت پکڑی ہے وہ درست نہیں، کیونکہ وہ علم الٰہی میں اور لوح محفوظ میں دونوں آیتیں متصل ہیں اس کے نزول میں تاخیر علم الٰہی کی حکمت کے پیش نظر ہے لیکن اس پر ایک عمدہ فرع مترتب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قسم اٹھانے والا جب کہے: اللہ کی قسم! تو گھر میں داخل ہوئی اور تجھے طلاق، اگر تو گھر میں داخل ہوئی اس نے اپنی پہلی قسم میں ان شاء اللہ دل میں کہا اور دوسری قسم میں دل میں ایسی بات نکالی جو اس استثنا کے مناسب تھی جو قسم اٹھا دیتا ہے خواہ وہ مدت ہو یا کوئی سبب ہو، کسی کی مشیت ہو اس نے محلوف لہ (جس کے لیے قسم اٹھائی) کے ڈر کی وجہ سے استثنا کو ظاہر نہ کیا تو یہ اس کو فائدہ دے گا اور دونوں قسمیں اس پر منعقد نہ ہوں گی طلاق میں بھی یہ ہو جب تک کہ دلیل موجود نہ ہو اگر دلیل موجود ہو تو اس کی استثنا کا دعویٰ قبول نہ ہو گا۔ یہ اس کو مفید ہو گا جب وہ فتویٰ لینے کے لیے آئے گا۔

میں کہتا ہوں: استثنا کی وجہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں ظاہر فرمائی اور دوسری میں مخفی رکھی، اسی طرح جب قسم اٹھانے والا بھی جب خوف کی بنا پر قسم اٹھائے اور استثنا کو مخفی کر دے۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا: ابو الفضل مراغی مدینۃ الاسلام (بغداد) میں پڑھتا تھا اور اس کے خطوط اس کے شہر سے اس کی طرف آتے تھے تو وہ انہیں صندوق میں رکھتا تھا اور ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں پڑھتا تھا اس خوف سے کہ ان میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اسے پریشان کر دے اور اسے علم کے حصول سے روک دے جب پانچ سال گزر گئے تو اس نے طلب علم کی غرض پوری

کر لی اور اس نے واپسی کا ارادہ کیا، اس نے اپنی سواری کو تیار کیا تو اس نے وہ اپنے خطوط نکالے اور انہیں پڑھا ان میں وہ کچھ لکھا تھا کہ اگر کوئی انہیں ان کے پہنچنے کے بعد پڑھتا تو اس کے لیے علم کا ایک حرف بھی پڑھنا ممکن نہ ہوتا۔ فضل نے اللہ کی حمد کی اور سواری پر اپنا سامان باندھا اور خراسان کے راستہ سے حلبۃ کے باب کی طرف نکل پڑے، کرائے والے نے سواری پیش کی وہ ایک خباز (نانبائی) کے پاس کھڑے ہوئے اس سے سامان سفر خرید رہے تھے وہ اس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے انہوں نے اسے ایک دوسرے نانبائی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ کیا تو نے عالم یعنی واعظ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ حضرت ابن عباس استثنا کو جائز قرار دیتے تھے اگرچہ سال بعد بھی ہو، میں نے اس کی بات سنی تو میں سوچنے لگ گیا اگر یہ صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ایوب علیہ السلام کو خُذۡ بِیَدِكَ ضِغۡثًا فَاضۡرِب بِّهِۦ وَلَا تَحۡنَثۡ (ص:44) نہ فرماتا، اسے یہ کہنے سے کون سی چیز مانع تھی کہ تو ان شاء اللہ کہہ دے جب اس نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا تو اس نے کہا: اس شہر کے نانبائیوں کی علمی کیفیت یہ تھی اس مرتبہ علم نے انہیں مراغۃ سے نکالا تھا، میں کبھی ایسا نہیں کروں گا وہ کرائے والے کے پیچھے چلا اسے کرایہ دے دیا اور وہاں ہی ٹھہرا رہا حتیٰ کہ فوت ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ استثنا یمین باللہ کو اٹھا دیتی ہے یہ اللہ کی طرف سے رخصت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اور وہ قسم جو غیر اللہ میں ہو اس کی استثنا میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ہر یمین میں استثنا واقع ہوتی ہے جیسے طلاق، عتاق وغیرہ۔ ابو عمر نے کہا: جس پر علماء کا اجماع ہے وہ حق ہے استثناء کا ذکر یمین باللہ میں ہے اس کے علاوہ میں نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكَفَّارَتُهٗٓ قسم توڑنے سے پہلے کفارہ دینے میں علماء کا اختلاف ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اس اجماع کے بعد کہ کفارہ سے پہلے قسم توڑنا مباح، حسن ہے، یہ علماء کے نزدیک اولیٰ ہے۔ علماء کے تین قول ہیں: (۱) مطلقاً جائز ہے یہ چودہ صحابہ، جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: کسی اعتبار سے جائز نہیں۔ یہ اشہب کی روایت امام مالک سے ہے۔ جواز کی وجہ کا ثبوت حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! ان شاء اللہ میں کسی کام پر قسم اٹھاؤں گا پھر اس کے علاوہ کوئی بہتر کام دیکھوں گا تو میں اپنی قسم کا کفارہ دوں گا اور وہ کام کروں گا جو بہتر ہوگا(1)'' اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور معنی کی جہت سے اس طرح ہے کہ قسم کفارہ کا سبب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيۡمَانِكُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ۔ یہاں کفارہ کو قسم کی طرف مضاف کیا اور معانی اسباب کی طرف مضاف کیے جاتے ہیں نیز کفارہ قسم پوری کرنے کا بدل ہے پس توڑنے سے پہلے کفارہ دینا جائز ہے اور منع کی دلیل مسلم کی روایت ہے جو حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ ''جس نے کسی کام پر قسم اٹھائی پھر اس نے اس کے علاوہ اس سے بہتر کام دیکھا تو وہ وہ کرے جو بہتر ہے''۔ نسائی نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ ''وہ قسم کا کفارہ دے'' اور معنی کی جہت سے اس طرح ہے کہ کفارہ گناہ کو اٹھانے کے لیے ہے جب تک اس نے قسم توڑی نہیں تو وہ کوئی چیز ہے ہی نہیں جس کو اٹھایا جائے، اس لیے کفارہ پہلے ادا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 48

کرنے میں کوئی فائدہ نہیں اور اِذَا حَلَفْتُمْ کا معنی ہے جب تم قسم اٹھاؤ اور پھر قسم توڑ دو نیز ہر عبادت جو وجوب سے پہلے ادا کی جائے وہ صحیح نہیں ہوتی جیسا کہ نمازیں اور دوسری عبادات ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم کا کفارہ کھانا کھلانے، غلام آزاد کرنے اور کپڑے پہنانے کے ساتھ جائز ہے اور روزے کے ساتھ جائز نہیں، کیونکہ بدن کا عمل وقت سے پہلے مقدم نہیں کیا جاتا اس کے علاوہ میں کفارہ کو مقدم کرنا جائز ہے۔ یہ تیسرا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ الله تعالیٰ نے کفارہ میں تین چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں اختیار دیا گیا ہے ان کی عدم موجودگی کے وقت روزے کا ذکر فرمایا کھانے سے آغاز فرمایا، کیونکہ وہ حجاز کے شہروں میں افضل تھا، کیونکہ اس کی حاجت زیادہ تھی اور لوگوں میں سیرابی بہت کم تھی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قسم کا کفارہ تخییر پر ہے۔ ابن عربی نے فرمایا: جو میرے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت کے اعتبار سے ہے اگر تو احتیاج کو محسوس کرے تو کھانا افضل ہے، کیونکہ جب تو غلام آزاد کرے گا تو ان کی حاجت پوری نہیں کرے گا اور گیارہویں محتاج کا اضافہ کرے گا، اسی طرح اس کے بعد لباس ہے جو اس سے متصل ہے جب الله تعالیٰ نے حاجت کو دیکھا تو مقدم مہم سے آغاز کیا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک مساکین کو اس چیز کا مالک بنانا ضروری ہے جو ان کے لیے نکالی جائے اور ان کے حوالے کر دے حتیٰ کہ وہ مالک ہو جائیں اور اس میں تصرف کریں، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ (انعام: 14) وہ کھلاتا ہے، کھلایا نہیں جاتا۔ اور حدیث میں ہے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے دادے کو سدس 1/6 حصہ دیا، کیونکہ یہ کفارہ کی ایک قسم ہے اس میں جائز نہیں مگر تملیک۔ اس کی اصل الکسوہ ہے امام ابوحنیفہ نے کہا: اگر انہیں صبح و شام کھلائے تو جائز ہے۔ ہمارے علماء میں سے ابن ماجشون کا یہ مختار قول ہے، ابن ماجشون نے کہا: کھانے میں قدرت دے دینا کھلانا ہے، الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ (الدہر) کسی اعتبار سے کھلائے وہ اس آیت میں داخل ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے کہ الوسط بمعنی اعلیٰ اور بہتر ہے یہاں یہ دو مرتبوں کے درمیان ایک مرتبہ ہے اور دونوں اطراف کے درمیان نصف ہے اس سے حدیث ہے خیر الامور اوسطھا بہتر امر درمیانہ ہے۔ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں عبدالرحمٰن بن مہدی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں سفیان بن عیینہ نے کہا انہوں نے سلیمان بن ابی مغیرہ سے روایت کیا انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا فرمایا: ایک شخص اپنے اہل کو خوراک دیتا ہے اس میں وسعت ہوتی ہے اور ایک شخص اپنے اہل کو خوراک دیتا ہے اس میں شدت ہوتی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی: مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ یہ دلیل ہے کہ یہاں وسط سے مراد وہ ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے یعنی وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ امام مالک کے نزدیک دس مسکینوں میں سے ہر ایک کے لیے کھانے میں مد ہوگا اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے مد کے ساتھ ہو یہی قول امام شافعی اور اہل مدینہ کا ہے۔ سلیمان بن یسار نے کہا: میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ جب قسم کا

کفارہ دیتے تھے تو گندم کا ایک مد، مد اصغر کے ساتھ دیتے تھے اور وہ اس کو ان کی طرف سے کافی سمجھتے تھے۔ یہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت کا قول ہے۔ عطا بن ابی رباح نے بھی یہی کہا ہے، قسم کے علاوہ کفارہ ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ ابن القاسم نے کہا: ہر جگہ مد کافی ہے۔ ابن المواز نے کہا: ابن وہب نے مصر میں ایک مد اور ایک نصف کا فتویٰ دیا۔ اور اشہب نے ایک مد اور ثلث 1/3 کا فتویٰ دیا فرمایا: ایک مد اور ایک ثلث 1/3 صبح و شام میں شہریوں کی درمیانی خوراک تھی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: گندم کا نصف صاع دے اور کھجور اور جو کا ایک صاع دے انہوں نے یہ حضرت عبداللہ بن ثعلبہ بن صغیر عن ابیہ کے سلسلہ سے مروی حدیث کی بنا پر کہا ہے۔ صغیر نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، آپ نے صدقہ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر فرد کی طرف سے یا دو شخصوں کو ایک صاع دینے کا حکم فرمایا، سفیان اور ابن المبارک نے اسی قول کو لیا ہے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔

سعید بن مسیب کا یہی قول ہے اور یہ اکثر فقہاء عراق کا قول ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس نے یہ روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع کھجور کا کفارہ دیا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا اور جو یہ نہ پائے وہ نصف صاع گندم دے: مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ یہ کفارہ کسی غنی اور ایسے قریبی رشتہ دار کو دینا جائز نہیں جس کا نفقہ لازم ہوتا ہے اگر رشتہ دار ایسے افراد سے ہو جس کا نفقہ لازم نہیں ہوتا، امام مالک نے فرمایا: مجھے تو اسے کھلانا بھی اچھا نہیں لگتا لیکن اگر وہ ایسا کر دے اور لینے والا فقیر ہو تو جائز ہوگا اگر ایسے غنی کو کھلایا جس کی غنا کا اسے علم نہ تھا تو ''مدونہ'' اور دوسری کتب میں ہے کہ جائز نہیں ہوگا اور ''الاسدیہ'' میں ہے جائز ہوگا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 25**۔ انسان وہ چیز کفارہ میں دے جو خود کھاتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہاں علماء کی ایک جماعت سے لغزش ہوئی انہوں نے کہا: جب وہ خود جَو کھاتا ہو اور لوگ گندم کھاتے ہوں تو وہ ایسی چیز کفارہ میں دے جو لوگ کھاتے ہیں۔ یہ کھلا سہو ہے، کیونکہ جب کفارہ دینے والا اپنے لیے صرف جو کی طاقت رکھتا ہے تو اسے دوسرے کے لیے کسی اور چیز کا مکلف نہیں کیا جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صاعاً من طعامٍ صاعاً من شعیرٍ دونوں کا علیحدہ ذکر فرمایا تا کہ ہر شخص وہ نکالے جو خود کھاتا ہے۔ اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ امام مالک نے فرمایا: اگر دس مسکینوں کو صبح و شام کھانا کھلایا تو اس کے لیے جائز ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: انہیں اکٹھا کھلانا جائز نہیں، کیونکہ وہ کھانے میں مختلف ہوتے ہیں بلکہ ایک مسکین کو ایک مد دے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک وقت کا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا کافی نہیں یعنی صرف صبح کا کھانا کھلانا اور شام کا کھانا نہ کھلانا یا صرف شام کا کھلانا اور صبح کا نہ کھلانا، بلکہ انہیں صبح و شام کھانا کھلائے۔ ابوعمر نے کہا: یہ ائمہ فتویٰ کا قول ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2 صفحہ 230

**مسئلہ نمبر 27**۔ ابن حبیب نے کہا: صرف روٹی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سالن بھی دیا جائے گا خواہ وہ زیتون کا تیل ہو یا کشک (جو کا پانی) ہو یا کامخ (سالن) ہو یا کوئی بھی سالن ہو جو میسر ہو۔ ابن عربی نے کہا: یہ زیادتی ہے میں اسے واجب نہیں جانتا، ہاں اس کے لیے مستحب ہے کہ روٹی کے ساتھ چینی، ہاں اور گوشت ہو، رہا کسی کھانے کے لیے سالن کی تعیین ہو تو اس کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ لفظ اس کو متضمن نہیں۔

میں کہتا ہوں، آیت کا نزول وسط میں ہے جو روٹی اور زیتون یا سرکہ کا تقاضا کرتی ہے اور جو چیز اس کے مفہوم میں ہو پنیر، کشک (جو کا پانی) وغیرہ جیسا کہ ابن حبیب نے کہا تھا: واللہ اعلم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین سالن سرکہ ہے'' حسن بصری نے کہا: اگر وہ مساکین کو روٹی اور گوشت کھلائے یا روٹی اور زیتون ایک مرتبہ ایک دن میں کھلائے حتیٰ کہ وہ سیر ہو جائیں تو کافی ہے یہ ابن سیرین، جابر بن زید اور مکحول کا قول ہے یہ حضرت انس بن مالک سے بھی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 28**۔ ہمارے نزدیک سارا کفارہ ایک مسکین کو دینا جائز نہیں امام شافعی کا یہی قول ہے (1) اور امام ابو حنیفہ کے اصحاب ایک فقیر کو یکبارگی تمام کفارہ دینے کو منع کرتے ہیں اور اس میں اختلاف کرتے ہیں کہ وہ تمام کفارہ ایک دن میں کئی مرتبہ ایک فقیر کو دے، بعض نے اس کی اجازت دی جب فعل متعدد ہو تو دوسرے فعل میں یہ کہنا اچھا ہے کہ اسے منع نہ کیا جائے جس کو پہلے دیا گیا ہے، کیونکہ مسکین کا اسم اس کو بھی شامل ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کو کئی ایام میں دینا جائز ہے اگر ایام متعدد ہوں گے تو وہ کئی مساکین کے قائم مقام ہوگا۔(2)

امام ابو حنیفہ نے کہا: یہ اس کے لیے جائز ہے، کیونکہ آیت سے مقصود اس مقدار کی تعریف ہے جو کھلایا جائے گا اگر اس نے یہ مقدار ایک کو دے دی تو جائز ہے۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا دس مساکین پر نص قائم فرمانا ہے پس اس سے عدول جائز نہیں، کیونکہ اس میں مسلمانوں کی ایک جماعت کا احیاء اور ان کی ایک دن کفایت کرنا ہے، پس وہ اس دن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی دعا کے لیے فارغ ہوں گے پھر اس کے سبب کفارہ دینے والے کو بخش دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَكَفَّارَتُهٗ** ضمیر کا مرجع نحوی قواعد کے مطابق ما ہے اور اس جگہ میں احتمال ہے کہ یہ **ما** بمعنی الذی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ **ما مصدریہ** ہو یا ضمیر کا مرجع قسم توڑنے کا گناہ ہو اگرچہ پہلے صراحۃً اس کا ذکر نہیں لیکن معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔(3)

**مسئلہ نمبر 30**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَهْلِيْكُمْ** یہ اہل کی جمع سالم ہے حضرت جعفر بن محمد صادق نے أهاليكم پڑھا ہے اور یہ جمع مکسر ہے۔ ابو الفتح نے کہا: اھال یہ لیال کی طرح ہے ان کا واحد اھلات ولیلات ہے عرب کہتے ہیں: اھل واھلة۔ شاعر نے کہا:

وَأَهْلَةِ وُدٍّ قد تَبَرَّيْتُ وُدَّهُمْ وأَبليتهُمْ فِي الجَهْدِ حَمْدِي ونائِلِي

وہ کہہ رہا ہے میں نے ان کی محبت سے اعراض کیا۔ یہ ابن سکیت کا قول ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن عربی 2۔ احکام القرآن للکیا طبری 3۔ المحرر الوجیز

**مسئلہ نمبر** 31۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ كِسْوَتُهُمْ یہ کاف کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے إِسوۃ اور أُسوۃ سعید بن جبیر اور محمد بن سمیقع یمانی نے أو کَإِسْوَتِهِم پڑھا ہے یعنی کإسوۃ أهلك۔ الکسوۃ مردوں کے حق میں ایک کپڑا ہے جو پورے جسم کو ڈھانپنے والا ہو اور عورتوں کے حق میں وہ کم از کم جس میں ان کی نماز جائز ہو اور وہ قمیص اور دوپٹہ ہے یہی حکم چھوٹے افراد کا ہے۔ ابن القاسم نے ''العتبیۃ'' میں کہا: چھوٹی بچی کو بڑا کپڑا پہنایا جائے گا اور چھوٹے بچے کو بڑا کپڑا پہنایا جائے گا کھانے پر قیاس کے اعتبار سے۔

امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور اوزاعی نے کہا: کسوۃ کا اطلاق جس پر کم از کم واقع ہوتا ہے وہ ایک کپڑا ہے۔ ابوالفرج نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور یہی ابراہیم نخعی اور مغیرہ کا قول ہے کہ جو تمام بدن کو ڈھانپ لے اس بناء پر کہ نماز اس سے کم میں جائز نہیں (1)۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: بہتر کپڑا جانگیا ہے۔ طبری نے سند کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔ حکم بن عتیبۃ نے کہا: عمامہ کافی ہے جس سے سر لپیٹا جاتا ہے (2)۔ یہ ثوری کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ کہنے پر مجھے زیادہ حرص دلاتی ہے کہ جائز نہیں ہے مگر وہ کپڑا جو گرمی اور سردی کی اذیت سے بچائے جیسا کہ اس پر کھانا ہے جو اس کی بھوک مٹا دے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں، رہی ایک چادر تو میں اسے نہیں جانتا اللہ تعالیٰ میرے لیے اور تمہارے لیے اپنی مدد سے معرفت کے دروازے کھول دے۔

میں کہتا ہوں: ایک قوم نے متعارف لباس کی رعایت رکھی ہے۔ بعض نے فرمایا: ایک کپڑا جائز نہیں مگر جب بڑا کپڑا ہو جس کے ساتھ پورا جسم لپٹ جائے جیسے کمبل اور بڑی چادر۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: قسم کے کفارہ میں ہر مسکین کے لیے کپڑا اور ازار ہے یا ایک کپڑا اور ردا یا قمیص یا قبا یا کمبل ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ انہوں نے حکم دیا کہ ہر مسکین کو دو دو کپڑے پہنائے جائیں۔ حسن اور ابن سیرین نے بھی یہی کہا۔ یہ ابن عربی کا مختار معنی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر** 32۔ طعام اور لباس کی قیمت دینا جائز نہیں، امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: قیمت دینا جائز ہے، وہ فرماتے ہیں: زکوٰۃ میں قیمت دینا جائز ہے تو پھر کفارہ میں کیسا ہوگا؟ ابن عربی نے کہا: اس کا بنیادی مقصد حاجت کا پورا کرنا ہے اور ضرورت کو ختم کرنا ہے پس اس میں قیمت جائز ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگر تم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف دیکھتے ہو تو عبادت کہاں ہے اور اعیان ثلاثہ پر نص قرآنی کہاں ہے اور ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف بیان کا انتقال کہاں جائے گا؟۔

**مسئلہ نمبر** 33۔ لباس کسی ذمی یا غلام کو دینا جائز نہیں، امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ذمی اور غلام کو دینا جائز ہے، کیونکہ وہ مسکین ہے۔ مسکنت کا لفظ اسے شامل ہے اور آیت کا عموم اس پر مشتمل ہے۔ ہم نے کہا: یہ خاص ہے کہ مال کا مخصوص حصہ مسکینوں کو دینا واجب ہے پس اسے کافر کو دینا جائز نہیں، اس کی اصل زکوٰۃ ہے جب کہ اتفاق ہے کہ مرتد کو لباس دینا جائز نہیں پس ہر دلیل جس کے ساتھ مرتد خاص ہوتا ہے وہی دلیل ذمی کے بارے میں ہماری دلیل ہے اور غلام مسکین نہیں ہے، کیونکہ وہ

1۔ احکام القرآن لابن عربی 2۔ المحرر الوجیز

آقا کے نفقہ کی وجہ سے مستغنی ہے پس اسے لباس نہیں دیا جائے گا جیسے غنی کو نہیں دیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 34**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ تحریر کا معنی ہے غلامی سے نکالنا۔ پھر یہ لفظ قید، مشقت اور دنیا کی تھکن سے نکالنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اسی سے ام مریم کا قول ہے: اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا (آل عمران: 35)

یعنی میں نے تیرے لیے اسے دنیا کے معاملات سے آزاد کرنے کی نذر مانی ہے جو میرے بطن میں ہے۔ اسی سے فرزدق بن غالب کا قول ہے:

أبني غُدانةَ إنني حَرَّرتُكم فوهبتُكم لعطيةِ بن جِعَالِ

یعنی میں نے تمہیں ہجو سے آزاد کیا۔ انسان کے رقبہ کو خاص کیا ہے، کیونکہ یہ وہ عضو ہے جس میں حیوان کو بیڑی اور پٹہ ڈالا جاتا ہے یہ ملک کی جگہ ہے پس تحریر کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 35**۔ ہمارے نزدیک ایسے مومن غلام کا آزاد کرنا جائز ہے جسمیں غیر کی شرکت نہ ہو اور نہ اس کا جس کا بعض پہلے آزاد ہو اور مدت تک آزاد کرنا جائز ہے، نہ مکاتب و مدبر غلام جائز ہے اور نہ ام ولد کا آزاد کرنا جائز ہے اور اس کا جو اس کی ملکیت میں آنے کے بعد خود بخود اس پر آزاد ہو جاتا ہو اور نہ اتنا بوڑھا ہو اور نہ اپاہج ہو جس کی وجہ سے کمائی میں نقصان ہوتا ہو، وہ غلام عیوب سے سلامت ہو اس میں کسی قسم کا عیب نہ ہو، جب کہ داؤد نے عیب دار کو آزاد کرنا جائز قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: کافرہ کا آزاد کرنا جائز ہے۔ کیونکہ لفظ کا اطلاق اس کا تقاضا کرتا ہے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ قربت واجبہ ہے پس کافر اس کا محل نہیں جیسے زکوۃ ہے پس قرآن میں غلام آزاد کرنے میں سے جو مطلق آیا ہے وہ اس مقید کی طرف راجع ہے جو قتل خطا میں غلام آزاد کرنے کا ذکر ہے۔ ہم کہتے ہیں: اس میں شرکت نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (النساء: 92) اور بعض رقبة، رقبة نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں: اس میں آزادی کی عقد نہ ہو چکی ہو، کیونکہ تحریر کا کلمہ ابتداءً آزاد کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسا رقبہ نہ ہو جو پہلے آزادی کی جگہ پر ہو۔ ہم نے کہا: وہ عیوب سے سلامت ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ پس اطلاق کامل رقبہ کو آزاد کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور اندھا غلام ناقص ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح میں مروی ہے کہ جو مسلمان کسی مسلمان غلام کو آزاد کرتا ہے تو اس کا یہ آزاد کرنا آگ سے چھٹکارا ہے۔ اس کا ہر عضو اس کے ہر عضو کے بدلے میں آگ سے آزاد کیا جاتا ہے حتیٰ کہ شرمگاہ کے بدلے شرمگاہ کو آگ سے آزاد کیا جاتا ہے (2)، یہ نص ہے۔ کانے غلام کے بارے مذہب میں دو قول مروی ہیں اسی طرح بہرے اور خصی کے بارے میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 36**۔ جس نے مال نکالا تا کہ کفارہ میں غلام آزاد کرے لیکن وہ مال ضائع ہو جاتا ہے تو اس پر کفارہ باقی رہے گا بخلاف اس کے جو زکوۃ کی ادائیگی کے لیے مال نکالتا ہے تا کہ وہ فقراء کو دے یا اس کے ساتھ غلام خریدے پھر وہ مال تلف ہو جاتا ہے تو اس پر کوئی دوسرا مال واجب نہیں ہے، کیونکہ اس نے حکم کی پیروی کی ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل من اعتق، حدیث نمبر 1467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر** 37۔ اس کفارہ میں اختلاف ہے جب قسم اٹھانے والا فوت ہو جاتا ہے۔ امام شافعی اور ابوثور نے کہا: قسموں کے کفارے اصل مال سے نکالے جائیں گے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: یہ قسم کا کفارہ ثلث سے نکالنا جائز ہوگا، اسی طرح امام مالک نے کہا ہے کہ اگر اس نے اس کے لیے وصیت کی ہو۔

**مسئلہ نمبر** 38۔ جس نے قسم اٹھائی جب کہ وہ خوشحال تھا اس نے کفارہ ادا نہیں کیا حتیٰ کہ تنگ دست ہو گیا یا قسم توڑ دے جب کہ وہ تنگ دست ہو پس اس نے جو کفارہ ادا نہ کیا حتیٰ کہ وہ خوشحال ہو گیا یا اس نے قسم توڑی جب کہ وہ غلام تھا تو پھر وہ کفارہ نہیں دے گا حتیٰ کہ آزاد ہو جائے پس اس تمام صورت حال میں کفارہ دینے کے وقت کا اعتبار ہوگا نہ کہ قسم توڑنے وقت کا اعتبار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر** 39۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! تم میں سے کسی کا اپنے گھر والوں کے متعلق قسم پر قائم رہنا اللہ کی بارگاہ میں کفارہ دینے سے زیادہ گناہ ہے جو کفارہ اللہ نے فرض کیا ہے''۔ اللجاج فی الیمین کا مطلب ہے اس کے مقتضیٰ پر قائم رہنا اگرچہ اس کی وجہ سے حرج اور مشقت لازم آتی ہو اور اس نے اس کو چھوڑ دیا جس میں فوری منفعت تھی یا متاخر منفعت تھی اگر کوئی ایسی صورت ہو تو قسم کا توڑنا اور کفارہ دینا لازم ہے وہ قسم کو علت نہ بنائے جیسا کہ ہم نے بیان کیا تھا وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ (بقرہ:224) کی تفسیر میں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی کام پر قسم اٹھائے پھر اس کے علاوہ کو اس سے بہتر دیکھے تو اسے قسم کا کفارہ دینا چاہیے اور اسے وہ کام کرنا چاہیے جو بہتر ہے یعنی جس میں خیر زیادہ ہے''۔

**مسئلہ نمبر** 40۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم میں اعتبار قسم کھانے والے کی نیت کا ہوگا''۔ علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جس پر قسم واجب ہو کسی حق کی وجہ سے جو اس پر واجب ہے اور اس نے قسم اٹھائی جب کہ اس کی نیت کوئی دوسری ہو تو اس کو اس کی نیت فائدہ نہ دے گی اور اس کی وجہ سے اس قسم کے گناہ سے خارج نہ ہوگا۔ دوسری حدیث میں اس کا مفہوم موجود ہے یمینك علی ما یصدقك علیه صاحبك تمہاری قسم اس کے مطابق ہوگی جس پر تمہارا خصم تصدیق کرے گا۔

روایت ہے یصدقك به صاحبك تمہارا خصم تیری تصدیق کرے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے اپنے طالب کے لیے اس حق میں قسم اٹھائی جو اس کے لیے اس پر تھا اور اپنی قسم میں استثنا کی یا اس نے اپنی زبان یا ہونٹوں کو حرکت دی یا اس کے ساتھ کلام کی تو یہ استثنا اسے مفید نہ ہوگی، کیونکہ محلوف لہ کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے کیونکہ قسم اس کا حق ہے۔ قسم اس کے مطابق واقع ہوگی جس کے لیے حاکم لے رہا ہے نہ کہ قسم اٹھانے والے کے اختیار پر ہوگی، کیونکہ اس سے تو قسم طلب کی گئی ہے یہ امام مالک کے مذہب کا ماحصل ہے۔

**مسئلہ نمبر** 41۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ یعنی ان تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز اس کی ملکیت میں نہ ہو یعنی کھانا کھلانا یا لباس پہنانا یا غلام آزاد کرنا نہ ہو تو وہ روزے رکھے۔ اور نہ ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو اس کا مال

غائب ہو یا بالکل نہ ہو۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس کا مال اس کے اپنے شہر میں نہ ہو اگر وہ ایسا شخص پائے جو اسے ادھار دیتا ہو تو پھر بھی روزہ رکھنا جائز نہیں اور اگر ایسا شخص نہ پائے تو پھر اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اپنے شہر تک مال پہنچنے کا انتظار کرے۔ ابن عربی نے کہا: یہ اس پر لازم نہیں بلکہ وہ روزوں کے ساتھ کفارہ دے، کیونکہ اس کے ذمہ وجوب ثابت ہو چکا ہے اور عدم کی شرط متحقق ہو چکی ہے پس حکم کو مؤخر کرنے کی کوئی وجہ نہیں پس وہ ان تینوں چیزوں سے عجز کی وجہ سے اس جگہ کفارہ دے۔ کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ بعض علماء نے فرمایا: جس کے پاس ضروریات زندگی سے زائد مال نہ ہو تو وہ ایسا شخص ہے جو ان تینوں چیزوں کو پانے والا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جس کے پاس ایک دن اور ایک رات کی خوراک ہو اور اس کے پاس زائد مال نہ ہو جو کھلائے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔ ابن القاسم سے مروی ہے کہ جس کے پاس ایک دن کے نفقہ سے زائد ہو وہ روزہ نہ رکھے۔ ابن القاسم نے ابن مزین کی کتاب میں کہا: اگر قسم توڑنے والے کے لیے ایک دن کی خوراک سے زائد ہو تو وہ کھانا کھلائے مگر یہ کہ اسے بھوک کا خوف ہو یا وہ ایسے شہر میں ہو جہاں اس پر مہربانی نہ کی جاتی ہو۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب اس کے پاس نصاب نہ ہو تو وہ پانے والا نہیں۔ احمد اور اسحاق نے کہا: جب اس کے پاس ایک دن اور ایک رات کی خوراک ہو تو وہ زائد سے کھانا کھلائے۔ ابوعبید نے کہا: جب اس کے پاس اپنے اور اپنے عیال کے لیے ایک دن کی خوراک ہو اور اتنا کپڑا بھی ہو جو ان کی کفایت کرتا ہو، پھر اس کے بعد وہ کفارہ دینے کی مقدار کا مالک ہو تو وہ ہمارے نزدیک پانے والا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ابوعبید کا قول بہتر ہے۔

**مسئلہ نمبر 42**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ حضرت ابن مسعود نے متتابعات بھی پڑھا ہے۔ پس اس کے ساتھ مطلق کو مقید کیا گیا۔ یہی امام ابوحنیفہ اور ثوری کا قول ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔ مزنی نے کفارہ ظہار پر قیاس کرتے ہوئے اور حضرت عبدالله کی قرأت کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے دوسرے قول میں فرمایا کہ علیحدہ علیحدہ تین روزے رکھنا جائز ہے۔ کیونکہ تتابع صفت ہے اور یہ ثابت نہیں ہوتی مگر نص کے ساتھ یا منصوص پر قیاس کے ساتھ جب کہ یہ دونوں صورتیں معدوم ہیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 43**۔ جس نے روزے کے دنوں میں کسی روز بھول کر روزہ افطار کر لیا۔ امام مالک نے فرمایا اس پر قضا لازم ہوگی امام شافعی نے فرمایا کہ اس پر کوئی قضا نہیں جس طرح اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں روزوں کی بحث میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 44**۔ یہ کفارہ جس پر الله تعالیٰ نے نص فرمائی ہے بالاتفاق آزاد مسلمان پر لازم ہے اور غلام قسم توڑ دے تو جو اس پر واجب ہوتا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ سفیان ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے کہتے ہیں کہ اس پر صرف روزہ ہے اس کے علاوہ کچھ جائز نہیں۔ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔ ابن نافع نے ان سے حکایت کیا ہے فرمایا: غلام کسی کو آزاد کرنے کے ساتھ کفارہ نہیں دے گا۔ کیونکہ اس کے لیے ولاء نہیں ہے لیکن وہ صدقہ کے ساتھ کفارہ دے گا اگر اس

1۔ احکام القرآن لابن عربی

کے مالک نے اسے اجازت دی ہو۔ درست یہ ہے کہ وہ روزہ رکھے۔

ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر وہ کھانا کھلائے یا لباس پہنائے اپنے آقا کی اجازت سے تو وہ واضح نہیں اور میرے دل میں اس کے متعلق شک ہے۔

**مسئلہ نمبر 45**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ یعنی تمہاری قسموں کو ڈھانپنا ہے۔ کفرت الشیٔ کا مطلب ہے کسی چیز کو ڈھانپ دینا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ کی قسم اٹھانے میں یہ کفارہ ہے۔ بعض تابعین کا خیال ہے کہ قسم کا کفارہ اس کی نیکی کے کرنے پر بھی ہے جس کو اس نے چھوڑنے کی قسم اٹھائی تھی۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں عنوان باندھا ہے من قال کفارتھا ترکھا اس کے تحت حدثنا علی بن محمد حدثنا عبداللہ بن نمیر عن حارثہ بن ابی الرجال عن عمرۃ عن عائشہ کے سلسلے سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قطع رحمی کی قسم اٹھائی یا ایسی بات میں قسم اٹھائی جو مناسب نہ تھی تو اس کا قسم پورا کرنا یہ ہے کہ وہ اس قسم کو پورا نہ کرے'' (1)۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی کام پر قسم اٹھائی پھر وہ اس کے علاوہ کام کو بہتر دیکھے تو وہ قسم کو ترک کر دے اور اس کا ترک اس کا کفارہ ہے''۔ (2)

میں کہتا ہوں: اس کی تائید حضرت ابوبکر صدیق کے واقعہ سے ہوتی ہے جب انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے اور ان کی بیوی نے قسم اٹھائی کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی حتیٰ کہ وہ کھانا کھائیں اور مہمانوں نے بھی قسم اٹھائی کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر کھانا کھائیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا: یہ کھانا نہ کھانے کی قسم اٹھانا شیطان کی طرف سے تھا پھر انہوں نے کھانا منگوایا اور کھایا پھر مہمانوں نے بھی کھایا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے روایت کیا ہے فرمایا: جب صبح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو عرض کی: یا رسول اللہ! انہوں نے اپنی قسم پوری کی اور میں نے قسم توڑ دی۔ فرمایا: حضرت ابوبکر نے آپ کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان سب سے زیادہ نیکی کرنے والا اور بھلائی کرنے والا ہے''۔ راوی نے فرمایا: مجھے کفارہ کے متعلق خبر نہیں پہنچی۔

**مسئلہ نمبر 46**۔ اللہ کی قسم کے علاوہ میں کفارہ کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے اپنے مال کو صدقہ کرنے کی قسم اٹھائی تو وہ تہائی مال صدقہ کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر قسم کا کفارہ ہے یہی قول اسحاق اور ابو ثور کا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ شعبی، عطا اور طاؤس نے کہا: اس پر کوئی چیز نہیں ہے، رہا مکہ کی طرف چلنے کی قسم اٹھانا تو امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور ابو ثور کے نزدیک اسے قسم کا کفارہ کافی ہے۔ ابن مسیب اور قاسم بن محمد نے کہا: اس پر کچھ نہیں ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: مدینہ طیبہ اور دوسرے شہروں کے اکثر علماء مکہ کی طرف چل کر جانے کی قسم پر اللہ کی قسم کے کفارہ کی مثل کفارہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من قال کفارتھا ترکھا، حدیث نمبر 2100، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2849۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من قال کفارتھا ترکھا، حدیث نمبر 2101، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتے ہیں یہ صحابہ کرام، تابعین اور جمہور فقہاء کی جماعت کا قول ہے۔ ابن قاسم نے اپنے بیٹے عبدالصمد کو یہی فتوی دیا تھا اس نے ذکر کیا کہ یہ لیث بن سعد کا قول ہے۔ ابن القاسم سے مشہور قول یہ ہے کہ ان کے نزدیک مکہ کی طرف چل کر جانے کی قسم میں کفارہ نہیں ہے مگر اس پر جو چلنے پر قادر ہو یہی امام مالک کا قول ہے۔

رہا غلام آزاد کرنے کی قسم اٹھانے والا تو اس پر اس کا آزاد کرنا ہے جس کو آزاد کرنے کی قسم اٹھائی تھی یہ امام مالک، امام شافعی وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ وہ قسم کا کفارہ دے اس پر غلام آزاد کرنا لازم نہیں۔ عطا نے کہا: وہ کوئی چیز صدقہ کر دے۔ مہدوی نے کہا: معتمد علیہ علماء کا اجماع ہے کہ جس نے طلاق کی قسم اٹھائی اور اسے توڑ دیا تو طلاق لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 47**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاحْفَظُوْۤا اَیْمَانَكُمْ یعنی جب تم قسم توڑ دو تو کفارہ جو تم پر لازم ہے اس کو جلدی ادا کر کے اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: قسم کو ترک کرنے کے ساتھ قسموں کی حفاظت کرو، کیونکہ جب تم قسم نہیں اٹھاؤ گے تو تمہاری طرف یہ تکلیفات متوجہ نہ ہوں گے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ شکر کا معنی اور لعل کا معنی پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۞ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۞

"اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو بچو ان سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کریم کی اور محتاط رہو اور اگر تم نے روگردانی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کا فرض تو بس پہنچا دینا ہے کھول کر (ہمارے احکام کو)"۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا ان اشیاء کے ترک کے ساتھ مومنوں کو خطاب کیا ہے، کیونکہ ان شہوات اور عادات کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں ملوث تھے اور ان کے نفوس پر یہ غالب تھیں، پس بہت سے مومنوں کے نفوس میں کچھ باقی تھیں۔ ابن عطیہ نے کہا (1): اس قبیل سے تھا پرندوں کو دیکھ کر کام کو نہ جانا اور کتب وغیرہ سے فال لینا

1۔ المحرر الوجیز

اور اس طرح کی بیہودہ چیزیں جو آج کل جاہل لوگ کرتے ہیں، رہا خمر (شراب) ابھی تک یہ حرام نہیں کی گئی اس کی مکمل حرمت جنگ احد کے واقعہ کے بعد تیسرے سال نازل ہوئی اور جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال شوال میں ہوئی۔ اس کا اشتقاق پہلے گزر چکا ہے رہا المیسر (جوا) سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے، رہا الانصاب تو بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد بت ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نرد اور شطرنج کا کھیل ہے اس کا بیان سورہ یونس آیت 32 میں **فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ** کے تحت آئے گا۔

رہا الْاَزْلَامُ اس سے مراد تیر ہیں اس کے بارے میں پہلی سورت میں گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے: بیت اللہ شریف میں خدام اور بتوں کے خدام کے پاس تیر تھے کوئی شخص آتا جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا تو اس سے کوئی تیر نکالتا اگر اس پر لکھا ہوا ہوتا امرنی ربی (میرے رب نے مجھے حکم دیا) تو وہ کام کو چلا جاتا خواہ اسے پسند ہوتا یا ناپسند ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ شراب کی حرمت بتدریج ہوئی اور بہت سے واقعات کے ساتھ ہوئی، کیونکہ وہ لوگ شراب کے بہت حریص تھے اور سب سے پہلے شراب کے متعلق یہ نازل ہوا: **يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (بقرہ: 219) یعنی اس کی تجارت میں منافع ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے شراب کو ترک کر دیا اور انہوں نے کہا: جس میں بڑا گناہ ہے اس کی ہمیں ضرورت نہیں اور بعض لوگوں نے اس کو ترک نہ کیا انہوں نے کہا: ہم اس کی منفعت لیتے ہیں اور اس کا گناہ چھوڑتے ہیں پھر یہ آیت نازل ہوئی: **لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى** (النساء: 43) بعض لوگوں نے پھر اس کو چھوڑ دیا اور کہا: ہمیں اس کی حاجت نہیں جو ہمیں نماز سے غافل کر دے اور بعض نے نماز کے اوقات کے علاوہ شراب پی حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ**۔

پس لوگوں پر یہ مطلقاً حرام ہو گئی حتیٰ کہ بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ نے شراب سے زیادہ کسی چیز کو شدت سے حرام نہیں فرمایا۔ ابو میسرہ نے کہا: یہ حضرت عمر بن خطاب کے سبب نازل ہوئی انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شراب کے عیوب ذکر کیے اور شراب کی وجہ سے لوگوں پر کیفیات نازل ہوتی تھی اللہ تعالیٰ سے انہوں نے اس کی حرمت کی دعا مانگی اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا۔ اے اللہ! شراب کے بارے ہمارے لیے شافی بیان فرما، تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت عمر نے کہا: انتھینا انتھینا ہم رک گئے، ہم رک گئے (1)۔ سورۂ بقرہ میں اور سورۃ النساء میں یہ گزر چکا ہے۔

ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى** (النساء: 43) اس آیت کو سورۂ مائدہ کی آیت **اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ** نے منسوخ کر دیا (2)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے فرمایا: میرے متعلق قرآنی آیات نازل ہوئیں۔ اس میں فرمایا: میں انصار کے ایک گروہ کے پاس آیا، انہوں نے کہا: ادھر آؤ ہم تجھے کھانا کھلائیں گے اور شراب پلائیں گے۔ یہ شراب کے حرام ہونے سے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، حدیث نمبر 3185، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المائدۃ، حدیث 2975

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، حدیث نمبر 3187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہلے کی بات ہے۔ فرمایا: میں ان کے پاس ایک باغ میں آیا وہاں ایک اونٹ کا بھونا ہوا سر تھا اور شراب کا مٹکا تھا۔ فرمایا: میں نے ان کے ساتھ کھایا، پیا۔ فرمایا: میں نے ان کے پاس انصار اور مہاجرین کا ذکر کیا۔ میں نے کہا: مہاجرین، انصار سے افضل ہیں۔ فرمایا: ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے اٹھائے اور مجھے اس کے ساتھ مارا پس میرا ناک زخمی ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے: اس نے ناک چیر دیا، اور سعد کا ناک چیرا ہوا تھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سارا واقعہ عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں یعنی شراب کے بارے میں ان کا ذکر کیا۔ یہ ارشاد نازل ہوا: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ شراب پینا اس وقت مباح معمول اور معروف تھا نہ اس پر انکار کیا گیا اور نہ اسے بدلا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اسے قائم رکھا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس پر سورۃ النساء کی آیت دلالت کرتی ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء:43) جیسا کہ پہلے گزرا ہے کیا ان کے لیے اس مقدار کا پینا مباح تھا جو نشہ دیتی تھی؟ حضرت حمزہ کا واقعہ اس میں ظاہر ہے جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیوں کی کوکھیں چیر دی تھی اور ان کی کہانیں کاٹ دی تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا آپ حضرت حمزہ کے پاس آئے۔ حضرت حمزہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسا کلام صادر ہوا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام، توقیر اور اکرام کے مخالف تھا جو دلیل ہے کہ حضرت حمزہ کی عقل ختم ہو چکی تھی نشہ آور شراب پینے کی وجہ سے، اسی وجہ سے راوی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جان گئے کہ وہ نشہ میں دھت ہیں، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ پر انکار نہ کیا اور نہ ان پر سختی کی، نہ حالت نشہ میں اور نہ اس کے بعد بلکہ آپ الٹے پاؤں لوٹے اور باہر نکل آئے۔ جب حضرت حمزہ نے کہا: تم تو میرے باپ کے غلام ہو۔ یہ اس کے خلاف ہے جو اصولیوں نے کہا ہے اور جو انہوں نے بیان کیا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: ہر شریعت میں نشہ حرام تھا، کیونکہ شرائع بندوں کے مصالح ہوتی ہیں نہ کہ مفاسد ہوتی ہیں اور مصالح کی اصل عقل ہے جیسا کہ مفاسد کی اصل عقل کا ضائع ہونا ہے پس ہر وہ چیز جو عقل کو ضائع کر دے یا اس میں تشویش پیدا کر دے اس سے منع واجب ہے مگر یہ کہ حضرت حمزہ کی حدیث کو اس پر محمول کیا جائے کہ انہوں نے اس کے پینے سے نشہ کا قصد نہیں کیا تھا لیکن وہ جلدی اثر کر گئی اور ان کے دماغ پر غالب آ گئی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِجْسٌ حضرت ابن عباس نے اس آیت میں فرمایا: رجس سے مراد ناراضگی ہے، جب کہ بدبودار چیز پائخانہ اور غلاظت کو رجس کہا جاتا ہے الرجز زا کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عذاب ہے اور الرکس کا معنی غلاظت ہے اور الرجس کا لفظ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (1)۔ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ یعنی شیطان کے ابھارنے اور مزین کرنے کی وجہ سے۔ بعض نے فرمایا: وہ ان امور کے آغاز پر تو خود عمل کرتا ہے حتیٰ کہ پھر وہ ان میں شیطان کی اقتدا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاجْتَنِبُوْهُ یعنی اس سے دور ہٹ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ان امور سے دور رہنے کا حکم

1۔ المحرر الوجیز

دیا ہے اور امر کے صیغہ سے ذکر فرمایا نیز احادیث کی نصوص اور اجماع امت بھی ان کی حرمت پر موجود ہے پس تحریم کی جہت سے اجتناب ثابت ہوا، اس کے ساتھ شراب حرام کی گئی۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ سورۂ مائدہ شراب کی حرمت کے ساتھ نازل ہوئی۔ یہ مدینہ طیبہ میں سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ تحریم مردار، خون اور لحم الخنزیر میں نازل ہوئی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ (الانعام: 145) اور دوسری آیات میں تو وہ خبر کے انداز میں نازل ہوئی جب کہ شراب کی حرمت نہی اور زجر کے انداز میں نازل ہوئی یہ مؤکد تحریم ہے۔ حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے فرمایا: جب شراب کی تحریم نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک دوسرے کے پاس گئے اور کہا کہ شراب حرام کردی گئی ہے اور شرک کے برابر کی گئی ہے یعنی بتوں کے لیے ذبح کے ساتھ ملایا ہے اور وہ شرک ہے پھر لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ کو معلق کیا فلاح کو امر کے ساتھ معلق کیا یہ وجوب کی تاکید پر دلیل ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ شراب کی تحریم اور شرع کے اس کو خبیث سمجھنے اور اس پر رجس کا اطلاق کرنے اور اس سے اجتناب کا امر دینے سے جمہور علماء نے اس کی نجاست کا حکم سمجھا ہے اور اس میں جمہور علماء کی ربیعہ، لیث بن سعد اور مزنی، امام شافعی اور بعض بغدادی علماء اور قروی علماء متاخرین نے مخالفت کی ہے۔ یہ علماء کہتے ہیں: شراب پاک ہے۔ حرام صرف اس کا پینا ہے۔ سعید بن حداد قروی نے اس کی طہارت پر، مدینہ طیبہ کی گلیوں میں اس کے بہائے جانے پر استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں: اگر یہ ناپاک ہوتی تو صحابہ کرام اسے گلیوں میں نہ بہاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے منع فرماتے جس طرح کہ راستوں میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے ایسا اس لیے کیا تھا، کیونکہ ان کے لیے تہہ خانے اور کنویں نہیں تھے جن میں وہ شراب کو بہاتے، کیونکہ ان کے عام حالات ایسے ہی تھے کہ ان کی لیٹرینیں گھروں میں نہ تھیں، حضرت عائشہ نے فرمایا: وہ گھروں میں لیٹرینیں بنانا ناپسند کرتے تھے اور اس شراب کو مدینہ سے باہر لے جانے میں کلفت اور مشقت تھی نیز اس سے حکم پر فوراً عمل سے تاخیر لازم آتی اور اس سے بچنا ممکن بھی تھا، کیونکہ مدینہ طیبہ کے راستے وسیع تھے اور شراب بھی اتنی زیادہ نہ تھی کہ وہ نہر بن جاتی اور پورے راستہ کو گھیر لیتی بلکہ وہ تھوڑی جگہوں پر تھی جس سے بچاؤ ممکن تھا۔ نیز اس عمل میں اس کو بہانے کی شہرت کا فائدہ بھی موجود تھا تاکہ شراب کی حرمت اس کے تلف کرنے کے ساتھ پھیل جائے اور اس سے نفع حاصل نہ کیا جائے اور لوگ اس پر موافقت کریں۔ واللہ اعلم

اگر یہ کہا جائے کہ تنجیس (ناپاک قرار دینا) حکم شرعی ہے اور اس میں کوئی نص نہیں ہے اور کسی چیز کے حرام ہونے سے پہلے اس کا نجس (ناپاک ہونا) لازم نہیں آتا، شرع میں بہت سی حرام چیزیں ایسی ہیں جو نجس نہیں ہیں۔ ہم کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رِجْسٌ یہ شراب کی نجاست پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ لغت میں رجس کا معنی نجاست ہے پھر اگر ہم یہ التزام کریں کہ ہم کوئی حکم نہ لگائیں مگر جن میں کوئی نص پائیں تو شریعت معطل ہو جائے گی، کیونکہ شریعت میں نصوص کم ہیں، پس پیشاب، پاخانہ، خون، مردار وغیرہ کی نجاست پر کون سی نص موجود ہے؟ یہ ظواہر، عمومات اور قیاس ہیں مزید سورۃ الحج میں اس معنی کی

وضاحت آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاجْتَنِبُوْهُ یہ مطلق اجتناب پر دلالت کرتا ہے کہ کسی اعتبار سے بھی اس سے نفع نہ اٹھایا جائے نہ پینے کا نہ بیچنے کا، نہ سرکہ بنانے کا، نہ علاج کا، نہ کوئی اور۔ اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں، مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو ایک مشکیزہ شراب کا تحفہ دیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: ''کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''نہیں'' حضرت ابن عباس نے فرمایا: پھر اس نے ایک شخص سے سرگوشی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''تو نے اس سے کیا سرگوشی کی ہے'' اس نے کہا: میں نے اسے بیچنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس ذات نے اس کا پینا حرام کیا ہے اس نے اس کا بیچنا بھی حرام کیا ہے''۔ فرمایا: اس نے اپنا منہ کھول دیا حتیٰ کہ ساری شراب نکل گئی (1) یہ ہمارے بیان پر دلیل ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی جائز منفعت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کو بیان فرما دیتے جیسا کہ مردار بکری کے بارے فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں نہیں اتاری اور پھر اسے دباغت کیوں نہیں کیا اور پھر اس سے نفع کیوں نہیں اٹھایا؟ (2)

**مسئلہ نمبر 8**۔ خون اور شراب کی بیع کی تحریم پر مسلمانوں کا اجماع ہے اس میں غلاظت اور تمام نجاسات اور ان تمام چیزوں کی بیع کی حرمت پر دلیل ہے جن کا کھانا حلال نہیں ہے اسی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ امام مالک کے نزدیک چوپاؤں کا گوبر بیچنا مکروہ ہے۔ اور ابن القاسم نے اس میں رخصت دی ہے، کیونکہ اس میں منفعت ہے قیاس وہ ہے جو امام مالک نے کہا ہے، یہی امام شافعی کا مذہب ہے یہ حدیث اس کی صحت پر شاہد ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ کسی کے لیے شراب کو سرکہ بنانا جائز نہیں اگر سرکہ بنانا جائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس شخص کو مشکیزہ کا منہ کھولنے نہ دیتے تاکہ اس میں جو کچھ ہے نکل نہ جائے، کیونکہ سرکہ مال ہے اور نبی کریم ﷺ نے مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے اور کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جس نے کسی مسلمان کی شراب ضائع کر دی تو اس نے مال ضائع کر دیا۔

حضرت عثمان بن ابی العاص نے یتیم کی شراب بہا دی تھی آپ ﷺ سے اسے سرکہ بنانے کی اجازت طلب کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں''۔ آپ نے سرکہ بنانے سے منع فرمایا۔ اہل حدیث اور اہل الرائے کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے اور سحنون بن سعید کا میلان بھی اسی طرف ہے، دوسرے علماء نے کہا: شراب کو سرکہ بنانے میں کوئی حرج نہیں انسان کے عمل سے جو سرکہ بن گئی اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد اور کوفیوں کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اگر شراب میں کستوری اور نمک ڈالی گئی پھر وہ مربیٰ بن گیا اور شراب کی حالت سے بدل گئی تو جائز ہے۔

امام محمد بن حسن نے امام ابو حنیفہ کی ''المربیٰ'' میں مخالفت کی ہے فرمایا: ہر کہ میں تبدیل کیے بغیر اس سے علاج بھی نہیں کیا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا: عراقیوں نے شراب کو سرکہ بنانے میں حضرت ابو درداء کے قول سے حجت پکڑی ہے وہ قول ابو ادریس

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2041
2۔ ایضاً، حدیث 2369

خولانی عن ابی الدرداء کے واسطہ سے مروی ہے اور وہ قوی نہیں ہے۔ حضرت ابو درداء شراب کا مربّی کھاتے تھے وہ کہتے تھے: سورج اور نمک نے اس کی دباغت کی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عثمان بن ابی العاص نے شراب کو سرکہ بنانے کے مسئلہ میں ان کی مخالفت کی ہے اور سنت کے ہوتے ہوئے کسی کی رائے میں حجت نہیں ہے۔ (و باللہ التوفیق)

یہ بھی احتمال ہے کہ سرکہ بنانے سے منع ابتداء اسلام میں ہو جب اس کی تحریم نازل ہوئی تھی تا کہ اسے ہمیشہ روکے نہ رکھیں، کیونکہ اس کے پینے کا زمانہ قریب تھا اس سے قطعی طور پر ان کے ارادہ میں عادت کو ختم کرنا تھا جب صورت حال اس طرح ہے تو اس کو سرکہ بنانے کے متعلق نہی میں اور اس کو بہانے کے حکم میں یہ نہ تھا کہ اس کا کھانا ممنوع ہے جب سرکہ بن جائے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: جب نصرانی شراب کو سرکہ بنادے تو اس کو کھانے میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح ہے اگر مسلمان اسے سرکہ بنادے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ اس روایت کو ابن عبد الحکم نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام مالک نے ابن القاسم اور ابن وہب کی روایت میں ذکر کیا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے شراب سے علاج کرنا صحیح نہیں حتیٰ کہ وہ اسے سرکہ بنادے اور اسے بیچنا بھی جائز نہیں بلکہ وہ اسے انڈیل دے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول مختلف نہیں کہ جب شراب خود بخود سرکہ بن جائے تو اس کا کھانا حلال ہے یہی حضرت عمر بن خطاب، قبیصہ، ابن شہاب اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔ یہ اکثر فقہاء کے مذہب کا ماحاصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ شراب کی ملکیت ہوگی اور انہوں نے اس کو اس طرف لوٹایا ہے کہ اس سے گلہ کے پھندے کو دور کیا جائے گا اور اس سے آگ بجھائی جائے گی۔ یہ نقل امام مالک سے معروف نہیں بلکہ یہ تو اس کے قول پر ہے جو اس کو پاک خیال کرتا ہے، اگر اس کی ملکیت جائز ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بہانے کا حکم نہ دیتے، نیز ملکیت نفع کی ایک صورت ہے اور اس کو بہانے کے ساتھ وہ نفع باطل ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ یہ آیت دلیل ہے کہ نرد اور شطرنج بطور جوا کھیلنا یا جوا کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب شراب کو حرام کیا تو اس معنی کی خبر دی جو اس میں تھا فرمایا: **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ** پھر فرمایا: **اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ** اور ہر وہ کھیل جس کا قلیل کثیر کی طرف دعوت دے اور وہ کھیلنے والوں کے درمیان عداوت اور بغض کو پیدا کرے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکے وہ شراب پینے کی طرح ہے اور اس کی مثل حرام ہونا ثابت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شراب پینا تو نشہ کا باعث بنتا ہے انسان اسکے ساتھ نماز پر قادر نہیں ہوتا جب کہ نرد اور شطرنج میں یہ معنی نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرمت میں شراب اور جوئے کو جمع کیا ہے اور دونوں کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ یہ دونوں لوگوں کے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرتے ہیں اور اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ شراب اگر نشہ دیتی ہے تو جوا نشہ نہیں دیتا پھر اللہ کے نزدیک ان میں افتراق نہیں ہے جو تحریم میں ان کے درمیان برابری سے مانع ہو، کیونکہ دونوں معانی کے اعتبار سے مشترک ہیں نیز شراب کا قلیل، نشہ نہیں دیتا جس طرح نرد اور شطرنج کا کھیل نشہ نہیں دیتا پھر بھی شراب کا قلیل، کثیر کی طرح حرام ہے کوئی انکار نہیں کیا جاتا کہ نرد اور شطرنج شراب کی طرح حرام ہیں اگرچہ نشہ نہیں

دیتی نیز کھیل کا آغاز غفلت کا موجب ہے اور وہ غفلت جو دل پر غالب آتی ہے وہ نشہ کی جگہ ہوتی ہے۔ اگر شراب حرام کی گئی ہے، کیونکہ یہ نشہ دیتی ہے اور نشہ کی وجہ سے نماز سے روکتی ہے پس نرد اور شطرنج کا کھیل بھی حرام ہونا چاہیے، کیونکہ وہ بھی غافل کرتا ہے اور نماز سے روکتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ یہ روایت دلیل ہے کہ اسے ناسخ نہیں پہنچی وہ سابقہ اباحت سے استدلال کرنے والا تھا پس یہ دلیل ہے کہ ناسخ کے وجود کے ساتھ حکم نہیں اٹھتا جیسا کہ بعض اصولیوں نے کہا ہے بلکہ ناسخ کے پہنچنے کے ساتھ حکم اٹھتا ہے جیسا کہ اس پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے یہ صحیح ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے توبیخ نہیں فرمائی بلکہ اس کے لیے حکم بیان فرمایا، کیونکہ وہ پہلے عمل کے ساتھ مخاطب تھا اگر اسے ترک کرتا تو بلا اختلاف نافرمانی کرنے والا ہوتا، اگرچہ ناسخ وجود میں پایا بھی گیا تھا اس طرح اہل قبا کے لیے واقع ہوا تھا جب وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور انہیں ناسخ کے بارے بتایا تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے والحمدللہ۔ اس میں الخمر (شراب) اور اس کے اشتقاق اور میسر کا ذکر گزر چکا ہے انصاب اور ازلام کے بارے اس سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو آگاہ فرمایا کہ شیطان ہمارے درمیان شراب کے ذریعے عداوت اور بغض پیدا کرنا چاہتا ہے، پس اسی نے ہمیں اس سے محتاط رہنے کا حکم دیا اور ہمیں اس سے منع فرمایا۔ روایت ہے کہ انصار کے دو قبیلوں نے شراب پی اور بعض نے بعض سے مزاق کیا جب وہ ہوش میں آئے تو بعض نے اس کے آثار دیکھے جو دوسروں نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ آپس میں بھائی بھائی تھے اور دلوں میں کسی قسم کا بغض نہ تھا تو بعض کہنے لگے: اگر میرا بھائی مجھ پر رحم کرنے والا ہوتا تو میرے ساتھ ایسا نہ کرتا پس اس طرح ان کے درمیان کینہ اور بغض پیدا ہو گیا پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ، الایۃ۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فرمایا: جب تم نشہ میں ہو جاؤ گے تو تم اللہ کا ذکر نہ کرو گے اور نہ نماز پڑھو گے اگر تم نماز پڑھو گے تو تم پر خلط ملط کر دے گا جس طرح اس نے حضرت علی کے ساتھ کیا، یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ کیا ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں گزرا ہے۔ حضرت عبیداللہ بن عمر نے فرمایا: قاسم بن محمد سے شطرنج کے بارے پوچھا گیا کہ کیا یہ جوا ہے اور نرد کے بارے پوچھا گیا کہ کیا یہ جوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہر وہ کھیل جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روک دے وہ میسر ہے۔ ابو عبید نے کہا: انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ، الایۃ۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جان لیا کہ یہ وعید، اِنْتَهُوْا کے معنی پر شدید ہے، تو حضرت عمر نے کہا: ہم شراب سے رک گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی کو حکم دیا کہ گلیوں میں اعلان کر دیں کہ خبردار شراب حرام کی گئی، پس مٹکے ٹوٹ گئے اور شراب بہا دی گئی حتیٰ کہ وہ مدینہ کی گلیوں میں بہہ رہی تھی۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا تحریم تاکید ہے اور وعید میں شدت ہے اور حکم کی پیروی ہے، منہی عنہ سے روکنا ہے۔ وَ اَطِیْعُوا پر عطف اچھا ہے، کیونکہ پہلی کلام میں اِنْتَهُوْا کے معنی کی تاکید ہے اور تاکید کے لیے اَطِیْعُوا کو ذکر رسول میں مکرر کیا ہے اور مخالفت سے ڈرایا ہے اور آخرت کے عذاب کی دھمکی دی ہے۔ فرمایا: اگر تم نے مخالفت کی اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۹۲﴾ یعنی ہمارے ذمہ تو اس تحریم کا پہنچانا ہے اور رسول پر اعمال خیر یا شر کا انجام بیان کرنا ہے۔(1)

لَیْسَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

''نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ جو (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے جب کہ وہ پہلے بھی ڈرتے تھے اور ایمان رکھتے تھے اور نیک عمل کیا کرتے تھے، پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور (جو اترا) اس پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور اللہ محبت کرتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس، حضرت براء بن عازب اور حضرت انس بن مالک نے کہا: جب شراب کی تحریم نازل ہوئی تو بعض صحابہ نے کہا: جو لوگ ہمارے فوت ہو چکے ہیں جب کہ وہ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے ان کا کیا ہوگا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرمایا: میں ابوطلحہ کے گھر میں لوگوں کو شراب پلا رہا تھا تو شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ندا کرنے والے کو ندا کرنے کا حکم دیا۔ ابوطلحہ نے کہا: باہر نکلو اور دیکھو کہ یہ آواز کیسی ہے؟ فرمایا: میں نکلا تو میں نے کہا: یہ منادی ندا کر رہا ہے کہ شراب حرام ہو گئی ہے۔ ابوطلحہ نے کہا: تم جاؤ اور اس شراب کو بہا دو، اس وقت شراب الفضیخ (وہ شراب جو کچی کھجور سے بنائی جاتی ہے) تھی، فرمایا: شراب مدینہ کی گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ بعض لوگوں نے کہا: ایک قوم شہید ہو گئی جب کہ ان کے پیٹوں میں شراب تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَیْسَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ الخ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اور یہ حدیث ان کے اس سوال کی مثل ہے جو انہوں نے پہلے قبلہ پر مرنے والوں کے متعلق کیا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ (بقرہ:143)(3) جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لیے مباح ہو حتیٰ کہ وہ اسی فعل کو کرتے ہوئے مرجائے تو اس پر کوئی گرفت اور گناہ نہیں اور نہ کوئی مواخذہ اور مذمت ہے، نہ اجر ہے، نہ مدح، کیونکہ مباح، شرع کی نسبت سے دونوں طرفوں میں برابر ہوتا ہے اس بنا پر مناسب ہے کہ خوف نہ کیا جائے اور جو مر چکا ہے اس کی حالت کے بارے میں سوال نہ کیا جائے جب کہ شراب اس کے پیٹ میں تھی جب کہ وہ مباح تھی۔ اور جس

1۔ المحرر الوجیز
2۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ المائدہ، حدیث نمبر 2976، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز

نے ایسا کہا ہے وہ اباحت کی دلیل سے غافل ہوا اور اس کو کوئی خطرہ نہیں یا اللہ تعالیٰ کے خوف کے غلبہ اور اپنے مومن بھائیوں پر شفقت کی وجہ سے مواخذہ اور سزا کا خیال اسے آیا، کیونکہ انہوں نے پہلے شراب پی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ وہم دور فرما دیا فرمایا: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت کے نزول میں یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ نبیذ التمر جب نشہ دے تو وہ خمر ہے۔ یہ نص ہے اس پر اعتراض جائز نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اہل زبان تھے اور انہوں نے سمجھا کہ یہ شراب ہے، کیونکہ اس وقت مدینہ طیبہ میں اور کوئی شراب نہ تھی۔ حکمی نے کہا:

لنا خمرٌ وليست خمر كَرْمٍ ولكن مِن نِتاجِ الباسقاتِ

كِرامٌ في السماءِ ذهبن طُولًا وفات ثِمارها أيدِي الجناةِ

اس پر واضح دلیل نسائی کی روایت ہے، ہمیں قاسم بن زکریا نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں عبید اللہ نے بتایا انہوں نے شیبان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے محارب بن دثار سے انہوں نے حضرت جابر سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا فرمایا: ”کشمش اور کھجور خمر (شراب) ہے“ اور عقل صحیح سے ثابت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب، ان کا لغت اور شرع کا عالم ہونا تجھے کافی ہے، نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر خطبہ دیا: اے لوگو! خبردار شراب کی حرمت نازل ہوئی۔ جب نازل ہوئی یہ پانچ چیزوں سے بنائی جاتی تھی انگور سے، کھجور سے، شہد سے، گندم سے اور جو سے اور خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ دے یہ شراب کے معنی میں واضح ہے۔ حضرت عمر نے صحابہ کرام کی موجودگی میں منبر پر شراب کے بارے خطبہ دیا وہ اہل زبان تھے اور انہوں نے خمر سے نہ سمجھا مگر وہ جو ہم نے ذکر کیا۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو امام ابو حنیفہ اور کوفیوں کا مذہب باطل ہو گیا کہ خمر صرف انگور سے ہوتی ہے (☆) اور جو انگور کے علاوہ کسی چیز سے ہو تو اسے خمر نہیں کہا جاتا اور اسے خمر کا اسم شامل نہیں اسے نبیذ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تركتُ النَّبِيذ لأهل النبيذِ وصِرتُ حَلِيفًا لِمن عابَه

شرابٌ يُدنِّس عِرضَ الفتَى ويفتحُ للشرِّ أبوابَه

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام ابو عبد اللہ مازری نے کہا: جمہور سلف کا مذہب یہ ہے کہ جو نوع نشہ دے اس کا پینا حرام ہے خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، وہ شراب کچی ہو یا پکائی گئی ہو کوئی فرق نہیں، انگور سے نکالی گئی ہو یا کسی دوسری چیز سے نکالی گئی ہے۔ جس نے شراب میں سے کچھ پیا اسے شراب کی حد لگائی جائے گی اور جو انگور سے نکالی جائے گی جو کچی اور نشہ آور ہوتی ہے اس کی حرمت پر اجماع ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر ہو اگرچہ ایک قطرہ بھی ہو۔ اور اس کے علاوہ جو شرابیں ہیں جمہور اس کی تحریم کا قول کرتے ہیں اور کوفی علماء خمر کے علاوہ قلیل شراب میں اختلاف کرتے ہیں اور اس سے مراد وہ ہے جو نشہ نہیں دیتی۔ اور جو

☆ امام اعظم ابو حنیفہ کا کہنا ہے خمر کا لفظ انگور کے ایسے رس جو پڑا پڑا جوش مارنے لگے اور گاڑھا ہو جائے اس میں حقیقت ہے اور دوسروں میں مجاز ہے اس لیے یہ اظہار محل نظر ہے۔

شراب انگور سے پکا کر بنائی جاتی ہے اہل بصرہ کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حرمت انگور کے شیرہ پر اور کچی کشمش کی شراب پر منحصر ہے جو ان دونوں سے پکائی گئی ہو اور ان کے علاوہ کچی اور پکی حلال ہے جب تک کہ وہ نشہ نہ دے۔ امام ابوحنیفہ تحریم کو اس سے خاص کرتے ہیں جو کھجور اور انگور کے پھلوں کا نچوڑ ہو۔ اس میں ان کی تفصیل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انگور کی شراب قلیل ہو یا کثیر وہ حرام ہے مگر اسے اتنا پکایا جائے کہ ایک تہائی باقی رہ جائے۔ اور کشمش اور کھجور کی شراب اس کو پکایا گیا ہو تو حلال ہے اگرچہ اس کو آگ نے تھوڑا سا بھی چھوا ہو اور ان کی کچی شراب وہ حرام ہے لیکن اس کی حرمت کے باوجود اس پر حد ثابت نہیں ہوتی یہ اسی صورت میں ہے جب کہ نشہ نہ دے، اگر نشہ دے تو تمام برابر ہیں۔

ہمارے شیخ فقیہ امام ابوالعباس احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس مسئلہ میں مخالفت کرنے والوں پر تعجب ہے۔ وہ کہتے ہیں: شراب جو انگور کے شیرہ سے بنائی گئی ہو وہ تھوڑی بھی زیادہ کی طرح حرام ہے، اس پر اجماع ہے۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خمر میں قلیل کیوں حرام ہے وہ تو عقل کو ضائع کرنے والی نہیں ہے؟ پس یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ زیادہ کی طرف دعوت دینے والی ہے یا یہ تعبد و تکلف کی بنا پر ہے۔ اس وقت انہیں کہا جائے گا: جو تم نے قلیل خمر میں مقدر کیا ہے وہی بعینہٖ قلیل نبیذ میں موجود ہے پس وہ بھی حرام ہو، کیونکہ ان دونوں کے درمیان صرف نام کا ہی فرق ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے یہ قیاس، قیاس کی انواع میں سے بلند ترین قسم ہے، کیونکہ اس میں فرع تمام اوصاف میں اصل کے مساوی ہے یہ اس طرح ہے جیسے غلام پر لونڈی کو قیاس کیا جاتا ہے آزادی کی سرایت میں پھر تعجب تو امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب پر ہے وہ قیاس میں غلو کرتے ہیں اور وہ قیاس کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں، اس کے باوجود انہوں نے اس قیاس جلی کو ترک کر دیا جس کی تائید کتاب و سنت اور امت کے ابتدائی علماء کے اجماع سے ہوتی ہے اور احناف نے یہ قیاس کا ترک ان احادیث کی وجہ سے کیا جن میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے جب کہ علماء نے اپنی اپنی کتب میں ان کی علتیں بیان کی ہیں اور ان احادیث میں سے کوئی بھی صحیح میں نہیں ہے۔ مزید تفصیل سورۃ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **طَعِمُوٓا** اس لفظ کی اصل کھانے کے بارے میں ہے طَعِمَ الطَّعام اور شَرِبَ الشَّراب کہا جاتا ہے لیکن مجازاً اس میں کہا جاتا ہے: لم اطعم خبزاً ولا ماء ولا نومًا۔ شاعر نے کہا:

نَعَامًا بِوَجْرَة صُعْر الخُدو　دِ لا تَطْعَمُ النوم الا صیاماً

سورۂ بقرہ میں **وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ** (بقرہ: 249) کے تحت گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت مباح اور شہوت کو اور کھانے، پینے اور نکاح کرنے کی ہر لذت سے نفع حاصل کرنے کو شامل ہے اگرچہ ان میں مبالغہ کیا گیا ہو اور انتہائی مہنگی ہوں یہ آیت اس ارشاد: **لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ** اور **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ** (الاعراف: 32) کی مثل ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ** ﴿۹۳﴾ اس میں چار اقوال ہیں: (۱) تقویٰ کے ذکر میں تکرار نہیں ہے اس کا معنی ہے شراب کے

پینے سے بچو اور اس کی تحریم پر ایمان لے آؤ۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کا تقویٰ اور ایمان ہمیشہ اور دائمی ہے۔ تیسرا یہ کہ احسان کے معنی پر تقویٰ ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے شراب کی حرمت سے پہلے دوسری محرمات سے تقویٰ اختیار کیا پھر اس کی تحریم کے بعد اس کے پینے سے تقویٰ اختیار کیا پھر باقی اعمال میں بھی تقویٰ اختیار کیا اور عمل بہت عمدہ کیا۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ وہ شرک سے بچے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے دوسرا معنی یہ کہ وہ کبائر سے بچے اور ایمان کو زیادہ کیا اور تیسرا معنی یہ کہ پھر وہ صغائر سے بچے اور نفلی کام کیے۔ محمد بن جریر نے کہا: پہلے تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کے حکم کو قبول کرنا اور اس کی تصدیق کرنا اور اس کو دین سمجھ کر اس پر عمل کرنا، دوسرے تقویٰ سے مراد تصدیق پر ثابت و قائم رہنا، تیسرے تقویٰ سے مراد احسان کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنا اور نوافل کے ساتھ قرب حاصل کرنا۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یہ دلیل ہے کہ متقی محسن اس متقی مومن سے افضل ہے جو عمل صالح کرتا ہے اور اس کی فضیلت احسان کے اجر کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** اس آیت کی حضرت قدامہ بن مظعون نے تاویل کی جو صحابہ کرام میں سے تھے جنہوں نے اپنے بھائی حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ کے ساتھ حبشہ کے علاقہ کی طرف ہجرت کی تھی، پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی، جنگ بدر میں شرکت کی تھی اور حضرت عمر بن خطاب کے سسر تھے۔ حضرت عبداللہ اور حضرت حفصہ کے ماموں تھے۔ حضرت عمر بن خطاب نے انہیں بحرین کا والی بنایا تھا پھر جارود کی شہادت پر انہیں معزول کر دیا تھا، جارود عبدالقیس کا سردار تھا۔ انہوں نے حضرت قدامہ کے خلاف شراب پینے کی گواہی دی تھی۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں ابوالحسن علی بن محمد مصری نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں یحییٰ بن ایوب علاف نے بتایا انہوں نے کہا مجھے سعید بن عفیر نے بتایا انہوں نے کہا مجھے فلیح بن سلیمان نے بتایا انہوں نے کہا مجھے ثور بن زید نے بتایا انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ شراب پینے والوں کو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہاتھوں، جوتوں اور لاٹھیوں کے ساتھ مارا جاتا تھا، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ لوگ زیادہ تھے حضرت ابوبکر انہیں چالیس کوڑے لگاتے تھے حتیٰ کہ وہ فوت ہو گئے ان کے بعد حضرت عمر بھی شرابیوں کو چالیس کوڑے لگاتے تھے حتیٰ کہ مہاجرین اولین میں سے ایک شخص لایا گیا جس نے شراب پی تھی حضرت عمر نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اس شخص نے کہا: تو مجھے کیوں کوڑے لگاتا ہے میرے اور تیرے درمیان کتاب اللہ ہے؟ حضرت عمر نے کہا: کون سی کتاب اللہ میں ہے کہ میں تجھے کوڑے نہ لگاؤں؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا اور میں ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں سے ہوں پھر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے پھر تقویٰ اختیار کیا اور اچھے اعمال کیے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ بدر، احد، خندق اور دوسری تمام جنگوں میں حاضر ہوا۔ حضرت عمر نے کہا: کیا تم اس کا رد نہیں کرتے جو یہ کہہ رہا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں اتریں جو گزر چکے ہیں اور یہ

لوگوں پر حجت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ الخ پھر مکمل آیت پڑھی اگر یہ ان لوگوں میں سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے شراب پینے سے منع کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: تم نے سچ کہا ہے تم کیا کہتے ہو؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب شراب پیے گا تو نشہ میں ہوگا جب نشہ میں ہوگا تو ہذیان بکے گا جب ہذیان بکے گا تو افترا باندھے گا اور جھوٹا الزام لگانے والے پر اسی کوڑے ہیں۔ حضرت عمر نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا تو اسے کوڑے لگائے گئے(1)۔

حمیدی نے ابوبکر برقانی سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: جب جارود بحرین سے آیا تو کہا: اے امیر المومنین! قدامہ بن مظعون نے نشہ دینے والی شراب پی ہے میں جب اللہ کے حق میں سے کوئی دیکھوں تو مجھ پر حق ہے کہ میں وہ تم تک پہنچاؤں۔ حضرت عمر نے کہا: جو تم کہہ رہے ہو اس پر گواہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر نے حضرت ابوہریرہ کو بلایا، پوچھا: اے ابوہریرہ کیسے گواہی دیتے ہو؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا: میں نے اسے شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے اسے نشہ میں قے کرتے ہوئے دیکھا۔ حضرت عمر نے کہا: تم شہادت میں گہرے ہو، پھر حضرت عمر نے قدامہ کو خط لکھا وہ بحرین میں تھے اسے حاضر ہونے کا حکم دیا جب قدامہ آیا تو جارود مدینہ میں تھا۔ حضرت عمر نے جارود سے بات کی فرمایا: اس پر کتاب اللہ کو قائم کر۔ حضرت عمر نے جارود سے کہا: تو گواہ ہے یا خصم ہے۔ جارود نے کہا: میں گواہ ہوں۔ حضرت عمر نے کہا: تو نے گواہی ادا کر دی پھر اس نے حضرت عمر سے کہا: میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ حضرت عمر نے کہا: تو اپنی زبان کو سنبھال ورنہ میں تجھے سخت سزا دوں گا۔ جارود نے کہا: اللہ کی قسم! یہ حق نہیں ہے کہ تیرے چچا کا بیٹا شراب پیے اور تو مجھے اذیت دے۔ حضرت عمر نے اسے دھمکایا تو حضرت ابوہریرہ نے کہا: جو بیٹھے ہوئے تھے اے امیر المومنین اگر تجھے ہماری گواہی پر شک ہے تو ابن مظعون کی بیوی ولید کی بیٹی سے پوچھ، حضرت عمر نے ہند کو بلایا اور اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر پوچھا، ہند نے اپنے خاوند کے خلاف شہادت دی۔ حضرت عمر نے کہا: اے قدامہ میں تجھے کوڑے لگاؤں گا۔ قدامہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر میں نے شراب پی ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں، تو اے عمر پھر بھی تم مجھے کوڑے نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں؟ اس نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَیْسَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۟

حضرت عمر نے کہا: اے قدامہ تو نے غلط تاویل کی ہے جب تو اللہ سے ڈرتا ہے تو اس سے اجتناب کر جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، پھر حضرت عمر قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: تم قدامہ کے کوڑوں میں کیا رائے رکھتے ہو؟ قوم نے کہا: ہمارا خیال ہے تم اسے کوڑے نہ لگاؤ جب تک وہ مریض ہے۔ حضرت عمر اس کو کوڑے لگانے سے خاموش ہو گئے، پھر ایک دن صبح اپنے ساتھیوں سے کہا: تمہاری قدامہ کے کوڑوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ قوم نے کہا: ہم نہیں دیکھتے کہ تم اسے کوڑے لگاؤ جب تک وہ مریض ہے۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! اس کا اللہ تعالیٰ سے کوڑے کے تحت ملاقات کرنا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اللہ سے ملوں جب کہ وہ میری گردن میں ہو؟ اللہ کی قسم! میں اسے کوڑے لگاؤں گا تم میرے پاس کوڑا لے آؤ، ان کا غلام اسلم

1۔ سنن دارقطنی، حدیث نمبر 3344

ایک چھوٹا سا نرم کوڑا لے آیا۔ حضرت عمر نے اسے پکڑا اس پر ہاتھ پھیرا پھر اسلم سے کہا: میں نے تجھے تیری قوم کی بری عادتوں پر پایا ہے، تم میرے پاس کوئی اور کوڑا لاؤ پھر اسلم ایک مکمل کوڑا لایا، حضرت عمر نے قدامہ کو کوڑے لگانے کا حکم دیا قدامہ حضرت عمر پر ناراض ہوا اور اسے چھوڑ دیا گیا پھر دونوں نے حج کیا، قدامہ حضرت عمر کو چھوڑے رہا حتیٰ کہ اپنے حج سے واپس آ گئے۔

حضرت عمر سقیا کے مقام پر اترے اور وہاں سو گئے جب حضرت عمر اٹھے تو کہا: قدامہ کو میرے پاس جلدی لاؤ، جاؤ اور اسے میرے پاس لے آؤ اللہ کی قسم! میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس کوئی آیا اور کہا: قدامہ سے صلح کرو وہ تمہارا بھائی ہے جب لوگ قدامہ کے پاس آئے تو اس نے آنے سے انکار کیا حضرت عمر نے قدامہ کو کھینچ کر لانے کا حکم دیا، حضرت عمر نے اس سے کلام کی اور اس کے لیے استغفار کیا یہ ان کی پہلی صلح تھی۔

ایوب ابن ابی تیمیہ نے کہا: اہل بدر میں سے ان کے علاوہ کسی کو شراب کی وجہ سے حد نہیں لگی۔ ابن عربی نے کہا: یہ آیت کی تاویل پر تیری راہنمائی کرتا ہے اور حضرت ابن عباس سے دارقطنی میں روایت کیا گیا ہے اور حضرت عمر سے برقانی کی حدیث میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صحیح ہے۔ اس نے اس کو وسیع کیا کہ اگر جو شراب پیتا اور دوسرے احکام میں اللہ سے ڈرتا تو پھر شراب پر کسی کو حد نہ لگائی جاتی۔ یہ غلط تاویل ہے قدامہ پر مخفی رہی اور انہوں نے اس کو پہچان لیا جن کو اللہ نے توفیق دی جیسے حضرت عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ شاعر نے کہا:

وإن حراما لا أرى الدهر باكيا     على شَجْوِه إلّا بكيتُ على عُمر

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شام میں ایک قوم نے شراب پی اور انہوں نے کہا: ہمارے لیے یہ حلال ہے اور انہوں نے اس آیت کی تاویل کی، حضرت علی اور حضرت عمر نے اجماع کیا کہ ان سے توبہ طلب کی جائے اگر وہ توبہ کر لیں تو فبہا ورنہ وہ قتل کیے جائیں۔ الکیا طبری نے یہ ذکر کیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

''اے ایمان والو ضرور آزمائے گا تمہیں اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ شکار سے پہنچ سکتے ہیں جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے تاکہ پہچان کرا دے اللہ تعالیٰ اس کی جو ڈرتا ہے اس سے بن دیکھے پس جو شخص حد سے بڑھے گا اس (تنبیہ) کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور آزمائے گا۔ ابتلا کا معنی آزمانا ہے، شکار عرب عاربہ کی معیشت کے ذرائع میں سے ایک تھا اور یہ تمام کے نزدیک عام تھا اور مستعمل تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے متعلق احرام اور حرم کے ساتھ آزمایا جس طرح بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن کے احکام میں حد سے تجاوز نہ کرنے میں آزمایا تھا (1)۔ بعض

1۔ المحرر الوجیز

علماء نے فرمایا: یہ حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ بعض لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ احرام باندھا ہوا تھا اور بعض نے نہیں باندھا ہوا تھا جب کوئی شکار سامنے آتا تو اس میں ان کے احوال اور افعال مختلف ہوتے اور ان پر اس کے احکام مشتبہ ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے احوال اور افعال کے احکام اور ان کے حج اور عمرہ کی ممنوعات کے بیان میں یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** علماء کے دو مختلف قول ہیں کہ اس آیت کے مخاطب کون ہیں (۱) وہ احرام نہ باندھنے والے لوگ ہیں یہ امام مالک کا قول ہے (۲) اس سے مراد احرام باندھنے والے لوگ ہیں یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور اس کا تعلق لَيَبْلُوَنَّكُمُ کے ساتھ ہے، کیونکہ امتناع کی تکلیف جس کے ساتھ ابتلا متحقق ہوتا ہے وہ احرام کے ساتھ ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ لازم نہیں کیونکہ تکلیف احرام نہ باندھنے والے میں بھی متحقق ہوتی ہے کہ اس کے لیے شکار کے امور میں سے شرط رکھی گئی ہے اور شکار کرنے کی کیفیت جو اس کے لیے مشروع کی گئی ہے، صحیح یہ ہے کہ آیت میں خطاب تمام لوگوں کو ہے جو احرام باندھے ہوئے نہ تھے اور جو احرام باندھے ہوئے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی وہ تمہیں مکلف بنائے گا اور تکلیف ابتداءً آزمائش ہوتی ہے اگرچہ کثرت وقلت میں فرق ہوتا ہے اور ضعف اور شدت میں تباین ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ مراد بعض شکار ہے اور من بعضیۃ ہے اس سے خاص خشکی کا شکار مراد ہے تمام شکار کو یہ حکم شامل نہیں، کیونکہ دریا کے لیے بھی شکار ہوتا ہے یہ طبری کا قول ہے اور الصید سے مراد المصید (جس کو شکار کیا جائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ یہ چھوٹے بڑے شکار کے حکم کا بیان ہے (2)۔ ابن وثاب اور نخعی نے ینالہ یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجاہد نے کہا: تمہارے ہاتھ ان کے بچوں، انڈوں اور ایسے شکار تک پہنچتے ہیں جو بھاگ نہیں سکتے اور تمہارے نیزے بڑے شکار تک پہنچتے ہیں۔ ابن وہب نے کہا: مالک نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ ہر وہ چیز جس تک انسان کا ہاتھ، نیزہ یا کوئی اور ہتھیار پہنچتا ہے پھر وہ اسے قتل کر دیتا ہے تو وہ شکار ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ نے خصوصاً ہاتھوں کا ذکر فرمایا، کیونکہ شکار کرنے میں ہاتھ کا زیادہ تصرف ہوتا ہے اور اس میں شکاری کتے اور رسیاں اور ہاتھ سے بنائے گئے جال وغیرہ داخل ہیں خصوصی طور پر نیزوں کا ذکر کیا، کیونکہ ان کے ساتھ شکار کو زخمی کیا جاتا ہے اس میں تیر وغیرہ بھی داخل ہیں (3)۔ شکاری کتے اور نیزوں میں سے جن چیزوں کے ساتھ شکار کیا جاتا ہے وہ سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ اس گفتگو میں کفایت ہے۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 6۔** جو چیز جال وغیرہ میں واقع ہو وہ اس کے مالک کے لیے ہے اگر شکار کو کوئی جال کی طرف مجبور کرے اگر وہ نہ ہوتا تو اس کے لیے پکڑنا ممکن نہ ہوتا تو اس کا مالک اس میں شریک ہوگا اور جو شکار اس مکھیوں کے چھتے میں واقع ہو جو پہاڑ میں لگایا گیا تھا تو وہ جال کی طرح ہے۔ برجوں کے کبوتر ان کے مالکوں کو لوٹائے جائیں گے اگر قدرت ہوگی اسی طرح

---

1۔ احکام القرآن لابن عربی　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

جباح (چھتہ) کی مکھیوں کا حکم ہے۔

امام مالک سے مروی ہے اور ان کے اصحاب نے کہا: جو کبوتر یا مکھی حاصل کر لے اس پر لوٹانا ضروری نہیں اگر کتے نے شکار کو مجبور کیا اور وہ کسی کے کمرے یا گھر میں داخل ہو گیا تو وہ کتے چھوڑنے والے کے لیے ہو گا نہ کہ گھر والے کا ہو گا اگر کتوں کے بھگانے کے بغیر کسی کے گھر میں شکار داخل ہو گیا تو وہ گھر والوں کا ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ شکار پکڑنے والے کے لیے ہو گا، بھگانے والے کے لیے نہ ہو گا کیونکہ اس کا نہ ہاتھ پہنچا ہے نہ نیزہ اور نہ کوئی اور چیز۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ امام مالک نے اہل کتاب کے شکار کو مکروہ کہا ہے اور اسے حرام نہیں کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ میں کم ضمیر سے مراد اہل ایمان ہیں، کیونکہ آیت کے آغاز میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پس ایمان والوں سے اہل کتاب نکل گئے۔ جمہور علماء نے امام مالک کی مخالفت کی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ۔ یہ ان کے نزدیک ان کے ذبیحہ کی مثل ہے۔ ہمارے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ آیت کریمہ ان کے طعام کو کھانے کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اور شکار اور چیز ہے پس طعام کے عموم میں شکار داخل نہیں اور اس کے لفظ کا اطلاق اس کو شامل نہیں۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ اس بنا پر ہے کہ شکار ان کے نزدیک مشروع نہیں ہے پس وہ ان کے طعام میں سے نہیں ہے پس یہاں یہ الزام ساقط ہو جائے گا اگر ان کے نزدیک ان کے دین میں یہ مشروع ہوتا تو اس کا کھانا ہمیں لازم ہوتا، کیونکہ لفظ اس کو بھی شامل ہوتا اور وہ ان کے طعام سے تھا۔ واللہ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

''اے ایمان والو! نہ مارو شکار کو جب کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو اور جو قتل کرے شکار کو تم میں سے جان بوجھ کر تو اس کی جزا یہ ہے کہ اسی قسم کا جانور دے جو اس نے قتل کیا ہے فیصلہ کریں اس کا دو معتبر آدمی تم میں سے درآں حالیکہ یہ قربانی کعبہ میں پہنچنے والی ہو یا کفارہ ادا کرے وہ یہ کہ چند مسکینوں کو کھانا دے یا اس کے برابر روزے ادا کرے تا کہ چکھے سزا اپنے کام کی۔ معاف فرما دیا اللہ تعالیٰ نے جو گزر چکا ہے اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے''۔

اس میں تیس مسائل ہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن عربی

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ ہر مسلمان مذکر اور مونث کو خطاب ہے یہ نہی آزمائش ہے جس کا ذکر یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ میں ہے۔

روایت ہے کہ ابوالیسر، ان کا نام عمرو بن مالک انصاری تھا۔ حدیبیہ کے سال انہوں نے احرام باندھا ہوا تھا اور انہوں نے جنگلی گدھا شکار کیا تو اس میں یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ قتل سے مراد ہر وہ فعل ہے جو روح کو فوت کر دے اس کی کئی صورتیں ہیں نحر کرنا، ذبح کرنا، گلہ دبا دینا، پتھر سے سر کچل دینا وغیرہ اللہ تعالیٰ نے محرم پر حرام کیا ہے ہر وہ فعل جس سے روح کو فوت کرنے والا ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نے شکار کو قتل کیا یا اس نے اسے ذبح کیا، پھر اس نے اس سے کھایا تو اس پر قتل کرنے کی ایک جزا ہے کھانے کی علیحدہ جزا نہیں یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: اس پر اس کی بھی جزا ہے جو اس نے کھایا یعنی اس کی قیمت۔ صاحبین نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے وہ فرماتے ہیں: استغفار کے علاوہ اس پر کچھ نہیں ہے، کیونکہ اس نے مردہ کو استعمال کیا ہے جس طرح دوسرا مردہ جانور اٹھاتا ہے اسی طرح اگر اس کو کسی دوسرے محرم نے کھایا تو اس پر پھر بھی صرف استغفار ہے۔ امام ابوحنیفہ کی حجت یہ ہے کہ اس نے احرام کی ممنوع چیز کو لیا ہے، کیونکہ اس کا قتل کرنا بھی ممنوع چیزوں میں سے تھا اور یہ معلوم شدہ ہے کہ قتل سے مقصود بھی کھانا ہوتا ہے اور جو چیز مقصود تک پہنچانے والی ہو یعنی احرام کے ممنوع تک تو وہ جزا کا موجب ہوتی ہے پھر جو مقصود ہے اس پر بدرجہ اولیٰ جزا ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے نزدیک محرم کا شکار کو ذبح کرنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محرم کو شکار کے قتل سے منع فرمایا ہے یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے اور امام شافعی نے فرمایا: محرم کے لیے شکار کا ذبح کرنا ذبح ہے اور انہوں نے اس کا تعلق اس سے جوڑا ہے کہ وہ ذبح کا فعل ذبح کے اہل یعنی مسلمان سے صادر ہوا ہے اور وہ اپنے محل کی طرف منسوب ہے اور وہ ہے حلال جانور، پس کھانے کی حلت کی وجہ سے اپنے مقصود کا فائدہ دے گا اس کی اصل حلال جانور کا ذبح کرنا ہے۔

ہم کہتے ہیں: تمہارا یہ کہنا کہ ذبح، ذبح کے اہل سے صادر ہوئی ہے حالانکہ محرم شکار کو ذبح کرنے کا اہل نہیں، کیونکہ اہلیت عقل سے نہیں سمجھی جاتی بلکہ یہ شرع ثابت کرتی ہے یہ ذبح میں اس کی اجازت اور اس کی نفی سے ہے اور شرع میں محرم کو ذبح سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ پس نہی کے ساتھ اہلیت کی نفی ہوگئی اور تمہارا قول کہ اس کا مقصود حاصل ہوتا ہے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ محرم جب شکار کو ذبح کرے گا تو اس کے لیے اس کا کھانا حلال نہ ہوگا اور تمہارے نزدیک اس سے کوئی غیر کھا سکتا ہے اور جب ذبح، ذبح کرنے والے کے لیے حلت کا فائدہ نہیں دیتی تو دوسرے کے لیے بھی بدرجہ اولیٰ مفید نہ ہوئی، کیونکہ فرع احکام میں اصل کے تابع ہوتی ہے پس یہ صحیح نہیں کہ جو اصل کے لیے ثابت نہ ہو وہ فرع کے لیے ثابت ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصَّیْدَ یہ مصدر ہے اس کے ساتھ اسماء کا معاملہ کیا گیا ہے پس شکار کیے گئے

حیوان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے(1)۔ الصَّیْدَ کا لفظ یہاں عام ہے ہر بری اور بحری شکار کو شامل تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آیا: وَ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا پس دریائی شکار کو مطلق مباح کر دیا یہ اس کا بیان آئندہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ خشکی کے شکار میں سے درندوں کے نکلنے اور ان کی تخصیص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہر وہ چیز جو درندوں میں سے حملہ نہیں کرتی مثلاً بلی، لومڑ، بجو اور اس جیسے دوسرے جانوروں کو محرم قتل نہیں کر سکتا اگر قتل کرے گا تو فدیہ دے گا۔ فرمایا: چھوٹے بھیڑیئے میرے خیال میں ان کو بھی محرم قتل نہ کرے، اگر انہیں قتل کرے گا تو فدیہ دے گا یہ کووں کے بچوں کی مثل ہیں اور جو چیزیں انسان پر غالب طور پر حملہ آور ہوتی ہیں ان کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ، اسی طرح سانپوں، بچھوؤں، چوہوں، کوؤں اور چیلوں کو مارنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسماعیل نے کہا: پانچ فواسق ہیں حل و حرم میں انہیں قتل کیا جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فواسق کہا اور اس کے افعال کو بیان کیا، کیونکہ فاسق فسق کے لیے فاعل کا وزن ہے اور چھوٹے جانوروں کا فعل نہیں ہوتا کتے کا عقور کا وصف بیان کیا اور چھوٹے کتے کاٹتے نہیں ہیں پس وہ اس کے تحت داخل نہ ہوں گے۔ قاضی اسماعیل نے کہا: کاٹنے والے کتے کا نقصان لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ فرمایا: ان میں سے سانپ اور بچھو ہیں کیونکہ ان سے بھی ڈرایا جاتا ہے اسی طرح چیل اور کوا یہ لوگوں کے ہاتھوں سے گوشت اچک لیتے ہیں۔ ابن بکیر نے کہا: بچھو کو قتل کرنے کا حکم دیا، کیونکہ وہ زہر والا ہے اور چوہے کو مارنے کا حکم دیا، کیونکہ وہ مشکیزہ اور جوتا کاٹ دیتا ہے جو مسافر کا زاد راہ ہوتے ہیں اور کوے کو مارنے کا حکم دیا، کیونکہ وہ اونٹوں کی پیٹھ پر بیٹھتا ہے اور ان کا گوشت کاٹ لیتا ہے۔ امام مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوے اور چیل کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ نقصان پہنچائیں۔

قاضی اسمٰعیل نے کہا: بھڑ میں اختلاف ہے بعض نے اسے سانپ اور بچھو کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ فرمایا: اگر بھڑ کا ابتداً حملہ نہ کرنا نہ ہوتا تو یہ لوگوں پر سانپ اور بچھو سے بھی زیادہ سخت ہوتا لیکن اس کی طبع میں حملہ کرنا نہیں ہے جیسا کہ سانپ اور بچھو میں ہے، بھڑ کو جب اذیت دی جائے تو وہ سخت لڑتی ہے۔ فرمایا: اگر بھڑ کسی کے سامنے آئے اور وہ اسے دور کر دے تو اس کے قتل میں اس پر کچھ نہ ہوگا۔ حضرت عمر بن خطاب سے بھڑ کے قتل کی اباحت ثابت ہے۔ امام مالک نے کہا: بھڑ کے قاتل کو کوئی چیز کھلانی چاہیے۔ اسی طرح امام مالک نے اس شخص کے بارے کہا جس نے کیکڑا، مکھی اور چیونٹی وغیرہ کو مارا۔ اصحاب الرائے نے کہا: ان تمام کے قاتل پر کوئی چیز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ نے کہا: محرم درندوں میں سے کسی کو قتل نہ کرے سوائے کاٹنے والے کتے اور بھیڑیئے کے خواہ وہ اس پر پہلے حملہ کریں یا یہ ان پر حملہ کرے اگر ان کے علاوہ کسی درندے کو قتل کرے گا تو فدیہ دے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر کتے اور بھیڑیئے کے علاوہ کسی درندے نے محرم پر حملہ کیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو اس پر کوئی چیز نہ ہوگی اور فرمایا: سانپ، بچھو، کوے اور چیل کے قتل میں اس پر کچھ نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے مگر امام زفر کا قول مختلف ہے یہی قول اوزاعی، ثوری اور حسن کا ہے اور انہوں نے اس پر حجت یہ پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص جانوروں کو محرم کے

1۔ المحرر الوجیز

لیے قتل کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ وہ نقصان پہنچاتے ہیں پس اس پر زیادتی کی کوئی وجہ نہیں مگر یہ کہ علماء کسی چیز پر جمع ہو جائیں اور اس کے معنی میں داخل کر دیں۔

میں کہتا ہوں: تعجب ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کہ وہ کیل کی علت کی وجہ پر گندم پر مٹی کو محمول کرتے ہیں اور درندوں کو علت فسق اور کاٹنے کی وجہ سے کتے پر محمول نہیں کرتے جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: امام زفر بن ہذیل نے کہا: محرم صرف بھیڑیئے کو قتل کرے اور جس نے احرام کی حالت میں کسی اور درندے کو قتل کیا تو اس پر فدیہ ہے خواہ وہ حملہ کی ابتدا کرے یا نہ کرے، کیونکہ وہ بے زبان ہے پس اس کا فعل رائیگاں ہے، یہ حدیث کا رد اور اس کی مخالفت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ہر وہ چیز جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا اسے قتل کرنے کی محرم کو اجازت ہے اور اس میں چھوٹا اور بڑا شکار برابر ہیں مگر سوائے سمع کے جو بھیڑیئے اور بجو کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا: بڑی چچڑی اور چھوٹی چچڑی اور وہ چیزیں جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان میں کوئی کفارہ نہیں ہے، کیونکہ یہ شکار میں سے نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُمًا**۔ یہ دلیل ہے کہ الصید سے مراد وہ ہے جو احرام سے پہلے ان پر حلال تھا اور احرام کی وجہ سے ان پر حرام کیا گیا یہ تمام ان سے مزنی اور ربیع نے ذکر فرمائی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جوں کا فدیہ کیوں دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اذیت دیتی ہے اور کھائی نہیں جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فدیہ نہیں دیا جاتا مگر اس پر جس پر فدیہ دیا گیا ہے بال، ناخن اور ان چیزوں کا پہننا جن کا پہننا اس کے لیے جائز نہیں تھا چونکہ جوں کے پھینکنے میں اپنی ذات سے اذیت کو دور کر دینا ہے جب کہ وہ اس کے سر اور داڑھی میں تھی گویا اس نے اپنے بالوں کی تکلیف کو دور کیا۔ جب وہ ظاہر ہوتی ہے تو قتل کی جاتی ہے، حالانکہ وہ اذیت نہیں دیتی ابوثور کا قول اس باب میں امام شافعی کے قول کی طرح ہے۔ یہ ابوعمر نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ائمہ حدیث نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جانوروں میں پانچ ایسے ہیں محرم پر ان کے قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹنے والا کتا'' (1)۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ یہی احمد اور اسحاق نے کہا ہے مسلم میں حضرت عائشہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''پانچ فواسق ہیں ان کو حل وحرم میں قتل کیا جائے گا سانپ، ابقع کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل''۔ اہل علم کی ایک جماعت کا یہی قول ہے فرماتے ہیں: کووں میں سے صرف ابقع کو مارا جائے گا، کیونکہ یہ مطلق کی تقیید ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ کوے کو پتھر مارے اور اسے قتل نہ کرے (2)۔ مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ جمہور علماء کا قول حضرت ابن عمر کی حدیث کے مطابق ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں السبع العادی (حملہ کرنے والا درندہ) یہ علت پر تنبیہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ** یہ مردوں اور عورتوں اور آزاد، غلام سب کو شامل ہے۔ کہا جاتا

---

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 5132

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1514، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: رجل حرام و امراۃ حرام۔ اس کی جمع حرم ہے جیسے عرب کہتے ہیں: قذال و قذل، احرم الرجل کا معنی ہے وہ حرم میں داخل ہوا جیسے کہا جاتا ہے اسھل یعنی سہل (آسانی) میں داخل ہوا یہ لفظ زمان و مکان کو شامل ہے احرام کی حالت اشتراک کے ساتھ ہے نہ کہ عموم کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے: رجل حرام جب کوئی حرمت والے مہینوں میں داخل ہو یا حرم میں داخل ہو یا احرام باندھے لیکن زمانے کی تحریم خارج ہے اس کا اعتبار اجماع سے خارج ہے اور مکان کی تحریم اور احرام کی حالت اصل تکلیف پر باقی ہے یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ مکان کے اعتبار سے حرم دو ہیں حرم مدینہ اور حرم مکہ۔ امام شافعی نے طائف کا اضافہ کیا ہے ان کے نزدیک طائف کا درخت کاٹنا جائز نہیں اور نہ اس کا شکار کرنا جائز ہے اور جس نے کوئی ممنوع کام یہاں بھی کیا تو اس پر جزا ہوگی اور رہا حرم مدینہ اس میں کسی کے لیے نہ شکار کرنا جائز ہے اور نہ درخت کاٹنا جائز ہے جیسا کہ حرم مکہ کا حکم ہے اگر کوئی ایسا کرے گا تو گناہگار ہوگا اور امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس پر جزا نہیں ہے۔ ابن ابی ذئب نے کہا: اس پر جزا ہے سعد نے کہا: اس کی جزا یہ ہے کہ اس کا سامان چھین لیا جائے۔ امام شافعی سے بھی یہ مروی ہے۔

امام ابوحنیفہ نے کہا: مدینہ طیبہ کا شکار حرام نہیں اسی طرح اس کے درخت کاٹنے بھی ممنوع نہیں۔ امام صاحب کے بعض متبعین نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کو تم مدینہ طیبہ کی حدود میں شکار کرتے ہوئے یا درخت کاٹتے ہوئے پاؤ تو اس کا سامان لے لو''۔ حضرت سعد نے اس شخص کا سامان لے لیا۔ فرمایا: فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو مدینہ طیبہ میں شکار کرے گا اس کا سامان نہیں لیا جائے گا یہ دلیل ہے کہ وہ حکم منسوخ ہے۔

امام طحاوی نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے ما فعل النفیر؟ (نفیر کا کیا ہوا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرندے کے شکار کرنے اور اس کو پکڑنے پر انکار نہ کیا۔ ان احادیث میں احناف کے لیے حجت نہیں۔ رہی پہلی حدیث وہ قوی نہیں ہے اگر صحیح بھی ہو تو بھی سلب کے نسخ میں ایسی بات نہیں کہ تحریم مدینہ جو صحت سے ثابت ہے اسے ساقط کر دے۔ کتنے ایسے حرام امور ہیں جن کی دنیا میں کوئی سزا نہیں ہے۔ رہی دوسری حدیث تو جائز ہے کہ وہ غیر حرم سے شکار کیا گیا ہو۔ اسی طرح حضرت عائشہ کی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وحشی جانور تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے چلے جاتے تو وہ کھیلتا اور بھاگتا رہتا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد محسوس کرتا تو پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور حرکت نہ کرتا تھا تاکہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو۔ ہماری دلیل وہ روایت ہے جو امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر میں ہرن کو مدینہ میں چرتا ہوا دیکھوں تو میں اسے پریشان نہ کروں''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان جو جگہ ہے وہ حرم ہے''۔ حضرت ابوہریرہ کا قول کہ ''میں ہرن کو پریشان نہیں کروں گا'' دلیل ہے کہ حرم مدینہ میں شکار کو ڈرانا بھی جائز نہیں جس طرح حرم مکہ میں شکار کو ڈرانا جائز نہیں ہے اسی طرح حضرت زید بن ثابت کا شرحبیل بن سعد کے ہاتھ سے چڑیا کو چھین لینا جس کو مدینہ طیبہ سے شکار کیا گیا تھا دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام مدینہ طیبہ کے شکار کی تحریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھ گئے تھے پس اس میں شکار کرنے کو انہوں نے جائز

قرار نہ دیا اور جو چیز شکار کی گئی اس کی ملکیت کو بھی جائز نہ کیا۔ ابن ابی ذئب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صحیح میں روایت کیا ہے: ''اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا تھا میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں جس طرح انہوں نے مکہ کو حرم بنایا تھا اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی، اس کا نہ گھاس کاٹا جائے گا نہ درخت کاٹا جائے گا نہ اس کا شکار بھگایا جائے گا''۔ چونکہ مدینہ حرم ہے اس میں شکار منع کیا گیا اور اس کے ساتھ جزا کو معلق کیا گیا جس طرح حرم مکہ کے ساتھ ہے۔(1)

قاضی عبدالوہاب نے کہا: یہ قول میرے نزدیک ہمارے اصول پر زیادہ قیاس کے مطابق ہے خصوصاً مدینہ طیبہ ہمارے اصحاب کے نزدیک مکہ سے افضل ہے اس میں نماز، مسجد حرام کی نماز سے افضل ہے اور امام مالک اور امام شافعی کی حجت میں سے یہ ہے کہ اس پر جزا کا حکم اور سامان چھین لینے کا حکم نہیں لگایا گیا۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا عموم اس پر کوئی حکم نہیں لگاتا ارشاد فرمایا: ''مدینہ عیر پہاڑ سے لے کر ثور پہاڑ تک حرام ہے جس نے اس میں کوئی بدعت نکالی یا کسی بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول کرے گا نہ نفل''۔ اس ارشاد میں وعید کو مطلق فرمایا اور کفارہ کا ذکر نہیں فرمایا(2) اور جو حضرت سعد سے ذکر کیا گیا ہے وہ ان کا مخصوص مذہب ہے۔ کیونکہ صحیح میں ان سے مروی ہے کہ وہ اپنے محل کی طرف سوار ہو کر عقیق میں گئے تو انہوں نے ایک غلام کو درخت کاٹتے ہوئے پایا۔

آپ نے اس سے سامان چھین لیا۔ جب حضرت سعد واپس آئے تو غلام کے مالک ان کے پاس آئے اور غلام کا سامان واپس کرنے کے لیے بات چیت کی۔ حضرت معاذ نے کہا: معاذ اللہ! میں وہ چیز واپس کر دوں جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی ہے آپ نے انہیں سامان واپس کرنے سے انکار کر دیا(3)۔ پس اس کا قول (نفلنیہ) اس کا ظاہر خصوص ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا اللہ تعالیٰ نے مُّتَعَمِّدًا جان بوجھ کر قتل کرنے والا کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ خطا اور بھول کر کرنے والے کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں مُّتَعَمِّدًا سے مراد وہ ہوتا ہے جو احرام کے علم کے ہوتے ہوئے کسی چیز کا قصد کرتا ہے۔ مخطی وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کا قصد کرتا ہے پھر وہ شکار پالیتا ہے اور بھولنے والا وہ ہے جو جان بوجھ کر شکار کا قصد کرتا ہے اور اسے احرام یاد نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق علماء کے پانچ اقوال ہیں: (۱) دار قطنی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: تکفیر جان بوجھ کر قتل کرنے میں ہے۔ انہوں نے خطا میں بھی کفارہ میں سختی کی تا کہ لوگ آئندہ ایسا نہ کریں۔ (۲) مُّتَعَمِّدًا کا قول غالب طور ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ نادر کو لاحق کیا گیا جیسا کہ اصول شریعت میں ہیں۔ (۳) خطا اور بھول کر ایسا کرنے والے پر کچھ نہیں۔ یہی قول طبری کا ہے اور امام احمد بن حنبل کی بھی ایک روایت یہی ہے حضرت ابن عباس اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے یہی طاؤس اور ابو ثور کا قول ہے یہی داؤد کا قول ہے۔ امام احمد نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مُّتَعَمِّدًا کا خاص ذکر کیا ہے تو یہ دلیل ہے کہ اس کے علاوہ کا حکم اس کے خلاف ہے اور مزید یہ کہا کہ اصل ذمہ کی برأت ہے جس نے ذمہ کی مشغولیت کا دعویٰ کیا اس پر دلیل ہے (۴) اس پر عمد، خطا اور نسیان کی صورت میں حکم لگایا جائے گا یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ عمر، طاؤس، حسن، ابراہیم اور زہری سے مروی ہے یہی قول امام مالک، امام

1۔ احکام القرآن لابن عربی　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ زہری نے کہا: عمدا میں جزا کا وجوب قرآن سے ہے اور خطا اور نسیان کی صورت میں جزا کا وجوب سنت ہے۔ ابن عربی نے کہا: اگر سنت سے مراد وہ آثار ہیں جو حضرت ابن عباس اور حضرت عمر سے مروی ہیں تو یہ بہتر ہیں اور یہ کتنا اچھا اُسوہ ہے (5) مُتَعَمِّدًا وہ اسے قتل کرتا ہے، کیونکہ اس نے اسے احرام کو بھول کر قتل کیا ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ فرمایا: اگر وہ احرام کو یاد رکھتے ہوئے کرتا تو اس پر پہلی مرتبہ بھی سزا ہوتی فرمایا: یہ دلیل ہے کہ اس کو متعمدا قتل کا ارادہ کرے جب کہ وہ احرام کو بھولا ہوا تھا۔ مجاہد نے کہا: اگر اسے احرام یاد ہو تو وہ احرام سے فارغ ہو گیا اور اس نے احرام کا ممنوع کام کیا اس لیے اس کا حج بھی نہیں ہے پس وہ اس پر باطل ہو گیا جیسا کہ کوئی نماز میں گفتگو کرتا ہے یا نماز میں حدث لاحق ہوتا ہے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ فرمایا: جس نے خطا کی پس اس پر جزا ہے۔ ہماری دلیل مجاہد کے خلاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جزا کو واجب کیا اور فساد کا ذکر نہیں کیا پس احرام یاد ہو یا یاد نہ ہو کوئی فرق نہیں ہے اور نماز پر حج کا قیاس صحیح نہیں، کیونکہ یہ دونوں مختلف ہیں۔ مجاہد سے مروی ہے کہ قتل عمد میں بھی اس پر حکم نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور اس کا حج مکمل ہے یہی ابن زید کا قول ہے۔ ہماری دلیل داؤد کے خلاف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بجو کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ شکار ہے''، جب محرم بجو کو قتل کرے تو اس کے لیے ایک مینڈھا بطور جزا مقرر فرمایا(1) اور عمداً اور خطأً کا ذکر نہیں فرمایا۔ ہمارے علماء میں سے ابن بکیر نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مُتَعَمِّدًا اس سے مراد خطا سے تجاوز نہیں، بلکہ مُتَعَمِّدًا سے یہ مراد لیا کہ وہ بیان کرے کہ یہ اس ابن آدم کی طرح نہیں جس کے قتل عمد میں کفارہ نہیں اور شکار میں کفارہ ہے اس سے مراد قتل خطا میں جزا کو ساقط کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11**۔ جو شخص حالت احرام میں جتنی مرتبہ جانور قتل کرے گا اس پر ہر مرتبہ فیصلہ ہوگا یہ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ وغیرہم کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ الآیۃ۔ پس نہی ہمیشہ کے لیے ہے اور مستمر ہے جب تک کہ وہ محرم ہے جب وہ قتل کرے گا اس کی وجہ سے اس پر جزا لازم ہو گی۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اسلام میں اس پر دو مرتبہ حکم نہیں لگایا جائے گا اس پر صرف ایک مرتبہ حکم لگایا جائے گا اگر وہ دوبارہ یہ جرم کرے گا تو اس پر حکم نہیں لگایا جائے گا اسے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ تجھ سے انتقام لے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ۔ یہ قول حسن، ابراہیم، مجاہد اور شریح کا ہے ان کے خلاف ہماری دلیل یہ ہے جو ہم نے اس کے بارے میں ذکر کی جو احرام میں تحریم کی طرف بڑھتا ہے دین اسلام میں اس پر خطاب متوجہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ اس میں چار قرأتیں ہیں: فجزاءٌ مثلُ جزا کے رفع اور تنوین کے ساتھ اور مثل صفت کی بنا پر ہے اور خبر مضمر ہے تقدیر اس طرح ہوگی فعلیہ جزاء مماثل واجب اولازم من النعم۔ یہ قرأت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مثل بعینہ جزا ہے اور جزا پر رفع بغیر تنوین کے اور مثل اضافت کے ساتھ یعنی فعلیہ جزاء مثل ما قتل اور مثل کا لفظ مقحم ہے جیسا کہ تیرا قول ہے: انا اکرم مثلك اس سے تیری مراد یہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب جزاء الصید یصیبہ المحرم، حدیث نمبر 3075، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ أنا اکرمك میں تیری عزت کرتا ہوں۔ اس کی مثال یہ ارشاد بھی ہے: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ (الانعام:122) اس کی تقدیر یہ ہے کمن ھو فی الظلمات اور اس کی یہ بھی نظیر ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ:11) یعنی لیس کھو شیئ یہ تقدیر تقاضا کرتی ہے جزا مثل کے علاوہ ہے، کیونکہ کوئی چیز اپنی ذات کی طرف مضاف نہیں ہوتی۔ ابوعلی نے کہا: اس پر مقتول کی جزا ہے نہ کہ مقتول کی مثل کی جزا ہے اضافت مثل کی جزا کا موجب ہے نہ کہ مقتول کی جزا کا۔ یہ امام شافعی کا قول ہے جیسا کہ آگے آئے گا اور قولہ مِنَ النَّعَمِ دونوں قرأتوں پر جزا کی صفت ہے۔ حسن نے من النَّعْمِ پڑھا ہے یعنی عین کے سکون کے ساتھ یہ بھی ایک لغت ہے۔ عبدالرحمن نے فجزاءٌ رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور مثل کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوالفتح نے کہا: مثل، نفس جزا کے ساتھ منصوب ہے معنی یہ ہے: ان یجزی مثل ماقتل۔ اور حضرت ابن مسعود اور اعمش فجزاءہ مثل، پڑھا ہے یعنی ھا کو ظاہر کرنے کے ساتھ۔ یہ احتمال ہے کہ وہ شکار کی طرف ضمیر لوٹے یا شکاری قاتل کی طرف۔

**مسئلہ نمبر 13۔** جزا شکار کو قتل کرنے کے ساتھ ہوتی ہے صرف پکڑنے سے نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''مدونۃ'' میں ہے جس نے کوئی پرندہ شکار کیا پھر اس کے پر اکھیڑ دیئے پھر اسے قید کر دیا حتیٰ کہ اس کے نئے پر اگ آئے اور وہ اڑ گیا تو فرمایا: اس پر کوئی جزا نہیں۔ فرمایا: اسی طرح اگر شکار کا ہاتھ یا پاؤں یا کوئی اور عضو کاٹ دیا اور اس کا نفس صحیح و سلامت ہے وہ شکار کے ساتھ لاحق ہو گیا تو اس پر کوئی جزا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر اتنی مقدار میں جزا ہے جو اس نے اس میں کمی کی اگر وہ چلا گیا اور معلوم نہ ہوا اس نے کیا کیا تو اس پر جزا ہے، اگر وہ اپاہج بن گیا اور شکار کے ساتھ لاحق نہ ہوا یا اس نے اسے گھرا ہوا چھوڑ دیا تو اس پر کامل جزا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14۔** جن جانوروں کی جزا دی جاتی ہے وہ دو قسم کے ہیں: ایک چوپائے اور دوسرے پرندے۔ چوپاؤں کی جزا ان کی مثل کے ساتھ دی جاتی ہے جو خلقت اور صورت میں ان کی مثل ہوتے ہیں مثلاً شتر مرغ کی جزا اونٹ کے ساتھ۔ وحشی گدھے اور گائے کی جزا گائے کے ساتھ۔ ہرن کی جزا بکری کے ساتھ۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور امام مالک کے نزدیک کم از کم جزا میسر ہدی ہے وہ قربانی کا جانور ہے جیسے بھیڑ میں سے جذع (جو چھ ماہ سے زائد ہو) اور باقی جانوروں سے ثنی (دندہ) ہو اور جس کی جزا ہدی تک نہ پہنچے تو اس میں کھانا کھلانا یا روزے رکھنا ہے، تمام قسم کے کبوتروں میں ان کی قیمت ہے سوائے مکہ کے کبوتر کے۔ مکہ کے کبوتر میں بکری ہے، اس میں یہ سلف کی پیروی نہیں ہے۔ چڑیا، فاختہ، قمری اور تمام طوق والے پرندے کبوتر کے حکم میں ہیں۔ ابن عبدالحکم نے امام مالک سے حکایت کیا ہے کہ مکہ کے کبوتر میں اور ان کے بچوں میں ایک بکری ہے فرمایا: اسی طرح حرم کے کبوتروں کا حکم ہے۔ فرمایا: حل کے کبوتر میں دو آدمیوں کا فیصلہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: مثل کا اعتبار قیمت میں ہوگا نہ کہ خلقت میں، شکار کی قیمت دراہم میں اس جگہ کے مطابق لگائی جائے گی جہاں اس نے قتل کیا ہے یا قریبی جگہ کا اعتبار ہوگا اگر ایسی جگہ قتل کیا ہو جہاں وہ شکار نہ بیچا جاتا ہو پھر اس قیمت سے چاہے تو ہدی خرید لے یا اس کے ساتھ کھانا خریدے اور مساکین کو کھلائے، ہر مسکین کو نصف صاع گندم دے یا ایک صاع جو دے یا ایک صاع کھجور

دے(1)۔ اور امام شافعی جانوروں میں سے مثل کا نظریہ رکھتے ہیں، پھر وہ مثل کی قیمت لگاتے ہیں جس طرح تلف کی گئی چیزوں میں مثل کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ مثل کی قیمت لی جائے گی جیسے کسی شے کی قیمت ہوتی ہے، کیونکہ وجوب میں مثل ہی اصل ہے۔ یہ واضح ہے اس پر اضافت کی قرأت ظاہر ہوتی ہے فَجَزَآءُ مِّثْلُ۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر خلقت کے طریق سے شبہ معتبر ہوتا، شتر مرغ میں اونٹ ہوگا، جنگلی گدھے میں گائے ہوگی، ہرن میں بکری ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اس کو دو عادل شخصوں پر موقوف نہ کیا جو اس کا فیصلہ کریں گے، کیونکہ یہ معلوم ہے اور اس میں غور و فکر کی ضرورت نہیں، عدل اور غور و فکر کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب حالت مشکل ہو اور اس پر نظر مضطرب ہو اور اس پر ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَجَزَآءُ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ پس مثل ظاہر مثل خلقی صوری کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ معنی کا، پھر فرمایا: مِنَ النَّعَمِ المثل کی جنس کو بیان کیا، پھر فرمایا: يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ یہ ضمیر مثل من النعم کی طرف راجع ہے، کیونکہ اس کے سوا کسی چیز کا ذکر نہیں پس ضمیر اس کی طرف راجع ہے، پھر فرمایا: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ جس میں ہدی متصور ہوتی ہے جو مقتول جانور کی مثل ہو۔ رہی قیمت تو اس کا ہدی ہونا متصور نہیں ہوتا اور نفس آیت میں اس کے لیے ذکر بھی نہیں ہے، پس جو ہم نے ذکر کیا وہ صحیح ہے۔ والحمدللہ۔

اور ان کا قول اگر شبہ معتبر ہوتا تو دو عادل شخصوں پر موقوف نہ کیا ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ دو عادل آدمیوں کا اعتبار شکار کے چھوٹا اور بڑا ہونے میں غور و فکر کے لیے واجب ہے اور جس کی جنس نہیں ہے اس کا فیصلہ اسی چیز سے جس کی جنس ہے اور جس پر نص واقع نہیں ہے اس کو اس کے ساتھ لاحق کرنا ہے جس میں نص واقع ہے (دو شخصوں کا فیصلہ اس کے بارے میں ہے)

**مسئلہ نمبر 15**۔ جس نے مکہ سے احرام باندھا اور کبوتروں کے بچوں پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا پھر وہ مر گئے تو اس پر ہر بچے میں ایک بکری ہے۔ امام مالک نے فرمایا: چھوٹے شکار میں بھی وہی ہے جو بڑے شکار میں ہے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک بکری کے چھوٹے بچے کے ساتھ کسی چیز کا فدیہ نہیں دیا جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا: دیت کی طرح اس میں چھوٹا اور بڑا برابر ہیں۔ امام مالک کے نزدیک گوہ میں اور جنگلی چوہے میں ان کی قیمت کا کھانا ہے۔ اہل مدینہ میں سے کچھ چھوٹے شکار میں امام مالک کی مخالفت کرتے ہیں اور جذع اور ثنی (دندہ) میں بھی مخالفت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابن عمر کے قول کے مطابق کہتے ہیں۔ خرگوش میں بکری کا بچہ ہے چوہے میں جفرہ (بکری کا چرنے والا بچہ) ہے امام مالک نے اسے موقوف روایت کیا ہے۔ ابو زبیر نے حضرت جابر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جب مجرم بجو کو قتل کرے تو اس میں مینڈھا ہے اور ہرن میں بکری ہے اور خرگوش میں بکری کا بچہ ہے اور جنگلی چوہے میں جفرہ ہے''۔ فرمایا: جفرہ اس بکری کے بچے کو کہتے ہیں جو چرتا ہو، اور دوسرے طریق میں ہے میں نے ابو زبیر سے پوچھا جفرہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو اور وہ چرتا ہو اس کو دار قطنی نے نقل کیا ہے (2)۔

امام شافعی نے فرمایا: شتر مرغ میں اونٹ ہے اور اس کے بچے میں اونٹ کا بچہ ہے اور وحشی گدھے میں گائے ہے اور وحشی گدھے کے بچہ میں میمنہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خلقت میں مثلیت کا فیصلہ فرمایا ہے چھوٹا اور بڑا متفاوت ہوتے ہیں پس

1۔ احکام القرآن للجصاص
2۔ سنن دار قطنی، حدیث نمبر 2546، 2549

اس میں چھوٹے اور بڑے کا اعتبار واجب ہے جیسا کہ دوسری ضائع کی جانے والی چیزوں میں ہوتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے اور یہ ہمارے علماء کا مختار ہے۔ علماء نے کہا: اگر شکار کانا ہو یا لنگڑا ہو یا اس کا کوئی عضو ٹوٹا ہوا ہو تو مثل بھی اسی صفت پر ہوگا تا کہ مثلیت متحقق ہو، پس جو مثل دیا جا رہا ہے ضروری نہیں کہ وہ اس سے بہتر ہو جو اس نے ضائع کیا ہے ہماری دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ صغیر اور کبیر کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَدْيًا یہ تقاضا کرتا ہے کہ اطلاق کے حق کی وجہ سے ہدی کا اسم اس کو شامل ہو اور یہ مکمل ہدی کا تقاضا کرتا ہے۔ والله اعلم

**مسئلہ نمبر 16**۔ شتر مرغ کے انڈے میں اونٹ کی ثمن کا دسواں حصہ ہے یہ امام مالک کے نزدیک ہے اور امام مالک کے نزدیک کبوتری کے انڈے میں بچہ ہو یا نہ ہو جب تک کہ انڈا ٹوٹنے کے بعد وہ بچہ بولا نہ ہو، اگر بچہ بولا ہو تو اس پر مکمل جزا ہوگی جس طرح اس پرندے کے بڑے کی جزا ہوتی ہے۔ ابن مواز نے کہا: دو عادل آدمیوں کے فیصلہ پر ہوگا۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ ہر پرندے کے انڈے میں اس کی قیمت ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے حضرت کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شتر مرغ کے انڈے میں اس کی ثمن کی مقدار فیصلہ فرمایا جس کو محرم نے توڑا تھا اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شتر مرغ کے ہر انڈے میں ایک دن کا روزہ ہے یا ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے"۔ (1)

**مسئلہ نمبر 17**۔ وہ جانور جن کی کوئی مثل نہیں مثلاً چڑیا اور ہاتھی تو اس کی گوشت کی قیمت ہوگی یا اس کے برابر کھانا ہوگا نہ وہ جو اس سے اغراض مراد لی جاتی ہیں، کیونکہ وہ جانور جن میں کوئی مثل ہوتی ہے اس کی مثل واجب ہوتی ہے۔ اگر مثل معدوم ہو تو قیمت اس کے قائم مقام ہوگی جیسے غصب وغیرہ۔ علماء کے دو مذاہب ہیں: (۱) تمام شکاروں میں قیمت کا اعتبار ہے (۲) اور ان جانوروں میں قیمت کا اعتبار ہوگا جن کا جانوروں میں سے مثل نہیں ہے۔ یہ اجماع اپنے ضمن میں قیمت کا اعتبار لیے ہوئے ہے جن کا مثل موجود نہیں، رہا ہاتھی تو اس میں بعض علماء نے فرمایا: اس میں بڑے اونٹ ہیں جن کی دو کہانیں ہیں یہ خراسانی سفید اونٹ ہیں جب ان اونٹوں میں سے کوئی چیز نہ ہو تو پھر اس کی قیمت کو کھانے کے اعتبار سے دیکھا جائے گا، پس کھانا اس پر ہوگا اس میں عمل اس طرح ہوگا کہ ہاتھی کو مرکب (قافلہ) میں رکھا جائے گا اور اس آخری منزل کو دیکھا جائے گا جہاں پانی پر قافلہ اترا ہے، پھر ہاتھی کو نکالا جائے گا اور قافلہ میں کھانا رکھا جائے گا حتیٰ کہ وہ اس حد پر اترے جہاں وہ نازل ہوا تھا جب کہ اس میں ہاتھی تھا یہ کھانے میں سے اس کے برابر ہے، رہا اس کی قیمت کو دیکھنا تو اس کی بہت بڑی رقم بنے گی، کیونکہ اس کی ہڈیاں اور انیاب ہیں پس کھانا بہت زیادہ ہوگا اور یہ ضرر ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ امام مالک نے عبد الملک بن قریب سے انہوں نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص حضرت عمر بن خطاب کے پاس آیا اور کہا: میں نے اور میرے ایک ساتھی نے دو گھوڑے دوڑائے، ہم گھاٹی کے دہانے پر پہنچے تو ہم نے ایک ہرن پکڑا جب کہ ہم محرم تھے اس کا آپ کیا حکم دیتے ہیں؟

1۔ سنن دارقطنی، عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر 2557

حضرت عمر نے قریب بیٹھے ایک شخص کو کہا: آؤ میں اور تو فیصلہ کریں، دونوں نے اس پر بکری کا فیصلہ کیا۔ وہ شخص واپس گیا تو کہہ رہا تھا: یہ امیر المومنین ہے جو ایک ہرن کا فیصلہ نہیں کر سکتا حتیٰ کہ اس نے ایک آدمی کو بلایا جو اس کے ساتھ فیصلہ کرے۔ حضرت عمر نے اس شخص کی بات سن لی اسے بلایا اور پوچھا: کیا تو سورۂ مائدہ پڑھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: کیا تو اسے جانتا ہے جس نے میرے ساتھ فیصلہ کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں؟ حضرت عمر نے کہا: اگر تو مجھے بتاتا کہ تو سورۂ مائدہ پڑھتا ہے تو میں تجھے سزا دیتا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ۔ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ جب فیصلہ کرنے والے دونوں اتفاق کر لیں تو فیصلہ لازم ہوگا یہی حسن اور امام شافعی کا قول ہے جب وہ مختلف ہو جائیں تو ان کے علاوہ کو دیکھا جائے گا۔ محمد بن المواز نے کہا: وہ ان کے قول سے زیادہ کو نہ لے، کیونکہ یہ تو بغیر تحکیم کے عمل ہوگا اسی طرح مثل خلقی سے طعام کی طرف منتقل نہ ہوگا جب وہ اس کا فیصلہ کریں، کیونکہ یہ امر لازم ہے یہ ابن شعبان کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: ان کا حکم یہ تھا کہ وہ مثل جزا کا فیصلہ کریں پس انہوں نے وہ کیا پھر اس نے طعام کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو جائز ہوگا۔ ابن وہب رحمہ اللہ نے ''العتبیة'' میں کہا: سنت یہ ہے کہ دونوں فیصلہ کرنے والے اسے اختیار دیں جس نے کوئی شکار کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے کہ وہ ہدی دے جو کعبہ تک پہنچنے والی ہو یا کفارہ دے جو مساکین کا کھانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھے۔ اگر وہ ہدی اختیار کرے تو دو عادل شخص فیصلہ کریں اس کے ساتھ جو مثال دیکھیں جب اس نے کوئی ایسا شکار کیا ہو کہ اس کے برابر بکری بنتی ہو تو وہ ادنیٰ ہدی ہے اور جو بکری تک نہ پہنچتی ہو تو اس میں کھانے کا فیصلہ کریں پھر اسے کھانا کھلانے کا اختیار دیا جائے گا یا ہر مد کے مقابلہ میں روزہ رکھے گا اسی طرح امام مالک نے ''المدونہ'' میں کہا۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ ہر اس چیز کے شکار میں نئے سرے سے فیصلہ کیا جائے گا خواہ پہلے اس میں فیصلہ ہو چکا ہو یا نہ ہو چکا ہو۔ اور اگر صحابہ کے فیصلہ جیسا کوئی فیصلہ کرے اس چیز میں جس کا صحابہ نے فیصلہ کیا تھا تو بہتر ہے۔ امام مالک سے مکہ کی کبوتری، جنگلی گدھے، ہرن، شتر مرغ کے علاوہ میں فیصلہ مروی ہے۔ ان چار چیزوں میں سلف صالحین کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ یہ جائز نہیں کہ محرم فیصلہ کرنے والوں میں سے ایک ہو یہی امام ابوحنیفہ کا قول اور امام شافعی کا ایک قول ہے محرم دو فیصلہ کرنے والوں میں سے ایک ہوگا۔ یہ ان کا تسامح ہے، کیونکہ آیت کا ظاہر ایک جنایت کرنے والے اور دو فیصلہ کرنے والوں کا تقاضا کرتا ہے۔ بعض عدد کو حذف کرنا ظاہر کو ساقط کرنا ہے اور معنی کا افساد ہے، کیونکہ آدمی کا اپنے بارے فیصلہ کرنا جائز نہیں اگر یہ جائز ہوتا تو اپنی ذات کی وجہ سے دوسرے سے مستغنی ہوتا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان فیصلہ ہے دوسرے شخص کی زیادتی دو آدمیوں کے ساتھ حکم کے استیناف پر دلیل ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 22**۔ جب ایک جماعت احرام باندھنے والوں کی ایک شکار کو قتل کرنے میں شریک ہو تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے فرمایا: ہر ایک پر مکمل جزا ہوگی۔ امام شافعی نے فرمایا: ان تمام پر ایک کفارہ ہوگا، کیونکہ حضرت عمر اور حضرت عبدالرحمٰن نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن زبیر کے موالی نے احرام باندھا ہوا تھا جب ان کے پاس سے بجو

1۔ احکام القرآن لابن عربی

گزراتو انہوں نے اپنی لاٹھیوں سے اسے ماردیا پھران کے دلوں میں خیال پیدا ہوا (کہ ہم نے ٹھیک نہیں کیا) وہ حضرت ابن عمر کے پاس آئے انہوں نے مسئلہ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک پر ایک ایک مینڈھا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم میں سے ہر ایک پر ایک مینڈھا ہے۔ فرمایا: تم پر سختی کی گئی ہے۔ فرمایا: تم میں سے ہر ایک پر مینڈھا ہے(1)۔ لغوی علماء نے کہا: لمعزز بکم کا معنی ہے تم پر سختی کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے وہ لوگ جنہوں نے بجو مارا ان پر مینڈھا ہے آپس میں اس کے حصے تقسیم کریں گے اور ہر ایک اپنا حصہ نکالے گا اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ**۔ یہ خطاب ہر قاتل کو ہے اور ہر شکار کو قتل کرنے والا مکمل ایک نفس کو قتل کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے ایک شخص کے بدلے پوری جماعت کو قتل کیا جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان پر قصاص واجب نہ ہوتا ہم نے اس کے وجوب کا قول کیا ہے اس پر ہمارا اور ان کے ساتھیوں کا اجماع ہے، پس جو ہم نے کہا: وہ ثابت ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب ایک جماعت مل کر حرم میں ایک شکار کو قتل کرے اور تمام غیر محرم تھے تو ان پر ایک جزا ہے بخلاف اس کے محرم لوگ شکار کو حرم اور حل میں قتل کریں، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام مالک نے فرمایا: ہر ایک پر کامل جزا ہے اس بنا پر کہ حرم میں داخلہ کے ساتھ انسان محرم ہو جاتا ہے جس طرح احرام کے تلبیہ کے ساتھ محرم ہو جاتا ہے دونوں فعلوں میں سے ہر ایک نے اسے ایسی صفت کا ارتکاب کیا جس کے ساتھ نہی متعلق ہے اور وہ دونوں حالتوں میں اس صفت کی ہتک کرنے والا ہے اور امام ابوحنیفہ کی حجت وہ ہے جو قاضی ابو زید دبوسی نے ذکر کیا ہے فرمایا: اس میں راز یہ ہے کہ احرام میں جنایت عبادت پر ہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے احرام کے ممنوع عمل کا ارتکاب کیا۔ جب حرم میں غیر محرموں نے شکار کو قتل کیا تو انہوں نے ایسے جانور کو تلف کیا جس کا تلف کرنا حرام تھا یہ اس کے قائم مقام ہے کہ اگر ایک جماعت ایک جانور کو تلف کرتی تو ان میں ہر ایک جانور کو قتل کرنے والا تھا اور وہ قیمت میں شریک ہوں گے۔

ابن عربی نے کہا: امام ابوحنیفہ ہم سے زیادہ قوی ہیں اس دلیل کی وجہ سے ہمارے علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے اور ہم سے اس کا جدا ہونا مشکل ہے۔(2)

**مسئلہ نمبر 24**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ** اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دونوں جب ہدی کا فیصلہ کریں گے تو اس ہدی کے ساتھ وہ تمام معاملات کیے جائیں گے جو ہدی کے ساتھ کیے جاتے ہیں مثلاً اشعار کرنا، قلادہ پہنانا اور مقام حل سے مکہ کی طرف بھیجی جائے گی اور مکہ میں اسے صدقہ کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ** اس سے مراد کعبہ کا عین نہیں، کیونکہ ہدی اس تک نہیں پہنچتی، کیونکہ کعبۃ مسجد میں ہے۔ اس سے مراد حرم ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ہدی کو حل کی طرف بھیجنے کی ضرورت نہیں اس بنا پر کہ چھوٹی ہدی چھوٹے شکار کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں پس وہ حرم میں خریدی جائے گی اور وہاں ہی وہ ہدی دی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ** کفارہ شکار کی طرف سے ہے ہدی کی وجہ سے

---

1۔ سنن دار قطنی، حدیث 2564
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 676

نہیں۔ ابن وہب نے کہا: امام مالک نے کہا: سب سے بہتر جو میں نے اس شخص کے بارے سنا جو شکار کو قتل کرتا ہے پھر اس میں اس پر فیصلہ کیا جاتا ہے اس شکار کی قیمت لگائی جائے گی جو اس نے شکار کیا، پھر دیکھا جائے گا کہ کھانے سے اس کی کتنی قیمت بنتی ہے ہر مسکین کو ایک مد کھلایا جائے گا یا ہر مد کی جگہ ایک دن روزہ رکھے گا۔ ابن القاسم نے اس کے متعلق کہا: اگر شکار کی قیمت دراہم سے لگائی جائے پھر اس کی قیمت طعام سے لگائی جائے تو یہ جائز ہے۔ درست پہلا قول ہے۔ عبداللہ بن عبدالحکم نے اس کی مثل کہا ہے۔ انہوں نے کہا: ان تین چیزوں میں اس کو اختیار ہے۔ جو فعل بھی کرے گا جائز ہوگا خواہ وہ شخص خوشحال ہو یا تنگ دست ہو یہی قول عطا اور جمہور فقہاء کا ہے، کیونکہ ''او'' تخییر کے لیے آتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہر چیز جو کفارات میں سے کتاب اللہ میں ''او'' کے ساتھ ہے اس میں جرم کرنے والے کو اختیار ہے جو کام کرنا اسے پسند ہو وہ کرلے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: جب محرم ہرن یا اس جیسی کوئی چیز قتل کرے گا تو اس پر مکہ میں بکری ذبح کرنی ہو گی، اگر وہ بکری نہ پائے تو پھر چھ مساکین کو کھانا کھلائے، پھر اگر اس کو نہ پائے تو اس پر تین دنوں کے روزے ہیں اگر اس نے اونٹ یا اسی جیسا جانور قتل کیا تو اس پر گائے ہوگی اگر وہ گائے نہ پائے تو بیس مساکین کو کھانا کھلائے اگر وہ یہ بھی نہ پائے تو بیس دن کے روزے رکھے۔ اگر شتر مرغ یا گدھا قتل کیا تو اس پر بدنہ ہوگا اگر وہ یہ نہ پائے تو تیس مساکین کو کھانا کھلائے اگر یہ نہ پائے تو تیس روزے رکھے۔ اور طعام ایک مد ہوگا مدان کے سیر ہونے کے لیے ہے۔ یہ ابراہیم نخعی اور حماد بن سلمہ کا قول ہے۔ علماء نے فرمایا: اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ اس صورت میں ہے اگر وہ ہدی نہ پائے۔ طبری نے حضرت ابن عباس سے حکایت کیا ہے فرمایا: جب محرم شکار کرے اور اس پر جزا کا فیصلہ کیا گیا ہو اگر وہ جزا پائے تو اسے ذبح کرے اور اسے صدقہ کرے اگر اس کے پاس جزا نہ ہو تو اس کی جزا دراہم کے ساتھ لگائی جائے گی، پھر دراہم کا اندازہ گندم سے لگایا جائے گا، پھر یہ نصف صاع کی جگہ ایک دن روزہ رکھے گا۔ فرمایا: طعام سے مراد روزوں کے امر کو واضح کرنا ہے جو طعام نہ پائے وہ اس کی جزا پائے گا۔ سدی سے یہی روایت کیا گیا ہے (1)۔ ظاہر آیت کے ساتھ اس قول پر اعتراض کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس سے علیحدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ علماء نے اس وقت میں اختلاف کیا ہے جس میں تلف کی گئی چیز کا اعتبار کیا جائے گا۔ ایک قوم نے کہا: جس دن اس نے تلف کیا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: فیصلہ کے دن کا اعتبار ہوگا۔ بعض نے کہا: اتلاف کے دن سے فیصلہ کے دن تک جو قیمت زیادہ ہوگی وہ لازم ہوگی۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء کا بھی ان کے اختلاف کی طرح اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ اتلاف کے دن والی قیمت لازم ہوگی اس پر دلیل یہ ہے کہ وجود حق تھا جب تلف کرنے والے نے اسے ختم کر دیا تو اس کی مثل اس کا ایجاد کرنا لازم تھا اور وہ عدم کے وقت میں ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ رہی ہدی تو اس میں اختلاف نہیں کہ وہ مکہ میں دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ رہا کھانا کھلانا تو اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے کیا وہ مکہ میں ہوگا جہاں اس نے جرم کیا ہے؟ وہ مکہ میں ہوگا یہ امام شافعی کا قول ہے۔ عطا نے کہا: جو خون یا کھانے سے ہو وہ مکہ میں ہوگا اور روزہ جہاں چاہے رکھے۔ یہ امام مالک کا قول روزوں کے متعلق ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 239 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 680

اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ قاضی ابومحمد عبدالوہاب نے کہا: شکار کے جزا میں کسی چیز کو حرم سے نکالنا جائز نہیں، سوائے روزوں کے۔ حماد اور امام ابوحنیفہ نے کہا: جہاں اس نے شکار کیا وہاں ہی وہ کفارہ دے۔ طبری نے کہا: جہاں چاہے کفارہ دے۔

رہا امام ابوحنیفہ کا قول تو اس کی نہ نظر میں کوئی وجہ اور نہ اس میں کوئی اثر ہے۔ رہا وہ جس نے کہا: جہاں چاہے روزہ رکھے کیونکہ روزہ ایک عبادت ہے جو روزہ دار کے ساتھ خاص ہے پس یہ ہر جگہ ہوسکتا ہے جس طرح دوسرے تمام کفارات کے روزے ہیں، رہا وہ قول کہ طعام مکہ میں ہوگا، کیونکہ وہ ہدی کا بدل ہے یا اس کی نظیر ہے اور ہدی مکہ کے مساکین کا حق ہے اسی وجہ سے اس کا بدل بھی مکہ میں ہوگا یا رہا وہ جس نے کہا کہ کھانا بھی ہر جگہ ہوسکتا ہے اس نے ہر طعام اور فدیہ کا اعتبار کیا، کیونکہ وہ ہر جگہ جائز ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 28**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا، العَدل اور العِدل، عین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی مثل ہے یہ کسائی کا قول ہے۔ فراء نے کہا: عدل الشئ عین کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے اس کی جنس سے اس کی مثل اور عین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے اس کی جنس کے علاوہ میں سے اس کی مثل یہ قول کسائی سے بھی روایت ہے تو کہتا ہے: عندی عدل دراھمك من الدراھم وعندی عدل دراھمك من الثیاب۔ کسائی سے صحیح یہ مروی ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یہی بصریوں کا قول ہے روزوں کا عدد کے اعتبار سے وجہ اقرب میں طعام کے مماثل ہونا صحیح نہیں ہے۔ امام مالک نے کہا: ہر مد کے طرف سے ایک دن روزہ رکھے(1)، اگرچہ دو یا تین ماہ سے بھی روزے بڑھ جائیں، یہی امام شافعی کا قول ہے۔

یحییٰ بن عمر مالکی نے کہا: کہا جاتا ہے کہ جتنے افراد اس شکار سے سیر ہو سکتے تھے اس سے عدد معلوم ہو جائے گا، پھر کہا جاتا ہے کتنا کھانا اس تعداد کو سیر کرتا ہے؟ اگر وہ چاہے تو اس کھانے کو نکالے، اگر چاہے ان مدوں کی تعداد کے برابر روزے رکھے۔ یہ بہتر قول ہے اس میں احتیاط ہے، کیونکہ کبھی شکار کی قیمت کھانے سے کم ہوتی ہے اس نظر سے کھانا کھلانا زیادہ ہوگا اور اہل علم میں سے کچھ وہ ہیں جو جزا کے روزوں میں دو ماہ سے تجاوز نہیں کرتے وہ کہتے ہیں: کیونکہ دو ماہ بلند ترین کفارہ ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر دو مدوں کے عوض ایک دن روزہ رکھے انہوں نے اذیت کے فدیہ کا اعتبار کیا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ، الذوق یہاں مستعار ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۞ (الدخان) اور فرمایا: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (النحل: 112) پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس۔

حقیقت میں ذوق زبان کے حاسہ میں ہے ان تمام آیات میں یہ استعارۃ استعمال ہوا ہے اسی سے حدیث ہے(3) ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھا جو اللہ تعالیٰ کو رب تسلیم کرنے پر راضی ہوا۔ الوبال کا معنی ہے برا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 680　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 681　3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

انجام مرعی و بیل وہ کھانا جس کو کھانے کے بعد تکلیف ہو اور طعام و بیل جب وہ کھانا بھاری ہو۔ اسی سے ہے

عقیلة شیخ کالوبیل یلندد

اس کے ساتھ اپنے تمام حالات کو تعبیر کیا۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ یعنی جو تم نے زمانہ جاہلیت میں شکار کیا وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا یہ عطا بن ابی رباح اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کفارہ کے نزول سے پہلے جو کچھ شکار کیا وہ معاف کر دیا۔ وَ مَنْ عَادَ یعنی جس نے نہی کے بعد پھر ایسا کیا۔ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ اللہ اس سے کفارہ کے ساتھ بدلہ لے گا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے آخرت میں اس کا انتقام لے گا اگر وہ اسے حلال سمجھتے ہوئے کرے گا اور ظاہر حکم میں وہ کفارہ دے گا (1)۔ شریح اور سعید بن جبیر نے کہا: اس پر پہلی مرتبہ وہ حکم لگایا جائے گا جب وہ دوبارہ شکار کرے گا تو اس پر حکم نہیں لگایا جائے گا اسے کہا جائے گا: تم جاؤ اللہ تعالیٰ تجھ سے انتقام لے گا یعنی تیرا گناہ کفارہ دینے سے بڑا ہے جیسا کہ جھوٹی قسم کا اکثر علماء کے نزدیک کفارہ نہیں ہے، کیونکہ اس کا گناہ بہت بڑا ہے اور نیک لوگ کفارہ دینے کے ساتھ عذاب سے بچتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ زید بن ابی المعلی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے شکار کیا جب کہ وہ محرم تھا پس اس نے تجاوز کیا پھر اس نے شکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے آگ نازل کی جس نے اس کو جلا دیا (2)، یہ امت کے لیے عبرت ہے اور حد سے بڑھنے والوں کو معصیت سے روکنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ عزیز یعنی اپنی ملک میں محفوظ ہے اسے اس کے ارادہ سے کوئی روکنے والا نہیں۔ ذُو انْتِقَامٍ جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ اگر چاہے گا تو انتقام لے گا۔

## أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

"حلال کیا گیا ہے تمہارے لیے دریائی شکار اور اس کا کھانا فائدہ اٹھاؤ تم اور دوسرے قافلے اور حرام کیا گیا ہے تم پر خشکی کا شکار جب تک تم احرام باندھے ہوئے ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم اکٹھے کیے جاؤ گے"۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ یہ حکم دریائی شکار کو حلال کرنے کا ہے اس سے مراد مچھلیوں کا شکار ہے یہاں بھی الصید بمعنی المصید ہے البحر کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے سبب سے ہے۔ البحر کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مَتَاعًا مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی متعتم به متاعاً۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَعَامُهٗ کا لفظ مشترک ہے اس کا اطلاق ہر کھانے پر ہوتا ہے اور خاص کھانے پر بھی ہوتا ہے جیسے صرف پانی اور صرف گندم، صرف کھجور، صرف دودھ۔ کبھی اس کا اطلاق نیند پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 240 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 241

پہلے گزر چکا ہے یہاں اس سے مراد وہ ہے جس کو دریا پھینک دے اور وہ اس پر تیرنے لگے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ الایہ کے تحت روایت کیا ہے کہ صید سے مراد وہ ہے جو شکار کیا گیا اور طعامہ سے مراد وہ ہے جس کو دریا پھینک دے۔ حضرت ابو ہریرہ سے اس کی مثل مروی ہے یہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ طعام سے مراد اس کا مردہ ہے یہ اسی معنی میں ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: طعام سے مراد وہ ہے جو اس کی وجہ سے نمکین کیا گیا ہو (1) اور باقی ہو، ان کے ساتھ ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے۔ قوم نے کہا: طعام سے مراد وہ نمک ہے جو اس کے پانی اور دوسری نباتات سے حاصل ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: پانی پر مردہ تیرتی ہوئی مچھلی نہیں کھائی جائے گی اور دوسری مچھلیاں کھائی جائیں گی اور دریائی حیوانات میں سے صرف مچھلی کھائی جائے گی، یہی ثوری کا قول ہے ابو اسحاق فزاری کی روایت میں جوان سے مروی ہے۔ حسن نے مردہ تیرنے والی مچھلی کو مکروہ قرار دیا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی مکروہ کہا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ الجری (مچھلی جس کی پیٹھ چوڑی ہوتی ہے اور منہ بھی کھلا ہوتا ہے اور اس کی ہڈی نہیں ہوتی) کا کھانا مکروہ کہا ہے ان سے ان تمام کا کھانا بھی مروی ہے اور یہی صحیح ہے۔ عبدالرزاق نے ثوری سے انہوں نے جعفر بن محمد سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جراد (مکڑی) اور مچھلیاں پاک ہیں۔ حضرت علی سے مردہ تیرنے والی مچھلی کے کھانے میں اختلاف مروی ہے اور حضرت جابر سے اختلاف مروی نہیں انہوں نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ یہی قول طاؤس، محمد بن سیرین، جابر بن زید کا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم سے حجت پکڑی ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ اور ابو داؤد اور دارقطنی کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت جابر بن عبداللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا:

''جس سے دریا ہٹ جائے اور جس کو دریا باہر پھینک دے اور جس کو تم پانی پر مردہ اور تیرتا ہوا پاؤ تو اسے نہ کھاؤ'' (2)۔

دارقطنی نے کہا: عبدالعزیز بن عبیداللہ عن وہب بن کیسان عن جابر کے سلسلہ میں منفرد ہے اور عبدالعزیز ضعیف ہے اس سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ سفیان ثوری نے ابو الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابو احمد زبیری کے علاوہ ثوری سے مسند کسی نے روایت نہیں کی جب کہ وکیع، عدنیان، عبدالرزاق، مؤمل اور ابو عاصم وغیرہم نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان تمام نے ثوری سے موقوف روایت کی ہے اور یہی صواب ہے۔ اسی طرح اس کو ایوب سختیانی، عبیداللہ بن عمر، ابن جریج، زہیر، حماد بن سلمہ وغیرہم نے ابو زبیر سے موقوف روایت کی ہے۔ ابو داؤد نے کہا: یہ حدیث ضعیف طریق سے مسند ذکر کی گئی ہے اور وہ طریق یہ ہے عن ابن ابی ذئب عن ابی الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ا)

دارقطنی نے کہا: اسماعیل بن امیہ اور ابن ابی ذئب نے ابو الزبیر سے مرفوع روایت کی ہے اور مرفوع صحیح نہیں ہے۔ یحییٰ بن سلیم عن اسمٰعیل بن امیہ نے اس کو مرفوع ذکر کیا جب کہ دوسرے محدثین نے اس کو موقوف ذکر کیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی،

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 241　　2۔ سنن دارقطنی، باب الصید والذبائح، جلد 4، صفحہ 268-267

(ا) سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمہ، باب فی اکل الطافی من السمک، حدیث نمبر 3319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ابی لیلی، اوزاعی اور اشجعی کی روایت میں ثوری نے کہا: دریا کی ہر چیز کھائی جائے گی خواہ مچھلی ہو یا دوسرے جانور ہوں، خواہ ان کو شکار کیا گیا ہو یا وہ مردہ پائے گئے ہو، امام مالک اور ان کے متبعین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ھو الطھور ماء ہ الحل میتۃ(1) (سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے) اس باب میں اسناد کی جہت سے حضرت جابر کی حدیث صحیح ترین ہے جو اس مچھلی کے بارے میں ہے جس کو عنبر کہا جاتا ہے یہ ثابت ہے اور اسے شیخین نے نقل کیا ہے اس میں ہے جب ہم مدینہ طیبہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور ہم نے اس مچھلی کا تذکرہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نکالا کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ ہے کہ تم ہمیں بھی کھلاؤ'' (2)۔ ہم نے اس میں سے گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو آپ نے تناول فرمایا۔ یہ مسلم کے الفاظ کا ترجمہ ہے اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابوبکر پر گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے فرمایا: مردہ پانی کے اوپر تیرنے والی مچھلی اس کے لیے حلال ہے(3) جو اس کے کھانے کا ارادہ کرے۔ اور حضرت ابن عباس سے انہوں نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابوبکر پر گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے پانی کے اوپر مردہ تیرتی ہوئی مچھلی کھائی اور ابوایوب نے سنداً روایت کی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے گروہ میں سمندر پر سوار ہوئے تو انہوں نے پانی پر مردہ مچھلی پائی انہوں نے ابوایوب سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: کیا یہ پاک ہے یہ متغیر نہیں ہوئی؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ حضرت ابو ایوب نے کہا: تم اسے کھاؤ اور میرا حصہ رکھ لو وہ روزے سے تھے۔ جبلہ بن عطیہ سے سنداً روایت کیا ہے کہ ابوطلحہ کے ساتھیوں نے پانی پر تیرتی ہوئی پائی انہوں نے اس کے متعلق ابوطلحہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: مجھے ہدیہ دے دو۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مچھلی پاک ہے، مکڑی پاک ہے(4)۔ دارقطنی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے۔ یہ آثار اس کے قول کو رد کرتے ہیں جو ان کو مکروہ کہتا ہے اور آیت کے عموم کی تخصیص وہ جمہور کی حجت ہے مگر امام مالک نے پانی کے خنزیر کو مکروہ کہا ہے اس کے نام کی وجہ سے لیکن حرام نہیں کیا ہے فرمایا: تم خنزیر کہتے ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: پانی کے خنزیر میں کوئی حرج نہیں۔ لیث نے فرمایا: سمندر کے مردہ میں کوئی حرج نہیں، فرمایا: اسی طرح پانی کا کتا اور پانی کے گھوڑے کا حکم ہے، فرمایا: پانی کا انسان اور پانی کا خنزیر نہیں کھایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کا اس حیوان میں اختلاف ہے جو خشکی اور پانی دونوں جگہوں رہتا ہے کیا اس کا شکار محرم کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ امام مالک، ابومجلز، عطا، سعید بن جبیر وغیرہم نے فرمایا: ہر وہ جانور جو خشکی میں زندگی گزارتا ہے اور اس کے لیے اس میں زندگی ہے تو وہ خشکی کا شکار ہے اگر محرم نے اسے قتل کیا تو فدیہ دے گا۔ ابومجلز نے اس میں مینڈک، کچھوے اور کیکڑے کا اضافہ کیا ہے۔ مینڈک اور اس کی اجناس امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہیں۔ امام شافعی کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مینڈک کو کھانا جائز نہیں اور اس کا قول ان چیزوں میں مختلف ہے جو خشکی میں رہتے ہیں اور ان کے مشابہ ہیں جنہیں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارت، جلد 1، صفحہ 11

2۔ صحیح مسلم، کتاب [illegible]، جلد 2، صفحہ 147

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الصید والذبائح، جلد 4، صفحہ 269

4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 270

نہیں کھایا جاتا جیسے خنزیر، کتا وغیرہ اور صحیح ان تمام چیزوں کا کھانا ہے، کیونکہ انہوں نے خنزیر کے کھانے کے جواز پر نص قائم کی ہے اور وہ خشکی میں اس کے مشابہ ہے جس کو نہیں کھایا جاتا۔ اور ان کے نزدیک مگرمچھ، فرش (سمندری جانور ہے اور دلفین (یہ بھی سمندری جانور ہے) نہیں کھائے جائیں گے اور ہر وہ چیز جس کی کچلیاں (بڑے دانت) ہوں وہ نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر ذی ناب (کچلیاں والا) کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا: ان انواع میں جو پانی سے باہر نہیں نکلتی ہیں وہ یقیناً صید البحر (دریائی شکار) سے ہیں اس پر امام مالک نے مینڈک کے بارے میں ''المدونہ'' میں جو فرمایا اس کا جواب مل گیا، کیونکہ انہوں نے فرمایا: مینڈک دریائی شکار میں سے ہے۔ عطا بن ابی رباح سے اس کے خلاف مروی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ حیوان کی اکثر زندگی کا اعتبار کرتے ہیں ان سے ابن الماء کے متعلق پوچھا گیا کیا وہ خشکی کا شکار ہے یا دریائی شکار ہے؟ انہوں نے کہا: جہاں وہ زیادہ رہتا ہے وہ اس جگہ کا شکار ہے اور جہاں وہ بچے دیتا ہے اس جگہ کا ہے یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے، درست یہ ہے کہ ابن الماء خشکی کا شکار ہے وہ چرتا ہے اور دانہ کھاتا ہے (1)۔ ابن عربی نے کہا: وہ حیوان جو پانی اور خشکی دونوں جگہ رہتا ہے اس میں صحیح یہ ہے کہ اس کو نہ کھایا جائے، کیونکہ اس میں دلیل تحلیل اور دلیل تحریم متعارض ہیں پس احتیاطاً تحریم کی دلیل غالب ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلسَّيَّارَةِ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد مقیم اور مسافر ہیں جیسا کہ ابوعبیدہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے اس مچھلی کو کھایا جب کہ وہ مسافر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی کھایا جب کہ آپ مقیم تھے پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ مقیم کے لیے حلال ہے جس طرح کہ وہ مسافر کے لیے حلال ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ السیارۃ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں جیسا کہ امام مالک اور نسائی کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا عرض کی: ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور ہمارے پاس پانی کم ہوتا ہے اگر ہم اس پانی کے ساتھ وضو کریں تو ہم پیاسے رہ جائیں کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے'' ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے فرمایا: اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے نعم (ہاں) فرما دیتے تو اس کے ساتھ صرف پیاس کے خوف کے وقت وضو کرنا جائز ہوتا، کیونکہ جواب، سوال پر مرتب ہوتا ہے اور اس پر یہ مشکل ہوتا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قاعدہ تاسیس سے آغاز کیا اور شرع نے بیان سے آغاز کیا فرمایا: ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے''۔

میں کہتا ہوں: جواب ان پر مقصود ہوتا اور دوسروں کی طرف متعدی نہ ہوتا اگر شریعت کا یہ حکم ثابت نہ ہوتا کہ شریعت کا ایک شخص پر حکم، تمام لوگوں پر ہوتا ہے مگر تخصیص کے ساتھ جس پر نص وارد ہو جائے جیسے حضرت ابوہریرہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا: ''بکری کا بچہ اس کو تو قربانی کر اور تیرے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے: وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا، تحریم اعیان کی صفت نہیں بلکہ یہ افعال کے متعلق ہوتی ہے اور حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ کا معنی ہے شکار کا فعل تم پر حرام کیا گیا ہے اور وہ شکار کرنے سے منع کرنا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 243
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 833

ہے یا الصید بمعنی المصید ہوگا اس بنا پر کہ مفعول کا فعل کے ساتھ نام رکھا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ اظہر ہے، کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ محرم کے لیے اس شکار کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جو اس کو ہبہ کیا گیا ہو اور اس کا خریدنا اور اس کا شکار کرنا بھی جائز نہیں اور کسی اعتبار سے اس کی ملکیت کی تجدید جائز نہیں اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد: **حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا** عام ہے اور نیز اس کی دلیل حضرت صعب بن جثامہ کی حدیث ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء کا اختلاف ہے اس بارے میں جو محرم شکار میں سے کھاتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی ان کے اصحاب، احمد اور اسحاق سے مروی ہے اور حضرت عثمان بن عفان سے صحیح یہ مروی ہے کہ محرم کے لیے اس شکار کے کھانے میں کوئی حرج نہیں جب کہ وہ اس کے لیے شکار نہ کیا گیا ہو، کیونکہ ترمذی، نسائی اور دارقطنی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خشکی کا شکار تمہارے لیے حلال ہے جب کہ وہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لیے شکار نہ کیا گیا ہو" (1)۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ باب میں احسن حدیث ہے۔

نسائی نے کہا: عمرو بن ابی عمرو، اس حدیث میں قوی نہیں اگرچہ امام مالک نے ان سے روایت کی ہے اگر محرم اس شکار سے کھائے جو اس کے لیے شکار کیا گیا ہے تو وہ دیت دے۔ حسن بن صالح اور اوزاعی کا بھی یہی قول ہے امام مالک کا قول اس شکار کے بارے میں مختلف ہے جو بعینہٖ محرم کے لیے شکار کیا گیا ہے۔ امام مالک کے نزدیک مشہور مذہب یہ ہے کہ محرم اس شکار سے نہ کھائے جو معین محرم یا غیر معین محرم کے لیے شکار کیا گیا ہو اور حضرت عثمان نے جو اپنے ساتھیوں کو کہا: اس کو نہیں لیا، جب شکار کا گوشت پیش کیا گیا جب کہ وہ محرم تھے (آپ نے فرمایا تھا) کھاؤ تم میری مثل نہیں، کیونکہ میری وجہ سے یہ شکار کیا گیا ہے۔ اہل مدینہ کے ایک گروہ نے یہی کہا ہے، امام مالک سے یہ بھی مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور اس کے اصحاب نے کہا: محرم کے لیے شکار کا کھانا ہر حال میں کھانا جائز ہے جب کہ اسے غیر محرم نے شکار کیا ہو، خواہ وہ اس کے لیے شکار کیا گیا ہو یا شکار نہ کیا گیا ہو، کیونکہ الله تعالیٰ کا ظاہر ارشاد ہے: **لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ** تم شکار نہ کرو جب کہ تم محرم ہو۔ الله تعالیٰ نے اس کا شکار حرام کیا ہے اور اسے قتل کرنا محرموں پر حرام کیا ہے نہ کہ وہ حرام کیا ہے جو کسی غیر نے شکار کیا ہے۔ اور بہزی کی حدیث سے حجت پکڑی ہے بہزی کا نام زید بن کعب ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وحشی گدھے کے بارے میں روایت کیا ہے جو زخمی تھا آپ نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا کہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دو۔ یہ امام مالک وغیرہ کی حدیث میں ہے۔ نیز ابو قتادہ کی حدیث سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے کہ انما ھی طُعْمَةٌ أطعمکموھا الله (2) یہ وہ کھانا ہے جو الله نے تمہیں کھلایا ہے۔ یہ حضرت عمر بن خطاب ایک روایت میں حضرت عثمان بن عفان کا قول ہے حضرت ابوہریرہ، حضرت زبیر بن العوام، مجاہد، عطا اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ محرم کے لیے کسی حال میں شکار کا کھانا جائز نہیں ہے خواہ وہ اس کے لیے شکار کیا گیا ہو یا

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 104۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب لحم الصید للمحرم، حدیث 1577، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 380

شکار نہ کیا گیا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول عام ہے: حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ مبہم ہے۔ طاؤس، جابر بن زید، ابوالشعثاء نے بھی یہی فرمایا ہے، ثوری سے بھی یہی مروی ہے اور اسحاق نے بھی یہ کہا ہے اور انہوں نے حضرت صعب بن جثامہ لیثی کی حدیث سے حجت پکڑی ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحشی گدھا ہدیہ پیش کیا جب کہ ابواء میں تھے یا ودان میں تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس کر دیا۔ فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے چہرے پر پریشانی دیکھی تو فرمایا: ''ہم تجھے واپس نہ کرتے مگر ہم احرام باندھے ہوئے ہیں'' (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے ذکر کیا ہے اور یہ لفظ امام مالک کا ہے۔ ابوعمر نے کہا: سعید بن جبیر، مقسم، عطا اور طاؤس کی حدیث سے حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت صعب بن جثامہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحشی گدھے کا گوشت پیش کیا۔ سعید بن جبیر نے اپنی حدیث میں کہا: وحشی گدھے کا پچھلا حصہ پیش کیا آپ نے اسے واپس کر دیا اس کا خون گر رہا تھا گویا وہ اس وقت میں شکار کیا گیا تھا۔ مقسم نے اپنی حدیث میں کہا: وحشی گدھے کی ٹانگ پیش کی۔ عطا نے اپنی حدیث میں کہا: شکار کا بازو پیش کیا گیا تو آپ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا: ہم محرم ہیں۔ طاؤس نے اپنی حدیث میں کہا عضدا من لحم صید شکار کے گوشت میں سے بازو پیش کیا۔ اسماعیل نے علی بن مدینی سے انہوں نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے حسن بن مسلم سے انہوں نے طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے ''مگر ان میں سے بعض''۔ حضرت ابن عباس سے انہوں نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے اسماعیل نے کہا میں نے سلیمان بن حرب کو اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہوئے سنا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شکار کیا گیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا کھانا جائز ہوتا۔ سلیمان نے کہا: وہ چیز جو اس پر دلیل ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شکار کیا گیا تھا حدیث میں ان کا یہ قول ہے کہ آپ نے اسے وہ واپس کر دیا جب کہ اس کے خون کے قطرے گر رہے تھے گویا وہ اس وقت شکار کیا گیا تھا۔

اسماعیل نے کہا: سلیمان نے اس حدیث کی تاویل کی، کیونکہ وہ تاویل کا محتاج تھا۔

رہی امام مالک کی روایت تو وہ تاویل کی محتاج نہیں، کیونکہ محرم کے لیے شکار کو زندہ پکڑنا جائز نہیں اور نہ اس کا ذبح کرنا جائز ہے۔ اسماعیل نے کہا: سلیمان بن حرب کی تاویل پر تمام احادیث مرفوعہ اس میں غیر مختلف ہوں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 8۔** جب کوئی شخص احرام باندھے اور اس کے ہاتھ میں یا اس کے گھر میں اس کے گھر والوں کے پاس شکار ہو تو امام مالک نے کہا: اگر وہ اس کے ہاتھ میں ہو تو اس پر اس کا چھوڑنا واجب ہے اور اگر اس کے گھر والوں کے پاس ہو تو اس کا اس پر چھوڑنا واجب نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل کا قول ہے اور ایک قول میں امام شافعی نے کہا: خواہ اس کے ہاتھ میں ہو یا گھر میں ہو اس پر اس کا چھوڑنا واجب نہیں۔ یہی ابوثور کا قول ہے۔ مجاہد، عبداللہ بن حرث سے اس کی مثل مروی ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے اور ابن ابی لیلیٰ، ثوری، امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا: اس پر اس کا چھوڑنا واجب ہے خواہ وہ اس کے گھر میں ہو یا اس کے ہاتھ میں ہو اگر اس نے اسے نہ چھوڑا تو ضامن ہوگا اس کے چھوڑنے والے قول کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 379

ارشاد ہے: حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا یہ ملک اور تصرف میں عام ہے اور اس کو پکڑے رکھنے والے قول کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز احرام کی ابتدا میں مانع نہیں وہ اس کی ہمیشہ ملک میں رکھنے کے مناسب نہیں، اس کی اصل نکاح ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اگر غیر محرم، مقام حل میں شکار کرے پھر اسے حرم میں لے آئے تو اس میں اس کے لیے ہر قسم کا تصرف جائز ہے (یعنی) ذبح کرنا اس کا گوشت کھانا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جائز نہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہی معنی شکار میں پایا جاتا ہے پس حرم میں حلالی کے لیے جائز ہوگا جیسے روکنا اور شرا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جب محرم، حلالی کی شکار پر راہنمائی کرے پھر حلالی اسے قتل کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ابوثور نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے، یہی ابن الماجشون کا قول ہے۔ کوفیوں، احمد، اسحاق اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے کہا: اس پر جزا ہے کیونکہ محرم نے اپنے احرام کے ساتھ ترک تعرض کا التزام کیا تھا پس وہ دلالت کی وجہ سے ضامن ہوگا جیسے وہ شخص جس کے پاس ودیعت رکھی گئی ہو جب وہ چور کی چوری کرنے پر راہنمائی کرے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اس محرم کے بارے میں اختلاف ہے جب وہ کسی دوسرے محرم کی شکار کی طرف راہنمائی کرے۔ کوفیوں اور اشہب مالکی کا خیال ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر جزا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ابوثور نے کہا: جزا قاتل محرم پر ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ کے وجوب کا تعلق قتل کے ساتھ ہے یہ کسی دوسرے کے انتفاء کی دلیل ہے، کیونکہ وہ دلالت کرنے والا ہے، پس اس کی دلالت کی وجہ سے چٹی لازم نہیں ہوگی جیسے کوئی غیر محرم حرم میں حرم کے شکار پر دلالت کر دے۔ کوفیوں اور اشہب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے استدلال کیا ہے جو ابوقتادہ کی حدیث میں ہے هل اشرتم او اعنتم (2) کیا تم نے اشارہ کیا یا مدد کی ہے؟ یہ جزا کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔ والله اعلم

**مسئلہ نمبر 12**۔ جب کوئی درخت مقام حل میں اُگا ہوا ہو اور اس کی شاخیں حرم میں ہوں پھر شکار اس حصہ سے پکڑا تو اس میں جزا ہے، کیونکہ اس نے وہ حرم سے پکڑا ہے۔ اگر اس کی اصل حرم میں ہو اور اس کی فرع حل میں ہو اس سے پکڑے گئے شکار کے بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ جزا اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے اس کی نفی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۝ یہ اس تحلیل و تحریم کے بعد تنبیہ اور تنبیہ ہے پھر تحذیر میں مبالغہ کے لیے قیامت اور حشر کے امر کو ذکر کیا ہے۔ والله اعلم

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَالْقَلَآىِٕدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝

"بنایا ہے الله تعالیٰ نے کعبہ جو حرمت والا گھر ہے بقا کا باعث لوگوں کے لیے نیز حرمت والے مہینوں کو اور حرم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 689
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 690

کی قربانی اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کو تاکہ تم خوب جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ یہاں جَعَلَ بمعنی خلق ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کعبۃ کو کعبۃ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چکور ہے اور عرب کے اکثر گھر گول اور چکور ہیں۔ بعض نے فرمایا: کعبۃ کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ظاہر اور مشہور ہے پس ہر اٹھی ہوئی چیز بارز (ظاہر) اور کعب کہلاتی ہے خواہ وہ گول ہو یا گول نہ ہو اسی سے کعب القدم اور کعوب القناۃ پاؤں کا ٹخنہ اور قناہ کا قلعہ۔ کعب ثدی المرأۃ جب عورت کے سینہ پر پستان ظاہر ہوں۔ اور اس کو الْبَيْتَ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ چھت اور دیواروں والا ہے یہ البیتیت کی حقیقت ہے اگرچہ اس میں کوئی ساکن نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو الْحَرَامَ کہا، کیونکہ اس نے اسے حرمت والا بنایا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مکہ کو اللہ نے حرم بنایا ہے اور لوگوں نے اس کو حرم نہیں بنایا ہے'' (1)۔ اس کا اکثر تفصیل سے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قِيٰمًا لِّلنَّاسِ یعنی لوگوں کی صلاح اور معاش کا باعث ہے، کیونکہ لوگوں کو اس کے ذریعے امن ملا ہے اس بنا پر یا قیاما بمعنی یقومون ہے۔ بعض نے فرمایا: قِيٰمًا، یقومون بشرائعھا۔ ابن عامر عاصم نے قیماً پڑھا ہے یہ دونوں واو کے ساتھ تھا واو ماقبل کسرہ کی وجہ سے یا سے بدل گئی ہے۔ بعض نے کہا: قوام۔ علماء نے فرمایا: ان اشیاء کو لوگوں کے لیے قیام بنانے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اس کی جبلت میں حسد، مقابلہ، قطع تعلقی ایک دوسرے سے اعراض، لوٹنا، غارت گری، قتل کرنا اور انتقام لینے جیسی صفات بھی پیدا فرمائیں پس حکمت الٰہیہ اور مشیت اولیت میں ضروری تھا کہ کوئی انہیں روکنے والا ہو جس کے ساتھ حالات درست رہیں اور کوئی روکنے والا ہو جس کے ساتھ انجام عمدہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (بقرہ: 30) اللہ تعالیٰ نے انہیں خلافت کا حکم دیا اور ان کے امور کو متحد کیا جو اتحاد انہیں تنازع سے روکے اور وہ انہیں باہمی الفت پر ابھارے اور قطع تعلقی سے روکے، ظالم کو مظلوم سے روکے اور ہر ہاتھ کو اس پر ثابت کرے جس پر وہ غالب ہے۔ ابن القاسم نے روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں مالک نے بتایا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: امام اس سے زیادہ روکتا ہے جتنا کہ قرآن روکتا ہے۔ یہ قول ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور سلطان کا ایک سال کا ظلم لوگوں کے ایک لحہ خلفشار سے کم نقصان دہ ہے پس اللہ تعالیٰ نے اس فائدہ کے لیے خلیفہ بنایا تاکہ امور اس کی رائے پر جاری ہوں اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے امور کے حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں بیت الحرام کی عظمت پیدا فرمائی اور ان کے نفوس میں ہیبت ڈالی۔ اور ان کے درمیان اس کی حرمت کو عظیم کیا پس اس کی طرف پناہ لینے والا محفوظ ہوگا اور جو مجبور کیا جائے گا وہ اس میں محفوظ ہوگا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 100

امن والا، حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کوان کے پاس سے۔

علماء نے فرمایا: جب یہ جگہ مخصوص ہے تو ہر مظلوم یہاں نہیں پکڑا جائے گا اور ہر ڈرنے والا یہاں سے نہیں اٹھایا جائے گا اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینوں کو ایک دوسری پناہ گاہ بنایا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ اسم جنس ہے اور مراد بالا جماع تین مہینے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے دلوں میں ان کی حرمت ثابت فرمائی تھی وہ ان مہینوں میں کسی نفس کو خوف زدہ نہیں کرتے تھے اور نہ ان میں خون کا مطالبہ کرتے تھے اور نہ ان میں بدلہ لیتے تھے حتیٰ کہ ایک شخص اپنے باپ کے قاتل یا بیٹے اور بھائی کے قاتل سے ملتا تو اسے بھی اذیت نہ پہنچاتا تھا انہوں نے ان میں زمانہ کا تہائی حصہ قطع کیا اور ان میں سے تین مہینے متواتر بنائے جن میں وہ آرام وسکون سے رہتے تھے اور امن اور سکون سے زمین میں سفر کرتے تھے اور انہوں نے ایک مہینہ نصف سال میں بنایا تھا وہ بھی محترم تھا اور وہ رجب کا مہینہ ہے اس کو رجب مضر کہا جاتا تھا اور اس کو رجب الاصم بھی کہا جاتا تھا، کیونکہ اس میں لوہے کی آواز نہیں سنی جاتی تھی اس کو منصل الاسنة بھی کہا جاتا تھا، کیونکہ عرب اس مہینہ میں اپنے نیزوں سے لوہا اتار لیتے تھے یہ قریش کا مہینہ ہے۔ اور عوف بن احوص نے اسی نام سے تعبیر کیا ہے:

شهر بني أُميّة والهَدَايا إذا سيقت مُضرّجها الدّماءُ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شہر اللہ کہا یعنی شہر آل اللہ اور اہل حرم کو آل اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ شہر اللہ مراد لیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر سختی فرمائی، کیونکہ بہت سے عرب اس کو حرمت والا مہینہ خیال نہ کرتے تھے (2)۔ ان شاء اللہ مہینوں کے اسماء سورۂ براءۃ میں آئیں گے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کیا اور رسل کرام کی زبانوں پر ہدی اور قلائد کو جاری فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب وہ اونٹ لیتے تھے تو اس کا خون نکالتے تھے یا اس کو جوتوں کا ہار پہنا دیتے تھے یا ایک شخص خود وہ ہار پہن لیتا تھا جیسا کہ سورت کی ابتدا میں گزرا ہے، کوئی اسے پریشان نہیں کرتا تھا جب وہ اسے ملتا تھا اس کے اور اس کی طلب یا ظلم کے درمیان یہ حد اور فیصل ہوتا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کا نظام بھیجا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے حق کو بیان فرمایا اور اپنے دین کو ایک نظم میں پرویا اور حق اپنے نصاب کی طرف لوٹا اور امامت اس کی طرف منسوب کی گئی اور اس کا وجوب مخلوق پر رکھا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور: 55) وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے کہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں۔

سورۂ بقرہ میں امامت کے احکام گزر چکے ہیں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا، ذٰلِكَ کا اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو باعث بقا بنایا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کیا تا کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے امور کی تفاصیل جانتا ہے اور اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہاری پہلی اور بعد والی مصلحتوں کو جانتا ہے پس اپنے کفر کی حالت پر اس کے لطف کو دیکھو (3)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 243 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 244 3۔ ایضاً

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا (بھی) ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم (بھی) ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ یہ ڈرانا ہے وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ یہ امید دلانا ہے اس کا معنی گزر چکا ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝

''نہیں (ہمارے) رسول پر کوئی ذمہ داری سوائے پیغام پہنچانے کے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو چھپا رہے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ہدایت دینا، توفیق بخشنا اور ثواب دینا اس کے ذمہ نہیں اس پر تو صرف پیغام پہنچانا ہے اس میں قدریہ کا رد ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ البلاغ کی اصل البلوغ ہے جس کا معنی پہنچنا ہے۔ بَلَغَ يَبْلُغُ بُلوغا أَبلغه إِبلاغا وتَبَلَّغ تَبلُّغا، بَالَغه مبالغةً، بلَّغه تَبلِيغا اور اسی سے البلاغة ہے کیونکہ اس کا معنی ہے لفظ کی خوبصورتی میں نفس تک معنی کو پہنچانا۔ تبالغ الرجل جب کوئی بلاغت کو استعمال کرے اور وہ بلیغ نہ ہو اس میں بلاغ ہے جس کا معنی کفایہ ہے، کیونکہ وہ حاجت کی مقدار پہنچاتا ہے۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو کہا جاتا ہے: بدأ السیٔ راز ظاہر ہوا أبداہ صاحبہ یُبدیہ اس نے اسے ظاہر کیا۔ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝ یعنی کفر اور نفاق میں سے جو تم اپنے دلوں میں چھپاتے ہو۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

''آپ فرما دیجئے: نہیں برابر ہو سکتا ناپاک اور پاک اگرچہ حیرت میں ڈال دے تجھے ناپاک کثرت سے، ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اے عقل والو! تا کہ تم نجات پا جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حسن نے کہا: الْخَبِيْثُ اور الطَّيِّبُ سے مراد حلال اور حرام ہے۔ سدی نے کہا: مومن و کافر ہیں۔ بعض نے کہا: مطیع اور عاصی ہیں۔ بعض نے کہا: ردی اور جید ہے۔ یہ بطور مثال ہے صحیح یہ ہے کہ لفظ ان تمام امور کو شامل ہے مکاسب، اعمال، لوگ، علوم و معارف وغیرہ سب متصور ہو سکتے ہیں اس میں سے خبیث فائدہ نہیں دیتا اور نہ اس کا انجام اچھا ہوتا ہے اگرچہ زیادہ بھی ہو اور پاکیزہ اگرچہ تھوڑا بھی نفع بخش ہوتا ہے اور انجام کے اعتبار سے عمدہ ہوتا ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (الاعراف: 58) اور جو سرزمین عمدہ زرخیز ہے (کثرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 244

سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا۔

اس آیت کی مثال یہ ارشاد بھی ہے: اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (ص) کیا ہم بنا دیں گے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بنا دیں گے پرہیزگاروں کو فجار کی طرح۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (الجاثیہ: 21) کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

خبیث، طیب کے مساوی نہیں ہوتا نہ مقدار میں، نہ خرچ کرنے میں، نہ مکان میں، نہ ذہاب میں۔ پاکیزہ دائیں جہت سے لیتا ہے خبیث بائیں جہت سے لیتا ہے، پاکیزہ جنت میں ہے، خبیث دوزخ میں ہے۔ یہ بالکل واضح ہے اور برابری کی حقیقت ایک جہت میں ہمیشہ رہنا ہے اس کی مثل استقامت (سیدھا ہونا) ہے اور اس کی ضد اعوجاج (ٹیڑھا ہونا) ہے جب معاملہ اس طرح ہے تو یہ مسئلہ بنتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** بعض علماء نے فرمایا: بیع فاسد فسخ کی جائے گی اور بازار کے حوالہ سے قائم نہیں رکھی جائے گی اور نہ بدن کے تغیر سے قائم رکھی جائے گی، کیونکہ اس کے قائم رکھنے میں بیع صحیح کے ساتھ برابر ہو جائے گی، بلکہ اسے ہمیشہ فسخ کیا جائے گا اور مشتری کو ثمن واپس کی جائے گی اگر وہ اس پر قابض ہو چکا ہو اگر اس (بائع) کے ہاتھ میں تلف ہو گئی تو وہ اس کا ضامن ہوگا، کیونکہ وہ امانت پر قابض نہیں ہوا تھا بلکہ شبہ عقد کی وجہ سے قابض ہوا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: بیع کو فسخ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ بیع جب فسخ کی جائے گی اور اس کے فوت ہونے کے بعد رد کی جائے گی تو بائع پر اس میں ضرر اور غبن ہوگا اور وہ سامان جو سو روپے کے برابر تھا وہ جب بائع کو لوٹائی جائے گی تو وہ بیس روپے کے برابر ہوگا اور مال میں عقوبت نہیں ہے۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ آیت عام ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد ہے''(1)۔

میں کہتا ہوں: جب مسائل فقہ میں عدم استواء میں اس معنی کو تلاش کیا جائے گا تو وہ کثرت سے ملیں گے اس میں سے غاصب کا مسئلہ بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** جس نے مغصوبہ جگہ پر مکان بنایا، درخت لگایا تو اس عمارت اور درخت کو کاٹنا لازم ہے، کیونکہ وہ خبیث ہے اور اسے لوٹایا جائے گا، جب کہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے: اس کو نہیں اکھیڑا جائے گا اور اس زمین کے مالک سے قیمت لے لے گا اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول لیس لِعرقٍ ظالم حقٌّ(2) 'ظالم کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔ رد کرتا ہے۔ ہشام نے کہا: العرق الظالم سے مراد وہ ہے جو دوسرے کی زمین میں درخت لگاتا ہے تاکہ اس کا مستحق ہو جائے۔ امام مالک

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 287 2۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، جلد 1، صفحہ 314

نے کہا العرق الظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جو بغیر حق کے کوئی چیز لیتا ہے یا کنواں کھودتا ہے یا درخت لگاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو زمین غصب کرے پھر اسے کاشت کرے یا کرائے پر دے یا گھر غصب کرے اس میں رہائش رکھے یا اسے کرائے پر دے پھر اس کا مالک اس کا مستحق ہو جائے تو رہائش رکھنے کا کرایہ غاصب پر ہوگا اور غاصب نے دوسرے سے جو کرایہ لیا تھا وہ بھی واپس کرنا ہوگا اور جب کوئی شخص اس گھر میں نہ رہے یا زمین کو کاشت نہ کرے اور اسے معطل کر دے تو امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس پر کچھ نہیں ہے اور ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کرایہ ہے۔ وقار نے اس کو اختیار کیا ہے، یہی امام شافعی کا مذہب ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ظالم کے لیے کوئی حق نہیں ہے''۔

ابو داؤد نے ابو زبیر سے روایت کیا ہے کہ دو آدمی جھگڑا لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ایک نے دوسرے کی زمین میں کھجور کے درخت لگائے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ زمین والے کے حق میں کیا اور کھجوروں والے کو کہا کہ وہ اپنی کھجوریں نکال لے فرمایا: میں نے دیکھا کہ ان کھجوروں کی جڑوں کو کلہاڑی کے ساتھ مارا گیا حتیٰ کہ وہ نکالی گئیں جب کہ وہ مکمل کھجوریں تھیں۔ یہ نص ہے۔ ابن حبیب نے کہا: اس میں حکم یہ ہے کہ زمین والے کو ظالم پر اختیار ہے اگر چاہے تو اکھیڑ ہوئے درختوں کی قیمت دے کر انہیں روک لے اگر چاہے تو انہیں اکھیڑ دے اور اکھیڑنے کی اجرت غاصب پر ہوگی۔

دار قطنی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی قوم کے گھروں میں ان کی اجازت سے گھر بنایا تو اسے گھر کی قیمت دی جائے گی اور جس نے ان کی اجازت کے بغیر گھر بنایا تو اس کے لیے گھر توڑنا ہوگا'' (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس کے لیے قیمت ہوگی، کیونکہ اس نے ایسی جگہ پر مکان بنایا جس کی منفعت کا وہ مالک تھا یہ اس طرح ہے کہ جس نے کسی شبہ کی وجہ سے مکان بنایا یا درخت لگائے تو اس کے لیے حق ہے اگر مال کا مالک چاہے تو اسے اس کی قیمت دے دے جس حالت پر وہ قائم ہے اگر وہ انکار کرے تو جس نے عمارت بنائی یا درخت لگائے اسے کہا جائے گا: اسے خالی زمین کی قیمت دے دے۔ اور اگر وہ انکار کرے تو دونوں شریک ہوں گے۔ ابن الماجشون نے کہا: اس کے اشتراک کی تفسیر یہ ہے کہ خالی زمین کی قیمت لگائی جائے گی پھر اس کی عمارت کی قیمت لگائی جائے گی عمارت کے ساتھ والی کی قیمت خالی زمین کی قیمت سے بڑھ جائے گی تو کام کرنے والا اس میں زمین کے مالک کے ساتھ شریک ہوگا اگر وہ پسند کریں تو تقسیم کر لیں یا ویسے روکے رکھیں۔ ابن الجہم نے کہا: جب زمین کا مالک عمارت کی قیمت دے گا اور اپنی زمین لے گا تو اس کے لیے گزشتہ سالوں کا کرایہ ہوگا۔ ابن القاسم وغیرہ سے مروی ہے جب کوئی شخص کسی کی زمین میں اس کی اجازت سے مکان بنائے تو پھر اس کے لیے اس کا نکالنا واجب ہو جائے تو وہ اسے اپنی کھڑی ہوئی عمارت کی قیمت دے گا۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''اس کے لیے قیمت ہے'' اور اس پر اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خبیث پر تعجب نہیں کرتے بعض نے فرمایا مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ دار قطنی، باب المراۃ تقتل إذا ارتدت، جلد 4، صفحہ 243

ذات ہے اور آپ کا اعجاب یہ ہے کہ آپ نے جو کفار کی کثرت اور مال حرام کی کثرت کا اور مومنین کی قلت اور حلال مال کی قلت کا مشاہدہ کیا تو تعجب کیا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ۝

''اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر ظاہر کی جائیں تمہارے لیے تو بری لگیں تمہیں اور اگر پوچھو کے ان کے متعلق جب کہ اتر رہا ہے قرآن تو ظاہر کر دی جائیں گی تمہارے لیے معاف کر دیا ہے الله نے ان کو اور الله بہت بخشنے والا بڑے حلم والا ہے۔ تحقیق پوچھا تھا ان کے متعلق ایک قوم نے تم سے پہلے پھر وہ ہو گئے ان احکام کا انکار کرنے والے''۔

ان آیات میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ بخاری اور مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے ایک شخص نے پوچھا: اے الله کے نبی! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: ''تیرا باپ فلاں ہے(1)'' تو یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الله کی قسم! تم مجھ سے کسی چیز کے بارے نہیں پوچھو گے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا جب تک میں اس جگہ میں ہوں (2)'' ایک شخص اٹھا اور پوچھا: یا رسول الله! میں کہاں داخل ہوں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آگ میں'' حضرت عبدالله بن حذافہ اٹھے پوچھا: یا رسول الله! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا؟ ''تیرا باپ حذافہ ہے'' آگے پوری حدیث ذکر کی۔ ابن عبدالبر نے کہا: حضرت عبدالله بن حذافہ پہلے اسلام لے آئے تھے انہوں نے حبشہ کی زمین کی طرف دوسری ہجرت کی تھی اور بدر میں شریک ہوئے تھے اور ان میں مزاح کی صفت تھی ان کو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط دے کر کسریٰ کی طرف بھیجا تھا جب انہوں نے کہا: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا باپ حذافہ ہے'' ان کی والدہ نے انہیں کہا: میں نے تجھ سے زیادہ نافرمان بیٹا نہیں سنا تو امن میں تھا کہ تیری ماں نے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح گناہ کیا ہوتا اور تو اسے لوگوں کے سامنے رسوا کرتا۔ حضرت عبدالله نے کہا: الله کی قسم! اگر آپ مجھے کالے غلام کے ساتھ لاحق کر دیتے تو میں اس کے ساتھ لاحق ہو جاتا۔ ترمذی اور دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 665 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 263

(آل عمران: 97) لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال میں حج فرض ہے؟ آپ ﷺ خاموش ہو گئے لوگوں نے پھر کہا: کیا ہر سال میں حج فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا (1)"۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ الایہ۔

یہ لفظ دارقطنی کے ہیں امام بخاری سے اس حدیث کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: یہ حسن ہے مگر مرسل ہے ابوالبختری نے حضرت علی سے ملاقات نہیں کی اور اس کا نام سعید ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے ابوعیاض عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے بھی روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے" ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا: یا رسول اللہ! ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا، اس نے پھر سوال لوٹایا اور کہا: یا رسول اللہ! ہر سال میں حج فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قائل کون ہے؟ انہوں نے کہا: فلاں۔ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا، اگر واجب ہو جاتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے اگر تم اس کی طاقت نہ رکھتے تو تم کفر کرتے" (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ، الایۃ۔

حسن بصری نے اس آیت میں فرمایا: لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے امور جاہلیت کے متعلق پوچھا جن کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا سوال کی کوئی وجہ نہیں تھی ان چیزوں کے متعلق جن کو اللہ نے معاف کر دیا تھا۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس قوم کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے بحیرہ، سائبۃ، وصیلۃ، حام کے بارے میں پوچھا (3)، یہ سعید بن جبیر کا قول ہے اور فرمایا: کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بعد میں فرمایا: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىِٕبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ۔

میں کہتا ہوں: صحیح اور مسند میں کفایت ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ آیت تمام کے جواب میں نازل ہوئی ہو سوال قریب قریب تھے۔ اشیاء کا وزن افعال ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ حمراء کے مشابہ ہے۔ یہ کسائی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا وزن افعلاء ہے جیسے تیرا قول ہے ھین واھوناء۔ فراء اور اخفش سے مروی ہے اور اس کی تصغیر میں اُشَیاء کہا جاتا ہے۔ مازنی نے کہا: اس کی تصغیر شہیات بنانا واجب ہے جس طرح اصدقاء کی تصغیر بنائی جاتی ہے اور مؤنث میں صدیقات اور مذکر میں صدیقون ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عون نے کہا: میں نے نافع سے لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ الخ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ہمیشہ کچھ مسائل ناپسند کیے جاتے تھے۔ مسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کرنا، بچیوں کو زندہ درگور کرنا، حقوق ادا نہ کرنا اور منہیات کا ارتکاب کرنا حرام کیا ہے اور تمہارے لیے تین چیزوں کو ناپسند کیا ہے قیل وقال، کثرت سوال اور مال کا ضائع کرنا" (4)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 100
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، جلد 2، صفحہ 282
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 698
4۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ، جلد 2، صفحہ 75

بہت سے علماء کا قول ہے کہ کثرت سوال سے مراد خواہ مخواہ فقہی مسائل کثرت سے پوچھنا ہے، غلط سوال کرنا اور مسائل میں تشقیق پیدا کرنا ہے اور جو احکام نازل نہیں ہوئے ان کا موجب بننا ہے۔ سلف صالحین اس صورت کو ناپسند فرماتے تھے اور اس کو تکلیف (احکام کے نزول کا موجب بننا) سے شمار کرتے تھے اور وہ کہتے تھے: جب مسئلہ درپیش ہوگا تو اس مسئلہ کی توفیق دی جائے گی۔ امام مالک نے کہا: میں نے اس شہر کے اہل کو پایا ان کے پاس کتاب وسنت کے علاوہ علم نہ تھا جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو امیر موجود علماء کو جمع کرتا اور جس پر علماء متفق ہو جاتے اسے نافذ کر دیتا تم کثرت سے سوال کرتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کو ناپسند فرمایا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: کثرت سوال سے مراد لوگوں سے اصرار کے ساتھ اور کثرت کے لیے لوگوں سے اموال اور حوائج کا کثرت سے سوال کرنا ہے۔ یہ بھی امام مالک کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کثرت مسائل سے مراد لوگوں کے خواہ مخواہ بلا ضرورت احوال پوچھنا یہاں تک کہ وہ لوگوں کی پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرے اور ان کی برائیوں پر اطلاع کا موجب بنے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے: وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (الحجرات: 12) ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہمارے بعض اصحاب نے کہا: جب کسی کو کھانا پیش کیا جائے تو وہ یہ نہ پوچھے کہ یہ کہاں سے آیا ہے یا اس کو کوئی چیز پیش کی جائے جس کو وہ خریدے تو وہ یہ نہ پوچھے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ مسلمانوں کے امور کو سلامتی اور صحت پر محمول کرے۔

میں کہتا ہوں: حدیث کو عموم پر محمول کیا جائے تو وہ ان تمام وجوہ کو شامل ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: ایک غافل قوم نے پیش آنے والے مسائل کے متعلق سوالات کی تحریم کا اعتقاد رکھا ہے حتیٰ کہ انہوں نے اس آیت کے ساتھ تعلق جوڑا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ یہ آیت صریح ہے کہ وہ سوال جس سے منع کیا گیا ہے وہ ہے جس کے جواب میں کوئی تکلیف واقع ہو اور وقت کے مسائل کے جواب میں کوئی تکلیف واقع نہیں ہوتی پس یہ آپس میں جدا ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن عربی کا یہ قول کہ "ایک غافل قوم نے اعتقاد رکھا ہے"۔ اس میں قبح ہے۔ بہتر یہ تھا کہ یوں کہتے "ایک قوم کا نظریہ پیش آنے والے مسائل کی تحریم کا ہے کیونکہ یہ اس کی عادت پر جاری ہوا ہے" ہم نے کہا: بہتر یہ تھا، کیونکہ سلف صالحین کی قوم اس کو ناپسند کرتی تھی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس شخص پر لعنت کرتے تھے جو ایسا مسئلہ پوچھتا جو پیش نہیں آیا ہوتا تھا۔ یہ دارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے اور زہری سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت زید بن ثابت انصاری کہتے تھے جب ان سے کسی امر کے متعلق پوچھا جاتا تھا کیا مسئلہ درپیش ہے؟ اگر لوگ کہتے: ہاں۔ تو اس کا حل بیان فرماتے جو اس کے متعلق جانتے تھے۔ اگر لوگ کہتے کہ یہ مسئلہ درپیش تو نہیں ہے، تو فرماتے: اس کو چھوڑ و حتیٰ کہ یہ پیش آجائے۔

حضرت عمار بن یاسر سے سند کے ساتھ مروی ہے کہ ان سے کسی مسئلہ کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ کہتے: یہ مسئلہ بھی پیش ہے؟ وہ کہتے: نہیں، تو آپ فرماتے: ہمیں چھوڑ و حتیٰ کہ وہ مسئلہ پیش ہو جائے، اس وقت تمہارے لیے اس کو بیان کرنے کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 700

کوشش کریں گے۔ دارمی نے کہا ہمیں عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ابن فضیل نے بیان کیا انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اصحاب رسول سے بہتر قوم نہیں دیکھی انہوں نے صرف تیرہ مسائل پوچھے حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا وہ تمام سوالات قرآن میں ہیں ان میں سے یہ ہیں۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ (البقرہ:217)

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (البقرہ:222) صحابہ کرام صرف وہ پوچھتے تھے جو انہیں نفع دیتا تھا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن عبدالبر نے کہا: آج کے سوال سے یہ کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی تحریم اور تحلیل نازل ہوگی جو سمجھنے کے لیے علم میں رغبت کی وجہ سے اور اپنی ذات سے جہالت کی نفی کی وجہ سے اس معنی کو حاصل کرنے کے لیے دین میں اس پر وقوف واجب ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جہالت کا علاج سوال ہے۔ جس نے عناد کی بنا پر بغیر سیکھنے اور سمجھنے کی نیت کے سوال کیا تو وہ ایسا شخص ہے جس کا نہ قلیل سوال حلال ہے نہ کثیر حلال ہے۔ ابن عربی نے کہا: عالم کے لیے مناسب ہے کہ وہ ان چیزوں میں مشغول ہوں وسیع دلائل، نظر کے راستوں کی وضاحت کرنا، اجتہاد کے مقدمات کو حاصل کرنا، استمداد پر معین آلہ کو شمار کرنا۔ جب کوئی مسئلہ پیش ہوگا وہ حل ہو جائے گا اور اس کا ادراک ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ صواب کا راستہ کھول دے گا(1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ اس میں غموض اور پوشیدگی ہے، کیونکہ آیت کی ابتدا میں سوال سے نہی وارد ہوئی پھر فرمایا: وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ یعنی پھر ان کے لیے سوال کو مباح کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اگر تم ان کے علاوہ مسائل پوچھو گے جن میں حاجت ہوگی۔ پس مضاف حذف کیا گیا ہے اور اس کو غیر حذف پر محمول کرنا درست نہیں۔ جرجانی نے کہا: عَنْهَا کی ضمیر دوسری اشیاء کی طرف لوٹ رہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) یعنی حضرت آدم علیہ السلام پھر فرمایا: ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً (المومنون:13) یعنی ابن آدم کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو نطفة فی قرار مکین نہیں بنایا تھا لیکن جب انسان کا ذکر کیا گیا تو وہ حضرت آدم ہے جو اپنی مثل انسان پر دلیل ہے یہ قرینۂ حال کے ساتھ تھا معنی یہ ہے کہ اگر تم اشیاء کے متعلق سوال پوچھو گے جب تحلیل یا تحریم یا حکم نازل کیا جائے گا یا تمہیں تفسیر کی حاجت ہوگی جب تم سوال کرو گے تو اس وقت تمہارے لیے حکم ظاہر کر دیا جائے گا اس نوع نے سوال کو مباح کر دیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مطلقہ، اور وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اور حاملہ عورت کی عدت بیان فرمائی اور ان عورتوں کی عدت کا ذکر نہیں ہوا جو حیض والی نہیں تھیں اور حاملہ بھی نہیں تھیں لوگوں نے ان کے متعلق پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی وَ الّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ (طلاق:4) پس سوال سے نہی اس صورت میں ہے جب سوال کی حاجت نہ ہو مگر جب حاجت ہو تو پھر سوال کرنا منع نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو معاف کر دیا جو ان سے پہلے ہو چکا۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 700

بعض علماء نے فرمایا: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے متعلق سوال کرنے کو معاف کر دیا جو انہوں نے امور جاہلیت سے اور جو ان جیسے تھے، کے متعلق پوچھا تھا۔ بعض نے فرمایا: العفو بمعنی ترک ہے یعنی اس نے ترک فرما دیا اور جس کے متعلق حلت اور حرمت کا حکم معروف نہیں ہے وہ معاف ہے پس تم ان کے متعلق بحث نہ کرو شاید تمہارے لیے اس کا ظاہر ہو جائے تو وہ تمہیں تکلیف دے۔ عبید بن عمیر فرمایا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا اور حرام فرمایا جس کو اس نے حلال فرمایا اس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام فرمایا اس سے اجتناب کرو اور ان کے درمیان کچھ چیزوں کو چھوڑ دیا نہ انہیں حلال فرمایا اور نہ انہیں حرام فرمایا پس یہ اللہ کی طرف سے معاف ہیں پھر یہ آیت پڑھی۔

دارقطنی نے ابوثعلبہ خشنی سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر فرمائے ہیں پس تم انہیں ضائع نہ کرو اور بعض چیزوں کو حرام کیا ہے پس تم ان کی پردہ دری نہ کرو اور بعض حدود مقرر فرمائی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے دانستہ سکوت فرمایا ہے ان سے بحث نہ کرو'' (1)۔

اس تقدیر کی بنا پر کلام میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی ان چیزوں کے متعلق مت پوچھو جن کو اللہ نے معاف فرمایا ہے اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں تکلیف ہو یعنی خود ہی اس نے ان کا ذکر نہیں کیا پس ان میں کوئی حکم ثابت نہیں کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ سے درگزر فرمایا ہے جو گزر چکا اگرچہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا تھا پس تم آئندہ ایسے مسائل نہ پوچھنا، پس عنہا کی ضمیر کا مرجع مسئلہ ہے یا سوالات ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۝ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم سے پہلے ایک قوم تھی کہ انہوں نے اس کی مثل آیات کا سوال کیا جب انہیں وہ عطا کی گئیں اور ان پر احکامات فرض کیے گئے تو انہوں نے ان کا انکار کیا اور کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے اونٹنی کا سوال کیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نے مائدہ (دسترخوان) کا سوال کیا تھا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے ڈرایا ہے جس میں پہلی قومیں مبتلا ہوئی تھیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 8**۔ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ جو تم نے سوال کی کراہیت اور اس کے متعلق نہی کا ذکر کیا ہے اس کے معارض یہ ارشاد ہے فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (النحل) پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس کا حکم دیا ہے وہ اس کے متعلق ہے جس کا وجوب ثابت ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا ان پر واجب ہے اور جس کے متعلق نہی وارد ہے وہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مکلف نہیں کیا ہے اور اس کا اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ مسلم نے حضرت عامر بن سعد سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الصید والذبائح، حدیث نمبر 104، صفحہ 298

نے فرمایا: ''مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جو کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کرے جو مسلمانوں پر حرام نہ کی گئی ہو پھر اس کے سوال کی وجہ سے ان پر حرام کر دی گئی ہو'' (1)۔ قشیری ابونصر نے کہا: اگر عجلانی زنا کے متعلق سوال نہ کرتے تو لعان ثابت نہ ہوتا۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: یہ اس پر محمول ہے جو کسی چیز کے متعلق عبث سوال کرتا ہے پس اس کے برے ارادہ کی وجہ سے اس چیز کی تحریم کے ساتھ سزا دی گئی اور تحریم عام ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس حدیث کے ساتھ قدریہ کا کوئی تعلق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے سبب اور علت کی وجہ سے کوئی کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے بلکہ سبب اور داعی اس کے افعال میں سے ایک فعل ہے لیکن قضاوقدر پہلے طے کر چکی ہے کہ جس چیز کے متعلق سوال کیا گیا اس کو حرام کر دیا جائے گا جب اس کے بارے سوال واقع ہوگا نہ یہ کہ سوال تحریم کا موجب اور اس کی علت ہے اس کی مثالیں بہت ہیں لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ۝ (الانبیاء) نہیں پرسش کی جاسکتی اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے اور ان (تمام سے) باز پرس ہوگی۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىٕبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۝

''نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام لیکن جنہوں نے کفر کیا وہ تہمت لگاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹی اور اکثر ان میں سے کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ یہاں جعل بمعنی سمی (نام رکھنا) ہے جیسے ارشاد فرمایا: اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (الزخرف:3) یعنی ہم نے اس کا نام قرآن عربی رکھا۔ اس آیت میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نام نہیں رکھا نہ حکم بنایا ہے اور نہ اس کا شرعاً مکلف بنایا ہے مگر اس نے اپنے علم سے فیصلہ کیا ہے اور اپنی قدرت وارادہ سے مخلوق کو پیدا کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیر وشر، نفع وضرر، طاعت ومعصیت میں سے ہر چیز کا خالق ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىٕبَةٍ، مِنْ زائدہ ہے بحیرہ فعلیۃ کے وزن پر بمعنی مفعولہ ہے یہ نطیحہ اور ذبیحہ کے وزن پر ہے۔ صحیح میں سعید بن مسیب سے مروی ہے بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ بتوں کی وجہ سے استعمال نہیں کیا جاتا تھا اس اونٹنی کا کوئی بھی دودھ نہیں نکالتا تھا اور سائبہ وہ اونٹنی ہوتی ہے جس کو لوگ اپنے بتوں کے لیے چھوٹ دیتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: البحیرۃ سے مراد لغت میں وہ اونٹنی ہے جس کے کان کٹے ہوئے ہوں۔ کہا جاتا ہے: بحرت اذن الناقۃ یعنی میں نے اونٹنی کے کان کاٹ دیے (2)۔ الناقۃ بحیرۃ و مبحورۃ۔ البحر (دریا) تخلیۃ (تنہائی) کی علامت تھا۔ ابن سیدہ نے کہا: کہا جاتا ہے بحیرہ وہ اونٹنی ہے جو بغیر چرواہے کے چھوڑی گئی ہو۔ پالتو اونٹنی کو بحیرہ کہا جاتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 262 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 701

ابن اسحاق نے کہا: البحیرہ، یہ سائبہ کی بچی ہے اور سائبہ وہ اونٹنی ہے جو متواتر دس اونٹنیاں جنم دے درمیان میں مذکر بچہ نہ ہو نہ اس پر سواری کی جاتی تھی اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی تھی اور نہ اس کا دودھ، سوائے مہمان کے کوئی پیتا تھا جو اس کے بعد بھی بچی جنم دیتی تو اس بچی کے کان کاٹے جاتے تھے اور اسے بھی ماں کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا تھا اس پر نہ سواری کی جاتی تھی نہ اس کی اون کاٹی جاتی تھی اور اس کا دودھ سوائے مہمان کے کوئی نہیں پیتا تھا جیسا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا جاتا تھا یہ بحیرہ سائبہ کی بیٹی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب اونٹنی پانچ بطنوں سے مادہ ہی جنم دیتی تو اس کے کان کاٹ دیئے جاتے اور حرام کر دی جاتی تھی۔

محرّمه لا یَطعم الناس لحمها　　ولا نحن فی شئ كذاك البحائر

ابن عزیز نے کہا: بحیرہ وہ اونٹنی ہے جو پانچ بچے جنم دیتی جب پانچواں مذکر ہوتا تو اسے ذبح کرتے اور اسے مرد اور عورتیں کھاتے اگر پانچواں بچہ مادہ ہوتا تو اس کے کان کاٹ دیتے اور اس کا گوشت اور دودھ عورتوں پر حرام ہوتا۔ عکرمہ نے کہا: جب وہ مر جاتی تو عورتوں کے لیے حلال ہوتی۔ اور سائبہ وہ اونٹ ہے جو نذر کی وجہ سے چھوڑا جاتا تھا جو انسان پر ہوتی تھی وہ اس طرح نذر مانتا تھا کہ اگر اللہ نے اس کو مرض سے صحت بخشی یا اسے گھر پہنچایا تو وہ ایسا کرے گا، وہ اونٹ نہ تو کسی چراگاہ سے روکا جاتا اور نہ کسی پانی سے اور نہ کوئی اس پر سوار ہوتا۔ ابو عبیدہ نے اس کے متعلق کہا ہے، شاعر نے کہا:

وسائبة لله تَنمِس تَشکُّرا　　إنِ الله عافی عامراً او مُجاشِعا

وہ کبھی اونٹنی کے علاوہ چیزوں کو بھی چھوڑ دیتے تھے، وہ جب غلام کو چھوڑتے تو اس پر ولاء نہ ہوتی تھی۔ بعض نے فرمایا: سائبۃ وہ اونٹنی ہے جو چھوڑی گئی ہو اس پر کوئی قید نہ ہو اور نہ اس کا چرواہا ہو(1)۔ فاعل بمعنی مفعول ہے جیسے عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ۝ (القارعۃ) بمعنی مرضیۃ ہے یہ سابت الحیۃ وانسابت سے مشتق ہے شاعر نے کہا۔

عقرتم　ناقة　كانت　لربی　و　سائبةً　فقوموا　للعِقاب

رہی وصیلۃ اور حام تو ابن وہب نے کہا: زمانہ جاہلیت کے لوگ بتوں کے لیے اونٹ اور بکریاں چھوڑ دیتے تھے۔ حام اونٹوں میں سے ہے نر جب اپنی ضربیں پوری کر لیتا تو اس پر وہ موروں کے پر لگا دیتے تھے اور اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اور رہی وصیلۃ یہ بکریوں میں سے ہے جب وہ ایک مادہ کے بعد دوسری مادہ کو جنم دیتی تو اسے چھوڑ دیتے تھے۔ ابن عزیز نے کہا: وصیلۃ بکریوں میں ہے فرمایا: جب بکری سات بچے جنم دے دیتی تو وہ دیکھتے تھے اگر ساتواں بچہ مذکر ہوتا تو اسے ذبح کیا جاتا اور اس سے مرد اور عورتیں کھاتی تھیں اگر مونث ہوتا تو وہ بکریوں میں چھوڑی جاتی۔ اگر وہ مذکر اور مونث دونوں بچے اکٹھے جنم دے دیتی تو وہ کہتے: وصلت اخاھا وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل گئی پس اسے اس کے مرتبہ کی وجہ سے ذبح نہ کیا جاتا تھا اس کا گوشت عورتوں پر حرام ہوتا تھا اور مادہ کا دودھ بھی عورتوں پر حرام ہوتا تھا مگر ان میں سے کوئی ایک مر جاتا تو اسے مرد اور عورتیں کھاتے تھے۔ حامی وہ نر ہے جس کی اولاد کی اولاد کی حفاظت کی گئی ہو۔

حَماها أبو قابُوس فی عِزِ مُلْكه　　كما قد حَمَی أولادَ أولادِه الفحلُ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 701

کہا جاتا ہے: جب اس کی پیٹھ سے دس بچے پیدا کیے گئے ہوں، تو کہتے ہیں: اس نے اپنی پیٹھ محفوظ کر لی بس اس پر نہ سواری کی جاتی تھی اور نہ ہی اسے گھاس اور پانی سے روکا جاتا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: وصیلۃ وہ بکری ہے جو پانچ بطنوں سے متواتر دس بچیاں جنم دے اور ان کے درمیان مذکر نہ ہو۔ عربوں نے کہا: وصلت۔ اس کے بعد جو جنم دیتی وہ ان کے مردوں کے لیے ہوتا عورتوں کے لیے نہ ہوتا مگر ان میں سے کوئی مرجاتا تو اس کے کھانے میں مذکر اور مونث شریک ہوتے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو آگ میں اپنی انتڑیاں کھینچتے ہوئے دیکھا یہ پہلا شخص تھا جس نے بتوں کے نام پر جانور چھوڑے تھے (2)'' ایک روایت میں ہے ''عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف جو بنی کعب سے تھا وہ اپنی انتڑیاں آگ میں کھینچ رہا تھا''۔ حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثم بن الجون سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ''عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو آگ میں اپنی انتڑیاں کھینچتے ہوئے دیکھا میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جو تجھ سے زیادہ اس کے مشابہ ہو اور کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ تیرے مشابہ ہو''۔ اکثم نے کہا: مجھے اندیشہ ہے یا رسول اللہ کہ اس کی مشابہت مجھے نقصان دے گی۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں تو مومن ہے وہ کافر ہے یہ پہلا شخص تھا جس نے دین اسماعیل میں تبدیلی کی تھی اور بحیرہ کو بحیرہ بنایا سائبۃ کو بتوں کے نام پر چھوڑا اور حامی کو حامی بنایا''۔ ایک روایت میں ہے ''میں نے ایک چھوٹا سا آدمی دیکھا جس کے بال کانوں کی لوؤں تک تھے اپنی انتڑیاں آگ میں کھینچ رہا تھا''۔

ابن القاسم کی روایت میں ہے امام مالک نے زید بن اسلم سے انہوں نے عطا بن یسار سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: وہ دوزخیوں کو اپنی بدبو کی وجہ سے اذیت دیتا ہے، یہ حدیث مرسل ہے۔ ابن عربی نے ذکر کی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلا شخص تھا جس نے یہ بدعت نکالی تھی وہ جنادہ بن عوف ہے اور صحیح میں کفایت ہے۔ ابن اسحاق نے روایت کیا ہے بتوں کے نصب کا سبب اور دین ابراہیمی میں تبدیلی کا سبب عمرو بن لحی تھا جو مکہ سے شام کی طرف نکلا جب بلقاء کے علاقہ میں مآب کے مقام پر پہنچا اور وہاں اس وقت عمالیق تھے جو عملیق کی اولاد تھے۔ کہا جاتا ہے: عملاق بن لاوذ بن سام بن نوح۔ اس نے انہیں دیکھا کہ وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ عمرو نے انہیں کہا: یہ بت کیا ہیں جن کی میں تمہیں عبادت کرتے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ بت ہیں، ہم ان کے ذریعے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے اور ان کے ذریعے مدد طلب کرتے ہیں تو ہماری مدد کی جاتی ہے۔ اس نے انہیں کہا: تم ان میں سے ایک بت مجھے نہیں دے دیتے جسے میں عرب کی زمین کی طرف لے جاؤں تا کہ وہ بھی اس کی عبادت کریں، تو انہوں نے اسے ایک بت دے دیا جس کا نام ہبل تھا وہ اسے مکہ لے آیا اور اسے نصب کر دیا لوگوں نے اس کی عبادت اور تعظیم شروع کر دی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو ان پر یہ آیت نازل فرمائی: **مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآىِٕبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ**۔ اللہ تعالیٰ نے نہیں مقرر کیا بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام کو لیکن قریش خزاعہ اور مشرکین عرب میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ تہمت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 702

2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 665

لگاتے ہیں اللہ پر جھوٹی، وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کی تحریم کا حکم دیا ہے، اور وہ کہتے ہیں: وہ ایسا اللہ کی اطاعت میں اپنے رب کی رضا کے لیے کرتے ہیں اور اللہ کی طاعت اس کے قول سے معلوم ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس ان کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی قول نہیں تھا۔ یہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے تھے انہوں نے کہا: مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا (الانعام:139) یعنی ان جانوروں کے پیٹوں میں جو ہے یعنی بچے اور دودھ وہ خالص ہمارے مذکر افراد کے لیے ہے۔ وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً (الانعام:139) اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اگر وہ مردہ ہوگا یعنی اگر وہ مردہ بچہ جنم دے گی تو اس میں مرد اور عورتیں شریک ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ (الانعام:139) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے جھوٹ کی وجہ سے آخرت میں عذاب دے گا۔ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۞ (الانعام) یعنی وہ تحریم و تحلیل جاننے والا ہے اور اس میں اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ نازل کیا: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۞ (یونس) آپ فرمایئے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا پس بنالیا تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہو؟ اور یہ نازل فرمایا: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الانعام:143) اور یہ نازل فرمایا: وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ (الانعام:138) بعض مویشی ہیں کہ نہیں ذکر کرتے نام خدا ان (کی ذبح) پر (یہ سب محض) افتراء ہے اللہ پر۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی چیز کو روکنے اور اوقاف لوٹانے کا تعلق اس سے قائم کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی مذمت کی جو وہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کو روک لیتے تھے اور انہیں استعمال نہیں کرتے تھے(1)۔ امام صاحب نے بحیرہ اور سائبہ پر قیاس کیا ہے جب کہ ان میں فرق واضح ہے اگر کوئی شخص اپنی زمین کا ارادہ کرتا ہے کہ یہ وقف ہوگی، اس کا پھل نہیں چنا جائے گا اور اس کی زمین کاشت نہیں کی جائے گی اور اس سے کسی قسم کا نفع نہیں اٹھایا جائے گا تو پھر اسے بحیرہ اور سائبہ سے تشبیہ دینا جائز ہوتا۔ علقمہ سے جس نے ان چیزوں سے متعلق سوال کیا اس کے جواب میں علقمہ نے کہا: تو جو اہل جاہلیت کے عمل کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ختم ہو چکا ہے۔ ابن زید نے بھی اسی طرح کہا۔ جمہور علماء احباس اور اوقاف کے جواز کے قائل ہیں، سوائے امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام زفر کے۔ یہی قول شریح کا بھی ہے لیکن امام ابو یوسف نے امام صاحب کے قول سے رجوع کر لیا تھا جب انہیں ابن علیہ نے ابن عون عن نافع عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت سنائی کہ حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خیبر کے حصہ کو صدقہ کرنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: أحبس الأصل و سبّل الثمرة(2) اصل کو روک لے اور پھل صدقہ کر دے۔ جنہوں نے احباس (روکنا) کو جائز قرار دیا ہے اس حدیث سے انہوں نے دلیل پکڑی ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 705

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الاحباس، جلد 4، صفحہ 193

یہ حدیث صحیح ہے یہ ابو عمر نے کہا ہے نیز یہ مسئلہ اجماع صحابہ سے ہے۔ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت فاطمہ عمرو بن العاص، حضرت ابن زبیر اور جابر رضی اللہ عنہم ان سب نے وقف کیے تھے اور ان کے اوقاف مکہ، مدینہ میں معروف و مشہور تھے۔ روایت ہے کہ امام ابو یوسف نے امام مالک سے رشید کی موجودگی میں کہا کہ حبس جائز نہیں تو امام مالک نے اسے کہا: یہ احباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احباس (وقف) ہیں مثلاً خیبر، فدک اور آپ کے صحابہ کے احباس ہیں (1)۔ اور امام ابو حنیفہ نے آیت سے جو حجت پکڑی ہے اس میں حجت نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے کہ انہوں نے اپنی عقول سے بغیر شرع کے تصرف کیا اور نہ ان کو انتفاع نہ کرنے کا مکلف بنایا گیا تھا اور نعمت کے زائل کرنے اور اس مصلحت کو زائل کرنے کا مکلف کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان اونٹوں میں اپنے بندوں کے لیے رکھی ہے اس وجہ سے یہ امور احباس اور اوقاف سے جدا ہو گئے۔ اور امام ابو حنیفہ اور زفر نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو عطا نے ابن مسیب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے شریح سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جس نے اپنا گھر اپنی اولاد میں سے آخری لوگوں پر وقف کر دیا تو انہوں نے کہا: حبس (روکنا، وقف کرنا) اللہ کے فرائض سے نہیں۔

علماء نے کہا: خلفاء راشدین حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے قاضی نے یہ فیصلہ کیا، نیز انہوں نے اس روایت سے دلیل پکڑی ہے جو ابن لہیعہ نے اپنے بھائی عیسیٰ سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سورۃ النساء کے نازل ہونے کے بعد سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں فرائض کو نازل کیا اور حبس سے منع فرمایا۔ طبری نے کہا: وہ صدقہ جو صدقہ کرنے والا اپنی زندگی میں کرتا ہے اس کی اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر اجازت دی ہے اور ائمہ راشدین نے اس پر عمل کیا ہے۔ یہ اللہ کے فرائض سے روکنا نہیں ہے اور نہ شریح کے قول میں حجت ہے اور نہ کسی اور کے قول میں جو سنت اور صحابہ کے عمل کے مخالف ہو وہ صحابہ جو ساری مخلوق پر حجت ہیں۔ رہی حضرت ابن عباس کی حدیث تو اس کو ابن لہیعہ نے روایت کیا ہے اور ابن لہیعہ وہ شخص ہے جس کا آخری عمر میں عقل درست نہیں رہا تھا اور اس کا بھائی غیر معروف ہے اس میں حجت نہیں ہے۔ یہ ابن القصار کا قول ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے جائز ہوگا کہ زمین وقف کے ذریعے مالک کی ملکیت سے نکل جائے اور کسی کی ملکیت میں بھی نہ ہو؟ امام طحاوی نے فرمایا: اس کا جواب یہ دیا جائے گا اس کا انکار نہیں کیا جاتا مثلاً تو اور تیرا مخالف ایک زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد بنانے پر متفق ہوئے لوگوں اور مسجد کے درمیان راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا وہ زمین اس طرح ملکیت سے نکل گئی اور کسی کی ملکیت میں داخل بھی نہیں ہوئی لیکن وہ اللہ کی طرف چلی گئی اسی طرح کنویں، پل وغیرہ کا حکم ہے پس جو تو اپنی حجت اپنے مخالف پر لازم کرے گا وہ تجھ پر لازم کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ حبس کو جائز قرار دینے والے علماء کا حبس کرنے والے کے تصرف کے بارے میں مختلف اقوال رکھتے ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: موقف پر اس کی ملکیت حرام ہے جس طرح غلام کی ملکیت اس پر حرام ہو جاتی ہے مگر اس کے لیے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 704

جائز ہے کہ وہ اپنے صدقہ کا والی بنا رہے اور اس کے قبضہ میں اس لیے ہوگا کہ وہ حق دار اور مستحقین میں تقسیم کرے اور صدقہ کرے، کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہمیشہ اپنے صدقہ سے متصل رہے۔ جو کچھ پہنچا ہے۔ حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ فرمایا: اسی طرح حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما اپنے صدقات سے متعلق رہے۔ یہی قول امام ابو یوسف کا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے زمین یا کھجور کا درخت یا گھر مساکین پر وقف کر دیا تو وہ اس کے ساتھ رہے گا وہ اس کی نگرانی کرے گا اسے کرائے پر دے گا اور مساکین میں اس کی آمدن تقسیم کرے گا حتیٰ کہ وہ مر گیا جب کہ حبس (وقف) اس کے قبضہ میں تھا تو وہ حبس نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ غیر کو اجازت نہیں دے گا وہ میراث ہے۔ امام مالک کے نزدیک گھر، دیواریں، زمین وغیرہ کا حبس نافذ نہ ہوگا اور نہ ان کا حبس مکمل ہوگا حتیٰ کہ کسی دوسرے کو اس کا متولی بنائے بخلاف گھوڑوں اور ہتھیاروں کے یہ امام مالک کے اصحاب کی ایک جماعت کا قول ہے اور یہی ابن ابی لیلی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** واقف کے لیے وقف سے نفع اٹھانا جائز نہیں، کیونکہ اس نے وہ اللہ کے لیے نکالا اور اپنی ملکیت سے جدا کیا پس اس میں سے کچھ انتفاع اپنے صدقہ سے رجوع ہے اور واقف کے لیے انتفاع جائز ہے اگر وقف میں انتفاع کی شرط لگا دی ہو یا وقف کرنے والا محتاج ہو جائے یا اس کے ورثاء محتاج ہو جائیں تو ان کے لیے وقف مال سے کھانا جائز ہے۔ ابن حبیب نے امام مالک سے روایت کیا فرمایا: جس نے اصل کو وقف کیا کہ اس کا غلہ مساکین پر خرچ ہوگا اگر وقف کرنے والے کی اولاد محتاج وفقیر ہو جائے گی تو انہیں اس مال سے دیا جائے گا خواہ وہ وقف کے دن غنی تھے یا فقراء تھے لیکن انہیں پورا غلہ نہیں دیا جائے گا اس خوف سے کہ کہیں وقف ختم نہ ہو جائے لیکن مساکین کے لیے اس میں سے حصہ باقی رہے گا تا کہ اس پر وقف کا اسم باقی رہے اور اولاد کے لیے تحریر لکھی جائے گی کہ انہیں مسکین ہونے کی بنا پر اسے دیا جائے گا مساکین کے علاوہ کے لیے حق نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** سائبہ کا آزاد کرنا جائز ہے، وہ یہ ہے کہ سردار اپنے غلام سے کہے: تو آزاد ہے۔ اور نیت آزاد کرنے کی کرے، یا کہے: یا میں تجھے سائبہ آزاد کیا(1)۔ امام مالک کے مذہب میں سے مشہور مالکی علماء کے نزدیک یہ ہے کہ اس کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی اور اس کا آزاد کرنا نافذ ہوگا۔ اسی طرح ابن القاسم، ابن عبدالحکم اور اشہب وغیرہم سے مروی ہے۔

ابن وہب نے بھی یہی کہا ہے: ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: کوئی سائبہ آزاد نہ کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء کی بیع اور اس کے ہبہ سے منع کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ ہر اس عالم کے نزدیک ہے جو ان کے مذہب کا قائل ہے۔ یہ سائبہ کے عتق کی کراہت پر محمول ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر سائبہ آزاد کرے گا تو نافذ ہو جائے گا اس میں حکم وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے بھی اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں سائبہ کے عتق کو ناپسند کرتا ہوں اور اس سے منع کرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوگا تو نافذ ہو جائے گا اور وہ مسلمانوں کی میراث ہوگا اور اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 706

کی دیت بھی ان پر ہوگی۔ اصبغ نے کہا: ابتداءً سائبہ کا آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ امام مالک کے مشہور مذہب کی طرف گئے ہیں اس کے لیے قاضی اسماعیل نے حجت پکڑی ہے اور اس کی تقلید کی ہے، اس کی حجت میں سے یہ بھی ہے کہ عتق السائبہ مدینہ میں عام ہے اور کوئی عالم اس کا انکار نہیں کرتا اور حضرت عبدالله بن عمر اور ان کے علاوہ سلف نے سائبہ آزاد کیا۔ ابن شہاب، ربیعہ اور ابوالزناد سے مروی ہے یہی عمر بن عبدالعزیز، ابوالعالیہ، عطا اور عمرو بن دینار وغیرہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوالعالیہ ریاحی بصری تیمی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو سائبہ آزاد کیا گیا ان کی مالکن نے انہیں رضا الٰہی کے لیے بنی ریاح سے سائبہ آزاد کیا تھا اور اس عورت نے ان کو لے کر مسجد کے حلقوں کا طواف کیا۔ اس کا نام رفیع بن مہران تھا۔ ابن نافع نے کہا: آج اسلام میں سائبہ نہیں ہے جس نے سائبہ آزاد کیا اس کی ولاء اس کے لیے ہوگی یہی قول امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ابن ماجشون کا ہے اور اسی کی طرف ابن عربی کا میلان ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''جس نے سائبہ آزاد کیا اس کی ولاء اس کے لیے ہوگی، اور ارشاد: ولاء اس کے لیے ہے جس نے آزاد کیا'' (1)۔ سے استدلال کیا ہے پس غیر معتق کے لیے ولاء کی نفی فرمائی اور انہوں نے الله کے ارشاد: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ سے حجت پکڑی ہے اور حدیث سے حجت پکڑی ہے ''اسلام میں سائبہ نہیں ہے (2)'' اور ابوقیس نے ہزیل بن شرحبیل سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک شخص نے حضرت عبدالله سے کہا: میں نے اپنا غلام سائبہ آزاد کیا تھا آپ کا نظریہ اس بارے میں کیا ہے؟ حضرت عبدالله نے کہا: اہل اسلام سائبہ نہیں کرتے سائبہ زمانہ جاہلیت میں تھا، تو اس کا وارث ہے اور اس کا ولی نعمت ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

''اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے الله تعالیٰ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف کہتے ہیں کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں''۔

اس آیت کریمہ کا معنی اور اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اے ایمان والو! تم پر اپنی جانوں کا فکر لازم ہے نہیں نقصان پہنچا سکے گا تمہیں جو گمراہ ہو جب کہ تم ہدایت یافتہ ہو۔ الله کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے تم سب نے پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو تم (اس دنیا میں) کیا کرتے تھے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 999
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 706

**مسئلہ نمبر 1**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس آیت کا ماقبل سے تعلق یہ ہے کہ اس سے ڈرانا ہے جس سے ڈرانا واجب ہے۔ یہ اس کی حالت ہے جس کی صفت گزر چکی ہے ان لوگوں میں سے جو اپنے دین میں اپنے آباء اور اپنے اسلاف کی تقلید کی طرف مائل ہوا اس آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قائم کرنا واجب نہیں جب انسان درست ہو اور کسی کو دوسرے کے گناہ کی وجہ سے پکڑا نہیں جائے گا اگر اس کی سنت میں اور اقاویل صحابہ و تابعین میں اس کی تفسیر وارد نہ ہوتی، جیسا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ذکر کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ اس کا معنی ہے اپنے نفسوں کی گناہوں سے حفاظت کرو۔ تو کہتا ہے: علیك زیداً یعنی الزم زیداً (زید کو لازم پکڑ) اور علیہ زیداً جائز نہیں بلکہ یہ تین الفاظ میں مخاطب کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً علیك زیداً یعنی زید کو پکڑو۔ عندك عمراً یعنی عمر تیرے پاس حاضر ہے۔ دونك زیداً یعنی وہ تمہارے قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

یاایھا المائح دلوی دونکا

اے کنواں کی گہرائی میں جانے والے میرا ڈول پکڑ۔ اور رہا یہ مصرعہ علیہ رجلاً لَیْسَنِیْ یہ شاذ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابوداؤد، ترمذی وغیرہما نے قیس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطاب فرمایا کہ تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور تم اس کی تاویل درست نہیں کرتے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ الآیۃ (1)۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ لوگ جب ظالم کو دیکھتے ہیں تو اس کے ہاتھوں کو نہیں روکتے قریب ہے اللہ تعالیٰ سب پر اپنی طرف سے عذاب نازل کر دے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسحاق بن ابراہیم نے کہا: میں نے عمرو بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے وکیع کو یہ کہتے ہوئے سنا عن ابی بکر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صحیح نہیں ہے اور کوئی حدیث ہے۔ میں کہتا ہوں: نہ اسماعیل عن قیس مروی ہے فرمایا اسماعیل نے قیس سے موقوف روایت کیا ہے۔ نقاش نے کہا: یہ وکیع کی طرف سے زیادتی ہے اس کو شعبہ نے سفیان اور اسحاق سے انہوں نے اسماعیل سے مرفوع روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے ابو امیہ شعبانی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں ابوثعلبہ خشنی کے پاس پہنچا تو میں نے اسے کہا: تم اس آیت کا کیا کرتے ہو۔ انہوں نے فرمایا: آیت ہے، آیت ہے۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ فرمایا: اللہ کی قسم! تو نے اس کے متعلق خبر والے سے پوچھا ہے، میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیکی کرو اور برائی سے رک جاؤ حتیٰ کہ جب تم ایسا بخل دیکھو جس کی اطاعت کی جاتی ہو، ایسی خواہش جس کی اتباع کی جاتی ہو اور ایسی دنیا جو ترجیح دی جاتی ہو اور صاحب رائے اپنی رائے کو پسند کرتا ہے تو خاص طور پر اپنے نفس کی فکر کرو اور عام لوگوں کے معاملہ کو چھوڑ دو تمہارے پیچھے کچھ ایام ہیں ان میں صبر، انگارے کو پکڑنے کی مثل ہوگا۔ ان دنوں میں پچاس آدمیوں کے اجر کی مثل ایک مزدور کا اجر ہوگا جو تمہارے عمل کی مثل عمل کرتے ہیں''۔ ایک روایت میں ہے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 131۔ ایضاً، باب ومن سورۃ المائدہ، حدیث نمبر 2983، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرض کی گئی: یارسول اللہ! ہم میں سے یا ان میں سے پچاس آدمیوں کا اجر۔ فرمایا: ''بلکہ تم میں سے پچاس کا اجر'' (1)۔

ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض راوی خاموش رہے ہیں اور اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''تم ایسے زمانہ میں ہو کہ تم میں سے جس نے اس کا دسواں حصہ ہی ترک کر دیا جس کا حکم دیا گیا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے، پھر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے جو حکم الٰہی کے دسواں حصہ پر ہی عمل کرلے گا تو نجات پائے گا'' (2)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: یہ آیت کا زمانہ نہیں ہے تم حق کہو جب تک وہ تم سے قبول کیا جائے، جب تم پر لوٹایا جائے تو پھر تم اپنے نفسوں کی فکر کرو۔ بعض فتنوں کے اوقات میں حضرت ابن عمر سے کہا گیا: اگر تم ان ایام میں گفتگو ترک کردو نہ تم نیکی کا حکم دو نہ برائی سے روکو۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا تھا: ''موجود کو غائب تک بات پہنچانی چاہیے'' اور ہم موجود تھے پس ہم پر تمہیں پہنچانا لازم ہے ایک زمانہ آئے گا جس میں حق کہا جائے گا تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ لیبلغ الشاھد الغائب کے قول کے بعد حضرت ابن عمر سے ایک روایت میں ہے ''ہم موجود تھے اور تم غائب تھے'' لیکن یہ آیت ان لوگوں کے لیے ہے جو ہمارے بعد آئیں گے اگر وہ حق کہیں گے تو ان سے حق قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن المبارک نے کہا: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کا خطاب تمام مومنین کو ہے یعنی دین داروں کو لازم پکڑو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) گویا فرمایا: ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دینا چاہیے اور برائی سے منع کرنا چاہیے یہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے وجوب پر دلیل ہے، تمہیں مشرکوں، منافقین اور اہل کتاب کی گمراہی نقصان نہیں پہنچائے گی، کیونکہ امر بالمعروف مسلمانوں کے ساتھ گنہگاروں میں جاری رہتا ہے جیسا کہ گزر چکا ہے یہ معنی سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: آیت کا معنی ہے تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا جو گمراہ ہوا جب کہ تم ہدایت یافتہ ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد۔

ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت اپنے ضمن میں یہ مفہوم رکھتی ہے کہ انسان خاص اپنے نفس سے مشغول ہو اور لوگوں کے عیوب سے تعرض ترک کر دے اور ان کے احوال کی تلاش چھوڑ دے، کیونکہ ان سے اس کی حالت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا۔ اور اس سے ان کی حالت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا یہ اس قول کی طرح ہے كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (المدثر) ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اپنے گھر کا دوست ہو جا اور خاص اپنے نفس کی فکر کر''۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس زمانہ سے مراد ایسا زمانہ ہو جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا مشکل ہو پس وہ اپنے دل سے ناپسند کرتا ہو اور اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول ہو۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 131۔ ایضاً، باب و من سورۃ المائدۃ، حدیث نمبر 2984، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 51۔ ایضاً، حدیث نمبر 2193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: ایک غریب حدیث میں آیا ہے جسے ابن لہیعہ نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں بکر بن سوادہ جذامی نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کر کے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب دوسو کا آغاز ہو تو نہ نیکی کا حکم دو اور نہ برائی سے منع کرو خاص اپنے نفس کی فکر کرو'' ہمارے علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے فرمایا کہ زمانہ بدل جائے گا، احوال میں فساد ہوگا اور مددگاروں کی کمی ہوگی۔ حضرت جابر بن زید نے کہا: آیت کا معنی ہے اے ان لوگوں کی اولاد میں سے ایمان والو! جنہوں نے بحیرہ اور سائبہ کو بتوں کے لیے چھوڑا تم دین پر اپنے نفسوں کو قائم رکھو تمہیں پہلے لوگوں کی گمراہی نقصان نہ دے گی جب تم ہدایت یافتہ ہو، فرمایا: جب کوئی اسلام لے آتا تو کفار اسے کہتے: تم نے اپنے آباء کو بے وقوف بنایا اور انہیں گمراہ کیا، تو نے ایسا کیا اور ایسا کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے سبب یہ آیت نازل فرمائی۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت خواہش کے بندوں کے بارے میں ہے جنہیں وعظ و نصیحت نفع نہیں دیتا جب تو کسی قوم کے متعلق جان لے کہ وہ دعوت کو قبول نہیں کرتے بلکہ استہزا کرتے ہیں اور غالب آتے ہیں تو ان سے خاموش ہو جا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں مشرکوں نے تکلیف دی تھی حتیٰ کہ بعض مرتد ہو گئے تھے تو باقی لوگوں کو کہا گیا: تم اپنے نفسوں کی فکر کرو تمہیں تمہارے ساتھیوں کا ارتداد کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ مجاہد نے کہا: یہود و نصاریٰ اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں ہے۔ ان دونوں حضرات کا نظریہ یہ ہے، کہ اہل کتاب کا کفر تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا جب وہ جزیہ ادا کریں۔ بعض نے فرمایا: یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے منسوخ ہے۔ یہ المہدوی کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے اس کا قائل معلوم نہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: ابوعبید القاسم بن سلام سے مروی ہے فرمایا: کتاب اللہ میں اس آیت کے سوا کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو ناسخ اور منسوخ کی جامع ہو۔ دوسرے علماء نے کہا: اس میں سے ناسخ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ کا قول ہے۔ الھدی سے یہاں مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر متعین ہوتا ہے جب قبولیت کی امید ہو یا ظالم کو روکنے کی امید ہو خواہ سختی کے ساتھ ہو جب تک کہ آمر کو اپنے خاص لوگوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو یا کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو جو عام مسلمانوں پر جاری ہونا ہو، خواہ لاٹھی کی طرف کے ساتھ ہو یا ایسے ضرر کے ساتھ ہو جو لوگوں کے ایک طائفہ کو لاحق ہوتا ہو، جب یہ اندیشہ ہو تو تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کی فکر کرو۔ یہ محکم، واجب ہے کہ وہ اپنے اوپر توقف کرے۔ اور منع کرنے والے کا عادل ہونا شرط نہیں اس پر اہل علم کی جماعت کا نظریہ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 249

مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ
بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاِنْ عُثِرَ
عَلٰٓي اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ڮ اِنَّآ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰي وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ
اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٨﴾

''اے ایمان والو! آپس میں تمہاری گواہی جب آ جائے کسی کو تم سے موت وصیت کرتے وقت (یہ ہے کہ) دو معتبر شخص تم میں سے ہوں یا دو اور غیروں میں سے اگر تم سفر کر رہے ہو زمین میں پھر پہنچے تمہیں موت کی مصیبت روکو ان دو گواہوں کو نماز پڑھنے کے بعد تو وہ قسم کھائیں اللہ کی اگر تمہیں شک پڑ جائے (ان الفاظ سے) کہ ہم نہ خریدیں گے اس قسم کے عوض کوئی مال اور اگرچہ قریبی رشتہ دار ہی ہو اور ہم نہیں چھپائیں گے اللہ کی گواہی (اگر ہم ایسا کریں) تو یقیناً ہم اس وقت گنہگاروں میں (شمار) ہوں گے۔ پھر اگر پتہ چلے کہ وہ دونوں گواہ سزاوار ہوئے ہیں کسی گناہ کے تو دو اور کھڑے ہو جائیں ان کی جگہ ان میں سے جن کا حق ضائع کیا ہے پہلے گواہوں نے اور (یہ نئے دو گواہ) قسم اٹھائیں اللہ کی کہ ہماری گواہی ٹھیک ہے ان دو کی گواہی سے اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا (اگر ہم ایسا کریں تو) بے شک اس وقت ہم ظالموں میں شمار ہوں گے۔ یہ طریقہ زیادہ قریب ہے کہ گواہ دیا کریں گواہی جیسا کہ چاہیے یا خوف کریں اس بات کا کہ لوٹائی جائیں گی قسمیں (میت کے وارثوں کی طرف) ان کی قسموں کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سنو اس کا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا فاسق قوم کو''۔

اس میں ستائیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ مکی نے کہا: یہ تین آیات اہل معانی کے نزدیک قرآن میں اعراب، معنی اور حکم کے اعتبار سے مشکل ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اس کا کلام ہے جس کے لیے اس کی تفسیر میں اطمینان واقع نہیں ہوا یہ ان کی کتاب میں واضح ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: مکی نے جو ذکر کیا ہے ابو جعفر نحاس نے بھی اس سے پہلے یہ ذکر کیا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیات تمیم داری اور عدی بن بداء کے سبب سے نازل ہوئیں۔ بخاری، دارقطنی وغیرہما نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: تمیم داری اور عدی بن بداء مکہ کی طرف جاتے تھے تو ان کے ساتھ بنی سہم کا ایک نوجوان بھی نکلا، وہ ایسے علاقہ میں فوت ہوا جہاں کوئی مسلمان نہیں تھا اس نے تمیم اور عدی کو وصیت کی اور اپنا ترکہ اپنے اہل کی طرف ان کے ہاتھ بھیج دیا ان دونوں نے چاندی کے جام کو اپنے پاس رکھ لیا جس پر سونے کے نقش و نگار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں سے قسم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 250

طلب کی کہ تم نے نہ چھپایا اور نہ تمہیں اطلاع ہے پھر وہ پیالہ مکہ میں پایا گیا انہوں نے کہا: یہ ہم نے عدی اور تمیم سے خریدا ہے۔ سہمی کے ورثاء میں سے دو آدمی آئے انہوں نے قسم اٹھائی کہ یہ پیالہ سہمی کا ہے اور ہماری گواہی ان کی گواہی سے زیادہ ٹھیک ہے اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا۔ فرمایا: پھر انہوں نے پیالہ لے لیا اس میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ دارقطنی کے الفاظ ہیں، ترمذی نے تمیم داری سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ۔

اس آیت سے میرے اور عدی بن بداء کے علاوہ لوگ بری ہیں۔ یہ دونوں نصرانی تھے اسلام سے پہلے شام کی طرف جاتے تھے پھر وہ تجارت کی غرض سے شام آئے، ان کے پاس بنی سہم کا ایک آدمی تجارت کی غرض سے آیا جس کا نام بدیل بن ابی مریم تھا۔ اس کے پاس چاندی کا پیالہ تھا اس کے ذریعے بادشاہ کا ارادہ کرتا تھا وہ اس کی تجارت کا بڑا حصہ تھا۔ وہ مریض ہو گیا تو انہیں اس نے وصیت کی اور انہیں حکم دیا کہ میرا مال میرے گھر والوں کو پہنچا دینا، تمیم نے کہا: جب وہ مر گیا تو ہم نے وہ پیالہ لے لیا اور ہم نے وہ پیالہ ہزار درہم کے عوض بیچ دیا پھر ہم نے انہیں تقسیم کیا، جب ہم ان کے گھر والوں کے پاس آئے تو ہم نے وہ سب کچھ ان کے حوالے کیا جو ہمارے پاس تھا، انہوں نے پیالہ سامان میں نہ پایا پس انہوں نے ہم سے اس پیالہ کے متعلق سوال کیا۔ ہم نے کہا: اس کے علاوہ اس نے کچھ نہیں چھوڑا اور اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں دیا۔ تمیم نے کہا: پھر جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کے بعد مسلمان ہوا تو میں نے اسے گناہ سمجھا پھر میں اس کے گھر والوں کے پاس آیا اور انہیں سب کچھ بتایا اور میں نے انہیں پانچ سو درہم ادا کر دیئے اور میں نے انہیں بتایا کہ اس کی مثل رقم میرے ساتھی کے پاس ہے۔ پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دلیل مانگی تو انہوں نے دلیل نہ پائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ عدی سے اس کے ساتھ قسم طلب کریں جو ان کے دین داروں پر عظیم ہے۔ پس عدی نے قسم اٹھا دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَیْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰی وَجْهِهَاۤ اَوْ یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ۔ عمرو بن العاص اور ان میں سے ایک اور آدمی اٹھا اور قسم اٹھائی پس عدی بن بداء کے ہاتھوں سے پانچ سو درہم چھین لیے گئے۔

ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث غریب ہے اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ واقدی نے ذکر کیا ہے کہ یہ تین آیات تمیم اور اس کے ساتھی عدی کے بارے میں نازل ہوئیں یہ دونوں نصرانی تھے اور ان کے کاروبار کی جگہ مکہ تھی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ابن ابی مریم مولی عمرو بن العاص مدینہ طیبہ آیا وہ شام میں تجارت کا ارادہ رکھتا تھا اس کے ساتھ تمیم اور اسکا ساتھی عدی نکلا۔ الحدیث۔ نقاش نے ذکر کیا ہے فرمایا: یہ بدیل بن ابی مریم مولی العاص بن وائل سہمی کے بارے میں

نازل ہوئی وہ سمندر میں، نجاشی کی زمین کی طرف سفر کرتے ہوئے نکلا۔ اس کے ساتھ دو نصرانی تھے ایک کو تمیم کہا جاتا تھا وہ لخم سے تھا اور عدی بن بداء۔ بدیل فوت ہوا تو وہ کشتی میں تھے اسے دریا میں پھینکا گیا تھا اس نے وصیت لکھی تھی اور اسے سامان میں رکھ دیا تھا اس نے کہا: میرا یہ سامان میرے گھر پہنچا دینا، جب بدیل فوت ہو گیا تو ان دونوں نے سامان پر قبضہ کر لیا اور اس مال میں سے جو انہیں پسند آیا وہ خود لے لیا اور جو مال انہوں نے لیا تھا اس میں چاندی کا ایک برتن بھی تھا اس میں تین سو مثقال تھا اور وہ سونے کے ساتھ منقش تھا مکمل حدیث ذکر کی۔ اس کو سنید نے ذکر کیا فرمایا: جب شام میں آئے تو بدیل مریض ہو گیا وہ مسلمان تھا۔ الحدیث۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ، شهد کا لفظ کتاب اللہ میں کئی معانی کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (بقرہ:282) بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے **احصروا** (شمار کرو)۔ شهد بمعنی قضی یعنی اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا: یہ ابو عبیدہ کا قول ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران:18) اور شهد بمعنی اقر بھی آیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: والملائكة يشهدون فرشتے اقرار کرتے ہیں اسی طرح شهد بمعنی حکم بھی آیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا (یوسف:26) اسی سے شهد بمعنی حلف (قسم اٹھانا) ہے جیسا کہ لعان میں ہے۔ شهد بمعنی وصی بھی آیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں اس کا معنی وصیت کے لیے حاضر ہونا ہے کہا جاتا ہے: شهدت وصية فلان یعنی میں فلاں کی وصیت کے وقت حاضر تھا۔ طبری کا خیال ہے کہ شهادة بمعنی قسم ہے پس معنی ہوگا جو تمہارے درمیان جھگڑا ہے اس کی دو آدمی قسم اٹھائیں اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ یہ اس شہادت کے علاوہ ہے جو مشهود له (جس کے لیے گواہی دی گئی ہو) کے لیے دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے لیے حکم معلوم نہیں ہے جس میں گواہ پر قسم واجب ہے۔ اس قول کو قفال نے اختیار کیا ہے اور یمین (قسم) کو شہادت کہا گیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ حکم ثابت ہوتا ہے جس طرح شہادت کے ساتھ حکم ثابت ہوتا ہے، ابن عطیہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ یہاں شہادت اسی شہادت کے معنی میں جس کی حفاظت کی جاتی ہے اور ادا کی جاتی ہے(1)، اور انہوں نے حضور اور یمین کے معنی میں ہونے کو ضعیف قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَيْنِكُمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ما بينكم ہے۔ ما کو حذف کیا گیا ہے اور شہادت کو ظرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اسم حقیقت میں استعمال ہوا ہے نحویوں کے نزدیک اس کو وسعت کی بنا پر مفعول کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

ويوما شهدناه سُلَيما و عامرا

شاعر کی مراد شهدنا فيه ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ (سبا:33) یعنی مكر كم فيهما۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 252

نُصافح من لاقيتَ لى ذا عداوة صِفَا حا و عَنِّى بين عَيْنَيْكَ مُنْزَوِى

مراد ما بين عينيك ہے پس ما کو حذف کیا گیا۔ اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ (الکہف:78) یعنی ما بینی وبینك۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا حَضَرَ اس کا معنی ہے جب موت قریب ہو ورنہ جب موت آجاتی ہے تو میت گواہی نہیں دیتا۔ یہ الله تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (النحل:98) اسی طرح ارشاد ہے: اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ (طلاق:1) اس کی مثل بہت سی آیات ہیں۔ اذا میں عامل مصدر ہے جو شہادۃ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ حین ظرف زمان ہے اور اس میں عامل حضر ہے اور اثنان اپنے اطلاق کے ساتھ دو شخصوں کا تقاضا کرتا ہے اور رجلین کا احتمال رکھتا ہے مگر اس کے بعد کہا: ذَوَا عَدْلٍ تو واضح کر دیا کہ مراد دو آدمی ہیں کیونکہ یہ لفظ مذکر کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ذواتا مونث کا تقاضا کرتا ہے۔ اثنان کو رفع مبتدا کی خبر کی حیثیت سے ہے اور وہ شہادۃ ہے ابوعلی نے کہا: شہادۃ کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور خبر اثنان ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے شهادة بينكم فى وصايا كم شهادة اثنين مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا، جیسا کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب:6) یعنی مثل امهاتهم اور اثنان کو رفع شہادۃ کی وجہ سے دینا بھی جائز ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: وفيما انزل عليكم او ليكن منكم ان يشهد اثنان ليقم الشهادة اثنان۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ، ذَوَا عَدْلٍ صفت ہے اثْنٰنِ کی او منکم دوسری صفت ہے (1)۔ اور اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اس کا مطلب ہے یا تمہارے علاوہ دوسروں کی گواہی۔ مِنْ غَيْرِكُمْ، اٰخَرٰنِ کی صفت ہے۔ اس آیت میں یہ فصل مشکل ہے۔ اس میں تحقیق یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(ا) منکم میں ضمیر مسلمانوں کے لیے ہے اور اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ کفار کے لیے ہے اس بنا پر اہل کتاب کی گواہی مسلمانوں پر سفر میں جائز ہوگی جب وصیت ہو۔ یہ سیاق آیت کے زیادہ مناسب ہے۔

نیز احادیث سے بھی یہ ثابت ہے یہ ان تین صحابہ کا قول ہے جنہوں نے نزول قرآن کو دیکھا یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبدالله بن قیس (☆) اور حضرت عبدالله بن عباس۔ آیت کا معنی اول سے آخر تک اس قول کی بنا پر یہ ہوگا کہ الله تعالیٰ نے خبر دی کہ موصی (وصیت کرنے والا) پر شہادت میں اس کا حکم، جب آجائے موت، یہ ہے کہ دو عادل آدمیوں کی شہادت ہو اگر وہ سفر میں ہو۔ الضرب فی الارض کا یہی معنی ہے اور اس کے ساتھ مومنین میں سے کوئی نہ ہو تو دو گواہ بنالے ان کفار میں سے جو موجود ہیں جب وہ آئیں اور عصر کی نماز کے بعد حلفا اس کی وصیت پر گواہی دیں کہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا اور نہ انہوں نے وصیت کو بدلا ہے اور جو انہوں نے گواہی دی ہے صحیح ہے انہوں نے اس میں گواہی کو چھپایا نہیں ہے اور ان کی شہادت کے مطابق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 252

☆ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب الشهادة اهل الذمة وفى الوصية فى السفر، حدیث نمبر 3128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فیصلہ کر دیا گیا پھر اس کے بعد پتہ چلا کہ انہوں نے جھوٹ بولا یا خیانت کی اور اس جیسی چیز کی جو گناہ ہے سفر میں موصی کے اولیاء میں سے دو آدمی قسم اٹھائیں اس کی جوان پہلے گواہوں پر ثابت ہو وہ ادا کریں۔ یہ حضرت ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، یحییٰ بن یعمر، سعید بن جبیر، ابو مجلز، ابراہیم، شریح، عبیدہ سلمانی، ابن سیرین، مجاہد، قتادہ، سدی، حضرت ابن عباس وغیرہم کے مذہب پر آیت کا معنی ہے فقہاء میں سفیان ثوری نے یہ کہا ہے۔ ابو عبید القاسم بن سلام کا میلان بھی اسی طرف ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں نے یہ کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس کو اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اہل ذمہ کی مسلمانوں پر سفر میں گواہی جائز ہے جب کہ مسلمان نہ ہوں (1)۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں کہ منکم سے مراد مومنین ہیں اور من غیرکم سے مراد کفار ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صرف مدینہ میں مومن تھے اور مومنین اہل کتاب کی معیت میں بت پرستوں کی صحبت میں اور مختلف کفار کے ساتھ تجارتی سفر کرتے تھے یہ حضرت ابو موسیٰ اور شریح وغیرہما کے مذہب پر محکم آیت ہے (2)۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ منسوخ ہے یہ زید بن اسلم، نخعی، امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ وغیرہم فقہاء کا قول ہے مگر امام ابو حنیفہ ان کی مخالفت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا: کفار کی ایک دوسرے پر گواہی جائز ہے اور مسلمان پر کفار کی گواہی جائز نہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (بقرہ: 282) اور وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: 2) سے حجت پکڑی ہے۔ ان علماء کا خیال ہے کہ آیت دین آخر میں نازل ہوئی اور اس میں ہے مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اس کی ناسخ ہے اور اس وقت اسلام صرف مدینہ میں تھا پس اہل کتاب کی شہادت جائز تھی آج زمین پر مسلمان پھیل چکے ہیں اور کفار کی شہادت ساقط ہو چکی ہے اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ فساق کی شہادت جائز نہیں اور کفار فساق ہیں پس ان کی شہادت جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: جو تم نے ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے لیکن ہم بھی اس کے مطابق کہتے ہیں اور یہ اہل ذمہ کی شہادت مسلمانوں کے او پر وصیت میں سفر کی حالت میں خاص ضرورت کے لیے جائز ہے جہاں مسلمان موجود نہ ہوں لیکن مسلمان موجود ہوں تو پھر جائز نہیں اور جو تم نے نسخ کا دعویٰ کیا ہے جو قرآن کے نزول کے وقت موجود تھے ان میں سے کسی سے یہ مروی نہیں ہے۔ پہلا قول صحابہ میں سے تین کا ہے اور یہ اس کے علاوہ میں نہیں ہے اور صحابہ کی مخالفت کرنا اور دوسرے کی طرف جانا اس کو اہل علم اچھا نہیں سمجھتے اور اس کو یہ بات بھی تقویت دیتی ہے کہ سورۂ مائدہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے حتیٰ کہ حضرت ابن عباس اور حسن وغیرہما نے کہا: اس میں منسوخ نہیں ہے۔ اور جو ان علماء نے نسخ کا دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ نسخ کے لیے ناسخ کا اثبات اس اعتبار سے ہونا ضروری ہے کہ ان کا جمع کرنا ممکن نہ ہو نیز ناسخ موخر بھی ہو اور جو انہوں نے ذکر کیا ہے ناسخ ہونا اس کا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک واقعہ میں ہے جو وصیت کے واقعہ کے علاوہ ہے اس میں حاجت اور ضرورت کا عنصر ہے اور ضروریات کے وقت حکم کا اختلاف ممتنع نہیں نیز کبھی کافر مسلمان کے نزدیک ثقہ (معتمد) ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت اسے پسند کرتا ہے، پس انہوں نے کہا: اس میں ناسخ نہیں ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 723
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 251

(۳) آیت میں نسخ نہیں ہے یہ زہری، حسن اور عکرمہ کا قول ہے اور منکم کا معنی ہے تمہارے قرابتداروں سے اور رشتہ داروں سے کیونکہ وہ زیادہ حفظ اور ضبط والے ہوتے ہیں اور نسیان سے دور ہوتے ہیں اور اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کا معنی ہے جو قریبی اور خاندان کے نہیں ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ عربی میں گہری نظر رکھنے پر مبنی ہے آخر کا معنی عربی میں پہلے کی جنس سے ہوتا ہے تو کہتا ہے: مررت بکریم و کریم آخر پس آخر کا قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ پہلے کی جنس سے ہے۔ اہل عرب کے نزدیک مررت بکریم و خسیس آخر اور مررت برجل وحمار اخر کہنا جائز نہیں اس بنیاد پر معنی اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کا معنی ہوگا دو عادل آدمی اور کفار عادل نہیں ہوتے اس بنا پر اس کا قول صحیح ہوگا جس نے من غیرکم کا معنی، مسلمان میں سے تمہارے خاندان کے علاوہ، کیا ہے یہ لغت کی جہت سے عمدہ معنی ہے اس سے امام مالک اور ان کے ہمنوا علماء کے لیے حجت پکڑی گئی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک من غیرکم کا معنی ہے جو تمہارے قبیلے سے نہ ہوں، اس بنا پر کہ اس قول کا آیت کے آغاز میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مقابلہ کیا گیا ہے پس مومنین کی جماعت کو خطاب کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام ابوحنیفہ نے اس آیت سے ذمی کفار کی آپس میں شہادت کے جواز پر استدلال کیا ہے فرمایا: اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کا معنی ہے جو تمہارے دین والوں کے علاوہ ہیں پس یہ ان کی ایک دوسرے پر شہادت کی جواز کی دلیل ہے، انہیں کہا جائے گا: تم اس آیت کے مقتضیٰ کے مطابق نہیں کہتے: کیونکہ یہ آیت اہل ذمہ کی مسلمانوں پر شہادت کی قبولیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور تم یہ نہیں کہتے ہو پس تمہارا اس کے ساتھ حجت پکڑنا درست نہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت طریق النطق کے اعتبار سے اہل ذمہ کی مسلمانوں پر شہادت کی قبولیت کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور طریق تنبیہ کے اعتبار سے اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کی قبولیت پر دلالت کرتی ہے، یہ اس طرح ہے کہ جب ان کی گواہی مسلمانوں پر قبول ہے تو ان کی آپس میں گواہی کی قبولیت بدرجہ اولیٰ ہوگی پھر مسلمانوں پر ان کی شہادت کے قبول نہ ہونے پر دلیل دلالت کرتی ہے پس ان کی آپس میں گواہی پر قبولیت ثابت و باقی ہوگی، یہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ اہل ذمہ کی اہل ذمہ پر گواہی کی قبولیت، مسلمانوں پر ان کی گواہی کی قبولیت کی فرع ہے جب مسلمانوں پر ان کی شہادت باطل ہوئی جو اصل ہے تو اہل ذمہ پر بھی ان کی شہادت باطل ہوگی جو فرع ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ یعنی تم سفر پر ہو۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ یعنی اگر تم زمین میں سفر پر ہو اور تمہیں موت کی مصیبت پہنچے تو تم اپنے گمان میں دو عادل آدمیوں کو وصیت کرو اور تم اپنا مال ان کے حوالے کر دو پھر تم مر جاؤ اور وہ تمہارے ورثاء کی طرف ترکہ لے جائیں پھر انہیں دونوں کے معاملہ میں شک ہو اور وہ ان پر خیانت کا دعویٰ کریں تو حکم یہ ہے کہ تم انہیں نماز کے بعد روک لو، یعنی ان دونوں سے توثیق کر لو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موت کو مصیبت کا نام دیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: موت اگرچہ مصیبت عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے لیکن اس سے بڑی مصیبت موت سے غفلت ہے اور اس کے ذکر سے اعراض ہے اور اس میں فکر کا ترک ہے اور

اس کے لیے عمل کا ترک ہے اگر چہ عبرت کی نگاہ رکھنے والے کے لیے اس میں عبرت ہے اور فکر کرنے والے کے لیے مقام فکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر جانور موت کو جانتے جتنا کہ تم جانتے ہو تو تم ان میں سے کوئی موٹا جانور نہ کھاتے"۔ روایت ہے کہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر سفر کر رہا تھا تو اس کا اونٹ گرا اور مر گیا، وہ اعرابی اونٹ سے اترا اور اونٹ کے اردگرد چکر لگانے لگا اور اس میں متفکر ہوا اور کہنے لگا: تجھے کیا ہوا ہے کہ تو کھڑا نہیں ہوتا ہے؟ تجھے کیا ہوا ہے کہ تو اٹھتا نہیں ہے؟ یہ تیرے اعضاء تو مکمل ہیں اور اعضاء سلامت ہیں، تجھے کیا ہوا ہے؟ کون تجھے اٹھائے ہوئے تھا اور کون تجھے کھڑا کیے ہوئے تھا اور کس نے تجھے گرا دیا اور کس نے تجھے حرکت سے روک دیا؟ پھر اس کے متعلق سوچتے ہوئے اور اس کے معاملہ میں تعجب کرتے ہوئے اسے چھوڑ گیا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَحْبِسُوْنَهُمَا۔ ابوعلی نے کہا: یہ اٰخَرٰنِ کی صفت ہے۔ موصوف اور صفت کے درمیان اِنْ اَنْتُمْ معترضہ ہے۔ یہ آیت اس شخص کو قید کرنے کی دلیل ہے جس پر حق ہو۔ حقوق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا جلدی طلب کرنا ممکن ہوتا ہے اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو صرف تاخیر سے پورے کرنا ممکن ہوتے ہیں اگر اسے چھوڑ دیا جائے جس پر حق ہے اور وہ غائب ہو جائے اور چھپ جائے تو حق باطل ہو جائے گا اور مال ضائع ہو جائے گا پس اس سے توثیق لینا ضروری ہے یا تو حق کے بدلے کوئی مال لیا جائے جسے رہن کہا جاتا ہے یا مطالبہ اور ذمہ میں قائم مقام کوئی شخص لیا جاتا ہے اور وہ کفیل ہے یہ پہلے سے کم مرتبہ ہے، کیونکہ جائز ہوتا ہے کہ وہ بھی غائب ہو جائے اور اسکا وجود متعذر ہو جس طرح پہلے شخص کا وجود متعذر تھا لیکن یہ اکثر کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اگر یہ تمام مشکل ہوں اور کوئی صورت باقی نہ رہے گی تو اسے قید کرنے کے ساتھ توثق ہے حتیٰ کہ اس سے حق کی ادائیگی کر لی جائے یا اس کا تنگ دست ہونا واضح ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اگر حق بدنی ہو تو بدل قبول نہیں کیا جائے گا جسے حدود اور قصاص میں اس کا جلدی پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا اسمیں قید کرنے کے ساتھ ہی وثوق ممکن ہوتا ہے اس حکمت کے پیش نظر ہی قید خانہ کا نظام شروع کیا گیا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی وغیرہما نے بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تہمت کے سبب قید کیا تھا۔ ابوداؤد نے عمرو بن شرید عن ابیہ کے سلسلہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: "مال دار کا حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے" (1)۔ ابن المبارک نے کہا: اس کی عزت کو حلال کرتا ہے اس پر سختی کی جاتی ہے۔ اور عقوبت سے مراد یہ ہے کہ اسے قید کیا جاتا ہے۔ خطابی نے کہا: حبس (قید کرنا) کی دو قسمیں ہیں: حبس عقوبت اور حبس استظہار پس عقوبت صرف واجب میں ہوتی ہے اور جو تہمت میں ہوتی ہے وہ اس لیے ہوتی ہے جو کچھ پیچھے ہے وہ ظاہر ہو جائے۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو تہمت میں دن کا کچھ وقت قید کیا پھر اسے چھوڑ دیا۔

معمر نے ایوب سے انہوں نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے فرمایا شریح کسی کے حق کے لیے کسی کے خلاف فیصلہ کرتے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 323

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیۃ، حدیث نمبر 3144، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تھے تو اس مجلس سے اٹھنے تک مسجد میں اسے قید کر دیتے تھے، اگر وہ حق ادا کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا ورنہ اسے قید خانہ میں لے جانے کا حکم دیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ اس سے مراد نماز عصر ہے۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے، کیونکہ اہل ادیان اس وقت کی تعظیم کرتے ہیں اور اس وقت میں جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسم اٹھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ حسن نے کہا: اس سے مراد صلاۃ ظہر ہے۔ بعض نے فرمایا: کوئی بھی نماز ہو۔ بعض نے فرمایا: ان کی نماز کے بعد، کیونکہ وہ دونوں کافر تھے۔ یہ حزی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: نماز کی شرط لگانے کا فائدہ وقت کی تعظیم کرنا ہے اور اسے ڈرانا ہے، کیونکہ اس وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ صحیح میں ہے جس نے عصر کے بعد جھوٹی قسم اٹھائی وہ اللہ سے ملاقات کرے گا جب کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ یہ آیت قسموں میں سختی کرنے میں اصل ہے اور سختی چار چیزوں کے ساتھ ہوتی ہے: (۱) زمانہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے (۲) مکان جیسے مسجد اور منبر۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس کسی سے قسم طلب کرنا واجب نہیں اور نہ رکن اور مقام کے درمیان، نہ تھوڑی اشیاء میں نہ زیادہ اشیاء میں اسی قول کی طرف بخاری کا رجحان ہے، کیونکہ باب باندھا ہے "مدعیٰ علیہ قسم اٹھائے جہاں اس پر قسم واجب ہوا سے کسی دوسری جگہ کی طرف پھیرا نہیں جائے گا"۔ امام مالک اور امام شافعی نے کہا: قسامت کی قسموں میں مکہ کی طرف لے جایا جائے گا جو اس کے متعلقہ لوگوں سے ہوگا اور رکن اور مقام کے درمیان قسم لی جائے گی اور جو مدینہ طیبہ سے متعلقہ لوگوں سے ہوگا اسے مدینہ طیبہ لے جایا جائے گا اور منبر کے پاس قسم لی جائے گی۔ (۳) حالت: مطرف، ابن الماجشون اور بعض اصحاب شافعی نے روایت کیا ہے وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے قسم اٹھائے گا، کیونکہ یہ روکنے میں زیادہ بلیغ ہے۔ ابن کنانہ نے کہا: وہ بیٹھ کر قسم اٹھائے گا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک وہ اسی حالت میں قسم اٹھائے جس حالت میں اس پر حکم لگایا گیا ہے اگر وہ کھڑا ہو تو کھڑا ہو کر اٹھائے بیٹھا ہو تو بیٹھ کر اٹھائے، کیونکہ کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے متعلق کوئی اثر اور نظر ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے علقمہ بن وائل عن ابیہ کی حدیث میں فانطلق لیحلف سے کھڑے ہو کر قسم اٹھانے کا مسئلہ مستنبط کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے (۴) لفظ کے ساتھ تغلیظ۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ کی قسم سے زائد کچھ نہ کہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اور ارشاد ہے: قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْٓ (یونس: 53) اور فرمایا: وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (الانبیاء: 57) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من کان حالفاً فلیحلف باللہ او لیصمت (1) جو قسم اٹھائے وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے اور آدمی کا قول: واللہ لا أزید علیهنّ (اللہ کی قسم میں ان پر زیادتی نہیں کروں گا) اور امام مالک نے کہا: وہ اس طرح قسم اٹھائے باللہ الذی لا الہ الا ھو میرے پاس فلاں کا حق نہیں ہے اور جو اس نے مجھ پر دعویٰ کیا ہے وہ باطل ہے اور امام مالک کی حجت ابو داؤد کی روایت ہے جو اس سند سے مروی ہے حدثنا مسدد قال حدثنا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، جلد 1، صفحہ 368

ابوالاحوص قال حدثنا عطا بن السائب عن ابی یحییٰ عن ابن عباس، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یعنی قسم اٹھانے والے شخص کو فرمایا ''تو اس طرح قسم اٹھا باللہ الذی لا الہ الا ھو تیرے پاس اس کے لیے کوئی چیز نہیں ہے(1)'' یعنی مدعی کے لیے۔

ابو داؤد نے کہا: ابو یحییٰ کا نام زیاد ہے جو کوفی ہے ثقہ اور ثبت ہے۔ کوفیوں نے کہا: صرف باللہ کے ساتھ قسم اٹھائے۔ اگر قاضی اسے متہم کرے تو اس پر قسم کو مغلظ کر دے وہ اس طرح قسم اٹھائے۔ باللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ الرحمن الرحیم الذی یعلم من السر ما یعلم من العلانیۃ الذی یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور۔ اصحاب شافعی نے قرآن کے ساتھ قسم کو مغلظ کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: قرآن کے ساتھ تغلیظ بدعت ہے صحابہ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا ہے(2)۔ امام شافعی نے فرمایا: انہوں نے صنعاء کے قاضی ابن مازن کو دیکھا وہ قرآن کے ساتھ قسم اٹھواتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کا حکم دیتا تھا اور یہ انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے جب کہ وہ صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: المھذب کتاب میں ہے اکثر قرآن اور جو کچھ اس میں ہے اس کی قسم اٹھائے تو امام شافعی نے مطرف سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن زبیر قرآن پر قسم لیتے تھے فرمایا: میں نے مطرف کو صنعاء میں دیکھا وہ قرآن پر قسم لیتے تھے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ عمدہ ہے۔ ابن المنذر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ حاکم کے لیے طلاق، عتاق اور مصحف کی قسم لینا مناسب نہیں۔ میں کہتا ہوں: ایمان میں گزر چکا ہے۔ حضرت قتادہ قرآن کی قسم لیتے تھے۔ احمد اور اسحاق نے کہا یہ مکروہ نہیں ہے ان دونوں سے یہ ابن المنذر نے حکایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ امام مالک اور امام شافعی کا اختلاف ہے کہ کتنے حق کے ضیاع پر قسم لی جائے گی؟ امام مالک نے فرمایا: کم از کم تین دراہم ہوں، انہوں نے قطع ید پر قیاس کیا ہے۔ ہر وہ مال جس میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور جس کے لیے عضو کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے وہ عظیم ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم اس مال کے لیے اٹھائی جائے جو کم از کم بیس دینار ہو انہوں نے زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے۔ اسی طرح ہر مسجد کے منبر کے پاس قسم اٹھوانے کا یہی حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ، فَيُقْسِمٰنِ میں فا عاطفہ ہے جملہ کا جملہ پر عطف ہے یا جزا کا جواب ہے، کیونکہ تَحْبِسُوْنَهُمَا کا معنی ہے احبسوھما یعنی انہیں قسم کے لیے روک لو پس یہ جواب امر ہے جس پر کلام دلیل ہے گویا فرمایا: اذا حبستموھما اقسما جب تم انہیں روکو تو وہ قسمیں اٹھائیں۔ ذوالرمہ نے کہا:

وانسانُ عینی یَحْسِرُ الماءَ مرۃً　　فَیَبْدو و تَاراتٍ یَجِمُّ فَیَغْرَقُ

اس کی تقدیر ہے اذا حسر بدا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ فَيُقْسِمٰنِ سے کیا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد وصی ہیں جب ان کے قول پر شک کیا گیا ہو۔ بعض نے فرمایا: گواہ ہیں جب وہ عادل نہ ہوں اور حاکم ان کے قول پر شک کرے تو ان سے قسمیں اٹھوائے۔ ابن عربی نے اس قول کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا جو میں نے سنا ہے...... یہ بدعت ہے...... ابن ابی لیلیٰ سے مروی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 726　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 725

ہے کہ وہ دو گواہوں کے ساتھ طالب سے بھی قسم لے کہ جس کے متعلق ان دونوں نے گواہی دی وہ حق ہے اور اس کے لیے حق کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میرے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے کہ جب حاکم کو قبضہ پر شک ہو تو وہ قسم اٹھائے کہ ابھی حق باقی ہے وگرنہ کسی دوسری صورت میں اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا یہ مدعی کے بارے میں ہے، پس گواہ کو کیسے روکا جائے گا یا اس سے حلف لیا جائے گا؟ یہ ایسی چیز ہے جو قابل التفات نہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: طبری کے قول سے گزر چکا ہے کہ اللہ کا حکم معلوم نہ ہو تو اس صورت میں گواہ پر قسم واجب ہوگی۔ بعض نے کہا: گواہ قسم اٹھائیں کیونکہ وہ مدعیٰ علیہا ہیں اس حیثیت سے کہ ورثاء نے دعویٰ کیا ہے کہ ان دونوں نے مال میں خیانت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ ارْتَبْتُمْ شرط ہے گواہوں کے قسم اٹھانے کی طرف توجہ نہ کی جائے گی مگر شک کی صورت میں اور جب شک واقع نہ ہو اور اختلاف واقع نہ ہو تو قسم نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت ابوموسیٰ کے حکم سے ذمیوں سے قسم اٹھوانے کے بارے میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شہادت قسم کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور وصیت اہل کے لیے نافذ ہوتی ہے۔ ابوداؤد نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص پر دقوقاء شہر میں موت کا وقت قریب آیا۔ اور اس نے کوئی مسلمان نہیں پایا جس کو وہ اپنی وصیت پر گواہ بنائے پس اس نے اہل کتاب سے دو آدمیوں کو گواہ بنایا پس وہ دونوں کوفہ آئے اور اشعری کے پاس آئے، پس انہوں نے انہیں یہ واقعہ بتایا اور وہ اس کا ترکہ اور اس کی وصیت لے آئے۔ اشعری نے کہا: یہ ایسا امر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اس کے بعد پھر نہیں ہوا۔ پھر اشعری نے عصر کے بعد ان الفاظ میں قسم اٹھوائی باللہ ماخانا ولا کذبا ولا بدلا ولا کتما ولا غیرا وانھا لوصیتہ الرجل وترکتہ اللہ کی قسم نہ انہوں نے خیانت کی نہ جھوٹ بولا، نہ کچھ بدلا، نہ چھپایا، نہ تبدیلی کی اور یہ اس شخص کی وصیت اور اس کا ترکہ ہے۔ اشعری نے ان کی شہادت کو قائم رکھا۔(2)

ابن عطیہ نے کہا: یہ شک اس کے نزدیک ہے جو آیت کو منسوخ نہیں دیکھتا خیانت میں یہ حکم مرتب ہوتا ہے اور تہمت کی صورت میں بعض لوگوں کی طرف یہ میلان کر رہے جن کے لیے وصیت کی گئی ہے اس کے نزدیک ایسی صورت میں قسم واقع ہوتی ہے اور جن کے نزدیک آیت منسوخ ہے ان کے نزدیک قسم نہیں اٹھوائی جاتی مگر خیانت یا کسی اعتبار سے تعدی اور زیادتی کا شک ہو، پس ان کے نزدیک قسم اٹھوانا منکر پر دعویٰ کے مطابق ہے نہ کہ شہادت کے لیے تکمیل ہے۔ ابن عربی نے کہا: شک اور تہمت کی قسم کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ دعویٰ کرنے اور حق کے ثبوت کے بعد اس میں شک واقع ہوتا ہے، اس صورت میں قسم کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں (۲) حقوق اور حدود میں مطلق تہمت۔ اس کی تفصیل ہے جس کا بیان کتب فروع میں ہے یہاں دعویٰ متحقق ہو گیا اور قوی ہو گیا جیسا کہ روایات میں ذکر کیا گیا ہے(3)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 725

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیة، باب الشهادة اهل الذمة وفي الوصية في السفر، حدیث نمبر 3128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 727

**مسئلہ نمبر 17**۔ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ شرط ہے اس کا تعلق تَحۡبِسُوۡنَهُمَا کے ساتھ ہے نہ کہ فَيُقۡسِمٰنِ کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ حبس، قسم کا سبب ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا نَشۡتَرِيۡ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى یعنی وہ دونوں اپنی قسم میں کہیں کہ ہم اپنی قسم کے ساتھ کوئی عوض خریدنا نہیں چاہتے جس کو ہم اس کے بدلے لیں جو اس نے ہمیں وصیت کی تھی اور ہم کسی کو وہ مال دینا نہیں چاہتے اگرچہ وہ جس کے لیے ہم تقسیم کررہے ہیں وہ ہمارا قریبی رشتہ دار بھی ہو قول کا اضمار کثیر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ (الرعد:23) یعنی وہ کہیں گے: سلام علیکم یہاں الاشتراء بمعنی بیع نہیں بلکہ تحصیل (حاصل کرنا) کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ لَا نَشۡتَرِيۡ میں لام، فَيُقۡسِمٰنِ کا جواب ہے، کیونکہ اقسم بھی اس کے ساتھ متصل ہوتا ہے جس کے ساتھ قسم متصل ہوتی ہے اور وہ لا، ما جو نفی کا معنی دیتے ہیں اور ان اور لام ایجاب کا معنی دیتے ہیں۔ بہ میں ضمیر اسم جلالت اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے یہ قریب ترین ذکر ہے معنی یہ ہے کہ ہم اس عوض کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے حصہ کو نہیں بیچتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ شہادت کی طرف راجع ہو اور قول کے معنی پر وہ ذکر کی گئی ہو جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينها وبين الله حجاب(1) مظلوم کی بددعا سے بچو، کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب نہیں ہے۔ ضمیر کا مرجع دعوۃ ہے جس کا معنی دعا ہے یہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثَمَنًا کوفیوں نے کہا: اس کا معنی ہے ذاثمن ایسا مال جو قیمت والا ہے پس مضاف کو حذف کیا گیا ہے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور ہمارے نزدیک اور بہت سے علماء کے نزدیک ثمن کبھی مراد ہوتی ہے اور کبھی سامان مراد ہوتا ہے۔ ثمن ہمارے نزدیک خریدی گئی چیز ہے جس طرح ثمن والی چیز خریدی جاتی ہے، پس ثمن اور ثمن والی چیز دونوں مبیع ہوتی ہیں بیع سامان، نقدی پر یا دونوں عرض (سامان) پر یا دونوں نقدی پر گھومتی رہتی ہے اس اصل پر مسئلہ پیدا ہوتا ہے جب مشتری مفلس قرار دیا جائے اور بائع اپنا سامان پائے تو کیا وہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: وہ اس کا زیادہ مستحق نہیں ہے اور انہوں نے اس اصل پر بنیاد رکھی ہے۔ اور ان کے شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد فرماتے ہیں: دوسرے قرض خواہوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: افلاس کی صورت میں وہ زیادہ حق دار ہے موت کی صورت میں نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: افلاس اور موت دونوں صورتوں میں اس کا مالک زیادہ مستحق ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اس دلیل سے حجت پکڑی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور اس اصل کلی سے کہ مفلس اور میت کے ذمہ میں اور جوان کے ہاتھوں میں ہے وہ قرض کو پورا کرنے کا محل ہے پس تمام قرض خواہ اپنے اپنے مال کی مقدار کے مطابق اس میں برابر کے شریک ہوں گے اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ سامان بعینہ موجود ہو یا نہ ہو، کیونکہ وہ بائع کی ملکیت سے مال نکل گیا ہے اور اس کی قیمت واجب ہوگئی ہے۔ اس پر اجماع ہے، پس ان کے لیے اس مال کی قیمت ہوگی یا جو اس میں سے موجود ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 331

گا۔ امام مالک اور امام شافعی نے اس قاعدہ کو ان اخبار کے ساتھ خاص کیا ہے جو اس باب میں مروی ہیں جنہیں ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 21۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ یعنی جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں شہادت میں سے علم عطا فرمایا ہے۔ اس میں سات قرأتیں ہیں، جو ان کو جاننے کا ارادہ کرے تو وہ "التحصیل" وغیرہ کتب میں پالے گا۔

**مسئلہ نمبر 22۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا حضرت عمر نے فرمایا: اس سورت میں جو احکام ہیں ان میں سے مشکل ترین آیت ہے۔ زجاج نے کہا: اور قرآن میں ترکیب کے اعتبار سے مشکل ترین یہ ارشاد ہے: مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ۔ عثر علی کذا۔ یعنی وہ اس پر مطلع ہوا، کہا جاتا ہے: عثرت منه علی خیانة یعنی میں مطلع ہوا۔ اعثرت غیری علیه، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ (الکہف: 21) کیونکہ وہ انہیں طلب کرتے تھے ان پر ان کی جگہ مخفی ہو گئی تھی العثور کا اصل معنی کسی شے پر گرنا اور واقع ہونا ہے اسی سے عربوں کا قول ہے: عثر الرجل یعثر عثورا جب اس کی انگلی کسی چیز کے ساتھ لگے اور اس کے ساتھ ٹکرا جائے۔ عثرت اصبع فلان بکذا جب اس کی انگلی کسی چیز کو لگے اور اس پر واقع ہو۔ عثر الفرس عثارا۔ اعشیٰ نے کہا:

بذاتِ لَوْث عَفَرْنَاةٍ إذا عَثَرَتْ　　فالتَّعْسُ أدْنَى لها مِنْ أنْ أقول لَعَا

العثیر اڑنے والا غبار، کیونکہ وہ چہرے پر گرتا ہے۔ العثیر مخفی اثر، کیونکہ وہ پوشیدگی سے اس پر واقع ہوتا ہے۔ اَنَّهُمَا میں ضمیر ان وصیوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو اثنان کے ارشاد میں ذکر کیے گئے ہیں یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع گواہ ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اسْتَحَقَّاۤ یعنی أستوجبا مستحق ہوا، اِثْمًا۔ خیانت کر کے انہوں نے وہ لیا جو ان کے لیے نہیں تھا۔ جھوٹی قسم کے ساتھ باطل گواہی کے ساتھ۔ ابو علی نے کہا: اثم اس چیز کا نام ہوتا ہے جو بغیر حق کے ظلماً لی جاتی ہے، کیونکہ اس کے بدلے میں اس کا لینا اثم ہے اس کو اثم کہا جاتا ہے جیسا کہ اس چیز کو اثم کہا جاتا ہے جو بغیر حق کے ظلماً لی جاتی ہے۔ سیبویہ نے کہا: مظلمة وہ ہے جو تجھ سے لی جاتی ہے، اسی طرح جو چیز لی جاتی ہے اسے مصدر کا نام دیا جاتا ہے اور وہ الجام ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 23۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا یعنی قسموں میں یا گواہی میں دو ان کی جگہ کھڑے ہوں اور فرمایا: فَاٰخَرٰنِ اس کے مطابق کہ ورثا دو تھے اور فَاٰخَرٰنِ کو رفع مضمر فعل کے ساتھ دیا گیا ہے اور يَقُوْمٰنِ صفت ہے اور مَقَامَهُمَا مصدر ہے اس کی تقدیر یوں ہے مقاما مثل مقامهما پھر صفت کو موصوف کی جگہ رکھا گیا اور مضاف الیہ کی جگہ رکھا گیا۔

**مسئلہ نمبر 24۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ، ابن السری نے کہا: اس کا معنی ہے

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب الاجارة، باب فی الرجل یفلس فلیجد الرجل الخ، حدیث نمبر 3056-3055، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 254، دار الکتب العلمیہ بیروت

جن کو وصیت کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ نحاس نے کہا: یہ سب سے بہتر ہے، کیونکہ ایک حرف کو دوسرے حرف کا بدل نہیں بنایا جاتا۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے تفسیر بھی اسی کے مطابق ہے، کیونکہ اہل تفسیر کے نزدیک اس کا معنی ہے: من الذین استحقت علیھم الوصیۃ جن پر وصیت کرنے کا حق رکھا گیا تھا اور الْاَوْلَیٰنِ، فَاٰخَرٰنِ سے بدل ہے۔ یہ ابن السری کا قول ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا ہے یہ نکرہ سے معرفہ بدل بن رہا ہے اور نکرہ سے معرفہ کو بدل بنانا جائز ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جب نکرہ پہلے ذکر کیا گیا ہو پھر اس کا ذکر دوبارہ کیا جائے تو وہ معرفہ بن جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (النور:35) پھر فرمایا: اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ (النور:35) پھر فرمایا: اَلزُّجَاجَةُ۔ بعض علماء نے فرمایا: الْاَوْلَیٰنِ اس ضمیر سے بدل ہے جو يَقُوْمٰنِ میں ہے گویا فرمایا: فیقوم الاولیان یا مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فاخران یقومان مقامھما ھما الاولیان۔ ابن عیسیٰ نے کہا: الاولیان، مضاف کے حذف پر استحق کا مفعول ہے یعنی استحق فیھم وبسببھم إثم الاولیین۔ پس فعلیھم بمعنی فیھم ہے جیسے علی ملك سلیمان۔ یعنی فی ملك سلیمان۔ شاعر نے کہا:

متی ماتُنکِرھا تَعرفوھا علی أقطارھا عَلَقٌ نَفِیثُ

اس شعر میں بھی علی بمعنی فی استعمال ہوا ہے یعنی فی اقطارھا۔

یحییٰ بن وثاب، اعمش اور حمزہ نے الْاَوَّلِین پڑھا ہے۔ اول کی جمع اس بنا پر کہ یہ اللذین سے بدل ہے یا علیھم کی ضمیر سے بدل ہے حفص نے استحق تا اور حا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے اور اس کا فاعل الاولیان ہے اور مفعول محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: من الذین استحق علیھم الاولیان بالمیت وصیتہ التی اوصی بھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر یہ ہے استحق علیھم الاولیان رد الایمان یعنی ان پر قریبی دو شخ قسموں کو لوٹانے کے حقدار ہیں۔ حسن سے الْاَوْلَان مروی ہے۔ ابن سیرین سے الْاَوَّلَیْنِ مروی ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں قرأتیں غلط ہیں مثنیٰ میں مثنان نہیں کہا جاتا مگر حسن سے الْاَوْلَان مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ یعنی وہ دو قسمیں اٹھائیں جو گواہوں کے قائم مقام ہوں۔ یہ کہیں کہ جو ہمارے ساتھی نے وصیت میں کہا وہ حق ہے اور وہ مال جس کی اس نے تمہیں وصیت کی وہ اس سے زیادہ ہے جو تم نے ہمیں دیا ہے اور یہ برتن ہمارے اس ساتھی کے سامان سے ہے جس کو وہ لے کر گیا تھا اور اس نے اس کو اپنی وصیت میں لکھا ہے اور تم دونوں نے خیانت کی ہے، پھر یہ ارشاد فرمایا: لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا یعنی ہماری قسمیں تمہاری قسموں سے زیادہ ٹھیک ہے۔ پس صحیح ہے کہ شہادت کبھی یمین (قسم) کے معنی میں ہوتی ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ (النور:6)

معمر نے ایوب سے انہوں نے ابن سیرین سے انہوں نے عبیدہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میت کے اولیاء میں سے دو آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے قسمیں اٹھائیں۔ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ یہ مبتدا خبر ہیں اور وَمَا اعْتَدَيْنَآ یعنی ہم نے اپنی قسموں

میں حق سے تجاوز نہیں کیا اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ۝ یعنی پھر تو ہم نے باطل پر قسمیں اٹھائیں اور ہم نے وہ لیا جو ہمارا نہیں تھا۔

**مسئلہ نمبر 26۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ اَدْنٰۤى یہ مبتدا خبر ہیں ان محل نصب میں ہے۔ یَّاْتُوْا، اَنْ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَوْ یَخَافُوْۤا اس پر معطوف ہے۔ اَنْ تُرَدَّ، یَخَافُوْۤا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ بعض علماء نے فرمایا یَّاْتُوْا اور فخافوا کی ضمائر موصی الیھما (جن کو وصیت کی گئی) کی طرف راجع ہیں۔ یہ آیت کے سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہیں یعنی یہ لائق ہے کہ لوگ خیانت سے بچیں اور وہ رسوائی کے خوف سے سچی سچی گواہی دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مدعی پر قسم لوٹائی جائے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 27۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا یہ امر کے صیغے ہیں اسی وجہ سے نون حذف کی گئی ہے یعنی جو تمہیں کہا جاتا ہے اسے قبول کرتے ہوئے سنو اور اللہ کے امر کی اس میں اتباع کرتے ہوئے سنو۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۝ فَسَقَ یَفْسِقُ ویَفْسُقُ بولا جاتا ہے جب کوئی اطاعت سے معصیت کی طرف نکل جائے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے واللہ اعلم

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۝

''جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو پھر پوچھے گا (ان سے) کیا جواب ملا تمہیں؟ عرض کریں گے: کوئی علم نہیں ہمیں، بے شک تو ہی خوب جاننے والا ہے سب غیبوں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ۔ کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا ماقبل سے کیسے تعلق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ زجر کے اعتبار سے اتصال ہے جو انہوں نے وصیت وغیرہ میں حقیقت کے خلاف ظاہر کیا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر جزا دینے والا عالم ہے۔ یَوْمَ ظرف زمان ہے اس میں عامل اسمعوا ہے یعنی اس دن کی خبر سنو۔ بعض علماء نے فرمایا: تقدیر اس طرح ہے: واتقوا یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ ڈرو اس دن سے اللہ تعالیٰ جس میں رسولوں کو جمع فرمائے گا۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تقدیر یہ ہے اذکروا او احذروا یوم القیامة حین یجمع اللہ الرسل معنی قریب ہے اور مراد ڈرانا اور دھمکی دینا ہے۔ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ تمہاری امتوں نے تمہیں کیا جواب دیا اور تمہاری قوم نے تمہیں کیا جواب دیا جب تم نے انہیں میری توحید کی طرف بلایا۔ قَالُوْا تو وہ کہیں گے لَا عِلْمَ لَنَا علماء مفسرین کا لَا عِلْمَ لَنَا کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: جو ہماری امتوں نے جواب دیا اس کے باطن کا ہمیں علم نہیں ہے، کیونکہ وہ یہ ہے جس پر جزا واقع ہوتی ہے، یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں علم عطا فرمایا، پس اس کلام میں حذف ہے۔

حضرت ابن عباس اور مجاہد سے اس کے خلاف مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے ہمیں

کوئی علم نہیں مگر وہ علم جس کو تو ہم سے زیادہ جانتا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں: وہ ڈرتے ہوں گے اور جواب دینے سے گھبراتے ہوں گے، پھر عقول جو جواب ان کی طرف لوٹائیں گی اس کے بعد وہ جواب دیں گے اور کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ حسن، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ رسولوں کو کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ قیامت کے اکثر مقام پر ہوگا، حدیث میں ہے ''جب جہنم کو لایا جائے گا وہ زور سے آواز نکالے گی کوئی نبی اور صدیق نہیں ہوگا مگر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جائے گا'' (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل نے مجھے قیامت کے دن کا خوف دلایا حتیٰ کہ اس نے مجھے رلا دیا۔ میں نے کہا: اے جبریل! کیا مجھے اگلے اور پچھلے گناہوں سے محفوظ نہیں کیا گیا؟'' جبریل نے مجھے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم اس دن کی ہولنا کی کو دیکھو گے جو تمہیں مغفرت کا مژدہ بھلا دے گی۔

میں کہتا ہوں: اگر سوال جہنم کے چیخنے کے وقت کا ہوگا...... جیسا کہ بعض نے کہا ہے...... تو مجاہد اور حسن کا قول صحیح ہے واللہ اعلم۔ نحاس نے کہا: اس میں صحیح یہ ہے کہ معنی یہ ہے کہ تمہیں سراً اور اعلانیہ کیا جواب دیا گیا تا کہ یہ کفار کے لیے توبیخ ہو جائے۔ وہ کہیں گے: ہمیں کوئی علم نہیں، پس یہ تکذیب ہوگی اس کے لیے جس نے مسیح علیہ السلام کو الٰہ بنایا۔ ابن جریج نے کہا: مَاذَآ اُجِبْتُمْ کا معنی ہے انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا؟ تو وہ کہیں گے: ہمیں کوئی علم نہیں، تو تمام غیوب کو خوب جاننے والا ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مشابہ ہے، فرمایا: مجھ پر ایک قوم حوض پر پیش ہوگی، وہ پیچھے کھینچ لیے جائیں گے میں کہوں گا: میرے امتی ہیں، کہا جائے گا: تم نہیں جانتے جو انہوں نے تمہارے بعد بدعتیں نکالیں۔

ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے الغیوب کی غین کو کسرہ دیا ہے اور باقی قراء نے ضمہ دیا ہے۔ ماوردی نے کہا: اگر کہا جائے اللہ تعالیٰ ان سے سوال کیوں کرے گا حالانکہ وہ ان سے زیادہ جانتا ہے؟ اس کے دو جواب ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرے گا تا کہ انبیاء کرام جان لیں کہ ان کے بعد ان کی امتوں نے جو کفر، نفاق اور جھوٹ بولا (۲) اس نے ارادہ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو گواہوں کے سامنے رسوا کرے تا کہ یہ بھی ان کے لیے عقوبت کی نوع بن جائے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''جب فرمائے گا اللہ تعالیٰ: اے عیسیٰ بن مریم! یاد کرو میرا انعام اپنے پر اور اپنی والدہ پر جب میں نے مدد فرمائی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 257، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ حلیۃ الاولیاء، ابونعیم، جلد 5، صفحہ 371

تمہاری روح القدس سے، باتیں کرتا تھا تو لوگوں سے (جبکہ تو ابھی) پنگھوڑے میں تھا اور جب پکی عمر کو پہنچا اور جب سکھائی میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل اور جب تو بنا تا تھا کیچڑ سے پرندے کی سی صورت میرے اذن سے پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو وہ (مٹی کا بے جان پتلہ) بن جاتا تھا پرندہ میرے اذن سے اور (جب) تو تندرست کر دیا کرتا تھا مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے اذن سے اور جب تو (زندہ کر کے) نکالا کرتا تھا مردوں کو میرے اذن سے اور جب میں نے روک دیا تھا بنی اسرائیل کو تجھ سے جب تو آیا تھا ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر تو کہا جنہوں نے کفر کیا تھا ان سے کہ یہ سب (معجزات) نہیں ہیں مگر کھلا ہوا جادو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ یہ قیامت کے دن کی صفت ہے گویا فرمایا: اس دن کو یاد کرو جمع فرمائے گا اللہ تعالیٰ رسولوں کو اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح کہے گا۔ یہ مہدوی کا قول ہے۔ عیسیٰ کا رفع کے مقام پر ہونا بھی جائز ہے اس بنا پر کہ ابن مریم دوسرا منادی ہو اور محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے، کیونکہ اس قسم کا منادی منصوب ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

یا حَکَمَ بنَ الْمُنْذِرِبْنِ الجَارُود

اور دوسرے اسم میں رفع جائز نہیں، جب وہ مضاف ہو۔ محمد بن احمد بن عبد الطوال نحوی کے نزدیک جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وہ نعمت یاد دلائے گا جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور ان کی والدہ پر کی تھی وہ ان کو دو وجوہ سے یاد دلا رہا ہے (۱) تا کہ وہ امتوں پر پڑھیں ان کرامات کو جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص فرمایا اور جن کے ساتھ انہیں علو مرتبہ کے اعتبار سے ممتاز فرمایا (۲) تا کہ حجت پختہ ہو جائے اور ان کے منکر کا رد ہو جائے، پھر اس نے اپنی نعمتوں کو شمار کرنا شروع کیا فرمایا: اِذْ اَيَّدْتُّكَ یعنی میں نے تجھے قوت بخشی۔ یہ الاید سے مشتق ہے جس کا معنی قوت ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں دو وجہیں ہیں (۱) پاکیزہ روح جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص فرمایا جیسا کہ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (النساء: 171) کے قول کے تحت گزر چکا ہے (۲) اس سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں۔ یہ اصح قول ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

تُكَلِّمُ النَّاسَ یعنی تو باتیں کرتا تھا لوگوں سے پنگھوڑے میں بچہ ہونے کے وقت اور کہولت (پکی عمر) میں نبی ہونے کی حیثیت سے۔ اس کا معنی اور مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ كَفَفْتُ اس کا معنی ہے میں نے دور کیا، پھیر دیا۔ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ بنی اسرائیل کو جب انہوں نے تمہارے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ یعنی دلالات اور معجزات، یہ آیت میں مذکور ہیں۔ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی جو تجھ پر ایمان نہیں لائے اور جنہوں نے تیری نبوت کا انکار کیا انہوں نے کہا: اِنْ هٰذَاۤ آیہ معجزات اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ کھلا جادو ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ساحر پڑھا ہے یعنی یہ شخص نہیں ہے مگر جادو پر پوری قوت رکھتا ہے۔

وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ ایمان لاؤ میرے ساتھ اور میرے رسول کے ساتھ انہوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور (اے مولا) تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ اس آیت کے معانی میں کلام گزر چکی ہے کلام عرب میں وحی کا معنی الہام ہے، وحی کے کئی معانی ہیں۔ وحی بمعنی جبریل کو رسولوں کی طرف بھیجنا اور وحی بمعنی الہام جیسا کہ اس آیت میں ہے یعنی میں نے انہیں الہام کیا اور ان کے دل میں ڈال دیا۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل: 68) تیرے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں ڈالا۔ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى (القصص: 7) ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں الہام کیا۔ وحی بمعنی نیند اور بیداری میں آگاہ کرنا بھی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اَوْحَیْتُ کا معنی ہے امرت میں نے حکم دیا۔ الی صلہ ہے کہا جاتا ہے: وحی، اوحی کا ایک معنی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾ (الزلزلۃ) حجاج نے کہا: وحی لھا القرار فاستقرت یعنی اسے قرار کا حکم دیا تو وہ قرار پکڑ گئی۔ بعض نے فرمایا: یہاں اَوْحَیْتُ کا معنی ہے میں نے انہیں حکم دیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں نے انہیں بیان کیا۔ وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اصل پر ہے بعض عرب ایک نون کو حذف کر دیتے ہیں یعنی اے میرے رب گواہ رہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اے عیسیٰ تم گواہ رہو ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

''جب کہا تھا حواریوں نے اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ کر سکتا ہے تیرا رب کہ اتارے ہم پر ایک خوان آسمان سے ان کی (اس تجویز پر) عیسیٰ نے کہا: ڈرو اللہ سے اگر تم مومن ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اس کا اعراب پہلے گزر چکا ہے۔ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ کسائی، حضرت علی، حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر اور مجاہد کی قرأت هل تستطیع یعنی تا کے ساتھ ہے(1) اور ربک نصب کے ساتھ ہے۔ کسائی نے ھل کے لام کو لا میں ادغام کیا ہے باقی قراء نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ربک کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے یہ قرأت پہلی قرأت سے زیادہ واضح ہے۔ سدی نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرے تو کیا تیرا رب تیری دعا قبول کرے گا؟ پس یَسْتَطِیْعُ بمعنی یطیع ہوگا جیسا کہ علماء نے کہا: استجاب بمعنی اجاب ہوتا ہے اسی طرح استطاع بمعنی اطاع ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا تیرا رب قدرت رکھتا ہے؟ یہ سوال ان کا اللہ تعالیٰ کی معرفت کے استحکام سے پہلے تھا اسی وجہ سے ان کی غلطی اور ان کی نامناسب تجویز پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا: اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 259

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿﴾ الله سے ڈرو اگر تم مومن ہو، یعنی الله کی قدرت میں شک نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، کیونکہ حواری انبیاء کرام مخلص جانثار اور قریبی لوگ ہوتے ہیں جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۗ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران:52) کون ہیں میرے مددگار الله کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کیا ہم مددکرنے والے ہیں الله (کے دین) کی۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کے حواری (مخلص ساتھی) ہوتے ہیں اور میرا حواری (مخلص ساتھی) زبیر ہے'' (1)۔ یہ معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام الله تعالیٰ کی معرفت اور جو اس کے لیے واجب اور جائز تھا اور جو اس پر کہنا حلال تھا وہ لے کر آئے اور انہوں نے یہ اپنی امتوں تک پہنچایا تھا پھر یہ بات ان خاص لوگوں پر کیسے مخفی تھی حتیٰ کہ وہ الله کی قدرت سے بھی ناواقف تھے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان لوگوں سے صادر ہوا جو ان کے ساتھ تھے جس طرح بعض جہال نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: ہمارے لیے ایک درخت متعین فرما دیں جس طرح ان مشرکوں کے لیے ایک متعین ہے (2) (مشرک زمانہ جاہلیت میں اس کی عبادت کرتے تھے) اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے چند لوگوں نے کہا: اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:138) اس کا بیان ان شاء الله سورۃ الاعراف میں آئے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: ان لوگوں کو الله تعالیٰ کی قدرت میں شک نہیں تھا، کیونکہ وہ مومن، عارف اور عالم تھے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے جیسے تو کسی کو کہتا ہے: کیا فلاں آنے کی طاقت رکھتا ہے؟ حالانکہ تو جانتا ہے کہ وہ طاقت رکھتا ہے پس معنی یہ ہوگا کیا وہ یہ کرے گا، کیا وہ میری یہ بات قبول کرے گا یا نہیں؟ وہ الله تعالیٰ کی استطاعت کو جانتے تھے کہ وہ یہ بھی کر سکتا ہے اور اس کے علاوہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ وہ خبر، دلالت اور نظر کے اعتبار سے جانتے تھے پس انہوں نے علم معاینہ کا ارادہ کیا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: اے میرے رب! دکھا مجھے کیسے تو مردوں کو زندہ کرے گا؟ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خبر اور نظر کے اعتبار سے یہ جانتے تھے لیکن انہوں نے اس معاینہ کا ارادہ کیا جس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا، کیونکہ نظر اور خبر کے علم میں شبہ اور اعتراضات داخل ہوتے ہیں اور علم المعاینہ میں ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہوتی اسی وجہ سے حواریوں نے کہا: تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (بقرہ:260)

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ تاویل ہے اور اس سے بھی بہتر تاویل وہ ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول تھا جو حواریوں کے ساتھ تھے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابن عربی نے الله تعالیٰ کے اسماء میں المستطیع کو بھی داخل کیا ہے اور فرمایا: کتاب و سنت میں یہ اسم موجود نہیں ہے لیکن فعلاً وارد ہے انہوں نے حواریوں کا قول ذکر کیا هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ۔ ابن الحصار نے اپنی کتاب ''شرح السنۃ'' میں اس کا رد کیا ہے۔ ابن الحصار نے کہا: الله تعالیٰ کا یہ قول اس بات کی خبر دے رہا ہے جو حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ استطاعت میں شک نہیں تھا اس سوال میں تلطف اور الله تعالیٰ کا ادب مقصود تھا، کیونکہ ہر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 527

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء لترکبن سنن من کان قبلکم، حدیث نمبر 2106، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ممکن کا وقوع اس کے علم میں ہے اور حواری تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں اچھے لوگ تھے پھر یہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ہر ممکن چیز پر قادر ہونے کے متعلق جہالت کا گمان کیسے جائز ہے؟ رہی تا والی قرأت۔ تو بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا تو اپنے رب سے سوال کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ یہ حضرت عائشہ اور مجاہد کا قول ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا: قوم اللہ تعالیٰ کی ذات کو زیادہ جانتی تھی (1)، وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا اس کا مطلب ہے کیا تو اپنے رب سے سوال کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟۔

حضرت عائشہ سے یہ بھی مروی ہے فرمایا: حواریوں کو شک نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ دستر خوان کے اتارنے پر قادر ہے لیکن انہوں نے کہا: کیا تو اپنے رب سے سوال کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے فرمایا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا: هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ۔ معاذ نے کہا: میں نے کئی مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تا کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا۔ هَلْ تستطيع رَبُّكَ (2)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے جو تو اپنے رب سے سوال کرے گا کیا تو دعویٰ کرتا ہے کہ تیرا رب تیری دعا قبول فرمائے گا؟ بعض علماء نے فرمایا: کیا تو اپنے رب سے دعا یا سوال کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ یہ مفہوم قریب قریب ہیں۔ محذوف نکالنا ضروری ہے جیسے فرمایا: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور یا کی قراءت پر حذف کی ضرورت نہیں رہتی۔ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ یعنی گناہوں سے اور کثرت سوال سے بچو، کیونکہ تم نہیں جانتے ہو کہ وہ آیات کی تجویز پر تمہارے لیے کیا اتار دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود وہی کرتا ہے جو اس کے بندوں کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی اگر تم اس پر ایمان لانے والے ہو اور جو کچھ وہ لے کر آیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہو، وہ تمہارے لیے ایسی آیات لایا ہے جن میں کفایت ہے۔

**قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۱۱۳**

''حواریوں نے کہا: ہم تو (بس) یہ چاہتے ہیں کہ ہم کھائیں اس سے اور مطمئن ہو جائیں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا تھا اور ہم ہو جائیں اس پر گواہی دینے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا۔ ان کی وجہ سے ناکل منصوب ہے۔ وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ یہ تمام معطوف ہے انہوں نے اپنے سوال کا سبب بیان کیا جب انہیں سوال سے منع کیا گیا۔ نَّاْكُلَ مِنْهَا میں دو وجہیں ہیں: (۱) انہوں نے اپنی بھوک مٹانے کی حاجت کے لیے کھانے کا ارادہ کیا۔ یہ اس لیے تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نکلتے تھے تو ان کے پیچھے پانچ ہزار یا اس سے زیادہ آدمی ہوتے تھے، بعض تو ان میں آپ کے اصحاب ہوتے تھے اور بعض آپ سے اپنی تکالیف اور مرضوں کے لیے دعا کروانے والے ہوتے تھے، کیونکہ وہ اپاہج یا نابینا ہوتے تھے، بعض دیکھتے تھے اور استہزاء کرتے تھے۔ ایک دن آپ ایک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 259، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب القرأۃ عن رسول اللہ، باب فی فاتحۃ الکتاب، حدیث نمبر 2854، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

علاقہ کی طرف نکلے تو ایک جنگل میں پہنچ گئے جہاں ان کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا وہ بھوکے ہو گئے اور انہوں نے حواریوں سے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کرو تا کہ وہ دعا فرمائیں کہ ہم پر آسمان سے خوان نازل ہو۔ شمعون جو حواریوں کے سردار تھے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ عرض کر رہے ہیں آپ دعا فرمائیں ان پر آسمان سے خوان نازل ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شمعون سے کہا: ان کو کہو کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ شمعون نے یہ لوگوں کو کہا تو پھر انہوں نے کہا: تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کرو کہ ہم اس سے کھانا چاہتے ہیں۔ (۲) نَّاْكُلَ مِنْهَا تا کہ ہم اس کی برکت حاصل کریں ہمیں کھانے کی حاجت نہیں۔ ماوردی نے کہا: یہ بہتر ہے، کیونکہ اگر وہ کھانے کے محتاج ہوتے تو انہیں سوال کرنے سے منع نہ کیا جاتا۔

وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا میں تین احتمال ہیں: (۱) ہمارے دل مطمئن ہو جائیں کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے (۲) ہم مطمئن ہو جائیں کہ اللہ نے ہمیں ہماری دعوت کے لیے چن لیا ہے (۳) ہمارے دل مطمئن ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سوال کو قبول فرما لیا ہے۔ یہ تینوں احتمال ماوردی نے ذکر کیے ہیں۔ مہدوی نے کہا: ہمارے دل مطمئن ہو جائیں کہ اس نے ہمارے روزے اور عمل کو قبول فرما لیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہم اس کی قدرت کا یقین کر لیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں۔ وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۝ اور ہم اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت و نبوت کی گواہی دینے والے ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جب ہم لوٹ کر جائیں تو جنہوں نے یہ نہیں دیکھا ہم تمہارے لیے ان کے پاس گواہ ہو جائیں۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۝

”عرض کی عیسیٰ بن مریم نے، اے اللہ! ہم سب کے پالنے والے اتار ہم پر خوان آسمان سے، بن جائے ہم سب کے لیے خوشی کا دن (یعنی) ہمارے اگلوں کے لیے بھی اور پچھلوں کے لیے بھی اور (ہو جائے) ایک نشانی تیری طرف سے اور رزق دے ہمیں اور تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ سیبویہ کے نزدیک اللّٰهُمَّ کی اصل یا اللہ ہے دو میم آخر میں یا کا بدل ہیں اور رَبَّنَاۤ دوسرا منادیٰ ہے (1)۔ سیبویہ اس کے علاوہ کوئی صورت جائز قرار نہیں دیتے۔ نعت ہونا جائز نہیں، کیونکہ اصوات مشابہ ہوتی ہیں اس کی وجہ سے جو اس کو لاحق ہوتی ہے۔ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً، مائدہ اس دستر خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اور جس پر کھانا نہ ہو اسے خوان کہا جاتا ہے یہ ماد عبدہ سے فاعلة کا وزن ہے جب غلام کھانا کھلائے۔ المائدہ جود یا گیا ہو۔ اسی سے رؤبۃ کا قول ہے، اخفش نے اس کو پڑھا:

نُهدى رؤس المترفين الأنداد    إلى أمير المؤمنين الممتاد (2)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 261
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 260

یعنی جس کا سوال کیا گیا ہو۔ پس المائدہ جو کھانے والوں کو کھانا کھلایا گیا ہو کھانے کو مجازاً مائدہ کہتے ہیں، کیونکہ وہ مائدہ پر کھایا جاتا ہے جیسے عرب بارش کو آسمان کہتے ہیں، اہل کوفہ نے کہا: مائدہ کو مائدہ اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ جو اس پر ہوتا ہے حرکت کرتا ہے یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہوگا ماد الشیٔ جب کوئی چیز حرکت کرے۔ شاعر نے کہا:

لعلك باكٍ إنْ تَغَنَّتْ حمامةٌ　　يَمِيدُ بها غُصْن من الأَيْكِ مائلُ

اس شعر میں یمید کا معنی حرکت کرنا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وأقلقنی قتلُ الكنانی بعدہ　　فكادَتْ بی الأرضُ الفضاءُ تَمِیدُ

اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل: 15) اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ۔

ابو عبیدہ نے کہا: مائدۃ فاعلۃ بمعنی مفعولۃ ہے جیسے عيشةٌ راضية بمعنی عيشة مرضية ہے۔ ماء دافق بمعنی مدفوق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا، تَكُوْنُ، مَآىِٕدَةً کی صفت ہے جواب نہیں ہے۔ اعمش نے تکن جواب کی بنا پر مجزوم پڑھا ہے اس کا معنی ہے اس کے نزول کا دن ہمارے پہلے اور پچھلے لوگوں کے لیے عید کا دن ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: مائدہ (دستر خوان) ان پر اتوار کے دن صبح و شام نازل ہوتا تھا، اسی وجہ سے انہوں نے اتوار کو عید کا دن بنایا۔ العید، مفرد ہے اور اس کی جمع الاعیاد ہے اس کی جمع یا کے ساتھ بنائی گئی ہے، حالانکہ اس کی اصل واو ہے، کیونکہ یا واحد میں لازم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے اور اعواد الخشب کے درمیان فرق کرنے کے لیے یا سے جمع بنائی گئی ہے۔ قد عیدوا کا معنی ہے وہ عید میں حاضر ہوئے یہ جوہری کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل عاد یعود ہے یعنی لوٹنا عید اصل میں عود تھا واو کو ماقبل کسرہ کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا جیسے میزان، میقات اور میعاد میں یہ اصل میں موازن، موقات، اور موعاد تھے۔

بعض علماء نے فرمایا: عید الفطر اور اضحیٰ کو عید اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ ہر سال لوٹ کر آتی ہیں۔ خلیل نے کہا: عید ہر وہ دن ہے جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں گویا وہ اس کی طرف لوٹ کر آئے ہیں۔ ابن الانباری نے کہا: عید کو عید کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ خوشی اور فرحت میں لوٹ کر آتی ہے کہ یہ تمام مخلوق کے لیے خوشی کا دن ہے کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ قیدی بھی اس دن طلب نہیں کیے جاتے اور سزا نہیں دیئے جاتے، وحشی اور پرندے شکار نہیں کیے جاتے اور بچے مدارس میں نہیں جاتے۔ بعض علماء نے فرمایا: عید کو عید اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ ہر انسان اپنی قدر و منزلت کی طرف لوٹتا ہے کیا آپ دیکھتے نہیں کہ لوگوں کے لباس، ہیئات اور کھانے مختلف ہوتے ہیں بعض مہمان ہوتے ہیں بعض میزبان ہوتے ہیں، بعض رحم کرتے ہیں بعض پر رحم کیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: عید کو عید اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ عزت و عظمت والا دن ہے اس کو عید کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ ایک عربوں کے نزدیک بہترین نر تھا اور اس کی لوگ نسبت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے: ابل عیدیۃ۔ شاعر نے کہا:

عِيدِيَّةٌ أُرْدِهِنَتْ فيها الدنانيرُ

یہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے لِاُولٰنَا وَ اُخْرٰنَا جمع پڑھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے لوگوں کے آخری شخص نے اسی طرح کھایا جس طرح پہلے شخص نے کھایا۔ وَ اٰيَةً مِّنْكَ یعنی یہ تمہاری طرف سے حجت و دلالت ہو گا۔ وَارْزُقْنَا یعنی ہمیں عطا فرما، وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۝ یعنی جس نے بھی عطا کیا تو اس سے بہتر ہے، کیونکہ تو غنی اور خوبیوں سراپا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝

”فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ بلاشبہ میں اتارنے والا ہوں اسے تم پر پھر جس نے کفر اختیار کیا اس کے بعد تم سے، تو بے شک میں عذاب دوں گا اسے ایسا عذاب کہ نہیں دوں گا کسی کو بھی اہل جہان سے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوال کا اس کے ساتھ جواب دیا جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سوال حواریوں کے لیے جواب تھا، یہ اس چیز کو ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دسترخوان کو نازل کیا اور اس کا وعدہ حق ہے پس ایک قوم نے مائدہ کے نزول کے بعد انکار کیا اور کفر کیا پس انہیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ کر دیا گیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: قیامت کے روز سب سے سخت عذاب منافقوں کو ہو گا اور اصحاب مائدہ اور آل فرعون میں سے جنہوں نے کفر کیا تھا (1)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝ علماء کا مائدہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا وہ نازل ہوا تھا یا نہیں؟ پس جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ نازل ہوا تھا اور یہی نظریہ حق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ مجاہد نے کہا: وہ نازل نہیں ہوا تھا یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے بیان فرمائی ہے اور لوگوں کو منع فرمایا کہ انبیاء سے نشانیوں کا سوال کریں۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کا سوال قبول کرنے کا وعدہ فرمایا جب انہیں فرمایا: فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ پھر جو تم میں سے اس کے بعد کفر کرے گا۔ تو اسے عذاب دوں گا...... الخ۔ تو وہ اپنے مطالبہ سے مستعفی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور کہا: ہم یہ نہیں چاہتے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ یہ قول اور اس سے پہلے والا قول غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ مائدہ نازل ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: حضرت عیسیٰ بن مریم نے بنی اسرائیل کو کہا: تم تیس دن روزے رکھو پھر اللہ تعالیٰ سے جو چاہو سوال کرو وہ تمہیں عطا فرمائے گا، پس انہوں نے تیس روزے رکھے اور کہا: اے عیسیٰ! اگر ہم کسی کے لیے کام کرتے ہیں پھر اپنے کام کو ختم کرتے ہیں تو وہ ہمیں کھانا کھلاتا ہے اور ہم نے روزے رکھے ہم بھوکے رہے ہیں پس تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے۔ ملائکہ وہ دسترخوان اٹھا کر لے آئے اس پر سات روٹیاں تھیں سات مچھلیاں تھیں پس انہوں نے لوگوں کے سامنے وہ دسترخوان رکھ دیا پس لوگوں کے آخری آدمی نے بھی اسی طرح کھایا جس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 262

طرح پہلے آدمی نے کھایا تھا۔ ابوعبداللہ محمد بن علی ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا فرمایا ہمیں عمار بن ہارون ثقفی نے بتایا انہوں نے زکریا بن حکیم حنظلی سے روایت کیا انہوں نے علی بن زید بن جدعان سے انہوں نے ابوعثمان نہدی سے انہوں نے حضرت سلمان فارسی سے روایت کیا فرمایا: جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مائدہ کا سوال کیا تو وہ کھڑے ہوئے اپنے اون والے کپڑے اتار دیئے اور کھدر والے کپڑے پہن لیے وہ سیاہ موٹے دھاگے سے سربال تھا اور سیاہ لحاف تھا۔ آپ اٹھے اور قدم سے قدم ملایا اور ایڑی کے ساتھ ایڑی کو ملایا اور انگوٹھے کو انگوٹھے کے ساتھ ملایا اور اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا، پھر اپنے سر کو جھکایا اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع کیا پھر رونے لگے حتیٰ کہ آنسو ان کی داڑھی پر جاری ہوئے اور آنسوؤں کے قطرے ان کے سینے پر گرنے لگے، پھر عرض کی: اے اللہ ہمارے پروردگار! ہم پر دسترخوان نازل فرما آسمان سے وہ ہمارے پہلے اور پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں عطا فرما اور تو روزی دینے والوں میں سے سب سے بہتر ہے۔ پس زرد گول دسترخوان نازل ہوا وہ دو عماموں کے درمیان تھا ایک عمامہ اوپر تھا اور ایک عمامہ نیچے تھا اور لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! اسے رحمت بنا اور اسے آزمائش نہ بنا الٰہی! میں تجھ سے عجائب کا سوال کرتا ہوں پس تو عطا کرتا ہے پس دسترخوان عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے اترا اور وہ رومال سے ڈھانپا ہوا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سجدہ میں گر گئے اور حواری بھی آپ کے ساتھ سجدہ میں گر گئے وہ اس کی ایسی عمدہ خوشبو محسوس کر رہے تھے جو انہیں اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: جو تم میں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار ہے اور اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ پر زیادہ اعتماد کرنے والا ہے وہ اس دسترخوان سے کپڑا اٹھائے تاکہ ہم اس سے کھائیں اور ہم اس پر اللہ کا ذکر کریں اور اس پر اللہ کی حمد کریں۔ حواریوں نے کہا: اے روح اللہ! آپ اس کے زیادہ لائق ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھے اچھی طرح وضو کیا پھر نماز پڑھی اور لمبی دعا مانگی پھر دسترخوان پر بیٹھے اور اس سے کپڑا اٹھایا اس دسترخوان پر بھونی ہوئی مچھلی تھی جس میں کوئی کانٹا نہیں تھا اس سے گھی بہہ رہا تھا کراث (بدبودار سبزی) کے علاوہ اس کے اردگرد تمام سبزیاں رکھی گئی تھیں اور اس کے سر کے پاس نمک اور سرکہ تھا اور دم کی جانب پانچ روٹیاں تھیں ایک روٹی پر پانچ انار تھے اور ایک روٹی پر کھجوریں تھیں اور ایک روٹی پر زیتون تھا۔ ثعلبی نے کہا: ایک روٹی پر زیتون تھا دوسری پر شہد تھا اور تیسری پر انڈے تھے اور چوتھی پر پنیر تھا اور پانچویں پر خشک گوشت تھا، یہود کو یہ خبر پہنچی تو غم اور پریشانی میں آئے وہ اس کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ شمعون نے کہا: جو حواریوں کا سردار تھا، اے روح اللہ! یہ دنیا کا کھانا ہے یا جنت کا کھانا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اس کے بعد تم نے ایسی نشانیوں کا سوال کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں عذاب دیا جائے، شمعون نے کہا: بنی اسرائیل کے خدا کی قسم! میں نے اس سے کوئی برا ارادہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا: اے روح اللہ! اگر اس نشانی کے ساتھ ایک اور نشانی بھی ہوتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے مچھلی تو اللہ کے اذن سے زندہ ہو جا، پس وہ مچھلی تازہ مچھلی کی طرح حرکت کرنے لگی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، حواری گھبرا گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا وجہ ہے کہ تم کسی چیز کے بارے سوال کرتے ہو جب وہ تمہیں دی

جاتی ہے تو تم ناپسند کرتے ہو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ تمہیں عذاب دیا جائے؟ فرمایا: یہ دستر خوان آسمان سے نازل ہوا اور اس پر نہ دنیا کا کھانا تھا اور نہ جنت کا کھانا تھا لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت بالغہ سے پیدا کیا تھا۔ اس نے فرمایا: ہو جا تو وہ ہو گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے مچھلی تو اسی طرح ہو جا جس طرح تو پہلے تھی، تو وہ پہلے کی طرح بھونی ہوئی ہو گئی۔ حواریوں نے کہا: اے روح اللہ! آپ ہی پہلے اس سے کھائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: معاذ اللہ! اس سے وہ کھائے جس نے طلب کیا اور جس نے سوال کیا، حواریوں نے اس سے کھانے سے انکار کر دیا اس خوف سے کہیں یہ فتنہ اور سزا نہ ہو، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو اس پر فقراء، مساکین، مریضوں، اپاہج، جزام والے، چلنے سے عاجز، نابینے اور زرد پانی والوں کو بلایا اور فرمایا: اپنے رب کے رزق اور اپنے نبی کی دعا سے کھاؤ اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور فرمایا تمہارے لیے خوشگوار ہوگا اور تمہارے علاوہ لوگوں پر عذاب ہوگا۔ پس انہوں نے کھایا حتیٰ کہ وہ سات ہزار تین سو افراد تھے وہ نکلے تو ڈکار مار رہے تھے اور ہر مریض ٹھیک ہو چکا تھا جس نے اس سے کھایا تھا اور ہر فقیر جس نے اس سے کھایا تھا وہ موت تک کھانے سے مستغنی ہو گیا تھا جب لوگوں نے یہ خیرات و برکات دیکھیں تو اس کھانے پر رش کر کے آ گئے چھوٹا، بڑا، بوڑھا، نوجوان، غنی، فقیر سب آ گئے اور اس سے کھانے لگے، وہ ایک دوسرے پر ناراض ہوئے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ صورت دیکھی تو ان کے درمیان باری مقرر کر دی، ایک دن وہ کھانا نازل ہوتا اور ایک دن نازل نہ ہوتا، جیسا کہ ثمود کی اونٹنی تھی ایک دن گھاس کھاتی تھی اور ایک دن پانی پیتی تھی پس وہ دستر خوان چالیس دن نازل ہوا وہ چاشت کے وقت نازل ہوتا تھا وہ اسی طرح رہتا حتیٰ کہ سایہ ڈھل جاتا۔ ثعلبی نے کہا: وہ دستر خوان قائم رہتا اس سے کھایا جاتا حتیٰ کہ جب سورج ڈھل جاتا تو وہ اوپر اڑ جاتا پس لوگ اس سے کھاتے پھر وہ آسمان کی طرف لوٹ جاتا اور لوگ اس کے سایہ کو دیکھتے رہتے حتیٰ کہ وہ ان سے چھپ جاتا جب چالیس دن مکمل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی۔ اے عیسیٰ! میرے اس دستر خوان کو صرف فقراء کے لیے خاص کر دے اغنیاء کے لیے یہ نہیں ہے، تو اغنیاء اس بارے میں شک کرنے لگے اور وہ فقراء کی طرف لوٹے اور لوگوں کو شک میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں اپنی شرط کے ساتھ پکڑنے والا ہوں پس صبح اس میں سے تینتیس خنزیر بن چکے تھے وہ غلاظت کھاتے تھے اور کوڑا تلاش کرتے تھے، پاکیزہ کھانا کھانے اور نرم بستروں پر سونے کے بعد یہ حالت ہو گئی۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو وہ روتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہوئے۔ خنزیر آئے اور اپنے گھٹنوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیٹھ گئے وہ رونے لگے اور ان کے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہیں پہچان گئے اور یہ کہا: کیا تو فلاں نہیں ہے؟ وہ اپنے سر سے اشارہ کرتا لیکن کلام نہ کر سکتا تھا، وہ سات دن اسی طرح ٹھہرے رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چار دن ٹھہرے رہے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی روحیں قبض کر لے صبح ہوئی تو معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں چلے گئے انہیں زمین نگل گئی یا انہیں کیا ہوا؟

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں کلام ہے۔ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی سے مروی ہے کہ مائدہ کا کھانا روٹی اور مچھلی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ مچھلی میں ہر کھانے کی خوشبو پاتے تھے۔ یہ ثعلبی نے ذکر کیا

ہے۔ حضرت عمار بن یاسر اور قتادہ نے کہا: مائدہ آسمان سے نازل ہوتا تھا اور اس پر جنت کے پھلوں میں سے پھل ہوتے تھے (1)۔ وہب بن منبہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو کی روٹیاں اور مچھلیاں نازل فرمائیں۔ اور ترمذی نے ابواب التفسیر میں حضرت عمار بن یاسر سے روایت کیا ہے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آسمان سے مائدہ نازل ہوا اس میں روٹی اور گوشت تھا انہیں حکم دیا گیا تھا کہ خیانت نہ کرو اور نہ کل کے لیے ذخیرہ کرو، پس انہوں نے خیانت کی اور ذخیرہ کیا اور کل کے لیے رکھ لیا تو وہ بندروں اور خنزیروں میں مسخ کر دیئے گئے'' (2)۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث ہے جو ابو عاصم اور کئی دوسرے لوگوں نے سعید بن ابی عروبة عن قتادة عن خلاس عن عمار بن یاسر کے سلسلہ سے موقوف روایت کی ہے ہم اسے مرفوع نہیں جانتے مگر حسن بن قزعہ کی حدیث سے ہمیں حمید بن مسعدہ نے بتایا فرمایا ہمیں سفیان بن حبیب نے سعید بن ابی عروبہ سے اسی طرح روایت کر کے بتایا اور انہوں نے اسے مرفوع روایت نہیں کیا۔ یہ حسن بن قزعہ کی حدیث سے اصح ہے ہم مرفوع حدیث کے لیے کوئی اصل نہیں جانتے۔ سعید بن جبیر نے کہا: دستر خوان پر ہر چیز اتاری گئی تھی سوائے گوشت اور روٹی کے۔

عطا نے کہا: اس پر ہر چیز نازل ہوئی سوائے مچھلی اور گوشت کے۔ کعب نے کہا: دستر خوان الٹا آسمان سے اتارا گیا تھا فرشتے اسے آسمان اور زمین کے درمیان اڑاتے رہے اور اس پر گوشت کے سوا ہر چیز تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ تینوں اقوال ترمذی کی حدیث کے مخالف ہیں اور وہ حدیث ان سے اولیٰ ہے، کیونکہ اگر وہ مرفوع صحیح نہیں ہے تو صحابی کبیر سے موقوف صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ قطعی بات ہے کہ دستر خوان نازل ہوا اور اس پر کھانا تھا اور اس کی تعیین کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ابو نعیم نے کعب سے روایت کیا ہے کہ دستر خوان دو مرتبہ نازل ہوا تھا بنی اسرائیل کے بعض عبادت گزار بندوں کے لیے۔ کعب نے کہا: بنی اسرائیل کے تین عبادت گزار جمع ہوئے، وہ تینوں ایک صحراء میں جمع ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم تھا، ایک نے کہا: تم مجھ سے سوال کرو میں اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے دعا کروں گا تم جو چاہو گے۔ انہوں نے کہا: ہم تجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اسی جگہ ایک بڑا کھلا چشمہ ظاہر کر دے اور سبز و شاداب باغات ہوں، اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو بڑا چشمہ اور سبز و شاداب باغ ظاہر ہو گیا، پھر ایک نے کہا: تم مجھ سے جو چاہو مانگو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا، انہوں نے کہا: ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ ہمیں جنت کے پھلوں میں سے کچھ کھلائے۔ اس نے دعا کی تو ان پر کھجور اتری، انہوں نے اس سے کھایا وہ واپس نہ گئی مگر وہ اس کا ایک رنگ کھا چکے تھے پھر وہ اٹھالی گئی۔ ایک نے کہا: تم مجھ سے سوال کرو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا جو تم چاہو، انہوں نے کہا: ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو دعا مانگ کہ اللہ ہم پر دستر خوان نازل کرے جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا پس اس نے دعا کی تو دستر خوان نازل ہوا انہوں نے اپنی ضرورت اس سے پوری کی پھر وہ اٹھالیا گیا، پھر پوری خبر ذکر کی۔

**مسئلہ**: سلمان مذکور کی حدیث میں دستر خوان کا بیان ہے وہ دستر خوان تھا ٹانگوں والا میز نہیں تھا۔ سفرۃ (دستر خوان) نبی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 261　2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 132

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستر خوان تھا اور عرب کے دستر خوان تھے ابو عبداللہ ترمذی حکیم نے روایت کیا ہے ہمیں محمد بن بشار نے بتایا فرمایا ہمیں معاذ بن ہشام نے بتایا فرمایا مجھے میرے باپ نے بتایا انہوں نے یونس سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ٹیبل (میز) اور پیالہ میں اور باریک نرم روٹی نہیں کھائی (1)۔ قتادہ نے فرمایا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا: پھر کس پر روٹی کھاتے تھے۔ فرمایا: دستر خوانوں پر۔ محمد بن بشار نے کہا: یہ یونس ابو الفرات الاسکاف ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ثابت ہے اس کے رجال پر بخاری اور مسلم کا اتفاق ہے، اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا فرمایا ہمیں معاذ بن ہشام نے بتایا پھر یہ حدیث ذکر کی اور اس میں فرمایا: یہ حسن غریب ہے۔ ترمذی ابو عبداللہ نے کہا: خوان وہ نئی چیز ہے جو عجمیوں نے شروع کی ہے اور عرب تو مشقت کرنے والے تھے اور وہ سفر پر کھاتے تھے سفر کا مفرد سفرۃ ہے یہ دستر خوان چمڑے سے بنائے جاتے تھے۔ ان دستر خوانوں کے لٹکانے کے لیے دھاگے تھے وہ بند ہوتے تھے اور کھلتے تھے۔ کھلنے کی وجہ سے انہیں دستر خوان کہا جاتا تھا، کیونکہ جب کھلتے تھے تو جو کچھ ان میں ہوتا تھا ظاہر ہو جاتا تھا، اسی وجہ سے اسے سفرہ کہا جاتا ہے۔ سفر کو سفر اس لیے کہا جاتا ہے کہ آدمی خود اپنے گھر سے باہر ظاہر ہو جاتا ہے سکرجۃ وہ پیالہ جو مائع چیز کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ سالن مختلف قسم کے کھانوں سے تیار ہوتا ہے اور عربوں کے لیے کھانے کے لیے مختلف چیزیں نہ تھیں ان کا کھانا ثرید ہوتا تھا جس پر گوشت کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھایا کرو۔ کیونکہ یہ لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے (2)۔ اگر کہا جائے کہ مائدہ کا ذکر احادیث میں ہے۔

ان احادیث میں ایک حضرت ابن عباس کی حدیث ہے فرمایا: لوکان الضب حراما ما اکل علی مائدۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر گوہ حرام ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر نہ کھائی جاتی۔ اس کو مسلم وغیرہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تصلی الملائکۃ علی الرجل ما دامت مائدتہ موضوعۃ فرشتے اس شخص کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک اس کا دستر خوان بچھا رہتا ہے۔ اس حدیث کو ثقات نے روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ مائدہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کپڑے اور رومال کی طرح بچھائی اور پھیلائی جاتی ہے، اس کا حق یہ ہے کہ یہ مادۃ ہو یعنی دال مشدد کے ساتھ ہو عربوں نے ایک دال کو یا بنا دیا اور مائدہ کہا گیا۔ اور فعل اس کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ یہ ممدودۃ ہوتا لیکن لغت میں فاعل کے وزن پر استعمال ہوتا ہے جیسے عرب کہتے ہیں: سر کاتم یہ مکتوم کے معنی میں ہے عیشۃ راضیۃ، مرضیۃ کے معنی میں ہے۔ اسی طرح لغت میں مفعول فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً رجلٌ مشؤمٌ یہ شائم کے معنی میں ہے۔ حجاب مستور، یہ ساتر کے معنی میں ہے۔

خوان وہ چیز جو پائیوں کے ذریعے زمین سے بلند ہو۔ مائدہ ہر وہ چیز جو پھیلائی اور بچھائی گئی ہو۔ السفرۃ جو اس کو ظاہر کر

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 1

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء انہ قال انھسوا اللحم نھسا، حدیث نمبر 1758، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دے جو اس کے اندر ہو، اسی وجہ سے سفرہ دھاگوں کے ساتھ باندھا ہوتا ہے۔ حسن سے مروی ہے فرمایا: میز پر کھانا ملوک (بادشاہوں) کا فعل ہے رومال پر کھانا عجمیوں کا فعل ہے اور سفرۃ پر کھانا عربوں کا فعل ہے۔ یہ سنت ہے۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

''جب پوچھے گا اللہ تعالیٰ: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے کہا تھا لوگوں سے کہ بنالو مجھے اور میری ماں کو دو خدا اللہ کے سوا؟ وہ عرض کریں گے: پاک ہے تو ہر شریک سے کیا مجال تھی میری کہ میں کہوں ایسی بات جس کا نہیں ہے مجھے کوئی حق۔ اگر میں نے کہی ہوتی ایسی بات تو تو ضرور جانتا اس کو۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے بے شک تو ہی خوب جاننے والا ہے تمام غیبوں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اس گفتگو کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ قتادہ، ابن جریج اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کے روز فرمائیں گے۔ سدی اور قطرب نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا جب انہیں آسمان کی طرف اٹھایا اور نصاریٰ نے آپ کے متعلق کہا جو کچھ کہا، ان علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ کیونکہ اذ کلام عرب میں ماضی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پہلا قول اصح ہے اس پر دلیل ماقبل کلام ہے یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ جس دن اللہ تعالیٰ جمع فرمائے گا رسولوں کو، اور مابعد کلام ہے هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔ اس بنا پر اذ بمعنی اذا ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا (سبا: 51) یہاں اذ بمعنی اذا ہے۔ ابوالنجم نے کہا:

ثم جزاه الله عنّی إذ جزَی　　جنّاتِ عَدْنٍ فی السّموات العُلَا

اس شعر میں اذ بمعنی اذا ہے۔

اسود بن جعفر نے کہا:

فالآن إذْ هازَلتُهنّ فإنّما　　يَقُلْنَ ألا لَمْ يذهبِ الشّيخ مَذهبا

اس میں بھی اذ بمعنی اذا ہے۔ مستقبل کو لفظ ماضی سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ امر متحقق تھا اور اس کی برہان ظاہر تھی گویا وہ کام واقع ہو چکا ہے۔

قرآن کریم میں ہے وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (الاعراف: 50) دوزخی جنتیوں کو پکاریں گے۔ یہاں صیغہ ماضی کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں اس سوال کے معنی میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے۔ یہ بطور استفہام نہیں اگرچہ

استفہام کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ سوال اس لیے کیا تا کہ جو ان کے الہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو توبیخ ہو جائے تا کہ سوال کے بعد ان کا انکار تکذیب میں زیادہ بلیغ ہو جائے اور توبیخ وتقریع میں سخت ہو جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی تعریف کا قصد فرمایا کہ ان کی قوم نے ان کے بعد نظریات کو بدل لیا اور ان پر ایسے ایسے دعویٰ کیے جو انہوں نے کہا نہیں تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نصاریٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو الہ نہیں بنایا تھا پھر ان کے بارے میں یہ کیسے فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انہوں نے کہا کہ مریم نے بشر کو جنم نہیں دیا بلکہ الہ کو جنم دیا تو ان کو یہ کہنا لازم ہے کیونکہ جزئیت کی وجہ سے اس کے قائم مقام ہو گئی جس کو اس نے جنا، پس وہ کہنے والوں کے قائم مقام ہو گئے جب یہ بات انہیں لازم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۚ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حجت کو پایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اس قول میں حجت دی وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى الخ۔ حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے ''اللہ تعالیٰ نے ان کو حجت بخشی سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ''۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

جواب سے پہلے دو امور کی وجہ سے تسبیح سے آغاز کیا (۱) جو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے وہ مبرا ہیں۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی عزت کے سامنے عجز کا اظہار کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی سطوت کے خوف سے سُبْحٰنَكَ سے آغاز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس قول کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کپکپی طاری ہو گئی حتیٰ کہ اس کی ہڈیوں کی آواز سنی گئی اور کہا: سبحانك۔ پھر کہا: مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ یعنی میری مجال نہیں کہ میں ایسی بات کا دعویٰ کروں جس کا مجھے حق نہیں یعنی میں مربوب ہوں، رب نہیں، میں عابد ہوں معبود نہیں، پھر کہا: اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف لوٹایا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا تھا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا تا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الہ بنانے والے کے لیے تنبیہ ہو جائے، پھر فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ جو مجھ میں پوشیدہ ہے تو وہ جانتا ہے اور میں وہ نہیں جانتا جو تیرے غیب میں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو وہ جانتا ہے جو میں جانتا ہوں اور میں نہیں جانتا جو تو جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا: تو جانتا ہے جو میں مخفی کرتا ہوں اور میں وہ نہیں جانتا جو تو مخفی کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں اور میں نہیں جانتا جس کا تو ارادہ کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو میرے رازوں کو جانتا ہے اور میں تیرے راز کو نہیں جانتا کیونکہ سر کی جگہ نفس ہے۔ بعض نے کہا: تو جانتا ہے جو مجھ سے دنیا میں ہوا اور میں نہیں جانتا جو تیری طرف سے دار آخرت میں ہوگا۔

میں کہتا ہوں: ان اقوال کا معنی قریب قریب ہے یعنی تو میرے راز جانتا ہے اور تو اسے جانتا ہے جس پر میرا ضمیر مشتمل

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 132

ہے جس کو تو نے پیدا کیا ہے میں اس کو نہیں جانتا جو تو نے غیب اور علم میں سے اپنے ساتھ خاص کیا ہے۔ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝ تو جانتا ہے جو ہو چکا ہے اور جو ہوگا اور جو نہیں تھا اور جو کچھ ہونے والا ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ۝۱۱۷

''نہیں کہا میں نے انہیں مگر وہی کچھ جس کا تو نے حکم دیا مجھے کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور تھا میں ان پر گواہ جب تک میں رہا ان میں پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی نگران تھا ان پر اور تو ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ یعنی میں نے دنیا میں انہیں توحید کا حکم دیا۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ، ان کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہے یہ ان مفسرہ ہے جیسے وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا (ص:6) میں، ان مفسرہ ہے اور اس کا محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے ما ذکرتُ لھم اِلّا عبادۃ اللہ یعنی میں نے ان کو نہیں یاد دلایا مگر اللہ کی عبادت۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو یعنی بانِ اعبدُوا اللہ۔ نون کو ضمہ دینا اولیٰ ہے، کیونکہ وہ کسرہ کے بعد ضمہ کو عرب ثقیل سمجھتے ہیں اور التقاء ساکنین کی اصل پر کسرہ بھی جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا جو میں نے انہیں حکم دیا اس کی حفاظت کرنے والا تھا۔ مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ، مَّا محل نصب میں ہے یعنی وقت دوامی فیھم، فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے سے پہلے موت دی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اخبار و احادیث ان کے اٹھائے جانے پر متفق ہیں اور وہ آسمان میں زندہ ہیں وہ قرب قیامت میں آسمان سے اتریں گے، دجال کو قتل کریں گے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس کا معنی ہے جب تو نے مجھے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ حسن نے کہا: وفات کا لفظ قرآن میں تین معانی میں استعمال ہوا ہے: (۱) موت کے لیے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (الزمر:42) یعنی ان کی عمر کے عرصہ کے ختم ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں موت دیتا ہے۔ (۲) نیند۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ (الانعام:60) یعنی وہ تمہیں رات کے وقت سلاتا ہے (۳) اٹھا لینا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ (آل عمران:55) اے عیسیٰ میں تجھے اٹھانے والا ہوں۔

كُنْتَ اَنْتَ اس میں اَنْتَ تاکید کے لیے ہے اور الرقیب، کنت کی خبر ہے اس کا معنی ہے ان پر نگران تھا، ان کو جاننے والا تھا اور ان کے افعال کا مشاہدہ کرنے والا تھا اس کی اصل المراقبۃ ہے یعنی تاڑنا، نگرانی کرنا۔ اسی سے مرقبہ ہے کیونکہ وہ رقیب میں بلند جگہ پر ہوتی ہے۔ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ۝ یعنی میری بات اور ان کی بات کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ بعض علماء

نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو نافرمان اور اطاعت شعار کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا ہمارے درمیان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کے لیے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے فرمایا: ''اے لوگو! تم الله تعالیٰ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں، برہنہ بدن اور غیر مختون جمع کیے جاؤ گے جس طرح ہم نے ابتدا میں مخلوق کو پیدا کیا تھا ہم اسی طرح اسے لوٹائیں گے یہ ہم پر وعدہ ہے، بے شک ہم ایسا کرنے والے ہیں، خبردار! سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے، خبردار! میری امت کے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا پھر انہیں دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا، میں کہوں گا: یا رب! یہ میرے ساتھی ہیں، ارشاد ہوگا: آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد اپنی طرف سے دین میں اختراع کیا، پھر میں اسی طرح کہوں گا جس طرح صالح بندے (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فرمایا مجھے کہا جائے گا یہ مرتد ہو گئے تھے جب سے آپ ان سے جدا ہوئے'' (1)۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

''اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے ان کو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ یہ بھی شرط اور جواب شرط ہیں اور وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ یہ بھی شرط اور جواب شرط ہیں۔ نسائی نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کو ساری رات قیام میں پڑھتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی وہ آیت یہ تھی اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (2)، اس آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے مہربانی اور لطف طلب کرنے کے لیے کہا: جس طرح ایک سردار اپنے غلام کے لیے رحمت طلب کرتا ہے، اسی وجہ سے فإنّهم عصوك نہیں کہا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الله تعالیٰ کے امر کو تسلیم کرنے کے اعتبار سے کہا اور عذاب سے پناہ طلب کرنے کے لیے کہا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ الله تعالیٰ کافر کو نہیں بخشے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ میں هم ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہیں جو کفر پر مر گئے تھے اور اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ میں هم ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہیں جنہوں نے موت سے پہلے توبہ کر لی تھی۔ یہ بہتر قول ہے۔ رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں جانتے تھے کہ کافر کی بخشش نہیں ہوتی یہ ایسا قول ہے کہ کتاب الله پر جرأت کی گئی ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کی اخبار منسوخ نہیں ہوتی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ انہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے اور آپ کے بعد انہوں نے ایسے اعمال کیے ہیں جن کا آپ نے حکم نہیں دیا تھا مگر وہ دین کے عمود (ستون) پر تھے، پس عرض کی: وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ یعنی اگر تو میرے بعد کے گناہ معاف کرے اور کہا: فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہ نہیں کہا: فإنّك أنت الغفور الرحيم۔ کیونکہ واقعہ تسلیم امر کا تقاضا کرتا ہے اور حکم اس کی طرف تفویض کرنے کا

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 2096　2۔ ایضاً، حدیث نمبر 21387

تقاضا کرتا ہے اگر آپ فانك انت الغفور الرحيم کہتے تو یہ وہم ہوتا کہ آپ نے ان کے لیے مغفرت کی دعا کی ہے جو شرک پر مرے ہیں اور یہ محال ہے، تقدیر اس طرح ہے کہ اگر تو انہیں باقی رکھے کفر پر حتیٰ کہ یہ مر جائیں اور تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں توحید کی ہدایت دے اور اپنی اطاعت کی توفیق دے پھر تو انہیں بخش دے تو تو ایسا غالب ہے کہ کوئی چیز تجھے تیرے ارادے سے روک نہیں سکتی۔ اَلْحَكِيْمُ جو تو کرتا ہے اس میں حکمت ہوتی ہے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ ایک جماعت نے فإنك أنت الغفور الرحيم پڑھا ہے۔ یہ قرآن میں سے نہیں ہے۔ یہ قاضی عیاض نے شفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: قرآن پر اس نے طعن کیا جس نے کہا: فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کا ارشاد وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ کے مناسب نہیں، کیونکہ مغفرت کے مناسب فإنك أنت الغفور الرحيم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال نہیں رکھتا مگر جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا جب اس کی طرف اس کو نقل کیا جائے جس کی طرف اس نے نقل کیا تو معنی میں ضعف ہو گیا، کیونکہ الغفور الرحيم منفرد شرط ثانی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے شرط اول کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں بنتا اور وہ اس پر ہے جو اللہ نے نازل کیا۔ اس کی قرأت پر مسلمانوں کا اجماع ہے یہ دونوں شرطوں سے متصل ہے کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تو انہیں عذاب دے تو تو سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر تو انہیں بخش دے تو تو سب پر غالب اور حکمت والا ہے (یعنی) دونوں امور تعذیب اور غفران میں تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اپنے عموم کی وجہ سے یہاں عزیز و حکیم ہی بہتر ہے، کیونکہ یہ دونوں شرطوں کو جامع ہے جب کہ الغفور الرحيم یہاں درست نہیں کیونکہ یہ عموم کا احتمال نہیں رکھتا جس عموم کا احتمال اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ رکھتا ہے اور پوری آیت میں جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم، اس کا عدل اور اس کی ثنا اور مذکورہ دو شرطیں موجود ہیں اس کے اعتبار سے عزیز و حکیم ہی اولیٰ ہے بنسبت ان اسماء کے جو بعض کلام کے مطابق ہوں اور بعض کے نہ ہوں۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے طریق سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کا یہ قول تلاوت کیا رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم) اے میرے پروردگار! ان بتوں نے تو گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور رحیم ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ذکر کیا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ پھر اپنے ہاتھ اٹھائے اور عرض کی: اللهم امتی اے اللہ! میری امت کو بخش دے، پھر رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا اور تیرا رب بہتر جانتا ہے اور اس سے پوچھ کہ تجھے کون سی چیز رلا رہی ہے؟ جبریل امین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہی سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا جو انہوں نے کہا...... اللہ بہتر جانتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا اور اسے یہ خوشخبری دے کہ ہم تجھے تیری امت کے معاملے میں خوش کریں گے اور تجھے پریشان نہیں کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا معنی ہے

اگر تو انہیں عذاب دے تو تو غالب، حکمت والا ہے اور اگر تو انہیں بخش دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔ کلام کی اپنے نسق پر توجیہ اولیٰ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کی ہے۔ وباللہ التوفیق

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''فرمایا اللہ تعالیٰ نے: یہ ہے وہ دن جس میں فائدہ پہنچائے گا سچوں کو ان کا سچ، ان کے لیے باغات ہیں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ سے یہی ہے بڑی کامیابی۔ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی سب آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ یعنی دنیا میں جو ان کا صدق تھا، رہا آخرت میں تو اس میں صدق نفع نہیں دے گا۔ دنیا میں صدق، اس میں احتمال ہے کہ عمل میں اللہ کے لیے صدق ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے بارے کذب اور جھوٹ کو ترک کیا۔ اس دن میں انہیں صدق نفع دے گا اگرچہ صدق ہر دن نفع دیتا ہے، یہ اس لیے فرمایا: کیونکہ اس میں جزا کا وقوع ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد آخرت میں ان کا صدق ہے۔ یہ انبیاء کرام کی شہادت دینا ہے کہ انہوں نے تبلیغ کی تھی۔ اور جو اپنے نفسوں پر اعمال کی صحیح صحیح گواہی دیں گے، اس دن میں سچ کے نفع کی وجہ یہ ہوگی کہ گواہی کو چھپانا ترک کرنے کی وجہ سے مواخذہ ان سے روک لیا جائے گا اور انبیاء کا اقرار کرنے اور اپنے نفسوں پر شہادت کی وجہ سے انہیں بخش دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

نافع اور ابن محیصن نے یوم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قرأت واضح ہے۔ یہ مبتدا اور خبر کی بنا پر ہے پس يَوْمُ يَنْفَعُ، ھذا کی خبر ہے اور جملہ قول کی وجہ سے محل نصب میں ہے، رہا نافع اور ابن محیصن کی قرأت، تو ابراہیم بن حمید نے محمد بن یزید سے روایت کیا ہے کہ یہ قرأت جائز نہیں، کیونکہ مبتدا کی خبر کو نصب دی گئی ہے اور اس میں بنا جائز نہیں۔ ابراہیم بن سری نے کہا: یہ اس معنی میں جائز ہے اللہ تعالیٰ نے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو سچ نفع دے گا۔ اور یوم، قول کی ظرف ہے اور ھذ قول کا مفعول ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: قال اللہ ھذا القول فی یوم ینفع الصادقین۔ بعض نے فرمایا: تقدیر عبارت یہ ہے: قال اللہ تعالیٰ ھذہ الاشیاء تنفع یوم القیامۃ۔ کسائی اور فراء نے کہا: یہاں یوم مبنی بر نصب ہے، کیونکہ یہ اسم کے علاوہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسے تو کہتا ہے: مضی یومئذ۔ کسائی نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

علی حینَ عاتبتُ المشِیبَ علی الصِّبَا　　وقلتُ ألَمّا أَصْحُ والشَّیْبُ وازِعُ (1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 264، دار الکتب العلمیہ بیروت

زجاج نے کہا: بصری اس کو جائز قرار نہیں دیتے جو فراء اور کسائی نے کہا ہے جب ظرف فعل مضارع کی طرف مضاف ہو، اگر فعل ماضی ہو تو صحیح ہوتا ہے جیسا کہ شعر میں گزرا ہے۔ فعل کو ظروف زمان کی طرف مضاف کرنا جائز ہے، کیونکہ فعل بمعنی مصدر ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف منصوب ہو اور اس مبتدا کی خبر ہو جو ھذا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ حدث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ظروف زمان، احداث کے متعلق اخبار ہوتے ہیں، تو کہتا ہے: القتال الیوم، الخروج الساعۃ اور جملہ قول کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ ھذا مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور یوم مبتدا کی خبر ہو اور اس میں عامل محذوف ہو، تقدیر اس طرح ہوگی: قال اللہ ھذا الذی قصصناہ یقع یوم ینفع الصادقین صدقھم۔ اس میں تیسری قرأت بھی ہے۔ یومٌ ینفع یعنی تنوین کے ساتھ۔ اس صورت میں کلام میں حذف ہوگا تقدیر عبارت فیہ ہوگی جیسے اس ارشاد میں ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (بقرہ:48) یہ اعمش کی قرأت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ جَنّٰتٌ یہ مبتدا خبر ہیں۔ تَجْرِيْ یہ صفت ہے۔ مِنْ تَحْتِهَا یعنی اس کے محلات اور اشجار کے نیچے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا ثواب بیان فرمایا کہ وہ ان سے ایسا راضی ہے کہ اس کے بعد کبھی غضب نہ ہو گا۔ وَرَضُوْا عَنْهُ وہ اس جزا سے راضی ہوں گے جو اس نے انہیں عطا فرمائی۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ کامیابی۔ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ جس کی خیر عظیم اور کثیر ہو، اس کو حاصل کرنے والے کی منزلت مرفوع ہوئی اور بلند ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ یہ آیت اس کے بعد ذکر فرمائی جو نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الٰہ کا دعویٰ کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اس کے لیے ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسری مخلوق کے لیے نہیں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا یہ معنی ہو کہ وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے وہ باغات عطا فرمائے گا جس کا ذکر اس نے اپنے اطاعت شعار بندوں کے لیے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے احسان اور کرم سے ہمیں بھی ان لوگوں سے کر دے۔ سورۂ مائدہ مکمل ہوئی۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

# سورۃ الانعام

آیاتہا ۱۶۵ | ٦ سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ ۵۵ | رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: یہ سورت مکی ہے سوائے دو آیتوں کے وہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ۔ یہ مالک بن صیف اور کعب بن اشرف یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی (۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ۔ یہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن جریج نے کہا: یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی۔ یہ ماوردی نے کہا: ثعلبی نے کہا: سورت انعام مکی ہے مگر چھ آیات مدنی ہیں: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ سے لے کر تین آیات تک۔ اور قُلْ تَعَالَوْا سے لے کر تین آیات تک۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ آیات محکمات ہیں۔ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْ لَّآ اَجِدُ یہ مکہ میں عرفہ کے دن نازل ہوا۔ ان تمام کے بارے میں کلام ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

حدیث میں ہے یہ تمام سورت اکٹھی نازل ہوئی سوائے چھ آیات کے اور اس کو ستر ہزار فرشتے لے کر آئے، ایک آیت کے ساتھ بارہ ہزار فرشتے تھے اور وہ یہ آیت ہے وَ عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَآ اِلَّا ھُوَ وہ فرشتے اس آیت کو رات کے وقت لے کر آئے، وہ بلند آواز سے تسبیح و تحمید کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو ہی کاتبان وحی کو بلایا، پھر انہوں نے اسے لکھا۔ ابو جعفر نحاس نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے ہمیں بتایا محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو حاتم روح بن الفرج نے بتایا جو حضارمہ کے مولی تھے انہوں نے کہا ہمیں احمد بن محمد ابو بکر عمری نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابن ابی فدیک نے بتایا انہوں نے کہا مجھے عمر بن طلحہ بن علقمہ بن وقاص نے بتایا انہوں نے نافع ابی سہل بن مالک سے روایت کیا انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سورۃ انعام نازل ہوئی تو اس کے ساتھ فرشتوں کا قافلہ تھا جنہوں نے افق کو گھیرا ہوا تھا''۔ وہ بلند آواز سے تسبیح کر رہے تھے اور زمین ان کے لیے تنگ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سبحان ربی العظیم کہا (1)۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: سورۃ انعام قرآن کی فاضل سورتوں میں سے ہے۔ حضرت کعب سے اسی کتاب میں مروی ہے فرمایا: تورات کا آغاز وہی ہے جو سورۃ انعام کا ہے اور تورات کا خاتمہ وہ ہے جو سورۃ ہود کا ہے۔ یہی وہب بن منبہ کا قول ہے۔ مہدوی نے ذکر کیا کہ مفسرین نے فرمایا: تورات کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ سے ہے اور اختتام اس ارشاد سے ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ الخ۔ (الاسراء: 111)

1۔ الاوسط للطبرانی، 6443

ثعلبی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے سورۃ انعام کی پہلی تین آیات وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ تک تلاوت کیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو چالیس ہزار فرشتوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے لیے اپنی عبادت کی مثل قیامت تک ثواب لکھتے رہتے ہیں اور ساتویں آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک لوہے کا گرز ہوتا ہے جب شیطان اس شخص کو وسوسہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے یا اس کے دل میں کوئی برا خیال ڈالنا چاہتا ہے تو وہ فرشتہ شیطان کو وہ گرز مارتا ہے، پس اس کے اور شیطان کے درمیان ستر حجابات ہو جاتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو میرے (عرش کے) سایہ میں چل جس دن میرے (عرش کے) سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہے اور میرے جنت کے پھلوں سے کھا اور کوثر کے پانی سے پی اور سلسبیل کے پانی سے غسل کر اور تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں'' (1)۔

بخاری میں ابن عباس سے مروی ہے فرمایا جب تجھے پسند ہو کہ تو عرب کی جہالت کو جان لے تو سورہ انعام کی ایک سو تیس سے اوپر آیات تلاوت کر قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ۧ۔

تنبیہ: علماء نے فرمایا: یہ سورت مشرکین، اور بدعتی لوگوں اور بعث ونشور کو جھٹلانے والے لوگوں کے خلاف حجت قائم کرنے میں اصل ہے، اس کا تقاضا ہے کہ یہ یکبارگی نازل ہو، کیونکہ یہ حجت کے اعتبار سے ایک مفہوم ہے اگرچہ بہت سی وجوہ کے اعتبار سے اس کا انداز مختلف ہے فرمایا: اس پر متکلمین نے اصول دین کی بنیاد رکھی، کیونکہ ایسی واضح آیات ہیں کہ جو قدریوں کا رد کرتی ہیں، ان سورتوں کے علاوہ جو ذکر کی گئی ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ توفیق الٰہی سے آگے آئے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ڛ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف سے کیا اور اپنی الوہیت کے اثبات سے کیا یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے علاوہ سورتوں کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ہے، ایک پر اکتفا باقی تمام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ ایک معنی ہے دوسرا مقام اس کو ادا نہیں کرتا، کیونکہ مختلف نعمتوں کے ساتھ اس کو گرہ لگائی ہے نیز اس میں ان لوگوں کے خلاف حجت ہے جو اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ کا معنی سورۃ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

1۔ درمنثور، تعارف سورۃ

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، علم اور ارادہ کی خبر دی ہے، فرمایا: جس نے پیدا کیا۔ کبھی خلق بمعنی اختراع ہوتا ہے اور کبھی بمعنی تقدیر ہوتا ہے، یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہاں یہ دونوں معنی مراد ہیں یہ آسمانوں اور زمین کے حدوث پر دلیل ہے، اس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کیا اور بغیر کجی کے برابر پیدا فرمایا ان میں چاند اور سورج کو دو نشانیاں بنایا اور انہیں ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ان میں بادلوں کو ودیعت کیا، زمین کو پھیلایا اور اس میں رزق اور نبات کو ودیعت رکھا اور ان میں ہر جانور کو بطور آیات پھیلایا اس میں پہاڑوں کو کیل کے طور پر اور راستے بنائے اور ان میں نہریں اور دریا جاری فرمائے اور پتھروں سے چشمے جاری فرمائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہیں اور اس کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں اور وہ اللہ واحد اور قہار ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو بیان کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** مسلم نے فرمایا: مجھے شریح بن یونس اور ہارون بن عبداللہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حجاج بن محمد نے بتایا انہوں نے کہا ابن جریج نے کہا مجھے اسماعیل بن امیہ نے بتایا انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کیا انہوں نے عبداللہ بن رافع مولی ام سلمۃ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے روز پیدا کیے اور درختوں کو سوموار کے دن پیدا کیا اور مکروہ کو منگل کے روز پیدا کیا نور کو بدھ کے روز پیدا کیا اور جمعرات کو زمین میں جانور پھیلائے اور جمعہ کے روز ساری مخلوق سے آخر میں جمعہ کی آخری گھڑی میں عصر کے بعد رات تک کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا'' (1)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے اس حدیث کو اس سورت کے آغاز کے لیے تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا: محدثین نے کہا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے، کیونکہ اہل تفسیر اور اہل تاریخ کے نظریہ کے مخالف ہے۔ بعض علماء نے کہا: اسماعیل بن امیہ نے ابراہیم بن یحییٰ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کی ہے اور ابراہیم سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ محمد بن یحییٰ نے ذکر کیا ہے فرمایا: میں نے علی بن مدینی سے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث (اللہ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا الخ) کے متعلق پوچھا تو علی نے کہا: یہ حدیث مدنی ہے۔ اس کو ہشام بن یوسف نے ابن جریج سے انہوں نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے انہوں نے ابورافع مولی سلمہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا...... علی نے فرمایا: ابراہیم بن ابی یحییٰ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ایوب بن خالد نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: عبداللہ بن رافع نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا حضرت ابو ہریرہ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز پیدا فرمایا''۔ پھر اسی طرح حدیث ذکر کی۔

علی بن مدینی نے کہا: میرا خیال ہے اسماعیل بن امیہ نے یہ امر ابراہیم بن ابی یحییٰ سے حاصل کیا ہے، بیہقی نے کہا: اس

1۔ صحیح مسلم، صفۃ المنافقین و احکامہم، جلد 2، صفحہ 371

ثعلبی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے سورۂ انعام کی پہلی تین آیات وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ تک تلاوت کیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو چالیس ہزار فرشتوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے لیے اپنی عبادت کی مثل قیامت تک ثواب لکھتے رہتے ہیں اور ساتویں آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک لوہے کا گرز ہوتا ہے جب شیطان اس شخص کو وسوسہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے یا اس کے دل میں کوئی برا خیال ڈالنا چاہتا ہے تو وہ فرشتہ شیطان کو وہ گرز مارتا ہے، پس اس کے اور شیطان کے درمیان ستر حجابات ہو جاتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو میرے (عرش کے) سایہ میں چل جس دن میرے (عرش کے) سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہے اور میرے جنت کے پھلوں سے کھا اور کوثر کے پانی سے پی اور سلسبیل کے پانی سے غسل کر اور تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں''(1)۔

بخاری میں ابن عباس سے مروی ہے فرمایا جب تجھے پسند ہو کہ تو عرب کی جہالت کو جان لے تو سورہ انعام کی ایک سو تیس سے اوپر آیات تلاوت کر قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ -

تنبیہ: علماء نے فرمایا: یہ سورت مشرکین، اور بدعتی لوگوں اور بعث ونشور کو جھٹلانے والے لوگوں کے خلاف حجت قائم کرنے میں اصل ہے، اس کا تقاضا ہے کہ یہ یکبارگی نازل ہو، کیونکہ یہ حجت کے اعتبار سے ایک مفہوم ہے اگرچہ بہت سی وجوہ کے اعتبار سے اس کا انداز مختلف ہے فرمایا: اس پر متکلمین نے اصول دین کی بنیاد رکھی، کیونکہ ایسی واضح آیات ہیں کہ جو قدریوں کا رد کرتی ہیں، ان سورتوں کے علاوہ جو ذکر کی گئی ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ توفیق الٰہی سے آگے آئے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف سے کیا اور اپنی الوہیت کے اثبات سے کیا یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے علاوہ سورتوں کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ہے، ایک پر اکتفا باقی تمام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ ایک معنی ہے دوسرا مقام اس کو ادا نہیں کرتا، کیونکہ مختلف نعمتوں کے ساتھ اس کو گرہ لگائی ہے نیز اس میں ان لوگوں کے خلاف حجت ہے جو اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ کا معنی سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

---

1۔ درمنثور، تعارف سورۃ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، علم اور ارادہ کی خبر دی ہے، فرمایا: جس نے پیدا کیا۔ کبھی خلق بمعنی اختراع ہوتا ہے اور کبھی بمعنی تقدیر ہوتا ہے، یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہاں یہ دونوں معنی مراد ہیں یہ آسمانوں اور زمین کے حدوث پر دلیل ہے، اس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کیا اور بغیر کجی کے برابر پیدا فرمایا ان میں چاند اور سورج کو دو نشانیاں بنایا اور انہیں ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ان میں بادلوں کو ودیعت کیا، زمین کو پھیلایا اور اس میں رزق اور نبات کو ودیعت رکھا اور ان میں ہر جانور کو بطور آیات پھیلایا اس میں پہاڑوں کو کیل کے طور پر اور راستے بنائے اور ان میں نہریں اور دریا جاری فرمائے اور پتھروں سے چشمے جاری فرمائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہیں اور اس کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں اور وہ اللہ واحد اور قہار ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو بیان کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مسلم نے فرمایا: مجھے شریح بن یونس اور ہارون بن عبداللہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حجاج بن محمد نے بتایا انہوں نے کہا ابن جریج نے کہا مجھے اسماعیل بن امیہ نے بتایا انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کیا انہوں نے عبداللہ بن رافع مولی ام سلمہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے روز پیدا کیے اور درختوں کو سوموار کے دن پیدا کیا اور مکروہ کو منگل کے روز پیدا کیا نور کو بدھ کے روز پیدا کیا اور جمعرات کو زمین میں جانور پھیلائے اور جمعہ کے روز ساری مخلوق سے آخر میں جمعہ کی آخری گھڑی میں عصر کے بعد رات تک کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا'' (1)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے اس حدیث کو اس سورت کے آغاز کے لیے تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا: محدثین نے کہا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے، کیونکہ اہل تفسیر اور اہل تاریخ کے نظریہ کے مخالف ہے۔ بعض علماء نے کہا: اسماعیل بن امیہ نے ابراہیم بن یحییٰ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے روایت کی ہے اور ابراہیم سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ محمد بن یحییٰ نے ذکر کیا ہے فرمایا: میں نے علی بن مدینی سے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث (اللہ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا الخ) کے متعلق پوچھا تو علی نے کہا: یہ حدیث مدنی ہے۔ اس کو ہشام بن یوسف نے ابن جریج سے انہوں نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے ایوب بن خالد سے انہوں نے ابو رافع مولیٰ سلمہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا ...... علی نے فرمایا: ابراہیم بن ابی یحییٰ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ایوب بن خالد نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: عبداللہ بن رافع نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا حضرت ابو ہریرہ نے میری انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور انہوں نے مجھے کہا: ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز پیدا فرمایا''۔ پھر اسی طرح حدیث ذکر کی۔

علی بن مدینی نے کہا: میرا خیال ہے اسماعیل بن امیہ نے یہ امر ابراہیم بن ابی یحییٰ سے حاصل کیا ہے، بیہقی نے کہا: اس

1۔ صحیح مسلم، صفۃ المنافقین واحکامھم، جلد 2، صفحہ 371

میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی نے ایوب بن خالد سے روایت کرنے میں اس کی متابعت کی ہے مگر موسیٰ بن عبیدۃ ضعیف ہے۔ بکر بن شرود سے مروی ہے انہوں نے ابراہیم بن ابی یحییٰ سے انہوں نے صفوان بن سلیم سے انہوں نے ایوب بن خالد سے...... اس کی سند ضعیف ہے...... انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ہے کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے میں اس کی موافقت نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے وہ سوال عطا فرما دیتا ہے''۔ فرمایا: حضرت عبد اللہ بن سلام نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق کا آغاز کیا، اتوار اور سوموار کے روز زمین کو پیدا کیا، منگل کے دن اور بدھ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا اور خوراک اور جو کچھ زمین میں ہے اسے جمعرات اور جمعہ کے دن کی عصر تک کے وقت میں پیدا کیا اور عصر کی نماز اور سورج کے غروب ہونے کے وقت کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اس حدیث کو بیہقی نے روایت کیا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن نہیں اتوار کے روز مخلوق کو پیدا کیا۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں حضرت ابن مسعود اور دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے مروی ہے۔ یہ اختلاف تفصیلاً گزر چکا ہے کہ زمین کو پہلے پیدا فرمایا یا آسمان کو پہلے پیدا فرمایا۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ جواہر کی تخلیق کے ذکر کے بعد اعراض کی تخلیق کا ذکر کیا، کیونکہ جوہر، عرض سے مستغنی نہیں ہوتا اور جو حوادث سے مستغنی نہیں ہوتا وہ حادث ہوتا ہے، جوہر متکلمین کی اصلاح میں اس جز کو کہتے ہیں جس کا آگے جز نہیں بنتا جو عرض کا جامع ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بحث اپنی کتاب ''الاسنی فی شرح الاسماء الحسنی'' میں الواحد اسم کے تحت ذکر کی ہے۔ اور عرض کو عرض اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ یہ جوہر اور جسم کو لاحق ہوتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہے۔ جسم مجتمع ہوتا ہے اور کم از کم جس پر جسم کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جو مجتمع جوہر ہیں یہ اصطلاحات ہیں اگرچہ صدر اول میں موجود نہیں تھیں، ان پر کتاب و سنت کا معنی دلالت کرتا ہے، ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، ان کو علماء نے استعمال کیا ہے ان پر اصطلاح قائم کی ہے اور ان پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے اور ان کے ساتھ مخالفین کو نیست و نابود کیا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ علماء کا الظُّلُمٰتِ اور النُّوْرَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ سدی، قتادہ اور جمہور مفسرین نے کہا: اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی روشنی ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد کفر اور ایمان ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ظاہر سے خروج ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: لفظ اس معنی کو بھی شامل ہے قرآن حکیم میں ہے: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ (انعام: 122) کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لیے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو۔

اس آیت میں الْاَرْضَ جنس کے لیے ہے، لفظ مفرد ہے لیکن مراد جمع ہے۔ اسی طرح النُّوْرَ ہے اس کی مثال یہ ارشاد:

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 17151

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266

ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر:67) شاعر نے کہا:

كُلُوا فِي بَعْضِ بَطْنِكُمْ تَعِفُّوا

یہ پہلے گزر چکا ہے۔

یہاں جعل بمعنی خلق ہے، اس کے علاوہ کوئی معنی نہیں، یہ ابن عطیہ کا قول ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: اس پر لفظ اور معنی نسق میں متفق ہیں جمع، جمع پر معطوف ہے اور مفرد، مفرد پر معطوف ہوتا ہے۔ پس لفظ ایک جیسے ہوتے ہیں اور فصاحت ظاہر ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: الظُّلُمٰتِ کو جمع اور النُّوْرَ کو مفرد ذکر کیا، کیونکہ ظلمات متعدی نہیں ہوتی ہیں اور نور متعدی ہوتا ہے۔ ثعلبی نے حکایت کیا ہے کہ بعض اہل معانی نے کہا: یہاں جعل زائدہ ہے اور عرب جعل کو کلام میں زائدہ کرتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد جَعلتُ أَرَى الاثنين أربعةً والواحد أثنينِ لَمّا هَدَّنِي الكِبَرُ

نحاس نے کہا: جعل بمعنی خلق ہے جب یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے تو صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے اور جعل کے محل پر سورۂ بقرہ میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝ یہ مبتدا خبر ہیں۔ معنی یہ ہے پھر کافر لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے شریک اور برابر ٹھہراتے ہیں، حالانکہ اس نے تنہا ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ثم کفار کے فعل کی قباحت پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ثابت ہے اور اس کی آیات پھیلی ہوئی ہیں اور اس کا انعام ظاہر ہے پھر اس کے بعد بھی وہ اپنے رب کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اے فلاں! میں نے تجھے عطا کیا، میں نے تجھے عزت دی، میں نے تجھ پر احسان کیا، پھر تو مجھے گالی دیتا ہے۔ اگر اس میں واو وغیرہ کے ساتھ عطف ہوتا تو توبیخ اس طرح لازم نہ آتی جس طرح ثم کے ساتھ توبیخ لازم ہوتی ہے (2)۔ واللہ اعلم

## هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝

''اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر مقرر کی ایک میعاد اور ایک میعاد مقرر ہے اللہ کے نزدیک پھر بھی تم شک کر رہے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ یہ آیت خبر ہے، اس کے مفہوم میں دو قول ہیں: ایک وہ ہے جو مشہور ہے اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور خلق سے مراد آپ کی نسل ہے اور فرع اپنے اصل کی طرف منسوب ہوتی ہے اسی وجہ سے فرمایا: خَلَقَكُمْ جمع کی ضمیر ذکر فرمائی آپ کو خطاب فرمایا جب کہ وہ حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ یہ حسن، قتادہ، ابن ابی نجیح، سدی، ضحاک اور ابن زید وغیرہم کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نطفہ (3) کو حقیقت میں اللہ نے مٹی سے پیدا فرمایا، پھر اسے تبدیل کیا حتیٰ کہ اس سے انسان بن گیا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے عالم کبیر کا پہلے ذکر فرمایا تو اس کے بعد عالم صغیر کا ذکر فرمایا اور وہ عالم صغیر انسان ہے اس میں وہ سب کچھ رکھا جو عالم کبیر میں ہے جیسا کہ ہم نے آیت توحید کے تحت سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ ابونعیم الحافظ نے اپنی کتاب میں مرہ عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرشتہ جو رحم پر متعین ہوتا ہے وہ نطفہ کو پکڑتا ہے پھر اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے، پھر کہتا ہے: اے رب! اس کے اعضاء مکمل بنانے ہیں یا نامکمل بنانے ہیں؟ اگر مکمل بنانے کا ارشاد ہوتا ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے اس کا رزق کیا ہے؟ اس کا اثر کیا ہے؟ اس کی عمر کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: ام الکتاب میں دیکھو۔ وہ لوح محفوظ میں دیکھتا ہے تو اس میں وہ اس کا رزق، اس کا اثر، اس کی عمر اور اس کا عمل دیکھتا ہے اور پھر وہ ایسی جگہ کی مٹی پکڑتا ہے جس جگہ اسے دفن ہونا ہے، پس اس مٹی کے ساتھ اس نطفہ کو گوندھتا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ (طٰہٰ:55) سے یہی مراد ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے تخریج کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی بچہ نہیں ہوا مگر اس پر اس کی قبر کی مٹی سے چھڑکاؤ کیا گیا" (1)۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر ہر انسان مٹی اور ماء مہین سے پیدا کیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ المومنون میں خبر دی ہے۔ پس آیات اور احادیث موافق ہو جائیں گی اور تعارض اور اشکال اٹھ جائے گا۔ واللہ اعلم۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق اخبار سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں، یہاں ہم کچھ مزید ان کی صفات، عمر اور وفات وغیرہ کے متعلق ذکر کرتے ہیں۔

ابن سعد نے "الطبقات" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں" (2)۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایسی زمین سے پیدا کیا جسے دجناء کہا جاتا ہے"۔ حسن نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کا سینہ ضریۃ سے پیدا کیا گیا۔ جوہری نے کہا: ضریۃ بنی کلاب کا ایک شہر ہے جو بصرہ کے راستہ پر ہے یہ مکہ کے زیادہ قریب ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو بھیجا تو اس نے زمین کی سطح سے مٹی اور نمکین مٹی سے کچھ اٹھایا اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا گیا پس جو اس کی میٹھی مٹی سے تخلیق کیا گیا وہ جنت کی طرف جانے والا ہے اگرچہ وہ کافر کا بیٹا بھی ہو اور جو اس کی نمکین مٹی سے تخلیق کیا گیا وہ آگ کی طرف جانے والا ہے اگرچہ وہ کسی متقی کا بیٹا بھی ہو، اسی وجہ سے ابلیس نے کہا تھا: کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا؟ کیونکہ وہ مٹی وہی لایا تھا، پھر آپ کا نام آدم رکھا گیا، کیونکہ انہیں أدیم الارض (زمین کی سطح) سے پیدا کیا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن سلام سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن کے آخر میں پیدا کیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کا سر آسمان کو چھوتا تھا...... فرمایا ...... پھر اسے زمین کی طرف جھکایا حتیٰ کہ وہ ساٹھ ہاتھ لمبے اور سات ہاتھ چوڑے ہو گئے۔ حضرت ابن عباس سے

---

1۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 280

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 159۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب التفاخر بالاحساب، حدیث 4452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مروی ہے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کا سر آسمان کو چھوتا تھا...... فرمایا ...... پھر اسے زمین کی طرف جھکایا حتیٰ کہ وہ ساٹھ ہاتھ لمبے اور سات ہاتھ چوڑے ہو گئے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام بہت زیادہ لمبے، گھنگھریالے بالوں والے تھے گویا لمبی کھجور ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ان کی حدیث میں طول کا ذکر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ کی طرف پیدل چالیس حج کیے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اتارا گیا تو ان کا سر آسمان کو چھوتا تھا اسی وجہ سے وہ گنجے ہو گئے اور آپ کی اولاد بھی گنجی ہوتی ہے، آپ کے قد کی طوالت کی وجہ سے خشکی کے جانور بھاگ گئے اور اس دن سے وہ وحشی بن گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا وصال نہ ہوا حتیٰ کہ ان کی اولاد کی اولاد کی اولاد چالیس ہزار ہو گئی۔ آپ نے اس پہاڑ کی چوٹی پر وصال فرمایا جس پر آپ اترے تھے، حضرت شیث علیہ السلام نے جبریل سے کہا: آدم علیہ السلام کی نماز جنازہ پڑھاؤ۔ جبریل نے حضرت شیث علیہ السلام سے کہا: تم آگے بڑھو اور اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھاؤ اور ان پر تیس تکبیریں کہو، پانچ تو نماز جنازہ کی ہیں اور پچیس حضرت آدم علیہ السلام کی فضلیت کے لیے ہیں۔ بعض نے کہا: اس پر چار تکبیریں کہیں۔ حضرت شیث علیہ السلام کی اولاد نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک غار میں رکھا اور اس پر محافظ مقرر کیے تاکہ قابیل کے بیٹوں میں سے کوئی ان کے قریب نہ آئے۔ جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آتے تھے اور آپ کے لیے استغفار کرتے تھے وہ حضرت شیث علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ حضرت آدم کی عمر نو سو چھتیس سال تھی۔ کہا جاتا ہے: کیا اس آیت میں دلیل ہے کہ جوہر ایک جنس سے ہیں؟ اس کا جواب ہے: ہاں، کیونکہ جب مٹی زندہ، قادر، علیم انسان بن سکتی ہے تو جواہر کا بھی ہر حال کی طرف تبدیل ہونا جائز ہے، کیونکہ حکم میں عقل برابری کا تقاضا کرتی ہے پتھروں کا انسان کی طرف بدلنا جائز اور صحیح ہے اس کی دلیل یہی آیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا**، **اَجَلًا** مفعول ہے۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** مبتدا خبر ہے ضحاک نے کہا: اجلاً سے مراد موت ہے **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** سے مراد قیامت کی مدت ہے۔ اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ اس نے مدت کا فیصلہ فرمایا اور اس نے تمہیں بتایا کہ تم نے موت تک ٹھہرنا ہے اور اس نے تمہیں قیامت کی مدت کے بارے آگاہ نہیں کیا۔ حسن، مجاہد، عکرمہ، خصیف، قتادہ نے کہا: یہ حسن کے الفاظ ہیں: جس دن اس نے تجھے پیدا کیا اس دن سے دنیا کی مدت کا تیرے مرنے تک کا فیصلہ کیا(1)۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** یعنی آخرت کی مدت اس کے پاس ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **قَضٰۤى اَجَلًا** یعنی ہمیں بتایا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى** آخرت کی مدت کا علم اس کے پاس ہے۔ بعض نے فرمایا: **قَضٰۤى اَجَلًا** اس سے مراد وہ ہے جو ہم چاند اور کھیتی باڑی کے اوقات جانتے ہیں۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى** سے مراد موت کی مدت ہے انسان نہیں جانتا کہ وہ کب مرے گا۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ **قَضٰۤى اَجَلًا** دنیا کی موت کا فیصلہ فرمایا۔ **وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ** آخرت کی ابتدا کا فیصلہ اس کے پاس ہے(2)۔ بعض علماء نے کہا: پہلی اجل سے مراد نیند میں روحوں کو قبض کرنا ہے اور دوسری اجل سے مراد موت کے وقت روح کا قبض کرنا ہے۔ حضرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 266 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 267

ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے میں شک کرتے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تم شک کرنے والوں کے جھگڑا کی طرح جھگڑتے ہو۔ التماری کا معنی شک کی بنا پر جھگڑنا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا یَرٰى ۝ (النجم)

وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''اور وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جانتا ہے تمہارے بھید بھی اور تمہاری کھلی باتیں بھی اور جانتا ہے جو تم کمارہے ہو۔ اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی اپنے رب کی نشانیوں سے مگر وہ ہو جاتے ہیں اس سے منہ پھیرنے والے۔ بے شک انہوں نے جھٹلایا حق کو جب وہ آیا ان کے پاس سو اب آیا چاہتی ہیں ان کے پاس خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ وہ مذاق کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ اس میں سوال یہ ہے کہ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ کا عامل کیا ہے، اس کے کئی جوابات ہیں: (1) اس کا مطلب ہے هو الله المعظّم او المعبود فی السموات وفی الأرض۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ ہی بلند شان والا یا معبود ہے جیسے تو کہتا ہے: زید الخلیفة فی الشرق و الغرب۔ یعنی شرق و غرب میں اس کا حکم ہے۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین میں تدبیر کرنے میں منفرد ہے، جیسے تو کہتا ہے: هو فی حاجات الناس وفی الصلاۃ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ خبر کے بعد خبر ہو، معنی یہ ہوگا: وهو الله فی السموات وهو الله فی الأرض۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے هو الله یعلم سرّکم و جهرکم فی السموت وفی الأرض فلا یخفی علیه شئ۔ یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور زمین میں تمہارے اعلانیہ امور اور بھیدوں کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: یہ میرے نزدیک عمدہ قول ہے۔ محمد بن جریر نے کہا: وهو الله فی السموٰت ویعلم سرّکم وجهرکم فی الأرض پس یعلم دونوں صورتوں میں مقدم ہے۔ پہلا قول اشکال سے سلامت ہے اس کے علاوہ بھی اقوال ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حرکت، انتقال اور امکنہ کے شغل سے پاک ہے۔ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ یعنی خیر و شر میں سے جو تم کماتے ہو۔ الکسب سے مراد نفع حاصل کرنے یا نقصان کو دور کرنے کے لیے فعل کرنا ہے اسی وجہ سے اللہ کے فعل کو کسب نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ یعنی علامت جیسے چاند کا پھٹنا وغیرہ۔ من جنس کے استغراق کے لیے ہے تو کہتا ہے: مافی الدار من احد گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ دوسرا من لتعضیة ہے۔ مُعْرِضِیْنَ ۝ كَانُوْا کی خبر ہے۔ الاعراض سے مراد ان آیات میں غور و فکر کا ترک کرنا ہے جن کے ذریعے توحید پر استدلال کرنا ان پر واجب تھا جیسے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس کی تخلیق کی علامت۔ یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ وہ قدیم، حی اور تمام اشیاء سے غنی

ہے، قادر ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہیں کرتی، عالم جس پر کوئی چیز مخفی نہیں جو اس نے معجزات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قائم کیے ہیں تا کہ ان کے ذریعے اس کے لائے ہوئے پیغام کی صداقت پر استدلال کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَدْ كَذَّبُوْا یعنی مشرکین مکہ نے جھٹلایا۔ بِالْحَقِّ یعنی قرآن۔ تو بعض علماء نے فرمایا: بِالْحَقِّ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ فَسَوْفَ يَأْتِيْهِمْ یعنی ان پر عذاب نازل ہوگا۔ الانباء سے مراد اخبار ہیں، یعنی عذاب، جیسے تیرا قول ہے: أصبر وسوف يأتيك الخبر تو صبر کر عنقریب تیرے پاس خبر (عذاب) آ جائے گی۔ اس سے مراد وہ ہے جو انہیں جنگ بدر وغیرہ میں تکلیف پہنچی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد قیامت کا عذاب ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝

''کیا نہیں دیکھا انہوں نے کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے قومیں جنہیں ہم نے (ایسا) تسلط دیا تھا زمین میں جو ہم نے تمہیں نہیں دیا اور ہم نے بھیجے بادل ان پر موسلا دھار برسنے والے اور ہم نے بنا دیں نہریں جو بہتی تھیں ان کے (گھروں اور باغوں کے) نیچے سے پھر بھی ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے اور پیدا کر دی ہم نے ان کے بعد ایک اور قوم''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ، كَمْ، اَهْلَكْنَا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اَلَمْ يَرَوْا کی وجہ سے منصوب نہیں، کیونکہ لفظ استفہام میں اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا، اس کا مابعد اس میں عمل کرتا ہے، کیونکہ اس کا مقام صدر کلام ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا وہ عبرت حاصل نہیں کرتے پہلی قوموں سے جن کو ہم نے اس لیے ہلاک کیا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کو جھٹلایا تھا یعنی کیا انہوں نے اس کو نہیں پہچانا؟ القرن سے مراد لوگوں کی ایک امت ہے اس کی جمع القرون ہے۔ شاعر نے کہا:

إذا ذَهبَ القرنُ الذى كنتَ فيهم    وخُلِّفتَ فى قَرْنٍ فأنت غَرِيبُ

قَرْنٍ سے مراد اپنے زمانہ کے لوگ ہیں یہ اقتران سے مشتق ہے۔ یعنی بعض لوگ بعض سے ملے ہوئے ہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی (1) یعنی لوگوں میں سے بہتر میرے اصحاب ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔ جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے اصح یہی قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اھل قرن ہے۔ اھل کو حذف کیا گیا ہے جیسے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں اھل حذف ہے۔ اس بنا پر قرن سے مراد زمانہ کی ایک مدت ہوگی۔ بعض نے فرمایا: یہ ساٹھ سال ہیں۔ بعض نے فرمایا: ستر سال ہیں۔ بعض نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، جلد 1، صفحہ 362

فرمایا: اسی سال ہیں۔ بعض نے فرمایا سو سال ہیں۔ اکثر اصحاب حدیث کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سو سال ہیں اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن بسر سے کہا: تعیش قرنا تو سو سال زندہ رہے (1)۔ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ القرن کی اصل ظاہر ہونے والی چیز جیسے قرن ماله، قرن من الحیوان، حیوان کا سینگ۔

مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ یہ غائب سے خطاب کی طرف خروج ہے اس کا عکس یہ ہے حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (یونس: 22) اس آیت میں پہلے خطاب تھا، پھر غائب کی ضمیر ذکر فرمائی۔ اہل بصرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے قول اَلَمْ يَرَوْا کے ساتھ ان کے متعلق خبر دی اور ان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب موجود تھے، پھر انہیں ان کے ساتھ خطاب کیا۔ عرب کہتے ہیں: قلت لعبد الله ما أكرمه وقلتُ لعبد الله ما أكرمك اگر غیب کے صیغہ پر آتا تو مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ ہوتا مکنه اور مکن له دونوں جائز ہیں اس میں دونوں لغتیں ہیں یعنی ہم نے دنیا سے انہیں وہ عطا کیا جو تمہیں عطا نہیں کیا۔

وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا اس سے مراد موسلا دھار بارش ہے، اس کو السماء سے تعبیر فرمایا، کیونکہ بارش آسمان سے آتی ہے شاعر کا قول ہے:

وإذا سَقَطَ السَّمَاءُ بأرضِ قومٍ

مِّدْرَارًا یہ وزن کثرت پر دلالت کرتا ہے جیسے مذکار اس عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی مذکر اولاد زیادہ ہو اور مئنات وہ عورت جس کی مونث اولاد زیادہ ہو۔ کہا جاتا ہے: دَرَّ اللبن، یدر جب دودھ کثرت سے آئے اور مِّدْرَارًا پر نصب حال کی بنا پر ہے۔ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ۔ اسی سے فرعون کا قول ہے: هذه الانهار تجری من تَحْتِي۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان پر نعمتوں میں وسعت کی تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ یعنی ان کے کفر کی وجہ سے ہم نے انہیں ہلاک کیا۔ گناہ، انتقام اور نعمتوں کے زوال کا سبب ہیں۔

وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۝ یعنی ہم نے ان کو پیدا کیا، پس ان لوگوں کو اہلاک سے بچنا چاہیے۔

**وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝**

''اور اگر ہم اتارتے آپ پر کتاب (لکھی ہوئی) کاغذ پر اور وہ چھو بھی لیتے اس کو اپنے ہاتھوں سے تب بھی کہتے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ہم ان کے سامنے آپ پر کتاب نازل کرتے جیسا کہ انہوں نے کاغذ پر لکھی ہوئی کلام طلب کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس کا مطلب ہے کتاب جو آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہوتی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تنزیل کا عمل دو اعتبار سے ہو سکتا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 269

ایک یہ کہ نزل علیک الکتاب کا معنی ہے کہ فرشتہ اس کے ساتھ اترتا۔ دوسرا یہ کہ اگر ہم کاغذ میں کتاب نازل کرتے جس کو اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے درمیان روک لیتا۔

نَزَّلْنَا مبالغہ فرمایا، کتاب کا آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہرنا طویل ہوتا ہے الکتاب مصدر ہے بمعنی کتابۃ، پس واضح ہوا کہ کتابت کاغذ میں ہوتی ہے کتاب کو نہیں سمجھا جاتا مگر کاغذ میں یعنی صحیفۃ میں۔ القرطاس سے مراد صحیفہ ہے۔ کہا جاتا ہے: قرطاس ضمہ کے ساتھ۔ قرطس فلان۔ جب کوئی تیر پھینکے اور اس صحیفہ کو جا لگے جو ہدف کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ پس وہ اسے دیکھتے اور اسے ہاتھ سے چھوتے جیسا کہ انہوں نے تجویز کیا ہے اور ہاتھوں سے ٹٹول کر تمیز بھی کر لیتے تاکہ ہر شک اور شبہ زائل ہو جائے تو پھر بھی ہٹ دھرمی اور کفر کی متابعت میں قائم رہتے اور کہتے: یہ تو کھلا جادو ہے ہماری آنکھیں بند کی گئی ہیں اور ہم پر جادو کیا گیا ہے۔ یہ آیت ان کے قول حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (الاسراء: 93) کا جواب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کی بنا پر بتایا کہ اگر اس طرح نازل ہوتا تو یہ اس کو بھی جھٹلائیں گے۔ کلبی نے کہا: یہ نضر بن حرث عبد اللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد کے بارے نازل ہوئی انہوں نے کہا: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ۝ (الاسراء) ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کر دیں ہماری زمین سے ایک چشمہ۔

**وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ۝ وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝**

''اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہو گیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں۔ اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتہ کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں) تو (یوں) ہم مشتبہ کر دیتے ان پر جس شبہ میں وہ اب ہیں۔ اور بلاشبہ مذاق اڑایا گیا رسولوں کا آپ سے پہلے پھر گھیر لیا انہیں جو مذاق اڑاتے تھے رسولوں کا اس چیز نے جس کے ساتھ مذاق اڑایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ یہ بھی انہوں نے تجویز کی۔ لولا بمعنی ھلا ہے۔ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اگر وہ فرشتے کو اپنی صورت میں دیکھتے تو مر جاتے، کیونکہ وہ اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: تو قیامت قائم ہو جاتی۔ حسن اور قتادہ نے کہا: وہ عذاب کے ساتھ ہلاک کیے جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری فرمائی ہے کہ جس نے کوئی نشانی طلب کی پھر وہ اس کے لیے ظاہر کر دی گئی اور وہ ایمان نہ لایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے فوراً ہلاک کر دیا۔ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝ یعنی انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا یعنی وہ فرشتے کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتے مگر مجسم ہونے کے بعد کیونکہ ہر جنس اپنی جنس سے مانوس ہوتی ہے اور دوسری جنس سے دور ہوتی ہے اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کا رسول فرشتہ کو بناتا تو وہ اس کے قرب سے دور ہوتے اور اس سے مانوس نہ ہوتے اور اس کی کلام سے رعب داخل ہوتا تو یہ چیز انہیں اس سے کلام

کرنے اور سوال کرنے سے انہیں روک دیتی اور مصلحت عام نہ ہوتی۔

اور اگر اللہ تعالیٰ اسے ملائکہ کی صورت سے انسانوں کی صورت کی طرف منتقل کرتا تا کہ وہ اس سے مانوس ہوں اور اس سے سکون پائیں تو یہ کہتے: تو فرشتہ نہیں ہے تو تو بشر ہے ہم تجھ پر ایمان نہیں لاتے، اور وہ پہلے حال کی طرف لوٹ جاتے۔ ملائکہ انبیاء کرام کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس آدمیوں کی شکل میں آئے تھے اور جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں آتے تھے، یعنی اگر فرشتہ نازل ہوتا تو وہ اسے انسانی شکل میں دیکھتے جیسا کہ انبیاء کی عادت جاری ہے اور اگر وہ اپنی عادت پر نازل ہوتا تو وہ اسے نہ دیکھ سکتے اور جب ہم اسے انسان بنا کر بھیجتے تو ان پر مشتبہ ہو جاتا اور وہ کہتے: یہ تو تیری طرح جادوگر ہے۔

زجاج نے کہا: وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ یعنی ہم ان کے رؤساء پر مشتبہ کر دیتے جس طرح وہ اپنے کمزور لوگوں پر مشتبہ ہوتے تھے۔ وہ انہیں کہتے تھے: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں، اس کے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ اس طرح ان پر معاملہ مشتبہ کرتے اور وہ انہیں شک میں مبتلا کرتے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ اگر وہ انسانی شکل میں فرشتہ نازل کرتا تو وہ التباس کا راستہ پاتے جیسا کہ وہ کرتے ہیں اللبس کا معنی مشتبہ کرنا اور خلط ملط کرنا ہے۔ لَبَسْتُ علیه الأمر، أَلْبِسه لَبْسًا یعنی میں نے اس پر خلط ملط کر دیا۔ اس کا اصل معنی کپڑے کے ساتھ ڈھانپنا ہے اور فرمایا: لَلَبَسْنَا اپنی طرف نسبت کی تخلیق کی جہت پر اور یَلْبِسُوْنَ فرمایا ان کی طرف نسبت کی اکتساب کی جہت پر، پھر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ یعنی جنہوں نے اپنے انبیاء سے استہزا کیا اس کی سزا کے طور پر عذاب نازل کر کے انہیں ہلاک کیا گیا حاق بالشیٔ یَحِیق حَیْقًا وحُیُوقًا وحَیَقَانًا اس کا معنی ہے اترنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: 43) اور نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے۔

مَّا كَانُوْا میں ما بمعنی الذی ہے بعض نے فرمایا: ما مصدریہ ہے یعنی اس کے استہزا کے انجام نے انہیں گھیر لیا۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے: سیر کرو زمین میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا۔ آپ (ان سے) پوچھیے کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ آپ (ہی انہیں) بتائیے (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے اس نے لازم کر لیا ہے اپنے آپ پر رحمت فرمانا یقیناً جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن ذرا شک نہیں اس میں (مگر) جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان استہزا کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کو کہو کہ زمین میں سفر کرو اور دیکھو اور خبر طلب کرو تا کہ تم جان لو جو عذاب اور عقاب تم سے پہلے کافروں پر اترا۔ ایسا سفر کرنا

مستحب ہے جب پہلی امتوں اور اجڑے ہوئے شہروں کے کھنڈرات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے ہو اور ان کا آخری انجام دیکھنے کے لیے ہو۔ یہاں مکذبون سے مراد وہ ہیں جنہوں نے حق اور حق والوں کو جھٹلایا نہ کہ وہ جنہوں نے باطل کو جھٹلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ بھی ان کے خلاف حجت ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے پوچھیے: کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ اگر وہ کہیں کہ کس کا ہے؟ تو تم کہو: اللہ کے لیے ہے، یعنی جب ثابت ہو گیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کا ہے اور وہی تمام کا خالق ہے، ان کے اعتراف کرنے کے ساتھ یا ان پر حجت قائم کرنے کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ پھر اس پر بھی قادر ہے کہ وہ انہیں جلدی عذاب دے اور انہیں موت کے بعد اٹھائے لیکن كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اس نے اپنے آپ پر رحمت کرنا لازم کر لیا ہے۔ اس نے اپنی جناب سے فضل و کرم کا وعدہ فرمایا ہے اس لیے اس نے ڈھیل دی ہے۔ یہاں نفس کا ذکر فرمایا مراد اس کا وجوب ہے اور وعدہ کی تاکید ہے اور اس کے علاوہ وسائط اٹھاتا ہے، کلام کا مطلب یہ ہے کہ اس نے روگردانی کرنے والوں پر مہربانی فرمائی ہے کہ وہ انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اس کی بارگاہ کی طرف لوٹ آئیں۔ اس نے خبر دی کہ وہ اپنے بندوں پر رحیم ہے وہ انہیں جلدی عذاب نہیں دیتا بلکہ وہ ان سے توبہ اور رجوع کو قبول فرماتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے کتاب میں اپنے اوپر یہ لازم کر لیا، وہ کتاب اس کے پاس ہے، کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے“(1)۔ یعنی جب اس نے اپنا فیصلہ ظاہر فرمایا اور جس کے لیے چاہا ظاہر فرمایا تو اس نے لوح محفوظ میں یہ تحریر ظاہر فرمائی یا جس میں ظاہر کرنا چاہا۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ خبر سچ ہے اور وعدہ حق ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے یعنی میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے جاتی ہے اور اس پر زائد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيَجْمَعَنَّكُمْ لام قسم ہے، نون تاکید ہے۔ فراء وغیرہ نے کہا: یہ جائز ہے کہ الرَّحْمَةَ پر کلام مکمل ہو اور مابعد وضاحت کی جہت سے نئی کلام ہو، پس لَيَجْمَعَنَّكُمْ کا معنی ہوگا وہ تمہارے جمع کرنے کو مؤخر کرے گا اور وہ تمہیں مہلت دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تمہیں قبور میں جمع کرے گا اس دن تک جس کا تم انکار کرتے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: الی بمعنی فی ہے یعنی وہ تمہیں قیامت کے دن میں جمع کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ لَيَجْمَعَنَّكُمْ، الرَّحْمَةَ سے بدل کی بنا پر منصوب ہو اس صورت میں لام بمعنی ان ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ تمہارے رب نے تمہیں جمع کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، اسی طرح بہت سے نحویوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہا ہے: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ (یوسف:35) یعنی أن یسجنوہ۔ بعض علماء نے فرمایا: كَتَبَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے، جیسا کہ (ان) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ یہ رحمت کی تفسیر کرنے والا ہے کہ وہ قیامت تک مہلت دیتا ہے، یہ زجاج سے مروی ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 356

لَا رَيْبَ فِيْهِ اس میں شک نہیں۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ یہ مبتدا خبر ہیں، یہ زجاج نے کہا ہے۔ یہ عمدہ قول ہے اس میں سے جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔ تو کہتا ہے: الذی یکرمنی فلہ درھم۔ فا شرط اور جزا کے معنی کے مضمن ہونے کی وجہ سے ہے۔ اخفش نے کہا: اگر تو چاہے تو اَلَّذِيْنَ کو لَيَجْمَعَنَّكُمْ میں کم ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں بنادے یعنی وہ ضرور ان مشرکوں کو جمع کرے گا جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا اپنے آپ کو۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے، اس نے کہا: یہ خطا ہے، کیونکہ اس کو مخاطب اور مخاطب سے بدل نہیں بنایا جاتا یہ نہیں کہا جاتا: مررت بلٖ زیدٍ اور نہ یہ کہا جاتا ہے: لا امررت بی زیدٍ کیونکہ یہ مشکل ہی نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے۔ قتبی نے کہا: یہ جائز ہے کہ اَلَّذِيْنَ، الْمُكَذِّبِيْنَ سے بدل ہو جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یا یہ ان کی صفت ہو بعض نے فرمایا اَلَّذِيْنَ نداء مفرد ہے۔

وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

”اور اسی کا ہے جو بس رہا ہے رات میں اور دن میں اور وہی سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ آپ فرمایئے: کیا بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی کو (اپنا) معبود بناؤں؟ (وہ اللہ جو) پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور خود نہیں کھلایا جاتا۔ فرمایئے: بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں سب سے پہلے سر جھکانے والا (نیز یہ حکم دیا گیا ہے کہ) ہرگز نہ بننا شرک کرنے والوں سے۔ آپ فرمایئے: میں ڈرتا ہوں اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے عذاب سے۔ وہ شخص ٹال دیا گیا عذاب جس سے اس روز تو یقیناً رحم فرمایا اللہ نے اس پر اور یہی کھلی کامیابی ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ النَّهَارِ یعنی جو ثابت ہے یہ بھی مشرکوں کے خلاف حجت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی، کیونکہ انہوں نے کہا تھا ہم جانتے ہیں کہ جو تم کرتے ہو اس پر تمہیں کوئی چیز نہیں ابھارتی مگر حاجت، پس ہم تمہارے لیے مال جمع کرتے ہیں حتیٰ کہ تو ہمارے غنی لوگوں میں ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محبوب! انہیں بتایئے کہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ مجھے غنی کرنے پر قادر ہے۔ سکن کا معنی پرسکون ہونا اور ٹھہرنا ہے مراد ہے جو ساکن ہے اور جو متحرک ہے سامع کے علم کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ساکن کو خصوصی طور پر ذکر کیا، کیونکہ سکون جن کو شامل ہے وہ حرکت کرنے والی چیزوں سے زیادہ ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے جو اس نے پیدا کیا یہ تمام ساکن و متحرک مخلوقات کو شامل ہے، کیونکہ اس پر رات، دن جاری ہوتے ہیں۔ اس مفہوم کی بنا پر سکون سے مراد وہ نہ ہوگا جو حرکت کی ضد ہے بلکہ مراد مخلوق ہے۔ یہ عمدہ قول ہے، کیونکہ یہ مختلف اقوال کا جامع ہے۔

وَ هُوَ السَّمِيْعُ وہ ان کی آوازوں کو سننے والا ہے۔ الْعَلِيْمُ ۝ ان کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا، اتخذ کے دو مفعول ہیں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آباء کے دین بت پرستی کی طرف بلایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اے پیارے محمد! تم کہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا رب، معبود اور ناصر بناؤں؟ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اسم جلالت کی صفت کی بنا پر جر کے ساتھ ہے۔ اخفش نے مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ زجاج نے کہا: مدح کی بنا پر نصب بھی جائز ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: فعل مضمر پر اس کی نصب بھی جائز ہے گویا فرمایا: أترك فاطر السٰموات والأرض کیا میں آسمانوں اور زمین پیدا کرنے والے کو چھوڑ دوں؟ کیونکہ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا اس کی ولایت کے ترک پر دلالت کرتا ہے۔ اس دلالت کی قوت کی وجہ سے فعل کا اضمار بہتر ہے۔

وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ اکثر علماء کی یہی قرأت ہے یعنی وہ رزق دیتا ہے، اسے رزق نہیں دیا جاتا، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ (الذاریات) میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں۔ سعید بن جبیر، مجاہد اور اعمش کی قرأت وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يَطْعَمُ ہے۔ یہ قرأت عمدہ ہے یعنی وہ بندوں کو رزق دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں جس کی مخلوق محتاج ہوتی ہے مثلاً غذا (وغیرہ)۔ دونوں فعلوں کو یا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کھلاتا ہے اور انہیں رزق دیتا ہے اور بت نہ اپنے آپ کو کھلاتا ہے اور نہ اپنے بنانے والے کو کھلاتا ہے۔ پہلے میں یا اور عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی بت وَ لَا يُطْعِمُ نہیں کھلاتا یا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ۔ کھانا کھلانے کو خصوصاً ذکر کیا گیا ہے دوسرے انعامات کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ تمام لوگوں کو اس کی زیادہ حاجت ہوتی ہے۔

قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ یعنی سب سے پہلے میں اللہ کے امر کے سامنے سر جھکاؤں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اپنی قوم اور اپنی امت سے میں پہلے اخلاص کا اظہار کروں۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ یعنی مجھے کہا گیا کہ تو ہرگز نہ بنا مشرکوں میں سے۔

قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ یعنی ڈرتا ہے کہ میں غیر کی عبادت کروں گا تو وہ مجھے عذاب دے گا۔ الخوف کا معنی مکروہ کی توقع ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اَخَافُ یہاں اعلم کے معنی میں ہے۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ یعنی جس سے عذاب ٹالا گیا۔ يَوْمَئِذٍ یعنی قیامت کا دن۔ فَقَدْ رَحِمَهٗ وہ نجات پا گیا، کامیاب ہو گیا اور رحم کیا گیا۔

کوفیوں نے من یصرف یا کے فتحہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابوعبید کا یہی مختار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ۔ اور ارشاد ہے فَقَدْ رَحِمَهٗ، رُحِمَ مجہول کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا اور حضرت ابی کی قرأت کی وجہ سے من یصرفه الله عنه۔ سیبویہ نے پہلی قرأت کو اختیار کیا ہے اور اہل مدینہ اور ابی عمرو کی قرأت ہے۔ سیبویہ نے کہا: جب کلام میں اضمار کم ہوتا ہے تو بہتر ہوتا ہے۔ رہی ان کی قرأت جنہوں نے یصرف یاء کے

فتحہ کے ساتھ پڑھا تو اس کی تقدیر یہ ہوگی: من یصرف اللہ عنہ العذاب اور جب من یصرف عنہ پڑھا جائے گا تو تقدیر یہ ہوگی من یصرف عنہ العذاب۔

وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ یعنی واضح نجات۔

**وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝**

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی دکھ تو نہیں کوئی دور کرنے والا اس دکھ کو سوائے اس کے اور اگر پہنچائے تجھے کوئی بھلائی (اس کو کوئی روک نہیں سکتا) وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ، المس اور الکشف، اجسام کی صفات سے ہیں یہاں مجازاً استعمال ہوا ہے معنی یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر فقر یا مرض کی شدت نازل ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر آپ کو عافیت، خوشحالی، نعمت ملے تو اللہ تعالیٰ خیر اور شر پر قادر ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے غلام! یا فرمایا: اے میرے بیٹے! کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھاؤں جن کے ساتھ تجھے اللہ تعالیٰ نفع دے''۔ میں نے کہا: ضرور کرم فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو یاد کر وہ تیری حفاظت فرمائے گا، تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر تو اسے اپنے سامنے پائے گا، تو خوشحالی میں اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر وہ شدت میں تجھ پر کرم فرمائے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر اور جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، جو کچھ ہونا ہے اس کے ساتھ قلم خشک ہو چکا ہے۔ اگر تمام مخلوق تجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے جس کا تیرے لیے اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔ تو اللہ کے لیے شکر اور یقین کے ساتھ عمل کر اور جان لے کہ ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنے میں خیر کثیر ہے اور نصرت و کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور کشادگی، کرب کے ساتھ ہے اور تنگی کے ساتھ آسانی ہے''(1)۔ اس حدیث کو ابوبکر بن ثابت خطیب نے اپنی کتاب ''الفصل والوصل'' میں ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے بھی ذکر کی ہے اور یہ مکمل ہے۔

**وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝**

''اور وہ غالب ہے اپنے بندوں پر اور وہ بڑا دانا ہر چیز سے خبردار ہے۔ آپ پوچھیے: کون سی چیز بڑی (معتبر) ہے

1۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 134-133، حدیث 631۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2440، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گواہی کے لحاظ سے؟ آپ ہی بتایئے: اللہ، وہی گواہ ہے میرے درمیان اور تمہارے درمیان۔ اور وحی کیا گیا ہے میری طرف یہ قرآن تا کہ میں ڈراؤں تمہیں اس کے ساتھ اور (ڈراؤں) اسے جس تک یہ پہنچے۔ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خدا اور بھی ہیں۔ آپ فرمایئے: میں تو (ایسی جھوٹی) گواہی نہیں دیتا۔ آپ فرمایئے: وہ تو صرف ایک خدا ہی ہے اور بے شک میں بیزار ہوں ان (بتوں) سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ**، القهر کا معنی غلبہ ہے۔ القاهر کا معنی غالب ہے۔ اقهر الرجل بولا جاتا ہے جب کوئی مجبور کر کے ذلیل کیا جائے۔ شاعر نے کہا۔

تَمَنَّى حُصَيْنٌ أن يَسُودَ جِذاعَه فأمسى حُصَيْنٌ قد أذلَّ و أقْهَرا

قھر کا معنی ہے مغلوب کیا گیا۔ **فَوْقَ عِبَادِهٖ** غلبہ کے ساتھ فوقیت مراد ہے، یعنی تمام بندے اس کے حکم کے تحت مسخر ہیں۔ فوقیت سے فوقیت مکانی مراد نہیں ہے، جیسے تو کہتا ہے: السلطان فوق رعيته یعنی سلطان منزل و رفعت کے اعتبار سے رعیت سے بلند ہے۔ قہر میں ایک زائد معنی ہے جو قدرت میں نہیں وہ ہے کسی کو مراد حاصل کرنے سے روک دینا۔ **وَهُوَ الْحَكِيْمُ** وہ اپنے امر میں حکیم ہے۔ **الْخَبِيْرُ ۝** اپنے بندوں کے اعمال سے باخبر ہے یعنی جو ان صفات سے متصف ہو واجب ہے کہ اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً** اس کا واقعہ یہ ہے کہ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کون تمہاری گواہی دیتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے یہاں لفظ شئ اللہ کی اسم کی جگہ واقع ہوا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ اکبر شهادة یعنی وہ ربوبیت کے ساتھ منفرد ہے اپنی توحید پر براہین کا قیام بہت بڑی شہادت ہے وہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ ہے کہ میں نے تمہیں تبلیغ کی اور میں نے جو کچھ کہا اور جو میں نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے میں اس میں سچا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ** قرآن میری نبوت کا گواہ ہے۔ **لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ** اے اہل مکہ! میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراتا ہوں اور **وَمَنْۢ بَلَغَ** جس کو قرآن پہنچا ہے۔ کلام کی طوالت کی وجہ سے ھا حذف کی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بالغ ہوا۔ اس سے دلیل پکڑی جاتی ہے کہ جو بالغ نہیں ہوا وہ مخاطب نہیں ہے اور وہ مکلف نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے فرمایا: **يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ** (المائدہ: 67) اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے۔

صحیح بخاری میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: "میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل کے متعلق بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے" (1)۔ خبر میں ہے جس کو کتاب اللہ کی ایک آیت پہنچی تو اسے اللہ کا امر پہنچا اسے وہ اپنائے یا

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 91

اسے ترک کرے (اس کی مرضی) مقاتل نے کہا: جن وانس میں سے جس کو قرآن پہنچا وہ اس کے لیے نذیر (ڈرانے والا) ہے۔ قرظی نے کہا: جس کو قرآن پہنچا گویا اس نے حضرت محمد ﷺ کو دیکھا اور ان سے سنا۔ ابونہیک نے: وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ پڑھا یعنی معروف کا صیغہ پڑھا۔ یہ جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى استفہام توبیخ وتقریع کے لیے ہے۔ ائنکم اصل پر دو ہمزوں کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جب تو دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرے گا تو تو کہے گا: ئنکم، اصمعی نے ابوعمرو اور نافع سے آئنکم روایت کیا ہے یہ لغت معروفہ ہے دو ہمزوں کے درمیان الف لگایا جاتا ہے، کیونکہ دو ہمزے جمع کرنا ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أيا ظبيةَ الوَعْسَاءِ بين جَلَاجِلٍ　　وبَيْنَ النَّقَا آ أنْتِ أمْ أمُّ سَالِمِ

اور جنہوں نے أنکم پڑھا خبر کی بنا پر تو اس نے ان پر شرک ثابت کیا۔ اور فرمایا: اٰلِهَةً اُخْرٰى، اُخر نہیں فرمایا۔ فراء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ الھۃ جمع ہے اور جمع پر تانیث واقع ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف: 180) اور ارشاد ہے: فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ (طٰہٰ) اور اگر الأول اور الاخر ہوتا تو بھی صحیح ہوتا۔ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ یعنی میں تمہارے ساتھ گواہی نہیں دیتا، کلام کی دلالت کی وجہ سے معکم کو حذف کیا گیا ہے اس کی مثال یہ ہے: فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ اگر وہ گواہی دیں تو تم ان کے ساتھ گواہی نہ دو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"جنہیں ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اس نبی کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو پہچانا اور جان بوجھ کر مخالفت کی۔ اس کا مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَلَّذِيْنَ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ یہ محل خبر میں ہے یعنی نبی کریم ﷺ کو پہچانتے تھے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الکتاب ہے یعنی وہ اسے پہچانتے تھے جس پر وہ کتاب دلالت کرتی ہے یعنی اس صفت پر ہے جو نبی کریم ﷺ کے امر کی صحت پر دلالت کرتی ہے۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہ نعت کی جگہ پر ہے اور اس کا مبتدا ہونا اور فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ کا خبر ہونا بھی جائز ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝
وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو، بے شک فلاح نہیں پائیں گے ظلم کرنے والے۔ اور (یاد کرو) وہ دن جب ہم جمع کریں گے سب کو پھر ہم کہیں گے انہیں جو شرک کیا کرتے تھے کہ کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے (خدا ہونے کا) تم دعویٰ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ مبتدا اور خبر ہیں یعنی کوئی زیادہ ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰى جس نے بہتان باندھا (1)۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ مراد قرآن اور معجزات ہیں۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے دنیا میں وہ فلاح نہیں پائیں گے، پھر نئی کلام شروع فرمائی فرمایا: وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا اس کا معنی ہے یاد کرو جب ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ظالم دنیا میں فلاح نہیں پائیں گے اور نہ اس دن جس میں ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ اس تقدیر پر الظّٰلِمُوْنَ پر وقف نہیں ہوگا، کیونکہ یہ متصل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مابعد کے متعلق ہے اور وہ اُنْظُرْ ہے یعنی دیکھ کیسے انہوں نے جھٹلایا اس دن کو جس میں ہم انہیں جمع کریں گے یعنی کیسے اس دن کو جھٹلاتے ہیں جس میں ہم انہیں جمع کریں گے؟

ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ یہ سوال انہیں رسوا کرنے کے لیے ہے نہ کہ وضاحت طلب کرنے کے لیے ہے۔ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ تم کہتے تھے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے شفیع ہیں یہ تمہیں اللہ کا قرب بخشیں گے۔ یہ ان کو توبیخ ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن میں زعم کا لفظ کذب کے معنی میں ہے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

''پھر نہیں ہوگا کوئی عذر ان کا بجز اس کے کہ کہیں کہ اس اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ، الفتنة سے مراد پرکھنا اور آزمائش کرنا ہے یعنی ان کے پاس جواب نہ ہوگا جب انہیں اس سوال سے آزمایا جائے گا اور وہ حقائق دیکھ لیں گے اور اس کے دعاوی اٹھ جائیں گے۔ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ وہ شرک سے برأت کریں گے اور شرک سے نفی کریں گے جب وہ مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور درگزر دیکھیں گے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اخلاص والوں کے اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردے گا اور اس پر کسی گناہ کو بخشنا بڑا نہیں ہے۔ جب مشرکین یہ دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ہمارا رب گناہوں کو بخشتا ہے اور شرک کو نہیں بخشتا تم آؤ ہم کہیں ہم گنہگار تھے اور ہم مشرک نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: چونکہ انہوں نے شرک کو چھپایا پس ان کے مونہوں پر مہر لگادو، پس ان کے مونہوں پر مہر لگادی جائے گی، ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے کرتوتوں کی ان کے پاؤں گواہی دیں گے اس وقت مشرکین پہچان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 277

حَدِیْثًا (النساء) اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات۔

ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس آیت کی تاویل بہت لطیف ہے، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے واقعات اور ان کی شرک کے ساتھ آزمائش کی خبر دی، پھر بتایا کہ ان کی معذرت اور بہانا کوئی نہ ہوگا جب وہ حقائق کو دیکھیں مگر یہ کہ وہ شرک سے برأت کا اظہار کریں گے۔ اس کی مثال لغت میں یہ ہے کہ تو ایک انسان کو دیکھتا ہے جو ایک گمراہ شخص سے محبت کرتا ہے، پھر جب وہ ہلاکت میں گرتا ہے تو وہ اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے، کہا جاتا ہے: تیری اس سے محبت نہ تھی مگر تو نے اس سے برات کی۔ حسن نے کہا: یہ منافقین کے ساتھ خاص ہے جو اپنی عادت پر دنیا میں چلتے رہے۔ فِتْنَتُهُمْ کا معنی ہے ان کے کفر کا انجام۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی ہے ان کا معذرت کرنا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ملاقات کرے گا اور فرمائے گا: اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی اور تجھے سردار نہیں بنایا تھا اور میں نے تیرا نکاح نہیں کیا تھا اور میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ کو مسخر نہیں کیا تھا، میں نے تجھے رئیس نہیں بنایا تھا کہ راحت سے رہتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں اے میرے رب! پھر فرمائے گا: کیا تو گمان رکھتا تھا کہ تو مجھ سے ملاقات کرنے والا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تجھے فراموش کر دیا جس طرح تو نے مجھ فراموش کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ دوسرے بندے سے ملے گا تو اسے فرمائے گا: وہ بھی اسی طرح کہے گا، پھر تیسرے سے ملے گا اسے یہ فرمائے گا تو وہ کہے گا: یارب! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے رسول پر ایمان لایا اور میں نے نماز پڑھی اور میں نے روزہ رکھا اور میں نے صدقہ کیا، جتنی اسے طاقت ہو گی وہ تعریف کرے گا۔ فرمایا: اسے کہا جائے گا: یہاں ٹھہر، پھر اسے کہا جائے گا: ابھی ہم تجھ پر گواہ پیش کریں گے، وہ دل میں سوچے گا: کون ہے جو مجھ پر گواہی دے گا؟ پھر اس کے منہ پہ مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران، گوشت اور ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی، وہ اپنے نفس سے بہانہ بنائے گا: یہ منافق ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا'' (1)۔

اُنْظُرْ كَیْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ

''دیکھو کیسا جھوٹ باندھا انہوں نے اپنے نفسوں پر اور گم ہو گئیں ان سے جو افترا بازیاں کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُنْظُرْ كَیْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ مشرکوں کا اپنا قول انہیں جھٹلائے گا کہ بتوں کی عبادت انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرے گی، بلکہ انہوں نے یہ گمان کیا اور ان کا گمان غلط تھا ان سے معذرت قبول کرنے کا باعث نہیں تھا اور ان سے جھوٹ کا اسم زائل نہیں ہوتا اور منافقوں کا عذر باطل کے ساتھ جھوٹ بولنا ہے اور ان کا انکار ان کا نفاق ہے۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ یعنی دیکھو کیسے ان کا افتراء لاشئ ہو گیا اور اپنے خداؤں سے شفاعت کا گمان کیسے باطل ہو گیا؟ بعض علماء نے فرمایا: وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ کا مطلب ہے جو وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے وہ ان سے جدا ہو گیا اور انہیں کسی چیز نے فائدہ نہیں دیا۔ حسن سے مروی ہے اس کا معنی ہے ان کی دہشت کی وجہ سے ان کا افتراء ان

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

سے جدا ہو جائے گا اور ان کی عقول کے ذہول کی وجہ سے ایسا ہو گا۔

اُنْظُرْ کے ارشاد سے مراد عبرت کی نظر سے دیکھنا ہے، پھر کہا گیا: کَذَبُوْا بمعنی یکذبون ہے، مستقبل کو ماضی سے تعبیر کیا گیا۔ اور آخرت میں ان کا جھوٹ بولنا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دہشت، حیرت اور ذہول کی حالت میں ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت میں ان سے جھوٹ واقع ہونا جائز نہیں، کیونکہ دنیا میں جو کچھ ہوا اس کا دار جزا ہے۔ اکثر اہل نظر کا یہی نظریہ ہے۔ یہ دنیا میں ہے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ کا معنی اس مفہوم پر یہ ہو گا کہ ہم اپنے خیال میں مشرک نہ تھے اور آخرت میں جھوٹ بولنے کے جواز پر وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ (النساء: 42) سے اعتراض وارد ہوتا ہے یہاں کوئی معارضہ اور تناقض نہیں ہے کیونکہ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا بعض مقامات پر ہو گا جب ان پر ان کی زبانیں، ہاتھ، پاؤں ان کے اعمال کے متعلق گواہی دیں گے اور اعضاء کی شہادت سے پہلے بعض مقامات پر وہ جھوٹ بولیں گے، جیسا پہلے گزر چکا ہے۔

سعید بن جبیر نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ وہ عذر پیش کریں گے اور حلف اٹھائیں گے۔ اسی طرح ابن نجیح اور قتادہ نے کہا ہے۔ مجاہد سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے علاوہ سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں اور لوگ آگ سے نکالے گئے ہیں تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ یعنی ہم نے جان لیا کہ پتھر نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان دیتے ہیں۔ یہ اگرچہ قول صحیح ہے، انہوں نے سچ بولا اور چھپایا نہیں لیکن ان کا عذر قبول نہ ہو گا، کیونکہ معاند کافر ہے اور غیر معذور ہے پھر ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ میں پانچ قراءتیں ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے یکن کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور فتنتهم کو یکن کی خبر کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا، یکن کا اسم ہے یعنی الا قولهم کے مفہوم میں ہے۔ یہ قراءت واضح ہے۔ اہل مدینہ اور ابو عمرو نے تکن تا کے ساتھ اور فتنتهم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا یعنی الا مقالتهم۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے ثم لم تکن کی بجائے وما کان فتنتهم الا ان قالوا پڑھا ہے۔ ابن عمر، عاصم نے حفص کی روایت سے اور اعمش سے مفضل کی روایت سے۔ حسن اور قتادہ وغیرہم نے ثم لم تکن کو تا کے ساتھ اور فتنتهم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اِلَّآ اَنْ قَالُوْا کو خبر بنایا ہے۔ یہ چار قراءتیں ہیں۔ اور پانچویں قراءت ثم لم یکن (یاء کے ساتھ) اور فتنتهم رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ فتنہ کو مذکر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ الفتون کے معنی میں ہے۔ اس کی مثال فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى (بقرہ: 275) یہاں بھی جاء فعل مذکر ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ فاعل موعظةٌ ہے۔ واللہ، واؤ قسم کے لیے ہے رَبِّنَا اسم جلالت کی صفت یا بدل ہے اور جنہوں نے رَبَّنَا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے وہ ندا کی بنا پر ہے یعنی یا ربنا۔ یہ عمدہ قراءت ہے، کیونکہ اس میں عجز اور تضرع کا مفہوم ہے مگر اس میں قسم اور جواب قسم کے درمیان منادیٰ کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ

الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

’’اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے اور اگر وہ دیکھ لیں ہر ایک نشانی بھی تو نہیں ایمان لائیں گے ان کے ساتھ یہاں تک کہ جب حاضر ہوں آپ کے پاس جھگڑتے ہوئے آپ سے (تو کہتے ہیں وہ لوگ) جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں یہ (قرآن) مگر جھوٹے قصے پہلے لوگوں کے‘‘۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ لفظ، من کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد کا صیغہ ذکر فرمایا مراد مشرکین، کفار مکہ ہیں۔ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً یعنی ہم نے انہیں ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے ایسا کیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سنتے اور سمجھتے نہیں لیکن جو وہ سنتے ہیں اس سے نفع حاصل نہیں کرتے اور وہ حق کی اطاعت نہیں کرتے تو وہ ایسے شخص کی مانند ہو گئے جو نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ اَكِنَّةً پردوں کو کہتے ہیں۔ یہ کنان کی جمع ہے جیسے الاسنۃ جمع ہے سنان کی اور الاعنۃ جمع عنان کی، کننت الشیٔ فی کنہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کسی چیز کو کسی شے میں محفوظ کرے اَکننت الشیٔ کا مطلب ہے میں نے اسے چھپا دیا۔ اور کنانہ ترکش کو کہتے ہیں۔ والکنۃ کاف اور نون کے فتحہ کے ساتھ۔ تیرے باپ کی بیوی، بیٹے یا بھائی کی بیوی کو بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کی حفاظت میں ہوتی ہے۔

اَنْ یَّفْقَهُوْهُ اس کا معنی ہے یفہموہ یعنی اس کو سمجھیں۔ یہ محل نصب میں ہے اس کا معنی ہے کراھیۃ ان یفھموہ یا اس کا معنی ہے لئلا یفقھوہ۔

وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا، وَقْرًا سے مراد بوجھ ہے۔ کہا جاتا ہے: وَقِرت أذنہ (1) واؤ کے فتحہ کے ساتھ تَوْقَرُ وَقْرًا یعنی اس کے کان بہرے ہو گئے۔ اس کے مصدر کا قیاس حرکت تھی لیکن یہ تسکین کے ساتھ آیا ہے۔ وقد وقر اللہ أذنہ یقرھا وقرا کہا جاتا ہے اللھم قِرْ أُذنہ۔ ابو زید نے عربوں سے حکایت کیا ہے أُذنٌ موقورۃ یعنی مجہول استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر وُقِرت واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہو گا۔ طلحہ بن مصرف نے وِقرا واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس نے ان کے کانوں میں ایسی چیز ڈال دی جس نے اسے سننے سے روک دیا۔ یہ وقر العیر سے تشبیہ کی بنا پر ہے اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کو اونٹ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ الوقر سے مراد الحمل ہے کہا جاتا ہے: نخلۃ مُوقِر و مُوقِرۃ جب کہ وہ کھجور بہت زیادہ پھل دار ہو۔ رجل ذُو قِرۃ جب وہ وقور (بفتح واو) والا ہو۔ کہا جاتا ہے: وَقُر الرجل (قاف کے ضمہ کے ساتھ) وقارا و وقر قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا اللہ تعالیٰ نے ان کے عناد کی خبر دی، کیونکہ انہوں نے چاند کو دو لخت ہوتے دیکھا تو کہنے لگے: یہ جادو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انہوں نے بغیر حجت کے آیات کا انکار کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ ان کا جھگڑا یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: تم وہ کھاتے ہو جو تم خود قتل کرتے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 279

ہو اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ قتل کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے یَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا سے مراد قریش ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قریش نے نضر بن حرث کو کہا: محمد کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا ہوں وہ پہلے لوگوں کے قصے بیان کرتا ہے جیسے میں تمہیں پہلے لوگوں کے واقعات بتاتا ہوں۔ نضر قصے اور واقعات بیان کرتا تھا اس نے عجم کے شہروں میں رستم اور اسفندیار کے قصے سنے تھے پھر انہیں وہ بیان کرتا تھا۔ اساطیر کا مفرد اسطار ہے جیسے ابیات کی جمع ابابیت ہے۔ زجاج سے مروی ہے اخفش نے کہا: اس کا مفرد اسطورۃ ہے جیسے احدوثۃ اور احادیث ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اس کا واحد اسطارۃ ہے۔ نحاس نے کہا: اس کا واحد اسطور ہے جیسے عثکول ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ اسطار کی جمع ہے اور اسطار، سطر کی جمع ہے سَطْر و سَطَر، السطر وہ چیز جو لمبی اور مؤلف ہو جیسے کتاب کی سطر۔ قشیری نے کہا: اس کا واحد اسطیر ہے۔ بعض نے کہا: یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے جیسے مذاکیر و عبادید، ابابیل وغیرہ، یعنی جس کو پہلے لوگ اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ جوہری وغیرہ نے کہا: الاساطیر سے مراد اباطیل اور الترہات ہیں۔

میں کہتا ہوں: میرے کسی شیخ نے کہا:

تطاول لیلی ؤ عترتنی وَساوِسی　لِآتٍ أَتَی بالتُرّهات الأباطیل

**وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝٢٦**

''اور وہ روکتے ہیں اس سے اور دور بھاگتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور وہ (اتنا بھی) نہیں سمجھتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ، النہی کا معنی روکنا ہے اور النای کا معنی دور کرنا ہے۔ یہ تمام کفار کو شامل ہے یعنی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے منع کرتے ہیں اور خود بھی دور بھاگتے ہیں۔

یہ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ابو طالب کے ساتھ خاص ہے، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے سے کفار کو منع کرتے تھے اور خود آپ پر ایمان لانے سے دور ہوتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اہل سیرت نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کعبہ کی طرف نکلے اور نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، جب نماز میں داخل ہوئے، ابو جہل لعنہ اللہ نے کہا: کون اس شخص کی طرف جائے گا اور اس کی نماز فاسد کر دے گا؟ ابن زبعری کھڑا ہوا، اس نے گوبر اور خون اٹھایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈال دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز چھوڑ کر واپس آ گئے، پھر آپ ابو طالب کے پاس گئے اور کہا: اے چچا جان! کیا آپ نے نہیں دیکھا جو میرے ساتھ کیا گیا؟ ابو طالب نے پوچھا: تمہارے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: عبد اللہ بن زبعری نے۔ ابو طالب اٹھے، تلوار اپنے کندھے پر رکھی اور آپ کے ساتھ چل پڑے حتیٰ کہ لوگوں کے پاس آئے، جب لوگوں نے ابو طالب کو آتا ہوا دیکھا تو اٹھنے لگے۔ ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! اگر کوئی شخص اٹھا تو میں اسے اپنی تلوار سے کاٹ کر رکھ دوں گا، وہ سب بیٹھ گئے حتیٰ کہ ابو طالب ان کے قریب آئے، پھر کہا بیٹا! تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبد اللہ بن زبعری نے۔ ابو طالب نے گوبر اور خون اٹھایا اور ان کے

چہروں، داڑھیوں اور کپڑوں پر مل دیا اور انہیں بہت برا کہا۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا جان! تمہارے متعلق ایک آیت اتری ہے۔ ابو طالب نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: تم قریش کو منع کرتے ہو کہ وہ مجھے اذیت دیں اور خود مجھ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہو۔ ابو طالب نے کہا:

واللهِ لن يَصلُوا إليكَ بجمعهم حتّى أُوسَّدَ في التُّراب دَفِينَا
فاصدَعْ بأمرِكَ ما عليكَ غَضاضةٌ وابشِرْ بذاكَ وقَرّ منكَ عُيونَا
ودَعوتَني وزعمتَ أنكَ ناصحِي فلقد صدقتَ و كنتَ قبلُ أمينا
وَ عَرَضتَ دِينًا قد عرفتُ بأنّه من خيرِ اديانِ البَرِيَّةِ دِينَا
لولا الملامةُ أو حِذارُ مَسَبَّةٍ لوجدْتَنِي سَمْحًا بذاكَ يَقِينا

لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا آپ کی ابو طالب نے جو مدد کی ہے وہ اسے نفع دے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اس سے اس وجہ سے بیڑیاں دور کی گئی ہیں اور انہیں شیاطین کے ساتھ جکڑا نہیں جائے گا اور انہیں سانپوں اور بچھوؤں والے کنویں میں نہیں ڈالا گیا ہے، اس کا عذاب یہ ہے ان کے پاؤں میں آگ کے جوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے سر میں ان کا دماغ ابل رہا ہے اور یہ دوزخیوں میں آسان ترین عذاب والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: 35)

صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے کہا: ''تم لا الہ الا اللہ پڑھو میں اس کی وجہ سے قیامت کے روز تمہارے لیے گواہی دوں گا'' (1)۔ انہوں نے کہا: اگر قریش مجھے یہ عار نہ دلاتے کہ جزع نے مجھے یہ پڑھنے پر مجبور کیا ہے تو میں اس کے ساتھ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرتا، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (القصص: 56)

یہ لفظ الجذع ہے جس کا معنی ضعف اور کمزوری ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخیوں میں کم ترین عذاب والا ابو طالب ہے، اسے آگ کے جوتے پہنائے گئے ہیں جن سے ان کا دماغ ابل رہا ہے'' (2)۔ رہا عبداللہ بن زبعری تو وہ فتح مکہ کے سال اسلام لایا تھا اور بہت عمدہ اسلام لایا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عذر پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عذر قبول کیا۔ وہ عمدہ شاعر تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا تھا اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بہت سے اشعار ہیں جو ان کے حالت کفر کے اشعار کو نسخ کرتے ہیں۔ اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں یہ اشعار کہے:

مَنَعَ الرُّقَادَ بَلَابِلٌ وهُمُومُ واللَّيلُ مُعْتَلِجُ الرِّوَاقِ بَهِيمُ
مِمّا أتانِي أنّ احمدَ لامَنِي فيهِ فبِتُّ كأنّنِي مَحْمُومُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 40
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 115

يا خيرَ من حملت على أوصالها ‌ ‌ عيرانةٌ سُرُحُ اليدينِ غشومُ
إني لمعتذرٌ إليك من الذي ‌ ‌ أسديت إذ انا في الضلال أهيمُ
أيامَ تأمرني بأغوى خطةٍ ‌ ‌ سهمٌ و تأمرني بها مخزومُ
وأمدُّ أسبابَ الردى ويقودني ‌ ‌ أمرُ الغواةِ وأمرهم مشؤومُ
فاليومَ آمنَ بالنبيِّ محمدٍ ‌ ‌ قلبي و مُخطئُ هذه محرومُ
مضتِ العداوةُ فانقضت أسبابُها ‌ ‌ وأتتْ أواصرُ بيننا وحلومُ
فاغفر فدىً لك والدايَ كلاهُما ‌ ‌ زللي فإنك راحمٌ مرحومُ
وعليك من سمةِ المليكِ علامةٌ ‌ ‌ نورٌ أغرُّ وخاتمٌ مختومُ
أعطاك بعد محبةٍ برهانَهُ ‌ ‌ شرفًا و برهانُ الإلهِ عظيمُ
ولقد شهدتُ بأنّ دينك صادقٌ ‌ ‌ حقًا وإنك في العباد جسيمُ
واللهُ يشهدُ أن أحمدَ مصطفىً ‌ ‌ مستقبلٌ في الصالحين كريمُ
قرمٌ علا بنيانُه من هاشمٍ ‌ ‌ فرعٌ تمكّن في الذرى وأرومُ

بعض علماء نے فرمایا: يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سنتے تھے، وہ قرآن سے روکتے تھے اور ان سے دور بھاگتے تھے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ پہلے دو قولوں کی بنا پر عنہ کی ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ کی ذات ہوگی اور قتادہ کے قول کی بنا پر ضمیر کا مرجع قرآن ہوگا۔ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ، ان نافیہ ہے یعنی وہ نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے نفسوں کو کفر پر اصرار کرنے کے ساتھ اور جن کو روکتے ہیں ان کے بوجھ اٹھانے کے ساتھ۔

**وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝**

''اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ پر تو کہیں گے: اے کاش! (کسی طرح) ہم لوٹا دیئے جائیں تو (پھر) نہیں جھٹلائیں گے اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہم ہو جائیں گے ایمانداروں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ یعنی کل جب کھڑے کیے جائیں گے، کیونکہ اذ کبھی اذا کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور کبھی اذا، اذ کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مستقبل کا امر گویا ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے، اسی وجہ سے ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ اور اِذْ وُقِفُوْا کا معنی ہے جب وہ روک لیے جائیں گے کہا جاتا ہے: وقفته وقفاً فوقف وقوفا۔ ابن السمیقع نے إذ وَقَفوا واو اور قاف کے فتحہ کے ساتھ وقوف سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

عَلَى النَّارِ یعنی وہ پل صراط کے اوپر ہوں گے اور آگ ان کے نیچے ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: علیٰ بمعنی با ہے یعنی جب وہ اس کے قریب ٹھہریں گے اور اسے دیکھیں گے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے جمعوا یعنی جب آگ کے دروازوں پر جمع

کیے جائیں گے کہا جاتا ہے: وہ جہنم کے پیٹھ پر روکے جائیں گے گویا وہ پگھلی ہوئی چربی کی پیٹھ ہے، پھر ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا (اے آگ!) اپنے ساتھی پکڑ لے اور میرے ساتھی چھوڑ دے۔ بعض علماء نے فرمایا: وقفوا کا معنی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں آگ سے بچائے) اس صورت میں علی بمعنی فی ہوگا یعنی وہ آگ میں داخل کیے جائیں گے۔ لو کا جواب محذوف ہے تاکہ ہر چیز کی طرف وہم جائے۔ یہ ڈرانے کے لیے زیادہ بلیغ ہے، معنی یہ ہے اگر آپ انہیں اس حالت میں دیکھیں گے تو بہت بری حالت میں دیکھیں گے یا بہت ہولناک منظر دیکھیں گے یا آپ بہت عجیب امر دیکھیں گے۔ اور اس تقدیر کی مثل کوئی اور تقدیر بھی ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

اہل مدینہ اور کسائی کی قرأت تینوں افعال پر رفع ہے۔ ابو عمرو، ابو بکر نے عاصم سے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن عامر نے نکذب پر رفع اور تکون پر نصب پڑھی ہے (1) یہ سب تمنی کے معنی میں داخل ہیں یعنی وہ تمنا کریں گے کہ انہوں نے نہ جھٹلایا ہوتا اور مومنین میں سے ہوتے۔ سیبویہ نے ولا نکذب کو علیحدہ کر کے پڑھا ہے اور اس کو تمنی کے تحت داخل نہیں کیا ہے معنی یہ ہے کہ ہم نہیں جھٹلائیں گے تکذیب کے ترک پر ثبات کے معنی کی بنا پر، یعنی ہم نہیں جھٹلائیں گے۔ ہم لوٹائے گئے یا نہ لوٹائے گئے۔ سیبویہ نے کہا: یہ اسی قول کی مثل ہے دعنی ولا اعود یعنی مجھے چھوڑ دو میں کسی حال میں نہیں لوٹوں گا آپ مجھے چھوڑیں یا نہ چھوڑیں (2)۔ ابو عمرو نے تمنی سے اس کے خروج پر اس آیت سے دلیل پکڑی ہے: وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۞ کبھی جھوٹ تمنی میں نہیں ہوتا یہ خبر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تمنی میں داخل کیا ہے ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں قیامت کے انکار اور اور رسولوں کی تکذیب میں جھوٹے ہیں۔ حمزہ اور حفص نے نکذب اور تکون کو تمنی کے جواب کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ یہ واجب نہیں ہے یہ دونوں تمنی میں داخل ہیں اس معنی پر کہ لوٹنے، تکذیب ترک کرنے اور مومنین سے ہونے کی تمنا کریں گے۔ ابو اسحاق نے کہا ولا نکذب کا معنی ہے اگر ہم لوٹائے گئے تو ہم نہیں جھٹلائیں گے نکذب اور نکون کی نصب ان کے اضمار کے ساتھ ہے جیسے استفہام، امر، نہی اور عرض کے جواب میں نصب دی جاتی ہے، کیونکہ یہ تمام واجب نہیں اور ابھی تک واقع نہیں ہوا۔ پس جواب کو واو کے ساتھ نصب دی جاتی ہے گویا پہلے فعل کے مصدر پر عطف کیا گیا ہے گویا انہوں نے کہا: یالیتنا یکون لنا رد و انتفاء من الکذب و کون من المومنین پس ان دونوں کو نرد کے مصدر پر محمول کیا گیا ہے رفع کی طرف معنی کی تبدیلی کی وجہ سے، پس اس میں ان کا اضمار ضروری ہے دونوں فعلوں میں نصب مکمل ہو گا۔ ابن عامر نے تمنی کے جواب کی بنا پر تکون پر نصب پڑھی ہے جیسے تیرا قول ہے: لیتك تصیر الینا نکرمك یعنی لیت مصیرك یقع و اکرامنا یقع پہلے دونوں فعلوں کو تمنی میں داخل کیا یا یہ ارادہ کیا کہ و نحن لا نکرمك علیحدہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابی نے ولا نکذب بِاٰیاتِ ربنا ابدا پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود سے يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ فَلَا نُكَذِّبَ فا اور نصب کے ساتھ بھی مروی ہے۔ فا کے ساتھ بھی جواب میں نصب دی جاتی ہے جس طرح واو کے ساتھ نصب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 281 2۔ ایضاً

دی جاتی ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ اور اکثر بصری علماء جواب میں نصب کو جائز قرار نہیں دیتے مگر فا کے ساتھ۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۲۸

''بلکہ عیاں ہو گیا ان پر جسے چھپایا کرتے تھے پہلے اور اگر انہیں بھیجا جائے (جیسے ان کی خواہش ہے) تو پھر بھی وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے اور بے شک وہ جھوٹے ہیں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ان کی تمنی اور ایمان کے دعویٰ سے اضراب ہے کہ اگر انہیں واپس بھیجا جائے۔

بَدَا لَهُمْ کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں اس تعیین کے بعد کہ مراد کون ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں، کیونکہ کفر کا اسم ان کو بھی شامل ہے پس ضمیر بعض مذکورین کی طرف راجع ہے۔ نحاس نے کہا: یہ انتہائی شیریں اور فصیح کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد کفار ہیں، انہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعظ کرتے تھے تو وہ ڈرتے تھے اور اس خوف کو چھپاتے تھے تا کہ ان کے ضعیف اور کمزور لوگ پہچان نہ لیں پس یہ قیامت کے روز ظاہر ہوگا(1)، اسی وجہ سے حسن نے کہا: بَدَا لَهُمْ بعض کے لیے ظاہر ہوا جو وہ بعض سے چھپاتے تھے۔ بعض نے فرمایا: بلکہ ظاہر ہوا ان کے لیے جو شرک سے انکار کرتے تھے۔ وہ کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝۲۳ پس الله تعالیٰ ان کے اعضاء کو بولنے کی طاقت بخشے گا اور وہ ان کے خلاف کفر کی گواہی دیں گے یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے پہلے جو چھپایا تھا وہ عیاں ہوگا۔ یہ ابوروق نے کہا ہے۔ اور بعض نے فرمایا: بَدَا لَهُمْ ان کے لیے عیاں ہوگا جو وہ کفر میں سے چھپاتے تھے یعنی ان کے برے اعمال ظاہر ہوں گے جیسا کہ فرمایا: وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ (الزمر)

مبرد نے کہا: ان کے کفر کی جزا ظاہر ہوگی جس کو وہ چھپاتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ظاہر ہوگا ان کے لیے جنہوں نے گمراہ لوگوں کی اتباع کی وہ جو گمراہ لوگ بعث اور قیامت کے امر سے چھپاتے تھے، کیونکہ اس کے بعد ہے وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۲۹ اور کہتے ہیں نہیں کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور ہم نہیں اٹھائے جائیں گے (قبروں سے)

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ رُدُّوْا بعض نے فرمایا: عذاب دیکھنے کے بعد۔ اور بعض نے فرمایا: عذاب دیکھنے سے پہلے اگر وہ واپس بھیجے گئے۔ لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ یعنی وہ اسی شرک وغیرہ کی طرف لوٹ جائیں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، ابلیس نے الله تعالیٰ کی آیات دیکھیں، پھر بھی ہٹ دھرمی کی۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۲۸ اس کے متعلق خبر دی ہے اور ان کی اس حالت کو بیان کیا ہے جس پر وہ دنیا میں تھے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرتے تھے اور دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے تھے جیسا کہ فرمایا: وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ (النحل: 124)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 282

اس کو آئندہ کی حالت سے حکایت کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جھوٹے ہیں اس میں جو انہوں نے اپنے بارے میں خبر دی کہ وہ تکذیب نہیں کریں گے مومن ہوں گے۔ یحییٰ بن وثاب نے ولو رِدُّوا را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اصل رُدِدُوا تھا دال کا کسرہ را کی طرف نقل کیا گیا۔

وَ قَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۲۹

''اور کہتے ہیں نہیں کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور ہم نہیں اٹھائیں جائیں گے (قبروں سے)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا یہ مبتدا خبر ہیں۔ ان نافیہ ہے اور نحن، ما کا اسم ہے اور بِمَبْعُوْثِيْنَ اس کی خبر ہے۔ یہ ان کے متعلق خبر دینے کی ابتدا ہے جو کچھ انہوں نے دنیا میں کہا تھا۔ ابن زید نے کہا: یہ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ کے تحت داخل ہے۔

اور انہوں نے کہا: نہیں ہے کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیوی زندگی کے، یعنی وہ کفر کی طرف لوٹ گئے اور دنیا کی لذت میں مشغول ہو گئے۔ یہ ہٹ دھری پر محمول ہوگا جیسا کہ ہم نے ابلیس کی حالت کے بارے میں بیان کیا ہے یا اس پر محمول ہوگا کہ اللہ تعالیٰ عرفان کے بعد ان پر ملتبس فرمادے گا۔ یہ عقلاً شائع اور عام ہے۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۰

''اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کیے جائیں گے اللہ کے حضور میں، اللہ فرمائے گا: کیا یہ (قبروں سے اٹھنا) حق نہیں؟ کہیں گے؟ بے شک (حق ہے) ہمارے رب کی قسم! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو اب چکھو عذاب بسبب اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ، وُقِفُوْا کا معنی ہے روکے جائیں گے۔ عَلٰى رَبِّهِمْ جو ان کے بارے میں اللہ کا حکم ہوگا اس پر۔ بعض علماء نے فرمایا: علی بمعنی عند ہے یعنی ملائکہ کے پاس اور جزا کے پاس اور جہاں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بادشاہی نہ ہوگی۔ تو کہتا ہے: وقفت علی فلان یعنی عندہ میں فلاں کے پاس ٹھہرا۔ لو کا جواب وقوف کی [illegible] کی بڑائی کے لیے حذف کیا گیا ہے۔ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ یہ تقریر اور توبیخ ہے یعنی کیا یہ دوبارہ اٹھنا حق نہیں؟ قَالُوْا بَلٰى وہ کہیں گے: کیوں نہیں؟ اپنے اعتراض کو قسم کے ساتھ مؤکد کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ انہیں اللہ کے حکم سے کہیں گے: کیا یہ دوبارہ اٹھنا اور عذاب حق نہیں ہے؟ پس وہ کہیں گے: بَلٰى وَ رَبِّنَا ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ حق ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَ هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۳۱

''بے شک خسارہ میں رہے وہ جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملاقات (کی خبر) کو یہاں تک کہ جب آگئی ان پر

قیامت، اچانک بولے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم سے ہوئی اس زندگی میں۔ اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ، لقاء اللہ سے مراد مرنے کے بعد اٹھنا ہے اور جزا ہے اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین كاذبة ليقطع بها مال امرء مسلم لقی الله وهو عليه غضبان (1) (یعنی جو جھوٹی قسم اٹھائے گا تا کہ اس کے ذریعے مسلمان آدمی کا مال لے لے وہ اللہ سے ملے گا جب کہ وہ اس پر ناراض ہو گا) اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کرے گا جب دیدار کرنے والے دیدار کریں گے۔ یہ قول قفال وغیرہ کا ہے۔ قشیری نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ لقا کو جزا پر اس جگہ محمول کیا جاتا ہے جہاں دلیل قائم ہو ہر جگہ یہ مفہوم ثابت نہیں ہوتا۔ پس لقا کو اس آیت میں ظاہر پر محمول کرنا چاہیے۔ کفار، صانع کا انکار کرتے ہیں روایت کا منکر وجود کا منکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قیامت کو ساعت کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں حساب بہت جلد ہوگا۔ بغتة کا معنی ہے اچانک۔ کہا جاتا ہے: بَغتهم الأمْرُ يَبْغتُهُم بَغْتًا بَغْتَةً یہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور سیبویہ کے نزدیک مصدر ہے (2) حال کی جگہ میں ہے جیسے تو کہتا ہے: قتلته صَبْرًا اور یہ شعر پڑھا:

فَلَأْيًا بِلَأْيٍ ما حَمَلْنا وَلِيدَنَا علی ظَهْرِ مَحْبوكٍ ظِمَاءٍ مَفَاصِلهُ

سیبویہ نے اس پر قیاس کرنے کو جائز قرار نہیں دیا یہ نہیں کہا جاتا: جاء فلان سرعةً۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا، حسرة پر ندا واقع ہوا ہے یہ حقیقت میں منادیٰ نہیں ہے، لیکن یہ حسرت کی کثرت پر دلالت کرتا ہے جیسے یا للعجب و یا للرخاء یہ حقیقت میں منادیٰ نہیں ہیں لیکن یہ کثرت تعجب اور رخا پر دلالت کرتا ہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا فرمایا: یا عجب تعال فهذا زمن إتيانك ہائے تعجب آ یہ تیرے آنے کا زمانہ ہے۔ اسی طرح تیرا قول ہے: یا حسرتی یعنی یا حسرتا تعالی فهذا وقتك یعنی اے حسرت! آ یہ تیرا آنے کا وقت ہے۔ اسی طرح جس میں ندا صحیح نہ ہو وہ اسی طرح جاری ہوگا یہ تیرے قول تعجب سے زیادہ بلیغ ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

فیا عجبًا من رَحْلِها المتحمَّلِ

بعض علماء نے فرمایا: یہ لوگوں کو اس بڑی حسرت پر تنبیہ ہے جو ان کو لاحق ہوگی یعنی اے لوگو! اس عظیم حسرت پر آگاہ رہو جو میری طرف سے ہوگی پس ندا حقیقت میں غیر منادی پر واقع ہے جیسے تیرا قول ہے: لا أرينك ههنا میں تجھے یہاں نہ دیکھوں پس نہی غیر منہی پر حقیقت میں واقع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا یعنی قیامت کے بارے میں اور اس کے اعمال پیش کرنے میں جو کوتاہی ہوئی۔ حسن سے مروی ہے: فَرَّطْنَا کا معنی ہے ہم نے ضائع کیا، اس کی اصل آگے بڑھنا ہے۔ کہا جاتا ہے فرط فلان یعنی وہ پانی کی طرف سب سے پہلے پہنچا، اسی سے حدیث ہے أنا فَرَطكم على الحوض (3) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ اسی سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 985 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 283 3۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1045

الفارط ہے پانی کے لیے آگے بڑھنے والا، اسی سے ہے: اللھم اجعله فرطا لابویه یہ بچے کے جنازہ میں دعا مانگی جاتی ہے، اے اللہ! اسے اپنے والدین کے لیے (جنت میں) پیش رو بنا۔ عربوں کا قول ہے فرطنا یعنی ہم نے عجز کو مقدم کیا۔ بعض علماء نے فرمایا فرطنا یعنی ہم نے دوسروں کو اللہ کی اطاعت کی طرف مقدم کر دیا اور ہم پیچھے رہ گئے۔ فیھا یعنی دنیا میں قیامت کے لیے عمل ترک کر کے کوتاہی کی۔ طبری نے کہا: ھا بیع کی طرف راجع ہے۔ یہ اس لیے کہ جب ان کے لیے ان کے سودا کا گھاٹا ظاہر ہوا جو انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا تھا اور آخرت کے بدلے دنیا کو ترجیح دی تھی تو انہوں نے کہا: **یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا** یعنی صفقه (سودا) میں کوتاہی کی اس پر افسوس۔ کلام کی چونکہ اس پر دلالت موجود تھی اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ گھاٹا نہیں ہوتا مگر بیع کے سودا میں اس کی دلیل **فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ** (بقرہ: 16) کا ارشاد ہے۔ سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے افسوس جو جنت کے موجب اعمال کو ہم نے ضائع کیا۔ خبر میں ہے حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: دوزخی لوگ جنت میں اپنے محلات دیکھیں گے تو کہیں گے: یا حسرتنا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ** اوزار سے مراد گناہ ہیں یہ وزر کی جمع ہے۔ **عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ** یہ بطور مجاز کہا گیا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا گیا ہے جو بوجھ اٹھاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: وَزَرَ یَزِرُ، وَزِرَ یُوْزَرُ فھو وازِرٌ و مَوْزُور اس کی اصل الوزر سے ہے جس کا مطلب پہاڑ ہے۔ اسی سے حدیث میں ان عورتوں کے بارے میں ہے جو جنازہ کے ساتھ نکلتی ہیں ارجعن مَوْزُوراتٍ غیرَ ماجوراتٍ(1) یعنی گناہ اٹھانے والیاں لوٹ جائیں جو اجر حاصل کرنے والی نہیں ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: عام لوگ کہتے ہیں مازورات گویا اس کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ یہ وزر سے ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: وہ شخص جو کپڑا بچھاتا ہے اور اس میں سامان رکھتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے: أحمل وزرك اپنا بوجھ اٹھا۔ اسی سے الوزیر ہے کیونکہ وہ امور مملکت جو اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں وہ ان کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اس کا معنی ہے انہیں گناہ لازم ہوئے اور وہ ان کی وجہ سے بھاری ہو گئے۔

اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ۝ یعنی بہت بری ہے وہ چیز جس کو وہ اٹھاتے ہیں۔

**وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۳۲**

''اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل اور تماشا اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لیے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں تو کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ**

دنیوی زندگی کو لہو اور تماشا اس کی مدت کے کم ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے جیسے شاعر نے کہا:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 114

أَلَا إِنَّمَا الدُّنْيَا كَأَحْلَامِ نَائِمٍ وَمَا خَيْرُ عَيْشٍ لَا يَكُونُ بِدَائِمٍ
تَأَمَّلْ إِذَا مَا نِلْتَ بِالْأَمْسِ لَذَّةً فَأَفْنَيْتَهَا هَلْ أَنْتَ إِلَّا كَحَالِمٍ

ایک اور شاعر نے کہا:

فَاعْمَلْ عَلَى مَهَلٍ فَأَنَّكَ مَيِّتٌ وَاكْدَحْ لِنَفْسِكَ أَيُّهَا الْإِنْسَانُ
فَكَأَنَّ مَا قَدْ كَانَ لَمْ يَكُ إِذْ مَضَى وَكَأَنَّ مَاهُوَ كَائِنٌ قَدْ كَانَا

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے دنیوی زندگی متاع لہو ولعب ہے یعنی وہ چیز جس کو وہ دنیا میں چاہتے ہیں اس کے لیے کوئی انجام نہیں وہ لہو ولعب کے قائم مقام ہے۔ سلیمان بن عبدالملک نے آئینہ دیکھا اور کہا: میں بادشاہ جوان ہوں۔ اس کی لونڈی نے اسے کہا:

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْكُنْتَ تَبْقَى غَيْرَ أَنْ لَا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ
لَيْسَ فِيمَا بَدَا لَنَا مِنْكَ عَيْبٌ كَانَ فِي النَّاسِ غَيْرَ أَنَّكَ فَانِي

اور بعض علماء نے کہا: لہو ولعب کا معنی باطل اور غرور ہے جیسا کہ فرمایا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (آل عمران) پس آیت سے مقصد کفار کا جھٹلانا ہے ان کے قول میں ہے: إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا۔ اللعب (کھیل) معروف ہے التلعابة بہت زیادہ کھیل۔ الملعب کھیل کی جگہ۔ کہا جاتا ہے: لعب یلعب، کھیلنا، اللہو بھی معروف ہے ہر وہ چیز جو تجھے مشغول کرے اس نے تجھے غافل کر دیا۔ لہوت، اللہو سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل کسی شے سے پھرنا ہے۔ یہ عربوں کے قول: لهيت عنه سے مشتق ہے۔ مہدوی نے کہا: اس میں بعد ہے، کیونکہ جس کا معنی پھرنا ہے اس کا لام کلمہ یا ہے اس کی دلیل لہیان ہے اور پہلا لام کلمہ واو ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ لہو ولعب سے وہ نہیں ہے جو امور آخرت سے ہے، کیونکہ لعب کی حقیقت وہ ہے جس سے نفع حاصل نہ ہو اور لہو وہ ہے جس کے ذریعے غفلت ہو اور جو کام آخرت کی غرض سے ہو وہ لہو ولعب سے خارج ہے۔ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے دنیا کی مذمت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دنیا اس شخص کے لیے دار الصدق ہے جو اس میں سچ کہتا ہے اور یہ دار نجات ہے اس شخص کے لیے جو اس کو سمجھ جاتا ہے اور یہ دار غنا ہے اس شخص کے لیے جو اس سے زاد راہ لیتا ہے۔ محمود وراق نے کہا:

لَا تُتْبِعِ الدُّنْيَا وَأَيَّامَهَا ذَمًّا وَإِنْ دَارَتْ بِكَ الدَّائِرَةُ
مِنْ شَرَفِ الدُّنْيَا وَمِنْ فَضْلِهَا أَنْ بِهَا تُسْتَدْرَكُ الْآخِرَةُ

ابو عمر بن عبد البر نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا ملعون ہے اور اس میں جو کچھ ہے وہ بھی ملعون ہے مگر جو اس میں اللہ کے ذکر سے ہے یا جو اللہ کے ذکر تک پہنچائے اور عالم اور معلم اجر میں دونوں شریک ہیں اور باقی تمام لوگ رذیل ہیں ان میں خیر نہیں ہے'' (1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56

ہے۔ انہوں نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرمایا: ”دنیا کی حقارت اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ نافرمانی نہیں کی جاتی مگر اس میں اور جو اللہ کے پاس ہے اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا مگر دنیا کو ترک کرنے کے ساتھ“۔

ترمذی نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر دنیا اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو وہ اس میں سے کسی کافر کو ایک پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتا“ (1)۔ شاعر نے کہا:

تَسَمَّعْ من الأیام إن کنتَ حازماً | فإنّك منها بین ناهٍ وآمرِ
إذا أبقتِ الدنیا علی المرء دِینه | فما فات من شیٔ فلیس لضائرِ
ولن تعدل الدنیا جناحَ بعوضةٍ | ولا وَزْن زِفٍّ من جناحٍ لطائرِ
فما رَضِیَ الدنیا ثوابا لمؤمنٍ | ولا رضی الدنیا جزاءً لکافرِ

حضرت ابن عباس نے فرمایا: لہو و لہب کافر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ دھوکے اور باطل کاموں میں ضائع کرتا ہے لیکن مومن کی زندگی اعمال صالحہ سے لبریز ہوتی ہے وہ لہو و لعب نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ اس سے مراد جنت ہے۔ خیر اس لیے ہے، کیونکہ یہ باقی ہے اور اس کو آخرت اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہم سے مؤخر ہے۔ اور دنیا کو دنیا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے قریب ہے۔

ابن عامر نے وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ یعنی ایک لام کے ساتھ پڑھا ہے اور اضافت مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے۔ تقدیر یہ ہے ولدار الحیاۃ الاخرۃ اور جمہور کی قرات پر وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ ہے۔

لام، لام ابتدائیہ ہے اور دار کو رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے اور الْاٰخِرَةُ اس کی صفت ہے اور خبر خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ ہے اس کی تائید تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ (القصص: 83) اور وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ (العنکبوت: 64) سے ہوتی ہے ان دونوں جملوں میں الآخرۃ، الدار کی صفت ہے۔

لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ یعنی شرک سے بچتے ہیں۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی کیا وہ نہیں جانتے کہ معاملہ اس طرح ہے تا کہ وہ دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے؟ واللہ اعلم۔

**قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ۝۳۳ وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤی اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ۝۳۴**

”(اے حبیب!) ہم جانتے ہیں کہ رنجیدہ کرتی ہے آپ کو وہ بات جو یہ کہہ رہے ہیں تو وہ نہیں جھٹلاتے آپ کو بلکہ یہ ظالم (دراصل) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اور بیشک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے تو انہوں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56

نے صبر کیا اس جھٹلائے جانے پر اور ستائے جانے پر یہاں تک کہ آ پہنچی انہیں ہماری مدد اور نہیں کوئی بدلنے والا اللہ کی باتوں کو اور آ ہی چکی ہیں آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ لام کے دخول کی وجہ سے ان کو کسرہ دیا گیا ہے۔ ابو میسرہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: اے محمد! اللہ کی قسم ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے، تو ہمارے نزدیک سچا ہے لیکن ہم اس کو جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی: فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا۔ يُكَذِّبُوْنَكَ کو مخفف اور مشدد دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ہم معنی ہیں جیسے حزنتہ اور احزنتہ ہم معنی ہیں۔ ابوعبید نے تخفیف کی قرات کو اختیار کیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے۔ ان سے مروی ہے کہ ابوجہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ اسے جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ۔

نحاس نے کہا: اس میں ابوعبید کی مخالفت کی گئی ہے اور لَا يُكَذِّبُوْنَكَ بھی مروی ہے اللہ تعالیٰ نے لَا يُكَذِّبُوْنَكَ نازل فرمایا اس کو یہ واقعہ تقویت دیتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس پر فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ تخفیف کے ساتھ پڑھا تو حضرت ابن عباس نے کہا فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کیونکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امین کہتے تھے اور يُكَذِّبُوْنَكَ کا معنی اہل لغت کے نزدیک یہ ہے کہ وہ آپ کو جھوٹ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو آپ کہتے ہیں اسے آپ پر لوٹاتے ہیں اور لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کا معنی ہے وہ آپ کو نہیں پاتے کہ آپ جھوٹ لاتے ہیں جیسے تو کہتا ہے: اکذبتہ میں نے اسے جھوٹا پایا۔ ابخلتہ میں نے اسے بخیل پایا، یعنی وہ آپ کو جھوٹا نہ پاتے اگر وہ آپ کے لائے ہوئے پیغام میں غور و فکر کرتے، یہ معنی بھی جائز ہے کہ وہ آپ پر ثابت نہیں کرتے کہ آپ جھوٹے ہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے: اکذبتہ جب تو اس پر حجت قائم کرے اور واضح کرے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور تشدید کی بنا پر معنی ہوگا کہ وہ آپ کو کسی حجت اور دلیل سے نہیں جھٹلاتے، اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ نحاس نے کہا: یہ قول ابوعبید کے مذہب میں ہے اس کا احتجاج لازم ہے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنہوں نے حدیث کو روایت کیا اور ان سے صحیح مروی ہے کہ انہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے اکذبت الرجل۔ جب تو خبر دے وہ جھوٹ لایا ہے اور اس نے جھوٹ روایت کیا ہے اور کذبتہ بولا جاتا ہے جب تو خبر دے کہ وہ جھوٹا ہے اسی طرح زجاج نے کہا ہے: کذبتہ جب تو کسی کو کہے کہ تو نے جھوٹ بولا۔ اکذبتہ جب تو ارادہ کرے کہ وہ جھوٹ لایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا یعنی تم بھی صبر کرو جس طرح انہوں نے صبر کیا۔ وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا اور وہ ستائے گئے حتیٰ کہ ہماری مدد آ پہنچی یعنی تیرے پاس وہ آئے گا جو تجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وہ اس نصرت کو ظاہر کرنے والا ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی دور نہیں کر سکتا اور اس کے فیصلہ کو کوئی توڑنے والا نہیں

اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا نہیں۔ اس کا ارشاد ہے: لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (الرعد) (ہر میعاد کے لیے نوشتہ ہے) اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر: 51) (بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی) وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ (الصافات) اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلہ: 21) (اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے) وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِي الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾، جَآءَكَ کا فاعل مضمر ہے معنی یہ ہے جاءك من نباء المرسلين نبأ۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

”اور اگر گراں ہے آپ پر ان کا (حق سے) روگردانی کرنا تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ) پھر لے آؤ ان کے پاس کوئی معجزہ (تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے)۔ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو جمع کر دیتا انہیں ہدایت پر، تو آپ نہ ہو جائیں ان سے جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ یعنی اگر تم پر ایمان سے ان کا اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا گراں ہے فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اگر طاقت رکھتے ہیں۔ اَنْ تَبْتَغِيَ کہ تلاش کر لیں۔ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ زمین میں سرنگ تا کہ تو اس جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے۔ اس سے النافقاء جو جنگلی چوہے کی بل ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اسی سے المنافق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اَوْ سُلَّمًا یہ نفقاً پر معطوف ہے یعنی آسمان کی طرف سیڑھی، یہ تمثیل ہے کیونکہ السلم کی کیونکہ سیڑھی ہوتی ہے جس پر چڑھا جاتا ہے وہ دوسری جگہ پہنچنے کا سبب ہوتی ہے۔ اور وہ مذکر ہے اور فراء نے سلم کی تانیث حکایت کی ہے وہ معروف نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: السلم سے مراد سیڑھی ہے۔ زجاج نے کہا: یہ السلامۃ سے مشتق ہے گویا وہ تجھے وہاں پہنچاتا ہے جہاں آپ چاہتے ہیں۔ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ اس کا سابقہ کلام پر عطف کیا گیا یعنی تا کہ وہ ایمان لے آئیں تو ایسا کرو۔ جواب حذف کیا گیا ہے، کیونکہ سامع کو علم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ ان پر زیادہ غم نہ کھائیں، کیونکہ یہ ایمان نہیں لائیں گے جیسا کہ وہ ان کی ہدایت کی طاقت نہیں رکھتے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو مومن پیدا فرماتا اور ان کو ہدایت پر پابند کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان کا کفر اللہ کی مشیت سے ہے۔ یہ قدریہ پر رد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں کوئی ایسی نشانی دکھاتا جو انہیں ایمان کی طرف مجبور کرتی لیکن اس نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے وہ اسے ثواب عطا کرے گا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غم زیادہ کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ انہیں

اس چیز نے شدید جزع فزع کی طرف اور غیر حلال چیز کی طرف نکالا، یعنی آپ ان کے کفر پر غمگین نہ ہوں کہ آپ حقیقت کو نہ جاننے والوں کی حالت کے قریب ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے دل ان کے کفر اور اذیت سے تنگ ہوتے ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور ان مردہ (دلوں) کو اٹھائے گا اللہ تعالیٰ پھر، وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور بولے: کیوں نہیں اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے؟ آپ فرمایئے: بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اتارے کوئی نشانی لیکن اکثر ان میں سے کچھ نہیں جانتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ یعنی جو غور سے سنتے اور سمجھتے ہیں اور حق کا ارادہ سنتے ہیں یہ وہ مومنین ہیں جو قبول کرتے ہیں اسے جو سنتے ہیں اور اس سے نفع حاصل کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ یہ معنی حسن اور مجاہد نے بیان کیا ہے۔ کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ اس سے مراد کفار ہیں۔ یہ حسن اور مجاہد سے مروی ہے یعنی وہ مردوں کے قائم مقام ہیں، کیونکہ وہ نہ حجت کو قبول کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف غور کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الموتی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو مر چکا ہے۔ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو حساب کے لیے اٹھائے گا۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ انہیں اللہ اور رسول پر ایمان کی ہدایت دے گا۔ حسن سے مروی ہے وہ انہیں شرک سے نکالے گا حتیٰ کہ وہ اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ پر ایمان لائیں گے یعنی موت کے وقت، دنیا میں مجبوری کی حالت میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حسن نے کہا: یہاں لولا بمعنی ھلا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَعدُّون عَقْرَ النِّيبِ أفضل مَجْدِكم　　بَنِى ضَوْطَرَى لولا الكَمِىَّ المُقَنَّعَا

تو مشرکوں کا یہ قول دلائل کے ظاہر ہونے کے بعد ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا، کیونکہ قرآن کے ذریعے حجت قائم کی گئی تھی جس کا مثل پیش کرنے سے وہ عاجز آ گئے تھے، کیونکہ قرآن کی جو فصاحت اور غیوب کا علم ہے (وہ کسی بشر کے پاس نہیں)

وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جو آیات نازل فرماتا ہے ان میں بندوں کی مصلحت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکلیں گے جو اس پر ایمان لائیں گے اور اس نے ان کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اس کے انزال پر قادر ہے۔ زجاج نے کہا: انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ انہیں ہدایت پر جمع کر دے، یعنی مجبور کر کے جمع کر دے۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي

الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝

''اور نہیں کوئی (جانور) چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے مگر وہ امتیں ہیں تمہاری مانند۔ نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو، پھر اپنے رب کی طرف اٹھائے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ دابة کا معنی اور تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ دب یدب فھو داب ہے جس کا معنی ہے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلنا۔ وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ، طائر جر کے ساتھ ہے لفظ پر عطف کیا گیا ہے۔

حسن اور عبد اللہ بن ابی اسحاق نے ولا طائرٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے مقام پر عطف کی بنا پر ایسا پڑھا ہے۔ من زائدة ہے تقدیر و ما دابةٌ ہے، بجناحیه تاکید ہے اور ابہام کے ازالہ کے لیے ہے، کیونکہ عرب طیران کو پرندے کے علاوہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں تو کسی شخص کو کہتا ہے طِر فی حاجتی یعنی تو میری حاجت کے لیے جلدی کر۔ بجناحیه ذکر فرمایا تاکہ قول پرندے کے لیے خاص ہو جائے اور طیران کا لفظ دوسروں کے لیے مجاز ہے۔ بعض نے فرمایا: پرندے کے جسم کا اعتدال دونوں پروں کے درمیان اس کی اڑنے میں مدد کرتا ہے اگر وہ غیر معتدل ہوتا تو وہ ایک طرف جھک جاتا پس اس نے ہمیں بتایا کہ پروں کے ساتھ پرندوں کا اڑنا ہے۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (النحل: 79) جناح پرندے کی اس طرف کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے اس کی اصل کسی جانب مائل ہونا ہے اسی سے جنحت السفينة ہے جب کشتی زمین کی طرف جھک جائے اس کے ساتھ لگ کر رک جائے طائر الانسان سے مراد انسان کا عمل ہے قرآن حکیم میں ہے وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (الاسراء: 13) اور ہر انسان کی قسمت کا نوشتہ اس کے گلہ میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔

اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ یعنی وہ تمہاری مثل جماعت ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ان کے رزق کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائی ہے اور ان میں عدل قائم کیا ہے پس تم ان پر ظلم نہ کرو اور ان کے بارے میں جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اس میں تجاوز نہ کرو۔ دابة یہ لفظ تمام مَادَب پر بھی واقع ہوتا ہے جو چیزیں زمین میں ہیں ان کا خاص ذکر کیا ہے آسمان کی چیزوں کا ذکر نہیں کیونکہ وہ زمین کی چیزوں کو جانتے تھے اور ان کا مشاہدہ کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تسبیح اور دلالت میں ہماری مثل ہیں اس کا معنی ہے کوئی جانور اور پرندہ نہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے اور اس کی وحدانیت پہ دلالت کرتا ہے اگر کفار غور کریں۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: یہ اس معنی پر ہماری مثل ہے کہ جانور بھی کل اٹھائے جائیں گے۔ سینگوں والے سے بغیر سینگوں والے جانور کے لیے قصاص لیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: مٹی ہو جا۔ یہ زجاج کا اختیار ہے اس نے کہا: اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ تخلیق، رزق، موت، بعث اور قصاص میں تمہاری مثل ہیں، اس میں پہلے قول کا معنی بھی داخل ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: جانوروں اور پرندوں کی ہر صنف میں انسانوں میں مشابہت ہے، بعض لوگ شیر کی طرح دوڑتے ہیں، بعض خنزیر کی طرح حریص ہوتے ہیں، بعض کتے کی طرح غراتے ہیں، بعض مور کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں یہ مماثلت کا معنی ہے۔ خطابی نے اس کو عمدہ کہا ہے انہوں نے کہا: تو بہائم اور سباع کے ساتھ رہتا ہے

پس ان سے احتیاط حاصل کر۔ مجاہد نے کہا: اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ان کی اصناف کے نام سے ہے جن کے ساتھ یہ پہچانے جاتے ہیں جس طرح تم پہچانے جاتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو صحیح نہیں ہیں، مثلاً وہ معرفت میں ہماری مثل ہیں وہ قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے اور جنت میں نعمتیں دیئے جائیں گے اور دنیا میں جو تکالیف ان پر آئیں ان کا عوض دیا جائے گا اور اہل جنت ان کی شکلوں کو دیکھ کر مانوس ہوں گے۔ صحیح قول یہی ہے کہ وہ ہماری طرح مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر دال ہیں، اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں، اس کی طرف سے انہیں رزق دیا جاتا ہے جس طرح تمہارا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔

سفیان کا قول عمدہ ہے، کیونکہ یہ تشبیہ ہے جو وجود میں واقع ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ، الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے جو واقعات ہوتے ہیں سب اس میں رقم فرمائے ہیں۔ بعض نے فرمایا: الکتاب سے مراد قرآن ہے یعنی ہم نے امر دین میں سے کسی چیز کو ترک نہیں کیا مگر ہم نے قرآن میں اس پر دلالت کی ہے یا تو واضح دلالت سے یا مجمل دلالت سے جس کا بیان رسول اللہ ﷺ سے یا اجماع سے یا قیاس سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ قیاس جو نص الکتاب سے ثابت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: 89) اور فرمایا وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا۔ اور فرمایا: اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لیے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف۔ فرمایا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

اس آیت میں اور سورۃ النحل کی آیت میں اجمالی طور پر اسے بیان فرمایا جس پر نص قائم نہ تھی اور جس کا ذکر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ قرآن میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا مگر اسے بیان فرمایا خواہ تفصیلاً خواہ اصلاً اور فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ: 3) آج مکمل کر دیا میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ۝ یعنی جزا کے لیے اٹھائے جائیں گے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں گزرا ہے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز حقوق والوں کو حقوق ادا کیے جائیں گے حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے بغیر سینگوں والی بکری کے لیے قصاص لیا جائے گا''۔ یہ دلیل ہے کہ جانوروں کو بھی قیامت کے روز اٹھایا جائے گا۔ یہ حضرت ابوذر، حضرت ابو ہریرہ اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حضرت ابن عباس نے ایک روایت میں فرمایا: جانوروں اور پرندوں کا حشر ان کا مرنا ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ پہلا قول اصح ہے آیت کا ظاہر اور خبر صحیح اس کی تائید کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۝ (التکویر) اور حضرت ابو ہریرہ کا قول جعفر بن برقان نے یزید بن اصم کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو اٹھائے گا جانور، حیوان، پرندے اور ہر چیز کو اٹھائے گا، اس دن اللہ تعالیٰ کے عدل سے سینگوں والی بکری سے بغیر سینگوں والی بکری سے قصاص لیا جائے گا۔ پھر فرمائے گا: تو مٹی ہو جا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَقُولُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (النباء) اور کافر (بصد حسرت) کہے گا: کاش میں خاک ہوتا۔ عطاء نے کہا: جب جانور بنی آدم کو اور ان کی گھبراہٹ کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے ہمیں تمہاری مثل تو نہیں بنایا، ہم نہ تو جنت کے امیدوار ہیں اور نہ دوزخ کا خوف ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا: مٹی ہو جاؤ۔ اس وقت کافر خواہش کرے گا کہ وہ مٹی بن جائے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ حشر جو آیت میں ہے وہ کفار کی طرف راجع ہے اور جو درمیان میں ہے وہ کلام معترض ہے اور دلائل کا قیام ہے۔ رہی حدیث تو اس سے مقصود حساب، قصاص کی تعظیم کی جہت پر تمثیل ہے اور اس میں اعتناء کی عظمت کے اعتبار سے تمثیل ہے تا کہ اس سے سمجھا جائے کہ ہر ایک سے حساب ہوگا اس سے کسی کے لیے بھاگنا نہیں ہے اور انہوں نے اس کو ایک اور حدیث سے تائید دی ہے جو صحیح میں نہیں ہے، بعض روات سے زیادتی مروی ہے فرمایا: حتیٰ کہ بغیر سینگوں والی بکری کے لیے سینگوں والی بکری سے قصاص لیا جائے گا اور اس پتھر کے لیے قصاص لیا جائے گا جسے دوسرا پتھر لگا ہوگا اور اس لکڑی کے لیے قصاص لیا جائے گا جس کو دوسری لکڑی نے خراش دی ہوگی۔ ان علماء نے کہا: پس ظاہر ہوا کہ اس سے مقصود وہ تمثیل ہے جو عبرت اور خوف دلانے کے لیے مفید ہے، کیونکہ جمادات کو خطاب ثواب اور عقاب معقول نہیں اور کوئی بھی شعور والا یہ نظریہ نہیں رکھتا، یہ بے وقوف لوگوں کا ہی تصور ہو سکتا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: قلم ان پر جاری نہیں ہوتا پس ان سے مؤاخذہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے اگرچہ احکام میں ان پر قلم جاری نہیں ہوتا لیکن جو ان کے درمیان ہوا اس کا ان سے مواخذہ ہوگا۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو بکریوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! کیا تو جانتا ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے ہیں؟'' میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا'' یہ نص ہے مزید بیان ہماری کتاب التذکرۃ باحوال الموتی وامور الآخرۃ میں موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاۗءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو (تو وہ) بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں (سرگرداں ہیں) جسے چاہے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اسے اور جسے چاہے لگا دے اسے سیدھے راستے پر۔ آپ فرمایئے: بھلا بتاؤ تو اگر آ جائے تم پر اللہ عذاب یا آ جائے تم پر قیامت کیا اس وقت اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ بتاؤ؟ اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اسی کو پکارو گے تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لیے اگر وہ چاہے گا اور تم بھلا دو گے انہیں

جنہیں تم نے شریک بنا رکھا تھا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكۡمٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں یعنی انہوں نے قوت سماعت اور قوت بصارت سے نفع نہ اٹھایا جانوروں میں سے ہر امت اپنے مصوں کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور کفار ہدایت نہیں پاتے یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ فِی الظُّلُمٰتِ یعنی کفر کی تاریکیاں۔ ابوعلی نے کہا: اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آخرت میں گونگے اور بہرے ہوں گے اس صورت میں حقیقی معنی ہوگا، مجازی معنی نہ ہوگا۔ مَنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضۡلِلۡهُ یہ دلیل ہے کہ اس نے کافر کی گمراہی کو چاہا اور اس نے ارادہ کیا کہ اس میں اس کا عدل نافذ ہو کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اس نے فرمایا: وَ مَنۡ يَّشَاۡ يَجۡعَلۡهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ یعنی جسے چاہے دین اسلام پر اسے لگا دے، تاکہ اس میں اس کا فضل نافذ ہو۔ اس میں قدریہ کے مذہب کا ابطال ہے۔ مشیت ان لوگوں کی طرف راجع ہے جنہوں نے تکذیب کی۔ ان میں سے کچھ کو گمراہ کرتا ہے اور کچھ کو ہدایت دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ نافع نے دونوں ہمزوں کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے پہلے ہمزہ کی حرکت کو پہلے ہمزہ پر ڈالا ہے اور دوسرے کو بین بین پڑھا ہے۔ ابوعبید نے نافع سے حکایت کی ہے کہ وہ ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں اور ان کے عوض الف لگاتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ اہل عرب کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ یا ساکنہ ہے اور الف ساکنہ ہے اور دو ساکن جمع نہیں ہوتے۔ مکی نے کہا: ورش سے مروی ہے کہ انہوں نے ہمزہ کو الف سے بدلا، کیونکہ ان سے روایت ہے کہ وہ دوسرے ہمزہ میں مد کرتے ہیں اور مد نہیں ہوتا مگر بدل کے ساتھ بدل، اصل کی فرع ہے اور اصل یہ ہے کہ ہمزہ، ہمزہ مفتوحہ اور الف کے درمیان ہے۔ ورش کے علاوہ یہ ان کا نظریہ ہے جو دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرتے ہیں۔ ہمزہ میں بدل کا جواز بہتر ہے اس کے بعد ساکن ہے، کیونکہ پہلا حرف مد و لین ہے، مد وہ جو ساکن کے ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ اس حرکت کے قائم مقام ہوتا ہے جس کے ساتھ دوسرے ساکن کے ساتھ بولنا ممکن ہوتا ہے۔

ابوعمرو، عاصم، حمزہ نے اَرَءَيۡتَكُمۡ دونوں ہمزوں کی تحقیق کے ساتھ پڑھا اور انہوں نے کلمہ کو اپنی اصل پر پڑھا ہے۔ اصل ہمزہ ہے، کیونکہ ہمزہ استفہام رایت پر داخل ہوا پس ہمزہ فعل کا عین کلمہ ہے اور یاء ساکن ہے، کیونکہ اس کے ساتھ ضمیر مرفوع متصل ہے۔

عیسیٰ بن عمر اور کسائی نے اریتکم دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عربی قواعد سے بعید ہے۔ شعر میں جائز ہے عرب کہتے ہیں: ارائیتك زیدا ما شأنه۔ بصریوں کا مذہب یہ ہے کہ حذف اور میم خطاب کے لیے ہے ان کا ترکیب میں کوئی محل نہیں۔ یہ زجاج کا مختار قول ہے۔ اور کسائی اور فراء وغیرہ کا مذہب یہ ہے ان کو نصب، رؤیت کے وقوع کی وجہ سے ہے۔ معنی ہے: أرأیتم أنفسکم جب خطاب کے لیے ہوں گے تو تاکید کے لیے زائدہ ہوں گے اور ان اتاکم میں ان محل نصب میں ہوگا۔ کیونکہ رایتکا مفعول ہوگا اور اگر کم ضمیر اسم ہوگی تو محل نصب میں ہوگی ان دوسرے مفعول کی جگہ ہوگا پس پہلی صورت میں رویت عین سے ہوگا، کیونکہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور بمعنی علم ہوگا تو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور اَوۡ اَتَتۡكُمُ السَّاعَةُ یا تمہارے پاس وہ وقت آ جائے جس میں تم اٹھائے جاؤ گے پھر فرمایا: اَغَيۡرَ اللّٰهِ

تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ یہ آیت ان مشرکین کے خلاف حجت قائم کرنے کے لیے ہے جو اعتراف کرتے تھے کہ اس کا صانع ہے یعنی تم تکالیف میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہو اور قیامت کے روز بھی تم اس کی طرف لوٹو گے پس تم خوشحالی میں شرک پر کیوں اصرار کرتے ہو، وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے اور عذاب ٹالنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ بل پہلی کلام سے اضراب ہے اور دوسرے کے لیے ایجاب ہے۔ اِیَّاهُ، تَدْعُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے۔ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ یعنی وہ اس تکلیف کو دور کردے گا جس کو دور کرنے کے لیے تم اسے پکارتے ہو اگر وہ چاہے گا۔ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ بعض علماء نے فرمایا: یہ عذاب کے نزول کے وقت ہو گا یعنی اس وقت وہ انہیں بھول جائیں گے جنہیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حسن نے کہا: تم اس طرح اعراض کرو گے جس طرح بھولنے والا اعراض کرتا ہے یہ اس کی طرف سے نجات سے مایوسی کے وقت ہو گا، کیونکہ اس میں نہ ضرر کی طاقت ہے، نہ نفع کی قوت ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی تتر کون ہو یعنی تم چھوڑ دو گے۔ نحاس نے کہا: اس کی مثل یہ ارشاد ہے:۔ وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ (طٰہٰ: 115) اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ۝

''اور بے شک بھیجے ہم نے رسول امتوں کی طرف آپ سے پہلے (جب انہوں نے سرکشی کی) تو ہم نے پکڑ لیا انہیں سختی اور تکلیف سے تاکہ وہ گڑگڑائیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے لیے بطور تسلی ہے اس میں اضمار ہے یعنی اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ رسلا اور اس میں دوسرا اضمار بھی ہے جس پر ظاہر دلالت کرتا ہے اس کی تقدیر یہ ہے فکذبوا فاخذناهم یہ آیت ماقبل سے متصل ہے جس طرح ایک حالت اپنی سے قریب حالت سے متصل ہوتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے نبی کی مخالفت کرنے میں پہلے لوگوں کے مسلک پر چلے جنہوں نے اپنے انبیاء کی مخالفت کی تھی پس یہ اس مصیبت اور بلا میں گرفتاری کے مقام پر ہیں جو ان سے پہلے لوگوں پر نازل ہوئی۔ بِالْبَاْسَآءِ کا معنی اموال میں مصائب وَ الضَّرَّآءِ بدنوں میں مصیبت۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصائب، تکالیف اور دوسرے ذرائع سے جو چاہتا ہے، تربیت فرماتا ہے لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (الانبیاء: 23)

ابن عطیہ نے کہا: عبادت گزار (صوفیاء) اپنے نفسوں کو اموال کی تفریق کر کے اور جسموں پر بھوک اور بغیر لباس کے رہ کر مشقت برداشت کر کے نفسوں کی تربیت کا استدلال کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ اس کی جہالت ہے جو ایسا کرتا ہے اور جس نے اس آیت کو اس کی اصل بنایا ہے یہ اس شخص کے لیے اللہ کی طرف سے عقوبت ہے جن کو وہ ان کے ساتھ امتحان میں مبتلا کرنا چاہے، ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اپنے نفسوں کو خود امتحان میں ڈالیں اور اس پر قیاس کرتے ہوئے تکلیف برداشت کریں، کیونکہ نفس سواری ہیں جس پر سوار ہو کر دار الکرامۃ تک پہنچنا ہے اور ان کے ذریعے قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے نجات پانا ہے قرآن حکیم میں ہے یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (المومنون: 51) اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو۔

اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (بقرہ: 267) اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (بقرہ: 172) اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس چیز کا حکم دیا جس کے ساتھ مرسلین کو خطاب کیا، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پاکیزہ چیزیں کھاتے تھے اور خوبصورت لباس پہنتے تھے اور ان سے زینت حاصل کرتے تھے، اسی طرح تابعین کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے اور سورۂ اعراف میں لباس وغیرہ کا حکم آئے گا۔ اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح یہ کہتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ زروع، جنات، پھل، نباتات اور جانور جن کو مسخر فرمایا اور جن کو ہمارے لیے کھانا حلال کیا اور جن کے دودھ استعمال کرنے اور ان کی کھال سے گرمی حاصل کرنے کو بطور احسان ذکر نہ فرماتا۔ اگر ان کا نظریہ درست ہوتا اور اس میں فضیلت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین و علماء اس پر زیادہ عمل کرتے۔ سورۂ بقرہ میں مال کی فضیلت، منفعت اور جو اس کو جمع کرنے کا انکار کرتا ہے اس کا رد گزر چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جسموں پر کمزوری کے خوف سے صوم وصال سے نہی فرمائی اور مال کو ضائع کرنے سے نہی فرمائی، جاہل اغنیاء کا رد کرتے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ۝ وہ پکاریں اور اپنے عجز کا اظہار کریں۔ یہ الضراعۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ذلت ہے، کہا جاتا ہے: ضرع فھو ضارع۔

فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

"تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب آیا ان پر عذاب تو وہ (توبہ کرتے اور) گڑگڑاتے لیکن سخت ہو گئے ان کے دل اور آراستہ کر دیا ان کے لیے شیطان نے جو وہ کیا کرتے تھے۔ پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی

گئی تھیں کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کے جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک، اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے، تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہان والوں کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا، لولا یہ تحضیض کے لیے ہے یہ وہ ہوتا ہے جو فعل کے ساتھ ملا ہوتا ہے بمعنی ھلا ہوتا ہے، یہ دعا کے ترک پر عتاب ہے اور ان کے متعلق خبر ہے کہ عذاب کے نزول کے وقت انہوں نے دعا نہیں کی۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہوں نے دعا کی ہو لیکن غیر مخلص کی طرح کی ہو یا اس وقت دعا کی ہو جب عذاب نازل ہو چکا ہو۔ اور ان تمام صورتوں میں دعا غیر نافع ہے۔ دعا کا حکم حالت خوشحالی اور شدت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

اور فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ (غافر) بے شک جو لوگ عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔

یہ سخت وعید ہے۔ وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی ان کے دل سخت ہو گئے، یہ کفر اور معصیت پر اصرار سے عبارت ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے ہیں۔ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ یعنی شیطان نے انہیں گناہوں کے ذریعے اغوا کیا اور گناہوں پر برانگیختہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کہا جاتا ہے: ان کی نسیان پر کیوں مذمت کی گئی جب کہ یہ ان کے فعل سے نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نسوا معنی ترکوا ہے یعنی انہوں نے جب ترک کر دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور ابن جریج سے مروی ہے اور یہی ابو علی کا قول ہے جو شخص کسی شے سے اعراض کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس شخص کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو بھول چکا ہو جیسے کہا جاتا ہے: ترکہ فی النسی۔ اس نے اسے بالکل بھلا دیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو نسیان کے لیے پیش کیا اس لیے مذمت جائز ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی سزا کے موجب کاموں پر مذمت جائز ہے۔

فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ یعنی نعمتیں اور خیرات کے دروازے کھول دیئے یعنی ہم نے نعمتوں کی کثرت کر دی۔ اہل عرب کے نزدیک اس کی تقدیر یہ ہے کہ ہر دروازہ جو بند تھا وہ ان پر کھول دیا۔

حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا حتیٰ کہ جب وہ اکڑے اور خوش ہوئے اور یہ گمان کرنے لگے یہ نعمتیں اور مال ہمیشہ رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے۔ اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ہم نے انہیں اچانک جڑ سے اکھیڑ دیا اور ہم ان پر غالب آ گئے۔ بَغْتَةً کا معنی اچانک ہے یعنی کسی نشان کے بغیر غفلت پر پکڑ لینا۔ جب کوئی غافل ہو اور اسے پکڑا جائے تو کہتے ہیں: فقد اخذ بغتة کسی کو اچانک حملہ کر کے قتل کرنا۔ یہ البغت سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تذکیر (نصیحت) جو پہلے گزر چکی ہے، اس سے انہوں نے اعراض کیا۔ اس کو علامت کے قائم مقام رکھا ہے واللہ اعلم۔

بَغْتَةً حال کی جگہ میں مصدر ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے جیسے فرمایا: وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (القلم) میں انہیں مہلت دوں گا میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی ناراضگی اور خفیہ تدبیر سے پناہ مانگتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے اس آیت میں غور کیا حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً۔ محمد بن نضر حارثی نے فرمایا: اس قوم کو بیس سال مہلت دی گئی۔ حضرت عقبہ بن عامر نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو گناہوں کے باوجود انہیں وہ عطا کر رہا ہے جو وہ چاہتے ہیں تو وہ اس کی طرف ان کے لیے استدراج ہے، پھر یہ آیت پڑھی: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ حسن نے کہا: اللہ کی قسم! لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں اللہ نے اس کے لیے دنیا میں کشادگی کی ہو اور وہ نہ ڈرے کہ ہو سکتا ہے اس سے تدبیر کی گئی ہو مگر اس کا عمل کم ہوا اور اس کی رائے عاجز ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بندے سے جو روک لیا اور اس نے گمان نہ کیا وہ اس کے لیے بہتر ہے مگر اس کا عمل کم ہوا اور اس کی رائے عاجز ہوئی خبر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: جب تم فقر کو اپنی طرف آتا دیکھو تو نیک لوگوں کے شعار کو مرحبا کہو اور جب تم غنی کو اپنی طرف آتا دیکھو تو کہو: گناہ جس کی سزا جلدی دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ المبلس مبہوت، غمگین اور خیر سے مایوس آدمی کو کہتے ہیں جو مایوسی بند نہیں ہوتی۔ یہ اس شدت کا جواب ہے جو ان پر نازل ہوئی۔ زجاج نے کہا:

یا صاحِ هل تعرفُ رَسْمًا مُكْرَسَا ۔۔۔ قال نَعَمْ أعرِفُه وأَبْلَسَا

یعنی اس نے جو دیکھا اس کی ہولناکی کی وجہ سے حیران ہوا۔ اس سے ابلیس کا اسم مشتق ہوا۔ ابلس الرجل یعنی آدمی خاموش ہوا۔ ابلست الناقة وهي مبلاس اونٹنی جب نر کی خواہش میں نہ بولے۔ ضَبِعَتِ الناقةُ تَضْبَعُ ضَبَعَةً وضَبْعًا جب اونٹنی نر کو چاہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، الدابر کا معنی ہے آخر۔ کہا جاتا ہے: دَبَرَ القومَ يَدْبُرُهم دَبْرًا جو سب سے آخر میں آنے والا ہو۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے من الناس من لا یاتی الصلاۃ الا دبریا (1) یعنی لوگوں میں سے جو نماز میں آخری وقت پر آتا ہے۔ یہاں معنی ہے ان کی نسل کاٹ دی انہیں بدل دیا اور ان میں سے کوئی باقی نہ چھوڑا۔ قطرب نے کہا: انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا گیا اور انہیں ہلاک کیا گیا۔ امیہ بن ابی صلت نے کہا:

فأُهلِكُوا بعذابٍ حَصَّ دابِرَهم ۔۔۔ فما استطاعوا له صَرْفًا ولا انتَصَروا

اسی سے التدبیر ہے، کیونکہ وہ امور کے انجام کو پختہ کرتا ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ بعض علماء نے فرمایا: ان کے ہلاک کرنے پر حمد ہے۔ بعض نے فرمایا: مومنین کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ کیسے حمد کریں۔ یہ آیت اپنے ضمن میں ظلم کو جو باچھوڑنے پر حجت کو لیے ہوئے ہے، کیونکہ ظلم کے پیچھے جڑ کو ہی

---

1۔ معانی القرآن للنحاس

ختم کر دینا اور دائمی عذاب تک پہنچانا ہے ہر حامد کی طرف حمد قطع کرنے والے کے استحقاق کے ساتھ۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ هُمْ یَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے: بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر لے لے اللہ تعالیٰ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور مہر لگا دے تمہارے دلوں پر تو کوئی خدا ہے اللہ کے سوا جو لا دے تمہیں یہ چیزیں؟ ملاحظہ ہو کس کس رنگ سے ہم بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلیں پھر بھی وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ آپ فرمایئے: یہ تو بتاؤ اگر آ جائے تم پر عذاب اچانک یا کھلم کھلا تو کون ہلاک کیا جائے گا بغیر ظالم لوگوں کے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ یعنی اگر تم سے قوت سماعت اور دیکھنے کی استطاعت واپس لے لے۔ سَمْعَكُمْ کو مفرد ذکر فرمایا، کیونکہ مصدر جمع پر دلالت کرتا ہے۔ وَ خَتَمَ مہر لگا دے۔ یہ پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ''ان'' کا جواب محذوف ہے تقدیر عبارت ہے فمن یاتیکم به، بہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ حال واقع ہو رہا ہے جیسے تیرا قول ہے: اضربه ان خرج یعنی خارجاً۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ معانی ہیں جو ان اعضاء کے ساتھ قائم ہیں اللہ جوارح (اعضاء) اور اعراض سب کو لے جاتا ہے اور کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا (النساء: 47) یہ آیت کریمہ کفار پر حجت ہے۔

مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِهٖ، مَّنْ مبتدا ہے اور اس کی خبر الہ ہے اور غیرہ اس کی صفت ہے اسی طرح یاتیکم محل رفع میں ہے کیونکہ الہ کی صفت ہے اس کا ذکر استفہام کے ذکر کی طرح ہے اور یہ جملہ رایتم کے دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ارایتم کا معنی علمتم ہے بہ میں ضمیر کو مفرد ذکر فرمایا، حالانکہ پہلے ذکر جمع کا ہو چکا ہے، کیونکہ معنی مراد ہے پس ھا مذکور کی طرف راجع ہے، بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع سمع ہے جیسے ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (التوبہ: 62) ابصار اور قلوب تضمین کی دلالت کے ساتھ داخل ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ ان مذکورات میں سے ایک کو۔ بعض نے فرمایا: ہدایت کی طرف ضمیر راجع ہے معنی جس کو شامل ہے۔

عبدالرحمن اعرج نے بِهٖ ؕ اُنْظُرْ ھا کے ضمہ کے ساتھ اصل پر پڑھا ہے، کیونکہ اصل میں ہ مضمومہ ہوتی ہے جیسے تو کہتا ہے: جئت معه۔ نقاش نے کہا: اس آیت میں سمع کی بصر پر فضیلت کی دلیل ہے، کیونکہ یہاں اور دوسری آیت میں سمع کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ آیات کو مختلف جہات سے بیان کرنا کبھی اعذار، کبھی انداز، کبھی ترغیب کبھی ترہیب، یہ تصریف الایات کا مفہوم ہے۔

ثُمَّ هُمْ یَصْدِفُوْنَ ۝ پھر وہ اعراض کرتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔ کہا جاتا

ہے: صدف عن الشیء جب کوئی کسی سے اعراض کرے اس کا مصدر صدفا و صدوفا آتا ہے اور صادف اسم فاعل آتا ہے۔
صادفتہ مصادفۃ اس کی اعراض کی جہت سے میں اسے ملا۔ ابن رقاع نے کہا:

إِذَا ذَكَرْنَ حديثًا قُلْنَ أحسنَه وهُنَّ عن كلّ سوء يُتّقى صُدُفُ

الصَّدَفُ فی البعیر اونٹ کا پاؤں یا ہاتھ وحشی جانب مائل ہوا۔ هُمْ يَصْدِفُوْنَ وہ حج اور آیات سے اعراض کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً حسن نے کہا: بَغْتَةً سے مراد رات کے وقت اور جَهْرَةً سے مراد دن کے وقت ہے۔ بعض نے فرمایا: بَغْتَةً کا معنی اچانک ہے۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: بغتهم الامر يبغتهم بغتا و بغتة جب اچانک ان کے پاس آجائے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ اس کی مثال یہ آیت ہے فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (الاحقاف) یعنی کیا کوئی ہلاک ہوگا سوائے تمہارے، کیونکہ تم نے شرک کیا۔ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا: يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان) اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔

## وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشی خبری سنانے کے لیے اور (عذاب جہنم سے) ڈرانے کے لیے تو جو ایمان لائے اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو کوئی خوف نہیں ہوگا انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ یعنی مرسلین ترغیب و ترہیب کرتے ہیں۔ حسن نے کہا: دنیا میں رزق کی وسعت کی بشارت دیتے ہیں اور آخرت میں ثواب کی بشارت دیتے ہیں اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:96) منذرین کا معنی اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں، یعنی ہم نے رسولوں کو ترغیب و ترہیب کی غرض سے بھیجا نہ کہ اس لیے کہ جو مطالبہ ان سے کسی نشانی کا کیا جائے وہ دکھائیں وہ تو ایسی آیات لے کر آتے ہیں جن کے ساتھ ان کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا: فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

## وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو پہنچے گا انہیں عذاب بوجہ اس کے کہ وہ حکم عدولی کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا آیات سے مراد قرآن اور معجزات ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد

ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ انہیں عذاب پہنچے گا۔ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ جو وہ کفر کرتے تھے۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں کہ خود جان لیتا ہوں غیب کو اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں نہیں پیروی کرتا میں مگر وحی کی جو بھیجی جاتی ہے میری طرف۔ آپ فرمایئے: کیا (کبھی) برابر ہوسکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا؟ تو کیا تم غور وفکر نہیں کرتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ یہ ان کے قول لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کیوں نہ اتاری گئی ان پر آیت اس کے رب کی طرف سے۔ کا جواب ہے مطلب یہ ہے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خزانے نہیں ہیں کہ میں اتاروں جو تم کسی نشانی کا مطالبہ کرو اور نہ میں غیب جانتا ہوں کہ تمہیں اس کے متعلق خبر دوں۔ الخزانة وہ چیز جس میں کوئی چیز محفوظ کی جائے۔

حدیث شریف میں ہے ''لوگوں کے لیے اس کے مویشیوں کی کھیریاں ان کے کھانے خزانہ کیے ہوئے ہوتی ہیں، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کے بالا خانہ میں کوئی آئے اور اس کی الماری توڑ دی جائے'' (1)۔ خزائن اللہ سے مراد اس کی مقدورات ہیں یعنی میں اس کا مالک نہیں کہ جو تم تجویز پیش کرو میں وہ سب کر گزروں وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ فرشتے افضل ہیں یعنی میں فرشتہ نہیں ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے ان امور کا مشاہدہ کروں جو ایک بشر نہیں کرتا۔ جو علماء کہتے ہیں کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ اس کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ قطعی طور پر کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتے مگر جس میں وحی آجاتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انبیاء کرام کی طرف سے اجتہاد، منصوص پر قیاس جائز ہے اور قیاس ادلہ شرعیہ سے ہے مزید بیان سورۂ اعراف میں آئے گا اور انبیاء کے اجتہاد کے جواز پر گفتگو سورۂ انبیاء میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ، الْاَعْمٰى سے مراد کافر اور الْبَصِیْرُ سے مراد مومن ہے یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد جاہل اور عالم ہیں۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ دونوں برابر نہیں ہیں کیا تم غور وفکر نہیں کرتے۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4505

''اور ڈرایئے اس (قرآن) سے انہیں جو ڈرتے ہوں اس سے کہ اٹھایا جائے گا انہیں ان کے رب کی طرف اس حالت میں کہ نہیں ہوگا ان کے لیے الله کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارشی (انہیں ڈرایئے) تا کہ یہ (کامل) پرہیزگار ہو جائیں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْذِرْ بِهِ، ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ انذار کا معنی اعلام (آگاہ کرنا) ہے یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بہ کی ضمیر کا مرجع الله تعالیٰ کی ذات ہے، بعض نے فرمایا: آخرت کا دن ہے۔

الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْا، اَنْ کو خاص فرمایا، کیونکہ ان پر حجت کو ثابت فرمایا یہی لوگ الله تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں نہ وہ حشر کے بارے میں متردد ہیں، معنی یہ ہے کہ وہ حشر کے عذاب کی توقع رکھتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: يَخَافُوْنَ کا معنی ہے وہ جانتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اسے ڈرایئے تا کہ وہ گناہ چھوڑ دے اگر وہ اہل کتاب ہے تو اسے ڈرایئے تا کہ وہ حق کی اتباع کرے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد مومنین ہیں۔ زجاج نے کہا: ہر وہ شخص مراد ہے جو دوبارہ اٹھنے کا اقرار کرتا ہے خواہ وہ مومن ہے یا کافر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آیت مشرکین کے بارے میں ہے یعنی انہیں قیامت کے دن سے ڈرایئے۔ پہلا قول اظہر ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ الله کے سوا کوئی ان کا حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا۔ شَفِيْعٌ یہ یہود و نصاریٰ کے گمان کا رد ہے جو کہتے تھے کہ ان کا باپ ان کی سفارش کرے گا، کیونکہ وہ کہتے تھے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) ہم الله کے فرزند اور اس کے لاڈلے ہیں مشرکین اپنے بتوں کو الله کی بارگاہ کا سفارشی بناتے تھے، الله تعالیٰ نے بتادیا کہ کفار کے لیے سفارش نہیں ہے۔ اور جن علماء نے کہا: آیت مومنین کے بارے میں ہے انہوں نے کہا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم الله کے اذن سے شفاعت کریں گے پس حقیقت میں وہی شفیع ہے جس نے اذن دیا۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء: 28) وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے۔

وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا: 23) اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لیے اس نے اجازت دی ہو۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ: 255) کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ یعنی مستقبل میں پرہیزگار بن جائیں۔ یہ ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے۔

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام، طلب گار ہیں (فقط) اس کی رضا کے نہیں

آپ پر ان کے حساب سے کوئی چیز اور نہ آپ کے حساب سے ان پر کوئی چیز ہے پھر بھی اگر آپ دور ہٹائیں انہیں تو ہو جائیں گے آپ بے انصافی کرنے والوں سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ مشرکین نے کہا: سلمان، صہیب، بلال اور خباب جیسے لوگوں کے ساتھ ہم بیٹھنے پر خوش نہیں ہیں آپ ان کو اپنے پاس سے دور کر دیں اور انہوں نے مطالبہ کیا یہ آپ ان کو لکھ کر دیں کہ آپ انہیں ہٹا دیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا تا کہ تحریر لکھ دیں۔ فقراء صحابہ اٹھے اور ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی وجہ سے حضرت سعد نے صحیح حدیث میں اپنے قول سے اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں واقع ہوا جو اللہ نے چاہا کہ واقع ہو۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے اسلام لانے کی امید پر اس عمل کی طرف مائل ہوئے اور آپ نے خیال فرمایا کہ یہ چیز آپ کے صحابہ میں کسی عظمت کو کم نہیں کرے گی اور ان کی قدر کو نہیں گھٹائے گی پس آپ اس عمل کی طرف مائل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی اور فقیر صحابہ کو دور کرنے کا جو ارادہ فرمایا تھا اس سے منع فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی انہیں دور نہیں کیا تھا۔ (صرف ارادہ کیا تھا اور نہی وارد ہوگئی)۔

مسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ آدمی تھے۔ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ انہیں اپنے پاس سے دور ہٹا دیں، یہ ہمارے پاس نہ بیٹھیں۔ فرمایا: ان صحابہ میں ایک میں تھا، حضرت ابن مسعود تھے، ایک ہذیل کا آدمی تھا، بلال تھا اور دو اور آدمی تھے میں ان کا نام نہیں لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خیال واقع ہوا جو اللہ نے چاہا کہ واقع ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ بعض علماء نے فرمایا: یہاں دعا سے مراد جماعت کے ساتھ فرضی نماز کی محافظت کرنا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ذکر اور قرأت قرآن ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دن کے آغاز اور اختتام پر دعا مراد ہو وہ دن کا آغاز دعا سے کرتے ہوں تا کہ انہیں نیکی کی توفیق ملے اور شام بھی دعا کرتے ہوں تا کہ مغفرت طلب کریں۔ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ اس کی طاعت اور اخلاص کا ارادہ کرتے ہیں فقط اللہ کی رضا کے لیے عبادت اور نیک اعمال کرتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں کسی اور کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ارادہ کرتے ہیں جس کی صفت بیان کی گئی ہے کہ اس کی وجہ ہے جیسے فرمایا: وَّیَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۞ (الرحمٰن) باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت و احسان والی ہے۔

اور فرمایا: وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد:22) اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرتے رہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔

آیت میں غداۃ اور عشی (صبح و شام) کا خاص ذکر فرمایا، کیونکہ غالب طور پر لوگ ان اوقات میں مشغول ہوتے ہیں اور

جو مشغولیت کے وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو وہ فراغت کے وقت میں بہت زیادہ عمل کرنے والا ہوگا، رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ان کے ساتھ رہتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ (الکہف: 28) آپ نہیں اٹھتے تھے حتیٰ کہ وہ پہلے اٹھتے تھے یہی مفہوم مکمل اور واضح طور پر ابن ماجہ نے سنن میں خباب سے اسی آیت کے تحت ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری آئے اور رسول اللہ ﷺ کو صہیب، بلال اور عمار اور خباب کے ساتھ پایا آپ کمزور اور غریب مومنین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جب انہوں نے ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد دیکھا تو انہوں نے انہیں حقیر سمجھا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور تنہائی میں کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے ایک ایسی مجلس قائم کریں کہ اس سے عربوں پر ہماری فضیلت ظاہر ہو، کیونکہ عرب کے وفود آپ کے پاس آتے ہیں ہم شرم محسوس کرتے ہیں کہ ان غلاموں کے ساتھ عرب ہمیں دیکھیں جب ہم آپ کے پاس آئیں تو انہیں اپنے پاس سے اٹھا دیں اور جب ہم فارغ ہو جائیں تو پھر اگر آپ کی رضی ہو تو ان کے ساتھ بیٹھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے'' انہوں نے مزید کہا کہ آپ ہمیں تحریر بھی لکھ دیں آپ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا تا کہ تحریر لکھ دیں۔ ہم ایک کونہ میں بیٹھے تھے اسی وقت جبریل امین اترے اور کہا: وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (1)

پھر اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کا ذکر کیا فرمایا: وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ پھر فرمایا: وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ فرمایا ہم آپ ﷺ کے قریب ہوئے حتیٰ کہ ہم نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں پر رکھے، رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ بیٹھے تھے جب آپ اٹھنا چاہتے تو اٹھ جاتے اور ہمیں چھوڑ جاتے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف: 28) یعنی آپ ان سرداروں سے مجلس نہ کریں فرمایا: وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف: 28) یعنی عیینہ اور اقرع کے دلوں کو ہم نے غافل کر دیا آپ ان کی پیروی نہ کریں۔ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (الکہف) فرطاً کا معنی ھلاکاً ہے یعنی عیینہ اور اقرع کا امر ہلاک ہونے والا ہے پھر ان کے لیے دو آدمیوں کی مثال دی اور دنیوی زندگی کی مثال دی۔ حضرت خباب نے کہا: پھر ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھتے تھے پھر جب وہ وقت آ جاتا جس میں آپ اٹھتے تھے تو ہم خود اٹھ جاتے تھے اور آپ کو چھوڑ جاتے تھے تا کہ آپ اٹھ جائیں۔ اس حدیث کو احمد بن محمد بن یحییٰ بن سعید قطان سے روایت ہے انہوں نے کہا ہمیں عمرو بن محمد عنقری نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسباط نے بتایا انہوں نے سدی سے روایت کیا انہوں نے ابوسعید ازدی سے روایت کیا یہ ازد قبیلہ کے قاری تھے انہوں نے ابوالکنود سے انہوں نے حضرت خباب سے روایت

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مجالسۃ الفقراء، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اس حدیث کو حضرت سعد سے بھی روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیت ہم چھ آدمیوں کے بارے نازل ہوئی ہیں، ابن مسعود، صہیب، عمار، مقداداور بلال۔ فرمایا: قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ہم خوش نہیں ہوں گے کہ ہم ان کے تابع ہوں آپ انہیں دور کر دیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے دل میں خیال آیا جو اللہ نے چاہا کہ خیال آئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کردی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ...... الخ(1)، الغدوۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ مزید بیان سورۂ کہف میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ان کی جزا اور ان کے رزق کی کفایت آپ پر نہیں ہے۔ ان کی جزا اور ان کے رزق اللہ کے ذمہ ہیں اور آپ کی جزا اور آپ کا رزق بھی اللہ پر ہے کسی اور پر نہیں۔ پہلا من تبعضیہ ہے اور دوسرا زائدہ تاکید کے لیے ہے اسی طرح وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ جب معاملہ اس طرح ہے تو آپ ان فاقہ مستوں کی طرف متوجہ ہوں اور ان کے ساتھ مجلس کریں اور انہیں دور نہ کریں، تاکہ آپ اس کے حق کی رعایت کریں جو دین میں ان کی مثل نہیں ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ظلم کا ارتکاب کریں گے۔ پناہ بخدا! کہ ایسا فعل آپ ﷺ سے صادر ہو یہ تو محض احکام الٰہی کا بیان ہے تاکہ آپ ﷺ کے علاوہ اہل اسلام میں سے کسی سے ایسی چیز صادر نہ ہو۔ اس کی مثل یہ ہے لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر:65) اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ شرک نہیں کریں گے اور آپ کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔

فَتَطْرُدَهُمْ نفی کا جواب ہے۔ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۲﴾

نہی کے جواب میں فا کے ساتھ نصب دی گئی ہے معنی یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو دور نہ کریں جو اپنے رب کو پکارتے ہیں ورنہ آپ بے انصافی کرنے والوں سے ہو جائیں گے آپ کے حساب سے ان پر کچھ نہیں ہے کہ آپ انہیں دور کریں یہ تقدیم و تاخیر پر ہے۔ ظلم اس کا اصل معنی کسی چیز کو اس کے مقام پر نہ رکھنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ اس آیت اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی کو جاہ و حشمت اور اس کے لباس کی وجہ سے عظیم نہیں سمجھنا چاہیے اور اس کے گمنام ہونے اور لباس پھٹے پرانے ہونے کی وجہ سے حقیر نہیں جاننا چاہیے۔

## وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ ﴿۵۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے آزمائش میں ڈال دیا بعض کو بعض سے تاکہ کہیں (مال وار کافر نادار مسلمانوں کو دیکھ کر) کیا یہ ہیں احسان کیا ہے اللہ نے جن پر ہم میں سے، کیا نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ اپنے شکر گزار (بندوں کو)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ یعنی جس طرح ہم نے آپ سے پہلے لوگوں کو آزمائش میں ڈالا اسی طرح ان کو آزمائش میں ڈالا۔ الفتنۃ کا معنی آزمانا ہے یعنی ہم نے ان کے ساتھ آزمانے والوں کے معاملہ کی طرح معاملہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مجالسۃ الفقراء، حدیث نمبر 4117، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا۔ لِّيَقُوْلُوْٓا لام کی وجہ سے نصب دی گئی ہے یعنی اشراف و اغنیاء کہیں۔ اَهٰٓؤُلَآءِ یعنی ضعفاء اور فقراء۔ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا نحاس نے کہا: یہ مشکل سے ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کیسے آزمائے گئے تا کہ وہ یہ آیت کہیں، کیونکہ اگر یہ انکار ہو تو ان کی طرف سے کفر ہے۔ اس کے دو جواب ہیں: (۱) معنی یہ ہے کہ اغنیاء کو فقراء کے ساتھ آزمائش میں ڈالا گیا کہ ان کا مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں برابر ہے تا کہ وہ استفہام کے طور پر کہیں نہ کہ انکار کے طور پر اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ جب انہیں اس کے ساتھ آزمایا گیا تو ان کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے یہ انکار کے طور پر کہا۔ یہ اس قول کی مثل ہوگا فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) پس (دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھر والوں نے تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ یعنی جن پر دولت ایمان کا احسان فرمایا، ان رؤسا پر نہیں جن کے متعلق اللہ کفر کو جانتا تھا۔ یہ استفہام تقریر ہے اور یہ ان کے قول اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ میں بَيْنِنَا کا جواب ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا اللہ تعالیٰ جانتا نہیں ہے جو اسلام کا شکر ادا کرے گا جب اسے اس کی طرف ہدایت ملے گی۔

**وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝**

''اور جب آئیں آپ کی خدمت میں وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر تو ان سے فرمایئے: سلام ہو تم پر لازم کر لیا تمہارے رب نے (محض اپنے کرم سے) اپنے آپ پر رحمت فرمانا تو جو کوئی کر بیٹھے تم میں سے برائی نادانی سے پھر توبہ کر لے اس کے بعد اور سنوار لے (اپنے آپ کو) تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، السلام اور السلا م دونوں کا ایک معنی ہے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے دین اور نفسوں میں سلامتی بخشے۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جن کو دور کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہی کی گئی تھی پھر جب آپ انہیں دیکھتے تو پہلے انہیں سلام کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب تعریفیں اس ذات کے لیے جس نے میری امت میں ایسے لوگ بنائے جنہیں پہلے سلام کرنے کا مجھے حکم دیا گیا'' (1)۔ اس بنا پر سلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی جہت سے تھا، یعنی ہماری طرف سے انہیں سلام پہنچا دے۔ دونوں صورتوں میں اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت و مرتبہ کی دلیل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائذ بن عمرو سے مروی ہے کہ ابوسفیان آیا سلیمان، صہیب، بلال اور دوسرے افراد کے پاس تو انہوں نے کہا: اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن کی گردن سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ راوی فرماتے ہیں حضرت ابوبکر نے کہا: کیا تم یہ قریش کے شیخ اور

1۔ زاد المسیر لابن جوزی

سردار کو کہتے ہو؟ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہیں سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! شاید تو نے انہیں ناراض کیا ہے، اگر تو انہیں ناراض کرے گا تو تو اپنے رب کو ناراض کرے گا"۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان فقراء صحابہ کے پاس آئے اور کہا: اے بھائیو! میں نے تمہیں ناراض کیا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں، اے بھائی، اللہ تیری مغفرت فرمائے۔ یہ ان لوگوں کے بلند مرتبہ اور حرمت کی دلیل ہے اس سے نیک لوگوں کا احترام اور جو انہیں اذیت دیتے ہیں اور انہیں ناراض کرتے ہیں ان سے احتساب کا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، کیونکہ اس پر اللہ کا غضب ہوتا ہے یعنی جو اس کے اولیاء میں سے کسی کو اذیت دیتا ہے اس پر اس کا عقاب نازل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ فضیل بن عیاض نے کہا: مسلمانوں کا ایک گروہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ہم سے گناہ ہوئے ہیں آپ ہمارے لیے استغفار فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ان سے اعراض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت انس بن مالک سے اس کی مثل مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اپنے سچے وعدہ اور اپنی سچی خبر کے ساتھ رحمت کرنا واجب فرمایا۔ بندوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جس کو وہ جانتے تھے کہ اس نے اس چیز کو لکھا ہے تو اس نے اس کو اپنے اوپر واجب کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے لوح محفوظ میں اس کو لکھا۔

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ یعنی جس نے بغیر ارادہ کے کوئی خطا کی۔ مجاہد نے کہا: وہ حرام حلال کو نہیں جانتا تھا اور اپنی جہالت کی وجہ سے وہ کام کر دیا جس نے کوئی برا کام کیا تو وہ اس سے جاہل ہے۔ یہ مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے بعض علماء نے فرمایا: دنیا کو آخرت پر ترجیح دی وہ جاہل ہے۔

فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ابن عامر اور عاصم نے ان کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح انه من عمل میں بھی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع نے انه من عمل میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں میں کسرہ پڑھا ہے۔ جنہوں نے کسرہ پڑھا ہے انہوں نے استئناف کے طور پر پڑھا ہے اور جملہ رحمت کے لیے تفسیر کرنے والا ہے اور انّ جب جملوں پر داخل ہوتا ہے تو اسے کسرہ دیا جاتا ہے اور فا کے بعد کا حکم ابتدا اور استئناف ہے اسی وجہ سے کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور جنہوں نے دونوں جگہ فتحہ پڑھا ہے پہلا محل نصب میں ہے، کیونکہ وہ الرحمة سے بدل ہے کسی شے کا بدل اس شے سے ہوتا ہے اور وہ وہی ہے پس اس میں کتب نے عمل کیا ہے گویا فرمایا: کتب ربکم علی نفسه انه من عمل اور رہا فانه غفور فتحہ کے ساتھ تو اس میں دو وجہیں ہیں۔

(1) یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہو اور اس کی خبر مضمر ہو گویا فرمایا: فله انه غفور رحیم۔ کیونکہ فا کے جو بعد ہوتا ہے وہ مبتدا ہوتا ہے یعنی اس کے لیے اللہ کی مغفرت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مبتدا مضمر ہو اور ان اور اس کا معمول خبر ہو تقدیر عبارت اس طرح ہو فامرہ غفران اللہ له۔ یہ سیبویہ کا مختار ہے۔ پہلی صورت کو انہوں نے جائز قرار نہیں دیا اور ابو حاتم نے اسے جائز قرار دیا۔ بعض نے فرمایا: کتب نے اس میں عمل کیا ہے یعنی کتب ربکم انه غفور رحیم۔ علی بن صالح اور ابن ہرمز سے استئناف کی بنا پر پہلے میں کسرہ مروی ہے اور دوسرے میں فتحہ مروی ہے یا تو مبتدا ہے یا مبتدا کی خبر ہے یا کتب کا معمول ہے، اور

جنہوں نے پہلے کو فتحہ دیا ہے وہ نافع ہے۔ اس نے الرحمۃ سے بدل بنایا ہے اور دوسرے سے نئی کلام سمجھی ہے، کیونکہ وہ فا کے بعد ہے، یہ قرأت واضح ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۵۵

"اور اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیتوں کو تا کہ ظاہر ہو جائے راستہ گنہگاروں کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ تفصیل سے مراد ایسا بیان ہے جس سے معانی ظاہر ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اس سورت میں ایسے دلائل اور مشرکین کے خلاف حجت کو بیان کیا اسی طرح ہم تمہارے لیے آیات بیان کریں گے جب تمہیں دین کے معاملہ میں ضرورت پڑے گی ہم تمہارے لیے ہر حق کے بارے میں اپنے دلائل اور حجتیں پیش کریں گے اہل باطل جس کا انکار کریں گے۔ قتبی نے کہا: نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ مطلب ہے ہم ایک چیز کے بعد دوسری چیز لائیں گے ہم ایک دفعہ سارا قرآن نازل نہیں کریں گے۔ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۵۵ کہا جاتا ہے: یہ لام فعل کے متعلق ہے تو پھر وہ فعل کہاں ہے جس کے یہ متعلق ہے؟ کوفیوں نے کہا: وہ مقدر ہے یعنی وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لنبين لكم وَ لِتَسْتَبِيْنَ نحاس نے کہا: اس حذف کی کوئی ضرورت نہیں۔ تقدیر یہ ہے نُفَصِّلُ الآيات ولتستبين سبيل المجرمين فَصَّلْنَاهَا بعض علماء نے فرمایا: واو کا داخل ہونا معنی پر عطف کے لیے ہے یعنی تا کہ حق ظاہر ہو جائے اور واضح ہو جائے یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ سَبِيْلُ کے لام پر رفع اور نصب پڑھے گئے ہیں۔ تا کی قرأت کی صورت میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا یعنی اے محمد! ﷺ تا کہ آپ مجرموں کا راستہ واضح کر دیں۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ تو اس کو واضح کر چکے تھے؟ زجاج کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے، معنی یہ ہے کہ تم مجرموں کا راستہ ظاہر کرو، مگر کہا جائے کہ سبیل المومنین ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ یہ اس طرح ہے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) اس کا مطلب ہے وتقيكم البرد پھر اس کو حذف کیا گیا، اسی طرح یہ معنی بھی ہوگا ولِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ لیکن پھر اس کو حذف کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کہا جاتا ہے: استبان الشئ واستبنته جب مجرموں کا راستہ ظاہر ہوا تو مومنین کا راستہ بھی ظاہر ہوا۔ السبیل کا لفظ مذکر اور مونث استعمال ہوتا ہے۔ تمیم مذکر اور اہل حجاز مونث استعمال کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ (الاعراف: 146) میں مذکر اور لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (آل عمران: 99) میں مونث استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ولتستبين کو یا اور تا کے ساتھ پڑھا گیا ہے تا کی صورت میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا اور مراد آپ کی امت ہوگی۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۵۶

"آپ فرمائیے: مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں پوجوں انہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا۔ آپ فرمائیے:

میں نہیں پیروی کرتا تمہاری خواہشوں کی ایسا کروں تو گمراہ ہو گیا میں اور نہ رہا میں ہدایت پانے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بعض علماء نے فرمایا: تَدْعُوْنَ بمعنی تعبدون ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عبادت کی جہت سے تم اپنے اہم امور میں جن کو پکارتے ہو، اس سے مراد بت ہیں۔

قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ تم ان اشیاء کی عبادت کا مطالبہ کرتے ہو اور جن کو تم دور کرنے کا ارادہ کرتے ہو میں تمہاری ان خواہشات کی اتباع نہیں کرتا۔ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا یعنی اگر میں تمہاری خواہشات کی اتباع کروں تو میں گمراہ ہو گیا۔ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾ میں راہ راست پر نہیں ہوں۔ ضللت لام کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابوعمرو بن علا نے کہا: لام کے کسرہ کے ساتھ تمیم کی لغت ہے، یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی یہی قرأت ہے۔ پہلی قرأت اصح اور افصح ہے، کیونکہ وہ اہل حجاز کی لغت ہے اور یہی جمہور کی قرأت ہے۔ جوہری نے کہا: الضلال اور الضلالۃ، الرشاد (ہدایت) کی ضد ہیں۔ وقد ضَلَلْتُ أَضِلُّ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ (سبا:50) یہ نجدیوں کی لغت ہے یہ فصیح ہے۔ اہل العالیہ کہتے ہیں: ضللتِ کسرہ کے ساتھ۔ اَضَلّ

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾

''آپ فرمایئے: بے شک میں قائم ہوں ایک روشن دلیل پر اپنے رب کی طرف سے اور جھٹلا دیا تم نے اسے نہیں ہے میرے پاس جس کی تم جلدی مچا رہے ہو، نہیں ہے حکم (کسی کا) سوائے اللہ کے وہی بتاتا ہے حق اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ یعنی میں دلالت، یقین، حجت اور برہان پر ہوں۔ خواہش پر نہیں ہوں اسی سے البینۃ (گواہی) ہے جس سے حق واضح اور ظاہر ہوتا ہے۔

وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ تم نے اس بینہ (دلیل) کو جھٹلایا، کیونکہ یہ بیان کے معنی میں ہے اس لیے ضمیر مذکر ذکر کی جیسے فرمایا: وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ (النساء:8) یہاں بھی ضمیر مذکر ذکر کر دی جب کہ ظاہر مرجع مونث ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت اسی آیت کے تحت کر دی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الرب ہے یعنی تم نے میرے رب کو جھٹلایا، کیونکہ اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: عذاب کی طرف راجع ہے۔ بعض نے کہا: قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کے معنی میں مصعب بن عبداللہ بن زبیر نے اشعار کہے ہیں وہ ایک عمدہ اور نیک شاعر تھے:

أأقعد بعد ما رجعت عظامی وکان الموتُ أقربَ ما یَلینی

أُجادلُ کلَّ مُعترضٍ خصیم وأجعل دِینَه غرَضًا لِدینی

فأترك ما علمتُ لرأیِ غیری ولیس الرأیُ کالعلم الیقین

وما أنا والخصومة وهي شيء يُصَرَّفُ في الشمال وفي اليمين

وقد سُنَّت لنا سننٌ قِوامٌ يَلُحْنَ بكلِّ فَجٍّ أو وَجِينِ

وكان الحقُّ ليس به خفاءٌ أَغَرَّ كغُرَّة الفَلَق المبينِ

وما عِوضٌ لنا مِنهاجُ جَهْمٍ بمنهاج أبنِ آمنةَ الأمين

فأمّا ما علمتُ فقد كَفَانِي وأمّا ما جهلتُ فجنِّبوني

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاعِنۡدِیۡ مَاتَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ اس سے مراد عذاب ہے۔ وہ تکذیب میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے وہ استہزا نزول عذاب کا جلدی مطالبہ کرتے تھے جیسے انہوں نے کہا: اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا (الاسراء:92) یا آپ گرادیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔
اللّٰھُمَّ اِنۡ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِکَ فَاَمۡطِرۡ عَلَیۡنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال:32) اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب میرے پاس وہ نشانیاں نہیں جن کا مطالبہ اور تجویز تم کرتے ہو۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ عذاب کی تاخیر اور تعجیل کا فیصلہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ بعض نے فرمایا: حق و باطل کے درمیان فاصل حکم اللہ کے لیے ہے۔ یَقُصُّ الۡحَقَّ یعنی وہ سچے واقعات بیان کرتا ہے۔ جو علماء قرآن میں مجاز سے منع کرتے ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ نافع، ابن کثیر، عاصم، مجاہد، اعرج اور حضرت ابن عباس کی قرأت ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ (یوسف:3) ہم بیان کرتے ہیں ایک بہترین قصہ۔ باقی قراء یَقۡضِ الۡحَقَّ ضاد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ حضرت علی، ابو عبدالرحمٰن، سلمی اور سعید بن مسیب نے اسی طرح پڑھا ہے۔ مصحف میں بغیر یا کے لکھا گیا ہے اس پر وقف مناسب نہیں یہ قضا سے ہے اس پر دلیل بعد والی کلام وَ ھُوَ خَیۡرُ الۡفٰصِلِیۡنَ ﴿۵۷﴾ ہے۔ فیصلہ، قضا میں ہوتا ہے نہ کہ قصص میں اس کی تائید اس لیے پہلے والی کلام اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ بھی کرتی ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت بھی اس کو تقویت دیتی ہے۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقۡضِ الۡحَقَّ۔ با کا دخول قضا کے معنی کو مؤکد کرتا ہے النحاس نے کہا: یہ لازم نہیں، کیونکہ یقضی کا معنی یاتی اور یصنع بھی ہوتا ہے معنی ہو سکتا ہے وہ حق لاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ معنی ہو حق فیصلہ فرماتا ہے۔ مکی نے کہا: ضاد کی قرأت مجھے زیادہ پسند ہے کیونکہ حرمیین اور عاصم کا اس پر اتفاق ہے۔ کیونکہ اگر یہ قضا سے ہوتا تو اس میں با لازم ہوتی جیسا کہ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حجت لازم نہیں کیونکہ یہ باء اکثر حذف بھی کی جاتی ہے۔

قُلۡ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۸﴾

''آپ فرمائیے: اگر میرے پاس ہوتی وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو (کبھی کا) فیصلہ ہو گیا ہوتا اس بات کا میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں اسے تم پر نازل کر دیتا حتیٰ کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا۔ الاستعمال کا مطلب ہے وقت سے پہلے کسی چیز کو جلدی طلب کرنا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکوں کو اور ان کی سزا کے وقت کو خوب جانتا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین والعاقبۃ للمتقین

ابوالفدا حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی

بھیرہ شریف

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر ابنِ کثیر 4 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

جلد چہارم

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد چہارم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ۝۵۹

''اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا انہیں سوائے اس کے، اور جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور سمندر میں ہے۔ اور نہیں گرتا کوئی پتا، مگر وہ جانتا ہے اس کو، اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں''۔

اس میں تین مسائل ہیں

**مسئلہ نمبر 1**۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے ساتھ بارہ ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفاتح الغیب خمس لا یعلمها إلا الله لا یعلم ما تغیض الأرحام الا الله ولا یعلم ما فی غد الا الله ولا یعلم متی یأتی المطر إلا الله ولا تدری نفس بأی أرض تموت إلا الله ولا یعلم متی تقوم الساعة إلا الله۔

''غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جانتا جو کچھ رحمیں چھپائے ہوئے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا اسے جو کچھ کل ہونے والا ہے سوائے اللہ کے، اور کوئی نہیں جانتا بارش کب ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نفس نہیں جانتا کون سی زمین میں اسے موت آئے گی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور کوئی نہیں جانتا قیامت کب قائم ہوگی سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

اور صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت موجود ہے انہوں نے فرمایا: جس نے گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے کل میں ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل: 65) ''آپ فرمائیے: (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔

**مَفَاتِحُ** مفتح کی جمع ہے، اس میں لغت فصیحہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مفتاح کی جمع ہے اور اس کی جمع مفاتیح آتی ہے اور یہ ابن سمیقع کی قرأت ہے۔ مفاتیح اور مفتح ہر اس شی سے عبارت ہے جو کسی بند شی کو کھول دیتی ہے چاہے وہ بند محسوس ہو جیسا کہ گھر کا تالا یا معقول ہو جیسا کہ نظر۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم بستی نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من الناس مفاتیح للخیر مغالیق للشر وان من الناس مفاتیح للشر مغالیق للخیر فطوبی لمن جعل اللہ مفاتیح الخیر علی یدیہ وویل لمن جعل اللہ مفاتیح الشر علی یدیہ۔(1)

''بے شک لوگوں میں بعض خیر اور بھلائی کی چابیاں (اور) شر اور برائی کے تالے ہیں۔ اور بلاشبہ لوگوں میں سے بعض شر کی چابیاں اور خیر کے تالے ہیں۔ پس مبارک ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے خیر کی چابیاں عطا فرمائیں اور ہلاکت و بربادی ہے اس کے لیے جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے شر کی چابیاں رکھیں''۔

اور آیت میں یہ لفظ استعارۃً غیوب تک پہنچنے کے معنی میں ہے جس طرح کہ ظاہر میں چابی کے ذریعے کسی انسان کی غیب چیز تک پہنچا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے: یہ لوگوں کے اس قول سے ماخوذ ہے افتح علی کذا یعنی مجھے عطا کیجئے یا مجھے وہ سکھا دیجئے جس کے ذریعے میں اس تک پہنچ جاؤں۔ پس اللہ تعالیٰ کے پاس ہی علم غیب ہے اور اسی کے دست قدرت میں اس تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، کوئی ان کا مالک نہیں ہوسکتا سوائے اس کے، پس وہ ان پر جسے مطلع کرنا چاہے اسے مطلع کر دے، اور جس پر انہیں چھپانا چاہے اس سے چھپا لے۔ اور اس کی طرف سے یہ عطا اور فیضان نہیں ہوتا مگر رسولوں پر (علیہم الصلوات والتسلیمات)۔

اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد ہیں: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران: 179) ''اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لیے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے''۔

اور مزید فرمایا: عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ الآیۃ (جن) ''(اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفاتح سے مراد خزائن رزق ہیں، یہ سدی اور حسن رحمہما اللہ سے منقول ہے اور مقاتل اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس سے مراد زمین کے خزانے ہیں۔ اور یہ مجاز ہے۔ اور ان سے اس (شئ) کو تعبیر کیا گیا ہے جس کے ذریعے ان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کے علاوہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں حدیث کے معنی متضمن ہیں یعنی اس کے پاس عمروں کا علم اور ان کے گزرنے کے وقت کا علم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عمروں کا انجام اور اعمال کے خواتم کا علم ہے۔ علاوہ ازیں بھی کئی اقوال ہیں۔ لیکن مختار پہلا قول ہی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کی کئی آیات میں علم غیب کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے سوائے اپنے بندوں میں سے ان کے جنہیں اس نے چن لیا۔ لہٰذا جس کسی نے کہا: بلاشبہ وہ کل بارش برسائے گا اور اس کا یقین کر لیا تو وہ کافر ہے، اس نے اس کے بارے ان علامات اور نشانیوں کے سبب خبر دی جن کے سبب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب ابواب فی فضائل اصحاب رسول اللہ، باب من کان مفتاحا للخیر، حدیث 232-233، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس نے یہ دعویٰ کیا یا نہیں۔ اسی طرح جس نے کہا: بلاشبہ وہ اسے جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے تو وہ کافر ہے(1)۔ اور اگر اس نے یقین نہ کیا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ عادۃً نوء (ایک ستارہ کا مغرب میں غروب ہونا اور اس کے بالمقابل اسی ساعت میں مشرق میں ایک ستارہ کا طلوع ہونا) کے سبب بارش برساتا ہے، اور وہ عادۃً بارش کا سبب ہے اور یہ کہ وہ بارش کا سبب اس بنا پر ہے کہ اس نے اس کا اندازہ لگالیا ہے اور وہ پہلے اس کے علم میں آچکا ہے تو وہ کافر نہیں، مگر اس کے لیے مستحب اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ وہ اس کے بارے کلام نہ کرے، کیونکہ اس میں اہل کفر کے کلام کے ساتھ مشابہت ہے اور اس میں اس کی لطیف حکمت سے جہالت ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے بارش نازل فرمادیتا ہے، کبھی ستارے کے غروب وطلوع کے سبب اور کبھی اس کے بغیر۔ اللہ تعالیٰ نے (حدیث قدسی میں) ارشاد فرمایا ہے: أصبح من عبادی مؤمن بی و کافر (2) بالکوکب ''میرے بندوں میں سے (بعض نے) میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے اور ستارے کے ساتھ کفر کرتے ہوئے صبح کی) اس کا بیان سورہ واقعہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اور اسی طرح طبیب کا قول بھی ہے: جب عورت کے دائیں پستان کا سرا سیاہ ہو جائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر بایاں پستان اس طرح ہو جائے تو پھر بچی ہوتی ہے اور اگر عورت دائیں پہلو کو بوجھل پارہی ہو تو بچی ہوتی ہے۔ اور انہوں نے خلقت کے بارے میں یہ دعویٰ عادۃً کیا ہے نہ کہ واجباً، لہٰذا یہ نہ کفر ہے اور نہ ہی فسق ہے۔ اور وہ آدمی جس نے مستقبل میں کسب اور کمائی کا دعویٰ کیا تو وہ کافر ہے یا اس نے مجمل یا مفصل واقعات ہونے کے بارے خبر دی اس سے پہلے کہ وہ وقوع پذیر ہوں تو اس کے کفر میں بھی کوئی شک نہیں۔ اور جس نے سورج اور چاند گرہن کی خبر دی تو ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے تادیباً کچھ سزا دی جائے گی لیکن اسے قید نہیں کیا جائے گا۔ رہی اس کی عدم تکفیر تو اس کے بارے ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ یہ ایسا امر ہے جسے حساب اور تقدیر منازل کے ساتھ جانا جاسکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (یٰسین: 39) ''اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لیے منزلیں''۔

اور جہاں تک ان کے لیے تادیبی سزا کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو شک میں ڈال دیتے ہیں، کیونکہ وہ تو اس کے اور اس کے غیر کے درمیان فرق کرنا نہیں جانتے۔ پس وہ اپنے عقائد کے بارے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے یقینی قواعد کو چھوڑ دیتے ہیں، پس تم انہیں ادب سکھاؤ تاکہ جب وہ اسے پہچان لیں تو وہ مخفی اور پوشیدہ رکھیں اور وہ اس کے بارے اعلان نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی باب سے وہ بھی ہے جو صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من أتی عرافا (فسأله عن شیٔ) لم تقبل له صلاۃ اربعین لیلۃ ''جو کسی نجومی اور کاہن کے پاس آیا اور کسی شیٔ کے بارے اس سے پوچھا تو اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جائے گی''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 730　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء باب قول اللہ تعالیٰ وتجعلون رزقکم الخ، حدیث نمبر 980

اور عراف سے مراد اندازہ لگانے والا اور وہ نجومی ہے جو علم غیب کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ عرافہ سے ماخوذ ہے اور اسے جاننے والے کو عراف کہا جاتا ہے، اور وہ وہ ہے جو ایسے اسباب اور مقدمات کے ساتھ امور پر استدلال کرتا ہے جن کی معرفت اور پہچان کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ اور اس فن کے بعض لوگ اس بارے میں کہا پرندہ اڑا کر فال پکڑنے، جادو منتر کے طور پر کنکریاں مارنے اور ستاروں کے ساتھ قوت اور مدد حاصل کرتے ہیں اور اس میں بھی اسباب عادیہ ہیں۔ اور یہی فن عیافہ (یا کے ساتھ) ہے اور ان تمام پر کہانت کا اسم بولا جاتا ہے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے اور کہانت سے مراد علم غیب کا دعویٰ کرنا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کتاب ''الکافی'' میں کہا ہے: وہ کمائی جس کے حرام ہونے پر اجماع ہے وہ سود، فاحشہ عورتوں کی اجرت، حرام کی کمائی، رشوت، اور نوحہ کرنے اور گانا گانے پر اجرت لینا، کہانت، غیب کا دعویٰ کرنے اور آسمان کی خبریں دینے پر اجرت لینا، بانسری بجانے، لہو ولعب اور ہر باطل کام کی اجرت ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ان زمانوں میں نجومیوں اور کاہنوں کے آنے کی وجہ سے احوال تبدیل ہو چکے ہیں بالخصوص دیار مصر میں، ان کے رؤساء، اتباع اور امراء میں نجومیوں سے ملنا عام ہو چکا ہے، بلکہ بہت سے فقہ اور دین کی طرف منسوب لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں وہ ان کاہنوں اور نجومیوں کے پاس آتے ہیں پس وہ ان پر سراسر فساد کی باتیں رکھتے ہیں اور وہ ان سے مال و دولت نکال لیتے ہیں، پس وہ ان کی باتوں سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے دین کے بارے میں فساد اور گمراہی میں واقع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب گناہ کبیرہ میں سے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں کی جاتی''۔ تو کیا حال ہوگا ان کا جنہوں نے ان کی باتوں پر اعتماد کیا اور ان پر اپنا مال خرچ کیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کاہنوں کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انهم ليسوا بشیء ''بلاشبہ وہ کوئی شی نہیں ہیں''۔ تو لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک بسا اوقات وہ ہمیں ایسی شی کے بارے بتاتے ہیں جو بالکل حق اور سچ ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تلك الكلمة من الحق يخطفها الجنی فيقرها فی اذن وليه (قر الدجاجة) فيخلطون معها مائة كذبة ''وہ کلمہ جو حق ہوتا ہے اسے جن اچک کر لے آتے ہیں اور چپکے سے اپنے ولی (یعنی جس کے وہ تابع ہو) کے کان میں ڈال دیتے ہیں (جیسے مرغی اپنی آواز منقطع کر لیتی ہے) اور وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ اور ملا لیتے ہیں''۔

حمیدی نے کہا ہے: یحییٰ بن عروہ کی اپنے باپ کیواسطہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس روایت کے سوا صحیح میں کوئی روایت نہیں ہے۔ اور اسے امام بخاری نے بھی ابو الاسود محمد بن عبد الرحمن کی حدیث سے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الملائكة تنزل فی العنان وهو السحاب فتذكر الامر قضی فی السماء فتسترق الشياطين السمع فتسمعه فتوحيه الی الكهان فيكذبون معها مائة كذبة من عند انفسهم۔

''بے شک فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہ اس امر کا ذکر کرتے ہیں جس کا فیصلہ آسمان میں ہو چکا ہوتا ہے پس شیاطین سننے کے لیے چھپے رہتے ہیں اور اسے سنتے رہتے ہیں اور پھر اسے کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ اور بولتے ہیں''۔ اس کا بیان سورۂ سبا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اللہ کریم نے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر فرمایا ہے، کیونکہ یہ دونوں انسان کے جوار میں اعظم المخلوقات ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شی کو جانتا ہے جو خشکی اور سمندر میں ہلاک ہوتی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: وہ خشکی میں نباتات، دانوں اور گٹھلیوں میں ہر شی کو اور سمندر میں رہنے والے جانوروں اور اس میں ان کے رزق میں سے ہر شی کو جانتا ہے۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا یزید بن ہارون نے محمد بن اسحاق سے، انہوں نے نافع سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ما من زرع على الأرض ولا ثمار على الأشجار ولا حبة في ظلمات الأرض إلا عليها مكتوب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ رزق فلان بن فلان ''زمین پر کوئی کھیتی نہیں اور درختوں پر کوئی پھل نہیں اور زمین میں چھپا ہوا کوئی دانہ نہیں مگر اس پر یہ لکھا ہوا ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے)''(1)۔

اور یہی اللہ تعالیٰ کی محکم کتاب میں ارشاد ہے: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

نقاش نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ ورقہ سے مراد اولاد بنی آدم میں سے وہ بچے لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت گر جاتے ہیں اور حبہ سے مراد وہ لیے جاتے ہیں جو قبل از وقت نہیں گرتے اور رطب سے زندہ مراد لیے جاتے ہیں اور یابس سے مراد مردہ لیے جاتے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول طریقہ رموز و اشارات پر جاری ہے، اور جعفر بن محمد سے صحیح (مروی) نہیں ہے لہٰذا اس کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ کا معنی ہے کہ درخت کا کوئی پتہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب گرے گا، کہاں گرے گا اور کتنے وقت تک ہوا میں اڑتا رہے گا اور کوئی دانہ نہیں مگر اس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کب آئے گا، کتنی مقدار میں وہ اگیں گے اور انہیں کون کھائے گا۔ اور فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ سے مراد زمین کا اندرونی اور باطنی حصہ ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہی حدیث کے موافق ہے اور یہی آیت کا مقتضی ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ۔

اور فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں سے نیچے ہے۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ یہ دونوں لفظ پر عطف کی بنا پر مجرور ہیں۔ ابن السمیقع اور حسن وغیرہما نے ان دونوں کو من ورقۃ کے محل پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں من تاکید کے لیے ہوگا۔ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کتاب مبین سے

1۔ الوسیط للواحدی، جلد 2، صفحہ 281

مراد لوح محفوظ ہے، کیونکہ ملائکہ وہیں سے (نصائح) اخذ کرتے ہیں، نہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی نسیان کی وجہ سے اسے لکھ رکھا ہے جو اسے لاحق ہوسکتا ہے، اس کی ذات تو اس سے منزہ اور برتر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس نے اسے تعظیم امر کے لیے لکھا ہے حالانکہ وہ اسے جانتا ہے، یعنی تم جان لو کہ یہ وہ ہے جس میں نہ ثواب لکھا ہوا ہے اور نہ ہی عقاب، تو پھر اس کے بارے کیا کیفیت ہوگی جس میں ثواب اور عقاب ہوگا؟۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۠﴿۶۰﴾

”اور وہ وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو، پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن میں تاکہ پوری کردی جائے (تمہاری عمر کی) معیاد مقرر، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ بتائے گا تمہیں جو تم کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ اور وہی ہے جو تمہیں سلا دیتا ہے۔

اور وہ تمہارے ان نفوس کو قبضہ میں لے لیتا ہے جن کے ساتھ تم (چیزوں میں) تمیز کرتے ہو۔ اور وہ فی الحقیقت موت نہیں بلکہ نیند کے سبب تصرف سے ارواح کو قبضہ میں لینا ہے جیسا کہ وہ انہیں موت کے ساتھ قبضہ میں لے لیتا ہے۔ اور التوفی کا معنی استیفاء الشیٔ (کسی شی کو پورا کرنا) ہے۔ اور توفی المیت کہا جاتا ہے (کیونکہ) وہ اپنی عمر کے ایام کی تعداد کو پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ جو سو جاتا ہے گویا اس نے اپنی بیداری کی حرکات کو پورا کر لیا ہوتا ہے اور الوفاۃ کا معنی موت ہے۔ اور أوفیتك المال، وتوفیته، واستوفیته کہا جاتا ہے جب تو سارے کا سارا مال لے لے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إن بنی الأدرم لیسوا من أحد ولا توفاهم قریش فی العدد

اس میں ولا توفاهم (پورا کرنے) کے معنی میں ہے۔

اور کہا جاتا ہے: حالت نیند میں جب روح بدن سے نکلتی ہے تو اس میں حیات (زندگی) باقی رہتی ہے، اس لیے اس میں حرکت اور سانس لینا وغیرہ موجود رہتا ہے۔ اور جب اس کی عمر کی مقرر میعاد گزر جائے اور اس کی روح نکل جائے تو اس کا سلسلہ حیات منقطع ہوجاتا ہے اور وہ مردہ ہوجاتا ہے پھر نہ وہ حرکت کرتا ہے اور نہ ہی اس کی سانس جاری رہتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: (سونے والے سے) روح خارج ہوتی ہی نہیں بلکہ اس سے ذہن نکل جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: یہ ایک ایسا امر ہے جس کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور یہی صحیح ترین قول ہے، واللہ اعلم۔

ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ پھر وہ تمہیں دن میں (نیند سے) اٹھاتا ہے یعنی بیدار کرتا ہے۔

لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى یعنی تاکہ ہر انسان اس مدت کو پورا کرلے جو اس کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

ابو رجاء اور طلحہ بن مصرف نے ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى پڑھا ہے۔ یعنی جو میعاد اس کے نزدیک مقرر ہے وہ

اسے پورا کردے۔ اور جَرَحْتُمْ بمعنی کسبتم ہے۔ اور سورۃ المائدہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اور آیت میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر عبارت اس طرح ہے ھو الذی یتوفاکم باللیل ثم یبعثکم بالنھار و یعلم ماجرحتم فیہ اس کی میعاد میں سے جو اہم ترین ہے اسے مقدم کیا اور بعث (دوبارہ اٹھانا) دن کے وقت واقع ہوتا ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ، ای فی المنام پھر وہ تمہیں خواب میں اٹھاتا ہے۔ آیت کا معنی ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کفار کو مہلت دینا ان کے کفر سے غفلت کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس نے ہر شے کی تعداد گن رکھی ہے وہ اسے جانتا ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے، بلکہ اس لیے ہے تاکہ وہ رزق اور حیات میں سے مقرر مقدار پوری کردے، پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہ انہیں (ان کے اعمال کا بدلہ) اور جزا دے گا۔ اور یہ بعث (دوبارہ اٹھایا جانا) حشر و نشر (کے برحق ہونے پر) دلیل ہے، کیونکہ نشاۃ ثانیہ کا مرتبہ نشاۃ اولیٰ کے بعد ہے اسی طرح بیداری کا مرتبہ نیند کے بعد ہے۔ اس بارے میں کہ جو ذات ان میں سے ایک پر قادر ہے تو وہ دوسرے پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝

''اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آجائے تم میں سے کسی کی موت توقبض کر لیتے ہیں اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور وہ کوتاہی نہیں کرتے، پھر لوٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے سنتے ہو اسی کا حکم ہے اور وہ سب سے تیز حساب کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ یعنی وہی عظمت اور رتبہ میں فوقیت رکھتا ہے (اس میں) مکان اور جہت کے اعتبار سے فوقیت مراد نہیں ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً یعنی ملائکہ میں سے نگہبان تم پر بھیجتا ہے۔ ارسال کا حقیقی معنی اطلاق الشیء بما حمل من الرسالۃ ہے (یعنی کسی شی کو اس کے ساتھ چھوڑنا ہے جو وہ پیغام وغیرہ میں سے اٹھائے ہوئے ہو) پس مقصود ملائکہ کو اس حفاظت اور نگہبانی کی ذمہ داری کے ساتھ بھیجنا ہے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ (انفطار) یعنی ملائکہ بندوں کے اعمال کی نگہبانی کرتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور حَفَظَةً حافظ کی جمع ہے، جیسا کہ کتبۃ کاتب کی جمع ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ دو فرشتے رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو فرشتے دن کے وقت ہوتے ہیں، ان میں سے ایک خیر اور نیکی لکھتا ہے اور دوسرا شر اور برائی لکھتا ہے، اور جب انسان چلتا ہے تو ان میں سے ایک اس کے آگے ہو جاتا ہے اور دوسرا اس کے پیچھے، اور جب بیٹھتا ہے تو ان میں سے ایک اس کی دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا بائیں طرف۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ الآیۃ (ق) ''(ان میں سے) ایک دائیں جانب اور (دوسرا) بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے''۔ اور کہا جاتا ہے: ہر انسان کے لیے پانچ فرشتے

ہیں: دو رات کے وقت ہوتے ہیں اور دو دن کے ساتھ خاص ہیں اور پانچواں رات اور دن میں سے کسی بھی وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

ومن الناس من يعيش شقيا　جاهل القلب غافل اليقظة

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو شقاوت، جہالت قلب اور بیداری میں غافل رہتے ہوئے زندگی گزارتا ہے''۔

فإذا كان ذا وفاء ورأى　حذر الموت واتقى الحفظة

''اور جب وہ صاحب وفا اور صاحب رائے ہو تو وہ موت سے ڈرتا ہے اور نگہبان فرشتوں سے بچتا ہے''۔

إنما الناس راحل و مقيم　فالذي بان للمقيم عظة

''بلاشبہ لوگ کوچ کر رہے ہیں اور مقیم ہیں پس جو ظاہر ہے وہ مقیم کے لیے نصیحت ہے''

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ مراد موت کے اسباب کا آنا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا جماعت کے مؤنث ہونے کی بنا پر فعل مؤنث مذکور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ (مائدہ: 32) اور کذبت رسل اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر اسے توفاہ رسلنا پڑھا ہے۔ اور اعمش نے تتوفاہ رسلنا تاء کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے اور مراد ملک الموت علیہ السلام کے معاونین اور مددگار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ روح کو جسم سے آہستہ آہستہ نکالتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کے قبض کا وقت ہوتا ہے تو ملک الموت علیہ السلام اسے قبض کر لیتے ہیں (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: حضرت ملک الموت علیہ السلام جسم سے روح قبض کرتے ہیں پھر اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اگر وہ مومن ہو یا ملائکہ عذاب کے سپرد کر دیتے ہیں اگر وہ کافر ہو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک الموت علیہ السلام کے ساتھ سات ملائکہ رحمت ہوتے ہیں اور سات ملائکہ عذاب ہوتے ہیں، پس جب وہ کسی مومن کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ رحمت کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے ثواب کی بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں اور وہ اسے لے کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی کافر کی جان کو قبض کرتے ہیں تو وہ اسے ملائکہ عذاب کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اسے عذاب کی بشارت دیتے ہیں اور اسے خوب خوفزدہ کرتے ہیں، پھر اسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، پھر اسے سجین کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور بندہ مومن کی روح علیین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے (2)۔

اور التوفی (موت دینا) کی نسبت کبھی ملک الموت علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سجدہ: 11) ''فرمائیے جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ'' اور کبھی ملائکہ کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہی اس کے والی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت اور دیگر آیات میں ہے۔ اور کبھی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 291　2۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 490

کیونکہ حقیقت میں وہی موت دینے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر: 42) ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت''۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ (الجاثیہ: 26) ''فرمایئے اللہ نے زندہ فرمایا ہے تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں''۔ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (الملک: 2) ''جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو''۔

پس ملائکہ میں سے ہر مامور فرشتہ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ یعنی نہ وہ اسے ضائع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ادائیگی میں کوتاہی (اور غفلت) کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پوری پوری اطاعت اور پیروی کرتے ہیں، اور اس کا اصل معنی تو آگے بڑھنا اور پیش پیش ہونا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور فرط کا معنی ہے عجز کو پیش کرنا (اور طاقت نہ ہونے کا اظہار کرنا)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) وہ کوئی کوتاہی اور لاپرواہی نہیں کرتے۔

عبید بن عمیر نے لا یُفْرِطون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ اس بارے میں حد سے تجاوز نہیں کرتے اکرام اور اہانت میں سے جس کے بارے انہیں حکم دیا جائے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کر کے حساب کے لیے اٹھائے گا۔ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ یعنی وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، وہ انہیں دوبارہ اٹھانے والا بھی ہے اور ان کا مالک بھی۔ الْحَقِّ قرات جمہور کے مطابق یہ مجرور ہے، کیونکہ یہ اسم جلالت کی نعت اور صفت ہے اور جس نے اسے الحق منصوب پڑھا ہے یا تو اس بنا پر کہ اس سے پہلے اعنی فعل مضمر ہے، یا پھر یہ مصدر ہے یعنی حقا۔

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ یعنی جان لو اور کہو: قیامت کے دن صرف اسی کا حکم ہوگا، یعنی قضا (فیصلہ) اور فصل صرف اور صرف اسی کا ہوگا۔ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ یعنی وہ کسی فکر، رؤیت کا محتاج نہیں اور نہ ہی ہاتھ کی گانٹھوں پر گننے کا محتاج ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے کون نجات دیتا ہے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں جسے تم پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ (اور کہتے ہو) اگر نجات دی اللہ نے ہمیں اس (مصیبت) سے تو ہم ضرور ہو جائیں گے اس کے شکر گزار (بندے)۔ فرمایئے اللہ ہی نجات دیتا ہے تمہیں اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اس میں ظلمات سے مراد) خشکی اور سمندر کی تکالیف اور مصیبتیں ہیں: کہا جاتا ہے: یوم مظلم یعنی شدید اور مشقت آمیز دن۔ نحاس نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: یوم مظلم جب دن شدید اور سخت ہو، اور اگر دن کی شدت بہت زیادہ بڑھ جائے تو پھر کہتے ہیں: یوم ذو کواکب (یعنی ایسا دن جس میں ستارے نظر آئیں، اس میں مراد شدت اور تکلیف ہوتی ہے) اور سیبویہ نے کہا ہے:

بنی أسدٍ هل تعلمون بلاءنا إذا كان يوم ذو كواكب أشنعا

''اے بنی اسد! کیا تم ہماری آزمائش اور مصیبت کو جانتے ہو، جب دن ستاروں والا ہو تو وہ انتہائی شنیع اور تکلیف دہ ہوتا ہے''۔

ظُلُمٰتِ کو جمع اس بنا پر لایا گیا ہے، کیونکہ اس سے مراد خشکی کی تاریکی، سمندر کی تاریکی، رات کی تاریکی اور بادلوں کی تاریکی ہے، یعنی جب تم غلط راستے پر گامزن ہو جاؤ اور تمہیں ہلاکت کا خوف اور ڈر ہو تو تم اسے چھوڑ دو۔

لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو نے ہمیں ان مصائب سے نجات دی۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم ضرور شکر گزار اور فرمانبردار بندے ہو جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے شدائد و مصائب کے وقت اسے پکارنے پر انہیں ملامت کی اور جھڑکا۔ کیونکہ وہ آرام اور خوشحالی کی حالت میں اس کے ساتھ اوروں کو بھی پکارتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (پھر تم شریک ٹھہراتے ہو)

اعمش نے وخیفة پڑھا ہے یہ خوف سے ماخوذ ہے، اور ابو بکر نے حضرت عاصم سے خِفية خاء کے کسرہ کے ساتھ قرآت کی ہے اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور فراء نے خُفوة اور خِفوة کا اضافہ کیا ہے اور کہا ہے: اس کی نظیر حُبیه، حِبیة، حُبوة اور حِبوة ہے۔ اور اعمش کی قرأت بہت بعید ہے۔

کیونکہ تَضَرُّعًا کا معنی ہے کہ تم گڑگڑانے (اور انتہائی عجز و انکساری) کا اظہار کرو اور خفية کا معنی ہے کہ تم اسی کی مثل چھپاؤ (اور اپنے اندر رکھو) اور کوفیوں نے لئن أنجانا پڑھا ہے۔ اور معنی کا سیاق تو تا کے ساتھ ہے جیسا کہ اہل مدینہ اور اہل شام نے قرآت کی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ کوفیوں نے اسے تشدید کے ساتھ يُنَجِّيْكُمْ پڑھا ہے اور باقیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا گیا ہے: دونوں کا معنی ایک ہے جیسا کہ نجا، أنجیته اور نجیته ہم معنی ہیں۔ اور کہا گیا ہے: تشدید، کثرت کا معنی بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور الکرب کا معنی وہ غم ہے جو نفس کو پکڑ لیتا ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: رجل مکروب (غمزدہ آدمی)۔ عنترہ نے کہا ہے:

و مكروبٍ كشفتُ الكرب عنه بطعنة فيصل لما دعانی

اور کربۃ اسی سے مشتق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ اس میں انہیں دھمکانا اور جھڑکنا مقصود ہے، جیسا کہ سورت کی ابتدا میں ہے۔ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۝ کیونکہ حجت جب معرفت کے بعد قائم ہو تو اخلاص واجب ہوتا ہے، اور انہوں نے اس کا بدل بنا لیا اور وہ اشراک (شرک کرنا) ہے۔ پس یہ اچھا ہے کہ انہیں اس جہت پر جھڑکا جائے اور انہیں ڈرایا دھمکایا جائے اگرچہ وہ نجات سے پہلے مشرک تھے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ

يَفْقَهُوْنَ ۝

''فرمائیے وہ قادر ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے اور خلط ملط کردے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی۔ دیکھو کیونکہ ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلوں کو تاکہ یہ لوگ (حقیقت کو) سمجھ لیں''۔

یعنی وہ تمہیں کرب اور مصیبت سے نجات دلانے پر بھی قادر ہے اور تمہیں عذاب دینے پر بھی۔ اور مِنْ فَوْقِكُمْ کا معنی ہے (اوپر سے) پتھر برسانا، طوفان، سخت چیخ اور ہوا، جیسا کہ اس نے عاد، ثمود، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم، اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کیا۔ یہ حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر وغیرہما سے مروی ہے۔ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسانا) اور زلزلہ وغیرہ ہے جیسا کہ اس نے قارون اور اصحاب مدین کے ساتھ کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ فَوْقِكُمْ سے مراد ظلم کرنے والے امراء (اور حکمران) ہیں۔ اور اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے مراد سفلہ مزاج اور برائی کرنے والے غلام ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا اور ابو عبد اللہ مدنی سے اَوْ يُلْبِسَكُمْ یا کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی وہ تمہیں عذاب کے ساتھ ڈھانپ دے (تم پر عذاب مسلط کردے) اور اسے تم پر عام کردے، اور یہ لفظ اللبس (لام کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے۔ اور فتحہ کی قرأت اللبس سے ماخوذ ہے۔ یہ مشکل مقام ہے اور اعراب اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

یعنی وہ تم پر تمہارا معاملہ خلط ملط کردے، پس دو مفعولوں میں سے ایک کو اور حرف جر کو حذف کردیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (مطففین: 3) (یعنی ان میں بھی مذکورہ حذف موجود ہے) اور یہ اختلاط یہ ہے کہ وہ ان کے معاملے کو خلط ملط کردے اور ان کی خواہشات اور چاہت میں اختلاف پیدا کردے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا کا معنی ہے کہ وہ تمہارے دشمن کو قوی کردے یہاں تک کہ وہ تم میں مخلوط ہو جائے اور جب وہ تمہارے ساتھ آملے تو تحقیق وہ تم میں خلط ملط ہو گیا (اور تم پر قوت پکڑ گیا)۔ شِيَعًا کا معنی مختلف گروہ اور فرقے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے مختلف گروہ بنادے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قتال کرنے لگو۔ اور یہ ان کا معاملہ خلط ملط ہو جانے اور طلب دنیا پر ان کے امراء کے متفرق ہونے کے سبب ہے۔ اور اس ارشاد گرامی وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ کا یہی معنی ہے یعنی فتنہ میں جنگ وقتل کے ساتھ تم میں سے بعض کو دوسروں کی شدت چکھائے۔ یہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں اور کفار تمام کو عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں خاص ہے اور حسن نے کہا ہے: یہ اہل صلوٰۃ (اہل قبلہ) کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ عملاً اور وجوداً اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے، ہم نے اپنے شہروں میں دشمن کے ساتھ

اختلاط کیا اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے والی بنے، ایسے فتنہ کے ساتھ جو ہم پر غالب اور مسلط رہتا کہ ہمارے بعض نے بعض کو قتل کیا اور بعض نے دوسروں کے مالوں کو مباح سمجھا۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظهر وما بطن (ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں ایسے فتنوں سے جو ظاہر ہوئے اور جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے)

اور حضرت حسن سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس کی تاویل کی ہے جو کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہوا(1)۔ مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم إن الله زوی لی الأرض فرأيت مشارقها و مغاربها وإن أمتي سيبلغ ملكها ما زوي لي منها وأعطيت الكنزين الأحمر والأبيض الى آخر الحديث۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین لپیٹ دی تو میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور عنقریب میری امت کی سلطنت اور حکومت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لیے اسے لپیٹا گیا اور مجھے دو خزانے سرخ و سفید (سونا اور چاندی) عطا فرمائے گا اور میں نے اپنے پروردگار سے اپنی امت کے لیے یہ التجا کی ہے کہ وہ اسے عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہ کرے اور یہ کہ وہ ان پر ایسے دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان میں سے نہ ہو اور وہ ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھنے لگے۔ اور میرے رب نے فرمایا ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو اسے رد نہیں کیا جاتا۔ میں نے آپ کو آپ کی امت کے لیے یہ عطا فرما دیا کہ میں انہیں عام قحط سالی کے سبب ہلاک نہیں کروں گا اور یہ کہ میں ان پر کسی بیرونی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی اجتماعیت اور محل سلطانی کو مباح سمجھ لے اگرچہ وہ ان پر اطراف و اکناف سے جمع ہو جائے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض بعض کو ہلاک کرنے لگیں اور بعض بعض کو قیدی بنالیں''۔

نسائی نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور وہ ساری رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہبانی کرتے رہے یہاں تک کہ فجر ہوگئی، تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نماز سے سلام پھیرا تو جناب خباب رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں آپ نے آج کی رات ایسی نماز ادا کی ہے میں نے آپ کو اس طرح کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جی ہاں بلاشبہ یہ انتہائی عجز اور خوف کی نماز تھی میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی التجا کی ہے۔ ان میں سے دو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرما دی ہیں اور ایک کو مجھ سے روک لیا ہے۔ میں نے اپنے پروردگار سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں اس کے ساتھ ہلاک نہ کرے جس کے ساتھ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ مجھے عطا فرما دیا ہے (یعنی میری التجا کو قبول کر لیا ہے) اور میں نے اپنے رب سے یہ التجا کی ہے کہ وہ ہم پر کسی بیرونی دشمن کو غلبہ نہ دے، تو اس نے یہ بھی مجھے عطا فرما دیا ہے اور میں نے اپنے رب سے التجا کی ہے کہ وہ ہمیں مختلف گروہوں میں خلط ملط نہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہیں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 305

فرمایا''۔ ہم نے یہ اخبار کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہیں۔ والحمدللہ

اور یہ روایت بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین علیہ السلام سے کہا: ''اے جبریل! کیا میری امت کی بقا اسی پر ہے''؟ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے عرض کی: بلاشبہ میں آپ کی مثل بندہ ہوں آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اور اپنی امت کے لیے التجا کیجئے''۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے، وضو فرمایا اور خوب اچھی طرح وضو کیا (نفل) نماز پڑھی اور خوب اچھی طرح نماز پڑھی، پھر (رب کریم کی بارگاہ میں) دعا کی تو حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: یا محمد إن اللہ تعالیٰ سمع مقالتك واجارهم من خصلتين وهو العذاب من فوقهم ومن تحت أرجلهم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو سنا ہے اور انہیں دو خصلتوں سے پناہ عطا فرمادی ہے اور وہ عذاب ہے ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے جبریل! کیا میری امت باقی رہے گی جب ان میں خواہشات مختلف ہیں اور وہ ان کے بعض کو بعض کی شدت چکھائے گا''۔

تو حضرت جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا، الآیہ (عنکبوت:2) (الف، لام، میم کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا)۔

حضرت عمرو بن دینار نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اعوذ بوجه الله (میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں (اس عذاب سے)) اور جب یہ نازل ہوئی اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ تو آپ نے کہا: هاتان اهون (یہ دونوں بہت آسان ہیں) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح و شام ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم إني أسئلك العافية في الدنيا والآخرة (اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی التجا کرتا ہوں) اللهم إني أسئلك العفو والعافية في ديني و دنياي اهلي ومالي (اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا، اپنے گھر والوں اور اپنے مال کے لیے عفو اور عافیت کی التجا کرتا ہوں)۔ اللهم أستر عوراتي وآمن روعاتي و أحفظني من بين يدي ومن خلفي وعن يميني وعن شمالي ومن فوقي وأعوذ بك أن أغتال من تحتي(1) (اے اللہ! مجھے بے پردگی سے محفوظ فرما، مجھے خوف سے، ڈر سے امن عطا فرما، میرے سامنے سے، پیچھے سے، میرے دائیں اور بائیں سے اور میرے اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں اپنے نیچے کی جانب سے ہلاک ہوں) وکیع نے کہا ہے: اس سے مراد خسف (زمین میں دھنسنا) ہے۔

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ دیکھو کیونکر ہم ان کے لیے حجتیں اور دلائل بیان کرتے ہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ اس

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل اذا اصبح اذا امسی، حدیث نمبر 3860، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے مراد اس شرک اور گناہوں کا بطلان ہے جن میں وہ مبتلا تھے۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ؕ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ٘ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور جھٹلایا اسے آپ کی قوم نے حالانکہ یہ حق ہے فرمائیے نہیں ہوں میں تمہارا ذمہ دار۔ ہر ایک خبر (کے ظہور) کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب جان لوگے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ، ای بالقرآن یعنی آپ کی قوم نے قرآن کو جھٹلایا ہے۔

ابن ابی عبلہ نے و کذبت تاء کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ وَ هُوَ الْحَقُّ حالانکہ اس کے قصص حق ہیں۔ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ حسن نے کہا ہے: (اس کا معنی ہے) میں تمہارے اعمال کا محافظ نہیں ہوں کہ میں تمہیں ان پر جزا اور بدلہ دوں، بلاشبہ میں تو ڈرانے والا ہوں میں نے پیغام (حق) پہنچا دیا ہے، اس کی مثل یہ آیت بھی ہے وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ (انعام) (اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوتا) میں تم پر تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا ہوں۔

پھر یہ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ان کا ایمان آپ کی وسعت میں نہیں ہے۔ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ یعنی ہر خبر کی ایک حقیقت ہے، یعنی ہر شی کے لیے ایک مقررہ وقت ہے جس میں وہ بغیر تقدیم و تاخیر کے واقع ہو جاتی ہے۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے: ہر عمل کی جزا ہے۔ حسن نے کہا ہے: یہ الله تعالیٰ کی جانب سے کفار کے لیے وعید ہے، کیونکہ وہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار نہ کرتے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایسی شی کے ساتھ وعید ہو جو دنیا میں ان پر نازل ہوگی۔

سدی نے کہا ہے: بدر کے دن ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ الله تعالیٰ انہیں ڈرا رہا ہے۔ اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بعض تفاسیر میں دیکھا ہے کہ یہ آیت داڑھ کے درد کے لیے باعث نفع ہے جب اسے کاغذ پر لکھ کر دانت پر رکھا جائے۔

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾

''اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بیہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ وہ الجھنے لگیں کسی اور بات میں اور اگر (کہیں) بھلا دے تجھے شیطان تو مت بیٹھو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے پاس''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ المحرر الوجیز

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا یعنی وہ ہماری آیتوں کی تکذیب اور ان کے ساتھ استہزا کی بیہودہ بحثیں کرتے ہیں فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ تو آپ ان سے اعراض کرلیں۔ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مومنین بھی اس خطاب میں داخل ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ علت اللہ تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث سننا ہے اور یہ علت مومنین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبھی کو شامل ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد اکیلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین سے اٹھنا ان پر شاق گزرتا تھا اور مومنین ان کے نزدیک اس طرح نہ تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اختلاف (اور نفرت) کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں جب کہ وہ استہزا کریں اور بیہودہ بحث کریں تاکہ وہ اس سے ادب سیکھیں اور بیہودہ بحث کرنا اور استہزا کرنا چھوڑ دیں۔

الخوض کا اصلی معنی ہے پانی میں غوطہ زن ہونا، پھر بعد میں ان اشیاء میں گم ہو جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جو جاہل بنا دینے والی ہیں، یہ غمرات الماء کے ساتھ تشبیہ ہے، پس محسوس کو معقول کے لیے بطور مجاز استعمال کیا گیا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خلط (باہم ایک دوسرے سے ملنا) سے ماخوذ ہے اور ہر وہ شی جس میں تو غوطہ زن ہو تو اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اسی سے خاض الماء بالعسل بھی ہے جب تو پانی کو شہد کے ساتھ ملا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھلایا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرک قوم کے پاس بیٹھتے تھے، آپ انہیں نصیحت فرماتے تھے اور انہیں دین اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور وہ قرآن کریم کے ساتھ استہزا کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے منہ پھیر لیں جس طرح کہ انکار اور نفرت کرنے والا اعراض کرتا ہے۔ تو اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب آدمی کسی دوسرے کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے اور اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کی بات قبول نہیں کرے گا تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے منکر کے اعراض کی طرح اعراض کرلے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں بیان کیا ہے وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ استہزا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ساتھ بیٹھنے سے منع فرما دیا ہے سوائے اس کے کہ آپ بھول جائیں۔ اور جب یاد آ جائے تو پھر اٹھ کھڑے ہوں۔ ورقاء نے ابن ابی نجیح کے واسطہ سے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے بارے میں ناحق باتیں کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں کتاب اللہ کی جانب سے ان کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ وہ ائمہ جو حجت اور دلیل ہیں اور ان کی اتباع کی جاتی ہے ان کے لیے جائز ہے کہ وہ فاسق لوگوں سے اختلاط کرتے اور اپنے تقویٰ کی بنا پر ان کی آراء کو درست اور صحیح قرار دیتے رہیں۔

علامہ طبری نے ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم جھگڑا کرنے والوں کی مجالست اختیار نہ کرو،

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 731

کیونکہ وہ لوگ الله تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحثیں کرتے ہیں (1)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ اہل کبائر کی مجالست اختیار کرنا حلال نہیں ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: جو کوئی الله تعالیٰ کی آیات کے بارے میں بیہودہ بحث کرے اس کی مجالست چھوڑ دی جائے اور اسے بھی چھوڑ دیا جائے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔ فرمایا: اور اسی طرح ہمارے اصحاب نے دشمن کی سرزمین میں داخل ہونے اور ان کے چرچ اور عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے منع کیا ہے اور کفار اور اہل بدعت کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ کہ ان کی محبت ومودت کا اعتقاد نہ رکھا جائے اور نہ ان کا کلام سنا جائے اور نہ ان کے ساتھ مناظرہ کیا جائے۔

اہل بدعت میں سے کسی نے ابو عمران نخعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہا: مجھ سے ایک کلمہ سنو، تو آپ نے اس سے اعراض کر لیا اور فرمایا: نصف کلمہ بھی نہیں۔ اور اسی کی مثل ایوب سختیانی سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت فضیل بن عیاض نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی الله تعالیٰ اس کے عمل کو اکارت اور ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام نکال دے گا۔ اور جس نے اپنی بیٹی کی شادی کسی مبتدع سے کر دی تو اس نے اس کا تعلق منقطع کر دیا اور جس نے کسی بدعتی کے ساتھ مجالست اختیار کی اسے حکمت عطا نہیں کی جائے گی۔ اور جب الله تعالیٰ کسی آدمی کے بارے میں جان لے کہ وہ بدعتی کو مبغوض جانتا ہے تو مجھے امید ہے کہ الله تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا۔

ابو عبدالله حاکم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وقر صاحب بدعة فقد أعان علی هدم الأسلام جس نے کسی بدعتی کی عزت وتوقیر کی تحقیق اس نے اسلام کو گرانے میں (کمزور کرنے میں) معاونت کی۔

مذکورہ تمام روایات واقوال سے اس کا قول باطل ہو گیا جس نے یہ گمان کیا کہ ان (اہل بدعت) کی مجالست جائز ہے جب کہ وہ ان کا کلام سننے سے محفوظ رہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّكَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ۞

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّكَ اس میں اِمَّا شرطیہ ہے، اسے نون ثقیلہ اغلباً لازم ہوتا ہے اور بعد اوقات لازم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اما یصبك عدوٌ فی مناواۃ  یوماً فقد کنتَ تستعلی وتنتصرُ

(اما یصبك میں نون ثقیلہ موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس اور ابن عامر رضی اللہ عنہم نے معنی تکثیر کی بنا پر ینسینك سین کو مشدد پڑھا ہے: کہا جاتا ہے: نسی اور أنسی دونوں کا ایک معنی ہے اور یہ دو لغتیں ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 314

قالت سليمي أتسري اليوم أم تقل وقد ينسيك بعض الحاجة الكسل

اور امرأالقیس کا قول ہے:

لَنْسَيْنِي إذا قُمتَ بِهِ بالى

آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر شیطان آپ کو ان کے پاس سے اٹھنا بھلا دے اور آپ اس نہی کے بعد ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى تو جب آپ کو یاد آئے تو پھر نہ بیٹھیں۔ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی مشرک قوم کے ساتھ اور ذکری تذکیر کا اسم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ انہوں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نسیان (بھول) سے مبرا ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہی خاص ہے اور آپ کے لیے نسیان جائز ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر ہم اپنے اصحاب کو ان کے اس قول میں معذور قرار دیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر: 65) میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم کے ساتھ خطاب امت کو ہے اس لیے کہ آپ کی طرف شرک کی نسبت محال ہے، تو اس بارے میں ان کا کوئی عذر نہیں کیونکہ نسیان کی نسبت آپ کی طرف جائز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نَسِيَ آدَمُ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ (حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی اولاد کو بھی نسیان لاحق ہو گیا) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: إنما أنا بشر مثلكم أنسى كما تنسون فإذا نسيت فَذَكِّرُوْنِي (بلاشبہ میں تمہاری مثل انسان ہوں میں بھی بھول جاتا ہوں جیسا کہ تم بھولتے ہو پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو) اسے بھی آپ نے صحیح میں روایت کیا۔ پس اس میں آپ نے نسیان کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اور فرمایا: آپ نے ایک آدمی کی قرأت سنی۔ تحقیق اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی ہے میں انہیں بھول چکا تھا۔

آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز ہونے کے بعد علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ طریقہ تبلیغ سے متعلقہ افعال اور احکام شرع میں بھی لاحق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں جو کچھ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اس کے مطابق عام علماء اور محققین ائمہ کرام نے پہلے موقف کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ ظاہر قرآن و احادیث اس پر شاہد ہے۔ البتہ ائمہ کرام نے یہ شرط عائد کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو اس پر متنبہ کر دیتا ہے اور اس (حالت نسیان) پر برقرار نہیں رکھتا۔ پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اس تنبیہ کا واقعہ کے فوراً بعد متصل ہونا شرط ہے؟ یہ مذہب قاضی ابوبکر اور اکثر علماء کا ہے۔ یا واقعہ سے تنبیہ کا مؤخر ہونا بھی جائز ہے جب تک کہ نبی علیہ السلام کی عمر اختتام پذیر نہ ہو اور سلسلہ وعظ و تبلیغ منقطع ہو جائے۔ ابوالمعالی نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت نے وعظ و ارشاد اور عبادات شرعیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہو اور بھول کا انکار کیا ہے، جیسا کہ

انہوں نے بالاتفاق وعظ وارشاد سے متعلقہ اقوال میں اس ( بھول ) کا انکار کیا ہے اور اس بارے میں وارد ہونے والے ظاہر دلائل سے عذر بیان کیا ہے۔

اسی کو الاستاذ ابو اسحاق نے اختیار کیا ہے۔ باطنیہ اور ارباب علم قلوب کی ایک جماعت نے اسے شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے: آپ کی طرف نسیان کی نسبت جائز نہیں ہے، بلاشبہ آپ قصداً اور ارادۃً بھولتے ہیں اور صورۃً نسیان کا قصد کرتے ہیں تاکہ سنت قائم ہو جائے۔ ائمہ تحقیق میں سے ایک عظیم امام اس طرف گئے ہیں اور وہ ابو المظفر الاسفرائینی ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''الاوسط'' میں یہ کہا ہے۔ اور یہ میلان صحیح اور پختہ نہیں ہے اور ضد کا ضد کے ساتھ جمع ہونا بہت زیادہ محال ہے۔

وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے ان کافروں کے حساب سے کچھ بوجھ البتہ پرہیزگاروں پر نصیحت کرنا فرض ہے شاید وہ باز آجائیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب یہ حکم نازل ہوا کہ آپ مشرکین کے ساتھ نہ بیٹھیں اور ارشاد باری تعالیٰ: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ سے یہی مراد ہے تو مسلمانوں نے کہا: ہمارے لیے مسجد میں داخل ہونا اور طواف کرنا ممکن نہ رہے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی: وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى یعنی اگر مومنین ان کے پاس بیٹھیں تو پھر چاہیے کہ وہ انہیں نصیحت کریں۔ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے اسے ترک کرنے کے بارے ڈرتے رہیں جس میں وہ واقع ہوئے ہیں (1)۔

پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم اس ارشاد ربانی کے ساتھ منسوخ ہے: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ (النساء: 140) ''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر ( یہ حکم ) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جا رہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان ( کفر و استہزا کرنے والوں ) کے ساتھ کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں''۔ (2)

یہ فتح ( مکہ ) سے پہلے رخصت تھی اور وہ وقت احتیاط و تحفظ کا وقت تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا ہے: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ تا قولہ وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: اظہر یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور معنی یہ ہے: مشرکین کے حساب میں سے کوئی شی تم پر واجب نہیں ہے، پس تم پر انہیں نصیحت کرنا لازم ہے اور انہیں زجر و تنبیہ کرنا لازم ہے، پھر اگر وہ انکار کر دیں تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ذکری مصدر ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو۔

ای ولکن الذی یفعلونہ ذکری، ای ولکن علیھم ذکری اور کسائی نے کہا ہے: معنی یہ ہے ولکن ھذہ ذکری (البتہ یہ نصیحت ہے)

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ

1۔ المحرر الوجیز
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 315

نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۟

''اور چھوڑ دے جنہوں نے بنالیا ہے اپنا دین کھیل اور دل لگی اور دھوکہ میں ڈال دیا ہے انہیں دنیوی زندگی نے اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے، نہیں ہے اس کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارشی اور اگر وہ معاوضہ میں دے ہر بدلہ تو نہ قبول کیا جائے گا اس سے، یہی وہ لوگ ہیں جو ہلاک کیے گئے ہیں بوجہ اپنے کرتوتوں کے ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے بوجہ اس کفر کے جو وہ کرتے رہے تھے''۔

یعنی آپ ان کے ساتھ قلبی تعلق قائم نہ کیجئے، کیونکہ وہ خطا اور لغزش کو تلاش کرنے والے لوگ ہیں اگرچہ آپ ان کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنے پر مامور ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) ہے۔

اور لَعِبًا وَّ لَهْوًا کا معنی ہے اس دین کے ساتھ استہزا کرنا جس کی طرف آپ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس دین کے ساتھ استہزا کیا جس پر وہ تھے، پس انہوں نے اس کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اور استہزاء دین میں جائز نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَعِبًا وَّ لَهْوًا کا معنی باطلاً و فرحاً ہے (یعنی باطل قرار دینا اور پھر خوش ہونا) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور لعب کا لفظ چار مقامات پر مقدم آیا ہے، اور اسے اس طرح نظم کیا گیا ہے:

اذا أتی لعبٌ و لهوٌ وکم من موضعٍ هو فی القرآنِ
فحرفٌ فی الحدید وفی القتال وفی الأنعام منها موضعان

''جب لعب ولہو مذکور ہو اور قرآن کریم میں یہ کتنے مقامات پر ہے پس ایک بار (سورہ) الحدید میں اور ایک بار القتال میں اور دو مقامات پر سورۃ الانعام میں ہے''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں دین سے مراد عید ہے۔ کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے عید بنائی ہے جس کی وہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور اس دن اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنی عید کو لعب ولہو بنا دیا ہے سوائے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے، کیونکہ انہوں نے اسے نماز، ذکر اور صدقہ وغیرہ دینے کا دن بنایا ہے، مثلاً جمعہ کا دن، عید الفطر کا دن اور قربانی کا دن۔

قولہ تعالیٰ: وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یعنی وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

قولہ تعالیٰ: وَذَكِّرْ بِهٖٓ آپ انہیں نصیحت کیجئے قرآن کے ساتھ یا (یوم) حساب کے ساتھ۔

اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ یعنی نفس کو گروی رکھ دیا جائے اور ہلاکت کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ معنی حضرت مجاہد،

قتادہ، حسن، عکرمہ اور سدی سے مروی ہے۔ اور ابسال کا معنی ہے: آدمی کو ہلاکت کے لیے پیش کرنا۔ لغت میں یہی معنی معروف ہے۔ أبسلت ولدی میں نے اپنے بچے کو رہن رکھا۔ عوف بن اُحوص ابن جعفر نے کہا ہے:

و أبسال بنی بغیر جرم　　بعوناہ ولا بدم مراقِ

بعوناہ یہ لفظ عین مہملہ کے ساتھ ہے اس کا معنی جنینا (ہم نے اسے مجرم قرار دیا)

اور البعو کا معنی الجنایۃ (جرم) ہے۔ بنی قشیر کے غنی نے سجیفہ کے دو بیٹوں کے خون کا ذمہ اٹھایا تو انہوں نے کہا: ہم تجھ سے راضی نہ ہوں گے، تو اس نے صلح کے مطالبہ میں اپنے بیٹوں کو ان کے پاس رہن رکھ دیا، اور نابغہ جعدی نے شعر کہا:

ونحن رھنا بالأفاقۃ عامراً　　بما کان فی الدرداء رھنا فأبسلا

الدرداء ان کا ایک دستہ تھا۔ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا الآیۃ عدل کا معنی فدیہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حَمِیْم کا معنی گرم پانی ہے اور قرآن کریم میں ہے۔ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ ﴿۱۹﴾ الآیہ (الحج) ”انڈیلا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی“۔

یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ (الرحمٰن) ”وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جواز حد گرم ہوگا“۔ اور یہ آیت بھی آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ ارشاد گرامی وَ ذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَ یَتَمَتَّعُوْا (الحجر: 3) اور اس کا معنی ہے: آپ ان پر غمزدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ پر تبلیغ کرنا اور نفوس کی ہلاکت کے بارے نصیحت کرنا لازم ہے، پس جس نے (اپنے نفس کو) ہلاک کر دیا تحقیق اس نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور گروی رکھ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا اصل معنی حرام کرنا ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: ھذا بسل علیك ای حرام (یہ تجھ پر حرام ہے) گویا وہ جنت سے محروم کر دیئے گئے اور جنت ان پر حرام کر دی گئی۔ شاعر نے کہا:

أجارتکم بسل علینا محرم　　وجارتُنا حلٌ لکم وحلیلھا

أبسال بمعنی تحریم ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

''آپ فرمایئے کیا ہم پوجیں الله تعالیٰ کے سوا اس کو جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے ہمیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور (کیا) ہم پھر جائیں الٹے پاؤں اس کے بعد کہ ہدایت دی ہے ہمیں الله نے؟ مثل اس شخص کے کہ بھٹکا دیا ہو اسے جنوں نے زمین میں اور وہ حیران و پریشان ہو، اس کے ساتھی ہوں جو اسے بلا رہے ہوں ہدایت کی طرف کہ ہمارے پاس آجا، آپ فرمایئے الله کی رہنمائی ہی حقیقی رہنمائی ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں سارے جہانوں کے رب کے سامنے۔ اور یہ کہ صحیح صحیح ادا کرو نماز اور ڈرو اس سے اور وہی ہے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور جس روز وہ کہے گا کہ تو ہو جا تو بس وہ ہو جائے گا۔ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی جس دن پھونکا جائے گا صور، جاننے والا ہے ہر چھپی خبر کا اور ہر ظاہر چیز کا اور وہی ہے حکمت والا سب کچھ جاننے والا''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا یعنی وہ جو ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے پوجیں۔ وَلَا يَضُرُّنَا اور وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر ہم اسے چھوڑ دیں۔ اس سے مراد بت (اصنام) ہیں۔ وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یعنی ہم ہدایت کے بعد ضلالت وگمراہی کی جانب لوٹ جائیں۔

اعقاب کا واحد عقب ہے اور یہ مؤنث ہے، اور اس کی تصغیر عقیبۃ ہے۔ جب کوئی الٹے پاؤں واپس لوٹے تو کہا جاتا ہے: رجع فلان علی عقبیه ابو عبیدہ نے کہا ہے: جو کوئی اپنی حاجت اور ضرورت سے واپس لوٹ آئے اور وہ اس کے ساتھ کامیاب نہ ہو تو کہا جاتا ہے: قد ردّ علی عقبیه۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تعقب بالشر بعد الخیر (وہ خیر اور بھلائی کے بعد شر کی طرف واپس لوٹا)۔ یہ اصل میں العاقبۃ اور العقبیٰ سے ماخوذ ہے اور یہ دونوں اس شی کے لیے (بولے جاتے) ہیں جو کسی شی کے پیچھے ہو اور واجب ہے کہ وہ اس کی اتباع اور پیروی میں ہو۔ اور اسی سے والعاقبۃ للمتقین ہے اور اسی معنی میں عقب الرجل (پاؤں کی ایڑی) بھی ہے اور اسی سے العقوبۃ ہے، کیونکہ وہ (سزا) گناہ کے پیچھے ہوتی ہے اور گناہ کے سبب ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: كَالَّذِي اس میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ یعنی جنوں نے اسے گمراہ کر دیا اور انہوں نے اس کی خواہش کو آراستہ اور مزین کیا اور اسے اس کی طرف دعوت دی۔ کہا جاتا ہے: ھوی یھوی الی الشیء کسی شے کی طرف انتہائی تیزی سے بڑھنا۔ اور زجاج نے کہا ہے: ھوی یھوی سے ماخوذ ہے اور یہ ھوی النفس سے ماخوذ ہے۔

یعنی شیطان نے اس کے لیے اس کی خواہش کو آراستہ کیا اور جماعت کی قرأت استھوتہ ہے یعنی ھوت بہ (جنات نے اسے بھٹکا دیا) یہ قرأت جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر ہے۔ اور حمزہ نے جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر استھواہ الشیاطین

پڑھا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے استھواہ الشیطان مروی ہے اور حسن سے بھی مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابی کی قرأت میں ہے اور ائْتِنَا کا معنی تابعنا (تو ہماری پیروی کر) ہے۔

اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں بھی یدعونہ الی الھدی بَیِّنا ہے اور حسن سے بھی استھوتہ الشیاطون مروی ہے۔ حیران حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث حیریٰ ہے جیسا کہ سکران کی مونث سکریٰ اور غضبان کی مونث غضبیٰ ہے۔ اور حیران وہ ہوتا ہے جو اپنے معاملے کی جہت کی رہنمائی نہیں پا سکتا۔ اور حار یحار حیرا و حیرۃ و حیرورۃ کا معنی ہے تردد (مضطرب اور متردد ہونا) اور اسی وجہ سے وہ پانی جو متغیر ہو کر زرد رنگ ہو جائے اور اس کے باہر نکلنے کا راستہ (سوراخ) نہ ہو اس کا نام حائر رکھا گیا ہے اور اس کی جمع حوران ہے۔ اور الحائر وہ جگہ جس میں پانی متغیر اور متردد ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تخطو علی بردیتین غذاھما غدق بساحۃ حائر یعبوب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بت کی پوجا کرنے والے کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جسے کوئی جن بلاتا ہے اور وہ اس کی پیروی میں چل پڑتا ہے اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ اس نے اسے انتہائی گمراہ کن اور ہلاکت والی جگہ میں پھینک دیا ہوتا ہے، اور پھر وہ اسی کی مصیبت اور تکلیف میں سرگرداں رہتا ہے(1)۔ اور ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت حضرت عبدالرحمن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنے والدین کو کفر کی دعوت دیتے تھے اور ان کے والدین اور مسلمان انہیں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى کا یہی معنی ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے تھے۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: ان کی والدہ ام رومان بنت حارث بن غنم کنانیہ تھی اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حالت کفر میں اپنی قوم کے ہمراہ بدر واحد (کے میدان) میں حاضر ہوئے اور دعوت مبارزت دی اور ان کے مقابلے کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ان کے والد محترم (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) ان کی طرف بڑھے اور یہ ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: متعنی بنفسك (مجھے اپنی ذات سے فائدہ پہنچاؤ) پھر وہ (عبدالرحمن) اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا اور وہ صلح حدیبیہ کے وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں تھے۔ یہ اہل سیر کا قول ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ان کا نام عبدالکعبہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بدل کر عبدالرحمن رکھ دیا اور وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔

اور کہا جاتا ہے کہ نسل در نسل چار افراد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پایا، یعنی باپ ہو اور اس کے بیٹے ہوں سوائے حضرت ابو قحافہ، ان کے صاحبزادے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر اور ان کے بیٹے ابو عتیق محمد بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہم کے۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 329

قولہ تعالیٰ: وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ، لِنُسْلِمَ پر لام، لام کی ہے، یعنی اُمِرْنَا کی نسلم و بأن اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (ہمیں حکم دیا گیا ہے تا کہ ہم گردن جھکا دیں اور اس کے بارے میں کہ نماز صحیح صحیح ادا کرو) کیونکہ حروف اضافت میں سے بعض کو بعض پر عطف کیا جاتا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أمرنا بأن نسلم (ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں) کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمرتك لتذهب، وبأن تذهب دونوں کا معنی ایک ہے(1) (میں نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو چلا جا)

نحاس نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن بن کیسان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ لام جارہ ہے۔ اور کل لام تین قسم کے ہیں: لام خفض (لام جارہ) لام امر اور لام توکید، کوئی لام ان تین قسموں سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام کا معنی اخلاص ہے (یعنی مخلص ہونا)۔

اور اقامة الصلوٰة کا معنی ہے نماز ادا کرنا اور اس پر دوام اختیار کرنا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ کا معنی پر عطف ہو، یعنی یدعونه الى الهدى ويدعونه أن اقيموا الصلاة (وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں ہدایت کی طرف اور وہ اسے بلا رہے ہوتے ہیں کہ صحیح صحیح نماز ادا کرو) کیونکہ ائْتِنَا کا معنی ہے أن ائتنا۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور اسی طرح وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بھی ہے یعنی وہی وہ ذات ہے جس کے لیے واجب ہے کہ اس کی عبادت کی جائے نہ کہ بت اور بِالْحَقِّ کا معنی بكلمة الحق ہے (یعنی کلمہ حق کے ساتھ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا) اور اس سے مراد اس کا قول کن ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ اور یاد کرو اس دن کو جس دن وہ کہے گا: تو ہو جا یا تم اس دن سے ڈرو جس دن وہ كُنْ کہے گا یا اس دن کا اندازہ کرو جس دن وہ كُنْ کہے گا۔ (یعنی اس یوم سے پہلے اذکر یا اتقوا یا قدر فعل محذوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عطف وَ اتَّقُوْهُ کی ہاء پر ہے۔ فراء نے کہا ہے: كُنْ فَیَكُوْنُ کہا جاتا ہے یہ صور کے لیے خاص ہے۔ یعنی ويوم يقول للصور كن فيكون (جس دن وہ صور کو کہے گا تو ہو جا تو وہ ہو جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ لوگوں میں سے جن کی موت کا اور جن کی حیات کا ارادہ فرمائے وہ سب ہو جاتا ہے۔ اور ان دونوں تاویلوں کی بنا پر قَوْلُهُ الْحَقُّ مبتدا اور خبر ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قول باری قَوْلُهُ الْحَقُّ کے سبب مرفوع ہے، یعنی وہ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں وہ حکم دیتا ہے اور الْحَقُّ اس کی نعت ہے اور اس بناء پر مکمل معنی اس طرح ہوگا: فَیَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ۔

اور ابن عامر نے فَیَكُوْنُ نصب کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ حساب اور بعث بعد الموت کی سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے اور سورۃ البقرہ میں اس پر مکمل بحث گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ یعنی اس کی بادشاہی ہوگی جس دن صور میں پھونکا جائے گا یا اس کا حق ہوگا جس دن صور

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 339

میں پھونکا جائے گا (یعنی تقدیر عبارت یہ ہے ولہ الملك يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ او ولہ الحق يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ (یوم) یوم یقول سے بدل ہے (1)۔ اور صور نور کا ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ فنا کے لیے ہوگا اور دوسرا اٹھانے اور زندہ کرنے کے لیے (2) اور یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے گمان کیا ہے، یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) میں پھونکا جائے گا جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے" ...... پھر صور میں پھونکا جائے گا اور اسے کوئی بھی نہیں سنے گا مگر وہ گردن کو جھکائے گا اور گردن کو اٹھالے گا ...... فرمایا ...... اور پہلے پہلے جو آدمی اسے سنے گا وہ اپنے اونٹ کے حوض کو مٹی کا لیپ کررہا ہوگا ...... فرمایا ...... پس وہ مر جائے گا اور لوگ بھی مر جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ بھیجے گا ...... یا فرمایا اللہ تعالیٰ نازل فرمائے گا ...... بارش جو شبنم کی طرح ہوگی اور اس سے لوگوں کے جسم اگ پڑیں گے پھر صور میں دوسری بار پھونکا جائے گا تب وہ کھڑے ہوکر دیکھنے لگیں گے" (3) آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور قرآن کریم میں بھی اسی طرح ہے ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى (الزمر: 68) یہاں فیھا نہیں فرمایا، تو اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ صورۃ کی جمع نہیں ہے اور تمام امتوں کا اس پر اجماع ہے کہ صور میں حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ ابوالہیثم نے کہا ہے: جو کوئی صور کے سینگ ہونے کا انکار کرے تو وہ اس کی طرح ہے جو عرش، میزان اور پل صراط کا انکار کرتا ہے اور ان کی تاویلات تلاش کرتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: وہ صور جس کا ذکر حدیث طیبہ میں ہے وہ سینگ کی مانند ہے اسی میں پھونکا جائے گا، اور صور صورۃ کی جمع ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: صور سینگ ہے۔ راجز کا قول ہے:

لقد نطحناهم غداة الجمعين نطحا شديدا لا كنطح الصورين

اور اسی معنی میں یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (النمل: 87)

کلبی نے کہا ہے: میں نہیں جانتا وہ صور کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ صورۃ کی جمع ہے جیسا کہ بسرۃ اور بسر ہے۔ یعنی مردوں کی صورتوں (جسموں) اور ارواح میں پھونکا جائے گا۔ اور حسن نے يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوَرِ پڑھا ہے، اور صور میں ایک لغت صاد کے کسرہ کے ساتھ صِور بھی ہے یہ صورۃ کی جمع ہے اور اس کی جمع صوار ہے، اور اس میں ایک لغت صیار یا کے ساتھ بھی ہے۔ اور عمرو بن عبید نے کہا ہے: عیاض نے پڑھا ہے يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوَرِ اور اس سے مراد خلق ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس نے کہا ہے اس آیت میں صور سے مراد صورۃ کی جمع ہے وہ ابوعبیدہ ہے۔ اگرچہ اس کا احتمال ہے لیکن یہ کتاب وسنت کے ساتھ مردود ہے اور یہ بھی کہ دوبارہ زندہ کرنے کے لیے صور میں دوبار نہیں پھونکا جائے گا، بلکہ اس میں ایک بار پھونکا جائے گا، پس حضرت اسرافیل علیہ السلام اس صور میں ایک بار پھونکیں گے جو کہ سینگ ہے اور اللہ تعالیٰ جسموں کو زندہ فرمادے گا۔

اور قرآن کریم میں ہے: فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم: 12)

---

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 57 2۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الزمر، حدیث نمبر 3167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6555

قولہ تعالیٰ: عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اس میں عالم، الَّذِیْ کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے وہ عالم الغیب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (عالم الغیب) اپنے سے پہلے مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر مرفوع ہو۔ اور بعض سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے ینفخ پڑھا ہے تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ اس کا فاعل عٰلِمُ الْغَیْبِ ہو، کیونکہ جب اس میں پھونک اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھی ماری جائے گی تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ عالم معنی پر محمول کرتے ہوئے مرفوع ہو جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لیبك یزید ضارع لخصومة

حسن اور اعمش نے عالم کو لہ کی ہا سے بدل بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

''اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے: کیا تم بناتے ہو بتوں کو خدا، بے شک میں دیکھتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اس بارے میں علماء نے کافی کلام کیا ہے، پس ابوبکر محمد ابن محمد بن حسن جوینی شافعی اشعری نے ''النکت'' میں اس کی تفسیر میں کہا ہے: لوگوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح ہے۔ اور جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا نام آزر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک آزر ان کی لغت میں عیب اور برائی ہے گویا کہ یہ فرمایا: اور یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: یا مخطی (اے خطا کرنے والے) اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو) اور جب معنی اس طرح ہو تو اسے مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آزر بت کا نام ہے اور جب معنی یہ ہو تو یہ محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے فعل مضمر ہوگا، گویا کہ اس طرح کہا: واذ قال ابراھیمُ لِأبیه أتتخذُ آزرَ الٰھا، أتتخِذُ أصناما آلهة (جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو کہا: کیا تم آزر کو الٰہ بنا رہے ہو)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس اتفاق کا دعویٰ کیا ہے اس پر اجماع نہیں ہے۔ پس محمد بن اسحاق، کلبی اور ضحاک نے کہا ہے: بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر ہے اور وہی تارح ہے، جیسا کہ اسرائیل اور یعقوب ہیں۔ (میں کہتا ہوں) پس یہ دونوں نام اسی کے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: آزر لقب ہے اور تارح نام ہے اور اسے ثعلبی نے ابن اسحاق قشیری سے بیان کیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ حسن نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر تھا۔ اور سلیمان التیمی نے کہا ہے: یہ گالی اور عیب ہے اور ان کے کلام میں اس کا معنی ہے وہ جو ٹیڑھا ہو (یعنی بداخلاق ہو)۔

معتمر بن سلمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ کلمہ انتہائی عیب اور بدخلقی پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہ شدید ترین کلمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے کہا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: آزر کا معنی ہے انتہائی پیر فرتوت (بہت بوڑھا)۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ ان کی لغت میں صفت ذم ہے، گویا کہ آپ نے کہا: اے خطا کرنے والے (یعنی یا مخطئ) یہ اس کے مرفوع ہونے کے مطابق ہے اور جنہوں نے اسے مجرور پڑھا ہے اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہوگی: واذ قال ابراهيم لِأبيه المُخطِئ (اور جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خطا کرنے والے باپ کو کہا)۔ اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ اَفعل کے وزن پر ہے۔

نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: آزر عجمی اسم ہے، اور یہ آزَرَ فلان فلانا سے مشتق ہے اس کا معنی ہے إذا عاونه (جب کوئی دوسرے کی مدد کرے) اور وہ بتوں کی عبادت پر اپنی قوم کی مدد اور معاونت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ القوة سے مشتق ہے۔ اور الأزر کا معنی قوت ہے۔ یہ ابن فارس سے منقول ہے۔ اور مجاہد اور یمان نے کہا ہے: آزر بت کا نام ہے اور یہ اس تاویل میں محل نصب میں ہے، تقدیر کلام ہوگی: أَتَتَّخِذُ آزَرَ إِلٰهًا (کیا آپ بت کو الٰہ بنا رہے ہیں) أَتَتَّخِذُ أصناما اور یہ قول بھی ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیر کلام ہے: اتتخذ آزر اصناما۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر آزر اسم جنس ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ثعلبی نے کتاب ''العرائس'' میں کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ باپ جس کا نام اس کے باپ نے تارح رکھا تھا، جب وہ نمرود کے ساتھ اس کے بت کدے کا بااختیار متولی بن گیا تو اس نے اس کا نام آزر رکھ دیا۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: بلاشبہ آزر آپ علیہ السلام کے باپ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو بت کا نام ہے اور آپ کا نسب اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بن تارح بن ناخور بن ساروع ابن اَرغو بن فالغ بن عامر بن شالخ بن اَرفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (1)۔

اور آزر میں کئی قراءتیں ہیں: أأزرًا یہ دو ہمزوں کے ساتھ ہے اس میں پہلا مفتوح اور دوسرا مکسور ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور آپ ہی سے أأزرًا دو مفتوح ہمزوں کے ساتھ بھی مروی ہے اور اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ آپ کی پہلی دونوں قراءتوں کے مطابق تَتَّخِذُ بغیر ہمزہ کے ہے۔

مہدی نے کہا ہے: أإزرًا؟ تو کہا گیا: بلاشبہ یہ بت کا نام ہے اور یہ أَتَتَّخِذُ إِزرًا کی تقدیر پر منصوب ہے اور اسی طرح أأزرًا بھی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ أأزرًا بنایا جائے اس بنا پر کہ یہ الأزر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے پیٹھ، پس یہ مفعول من أجله ہو جائے گا۔ گویا کہ یہ کہا: أَلِلقُوةِ تَتَّخِذُ أصناما (کیا قوت کا سبب تم بتوں کو بناتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ ازرًا معنی وزرًا (بوجھ) ہو، اور واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہو۔

قشیری نے کہا ہے: مشرکین پر حجت قائم کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بتوں کی عبادت کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 344

آپ کا اپنے باپ کا رد کرنے کا واقعہ ذکر کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرنے کے قریب تر لوگ عرب تھے، کیونکہ وہ آپ کی ذریت اور اولاد تھے (اور آیت میں اذ کہ فعل محذوف ہے) تقدیر کلام ہے: واذکر اذ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ (اور یاد کرو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) یا پھر ذکر محذوف ہے جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں مذکور ہے: ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے) اور تقدیر کلام ہوگی: وذکرہم اذ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ (اور یاد دلایئے جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے) اور آزر بھی پڑھا گیا ہے یعنی یا آزر، یہ منادی مفرد ہونے کی بنا پر ہے اور یہ حضرت ابی اور یعقوب وغیرہما کی قرأت ہے۔ اور یہ قرأت اس کے قول کو تقویت دیتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ہے: اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اس میں تَتَّخِذُ فعل کے دو مفعول ہیں اور فعل میں استفہام برائے انکار ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝۷۵

''اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی مَلَكُوْتَ بمعنی ملک (بادشاہی) ہے اور معنی صفت میں اظہار مبالغہ کے لیے واؤ اور تا کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اسی کی مثل رغبوت، رھبوت اور جبروت ہیں (1)۔ اور ابو السمال العدوی نے لام ساکن کے ساتھ مَلْکوت پڑھا ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک فتحہ کو خفیف ہونے کی بنا پر حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ اور شاید یہ اس میں ایک لغت ہے اور نُرِیْ بمعنی اُرِینا ہے، پس یہ ماضی کے معنی میں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آسمانوں میں ملائکہ کی عبادت اور دیگر عجائب قدرت (کا دکھانا) ہے اور زمین میں اولاد آدم کی عصیاں شعاری (دکھانا) ہے، پس آپ جسے گناہ اور نافرمانی کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کے لیے بددعا کرتے تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے ابراہیم! میرے بندوں سے رک جا، (یعنی ان کی ہلاکت کی دعا نہ کیا کر) کیا تم جانتے نہیں کہ میرے اسماء میں سے الصبور (بہت زیادہ صبر کرنے والا) بھی ہے؟ اسی کے ہم معنی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آسمانوں اور زمین کو ظاہر فرما دیا یہاں تک کہ عرش اور سب سے نیچے والی زمین کو بھی۔ اور ابن جریج نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: آپ علیہ السلام کے لیے ساتوں آسمان کھول دیئے گئے تو آپ نے ان کی طرف دیکھا یہاں تک کہ آپ کی نظر عرش تک پہنچ گئی اور آپ علیہ السلام کے لیے زمینوں کو کھول دیا گیا اور آپ نے ان کی طرف دیکھ لیا (3) اور آپ نے جنت میں اپنا محل بھی ملاحظہ فرمایا۔

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 265

2۔ تفسیر الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 24

3۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 449۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 349

پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا (العنکبوت: 27) (اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جانثاری) کا اجر اس دنیا میں) یہ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان کی بادشاہی میں سے وہ دکھائی جو کچھ اس نے ستاروں کے بارے بیان کیا ہے اور زمین کی بادشاہی میں سے سمندر، پہاڑ اور درخت دکھائے اور اسی طرح کی چیزوں کے بارے استدلال کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے اور فرمایا: جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کو تہہ خانہ میں رکھا گیا اور آپ کا رزق آپ کی انگلیوں کی اطراف (پوروں) میں رکھ دیا گیا پس آپ انہیں چوستے رہتے تھے، نمرود لعین نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ اس کی بادشاہی اس بچے کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی جو ابھی پیدا ہوگا، تو اس نے مردوں کو عورتوں سے الگ رہنے کا حکم دے دیا۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اس نے پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ آزر نمرود کے مقربین میں سے تھا اس نے اسے ایک دن اپنے کسی کام کے لیے بھیجا تو اس دوران اس نے اپنی بیوی سے مجامعت کر لی اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حاملہ ہوگئی۔

اور یہ قول بھی ہے: بلکہ اس نے بت خانہ میں اس کے ساتھ مجامعت کی اور وہ حاملہ ہوگئی اور اسی وقت اس کے سامنے بت گر گئے، پس اس نے اسے ایک قبیلے میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنم دیا، اور آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے زمین میں ایک تہہ خانہ کھودا اور اس کے دروازے پر ایک چٹان رکھ دی تا کہ درندے اسے پھاڑ نہ دیں۔ آپ کی ماں آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور دودھ پلا دیتی تھی اور وہ انہیں اپنی انگلیاں چوستے ہوئے پاتی تھیں، ان میں ایک میں شہد تھا، ایک میں پانی تھا اور ایک میں دودھ آتا تھا، اور آپ نشوونما پاتے گئے، پس آپ ایک سال کی عمر میں تین سال کے لگتے تھے۔ پس جب اس نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا تو لوگوں کو اس سے وہم ہوا کہ یہ تو دو سال قبل پیدا ہوئے، تو آپ نے اپنی ماں سے پوچھا: میرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: میں۔ پھر آپ نے پوچھا: تیرا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تیرا باپ۔ آپ نے پھر سوال کیا: اس کا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا: نمرود۔ آپ نے پھر کہا: اور اس کا رب کون ہے؟ تو اس نے آپ کو تھپڑ دے مارا اور وہ جان گئی کہ یہی وہ بچہ ہے جس کے ہاتھوں ان کی بادشاہی ختم ہو جائے گی۔

امام کسائی کی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں یہ مکمل قصہ موجود ہے اور قصص میں اسی کتاب کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ کا مولد حران ہے لیکن آپ کے باپ نے آپ کو سرزمین بابل کی طرف منتقل کر دیا۔ اور اسلاف میں سے عام اہل علم نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بن کنعان بن سنحاریب بن کوش بن سام بن نوح کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ طوفان نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے درمیان ایک ہزار دو سو تریسٹھ برس کا فاصلہ تھا۔ اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے تین ہزار تین سو تئیس برس بعد تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ہم نے انہیں ملکوت دکھائے تا کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

**فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝**

"پس جب چھا گئی ان پر رات (تو) دیکھا انہوں نے ایک ستارا بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا (تو) بولے میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ یعنی جب رات نے اسے اپنی تاریکی کے ساتھ ڈھانپ لیا، الجَنَّة، الجِنة، الجُنة، الجنین، المِجَنّ اور الجن تمام الفاظ بمعنی ستر (ڈھانپنا) ہیں اور جنان اللیل کا معنی رات کا سخت تاریک ہونا اور اس کا ڈھانپ لینا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

دلولا جنانُ اللیل أدرك رکضنا بذی الرمث والأرطی عیاض بن ناشب

اور کہا جاتا ہے: جنون اللیل بھی اسی معنی میں ہے۔ اور کہا جاتا ہے: جنة اللیل واجنه اللیل (رات نے اسے ڈھانپ لیا) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (1)

رَاٰ كَوْكَبًا یہ دوسرا قصہ ہے اور یہ آپ پر ملکوت پیش کرنے کے قصہ کے سوا ہے۔ کہا گیا ہے: آپ نے اس چٹان کو شق ہوتے دیکھا جو آپ کے تہہ خانہ کے منہ پر رکھی ہوئی تھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ جب آپ کے باپ نے آپ کو تہہ خانہ سے نکالا وہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا تو آپ نے اونٹ، گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور فرمایا: ان کے لیے رب کا ہونا ضروری ہے اور آپ نے مشتری یا زہرہ کو دیکھا، پھر چاند کو دیکھا اور سورج کو اور یہ سب مہینے کے آخر میں ہوا۔ اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس تھی اور سترہ برس عمر ہونے کا قول بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نمرود پر غالب آئے اس وقت آپ کی عمر سترہ برس تھی۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هٰذَا رَبِّيْ اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں اور کہا گیا ہے: آپ کا یہ قول نظر و فکر کی مہلت، عہد طفولیت میں اور حجت قائم ہونے سے پہلے کی حالت میں تھا۔ اور اس حال میں نہ کفر ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان (2)۔ یہ قول کرنے والوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کی سند سے مروی ہے۔ فرمایا: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ تو آپ نے اس کی پوجا کی یہاں تک کہ وہ آپ سے غائب ہو گیا۔

اور اسی طرح سورج اور چاند کا واقعہ بھی ہے، پس جب آپ کی نظر و فکر مکمل ہو گئی تو آپ نے کہا: اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ بلاشبہ میں تو اس سے بری ہوں جسے تم شریک ٹھہراتے ہو۔ اور آپ نے اس کے غروب اور متغیر ہونے سے استدلال کیا، کیونکہ یہ حدوث پر انتہائی ظاہر اور واضح علامت و نشانی ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول ہو اس پر اوقات میں سے کوئی ایسا وقت آئے مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنے والا اور اسے پہچاننے والا ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکر یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا وہم اس کے بارے کیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے اس سے بچا لیا ہے اور اس سے پہلے ہی اس کی ہدایت اور رہنمائی فرما دی ہے اور اسے اپنی بادشاہی دکھا دی ہے تاکہ وہ کامل

1۔ صحاح مادہ جنن
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 360

یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے (1)۔ یہ جائز نہیں ہے کہ اسے معرفت سے خالی تصور کیا جائے بلکہ اس نے پہلی نظر میں رب کریم کا عرفان حاصل کر لیا۔

زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ جواب غلط ہے اور جس نے یہ کہا ہے اس نے غلطی کی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا: وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿۳۵﴾ (ابراہیم) (اور بچالے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی) اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۴﴾ (الصافات) (جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہیں کیا۔

زجاج نے کہا: میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ انہوں نے کہا: (کیا) تمہارے قول کے مطابق یہ میرا رب ہے؟ کیونکہ وہ بتوں، سورج اور چاند کی عبادت کرتے تھے۔ اور اسی قول کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ (القصص: 62) (میرے شرکاء کہاں ہیں) حالانکہ وہ تو وحدہ لاشریک ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے: تمہارے قول کے مطابق جو میرے شریک ہیں وہ کہاں ہیں؟ این شرکائی علی قولکم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تہہ خانے سے نکلے تو آپ نے ستارے کی روشنی دیکھی اور آپ اپنے رب کے طالب تھے، تو آپ کو گمان ہوا کہ یہ نور اور روشنی اسی کی ہے، تب آپ نے یہ کہا: ھٰذَا رَبِّیۡ یعنی وہ مجھے اپنا نور دکھا رہا ہے۔ فَلَمَّاۤ اَفَلَ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے جان لیا کہ یہ ان کا رب نہیں ہے۔ فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا پھر جب آپ نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا اور اس کی روشنی پر آپ کی نظر پڑی۔

قَالَ ھٰذَا رَبِّیۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنۡ لَّمۡ یَہۡدِنِیۡ رَبِّیۡ لَاَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّیۡنَ (تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی گمراہ قوم سے) پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ اور یہ شرک نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ نے اس روشنی اور نور کی نسبت اپنے رب کی طرف کی ہے، لیکن جب آپ نے اسے زائل ہوتے ہوئے دیکھا تو علم نے آپ کی رہنمائی کی کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، تو آپ نے اپنے دل سے اس کی نفی کر دی اور یہ یقین کر لیا کہ یہ مربوب ہے رب نہیں ہے۔

اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ آپ نے ھٰذَا رَبِّیۡ کے الفاظ اپنی قوم پر حجت پختہ کرنے کے لیے کہے، پس (پہلے) آپ نے ان کے ساتھ موافقت ظاہر کی، لیکن جب ستارہ ڈوب گیا تو حجت مکمل اور پختہ ہو گئی اور فرمایا: جو شی متغیر ہو جائے وہ رب نہیں بن سکتی۔ اور وہ لوگ ستاروں کی تعظیم بجالاتے تھے، ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کے ساتھ حکم لگاتے تھے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں حسین ترین قول وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح مروی ہے۔ انہوں نے قول باری تعالیٰ: نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ (النور: 35) کے بارے کہا ہے: اسی طرح بندہ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 359

اور اس پر اپنے دل سے استدلال کرتا ہے اور جب وہ اسے پہچان لیتا ہے تو وہ نور پر نور کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور اس پر اپنے دلائل سے استدلال کیا، تو آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ کا رب اور خالق ہے، پھر جب اللہ عزوجل نے اپنی ذات کے بارے میں آپ کو عرفان عطا فرمایا تو معرفت میں اور اضافہ ہو گیا، تب آپ نے فرمایا: اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ (کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دے دی ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول ان کے فعل اور عمل کا انکار کرتے ہوئے استفہام اور زجر و توبیخ کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے: أهَذَا رَبِّي کیا یہ میرا رب ہے یا کیا اس کی مثل رب ہو سکتا ہے؟ پھر ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ (الانبیاء: 34) یعنی أفهم الخالدون۔ اور ہذلی نے کہا ہے:

رَفَوْنِي وقالوا يَا خُوَيلد لَا تَرَعْ ... فقلتُ وأنكرتُ الوجوهَ هُم هُم

ایک دوسرے نے کہا ہے:

لعمرُك ما أدري وإنْ كنتَ دَارِيًا ... بسبعٍ رمين الجمر ام بثمان

(دونوں شعروں میں ہمزہ استفہام محذوف ہے)

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: هَذَا رَبِّي عَلَى زَعْمِكُمْ (تمہارے گمان کے مطابق یہ میرا رب ہے)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ (القصص) (کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے۔) اور مزید فرمایا: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان) ای عِنْدَ نَفْسِكَ (یعنی اپنے نفس کا ذائقہ چکھ) (لو چکھو، تم بڑے معزز و مکرم ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور تم کہتے ہو یہ میرا رب ہے۔ اس میں قول کو مضمر کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں قول کا اضمار کثیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ هٰذَا رَبِّیْ میں یہ معنی ہے ای هذا دلیلٌ عَلَى رَبِّي (یہ میرے رب پر دلیل ہے)

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ﴿۷۷﴾

"پھر جب دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا: اگر نہ ہدایت دیتا مجھے میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی اس گمراہ قوم سے"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا۔ کہا جاتا ہے: بَزَغَ الْقمرُ جب چاند طلوع ہونا شروع ہو اور البزغ کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے، گویا چاند اپنے نور کے ساتھ تاریکی اور اندھیرے کو پھاڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے ہے بَزَغَ البَيْطار الدابة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب سالوتری جانور کا خون بہادے۔

لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ یعنی اگر وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم نہ رکھتا۔ حالانکہ آپ ہدایت یافتہ تھے۔ تو یہ نظر و فکر کی مہلت

میں جاری ہوسکتا ہے یا آپ نے جواز عقلی کے امکان کے سبب ثابت قدمی کا سوال کیا، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا ہے: وَمَا يَكُونُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (اعراف: 89) (اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ۔)

اور قرآن کریم میں ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

''پھر جب دیکھا سورج کو جگمگاتے ہوئے (تو) بولے (کیا) یہ میرا رب ہے؟ یہ تو ان سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا (تو) آپ نے فرمایا: اے میری قوم! میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً، بَازِغَةً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کیونکہ یہ آنکھ کی رؤیت ہے (1)۔ بَزَغَ يَبْزُغُ بزوغاً کا معنی ہے جب وہ طلوع ہوا۔ اور أَفَلَ يَأْفِلُ أفولاً کا معنی یہ ہے جب وہ غروب ہوا۔

اور فرمایا: هٰذَا اور الشَّمْسَ مونث ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَفَلَتْ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ شمس کی تانیث اس کی تفخیم اور اس کی عظمت کے سبب ہے۔ اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: رجل نسابة و علامة اور کہا: هٰذَا رَبِّيْ اس کا معنی ہے: هذا الطالع ربی (کیا یہ طلوع ہونے والا میرا رب ہے)۔ کسائی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: هذا الضوء (کیا یہ روشنی میرا رب ہے)۔ ابو الحسن علی بن سلیمان نے کہا ہے: ای هذا الشخص (کیا یہ شخص میرا رب ہے)، جیسا کہ اعشی نے کہا:

قامت تبکیه علی قبره من لی من بعدك یا عامرُ
ترکتنی فی الدار ذا غُرْبَةٍ قد ذَلّ من لیس له ناصرُ

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

''بے شک میں نے پھیر لیا ہے اپنا رخ اس ذات کی طرف جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو یکسو ہو کر اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ یعنی میں نے اپنی عبادت اور توحید سے اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کا قصد کیا۔

آیت میں الوجہ کا ذکر کیا کیونکہ چہرہ ان اعضاء میں سے زیادہ ظاہر ہے جن سے انسان پہچانا جاتا ہے۔ حَنِيْفًا اس کا معنی ہے حق کی طرف مائل ہوتے ہوئے۔ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ ما کا اسم اور خبر ہے۔ اور جب تو وقف کرے تو کہے: أنا تو تو نے بیان حرکت کے لیے الف کا اضافہ کر دیا اور یہی صحیح لغت ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں:

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 77

أن۔ اور کسائی نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: أنہ یہ تین لغات ہیں۔

اور حالت وصل میں تین لغات ہیں کہ درج کلام میں الف کو حذف کر دیا جائے، کیونکہ یہ حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے زائد کیا گیا ہے۔ اور عربوں میں سے بعض حالت وصل میں الف کو ثابت رکھتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

أنَا سَیف العشِیرۃ فأعرفونی

اور یہی بعض بنی قیس اور ربیعہ کی لغت ہے۔ یہ فراء سے منقول ہے اور بعض عرب حالت وصل میں کہتے ہیں: آن فعلت، مثلاً عان فعلت، اسے کسائی نے بعض قضاعہ سے بیان کیا ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْــٴًـا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

''اور جھگڑنے لگی ان سے ان کی قوم، آپ نے کہا: کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے ہدایت دے دی ہے مجھے۔ اور نہیں ڈرتا میں ان سے جنہیں تم شریک بناتے ہو اس کا، مگر یہ کہ چاہے میرا ہی پروردگار کوئی تکلیف پہنچانا، گھیرے ہوئے ہے میرا رب ہر چیز کو (اپنے) علم سے تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ یہ جھگڑنے اور جدال کرنے پر دلیل ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں آپ سے جھگڑا کیا۔ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ نافع نے نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے نون کو مشدد پڑھا ہے۔ اور اس میں ابن عامر سے ہشام کی روایت مختلف ہے۔ جس نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہے: اس میں اصل دو نون ہیں۔ پہلی علامت رفع ہے اور دوسری فعل اور یا کے درمیان بطور فاصلہ ہے، پس جب فعل میں دو ہم مثل حرف جمع ہو گئے اور وہ ثقیل ہو گئے تو ایک نون کو دوسری میں ادغام کر دیا گیا چنانچہ تشدید واقع ہو گئی اور واؤ کو مد کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے تاکہ التقائے ساکنین نہ ہو، ایک واؤ اور دوسرا مشدد حروف میں سے پہلا۔

پس یہ مد دو ساکنوں کے درمیان فاصلہ ہو گئی۔ اور جنہوں نے تخفیف کی ہے انہوں نے اجتماع مثلین کو خفیف سمجھتے ہوئے دوسرے نون کو حذف کر دیا ہے اور پہلی کو حذف نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ رفع کی علامت ہے۔ اور اگر اسے حذف کر دیا جائے تو مرفوع، مجزوم اور منصوب کے ساتھ مشتبہ ہو جائے گا۔ اور ابو عمرو ابن العلاء سے بیان کیا گیا ہے کہ قرأت غلط ہے۔ اور سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: انہوں نے تضعیف (مضاعف) کو ثقیل سمجھا ہے۔ اور شعر بھی کہا ہے:

تراہ کالثَغَامِ یُعَلُّ مِسْکًا یَسوء الفالِیاتِ إذا فَلَیْنِی

قولہ تعالیٰ: وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖ یعنی کیونکہ وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

اور انہوں نے آپ کو اپنے الہوں کی کثرت کے سبب خوفزدہ کیا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دے اور اسے قدرت دے دے تو اس وقت اسے اس کے ضرر اور نقصان کا خوف ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْــٴًـا کا یہی معنی ہے۔ یعنی مگر یہ کہ میرا رب ہے کہ وہ مجھے گناہ کے بدلے کوئی

تکلیف دہ شے اور مصیبت لاحق کرے، جس کے مطابق میں نے عمل کیا تو اس کی مشیت مکمل ہوگئی۔ یہ استثنا ہے یہ پہلے کلام میں سے نہیں ہے۔ اور بہ میں ہا ضمیر میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ معبود کے لیے ہو اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا کہ میں ان سے خوفزدہ ہوں، پھر فرمایا: وَسِعَ رَبِّیۡ كُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا یعنی اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ كَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَكۡتُمۡ وَ لَا تَخَافُوۡنَ اَنَّكُمۡ اَشۡرَكۡتُمۡ بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَیۡكُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَ هُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

''اور کیسے ڈروں میں (ان سے) جنہیں تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے حالانکہ تم نہیں ڈرتے (اس سے) کہ تم نے شریک بنایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسے کہ نہیں اتاری اللہ نے اس کے متعلق تم پر کوئی دلیل تو (تم ہی بتاؤ) دونوں فریقوں سے کون زیادہ حق دار ہے امن (وسلامتی کا) اگر تم (کچھ) جانتے ہو؟ وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لیے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَكۡتُمۡ یہاں كَیۡفَ میں انکار کا معنی ہے۔ یہ ان پر اس بات کا انکار ہے کہ وہ اسے بتوں سے ڈرا سکتے ہیں، حالانکہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، یعنی میں کیسے ڈروں ان سے جو مردہ ہیں، حالانکہ تم اس اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جو ہر شے پر قادر ہے۔

مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَیۡكُمۡ سُلۡطٰنًا اس میں سلطان کا معنی حجت اور دلیل ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ یعنی دونوں فریقوں میں سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن وسلامتی کا کون زیادہ حق دار ہے؟ کیا موحد یا مشرک۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اس میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت سلمان اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول میں سے ہے، جیسا کہ عالم سوال کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا قول ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے ساتھ جواب دیا جو ان پر حجت اور دلیل ہے۔ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔

اور صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر یہ خاصی شاق گزری، وہ کہنے لگے: ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟ تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایسا نہیں جس طرح تم گمان کر رہے ہو بلکہ یہ تو اس طرح ہے جیسے لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) (اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ

بنانا، یقیناً شرک ظلم عظیم ہے) وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ اور وہی دنیا میں ہدایت یافتہ ہیں۔(1)

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝۸۳

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں۔ ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ اس میں تلك آپ کے تمام دلائل کی طرف اشارہ ہے، یہاں تک کہ آپ نے ان کے ساتھ جھگڑا کیا اور آپ دلیل کے ساتھ ان پر غالب رہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا یہ قول ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آپ کی ان کے خلاف وہ دلیل ہے کہ جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا آپ ڈرتے نہیں اس سے کہ ہمارے الہٰ آپ کو ہلاک کر دیں گے اس لیے کہ آپ انہیں سب وشتم کرتے ہیں؟ تو آپ نے ان کو جواب دیا: کیا تم ان سے ڈرتے نہیں جب کہ تم عبادت اور تعظیم میں چھوٹے اور بڑے کو مساوی قرار دیتے ہو، کہ بڑا غضب ناک ہو جائے گا اور وہ تمہیں ہلاک کر دے گا؟

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ یعنی ہم علم، فہم وفراست، امامت اور بادشاہی عطا فرما کر جس کے چاہتے ہیں درجات بلند فرما دیتے ہیں۔ قراء کوفہ نے درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل سورۂ یوسف میں بھی ہے انہوں نے فعل کو مَنْ پر واقع کیا ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے: ونَرْفَعُ مَنْ نَشَاءُ إِلَى دَرَجَاتٍ پھر الی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اہل حرمین اور ابو عمرو نے اضافت کی بنا پر بغیر تنوین کے پڑھا ہے، اس میں فعل درجات پر واقع ہے، اور جب درجات بلند کیے گئے تو صاحب درجہ کو بلند کر دیا گیا۔ اس قرأت کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ (غافر: 15) تقویت دیتا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَهُ (اے اللہ! اس کا درجہ بلند فرما) اس کے لیے باعث تقویت ہے، پس بلندی کی نسبت درجات کی طرف فرمائی۔ اور وہی ہے اس کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے (وہی) اپنے شرف وفضل میں رفیع اور بلند ہے۔ پس دونوں قرأتیں باہم متقارب ہیں، کیونکہ جس کے درجات بلند کر دیئے گئے تحقیق اسے بلند کر دیا گیا، اور جسے بلند کر دیا گیا تحقیق اس کے درجات بلند کر دیئے گئے۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ یعنی وہ ہر شی کو اس کے محل میں رکھتا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۸۴ وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰى وَ عِیْسٰى وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۸۵ وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ لقمان، باب لا تشرك باللہ، حدیث نمبر 4403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری

اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾

''اور ہم نے عطا فرمائے انہیں اسحاق اور یعقوب ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی تھی ان سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (راہ راست دکھائی) اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو۔ اور (ہم نے ہدایت دی) زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔ اور (ہدایت دی) اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ان سب کو ہم نے فضیلت دی سارے جہان والوں پر''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ یعنی ہم نے انہیں دین کے بارے میں استدلال کرنے (غلبہ پانے) اور دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کی جزا کے طور پر اسحاق اور یعقوب علیہما السلام عطا فرمائے۔

كُلًّا هَدَیْنَا یعنی ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ ہے۔ اور (ترکیب کلام میں) كُلًّا، هَدَیْنَا کی وجہ سے منصوب ہے اور نُوْحًا دوسرے هَدَیْنَا کے سبب منصوب ہے۔ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے اور طبری اور کئی دیگر مفسرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے مثلاً قشیری اور ابن عطیہ وغیرہ نے۔

اور پہلا قول زجاج نے کیا ہے، اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس ذریت میں حضرت یونس اور حضرت لوط علیہما السلام کو بھی شمار کیا گیا ہے اور وہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں حضرت لوط علیہ السلام آپ کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بھانجے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ تمام کے تمام انبیاء علیہم السلام ذریت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اگرچہ ان میں وہ بھی ہیں جو باپ اور ماں کی جہت سے ولادت کے اعتبار سے آپ کے ساتھ نہیں ملتے، کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے اور عرب چچا کو اب (باپ) ہی شمار کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے بارے خبر دی کہ انہوں نے کہا: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (البقرہ:133) (ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق کے خدا کی)

اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں شمار کیا گیا ہے، حالانکہ آپ ان کی بیٹی کے بیٹے (نواسے) تھے۔ اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اولاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد ہے اور اسی سے انہوں نے استدلال کیا ہے جن کی یہ رائے ہے کہ بیٹیوں کی اولاد اسم الولد (مراد لفظ الولد) میں داخل ہوتی ہے (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 317

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جس نے ولدہ و ولد ولدہ پر کچھ وقف کیا تو اس میں بیٹوں کی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد بھی نسل میں داخل ہوگی۔ اور اسی طرح جب کسی نے اپنے قرابت داروں کے لیے وصیت کی تو اس میں بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرابت سے مراد ہر ذی رحم محرم ہے۔ اور آپ کے نزدیک چچا کا بیٹا، پھوپھی کا بیٹا، ماموں کا بیٹا، خالہ کا بیٹا یہ بھی اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ محرم نہیں ہے۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قرابت کا اطلاق ہر ذی رحم محرم اور دوسروں پر ہے۔ پس آپ کے نزدیک نہ ابن العم ساقط ہوا اور نہ کوئی اور۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہ ہوگی۔ اور اس کا قول: لقرابتی و عقبی۔ اس کے قول لولدی و ولد ولدی کی طرح ہے۔ اس میں بیٹوں کی اولاد داخل ہوتی ہے اور اس کی جو باپ کے عصبہ اور صلب کی طرف راجع ہوتا ہے، اور اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں ہوتی۔ اس طرح کا بیان حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (النساء: 11) (حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں) اور مسلمانوں نے ظاہر آیت سے صرف صلبی اولاد اور خاص کر بیٹوں کی اولاد ہی سمجھا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى (الانفال: 41) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرابت داروں کو عطا فرمایا، ان میں سے آپ کے چچا ہیں نہ کہ آپ کے ماموؤں کی اولاد۔ پس اسی طرح بیٹیوں کی اولاد بھی نسب کے اعتبار سے آپ کی طرف منسوب نہیں ہوتی، اور نہ وہ لفظ اب میں آپ کے ساتھ ملیں گے۔ ابن القصار نے کہا ہے: جنہوں نے بیٹیوں کو اقارب میں داخل کیا ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے فرمایا: اِنَّ ابنِي هَذَا سَيِّد (بلاشبہ یہ میرا بیٹا سردار ہے) اور ہم کسی کو نہیں جانتے جو بیٹیوں کی اولاد کے بارے یہ کہنے سے روکتا ہو کہ وہ ان کی ماں کے باپ کی اولاد ہے۔ اور معنی اسی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ ولد، تولد سے مشتق ہے۔ اور وہ بالیقین ان کی ماں کے باپ سے متولد ہیں۔ اور ماں کی جہت سے متولد ہونا باپ کی جہت سے متولد ہونے کی طرح ہے۔ اور اس پر قرآن کریم بھی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آپ کی ذریت میں سے بنایا گیا ہے، حالانکہ وہ آپ کی بیٹی کے بیٹے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ان اسماء میں سے جو غیر منصرف ہیں ان کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے اور داؤد منصرف نہیں، کیونکہ عجمی اسم ہے، اور جب یہ فاعول کے وزن پر ہو تو اس میں الف لام لگانا اچھا نہیں ہوتا لہٰذا یہ منصرف نہیں۔ اور الیاس بھی عجمی اسم ہے۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اور قلبی نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے نواسے تھے۔

اعرج، حسن، اور قتادہ نے وَاِلْيَاسَ کو الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور اہل حرمین، ابو عمرو اور عاصم نے وَالْيَسَعَ کو لام مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا کوفیوں نے واللَّيسع پڑھا ہے۔ اور اسی طرح کسائی نے بھی قرأت کی

ہے اور اس کی قرأت کارد کیا ہے جس نے وَالْيَسَعَ پڑھا ہے۔ کہا: کیونکہ الیفعل نہیں کہا جا سکتا جیسا الیحیی نہیں کہا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: الیعمل اور الیحمد اور اگر یحییٰ کو نکرہ قرار دیا جائے تو پھر یقینا تو الیحیی کہے گا۔ اور ابو حاتم نے اس کارد کیا ہے جس نے اللَّيْسع پڑھا ہے اور کہا ہے: لَيْسع نہیں پایا جاتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ رد لازم نہیں آتا، کیونکہ کلام عرب میں حیدر اور زینب موجود ہے۔ اس میں حق بات یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے، اور عجمہ قیاس کے ذریعہ نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ سماعاً لیا جاتا ہے اور عرب کثرت سے تغیر و تبدل کرتے ہیں۔ اور ایک اسم کا دو لغتوں میں آنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: جس نے دو لاموں کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی اصل لَيْسع ہے، پھر اس پر الف لام تعریف کا داخل کر دیا گیا۔ اور اگر اس کی اصل یسع ہوتی تو پھر اس پر الف لام داخل نہ ہوتا، کیونکہ یہ (الف لام) یزید اور یشکر پر داخل نہیں ہوتا۔ یہ دونوں دو آدمیوں کے نام ہیں، کیونکہ یہ دونوں معرفہ اور علم ہیں۔ اور رہا لَيْسع تو یہ نکرہ ہے تو اس پر الف لام تعریف کے لیے داخل ہو سکتا ہے، اور ایک لام کے ساتھ قرأت کرنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اکثر قرأت اسی کے مطابق ہے۔ اور مہدوی نے کہا ہے: جس نے ایک لام کے ساتھ الیسع پڑھا ہے تو اس میں اسم یسع ہے، اور اس پر الف لام زائدہ داخل کر دیا گیا ہے جیسا کہ الخمسة عشر میں الف لام زائدہ ہے اور اسی طرح اس قول میں بھی ہے:

وجدنا اليزيد بن الوليد مباركاً      شديداً بأعباء الخلافة كاهلهُ

اس میں الیزید پر الف لام زائدہ ہے۔

اور انہوں نے فعل مضارع پر بھی الف لازم زائدہ داخل کیا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

فيستخرج اليربوع من نافقائه      ومن بيته بالشيخة اليتقصعُ

اس میں مراد الذی یتقصعُ ہے۔

قشیری نے کہا ہے: اسے لام کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور معنی ایک ہے، کیونکہ یہ ایک مشہور و معروف نبی علیہ السلام کا اسم گرامی ہے، جیسا کہ اسماعیل اور ابراہیم علیہما السلام، لیکن یہ ان اسماء سے خارج ہے جو الف لام داخل کرنے کے سبب اسماء عجمیہ ہیں۔ اور ایک قوم کو وہم ہوا ہے کہ الیسع الیاس علیہ السلام ہیں، حالانکہ اس طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے۔ اور وہب نے کہا ہے، الیسع صاحب الیاس تھے، اور یہ دونوں حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الیاس ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے دادا تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ الیاس ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نہیں، بلکہ حضرت الیسع حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

اور ''لوط'' عجمی اسم ہے اور اپنے خفیف ہونے کی بنا پر منصرف ہے۔ اس کا مادہ اشتقاق عنقریب سورۂ اعراف میں آئے گا۔

وَمِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''اور ہدایت دی ان کے کچھ باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کو اور ہم نے چن لیا ان (سب) کو

اور ہدایت دی ان (سب) کو راہ راست کی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اس میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی ہم نے ان کے باپ دادوں، ان کی اولاد اوران کے بھائیوں میں سے بعض کو ہدایت دی۔

وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں خالص کر دیا، اور یہ اہل لغت کے نزدیک بمعنی اِخترناھم (ہم نے انہیں چن لیا) ہے۔ یہ جَبَیْتُ الماءَ فی الحوض سے مشتق ہے یعنی میں نے پانی حوض میں جمع کر لیا۔ اور اجتباء کا معنی وہ شی ہے جسے تو چن رہا ہے اسے اپنے خواص کے ساتھ ملا رہا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: جَبَیْتُ الماء فی الحوض جبیا یہ مقصود ہے (یعنی میں نے پانی کو حوض میں بند کر دیا) اور الجابیہ کا معنی حوض ہے، جیسے کسی نے کہا:

کجابیۃ الشیخ العراقی تفھق

اور اصطفاء اور ھدایۃ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۸۸

''یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ جس کی چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتا ان سے وہ (عمل) جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا یعنی اگر وہ میرے سوا کسی کی عبادت کرتے تو یقیناً ان کے اعمال ضائع ہو جاتے، لیکن میں نے انہیں محفوظ رکھا، بچا لیا۔ حبوط کا معنی بطلان (باطل ہونا) ہے۔ اس کا بیان سورہ البقرہ میں گزر چکا ہے (1)۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَ كَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ۝۸۹

''یہ وہ لوگ تھے ہم نے عطا کی تھی جنہیں کتاب اور حکمت اور نبوت تو اگر انکار کریں اس کا یہ (مکہ والے) تو ہم نے مقرر کر دیئے ہیں اس کو ماننے کے لیے ایسے لوگ جو اس کے ساتھ سفر کرنے والے نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ترکیب کلام میں یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اور حکم کا معنی علم اور فقاہت ہے۔ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا تو اگر وہ ہماری آیات کا انکار کریں۔ هٰۤؤُلَآءِ آپ کے زمانے کے کفار اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ فَقَدْ وَ كَّلْنَا یہ جواب شرط ہے۔ یعنی تو ہم نے اس کے ساتھ ایمان لانے کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ مراد اہل مدینہ میں سے انصار ہیں اور اہل مکہ میں سے مہاجرین ہیں۔

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 455

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے بعد فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

ابورجاء نے کہا ہے: مراد ملائکہ ہیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ جن وانس اور ملائکہ میں سے ہر مومن کے لیے عام ہے۔ اور بِكٰفِرِيْنَ میں باز ائدہ ہے اور برائے تاکید ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۰

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہدایت دی تھی اللہ نے تو انہیں کے طریقے کی پیروی کرو۔ آپ فرمایئے: میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ قرآن) پر کوئی اجرت، نہیں ہے وہ (قرآن) مگر نصیحت سارے جہانوں کے لیے''

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اقتدا کا معنی ہے: طلبُ موافقةِ الغيرِ في فعلهِ کسی غیر کے فعل میں اس کی موافقت اور پیروی کرنا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اِصْبِرْ كَمَا صَبَرُوْا تم صبر کرو جیسے انہوں نے صبر کیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کا معنی ہے تم توحید اور احکام شرعیہ میں ان کی پیروی کرو، حالانکہ وہ احکام مختلف ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت سے ان انبیاء علیہم السلام کی شرائع کی پیروی اور اتباع واجب ہونے پر استدلال کیا ہے ان امور میں جن میں نص موجود نہیں۔

جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک آدمی کو زخمی کر دیا تو ان کا جھگڑا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قصاص لازم ہے، قصاص لازم ہے''۔ تو ام الربیع نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فلانہ سے قصاص لیا جائے گا؟ قسم بخدا اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ اے ام الربیع! قصاص تو کتاب اللہ کا حکم ہے''۔ اس نے عرض کی: قسم بخدا! اس سے کبھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔

راوی نے بیان کیا: پس وہ اپنے (موقف پر) قائم رہی یہاں تک کہ انہوں نے دیت کو قبول کر لیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنّ من عبادِ الله مَنْ لو أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھالیں تو وہ اسے یقیناً پوری فرما دیتا ہے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس قول باری تعالیٰ پر موقوف کر دیا۔

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الآیہ (المائدہ: 45) (اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لیے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان)۔

اور کتاب اللہ میں اس آیت کے سوا کہیں بھی دانت کے قصاص کے بارے کوئی نص موجود نہیں، اور یہ تورات کے حکم کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 389

بارے خبر ہے اور اس کے باوجود آپ نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اور اس پر اسے موقوف کر دیا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے بڑے بڑے اصحاب نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اور یہ کہ جو کچھ اس میں پایا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ ابن بکیر نے کہا ہے: یہی وہ ہے جس کا تقاضا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کرتے ہیں اور اس میں بہت سے اصحاب مالک، اصحاب شافعی اور معتزلہ نے اختلاف کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ:48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ تقیید کا احتمال رکھتی ہے، سوائے ان امور کے جن کی اخبار تم پر بیان کی گئیں اور ان کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود نہیں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے سورۂ ص کے سجدہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ ''ص'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو یہ پڑھتا ہے وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ اور حضرت داؤد علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم تمہارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2۔** حمزہ اور کسائی نے اقْتَدِهْ ۭ قُلْ وصل کلام میں بغیر ہا کے پڑھا ہے اور ابن عامر نے اقتدھی قل قرأت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ ہا حالت وقف میں بیان حرکت کے لیے ہوتی ہے اور ہا کے ساتھ اور نہ اس کے بعد کوئی واؤ یا یا مضمر ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ اور جس نے غلطی سے اجتناب کیا ہے اور سواد اعظم کی اتباع اور پیروی کی ہے تو اس نے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ پڑھا ہے۔ پس اس نے وقف کیا ہے اور وصل نہیں کیا، کیونکہ اگر وہ ہا کے ساتھ وصل کرے تو یہ غلطی ہے اور اگر اسے حذف کرے تو یہ سواد اعظم کی مخالفت ہے اور جمہور نے حالت وصل میں نیت وقف سے نہ نیت ادراج کی بنا پر رسم الخط میں اس کے ثابت ہونے کی اتباع کرتے ہوئے اسے ہا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن عیاش اور ہشام نے اقْتَدِهٖ قُلْ ہا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ غلط ہے عربی میں جائز نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا یعنی میں تم سے اس (تبلیغ) قرآن پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ اِنْ هُوَ یعنی یہ قرآن نہیں ہے۔ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ مگر یہ مخلوق کے لیے نصیحت ہے۔ اور ہدایت کی نسبت ان کی طرف کی اور فرمایا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ان کے سبب ہدایت واقع ہونے کی وجہ سے (انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو) اور فرمایا: ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، کیونکہ وہی ہدایت کا خالق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ص، حدیث نمبر 4433، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3388

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

''اور نہ قدر پہچانی انہوں نے الله کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا، جب کہا انہوں نے کہ نہیں اتاری الله نے کسی آدمی پر کوئی چیز (یعنی وحی)، آپ پوچھیے: کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے لے آئے تھے موسیٰ (جو سراسر) نور تھی اور (سراپا) ہدایت تھی لوگوں کے لیے تم نے بنالیا ہے اسے الگ الگ کاغذ ظاہر کرتے ہو اسے اور چھپا لیتے ہو (اس کا) بہت سا (حصہ) اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا۔ آپ فرمادیجئے! الله پھر چھوڑ دیجئے انہیں (تاکہ) وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ یعنی اس حق کے بارے میں جو اس کے لیے واجب (ثابت) ہے اور جو اس کے لیے محال ہے اور جو جائز ہے (یعنی انہوں نے الله تعالیٰ کے بارے میں واجب، محال اور جائز کی پہچان ہی نہیں کی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اس پر ایمان ہی نہیں لائے کہ وہ ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی عظمت کا حق تھا۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: لِفُلَانٍ قَدْرٌ (فلاں کی قدر اور عظمت ہے) اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انہوں نے کہا: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ تو انہوں نے الله تعالیٰ کی نسبت اس طرف کر دی کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی حجت قائم نہیں کرتا، اور نہ وہ انہیں ایسے امور کے بارے حکم دیتا ہے جن میں ان کی اصلاح اور فائدہ ہو۔ تو اس طرح انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح تعظیم نہیں کی جس طرح اس کی تعظیم کا حق تھا اور نہ انہوں نے اس طرح الله تعالیٰ کو پہچانا جس طرح اسے پہچاننے کا حق تھا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا: یعنی انہوں نے الله تعالیٰ کی اس طرح معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا۔ ما عَرَفُوا اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِه نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین معنی ہے، کیونکہ قدرتُ الشئ و قدرتہ کا معنی ہے میں نے اس کی مقدار کو پہچان لیا۔ اور اس پر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ یعنی انہوں نے اس کی معرفت حاصل نہیں کی جیسے اس کی معرفت کا حق تھا، جب انہوں نے کوئی رسول بھیجے جانے کا انکار کیا۔ دونوں معنی باہم قریب ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے الله تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی جس طرح ان کی قدر کرنے کا حق تھا۔ ابو حیوۃ نے وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدَرِهٖٓ دال کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ (1)

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 82

اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: (کہ یہ قول کہنے والے) مشرکین قریش ہیں۔ اور حسن اور سعید بن جبیر نے کہا ہے جس نے یہ قول کیا تھا وہ ایک یہودی تھا۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ سدی نے کہا ہے: اس کا نام فنحاص تھا(1)۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے بھی مروی ہے انہوں نے کہا: وہ مالک بن صیف تھا، وہ آیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنے لگا تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسے فرمایا: ''میں تجھے اس کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔ کیا تو تورات میں نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ انتہائی موٹے اور بھاری عالم کو مبغوض جانتا ہے''؟۔ وہ خوب موٹا عالم تھا، تو وہ غضب میں آ گیا اور کہنے لگا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ تو اس کے ساتھ موجود ساتھیوں نے اسے کہا: تیری ہلاکت اور بربادی ہو! کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نہیں؟ تو اس نے پھر کہا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نازل نہیں کی (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس کے قول کو توڑنے اور اس کے رد کے لیے فرمایا: قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ یعنی تم نے اسے الگ الگ کاغذ میں کر دیا ہے۔ (بمعنی فی قراطیس۔ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا یہ ان یہودیوں کے بارے ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور دیگر احکام کو چھپایا۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى یہ مشرکین کو خطاب ہے اور قولہ: تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ یہ یہودیوں کو خطاب ہے اور قول باری تعالیٰ: وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ اس کی قرأت کے مطابق صحیح ہوسکتا ہے جس نے یَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ يُبۡدُوۡنَهَا وَيُخۡفُوۡنَ تمام کو یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تا کی قرأت کی بنا پر یہ تمام آیت یہود کے لیے ہوگی اور وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا کا معنی ہوگا۔ وعلمتم مالم تکونوا تعلمونہ انتم ولا اباؤکم (اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا) یہ معنی تورات نازل کرنے کے ساتھ ان پر احسان جتلانے کی بنا پر ہے۔ اور تورات کو صحف بنا دیا گیا اسی لیے ارشاد فرمایا: قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا یعنی تم کاغذات کو ظاہر کرتے ہو۔ اور یہ ان کی مذمت ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے قرآن کریم کو اجزاء میں لکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے وہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور یہ کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے۔ یا قل اللہ عَلَّمَكُمُ الکتاب یعنی آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتاب کا علم دیا ہے۔ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ۔ يَلۡعَبُوۡنَ بمعنی لاعبین ہے۔ یعنی پھر تم اسے چھوڑ دو اس حال میں کہ وہ اپنی بیہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں۔ اور اگر یہ جواب امر ہوتا تو پھر یلعبوا کہا جاتا۔ اور کلام کے معنی میں جھڑک اور تہدید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یجعلونہ۔

قول باری تعالیٰ: نُوۡرًا وَّهُدًى کے لیے محل صفت میں ہے اور پھر یہ صلہ میں ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مستانفہ ہو، اور تقدیر کلام ہوگی: یجعلونہ ذا قراطیس اور قول باری تعالیٰ: تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد، صفحہ 394 2۔ ایضاً

قراطیس کی صفت ہو، کیونکہ نکرہ کی صفت جملہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور اس کے جملہ مستانفہ ہونے کا احتمال بھی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹۲

"اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اس کو بابرکت ہے، تصدیق کرنے والی ہے اس (وحی) کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) اور اس لیے تاکہ ڈرائیں آپ مکہ (والوں) کو اور جو اس کے اردگرد ہیں۔ اور جو ایمان لائے ہیں آخرت کے ساتھ وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر (بھی) اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ هٰذَا كِتٰبٌ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَنْزَلْنٰهُ یہ صفت ہے مُبٰرَكٌ یعنی اس میں برکت رکھی گئی ہے اور برکت کا معنی زیادتی اور اضافہ ہے۔ اور غیر قرآن میں حال ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اسی طرح مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ہے۔ یعنی وہ کتب جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ (قرآن کریم) شرک کی نفی کرنے اور توحید کے اثبات میں ان کی موافقت کرتا ہے۔

وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہاں مراد اس کے باسی اور رہنے والے ہیں۔ پس اس میں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی ہم نے قرآن کریم برکت اور ڈرانے کے لیے نازل فرمایا۔ وَ مَنْ حَوْلَهَا مراد جمیع آفاق ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ان سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ اور اس کا ایمان تو معتبر اور کافی نہیں جو آخرت کے ساتھ تو ایمان لائے لیکن حضور نبی کریم ﷺ پر اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳

"اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا کہے کہ وحی کی گئی ہے میری طرف حالانکہ نہیں وحی کی گئی اس کی طرف کچھ بھی اور (کون زیادہ ظالم ہے اس سے) جو کہے کہ میں (بھی) نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے نازل کیا ہے اللہ نے۔ کاش! تم دیکھو جب ظالم موت کی سختیوں میں (گرفتار) ہوں اور فرشتے بڑھا رہے ہوں (ان کی طرف) اپنے ہاتھ (اور انہیں کہیں کہ) نکالو اپنی جان کو۔ آج تمہیں دیا جائے گا ذلت کا عذاب اس وجہ سے کہ تم بہتان لگاتے تھے اللہ تعالیٰ پر ناحق اور تم اس کی آیتوں (کے ماننے) سے تکبر کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ اَظْلَمُ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کوئی اس سے بڑھ کر ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰی اس سے جس نے جھوٹ گھڑا۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ پس اس نے گمان کیا کہ وہ نبی ہے۔ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (حالانکہ اس کی طرف کوئی شی وحی نہیں کی گئی)

یہ آیت رحمان الیمامہ، اسود عنسی اور مسیلمہ کی بیوی سجاح کے بارے نازل ہوئی، ان تمام نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور ہر ایک نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی ہے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل فرمائی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طریقہ سے جس نے فقہ، سنت اور اس طریقہ سے جس پر اسلاف عمل پیرا رہے، اعراض کر لیا تو وہ کہنے لگتا ہے: میرے دل میں اس طرح واقع ہوا ہے، یا میرے دل نے مجھے اس طرح خبر دی ہے، پس وہ اسی کے مطابق فیصلے کرنے لگتے ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں واقع ہوتا ہے اور ان کے احساسات میں جو ان پر غالب آ جاتا ہے، اور وہ یہ مان کرنے لگتے ہیں کہ یہ ان کے دلوں کی کدورتوں سے صاف ہونے اور اغیار کے تصور سے ان کے خالی ہونے کے سبب ہے، پس ان کے لیے علوم الٰہیہ اور حقائق ربانیہ ظاہر ہو رہے ہیں، اور وہ کلیات کے اسرار پر واقفیت رکھتے ہیں اور جزئیات کے احکام جانتے ہیں پس وہ اس کے سبب تمام شریعتوں کے احکام سے مستغنی ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ احکام شرعیہ عام ہیں، ان کے ساتھ کند ذہنوں اور عام لوگوں پر حکم لگایا جاتا ہے، اور رہے اولیاء اور خواص لوگ تو وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہوتے۔ تحقیق اس میں آیا ہے جو وہ نقل کرتے ہیں کہ اپنے دل سے فتویٰ لو اگرچہ تجھے لوگوں نے فتویٰ دے رکھا ہو اور وہ اس پر حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ان علوم کے سبب جو ان پر ظاہر ہوئے اس سے مستغنی ہو گئے جو ان کا مفہوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھا۔ یہ قول زندقہ اور کفر ہے، اس کے قائل کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اور اس کے ساتھ سوال و جواب کی ضرورت اور حاجت نہ ہوگی، کیونکہ اس سے احکام کو گرانا (باطل کرنا) اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کو ثابت کرنا لازم آتا ہے۔ اس معنی کا مزید بیان عنقریب سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس میں مَنْ محل جر میں ہے۔ یعنی عبارت اس طرح ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ قَالَ سَاُنْزِلُ (اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے کہا میں بھی نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسے اللہ نے نازل کیا ہے) اور اس سے مراد وہ عبداللہ بن ابی سرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا، پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ اور اس کا سبب جو مفسرین نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب سورۃ المومنون کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے یہ آیت املا کرائی۔ جب آپ آخر میں اس قول تک پہنچے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (المومنون: 14) (پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا)

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 406

توعبداللہ نے انسان کی تخلیق کی تفصیل میں بڑا تعجب کیا اور یہ کہنے لگا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون) (بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے)۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هكذا انزلت علی مجھ پر اسی طرح نازل کی گئی ہے۔ تو اس وقت عبداللہ کو شک لاحق ہو گیا اور اس نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو تحقیق میری طرف اسی طرح وحی کی گئی ہے جیسے ان کی طرف وحی کی گئی ہے، اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو تحقیق میں نے اسی طرح کہا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے۔ پس وہ اسلام سے مرتد ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا۔ تو اسی کے بارے یہ قول ہے: وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اسے کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے(1)۔ اور اسے محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے شرحبیل نے بیان کیا ہے کہ آیت وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی وہ اسلام سے مرتد ہو گیا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور عبداللہ بن خطل اور مقیس بن صبابہ کو قتل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اگرچہ یہ لوگ غلاف کعبہ کے نیچے پائے جائیں، تو عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھاگ گیا۔ آپ اس کے رضاعی بھائی تھے۔ اس کی ماں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا تھا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے چھپائے رکھا یہاں تک کہ اہل مکہ کے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور اس کے لیے امان طلب کی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر فرمایا نعم (ہاں)۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما صمتُّ إلّا ليقومَ إليهِ بعضُكم فيَضْرِبُ عُنُقَه (میں خاموش نہیں رہا مگر صرف اس لیے کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن کاٹ دے (یعنی اسے قتل کر دے)۔ تو انصار میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو کیوں آپ نے میری طرف اشارہ نہیں کر دیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنَّ النبيَّ لا يَنْبَغِي أن تكونَ له خائنةُ الأعين (بلاشبہ نبی کے لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ اس کی آنکھ خیانت کرے)(2)

ابوعمر نے بیان کیا ہے: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ایام فتح میں اسلام لایا اور خوب اچھی طرح اسلام لایا، اور اس کے بعد اس سے کوئی ایسا فعل ظاہر نہیں ہوا جو ناپسندیدہ اور منکر ہو۔ وہ قریش کے نجباء، صاحب عقل اور کریم اور سخی لوگوں میں سے ایک تھا، اور بنی عامر بن لوی کے شہسواروں میں شمار تھا، پھر اس کے بعد 25ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مصر کا والی مقرر فرمایا اور 27ھ میں اس کے ہاتھ پر افریقہ فتح ہوا اور وہاں سے اس نے 31ھ میں سرزمین نوبہ سے اساود کی جنگ لڑی، اور اس نے اس کے ساتھ ایسی صلح کی جو صلح آج دن تک باقی ہے۔ اور 34ھ میں ارض روم سے صواری کی جنگ لڑی اور جب یہ اپنے وفدوں کے ساتھ واپس لوٹا تو ابن ابی حذیفہ نے اسے فسطاط میں داخل ہونے سے روک دیا، پس وہ عسقلان کی طرف چلا گیا اور وہیں مقیم ہو گیا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ رملہ میں مقیم رہا یہاں تک کہ فتنہ سے بھاگتے ہوئے فوت ہو گیا۔ اور اس نے اپنے رب کریم

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 407 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب قتل الاسیر، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اس طرح دعا مانگی: اے اللہ! میرا آخری عمل صبح کی نماز کو بنا دے۔ چنانچہ اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی اور پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ العادیات تلاوت کی، اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت پڑھی پھر اس نے اپنی دائیں طرف سلام پھیرا، پھر اپنی بائیں طرف سلام پھیرنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی۔

یہ سب یزید بن ابی حبیب وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور اس نے حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اس کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں کے اجتماع سے پہلے ہو چکی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ افریقہ میں فوت ہوئے۔ اور صحیح قول یہ ہے کہ ان کا وصال 36ھ یا 37ھ میں عسقلان میں ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ 36ھ میں فوت ہوئے۔ حفص بن عمر نے حکم بن ابان سے اور انہوں نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قرآن کریم کا معارض لایا اور اس نے کہا: والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا، فالخابزات خبزا، فاللاقمات لقما۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ، غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد سکرات الموت اور اس کی سختیاں ہیں۔ اور الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے۔ اور اس کی اصل وہ شی ہے جو چیزوں کو ڈھانک لیتی ہے اور انہیں چھپا لیتی ہے۔ اور اسی سے غَمَرَ الماءُ ہے (پانی نے اسے چھپا لیا) پھر یہ لفظ شدائد اور تکالیف کے معنی میں وضع کیا گیا۔ اور اسی لیے غمرات الحرب ہے (یعنی جنگ کی سختیاں)

جوہری نے کہا ہے: الغمرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے اس کی جمع غُمَر ہے جیسا کہ نَوبَۃ کی جمع نُوَب ہے۔ قطامی نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وحَانَ لِتالِكَ الغُمَرِ انحِسَارُ

اور غَمَرٰتِ الْمَوْتِ سے مراد موت کی تکالیف اور سختیاں ہے۔ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ بَاسِطُوْۤا اصل میں باسطون تھا۔ کہا گیا ہے کہ فرشتے عذاب اور لوہے کے گرزوں کے ساتھ ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔

یہ حسن اور ضحاک سے مروی ہے اور یہ قول بھی ہے: ان کی ارواح قبض کرنے کے لیے (فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (الانفال:50) (اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر) یہ آیت دونوں قولوں کو جمع کیے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے: بَسَطَ إِلَيهِ يَدَهُ بِالمَكرُوهِ (اس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ شدت اور سختی کے ساتھ آگے کیا)۔

اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنی جانوں کو عذاب سے خلاصی دلاؤ اگر تمہارے لیے ممکن ہو۔ اور یہ زجر و توبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم انہیں سختی کے ساتھ نکالو، کیونکہ بندۂ مومن کی روح اپنے رب کی ملاقات کے لیے بہت تیزی اور فرحت کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 459

ساتھ نکلتی ہے، اور کافر کی روح کو انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچ کر نکالا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے: اے خبیث نفس! تو نکل آ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی رسوائی کی طرف اس حال میں کہ تو بھی ناراض ہے اور وہ تجھ سے ناراض ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے(1)۔ اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قائل کے اس کے لیے اس قول کی مانند ہے جسے وہ عذاب دے رہا ہو: لَاُذِيقَنَّكَ العذابَ وَلَاُخْرِجَنَّ نفسكَ (میں یقیناً تجھے عذاب چکھاؤں گا اور تیری جان کو نکالوں گا) اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ وہ خود اپنی جانوں کو نہیں نکالتے بلکہ حضرت ملک الموت علیہ السلام اور ان کے ساتھی اسے قبض کرتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ کفار کو کہا جائے گا اس حال میں کہ وہ آگ میں ہوں گے اور امر کے عظیم ہونے کی وجہ سے جواب امر محذوف ہے، یعنی اگر تو ظالموں کو اس حال میں دیکھے تو یقیناً تو نے بہت بڑے عذاب کو دیکھا ہے۔ الْهُوْنِ اور الھوان معنی میں دونوں برابر ہیں (رسوائی) اور تَسْتَكْبِرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کو قبول کرنے سے تکبر اور نفرت کرتے ہو۔

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

''اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ اور تم چھوڑ آئے ہو جو ہم نے عطا فرمایا تھا تمہیں اپنے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں۔ بے شک ٹوٹ گئے تمہارے سارے رشتے اور کھو گئے تم سے جو تم دعویٰ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى یہ حشر سے عبارت ہے اور فُرَادٰى حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث کا ہے۔ ابو حیوہ نے فراداً تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے، اور وہ محل رفع میں فراد نہیں کہتے۔ احمد بن یحییٰ نے فراد بغیر تنوین کے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: یہ ثلاث اور رباع کی مثل ہے۔ اور فرادی، فردان کی جمع ہے جیسا کہ سکاری، سکران کی جمع ہے اور کسالی، کسلان کی جمع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا واحد فرد ہے۔

اس میں را مجزوم ہے اور فرد را کے کسرہ کے ساتھ۔ اور فرد را کے فتحہ کے ساتھ اور فرید ہے۔ اور معنی یہ ہے: تم ہمارے پاس آ گئے ہو اکیلے اکیلے، تم میں سے ہر ایک منفرد ہے گھر والوں، مال اور اولاد میں سے کوئی ساتھ نہیں، اور نہ ہی ان میں سے کوئی مددگار ہے جو گمراہی میں تمہارے مصاحب تھے، اور انہوں نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا تم عبادت کرتے رہے۔ اعرج نے فردی بغیر الف کے پڑھا ہے جیسا کہ سکریٰ اور کسلیٰ ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ، حدیث نمبر 4251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی جس طرح تم پہلی بار اکیلے اکیلے پیدا کیے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ننگے بدن جیسا کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکلے، ننگے پاؤں، غیر مختون، ایک رنگ (بے عیب) ان کے ساتھ کوئی شے نہ ہوگی۔ اور علماء نے کہا ہے: بندے کو کل (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اور اس کے وہ تمام اعضاء ہوں گے جو اس کی ولادت کے دن تھے۔ پس جس کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا قیامت کے دن وہ اس پر لوٹا دیا جائے گا۔ یہی معنی ہے آپ کے قول غُرْلاً کا یعنی غیر مختون، یعنی ختنہ کے وقت جو حصہ کاٹ دیا گیا تھا وہ ان پر واپس لوٹا دیا جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں عطا کیا اور ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ اور خول کا معنی ہے: وہ غلام اور دیگر نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ یعنی تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا۔

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کی تم پرستش کرتے رہے اور جنہیں تم نے میرا شریک بنایا۔ مراد بت ہیں، اور مشرک کہتے تھے: بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اور اس کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ نافع، کسائی اور حفص نے ظرف ہونے کی بنا پر اسے منصوب پڑھا ہے یعنی بَيْنَكُمْ، معنی یہ ہے تحقیق تمہارے درمیان تمہارے رشتے ٹوٹ گئے۔

لقد تقطع وصلکم بینکم اور وصل کے حذف پر یہ قول دلیل ہے وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ پس یہ ان کے درمیان اور ان کے شرکاء کے درمیان تعلق منقطع ہونے اور ایک دوسرے کو چھوڑنے پر دلیل ہے، جب کہ انہوں نے ان سے برأت اختیار کرلی اور وہ ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ اور ان کے لیے ان کا مقاطعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان سے اپنا رشتہ اور تعلق چھوڑ دیا۔ پس تقطع کے بعد الوصل کو مضمر کرنا اچھا ہے، کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں مانصب پر دلالت کرتا ہے یعنی لقد تقطع ما بینکم اور اس میں سوائے نصب کے کوئی اور جائز نہیں۔ کیونکہ تم نے جسے قطع کیا ہے اس کو ذکر کر دیا ہے اور وہ ما ہے گویا کہ یہ کہا: لقد تقطع الوصل بینکم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے لقد تقطع الامر بینکم (معاملہ تمہارے درمیان کٹ گیا)۔ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔ اور باقیوں نے بینکم رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے یہ اسم ظرف نہیں، پس فعل کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے لہٰذا اسے رفع دیا گیا۔ اور بین کے اسم ہونے کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اس پر حرف جر داخل ہے: وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (فصلت: 5) اور هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ (الکہف: 78) اور یہ بھی جائز ہے کہ نصب کی قرأت رفع کے معنی پر ہو، اور اسے نصب اس لیے دی گئی کیونکہ اس کا اکثر استعمال ظرف منصوب کی بنا پر ہے، حالانکہ یہ محل رفع میں ہے اور یہی اخفش کا مذہب ہے۔ پس اس اعتبار سے دونوں قرأتیں ہم معنی ہیں، لہٰذا جس طرح چاہے قرأت کرو وَضَلَّ عَنْكُمْ اور تم سے کھو گئے۔ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (وہ سب) جن کے ساتھ تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔

روایت ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو عرض کی: یا رسول اللہ!

صلی اللہ علیہ وسلم کتنا برا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھ رہے ہوں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس دن ان میں سے ہر آدمی اپنی فکر میں ہوگا جو اسے مستغنی کر دے گی نہ مرد عورتوں کی طرف دیکھیں گے اور نہ عورتیں مردوں کی طرف دیکھیں گی، وہ ایک دوسرے سے مشغول (غافل) ہوں گے''۔ یہ حدیث صحیح میں ثابت ہے اور اسی کی ہم معنی روایت مسلم نے نقل کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی پھاڑنے والا ہے دانے اور گٹھلی کو، نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، یہ ہے اللہ پس کدھر تم بہکے چلے جارہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ اللہ تعالیٰ کی صنعت وکاریگری کے عجائب کو شمار کیا گیا ہے جن میں سے ادنیٰ شی سے بھی ان کے الہ عاجز ہیں۔ الفلق کا معنی شق کرنا (پھاڑنا) ہے۔ یعنی وہ مردہ گٹھلی کو پھاڑتا ہے اور اس سے سبز پتے نکالتا ہے، اور اسی طرح دانہ بھی ہے اور وہ سبز پتوں سے مردہ گٹھلی اور دانے نکالتا ہے۔ اور یہی معنی ہے کہ وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ حسن اور قتادہ سے یہی منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَالِقُ کا معنی خالق ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فلق سے مراد وہ شق اور چیر ہے جو دانے اور گٹھلی میں ہوتا ہے اور النوی، نواۃ کی جمع ہے، اور یہ ہر اس شی میں جاری ہوسکتا ہے جس میں گٹھلی ہو مثلاً کشمش اور اخروٹ۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ وہ زندہ انسان کو مردہ نطفہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ نطفہ زندہ انسانوں سے نکالتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: والذی فلق الحبة وبرأ النسمة إنه لعهد النبی الأمی صلی اللہ علیہ وسلم إلی أن لا یحبنی إلا مؤمن ولا یبغضنی إلا منافق (1) (قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور آدمی کو پیدا فرمایا! بلاشبہ اس نے میرے بارے میں حضور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا کہ مجھ سے سوائے مومن کے کوئی محبت نہیں کرے گا اور مجھ سے سوائے منافق کے کوئی بغض نہ رکھے گا)۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ یہ ترکیب کلام میں مبتدا اور خبر ہیں۔ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ پس تم حق سے کہاں پھرے جارہے ہو اس کے باوجود کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت ملاحظہ کر رہے ہو؟۔

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ، الفصل الاول

الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾

''وہ نکالنے والا ہے صبح کو (رات کی تاریکی) سے اور بنایا ہے اس نے رات کو آرام کے لیے اور (بنایا ہے) سورج اور چاند کو حساب کے لیے یہ اندازہ ہے (مقرر کیا ہوا) سب سے زبردست سب کچھ جاننے والے کا''۔

قولہ تعالیٰ: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی نعت (اور صفت) ہے، یعنی ذالکم اللہ ربکم فالق الاصباح۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے إن اللہ فالقُ الِاصباح (بے شک اللہ تعالیٰ صبح کو نکالنے والا ہے) الصبح اور الصباح سے مراد اول النہار (دن کا پہلا حصہ) ہے، اور اسی طرح الْاِصْبَاحِ بھی ہے۔ یعنی وہ ہر دن صبح کو نکالنے والا ہے، مراد فجر ہے۔ اور الْاِصْبَاحِ، أصبح کا مصدر ہے۔ اور معنی ہے: وہ تاریکیوں سے روشنی کو پھاڑ کر نکالنے والا اور اسے ظاہر کرنے والا ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کا معنی ہے خالقُ النھارِ (دن کو پیدا کرنے والا) یہ معرفہ ہے نحویوں میں سے کسی کے نزدیک اس میں تنوین جائز نہیں ہے۔

حسن اور عیسیٰ بن عمر نے فالقُ الاصباح ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہ صبح کی جمع ہے۔ اعمش نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فلقَ الأصباحِ فعل کے وزن پر پڑھا ہے ہمزہ مسور ہے اور حا منصوب ہے۔ حسن عیسیٰ بن عمر، حمزہ اور کسائی نے وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور دونوں مقامات میں فَالِقُ کے معنی پر محمول کرتے ہوئے الَّيْلَ کو نصب دی ہے، کیونکہ وہ بمعنی فلق ہے، کیونکہ وہ امر ہے جو ہو چکا پس اسے معنی پر محمول کیا گیا۔

اور یہ بھی کہ اس کے افعال ماضیہ ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ، اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً پس اول کلام کو آخر پر محمول کیا گیا ہے۔ فعل کو مضمر کرنے کی بنا پر الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کو نصب دینے پر ان کا اجماع اسے تقویت دیتا ہے۔ انہوں نے اسے فاعل پر محمول نہیں کیا کہ وہ اسے خبر دیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے اور نحاس نے کہا ہے: تحقیق یزید بن قطیب سکونی نے لفظ پر عطف کرتے ہوئے جر کے ساتھ اس طرح قرأت کی ہے وجاعلُ اللیلِ سکنًا والشمسَ والقمرَ حُسْبَانًا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مکی اور مہدوی وغیرہما قراء سبع کا اجماع مراد لیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور یعقوب نے اس سے رویس کی روایت میں وجاعلُ اللیلِ ساکنًا پڑھا ہے اور اہل مدینہ نے سکون کے محل کی وجہ سے وجاعلُ اللیلِ سکنًا پڑھا ہے۔ اور موطا میں یحییٰ بن سعید سے یہ روایت ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے تھے اور کہتے تھے: اللھم فالقُ الاصباحِ وجاعلُ اللیلِ سکنًا والشمس والقمر حسبانا إقضِ عَنِّي الدینَ وأَغْنِنِي من الفقرِ وأمتعني بسَمْعِي وبَصَرِي وقُوَتِي فی سبیلك (اے اللہ! صبح کو نکالنے والے (رات کی تاریکی سے) اور رات کو بنانے والے آرام کے لیے اور سورج اور چاند کو بنانے والے حساب کے لیے! مجھ سے قرض ادا فرما دے اور مجھے فقر وافلاس سے غنی کر دے اور مجھے اپنے راستے میں میرے کانوں، میری آنکھوں اور میری قوت وطاقت کے ساتھ ہمیشہ فائدہ پہنچا)

اور اگر کہا جائے: کیسے یہ فرمایا: وأمتعنی بسَمْعِي و بَصَرِي اور نسائی اور ترمذی وغیرہما کی کتاب میں ہے واَجْعَلْهُ الوَارِثَ مِنِّي (اور اسے میرا وارث بنا دے) اور وہ تو بدن کے ساتھ ہی فناہ ہو جائیں گے؟ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ کلام

میں مجاز ہے اور معنی یہ ہے: اللھم لَا تَعْدِمْهُ قَبْلِي (اے اللہ! اسے مجھ سے پہلے معدوم نہ کرنا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں سمع اور بصر سے مراد حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، کیونکہ ان دونوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: هما السمعُ والبصرُ (1) (یہ دونوں کان اور آنکھ ہیں) یہ تاویل حقیقت سے بہت دور ہے، بلاشبہ ان دونوں سے مراد دو اعضاء ہیں (یعنی کان اور آنکھ) اور حُسْبَانًا کا معنی ہے یعنی ایسے حساب کے لیے جس کے ساتھ بندوں کے مصالح اور فوائد متعلق ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَّالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا کے تحت کہا ہے ای الحساب یعنی حساب لگانے کے لیے۔ اور اخفش نے کہا ہے: حسبان، حساب کی جمع ہے، جیسا کہ شہاب اور شہبان ہیں۔ اور یعقوب نے کہا ہے: حسبان مصدر ہے حسبتُ الشی کا أحسبه حسبانا و حسبانا و حسبة اور الحساب اسم ہے۔ اور ان کے سوا دوسرے نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کی چال کو حساب کے مطابق رکھا ہے اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔

تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وحدانیت پر دلیل بیان فرمائی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حُسْبَانًا کا معنی ضیا (روشنی) ہے اور الحسبان کا لغت میں معنی آگ ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ (الکہف: 40) (اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حُسْبَانًا کا معنی نار (آگ) ہے۔ اور الحسبانة کا معنی ہے: چھوٹا تکیہ۔

**وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۹۷**

''اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے ستاروں کو تاکہ سیدھی راہ معلوم کر سکو ان سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں، بے شک ہم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں دلائل ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کو بیان فرمایا ہے اور ستاروں میں بہت زیادہ منافع اور فوائد ہیں۔ اس آیت میں ان کے بعض منافع ذکر فرمائے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی معرفت اور پہچان شرعاً مستحب ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ (الصافات) (اور اسے محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے) وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (الملک: 5) (اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ) یہاں جَعَلَ بمعنی خلق ہے قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ یعنی ہم نے مفصل دلائل بیان کر دیئے ہیں تاکہ اعتبار میں یہ انتہائی بلیغ ہو جائیں۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اہل علم کو اس لیے خاص فرمایا، کیونکہ یہی لوگ ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

**وَ هُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸**

---

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب مناقب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما الفصل الثانی

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے پھر (تمہارے لیے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی، بے شک ہم نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) سمجھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ اس میں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ سورت کی ابتدا میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَمُسْتَقَرٌّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر، حضرت حسن، حضرت ابو عمرو، حضرت عیسیٰ، اعرج، شیبہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے، مگر جنہوں نے کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک تقدیر عبارت فمنها مستقر ہے اور جنہوں نے فتحہ دیا ہے ان کے نزدیک لها مستقر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس اس کے لیے ٹھہرنے کی جگہ ہے، رحم میں اور امانت رکھے جانے کی جگہ اس زمین میں ہے جس میں وہ مرے گا۔ یہ تفسیر قاف کے فتحہ پر دلالت کرتی ہے، اور حسن نے کہا ہے: پس ٹھہرنے کی جگہ قبر میں ہے۔ اور اکثر مفسرین کہتے ہیں: مستقر وہ جگہ ہے جو رحم میں تھی اور مستودع وہ ہے جو صلب میں تھی۔ اسے حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے مستقرٌ فی الأرض، و مستودعٌ فی الأصلاب (ٹھہرنے کی جگہ زمین میں ہے اور امانت رکھے جانے کی جگہ اصلاب میں ہے)(1)

حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے پوچھا کیا تو نے شادی کی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ تیری پشت سے انہیں نکالے گا جنہیں اس میں بطور ودیعت رکھا ہوا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مستقر وہ ہے جسے پیدا کیا جائے اور مستودع وہ ہے جسے پیدا نہ کیا گیا ہو۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: مستودع عند اللہ (اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھے جانے کی جگہ ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور قرآن کریم میں ہے وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ (توبہ) (اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقرر تک) استیداع کا اشارہ ان کے قبر میں ہونے کی طرف یہاں تک کہ انہیں حساب کے لیے وہاں سے اٹھا لیا جائے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں پہلے ہو چکا ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ حضرت قتادہ نے فرمایا: فَصَّلْنَا کا معنی ہے ہم نے بیان کر دیا (اور ہم نے پختہ کر دیا یعنی بمعنی بینا و قدرنا، واللہ اعلم)۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 435

''اور وہی ہے جس نے اتارا بادل سے پانی، تو ہم نے نکالی اس کے ذریعے سے اگنے والی ہر چیز پھر ہم نے نکال لیں اس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں، اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اس کے گابھے اور گچھے نیچے جھکے ہوئے اور (ہم نے پیدا کیے) باغات انگور اور زیتون اور انار کے بعض (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ دیکھو ہر درخت کے پھل کی طرف جب وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اس کے پکنے کو، بے شک ان میں نشانیاں ہیں (اس کی قدرت کاملہ کی) اس قوم کے لیے جو ایمان دار ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور وہی ہے جس نے بادل سے بارش نازل فرمائی۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اس کے ذریعے ہم نے اگنے والی چیزوں کی ہر قسم ہم نے نکالی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر حیوان کا رزق ہم نے نکالا۔ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا اخفش نے کہا ہے: یعنی اخضر (یعنی پھر ہم نے اس سے سبزہ نکالا) جیسا کہ عرب کہتے ہیں: أرِنیهانمرة أرِکها مطِرة (مجھے دکھاؤ وہ بادل بارش ضرور برساتے ہیں) اور الخضر سے مراد سبزیوں کی ہریالی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس سے مراد گندم، جو، سفید جو، مکئی، چاول اور عام قسم کے دانے تھے۔

يُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا یعنی ان میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوتے ہیں جیسے سٹہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ فراء نے غیر قرآن میں ماقبل پر عطف کرتے ہوئے قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ پڑھنا جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: قُنوان۔ فراء نے کہا ہے: یہ بنی قیس کی لغت ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: قِنوان اور بنی تمیم کہتے ہیں: قنیان پھر واحد میں ان تمام کا اتفاق ہے۔ اور وہ کہتے ہیں: قِنْوٌ اور قُنْوٌ کھجور کا گابھا شگوفہ پھوٹنے سے پہلے بند ہوتا ہے۔ اور اغریض (شگوفہ) کو بھی طلع (گابھا) کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور طلع وہ ہے جو کھجور کا خوشہ دکھائی دیتا ہے۔ قنوان، قنو کی جمع ہے اور اس کا تثنیہ قنوان ہے جیسے صنو اور صنوان ہے (یہ نون کے کسرہ کے ساتھ ہے)۔ اور اس کی جمع بھی تثنیہ کے وزن پر آئی ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: تثنیہ صنوانِ ہے اور جمع صنوانٌ ہے (یعنی اس میں نون مرفوع ہے) اور القنو کا معنی ہے خوشہ۔ اور اس کی جمع القنوان اور الاقناء ہے، جیسے اس قول میں ہے: طویلةُ الأقناء والأثاکل کسی اور نے کہا ہے: أقناء جمع قلت ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: ابن ہرمز نے قنوان قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے قاف کا ضمہ بھی مروی ہے اور فتحہ کی صورت میں یہ جمع غیر مکسر کا اسم ہے، یہ قائم مقام رکب کے ہے سیبویہ کے نزدیک، اور قائم مقام باقر اور حامل کے ہے۔ کیونکہ فعلان جمع کی امثلہ میں سے نہیں ہے اور قاف کو ضمہ اس بنا پر دیا گیا ہے کہ یہ قنو کی جمع ہے اور اس کا معنی خوشہ ہے یعنی العذق عین کے کسرہ کے ساتھ اور یہی کباسہ ہوتا ہے اور یہی عنقود النخلہ (کھجوروں کا گچھا) ہے اور العَذق عین کے فتحہ کے ساتھ نفس کھجور کو کہتے ہیں (مراد کھجور کا پھل دار درخت ہے)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قنوان کا معنی کھجور کے درخت کا گوند بھی ہے۔ دَانِيَةٌ یعنی قریب۔ جنہیں کھڑے ہونے والا اور بیٹھنے والا سبھی حاصل کر سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم وغیرہما سے یہ مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ان میں سے کچھ قریب ہیں اور کچھ بعید ہیں۔ اور اسے کلام سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اسی کی مثل سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) بھی ہے۔

اور خاص طور پر قریب کا ذکر کیا ہے، کیونکہ آیت میں مقصود اپنی قدرت کا ذکر اور نعمت کے ساتھ احسان جتلانا ہے اور احسان اسی میں ہوتا ہے جو قریب ہو اور اکثر اسے حاصل کیا جا سکتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ یعنی ہم نے باغات پیدا کیے۔ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم نے وَّ جَنّٰتٍ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں سے صحیح یہی ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے اس قرأت کا انکار کیا ہے، حتیٰ کہ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ محال ہے، کیونکہ کھجوروں کے باغات نہیں ہوتے۔ نحاس نے کہا: قرأت جائز ہے اور تاویل اس طور پر نہیں ہے، بلکہ مبتدا ہونے کی بنا پر اسے رفع دیا گیا ہے اور خبر محذوف ہے (تقدیر عبارت ہے) ولهم جنات (اور ان کے لیے باغات ہیں) جیسا کہ قراء کی ایک جماعت نے وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (الواقعہ) پڑھا ہے۔ اور اس کی مثل کو سیبویہ، کسائی اور فراء نے جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور اسی بنا پر وحورًا عينًا بھی ہے اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

جئني بمثلِ بني بَدْرٍ لقومهم	أو مثلَ أُسْرَةِ مَنْظُورِ بن سيارِ

اور کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ، اخرجناها (یعنی انگور کے باغات ہم نے پیدا کیے) یہ اسی طرح ہے جیسے تمہارا یہ قول ہے: أكرمتُ عبدَالله وأخوه، اي وأخوه اكرمتُ أيضًا (یعنی میں نے عبداللہ کی تکریم کی اور اس کے بھائی کی بھی ہم نے تکریم کی) اور رہے زیتون اور رمان کے الفاظ تو ان میں بالاجماع نصب کے سوا کوئی اعراب جائز نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَّ جَنّٰتٍ رفع کے ساتھ قنوان پر لفظاً معطوف ہے، اگرچہ معنی میں یہ اس کی جنس میں سے نہیں ہے۔ وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ یعنی وہ پتوں میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، یعنی زیتون کے پتے تمام ٹہنی پر ہونے اور اپنے حجم کے اعتبار سے انار کے پتوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں لیکن ذائقے میں وہ ان جیسے نہیں ہیں۔ حضرت قتادہ وغیرہ سے یہ مروی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ دیکھنے میں ایک جیسے ہیں اور ذائقے میں ایک جیسے نہیں ہیں، جیسا کہ دو انار اپنے رنگ میں ایک جیسے ہوتے ہیں اور اپنے ذائقے میں مختلف ہوتے ہیں۔ انار اور زیتون کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں ان (عربوں) کے قریب تھے اور یہ دونوں ان کے نزدیک ذی قدر تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ (الغاشیہ) اس میں انہیں اونٹ کی طرف دیکھنے کی دعوت دی کیونکہ یہ ایسا جانور ہے جس کی پہچان وہ سب سے زیادہ رکھتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ یعنی تم عبرت کی نظر سے دیکھو نہ کہ ایسی نظر سے جو غور وفکر سے خالی ہو۔ اور ثمر لغت میں درخت چننے کو کہتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ثُمُرِهٖ ثا اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں میں فتحہ پڑھا ہے اور یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ بقرۃ اور بقر، شجرۃ اور شجر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ثمر سے مراد مال کی مختلف اقسام ہیں۔ اور ثمر سے مراد کھجور کا پھل ہے گویا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق معنی یہ ہوگا۔ دیکھو ان مالوں کی طرف جن سے پھل حاصل ہوتا ہے۔ ثمر ثا اور م دونوں کے ضمہ کے ساتھ ثمار کی جمع ہے اور اس سے مراد پھل دار مال ہے۔ اور اعمش سے ثُمْرہ ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمْر ثَمَرۃ کی جمع ہو جیسا کہ بَدَنۃ اور بُدْن ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمُر جمع الجمع ہو، پس آپ کہیں گے: ثمرۃ و ثمار و ثمر جیسا کہ حمار اور حمر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ ثمرۃ کی جمع ہو جیسا کہ خشبۃ کی جمع خشب ہے نہ کہ جمع الجمع ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَنْعِهٖ محمد بن سمیقع نے ویانعہ پڑھا ہے اور ابن محیصن اور ابن ابی اسحاق نے ویُنْعِهٖ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض اہل نجد کی لغت ہے کہا جاتا ہے: یَنَعَ الثمر (پھل پک گیا) یَیْنَعُ اور الثمر یانع۔ أینع یونع (والتمر مُونع)۔ اس کا معنی ہے پھل کا پک جانا۔ ینع اور أینع تب کہا جاتا ہے جب پھل پک جائے اور اسے پالیا جائے۔ حجاج نے اپنے خطبہ میں کہا تھا: أری رؤسا قد أینَعَتْ وحان قِطافها (میں بعض سروں کو دیکھ رہا ہوں وہ پک چکے ہیں اور انہیں توڑنے کا وقت آ پہنچا ہے)۔

ابن الانباری نے کہا ہے: الینع یانع کی جمع ہے، جیسا کہ راکب اور رکب، اور تاجر و تجر ہیں۔ مراد بہت زیادہ پکنے والا پھل ہے اور فراء نے کہا ہے: أینع، ینع کی نسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہے احمر (سرخ) اور اسی سے وہ بھی ہے جو حدیث ملاعنہ میں مروی ہے: إن ولدته أحمر مثل الینَعة (اگر اس نے بچے کو پکے ہوئے پھل کی مانند سرخ جنا) اور یہی خرزہ حمراء (سرخ پتھر) ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ عقیق ہے یا اس کی کوئی قسم ہے۔

پس یہ آیت اس کے لیے دلیل ہے جس نے تدبر کیا اور قلب ونظر کے ساتھ دیکھا اور خوب نظر وفکر کرتے ہوئے دیکھا کہ تبدیلیوں کے لیے کسی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضرور ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ پس تم اسے دیکھتے ہو کہ یہ پہلے طلع (گابھا) ہے پھر جب گابھا پھٹ گیا تو یہ اغریض (شگوفہ) ہو گیا۔ اور اغریض کو ضحک کا نام بھی دیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد بلح پھر سیاب، پھر جدال جب کہ یہ سبز ہو اور گول ہو اس سے پہلے کہ یہ سخت ہو، پھر جب یہ بڑھ جائے تو بسر، پھر جب سرخ ہو جائے تو زہو کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: أزهی یُزهی، پھر جب اس میں پکنے کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو یہ مُوکت کہلاتی۔ اور اگر یہ آثار ذنب (پیچھے) کی جانب سے ظاہر ہوں تو یہ مُذَنِّب کہلاتی ہے اور یہی تَذْنُوب ہے پھر جب یہ نرم ہو جائے تو یہ ثَعْد کہلاتی ہے اور جب یہ نصف پک جائے تو اس کا نام مُجَزِّعة ہے اور جب دو تہائی تک پک جائے تو یہ حُلْقانہ کہلاتی ہے اور جب یہ ساری پک جائے تو یہ مُنْسِبة کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: رطب مُنْسِبت، پھر جب یہ

خشک ہو جاتی ہے تو تمر بن جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کر کے، اس میں تغیر اور تبدیلی لا کر اور عدم سے اسے وجود عطا کر کے اپنی وحدانیت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کیا ہے اور یہ کہ اسے بنانے والا قادر اور عالم ہے۔ اور یہ دوبارہ اٹھائے جانے کے جواز پر دلیل ہے۔ اس طرح کہ وہ نباتات کو خشک ہونے کے بعد پھر وجود اور تازگی عطا فرماتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: يَنَعَ الثمر يَيْنَعُ وَيَيْنِعُ يَنْعًا وَيُنْعًا وَيُنُوعًا اس کا معنی ہے پھل پک گیا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھی طرح پکنا وہ ہوتا ہے جو بغیر فساد کے ہو اور اس میں نقش (کانٹوں کے ساتھ سوراخ کرنا) نہ ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقش یہ ہے کہ اہل بصرہ پھل میں سوراخ کرتے تھے تاکہ اسے پکایا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پھل میں اس طرح سوراخ کر دیا جائے کہ اس میں ہوا تیزی سے داخل ہونے لگے پس اس طرح وہ جلدی پک جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس طرح پکنا مراد نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مراد ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کو مربوط کیا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسا پکنا ہے جو بالذات ہو اور بغیر کسی حیلہ کے ہو۔ اور انجیر والے بعض شہروں میں جو (آب و ہوا کے اعتبار سے) ٹھنڈے ہیں، ان میں وہ پکتا نہیں یہاں تک کہ ان کے منہ میں ایک لکڑی سی داخل کی جاتی ہے درآنحالیکہ اسے تیل لگایا ہوتا ہے، پس جب وہ پک جاتا ہے تو اس کی بیع حلال ہوتی ہے، کیونکہ ایسا ہوا کی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے اور اہل شہر کی یہ عادت اور رواج ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ بروقت اچھے طریقہ سے پک کر تیار نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ ایسا پکنا ہے جس پر کھجوروں کی بیع کا جائز ہونا موقوف ہوتا ہے اور اسی کے سبب وہ کھانے کے قابل ہوتی ہیں اور وہ آفت کے سبب ضائع ہونے سے محفوظ ہوتی ہیں اور یہ ثریا (ستارہ) کے طلوع کے وقت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک عادت جاریہ قرار دیا ہے اور اسے اپنے علم و قدرت کے ساتھ محکم کر دیا ہے۔ معلّٰی بن اسد نے وہیب سے، انہوں نے عسل بن سفیان سے، انہوں نے حضرت عطا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب صبح کے وقت ثریا طلوع ہوتا ہے تو اہل علاقہ سے آفت کو اٹھا لیا جاتا ہے''۔ اور ثریا ستارہ ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا طلوع مئی کے مہینے کی گیارہ راتیں گزرنے کے بعد صبح کے وقت ہوتا ہے۔ اور بخاری میں ہے اور مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنی زمین کا پھل نہیں بیچتے تھے یہاں تک کہ ثریا طلوع ہو جاتا اور زردی سرخی سے واضح اور ظاہر ہو جاتی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جنہوں نے پھلوں میں آفات کو ساقط کیا ہے انہوں نے ان آثار سے اور ان کی مثل ارشادات نبویہ سے استدلال کیا ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے۔ اور پھلوں کی بیع کرنے سے آپ نے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ ان سے آفت اور ہلاکت کے آثار ختم ہو جائیں۔ عثمان بن سراقہ نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ایسا کب ہوتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب ثریا طلوع ہوتا ہے(1)۔

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 5012

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کے وضع اور ساقط کرنے کا حکم دیا ہو اور اگر میرے نزدیک ثابت ہوتا تو میں اسے نہ چھوڑتا، وہ اصل اور بنیاد جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ جس کسی نے کوئی ایسی شی خریدی جس کی بیع اور اس پر قبضہ جائز ہوتا ہے تو اس کی آفت اور بیماری اسی کے لیے ہوگی، فرمایا: اگر میں آفات کو ساقط کرنے کا قائل ہوتا تو میں اسے قلیل وکثیر مقدار میں ساقط کر دیتا۔ اور یہی قول امام ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔

امام مالک اور اکثر اہل مدینہ نے اس کی وضع کا موقف اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفات کی وضع کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے۔ اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اصحاب حدیث کا قول ہے۔ اور اہل ظاہر نے عموم حدیث کی بنا پر خریدی ہوئی شی سے اسے ساقط کیا ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے تب اس کا اعتبار کیا ہے جب آفت پھل کی تہائی یا اس سے زیادہ مقدار کو پہنچ جائے اور جو آفت تہائی سے کم مقدار میں ہو اسے انہوں نے لغو قرار دیا ہے اور اسے تابع قرار دیا ہے، کیونکہ کوئی پھل اپنی خوبی میں قلیل عذر سے خالی نہیں ہوتا اور اپنی تھوڑی مقدار میں فساد اور عیب پڑنے سے محفوظ نہیں ہوتا۔ اصبغ اور اشہب پھل کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ قیمت کی طرف دیکھتے تھے۔ جب قیمت تہائی یا زیادہ مقدار کو پہنچ جاتی تو وہ اس سے ساقط کر دیتے۔ اور ابن قاسم کے نزدیک تو آفت کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر یہ ہے کہ سرقہ (چوری) آفت نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں ہے اور کتاب میں یہ بھی ہے کہ وہ آفت ہے اور یہ ابن القاسم سے مروی ہے اور ان کے اصحاب اور لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور مطرف اور ابن الماجشون نے کہا ہے: آسمان سے پھلوں کو زیادہ تری (بارش) یا سردی یا خشکی یا گرمی یا آدمی کے اختیار اور عمل کے بغیر درختوں کا ٹوٹنا (یعنی آندھی اور طوفان کے سبب) لاحق ہوتا ہے وہ آفت ہے، البتہ خشکی کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور ابن القاسم کی روایت میں ہے کہ وہ بھی آفت ہے۔ اور سبزیوں کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی پھلوں کی طرح ہیں (اور ان میں بھی آفت کا اعتبار ہوتا ہے)۔ جس کسی نے پھل کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اسے بیچ دیا اس شرط پر کہ وہ اسے باقی رہنے دے گا تو اس کی بیع فسخ کر دی جائے گی اور مردود ہوگی، کیونکہ اس سے منع کیا گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانے کے مترادف ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تیرا کیا خیال ہے اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک لے تو کیونکر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا مال بغیر حق کے لے سکتا ہے؟''۔ یہ جمہور کا قول ہے، اسے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے صحیح قرار دیا ہے اور نہی کو کراہیت پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور نے پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع کو اس شرط پر جائز قرار دیا ہے کہ اسے توڑ لیا جائے۔ اور امام ثوری اور ابن ابی لیلیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں موجود نہی سے استدلال کیا ہے اور جمہور نے اسے قیاس جلی کے ساتھ خاص کیا ہے، کیونکہ اس میں مبیع معلوم ہے اور حالت عقد میں اس پر قبضہ صحیح ہوتا ہے پس اس کی بیع بھی دیگر تمام بیچی جانے والی چیزوں کی طرح صحیح ہوگی۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ

تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اور بنایا انہوں نے اللہ کا شریک جنوں کو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے انہیں اور گھڑ لیے ہیں انہوں نے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں محض جہالت سے۔ پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ یہ ان کی جہالت کی دوسری نوع کا ذکر ہے، یعنی ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جنات میں سے شرکاء کا اعتقاد رکھ لیا ہے (یعنی انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا ہے)۔ نحاس نے کہا ہے: ترکیب کلام میں الْجِنَّ مفعول اوّل ہے اور شُرَكَآءَ مفعول ثانی ہے، جیسا کہ ان ارشادات میں ہے: وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ:20)، وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ (المدثر) اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: وَجَعَلُوا لِلّٰهِ الْجِنَّ شُرَكَاءَ اور یہ بھی جائز ہے کہ الجِنّ شرکاء سے بدل ہو اور مفعول ثانی لِلّٰهِ ہو۔ اور کسائی نے الجِن پر رفع بھی جائز قرار دیا ہے تو پھر کلام اس طرح ہوگی هُمُ الجِنُّ وَخَلَقَهُمْ اسی طرح جمہور کی قرآت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنانے والوں کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ خَلَقَ الجَاعِلِیْنَ لَهٗ شُرَكَاءَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خَلَقَ الجنَ الشُرَكَاءَ اور اسی نے شریک جنوں کو پیدا کیا ہے (یہ دراصل ضمیر کے مرجع کی طرف اشارہ ہے)۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے هو کی زیادتی کے ساتھ وهو خَلَقَهُمْ قرأت کی ہے، اور یحییٰ بن یعمر نے وَخَلْقَهُمْ لام کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، اور کہا: ای وجعلوا خلقهم لله شركاء (اور انہوں نے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا) کیونکہ وہ چیزوں کو بناتے تھے پھر ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ یہ آیت مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور ان کے جنوں کو شریک ٹھہرانے کا معنی یہ ہے کہ وہ ان کی اطاعت و پیروی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن وغیرہ سے مروی ہے۔

حضرت قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ وہی ہیں جنہوں نے کہا ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت زنادقہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ کہتے: اللہ تعالیٰ اور ابلیس دونوں بھائی ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) پس اللہ تعالیٰ انسانوں اور جانوروں کا خالق ہے، اور ابلیس جنوں، درندوں اور بچھوؤں وغیرہ کا خالق ہے۔ اور اسی کے قریب قریب مجوسیوں کا قول بھی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: عالم کے دو صانع ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا شیطان ہے جو الٰہ قدیم کی فکر سے پیدا ہونے والا ہے۔ (یعنی وہ حادث ہے)۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ شر اور برائی کا صانع حادث ہے۔ اور معتزلہ میں سے حائطیہ جو کہ احمد بن حائط کے اصحاب ہیں نے بھی اسی طرح کہا ہے، ان کا گمان بھی یہ ہے کہ کائنات کو بنانے والے دو ہیں: ایک الٰہ قدیم ہے اور دوسرا محدث ہے، اسے پہلے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے پھر تدبیر عالم کا فریضہ اس کے سپرد کر دیا ہے اور یہ وہی ہے جو آخرت میں مخلوق کا محاسبہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند اور عظیم ہے جو کچھ ظالم اور انکار کرنے والے لوگ اس کے بارے کہتے ہیں۔

وَخَرَقُوْا نافع نے تکثیر کی بنا پر اسے تشدید کے ساتھ (خَرَّقُوا) پڑھا ہے، کیونکہ مشرکین نے دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی

بیٹیاں ہیں اور وہ ملائکہ ہیں اور انہوں نے انہیں چھپے جانے کے سبب جن کا نام دیا۔ اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور یہودیوں نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، پس اس طرح ان کا کفر کثیر ہو گیا۔ پس معنی کی مطابقت کی وجہ سے فعل کو مشدد لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے برتر اور بلند ہے جو وہ کہتے ہیں۔ باقیوں نے تقلیل کی بنا پر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے وَخَرَقُوْا لَهٗ کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ اور وخَرَقُوا بالتخفیف، عربی کلمہ ہے، آدمی جب اپنی پکار اور دعویٰ میں جھوٹ بولے تو کہا جاتا ہے: خرقها و رب الکعبه (اس نے اسے گھڑ لیا رب کعبہ کی قسم)

اور اہل لغت نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے اِخْتَلَفُوا وافتَعَلُوا (انہوں نے اختلاف کیا اور فعل کیا) اور وخرقوا کثیر پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خَرَقُوْا کا معنی ہے انہوں نے جھوٹ بولا۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک خَرَقَ، اِخْتَرَقَ اور اِخْتَلَقَ کا معنی ایک ہی ہے، یعنی أَحْدَثَ (اس نے گھڑ لیا، اس نے جھوٹ بولا)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

''موجد ہے آسمانوں اور زمین کا، کیوں کر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی وہ ان دونوں کو بنانے والا ہے، تو پھر کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ اور بَدِيْعُ مبتدا مضمر کی خبر ہے یعنی هُوَ بَدِيْعٌ۔ کسائی نے للہ کی صفت ہونے کی بنا پر اس پر کسرہ بھی جائز قرار دیا ہے اور بمعنی بدیعا السموات والأرض اس پر نصب بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک یہ خطا ہے، کیونکہ یہ ماضی کے معنی کے لیے ہے (کیونکہ بصریوں کے نزدیک اسم فاعل جب آل کا صلہ نہ ہو تو عمل کے لیے دو شرطیں ہیں یا وہ بمعنی حال ہو یا بمعنی استقبال ہو۔ اور امام کسائی نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے جب یہ ماضی کے لیے بھی ہو)

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ یعنی کہاں سے اس کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور ہر شے کا بیٹا اس کے مشابہ ہوتا ہے، اور اس کی تو کوئی شبیہ نہیں ہے؟ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ عبارت عام ہے اور اس میں معنی خاص ہیں، یعنی اس نے عالم (کائنات) کو پیدا کیا ہے اس میں اس کا کلام داخل نہیں اور نہ ان میں اس کی ذاتی صفات داخل ہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف:156) اس (رحمت) کی وسعت نہ ابلیس کو شامل ہے اور نہ ہی اسے جس کی موت حالت کفر پر ہو۔ اور اس کی مثل تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف:25) بھی ہے (وہ ہر شی کو برباد کر دے گا) حالانکہ اس نے آسمانوں اور زمین کو برباد نہیں کیا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾

''یہ اللہ ہے (جو) تمہارا پروردگار ہے نہیں کوئی خدا سوائے اس کے پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا پس عبادت کرو اس کی اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، ذٰلِكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور اللّٰهُ رَبُّكُمْ بدل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَبُّكُمْ خبر ہو اور خَالِقُ دوسری خبر ہو، یا پھر اس کا مبتدا مضمر ہو، یعنی هُوَ خَالِقُ۔ کسائی اور فراء نے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾

''نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو اور وہ بڑا باریک بین (اور) پوری طرح باخبر ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ حدوث کی علامات سے منزہ اور پاک ہے، اور انہیں میں سے ایک ادراک ہے اس کا معنی احاطہ کرنا اور حدود قائم کرنا ہے، جیسا کہ تمام مخلوقات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، اور رؤیت ثابت ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کی حقیقت کی کنہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدركتُ كذا و كذا (میں نے فلاں فلاں کی حقیقت کو پہچان لیا) کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن رؤیت کے بارے میں صحیح احادیث ثابت ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ نظریں دنیا میں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور آخرت میں مومنین اس کا دیدار کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اپنے اس ارشاد میں خبر دی ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ (قیامہ) (کئی چہرے اس روز تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)

اور سدی نے یہی کہا ہے اور یہی احسن ہے جو کہا گیا ہے، کیونکہ اس پر قرآن کریم بھی دال ہے اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے بارے اخبار بھی وارد ہیں۔ اس کا بیان عنقریب سورۂ یونس میں آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، حالانکہ وہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دلوں کی آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، یعنی عقلیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں کہ وہ اس کے بارے وہم میں مبتلا ہو جائیں۔ کیونکہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) (اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آنکھیں جو دنیا میں پیدا کی گئی ہیں وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن وہ جس کے لیے شرف و کرامت کا ارادہ فرماتا ہے اس کے لیے وہ نظر اور ادراک پیدا فرما دیتا ہے جس کے ساتھ وہ اسے دیکھ لیتا ہے جیسا کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں عقلاً جائز ہے، کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہوتو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رؤیت کے بارے عرض کرنا امر محال ہوگا اور یہ محال ہے کہ نبی علیہ السلام اس سے ناواقف اور بے علم ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے

بارے میں کون سی چیز جائز ہے اور کون سی جائز نہیں ہے، بلکہ وہ تو عرض ہی نہ کرتے (تو ان کے عرض کرنے سے ثابت ہوا) کہ رؤیت جائز ہے محال نہیں ہے۔

ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے رب کی رؤیت کے بارے میں سلف نے اختلاف کیا ہے، پس صحیح مسلم میں حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تکیہ لگائے بیٹھا تھا، تو انہوں نے کہا: اے ابا عائشہ! (ابو عائشہ امام مسروق کی کنیت ہے) تین چیزیں ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں جس نے گفتگو کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟ انہوں نے کہا: جس نے یہ گمان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ مسروق نے کہا: میں تکیہ لگائے ہوئے تھا پھر میں سیدھا بیٹھ گیا اور میں نے کہا: اے ام المومنین! تم نظر و فکر کر لیجئے اور اتنی جلدی نہ کیجئے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾ (التکویر) (اور بلاشبہ اس نے اسے دیکھا ہے روشن کنارے پر) وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ (النجم) (اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا) تو انہوں نے فرمایا: میں اس امت میں سے پہلی ہوں جس نے اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ جبریل امین ہیں میں نے انہیں دوبار کے سوا اس صورت اور شکل میں نہیں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق فرمایا ہے، میں نے انہیں آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا کہ وہ اپنی خلقت کے عظیم ہونے کی وجہ سے زمین و آسمان کے مابین کو بھرے ہوئے تھے''۔ تو انہوں نے فرمایا: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ٞ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۰۳﴾ یا تو نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾ (الشوریٰ) (اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے)''۔

انہوں نے فرمایا: جس نے یہ خیال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ میں کسی شی کو چھپا کر رکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) اور مزید انہوں نے فرمایا: اور جس نے یہ خیال کیا کہ وہ آئندہ کل ہونے والے واقعہ کی خبر دیتے ہیں تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے)

عدم رؤیت اور جبرائیل امین کو دیکھنے کے جس نظریہ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اختیار کیا ہے وہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین کو دیکھا، اور ان دونوں سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اور محدثین، فقہاء اور متکلمین کی ایک جماعت نے اس کے اور امتناع رؤیت کے انکار کا قول

کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اِنَّہٗ رَاٰہُ بِعَیْنِہٖ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے رب کا دیدار کیا۔ آپ سے یہ روایت مشہور ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ (النجم) (نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ) نے)۔

اور عبداللہ بن حارث نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اکٹھے ہوئے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم بنی ہاشم کہتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار اپنے پروردگار کو دیکھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم تعجب کر رہے ہو کہ خلت حضرات ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہے، کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے، اور رؤیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ فرمایا: پس حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا یہاں تک کہ پہاڑوں نے بھی اس کا جواب دیا، پھر فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت اور کلام کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی نصیب ہوا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف دیدار عطا ہوا۔ (1)

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ حسن اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتے تھے: تحقیق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ اور اسے ابو عمر طلمنکی نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، اور بعض متکلمین نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور ان سے پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور نقاش نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق کہتا ہوں: بِعَیْنِہٖ رَاٰہُ رَاٰہُ! حَتّٰی اِنْقَطَعَ نفسہ۔ یعنی نفس احمد، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے (آپ مسلسل یہ کہتے رہے) یہاں تک کہ آپ کی سانس کٹ گئی یعنی حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سانس (اکھڑ گئی)۔

اور یہی موقف شیخ ابوالحسن اشعری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نظر کے ساتھ اور اپنے سر کی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاَی اللّٰہَ بِبَصَرِہٖ وَعَیْنَیْ رَاْسِہٖ اور حضرت انس، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت عکرمہ، حضرت ربیع اور حضرت حسن رحمہم اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت حسن قسم کھایا کرتے تھے بِاللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَقَدْ رَاٰی مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ رَبَّہٗ (قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں یقیناً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے)

اور ایک جماعت نے کہا ہے ان میں سے ابو العالیہ، قرظی اور ربیع بن انس رحمہم اللہ علیہم ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل (کی آنکھوں) کے ساتھ اپنے پروردگار کو دیکھا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہ بیان کیا گیا ہے اور ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ والنجم، حدیث نمبر 3200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کے ساتھ اسے دیکھا ہے، اور یہ دنیا میں آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے قول سے پیچھے ہٹ گئے (کمزور پڑ گئے) اور حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: دنیا میں اسے نہیں دیکھا گیا، کیونکہ وہ باقی رہنے والی ذات ہے اور باقی کو فانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب وہ آخرت میں ہوں گے اور انہیں باقی رہنے والی نظریں عطا کی جائیں گی تو پھر وہ باقی کو باقی کے ساتھ دیکھ لیں گے۔ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کلام بہت خوب اور اچھا ہے، اور اس میں رؤیت کے محال ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے مگر صرف اس حیثیت سے کہ قدرت ضعیف اور کمزور ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے قوت عطا فرما دے اور رؤیت کے بوجھ کو اٹھانے پر اسے قادر کر دے تو اس کے حق میں رؤیت ممتنع نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اس بارے کچھ بیان عنقریب سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ یعنی اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اسے جانتا ہے، اور تجنیس کلام کے لیے ابصار کو خاص کیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کلام میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق آنکھوں کا ادراک نہیں کر سکتی، یعنی وہ بصر کی حقیقت کی کیفیت نہیں پہچان سکتے، اور وہ شے جس کے سبب انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے وہ دیکھنے کی شے ان دو کے سوا اس کے تمام اعضائے بدن میں نہیں ہے۔ پھر فرمایا: وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ یعنی وہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ کہا جاتا ہے: لَطَفَ فلانٌ بفلانٍ يَلْطُفُ یعنی اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا (مہربانی کی) اور اللُّطْفُ فِي الفِعْلِ کا معنی ہے کام میں نرمی کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف کا مفہوم توفیق بخشنا اور بچانا ہے۔ اور اَلطَفَه بِكَذَا، یعنی اس نے اس کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کیا اور اس کا اسم اللَّطف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاءتْنا من فلانٍ لَطَفَة یعنی فلان کی جانب سے ہمارے پاس ہدیہ آیا۔ اور ملاطفۃ کا معنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور مہربانی برتنا ہے۔

جوہری اور ابن فارس سے یہ منقول ہے، ابو العالیہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے وہ چیزوں کو نکالنے میں بڑا باریک بین اور ان کی جگہ سے باخبر ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لطیف وہ ہے جس نے تیرے دل کو ہدایت سے منور کر دیا، اور تیرے جسم کی غذا کے ساتھ تربیت اور نشوونما کی، اور اس نے تجھے مصیبت اور آزمائش میں ولایت عطا فرمائی، اور وہ تیری حفاظت کرتا ہے حالانکہ تو آگ (جہنم) میں گرتا ہے اور وہ تجھے جنۃ الماویٰ میں داخل کر دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے معنی بیان کیے گئے ہیں جو اتفاق اور دوسرے معنی کی طرف راجع ہیں۔ عنقریب سورۂ الشوریٰ میں اس کے بارے علماء کے اقوال آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴

''بے شک آئیں تمہارے پاس آنکھیں کھولنے والی دلیلیں اپنے رب کی طرف سے تو جس نے آنکھوں سے

دیکھا تو اس نے اپنا فائدہ کیا اور جو اندھا بنا رہا تو اس نے اپنا نقصان کیا اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان''۔

قولہ تعالیٰ: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی ایسی علامات اور دلائل جن کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ بَصَآئِرُ، بصیرۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی دلالت اور رہنمائی ہے، جیسا کہ شاعر کا قول بھی ہے:

جاؤا بصائرھم علی أکتافھم　　وبصیرتی یَعْدُو بھا عَتَدٌ وَأَی

بصیرۃ سے مراد حجت بینہ اور ظاہرہ ہے۔ اور دلیل کو تعظیم شان کے لیے مجئ (آنے) کی صفت کے ساتھ متصف کیا گیا، جب کہ یہ اس غائب کے قائم مقام ہے جس کا حاضر ہونا نفس کے لیے متوقع ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے: جاءتْ العافیۃُ وقد إنصرفَ المرضُ (عافیت آئی اس حال میں کہ مرض چلا گیا) اور أقبلَ السعُود وأدبرَ النّحوسُ (سعادت آ گئی اور نحوست چلی گئی۔)

فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ، الْاَبْصَارَ اس کا معنی ہے ھوالإِ دراكُ بِحاسةِ البصرِ (آنکھ کے ساتھ کسی چیز کو دیکھنا، اس کا ادراک کرنا) پس جس کسی نے استدلال کر لیا اور پہچان لیا تو اس نے اپنے آپ کو نفع پہنچایا۔

وَمَنْ عَمِيَ اور جس نے رہنمائی حاصل نہ کی تو وہ اندھے کے قائم مقام ہو گیا، تو اس اندھا بننے کا نقصان اور ضرر اس کی اپنی ذات کو ہوگا۔ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی میں نے اس پر تمہاری حفاظت اور نگہبانی کا حکم نہیں دیا کہ تم اپنے آپ کو ہلاک کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے عذاب سے میں تمہاری محافظت اور نگہبانی نہیں کروں گا۔ اور یہ قول بھی ہے: بِحَفِيْظٍ اس کا معنی برقیب (تاکنے والا) ہے۔ میں تم پر تمہارے اعمال کو شمار کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پیغامبر (رسول) ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، اور وہ تم پر نگہبان ہے اس پر تمہارے افعال و اعمال میں سے کوئی شے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ آیت فرضیت قتال سے پہلے نازل ہوئی، پھر آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں تلوار کی قوت کے ساتھ بتوں کی عبادت سے روکیں۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

''اور اسی طرح ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید) کی دلیلوں کو اور تاکہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے اور تاکہ ہم واضح کر دیں اس کو اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ، كَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے۔ یعنی نُصَرِّفُ الآیاتِ مثلَ مَاتَلَوْنَا عَلَيْكَ (یعنی ہم دلائل طرح طرح سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے آپ پر انہیں تلاوت فرمایا ہے) یعنی جیسا کہ ہم نے اس سورت میں وعدہ، وعید، وعظ اور تنبیہ کے بارے مختلف دلائل بیان کیے ہیں اسی طرح ہم انہیں دوسری سورتوں میں بھی بیان کریں گے۔ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ اس میں واؤ فعل مضمر پر عطف کے لیے ہے تقدیر کلام یہ ہے: ای نُصَرِّفُ الآیاتِ لِتَقُومَ الحجۃُ ولیقولوا دَرَسْتَ (ہم دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ حجت قائم ہو جائے اور تاکہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ، صَرَّفْنَاهَا (تا کہ وہ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے ہم نے انہیں بیان کیا) تو اس صورت میں لام صیرورت کے لیے ہوگا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اسی طرح ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں: كَتَبَ فلانٌ هَذَا الكِتَابَ لِحَتْفِهِ (فلاں نے یہ تحریر اپنی موت کے وقت لکھی) یعنی اس کا حکم اس کی طرف لوٹ آیا۔ اور اسی طرح جب دلائل بیان کر دیئے گئے تو ان کا امر اس طرف لوٹ آیا کہ وہ کہیں: آپ نے خود پڑھ سنایا ہے اور آپ نے جبر ویسار سے خوب سیکھا ہے، اور یہ دونوں مکہ مکرمہ میں نصرانی غلام تھے، تو اہل مکہ نے کہا: بلاشبہ یہ ان دونوں سے پڑھتے ہیں (تعلیم حاصل کرتے ہیں)۔ نحاس نے کہا ہے: اس معنی میں دوسرا قول اچھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ کا معنی ہو کہ ہم اس کے بارے یکے بعد دیگرے دلائل بیان کرتے ہیں تا کہ وہ کہہ اٹھیں: آپ نے ہمیں خوب پڑھ سنایا ہے۔ نَأتِي بِهَا آيَةً بعدَ آيةٍ لِيقولُوا دَرَسْتَ عَلَيْنَا پس وہ اوّل کو آخر کے ساتھ ملا کر ذکر کرتے ہیں اور یہی حقیقت ہے اور جو کچھ ابو اسحاق نے بیان کیا ہے وہ مجاز ہے۔

اور دَرَسْتَ میں سات قرأتیں ہیں۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے دارست دال اور را کے درمیان الف کے ساتھ قرأت کی ہے، جیسا کہ فاعلت اور یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم اور اہل مکہ کی قرأت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دارست کا معنی ہے تالیت (آپ نے خوب موافقت اور تابعداری کی ہے، پڑھ کر سنانے میں)۔ ابن عامر نے درست پڑھا ہے یعنی سین کے فتحہ اور تا کے سکون کے ساتھ بغیر الف کے جیسا کہ خرجت۔ اور یہ حسن کی قرأت ہے اور باقیوں نے درست پڑھا ہے، جیسا کہ خرجت۔ پس پہلی قرأت کے مطابق معنی ہوگا: دارست اهل الكتاب و دارسوك یعنی آپ نے ان (اہل کتاب) کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور اس معنی پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (الفرقان: 4) یعنی یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن پر معاونت کی اور انہوں نے اس بارے میں آپ سے مذاکرات کیے اور یہ سب مشرکین کا قول ہے اور اس کی مثال ان کا یہ قول ہے: وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ (الفرقان) (اور کفار نے کہا: یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے اس شخص نے لکھوالیا ہے انہیں، پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تا کہ ازبر ہو جائیں)۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (النحل) (اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے؟ کہتے ہیں: (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دارستنا تو پھر اس کا معنی درست کے معنی کی طرح ہو جائے گا، نحاس نے اسے ذکر کیا ہے اور اسے ہی پسند کیا ہے، اور پہلا معنی مکی نے ذکر کیا ہے۔ اور نحاس نے گمان کیا ہے کہ وہ مجاز ہے، جیسا کہ کسی نے یہ کہا ہے:

لِلْمَوتِ ماتَلِدُ الوالِدَه

اور جنہوں نے درست پڑھا ہے تو اس قرآت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اچھا یہ ہے کہ معنی یہ ہو: ولِئَلَا یَقُولُوا اِنقَطَعَتْ وامحت (تا کہ وہ کہہ اٹھیں: کٹ گیا اور مٹ گیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں لائیں گے(1)۔

اور حضرت قتادہ نے دُرست پڑھا ہے بمعنی قرئت (پڑھا گیا): سفیان ابن عیینہ نے عمرو بن عبید سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے دارست پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ قرأت جائز نہیں۔ انہوں نے کہا: کیونکہ آیات تکرار اور مذاکرہ نہیں کرتیں۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس طرح قرأت جائز ہے، اور معنی وہ نہیں ہے جو ابو حاتم نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کا معنی ہے دارستْ امتك، ای دارستك أمتك (آپ کی امت نے آپ کے ساتھ تکرار اور مذاکرہ کیا) اگرچہ اس کا ذکر پہلے نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ (ص) (پھر انہیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے) اور اخفش نے بیان کیا ہے وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسَتْ اور یہ بمعنی درستَ ہے مگر یہ زیادہ بلیغ ہے۔

اور ابو العباس نے بیان کیا ہے کہ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسَتَ امر کی بنا پر لام کو ساکن پڑھا گیا ہے اور اس میں تہدید (جھڑک) کا معنی ہے، یعنی چاہیے کہ وہ جو چاہیں کہیں کیونکہ حق تو بین اور واضح ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (توبہ:82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ)۔

اور جنہوں نے لام کو کسرہ دیا ہے ان کے نزدیک یہ لام کی ہے۔ ان تمام قرأتوں کا اشتقاق تو ایک شی کی طرف ہی راجع ہے، یعنی تلیین اور تذلیل کی طرف۔ اور درست، درس یدرس دراسۃ سے ہے، اور اس کا معنی ہے کسی غیر پر پڑھنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: درستہ یعنی ذللتہ بکثرۃ القرأۃ (میں نے اسے کثرت قرأت کے سبب پامال کر دیا) اور اس کی اصل درس الطعام ہے یعنی گندم گہنا۔ اور دیاس کا معنی لغت شام کے مطابق دراس ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل درست الثوب أدرسہ درسا سے ہے یعنی میں نے کپڑے کو پرانا کر دیا۔ اور دَرس الثوبُ درسا کا معنی ہے أخلق یعنی کپڑا پرانا ہو گیا۔ اور یہ معنی بھی تذلل کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: حضرت ادریس علیہ السلام کو کتاب اللہ کثرت کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے ادریس کا نام دیا گیا۔ اور دارست الکتب و تدارستها اور إدارستها یہ سب درستها کے معنی میں ہیں۔ اور درست الکتاب درسا و دراسۃ (میں نے کتاب خوب اچھی طرح پڑھی) اور درست المرأۃ درسا ای حاضت (عورت حائضہ ہو گئی) اور کہا جاتا ہے کہ عورت کی شرمگاہ کو کنایۃ ابا ادراس کہا جاتا ہے۔ اور یہ بمعنی حیض ہے۔ اور الدرس خفیہ راستے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور اصمعی نے بیان کیا ہے: بعیر لم یدرس یعنی اونٹ پر سوار نہیں ہوا گیا، اور درست، درس المنزل سے ماخوذ ہے جب منزل کا نشان مٹ جائے۔ اور حضرت ابن مسعود اور آپ کے اصحاب نے، حضرت ابی، حضرت طلحہ، حضرت اعمش نے ولِيَقُوْلُوا درس قرأت کی ہے۔ یعنی درس محمد الآیات (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات پڑھیں) وَلِنُبَيِّنَهٗ یعنی تا کہ ہم قول اور تصریف کو واضح کر دیں، یا تا کہ ہم قرآن کو واضح کر دیں۔ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 89

اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۶﴾

''پیروی کیجئے آپ اس کی جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اور منہ پھیر لو مشرکوں کی طرف سے''۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ یعنی قرآن کی اتباع کیجئے، یعنی اپنے دل اور طبیعت کو ان کے ساتھ مشغول نہ رکھیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رکھیے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْاؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًاۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۷﴾

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہیں آپ ان کے ذمہ دار''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا یہ اس پر نص ہے کہ شرک اس کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ مذہب قدریہ کا بطلان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کی حفاظت اور نگہبانی کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔

وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ یعنی آپ ان کے امور اور معاملات کو ان کے دین یا ان کی دنیا کے مصالح اور منافع میں مضبوط اور پختہ کیجئے، یہاں تک کہ ان کے لیے اسے پانا آسان ہو جائے جو ان کے لیے واجب اور ضروری ہے۔ پس اس بارے میں نہ آپ نگہبان ہیں اور نہ ہی ذمہ دار ہیں، بلاشبہ آپ تو صرف مبلغ (اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں) اور یہ جنگ وقتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

''اور نہ تم برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔ یونہی آراستہ کر دیا ہے ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل، پھر اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور انہوں نے پھر وہ انہیں بتائے گا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ نہی ہے۔ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ یہ جواب نہی ہے۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو اس سے منع کیا ہے کہ وہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب وہ انہیں برا بھلا کہیں گے تو کفار نفرت کریں گے اور وہ اپنے کفر میں اور بڑھ جائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کفار قریش نے حضرت ابو طالب کو کہا: یا تو آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو ہمارے الٰہوں کو برا بھلا کہنے اور ان سے نفرت کرنے سے منع کریں اور یا پھر ہم بھی اس کے الٰہ کو برا بھلا کہیں گے اور اس کی ہجو کریں گے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے بیان کیا ہے: اس کا حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے پس جب کافروں کو اس سے منع کیا گیا ہے اور خوفزدہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کو یا نبی مکرم ﷺ کو یا اللہ تعالیٰ عزوجل کو برا بھلا کہیں، تو پھر مسلمانوں کے لیے بھی حلال نہیں ہے کہ وہ ان کی صلیب، ان کے دین اور ان کے گرجا گھروں کو برا بھلا کہیں، اور نہ ہی وہ اس طرح کا تعرض کریں جو انہیں اس حالت تک پہنچادے، کیونکہ یہ معصیت پر ابھارنے کے قائم مقام ہے۔ اور انہیں اصنام سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ان کے بارے عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتے جو کفار ان کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں بھی صلح کی ایک قسم کا بیان ہے، اور سد ذرائع کے حکم کے واجب ہونے پر دلیل ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے سورۃ البقرہ میں۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ کبھی حق دار اپنے حق سے رک جاتا ہے جب وہ اسے ایسے ضرر اور نقصان تک پہنچادے جو دین میں ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں وہ روایت ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم قطع تعلقی کے ڈر سے قرابت داروں کے درمیان فیصلہ نافذ نہ کرو۔ ابن عربی نے کہا ہے۔ اگر حق واجب ہو تو وہ اسے ہر حال میں لے گا اور اگر وہ جائز ہو تو اس میں یہ قول ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: عَدْوًا یعنی جہالت کے سبب اور زیادتی کرتے ہوئے۔ اور اہل مکہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے عُدُوًّا عین اور دال کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حسن، ابورجا اور حضرت قتادہ کی قرأت ہے اور یہ پہلی قرأت کی طرف ہی راجع ہے، اور مجموعی طور پر یہ دونوں بمعنی ظلم ہیں۔ اور اہل مکہ نے عَدُوًا عین کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ بمعنی عدو (عداوت دشمنی) کے پڑھا ہے اور یہ واحد ہے لیکن جمع کی طرف سے ذکر ہو رہا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الشعراء) (پس وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمُ الْعَدُوُّ (المنافقون: 4) یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ جس طرح ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل کو آراستہ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ ہم نے اہل طاعت کے لیے طاعت کو، اور اہل کفر کے لیے کفر کو آراستہ کر دیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (فاطر: 8) اس میں قدریہ کا رد ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠٩

''اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی پوری کوشش سے کہ اگر آ گئی ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور ایمان لائیں گے اس کے ساتھ۔ آپ فرمائیے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ جب یہ نشانی آ جائے گی تو (تب بھی) یہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْسَمُوْا یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں۔ اور جهدُ اليمين کا معنی ہے قسم کو مضبوط اور پختہ کرنا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا ہے۔ اور قولہ: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان کی قسموں کی وہ انتہائی کوشش جس تک ان کا علم پہنچا ہے، اور جہاں تک ان کی قدرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی الٰہ اعظم ہے اور یہ الٰہ جن کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کا گمان ہے کہ یہ انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ان کے بارے خبر دی گئی ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:3) (ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں)

وہ اپنے آبا کی، بتوں کی اور علاوہ ازیں دوسری چیزوں کی قسمیں کھاتے رہتے تھے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم بھی کھاتے تھے اور وہ اسے جهد اليمين کا نام دیتے تھے جب قسم اللہ کی کھاتے۔ اور جهد کا لفظ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل اَقْسَمُوْا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے معنی میں ہے(1) اور الجهد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے مشقت اٹھانا (انتہائی کوشش کرنا)۔ کہا جاتا ہے: فعلتُ ذالِكَ بجَهْدِ (میں نے وہ کام مشقت اور کوشش کے ساتھ کیا) اور الجُهد (جیم کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے: هذا جُهدُ (یہ میری طاقت ہے) اور بعض ان دونوں کو ایک ہی معنی میں رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں: وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (توبہ:79) (اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے) اور اسے جهدهم بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ ابن قتیبہ سے منقول ہے۔ اور آیت کا سبب نزول جو کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے، ان میں قرظی اور کلبی وغیرہ ہیں، وہ یہ ہے کہ قریش نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہمیں خبر دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر اپنا عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور یہ کہ قوم ثمود کے لیے ایک اونٹنی تھی، پس آپ بھی ہمارے سامنے ایسے معجزات میں سے کوئی لائیں تا کہ ہم آپ کی تصدیق کر سکیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کون سی شی تم پسند کرتے ہو؟''۔ انہوں نے عرض کی: آپ ہمارے لیے صفا (پہاڑ) کو سونا بنا دیجئے۔ تو قسم بخدا! اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ہم تمام کے تمام یقیناً آپ کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگنے کے لیے اٹھے، تو حضرت جبریل امین علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ''اگر آپ چاہیں تو صفا (پہاڑ) سونا ہو جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ ظاہر فرما دیا اور انہوں نے اسے دیکھ کر تصدیق نہ کی تو وہ یقیناً انہیں عذاب دے گا اس لیے آپ انہیں چھوڑ دیں یہاں تک کہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے''۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بل يتوبُ تائبهم(2) (بلکہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لے) تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اللہ رب العزت نے واضح فرما دیا کہ جس کے بارے وہ اپنے علم ازلی کے ساتھ جانتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، وہ ایمان نہیں لائے گا اگرچہ وہ قسم بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 333
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 485۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 218

کھائے کہ وہ یقیناً ایمان لائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے (کہ وہ ایسی قسم کھاتے ہیں) جو ان کے نزدیک انتہائی شدید اور اغلظ ہے۔ یہاں احکام میں سے بہت بڑا مسئلہ پیش آتا ہے اور وہ آدمی کا یہ قول ہے: الأیمان تلزمه إن كان كذا او كذا (اس پر قسم لازم ہوگی اگر اس طرح ہوا)۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ قسم ابتداء اسلام میں اس صورت کے بغیر معروف و مشہور تھی، وہ کہتے تھے: علیّ أشد ما أخذه أحدٌ على أحدٍ (مجھ پر اسے لینا انتہائی لازم اور ضروری ہے جو ایک کا دوسرے پر ہے)

تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی عورتیں آزاد (مطلقہ) ہو جائیں گی پھر صورتیں بہت زیادہ ہو گئیں یہاں تک کہ وہ لوگوں کے درمیان اس صورت کی طرف لوٹ آئیں جو ان کی اصل ہے۔ ہمارے شیخ الفهری طرسوسی کہا کرتے تھے: جب وہ اس میں حانث ہوگا تو اس پر تیس مسکینوں کو کھانا کھلانا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا قول الأیمان، یمین کی جمع ہے، اور اگر اس نے علی یمین کہا اور حانث ہو گیا تو ہم اس پر ایک کفارہ لازم کریں گے۔ اور اگر اس نے کہا: علی یمینان تو حانث ہونے کی صورت میں اس پر دو کفارے لازم ہوں گے اور أیمان یمین کی جمع ہے لہٰذا اس میں اس پر تین کفارے لازم ہوں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احمد بن محمد بن مغیث نے اپنے وثائق میں ذکر کیا ہے کہ قیروان کے شیوخ نے اس میں اختلاف کیا ہے اور ابو محمد بن ابی زید نے کہا ہے: اس پر اپنی بیوی کے بارے میں تین طلاقیں لازم ہو سکتی ہیں، مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چلنا، اپنے مال کا تہائی حصہ صدقہ کرنے، قسم کا کفارہ اور غلام کو آزاد کرنا لازم ہو سکتا ہے۔

ابن مغیث نے کہا ہے: اور اسی طرح ان کے سردار ابن ارفع اور فقہاء طُلَيْطُله میں سے ابن بدر نے کہا ہے۔ اور شیخ ابو عمران فاسی، ابو الحسن قابسی، اور ابو بکر بن عبد الرحمن قروی نے کہا ہے: اس پر ایک طلاق لازم ہو جائے گی جب اس کی نیت نہ ہوئی۔ اور اس بارے میں ان کی حجت ابن حسن کی روایت ہے جو انہوں نے اس قول کے بارے میں ابن وہب سے سنی ہے: أشد ما أخذه أحد على أحد أن عليه في ذالك كفارة يمين۔

ابن مغیث نے کہا ہے: جن کا ہم نے نام لیا ہے انہوں نے الأیمان تلزمه کہنے والے پر ایک طلاق لازم کی ہے، کیونکہ اس کے اس قول سے بڑھ کر برا حال کوئی نہیں ہوتا: أشد ما أخذه أحد على أحد أن عليه كفارة يمين۔ (انہوں نے کہا) اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ فرمایا: پہلے گروہ نے ابن القاسم کے قول سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے اس کے بارے کہا جس نے یہ کہا: علیّ عهد الله وغليظ ميثاقه و كفالته وأشد ما أخذه أحدٌ على أحد على أمر ألا يفعله ثم فعله یعنی وہ کسی کام کے بارے مذکور لفظ کہہ کر قسم کھاتا ہے کہ وہ اسے نہیں کرے گا پھر وہ اسے کر گزرتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس نے طلاق اور عتاق کا ارادہ نہیں کیا اور اس نے ان دونوں کو اس سے جدا اور علیحدہ رکھا تو چاہیے کہ اس پر تین کفارے لازم ہوں۔ اور اگر قسم کھاتے وقت اس کی کوئی نیت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اس قول میں دو کفارے ادا کرے: علیّ عهد الله وغليظ ميثاقه اور وہ غلام آزاد کرے گا اور اس کی عورتیں چھوٹ جائیں گی، اور مکہ مکرمہ کی طرف پیدل چل کر جائے گا اور

اپنے مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرے گا جب اس نے یہ کہا: أشد ما أخذہ أحد علی أحد۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا طریقہ استدلال تو وہ یہ ہے کہ الأیمان میں الف لام جنسی ہوگا یا عہدی ہوگا پس اگر الف لام عہدی ہو تو پھر معہود تیرا قول باللہ ہوگا تو اس صورت میں وہ لازم ہوگا جو فہری نے کہا ہے اور اگر الف لام جنسی ہو تو پھر طلاق جنس ہے اور اس پر یہ داخل ہو رہا ہے اور پھر اس کا عدد پورا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں ہر جنس میں ایک معنی داخل ہونا کافی ہوتا ہے، کیونکہ اگر جنس میں کل معنی داخل ہو تو پھر اس کے لیے تمام مال صدقہ کرنا لازم ہو، کیونکہ کبھی مال کا صدقہ کرنا قسم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم (1)

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے: ان نشانیوں اور معجزات کے لانے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اور وہ جب چاہے گا انہیں لے آئے گا۔

وَمَا یُشْعِرُكُمْ، ای وما یدریکم أیمانکم اور تمہیں اپنی قسموں کے بارے میں کیا خبر مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اس میں اِن مکسور ہے، اور یہ قرأت حضرت مجاہد، ابو عمرو اور ابن کثیر کی ہے، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اس کی شہادت دیتی ہے۔ وَمَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اور حضرت مجاہد اور ابن زید نے کہا ہے: اس کا مخاطب مشرکین ہیں، اور کلام مکمل ہو گیا۔ ان پر حکم یہ لگایا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور تحقیق اس کے بعد آیت میں (اللہ تعالیٰ نے) ہمیں بتایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ تاویل اس کی قرأت سے مشابہت رکھتی ہے جس نے تُؤمنون تا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور فراء وغیرہ نے کہا ہے: خطاب مومنین کے لیے ہے، کیونکہ مومنوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آیت نازل ہوئی تو شاید وہ ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا یُشْعِرُكُمْ یعنی تمہیں کیا خبر اور تمہیں کون بتائے اے مومنین! اَنَّهَاۤ یعنی ہمزہ مفتوح ہے، اور یہ اہل مدینہ، اعمش اور حمزہ کی قرأت ہے یعنی لَعَلَّها إذا جاءت لا یُؤمنونَ (شاید جب وہ نشانی آجائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے) خلیل نے کہا ہے: اَنَّهَاۤ بمعنی لعلها ہے، اسے ان سے سیبویہ نے بیان کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ۝ (عبس) یعنی انه یزکیٰ (اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جائے) اور عربوں سے حکایت ہے: ایت السوق أنك تشتری لنا شیئا، ای لعلك (تو بازار آ شاید تو ہمارے لیے کوئی شی خریدے)

اور ابو النجم نے کہا ہے:

قلت لشَیْبَان اُدْنُ من لقائه أنْ تُغَدِّی القومَ من شِوَائه

اور عدی بن زید نے کہا ہے:

أعاذِلَ ما یُدریك أنّ منیّتی إلی ساعة فی الیوم أو فی ضُحَی الغَدِ

1۔ احکام القرآن لابن عربی، جلد 2، صفحہ 737

تو ان میں أنّ بمعنی لعلّ مذکور ہے۔

اور درید بن صمہ نے کہا ہے:

أرینی جوادًا مات هزلًا لأنّني	أری ما ترین أو بخیلا مخلّدا

تو اس میں بھی لأنّنی، لعلّنی کے معنی میں ہے۔ اور کلام عرب میں أنّ بمعنی لعلّ کا استعمال کثیر ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ مصحف حضرت ابی بن کعب میں اسی طرح ہے: وما أدراکم لعلها اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: کہ لا زائدہ ہے، اور معنی ہے: وما یشعرکم أنها یعنی الآیات۔ تمہیں کیا خبر کہ نشانیاں جب مشرکین کے پاس آجائیں تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس اس میں لا زائد کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں لا زائد کیا گیا ہے: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝ (الانبیاء) کیونکہ اس کا معنی ہے: وحرام علی قریۃ مہلکۃ رجوعهم (ہلاک شدہ گاؤں پر ان کا رجوع حرام ہے)

اور اس قول باری تعالیٰ میں مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (الاعراف: 12) اس کا معنی ہے: مَا منعكَ أن تسجدَ (تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا ہے) اور زجاج اور نحاس وغیرہما نے لا کے زائدہ ہونے کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ غلط اور خطا ہے، کیونکہ اسے ایسی عبارت میں زائد کیا جاتا ہے جس میں یہ اشکال پیدا نہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: وما یُشعرُکم أنها إذا جاءتْ لا یُؤمنونَ أو یُؤمنونَ (تمہیں کیا خبر ہے کہ جب وہ نشانی آجائے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے یا ایمان لائیں گے) پھر سامع کو اس کا علم ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ نحاس وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝۱۱۰

”اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں“۔

یہ آیت مشکل ہے، اور بالخصوص وہ (اشکال) اس میں ہے وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو قیامت کے دن آگ کے شعلوں اور انگاروں کی حرارت کی طرف پھیر دیں گے، جس طرح کہ وہ دنیا میں ایمان نہیں لائے۔

وَنَذَرُهُمْ اور ہم انہیں دنیا میں چھوڑ دیں گے یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے اور ہم انہیں سزا نہیں دیں گے، پس آیت کا کچھ حصہ آخرت کے بارے میں ہے اور کچھ دنیا کے بارے میں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ۝ (الغاشیہ) یہ آخرت میں ہوگا اور عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ۝ (الغاشیہ) یہ دنیا میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم دنیا میں پھیر دیں گے، یعنی ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان حائل ہو جائیں گے اگر وہ نشانی ان کے پاس آ بھی جائے، جیسا کہ ہم ان کے درمیان اور ایمان کے درمیان پہلی بار حائل ہوئے، جب آپ نے انہیں دعوت دی اور ان پر اپنا معجزہ ظاہر فرمایا۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (الانفال: 24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم)

حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان) اور معنی یہ ہے: چاہیے یہ تھا کہ وہ ایمان لاتے جب ان کے پاس نشانی آ گئی اور انہوں نے اسے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا اور اسے اپنے دلوں کے ساتھ پہچان لیا، پس جب وہ ایمان نہیں لائے تو ایسا اللہ تعالیٰ کے ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھرنے کے سبب ہوا۔

كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور کاف محذوف پر داخل کیا گیا ہے، ای فلا یؤمنون کما لم یؤمنوا به اول مرة (پس وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے) یعنی پہلی مرتبہ ان کے پاس ایسی نشانیاں اور معجزات آئے جن کا معارض (اور مقابل) لانے سے وہ عاجز آ گئے مثلاً قرآن کریم وغیرہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور ہم ان کے دلوں کو پھیر دیں گے تا کہ وہ ایمان نہ لائیں جس طرح کہ گزشتہ امتوں کے کفار ایمان نہیں لائے جب انہوں نے ان نشانیوں کو دیکھا جن کی انہوں نے خواہش کی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے: یعنی أنها اذا جاءت لا یؤمنون کما لم یؤمنوا أول مرة و نقلب أفئدتهم و أبصارهم (یہ کہ جب وہ نشانی آ جائے وہ ایمان نہیں لائیں گے جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے) وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں ہی چکر کاٹتے رہیں۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ، لیکن اکثر ان میں سے (بالکل) جاہل ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور وہ انہیں عیاں دیکھ لیتے۔ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى اور مردے ان سے باتیں کرنے لگتے ہمارے انہیں زندہ کرنے کے ساتھ۔ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ نشانیوں میں سے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا (وہ ہر شی ہم ان کے لیے جمع کر دیتے) قُبُلًا ان کے سامنے۔ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ نافع اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے معاینہ ان کے روبرو، تو وہ ایمان نہ لاتے۔

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: قِبَلا بمعنی ناحیة (طرف) ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: لی قِبل فلان مالٌ (میرا فلاں کی طرف مال ہے) پس قِبَلا، طرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور باقیوں نے قبلا پڑھا ہے یعنی قاف اور با کے ضمہ کے ساتھ، اور اس کا معنی ہے ضمناء پس یہ قبیل کی جمع ہوگی بمعنی کفیل، جیسا کہ رغیف اور رغف ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ (الاسراء) یعنی وہ اس کے ضامن ہوں گے۔ یہ فراء سے منقول ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ معنی قبیل قبیل ہے۔ یعنی جماعت در جماعت۔

اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ دونوں قولوں کے مطابق حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے قبلا بمعنی مقابلہ ہے (یعنی سامنے) اور اسی معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (یوسف: 26) (اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے) اور اسی سے قُبُل الرجلِ و دُبُرہ ہے اور یہ اس چیز کے لیے ہے جو آدمی کے سامنے ہو اور اس کے پیچھے ہو۔ اور اس سے قُبُل الحیض بھی ہے۔

ابو زید نے بیان کیا ہے: لقیت فلانا قُبُلا و مقابلة و قَبَلا و قُبُلا ان تمام کا معنی ہے میں آدمی کو بالمشافہ (روبرو) ملا۔ پس معنی میں ضمہ، کسرہ کی طرح ہی ہے اور دونوں قرأتیں مساوی اور برابر ہیں۔ مکی نے یہ کہا ہے اور حسن نے قُبْلا پڑھا ہے اس میں با سے ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور فراء کے قول کے مطابق اس میں ایسی شے کا بولنا مراد ہے جو بولتی نہیں اور اس چیز کی کفالت میں جو عقل و فہم نہیں رکھتی ان کے لیے بہت بڑی علامت اور نشانی ہے۔ اور اخفش کے قول کے مطابق اس میں ان اجناس کا جمع ہونا ہے جو معبود نہیں۔ اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں اَنْ استثنا کے محل میں ہے پہلے کلام سے نہیں ہے۔ یعنی لٰکن اِنْ شاء اللہ لهم (لیکن اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے چاہتا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ استثنا ان اہل سعادت کے لیے ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اور اس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ لیکن ان میں سے اکثر حق سے جاہل ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اس چیز سے غافل اور جاہل ہیں کہ ایک نشانی اور معجزہ دیکھ لینے کے بعد مزید نشانیوں اور معجزات کی خواہش کرنا جائز نہیں ہوتا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿112﴾

"اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لیے، اور اگر چاہتا آپ کا رب تو وہ یہ نہ کرتے سو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حوصلہ اور تسلی دے رہا ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ کو اس قوم کے ساتھ آزمائش میں ڈالا ہے اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے بھی ہر نبی کے لیے دشمن بنائے تھے۔ عَدُوًّا یعنی دشمن۔ پھر ان کی صفت بیان کی اور فرمایا: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ (1) سیبویہ نے بیان کیا ہے کہ جعل بمعنی وصف ہے۔ عَدُوًّا مفعول اوّل ہے۔ لِكُلِّ نَبِيٍّ یہ مفعول ثانی کے محل میں ہے۔ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یہ عدو سے بدل ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ شیاطین مفعول اوّل ہو اور عدو مفعول ثانی ہو۔ گویا کہ اس طرح کہا گیا: جعلنا شیاطین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 124

الْإِنسِ والجِنِّ عدّوًا اور اعمش نے شیاطین الجنّ والانس پڑھا ہے یعنی الجن کو مقدم کیا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے۔ (1)

يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا یہ اس شے سے عبارت ہے جو جنوں میں سے شیطان انسانوں کے شیطانوں کی طرف وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ اور اسے وحی کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ یہ خفیہ ہوتی ہے، اور ان کی ملع سازی کو زخرف کہا ہے، کیونکہ وہ اسے خوب آراستہ کر کے بیان کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سونے کو زخرف کا نام دیا گیا ہے۔ اور ہر وہ شے جو حسین ہو اور اس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو تو وہ زخرف ہے۔ اور المزخرف کا معنی ہے المزین (وہ شے جس کو آراستہ کیا جائے، خوشنما بنایا جائے) اور زخارف الماء کا معنی پانی کے راستے ہیں۔ اور غُرُوْرًا کو مصدر کی بنا پر نصب دی گئی ہے، کیونکہ يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کا معنی ہے وہ انہیں اس کے ساتھ بہت دھوکہ دیتے ہیں۔ یغرونهم بذالك غرورا تو اس صورت میں غُرُوْرًا مفعول مطلق ہوگا)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ حال کے محل میں ہو۔

اور غُرُوْرًا کا معنی باطل ہونا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف اسناد کے ساتھ یہ مروی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ: يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ کے بارے میں کہا ہے کہ ہر جن کے ساتھ ایک شیطان ہے اور ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے، پس ان میں سے ایک دوسرے کو ملتا ہے اور یہ کہتا ہے: میں نے اپنے صاحب کو اس طرح گمراہ کیا ہے پس تو بھی اپنے صاحب کو اسی طرح گمراہ کر دے۔ اور دوسرا بھی اسے اسی طرح کہتا ہے۔ پس یہی ان میں سے بعض کی بعض کی طرف وحی ہے اور حضرت عکرمہ اور ضحاک، سدی اور کلبی نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: پہلا قول اسی پر دلالت کرتا ہے وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام: 121) پس یہ اسی معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر صحیح سنت بھی دلالت کرتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر جنوں میں سے ایک ساتھی اس پر مسلط کیا گیا ہے"۔ عرض کی گئی: کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے اور اس نے اسلام قبول کر لیا ہے (یعنی وہ مطیع ہو چکا ہے) اور وہ مجھے خیر اور نیکی کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا"۔ اس میں فاسلم کا لفظ میم کے رفع اور نصب دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ پس رفع اس معنی پر ہے کہ میں اس کے شر سے محفوظ ہوں۔ اور نصب اس معنی کی بنا پر ہے کہ وہ اسلام لا چکا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما منکم من احد اور یہ نہیں کہا ولا من الشیاطین (اور نہ شیطانوں میں سے) مگر یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس میں دو جنسوں میں سے ایک کو دوسری کے بارے متنبہ اور آگاہ کرتا ہو۔ پس یہ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) کے باب سے ہوگا۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت عوف بن مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 476

اباذر! کیا تو نے انسانوں اور جنات کے شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے؟'' ۔انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا انسانوں کے شیاطین بھی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ جنوں کے شیاطین سے زیادہ شریر ہیں''(1)۔ اور مالک بن دینار نے کہا ہے: بلاشبہ انسانوں کا شیطان مجھ پر جنوں کے شیطان سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اس لیے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کروں تو جنوں کا شیطان مجھ سے دور ہو جاتا ہے اور انسانوں کا شیطان میرے پاس آجاتا ہے اور وہ مجھے واضح طور پر معاصی اور گناہوں کی طرف کھینچتا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

إن النساء رَياحين خُلقِن لكم — وكلُكم يشتهِي شمّ الرياحين

''بے شک عورتیں خوشبودار پودے ہیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں اور تم تمام ریاحین کی خوشبو پسند کرتے ہو''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس طرح جواب دیا:

إن النسآء شياطين خُلقِن لنا — نعوذ بالله من شر الشياطين

''بلاشبہ عورتیں شیاطین ہیں جو ہمارے لیے پیدا کی گئی ہیں ہم شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ** اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ دھوکہ دہی کے قول کی وسوسہ اندازی نہ کرتے۔

**فَذَرْهُمْ** یہ امر ہے اور اس میں تہدید (ڈرانے) کا معنی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: نہیں کہا جائے گا: وذَرَ اور نہ ہی ودَعَ، ترک کے سبب وہ ان دونوں سے مستغنی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے اکثر استعمال کی بنا پر ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: **وَذَرِ الَّذِيْنَ** اور **ذَرْهُمْ** اور **مَا وَدَّعَكَ** اور حدیث طیبہ میں ہے: لينتهين أقوام عن وَدْعِهم الجُمُعات (2) (قومیں اپنے جمعوں کو چھوڑنے سے باز آجائیں گی) اور اس کا قول إذا فعلوا سے مراد معاصی اور گناہ ہیں۔ فقد تُوُدِّعَ منهم تحقیق وہ ان سے چھڑا دیا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: واؤ ثقیل ہے، پس جب ترک ہے اس میں واؤ نہیں ہے اور یہ اس کے معنی میں ہے جس میں واؤ ہے تو پھر اسے چھوڑ دیا گیا جس میں واؤ ہے اور یہ اس کے قول کا معنی ہے یہ نص نہیں ہے۔

## وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۝

''اور (چھوڑیئے) تاکہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان کے دل جو نہیں ایمان لائے آخرت پر اور تاکہ پسند کریں اسے اور کرتے رہیں جو گناہ وہ اب کر رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: **وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ**، تصغی بمعنی تمیل (مائل ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: صغوت أصغُو صَغْوًا و صُغُوًّا، وصَغَيت أصغَى، وصَغِيت یہ غین کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے: صغِي يَصْغَى صغًى وصُغِيًّا، وأصغيت

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 499

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2132

إلیه إصغاء تمام ہم معنی ہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

تَرَی السَّفِیْهَ بِه عن کلّ مُحْکَمَة　　زَیْغٌ و فیه الی التشبیه إصغاء

اور کہا جاتا ہے: أصغیت الإناء (اور یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو برتن کو جھکا دے تا کہ جو کچھ اس میں ہے وہ جمع اور اکٹھا ہو جائے۔ اور اس کی اصل المیل الی الشئ لغرض من الاغراض ہے یعنی کسی غرض اور مقصد کے لیے کسی چیز کی طرف مائل ہونا (جھکنا) اور اسی سے ہے صَغَت النجوم ستارے غروب ہونے کی طرف مائل ہوئے۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) (اور تمہارے دل بھی توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں) ابوزید نے کہا ہے: (کہا جاتا ہے) صَغْوہ معك و صِغْوہ معك، صَغاہ معك، ای میله (اس کا میلان تیرے ساتھ ہے) اور حدیث میں ہے: فأصْغَی لها الإناء (1) یعنی اس نے بلی کے لیے برتن جھکا دیا۔ اور أکرموا فلانا فی صاغِیته یعنی تم فلان کی تکریم کرو اس کی اس قرابت کے سبب جس کی طرف وہ مائل ہوتے ہیں اور جو اس کے پاس ہے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور أصغت الناقة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب ناقہ اپنا سر آدمی کی طرف جھکائے گویا کہ وہ اس سے کچھ سن رہی ہے جب وہ اس پر کجاوہ باندھتا ہے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تُصْغِی إذا شدّها بالکُورِ جانحةً　　حتی إذا ما استوَی فی غَرْزِها تَثِبُ

اور وَ لِتَصْغَی میں لام لام کی ہے، اور اس میں عامل یُوْحِیْ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ لِیَغُرُّوهم ولِتَصْغَی (ان میں سے بعض بعض کی طرف القاء کرتے ہیں تا کہ وہ انہیں دھوکہ دیں تا کہ (دل ان کی طرف) مائل ہوں)۔ اور بعض نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ لام امر ہے، اور یہ غلط ہے، کیونکہ اس میں ولِتصغَ إلیه الف کو حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ لام کی ہی ہے۔

اور اسی طرح ولِیَرضَوْہُ ولِیَقْتَرِفُوا میں بھی ہے۔ مگر حسن نے وَلِیَرْضَوْهُ وَلِیَقْتَرِفُوا لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے لام امر قرار دیا ہے اور اس میں تہدید کا معنی موجود ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے: إفعل ماشئتَ (جو تیری مرضی وہ کر، تو اس میں امر تہدید کے لیے ہے) اور وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ کا معنی ہے ولیکتسبوا (چاہیے کہ وہ کرتے رہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے یہی مروی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرج یقترفُ أهله ای یکتسب لهم (وہ نکل گیا جو اپنے اہل کے لیے کرتا ہے) اور قارَفَ فلانٌ هذا الأمر جب وہ اس کام میں خود واقع ہو اور اسے عملاً کرے۔ اور قرفتنی بما إدعیت علیّ ای رمیتنی بالریبة (تو نے مجھے شک میں ڈال دیا) اور قرف القُرحة (تب کہا جاتا ہے) جب وہ زخم کو چھیل دے اور اقترف کَذِبًا (اس نے جھوٹ گھڑ لیا)۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاستبراء، باب سور الهرة، حدیث 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارت، باب الوضوء بسور الهرة، حدیث 380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روبہ نے کہا ہے:

أعيا اقتراف الكذب المقروفِ　　تقوى التّقي وعفةُ العفيفِ

اور اس کا اصل معنی ہے کسی شی سے کوئی ٹکڑا کاٹنا۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۱۱۴

"(آپ ان سے پوچھیے) کیا الله کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور منصف حالانکہ وہی ہے جس نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب مفصل۔ اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ (اچھی طرح) جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) اتارا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ، تو (اے سننے والے!) ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا اس میں غیر کو اَبْتَغِيْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔ اور حَكَمًا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر چاہے تو حال بنالے۔ اور معنی یہ ہے: کیا میں تمہارے لیے الله تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم تلاش کروں حالانکہ وہ وہ ہے جو تمہیں آیات کے بارے سوال کی مشقت اور بوجھ کے وقت کافی ہوا (کہ) اس نے تمہاری طرف کتاب مفصل نازل فرمادی، اس میں مفصل بمعنی مبین (وضاحت کرنے والی) ہے۔ پھر کہا گیا ہے: حکم، حاکم سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ حکم نام رکھنے کا کوئی مستحق نہیں ہے مگر وہی جو حق کے ساتھ فیصلے کرتا ہے، کیونکہ یہ مدح میں بہت عظیم صفت ہے اور حاکم ایسی صفت ہے جو فعل پر جاری ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ اس کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے جو بغیر حق کے فیصلے کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اس میں مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: (وہ مراد ہیں) جو ان میں سے اسلام لے آئے مثلاً حضرت سلمان، حضرت صہیب اور حضرت عبدالله بن سلام رضی اللہ عنہم۔ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ یعنی وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ یعنی وہ سب جو قرآن کریم میں وعدہ وعید میں سے ہے وہ سب برحق ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ یعنی آپ اس بارے میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں کہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ قرآن الله تعالیٰ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے رؤساء (سردار) ہیں اور وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۱۵

"اور مکمل ہوگئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اہل کوفہ کی قرأت کلمہ واحد کے ساتھ ہے اور باقیوں کی جمع کے ساتھ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مواعيدُ ربك (تیرے رب کے وعدے) پس انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور کلمات، عبارات یا متعلقات کی طرف راجع ہے اور متعلقات سے مراد وعدہ اور وعید وغیرہ ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا: الکلمات سے مراد

قرآن کریم ہے اسے کوئی بدلنے والا نہیں، جھوٹ گھڑنے والے نہ اس میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کمی کر سکتے ہیں۔

صِدْقًا وَّ عَدْلًا یعنی اس میں جو وعدہ اور حکم ہے (اس کی سچائی اور عدل سے) اس کے فیصلے کو کوئی رد کرنے والا نہیں اور نہ کوئی اس کے وعدہ کے خلاف ہونا ممکن ہے اور رمانی نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: جس بارے میں وہ اس کے ساتھ فیصلہ فرمائے اسے کوئی تبدیل کرنے والا نہیں، یعنی بلاشبہ اگر وہ اس کے لیے الفاظ میں تغیر و تبدل ممکن بنادے جیسا کہ اہل کتاب نے تورات و انجیل میں تبدیلی کر لی تو پھر یہ قابل اعتماد اور قابل اعتبار نہیں رہتا۔ اور یہ آیت قرآن کریم کی دلالات کے واجب الاتباع ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ایسا حق ہے جسے ایسی شی کے ساتھ تبدیل کرنا ممکن نہیں جو اس کی مناقض ہو، کیونکہ یہ ایسے حکیم کی جانب سے ہے جس پر تمام امور میں سے کوئی شی مخفی نہیں ہے۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۱۷﴾

''اور (اے سننے والے!) اگر تو اطاعت کرے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے، وہ نہیں پیروی کرتے سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ مگر محض تخمینے لگاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی اگر تو اطاعت کرے کفار کی۔ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو وہ تجھے بہکا دیں گے اس راستے سے جو اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ اس میں اِنْ بمعنی ما ہے، اور اسی طرح وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ہے یعنی نہیں ہیں وہ مگر تخمینے لگاتے ہیں اور اندازے لگاتے ہیں، اور اسی سے الخرص ہے، اور اس کا اصل معنی کاٹنا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

تری قِصَد المُرّان فینا كأنه　　تَذَرُّع خِرصان بأیدِی الشّواطِبِ

یعنی وہ ٹہنی جو طولاً کاٹی جاتی ہے اور اس سے (سہارا کے لیے) کھونڈی بنائی جاتی ہے۔ اور یہ خرصان خرص کی جمع ہے۔ اور اس سے خَرَص یَخْرُص النخل خَرْصا ہے جب وہ اس کا اندازہ لگائے تاکہ وہ اس سے خراج وصول کرے۔ اور خارص وہ ہوتا ہے جو ایسی شی کے ساتھ کاٹتا ہے جس کے ساتھ کاٹنا جائز نہیں ہوتا، جب کہ اس کے ساتھ اسے یقین نہ ہو۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ ذاریات میں آئے گا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بعض لوگوں نے کہا ہے: یہاں اَعْلَمُ بمعنی یعلم ہے۔ اور اس کی تائید میں حاتم طائی کا قول بیان کرتے ہیں۔

تحالفتْ طيئٌ من دوننا حلفاً　　والله أعلم ما كنا لهم خُذُلا

اور خنساء کا قول ہے:

الله أعلم أن جفنته تغدو غداة الريح أو تسری

(ان دونوں میں أعلم بمعنی یعلم ہے)

اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ کے مطابق نہیں ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے اصل پر مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ اس میں من بمعنی أی ہے۔ اور یہ محل رفع میں ہے اور اسے رفع دینے والا عامل يَّضِلُّ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أعلم کے سبب محل نصب میں ہے، یعنی إن ربك أعلم أی الناس يَضِل عن سبيله (بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے لوگوں میں سے کون ہے جو اس کی راہ سے بہک رہا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حرف جر کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے یعنی بمن يَضِل بعض بصریوں نے یہ کہا ہے۔ یہ اچھا اور حسین ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور سورہ نحل کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور یضل بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مفعول کو حذف کرنے کی بنا پر ہے، اور پہلا قول احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور اگر یہ اضلال سے ہوتا تو وہ فرماتا: وهو أعلم بالهادين۔

## فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''تو کھاؤ اس میں سے لیا گیا ہے نام خدا جس پر اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ یہ آیت کچھ لوگوں کے سبب نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ہم اسے تو کھاتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ مار دے؟ تب یہ آیات نازل ہوئی: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ اسے ترمذی وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت اس بات کا حکم ہے کہ کوئی مشروب پیتے وقت، ذبح کے وقت اور ہر قسم کی کھائی جانے والی شی کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی (یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) پڑھنا چاہیے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم اس کے احکام اور اوامر کو لینے والے (پکڑنے والے) ہو، کیونکہ ایمان انہیں متضمن ہوتا ہے اور انہیں پکڑنے اور ان کی پیروی کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

## وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اهل الکتاب، حدیث 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور کیا ہوا تمہیں کہ نہیں کھاتے ہو تم اس جانور کو لیا گیا ہے اللہ کا نام جس پر حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لیے جو اس نے حرام کیا تم پر مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف، اور بے شک بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشوں سے بے علمی کے باعث، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اس کا معنی ہے تمہارے لیے کون سی شی مانع ہے اس کو کھانے سے جس پر تم نے اپنے رب کا نام لیا ہے اگرچہ تم نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔

وَ قَدْ فَصَّلَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال اور حرام کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور تم سے التباس اور شک کو زائل کر دیا گیا ہے اور ما استفہامیہ تقریر کو متضمن ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: وأیّ شیءٍ لَكُمْ فی اَلَّا تَاْكُلُوْا (اور اس میں تمہارے لیے کون سی شی ہے کہ تم اسے نہیں کھاتے) اور أن بتقدیر حرف جر محل جر میں ہے۔ اور اس بنا پر محل نصب میں ہونا بھی صحیح ہے کہ حرف جر مقدر نہ ہو اور نصب دینے والا عامل اس فعل کا معنی ہو جو مالکم میں ہے اور اس کی تقدیر ہے ما یمنعکم (کونسی شی تمہیں روکتی ہے) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ اس میں مراد وہ سب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے ہیں مثلاً مردار وغیرہ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے۔ اور نافع اور یعقوب نے وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ دونوں فعلوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، ابن عامر اور ابن کثیر نے دونوں میں ضمہ پڑھا ہے۔ (یعنی فصل اور حرم) اور کوفیوں نے فصل کو فتحہ کے ساتھ اور حرم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور عطیہ العوفی نے فصل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے جدا کرنا اور ظاہر کرنا، جیسا کہ اس آیت میں پڑھا گیا ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ہود: 1) ای إستبانت (یعنی ظاہر کر دیں)۔ ابو عبیدہ نے اہل مدینہ کی قرأت کو اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فصل کا معنی بین (بیان کرنا، واضح کرنا) ہے اور یہ وہی ہے جو سورۃ المائدہ میں اس ارشاد کے تحت مذکور ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ الآیہ (المائدہ: 3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ سورۃ الانعام مکی ہے اور سورۃ المائدہ مدنی سورت ہے تو یہ کیسے اس کا بیان بن سکتی ہے جو ابھی تک نازل ہی نہیں ہوئی؟ سوائے اس صورت کے کہ فصل بمعنی یفصل ہو۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ اور قراء کوفہ نے اسے یضلون، أضل سے پڑھا ہے۔

بِاَهْوَآىِٕهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی مشرکین نے جب کہا: جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی چھری کے ساتھ ذبح کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جنہیں تم اپنی چھریوں کے ساتھ ذبح کرتے ہو۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنی بغیر علم کے جو وہ ذبح کے معاملہ میں جانتے ہیں، کیونکہ اس میں حکمت اس خون کو نکالنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہم پر حرام قرار دیا ہے بخلاف اس جانور کے جو دم گھٹنے سے مر جائے۔ اسی لیے محل مخصوص سے ذبح کو مشروع کیا گیا ہے تاکہ اس میں ذبح جانور سے تمام خون کے نکلنے کا سبب بن جائے بخلاف کسی اور عضو

کے (کیونکہ وہاں سے سارے خون کا نکلنا ممکن نہیں ہوتا) واللہ اعلم۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور ترک کر دو ظاہر گناہ کو اور چھپے ہوئے کو، بے شک وہ لوگ جو کماتے ہیں گناہ (تو) جلدی ہی سزا دی جائے گی انہیں (اس گناہ کی) جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اس بارے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ اور ان کا نتیجہ اور حاصل جس کی طرف وہ راجع ہیں وہ یہ ہے کہ ظاہر وہ ہے جو بدن کا ایسا عمل ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو اور باطن وہ عمل ہے جس کا دل سے اعتقاد رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، چاہے حکم امر کی صورت میں ہو یا نہی کی صورت میں۔ اس مرتبہ پر وہی پہنچ سکتا ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور نیکی کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا (المائدہ:93) (پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور (جو اترا) اس پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں) اور یہ اس اعتبار سے تیسرا مرتبہ ہے جن کا بیان پہلے سورۃ المائدہ میں ہو چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں تھے کہ ظاہراً زنا کرتے اور باطناً انہیں بیویاں بناتے تھے۔ اور جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے وہ ہر گناہ کو جامع ہے (اور ہر امر کا موجب ہے)۔

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''اور مت کھاؤ اس جانور سے کہ نہیں لیا گیا اللہ کا نام اس پر اور اس کا کھانا نافرمانی ہے اور بے شک شیطان ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے دلوں میں (اعتراضات) تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم مشرک ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ابوداؤد نے روایت بیان کی ہے کہ یہودی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہم اسے تو کھا لیتے ہیں جسے ہم خود مارتے ہیں اور اسے نہیں کھاتے جسے اللہ تعالیٰ مار دے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ، الی آخر الآیۃ (1)۔ اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ انہوں نے بیان فرمایا: مشرکین نے ان سے جھگڑا کر دیا اور انہوں نے کہا: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے تو اسے تم نہیں کھاتے اور جسے تم خود ذبح کرتے ہو اسے تم کھا لیتے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی ذبائح اہل الکتاب، حدیث نمبر 2436، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہو۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے لیے ارشاد فرمایا: لَا تَاْكُلُوْا تم نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا ہے۔ اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور وہ یہ ہے کہ جو لفظ سبب کی بنا پر وارد ہو کیا اسے اسی پر محصور کیا جائے گا یا نہیں؟ تو ہمارے علماء نے بیان کیا ہے: اس میں دعویٰ عموم کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں جسے شارع نے ابتداءً ہی الفاظ عموم کے ساتھ ذکر کیا ہو، البتہ وہ جسے کسی سوال کے جواب میں ذکر کیا ہو تو اس میں تفصیل ہے، جو اصول فقہ میں معروف ہے۔ مگر یہ کہ اگر اسے بغیر سوال کے لفظ مستقل کے ساتھ ذکر کیا جائے تو پھر وہ تعمیم کے ارادہ کے صحیح ہونے کی صورت میں اوّل (کلام) کے ساتھ لاحق ہوگا، پس قول باری تعالیٰ: لَا تَاْكُلُوْا مردار کو شامل ہونے میں ظاہر ہے۔ اور اس میں وہ بھی داخل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا کیونکہ یہ الفاظ عام ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی اور کے ذکر کی زیادتی وہ ہے جس کی تحریم کا تقاضا بطور نص اس ارشاد سے ہوتا ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرہ: 173) (اور وہ جانور بلند کیا گیا جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام) کیا اس میں وہ جانور بھی داخل ہوگا جس پر ذبح کے وقت یا شکار پر چھوڑتے وقت کسی مسلمان نے تسمیہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں پانچ قول ہیں۔ اور یہی وہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ پہلا قول: اگر اس نے تسمیہ سہواً (بھول کر) چھوڑ دیا تو دونوں جانور کھائے جائیں گے یہی اسحاق کا قول ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور اگر اس نے عمداً (جان بوجھ کر) چھوڑ دیا تو دونوں نہ کھائے جائیں گے۔ امام مالک اور ابن القاسم نے اپنی کتاب میں یہی کہا ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے اصحاب، امام ثوری، حسن بن حی، عیسیٰ اور اصبغ نے کہا ہے اور سعید بن جبیر اور عطا نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے پسند کیا ہے اور کہا ہے: یہ احسن ہے، کیونکہ اسے فاسق کا نام نہیں دیا جا سکتا جب وہ بھول گیا۔

دوسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا سہواً چھوڑ دیا تو وہ دونوں کو کھا لے گا۔ اور امام شافعی اور حسن رحمہما اللہ کا قول ہے اور حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عطا، حضرت سعید بن مسیب، حضرت جابر بن زید، حضرت عکرمہ، حضرت ابو عیاض، حضرت ابو رافع، حضرت طاؤس، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ اور زہراوی نے امام مالک بن انس سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ ذبیحہ کھایا جائے گا جس پر عمداً یا بھول کر تسمیہ چھوڑ دیا گیا۔ اور حضرت ربیعہ سے بھی یہی مروی ہے۔ عبد الوہاب نے کہا ہے: تسمیہ سنت ہے، پس جب ذبح کرنے والے نے اسے بھول کر چھوڑ دیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے قول کے مطابق وہ ذبیحہ کھایا جائے گا۔

تیسرا قول: اگر اس نے تسمیہ عمداً یا بھول کر چھوڑ دیا تو اس کا کھانا حرام ہے۔ محمد بن سیرین، عبد اللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ، عبد اللہ بن عمر، نافع، عبد اللہ بن زید خطمی اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے: اور اسی طرح ابو ثور اور داؤد بن علی نے کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں یہی ہے۔

چوتھا قول: اگر اس نے عمداً تسمیہ چھوڑ دیا تو اسے کھانا مکروہ ہے۔ ہمارے علماء میں سے قاضی ابو الحسن اور شیخ ابو بکر نے

یہی کہا ہے۔

پانچواں قول: اشہب نے کہا ہے کہ عمداً تسمیہ چھوڑنے والے کا ذبیحہ کھایا جائے گا (1) مگر یہ کہ وہ حقیر اور ناپسند کرتا ہو اور اسی طرح علامہ طبری نے کہا ہے (دلائل یہ ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور دوسرا ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں صورتیں بیان فرما دیں اور دونوں کا حکم واضح فرما دیا۔ اس کا قول لَا تَاْكُلُوْا نہی ہے جو تحریم پر دلالت کرتی ہے اسے کراہت پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اپنے بعض ایسے مقتضیات کو شامل ہے جو حرام محض ہے اور اس میں تبعض جائز نہیں، یعنی اس سے تحریم اور کراہت ایک ساتھ مراد لیے جائیں۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس اصول ہے۔ اور رہا بھولنے والا تو اس کی طرف خطاب متوجہ ہی نہیں، کیونکہ اسے خطاب کرنا محال ہے، پس شرط اس پر واجب نہیں ہے۔

اور رہا وہ جو تسمیہ کو جان بوجھ کر ترک کرنے والا ہے تو وہ تین احوال سے خالی نہیں ہوگا یا تو وہ اس وقت تسمیہ ترک کرے گا جب ذبیحہ کو لٹائے گا اور کہے گا: میرا دل اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی توحید سے بھرا ہوا ہے لہٰذا میں اپنی زبان کے ساتھ ذکر کرنے کا محتاج نہیں ہوں۔

پس اسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا ذکر کیا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ یا وہ کہتا ہے: بلاشبہ یہ صریح تسمیہ کا محل نہیں ہے، کیونکہ یہ قربت نہیں ہے، تو اسے بھی وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ یا وہ کہتا ہے: میں تسمیہ نہیں پڑھوں گا، اور تسمیہ کی کون سی قدر و منزلت ہے، تو یہ حقیر جاننے والا فاسق ہے اس کا ذبیحہ نہیں کھائے جائے گا۔

علامہ ابن عربی (2) نے کہا ہے: مجھے رأس المحققین، امام الحرمین پر بڑا تعجب ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بلاشبہ قرب کی حالت میں مشروع ہے اور ذبح حالت قربت نہیں ہے۔ یہ نظریہ قرآن و سنت سے معارض آتا ہے۔ آپ ﷺ نے حدیث صحیح میں فرمایا ہے: ''وہ جانور جس کا خون بہایا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا تو اسے کھاؤ''۔ پھر اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے سے مراد دل میں نام لینا ہے، کیونکہ ذکر نسیان کی ضد ہے اور نسیان کا محل دل ہے پس ذکر کا محل بھی دل ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت بیان فرمائی: ''اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے وہ تسمیہ پڑھے یا نہ پڑھے'' (3)۔ تو ہم کہیں گے: ذکر باللسان بھی ہے اور ذکر بالقلب بھی۔ اور وہ عمل جو عرب کرتے تھے وہ زبان سے بتوں کا نام لیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام زبان کے ساتھ لینے کے ذریعہ اسے ختم کیا اور شریعت میں یہی مشہور ہے یہاں تک کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے گا جب وضو کرے (4)، تو آپ نے فرمایا: کیا وہ ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور رہی وہ حدیث جس کے ساتھ انہوں نے تعلق قائم کیا ہے ''کہ اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے دل میں ہے'' (5)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 749 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 750
4۔ ایضاً 5۔ صحیح بخاری، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 828

تحقیق اہل علم کی ایک جماعت نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ذبیحہ پر تسمیہ پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کو فرمایا جنہوں نے آپ سے سوال کیا اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم ہمارے پاس گوشت لے کر آتی ہے اور ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے یا نہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لے لو اور اسے کھالو'' (1)۔

اسے دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے مرسل روایت کیا ہے اور اسے مرسل بیان کرنے میں آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اور اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ نے اس کے آخر میں کہا: و ذالك في اول الإسلام (کہ وہ ابتداء اسلام میں ہوا) مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ ضعیف ہے اور فی نفسہ حدیث میں وہ موجود ہے جو اس کا رد کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس میں کھانے پر تسمیہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ آیت آپ پر نازل ہو چکی تھی۔ اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کو صحیح ہونے پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث مدینہ طیبہ کی ہے اور علماء کا اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ سورۃ الانعام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔

اور وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کا معنی ہے کہ یہ معصیت اور گناہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور لَفِسْقٌ کا معنی الخروج (نکلنا) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ یعنی وہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے کی باتیں ڈالتے ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: جسے اللہ تعالیٰ ذبح کرے (یعنی مار دے) تو اس کو تم نہ کھاؤ اور جسے تم خود ذبح کرو تو اسے کھالو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: اس آیت میں شیاطین سے مراد فارس کے مجوسیوں میں سے سرکش انسان ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: بلکہ شیاطین سے مراد جن ہیں اور جنوں میں سے کافر قریش کے اولیاء (دوست) ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ مختار کہتا ہے: میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے، بلاشبہ شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے رہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول: لِيُجَادِلُوْكُمْ مراد ان کا یہ قول ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ مار دے تم اسے نہ کھاؤ اور جسے تم مارو تم اسے کھالو۔ اور مجادلہ کا معنی ہے قوت کے ساتھ حجت کے طریقہ پر قول کا دفاع کرنا۔ یہ أجدل سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے طاقتور پرندہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدالہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد زمین ہے۔ تو گویا وہ اس پر غلبہ پاتا ہے دلیل کے ساتھ اور وہ

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2446۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 162		3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 340

اسے اس طرح مغلوب کر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ قبضہ کی ہوئی زمین کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جدال سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے بٹائی کا مضبوط ہونا، گویا ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حجت اور دلیل کو بل دیتا ہے یہاں تک کہ اسے کاٹ دیتا ہے اور وہ حق کی نصرت اور معاونت میں حق ہوتی ہے اور باطل کی نصرت اور مدد میں باطل ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ یعنی مردار کو حلال قرار دینے میں اگر تم نے ان کی بات مانی۔ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (تو تم مشرک ہو جاؤ گے) پس آیت اس پر دلیل ہے کہ جس نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو حلال قرار دیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ اس کے سبب مشرک ہو جائے گا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام قرار دیا ہے اور یہ نص سے ثابت ہے۔ اور جب کسی نے کسی غیر کی حلال کردہ چیز کو قبول کر لیا تحقیق اس نے بھی شرک کیا۔ علامہ ابن عربی (2) نے کہا: بلاشبہ مومن مشرک کی اطاعت کرنے سے مشرک ہو جاتا ہے جب وہ اعتقاد میں اس کی اطاعت و پیروی کرے۔ اور جب وہ فعل اور عمل میں اس کی پیروی کرے اور اس کا عقیدہ صحیح سالم ہو اور توحید و تصدیق پر قائم اور جاری ہو تو گنہگار ہو گا۔ پس تم اسے سمجھ لو اور یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٢﴾

"کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لیے نور چلتا ہے جس کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو، نہیں نکلنے والا ان سے، یونہی آراستہ کر دیئے گئے کافروں کے لیے وہ اعمال جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ جمہور نے واؤ کو مفتوح پڑھا ہے، اور اس پر ہمزہ استفہام داخل کیا گیا ہے۔ مسیبی نے نافع بن ابی نعیم سے اَوْ مَنْ كَانَ واؤ ساکن کے ساتھ روایت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کا معنی پر محمول ہونا بھی جائز ہے، یعنی تم دیکھو اور تدبر کرو کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی منصف تلاش کروں؟ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ مردہ تھا جس وقت وہ نطفہ تھا، پھر ہم نے اس میں روح پھونک کر اسے زندہ کیا، اسے ابن البحر نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: کیا وہ جو پہلے کافر تھا اور ہم نے اسے ہدایت عطا فرمائی؟

یہ آیت حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے بارے نازل ہوئی۔ اور زید بن اسلم اور سدی نے کہا ہے: فَاَحْيَيْنٰهُ سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں (یعنی ہم نے انہیں ہدایت عطا فرما کر زندگی بخش دی)۔ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ مراد ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ ہے (یعنی وہ کفر کے سبب اندھیروں میں پڑا رہا) اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ہر مومن اور کافر کے بارے میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جہالت کے سبب مردہ تھا تو ہم نے اسے علم کے ساتھ زندہ کر دیا۔ بعض اہل علم نے شعراء بصرہ میں سے کسی کے یہ اشعار بھی بیان کیے ہیں جو اس تاویل کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 752

وفي الجهل قبل الموت موتٌ لأهله　　فأجسامهم قبل القبور قبورُ

''جہالت میں موت سے قبل ہی جاہلوں کے لیے موت ہے اور ان کے اجسام قبروں میں جانے سے پہلے ہی قبریں ہیں''۔

وإنّ أمرا لم يَحْيَ بالعلم ميّتٌ　　فليس له حتى النشور نشورُ

''اور بلاشبہ آدمی جو علم کے ساتھ زندہ نہیں ہوا وہ مردہ ہے اور اس کے لیے نشور (مرنے کے بعد زندہ کیا جانا) بھی نشور نہیں ہے''۔

اور نور سے مراد ہدایت اور ایمان ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد حکمت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہی نور ہے جس کا ذکر ان ارشادات میں ہے: يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (الحدید:12) (کہ ضوفشانی کر رہا ہو گا ان کا نور ان کے آگے بھی اور ان کے دائیں جانب بھی) اور انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید:13) (ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کر لیں تمہارے نور سے) يَمْشِيْ بِهٖ اس نور کی روشنی میں وہ چلتا ہے۔ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لوگوں کے درمیان وہ اس کی مثل ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو۔ ای کمن ھو تو اس میں مثل زائدہ ہے۔ آپ کہتے ہیں: أنا أكرم مثلك، ای أكرمك (میں تیری عزت و تکریم کرتا ہوں۔ اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (المائدہ:95) (تو اس کی جزا یہ ہے کہ اسی قسم کا جانور دے جو اس نے قتل کیا ہے)

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ:11) (نہیں اس کی مانند کوئی چیز) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَنْ مَّثَلُهٗ کا معنی ہے مثل من ھو فی الظلمات (اس کی مثل جو تاریکیوں میں ہے) اور المثل اور المثل دونوں کا معنی ایک ہے۔ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ شیطان نے ان کے لیے بتوں کی عبادت کو آراستہ کر دیا اور انہیں یہ وہم دلایا کہ وہ مسلمانوں سے افضل ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲۳

''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر بستی میں اس کے بڑے لوگوں کو وہاں کے مجرم تا کہ وہ مکر و فریب کیا کریں اس میں اور نہیں فریب دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا اس کا معنی ہے: جس طرح ہم نے کافروں کے لیے ان اعمال کو آراستہ کیا جو وہ کیا کرتے تھے اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بنایا۔ مُجْرِمِيْهَا یہ جعل کا مفعول اوّل ہے۔ اَكٰبِرَ یہ مفعول ثانی ہے اور ان میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور جعل بمعنی صیر ہے۔ اور الاکابر، الاکبر کی جمع ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد عظماء (بڑے لوگ) ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکابر سے مراد رؤساء اور عظماء ہیں۔ اور انہیں خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ فساد برپا کرنے پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور مکر کا معنی استقامت کی مخالفت میں حیلہ کرنا ہے۔ اور اس کا اصل معنی الفتل (بٹنا) ہے۔ پس مکر و فریب کرنے والا استقامت سے پھر جاتا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ہر گھاٹی پر چار چار بیٹھتے تھے اور لوگوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی سے نفرت دلاتے تھے جیسا کہ ان سے پہلے امم ماضیہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا۔

وَمَا يَمْكُرُونَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی ان کے مکر و فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دردناک عذاب کے ساتھ مکر کی جزا اور بدلہ ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ اپنی فرط جہالت کی وجہ سے فی الحال اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ان کے فریب کا وبال انہیں کی طرف لوٹے گا۔

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب آئے ان کے پاس کوئی نشانی کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے جیسے دیا گیا اللہ کے رسولوں کو، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو، عنقریب پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت، بوجہ ان مکروں کے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ اس میں ان کی جہالت کی ایک دوسری چیز بیان فرمائی اور وہ یہ کہ وہ کہنے لگے: ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ہم انبیاء ہو جائیں اور ہمیں انہیں نشانیوں کی طرح عطا کی جائیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ اور اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں)۔

اور جَآءَتْهُمْ میں ضمیر ان اکابر کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ ولید بن مغیرہ (1) نے کہا: اگر نبوت حق ہے تو پھر میں اس کے لیے تم سے زیادہ اہل اور بہتر ہوں، یا کیونکہ میں عمر کے اعتبار سے تم سے بڑا ہوں اور میرا مال تم سے زیادہ ہے۔

اور ابو جہل نے کہا: قسم بخدا! ہم اس کے ساتھ راضی ہوں گے اور نہ کبھی اس کی اتباع کریں گے، مگر اس صورت میں کہ ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی آئے جیسے ان کے پاس آتی ہے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے نبوت کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے کہا: ہم تمہاری تصدیق نہ کریں گے یہاں تک کہ ہمارے پاس حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اور دیگر ملائکہ آئیں اور وہ ہمیں آپ کی صداقت کے بارے خبر دیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ یعنی اس کے بارے جسے اس پر امین بنایا گیا ہے اور جو اس کا محل ہے۔

اور حَيْثُ یہاں ظرف نہیں ہے، بلکہ یہ اسم ہے اس میں وسعت ہونے کی بنا پر مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے اسے نصب دی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ رسالت کے اہل کو خوب جانتا ہے اور یہ اصل عبارت اس طرح ہے اللہ أعلم بمواضع رسالتہ اللہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 414　2۔ ایضاً

تعالیٰ اپنی رسالت کی جگہوں کو خوب جانتا ہے، پھر حرف کو حذف کر دیا گیا اور یہ جائز نہیں ہے کہ أعلم، حیث میں عمل کرے اور وہ ظرف ہو، کیونکہ اس پر معنی یہ ہوگا اللہ أعلم فی ھذا الموضع (اللہ تعالیٰ اس محل میں خوب جانتا ہے) اور یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ متصف کیا جائے، بلاشبہ اس کا محل اس فعل مضمر کے ساتھ نصب ہے جس پر "أعلم" دلالت کرتا ہے اور یہ اسم ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

اور الصغار کا معنی ظلم، ذلت اور حقارت ہے، اور اسی طرح الصُغر (بالضم) بھی ہے۔ اور مصدر الصغر ہے۔ اور اس کی اصل الصغر ہے جو کبر کا مقابل ہے۔ گویا ذلت آدمی کی ذات کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الصغر ہے اور اس کا معنی ہے ذلت کے ساتھ راضی ہونا۔

اسی سے کہا جاتا ہے: صَغَرَ یَصْغُرُ ماضی میں غین مفتوح ہے اور مضارع میں مضموم ہے۔ اور صَغِرَ، یَصْغَرُ ماضی میں غین مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں، صِغَرًا و صِغارًا اور اسم فاعل صَاغِرٌ اور صغیر ہوگا۔ اور صاغر کا معنی ہے ظلم کے ساتھ راضی ہونے والا۔ اور المصغوراء کا معنی الصغار (حقیر) ہے اور ارض مصغرۃ کا معنی ہے ایسی زمین جس کی فصل نہ بڑھے۔ یہ ابن السکیت سے منقول ہے۔

عِنْدَ اللّٰهِ، ای من عند اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اور پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، (اصل عبارت ہے) سیصیب الذین أجرموا عند اللہ صغارٌ اور فراء نے کہا ہے: سَیُصِیبُ الَّذِینَ أجرمُوا صغار مِنَ اللہ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے سَیُصِیبُ الذین أجرموا صغارٌ ثابتٌ عند اللہ عنقریب انہیں پہنچے گی جنہوں نے جرم کیے ذلت جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثابت ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے احسن ہے، کیونکہ اس میں عند اپنے محل میں واقع ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور جس (خوش نصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کشادہ کر دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس (بدنصیب) کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے تو بنا دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ، بہت تنگ، گویا وہ زبردستی چڑھ رہا ہے آسمان کی طرف، اسی طرح ڈال دیتا ہے اللہ تعالیٰ ناپاکی ان پر جو ایمان نہیں لاتے"۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ یعنی وہ اسلام کے لیے اس کا سینہ وسیع کر دیتا ہے اور اسے توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اس کے نزدیک اس کا اجر و ثواب مزین اور آراستہ کر دیتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: شرح کا معنی شق کرنا ہے، اور اس کی اصل التوسعۃ (وسعت کرنا) ہے۔ اور شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ (الزمر: 22) کا معنی ہے اس نے اس کا

سینہ اس کی وضاحت و بیان کے ساتھ وسیع کر دیا اور شرحتُ الأمر کا معنی ہے میں نے اس کو بیان کر دیا اور اسے خوب واضح کر دیا۔ اور قریش عورتوں کے لیے خوب وسعت رکھتے تھے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کانت قریش تشرح النساء شرحا یہ توسعة اور البسط سے ماخوذ ہے اور یہ عورت کو گدی کے بل چت لٹا کر اس سے وطی کرنا ہے۔ اور الشرح کا معنی الکشف (ظاہر کرنا اور ننگا کرنا) ہے۔ آپ کہتے ہیں: شرحتُ الغامِضَ میں نے ڈھانپی ہوئی چیز کو ظاہر کر دیا، ننگا کر دیا۔ اور اسی سے تشریح اللحم (گوشت کو لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹنا) بھی ہے۔ راجز نے کہا ہے:

کَمْ قَدْ أَکَلْتُ کَبِدًا وَ إِنْفَحَهْ ثُمَّ ادَّخَرْتُ أَلْیَةً مُشَرَّحَهْ

''اور گوشت کا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے۔ اور گوشت کا ہر موٹا اور لمبا ٹکڑا شریحہ کہلاتا ہے''۔

وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ اور جس کے لیے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے۔ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (تو اس کے سینہ کو بہت تنگ بنا دیتا ہے) یہ قدریہ کا رد ہے۔ اس آیت کی نظیر سنت میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من یُرِدِ اللهُ به خَیْرًا یُفَقِّهْهُ فی الدین(1) (جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی فقاہت اور سمجھ عطا فرما دیتا ہے)۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جب سینہ وسیع اور نور سے منور ہو۔ اور دین سے مراد عبادات ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) (بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) اور اس کے خطاب کی دلیل یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا ارادہ نہیں فرماتا اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے، اس کی فہم کو (معانی سے) دور کر دیتا ہے اور اسے فقاہت عطا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم

اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا سینہ کھل جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم یدخل القلب نورٌ (ہاں دل میں نور داخل ہو جاتا ہے) تو انہوں نے عرض کی: کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التَّجافِی عن دار الغُرورِ والإنابةُ إلی دار الخلود والإستعدادُ للموت قبل نزول الموت(2) (دار الغرور (دنیا) سے دوری اختیار کرنا اور دار الخلود (آخرت) کی طرف میلان رکھنا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا)۔

اور ابن کثیر نے ضَیْقًا تخفیف کے ساتھ قرأت کی ہے، مثلاً هین اور لین یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور نافع اور ابو بکر نے حَرِجًا کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے: (تنگی) معنی کو مکرر لایا گیا ہے اور یہ لفظ مختلف ہونے کے سبب اچھا اور خوبصورت ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ حرجا قرأت کی ہے، یہ حرجة کی جمع ہے۔ اور اس کا معنی بھی بہت زیادہ تنگی کا ہونا ہے اور الحرجة اس کا معنی الغیضة (گھنے درختوں والی جگہ، جنگل) ہے اور اس کی جمع حرج اور حرجات ہے۔ اور اسی سے ہے فلان یتحرج یعنی وہ اپنے نفس پر گناہوں کے لیے اپنی خواہش کو ترک کرنے پر تنگی محسوس کرتا ہے۔ یہ ہروی نے کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: الحرج کا معنی گھنے درختوں والی جگہ (جنگل) ہے۔ تو گویا کافر کے دل تک حکمت نہیں پہنچ سکتی جیسا کہ کوئی چرنے والا جانور اس جگہ تک نہیں پہنچ سکتا جہاں درخت گھنے ہوں (آپس میں جڑے ہوئے ہوں)

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 1087

2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 542-543

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ معنی مروی ہے اسے مکی اور ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ہر تنگی کو حَرِجا اور حَرَج کہلاتا ہے۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: مکان حَرَج و حرِج یعنی وہ تنگ جگہ جہاں درخت کثیر ہوں اور اس تک چرنے والا جانور نہ پہنچ سکتا ہو۔ اور اس طرح بھی قرأت کی گئی ہے: یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا و حَرِجًا اور یہ قائم مقام ہے الوَحَد اور الوَحِد اور الفَرَد اور الفَرِد اور الدنَف اور الدنِف کے (یعنی) دونوں قرأتوں کے مطابق ایک معنی ہے اور اسے کسی اور نے فراء سے بیان کیا ہے اور قد حرِج صدرہ یحرَج حرجا (اس کا سینہ تنگ ہو گیا)۔

اور الحرَج کا معنی اثم (گناہ) ہے اور الحرج کا معنی الناقة الضامرة (کمزور اور نحیف اونٹنی) بھی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الطویلة علی وجه الأرض (سطح زمین پر پھیلنے اور لمبا ہونے والی) یہ ابوزید سے مروی ہے، اور یہ لفظ مشترک ہے اور الحرج کا معنی وہ لکڑیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں اور ان میں مردے کو اٹھایا جاتا ہے، یہ اصمعی سے منقول ہے اور یہی امرء القیس کا قول بھی ہے:

فإمّا تَرَيْنِي لِي رِحالة جابِرٍ علی حَرَجٍ كالقَرِّ تَخْفِقُ أكفانِي

''اور بسا اوقات انہیں عورتوں کی میت پر رکھا جاتا ہے۔

ظلیم کا وصف بیان کرتے ہوئے عنترہ نے کہا ہے۔

يَتْبَعْنَ قُلَّةَ رأسِه وكأنَّه حَرَجٌ على نَعْشٍ لهنّ مُخَيَّمِ

اور زجاج نے کہا ہے: الحرج کا معنی ہے بہت زیادہ تنگ ہونا۔ پس جب کہا جائے: فلان حرج الصدر، تو اس کا معنی ہو گا اپنے سینے میں بہت زیادہ تنگی محسوس کرنے والا (یعنی ذو حرج فی صدرہ) اور جب کہا جائے: حرِج تو یہ اسم فاعل ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: حرِج اسم فاعل ہے اور حرج مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل عَدْلٌ و رِضًا۔

قولہ تعالیٰ: كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ اسے ابن کثیر نے صاد کے سکون کے ساتھ مخفف پڑھا ہے، یہ الصعود سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے اوپر چڑھنا۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ایمان سے بھاگنے اور اسے اپنے اوپر ثقیل سمجھنے کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جسے ایسے کام کا مکلف بنایا جائے جسے کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، جیسا کہ آسمان پر چڑھنے کی طاقت نہیں رکھی جا سکتی۔ اور اسی طرح يُصَاعِدُ کا لفظ بھی ہے اور اس کی اصل يَتَصَاعَدُ ہے، تا کو صاد میں ادغام کر دیا گیا ہے اور یہ ابوبکر اور نخعی کی قرأت ہے، مگر اس میں ایک کام کرنے کے بعد فوراً دوسرا کام کرنے کا معنی ہے اور ایسا فعل کام کرنے والے پر انتہائی ثقیل اور بھاری ہوتا ہے۔

اور باقیوں نے اسے الف کے بغیر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اسی کی طرح ہے جو اس سے پہلے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ یکے بعد دیگرے ایسا کام کرنے کا پابند اور مکلف ہوتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا، اسی طرح تیرا یہ قول ہے: يَتَجَرَّعُ اور يَتَفَوَّقُ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پڑھا كَاَنَّمَا يَتَصَعَّدُ نحاس نے کہا ہے: اس قرأت کا معنی اور

اس کی قرأت جس نے یَصَّعَدُ اور یُصَاعِدُ پڑھا ہے کا معنی ایک ہے۔ اور دونوں میں معنی یہ ہے کہ کافر وہ ہے جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے تنگ کر دیا ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے، حالانکہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا، تو گویا وہ اس کی استدعا کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے قریب ہے اس کا دل اسلام سے دور بھاگتے ہوئے آسمان کی طرف چڑھ جائے۔

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پر ناپاکی ڈال دیتا ہے، جیسا کہ اس نے ان کے جسموں میں سینہ تنگ کر دیا۔ اور رجس کا لغوی معنی بدبو (النتن) ہے۔ ابن زید (1) نے کہا ہے: یہ عذاب ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رجس سے مراد شیطان ہے (2)، یعنی اللہ تعالیٰ اسے ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رجس سے مراد وہ شی ہے جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور اسی طرح اہل لغت کے نزدیک الرجس سے مراد بدبو ہے، پس آیت کا معنی یہ ہے واللہ اعلم: وہ دنیا میں ان پر لعنت ڈالتا ہے اور آخرت میں عذاب (میں مبتلا کرے گا)۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

''اور یہ ہے راستہ آپ کے رب کا (بالکل) سیدھا، ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا یعنی یہ وہ ہے جس پر اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور مومنین ہیں۔ آپ کے رب کا دین ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ یعنی ہم نے دلائل کو بیان کر دیا ہے۔ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (ان لوگوں کے لیے جو نصیحت قبول کرتے ہیں)

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

''ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے ہاں اور وہی ان کا دوست ہے بسبب ان نیک اعمال کے جو وہ کیا کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ یعنی نصیحت قبول کرنے والے کے لیے۔ دَارُ السَّلٰمِ جنت ہے، پس جنت اللہ کا گھر ہے، جس طرح کہ کہا جاتا ہے: الکعبۃُ بیتُ اللہ (کعبۃ معظمہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی دار السلامہ ہو، یعنی وہ گھر جس میں آدمی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور عِنْدَ رَبِّهِمْ کا معنی ہے اس کے ہاں ان کے لیے یہ ضمانت دی گئی ہے کہ وہ انہیں اپنے فضل سے اس تک پہنچائے گا۔ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ اور وہی ان کا مددگار اور معاون ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 144
2۔ ایضاً

لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

"اور جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ ان سب کو (اور فرمائے گا) اے جنوں کے گروہ! بہت گمراہ کیا تم نے انسانوں کو، کہیں گے ان کے دوست انسانوں میں سے اے ہمارے رب! فائدہ اٹھایا ہم نے ایک دوسرے سے اور پہنچ گئے ہم اپنی اس معیاد کو جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آگ تمہارا ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہو گے اس میں مگر جسے اللہ تعالیٰ (نجات دینا) چاہے بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے یعنی وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ يَقُوْلُ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مراد قیامت کے دن تمام مخلوق کو میدان حشر میں جمع کرنا ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ اس میں منادی مضاف ہے۔ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (انہیں بہت گمراہ کیا) اس میں وہ مصدر جو مفعول کی طرف مضاف ہے اسے حذف کر دیا گیا اور حرف جر با کو حذف کر دیا (یعنی من الاستمتاع بالانس)

اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ اور یہ اس کے قول کو رد کرتا ہے جس نے کہا: بیشک جن وہ ہیں جنہوں نے انسانوں سے فائدہ اٹھایا، کیونکہ انسانوں نے انہیں قبول کیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے والا ہے۔ اور عربی میں تقدیر کلام یہ ہوگی: اِسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بَعْضًا (ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا) پس جنوں نے انسانوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ انہوں نے اس میں لذت محسوس کی کہ انسانوں نے ان کی اطاعت و پیروی کی ہے۔ اور انسان جنات کو قبول کر کے لطف اندوز ہوتے رہے یہاں تک کہ جنوں کے انہیں بہکانے کے سبب انہوں نے زنا کیا اور شراب پیتے رہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے سفر کے دوران جب کسی وادی سے گزرتا اور اسے اپنے اوپر خوف محسوس ہوتا تو وہ کہتا: أعوذ بربّ هذا الوَادِي مِنْ جميعِ مَا أَحْذَرُ (میں اس وادی کے سردار کی پناہ مانگتا ہوں ان تمام چیزوں سے جن سے میں ڈرتا ہوں) اور قرآن کریم میں ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾ (الجن) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے غرور کو)

پس یہی انسانوں کا جنوں سے استمتاع اور فائدہ تھا۔ اور رہا جنوں کا انسانوں سے فائدہ تو وہ یہ کہ وہ انہیں جھوٹی خبریں، کہانت اور سحر القا کرتے رہتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنوں کا انسانوں سے استمتاع یہ تھا کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ جن اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ ان سے وہ تمام چیزیں دور کر دیں جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ اور آیت کا معنی گمراہ ہونے والوں اور گمراہ کرنے والوں کو آخرت میں عالمین کی آنکھوں کے سامنے ڈانٹنا اور جھڑکنا ہے۔

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا اس میں مقررہ مدت سے مراد موت اور قبر ہے اور ہم انتہائی نادم ہو کر آئے ہیں۔ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ یعنی آگ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 128

مثوی کا معنی ٹھکانا ،ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ استثناء اوّل کلام میں سے نہیں ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ استثنا یوم قیامت کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی تم ہمیشہ آگ میں رہو گے مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے ان کے قبروں سے نکل کر ان کے جمع ہونے کی مقدار اور ان کی مدت حساب کی مقدار میں سے۔ تو اس صورت میں استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا آگ کی طرف راجع ہے، یعنی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تمہیں بعض اوقات میں بغیر آگ کے عذاب دے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: استثناء اہل ایمان کی ہے۔ تو اس بناء پر ما بمعنی من ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ آیت اس کے بارے وقف کو ثابت کر رہی ہے جو ابھی نہیں مرا، جب کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کہ وہ دنیا میں بغیر عذاب کے رہیں۔ اس آیت کا معنی اس آیت کے معنی کی طرح ہے جو سورۂ ہود میں ہے۔

اور وہ یہ ارشاد ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ (ہود: 106) وہاں اس کا کامل بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ یعنی انہیں سزا دینے میں اور اپنے جمیع افعال میں (آپ کا رب بڑا دانا ہے)۔ عَلِیْمٌ اور انہیں سزا دینے کی مقدار کے بارے سب کچھ جاننے والا ہے۔

## وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۱۲۹

''اور یونہی ہم مسلط کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو وہ کرتے رہتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًۢا اس کا معنی ہے جس طرح ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے ان کاموں کے متعلق جو میں نے تمہارے لیے بیان کیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے فائدہ اور حظ اٹھاتے ہیں (اسی طرح) میں بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتا ہوں، پھر کل وہ ایک دوسرے سے برأت اختیار کر لیں گے۔ اس تفسیر پر نُوَلِّیْ کا معنی ہے نجعل ولیًا (ہم دوست بنا دیتے ہیں)

ابن زید نے کہا ہے: ہم ظالم جنوں کو ظالم انسانوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور وہ انہیں ہلاک اور ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔ یہ ظالموں کے لیے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دے گا۔ اور اس آیت میں وہ تمام داخل ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یا رعیت پر ظلم کرتے ہیں یا ایسا تاجر جو اپنی تجارت میں لوگوں پر ظلم کرتا ہے یا چور وغیرہ۔

اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب تو کسی ظالم کو دیکھے کہ وہ دوسرے ظالم سے انتقام لے رہا ہے تو ٹھہر جا اور اس میں تعجب کرتے ہوئے غور و فکر کر۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے راضی ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات کا والی ان کے نیک لوگوں کو بناتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو وہ ان کے معاملات پر ان کے شریر لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس نے ظالم کی معاونت کی اللہ تعالیٰ اسے اس پر مسلط کر دے گا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے بعض کو بعض کے سپرد کر دیتے ہیں ان اعمال میں جنہیں وہ کفر میں سے ناپسند کرتے ہیں، جیسا کہ ہم انہیں کل رؤساء کے حوالے کر دیں گے جو انہیں عذاب سے نجات دلانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ یعنی ہم اسی طرح ان کے ساتھ آخرت میں کریں گے جس طرح ہم ان کے ساتھ دنیا میں کرتے ہیں۔ اور الله تعالیٰ کے اس ارشاد نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (النساء:115) کے تحت کہا گیا ہے: کہ ہم اسے اس کے حوالے کر دیں گے جس کے حوالے اس نے اپنے آپ کو کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کی تفسیر یہ ہے کہ الله تعالیٰ جب کسی قوم کے بارے شر کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ ان کے معاملات ان کے شریر لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس پر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ:30) (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝۱۳۰

"اے گروہ جنوں اور انسانوں کے! کیا نہیں آئے تمہارے پاس رسول تم ہی میں سے سناتے تھے تمہیں ہماری آیتیں اور ڈراتے تھے تمہیں تمہاری اس دن کی ملاقات سے، کہیں گے: ہم گواہی دیتے ہیں اپنے خلاف اور دھوکہ میں مبتلا کیا تھا انہیں دنیوی زندگی نے اور گواہی دیں گے اپنے خلاف کہ وہ کفر کرتے رہے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ یعنی جس دن ہم انہیں جمع کریں گے تو ہم ان کو کہیں گے۔ لھم کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے؟ پھر اسے کلام سے حذف کر دیا گیا، تو وہ اس بارے میں اعتراف کریں گے جس میں ان کی رسوائی ہوگی اور مِّنْكُمْ کا معنی ہے فی الخلق والتکلیف والمخاطبة (یعنی تخلیق میں، احکام کا مکلف ہونے میں اور مخاطب ہونے میں وہ تم میں سے تھے) اور جب جن ان میں سے ہیں جنہیں خطاب کیا جا رہا ہے اور وہ عقل اور سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں تو فرمایا: مِّنْكُمْ اگرچہ رسول انسانوں میں سے تھے اور خطاب میں انسانوں کو اسی طرح غلبہ دیا گیا ہے جس طرح مذکر مونث پر (یعنی مردوں کو عورتوں پر) غلبہ دیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے فرمایا: جنوں کے رسول وہ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے پاس وہ آیات پہنچائیں جو انہوں نے وحی سے سنی تھیں، جیسا کہ فرمایا: وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ (الاحقاف) (تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے)

حضرت مقاتل اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما (2) نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے جنوں میں سے اسی طرح رسول بنائے جس طرح اس نے انسانوں میں سے رسول بنائے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: رسول انسانوں میں سے ہیں اور ڈرانے والے جنوں میں سے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ (الاحقاف) اور یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ احقاف میں آئے گا۔ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے کہا ہے: حضور نبی رحمت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 170　　2۔ ایضاً　　3۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 44

محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے انسانوں اور جنوں تمام کی طرف رسول بھیجے جاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أعطیتُ خمسًا لم یُعطهنّ نبیٌّ قبلی کان کلّ نبیّ یُبعث إلی قومه خاصّة و بعثتُ إلی کلّ أحمرَ و أسودَ، الحدیث (1) مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا رہا اور مجھے ہر سرخ وسیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کانتِ الرّسلُ تُبعثُ إلی الإنس وأنّ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بُعثَ إلی الجنّ والإنسِ (2) (پہلے انبیاء ورسل علیہم السلام انسانوں کی طرف مبعوث کیے جاتے رہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس کی طرف (نبی بنا کر) بھیجے گئے)

اسے ابو اللیث سمرقندی نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنوں میں سے ایک قوم نے انبیاء علیہم السلام کا کلام سنا پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر گئے اور انہیں اس کے بارے آگاہ کیا، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ تو انہیں کو رسل اللہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ انہیں رسول بنائے جانے پر نص موجود نہیں۔

اور قرآن کریم میں ہے: یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ (الرحمٰن) ای من احدھما (یعنی ان میں سے ایک سے نکلتے ہیں) اور بلاشبہ وہ ملح (نمکین) سے نکلتے ہیں نہ کہ عذب (میٹھے) سے، پس اسی طرح انسانوں میں سے رسول ہیں نہ کہ جنوں میں سے، پس منکم کا معنی ہے من أحد کم (تم میں سے ایک سے)

اور یہ جائز ہے، کیونکہ دونوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ کے محل میں رسل کو تمام میں سے قرار دیا ہے، کیونکہ قیامت کا عرصہ جن وانس دونوں کو شامل ہوگا اور ان پر حساب ہوگا نہ کہ اور مخلوق پر، تو جب اس عرصہ میں ثواب وعقاب کے اعتبار سے ایک حساب میں ہو گئے تو اس دن انہیں ایک خطاب کے ساتھ خطاب کیا جائے گا، گویا کہ وہ ایک جماعت ہیں، کیونکہ ان کی خلقت کی ابتدا عبودیت کے لیے ہے اور ثواب وعقاب عبودیت (بندگی) پر ہوگا، اور اس لیے بھی کہ جنوں کی اصل آگ کے شعلوں سے ہے اور ہماری اصل مٹی سے ہے اور ان کی تخلیق کا انداز ہماری خلقت کے سوا ہے، پس ان میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر۔ اور ہمارا دشمن ابلیس ان کا بھی دشمن ہے۔ وہ ان کے مومنوں سے عداوت رکھتا ہے اور ان کے کافروں سے دوستی رکھتا ہے۔ اور ان میں خواہش پرست بھی ہیں، مثلاً شیعہ، قدریہ اور مرجئہ جو ہماری کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجن میں ان کے بارے بیان کیا ہے فرمان خداوندی ہے: وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ (الجن: 14) (اور بے شک ہم سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم)

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ (الجن) (اور ہم میں سے بعض نیک بھی ہیں اور بعض اور طرح کے ہم بھی تو کئی راستوں پر گامزن ہیں) اس کا بیان وہاں آئے گا۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199

2۔ زاد المسیر لابن الجوزی، جلد 3، صفحہ 125

یَقُصُّوْنَ یہ محل رفع میں ہے اور رسل کی صفت ہے۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا یعنی ہم ان کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے پیغام پہنچایا۔ وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو خطاب ہے، یعنی وہ ہیں جنہیں دنیوی زندگی نے دھوکہ دیا ہے یعنی اس نے انہیں دھوکہ دیا اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ہمیشہ رہے گی اور انہیں یہ خوف ہوا کہ اگر وہ ایمان لائے تو وہ ان سے ختم ہو جائے گی ( چھن جائے گی )۔ وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی انہوں نے اپنے کفر کا اعتراف کرلیا۔ حضرت مقاتل (1) نے کہا ہے: یہ اس وقت ہوگا جب اعضاء بدن ان کے خلاف شرک کی گواہی دیں گے۔ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ اور ان کرتوتوں کے بارے جو وہ کرتے تھے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

''یہ اس لیے کہ نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو ظلم سے اس حال میں کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ یہ سیبویہ کے نزدیک محل رفع میں ہے: یعنی الأمرُ ذالك اور ان مخففہ من الثقیلہ ہے۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ یہ کیا کیونکہ میں بستیوں کو ان کے ظلم کے سبب ہلاک کرنے والا نہیں ہوں، یعنی ان کے شرک کے سبب اس سے پہلے کہ ان کی طرف رسل علیہم السلام بھیجے جائیں کہ وہ یہ کہیں: ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا آیا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ڈرانے والا آیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں نہیں ہوں کہ بستی کے رہنے والوں میں سے کسی ایک کے شرک کرنے کے سبب پوری بستی کو ہلاک کردوں، تو یہ اس ارشاد کی مثل ہے وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ)

اور اگر وہ رسل علیہم السلام کی بعثت سے پہلے انہیں ہلاک کردے تو اس کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ: 118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ذٰلِكَ محل نصب میں ہو اور معنی یہ ہو: فَعَلَ ذَالِكَ بِهِمْ (اس نے یہ ان کے ساتھ کیا) کیونکہ وہ بستیوں کو ظلم کے سبب ہلاک نہیں کرتا۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے مطابق، اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا یعنی جن وانس میں سے ہر ایک کے لیے درجے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 94

كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ⑱ (الاحقاف) (یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جوان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے)

پھر فرمایا: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ⑲ (الاحقاف) (اور ہر ایک کے لیے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ جنوں میں سے مطیع وفرمانبردار جنت میں ہوں گے اور گنہگار جہنم میں ہوں گے۔ اسی طرح انسان بھی ہیں اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہی زیادہ صحیح ہے پس اسے جان لو۔

اور وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ کا معنی یہ ہے کہ طاعت اور نیکی کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے ثواب وجزا میں درجے ہیں۔ اور معصیت وگناہ کا عمل کرنے والے ہر فرد کے لیے عقاب اور سزا میں درجے ہیں۔

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ یعنی نہ وہ غافل ہے اور نہ وہ بھولنے والا ہے۔ اور غفلت کا معنی یہ ہے أن يذهبَ الشئ عنك لاشتغالك بغيره کہ کسی غیر میں پڑے مشغول ہونے کی وجہ سے کوئی شی تجھ سے چلی جائے (ضائع ہو جائے) عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ابن عامر نے اسے تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یا کے ساتھ۔

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۞

''اور آپ کا پروردگار غنی ہے رحمت والا ہے اگر چاہے تو لے جائے (تباہ کر دے) تمہیں اور تمہاری جگہ لے آئے تمہارے بعد جسے چاہے جیسے پیدا کیا تمہیں دوسری قوم کی اولاد سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ یعنی آپ کا پروردگار اپنی مخلوق سے اور ان کے اعمال سے غنی ہے (اسے ان کی کوئی حاجت اور پرواہ نہیں ہے) ذُو الرَّحْمَةِ وہ اپنے دوستوں اور اہل طاعت کے ساتھ رحمت کا سلوک کرنے والا ہے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر وہ چاہے تو تمہیں موت دے کر اور عذاب کے ساتھ تباہ کر کے ختم کر دے۔

وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ یعنی وہ تمہاری جگہ ایک دوسری مخلوق لے آئے جو تم سے زیادہ فضیلت والی اور زیادہ اطاعت شعار ہو۔ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے، یعنی يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ استخلافا مثل ما انشاءكم (تمہارے بعد تمہاری جگہ لے آئے جسے لانا چاہے اسی کی مثل جیسے اس نے تمہیں پیدا کیا دوسری قوم کی اولاد سے) اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہیں: اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (النساء: 133) (اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو)

اور وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (محمد: 38) (اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گا) پس معنی یہ ہے کہ تمہاری جگہ دوسروں کو بدل دے، جیسا کہ تو کہتا ہے: أعطيتك من دينارك ثوبا (میں نے تجھے تیرے دینار کے بدلے کپڑا دیا)

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۱۳۴﴾

''بے شک جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور آنے والا ہے اور نہیں ہو تم (اللہ کو) عاجز کرنے والے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ اس میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ أوعدت فی الشر سے ہو (تجھے شر کے بارے میں وعید سنائی گئی) اور اس کا مصدر الایعاد ہو اور مراد آخرت کا عذاب ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ وعدت سے ہو یعنی وہ ساعت جس کے آنے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کے آنے میں خیر اور شر دونوں ہیں پس خیر کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس کا یہ معنی حسن سے مروی ہے۔ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ کہا جاتا ہے: أعجزنی فلانٌ (فلاں نے مجھے عاجز کردیا ہے) یعنی فاتنی و غلبنی (فلاں میری طرف آگے بڑھا اور مجھ پر غالب آگیا)

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''آپ فرمایئے: اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرنے والا ہوں، تو تم جان لو گے کہ کس لیے ہوتا ہے اچھا انجام اس دنیا کے گھر کا بے شک فلاح نہیں پاتے ظلم کرنے والے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ابوبکر نے جمع کے ساتھ مکاناتکم پڑھا ہے۔ اور مکانۃ کا معنی طریقہ ہے اور آیت کا معنی یہ ہے: تم اس طریقہ پر ثابت (قائم) رہو جس پر تم ہو اور میں اس پر ثابت ہوں جس پر میں ہوں۔ اور اگر کہا جائے: کیسے یہ جائز ہے کہ انہیں اس پر ثابت رہنے کا حکم دیا جائے جس پر وہ ہیں، حالانکہ وہ کفار ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تہدید اور جھڑک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: فَلْیَضْحَكُوْا قَلِیْلًا وَّ لْیَبْكُوْا كَثِیْرًا (التوبہ: 82) (تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ) اور اس پر دلیل فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ہے، یعنی اچھا انجام وہ ہے جس پر اس کے صاحب کی تعریف کی جاتی ہے، یعنی جس کے لیے دارالاسلام میں مدد و نصرت ہو اور جس کے لیے زمین کی وراثت ہو اور جس کے لیے دار آخرت یعنی جنت ہو۔

زجاج (1) نے کہا ہے: مَكَانَتِكُمْ کا مفہوم ہے دنیا میں تمہارا مضبوط اور جے ہوئے قدموں والا ہونا۔ (تمکنکم فی الدنیا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت نخعی نے کہا ہے اس کا معنی ہے: علی ناحیتکم (اپنی جہت پر) اور قتبی نے کہا ہے: علی موضعکم (اپنی جگہ پر) اِنِّیْ عَامِلٌ میں کام کرنے والا ہوں اپنی جگہ پر علی مکانتی پھر دلالت حال کی وجہ سے اسے حذف کردیا گیا۔ اور من، مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ میں محل نصب میں ہے اور یہ بمعنی الذی ہے، کیونکہ علم کا واقع ہونا اسی پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، کیونکہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا پس فعل معلق ہو جائے گا، یعنی تعلمون أیّنا تکون لہ عاقبۃ الدار (تم جانتے ہو ہم میں سے کون ہے جس کے لیے دنیا کے گھر کا انجام اچھا ہوگا) یہ اس قول کی طرح ہے: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی (الکہف: 12) (تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 173

سکتا ہے) حمزہ اور کسائی نے مَن یکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآىِٕنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىِٕهِمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اور انہوں نے بنا رکھا ہے اللہ کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ اور کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے۔ تو وہ (حصہ) جو ہو ان کے شریکوں کے لیے تو وہ نہیں پہنچتا اللہ تعالیٰ کو اور جو (حصہ) ہو اللہ تعالیٰ کے لیے تو وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا اس میں ایک مسئلہ ہے:

اور کہا جاتا ہے: ذَرَاَ یَذْرَاُ ذَرْاً، ای خَلَقَ (اس نے پیدا کیا) اور کلام میں حذف اور اختصار ہے اور وہ یہ ہے وجعلوا لأصنامهم نصیبا (اور انہوں نے اپنے بتوں کے لیے حصہ مقرر کیا) اور اس پر دلیل مابعد کلام ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جسے شیطان نے ان کے لیے آراستہ کیا اور انہیں گمراہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مال کا ایک مقررہ حصہ اپنے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا اور ایک حصہ اپنے بتوں کی طرف۔ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے اور معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ وہ ایک جز اللہ کے لیے اور ایک جز اپنے شرکاء کے لیے مقرر کر دیتے اور جب ان کے شریکوں کا حصہ ان پر خرچ کرنے کی وجہ سے اور انہیں غلاف وغیرہ پہنانے کی وجہ سے ختم ہو جاتا تو وہ اس کا عوض ادا کرنے کے لیے اس حصے سے لے لیتے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا اور جب وہ حصہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے مقرر ہوتا وہ مہمانوں اور مساکین پر خرچ کرنے کے سبب ختم ہو جاتا تو وہ اس سے بطور عوض اور بدلہ کوئی شے نہ لیتے اور کہتے: اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے اور ہمارے شریک فقراء اور محتاج ہیں۔ اور یہ ان کی جہالت اور ان کے کذب میں سے تھا۔ اور زعم کا معنی کذب ہے۔

قاضی شریح نے کہا ہے: بلاشبہ ہر شے کے لیے کنیت ہے اور جھوٹ کی کنیت زعموا ہے اور وہ ان چیزوں میں جھوٹ بولتے تھے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی شرعی حکم نازل نہیں ہوا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو عرب کی جہالت کو جاننا چاہے تو اس کو چاہیے کہ وہ سورۃ الانعام کی ایک سو تیس سے اوپر والی آیات پڑھے اس قول تک قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: 140)

ابن عربی (2) نے کہا ہے: یہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے صحیح کلام ہے، کیونکہ انہوں نے معرفت اور عدل کے بغیر اپنی عاجز عقلوں کے ساتھ حلال و حرام کی تقسیم میں بیوقوفانہ تصرف کیا، اور جہالت کے سبب انہوں نے جو تصرف کیا اس میں بتوں کو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 500 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 252

بنانا سب سے بڑی جہالت اور سب سے بڑا جرم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر زیادتی کرنا مخلوق پر زیادتی کرنے کی نسبت بہت بڑا جرم ہے۔ اور اس بارے میں دلیل کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے، اپنی صفات میں یکتا ہے اور اپنی مخلوقات میں واحد ہے اس دلیل سے زیادہ بین اور واضح ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (1) سے کہا: بلاشبہ تمہاری عقلیں کامل تھیں اور تم وافر ذہانت اور دانائی رکھتے تھے، پھر تم پتھروں کی پوجا کرتے رہے تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ عقلیں ہیں قریب ہے کہ انہیں کوئی پیدا کرنے والا ہو۔ پس عربوں کی عقلی کمزوری اور ان کی جہالت میں سے یہ وہ امر ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی اور اسلام نے آکر اسے مٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اسے باطل کر دیا۔ پس ہمارے لیے ظاہر یہ ہے کہ ہم اسے مار دیں یہاں تک کہ وہ ظاہر نہ ہو، اور ہم اسے بھول جائیں یہاں تک کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے، مگر ہمارے رب کریم نے تو اس کا ذکر اپنی نص کے ساتھ کیا ہے اور اسے اپنی شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جس طرح کہ اس نے اپنے ساتھ کفر کرنے والوں کے کفر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس میں حکمت ہے۔ واللہ اعلم

اس کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا ہے، اور اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے کہ کفر اور باہم میل جول (آمیزش) دونوں قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ اور یحییٰ بن وثاب، سلمی، اعمش اور کسائی نے بزعمهم زا کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ، ای إلی المساکین یعنی وہ حصہ جو ان کے شریکوں کے لیے ہے وہ مساکین تک نہیں پہنچ سکتا۔ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ یعنی ان کا فیصلہ کتنا برا فیصلہ ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: جب وہ ایسے جانور کو ذبح کرتے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہوتا تو وہ اس پر بتوں کا نام لیتے، اور جب اسے ذبح کرتے جو ان کے بتوں کے لیے مختص ہوتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتے، تو ارشاد: فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىِٕهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ کا یہی معنی ہے، پس ان کا ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنا مذموم تھا اور یہ ان جانوروں میں داخل ہے جنہیں اس بنا پر کھانے سے منع کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳۷

''اور یونہی خوشنما بنا دیا ہے بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو ان کے شریکوں نے تاکہ ہلاک کر دیں انہیں اور مشتبہ کر دیں ان پر ان کا دین اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ایسا نہ کرتے، تو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 255

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اس کا معنی ہے جس طرح انہوں نے ان کے لیے اسے خوشنما بنایا کہ وہ الله تعالیٰ کے لیے ایک حصہ مقرر کردیں اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لیے مقرر کردیں اسی طرح ان کے شریکوں نے بہت سے مشرکین کے لیے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو خوشنما بنا دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے لیے فقر و فاقہ کے خوف سے بیٹیوں کے قتل کو خوشنما بنا دیا گیا۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے: یہاں ان کے شریکوں سے مراد وہ ہیں جو بتوں کی خدمت میں رہا کرتے تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے (2) کہ مراد لوگوں میں گمراہ اور خواہش پرست لوگ ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد شیاطین ہیں۔

اور اس سے اشارہ الوأد کی طرف ہے اور وہ فقر و فاقہ کے خوف سے اور اس مدد و نصرت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس سے انہیں محروم رکھا گیا بیٹی کو زندہ درگور کرنا ہے۔ اور شیاطین کو شرکاء کا نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے الله تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ان کی اطاعت و پیروی کی ہے تو انہوں نے انہیں طاقت و فرمانبرداری کے وجوب میں الله تعالیٰ کے ساتھ شریک کرلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی الله تعالیٰ کی قسم کھاتا تھا کہ اگر اس کے اتنے بچے پیدا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک قربانی دے گا، جیسا کہ حضرت عبدالمطلب (3) نے ایسا کیا جب انہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبدالله کو ذبح کرنے کی نذر مانی۔ پھر کہا گیا ہے: آیت میں چار قراءتیں ہیں، ان میں سے اصح جمہور کی قراءت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ اور یہ اہل حرمین، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ شُرَكَآؤُهُمْ، زَيَّنَ کی وجہ سے مرفوع ہے، کیونکہ انہوں نے خوشنما بنایا اور انہوں نے قتل نہ کیا اور قَتْلَ، زَيَّنَ کے سبب منصوب ہے۔ اور اَوْلَادِهِمْ مفعول کی طرف مضاف ہے (☆)۔

اور مصدر میں اصل یہ ہے کہ اسے فاعل کی طرف مضاف کیا جائے، کیونکہ اسی نے اسے بنایا ہے اور اس لیے کہ وہ اس سے مستغنی نہیں اور وہ مفعول سے مستغنی ہوتا ہے۔ اور وہ یہاں لفظاً مفعول کی طرف مضاف ہے لیکن معناً فاعل کی طرف مضاف ہے، کیونکہ تقدیر کلام ہے: زین لکثیر من المشرکین قتلهم اولادهم شرکاءهم (بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکاء نے یہ خوشنما بنا دیا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا اور وہ فاعل ہے جس طرح اس قول باری تعالیٰ سے حذف کیا گیا ہے۔ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ (فصلت: 49) یعنی یہ من دعائہ الخیر ہے۔ اس میں ہا ضمیر دعا کا فاعل ہے، یعنی انسان خیر اور بھلائی کی دعا مانگنے سے نہیں اکتاتا۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ مکی نے کہا ہے: یہ قراءت ہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اس میں اعراب صحیح ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر جمہور کا عمل ہے۔

اور دوسری قراءت زُيِّنَ فعل مجہول کے ساتھ ہے۔ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلُ یہ رفع کے ساتھ ہے۔ اَوْلَادِهِمْ جر

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174　　2۔ ایضاً　　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 754

☆ متن میں عبارت اسی طرح ہے جب کہ مراد یہ ہے لفظ قتل اپنے مفعول "اولادھم" کی طرف مضاف ہے۔

کے ساتھ ہے۔ اور شُرَكَآؤُهُمْ رفع کے ساتھ ہے۔ یہ حسن کی قرأت ہے اور ابن عامر اور اہل شام نے زُین زا مضموم کے ساتھ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ، قَتْلَ کو رفع کے ساتھ اور اَوْلَادِهِمْ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ شُرَكَآؤُهُمْ اس میں مجرور ہے جو ابو عبید نے بیان کیا ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور نے اہل شام سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (یعنی اس میں زا مضموم، قتل مضموم اور اولادھم اور شرکائھم دونوں مکسور ہیں) پس دوسری قراءت (یعنی) حسن کی قراءت جائز ہے اس میں قتل نائب الفاعل ہوگا، اور شرکاؤھم اس فعل مضمر کے سبب مرفوع ہوگا جس پر زین دلالت کرتا ہے یعنی زینہ شرکاؤھم اور اسی وجہ سے ضرب زید عمرو پڑھنا جائز ہوتا ہے، بمعنی ضربہ عمرو اور سیبویہ نے بیان کیا ہے۔

لِيُبْكَ يَزِيدُ ضَارِعٌ لخصومة یعنی یبکیہ ضارع (1)

ابن عامر اور عامر نے ابوبکر کی روایت سے اس طرح قراءت کی ہے: يُسَبَّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ (النور) تقدیر کلام ہے یسبحہ رجال اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے پڑھا ہے: قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارُ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (البروج) بمعنی قتلھم النار۔ نحاس نے کہا ہے: اور وہ جو ابو عبید نے ابن عامر اور اہل شام سے بیان کیا ہے وہ نہ کلام میں جائز ہے اور نہ ہی شعر میں، البتہ نحویوں نے ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے ساتھ تفریق کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح فاصلہ نہیں ہوتا، اور رہے ظروف کے علاوہ دوسرے اسماء تو ان کے ساتھ فرق کرنا غلطی ہے۔ مکی نے کہا ہے: اس قراءت میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق کی وجہ سے ضعف اور کمزوری ہے، کیونکہ شعر میں اس قسم کی تفریق ظرفوں کے ساتھ جائز ہوتی ہے کیونکہ ان میں اتنی وسعت پائی جاتی ہے اور وہ مفعول بہ میں شعر میں بھی بعید ہے۔ لہٰذا قراءت میں اس کو جائز قرار دینا اس سے بھی بعید تر ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: ابن عامر کی یہ قراءت مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان تفریق ہونے کی بنا پر ہے، اور اس کی مثل شاعر کا قول ہے:

فزججتها بمزجة زجَّ القلوصَ أبي مَزادة (2)

اس میں مراد زج أبي مزادة القَلوص ہے۔

اور دوسرا شعر ہے:

تَمُرّ على ما تستمر و قد شفت غلائلَ عبدُ القيس منها صُدُورِها

اس میں مراد شفت عبدُ القیس غلائل صدورھا ہے۔

(پہلے شعر میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان مفعول بہ کا اور دوسرے میں فاعل کا فاصلہ ہے)

ابو غانم احمد بن حمدان نحوی نے کہا ہے: ابن عامر کی قراءت عربی لغت میں جائز نہیں ہے اور یہ ایک عالم کی پھسلاہٹ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 349
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 350

ہے، اور جب ایک عالم (راہ راست سے) پھسل جائے تو اس کی اتباع اور پیروی جائز نہیں ہوتی، اور اس کے قول کو اجماع کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور اسی طرح واجب ہوتا ہے کہ اسے بھی اجماع کی طرف لوٹا دیا جائے جو ان میں پھسل جائے یا بھول جائے اور یہ غیر صحیح پر اصرار کرنے سے اولیٰ اور بہتر ہوتا ہے، البتہ انہوں نے شاعر کو ضرورت۔ کے تحت اجازت دی ہے کہ وہ ظرف کے ساتھ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کرے کیونکہ یہ فاصلہ شمار نہیں ہوتا۔ جیسے کسی نے کہا:

كماخُطّ الكتاب بكفِ يوما يهودِيّ يُقارِبُ أو يُزِيلُ(1)

اور دوسرے نے کہا:

كأن أصواتَ مِن إيغالهن بنا أواخِرِ المَيْسِ أصواتُ الفَرارِيجِ

اور ایک اور شاعر نے کہا:

لما رأت سَاتِيدَما استعبَرتْ لِلّهِ دَرُّ اليومَ مَنْ لَامَها

(مذکورہ تینوں اشعار میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے)

اور علامہ قشیری نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے یہ قبیح ہے اور یہ محال ہے، کیونکہ جب ایک قراءت تواتر کے ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ فصیح ہوتی ہے نہ کہ قبیح۔ اور کلام عرب میں یہ موجود ہے اور مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں شرکائهم یاء کے ساتھ موجود ہے (2) اور یہ ابن عامر کی قراءت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قراءت میں قتل کی اضافت شرکاء کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ شرکاء وہی ہیں جنہوں نے اسے خوشنما بنایا اور اس کی دعوت دی، پس فعل اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے اور اصل میں یہی واجب ہوتا ہے لیکن انہوں نے مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان فرق کر دیا ہے اور مفعول کو مقدم کیا ہے اور اسے اپنے حال پر منصوب چھوڑ دیا ہے، جب کہ معنی میں وہ متاخر ہے، اور مضاف الیہ کو موخر کیا ہے اور اسے اپنے حال پر مجرور چھوڑ دیا ہے، جب کہ وہ متقدم اور قتل کے بعد تھا اور تقدیر عبارت ہے: وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ یعنی ان قتل شرکاؤهم اولادهم (یعنی ان کے شریکوں نے ان کی اولاد کو قتل کیا)

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ ابو عبید کے سوا نے بیان کیا ہے وہ چوتھی قراءت ہے اور وہ جائز ہے اس بنا پر کہ ان کے شرکاء ان کی اولاد کا بدل ہو گئے، کیونکہ وہ نسب اور میراث میں ان کے شریک تھے۔ لِيُرْدُوْهُمْ اس میں لام کی ہے اور ارداء کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ اور وہ ان پر مشتبہ کریں ان کا وہ دین جو ان کے لیے پسندیدہ ہے، یعنی وہ انہیں باطل کا حکم دیتے ہیں اور انہیں اپنے دین کے بارے میں شک میں ڈالتے ہیں۔

اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اور اس میں اولاد کا قتل نہیں تھا، پس حق پر پردہ ڈال دیا جائے گا تو اس کے سبب وہ شک اور التباس میں واقع ہو جائیں گے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے۔ اور یہ قدریہ کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 350 2۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 357۔ تفسیر الرازی، جلد 13، صفحہ 206

رد ہے۔ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ اس افترا اور بہتان سے مراد ان کا یہ قول ہے اِنَّ لِلّٰہِ شُرَکَآءَ (کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں)

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳۸

''اور بولے یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کوئی نہیں کھا سکتا انہیں سوائے اس کے جسے ہم چاہیں (یہ بات) اپنے گمان سے (کہتے ہیں) اور بعض مویشی ہیں حرام ہیں جن کی پشتیں (سواری کے لیے) اور بعض مویشی ہیں کہ نہیں ذکر کرتے نام خدا ان (کی ذبح) پر (یہ سب محض) افترا ہے اللہ پر عنقریب سزا دے گا انہیں جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت کی ایک دوسری قسم بیان کی ہے۔ اَبان بن عثمان نے حُجُرٌ حا اور جیم کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور حسن اور قتادہ نے حا کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ حَجْرٌ پڑھا ہے۔ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور حسن سے حا کے ضمہ کے ساتھ حُجْرٌ بھی منقول ہے۔

ابو عبید نے ہارون سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سارے قرآن کریم میں حِجْرٌ کے لفظ کو حسن حا کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں سوائے اس قول کے: بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝۵۳ (الفرقان) اس مقام پر وہ کسرہ پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے وَحَرْثٌ حِرْجٌ اس میں را جیم سے پہلے ہے۔ اسی طرح مصحف ابی میں ہے اور اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ جبذ اور جذب کی مثل ہے۔ اور دوسرا قول، اور وہی اصح ہے۔ کہ یہ الحرج سے ہے، کیونکہ حرج (بکسر حاء) لغت حرج (بفتح الحاء) ہی ہے اور اس کا معنی تنگی اور گناہ ہے۔ پس اس کا معنی ہوگا حرام۔ اور اسی سے ہے فلاں یتحرج یعنی فلاں ایسے کام میں داخل ہونے سے اپنے اوپر تنگی محسوس کرتا ہے جو حرام میں سے اس پر مشتبہ ہو۔

اور الحجر لفظ مشترک ہے اور یہاں اس کا معنی حرام ہے، اور اس کا اصل معنی روکنا ہے اور عقل کو حجر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ فلان فی حجر القاضی یعنی وہ قاضی کی حفاظت (نگہداشت) میں ہے۔ حجرت علی الصبی حجرا میں نے بچے پر پابندی عائد کردی) اور الحجر کا معنی عقل ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ (الفجر) (یقیناً اس میں قسم ہے عقل مند کے لیے) حجر کا معنی مونث گھوڑا بھی ہے اور حجر کا معنی قرابت بھی ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

يُرِيدُونَ أن يُقْصُوه عَنِّي وانه لذُو حَسَبٍ دانٍ إلىَّ وذو حِجْرٍ

اور حجر الإنسان و حجرہ (آدمی کے قرابت دار) اس میں دونوں لغتیں ہیں اور فتحہ اکثر ہے، یعنی انہوں نے جانور اور کھیتی حرام قرار دی اور اسے بتوں کے لیے خاص کر دیا اور انہوں نے کہا: لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ اور ان سے مراد بتوں کے خدام ہیں، پھر بیان فرمایا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کے بارے شریعت نے کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ اسی لیے فرمایا: بِزَعْمِهِمْ۔

وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا ان سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں وہ اپنے الہوں کے لیے روک کر رکھتے تھے جیسا کہ حصہ والی بات پہلے گزر چکی ہے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان سے مراد بحیرہ، وصیلہ، اور حام ہیں۔ وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا یعنی وہ جانور جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے۔ اور ابووائل (1) نے کہا ہے: ان پر وہ حج نہیں کرتے تھے۔

افْتِرَآءً یعنی (اللہ تعالیٰ پر) افترا اور بہتان لگانے کے لیے علی اللہ کیونکہ وہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اور یہ (افتراء) مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی یفترون افتراء، تو اس صورت مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔

وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

''اور بولے جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ نرا ہمارے مردوں کے لیے ہے اور حرام ہے ہماری بیویوں پر اور اگر وہ مرا ہوا (پیدا) ہو تو پھر وہ سب (مرد و زن) اس میں حصہ دار ہیں۔ اللہ جلدی بدلہ دے گا انہیں ان کے اس بیان کا بے شک وہ حکمت والا علم والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا یہ ان کی جہالت کی ایک اور نوع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ دودھ ہے۔ اسے انہوں نے مردوں کے لیے حلال قرار دیا اور عورتوں پر حرام قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ان کے پیٹوں میں موجود بچے ہیں۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ ہم مردوں کے لیے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی مر گیا تو اسے مرد اور عورتیں سبھی کھا سکیں گے۔ اور خَالِصَةٌ میں ھا خلوص میں اظہار مبالغہ کے لیے (یعنی وہ خالصۃ مردوں کے لیے ہیں)۔ اور اسی کی مثل رجل علامۃ و نسابۃ ہے (2) (یعنی ان کے آخر میں تا مبالغہ کے لیے ہے) یہ کسائی اور اخفش سے مروی ہے۔ اور خَالِصَةٌ مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور وہ ما ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اس خَالِصَةٌ کی تانیث الانعام کے مونث ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور ایک قوم کے نزدیک یہ قول غلط ہے، کیونکہ جو کچھ ان کے شکموں میں ہے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ اور یہ اس قول سے مشابہت نہیں رکھتا: يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ (یوسف:10) کیونکہ اس میں سیارہ کا بعض بھی سیارہ ہی ہے اور یہ لازم نہیں آتا۔

فراء نے کہا ہے: چونکہ جو جانوروں کے شکموں میں ہیں وہ بھی انہیں کی مثل جانور ہیں، لہٰذا ان جانوروں (لفظ الانعام) کے مونث ہونے کی وجہ سے انہیں بھی مونث قرار دیا گیا ہے، یعنی الأنعام التی فی بطون الأنعام خالصۃ لذکورنا (وہ چوپائے جو ان چوپاؤں کے شکموں میں ہیں نرے ہمارے مردوں کے لیے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ جماعت جو شکموں میں ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: بلاشبہ ما سے مراد دودھ اور جنین دونوں ہو سکتے ہیں، لہٰذا تانیث معنی کے اعتبار سے اور تذکیر (مذکر لانا) لفظ کی بنا پر ہے۔ اور اسی لیے کہا ہے: مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا یعنی لفظ کی بنا پر اسے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اگر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 174
2۔ ایضاً

معنی کی رعایت کرتے تو کہتے و محرمۃ اور اعمش کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے اور وہ خالص بغیر ہا کے ہے۔ کسائی نے کہا ہے: خالص اور خالصۃ دونوں کا معنی ایک ہے، مگر ہا مبالغہ کے لیے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رجل داھیۃ و علامۃ جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے خَالِصَةٌ منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اس ظرف کی ضمیر سے حال ہے جو ما کا صلہ ہے اور مبتدا کی خبر محذوف ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: الذی فی الدار قائما زید یہ بصریوں کا مذہب ہے اور فراء کے نزدیک بالیقین منصوب ہے۔ اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر کی قراءت میں خالصا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خالصہ علی الاضافت پڑھا ہے پس یہ مبتدا ثانی ہوگا اور خبر لذ کورنا ہوگی اور پھر جملہ ما کی خبر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خالصہ، ما سے بدل ہو۔ پس اس میں یہ پانچ قراءتیں ہیں۔

وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزْوَاجِنَا یعنی ہماری بیٹیوں پر وہ حرام ہیں۔ یہ ابن زید سے منقول ہے اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے: مراد ان کی عورتیں ہیں۔ وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، یعنی اور اگر وہ مردہ ہوا جو ان چوپاؤں کے شکموں میں ہے۔

فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ تو مرد اور عورتیں بھی اس میں شریک ہوں گے اور فرمایا فیہ اس لیے کہ میتۃ سے مراد حیوان ہے اور یا کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے، (اسی وجہ سے) فیھا نہیں کہا۔ میتۃ رفع کے ساتھ بمعنی تقع یا تحدث ہے (اگر مردہ پیدا ہوگا) میتۃ نصب کے ساتھ ہو (عبارت ہوگی) وان تکن النسمۃ میتۃ (اور اگر پیدا ہونے والا جانور مردہ ہوا)

سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جلدی ہی ان کے کذب اور بہتان کا بدلہ دے گا، یعنی انہیں اس پر عذاب دے گا۔ اور وَصْفَهُمْ حرف جار محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ای بوصفھم اور آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عالم کے لیے چاہیے کہ وہ اپنے مخالف کے قول کو پڑھے اور سمجھے اگر چہ اس پر عمل نہ کرے تاکہ وہ اس کے قول کے فاسد ہونے کو جان لے اور یہ جان لے کہ اس پر کیسے رد کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ان کے اقوال کا علم دیا اہل زمانہ میں سے جنہوں نے ان کی مخالفت کی، تاکہ وہ ان کے قول کے فساد کو جان لیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۴۰﴾

''یقیناً نقصان اٹھایا جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر جانے اور حرام کر دیا جو رزق دیا تھا انہیں اللہ نے بہتان باندھ کر اللہ تعالیٰ پر بے شک وہ گمراہ ہو گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور اپنی عقلوں کے ساتھ بحیرہ وغیرہ کو حرام قرار دینے کے سبب ان کے نقصان اور خسارہ اٹھانے کی خبر دی ہے، پس انہوں نے اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے حماقت سے قتل کیا۔ اور اپنے مالوں میں اپنے اوپر پابندیاں لگائیں اور وہ فقر و افلاس سے نہ ڈرے، تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے

تناقض اور تضاد کو ظاہر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بے شک عربوں میں سے کچھ تھے جو اپنی اولاد کو فقر و افلاس کے ڈر سے قتل کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر اسے بیان کیا ہے اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جو محض حماقت سے بغیر کسی حجت اور دلیل کے انہیں قتل کر دیتے تھے۔ اور وہ ربیعہ اور مضر کے قبائل تھے، یہ حمیت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اور ان میں سے بعض کہتے تھے: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور انہوں نے اپنی بیٹیوں کو اللہ کی بیٹیوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہمیشہ غمزدہ رہا کرتا تھا، تو (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تجھے کیا ہے تو مغموم رہتا ہے"؟ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنے عہد جاہلیت میں ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اللہ تعالیٰ میرے لیے اسے معاف نہیں فرمائے گا اگرچہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "مجھے اپنے گناہ کے بارے بتاؤ"۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے، پس میرے ہاں بچی پیدا ہوئی تو میری بیوی نے مجھ سے سفارش کی کہ میں اسے چھوڑ دوں چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی اور احکام سمجھنے کی عمر کو پہنچ گئی (یعنی بالغ ہو گئی) اور حسین و جمیل عورتوں میں سے ہو گئی اور لوگ اس کے لیے پیغام نکاح دینے لگے، تو میرے اندر حمیت داخل ہو گئی اور میرا دل برداشت نہ کر سکا کہ میں اس کی شادی کروں یا اسے گھر میں بغیر شادی کے چھوڑ دوں، تو میں نے بیوی کو کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنے رشتہ داروں کی ملاقات کے لیے فلاں فلاں قبیلہ میں جاؤں پس تو اسے میرے ساتھ بھیج دے، وہ اس پر بہت خوش ہوئی اور اس نے اسے کپڑوں اور زیور کے ساتھ خوب آراستہ کیا (یعنی اس کا بناؤ سنگھار کیا) اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس سے خیانت نہ کروں گا، چنانچہ میں اسے ایک کنوئیں کے کنارے لے گیا اور میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو بچی سمجھ گئی کہ میں اسے کنوئیں میں پھینکنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تو وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور رونے لگی: اے ابا جان! کیوں تم میرے ساتھ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تو مجھے اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں نے کنوئیں میں دیکھا اور مجھ میں حمیت بھڑک اٹھی پھر وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور کہنے لگی: اے ابا! میری امی کی امانت ضائع نہ کر۔ تو میں ایک بار کنوئیں میں دیکھتا اور ایک بار اس کی طرف اور میں اس پر رحم کرتا رہا، یہاں تک کہ شیطان مجھ پر غالب آ گیا اور میں نے اسے پکڑا اور اسے اوندھا کر کے کنوئیں میں پھینک دیا، اور وہ کنوئیں میں بھی پکارتی رہی۔ اے ابا! تو نے مجھے قتل کیا ہے، اور میں وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز ختم ہو گئی تو میں واپس آ گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی رونے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو أُمِرتُ أنْ أعاقب أحد أبما فعل فی الجاهلیة لَعَاقبتُكَ (اگر مجھے حکم دیا جاتا کہ میں کسی کو اس فعل پر سزا دوں جو اس نے عہد جاہلیت میں کیا تو میں تجھے ضرور سزا دیتا) (1)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 1، صفحہ 517

وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ٘ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کیے باغات کچھ چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور کچھ بغیر اس کے اور کھجور اور کھیتی الگ الگ ہیں کھانے کی چیزیں ان کی اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک جیسے اور (ذائقہ میں) مختلف، کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل دار ہو اور ادا کرو اس کا حق جس دن وہ کٹے۔ اور فضول خرچی نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو''۔

اس میں تیئس مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَنْشَاَ یعنی اس نے پیدا کیا۔ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ ایسے باغات کو جو زمین پر بچھے اور چھپروں پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ اور ایسے جو چھپروں پر نہیں چڑھائے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو زمین پر پھیل جائیں ان میں سے جو بچھ جاتے ہیں مثلاً انگور کی بیلیں، کھیتیاں اور تربوز کی بیل وغیرہ۔ اور غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد وہ ہیں جو اپنے تنے پر کھڑے ہوں مثلاً کھجور کے درخت اور دیگر تمام درخت۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معروشات وہ زمین جن کے درخت بلند ہو جائیں اور تعریش کا اصل معنی الرفع (بلند ہونا) ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ معروشات وہ ہیں جنہیں لوگ لگاتے ہیں اور انہیں اوپر چڑھاتے ہیں اور غیر معروشات وہ ہیں جو پھلوں سے جنگلوں اور پہاڑوں میں خود نکلتے ہیں (1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غین اور سین کے ساتھ قراءت اس پر دلالت کرتی ہے۔ مغروسات و غیر مغروسات۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ ان دونوں کا علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ یہ دونوں جنات، باغات میں داخل ہیں اس لیے کہ ان دونوں میں فضیلت ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ الآیہ (البقرہ: 98) کے تحت اس کا بیان گزر چکا ہے۔

مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ یعنی اس کا ذائقہ مختلف ہے ان میں سے کچھ جید (عمدہ) ہیں اور کچھ ردی اور گھٹیا۔ اور اس کا نام اکل رکھا کیونکہ وہ کھائے جاتے ہیں۔ اور اُكُلُهٗ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور مُخْتَلِفًا اس کی نعت اور صفت ہے۔ لیکن جب یہ اس پر مقدم ہوا اور منصوب کے قریب ہوا تو اسے نصب دی گئی، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: عندی طباخا غلام اور شاعر نے کہا ہے:

الشّیْ منتشر یلقاک عن عرض والصالحات علیہا مغلقا باب

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُخْتَلِفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یہ مسئلہ علم نحو کے مشکل مسائل میں سے ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: قد أنشأھا ولم یختلف أکلھا وھو ثمرھا (تحقیق اس نے اسے پیدا کیا اور اس کے پھل مختلف نہیں) تو جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اپنے اس قول کے ساتھ: خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178

(الانعام:102) تو جان لیجئے کہ اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس کے پھل مختلف ہیں، یعنی إنه أنشأها مقدرًا فيه الاختلافُ (اس نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ اس میں اختلاف مقدر ہے) اسے سیبویہ نے اپنے اس قول کے ساتھ بیان کیا ہے: مررتُ برجل معه صقرٌ صائدًا به غدًا یہ حال کی بنا پر ہے۔ (یعنی میں ایک آدمی کے پاس سے گزرا اس کے ساتھ باز تھا درآنحالیکہ وہ اس سے کل شکار کرے گا) اسی طرح آپ کہتے ہیں: لتدخلُنَّ الدارَ آکلینَ شاربینَ، ای مقدرینَ ذالك (تم گھر میں داخل ہوتے ہو کھاتے پیتے ہوئے (یعنی حال یہ ہے کہ تم کھا، پی رہے ہو) تیسرا جواب یہ ہے: یعنی لما أنشاءہ کان مختلفا أکلُہ (جب اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تو اس کے پھل مختلف تھے۔ یہ اس معنی کی بنا پر ہے لو کان له أکلٌ لکانَ مختلفا أکلُہ (یعنی اگر اس کے پھل ہوتے تو اس کا ذائقہ مختلف ہوتا)

اور اکلهما نہیں کہا، کیونکہ اس نے اعادہ کے ذکر کے وقت ان دو میں سے ایک پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11)، ای الیهما اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ (ان کا ایک دوسرے پر) عطف کیا گیا ہے۔

**مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ** یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ اور اس میں تین دلیلیں ہیں (۱) جس پر سب سے پہلے دلیل قائم ہوتی ہے وہ یہ کہ متغیرات یعنی تبدیلیوں کے لیے مغیر یعنی تبدیلی لانے والے کا ہونا ضروری ہے (۲) دوسری دلیل اس پر کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہم پر احسان ہے، پس اگر وہ چاہتا تو جب اس نے ہمیں پیدا کیا تو وہ ہمارے لیے غذا پیدا نہ کرتا اور جب اس نے اسے پیدا کر دیا تو وہ دیکھنے میں حسین اور ذائقے میں عمدہ اور طیب نہ ہوتی، اور جب اس نے اسے اس طرح پیدا فرما دیا تو اسے چننا آسان نہ ہوتا۔ پس اس پر ابتداء ایسا کرنا لازم نہیں تھا، کیونکہ اس پر کوئی شی واجب نہیں۔ (۳) اور تیسری دلیل قدرت پر ہے کہ وہ پانی جس کی شان یہ ہے کہ وہ زمین میں نیچے اتر جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک علام الغیوب کی قدرت سے درخت کی جڑوں سے اس کی شاخوں کی جانب اوپر چڑھ آتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے آخر تک پہنچتا ہے تو اس میں پتے اگتے ہیں جو اس کی جنس سے نہیں۔ اور پھل اپنے خاص وصف کے ساتھ وافر مقدار میں نکلتا ہے اور اس کا رنگ صاف اور حسین ہوتا ہے، اسے چننا آسان ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ لذیذ ہوتا ہے، تو طبائع اور ان کی اجناس کہاں گئیں؟ فلاسفہ اور ان کے لوگ کہاں گئے؟ کیا یہ طبیعت کی قدرت میں ہے کہ وہ اس طرح کی پختگی لا سکے، یا یہ عجیب وغریب ترتیب مرتب کر سکے؟ ہرگز نہیں۔ عقلی اعتبار سے اسے کوئی مکمل نہیں کر سکتا مگر وہی جو حی (زندہ) ہو، عالم (جاننے والا) ہو، قدیر (قدرت والا) ہو اور مرید (ارادہ کرنے والا) ہو، پس پاک ہے وہ ذات جس کے لیے ہر شی میں کوئی نشانی اور دلیل ہے۔

اور اس آیت کو ماقبل کے ساتھ متصل لانے کی وجہ یہ ہے کہ جب کفار نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان باندھے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور کئی چیزوں کو حلال وحرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر انہیں دلیل دی کہ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے، اور یہ کہ اس نے ان چیزوں کو ان کے لیے رزق بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: كُلُوْا مِنْ ثَمَرِةٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ یہ دو بنائیں اور اصلیں ہیں اور دونوں اِفعل (امر) کے صیغہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک مباح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ (الجمعہ: 10) اور دوسری واجب ہے۔ اور شریعت میں مباح اور واجب کا ملنا ممتنع نہیں ہے۔ اور حق ادا کرنے کے امر سے پہلے کھانے کی نعمت کے ذکر سے آغاز کیا تاکہ وہ واضح کر دے کہ نعمت کے ساتھ ابتدا، حکم کی پابندی سے پہلے یہ اس کا فضل (اور احسان) ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ حق کی تفسیر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ تو حضرت انس بن مالک، حضرت ابن عباس، حضرت طاؤس، حضرت حسن، حضرت ابن زید، حضرت ابن الحنفیہ، حضرت ضحاک اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے کہ حق سے مراد وہ زکوٰۃ ہے (1) جو فرض کی گئی ہے، عشر اور نصف عشر ہے۔ اور اسے ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔

اور حضرت علی بن حسین، حضرت عطا، حضرت حکم، حضرت حماد، حضرت سعید بن جبیر (2) اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد وہ حق ہے جو زکوٰۃ کے سوا مال میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے ندباً حکم فرمایا ہے۔ اور حضرت ابن عمر اور محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا گیا ہے، اور اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب تو فصل کی کٹائی کرے اور تیرے پاس مساکین حاضر ہوں تو ان کے لیے کچھ بالیں (سٹے) چھوڑ دے، اور جب تو (انگور یا کھجوریں وغیرہ) توڑے تو ان کے لیے کچھ خوشے پھینک دے، اور جب تو اپنی کھیتی کو صاف کرے اور اس سے دانے نکال لے تو اس سے ان کے لیے کچھ حصہ چھوڑ دے، اور جب تو اس کا کیل (مقدار) معلوم کر لے تو اس کی زکوٰۃ (عشر) ادا کر۔ اور تیسرا قول زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے، کیونکہ یہ سورت مکیہ ہے اور آیت زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ: 103) (اے حبیب! وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ) اور وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 43) (اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ)

یہ حضرت ابن عباس، ابن الحنفیہ، حسن، عطیہ العوفی، نخعی اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے سدی سے اس آیت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: عشر اور نصف عشر کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے، تو میں نے کہا: یہ کس سے منقول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: علماء سے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے سبب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی عمومیت کے سبب کہ ''وہ زمین جسے بارش سیراب کرے (3) اس کی پیداوار میں عشر ہے اور جسے بڑے یا چھوٹے ڈولوں کے ساتھ سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے''۔ ہر اس پیداوار میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے جسے زمین اگاتی ہے چاہے وہ اناج ہو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 757 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 178 3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

یا کوئی اور۔ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے بیان کیا ہے: سوائے ایندھن کی لکڑی، گھاس، وہ درخت جس کی شاخوں سے کمانیں بنائی جاتی ہیں۔

القصب، انجیر (☆)، غاف کے درخت کا چھلکا (غاف ایک انتہائی میٹھے پھل والا درخت ہے) قصب الذریرۃ (خاص قسم کی خوشبو کے پودے) اور قصب السکر (گنا) کے۔ اور جمہور نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور وہ تاویل یہ کرتے ہیں کہ حدیث طیبہ کا مقصود اس زمین کو بیان کرنا ہے جس سے عشر لیا جائے گا اور جس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ ابوعمر نے کہا ہے: اس بارے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے جسے تو جانتا ہے کہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے سوا میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسے حضرت حسن، ابن سیرین اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم سے روایت کیا گیا ہے۔ اور کوفیوں میں سے ابن ابی لیلیٰ، ثوری، حسن ابن صالح، ابن مبارک اور یحییٰ بن آدم رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور اسی طرف ابوعبید بھی گئے ہیں۔ اور اسے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور یہی حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے، کیونکہ وہ زکوٰۃ نہیں لیتے تھے مگر گندم، جو، کھجور اور کشمش سے۔ اور اسے وکیع نے طلحہ بن یحییٰ عن ابی بردہ عن ابیہ کی سند سے بیان کیا ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر وہ خوراک جو ذخیرہ کی جاسکتی ہو اس میں زکوٰۃ (عشر) واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: زکوٰۃ ان چیزوں میں واجب ہوتی ہے جو خشک ہو جائے اور اسے ذخیرہ کیا جاسکتا ہو اور اسے بطور خوراک کھایا جاسکتا ہو۔ اور زیتون میں کوئی شی نہیں ہے کیونکہ وہ ادام (سالن) ہے۔ اور اسی کی مثل ابوثور نے بھی کہا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کئی اقوال کہے ہیں ان میں سے اظہر قول یہ ہے کہ زکوٰۃ ان تمام چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے جب کہ ان کے وسق بنائے جا سکتے ہوں۔ اور انہوں نے اسے بادام میں واجب کیا ہے کیونکہ یہ کیلی چیز ہے لیکن اخروٹ میں نہیں کیونکہ ان کا شمار عددی چیزوں میں ہے (یعنی یہ گن کر بیچے جاتے ہیں نہ کہ وزن وکیل کے ساتھ) اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لیس فیما دون خمسۃ أوسق من تمرأ وحبّ صدقۃ (1) (پانچ سے کم وسق کھجوروں یا دانوں میں کوئی صدقہ (زکوٰۃ وعشر) نہیں ہے) انہوں نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی ہے کہ واجب کا محل وسق ہے، اور آپ نے اس مقدار کو بیان کر دیا ہے جس سے حق (زکوٰۃ) نکالنا واجب ہوتا ہے۔ اور امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ زکوٰۃ ہر اس پیداوار میں واجب ہے جسے زمین اگائے، یہاں تک کہ سبزی کی دس گانٹھوں میں سے ایک گانٹھ (بطور زکوٰۃ) واجب ہوگی اور ان سے اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے، اور یہی حضرت عمر بن العزیز کا قول ہے کیونکہ انہوں نے لکھا کہ عشر ہر اس پیداوار سے لیا جائے جسے زمین اگاتی ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔

اسے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے سماک بن فضل سے ذکر کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر نے لکھا............ پھر آگے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 314

☆ بعض نسخوں میں تین ہے۔

اسے ذکر کیا۔ اور یہی قول حماد بن ابی سلیمان اور آپ کے شاگرد رشید حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور ابن عربی کا میلان بھی احکام میں اسی طرف ہے (1) پس فرمایا ہے: اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا آئینہ بنایا اور حق کو دیکھ لیا، اور اسے پکڑا جو مذہب حنفی کو قوت اور طاقت دیتا ہے۔ اور انہوں نے کتاب القبس بما علیہ الإمام مالك بن انس میں کہا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اور لوگوں نے ان تمام میں یا بعض میں زکوٰۃ واجب ہونے میں اختلاف کیا ہے جنہیں آیت متضمن ہے، تحقیق ہم نے اس کا خلاصہ ''الاحکام'' میں بیان کر دیا ہے کہ زکوٰۃ ان چیزوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جنہیں غذا بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے نہ کہ سبزیوں وغیرہ کے ساتھ۔ اور انار، فرسك (اخروٹ یا اس قسم کی کوئی اور شی) اور اترج (لیموں کا درخت) طائف میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس پر کوئی اعتراض کیا اور نہ اس کا ذکر کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اگرچہ احکام میں اس کا ذکر نہیں اور یہی صحیح مسئلہ ہے کہ سبزیوں میں کوئی شی نہیں ہے۔ اور رہی آیت تو اس میں اختلاف ہے، کیا یہ محکم ہے یا منسوخ ہے یا ندب پر محمول ہے؟ اور ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے جو اس کے محتملات میں سے ایک کو بیان کرے، بلکہ جو قاطع معلوم ہے وہ وہ ہے جسے ابن بکیر نے اپنی ''احکام'' میں ذکر کیا ہے کہ کوفہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مدینہ طیبہ میں احکام مضبوط اور پختہ ہونے کے بعد فتح ہوا، تو کیا یہ جائز ہے کہ کوئی وہم میں پڑنے والا وہم میں پڑ جائے یا جسے ادنیٰ سی بصیرت ہو کہ شریعت اس کی مثل ہو تو وہ معطل کر دی گئی ہے اور اس کے مطابق دار الہجرۃ اور محبط وحی میں عمل نہیں کیا گیا اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں، یہاں تک کہ اس کے مطابق کوفہ کے باسیوں نے عمل کیا؟ بلاشبہ یہ اس کے بارے میں درست ہے جس نے یہ گمان کیا اور اس طرح کہا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم کے معنی میں سے اس پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ: 67) (اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام) کیا آپ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز چھپا کر رکھی ہوگی جس کی تبلیغ اور بیان کا آپ کو حکم دیا گیا؟ حاشا وکلا (ایسا ہرگز ممکن نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت)

اور دین کے کامل ہونے میں سے یہ ہے کہ آپ نے سبزیوں میں سے کوئی شی نہیں لی۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ (2) رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں کہا ہے جسے دارقطنی نے بیان کیا ہے: بے شک ہمارے پاس کھیرے، ککڑیاں، پیدا ہونے کی جگہوں میں سے وہ دس ہزار تک نکالے جاتے تھے اور ان میں کوئی شے (زکوٰۃ) نہ ہوتی تھی۔ اور زہری اور حسن نے کہا ہے: سبزی جب بیچ دی جائے تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کی زکوٰۃ دی جائے گی جب اس کے ثمن (قیمت) دوسو درہم تک پہنچ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 759	2۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100

جائیں۔ اور پھلوں کے ثمن کے بارے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ ان دونوں کے قول میں اس کے لیے کوئی حجت نہیں ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور ترمذی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لکھا اور سبزیوں کے بارے (زکوٰۃ) کا حکم دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیس فیھا شیء (1) ان میں کوئی شی نہیں ہے اور اسی معنی کی روایت حضرت جابر، حضرت انس، حضرت علی، حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ان کی احادیث دارقطنی نے ذکر کی ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اصحاب نے صالح بن موسیٰ عن منصور عن ابراہیم عن الاسود عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سبزیوں میں سے جو زمین اگائے اس میں زکوٰۃ ہے''۔ فیما أنبتتِ الأرضُ من الخضر زکاۃ (2) ابوعمر نے کہا ہے: اس حدیث کو منصور کے ثقہ اصحاب میں سے کسی نے اس طرح روایت نہیں کیا، بلکہ یہ ابراہیم کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب سنت کی جہت سے اسانید ضعیف ہونے کے سبب استدلال ساقط ہو گیا تو پھر کچھ باقی نہ رہا مگر وہی جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آیت کے عموم میں تخصیص مراد ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد فیما سقت السماءُ العشرُ (3) کے عموم کے بارے میں جو ہم نے ذکر کیا ہے (وہ ثابت ہو گیا)

امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ علیہما نے کہا ہے: سبزیوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے سوائے ان کے جن کا پھل باقی رہنے والا ہے اور سوائے زعفران وغیرہ کے کہ اس کا شمار وزنی چیزوں میں ہوتا ہے اور اس میں زکوٰۃ ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ عصفر (زرد رنگ) اور کتان (السی) میں بیج کا اعتبار کرتے ہیں، پس جب ان دونوں کا بیج قرطم (کڑ کے بیج) اور کتان (السی) میں سے پانچ وسق تک پہنچ جائے تو عصفر اور کتان بیج کے تابع ہوں گے، اور اس سے عشر یا نصف عشر لیا جائے گا۔ اور رہی روئی تو اس میں ان کے نزدیک پانچ سے کم گانٹھوں میں کوئی شی نہیں ہے اور ایک گانٹھ تین سو سیر عراقی کی ہوگی۔ اور ورس (ایک قسم کی گھاس جو رنگائی کے کام آتی ہے) اور زعفران جب پانچ سیر سے کم ہوں تو ان میں کوئی شی (زکوٰۃ) نہ ہوگی۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک پانچ سیر تک پہنچ جائے تو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) ہوگا، چاہے وہ عشر ہو یا نصف عشر۔

اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اسی طرح (حکم) اس گنے کا ہے جس سے شکر (اور چینی) بنتی ہے، اور وہ عشری زمین میں ہو نہ کہ خراجی زمین میں، تو اس میں وہی حکم ہے جو زعفران میں ہے۔

عبدالملک بن ماجشون نے پھلوں کی جڑوں میں زکوٰۃ واجب کی ہے نہ کہ سبزیوں میں۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو موقف امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے، ان کے نزدیک کوئی زکوٰۃ نہیں نہ بادام میں، نہ اخروٹ میں اور نہ ہی

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 81
2۔ دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 195
3۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 201

بندق میں اور جو بھی ان کی مثل ہے، اگرچہ انہیں ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ان کے نزدیک ناشپاتی، سیب اور امرود میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ ہی ان چیزوں میں جو ان کی مثل ہیں نہ خشک ہوتی ہے اور نہ ذخیرہ کی جا سکتی ہے، البتہ انجیر میں اختلاف ہے۔ اور اہل مغرب میں سے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے ہیں ان کے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ انجیر میں زکوٰۃ نہیں ہے، مگر عبدالملک بن حبیب یہ رائے رکھتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس میں زکوٰۃ ہے۔ وہ اسے کھجور اور کشمش پر قیاس کرتے ہیں اور بغداد کے مالکی مذہب رکھنے والے اہل علم کی ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے، ان میں اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے: وہ سنت جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں، اور وہ جو میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ ہر قسم کے پھلوں میں سے کسی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، انار، خرسک اور انجیر اور جو ان کے مشابہ ہیں۔ اور جو ان کے مشابہ نہیں بشرطیکہ وہ فواکہ (پھلوں) میں سے ہوں۔

ابوعمر نے کہا ہے: پس آپ نے انجیر کو اس باب میں داخل کیا ہے اور میرا گمان ہے (واللہ اعلم) آپ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ اسے خشک کیا جاتا ہے اور ذخیرہ کیا جاتا ہے اور اسے خوراک بنایا جاتا ہے، اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ اسے اس باب میں داخل نہ کرتے، کیونکہ یہ انار سے بڑھ کر کھجور اور کشمش کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور مجھے علامہ ابہری اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت سے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ اس میں زکوٰۃ کے وجوب کا فتویٰ دیتے ہیں، اور وہ اپنے نزدیک اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے اصول پر دیکھتے ہیں۔

اور انجیر کیلی شی ہے اس میں پانچ وسقوں کی رعایت کی جائے گی اور وہ شے جو وزن کے اعتبار سے ان کی مثل ہو اور ان کے نزدیک انجیر میں کھجور اور کشمش کا حکم لگایا جائے گا جن پر تمام کا اجماع ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: کھجور اور انگور کے سوا پھلوں میں سے کسی شی میں کوئی زکوٰۃ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے زکوٰۃ وصول کی ہے اور یہ دونوں اہل حجاز کی خوراک تھی جسے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے فرمایا: کبھی اخروٹ اور بادام کو بھی ذخیرہ کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں میں زکوٰۃ نہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں حجاز میں خوراک نہیں بنیں، جتنا مجھے علم ہے، بلاشبہ یہ دونوں پھل ہیں۔ اور زیتون میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ پس اسے رمان (انار) کے ساتھ ملایا ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ انجیر غذا اور خوراک میں اس سے زیادہ نفع بخش ہے اور اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ ہے انہوں نے یہ عراق میں کہا اور پہلا قول مصر میں کہا: پس زیتون کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مضطرب ہو گیا، اور اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف نہیں، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ ان دونوں کے نزدیک آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور دونوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ انار میں زکوٰۃ نہیں ہے اور اس میں زکوٰۃ کو واجب کرنا دونوں کو الزام دینا ہے۔ ابوعمر نے کہا ہے: اگر انار اس اتفاق سے نکل چکا ہے تو اس سے یہ معنی ظاہر ہوا کہ آیت اپنے عموم پر نہیں ہے اور ضمیر عائد مذکور چیزوں میں سے بعض کی

طرف راجع ہے اور بعض کی طرف نہیں۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے سبزیوں میں عشر واجب کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ اور اس سے پہلے زیتون اور انار کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کا ذکر جملہ کے بعد ہو وہ بلا اختلاف اخیر کی طرف پھر جاتا ہے۔ الکیا طبری نے یہ کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے کبھی بھی انار کو پیوند نہیں لگایا مگر باغ کے پانی میں سے ایک قطرہ کے ساتھ۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب تم انار کو کھاؤ تو تم اسے دانوں کے باریک چھلکے سمیت کھاؤ، کیونکہ وہ معدے کو صاف کرتا ہے۔ اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم انار کو اس کے سرے سے نہ توڑو کیونکہ اس میں ایک کیڑا ہوتا ہے جس سے جذام کی بیماری لگ جاتی ہے۔ زیتون کے تیل کے فوائد عنقریب سورۃ المومنون میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ واجب ہے ان میں سے زہری، اوزاعی، لیث، ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ زہری، اوزاعی اور لیث نے کہا ہے: زیتون کا تخمینہ لگایا جائے گا اور اس سے صاف تیل لے لیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اندازہ نہیں لگایا جائے گا، البتہ اس کا تیل نکالے جانے کے بعد اس سے عشر لیا جائے گا، جب کہ اس کا ماپ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما علیہ نے کہا ہے: اس کے دانوں سے عشر لیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** قولہ تعالیٰ: یَوْمَ حَصَادِهٖ ابوعمرو، ابن عمر اور عاصم نے حصادہ حا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے، اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ، اور یہ دونوں لغتیں مشہور ہیں۔ اور اسی کی مثل الصَرام اور الصِرام، الجَذاذ اور الجِذاذ، القَطاب اور القِطاب ہیں۔ زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت کے بارے میں علماء کے تین مختلف قول ہیں:

(۱) زکوٰۃ واجب ہونے کا وقت فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ محمد بن مسلمہ نے یہی کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ حَصَادِهٖ۔(1)

(۲) اس کا وقت پکنے کے ایام ہیں، کیونکہ (کھیتی) پکنے سے پہلے پہلے نہ چارہ ہوتی ہے، نہ غذا اور نہ ہی طعام اور جب وہ پک جائے اور وہ اس کھانے کے وقت کو پہنچ جائے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے تو پھر وہ حق واجب ہو جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کیونکہ نعمت مکمل ہو جانے کے ساتھ اس نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اس کی ادائیگی کٹائی کے وقت ہوگی جب کہ وہ واجب پکنے کے وقت ہو جاتا ہے(2)۔

(۳) حق کا وجوب اندازہ مکمل کرنے کے بعد ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت اس میں واجب زکوٰۃ ثابت ہو جاتی ہے اور یہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شرط ہے۔ اس کی اصل زکوٰۃ وصول کرنے والے کا رپوڑ میں آنا ہے(3)، یعنی حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 762 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 763

کہا ہے۔ نص قرآنی کے مطابق پہلا قول صحیح ہے۔ اور مذہب ثانی مشہور ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی فصل پکنے کے بعد فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کی ملکیت سے ادا کی جائے گی یا وہ انداز ہ لگانے سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس کے وارثوں پر ہوگی۔ اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: پھل کے مالکوں کو وسعت دینے کے لیے اندازہ لگانے کو مقدم کیا گیا ہے اور اگر کسی آدمی نے اندازہ لگانے کے بعد اپنی زکوٰۃ کو مقدم کیا اور کاٹنے سے پہلے پہلے ادا کر دی تو وہ اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی، کیونکہ اس نے اسے واجب ہونے سے پہلے نکال دیا ہے۔ اور اندازہ لگانے کے بارے علماء کے مختلف قول ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ثوری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دی ہے، اور انہوں نے فرمایا: اندازہ لگانا مستعمل نہیں۔ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ باغ کے مالک پر لازم ہے کہ وہ اس کا عشر مساکین کو ادا کرے جو اس کے قبضے میں ہو جب وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اور شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: موجودہ دور میں اندازہ لگانا بدعت ہے۔ اور جمہور اس کے خلاف ہیں، پھر ان کا اختلاف ہوا ہے اور اس کے جواز پر سب سے بڑی دلیل کھجور اور انگور کے بارے میں ہے کہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ (1) کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھیجا اور حکم فرمایا کہ وہ اسی طرح انگوروں کا اندازہ لگالیں جس طرح کھجوروں کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش لے لی جائے جس طرح کھجوروں کی زکوٰۃ میں تمر (پکی کھجوریں) لے لی جاتی ہیں۔ اسے ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔ اور داؤد بن علی نے کہا ہے: زکوٰۃ کے لیے کھجوروں میں اندازہ لگانا جائز ہے اور انگور میں جائز نہیں ہے اور حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے اور صحیح سند سے متصل نہیں ہے ابو محمد عبدالحق نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اندازہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو کھجور کے درخت پر تر کھجوریں ہیں اور ان کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے جو ان میں ناقص ہوں اگر وہ پک کر تیار ہوتیں پھر نقصان کے بعد جو باقی ہیں انہیں شمار کیا جائے اور ان بعض کو بعض کے ساتھ ملایا جائے گا یہاں تک کہ باغ مکمل ہو جائے، اور اسی طرح انگور کا بھی اندازہ لگایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اندازہ لگانے کے لیے ایک آدمی ہی کافی ہوتا ہے جیسا کہ حاکم۔ اور جب پکی ہوئی کھجوریں اس کے اندازہ سے بڑھ جائیں تو پھر باغ کے مالک پر ان میں سے (مزید زکوٰۃ) نکالنا لازم نہیں، کیونکہ اب فیصلہ نافذ ہو چکا ہے، عبدالوہاب نے یہی کہا ہے اور اسی طرح جب مقدار کم ہو جائے تو پھر زکوٰۃ کم نہیں ہوگی۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں پر اندازہ لگایا جاتا تھا اور پھر اسی اندازہ کے مطابق ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اگر باغ کا مالک اندازے میں کثرت اور زیادتی کا مطالبہ کرے تو اندازہ لگانے والا اسے اس بارے میں اختیار دے دے کہ وہ اسے اس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے جتنا اس نے اندازہ لگایا ہے اور وہ اس کے اندازہ کے مطابق لے لے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ ہمیں ابن جریج نے حضرت ابوالزبیر رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار وسق کا اندازہ لگایا اور یہ گمان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کو جب آپ نے اختیار دے دیا تو انہوں نے کھجوریں لے لیں اور انہیں بیس ہزار وسق دے دیئے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو میں نے حضرت عطا کو کہا: تو (کیا) اندازہ لگانے والے پر لازم ہے کہ جب مال کا مالک اندازے میں زیادتی اور کثرت کا مطالبہ کرے تو وہ اسے اختیار دے دے جیسا کہ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کو اختیار دیا؟ تو انہوں نے فرمایا: مجھے میری عمر کی قسم! کون سی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بہتر اور افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اور اندازہ نہیں ہوتا مگر پکنے کے بعد، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی طرف بھیجتے تھے (1) اور وہ ان پر کھجوروں کا تخمینہ لگاتے تھے جس وقت پہلی کھجوریں پک جاتیں اس سے پہلے کہ ان میں سے کچھ کھائی جائیں۔ پھر آپ یہودیوں کو اختیار دیتے تھے کہ چاہے تو وہ انہیں اس اندازے کے مطابق لے لیں یا وہ انہیں آپ کو دے دیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگانے کا حکم دیا تا کہ زکوٰۃ شمار کر لی جائے اس سے پہلے کہ پھل کھایا جائے اور اسے تقسیم کیا جائے۔ اسے دار قطنی نے ابن جریج عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ فرمایا: اور صالح بن ابی الاخضر نے اسے زہری عن ابن مسیب کی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور مالک، معمر اور عقیل نے اسے زہری عن سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب تخمینہ لگانے والا تخمینہ لگالے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے اندازہ میں سے کچھ مقدار ساقط کر دی جائے، کیونکہ ابو داؤد، ترمذی اور بستی نے اپنی صحیح میں حضرت سہل بن ابی حثمہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو لے لو اور تیسرا حصہ چھوڑ دو اور اگر تم تیسرا حصہ نہ چھوڑو تو چوتھا حصہ چھوڑ دو'' (2)۔ یہ ترمذی کے الفاظ ہیں۔ ابو داؤد نے کہا ہے: اندازہ لگانے والا تیسرا حصہ خرفہ (چنا ہوا میوہ) کے لیے چھوڑ دے گا۔ اور اسی طرح یحییٰ القطان نے کہا ہے۔ اور ابو حاتم البستی نے کہا ہے: اس خبر کی دو صفتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عشر میں سے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دے اور دوسری یہ ہے کہ وہ عشر لگانے سے پہلے کل کھجوروں میں سے اتنی مقدار چھوڑ دے، جب کہ وہ بہت بڑا باغ ہو اس کا احتمال رکھتا ہو۔

الخرفۃ خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی کھجوروں میں سے وہ جو چنی جاتی ہیں جس وقت وہ اپنے پھل کو پاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: التمر خرفۃ الصائم (کھجور روزے دار کا چنا ہوا پھل ہے) یہ جوہری اور ہروی سے منقول ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اندازہ لگانے والا اپنا اندازہ لگانے کے وقت کھجوروں اور انگوروں میں سے کوئی شی نہیں چھوڑے گا مگر وہی جو اس نے اندازہ لگایا۔ اور مدینہ طیبہ کے بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ اندازے میں تخفیف کرے گا اور وہ محتاجوں کے لیے صلہ رحمی وغیرہ کے لیے کچھ چھوڑ دے گا (یعنی غرباء و مساکین کو دینے کے لیے اور رشتہ داروں اور دوست احباب کو

1۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 134　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 226

دینے کے لیے)

**مسئلہ نمبر 14**۔ اگر اندازہ لگائے جانے کے بعد اور انہیں توڑنے سے پہلے پھل پر کوئی آفت آجائے (اور وہ خراب ہو جائے) تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اس پر اہل علم کا اجماع ہے، مگر اس صورت میں کہ اس میں سے پانچ وسق یا اس سے زیادہ مقدار باقی رہ جائے (تو اس کے مطابق اس پر زکوٰۃ ہوگی)۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اور پانچ وسقوں سے کم مقدار میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح حضور نبی مکرم ﷺ سے واضح طور پر مروی ہے۔ اور یہ کتاب اللہ میں مجمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ: 267) (اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لیے زمین سے)

اور مزید ارشاد فرمایا: وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ پھر عشر اور نصف عشر کے ساتھ اس اجمال کا بیان واقع ہوا، پھر جب وہ مقدار کہ جب مال اس تک پہنچ جائے تو اس سے حق (زکوٰۃ) لیا جائے گا، وہ مجمل تھی تو اس کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور فرمایا: لیس فیما دون خمسة أوسق من تمر اوحب صدقة (1) (کہ کھجور یا دانوں (اناج) کی وہ مقدار جو پانچ اوسق سے کم ہو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے)۔ اور یہ ارشاد سبزیوں میں زکوٰۃ کی نفی کرتا ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جن کے وسق بنائے جاتے ہیں۔ پس جسے اپنے حصہ میں کھجوروں یا اناج میں سے پانچ وسق حاصل ہو جائیں اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی طرح حکم کشمش کا ہے۔ اور یہی علماء کے نزدیک نصاب کے نام کے ساتھ موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے: وَسق و وِسق (یعنی واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی) اس کی مقدار ساٹھ صاع ہے، اور ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اور ایک مد میں ایک رطل بغدادی اور اس کا تہائی حصہ۔ اور مجموعی طور پر پانچ اوسق کی مقدار مد کے اعتبار سے ایک ہزار دو سو مد ہے اور یہ وزن کے اعتبار سے ایک ہزار چھ سو رطل ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اور جسے کھجور اور کشمش کے مجموعی طو پر پانچ وسق حاصل ہوں اس پر بالا جماع زکوٰۃ لازم نہیں، کیونکہ یہ دو مختلف جنسیں ہیں اور اسی طرح علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کو گندم کے ساتھ اور گندم کو کشمش کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا اور نہ ہی اونٹ کو گائے کے ساتھ اور نہ گائے کو بکری کے ساتھ ملایا جائے گا، البتہ بکریوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا اس پر اجماع ہے اور گندم کو جو اور بغیر چھلکے والے جو کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 17**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ان تین میں اس کی اجازت دی ہے، کیونکہ یہ ایک قسم (جنس) کے معنی میں ہیں اس لیے کہ ان کی منفعت اور فوائد ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں اور یہ اگنے اور کٹائی میں بھی آپس میں جمع ہیں۔ اور ان میں افتراق نام کے اعتبار سے ہے اور یہ حکم میں ان کے الگ الگ ہونے کو ثابت نہیں کرتا جیسا بھینسیں اور گائیں، بھیڑیں اور بکریاں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: انہیں جمع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ مختلف اقسام ہیں، ان کی صفات جدا جدا ہیں،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 316

ان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ اور یہی ان کے افتراق کو ثابت کرتا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دالیں تمام کی تمام ایک نوع ہیں، ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایسے دانے جن کے نام کی دوسرے سے الگ پہچان ہو اسے نہیں ملایا جائے گا، کیونکہ وہ خلقت (بناوٹ) اور ذائقے وغیرہ میں دوسرے سے جدا اور مختلف ہوتا ہے اور ہر قسم کو آپس میں ملا دیا جائے گا، یعنی اس کی ردی قسم کو جید کے ساتھ، جیسا کہ کھجور اور اس کی انواع، کشمش سیاہ رنگ کی اور سرخ رنگ کی، گندم اور اس کی اقسام گندمی وغیرہ۔

اور یہی ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ، آپ کے صاحبین امام یوسف اور امام محمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ کا قول ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: تمام دانوں کو آپس میں ملا دیا جائے گا یعنی دالیں وغیرہ انہیں زکوٰۃ میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے گا۔ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملانے سے اور دانوں میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملانے سے ہچکچاتے تھے، پھر اپنے حکم کے آخر میں کہا کرتے تھے، وہ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کہہ رہے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: (کھیتی کی) وہ مقدار جسے اس کے مالک نے اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے کے بعد یا اس کے بعد کہ اسے ہاتھ میں مل کر دانے نکال کر کھایا جا سکے، ضائع کر دیا تو اس کا حساب اس پر ڈالا جائے گا اور اس کی وہ مقدار جو اس کے مالک نے اسے کاٹنے اور اسے توڑنے کے دوران کسی کو دی اور زیتون میں سے اسے چننے کی حالت میں کسی کو دی، اسے تلاش کر کے اس پر حساب ڈالا جائے گا۔ اور اکثر فقہاء اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ زکوٰۃ واجب نہیں کرتے مگر صرف اسی مقدار پر جو گاہنے کے بعد اس کے قبضے میں موجود ہو۔

حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے دانوں کی زکوٰۃ کے بارے کہا ہے: نفقہ (خرچہ) سے پہلے اس (زکوٰۃ) سے آغاز کیا جائے گا اور چھلکوں سے نکلے ہوئے دانے اس نے اور اس کے گھر والوں نے کھا لیے تو (ان کا) اس پر حساب نہیں لگایا جائے گا، یہ ان تازہ پکی کھجوروں کے قائم مقام ہیں جو باغ کے مالک کے اہل کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں وہ اسے کھاتے ہیں اور ان پر ان کا تخمینہ نہیں لگایا جاتا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تخمینہ لگانے والا باغ کے مالک کے لیے اتنی کھجوروں کی مقدار چھوڑ دے گا جسے وہ خود اور اس کے گھر والے کھائیں گے اور وہ اس کا تخمینہ ان پر نہیں لگائے گا۔ اور تازہ پکی کھجوروں کی جو مقدار اس نے خود کھالی اس کا حساب اس پر نہیں ڈالا جائے گا۔

ابوعمر نے کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی موافقت کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: **كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ** اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ اس آیت کے مطابق کٹائی سے پہلے کھائی جانے والی مقدار کا حساب نہیں لگایا جائے گا۔ اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب تم تخمینہ لگاؤ تو تہائی چھوڑ دو اور اگر تم تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی چھوڑ دو'' (1)۔ اور جتنی مقدار چوپاؤں اور بیلوں نے گاہنے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 226

کے وقت کھالی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک اس میں سے کسی شی کا حساب اس کے مالک پر نہیں ڈالا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ لوبیا، چنے اور مٹر میں سے سبز حالت میں جو بیچ دیئے گئے، خشک حالت میں اس کی مقدار کا اندازہ لگایا جائے اور دانوں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اسی طرح پھل میں سے جو سبز حالت میں بیچ دیا گیا تو اس کی چھان بین کی جائے اور اس کی (تلاش کا) قصد کیا جائے اور خشک حالت میں اس کا اندازہ لگایا جائے اور پھر اس اندازے کے مطابق کشمش اور پکی کھجوروں کی صورت میں اس کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے ثمن (قیمت) سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اور کھجور کے پھل میں سے جو پکی کھجور نہ بنے اور انگور میں سے جو کشمش نہ بنے جیسا کہ مصر کا انگور اور وہاں کے ڈوکے (کچی کھجور) اور اسی طرح وہاں کا زیتون جس سے تیل نہیں نکالا جاتا، تو اس کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے ثمن سے نکالی جائے گی اور اس کے سوا اس کے مالک کو کسی شی کا مکلف اور پابند نہیں بنایا جائے گا، اور نہ ہی اس میں اس کے ثمن کے بیس مثقال یا دوسو درہم تک پہنچنے کی رعایت کی جائے گی، بلکہ اس میں صرف اتنا دیکھا جائے گا کہ اس کی مقدار پانچ اوسق اور اس سے زیادہ تک پہنچ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان سے پکی کھجوروں کی صورت میں اس کا عشر یا نصف عشر نکالا جائے گا، جب اس کے گھر والوں نے انہیں تازہ حالت میں کھایا یا وہ کسی کو کھلائیں۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ زمین جسے بارش، دریاؤں اور چشموں کے پانی سے سیراب کیا جائے یا وہ بارانی زمین ہو تو اس کی پیداوار میں عشر ہوگا اور جسے اونٹنیوں یا اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا جائے تو اس میں نصف عشر ہوگا اور اسی طرح اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو تو اس میں عشر ہوگا'' (1)۔ اور سیح سے مراد وہ پانی ہے جو سطح زمین پر جاری ہو۔ ابن السکیت نے یہی کہا ہے۔ اور سیح کا لفظ حدیث میں مذکور ہے، اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور اگر وہ جاری پانی سے سیراب ہوئی ہو لیکن زمین کا مالک پانی کا مالک نہ ہو بلکہ وہ اس کے لیے اس کا کرایہ دیتا ہو تو وہ آسمان کے پانی (بارش) کی طرح ہے۔

مشہور مذہب یہی ہے۔ اور ابوالحسن لخمی نے کہا ہے کہ وہ نضح (اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے) کے حکم میں ہے، پس اگر ایک بار اسے آسمان کے پانی کے ساتھ سیراب کیا گیا اور ایک بار ڈول (راہٹ) کے ساتھ۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس کی طرف دیکھا جائے گا جس کے ساتھ کھیتی مکمل ہوئی ہے اور وہ بڑھتی اور نشوونما پاتی رہی ہے اور حکم اسی پر معلق ہوگا۔ یہ ابن القاسم کی ان سے روایت ہے۔ اور ابن وہب نے ان سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب نصف سال چشموں کے ساتھ سیراب کیا گیا پھر وہ پانی منقطع ہو گیا اور بقیہ سال اسے اونٹوں کے ساتھ سیراب کیا گیا تو بلاشبہ اس پر اس کی نصف زکوٰۃ عشر ہوگی اور نصف آخر نصف عشر ہوگی۔ اور ایک بار کہا ہے: اس کی زکوٰۃ اس کے مطابق ہوگی جس کے ساتھ اس کی حیات مکمل ہوئی۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی اس کے حساب سے زکوٰۃ دے گا۔ اس کی مثال یہ

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 225

ہے کہ وہ دو مہینے اونٹ کے ساتھ پانی پلائے اور چار مہینے آسمان کا پانی، تو اس میں آسمان کے پانی کی وجہ سے عشر کے دو ثلث ہوں گے اور اونٹ کے ساتھ سیراب کرنے کی وجہ سے عشر کا چھٹا حصہ ہوگا۔ اور اسی کے مطابق بکار بن قتیبہ فتویٰ دیتے تھے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اغلب کی طرف دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق زکوٰۃ دی جائے گی اور ماسویٰ کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر اس نے اسے ایک دن یا دو دن بارش کے پانی کے ساتھ سیراب کیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی حصہ نہیں رکھا جائے گا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اعتبار اغلب کا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام کے تمام اس آیت کے احکام میں سے ہیں، شاید ہمارے سوا کوئی اور اس سے زیادہ بھی بیان کرے گا جتنا اللہ تعالیٰ اس کے لیے منکشف فرمائے گا۔ اس آیت کے تمام معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 22۔** اور رہا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: لیس فی حب ولاتمر صدقۃٌ (1) (دانوں اور کھجوروں میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں ہے) اور اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔ تو حمزہ کنانی نے کہا ہے: اس حدیث میں فی حب کے الفاظ اسماعیل بن امیہ کے بغیر کسی نے ذکر نہیں کیے اور وہ ثقہ اور قریشی ہے اور سعید بن العاص کی اولاد میں سے ہے۔ فرمایا: اس حدیث کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اصحاب میں سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ایسے ہی ہے جیسے حمزہ نے کہا ہے اور یہ بہت بڑی اور عظیم سنت ہے جس کو تمام نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے، اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے ثابت اور محفوظ سند کے ساتھ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کیا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل روایت بیان کی ہے، لیکن وہ غریب ہے اور ہم نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسناد حسن کے ساتھ پایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا اسراف کا لغوی معنی خطا (غلطی) کرنا ہے۔ ایک اعرابی نے ایک قوم کے ارادہ سے کہا: طلبتکم فسرفتکم یعنی میں نے تمہاری جگہ (پانے میں) غلطی کھائی۔ اور شاعر نے کہا:

وقال قائلهم والخيل تخبطهم أسرفتم فأجبنا أننا سَرَف

اور نفقہ اور خرچہ میں اسراف کرنے کا معنی ہوتا ہے فضول خرچی کرنا۔ اور مسرف لقب ہے مسلم بن عقبہ مری کا جو کہ واقعہ حرہ میں قائد تھا، کیونکہ اس نے اس میں انتہائی اسراف (فضول خرچی) کی۔ علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے:

هُمْ منعوا ذِمارِي يوم جاءت كتائبُ مُسْرِفٍ و بني اللَّكِيعهْ

اور آیت میں معنی مقصود یہ ہے کہ تم کسی شی کو بغیر حق کے نہ لو کہ پھر تم اسے ایسی جگہ رکھو جو اس کا حق نہیں۔ اصبغ بن فرج نے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح ایاس بن معاویہ کا قول ہے: جس شی کے ساتھ بھی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرے تو وہی سرف اور اسراف ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: یہ والیوں کے لیے خطاب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم اپنے حق سے زیادہ کوئی شی نہ لو

1۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 5، صفحہ 39

اور نہ وہ شے جو لوگوں پر واجب اور لازم نہیں ہوتی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے: المعتدِی فی الصدقۃِ کمانعِھا (1) (صدقہ میں زیادتی کرنے والا اسے روکنے والے کی طرح ہے)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر ابوقبیس (پہاڑ) کسی آدمی کے لیے سونا ہو جائے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں خرچ کر ڈالے تو وہ اسراف (فضول خرچی) کرنے والا نہیں ہوگا اور اگر اس نے ایک درہم یا ایک مد اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کیا تو وہ مسرف ہو گیا۔ اور اسی معنی میں حاتم کو کہا گیا: لَا خَیْرَ فِی السرافِ فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہے تو اس نے جواب دیا: لَا سرف فی الخیرِ (خیر اور نیکی میں کوئی فضول خرچی نہیں ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول ضعیف ہے اور اسے وہ حدیث رد کرتی ہے جسے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ نے پانچ سو کھجور کے درختوں کا قصد کیا اور انہیں توڑا پھر انہیں ایک دن میں تقسیم کر دیا اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی شی نہ چھوڑی، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی تم سارے کا سارا مال نہ دو۔

اور عبدالرزاق نے ابن جریج سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کھجور کا ایک درخت توڑا اور اسے صدقہ کرتے رہے یہاں تک کہ اس سے کوئی شی باقی نہ رہی، تو یہ حکم نازل ہوا: وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم اسراف نہ کرو)۔ حضرت سدی نے کہا ہے: وَلَا تُسْرِفُوْا کا معنی ہے: تم اپنے مال اس طرح (دوسروں کو) نہ دو کہ تم خود فقیر ہو کر بیٹھ رہو۔ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: الاسراف ما قصرتَ عن حق اللہ تعالیٰ (کہ اسرف وہ ہے جو تو نے اللہ تعالیٰ کے حق سے کوتاہی اور غفلت کی)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو تمام مال صدقہ کرنا اور مسکینوں کا حق نکالنے سے روکنا دونوں سرف کے حکم میں داخل ہیں اور عدل اس کے خلاف ہے کہ وہ صدقہ بھی کرے اور باقی بھی رکھے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: خیر الصدقۃ ما کان عن ظَھرِ غنیً (2) (بہترین صدقہ وہ ہے جو حاجات سے فالتو مال سے ہو) مگر یہ کہ اس کا نفس قوی ہو، غنی ہو، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا ہو اور منفرد ہو اس کے اہل و عیال نہ ہوں، تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے۔ اور اسی طرح وہ مال میں سے وہ حق نکالے جو اس پر واجب ہو مثلاً زکوٰۃ وغیرہ اور بعض احوال میں جو اسے مال میں متعینہ حقوق میں سے پیش آتے رہتے ہیں (انہیں وہ ادا کرے)۔ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: اسراف وہ ہے جسے وہ صلاح اور درستگی کی طرف لوٹانے پر قادر نہ ہو۔ اور سرف وہ ہے جسے وہ صلاح کی طرف لوٹانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: اسراف کا معنی فضول خرچی کرنا اور زیادتی کرنا ہے اور سرف کا معنی غفلت اور جہالت ہے (آدمی اس کام سے غافل اور جاہل ہوتا ہے اس لیے وہ اس پر خرچ کر ڈالتا ہے) جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

أَعْطَوْا ھُنَیدَۃً یحدُوھا ثمانیۃٌ　　مافی عطائِھِم مَنٌّ ولا سَرَفٌ

ای اِغفال (یعنی ان کی عطا میں نہ احسان جتلانا ہے اور نہ اس سے غافل رہنا ہے)

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 192

اور رجلٌ ہَرِفُ الفؤاد، یعنی اس کا دل خطا کرنے والا اور غافل ہے۔ طرفہ نے کہا ہے:

إنّ امرأً ہَرِفَ الفؤاد یری عَسَلاً بماء سحابة شَتمِي

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾

''اور (پیدا فرمائے) بعض مویشی بوجھ اٹھانے والے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے۔ کھاؤ اس میں سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا اس کا ماقبل پر عطف ہے، یعنی و أنشاء حمولة و فرشا من الأنعام (یعنی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے مویشیوں میں سے بعض بوجھ اٹھانے کے لیے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے) اور الانعام کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) انعام سے مراد صرف اونٹ ہیں، عنقریب اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

(۲) کہ انعام کا اطلاق اکیلے اونٹ پر ہے اور جب اس کے ساتھ گائیں اور بکریاں ہوں تو بھی وہ انعام ہی ہیں۔

(۳) اور یہی زیادہ صحیح ہے اور یہ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انعام حیوانوں میں سے ہر وہ حیوان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس قول کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (المائدہ:1) (حلال کیے گئے ہیں تمہارے لیے بے زبان جانور سوائے ان کے جن کا حکم پڑھ کر سنایا جائے گا تمہیں) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حمولۃ وہ جانور ہے جو بوجھ اٹھانے اور کلام کرنے کی طاقت رکھتا ہو، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے۔ پھر کہا گیا ہے: یہ لفظ اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر وہ جانور جو اپنے اوپر زندہ کو اٹھالے چاہے وہ جانور گدھا ہو یا خچر ہو یا اونٹ ہو۔ یہ ابوزید سے منقول ہے، چاہے اس پر کوئی بوجھ ہو یا نہ ہو، جیسا کہ عنترہ نے کہا ہے:

ما رَاعنِی إلا حمولةُ أهلِها وسط الدِّيارِ تَسُفُّ حَبَّ الخِمْخِمِ

اور فعولۃ فا کے فتحہ کے ساتھ جب فاعل کے معنی میں ہو تو اس میں مذکر اور مونث دونوں برابر ہوتے ہیں، جیسے تیرا یہ قول: رجلٌ فروقة و امرأة فروقة یہ بزدل اور خوفزدہ آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔

اور رجل صَرورة و امرأة صرورة جب وہ حج نہ کریں۔ اور اس کی جمع نہیں آتی اور جب یہ مفعول کے معنی میں ہو تو پھر ہا کے ساتھ مذکر و مؤنث کے درمیان فرق کیا جائے گا، جیسے الحلوبة و الرکوبة اور الحمولة (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بوجھ ہیں۔ اور رہا الحمول (ضمہ کے ساتھ بغیر ہا کے) تو اس سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر ہودج رکھے ہوئے ہوں، چاہے ان میں عورتیں ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ابوزید سے مروی ہے۔ وَّ فَرْشًا حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حمولۃ اونٹوں، گائیوں میں سے ہوتا ہے۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول کرنے والے نے اس ارشاد سے استشہاد کیا

ہے۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ فرمایا: ثمانیة، حمولة و فرشا سے بدل ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: حمولة سے مراد اونٹ ہیں اور الفرش سے مراد بکریاں ہیں۔

اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حمولة سے مراد ہر وہ جانور جو بوجھ اٹھائے چاہے وہ اونٹ ہو یا گائے ہو یا گھوڑا یا خچر ہو یا گدھے ہوں۔ اور فرش سے مراد بکریاں ہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: حمولہ وہ جانور جس پر سوار ہوا جاتا ہے اور فرش وہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور دودھ پیا جاتا ہے، جیسا کہ بکریاں، اونٹوں کے بچے اور گائیوں کے بچھڑے وغیرہ۔ ان کے اجسام کی لطافت اور ان کے فرش کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کا نام فرش رکھا گیا ہے اور فرش سے مراد ایسی ہموار زمین ہے جس پر لوگ آسانی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ راجز نے کہا ہے:

أورثني حَمولة و فَرْشا أمُشُّها فى كل يومٍ مَشّا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَحَوَيْنا الفَرْش من أنعامكم والحَمُولات ورَبَّاتِ الحَجَل(2)

اصمعی نے کہا ہے: میں نے اس کی جمع نہیں سنی ہے۔ مزید کہا: اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر ہو اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہو۔ اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فرشها الله فرشا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے بچھا دیا (پھیلا دیا)۔ اور الفرش سے مراد گھر کا وہ ساز و سامان ہے جو بکھیر دیا گیا ہو۔ اور فرش سے مراد وہ کھیتی بھی ہے جب وہ پھیل جائے اور فرش کا معنی وسیع فضا بھی ہے۔ اور الفرش فی رجل البعیر اس کا معنی ہے، اونٹ کے پاؤں میں تھوڑی سی وسعت، اور یہ محمود اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اور افترش الشئ کا معنی ہے شی کا پھیل جانا، بچھ جانا۔ اور یہ لفظ مشترک ہے اور کبھی قول باری تعالیٰ: وَّ فَرْشًا اس معنی کی طرف بھی راجع ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ان دونوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن یہ ہے کہ حمولہ سے مراد وہ جانور ہے جسے بوجھ اٹھانے کے لیے مسخر کر لیا گیا ہو اور فرش وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی جلد (کھال) اور اون کے ساتھ پیدا فرمایا ہے جس پر بیٹھا جا سکتا ہے اور اسے بچھایا جا سکتا ہے۔ اور باقی آیت پہلے گزر چکی ہے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 179	2۔ ایضاً

"(پیدا فرمائے) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں یا جسے لیے ہوتے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم بتاؤ مجھے علم کے ساتھ اگر ہو تم سچے؟ اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھیے: کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا جسے لیے ہوئے ہیں (اپنے اندر) دو ماداؤں کے رحم کیا تم تھے موجود جب وصیت کی تمہیں اللہ نے اس بات کی؟ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو بہتان باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا تا کہ گمراہ کرے لوگوں کو اپنی جہالت سے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو ظالم ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ اس میں ثَمٰنِيَةَ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے اور وہ فعل أنشأ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے آٹھ جوڑے پیدا فرمائے) یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور اخفش سعید نے کہا ہے: یہ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور اخفش علی بن سلیمان نے بیان کیا ہے: اس کی نصب (فعل) کلوا کے سبب ہے، یعنی کلوا لحم ثمانیۃ أزواج (تم آٹھ جوڑوں کا گوشت کھاؤ)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما سے محل کے اعتبار سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس معنی میں منصوب ہو۔ معنی ہو کلوا المباح ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ (تم مباح کھاؤ (یعنی) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو) یہ آیت مالک بن عوف اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے کہا: وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ اور مومنین کو اس آیت کے سبب ان (جانوروں) پر آگاہ فرمایا جنہیں اس نے ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، تا کہ یہ ان کی طرح نہ ہو جائیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

زوج فرد کے خلاف ہے: کہا جاتا ہے: زوج (جوڑا) اور فرد (ایک) جیسا کہ کہا جاتا ہے: خسا (رذیل، گھٹیا) اور زکا (پاکیزہ، اعلیٰ) شفع (جفت) اور وتر (طاق)۔ اور ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ سے مراد آٹھ افراد ہیں۔

اور اہل عرب کے نزدیک ہر فرد دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اسے زوج کا نام دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے للذکر زوج (مذکر کے لیے زوج ہے یعنی دوسرا ہے) اور للأنثی زوج (اور مونث کے لیے زوج یعنی دوسرا ہے) اور لفظ زوج واحد اور تثنیہ (دو) کے لیے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ھما زوجان، وھما زوج جیسے کہا جاتا ہے: ھما سیان وھما سواء (وہ دونوں برابر ہیں) اور آپ کہتے ہیں: اشتریتُ زوجَی حمام (میں نے کبوتر کا جوڑا خریدا) اور انت، تعنی ذکرا وانثی (اور تو اس سے مراد مذکر اور مونث لیتا ہے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ یعنی بھیڑ میں سے دو مذکر (نر) اور مونث (مادہ) اور الضَّاْنِ سے مراد ریوڑ میں سے اون والی ہیں یعنی بھیڑیں اور یہ ضائن کی جمع ہے۔ اس کی مونث ضائنۃ ہے اور جمع ضوائن آتی ہے۔ اور یہ بھی

کہا گیا ہے: یہ ایسی جمع ہے جس کی واحد نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی جمع ضئین ہے، جیسا کہ عبد کی جمع عبید ہے۔ اور اس میں ضِئین بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ شعیر میں شِعیر کہا جاتا ہے اور ضاد کو اتباعاً کسرہ دیا گیا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ لغت بصریوں کے نزدیک مسموع ہے اور کوفیوں کے نزدیک ہر اس لفظ میں جاری ہوتی ہے جس میں دوسرا حرف حرف حلقی ہو۔ اور اسی طرح معز میں بھی فتحہ اور سکون ہے۔ اور ابان بن عثمان نے من الضأن اثنان ومن المعز اثنان پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں ومن المعز اثنان ہے اور یہی اکثر کی قراءت ہے اور ابن عامر اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: کلام عرب میں اکثر المعز والضأن بالسکون ہیں اور اس پر جمع کے بارے میں ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: معیز اور یہ معز کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عبد و عبید اور امرؤالقیس نے کہا ہے:

و یَمْنَحُها بنو شَمَجَی بن جَرْمٍ　　مَعِیزَ هُمُ حنانك ذا الحنَانِ(1)

اور اسی کی مثل ضأن اور ضئین ہیں۔ معز ریوڑ میں سے ضان کے خلاف ہے اور یہ بالوں اور چھوٹی دُموں والی بکریاں ہوتی ہیں اور یہ اسم جنس ہے اور اسی طرح المَعَز والمَعِیزُ والأمعوز والمِعزی ہیں اور مَعْز کی واحد ماعز ہے، جیسے صاحب اور صَحْب، تاجر اور تجر ہیں اور مونث ماعزۃ ہے اور یہ عنز (بکری) ہے اور اس کی جمع مواعز آتی ہے۔ اور أمعز القوم کا معنی ہے ان کی بکریاں زیادہ ہو گئیں۔ اور المعاز بکریاں رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ ابو محمد فقعسی نے کہا ہے وہ دودھ کی زیادتی کی وجہ سے اونٹوں کی تعریف کرتا ہے اور زمانے کی شدت اور سختی کے حالات میں بکریوں کی فضیلت بیان کرتا ہے:

یَکِلْنَ کَیْلاً لیس بالْمَمْحُوقِ　　إِذْ رَضِیَ المعاز باللعُوقِ

اور معز کا معنی زمین کی صلابت اور سختی بھی ہے اور امعز ایسی سخت جگہ جہاں سنگریزے زیادہ ہوں۔ اس کا مونث معزاء ہے۔ اور استمعز الرجل فی أمرہ کا معنی ہے آدمی نے اپنے کام میں خوب محنت اور کوشش کی۔ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ یہ حرم کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ یہ اس پر معطوف ہے اور اسی طرح اَمَّا اشْتَمَلَتْ بھی ہے اور ہمزہ وصل کے ساتھ مد کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ استفہام اور خبر میں فرق ہو جائے۔ اور ہمزہ کو حذف کرنا بھی جائز ہے کیونکہ ام استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا:

تَرُوحُ من الحَیِّ أم تَبْتَکِر

**مسئلہ نمبر 3۔** علماء نے کہا ہے: یہ آیت مشرکین کے خلاف حجت ہے بحیرہ اور جو اس کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں ان کے بارے میں۔ اور ان کے اس قول کے بارے میں: **مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا** اور یہ علم میں مناظرہ کرنے کے اثبات پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ان

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 106

کے ساتھ مناظرہ کریں اور ان کے سامنے ان کے قول کا فاسد ہونا بیان فرمائیں۔ اور اس میں نظر و فکر اور قیاس کے ساتھ گفتگو کرنے کا اثبات ہے۔ اور اس میں دلیل موجود ہے کہ جب قیاس کے مقابلے میں نص آجائے تو پھر قیاس کے ساتھ بات کرنا باطل ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ "جب اس پر کوئی اعتراض (نقض) وارد ہو"۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قیاس صحیح کے ساتھ بات کرنے کا حکم دیا ہے اور انہیں ان کی علت جاری کرنے کا حکم دیا۔ اور معنی یہ ہے: آپ ان سے کہیں اگر وہ مذکر (نر) کو حرام کرتا تو پھر ہر مذکر (نر) حرام ہوتا اور اگر وہ مونث (مادہ) کو حرام کرتا تو ہر مونث (مادہ) حرام ہوتی۔ اور اگر وہ اسے حرام کرتا جو بھیڑ اور بکریوں کے رحموں کے اندر ہے، تو پھر ہر پیدا ہونے والا ان کا بچہ حرام ہوتا چاہے وہ مذکر ہو یا مونث اور وہ تمام کے تمام پیدا کیے گئے ہیں اور جب تمام کے تمام علت پائے جانے کی وجہ سے حرام ہیں، تو اس سے ان کی علت کا انتقاض اور ان کے قول کا فاسد ہونا ظاہر ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اس بارے میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب اس پر جھوٹا بہتان ہے۔

**نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ** مجھے علم کے ساتھ آگاہ کرو اگر تمہارے پاس ہے کہ یہ تحریم جسے تم نے اپنا رکھا ہے کہاں سے آگئی؟ اور ان کے پاس کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ کتابیں پڑھتے ہی نہیں۔

اور **وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ** اور اس کے مابعد میں گفتگو اسی طرح ہے جیسے پہلے گزر چکی ہے۔ **اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ** یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر تھے جب اس نے اسے حرام قرار دیا؟ اور جب حجت اور دلیل ان پر لازم ہوئی تو وہ بہتان تراشی میں لگ گئے اور کہنے لگے: اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ** واضح فرمادیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے، جب انہوں نے کہا: اس پر دلیل موجود نہیں۔

**قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾**

"آپ فرمائیے: میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا (رگوں کا) بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت، کیونکہ وہ سخت گندہ ہے یا جو نافرمانی کا باعث ہو (یعنی) وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بلند کیا جائے غیر خدا کا نام پھر جو شخص لاچار ہو جائے نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو (حد ضرورت سے) تو بے شک آپ کا رب بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا** اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان چیزوں کے بارے میں بتایا ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ اور معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے جو (کتاب) میری طرف وحی کی گئی ہے میں اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے ان چیزوں کے، نہ کہ وہ جنہیں تم اپنی مرضی سے حرام قرار دیتے ہو۔ یہ

آیت مکی ہے۔ اس وقت شریعت میں سوائے ان چیزوں کے کوئی چیز حرام نہ تھی، پھر مدینہ طیبہ میں سورہ المائدہ نازل ہوئی۔ اور محرمات میں اضافہ کیا گیا جیسا کہ الْمُنْخَنِقَةُ (گلا گھونٹنے سے مرا ہوا جانور) الْمَوْقُوذَةُ (چوٹ سے مرا ہوا جانور) الْمُتَرَدِّيَةُ (اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا جانور) النَّطِيحَةُ (سینگ لگنے سے مرا ہوا جانور) اور شراب وغیرہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں درندوں میں سے ہر ذی ناب کو اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے سے شکار کرنے والا) کے کھانے کو حرام قرار دیا(1)۔

اس آیت کے حکم اور اس کی تاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) ایک وہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آیت مکیہ ہے اور ہر وہ حرام شے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے یا جو کتاب میں حکم آیا ہے اسے اس (آیت) کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، تو یہ حکم کی زیادتی اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس کی وساطت سے ہے۔ اہل نظر وفکر میں سے اکثر علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اکثر فقہاء اور اہل اثر نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی نظیر عورت کا اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنا ہے اس کے باوجود کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) اور اسی طرح قسم اور ایک شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ (البقرہ:282) (اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے: اکل کل ذی ناب من السباع حرام(2) (درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور کوئی شی حرام قرار نہیں دی جائے گی مگر وہی جس کا ذکر اس میں ہے۔ اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور ان سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کوئی حرام بین اور واضح نہیں مگر وہی جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت حیوانوں میں سے ہر شی کو حلال قرار دیتی ہے سوائے ان کے جن کی آیت میں استثنیٰ ہے مثلاً مردار، بہنے والا خون اور خنزیر کا گوشت، اسی لیے ہم نے کہا ہے: انسان اور خنزیر کے سوا درندوں اور تمام حیوانوں کا گوشت مباح ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: اور اسی پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام جانوروں کو حلال قرار دینے کی بناء کی ہے جن کے بارے سکوت اختیار کیا گیا ہے، سوائے ان کے جن پر کوئی دلیل دلالت کرے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس آدمی کا جواب ہے جس نے معین شی کے بارے پوچھا تو مخصوص اس کے جواب میں یہ آیت واقع ہوئی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ تحقیق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس آیت میں جو چیزیں ہیں ان کے بارے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 245　　2۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 492

جواب میں انہیں ان چیزوں کے حرام ہونے کے بارے بتایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ آپ نے یہ اس حال میں کہا جو وحی کی حالت تھی اور اس کے نازل ہونے کا وقت تھا، پھر اس کے بعد دوسری چیزوں کو حرام قرار دینے کے بارے وحی کا نازل ہونا ممتنع نہیں تھا۔

اور ابن عربی نے گمان کیا ہے (1) کہ یہ آیت مدنیہ ہے حالانکہ یہ اکثر کے قول کے مطابق مکیہ ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اس دن نازل ہوئی جس دن آپ پر اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ (مائدہ:3) نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی ناسخ آیت نازل نہیں ہوئی لہٰذا یہ آیت محکم ہے۔ نتیجتاً انہیں ہی حرام قرار دیا جائے گا جن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اور اسی کی طرف میں بھی مائل ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ میری رائے ہے اور اسے کئی دوسروں نے بھی بیان کیا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے کہ سورۃ الانعام مکی ہے سوائے اس قول کے تین آیات تک قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ (الانعام:151) اور اس کے بعد بہت سا قرآن کریم نازل ہوا اور بہت سی احادیث بیان ہوئیں۔ اور شراب کی حرمت کا حکم مدینہ منورہ میں سورۃ المائدہ میں نازل ہوا۔ اور اس پر تمام نے اجماع کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں (2) میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے وہ مدینہ منورہ میں فرمایا۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم مدینہ منورہ میں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہوا: لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علماء کے درمیان اختلاف کا سبب یہی ہے پس ایک جماعت نے ان احادیث کے ظاہر سے عدول کیا ہے جو درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کے بارے وارد ہیں، کیونکہ وہ اس آیت سے متاخر ہیں اور اس میں حصر ظاہر ہے پس اس کے مطابق عمل کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ یا تو یہ اپنے متقدم کے لیے ناسخ ہیں یا پھر یہ آیت ان احادیث پر راجح ہے۔ اور رہے وہ جو تحریم کے قائل ہیں تو ان کے لیے یہ بات ظاہر ہے اور ان کے نزدیک ثابت ہے کہ سورۃ الانعام مکی سورت ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور بلاشبہ اس آیت کے ساتھ جاہلیت کے اس نظریہ کو رد کرنے کا قصد کیا گیا ہے جس کے تحت وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام جانوروں کو حرام قرار دیتے تھے، پھر اس کے بعد بہت سے امور کو حرام قرار دیا گیا جیسا کہ پالتو گدھے اور خچروں کا گوشت وغیرہ اور درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے: جن چیزوں کا ذکر اس آیت میں ہے ان کے سوا کوئی شی حرام نہیں ہے ان کے اس قول پر یہ لازم آتا ہے کہ اسے بھی حرام قرار نہ دیا جائے جس جانور پر ذبح کے وقت عمداً اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اور اس شراب کو حلال سمجھا جائے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور انگور کی شراب کے حرام ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہونے میں اس پر واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب میں ایسی چیزیں پائی ہیں جن کے حرام ہونے کے بارے آپ کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 764 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراھیۃ کل ذی ناب وذی مخلب، حدیث نمبر 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرف وحی کی گئی ہے اور وہ ان کے سوا ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ اور یہ ان میں سے ہیں جن کے بارے اس کے بعد قرآن نازل ہوا ہے۔ اور درندوں، گدھوں، اور خچروں کے گوشت کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں۔

پس آپ نے ایک بار کہا: یہ حرام ہیں، کیونکہ اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی موجود ہے، اور یہی آپ کا قول صحیح ہے جو کہ مؤطا میں ہے۔ اور ایک بار فرمایا: یہ مکروہ ہے اور ''مدونہ'' میں ظاہر قول یہی ہے، کیونکہ آیت ظاہر ہے اور اس لیے بھی کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے ان تمام کی اباحت مروی ہے اور یہی امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن دینار (1) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: ہمارے ہاں بصرہ میں حکم بن عمرو غفاری یہ کہتا رہا ہے، لیکن بحر ابن عباس نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی ہے: لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے درندوں کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تو آپ کو کہا گیا: ابوثعلبہ خشنی کی حدیث ہے تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جو ہمارا رب ہے ہم اس کی کتاب کو ایسے اعرابی کی حدیث کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے جو اپنی پنڈلیوں پر پیشاب کرتا ہے۔ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ہاتھی اور شیر کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اور قاسم نے کہا ہے: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں جب انہوں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ درندوں میں سے ہر ذی ناب حرام ہے: وہ حلال ہے، اور آپ یہ آیت تلاوت فرماتیں: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا انہوں نے فرمایا کہ اگر ہنڈیا کا پانی خون کی وجہ سے زرد بھی ہو جاتا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھتے تو آپ اسے حرام قرار نہ دیتے۔ اور اس باب میں صحیح وہی ہے جو ہم نے شروع میں ذکر کر دیا ہے اور آیت کے بعد محرمات کے بارے جو کچھ بیان ہوا ہے جو سب اسی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسی پر معطوف ہے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے قبس میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے خلاف ہے جو انہوں نے احکام میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ اور ہمارے اصحاب میں سے اہل بغداد نے کہا ہے کہ جو کچھ اس کے سوا ہے وہ سب حلال ہے، لیکن درندوں کو کھانا مکروہ ہوتا ہے اور فقہاء امصار کے نزدیک ان میں سے امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور عبدالملک رحمۃ اللہ علیہم علیہ ہیں درندوں میں ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے اور یہ ممتنع نہیں ہے کہ اس قول باری تعالیٰ: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا کے بعد کوئی ایسی زیادتی واقع ہو جس میں دلیل بیان ہو رہی ہو، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث (2) (کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک چیز کے ساتھ) اور آپ نے کفر، زنا اور قتل کا ذکر کیا۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 830    2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 185

پھر ہمارے علماء نے فرمایا: بلاشبہ قتل کے اسباب دس ہیں جو دلائل سے ثابت ہیں، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بارے خبر دیتے ہیں جو آپ ﷺ تک اللہ تعالیٰ کے علم سے پہنچا اور وہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور ثابت رکھتا ہے (اور جسے چاہتا ہے) منسوخ کر دیتا ہے اور مقدر کر دیتا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(1)۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلم نے معن سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے ''کہ پرندوں میں ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا گیا ہے''(2)۔ اور پہلی روایت اصح ہے اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کو حرام قرار دینا ہی صریح مذہب ہے اور اسی کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ''الموطا'' میں عنوان بنایا جس وقت آپ نے یہ کہا: تحریم اکل کل ذی ناب من السباع پھر حدیث ذکر کی اور اس کے بعد آپ نے فرمایا: وھو الأمر عندنا (اور یہ حکم ہمارے نزدیک ہے) پس آپ نے یہ خبر دی کہ اثر کے ساتھ عمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ''کہ یہ آیت آپ ﷺ پر آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے'' ہمیں یہ کہنے سے نہیں روکتا کہ ان اشیاء میں سے بعض کی تحریم اس آیت کے بعد ثابت ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے اور پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر کے سال منع فرمایا(3)۔ اس تاویل کے صحیح ہونے پر گندگی، بول، گندگی کے کیڑے اور گدھوں کی تحریم پر اجماع دلالت کرتا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو اس آیت میں مذکور نہیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: **مُحَرَّمًا** ابن عطیہ نے کہا ہے: تحریم کا لفظ جب حضور نبی کرم ﷺ کی زبان اقدس پر وارد ہو تو وہ اس (معنی) کی صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ مذکور شے سے مکمل طور پر کلیۃً رک جائیں اور لغت کے اعتبار سے بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ آپ کراہت اور اس طرح کے محل میں حد درجہ توقف کریں (رکے رہیں) اور جب اس کے ساتھ تاویل کرنے والے (مجتہدین) صحابہ کرام کی جانب سے تسلیم کا کوئی قرینہ مقترن نہیں اور ان تمام کا اجماع ہے اور احادیث کے الفاظ میں کوئی اضطراب بھی نہیں تو پھر شرعاً واجب ہے کہ اس کی تحریم حظر و منع کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور یہ خنزیر، مردار، خون کے ساتھ مل جائے اور یہی حال شراب کی تحریم کا ہے۔ اور (اگر) اس کے ساتھ احادیث کے الفاظ مضطرب ہونے کا قرینہ مقترن ہو اور ائمہ کا احادیث کا علم رکھنے کے باوجود اس میں اختلاف ہو جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانا حرام ہے''(4)۔ تحقیق درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے رسول اللہ ﷺ کی نہی وارد ہے، پھر صحابہ کرام اور جو ان کے بعد ہیں ان کے درمیان ان کی تحریم میں اختلاف ہوا ہے، تو جو نظر و فکر کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198
4۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147

صلاحیت رکھتا ہے اس کے لیے ان وجوہ کی بنا پر جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو اس منع پر محمول کرے جس کے تحت کراہت وغیرہ ہیں۔ اور جس کے ساتھ تاویل کا قرینہ مقترن ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھریلو گدھوں کا گوشت کو حرام قرار دینا، تو بعض صحابہ کرام جو اس وقت حاضر تھے انہوں نے یہ تاویل کی (کہ یہ حکم اس لیے دیا گیا) کیونکہ یہ نجس ہیں اور ان میں سے بعض نے یہ تاویل کی (کہ یہ اس لیے ہوا) تاکہ لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے جانور ختم نہ ہو جائیں اور بعض نے تحریم محض کی تاویل کی۔ اور امت میں ان کے گوشت کی تحریم میں اختلاف ثابت ہو گیا، تو علماء میں سے جو نظر و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ وہ لفظ تحریم کو کراہت وغیرہ کے معنی پر محمول کریں اپنے اجتہاد اور قیاس کے اعتبار سے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں اور اختلاف کے سبب میں یہ حسین عقیدہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک گدھا نہیں کھایا جائے گا، کیونکہ اس کا جوہر خبیث اس وقت ظاہر ہوا جب یہ مذکر گدھے پر چڑھ دوڑا اور اس سے لواطت کی، تو اس کو رجس کا نام دیا گیا ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا ہے: چوپاؤں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی جانور قوم لوط کے عمل کی مثل عمل نہیں کرتا۔ اسے ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** عمرو بن دینار نے ابو الشعثاء (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ کئی چیزیں کھاتے تھے اور کئی چیزیں چھوڑ دیتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنی حلال چیزوں کو حلال قرار دیا اور اپنی حرام چیزوں کو حرام قرار دیا، پس جس کو اس نے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام کر دیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے وہ خاموش ہے وہ عفو (معاف) ہے اور انہوں نے یہ آیت تلاوت کی قُل لَّآ اَجِدُ الآیہ یعنی وہ چیز جس کی تحریم بین اور واضح نہ ہو تو وہ اس آیت کے ظاہر کے مطابق مباح ہے۔

اور زہری نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی قُل لَّآ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا اور فرمایا: بلاشبہ مردار کو کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس سے جو شے نہیں کھائی جائے گی وہ گوشت ہے۔ اور رہی اس کی جلد، ہڈی، اون اور بال تو یہ سب حلال ہیں۔ اور ابوداؤد نے ملقام بن تلب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور میں نے حشرات الارض (2) کی تحریم کے بارے آپ سے نہیں سنا۔ الحشرۃ کا معنی ہے زمین پر رینگ کر چلنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے مثلاً یرابیع (چوہے کی مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں کوتاہ اور پچھلی بڑی اور دم دراز ہوتی ہے) گوہ اور سیہہ اور انہیں کی طرح کے اور جانور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أكلنا الرُّبَی یا أمَّ عمرو ومن یَكُن غریبا لَدَیكُم یأكُلِ الحشرات

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 183۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، حدیث نمبر 3306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 174

یعنی جو رینگتے ہیں اور چلتے ہیں اور الدُّبی دبیۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے چوہیا۔ خطابی نے کہا ہے: ان کے اس قول لم اسمع لھا تحریما میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ مباح ہیں، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی اور نے اسے سنا ہو۔ تحقیق لوگوں نے یربوع (جنگلی چوہا) اور وبر (بلی سے چھوٹا ایک جانور ہے) اس کی جمع دبار ہے اور ان کی طرح کے حشرات کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور یربوع کے بارے میں حضرات عروہ، عطا، امام شافعی اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم علیہ نے رخصت دی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وبر میں کوئی حرج نہیں اور ابن سیرین، حکم، حماد اور اصحاب رائے نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور اصحاب رائے نے قنفذ (سیہہ) کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔

اور اس کے بارے مالک بن انس سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا۔ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے: اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سیہہ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ابوثور بھی اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور انہوں نے اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ اور اس کے بارے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الایہ تو ان کے پاس موجود ایک شخص نے کہا: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خبیثۃ من الخبائث (1) (یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے) یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے تو پھر اسی طرح ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گوہ، یربوع اور ورل (گوہ کی طرح کا ایک جانور ہے مگر اس سے بڑا ہوتا ہے) کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور آپ کے نزدیک سانپ کھانے بھی جائز ہیں بشرطیکہ انہیں ذبح کیا جائے۔ اور یہی قول ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعی کا ہے۔ اور اسی طرح اژدھا، بچھو، چوہے، غنظایہ (چھپکلی کی طرح ایک جانور) سیہہ اور مینڈک کے بارے بھی ان کا قول ہے۔

اور ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ قول کے میں زمین کے چھوٹے پرندے (یا کیڑے مکوڑے) بچھو اور کیڑے کھانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: پانی میں (ان میں سے) کسی کا مرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شہد کی مکھیوں کے بچے اور پنیر اور کھجور کے کیڑے اور انہیں کی طرح کی اور چیزیں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان کی دلیل ملقام بن تلب کی حدیث ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا ہے تو وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے۔ اور چوہیا کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے: وہ حرام نہیں ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا اور مدینہ طیبہ کے علماء کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے اور دیگر موذی جانوروں میں سے کسی شی کے کھانے کی اجازت نہیں دیتے مثلاً سانپ، چھپکلیاں، چوہے اور انہیں کے مشابہ دیگر جانور۔ اور ہر وہ شے جسے مارنا جائز ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 177

ہے اس کے نزدیک اسے کھانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ان کے نزدیک ذبح کا عمل ہو سکتا ہے۔ اور یہی قول ابن شہاب، عروہ، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک تمام وحشی درندوں میں سے کوئی شی نہ کھائی جائے گی اور نہ ہی گھریلو بلی کھائی جائے گی اور نہ ہی جنگلی کیونکہ وہ بھی درندہ ہے۔

اور فرمایا: نہ بجو کھایا جائے گا اور نہ ہی لومڑ اور چیر پھاڑ کرنے والے پرندوں کو کھانے میں کوئی حرج نہیں مثلاً گدھیں، چیلیں اور عقاب وغیرہ، وہ بھی جس نے کوئی مردار کھایا اور وہ بھی جس نے نہ کھایا۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام کے تمام پرندے حلال ہیں، مگر وہ گدھوں کو ناپسند کرتے ہیں (اور مکروہ جانتے ہیں) اور امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا جو چیر پھاڑ کرنے والے پرندے کھانا مکروہ جانتا ہو اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا انکار کیا ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرندوں میں سے ہر ذی مخلب کو کھانے سے منع کیا ہے'' (1)۔

اور اشہب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہاتھی کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ اسے ذبح کیا جائے۔ اور یہی امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور اس سے امام شافعی نے منع فرمایا ہے۔ اور حضرت نعمان (امام اعظم ابوحنیفہ) رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے بجو اور لومڑ کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت دی ہے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بجو کھاتے رہتے تھے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ عام نہی نہیں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے درندوں میں سے کسی درندے کو خاص نہیں کیا۔ اور بجو کو کھانے کی اباحت کے بارے میں وہ حدیث جسے امام نسائی نے روایت کیا ہے وہ ان احادیث میں سے نہیں ہے جو نہی والی حدیث کے معارض آسکتی ہو (2)، کیونکہ اس حدیث کو بیان کرنے میں عبدالرحمن بن ابی عمار منفرد ہیں اور وہ نقل علم کے ساتھ مشہور نہیں اور نہ وہ راوی ان میں سے ہے جسے حجت بنایا جاسکتا ہو جب کہ اس کے خلاف وہ ہے جو اس سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: درندوں میں سے ہر ذی ناب کو کھانے سے نہی کی حدیث اسناد متواترہ سے مروی ہے۔ اور ثقہ اور انتہائی مضبوط ائمہ کرام کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے اور یہ محال ہے کہ ان کے معارض ابن ابی عمار کی حدیث کی مثل لائی جائے۔ ابوعمر نے کہا ہے: مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ بندر کھانا جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ فرمایا: اور میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اسے کھانے کی رخصت دی ہو مگر وہ روایت جسے عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے ایوب سے ذکر کیا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بندر کھانے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ بهيمة الأنعام میں سے نہیں ہے (یعنی وہ چوپائے جن کا گوشت کھایا جاسکتا ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے حضرت عطا سے روایت کیا ہے کہ ان سے بندر کے بارے پوچھا گیا جسے حرم پاک میں مار دیا جاتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے بارے دو عادل آدمیوں کا فیصلہ ہوگا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، جلد 2، صفحہ 147
2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198

فرمایا: پس حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اس کا گوشت کھانا جائز ہے، کیونکہ جزا اس پر واجب نہیں ہوتی جو شکار کے علاوہ کسی (جانور) کو قتل کردے۔

اور رویانی کی (بحر المذہب) میں ہے جو کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر ہے اور امام شافعی نے کہا ہے بندروں کی بیع کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سکھلایا جاتا ہے اور ان سے مال کی حفاظت کا نفع اٹھایا جاتا ہے اور کشفی نے ابن شریح سے بیان کیا ہے کہ اس کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تو ان سے پوچھا گیا اس سے نفع کی صورت کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ان کے ساتھ بچے خوش ہوجاتے ہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: کتا، ہاتھی اور تمام کے تمام ناب والے جانور میرے نزدیک بندر کی مثل ہیں اور حجت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں ہے نہ کہ کسی اور کے قول میں۔ تحقیق لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ عرب میں ایسا کوئی نہیں ہے جو کتے کا گوشت کھاتا ہو سوائے فقعس کی قوم کے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جانور کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے جو غلاظت اور گندگی کھاتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹوں میں جلالہ سے مراد یہ ہے کہ اس پر سوار ہوا جاتا یا اس کا دودھ پیا جاتا ہو۔ حلیمی ابو عبداللہ نے کہا ہے: جلالہ وہ ہوتا ہے جو گندگی اور غلاظت کھاتا ہو چاہے وہ چوپایا ہو یا آزاد پھرنے والی مرغی (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

اور علماء نے کہا ہے: ہر وہ جانور جس کے گوشت میں غلاظت کی بو ظاہر ہو جائے یا اس کا ذائقہ اس میں ظاہر ہو جائے تو وہ حرام ہے اور اگر وہ ظاہر نہ ہو تو فھو حلال تو وہ حلال ہوگا۔ اور علامہ خطابی نے کہا ہے: یونہی یہ نہی تنزیہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ غلاظت کی غذا کھائے اور اس کی بو اس کے گوشت میں پائی جائے اور یہ تب ہوگا جب اس کا غالب چارہ اس میں سے ہو اور اگر وہ گھاس چرے اور وہ دانے کھائے اور اس کے ساتھ وہ گندگی میں سے بھی کوئی شی کھالیتا ہو تو وہ جلالہ نہیں ہوگا، بلاشبہ یہ آزاد پھرنے والی مرغی کی طرح ہے۔ اور اسی طرح وہ حیوان جو کبھی کبھار گندگی میں سے کوئی شی پائے لیکن اس کی غالب غذا اور چارہ اس کے سوا ہو تو اس کا گوشت کھانا مکروہ نہیں ہوگا۔

اور اصحاب الرائے، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اسے نہیں کھایا جائے گا یہاں تک کہ اسے کچھ دنوں تک روک کر رکھا جائے اور وہ گندگی کے علاوہ صاف چارہ کھائے، پس جب اس کا گوشت صاف اور پاک ہوجائے تو پھر اسے کھا لیا جائے۔ تحقیق حدیث میں مروی ہے کہ ''گائے، بیل کو چالیس دن تک چارہ کھلایا جائے گا پھر اس کا گوشت کھایا جائے گا''۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مرغ کو تین دن تک روکتے تھے اور پھر اسے ذبح کرتے تھے۔ اور اسحاق نے کہا ہے: اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اس کے بعد کہ اس کے گوشت کو اچھی طرح دھو ڈالا جائے۔ اور حسن جلالہ کے گوشت کو کھانے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ اور اسی طرح امام مالک بن انس کا بھی نظریہ ہے اور اس باب میں سے یہ بھی ہے کہ زمین میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 446۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 175

گندگی پھینکنے سے منع کیا گیا ہے۔ بعض سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کی زمین کرائے پر دیتے تھے اور اس پر شرط عائد کرتے تھے جو اسے کرائے پر لیتا تھا کہ وہ اس میں گندگی نہ پھینکے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنی زمین کرائے پر دیتے تھے اور یہ شرط لگاتے تھے کہ اس میں گندگی اور غلاظت کے ساتھ کھاد نہیں ڈالی جائے گی۔

اور یہ روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی زمین میں غلاظت ڈال کر اسے کاشت کرتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو وہ ہے جو لوگوں کو وہی کھلاتا ہے جو ان سے نکلتا ہے۔

گھوڑے کا گوشت کھانے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مباح قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جہاں تک خچر کا تعلق ہے تو وہ گھوڑے اور گدھے کے درمیان سے پیدا ہوا ہے اور ان میں سے ایک کھایا جاتا ہے یا مکروہ ہے اور وہ گھوڑا ہے اور دوسرا حرام ہے اور وہ گدھا ہے پس تحریم کا حکم غالب رہے گا، کیونکہ جب حلت اور حرمت کا حکم ایک معین چیز میں جمع ہو جائے تو اس میں تحریم کے حکم کو غالب قرار دیا جائے گا۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل عنقریب سورۃ النحل میں آئے گی۔ اور مکڑی کا حکم سورۃ الاعراف میں آئے گا۔

جمہور اسلاف و اخلاف کا موقف ہے کہ خرگوش کھانا جائز ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اس کی تحریم کو بیان کیا ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ سے اس کے مکروہ ہونے کا حکم منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس اسے (خرگوش کو) لایا گیا اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے نہ کھایا اور نہ اسے کھانے سے منع فرمایا۔ اور گمان یہ ہے کہ اسے حیض آرہا تھا۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی نے موسیٰ بن طلحہ سے مرسل روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس خرگوش لایا گیا، اسے ایک آدمی نے بھونا تھا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کا خون دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا اور اسے نہ کھایا۔ اور وہ جس کے پاس تھا اسے فرمایا: ''تم کھاؤ کیونکہ اگر میں اسے چاہتا (اور پسند کرتا) تو میں اسے کھالیتا'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں ایسی کوئی شی نہیں ہے جو اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہو اور بلاشبہ یہ آپ ﷺ کے اس قول کی طرح ہے: ''بے شک یہ میری قوم کی زمین میں نہیں ہے کہ میں بذات خود پاؤں اور اسے عفو قرار دوں'' (2)۔ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم مرالظہران کے مقام سے گزرے پس ہم نے ایک خرگوش کو بھگایا اور وہ سب اس کے پیچھے دوڑ پڑے تو انہوں اس پر غلبہ پا لیا (یعنی اسے پکڑ لیا) فرمایا: پس میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا یہاں تک کہ میں نے اسے پالیا اور اسے ابوطلحہ کے پاس لے آیا اور انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی سرین اور اس کی ران رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیج دیں اور میں اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آیا تو آپ نے اسے قبول فرمالیا (3)۔

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 1، صفحہ 198
2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 831
3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح، جلد 2، صفحہ 152

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ یعنی کھانے والے پر جو اسے کھاتا ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے أُوْحی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے يَطَّعمه طا کو مشدد پڑھا ہے۔ انہوں نے يتطعمه کا ارادہ کیا اور پھر ادغام کر دیا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور محمد بن حنفیہ نے اسے فعل ماضی کے ساتھ علی طاعم طعمه پڑھا ہے۔ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی إلا أنْ تكون العين أو الجثة أو النفس ميتة (یعنی ضمیر مستتر کا مرجع ان تینوں میں سے کوئی شی ہو سکتی ہے اور یکون یا کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ميتة کو مرفوع، یعنی معنی یہ ہو گا تقع و تحدث ميتة (مردار واقع ہو گا) اور مسفوح سے مراد وہ جاری ہے جو بہہ رہا ہو اور یہ حرام کیا گیا ہے۔ اور جو اس کے سوا ہے معفو عنہ ہے۔

ماوردی نے بیان کیا ہے (1) کہ ایسا خون جو دم مسفوح (بہنے والا خون) نہ ہو اگر وہ رگوں والا ہو اور ان پر جما ہوا ہو جیسا کہ جگر اور تلی تو وہ حلال ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردے اور دو خون حلال کیے گئے ہیں'' (2)۔ الحدیث۔

اور اگر وہ رگوں والا نہ ہو کہ وہ ان پر جامد ہو اور وہ گوشت کے ساتھ ہو تو اس کی تحریم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک قول ہے کہ وہ حرام ہے، کیونکہ وہ نہ تو سارا دم مسفوح ہے اور نہ بعض۔ اور بلاشبہ جگر اور تلی کی استثنا کے لیے مسفوح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ حرام نہیں ہے، اس لیے کہ تحریم مسفوح کے ساتھ مختص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے عمران بن جریر نے کہا ہے: میں نے ابو مجلز سے اس گوشت کے بارے پوچھا جو خون کے ساتھ لتھڑا پڑا ہو اور ہانڈی میں خون کی سرخی اس پر غالب آ رہی ہو تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دم مسفوح (بہنے والے خون) کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے کہا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: اگر یہ آیت نہ ہوتی تو مسلمان ان رگوں کی اتباع کرتے جن کا یہودی اتباع کر رہے ہیں۔ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عرق (رگ) دماغ میں خون ہونے کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا اور مضطر (مجبور) کا حکم سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝

''اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری سے ہم نے حرام کی ان پر دونوں (گائے اور بکری) کی چربی مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 181
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 182

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ جب اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر حرام فرمائیں تو اس سے پیچھے ان کا ذکر کیا جو اس نے یہودیوں پر حرام کیں، کیونکہ اس میں ان کے اس قول کی تکذیب مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی شی حرام نہیں کی، بلکہ ہم نے بذات خود اپنے اوپر ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں بنی اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ اور هَادُوْا کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ تحریم ان پر تھی جو یہودی بنے تھے بلاشبہ یہ پابندی ان پر بطور آزمائش اور سزا تھی پس ان پر جو چیزیں حرام کی گئیں ان میں سے پہلی چیز جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر ناخن والا جانور۔ حسن نے ظفر فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوالسمال نے ظِفْر ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور ابوحاتم نے ظا کے کسرہ اور فا کے سکون کا انکار کیا ہے اور یہ قراءت ذکر نہیں کی حالانکہ یہ ایک لغت ہے۔ ظِفِر ظا اور فا دونوں کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور اس کی جمع أظفار، أظفور اور أظافیر ہے۔

علامہ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نحاس نے فراء سے یہ زیادتی بیان کی ہے أظافیر و أظافرۃ۔ ابن السکیت نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل أظفر بین الظفر جب اس کے ناخن طویل اور لمبے ہوں، جیسے کہا جاتا ہے: رجل أشعر یہ لمبے بالوں والے آدمی کو کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ چوپاؤں اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں کھلی نہ ہوں، جیسے اونٹ، شتر مرغ، مرغابی اور بطخ۔ اور ابن زید نے کہا ہے: صرف اونٹ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ذِيْ ظُفُرٍ سے مراد اونٹ اور شتر مرغ ہے، کیونکہ شتر مرغ اونٹ کی طرح ناخن والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد پرندوں میں سے ہر ذی مخلب (پنجے والا) اور چوپاؤں میں سے ہر کھر والا جانور ہے۔ اور حافر (کھر) کو مجاز أظفر کا نام دیا جاتا ہے۔

اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: کھر بھی ناخن ہے اور پنجہ (مخلب) بھی ناخن ہے، مگر یہ اپنی مقدار کے مطابق ہیں اور وہ اپنی مقدار پر ہے یہاں کوئی استعارہ اور مجاز نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ انہی دونوں کو ان دونوں میں سے کاٹا اور لیا جاتا ہے اور دونوں کی جنس ایک ہے، یعنی یہ نرم و ملائم ہڈی ہے۔ یہ دراصل غذا سے بڑھتی ہے اور انسان کے ناخنوں کی مثل اسے کاٹا جاتا ہے اور اسے حافر کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ زمین پر لگنے کے وقت اسے کھودتے ہیں۔ اور اس کا نام مخلب رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی ان سوئیوں کے سروں کے ساتھ دوسرے پرندے کو زخمی کر دیتا ہے۔ اور اسے ظفر اسے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اشیاء کو اپنے ناخنوں کے ساتھ پکڑتا ہے، یعنی آدمی اور پرندہ ان کے ساتھ غلبہ پاتا اور کامیاب ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد ثرب اور گردوں کی چربی ہے۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور ثروب، ثرب کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ باریک چربی ہے جو اوجھ پر ہوتی ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر چربی حرام کر دی سوائے اس کے جو ہڈی کے ساتھ یا ہڈی پر ملی ہوئی ہو اور ان کے لیے پہلو اور چکی (لاٹ) کی چربی حلال قرار دی، کیونکہ وہ دم کی ہڈی پر ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اس میں استثنا کی بنا پر ما محل نصب میں ہے اور ظُهُوْرُهُمَاۤ، حَمَلَتْ کا فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَوِ الْحَوَايَاۤ ظہور پر عطف ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی او حملت حوایاھما اور اس پر الف لام اضافت کا بدل ہے۔ اور اس بنا پر الحوایا (آنتیں) من جملہ ان میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا۔

اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ اس میں مَا حَمَلَتْ پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس بارے میں جو کہا گیا ہے اس میں سے یہی اصح ہے۔ اور یہی قول کسائی، فراء اور احمد بن یحییٰ کا ہے۔ اور نظر و فکر یہ ثابت کرتی ہے کہ شی کا عطف اس پر کیا جائے جو اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ورنہ اس کا معنی صحیح نہ ہوگا یا دلیل اس معنی کے سوا کسی اور پر دلالت کرے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک استثنا تحلیل میں ہے یعنی صرف وہ چربی جسے ہڈیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔ اور قولہ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ محرم (حرام کی ہوئی شی) پر معطوف ہے۔ اور معنی یہ ہے: ان پر حرام کی گئی ہے ان دونوں کی چربی یا آنتیں یا وہ جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، سوائے اس کے جسے پشتیں اٹھائے ہوئے ہوں، کیونکہ وہ حرام نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ چربی نہیں کھائے گا تو وہ پشت کی چربی کھانے سے حانث ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے من جملہ چربی سے اس کی استثنا کی ہے جو ان کی پشت پر ہو۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: اَوِ الْحَوَايَاۤ، الْحَوَايَا: اس سے مراد مباعر (مینگنیاں نکلنے کی جگہ یعنی انتڑیاں) ہے (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔ اور مباعر، مبعر کی جمع ہے، اور ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں مینگنیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور بعر سے مراد زبل (کھاد، گوبر اور لید) ہے اور الْحَوَايَا کا واحد حاویاء ہے، جیسا کہ قاصعاء اور قواصع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حاویۃ کی جمع ہے جیسا کہ ضاربۃ اور ضوارب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حویۃ کی جمع ہے جیسا کہ سفینۃ اور سفائن ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: الحوایا (انتڑیاں) وہ ہیں جو پیٹ میں گول گھومی ہوئی ہیں (2) اور یہ گھومنے والی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا سے مراد دودھ کے خزائن (آنتیں) ہیں اور یہ مباعر (گوبر کی انتڑیوں) کے ساتھ ملی ہوتی ہیں اور یہ مصارین (آنتیں) ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحوایا وہ آنتیں ہیں جن پر چربی ہوتی ہے اور اس مقام کے سوا الحوایا سے مراد وہ کپڑا (یا کمبل) ہے جو اونٹ کی کوہان کے اردگرد ڈالا جاتا ہے جیسے امرؤ القیس نے کہا ہے:

جعلنَ حَوَايَا و اقْتَعَدْنَ قعائدا　　وحففن من حَوْكِ العِراق المُنَمَّق

پس اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے (3) کہ اس نے ان پر یہ تحریم تورات میں لازم کی ہے یہ ان کی کذب بیانی کے رد کے لیے کہا ہے، اور اس بارے میں اس کی نص ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ و کل دابۃ لیست مشقوقۃ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 110
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 769

الحاضر وکل حوت لیس فیه سفاسق، ای بیاض (تم پر حرام کر دیئے گئے ہیں مردار، خون، خنزیر کا گوشت، ہر وہ جانور جس کے کھر سامنے سے کھلے نہ ہوں اور ہر وہ مچھلی جس میں سفیدی نہ ہو) پھر الله تعالیٰ نے اس تمام کو حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور ان کے لیے مباح قرار دیئے وہ جو ان پر حیوانوں میں سے حرام تھے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے اس تکلیف اور مشقت کو زائل فرما دیا اور حل و حرمت اور امر و نہی کے اعتبار سے دین اسلام کے احکام لازم کر دیئے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر وہ اپنے چوپاؤں کو ذبح کریں اور انہیں کھائیں (1) جنہیں الله تعالیٰ نے ان کے لیے تورات میں حلال قرار دیا ہے اور انہیں چھوڑ دیں جنہیں ان پر حرام کیا ہے تو کیا وہ (جانور) ہمارے لیے حلال ہوگا؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ حرام ہے اور سماع المبسوط میں کہا ہے: وہ حلال ہے اور یہی ابن نافع نے کہا ہے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: میں اسے مکروہ قرار دیتا ہوں۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ذبح کے وقت وہ اس کا قصد (اور نیت) نہیں کرتے، لہٰذا وہ خون کی طرح حرام ہے۔ اور دوسرے قول کی وجہ یہ ہے اور وہی صحیح ہے کہ الله تبارک و تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ ان کی تحریم کا حکم اٹھا لیا ہے اور اب اس میں ان کا اعتقاد موثر نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ اعتقاد فاسد ہے۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے صحیح ہونے پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے صحیحین نے حضرت عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم قصر خیبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، تو کسی آدمی نے چمڑے کا ایک برتن جس میں چربی تھی پھینکا تو میں اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف اچھلا پس جب میں (دوسری طرف) متوجہ ہوا تو وہاں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے تو مجھے آپ سے حیا آ گئی (2)۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم کے الفاظ ہیں: حضرت عبدالله بن مغفل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے خیبر کے دن چربی سے بھرا ہوا چمڑے کا ایک برتن پایا تو میں اس سے چمٹ گیا اور میں نے کہا: آج میں اس میں سے کسی کو کوئی شی نہ دوں گا، وہ فرماتے ہیں: پھر میں دوسری جانب متوجہ ہوا تو دیکھا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبسم فرما رہے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبسم فرمانے کا سبب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چمڑے کا برتن اٹھانے کے لیے ابن مغفل کی شدید حرص کو اور اس کے بارے شدید بخل کو دیکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نہ وہ برتن پھینک دینے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی اور عام علماء رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب یہی ہے کہ اسے کھانا جائز ہے، مگر امام مالک نے اس میں اختلاف کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

ابن منذر نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا حرام ہونا بھی بیان کیا ہے اور امام مالک کے کبار اصحاب اسی کی طرف گئے ہیں اور ان کا استدلال وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ پس اگر انہوں نے ہر ناخن والا جانور ذبح کیا تو اصبغ نے کہا ہے: کتاب الله میں ان کے ذبائح میں سے جو حرام ہے اسے کھانا حلال نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی تحریم کا اعتقاد

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770
2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 606

رکھتے ہیں۔ اور اشہب اور ابن القاسم نے بھی یہی کہا ہے اور ابن وہب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: جو ان پر حرام ہے، اور ہم اس کے بارے اپنی کتاب سے جانتے ہیں تو ہمارے لیے ان کے ان ذبائح کو کھانا حلال نہیں ہوگا اور جس کی تحریم کو ہم نہیں جانتے مگر ان کے اقوال اور ان کے اجتہاد سے تو ان کے ذبائح میں سے وہ ہم پر حرام نہیں ہوگا (1)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ، ای ذالك التحریم (وہ تحریم) پس ذٰلِكَ محل رفع میں ہوا، یعنی الأمر ذالك جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ یہ ہم نے انہیں سزا دی ان کے ظلم کے بدلے، یہ ان کے لیے سزا ہے ان کے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کی وجہ سے اور انہیں الله تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے اور ان کے سود لینے اور لوگوں کے مالوں کو باطل طریقے سے حلال سمجھنے کی وجہ سے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ تحریم بلاشبہ گناہ کے سبب ہوئی، کیونکہ یہ تنگی ہے اور خوشحالی اور وسعت سے اس کی طرف مؤاخذہ کے وقت ہی پھیرا جا سکتا ہے۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بلاشبہ ہم یہود کے بارے اپنی اس خبر دینے میں سچے ہیں کہ ہم نے ان پر گوشت اور چربی حرام کر دی۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"پھر اگر وہ جھٹلائیں آپ کو تو آپ فرمائیے: تمہارا پروردگار کشادہ رحمت والا ہے اور نہیں ٹالا جا سکتا اس کا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہو"۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ یہ شرط ہے اور جواب شرط یہ ارشاد گرامی ہے: فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ یعنی اس نے اپنی رحمت کے وسیع ہونے کے سبب تم سے درگزر فرمائی اور تمہیں دنیا میں کوئی سزا نہ دی۔ پھر الله تعالیٰ نے اس عذاب کے بارے خبر دی جو اس نے ان کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے اور فرمایا: وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (اور اس کا عذاب جرائم پیشہ قوم سے نہیں ٹالا جا سکتا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب الله تعالیٰ دنیا میں عذاب نازل کرنے کا ارادہ فرما لے تو پھر جرائم پیشہ قوم سے اس عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

"اب کہیں گے جنہوں نے شرک کیا اگر چاہتا الله تعالیٰ تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے کسی چیز کو۔ ایسا ہی جھٹلایا تھا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ چکھا انہوں نے ہمارا عذاب۔ آپ فرمائیے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اسے ہمارے لیے؟ تم نہیں پیروی کرتے مگر نرے گمان کی اور نہیں ہو تم مگر اٹکلیں مارتے ہو"۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 770

قولہ تعالیٰ: سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں۔ انہوں نے کہا: لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ سے مراد بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علم غیب کے ساتھ اس بارے میں خبر دی ہے جو وہ عنقریب کہیں گے اور انہوں نے گمان کیا کہ یہی ان کے لیے سہارا اور تھامنے کی شے ہے جب انہیں حجت نے لازم پکڑ لیا اور انہیں اس نظریہ کے باطل ہونے کا یقین ہو گیا جس پر وہ تھے۔ اور معنی یہ ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہمارے باپ دادا کی طرف رسول بھیج دیتا اور وہ انہیں شرک سے اور ان چیزوں کو حرام کرنے سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال کیا ہے، منع کرتا تو وہ اس سے باز آ جاتے، رک جاتے اور ہم بھی اس طریقہ پر ان کی اتباع و پیروی کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا رد کیا اور فرمایا: هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا یعنی کیا تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل ہے کہ یہ اسی طرح ہے؟

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ یعنی تم اس قول میں محض ظن کی پیروی کر رہے ہو۔ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (اور تم نری اٹکلیں مارتے ہو) تاکہ تم اپنے ضعیف اور کمزور لوگوں کو وہم میں مبتلا کر سکو کہ تمہارے پاس یہ حجت اور دلیل ہے۔

اور قولہ: وَ لَآ اٰبَآؤُنَا کا اَشْرَكْنَا میں نون پر عطف کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا: نحن ولا آباونا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول: وَ لَآ تو کید مضمر کے قائم مقام ہے، اسی لیے یہ کہنا اچھا ہے: ماقمت ولا زید

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۴۹﴾

''آپ فرمائیے۔ اللہ ہی کے لیے کامل دلیل ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت فرما تا تم سب کو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ یعنی ایسی کامل دلیل جو محجوج (جس کے خلاف حجت لائی گئی) کے عذر کو ختم کر دیتی ہے اور اس سے شک کو دور کر دیتی ہے جس نے اس میں غور و فکر کی۔ پس اس کی کامل حجت اس پر ہے کہ یہ بین اور واضح ہے کہ وہ واحد اور یکتا ہے اور اس نے انبیاء اور رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا ہے، پس اس نے مخلوقات میں نظر و فکر کے ذریعے توحید کو بیان فرمایا اور معجزات کے ذریعے رسولوں کی تائید فرمائی اور اپنا امر (حکم) ہر مکلف پر لازم کیا۔ اور رہا اس کا علم، اس کا ارادہ اور اس کی کلام تو یہ غیب ہے جس پر کوئی بندہ مطلع نہیں ہو سکتا، سوائے ان رسولوں کے جنہیں وہ چن لے (پسند فرما لے) اور مکلف بنانے کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے کہ بندہ اس حیثیت میں ہو کہ اگر وہ اس کام کو کرنے کا ارادہ کر لے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا ہے تو وہ اس کے لیے ممکن اور آسان ہو۔

اور معتزلہ نے اس قول کے سبب التباس پیدا کیا ہے: لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا انہوں نے کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جنہوں نے اس کی مشیت سے شرک کیا۔ اور ان کا اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مذمت بیان کی ہے کہ انہوں نے حق کی طلب میں اپنا اجتہاد اور کوشش کر دی۔ اور بلاشبہ انہوں نے مزاح اور لہو و لعب کے اعتبار سے کیا۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ (الزخرف:20) (اور کفار کہتے ہیں کہ اگر چاہتا (خداوند) رحمٰن تو ہم انہیں نہ پوجتے) اگر وہ یہ قول تعظیم و تکریم اور اس کی معرفت کی بنا پر کہتے تو یہ

ان کے لیے عیب نہ ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْشَآءَاللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (الانعام: 107) (اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے) اور مَا كَانُوْالِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام: 111) (تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا) اور فَلَوْشَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور مومن یہ کہتے ہیں: یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے بارے جانتا ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

''آپ فرمائیے: لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اسے۔ پھر اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو آپ نہ گواہی دیجئے ان کے ساتھ اور نہ تم پیروی کرنا ان کی خواہشوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور جو نہیں ایمان لاتے آخرت پر اور وہ اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمْ یعنی آپ فرمائیے ان مشرکین کو۔ تم اس پر اپنے گواہ لاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے جسے تم نے حرام کیا ہے۔ اور هَلُمَّ یہ کسی شی کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا کلمہ ہے۔ اور اس میں اہل حجاز کے نزدیک واحد، جمع اور مذکر اور مؤنث سبھی برابر ہوتے ہیں۔ (یعنی تمام کے لیے هلم ہی استعمال ہوتا ہے) مگر نجد کی لغت میں ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: هلما، هلموا، هلمی وہ اس طرح اس کے ساتھ (تثنیہ) جمع وغیرہ کی) علامت لاتے ہیں جیسے وہ تمام افعال میں ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم اہل حجاز کی لغت پر نازل ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا (الاحزاب: 18) وہ فرماتا ہے: هلم یعنی حاضر کرو یا قریب ہو۔ اور هلم الطعام اس کا معنی ہے کھانا لاؤ۔ اور یہاں آیت میں معنی ہے: هاتوا شهداكم (تم اپنے گواہ لاؤ) اور میم کو فتحہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے دیا گیا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں رُدَّ یا هذا، تو اس میں (دال پر) ضمہ اور کسرہ جائز نہیں۔ اور خلیل کے نزدیک دراصل ها ہے اور اس کے ساتھ لم ملا دیا گیا ہے، پھر کثرت استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس کی اصل هل ہے اور اس پر لم کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اپنے الفاظ پر ہے اور هات کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خلیل کی ''کتاب العین'' میں ہے: اس کی اصل هل أؤم ہے یعنی هل أقصدك (کیا میں تیرا قصد کر سکتا ہوں) پھر انہوں نے اسے کثرت سے استعمال کیا یہاں تک کہ اس قول کا مقصود یہ رہ گیا (احضر) حاضر کرو) جیسا کہ تعال اس کا اصل معنی تو ہے کہ اوپر والا نیچے والے کو کہے: اور پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ اس معنی میں ہو گیا کہ نیچے والا اوپر والے کو کہتا ہے تعال۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ شَهِدُوْا یعنی اگر ان میں سے بعض بعض کی شہادت دے دیں۔ فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ تو تم ادا شہادت کی

تصدیق نہ کرو سوائے کتاب اللہ کے یا نبی کریم ﷺ کی زبان کے اور ان کے پاس ان میں سے کوئی شی نہیں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

''آپ فرمائیے: آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو کچھ حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر (وہ یہ) کہ نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی (کے خوف) سے ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا ہے اللہ نے سوائے حق کے یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے جن کا تا کہ تم (حقیقت کو) سمجھو۔ اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور پورا کرو ناپ اور تول انصاف کے ساتھ ہم نہیں تکلیف دیتے کسی کو مگر اس کی طاقت کے برابر اور جب بھی بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ ہو (معاملہ) رشتہ دار کا اور اللہ تعالیٰ سے کیے وعدہ کو پورا کرو، یہ ہیں وہ باتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔ اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا، سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کر دیں گے تمہیں اللہ کے راستہ سے، یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں جن کا تا کہ تم متقی بن جاؤ''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ آؤ اور پڑھو جو یقیناً حق ہے جیسا کہ میرے رب نے میری طرف وحی فرمایا ہے، نہ یہ ظن ہے اور نہ ہی کذب جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، پھر اسے بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: تعال یعنی آگے آؤ اور عورت کے لیے تعالی تثنیہ مذکر و مؤنث کے لیے تعالیا اور جمع مذکر کے لیے تعالوا اور جمع مونث کے لیے تعالین کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب:28) (تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں) اور انہوں نے تقدم کو تعالیٰ اور ارتفاع (بلند ہونا اور چڑھنا) کی ایک قسم قرار دیا ہے، کیونکہ

مامور بالتقدم فی الاصل اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہے گویا کہ وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسے کہا گیا: تعال، ای إرفع شخصك بالقیام و تقدم (یعنی اٹھ اور آگے آ) اور انہوں نے اس میں وسعت رکھ دی ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے ٹھہرنے والے کے لیے استعمال کیا ہے، یہ ابن الشجری نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مَا حَرَّمَ اس میں مَا خبر یہ ہے اور اَتْلُ کے سبب محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہے: آؤ میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ پس اگر عَلَیْکُمْ، حَرَّمَ کے ساتھ معلق ہو تو پھر وجہ یہ ہے، کیونکہ یہ قریب ترین ہے اور یہ بصریوں کی پسند ہے۔ اور اگر تم اسے اَتْلُ کے ساتھ معلق کرو تو یہ جید اور عمدہ ہے، کیونکہ وہ اسبق اور پہلے ہے۔ اور اسے ہی کوفیوں نے اختیار کیا ہے۔

اور اس قول میں تقدیر عبارت یہ ہے أتل علیکم الذی حرم ربکم، ألا تشرکوا یہ محل نصب میں ہے اور اس میں پہلے لفظ اول کے ساتھ فعل مقدر ہے، یعنی أتل علیکم ألا تشرکوا یعنی میں تم پر تلاوت کرتا ہوں کہ شرک کرنا حرام ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس فعل اغرا کے سبب منصوب ہو جو عَلَیْکُمْ میں ہے اور عَلَیْکُمْ اپنے ماقبل سے منقطع ہو، یعنی علیکم ترك الإشراك، وعلیکم إحسانا بالوالدین (تم پر شرک کو ترک کرنا لازم ہے اور تم پر والدین کے ساتھ احسان کرنا لازم ہے) اور یہ کہ تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو اور یہ کہ تم بے حیائی کے نزدیک نہ جاؤ، جیسا کہ تم کہتے ہو: علیك شأنك، ای إلزم شانك (اپنے کام کو لازم پکڑ)

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ (المائدہ: 105) (تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کو دیکھو) یہ سب ابن شجری نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ ان محل نصب میں ہو اور وہ ما سے بدل ہو۔ یعنی أتل علیکم تحریم الاشراك (میں تم پر شرک کی تحریم کا حکم تلاوت کرتا ہوں) اور فراء نے اختیار کیا ہے کہ لا نہی کے لیے ہے، کیونکہ اس کے بعد ولا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ تمام مخلوق کو ان چیزوں کے بارے تلاوت سننے کی دعوت دیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔ اور اسی طرح آپ کے بعد علماء پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو تبلیغ کریں اور ان کے لیے وہ چیزیں بیان کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں میں سے حرام قرار دیں ہیں جو اس نے حلال فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران: 187) (کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو)۔ اور ابن المبارک نے ذکر کیا ہے: ہمیں عیسیٰ بن عمر بن عمرو بن مرہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے انہیں بتایا اور کہا کہ ان کے ہمنشین ربیع بن خثیم نے کہا: کیا تجھے یہ بات خوش کرے گی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحیفہ لایا جائے جس کی مہر نہیں توڑی گئی؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس یہ پڑھو قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ، پس انہوں نے تین آیات کے آخر تک پڑھا۔ اور حضرت کعب الاحبار نے کہا ہے: یہ آیت تو تورات کا آغاز ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ الآیہ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ وہ محکم آیات

ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں کیا ہے اور ان پر تمام مخلوق کے ادیان کا اجماع ہے اور وہ کسی دین میں بھی منسوخ نہیں ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیے گئے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا والدین کے ساتھ احسان کرنے کا مفہوم ہے ان کے ساتھ نیکی کرنا، ان کی حفاظت کرنا، انہیں (تکلیف اور رنج والم سے) بچانا، ان کے حکم کی تعمیل کرنا، ان سے غلامی کو زائل کرنا اور ان پر رعب داب اور غلبہ نہ پانا۔ اور إِحْسَانًا مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اس کا ناصب اس کا ہم لفظ فعل مضمر ہے۔ تقدیر کلام ہے و أحسنوا بالوالدين إحسانا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ املاق کا معنی فقر وافلاس ہے یعنی تم فقر وافلاس کے خوف سے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہ کرو، کیونکہ میں تمہارا اور ان کا رازق ہوں۔ تحقیق ان میں ایسے ہی تھے جو فقر وافلاس کے ڈر سے بچیوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے تھے، جیسا کہ ظاہر آیت دلالت کرتی ہے۔ أملق بمعنی افتقر (فقیر ہونا) ہے اور املقه بمعنی افقرہ (اس نے اسے مفلس کر دیا) یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ نقاش نے مورج سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: املاق کا معنی لغت لخم کے مطابق بھوک ہے۔

اور منذر بن سعید نے ذکر کیا ہے کہ املاق کا معنی انفاق (خرچ کرنا) ہے کہا جاتا ہے: أملق ماله بمعنی أنفقه (یعنی اس نے اپنا مال خرچ کیا) اور یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو فرمایا: أملقي من مالك ما شئت (اپنے مال میں سے تو جو چاہے خرچ کر) اور رجل ملق وہ آدمی جو اپنی زبان سے وہ کچھ دیتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ پس الملق لفظ مشترک ہے اس کا بیان اپنے محل میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اس سے وہ استدلال کرتے ہیں جو عزل سے روکتے ہیں، کیونکہ زندہ درگور کرنا موجود فرد اور نسل کو اٹھانا اور ختم کرنا ہوتا ہے اور عزل اصل نسل کا انکار ہوتا ہے لہٰذا یہ اس کے مشابہ ہو گیا، مگر ایک نفس کو قتل کرنا (مارنا) بہت بڑا گناہ اور انتہائی قبیح اور برا فعل ہے۔ اسی لیے ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: بے شک عزل کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ذالك الوأد الخفي (1) وہ (عزل کرنا) وأد خفی ہے یعنی یہ خفیہ زندہ درگور کرنا ہی ہے) تو یہ کراہت ہے نہ کہ تحریم اور صحابہ کرام کی ایک جماعت اور دوسروں نے بھی یہ کہا ہے۔ اور عزل کی اباحت کے بارے میں بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت، تابعین اور فقہاء کا قول ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا علیکم ألا تفعلوا فانما هو القدر (2) یعنی تم پر کوئی حرج نہیں اس بارے میں کہ تم نہ کرو (بلاشبہ یہ تقدیر ہے) تحقیق اس سے حسن اور محمد بن مثنی نے یہ سمجھا ہے کہ یہ عزل کے بارے میں نہی اور زجر و توبیخ ہے۔ اور پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وإذا اراد الله خلق شئ لم يمنعه شئ (3) (اور جب اللہ تعالیٰ کسی شی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرما لے تو کوئی شی اسے نہیں روک سکتی) امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: آزاد عورت کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل جائز نہیں ہوتا، گویا انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 466 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 464 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 465

انزال کو عورت کی لذت کی تکمیل دیکھا ہے اور اسے بچے کے بارے میں عورت کے حق میں سے قرار دیا ہے اور اگر موطوءہ لونڈی ہو تو اس کے بارے ان کا یہ خیال نہیں، کیونکہ آدمی اس کے ساتھ اس کی اجازت کے بغیر عزل کرسکتا ہے، کیونکہ اس کا ذکر کردہ چیزوں میں سے کسی شی میں کوئی حق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے۔ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ (الانعام: 120) (اور ترک کردو ظاہری گناہ کو اور چھپے ہوئے کو) پس اس کا قول مَا ظَهَرَ گناہوں اور معاصی کی تمام انواع سے نہی اور روکنا ہے۔ اور وَ مَا بَطَنَ سے مراد مخالفت کا وہ نظریہ اور اعتقاد جو دل میں پختہ ہو جائے۔ اور ظہر وبطن دو حالتیں ہیں جو مکمل طور پر اشیاء کی ان تمام اقسام کو محیط ہیں جو اس کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اور مَا ظَهَرَ، الْفَوَاحِشَ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور وَ مَا بَطَنَ اس پر معطوف ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، النَّفْسَ میں الف لام تعریف جنس کے لیے ہے، جیسا کہ ان کے اس قول میں ہے: أهلك الناسَ حبُّ الدرهم والدينار اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ (المعارج: 19) (ان مثالوں میں الناس اور الْاِنْسَانَ پر الف لام تعریف جنس کے لیے ہے) کیا آپ دیکھتے نہیں کہ رب کریم کا ارشاد ہے: اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ﴿۲۲﴾ (المعارج) (سوائے نمازیوں کے) اور اسی طرح ارشاد گرامی ہے: وَ الْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ (العصر) (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) کیونکہ آگے فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (العصر: 3) (سوائے ان کے جو ایمان لائے) تو یہ آیت اس نفس کو قتل کرنے کے بارے میں نہی ہے جسے حرام کیا گیا ہے، چاہے وہ مومن ہو یا ان کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہو مگر اس حق کے ساتھ جو اس کے قتل کو واجب کرتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پس جس نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے" (1)۔

اور اس حق میں کئی امور ہیں: ان میں سے زکوٰۃ کا انکار کرنا اور نماز کو ترک کرنا بھی ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کیا۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ (التوبہ: 5) (پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ولا يحلُّ دمُ امرئٍ مسلمٍ إلّا بإحدى ثلاث الثيب الزاني والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة (2) (مسلم آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے ثیبہ عورت جو زنا کرے، نفس کو نفس کے بدلے (ایک آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے گا) اور جماعت سے الگ ہو کر اپنے

1۔ دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 89

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3621

دین کو ترک کرنے والا (یعنی مرتد ہونے کے سبب وہ واجب القتل ہو جائے گا)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منهما(1) (جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کردو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ(2) (جسے تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کا عمل کرتا ہے تو تم فاعل اور مفعول بہ کو قتل کردو) عنقریب اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا الآیہ (المائدہ: 32) (بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے کہ کہ انہیں (چن چن کر) قتل کیا جائے)۔

اور مزید فرمایا: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا الآیہ (الحجرات: 9) (اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو) اور اسی طرح وہ آدمی جس نے مسلمانوں کا عصا توڑا اور ان میں سے کسی جماعت کے امام کی مخالفت کی اور ان کے کلمہ (قول) کو متفرق کردیا اور اہل و مال کو اچک کر زمین میں فساد برپا کردیا اور حاکم وقت کے خلاف بغاوت کردی اور اس کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اسے بھی قتل کردیا جائے گا، پس رب کریم کے ارشاد اِلَّا بِالْحَقِّ کا یہی معنی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: المؤمنون تتکافأ دماؤهم ویسعی بذمتهم ادناهم لا یقتل مسلم بکافر ولا ذوعهد فی عهده ولا یتوارث اهل ملتین(3) (مومنین کے خون کا بدلہ لیا جائے گا اور ان کے ادنیٰ اپنی ذمہ داری کے لیے کوشش کریں گے کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی ذمی کو اس کے عہد کے دوران قتل کیا جائے گا اور علیحدہ علیحدہ دو دین رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے)۔ ابوداؤد اور نسائی نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: من قَتَلَ معاهدا فی غیر کُنْهِهِ حَرَّمَ اللہ علیه الجنة (جس نے کسی ذمی کو بلا وجہ قتل کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کردی۔

اور ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے فرمایا: من قَتَلَ رجلاً من أهل الذمة لم یجد ریح الجنة وإن ریحها لیوجد من مسیرة سبعین عاما(4) (جس نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کیا وہ جنت کی ہوا نہیں پائے گا اور بلاشبہ اس کی ہوا ستر برس کی مسافت سے پائی جائے گی)

اور بخاری شریف میں اس حدیث میں ہے: ''بے شک اس کی ہوا (خوشبو) چالیس برس کی مسافت سے پائی جائے گی''(5)۔ آپ نے اسے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 128
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، کتاب الفرائض، حدیث 2523۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6745
5۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 1021

**مسئلہ نمبر 9۔** قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ یہ ان محرمات کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں کاف اور میم خطاب کے لیے ہیں اور ان دونوں کا اعراب میں کوئی حصہ نہیں۔ وَصّٰكُمْ بِهٖ وصیت سے مراد وہ امر (حکم) ہے جو مؤکد اور مقرر ہو۔ اور کاف اور میم محل نصب میں ہیں، کیونکہ یہ ضمیر ہے جو مخاطب کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اور وحی میں ضمیر فاعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مطر الوراق نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں پر اوپر سے جھانک کر دیکھا اور فرمایا: تم کس بنا پر مجھے قتل کرتے ہو؟ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے وہ آدمی جس نے محصن ہونے کے بعد زنا کیا تو اس پر رجم کی سزا ہے یا جس نے عمداً کسی کو قتل کیا تو اس پر قصاص ہے یا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تو اس پر قتل کی سزا ہے'' (1)۔ تو قسم بخدا! نہ میں نے زنا کیا ہے زمانہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں اور میں نے کسی کو قتل نہیں کیا کہ اس کے بدلے میری جان لی جائے (یعنی مجھے قصاصاً قتل کیا جائے) اور نہ میں مرتد ہوا ہوں جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، بلاشبہ میں شہادت دیتا ہوں لا إله إلا الله وأن محمدًا عبده ورسوله، یہ جو میں نے تمہارے لیے ذکر کیا ہے اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم (حقیقت کو) سمجھو (2)۔

**مسئلہ نمبر 10۔** قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جس میں اس کا فائدہ ہو اور یہ اس کے اصل مال کی حفاظت کرنا اور اس کے فروع میں اضافہ کرنا ہے۔ اور اس میں یہی سب سے اچھا قول ہے، کیونکہ یہ جامع قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی اس میں تجارت کرنے کے ساتھ اور نہ تو اس سے خریدے اور نہ قرض لے۔

**مسئلہ نمبر 11۔** قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ یعنی یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور یہ کبھی بدن میں ہوتی ہے اور کبھی معرفت و پہچان میں تجربہ کے ساتھ اور دونوں وجہوں کا حصول ضروری ہے، کیونکہ یہاں أشُدّ کا لفظ مطلق واقع ہوا ہے، حالانکہ سورۃ النساء میں یتیم کے حال کا بیان مقید آیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی)۔

پس یہ قوت بدن اور وہ بلوغ النکاح ہے اور قوت معرفت اور وہ ایناس الرشد ہے دونوں کو جامع ہے اور اگر یتیم کو اپنے مال پر معرفت حاصل ہونے سے پہلے اور قوت بدنیہ حاصل ہونے کے بعد قدرت اور اختیار دے دیا جائے تو وہ یقیناً اسے اپنی شہوات میں ضائع کر دے اور پھر وہ ایسا نادار اور مفلس باقی رہ جائے جس کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا۔ اور اس شرط کے ساتھ یتیم کو خاص اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں اور آباء اپنے بیٹوں کے پاس موجود نہیں ہوتے پس باپ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 485

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب الامام یامر بالعفو فی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود باب لایحل دم امرئ مسلم الا فی ثلاث۔ حدیث نمبر 2523، ایضاً

کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا (اور جھوٹ بولنا) بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ اور جوانی کی عمر تک پہنچنا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو بغیر احسن طریقہ کے اس کے مال کے قریب جانے کو مباح قرار دیتا ہو یا کیونکہ بالغ کے حق میں حرمت ثابت ہے۔ اور یتیم کو خاص طور پر ذکر اس لیے کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے جھگڑا کیا ہے (اور وہ غالب ہے) اور معنی یہ ہے کہ تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو ہمیشہ کے لیے بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور کلام میں حذف ہے: فإذا بلغ أشُدَّهُ و أُونس منه الرُّشْدُ فادْفَعُوا إليه ماله (یعنی جب وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اور اس سے دانائی مانوس ہو جائے تو تم اسے اس کا مال دے دو)۔

اور علماء نے یتیم کے جوانی کی عمر کو پہنچنے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس ابن زید نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا مراد ہے۔ اور اہل مدینہ نے کہا ہے: اس کا بالغ ہونا اور اس کا رشد و ہدایت سے مانوس ہونا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے مراد اس کا پچیس برس کی عمر کو پہنچنا ہے۔

ابن عربی نے کہا(1) ہے: تعجب ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ پر کہ وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مقدارات قیاسی اور نظری طور پر ثابت نہیں ہوتیں بلکہ یہ نقلی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ اور آپ انہیں احادیث ضعیف سے ثابت کرتے ہیں، لیکن وہ دار الضرب (بغداد) میں سکونت پذیر ہیں پس ان کے پاس مدلس راوی کثیر ہیں اور اگر وہ معدن (مدینہ منورہ) میں سکونت پذیر ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقدر بنایا تو پھر ان سے دین کے خالص مسائل کے سوا کچھ صادر نہ ہوتا(2)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ادھیڑ عمر کی انتہا، اس میں یہ کہ اس میں جوانی کی قوتیں جمع ہو چکی ہوں، جیسا کہ سحیم بن وثیل نے کہا ہے:

أخُو خمسين مُجْتَمِعٌ أشُدِّی ونَجَّذَنِي مُدَاوَرَةُ الشُّئُونِ

اس میں نجذنی دال اور ذال دونوں کے ساتھ مروی ہے اور الأشدّ واحد ہے اس کی جمع نہیں۔ لہٰذا یہ الآنك کے قائم مقام ہے۔ جس کا معنی سیسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا واحد شدّ ہے، جیسا کہ فلس اور افلس ہے اور اس کی اصل شدّ النهار یعنی دن چڑھ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أتيتُه شد النهار و مد النهار (میں اس کے پاس آیا اس حال میں کہ دن چڑھ چکا تھا اور پھیل گیا تھا۔ اور محمد بن محمد الضبی عنترہ کا شعر کہتا ہے:

عَهْدِی به شدَّ النهار كأنما خُضِبَ اللَّبانُ ورأسُهُ بالعِظْلِمِ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تُطيف به شَدَّ النهار ظَعِينةٌ طويلةُ أنقاءِ اليدَيْن سَحُوق

اور سیبویہ کہتے ہیں: اس کا واحد شِدّة ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور معنی میں یہی اچھا اور حسین ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: بلغ الغلام شِدّته (بچہ اپنی جوانی کو پہنچ گیا) لیکن فِعْلہ کی جمع أفْعُل کے وزن پر نہیں آتی اور رہا انعم تو یہ نعم کی جمع ہے۔ یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 271

2۔ یہ ابن عربی کی جانب سے امام ابوحنیفہ پر تشدید ہے حالانکہ ادلہ کو پیش نظر رکھا جائے تو امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ائمہ کے نقطہ نظر پر فائق ہوتا ہے۔

ان کے اس قول سے ہے: یوم بؤس ( تکلیف دہ اور تنگ دن ) اور یوم نُعْم ( خوشحال دن ) اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا ہے کہ اس کی واحد شدّ ہے، جیسا کہ کلب اور اکلب ہے اور اس کی واحد شدّ ہے مثل ذئب اور اذئب تو بلاشبہ یہی قیاس ہے، جیسا کہ وہ ابابیل کی واحد میں کہتے ہیں: أبول یہ عجول پر قیاس ہے اور یہ کوئی ایسی شی نہیں ہے جو عربوں سے سنی گئی ہو۔ ابوزید نے کہا ہے: اصابتنی شُدًی یہ فعلی کے وزن پر ہے، ای شِدّۃ ( مجھے تکلیف آ پہنچی ہے اور فعلی کے وزن پر ہے اور اشد الرجل ( تب کہا جاتا ہے ) جب اس کے پاس طاقتور سواری کا جانور ہو۔

**مسئلہ نمبر 12** ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ یعنی بیع وشراء کرتے وقت لینے دینے میں عدل کے ساتھ ناپ اور تول پورا پورا کرو۔ اور القسط کا معنی عدل ہے۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اور ہم ناپ تول پورا کرنے میں کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ اوامر بلاشبہ انہی چیزوں میں ہیں جو حفاظت اور پرہیز کے اعتبار سے انسان کی قدرت واختیار کے تحت واقع ہیں۔ اور ایسا تفاوت اور فرق جو دو ناپوں کے درمیان اس طرح ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو اور نہ وہ آدمی کی قدرت اور اختیار کے تحت داخل ہو تو وہ معاف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کیل بمعنی مکیال ( یعنی پیمانہ جس کے ساتھ ماپ کیا جاتا ) ہے۔

کہا جاتا ہے: هذا كذا و كذا كَيْلًا یہ ناپ کے اعتبار سے اتنا اتنا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر میزان کا عطف کیا گیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے بارے میں یہ جان لیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ اس بات سے تنگ دل ہیں کہ وہ خوشی کے ساتھ کسی کو وہ شی بھی دیں جو دنیا میں ان پر لازم اور ضروری نہیں تو اس نے دینے والے کو یہ حکم فرمایا کہ وہ صاحب حق کا وہ حق پورا پورا ادا کرے جو اس کا بنتا ہے اور اسے زیادہ دینے کا پابند نہیں فرماتا، کیونکہ زیادتی اس پر گراں گزرے گی اور اس کا دل تنگ ہوگا۔ اور صاحب حق کو حکم فرمایا کہ وہ اپنا پورا پورا حق وصول کرلے اور اسے اپنے حق سے کم مقدار پر راضی ہونے کا پابند نہیں کیا، کیونکہ اس نقصان اور کمی میں اس کا دل تنگ ہوگا۔

اور موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی قوم میں کبھی خیانت ظاہر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے اور کسی قوم میں زنا عام نہیں ہوتا مگر اس میں موت بڑھ جاتی ہے اور کوئی قوم ناپ تول میں کمی نہیں کرتی مگر ان سے رزق کاٹ لیا جاتا ہے ( یعنی ان کا رزق کم کردیا جاتا ہے ) اور کوئی قوم بغیر حق کے ( بے انصافی کے ساتھ ) فیصلے نہیں کرتی مگر ان میں قتل وغارت عام ہوجاتی ہے اور کوئی قوم وعدہ خلافی نہیں کرتی مگر ان پر دشمن کو مسلط کردیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ تم عجمیوں کے گروہ ہو تمہیں ایسے دو امروں کا والی اور پابند بنایا گیا ہے جن کے سبب تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوگئے اور وہ ناپ اور تول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13** ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا یہ ارشاد احکام اور شہادات تمام کو متضمن ہے۔ وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اگرچہ وہ حق تمہارے کسی قرابت دار پر ہو، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا یہ ان تمام وعدوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لے رکھے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عقد ہوں جو دو آدمیوں کے

درمیان طے پاتے ہیں۔ اور اس عہد کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت اور اسے وفا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ( تا کہ تم نصیحت حاصل کرو)

**مسئلہ نمبر 14**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ یہ بہت عظیم آیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ماقبل پر عطف کیا ہے، کیونکہ جب اس نے پہلے نہی اور امر بیان کیا تو یہاں اپنے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع و پیروی کرنے سے ڈرایا اور اس میں اپنے راستے کی اتباع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، جیسا کہ ہم اسے احادیث صحیحہ اور اقوال سلف کے ساتھ بیان کریں گے۔

وَ اَنَّ یہ محل نصب میں ہے ای واتل أنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ (اور میں تلاوت کرتا ہوں کہ یہ میرا راستہ ہے) اور فراء اور کسائی سے منقول ہے۔ امام فراء نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو یعنی وَصّٰىكُمْ بِهٖ وبأنّ هٰذَا صِرَاطِیْ (اس نے تمہیں حکم دیا ہے اس کے بارے اور اس کے بارے کہ یہ میرا راستہ ہے) اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے: ولأنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ ( کیونکہ یہ میرا راستہ ہے) جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (الجن: 18) (یعنی ولأنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ)۔

اور اعمش، حمزہ اور کسائی نے وإنَّ هذا ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی ان آیات میں جوذکر کیا گیا ہے وہی میرا سیدھا راستہ ہے۔

ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے وانْ هذا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور ان مخففہ مشددہ کی مثل ہی ہے۔ مگر یہ کہ اس میں ضمیر قصہ اور شان ہے۔ ای وانه هذا اور یہ محل رفع میں ہے۔ اور محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ زائدہ ہو اور تاکید کے لیے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ (یوسف: 96) اور الصراط سے مراد وہ راستہ ہے جو دین اسلام ہے۔ مُسْتَقِیْمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا معنی ہے ہموار اور سیدھا جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اور اپنے اس راستے کی اتباع و پیروی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا جسے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر راستہ قرار دیا اور اسے شریعت بنایا اور اس کی انتہا جنت میں ہے۔ اور اس سے متفرق راستے نکلتے ہیں پس جو سیدھے راستے پر چلتا گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے ان راستوں کی طرف نکل گیا تو انہوں نے اسے جہنم تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (اور تم اور راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اس راستے سے ایک طرف کر دیں گے)۔ داری ابو محمد نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان، حماد بن زید اور عاصم بن بہدلہ نے خبر دی ہے حضرت ابو وائل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمارے لیے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر فرمایا هذا سبیلُ الله (یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے) پھر اس کی دائیں جانب بھی خطوط کھینچے اور اس کی بائیں جانب بھی۔ پھر فرمایا هذه سُبُلٌ على كل سبيل منها شيطان يدعو اليها (1) (یہ راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے اور وہ اس کی طرف بلاتا ہے)۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 91

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اور اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے (1) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور دو خط اس کی دائیں جانب اور دو خط اس کی بائیں کھینچے، پھر اپنا دست مبارک درمیان والے خط پر رکھا اور فرمایا: ھذا سبیل اللہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ اور یہ راستے یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، تمام اہل ادیان، اہل بدعت، خواہش اور نفس پرستوں کی جملہ گمراہیوں اور فروعات میں شذوذ اور علاوہ ازیں انتہائی گہرائی میں غواصی کرنے والوں کی جانب سے علم کلام میں جدل ومناظرہ وغیرہ سبھی کو شامل ہیں۔ یہ سب کے سب صراط مستقیم سے بھٹکنے کا ذریعہ ہیں اور سوء اعتقاد کا وہم پیدا کرنے والے ہیں۔ یہ ابن عطیہ نے کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہی صحیح ہے۔ علامہ طبری نے کتاب آداب النفوس میں ذکر کیا ہے: محمد بن عبدالاعلی صنعانی نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے بتایا کہ ہمیں محمد بن ثور نے معمر سے اور انہوں ابان سے نقل کیا ہے کہ کسی آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: صراط مستقیم کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کے قریب چھوڑا ہے اور اس کی ایک طرف جنت میں ہے اور اس کی دائیں جانب بھی راستے ہیں اور اس کی بائیں جانب بھی راستے ہیں اور وہاں لوگ ہیں جو اپنے پاس سے گزرنے والے کو بلاتے ہیں، پس جس نے ان راستوں میں سے کسی کو اختیار کر لیا تو وہ اسے جہنم تک پہنچا دے گا اور جو سیدھے راستے پر چلتا گیا تو وہ اس کے سبب جنت تک پہنچ جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الآیہ۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم علم سیکھ لو اس سے پہلے کہ اسے قبض کر لیا جائے اور اس کا قبض کرنا یہ ہے کہ اہل علم اٹھ جائیں (فوت ہو جائیں) خبردار! تم کلام میں غلو کرنے، اس کی انتہائی گہرائی تک پہنچنے (یا چرب زبانی سے باتیں کرنے) اور بدعت سے بچو، اور تم پر قدیم اوّل (ابتدائی پرانا دین) کو پکڑنا لازم ہے۔

اسے دارمی نے روایت کیا ہے: تعلموا العلم قبل أن يُقبض، وقبضه أن يذهب أهله، ألا وإياكم والتَّنَطُّعَ والتعمق والبدع وعليكم بالعتيق اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد بدعتیں ہیں۔ ابن شہاب نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا، الآیہ (الانعام: 159) (بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ) پس بھاگو بھاگو اور نجات پاؤ نجات پاؤ اور صراط مستقیم اور مضبوط طریقے کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو یہ وہی ہے جس پر سلف صالحین چلے اور یہی نفع بخش تجارت ہے۔

ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أمرتكم به فخذوه وما نهيتكم عنه فانتهوا (2) (میں جس چیز کے بارے تمہیں حکم دوں تم اسے لے لو اور جس سے میں تمہیں منع کروں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ، جلد 1، صفحہ 3
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التفسیر، جلد 1، صفحہ 2

اس سے رک جاؤ)۔ اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسا وعظ فرمایا کہ اس سے آنکھیں (آنسوؤں سے) بہہ پڑیں اور اس سے دل خوفزدہ ہو گئے، تو ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ بے شک یہ تو الوداع کہنے والے کا وعظ ہے، تو ہماری حفاظت کے لیے کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے تمہیں ایک روشن اور واضح دین پر چھوڑا ہے اس کی رات اس کی دن کی مثل ہے۔ جو بھی میرے بعد اس میں بھٹک جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، تم میں سے جو زندہ رہا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا پس تم پر اسے اختیار کرنا لازم ہے جسے تم میری سنت سے اور میرے بعد خلفائے راشدین مہدیین کی سنت سے پہچانو اس پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ۔ اور ایسے امور سے بچو جو نئے اختراع کیے گئے ہوں، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور تم پر اطاعت لازم ہے اگرچہ (امیر) حبشی غلام ہی ہو، کیونکہ مومن نکیل ڈالے گئے اونٹ کی طرح ہے کہ اسے جہاں چلایا جائے وہ پیروی کرتا ہے" (1)۔ اسے ترمذی نے اسی معنی کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

قد ترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها لا یزیغ عنها بعدی إلاهالك من یعش منکم فسیری إختلافا کثیرا فعلیکم بما عرفتم من سنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین بعدی عضوا علیها بالنواجذ وإیاکم والأمور المحدثات فإن کلّ بدعة ضلالة و علیکم بالطاعة وإن عبدًا حبشیًا فإنما المؤمن کالجَمَل الأنِف حیثما قِید انقاد۔ (2)

اور ابو داؤد نے روایت بیان کی ہے (3) کہ ابن کثیر نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوسفیان نے خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ کسی آدمی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف خط لکھا اور تقدیر کے بارے آپ سے دریافت کیا، تو آپ نے اس کی طرف لکھا: أما بعد! فإنی أوصیك بتقوی الله والا قتصادَ فی أمرہ واتباع سنة رسول الله ﷺ وترك ما أحدث المحدثون بعد ما جرت به سنته، و کُفُوا مؤونته فعلیك بلزوم الجماعة فانها لك باذن الله عصمة الخ۔

(میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے معاملہ میں میانہ روی کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع کرنے کی نصیحت کرتا ہوں، اور انہیں ترک کرنے کی جو مبتدع لوگوں نے ایجاد کی ہیں اس کے بعد کہ ان کے بارے سنت موجود ہے اور اس کی مشقت (اور معاونت) سے باز رہو، پس تجھ پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہے کیونکہ وہ تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے حفاظت اور بچاؤ ہے۔ پھر تو جان لے کہ لوگوں نے کسی بدعت کو ایجاد نہیں کیا مگر اس سے پہلے کوئی ایسی شی گزر چکی ہو جو اس پر دلیل ہو یا اس میں اس کا قیاس ہو، کیونکہ سنت کو سنت اس نے قرار دیا ہے جو اس کے خلاف خطا اور غلطی، بے وقوفی (یعنی کم عقلی) اور تعمق (گہرائی) تو جانتا اور اس سے واقف ہے، پس تو اپنے آپ کے لیے اس پر راضی اور خوش رہ جس سے قوم نے اپنے نفسوں کو راضی رکھا، کیونکہ وہ علم کی بنا پر اس سے واقف ہوئے اور کھلی نگاہ کے ساتھ دیکھ کر اس سے باز رہے، بلاشبہ وہ کشف امور پر زیادہ قوت اور قدرت رکھتے تھے اور جس فضل و مہربانی کے ساتھ وہ اس مقام میں ہے وہ اولیٰ اور افضل ہے، پس اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم ہو تو پھر تم اس کی طرف ان پر سبقت لے گئے ہو اور اگر تم کہو کہ یہ (بدعت) ان کے بعد

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 453　2۔ ایضاً　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنہ، جلد 2، صفحہ 279

ظاہر ہوئی ہے تو اسے ایجاد نہیں کیا مگر اس نے جس نے ان کے راستے کے علاوہ کسی اور کی اتباع اور پیروی کی ہے اور اس نے اپنے آپ کو ان سے دور کر لیا ہے، بلاشبہ سابقون تو وہی ہیں۔ تحقیق انہوں نے اس بارے میں ایسی گفتگو کی ہے جو کافی ہے اور انہوں نے وہ وصف بیان کیا ہے جو شفایاب کرتا ہے (یعنی باعث اطمینان ہے) پس جو ان سے کم ہے وہ کوتاہی کرنے والے کی طرف سے ہے اور جو ان سے اوپر (اور زیادہ) ہے وہ جسارت کرنے والے کی طرف سے ہے۔ تحقیق ایک قوم نے ان کے جو درجہ میں ان سے کم ہے اس نے کوتاہی کی پس انہوں نے جفا کی (ظلم کیا) اور ان میں سے کئی قوموں نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے غلو کیا اور بلاشبہ وہ اس کے باوجود ہدایت مستقیم پر ہیں۔ اور حدیث ذکر کی (1)۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: تم پر اثر و سنت کی اقتدا کرنا لازم ہے، کیونکہ ڈر ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب کوئی انسان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام احوال میں آپ کی اقتدا اور پیروی کرنے کا ذکر کرے گا تو لوگ اس کی مذمت کریں گے اور اس سے نفرت کریں گے اور اس سے برأت اختیار کرلیں گے اور وہ اسے ذلیل و رسوا کریں گے۔ حضرت سہل نے کہا: بے شک اہل سنت کے ہاتھ پر بدعت ظاہر ہوئی، کیونکہ انہوں نے ان کی معاونت کی اور انہوں نے اس کے ساتھ بحث مباحثہ کیا اور ان کے جھوٹے دعوے ظاہر ہوئے اور عام لوگوں میں پھیل گئے اور اس نے بھی اسے سن لیا جس نے نہیں سنا ہوا تھا، اگر وہ انہیں چھوڑ دیتے اور ان سے گفتگو نہ کرتے تو ان میں سے ہر ایک اس کے ساتھ مر جاتا جو اس کے سینے میں تھا اور اس سے کوئی شی ظاہر نہ ہوتی اور وہ اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ اور حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: تم میں سے کوئی کسی بدعت کا آغاز نہیں کرتا یہاں تک کہ ابلیس اس کے لیے کوئی عبادت ایجاد کرتا ہے اور وہ اس کے مطابق عبادت کرنے لگتا ہے پھر وہ اس کے لیے بدعت کو ایجاد کر دیتا ہے اور جب وہ بدعت کے بارے بولنے لگتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ اس سے اس خدمت (اور بوجھ) کو الگ کر لیتا ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں کوئی حدیث نہیں جانتا جو مبتدع کے لیے اس حدیث سے زیادہ سخت ہو۔ حجب اللہ الجنة عن صاحب البدعة (اللہ تعالیٰ نے جنت کو بدعتی سے چھپا لیا ہے) فرمایا: پس یہودی اور نصرانی اس کی نسبت زیادہ امیدوار ہیں۔ حضرت سہل نے کہا: جو چاہے کہ اپنے دین کی عزت و تکریم کرے تو وہ سلطان وقت کے پاس داخل نہ ہو، عورتوں کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور ہوس پرستوں کے ساتھ مخاصمت اور جھگڑا نہ کرے۔ اور یہ بھی فرمایا: تم اتباع و پیروی کرو اور نئی چیزیں (بدعت) ایجاد نہ کرو۔ تمہارے لیے وہ کافی ہوگی۔

اور مسند دارمی میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے ابو عبدالرحمن! بلاشبہ میں نے مسجد میں ابھی وہ شے دیکھی ہے جس کو میں نے ناپسند کیا ہے اور الحمدللہ میں نے خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا، انہوں نے پوچھا: تو وہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: اگر آپ زندہ رہے تو عنقریب آپ اسے دیکھ لیں گے۔ میں نے مسجد میں ایک قوم کو مختلف حلقوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقے میں ایک آدمی ہے اور ان کے

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3996 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاتھوں میں سنگریزے ہیں اور وہ انہیں کہہ رہا ہے: سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔ چنانچہ وہ سو مرتبہ سبحانہ اللہ پڑھتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو پھر تم نے انہیں کیا کہا؟ انہوں نے بتایا: میں نے انہیں کچھ نہیں کہا۔ آپ کی رائے اور حکم کا انتظار کیا۔ انہوں نے فرمایا: کیا تم نے انہیں حکم نہیں دیا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور میں ان کے لیے ضامن ہوں کہ یہ عمل ان کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی ان کی معیت میں چلے یہاں تک کہ وہ ان حلقوں میں سے ایک حلقے میں آئے اور ان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ اور فرمایا: یہ کیا ہے جو میں تمہیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ابو عبد الرحمن! یہ سنگریزے ہیں ہم ان کے ساتھ تکبیر و تہلیل (اور تسبیح) کو شمار کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: سو تم اپنے گناہوں کو شمار کرو اور میں تمہارے لیے ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کوئی شی ضائع نہیں ہوگی، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! تم پر افسوس ہے تمہاری ہلاکت کتنی تیزی سے آپہنچی ہے، کیا ضلالت و گمراہی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اے ابو عبد الرحمن! قسم بخدا! ہم نے سوائے نیکی کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا: کتنے ہی خیر اور نیکی کا ارادہ کرنے والے ہیں ہرگز اسے نہیں پہنچ سکیں گے (☆)۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیز سے روایت ہے کہ ان سے کسی آدمی نے ہوس پرستوں اور اہل بدعت کی کسی شی کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا: تجھ پر لازم ہے کہ تو اعراب اور غلام کے دین کو لازم پکڑے جو کتاب کے بارے میں ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس سے علیحدگی اختیار کرلے۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم کون سی شے سے بنی آدم (انسان) کے پاس آتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہر شے سے۔ اس نے کہا: کیا تم استغفار سے پہلے بھی ان کے پاس آتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: دور ہو! وہ شے ہے جسے توحید کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا: میں یقیناً ان میں کوئی ایسی شے پھیلا دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار نہیں کریں گے۔

امام اوزاعی نے فرمایا: پس اس (ابلیس) نے لوگوں میں ہوس کو پھیلا دیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نہیں جانتا دو نعمتوں میں سے کون سی نعمت مجھ پر زیادہ عظیم ہے یہ کہ اس نے مجھے اسلام کی ہدایت اور رہنمائی عطا فرمائی یا یہ کہ اس نے مجھے اس ہوس سے عافیت اور چھٹکارا عطا فرمایا؟ اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہوس پرستوں کو اصحاب الاہواء کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ آتش جہنم میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب دارمی سے مروی ہے۔

اور حضرت سہل بن عبد اللہ سے معتزلہ کے پیچھے نماز پڑھنے اور ان سے نکاح، شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: نہیں، ان کی کوئی عزت و تکریم نہیں، وہ کفار ہیں، وہ کیسے مومن ہوسکتا ہے جو یہ کہتا ہے: قرآن کریم مخلوق ہے، نہ جنت پیدا کی گئی ہے اور نہ ہی جہنم اور نہ ہی اللہ کی کوئی پل صراط ہے، کوئی شفاعت نہیں، مومنین میں سے کوئی جہنم میں داخل نہیں ہوگا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے گنہگاروں میں سے کوئی جہنم سے نہیں نکلے گا، نہ کوئی عذاب قبر ہے اور نہ ہی منکر و نکیر ہیں۔ اور آخرت میں نہ ہمارے رب کا دیدار ہے اور نہ ہی زیادہ (کا کوئی تصور ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم مخلوق ہے، نہ وہ

---

☆ ذکر اذکار کے بارے یہ تشدید کا پہلو ہے انسان خلوص نیت سے حضور قلب کے ساتھ ذکر کرے یہی تو مقصود ہے۔

سلطان کو جانتے ہیں اور نہ ہی جمعہ کو اور وہ اسے کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے کسی بدعتی سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو ضائع کر دے گا اور اس کے دل سے نور اسلام کو نکال دے گا آپ کے کلام میں سے یہ اور زیادہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ابوسفیان ثوری نے کہا ہے: بدعت ابلیس کے نزدیک معصیت (گناہ) سے زیادہ پسندیدہ ہے، (کیونکہ) معصیت سے توبہ کی جاسکتی ہے اور بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل السنۃ میں سے ایسے آدمی کی طرف دیکھنا عبادت ہے جو سنت کی طرف دعوت دیتا ہو اور بدعت سے منع کرتا ہو۔ اور ابوالعالیہ نے کہا: تم پر اس پہلے امر کو مضبوطی سے تھامنا لازم ہے جس پر تم تفرقہ سے پہلے تھے۔ عاصم الاحوال نے کہا ہے: میں نے اس کے بارے حسن سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے تجھے نصیحت کی ہے قسم بخدا! اور تجھے سچ کہا ہے۔

تحقیق سورۂ آل عمران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی گزر چکے ہیں کہ ''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ امت عنقریب تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی''۔ الحدیث، بعض اہل معرفت علماء نے کہا ہے: یہ فرقہ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے فرقوں میں زائد ہوا ہے وہ قوم ہے جو علماء سے عداوت رکھتے ہیں اور فقہاء سے بغض رکھتے ہیں اور گزشتہ امتوں میں سے یہ فرقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں ایک قوم ہوگی جو اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم سے کفر کریں گے درآنحالیکہ انہیں احساس اور شعور بھی نہ ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کفر کیا۔ فرمایا: تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیسے لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بعض کا اقرار کریں گے اور بعض کا انکار کریں گے''۔ پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر نثار و قربان! وہ کیا کہیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ابلیس کو اللہ تعالیٰ کے برابر اور مساوی قرار دیں گے اس کی صفت خلق میں، قوت میں اور رزق میں۔ اور کہیں گے خیر اور بھلائی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر ابلیس کی جانب سے''۔ فرمایا: پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں فرمایا: ''میری امت ان سے عداوت، بغض اور جھگڑا فساد نہیں کرے گی وہی اس امت کے زنادقہ ہیں''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور سورۃ النساء میں اور اس سورت میں اہل بدعت اور ہوس پرستوں کی مجالست اور ہمنشینی اختیار کرنے سے نہی کا بیان گزر چکا ہے۔ اور بلاشبہ جو ان کے ساتھ مجالست کرے گا اس کا حکم ان کے حکم کی مثل ہی ہوگا۔ پس فرمایا: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا الآیہ (الانعام:68) (اور (اے سننے والے!) جب تو دیکھے انہیں کہ بے ہودہ بحثیں کر رہے ہیں ہماری آیتوں میں)، پھر سورۃ النساء میں ان لوگوں کی سزا بیان فرمائی جنہوں نے ایسا کیا اور اس کی مخالفت کی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا۔ پس فرمایا: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ الآیہ (النساء:140) اور سورۃ النساء مدنی سورت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے ساتھ ملا دیا جس نے ان کی مجلس اختیار کی۔ اور اس امت کے ائمہ میں ایک جماعت نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور اہل بدعت کی مجلس اختیار کرنے والے پر معاشرت اور مخالطت کی بنا پر ان آیات کے تقاضا کے مطابق حکم صادر کیا، ان

میں سے امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم ہیں، کیونکہ انہوں نے اہل بدعت کی مجالست اختیار کرنے والے آدمی کے بارے میں کہا ہے: اسے ان کی مجالست اختیار کرنے سے روکا جائے گا، اگر وہ رک جائے تو فبہا ورنہ اسے ان کے ساتھ جلا دیا جائے گا، ان کی مراد یہ ہے کہ حکم میں (اسے ان کی مثل قرار دیا جائے گا)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شراب پینے والوں کی مجلس اختیار کرنے والے پر حد کا حکم لگایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (النساء:140) (ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گے) آپ کو عرض کی گئی: وہ کہتا ہے میں ان کی مجلس اپناتا ہوں تاکہ میں ان پر اسے واضح کروں اور ان کی باتوں کا رد کروں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسے ان کی مجالست سے روکا جائے گا اور اگر وہ باز نہ آئے تو اسے ان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

''پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب تاکہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی اور (یہ کتاب) باعث ہدایت و رحمت ہے تاکہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے پر ایمان لائیں۔ اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے، بابرکت ہے سو پیروی کرو اس کی اور ڈرو (اللہ سے) تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اس میں مُوْسَى اور الْكِتٰبَ دونوں مفعول ہیں۔ تَمَامًا یہ مفعول من أجلہ ہے یا یہ مصدر ہے (یعنی مفعول مطلق) عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ، اَحْسَنَ کو نصب اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے رفع دیا، تو وہ قراءت یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق کی ہے۔ اور وہ اس تقدیر پر ہے: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ۔ مہدوی نے کہا ہے: اس میں بُعد ہے، کیونکہ اس میں مبتدا محذوف ہے جو کہ الَّذِيْٓ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے (یعنی ھو)۔ اور سیبویہ نے خلیل سے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ سنا ہے: ما أنا بالذی قائلٌ لك شیئا اور جنہوں نے نصب دی ہے تو وہ اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کسائی اور فراء نے اس کی اجازت دی ہے کہ یہ اسم ھو جو کہ الذی کی صفت واقع ہو رہا ہو۔ اور ان دونوں نے اس جملے کو جائز قرار دیا ہے۔ مررتُ بالذی أخیك دونوں معرفہ اور جو اس کے قریب ہے اس کے ساتھ الذی کی صفت لگاتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بصریوں کے نزدیک محال ہے، کیونکہ یہ صفت ہے اسم کی اسے مکمل کیے جانے سے پہلے اور ان کے نزدیک معنی ہے: علی المحسن (نیک عمل کرنے والے پر) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تماما علی المحسن المومن (تاکہ پوری کر دیں نعمت نیک عمل کرنے والے مومن پر)

اور قولہ باری تعالیٰ: تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ کے معنی میں حسن نے کہا ہے: ان میں محسن اور غیر محسن دونوں طرح کے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ نیک عمل کرنے والوں پر نعمت مکمل کر دے۔ فانزل اللہ الکتاب تماما

علی المحسنین اور اس قول کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی: تماماً علی الذین أحسنو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی ان احسانات میں زیادتی کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر فرمائے ان میں سے جن کا علم ان پر تورات نازل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔

محمد بن یزید نے کہا ہے: پس معنی ہے: تماماً علی الذی أحسنه الله عزوجل إلی موسیٰ علیه السلام من الرسالة وغیرھا (مکمل کرتے ہوئے اس نعمت واحسان کو جو اس نے رسالت وغیرہ میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرمایا)۔ اور عبداللہ بن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے علی إحسان الله إلی انبیائه علیهمُ السلام من الرسالة وغیرھا (1) (مکمل کرتے ہوئے اس احسان کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر رسالت وغیرہ میں فرمایا)

اور ربیع بن انس نے کہا ہے: تماماً علی إحسان موسیٰ من طاعته لِلّٰهِ عزّوجلّ (2) (مکمل کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس نیکی کو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی صورت میں وہ کرتے ہیں) اور فراء نے بھی یہ کہا ہے، پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور انہیں کتاب کا عطا کیا جانا اس سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بمعنی واو ہے۔ یعنی وآتینا موسیٰ الکتاب (اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) کیونکہ یہ دونوں حرف عطف ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: تقدیر کلام ہے ثمّ کنّا قد آتینا موسیٰ الکتاب قبلَ إنزالنا القرآن علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنے سے پہلے)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ، ثم أتل ما آتینا موسیٰ تماماً (فرمایئے آؤ میں تلاوت کرتا ہوں وہ جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، پھر میں وہ تلاوت کرتا ہوں جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نعمت مکمل کرتے ہوئے عطا فرمایا)۔ وَ تَفْصِیْلًا اس کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور اسی طرح هُدًى وَّ رَحْمَةً بھی معطوف ہے۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ اس میں مبارک صفت ہے یعنی جس میں بہت زیادہ خیرات و برکات ہیں۔ اور قرآن کریم کے علاوہ حال ہونے کی بنا پر اسے مبارکاً پڑھنا بھی جائز ہے۔ فَاتَّبِعُوْهُ یعنی تم اس کے مطابق عمل کرو جو کچھ اس میں ہے۔ وَاتَّقُوْا یعنی اس کی تحریف سے بچو۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ تم رحمت کے امیدوار بن جاؤ پس تم عذاب نہیں دیئے جاؤ گے۔

اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَیْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 189 2۔ ایضاً

عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝۱۵۷

"(ہم نے اسے اتارا ہے) تاکہ یہ نہ کہو کہ اتاری گئی تھی کتاب تو صرف دو گروہوں پر ہم سے پہلے اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ اگر اتاری گئی ہوتی ہم پر کتاب تو ہوتے ہم زیادہ ہدایت پانے والے ان سے، بے شک آ گئی ہے تمہارے پاس روشن دلیل اپنے رب کی طرف سے اور سراسر ہدایت اور رحمت تو کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور منہ پھیرا ان سے؟ عنقریب ہم سزا دیں گے انہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ تَقُوْلُوْٓا یہ محل نصب میں ہے۔ کوفیوں نے کہا ہے: لِئَلَّا تقولوا (تاکہ تم یہ نہ کہو) اور بصریوں نے کہا ہے: أنزلناہ کراھیۃَ أن تقولوا (ہم نے اسے نازل کیا یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ تم کہو)۔ اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فاتقوا أنْ تقولوا یا أھل مکۃ (اے اہل مکہ تم یہ کہنے سے بچو)، اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ کہ تورات اور انجیل نازل کی گئی۔ عَلٰي طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ہم سے پہلے دو گروہوں پر یعنی یہود و نصاریٰ پر اور ہم پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔

وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اور ہم تو ان کی کتابوں اور ان کی لغات سے بالکل ناواقف اور غافل تھے۔ اور یہاں عن دراستھما نہیں فرمایا، اس لیے کہ ہر گروہ ایک جماعت ہے۔ او تقولوا اس کا عطف أن تقولوا پر ہے۔ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ عذر زائل ہو گیا۔ اور البینۃ اور البیان دونوں ہم معنی ہیں۔ اور اس سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات گرامی ہے اور آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بینہ کا نام دیا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ اور یہ سراسر ہدایت اور رحمت ہے اس کے لیے جس نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ پھر فرمایا: فَمَنْ اَظْلَمُ یعنی اگر تم نے جھٹلایا تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ فإن کذبتم فلا أحدَ أظلم مِنکم۔ صدف اس کا معنی اعراض جس نے اعراض کیا اور يَصْدِفُوْنَ وہ اعراض کرتے تھے، منہ پھیرا کرتے تھے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝۱۵۸

"کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا خود آئے آپ کا رب یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی (لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی۔ آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اس کا معنی ہے میں نے ان پر حجت قائم کر دی اور ان پر کتاب نازل کی لیکن وہ ایمان نہ لائے،

پس وہ کس کی انتظار کر رہے ہیں؟ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ موت کے وقت ان کی ارواح کو قبض کرنے کے لیے فرشتے ان کے پاس آ ئیں۔

اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس کا مفہوم ہے: امر ربک یا ان کے بارے میں قتل وغیرہ سے متعلقہ تیرے رب کا حکم آجائے، کبھی مضاف الیہ کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس سے مراد مضاف ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) مراد اھل القریۃ ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ:93) اس میں مراد حب العجل ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے یأتی أمر ربك، یعنی عقوبةَ رِبّك اور عذاب ربك (تیرے رب کی سزا اور تیرے رب کا عذاب آجائے گا)۔ اور کہا جاتا ہے: یہ ان متشابہ آیات میں سے ہے جن کی تاویل سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور اسی کی مثل میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کہا گیا ہے: اٰيٰتِ رَبِّكَ سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ اس کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہیں دنیا میں مہلت دی جائے گی اور جب ساعت (قیامت) ظاہر ہو جائے گی تو پھر کوئی مہلت نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے آنے سے مراد قیامت کے دن میدان حشر میں اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے آنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (الفجر) (اور جب آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے)

اللہ تعالیٰ کے آنے میں کسی نوع کی کوئی حرکت، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور زوال وغیرہ نہیں ہے، کیونکہ یہ چیزیں تب ہوتی ہیں جب آنے والا جسم یا جوہر ہو اور جس نظریہ پر جمہور ائمہ اہل السنۃ ہیں وہ کہتے ہیں: وہ آتا ہے، نزول فرماتا ہے، لیکن وہ اسے کسی کیفیت کے ساتھ مکیف نہیں کرتے، کیونکہ اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے۔

ارشاد گرامی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾ (الشوریٰ) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے)

اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین چیزیں جب ظاہر ہو جائیں گی تو پھر کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا یا اس نے اپنے ایمان کی حالت میں کوئی عمل خیر نہیں کیا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا نکلنا اور دابۃ الارض کا ظاہر ہونا''۔ اور صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک مغرب میں توبہ کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی مسافت ستر برس کی ہے اسے بند نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج اس کی طرف سے طلوع ہو جائے'' (1)۔ اسے دارقطنی، دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: ھذا حدیث حسن صحیح۔ اور سفیان نے بیان کیا ہے:

1۔ سنن ابن ماجہ کتاب الفتن، باب طلوع الشمس من مغربھا، حدیث نمبر 4059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ شام کی طرف ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس دن تخلیق فرمایا جس دن زمین و آسمان پیدا فرمائے۔ مفتوحًا یعنی توبہ کے لیے کھولا گیا ہے اور بند نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔ فرمایا: حدیث حسن صحیح (یہ حدیث حسن صحیح ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سب کو خوارج اور معتزلہ نے جھٹلایا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا کہ انہوں نے کہا: اے لوگو! بلاشبہ رجم حق ہے اس کے بارے تم کسی دھوکے میں نہ آنا اور بے شک اس کی نشانی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رجم کیا ہے اور بلاشبہ ہم نے ان دونوں کے بعد رجم کیا ہے۔ اور عنقریب اس امت سے ایک قوم ہوگی وہ رجم کو جھٹلائیں گے، دجال کی تکذیب کریں گے، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا انکار کریں گے، عذاب قبر کو نہیں مانیں گے، شفاعت کا انکار کریں گے اور اس قوم کو جھٹلائیں گے جو آگ (جہنم) سے نکالیں جائیں گے اس میں جلنے کے بعد۔ اسے ابوعمر نے ذکر کیا ہے(1)۔

اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور وہ اسی کے ہم معنی ہے کہ ''سورج کو لوگوں سے روک لیا جائے گا جس وقت زمین میں گناہ زیادہ ہو جائیں گے اور نیکی ختم ہو جائے گی اور کوئی اس کا حکم نہیں دے گا اور گناہ پھیل جائے گا اور اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ ایک رات کی مقدار عرش کے نیچے، جب بھی وہ سجدہ ریز ہوگا اور اپنے رب سے اجازت طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو اسے کوئی جواب نہیں ملے گا یہاں تک کہ چاند اس کے ساتھ برابر ہو جائے گا اور وہ بھی اس کے ساتھ سجدہ ریز ہوگا اور اذن طلب کرے گا کہ وہ کہاں سے طلوع ہو تو ان دونوں کو کوئی جواب نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ سورج کو تین راتوں کی مقدار اور چاند کو دو راتوں کی مقدار روک لیا جائے گا اور زمین میں تہجد گزاروں کے سوا اس رات کی طوالت کو کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اس وقت مسلمانوں کے شہروں میں سے ہر شہر میں ان کی ایک قلیل سی جماعت ہوگی، پس جب دونوں کے لیے تین راتوں کی مقدار مکمل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ فرمائیں گے: '' بے شک رب کریم سبحانہ وتعالیٰ تم دونوں کو حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنے مغارب کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے طلوع ہو جاؤ اور یہ کہ تم دونوں کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی اور نور نہیں ہے''۔ پس وہ دونوں سیاہ حالت میں اپنے مغارب سے طلوع ہوں گے، نہ سورج کی روشنی ہوگی اور نہ چاند کا نور ہوگا، اس سے پہلے ان کے گرہن میں ان کی مثال موجود ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ (القیامہ) (اور (بے نوری میں) سورج اور چاند یکساں ہو جائیں گے)

اور ارشاد گرامی ہے: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ (التکویر) (یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) پس یہ دونوں بلند ہوں گے اس طرح جیسے دو جوڑے گئے اونٹ۔ اور جب سورج اور چاند آسمان کے نصف تک پہنچ جائیں گے تو ان کے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئیں گے اور وہ انہیں سینگوں سے پکڑ لیں گے اور انہیں مغرب کی طرف واپس لوٹا دیں گے اور وہ اپنے مغارب میں غروب نہیں ہوں گے بلکہ وہ دونوں باب التوبۃ میں غروب ہوں گے پھر وہ دونوں کواڑ واپس لوٹائے جائیں گے،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 156

پھر ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ جڑ جائے گا اور وہ دونوں اس طرح مل جائیں گے گویا ان کے درمیان کبھی کوئی شگاف (اور دراڑ) تھی ہی نہیں۔ اور جب توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا تو اس کے بعد کسی بندے کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کے بعد اسے نیکی نفع نہیں دے گی جسے وہ کرے گا، مگر وہ آدمی جو اس سے پہلے نیکوکار ہو تو وہ اس پر عمل کرتا رہے گا جس پر وہ اس دن سے پہلے عمل پیرا تھا، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (انعام:158) ((لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی)

پھر اس کے بعد سورج اور چاند کو روشنی اور نور عطا کر دیا جائے گا، پھر وہ لوگوں پر اسی طرح طلوع و غروب ہوتے رہیں گے جیسے وہ اس سے قبل طلوع و غروب ہوتے تھے۔ علماء نے بیان کیا ہے: سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد کسی نفس کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا، کیونکہ وہ ان کے دلوں میں اس خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے خالص ہوا ہے جس کے ساتھ نفس کی تمام شہوات کو ٹھنڈا کر دیا گیا ہے اور قوائے بدنیہ میں سے ہر قوت سست اور ماند پڑ گئی ہے، پس تمام لوگ قیامت قریب آنے کے یقین کی وجہ سے اس آدمی کی طرح ہو گئے ہیں جس پر موت حاضر ہو (کیونکہ اس کی طرح) اس سے بھی گناہوں کی تمام انواع کی طرف دعوت دینے والے جذبات منقطع ہو چکے ہیں اور اب ان کے ابدان سے ان کا صدور باطل ہے، پس جس نے اس قسم کی حالت میں توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، جیسا کہ قریب المرگ آدمی کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ (1) (بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول نہیں فرماتا جب تک وہ (موت کے وقت) غرغر کی آواز نہ نکالے) یعنی اس کی روح راس الحلق تک پہنچ جائے اور وہ وقت اس معاینہ اور مشاہدہ کا ہے جس میں وہ دیکھ لیتا ہے کہ اس کا ٹھکانا جنت میں ہے یا جہنم میں، پس سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا مشاہدہ بھی اس کی مثل ہے۔ اور اس پر چاہیے کہ جس نے اس کا مشاہدہ کیا جب تک وہ زندہ رہے اس کی توبہ مردود ہو اور جو اس وقت موجود ہو اس کا حکم بھی مشاہدہ کرنے والے کی طرح ہو، کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بارے میں، اس کے نبی ﷺ کے بارے میں اور اس کے وعدہ کے بارے میں ضروری اور بدیہی ہو گیا ہے۔ اور اگر ایام دنیا اتنے عرصہ تک پھیل جائیں کہ لوگ اس عظیم واقعہ کو بھول جائیں جیسے وقوع پذیر ہوا اور اس کے بارے میں وہ بہت تذکرہ کریں اور اس کے بارے خبر خاص ہو جائے اور اس سے تواتر ختم ہو جائے (یعنی اب وہ خبر متواتر نہ رہے) تو اس وقت جس نے اسلام قبول کیا یا توبہ کی تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث یاد کی ہے اور اس کے بعد میں اسے نہیں بھولا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک (قیامت کے) ظاہر ہونے کے اعتبار سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور لوگوں پر چاشت کے وقت دابۃ کا نکلنا ہے ان میں سے جو بھی دوسری سے پہلے ظاہر ہوئی تو اس کے قریب ہی دوسری علامت ظاہر ہو جائے گی" (2)۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 324	2۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 404

اور اس بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرہ میں تشریف فرما تھے اور اس سے نیچے ہم تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''تم کس کے بارے ذکر کر رہے ہو؟'' ہم نے عرض کی: قیامت کے بارے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دس علامات ظاہر ہو جائیں۔ ایک خسف (زمین کا دھنسنا) مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرہ عرب میں، دخان (دھواں) کا ظاہر ہونا، دجال کا نکلنا، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور ایک آگ جو کہ قعر عدن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانک کر لے جائے گی'' (1)۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: مجھے عبدالعزیز بن رفیع نے ابوالطفیل سے اور انہوں نے ابو سریحہ سے اسی طرح بیان کیا ہے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کرتے۔ اور ان دو میں سے ایک نے دسویں علامت کے طور پر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ اور دوسرے نے کہا ہے: اور ایک ہوا ظاہر ہوگی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامات کی ترتیب میں یہ حدیث متفق (انتہائی قابل اعتماد) ہے۔ ان میں سے بعض واقع ہو چکی ہیں اور وہ تینوں خسف ہیں جیسا کہ ابوالفرج علامہ جوزی نے عراق، عجم اور مغرب میں ان کے واقع ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کے سبب خلق کثیر ہلاک ہوئی۔ انہوں نے کتاب ''فہوم الآثار'' وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور دابہ کا ذکر سورۃ النمل میں آئے گا اور یاجوج ماجوج کا سورۃ الکہف میں آئے گا۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک یہ علامات تسلسل کے ساتھ سال بسال دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی مثل ظاہر ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورج کو مغرب سے طلوع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو کہا تھا: فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (البقرہ:258) (کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے)

اور ان کے بعد آنے والے ملاحدہ اور نجومی اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ (کام) ہونے والا نہیں (یعنی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو سکتا) تو اللہ تعالیٰ ایک دن اسے مغرب سے طلوع فرمائے گا تا کہ وہ منکرین کو اپنی قدرت دکھائے کہ سورج اس کی بادشاہی اور سلطنت میں ہے، اگر وہ چاہے تو وہ اسے مشرق سے طلوع کرے اور اگر چاہے تو وہ اسے مغرب سے طلوع کرے۔ اور اس پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ توبہ اور ایمان کاروان کے لیے ہے جو منکرین میں سے ایمان لائے اور توبہ کی، کیونکہ وہ سورج کے طلوع ہونے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کو جھٹلانے والے ہیں۔ اور رہے اس کی تصدیق کرنے والے تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس سے پہلے کا ان کا ایمان ان کے لیے نفع بخش ہوگا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کسی کافر کا نہ کوئی عمل قبول کیا جائے گا اور نہ ہی توبہ جب کہ وہ اس وقت اسلام لایا جب اس نے اسے دیکھا، مگر وہ جوان دنوں صغیر (نابالغ) ہو اگر وہ اس کے بعد اسلام لے آیا تو اس سے اسے قبول کر لیا جائے گا اور جو گنہگار مومن تھا پس اس نے گناہ سے توبہ کر لی تو اس سے قبول کر لی جائے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 393

اور عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: سورج طلوع ہونے کے وقت اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس وقت ایسی چیخ ہوگی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہو جائیں گے، پس جو اس وقت اسلام لایا یا اس نے توبہ کی اور ہلاک ہو گیا تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور جس نے اس کے بعد توبہ کی تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ اسے ابو اللیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال باقی رہیں گے یہاں تک کہ وہ کھجور کے درخت لگائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے غیب کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے یوم تاتی تا کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً تلتقطہ بعض السیارۃ ہے اور ذھبت بعض أصابعہ ہے۔ اور جریر نے کہا ہے:

لما أتى خبرُ الزبير تواضعتْ سُورُ المدينة والجبالُ الخُشَّعُ

مبرد نے کہا ہے: تانیث مؤنث کی مجاورت کی بنا پر ہے نہ کہ اصل کی بنیاد پر۔ اور ابن سیرین نے لا تنفع کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: وہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ ابن سیرین کی غلطی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس میں نحو کا باریک سا قانون ہے اسے سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور نفس میں سے ہر ایک دوسرے پر مشتمل ہے پس ایمان کو مونث لایا گیا، کیونکہ وہ نفس میں سے ہے اور اس کے ساتھ ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

مَشَيْنَ كما اهتزّتْ رماحٌ تَسفّهتْ أعاليها مَرُّ الرياحِ النَّواسِمِ

مہدوی نے کہا ہے: بہت سے ائمہ مضاف مذکر کے فعل کو مؤنث لاتے ہیں جب اس کی اضافت مونث کی طرف ہو اور مضاف مضاف الیہ کا بعض ہو یا اس سے ہو یا اس کے ساتھ ہو۔ اور اسی پر ذی الرمہ کا قول ہے: مشین ...... البیت۔

پس مرّ (کے لیے فعل) مونث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ الریاح کی طرف مضاف ہے اور وہ مونث ہے جب کہ المرّ من الریاح ہے۔ اور نحاس نے کہا: اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے وہ یہ کہ ایمان کو مونث لایا گیا ہے، کیونکہ وہ مصدر ہے جیسا کہ مصدر مونث کے لیے مذکر فعل لایا جاتا ہے، مثلاً فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (البقرہ: 275) اور جیسا کہ شاعر نے کہا:

فقد عذرتنا في صحابته العذر

اور ایک قول میں عذر کو مؤنث لایا گیا ہے، کیونکہ یہ بمعنی المعذرۃ ہے۔ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی (تمہارے عذاب کا) انتظار کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے کئی گروہ (اے محبوب!) نہیں ہے آپ کا ان سے کوئی علاقہ، ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ اسے حمزہ اور کسائی نے فارقوا الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی قراءت ہے، یہ المفارقۃ اور الفراق سے ماخوذ ہے۔ یہ اس معنی پر ہے کہ انہوں نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس سے نکل گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: واللہ ما فرقوہ ولکن فارقوہ (قسم بخدا! انہوں نے دین میں تفرقہ نہیں ڈالا بلکہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا)۔ اور باقیوں نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، سوائے نخعی کے، کیونکہ انہوں نے اسے فرقوا مخفف پڑھا ہے، یعنی وہ بعض احکام کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ انہوں نے کفر کیا۔ حضرت مجاہد، قتادہ، سدی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مراد یہودی و نصاریٰ ہیں۔ اور وہ تفرقہ کی صفت کے ساتھ متصف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ۝ (البینۃ) (اور نہیں بٹے فرقوں میں اہل کتاب مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان کے پاس روشن دلیل)

اور مزید فرمایا: وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (النساء: 150) (اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان)۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ مراد مشرکین ہیں، ان میں سے بعض نے بتوں کی پوجا کی اور بعض نے فرشتوں کی پرستش کی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت عام ہے اور کفار کو شامل ہے۔ اور ہر وہ جس نے بدعت کا ارتکاب کیا اور ایسا عمل پیش کیا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا تو اس نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (1) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ یہ اہل بدعت، شبہات میں مبتلا کرنے والے اور اس امت کے گمراہ لوگ ہیں۔ اور بقیہ بن ولید نے بیان کیا ہے کہ ہمیں شعبہ بن حجاج، مجالد نے شعبی سے انہوں نے شریح کے واسطہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا بلاشبہ یہ اس امت میں سے اصحاب بدعت، ہوس پرست اور اصحاب ضلالت و گمراہی ہیں (2)۔ اے عائشہ! بے شک ہر گنہگار کے لیے توبہ ہے سوائے بدعت کا ارتکاب کرنے والوں اور ہوس پرستوں کے، ان کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے اور میں ان سے بری ہوں اور وہ ہم سے بری نہیں۔

اور لیث بن ابی سلیم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ قراءت کی۔ اور شِیَعًا کا معنی ہے متفرق گروہ اور جماعتیں۔ اور ہر قوم جن کا نظریہ (اگر) ایک ہو ان میں سے بعض بعض کی رائے کی اتباع اور پیروی کرتے ہوں تو وہی شیع ہے۔ لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اپنی براءت ثابت کر دی۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے: من غشنا فلیس منا یعنی ہم اس سے بری ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

إذا حاولتَ لی أَسَدَ فُجورًا فإنی لستُ منك ولستَ منیّ

ای أنا ابرأ منك (یعنی میں تجھ سے بری ہوں گا)۔ اور فی شیء محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ خبریں موجود ضمیر سے حال ہے،

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 92 2۔ ایضاً

یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس میں مضاف محذوف ہے اور معنی ہے لست من عقابهم فی شئ (ان کی سزا سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں) بلاشبہ آپ پر فقط ڈرانا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ (ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے) یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

''جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لیے دس ہوں گی اس کی مانند۔ اور جو کوئی کرے گا ایک برائی تو نہ بدلہ ملے گا اسے مگر اس (ایک برائی) کے برابر اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ اس میں مَنْ مبتدا اور وہی شرط ہے اور جواب شرط فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ہے یعنی اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیاں ہوں گی، اس میں حسنات کو حذف کر دیا گیا ہے اور امثال کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے جو اس کی صفت ہے (یعنی حسنات أمثالها) اور أمثال، مثل کی جمع ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: عندی عشرۃ نسابات، ای عندی عشرۃ رجال نسابات (میرے پاس دس صاحب نسب آدمی ہیں تو اس میں رجال کو حذف کر کے اس کا قائم مقام نسابات جو کہ صفت ہے، کو رکھ دیا گیا ہے)

اور ابوعلی نے کہا ہے: عَشْرُ اَمْثَالِهَا میں تانیث اچھی ہے، کیونکہ اُمثال مونث کی طرف مضاف ہے اور مؤنث کی طرف اضافت جب معنی میں بھی ہو تو اس میں تانیث اچھی اور حسین ہوتی ہے، جیسے يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ (یوسف: 10) اور ذهبت بعض أصابعه۔

حسن، سعید بن جبیر اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم نے فَلَهٗ عَشْرٌ اَمْثَالُهَا پڑھا ہے اور تقدیر عبارت ہوگی: فله حسناتٌ أمثالها یعنی اس کے لیے اس جزا میں سے دس گناہ ہوگی جو اس کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کے لیے ایک مثل ہو اور پھر اس مثل کو کئی گناہ کیا جاتا ہو اور وہ پس وہ دس ہو جاتی ہو۔ اور یہاں الحسنة سے مراد ایمان ہے، یعنی جس نے یہ شہادت دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے دنیا میں جو بھی نیکی اور خیر کا عمل کیا اس کے ہر عمل کے بدلے ثواب دس گنا ہوگا۔

وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ یہاں سیئة سے مراد شرک ہے۔

فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا (تو اسے بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اس ایک برائی کے برابر) اور وہ بدلہ ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے، کیونکہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور آتش جہنم میں سب سے بڑی سزا ہے، پس اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ (النباء) یعنی ایسی جزا جو عمل کے موافق ہوگی۔ اور رہی نیکی تو وہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نص موجود ہے اور حدیث میں ہے: الحسنة بعشر أمثالها وأزيد والسيئة واحدةٌ وأغفر فالويل لمن غلبت أحاده أعشاره (ایک نیکی کا بدلہ دس گنا اور اس سے بھی زائد ہے اور برائی (گناہ) ایک ہے اور اس کی مغفرت فرما دیتا ہوں لیکن ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لیے جس کی ایک برائی ان دس پر غالب آ گئی)۔

اور اعمش نے ابو صالح سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حسنہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور سیئہ سے مراد شرک ہے۔

وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی ان کے اعمال کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا۔ تحقیق اس آیت کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہ انفاق فی سبیل اللہ سے مختلف ہے اور اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے: دس گنا تمام نیکیوں کے لیے ہے۔ اور سات سو گنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے اور اس میں خاص اور عام برابر ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: عوام کے لیے دس گنا (بدلہ) ہوتا ہے اور خواص کے لیے سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ جو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ امر توقیف کا محتاج ہوتا ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ خریم بن فاتک کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے اس میں ہے: اما حسنة بعشر فمن عمل حسنة فله عشر أمثالها و أما حسنة بسبعمائة فالنفقة في سبيل الله (ایک نیکی دس کے برابر ہے پس جس نے ایک نیک عمل کیا تو اس کے لیے اس کی مثل دس ہوں گی اور رہی وہ نیکی جو سات سو کے برابر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے)۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٦١﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٦٣﴾

”آپ فرمائیے بے شک مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے۔ آپ فرمائیے بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔ نہیں کوئی شریک اس کا اور مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ کفار نے تفرقہ ڈالا (تو ساتھ ہی) بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح دین تک پہنچا دیا اور وہ دین ابراہیمی ہے۔ دِيْنًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یہ قطرب سے منقول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کی نصب هَدٰىنِيْ فعل کی وجہ سے ہے یہ اخفش کا قول ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور نے کہا ہے: معنی پر محمول ہونے کی وجہ سے یہ منصوب ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے هداني عرفني دينا (اس نے مجھے سیدھے راستے تک پہنچایا اور دین کی مجھے پہچان کرا دی) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صِرَاطٍ سے بدل ہو یعنی هداني صراطا مستقيما دينا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے، گویا کہ یہ کہا: اتبعوا دينا، واعرفوا دينا (یعنی تم دین کی اتباع کرو اور دین کی معرفت حاصل کرو)

قِيَمًا کوفیوں اور ابن عامر نے اسے قاف کے کسرہ اور تخفیف اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے جیسا کہ شبع اور اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور باقیوں نے قاف کے فتحہ یا کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَيِّمًا۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور یا اصل میں واؤ ہے قيوم پھر واؤ کو یاء سے بدل کر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا ہے جیسے میت میں ہوا

ہے۔ اور اس کا معنی سیدھا (صحیح) دین جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ یہ بدل ہے۔ حَنِیْفًا زجاج نے کہا ہے: یہ ابراہیم سے حال ہے اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ منصوب ہے اور اس سے پہلے أعنی فعل مضمر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ لفظ صلوٰۃ کا مادہ اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد رات کی نماز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عید کی نماز مراد ہے۔ اور النسك، نسیکۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ذبیحہ (ذبح شدہ جانور یعنی قربانی) اور حضرت مجاہد، ضحاک اور سعید بن جبیر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور معنی یہ ہے: حج اور عمرہ میں میری قربانی۔ اور حسن نے کہا ہے: نُسُكِیْ سے مراد ہے میرا دین۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری عبادت۔ اور اسی سے ناسك وہ کہلاتا ہے جو عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس آیت میں نسك سے مراد نیکی اور طاعت کے جمیع اعمال ہیں۔ اور یہ معنی تیرے اس قول سے لیا گیا ہے: نسك فلان فھو ناسك جب کوئی عبادت گزار ہو۔

وَ مَحْیَایَ یعنی جو عمل میں اپنی زندگی میں کروں گا۔ وَ مَمَاتِیْ یعنی وہ اعمال جن کے بارے میں اپنی وفات کے بعد کرنے کی وصیت کروں گا۔ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ان کے ذریعے خالصۃ اسی کے قرب کا ارادہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ یعنی میرا جینا اور میرا مرنا اسی کے لیے ہے۔ اور حسن نے نسکی سین کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اہل مدینہ نے و محیای درج کلام میں یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عام نے یا کو مفتوح پڑھا ہے، کیونکہ اس میں دو ساکن (الف اور یا) جمع ہو جاتے ہیں،

اور اس میں الف مدہ ہے یہ حرکت کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور یونس نے إضربان زیدا کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ اس میں اجتماع ساکنین ہے اور دوسرے میں ادغام بھی نہیں ہے اور جنہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے مطابق پڑھا ہے اور غلطی سے بچنا چاہا ہے تو انہوں نے محیای پر وقف کیا ہے تو اس صورت میں وہ جملہ نحویوں کے نزدیک غلطی کا مرتکب نہیں ہے۔ اور ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمر اور عاصم جعدری نے و محییّ دوسری یاء کو شد کے ساتھ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور یہ علیا مضر کی لغت ہے وہ کہتے ہیں: قفی اور عصی اور اہل لغت نے کہا ہے:

سبقوا ھوَیّ وأعنقوا الھواھم (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نماز کا آغاز اس ذکر سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرنے کا ارادہ فرماتے تو یہ کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تا قولہ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے(1) کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے اور میں اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہوں تو میرے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دے بلاشبہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا اور میری اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی فرما اور تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا اور مجھ سے برے اخلاق کو پھیر دے (دور کر دے) اور تیرے سوا مجھ سے کوئی انہیں دور نہیں کر سکتا میں حاضر ہوں جملہ سعادتیں تیرے پاس ہیں اور تمام تر بھلائیاں تیرے قبضے میں ہیں اور تیری طرف شر کو کوئی راہ نہیں۔ تو سراپا برکت ہے اور بلند مرتبہ اور غالب ہے۔ أستغفرك وأتوب إليك (میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں)'' الحدیث۔

اور اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ہمیں نضر بن شمیل کی طرف سے خبر پہنچی ہے اور یہ لغت اور دیگر علوم کے علماء میں سے تھا اس نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد هو الشر ليس إليك کا معنی یہ ہے کہ شر ان چیزوں میں سے نہیں جن کے ساتھ تیرا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نماز میں توجیہ (یعنی وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي...... الآیہ پڑھنا لوگوں پر واجب نہیں، بلکہ ان پر تکبیر اور پھر قرأت واجب ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں دیکھا جو قراءت سے پہلے لوگ کہتے ہیں: (یعنی) سبحانك اللهم وبحمدك اور اختصار میں وہ ہے جو المختصر میں مذکور نہیں۔ کہ امام مالک یہ خالصۃً اپنے بارے میں کہتے تھے، کیونکہ اس کے بارے حدیث صحیح ہے اور آپ اس خوف سے لوگوں کو اس کے بارے نہیں کہتے تھے کہ وہ اس کے واجب ہونے کا اعتقاد رکھ لیں گے۔ علامہ ابو الفرج جوزی نے کہا ہے کہ میں اپنے بچپنے میں اپنے شیخ ابوبکر الدینوری کے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔ تو انہوں نے مجھے ایک مرتبہ ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے بیٹے! بے شک فقہاء نے قراءت فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے، اور ان کے اس بارے کوئی اختلاف نہیں کہ افتتاح (ثنا پڑھنا) سنت ہے، پس تو واجب میں مشغول ہو اور سنن کو چھوڑ دے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل اس اعرابی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جسے آپ نے نماز سکھائی: ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ اور پھر قراءت کر''۔ اور آپ نے اسے یہ نہیں فرمایا: سبح (کہ تو تسبیح یعنی سبحانك اللهم وبحمدك پڑھ)

1۔ صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین و قصرها، جلد 1، صفحہ 263

جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور نہ یہ فرمایا کہ تو کہہ: وجھتُ وجھی جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تو کیسے پڑھتا ہے جب نماز شروع کرتا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی: میں کہتا ہوں (1) اللہ اکبر، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (فاتحہ) پس انہوں نے نہ تو توجیہ (یعنی انی وجھت وجھی) اور نہ ہی تسبیح (یعنی سبحانك اللھم) کا ذکر کیا۔ اور اگر کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کہا کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے: یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تکبیر سے پہلے کہتے ہوں اور بعد ازاں اللہ اکبر کہتے ہوں اور یہی ہمارے نزدیک حسن ہے۔

اور کہا جائے کہ نسائی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے: اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ الحدیث، تو ہم کہیں گے: ہم اسے رات کی نفل نماز پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ نسائی کی کتاب میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کے وقت نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: سبحانك اللھم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا إله غيرك یا مطلق نفل نماز میں آپ اس طرح پڑھتے تھے، کیونکہ نفل نماز فرض نماز سے اخف ہے، کیونکہ نفل نماز کھڑے، بیٹھے اور سوار ہونے کی حالت میں پڑھنا جائز ہوتی ہے اور سفر میں منہ قبلہ شریف کی طرف ہو یا کسی اور طرف، پس اس کا معاملہ آسان ہے۔

اور نسائی نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نفل نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ (انعام) اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۞ اللھم أنت الملك لا إله إلا انت سبحانك وبحمدك پھر قراءت کرتے تھے۔

یہ نفلوں میں ہونے پر نص ہے نہ کہ واجب میں۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ فرض نماز میں تکبیر کے بعد تھا، تو پھر اسے جواز اور استحباب پر محمول کیا جائے گا اور رہا امر مسنون تو وہ تکبیر کے بعد قراءت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔ پھر جب آپ نے یہ کہا تو یہ نہیں کہا: وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اور اس کی وضاحت یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ان میں سے کوئی بھی اول نہیں۔ پس اگر کہا جائے: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام آپ سے پہلے نہیں ہیں؟ تو ہم کہیں گے: اس کے تین جواب ہیں۔

(۱) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معنوی طور پر تمام مخلوق میں سے اول ہیں، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: نحن الآخرون الأولون یوم القیامة ونحن اول من یدخل الجنة (3) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن اوّل ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے) اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: نحن الآخرون من اهل الدنیا والأولون یوم القیامة المقضی لهم قبل الخلائق (ہم اہل دنیا میں سے آخر ہیں اور قیامت کے دن اوّل ہوں گے مخلوقات سے پہلے ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا)۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 653 2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 159 3۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 282

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ہیں، کیونکہ آپ خلق میں ان پر مقدم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کنت اول الأنبیاء فی الخلق و آخرهم فی البعث (1) (میں خلقت میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اوّل ہوں اور بعث میں اس سے آخر میں ہوں) پس یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام وغیرہ سے پہلے آیا ہے۔

(۳) اوّل المسلمینَ من اهل ملته (کہ میں اہل دین میں سے پہلا مسلمان ہوں) یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔ اور اوّل کے بارے روایات مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض میں ان کا ثبوت ہے اور بعض میں نہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (2) یا فاطمة قومی فأشهدی أضحیتكِ فإنه یغفر لك فی اوّل قطرة من دمها كلّ ذنب عملتیه ثم قولی: اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (اے فاطمہ! اٹھ اور اپنی قربانی کے پاس حاضر ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے خون کے پہلے قطرہ کے ساتھ ہی تیرے ہر اس گناہ کو بخش دے گا جو تو نے کیا اور پھر یہ کہا: اِنَّ صَلَاتِیْ الخ) عمران نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (اعزاز) صرف آپ کے لیے اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہے یا مسلمانوں کے لیے عام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے''۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ۭ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور رب حالانکہ وہ رب ہے ہر چیز کا۔ اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، پھر اپنے رب کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے تو وہ بتائے گا تمہیں جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ یعنی (آپ فرمائیے کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں) حالانکہ وہ ہر شی کا مالک ہے۔ روایت ہے کہ کفار نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ اور ہمارے الہوں کی عبادت کرو اور جس دین پر تم ہو اسے ترک کر دو، تو ہم تمہارے لیے ہر اس تاوان کے ضامن ہوں گے (3) جس میں آپ اپنی دنیا اور آخرت میں واقع ہوں گے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ استفہام ہے جو تقریر اور زجر و توبیخ کا تقاضا کرتا ہے اور غیر، أبغی فعل کے سبب منصوب ہے اور ربًا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 282　2۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 101　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 370

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا یعنی تمہارا اس حال پر ہونا مجھے الله کے سوا کوئی اور رب تلاش کرنے کی صورت میں مجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا، کیونکہ کوئی شخص (کوئی چیز) نہیں کماتا مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے، یعنی جو معصیت اور گناہ اس نے کیا اور جو خطا اس سے صادر ہوئی اس کا مؤاخذہ اس کے سوا کسی اور سے نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مخالفین میں سے بعض علماء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ فضولی کی بیع صحیح نہیں ہوتی اور یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت سے مراد یہ ہے کہ اسے ثواب و عقاب پر محمول کیا جائے گا (1) نہ کہ احکام دنیا پر۔ اس کی دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى جیسا کہ اس کا بیان آئے گا۔ اور فضولی کی بیع ہمارے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، اگر وہ اس کی اجازت دے دے تو وہ جائز ہو جاتی ہے۔ عروہ البارقی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خرید و فروخت کی اور آپ کے حکم کے بغیر تصرف کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت عطا فرما دی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

بخاری اور دارقطنی نے عروہ بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ مال (بکریاں) لائی گئیں تو آپ نے مجھے ایک دینار عطا فرمایا اور فرمایا: ''اے عروہ! مال کے پاس جاؤ اور ہمارے لیے اس دینار کے عوض ایک بکری خرید لو''۔ پس میں اس مال کے پاس آیا اور میں نے سودا کیا اور میں نے ایک دینار کے بدلے دو بکریاں خریدیں اور میں ان دونوں کو ہانک کر لے آیا تو راستے میں ایک آدمی مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے سودا کیا تو میں نے اسے ایک بکری ایک دینار کے عوض بیچ دی اور میں دوسری بکری اور ایک دینار لے کر آیا اور عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم یہ بکری ہے اور یہ آپ کا دینار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''تم نے یہ کیسے کیا''؟ تو میں نے آپ کو ساری بات عرض کی۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللهم بارك له في صفقة يمينه (اے الله! اس کے لیے اس کے کاروبار میں برکت رکھ دے) پھر میں نے دیکھا کہ میں کوفہ کے محلہ کناسہ میں ٹھہرا ہوا ہوں اور میں نے چالیس ہزار کا نفع کمایا اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچوں۔ یہ دارقطنی کے الفاظ ہیں۔

ابوعمر نے کہا ہے: یہ حدیث جید ہے اور اس میں دو بکریوں کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہونا صحیح ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے وہ دینار نہ لیتے اور نہ اپنے لیے بیع کو نافذ کرتے۔ اور اس میں وکالت کے جائز ہونے پر دلیل ہے اور اس میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب کوئی مؤکل اپنے وکیل کو کہے: تو اس طرح خرید۔ تو اس نے اس سے زیادہ کے عوض خریدا جس کے ساتھ اسے وکیل بنایا گیا تھا، تو کیا وہ امر لازم آئے گا یا نہیں؟ جیسا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہے: تو اس درہم کے عوض ایک رطل کا گوشت خرید لا، جس کا وصف (کوالٹی) یہ ہو۔ پس اس نے اس کے لیے اسی وصف کا چار رطل گوشت اس ایک درہم کے عوض خریدا۔ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 772

تمام کا تمام مؤکل کے لیے لینا لازم ہوگا بشرطیکہ صفت اور جنس میں موافقت ہو، کیونکہ وہ محسن (نیکی اور احسان کرنے والا) ہے۔ اور یہی قول امام یوسف اور امام محمد بن حسن کا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ زیادتی مشتری کے لیے ہوگی۔ اور یہ حدیث آپ کے خلاف حجت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، یعنی کسی شخص سے دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر نفس کا مواخذہ اس کے اپنے جرم کے سبب ہوگا اور اپنے گناہ کے سبب اسے سزا دی جائے گی۔ الوزر کا اصلی معنی ثقل (بوجھ) ہے اور اسی کے مطابق الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ (الم نشرح) (اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اتار دیا) اور یہاں اس کا معنی ذنب (گناہ) ہے، جیسا کہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (انعام: 31) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: وَزَرَ يَوْزَرُ اور وُزِرَ يُوزَرُ اور وَزِرَ يَوْزَرُ، وَزْرًا اور إِزْرًا بھی جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: إِسادة (کہ یہ اصل میں وسادۃ تھا) اور یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ کہتا تھا: تم میرے راستے کی اتباع اور پیروی کرو میں تمہارے بوجھ اٹھالوں گا۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اس نظریہ کے رد کے لیے نازل ہوئی کہ آدمی سے اس کے باپ اور بیٹے کے بدلے اور اس کے حلیف کے گناہ کے بدلے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت سے مراد آخرت میں ہو اور اسی طرح اس آیت سے بھی جو اس سے پہلے ہے اور رہی دنیا تو اس میں بعض سے بعض کے جرم کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے، بالخصوص جب نیک اور اطاعت شعار لوگ گنہگاروں کو نہ روکیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (المائدہ: 104) کے ضمن میں حدیث ابی بکر میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال: 25) (اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہوگیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: 11) (بے شک الله تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے)

اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک اور صالح لوگ ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں جب زنا بڑھ جائے گا" (1)۔ علماء نے بیان کیا ہے: (کہ اس کا معنی ہے) زنا کی اولاد (جب زیادہ ہوجائے گی) اور الخبث با کے فتحہ کے ساتھ یہ زنا کا اسم ہے۔ پس الله تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس کے ذریعہ دیت خطا عاقلہ پر واجب کی ہے یہاں خون کی تعظیم کی خاطر کسی آزاد مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے اور اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن والشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 1056

نہیں ہے اور اس پر دلیل وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم اس دنیا میں ہو کہ عمرو کے فعل کا مؤاخذہ زید سے نہیں لیا جائے گا کہ جو جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کا انجام اسی پر ہوگا۔ اور ابو داؤد نے ابو رمثہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں اپنے باپ کے ساتھ حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، تو حضور نبی کریم ﷺ نے میرے باپ کو فرمایا: ''کیا یہ تیرا بیٹا ہے''؟ تو باپ نے جواباً عرض کیا: ہاں رب کعبہ کی قسم۔ مزید کہا: حقا (یہ حق ہے) مزید کہا: اشھد بہ (میں اس کے بارے شہادت دیتا ہوں)۔ ابو رمثہ کہتے ہیں: میرے باپ کے ساتھ میری مشابہت ثابت ہونے اور میرے باپ کے مجھ پر قسم کھانے سے حضور نبی کریم ﷺ خوب کھل کر مسکرائے۔ پھر ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ وہ تجھ پر کوئی گناہ نہیں ڈالے گا اور تو اس پر کوئی گناہ نہ ڈال سکے گا'' اور پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور یہ اس کے معارض نہیں ہے جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: 13) (اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ) کیونکہ اسے دوسری روایت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے: لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل: 25) (تاکہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہے ہیں (جہالت سے) پس جو ضلالت و گمراہی میں امام بنا اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت دی اور اس پر عمل پیرا رہا تو اس پر ان کا بوجھ بھی ڈالا جائے گا جنہیں اس نے گمراہ کیا لیکن اس سے گمراہ ہونے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

''اور وہی ہے جس نے بنایا تمہیں (اپنا) خلیفہ زمین میں اور بلند کیا ہے تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں تاکہ آزمائے تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا فرمائی ہے، بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ، خَلٰٓئِفَ خلیفہ کی جمع ہے، جیسے کرائم، کریمۃ کی جمع ہے اور ہر وہ جو گزر جانے والے کے بعد آئے وہی خلیفہ ہوتا ہے (1)، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں گزشتہ امتوں اور قرون سابقہ کا خلیفہ بنایا ہے۔ شماخ نے کہا ہے:

تصیبُهُم و تخطِئنِي المنايا　　وأخلُف في رُبوعٍ عن رُبوعِ

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ یعنی خلقت، رزق، قوت، طاقت اور فضل و علم میں، بعض کو بعض پر اس نے بلند کیا۔

---

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 147

دَرَجٰتٍ حرف جر کے حذف کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، یعنی الی درجات لِّيَبْلُوَكُمْ اسے لام کی کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور ابتلاء کا معنی اختبار (آزمائش) ہے یعنی تاکہ وہ تم میں سے اسے ظاہر کرے جو اس کا انجام ہوگا ثواب یا عقاب۔ اور وہ اپنے علم کے ساتھ ہمیشہ مستغنی ہے۔ پس اس نے خوشحال اور دولت مند کو دولت اور غنا کے ساتھ آزمایا اور اس سے شکر کا مطالبہ کیا اور اس نے تنگ دست کو فقر و افلاس کے ساتھ آزمایا اور اس سے صبر کا مطالبہ کیا۔ اور کہا جاتا ہے: لِّيَبْلُوَكُمْ یعنی تاکہ تم میں سے بعض بعض کو آزمائیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (الفرقان:20) (اور ہم نے بنا دیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش) اس کا بیان آگے آئے گا۔

پھر انہیں خوفزدہ کیا اور فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ بے شک آپ کا رب اسے جلد سزا دینے والا ہے جو اس کی نافرمانی اور گناہ کرے۔ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اور بے شک وہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اس کے لیے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے)

اور فرمایا: سَرِيْعُ الْعِقَابِ اس کے باوجود کہ اس کا وصف امہال (مہلت دینا) ہے اور اس کے باوجود کہ آگ کا عذاب جو آخرت میں ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ ہر آنے والی شی قریب ہوتی ہے، پس وہ اس بنا پر جلد سزا دینے والا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (النحل:77) (اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد) اور مزید فرمایا یَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ (المعارج) (کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے لیکن ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) اور وہ اس کے لیے بھی سَرِيْعُ الْعِقَابِ ہو سکتا ہے جو دار دنیا میں اس کا مستحق ہو جائے، پس یہ اس جہت پر خطائیں اور گناہ واقع ہونے کی جگہوں اور مقامات کے لیے تحذیر اور ڈراوا ہے (1)۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۃ الانعام کا ترجمہ آج مورخہ 16 اگست 2007 بروز جمعرات بوقت 12 بج کر 45 منٹ پر اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ علی ذالك و الصلوٰۃ و السلام علی سید الأنبیاء و المرسلین و علی آله و اصحابه اجمعین

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 1، صفحہ 529

# سورۃ الاعراف

(آیاتہا ۲۰۶) (۷ سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَکِّیَّۃٌ ۳۹) (رکوعاتہا ۲۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یہ مکی سورت ہے، سوائے آٹھ آیتوں کے اور وہ یہ ہیں رب کریم کے ارشاد: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ سے لے کر قولہ تعالیٰ: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ تک (1)۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف پڑھی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کیا (2)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔

**الٓمّٓصٓ ۚ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝**

"الف، لام، میم، صاد۔ یہ کتاب ہے نازل کی گئی ہے آپ کی طرف پس چاہیے کہ نہ ہو آپ کے سینہ میں کچھ تنگی اس (کی تبلیغ) سے (یہ نازل کی گئی ہے) تاکہ آپ ڈرائیں اس سے اور یہ نصیحت ہے مومنوں کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓصٓ سورۃ البقرہ کے شروع میں ان حروف کی بحث گزر چکی ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور كِتٰبٌ اس کی خبر ہے، گویا کہ یہ فرمایا: الٓمّٓصٓ حروف كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (یہ حروف ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے) اور کسائی نے کہا ہے: ای ھذا کتاب (یہ کتاب ہے) (اس میں کتاب خبر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ھذا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: حَرَجٌ، ای ضیق (تنگی) یعنی آپ کا سینہ تبلیغ کے سبب تنگ نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: إنی أخاف أن يثلغوا رأسی فيدعوه خُبزۃ (3) (مجھے خوف ہے کہ وہ میرا سر کچل دیں اور اسے ٹکیہ جگہ میں پھینک دیں) الحدیث۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر میں یہ کلام نہی ہے، لیکن اس کا معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی کی نفی کرنا ہے، یعنی لا یضیق صدرك ألا يؤمنوا به (آپ کا سینہ تنگ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایمان نہیں لائے) بلاشبہ آپ پر تبلیغ کرنا لازم ہے اور اس کے ساتھ ڈرانے کے سوا ان کے ایمان یا کفر میں سے کوئی شے آپ پر لازم نہیں، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیہ (الکہف:6) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو) اور مزید فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

1۔ المحرر الوجیز　　2۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح باب القراۃ فی المغرب بالمص، حدیث نمبر 980،
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا، جلد 2، صفحہ 385

اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (الشعراء) ((اے جان عالم!) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے)۔ اور حضرت مجاہد اور قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ یہاں حرج کا معنی شک ہے (1)، لیکن یہ کفر کا شک نہیں بلکہ تنگی کا شک ہے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۝ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اور اس (قول میں) بہت بعد ہے۔ اور منه میں ہا ضمیر قرآن کے لیے ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ انذار کے لیے ہے، یعنی أنزل إلیك الکتاب لتنذر به فلا یكن فی صدرك حرج منه (آپ کی طرف کتاب نازل کی گئی تا کہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں پس آپ کے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو) پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس تکذیب کے لیے ہے جو آپ کو قوت کلام عطا کر رہی ہے یعنی فلا یكن فی صدرك ضیق من تکذیب المکذبین له (آپ کے سینے میں اسے جھٹلانے والوں کی تکذیب سے کوئی تنگی نہ ہو)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ ذِكْرٰی اس کے لیے جائز ہے کہ یہ محل رفع، محل نصب اور محل خفض (جر) میں ہو۔ پس رفع کی دو وجہیں ہیں۔ بصریوں نے کہا ہے: یہ مبتدا مضمر کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف كِتٰبٌ پر ہے (لہٰذا یہ مرفوع ہے) اور نصب کی بھی دو وجہیں ہیں: ایک مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر، یعنی وذکری به ذکری یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف أنزلناه کی ہا ضمیر ہے (لہٰذا یہ منصوب ہے) اور محل جر اس بنا پر ہے کہ اسے لِتُنْذِرَ بِهٖ کے محل پر محمول کیا جائے۔ اور انذار (ڈرانا) کافروں کے لیے ہے اور نصیحت مومنوں کے لیے ہے، کیونکہ یہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"(اے لوگو!) پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اور نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کی، بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) یعنی کتاب و سنت۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ امر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سبھی کو شامل ہے اور ظاہر کلام یہ ہے کہ یہ امر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام لوگوں کے لیے ہے، یعنی اتبعوا ملة الإسلام والقرآن (تم دین اسلام اور قرآن کی پیروی کرو اور اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 54

کے حلال کو حلال قرار دو اور اس کے حرام کو حرام قرار دو اور اس کے امر کی پیروی کرو اور اس کی نہی سے اجتناب کرو(1)۔ اور یہ آیت نص کی موجودگی میں آراء کی پیروی ترک کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ، مِنْ دُوْنِهٖۤ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے دوستوں کی پیروی نہ کرو) اس میں ہا ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی یہ ہے: تم اس کے ساتھ کسی غیر کی عبادت نہ کرو اور نہ اسے دوست بناؤ جو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیر دے اور ہر وہ جس نے کسی مذہب کو پسند کر لیا تو وہ مذہب رکھنے والے اس کے اولیاء اور دوست ہیں۔

اور حضرت مالک بن دینار سے روایت ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی: وَ لَا تَبْتَغُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوست تلاش نہ کرو) اور اَوْلِیَآءَ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے (جو قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ضمیر اس ما کی طرف لوٹ رہی ہے جو اس قول میں ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم، قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۝ اس میں ما زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ما فعل کے ساتھ مصدر ہوتا ہے۔

وَ كَمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَیَاتًا اَوْ هُمْ قَآىٕلُوْنَ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ۝۵

"اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت یا جب وہ دو پہر کو سو رہے تھے۔ پس نہ تھی ان کی (چیخ و) پکار جب آیا ان پر ہمارا عذاب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا: بے شک ہم ہی ظالم تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اس میں كَمْ تکثیر کے لیے ہے، جس طرح کہ رُبَّ تقلیل کے لیے ہوتا ہے۔ اور کم مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اَهْلَكْنٰهَا اس کی خبر ہے، یعنی بہت سی بستیاں تھیں۔ قری بہت سے لوگوں کے اکٹھا رہنے کی جگہوں کو کہتے ہیں۔ ہم نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ اور کم کو اس بنا پر محل نصب میں قرار دینا بھی جائز ہے کہ اس کے بعد فعل مضمر ہو اور اس سے پہلے فعل مقدر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ استفہام اپنے سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور پہلے قول کو یہ قول تقویت دیتا ہے: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ (الاسراء: 17) (اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد) اگر اَهْلَكْنٰهَا ضمیر کے ساتھ مشغول نہ ہوتا تو اس کے ساتھ کم کا محل یقیناً منصوب ہوتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَهْلَكْنٰهَا، قَرْیَةٍ کی صفت اور كَمْ معنی میں ھی القریة ہو اور جب تو نے القریة کی صفت لگائی تو گویا تو نے کم کی صفت لگائی۔

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا (النجم: 26) (اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آ سکتی) پس ضمیر معنی کے اعتبار سے كَمْ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ معنی میں ملائکہ ہیں۔ پس اس تقدیر پر یہ صحیح نہیں ہے کہ كَمْ محل نصب میں ہو اس فعل کے سبب جو اس کے بعد مضمر ہو۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 766

فَجَآءَهَا بَاْسُنَا اس میں اشکال ہے فا کے ساتھ عطف ہونے کی وجہ سے۔ پس فراء نے کہا ہے: فا بمعنی واؤ ہے، پس ترتیب لازم نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے: (کہ اصل عبارت ہے) وکم من قریۃ أردنا إھلا کھا فجاءھا بأسنا (اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے برباد کرنے کا ارادہ کیا پس ہمارا عذاب ان پر آیا) جیسے یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (النحل) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہلاکت اور بربادی بعض قوم پر واقع ہوئی، پس تقدیر کلام ہوگی: وکم من قریۃ أھلکنا بعضھا فجاءھا بأسنا فأھلکنا الجمیع (اور کتنی بستیاں تھیں ان میں سے بعض کو ہم نے برباد کر دیا پھر ہمارا عذاب ان پر آیا تو ہم نے تمام کو ہلاک کر دیا)۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے اور کتنی بستیاں تھیں ہم نے انہیں اپنے حکم اور فیصلے میں برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے انہیں اپنی طرف سے ملائکہ عذاب ان کی طرف بھیج کر برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا اور بأس سے مراد تباہ و برباد کر دینا، جڑ سے اکھیڑ دینا ہے۔ اور البأس کا معنی آدمی پر آنے والا عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: أھلکنا ھا فکان إھلا کنا ایاھم فی وقت کذا، فمجیء البأس علی ھذا ھو الإھلاك (ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ہمارا انہیں ہلاک کرنا فلاں وقت میں تھا، پس اس بنا پر عذاب آنے کا معنی ہلاک و برباد کرنا ہے)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ باس (عذاب) إھلاك (ہلاک کرنا) کے علاوہ ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور فراء نے بھی بیان کیا ہے کہ جب دو فعلوں کا معنی ایک ہو یا ایک کی طرح ہو تو ان میں سے جسے چاہے پہلے ذکر کر دے، پس معنی یہ ہے وکم من قریۃ جاءھا باسنا فاھلکناھا، جیسے دَنَا فقَرُب اور قَرُب فدنا (دونوں کا معنی قریب ہونا ہے) اور شتمنی فأساء اور أساء فشتمنی، کیونکہ الإساءۃ اور الشتم (برا بھلا کہنا) دونوں ایک شی ہیں۔(1)

اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر: 1) اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور انشق القمر فاقتربت الساعۃ دونوں کا معنی ایک ہے (قیامت قریب ہوئی اور چاند پھٹ گیا) بَیَاتًا اس کا معنی ہے۔ لیلا (رات کے وقت) اور اسی سے البیت ہے، کیونکہ اس میں رات گزاری جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بات یبیت بیتا وبیاتا (رات گزارنا) اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ یعنی یا اس حال میں کہ وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ پس انہوں نے ثقیل سمجھا تو انہوں نے واؤ کو حذف کر دیا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ جب ذکر دوبارہ ہو تو واؤ کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ کہتے ہیں: جاءنی زیدٌ راکبا أو ھو ماش اس میں واؤ کی ضرورت نہیں (اور وھو ماش نہیں کہا جائے گا) مہدوی نے کہا: یہ نہیں کہا بیاتا أو وھم قائلون کیونکہ جملہ میں ایک ضمیر ہے جو اول کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ واؤ سے مستغنی ہے۔ اور یہ معنی میں زجاج کے قول کے ساتھ برابر ہے اور یہاں اَوْ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ تفصیل کے لیے ہے، جیسے آپ کے اس قول میں: لأکرمنك منصفاًلی أو ظالما (میں ضرور بضرور تیری عزت و تکریم کروں گا تو میرے ساتھ

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 371

انصاف کرے یا ظلم) اور نحویوں کے نزدیک اس واؤ کو واوالوقت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور قَآىِٕلُوْنَ یہ قائلۃ سے ہے اور اس کا معنی ہے قیلولہ کرنا۔ اور اس کا معنی ہے دوپہر کے وقت سونا۔ اور یہ بھی کہا ہے: الإستراحة نصف النهار إذا إشتد الحر وإن لم يكن معها نوم (دوپہر کے وقت آرام کرنا جب گرمی شدید ہو اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو) اور آیت کا معنی یہ ہوا: ہمارا عذاب ان پر آیا اس حال میں کہ وہ غافل تھے یا تورات کے وقت یا دن کے وقت۔ اور الدعویٰ اس کا معنی دعا (پکارنا) ہے اور اسی سے یہ قول ہے: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ (یونس:10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی)

اور نحویوں نے بیان کیا ہے: اللهم أشركنا في صالح دعوى من دعاك (اے الله! ہمیں اس اچھی اور صالح دعا میں شریک کرنا جو کوئی تجھ سے مانگے) اور کبھی دعویٰ بمعنی ادعاء (دعویٰ کرنا) بھی ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ بربادی اور ہلاکت کے وقت اس اقرار میں مخلص تھے کہ وہ ظالم لوگ تھے۔ اور دَعْوٰىهُمْ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا اسم اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا ہے اور اس کی نظیر فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا (النمل:56) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الدعوی محل رفع میں ہو اور اَنْ قَالُوْۤا محل نصب میں، جیسے الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا (البقرہ:177) اس میں البر رفع کے ساتھ ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا (الروم:10) اس میں عاقبۃ رفع کے ساتھ ہے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ ۝

''سو ہم ضرور پوچھیں گے ان سے بھیجے گئے (رسول) جن کی طرف اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے۔ پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے اور نہ تھے ہم ان سے غائب''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار سے حساب لیا جائے گا۔ اور قرآن میں ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ) (پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے)۔

اور سورۃ القصص میں ہے: وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (القصص) (اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ) یعنی جب وہ عذاب میں قرار پکڑ جائیں گے۔ اور آخرت میں کئی وطن ہوں گے۔ ایک وطن ایسا ہوگا جس میں حساب و کتاب کے لیے پوچھ گچھ کی جائے گی اور ایک وطن ایسا ہوگا جس میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور ان سے سوال (عذاب کو) پختہ کرنے، زجر و توبیخ اور انہیں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ہوں گے۔ اور رسولوں سے سوال اپنے بارے میں گواہ لانے اور تفصیل بیان کرنے کے بارے ہوں گے یعنی انہیں ان کی قوم نے جو جوابات دیئے (ان کے بارے ان سے پوچھا جائے گا)

اور الله تعالیٰ کے اس ارشاد: لِيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (الاحزاب:8) (یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق) کا یہی معنی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ یعنی انبیاء علیہم السلام سے ہم پوچھیں گے۔ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ اور ہم ان ملائکہ سے پوچھیں گے جو ان کی طرف بھیجے گئے۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ میں لام قسمیہ ہے اور یہ حقیقۃً تاکید کے لیے ہے۔ اور اسی طرح فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ) ان پر (ان کے حالات) بیان کرے گا۔ وَّ مَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ یعنی ہم ان کے اعمال کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ اور آیت اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ جاننے والا ہے۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَىِٕذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹

''اور (اعمال کا) تولنا اس دن برحق ہے پس جن کے بھاری ہوئے ترازو تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور جن کے ہلکے ہوئے ترازو تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو بوجہ اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الْوَزْنُ يَوْمَىِٕذِ الْحَقُّ یہ مبتدا اور خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ الْحَقُّ صفت ہو اور خبر يَوْمَىِٕذٍ ہو اور یہ بھی جائز ہے الْحَقُّ مصدر کی بنا پر منصوب ہو۔

اور وزن سے مراد میزان (ترازو) کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کرنا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بندوں کے صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا اور یہی صحیح ہے اور اسی کے بارے حدیث میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میزان سے مراد وہ کتاب ہے جس میں مخلوق کے اعمال درج ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میزان سے مراد نیکیوں اور گناہوں کا عیاں ہونا ہے۔ اور آپ سے حضرت ضحاک اور اعمش سے یہ بھی مروی ہے کہ وزن اور میزان عدل اور قضا (عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا) کے معنی میں ہیں اور وزن کا ذکر بطور ضرب المثل ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا الکلام فی وزن ھذا وفی وزانہ یعنی یہ کلام اس کے مساوی اور ہم پلہ ہے اگرچہ وہاں کوئی وزن نہیں۔ زجاج نے کہا ہے: لغت اور زبان کے اعتبار سے یہ جائز ہے اور اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اس کی اتباع اور پیروی کی جائے جو ان صحیح احادیث میں ہے جو میزان کے ذکر میں وارد ہیں۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: اس بارے میں انہوں نے جو کہا خوب کہا کہ اگر میزان کو اس (مذکورہ معنی) پر محمول کیا جائے تو پھر چاہیے کہ پل صراط کو دین حق (کے معنی) پر محمول کیا جائے، جنت اور دوزخ اس معنی پر جوارواح پر صادق آتا ہے نہ کہ اجسام پر اور شیاطین اور جنات کو اخلاق مذمومہ پر اور ملائکہ کو قوائے محمودہ کے معنی پر محمول کیا جائے، حالانکہ امت کا دور اول میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہ تمام الفاظ بغیر کسی تاویل کے اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ اور تاویل نہ ہونے پر اجماع ہے تو پھر ظاہر معنی مراد لینا واجب ہے اور یہ ظواہر ہی نصوص ہو گئے۔

ابن فورک نے کہا ہے: معتزلہ نے اس بنا پر میزان کا انکار کیا ہے کہ اعراض کا وزن کرنا محال ہے، کیونکہ وہ بالذات قائم ہی نہیں ہوتے۔ اور متکلمین میں سے بعض کہتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام میں بدل دے گا اور وہ قیامت کے دن ان

کا وزن کرے گا۔ اور یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ موازین ان کتابوں کے سبب بوجھل اور بھاری ہوں گے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں اور انہیں کے سبب خفیف اور ہلکے ہوں گے۔ اور حدیث طیبہ میں وہ مروی ہے جو اس کو ثابت کرتا ہے اور وہ اس طرح مروی ہے کہ بعض لوگوں کا میزان (ترازو) قریب ہے کہ نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے پھر اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے گا جس پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھا ہو گا تو وہ بھاری ہو جائے گا، تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ ان کتابوں کے وزن کی طرف راجع ہے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں نہ کہ نفس اعمال کی طرف اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میزان کو ہلکا کر دے گا جب چاہے گا اور بھاری کر دے گا جب ارادہ فرمائے گا اس شے کے ساتھ جو ان صحف میں سے اس کے پلڑوں میں رکھی جائے گی جن میں اعمال درج ہیں۔

اور صحیح مسلم میں صفوان بن محرز سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: آپ نے کیا سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نجوی (سرگوشی) کے بارے کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک مومن کو قیامت کے دن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا اور اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا: کیا تو (اسے) پہچانتا ہے۔ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں، تو رب کریم فرمائے گا: چونکہ میں نے اسے دنیا میں تجھ پر مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے اور میں اسے آج بھی تیرے لیے معاف فرماتا ہوں، پس اسے اس کی نیکیوں کا صحیفہ عطا کر دیا جائے گا۔ اور رہے کفار اور منافقین تو انہیں بھی مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا'' (1)۔ پس آپ کا قول: فیعطی صحیفة حسناته یہ اس پر دلیل ہے کہ اعمال صحف میں لکھے جاتے ہیں اور ان کا وزن کیا جائے گا۔

اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا اور اس پر ننانوے رجسٹر (دفتر) کھل جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نگاہ تک ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو اس میں سے کسی کا انکار کرتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا میرے کراماً کاتبین فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا تیرا کوئی عذر ہے، کیا تیری کوئی نیکی ہے؟ تو وہ آدمی ڈر جائے گا اور عرض کرے گا: نہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا: (کیوں نہیں) بلکہ ہمارے پاس تیری نیکیاں ہیں اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہو گا، پھر اس کے لیے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں یہ لکھا ہو گا أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله (میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں) تو وہ پوچھے گا: اے میرے رب! ان رجسٹروں کے ہوتے ہوئے اس کاغذ کے ٹکڑے کی کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: بلاشبہ تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا پس وہ کاپیاں (اور رجسٹر) ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو کاپیوں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہو جائے گا'' (2)۔ ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں:

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360　　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 328

فلا یثقل مع اسم اللہ شئ (1) پس اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی شی بھاری نہیں ہو سکتی۔ اور فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس بارے مزید بیان سورۃ الکہف اور سورۃ الانبیاء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَوَازِيْنُهٗ یہ میزان کی جمع ہے اور اس کی اصل موزان ہے، واؤ ماقبل مکسور کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ وہاں ایک عامل کے لیے کئی میزان ہوں اور ہر میزان کے ساتھ ایک نوع کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میزان ایک ہو اور اسے لفظ جمع کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہو، جیسے آپ کہتے ہیں: خرج فلان إلی مکّۃ علی البغال، اور خرج إلی البصرۃ فی السفن۔ اور قرآن کریم میں ہے: كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الشعراء) اور كَذَّبَتْ عَادُ ِالْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الشعراء) اور بلاشبہ دو تاویلوں میں سے ایک کے مطابق وہ رسول ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الموازین، موزون کی جمع ہے، نہ کہ میزان کی اور موازین سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا وزن کیا جائے گا۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ اس کی تفسیر بھی مذکورہ تفسیر کی مثل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نیکیوں اور بدیوں کا وزن ایسے ترازو میں کیا جائے گا جس کی ایک لسان (یعنی وہ حصہ جو تولتے وقت ہاتھ میں رہتا ہے) اور دو پلڑے ہیں، پس جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اس کے عمل کو انتہائی حسین صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو اس کی نیکیاں اس کی بدیوں پر غالب آجائیں گی اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، اور کافر کے عمل کو انتہائی قبیح صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس کا وزن ہلکا ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ جہنم میں گر جائے گا۔ اور جس کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اشارہ کیا ہے وہ اس کے قریب ہے جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال میں سے ہر جز کا جوہر تخلیق فرمائے گا اور اسی جوہر کا وزن کیا جائے گا اور اسے ابن فورک وغیرہ نے رد کیا ہے۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''جب مومن کی نیکیاں کم ہوں گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انگلی کے پورے کی مثل کاغذ کا ٹکڑا نکالیں گے اور اسے میزان کے اس دائیں پلڑے میں ڈال دیں گے جس میں اس کی نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں بڑھ جائیں گی (یعنی یہ پلڑا بھاری ہو جائے گا) پس وہ بندہ مومن حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کرے گا: آپ پر میرے ماں باپ نثار! آپ کا چہرہ مبارک کتنا حسین ہے اور آپ کے اخلاق کتنے خوبصورت ہیں (یہ تو بتائیے) آپ کون ہیں؟ تو آپ فرمائیں گے: أنا محمد نبیک و ھذہ صلواتک التی کنت تصلی علیّ قد و فیتک أحوج ما تکون إلیھا (میں تیرا نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور یہ تیرا وہ درود پاک ہے جو مجھ پر تو پڑھتا تھا اور میں نے تیری وہ حاجت پوری کر دی جس کا تو زیادہ حاجت مند تھا۔ اسے قشیری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے (2) اور بیان کیا کہ یہ بطاقہ (با کے کسرہ کے ساتھ) کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جس میں سامان (متاع)

---

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فیمن یموت و ھو یشھد ان لا الہ الا اللہ، حدیث نمبر 2563، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر کبیر، جلد 13، صفحہ 27

کی تفصیل لکھی جائے یہ اہل مصر کی لغت کے مطابق ہے۔

اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ محمد بن یحییٰ نے بیان کیا کہ بطاقہ لکھی ہوئی پرچی (رقعہ) کو کہتے ہیں (1) اور اہل مصر رقعۃ کو بطاقۃ کہتے ہیں۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن وزن کرنے والے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہوں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: یا جبریل زِنْ بینهم فردساً من بعض علی بعض (اے جبریل! ان کے درمیان وزن کرا اور بعض سے بعض کی طرف لوٹا دے) فرمایا: وہاں کوئی سونا اور چاندی نہ ہوگا۔ پس اگر ظالم کی نیکیاں ہوں گی تو اس کی نیکیاں لے کر مظلوم کی طرف لوٹا دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ لے کر ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پس وہ آدمی لوٹے گا اور اس پر پہاڑ کی مثل (بوجھ) ہوگا (2)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے "کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم! میزان کے پاس کرسی کی جانب جاؤ اور اپنی اولاد کے ان اعمال کی طرف دیکھو جو تمہاری طرف اٹھائیں جائیں گے پس جس کی نیکی شر پر رائی کے دانہ کے برابر بھی بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جنت ہے اور جس کا شر اس کی نیکی پر رائی کے دانہ کی مقدار بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جہنم ہے یہاں تک کہ تو جان لے گا کہ میں ظالم کے سوا کسی کو عذاب نہیں دوں گا"۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

"اور یقیناً ہم نے ہی آباد کیا تمہیں زمین میں اور مہیا کر دیئے تمہارے لیے اس میں زندہ رہنے کے اسباب بہت ہی کم تم شکر ادا کرتے ہو"۔

یعنی ہم نے زمین کو تمہارے لیے سکونت کی جگہ اور بچھونا بنا دیا اور ہم نے تمہارے لیے اس میں اسباب معیشت پیدا فرما دیئے۔ مَعَايِش معیشة کی جمع ہے، یعنی کھانے پینے میں سے وہ چیزیں جن کے لیے کوشش کی جاتی ہے اور جن کے ساتھ زندگی قائم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عاش یعیش عیشاً و معاشا و معیشا و معیشة و عیشة۔ اور زجاج نے کہا ہے: معیشة سے مراد وہ سبب زندگی ہے جس کے ساتھ زندگی متصل ہوتی ہے۔ اخفش اور کثیر نحویوں کے نزدیک معیشة مفعلة کے وزن پر ہے (یعنی مصدر میمی)۔ اور اعرج نے معائش ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح خارجہ ابن مصعف نے نافع سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہمزہ غلطی ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ واحد معیشة ہے اور اس کی اصل مَعْيِشَة ہے، پھر الف وصل کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ اور یا دونوں ساکن ہیں، پس حرکت دینا ضروری ہے، کیونکہ حذف کا کوئی راستہ نہیں۔ اور الف کو حرکت نہیں دی جا سکتی پس یا کو وہ حرکت دی گئی جو اس کے لیے واحد میں ثابت ہے اور واؤ میں اس کی مثال منارة و مناور اور مقامۃ و مقاوم ہے، جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

وانّي لقوّامٌ مقاوِمُ لم یکن　جریر ولا مَوْلَی جریرٍ یقُومها

اور اسی طرح مصیبة و مَصَاوِب ہے۔ یہ جید اور عمدہ ہے اور لغت شاذہ مصائب ہے۔ اخفش نے کہا ہے: بلاشبہ مصائب

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 69

جائز ہے، کیونکہ اس کا واحد معتل ہے (یعنی اس میں حرف علت موجود ہے)۔

زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس طرح ان پر مقائم کہنا لازم آئے گا، البتہ یہ قول ہے کہ یہ وسادۃ اور إسادۃ کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَعَایِشَ میں ہمزہ جائز نہیں، کیونکہ معیشۃ مفعلۃ کے وزن پر ہے، اس میں یا اصلیہ ہے اور ہمزہ تب ہوتا ہے جب یا زائدہ ہو جیسے مدینۃ و مدائن اور صحیفۃ و صحائف اور کریمۃ و کرائم اور وظیفۃ و وظائف اوران کے مشابہ الفاظ میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ⑪

''اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل وصورت بنائی تمہاری پھر حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے نہ تھا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ جب الله تعالیٰ اپنی نعمت کا ذکر کر چکا تو اس نے اپنی تخلیق کی ابتدا کا ذکر فرمایا۔ اور خلق کا معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں نطفہ کی صورت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہاری خاص شکل وصورت بنائی پھر ہم تمہیں خبر دے رہے ہیں کہ ہم نے ملائکہ کو کہا: آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

اور حضرت ابن عباس اور ضحاک وغیرہما سے روایت ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا پھر ہم نے اس کی پشت میں تمہیں خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ اور اخفش نے کہا: ثُمَّ بمعنی واؤ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، بعد ازاں ہم نے ملائکہ کہ کہا: تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، پھر ہم نے تمہیں خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ تو یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا کیا، تو ان کا ذکر لفظ جمع کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ آپ ابو البشر ہیں۔ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یہ ضمیر بھی آپ ہی کی طرف راجع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: نحن قتلناکم یعنی قتلنا سیدکم (کہ ہم نے تمہارے سردار کو قتل کر دیا) پھر کہا: ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اور اس بنا پر تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ مراد حضرت آدم علیہ السلام اور مائی حوا علیہا السلام ہیں۔ پس حضرت آدم علیہ السلام خاک سے ہیں اور حضرت حواء علیہا السلام آپ کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، پھر اس کے بعد شکل وصورت بنی۔ سو معنی یہ ہوا: تحقیق ہم نے تمہارے والدین (حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حوا علیہا السلام) کو پیدا فرمایا پھر ہم نے ان دونوں کو خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ حسن نے یہی کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں اس وقت خاص شکل وصورت عطا کی جس

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 321

وقت ہم نے تم سے میثاق (وعدہ) لیا۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اسے آپ سے ابن جریج اور ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے اچھا قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اس طرف جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر انہیں اس وقت شکل وصورت عطا فرمائی جب ان سے میثاق لیا، پھر ملائکہ کو سجود کا حکم اس کے بعد ہوا۔ اور اسے یہ ارشاد تقویت دیتا ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الاعراف:172) (اور اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو) اور یہ حدیث طیبہ بھی ''کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چیونٹیوں کی طرح نکالا اور ان سے میثاق لیا'' (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ اخبار کے لیے ہے، یعنی ہم نے تمہیں آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں ارحام میں شکل وصورت عطا فرمائی۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ صحیح قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان تمام اقوال کا احتمال ہوسکتا ہے، البتہ ان میں سے صحیح وہ ہے جس کی تائید قرآن کریم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

اس میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور مزید فرمایا: وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسا:1) (اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا)

پھر فرمایا: جَعَلْنٰهُ یعنی ہم نے ان کی نسل اور اولاد کو بنایا۔ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ الآیہ (المومنون) (پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں) پس حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا گیا پھر شکل وصورت بنائی گئی اور انہیں سجود کی عزت وتکریم سے نوازا گیا اور ان کی نسل اور اولاد کی شکلیں اور صورتیں ماؤں کے رحموں میں بنائی گئیں رحموں میں اور باپوں کی صلبوں میں تخلیق کیے جانے کے بعد، حالانکہ سورۃ الانعام کی ابتدا میں گزر چکا ہے کہ ہر انسان کو نطفہ اور مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، پس اس میں غور کرلو۔ اور یہاں فرمایا: خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ۔

اور سورۃ الحشر کے آخر میں فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (وہ اللہ سب کا خالق، سب کو پیدا کرنے والا (سب کی مناسب) صورت بنانے والا ہے) تو اس میں تصویر (شکلیں بنانے) کا ذکر (برئ) جامہ خلقت پہنانے کے بعد ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے ارواح کو پہلے پیدا کیا پھر بعد میں جسموں کو شکل وصورت عطا کی۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ یہ استثنا من غیر جنسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے استثنا ہے تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا نہیں؟ جیسے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2455، روایت بالمعنی

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے، ابلیس نے کہا: (کیونکہ) میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا مجھے آگ سے اور تو نے پیدا کیا اسے کیچڑ سے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: مَا مَنَعَكَ، مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، یعنی أی شیٔ منعك؟ (کون سی شے ہے جس نے تجھے روکا ہے؟) یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اَلَّا تَسْجُدَ یہ محل نصب میں ہے، یعنی مِنْ أنْ تسجد (تجھے سجدہ کرنے سے) اور لا زائدہ ہے۔ اور سورہ ''ص'' آیت 75 میں ہے مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے) اور شاعر نے کہا ہے:

أبَى جُودُہ لا البخلَ فاستعجلت به   نَعَمْ من فَتًى لا یمنع الجودَ نائلُه(1)

اس میں مراد أبی جودہ البخل ہے، اس میں لا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لا زائدہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں منع قول اور دعا کی ایک طرف ہے، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ فرمایا: من قال لك ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے کہا کہ تو سجدہ نہ کرے؟) یا من دعاك إلى ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے اس طرف دعوت دی کہ تو سجدہ نہ کرے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قد قلت لك ألّا تفعل كذا (تحقیق میں نے تجھے کہا کہ تو اس طرح نہ کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت ہے: مَا مَنَعَكَ من الطاعةِ و أحوجك إلى ألّا تسجد (کون سی شی نے تجھے اطاعت سے روکا ہے اور تجھے اس کا محتاج بنا دیا ہے کہ تو سجدہ نہ کرے؟)

علماء نے کہا ہے: وہ شے جس نے اسے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا تھا وہ تکبر اور حسد تھا۔ اور اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا جب اسے اس کے بارے حکم دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ⑦ (ص) (کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ⑧ (ص) (پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھر پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے) تو گویا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ⑧ کے قول سے اس میں امر عظیم (بہت بڑا اضطراب) داخل ہو گیا، کیونکہ اس سجدہ کرنے میں سجدہ کرنے والے کی ذلت و رسوائی اور جس کے لیے کیا گیا اس کی عزت و تکریم ہے پس اس نے اپنے دل میں یہ رکھ لیا کہ وہ سجدہ نہیں کرے گا جس وقت اسے اس کا حکم دیا گیا۔ پس جب حضرت آدم علیہ السلام میں روح پھونکی گئی تو ملائکہ سجدے میں گر گئے اور وہ ان کے درمیان کھڑا باقی رہا، پس اس نے اپنے قیام اور سجدہ ترک کرنے کے ساتھ اسے ظاہر کر دیا جو اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ یعنی میرے حکم کی پیروی سے تجھے کس نے روکا ہے؟ تو اس نے اپنے دل کا راز نکال دیا اور کہا: اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 378

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: اِذْ اَمَرْتُكَ یہ اس پر دلیل ہے جو فقہاء کہتے ہیں کہ جب امر مطلق بغیر قرینہ کے ہو تو وہ وجوب کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اس میں مذمت اس امر مطلق کو ترک کرنے پر معلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (آدم کو سجدہ کرو) اور یہ بین اور واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ یعنی سجدہ کرنے سے مجھے میری اس فضیلت نے روکا ہے جو مجھے اس پر حاصل ہے۔ ابلیس کی طرف سے یہ جواب بالمعنی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لمن ھذہ الدار؟ یہ گھر کس کا ہے؟ تو مخاطب کہتا ہے: مالکھا زید (اس کا مالک زید ہے) تو یہ عین جواب نہیں ہے، بلکہ ایسا کلام ہے جو معنی جواب کی طرف راجع ہے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ پس اس نے گمان کیا کہ آگ مٹی سے اشرف و اعلیٰ ہے، اس لیے کہ یہ بلند مرتبہ ہے، بلندی کی طرف چڑھنے والی ہے اور تیز رفتار ہے اور اس لیے بھی کہ یہ ایک روشن جوہر ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور اس نے قیاس میں غلطی کی پس جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا اللہ تعالیٰ اسے ابلیس کے ساتھ ملا دے گا۔ ابن سیرین نے کہا: سورج و چاند کی عبادت صرف اور صرف قیاسوں کے مطابق کی گئی۔

اور حکماء نے کہا ہے: اللہ کے اس دشمن نے اس بارے میں خطا اور غلطی کی ہے کہ اس نے آگ کو مٹی پر فضیلت دی ہے، اگرچہ یہ دونوں جامد مخلوق ہونے کے اعتبار سے ایک درجہ میں ہیں، پھر بھی مٹی آگ سے چار وجہ سے افضل و برتر ہے۔

(۱) مٹی کے جوہر میں استحکام اور سکون ہے، وقار اور بردباری ہے، حلم، حیا اور صبر ہے اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کو مذکورہ سعادت و اعزاز کے بعد توبہ، تواضع اور عجز و انکساری کی طرف دعوت دینے والا ہے، پس اس نے آپ کو مغفرت، اجتباء اور ہدایت کا وارث بنا دیا۔ اور آگ کے جوہر میں خفت (ذلت) طیش، حرارت، بلندی اور اضطراب ہے اور یہ ابلیس کو مذکورہ شقاوت و بدبختی کے بعد تکبر اختیار کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی دعوت دینے والا ہے، پس اس نے اسے ہلاکت، عذاب، لعنت اور شقاوت کا وارث بنا دیا۔ یہ قفال نے کہا ہے۔ (۲) بے شک حدیث اس پر ناطق ہے کہ جنت کی مٹی انتہائی خوشبودار کستوری (کی مثل) ہے اور اس پر کوئی حدیث نہیں کہ جنت میں آگ ہے اور (نہ اس پر) کہ جہنم میں مٹی ہے۔ (۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ آگ عذاب کا سبب ہے اور یہ اللہ کا عذاب اس کے دشمنوں کے لیے ہے، لیکن مٹی عذاب کا سبب نہیں ہے۔

(۴) مٹی آگ کی محتاج نہیں اور آگ مکان کی محتاج ہے اور اس کا مکان مٹی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک پانچویں قول کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مٹی سجدہ کرنے کی جگہ اور پاک کرنے والی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔ اور آگ ڈرانے والی اور عذاب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (الزمر: 16)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابلیس کے لیے قیاس کی نسبت اطاعت و فرمانبرداری اولیٰ اور بہتر تھی لیکن اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور یہ وہ پہلا فرد ہے جس نے اپنی رائے کے مطابق قیاس کیا اور نص کی مخالفت میں قیاس مردود ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قیاس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کچھ اس کے قائل ہیں اور کچھ اسے رد کرنے والے ہیں۔ پس جو اس کے قائل ہیں وہ صحابہ، تابعین، اور ان کے بعد آنے والے جمہور ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً جائز ہے اور شرعاً ایسا واقع ہوا ہے اور یہی صحیح ہے۔

شافعیہ میں سے قفال اور ابوالحسین بصری اس طرف گئے ہیں کہ اس کے مطابق عقلاً عمل کرنا واجب ہے اور نظام نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ اور بعض اہل ظواہر نے اس کا رد کیا ہے، لیکن پہلا (قول) صحیح ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ'' میں کہا ہے: اس کا معنی ہے لا عصمۃ لِأحد إلا في کتاب اللہ او سنۃ نبیہ او في إجماع العلماء اذا وجد فیھا الحکم فإن لم یوجد فالقیاس (کسی کے لیے عصمت اور بچاؤ نہیں ہے مگر کتاب میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں علماء کے اجماع میں جب کہ اس میں حکم پایا جائے اور اگر حکم نہ پایا جائے تو پھر قیاس ہے) اور اسی بنا پر انہوں نے عنوان باندھا باب من شبہ اصلا معلوما بأصل مبین قد بیّن اللہ حکمھا لیفھم السائل (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے کسی اصل معلوم کو اس اصل مبین کے ساتھ تشبیہ دی جس کے حکم کو اللہ نے بیان فرما دیا تا کہ سائل سمجھ جائے) اور اس کے بعد یہ عنوان ذکر کیا۔ باب الأحکام التي تعرف بالدلائل وکیف معنی الدلالۃ وتفسیرھا (یہ باب ان احکام کے بیان میں ہے جو دلائل سے پہچانے جاتے ہیں اور دلالۃ کا معنی اور اس کی تفسیر کیا ہے)۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: کتاب اللہ، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اجماع امت سے اجتہاد و استنباط کرنا ہی حق واجب ہے اور اہل علم کے لیے فرض لازم ہے اور اس بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے کئی احادیث و روایات مروی ہیں۔ اور ابوتمام مالکی نے کہا ہے: امت نے قیاس پر اجماع کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کا زکوٰۃ میں سونے اور چاندی کے قیاس پر اجماع ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: أقیلوني بیعتي (تم میری بیعت توڑ دو) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ لا نقیلک ولا نستقیلک، رضیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا أفلا نرضاک لدنیانا؟(1) (قسم بخدا! نہ ہم آپ کی بیعت توڑیں گے اور نہ توڑنے کا مطالبہ کریں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہمارے دین کے لیے پسند فرمایا ہے تو ہم کیوں نہ آپ کو اپنی دنیا کے لیے پسند کریں گے) تو اس میں آپ نے امامت کو نماز پر قیاس کیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا اور فرمایا: واللہ لا أفرق بین ما جمع اللہ(2) (قسم بخدا! میں ان کے درمیان تفریق نہیں کروں گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے جمع فرمایا ہے) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں شراب پینے والے کے بارے میں قیاس کی تصریح کر دی اور فرمایا: إنّہ إذا سکر ھَذَی، واذا ھَذَی افتری، فحدہ حد القاذف (بے شک جب وہ نشے میں ہوتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان کہتا ہے تو بہتان تراشی کرتا ہے پس اس کی حد تہمت لگانے والے کی حد کی مثل ہوگی) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف ایک خط لکھا اور اس میں فرمایا: الفَھْم الفَھْم فیما یختلِجُ في صدرک فما لم یبلغک في الکتاب والسنۃ، أعرف الأمثال والأشباہ،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 133، روایت بالمعنی
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 67

ثم قس الامور عند ذالك، فاعمد الی أحبها إلی اللہ تعالٰی وأشبهها بالحق فیما تری، الحدیث بطوله ذکرہ الدار قطنی(1) (خوب سمجھو اور غور وفکر کرو ایسے امر میں جس کے بارے میں تمہارے دل میں کوئی خلش اور شک پیدا ہو جائے اور اس کے بارے کتاب وسنت کا حکم تمہیں نہ پہنچے تو اس کی امثال واشباہ کو پہچانو، پھر ان امور میں سے کسی پر قیاس کرلو اور اس پر اعتماد کرو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو اور تمہاری رائے میں حق کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہو۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیث وباء میں کہا، جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام سرغ سے واپس لوٹے! نفرّ من قدر اللہ؟ (کیا ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نعم! نفرّ من قدر اللہ إلی قدر اللہ (ہاں! ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: تمہاری کیا رائے ہے(2)...... پس آپ نے اسے ان مسائل پر قیاس کیا اور ان کے مطابق اس میں غور وفکر کی جو اس سے مشابہت رکھتے تھے اور یہ سب مہاجرین وانصار کی موجودگی میں ہوا اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور اس معنی میں جہاں تک آثار اور آیات قرآنیہ کا تعلق ہے تو وہ کثیر اور بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس اصول دین میں سے ایک اصل ہے۔

اور مسلمانوں کی حفاظت اور بچاؤ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور عمل کرنے والے علماء اس کی پناہ لیتے ہیں اور اس کے ساتھ احکام مستنبط کرتے ہیں اور یہ ان کی جماعت کا قول ہے جو حجت ہیں اور جو ان سے الگ ہو گیا اس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ اور رہی مذموم رائے اور ایسا قیاس جس میں منھی عنہ (وہ شی جس سے منع کیا گیا ہو) کے بارے تکلف کیا گیا ہو تو وہ اس مذکورہ اصول پر نہیں، کیونکہ وہ ظن اور شیطان کی جانب سے دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء: 36) (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں) اور قیاس کی مذمت میں جتنی کمزور اور ضعیف اخبار واحادیث قیاس کے مخالف لاتے ہیں تو وہ قیاس مذموم کی اس نوع پر محمول ہیں، جس کی شریعت میں کوئی اصل معلوم نہیں۔ اس بارے مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اتر جا یہاں سے مناسب نہیں ہے تیرے لیے کہ تو غرور کرے یہاں رہتے ہوئے پس نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی فرمایا: تو آسمان سے اتر جا۔ فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا کیونکہ اس کے باسی تواضع اور انکساری کرنے والے فرشتے ہیں۔ فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ پس تو نکل جا بلاشبہ تو ذلیلوں میں سے ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے اپنے مولیٰ کی نافرمانی کی تو وہ ذلیل ہے۔

ابوروق اور بجلی نے کہا: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو اپنی اس صورت سے الگ ہو جا جس میں تو ہے، کیونکہ اس نے اس پر فخر کیا کہ

1۔ سنن دارقطنی، حدیث نمبر 4471 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1683 مختصر

وہ آگ سے ہے پس اس کی صورت تاریکیوں کے ساتھ اور اس کی چمک اور روشنی کے زوال کے ساتھ بدشکل ہوگئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف منتقل ہو جا، جیسے کہا جاتا ہے: هبطنا ارض كذا یعنی ہم دوسری جگہ فلاں زمین کی طرف منتقل ہو گئے، تو گویا اسے زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف نکال دیا گیا؛ اور اس کا غلبہ اور سلطنت انہیں میں ہے اور وہ زمین جس میں داخل نہیں ہوسکتا مگر چور کی حالت کی طرح وہ اس میں ڈرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس سے نکل جاتا ہے۔ پہلا قول اظہر اور واضح ہے اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾

''بولا مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے''۔

اس نے قبروں سے اٹھانے اور حساب کے دن تک باقی رہنے کی مہلت مانگی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ وہ نہ مرے، کیونکہ یوم البعث کے بعد پھر کوئی موت نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی وغیرہما رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے نفخہ اولیٰ تک مہلت دی کہ اس وقت تمام مخلوق مر جائے گی۔ اور اس کا مہلت کا مطالبہ نفخہ ثانیہ تک تھا جس وقت لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے اٹھیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار فرما دیا۔ اور فرمایا: اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اور جسے اٹھایا جائے گا اس کا ذکر پہلے نہیں کیا، کیونکہ یہ قصہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے بارے میں ہے، پس قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہی ہیں جنہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا۔

قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾

''کہنے لگا اس وجہ سے کہ تو نے مجھے (اپنی رحمت سے) مایوس کر دیا میں ضرور تاک میں بیٹھوں گا ان (کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستہ پر۔ پھر میں ضرور آؤں گا ان کے پاس (بہکانے کے لیے) ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو نہ پائے گا ان میں سے اکثر کو شکر گزار''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ اغواء کا معنی ہے ایقاع الغی فی القلب (دل میں گمراہی کو واقع کرنا) یعنی اس وجہ سے کہ تو نے میرے دل میں گمراہی، عناد اور تکبر ڈال دیا۔ اور یہ اس لیے (کہا) کیونکہ ابلیس کا کفر کفر جہالت نہیں، بلکہ وہ کفر عناد و تکبر ہے۔ اور اس کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی قسم ہے، یعنی تیرے مجھے گمراہ کرنے کی قسم میں ضرور بضرور ان کے لیے تیرے راستے

پر، یا تیرے راستے میں بیٹھوں گا، پس کلام میں حذف ہے فبا غوائك إیای لأقعدن لھم علی صراطك أو فی صراطك اس قول کی دلیل اس کا وہ قول ہے جو سورہ ص میں ہے: فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿﴾ (تیری عزت کی قسم! میں ضرور بالضرور ان تمام کو گمراہ کروں گا) تو گویا ابلیس اللہ تعالیٰ کے اسے گمراہ کرنے کی مقدار سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں اسے بندوں پر تسلط اور غلبہ دینے کا ذکر ہے، پس اس نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی قدر کے عظیم ہونے پر قسم کھائی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی لام ہے، گویا اس نے یہ کہا: فلإغوائك إیای (تیرے مجھے گمراہ کرنے کی وجہ سے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ با بمعنی مع ہے اور معنی ہے فمع اغوائك إیای (پس تیرے مجھے گمراہ کرنے کے ساتھ) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استفہام ہے، گویا اس نے پوچھا بأی شئ أغواہ؟ (کون سی شے کے سبب اللہ نے اسے گمراہ کیا ہے) اور اس بنا پر یہ ہونا چاہیے: فِبم أغویتنی؟ (کیونکر تو نے مجھے گمراہ کیا؟)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فبما اھلکتنی بلعنك إیای (کس سبب سے تو نے مجھے اپنی نعمت کا مستحق قرار دے کر ہلاک کیا)؟ تو اس کے مطابق اغواء بمعنی اھلاك (ہلاک کرنا) ہوا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿﴾ (مریم) ای ھلاکا (وہ ہلاکت کو جا ملیں گے)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی فما أضللتنی (تو نے مجھے کس سبب سے گمراہ کیا؟) تو اس میں اغوا بمعنی اضلال (گمراہ کرنا) اور ابعاد (اپنی رحمت سے دور کرنا) ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: خیبتنی من رحمتك (تو نے مجھے اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے) اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وَمَنْ يَغْوَ لَا يَعْدَمْ عَلَى الْغَيِّ لَائِمًا

ای مَنْ یَخِب (جو محروم ہو جاتا ہے)

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: غوی الرجل (یغوی) غیا جب آدمی پر اس کا معاملہ فاسد ہو جائے یا اس کے دل میں وہ فاسد ہو جائے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿﴾ (طٰہٰ) (اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا) کے معانی میں سے ایک ہے یعنی جنت میں اس کا رہنا فاسد ہو گیا۔

اور کہا جاتا ہے: غَوِیَ الفَصِیل (جب اونٹ کے بچے کو بدہضمی ہونا اور لاغری سے قریب بہ ہلاکت ہونا) جب وہ اپنی ماں کا دودھ نہ پی سکے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا اور اس میں کفر پیدا کر دیا، اسی وجہ سے اس ارشاد میں اغوا (گمراہ کرنے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور یہی حقیقت ہے اور موجود کوئی شے نہیں ہے مگر وہ اس کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہی سب صادر ہوتا ہے۔ قدریہ وغیرہ نے ابلیس کی مخالفت کی ہے جس کی اطاعت و مطاوعت انہوں نے ہر اس معاملے میں کی جسے اس نے ان کے لیے مزین اور آراستہ کیا، لیکن اس مسئلہ میں انہوں نے اس کی پیروی نہ کی اور وہ کہتے ہیں: ابلیس نے غلطی اور خطا کی ہے اور وہ خطا کا اہل تھا اسی وجہ سے اس نے گمراہی کی نسبت اپنے رب کی طرف کی، اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ تو انہیں کہا جائے گا: ابلیس اگر خطا کا اہل ہے تو تم نبی علیہ السلام کے

بارے میں کیا کرو گے جو مکرم اور معصوم ہے اور وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا: وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہود) (اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے وہ پروردگار ہے تمہارا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت طاؤس کے پاس مسجد حرام میں ایک آدمی آیا اور وہ قدریہ (فرقہ سے) متہم تھا اور وہ بڑے اور عظیم فقہاء میں سے تھا۔ پس وہ آپ کے پاس بیٹھ گیا تو حضرت طاؤس نے اسے کہا: تو اٹھے گا یا تجھے اٹھایا جائے گا؟ تو حضرت طاؤس کو عرض کی گئی: آپ یہ الفاظ ایک فقیہ آدمی کو کہہ رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: ابلیس اقفه منه (ابلیس اس سے بڑھ کر فقیہ ہے) ابلیس کہتا ہے: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (الحجر: 39) (اے میرے رب! کس سبب سے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے) اور یہ کہتا ہے: أنا أغوی نفسی (میں اپنے آپ کو گمراہ کرتا ہوں)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی (میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور ان کی تاک میں بیٹھوں گا) اس سے اعراض کرنے کے ساتھ اور باطل کو مزین و آراستہ کرنے کے ساتھ یہاں تک کہ وہ اسی طرح ہلاک ہو جائیں جیسے وہ ہلاک ہوا یا وہ انہیں اسی طرح گمراہ کر دے جیسے وہ گمراہ ہوا یا وہ انہیں اسی طرح محروم کر دے جیسے اسے محروم کیا گیا، جیسا کہ یہ تینوں معانی اَغْوَيْتَنِيْ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ اور صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے۔ اور صِرَاطَكَ منصوب ہے اس بنا پر کہ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پہلے علی یا فی محذوف ہے، جیسے سیبویہ نے بیان کیا ہے ضرب زید الظھر و البطن اور یہ شعر بھی کہا:

لَدْنٌ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُه فيه كما عَسَل الطريقَ الثَّعْلَبُ(1)

(دونوں مثالوں میں الظھر و البطن اور الطریق سے پہلے حروف جار محذوف ہے)

اور اس قول: ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ کی تاویل میں جو احسن ترین قول کہا گیا ہے (وہ یہ ہے): میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا حق سے اور انہیں دنیا میں رغبت دلاؤں گا اور انہیں آخرت کے بارے میں شک میں مبتلا کروں گا اور گمراہی میں یہ انتہا ہے، جیسے اس نے کہا: وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ (النسا: 119) جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور سفیان نے منصور سے اور اس نے حکم بن عتیبہ سے روایت کیا ہے (2) کہ اس نے کہا: مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ یعنی ان کی دنیا کی جانب سے۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ ان کی آخرت کی جانب سے۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان کی نیکیوں کی جانب سے۔ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں اور برائیوں کے اعتبار سے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور اس کی شرح یہ ہے کہ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ کا معنی ہے میں ضرور ان کے پاس آؤں گا ان کی دنیا کی جانب سے، یہاں تک کہ وہ اس میں موجود آیات اور امم ماضیہ کی اخبار کو جھٹلانے لگیں وَمِنْ خَلْفِهِمْ اور ان کی آخرت کی جانب سے یہاں تک کہ وہ اس کی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 380
2۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 162

تکذیب کردیں۔ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ ان کی نیکیوں اور ان کے امور دینیہ کی جانب سے۔ اور اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ۞ (الصافات) (کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کروفر سے)

وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں کی طرف سے، یعنی وہ شہوات کی اتباع و پیروی کریں گے، کیونکہ وہ شہوات کو ان کے لیے مزین و آراستہ کردے گا۔ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ اور تو ان میں سے اکثر کو موحد، اطاعت کرنے والا فرمانبردار اور اظہار شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۞

''فرمایا: نکل جا یہاں سے ذلیل (اور) راندہ ہوا جس کسی نے پیروی کی تیری ان سے تو یقیناً میں بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا فرمایا: تو جنت سے نکل جا۔ مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا، مذءوما بمعنی مذموما (مذمت کیا ہوا، ذلیل وخوار) ہے اور الذام میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عیب ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: مَذْءُوْمًا اور مذموما معنی کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذأمته و ذممته اور ذمته تمام کا معنی ایک ہے۔ اور اعمش نے مذوما پڑھا ہے۔ اور معنی ایک ہے، مگر انہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مذءوم کی نفی کی گئی ہے اور دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور مدحور کا معنی دور کیا ہوا، بھگایا ہوا ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے اور اس کا اصل معنی الدفع (دفع کرنا) ہے۔ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ اس میں لام، لام قسم ہے اور جواب قسم لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَمَنْ تَبِعَكَ میں لام توکید ہے۔ اور لَاَمْلَـَٔنَّ میں لام قسم ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ غیر قراءت میں پہلی لام کو حذف کرنا جائز ہے اور دوسری کو حذف کرنا جائز نہیں ہوتا۔ کلام میں شرط اور جزا کا معنی ہے۔ بمعنی من تبعك عذبته (جس نے تیری اتباع کی میں اسے عذاب دوں گا) اور اگر تو کہے: من تبعك أعذبه تو یہ جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ تو ارادہ یہ کرے لأعذبه اور عاصم نے ابوبکر بن عیاش کی روایت سے لِمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ کو لام مسکور کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے من أجل من تبعك۔ واللہ اعلم۔

جیسے کہا جاتا ہے: أكرمت فلانا لك اور کبھی معنی ہوتا ہے: الدحر لمن تبعك (دفع کرنا اور بھگایا جانا اس کے لیے ہے جو تیری اتباع کرے گا) اور مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ کا معنی ہے یعنی تم میں سے اور اولاد آدم میں سے۔ کیونکہ اس کا ذکر ہی چل رہا ہے کیونکہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یہ اولاد آدم کو خطاب ہے۔

وَیٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۞

''اور اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے''۔

ابلیس کو آسمان سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا: تم اور حواء دونوں جنت میں رہو۔ اور سورۃ البقرہ میں اسکان (سکونت اختیار کرنے کے لیے کہنا) کا معنی گزر چکا ہے اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کا معنی وہاں گزر چکا ہے۔ والحمدللہ

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰

''پھر وسوسہ ڈالا ان کے (دلوں میں) شیطان نے تاکہ بے پردہ کر دے ان کے لیے جو ڈھانپا گیا تھا ان کی شرمگاہوں سے اور (انہیں) کہا کہ نہیں منع کیا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لیے کہ کہیں نہ بن جاؤ تم دونوں فرشتے یا کہیں نہ ہو جاؤ ہمیشہ زندہ رہنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ یعنی ان دونوں کی طرف شیطان نے وسوسہ اندازی کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جنت کے اندر سے کہ اس نے سانپ کی صورت میں اپنے آپ کو جنت میں داخل کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنت کے باہر سے، اس اختیار کے ساتھ جو اسے دیا گیا۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور وسوسہ کا معنی ہے: الصوت الخفی (1) (مخفی اور پوشیدہ آواز) اور وسوسۃ کا معنی ہے: حدیث النفس (اندر کی بات (دل میں اٹھنے والا خیال)۔ کہا جاتا ہے: وسوستْ إلیہ نفسُہ وسوسۃً ووسواسا (اس کے نفس نے اس میں یہ بات ڈال دی) اور وسواس (واؤ کے فتحہ کے ساتھ) اسم ہے، مثلاً زلزال اور شکار کرنے والے اور کتے کی آہٹ اور آہستہ آواز اور زیورات کی آواز کو وسواس کہا جاتا ہے۔ اعشی نے کہا ہے:

تَسْمَعُ للحَلْی وَسْواسا إذا انصرفَتْ　كما استعانَ بریحٍ عِشْرِقٌ زَجِلُ

اور وسواس شیطان کا نام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝ (الناس)

لِيُبْدِيَ لَهُمَا تاکہ ان دونوں کے لیے ظاہر کر دے۔ اس میں لام لام عاقبۃ ہے، جیسے اس ارشاد میں ہے: لیکون لھم عدوا وحزنا (تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے۔ اور وٗرِيَ کا معنی ہے ان سے جو چھپایا گیا ہے اور ڈھانپا گیا ہے۔ اور غیر قرآن میں اسے اوری پڑھنا بھی جائز ہے، جیسے اُقِّتت۔ اور مِنْ سَوْاٰتِهِمَا کا معنی ہے ان کی شرمگاہوں سے (ای من عوراتھما) اور فرج (شرمگاہ) کو عورت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اسے ظاہر کرنا اس کے صاحب کو برا لگتا ہے۔ اور یہ شرمگاہ کو ننگا کرنے کے قبیح اور برا ہونے پر دلیل ہے، سو یہ کہا گیا کہ ان کی شرمگاہیں ان دونوں کے لیے ظاہر ہیں ان کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ ان دونوں پر پتے اور کلیاں ہیں جن کے سبب ان کی شرمگاہوں کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا پھر وہ کلیاں زائل ہو گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 137

ہے کہ ان پر کپڑا تھا اور پھر وہ ساقط ہو گیا (گر گیا) واللہ اعلم

اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اس میں اَنْ محل نصب میں ہے، بمعنی اِلَّا ہے، اَنْ کو مکروہ قرار دیتے ہوئے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کوفی کہتے ہیں: لئلا تکونا (تا کہ تم دونوں نہ ہو جاؤ)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ای اِلَّا اَلّا تکونا ملکین تعلمان الخیر والشر (مگر یہ کہ تم دونوں نہ ہو جاؤ فرشتے جو خیر و شر کو جانتے ہیں)۔ اور کہا گیا ہے: حضرت آدم علیہ السلام نے ہمیشہ رہنے کا طمع کیا، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ ملائکہ یوم قیامت تک نہیں مریں گے۔

نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر ساری مخلوق پر فرشتوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اور ایک یہ ہے وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ (الانعام: 50) (اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں) اور یہ بھی ہے: وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النسا: 172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)۔ اور حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو شکل و صورت، پروں اور عزت و تکریم کے اعتبار سے فضیلت دی ہے(1)۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے طاعت اور ترک معصیت کی وجہ سے انہیں فضیلت دی، پس اس وجہ سے ہر شی میں فضیلت واقع ہوتی ہے۔

اور ابن فورک (2) نے کہا ہے: اس آیت میں یہ دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس معنی میں دو فرشتے مراد ہوں کہ ان دونوں کے لیے کھانے کی طلب نہیں ہو گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، زجاج اور بہت سے علماء کی پسند یہ ہے کہ مومنین کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، سوائے فرشتوں کے ایک گروہ کے اور وہ ہیں حضرت جبریل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام اور حضرت ملک الموت علیہ السلام، کیونکہ یہ من جملہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔ اور ہر فریق نے شریعت کے ظاہر سے استدلال کیا ہے اور فضیلت اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لام کے کسرہ کے ساتھ مَلِكَیْنِ قراءت کی ہے اور یہی قراءت یحییٰ بن ابی کثیر اور ضحاک کی ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے لام کے کسرہ کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کوئی ملک نہ تھا کہ دو ملک ہو جائیں۔ حضرت نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس قراءت کی بنا پر لام کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے، لیکن پہلی قراءت میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہو گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (3) نے فرمایا کہ یہ دونوں ملک کی جہت سے ملعون ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰى ۝ (طٰہٰ) (کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو)۔ اور ابو عبید نے گمان کیا ہے کہ یحییٰ بن ابی کثیر کا استدلال اس قول کے ساتھ ہے۔ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰى اور یہ حجۃ بینہ ہے، لیکن لوگوں نے اسے ترک کر دیا ہے اسی لیے ہم نے بھی اسے ترک کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 88 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 385 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 167

ہے: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ شاذ قراءت ہے۔

ابوعبید کے اس کلام کا انکار کیا گیا ہے اور اسے فحش غلطی قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ وہم ہوا ہو کہ وہ جنت کی بادشاہی سے زیادہ تک پہنچ سکتے ہیں، حالانکہ جنت ہی طالبین کی انتہا اور غایت ہے۔ بلاشبہ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰى کا معنی جنت کی بادشاہی میں قائم رہنا، اور اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝۲۱

''اور قسم اٹھائی ان کے سامنے کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَقَاسَمَهُمَاۤ یعنی ان دونوں کے لیے قسم اٹھائی، کہا جاتا ہے: أقسم إقساما! بمعنی حلف (اس نے قسم اٹھائی) شاعر نے کہا ہے:

وقاسمها بالله جهدا لأنتم ألذّ من السّلوٰی إذا ما نشورها(1)

اور اس میں ایک کی جانب سے باب مفاعلہ ذکر کیا ہے۔ اور اس سے اس کا رد ہوتا ہے جس نے کہا ہے کہ باب مفاعلہ دونوں (فاعل اور مفعول) کی جانب سے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ، لکما صلہ میں داخل نہیں ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: إنّی ناصح لکما لمن الناصحین (بلاشبہ میں تم دونوں کو نصیحت کر رہا ہوں، کیونکہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)

یہ ہشام نحوی نے کہا ہے۔ اور اس کی مثال سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور کلام کا معنی ہے: اتبعانی أرشد کما (تم دونوں میری اتباع کرو میں تمہاری رہنمائی کروں گا) اسے قتادہ نے ذکر کیا ہے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝۲۲ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۲۳ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ۝۲۴

''پس شیطان نے نیچے گرا دیا ان کو دھوکہ سے، پھر جب دونوں نے چکھ لیا درخت سے تو ظاہر ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور چھپانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے اور ندا دی انہیں ان کے رب نے، کیا نہیں منع کیا تھا میں نے تمہیں اس درخت سے اور کیا نہ فرمایا تھا تمہیں کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ دونوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لیے اور نہ رحم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 385

فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیچے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک''۔

قولہ تعالیٰ: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ یعنی شیطان نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے انہیں قسم کے ساتھ دھوکہ دیا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام یہ گمان رکھتے تھے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا، پس شیطان نے انہیں اپنی وسوسہ اندازی اور قسم کے ساتھ دھوکہ میں ڈال دیا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس نے ان دونوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائی یہاں تک کہ انہیں دھوکے میں ڈال دیا۔ اور مومن اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ کھا جاتا ہے(1)۔ بعض علماء کہتے ہیں: جس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ دیا ہم وہ دھوکہ کھا گئے (2)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: المؤمن غِرٌّ کریم والفاجر خَبٌّ لئیمٌ (3) (مومن ناتجربہ کار دھوکہ کھانے والا اور سخی ہے اور فاجر دغاباز اور لعین ہے) اور نفطویہ نے کہا ہے:

إنّ الكريم إذا تَشاءُ خَدَعتَه ۔۔۔ وترى اللَّئيمَ مُجرِّبا لايُخْدَعُ

بے شک کریم کو جب تو چاہے اسے دھوکے میں مبتلا کر دے اور تو لئیم کو تجربہ کار دیکھے گا اسے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا''۔

فَدَلّٰىهُمَا کہا جاتا ہے: أدلَى دلوہ اس نے اپنا ڈول نیچے لٹکایا۔ و دلاها اور اسے نکالا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دلّاهما کا معنی ہے اس نے ان دونوں کو جرات دلائی۔ یہ الدالة سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے جرأت کرنا یعنی اس نے انہیں معصیت پر جرأت دلائی تو وہ جنت سے نکل گئے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ یعنی جب انہوں نے اس درخت سے کھایا۔ اور سورۃ البقرہ میں اس درخت کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کیسے کھایا۔

بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا پہلے حضرت مائی حوا علیہا السلام نے کھایا تو انہیں کوئی شے نہ پہنچی (یعنی کوئی تکلیف نہ پہنچی) پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کھایا تو سزا نافذ ہو گئی، کیونکہ اس کے قریب جانے کی نہی دونوں کے لیے تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کلیاں اور پتے جو ان کا لباس تھے وہ اتر گئے اور ہاتھوں اور پاؤں میں ناخن آ گئے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ طَفِقَا اس میں فا کو ساکن پڑھنا جائز ہے اور اخفش نے طَفَقَ یَطْفِقُ بیان کیا ہے، مثلاً ضرب یضرب کہا جاتا ہے: طفق یعنی وہ کام میں شروع ہوا۔ یَخْصِفٰنِ حسن نے اسے خا کے کسرہ اور صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اصل میں یختصفان تھا اس میں ادغام کیا گیا (تا کو صاد سے بدلنے کے بعد صاد کو صاد میں) اور التقاء ساکنین کی وجہ سے خا کو

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 459 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 959 3۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 110

کسرہ دیا گیا ہے۔ اور ابن بریدہ اور یعقوب نے خا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے تا کی حرکت اس کو دی ہے اور یُخَصِّفان کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یہ خَصَّف یُخَصِّف سے ماخوذ ہے۔

اور زہری نے یُخصِفان پڑھا ہے یہ أخصَف سے ہے۔ اور یہ دونوں ہمزہ یا تضعیف سے منقول ہے اور معنی یہ ہے: وہ دونوں پتے کاٹنے لگے اور انہیں چپٹانے لگے تا کہ وہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ سکیں۔ اور اسی سے خَصَف النعل (اس نے جوتے کا چمڑا چپٹایا) ہے۔ اور خصاف وہ ہوتا ہے جو جوتے سیتا ہے۔ اور مِخْصف مِثْقب (برما) کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد انجیر کے پتے ہیں (1)۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی شرمگاہ ننگی اور ظاہر ہو گئی تو وہ جنت کے درختوں کا چکر لگانے لگے تا کہ وہ ان سے پتے لیں اور ان کے ساتھ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکیں، تو جنت کے درختوں نے آپ کو روک دیا (ڈانٹ دیا) یہاں تک کہ انجیر کے درخت نے آپ پر رحم کیا اور پتا آپ کو عطا کیا، تو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حوا علیہما السلام جنت کے پتے اپنے اوپر چپٹانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انجیر کو بدلا یہ دیا کہ حلاوت اور منفعت میں اس کے ظاہر اور باطن کو ایک جیسا کر دیا اور اسے ایک سال میں دو بار پھل عطا فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آیت میں کشف عورۃ کے قبیح ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر اسے ڈھانپنا واجب کر دیا، اس لیے انہوں نے اسے ڈھانپنے میں جلدی اور تیزی کی، اور یہ اس کے مانع نہیں ہے کہ اس کے بارے انہیں یہ حکم جنت میں دیا گیا، جیسے انہیں یہ کہا گیا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (الاعراف: 19)

اور صاحب البیان نے امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ جو آدمی درخت کے پتوں کے سوا کوئی شی ایسی نہ پائے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکتا ہو، تو اس پر انہیں کے ساتھ ڈھانپنا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ یہ ظاہری پردہ ہے جس کے ساتھ پردہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو سکتا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں کیا۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا: کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا ربنا (اے ہمارے رب!) یہ ندا مضاف ہے۔ اصل میں یہ یا ربنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک ''یا'' کو حذف کرنے میں تعظیم کا معنی ہے، پس انہوں نے اپنی خطا کا اعتراف کیا اور توبہ کر لی۔ اس کی بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور قول باری تعالیٰ: قَالَ اهْبِطُوْا کا معنی آخر آیت تک پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۞

''(نیز) فرمایا: اسی زمین میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے تم اٹھائے جاؤ گے''۔

اس میں مذکورہ تمام ضمیریں الارض (زمین) کے لیے ہیں۔ اور قَالَ میں واؤ ذکر نہیں کی گئی۔ اور اگر وہ ذکر ہوتی تو بھی جائز ہوتا اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: قال زید لعمرو کذا قال له کذا (اس میں قال له کذا سے پہلے واؤ ذکر کر دی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 211

جائے تو وہ درست اور صحیح ہے)

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِكَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّكَّرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

''اے اولاد آدم بے شک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو اور باعث زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِكُمۡ بہت سے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ شرمگاہ کو ڈھانپنا واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِكُمۡ اور ایک قوم (گروہ) نے کہا ہے کہ اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے، بلکہ اس میں فقط اس کے انعام ہونے پر دلیل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور من جملہ نعمتوں میں سے ایک شرمگاہ کو ڈھانپنا بھی ہے۔ پس یہ بیان کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی اولاد کے لیے وہ کچھ پیدا فرمایا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہوں کو ڈھانپ سکتے ہیں اور یہ پردے کے امر پر دلیل ہے۔ اور لوگوں کی نگاہوں سے ستر عورت کے واجب ہونے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ شرمگاہ کیا ہے؟ تو ابن ابی ذئب نے کہا ہے: یہ مرد میں سے صرف اس کی شرمگاہ ہے، یعنی قبل اور دبر اس کے سوا کوئی حصہ شرمگاہ نہیں۔ اور داؤد اہل ظاہر، ابن ابی مسلمہ اور طبری کا یہی قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِكُمۡ، بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا، لِیُرِیَهُمَا سَوۡاٰتِهِمَا۔

اور بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1)۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی گلیوں میں اپنی سواری پر چل رہے تھے۔ اور اس میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اپنی رانوں سے اوپر چڑھالی یہاں تک میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کی سفیدی دیکھ لی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ناف شرمگاہ نہیں ہے اور آدمی کے لیے مکروہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے اپنی ران کھول دے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: گھٹنا شرمگاہ ہے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صحیح روایت کے مطابق ناف اور دونوں گھٹنے شرمگاہ میں سے نہیں ہیں۔

اور ابو حامد ترمذی نے بیان کیا ہے کہ ناف کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جو آپ نے جرہد کو فرمایا: (2) غطّ فخذك فإن الفخذ عورة (3) (اپنی ران کو ڈھانپ لے کیونکہ ران شرمگاہ ہے) اسے امام بخاری نے تعلیقاً بیان کیا ہے۔ اور فرمایا: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور حضرت جرہد کی حدیث میں زیادہ احتیاط ہے یہاں تک کہ وہ ان (علماء) کے اختلاف سے نکل جائے۔ اور جرہد کی یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53
2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستئذان والادب، جلد 2، صفحہ 103
3۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53

حدیث اس کے خلاف دلالت کرتی ہے جو کچھ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ناف پر بوسہ دیا اور کہا: میں تمہیں اسی جگہ بوسہ دے رہا ہوں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں بوسہ دیتے تھے (1)۔ پس اگر ناف شرمگاہ ہوتی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہاں بوسہ نہ دیتے اور نہ ہی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ انہیں اس کی اجازت دیتے۔ اور جہاں تک آزاد عورت کا تعلق ہے تو اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا اس کا سارا بدن شرمگاہ ہے اور یہی نظریہ اکثر اہل علم کا ہے۔

تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أراد أنْ یتزوج إمرأۃ فلینظر إلی وجھھا و کفیھا (2) (جو آدمی کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کو دیکھ لے) اور اس لیے بھی کہ احرام میں بھی چہرے کو ننگا کرنا واجب ہے۔ ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے: عورت کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور رہی ام ولد (ایسی کنیز جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) تو اس کے بارے اثرم نے کہا ہے: میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ان سے ام ولد کے بارے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ نماز کیسے پڑھے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ اپنا سر اور اپنے پاؤں ڈھانپ لے گی، کیونکہ اسے بیچا نہیں جا سکتا اور وہ اسی طرح نماز پڑھے گی جیسے آزاد عورت پڑھتی ہے۔ اور جہاں تک لونڈی کا تعلق ہے تو اس کا وہ سارا جسم شرمگاہ ہے جو پستانوں سے نیچے ہے اور اس کے لیے اپنے سر اور اپنی کلائیوں کو ننگا کرنا جائز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا حکم مرد کے حکم کی مثل ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لیے اپنے سر اور سینے کو ننگا کرنا مکروہ ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لونڈیوں کو اپنے سر ڈھانپنے پر سزا دیتے تھے اور فرماتے تھے: تم آزاد عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر اس کی ران ننگی ہوئی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے۔ اور ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے کہ لونڈی کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور یہ فقہاء کے اقوال سے خارج ہے، کیونکہ ان کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد عورت کے لیے جائز ہے کہ فرض نماز پڑھے اور اس کے دونوں ہاتھ اور چہرہ مکمل طور پر ننگے ہوں اور وہ ان کے ساتھ زمین کو مس کر رہی ہو۔ تو پھر لونڈی کے لیے بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہوگا اور ام ولد کی حالت لونڈی سے زیادہ گہری ہے۔ اور صغیر بچے کی شرمگاہ کی کوئی حرمت نہیں ہے۔ اور جب بچی اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے آنکھ کا اشارہ ہو سکتا ہو اور اسے شہوت دلائی جا سکتی ہو تو پھر وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔

اور ابوبکر بن عبدالرحمن کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (الاحزاب: 59) (اے نبی مکرم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو) اور حضرت

1۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 255 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 299

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کون سے کپڑوں میں عورت نماز پڑھ سکتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ قمیص اور ایسی اوڑھنی میں جو اس کے پاؤں کے ظاہر کو ڈھانپ سکتی ہو نماز پڑھ سکتی ہے (1)۔ اسے مرفوع روایت کیا گیا ہے اور جنہوں نے اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پر موقوف روایت کیا ہے وہ زیادہ ہیں اور زیادہ حافظ ہیں۔ ان میں مالک اور ابن اسحاق وغیرہ ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے: عبدالرحمن بن عبداللہ بن دینار نے اسے محمد بن زید عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مرفوع روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ ابوعمر نے کہا ہے: ان کے نزدیک یہ عبدالرحمن ضعیف راوی ہے، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بعض احادیث کو روایت کیا ہے۔ اور اس باب میں اجماع خبر سے زیادہ قوی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یعنی ہم نے تم پر وہ بارش برسائی جو روئی اور کتان (السی کا پودا جس سے کپڑے بنائے جاتے ہیں) اگاتی ہے اور ان جانوروں کو قائم رکھتی ہے جن سے اون اور بال وغیرہ حاصل ہوتے ہیں اور یہ مجازی مفہوم ہے اور اسی کی مثل یہ آیت ہے وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس انزال سے مراد لباس میں اس شے کو اتارنا ہے جو حضرت آدم اور حضرت مائی حواء علیہما السلام کے ساتھ تھی، تاکہ وہ اپنے غیر کے لیے مثال بن جائے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ یعنی ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) اس میں بھی انزل بمعنی خلق ہے، جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے تمہیں اسے بنانے کی کیفیت کے بارے الہام کیا (یعنی تمہارے ذہنوں میں اسے بنانے کا طریقہ ڈال دیا)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ رِیْشًا ابوعبدالرحمن، حسن اور عاصم نے مفضل ضبی کی روایت سے، ابوعمرو نے حسین بن علی جعفی کی روایت سے وریاشا پڑھا ہے اور ابوعبید نے اسے حسن کے سوا کسی سے بیان نہیں کیا اور اس کے معنی کی تفسیر بیان نہیں کی۔ یہ ریش کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ زینت ہے جو مال اور لباس کے سبب ہو۔ اور فراء (2) نے کہا ہے: ریش و ریاش جیسے کہا جاتا ہے: لبس و لباس اور ریش الطائر (پرندے کے پر) وہ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد زندگی کی فراخی اور خوشحالی ہے۔ اور وہ معنی جسے اکثر اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ ریش لباس یا معیشت میں سے وہ شی ہے جو ڈھانپ لے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فَرِیشِي منكم وهَوَايَ معكم وإنْ كانت زيارَتكم لِمَاما (3)

اور ابوحاتم نے ابوعبیدہ سے بیان کیا ہے: وهبت له دابة بريشها اسے سواری لباس سمیت دی گئی، مراد وہ کپڑے ہیں جو اس پر ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَیْرٌ بیان فرمایا کہ تقویٰ بہترین اور اچھا لباس ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 94 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 139 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 214

إذا المرء لم يلبس ثياباً من التقىٰ تقلب عريانا وإن كان كاسيا

جب آدمی تقویٰ کا لباس نہیں پہنتا تو وہ ننگا ہی لگتا ہے اگر چہ لباس پہنے ہوئے ہو۔

وخيرُ لباسِ المرءِ طاعةُ ربه ولا خيرَ فيمن كان لله عاصيا

اور آدمی کا بہترین لباس اپنے رب کی اطاعت ہے اور اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

اور قاسم بن مالک نے عوف سے اور انہوں نے معبد جہنی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: لِبَاسُ التَّقْوٰى تقویٰ کا لباس حیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد عمل صالح ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد چہرے پر حسین خاموشی ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی اور اس کے بارے رہنمائی فرمائی۔ اور یہ قول بھی ہے: لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد اون اور کھدر کے کپڑے پہننے ہیں۔

یہ ان میں سے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع وانکساری کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کی عبادت کی جاتی ہے اور یہ دوسرے لباس سے بہتر ہے۔ اور زید بن علی نے کہا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد زرہ اور خود، دو کلائیاں اور دو پنڈلیاں ہیں، جن کے ساتھ جنگ میں اپنی حفاظت کی جاتی ہے(2)۔ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے خوف کا احساس کرنا ہے ان تمام امور میں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور جن سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے، اور اسی کی طرف حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہم کا قول راجع ہے۔ اور حضرت زید بن علی کا قول حسن اور اچھا ہے، کیونکہ انہوں نے جہاد پر ابھارا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد شرمگاہ کو ڈھانپنا ہے(4)۔ اور یہ اس میں تکرار ہے، کیونکہ پہلے ارشاد فرمایا: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد کھدر کا لباس پہننا ہے، کیونکہ یہ تواضع اور ترک رعونت کے زیادہ قریب ہے تو یہ ایک دعویٰ ہے، حالانکہ علماء میں سے فضلاء تقویٰ کے حصول کے ساتھ ساتھ انتہائی قیمتی اور اعلیٰ لباس پہنتے ہیں، جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اہل مدینہ اور کسائی نے لباس کو پہلے لباساً پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ یعنی وانزلنا لباس التقوى اور باقیوں نے مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور ذالك اس کی صفت ہے اور خير مبتدا کی خبر ہے۔ اور اس کا معنی ہے: تقویٰ کا لباس جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ ہے جسے تم جانتے ہو، تمہارے لیے ان کپڑوں کے پہننے سے بہتر ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتے ہیں اور یہ وہ زینت ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل فرمائی، پس تم اسے پہن لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے هو ضمیر مضمر ہے، یعنی هو لباسُ التقوى

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389
2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 463
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389
4۔ ایضاً

یعنی وہ ستر عورت ہے اور اسی کے مطابق ابن زید کا قول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے ولباس التقوی ھو خیر یعنی ذالك بمعنی ھو ہے اور پہلی ترکیب ہی زیادہ احسن ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اور اعمش نے ولباس التقوی خیرٌ پڑھا ہے۔ انہوں نے ذالك نہیں پڑھا۔ اور یہ مصحف کے خلاف ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ ان علامات اور نشانیوں میں سے ہے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کا خالق ہے اور ذالك صفت یا بدل یا عطف بیان ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''اے اولاد آدم! نہ فتنہ میں مبتلا کر دے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے (اور) اتروا دیا ان سے ان کا لباس تا کہ دکھلا دے انہیں ان کے پردہ کی جگہیں۔ بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں۔ بلاشبہ ہم نے بنا دیا شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَفْتِنَنَّكُمُ یعنی شیطان تمہیں دین سے پھیر نہ دے، جیسے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال کر فتنہ میں مبتلا کیا۔ ابٌ مذکر کے لیے اور ابۃٌ مونث کے لیے آتا ہے۔ پس اسی بنا پر ابوان کہا گیا ہے۔ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے اور مِّنَ الْجَنَّةِ پر وقف کیا جائے گا۔ لِيُرِيَهُمَا یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ، یراکم اصل میں یرء اکم تھا پھر ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ اور وقبیلہ اس کا عطف ضمیر پر ہے اور ھو برائے تاکید ہے تا کہ عطف احسن ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرہ:35) یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رأیتك و عمرو کہنا قبیح ہے، (یعنی ضمیر متصل پر عطف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ضمیر منفصل سے اس کی تائید لگائی جائے)۔ اور اس پر کہ مضمر، مظہر کی طرح ہوتا ہے۔ اور اس میں ستر عورت کے واجب ہونے پر بھی دلیل ہے۔ کیونکہ ارشاد گرامی ہے: يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا اور دوسروں نے کہا ہے: بلاشبہ اس میں زوال نعمت سے تحذیر اور ڈراوا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا۔ یہ تب ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت ہم پر لازم ہوتی ہے اور معاملہ اس کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ اس میں قَبِيْلُهٗ سے مراد شیطان کا لشکر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد جن اور شیاطین ہیں (1)۔ ابن زید نے کہا ہے: قَبِيْلُهٗ سے مراد اس کی نسل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی قوم مراد ہے۔ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ جن دیکھے نہیں جا سکتے (2)، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے ہو)۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 141　　2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 98

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا دکھائی دینا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انہیں دکھانے کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کے جسموں سے پردہ ہٹا دیتا ہے یہاں تک کہ انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جن نہیں دکھائی دیتے مگر اس وقت کے نبی علیہ السلام کو (دکھائی دیتے ہیں) تاکہ یہ اس کی نبوت پر دلیل ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خلقت میں تخلیق فرمایا ہے جس میں وہ دکھائی نہیں دیتے، ہاں جب وہ اپنی اصلی صورتوں سے کسی اور شکل میں منتقل ہوتے ہیں تو پھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ ان معجزات میں سے ہے جو انبیاء وقت صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے سوا ظاہر نہیں ہو سکتا۔

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے عادت جاریہ بنادی ہے کہ آج (دنیا میں) اولاد آدم شیاطین کو نہیں دیکھ سکتی۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: إن الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1) (بے شک شیطان انسان کی رگ خون میں چلتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ (الناس) (جو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے لوگوں کے دلوں میں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن للملك لمة وللشیطان لمة (2) (بے شک (دل میں) ایک خیال فرشتے کی جانب سے آتا ہے اور ایک شیطان کی جانب سے) پس جہاں تک فرشتے کے خیال کا تعلق ہے تو خیر اور بھلائی کا وعدہ اور حق کی تصدیق ہوتا ہے اور جہاں تک شیطان کے خیال کا تعلق ہے تو وہ شر کا وعدہ اور حق کی تکذیب کے بارے ہوتا ہے) اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور شیاطین اور (جنات) کی رؤیت کے بارے میں اخبار صحیح موجود ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (3) کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد فرمائی اور آگے انہوں نے طویل قصہ بیان کیا اور اس میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اس جن کو پکڑ لیا جو کھجوریں اٹھاتا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ما فعل أسیرك البارحة (4) (گزشتہ رات تیرے قیدی نے کیا کیا) اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واللہ لولا دعوۃ أخی سلیمان لأصبح موثقا یلعب به ولدان أهل المدینة (5) (قسم بخدا! اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو میں صبح کے وقت اسے بندھا ہوا چھوڑ دیتا یہاں تک کہ اہل مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیلتے) اور اس عفریت کے بارے میں جو آپ پر اچانک حاضر ہو جاتا تھا سورۃ ص میں اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی ہم نے ان کی سزا میں اضافہ کرتے ہوئے شیاطین کو ان کا دوست بنا دیا اور ہم نے انہیں حق سے انحراف کرنے میں مساوی اور برابر قرار دیا۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝٢٨

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 918 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 123

3۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310 4۔ ایضاً 5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 205

''اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں: پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔ آپ فرما دیجئے: بے شک اللہ حکم نہیں دیتا بے حیائیوں کا۔ کیا ایسی بات لگاتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے''۔

اکثر مفسرین کے قول کے مطابق یہاں فَاحِشَةً سے مراد ان کا ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرنا ہے (1)۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد شرک اور کفر ہے (2)۔ اور اس پر انہوں نے ان کی اپنے اسلاف کی تقلید کرنے سے استدلال کیا ہے اور اس سے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بارے حکم دیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (اور اللہ نے بھی ہمیں اس کا حکم دیا ہے) یہ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اس (نظریہ) کو ناپسند کرتا جس پر ہم ہیں تو ہم یقیناً اس سے منتقل ہو جاتے (3)۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ بیان فرمایا کہ وہ اپنی رائے اور مرضی سے فیصلہ دے رہے ہیں اور انہوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور تقلید کی مذمت اور ان کی بہت سی جہالتوں کی مذمت گزر چکی ہے۔ اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے حکم دیا ہے میرے رب نے عدل و انصاف کا، اور سیدھا کرو اپنے چہرے (قبلہ کی طرف) ہر نماز کے وقت اور عبادت کرو اس کی اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لیے عبادت کو جس طرح اس نے پہلے پیدا کیا تھا تمہیں ویسے ہی تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دے دی اور ایک گروہ ہے کہ مقرر ہو گئی ان پر گمراہی، انہوں نے بنا لیا شیطانوں کو (اپنا) دوست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قسط کا معنی عدل ہے (5)، یعنی اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے پس تم اس کی اطاعت کرو اور کلام میں حذف ہے۔ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ اور ہر نماز میں تم اپنے چہروں کو قبلہ شریف کی طرف متوجہ کرو۔ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ جس مسجد میں بھی تم ہو۔ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ اس کی مثل یہ آیت ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 94) (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اور کاف محل نصب میں ہے، یعنی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 99　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 216　3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 91
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 464　5۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 183

تعودون کما بدأکم یعنی جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ تمہیں لوٹائے گا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اپنے ماقبل کے متعلق ہے۔

یعنی ومنہا تُخرَجون کما بدأکم تعودُون (اس سے تم نکالے جاؤ گے جیسے اس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ فَرِیْقًا هَدٰی اس میں فَرِیْقًا، تعودون کی ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای تعودون فریقین تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم دو فریق ہو گے۔ ایک سعادت مند، خوش بخت لوگوں کا گروہ اور دوسرا اشقیا اور بد بخت لوگوں کا گروہ۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے: تعودون فریقین فریقا ھدی و فریقا حق علیھم الضلالۃ یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے اس قول باری تعالیٰ: فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ کے ضمن میں کہا ہے: جس کی تخلیق ابتداء اللہ تعالیٰ نے گمراہی وضلالت کے لیے کی وہ اسے گمراہی کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے ہدایت یافتہ لوگوں کے اعمال جیسے اعمال کیے۔ اور جسے ابتداء اللہ تعالیٰ نے ہدایت پر تخلیق فرمایا تو اسے ہدایت کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے گمراہ لوگوں کے اعمال کی مثل عمل کیے۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ابتداءً ہی گمراہی پر پیدا کیا اور اس نے فرشتوں کے ساتھ مل کر سعادت وخوش بختی کے اعمال کیے، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اسی کی طرف لوٹا دیا جس پر اسے ابتداءً پیدا فرمایا تھا۔ اور فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (البقرہ) (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا) اس میں قدریہ اور ان کے متبعین کا واضح رد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَرِیْقًا، هَدٰی کے سبب منصوب ہے۔ اور دوسرا فریقا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے، یعنی و أضل فریقا (اور اس نے ایک گروہ کو گمراہ کر دیا) سیبویہ نے بھی کہا ہے:

أصبحتُ لا أحمل السِّلاحَ ولا أملِكُ رأسَ البعيرِ إن نَفَرا
والذِّئبُ أخشاه إن مررتُ به وَحْدِی وأخشَى الرياحَ والمطرا

فراء نے کہا ہے: اگر مرفوع ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور عیسیٰ ابن عمر نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ أنھم پڑھا ہے۔ یعنی لأنھم

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝۳۱

"اے آدم کی اولاد! پہن لیا کرو اپنا لباس ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ یہ خطاب سارے عالم کو ہے، اگرچہ اس سے مقصود عرب کے وہ لوگ ہیں جو ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے، کیونکہ یہ حکم ہر مسجد میں نماز کے لیے عام ہے، کیونکہ اعتبار عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب

کا۔ اور بعض علماء نے اس سے طواف مراد ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ طواف تو صرف اور صرف ایک مسجد میں ہوتا ہے اور وہ جو ہر مسجد کو شامل ہے وہ نماز ہے۔ یہ قول ان کا ہے جن پر مقاصد شریعت مخفی رہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک عورت بیت اللہ شریف کا طواف کر رہی تھی اس حال میں کہ وہ برہنہ تن تھی اور کہہ رہی تھی: کون ہے جو مجھے طواف کے کپڑے عاریۃً دے گا؟ (کہ) وہ اسے اپنی شرمگاہ پر رکھ لے گی۔ اور کہہ رہی تھی:

اليومَ يَبْدُو بعضُه أوكلّه وما بَدَا منه فلا أحِلّه (1)

تب یہ آیت نازل ہوئی: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور یہ عورت ضباعہ بنت عامر بن قرط تھی۔ یہ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: عرب لوگ بیت اللہ شریف کا طواف ننگے بدن کرتے تھے سوائے حمس کے اور حمس سے مراد قریش اور ان کی اولاد ہے، وہ ننگے بدن طواف کرتے رہتے تھے مگر یہ کہ قریش انہیں کپڑے عطا کر دیں پس مرد مردوں کو دیتے تھے اور عورتیں عورتوں کو دیتی تھیں۔ اور قریش مزدلفہ سے نہیں نکلتے تھے اور سارے کے سارے لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ اور مسلم کے سوا کسی اور میں ہے: وہ کہتے تھے ہم اہل حرم ہیں، پس عربوں میں سے کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ہمارے کپڑوں کے بغیر طواف کرے اور جب وہ ہماری سرزمین میں داخل ہو جائے تو پھر وہ ہمارے کھانے کے سوا کھانا نہ کھائے، پس عرب میں سے جس کا مکہ مکرمہ میں کوئی دوست نہ ہوتا تو اسے کپڑا عاریۃً دیتا اور نہ کوئی ایسا خوشحال ہوتا جو اسے اس کے عوض اجرت پر رکھ لیتا تو اس کے لیے دو میں سے ایک امر ضروری ہوتا کہ یا تو وہ ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے یا وہ اپنے کپڑوں میں طواف کرے اور جب وہ اپنے طواف سے فارغ ہو تو اپنا لباس اتار کر پھینک دے اور پھر اسے کوئی بھی مس نہ کرے۔ اور اس کپڑے کو اللقیٰ (پھینکا ہوا) کہا جاتا تھا۔ عرب کے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

كفَى حَزَنا كَرِّی عليه كأنه لقًى بين أيدى الطائفين حَرِيمُ (2)

چنانچہ وہ اسی جہالت، بدعت اور گمراہی پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ کو مبعوث فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ، الآیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے یہ اعلان کیا: ألا لا يطوف بالبيت عُرْيان (خبردار! غور سے سنو! کوئی بھی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز ہے اور اس کی زینت جوتا ہے، کیونکہ کرز بن وبرہ نے اسے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے ایک دن فرمایا: خذوا زينة الصلوٰة (تم نماز کی زینت کو اختیار کرو) تو عرض کی گئی: نماز کی زینت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: البسوا نعالكم فصلّوا فيها (تم اپنے جوتے پہن لو اور ان میں نماز پڑھو)

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ستر عورت واجب ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے اور جمہور اہل علم نے یہ موقف

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 777
2۔ ایضاً

اختیار کیا ہے کہ یہ نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ اور ابہری نے کہا ہے: یہ بھی من جملہ ایک فرض ہے اور آدمی پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے رکھے چاہے وہ نماز میں ہو یا نہ ہو۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اپنے کپڑے کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے لے لو اور تم ننگے بدن نہ چلو" (1)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور اسماعیل قاضی نے یہ کہا ہے کہ ستر عورت نماز کی سنتوں میں سے ہے اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ستر عورت نماز میں فرض ہوتا تو ننگے آدمی کے لیے نماز پڑھنا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ہر وہ شے جو نماز میں فرض ہے اس پر قدرت ہوتے ہوئے اس پر عمل کرنے یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے بدل کو لانا واجب ہوتا ہے، یا پھر ساری کی ساری نماز ساقط ہو جائے گی، حالانکہ صورت حال اس طرح نہیں ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جب ہم نے کہا ہے کہ ستر عورت نماز میں فرض ہے اور امام کا تہبند گر جائے اور اس کی دبر ننگی ہو جائے اور وہ رکوع کی حالت میں ہو اور وہ اپنا سر اٹھائے اور اسے ڈھانپ لے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے، یہ ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور سحنون نے کہا ہے: مقتدیوں میں سے جس کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے۔ اور سحنون سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ (امام) بھی نماز کا اعادہ کرے گا اور مقتدی بھی اعادہ کریں گے، کیونکہ ستر عورت نماز کی شرائط میں سے ایک شرط ہے اور جب شرمگاہ ظاہر ہو جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس کی اصل طہارت (پاکیزگی) ہے۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے (2)؟ جنہوں نے کہا ہے کہ ان کی نماز باطل نہ ہو گی تو انہوں نے کسی شرط کو مفقود نہیں پایا۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ (اس کپڑے کو) اپنی جگہ باندھ لے اس کی نماز صحیح ہو گی اور اس کی نماز باطل ہو گی جس نے اس کی طرف دیکھ لیا تو یہ ایسی غلطی ہے جسے مٹانا واجب ہوتا ہے اور اس میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ اور بخاری اور نسائی میں حضرت عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب میری قوم حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس سے واپس لوٹ کر آئی تو انہوں نے بتایا آپ ﷺ نے فرمایا ہے: لیؤمکم اکثرکم قراۃ للقرآن (3) (چاہیے کہ تم میں سے زیادہ قرآن کریم پڑھنے والا تمہاری امامت کرائے) اس نے بیان کیا: پس انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے رکوع و سجود کے بارے سکھایا۔ پس میں انہیں نماز پڑھاتا تھا اور مجھ پر پھٹی ہوئی چادر ہوتی تھی۔ اور وہ میرے باپ کو کہتے تھے: کیا تو اپنے بیٹے کی دبر ہم سے ڈھانپ نہیں سکتا۔ یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ اور حضرت سہل بن سعد سے ثابت ہے کہ انہوں نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چادریں تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی گردنوں میں باندھے ہوتے تھے جیسے بچے کرتے ہیں۔ تو کسی کہنے والے نے کہا: اے عورتوں کے گروہ! تم اپنے سر (سجدوں سے) نہ اٹھاؤ یہاں تک کہ مرد (پہلے) اٹھا لیں (4)۔ اسے بخاری، نسائی اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب کوئی اپنی شرمگاہ کو دیکھے تو اس کے بارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 154

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 780

3۔ سنن نسائی، کتاب القبلہ، جلد 1، صفحہ 125

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 92

نے کہا: ہے جب کپڑا تنگ ہو تو وہ اسے بٹن لگا لے یا اسے کسی شے کے ساتھ سی لے تاکہ قمیص دور نہ ہٹے کہ گریبان سے شرمگاہ دکھائی دے، اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی شرمگاہ دیکھ لی وہ اپنی نماز کا اعادہ کرلے۔ اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام مالک نے حالت نماز میں قمیص کے بٹنوں کو کھلا رکھنے کی رخصت دی ہے اور وہ شلوار (پائجامہ) پہنے ہوئے ہو۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ اور ابوثور رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی قول ہے۔ اور حضرت سالم کھلے بٹنوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اور داؤد الطائی نے کہا ہے: جب ڈاڑھی بڑی ہو تو اس کے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اسی معنی کو اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ پس اگر وہ امام ہو تو وہ نماز نہیں پڑھائے گا مگر اپنی چادر اوڑھ کر، کیونکہ یہ زینت میں سے ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: زینت میں سے نماز جوتوں میں پڑھنا بھی ہے۔ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نماز کی زینت رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ہے۔ ابوعمر نے کہا ہے: ہر شے کے لیے زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت تکبیر اور رفع یدین ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ تم پر وسعت فرمائے تو بھی اپنے آپ کو وسعت دو (1)، آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے جمع کرے، نماز پڑھے ازار (تہبند) اور ردا (اوپر چڑھنے والی چادر) میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قبا (میں) شلوار اور ردا میں، شلوار اور قمیص میں، شلوار اور قبا میں۔ اور میں تو گمان کرتا ہوں کہ انہوں نے فرمایا: تبان (اتنا قلیل کپڑا جس سے صرف شرمگاہ ڈھانپی جاسکے) اور قمیص میں، تبان اور ردا میں، اور تبان اور قبا میں۔ بخاری اور دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: **وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہر اس شی کا کھانا پینا حلال قرار دیا ہے جب تک وہ فضول خرچی یا تکبر و نخوت ہو (2)۔ اور رہی وہ شی جس کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے وہ ہے جو بھوک کا ازالہ کردے، پیاس میں سکون عطا کردے، پس اسے عقلاً اور شرعاً کھانا مستحب ہے، کیونکہ اس میں جان کی حفاظت اور حواس کی نگہداشت ہے، اسی لیے شریعت نے صوم وصال سے منع کیا ہے، کیونکہ وہ جسم کو کمزور کردیتا ہے اور نفس کو ماردیتا ہے اور عبادت سے کمزور کردیتا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اس سے منع کرتی ہے اور عقل اس کا دفاع کرتی ہے، اور جس نے حاجت اور ضرورت کی مقدار سے بھی اپنے آپ کو روک کر رکھا تو اس کے لیے نہ کوئی نیکی میں سے حصہ اور نہ ہی زہد میں ہے، کیونکہ عجز اور ضعف کے سبب وہ طاعت وعبادت کے جس عمل سے محروم ہوا ہے وہ اجر و ثواب کے اعتبار سے زیادہ اور عظیم ہے۔ اور حاجت وضرورت کی مقدار سے زائد کے بارے میں دو مختلف قول ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حرام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مکروہ ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی صحیح ہے (3)، کیونکہ سیر ہونے کی مقدار شہروں اور زمانوں کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح دانت اور اشتہاء طعام بھی اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ کم کھانے میں کثیر فوائد ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں کہ آدمی جسم کے اعتبار سے صحت مند ہوتا ہے، قوت حفظ کے اعتبار سے عمدہ واعلیٰ اور فہم کے اعتبار سے انتہائی ذکی اور ذہین ہوتا ہے، نیند کم ہوتی ہے اور جان ہلکی

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53 2۔ تفسیر ابن عباس، جلد 1، صفحہ 420 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 781

پھلکی رہتی ہے اور زیادہ کھانے میں معدہ بوجھل اور بدہضمی کی بو ہوتی ہے اور اسی سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی نسبت زیادہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کم کھانے کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: أکبر الدواء تقدیر الغذاء (سب سے بڑھ کر دوا غذا کی ایک مقدار مقرر کرنا ہے)

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے اس معنی کو انتہائی شافی بیان کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور وہ اطباء کے کلام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ما ملأ آدمیّ وعاءً شرا من بطن بحسْب ابن آدم لقیمات یقِمْنَ صُلْبَہ فإنْ کان لا محالۃ فثلثٌ لطعامہ وثلثٌ لشرابہ وثلث لنفسہ (1) (انسان ہونے کے اعتبار سے آدمی پیٹ کے برتن کو جس شی سے بھر سکتا ہے وہ چند لقمے ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھتے ہیں اور اگر ضروری بھی ہو تو پھر ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی مشروبات کے لیے اور ایک تہائی اس کے سانس کے لیے ہو)

ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے اسے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر بقراط یہ تقسیم سن لیتا تو بالیقین اسے اس حکمت پر تعجب ہوتا۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ رشید کے پاس ایک عیسائی ماہر حکیم تھا تو اس نے حضرت علی ابن الحسین رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہاری کتاب میں علم طب کی کوئی شی نہیں ہے اور علم دو طرح کا ہے: ایک علم الادیان اور ایک علم الابدان۔ تو حضرت علی نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ساری طب کو ہماری کتاب کی نصف آیت میں جمع کر دیا ہے۔ تو اس نے پوچھا: وہ کون سی ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا۔ پھر نصرانی نے کہا: تمہارے رسول ﷺ سے علم طب کی کوئی شی مروی نہیں ہے۔ تو حضرت علی نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے تھوڑے الفاظ میں ساری طب کو جمع کر دیا ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: المعدۃ بیت الأدواء والحِمْیَۃ رأسُ کلّ دواء وأعط کل جسد ما عوّدتہ (معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز دوا کی اصل ہے اور تو ہر جسم کو وہ دے جس کا تو نے اسے عادی بنایا ہے) تو وہ نصرانی بولا: ما ترک کتابکم ولا نبیکم لجالینوس طباً (2) (تمہاری کتاب اور تمہارے نبی علیہ السلام نے جالینوس کی طب کی کوئی شے چھوڑی ہی نہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہا جاتا ہے بے شک مریض کا علاج دو حصوں میں منقسم ہے: نصف دوا ہے اور نصف پرہیز ہے۔ پس اگر یہ دونوں جمع ہوں تو مریض تندرست اور صحت یاب ہو جائے گا، ورنہ اس میں پرہیز اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ پرہیز ترک کرنے کے ساتھ دوا فائدہ نہیں دیتی، حالانکہ پرہیز دوا چھوڑ دینے کے باوجود فائدہ دیتی ہے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أصل کل دواء الحِمیۃ (ہر دوا کی اصل پرہیز ہے) اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے کہ پرہیز ہر دوا سے غنی کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم

اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہند کا بڑا علاج پرہیز ہے، مریض کھانے، پینے، کلام سے چند دن تک پرہیز کرتا ہے تو وہ تندرست اور صحت یاب ہو جاتا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60

2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 100

**مسئلہ نمبر 5۔** مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے''(1)۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دنیا میں سے انتہائی قلیل حاصل کرنے اور اس میں انتہائی زہد و قناعت اختیار کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور عرب کم کھانے کے سبب مدح و تعریف کرتے ہیں اور زیادہ کھانے کے سبب مذمت کرتے ہیں، جیسا کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

تکفیه فِلْذَةُ كِبْدٍ إن أَلَمّ بها من الشِّواء ويُرْوِي شُرْبَهُ الغُمَرُ

اسے جگر کا ایک ٹکڑا کافی ہوتا ہے اگر وہ روسٹ شدہ میں سے اس پر اصرار کرے اور ایک چھوٹا سا پیالہ اس کی پیاس کو بجھا دیتا ہے۔

اور ام زرع نے ابن ابی زرع کے بارے کہا ہے: بھیڑ کے چار ماہ کے بچے کے بازو اسے سیر کرتے ہیں، اور حاتم طائی نے زیادہ کھانے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے:

فإنك إن أعطيتَ بطنك سؤلَه وفرجَك نالا مُنتهى الذَّمِّ أجمعا

اگر تو پیٹ اور فرج کو اس کی خواہش کے مطابق دیتا رہے گا تو وہ دونوں مذمت کی انتہا کو پالیں گے۔

اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المؤمن یأکل فی معیً واحد (2) کا معنی یہ ہے کہ پیٹ بھرنے سے کم کھاتا ہے اور وہ اپنے نفس پر دوسرے کو ترجیح دیتا ہے اور وہ اپنے کھانے میں دوسرے کے لیے باقی رکھتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کھالے اسی پر وہ قناعت کر لیتا ہے۔ پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد: والکافر یأکل فی سبعۃ أمعاء (3) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ کبھی مومن کی نسبت کافر کم کھانے والا پایا جاتا ہے اور کبھی کافر اسلام قبول کرتا ہے لیکن اس کا کھانا کم و بیش نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ ایک معین (فرد) کی طرف ہے۔ ایک کافر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مہمان ٹھہرا، کہا جاتا ہے کہ وہ جہجاہ غفاری تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثمامہ بن اثال تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نضلہ بن عمرو غفاری تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ بصرہ بن ابی بصرہ غفاری تھا۔ اس نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا، پھر صبح کے وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اس نے ایک بکری کا دودھ پیا اور اسے بھی مکمل طور پر نہ پی سکا۔ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا(4) گویا کہ آپ نے اس طرح فرمایا: هذا الکافر (یہ کافر) واللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل جب نور توحید کے ساتھ منور ہو جاتا ہے تو وہ طاعت و عبادت کے لیے تقویٰ کی آنکھ سے کھانے کی طرف دیکھتا ہے اور اس سے بقدر حاجت لے لیتا ہے اور جب وہ کفر کے ساتھ تاریک تھا اس کا کھانا ایسا تھا جیسے چوپایہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، جلد 2، صفحہ 186 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ جامع ترمذی، باب ماجاء ان المومن یاکل فی معی واحد، حدیث نمبر 1741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چرتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پتلا پاخانہ کر دیتا ہے۔

اوران آنتوں میں اختلاف ہے، کیا یہ حقیقی مراد ہیں یا نہیں؟ تو کہا گیا ہے کہ مراد حقیقی انتڑیاں ہیں اور طب وتشریح کے علماء کے نزدیک ان کے معروف نام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان سات اسباب میں سے کنایہ ہیں جن کے ساتھ پیٹو کھاتا ہے: وہ حاجت اور ضرورت کے لیے، کوئی خبر سننے کے لیے، چکھنے کے لیے، سونگھنے کے لیے، دیکھنے کے لیے، مس کرنے کے لیے کھاتا ہے اور فوائد ومنافع میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ اس کے کھانے کی مثل کھاتا ہے جس کی سات انتڑیاں ہوں۔ اور مومن اپنے کم کھانے کے سبب اس کی مثل کھانا کھاتا ہے جس کی صرف ایک آنت ہوتی ہے، پس وہ کافر کے ساتھ اس کے کھانے کے اجزاء میں ایک جز کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور کافر اس پر سات گناہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور معی کا لفظ اس حدیث میں معدہ کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب یہ پختہ ہو گیا تو پھر جان لے کہ آدمی کے لیے کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھوں کو دھونا مستحب ہے، کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: الوضوء قبل الطعام وبعدہ برکۃ(1) (کھانے سے پہلے اور بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) باعث برکت ہے) اور اسی طرح تورات میں ہے۔ اسے زاذان نے سلمان سے روایت کیا ہے۔ اور امام مالک پاک صاف ہاتھوں کو دھونا مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن حدیث طیبہ کی اقتدا و پیروی کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور کوئی (آدمی) کھانا نہ کھائے یہاں تک کہ یہ جان لے کہ آیا وہ گرم ہے یا ٹھنڈا؟ کیونکہ اگر وہ گرم ہوگا تو اسے تکلیف اور اذیت ہوگی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ابردوا بالطعام فان الحار غیر ذی برکۃ(2) (کھانے کو ٹھنڈا کر لو کیونکہ گرم کھانا برکت والا نہیں ہوتا) یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکی ہے۔ اور کھانے کو سونگھے نہیں کیونکہ یہ چوپاؤں کا عمل ہے، بلکہ اگر اسے پسند ہو تو اسے کھا لے اور اگر پسند نہ ہو تو اسے چھوڑ دے۔ اور لقمہ چھوٹا بنائے اور اسے زیادہ دیر تک چبائے تاکہ پیٹو اور حریص شمار نہ ہو۔ اور شروع میں بسم اللہ شریف پڑھے اور آخر میں الحمد کہے۔ اور یہ مناسب نہیں کہ وہ الحمد للہ کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک تمام ساتھی کھانے سے فارغ ہو جائیں، کیونکہ آواز بلند کرنے میں انہیں کھانے سے روکنے کی طرف اشارہ ہے۔ کھانے کے آداب بہت زیادہ ہیں، یہ تمام انہیں میں سے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سورۂ ہود میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور پینے کے بھی معروف آداب ہیں۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا اکل احدکم فلیاکل بیمینہ واذا شرب فلیشرب بیمینہ فان الشیطان یاکل بشمالہ ویشرب بشمالہ(3) (جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے اور جب کوئی مشروب پیے تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 172
2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 249، حدیث نمبر 40802
3۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 172

سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے)

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: **وَ لَا تُسْرِفُوْا** یعنی کھانے کی کثرت میں (تم فضول خرچی نہ کرو) اور اس میں سے کثرت شرب بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ (زیادہ کھانا یا پینا) معدے کو بوجھل کر دیتا ہے اور یہ آدمی کو اپنے مالک کی خدمت سے روک لیتا ہے اور خیر اور نیکی کے اضافی کاموں میں حصہ لینے سے روک دیتا ہے۔ اور اگر اس نے اس حد سے انتہائی تجاوز کر لیا کہ فرض قیام سے اس نے روک دیا تو یہ اس پر حرام ہو جائے گا، حالانکہ اس نے اپنے کھانے اور پینے میں اسراف اور زیادتی کی ہے۔ اسد بن موسیٰ نے عون بن ابی جحیفہ عن اُبیہ کی حدیث روایت کی ہے اس نے بیان کیا: میں نے موٹے گوشت کے ساتھ ثرید بنا کر کھایا، پھر میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میں (معدہ بھر جانے کے سبب) ڈکار لے رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "ابا جحیفہ! اپنے ڈکار روک لے، کیونکہ دنیا میں اکثر لوگ پیٹ بھرے ہوتے ہیں قیامت کے دن ان کی بھوک طویل ہو جائے گی" (1)۔ پس اس کے بعد ابو جحیفہ نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا یہاں تک کہ دنیا سے وصال فرما گئے، وہ جب صبح کا کھانا کھا لیتے تھے تو شام کا نہ کھاتے تھے اور جب کبھی شام کا کھاتے تو پھر صبح کا کھانا نہ کھاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المؤمن یأکل فی مِعًی واحد (2) کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ایمان تام، کیونکہ آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے ایمان کا کمال یہ ہے کہ ابو جحیفہ کی طرح ایسے امور میں فکر کرتا ہے جو اسے موت اور اس کے بعد پیش آئیں گے اور ان احوال میں سے خوف اور ڈر سے اپنی شہوت کو پورا کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

اور ابن زید نے کہا ہے: **وَ لَا تُسْرِفُوْا** کا معنی ہے: تم حرام نہ کھاؤ (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ السرف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) کہ تو ہر وہ شی کھائے جس کی تجھ میں طلب اور چاہت پیدا ہو (4)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اسراف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) پیٹ بھرنے کے بعد مزید کھانا۔ اور یہ سب ممنوع ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا: اے بیٹے! (ایک بار) پیٹ بھرنے کے اوپر مزید پیٹ بھر کر نہ کھا، کیونکہ تیرا اسے کتے کے لیے ڈال دینا اس میں سے بہتر ہے کہ تو اسے کھائے۔ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا: اس نے کیا کیا؟ انہوں نے بتایا: اسے گزشتہ رات بدہضمی ہو گئی۔ آپ نے کہا: اسے بدہضمی ہوئی؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ اگر وہ مر جاتا تو میں اس پر نماز نہ پڑھتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے ایام حج میں چکنائی نہ [illegible] تے تھے اور کھانے کی قلیل مقدار پر اکتفا کرتے تھے اور ننگے بدن طواف کرتے تھے۔ تو ان کو فرمایا گیا: **خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا** یعنی تم اس شے کو حرام کرنے میں زیادتی اور اسراف نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام نہیں کیا۔

---

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 217، حدیث نمبر 6220
2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 186
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 218
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، جلد 1، صفحہ 248

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے، آپ فرمایئے: یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی (اور) صرف انہیں کے لیے ہیں قیامت کے روز، یونہی ہم مفصل بیان کرتے ہیں آیتوں کو ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) جانتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنی طرف سے ایسی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام نہیں کیا۔ یہاں زینت کا لفظ خوبصورت اور حسین لباس کے لیے ہے، جب اسے پہننے والا اس پر قادر ہو۔ اور یہ بھی کیا گیا ہے: مراد تمام کپڑے ہیں، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: إذا وسع الله عليكم فأوسعوا (1) (جب اللہ تعالیٰ تمہیں وسعت اور خوشحالی عطا فرمائے تو تم بھی اپنے نفسوں کو راحت اور وسعت عطا کرو) یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن حسین ابن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ ان کے بارے روایت ہے کہ وہ ریشم اور ان سے بنا ہوا کپڑا پچاس دینار کے عوض خرید کر موسم سرما میں وہ لباس پہنتے تھے اور جب گرمیوں کا موسم آتا تو اسے صدقہ کر دیتے یا اسے بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دیتے اور موسم گرما میں وہ مصری کپڑوں میں سے سرخ مٹی سے رنگے ہوئے دو کپڑے پہنتے تھے اور یہ کہتے تھے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو یہ آیت قیمتی اور عمدہ لباس پہننے اور جمعہ اور عید کے دنوں میں لباس کے ساتھ حسن و جمال کا اظہار کرنے پر دلیل ہے، (اسی طرح) لوگوں سے ملاقات کرنے کے وقت اور بھائیوں کی زیارت و ملاقات کے وقت حسین لباس پہننے پر بھی دلیل ہے۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں تو وہ حسن و جمال کا اہتمام کریں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے (2) کہ انہوں نے ایک ریشمی حلہ دیکھا جو مسجد کے دروازے کے پاس بیچا جا رہا تھا، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اسے جمعہ کے دن پہننے کے لیے اور وفود سے ملاقات کے وقت پہننے کے لیے خرید لیں جب وہ (وفود) آپ سے ملاقات کے لیے آتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما يلبس هذا من لا خلاق له في الآخرة (3) (اسے وہ پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو) تو اس میں آپ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 52
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 189
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 122

نے تجمل وخوبصورتی کے سبب اس کا انکار نہیں کیا، بلکہ اس کے ریشمی ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کیا، حالانکہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درہم کے عوض ایک حلہ خریدا آپ اس میں نماز پڑھتے تھے۔

اور حضرت مالک بن دینار عدن کا بنا ہوا عمدہ کپڑا پہنتے تھے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا کپڑا تقریباً ایک دینار کے عوض خریدا جاتا تھا۔ یہ کہاں ان میں سے ہیں جن سے اعراض کیا جاتا ہے اور آپ کھدر کے لباس کو السی اور اون کے کپڑوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اور فرماتے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ غور کرو! جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کیا آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تقویٰ کا لباس ترک کر دیا؟ نہیں۔ قسم بخدا! بلکہ وہ تو اہل تقویٰ ہیں اور صاحب عقل وعرفان ہیں اور ان کے سوا صرف اہل دعویٰ ہیں، ان کے دل تقویٰ سے خالی نہیں۔ خالد بن شوذب نے کہا ہے: میں حسن کے پاس حاضر تھا اور ان کے پاس فرقد آیا اور حسن نے اسے اس کے کپڑوں سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور فرمایا: اے فریقد، اے ام فریقد کے بیٹے! بے شک نیکی اس لباس میں نہیں ہے، بلکہ نیکی وہ ہے جو سینے میں راسخ ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ اور میرے بھتیجے ابو محمد معروف بالکرخی ابو الحسن بن یسار کے پاس تشریف لے گئے اور وہ اون کا جبہ پہنے ہوئے تھے، تو ابو الحسن نے انہیں کہا: اے ابا محمد! تو نے اپنے دل کو صوفی بنایا ہے یا اپنے جسم کو؟ اپنے دل کو صوفی بنا اور اپنے بدن کو قہستانی کپڑا پہنا۔ ایک آدمی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا: آپ کے اصحاب (ساتھیوں) کی ایک جماعت آئی ہے اور وہ جامع میں ہیں، پس آپ چلے اور آپ نے ان پر پیوند لگے ہوئے کپڑے اور پٹیاں (چھوٹے چھوٹے رومال) دیکھیں تو آپ یہ کہنے لگے:

أمّا الخيام فإنها كخيامهم　　وأرى نساء الحيّ غير نسائه

''جہاں تک خیموں کا تعلق ہے تو یہ ان کے خیموں کی طرح ہیں اور میں محلے کی عورتوں کو اجنبی عورتیں دیکھ رہا ہوں''۔

ابو الفرج ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں چار وجہ سے پٹیاں اور پیوند لگے کپڑے پہننا ناپسند کرتا ہوں: ایک تو اس لیے کہ یہ اسلاف کا لباس نہیں ہے، بلاشبہ وہ اہم ضرورت کے وقت پیوند لگاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لباس فقر وافلاس کے دعویٰ کو متضمن ہوتا ہے، حالانکہ آدمی کو حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اثر کو ظاہر کرے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں زہد کا اظہار ہے، حالانکہ ہمیں اسے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے یہ ان لوگوں کے ساتھ مشابہت ہے جو شریعت سے دور ہٹنے والے ہیں۔ اور جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے وہ انہیں میں سے ہوتا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس نے خطا اور غلطی کی ہے جس نے بالوں اور اون کے لباس کو روئی اور کتان کے لباس پر ترجیح دی ہے، بشرطیکہ وہ اس کا لباس پہننے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور جس نے سبزی اور دال کھائی اور اسے گندم کی روٹی کی نسبت زیادہ پسند کیا۔ اور جس نے اس خوف سے گوشت کھانا چھوڑ دیا کہ اس سے اس میں عورتوں کی خواہش اور طلب پیدا ہوگی۔ حضرت بشر بن حارث سے اونی لباس کے بارے پوچھا گیا، تو ان پر یہ شاق گزرا اور ان کے چہرے میں کراہیت اور ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر فرمایا: شہروں میں میرے نزدیک خز (ریشم) اور معصفر پہننا اون پہننے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اور ابو الفرج نے کہا ہے: اسلاف متوسط لباس پہنتے تھے، نہ زیادہ اعلیٰ اور نہ زیادہ گھٹیا اور وہ جمعہ، عید اور بھائیوں سے

ملاقات کے لیے عمدہ اور خوبصورت لباس پسند کرتے تھے اور ان کے نزدیک عمدہ لباس پسند کرنا، قبیح نہیں تھا۔ اور رہا وہ لباس جو اپنے پہننے والے کے لیے عیب ہوتا ہے، چونکہ وہ اظہار زہد اور اظہار فقر کو متضمن ہوتا ہے، تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کی زبان ہے اور یہ پہننے والے کی حقارت اور ذلت کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہ سب مکروہ ہے اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور کوئی کہنے والا کہے: لباس کا عمدہ اور ارفع ہونا تو نفس کی خواہش ہے، حالانکہ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس میں (اعلیٰ اور قیمتی لباس میں) مخلوق کے لیے تزیین و آرائش ہے، حالانکہ ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہمارے افعال اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لیے ہوں نہ کہ مخلوق کے لیے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ ہر شی (یا عمل) جس کی خواہش نفس کرتا ہے وہ قابل مذمت نہیں ہوتی، لہٰذا لوگوں کے لیے جو بھی زیب و زینت کی جائے گی وہ مکروہ نہ ہوگی، البتہ اس سے ضرور روکا جائے گا جب شریعت نے اس سے منع کیا ہو یا دین کے معاملے میں ریا کی وجہ سے (اس سے منع کیا جائے گا) کیونکہ انسان کے لیے واجب ہے کہ وہ خوبصورت دکھائی دے۔ یہ نفس کا وہ حصہ ہے جو قابل ملامت نہیں، اسی وجہ سے وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور شیشے میں دیکھتا اور اپنی دستار کو درست کرتا ہے اور وہ ایسا لباس پہنتا ہے جس کا کپڑا اندر کی جانب سے کھردرا ہوتا ہے اور باہر کی جانب سے اس کا ظاہر انتہائی حسین اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو مکروہ ہو اور نہ ہی اس کی مذمت کی جاسکتی ہے۔

حضرت مکحول نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کا ایک گروہ دروازے پر آپ کا انتظار کر رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ارادہ سے باہر تشریف لائے اور گھر میں ایک برتن تھا جس میں پانی تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی میں دیکھنے لگے اور اپنی ریش مبارک اور اپنے بال سیدھے اور درست فرمانے لگے۔ تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ بھی یہ کر رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعم إذا خرج الرجلُ إلى أخوانه فليهئ من نفسه فإنّ الله جميل يحب الجمال (ہاں جب آدمی اپنے بھائیوں کے پاس جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو تیار کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر(1) (جنت میں وہ داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا) تو ایک آدمی نے عرض کی: بے شک آدمی تو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا حسین ہو اور اس کے جوتے حسین ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إنّ الله جميل يحب الجمال الكِبْرُ بطرُ الحق وغمطُ الناس (2) (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال (خوبصورتی) کو پسند کرتا ہے اور تکبر حق کو قبول کرنے سے انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے) اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، وہ تمام کی تمام نظافت اور حسن ہیئت پر دلالت کرتی ہے۔

محمد بن سعد نے بیان کیا ہے کہ فضل بن دکین نے ہمیں خبر دی، انہوں نے کہا ہمیں مندل نے ثور کے واسطہ سے خالد بن معدان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوران سفر کنگھی، شیشہ، تیل، مسواک اور سرمہ اپنے ساتھ رکھتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 65 2۔ ایضاً

تھے۔ اور ابن جریج سے مروی ہے: کنگھی ہاتھی دانت کی تھی اس کے ساتھ آپ کنگھی کرتے تھے۔ ابن سعد نے کہا ہے: ہمیں قبیصہ بن عقبہ نے بتایا ہے انہوں نے بیان کیا سفیان نے ربیع بن صبیح عن یزید رقاشی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے سر مبارک کو تیل لگاتے تھے اور اپنی ریش مبارک کو پانی کے ساتھ کنگھی کرتے تھے۔

یزید ابن ہارون نے ہمیں خبر دی ہے کہ عباد بن منصور نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرمہ دانی تھی جس سے آپ سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ ڈالتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، طیبات کا اسم ہر اس شی کے لیے عام ہے جو کمائی اور کھانے کے اعتبار سے پاکیزہ اور طیب ہو۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم (1) نے بیان کیا ہے: مراد رزق میں سے وہ پاکیزہ اور حلال چیزیں ہیں جنہیں اہل جاہلیت نے حرام قرار دیا مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ (یہ سبھی جانور ہیں جنہیں انہوں نے اپنے لیے حرام کر رکھا تھا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ سے مراد ہر لذیذ کھانا ہے، تحقیق طیبات کو ترک کرنے اور لذات سے اعراض برتنے میں اختلاف ہے، پس ایک قوم نے کہا ہے: اس کا تعلق قربات سے نہیں ہے اور مباحات میں عمل کرنا اور نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں فی ذاتہ کوئی قربت نہیں ہے، بلکہ یہ تو دنیا میں زہد اختیار کرنے، دنیا میں اپنی طویل امید کو کم کرنے اور اس کی وجہ سے تکلف ترک کرنے کا ایک ذریعہ اور راستہ ہے۔ اور یہ اس کے لیے مستحب امر ہے اور مستحب سبب قربت ہے۔ اور ایک اور فریق نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے: اگر ہم چاہتے تو ہم صلاء، صلائق اور صناب بناتے، لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کو کئی اقوام کی مذمت کرتے ہوئے سنا ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں) اور صرائق را کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور صلائق اور صرائق دونوں کا معنی روٹی ہے۔ اور صلائق (لام کے ساتھ) سے مراد وہ ہے جو گوشت اور سبزی کے ساتھ لگائی جائے۔ اور صلاء (صاد کے کسرہ اور مد کے ساتھ) سے مراد بھنا ہوا گوشت ہے۔ اور صناب سے مراد رائی اور کشمش سے بنائی ہوئی چٹنی ہے۔ اور دوسروں نے ان تمام کی موجودگی میں کلفت اور غیر کلفت کے ساتھ فرق کیا ہے۔ ابو الحسن علی بن مفضل جو ہمارے اشیاخ کے شیخ ہیں انہوں نے فرمایا ہے: یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ

کیونکہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو محض اس کے عمدہ اور طیب ہونے کی وجہ سے اسے کھانے سے منع فرمایا ہو، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ، شہد، تربوز اور پکی کھجوریں تناول فرماتے تھے، البتہ ان کے لیے تکلف کرنا اس لیے مکروہ ہے کہ ان میں شہوات دنیا کے سبب امور آخرت سے غافل ہونا لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

میں (مفسر کہتا ہوں: بعض صوفیاء نے لذیذ کھانے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 194

طرح ہے تو پھر فواحش میں سے ظاہر زنا ہے۔ واللہ اعلم

وَالْاِثْمَ حسن نے کہا ہے: اس سے مراد خمر (شراب) ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

شربتُ الإثم حتی ضلّ عقلی		کذاك الإثمُ تذهبُ العقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل جاتی رہی اسی طرح گناہ عقلوں کو ختم کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

نشرب الإثم بالصُّوَاع جِهارًا		وتری المسك بیننا مُستعارا (1)

اس میں بھی اثم کا لفظ شراب کے معنی میں مذکور ہے۔

وَالْبَغْیَ اس کا معنی ظلم کرنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور ثعلب نے کہا ہے: البغی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی کے بارے میں کچھ دعویٰ کرتا ہے اور اس بارے میں گفتگو کرتا ہے اور وہ بغیر حق کے اس سے مطالبہ کرتا ہے، مگر یہ کہ وہ حق کے ساتھ اس پر غالب آجائے۔ (یعنی اگر دوسرا حق کے ساتھ اس پر غالب نہ آئے تو یہ اس سے ناحق چیز لے لیتا ہے) اور اثم اور بغی کو فواحش سے الگ ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں بھی فواحش میں سے ہیں، تو یہ فحش میں ان کے انتہائی برا ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ پس ان دونوں کے امر کی تاکید کے لیے اور ان کے بارے زجر و توبیخ کا قصد کرتے ہوئے ان کے ذکر پر نص بیان فرمائی۔ اور اسی طرح وَ اَنْ تُشْرِكُوْا اور وَ اَنْ تَقُوْلُوْا ہیں۔ یہ دونوں ماقبل پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہیں۔ اور ایک جماعت نے اثم بمعنی خمر ہونے کا انکار کیا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اثم سے مراد وہ گناہ ہے جو حد اور لوگوں پر لمبا ہونے (انتہائی شاق ہونے) سے کم ہو۔ نحاس نے کہا ہے: رہا یہ کہ اثم بمعنی خمر ہو تو یہ معروف نہیں۔ اور اثم کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ تمام گناہ اثم کہلاتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا ہے:

إنی وجدتُ الأمرَ أرشَدُه		تقوی الإله وشرُّه الإثمُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عربی نے بھی اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: "شعر میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے"۔ کیونکہ اگر وہ کہتا: شربتُ الذنب یا شربتُ الوزر لکان کذالك (میں نے گناہ کیا یا میں نے بوجھ (گناہ کا) اٹھایا تو اس طرح ہوا) اس قوت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ذنب اور وزر دونوں شراب کے اسماء میں سے ہیں، اسی طرح لفظ اثم بھی ہے۔ اور جس نے اس قسم کی مثالوں کے ساتھ گفتگو اور تکلم کو ثابت کیا ہے جو لغت اور معانی میں طریقہ استدلال سے جہالت اور ناواقفی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے اسے حسن سے ذکر کیا ہے اور جوہری نے صحاح میں کہا ہے: کبھی خمر کو اثم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

شربتُ الإثم.......... البیت (2)

اور ہروی نے اپنی غریب میں کہا ہے کہ خمر اثم (گناہ) ہے پس یہ بعید نہیں ہے کہ اثم کا لغوی اطلاق تمام گناہوں پر ہوتا

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 146		2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 220

ہے اور خمر پر بھی اور اس میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اور بغی کا معنی ظلم میں تجاوز کرنا (اور حد سے بڑھنا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فساد ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝٣٤

''اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، سو جب آ جائے ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ یعنی ہر امت کے لیے ایک وقت ہے جو مقرر کر دیا گیا ہے۔ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ یعنی جب ان کا وہ وقت آ جائے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم اور معین ہے۔

ابن سیرین نے صیغہ جمع کے ساتھ جاء آجالھم پڑھا ہے۔ لَا يَسْتَأْخِرُونَ تو نہ وہ اس سے ایک لحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ ایک لحہ سے کم، مگر یہ خاص طور پر ساعت کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اوقات کے اسماء میں سے اُقل اور کم یہی ہے اور یہ ظرف زمان ہے۔

وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں) تو یہ اس پر دلیل ہے کہ مقتول اپنا مقررہ وقت آنے پر ہی قتل کیا جاتا ہے۔ اور أجل الموت سے مراد موت کا مقررہ وقت ہے، جیسے اجل الدین قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت ہے۔ اور ہر وہ شی جس کے ساتھ کسی شی کو موقت کر دیا جائے تو وہی اس کے لیے اَجل ہوتی ہے۔ اور انسان کی اَجل سے مراد وہ خاص وقت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ لامحالہ اس وقت خاص میں زندہ آدمی مر جائے گا۔ اور یہ وہ وقت ہے جس سے اس کی موت کا موخر ہونا جائز نہیں ہوتا، اس حیثیت سے نہیں کہ اس کی تاخیر مقدر نہیں۔ اور بہت سے معتزلہ نے کہا ہے سوائے اس کے جس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی ہے: بے شک مقتول اپنے اس مقرر وقت سے پہلے مر جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور یہ کہ اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو وہ ابھی زندہ رہتا۔ یہ غلط ہے، کیونکہ مقتول اس وجہ سے نہیں مرا کہ دوسرے نے اسے قتل کیا ہے، بلکہ اس وجہ سے اسے موت آئی ہے) جو فعل اللہ تعالیٰ نے اس کی جان ختم کرنے کے بارے اس وقت کیا جب اسے ضرب لگی۔ پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر وہ اپنے مقررہ وقت پر مرا ہے تو پھر اس کے قاتل کو قتل کیوں کیا جاتا ہے اور اس سے قصاص کیوں لیا جاتا ہے؟ تو جواب یہ دیا جائے گا: ہم اسے اس لیے قتل کرتے ہیں کہ اس نے حد سے تجاوز کیا ہے اور اس نے ایسا تصرف کیا ہے جس میں اسے تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا، اس کا سبب مقتول کی موت اور اس کے جسم سے روح کا نکلنا نہیں، کیونکہ یہ اس (قاتل) کا فعل نہیں۔ اگر وہ لوگوں کو اور اس کی اس تعدی اور زیادتی کو بغیر قصاص کے چھوڑ دے تو بالیقین یہ فساد اور لوگوں کو ہلاکتوں تک پہنچا دے۔ یہ بالکل واضح اور بین ہے۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

''اے اولاد آدم! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں سے جو بیان کریں تم پر میری آیتیں تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور غرور کیا ان سے وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یہ شرط ہے۔ ما کے دخول کی وجہ سے نون تاکید داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما صلہ ہے، یعنی أن یأتکم (اگر تمہارے پاس رسول آئیں) اس میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی طرف ان میں سے رسول بھیجے گا تا کہ ان کا قبول کرنا (آسان اور) اقرب ہو۔ اور قصص سے مراد لگا تار اور تسلسل کے ساتھ بات کرنا ہے۔

آیاتی یعنی میرے فرائض اور میرے احکام (وہ تم پر میرے فرائض اور میرے احکام بیان کریں)۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ یہ شرط ہے اور اس کا مابعد اس کا جواب ہے اور پھر یہ پہلی شرط کا جواب ہے، یعنی جس نے اصلاح کر لی اس کی جو میرے اور اس کے درمیان ہے۔ وأصلح منکم ما بینی وبینه۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ اس پر دلیل ہے کہ قیامت کے دن مومنین نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ انہیں غم لاحق ہوگا اور نہ ان پر کوئی رعب اور ڈر طاری ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کے احوال اور خوف تو انہیں لاحق ہوگا لیکن ان کا انجام امن اور سکون ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ کا جواب وہ ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے، یعنی فأطیعوهم فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ (پس تم ان کی اطاعت کرو اور جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی (1)) پہلا قول زجاج کا ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو انہیں مل جائے گا ان کا حصہ جو ان کی قسمت میں لکھا ہے، یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے جو قبض کریں گے ان کی روحوں کو تو (ان سے) کہیں گے: کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا؟ کہیں گے: وہ گم ہو گئے ہم سے اور گواہی دیں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے''۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 102

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے سے اور اس کی آیات کو جھٹلانے سے زیادہ برا اور شنیع ظلم کون سا ہے۔ پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ یعنی رزق، عمر اور عمل میں سے جو ان کے لیے لکھا جا چکا ہے وہ انہیں مل جائے گا۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ اور ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شقاوت وسعادت میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ حصہ انہیں مل جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خیر اور شر میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے (وہ انہیں مل جائے گا) حسن اور ابو صالح نے کہا ہے: ان کے کفر کی مقدار کے برابر عذاب انہیں مل جائے گا۔ اور علامہ طبری کی پسند یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: ما كُتِبَ لهم، اي ما قُدِّرَ لهم من خيرٍ و شرٍ و رزقٍ و عملٍ و أجلٍ (1) (جو ان کے لیے لکھا گیا ہے یعنی خیر اور شر، رزق، عمل اور اُجل (عمر) میں سے جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سب انہیں مل جائے گا)، جیسا کہ ابن زید، حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال میں سے پہلے گزر چکے ہیں۔ فرمایا: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس کے پیچھے یہ ارشاد گرامی ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ یعنی یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے موت کے فرشتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ کفار کا عذاب اس میں مذکور ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ حسن بن علی حلوانی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے علی بن مدینی نے لکھوایا ہے اور کہا ہے، میں نے عبدالرحمن بن مہدی سے قدر کے بارے پوچھا، تو انہوں نے مجھے کہا: ہر شی تقدیر کے مطابق ہے، طاعت و معصیت بھی تقدیر کے ساتھ ہیں اور سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی یہ کہے: بے شک گناہ تقدیر کے ساتھ نہیں ہیں۔ علی نے بیان کیا اور عبدالرحمن بن مہدی نے مجھے کہا: علم، قدر اور کتاب بھی ہم معنی اور برابر ہیں۔ اور جب میں نے عبدالرحمن بن مہدی کا کلام یحییٰ بن سعید پر پیش کیا تو انہوں نے کہا: اس کے بعد قلیل و کثیر کوئی شی باقی نہیں رہی۔

اور یحییٰ بن معین نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں مروان فزاری نے بیان کیا کہ ہمیں اسماعیل بن سمیع نے بکیر الطویل سے، انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (2) سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ کے بارے کہا کہ یہ وہ قوم ہے جو ایسے اعمال کریں گے جو اعمال کرنا ان کے لیے لازم اور ضروری ہیں۔ اور حتی غایت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ان کے بارے ابتدائے خبر کے لیے ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: حتی، اِمّا اور اِلّا ان میں امالہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ حروف ہیں اور ان کے درمیان اور اسماء کے درمیان واضح فرق ہے، جیسے حبلی اور سکری۔ زجاج نے کہا ہے: حتیٰ کو یا کے ساتھ لکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ سکری کے مشابہ ہے اور اگر الّا کو یا کے ساتھ لکھا جائے تو یہ الی کے مشابہ ہو جائے گا۔ اور اما کو یا کے ساتھ نہیں لکھا گیا، کیونکہ یہ ان ہے اس کے ساتھ ما ملایا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور تَدْعُوْنَ کا معنی تعبدون ہے (تو کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرعبادت کرتے تھے) قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا کہیں گے: وہ ہم سے گم ہو گئے یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 203 2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 201

وہ باطل ہیں اور وہ چلے گئے ہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ (سب) آخرت میں ہوگا۔

وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ یعنی وہ اپنے بارے میں کفر کا اقرار کریں گے۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: داخل ہو جاؤ ان امتوں میں سے جو گزر چکی ہیں تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے (ان کے پاس) دوزخ میں (داخل ہو جاؤ) جب بھی داخل ہوگی کوئی امت تو وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر یہاں تک کہ جب جمع ہو جائیں گی اس میں سب امتیں، تو کہے گی آخری امت پہلی امتوں کے متعلق: اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس دے ان کو دگنا عذاب آگ سے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اور کہیں گی پہلی امتیں پچھلی امتوں سے کہ نہیں ہے تمہیں ہم پر کوئی فضیلت پس چکھو عذاب بوجہ اس کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ، ای مع أمم یعنی تم داخل ہو جاؤ ان امتوں کے ساتھ۔ تو اس میں فی بمعنی مع ہے۔ اور یہ ممتنع نہیں ہے، کیونکہ تیرا قول: زید فی القوم بمعنی زید مع القوم ہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فی اپنے معنی میں ہی ہے (1)۔ أی أدخلوا فی جملتهم (تم بھی ان کے اجتماع میں داخل ہو جاؤ) اور قائل (کہنے والا) کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم داخل ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ داروغہ جہنم مالک ہے۔ (یعنی وہ انہیں کہے گا: تم داخل ہو جاؤ)۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا جب بھی کوئی امت داخل ہوگی تو وہ اس پر لعنت بھیجے گی جو اس سے پہلے جہنم کی طرف جا چکی ہے اور یہ دین اور ملت کے اعتبار سے اسی کی طرح ہے (2)۔ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا یہاں تک کہ جب سب امتیں اس میں جمع ہو جائیں گی۔ اعمش نے تدارکوا پڑھا ہے اور یہ اصل ہے، پھر اس میں ادغام ہوا اور اسے ہمزہ وصل کی ضرورت پڑی۔ اسے مہدوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔ حتی إذا أدرکوا یعنی جب بعض بعض کو پالیں گے۔ اور عصمہ نے ابو عمرو سے حتی إذا إدّارکوا نقل کیا ہے اس میں اجتماع ساکنین کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 398 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 149

اور بیان کیا ہے کہ یہ دونوں قرائتیں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور اس کے لیے مال کا دو تہائی ہے۔ اور ابو عمرو سے یہ بھی منقول ہے: إِذَا ادَّارَكُوا یعنی الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، تو گویا انہوں نے تذکر کے لیے إذا پر سکوت کیا۔ اور جب ان کا سکوت طویل ہوا تو ہمزہ وصل قطعی ہو گیا جیسے اس سے ابتدا کی جائے۔ اور شعر میں الف وصل بطور قطع استعمال ہوا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

یا نفسُ صبراً کلّ حیّ لاقِ وکلّ إثنین إلی إفتراق

حضرت مجاہد اور حمید بن قیس سے حَتّٰى إِذَا ادَّارَكُوا مروی ہے (یعنی) اس میں التقاء ساکنین کی وجہ سے اذا کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے اور دال کے بعد والے الف کو بھی حذف کر دیا گیا ہے اور جَمِيْعًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ قَالَتْ أُخْرٰىهُمْ لِأُوْلٰىهُمْ یعنی بعد میں داخل ہونے والی امت اور یہ اتباع کرنے والے ہیں پہلی امتوں کے بارے کہے گی۔ اور وہ قیادت کرنے والے والیاں ہیں۔ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۔ لِأُوْلٰىهُمْ میں لام لام اجل ہے، کیونکہ انہوں نے پہلی امتوں کو خطاب نہیں کیا، بلکہ انہوں نے پہلی امتوں کے حق میں کہا: رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا (اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا)

اور الضعف سے مراد ایک مقدار پر اسی کی مثل زائد مقدار چاہے ایک بار یا کئی بار۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہاں الضعف سے مراد اژدہا اور سانپ ہیں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ (الاحزاب) (اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت) اور وہاں ضعف کا ذکر اس سے کثیر معنی اور جو احکام اس پر مترتب ہو رہے ہیں ان کے لیے آ رہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) تابع اور متبوع ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یہ ان کی قراءت ہے جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہر فریق اس (عذاب) کے بارے نہیں جانتا جو دوسرے فریق کے لیے ہے، کیونکہ اہل جہنم میں سے بعض جب یہ جان لیں کہ کسی اور کا عذاب اس کے عذاب سے زیادہ ہے تو یہ بھی اس کے لیے راحت اور تسلی کی ایک قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یعنی لیکن تم نہیں جانتے اے مخاطبین! جو عذاب وہ پا رہے ہیں۔ اور جائز ہے کہ معنی یہ ہو لیکن تم نہیں جانتے اے اہل دنیا! اس عذاب کی مقدار جس میں وہ مبتلا ہیں۔

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی پہلی امتیں پچھلی امتوں کو کہیں گی: تحقیق تم نے کفر کیا اور تم نے وہی کیا جو ہم نے کیا، پس تم عذاب میں کسی تخفیف کے مستحق نہیں ہو۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

”بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے نہ کھولے جائیں گے ان کے لیے آسمان کے

دروازے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں جرم کرنے والوں کو۔ ان کے لیے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی ان کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اسی لیے صحیح احادیث موجود ہیں جو ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں کافر کی روح قبض کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا: اس سے ایسی ہوا (بو) خارج ہوتی ہے جو سطح زمین پر پائے جانے والے مردار سے زیادہ بدبودار ہوتی ہے، پس وہ اسے لے کر اوپر کی جانب چڑھتے ہیں اور ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں: یہ خبیث روح کس کی ہے؟ تو یہ بتاتے ہیں: فلاں بن فلاں کی۔ اور یہ اس کا وہ قبیح ترین نام لیتے ہیں جس کے ساتھ اسے دنیا میں پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ آسمان دنیا تک پہنچ کر رک جاتے ہیں اور وہ اسے کھولنے کی درخواست کرتے ہیں لیکن اس کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جاتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے جب وہ دعا مانگیں گے۔ حضرت مجاہد اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے ان کے لیے جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، کیونکہ جنت آسمانوں میں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ اور اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہیں ہوسکتا پس وہ بھی بالیقین جنت میں داخل نہ ہوسکیں گے۔ اور یہ اس پر قطعی دلیل ہے کہ ان کے لیے عفو و درگزر جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان مسلمانوں کا اجماع ہے تو ان پر خطا کا اطلاق کرنا جائز نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کی۔

قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا ہے: اگر کوئی کہنے والا کہے اس امت کا یہ اجماع کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ متکلمین کی ایک جماعت نے یہ گمان کیا ہے کہ کافروں میں سے یہود و نصاریٰ اور دیگر کی تقلید کرنے والے دوزخ میں نہیں ہوں گے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جنہوں نے اپنے اندر پیدا ہونے والے شبہ کی بنا پر مقلد کے کافر ہونے کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ نظریہ ہی نہیں کہ مقلد کافر ہے اور اسی بنا پر کہا ہے کہ وہ جہنم میں نہیں ہوگا اور اس بارے علم کہ مقلد کافر ہے یا نہیں بطریق نظر حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس کا انحصار توقیف اور خبر پر ہے۔

حمزہ اور کسائی نے لا یُفتح یا مضمومہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر ہے اور باقیوں نے جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر تا کے ساتھ قراءت کی ہے جیسے فرمایا: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿ ص﴾ (ص) پس اسے مونث لایا گیا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کی ہے، اس معنی کی بنا پر کہ تخفیف قلیل و کثیر کے لیے ہوتی ہے اور تشدید تکثیر و

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت

تکریر کے لیے ہوتی ہے کسی اور کے لیے نہیں (اور تکریر کا معنی ہوتا ہے یکے بعد دیگرے بار بار کوئی کام کرنا) اور یہاں تشدید اولیٰ ہے، کیونکہ یہ کثیر پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور الجمل ابل (اونٹ) میں سے ہے۔ فراء نے کہا ہے: جمل زوج الناقة(1) (نر اونٹ کو کہتے ہیں)۔

اور اسی طرح حضرت عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا(2) جب ان سے اونٹ (جمل) کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ زوج الناقہ ہے۔ گویا جس نے آپ سے اس کے بارے پوچھا اس نے ایسی چیز سے جہالت اور ناواقفی کا اظہار کیا جسے تمام لوگ جانتے ہیں۔ اور اس کی جمع جمال، اجمال، جمالات اور جمائل ہے۔ اور اسے جمل کا نام دیا جاتا ہے جب کہ یہ چوپایہ ہے۔ اور حضرت عبد الله رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: حتی یلج الجملُ الأصفر فی سم الخیاط اسے ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے، سند اس طرح ہے حدثنا ابی حدثنا نصر بن داؤد حدثنا ابو عبید حدثنا حجاج عن ابن جریج عن ابن کثیر عن مجاهد قال فی قراۃ عبد الله ...... اور آگے ذکر کیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الجُمَّل جیم کو ضمہ کے ساتھ اور میم کو فتحہ اور شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد کشتی کی وہ رسی ہے جسے قلس کہا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ رسیاں ہیں جو اکٹھی ہوں، یہ جملة کی جمع ہے، یہ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ موٹی رسی ہے(3) جو قنب کی چھال سے بنائی گئی ہو۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ رسی جس کے ساتھ کھجور کے درخت پر چڑھا جاتا ہے وہ مراد ہے۔

اور ان سے بھی اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے: الجُمَل جیم کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ اور اس کا معنی بھی کشتی کی موٹی رسی اور مطلق رسی ہے، جیسے ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور ان سے الجُمُل جیم اور میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ یہ جمل کی جمع ہے، جیسے أسد اور أُسُد ہے۔ اور الجُمْل مثلاً أسْدٌ اور أُسُد ہے۔ اور ابو السمال سے الجَمْل جیم کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ یہ جمل کی تخفیف ہے۔

اور سَمِّ الْخِيَاطِ کا معنی سوئی کا سوراخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور بدن میں ہر باریک سوراخ سَمّا اور سِما کہلاتا ہے۔ اور اس کی جمع سموم ہے۔ اور السم القاتل (قتل کرنے والا زہر) کی جمع سمام آتی ہے۔ اور ابن سیرین نے فی سُم سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الخیاط وہ سوئی جس کے ساتھ کپڑا سیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خِیاط و مِخْیَط جیسے إزار و مِئزر اور قِناع و مِقْنع اور مِھَاد، فراش (بچھونا) کو کہتے ہیں۔ اور غواش، غاشیة کی جمع ہے، یعنی وہ آگ جو انہیں ڈھانپ لے گی۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی ہم کافروں کو اسی طرح کا بدلہ دیتے ہیں۔ والله اعلم

**وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾**

"اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم تکلیف نہیں دیتے کسی کو مگر جتنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 211 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 104 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 214

اس کی طاقت ہے، وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ یہ کلام معترضہ ہے، یعنی والذین آمنوا وعملوا الصالحات أولئك أصحاب الجنة هم فيها خالدون (اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ کا معنی یہ ہے کہ اس نے کسی کو بیویوں کے نفقہ کا مکلف نہیں بنایا مگر صرف اتنی مقدار کا جسے وہ پالے اور اس پر قدرت رکھتا ہو، نہ کہ اتنی مقدار کا جس تک اس کا ہاتھ پہنچ ہی نہ سکے۔ اور اس سے، فعل سے پہلے استطاعت ثابت کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن الطیب نے کہا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا (الطلاق: 7) (اور تکلیف نہیں دیتا اللہ تعالیٰ کسی کو مگر اس قدر جتنا اسے دیا ہے)

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۙ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳

''اور ہم نکال لیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہے رواں ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے تھے اگر نہ ہدایت دیتا ہمیں اللہ تعالیٰ، بے شک آئے ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ۔ اور ان (خوش نصیبوں) کو آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے وارث بنائے گئے ہو تم جس کے بوجہ ان عملوں کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں ذکر فرمایا ہے جن کے ساتھ وہ اہل جنت پر انعام فرمائے گا (اور وہ) ان کے سینوں سے کینہ کو نکال دینا ہے۔ اور النزع کا معنی الإستخراج (نکالنا) ہے اور الغل کا معنی وہ کینہ ہے جو سینے میں مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع غلال ہے، یعنی ہم جنت میں اس کینہ وغیرہ کو ختم کر دیں گے جو دنیا میں ان کے دلوں میں مخفی تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے دروازے پر کینہ بٹھائے ہوئے اونٹ کی طرح ہو گا تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے دلوں سے نکالا ہو گا''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم ان میں سے ہوں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنت میں کینہ نکالنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے ساتھ ان کی قرابت اور درجات کی فضیلت کے سبب حسد نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ جنت کی شراب کے سبب ہو گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝۲۱ (الدہر) یعنی وہ شراب سینوں سے تکلیف دہ چیزوں کو نکال کر انہیں پاک کر دے گی۔ اس کا بیان سورۃ الانسان اور زمر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 401

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا اور وہ کہیں گے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں راہ دکھائی اس ثواب (اور ٹھکانے) کی، اس طرح کہ اس نے ہماری رہنمائی فرمائی اور ہمارے لیے ہدایت کو تخلیق فرمایا (یعنی ہدایت کو ہمارا مقدر بنا دیا۔ اور یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَ مَا كُنَّا ابن عامر کی قرأت بغیر واؤ کے ہے۔ اور باقیوں کی قراءت واؤ کے ساتھ ہے(1)۔ لِنَهْتَدِیَ اس میں لام کی ہے۔

لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یہ محل رفع میں ہے۔ وَ نُوْدُوْۤا یہ اصل میں نودیوا ہے۔ ان یہ محل نصب میں مخففہ عن المثقلہ، یعنی بأنه تلکم الجنة اور کبھی تفسیر اسی شے کی ہوتی ہے جس کے ساتھ ندا دی گئی، کیونکہ ندا تو قول ہے، پس اس کا کوئی محل نہ ہوگا یعنی انہیں کہا جائے گا: تِلْكُمُ الْجَنَّةُ (یہی وہ حقیقت ہے) کیونکہ اس کے بارے دنیا میں ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا، یعنی انہیں کہا جائے گا: هذه تلکم الجنة التی وعدتم بها یہ وہی جنت ہے جس کے بارے تم سے وعدہ کیا گیا تھا یا انہیں یہ دخول سے پہلے کہا جائے گا جس وقت وہ اسے دور سے دیکھیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تلکم بمعنی هذه ہے(2)۔ اور اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کا معنی ہے۔ تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے محلات کے وارث بنا دیئے گئے ہو اور تمہارا اس میں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ساتھ ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ (النساء: 70) (یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا) اور مزید فرمایا: فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ (النساء: 175) تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ولا أنا إلا أن یتغمدنی الله برحمة منه و فضل (3) (مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و فضل کے ساتھ ڈھانپ لے)

اور صحیح کے علاوہ کسی اور میں ہے: کوئی کافر اور کوئی مومن نہیں (4) مگر اس کے لیے جنت اور جہنم میں ایک ٹھکانا ہے۔ جب اہل جنت جنت میں اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو اہل جہنم کے لیے جنت بلند کی جائے گی اور وہ اس میں اپنے ٹھکانوں کی طرف دیکھ لیں گے اور انہیں کہا جائے گا: یہ تمہارے ٹھکانے تھے اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کا عمل کرتے، پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! تم ان کے وارث بن جاؤ ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو، پس ان کے محلات اہل جنت کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں ہے: ''کوئی مسلمان آدمی نہیں مرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ جہنم میں ایک یہودی یا عیسائی کو داخل کرتا ہے''(5)۔ پس یہ بھی میراث ہے۔ وہ جسے چاہے اپنے فضل کے ساتھ انعام عطا فرمائے اور جسے چاہے اپنے عدل کے ساتھ عذاب میں ڈال دے۔ الختصر یہ کہ جنت اور اس کے محلات اس کی رحمت کے بغیر نہیں پائے جا سکتے، پس

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 154 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، صفة المنافقین واحکامهم، جلد 2، صفحہ 377

4۔ تفسیر المراغی، جلد 3، صفحہ 304 5۔ صحیح مسلم، کتاب التوبة، جلد 2، صفحہ 360

جب وہ اپنے اعمال کے سبب اس میں داخل ہوں گے تو تحقیق وہ اس کی رحمت کے ساتھ اس کے وارث بنیں گے اور اس کی رحمت کے ساتھ ہی اس میں داخل ہوں گے''۔ کیونکہ ان کے اعمال بھی ان کے لیے اس کی جانب سے رحمت اور ان پر اس کا فضل واحسان ہے۔ اور بغیر ادغام کے أُورِثْتُمُوهَا پڑھا گیا ہے اور تا کو تا میں ادغام کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور آواز دیں گے جنتی دوزخیوں کو بے شک ہم نے پالیا جو وعدہ فرمایا تھا ہمارے ساتھ ہمارے رب نے سچا تو کیا تم نے بھی پایا جو وعدہ کیا تھا تمہارے رب نے سچا، وہ کہیں گے: ہاں۔ تو پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان یہ کہ لعنت ہو اللہ کی ظالموں پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہ سوال مزید اضطراب میں ڈالنے کے لیے اور عار دلانے کے لیے ہے۔ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مثلاً أن تلكم الجنة (کہ یہی وہ جنت ہے یعنی ہم نے تو اسے پالیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نفس ندا ہے۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ یعنی پھر ایک پکارنے اور آواز دینے والا آواز دے گا اور وہ ملائکہ میں سے ہوگا۔ بَيْنَهُمْ یہ ظرف ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أعلم وسطهم (میں ان کے وسط کو جانتا ہوں)۔ اعمش اور کسائی نے نَعِم عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس لغت پر عین کو سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: جس نے عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ نعم پڑھا ہے تو اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ نعم جو کہ حرف جواب ہے اور نعم جو کہ اونٹ، گائے اور بکری کا اسم ہے کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے۔ اور حضرت عمر سے جواب میں نعم بفتح العین کا انکار بھی مروی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ نعم کا استعمال قلیل ہے۔ اور نَعَم اور نَعِم یہ دونوں لغتیں ہیں بمعنی وعدہ کرنا اور تصدیق کرنا، پس وعدہ کا معنی تب پایا جاتا ہے جب تو موجب کے بارے میں سوال کرے مثلاً تیرا یہ قول: أيقوم زيد؟ (کیا زید کھڑا ہے؟) تو وہ جواب میں کہے: نعم (ہاں) اور تصدیق کا معنی پایا جاتا ہے جب تو کسی وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کے بارے خبر دے، تو کہے: قد كان كذا وكذا (واقعہ اس اس طرح ہوا، تو وہ کہے: نعم (ہاں) اور جب تو منفی کے بارے میں سوال کرے تو پھر جواب میں بلیٰ ہوگا، جیسے تیرا یہ قول ألم أكرمك (کیا میں نے تیری عزت وتکریم نہیں کی؟) تو وہ کہے گا بلیٰ (کیوں نہیں) پس نعم، اس سوال کے جواب کے لیے ہے جو ایجاب پر داخل ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے۔ اور بلیٰ اس استفہام کے جواب کے لیے ہے جو نفی پر داخل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى (اعراف: 172)

بزی، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔ اور باقیوں نے أن کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظ اللعنة کو مبتدا ہونے کی بنا پر رفع دیا ہے پس ان دونوں قرأتوں کے مطابق حرف جر کو ساقط کرنے کی بنا پر محل نصب

میں ہے۔ اور مخففہ میں جائز ہوتا ہے کہ اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو اور وہ مفسرہ ہو جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اعمش سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ اِنْ لَعْنَةُ اللّٰهِ پڑھا ہے۔ اور یہ قول کو مضمر ماننے کی بنا پر ہے جیسے کوفیوں نے قراءت کی ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اِنَّ اللّٰهَ (آل عمران: 39) اور روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت طاؤس ہشام بن عبدالملک کے پاس تشریف لے گئے اور اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور یوم الاذان (کی شدت) سے بچ۔ تو اس نے کہا: یوم الأذان کون سا دن ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یہ سن کر ہشام بیہوش ہو گیا، اس پر حضرت طاؤس نے کہا: یہ ذلت و رسوائی تو فقط بیان کی ہے تو مشاہدہ اور معاینہ کی ذلت کیسی ہو گی۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝۴۵

''جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور چاہتے ہیں اسے کہ ٹیڑھا ہو جائے اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اس سے پہلے ھم یا اعنی مضمر ماننے کی بنا پر اس کا محل رفع اور نصب میں ہونا بھی جائز ہے، یعنی جو دنیا میں لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں۔ اور یہ الصد سے ماخوذ ہے جس کا معنی منع کرنا اور روکنا ہے یا جو ذاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے راستے سے اعراض کرتے ہیں۔ اور یہ الصدود سے ماخوذ ہے۔

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وہ اسے ٹیڑھا کرنے کی خواہش اور طلب رکھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں سو اس کے ساتھ ایمان نہیں لاتے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ، ای وکانوا بھا کافرین (اور وہ اس (آخرت) کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں) پس اسے کلام سے حذف کیا گیا ہے اور یہ کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝۴۶

''اور ان دونوں (جنت و دوزخ) کے درمیان پردہ ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو پہچانتے ہوں گے سب کو ان کی علامت سے اور وہ آواز دیں گے جنتیوں کو کہ سلامتی ہو تم پر (اور ابھی) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ یعنی جہنم اور جنت کے درمیان پردہ ہے، کیونکہ انہیں دو کا ذکر جاری ہے۔ حجاب کا معنی حاجز (رکاوٹ، پردہ) یعنی دیوار ہے اور یہ سور (دیوار) وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ (الحدید: 13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار)

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یعنی علی أعراف السور یعنی دیوار کی بلندیوں پر کچھ مرد ہوں گے۔ اور اسی سے عرف الفرس (گھوڑے کی گردن کے بال) اور عرف الدیك (مرغ کی کلغی) ہیں۔ عبداللہ بن ابی یزید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اعراف سے مراد بلند اور اونچی شے ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اعراف سے مراد دیوار ہے جس کی بلندی مرغ کی کلغی کی طرح ہوگی۔ اور لغت میں اعراف بلند جگہ کو کہتے ہیں اور یہ عرف کی جمع ہے۔ یحییٰ بن آدم نے کہا ہے: میں نے کسائی سے اعراف کی واحد کے بارے پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ تو میں نے کہا: ہمیں اسرائیل نے جابر سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الأعراف سور له عرف كعرف الديك (1) تب انہوں نے کہا: ہاں قسم بخدا! اس کی واحد یہی ہے اور جمع اعراف ہے، اے لڑکے کاغذ لاؤ، پھر آپ نے اسے لکھ لیا اور یہ کلام محل مدح میں بیان ہوا ہے، جیسے اس بارے میں فرمایا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37) (وہ (جوان) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یاد الٰہی سے)۔ اور اصحاب اعراف کے بارے میں علماء کے دس اقوال ہیں:

پس حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، حضرت شعبی، حضرت ضحاک اور حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ وہ جماعت ہے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر اور مساوی ہوں گی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور مسند خیثمہ بن سلیمان کے پندرہویں جز کے آخر میں ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا اور نیکیوں اور بدیوں کا وزن کیا جائے گا اور جس کی نیکیاں بدیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھی بھاری ہو جائیں گی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کے گناہ اس کی نیکیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھاری ہو جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہو گئیں؟ (وہ کہاں ہوگا) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اصحاب اعراف ہیں وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور اس میں داخل ہونے کے خواہشمند ہوں گے'' (2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اصحاب اعراف سے مراد صالحین فقہاء و علماء کی جماعت ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہداء ہیں۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: اور یہ بھی قول ہے کہ مومنین میں سے فضلاء اور شہداء ہیں، جو اپنی ذاتوں میں مشغول ہونے سے فارغ ہوئے اور لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جب وہ اصحاب نار کو دیکھیں گے تو وہ جہنم کی طرف لوٹائے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور معلوم کا خلاف بھی مقدور ہوتا ہے اور جب وہ اہل جنت کو دیکھیں گے اور وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے اس کے بعد وہ اپنے لیے اس میں داخل ہونے کے امیدوار ہوں گے۔ اور شرحبیل ابن سعد نے کہا ہے: اصحاب اعراف سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ شہید ہونے والے لوگ ہیں جو اپنے آباء کی نافرمانی کرتے ہوئے نکلے تھے۔

طبرانی نے اس بارے میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ان کی نافرمانی اور ان کی شہادت کو برابر قرار دیا جائے گا۔ اور ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ وَعَلَى

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 244 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 228

الْاَعْرَافِ رِجَالٌ کے بارے میں ذکر کیا ہے فرمایا: اعراف پل صراط پر بلند جگہ ہے، یہی نظریہ حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت جعفر ذوالجناحین رضی اللہ عنہم کا ہے، وہ اپنے محبت کرنے والوں کو چہروں کی سفیدی اور نور سے اور بغض رکھنے والوں کو چہروں کی سیاہی سے پہچان لیں گے۔ اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ قیامت کے دن وہ عدل کرنے والے لوگ ہیں جو لوگوں پر ان کے اعمال کے بارے شہادت دیں گے اور یہ ہر امت میں ہوں گے۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: جو کچھ اس بارے میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے اور یہ اس دیوار پر ہوں گے جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ گروہ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ قوم ہے جن کے صغیرہ گناہ تھے وہ ان سے دنیا میں مصائب و آلام کے ساتھ ختم نہیں ہوئے اور انہوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا پس انہیں جنت سے روک دیا جائے گا تاکہ اس کے سبب انہیں غم اور اضطراب لاحق ہو اور یہ ان کے صغیرہ گناہوں کے مقابلہ میں ہو جائے گا۔ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ اصحاب اعراف میں ہوں گے، کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ وہ گنہگار لوگ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد زنا سے پیدا ہونے والے لوگ ہیں۔ اسے قشیری (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصحاب اعراف سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو اس دیوار کے ساتھ مقرر ہوں گے، وہ کافروں کو مومنین سے انہیں جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے الگ کریں گے۔ اسے ابومجلز نے ذکر کیا ہے۔ تو ان کو کہا گیا: ملائکہ کو رجال نہیں کہا جاتا؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ مذکر ہیں مؤنث نہیں ہیں، لہٰذا ان پر لفظ رجال کا اطلاق کرنا بعید نہیں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اس کا اطلاق جنوں پر کیا گیا ہے: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی)

پس یہ ملائکہ مومنین کو ان کی علامات سے اور کفار کو ان کی علامات سے پہچان لیں گے۔ اور وہ مومنین کو ان کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے بشارت دیں گے درآنحالیکہ وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے لیکن وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے۔ اور جب وہ اہل جہنم کو دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کے لیے عذاب سے سلامتی کی دعا کریں گے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اعراف پر اہل جنت میں سے وہ لوگ ہوں گے جن کا جنت میں داخل ہونا مؤخر ہوگا اور ان کے لیے وہ وصف واقع ہو سکتا ہے جس کا اعتبار دونوں فریقوں میں کیا گیا ہے۔ اور يَعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ یعنی وہ سب کو ان کی علامات سے پہچانتے ہوں گے اور وہ اہل جنت میں چہروں کی سفیدی اور ان کا حسن ہے اور اہل جہنم میں چہروں کی سیاہی اور ان کا قبح ہے، علاوہ ازیں پہچان کے لیے ان کا اپنا محل ہوگا اور ان کا اپنا محل اور مکان ہوگا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تعیین کرنے سے توقف کیا گیا ہے، کیونکہ اثر اور تفصیل میں اضطراب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 157

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404

پھر یہ کہا گیا ہے کہ اعراف عرف کی جمع ہے اور اس سے مراد ہر بلند اور اونچا مقام ہے، کیونکہ وہ اپنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے پست جگہ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور اعرف ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اعراف سے مراد پل صراط کی بلندیاں ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبل احد ہے اسے وہاں رکھا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور زہراوی نے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں قیامت کے دن جنت اور دوزخ کے درمیان اس کی تمثیل بنائی جائے گی اس پر کچھ قوموں کو روک لیا جائے گا ان تمام کو ان کی علامات سے پہچان لیا جائے گا اور وہ ان شاء اللہ تعالیٰ اہل جنت میں سے ہوں گے''۔ اور دوسری حدیث حضرت صفوان بن سلیم سے ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد جنت کے ارکان میں سے ایک رکن پر ہے''(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمر نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں بلاشبہ وہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے''(2)۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ یعنی اصحاب اعراف اصحاب جنت کو آواز دیں گے۔ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ یعنی وہ انہیں کہیں گے: تم پر سلام ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم سزا سے سلامت ہو۔ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ یعنی صحاب اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے، یعنی ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے۔ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور لغت میں طمع بمعنی علم معروف ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے کہ مراد اصحاب اعراف ہی ہیں۔

اور ابو مجلز نے کہا ہے: وہ اہل جنت ہیں (3)، انہیں اصحاب اعراف کہیں گے: تم پر سلام ہو اور ابھی تک اہل جنت جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ ان مومنین کے لیے جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے جو اصحاب اعراف کے پاس سے گزریں گے۔ اور وقف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر ہے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ اور اس قول پر لَمْ یَدْخُلُوْهَا پھر ابتداوَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ سے ہوئی ہے۔ اس معنی پر کہ وهم يطمعون في دخولها اور وہ جنت میں داخل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ حال ہو اور معنی یہ ہو: اصحاب اعراف کے پاس سے گزرنے والے مومنین جنت میں داخل نہیں ہوئے، حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں اور بلاشبہ وہ اس میں داخل ہوئے ہیں اس میں داخلے کی خواہش رکھے بغیر۔ تو اس طرح لَمْ یَدْخُلُوْهَا پر وقف نہیں کیا جائے گا۔

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۴۷

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 232
3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 233

''اور جب پھیری جائیں گی ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف (تو) کہیں گے: اے ہمارے رب! نہ کر تو ہمیں ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ اور جب ان کی نگاہیں اس جہت پھیری جائیں گی جس میں سامنے اہل جہنم ہوں گے۔ دو لفظوں کے بغیر تفعال کے وزن پر کوئی مصدر نہیں آیا اور وہ دو تلقاء اور تبیان ہیں اور باقی تمام فتحہ کے ساتھ آتے ہیں، مثلاً تسیار، تھمام اور تذکار۔ اور رہا اسم تو وہ اس میں کسرہ کے ساتھ کثیر آتا ہے، مثلاً تقصار اور تمثال۔ قَالُوْا یعنی اصحاب اعراف کہیں گے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ یعنی وہ الله تعالیٰ سے التجا کریں گے کہ وہ ان کے ساتھ (ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ) نہ کر دے، حالانکہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ انہیں ان کے ساتھ نہیں کرے گا۔ تو یہ علی سبیل التذلل اور عجز کی بنا پر ہے، جیسے اہل جنت کہیں گے: رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (التحریم: 8) (اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور مکمل فرما) اور کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یہ الله تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بنا پر کہیں گے اور ان کے لیے اس میں لذت ہوگی۔

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝

''اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی علامتوں سے (انہیں) کہیں گے نہ فائدہ پہنچایا تمہیں تمہارے جتھے نے اور (نہ اس ساز و سامان نے) جس کی وجہ سے تم غرور کیا کرتے تھے۔ (اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انہیں الله اپنی رحمت سے۔ (دیکھو! انہیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ یعنی اعراف والے اہل نار میں سے ان لوگوں کو کہیں گے جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے۔ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ وہ انہیں کہیں گے: تمہیں دنیا کے لیے جمع کیے گئے مال نے اور ایمان سے تمہارے غرور اور تکبر کرنے نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ یہ اشارہ مومنین فقراء کے گروہ کی طرف ہے، جیسے حضرت بلال، حضرت سلمان اور حضرت خباب وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اَقْسَمْتُمْ کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں قسمیں اٹھایا کرتے تھے؟ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ کہ آخرت میں الله تعالیٰ انہیں عطا نہیں فرمائے گا۔ بِرَحْمَةٍ اپنی رحمت میں سے۔ اس کے ساتھ وہ انہیں جھڑکیں گے۔ اور وہ ان کے غم اور حسرت میں یہ کہہ کر اضافہ کریں گے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (کہ انہیں حکم مل چکا ہے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور عکرمہ نے دخلوا الجنة قراءت کی ہے یعنی الف کے بغیر اور دال مفتوح کے ساتھ۔ (وہ جنت میں داخل ہو چکے ہیں) اور طلحہ بن مصرف نے خاء کے

کسرہ کے ساتھ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے (یعنی وہ جنت میں داخل کر دیئے گئے ہیں)

اور یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اصحاب اعراف ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام ہیں، کیونکہ ان کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہے۔ اور جنہوں نے اصحاب اعراف گنہگاروں کو بنایا ہے تو اصحاب نار کے لیے ان کے قول کا آخر وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ہے۔ اور اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ آخر آیت تک اہل جہنم کو اس پر زجر و توبیخ کے لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور پہلا حسن سے مروی ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان ملائکہ کے کلام میں سے ہے جو اصحاب اعراف کے ساتھ مقرر ہوں گے، کیونکہ اہل جہنم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اصحاب اعراف ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے تو ملائکہ اصحاب اعراف کو کہیں گے: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور آواز دیں گے دوزخی جنتیوں کو کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی یا جو کچھ دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے جنتی کہیں گے کہ اللہ نے حرام کر دی ہیں یہ دونوں چیزیں کافروں پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَنَادٰٓى کہا گیا ہے: جب اہل اعراف جنت تک پہنچ جائیں گے تو اہل جہنم خواہش کریں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک جنت میں ہمارے رشتہ دار اور قرابت دار ہیں پس ہمیں اجازت عطا فرمائی جائے کہ ہم انہیں دیکھیں اور ان سے بات کریں۔ اور اہل جنت ان کے چہرے سیاہ ہونے کی وجہ سے انہیں نہ پہچان سکیں گے، تو وہ (اہل جہنم) انہیں کہیں گے: اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے) تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ عذاب میں ہو۔ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تو اہل جنت کہیں گے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کا طعام و شراب دونوں کافروں پر حرام کر دیئے ہیں۔ الافاضۃ کا معنی التوسعۃ (وسعت دینا، کشادگی پیدا کرنا) کہا جاتا ہے: أفاض علیه نعمه (اس نے اس پر اپنی نعمتیں انڈیل دیں یعنی ان میں توسیع کر دی)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اس پر بھی دلیل ہے کہ کسی کو پانی پلانا افضل ترین اعمال میں سے ہے۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: پانی، کیا تم اہل جہنم کی طرف دیکھتے نہیں کہ جس وقت وہ اہل جنت سے مدد طلب کریں گے تو وہ یہ کہیں گے: اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ ہم پر پانی انڈیلو یا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے)

اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: آپ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ صدقہ کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی۔ اور ایک روایت میں ہے: پس انہوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا: هذه لأم سعد (1) (یہ کنواں سعد کی ماں کے نام ہے)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم أن أم سعد كانت تحب الصدقة، أفينفعها أن أتصدق عنها؟ قال: نعم وعليك بالماء (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک سعد کی ماں صدقہ پسند کرتی تھی کیا میرا اس کی طرف سے صدقہ دینا اسے نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور تجھ پر پانی صدقہ کرنا لازم ہے)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کی طرف سے (لوگوں کو) پانی پلائے۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی پلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ترین سبب قربت ہے۔ اور بعض تابعین نے کہا ہے: من كثرت ذنوبه فعليه بسقي الماء (جس کے گناہ زیادہ ہو جائیں تو اس پر (لوگوں کو) پانی پلانا واجب ہے) اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کی مغفرت فرما دی جس نے کتے کو پانی پلایا، تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوگی جس نے ایک مومن موحد انسان کو پانی پلایا اور اسے زندگی بخش دی؟۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم میں سے ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا کہ اسے شدید پیاس نے آلیا چنانچہ وہ کنویں میں اترا اور اس سے پانی پی لیا پھر جب وہ باہر نکلا تو اچانک ایک کتے کو پیاس کی وجہ سے مٹی چاٹتے ہوئے دیکھا تو اس نے (دل میں) کہا اس کتے کو اسی طرح پیاس کے سبب (تکلیف) ہے جیسے مجھے پہنچی ہے چنانچہ اس نے اپنا خف (موزہ) پانی سے بھرا، اسے اپنے منہ (کے دانتوں) سے پکڑا، پھر اوپر چڑھا اور اس کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر افزائی فرمائی اور اس کی مغفرت فرما دی''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم (کیا) ہمارے لیے چوپایوں میں بھی اجر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر تر (زندہ) جگر رکھنے والی شے میں اجر ہے'' (3)۔ اور اس کے برعکس وہ روایت ہے جسے مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک عورت (4) کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا اس نے اسے قید کر رکھا تھا یہاں تک کہ وہ مر گئی پس اس میں آگ داخل ہو گئی نہ اس نے اسے کچھ کھلایا اور نہ اسے پانی پلایا، کیونکہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ ہی اس نے اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی''۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کو ایک بار ایسی جگہ پانی پلایا جہاں پانی پایا جاتا ہو تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کر دیا (یعنی اسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب دیا جائے گا) اور جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ ایک بار پانی پلایا جہاں پانی نہ پایا جاتا ہو تو گویا اس نے اسے زندہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 236۔ ایضاً، حدیث 1431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرها، جلد 2، صفحہ 237
3۔ صحیح بخاری، المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 333
4۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرها، جلد 2، صفحہ 236

کردیا'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک حوض اور مشکیزے کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کے لیے اسے روکنا جائز ہے جو اس سے پانی لینا چاہے، کیونکہ اہل جنت کے اس قول: اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کا معنی ہے کہ تمہارے لیے اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک باب ذکر کیا ہے: باب من رأى أن صاحب الحوض والقربة أحق بمائه (یہ باب اس کے بیان میں ہے جس کی رائے ہے کہ حوض اور مشکیزے کا مالک اپنے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے) اور انہوں نے اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کچھ لوگوں کو اپنے حوض سے اس طرح دھتکار دوں گا جیسے اجنبی اونٹ کو حوض سے بھگا دیا جاتا ہے'' (2)۔ مہلب نے کہا ہے: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حوض کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: لأذودن رجالا عن حوضي (3)۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

''جنہوں نے بنا لیا تھا اپنے دین کو کھیل اور تماشا اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا انہیں دنیا کی زندگی سو آج ہم فراموش کر دیں گے انہیں جیسے بھلا دیا تھا انہوں نے اس دن کی ملاقات کو اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے''۔

اس میں الَّذِيْنَ کافرین کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اضمار کے سبب محل رفع اور محل نصب میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اہل جنت کے قول میں سے ہے: فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ یعنی آج ہم انہیں جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا یعنی جیسے انہوں نے (اس دن کی ملاقات کے مطابق) عمل ترک کر دیا تھا اور اسے جھٹلا دیا تھا۔ اور اس میں ما مصدر یہ ہے یعنی ان کے بھلا دینے کی طرح۔ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ یہ اس پر معطوف ہے، یعنی وجحدهم ان کے ہماری آیتوں کا انکار کرنے کی طرح (آج ہم بھی انہیں فراموش کر دیں گے)

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور بے شک لے آئے ہم ان کے پاس ایک کتاب جسے ہم نے واضح کر دیا ہے (اپنے) علم (کامل) سے درآنحالیکہ وہ ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ اس میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ فَصَّلْنٰهُ ہم نے اسے واضح کر دیا ہے یہاں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الرہون، جلد 1، صفحہ 180
2۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318
3۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318

تک کہ جس نے اس میں تدبر اور غور وفکر کیا اس نے اسے پہچان لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَصَّلْنٰهُ کا معنی ہے ہم نے اسے متفرق طور پر نازل کیا۔ عَلٰى عِلْمٍ اپنی طرف سے علم کامل کے ساتھ، لہٰذا اس میں کوئی سہو اور غلطی واقع نہیں ہوئی۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً زجاج نے کہا ہے: یعنی هادیاً و ذا رحمة (1) (درآنحالیکہ وہ ہدایت دینے والی اور سراپا رحمت ہے) انہوں نے اسے فَصَّلْنٰهُ کی ہا ضمیر سے حال بنایا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: هدیً و رحمةٌ پڑھنا بھی جائز ہے، بمعنی هو هدی و رحمة۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتاب سے بدل بناتے ہوئے جر کے ساتھ هدی و رحمةٍ پڑھنا بھی جائز ہے۔ امام کسائی اور فراء نے کہا ہے: کتاب کی صفت ہونے کی بنا پر هدی و رحمة جر کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (الانعام:155) کی مثل ہے۔ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ مومنین کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

''کافر کس چیز کے منتظر ہیں؟ یہ کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جس روز ظاہر ہوگا اس کا انجام تو کہیں گے جو بھلائے ہوئے تھے اسے اس سے پہلے کہ بے شک لائے تھے ہمارے رب کے رسول حق (پیغام) تو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں تو وہ سفارش کریں ہمارے لیے یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے تا کہ ہم عمل کریں اس کے برعکس جو ہم کیا کرتے تھے۔ بے شک انہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گیا ان سے جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ یہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور آل سے ماخوذ ہے اور اہل مدینہ ہمزے کی تخفیف کرتے ہیں۔ اور النظر کا معنی ہے انتظار کرنا، یعنی کیا وہ انتظار نہیں کر رہے مگر عقاب وحساب میں سے اس کے بارے جس کا قرآن کریم میں ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ يَنْظُرُوْنَ، النظر الی یوم القیامه (یوم قیامت کی طرف دیکھنے) سے ماخوذ ہے۔ اور تَاْوِيْلَهٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور عاقبة الکتاب (کتاب کا انجام) وہ بعث وحساب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی جزاؤہ ہے یعنی ان کا کتاب کو جھٹلانے کا انجام اور جزا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی ہے عاقبت یعنی اس کا انجام، یہ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی قیامت کے دن اس کا انجام ظاہر ہوگا۔ اور یوم یقول کے سبب منصوب ہے، یعنی یقول الذین نسوه من قبل یوم یاتی تاویله۔ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ اس میں استفہام، تمنی اور آرزو

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 480

کے معنی میں ہے۔ فَيَشْفَعُوْا یہ جواب استفہام ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أو هل نرد(1) (یا کیا ہم لوٹا دیئے جائیں گے) فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ زجاج نے کہا ہے: نرد کا عطف معنی پر کیا گیا ہے، یعنی هل یشفع لنا أحد أو نرد (کیا کوئی ہماری سفارش کرے گا یا ہم واپس لوٹائے جائیں گے) اور ابن اسحاق نے أو نرد فنعمل دونوں میں نصب پڑھی ہے اور معنی ہے إلا أن نرد (ورنہ ہمیں واپس لوٹا دیا جائے) جیسے کسی نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تَبْكِ عينُك إنما نحاول مُلْكًا أو نموتَ فَنُعْذَرَا

(اس میں أو نموت، إلا أن نموت کے معنی میں ہے)

اور حسن نے أو نرد فنعمل دونوں کو مرفوع پڑھا ہے۔ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یعنی انہوں نے اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا، اور ہر وہ جو اپنے آپ کو نفع نہ پہنچائے تحقیق انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے نعمتوں کو اور اپنے لطف و راحت کو نقصان پہنچایا۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی وہ باطل ہو گیا جو وہ کہتے تھے کہ الله تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے۔

**اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝54**

''بلاشبہ تمہارا رب الله ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ڈھانکتا ہے رات سے دن کو درآنحالیکہ طلب کرتا ہے دن رات کو تیزی سے اور (پیدا فرمایا) سورج اور چاند اور ستاروں کو وہ سب پابند ہیں اس کے حکم کے، سن لو! اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔ بڑی برکت والا ہے الله تعالیٰ جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ الله تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ قدرت ایجاد میں منفرد اور یکتا ہے، پس وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

سِتَّةِ کی اصل سدسة ہے، پس انہوں نے دال کو سین میں ادغام کرنے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں تا کے مخرج کے قریب مل گئے لہٰذا تا ان دونوں پر غالب آ گئی۔ اور اگر چاہے تو کہے: دو سینوں میں سے ایک کو تا سے بدل دیا جائے اور پھر اسے دال میں ادغام کر دیا جائے، کیونکہ تو اس کی تصغیر میں کہتا ہے: سدیسة اور اس کی جمع أسداس آتی ہے اور جمع اور تصغیر دونوں اسماء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: جاء فلان سادسا وسادتا وساتا پس جس نے ساتا کہا ہے اس نے سین کو تاء سے بدل دیا ہے۔ اور الیوم سے مراد سورج کے طلوع ہونے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک ہے۔ پس اگر سورج نہ ہو تو پھر یوم بھی نہ ہو۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 240

اورفرمایا: فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ کا معنی ہے آخرت کے ایام میں سے چھ دنوں میں، ان میں سے ہر دن ہزار برس کا ہوگا۔ اور یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی تعظیم بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چھ دن ایام دنیا میں سے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ (1) نے کہا ہے: ان میں سے پہلا دن اتوار کا دن تھا اور آخر جمعہ کا دن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مدت ذکر فرمائی ہے اگر وہ ایک لحظہ میں ان کی تخلیق کرنا چاہتا تو یقیناً ایسا کر دیتا۔ کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے کہتا: کون ( تو ہوجا) تو وہ ہوجاتا۔ لیکن اس نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ بندوں کو امور میں نرمی اور تثبت کی تعلیم دے اور تاکہ ملائکہ کے لیے یکے بعد دیگرے اس کی قدرت کا اظہار ہو۔

اور یہ ان کے نزدیک ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔ اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اس نے انہیں چھ دنوں میں پیدا فرمایا، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کی ایک مدت مقرر ہے۔ اور اس نے اس کے ذریعے گنہگاروں کو سزا دینے میں جلدی کرنے کو بھی بیان کیا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۞ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں، پس آپ صبر فرمائیے ان ( کی دل دکھانے والی) باتوں پر)

اس کے بعد فرمایا: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا (ق:36) (اور قریش مکہ سے پہلے ہم نے برباد کر دیا بہت سی قوموں کو جو شوکت و قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں)

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یہ استواء کا مسئلہ ہے، اس بارے میں علماء کا بہت سا کلام اور جرأت کا اظہار ہے۔ ہم نے اس بارے میں علماء کے اقوال الکتاب الأسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی و صفاتہ العلی میں بیان کر دیئے ہیں اور وہاں ہم نے چودہ اقوال ذکر کیے ہیں۔ اکثر متقدمین اور متاخرین کی جانب سے یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جہت اور تحیز سے منزہ اور پاک ہے تو پھر اس کی ضرورت اور اس کے لواحق لازم میں سے یہ بھی ہے کہ عام علماء متقدمین کے نزدیک اور متاخرین میں سے محققین اور قائدین کے نزدیک اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات جہت سے پاک اور منزہ ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے اوپر کوئی جہت نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اسے جہت کے ساتھ خاص کر دیا جائے تو پھر وہ کسی مکان اور حیز میں ہو اور مکان اور حیز تسلیم کرنے پر متحیز کے لیے حرکت، سکون، تغیر اور حدوث ماننا لازم آتا ہے (اور رب کریم کی ذات ان تمام سے مبرا اور منزہ ہے)

یہ متکلمین کا قول ہے اور دور اول کے اسلاف رضی اللہ عنہم جہت کی نفی کے بارے کوئی کلام نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے بارے وہ بولتے تھے، بلکہ انہوں نے یہی بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے اثبات میں وہی کافی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمادیا ہے اور اس کے رسولوں نے خبر دی ہے اور سلف صالح میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے کہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 408

اپنے عرش پر حقیقۃً متمکن ہوا ہے اور اس نے عرش کو اس لیے خاص کیا ہے، کیونکہ وہ اس کی مخلوقات میں سے بہت عظیم ہے، لیکن وہ اس استوا اور تمکن کی کیفیت سے ناواقف ہیں، کیونکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: لغت میں استوا معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے، لہٰذا اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے۔ اور اتنی مقدار کافی ہے اور جو اس سے زیادہ کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ علماء کی کتب سے اس مقام کا مطالعہ کرے۔ اور کلام عرب میں استوا کا معنی بلندی اور استقرار ہے۔ جوہری نے کہا ہے: إستوی من إعوجاج (وہ ٹیڑھا ہونے سے بچ گیا، سیدھا ہو گیا) إستوی علی ظهر دابته (وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھ گیا) إستوی إلی السماء اس نے آسمان کا قصد کیا۔ اور إستوی بمعنی إستولی و ظهر (والی بننا اور غالب آنا) ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا:

قد إستوی بشرٌ علی العراق　　من غیر سیف ودمٍ مهراق(1)

تحقیق بشر نے عراق پر قبضہ جما لیا تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر۔

اور إستوی الرجل کا معنی ہے آدمی کی جوانی انتہا کو پہنچ گئی۔ إستوی الشئ کا معنی ہے شے معتدل اور سیدھی ہو گئی۔ ابوعمر بن عبدالبر نے ابوعبیدہ سے قول باری تعالیٰ: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) کے بارے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عرش پر بلند ہوا۔ اور شاعر نے کہا ہے:

فأوردتهم ماء بفیفاء قفرۃ　　وقد حلق النجمُ الیمانِ فاستوی

اس میں استوی بلند ہونے کے معنی میں ہے بمعنی علا و ارتفع۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اللہ تعالیٰ کی بلندی اور ارتفاع اس کی عظمت و بزرگی، اس کی صفات اور بادشاہی کی بلندی اور رفعت سے عبارت ہے، یعنی اس سے اوپر کوئی نہیں ہے جس کے لیے عظمت و جلال کے ان معانی میں سے کوئی ایک ثابت ہو اور نہ ہی کوئی اور اس کے ساتھ ہے کہ اس کے اور اس کے مابین یہ رفعت و بلندی مشترک ہو، بلکہ یہ عظمت و رفعت اور بلندی بالاطلاق اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذات کے لیے ہے (اور کوئی دوسرا کسی اعتبار سے اس کے ساتھ شریک نہیں ہے)۔

قولہ تعالیٰ: عَلَى الْعَرْشِ یہ لفظ مشترک ہے ایک سے زیادہ معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ علامہ جوہری وغیرہ نے کہا ہے: عرش کا معنی سریر الملک (بادشاہ کا تخت) ہے قرآن کریم میں ہے نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا (النمل: 41) (شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی) وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: 100) (اور جب شاہی دربار میں پہنچے تو آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر) اور عرش کا معنی سقف البیت (مکان کی چھت) ہے۔ اور عرش القدم کا معنی ہے قدم کی پشت کا بلند حصہ اور اس میں انگلیاں بھی ہیں۔ عرش السماک: چار چھوٹے ستاروں جو عواء (چاند کی منازل میں سے ایک منزل ہے) کے نیچے ہیں، کہا جاتا ہے: إنها عجز الأسد (بے شک وہ اسد کی دم ہے) اور عرش البئر کا معنی ہے کنویں کو لکڑی کے ساتھ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 229

بنانا، اس کے بعد کہ اسے نیچے قد آدم کی مقدار پتھر سے بنالیا جائے تو وہ لکڑی جس سے اوپر کا حصہ بنایا جاتا ہے وہ عرش کہلاتی ہے، اس کی جمع عروش آتی ہے اور عرش مکہ مکرمہ کا نام بھی ہے اور عرش کا معنی ملک اور سلطنت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: ثُلَّ عرش فلان جب اس کا ملک، سلطنت اور اس کی عزت جاتی رہے (چھن جائے)۔

زہیر نے کہا:

تداركتما عَبْسًا وقد ثُلَّ عَرْشُها وذُبْيَانُ إذ ذَلَّتْ بأقدامها النَّعْلُ

اور کبھی آیت میں عرش کی تاویل ملک کے معنی سے کی جاتی ہے، یعنی کوئی بادشاہی اور ملک مستحکم اور مضبوط نہیں مگر وہ جو اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعز اسمہ کی ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے اور اس میں بھی نظر ہے۔ ہم نے اس کے بارے جملہ اقوال اپنی کتاب میں بیان کر دیئے ہیں۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ یعنی وہ اسے (رات کو) پردے کی طرح بنا دیتا ہے، یعنی دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے (چلی جاتی ہے) تاکہ رات کے آنے سے دنیا میں زندگی کو قائم رکھنا مکمل ہو جائے، پس رات آرام اور سکون کے لیے ہے اور دن کاروبار حیات کے لیے۔ اور اسے يُغَشِّي تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس کی مثل سورۂ رعد میں ہے۔ اور یہ ابوبکر کی عاصم، حمزہ اور کسائی سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے تخفیف کی ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں أغشى اور غشى اور تمام نے فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى کے تشدد ہونے پر اجماع کیا ہے۔ اور فَأَغْشَيْنٰهُمْ (یٰسین: 9) پر بھی تمام کا اجماع ہے پس یہ دونوں قرأتیں مساوی ہیں اور تشدید میں تکریر اور تکثیر کا معنی پایا جاتا ہے اور تغشية اور إغشاء کا معنی ہے: ایک شے کا دوسری شے کو ڈھانپ دینا، چھپا دینا اور اس آیت میں رات پر دن کے داخل ہونے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دو میں سے ایک پر اکتفا کیا گیا ہے، جیسے سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) (ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے) اور بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران: 26) (تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی) میں ہے۔

اور حمید بن قیس نے يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے بے شک دن رات کو ڈھانپ لیتا ہے۔ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا یعنی وہ اسے ہمیشہ طلب کرتا ہے بغیر کسی فتور اور سکون کے۔ اور يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے: استوی علی العرش مغشیا اللیل النہار (وہ عرش پر اپنی شان کے مطابق متمکن ہوا درآنحالیکہ وہ رات سے دن کو ڈھانکتا ہے) اور اسی طرح يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا بھی اللیل سے حال ہے، یعنی یغشی اللیل النہار طالباله (رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے اسے تیزی سے طلب کرتے ہوئے)

اور یہ احتمال بھی ہے کہ جملہ مستانفہ ہو حال نہ ہو اور حَثِيْثًا طالب المقدر سے بدل ہو یا اس کی صفت ہو یا مصدر محذوف کی صفت ہو، یعنی یطلبہ طلباً سریعاً اور الحث کا معنی ہوتا ہے: بہت جلدی کرنا اور تیزی کرنا۔ اور ولی حثیثا ای برعا (یعنی وہ تیزی سے واپس بھاگا)۔

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اخفش نے کہا ہے: اس کا عطف السموات پر ہے، یعنی وخلق الشمس (اور اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو تخلیق فرمایا وہ سب اس کے حکم کے پابند ہیں) اور حضرت عبداللہ بن عامر (1) سے ان تمام میں رفع مروی ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ اپنی خبر میں سچا ہے، پس اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا، اس نے انہیں تخلیق فرمایا ہے اور انہیں اس کے بارے حکم دیا جو پسند فرمایا۔ اور یہ امر نہی کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عیینہ (2) نے کہا ہے: اس نے خلق اور امر کے درمیان فرق کیا ہے، پس جس نے ان دونوں کو جمع کیا تو اس نے کفر کیا، پس خلق مخلوق ہے اور امر اس کا وہ کلام ہے جو غیر مخلوق ہے اور وہ اس کا یہ قول ہے: کن (ہو جا)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۝ (یٰسین) (اس کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے) اور خلق اور امر کے الگ الگ اور متفرق ہونے میں اس کے قول کے فاسد ہونے پر بین دلیل موجود ہے جس نے کہا ہے کہ قرآن مخلوق ہے، کیونکہ اگر اس کا وہ کلام جو امر ہے مخلوق ہو تو تحقیق اس نے پھر یہ کہا: الا لہ الخلق والخلق اور یہ کلام سے عاجز آنا، ناپسندیدہ اور ایسا کلام ہے جس میں مدد کی حاجت اور ضرورت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسی کلام کرنے سے بلند و برتر ہے جس میں کوئی فائدہ اور نفع نہیں۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (الروم: 25) (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے)

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ پس اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ خبر دی ہے کہ مخلوقات اسی کے حکم کے ساتھ قائم ہیں، پس اگر امر بھی مخلوق ہو تو وہ یقیناً ایک دوسرے امر کا محتاج ہوگا جس کے ساتھ وہ قائم ہوگا اور پھر وہ امر کا ایک مزید امر محتاج ہوگا یہاں تک کہ اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور یہ محال ہے، تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا وہ امر جو اس کا کلام ہے وہ قدیم ازلی اور غیر مخلوق ہے، تاکہ اس کے ساتھ مخلوقات کا قیام صحیح ہو سکے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ (الحجر: 85) (اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان دونوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی قول کے ساتھ اور وہ اس کا وہ قول ہے جو اس نے چیزوں کے موجود ہونے کے لیے فرمایا ہے یعنی کن (تو ہو جا) پس اگر حق بھی مخلوق ہو تو پھر یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کے ساتھ مخلوقات کو پیدا کرے، کیونکہ خلق مخلوق کے ساتھ تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اور اس پر یہ ارشادات دلالت کرتے ہیں: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ۝ (الصافات) (اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے)

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 482 2۔ ایضاً

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ۝ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ (السجدہ:13) (لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے، یہ سب قدیم میں قول کے مقدم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وجود میں ازل کو ثابت کرتا ہے اور ان کے رد کے لیے یہی ایک نکتہ کافی ہے۔

اور ان کے لیے یہ آیات ہیں جن سے انہوں نے اپنے مذہب پر استدلال کیا ہے مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ الآیہ (الانبیاء:2) (نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے)

اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا۝ (الاحزاب) اور مفعولاً اور وہ آیات جو ان کی مثل ہیں (اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے)

قاضی ابوبکر نے کہا ہے: مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ (الانبیاء:2) کا معنی ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو وعظ و نصیحت اور جو وعدہ و تخفیف انہیں ہوتا ہے۔ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ یَلْعَبُوْنَ۝ (الانبیاء) (مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں (مگن) ہوتے ہیں، کیونکہ رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی نصیحت اور ان کا ڈرانا بھی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ۝ (الغاشیہ) (پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے) اور کہا جاتا ہے: فلان لی مجلس الذکر (فلاں وعظ و نصیحت کی مجلس میں ہے) اور وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا۝ (الاحزاب) اور مفعولاً کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کافروں کے لیے اپنی سزا اور انتظام کا اور مومنین کے لیے اپنی مدد و نصرت کا اور جو اس کے بارے فیصلہ فرمایا ہے اور اپنے افعال میں سے جو اس کے لیے مقرر فرمائے ہیں ان کا ارادہ کیا ہے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (ہود:40) (یہاں تک کہ جب آ گیا اس کا حکم)

اور اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ۝ (ہود) (اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا) یعنی اس کے مطابق اس کی شان، اس کے افعال اور اس کا طریقہ کار ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها أمرها حتى إذا تبوأت بأخفافها مرعى تبوأ مضجعا

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور جب یہ ثابت اور پختہ ہو گیا تو پھر یہ جان لو کہ امر کسی شے کے ارادہ میں سے نہیں ہے۔ اور معتزلہ کہتے ہیں: امر نفس ارادہ ہی ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ کبھی ایسی شے کے بارے حکم دیتا ہے جس کا وہ ارادہ نہیں فرماتا اور اس سے منع فرما دیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا لیکن اس کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کے ساتھ مل کر پچاس نمازیں پڑھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں پانچ سے زیادہ کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور کبھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ارادہ فرمایا کہ وہ فرماتا ہے: وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران:140) اور کافروں کو آپ کو قتل کرنے سے منع فرما دیا اور انہیں اس بارے حکم نہیں دیا۔ اس باب میں یہی صحیح اور نفس ہے، پس اس میں غور کر لو۔

قولہ تعالیٰ: تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، تَبٰرَكَ باب تفاعل ہے۔ یہ برکت سے ماخوذ ہے(1) اور اس کا معنی کثرت اور وسعت ہے۔ کہا جاتا ہے: بورك الشئ اور بورك فيه (شے میں کثرت اور وسعت رکھ دی گئی) یہ ابن عرفہ نے کہا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: تَبٰرَكَ کا معنی ہے تعالیٰ و تعاظم وارتفع (اور وہ بلند و بالا اور عظمت و شان والا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کے نام سے یمن و برکت حاصل کی جاتی ہے۔ اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

''دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ، بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یہ دعا اور اس میں عجز و انکساری کرنے کے بارے امر ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ساتھ ایسی صفات کو ملا دیا ہے جو اس کے ساتھ حسین لگتی ہیں اور وہ خشوع اور عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ اور خُفْيَةً کا معنی ہے وہ راز اور چھپی ہوئی بات جو دل میں ہوتا کہ وہ ریا کاری سے دور اور محفوظ رہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کی تعریف کی ہے جب ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) (جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے)

اور اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خير الذكر الخفي و خير الرزق ما يكفي (2) (بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو (حاجات کے لیے) کافی ہو)۔ اور یہ پختہ شرعی حکم ہے کہ نیکی کے اعمال میں وہ سر اور راز جس میں کوئی عیب اور نقص نہ ہو اجر کے اعتبار سے جہر سے اعظم اور افضل ہے۔ اور یہ معنی پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: تحقیق ہم نے کئی اقوام کو پایا ہے کہ وہ زمین پر عمل کرنے پر قدرت رکھتے تھے لیکن ان کا وہ عمل ہمیشہ جہراً ہوتا تھا۔ اور مسلمان دعا میں انتہائی کوشش اور عجز و انکساری کرتے ہیں اور ان کی آواز تک نہیں سنی جاتی، بلاشبہ دعا ان کے درمیان اور ان کے رب کے درمیان ایک سرگوشی ہوتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً۔ اور عبد صالح کا ذکر کیا ہے، اس کے عمل کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ آمین کو آہستہ (اور مخفی) کہنا اسے جہراً کہنے سے اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ یہ بھی ایک دعا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کے بارے بحث گزر چکی ہے۔

اور مسلم نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ہم سفر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور ایک روایت ہے ایک غزوہ میں تھے۔ پس لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی جب بھی کسی گھاٹی پر بلند ہوتا تو کہتا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! اپنے نفسوں پر نرمی کرو بے شک تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ اسے جو غائب ہے، بلاشبہ تم اس سے دعا مانگ رہے ہو جو سننے والا ہے، قریب ہے اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 164
2۔ مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 180

وہ تمہارے ساتھ ہے'' (1)۔ الحدیث

**مسئلہ نمبر 2۔** دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان میں سے حضرت جبیر بن مطعم، سعید بن مسیب اور حضرت سعید بن جبیر ہیں۔ اور حضرت شریح نے ایک آدمی کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کون انہیں پکڑے گا؟ تیری ماں تو ہے نہیں! اور حضرت مسروق نے ایک قوم کو کہا جنہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے: اللہ انہیں توڑ دے۔ اور انہوں نے یہ پسند کیا کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کے بارے دعا مانگے تو اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ اور وہ کہتے: یہی اخلاص ہے۔ اور حضرت قتادہ اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے۔ اور حضرت عطا، طاؤس اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے ہاتھ اٹھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔ اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اور آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی (2)۔ اور اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے اور کہا: ''اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو خالد نے کیا ہے'' (3)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا: جب غزوہ بدر کا دن تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا، وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے صحابہ کرام تین سو سترہ افراد تھے، تو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے منہ قبلہ شریف کی طرف کیا اور اپنے رب سے گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور امام ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفع یدیہ لم یحطھما حتی یمسح بھما وجھہ (5) (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ بلند کرتے تو پھر آپ انہیں نیچے نہ کرتے یہاں تک کہ انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔) امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ أن یرفع یدیہ إلیہ فیردھما صفرا (6) (او قال) خائبتین (بے شک تمہارا رب بڑا حیادار اور سخی ہے وہ اپنے بندے سے حیا محسوس کرتا ہے جو اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ بلند کرے اور وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے (یا فرمایا) وہ انہیں ناکام واپس کر دے)

پہلے گروہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے مسلم نے عمارہ بن رویبہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو منبر پر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا برا کرے۔ تحقیق میں نے رسول اللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ، جلد 2، صفحہ 364
2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 938
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 622
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 93
5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 174
6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 284

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ کے ساتھ اسی طرح زائد کہتے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی مسبحہ انگلی کے ساتھ اشارہ کیا(1)۔ اور جو روایت سعید بن ابی عروبہ نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوائے بارش کی دعا کے کسی شے کے بارے دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے اور آپ بارش کی دعا کے وقت انہیں اتنا بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی (2)۔ پہلی حدیث سعید بن ابی عروبہ کی حدیث سے سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور زیادہ ثابت ہے، کیونکہ آخری عمر میں حضرت سعید کی عقل مختل ہوگئی تھی۔ تحقیق حضرت شعبہ نے جو روایت قتادہ عن انس بن مالک سے بیان کی ہے اس میں انہوں نے سعید کی مخالفت کی ہے اور اس میں کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی (3)۔ اور تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: جب مسلمانوں پر کوئی آفت اور مصیبت نازل ہو تو اس وقت ہاتھ اٹھانا انتہائی جمیل اور حسین ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب بارش کے وقت اور غزوہ بدر کے دن کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دعا مانگنا اچھا ہے جس حالت میں آسان اور میسر ہو، محل فقر کے اظہار کے لیے، رب کریم کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے کے لیے اور اس کی بارگاہ میں عجز وانکساری اور خشوع وخضوع کے اظہار کے لیے انسان سے یہی مطلوب ہے، پس اگر چاہے تو وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور اپنے ہاتھ بلند کرے تو یہ بہت اچھا ہے اور اگر چاہے تو ایسا نہ کرے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اور اس سے ہاتھ اٹھانے وغیرہ کی صفت اور حالت کا ارادہ نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا: الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا (آل عمران: 191) (وہ عقلمند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے) پس اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف بیان فرمائی ہے اور مذکورہ حالت کے سوا کسی حالت کی شرط نہیں لگائی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن اپنے خطبہ میں دعا فرمائی درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک قبلہ سمت نہ تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ مراد یہ ہے کہ دعا میں حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اگرچہ لفظ عام ہیں۔ (اسی طرف یہ اشارہ ہے) اور معتدی وہ ہوتا ہے جو حد سے تجاوز کرنے والا ہو اور ممنوع کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ اور کبھی وہ اس شی کے اعتبار سے فضیلت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس میں وہ حد سے تجاوز کرتا ہے (4)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیکون قوم یعتدون فی الدعاء (5) (عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے) اسے ابن ماجہ نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے روایت کیا ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 287
2۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 293
3۔ سنن نسائی، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 244
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410
5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283

عفان، حماد بن سلمہ اور سعید الجریری نے ابونعامہ سے ہمیں خبر دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سے قصر ابیض کی التجا کرتا ہوں جب میں اس میں داخل ہوں۔ تو انہوں نے فرمایا: اے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کر اور جہنم سے پناہ مانگ، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے'' (1)۔

اور دعا میں حد سے بڑھنا کئی اعتبار سے ہے: ان میں سے ایک ہے بہت زیادہ بلند آواز سے اور چیخ کر دعا مانگنا (2)، جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ انسان اس بارے میں دعا مانگے کہ اس کے لیے نبی کا مقام و مرتبہ ہو یا کسی محال شے کے بارے دعا مانگے اور اسی طرح کی مبالغہ آمیز دعائیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ معصیت وغیرہ کی خواہش رکھتے ہوئے دعا مانگے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسی شے کے بارے دعا مانگے جو کتاب وسنت میں نہیں ہے۔ پس وہ انتہائی فقر آمیز الفاظ چنتا ہے اور مسجع کلمات اختیار کرتا ہے درآنحالیکہ وہ انہیں رسالوں میں پاتا ہے ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اور نہ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، پس وہ انہیں اپنا شعار اور عادت بنا لیتا ہے اور وہ ان الفاظ کو چھوڑ دیتا ہے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا مانگی۔ یہ سب چیزیں دعا کی قبولیت کے مانع ہوتی ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

''اور نہ فساد پھیلاؤ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور دعا مانگو اس سے ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے، بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکوکاروں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس میں ایک مسئلہ ہے:

وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اصلاح کے بعد چاہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہر فساد سے منع فرمایا ہے چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر۔ صحیح اقوال کے مطابق یہ حکم عام ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم چشمے دار پانی بند نہ کرو اور نقصان پہنچانے کے لیے پھل دار درخت نہ کاٹو۔ اور یہ بھی وارد ہے: زمین میں فساد سے دنانیر ختم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین میں فساد سے حکام کی تجارت منقطع ہو گئی۔ اور علامہ قشیری نے کہا ہے: اس سے مراد ہے اور تم شرک نہ کرو، پس یہ شرک، خون بہانے اور زمین میں ہرج اور فساد برپا کرنے سے نہی ہے اور زمین میں اصلاح کے بعد احکام شریعہ کو لازم پکڑنے کا حکم ہے، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے رسول بھیج کر اس کی اصلاح فرما دی ہے، (پس یہ) شرائع کو پختہ کرنا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی وضاحت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس قول کے قائل نے عظیم اصلاح کے بعد بہت بڑے فساد کا قصد کیا ہے پس اس نے اسے خاص طور پر ذکر کیا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے تو وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، بلاشبہ وہ تب ہے جب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 411

اس میں ضرر اور نقصان مومن کا ہو۔ اور اگر اس کا ضرر اور نقصان مشرکین کو پہنچے تو پھر وہ جائز ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کنویں کا پانی بند کیا اور آپ نے کافروں کے درخت کاٹ دیئے۔ قطع الدنانیر کے بارے میں بحث سورۃ ہود میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا یہ اس بارے امر ہے(1) کہ انسان انتظار، خوف اور اللہ تعالیٰ سے امید کی حالت میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ امید اور خوف انسان کے لیے پرندے کے دو پروں کی مثل ہوتے ہیں جو اسے صراط مستقیم میں اٹھائے رکھتے ہیں اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک منفرد ہو جائے تو انسان ہلاک ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿۵۰﴾ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں اور (یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے امید بھی دلائی اور خوف بھی دلایا۔ پس انسان دعا مانگے اس کی سزا سے ڈرتے ہوئے اور اس کے ثواب کی حرص اور طمع رکھتے ہوئے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (الانبیاء:90) (اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے) اس بارے میں گفتگو آگے آئے گی۔

خوف کا معنی ہے: الانزعاج لما لا یؤمن من المضار (اس شے کے لیے بے قرار اور بے چین ہونا جس کے ضرر اور نقصان سے وہ محفوظ نہ ہو) اور طمع کا معنی ہے: توقع المحبوب (کسی محبوب اور پسندیدہ شی کی توقع رکھنا) یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: مناسب یہ ہے کہ طویل زندگی میں خوف امید پر غالب رہے(2) اور جب موت آجائے تو پھر امید غالب رہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یموتن أحد کم إلا وھو یحسن الظن باللہ(3) (تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اس میں قریبۃ نہیں کیا، سو اس میں سات وجوہ ہیں: ان میں سے پہلی یہ ہے کہ رحمت اور رحم ایک ہی شے ہے اور یہ عفو اور غفران کے معنی میں ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: رحمت مصدر ہے اور مصدر کا حق یہ ہے کہ وہ مذکر ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ (البقرہ:175) یہ قول زجاج کے قول کے قریب ہے، کیونکہ مَوْعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت سے احسان کا ارادہ کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جس کی تانیث حقیقی نہ ہو تو اسے مذکر لانا جائز ہوتا ہے، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہاں رحمت سے مراد بارش ہے۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔ اور کہا ہے: اسے مذکر لانا جائز ہے جیسے بعض مؤنث کو مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ شعر بھی کہا ہے:

فلا مُزْنَةٌ وَدَقَتْ وَدْقَھا ولا أرضَ أبْقَلَ إبْقالَھا

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: مکان کی تذکیر کی بنا پر قریب مذکر ذکر کیا گیا ہے، یعنی مکانا قریبا۔ علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 411 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، الجنۃ وصفۃ نعیمھا، جلد 2، صفحہ 387

خطا ہے، اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا تو پھر قرآن کریم میں قریب منصوب ہوتا، جیسے آپ کہتے ہیں: ان زیدا قریبا منك اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے نسبت کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ فرمایا: إن رحمة الله ذات قرب (بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت قرب والی ہے) جیسے آپ کہتے ہیں: امرأة طالق وحائض۔ اور فراء نے کہا ہے: جب قریب کا لفظ مسافت کے معنی میں ہو تو اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے اور اگر نسب کے معنی میں ہو تو پھر بلا اختلاف مونث لایا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: هذه المرأة قريبتي، ای ذات قرابتي اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ نے فراء سے ذکر کیا ہے: نسب میں کہا جائے گا قريبة فلان اور غیر نسب میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہیں۔ کہا جاتا ہے: دارك منا قريب (تیرا گھر ہمارے قریب ہے) وفلانة منا قريب (اور فلانہ ہمارے قریب ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿۶۳﴾ (الاحزاب) (اور (اے سائل)! تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو) اور جس نے اس کا استدلال کیا ہے اس نے کہا ہے: اسی طرح کلام عرب بھی ہے، جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

له الوَيْلُ إن أمسَى ولا أمّ هاشم قَرِيبٌ ولا البَسْبَاسَةُ ابنةُ يَشْكُرا

زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے، کیونکہ مذکر اور مونث کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دونوں اپنے افعال پر جاری ہوں۔

**وَ هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾**

''اور وہی خدا ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری سناتے ہوئے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف پھر ہم اتارتے ہیں اس سے پانی پھر پیدا کرتے ہیں اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم نصیحت قبول کرو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ کا عطف قول باری تعالیٰ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے ایک دوسری شے کا ذکر کیا ہے اور اپنی وحدانیت اور اپنے الٰہ ہونے کے ثبوت پر دلیل بیان کی ہے۔ اور ریح کے بارے سورۃ البقرہ میں کلام گزر چکی ہے۔ ریاح جمع کثرت ہے اور ارواح جمع قلت ہے۔

اور ریح کی اصل روح ہے اور جس نے جمع قلت میں ارياح کہا ہے اس نے خطا کی ہے۔ بُشْرًا میں سات قرائتیں ہیں: اہل حرمین اور ابو عمرو نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ نُشُرا پڑھا ہے اور یہ نسبت کے معنی کی بنا پر ناشر کی جمع ہے۔ یعنی ذات نشر (خوشخبری سنانے والی) پس یہ شاهد اور شهد کی مثل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ نشور کی جمع ہو جیسے رسول کی جمع رسل ہے۔ کہا جاتا ہے: ريح النشور جب ہوا ادھر ادھر سے آئے اور نشور بمعنی منشور ہے، جیسے رکوب بمعنی مرکوب ہے، یعنی وہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اس حال میں کہ وہ پھیلی ہوئی (اور بکھری ہوئی) ہوتی ہیں۔

حسن اور قتادہ نے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ نُشْرًا پڑھا ہے اور یہ نشرا سے مخفف کیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: کتب و رسل۔ اعمش اور حمزہ نے مصدر ہونے کی بنا پر نون کے فتحہ اور شین کے سکون کے ساتھ نَشْرًا پڑھا ہے۔ اس میں اس کے ماقبل کے معنی کا عمل کیا گیا ہے۔ گویا یہ فرمایا: وھو الذی ینشر الریاح نشرا (اور وہ وہی ہے جو ہواؤں کو اچھی طرح پھیلاتا ہے) نشرتُ الشئ فانتشر (میں نے شے کو پھیلایا پس وہ پھیل گئی)

گویا کہ وہ لپٹی ہوئی تھی تو اسے ہوا کے چلنے کے وقت پھیلا دیا گیا) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو اور الریاح سے حال کے محل میں ہو۔ گویا کہ فرمایا: یرسل الریاح منشرۃ ای محییۃ (وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے درآنحالیکہ وہ خوشخبری سنانے والی یعنی زندہ کرنے والی ہوتی ہے) اور یہ أنشر اللہ المیت فنشر (اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گیا) سے ماخوذ ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أتانا رکضا، ای راکضا (وہ ہمارے پاس دوڑتے ہوئے آیا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نشرا (فتحہ کے ساتھ) اس نشر سے ماخوذ ہے جو طی (لپیٹنا) کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، گویا کہ ہوا اپنے ساکن ہونے کی حالت میں لپٹی ہوئی شے کی مثل ہے پھر اسے اپنی حالت سے بھیجا جاتا ہے تو وہ کھلنے والی شے کی طرح ہو جاتی ہے اور ابوعبید نے متفرقۃ فی وجوھہا کے معنی کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے، (یعنی) معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ادھر ادھر پھیلا دیتا ہے۔

حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے با کے ساتھ شین کے سکون اور تنوین کے ساتھ بُشْرًا پڑھا ہے اور یہ بشیر کی جمع ہے، یعنی وہ ہوائیں جو بارش کی بشارت دیتی ہیں۔ اور اس پر شاہد رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ (الروم: 46) ہے (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے)

شین اصل میں مضموم ہے، لیکن اسے تخفیف کے لیے ساکن کیا گیا ہے جیسے رُسُل و رُسْل۔ اور آپ سے با کے فتحہ کے ساتھ بَشْرًا بھی مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بُشُرًا بھی پڑھا جاتا ہے اور بَشْرًا، بَشَرَ، یبشر، بمعنی بشّر کا مصدر ہے۔ یہ پانچ قرائتیں ہیں۔ محمد الیمانی نے حبلی کے وزن پر بشری پڑھا ہے اور ساتویں قراءت با اور شین کے ضمہ کے ساتھ بُشُری ہے۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا السحاب مذکر اور مونث دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ جمع بھی ہے جس کے واحد اور اس کے درمیان ہا ہو۔ اس کی صفت واحد کے ساتھ لگانا جائز ہے پس آپ کہیں گے: سحاب ثقیل و ثقیلۃ اور معنی یہ ہے: حملت الریحُ سحاباً ثقالاً بالماء (یعنی ہوا نے پانی والے بھاری بادل کو اٹھایا) یعنی اسے اٹھانے کے سبب وہ بوجھل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے: أقل فلان الشئ یعنی فلاں نے شے اٹھائی۔ سُقْنٰهُ یعنی ہم بادل کو لے جاتے ہیں۔ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ ایسے شہر کی طرف جس میں نباتات اور سبزہ وغیرہ نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے: سقتہ لبلد کذا والی بلد کذا (میں اسے فلاں فلاں شہر کی طرف لے گیا) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے: لاجل بلد میت (یعنی ہم اسے ویران شہر کے لیے چلاتے ہیں) یعنی یہ لام اجلیہ ہے۔ اور البلد سے مراد زمین کی ہر جگہ ہے چاہے وہ آباد ہو یا غیر آباد، وہ سکونت سے خالی ہو یا اس میں سکونت ہو۔ البلدۃ اور البلد، البلاد اور البلدان کی واحد

ہے۔اور البلد کا معنی الاثر ہے اور اس کی جمع أبلاد ہے۔شاعر نے کہا ہے:۔

مِن بعد ما شَمل البِلیٰ أبلادَها

اور البلد سے مراد أُدْحِیّ النَّعام (ریت سے شتر مرغ کے انڈے دینے کی جگہ) بھی ہے۔کہا جاتا ہے: هو أذلّ من بيضة البلد، یعنی وہ شتر مرغ کے انڈے سے بھی زیادہ ذلیل ہے جسے وہ چھوڑ دیتا ہے) اور البلدة سے مراد زمین ہے۔کہا جاتا ہے: هذه بلدتنا (یہ ہماری زمین ہے)۔

جیسے کہا جاتا ہے: بحرتُنا اور البلدة چاند کی منازل میں سے ایک منزل بھی ہے اور وہ قوس کے چھ ستارے ہیں سال کے سب سے چھوٹے دن میں سورج اس میں اترتا ہے۔اور البلدة کا معنی سینہ بھی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلان واسع البلدة یعنی فلاں وسیع سینے والا ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

أُنیخَتْ فألقَتْ بَلْدَةً فوقَ بلدة	قلیلٍ بها الأصواتُ إلّا بُغَامُها

شاعر کہہ رہا ہے: اونٹنی بیٹھی تو اس نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا۔اور البلدة (با کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ) کا معنی دو بھوؤں کے درمیان پایا جانا والا فاصلہ اور کشادگی بھی ہے۔پس یہ دونوں الفاظ مشترکہ میں سے ہیں۔فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ پھر ہم اس شہر میں پانی اتارتے ہیں، (یعنی به کی ضمیر کا مرجع البلد ہے)۔اور یہ بھی کہا گیا ہے: پھر ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں (یعنی ضمیر کا مرجع السحاب ہے) کیونکہ سحاب (بادل) پانی برسانے کا آلہ اور ذریعہ ہے۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو فأنزلنا منه الماء (یعنی با بمعنی من ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (الدھر: 6) یعنی اس میں بِهَا بمعنی منها ہے۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔اسی مثل ذالك الإخراج نحيي الموتى یعنی ان پھلوں کو نکالنے کی مثل ہم مردوں کو زندہ کریں گے۔امام بیہقی وغیرہ نے ابو رزین العقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ کیسے اٹھائے گا؟ اور اس کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو اپنی قوم کی وادی سے اس حال میں نہیں گزرا کہ وہ خشک اور قحط زدہ تھی اور پھر تو اس کے پاس سے اس حال میں گزرا کہ وہ سبزے لہرا رہی ہو؟''۔عرض کی: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتلك آية الله في خلقه پس یہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ان کا اپنی قبروں میں احیاء اس بارش کے سبب ہوگا جسے اللہ تعالیٰ ان کی قبور پر برسائے گا تو ان کی قبریں شق ہو جائیں گی، پھر ان کی طرف ارواح لوٹ آئیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے جسے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''پھر اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا''۔یا فرمایا ''اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا وہ شبنم کی طرح ہوگی اور اس کے سبب لوگوں کے جسم ظاہر ہو جائیں گے، پھر کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ۔وہ وہاں ٹھہر جائیں گے اور اس سے باز پرس کی جائے گی''۔آگے حدیث ذکر کی۔اور ہم نے اسے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں مکمل ذکر کیا ہے۔والحمدللہ۔پس یہ بعث ونشور پر

دلیل ہے (1) اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی امور لوٹائے جائیں گے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

''اور جو سرزمین عمدہ و زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا، اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو شکر گزار ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا اس میں الْبَلَدُ الطَّيِّبُ سے مراد عمدہ اور زرخیز سرزمین ہے۔ اور خبیث وہ زمین ہے جس کی مٹی میں پتھر یا کانٹے ہوں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد تشبیہ دینا ہے (یعنی) اللہ تعالیٰ نے تیز فہم کو عمدہ اور زرخیز سرزمین سے تشبیہ دی ہے اور کند ذہن (اور کمزور فہم) کو خبیث سے، یہ نحاس سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی مثال ہے، پس ایک دل وہ ہے جو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے (وہ طیب اور پاکیزہ ہے) اور ایک فاسق دل ہوتا ہے جو اسے قبول نہیں کرتا (وہ خبیث ہوتا ہے) یہ قول بھی حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مومن کی مثال ہے جو اخلاص اور اطاعت شعاری کے ساتھ عمل کرتا ہے اور منافق کی مثال ہے جس میں اخلاص نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان (2) ہے! اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو خوبصورت سینگ پائے گا تو وہ یقیناً عشاء میں حاضر ہو''۔ نَكِدًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس سے مراد وہ تنگی ہے جو خیر (خوشحالی) لانے سے مانع اور رکاوٹ ہو، اور یہ ایک تمثیل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اولاد آدم میں طیب بھی ہیں اور خبیث بھی۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے إِلَّا نَكْدًا پڑھا ہے اور ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے۔ ابن القعقاع نے نَكَدًا کاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی ذانکد مصدر ہے۔ جیسے کسی کا قول ہے:

فانما هي اقبال و ادبار

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نکدا کا لفظ کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ایک ہی معنی میں ہے جیسا کہ دنِف اور دنَف اور یہ دو لغتیں ہیں۔ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ یعنی جیسا کہ ہم نے کئی طریقوں سے بیان کیا ہے اور یہی شرک کے بطلان میں حجج اور دلائل ہیں۔ اسی طرح ہم ہر اس شے میں علامات اور نشانیاں بیان کرتے ہیں جن کے لوگ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ یہاں شکر کرنے والے کی تخصیص فرمائی کیونکہ اس سے نفع وہی حاصل کرتے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، الفتن و اشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 403	2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 89

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

''بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اللہ کے سوا، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے''۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ جب یہ بیان کیا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) خالق بھی ہے اور کمال پر قادر بھی تو اس نے کئی امتوں کے قصص اور واقعات بیان کیے اور ان میں کفار کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے والی چیزوں کا ذکر کیا۔ لقد میں لام تاکید کے لیے ہے جو قسم پر متنبہ کرتی ہے۔ اور فا اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ دوسری (شے) اوّل کے بعد ہے۔

يٰقَوْمِ اس میں منادی مضاف ہے۔ اور اسے اپنے اصل پر رکھتے ہوئے یا قومی پڑھنا بھی جائز ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کی حرمت کا حکم لے کر زمین پر مبعوث ہوئے۔ نحاس نے کہا ہے: لفظ نوح منصرف ہے، کیونکہ اس میں حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے ناح ینوح سے مشتق مان لیا جائے۔ یہ معنی اس کے علاوہ دوسرا مفہوم سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: مورخین میں سے حسن نے یہ کہا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے۔ اسے وہم ہوا ہے اور اس کے وہم کی صحت پر دلیل صحیح حدیث ہے کہ جب شب معراج حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان الفاظ کے ساتھ استقبال کیا: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے) اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی) تو اگر حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے باپ ہوتے تو یقیناً اس طرح کہتے: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح مگر جب انہوں نے الاخ الصالح کہا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام میں جمع اور اکٹھے ہیں، صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ اور اس کے بعد کسی منصف کے کلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اس مقام پر آباء جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب سے جواب ان الفاظ میں آیا ہے: مرحباً بالابن الصالح اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: بالاخ الصالح جیسا کہ حضرات موسیٰ، عیسیٰ، یوسف، ہارون اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کی جانب سے ذکر کیا گیا ہے اور بالاتفاق ان میں سے کوئی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ نہیں ہے۔ اور مازری نے بیان کیا ہے: تحقیق مورخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے جد امجد تھے، پس اگر اس پر دلیل قائم بھی ہو جائے کہ حضرت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 785

ادریس علیہ السلام بھی مبعوث کیے گئے تو پھر بھی ان کا قول صحیح نہیں ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے ہونے کی طرف آپ کی نسبت کرتے ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کے اس قول کی خبر دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو مبعوث فرمائے گئے اور اگر دلیل قائم نہ ہو تو پھر وہ جائز ہے جو انہوں نے کہا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس معنی پر محمول کیا جائے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نبی غیر مرسل تھے۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تمام اہل زمین کے لیے مختص تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام کی نبوت فقط اپنی قوم کے لیے تھی جیسا کہ حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط وغیرہم علیہم الصلوات والتسلیمات کی تھی۔ اور بعض نے اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ (الصافات) (اور بے شک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں (یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟)

اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اور اس طرح بھی پڑھا گیا ہے: سلام علی ادراسین حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالحسن بن بطال کو دیکھا ہے کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام رسول نہیں تھے کہ وہ اس اعتراض سے محفوظ رہیں۔

اور حضرت ابوذر الطویل کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام دونوں رسول ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: انہیں اس طرح اکٹھا اور جمع کیا جا سکتا ہے (1) کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت لوگوں کی اصلاح کے لیے مشہور ہے اور آپ نے انہیں عذاب اور ہلاکت کے خوف سے ایمان پر ابھارا اور برانگیختہ کیا، پس مراد یہ ہے کہ آپ وہ پہلے نبی ہیں جو اس صفت پر مبعوث کیے گئے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کے آٹھ سو برس بعد آپ کی بعثت ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: آپ ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو دعوت حق دیتے رہے، جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ پھر آپ طوفان کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ زیادہ ہو گئے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

وہب نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اس وقت آپ کی عمر پچاس برس تھی۔ عون بن شداد نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی اس وقت آپ کی عمر ساڑھے تین سو برس تھی۔ ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ اب تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ نقاش نے سلیمان بن ارقم سے اور انہوں نے زہری سے بیان کیا ہے کہ عرب، فارس، روم، اہل شام اور اہل یمن سام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ سندھ، ہند، زنج، حبشہ، زط، نوبہ اور سیاہ جلد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 416

والے تمام حام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ ترک، بربر، چین سے آگے کے لوگ، یاجوج ماجوج اور صقالیہ تمام کے تمام یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔ اس طرح تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے (1)۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، غَيْرُهٗ کی قراءت رفع کے ساتھ حضرت نافع، ابوعمرو، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی قراءت ہے یعنی مالکم الٰہٌ غیرہ یہ محلاً صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیرٌ بمعنی اِلّا ہے، یعنی مالکم من الٰہ اِلّا اللہ۔ ابوعمرو نے کہا ہے: میں نہ خبر کو پہچانتا ہوں اور نہ نصب کو۔ کسائی نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جر کے ساتھ پڑھا ہے اور استثنا کی بنا پر نصب بھی جائز ہے اور یہ زیادہ نہیں ہے، مگر امام کسائی اور فراء نے ہر اس جگہ میں جائز قرار دی ہے جس میں اِلّا اچھا اور حسین لگتا ہے چاہے کلام مکمل ہو یا مکمل نہ ہو، پس ان دونوں نے ماجاءنی غیرك کو جائز قرار دیا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض بنی اُسد اور قُضاعہ کی لغت ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

لم يَمْنَعِ الشُّرْبَ منها غيرَ أن هتفَتْ　　حمامةٌ فی سَحُوق ذاتِ أو قَال

امام کسائی نے کہا ہے: جاءنی غیرك حالت ایجاب میں کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں اِلّا واقع نہیں ہوسکتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک غیر پر نصب جائز نہیں ہوتی جب تک کلام مکمل نہ ہو۔ اور یہ ان کے نزدیک قبیح ترین غلطی ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۞ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

''ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: (اے نوح!) ہم دیکھتے ہیں تمہیں کھلی گمراہی میں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! نہیں ہے مجھ میں ذرا گمراہی، بلکہ میں تو رسول ہوں سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تمہیں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے''۔

الْمَلَاُ سے مراد قوم کے اشراف اور ان کے رؤساء ہیں۔ اس کا بیان پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور الضلال اور الضلالۃ کا معنی ہے راہ حق سے پھر جانا اور اس سے ہٹ جانا، یعنی بلاشبہ ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمیں ایک خدا کی طرف دعوت دینے میں راہ حق سے پھرے ہوئے ہو۔ اُبَلِّغُكُمْ یہ تشدید کے ساتھ ہو تو التبلیغ سے ماخوذ ہے۔ اور تخفیف کے ساتھ ہو تو الابلاغ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں اور دو لغتیں ہیں، جیسا کہ کرمه اور اکرمه ہیں۔ وانصح لکم یہ النصح سے ہے اور اس کا معنی ہے: معاملات میں نیت کا فساد کی آمیزش سے خالص اور پاک ہونا، بخلاف غش (ملاوٹ) کے۔

کہا جاتا ہے: نصحتُه و نصحتُ له نصیحةً و نصاحةً و نصحًا اور یہ لام کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْصَحُ لَكُمْ اس کا اسم النصیحة ہے۔ النصیح کا معنی ہے الناصح (نصیحت کرنے والا) اور قوم نصحاء (نصیت

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الصافات، حدیث نمبر 3154، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ المحرر الوجیز

کرنے والی قوم) اور رجل ناصح الجیب اس کا معنی ہے صاف دل آدمی۔ اصمعی نے کہا ہے: الناصح کا معنی خالص چاہے شہد ہو یا کوئی اور شے ہو، جیسا کہ الناصع ہے اور ہر وہ شی جو خالص ہو وہ نصح ہے۔ اور انتصح فلان کا معنی ہے فلاں نصیحت کی طرف متوجہ ہوا (یعنی اس نے نصیحت قبول کی)۔ کہا جاتا ہے: انتصحنی أننی لك ناصح (تو میری نصیحت کی طرف توجہ کر بلاشبہ میں تجھے نصیحت کر رہا ہوں) اور الناصح، خیاط (درزی) کو بھی کہتے ہیں۔ اور النصاح سے مراد وہ دھاگہ ہے جس کے ساتھ سیا جاتا ہے۔ اور النصاحات سے مراد جلود (جلدیں اور چمڑے) بھی ہیں۔ اعشی نے کہا ہے:

فَتَرَى الشُّرْبَ نَشَاوَى كلهم　　مثل ما مُدّتْ نِصاحاتُ الرُّبَحِ

الرُّبَحُ لغوی طور پر الرُّبَع کے معنی میں ہے اور یہ اونٹ کا بچہ ہوتا ہے اور الرُّبَح پرندہ بھی ہے، اس کے مزید معنی سورۂ برأت میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

أَوَ عَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

''کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعہ جو تم میں سے ہے تا کہ وہ ڈرائیں تمہیں (غضب الٰہی سے) اور تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے، پھر بھی انہوں نے جھٹلایا نوح کو تو ہم نے نجات دی ان کو اور جو آپ کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے غرق کر دیا ان (بدبختوں) کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، بے شک وہ لوگ دل کے اندھے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: أَوَ عَجِبْتُمْ اس میں واؤ کو فتحہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ واؤ عاطفہ ہے (1)، اس پر الف استفہام تقریر کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ اور واؤ کا طریقہ یہ ہے کہ یہ حروف استفہام پر داخل ہوتی ہے سوائے الف کے اس کی قوت کے سبب (یعنی الف پر یہ داخل نہیں ہو سکتی) أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی۔ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْكُمْ، یعنی علی لسان رجل (ایک آدمی کی زبان پر) اور یہ بھی کہا گیا ہے: علی بمعنی مع ہے یعنی مع رجل (ایک آدمی کے ذریعہ) اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے تمہارے اس رب کی طرف سے نصیحت آئی جو تم میں سے ایک آدمی پر نازل کی گئی ہے، یعنی تم اس آدمی کے نسب کو جانتے ہو، یعنی ایسے آدمی پر جو تمہاری جنس میں ہے۔ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو بسا اوقات اختلاف جنس میں مزاجوں میں باہم منافرت اور تضاد ہوتا۔ اور الفلك واحد بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی۔ سورۃ البقرہ میں اس کے بارے گزر چکا ہے۔ عَمِيْنَ یعنی وہ لوگ حق (کی پہچان) سے اندھے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کی پہچان اور معرفت سے اندھے ہیں، کہا جاتا ہے: رجلٌ عَمِ بکذا یعنی آدمی اس سے جاہل ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 169

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ
مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا کیا تم نہیں ڈرتے؟ کہنے لگے وہ سردار جو کافر تھے آپ کی قوم سے کہ (اے ہود!) ہم تو خیال کرتے ہیں کہ تم بڑے نادان ہو اور ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ہود نے کہا: اے میری قوم! نہیں مجھ میں ذرا نادانی بلکہ میں تو رسول ہوں رب العالمین کی طرف سے، پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں تو تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جو دیانتدار ہو۔ کیا تم تعجب کرتے ہو کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ ڈرائے تمہیں؟ (عذاب الٰہی سے) اور یاد کرو جب اس نے بنادیا تمہیں جانشین قوم نوح کے بعد اور بڑھا دیا تمہیں جسمانی لحاظ سے قد و قامت میں تو یاد کرو اللہ (تعالیٰ) کی نعمتوں کو شاید تم کامیاب ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: **وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا** یعنی اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ قبیلہ میں ان کے بھائی تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک بشر (اور انسان) تھے۔ اور مصنف ابی داؤد میں ہے کہ **اَخَاهُمْ هُوْدًا** کا معنی ہے ان کے ساتھ ہود علیہ السلام (کو ان کی طرف بھیجا) اور عاد سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ابن اسحاق نے نسب اس طرح بیان کیا ہے: وعاد ھو ابن عوص بن ارم بن شالخ بن أرفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (1) اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب اس طرح ہے: ھود بن عبد اللہ بن رباح بن الجلود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح (2)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عاد کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ آپ نسب کے اعتبار سے ان میں سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے ان سے افضل تھے۔

اور عاد کو جس نے منصرف نہیں بنایا اس نے اسے قبیلہ کا نام قرار دیا اور جس نے اسے منصرف قرار دیا ہے اس نے اسے محلے کا نام قرار دیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں ہے: عاد الاولی یہ بغیر الف

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 489
2۔ ایضاً

کے ہے۔ اور ہود عجمی لفظ ہے اور یہ اپنے خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ عربی ہو اور ھاد یھود سے مشتق ہو۔ اور اس پر نصب (زبر) بدل ہونے کی وجہ سے ہو۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان سات آباء کا فاصلہ تھا۔ اور روایت ہے کہ عاد کے تیرہ قبیلے تھے، وہ ٹیلوں پر اترتے تھے، ان میں سے ایک عالج کا ٹیلہ تھا۔ ان کے پاس باغات، کھیتیاں اور بڑی بڑی عمارتیں تھیں اور ان کے شہر بڑے سرسبز و شاداب تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہو گیا تو اس نے اس سرزمین کو جنگل بنا دیا اور یہ حضر موت کے نواح سے یمن تک تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو ہلاک کر دیا تو حضرت ہود علیہ السلام ان لوگوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے جو آپ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور پھر وہ وہیں رہے یہاں تک کہ وصال فرما گئے۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ یعنی بلاشبہ ہم آپ کو نادان اور کم عقل دیکھ رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

مَشَيْنَ كما اهتزّتْ رِماحٌ تسفّهتْ　　أعالِيهَا مَرُّ الرِّيَاحِ النَّوَاسِمِ(1)

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں رؤیت سے مراد رؤیۃ البصر (آنکھ کی بصارت ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد وہ رائے ہے جو ظن غالب ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ اس میں خُلَفَآءَ مذکر اور معنی کی بنا پر خلیفہ کی جمع ہے اور لفظ کی بنا پر خلائف کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان یہ فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد انہیں زمین کا باسی بنا دیا۔ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً اور یہ بھی جائز ہے کہ بَصْطَةً صاد کے ساتھ ہو، کیونکہ اس کے بعد طاہے، یعنی قد و قامت کے اعتبار سے طویل اور جسم کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور عظیم الجثہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے (قدوں کی) زیادہ طوالت سو ذراع تھی (2)۔ اور ان میں سے جو چھوٹے قد کے تھے ان کی طوالت ساٹھ ذراع تھی۔ اور یہ زیادتی ان کے آبا کی تخلیق اور قد و قامت پر تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیادتی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے قد و قامت پر تھی۔ وہب نے کہا ہے: ان میں سے کسی ایک کا سر عظیم اور بڑے قبہ کی مثل تھا۔ اور آدمی کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں درندہ بچے دے سکتا تھا اور اسی طرح ان کی ناک کے نتھنے تھے (3)۔ شہر بن حوشب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قوم عاد کا ایک آدمی پتھر سے (دروازے کے) دو کواڑ بناتا تھا کہ اگر اس امت کے پچاس آدمی اس پر جمع ہو جائیں تو وہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی اپنے پاؤں کے ساتھ زمین کو زور سے دباتا تو وہ اس میں گھس جاتا۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ الاء کی واحد الی، إلی، إلْوٌ اور أَلٰی ہے، جیسا کہ آناء کی واحد إِنًی، إِنْیٌ، إِنْوٌ اور أَنًی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 417　　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 170　　3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 491

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۞ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞

''وہ کہنے لگے (اے ہود!) کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس کہ ہم عبادت کریں ایک اللہ کی اور چھوڑ دیں ان (معبودوں) کو جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ سو لے آؤ ہم پر وہ (عذاب) جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود (علیہ السلام) نے کہا: واجب ہو گیا تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب کیا تم جھگڑا کرتے ہو مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (حالانکہ) نہیں اتاری اللہ نے ان کے لیے کوئی سند، سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ پھر ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ان کے ہمراہ تھے اپنی خاص رحمت سے اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور نہ تھے وہ ایمان لانے والے''۔

تو آپ نے انہیں فرمایا: قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ تحقیق تم پر واجب ہو گیا، اس میں وَقَعَ بمعنی وجب ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع القول والحکم یعنی قول اور حکم واجب ہو گیا اور اسی کی مثل یہ آیت ہے: وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ (الاعراف: 134) یعنی جب ان پر عذاب نازل ہوا۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ (النمل: 82) (اس میں بھی وقع بمعنی وجب ہے) اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجس سے مراد وہ زنگ ہے جو کفر کی زیادتی کے سبب دل پر جم جاتا ہے۔ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ (الاعراف: 71) اس میں اسماء سے مراد وہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور ان کے نام مختلف تھے۔

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے بارے میں تمہارے لیے کوئی حجت اور دلیل نازل نہیں کی۔ یہاں اسم بمعنی مسمی ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ (یوسف: 40) اور یہ اسماء مثلاً عزی یہ العز اور الاعز سے بنا ہے اور اللات وغیرہ ہیں۔ ان کے لیے عزت اور الوہیت میں سے کوئی شے نہیں۔ دابر اس سے مراد آخر (یعنی جڑ) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے یعنی ان کے لیے کوئی شے باقی نہ رہی۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞

''اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ

تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا۔ بے شک آچکی ہے تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ الله کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے الله کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب دردناک''۔

ثمود سے مراد ثمود بن عاد بن ارم بن سام بن نوح ہے۔ اور یہ جدیس کا بھائی تھا، معاشی طور پر یہ لوگ خوشحال تھے، لیکن انہوں نے الله تعالیٰ کے حکم کے خلاف عمل کیا اور غیر الله کی عبادت اور پوجا کی اور زمین میں فساد برپا کیا۔ تو الله تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا۔ اور آپ کا نسب اس طرح تھا صالح بن عبید بن آسف بن کاشح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔ اور یہ عرب قوم تھے، آپ ان میں نسب کے اعتبار سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے افضل تھے۔ پس آپ نے انہیں الله تعالیٰ کی طرف دعوت دی یہاں تک کہ آپ بوڑھے ہو گئے اور ان میں سے سوائے کمزور لوگوں کی قلیل تعداد کے انہوں نے آپ کی اتباع نہ کی۔ ثمود کا لفظ غیر منصرف ہے، کیونکہ اسے قبیلے کا نام بنایا گیا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ عجمی اسم ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ یہ الثمد سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے قلیل پانی۔

تحقیق قراء نے اس طرح پڑھا: اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ (ہود:68) کیونکہ یہ چھوٹے قبیلہ (یا محلہ) کا نام ہے۔

اور قوم ثمود کی رہائش گاہیں حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ کی جانب مقام حجر پر تھیں اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کا نام ثمود رکھا گیا۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً جب انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا تو آپ نے سخت پتھر سے ان کے لیے اونٹنی نکالی۔ تو ایک دن اس کے لیے تھا جس میں وہ وادی کا سارا پانی پی جاتی تھی اور انہیں اسی کی مثل دودھ دیتی تھی کہ اس سے زیادہ لذیذ اور شیریں دودھ کبھی بھی کسی نے نہیں پیا۔ اور وہ ان کی کثرت کے باوجود ان کی حاجت اور ضرورت کے مطابق ہوتا تھا۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الشعراء:155) اس میں ناقۃ کی اضافت اور نسبت الله تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس بنا پر کہ خلق (مخلوق) کی نسبت خالق کی طرف ہے۔ اور اس میں تشریف اور تخصیص کا معنی پایا جاتا ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ یعنی تم پر نہ اس کا رزق (خوراک) ہے اور نہ اس کی کوئی مشقت اور بوجھ۔

**وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝**

''اور یاد کرو جب الله تعالیٰ نے بنایا تمہیں جانشین عاد کے بعد اور ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں تم بناتے ہو اس کے میدانی علاقوں میں عالی شان محل اور تراشتے ہو، پہاڑوں میں مکانات، سو یاد کرو الله تعالیٰ کی نعمتوں کو اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ اس میں کلام محذوف ہے، اصل عبارت ہے وبوّأکم فی الأرض منازل (اوراس نے تمہیں زمین میں گھروں کا ٹھکانا دیا) تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا یعنی تم ہر جگہ عالیشان محل بناتے ہو۔ وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا انہوں نے پہاڑوں میں اپنی طویل اور لمبی عمروں کے لیے مکانات بنائے، کیونکہ چھت اور بنیادیں ان کی عمریں ختم ہونے سے پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حسن نے حا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے اور اس میں حروف حلقیہ میں سے ایک ہے، پس اسی لیے یہ باب فعل یفعل کے وزن پر آیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جنہوں نے عالی شان اور بلند و بالا محلات بنانے کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے، الله تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف:32) (آپ فرمائیے: کس نے حرام کیا الله کی زینت کو جو پیدا کیا اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے گھر تعمیر کیا اور اس پر مال کثیر خرچ کیا، جب اس کا ذکر حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ کوئی آدمی ایسا مکان بنائے جو اس کے لیے نفع بخش ہو۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا أنعم الله علی عبد أحب أن یری أثر النعمة علیه (1) (جب الله تعالیٰ کسی بندے پر احسان و انعام فرمائے تو پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اس نعمت و احسان کا اثر دکھائی دے) اور نعمت و احسان کے آثار میں سے خوبصورت مکان اور اچھا لباس ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اگر کوئی مال کثیر کے عوض حسین و جمیل کنیز خریدے تو اس کے لیے جائز ہے، حالانکہ اس سے کمتر بھی اس کے لیے کافی ہو سکتی ہے، تو یہ مکان اور محل بھی اسی طرح ہیں۔ لیکن بعض دوسروں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ ان میں امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے استدلال کیا ہے: إذا أراد الله بعبد شرا أهلك ماله فی الطین واللبن (جب الله تعالیٰ کسی بندے کے بارے شر کا ارادہ فرمائے تو وہ اپنا مال مٹی اور اینٹوں میں ضائع کر دیتا ہے) اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بنی فوق ما یکفیه جاء به یوم القیامة یحمله علی عنقه (2) (جس نے اپنی حاجت اور ضرورت سے زیادہ عمارت بنائی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے بارے اسی طرح میں کہتا ہوں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وما أنفق المؤمن من نفقة فإن خلفها علی الله عزوجل إلا ما کان فی بنیان أو معصیة (3) (بندہ مومن جو مال بھی خرچ کرے تو اس کی جگہ اور عطا فرمانا الله تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہوتا ہے سوائے اس کے جو عمارت یا معصیت (برائی) میں خرچ ہو) اسے حضرت جابر

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیئذان والادب، جلد 2، صفحہ 105۔ ایضاً، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مجمع الزوائد، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 121، حدیث نمبر 6281　3۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 28

بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے اسے نقل کیا ہے۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: لیس لابن آدم حق فی سوی ھذہ الخصال بیت یسکنہ و ثوب یواری عورتہ و جِلف الخبز والماء، اخرجہ الترمذی (1) (آدمی کا ان چیزوں کے سوا میں کوئی حق نہیں گھر جو اسے رہائش کے کافی ہو، کپڑا جو اس کے لیے ستر عورت کا کام دے، خشک روٹی اور پانی) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار بھی منعم علیہم ہیں۔ اس کے بارے بحث سورہ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ سورۃ البقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ اس میں العثی اور العثو دو لغتیں ہیں۔ اور اعمش نے تا کے کسرہ کے ساتھ تِعثوا پڑھا ہے انہوں نے اسے عثی یعثی سے لیا ہے نہ کہ عثا یعثو سے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

"کہا ان سرداروں نے جو تکبر کیا کرتے تھے ان کی قوم سے ان لوگوں کو جنہیں وہ کمزور و ذلیل سمجھتے تھے جو ان میں سے ایمان لائے تھے کیا تم یقین رکھتے ہو کہ صالح رسول ہے اپنے رب کی طرف سے۔ انہوں نے کہا: بے شک ہم اس پر جسے دے کر انہیں بھیجا گیا ہے ایمان لانے والے ہیں۔ کہنے لگے وہ لوگ جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو اس چیز کے جس پر تم ایمان لائے ہو منکر ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اس میں دوسرا پہلے سے بدل ہے، کیونکہ وہ مستضعفین (جنہیں وہ کمزور سمجھتے تھے) مومنین ہی تھے اور یہ بدل بعض من الکل ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝

"پس انہوں نے کونچیں کاٹ ڈالیں اس اونٹنی کی اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے اور کہا: اے صالح! لے آؤ ہم پر اس (عذاب) کو جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اگر تم اللہ کے رسولوں سے ہو۔ پھر آلیا انہیں زلزلہ کے جھٹکوں نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ تو (صالح) نے منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور (بصد حسرت) کہا: اے میری قوم! بے شک پہنچا دیا میں نے تم کو پیغام اپنے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57

رب کا اور میں نے خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم تو پسند ہی نہیں کرتے (اپنے) خیر خواہوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَعَقَرُوا النَّاقَةَ، العقر کا معنی ہے زخمی کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عضو کو کاٹ دینا جو اس کی جان میں اثر انداز ہو۔ اور عقرتُ الفرس تب کہا جاتا ہے جب تو تلوار کے ساتھ اس کے پاؤں پر ضرب لگائے۔ وہ خیل عقری ہے۔ اور عقرت ظہر الدابۃ جب تو جانور کی پشت کو زخمی کر دے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

تقولُ وقدْ مالَ الغَبِيطُ بِنا معاً   عَقَرْتَ بعِيرى يا امرأ القيس فانْزِلِ

یعنی تو نے میرے اونٹ کو زخمی کر دیا۔

قشیری نے کہا ہے: عقر سے مراد اونٹ کی کونچ کو کھولنا یعنی کاٹنا ہے۔ پھر نحر کو عقر کہا گیا ہے، کیونکہ عقر اکثر نحر (جان سے مار دینا) کا سبب بن جاتا ہے۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ان میں صحیح ترین وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور آپ ﷺ نے ناقہ کا ذکر بھی کیا اور اس کا بھی جس نے اس کی کونچیں کاٹی تھیں۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تب ان میں سے سب سے بد بخت انسان اٹھا ناقہ کی طرف وہ آدمی اٹھا جو اپنے گروہ میں غالب، انتہائی خبیث اور شریر اور سب سے زیادہ طاقتور تھا جیسے ابو زمعہ ہے" (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اس کے نام کے بارے کہا گیا ہے کہ قدار بن سالف ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی حکمرانی ایک عورت کے پاس تھی جسے ملکی کہا جاتا تھا، جب لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف مائل ہونے لگے تو اس کے دل میں آپ کے بارے حسد کی آگ بھڑک اٹھی، تو اس نے دو عورتوں کو بلا کر کہا۔ ان دونوں کے دو دوست تھے جو ان سے عشق کرتے تھے کہ تم دونوں ان کی بات تسلیم نہ کرو اور ان سے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بارے مطالبہ کرو، تو ان دونوں عورتوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ دونوں مرد نکلے اور انہوں نے اونٹنی کو ایک تنگ جگہ میں بند کر دیا اور ان میں سے ایک نے اسے تیر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ اور اس ناقہ کا بچہ سقب اس چٹان کی طرف آیا جس سے وہ نکلی تھی اور تین دفعہ ڈکارا (یعنی اپنی آواز نکالی) وہ چٹان پھٹ گئی اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔

کہا جاتا ہے: یہ وہی دابۃ (جانور) ہے جو آخری زمانہ میں لوگوں پر ظاہر ہوگا۔ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: جن لوگوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹی تھیں ان میں سے چار افراد نے سقب کا پیچھا کیا، ان میں سے ایک مصدع اور ایک اس کا بھائی ذؤاب تھا۔ تو مصدع نے اسے تیر مارا اور وہ اس کے دل میں پیوست ہو گیا پھر اسے ٹانگ سے کھینچ لیا اور اسے اپنی ماں کے ساتھ ملا دیا (یعنی مار ڈالا) اور انہوں نے اسے اس (ناقہ) کے ساتھ کھایا (2)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا: بلاشبہ تمہاری عمر سے تین دن باقی ہیں، اسی وجہ سے وہ تین بار ڈکارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ناقہ کی کونچیں کاٹنے والے نے ہی اسے مارا اور اس کے ساتھ آٹھ آدمی تھے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ (النمل: 48) (اور اس شہر میں نو شخص تھے) اس کا بیان سورۃ النمل

1۔ صحیح مسلم، الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا، جلد 2، صفحہ 383   2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 501

میں آئے گا۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا معنی ہے۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ (القمر) (پس ثمودیوں نے بلایا اپنے ایک ساتھی (قدار) کو پس اس نے وار کیا اور (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں)

وہ شراب پی رہے تھے تو پانی ان کے لیے کم ہو گیا کہ وہ اسے اپنی شراب میں ملا سکیں اور وہ ناقہ کے دودھ کا دن تھا، پس ان میں سے ایک اٹھا اور لوگوں کی نگرانی کرنے لگا اور اس نے کہا: میں ضرور اس سے لوگوں کو راحت پہنچاؤں گا۔ تو اس نے اسے مار ڈالا۔

قولہ تعالیٰ: وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے تکبر کیا۔ عَتَا یَعْتُو عُتُوًّا کا معنی ہے تکبر کرنا، سرکشی کرنا۔ اور جب کوئی اطاعت اور پیروی نہ کرے تو کہا جاتا ہے: تَعَتَّى فلان اور الليل العاتی کا معنی ہے: سخت تاریک رات۔ خلیل نے یہی معنی بیان کیا ہے۔

وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اور انہوں نے کہا: اے صالح! لے آ وہ عذاب جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پس شدید زلزلے نے انہیں آلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ شدید چیخ تھی جس نے ان کے دلوں کو کاٹ دیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ثمود کے قصہ میں ہے۔ قصہ ثمود میں ہے کہ پھر چیخ نے انہیں آلیا۔

کہا جاتا ہے: رَجَفَ الشئ يَرْجُفُ رَجْفًا رَجَفَانًا (کسی شی کا کانپنا، لرزہ براندام ہونا) اور أرجفتِ الريحُ الشجرَ کا معنی ہے: ہوا نے درخت کو حرکت دی، ہلا دیا۔ اور اس میں اصل وہ حرکت ہے جس کے ساتھ آواز بھی ہو۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿۶﴾ (النازعات)

شاعر کا قول بھی ہے:

ولما رأيت الحج قد آنَ وَقتُه وظلت مطايا القوم بالقوم تَرْجُفُ

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ پس وہ اپنے گھروں میں ہو گئے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں لفظ دار جنس کے طور پر واحد لایا گیا ہے، حالانکہ یہ فی دورھم کے معنی میں ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا ہے: فِيْ دِيَارِهِمْ (ہود: 94) یعنی اپنے گھروں میں جٰثِمِيْنَ یعنی اپنے گھٹنوں اور مونہوں کے بل زمین کے ساتھ چپکنے والے (گرنے والے) جیسا کہ پرندہ چپک جاتا ہے، یعنی وہ عذاب کی شدت سے مر گئے۔ جثوم کا اصل لفظ خرگوش اور اس کی مثل جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چپکنے کی جگہ کو مجثم کہا جاتا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

بها العِينُ والآرامُ يَمْشِين خِلْفَة وأطلاؤها يَنْهَضْنَ مِنْ كل مَجْثَمِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بجلی کی وہ کڑک کے ساتھ جل گئے اور ان تمام نے سوائے ایک آدمی کے صبح مردہ حالت میں کی وہ آدمی اللہ تعالیٰ کے حرم میں موجود تھا، پس جب وہ حرم پاک سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی آفت آئی جو اس کی قوم پر آئی (1)۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ پس آپ نے ان سے مایوس ہو کر ان سے چہرہ پھیر لیا۔

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ قول ان کی موت سے

1۔ سنن ابی داود، کتاب الخراج والامارۃ والفئ الخ، حدیث نمبر 2684، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہلے کہا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی موت کے بعد آپ نے یہ کہا ہو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقتولین بدر کو یہ کہا: هل وجدتم ما وعد ربكم حقا (1) (کیا تم نے اسے سچا پالیا ہے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کیا آپ ان مردوں سے گفتگو فرما رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أنتم بأسمع منهم ولكنهم لا يقدرون على الجواب (2) (تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے) اس میں پہلا احتمال زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ اور اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ یعنی تم نے میری نصیحت قبول نہیں کی۔

## وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب انہوں نے کہا اپنی قوم سے کہ کیا تم کیا کرتے ہو ایسی بے حیائی (کا فعل) جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا ساری دنیا میں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ امام فراء نے کہا ہے: لوط ان کے اس قول سے مشتق ہے: هذا أليطُ بقلبي، اى ألصق یعنی یہ میرے دل کے ساتھ چمٹ گیا۔ نحاس نے کہا ہے: زجاج نے کہا ہے: بعض نحویوں یعنی فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ جائز ہے کہ لوط لطت الحوض سے مشتق ہو اور یہ تب کہا جاتا ہے جب تو حوض کو مٹی کے ساتھ لیپ کرے۔ فرمایا: یہ غلط ہے کیونکہ عجمی اسماء مشتق نہیں ہوتے جیسے اسحاق وغیرہ، پس یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ سحق بمعنی بعد سے ہے۔ لوط کا لفظ خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں اور درمیان والا حرف ساکن ہے۔

نقاش نے کہا ہے: لوط عجمی اسماء میں سے ہے عربی میں سے نہیں ہے۔ اور رہا اس کا لطت الحوض اور هذا اليط بقلبي تو یہ صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود اسم عجمی ہے جیسا کہ ابراہیم اور اسحاق وغیرہ۔ سیبویہ نے کہا ہے: نوح اور لوط عجمی اسماء ہیں، مگر خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت کی طرف بھیجا جس کا نام سدوم تھا، اور آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور اس کے آخر میں نصب یا تو سابقہ اَرْسَلْنَا کی وجہ سے ہے اور یہ اس پر معطوف ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اور اس سے پہلے اذكر فعل محذوف ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ اس میں فاحشہ سے مراد مذکروں کے ساتھ فعل بد کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فاحشہ کے لفظ کے ساتھ کیا ہے تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ یہ زنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (الاسراء: 32) (تم زنا کے قریب نہ جاؤ بلاشبہ یہ بے حیائی ہے)

علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے جو اس پر واجب ہوگا جس نے اس فعل بد کا ارتکاب کیا اس کے بعد کہ اس کے حرام ہونے پر تمام کا اجماع ہے۔ پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اسے رجم (سنگسار) کیا جائے گا (3) چاہے محصن ہو یا غیر محصن (غیر شادی شدہ)۔ اور اسی طرح اسے بھی رجم کیا جائے گا جس کے ساتھ یہ فعل کیا گیا بشرطیکہ وہ بالغ ہو۔ اور آپ سے

1۔ صحیح مسلم، الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 387 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786

یہ بھی مروی ہے: اسے رجم کیا جائے گا اگر وہ محصن ہو اور اگر غیر محصن ہو تو اسے قید کیا جائے گا اور تادیبی سزا دی جائے گی۔ یہی مذہب حضرات عطا، ابراہیم نخعی اور ابن مسیب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ نے کہا ہے: محصن اور غیر محصن دونوں کو تعزیر لگائی جائے گی (1)۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زنا پر قیاس کرتے ہوئے اسے حد زنا لگائی جائے گی (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ؈ (الحجر) (اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر) پس یہ ان کے لیے سزا اور ان کے فعل کا بدلہ ہے۔

اور اگر کہا جائے: اس میں دو وجہوں سے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، ایک تو یہ کہ قوم لوط کو دیگر تمام امتوں کی طرح کفر اور تکذیب پر سزا دی گئی اور دوسری یہ کہ ان کے صغیر اور بڑے سب ہی اس میں داخل ہیں۔ پس یہ باب الحدود سے اس کے خارج ہونے پر دلیل ہے۔ تو کہا جائے گا: جہاں تک پہلی وجہ ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے معاصی کا ارتکاب کیا پس ان کے بدلے اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا۔ ان معاصی میں سے یہ بھی ہے۔ اور رہی دوسری وجہ تو ان میں سے کچھ یہ فعل کرنے والے تھے اور ان میں سے کچھ راضی تھے، تو جمہور کے اس پر سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے تمام کو سزا دی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اپنے بندوں کے بارے میں سنت ہے۔ اور فاعلین پر سزا کا امر مسلسل باقی رہے گا۔ واللہ اعلم

ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور دارقطنی نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو'' (3)۔ یہ لفظ ابوداؤد اور ابن ماجہ کے ہیں۔

اور ترمذی میں ہے ''وہ دونوں محصن ہوں یا محصن نہ ہوں'' (4)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے غیر شادی شدہ جوان کے بارے روایت کیا ہے جو عمل لواطت کی حالت میں پایا جائے۔ آپ نے فرمایا: اسے رجم کیا جائے گا (5)۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو جلا دیا اس کا نام فجاءہ تھا، اس نے قوم لوط کا عمل کیا تھا اور یہی رائے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تھی، کیونکہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اس کے بارے لکھا تو آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا اور اس بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بلا شبہ یہ ایسا گناہ ہے جو سابقہ امتوں میں سے سوائے ایک امت کے کسی نے نہیں کیا اور اس کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے (بطور سزا معاملہ) کیا اس کے بارے تم جانتے ہو، میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اسی پر متفق ہوئی کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ نتیجۃً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف اسے آگ کے ساتھ جلا دینے کا حکم بھیجا تو انہوں نے اسے جلا دیا۔ پھر ایسے لوگوں کو ابن زبیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786    2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3869، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 176۔ ایضاً، حدیث نمبر 2550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں جلایا۔ پھر ہشام بن ولید نے انہیں جلانے کی سزا دی۔ پھر خالد قشیری نے عراق میں انہیں جلایا۔

روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں سات افراد لواطت کے جرم میں پکڑے گئے۔ تو آپ نے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو آپ نے ان میں سے چار کو شادی شدہ پایا تو آپ نے ان کے بارے حکم صادر کیا پس انہیں حرم سے باہر نکال کر رجم کر دیا گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے اور تین کو حد جاری کر دی اور آپ کے پاس حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم تھے لیکن ان دونوں نے اس حکم پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور یہی موقف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ حضرت ابن عربی نے کہا ہے: وہ موقف جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے وہ حق کے زیادہ قریب ہے اور وہ سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور اعتماد کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔ اور جہاں تک احناف کا قول ہے تو انہوں نے کہا: زنا کی سزا تو معلوم ہے، تو یہ گناہ جب اس کے سوا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس کی حد میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اور وہ اس بارے میں اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ من وضع حدًّا فی غیر حدٍّ فقد تعدّی و ظلم (جس نے غیر حد کی جگہ حد لگائی تو اس نے زیادتی اور ظلم کیا) اور یہ بھی کہ اس نے ایسی فرج میں وطی کی ہے جس کے ساتھ نہ حلت کا تعلق ہے اور نہ ہی احصان کا، نہ مہر واجب ہوتا ہے اور نہ ہی نسب ثابت ہوتا ہے، پس اس کے ساتھ حد کا کوئی تعلق نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اگر کسی نے چوپائے کے ساتھ بدکاری کی تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ نہ اس آدمی کو قتل کیا جائے گا اور نہ ہی چوپائے کو۔ اور یہ قول بھی ہے: دونوں کو مار ڈالا جائے گا۔ اسے ابن منذر نے ابو سلمہ بن عبد الرحمن سے بیان کیا ہے۔ اور اس باب میں ایک اور حدیث ہے جسے ابو داؤد اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی جانور کے ساتھ بدکاری کی تو تم اسے قتل کر دو اور اس کے ساتھ اس چوپائے کو بھی قتل کر دو'' (2)۔ تو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اس جانور کی حالت (اور حکم) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اس کے بارے جو رائے رکھتا ہوں وہ کہہ دیا، مگر یہ مکروہ ہے کہ جس جانور کے ساتھ یہ عمل کیا گیا ہے اس کا گوشت کھایا جائے (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: اگر یہ حدیث ثابت ہے تو پھر اس کے مطابق قول کرنا واجب ہے اور اگر ثابت نہیں تو پھر چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کثرت سے استغفار کرے جس نے اس طرح کا فعل کیا اور اگر حاکم اسے تعزیر لگائے تو یہ اچھا اور حسن ہے۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چوپائے کا قتل اس لیے ہے تاکہ وہ کسی بدشکل شے کو جنم نہ دے۔ پس اس کا قتل اس معنی کے لیے مصلحت ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ سنت سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم

ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جس نے کسی چوپائے سے بدکاری کی اس پر حد نہیں ہے۔ ابو داؤد نے کہا ہے: اسی طرح حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور حکم نے کہا ہے: میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے کوڑے لگائے جائیں، لیکن وہ حد کی مقدار کو نہ پہنچیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ زانی کے قائم مقام ہی ہے (4)۔ اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 787　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب فیمن اتی بھیمۃ، حدیث نمبر 3871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، حدیث نمبر 3872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زہری نے کہا ہے: اسے سو کوڑے مارے جائیں گے چاہے وہ محصن ہو یا محصن نہ ہو۔ امام مالک، ثوری، احمد رحمۃ اللہ علیہم اور اصحاب رائے نے کہا ہے: اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ یہ حضرت عطا، نخعی اور حکم رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس سے مختلف ہے۔ اور یہ اس باب میں آپ کے مذہب کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جابر بن زید نے کہا ہے: اس پر حد قائم کی جائے گی، مگر چوپایہ اس کا ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اس میں مِنْ استغراق جنس کے لیے ہے، یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے پہلے کسی امت میں کوئی لواطت کرنے والا نہ تھا اور ملحد گمان کرتے ہیں کہ وہ ان سے پہلے بھی تھے۔ لیکن سچ وہی ہے جو قرآن کریم میں آیا ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ ابلیس ان کے عمل کی اصل تھا اس طرح کہ اس نے انہیں اپنی طرف بلایا اللہ اس پر لعنت کرے۔ پس وہ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے نکاح کر دیتا تھا۔ حسن نے کہا ہے: وہ یہ عمل غرباء (اجنبیوں) سے کرتے تھے (1)، آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ جس کے بارے میں اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ قوم لوط کا عمل ہے'' (2)۔ اور حضرت محمد بن سیرین نے کہا ہے: جانوروں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی نہیں ہے جو قوم لوط کے عمل کی مثل عمل کرتا ہو۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝۸۱

''بے شک تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ تو حد سے گزرنے والے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمْ حضرت نافع اور حفص نے خبر کی بنا پر اسے ایک ہمزہ مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مذکور فاحشہ کی تفسیر ہے، پس اس پر حرف استفہام داخل کرنا اچھا نہیں، کیونکہ یہ اپنے مابعد کو اپنے ماقبل سے قطع کر دیتا ہے۔ لیکن باقیوں نے استفہام کی بنا پر اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ استفہام توبیخ (جھڑک) کے معنی میں ہے اور یہ حسین ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اور مابعد مستقل کلام ہے۔ ابو عبید اور کسائی وغیرہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝۳۴ (الانبیاء) اس میں أفھم نہیں فرمایا۔ اور مزید فرمایا: اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران: 144) اس میں أانقلبتم نہیں فرمایا۔

اور یہ انتہائی قبیح غلطی ہے، کیونکہ ان دونوں نے دو چیزوں کو ایسی چیز کے ساتھ مشابہت دی ہے جس کے ساتھ وہ مشابہت نہیں رکھتیں، کیونکہ شرط اور جزا دونوں ایک شے کے قائم مقام ہیں جیسا کہ مبتدا اور خبر۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ ان دونوں میں استفہام ہو۔ پس یہ کہنا جائز نہیں: أفإن مت أفھم جیسے یہ کہنا جائز نہیں أزید أمنطلق۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں دو جملے ہیں، پس آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ ان میں سے ہر ایک کے بارے سوال کریں (یعنی ہر ایک کے

1۔ تفسیر بصری، جلد 3، صفحہ 103　　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187۔ ایضاً، حدیث نمبر 2552، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ حرف استفہام لگائیں) یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے اور اسے نحاس اور مکی وغیرہما نے اختیار کیا ہے۔ شهوة یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، ای تشتهونهم شهوته (یعنی تم ان سے شہوت پرستی کرتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں مصدر ہو۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾ (الشعراء) اس برائی کے سبب تم شرک کی طرف جمع ہونے میں حد سے بڑھنے والے ہو۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ‌ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ‌ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۸۳﴾

''اور نہ تھا کوئی جواب ان کی قوم کے پاس سوائے اس کے کہ وہ بولے: باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ پس ہم نے نجات دے دی لوط کو اور ان کے گھر والوں کو بجز ان کی بیوی کے، وہ ہوگئی پیچھے رہ جانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ یعنی حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی اتباع کرنے والوں کو بستی سے باہر نکال دو۔ اور يَّتَطَهَّرُوۡنَ کا معنی ہے یہ لوگ تو اس قسم کا کام کرنے سے بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تطهر الرجل یعنی وہ گناہ سے پاک رہا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! انہوں نے انہیں بغیر عیب کے عیب لگا دیا ہے(1)۔ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں باقی رہنے والے ہیں۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: غَبَرَ الشئ تب کہا جاتا ہے جب کوئی شے گزر جائے (ختم ہو جائے) اور جب کوئی شے باقی رہے تب بھی غبر کہا جاتا ہے۔ پس یہ الفاظ اضداد میں سے ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: گزرنے والے کے لیے عابرین کے ساتھ اور باقی رہنے والے کے لیے غابرین کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسے ابن فارس نے ''المجمل'' میں بیان کیا ہے۔ اور زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ یعنی وہ نجات سے غائب ہونے والوں میں سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عمر کے طویل ہونے کے سبب پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ اس طرف جاتے ہیں کہ اس کا معنی من المعمرين ہے یعنی وہ بوڑھی ہوگئی۔ اور لغت میں اکثر یہ ہے کہ غابر باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

فما وَنَى محمدٌ مذْ أنْ غَفَرْ له الإلهُ مامضى وما غَبَرْ

اس میں غبر باقی رہنے والا کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۸۴﴾

''اور برسایا ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ تو دیکھو کیسا (عبرتناک) انجام ہوا مجرموں کا''۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کے وقت نکلے جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 425

(ہود:81) پھر حضرت جبریل امین علیہ السلام کو حکم دیا گیا تو انہوں نے اپنا پر ان بستیوں کے نیچے داخل کیا اور ان تمام کو نیچے سے اکھیڑ ڈالا اور انہیں اوپر اٹھالیا یہاں تک کہ اہل آسمان نے مرغوں کی پکار اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، پھر ان کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا (یعنی الٹا کر کے زمین پر دے مارا) اور ان پر کنکر کی پتھریاں برسائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر جو ان میں سے غائب تھا۔ اور آپ نے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو پالیا، آپ کے پاس ایک پتھر تھا پس اسے قتل کر دیا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار بستیاں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ پانچ تھیں۔ اور ان میں چار لاکھ افراد تھے۔ اس کا بیان سورۃ ہود میں حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر، بے شک آگئی تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے تو پورا کرو ناپ اور تول کو اور نہ گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ فساد برپا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور مت بیٹھا کرو راستوں پر کہ ڈرا رہے ہو تم (راہ گیروں کو) اور روک رہے ہو تم اللہ کی راہ سے جو ایمان لایا اللہ کے ساتھ اور تلاش کرتے ہو اس میں عیب اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھو! کیا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا۔ اور اگر ایک گروہ تم میں سے ایمان لا چکا ہے اس کے ساتھ جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہ لایا تو (ذرا) صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ ہمارے درمیان اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِلٰى مَدْيَنَ مدین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بلد اور قطر کا نام ہے(1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے جیسے بکر اور تمیم قبیلوں کے نام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی اولاد میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426

سے تھے۔ پس جن کی رائے ہے کہ مدین آدمی کا نام ہے ان کے نزدیک یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں معرفہ اور عجمہ پائے جاتے ہیں۔ اور جن کی رائے ہے کہ یہ قبیلہ یا زمین کا نام ہے تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ اسے منصرف قرار نہ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ روایت ہے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا بیٹا تھا۔ اور مکی نے کہا ہے: وہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا خاوند تھا (1)۔ اور اس کے نسب میں اختلاف ہے۔

حضرت عطا اور ابن اسحاق وغیرہما نے کہا ہے: شعیب هو ابن میکیل بن یشجرا بن مدین بن ابراهیم علیه السلام سریانی زبان میں ان کا نام بیروت تھا اور ان کی ماں میکائیل بنت لوط تھی (2)۔ اور شرقی بن قطامی نے یہ گمان کیا ہے کہ شعیب بن عیفاء بن یوبب بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام نسب ہے۔ اور ابن سمعان کا خیال ہے کہ شعیب بن جزی بن یشجر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم نسب ہے۔ اور شعیبٌ شَعْب یا شِعْب کی تصغیر ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ شعیب بن یوبب ہے اور یہ قول بھی ہے: شعیب بن صفوان بن عیفاء بن ثابت بن مدین بن ابراہیم نسب ہے۔ واللہ اعلم

آپ نابینا تھے، اسی لیے آپ کی قوم نے کہا: وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا (ہود: 91) (اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے) اور آپ کو اپنی قوم کی طرف حسن مراجعت کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔ اور آپ کی قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والی اور ناپ تول میں کمی کرنے والی تھی (3)۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بیان آ گیا اور اس سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کا رسول بن کر تشریف لانا ہے۔ اور آپ کے کسی معجزہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس بارے میں آپ کا معجزہ امام کسائی نے قصص الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ، البخس کا معنی ہے کمی کرنا، گھٹا کر دینا اور یہ سامان تجارت میں عیب لگانے اور اس میں رغبت کم ہونے کے سبب ہوتی ہے یا قیمت میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے سبب اور ماپ میں زیادتی اور کمی کرنے کا حیلہ کرنے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ سب مال کو باطل طریقے سے کھانا ہے، سابقہ اور گزشتہ تمام امتوں میں تمام رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی زبانوں سے اس سے منع کیا گیا ہے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس کا عطف وَ لَا تَبْخَسُوْا پر ہے یہ لفظ چھوٹے اور بڑے ہر فساد کو شامل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے حضرت شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث فرمانے سے پہلے اس زمین میں معاصی اور گناہوں کے اعمال کیے جا رہے تھے، محارم کو حلال سمجھا جا رہا تھا اور اس میں خون بہایا جا رہا تھا۔ فرمایا: پس یہی اس کا فساد ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو زمین کی اصلاح ہو گئی۔ اور ہر نبی جسے اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اس نے ان کی اصلاح کی، (اور فساد کو جڑ سے اکھیڑنے کی سرتوڑ کوشش فرمائی)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 507　　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ اللہ تعالیٰ نے انہیں راستوں پر بیٹھنے سے اور اس راستے کو بند کرنے سے منع فرمایا ہے جو راستہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف لے جانے والا ہے۔ وہ اس آدمی کو عذاب اور اذیت سے ڈراتے دھمکاتے تھے جو ایمان لے آتا۔ علماء نے راستوں پر بیٹھنے کے معنی میں اختلاف کیا ہے اور تین معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانے والے راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور جو بھی آپ کے پاس آنے کی کوشش اور ارادہ کرتا وہ اس کو خوفزدہ کرتے تھے اور روکتے تھے اور یہ کہتے تھے: وہ تو کذاب ہے تو اس کی طرف مت جا، جیسا کہ قریش مکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کرتے تھے (1)۔ یہی آیت کا ظاہر معنی ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ڈاکہ ڈالنے اور مال چھیننے سے نہی ہے (2)۔ اور یہ فعل ان کے افعال میں سے تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے شب معراج راستے میں ایک لکڑی دیکھی جو کپڑا بھی اس کے پاس سے گزرتا وہ اسے پھاڑ دیتی اور اس نے ہر شی کو پھاڑ دیا، تو میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟، تو انہوں نے کہا: یہ آپ کی امت میں سے اس گروہ کی مثال ہے جو راستے پر بیٹھتے ہیں اور ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ الآیہ (3) اور چوروں اور حملہ آوروں کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے: وہ دسواں حصہ (عشر) وصول کرتے تھے (4)۔ اور آج کے دور میں ان کی مثل وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے وہ مال قہر و جبر کے ساتھ وصول کرتے ہیں جو ان پر وظائف مالیہ میں سے شرعاً لازم ہوتا ہے۔ اور اس مال کا ضامن بنا دیتے ہیں جس کی ضمانت اصلاً جائز ہوتی ہے مثلاً زکوٰۃ، مال میراث اور ملاہی وغیرہ (کھیل کود کا سامان وغیرہ) اور وہ مختلف راستوں پر ڈیرہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا وجود کثرت سے ہے اور تمام شہروں میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اور یہ عظیم کبیرہ اور فحش ترین گناہوں میں سے ہے، کیونکہ یہ ظلم، غصب اور لوگوں پر بے جا زیادتی ہے اور یہ منکر کو پھیلانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اس پر دوام اختیار کرنا اور اسے مزید پختہ کرنا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریعت اور قضاء کے حکم کو اپنے ذمے میں شامل کرنا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اسلام میں سے سوائے رسم کے کچھ باقی نہ رہا اور دین میں سے سوائے نام کے کچھ نہیں رہا۔ اس تاویل کے لیے وہ نہی باعث تقویت ہے جو اس سے قبل مال کے ناپ تول اور اس میں کمی کرنے کے بارے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَنْ اٰمَنَ بِهٖ اس میں بہ کی ضمیر یہ احتمال بھی رکھتی ہے کہ اسم جلالت کی طرف لوٹ رہی ہو اور یہ بھی کہ شعیب کی طرف لوٹ رہی ہو۔ یہ ان کے قول کے مطابق ہے جن کی رائے یہ ہے کہ مراد راستہ بند کرنے کے لیے راستے پر بیٹھنا ہے اور یہ بھی کہ وہ السبیل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عِوَجًا ابو عبید اور زجاج نے کہا ہے: یہ معانی میں عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور اجرام میں عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ یعنی اس نے تمہاری تعداد بڑھا دی یا فقر و افلاس کے بعد دولت و ثروت کے ساتھ تمہیں بڑھا دیا، یعنی تم فقراء تھے تو اس نے تمہیں دولت مند بنا دیا۔ فَاصْبِرُوْا یہ کفر پر قائم رہنے کا امر نہیں

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 427  2۔ ایضاً  3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 280  4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 508

ہے بلکہ یہ وعید اور جھڑک ہے۔ اور فرمایا: وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ معنی کے اعتبار سے كَانَ مذکور ہے اگرچہ لفظ کا تقاضا تو یہ ہے کہ کانت ہوتا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾

”کہنے لگے وہ سردار جو غرور و تکبر کیا کرتے تھے ان (شعیب) کی قوم سے یا تو ہم نکال کر رہیں گے تمہیں اے شعیب! اور جو ایمان لائے تمہارے ساتھ اپنی بستی سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں، شعیب نے کہا: اگرچہ ہم اس (ارتداد) کو ناپسند بھی کرتے ہوں۔ پھر تو ہم نے ضرور بہتان باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اگر ہم لوٹ آئیں تمہارے دین میں اس کے بعد کہ جب نجات دے دی ہمیں اللہ نے اس سے اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ جو پروردگار ہے ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے، صرف اللہ پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، اے ہمارے رب! فیصلہ فرما دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے“۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا کا معنی ہے تم لوٹ آؤ گے ہماری ملت کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے متبعین آپ کے ساتھ ایمان لانے سے پہلے کفر پر تھے، یعنی تم ضرور ہماری طرف لوٹ آؤ گے جیسے تم پہلے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ عود بمعنی ابتدا ہو۔ کہا جاتا ہے: عاد إلى من فلان مكروه یعنی فلاں سے میری طرف آنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، اگرچہ اس سے پہلے اس کا آنا مکروہ نہیں، یعنی وہ اس سے میرے ساتھ مل گیا۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ یعنی اگر ہم ناپسند کریں تو تم ہمیں وطن سے نکلنے پر یا اپنی ملت کی طرف لوٹنے پر مجبور کرو گے، یعنی اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے بہت بڑا کام کر لیا۔

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا یہ ان کی ملت کی طرف لوٹنے سے مایوسی اور ناامیدی کا اظہار ہے۔ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یعنی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اس کی طرف لوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے (1)۔ فرمایا: یہ اہل السنت کا قول ہے۔ یعنی وما یقع

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 509

منا العود إلى الکفر إلّا أن یشاء الله ذالك (ہم سے کفر کی طرف لوٹنے کا وقوع نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے چاہے) پس یہ استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں استثنا اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنے کی جہت پر ہے جیسے یہ کہا: وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ (ہود: 88) اور اس پر دلیل اس کا مابعد وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: لا أكلمك حتى يبيض الغراب، وحتى يلج الجمل في سم الخياط (میں تیرے ساتھ کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ کوا سفید ہو جائے اور یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے) اور کوا کبھی سفید نہ ہوگا اور اونٹ سوئی کے ناکے میں کبھی داخل نہ ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ہمارا رب ما کان اور ما یکون کے علم کو گھیرے ہوئے ہے۔ عِلْمًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم بستی میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ تم نے ہمارے پڑوس کو ناپسند کیا ہے، بلکہ ہم تمہارے گاؤں سے کسی اور کی طرف ہجرت کر کے نکل جائیں گے۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ ہمیں اس کی طرف لوٹا دے۔ اور اس معنی میں بُعد ہے، کیونکہ عاد للقریۃ کہا جاتا ہے، عاد فی القریۃ نہیں کہا جاتا۔

قولہ تعالیٰ: عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ کئی مقام پر یہ پہلے گزر چکا ہے۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو امتوں کی طرف بھیجا ایک اہل مدین، اور دوسرے اصحاب الایکۃ (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے۔ پس جب طویل وقت گزر گیا آپ کی قوم اپنے کفر اور اپنی گمراہی میں سرکش ہوگئی اور آپ ان کی اصلاح سے مایوس ہو گئے تو ان کے لیے بددعا کی اور کہا: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور انہیں زلزلہ کے ساتھ ہلاک اور تباہ کر دیا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝٩٠
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝٩١ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ
يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝٩٢ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ
يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝٩٣

''اور کہا ان رئیسوں نے جو کافر تھے ان کی قوم سے کہ اگر تم پیروی کرنے لگو شعیب کی تو یقیناً تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ پھر پکڑ لیا انہیں زلزلہ نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ جن (بدبختوں) نے جھٹلایا شعیب کو (وہ یوں نابود کر دیئے گئے) گویا کبھی بستے ہی نہ تھے ان مکانوں میں۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو ہو گئے وہی نقصان اٹھانے والے۔ تو منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور کہا: اے میری

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 511

قوم! بے شک میں نے پہنچا دیئے تھے تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں نے نصیحت کی تھی تمہیں۔ تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم (کے ہولناک انجام) پر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ یعنی انہوں نے اپنے سے کمتر اور کمزور لوگوں کو کہا: لَىٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرنے لگے تو یقیناً تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ رجفہ کا معنی چیخ (کرخت آواز) ہے اور اصحاب الایکۃ شدید بادل کے سبب ہلاک کیے گئے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا جرجانی نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ نیا کلام ہے۔ یعنی جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہ اس طرح ہو گئے گویا وہ ہمیشہ سے مردہ تھے۔ اور یَغْنَوْا بمعنی یقیموا (مقیم ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: غَنِیتُ بالمکان جب تو کسی مکان میں مقیم ہو۔ اور غَنَی القومُ فی دارھم یعنی ان کا اپنے گھروں میں قیام طویل عرصہ سے ہے اور مغنی بمعنی منزل (گھر) ہے اور اس کی جمع مغانی ہے۔ عبید نے کہا ہے:

و غَنِیتُ سبْتًا قبلَ مَجْرَی دَاحِسٍ ۔۔۔ لو کان للنفس اللَّجُوجِ خُلود

اور حاتم طیٔ نے کہا:

غنِینا زمانا بالتَّصَعْلُك والغِنَی ۔۔۔ کما الدَّهرُ فی أیامه العسرُ والیسرُ (1)

کسبنا صُروفَ الدَّهْرِ لِینًا وغِلظة ۔۔۔ وکلًّا سقاناه بکأسِهما الدهرُ

فما زادنا بَغْیًا علی ذِی قرابة ۔۔۔ غِنَانَا ولا أَزْرَی بأحسابنا الفقْرُ

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ یہ ابتدائے خطاب ہے۔ اور یہ ذم و توبیخ میں مبالغہ ہے اور امر کی تعظیم و تفخیم کا اعادہ ہے۔ جب انہوں نے کہا: جس کسی نے حضرت شعیب علیہ السلام کی اتباع اور پیروی کی وہ خسارے میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خسارے اور نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم کے ہولناک انجام پر۔ أسیت علی الشیء (میں نے فلاں پر اظہار غم کیا) آسی (أسیَ) (غم کرنا) وأنا آسٍ (اور میں غم کرنے والا ہوں)

**وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾**

"اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر یہ کہ (جب نبی جھٹلایا گیا) تو ہم نے مبتلا کر دیا وہاں کے باشندوں کو سختی اور تکلیف میں تا کہ وہ گڑگڑانے لگیں پھر ہم نے بدل دی تکلیف کی جگہ راحت حتیٰ کہ وہ پھلے پھولے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 430

کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت، تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اور اس کا انہیں خواب و خیال بھی نہ تھا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اس میں اضمار ہے اور وہ ہے فکذب أهلها إلا أخذناهم (اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی اس کے رہنے والوں نے تکذیب کی) مگر ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا)۔ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ یعنی پھر ہم نے ان کی تکلیف اور خشک سالی کو خوشحالی اور راحت کے ساتھ بدل دیا۔ حَتّٰى عَفَوْا یہاں تک کہ وہ کثیر اور وافر ہو گئے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے مال و منال اور اولاد بڑھ گئی (2)۔ اور عفا کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ عفا کا معنی بڑھنا اور کثیر ہونا ہے۔ اور عفا کا معنی مٹ جانا اور ختم ہو جانا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ اس نے انہیں شدت و تکلیف اور راحت و خوشحالی میں مبتلا کیا پس نہ انہوں نے روکا اور منع کیا اور نہ ہی شکر ادا کیا۔ وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ (اور کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت) اور ہم بھی انہیں کی مثل ہیں۔ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا تاکہ یہ ان کے لیے بہت زیادہ باعث حسرت ہو جائے۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۹۶

''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی لیکن انہوں نے جھٹلایا (ہمارے رسولوں کو) تو پکڑ لیا ہم نے انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى مدینہ (شہر) کو قریہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں یہ قریت الماء سے ماخوذ ہے، یہ تب کہا جاتا ہے جب تو پانی جمع کرے۔ یہ مکمل طور پر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اٰمَنُوْا یعنی اگر بستیوں والے تصدیق کرتے۔ وَ اتَّقَوْا اور وہ شرک سے بچتے۔ لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ یعنی بارش اور نباتات (اناج وغیرہ) انہیں عطا فرماتے۔ اور یہ ان اقوام میں خاص طور پر ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ جب کبھی مومنین کو زندگی کی تنگی اور تلخیوں کے ساتھ آزمایا جاتا ہے تو وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی ہے جب کہ آپ نے اپنی قوم کو فرمایا: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ (نوح) (معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ برسائے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش)

اور حضرت ہود علیہ السلام کے بارے ہے: ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا (ہود: 52) (پھر (دل و

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 242 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 513

جان سے ) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش ) پس اللہ تعالیٰ نے ان سے خاص طور پر بارش اور شادابی کا وعدہ فرمایا۔ اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور مومنین نے ان کی تصدیق کی اور تکذیب نہ کی۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾

"تو کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اس حال میں کہ وہ سو رہے ہوں یا کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب چاشت کے وقت جب کہ وہ کھیل کود رہے ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى یہ استفہام برائے انکار ہے۔ اور فا عاطفہ ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ (المائدہ:50) (تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں؟)

قریٰ سے مراد مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح کی بستیاں ہیں، کیونکہ انہوں نے ہی حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ عام ہے اور تمام بستیوں کو شامل ہے۔ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا یعنی ان پر ہمارا عذاب آ جائے۔ بَيَاتًا رات کے وقت۔

وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ (درآنحالیکہ وہ سو رہے ہوں) اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا حرمیان اور ابن عامر نے واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ أو عاطفہ ہے اور اباحت کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿٢٤﴾ (دہر) (اور نہ کہنا مانیے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا)۔ جالس الحسن او ابن سیرین (تو حسن یا ابن سیرین کی مجالست اختیار کر (یعنی ان دو میں سے ہر ایک کے ساتھ بیٹھنا مباح ہے) اور آیت میں معنی یہ ہے: یا وہ سزاؤں کی ان قسموں سے بے خوف اور امن میں ہو گئے ہیں، یعنی اگر تم ایک قسم سے بے خوف ہو چکے ہو تو دوسری سے بے خوف اور پر امن نہ ہو۔ اور او کا دو چیزوں میں سے ایک کے لیے ہونا جائز ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: ضربتُ زیدًا أو عمرًا (میں نے زید کو مارا یا عمر کو) اور باقیوں نے واؤ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے بعد ہے۔ اسے واؤ عطف قرار دیا ہے جس پر الف استفہام داخل ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا (البقرہ:100) (کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا)

اور ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ کا معنی ہے: اور وہ اس حالت میں ہوں جو انہیں کوئی نفع نہ دے سکے۔ ہر وہ آدمی جو ایسے کام میں لگا ہو جو اس کے لیے نقصان دہ تو ہو لیکن نفع بخش نہ ہو اسے لاعب کہا جاتا ہے اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور "الصحاح" میں ہے اللَّعِبُ معروف ہے اور اللِّعْبُ اس کی مثل ہے اور لَعِبَ يَلْعَبُ اور تَلَعَّبَ (لَعِبَ) کے بعد دیگرے کھیل کود میں مصروف رہنا اور رجل تِلْعَابَة بہت زیادہ کھیل کود میں مصروف رہنے والا آدمی۔ اور التلعاب فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ مصدر ہے اور

جاریۃ لعوبٌ (بہت زیادہ کھیلنے والی لڑکی)

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

"تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ہیں الله کی خفیہ تدبیر سے پس نہیں بے خوف ہوتے الله کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ یعنی کیا وہ اپنے مکر و فریب پر الله تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے مکر سے مراد اس کی خفیہ تدبیر ہے جو اس نے نعمت و صحت عطا کرنے کی صورت میں اپنا رکھی ہے۔

اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"کیا یہ (حقیقت) واضح نہ ہوئی ان لوگوں پر جو وارث بنے زمین کے اس کے اصلی مالکوں (کی تباہی) کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو سزا دیں انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اور مہر لگا دیں ان کے دلوں پر تاکہ وہ کچھ سن ہی نہ سکیں"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَلَمْ یَهْدِ کیا یہ واضح اور ظاہر نہیں ہوا؟ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مراد کفار مکہ اور ان کے اردگرد رہنے والے لوگ ہیں۔ اَصَبْنٰهُمْ یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں پکڑ لیں۔ بِذُنُوْبِهِمْ ان کے کفر اور ان کے جھٹلانے کے سبب۔ وَنَطْبَعُ، ای ونحن نطبع امور ھم مہر لگا دیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أصبنا پر معطوف ہے، یعنی نُصیبهم ونطبع (ہم انہیں سزا دیں اور مہر لگا دیں) تو اس میں ماضی مستقبل کے محل میں واقع ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

"یہ بستیاں ہیں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی کچھ خبریں اور بے شک آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ اور نہ ہوا یہ کہ ایمان لاتے اس پر جس کو جھٹلا چکے تھے اس سے پہلے اسی طرح مہر لگا دیتا ہے الله تعالیٰ کافروں کے دلوں پر"۔

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الْقُرٰى یعنی یہ وہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک اور تباہ و برباد کیا۔ اور وہ حضرت نوح، عاد، حضرت لوط، حضرت ہود اور حضرت شعیب علیہم السلام کی بستیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ نَقُصُّ ہم بیان کرتے ہیں۔ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا آپ سے ان کی کچھ خبریں۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے باعث تسلی و اطمینان ہے۔

فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا یعنی ایسا نہیں کہ وہ کفار اپنے ہلاک ہونے کے بعد ایمان لائیں اگر ہم انہیں زندہ کر دیں (1)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا (انعام: 28) (اور اگر انہیں واپس بھیجا جائے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 515

(جیسے ان کی خواہش ہے) تو پھر وہ بھی وہی کریں) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ربیع نے کہا ہے: اس دن سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جس دن اس نے میثاق لیا کہ وہ رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے (1)۔ بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ مراد یوم میثاق ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تو وہ مجبوراً ایمان لائے نہ کہ رضامندی کے ساتھ۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس دن وہ مجبوراً ایمان لائے جس دن اللہ تعالیٰ نے ان سے میثاق لیا پس یہ نہیں ہو سکتا کہ اب وہ حقیقتاً ایمان لائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے معجزات کا سوال کیا، پس جب انہوں نے معجزات دیکھ لیے تو پھر ایسا نہ ہوا کہ وہ اس پر ایمان لاتے جسے وہ معجزہ دیکھنے سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 110) (جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ کافروں کے دلوں پر مہر لگائی اسی طرح وہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا جو حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اور نہ پایا ہم نے ان کی اکثریت کو وعدہ کا پابند اور ضرور پایا ان میں سے بہتوں کو حکم عدولی کرنے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ اس میں من زائدہ ہے اور یہ معنی جنس پر دلالت کرتا ہے اور اگر من نہ ہوتا تو پھر یہ وہم جائز ہوتا کہ یہ معنوی اعتبار سے واحد ہے۔ (یعنی صرف ایک وعدہ مراد ہوتا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ان سے اس وقت لیا گیا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا گیا تھا اور جس نے عہد توڑ دیا اس کے لیے کہا گیا ہے اس کا کوئی عہد نہیں یعنی گویا اس نے وعدہ کیا ہی نہیں۔ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا (2) ہے: اس وعدہ سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان سے لیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ کفار منقسم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں نہ امانت ہے اور نہ ایفائے عہد ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے کفر کے باوجود امانتدار بھی ہیں اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے انکار کر دیا ان کا، سو دیکھو کیسا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے بھیجا حضرت نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے بعد۔ مُّوْسٰى حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو۔ بِاٰيٰتِنَآ اپنے معجزات اور نشانیوں کے ساتھ۔ فَظَلَمُوْا بِهَا تو انہوں نے انکار کر دیا اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 181
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 106

انہوں نے ان نشانیوں کی تصدیق نہ کی۔ اور آیت میں ظلم کا معنی ہے: وضعُ الشیٔ فی غیر موضعہ (کسی شی کو وہاں رکھنا جو اس کا محل نہ ہو ظلم کہلاتا ہے)

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ سو دیکھو فساد برپا کرنے والوں کے معاملے کا انجام کیسا ہوا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

''اور کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے: اے فرعون! بلاشبہ میں رسول ہوں پروردگار عالم کا۔ واجب ہے مجھ پر کہ میں نہ کہوں اللہ پر سوائے سچی بات کے، میں آیا ہوں تمہارے پاس روشن دلیل لے کر تمہارے رب کی طرف سے پس بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ فرعون نے کہا: اگر تم لائے ہو کوئی نشانی تو پیش کرو اسے اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔ تو ڈال دیا موسیٰ نے اپنا عصا تو فوراً وہ صاف اژدہا بن گیا۔ اور نکالا اپنا ہاتھ (گریبان سے) تو فوراً وہ سفید (روشن) ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے۔ کہنے لگے قوم فرعون کے رئیس: واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے ملک سے، تو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ بولے: مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو اور بھیجو شہروں میں ہرکارے، تاکہ وہ لے آئیں تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو''۔

حَقِيْقٌ عَلٰى یعنی مجھ پر واجب ہے۔ اور جنہوں نے علی اَن لا پڑھا ہے تو معنی یہ ہوگا حریص علی ألا أقول (وہ اس پر حریص ہے کہ میں نہ کہوں) اور حضرت عبداللہ کی قراءت میں حقیق ألا أقول ہے یعنی اس میں علی موجود نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ علی بمعنی با ہے (1)، یعنی حقیق بألا أقول اور اسی طرح حضرت ابی اور اعمش کی قراءت میں بألا أقول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: رمیتُ بالقوس وعلی القوس۔ پس اس بنا پر حقیق بمعنی محقوق (ثابت شدہ) ہوگا۔ اور فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ کا معنی ہے تو انہیں چھوڑ دے۔ (کیونکہ) وہ انہیں انتہائی مشقت آمیز کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ۔ اسے اجسام اور معانی دونوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور الثعبان سے مراد اژدہا (بہت بڑا سانپ) ہے اور یہی تمام سانپوں سے بڑا اور شدید ہوتا ہے۔

مُّبِيْنٌ یعنی ایسا سانپ جس میں کوئی التباس اور ابہام نہ تھا۔ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ اور آپ نے اپنا دست مبارک نکالا اور اسے ظاہر

1۔ زادالمسیر، جلد 2، صفحہ 182

کیا۔ کہا گیا ہے کہ اپنے گریبان سے یا اپنے پہلو سے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (النمل:12) یعنی بغیر برص (کی بیماری) کے وہ سفید اور روشن نکلے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت زیادہ گندمی رنگ کے تھے، پھر آپ نے اپنا ہاتھ دوبارہ اپنے گریبان میں داخل کیا تو وہ اپنی پہلی رنگت کی طرف واپس لوٹ آیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: آپ کے ہاتھ میں اتنا نور اور چمک تھی کہ اس کے ساتھ زمین و آسمان کے مابین ہر شی روشن ہوگئی اور چمکنے لگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کا ہاتھ اتنا سفید نکلتا تھا جیسے برف ظاہر ہوتی ہے اور جب آپ اسے واپس لوٹاتے تو وہ سارے بدن کی رنگت پر واپس لوٹ آتا۔ اور عَلِیْمٌ کا معنی ہے سحر اور جادو جاننے والا۔ مِّنْ اَرْضِكُمْ یعنی تمہارے ملک سے اے قبطیوں کے گروہ، کیونکہ اسے تم پر بنی اسرائیل مقدم ہیں۔

فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ یعنی فرعون نے کہا: اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان رئیسوں کا قول ہے (1)۔ یعنی انہوں نے اکیلے فرعون کو کہا: فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ جیسے جابر حکمرانوں اور رؤساء کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ما ترون فی کذا (تم اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہو)۔ اور یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ قول فرعون اور اس کے ساتھیوں کو کہا ہو۔ اس میں ما محل رفع میں ہے۔ اس بنا پر کہ ذا بمعنی الذی ہو اور اگر ذا اور ما ایک ہی شی ہوں تو پھر ما محل نصب میں ہوگا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ اہل مدینہ، عاصم اور کسائی نے بغیر ہمزہ کے قراءت کی ہے۔ مگر ورش اور کسائی نے ہا کے کسرہ میں اشباع کیا ہے۔ اور ابو عمرو نے ہمزہ کو ساکن اور ہا کو مضموم پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: أرجأته و أرجيته یعنی میں نے اسے مہلت دی۔ اسی طرح ابن کثیر، ابن محیصن اور ہشام نے بھی پڑھا ہے، مگر انہوں نے ہا کے ضمہ میں اشباع کیا ہے۔ اور تمام اہل کوفہ نے ارجہ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فراء نے کہا ہے: یہ عرب کی لغت ہے وہ وصل کلام میں ہا کنایہ پر وقف کرتے ہیں جب کہ اس کا ماقبل متحرک ہو، اسی طرح هذه طلحة قد أقبلت ہے۔ لیکن بصریوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اَرْجِهْ کا معنی ہے تم اسے روک دو (2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اسے مہلت دو (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَرْجِهْ یہ رجا یرجو سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسے لالچ دو اور اسے امید دلا کر چھوڑ دو۔ اسے نحاس نے محمد بن زید سے بیان کیا ہے اور ہا کا کسرہ ماقبل کی اتباع میں ہے اور اصل کی بنا پر اسے ضمہ دینا جائز ہے اور اسے سکون دینا غلطی ہے یہ جائز نہیں مگر شعر میں بطور شاذ ہو سکتا ہے۔ وَ اَخَاهُ اس کا عطف ہا پر ہے۔ حٰشِرِیْنَ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یَاْتُوْكَ یہ حالت جزم میں ہے، کیونکہ یہ جواب امر ہے اسی لیے اس کے آخر سے نون اعرابی محذوف ہے۔ سوائے حضرت عاصم کے تمام اہل کوفہ نے بِكُلِّ سَحّٰرٍ قراءت کی ہے۔ اور باقی تمام لوگوں نے ساحر پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں باہم متقارب ہیں مگر فعال (سحار) میں مبالغہ زیادہ ہے۔

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 518　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 245　3۔ ایضاً

اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اور آ گئے جادوگر فرعون کے پاس، جادوگروں نے کہا: یقیناً (آج تو) ہمیں بڑا انعام ملنا چاہیے اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آ جائیں۔ فرعون نے کہا: بے شک اور (اس کے علاوہ) تم خاصان بارگاہ سے ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ اس میں بھیجنے کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ سامع کو اس کا علم ہے۔ ابن عبدالحکم نے کہا ہے: وہ بارہ نقیب تھے، ہر نقیب کے ساتھ بیس عریف تھے اور ہر عریف کے ماتحت ایک ہزار جادوگر تھے۔ اور مقاتل بن سلیمان کے قول کے مطابق ان کا سردار شمعون تھا۔ ابن جریج نے بیان کیا ہے: وہ نو سو افراد تھے(1) جو عریش، فیوم اور اسکندریہ سے تین تین سو تعلق رکھتے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے: وہ پندرہ ہزار جادوگر تھے(2)، اور وہب سے مروی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بارہ ہزار تھے(3)۔ ابن المنکدر نے اسی ہزار کہا ہے(4)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چودہ ہزار تھے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے: تین سو ہزار جادوگر ریف سے تعلق رکھتے تھے، تین سو ہزار جادوگر صعید سے تھے، اور تین سو ہزار جادوگر فیوم اور اس کے گرد ونوح سے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ستر آدمی تھے اور تہتر کا قول بھی بیان کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اور روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ رسیاں اور عصا تھے جو تین سو اونٹوں پر لدے ہوئے تھے پس وہ اژدہا ان تمام کو نگل گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب اس نے منہ کھولا تو اس کا جبڑا اسی ذراع ہو گیا وہ اپنے نیچے والے جبڑے کو زمین پر رکھے ہوئے تھا اور اوپر والے جبڑے کو محل کی فصیل پر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے منہ کی وسعت چالیس ذراع تھی۔ واللہ اعلم

پس اس نے فرعون کو نگلنے کا قصد کیا، تو وہ اپنے تخت سے اچھلا اور بھاگ نکلا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہنے لگا، پس جب آپ نے اسے پکڑا تو وہ پہلے کی طرح عصا تھا۔ حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس عصا کے خوف سے پندرہ ہزار افراد فوت ہوئے۔ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی انعام اور مال ہوگا۔ اس میں فقالوا فاکے ساتھ نہیں کہا، کیونکہ مراد یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: لما جاء وا قالوا اور خبر کی بنا پر اسے اِنَّ لنا بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ حضرت نافع اور ابن کثیر کی قراءت ہے (یعنی) انہوں نے فرعون پر لازم قرار دیا کہ وہ ان کے لیے مال مقرر کرے اگر وہ غالب آ جائیں، تو فرعون نے انہیں کہا: قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی بے شک (اس کے علاوہ) تم ہمارے نزدیک بلند رتبہ لوگوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پس اس نے ان کے لیے اس سے زیادہ کا اقرار کیا جس کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک انہوں نے اس سے اپنے لیے اپنے فیصلے کے بارے یقین حاصل کیا اگر وہ غالب آ گئے، یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے اجر واجب اور ضروری ہوگا اگر ہم غالب آ گئے۔ باقیوں نے استخبار کی جہت پر استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے فرعون سے اطلاع حاصل کی کیا وہ انہیں کوئی اجر دے گا اگر وہ غالب آ گئے یا نہیں تو پس انہیں اس بارے فرعون پر یقین نہ تھا، تو انہوں نے اس سے پوچھ لیا کیا وہ ایسا کرے گا؟ تو اس نے انہیں کہا ''جی ہاں'' تمہارے لیے اجر بھی ہو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 438　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

گا اور قرب بھی بشرطیکہ تم غالب آجاؤ۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم (پہلے) ڈالو ورنہ ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم ہی ڈالو پس جب انہوں نے ڈالا تو جادو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور خوفزدہ کر دیا انہیں اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا۔ اور ہم نے وحی کی موسیٰ کو کہ ڈال دیجیے اپنا عصا تو فوراً وہ نگلنے لگا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا''۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ادب سے پیش آئے تو یہی ان کے ایمان کا سبب بن گیا اور أن کسائی اور فراء کے نزدیک محل نصب میں ہے، معنی یہ ہے إما أن تفعل الإلقاء (یا آپ ڈالیں) اور اسی کی مثل شاعر کا یہ قول بھی ہے:

قالوا الرّكوب فقلنا تلك عادتنا

قَالَ اَلْقُوْا فراء نے کہا ہے: کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا بلاشبہ تم ہرگز اپنے رب پر غالب نہیں آسکو گے اور تم ہرگز اس کی آیات اور نشانیوں کو باطل نہیں کر سکو گے۔ اور یہ قرآن کریم کے اس معجزہ میں سے ہے کہ اس کی مثل لوگوں کا کلام نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اس پر قادر ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے تھوڑے الفاظ بہت زیادہ معانی کو متضمن ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تہدید اور ڈراوا ہے، یعنی تم پہلے ڈالو، پس تم اس ذلت اور رسوائی کو دیکھ لو گے جو تم پر طاری ہوگی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ انہیں جادو کا حکم دیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ حکم اس لیے دیا تاکہ ان کا جھوٹ اور ان کی ملمع سازی ظاہر ہو جائے گی۔ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا پس جب انہوں نے رسیاں اور عصا ڈالے۔ سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ یعنی انہوں نے انہیں وہم میں ڈال دیا اور آنکھوں کو صحیح ادراک کرنے سے بدل دیا، ایسی شے کے ساتھ جس سے ایسی ملمع سازی کا وہم دلایا جاتا ہے جو شعوذہ اور خفۃ الید کے قائم مقام ہوتی ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور عظیم کا معنی ہے وہ ان کے نزدیک بڑا تھا، کیونکہ وہ کثیر تھا لیکن وہ فی الحقیقت بڑا نہ تھا۔ ابن زید نے کہا(1) ہے: اجتماع اسکندریہ میں تھا اور سانپ کی دم بحیرہ کے پر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اژدہا نے منہ کھولا اور وہ انہیں نگلنے لگا جو رسیاں اور عصا انہوں نے ڈالے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو رسیاں انہوں نے ڈالی تھیں وہ چمڑے کی تھیں اور ان میں پارہ بھرا ہوا تھا پس انہوں نے حرکت کی اور وہ کہنے لگے یہ سانپ ہیں۔ حفص نے تَلْقَفُ لام کے سکون اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے لَقِفَ يَلْقَفُ کا مضارع بنایا ہے۔ نحاس

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 521

نے کہا ہے: اس قراءت پر تِلَقَّفُ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ لَقِفَ سے ہے۔ اور باقیوں نے تشدید اور لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اسے تَلَقَّف کا مضارع بنایا ہے اور یہ (اصل میں) تَتَلَقَّفُ ہے۔ کہا جاتا ہے: لَقِفت الشئ وتلقفته جب تو کسی شے کو پکڑ لے یا اسے نگل لے۔ تَلَقَّف اور تَلَقَّم اور تَلَهَّم تمام کا ایک معنی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: مجھے بعض قراءتوں میں تَلَقَّمَ میم اور تشدید کے ساتھ کی خبر پہنچی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أنت عصا موسی التی لم تزلْ تَلَقَّمُ ما یأفِكه الساحرُ(1)

اور تَلَقَّفُ بھی روایت کیا جاتا ہے۔ مَا يَأْفِكُوْنَ یعنی اسے جوان کا جھوٹ تھا، کیونکہ وہ رسیاں لے کر آئے اور انہوں نے ان میں پارہ بھر دیا یہاں تک کہ وہ حرکت کرنے لگیں۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

”تو ثابت ہو گیا حق اور باطل ہو گیا جو (جادو) وہ کیا کرتے تھے وہ یوں فرعونی مغلوب ہو گئے وہاں (بھرے مجمع میں) اور پلٹے ذلیل وخوار ہو کر۔ اور گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے (اور) کہنے لگے: ہم تو ایمان لے آئے سارے جہانوں کے پروردگار پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا“۔

قولہ تعالیٰ: فَوَقَعَ الْحَقُّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تو حق غالب آگیا(2)۔ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور اس سے فعل صَغِرَ یَصْغَرُ صَغَرًا وصِغَرًا وصَغارًا ہے۔ یعنی فرعون کی قوم اور ان کے ساتھ فرعون بھی ذلیل وخوار اور مغلوب ہو کر واپس پلٹے اور رہے جادوگر تو وہ ایمان لے آئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

”فرعون نے کہا: تم تو ایمان لائے ہوئے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں (اس کے مقابلہ کی) تمہیں اجازت دیتا، بے شک یہ ایک فریب ہے جو تم نے (مل کر) کیا ہے شہر میں تاکہ تم نکال دو یہاں سے اس کے اصلی باشندوں کو ابھی (اس کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں (پہلے) کٹوا دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مختلف طرفوں سے پھر تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا سب کے سب کو۔ وہ بولے: (پرواہ نہیں) ہم تو اپنے رب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 246 2۔ ایضاً

کی طرف جانے والے ہیں۔ اور تو کیا ناپسند کرتا ہے ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے رب کی آیتوں پر جب وہ آئیں ہمارے پاس، اے ہمارے رب! انڈیل دے ہم پر صبر اور وفات دے ہمیں اس حال میں کہ ہم مسلمان ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ یہ فرعون کی طرف سے ان کا انکار ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا یعنی تمہارے اور ان کے درمیان اس بارے میں اتفاق ہو چکا ہے کہ تم شہر کے والی اور حاکم بن جاؤ۔ یعنی تمہارے اس صحراء میں ظاہر ہونے سے پہلے یہ مصر کے شہر میں تم میں سے تھا۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ ان کے لیے دھمکی اور جھڑک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: سب سے پہلے فرعون نے سولی دی اور ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹے (1) (یعنی) دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ (یا) دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یہ حسن سے مروی ہے۔

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا حسن نے قاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی تَنْقَمُ) اخفش نے کہا ہے: یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: نَقِمت الأمر و نَقَمته یعنی میں نے اس کا انکار کر دیا۔ (آیت میں مراد یہ ہے) کہ تو ہماری کسی شے کو ناپسند نہیں کرتا سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئے اور وہ حق ہے۔ لَمَّا جَآءَتْنَا جب اس کی آیات اور اس کے دلائل ہمارے پاس آگئے۔ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا اس میں الافراغ کا معنی ہوتا ہے انڈیلنا، یعنی اے ہمارے رب! سولی پر چڑھائے جانے اور ہاتھ پاؤں کاٹے جانے کے وقت ہم پر صبر انڈیل دے۔ وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ (اور ہمیں اس حال میں وفات دے کہ ہم مسلمان ہوں) پس کہا گیا ہے کہ فرعون نے جادوگروں کو پکڑا اور دریا کے کنارے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے۔ اور جادوگروں کے ایمان لانے کے وقت چھ لاکھ افراد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۸﴾

"اور کہا قوم فرعون کے سرداروں نے: (اے فرعون!) کیا تو (یونہی) چھوڑے رکھے گا موسیٰ اور اس کی قوم کو تا کہ فساد برپا کرتے رہیں اس ملک میں اور چھوڑے رہے موسیٰ تجھے اور تیرے خداؤں کو۔ اس نے (برافروختہ ہو کر) کہا: (ہرگز نہیں بلکہ) ہم تہ تیغ کر دیں گے ان کے لڑکوں کو اور زندہ چھوڑ دیں گے ان کی عورتوں کو۔ اور ہم بے شک ان پر غالب ہیں۔ فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 440

استقامت سے کام لو۔ بلا شبہ زمین اللہ ہی کی ہے وارث بناتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے (مخصوص) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی تاکہ وہ افتراق پیدا کر کے اور معاملات کو بکھیر کر (زمین میں فساد برپا کرتے رہیں)۔ وَيَذَرَكَ اس میں را منصوب ہے اور یہ جواب استفہام ہے اور واؤ فا کے قائم مقام ہے۔ وَ اٰلِهَتَكَ حسن نے کہا ہے: فرعون بتوں کی عبادت کرتا تھا، پس وہ خود عبادت کرتا تھا اور اس کی عبادت کی جاتی تھی۔

سلیمان تیمی نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ فرعون گائے کی پوجا کرتا تھا۔ تیمی نے کہا ہے: میں نے حسن سے پوچھا کیا فرعون کسی شے کی عبادت کرتا تھا؟ تو انہوں نے کہا: ہاں، بلا شبہ وہ ایک شے کی عبادت کرتا تھا اور وہ اسے اپنی گردن میں ڈال لیتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ اٰلِهَتَكَ کا معنی ہے وطاعتک (اور وہ چھوڑ دے تجھے اور تیری اطاعت و پیروی کو) جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر)

بلا شبہ انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی بلکہ انہوں نے ان کی اطاعت کی۔ تو یہ تمثیل ہوگئی۔ اور نعیم بن میسرہ نے رفع کے ساتھ ویذرُك پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے وهو يَذَرُك۔ اور اشہب عقیلی نے وَيَذْرك مجزوم پڑھا ہے اور يذرك میں ضمہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کی گئی ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رفع اور نون کے ساتھ وَنَذَرُك پڑھا ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ اس کی عبادت چھوڑ دیں گے اگر اس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ چھوڑا۔

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے والاهتك پڑھا ہے اور اس کا معنی عبادتك (تیری عبادت) ہے۔ اس قراءت کے مطابق اس کی عبادت کی جاتی تھی اور وہ کسی کی عبادت نہ کرتا تھا(1)، یعنی اور وہ تیرے لیے اپنی عبادت چھوڑ دے۔ ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس قراءت والوں کا مذہب یہ ہے کہ فرعون نے جب کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (النازعات) اور مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص: 38) تو اس میں اس کے لیے کسی اور رب اور الٰہ ہونے کی نفی ہے۔ تو اسے کہا گیا: ويذرك والإهتك اس کا معنی ہے وہ تجھے اور تیرے لیے لوگوں کی عبادت کو چھوڑ دے گا۔ اور عام قراءت وَاٰلِهَتَكَ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ اس معنی پر مبنی ہے کہ فرعون نے اپنے ظاہری حکم میں ربوبیت کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ خود جانتا تھا کہ وہ مربوب ہے اور اس کی دلیل حمام (موت) کی حاضری کے وقت اس کا یہ قول ہے اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ (یونس: 90) (میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل)

لیکن اس کا یہ قول قبول نہ کیا گیا، کیونکہ اس نے یہ اقرار توبہ کا دروازہ بند ہونے کے بعد کیا۔ اور اس حال سے پہلے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 441

الہٰ تھا جس کی وہ خفیہ عبادت کرتا تھا اور رب العالمین جل وعزا کے سوا تھا۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں الفاظ یہ ہیں۔ اتذر موسی وقومہ لیفسدوا فی الارض وقد ترکوك ان یعبدوك اور یہ بھی کہا ہے کہ الفاظ والا ھتك ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ گائے کی پرستش کرتا تھا، جب اس نے گائے کو حسین اور خوبصورت دیکھا تو اس نے اس کی عبادت کا حکم دے دیا اور کہا: انا ربکم و رب ھذہ (میں تمہارا اور اس کا رب ہوں) اور اسی لیے کہا: فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا (طٰہٰ:88) (پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کے چھوٹے چھوٹے بت تھے اس کی قوم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کی پرستش کرتی تھی تو اسی کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔ اور اسی لیے اس نے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات) اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: فرعون کا قول: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور شی کی عبادت کرتے تھے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت کے مطابق بالالاھۃ سے مراد وہ گائے ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے مراد سورج لیا ہے اور وہ اس کی عبادت کرتے تھے (1)۔ شاعر نے کہا ہے:

واَعْجَلْنَا الإلاهةَ اَنْ تَؤُبَا

پھر اس نے اپنی قوم کے ساتھ اظہار انس کیا اور کہا: سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ نافع اور ابن کثیر نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لیے تشدید کے ساتھ سنقتل پڑھا ہے۔

وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (اور ہم ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیں گے) لہٰذا تم ان کی جانب سے خوفزدہ نہ ہو۔ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (اور بے شک ہم ان پر غالب ہیں) اس کلام کے ساتھ اس نے انہیں حوصلہ اور تسلی دی۔ اور اس نے یہ نہیں کہا سنقتل موسٰی (کہ ہم موسیٰ کو قتل کر دیں گے) کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سخت مرعوب تھا، پس جب بھی وہ آپ کو دیکھتا تو وہ اس طرح پیشاب کرنے لگتا جیسے گدھا پیشاب کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تک فرعون کی یہ بات پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ یعنی آپ نے انہیں یہ حرص اور امید دلائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں سرزمین مصر کا وارث بنائے گا۔ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ یعنی جنت اس کے لیے ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور عاقبۃ کل شی سے مراد ہر شے کا انجام اور آخر ہوتا ہے، لیکن جب یہ لفظ مطلق بولا جائے اور کہا جائے: العاقبۃ لفلان تو اس سے عرف میں خیر اور اچھائی سمجھی جاتی ہے۔ (یعنی خیر اور اچھائی فلاں کے لیے ہے)

قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 524

''قوم موسیٰ نے کہا: ہم تو ستائے گئے اس سے پہلے بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس اور اس کے بعد بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس، آپ نے کہا: عنقریب تمہارا رب ہلاک کر دے گا تمہارے دشمن کو اور (ان کا) جانشین بنا دے گا تمہیں زمین میں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْۤا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: ہم تو آپ کی ولادت کی ابتدا میں بیٹوں کو قتل اور عورتوں کو غلامی میں رکھنے کے ساتھ ستائے گئے۔ وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اور اب اسے ہم پر لوٹایا جا رہا ہے، ان کی مراد وہ دھمکی اور وعید ہے جو فرعون کی جانب سے تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے کی اذیت سے مراد یہ ہے(1) کہ وہ نصف دن تک بنی اسرائیل کو اپنے کاموں میں لگائے رکھتے تھے اور پھر بقیہ دن انہیں اپنی کمائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اور بعد کی اذیت یہ تھی کہ وہ سارا دن بغیر کچھ کھلائے پلائے انہیں اپنے کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ یہ جویبر نے کہا ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے: پہلے اور بعد کی اذیت ایک ہی تھی اور وہ ان سے جزیہ لیتا تھا۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ، عَسٰى اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بمعنی واجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نیا وعدہ کیا اور اسے ثابت کر دیا۔ تحقیق وہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں مصر میں خلیفہ بنائے گئے۔ اور انہوں نے یوشع بن نون کے ساتھ بیت المقدس کو فتح کیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے یہ اس وقت کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں نکالا اور فرعون نے ان کا تعاقب کیا پس وہ ان کے پیچھے تھا اور ان کے سامنے سمندر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس وعید کو پورا کر دیا کہ فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا اور انہیں نجات عطا فرما دی۔ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔ یعنی پھر وہ اس عمل کو دیکھے گا جس کے بدلے جزا واجب ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزا نہیں دے گا جو وہ ان کے بارے جانتا ہے، بلکہ اس پر جزا دے گا جو ان سے وقوع پذیر ہوگا۔

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی سے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ سنین سے مراد قحط سالی ہے اور لغت میں یہ معنی معروف ہے۔ کہا جاتا ہے: أصابتهم سَنَة، أي جَدْب (انہیں قحط سالی آ پہنچی) اور تقدیر ہے جَدْبُ سنة اور حدیث مبارکہ میں ہے: اللّٰهُمَّ اجعلها عليهم سنِين كسِني يوسف (2) (اے اللہ! ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے قحط کی طرح قحط مسلط کر دے) عربوں میں سے کچھ ہیں جو سنین کے نون کو اعراب دیتے ہیں۔ فراء نے شعر بیان کیا ہے:

أرَى مَرّ السنينِ أخذْنَ مِنّي ... كما أخذَ السِّرار من الهلال

نحاس نے کہا ہے: سیبویہ نے یہ شعر نون کے فتحہ کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن اس بارے میں وہ کہا ہے جو کسی اور کے نزدیک جائز نہیں ہے اور وہ یہ قول ہے:

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 188		2۔ صحیح بخاری، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136

وقد جَاوَزْتُ رأسَ الأربَعينِ (یعنی اس اربعین کی نون کو کسرہ دیا ہے)

فراء نے بنی عامر سے بیان کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: أقمتُ عندہ سِنِينًا یا ھذا، اس میں سنین منصرف ہے۔ اور بنو تمیم اسے غیر منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: مضت لہ سنینُ یاھذا اور سنین سنۃ کی جمع ہے اور یہاں سنۃ بمعنی قحط سالی ہے بمعنی حول (سال) نہیں۔ اور اسی سے أسْنَتَ القوم ہے یعنی وہ قحط میں مبتلا ہو گئے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيدَ لقومه ورجالُ مكةَ مُسْنِتُونَ عِجافُ

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور ان کے دل نرم ہو جائیں۔

**فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾**

''تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور تو) کہتے ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے، سن لو! ان کی بدفالی تو (مکافات عمل کے قانون کے مطابق) اللہ کے پاس سے ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ یعنی جب ان پر خوشحالی اور وسعت آئی۔ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ یعنی ہم اس کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیں عطا کی گئی ہے۔ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ اور اگر انہیں قحط اور کوئی بیماری آ پہنچتی۔ اور یہی دوسرا مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدفالی پکڑتے (1)، اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ (النساء: 78)

یَّطَّیَّرُوْا اصل میں یتطیروا ہے پھر تا کو طا میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے فعل ماضی کی بنا پر تطیروا پڑھا ہے۔ اس میں اصل تو الطیرۃ اور زجر الطیر (پرندے کو جھڑکنا) سے ہے۔ پھر ان کا استعمال زیادہ ہو یا یہاں تک کہ ہر بدفالی کو تطیر کہا گیا۔ عرب سانح سے برکت حاصل کرتے تھے اور سانح سے مراد وہ ہے جو دائیں طرف سے آتا ہے اور وہ بارح سے بدفالی پکڑتے تھے اور اس سے مراد وہ ہے جو بائیں طرف سے آتا ہے (2)۔ وہ کوے کی آواز سے بھی بدفالی پکڑتے تھے۔ اور وہ اس سے جدائی اور افتراق کی تاویل کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے اپنے اوقات مقررہ کے علاوہ آوازیں نکالنے سے بھی۔ اور اسی طرح ہرن سے جب کہ وہ دائیں یا بائیں گزرتا اور جب وہ بائیں گزرتا تو کہتے: میرے لیے بائیں طرف سے آنے والے کے بعد دائیں طرف سے آنے والا کون ہے؟ مگر جو چیز ان کے نزدیک زیادہ قوی تھی وہ تمام پرندوں میں واقع تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ان تمام کا نام تطیر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 190

رکھا۔ اور عجمی لوگ فال پکڑتے تھے جب وہ کسی بچے کو دیکھتے کہ اسے صبح کے وقت معلم کے پاس لے جایا جارہا ہے۔ اور اس بچے کو دیکھ کر برکت حاصل کرتے تھے جو معلم کے پاس سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہا ہوتا۔ اور وہ اس پانی بھرنے والے (ماشکی) کو دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے جس کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا منہ بند مشکیزہ ہوتا اور اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے جس کا مشکیزہ فارغ اور اس کا منہ کھلا ہوتا۔ اور وہ اس قلی کو دیکھ کر جو بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا اور وہ جانور جس پر بوجھ لدا ہوتا اسے دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے اور جس قلی نے اپنا بوجھ اتار دیا ہوتا اور وہ جانور جس سے بوجھ اتار لیا جاتا اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے۔ پس دین اسلام آیا تو اس نے فال پکڑنے اور بدفالی سے منع کر دیا جو پرندے کی آواز سن کر پکڑی جاتی تھی چاہے وہ آواز جو بھی ہو اور جس حال میں ہو۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: أَقِرُّوا الطیر علی مِکِنَاتِها(1) (پرندے کو اپنے انڈوں پر بٹھائے رکھو) اور یہ اس لیے فرمایا کیونکہ بہت سے زمانہ جاہلیت کے لوگ تھے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتے تو وہ پرندے کے پاس اس کے گھونسلے میں آتے اور اسے وہاں اڑاتے۔ پس جب وہ اپنی اڑان میں دائیں سمت اختیار کرتا تو وہ اپنے کام کو چلے جاتے اور یہی ان کے نزدیک سانح (دائیں جانب سے آنے والا) ہے اور اگر وہ بائیں سمت اڑتا تو وہ واپس لوٹ جاتے اور یہی ان کے نزدیک بارح (بائیں جانب سے آنے والا) ہے چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرما دیا: أَقِرُّوا الطیر علی مِکِنَاتِها(2) حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور اہل عرب کہتے ہیں: وُکُناتِها امرؤ القیس نے کہا ہے:

وقد أغتَدِی والطَّیرُ فی وُکُناتِها

اور الوکنۃ ہر گھونسلے کا نام ہے اور الوکن سے مراد پرندے کی وہ جگہ ہے جہاں وہ انڈے دیتا ہے اور بچے جنتا ہے۔ اور وہ کسی دیوار اور درخت میں کوئی سوراخ یا بل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وَکَنَ الطائر یَکِنُ وُکُونا جب پرندہ اپنے انڈوں کو سی رہا ہو۔ اور عربوں میں سے ایسے بھی تھے جو فال کو کچھ نہ جانتے تھے۔ اور اسے جھٹلانے والوں کی تعریف کرتے تھے۔ مرقش نے کہا ہے:

ولقد غَدَوْتُ وکنتُ لا أغدُوا علی وَاقٍ و حاتم

فإذا الأشائِمُ کالأیا مِنِ والأیامِنُ کالأشائم

اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو ایک پرندہ چیختے چلاتے گزرا، تو قوم کے ایک آدمی نے کہا: خیر، خیر (بہت اچھا، بہت اچھا) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ما عند هذا لا خیرٌ ولا شرٌّ (اس کے پاس نہ خیر ہے اور نہ شر)

ہمارے علماء نے کہا ہے: جہاں تک پرندوں کی گفتگو ہے تو اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا جس پر بطور دلالت اسے محمول کیا جاتا ہے اور ان کے پاس کسی شے کے ہونے کا علم ہے چہ جائیکہ وہ مستقبل میں ہونے والی کسی شے کی خبر دیں اور نہ ہی لوگوں میں کوئی ہے جو پرندوں کی بولی جانتا ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کے لیے خاص کیا،

1۔ مسند امام احمد، جلد 6، صفحہ 381    2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب العقیقۃ، حدیث نمبر 2452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس فال پکڑنا مکمل طور پر باطل ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس مِنّا من تحلم او تکھن أو ردّہ عن سفرہ تطیر (وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے خواب کے بارے جھوٹا دعویٰ کیا یا کہانت اختیار کی (غیب کی بات بتانا) یا بدفالی نے اسے اپنے سفر سے واپس لوٹا دیا)

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فال پکڑنا شرک ہے، تین، اور وہ ہمیں پیش نہیں آتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے توکل کے سبب ختم کر دیتا ہے'' (1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: ''جسے بدفالی نے اپنے کام سے واپس لوٹا دیا تحقیق اس نے شرک کیا''۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کفارہ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أن یقولَ أحدُھم اللّٰھُمَّ لا طیرالا طیرك ولا خیرالا خیرك ولا إله غیرك ثم یمضی لحاجته (2) (کہ ان میں سے کوئی یہ کہے: اے اللہ! کوئی فال نہیں سوائے تیری فال کے اور کوئی خیر نہیں سوائے تیری خیر اور بھلائی کے اور تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں یہ کہہ کر پھر وہ اپنے کام کو چلا جائے)

اور ایک دوسری روایت میں ہے: جب تم میں سے کوئی ایسا وہم پائے تو اسے یہ کہنا چاہیے: اللّٰھُمَّ لایأتی بالحسنات إلا أنت ولا یذھب بالسیئات إلا أنت لاحولَ ولا قوةَ إلابك (3) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی نیکیاں لانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی برائیوں کو مٹانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی طاقت اور قوت نہیں) پھر وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنے کام کو چلا جائے تو جو بھی وہ اپنے دل میں اس بارے پائے گا اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا اور جو شے اسے وہم ڈالے گی اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو گا۔ اور فال اور طیرہ میں فرق سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ حسن نے طَیْرُھم پڑھا ہے اور یہ طائر کی جمع ہے یعنی جو ان کے لیے اور ان کے خلاف مقدر کیا گیا ہے (اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے) وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی انہیں جو قحط سالی اور مصائب لاحق ہوئے ہیں وہ بلاشبہ ان کے گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی طرف سے نہیں۔

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور انہوں نے کہا: کیسی ہی تو لے آئے ہمارے پاس نشانی (معجزہ) تا کہ تو جادو کرے ہم پر اس سے ہرگز نہیں ہم تم پر ایمان لانے والے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ یعنی فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: مھما۔ خلیل نے کہا ہے: یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکھانة والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ ایضاً، حدیث نمبر 3411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ابن ماجہ، حدیث نمبر 3527، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مجمع الزوائد، کتاب الطب، جلد 5، صفحہ 180، حدیث نمبر 8412
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکھانة والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ حدیث نمبر 3418، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصل میں ما، ما ہے(1)۔ پہلا ما شرطیہ ہے اور دوسرا زائدہ ہے جو جزا کے لیے بطور تاکید ہے، جیسا کہ تمام حروف میں زیادتی کی جاتی ہے، مثلاً أما، حیثما، أینما اور کیفما پس علمائے نحو نے ایسے دو حرفوں کو ناپسند کیا جن کا لفظ ایک ہے، تو انہوں نے پہلے کے الف کو ہا سے بدل دیا اور کہا: مھما۔

کسائی نے کہا ہے: اس کی اصل مہ معنی اکفف ہے، رک جا جو بھی تو ہمارے پاس نشانی لے آئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کلمہ مفردہ ہے۔ اس کے ساتھ جزا لائی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے مابعد کو بر تقدیر ان جزم دے۔ آیت میں جواب شرط فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ہے۔ لِّتَسْحَرَنَا تاکہ تو ہمیں اس نظریہ سے پھیر دے جس پر ہم ہیں۔ اس لفظ کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے سجدہ میں گرنے کے بعد بیس برس تک قبط میں رہے اور انہیں معجزات (نشانیاں) دکھاتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا، پس یہ ان کا قول تھا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''پھر بھیجا ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون (یہ سب) واضح نشانیاں تھیں پھر بھی وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ (پیشہ ور) مجرم تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اسرائیل نے سماک کے واسطہ سے نوف شامی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آنے کے بعد آل فرعون میں چالیس برس تک ٹھہرے رہے۔ اور محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے منجاب سے بیس سال کا عرصہ روایت کیا ہے، آپ انہیں نشانیاں یعنی ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون کے معجزات دکھاتے رہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: الطُّوْفَانَ اس سے مراد شدید بارش ہے(2) یہاں تک کہ وہ اس میں تیرنے لگے۔ حضرت مجاہد اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ طوفان سے مراد موت ہے(3)۔ اخفش نے کہا ہے: اس کا واحد طوفانۃ ہے(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا کہ رجحان اور نقصان مصدر ہیں، پس اس کے لیے واحد کا کوئی مطالبہ نہیں۔

نحاس نے کہا ہے: لغت میں طوفان وہ ہے جو ہلاک کرنے والا ہو چاہے وہ صوت ہو یا سیلاب، یعنی وہ ان پر چکر لگاتا رہا اور انہیں ہلاک کرتا رہا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بنی اسرائیل کو اس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پہنچا، بلکہ وہ قبطیوں کے گھروں میں داخل ہوا یہاں تک کہ وہ اپنی ہنسلیوں تک پانی میں کھڑے رہے۔ اور وہ پانی مسلسل سات دن تک ان پر رہا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ چالیس دن تک رہا۔ تب انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرما دے تو ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس آپ نے رب کریم سے دعا کی تو اس نے ان سے طوفان کو اٹھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 444
3۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 40
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443

لیا لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سال ان کے لیے گھاس اور فصلوں میں وہ کچھ اگایا جو اس سے پہلے نہ اگایا تھا، تو وہ کہنے لگے: وہ پانی تو نعمت تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈی کو بھیج دیا اور یہ ایک معروف حیوان ہے، جراد مذکر و مونث دونوں صورتوں میں جرادۃ کی جمع ہے پس اگر تو ان کے درمیان فرق کرنا چاہے تو پھر صفت لگانا پڑے گی اور تو یہ کہے گا رأیت جرادۃ ذکرًا (میں نے نرٹڈی کو دیکھا) پس وہ ان کے پھلوں اور کھیتیوں سبھی کو کھا گئی یہاں تک کہ وہ چھتوں اور دروازوں کو کھانے لگی اور ان کے گھر گرنے لگے، لیکن بنی اسرائیل کے گھروں میں اس میں سے کوئی شے داخل نہ ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ٹڈی کو مارنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جب وہ کسی زمین میں آئے اور اسے خراب کرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے: اسے نہیں مارا جائے گا۔ اور تمام علمائے فقہ نے کہا ہے: اسے مار دیا جائے گا۔ فریق اول کا استدلال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بہت بڑی مخلوق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتی ہے اور اس پر قلم نہیں چلتا۔

اور اس وجہ سے بھی کہ یہ روایت ہے ''تم ٹڈی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ الاعظم کا لشکر ہے'' (1)۔

اور جمہور نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اسے چھوڑنے میں اموال کا فساد ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مسلمانوں کو قتل کرنے کی رخصت دی ہے جب وہ کسی کا مال لینا چاہے، پس ٹڈی جب اموال کو برباد کرنے کا ارادہ کرے تو بدرجہ اولیٰ اسے قتل کرنا جائز ہوگا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ سانپ اور بچھو کو مارنا جائز ہے؟ کیونکہ وہ دونوں لوگوں کو اذیت دیتے ہیں پس اسی طرح ٹڈی بھی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب ٹڈی کے خلاف دعا کرتے تو اس طرح کہتے: اَللّٰهُمَّ أهلك كبارہ وأقتل صغارہ وأفسد بيضه أقطع دابرہ وخُذ بأفواهه عن معايشنا وأرزاقنا إنك سميع الدعاء (اے اللہ! اس کے بڑوں کو ہلاک کر دے اور اس کے چھوٹوں کو قتل کر دے اور اس کے انڈوں کو فاسد کر دے اور اس کے پیچھے آنے والوں کو قطع کر دے اور اس کے مونہوں سے ہماری معیشت اور ہمارے رزق لے لے بے شک تو دعا کو سننے والا ہے)

ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کے خلاف اس کی دم کٹ جانے کی دعا کیسے کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''بے شک ٹڈی سمندر میں ایک مچھلی کی چھینک (سے پیدا شدہ) ہے'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم سات غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے اور ہم آپ کے ساتھ ٹڈی کھاتے رہے (3)۔ المختصر اس کے کھانے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ جب اسے کوئی زندہ پکڑ لے اور اس کا سر کاٹ دیا جائے تو یہ بالاتفاق حلال ہے۔ اور یہ اس کو ذبح کرنے کے قائم مقام ہو جاتا ہے، البتہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کیا آدمی اس کے سبب موت کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے جب اسے شکار کیا جائے یا نہیں؟۔

---

1۔ شعب الایمان فی محنة الجراد والصبر علیها، جلد 7، صفحہ 232، حدیث نمبر 10127

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3211، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 152

تو عام رائے یہی ہے کہ سبب موت جاننے کی ضرورت نہیں، اسے کھایا جائے گا جیسے بھی یہ مرے۔ ان کے نزدیک اس کا حکم مچھلی کے حکم کی مثل ہے۔ یہ نظریہ ابن نافع اور مطرف کا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ سبب موت جاننا لازم اور ضروری ہے، مثلاً اس کے سر کا کٹنا یا پاؤں کا یا اس کے پروں کا کٹ جانا، جب کہ اس کی موت اس سبب سے ہو یا اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ آپ کے نزدیک وہ خشکی کا جانور ہے اور اس کا مردار حرام ہے۔ حضرت لیث مردہ ٹڈی کھانا مکروہ جانتے تھے، مگر جب کوئی اسے زندہ پکڑے پھر وہ مر جائے تو بے شک اسے پکڑنا ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ یہی نظریہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ (1) سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں مچھلی اور ٹڈی اور دو خون (حلال کیے گئے ہیں) جگر اور تلی''۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے: احمد بن منیع، سفیان بن عیینہ نے ابو سعید سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ٹڈی بڑی طشتری میں رکھ کر ایک دوسرے کو بطور ہدیہ دیتی تھیں (2)۔ اسے ابن منذر نے بھی ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ محمد بن منکدر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہزار امتیں پیدا فرمائی ہیں ان میں سے چھ سو سمندر میں ہیں اور چار سو خشکی میں ہیں۔ اور بلاشبہ ان امتوں میں سے سب سے پہلے ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے پس جب ٹڈی ہلاک ہو جائے گی تو باقی امتیں موتیوں کی لڑی کی مثل اس کے پیچھے آئیں گی جب وہ کٹ جائے''۔ اسے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا: بلاشبہ ان امتوں میں سب سے اول ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے، کیونکہ اسے اس مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے فالتو بچی تھی۔ پھر آدمیوں کے ہلاک ہونے کی وجہ سے وہ امتیں ہلاک ہو جائیں گی کیونکہ یہ ان کے لیے مسخر ہے۔

ہم قبط کے قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں پس انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معاہدہ کیا کہ اگر ان سے ٹڈی کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس آپ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اسے دور کر دیا گیا۔ اور ان کی کھیتوں میں سے ابھی کچھ چیزیں باقی تھیں، تو وہ کہنے لگے: جو باقی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہوگا۔ اور وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جوئیں بھیج دیں۔ اور یہ چھوٹا سا کیڑا ہے۔ یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور الدبی سے مراد اڑنے سے پہلے کی ٹڈی ہے۔ اس کی واحد دباۃ ہے۔ جب کوئی کیڑا زمین کی نباتات کھا جائے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: أرض مدبية اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمل سے مراد وہ سوس (گھن) ہے جو گندم میں ہوتا ہے (3)۔ ابن زید نے کہا (4) ہے: اس سے مراد براغیث (مچھر)

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الصید والذبائح، جلد 4، صفحہ 272

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 444

4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 191

ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے کیڑے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد حمنان ہے اور یہ چچڑی کی ایک قسم ہے، اس کا واحد حمنانۃ ہے۔ پس یہ ان کے جانوروں اور ان کی کھیتیوں کو کھا گئی۔ اور ان کی جلد کے ساتھ چمٹ گئی، گویا کہ یہ ان پر چیچک ہے اور اس نے انہیں سونے اور قرار حاصل کرنے سے روک دیا۔ اور حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: قمل سے مراد جعلان ہے (یعنی سیاہ رنگ کا کیڑا) اور اہل لغت کے نزدیک قمل چچڑیوں کی ایک قسم ہے۔

ابوالحسن اعرابی عدوی نے کہا ہے: قمل چچڑی کی جنس سے ایک چھوٹا سا کیڑا ہے، لیکن یہ اس سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کی واحد قملۃ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس کے خلاف نہیں ہے جو اہل تفسیر نے کہا ہے، کیونکہ یہ مراد لینا جائز ہے کہ یہ تمام اشیاء ان پر بھیجی گئی ہوں اور یہ تمام انہیں اذیت پہنچانے کے اعتبار سے جمع ہو سکتی ہیں۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ عین شمس (اس وقت مصر کا دار الخلافہ) میں ریت کا ایک ٹیلہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا عصا مارا تو وہ قمل (جوئیں) بن گیا۔ قمل کی واحد قملۃ ہے۔ عطا خراسانی نے کہا ہے: اسے قُمَّلُ اور قُمْلُ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

اور حسن کی قرات میں ہے والقَمْل یعنی قاف مفتوح اور میم ساکن ہے۔ پس وہ عجز و زاری کرنے لگے لیکن جب ان سے اسے دور کر دیا گیا تو وہ پھر ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈک مسلط کر دیئے۔ ضفادع، ضفدع کی جمع ہے۔ اور یہ وہ معروف جانور ہے جو پانی میں ہوتا ہے (اور اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے)

کہ انہیں مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے امام احمد بن حنبل سے، انہوں نے عبدالرزاق سے اور ابن ماجہ نے محمد بن یحییٰ نیشاپوری ذہلی سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرد (موٹے سر سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندہ کو شکار کرتا ہے۔ لٹورا) مینڈک، چیونٹی اور ہد ہد کو مارنے سے منع فرمایا ہے (1)۔

نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ ایک حکیم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوا میں مینڈک کا ذکر کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کے مارنے سے منع فرمایا (2)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صرد پہلا پرندہ ہے جس نے روزہ رکھا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف بنانے کے لیے شام سے حرم پاک کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھ سکینہ (تیز رو ہوا) اور صرد تھے، پس صرد نے مخصوص جگہ کی طرف آپ کی رہنمائی کی اور سکینہ نے اس کی مقدار کی طرف، پس جب آپ اس خاص جگہ تک پہنچے تو سکینہ بیت اللہ شریف کی جگہ پر چلی اور پکار کر کہا: اے ابراہیم! میرے سائے کی مقدار پر (گھر) تعمیر کر دے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرد کو مارنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیت اللہ شریف پر راہنمائی کی اور مینڈک کو مارنے سے منع کیا، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی جانے والی آگ پر پانی ٹپکاتا تھا۔ اور جب یہ فرعون پر مسلط ہوئے تو یہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3213-3214، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، کتاب ابواب السلام، باب فی قتل الذر، حدیث نمبر 4583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 201۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب النوم، باب قتل الضفدع، حدیث 4585، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے اور تمام جگہوں پر چھا گئے۔ جب یہ تنور کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وہاں بھی ڈیرہ ڈال لیا حالانکہ ان میں آگ بھڑک رہی تھی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو تسبیح بنا دیا۔ کہا جاتا ہے: تمام جانوروں سے زیادہ یہ تسبیح کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تم مینڈک کو نہ مارو، کیونکہ اس کی وہ آواز جو تم سنتے ہو وہ تسبیح ہے۔

پس روایت ہے کہ اس (مینڈک) نے ان کے بستروں، برتنوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو بھر دیا تھا ایک آدمی اپنی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا اور جب وہ بات کرتا تو مینڈک اچھل کر اس کے منہ میں داخل ہو جاتا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا اور کہنے لگے: ہم توبہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انہیں دور کر دیا لیکن وہ دوبارہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر خون بھیجا تو ان پر نیل خون بن کر بہنے لگا۔ اسرائیل اس سے پانی کے چلو بھرتے تھے اور قبطی خون کے۔ اسرائیلی قبطی کے منہ میں پانی انڈیلتا تھا تو وہ خون ہو جاتا تھا۔ اور قبطی اسرائیلی کے منہ میں خون انڈیلتا تھا تو وہ میٹھا اور لذیذ پانی ہو جاتا تھا۔

اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ یعنی ظاہر اور بین علامات، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ، حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے ایک نشانی ظاہر کی تھی اور وہ ایک نشانی آٹھ دن تک رہی۔ بعض نے کہا ہے: چالیس دنوں تک رہی۔ اور بعض نے کہا ہے: ایک مہینہ تک رہی پس اسی لیے فرمایا: مُّفَصَّلٰتٍ، فَاسْتَكْبَرُوْا پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے سے تکبر کرتے رہے۔

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اور جب آجاتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے: اے موسیٰ! دعا کر ہمارے لیے اپنے رب سے اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم ہٹا دو گے ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کر دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ پھر جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب ایک مقررہ میعاد تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے تو فوراً انہوں نے (توبہ کا عہد) توڑ دیا۔ پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے اور غرق کر دیا انہیں سمندر میں کیونکہ انہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور وہ اس (آنے والے) عذاب سے بالکل غافل تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ اس میں رجز کا معنی عذاب ہے۔ اسے را کے ضمہ کے ساتھ رُجز بھی پڑھا گیا ہے، اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ عذاب طاعون تھا اس کے ساتھ ستر ہزار قبطی ایک دن میں

1۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 2، صفحہ 253

مرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجز سے مراد وہی آیات اور نشانیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اس میں ما معنی الذی ہے، یعنی اس کے سبب جس کا علم اس نے آپ کو ودیعت فرمایا یا اس کے سبب، جس کے ساتھ اس نے آپ کو مخلص فرمایا ہے اور آپ کو آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ قسم ہے، یعنی اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے مگر تم نے ہمارے لیے دعا نہیں کی، پس ما صلہ ہے۔ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ یعنی اگر آپ اپنے الله سے دعا کریں یہاں تک کہ وہ ہم سے (عذاب کو) دور فرما دے۔

لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ تو ہم یقیناً اس دین کے بارے آپ کی تصدیق کریں گے جو لے کر آپ تشریف لائے۔ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ (اور ہم ضرور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ روانہ کر دیں گے) وہ ان سے خدمت لیتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ یعنی ان کی وہ مدت جو ان کے لیے غرق کرنے کے بارے مقرر کی گئی تھی۔ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ تو فوراً انہوں نے وہ عہد توڑ دیا جو انہوں نے اپنے بارے میں کیا تھا۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ اس میں یم کا معنی سمندر ہے۔ وَكَانُوْا عَنْهَا اور اس عذاب سے غافل تھے (یعنی ہا ضمیر سے مراد النقمۃ عذاب ہے) اور اس پر فَانْتَقَمْنَا دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہا ضمیر سے مراد آیات ہیں یعنی انہوں نے ان کا اعتبار نہ کیا یہاں تک کہ وہ ان سے غافلوں کی طرح ہو گئے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنایا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور پورا ہو گیا آپ کے پروردگار کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے متعلق بوجہ اس کے کہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے برباد کر دیا جو کیا کرتا تھا فرعون اور اس کی قوم اور (برباد کر دیئے) جو بلند مکان وہ تعمیر کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ اس میں قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ جنہیں خدمت لینے کے سبب ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا کسائی اور فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ اصل میں فی مشارق الارض و مغاربها تھا پھر اس سے فی کو حذف کر دیا گیا اور انہیں نصب دے دی گئی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ سرزمین قبط کے وارث بنے اور یہ دونوں مفعول صریح کے طور پر منصوب ہیں۔ کہا جاتا ہے: ورثت المال (میں مال کا وارث بنا) واورثتہ المال (میں نے اسے مال کا وارث بنایا) پس یہ فعل ہمزہ کے ساتھ متعدی ہو گیا اور اس نے دو مفعولوں کو نصب دی۔ اور الارض سے مراد شام و مصر کی زمین ہے۔ اور مشارقها و مغاربها سے مراد اس کی شرق و غرب کی جہتیں ہیں۔ پس

اس میں الارض مخصوص ہے۔ یہ حسن اور قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ساری زمین ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہ دونوں پوری زمین کے بادشاہ تھے۔ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا یعنی اس میں ہم نے کھیتیاں، پھل اور نہریں نکال کر برکت رکھ دی۔

وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وہ یہ ارشاد ہے: وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ نَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّ نَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ۝ (القصص) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث)

بِمَا صَبَرُوۡا یعنی ان کے اس صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے فرعون کی اذیت اور ستانے پر کیا اور الله تعالیٰ کے حکم پر صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کیا۔ وَ دَمَّرۡنَا مَا کَانَ یَصۡنَعُ فِرۡعَوۡنُ وَ قَوۡمُهٗ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡرِشُوۡنَ کہا جاتا ہے: عَرَشَ یَعۡرِشُ (1) جب وہ تعمیر کرے، بنائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یعنی جو وہ محلات اور بلند مکان وغیرہ تعمیر کرتے تھے ہم نے انہیں برباد کر دیا (2)۔

اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد بیلوں کو بلندی پر چڑھانا ہے۔ ابن عامر اور ابوبکر نے عاصم سے را کے ضمہ کے ساتھ یَعۡرُشُون پڑھا ہے (3)۔ کسائی نے کہا ہے: یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابراہیم بن ابی عبلہ نے یُعَرِّشون یعنی را کو مشدد اور یا کو مضموم پڑھا ہے۔

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتَوۡا عَلٰی قَوۡمٍ یَّعۡکُفُوۡنَ عَلٰۤی اَصۡنَامٍ لَّهُمۡ ۚ قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰهًا کَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ۝۱۳۸

''اور ہم نے پار اتارا بنی اسرائیل کو سمندر سے تو گزرے وہ ایک ایسی قوم پر جو مگن بیٹھے تھے اپنے بتوں کی عبادت میں، بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! بناؤ ہمارے لیے بھی ایک (ایسا) خدا جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا: یقیناً تم جاہل (اور بے سمجھ) لوگ ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتَوۡا عَلٰی قَوۡمٍ یَّعۡکُفُوۡنَ عَلٰۤی اَصۡنَامٍ لَّهُمۡ حمزہ اور کسائی نے کاف کو کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: عَکَفَ یَعۡکِفُ و یَعۡکُفُ اس کا معنی ہے کسی شے پر قائم رہنا اور اسے لازم پکڑنا۔ دونوں بابوں سے اس کا مصدر مفعول کے وزن پر آتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قوم لخم تھی اور وہ رقہ میں اترے ہوئے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے بت گائے کے مجسمے تھے (4)، اسی لیے سامری نے ان کے لیے بچھڑا نکالا تھا۔ قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰهًا کَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ اسی کی مثل عرب جہلاء کا قول ہے درآنحالیکہ انہوں نے کفار کا

1۔ زادالمسیر، جلد 2، صفحہ 194
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 55
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 532
4۔ زادالمسیر، جلد 2، صفحہ 194

ایک سبز درخت دیکھا تھا اس کا نام ذات انواط تھا وہ ہر سال میں ایک دن اس کی تعظیم کرتے تھے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے لیے ایک ذات انواط بنا دیں جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اکبر۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم نے اسی طرح کہا جیسے قوم موسیٰ نے کہا تھا: اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (1) یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقہ پر پورے پورے چلو گے حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم بھی اس میں داخل ہو گے''۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حنین کی طرف نکلنے کے دوران واقعہ پیش آیا۔ اس کا بیان سورۂ براۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

''بے شک یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں تباہ ہو کر رہیں گے اور باطل ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: کیا بغیر اللہ کے میں تلاش کروں تمہارے لیے کوئی اور خدا حالانکہ اسی نے فضیلت دی ہے تمہیں سارے جہانوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ، متبر بمعنی مهلك (ہلاک کیا گیا) ہے اور تبار بمعنی ہلاک) ہے (2)۔ ہر ٹوٹا ہوا برتن متبر کہلاتا ہے۔ اور أمر متبر (تباہ حال معاملہ) یعنی بلا شبہ عابد اور معبود ہلاک ہو کر رہیں گے۔ اور قولہ وَ بٰطِلٌ یعنی ختم ہو جانے والا اور اڑ جانے والا ہے۔ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس میں کانوا صلہ زائدہ ہے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا یعنی آپ نے فرمایا: کیا میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا تلاش کروں؟ کہا جاتا ہے: بغيته و بغيت له (میں نے اسے چاہا اور اس کے لیے طلب کیا) وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ یعنی حالانکہ اسی نے تمہیں تمہارے زمانے کے عالمین پر فضیلت دی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ اور ان آیات اور نشانیوں کے ساتھ جن کے ساتھ انہیں خاص فرمایا انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

''اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے جو چکھاتے تھے تمہیں سخت عذاب، مار ڈالتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی''۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے احسانات یاد دلائے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو خطاب ہے، یعنی تم وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف کو نجات دی، جیسا کہ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 57
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 448

میں گزر چکی ہے۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس رات کا اور مکمل کیا اسے دس راتوں سے، سو پوری ہوگئی اس کے رب کی میعاد چالیس راتیں۔ اور (طور پر جاتے وقت) کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا نائب رہنا میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کے راستہ پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عزت و تکریم عطا فرمائی۔ پس اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا وعدہ فرمانا ان کے لیے باعث عزت و تکریم تھا۔ وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ حضرت ابن عباس (1)، حضرت مجاہد اور حضرت مسروق رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: یہ ذوالقعدہ اور ذوالحج کے دس دن تھے۔ آپ کو حکم ہوا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھیں اور آپ اس میں اس عبادت کے ساتھ منفرد ہوں گے، پس جب آپ نے روزے رکھے تو آپ نے اپنے منہ کی بو کو ناپسند کیا اور مسواک کی۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے خرنوب کی لکڑی سے مسواک کی، تو ملائکہ نے کہا: بلاشبہ ہم آپ کے منہ سے کستوری کی خوشبو سونگھتے تھے تو آپ نے مسواک کے ساتھ اسے فاسد کر دیا ہے۔ پس آپ پر ذوالحجہ کی دس راتیں اور بڑھا دی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نے مسواک کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: ''اے موسیٰ! میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ تیرا منہ اس حالت پر واپس لوٹ آئے جس پر پہلے تھا۔ کیا تو جانتا نہیں ہے کہ روزے دار کے منہ کی بو میرے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے'' (2)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مزید دس دن آپ کو روزے رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا شرف یوم نحر (دسویں ذوالحج) کی صبح کو حاصل ہوا جس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام قربانی کے عوض ذبح ہونے سے محفوظ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حج مکمل کیا۔ عشر کے لفظ کے آخر سے ہا کو اس لیے حذف کر دیا گیا، کیونکہ معدود مونث ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ثلاثین اور عشرۃ سے مراد چالیس ہے، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے تیس دن انہی میں سے دس دنوں کے ساتھ مکمل کیے۔ پس یہ واضح کر دیا کہ وہ دس تیس کے سوا ہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ سورۂ بقرہ میں اربعین (چالیس) کہا ہے اور یہاں ثلاثین (تیس) فرمایا ہے، پس یہ نیا کلام ہو جائے گا۔ تو کہا گیا ہے: اس طرح نہیں ہے۔ تحقیق فرمایا: وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ تو اربعون، اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 59 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 195

ثلاثون وعشرۃ یہ ایک ہی قول ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں (کیونکہ دونوں کا معنی چالیس ہے) پس اللہ تعالیٰ نے تفصیل و تالیف کے طریقہ پر دو قول ارشاد فرمائے۔ پس قول مرکب میں اربعین فرمایا، اور پھر فرمایا ثلاثین، یعنی مسلسل ایک مہینہ اور دس دن۔ سب کا معنی چالیس ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

عشر و اربع......

یعنی چودہ، چاند کی رات۔ اور یہ کلام عرب میں جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کسی معاہدہ کی مدت مقرر کرنا سنت ماضیہ ہے اور قدیمی معنی ہے اسے اللہ تعالیٰ نے قضایا (فیصلوں) میں بنیاد بنایا ہے اور اس کے ساتھ امتوں کے فیصلے فرمائے ہیں اور اس کے ساتھ انہیں اعمال میں تاخیر کرنے کی مقدار پر آگاہ کیا ہے، پس پہلی مدت جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ چھ دن ہے جن میں اس نے تمام مخلوقات کو تخلیق فرمایا ہے۔ **وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ** [3] **وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ** ﴿۳۸﴾ (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں) ہم اس کا معنی اس سے قبل اسی سورۃ میں **اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ** (الاعراف: 54) کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے بیان فرمایا ہے: جب کسی معنی (مقصد) کے لیے مدت مقرر کر دی جائے تو اس میں مؤجل کو حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے اور جب وہ مدت آجائے اور وہ شے میسر نہ ہو تو اس میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے اور بطور عذر اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بیان فرمایا اور ان کے لیے تیس دن مقرر فرما دیے پر ان میں دس دن مزید بڑھا دیئے تاکہ چالیس مکمل ہو جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دس دن اپنی قوم پر تاخیر کر دی اور وہ اس تاخیر اور تاخر کے جواز کو نہ سمجھ سکے، یہاں تک کہ وہ کہنے لگے: بلاشبہ موسیٰ بہک گیا یا بھول گیا (نعوذ باللہ من ذالک) اور انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا۔ اور آپ کے بعد انہوں نے اپنا نظریہ بدل دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور الٰہ کی عبادت کرنے لگے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: بلاشبہ میرے رب نے میرے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ فرمایا کہ میں اس سے شرف ملاقات حاصل کروں اور میں تم میں حضرت ہارون علیہ السلام کو نائب اور خلیفہ بنا رہا ہوں۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا۔ پس ان کا وہ فتنہ جس میں انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی انہی دس دنوں میں وقوع پذیر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر زائد کیے تھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ زیادتی جو مقررہ مدت پر ہوتی ہے وہ اسی طرح مقدر ہوتی ہے جیسے وہ مقررہ مدت مقدر ہوتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتی مگر حاکم کے ایسے اجتہاد کے ساتھ جو اس معاملہ سے متعلقہ معانی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 790

مثلاً وقت، حال اور عمل میں غور وفکر کرنے کے بعد ہو، پس یہ گزشتہ مدت کے ثلث (تہائی) کے مثل ہوسکتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مقرر فرمائی۔ اگر حاکم مناسب خیال کرے کہ وہ اپنے لیے اصل کو اجل اور زیادتی کو ایک ہی مدت میں جمع کرلے تو یہ جائز ہے، لیکن اس کے بعد انتظار ضروری ہے تاکہ انسان پر عذر طاری ہوجائے، یہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بندے کو معذور قرار دیا ہے اور اس کی مدت کو مؤخر کردیا ہے یہاں تک کہ وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بھی حکام کے محکوم علیہ کو یکے بعد دیگرے معذور قرار دینے کی اصل ہے اور یہ مخلوق کے ساتھ لطف وعنایت ہے اور چاہیے کہ طاقتور حکام ان پر حق نافذ کریں۔

کہا جاتا ہے: أعذَرَ فی الأمرأی بالغ فیہ یعنی اس نے معاملہ میں حد درجہ کوشش کی اتنی کہ اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہوسکتی (یعنی اس کے بعد کوئی عذر پیش نہیں کیا جاسکتا) اور بنی آدم کے لیے سب سے بڑی کوشش ان کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمانا ہے تاکہ ان پر حجت مکمل ہوجائے۔ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو)

اور فرمایا: وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (فاطر: 37) (اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا) کہا گیا ہے کہ یہ رسل علیہم السلام ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد بڑھاپا ہے، کیونکہ وہ کہولت کی عمر میں آجاتا ہے اور یہ بچپن کی عمر سے مفارقت اور جدائی کی علامت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ساٹھ برس کو عذر دور کرنے کی غایت اور انتہا قرار دیا ہے، کیونکہ ساٹھ برس بندوں کے انتہائی تجربہ کار ہونے کے قریب ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے، خشوع وخضوع پیش کرنے اور اطاعت وفرمانبرداری کی عمر ہے۔ اور اس میں موت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات تاک میں ہوتی ہے۔ پس اس میں کوشش کے بعد کوشش ہے (اور ڈراوے کے بعد ڈراوا ہے) پہلا (ڈراوا) نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور دوسرا بڑھاپے کے ساتھ اور یہ چالیس برس مکمل ہونے کے وقت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (الاحقاف: 15) پس اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ جو آدمی چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے تو اب اس کے لیے وقت ہے کہ وہ اپنی ذات پر اور اپنے والدین پر اللہ تعالیٰ کے احکامات و احسانات کی مقدار کو جانے اور ان کا شکر ادا کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اپنے شہر کے اہل علم کو جانتا ہوں، وہ دنیا تلاش کرتے رہتے ہیں اور لوگوں میں مل جل کر رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے چالیس برس پورے ہوجاتے ہیں، پس جب ان پر یہ وقت آجائے تو وہ لوگوں سے علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کرلیتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ تاریخ راتوں سے (شمار) ہوتی ہے نہ کہ دنوں سے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (تیس راتیں) کیونکہ راتیں ہی مہینوں کی ابتدا ہیں۔ اور انہی کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایام کے

بارے خبر دیتے تھے، یہاں تک کہ مروی ہے کہ وہ کہتے تھے: صُمنا خمسًا مع رسول الله ﷺ (ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پانچ روزے رکھے)۔ اور عجمی اس میں مخالفت کرتے ہیں اور وہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے ہیں، کیونکہ ان کا اعتماد سورج پر ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورج کا حساب منافع (بیع، شرا اور اجارہ وغیرہ) کے لیے ہے اور چاند کا حساب مناسک (احکام) کے لیے ہے، اسی لیے فرمایا: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً کہا جاتا ہے: أرختُ تاریخا اور ورختُ توریخا (میں نے تاریخ بیان کی) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ اس کا معنی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی مناجات کے لیے جانے اور اسی میں اپنے آپ کو مشغول رکھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو فرمایا: تم میرے نائب اور خلیفہ ہو۔ پس یہی ارشاد اپنا نائب اور خلیفہ بنانے پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت علی کو فرماتے ہوئے سنا ہے جب آپ ﷺ نے انہیں ایک غزوہ کے وقت اپنا نائب بنایا: أما ترضى أن تكون منى بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبيَّ بعدي (1) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے) اس روایت سے روافض، امامیہ اور شیعہ کے تمام فرقوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر خلیفہ اور نائب بنایا، یہاں تک کہ امامیہ نے صحابہ کرام کو کافر قرار دیا۔ قبحهم الله (اللہ تعالیٰ ان کا برا کرے)

نوٹ: اب ان کے مقتدر علماء اس قسم کے اقوال سے اجتناب کرتے ہیں اور خلفاء راشدین، امہات المومنین اور صحابہ کرام کے بارے میں تکریم کے الفاظ ذکر کرتے ہیں۔

کیونکہ ان کے نزدیک انہوں نے اس عمل کو ترک کر دیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے۔ اور انہوں نے آپ کے سوا کسی اور کو اجتہاد کے ساتھ خلیفہ بنالیا۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دیا جب آپ اپنے حق کے مطالبہ کے لیے نہ اٹھے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے اپنے کفر میں اور ان کے کفر میں جو ان کے قول کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں کوئی شک نہیں ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی میں کسی کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا اس وکالت کی طرح ہے جو مؤکل کے معزول کرنے یا اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور یہ اس کی وفات کے بعد تک باقی رہنے کا تقاضا نہیں کرتی، پس اس سے وہ مسئلہ حل ہو جائے گا جس کے ساتھ امامیہ وغیرہ کا تعلق ہے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ پر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور کئی دوسروں کو نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور اس سے بالاتفاق ان کی خلافت کا دائمی ہونا لازم نہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اصل رسالت میں شریک کیا گیا تھا، پس ان کے لیے اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو قصد انہوں نے کیا ہے۔ والله الموفق للهداية

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 278

قولہ تعالیٰ: وَ اَصۡلِحۡ یہ اصلاح سے امر ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اصلاح میں سے یہ تھا کہ آپ سامری کو زجرو توبیخ کرتے اور اسے بدل دیتے (1)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور ان کے امور کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کی اصلاح کریں، یعنی مصلح ہو جائیں۔

وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِيۡلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ یعنی آپ گنہگاروں اور نافرمانوں کی راہ نہ چلیں۔ اور نہ ہی ظالموں کے معاون و مددگار بنیں۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے (تو اس وقت) عرض کی: اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے مجھے، البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے پھر جب تجلی ڈالی ان کے رب نے پہاڑ پر تو کر دیا اسے پاش پاش اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب آپ کو ہوش آیا تو عرض کی: پاک ہے تو (ہر نقص سے) میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا یعنی جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے۔ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ اور ان کے رب نے انہیں بلا واسطہ اپنا کلام سنایا۔ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ تو آپ نے رب کریم کا دیدار کرنے کی التجا کی، اور جب اس نے آپ کو اپنا کلام سنایا تو آپ دیدار الٰہی کے مشتاق ہوئے۔ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ تو رب کریم نے فرمایا: تم دنیا میں مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے کہ آپ نے یہ ارادہ کیا۔ مجھے ایک عظیم نشانی دکھا تاکہ میں تیری قدرت کا نظارہ کر سکوں۔ کیونکہ آپ نے عرض کی اِلَيۡكَ (تیری طرف) اور رب کریم نے فرمایا: قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ اگر آپ کسی آیت اور نشانی کا سوال کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو وہ عطا فرما دیتا جو آپ مانگتے، جیسا کہ اس نے آپ کو دیگر تمام آیات اور نشانیاں عطا فرمائی تھیں، حالانکہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کسی دوسری آیت اور نشانی کی طلب سے اظہار عجز ہے، پس یہ تاویل باطل ہے۔ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ آپ کے لیے اس شے سے مثال بیان کی گئی جو اپنی بناء کے اعتبار سے زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہے، یعنی اگر پہاڑ اپنی جگہ پر ثابت رہا اور ساکن رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے اور اگر وہ ساکن نہ رہا تو پھر بلاشبہ تم میری رؤیت کی طاقت نہیں رکھ سکتے، جیسا کہ پہاڑ مجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 450

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے قاضی ابوبکر بن طیب سے جو ذکر کیا ہے اس کا مفہوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اسی لیے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور یہ کہ پہاڑ نے اپنے رب کو دیکھا تو وہ بہ جان کر پاش پاش ہو گیا کہ اللہ کریم نے اسے اس کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ اور انہوں نے اس کا استنباط اس ارشاد گرامی سے کیا ہے: وَ لٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ پھر فرمایا: فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا، تجلی کا معنی ہے ظہر (ظاہر ہونا) یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: جلوتُ العروس ای أبرزتُها (میں نے دلہن کو ظاہر کیا) اور جلوتُ السیف (میں نے تلوار کو زنگ سے صاف کیا) ان دونوں میں جلا کا معنی موجود ہے اور تجلی الشی کا معنی ہوتا ہے انکشف (ظاہر ہونا، منکشف ہونا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تجلّی أمرہ و قدرتہ (یعنی اس نے اپنا امر اور اپنی قدرت کا اظہار کیا) یہ قطرب وغیرہ نے کہا ہے۔

اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت دکا ہے۔ اور اس کی صحت پر دکت الارض دکا دلالت کرتا ہے۔ اور بلاشبہ پہاڑ (جبل) مذکر ہے اور اہل کوفہ نے دکاء پڑھا ہے یعنی اسے ارض دکاء کی مثل قرار دیا ہے۔ اور اس سے مراد ہموار زمین ہے جہاں پہاڑ نہ ہوں۔ اور اس کا مذکر ادک ہے۔ اور دکاء کی جمع دکاوات اور دک ہے جیسا کہ حمراوات اور حمر ہیں۔ کسائی نے کہا ہے: الدك من الجبال کا معنی ہے پہاڑ کا چوڑا ہو جانا، اس کی واحد ادک ہے۔ ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: دکاء کی جمع دکاوات ہے۔ اس سے مراد مٹی کی وہ راب (اور کیچڑ) ہے جس میں شدت اور سختی نہ ہو۔ اور اسی طرح الدکداك من الرمل کا معنی ہے: وہ ریت جو زمین کی کوہان نہ ہو۔

اور ایک تفسیر میں ہے: پہاڑ زمین میں دھنس گیا اور وہ اب بھی اس میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے اسے مٹی بنا دیا۔ عطیہ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد اڑنے والی ریت ہے۔ وَ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آپ مردہ ہو کر گر پڑے۔ کہا جاتا ہے: صَعِقَ الرجل فهو صَعِقٌ و صُعِقَ فهو مصعوق حضرت قتادہ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نویں ذی الحجہ جمعرات کے دن بیہوش ہو کر گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے دسویں ذوالحجہ جمعہ کے دن آپ کو تورات عطا فرمائی (1)۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ کی التجا کرنے سے توبہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ نے یہ عرض بغیر اجازت لیے کی، پس اسی لیے آپ نے توبہ کی۔ اور بعض نے کہا ہے: آیات و علامات کے ظہور کے وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور خشوع و خضوع کے اظہار کے لیے یہ کلمات کہے۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ توبہ کسی معصیت سے نہ تھی، کیونکہ انبیاء معصوم ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک بھی رؤیت باری تعالیٰ جائز ہے۔ مبتدعہ کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے یہ التجا ایک قوم کے لیے کی تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ جائز نہیں ہے اور یہ توبہ کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 539

کہا گیا ہے: میں تیری بارگاہ میں قبطی کے قتل سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ الانعام میں یہ بیان گزر چکا ہے کہ رؤیت جائز ہے۔

علی بن مہدی طبری نے بیان کیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال محال ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کا اقدام نہ کرتے، جیسا کہ رب کریم کو یہ کہنا جائز نہیں ہے: اے رب! کیا تیری کوئی بیوی اور بیٹا ہے۔ عنقریب سورۃ القیامہ میں معتزلہ کا مذہب اور ان کا رد آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں اپنی قوم میں سے پہلا مومن ہوں۔ بعض نے کہا ہے: اس زمانے میں بنی اسرائیل میں سے میں پہلا مومن ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: یقیناً اس بارے میں تیرا پہلے وعدہ ہے کہ دنیا میں تجھے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حدیث صحیح میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے درمیان (ترجیح کا) چناؤ نہ کرو، کیونکہ لوگ قیامت کے دن صعقہ کے سبب گرے پڑے ہوں گے تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا پس میں اچانک موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ عرش کے پائیوں میں سے ایک کو پکڑے ہوئے ہیں، سو میں نہیں جانتا کہ کیا ان پر بھی صعقہ طاری ہوا ان لوگوں میں جن پر صعقہ طاری ہوا اور پھر انہوں نے مجھ سے افاقہ پا لیا یا پہلے صاعقہ کے ساتھ ہی ان کا حساب لیا گیا'' (1) یا فرمایا ''یا ان کے لیے پہلا صعقہ ہی کافی ہوا''۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام اور رؤیت کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو مرتبہ شرف ہمکلامی عطا فرمایا۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار شرف دیدار حاصل کیا۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغمبری سے اور اپنے کلام سے اور لے لو جو میں نے دیا ہے تمہیں اور ہو جاؤ شکرزار بندوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ، الإصطفاء بمعنی الإجتباء ہے۔ یعنی میں نے تجھے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور پھر آیت میں علی الخلق (مخلوق پر) نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس اِصطفاء اور سرفرازی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور تحقیق اس نے ملائکہ سے بھی کلام فرمایا ہے اور اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جب کہ آپ کے علاوہ بھی اس نے رسول مبعوث فرمائے ہیں، پس عَلَى النَّاسِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت نافع اور ابن کثیر نے صیغہ مفرد کے ساتھ برسالتی پڑھا ہے (2)۔ اور باقیوں نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور الرسالۃ مصدر ہے، پس اسے مفرد لانا جائز ہے۔ اور جو جمع لائے ہیں وہ اس بنا پر ہے کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، سورۃ اعراف، جلد 2، صفحہ 668 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

کو رسالت کی انواع و اقسام کے ساتھ بھیجا یا اس کی انواع مختلف ہیں، نتیجۃً مصدر کی جمع اس کی انواع کے اختلاف کی وجہ سے ہے، جیسے فرمایا: اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝ (لقمان) أصوات (آوازیں) کی اجناس کے اختلاف اور آواز نکالنے والوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے اسے جمع لایا گیا ہے۔ اور لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ میں اسے واحد ذکر کیا، کیونکہ اس میں آوازوں میں سے ایک جنس کا ارادہ کیا ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کی قوم وصف تکلم میں آپ کے ساتھ شریک نہیں اور نہ ہی ستر افراد میں سے کوئی ایک آپ کے ساتھ شریک ہے، جیسے ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ یہ قناعت کرنے کی طرف اشارہ ہے، یعنی آپ اس پر قناعت کریں جو میں نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ یعنی میں نے جو احسانات تم پر کیے ہیں اور جو میرا فضل تم پر ہے اس کا اظہار کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے: دابۃ شکور یہ کہا جاتا ہے جب جانور کا موٹاپا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ اور شاکر (شکر گزار) کو مزید کی پیشکش کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) (کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا)۔ اور روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے بعد چالیس راتیں ٹھہرے رہے جس نے بھی آپ کو دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کے نور کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

"اور ہم نے لکھ دی موسیٰ کے لیے تختیوں میں ہر چیز نصیحت پذیری کے لیے اور (لکھ دی) تفصیل ہر چیز کی پھر (فرمایا) پکڑ لو اسے مضبوطی سے اور حکم دو اپنی قوم کو کہ پکڑ لیں اس کی اچھی باتیں، عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں نافرمانوں کا (برباد شدہ) گھر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اس میں الواح سے مراد تورات ہے۔ اور خبر میں روایت ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے آپ کو اپنے پر کے ساتھ اٹھایا اور بلندی میں لے گئے حتیٰ کہ آپ کو اتنا قریب کیا کہ آپ نے قلم چلنے کی آواز سنی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے تختیاں لکھیں۔ اسے حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ تختیاں سبز رنگ کے زمرد کی تھیں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: وہ سرخ یاقوت کی تھیں۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: وہ زبرجد کی تھیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں (1)۔ اور وہ آسمان سے نازل ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ٹھوس پتھر سے بنی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نرم و ملائم کر دیا تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ کاٹ دیا پھر اسے اپنی انگلیوں کے ساتھ شق کیا، تو اس پتھر نے آپ کی اسی طرح اطاعت کی جیسے لوہے نے حضرت داؤد علیہ السلام کی۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے تختیوں میں اس طرح لکھ دیا ہے جیسے انگوٹھی کا نقش

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

ہوتا ہے۔ (یعنی سب ان میں کندا کر دیا ہے)

حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے: تورات نازل ہوئی تو وہ ستر اونٹوں کا بوجھ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت اپنی ذات کی طرف تشریف کے لیے کی ہے، حالانکہ یہ تختیاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھی گئیں اور انہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے اس قلم کے ساتھ لکھا جس کے ساتھ ذکر (قرآن کریم) لکھا۔ اور نہر نور سے سیاہی لی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تحریر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا اور اسے تختیوں میں تخلیق کر دیا۔ اور اللوح کی اصل لوح لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ (البروج) تو گویا تختی وہ ہے جس میں معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور روایت ہے کہ وہ دو تختیاں تھیں اور جمع (الواح) اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ دو بھی جمع ہے۔

اور کہا جاتا ہے: رجل عظیم الألواح یہ تب کہا جاتا ہے جب کسی آدمی کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کی ہڈی بڑی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: تختیاں اس وقت ٹوٹ گئیں جب آپ نے انہیں پھینکا پس سوائے چھٹی تختی کے وہ سب اٹھالی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساتویں تختی باقی رہی اور بقیہ چھ اٹھالی گئیں پس وہ جو اٹھالی گئی اس میں ہر شے کی تفصیل درج تھی اور جو باقی رہی اس میں ہدایت اور رحمت کا ذکر تھا۔

حافظ ابونعیم نے عمرو بن دینار سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے انہوں نے چالیس راتیں روزہ رکھا اور جب تختیوں کو پھینکا اور وہ ٹوٹ گئیں تو آپ نے پھر اسی طرح روزے رکھے تو وہ پھر آپ کی طرف واپس لوٹا دی گئیں۔ اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد حلال وحرام کی وضاحت اور آپ کے دین کے احکام میں سے ہر وہ شے ہے جس کی آپ کو احتیاج اور ضرورت تھی۔ یہ معنی ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ایسا لفظ ہے جو تفخیم کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اس سے تعمیم مراد نہیں ہوتی، مثلاً آپ کہتے ہیں: دخلتُ السوق فاشتریتُ کلّ شئ (میں بازار میں داخل ہوا اور میں نے ہر شے خرید لی) عند فلان کل شئ (فلاں کے پاس ہر شے ہے) اور تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ (الاحقاف: 25) (تہس نہس کر کے رکھ دے گی ہر چیز کو) وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل: 23) (اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی احکام میں سے ہر اس شے کی تفصیل جس کا انہیں حکم دیا گیا، کیونکہ ان میں اجتہاد نہیں تھا، بلکہ یہ صرف امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص ہے۔ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ اس کلام میں حذف ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا (ای فقلنا له): اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، یعنی پوری کوشش اور نشاط کے ساتھ۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (البقرہ: 63) (پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے) اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا یعنی اپنی قوم کو حکم دو وہ اوامر پر عمل کریں اور نواہی کو چھوڑ دیں اور ضرب الامثال اور نصائح و مواعظ میں تدبر اور غور و فکر کریں۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: 55) (اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) اور فرمایا: فَيَتَّبِعُوْنَ

اَحْسَنَهٗ (زمر:18) (کہ وہ اتباع اور پیروی کریں اس کی اچھی باتوں کی) پس معاف کر دینا قصاص لینے سے اچھا ہے۔ اور صبر کرنا انتقام لینے سے احسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اچھی چیزیں فرائض اور نوافل ہیں اور گھٹیا مباح ہے۔

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دَارَ الْفٰسِقِيْنَ سے مراد وہ ہے جس پر سے وہ گزرے جب انہوں نے سفر کیا یعنی قوم عاد و ثمود کے گھر اور وہ بستیاں جو برباد کر دی گئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد جہنم ہے۔ یہ حسن اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، یعنی چاہیے کہ تم انہیں یاد رکھو اور اس سے بچو کہ تم ان میں سے ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے مصر کا ارادہ کیا ہے، یعنی میں عنقریب تمہیں قبطیوں کے گھر اور فرعون کے وہ مسکن دکھاؤں گا جو اب ان سے خالی پڑے ہیں۔ یہ حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں عنقریب تمہیں کفار کے وہ گھر دکھاؤں گا جن میں تم سے پہلے جبابرہ اور عمالقہ سکونت پذیر رہے تاکہ ان سے عبرت حاصل کرو، مراد شام ہے۔ یہ دونوں قول ان دونوں پر دلالت کرتے ہیں وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ، الآیہ (الاعراف: 137) (اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنا دیا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی) وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ الآیہ (القصص:5) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباس اور قسامہ بن زہیر رضی اللہ عنہم نے سأورثکم پڑھا ہے یہ ورث سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الدار سے مراد الہلاک (ہلاک کرنا) ہے اور اس کی جمع ادوار ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کو غرق کیا تو سمندر کو حکم ارشاد فرمایا کہ ان کے جسموں کو ساحل پر پھینک دے، فرمایا: پس اس نے ایسے ہی کیا، تو بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک ہونے والے فاسق دکھا دیئے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

''میں پھیر دوں گا اپنی نشانیوں سے ان لوگوں (کی توجہ) کو جو غرور کرتے پھرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیوں کو (تو بھی) نہ ایمان لائیں ان پر اور دیکھ بھی لیں راہ رشد و ہدایت تب بھی نہ بنائیں اسے (اپنا) راستہ اور اگر دیکھیں گمراہی کے راستہ کو (تو جھٹ) بنا لیں اسے (اپنی راہ) غفلت برتنے والے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو، ضائع ہو گئے ان کے سارے اعمال۔ کیا انہیں جزا

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 543

دی جائے گی سوائے اس کے جو وہ کیا کرتے تھے؟ (ہرگز نہیں)''۔

قولہ تعالیٰ: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں اپنی کتاب کی فہم اور سمجھ سے روک دوں گا۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے بھی یہی کہا ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں اس کے سبب انہیں ایمان سے پھیر دوں گا۔ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہی آیات کے نفع سے پھیر دوں گا۔ اور یہ ان کے تکبر اور غرور کی جزا (اور بدلہ) ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف:5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اس معنی کی بناء پر آیات سے مراد معجزات ہیں یا نازل کردہ کتب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد زمین وآسمان کی تخلیق ہے یعنی میں انہیں ان کا اعتبار کرنے (مراد عبرت حاصل کرنے) سے پھیر دوں گا۔ یَتَكَبَّرُوْنَ یعنی وہ اپنے آپ کو افضل الخلق گمان کرتے ہیں۔ اور یہ گمان باطل ہے، پس اسی لیے فرمایا: بِغَیْرِ الْحَقِّ یعنی نہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرتے تھے اور نہ ہی اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے ان کی طرف توجہ کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا یعنی یہ ان تکبر کرنے والوں کا انداز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ وہ چھوڑ دیں راہ رشد و ہدایت کو اور وہ راہ ضلالت و گمراہی کی پیروی کریں، یعنی کفر کو دین بنا لیں۔ پھر اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یعنی یہ وہ فعل ہے جو میں نے ان کے ساتھ ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے کیا ہے۔

وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ یعنی وہ حق میں تدبر اور غور و فکر کرنے کے اعتبار سے غافلوں کی مثل ہیں۔ اور معنی میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے غافل ہوں جو اس کے سبب انہیں بدلہ اور سزا دی جائے گی، جیسے کہا جاتا ہے: ما أغفل فلان عما یراد به؟ (فلاں اس سے کتنا غافل ہے جس کا اس کے بارے ارادہ کیا جا رہا ہے؟) حضرت مالک بن دینار نے دونوں حرفوں میں یا کے ضمہ کے ساتھ وان یُرَوا پڑھا ہے یعنی یہ ان کے ساتھ کیا جائے گا۔ اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے سبیل الرُّشْد راء کو ضمہ اور شین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا اہل کوفہ نے را اور شین کے فتحہ کے ساتھ الرشد پڑھا ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو نے رُشْد اور رَشَد کے درمیان فرق کیا ہے۔ فرمایا: رُشْد اصلاح میں ہوتا ہے اور رَشَد دین میں ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: سیبویہ اس طرف گئے ہیں کہ رُشْد اور رَشَد سُخْط اور سَخَط کی مثل ہیں اور اسی طرح کسائی نے بھی کہا ہے۔ اور ابو عمرو سے صحیح اس کے سوا ہے جو ابو عبید نے کہا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: نصر بن علی نے اپنے باپ کے واسطہ سے ابو عمرو بن علاء سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب رشد آیت کے درمیان میں ہو تو اس میں شین ساکن ہو گی اور جب آیت کے سرے پر ہو تو وہ متحرک ہو گی۔ نحاس نے کہا ہے: رأس الآیہ سے مراد یہ ہے جیسے یہ آیت: وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (الکہف) پس آپ کے نزدیک یہ دونوں لغتیں ایک معنی میں ہیں، مگر آپ نے یہ فتحہ اس لیے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 544

دیا ہے تا کہ آیات متفق ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے: رَشَدَ یَرْشُدُ، رَشُدَ یَرْشُدُ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے رَشِدَ یَرْشَدُ، رُشْد اور رَشَد کا لغت میں حقیقی معنی ہے کہ انسان اس میں کامیاب ہو جس کا وہ ارادہ کرے اور یہ نقصان اور خسارے کی ضد ہے۔ (یعنی رشد کی ضد الخیبۃ ہے)

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

''اور بنالیا قوم موسیٰ نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا جو محض ڈھانچہ تھا اس سے گائے کی آواز آتی تھی، کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ وہ نہ بات کر سکتا ہے ان سے اور نہ انہیں ہدایت کی راہ بتا سکتا ہے، انہوں نے (خدا) بنالیا اسے اور وہ (بڑے) ظالم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے طور پر جانے کے بعد بنالیا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ (اپنے زیورات سے)۔ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے سوا اہل کوفہ نے اسے مِنْ حِلِيِّهِمْ حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے مِنْ حَلْيِهِمْ حا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ حَلْیٌ، حُلِیٌّ اور حِلِیٌّ کی جمع ہے، جیسے ثَدْی، ثُدِیٌّ اور ثِدِیٌّ ہیں۔

اس کی اصل حلُوی ہے، پھر واؤ کو یا میں مدغم کیا گیا اور لام یا کی مجاورت کے سبب مکسور ہوگئی اور لام کے کسرہ کی وجہ سے حا کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور حا کا ضمہ اصل کی بنا پر ہے۔ عِجْلًا یہ مفعول ہے (بچھڑا) جَسَدًا یہ نعت یا بدل ہے۔ لَّهٗ خُوَارٌ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ کہا جاتا ہے: خار یَخُور خُوارًا جب گائے آواز نکالے (یعنی وہ محض ڈھانچہ تھا اور اس سے گائے کی آواز آتی تھی) اس طرح جأر یَجْأر جُؤارا بھی ہے۔ جب کوئی بزدل اور کمزور ہو جائے تو کہا جاتا ہے خَور یَخْوَر خَوَرًا۔

بچھڑے کے قصص میں مروی ہے کہ سامری جس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا، اس کی نسبت سامرہ نامی گاؤں کی طرف کی جاتی ہے(1)۔ وہ قتل الابناء کے سال پیدا ہوا (یعنی اس سال جس میں فرعون نے بچوں کو قتل کروا دیا تھا)، اس کی ماں نے اسے پہاڑ کی ایک غار میں چھپا دیا۔ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اسے غذا پہنچائی (اور اس کی پرورش کی) پس اس وجہ سے اس نے آپ کو پہچان لیا۔ اور جب انہوں نے نر کی خواہشمند گھوڑی پر فرعون کو سمندر میں دھکیلنے کے لیے سمندر کو عبور کیا تو اس (سامر) نے گھوڑی کے کھر کے نشان سے ایک مشت مٹی اٹھالی۔ اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (طٰہٰ: 96) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے تیس دن کا وعدہ کیا تھا اور پھر جب مزید دس دن کی آپ نے تاخیر کر دی اور تیس راتیں گزر گئیں، تو آپ نے بنی اسرائیل کو کہا اور ان میں اس کی اطاعت و پیروی کی جاتی تھی۔ بلاشبہ تمہارے پاس آل فرعون کے زیورات میں سے زیورات ہیں۔ ان کی عید تھی جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور قبطیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 455

سے زیورات عاریۃً لیتے تھے پس آج بھی اسی لیے انہوں نے عاریۃً لیے ہوئے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر سے نکالا اور قبطیوں کو غرق کر دیا تو وہ زیورات انہیں کے قبضے میں رہ گئے، تو سامری نے انہیں کہا: بلاشبہ یہ تم پر حرام ہیں، پس جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ لے آؤ ہم انہیں جلا دیں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیورات وہ ہیں جو بنی اسرائیل نے قوم فرعون کے غرق ہونے کے بعد لیے تھے۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں کہا: بے شک یہ زیورات مال غنیمت ہے اور یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے، پس آپ نے ایک گڑھا کھدوا کر انہیں اس میں جمع کر دیا تو سامری نے انہیں اٹھا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس رات زیورات ادھار لیے جس رات انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے قبطیوں کو یہ وہم دلایا کہ ان کی شادی یا کوئی اجتماع ہے۔ اور سامری نے ان کا یہ قول سنا ہوا تھا اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:138) اور وہ الٰہ گائے کی شکل پر تھے تو اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا بنایا جو محض ڈھانچہ تھا، مگر وہ اس سے گائے کی آواز سنتے تھے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت اور خون میں بدل دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جب اس نے وہ مٹی کی مشت آگ میں ان زیورات پر ڈالی تو وہ بچھڑا بن گیا جس سے گائے کی آواز آتی تھی۔ پس اس نے ایک بار گائے کی آواز نکالی اور دوسری بار نہیں پھر اس نے قوم کو کہا: هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ (طٰہٰ:88) (یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے) وہ کہہ رہا ہے: وہ اسے بھول گیا اور اس کی تلاش میں چلے گئے اور اس سے بھٹک گئے، تو تم آؤ ہم اس بچھڑے کی عبادت کریں۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس حال میں بتایا کہ وہ مناجات میں مشغول تھے: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ (طٰہٰ) (کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! اس سامری نے ان کے زیور سے ان کے لیے بچھڑا بنایا ہے، پس اس کا جسم کس نے بنایا ہے؟۔ آپ کی مراد گوشت اور خون ہے۔ اور اس کے لیے گائے کی آواز کس نے بنائی ہے؟ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: میں نے۔ تو آپ نے عرض کی: تیری عزت وجلال کی قسم تیرے سوا انہیں کسی نے گمراہ نہیں کیا۔ رب کریم نے فرمایا: صدقت یاحکیم الحکماء (اے حکیم الحکماء تو نے سچ کہا ہے) اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (الاعراف:155) (نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش) اور قفال نے کہا ہے: سامری نے بچھڑے کا پیٹ خالی رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں ہوا بھر دی تھی، یہاں تک کہ اس سے گائے کی آواز آنے لگی اور اس نے انہیں وہم دلایا کہ بلاشبہ وہ اس طرح ہو گیا ہے جب اس نے اس ڈھانچے میں وہ مٹی ڈالی جو اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑوں کے قدموں سے اٹھائی تھی۔ اس کلام میں بہت کمزوری اور ضعف ہے۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ یہ بیان فرمایا کہ معبود کے لیے واجب اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ کلام کر سکے۔ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اور نہ وہ ان کی دلیل کی طرف کسی راستے کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اِتَّخَذُوْهُ انہوں نے اسے خدا بنا لیا ہے۔ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ یعنی وہ اس بچھڑے کو خدا بنانے میں اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ظلم

کرنے والے ہو گئے یعنی بچھڑے کو خدا بنانے کے سبب مشرک ہو گئے۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ یعنی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقررہ وقت پر واپس آنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے۔ حیرت زدہ شرمندہ آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: قد سُقِطَ فی یَدِہٖ (تحقیق وہ سخت نادم اور پشیمان ہے)۔ اخفش نے کہا ہے: اسے کہا جاتا ہے: سُقِطَ فی یدہ و أسقط اور جنہوں نے علی بناء الفاعل سَقط فی ایدیھم کہا ہے: ان کے نزدیک اس کا معنی ہے: سَقَطَ الندمُ (پشیمانی اور ندامت کا آنا)۔ ازہری اور نحاس وغیرہما نے یہی کہا ہے: ندامت دل میں ہوتی ہے، لیکن ذکر ید (ہاتھ) کا کیا ہے، کیونکہ جو کسی شے پر قابض ہو جائے اس کے لیے کہا جاتا ہے: قد حصل فی یدہ أمر کذا (تحقیق اس طرح کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ غالب اشیاء کے معاملات ہاتھ کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ (الحج: 10) (اس روز اسے بتایا جائے گا کہ یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا) اور یہ بھی کہ اگرچہ ندامت دل میں ہوتی ہے لیکن اس کا اثر بدن میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ نادم آدمی اپنا ہاتھ کاٹنے لگتا ہے اور اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا (کہف: 42) (پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا) یعنی وہ نادم ہوا۔ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (الفرقان: 27) یعنی ندامت کے سبب اس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور نادم انسان اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل استسار سے ہے اور اس سے مراد ایک آدمی کا دوسرے آدمی کو مارنا ہے یا اسے پچھاڑ دینا ہے پس وہ اسے ہاتھوں کے بل زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ اسے باندھ لے یا اس کی مشکیں کس لے، پس جسے گرایا گیا ہے وہ گرانے والے کے ہاتھ میں مسقوط بہ ہوتا ہے۔

وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف پلٹ گئے ہیں۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ یعنی وہ عبودیت کا اقرار اور استغفار کرنے لگے۔ حمزہ اور کسائی نے تا خطاب کے ساتھ ولئن لم ترحمنا ربنا و تغفرلنا پڑھا ہے۔ اس میں استغاثہ، تضرع، عجز وانکساری اور سوال و دعا میں خوب اصرار کرنے کا معنی ہے۔ ربنا حرف ندا کے حذف کے سبب منصوب ہے۔

اور دعا اور خشوع وخضوع میں یہی زیادہ بلیغ ہے۔ پس ان دونوں کی قراءت میں عجز وانکساری اور تضرع زیادہ ہے، لہٰذا یہی اولیٰ ہے۔

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖؗ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

''اور جب واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف خشمناک (اور) غمگین ہو کر (تو) بولے (اے قوم!) بہت بری جانشینی کی ہے تم نے میری میرے بعد، کیا تم نے جلد بازی کی اپنے رب کے فرمان سے اور (غصہ سے) پھینک دیں تختیاں اور پکڑ لیا سر اپنے بھائی کا (اور) کھینچا اسے اپنی طرف، ہارون نے کہا: اے میری ماں جائے! اس قوم نے کمزور و بے بس بنا دیا مجھے اور قریب تھا کہ قتل کر دیں مجھے، سو نہ ہنساؤ مجھ پر دشمنوں کو اور نہ شمار کرو مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ۔ موسیٰ نے التجاء کی اے میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو زیادہ رحم کرنے والا ہے تمام رحم کرنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا اس میں غَضْبَانَ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث غضبی ہے اور اس لیے کہ اس میں الف نون اس الف تانیث کی مثل ہے جو تیرے قول حمراء میں ہے اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اَسِفًا سے مراد شدید الغضب (سخت غصہ) ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ (1) نے فرمایا: اسف کا درجہ غضب کے بعد ہے یعنی جب غصہ غضب سے زیادہ شدید ہو تو اسف کہلاتا ہے (اور وہ آدمی) أَسِف وأَسِيف وأَسْفان اور أَسُوف کہلاتا ہے۔ اور الأسيف کا معنی حزین (غمگین) بھی ہے۔

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے عمل کی وجہ سے غمگین و پشیمان واپس لوٹے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ عزوجل نے آپ کو واپسی سے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ انہیں بچھڑے کے سبب فتنہ و آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے، پس اسی لیے آپ غصے کی حالت میں واپس لوٹے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام میں غصہ لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا، لیکن وہ بہت جلد اتر جاتا تھا، پس وہ جتنا زیادہ تھا اتنا جلدی اترتا تھا۔

ابن القاسم نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب غصے میں ہوتے تو آپ کی ٹوپی سے دھواں ظاہر ہوتا تھا اور آپ کے بدن کے بال آپ کے جبے کو اٹھا دیتے تھے اور یہ اس لیے ہے کہ غصہ ایک انگارہ ہے جو دل میں جلنے لگتا ہے۔ اسی لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جسے غصہ آئے وہ چت لیٹ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 77 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

جائے اور اگر اس کا غصہ ختم نہ ہو تو پھر وہ غسل کرے، پس اس کا لیٹنا اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دے گا اور اس کا غسل کرنا اسے زائل کر دے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تیز غصہ ہی اس کا سبب بنا تھا کہ آپ نے حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ دے مارا اور ان کی آنکھ پھوڑ دی۔ اس بارے علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا ذکر سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس لیے اجازت طلب کی کیونکہ وہ کلیم اللہ تھے۔ گویا کہ انہوں نے یہ جانا کہ جس کسی نے آپ پر جرأت کی یا آپ کی طرف اذیت کا ہاتھ بڑھایا تو یہ انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جب انہوں نے آپ پر حجت پیش کی تو آپ نے فرمایا: تو میری روح کہاں سے نکالے گا؟ کیا میرے منہ سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب سے کلام کی ہے یا میرے کان سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب کا کلام سنا ہے یا میرے ہاتھ سے، حالانکہ میں نے ان کے ساتھ تختیوں کو پکڑا ہے یا میرے پاؤں سے، حالانکہ میں طور پر رب کریم سے ہم کلام ہونے کے لیے ان پر کھڑا ہوا یا میری آنکھوں سے، حالانکہ اس کے نور سے میرا چہرہ چمک اٹھا، پس وہ لاجواب ہو کر اپنے رب کی طرف واپس لوٹ گیا۔

مصنف ابی داؤد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے تو اگر اس سے غصہ زائل ہو جائے (تو بہتر) ورنہ اسے چاہیے کہ وہ لیٹ جائے'' (1)۔

ابووائل القاص سے بھی مروی ہے انہوں نے بیان کیا: ہم عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے تو ایک آدمی نے ان سے گفتگو کی اور انہیں غصہ دلا دیا، تو آپ (مجلس سے) اٹھ گئے، پھر آپ اس حال میں واپس آئے کہ آپ نے وضو کیا ہوا تھا، انہوں نے فرمایا: میرے باپ نے میرے جد امجد عطیہ سے مجھے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور بلاشبہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور بلاشبہ آگ پانی کے ساتھ بجھائی جاتی ہے پس جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے وضو کرنا چاہیے'' (2)۔

قولہ تعالیٰ: بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قوم کی مذمت ہے، یعنی بہت برا عمل ہے جو تم نے میرے بعد کیا ہے۔ جو عمل مکروہ اور ناپسندیدہ ہو اس کے لیے خلفہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ خیر اور بھلائی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے: خلفہ بخیر او بشر فی أهلہ وقومہ بعد شخوصہ (یعنی اس نے اپنے گھر والوں اور اپنی قوم میں اپنی بلندی کے بعد خیر یا شر کو اپنا خلیفہ بنایا)

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ یعنی کیا تم اپنے رب کے فرمان سے سبقت لے گئے؟ اور العجلۃ سے مراد کسی شے کے ساتھ اس کے وقت سے پہلے آگے بڑھنا ہے اور یہ مذموم ہے۔ اور السرعۃ کا معنی ہے: عمل الشی فی أول أوقاتہ (کسی شی پر اس کے اول وقت میں عمل کرنا) اور یہ قابل تعریف ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 303 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 304

ایضاً، حدیث نمبر 4151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعقوب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: عجلتُ الشیئَ (یعنی) میں اس شے کی طرف سبقت لے گیا۔ اور أعجلتُ الرجلَ میں نے آدمی کو جلدی میں ڈالا، یعنی میں نے اسے عجلت پر ابھارا۔ اور أَمْرَ رَبِّكُمْ کا معنی ہے معیاد ربکم، یعنی تمہارے رب نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی تم نے اپنے رب کی ناراضگی لینے میں جلدی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم نے بچھڑے کی عبادت کرنے میں جلدی کی ہے اس سے پہلے کہ تمہارے رب کی طرف سے کوئی حکم تمہارے پاس آتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ اور آپ نے تختیاں پھینک دیں شدید غصے کی وجہ سے جو آپ پر اس وقت طاری ہوا جب آپ اپنی قوم کے پاس آئے اور وہ بچھڑے کی عبادت میں لگے ہوئے تھے، تو آپ ان کے معاملہ کو مہمل چھوڑنے اور اس پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اپنے بھائی پر غصے ہوئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر (1) نے کہا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے: لیس الخبرُ کالمعاینۃ (سنی ہوئی خبر دیکھی ہوئی شے کی مثل نہیں ہوتی)۔ اور وہ قابل التفات نہیں جو حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اگر وہ آپ سے صحیح ہے اور وہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے تختیوں کو اس وقت پھینکا جب آپ نے ان میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت دیکھی اور آپ کی امت کے لیے نہیں تھی۔ یہ ردی قول ہے اور قطعاً مناسب نہیں کہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ تختیاں ٹوٹ گئیں اور ان سے تفصیل اٹھالی گئی اور ہدایت اور رحمت ان میں باقی رہی۔

**مسئلہ نمبر 2۔** تحقیق بعض جاہل متصوفہ نے اس سے کپڑے پھینکنے کے جواز پر استدلال کیا ہے جب غنا پر ان کی خوشی انتہائی بڑھ جائے (اور وہ جھومنے لگیں) پھر ان میں سے بعض صحیح کپڑے پھینکتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو پہلے انہیں پھاڑ ڈالتے ہیں اور پھر پھینکتے ہیں۔ فرمایا: یہ لوگ ایک غیبی اور مخفی حالت میں ہوتے ہیں پس انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی قوم کے بچھڑے کی عبادت کرنے کے سبب جب غم غالب آگیا، تو آپ نے تختیاں پھینک دیں اور انہیں توڑ دیا اور آپ کو اس کا ادراک نہ ہوا جو آپ نے کیا۔

علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: کون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے صحیح قرار دے سکتا ہے کہ آپ نے تختیاں توڑنے کے لیے انہیں پھینک دیا؟ جو قرآن کریم میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے انہیں پھینکا، تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹ گئیں؟ پھر اگر کہا جائے کہ وہ ٹوٹ گئیں تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آپ نے انہیں توڑنے کا قصد اور ارادہ کیا؟ پھر اگر ہم اسے آپ سے صحیح قرار دیں تو ہم کہیں گے: آپ حالت غضب میں تھے، یہاں تک کہ اگر آپ کے سامنے آگ کا سمندر ہوتا تو آپ اس میں کود جاتے۔ اور کون ہے جو ان (متصوفہ) کی حالت غیبیہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے حالانکہ وہ دوسرے سے غنا کو سمجھ رہے ہوتے ہیں اور اگر ان کے پاس کنواں ہو تو اس سے بچتے اور ڈرتے بھی ہیں۔

پھر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے احوال کو ان سفہاء کے احوال پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ابن عقیل سے ان کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 457

وجد کرنے اور اپنے کپڑے پھاڑنے کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ خطا ہے اور حرام ہے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ایک کہنے والے نے آپ سے کہا: بلاشبہ وہ اسے نہیں جانتے ہوتے جو وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر وہ یہ جانتے ہوئے ایسی جگہوں پر حاضر ہوئے کہ ان پر خوشی غالب آجائے گی اور وہ ان کی عقلوں کو زائل کر دے گی تو وہ اس وجہ سے گنہگار ہوئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایسی جگہ داخل کیا جہاں انہوں نے کپڑے پھاڑنے وغیرہ جیسے فاسد کام کیے اور ان سے شریعت کا خطاب ساقط نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں حاضر ہونے سے پہلے انہیں یہ خطاب کیا جا چکا ہے کہ وہ ایسی جگہ سے اجتناب کریں جو انہیں اس حال تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ انہیں کوئی نشہ آور مشروب پینے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح یہ وہ شدید خوشی ہے جسے اہل تصوف وجد کا نام دیتے ہیں اگر وہ سچے ہیں کہ اس میں طبعی نشہ ہے اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو انہوں نے صحو کے باوجود فاسد کام کیا، پس اس میں دونوں حالتوں (صحو اور سکر) میں سلامتی نہیں ہے۔ اور شک کے مقامات سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ یعنی آپ نے اپنے بھائی کی ریش اور زلفیں کھینچیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے اور آپ بنی اسرائیل کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ محبوب تھے، کیونکہ آپ میں غصہ بہت کم (اور مزاج نرم) تھا۔

علماء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے بھائی کا سر پکڑنے کی چار تاویلیں کی ہیں:

(۱) یہ انداز ان کے عرف اور عادت میں عام تھا، جیسا کہ عرب اپنے بھائی اور ساتھی کی تعظیم و تکریم کے لیے اس کی ڈاڑھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں، تو یہ عمل بطریق تذلیل و رسوائی نہ ہوا۔

(۲) آپ پر تختیوں کے نزول نے آپ کو بہت خوش کر رکھا تھا، کیونکہ یہ اسی مناجات میں آپ پر نازل ہوئی تھیں اور آپ نے چاہا کہ آپ انہیں تورات سے پہلے بنی اسرائیل سے مخفی رکھیں۔ تو حضرت ہارون علیہ السلام نے آپ کو کہا: میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑو، تاکہ اس تذلیل کی وجہ سے بنی اسرائیل پر آپ کی خوشی مشتبہ نہ ہو جائے۔

(۳) آپ نے یہ عمل اس لیے کیا کیونکہ آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کے ساتھ بچھڑے کی پرستش کے عمل کی طرف مائل ہیں۔ اور اس طرح کا عمل انبیاء علیہم السلام کے لیے جائز نہیں ہوتا۔

(۴) آپ نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملایا تاکہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ اسے جان لے، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے اسے ناپسند کیا تاکہ بنی اسرائیل یہ گمان نہ کریں کہ آپ نے ان کی اہانت کی ہے۔ پھر آپ کے بھائی نے آپ کو جتایا کہ بنی اسرائیل نے اسے کمزور سمجھا، یعنی بچھڑے کی عبادت کرنے والوں نے اور قریب تھا کہ وہ اسے قتل کر دیتے۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھائی کا عذر سنا تو کہا: اے میرے رب! میری اور میرے بھائی کی مغفرت فرما (رب اغفرلی ولاخی) یعنی میں نے جس غصے کے سبب تختیاں پھینکیں ہیں میرا وہ عمل معاف فرما دے اور میرے بھائی کی مغفرت فرما، کیونکہ میں نے انہیں بنی اسرائیل کو روکنے میں کوتاہی کرنے والا گمان کیا ہے اگرچہ ان سے کوتاہی واقع نہیں ہوئی۔ یعنی تو میرے

بھائی کی مغفرت فرما اگر اس سے کوتاہی ہوئی ہے۔

حسن نے کہا ہے: حضرت ہارون علیہ السلام کے سوا ان تمام نے بچھڑے کی پرستش کی، کیونکہ اگر وہاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے سوا کوئی مومن ہوتا تو آپ اپنے قول میں صرف اس پر اکتفانہ کرتے: رب اغفرلی ولاخی، آپ یقیناً اس مومن کے لیے بھی دعا کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنے لیے اس فعل سے استغفار کیا جو آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا۔ آپ نے انہیں اس پر پانے کی وجہ سے ایسا کیا۔ جب کہ وہ اس عمل کے ساتھ ملحق نہ تھے تو انہوں نے جو کچھ ہوا اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا تا کہ آپ رجوع کرلیں پھر دونوں نے بنی اسرائیل کے عمل کا تدارک کیا۔ اسی لیے کہا: یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤاۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ الآیہ (طٰہٰ) (موسیٰ نے (آکر غصہ سے) کہا: اے ہارون! کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا)۔

تو حضرت ہارون علیہ السلام نے وضاحت کی کہ انہیں تو اپنے قتل کا خوف پیدا ہو گیا تھا پس یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ جسے برائی سے روکتے وقت اپنی جان پر قتل کا خوف ہو اس کے لیے سکوت اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کا بیان پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ غضب احکام کو تبدیل نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ نے آپ کے افعال میں سے کسی شی کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ یہ صرف تختیوں کو پھینکنے، بھائی کو عتاب کرنے اور حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ مارنے کا سبب بنا۔ مہدوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: چونکہ آپ کا غصہ اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے تھا اور بنی اسرائیل سے آپ کا سکوت ان کے باہم لڑنے اور متفرق ہونے کے خوف سے تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ابْنَ اُمَّ آپ ان کی ماں اور باپ دونوں کے بیٹے تھے (یعنی سگے بھائی تھے) البتہ یہ کلمہ انتہائی نرمی اور شفقت و مہربانی کا کلمہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے: کہا گیا ہے حضرت ہارون علیہ السلام صرف ماں کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے باپ کی طرف سے نہیں۔ لفظ ام کو میم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے فتحہ دیا ہے انہوں نے ابن ام کو ایک اسم قرار دیا ہے جیسے خمسۃ عشر۔ پس یہ تیرے اس قول کی طرح ہو گیا: یا خمسة عشر أقبلوا اور جنہوں نے کسرہ پڑھا ہے انہوں نے اسے ضمیر متکلم کی طرف مضاف کیا ہے پھر یا اضافت کو حذف کر دیا ہے، کیونکہ نداء کا دارو مدار حذف پر ہے اور انہوں نے میم میں کسرہ کو باقی رکھا ہے تا کہ وہ اضافت پر دلیل ہو جائے، جیسا کہ یہ قول یا عباد۔ اس پر ابن السمیقع کی قراءت یابن امی دلالت کرتی ہے کہ اس میں یا اپنے اصل پر ثابت ہے۔

کسائی، فراء اور ابو عبید نے کہا ہے: یہ یابن ام فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس کی تقدیر یابن أماہ ہے۔ اور بصریوں نے کہا: یہ قول غلط ہے، کیونکہ الف خفیف حرف ہے حذف نہیں ہو سکتا، البتہ اس نے دو اسموں کو ایک اسم بنا دیا ہے۔ اخفش اور ابو حاتم نے کہا ہے: یابن ام یعنی کسرہ کے ساتھ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: یا غلام غلام أقبل، یہ لغت شاذ ہے اور اس کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

قراءت کرنا بعید ہے۔ بلاشبہ یہ اس میں ہوتا ہے جو تیری طرف مضاف ہو۔ اور رہا وہ مضاف جو اس کی طرف مضاف ہو جو تیری طرف مضاف ہے تو اس میں وجہ یہ ہے کہ تو کہے: یا غلام غلامی، اور یا ابن اخی۔ اور یا ابن ام اور یا ابن عم بھی کلام میں اس کی کثرت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا ہے۔

زجاج اور نحاس نے کہا ہے: لیکن اس کی حسین اور جید وجہ یہ ہے کہ الابن کو ام اور عم کے ساتھ ملا کر ایک اسم بنا دیا جائے۔ یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہے: یا خمسة عشر أقبلوا پس یا کو حذف کر دیا گیا جیسے یا غلام سے اسے حذف کیا گیا۔ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ یعنی قوم نے مجھے ذلیل ورسوا کیا اور مجھے کمزور و بے بس بنا دیا۔ وَ كَادُوْا یعنی یہ قریب ہو گئے۔ يَقْتُلُوْنَنِیْ یہ لفظ دونوں نونوں کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے۔ اور غیر قرآن میں اس میں ادغام جائز ہوتا ہے۔ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ یعنی آپ دشمنوں کو خوش کیجئے۔ اور الشماتہ کا معنی ہے: السرور بما يصيب أخاك من المصائب في الدين والدنيا (یعنی تیرے کسی بھائی کو دین و دنیا میں مصائب و آلام میں سے جو پہنچے اس پر اظہار مسرت کرنا، شماتت کہلاتا ہے) اور یہ حرام ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: لا تظهر الشماتة بأخيك فيعافيه الله ويبليك (تو اپنے بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کر (کہیں ایسا نہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ اسے نجات عطا فرما دے اور تجھے اس میں مبتلا کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پناہ مانگتے تھے اور یہ عرض کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إني أعوذ بك من سوء القضاء ودرك الشقاء وشماتة الأعداء (1) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بری تقدیر سے، بدبختی پانے سے اور دشمنوں کی تکلیف پر خوش ہونے سے) اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا ما الدَّهرُ جر على أُناسٍ　كَلاكِلَه　أناخ　بآخرينا
فقل للشامتين بِنَا أَفِيقوا　سَيَلقَى الشامتون كما لَقِينا

حضرت مجاہد اور مالک بن دینار رحمہما اللہ نے تا کے نصب اور میم کے فتحہ کے ساتھ تَشْمَتْ اور الأعداء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے: تو میرے ساتھ وہ سلوک نہ کر جس کے سبب دشمن خوش اور مسرور ہوں (لا تفعل بي ما تشمت من أجله الأعداء) یعنی ان کی طرف سے ایسا کوئی فعل نہیں ہوا جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تبشمت دونوں ہی فتحہ مروی ہے اور الأعداء نصب کے ساتھ ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اے میرے رب! تو مجھ پر خوش نہ ہو۔ اور یہ جائز ہے جیسا کہ یہ قول ہے: اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:15) وغیرہ۔ پھر مقصود اور مراد کی طرف رجوع فرمایا اور وہ فعل مضمر کر دیا جس کے ساتھ الْاَعْدَآءَ کو نصب دی، گویا کہ اس طرح فرمایا: ولا تشمت بي الأعداء۔

ابو عبید نے کہا ہے: میں نے حمید سے بیان کیا ہے کہ یہ فلا تشمت میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں، کیونکہ اگر یہ شمت سے ہو تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور اگر یہ اشمت سے ہے تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (ظالمین

1۔ صحیح بخاری، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 979

سے ) مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

”بے شک انہوں نے بنالیا بچھڑے کو معبود جلدی ہی پہنچے گا انہیں غضب ان کے رب کی طرف سے اور رسوائی دنیا کی زندگی میں اور اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں بہتان باندھنے والوں کو۔ اور جنہوں نے کیے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے بے شک آپ کا رب اس کے بعد بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے“۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب ہونے کا معنی سزا ہے۔ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کیونکہ انہیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذلت سے مراد جزیہ ہے۔ لیکن یہ معنی بعید ہے، کیونکہ جزیہ ان سے نہیں لیا گیا تھا بلکہ ان کی اولاد سے لیا گیا تھا۔ پھر یہ کہا گیا ہے: یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام مکمل ہو رہا ہے، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے دی ہے اور کلام مکمل ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ یہ قول حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے اس سے پہلے کہ آپ کی قوم اپنے آپ کو قتل کرنے کے ساتھ توبہ کرے، کیونکہ جب انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس قتل عظیم کے بعد انہیں معاف فرما دیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ ان میں سے جو مقتول ہوا وہ شہید ہے اور جو زندہ باقی رہا تو اس کی بخشش کر دی گئی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وہاں ایک گروہ تھا ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ڈال دی گئی، انہوں نے توبہ نہیں کی، پس ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سے مراد وہی لوگ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات سے واپس لوٹنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ان کی اولاد ہے۔ اور وہ وہ ہے جو بنی قریظہ اور بنی نضیر پر وقوع پذیر ہوا، یعنی عنقریب ان کی اولاد کو (غضب الٰہی) پہنچے گا۔ واللہ اعلم

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ یعنی جس طرح کا سلوک ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے اسی طرح ہم بہتان باندھنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کوئی بدعت کا ارتکاب کرنے والا نہیں ہے مگر وہ اپنے سر پر ذلت و رسوائی کو پاتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ یعنی مبتدعین (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور اس سے خون بہنے لگا اور آپ نے اسے مبرد کے ساتھ ٹھنڈا کیا

اور اسے خون سمیت سمندر میں پھینک دیا اور انہیں اس سے پانی پینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس جس کسی نے اس بچھڑے کی عبادت کی تھی اور اسے وہ پانی پلایا گیا تو وہ اس کے منہ کی اطراف پر ظاہر ہو گیا۔ پس اس سے بچھڑے کی عبادت کرنے والے پہچان لیے گئے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی بے شک اللہ تعالیٰ شرک وغیرہ سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ یہ بھی کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ یعنی جنہوں نے کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا۔ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا ایسا کرنے کے بعد پھر انہوں نے توبہ کر لی۔ وَاٰمَنُوْٓا ۫ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا یعنی بلاشبہ آپ کا رب توبہ کے بعد لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ مغفرت فرمانے والا رحم فرمانے والا ہے۔

## وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

"اور جب فرو ہو گیا موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ تو اٹھا لیا ان تختیوں کو اور ان کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اس میں سَكَتَ بمعنی سکن (ساکن ہونا، فرو ہونا) ہے۔ اسی طرح معاویہ ابن قرہ نے سکن نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ سکوت میں اصل سکون اور امساک (رک جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے جری الوادی ثلاثا ثم سکن، یعنی پھر وادی چلنے سے رک گئی۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سكت موسى عن الغضب تو اس میں قلب کیا گیا ہے۔ جیسے تیرا یہ قول ہے: أدخلتُ الأصبع في الخاتم (میں نے انگلی انگوٹھی میں داخل کی) اور أدخلت الخاتم في الأصبع (میں نے انگوٹھی انگلی میں داخل کی) أدخلت القلنسوة في رأسي (میں نے ٹوپی اپنے سر میں داخل کی) اور أدخلت رأسي في القلنسوة (میں نے اپنا سر ٹوپی میں داخل کیا)

اَخَذَ الْاَلْوَاحَ یعنی آپ نے ان تختیوں کو اٹھا لیا جنہیں آپ نے پھینکا تھا۔ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ یعنی ان کی تحریر میں ضلالت و گمراہی سے ہدایت اور عذاب سے رحمت تھی۔ اور نسخ کا معنی ہے: نقل ما في كتاب إلى كتاب آخر (یعنی جو کچھ ایک کتاب میں تحریر ہے اسے دوسری کتاب میں منتقل کرنا) جس اصل سے تو نے لکھا اسے نسخہ اور فرع کو بھی نسخہ کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے: جب تختیاں ٹوٹ گئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن روزے رکھے، پھر وہ آپ پر واپس کر دی گئیں اور آپ کو وہ تختیاں دو تختیوں میں لوٹا دی گئیں (1) اور ان سے کوئی شے مفقود نہ کی تھی۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اس بنا پر وَفِيْ نُسْخَتِهَا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ ٹوٹی ہوئی تختیوں میں تحریر تھا اور وہ نئی تختیوں میں منتقل کیا گیا وہ ہدایت اور رحمت ہے۔ اور حضرت عطا نے بیان کیا ہے: اور اس میں جو ان میں سے باقی بچا اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ اور ان میں سے ساتویں تختی کے سوا کوئی باقی نہ رہی اور ان میں سے چھ ختم ہو گئیں۔ لیکن حدود و احکام

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 549

میں سے کوئی شے ختم نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ فِیْ نُسْخَتِهَا کا معنی ہے: آپ کے لیے ان تختیوں میں جو کچھ لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے اس میں ہدایت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کچھ ان میں لکھا گیا ہے اس میں ہدایت اور رحمت ہے، پس وہ اس اصل کے محتاج نہیں ہیں جس سے یہ منقول ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: النسخ ما یقول فلان، یعنی اپنی کتاب میں وہی کچھ لکھ دے جو فلاں کہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ یہ بمعنی یخافون ہے (یعنی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ لِرَبِّهِمْ کے لام میں تین اقوال ہیں: کوفیوں نے کہا ہے یہ لام زائدہ ہے۔ کسائی نے کہا ہے: مجھے اس نے بتایا ہے جس نے فرزدق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نقدت لها مائة درهم بمعنی نقدتها (میں نے سو درہم گنے) اور بعض نے کہا ہے: یہ لام اجل ہے، معنی یہ ہے: وہ لوگ جو اپنے رب کی وجہ سے ڈرتے ہیں نہ ان میں ریا کاری ہے اور نہ شہرت، یہ اخفش سے منقول ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ لام مصدر کے متعلق ہے معنی یہ ہے: للذین هم رهبتهم لربهم (ان لوگوں کے لیے جن کا خوف اور ڈر اپنے رب کے لیے ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب مفعول مقدم ہو تو لام داخل کرنا اچھا اور حسین ہوتا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے: اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (یوسف) پس جب معمول مقدم ہو اور وہ مفعول ہو تو فعل کا عمل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے پس یہ اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو متعدی نہیں ہوتا۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور چن لیے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے وعدۂ ملاقات کے لیے پھر جب پکڑ لیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے تو موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی، کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم سے، نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش۔ تو گمراہ کرتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ہی ہمارا کارفرما ہے بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا اس میں قَوْمَهٗ اور سَبْعِيْنَ رَجُلًا دو مفعول ہیں اور ان میں سے ایک سے مِن کو حذف کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے یہ شعر بیان کیا ہے:

مِنَّا الَّذِي اُخْتِيرَ الرِّجَالَ سَمَاحَةً وَبِرًّا إِذَا هَبَّ الرِّيَاحُ الزَّعَازِعُ(1)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 155

اور راعی نے ایک آدمی کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے:

اختَرْتُكَ النَّاسَ إذ رَثَّتْ خلائقُهُم  واختلَّ من كان يُرْجَى عنده السُّولُ

اس میں مراد اخترتُكَ من النّاس ہے۔ اختار اصل میں اختیر ہے۔ پس جب یا متحرک ماقبل مفتوح ہے تو اسے الف سے بدل دیا گیا، جیسے قال اور باع۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی جب وہ مر گئے۔ لغت میں الرجفة سے مراد شدید زلزلہ ہے۔ روایت ہے کہ ان پر زلزلہ آیا، یہاں تک کہ وہ مر گئے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتا، جیسے اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ (النساء: 176) (اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے) اور وَ اِيَّايَ معطوف ہے۔ معنی یہ ہے: اگر تو چاہتا تو ہمیں موت دے دیتا ہم بنی اسرائیل کی موجودگی میں اس سے پہلے کہ ہم وعدہ ملاقات کے لیے نکلتے تاکہ وہ مجھے متہم نہ کرتے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے کہا ہے: یحییٰ بن سعید القطان نے سفیان سے، انہوں نے ابواسحاق سے، انہوں نے عمارہ بن عبد سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام چلے اور ان کے ساتھ شبر اور شبیر بھی نکلے۔ یہ دونوں حضرت ہارون علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ پس وہ سب ایک پہاڑ کے پاس رکے اس میں ایک چارپائی تھی، تو حضرت ہارون علیہ السلام اس پر آرام فرما ہوئے تو ان کی روح قبض کر لی گئی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مراجعت فرما ہوئے، تو انہوں نے کہا: تم نے انہیں قتل کر دیا ہے، تم نے ہمارے ساتھ ان کی نرمی اور خوش اخلاقی پر حسد کیا ہے یا انہوں نے اسی طرح کا کلام کیا۔ یہ شک سفیان کو ہے۔

تو آپ نے فرمایا: میں انہیں کیسے قتل کر سکتا تھا حالانکہ ان کے دو بیٹے میرے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا: پس تم چن لو جسے تم چاہو۔ تو انہوں نے ہر قبیلے سے دس افراد چن لیے۔ آپ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: پس اسی کے متعلق یہ ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا وہ تمام آپ (ہارون علیہ السلام) کے پاس جا کر رکے اور کہا: اے ہارون! تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: ما قتلني أحد ولكن الله توفاني (مجھے کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے موت دی ہے) وہ کہنے لگے: اے موسیٰ (علیہ السلام) فیصلہ نہیں ہو رہا۔ تو زلزلے نے انہیں پکڑ لیا، پس وہ دائیں بائیں جھولنے لگے اور آپ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کہتے ہیں: لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ فرمایا: پس آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا اور ان تمام کو انبیاء بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اس قول کی وجہ سے انہیں شدید زلزلے نے پکڑ لیا۔ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء: 153) (تم ہمیں اللہ تعالیٰ کا ظاہر دیدار کراؤ) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (البقرہ: 55) (اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم

دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں شدید زلزلے نے اس لیے پکڑ لیا، کیونکہ انہوں نے انہیں منع نہیں کیا تھا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی، حالانکہ وہ اس کی عبادت پر راضی نہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ستر افراد ان کے سوا تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی زیارت ظاہراً کراؤ۔ اور وہب نے کہا(1) ہے: وہ مرے نہیں تھے، بلکہ انہیں شدید زلزلے نے پکڑا تو وہ ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس طرح ہو گئے کہ ان کے جوڑ جوڑ جدا جدا ہو جائیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی موت کا خوف لاحق ہو گیا۔ حالانکہ سورۃ البقرہ میں حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت گزر چکی ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات مردہ حالت میں رہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں زلزلہ کے پکڑنے کا سبب ان کے علاوہ ہے۔ صحیح سبب کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قول باری تعالیٰ: اَتُهْلِكُنَا میں مقصود استفہام انکاری ہے یعنی تو اس طرح نہیں کرے گا۔ اور عرب کلام میں اس کا استعمال کثیر ہے۔ اور جب کلام نفی ہو تو وہ بمعنی ایجاب ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ألستم خيرَ مَنْ ركب المطايا وأنْدَى العالمين بُطونَ راحِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی دعا اور طلب ہے، یعنی تو ہمیں ہلاک نہ کر اور اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے مراد وہ قوم ہے جو زلزلہ کے سبب مری۔ اور مبرد نے کہا ہے: استفہام سے مراد استفہام برائے استعظام ہے۔ گویا وہ کہہ رہے ہیں: تو ہمیں ہلاک نہ کر، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض ہلاک نہیں کرتا۔ لیکن آپ نے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی طرح کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ:118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) بعض نے کہا: سفہاء سے مراد یہی ستر افراد ہیں۔ اور معنی یہ ہے: کیا تو بنی اسرائیل کو اس عمل کے عوض ہلاک کر دے گا جو ان بےوقوفوں نے یہ قول کہہ کر کیا: اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء:153)

اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش اور تیرا امتحان۔ اس میں آپ نے فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف کی ہے اپنی طرف اس کی نسبت نہیں کی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۞ (الشعراء) اس میں انہوں نے مرض (بیماری) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔ اور حضرت یوشع نے کہا ہے تھا: وَمَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (الکہف:63) (اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے) بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا استفادہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا جوان کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ (طٰہٰ:85) پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آئے تو دیکھا بچھڑا عبادت کے لیے کھڑا کیا گیا ہے اور اس کی آواز گائے کی طرح ہے۔ تو آپ نے کہا: اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش تو فتنہ کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (جسے تو چاہتا ہے اور تو ہدایت دیتا

1۔ معالم التنزیل، جلد2، صفحہ 550

ہے جسے تو چاہتا ہے) یہ قدر یہ کا رد ہے۔

وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں خیر و برکت اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف۔ اللہ نے فرمایا: میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً یعنی تو ہمیں ایسے اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرما جن کے عوض ہمارے لیے نیکیاں لکھی جائیں۔ وَّ فِي الْاٰخِرَةِ یعنی (آخرت میں) ان پر جزا ہو۔

اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ یہ حضرت مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور الھود کا معنی توبہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ یعنی جو اس کے مستحق ہیں، یعنی یہ زلزلہ اور صاعقہ میری طرف سے عذاب ہے میں اسے پہنچاتا ہوں جسے چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ مَنْ اَشَآءُ کا معنی ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ میں اسے گمراہ کر دوں۔

قولہ: وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ اس میں عموم ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، یعنی جو بھی اس میں داخل ہو یہ اس سے عاجز نہیں (یعنی ہر شے اس عموم میں داخل ہے) اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری رحمت مخلوق میں سے ہر شے پر کشادہ ہے یہاں تک کہ چوپائے بھی اپنی اولاد پر رحمت کناں اور مہربان ہیں۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے: اس آیت میں ہر شے حتیٰ کہ ابلیس بھی شامل ہے، پس اس نے کہا: میں بھی شے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (سو میں اس کو لکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں) پھر یہود و نصاریٰ نے کہا: نحن متقون (ہم متقی ہیں) تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الآیہ (الاعراف: 157) (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے) پس یہ آیت عموم سے نکل گئی، والحمد للہ۔ حماد بن سلمہ نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت کے لیے لکھا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462

التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"(یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔ وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔ پس جو لوگ ایمان لائے اس (نبی امی) پر اور تعظیم کی آپ کی اور امداد کی آپ کی اور پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا آپ کے ساتھ وہی (خوش نصیب) کامیاب و کامران ہیں"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے نوف بکالی حمیری (1) سے روایت بیان کی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے وعدہ ملاقات کے لیے اپنی قوم کے ستر افراد چن لیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں تمہارے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنا دوں تم نماز پڑھ سکو گے جہاں تمہیں نماز کا وقت آ پہنچے سوائے غسل خانہ یا حمام یا قبرستان کے اور یہ کہ میں تمہارے دلوں میں سکینہ رکھ دوں اور میں تمہیں اس طرح بنا دوں کہ تم تورات حفظ اور از بر پڑھنے لگو، تم میں سے مرد و عورت، آزاد و غلام اور صغیر و کبیر سبھی اسے پڑھ سکیں گے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بارے اپنی قوم کو بتایا، تو انہوں نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ہم گرجا گھروں کے بغیر نماز پڑھیں اور نہ ہم اپنے دلوں میں سکینہ اٹھانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ سکینہ اس طرح ہو جیسے پہلے اور تابوت میں تھی اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم تورات کو دیکھے بغیر پڑھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ پس اسے اس امت کے لیے بنا دیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار، تو مجھے ان کا نبی بنا دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان کا نبی ان میں سے ہوگا۔ پھر عرض کی: اے میرے رب! مجھے ان میں سے بنا دے۔ فرمایا: تم انہیں ہرگز نہ پا سکو گے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! میں تیرے پاس بنی اسرائیل کا وفد لے کر آیا ہوں، تو نے ہمارے وفد کا تحفہ ہمارے سوا دوسروں کو عطا فرما دیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 101

بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۝ (اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے)

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر راضی ہو گئے۔ نوف نے کہا(1) ہے: پس تم اس اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرو جس نے بنی اسرائیل کا تحفہ تمہیں عطا فرمایا ہے۔ ابونعیم نے بھی یہ قصہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ بن ابی عمرو شیبانی نے بتایا ہے انہوں نے کہا مجھے نوف بکالی نے بیان کیا ہے جب انہوں نے وعظ ونصیحت شروع کیا فرمایا: کیا تم اپنے اس رب کی حمد وثنا بیان نہیں کرو گے جس نے تمہاری حالت غیوبت میں تمہاری حفاظت کی اور اس نے تمہیں تمہارے نصیب کے بعد بھی مزید عطا کیا اور قوم بنی اسرائیل کو دیا جانے والا تحفہ تمہارے لیے رکھ چھوڑا۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا وفد لے کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں نے تمہارے لیے زمین کو مسجد بنا دیا ہے اس طرح کہ اس میں جہاں بھی تم نماز پڑھو گے میں تمہاری نماز قبول کرلوں گا سوائے تین جگہوں کے جس نے ان میں نماز پڑھی میں اس کی نماز قبول نہیں کروں گا اور وہ قبرستان، حمام اور غسلخانہ ہے۔ تو انہوں نے کہا: نہیں، مگر کنیسہ میں۔ رب کریم نے فرمایا: میں نے تمہارے لیے مٹی کو پاکیزہ بنا دیا ہے جب تم پانی نہ پاؤ (تو اس سے طہارت حاصل کرلو) انہوں نے کہا: نہیں مگر پانی کے ساتھ۔ فرمایا: اور میں نے تمہیں اس طرح بنا دیا ہے کہ جس نے اکیلے نماز پڑھی تو میں اس کی نماز قبول کرلوں گا۔ انہوں نے کہا: نہیں، مگر جماعت کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ان الفاظ نے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے(2) یہودی ونصاریٰ کو اس اشتراک سے خارج کر دیا ہے جو اس قول فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ وعدہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے خاص ہو گیا۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم وغیرہما نے کہا ہے۔ اور يَتَّبِعُوْنَ کا مفہوم ہے یعنی وہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، آپ کے دین اور آپ کے لائے ہوئے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔ رسول اور نبی دو اسم ہیں اور دو معنوں کے لیے ہیں، کیونکہ رسول نبی کی نسبت اخص ہوتا ہے اور لفظ رسول کو معنی رسالت کے اہتمام کے لیے مقدم کیا گیا ہے، ورنہ معنوی اعتبار سے نبوت مقدم ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کا رد کیا جب انہوں نے یہ کہا: وبرسولك الذی أرسلت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: قل آمنتُ بنبیك الذی أرسلت یعنی کہو میں تیرے اس نبی کے ساتھ ایمان لایا جسے تو نے مبعوث فرمایا) یہ صحیح میں مذکور ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کے قول: وبرسولك الذی أرسلت میں رسالت کا ذکر مکرر ہے۔ اور اس کا معنی ایک ہے پس یہ ایسی زیادتی کی مثل ہو جائے گا جس میں کوئی فائدہ نہیں، بخلاف اس قول کے وبنبیك الذی أرسلت کیونکہ نبوت و رسالت میں کوئی تکرار نہیں ہے(3)۔ اس بنا پر ہر رسول نبی ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں، کیونکہ رسول اور نبی دونوں امر عام میں مشترک ہیں اور وہ ہے النبأ (خبر دینا مراد نبوت ہے) اور امر خاص میں دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور وہ ہے رسالت۔ پس جب تو نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہیں تو یہ اس معنی کو بھی متضمن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 461 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 462 3۔ ایضاً

اور رسول ہیں۔ اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دیگر انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے بارے میں بھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: الْاُمِّیَّ یہ امۃ امیتکی طرف منسوب ہے، وہ جو اپنی ولادت کی اصل حالت پر ہو، نہ وہ لکھنا سیکھے اور نہ ہی پڑھنا۔ یہ ابن عزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے نہ وہ لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں اور نہ وہ حساب لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ (العنکبوت: 48) (اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے)

اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب الحديث (1) (بے شک ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ شمار کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ ام القریٰ کی طرف نسبت ہے (اس وجہ سے آپ کو امی کہا گیا ہے) اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں محمد بن سنان نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں فلیح نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ہلال نے عطا بن یسار سے بیان کیا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما (2) سے ملاقات کی اور میں نے کہا: تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے بارے میں مجھے بتایئے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہاں قسم بخدا! بے شک تورات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض وہ صفات بیان کی گی ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا (الاحزاب) اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا) اور امیوں کے لیے پناہ گاہ بنا کر بھیجا، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ اکھڑ مزاج اور تند خو نہیں ہیں اور نہ آپ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں، آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے ہیں بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کی روح قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ان کے سبب ٹیڑھی ملت کو سیدھا کر دے۔ اس طرح کہ وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے لگیں اور وہ اس کے ساتھ اندھی آنکھوں کو، بہرے کانوں کو اور بند دلوں کو کھول دے۔

(بخاری کے علاوہ دوسری کتب میں ہے) حضرت عطا نے بیان کیا: پھر میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے ملا اور اسی کے بارے ان سے سوال کیا تو دونوں کے الفاظ میں کوئی اختلاف نہ ہوا (یعنی انہوں نے بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسا جواب دیا) مگر یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان میں فرمایا: قلوبا غلوفيا وآذانا صموميا وأعينا عموميا۔ ابن عطیہ (3) نے کہا ہے: میں یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ وہم ہے یا عجمہ ہے۔ تحقیق حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے: قلوبا غلوفا وآذانا صموما وأعينا عموميا۔ علامہ طبری نے کہا ہے: یہ قبیلہ حمیر کی لغت ہے۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں مزید یہ بیان کیں: آپ کا مولد شریف مکہ مکرمہ ہے۔ اور آپ کی ہجرت گاہ طابہ ہے اور آپ کا ملک

1۔ صحیح مسلم، کتاب القیام، جلد 1، صفحہ 347 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462 3۔ ایضاً

شام ہے۔ آپ کی امت حمد اور تعریف بیان کرنے والی ہے وہ ہر حال اور ہر منزل میں الله تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے، وہ اپنے اعضاء کو وضو میں دھوئیں گے اور اپنی پنڈلیوں کے نصف تک چادریں باندھیں گے، دھوپ کو پسند کرنے والے ہوں گے اور وہ وہیں نماز پڑھیں گے جہاں انہیں نماز نے آلیا اگرچہ جھاڑو مارتے ہوئے۔ میدان جہاد میں ان کی صف نماز میں ان کی صف کی مثل ہوگی۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف) (بے شک الله تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے)

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ انہیں شرک چھوڑنے، مکارم اخلاق اپنانے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ انہیں منکر یعنی بتوں کی عبادت کرنے اور قطع تعلقی سے منع کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات سے مراد محللات (حلال چیزیں) ہیں۔ تو گویا آپ نے محللات کو طیب کی صفت سے متصف کیا ہے، کیونکہ یہ ایسا لفظ ہے جو مدح وتشریف کو متضمن ہے۔ اور اس اعتبار سے خبائث کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ ان سے مراد محرمات (حرام چیزیں) ہیں اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: خبائث سے مراد خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ہے۔ اور اس بنا پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے متقذرات (ناپسندیدہ چیزیں) مثلاً سانپ، بچھو، گبریلا وغیرہ کو حلال قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات وہ ہیں جو کھانے کے اعتبار سے طیب اور پاکیزہ ہوں مگر ان کے نزدیک یہ لفظ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ کھانے اور ذائقے کے اعتبار سے اس کا عموم شراب اور خنزیر کو حلال کرنے کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ آپ اسے ان چیزوں کے ساتھ مختص قرار دیتے ہیں جنہیں شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ اور آپ لفظ خبائث کو عام قرار دیتے ہیں اور یہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو شرعاً محرمات ہیں یا متقذرات ہیں۔ پس وہ بچھوؤں، گبریلوں اور چھپکلی اور ان جیسی دیگر چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ پس لوگوں کے یہی دونوں نظریے ہیں اور سورۃ البقرہ میں یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ، الاصر کا معنی ثقل اور بوجھ ہے(1)۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن جبیر نے یہی کہا ہے۔ اور اصر سے مراد عہد بھی ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور یہ آیت دونوں معنوں کو جامع ہے، کیونکہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ بوجھل اور بھاری اعمال کے ساتھ قائم رہیں، پس الله تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ان سے وہ عہد اور ان اعمال کا بوجھ اتار لیا، جیسا کہ پیشاب کو دھونا اور مال غنیمت کو حلال کر دینا، حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، اس کے ساتھ مل کر کھانا اور اس کے ہمراہ لیٹنا وغیرہ، کیونکہ ان میں سے اگر کسی کے کپڑے پر پیشاب لگ جاتا تو وہ اسے کاٹ دیتا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ اگر ان کی جلد پر پیشاب لگ جاتا اور جب وہ مال غنیمت جمع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463

کرتے تو آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی اور وہ اسے کھا جاتی (1) اور جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تو وہ اس کے قریب نہ جاتے۔ علاوہ ازیں بھی اسی طرح احکام تھے جو حدیث صحیح وغیرہ میں ثابت ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ پس اغلال (زنجیریں) انہیں بوجھوں کے لیے مجاز اً ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان بوجھوں میں سے ہفتے کے دن کاروبار چھوڑنا بھی ہے، کیونکہ یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہفتے کے دن ایک آدمی کو گھاس (کانٹے) اٹھائے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن ماردی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے (2)۔ اور ان میں دیت نہ تھی، البتہ قصاص تھا۔ اور ان کی توبہ کی علامت کے طور پر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ آپس میں قتال کریں، علاوہ ازیں بھی احکام تھے۔ پس انہیں بھی اغلال کے ساتھ تشبیہ دی گئی، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فليس كعهد الدّار يا أم مالك ولكن أحاطت بالرقاب السلاسل(3)

وعاد الفتى كالكَهْل ليس بقائل سوى العدل شيئا فاستراح العواذل

پس حدود اسلام اور ممنوعات کی طرف قدم بڑھانے کے موانع کو ایسی زنجیروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو گردنوں کو گھیرے ہوئے ہوں۔ اور اس معنی میں ابو احمد بن جحش کا ابو سفیان کے لیے قول ہے:

إذهب بها إذهب بها طُوِّقتَها طوقَ الحمامه

یعنی اس کی عار تجھے لازم ہے۔ کہا جاتا ہے: طوق فلان كذا جب وہ اسے لازم پکڑ لے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اگر کہا جائے: أغلال جو کہ جمع ہے اس کا عطف اصر پر کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ مفرد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصر مصدر ہے اور اس کا اطلاق کثرت پر ہوتا ہے۔ اور ابن عامر نے تو آصارھم جمع کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا أعمالهم ہے۔ اور اس کی جمع گناہوں کی اقسام مختلف ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور باقیوں نے اسے واحد پڑھا ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے اور اس کا اطلاق اپنی جنس کے قلیل و کثیر افراد پر ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ لفظاً مفرد ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا (البقرہ: 286) میں اس کے مفرد ہونے پر اجماع ہے۔ اور اسی طرح کا معنی ہوگا جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ آئیں گے، مثلاً وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (البقرہ: 7) لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ (ابراہیم: 43) اور مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (الشوریٰ: 45) یہ تمام الفاظ جمع کے معنی میں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ یعنی انہوں نے آپ کی عزت و توقیر کی اور آپ کی مدد کی۔ اخفش نے کہا: جحدری اور عیسیٰ نے تخفیف کے ساتھ وعزروہ پڑھا ہے اور اسی طرح عزرتموھم میں بھی ہے کہا جاتا ہے: عَزَرَہٗ یَعْزِرُہٗ و یَعْزِرُہٗ اور التُّعْزِیر سے قرآن کریم اور الفلاح سے مراد مطلوب کو پانے میں کامیاب ہونا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

---

1۔ جامع ترمذی، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 464

الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

''آپ فرمایئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف وہ اللہ جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اس کی تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ''۔

ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے بارے میں یہ کہیں: اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا(1) (بے شک میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں) اور كَلِمٰتِهٖ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ کلمات ہیں جو اس نے تورات، انجیل اور قرآن کریم میں لکھے ہیں۔

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

''اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے''۔

یعنی وہ لوگوں کو ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور يَعْدِلُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ حکم اور فیصلہ میں عدل کرتے ہیں اور تفسیر میں ہے: یہ ایک قوم ہے جو چین سے پرے اور دریائے رمل سے پرے ہے۔ وہ حق اور عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، وہ حضور نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور ہفتہ کو (کاروبار) چھوڑ دیا، وہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہم میں سے کوئی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ پس یہ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اختلاف رونما ہوا تو ان میں سے ایک گروہ تھا جو حق کے ساتھ راہ بتاتے تھے اور وہ اس پر قادر نہ تھے کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی زمین کے ایک کنارہ کی طرف مخلوق سے الگ تھلگ کر کے نکال دیا، پس ان کے لیے زمین میں ایک راستہ بن گیا، وہ اس میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے یہاں تک کہ وہ چین سے پرے نکل گئے اور وہ اب تک حق پر ہیں۔ ان کے درمیان اور لوگوں کے درمیان ایک سمندر ہے جس کی وجہ سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت جبرئیل امین علیہ السلام شب معراج حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ان کے پاس گئے۔ پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور آپ نے انہیں قرآن کریم کی سورتوں کی تعلیم دی اور پھر انہیں فرمایا: ''کیا تمہارا کیل اور وزن کا کوئی پیمانہ ہے''؟ انہوں نے بتایا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے''؟ انہوں نے بتایا: ہم کھلی زمین کی طرف نکلتے ہیں اور فصل کاشت کرتے ہیں، پھر جب ہم اسے کاٹ لیں تو اسے وہیں رکھ دیتے ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اس کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ قل یایہا الناس، جلد 2، صفحہ 668

حاجت اور ضرورت ہو تو وہ اپنی حاجت کے مطابق اس سے لے لیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہاری عورتیں کہاں ہیں"؟ انہوں نے بتایا: وہ ہماری ایک طرف (کنارے) میں ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اپنی بیوی کی حاجت اور ضرورت ہو تو وہ حاجت کے وقت اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: "کیا تم میں سے کوئی اپنی بات میں جھوٹ بولتا ہے"؟ تو انہوں نے بتایا: اگر ہم میں سے کوئی اس طرح کرے تو بھڑکتی آگ اسے پکڑ لیتی ہے، بے شک آگ اترتی ہے اور اسے جلا دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا: "کیا وجہ ہے تمہارے گھر ہموار اور برابر ہیں"؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے بعض بعض سے بلند نہ ہوں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا وجہ ہے تمہاری قبریں تمہارے دروازوں پر ہیں"؟ تو انہوں نے بتایا: تاکہ ہم موت کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ شب معراج دنیا کی طرف لوٹ کر آئے تو آپ پر یہ آیت نازل کی گئی: وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ (الاعراف)(1) مراد حضور نبی مکرم ﷺ کی امت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو آگاہ فرما رہا ہے کہ میں نے جو موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم میں عطا فرمایا میں نے وہ آپ کو آپ کی امت میں عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے ہمارے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایمان لائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو منسوخ ہونے سے پہلے مضبوطی سے تھامے رکھا، نہ انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی کی اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

"اور ہم نے بانٹ دیا انہیں بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف جب پانی طلب کیا آپ سے آپ کی قوم نے (ہم نے وحی کی) کہ مارو اپنے عصا سے اس پتھر کو تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے۔ جان لیا ہر ایک گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اور ہم نے سایہ کر دیا ان پر بادل کا اور ہم نے اتارا ان پر من و سلویٰ۔ (اور فرمایا) کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ اور نہیں ظلم کیا انہوں نے ہم پر بلکہ وہ اپنی

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 2، صفحہ 270

جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ اور جب کہا گیا انہیں کہ آباد ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو اور کہو (اے کریم) بخش دے ہمیں اور داخل ہو دروازہ سے جھکتے ہوئے ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں (اور) زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو۔ تو بدل ڈالی جنہوں نے ظلم کیا تھا ان سے بات خلاف اس کے جو کہی گئی تھی انہیں، تب ہم نے بھیج دیا ان پر عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ ظلم کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں شمار کیں۔ اور انہیں قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ ہر قبیلے کا معاملہ ان کے اپنے سردار کی طرف سے معروف ہو، تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر معاملہ آسان ہو جائے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (المائدہ: 12) (1) (اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: اثْنَتَیْ عَشْرَةَ حالانکہ لفظ السبط مذکر ہے کیونکہ اس کے بعد امما ہے پس تانیث امم کی وجہ سے ہوئی۔ اور اگر السبط کے مذکر ہونے کی وجہ سے اثنی عشر کہا جاتا تو جائز ہوتا، یہ فراء سے منقول ہے۔ بعض نے کہا ہے: اسباط سے مراد قبائل اور فرقے ہیں، اسی لیے عدد مونث لایا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

وان قریشا کلها عشر أبطن وانت بریٔ من قبائلها العشر

پس وہ بطن سے قبیلہ اور فصیلہ کی طرف گیا۔ پس اسی لیے اسے مونث ذکر کیا۔ اور بطن مذکر ہے، جیسا کہ اسباط مذکر کی جمع ہے۔ زجاج نے کہا (2) ہے: اس کا معنی ہے ہم نے ان کو بارہ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ أسباطا یہ اثنتی عشرۃ سے بدل ہے۔ امما یہ اسباط کی صفت ہے۔ مفضل نے عاصم سے وَ قَطَعْنٰهُمُ مخفف روایت کیا ہے۔ أسباطا حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں اسباط حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں قبائل کے قائم مقام تھے۔ اسباط، السبط سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی وہ درخت ہے جسے اونٹ چرتے ہیں اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

معمر نے ہمام بن منبہ سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ کے بارے میں روایت کیا ہے انہوں نے کہا: دانے ابھی چھلکے میں ہیں۔ (یعنی یہ کام بہت مشکل ہے) اور انہیں کہا گیا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا پس وہ اپنی سرینوں پر سہارا لیتے ہوئے داخل ہوئے۔ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ یہ مرفوع ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے اور یہ محل نصب میں ہے۔ اور ما مصدر یہ ہے، یعنی بظلمهم اس آیت میں جو معانی اور احکام ہیں وہ سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمد للہ

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِیْهِمْ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 557 2۔ ایضاً

مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

''اور پوچھو ان سے حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر جب کہ وہ حد سے بڑھنے لگے ہفتہ (کے حکم کے بارے) میں جب آیا کرتیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتہ کے دن پانی پر تیرتی ہوئیں اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا تو وہ نہ آتیں ان کے پاس (اس طرح بے دھڑک) ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں بہ سبب اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے۔ اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ تم کیوں نصیحت کرتے ہو اس قوم کو، الله جنہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے سخت عذاب۔ انہوں نے کہا: تا کہ معذرت پیش کر سکیں تمہارے رب کے دربار میں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور شاید وہ ڈرنے لگیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ یعنی ان سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں (یعنی یہ اصل میں عن اهل القرية ہے) انہیں اس (قریہ) سے تعبیر کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ وہ ان کی جائے استقرار تھی یا اس لیے کہ وہ ان کے اجتماع کا سبب تھی۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا (یوسف: 82) (اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اهتز العرش لموت سعد بن معاذ یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے آنے سے ملائکہ میں سے اہل عرش فرحت وانبساط کے ساتھ جھومنے لگے۔ آیت میں مراد یہ ہے جو یہود آپ کے پڑوس میں ہیں ان سے ان کے اسلاف کے حال کے بارے پوچھو اور اس کے بارے کہ الله تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بندروں اور خنزیروں میں بدل دیا تھا۔ یہ سوال برائے تقریر و توبیخ ہے۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی علامت ہے۔ کیونکہ الله تعالیٰ نے آپ کو بغیر تعلم کے ان امور پر مطلع فرما دیا تھا۔ اور وہ کہتے تھے: ہم الله تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، کیونکہ ہم الله تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتوں میں سے ہیں اور اسرائیل کے پوتوں میں سے ہیں اور وہ بکر الله تھے اور حضرت موسیٰ کلیم الله کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کے بیٹے عزیر کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کی اولاد میں سے ہیں۔ پس الله تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس بستی والوں کے بارے میں پوچھو، کیا میں نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے عذاب نہیں دیا۔ اور وہ فروع شریعت میں سے ایک فرع کو تبدیل کرنے کے سبب ہوا۔ اور اس بستی کی تعیین کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس، عکرمہ اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ ایلہ ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ایلہ اور طور کے درمیان مدین ہے۔

زہری نے کہا ہے: وہ طبریہ ہے۔ حضرت قتادہ اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ شام کے سواحل میں سے ایک ساحل ہے اور یہ مدین اور عینون کے درمیان ہے، اسے مقناۃ کہا جاتا ہے۔ یہودی اس قصہ کو چھپاتے تھے، کیونکہ اس میں ان کی بہت سبکی اور بے عزتی ہے۔

الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ یعنی وہ سمندر کے قریب آباد تھے۔ تو کہتا ہے: كنتُ بحضرة الدار أي بقربها یعنی میں گھر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 467

کے قریب ہوں۔ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ یعنی وہ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے، حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے: سَبَت الیهودُ انہوں نے اپنے ہفتہ کے بارے حکم پر عمل ترک کر دیا۔ اور سُبِت الرجلُ مفعول کو سباتا کہا جاتا ہے (یعنی آدمی کو نیند آ گئی) اس نے اسے گونگے کی مثل کر چھوڑا۔ اور اسبت وہ ساکن ہو گیا اور اس نے حرکت نہ کی اور القوم صاروا فی السبت قوم نیند اور آرام میں ہو گئی۔

اور یہودی ہفتہ کے دن میں داخل ہوئے الیهود دخلوا فی السبت اس میں السبت سے مراد معروف دن (یعنی ہفتہ کا دن ہے) اور راحة (آرام لینا) اور قطع (کسی شے کو کاٹنا) کے معنی میں بھی ہے۔ اس کی جمع أسْبُت، سُبُوت اور أسبات آتی ہے۔ اور حدیث میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، ''جس کسی نے ہفتے کے دن پچھنے لگوائے تو اسے برص کی بیماری لگ جائے گی پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے''، ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہفتہ کے دن خون جم جاتا ہے، پس جب تو اسے باہر نکالنے کے لیے کھینچے گا تو وہ جاری نہیں ہو گا اور وہ برص کی طرف لوٹ جائے گا۔

جمہور کی قراءت يَعْدُون ہے اور ابو نہیک نے يُعِدُّون یاء کے ضمہ، عین کے کسرہ اور دال کی شد کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پہلا لفظ الاعتداء سے ہے اور دوسرا الاعداد سے ہے، یعنی وہ انہیں پکڑنے کا آلہ تیار کرتے ہیں۔ ابن السمیقع نے فی الأسبات، السبت کی جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ اور اسے أسباتهم بھی پڑھا گیا ہے۔ شُرَّعًا یعنی کثیر تعداد میں پانی پر ظاہرا تیرتے ہوئے۔ حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مچھلیاں اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ سمندر کی مچھلیاں ہفتے کے دن سمندر سے تیرتے ہوئے آتیں اور ایلہ میں جمع ہو جاتیں۔ الله تعالیٰ نے انہیں الہام کیا کہ انہیں ہفتہ کے دن شکار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ الله تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کا شکار کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ان کے دروازوں پر اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتی تھیں، جیسا کہ سفید مینڈھے ہوتے ہیں۔ اسے بعض متاخرین نے بیان کیا ہے۔ پس وہ حد سے بڑھنے لگے اور انہوں نے انہیں ہفتے کے دن پکڑنا شروع کر دیا۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ اتوار کے دن پکڑنے لگے، یہی زیادہ صحیح قول ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ یعنی وہ ہفتہ کے دن (ایسا) نہ کرتے۔ کہا جاتا ہے: سبت یسبِت جب وہ ہفتے کے دن کی تعظیم کرے۔ حسن نے یاء کے ضمہ کے ساتھ يُسْبِتون پڑھا ہے، یعنی وہ ہفتے کے دن میں داخل ہوتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: أجمعنا وأظهرنا وأشهرنا یعنی ہم جمعہ، ظہر اور مہینے میں داخل ہوئے۔ لَا تَأْتِيْهِمْ یعنی ان کی مچھلیاں نہ آتیں۔ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ یعنی ہم عبادت میں ان پر سختی کرتے ہیں اور انہیں آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ یعنی ان کے فسق کے سبب (ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا)۔ حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم کتاب الله میں کوئی حلال پاتے ہو جو تمہارے پاس سوائے خوراک اور غذا کے نہ آتا ہو اور ایسا حرام جو بغیر ناپ تول کے آتا ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، داؤد اور ایلہ کے قصہ میں ہے: اِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيْهِمْ اس

آیت کے قصص میں مروی ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا کہ ابلیس نے ان کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی اور کہا: تمہیں ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا ہے پس تم حوض بنالو، پھر وہ جمعہ کے دن مچھلیاں ان کی طرف ہانکتے تھے اور وہ ان (حوضوں) میں باقی رہتی تھیں اور پھر پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے وہاں سے نکلنا ممکن نہ ہوتا تھا، چنانچہ اتوار کے دن وہ انہیں پکڑتے تھے۔

اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ابن رومان کا گمان ہے کہ ان میں سے ایک آدمی رسی پکڑتا تھا اور اس میں ایک پھندا سا رکھتا اور اسے مچھلی کی دم میں ڈال دیتا اور رسی کی دوسری طرف کیل کے ساتھ بندھی ہوتی، وہ اسے اتوار تک اسی طرح چھوڑے رکھتا، پھر جب لوگوں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کرلیا اسے کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ مچھلی کا شکار بہت زیادہ ہوگیا اور اسے بازاروں میں لایا جانے لگا اور فاسقوں نے اس کے شکار کا اعلان کردیا، پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ اٹھا اور وہ روکنے لگا اور اس نے روکنے کی اعلانیہ خوب کوشش کی اور علیحدگی اختیار کرلی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک روکنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ مل کر نہیں رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کو دیوار کے ساتھ تقسیم کردیا۔ پس ایک دن منع کرنے والے اپنی مجالس میں آئے لیکن ان ظالموں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی بھی نہ نکلا، تو انہوں نے کہا: بے شک ان لوگوں کو کچھ ہوگیا ہے، پھر انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بن چکے تھے۔ پس انہوں نے دروازہ کھولا اور ان پر داخل ہوئے، تو بندروں نے انسانوں سے اپنے انساب کو پہچان لیا، لیکن انسان اپنے نسب بندروں سے نہ پہچانتے تھے، پس بندر انسانوں میں سے اپنے نسب والے کے پاس آتا اور اس کے کپڑے سونگھنے لگتا اور پھر رونے لگتا۔ تو وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا؟ تو وہ اپنا سر ہلا کر کہتا: ہاں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جوان بندر ہوگئے اور بوڑھے خنزیر ہوگئے۔ پس اس سے صرف انہوں نے ہی نجات پائی جو اس سے باز رہے (اور دوسروں کو منع کرتے رہے) اور وہ تمام کے تمام ہلاک ہوگئے۔ پس اس قول کی بنا پر بنی اسرائیل صرف دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا میں معنی ہوگا یعنی شکار کرنے والوں نے نصیحت کرنے والوں کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں نصیحت کی: جب تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاک کرنے والا ہے تو پھر تم ہمیں نصیحت کیوں کرتے ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں میں بدل دیا۔ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یعنی نصیحت کرنے والوں نے کہا: ہمارا تمہیں نصیحت کرنا تمہارے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے، یعنی بلاشبہ تمہیں نصیحت کرنا ہم پر واجب ہے شاید تم ڈرنے لگو۔

علامہ طبری نے یہ قول ابن کلبی سے بیان کیا ہے اور جمہور مفسرین نے کہا ہے: بے شک بنی اسرائیل تین گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور آیت میں ضمائر سے یہی ظاہر ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے نافرمانی کی اور شکار کیا، وہ ستر ہزار کے قریب لوگ تھے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے منع کیا اور ان سے علیحدہ ہوگیا اور وہ بارہ ہزار تھے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو علیحدہ تو ہوگیا لیکن نہ اس نے انہیں روکا اور نہ خود نافرمانی کی۔ اور اسی گروہ نے منع کرنے والوں کو کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جو

نافرمانی اور حکم عدولی کا ارادہ رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے۔ انہوں نے یہ قول ظن غالب کی بنا پر کیا اور اس وقت نافرمان امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل معہود نہ تھا، تو روکنے والوں نے کہا: ہمارا نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے شاید وہ ڈر جائیں، تقویٰ اختیار کرلیں۔ اور اگر دو گروہ ہوتے تو یقیناً روکنے والے نافرمانوں کو کہتے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، شاید تم ڈرنے لگو۔ پھر اس کے بعد اختلاف ہوا ہے پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ گروہ جس نے نہ منع کیا اور نہ خود نافرمانی کی وہ نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ ہلاک ہوگیا اسے یہ سزا منع نہ کرنے پر دی گئی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: میں اسے نہیں جانتا جو ان کے ساتھ کیا گیا۔ اور یہی آیت سے ظاہر ہے۔ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس وقت کہا جب انہوں نے یہ کہا میں اسے نہیں جانتا جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا: کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انہوں نے اس عمل کو ناپسند کیا جو وہ کر رہے تھے اور انہوں نے ان کی مخالفت کی تو انہوں نے کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے؟ پس میں اسی نظریہ پر رہا یہاں تک کہ میں نے انہیں پہچان کرادی کہ وہ نجات پا گئے، تو آپ نے مجھے حلہ پہنایا۔ اور یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ صرف حدود سے تجاوز کرنے والا گروہ ہلاک ہوا کوئی اور نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (اور ہم نے ان کو پکڑ لیا جنہوں نے ظلم کیا) اور یہ ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ الآیہ (البقرہ:65) (اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی)

عیسیٰ اور طلحہ نے معذرةً کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی کے نزدیک اس کے نصب کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ نصب مصدر ہونے کی بنا پر ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ تقدیر کلام ہے فعلنا ذالك معذرة۔ اور یہی حضرت حفص کی حضرت عاصم سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ پسندیدہ ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی نیا عذر پیش کریں جس پر انہیں ملامت کی گئی ہے، لیکن جب انہیں یہ کہا گیا: تم کیوں نصیحت کرتے ہو تو انہوں نے جواباً کہا: موعظتنا معذرة (ہماری نصیحت ایک معذرت ہے) اور اگر کوئی آدمی کسی آدمی کو کہے: معذرةً إلى الله وإليك من كذا (یعنی فلاں عمل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اور تیرے پاس معذرت ہے) تو اس سے مراد معذرت پیش کرنا ہوتا ہے، تو یہ یقیناً منصوب ہوگا۔

یہ قول سیبویہ کا ہے۔ یہ آیت سد ذرائع کے قول پر دلیل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور تفصیلی گفتگو اس باب میں بھی گزر چکی ہے کہ جنہیں مسخ کر دیا گیا کیا ان کی آگے نسل چلی یا نہیں؟ الحمد للہ۔ سورۃ آل عمران اور سورۃ المائدہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام گزر چکا ہے اور سورۃ النساء میں فساد برپا کرنے والوں کے علیحدہ ہونے اور ان کے ایک طرف ہونے کا ذکر گزر چکا ہے اور یہ کہ جوان کے پاس بیٹھا وہ ان کی مثل ہوگیا، پس دوبارہ ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝165

''پھر جب انہوں نے فراموش کردی جو انہیں نصیحت کی گئی تھی (تو) ہم نے نجات دے دی انہیں جو روکتے تھے برائی سے اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جنہوں نے ظلم کیا برے عذاب سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے''۔

نسیان کا اطلاق بھولنے والے پر ہوتا ہے۔ اور عامد کا اطلاق ترک کرنے والے پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖۤ یعنی انہوں نے اسے بالارادہ ترک کر دیا۔ اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: 67) (انہوں نے بھلا دیا اللہ کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں) اور بِعَذَابٍۭ بَـِٕيْسٍ کا معنی ہے شدید عذاب۔ اور اس میں گیارہ قرائتیں ہیں: (۱) ابوعمرو، حمزہ اور کسائی کی قراءت فعیل کے وزن پر بئیس ہے(1) (۲) اہل مکہ کی قراءت بئیس با کے کسرہ کے ساتھ ہے اور وزن ایک ہی ہے (۳) اہل مدینہ کی قراءت بیس ہے یعنی باء مکسور ہے اس کے بعد یاء ساکن ہے(2) اور اس کے بعد سین تنوین مکسور کے ساتھ ہے اور اس میں دو قول ہیں: کسائی نے کہا ہے: اس میں اصل بییس ہے ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے دو یا جمع ہوئی ہیں ان میں سے ایک کو حذف کر دیا گیا ہے اور پہلے حرف کو کسرہ دیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رغیف اور شہید۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد بئس فعل کے وزن پر ہے، پھر پہلے حرف کو کسرہ دے دیا گیا، ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور کسرہ کو حذف کر دیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: رَحِم و رِحْم (۴) حسن کی قراءت میں با مکسور اس کے بعد ہمزہ ساکن اور اس کے بعد سین مفتوح ہے (۵) ابوعبدالرحمن مقری نے بئیس با کو مفتوح، ہمزہ کو مکسور اور سین کو تنوین مکسور کے ساتھ پڑھا ہے (۶) یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بعذاب بئیس بھی مروی ہے یعنی با مفتوح، ہمزہ مکسور اور سین مفتوح ہے (۷) اعمش کی قراءت فیعل کے وزن پر بیئس ہے اور ان سے بیاس، فیعل کے وزن پر بھی مروی ہے۔ اور آپ سے بئیس با مفتوح، ہمزہ مشدد مکسور اور سین تمام میں تنوین مکسور کے ساتھ مروی ہے۔ مراد اعمش کی قراءت ہے۔ (۱۰) نصر بن عاصم کی قراءت بعذاب بیّس ہے یعنی با مفتوح اور یا مشدد بغیر ہمزہ کے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بئیس مروی ہے یعنی با مکسور ہے اس کے بعد ہمزہ ساکن ہے اور اس کے بعد یا مفتوح ہے۔ پس یہ گیارہ قرائتیں ہیں جنہیں نحاس نے ذکر کیا ہے۔

علی بن سلیمان نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: جاء ببنات بیس یعنی وہ ردی شے لے کر آیا، پس بعذاب بیس کا معنی ہوا بعذاب ردئ۔

اور رہی حسن کی قراءت تو ابوحاتم کا گمان ہے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں، انہوں نے کہا: کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا مررت برجل بئس، بلکہ کہا جاتا ہے: بئس الرجل یا بئس رجلا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ ابوحاتم کے کلام سے مردود ہے، نحویوں نے بیان کیا ہے: ان فعلت کذا او کذا فبھا و نعمت (اگر تو نے اس اس طرح کیا تو بہتر ہے اور اچھا ہے) وہ مراد یہ لیتے ہیں فبھا و نعمت الخصلۃ (یعنی خصلت اچھی ہے) اور حسن کی قراءت پر تقدیر کلام یہ ہوگی: بعذاب بئس العذاب۔

**فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝**

''پھر جب انہوں نے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر راندے ہوئے''۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 213

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 469

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ یعنی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں حدود سے تجاوز کیا۔ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ کہا جاتا ہے: خسأته فخسأ یعنی میں نے اسے دور کر دیا اور میں نے اسے بھگا دیا۔ سورۃ البقرہ میں پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معافی اور گناہ عذاب کا سبب ہیں۔ اور اس میں کوئی خفا اور ابہام نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سنائی دینے والے کلام کے ساتھ فرمایا، تو وہ اس طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے انہیں بندر بنا دیا۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۷﴾

”اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب۔ بے شک آپ کا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور رحیم (بھی) ہے“۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلاف کو آگاہ کیا کہ وہ اگر تبدیل نہ ہوئے اور وہ نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسے شخص کو بھیج دے گا جو انہیں عذاب میں ڈال دے گا۔ اور ابو علی نے کہا ہے: آذن مد کے ساتھ ہو تو بمعنی اعلم (بتانا اور آگاہ کرنا) ہے اور أذّن تشدید کے ساتھ ہو تو معنی نادی (پکارنا، ندا دینا) ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ آذن اور أذّن دونوں بمعنی أعلم ہیں، جیسے أیقن اور تیقّن کہا جاتا ہے۔ زہری نے کہا ہے:

فقلتُ تَعَلَّمْ إن للصيد غِرّةً فإلّا تُضَيِّعها فإنك قاتِلُهْ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تعلّم إن شرّ الناس حيّ يُنادَى في شعارهم يَسار

یعنی یہ بمعنی علم ہے اور یَسُوْمُهُمْ کا معنی ہے وہ انہیں چکھائے گا۔ اور یہ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: اس سے مراد بخت نصر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب مراد ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت مراد ہے۔ اور یہی اظہر ہے، کیونکہ یہ یوم قیامت تک باقی رہنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ یہاں ان سے جزیہ لینا مراد ہے۔ اور اگر کہا جائے: ان کی شکلیں تو مسخ کر دی گئیں، تو پھر ان سے جزیہ کیسے لیا جا سکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ ان کے بیٹوں اور ان کی اولاد سے لیا جائے گا۔ اور وہ ذلیل ترین قوم ہیں اور وہ یہودی ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے(1) کہ انہوں نے کہا: سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد خراج ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی نبی علیہ السلام نے کبھی خراج لازم نہیں کیا، سب سے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 168

پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہی خراج وضع کیا اور اسے تیرہ برس تک لاگو رکھا اور پھر روک دیا۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''اور ہم نے بانٹ دیا انہیں زمین میں کئی گروہوں میں ان میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ اس طرح ہیں اور ہم نے آزمایا انہیں نعمتوں اور تکلیفوں کے ساتھ تاکہ وہ (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا یعنی ہم نے انہیں شہروں میں تقسیم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ان کے معاملہ کو بکھیرنے اور پھیلانے کا ارادہ کیا ہے، پس کوئی کلمہ انہیں جمع نہیں کر سکا۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ یہ مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ مراد وہ لوگ ہیں جو حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور جنہوں نے ان میں سے کوئی تبدیلی نہیں کی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہونے سے پہلے فوت ہو گئے یا وہ لوگ مراد ہیں جو چین سے پرے ہیں، جیسا کہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اسے رفع دیا ہو۔ مراد ان میں سے کافر لوگ ہیں۔ وَبَلَوْنٰهُمْ یعنی ہم نے انہیں آزمایا۔ بِالْحَسَنٰتِ یعنی خوشحالی اور عافیت کے ساتھ۔ وَالسَّيِّاٰتِ یعنی خشک سالی اور سختیوں کے ساتھ۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ وہ اپنے کفر سے لوٹ آئیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

''پھر جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جو وارث ہوئے کتاب کے وہ لیتے ہیں مال اس دنیا کا اور (بایں ہمہ) کہتے ہیں کہ ضرور بخش دیا جائے گا ہمیں۔ اور اگر آ جائے ان کے پاس اور مال اس جیسا تو لے لیں اس کو بھی کیا نہیں لیا گیا تھا ان سے پختہ وعدہ کتاب میں کہ نہ منسوب کریں اللہ کی طرف کوئی بات سوائے حق کے اور پڑھ لیا انہوں نے جو کتاب میں تھا۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان کے لیے جو متقی ہیں، تو کیا تم (اتنا) بھی نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ یعنی ان کی اولاد جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں تقسیم کر دیا تھا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: الخلف لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ مراد اولاد ہے اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں (یعنی واحد اور جمع کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے) اور الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو واو بدل ہے چاہے وہ بچہ ہو یا کوئی اجنبی ہو۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مراد صالح اور نیک ہے اور اگر لام کے سکون کے ساتھ ہو تو مراد شریر اور بد ہے۔ لبید نے کہا ہے:

ذهبَ الذين يُعاشُ في أكنافِهم    وبقيتُ في خلْف كجلد الأجرب(1)

اُور اسی سے یہ بھی ہے کہ ردی کلام کو خلف کہا گیا ہے۔ اور اسی سے یہ مشہور مثال بھی ہے سکت ألفا و نطق خلفا ہزار لحظہ خاموش رہا، بولا تو غلط بولا۔

پس لام ساکن کے ساتھ خلْف ذم میں اور لام مفتوح کے ساتھ خلَف مدح میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی اس کا مشہور استعمال ہے۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: یَحمِل هذا العلم من کل خَلَف عدولهُ (اس علم کو ہر نیک آدمی سے اس کا عادل جانشین روایت کرے گا او کمال قال) اور کبھی ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا:

لنا القَدَمُ الأولى إليك وخَلَفُنا    لِأوّلنا في طاعة الله تابع (2)

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

إنا وجدنا خَلَفًا بئس الخلَفْ    أغلق عنا بابَه ثم حلف

لا يُدخل البوابُ إلا مَنْ عرفْ    عبدا إذا ما ناء بالحِمل وَقَفْ

شعر میں وقف کی جگہ خضف بھی منقول ہے اور اس کا معنی ہے گوز کرنا۔ آیت سے مقصود مذمت بیان کرنا ہے۔

وَّرِثُوا الْكِتٰبَ مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد یہودی ہیں، وہ کتاب اللہ کے وارث بنے انہوں نے اسے پڑھا اور اسے سمجھا، لیکن اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اسے پڑھنے کے باوجود اس کے حرام کردہ امور کا ارتکاب کیا۔ پس یہ ان کے لیے زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى پھر ان کے بارے یہ خبر دی کہ وہ اپنی شدت حرص و طمع کے سبب سامان دنیا میں سے جو بھی انہیں ملے اسے وہ لے لیتے ہیں۔ وَ یَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا اور کہتے ہیں: ہم بخش دیئے جائیں گے حالانکہ وہ توبہ نہیں کرتے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ توبہ نہیں کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ اس میں عرض بمعنی سامان دنیا ہے، یہ را کے فتحہ کے ساتھ ہے اور جب را کے سکون کے ساتھ ہو تو پھر اس سے مراد درا ہم و دنانیر کے سوا ہر قسم کا مال ہوتا ہے۔ اس آیت میں اشارہ رشوت اور خبیث (حرام) کمائی کی طرف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی کہ وہ اپنے اس قول سَیُغْفَرُ لَنَا کے ساتھ دھوکہ کھا رہے ہیں اور یہ کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب دوسری بار ان کے لیے اس کا امکان ہو تو وہ اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ تو ان کا مغفرت کے ساتھ دھوکہ کھانا قطعی ہے، حالانکہ وہ (اپنے اعمال پر) مصر ہیں، بلاشبہ سَیُغْفَرُ لَنَا وہ کہہ سکتا ہے جو (ایسے اعمال کو) چھوڑ دے اور نادم ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وہ وصف ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی ہے اور یہ ہم میں بھی موجود ہے۔ دارمی ابو محمد نے بیان کیا ہے کہ ہمیں محمد بن مبارک نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں صدقہ بن خالد نے ابن جابر سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 472    2۔ ایضاً

انہوں نے شیخ سے جن کی کنیت ابو عمرو تھی انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: عنقریب قرآن قوموں کے سینوں میں بوسیدہ ہو جائے گا جیسے کپڑا بوسیدہ ہو جاتا ہے اور وہ گر جاتا ہے، وہ اسے پڑھیں گے لیکن اس کا کیف اور لذت نہیں پائیں گے، وہ بھیڑوں کی کھالیں، بھیڑیوں کے دلوں (جسموں) پر پہن لیں گے، ان کے اعمال میں ایسی حرص ہوگی جس میں خوف کی آمیزش نہ ہوگی، اگر وہ کوتاہی کریں گے تو کہیں گے: ہم عنقریب پہنچ جائیں گے، اور اگر گناہ کریں گے تو کہیں گے: ہم بخش دیئے جائیں گے، بے شک ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یَّاْتِهِمْ میں ضمیر مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے لیے ہے، یعنی یثرب کے وہ یہودی جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کیا اگر ان کے پاس بھی اس طرح کا سامان دنیا آ جائے تو وہ اسے لے لیں جس طرح ان کے اسلاف نے اسے لیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اس میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ شریعت اور احکام میں قول حق کو لازم پکڑنے میں شدید تاکید کا اظہار ہے اور یہ کہ حکام رشوت کے سبب باطل کی طرف مائل نہ ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ ہے جو ان پر لازم تھا اور اسی کے ساتھ قول حق کے بارے میں ان سے میثاق لیا گیا اور یہ ہمارے لیے لازم ہے اس کا ذکر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی ہوا اور ہمارے رب کی کتاب میں بھی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور تمام شریعتوں میں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ یعنی انہوں نے اسے پڑھا اور وہ ان کے قریب العہد ہیں۔ ابو عبدالرحمن نے وادّارسوا ما فیہ پڑھا ہے یعنی انہوں نے تا کو دال میں ادغام کیا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حق حاصل کرنے والا رشوت لے کر ان کے پاس آتا تھا تو وہ اس کے لیے کتاب اللہ نکال کر لے آتے اور اس کے ساتھ اس کا فیصلہ کرتے۔ اور جب کوئی مبطل (باطل کرنے والا) آتا تو وہ اس سے رشوت لے لیتے اور اس کے لیے اپنی وہ کتاب نکال لاتے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ لکھی ہوتی اور اس کا فیصلہ کرتے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ تحقیق انہوں نے اپنے گناہوں کی بخشش کے بارے میں وہ باطل قول کیا جسے وہ ثابت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ یقین رکھتے ہیں۔

ابن زید نے کہا ہے: یعنی ان احکام میں جن کے بارے وہ فیصلہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ کا معنی ہے انہوں نے اس کے مطابق عمل ترک کر کے اور اس کی فہم اور سمجھ کو چھوڑ کر اسے مٹا دیا۔ یہ معنی تیرے اس قول سے ہے: درست الریح الآثار یہ تب کہا جاتا ہے جب ہوا آثار کو مٹا دے۔ خط دارس و ربع دارس، جب وہ اسے مٹا دے اور اس کا نشان ختم ہو جائے۔ اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے موافق ہے: نَبَذَ

فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ الآیہ (البقرہ:101) اور اس قول کے: فَنَبَذُوهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ (آل عمران:187) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝

''اور جنہوں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کتاب کو اور قائم کیا نماز کو بے شک ہم ضائع نہیں کریں گے اجر اصلاح کرنے والوں کا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتٰبِ کتاب سے مراد تورات ہے، یعنی وہ جو اس کے ساتھ مضبوطی سے عمل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے: مسك به و تمسك به یعنی وہ اس کے ساتھ چمٹ گیا، اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ ابو العالیہ اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں يمسكون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ أمسك يمسك سے ہے۔ پہلی قراءت اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے لیے تکریر و تکثیر کا معنی موجود ہے اور اسی کے سبب ان کی مدح اور تعریف کی جا رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور دین کے ساتھ تمسک اور عمل ملازمت (لازم پکڑنا) تکریر کا محتاج ہوتا ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

فما تَمَسَّكُ بالعهد الذی زعمتْ إلّا كما تُمسك الماءَ الغرابيل(1)

اس نے کثرت کے ساتھ عہد توڑنے کی مذمت کرتے ہوئے طبعاً یہ شعر کہا ہے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

''اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ ان کے اوپر اس طرح گویا وہ سائبان ہے اور خیال کرنے لگے کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر (ہم نے کہا) پکڑ لو جو ہم نے دیا ہے تمہیں (پوری) قوت سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ، نَتَقْنَا اس کا معنی ہے ہم نے اٹھایا۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ یعنی گویا کہ وہ اپنے اٹھنے اور بلند ہونے کے سبب ایک بادل ہے جس کا سایہ کیا جا رہا ہے۔ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ یعنی جو ہم نے تمہیں دیا ہے تم اسے انتہائی قوت کے ساتھ پکڑ لو۔ سورۃ البقرہ میں آیت کے آخر تک کا ذکر گزر چکا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 473

اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''اور (اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا: بےشک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی (یہ اس لیے ہوا) کہ کہیں تم یہ نہ کہو روز حشر کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ شرک تو صرف ہمارے باپ دادا نے کیا تھا (ہم سے) پہلے اور ہم تو تھے ان کی اولاد ان کے بعد تو کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس شرک کی وجہ سے جو کیا تھا باطل پرستوں نے۔ اور اسی طرح ہم مفصل بیان کرتے ہیں نشانیاں تاکہ وہ (ان میں غور کریں) اور کفر سے باز آ جائیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ یعنی تم انہیں یاد دلاؤ اس کے باوجود کہ معاہدوں کا ذکر ان کی کتابوں میں پہلے گزر چکا ہے وہ میثاق جو میں نے بندوں سے اس دن لیا جس دن حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اولاد کو نکالا۔ یہ ایک مشکل آیت ہے اور علماء نے اس کی تاویل اور اس کے احکام کے بارے کافی گفتگو کی ہے، جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم حسب توفیق اسے ذکر کریں گے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بنی آدم کی پشتوں سے بعض کو نکالا۔ انہوں نے کہا: اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کے ساتھ انہیں اپنی توحید پر دلیل بنایا، کیونکہ ہر بالغ بالضرور یہ جانتا ہے کہ اس کا رب واحد و یکتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی فرمایا: (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!) پس یہ ان پر گواہ بنانے کے لیے قائم مقام اور ان کی طرف سے اقرار ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے بارے میں فرمایا: قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىٕعِيْنَ ۝ (فصلت) (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں) قفال اور اطنب نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جسموں کو پیدا کرنے سے پہلے ارواح کو نکالا۔ اور ان میں معرفت رکھ دی جس کے سبب انہوں نے اس خطاب کو جان لیا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان دونوں قولوں کے سوا اور مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے جسموں کو نکالا جن میں روحیں تھیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بےشک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا (1) پھر اپنے دست قدرت کے ساتھ ان کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے اعمال کریں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ باب فی القدر، حدیث نمبر 4081، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل نار کے اعمال کریں گے''۔ تو ایک آدمی نے عرض کی: تو پھر عمل کس لیے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ اس سے اہل جنت کے اعمال کی طرح عمل کراتا ہے یہاں تک کہ وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتے ہوئے فوت ہو جاتا ہے پس وہ اسے جنت میں داخل فرما دے گا اور جب کسی بندے کو جہنم کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کراتا ہے' یہاں تک کہ وہ اہل جہنم کے اعمال میں سے کوئی عمل کرتے ہوئے مر جاتا ہے پس اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل فرما دے گا''۔

ابوعمر نے کہا ہے: یہ حدیث منقطع الاسناد ہے، کیونکہ مسلم بن یسار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ اور اس میں یحییٰ بن معین نے کہا ہے: مسلم بن یسار معروف نہیں، ان کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان نعیم بن ربیعہ ہیں، اسے نسائی نے ذکر کیا ہے، اور نعیم علمی اعتبار سے غیر معروف ہے، لیکن اس حدیث کا معنی کئی وجوہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح ہے جو ثابت بھی ہیں اور زیادہ بھی ہیں، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہیں (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کی پشت کو مس کیا تو ان کی پشت سے ہر وہ روح گری جسے قیامت تک ان کی اولاد میں سے پیدا ہونا تھا اور ان میں سے ہر آدمی کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی اور پھر انہیں آدم علیہ السلام پر پیش فرمایا تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہیں؟ رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد ہے، پس آپ نے ان میں سے ایک آدمی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے درمیان پائی جانے والی چمک نے انہیں متعجب کر دیا۔ تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد میں سے آخری امتوں میں سے ایک فرد ہے، اسے داؤد کہا جائے گا، تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! تو نے اس کی عمر کتنی بنائی ہے؟ رب کریم نے فرمایا: ساٹھ برس۔ تو انہوں نے عرض کی اے میرے پروردگار! اس کی عمر میں میری عمر میں سے چالیس سال کا اضافہ کر دے پس جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر گزر چکی تو حضرت ملک الموت علیہ السلام ان کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: کیا ابھی میری عمر میں چالیس برس باقی نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: کیا آپ نے وہ اپنے بیٹے حضرت داؤد علیہ السلام کو نہیں دے دیئے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کر دیا پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولنے لگی'' (2)۔ اور ترمذی کے علاوہ میں ہے، ''پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے کتاب اور گواہوں کو حکم فرمایا''۔ ایک روایت میں ہے، ''پس آپ نے ان میں ضعیف، غنی، فقیر

1۔ جامع ترمذی کتاب القدر عن رسول اللہ، حدیث نمبر 2061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(ذلیل) بیماری اور تکلیف میں مبتلا اور صحت مند کو دیکھا، تو آدم علیہ السلام نے پوچھا: اے میرے پروردگار! یہ کیا ہے؟ تو نے ان کے درمیان مساوات قائم نہیں فرمائی؟ تو رب کریم نے فرمایا: میں نے چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''انہیں آپ کی پشت سے نکالا گیا جیسے کنگھی سر سے نکالی جاتی ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی کی طرح عقل عطا فرما دی اور ان سے وعدہ لیا اس بارے میں کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس انہوں نے اس کا اقرار کیا اور اسے لازم پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ وہ عنقریب ان کی طرف انبیاء ورسل علیہم الصلوات والتسلیم مبعوث فرمائے گا، پس ان میں سے بعض بعض پر گواہ ہو گئے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان پر سات آسمانوں کو شاہد بنایا، پس اب قیامت تک جو بھی پیدا ہوگا اس سے وہ عہد لے لیا گیا ہے۔ اس جگہ اور مقام کے بارے اختلاف ہے جس میں اس وقت یہ میثاق لیا گیا اس بارے میں چار اقوال ہیں:

پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ جگہ بطن نعمان ہے، یہ عرفات کے پہلو میں ایک وادی ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہند میں اتارا، پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے ہر اس روح کو نکالا جسے یوم قیامت تک پیدا کرنا تھا، پھر فرمایا: **اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا** یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ حضرت حسن نے کہا ہے: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی صلب میں لوٹا دیا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جگہ مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: وہ آسمان دنیا میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت سے اس کی طرف اتارا تو آپ کی پشت کو مس کیا تو آپ کی پشت کی دائیں جانب سے موتیوں کی مثل سفید اولاد کو نکالا اور انہیں فرمایا: تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور آپ کی پشت کی بائیں جانب سے سیاہ رنگ کی اولاد کو نکالا اور ان کے لیے فرمایا: تم جہنم میں داخل ہو جاؤ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ہر نفس جو جنت کے لیے پیدا کیا گیا وہ سفید رنگ میں نکلا اور ہر نفس جو جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ سیاہ رنگ میں نکلا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اگر یہ کہا جائے اس کا مخلوق کو عذاب دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے (1) حالانکہ انہوں نے گناہ نہیں کیے، یا وہ انہیں اس پر سزا دے جس کا اس نے ان سے ارادہ کیا ہے اور ان پر وہ لکھ دیا اور اس کی طرف انہیں چلایا ہے؟ تو ہم کہیں گے: یہ کہاں سے ممتنع ہے، کیا عقلاً یا شرعاً؟ پس اگر کہا جائے: کیونکہ ہم میں سے رحیم وحکیم کا اس طرح کرنا جائز نہیں ہوتا، تو ہم کہیں گے: اس لیے کہ اس سے اوپر تو ایک امر (حکم دینے والا) ہوتا ہے جو اسے حکم دیتا ہے اور منع کرنے والا ہوتا ہے جو اسے منع کرتا ہے، روکتا ہے۔ اور ہمارا رب تعالیٰ وہ ہے کہ اس سے اس کے بارے نہیں پوچھا جا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 801

سکتا جو وہ کرتا ہے اور ان لوگوں سے پوچھا جا سکتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق پر قیاس کیا جائے اور بندوں کے افعال کو معبود کے افعال پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحقیقت تمام کے تمام افعال اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہیں اور مخلوق ساری کی ساری اسی کی ہے، وہ ان میں تصرف کرتا ہے جیسے چاہے اور ان کے درمیان اسی کے بارے فیصلہ کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔ اور یہی وہ شے ہے جسے آدمی پاتا ہے کہ فطری نرمی، جنسی شفقت اور ثناء مدح کی محبت اس پر ابھارتی اور برانگیختہ کرتی ہے، ہر اس شے کے لیے جس میں اسے نفع کی توقع ہوتی ہے۔ اور رب کریم کی ذات ان تمام سے پاک ہے، لہٰذا اس میں اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت کے بارے اختلاف ہے، کیا یہ خاص ہے یا عام ہے؟ بعض نے کہا ہے: یہ آیت خاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنۢ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمۡ پس اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اولاد آدم میں سے جو ہے وہ آپ کی صلب سے نکلا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَوۡ تَقُولُوٓاْ إِنَّمَآ أَشۡرَكَ ءَابَآؤُنَا مِن قَبۡلُ پس اس سے یہ نکلا کہ ہر وہ جو آپ کے آباء نہ تھے وہ مشرک تھے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں مخصوص ہے جن سے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں پر عہد لیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے، کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ بچہ تھا پس اسے غذا دی گئی اور اس کی تربیت کی گئی اور بلاشبہ اس کا مدبر (تدبیر کرنے والا) اور خالق ہے۔ اور یہی معنی وَأَشۡهَدَهُمۡ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ کا ہے۔ اور قَالُواْ بَلَىٰ کا معنی ہے بلاشبہ یہ ان پر واجب ہے۔ پس جب مخلوق نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا اعتراف کر لیا کہ وہ رب ہے پھر وہ اس سے غافل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے سبب انہیں یاد دلایا اور اس تذکیر کو اپنے منتخب اور اصفیاء میں سے افضل ترین کے ساتھ ختم کیا تا کہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حجت اور دلیل قائم ہو جائے پس اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: فَذَكِّرۡ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٞ ۝ لَّسۡتَ عَلَيۡهِم بِمُصَيۡطِرٍ ۝ (الغاشیہ) پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں، آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو جبر کرنے کی قدرت بھی عطا فرمائی اور آپ کو سلطنت اور قوت عطا فرمائی اور آپ کے لیے آپ کے دین کو زمین میں غالب کر دیا۔ طرطوشی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: بے شک یہ عہد ہر بشر کو لازم ہے اگرچہ وہ اسے اس دنیا میں نہ یاد کرتے ہوں، جیسا کہ اس کی طلاق لازم ہو جاتی ہے جس پر اس کی شہادت دے دی جائے حالانکہ وہ اسے بھول چکا ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے کہا ہے: بے شک وہ جو صغر سنی میں ہی فوت ہو گیا تو وہ اپنے میثاق اوّل کے اقرار کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گا اور جو سن بلوغت کو پہنچ گیا تو میثاق اوّل اس کے لیے نفع مند نہیں۔ یہ کہنے والا یہ بھی کہتا ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں ہوں گے اور اس بارے میں یہی صحیح ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں آثار مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ الروم میں آئے گی ان شاء اللہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 475

ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں بھی کیا ہے۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ ظُهُوْرِهِمْ یہ قول باری تعالیٰ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ سے بدل اشتمال ہے۔ اور آیت کے الفاظ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ عہد اولاد آدم سے لیا گیا ہے، لفظ کے اعتبار سے آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے اس پر الفاظ کی توجیہ ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیّٰتَهُمْ (اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا) ظہر آدم کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ وہ سب کے سب آپ کی اولاد ہیں اور یہ کہ انہیں میثاق کے دن آپ کی پشت سے نکالا گیا۔ پس وہ اپنے ارشاد مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ کے سبب آپ کے ذکر سے مستغنی ہو گیا۔

ذُرِّیّٰتَهُمْ کوفیوں اور ابن کثیر نے اسے واحد اور تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً (آل عمران: 38) یہ واحد کے لیے ہے، کیونکہ انہوں نے بچہ عطا کرنے کی التجا کی تو آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی اور قراء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ (مریم: 58) میں اس کے واحد ہونے پر اجماع کیا ہے اور ذریت آدم سے زیادہ اور کوئی شے نہیں۔ اور فرمایا: وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یہ جمع کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے ذریاتھم صیغہ جمع کے ساتھ قراءت کی ہے، کیونکہ ذریت کا لفظ جب واحد کے لیے واقع ہوتا ہے تو یہ ایسے لفظ کے ساتھ آتا ہے جو واحد کے لیے واقع نہیں ہوتا تو یہ جمع ہوتا ہے، کیونکہ کلمہ اپنے معنی مقصود کے لیے خالص ہوتا ہے اور اس (معنی) میں کوئی شے شریک نہیں ہوتی اور وہ معنی جمع ہے، کیونکہ بنی آدم کی پشتوں سے کثیر تعداد میں مناسب اولادوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نکالا گیا، ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پس جمع اس معنی کے لیے ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: بَلٰى اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں ارشاد گرامی: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً (البقرہ: 81) کے تحت مکمل طور پر گزر چکی ہے، پس وہیں غور کر لو اَوْ تَقُوْلُوْۤا۔

اَوْ تَقُوْلُوْۤا ابو عمرو نے دونوں مقام میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو اس سے قبل غیب متکرر کے لفظ پر لوٹایا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیّٰتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اور قول باری تعالیٰ: قَالُوْا بَلٰى بھی لفظ غیب ہے۔

اور اسی طرح وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ بھی ہے وَ لَعَلَّهُمْ پس اسے اپنے ماقبل اور اپنے مابعد پر لفظ غیب کے ساتھ محمول کیا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں میں تا پڑھی ہے۔ انہوں نے اسے سابقہ لفظ خطاب پر راجع کیا ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى اور شَهِدْنَا ملائکہ کے قول میں سے ہوگا۔ (یعنی) جب انہوں نے کہا: بَلٰى (تو) ملائکہ نے کہا: شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا، اَوْ تَقُوْلُوْۤا یعنی تاکہ تم نہ کہو۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب انہوں نے بَلٰى کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: تم گواہ ہو جاؤ (تو) انہوں نے کہا: ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں تاکہ تم نہ کہو یا کہو۔ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور سدی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدْنَا یہ بنی آدم کے قول میں سے ہے اور

اس کا معنی ہے: ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر گواہ بنایا، پس اس کے مطابق یہ ہوگا ''انہوں نے کہا: ہاں (کیوں نہیں) ہم بعض بعض پر گواہ ہیں''۔

جب یہ ملائکہ کے قول میں سے ہو تو پھر وقف بَلٰی پر کیا جائے گا اور اس پر وقف اچھا نہیں ہوگا جب یہ بنی آدم کے قول میں سے ہو کیونکہ اَن، بلی سے ماقبل کے متعلق ہے۔ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ (اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نفسوں پر گواہ بنا دیا) تا کہ وہ نہ کہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو اس طرح نکالا جیسے سر سے کنگھی نکال لی جاتی ہے(1) اور ان سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: بے شک تو ہی ہمارا رب ہے (تو) ملائکہ نے کہا: ہم تمہارے اس قول پر گواہ ہیں''۔ یعنی ہم تم پر ربوبیت کا اقرار کرنے پر گواہ ہیں تا کہ تم یہ نہ کہو۔ پس یہ (مفہوم) تا پر دلالت کرتا ہے۔ مکی نے کہا ہے: معنی کے صحیح ہونے کی وجہ سے یہی پسندیدہ ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا نظریہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدْنَا اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے قول میں سے ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں۔ یہ ابو مالک نے کہا ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے ان کی اقتدا کی۔ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ یعنی معنی یہ ہے کہ تو یہ نہیں کرے گا (کہ تو ہمیں ، شرک کی وجہ سے ہلاک کر دے جو باطل پرستوں نے کیا) اور توحید (کے معاملہ) میں تقلید کرنے والوں کے لیے کوئی عذر نہیں۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝

''اور پڑھ سنائیے انہیں حال اس کا جسے دیا ہم نے (علم) اپنی آیتوں کا تو وہ کترا کر نکل گیا ان سے تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو ہو گیا وہ گمراہوں میں''۔

اہل کتاب نے ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا علم انہیں تورات سے ہوا ہے۔ اور اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے بارے یہ آیات نازل کی گئی ہیں۔

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا ہے: وہ بلعام بن باعوراء ہے، اسے ناعم کہا جاتا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ہے، وہ اس حیثیت میں تھا کہ جب دیکھتا تو عرش کو دیکھتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ، اٰيٰتِنَا سے مراد وہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیۃ (ایک آیت) نہیں کہا، اس کی مجلس میں بارہ ہزار پڑھنے والے علماء تھے جو اس سے پڑھتے لکھتے تھے۔ پھر وہ اس طرح ہو گیا کہ سب سے اوّل اس نے اس بارے میں کتاب لکھی کہ ''عالم کو بنانے والا کوئی نہیں''۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 133
2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 568

حضرت مالک بن دینار نے کہا ہے: بلعام بن باعوراء کو بادشاہ مدین کی طرف بھیجا گیا تا کہ وہ اسے دعوت ایمان دے۔ پس اس نے اسے بہت کچھ عطا کیا اور اسے خاموش کرا دیا نتیجۃً اس نے اس کے دین کی اتباع کر لی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو چھوڑ دیا، چنانچہ اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بلعام کو نبوت عطا کی گئی تھی (۱)، اس کی دعا قبول کی جاتی تھی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آئے آپ جابروں (اور ظالموں) کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، تو ان جابروں نے بلعام بن باعوراء سے درخواست کی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بددعا کرے پس وہ دعا کرنے کے لیے اٹھا تو اس کی زبان اپنے ساتھیوں کی بددعا کی طرف پھر گئی۔ اس بارے میں اسے کہا گیا، تو اس نے کہا: میں اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوں جو تم سن رہے ہو۔ اور اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی، تو اس نے کہا: تحقیق اب مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں چلی گئیں۔ مکر، دھوکہ اور حیلہ کے سوا کچھ باقی نہ رہا، میں عنقریب تمہیں ایک حیلہ اور مکر بتاؤں گا، میری رائے یہ ہے کہ تم اپنی نوجوان لڑکیوں کو ان کی طرف نکالو کیونکہ اللہ تعالیٰ زانیوں کو بہت مبغوض جانتا ہے، پس اگر وہ اس میں واقع ہو گئے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل فعل زنا کرنے لگے، نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون بھیجا تو اس کے سبب ان میں سے ستر ہزار مر گئے۔ یہ خبر مکمل طور پر ثعلبی وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ روایت ہے کہ بلعام بن باعوراء نے دعا (1) کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جبارین کے شہر میں داخل نہ ہوں، تو اس کی دعا قبول ہو گئی اور آپ تیہ میں ہی رہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کون سے گناہ کے سبب ہم تیہ میں ہی باقی رہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلعام کی دعا کے سبب۔ تو آپ نے عرض کی: جس طرح تو نے اس کی دعا میرے خلاف سن لی ہے اسی طرح میری دعا بھی اس کے خلاف قبول فرما لے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اسم اعظم سلب کر لیا اور اسے اس حالت سے بالکل نکال دیا جس پر وہ تھا۔

ابو حامد نے کتاب ''منہاج العارفین'' کے آخر میں اس کے بارے کہا ہے: میں نے بعض عارفین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بعض انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے بلعام اور اس کے ان آیات و کرامات کے بعد مطرود ہونے کے بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ میں نے اسے عطا کیا تھا اس پر ایک دن بھی اس نے شکر ادا نہ کیا تھا، اگر وہ اس پر ایک بار بھی میرا شکر ادا کرتا تو میں اس سے سلب نہ کرتا۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلعام نبی تھا اور اسے کتاب دی گئی تھی۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ اسے نبوت عطا کی گئی تھی، پس اس کی قوم نے اسے اس پر رشوت دی کہ وہ خاموش رہے چنانچہ اس نے وہی کیا اور قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ ماوردی نے کہا (2) ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی نبوت کے لیے منتخب نہیں فرماتا مگر اسے ہی جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کو چھوڑ کر معصیت و گناہ کی طرف نہیں نکلے گا۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 221　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 279

ا۔ یہ قول کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ اس کا رد آگے آ رہا ہے۔ کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے عصمت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ آیت امیہ بن ابی صلت ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تحقیق اس نے کتابیں پڑھی تھیں اور یہ جان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت رسول بھیجنے والا ہے اور اس نے یہ تمنا کی کہ وہی وہ رسول ہے، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا تو اس نے اس پر حسد کیا اور آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا شعور ایمان لے آیا اور اس کے دل نے کفر کیا'' (1)۔

حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے: یہ آیت ابو عامر بن صیفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دور جاہلیت میں ٹاٹ پہنتا تھا، پس اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا، اس لیے کہ وہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کیا ہے جو تم لے کر آئے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں حنیفیہ دین ابراہیم لے کر آیا ہوں''۔ اس نے کہا: بلاشبہ میں اسی پر ہوں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس پر نہیں ہے کیونکہ تو نے اس میں وہ کچھ داخل کر دیا ہے جو اس میں سے نہیں ہے''۔ تو ابو عامر نے کہا: اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو مار دے اس حال میں کہ وہ مطرود اور اکیلا ہو۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو اسی طرح مار دے''۔ بے شک اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تعریض کرتے ہوئے کہا جب آپ مکہ مکرمہ سے نکلے۔ پھر ابو عامر شام کی طرف نکلا اور قیصر کے پاس رہنے لگا اس نے منافقین کی طرف لکھا: تم تیار رہو کیونکہ میں قیصر کے پاس سے ایک لشکر لے کر تمہارے پاس آ رہا ہوں تا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال سکیں، پھر وہ شام میں ہی تنہا مر گیا۔ اور اس کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا: **وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ** (التوبۃ: 107) (اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے اب تک) اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں کہا ہے کہ یہ آیت ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی اس کے لیے تین دعائیں تھیں جو اس کے لیے قبول کی جاتی تھیں، اس کی ایک بیوی تھی اسے بسوس کہا جاتا اور اس سے اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ تو اس نے کہا: تو ان میں سے ایک دعا میرے لیے کر دے۔ تو اس نے کہا: ایک تیرے لیے ہے، بتا تو کیا حکم دیتی ہے؟ اس نے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر کہ وہ مجھے بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین عورت بنا دے۔ پس جب اس (عورت) نے یہ جان لیا کہ ان میں اس کی مثل کوئی نہیں ہے تو اس نے اس (خاوند) سے اعراض کر لیا، منہ پھیر لیا۔ تب اس نے اللہ تعالیٰ سے اس کے خلاف یہ دعا کی کہ وہ اسے بھونکنے والی کتیا بنا دے۔ تو اس میں دو دعائیں ختم ہو گئیں، پھر اس کے بیٹے آئے اور کہنے لگے: ہم اس پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہماری ماں کتیا رہے لوگ ہمیں اس پر عار دلاتے ہیں، پس تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ اسے اس حالت پر لوٹا دے جس پر وہ پہلے تھی۔ چنانچہ اس نے دعا کی اور وہ اپنی پہلی والی حالت پر لوٹ آئی اور اس میں اس کی دعائیں ختم ہو گئیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر اسی پر ہیں۔

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 171، حدیث نمبر 15241

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت قریش کے بارے نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی وہ نشانیاں اور آیات عطا کیں جو اس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائیں پس وہ ان سے کترا کر نکل گئے اور انہیں قبول نہ کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلعام جبارین کے شہر میں سے تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ یمن کا تھا۔ **فَانْسَلَخَ مِنْهَا** یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے نکل گیا، یعنی اس سے وہ علم چھین لیا گیا جو وہ جانتا تھا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: العلم علمان علم فی القلب فذالك العلم النافع و علم علی اللسان فذالك حجة الله تعالی علی ابن آدم (علم دو قسم کے ہیں ایک علم دل میں ہے وہی نفع بخش علم ہے اور ایک علم زبان کا ہے اور وہی ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے) پس یہ بلعام اور اس جیسے لوگوں کے علم کی مثال ہے، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم اس سے توفیق اور حق پر موت کی التجا کرتے ہیں۔

اور الانسلاخ کا معنی نکلنا ہے، کہا جاتا ہے: إنسلخت الحیة من جلدها یعنی سانپ اپنی جلد سے نکل گیا (یعنی اس کی کھال اتر گئی) فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ یعنی شیطان کے ساتھ مل گیا۔ کہا جاتا ہے: أتبعتُ القوم یعنی میں قوم سے مل گیا۔ بعض نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار کرتے رہے پھر انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو۔ آپ سنائیں (انہیں) یہ قصہ شاید وہ غور وفکر کرنے لگیں۔ بہت بری کہاوت ہے اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور (وہ) اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ اس سے مراد بلعام ہے۔ یعنی اگر ہم چاہتے تو اسے اس کے نافرمان اور گنہگار ہونے سے پہلے موت دے دیتے پھر اسے جنت کی طرف بلند کر دیتے۔ بِهَا یعنی ان آیتوں کے ساتھ عمل کرنے کے سبب۔ **وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ** یعنی لیکن وہ تو پستی کی طرف جھک گیا۔ یہ معنی حضرت ابن جبیر اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سکن الیھا یعنی وہ تو پستی کی لذتوں میں کھو گیا۔ الاخلاد کا اصل معنی لزوم ہے۔ کہا جاتا ہے: أخلد فلان بالمکان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے لازم پکڑے ہوئے ہو۔ زہیر نے کہا ہے:

لمن الدیار عشیتها بالغاقد　　کالوحی فی حجر المسیل المخلد(1)

اس میں مخلد بمعنی مقیم ہے، تو گویا معنی یہ ہوا اس نے زمین کی لذتوں کو لازم پکڑ لیا۔ اور انہیں الارض سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سامان دنیا (اور اس کی لذات) زمین پر ہی ہیں۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی اس نے اس کی پیروی کی جو کچھ شیطان نے اس کے لیے آراستہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خواہشات کفار کے ساتھ تھیں۔ بعض نے کہا ہے: وہ اپنی بیوی کی رضا اور خوشنودی کی پیروی کرنے لگا، وہ اموال میں رغبت رکھتی تھی یہاں تک کہ اس نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف دعا پر ابھارا۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ اور یہ حال کے محل میں ہے، یعنی اس کی مثال ہانپنے والے کتے کی مثال کی طرح ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی شے اور حالت پر ہے جس میں وہ معصیت اور گناہ سے نہیں ڈرتا۔ تو وہ اس کتے کی مثل ہے جس کی یہ حالت ہو پس معنی یہ ہوا کہ وہ ہر حال میں ہانپنے والا ہے، تو اسے بھگائے یا اسے نہ بھگائے۔

ابن جریج نے کہا ہے: کتا منقطع الفوائد ہے اس کا دل نہیں ہوتا، اگر تو اس پر حملہ کرے تو وہ ہانپتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپتا ہے۔ اسی طرح وہ ہے جو ہدایت کو ترک کر دیتا ہے اس کا دل نہیں ہوتا، بلاشبہ اس کا دل کٹ جاتا ہے۔ قتیبی نے کہا ہے: ہر شے ہانپتی ہے چاہے تھکاوٹ کی حالت ہو یا آرام و راحت کی حالت، بیماری کی حالت ہو یا صحت کی حالت، سیرابی کی حالت ہو یا پیاس کی حالت۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی مثل قرار دیا ہے جس نے اس کی آیات کو جھٹلایا اور فرمایا: اگر تو اسے وعظ و نصیحت کرے تب بھی وہ گمراہ ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ گمراہ ہے تو پس وہ اس کتے کی مثل ہے کہ اگر تو اسے چھوڑے تب بھی وہ ہانپے اور اگر تو اسے دھتکارے اور بھگائے تب بھی وہ ہانپے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ (الاعراف) (اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو)

جوہری نے کہا ہے: لهث الكلب يلهث لهثا و لهاثا تب کہا جاتا ہے جب کتا تھکاوٹ یا پیاس کے سبب اپنی زبان باہر نکالے اور اسی طرح وہ آدمی ہوتا ہے جب وہ خوب تھک جائے۔ اور ارشاد گرامی: اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ کا مفہوم ہے کہ جب تو کتے پر حملہ کرے تو وہ بھونکتا ہے اور بھاگتے ہوئے واپس مڑ جاتا ہے اور جب تو اسے چھوڑ دے تو وہ تجھ پر زور دیتا ہے اور بھونکتا ہے، پس وہ تیری طرف بڑھنے اور تجھ سے پیچھے ہٹنے میں اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے تو اس وقت اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو شدت پیاس کے وقت طاری ہوتی ہے یعنی وہ زبان نکال لیتا ہے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے درندوں میں سے کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس لیے کہ کتے کا دل مردہ ہے اور بلاشبہ اس کا ہانپنا اس کے دل کی موت کی وجہ سے ہی ہے، چونکہ بقیہ تمام درندے اس طرح نہیں ہیں اس لیے وہ ہانپتے نہیں۔ اور کتا اس لیے اس طرح ہو گیا، کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو آپ کا دشمن بہت خوش ہوا اور وہ درندوں کی طرف گیا اور انہیں

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 478

حضرت آدم کے خلاف انگیخت دلائی۔ پس کتے میں ان تمام سے زیادہ اس کی طلب ہوئی۔ تو حضرت جبریئل امین علیہ السلام وہ عصا لے کر نازل ہوئے جو مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں آپ کے لیے اسے ایک نشانی اور معجزہ بنا دیا اور اس میں بہت بڑی طاقت رکھ دی اور وہ آس الجنۃ میں سے تھا، پس آپ (جبریئل امین علیہ السلام) نے وہ اس دن حضرت آدم علیہ السلام کو دیا تاکہ آپ ان کے ساتھ درندوں کو اپنے آپ سے دور بھگائیں۔ اور ایک روایت کے مطابق آپ کو اس بارے حکم دیا کہ آپ کتے کے قریب ہوں اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھیں۔ پس اس وجہ سے کتا آپ کے ساتھ مانوس ہو گیا۔ اور اس کا دل ڈنڈے کی طاقت سے مر گیا اور وہ ہمارے آج دن تک آپ سے اور آپ کی اولاد سے محبت کرتا ہے، جب بھی کوئی اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دے اور وہ اولاد آدم کے پہرے داروں میں سے ایک پہرے دار (محافظ) بن گیا۔ اور جب اسے ادب سکھایا جائے اور شکار کی تعلیم دی جائے تو وہ ادب سیکھ جاتا ہے اور تعلیم کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اسی کے بارے یہ ارشاد ہے: تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (المائدہ:4) (تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا ہے تمہیں اللہ نے)۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے بعد بلعام اسی طرح ہانپتا رہا جیسے کتا ہانپتا ہے۔ کثیر اہل علم کے قول کے مطابق یہ مثال تاویل کے ساتھ ہر اس کے لیے عام ہے جسے قرآن (کا علم) عطا کیا گیا اور اس نے اس کے مطابق عمل نہ کیا، بعض نے کہا ہے: یہ ہر منافق کے بارے میں ہے، پہلا قول اصح ہے۔

قول باری تعالیٰ: فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ کے بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی اگر تو اس پر اپنے جانور (سواری) یا اپنے پاؤں کے ساتھ حملہ کرے تو وہ ہانپنے لگتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا ہے۔ اور اسی طرح وہ آدمی ہے جو کتاب پڑھتا ہے لیکن جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل نہیں کرتا۔ اور کسی اور نے کہا ہے: یہ انتہائی بری تمثیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمثیل اس بارے میں دی ہے کہ اس پر اس کی خواہش اتنی غالب آ گئی یہاں تک کہ وہ اس طرح ہو گیا کہ اپنے نفس کے بھی نفع اور نقصان کا مالک نہ رہا جیسا کہ ہمیشہ ہانپنے والا کتا ہوتا ہے، اس پر حملہ کیا جائے یا حملہ نہ کیا جائے، وہ ہانپنے کو چھوڑنے میں اپنے آپ کا مالک نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتے کی عادات میں سے یہ ہے کہ وہ اس پر واقع ہو جاتا ہے جو اسے ابتدا میں سختی اور شدت کے ساتھ خوفزدہ نہ کرے، پھر حقیر سا عوض پانے کے ساتھ ہی اس کی طیش پرسکون ہو جاتی ہے (یعنی اس کا غصہ اتر جاتا ہے اور وہ مانوس ہونے لگتا ہے) اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے بطور تمثیل بیان فرمایا ہے جو دین کے معاملہ میں رشوت لیتا ہے یہاں تک کہ اپنے رب کی آیات سے باہر نکل جاتا ہے۔ پس یہ آیت اس کی دلیل ہے جس نے اس میں اس اعتبار سے تدبر اور غور و فکر کی کہ کوئی نہ اپنے عمل کے ساتھ دھوکہ کھائے اور نہ اپنے علم کے ساتھ، کیونکہ وہ اس کے بارے نہیں جانتا جس پر اس کا خاتمہ ہو گا۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ حق کو باطل کرنے یا اسے تبدیل کرنے کے لیے رشوت لینا ممنوع ہے۔ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ بغیر ایسی حجت اور دلیل کے کسی عالم کی تقلید منع ہے جسے وہ بیان کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اسے اپنی یہ آیات عطا فرمائیں لیکن وہ ان سے نکل گیا پس واجب ہے کہ وہ کسی

دوسرے کے بارے اس کی مثل سے ڈرتا ہے اور یہ کہ وہ اس سے بغیر حجت کے کوئی شے قبول نہ کرے۔

**قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝** یعنی یہ تمام کفار کی مثال ہے۔ اور قولہ: سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ۔ کہا جاتا ہے: ساء الشیء یعنی شی قبیح اور بری ہے۔ یہ فعل لازم ہے اور ساء یسوء مسائۃ یہ متعدی ہے: أی قبح مثلھم (ان کی مثال قبیح ہے) اور تقدیر کلام ہے ساء مثلا مثل القوم (قوم کی مثال انتہائی قبیح مثال ہے) پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا، اور تمیز کی بنا پر مثلا کو نصب دی گئی ہے۔ اخفش نے کہا ہے: مجازا المثل القوم بنا دیا گیا ہے اور القوم مبتدا ہونے یا مبتدا مضمر ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ تقدیر کلام ہے: ساء المثل مثلاً ھو مثل القوم۔ ابوعلی نے تقدیر کلام یہ بیان کیا ہے: ساء مثلاً مثل القوم۔ عاصم حجدری اور اعمش نے ساء مثل القوم پڑھا ہے یعنی مثل ساء کے سبب مرفوع ہے۔

**مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝**

”جسے ہدایت بخشے اللہ تعالیٰ سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جنہیں گمراہ کر دے تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں“۔

اس کا معنی اور مفہوم کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت قدریہ کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ ان کا رد بھی کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین کو ہدایت دی ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کر لے۔

**وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝**

”اور بے شک ہم نے پیدا کئے جہنم کے لیے بہت سے جن اور انسان ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ان سے اور ان کے کان تو ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ان سے وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اپنے عدل کے ساتھ جہنم کے لیے کئی اہل پیدا کیے ہیں، پھر ان کے اوصاف بیان کیے اور فرمایا: **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** یعنی یہ اس کی طرح ہوتے ہیں جو سمجھتا نہیں، کیونکہ وہ دلوں سے کوئی نفع نہیں اٹھاتے، نہ وہ ثواب کی عقل و سمجھ رکھتے ہیں اور نہ سزا اور عذاب سے ڈرتے ہیں۔ **اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا** اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ ہدایت کو نہیں دیکھتے اور **اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** ان کے کان تو ہیں لیکن ان کے ساتھ نصائح کو نہیں سنتے۔ یہاں کلی طور پر ان کے حواس سے ادراک کی نفی مقصود نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سورۃ البقرہ میں اسے بیان کیا ہے۔

**اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ** کیونکہ وہ (اہل جہنم) ثواب کی طرف ہدایت اور رہنمائی نہیں پا سکتے، پس وہ حیوانوں

کی طرح ہیں، یعنی ان کا مقصد کھانا اور پینا ہے اور وہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں، کیونکہ حیوان اپنے منافع اور نقصان کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے مالک کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہ اس کے خلاف ہیں۔

حضرت عطا نے کہا ہے: حیوان الله تعالیٰ کو پہچانتے ہیں، لیکن کافر اسے نہیں پہچانتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حیوان الله تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور کافر مطیع نہیں ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی انہوں نے تدبر اور غور وفکر چھوڑ دیا ہے اور جنت اور جہنم سے اعراض کرلیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۸۰

''اور الله ہی کے لیے ہیں نام اچھے اچھے سو پکارو اسے انہی ناموں سے اور چھوڑ دو انہیں جو کجروی کرتے ہیں اس کے ناموں میں، انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا یہ امر اس بارے ہے کہ عبادت خالصۃً الله تعالیٰ ہی کے لیے ہو اور مشرکین وملحدین سے کلی اجتناب ہو۔ مفسرین میں سے مقاتل وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مسلمانوں میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنی نماز میں کہہ رہا تھا: یا رحمن یا رحیم۔ تو مشرکین مکہ میں سے ایک آدمی نے کہا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور ان کے اصحاب یہ گمان نہیں کرتے کہ وہ ایک رب کی عبادت کرتے ہیں، تو اسے کیا ہوا ہے کہ یہ دو ربوں کو پکار رہا ہے؟ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ترمذی اور سنن ابن ماجہ وغیرہما میں حدیث طیبہ موجود ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت بیان کی ہے اس میں یہ بیان ہے کہ الله تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں (1)۔ دونوں میں سے ایک میں وہ کچھ ہے جو دوسرے میں نہیں ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب الاسنی فی شرح اسماء الله الحسنی'' میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے اور ترمذی کی حدیث ذکر کی ہے اور وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اگرچہ اس میں ابوعیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صفوان بن صالح کی حدیث کے سوا نہیں جانتے، اور وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔ اس بارے میں انہی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ قول متواتر أ منقول ہے: ''بے شک الله تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں، ایک کم سو ہیں جس نے انہیں شمار کیا (پڑھا) وہ جنت میں داخل ہوگا'' (2)۔

اس میں أحصاها کا معنی ہے جس نے انہیں گنا اور انہیں یاد کیا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جسے ہم نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اور ہم نے وہاں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام ترمذی کی حدیث صحیح ہے۔ اور ہم نے اسماء میں سے وہ بھی ذکر کیے ہیں جن پر اجماع ہے اور وہ بھی جن میں اختلاف ہے جن پر ہم اپنے ائمہ کی کتب میں واقف ہوئے ہیں اور وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب اسماء الله عزوجل، حدیث نمبر 3850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 257

تقریباً دوسو اسم ہیں۔ اور ہم نے ان کی تعیین سے پہلے کتاب کے مقدمہ میں بتیس فصلیں ذکر کی ہیں جو ان کے احکام سے متعلق ہیں جو کوئی واقف ہونا چاہے وہ اس کتاب اور اس کے علاوہ دیگر کتب جو اس بارے میں لکھی گئی ہیں ان کی طرف رجوع کرے۔ واللہ الموفق للصواب، لارب سواہ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے اس باب میں اسم اور مسمی میں اختلاف کیا ہے، علماء نے اس بارے میں جو کہا ہے ہم نے اسے ''الکتاب الاسنیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔ ابن الحصار نے کہا ہے: اس آیت میں اسم کا وقوع مسمی پر بھی ہے اور تسمیہ پر بھی۔ پس قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یہ مسمیٰ پر واقع ہے، اور قول باری تعالیٰ: الْاَسْمَآءُ یہ اسم کی جمع ہے اور تسمیات پر واقع ہے، جو کچھ ہم نے کہا ہے فَادْعُوْهُ بِهَا اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، قول باری تعالیٰ فَادْعُوْهُ میں ہا ضمیر مسمیٰ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہی مدعو ہے اور بِهَا میں ھا ضمیر اسماء کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی وہ اسماء ہیں جن کے ساتھ پکارا جاتا ہے نہ کہ ان کے سوا کسی اور کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کا تقاضا لسان العرب کرتی ہے۔ اسی کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بھی ہے: لی خمسة أسماء أنا محمد وأحمد الحدیث (میرے پانچ اسماء ہیں میں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں) اس میں سے کچھ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وہ رائے جسے اہل حق اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسم ہی مسمی ہے، یا اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ اسم تسمیہ کا غیر ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے: اس میں تین اقوال ہیں۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا غیر ہو تو پھر ضروری ہے کہ اسماء اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے ہوں۔ دوسرا قول یہ ہے دوسروں نے کہا ہے: اس سے مراد تسمیات ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو واحد ہے اور اسماء جمع ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ آیت میں اسماء بمعنی تسمیات ہیں۔ اس پر تاویل کرنے والوں کا اجماع ہے اس کے سوا (کوئی اور مراد لینا) جائز نہیں۔

قاضی ابوبکر نے کتاب ''التمہید'' میں کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل یہ ہے ''کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسم ہیں جس نے انہیں پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا'' (1)۔ یعنی بلا اختلاف اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے مختلف اور متفرق اوصاف پر ہونے سے عبارت ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اپنی ذات کے لیے مستحق ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اس صفت کے لیے مستحق ہوتا ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کے وہ اسماء جو اس کی ذات کی طرف لوٹتے ہیں وہی وہ ہیں اور جو اس کی صفت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہی اس کے اسماء ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اس کی ذات کی صفات ہیں اور ان میں سے کچھ افعال کی صفات ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کی یہی تاویل ہے یعنی التسمیات الحسنی۔ تیسرا قول یہ ہے ان میں سے بعض دوسروں نے کہا ہے:

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 314

وللہ الصفات (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں)

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اسماء کو حسنیٰ کا نام دیا ہے، کیونکہ وہ کانوں اور قلوب میں حسنہ اور خوبصورت لگتے ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے جود وکرم اور اس کی رحمت وفضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اور الحسنی مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فعلی کے وزن پر الحسنی مقدر ہو، جو کہ احسن کی مؤنث ہے، جیسا کہ کبری، اکبر کی مونث ہے، اور جمع کبر اور حسن ہے۔ اور پہلے (قول) پر اسے مفرد لایا گیا ہے جیسا کہ غیر ذوی العقول کا وصف مفرد لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴿۱۸﴾ (طٰہٰ) اور یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ (سبا:10)

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: فَادْعُوْهُ بِهَا یعنی تم اس میں سے اس کے اسماء کے سبب طلب کرو، پس ہر اسم کے ساتھ وہی چیز طلب کی جائے گی جو اس کے لائق اور مناسب ہوگی۔ پس تو کہے گا: اے رحیم! مجھ پر رحم فرما، اے حکیم! مجھے حکمت ودانائی عطا فرما، اے رازق! مجھے رزق عطا فرما، اے ہادی! مجھے ہدایت عطا فرما، اے فتاح! مجھے فتح اور کامیابی عطا فرما، اے تواب! میری توبہ قبول فرما۔ اسی طرح تمام اسماء ہیں۔

اور اگر تو عام اسم کے ساتھ دعا مانگے تو تو کہے گا: اے مالک! مجھ پر رحم فرما، اے عزیز! مجھے حکمت ودانائی عطا فرما، اے لطیف! مجھے رزق عطا فرما اور اگر اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگے اور کہے: اے اللہ! تو یہ ہر اسم کو متضمن ہے۔ اور یہ نہیں کہے گا: اے رزاق! مجھے ہدایت عطا فرما، مگر یہ کہ ارادہ یہ ہو اے رزاق مجھے خیر اور بھلائی عطا فرما۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی طرح تو اپنی دعا کو مرتب کر تو تو مخلصین میں سے ہو جائے گا۔ دعا کی شرائط سے سورۃ البقرہ میں اور اس سورت میں بھی گزر چکی ہیں۔ والحمد للہ

**مسئلہ نمبر 6**۔ قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد اسماء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں داخل کیے ہیں۔ مثلاً متمّ نورہ، خیر الوارثین، خیر الماکرین، رابع ثلاثۃ، سادس خمسۃ، الطیب اور المعلِم اور انہی کی مثل اور اسماء۔ ابن الحصار نے کہا ہے: انہوں نے اس میں ابن برجان کی اقتدا کی ہے، انہوں نے اسماء میں النظیف بھی ذکر کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی جو کتاب وسنت میں وارد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ان کے قول میں سے ذکر کیا گیا ہے مما لم یرد فی کتاب ولا سنۃ تو تحقیق صحیح مسلم میں الطیب آیا ہے۔ اور ترمذی نے النظیف ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: رب اعنی ولا تعن علی و انصرنی ولا تنصر علی و امکرلی ولا تمکر علی الحدیث (1) (اے میرے پروردگار! میری مدد فرما، میرے خلاف مدد نہ کر، مجھے نصرت عطا فرما اور میرے خلاف کسی کی نصرت نہ کر اور میرے لیے تدبیر فرما اور میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) اور اس حدیث کے بارے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ پس اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: یا خیر الماکرین امکرلی ولا تمکر علی (اے سب سے بہتر تدبیر فرمانے والے میرے لیے تدبیر فرما اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب دعوات عن رسول اللہ، باب فی دعاء النبی علیہ السلام، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) ہم نے الطیب اور النظیف کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی ہیں جن کا ذکر اخبار میں ہے اور وہ سلف صالحین سے منقول ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا اور ان کے ساتھ دعا مانگنا جائز ہے اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا تو جائز ہے اور ان کے ساتھ دعا نہیں مانگی جاتی اور وہ بھی ہیں جن کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ نام رکھا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ دعا مانگی جائے، جیسا کہ انہیں شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ وہاں تیرے لیے اس کی خوب وضاحت ہو جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يُلْحِدُوْنَ الحاد کا معنی ہے ایک طرف جھک جانا اور قصد ترک کر دینا، کہا جاتا ہے: الحد الرجل فی الدین (آدمی دین کے معاملہ میں کج رو ہو گیا یعنی اس نے دین کا اعتدال ترک کر دیا) اور جب کوئی جھک جائے تو کہا جاتا ہے: الحد اور اسی سے قبر میں لحد بھی ہے، کیونکہ وہ بھی قبر کی ایک طرف میں ہوتی ہے۔ يَلْحَدُوْنَ بھی پڑھا گیا ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الحاد تین وجوہ سے ہو سکتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں تغیر اور تبدیلی ہو جیسا کہ مشرکین نے کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے انہیں (اسماء کو) اس معنی سے پھیر دیا جس پر یہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ اپنے بتوں کے نام رکھ لیے۔ پس انہوں نے اللات کو لفظ اللہ سے، العزیٰ کو العزیز سے اور منات کو المنان سے مشتق کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ نے یہی کہا ہے۔ دوسری وجہ ان میں زیادتی کے سبب (الحاد ہو سکتا ہے)۔ اور تیسری وجہ ان سے کچھ کم کر کے (الحاد ہو سکتا ہے) جیسا کہ وہ جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں جو دعائیں اختراع کرتے ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا نام اس کے اسماء کے بغیر لیتے ہیں اور وہ اس کا ذکر اس کے بغیر کرتے ہیں اس کے افعال میں سے جن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسی چیزوں سے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: پس تو ان سے بچ اور پرہیز کر اور تم میں سے کوئی بھی اسے نہ پکارے مگر انہیں اسماء میں سے کسی کے ساتھ جو کتاب اللہ اور کتب خمسہ میں ہیں (پانچ کتابوں سے مراد) بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی ہیں۔ پس یہی وہ کتابیں ہیں جن پر اسلام کا دارومدار ہے اور ان میں وہ سب کچھ شامل ہے جو اس مؤطا میں ہے جو اصل التصانیف ہے۔ اور تم اس کے سوا (سب کو) چھوڑ دو اور تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں اس طرح کی دعا کو پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار کر لیا ہے اور اسی وجہ سے مخلوق کی طرف اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اسماء میں زیادتی سے مراد تشبیہ ہے اور نقصان سے مراد تعطیل ہے، کیونکہ مشبہ نے ایسے ناموں کے ساتھ اسے متصف کیا ہے جن کے بارے میں اس نے اجازت نہیں دی اور معطلہ نے اس سے وہ اوصاف سلب کر لیے ہیں جن کے ساتھ وہ متصف ہے۔ اسی وجہ سے اہل حق نے کہا ہے: بے شک ہمارا دین دو راستوں کے درمیان ایک راستہ ہے، نہ اس کا تعلق تشبیہ کے ساتھ ہے اور نہ ہی تعطیل کے ساتھ ہے۔ شیخ ابوالحسن بوشنجی سے توحید کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 810

فرمایا: ایک ذات کو ثابت کرنا جس کی دیگر ذاتوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو اور نہ ہی (اس کی) صفات میں سے کوئی معطل ہو۔
تحقیق قول باری تعالیٰ: وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ میں کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم انہیں چھوڑ دو اور تم ان سے بحث مباحثہ نہ کرو اور نہ ان کے ساتھ تعرض کرو۔ پس اس بنا پر یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی وعید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا (المدثر) (آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے)

اور اس کا ارشاد ہے: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا (الحجر: 3) (انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں) اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

## وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۸۱

''اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا فرمایا ایک امت ہے جو راہ دکھاتی ہے حق کے ساتھ اور حق کے ساتھ ہی عدل وانصاف کرتی ہے''۔

حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''وہ یہی امت ہے'' اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تمہارے لیے ہے اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو بھی اسی کی مثل عطا فرمائی''۔ اور آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: ''بے شک میری امت میں سے ایک قوم حق پر رہے گی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں گے''۔ پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کسی وقت بھی دنیا کو ایسے داعی سے خالی نہیں کرے گا جو حق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

## وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۲

''اور جنہوں نے تکذیب کی ہماری آیتوں کی تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے جنہوں نے اس کی آیات کی تکذیب کی ہے کہ وہ انہیں آہستہ آہستہ پستی میں گرا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل مکہ ہیں اور استدراج کا معنی ہے بالتدریج منزل بمنزل کسی چیز کو پکڑنا اور درج کا معنی ہے کسی شے کو لپیٹنا۔ کہا جاتا ہے: أدرجته و درجته (میں نے اسے لپیٹ دیا) اور اسی سے أدرج المیت فی أکفانه بھی ہے (یعنی میت کو اپنے کفن میں لپیٹ دیا گیا) بعض نے کہا ہے: یہ الدرجه سے ہے۔ پھر استدراج یہ ہوگا کہ کسی کو درجہ بدرجہ مقصود کی طرف گرایا جائے۔ ضحاک نے کہا ہے: جب بھی وہ ہمارے لیے نئی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں ہم انہیں نئی نعمت عطا فرما دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کونسی وہ انتہا ہے جس سے بندہ دھوکہ کھا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: الطاف وکرامات سے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ہم ان پر نعمتوں کی بوچھاڑ کر دیں گے

اور انہیں شکر بھلا دیں گے۔ اور انہوں نے یہ اشعار کہے ہیں:

أحسنتَ ظنّكَ بالأيّامِ إذ حَسُنتْ　　ولم تَخَفْ سوءَ ما يأتي به القَدَرُ

و سالمتْكَ الليالي فاغتررتَ بها　　و عند صَفْوِ الليالي يحدثُ الكَدَرُ

**وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ۟ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝۱۸۳**

''اور میں مہلت دیتا ہوں انہیں، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پختہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُمْلِيْ لَهُمْ یعنی میں ان کے لیے مدت طویل کر دیتا ہوں اور انہیں مہلت دیتا ہوں اور ان کی سزا مؤخر کر دیتا ہوں۔ اِنَّ كَيْدِيْ یعنی بے شک میری خفیہ تدبیر مَتِيْنٌ انتہائی قوی اور مضبوط ہے۔ اس کی اصل المتن سے ہے، اور اس سے مراد وہ موٹا گوشت ہے جو صلب کی جانب سے ہو۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت استہزاء کرنے والے قریش کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دینے کے بعد پھر ایک ہی رات میں ہلاک کر دیا۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً (انعام:44) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۸۴**

''کیا اب تک نہیں غور و فکر کیا انہوں نے۔ ان کے صاحب پر تو جنوں کا ذرا اثر نہیں، نہیں ہے وہ مگر کھلم کھلا ڈرانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا کیا اب تک انہوں نے اس میں غور و فکر نہیں کیا جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر ان کے پاس آئے۔ يَتَفَكَّرُوْا پر وقف کرنا اچھا ہے۔ پھر فرمایا: مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ یہ ان کے اس قول کا رد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ (الحجر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رات قریش کو دعوت دینے کے لیے صفا پر کھڑے ہوئے، آپ علیحدہ علیحدہ قبیلہ کو بلاتے اور فرماتے: ''اے بنی فلاں'' آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی سزا سے ڈراتے رہے۔ تو ان میں سے بعض کہنے والوں نے کہا: بے شک ان کا یہ صاحب تو مجنون ہے، رات بھر آواز بلند ہوتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی (1)۔

**اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۵**

''کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں اور (اس میں) جو چیز پیدا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس میں کہ شاید نزدیک آ گئی ہو ان کی مقررہ میعاد۔ تو کس بات پر وہ اس (قرآن) کے بعد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 483

ایمان لے آئیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا یہ قرآن کریم کی آیات میں نظر وفکر کرنے سے ان کے اعراض کرنے پر اظہار تعجب ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کو پہچان سکتے، جیسا کہ ہم نے انہیں سورۃ البقرہ میں بیان کیا ہے۔ اور ملکوت مبالغہ میں سے ہے۔ اور اس کا معنی ہے وسیع مملکت، عظیم سلطنت۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں نظر وفکر کرنا اور اس کی مخلوقات سے عبرت حاصل کرنا واجب ہے انہوں نے اس آیت اور اس کی مثل دیگر آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا (ق: 6) کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے۔ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۝ الآیہ (الغاشیہ) (کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے) وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نظر وفکر نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی ہے اور ان کے اپنے حواس سے نفع اٹھانے کو سلب کر لیا ہے پس ارشاد ربانی ہے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا الآیہ (الاعراف: 179) (ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے) علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ واجبات میں سے پہلا واجب کیا ہے، کیا وہ نظر وفکر کرنا اور استدلال کرنا ہے یا وہ ایمان ہے جو دل میں حاصل ہونے والی تصدیق ہے اور اس کے صحیح ہونے کے لیے معرفت شرط نہیں؟ تو قاضی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر وفکر اور استدلال کرنا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو بداہۃً نہیں جانا جا سکتا، بلکہ اس کا علم نظر و فکر کرنے اور ان دلائل سے استدلال کرنے سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی معرفت اور پہچان کے لیے قائم کیے ہیں۔ یہی موقف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اپنی کتاب میں یہ باب باندھا ہے (باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ عزوجل: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

قاضی نے کہا ہے: جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے نہیں جانتا تو وہ جاہل ہے اور جو اس کے بارے جاہل ہے وہ کافر ہے۔ ابن رشد نے اپنے مقدمات میں کہا ہے: یہ بین نہیں ہے، کیونکہ ایمان اس یقین کے ساتھ صحیح ہوتا ہے جو اسے حاصل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تقلید کے سبب ہدایت عطا فرمائی اور پہلے مرحلہ میں اعتبار اس کا ہے جس کے اعتبار کی طرف اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی آیت کے رہنمائی فرمائی۔ فرمایا: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر واستدلال ہے ان کے خلاف علامہ الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ تمام زمانوں میں عوام الناس اور مقلدین کا نام مومنین رکھنے پر تمام مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر وہ صحیح ہے جس کی طرف نظر واستدلال والے لوگ گئے ہیں تو پھر مومن صرف اسے ہی کہا جائے جس

کے پاس نظر و استدلال کے سبب علم ہو۔ اور مزید یہ کہا ہے: اگر ایمان صحیح نہ ہو مگر نظر و استدلال کے بعد تو پھر کفار کے لیے جائز ہے کہ جب مسلمان ان پر غالب آئیں تو وہ ان سے کہیں: تمہارے لیے ہمیں قتل کرنا حلال نہیں ہے، کیونکہ تمہارے دین میں سے یہ ہے کہ ایمان صحیح نہیں ہوتا مگر نظر و فکر اور استدلال کے بعد، پس تم ہمیں مہلت دو تا کہ ہم غور و فکر کریں اور دلائل حاصل کر سکیں۔ علامہ نے فرمایا: یہ شے انہیں ان کے کفر پر ہی چھوڑنے کی طرف پہنچانے والی ہے اور یہ کہ انہیں قتل نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ غور و فکر کر لیں اور استدلال کر لیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کا قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور وہ ایمان لائیں میرے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو میں لے کر آیا ہوں، پس جب انہوں نے ایسا کر لیا تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے اموال مجھ سے محفوظ کر لیے سوائے حق کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے''۔ ابن منذر نے ''کتاب الاشراف'' میں ایمان کامل کی صفات ذکر کی ہیں اہل علم میں سے جو کوئی اسے یاد رکھتا ہے ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ کافر جب کہے اشهد أن لا إله إلّا الله و أشهد أنّ محمدًا عبدُہ و رسولہٗ اور یہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جو لے کر آئے وہ حق ہے اور میں ہر اس دین سے اظہار برأت کرتا ہوں جو دین اسلام کے مخالف ہے، درآنحالیکہ وہ بالغ اور صحیح العقل ہو بلاشبہ وہ مسلمان ہے۔ اور اگر اس کے بعد وہ رجوع کر لے اور کفر ظاہر کرے تو وہ مرتد ہوگا اور اس پر وہ سزا واجب ہوگی جو مرتد پر واجب ہوتی ہے۔ ابو حفص زنجانی نے کہا ہے: ہمارے شیخ قاضی ابو جعفر احمد بن محمد سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اوّل الواجبات اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور اس دین کے ساتھ ایمان لانا ہے جو آپ ﷺ لے کر آئے، بعد ازاں نظر و استدلال دونوں اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں، پس آپ کے نزدیک ایمان باللہ کا وجوب معرفت باللہ پر مقدم ہے۔ فرمایا: یہ صواب کے زیادہ قریب ہے اور مخلوق کے لیے زیادہ مفید ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر معرفت اور نظر و استدلال کی حقیقت کو جانتے ہی نہیں پس اگر ہم کہیں: اوّل الوجبات اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے تو یہ یقیناً ایک جم غفیر اور کثیر تعداد کی تکفیر تک پہنچا دے گا اور یہ کہ پھر اکا دکا لوگوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اور یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یقین دلایا ہے کہ اہل جنت میں سے سب سے زیادہ آپ کی امت ہوگی۔ اور یہ کہ تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی امتیں ایک صف ہوں گی اور آپ ﷺ کی امت اسی صفیں ہوگی۔ اور یہ اتنا بین اور واضح ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ والحمد للہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ متکلمین میں سے بعض متاخرین اور متقدمین نے یہ کہا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کو ان طرق سے نہ پہچانا جو انہوں نے معرفت کے طریقے مقرر کیے ہیں اور ان ابحاث سے نہ پہچانا جو انہوں نے تحریر کیے ہیں تو اس کا ایمان صحیح نہیں اور وہ کافر ہے۔ تو اس بنا پر تو اکثر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے اور سب سے اوّل جس سے تکفیر کی ابتدا کی جائے گی وہ اس کے اپنے آباء، اسلاف اور پڑوسی ہوں گے۔ اور بعض کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے کہا: مجھے اہل نار کی کثرت کے سبب برا بھلا نہ کہہ۔ او کما قال

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول صادر نہیں ہو سکتا مگر اسی سے جو کتاب اللہ اور اپنے نبی ﷺ کی سنت سے جاہل ہو، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو متکلمین کی ایک قلیل سی جماعت پر محصور کر دیا ہے اور انہوں نے عام مسلمانوں کی تکفیر کی مشقت کی ہے۔ یہ اس اعرابی کے قول سے کہاں ثابت ہے جس نے پیشاب کرنے کے لیے اپنی شرمگاہ کو کھولا۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ کے اصحاب نے اسے جھڑکا: اللّٰھمّ ارحمنی و محمدًا ولا ترحم معنا أحدا (اے اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر) تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لقد حجرت واسعًا (1) (تحقیق تو نے وسیع (رحمت) کو محدود کر دیا ہے) اسے امام بخاری، ترمذی اور دیگر آئمہ نے روایت کیا ہے۔ کیا آپ اس اعرابی کے بارے جانتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو دلیل و برہان اور حجت و بیان کے ساتھ پہچان لیا تھا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شے سے وسیع ہے اور اس کی مثل اور کتنے ہوں گے جن کے لیے ایمان کا حکم لگایا گیا، بلکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے تو اس بارے بہت سے لوگوں کے بارے صرف اس پر اکتفا کیا کہ وہ شہادتین پڑھنے کے سبب اسلام لائے، حتیٰ کہ آپ نے اس میں اشارے پر بھی اکتفا کیا۔ کیا تم جانتے نہیں ہو جب آپ نے سوداء کو کہا تھا: ''اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟''۔ اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''میں کون ہوں؟''۔ اس نے کہا: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: أعتقها فإنها مومنة (تو اسے آزاد کر دے بلاشبہ یہ مومنہ ہے) یہاں نظر و استدلال تو نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ نے پہلے ہی مرحلہ میں ان کے ایمان کا حکم لگا دیا، اگرچہ وہاں نظر و معرفت سے غفلت تھی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4۔** امرد (بے ریش نابالغ بچہ) اور عورتوں میں سے حسینوں کے چہروں میں دیکھنا اور غور و فکر کرنا بھی جائز نہیں۔ علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوطیب طاہر بن عبداللہ طبری نے کہا ہے مجھے اس گروہ کی جانب سے یہ خبر پہنچی ہے جو سماع سنتا ہے کہ وہ امرد کے چہرے کی طرف کثرت سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات اسے زیور اور رنگ دار کپڑوں کے ساتھ آراستہ اور مزین کرتے ہیں اور وہ گمان یہ کرتے ہیں کہ وہ اس سے ایمان میں زیادتی کا قصد کرتے ہیں نظر و فکر کے ذریعے اور صنعت سے صانع پر استدلال کرتے ہیں۔ یہ خواہش نفس کی پیروی کرنے، عقل کو دھوکہ دینے اور علم کی مخالفت کرنے کی انتہا ہے۔ ابوالفرج نے کہا ہے: امام ابوالوفاء بن عقیل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے دیکھنا حلال نہیں کیا مگر صرف اس صورت میں جس کی طرف نفس کا میلان نہ ہو، اس میں ہواء و ہوس کا حصہ نہ ہو، بلکہ اس میں ایسی عبرت ہو جس میں شہوت کی آمیزش نہ ہو۔ اور نہ اس کے ساتھ لذات کی ملاوٹ ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی عورت کو رسول بنا کر مبعوث نہیں فرمایا اور نہ ہی کسی کو قاضی، امام اور موذن بنایا، یہ سب اس لیے ہوا کیونکہ عورت شہوت اور فتنہ کا محل ہے۔ پس جس نے کہا: میں حسین و جمیل صورت سے نصیحت پکڑتا ہوں تو ہم اس کی تکذیب کریں گے۔ اور ہر وہ جس نے اپنے آپ کو ایسی فطرت اور طبیعت کے ساتھ ممتاز کیا جو اسے ہماری طبائع سے نکال دے تو ہم اس کی تکذیب کریں گے، بلاشبہ یہ ان کے لیے شیطان کے دھوکے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: عالم کبیر کی ہر شے کی نظیر عالم صغیر میں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **لَقَدْ خَلَقْنَا**

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889

الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾ (التین) (بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر) اور مزید یہ فرمایا: وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

ہم نے وجہ تمثیل سورۃ الانعام کے اول میں بیان کر دی ہے۔ پس صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرف دیکھے اور اپنی خلقت میں اس وقت سے غور وفکر کرے جب کہ وہ ٹپکنے والے پانی سے لے کر خلقا سویا کے مقام تک پہنچا، اسے غذائیں مہیا کی جاتی ہیں، نرمی کے ساتھ اس کی تربیت کی جاتی ہے اور انتہائی ملائمت کے ساتھ اس کی حفاظت کی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ قوت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے اور جوانی و بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اور جب وہ اس حال میں ہوتا ہے تو پھر کہتا ہے: میں ہی میں ہوں، اور اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس پر ایسا زمانہ بھی آیا ہے جب وہ قابل ذکر شے نہ تھا اور عنقریب وہ قبر میں لوٹ جائے گا۔ پس اس پر افسوس ہے اگر یہ تھکا ماندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾ ...... تا قولہ ...... الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں ...... پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا)

پس وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ بندہ ہے جسے پالا گیا ہے، احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اگر وہ کوتاہی کرے، اسے ثواب کی امید دلائی گئی ہے اگر وہ اطاعت و فرمانبرداری کرے، پس وہ اپنے مولیٰ کی عبادت پر متوجہ رہے (کیونکہ) اگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ (مولیٰ) تو اسے دیکھ رہا ہے اور وہ لوگوں سے نہ ڈرے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اس سے ڈرے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی پر تکبر نہ کرے، کیونکہ وہ غلاظت اور میل کچیل سے مرکب ہے، وہ جنت کی طرف جانے والا ہے اگر اس نے اطاعت کی یا پھر آتش جہنم کی طرف جانے والا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے شیوخ پسند کرتے ہیں کہ آدمی ان حکمت بھرے اشعار میں غور وفکر کرے جو ان علمی اوصاف کے جامع ہیں۔

کیف یَزْهُو مَن رجیعُه أبدَ الدهر ضجیعُه
فهو منه وإلیه وأخوه ورضیعُه
وهو يدعوه إلى الحش بصُغر فیطیعُه

قولہ تعالیٰ: وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے، یعنی ان اشیاء میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں۔ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ یعنی ان مقررہ مدتوں میں جن کے بارے امید ہے کہ وہ قریب آ گئی ہوں۔ یہ کلام محل جر میں ہے اور اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ اس میں اقترب أجل (مقررہ میعاد کا قریب آنا) سے مراد غزوہ بدر اور غزوۂ احد کے دن ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ یعنی وہ قرآن جو حضور نبی

رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اس کے بغیر کون سا قرآن ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے؟ اور بعض نے کہا ہے: آیت میں ہاضمیر کا مرجع اجل ہے، معنی یہ ہوگا مقررہ معیاد آنے کے بعد وہ کون سی بات کے ساتھ ایمان لائیں گے جس وقت ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا، کیونکہ آخرت تو دار التکلیف نہیں ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

''جسے گمراہ کردے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے۔ وہ رہنے دیتا ہے انہیں کہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں''۔

بیان فرمایا کہ ان کے اعراض کی وجہ یہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کردیا ہے۔ یہ قدر یہ کا رد ہے۔ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ یہ جملہ مستانفہ ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ فاء اور اس کے مابعد کے محل پر محمول کرتے ہوئے اسے جزم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ يَعْمَهُوْنَ یعنی وہ حیرت زدہ رہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ متردد ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدا میں پوری بحث گزر چکی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ کب ہوگا اس کا وقوع۔ آپ کہیے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی، یہ (حادثہ) بہت گراں ہے آسمانوں اور زمین میں، نہ آئے گی تم پر مگر اچانک۔ وہ پوچھتے ہیں آپ سے گویا آپ خوب تحقیق کرچکے ہیں اس کے متعلق۔ آپ فرمایئے: اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا، ایان یہ متیٰ کے مثل زمانے اور وقت کے بارے سوال کے لیے آتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

أيان تقضي حاجتي أيان أما ترى لِنجحِها أوانا(1)

اس میں أیان وقت کے بارے سوال کے لیے ہی ہے۔

یہودی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کرتے تھے: اگر آپ نبی ہیں تو ہمیں قیامت کے بارے بتایئے وہ کب قائم ہوگی؟ اور یہ روایت بھی ہے کہ مشرکین نے فرط انکار کی وجہ سے یہ کہا: مُرْسٰىهَا سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور خبر ایان ہے۔ اور یہ ظرف مبنی علی الفتح ہے۔ یہ مبنی ہے کیونکہ اس میں استفہام کا معنی ہے۔ اور مُرْسٰىهَا میم کے ضمہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 484

ساتھ ہے، یہ أرساها اللہ سے ہے یعنی اللہ نے اسے ثابت کر دیا، گویا اس کا معنی ہوا متی مُثْبَتُها یعنی اس کا وقوع کب ہوگا؟ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ رَسَتْ سے ہے۔ بمعنی ثبتت و وقفت (ثابت ہوگئی اور ٹھہر گئی) اور اسی سے وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا:13) ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بمعنی ثابتات ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کسی کے لیے اس نے اسے بیان نہیں کیا، تا کہ بندہ ہمیشہ محتاط اور خوفزدہ رہے۔

لَا يُجَلِّيْهَا یعنی وہ اسے ظاہر نہیں کرے گا۔ لِوَقْتِهَآ بمعنی فی وقتها ہے یعنی اپنے وقت میں اِلَّا هُوَ مگر وہی۔ التجلیة کا معنی ہے شے کو ظاہر کرنا۔ کہا جاتا ہے: جلالی فلان الخبر یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ خبر ظاہر کر دے اور اس کی وضاحت کر دے۔ اور ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے باسیوں پر اس کا علم مخفی ہے۔ اور ہر وہ شے جس کا علم مخفی اور پوشیدہ ہو تو وہ دل پر ثقیل اور گراں ہوتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا آنا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں پر گراں ہے۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے: اس کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین کے مکینوں پر بھاری اور عظیم ہوگا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کے عظیم اور بھاری ہونے کی وجہ سے آسمان اور زمین (اسے برداشت کرنے کی) طاقت نہیں رکھیں گے، کیونکہ آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے اور سمندر بہہ جائیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے بارے سوال کرنا ثقیل اور بھاری ہے۔ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یعنی یہ تم پر اچانک آئے گی، بَغْتَةً مصدر ہے حال کے محل میں ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا یعنی وہ آپ سے اس کے بارے کثرت سے سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کے بارے جانتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے: الحفی کا معنی ہے کسی شے کے بارے جاننے والا۔ اور الحفی کا معنی ہے: سوال میں انتہا کو پہنچنے والا۔ اعشی نے کہا ہے:

فإن تسألي عَنّي فيا رب سائل    حَفِي عن الأعشَى به حيثُ أصْعَدَا

کہا جاتا ہے: أحفى في المسألة وفي الطلب (یعنی اس نے سوال میں اور طلب میں انتہا کر دی) فهو محفٍ وحفي علی التکثیر وہ کثرت میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے، مثلاً مخصِب اور خصیب۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: وہ آپ سے پوچھتے ہیں گویا آپ اس کے بارے سوال سے متعلق اصرار کرنے والے ہیں۔ المعنی یسألونك كأنك حفِي بالمسألة عنها، ای مُلِحٌ یہ اس طرف جاتا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: وہ آپ سے اس کے بارے پوچھتے ہیں گویا آپ ان کے ساتھ سلوک کرنے پر مصر ہیں اور ان کے سوال سے خوش ہیں یسألونك عنها كأنك حَفِيٌّ بهم أي حفي ببرهم و فرِح بسؤالهم اور یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے کہا: ہمارے اور آپ کے درمیان قرابت اور رشتہ داری ہے تو آپ ہم پر قیامت کے وقت کے بارے راز ظاہر فرما دیجئے۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ دو علموں میں سے ایک قیامت کے وقوع کے بارے ہے اور

دوسرا اس کی حقیقت و ماہیت کے بارے ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے نفع کا اور نہ ضرر کا، مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف، نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا (نافرمانوں کو) اور خوش خبری سنانے والا اس قوم کو جو ایمان لائی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا یعنی میں مالک نہیں ہوں کہ میں اپنی ذات کی طرف خیر اور نفع لا سکوں اور نہ اس کا مالک ہوں کہ اپنے آپ سے شر اور ضرر دور کر سکوں، تو پھر میں قیامت کے علم کا مالک کیسے ہو سکتا ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: میں اپنے آپ کے لیے ہدایت اور ضلال کا مالک نہیں ہوں۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ یہ استثنا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور معنی یہ ہے: مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ کہ وہ مجھے اس کا مالک بنا دے اور مجھے قدرت عطا فرما دے۔ سیبویہ نے کہا ہے:

مهما شاء بالناس يفعل

وہ لوگوں کے بارے جو چاہے وہ کر دیتا ہے۔

وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ اس کا معنی ہے اگر میں اسے جان لیتا جو مجھ سے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس سے پہلے کہ وہ مجھے اس کے بارے آگاہ فرمائے تو میں یقیناً اسے کرتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اگر میں جان لیتا کب جنگ میں میرے لیے مدد و نصرت آئے گی تو میں یقیناً قتال کرتا اور میں مغلوب نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے کہا ہے: اگر میں قحط سالی کے بارے جان لیتا تو میں یقیناً خوشحالی کے زمانہ میں اس کی تیاری کرتا جو مجھے کافی ہو رہتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں اس (مال) تجارت کے بارے جان لیتا جو ختم ہو جاتا ہے تو میں یقیناً اسے اس کی کساد بازاری کے وقت خرید لیتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں جان لیتا میں کب فوت ہوں گا تو میں یقیناً اعمال صالحہ میں سے بہت جمع کر لیتا۔ یہ حسن اور ابن جریج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) غیب جان لیتا تو میں یقیناً ہر اس کے بارے جواب دیتا جس کے بارے مجھ سے سوال کیا جاتا ہے۔ یہ سب ہی مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ یہ نیا کلام ہے، یعنی مجھے کوئی جنون نہیں ہے، کیونکہ انہوں (کفار مکہ) نے آپ کو مجنون کہا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور معنی یہ ہے اگر میں غیب جان لیتا تو مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور میں محفوظ رہتا۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ (الشعرا) (نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 485

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے پھر جب مرد ڈھانپ لیتا ہے عورت کو تو حاملہ ہو جاتی ہے ہلکے سے حمل سے پھر چلتی پھرتی رہتی ہے اس کے ساتھ، پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دعا مانگتے ہیں (میاں بیوی) الله سے جو ان کا رب ہے کہ اگر تو عنایت فرمائے ہمیں تندرست لڑکا تو ہم ضرور ہو جائیں گے تیرے شکر گزار بندوں سے پس جب الله عطا کرتا ہے انہیں تندرست لڑکا دونوں بناتے ہیں، الله کے ساتھ شریک اس میں جو اس نے انہیں دیا، تو بلند و برتر ہے الله ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ جمہور مفسرین نے کہا ہے: اس میں نفس واحد (ایک نفس) سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اور بنایا اس سے جوڑا) یعنی حواء علیہا السلام سے۔ لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا تا کہ وہ اس سے انس حاصل کریں اور اطمینان پائیں اور یہ سب جنت میں ہوا۔ پھر دوسری حالت کا آغاز ہوا جو ان دونوں کے زمین پر اترنے کے بعد دنیا میں پیش آئی۔ پس فرمایا: فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا یہ جماع سے کنایہ ہے۔ حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا ہر وہ شے ہے جو پیٹ میں ہو یا درخت کے اوپر ہو تو وہ حمل کہلاتی ہے (یعنی اس میں حا مفتوح ہے) اور جب وہ (بوجھ) پیٹھ پر ہو یا سر پر تو وہ حمل کہلاتا ہے (یعنی اس میں حا مکسور ہوتی ہے) یعقوب نے حمل النخلة بالکسر بیان کیا ہے۔ اور ابوسعید سیرافی نے کہا ہے: عورت کے حمل کے بارے میں حمل اور رحمل دونوں کہے جاتے ہیں، یہ ایک بار اپنے مخفی اور پوشیدہ ہونے کی وجہ سے عورت کے حمل کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور ایک بار اپنے واضح اور ظاہر ہونے کی وجہ سے حمل الدابة (چوپائے کا بوجھ) کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور حمل مصدر بھی ہے جب کوئی کسی پر حملہ کرے تو کہا جاتا ہے: حَمل علیه، یحمِل حملاً۔ فَمَرَّتْ بِهٖ یعنی پھر وہ منی کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے، یعنی اس ہلکے سے حمل کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ وہ فرما رہا ہے: وہ کھڑی ہوتی ہے، بیٹھتی ہے اور ادھر ادھر چلتی رہتی ہے، کروٹ بدلتی رہتی ہے اور وہ اپنے حمل کے بوجھل اور بھاری ہونے تک کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ یہ معنی حسن اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فاستمر بها الحمل (پس اس کے ساتھ حمل قائم رہتا ہے) پس اس میں قلب کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدخلتُ القلنسوة فی رأسی (میں نے ٹوپی سر میں داخل کی) حضرت عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما

نے اسے فَمَارَتْ بِہٖ الف اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مَارَ، یَمُوْرُ سے ہے جب کوئی آئے، جائے اور تصرف کرے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہ نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ المِرْیَۃ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ اس بارے میں شک میں پڑ جاتی ہے جو اسے لاحق ہوتا ہے کہ کیا یہ حمل ہے یا بیماری ہے؟ یا اسی طرح کے اور شکوک وشبہات۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أثمر النخل (درخت پھل دار ہو گیا) اور بعض نے کہا ہے: جب وہ بوجھ میں داخل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصبح وأمسی (اس نے صبح کی اور شام کی) دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا، دَعَوَا میں ضمیر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ اس قول کی بنا پر ہے جو اس آیت کے قصص میں روایت کیا گیا ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام جب پہلی بار حاملہ ہوئیں تو آپ نہ جانتی تھیں کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ اس کی قراءت کو تقویت دیتا ہے جس نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو آپ اس سے گھبرا گئیں۔ چنانچہ ابلیس نے آپ کی طرف موقع پا لیا۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک ابلیس ایک آدمی کی صورت میں حضرت حواء علیہا السلام کے پاس آیا جب آپ پہلے حمل کے ساتھ بوجھل ہوئیں اور کہا: تمہارے پیٹ میں یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں جانتی۔ اس نے کہا: مجھے تو یہ خوف ہے کہ کہیں یہ چوپایہ ہو۔ پس آپ نے یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کو بتائی، تو وہ دونوں اس وجہ سے پریشان رہنے لگے۔ پس وہ (ابلیس) دوبارہ آپ کے پاس گیا اور کہنے لگا: وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ پس اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو تو انسان کو جنم دے گی کیا تو اس کا نام میری نسبت سے رکھے گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: پس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ پس جب آپ نے بچے کو جنم دیا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اس کا نام میرے نام پر رکھو۔ تو آپ نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: حارث۔ اگر وہ آپ کو اپنا نام بتاتا تو یقیناً آپ اسے پہچان لیتی۔ پس آپ نے بچے کا نام عبد الحارث رکھا۔ اسی طرح ضعیف حدیث سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، یہ ترمذی وغیرہ میں ہے اور اسرائیلیات میں کثیر واقعات ہیں جو ثابت نہیں۔ اور کوئی بھی صاحب دل ان کی اعتماد نہیں کرتا۔ بلاشبہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہا السلام اگرچہ اس نے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کیا ہے لیکن مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جا سکتا، پس یہ قصے بنائے گئے ہیں اور لکھ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس نے ان دونوں کو دو بار دھوکہ دیا ایک بار جنت میں دھوکہ دیا اور (ایک بار) زمین میں دھوکہ دیا'' (1)۔ اور اس کی تائید سلمی کی قراءت أتشہا کون تا کے ساتھ سے کی گئی ہے۔ اور صَالِحًا کا معنی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست بچہ چاہتا ہے۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا وہ شرک جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی طرف منسوب ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 3۔** مفسرین نے کہا ہے: یہ تسمیہ اور صفت میں شرک تھا، نہ کہ عبادت اور ربوبیت میں۔ اہل معانی نے کہا: بلاشبہ دونوں نے یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ حارث ان دونوں کا رب ہے اس وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 204

عبدالحارث رکھا ہے، بلکہ یہ قصد کیا کہ حارث بیٹے کی نجات کا سبب ہے اس لیے اس کا نام اس کے نام کے ساتھ رکھا جیسا کہ کوئی آدمی انتہائی عاجزی اور خضوع کی بنا پر اپنے آپ کو عبد ضیفه پکارنے لگے، نہ کہ اس بنا پر کہ ضیف (مہمان) اس کا رب ہے، جیسا کہ حاتم نے بھی کہا ہے:

وإنّي لَعبد الضيف مادام ثاوِيًا وما فيّ إلّا تيلكَ من شِيمة العبدِ

اور ایک قوم نے کہا ہے: بے شک یہ آدمیوں کی جنس کی طرف راجع ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مشرکین کے حال کی وضاحت اور بیان ہے اور یہ وہ (معنی) ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پس قول باری تعالیٰ: جَعَلَا لَهٗ میں مراد مذکر اور مونث کفار ہیں اور اس سے دونوں جنسیں مراد لی گئی ہیں۔ اور اس پر دلیل فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ہے۔ اس میں یشرکان نہیں کہا ہے۔ یہ قول حسن ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وہ ہے جس نے تمہیں ایک شکل سے پیدا کیا ہے۔ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا یعنی دونوں جنسوں نے (جب ایک دوسرے کو ڈھانپ لیا) اس قول کے مطابق آیت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کا ذکر نہیں ہوگا۔ پس جب الله تعالیٰ انہیں صحیح سالم صحت مند لڑکا عطا فرما دیتا ہے جیسے وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں تو پھر وہ دونوں اسے فطرت سے شرک کی طرف پھیر دیتے ہیں، یہ مشرکین کا فعل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی نومولود بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے ''وہ اس ملت پر پیدا کیا جاتا ہے، (پھر) اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں''۔

عکرمہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام اس کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بلکہ الله تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد تمام مخلوق کے لیے عام قرار دیا ہے۔ حسین بن فضل نے کہا ہے: اہل فکر و نظر کے نزدیک یہ زیادہ عجیب ہے، کیونکہ پہلے قول میں عظائم کو الله تعالیٰ کے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اہل مدینہ اور حضرت عاصم نے توحید اور مفرد کی بنا پر شرکا پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو اور تمام اہل کوفہ نے صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ فعلاء کے وزن پر ہے اور شریک کی جمع ہے۔ اخفش سعید نے پہلی قراءت کا انکار کیا ہے۔ اور یہ قراءت صحیح ہے اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی جعلا له ذا شرك جیسا کہ وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) میں ہے پس معنی اس طرف راجع ہوگا کہ انہوں نے اس کے شریک بنا لیے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آیت اس پر دلیل ہے کہ حمل امراض میں سے ایک مرض ہے۔ ابن القاسم اور یحییٰ نے مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حمل کی ابتدا آسانی اور سرور ہے (1) اور اس کا آخر بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے۔ یہ وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: إنه مرض من الأمراض قول باری تعالیٰ: دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا کا ظاہر اس کی تائید کرتا ہے اور یہ وہ حالت ہے جس کا مشاہدہ حاملہ عورتوں میں کیا جاتا ہے۔ امر کے عظیم ہونے اور خطاب کے شدید ہونے کی وجہ سے ہی اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 820

کی موت کو شہادت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے (1)۔ اور جب یہ ظاہر آیت سے ثابت ہے، تو پھر حاملہ کی حالت افعال میں مریض کی حالت کی مثل ہے۔ علماء امصار کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مریض کا فعل کسی کو ہبہ اور عطیہ دینے کے بارے اپنے (مال کے) ثلث (تہائی حصہ) میں جاری ہوتا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حاملہ میں آزاد آدی کی حالت کی مثل جاری ہوگا اور رہا اس سے قبل تو وہ اس طرح نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حمل ایک عادت ہے اور اس میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا ہے: اس طرح اکثر بیماریوں میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے اور کبھی وہ مر جاتا ہے جو مریض نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس دن سے عورت حاملہ ہوئی اس دن سے جب اس کے چھ مہینے گزر جائیں تو پھر اس کا اپنے مال میں سوائے ثلث کے کوئی فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اور جس نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی درآنحالیکہ وہ حاملہ تھی تو جب اس پر چھ ماہ گزر گئے تو اس نے اس کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے یہ صحیح نہیں، کیونکہ وہ عورت مریضہ ہے اور مریضہ کا نکاح صحیح نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یحیٰ نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے آدی کے بارے میں جو قتال میں حاضر ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب وہ جنگ کے لیے صف میں موجود ہو تو پھر اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصہ کے سوا میں کسی شے کا فیصلہ کرے، بلاشبہ وہ حاملہ عورت اور ایسے مریض کے قائم مقام ہے جس پر اس کی حالت کے سبب (موت کا) خوف غالب ہوتا ہے۔ اور اسی حکم میں وہ بھی شامل ہے جسے قصاصاً قتل کرنے کے لیے قید کیا گیا ہو۔ اس بارے میں امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (2) نے کہا ہے: جب تو بنظر غائر دیکھے تو تجھے اس بارے میں کوئی شک نہ ہوگا کہ قتل کے لیے محبوس آدی کی حالت مریض کی نسبت زیادہ شدید اور پریشان کن ہوتی ہے اور اس کا انکار نظر وفکر میں غفلت کی علامت ہے، کیونکہ دونوں کے نزدیک موت کا سبب موجود ہے۔ جیسا کہ مرض موت کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (آل عمران) (اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو)

اور روشد طائی نے کہا ہے:

يا أيها الراكبُ المُزجِي مَطِيَّتَه ۔۔۔ سائِلْ بني أسَدٍ ماهذه الصَّوتُ

وقل لهم بادروا بالعُذرِ والتمسوا ۔۔۔ قولا يُبرِّئكم إنّي أنا المَوْتُ

اور جو اس پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی فضل من مات فی الطاعون، حدیث نمبر 2704۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب:10) (جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے)

پس امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کیسے کہتے ہیں کہ شدید ترین حالت بلاشبہ یہ مبارزت (اور مقابلہ) کی حالت ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابل ہونے اور دونوں فریقوں کے ایک دوسرے کے ساتھ قریب ہونے کی اس عظیم حالت کے ساتھ خبر دی ہے جس میں دل نرخروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور (یہ) اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوء ظن رکھنے اور دلوں کے متزلزل اور ان کے اضطراب میں سے ہے، کیا یہ حالت تو مریض پر دیکھتا ہے یا نہیں؟ یہ وہ حالت ہے جس میں کوئی انصاف کرنے والا شک نہیں کر سکتا۔ اور یہ اس کے لیے جو اپنے اعتقاد میں ثابت اور پختہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس طرح جہاد کرے جیسے جہاد کا حق ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آیات و معجزات کی شہادت دے، پس یہ ہمارے بارے میں کیسے ہو سکتی ہے؟

**مسئلہ نمبر 7۔** ہمارے علماء نے سمندر میں سفر کرنے والے کے بارے میں خوف کے وقت حکم میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اس کا حکم صحیح اور تندرست آدمی کے حکم میں ہوگا یا کہ حاملہ کے حکم میں؟ تو ابن القاسم نے کہا ہے: اس کا حکم صحت مند آدمی کے حکم کی طرح ہے۔ ابن وہب اور اشہب نے کہا ہے: اس کا حکم اس حاملہ کے حکم کی طرح ہے جس کے حمل کی مدت چھ ماہ ہو جائے۔ قاضی ابو محمد نے کہا ہے: ان دونوں کا قول زیادہ عمدہ اور اچھا ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس پر خوف کی حالت میں ہے جیسا کہ بوجھ اٹھانے والے (حالت خوف میں ہوتے ہیں)۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: ابن القاسم نے سمندر کا سفر نہیں کیا اور نہ اس نے عود پر کوئی کپڑا دیکھا۔ اور جو چاہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یقین کر لے کہ وہ اکیلا فاعل ہے اس کے ساتھ کوئی اور فاعل نہیں اور یہ اسباب کمزور ہیں یقین رکھنے والے کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور توکل اور تفویض کرنا ثابت ہوتا ہے پس چاہیے کہ وہ سمندر کا سفر کرے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

”کیا وہ شریک بناتے ہیں اسے جس نے پیدا نہیں کی کوئی چیز اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ نہیں طاقت رکھتے ان کو مدد پہنچانے کی اور نہ اپنی آپ مدد کر سکتے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا یعنی کیا وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو کسی شے کو تخلیق کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ یعنی بت (خود) پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فرمایا يُخْلَقُوْنَ یہ واؤ اور نون کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بت نقصان اور نفع پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا انہیں الناس (لوگوں) کے قائم مقام قرار دیا گیا (اس لیے جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

ہیں) اور یہ ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ (النمل: 18) (اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں) وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ یعنی بلاشبہ بت نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ غالب آسکتے ہیں۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

''اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ اخفش نے کہا ہے: اگر تم بتوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہ کریں گے۔ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: کیونکہ یہ راس الآیۃ ہے، مراد یہ ہے کہ فرمایا: اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا: أم صمتم اور صامتون اور صمتم سیبویہ کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ہیں جن کے بارے پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لَا یَتَّبِعُوْكُمْ کو مشدد اور مخفف دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور بعض اہل لغت نے کہا ہے: أتبعه جب مخفف ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے نہ پا سکے۔ اور اِتّبعه جب مشدد ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے پالے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖؗ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

''(اے کفار) بے شک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، بندے ہیں تمہاری طرح تو پکارو انہیں پس چاہیے کہ قبول کریں تمہاری پکار کو اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں چلتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کے ہاتھ ہیں پکڑتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کی آنکھیں ہیں دیکھتے ہیں جن سے یا کیا ان کے کان ہیں وہ سنتے ہیں جن کے ساتھ، آپ کہیے: پکارو اپنے شریکوں کو پھر سازش کرو میرے خلاف اور مت مہلت دو مجھے۔ یقیناً میرا حمایتی اللہ ہے جس نے اتاری یہ کتاب اور وہ حمایت کیا کرتا ہے نیک بندوں کی''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اللہ تعالیٰ نے) بتوں کی پوجا کے بارے میں ان سے جھگڑا کیا ہے۔ تَدْعُوْنَ یہ تعبدون کے معنی میں ہے یعنی جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم انہیں (بتوں کو) الٰہ پکارتے ہو۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی من غیر اللہ، اللہ کے سوا کو۔ اور بتوں کو عباد کہا گیا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور

مسخر ہیں۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ بت تمہاری طرح مخلوق ہیں۔ جب مشرکین نے یہ اعتقاد بنالیا کہ بت نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کے قائم مقام قرار دیا اور فرمایا: فَادْعُوْهُمْ اور یہاں فادعوهن نہیں کہا (یعنی ان کے لیے مونث ضمیر ذکر کرنے کی بجائے جمع مذکر ضمیر ذکر کی جوذوی العقول کے لیے ذکر کی جاتی ہے)

اور ان کے لیے فرمایا: عِبَادٌ (وہ بندے ہیں تمہاری طرح) اور مزید کہا: اِنَّ الَّذِيْنَ اس کی جگہ ان التہ ذکر نہیں لیا۔ اور فَادْعُوْهُمْ کا معنی یہ ہے پس تم ان سے نفع اور نقصان کا مطالبہ کرو۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہاری پکار کو) اور یہ کہ بتوں کی پرستش نفع پہنچائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ فَادْعُوْهُمْ کا معنی ہے فاعبدوهم (پس تم ان کی پرستش کرو) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زجر و توبیخ کی اور ان کی عقلوں کی سفاہت اور حماقت کو بیان فرمایا اور فرمایا: اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا، الآیہ یعنی تم ان سے افضل ہو تو پھر تم ان کی پرستش کیونکر کرتے ہو۔ مقصود ان کی جہالت کا بیان ہے۔ کیونکہ معبود جوارح سے متصف ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ پڑھا ہے یعنی ان کو التقائے ساکنین کی وجہ سے تخفیف اور کسرہ کے ساتھ اور عِبَادٌ کو نصب اور تنوین کے ساتھ اور امثالکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے ما الذين تدعون ...... الخ۔ وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے نہیں ہیں، یعنی وہ تو پتھر اور لکڑی ہے پس تم جن کی پوجا کرتے ہو تم خود ان سے اشرف اور اعلیٰ ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے لیے مناسب نہیں کہ اسے اس طرح پڑھا جائے اس کی تین وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ سواد اور جمہور کی قراءت کے خلاف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیبویہ ان کی خبر پر رفع مختار سمجھتے ہیں جب وہ ما کے معنی میں ہو، پس وہ کہتے ہیں: اِن زید منطلق کیونکہ ما کا عمل ضعیف ہے اور ان اس کے معنی میں ہونے کے سبب اس سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ کسائی نے گمان کیا ہے عرب کلام میں ان بمعنی ما آتا ہی نہیں مگر یہ کہ اس کے بعد ایجاب ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝ (الملک)

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اس میں اصل تو یہ ہے کہ لام مکسور ہو، پھر ثقیل ہونے کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا گیا۔ پھر کہا گیا ہے: کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: فادعوهم إلى أن يتبعوكم فليستجيبوا لكم إن كنتم صادقين أنهم آلهة پس تم انہیں پکارو یہاں تک کہ وہ تمہاری اتباع کریں اور چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کو قبول کریں اگر تم سچے ہے کہ وہ معبود ہیں۔ ابوجعفر اور شیبہ نے أم لهم أيد يبطشون بها طا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ الفاظ الید، الرجل اور الأذن سب مونث ہیں ہا کے ساتھ ان کی تصغیر لائی جاتی ہے۔ اور الید میں تصغیر کے وقت یاء کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اسے اپنے اصل کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: يُدَيّة یعنی دو یا جمع ہونے کی وجہ سے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ اس میں شرکاء سے مراد بت ہیں۔ ثُمَّ كِيْدُوْنِ پھر تم اور وہ میرے خلاف سازش کرو۔ فَلَا تُنْظِرُوْنِ اور تم مجھے مہلت نہ دو۔ اصل میں کیدونی تھا اس سے یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کر

رہا ہے۔ اور اسی طرح فَلَا تُنْظِرُوْنِ کا معنی ہے۔ اور کید کا معنی مکر کرنا ہے۔ اور کید کا معنی جنگ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: غزا فلم یلق کیدا اس میں کید جنگ کے معنی میں ہے۔ اِنَّ وَلِیِّ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ یعنی وہ جو میری مدد اور حفاظت کا والی ہے وہ اللہ ہے۔ اور ولی الشیٔ کا معنی ہے: وہ جو اس شے کی حفاظت کرتا ہے اور اور اس سے ضرر اور نقصان کو روکتا ہے۔ اور الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ اور وہی نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ألا إن آل أبي یعنی فلانا ...... لیسوال باولیاء إنما ولي الله و صالح المومنین (خبردار غور سے سنو! بے شک آل فلان میرے اولیاء (محافظ) نہیں ہیں بلکہ میرا محافظ اور مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں)

اخفش نے کہا ہے: اسے إنّ ولیّ اللهِ الذی نزّل الکتاب بھی پڑھا گیا ہے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ عاصم جحدری کی قراءت ہے۔ اور پہلی قراءت زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ (اور وہ نیک بندوں کی حمایت کیا کرتا ہے)

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا وہ طاقت نہیں رکھتے تمہاری امداد کے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو وہ نہ سنیں گے اور تو دیکھے گا انہیں کہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اسے مکرر ذکر فرمایا تا کہ وہ یہ بیان کرے کہ جن کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى یہ شرط ہے اور جواب شرط لَا یَسْمَعُوْا ہے۔ وَتَرٰىهُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ یہ حال کے محل میں واقع ہے مراد بت ہیں۔ اور نظر کا معنی ہے اس کی طرف دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھنا جس کی طرف دیکھا جا رہا ہے، یعنی تو انہیں دیکھے گا جیسے وہ تیری طرف آنکھیں کھولے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں خبر واؤ (مراد جمع مذکر کا صیغہ ہے) کے ساتھ دی حالانکہ وہ جماد ہیں جو نہیں دیکھ سکتے، اس لیے کہ یہ خبر اس کے فعل کے قائم مقام ہے جو عقل رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی آنکھیں جواہر سے بنی ہوئی تھیں پس اس لیے فرمایا: وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں، ان کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ وہ نہیں دیکھ رہے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں سے نفع حاصل نہیں کر رہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

''قبول کیجئے معذرت (خطا کاروں سے) اور حکم دیجئے نیک کاموں کا اور رخ (انور) پھیر لیجئے نادانوں کی طرف سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ آیت تین کلمات پر مشتمل ہے، جو مامورات اور منہیات میں قواعد شریعت کو متضمن ہیں۔ پس قول باری تعالیٰ: **خُذِ الْعَفْوَ** میں قطع تعلقی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، گنہگاروں سے معذرت قبول کر کے انہیں معاف کرنا، مومنین کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور علاوہ ازیں اطاعت شعاروں کے اخلاق داخل ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: **وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ** میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، حلال و حرام کے معاملہ میں الله تعالیٰ سے ڈرنا، آنکھوں کو نیچا رکھنا اور دار آخرت کے لیے تیاری کرنا داخل ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: **وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ** میں علم کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر ابھارنا، ظلم کرنے والوں سے اعراض کرنا، احمقانہ جھگڑوں سے پرہیز کرنا، کند ذہن جہلاء کی مساوات سے بچنا اور دیگر اخلاق حمیدہ اور افعال رشیدہ داخل ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خصائل شرح و بسط کی محتاج ہیں، تحقیق رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جابر بن سلیم کے لیے ان تمام کو جمع کیا۔ حضرت جابر بن سلیم ابو جری (1) نے بیان کیا ہے: میں اپنی سواری پر سوار ہوا پھر مکہ مکرمہ آیا اور رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کیا، میں نے اپنی سواری مسجد کے دروازے پر بٹھائی۔ تو انہوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میری رہنمائی کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے آپ اپنے اوپر سرخ دھاری دار اونی چادر لیے ہوئے تھے، میں نے عرض کی: السلام علیک یارسول الله، تو آپ نے فرمایا: ''وعلیک السلام''۔ پھر میں نے عرض کی: بے شک ہم (دیہاتی) جنگل میں رہنے والے لوگ ہیں، ایسی قوم ہیں کہ ہم میں جفا اور زیادتی وافر ہے، سو آپ مجھے ایسے کلمات سکھا دیں جن کے سبب الله تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے۔ آپ نے فرمایا: ''قریب آ''، آپ نے یہ تین بار فرمایا، چنانچہ میں قریب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف توجہ کر'' میں آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو الله تعالیٰ سے ڈر اور کسی نیکی کو بھی حقیر نہ جان (اگرچہ) وہ تیرا اپنے بھائی کو متبسم چہرے کے ساتھ ملنا ہی ہو اور یہ کہ تو پانی طلب کرنے والے کے برتن میں اپنا ڈول مکمل طور پر انڈیل دے اگر کوئی آدمی تجھے ایسے سبب سے گالیاں دیتا ہے جسے وہ تجھ میں نہیں جانتا تو تو اسے اس وجہ سے گالیاں نہ دے جسے تو اس میں جانتا ہے تو بلاشبہ الله تعالیٰ اسے تیرے لیے اجر بنا دے گا اور اس پر اسے بوجھ بنا دے گا اور تو ان (چیزوں) میں سے کسی شے کو بھی برا بھلا نہ کہہ جو الله تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہیں''۔ ابو جری نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں نے اس کے بعد کسی بکری اور کسی اونٹ کو بھی گالیاں نہیں دیں۔ اس کو اس معنی کے ساتھ ابوبکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ (2)

ابو سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تم لوگوں کو اپنے مالوں کے ساتھ وسعت نہیں دے سکتے البتہ تمہاری طرف سے چہرے کی کشادگی اور حسن اخلاق انہیں وسعت عطا کر سکتا ہے''۔ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے یہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823　　2۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے میں نازل فرمائی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما (1) کی حدیث سے قول باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ کے بارے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے نازل فرمائی ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ (2) سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''اے جبریل یہ کیا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں عالم (جاننے والے) سے پوچھ لوں۔ ایک روایت میں ہے: ''میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں اپنے رب سے پوچھ لوں''۔ چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی ہی دیر گزری کہ وہ واپس لوٹ آئے اور بتایا: بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرما رہا ہے کہ آپ اسے معاف فرما دیں جو کوئی آپ سے ظلم و زیادتی کرے اور اسے عطا فرمائیں جو آپ کو محروم رکھے اور اس سے صلہ رحمی کریں جو آپ سے قطع تعلقی کرے''۔

کسی شاعر نے اسے نظم کیا ہے اور اس نے کہا ہے:

مکارم الأخلاق فی ثلاثۃٍ من کَمُلَتْ فیہ فذالك الفتَی

اعطاءُ مَنْ تحرِمہ ووَصلُ مَن تَقْطَعُہ والعفُوْ عَمّن إعتدَی

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارم اخلاق کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے، قرآن کریم میں اس آیت سے زیادہ مکارم اخلاق کی جامع کوئی آیت نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں''۔ شاعر نے کہا ہے:

کلُّ الأمور تزول عنك و تنقضی إلّا الثناء فإنہ لك باقی

ولو أنّنِی خُیِّرتُ کلّ فضیلۃ ما أخترت غیر مکارم الأخلاق

اور سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی۔ آپ سے کہا گیا: کون سی شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا: نو چیزوں کے بارے، سراً اور جہراً اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، حالت رضا اور غضب میں کلمہ حق کہنا، حالت فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلقی کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور اس سے درگزر کروں جو مجھ پر زیادتی کرے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میرا دیکھنا عبرت ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم ارشاد فرمایا ہے سراً اور علانیۃً، اخلاص اختیار کرنا، حالت رضا اور غضب میں عدل کرنا، غنی اور فقر کی حالت میں میانہ روی اپنانا اور یہ کہ میں اس سے درگزر کروں جو مجھ پر ظلم و زیادتی کرے اور اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلقی کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میری نظر عبرت ہو''۔

---

1۔ صحیح بخاری، سورۃ اعراف، جلد 2، صفحہ 669    2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قولِ باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ سے مراد زکوٰۃ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کثیر مال میں سے تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اور یہ معنی مراد لینے میں انتہائی بعد ہے، کیونکہ یہ عفا سے ہے جب وہ مٹ جائے (یعنی نام ونشان ختم ہو جائے) تحقیق کہا جاتا ہے: خذ العفو منه، یعنی تو اس پر تنقیص نہ کر اور اس سے درگزر کر لے۔ اور سبب نزول اس کی تردید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین پر حجت قائم کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے تو اس نے مکارم اخلاق پر آپ کی رہنمائی فرمائی ہے، کیونکہ یہی مشرکین کو ایمان کی طرف کھینچ لانے کا سبب ہے، یعنی لوگوں کے اخلاق میں سے جو مٹ چکے ہیں آپ ان کے ساتھ ان سے پیش آئیں اور انہیں آسان بنا دیں۔ تو کہتا ہے: أخذت حقي عفوا صفوا، أي سهلا یعنی میں نے اپنا حق آسانی سے لے لیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ یہ عرف بمعنی معروف ہے یعنی آپ نیکی کا حکم دیجیے۔ عیسیٰ بن عمر نے العرف دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے، جیسے حلم ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ العرف، المعروف اور العارفة سے مراد ہر وہ اچھی خصلت ہے جسے عقول پسند کرتی ہیں اور اس کے ساتھ دل اطمینان پاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

من يفعل الخير لا يَعْدَم جَوازِيَه　　لا يذهب العُرْف بين الله والنّاس

اور حضرت عطا نے کہا ہے: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یعنی جب آپ ان پر حجت قائم کر دیں اور انہیں نیکی کا حکم دیں پھر وہ آپ پر جہالت اور نادانی کا اظہار کریں تو آپ ان سے اعراض فرمالیں، ان کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے اور ان کے جواب سے اپنے درجہ اور مقام کو بلند رکھتے ہوئے۔ یہ اگرچہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مقصود اپنی تمام مخلوق کو ادب سکھانا ہے۔

ابن زید اور عطا رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ آیت آیۃ السیف سے منسوخ ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ محکم ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر آیا اور وہ اپنے بھتیجے حر بن قیس ابن حصن کے پاس آ کر اترا اور یہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریب رکھتے تھے اور قراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجالس اور آپ کی مشاورت کے اصحاب تھے، وہ بوڑھے تھے یا جوان، تو عیینہ نے اپنے بھتیجے کو کہا: اے بھتیجے! کیا تیرا اس امیر کے پاس کوئی تعلق اور ذریعہ ہے کہ تو میرے لیے اس کے پاس داخل ہونے کی اجازت لے لے۔ اس نے جواب دیا: میں عنقریب تمہارے لیے ان سے اجازت لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے عیینہ کے لیے اجازت طلب کی۔ پس جب وہ داخل ہوا تو کہا: اے ابن خطاب! قسم بخدا! تو ہمیں زیادہ نہیں عطا کرتا اور نہ تو ہمارے درمیان عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ راوی نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے یہاں تک کہ آپ نے اسے سزا دینے کا قصد کر لیا۔ تو حر نے کہا: اے امیر المومنین! بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ بلاشبہ یہ جاہلوں میں سے ہے۔ تو قسم بخدا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اس سے تجاوز کر

لیا (اور اعراض برت لیا) جونہی انہوں نے آپ پر یہ آیت تلاوت کی اور آپ اللہ عزوجل کی کتاب سے خوب واقف تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے مطابق عمل کرنا اور حضرت حر کا اس سے استدلال کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور اسی طرح اسے حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے بھی استعمال کیا ہے، اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور جب جفا اور زیادتی سلطان کے خلاف عمداً اور اس کے حق کو حقیر جانتے ہوئے ہو تو اس کے لیے اس پر تعزیر ہے۔ اور جب اس کے سوا ہو تو پھر اعراض، درگزر اور عفو ہے، جیسا کہ خلیفہ عادل نے کیا۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٢٠٠

''اور اگر پہنچے آپ کو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ تو فوراً پناہ مانگیے اللہ سے، بے شک وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب ارشاد باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ نازل ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا: اے میرے رب! کیسے غصہ سے بچ سکتا ہوں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ اور نزغ الشیطان سے مراد اس کے وساوس ہیں۔ اس میں دو لغتیں ہیں: نزغ اور نغز۔ کہا جاتا ہے: ایاك و النزاغ و النغاز وساوس سے بچ، درآنحالیکہ وہ (فساد پر) بھڑکانے اور ابھارنے والے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: النزغ سے مراد تھوڑی سی حرکت ہوتی ہے اور شیطان کی طرف سے ادنیٰ سا وسوسہ ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر تھا اور ان کے درمیان شیطان کی جانب سے وسوسہ پیدا ہو گیا تو ان میں سے کسی ایک نے اپنے ساتھی کے لیے کوئی شے باقی نہ رکھی، پھر وہ دونوں آپس میں جدا نہیں ہوئے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی کے لیے استغفار کیا اور مغفرت طلب کی۔ اور يَنْزَغَنَّكَ کا معنی ہے: غصے کے وقت تجھے ایسا وسوسہ پہنچے اور عارض آئے کہ اس کے سبب وہ غصہ نہ اترے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اس بارے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کر۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس سے التجا کرنے اور اس کی پناہ طلب کرنے کے سبب وہ وسوسہ کو دور کرے اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے۔ پس کتوں سے پناہ طلب نہیں کی جائے گی مگر کتوں کے رب کی پناہ طلب کی جائے گی۔ اسلاف میں سے کسی سے یہ حکایت منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد کو کہا: تو شیطان کے بارے کیا کرے گا جب وہ تیرے لیے گناہوں کو مزین اور آراستہ کرے؟ تو اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پھر پوچھا: پھر اگر وہ لوٹ آئے؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پوچھا: اگر وہ پھر آ گیا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے کہا: یہ تو طویل ہو جائے گا، تیرا کیا خیال ہے اگر تو تیرا گزر کسی ریوڑ کے پاس سے ہو اور اس کا کتا تجھے بھونکنے لگے اور تجھے آگے بڑھنے سے روک دے تو تو کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کی تکلیف کو برداشت کروں گا اور اپنی ہمت کے ساتھ اسے واپس لوٹا دوں گا۔ اس نے کہا: یہ تو معاملہ تجھ پر طویل ہو جائے گا، البتہ تو ریوڑ کے مالک سے مدد طلب کر تو وہ اسے تجھ سے روک لے گا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** النغز والنزغ والھمز والوسوسۃ یہ تمام الفاظ معنی میں برابر ہیں۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُلْ سَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ (المومنون) (اور کہیے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے) اور مزید فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ (الناس) (بار بار وسوسہ ڈالنے والے، بار بار پسپا ہونے والے کے شر سے) نزغ کا اصل معنی فساد برپا کرنا ہے، کہا جاتا ہے: نزغ بیننا یعنی اس نے ہمارے درمیان فساد برپا کر دیا۔ اور اس معنی میں الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ (یوسف:100) یعنی میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان شیطان نے فساد برپا کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا النزغ کا معنی الاغواء (گمراہ کرنا) اور الاغراء (بھڑکانا، ابھارنا) ہے اور یہ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے (1) اور اسے کہتا ہے فلاں فلاں شے کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ اسے یہ کہہ دیتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جب وہ اس تک پہنچ جائے تو اسے (آدمی کو) چاہیے کہ وہ الله تعالیٰ کی پناہ طلب کرے اور اس (میں فکر کرنے) سے رک جائے (باز آ جائے)"۔ اور اس بارے میں حضرت عبدالله رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ محض ایمان ہے"۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: "وہ صریح ایمان ہے"۔

اور صریح سے مراد خالص ہے (یعنی وہ خالص ایمان ہے) اور یہ اپنے ظاہر (معنی) پر نہیں، کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ وسوسہ بذات خود ایمان ہو، کیونکہ ایمان تو یقین ہے، بلاشبہ یہ اشارہ اس خوف الٰہی کی طرف ہے جو انہوں نے اپنے دلوں میں پایا کہ انہیں اس پر سزا دی جائے گی جو ان کے دلوں میں واقع ہوا ہے۔ تو گویا آپ نے یہ فرمایا: تمہارا اس (وسوسہ) سے ڈرنا محض ایمان اور خالص ایمان ہے، کیونکہ تمہارا ایمان صحیح ہے اور تمہیں وسوسہ کے فساد کے بارے علم ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کو ایمان کا نام دیا، کیونکہ اس کا دفاع، اس سے اعراض کرنا، اس کو رد کرنا، اسے قبول نہ کرنا اور اس سے ڈرنا ایمان کے سبب ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اور رہا یہ کہ الله تعالیٰ نے پناہ طلب کرنے کا حکم فرمایا ہے تو یہ اس لیے کہ وہ وساوس شیطان کے آثار اور علامات میں سے ہوتے ہیں۔ اور رہی اس معاملہ کی انتہا تو وہ ان کی طرف مائل ہونا اور ان کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جو صحیح الایمان ہو اور اس نے اس کے مطابق عمل کیا جس کے بارے اسے اس کے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسے نفع دیا اور اس نے اس سے نفع حاصل کیا۔ اور رہا وہ جسے شبہ لاحق ہو گیا اور اس پر احساس غالب آ گیا اور وہ اس سے علیحدگی پر قادر نہ ہو سکا تو پھر اس کی تشفی کے لیے دلیل عقلی کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو فرمایا جسے اجرب اونٹ کے بارے شبہ لاحق ہو گیا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عدوی (متعدی مرض نہیں ہے) اور اعرابی نے کہا: اونٹوں کو کیا ہوا جو صحرا میں ہوتے ہیں تو ہرن کی مثل ہوتے ہیں پس جب ان میں اجرب اونٹ داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79

ہوا تو اس نے انہیں اجرب کر دیا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن أعدی ألاوّل تو پہلے کو بیماری کس نے لگائی؟ تو آپ کے اس ارشاد نے شبہ کو جڑ سے نکال دیا۔ پس جب شیطان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں انہیں اکسانے اور گمراہ کرنے سے مایوس ہو گیا، تو وہ وقتاً فوقتاً ان وساوس کے ذریعے ان میں تشویش پیدا کرنے لگ گیا۔ وساوس سے مراد باطل احساسات ہیں۔ پس ان کے دل ان سے نفرت کرنے لگے اور ان کے نزدیک ان کا وقوع ان پر بڑھ گیا پس وہ حاضر خدمت ہوئے، جیسا کہ صحیح میں ہے۔ اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ہم اپنے نفسوں میں وہ پاتے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی اسے اس سے بڑا سمجھ رہا ہے کہ وہ اس کے بارے کلام کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پاتے ہو''؟ عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك صریح الأیمان رغماً للشیطان حسب ما نطق به القرآن فی قوله: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (حجر: 42) (وہ صریح (خالص) ایمان ہے شیطان کے لیے ذلت اور خاک ہے جیسا کہ اس کے بارے قرآن نے فرمایا: بے شک میرے بندے ان پر تجھے کوئی غلبہ نہیں ہوگا) پس دل میں اٹھنے والے ایسے خیالات جو پختہ نہ ہوں اور نہ وہ کسی شبہ کے سبب پیدا ہوئے ہوں تو یہ وہ ہیں جن سے اعراض کر لینے کے سبب انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔ اور انہی کی مثل پر اسم وسوسہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ معنی سورۃ البقرہ کے آخر میں گزر چکا ہے، والحمدللہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

''بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کیے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں شیطان کھینچ لے جاتے ہیں انہیں گمراہی میں پھر (انہیں گمراہ کرنے میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (1) مراد شرک اور گناہ ہیں (یعنی وہ لوگ جو شرک اور گناہوں کے ارتکاب سے مجتنب رہے ہیں) اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ یہ اہل بصرہ اور اہل مکہ کی قراءت ہے۔ اور اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی قراءت طائف ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے طیف یاء کی تشدید کے ساتھ مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی مثل میں کلام عرب طیف تخفیف کے ساتھ ہے، اس بنا پر کہ یہ طاف یطیف کا مصدر ہے۔ کسائی نے کہا ہے: یہ طیف سے مخفف ہے جیسا کہ میتا اور میت ہے۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں طیف کا معنی وہ وہم اور خیال ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے یا نیند کی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح طائف کا معنی بھی ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی سے طیف کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: مصادر میں فیعل کا وزن نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مصدر نہیں ہے، لیکن طائف کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ لوگ جو گناہوں سے بچتے رہے جب انہیں کوئی شے لاحق ہو تو وہ اللہ عزوجل کی قدرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 492

اور اپنے اوپر اس کے انعامات میں غور وفکر کرتے ہیں اور معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الطیف اور الطائف دونوں مختلف المعنی ہیں۔ پس پہلے کا معنی تخیل (خیال کا آنا) ہے اور دوسرے کا معنی نفس شیطان ہے۔ پس پہلا طاف الخیال یطوف طیفا کا مصدر ہے۔ اور انہوں نے اس سے اسم فاعل کا صیغہ طائف نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: کیونکہ یہ ایک تخیل ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

رہا قول باری تعالیٰ: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (القلم:19) تو اس میں طیف نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ حقیقۃً اسم فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: طفتُ علیهم اطوف اور طاف الخیال یَطِیفُ (یعنی پہلا باب نَصَرَ یَنْصُرُ بمعنی چکر لگانا اور دوسرا باب ضَرَبَ یَضْرِبُ بمعنی خیال آنا ہے)۔ اور حسان نے کہا ہے:

فَدَعْ هذا ولکن مَن لِطَيْفِ يُؤَرِّقُنِي إذا ذهب العِشَاء

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الطیف بمعنی غضب (غصہ) ہے اور جنون، غضب اور وسوسہ کو طیف کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ دل میں پیدا ہونے والا خطرہ اور کھٹکا ہے جسے خیال کے خطرہ کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ یعنی وہ اس سے رک جاتے ہیں، باز رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس انہیں بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے تذکروا ذال کو مشدد پڑھا ہے۔ لغت عربیہ میں اس کی کوئی وجہ (دلیل) نہیں۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** عصام بن مصطلق نے بیان کیا ہے: میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو دیکھا، تو ان کی شہرت اور ان کے چہرے کے حسن و جمال نے مجھے بہت متعجب کیا۔ نتیجۃً مجھ میں اس حسد کی آگ بھڑکنے لگی جسے ان کے باپ کے ساتھ بغض کے سبب میرا سینہ چھپائے ہوئے تھا۔ سو میں نے کہا: آپ ابن ابی طالب ہیں انہوں نے فرمایا: ہاں۔ چنانچہ میں نے انہیں اور ان کے باپ کو مبالغہ کی حد تک برا بھلا کہا۔ تو انہوں نے میری طرف انتہائی شفقت و مہربانی کی نظر سے دیکھا، پھر فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ اور آپ نے اسے فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ تک پڑھا۔ پھر مجھے ارشاد فرمایا: نرمی اور ملائمت کا اظہار کر، اللہ تعالیٰ سے میرے لیے اور اپنے لیے استغفار کر، بلاشبہ اگر تو ہم سے مدد طلب کرے گا تو ہم تیری معاونت کریں گے اور اگر تو ہم سے عطیہ طلب کرے گا تو ہم تجھے عطیات سے نوازیں گے اور اگر تو ہم سے رہنمائی مانگے گا تو ہم تیری رہنمائی فرمائیں گے۔ پس جو مجھ سے زیادتی اور کوتاہی ہوئی اس پر مجھ میں ندامت اور شرمندگی ظاہر ہو گئی تو آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ (یوسف) (آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرما دے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے) کیا تو اہل شام میں سے ہے؟ میں نے کہا: ہاں تو آپ نے فرمایا:

شِنْشِنَةٌ أعرفها من أَخْزَم

(اس عادت اور خراج کو تو میں اخزم سے جانتا ہوں)

اللہ تجھے سلامت رکھے اور تجھے سہارا عطا فرمائے، تجھے معاف فرمائے اور تیری مدد فرمائے۔ تو اپنی حاجات اور پیش آنے والی عوارض ہمیں پیش کر تو تو ہمیں اپنے گمان سے کہیں بڑھ کر پائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ عصام نے کہا: پس زمین اپنی وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی اور میں نے یہ چاہا کہ یہ (زمین) میرے لیے نرم ہو جائے، پھر میں ان سے چھپتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا، اس حال میں کہ سطح زمین پر ان سے اور ان کے باپ سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی محبوب نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے شیاطین کے بھائی اور وہ گمراہ انسانوں میں سے فاجر لوگ ہیں شیاطین انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں۔ اور فاجروں کو اخوان الشیاطین کہا گیا ہے، کیونکہ وہ ان کے وساوس کو قبول کرتے ہیں۔ تحقیق اس آیت میں شیطان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ جو کچھ اس کی وضاحت میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ، حضرت حسن اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور لَا يُقْصِرُوْنَ کا معنی ہے یعنی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ رجوع کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ تمہارے لیے مدد و نصرت کی استطاعت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں اور ان کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں، کیونکہ کفار شیاطین کے بھائی ہیں۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: بے شک مومن جب اسے شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اور خیال چھوتا ہے تو وہ قرب کے بارے آگاہ ہو جاتا ہے (اور وہ خدا کو یاد کرنے لگ جاتا ہے) اور رہے مشرک تو شیطان انہیں کھینچ لاتا ہے۔

اور لَا يُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: دونوں قولوں کی بنا پر اس کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا شیطان کی طرف لوٹنا بھی جائز ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر وہ نہ ان سے باز آتے ہیں اور نہ ان پر رحم کرتے ہیں۔ الاقصار کا معنی ہے: کسی شے سے رک جانا، باز آجانا، یعنی شیاطین کفار کو گمراہی کی طرف کھینچنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ (اور اس سے باز نہیں آتے)

اور قول باری تعالیٰ: فِي الْغَيِّ میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ يَمُدُّوْنَهُمْ کے ساتھ متصل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اخوان کے ساتھ متصل ہو۔ اور الغی کا معنی جہالت ہے۔ نافع نے يُمِدُّونهم (1) یا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں (یعنی) مد اور امد، مدکا بغیر الف کے استعمال زیادہ ہے۔ یہ مکی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: اہل عرب کی ایک جماعت اہل مدینہ کی قراءت کا انکار کرتی ہے۔ ان میں سے ابو حاتم اور ابو عبید بھی ہیں، ابو حاتم نے کہا ہے: میں اس کی کوئی وجہ نہیں جانتا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو وہ ان کے لیے گمراہی اور جہالت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور اہل لغت میں سے ایک جماعت نے بیان کیا ہے ان میں سے ابو عبید بھی ہیں کہ جب کوئی شے کسی شے کی ذات میں کثرت اور زیادتی پیدا کر دے تو مدہ کہا جائے گا، اور جب کوئی اس میں کسی غیر کے سبب زیادتی کر دے تو أمدہ کہا جائے گا، مثلاً يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ (آل عمران) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 236

رب پانچ ہزار فرشتوں سے جونشان والے ہیں)
اور محمد بن زید سے بیان ہے کہ انہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے لیے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: کہا جاتا ہے: مددتُ له فی کذا یعنی میں نے اسے اس کے لیے مزین اور آراستہ کیا اور میں نے اسے ایسا کرنے کی استدعا کی۔ اور أمددتهُ فی کذا یعنی میں نے اپنی رائے یا کسی اور طریقے سے اس کی مدد کی۔ مکی نے کہا ہے: پسندیدہ فتحہ ہے۔

کیونکہ کہا جاتا ہے: مددتُ فی الشر اور أمددت فی الخیر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝ (البقرہ) (ڈھیل دیتا ہے انہیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں) پس یہ اس حرف میں فتحہ کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا استعمال شر میں ہوا ہے اور گمراہی (غی) بھی شر ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جمہور اسی موقف پر ہیں۔ اور عاصم جحدری نے یمادونهم فی الغی پڑھا ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے يَقْصُرون یا کو فتحہ، صاد کو ضمہ اور قاف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے يُقْصِرون اس کی ضد کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امراء القیس نے کہا ہے:

سَمَالكَ شَوْقٌ بعد ما كان أَقْصَرَا

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝۲۰۳

"اور (اے محبوب!) جب آپ نہیں لائے ان کے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں: کیوں نہ بنالیا تم نے خود اسے فرمائیے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے رب سے، یہ روشن دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہیں اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ یعنی جب آپ ان پر کوئی آیت نہیں پڑھتے۔ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا اس میں لَوْ لَا بمعنی هلا (کیوں نہیں) ہے، اور اس معنی پر اس کے متصل بعد صرف فعل آسکتا ہے چاہے وہ ظاہر ہو یا مضمر ہو، اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور اجْتَبَيْتَهَا کا معنی ہے تو نے اسے گھڑ لیا اپنی طرف سے۔ پس آپ انہیں آگاہ کر دیجئے کہ آیات اللہ عزوجل کی جانب سے آتی ہیں اور یہ کہ آپ ان پر نہیں پڑھتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرماتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجتبيتُ الكلام أي ارتجلتُه واختلقته واخترعته جب تو اپنی طرف سے کوئی کلام لائے (تو تب مذکورہ جملہ کہتا ہے) قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ فرمائیے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے نہ کہ اپنی طرف سے۔ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ مراد قرآن کریم ہے، بَصَآئِرُ، بصيرة کی جمع ہے، اور اس کا معنی رہنمائی اور نصیحت ہے، یعنی یہ وہ بصائر (دلائل) ہیں جن کے ساتھ میں نے تمہاری اس پر رہنمائی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے، یعنی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: بصائر سے مراد طرق (راستے) ہیں اور البصائر سے مراد دین کے طرق ہیں۔
جعفی نے کہا ہے:

راحوا بصائرُھم علی أکتافھم　و بَصِیرتِی یَعْدُوبھا عَتِدٌ وأی

هُدًى سے مراد رشد و بیان ہے۔ اور رَحْمَةٌ سے مراد نعمت ہے۔

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

''اور جب پڑھا جائے قرآن (مجید) تو کان لگا کر سنو اسے اور چپ ہو جاؤ تا کہ تم پر رحمت کی جائے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کہا گیا ہے: بے شک یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر، زہری، عبید اللہ بن عمیر، عطا بن ابی رباح اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تھے تو مشرکین آپ کے پاس آتے تھے اور مکہ میں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ (فصلت: 26) (مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا آلایہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خطبہ کے بارے نازل ہوئی ہے(1)۔ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، عطا، عمرو بن دینار، زید بن اسلم، قاسم بن مخیمرہ، مسلم بن یسار، شہر بن حوشب اور عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اس میں قرآن تھوڑا ہے۔ اور پورے خطبہ میں خاموش رہنا واجب ہوتا ہے۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ نقاش نے کہا ہے: یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں نہ خطبہ تھا اور نہ ہی جمعہ۔ علامہ طبری نے حضرت سعید بن جبیر (2) سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ عید الاضحیٰ، عید الفطر اور جمعہ کے دن کی نمازوں اور ان نمازوں میں خاموش رہنے کے بارے ہے جن میں امام بالجہر قراءت کرتا ہے پس یہ عام ہے۔ اور یہ قول صحیح ہے، کیونکہ یہ ان تمام کو جامع ہے جن میں اس آیت اور علاوہ ازیں سنت کے مطابق خاموش رہنا واجب ہے۔ نقاش نے کہا ہے: اہل تفسیر نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس میں استماع سے مراد نماز میں قرآن کریم کا سننا ہے چاہے وہ نماز فرض ہو یا غیر فرض۔ نحاس نے کہا ہے: لغوی طور پر تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاموشی ہر شے (یعنی ہر حال) میں واجب ہوتی ہے، مگر یہ کہ کوئی دلیل کسی شے کے اختصاص پر دلالت کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم اس کے مطابق عمل کرو جو اس میں ہے اور تم اس سے تجاوز نہ کرو۔ اور الانصات سے مراد (قرآن کریم) سننے کے لیے، غور و فکر کے لیے اور پھر (اس کے معنی کی) رعایت کے لیے خاموش رہنا ہے۔ اس کا باب أنْصَتَ یُنْصِتُ إنْصَاتًا ہے اور نَصَتَ بھی (اسی معنی میں ہے) شاعر نے کہا ہے:

قال الإمامُ علیکم أمْرَ سیّدکم　فلم نُخالف و أنصتنا کما قالا

اور کہا جاتا ہے: أنصتوہ و أنصتوا لہ (تم اسے خاموش کرا دو، اور تم اس کے لیے خاموش ہو جاؤ)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 238　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 494

شاعر نے کہا ہے:

إذا قالتْ حَذامِ فأنصِتوها فإنّ القولَ ما قالت حَذامِ

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کے بارے میں بعض نے کہا ہے: یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھا تاکہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے اسے یاد کر سکیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں بہت بعد ہے، صحیح قول وہی ہے جس میں عموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور تخصیص دلیل کی محتاج ہوتی ہے۔

عبدالجبار بن احمد نے فوائد القرآن میں اس کے بارے کہا ہے: بے شک مشرکین عناد اور سرکشی کی وجہ سے بہت زیادہ شور وشغب کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بطور حکایت بیان کیا ہے: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (فصلت) تو اللہ تعالیٰ نے اداءِ وحی کی حالت میں مسلمانوں کو اس حالت کے خلاف رہنے کا حکم دیا اور یہ کہ وہ غور سے سنیں اور اسی بنا پر جنوں کی مدح اور تعریف بیان کی پس فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ الآیہ (الاحقاف: 29) (اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں)

اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ جب نماز میں قرآن پڑھتے تو آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کا جواب دیتے، جب آپ ﷺ پڑھتے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو وہ بھی آپ کے قول کی طرح کہتے۔ یہاں تک کہ آپ سورۃ الفاتحہ اور سورت پوری کر دیتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ بعد ازاں وہ خاموش ہو گئے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ انصات (خاموش رہنا) سے مراد اس جہر (آواز بلند کرنا) کو ترک کرنا ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے جواب میں آواز بلند کرتے تھے۔ اور حضرت قتادہ نے اس آیت میں کہا ہے: ایک آدمی آتا تھا اس حال میں کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ ان سے پوچھتا: تم نے کتنی نماز پڑھ لی ہے؟ کتنی ابھی باقی ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ نماز میں اپنی حاجات وضروریات کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ سورۃ الفاتحہ میں قراءت خلف الامام کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور خطبہ کا حکم سورۃ الجمعہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

## وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

"اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی چلائے بغیر (یوں یاد کرو) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور نہ ہو جاؤ (یاد الٰہی سے) غافل رہنے والوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً اسی کی مثل یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (الاعراف:55) ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ دعا کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہاں ذکر سے مراد نماز میں قراءت کرنا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پورے غور وفکر اور تدبر کے ساتھ قرآن کریم پڑھو۔ تَضَرُّعًا مصدر ہے، اور کبھی یہ حال کے محل میں ہوتا ہے۔ اور وَّ خِيْفَةً اس پر معطوف ہے۔ خیفة کی جمع خوف ہے، کیونکہ یہ خوف کے معنی میں ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور خیفة کی اصل خِوْفة ہے، اس میں واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا ہے۔ (کہا جاتا ہے) خَاف الرجلُ یَخَاف خوفًا و خیفةً و مخافةً فهو خائفٌ اور قوم خُوّف اپنے اصل کی بنا پر ہے۔ اور خُیف لفظ کی یا پر ہے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے کہ خیفة کی جمع میں خیف بھی کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الخیفة (کا معنی) الخوف ہے اور جمع خیف ہے اور اس کی اصل واؤ ہے۔ وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ یعنی آواز بلند کیے بغیر، یعنی اسمع نفسك (تو اپنے آپ کو سنا) جیسا کہ ارشاد گرامی ہے: وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) یعنی اتنی آواز جو جھر (چیخ وپکار) اور مخافتة (انتہائی دھیمی) کے درمیان ہو اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ذکر کے ساتھ آواز کو انتہائی بلند کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ پہلے کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ حضرت قتادہ اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: الْاٰصَالِ سے مراد شامیں ہیں اور الغد وغدوة کی جمع ہے۔ اور ابومجلز نے بالغدو والإیصال پڑھا ہے اور یہ آصلنا کا مصدر ہے، یعنی ہم شام کے وقت داخل ہوئے (دخلنا فی العشی) اور الآصال اصل کی جمع ہے، جیسے طنب کی جمع اطناب ہے اور جمع الجمع ہے اور اس کی واحد اصیل ہے اور اس کی جمع اصل ہے۔ یہ زجاج سے منقول ہے۔۔

اخفش نے کہا ہے: الآصال، اصیل کی جمع ہے۔ جیسے یمین اور ایمان ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: أصل، أصیل کی جمع ہے، اور کبھی اصل واحد بھی ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ولا بأحسن منها إذْ دَنَا الأُصُلُ

جوہری نے کہا ہے: اصیل عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک کا وقت ہوتا ہے اور اس کی جمع اُصُلُ و آصال و أصائِل ہے، گویا کہ یہ اصلیة کی جمع ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لعمرِی لأنتَ البیتُ أکرِمُ أهلَه وأقعد لی أفیائه بالأصائل

اور اس کی جمع اصلان بھی بنائی جاتی ہے جیسے بعیر کی جمع بعران ہے۔ پھر انہوں نے جمع کی تصغیر بنائی اور کہا: اصیلان، بعد ازاں انہوں نے نون کو لام سے بدل دیا اور کہا: اصیلال اور اسی کے مطابق نابغہ کا قول ہے:

وقفتُ فیها أصَیْلَالًا أسائلها عَیَّتْ جوابا وما بالربْع من أحدِ

اور لحیانی نے بیان کیا ہے: لقیته اصیلالا۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ اور ذکر سے غافل رہنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

''بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے، وہ تکبر نہیں کیا کرتے اس کی عبادت سے اور پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اس کی اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ اس میں الَّذِیْنَ سے مراد بالاجماع ملائکہ ہیں۔ اور فرمایا عِنْدَ رَبِّكَ۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق تو ہر مکان کے ساتھ ہے لیکن چونکہ وہ اس کی رحمت کے قریب ہیں اور ہر وہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہے تو وہ اس کے پاس ہی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ اور اس کے سوا کسی نے کہا ہے: کیونکہ وہ ایسی جگہ میں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کوئی اور حکم نافذ ہی نہیں ہوتا (اس لیے فرمایا وہ تیرے رب کے مقرب ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: عند الخلیفة جیش کثیر (خلیفہ کے پاس بہت زیادہ لشکر ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی عظمت وشرف کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور یہ کہ وہ انتہائی محترم اور مکرم مکان میں ہیں۔ پس یہ ان کے لیے عظمت وکرامت کے اعتبار سے قرب کا بیان ہے نہ کہ مسافت کے اعتبار سے۔ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ یعنی وہ اس کی عظمت بیان کرتے ہیں اور ہر نقص اور کمزوری سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وَ لَهٗ یَسْجُدُوْنَ کہا گیا ہے: وہ اس کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی کمتری اور انتہائی عجز کا اظہار کرتے ہیں، بخلاف گناہ کرنے والوں کے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کے بارے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ یہ قاری کے لیے محل سجدہ ہے۔ قرآن کریم کے سجود کی تعداد کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس اس بارے میں جو انتہائی قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تعداد پندرہ ہے۔ پہلا سجدہ سورہ اعراف کی آخری آیت ہے اور آخری سجدہ سورۂ علق کی آخری آیت ہے۔ یہ ابن حبیب اور ابن وہب کا قول ہے۔ اور ایک روایت میں اسحاق بھی ان میں شامل ہیں۔ بعض علماء نے سورۃ الحجر میں قول باری تعالیٰ: وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۹۸﴾ (الحجر) پر سجدہ کرنے کا اضافہ کیا ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس اس طرح کل سجدے سولہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کریم میں چودہ سجدے ہیں۔ ابن وہب نے دوسری روایت میں یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ ساقط کر دیا ہے۔ اور یہی اصحاب الرائے کا قول ہے اور اس کا ساقط ہونا صحیح ہے، کیونکہ اس کے ثبوت کے بارے کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جسے ابن ماجہ اور ابو داؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ بن منین سے اور یہ بنی عبد کلال میں سے تھے اور انہوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قرآن کریم میں پندرہ سجدے پڑھائے۔ ان میں سے تین مفصل میں ہیں اور دو سجدے حج میں ہیں (1)۔ اس میں عبداللہ بن منین قابل حجت نہیں ہیں۔ ابو محمد عبد الحق نے یہی کہا ہے۔ ابو داؤد نے عقبہ بن عامر سے بھی حدیث ذکر کی ہے انہوں نے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیان کیا میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اور جس نے دو سجدے نہ کیے تو اس نے انہیں پڑھا ہی نہیں'' (1)۔ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن لہیعہ ہے اور وہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو ثابت رکھا ہے اور سورۃ ص کا سجدہ ساقط کر دیا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ کل سجدوں کی تعداد گیارہ ہے، اس میں سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ اور مفصلات کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گیارہ سجدے کیے ہیں ان میں مفصل میں سے کوئی سجدہ نہیں ہے (اور وہ یہ ہیں) الاعراف، الرعد، النحل، بنی اسرائیل، مریم، سورۃ الحج کا ایک سجدہ، فرقان، سلیمان، سورۃ النمل، سجدہ، ص، سجدۃ الحوامیم (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سجدوں کی تعداد دس ہے، انہوں نے حج کا دوسرا سجدہ، سورہ ص کا سجدہ اور مفصل کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ چار ہیں، آلم تنزیل کا سجدہ، حم تنزیل کا سجدہ، سورہ نجم اور سورہ علق کا سجدہ۔ اس اختلاف کا سبب احادیث کے نقل اور عمل میں اختلاف ہے۔ اور ان کا اختلاف خالص اس امر میں ہے جو قرآن کریم میں سجود کے متعلق ہے، کیا اس سے مراد سجود التلاوۃ ہیں یا نماز میں فرض سجدوں کے متعلق؟

**مسئلہ نمبر 3۔** سجود تلاوت کے وجوب میں اختلاف ہے، حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ نے کہا ہے: سجدہ تلاوت واجب ہے۔ اور استدلال یہ ہے کہ سجود کے بارے مطلق امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے (3) اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان علیحدہ ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس (وہ ہلاک ہوا)''۔ اور ابو کریب کی روایت میں یا ویلی کے الفاظ ہیں (ہائے میری ہلاکت) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول سے جو آپ نے ابلیس لعنہ اللہ کی طرف سے بطور خبر ارشاد فرمایا: ''ابن آدم جو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا (4) تو اس نے سجدہ کیا پس اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کیا پس میرے لیے جہنم ہے''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی محافظت اور اہتمام کرتے تھے۔ اور ہمارے ... الثابت کی حدیث کی تاویل کی ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر آیت سجدہ پڑھی (پھر آپ نیچے اترے) اور سجدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا، پھر دوسرے جمعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت سجدہ پڑھی پس لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! ٹھہر جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر فرض نہیں کیا مگر یہ کہ ہم چاہیں''۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 61	4۔ ایضاً

اور یہ انصار و مہاجرین صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا، تو کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا پس اس کیساتھ اس بارے میں اجماع ثابت ہو گیا۔ اور رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ ''ابن آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا'' تو یہ سجدہ کے واجب ہونے کے بارے خبر ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت استحباب پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سجود تلاوت ادا کرنے میں ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی نماز میں ضرورت ہوتی ہے مثلاً حدث اور نجس سے پاک ہونا، نیت کرنا، قبلہ شریف کی طرف منہ کرنا اور وقت کا ہونا، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے ذکر کیا ہے کہ وہ بغیر طہارت کے سجدہ کر لیتے تھے۔ اسے ابن منذر نے شعبی سے ذکر کیا ہے۔ کیا جمہور کے قول کے مطابق سجدہ کرنے والا تکبیر تحریمہ کہنے، ہاتھوں کو اٹھانے، تکبیر کہنے اور سلام پھیرنے کا محتاج ہوتا ہے؟

اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ سجدہ کے لیے تکبیر کہے اور تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے (یعنی رفع یدین کرے) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک اثر میں مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے اور اسی طرح جب سجدہ سے اٹھتے تو تکبیر کہتے۔ (1)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کے دوران سجدہ میں جانے کے لیے اور اس سے اٹھنے کے لیے تکبیر کہے گا۔ اور آپ سے نماز کے باہر سجدہ کے لیے تکبیر کہنے میں اختلاف منقول ہے۔ اور تکبیر کے بارے اسی طرح عام فقہاء نے کہا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک سجدہ کے لیے سلام نہیں ہے۔ سلف میں سے ایک جماعت اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ وہ سجدے سے سلام پھیرے گا۔ اور اس مذہب پر یہ بات ثابت ہے کہ سجدے کے اوّل میں تکبیر احرام کے لیے ہے۔ اور ان کے قول کے مطابق جو کہتے ہیں کہ سلام نہیں ہے فقط سجود ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''نماز کی چابی طہارت حاصل کرنا ہے، اس کی تحریم تکبیر کہنا ہے اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے'' (2)۔ اور یہ عبادت ہے اس کے لیے تکبیر ہے، پس اس کی تحلیل بھی ہے نماز جنازہ کی طرح بلکہ اس سے بھی اولیٰ، کیونکہ یہ فعل ہے اور نماز جنازہ قول ہے۔ اور اسے ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اب رہا اس کا وقت! تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ مطلق تمام اوقات میں سجدہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ایک خاص سبب سے نماز ہی ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب تک صبح خوب روشن نہ ہو یا عصر کے بعد جب تک سورج زردی مائل نہ ہو (سجدہ کیا جا سکتا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سجدہ کیا جا سکتا ہے اور عصر کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مذہب میں یہی تین اقوال ہیں۔ اور سبب اختلاف وہ معارضہ ہے جس کا تقاضا قراءت پر مرتب

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یسمع السجدۃ وھو راکب الخ، حدیث نمبر 1204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب مفتاح الصلوٰۃ الطھور، حدیث نمبر 271-270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہونے والے سجود میں سے کسی سجدہ کی قراءت کا سبب کرتا ہے کیونکہ صبح اور عصر کے بعد نماز پڑھنے سے نہی عام ہے اور اس معنی میں ان کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ ان دونوں وقتوں میں نماز سے منع کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب وہ سجدے کرے تو اپنے سجدہ میں یہ کہے گا: اے اللہ! اس کے ساتھ مجھ سے بوجھ اتار دے۔ اور میرے لیے اس کا اجر لکھ دے اور اسے میرے لیے اپنے پاس ذخیرہ بنا دے (1)۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اور اگر کوئی آیت سجدہ نماز میں پڑھے، پس اگر وہ نفل نماز ہے تو وہ سجدہ کر لے چاہے وہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت کے ساتھ اور وہ اس میں کسی اور کی آمیزش سے پر امن رہے۔ اور اگر وہ جماعت میں ہے تو وہ اس میں تخلیط سے پر امن نہیں ہے پس بیان یہ کیا گیا ہے کہ سجدہ کر لینا جائز ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ اور اگر وہ فرض نماز میں ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور قول یہ ہے کہ نماز میں سجدہ کرنا ممنوع ہے، چاہے وہ نماز سری ہو یا جہری، جماعت کے ساتھ ہو یا انفرادی ہو۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ سجدہ تلاوت ادا کرنے سے فرض نماز کے سجود کی تعداد میں اضافہ لازم آتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی علت جماعت میں تخلیط کا خوف ہے۔ اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ اور اس بنا پر سجدہ سے نہ کسی منفرد کو روکا جائے گا اور نہ اس جماعت کو جس میں تخلیط اور فساد سے امن ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ بخاری نے ابو رافع سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں عشاء کی نماز پڑھی اور آپ نے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ (الانشقاق) پڑھی اور سجدہ کیا، تو میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے اس کا سجدہ کیا ہے، تو میں اس میں سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ سے جا ملوں گا۔ یہ اسے بیان کرنے میں منفرد ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمران بن حصین کو کہا گیا: وہ آدمی جو آیت سجدہ سنتا ہے اور اس کے لیے نہیں بیٹھتا؟ تو آپ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے اگر وہ اس کے لیے بیٹھ جائے! تو وہ اس پر واجب نہیں ہوگا۔ اور حضرت سلمان نے کہا: ہم نے کبھی اس کی جرأت نہیں کی۔ اور عثمان نے کہا ہے: بے شک سجدہ اس پر ہے جس نے آیت سجدہ سنی۔ اور زہری نے کہا ہے: وہ سجدہ نہ کرے گا مگر اس حال میں کہ وہ باوضو ہو، پس جب تو سجدہ کرے اور تو شہر میں ہو تو منہ قبلہ شریف کی طرف کر اور اگر تو سوار ہو تو پھر تجھ پر لازم نہیں جس طرح تیرا چہرہ ہو (ادھر ہی منہ کر کے سجدہ کر لے) اور حضرت سائب قصص بیان کرنے والے کی آیات سجود پر سجدہ نہ کرتے تھے۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابن ماجہ، باب سجود القرآن، حدیث نمبر 1042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ الانفال

(آیاتہا ۷۵) (۸ سورۃ الانفال مدنیۃ ۸۸) (رکوعاتہا ۱۰)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حضرت حسن، عکرمہ، جابر اور عطا رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی بدری ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ سورۃ مدنی ہے سوائے سات آیات کے اور وہ قول باری تعالیٰ: وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سے لے کر ساتویں آیت کے آخر تک ہیں۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ①

"دریافت کرتے ہیں آپ سے غنیمتوں کے متعلق۔ آپ فرمایئے: غنیمتوں کے مالک اللہ اور رسول ہیں پس ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور اصلاح کرو اپنے باہمی معاملات کی اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اگر تم ایمان دار ہو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں دشمن کا مقابلہ کیا، جب اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا (اور وہ بھاگ نکلے) تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے انہیں قتل کرنے کے لیے ان کا تعاقب کیا اور ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے آپ کے اردگرد رہا اور ایک گروہ جمع شدہ مال اور چھینے ہوئے مال غنیمت پر قابض رہا، پس جب اللہ تعالیٰ نے دشمن کو بھگا دیا اور جو ان کے تعاقب میں گئے تھے وہ واپس لوٹ آئے تو انہوں نے کہا: مال غنیمت ہمارا ہے، ہم وہ ہیں جنہوں نے دشمن کا پیچھا کیا اور ہمارے سبب ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں مار بھگایا اور انہیں شکست اور ناکامی سے دوچار کیا۔ اور وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد جمع رہے انہوں نے کہا: تم مال غنیمت کے ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، بلکہ وہ ہمارا ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد جمع رہے تاکہ دشمن آپ کو کوئی دھوکہ نہ پہنچا سکے۔ اور وہ لوگ جو جمع شدہ اور چھینے ہوئے مال پر قابض رہے انہوں نے کہا: تم ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، وہ تو ہمارے لیے ہے، ہم نے ہی اسے جمع کیا ہے اور ہم نے اس پر قبضہ کیا ہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تیزی کے ساتھ ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔ ابو عمر نے کہا: اہل

علم نے لسان العرب میں کہا ہے: اِسْتَلْوَذُوا (یعنی) وہ قریب ہوئے اور احاطہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے: الموت مُسْتَلْوِعلی العباد (موت بندوں کے قریب ہے اور احاطہ کیے ہوئے ہے) اور آپ کا قول: فقسمہ عن فُواق یعنی تیزی کے ساتھ آپ نے اسے تقسیم کردیا۔ وہ کہتے ہیں: والفُواق مابین حَلْبَتَی الناقۃ (یعنی فواق سے مراد اونٹنی کو دوبارہ دوہنے کے درمیان والا وقفہ ہے)

کہا جاتا ہے: انتظرہ فوق ناقۃ یعنی اتنی مقدار تو اس کا انتظار کر۔ اور وہ اسے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ بولتے ہیں یعنی فُواق اور فَواق۔ اور یہ حکم اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (الانفال: 41) (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ) گویا علماء کے نزدیک معنی یہ ہے یعنی اس بارے میں حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہے اور اس بارے میں عمل اس کے مطابق ہے جو اللہ تعالیٰ کے قریب کردے۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: ہمارے اصحاب میں سے عبدالرحمن بن حارث وغیرہ نے سلیمان بن موسیٰ اشدق سے انہوں نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مال غنیمت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم میں اصحاب بدر کی جماعت تھی جو (غزوۂ بدر میں) شریک تھے جس وقت ہمارے درمیان مال غنیمت کے بارے اختلاف ہوا اور اس میں ہمارے اخلاق درست نہ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برابر برابر تقسیم فرما دیا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے خوف، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اپنے معاملات میں اصلاح کے لیے تھا۔

اور صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بہت زیادہ مقدار میں مال غنیمت حاصل کیا، اس میں ایک تلوار تھی، میں نے اسے اٹھالیا اور اسے لے کر میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یہ تلوار مجھے عطا فرما دیجیے، بلاشبہ میں وہ ہوں جس کی حالت سے آپ واقف و آگاہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے وہیں لوٹا دو جہاں سے تو نے اسے اٹھایا ہے''۔ پس میں چلا گیا یہاں تک کہ میں نے اسے مقبوض مال میں پھینکنے کا ارادہ کیا تو میرے نفس نے مجھے ملامت کی اور میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ کر آیا اور عرض کی: آپ یہ (تلوار) مجھے عطا فرما دیجیے۔ آپ بیان کرتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنی آواز سخت کی اور فرمایا: ''اسے وہیں لوٹا دو جہاں سے اسے اٹھایا ہے''۔ پس میں چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے اسے مال مقبوض میں ڈال دینے کا ارادہ کیا تو میرے نفس نے مجھے ملامت کی اور میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ آیا اور عرض کی: آپ یہ تلوار مجھے عطا فرما دیجیے۔ آپ فرماتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنا لہجہ سخت کیا اور فرمایا: ''تو اسے وہیں لوٹا دے جہاں سے تو نے اسے اٹھایا ہے''۔ تب اللہ تعالیٰ نے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ نازل فرمائی۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔ اور اس بارے میں روایات کثیر ہیں۔ اور اس بارے میں جو ہم نے ذکر کردیا ہے وہ کافی ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ۔

**مسئلہ نمبر 2۔** الْاَنْفَالِ کا واحد نفل فا متحرکہ کے ساتھ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إِنَّ تَقْوَى رَبِّنَا خَيرُ نَفَلٍ  وَ بِإِذْنِ اللهِ رَيْثِي وَالعَجَلْ

اس میں خیر نفل بمعنی خیر غنیمۃ (اچھی غنیمت) ہے اور نفل کا معنی یمین (قسم) ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے فتبرئکم یهود بنَفْل خمسین منهم (یہود پچاس قسموں کے ساتھ تمہیں ان سے بری کر دیں گے) اور النفل کا معنی الانتفاء (نفی کرنا، انکار کرنا) بھی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے فانتفل من ولدها (پس اس نے اس کے بچے کا انکار کر دیا) اور نفل ایک معروف بوٹی بھی ہے۔ اور نفل کا معنی واجب پر زیادتی کرنا بھی ہے اور وہ نفلی عبادت ہے۔ اور بچے کا بچہ بھی نافلہ کہلاتا ہے، کیونکہ وہ بچے پر زائد ہی ہوتا ہے۔ اور مال غنیمت بھی نافلہ کہلاتا ہے، کیونکہ یہ وہ اضافہ اور زیادتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے حلال قرار دیا ہے اور یہ ان میں سے ہے جو دیگر امتوں پر حرام تھی۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے (دیگر) انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ اور ان میں۔ ایک یہ ہے کہ میرے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا ہے (1)۔ اور الْأَنْفَالِ سے مراد بذات خود غنائم ہی ہیں۔ عنترہ نے کہا ہے:

إنّا إذا أحمر الوَغَى نُروِي القنا  ونَعِفّ عند مقاسم الأنفال

اس میں الْأَنْفَالِ سے مراد غنائم ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** انفال کے محل میں علماء کا اختلاف ہے اس بارے میں چار اقوال ہیں:

(۱) اس کا محل اس مال میں ہے جو کافروں سے کٹ کر مسلمانوں کی طرف آ جائے یا بغیر جنگ کے لے لیا جائے (۲) اس کا محل خمس (پانچواں حصہ) ہے (۳) اس کا محل خمس کا خمس (پانچواں کا پانچواں حصہ) ہے (۴) اصل مال غنیمت، جیسا بھی امام وقت اسے پاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ انفال سے مراد وہ عطیات اور انعامات ہیں جو امام وقت خمس سے عطا کرتا ہے، جس طرح اس کے بارے وہ اپنی رائے رکھتا ہو۔ بقیہ چار حصوں میں کوئی نفل نہیں ہوتا، بلاشبہ وہ کل مال غنیمت سے نفل نہیں پاتا کیونکہ اس کے مستحق معین ہوتے ہیں اور وہ اسے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ حاصل کرتے ہیں اور خمس کی تقسیم امام کے اجتہاد اور رائے کو سونپ دی گئی ہے۔ اور اس کے مستحق معین نہیں ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جو مال غنیمت تمہیں عطا فرمایا ہے میرے لیے سوائے خمس کے اور کچھ نہیں اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جائے گا'' (2)۔ پس اس کے بعد یہ ممکن نہیں کہ نفل کسی ایک کا حق ہو اور بلاشبہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے وہ خمس ہے۔ آپ کے مذہب میں سے یہی معروف ہے۔ اور تحقیق آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ خمس کا خمس ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن مسیب، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور سبب اختلاف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے انہوں نے

---

1۔ مشکوۃ المصابیح باب فضائل سید المرسلین

2۔ سنن ابی داؤد، باب فداء الاسیر بالمال، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، باب فی الامام یستاثر بشیئ من الفیئ لنفسہ، حدیث نمبر 2374، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی جانب ایک سریہ بھیجا تو انہیں بہت سے اونٹ مال غنیمت میں ہاتھ آئے، ان کے حصے میں بارہ یا گیارہ گیارہ اونٹ آئے اور پھر انہیں ایک ایک اونٹ بطور نفل بھی دیا گیا۔ اسی طرح اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ شک آپ سے یحییٰ کی روایت میں موجود ہے اور اسی پر مؤطا کے راویوں کی ایک جماعت نے ان کی اتباع کی ہے سوائے ولید بن مسلم کے کیونکہ انہوں نے مالك عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس میں کہا ہے: ان کے حصص بارہ بارہ اونٹ تھے اور ایک ایک اونٹ انہیں بطور تنفیل دیا گیا۔ اور انہوں نے شک کا اظہار نہیں کیا۔ ولید بن مسلم اور حکم بن نافع نے شعیب بن ابی حمزہ سے انہوں نے حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں نجد کی جانب بھیجا۔ اور ولید کی روایت میں ہے اس کی تعداد چار ہزار تھی۔ اور لشکر سے ایک سریہ نکلا۔ اور ولید کی روایت میں ہے: پس میں بھی ان میں تھا جو اس میں نکلے تھے۔ پس لشکر کے حصص بارہ بارہ اونٹ تھے۔ اور اہل سریہ کے حصہ بطور تنفیل ایک ایک اونٹ تھا، پس ان کے حصص تیرہ تیرہ اونٹ ہو گئے، اسے ابو داؤد نے ذکر کیا ہے۔ اسی سے انہوں نے استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں: بے شک نفل مجموعی خمس سے ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ سریہ (چھوٹا سا دستہ) اگر کسی مقام پر اترا مثلاً اس میں دس افراد شامل تھے انہوں نے اپنے مال غنیمت میں ڈیڑھ سو (اونٹ) حاصل کیے، تو ان سے ان کا خمس تیس اونٹ پہلے نکال لیے جائیں گے اور ان کے لیے ایک سو بیس رہ جائیں گے، جو دس افراد پر تقسیم کیے جائیں گے اور وہ ہر ایک کے حصہ میں بارہ بارہ اونٹ آئیں گے، پھر اس قوم کو خمس میں سے ایک ایک اونٹ دے دیا جائے گا، کیونکہ اس میں تیس کا خمس دس اونٹ نہیں ہو سکتے۔ پس جب تو نے دس کے لیے حصہ پہچان لیا تو پھر سو، ہزار اور زائد کے لیے جو ہو گا اسے بھی معلوم کرلے گا۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ نفل خمس کے خمس میں سے ہو گا انہوں نے اس طرح کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (مال غنیمت میں) کپڑے بھی ہوں جو بیچے جا سکتے ہوں اور اونٹوں کے علاوہ بھی ساز و سامان ہو، تو وہ آدمی جسے اونٹ نہ ملے اسے اس سامان میں سے اونٹ کی قیمت ادا کر دی جائے۔ اور اسے اس حدیث سے تقویت پہنچتی ہے جسے مسلم نے اس حدیث کے بعض طرق میں بیان کیا ہے: ''پس ہم نے اونٹ اور بکریاں حاصل کیں''، الحدیث۔

محمد بن اسحاق نے اس حدیث میں ذکر کیا ہے کہ امیر (لشکر) نے تقسیم سے پہلے ان کے لیے تنفیل کی اور یہ اسے ثابت کرتا ہے کہ نفل کل مال غنیمت میں سے ہو۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے خلاف ہے۔ اور جنہوں نے ان کے خلاف روایت کی ہے ان کا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہ حفاظ ہیں، یہ ابو عمر رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اور مکحول اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ثلث سے زیادہ کے ساتھ تنفیل نہیں کی جائے گی، جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ ان کے لیے زیادہ عطا کرنے کا قول کرے تو اسے ان کے لیے پورا کرنا چاہیے اور وہ اسے خمس میں سے ادا کرے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: نفل میں کوئی ایسی حد نہیں ہے جس سے امام تجاوز نہ کر سکتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 4۔** حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس پر دلیل ہے جو ولید اور حکم نے شعیب سے اور انہوں نے نافع سے

ذکر کیا ہے کہ جب سریہ لشکر میں سے نکلے اور وہ مال غنیمت حاصل کرنے تو لشکر بھی ان کے ساتھ شریک ہوگا اور یہ ایک مسئلہ اور حکم ہے جسے حدیث میں شعیب کے سوا نافع سے کسی نے ذکر نہیں کیا اور اس کے بارے میں علماء میں اختلاف نہیں۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا امام وقت کے اس قول کے بارے اختلاف ہے جو قتال سے پہلے یہ کہتا ہے: جس نے اس قلعہ میں سے اتنا گرادیا تو اس کے لیے اتنا (مال) ہوگا اور جو کوئی فلاں جگہ تک پہنچ گیا تو اس کے لیے اتنا (مال) ہوگا اور جو کسی کا سر لے کر آیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جو کوئی کسی کو قیدی بنا کر لایا تو اس کے لیے اتنا ہوگا۔ گویا امام وقت یہ کہہ کر انہیں انگیخت دلا رہا ہے اور ان کے جذبات کو ابھار رہا ہے۔ پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قتال تو پھر حصول دنیا کے لیے ہوگا اور یہ جائز نہیں ہوگا۔ اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث میں موجود ہے، جب بدر کا دن تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جس نے کسی کو قیدی بنایا تو اس کے لیے اتنا ہوگا'' (1)۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور آپ رضی اللہ عنہ سے ہی حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس اس طرح کیا اور فلاں فلاں جگہ پر آیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا''۔ پس جوان تیزی سے دوڑ پڑے اور بوڑھے جھنڈوں کے پاس ہی ثابت قدم رہے۔ پس جب انہیں فتح حاصل ہوگئی تو جوان آئے اور اسی کا مطالبہ کرنے لگے جوان کے لیے مقرر کیا گیا تھا تو بوڑھوں نے انہیں کہا: تم ہمارے بغیر ادھر نہیں جا سکتے تھے، تحقیق ہم تمہارے لیے مددگار اور معاون تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ** (اور تم اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو) اسے اسماعیل بن اسحاق نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو کہا جب وہ اپنی قوم میں آپ کے پاس آئے اور وہ شام کا ارادہ رکھتے تھے: کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو کوفہ آئے اور تیرے لیے تمام زمین اور قیدیوں کے بدلے خمس کے بعد ثلث (تیسرا حصہ ہو؟) اور یہ فقہائے شام کی جماعت نے کہا ہے: ان میں امام اوزاعی، مکحول اور ابن حیوہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم شامل ہیں۔ اور ان کی رائے میں خمس کل مال غنیمت میں سے ہے اور نفل خمس کے بعد ہے پھر اصل لشکر کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم ہے۔ اور اسحاق، امام احمد اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آج لوگوں کا موقف یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے نفل نہیں ہوگا یہاں تک کہ خمس نکال لیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ امام وقت سریہ کو کہے: جو مال تم نے حاصل کیا اس کا ثلث تمہارے لیے ہے۔ سحنون نے کہا ہے: وہ اس سے ابتداءً مراد لیتے ہیں۔ پس اگر یہ واقع ہوگیا تو وہ نافذ ہو جائے گا اور باقی مال میں ان کے حصص ہوں گے۔ اور سحنون نے کہا ہے: جب امام نے سریہ کو کہا: جو مال تم نے حاصل کیا تو تم پر اس میں خمس نہیں ہوگا۔ تو یہ قول جائز نہیں

1۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ پس اگر یہ واقع ہو گیا تو بھی میں اسے رد کرتا ہوں، کیونکہ یہ حکم شاذ ہے یہ جائز نہیں ہے اور نہ نافذ العمل ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مستحب قرار دیا ہے کہ امام تنفیل نہ کرے مگر اس مال میں جو ظاہر ہو مثلاً عمامہ (مراد خود ہوں گے یا دستاریں) گھوڑے اور تلواریں۔ اور بعض علماء نے اس سے منع کیا ہے کہ امام وقت سونے، چاندی یا موتیوں وغیرہ میں تنفیل کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: ہر شے میں تنفیل جائز ہے (1)۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول اور آیت کے مقتضی کے مطابق یہی قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ یہ تقویٰ اور اصلاح احوال کے بارے میں حکم ہے یعنی تم دعا میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر جمع ہو جاؤ: اللّٰھم أصلح ذات البَیْن یعنی اے اللہ ایسی حالت پیدا فرما دے جس کے سبب باہمی اتفاق اور اجتماعیت پیدا ہو جائے۔ پس یہ اس تصریح پر دلیل ہے کہ ان کے درمیان اختلاف پھوٹ پڑا یا نفوس باہم جھگڑنے کی طرف مائل ہو گئے جیسا کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ اور تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، یعنی تم اپنے اقوال وافعال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو۔ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اور غنائم اور دیگر معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یعنی مومن کا طریقہ یہ ہے کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس کی پیروی کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان بمعنی اذ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝

''صرف وہی سچے ایمان دار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں (اور) جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو، نیز اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں انہی کے لیے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور بخشش ہے اور باعزت روزی''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال غنیمت کو تقسیم کرنے کا جو حکم ارشاد فرمایا ہے یہ آیت اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کو لازم پکڑنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔ الوجل کا معنی خوف ہے۔ اس کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 498

مضارع میں چار لغتیں ہیں۔ وَجِلَ، یَوْجل و یَاجَل و یَیْجَل و یِیجل، اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے۔ اور مصدر وَجِلْ وَجَلًا و مَوْجَلًا بالفتح ہے۔ اور یہ جیم کے کسرہ کے ساتھ موجِل ہو تو پھر اسم ظرف بنتا ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے: یاجل انہوں نے مضارع میں واؤ ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا ہے اور قرآن کریم کی لغت واؤ کے ساتھ ہے۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ (الحجر: 53) اور جنہوں نے یا کے کسرہ کے ساتھ یِیجل کہا ہے تو یہ بنی اسد کی لغت کے مطابق ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: أنا إیجل، ونحن نِیجل، وانت تِیجل یہ تمام کلمات کسرہ کے ساتھ ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے: یَیجل تو ان کی بنا بھی اسی لغت پر ہے لیکن انہوں نے یا کو فتحہ دیا ہے جیسے انہوں نے یَعلم میں یا کو فتحہ دیا ہے اور یعلم میں یا کو کسرہ اس لیے نہیں دیا، کیونکہ انہوں نے یا پر کسرہ کو ثقیل سمجھا ہے، اور یِیجل میں کسرہ دیا گیا ہے اس لیے کہ دو یاؤں میں سے ایک نے دوسری کے سبب قوت پکڑ لی ہے۔ اور اس سے امر کا صیغہ اِیْجَل ہے (یہ اصل میں اِوْجَل تھا) اس میں واؤ ماقبل مکسور یا سے بدل گئی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں: انی منه لأوْجَل (میں اس کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہوں اس میں أوْجَل اسم تفضیل کا صیغہ ہے) اور مونث میں وَجْلیٰ نہیں کہا جائے گا، بلکہ مونث وجلة ہے۔ سفیان نے سدی سے قول باری تعالیٰ: الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جب اس نے ظلم ڈھانے کا ارادہ کیا تو اسے کہا گیا: اللہ تعالیٰ سے ڈر، تو وہ رک گیا اور اس کا دل خوفزدہ ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ اس کے ذکر کے وقت خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اور ایسا ان کی قوت ایمانی اور اپنے رب کی طرف توجہ اور رعایت کے اعتبار سے ہوتا ہے، گویا کہ وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہیں۔ اور اس آیت کی مثل یہ آیت بھی ہے: وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الحج) اور (اے محبوب! مژدہ سنائیے تواضع کرنے والوں کو۔ وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں) اور فرمایا: وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (الرعد: 28) (اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے) پس یہ کمال معرفت اور وثوق قلب کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اور وجل کا معنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ ہونا اور گھبرا جانا ہے اور اس کے معنی میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں معنوں کو اپنے اس ارشاد میں جمع کر دیا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: 23) (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں اور کانپنے لگتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے، پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف)

یعنی ان کے نفوس اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے کی حیثیت سے پرسکون ہوتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی حالت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں اور اس کے رعب وجلال اور اس کی سزا سے خوفزدہ رہتے ہیں، نہ کہ اس طرح جیسا کہ جاہل عوام اور حقیر بدعتی لوگ کرتے ہیں مثلاً چیخ و پکار کرنا، شور مچانا اور ایسی آوازیں نکالنا جو گدھوں کے رینگنے کے مشابہ ہوتی ہیں۔ پس یہ صورت حال لاحق ہو اور وہ یہ گمان کرے کہ یہ وجد اور خشوع ہے تو اسے کہا جائے گا: تو اللہ تعالیٰ کی

معرفت، اس کا خوف اور اس کی عظمت و جلال کی تعظیم کرنے میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی حالت اور کیفیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے باوجود وعظ و نصیحت کے وقت ان کی حالت اللہ تعالیٰ کے بارے فہم اور اس کے خوف سے رونے کی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے سماع اور اپنی کتاب کی تلاوت کے وقت اہل معرفت کے احوال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۳﴾ (المائدہ) (اور جب سنتے ہیں (قرآن) جو اتارا گیا رسول کی طرف تو تو دیکھے گا ان کی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ پہچان لیا انہوں نے حق کو، کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے پس تو لکھ لے ہمیں (اسلام کی صداقت کی) گواہی دینے والوں میں)

پس یہ ان کی حالت کا بیان اور ان کے قول کی حکایت ہے۔ اور جو اس طرح نہیں تو وہ نہ ان کی ہدایت پر ہے اور نہ ان کے طریقہ پر۔ پس جو ان کا طریقہ اپنائے ہوئے ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر چلتا رہے اور جو کوئی مجنونوں کے احوال اختیار کرے اور جنون تو ان کی اخس ترین حالت ہے۔ اور جنون ایک فن ہے۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ لوگوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے سوالات کیے یہاں تک کہ انہوں نے آپ سے پوچھنے میں اصرار کیا، پس آپ ﷺ ایک دن باہر تشریف لائے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: سَلُونِي لا تسألوني عن شئ الا بينته لكم ما دمتُ في مقامي هذا (1) (تم مجھ سے پوچھو تم کسی شے کے بارے مجھ سے سوال نہیں کرو گے مگر میں اسے تمہارے لیے بیان کروں گا جب تک میں اپنے اس مقام میں ہوں)

پس جب لوگوں نے یہ سنا تو وہ خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ کے سامنے کوئی بات پیش کرنے سے خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس میں نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا تو ہر انسان اپنا سر اپنے کپڑے میں لپیٹ کر رو رہا تھا۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں انتہائی بلیغ وعظ ارشاد فرمایا، اس کے سبب آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور دل کانپ گئے۔ الحدیث

وعظنا رسول الله ﷺ موعظة بليغة ذرفت منها العيون، ووجلت منها القلوب آپ نے یہ نہیں فرمایا: زَعَقْنا ولا رَقَصْنا ولا زَفَنا ولا قُمْنا (ہم چیخ و پکار کرنے لگے نہ یہ فرمایا کہ ہم رقص کرنے لگے، نہ یہ فرمایا کہ ہم اچھلنے کودنے لگے اور نہ یہ فرمایا کہ ہم اٹھ کھڑے ہوئے)

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا یعنی ان کی تصدیق میں اضافہ کر دیتی ہیں، کیونکہ اس ساعت اور وقت کا ایمان گزشتہ کل کے ایمان سے زیادہ ہوتا ہے، پس جس نے دوسری اور تیسری بار تصدیق کی تو یقیناً اس کی تصدیق سابقہ تصدیق سے زیادہ ہو گئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آیات اور دلائل کی کثرت کے سبب انشراح صدر میں زیادتی ہے۔ اور یہ معنی سورۂ آل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 263

عمران میں گزر چکا ہے: وَّ عَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَكَّلُوۡنَ، توکل کا معنی بھی سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے: الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ اس کا بیان سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا یعنی وہ جن کا ظاہر اور باطن ایمان میں برابر ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: إن لکل حق حقیقۃ فما حقیقۃ إیمانك؟ الحدیث (بے شک ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟) کسی آدمی نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: اے ابا سعید! کیا آپ مومن ہیں؟ تو آپ نے اسے فرمایا: ایمان دو قسم کے ہیں، پس اگر تو مجھ سے اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل علیہم السلام، جنت،، دوبارہ زندہ کیے جانے اور حساب پر ایمان کے بارے پوچھ رہا ہے تو میں یقیناً مومن ہوں۔ اور اگر تو مجھ سے اس قول باری تعالیٰ: اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَ اِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِیۡمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَكَّلُوۡنَ ۚۖ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا کے بارے پوچھ رہا ہے تو قسم بخدا میں نہیں جانتا میں ان میں سے ہوں یا نہیں۔

ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو کوئی یہ کہے: أنا مؤمن باللہ حقًّا (میں یقیناً اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والا ہوں) تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو (کسی شی کی) آگاہی، اطلاع اور احاطہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، پس اس کے مفقود ہونے کی وجہ سے اس بارے میں اس کا دعویٰ باطل ہے۔ اور اس سے وہ اسی معنی کا ارادہ کر رہے ہیں جو اہل سنت نے بیان کیا ہے: بے شک مومن حقیقی وہ ہے جس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا گیا ہو، پس جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مخفی حکمت میں سے اسے نہیں جانتا تو اس کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ حقیقۃً مومن (انه مومن حقا) ہے صحیح نہیں ہے۔

## كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَیۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۪ وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾

"جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ اور بے شک اہل ایمان کا ایک گروہ (اس کو) ناپسند کرنے والا تھا"۔

قولہ تعالیٰ: كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَیۡتِكَ بِالۡحَقِّ زجاج نے کہا ہے: کاف محل نصب میں ہے، یعنی الأنفال ثابتة لك كما أخرجك ربك من بيتك بالحق (مال غنیمت آپ کے لیے ثابت ہے جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ) یعنی مِثل إخراجك ربك من بيتك بالحق اور معنی یہ ہے: غنائم میں اپنا حکم جاری کر دیجئے اور جسے چاہیں بطور نفل دیجئے اگرچہ وہ ناپسند کریں، کیونکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کہا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قیدی بنا کر لانے والے کے لیے کوئی شے مقرر فرمائی: بہت سے لوگ بغیر شے کے باقی رہ جائیں گے۔ (یعنی بہت سے لوگوں کے حصہ میں کچھ بھی نہیں آئے گا) پس کما میں کاف کا محل نصب ہوا جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور فراء نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ قسم ہے، یعنی والذی أخرجك (قسم ہے اس کی جس نے آپ کو نکالا) پس کاف بمعنی واؤ ہوا اور ما بمعنی الذی ہوا۔ اور سعید بن مسعدہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اولئك هم المؤمنون حقًّا كما اخرجك ربك من بيتك بالحق فرمایا: اور بعض علماء نے کہا ہے: كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَیۡتِكَ بِالۡحَقِّ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصۡلِحُوۡا

ذَاتَ بَيْنِكُمْ (جس طرح آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ نکال لایا پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے درمیان معاملات کی اصلاح کرو)

اور عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ، كَمَاۤ اَخْرَجَكَ (تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو جس طرح اس نے تمہیں نکالا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ قول باری تعالیٰ لَهُمْ دَرَجٰتٌ کے متعلق ہے اس کا معنی ہے: ان کے لیے اپنے رب کے پاس درجات ہیں اور بخشش ہے اور باعزت روزی ہے، یعنی مومنین کے لیے آخرت میں یہ وعدہ حق ہے جس طرح آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر سے اس حق کے ساتھ نکالا ہے جو اس کے لیے ثابت ہے۔ پس اس نے آپ کے ساتھ آپ کا وعدہ پورا کر دیا اور آپ کو آپ کے دشمن کے مقابلہ میں کامیاب فرمایا اور آپ کے لیے اسے پورا فرما دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لیے ہے) پس جس طرح اس نے یہ وعدہ دنیا میں پورا کر دیا ہے اسی طرح وہ تمہارے ساتھ اس وعدہ کو پورا فرما دے گا جو اس نے تمہارے ساتھ آخرت کے بارے کیا ہے۔ یہ قول حسن ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور اسے پسند کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَمَاۤ میں کاف کاف تشبیہ ہے اور اس کا مخرج مجازات کے طریقہ پر ہے، جیسا کہ کوئی کہنے والا اپنے غلام کو کہے: جس طرح میں نے تجھے اپنے دشمنوں کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے تجھے کمزور سمجھا اور تو نے مدد طلب کی تو میں نے تیری امداد کی اور تجھے قوی اور طاقتور بنا دیا اور تیری علت اور کمزوری دور کر دی، پس اب تو انہیں پکڑ لے اور اس کے ساتھ ان کا پیچھا کر۔ اور جس طرح میں نے تجھے لباس پہنایا اور تجھے کھانے پینے کی اشیاء مہیا کیں پس تو اس اس طرح عمل کر اور جس طرح میں نے تجھ پر احسان کیا تو تو اس پر میرا شکر ادا کر۔ پس ارشاد فرمایا: جس طرح آپ کا رب آپ کو آپ کے گھر سے حق کے ساتھ نکال لایا اور اس نے تمہیں غنودگی کے ساتھ ڈھانپ دیا تا کہ یہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے، یعنی اس کے ساتھ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو راحت حاصل ہو۔ اور اس نے آسمان سے پانی اتارا تا کہ اس سے تمہیں پاک کر دے اور اس نے تم پر آسمان سے فرشتے نازل فرمائے جو پے در پے آنے والے ہیں، سو تم مارو (ان کی) گردنوں کے اوپر اور چوٹ لگاؤ ان کے ہر بند پر، گویا وہ یہ فرما رہا ہے: تحقیق میں نے تمہاری علل دور کر دی ہیں اور ملائکہ کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی ہے پس تم ان کے ان مواضع پر مارو، درآنحالیکہ یہ متقل ہے، تا کہ تم حق کو حق قرار دینے اور باطل کو باطل قرار دینے میں اللہ تعالیٰ کی مراد کو پہنچ سکو۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ یعنی ایک گروہ مکہ کو چھوڑنا اور اپنے اموال اور گھروں کو چھوڑنا ناپسند کرنے والا تھا۔

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝

''جھگڑ رہے تھے آپ سے سچی بات میں اس کے بعد کہ وہ واضح ہو چکی تھی گویا وہ ہانکے جا رہے تھے موت کی طرف درآنحالیکہ وہ (موت کو) دیکھ رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: یُجَادِلُوْنَكَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ ان کا جھگڑا، ان کا یہ قول تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (ابوسفیان کے تجارتی) قافلہ کے مقابلہ کی دعوت دی اور پھر وہ قافلہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر آپ نے انہیں جنگ لڑنے کا حکم دیا اور ان کے پاس کوئی زیادہ سازوسامان نہ تھا تو یہ حکم ان پر گراں گزرا اور انہوں نے کہا: اگر آپ ہمیں جنگ لڑنے کی خبر دیتے تو ہم یقیناً تیاری کے ساتھ آتے اور فِی الْحَقِّ سے مراد فی القتال (جنگ کے بارے میں) ہے۔ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ یعنی ان کے لیے یہ واضح ہونے کے بعد کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی شی کے بارے کوئی حکم نہیں دیتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لیے یہ بات واضح ہونے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قافلے یا اہل مکہ کے مقابلے میں کامیابی کا وعدہ فرما رکھا ہے اور جب قافلہ چلا گیا تو پھر اہل مکہ سے مقابلہ ضروری ہے اور انہیں کے مقابلہ میں کامیابی بھی ہے۔ پس کلام کا مفہوم ان کے مجادلہ اور جھگڑنے کا انکار کرنا ہے۔ كَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ قوم کی ملاقات کو ناپسندیدگی کا اظہار ہے (یعنی ان کے لیے جنگ میں واقع ہونا گویا موت کو دعوت دینا ہے)

وَ هُمْ یَنْظُرُوْنَ یعنی وہ جانتے ہیں کہ موت ان پر واقع ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ (النباء: 40) یعنی اس میں ینظر بمعنی یعلم ہے۔

وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَ ۙ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَ یُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ۸

''اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لیے ہے اور تم پسند کرتے تھے کہ نہتہ گروہ تمہارے حصے میں آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو حق کر دے اپنے ارشادات سے اور کاٹ دے کافروں کی جڑ، تاکہ ثابت کر دے حق کو اور مٹا دے باطل کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) عادی مجرم''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ اس میں اِحْدَى محل نصب میں مفعول ثانی ہے۔ اَنَّهَا لَكُمْ یہ بھی احدی سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ وَ تَوَدُّوْنَ یعنی اور تم پسند کرتے ہو۔ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ سے مراد وہ ہے جس کے پاس ہتھیار نہ ہوں۔ اور الشَّوْكَةِ کا معنی ہتھیار ہے۔ اور الشوك سے مراد وہ بوٹی ہے جس کے کانٹے ہوں۔ اور اسی سے رجل شائك السلاح (یعنی تیز دھار ہتھیار رکھنے والا آدمی) ہے، پھر اس میں قلب کر کے کہا جاتا ہے: شاکی السلاح مراد یہ ہے کہ تم پسند کرتے ہو کہ تم اس گروہ کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ جس کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہیں اور نہ اس میں جنگ ہے۔ یہ زجاج سے منقول ہے۔

وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ یعنی (اللہ چاہتا تھا) کہ وہ اسلام کو غالب کر دے اور حق ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے، لیکن اس کا اظہار (اور غلبہ) اس کو اس حیثیت سے ثابت کرنا ہے کہ اس کی باطل کے ساتھ کوئی مشابہت ظاہر نہ ہو۔ بِكَلِمٰتِهٖ سے مراد بوعدہٖ ہے یعنی اپنے وعدہ کے ساتھ، کیونکہ اس نے اس بارے میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ الدخان میں وعدہ

فرمایا ہے۔ پس ارشاد فرمایا: یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ (الدخان) (جس روز ہم انہیں پوری شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدلہ لے لیں گے) یعنی ہم ابوجہل اور اس کے ساتھیوں سے انتقام لینے والے ہیں اور مزید فرمایا: لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الفتح:28) (تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکلماتہ بمعنی بامرہ یعنی تمہیں اپنے اس حکم کے ساتھ کہ تم ان کے ساتھ جہاد کرو۔ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَ یعنی انہیں ہلاکت کے سبب نیست و نابود کر دے۔ لِیُحِقَّ الْحَقَّ یعنی تا کہ وہ دین اسلام کو غلبہ عطا فرمائے اور اسے تقویت دے۔

وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ یعنی اور وہ کفر کو مٹا دے اور اسے باطل کرنے سے مراد اسے معدوم کرنا ہے جیسا کہ حق کو حق قرار دینے کا معنی اسے ظاہر کرنا اور غالب کرنا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (الانبیاء:18) (بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے کچل دیتا ہے اور وہ یکا یک ناپید ہو جاتا ہے۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (اگرچہ عادی مجرم اسے ناپسند ہی کریں)

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

"یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔ اور نہیں بنایا فرشتوں کے نزول کو اللہ نے مگر ایک خوشخبری اور تا کہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل۔ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت غالب ہے حکمت والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ الاستغاثۃ کا معنی مدد اور نصرت طلب کرنا ہے۔ غوث الرجل (اس نے آدمی کی مدد کی) کہا: واغوثاہ (اے مدد کرنے والے) اور اس سے اسم غوث، غَواث اور غُواث ہیں۔ اور إستغاثنی فلانٌ فأغثتُه (فلاں نے مجھ سے مدد طلب کی تو میں نے اس کی مدد کی) اس کا اسم الغیاث ہے، یہ جوہری سے منقول ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے آپ نے بیان فرمایا: جب غزوہ بدر کا دن تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب تین سو سترہ افراد تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھوں کو پھیلایا اور اپنے کریم رب کی بارگاہ میں التجاء کرنے لگے: "اے اللہ! میرے لیے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ فرمایا ہے (1)، اے اللہ! تو مجھے وہ عطا فرما جو تو نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 93

جائے گی"۔ پس آپ ﷺ اپنے دست مبارک پھیلا کر اور قبلہ رو ہو کر مسلسل اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے کندھوں سے آپ کی چادر گر گئی، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، انہوں نے آپ کی چادر مبارک اٹھائی اور آپ کے کندھوں پر ڈال دی، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو تھام لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ آپ کا اپنے رب کی بارگاہ میں مناجات کرنا اور التجا کرنا آپ کے لیے کافی ہے، یقیناً وہ عنقریب آپ کو عطا فرمائے گا جس کے بارے اس نے آپ سے وعدہ فرمایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ** پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ آپ ﷺ کی امداد فرمائی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آگے پوری حدیث ذکر کی (1)۔

**مُرْدِفِیْنَ** دال کے فتحہ کے ساتھ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کی قراءت ہے۔ اور باقیوں نے دال کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل کا صیغہ قرار دیا ہے بمعنی متتابعین (یعنی لگاتار، پے درپے) ہے، یکے بعد دیگرے جماعت آتی رہی اور یہ دکھائی دینے میں زیادہ خوفناک ہے۔ اور دال کے فتحہ کے ساتھ **مُرْدَفِیْنَ** مفعول مالم یسم فاعلہ کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ لوگ جنہوں نے بدر کے دن جنگ لڑی ان کے لیے ایک ہزار فرشتے پے درپے لائے گئے، یعنی کفار کے مقابلے میں ان کی مدد کے لیے ایک ہزار فرشتے ان کی طرف نازل کیے گئے۔ پس مردفین دال کے فتحہ کے ساتھ الف (ہزار) کی صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ **مُمِدُّكُمْ** میں ضمیر منصوب سے حال ہے (تقدیر کلام اس طرح ہوگی) ممدکم فی حالِ اِردافکم بألف من الملائکة (میں تمہاری مدد کرنے والا ہوں اس حال میں کہ ایک ہزار فرشتے پے درپے تمہارے پاس آنے والے ہیں) اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ رَدِفَنی اور أَرْدَفَنی دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور ابوعبید نے أردف بمعنی رَدِفَ ہونے کا انکار کیا ہے۔

انہوں نے اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی وجہ سے یہ کہا ہے: **تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ** ۞ (النازعات) یہاں المردفة نہیں کہا۔ نحاس اور مکی وغیرہما نے کہا ہے: دال کو مکسور پڑھنا اولیٰ ہے، کیونکہ اہل تاویل اسی قراءت پر تفسیر بیان کرتے ہیں، یعنی أردف **بعضهم بعضا** (ان میں سے بعض بعض کے ردیف بنے، پیچھے آئے) اس لیے کہ اس میں فتحہ کا معنی موجود ہے جیسا کہ ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے۔ اور اس لیے کہ اکثر قراء اسی پر ہیں۔ سیبویہ نے کہا ہے: بعض نے اسے **مُرَدِّفِین** را کے فتحہ اور دال کے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نے **مُرِدِّفِین** را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے را کے ضمہ کے ساتھ **مُرُدِّفِین** پڑھا ہے۔ ان تینوں قراءتوں میں دال مکسور اور مشدد ہے۔ پس سیبویہ کے نزدیک یہ پہلی قراءت میں یہ اصل میں مرتدفین ہے، پھر تا کو دال میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اسی کی حرکت را کو دے دی گئی ہے تاکہ دو ساکن جمع نہ ہو جائیں۔ اور دوسری قراءت میں التقائے ساکنین کی وجہ سے را کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور تیسری میں میم کے ضمہ کی اتباع کرتے ہوئے را کو ضمہ دیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: رَدِّ و رُدُّ و رُدَّ یا ھذا۔ جعفر بن محمد اور عاصم جحدری نے بآلُفٍ پڑھا ہے یہ الف کی جمع ہے، جیسا کہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 208

فلس کی جمع افلس ہے۔ اوران دونوں سے بالف بھی منقول ہے۔ اور ملائکہ کے نازل ہونے، ان کے نشان لگانے اوران کے قتال کرنے کا ذکر سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى (آل عمران:126) کی بحث بھی اس میں پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اور مراد امداد ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مراد ارداف (ردیف بنانا، پے درپے بھیجنا ہو۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران:126) اس میں اس پر متنبہ کیا ہے کہ مدد اور نصرت اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف سے تھی نہ کہ ملائکہ کی طرف سے، یعنی اگر وہ آپ کی مدد نہ فرماتا تو فرشتوں کی کثیر تعداد کے ساتھ بھی نفع حاصل نہ ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد و نصرت تلوار کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور کبھی حجت و دلیل کے ساتھ ہوتی ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

''یاد کرو جب اللہ نے ڈھانپ دیا تمہیں غنودگی سے تاکہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے اور اتارا تم پر آسمان سے پانی تاکہ پاک کر دے تمہیں اس سے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدموں کو''۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اس میں دو مفعول ہیں۔ اور یہ اہل مدینہ کی قراءت ہے اور یہی اچھی ہے، کیونکہ اس میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کا ذکر پہلے وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران:126) کے تحت گزر چکا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس کے بعد وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ ہے اور اس میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ پس اس طرح اغشاء کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے گی تاکہ کلام باہم متوافق اور متشاکل ہو جائے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یغشاکم النعاس پڑھا ہے یعنی فعل کی نسبت نعاس کی طرف کی ہے۔ اس کی دلیل اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى (آل عمران: 154) ہے اس کی قراءت کے مطابق جس نے یا یا تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پس انہوں نے فعل کی اضافت نعاس کی طرف کی ہے یا اَمَنَةً کی طرف۔ اور الأمنة ھی نعاس (غنودگی) ہے، پس یہ خبر دی کہ غنودگی وہی ہے جو حق کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور باقیوں نے یغشیکم غین کے یا کے ضمہ فتحہ اور شین کی شد کے ساتھ قراءت کی ہے اور النعاس حضرت نافع کی قراءت کے مطابق نصب کے ساتھ ہے، دو لغتیں غشی اور اغشی کے معنی کے مطابق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاَغْشَيْنٰهُمْ (یاسین:9) اور مزید فرمایا: فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ (النجم) اور مزید فرمایا: كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ (یونس:27) مکی نے کہا ہے: پسندیدہ قراءت یا کے ضمہ، تشدید اور نعاس کی نصب ہے، کیونکہ اس کے بعد أمنة منه ہے اور منه میں ہاء ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، پس وہی وہ ہے جو لوگوں کو غنودگی کے ساتھ ڈھانپ دیتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اکثر قراء اسی پر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أمنة من العدو ہے (یعنی ہا ضمیر کا مرجع عدو ہیں)

اور أمنة مفعول من اجلہ ہے یا مصدر ہے، کہا جاتا ہے: أمن أمنة وأمنا وأمانا یہ سب برابر ہیں۔ اور نعاس (غنودگی اور نیند) اس امن والے کی حالت ہے جسے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اور یہ غنودگی اس رات میں طاری ہوئی جس کی صبح کو جنگ تھی،

پس یہ نیند بھی عجیب تھی کہ اس کے باوجود کہ ان کے سامنے ایک اہم ترین اور مشکل میں ڈال دینے والا امر تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو مربوط اور پرسکون کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ہم میں حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا بدر کے دن کوئی گھوڑسوار نہ تھا، وہ ابلق گھوڑے پر سوار تھے اور میں نے دیکھا کہ ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر کوئی سو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم درخت کے نیچے نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔
ماوردی (1) نے کہا ہے: اس رات نیند کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انہیں راحت وسکون پہنچانے کی دو وجہ تھیں: ان میں ایک یہ تھی کہ انہیں صبح کی جنگ کے لیے راحت اور سکون پہنچا کر طاقتور اور قوی بنانا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے دلوں سے رعب زائل کر کے انہیں امن اور سکون پہنچانا تھا، جیسے کہا جاتا ہے: امن سلا دیتا ہے اور خوف جگا دیتا ہے۔ الأمنُ مُنِیمٌ والخوف مُسْهِرٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ کریم نے انہیں دو لشکروں کے ملنے کی حالت میں (مراد حالت جنگ) انہیں ڈھانپ دیا۔ اور اس کی مثل گفتگو غزوہ احد کے بیان میں سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ⑪ ظاہر قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ غنودگی بارش سے پہلے طاری ہوئی۔ اور ابن ابی نجیح نے کہا ہے: بارش نیند سے پہلے ہوئی۔ زجاج نے بیان کیا ہے (2) کہ کفار بدر کے دن مومنین سے پہلے بدر کے پانی کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈالا۔ اور مومنین اس حال میں باقی رہ گئے کہ ان کے لیے کوئی پانی نہ تھا، پس ان کے نفوس گھبرا گئے اور وہ پیاس محسوس کرنے لگے اور جنبی ہوئے اور وہ اسی طرح نمازیں پڑھنے لگے۔ تو بعض نے اپنے دلوں میں شیطان کے وسوسے ڈالنے کے سبب کہا: ہم گمان کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور ہم میں اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اور ہماری حالت یہ ہے اور مشرکین پانی پر قابض ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے سترہ رمضان المبارک غزوہ بدر کی رات اتنی بارش برسائی یہاں تک کہ وادیاں بھر کر بہنے لگیں۔ اور انہوں نے جی بھر کر پانی پیا، غسل اور طہارت کا اہتمام کیا اور اپنے اونٹوں کو خوب سیراب کیا۔ اور ان کے اور مشرکین کے درمیان جوریت اور دلدل تھی وہ خوب جم گئی، یہاں تک کہ جنگ کے وقت اس میں مسلمانوں کے پاؤں خوب جمے رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ احوال ان کے بدر پہنچنے سے پہلے تھے۔ اور یہی اصح ہے۔
اور یہی وہ ہے جسے ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں اور دوسروں نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ اس کا خلاصہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوسفیان کے بارے خبر دی گئی کہ وہ شام سے آ رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ان کی طرف ابھارا اور فرمایا: ''یہ قریش کا قافلہ ہے اس میں وافر اموال ہیں پس تم ان کی طرف نکلو شاید اللہ تعالیٰ یہ اموال تمہیں بطور غنیمت عطا فرما دے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک تھوڑی سی جماعت اٹھی اور قوم نے بوجھ محسوس کیا اور نکلنا ناپسند کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تیزی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے جس نے کوئی عذر پیش کیا اور نہ اس کا انتظار کیا جس کا اونٹ غائب تھا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین وانصار میں سے

1۔ تفسیر ماوردی، صفحہ 299
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 500

تین سو تیرہ اصحاب کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ اور بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: بدر کے دن مہاجرین کی تعداد اسی سے کچھ زائد تھی۔ اور انصار کی تعداد دو سو چالیس سے کچھ اوپر تھی۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ ہی سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ہم گفتگو کرتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو دس سے کچھ زائد تھی اور یہ طالوت کے ان ساتھیوں کی تعداد کے برابر تھی جنہوں نے اس کے ساتھ دریا کو عبور کر لیا تھا اور اس کے ساتھ سوائے مومن کے کسی نے عبور نہیں کیا تھا۔ اور علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: پس ہم بدر کی طرف نکلے، جب ہم نے ایک یا دو دن کا سفر کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا کہ ہم اپنی تعداد شمار کریں چنانچہ ہم نے ایسا کیا تو ہم تین سو تیرہ افراد تھے، ہم نے اپنی تعداد کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا تو آپ اس پر بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''یہ اصحاب طالوت کی تعداد تھی'' (1)۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: ان تمام لوگوں کا گمان یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ نہیں لڑیں گے پس انہوں نے زیادہ تیاری نہ کی۔ اور ابوسفیان جس وقت حجاز کے قریب پہنچا تو وہ خبریں لینے لگا اور جس سوار سے ملاقات ہوتی اس سے حالات کے بارے پوچھتا، کیونکہ اسے لوگوں کے مال پر خوف لاحق ہو گیا تھا، یہاں تک کہ بعض سواروں سے اسے یہ خبر پہنچی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لیے لوگوں کو جمع کیا ہے (اور جنگ پر ابھارا ہے) تو وہ اس سے ڈر گیا اور اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو اجرت پر لیا اور اسے مکہ بھیجا اور اسے یہ حکم دیا کہ وہ قریش کے پاس جائے اور انہیں اپنے اموال (کی حفاظت) کے لیے جمع کرے اور انہیں یہ خبر دے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس کے لیے رکاوٹ ہیں۔ پس ضمضم نے ایسا ہی کیا۔ تو اہل مکہ ایک ہزار یا اسی طرح کی تعداد میں نکلے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ نکلے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے بارے خبر موصول ہوئی کہ وہ اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے نکل پڑے ہیں۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ کیا، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور بہت اچھی گفتگو کی، پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اٹھے اور آپ نے بھی انتہائی خوبصورت گفتگو کی، پھر حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ وہ کیجئے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، قسم بخدا! ہم اس طرح نہیں کہیں گے جیسے بنی اسرائیل نے کہا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ) (پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو (ان سے) ہم تو یہاں ہی بیٹھیں گے)

ولکن إذهب انت و ربك فقاتلا إنا معكم مقاتلون (بلکہ آپ چلیں اور آپ کا رب اور دونوں جنگ لڑیں بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ لڑیں گے) اور قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے آپ برک الغماد یعنی شہر حبشہ تک چلیں، ہم وہاں تک تمہاری معیت میں لڑیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت خوش ہوئے اور انہیں دعا خیر سے نوازا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو''۔ آپ کی مراد انصار تھے۔ اس لیے کہ وہی لوگ زیادہ تعداد میں تھے اور انہوں نے جس

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 564

وقت عقبہ پر آپ کی بیعت کی تھی تو عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ بے شک ہم آپ کی حفاظت اور ذمہ سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے شہر میں تشریف لے آئیں، پس جب آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے۔ ہم آپ کی ہر اس شے سے حفاظت کریں گے جس سے ہم اپنی، اپنی اولاد، اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ یہ خوف محسوس فرما رہے تھے کہ انصار یہ رائے نہ رکھتے ہوں کہ ان پر آپ ﷺ کی مدد و نصرت کرنا صرف مدینہ طیبہ میں لازم ہے اور ان پر یہ لازم نہیں کہ آپ انہیں ساتھ لے کر ان کے شہروں سے باہر دشمن کی طرف چل پڑیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تو ان میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور بعض نے کہا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دن ان دونوں نے گفتگو کی ہو۔ عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ ہم گروہ انصار کا ارادہ فرما رہے ہیں؟ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ تو انہوں نے عرض کی: بے شک ہم آپ ﷺ کے ساتھ ایمان لائے اور ہم نے آپ کی اتباع اور پیروی کی، آپ وہ کیجئے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ ہمیں اس سمندر تک لے چلیں اور پھر آپ اس میں کود جائیں تو یقیناً ہم آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امضوا علی برکۃ اللہ فکأنی أنظر إلی مصارع القوم (تم اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ چلو گویا میں قوم کے گرنے کی جگہوں کی طرف دیکھ رہا ہوں)

پس رسول اللہ ﷺ چل پڑے اور بدر کے پانی تک قریش سے پہلے جا پہنچے۔ اور قریش کو پہلے پہنچنے سے اس موسلا دھار بارش نے روکا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمائی اور مسلمانوں پر صرف اتنی مقدار میں برسی جس نے ان کے لیے وادی کی نرم ریت کو سخت اور مضبوط کر دیا اور چلنے میں ان کی معاون ثابت ہوئی۔ الدھس سے مراد ایسی نرم ریت ہے جس میں پاؤں دھنس جاتے ہوں۔ آپ ﷺ بدر کے پانیوں میں سے مدینہ طیبہ کی جانب قریب تر پانی کے پاس اتر پڑے۔ تو حضرت حباب بن منذر بن عمرو بن جموح نے اس کے سوا کی طرف اشارہ کیا اور آپ سے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اس منزل کے بارے آپ کی کیا رائے ہے، کیا یہ ایسی منزل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اترنے کا حکم فرمایا اور ہمارے لیے اس جگہ سے آگے پیچھے ہونا جائز نہیں یا پھر یہ رائے اور جنگی چال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''(نہیں) بلکہ یہ رائے، جنگ اور تدبیر ہے''۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ، بلاشبہ یہ آپ کے لیے اترنے کی جگہ مناسب اور موزوں نہیں ہے، پس ہمیں اٹھا کر اس قوم کے قریب تر پانی کے پاس لے چلیں ہم وہاں پڑاؤ ڈالیں گے اور اس کے پیچھے جو کنوئیں ہیں ہم انہیں بند کر دیں گے، پھر ہم وہاں حوض بنالیں گے اور اسے پانی سے بھر دیں گے نتیجۃً ہم پانی پئیں گے اور وہ نہیں پی سکیں گے۔ حضور نبی رحمت ﷺ نے ان کی اس رائے کو مستحسن قرار دیا اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ پھر دشمن سے مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ اور مسلمانوں کی مدد اور نصرت فرمائی، آپ نے ستر مشرکین کو قتل کیا اور ان میں سے ستر کو قیدی بنالیا اور ان سے مومنین کا انتقام لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کے سینہ مبارک اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں کو ان کے غیظ و غضب سے شفا عطا فرمائی۔ (اور انہیں ٹھنڈا کیا)

اور اسی بارے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

عَرفتُ دیار زینب بالکثِیب کخط الوحیِ فی الورَق القشِیبِ

میں نے ٹیلے پر زینب کے گھر کو اس طرح پہچان لیا جس طرح بوسیدہ کاغذ پر تحریر کے خط کو پہچان لیا جاتا ہے۔

تداولُها الریاح وکلّ جَوْنٍ من الوَسْمِیّ منہمِرٍ سَکُوبِ

ان گھروں پر ہوائیں چلتی ہیں اور موسم بہار کا ہر سیاہ بادل لگاتار اور موسلا دھار برستا ہے۔

فأمسی رُبعُها خلقا وأمست یبابا بعد ساکنها الحبیب

پس ان کے نشان بوسیدہ ہو گئے اور وہ اجڑے پڑے ہیں جب کہ پہلے کبھی وہاں محبوب رہتا تھا۔

فدع عنك التذکّر کلّ یوم ورُدّ حرارۃ الصدر الکئیب

پس تو ہر روز ان کو یاد کرنا چھوڑ دے اور اپنے غمزدہ سینے کی حرارت کو ختم کر دے۔

وخبّر بالذی لا عیب فیه بِصدق غیرِ إخبارِ الکذوبِ

اور ان جھوٹے قصوں کی اخبار کو چھوڑ کر اس سچی بات کی خبر دے جس کے سنانے میں کوئی حرج نہیں۔

بما صنع الإله غداۃ بدرٍ لنا فی المشرکین من النصیب

سنا کہ خداوند (مقتدر) نے ہمیں بدر کے دن مشرکین پر کامیابی عطا فرمائی

غداۃ کأن جمعهم حِراءٌ بدت أرکانه جُنْحَ الغروب

وہ دن جب ان کا گروہ کوہ حرا کی طرح معلوم ہوتا تھا لیکن ان کی بنیادیں زوال کے وقت جھک گئیں۔

فلاقیناهُم منّا بجمع کأسد الغاب مردانٍ و شِیبِ

ہم نے ایک ایسی جماعت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جس کے بوڑھے اور جوان سب جنگل کے شیر تھے۔

أمام محمد قد وازروه علی الأعداء فی لَفح الحروب

وہ جماعت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی جس نے جنگ کی لپیٹ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی۔

بأیدیهم صوارِم مرهفات وکلّ مجربٍ خاظِی الکعُوب

ان کے ہاتھوں میں پتلی اور تیز دھار والی تلواریں اور موٹی موٹی گرہوں والے آزمودہ نیزے تھے۔

بنو الأوسِ الغطارِفُ وازرتها بنو النجار فی الدّین الصلیب

وہ سرداران بنو اوس تھے جنہیں دین محکم میں بنو نجار نے مدد دی تھی۔

فغادرْنا أبا جهل صریعا وعتبۃَ قد ترکنا بالجَبُوب

پس ہم نے ابو جہل کو پچھاڑا ہوا اور عتبہ کو سخت زمین پر پڑا ہوا چھوڑا۔

وشیبۃَ قد ترکنا فی رجال ذوِی حسب إذا نُسِبوا حسیبِ

اور شیبہ کو ایسے لوگوں میں چھوڑا جن کے نسب جب بیان کیے جائیں تو وہ بڑے نسب والے نکلیں۔

يناديهم رسول الله لما قذفناهم كباكِبَ في القليب

جب ہم نے انہیں جتھوں کی صورت میں کنوئیں میں ڈالا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ندا دے رہے تھے۔

ألم تجِدوا كلامِيَ كان حقا وأمُرالله يأخذ بالقلوب

کیا تم نے نہیں پایا کہ میری بات سچ تھی اور اللہ کا حکم دلوں کو (بھی) پکڑ لیتا ہے۔

فما نطقوا ولو نطقوا لقالوا أصبتَ وكنتَ ذارأي مصيب

وہ کچھ نہ بولے اور اگر وہ بولتے تو کہتے کہ آپ نے سچ کہا تھا اور آپ ہی صحیح رائے والے تھے۔

اور یہاں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: تم میں اہل بدر کیسے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ ہم میں انتہائی عظیم اور اچھے لوگ ہیں''۔ تو انہوں نے کہا: ''بلاشبہ وہ ہمارے درمیان بھی اسی طرح ہیں'' (1)۔ تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ مخلوقات کا شرف و عظمت ان کی ذاتوں کے سبب نہیں ہوتا، بلکہ ان کے افعال کے سبب ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کے افعال شریفہ دائمی تسبیح و تحمید پر مواظبت اختیار کرنا ہے۔ اور ہمارے افعال کا شرف اطاعت و بندگی میں اخلاص پیدا کرنے کے ساتھ ہے۔ اور طاعات کی افضیلت شریعت کے انہیں فضیلت دینے کے ساتھ ہے اور ان میں سب سے افضل جہاد ہے اور افضل ترین جہاد یوم بدر ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد (اور مضبوطی) اسی پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قافلہ کی راہ روکنے کے لیے نکلنا اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت کے حصول کے لیے لشکر لے کر نکلنا جائز ہے، کیونکہ یہ کسب حلال ہے۔ اور یہ اسے رد کرتا ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے، جب کہ انہوں نے کہا ہے: یہ جنگ دنیا کے حصول کے لیے ہے۔ اور یہ جو روایت ہے کہ جس نے اس لیے قتال کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والا ہے اور یہ اس کے سوا ہے جو مال غنیمت کے حصول کے لیے قتال کرتا ہے، تو اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس کا قصد اور ارادہ صرف یہی ہو اور اس میں دین کا کوئی حصہ نہ ہو۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ بدر سے فارغ ہوئے تو انہوں (صحابہ کرام) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: آپ پر قافلے کو پکڑنا لازم ہے، اس کے سوا کوئی شے نہیں۔ تو عباس نے انہیں ندا دی اور وہ اس وقت قیدیوں میں تھے۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا''۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''وہ کیوں''؟ انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کا آپ کے ساتھ وعدہ فرمایا، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ عطا فرما دیا جس کا اس نے آپ سے وعدہ فرمایا۔ تو حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا ہے'' (2) اور حضرت عباس کو اس کا علم حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمہا، جلد 2، صفحہ 387　　2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی باتوں سے اور جو بدر کا معاملہ ہوا اس سے ہوا۔ پس انہوں نے اسے دوران گفتگو سنا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک مقتولین بدر کو چھوڑے رکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب کھڑے ہوئے اور انہیں ندا دی اور فرمایا: ”اے ابا جہل بن ہشام، اے امیہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ کیا تم نے اسے سچ نہیں پایا جو تمہارے رب نے وعدہ کیا بلاشبہ میں نے تو اسے سچ پالیا ہے جو میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا الیس قد وجد تم ما وعد ربکم حقًا فانی قد وجدتُ ما وعدنی ربّی حقًا (1) پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول سنا تو عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے سن سکتے ہیں اور وہ کیونکر جواب دے سکتے ہیں حالانکہ وہ مردار ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ما أنتم بأسمع لما أقول منهم ولکنهم لا یقدرون أن یجیبوا (قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میرا قول تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے لیکن وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے)

بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے حکم دیا پس انہیں گھسیٹا گیا اور انہیں بدر کے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ جیفوا جیم اور یا کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی ہے وہ بدبودار ہو گئے اور مردار بن گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول: یسمعون کا اطلاق اس پر بعید ہے جس کے مطابق عادت جاریہ ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیا کہ وہ زندوں کے سننے کی طرح سن رہے ہیں۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ موت نہ عدم محض ہے اور نہ صرف فنا ہے، بلکہ یہ تو روح کے تعلق کا بدن سے منقطع ہونا اور اس سے جدا ہونا ہے اور یہ ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی ہے۔ اور حالت کا تبدیل ہونا اور ایک دار سے دوسرے دار کی طرف منتقل ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إن المیّت إذا وضع فی قبرہ وتولی عنه أصحابه أنه یسمع قرع نعالهم، الحدیث (2) (بے شک میت کو جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے واپس آتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا ہے) أخرجه الصحیح۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ اس میں بہ میں ضمیر اس پانی کی طرف لوٹ رہی ہے جس نے وادی کی نرم ریت کو سخت کر دیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ربط القلوب (دلوں کو مضبوط کرنا) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس تثبیت الأقدام سے مراد میدان جنگ میں مدد و نصرت کا حاصل ہونا ہے۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾

”یاد کرو جب وحی فرمائی آپ کے رب نے فرشتوں کی طرف کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس تم ثابت قدم رکھو ایمان والوں کو، میں ڈال دوں گا کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب سو تم مارو (ان کی) گردنوں کے اوپر اور چوٹ لگاؤ ان کے ہر بند پر“۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ انفال، جلد 2، صفحہ 134
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، جلد 2، صفحہ 386

قولہ تعالیٰ: اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ، اِذْ میں عامل یُثَبِّتَ ہے یعنی یُثَبِّتْ بِهِ الْاَقْدَامَ ذالك الوقت (وہ اس وقت اس کے ساتھ قدموں کو جما دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عامل لیربط ہے ای ولیربط إذ یوحی (اور تاکہ مضبوط کر دے (دلوں کو) جب اس نے وحی فرمائی) اور تقدیر عبارت ہوگی: أذکر (یاد کرو) اور اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ محل نصب میں ہے اور معنی ہے بانی معکم یعنی مدد و نصرت کے ساتھ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ معکم عین کے فتحہ کے ساتھ ظرف ہے اور جنہوں نے اسے ساکن پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ حرف ہے۔ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی تم انہیں بشارت دو مدد و نصرت کی یا ان کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کی یا بغیر جنگ کے ان کے ساتھ حاضر رہنے کی، پس فرشتہ صف کے آگے آدمی کی صورت میں چلتا رہا اور یہ کہتا رہا: چلو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اور مسلمان یہ گمان کرتے رہے کہ وہ ان میں سے ہے۔ تحقیق آل عمران میں یہ گزر چکا ہے کہ ملائکہ نے اس دن قتال کیا۔ پس انہوں نے کئی سروں کو گردنوں سے الگ ہوتے دیکھا اس کے بغیر کہ کوئی ظاہر مارنے والے انہیں ضرب لگاتے، بعض نے کہنے والے کو سنا کہ اس کا یہ قول سنائی دے رہا ہے لیکن اس کا سراپا نظر نہیں آ رہا۔ أقدم حیزوم (حیزوم آگے بڑھو) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس تثبیت (ثابت قدمی) سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنین کی مدد کے لیے فرشتوں کے نازل ہونے کا ذکر کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ اس کا بیان پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ یہ امر (حکم) ملائکہ کو ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امر مومنین کے لیے ہے۔ یعنی إضربوا الأعناق (تم گردنیں مار دو یعنی قتل کرو) اور لفظ فوق زائدہ ہے۔ یہ اخفش، ضحاک اور عطیہ نے کہا ہے۔ اور مسعودی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں اس لیے نہیں مبعوث کیا گیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا عذاب دوں بلکہ مجھے تو گردنوں کو مارنے اور بیڑیاں باندھنے کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ إنّی لم أبعث لأعذب بعذاب الله وإنما بعثتُ بضرب الرقاب و شدّ الوثاق (1)

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ فوق معنی کا فائدہ دے رہا ہے پس اسے زائدہ بنانا جائز نہیں ہے، البتہ معنی یہ ہے کہ ان کے لیے چہروں اور ان کے قریبی اعضاء پر مارنے کو مباح قرار دیا گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد ہر سر اور کھوپڑی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد گردنوں سے اوپر والا حصہ ہے اور وہ سر ہیں۔ یہ عکرمہ نے کہا ہے (2)۔ اور سر پر ضرب لگانا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ ادنیٰ شے بھی دماغ میں اثر کر جاتی ہے۔ اور اس معنی میں سے کچھ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور یہ کہ فوق زائدہ نہیں ہے۔ یعنی قول باری تعالیٰ: فَوْقَ اثْنَتَیْنِ (النساء: 11) کے تحت یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ زجاج نے کہا ہے: بنان کی واحد بنانۃ ہے اور یہاں ان سے مراد انگلیاں اور ان کے علاوہ دیگر اعضاء ہیں۔ اور البنان ان کے اس قول سے مشتق ہے: ابن الرجل بالمکان ((جب کوئی آدمی کسی جگہ مقیم ہو جائے تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)) پس بنان کا لفظ ہر اس شے کے لیے بولا جاتا ہے جو اقامت اور حیات کے لیے ہوتی ہے۔

---

1۔ کنز العمال، کتاب الحدود و محظوراتہ، جلد 5، صفحہ 393، حدیث نمبر 13391، مکتبۃ التراث الاسلامی

2۔ تفسیر طبری، سورۂ انفال، جلد 9، صفحہ 234، دار احیاء التراث العربیۃ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں بنان سے مراد دونوں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے پورے ہیں (1)۔ اور یہ جنگ میں ثابت رہنے اور محل ضرب سے عبارت ہے، کیونکہ جب پوروں پر ضرب لگائی جائے تو مضروب لڑنے کے قابل نہیں رہتا بخلاف دیگر تمام اعضاء کے (کہ ان پر ضرب لگنے کے باوجود مضروب جنگ جاری رکھ سکتا ہے)

جیسا کہ عنترہ نے کہا ہے:

وكان فَتَى الهَيْجاء يحمِى ذِمَارها　　ويضرب عند الكَرْب كلّ بنَانِ

اس سے مراد انگلیوں کے پورے ہیں۔

اور عنترہ کے قول میں بنان بمعنی انگلیاں بھی ہیں:

وأنّ الموت طوع يدى إذا ما　　وصلت بَنَانَها بالهِنْدُوَانِى

اور یہ معنی کہ بنان بمعنی انگلیاں عرب کے اشعار میں کثرت سے موجود ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: البنان سے مراد انگلیاں ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: مراد انگلیوں کے پورے ہیں۔

اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام بنان رکھا گیا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ ان احوال کی اصلاح ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان قرار حاصل کرتا ہے اور اقامت اختیار کرتا ہے۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: البنان سے مراد اعضائے بدن کے تمام جوڑ ہیں (2)۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑬ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ⑭

''یہ حکم اس لیے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جو مخالفت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (اے حق کے دشمنو!) یہ سزا ہے، پس چکھو اسے، نیز (یاد رکھو) کافروں کے لیے آتش (جہنم) کا عذاب بھی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ، ذٰلِكَ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تقدیر کلام ہے: ذالك الأمر، یا الأمر ذالك (یہ حکم اس لیے ہے) شَآقُّوا اللّٰهَ یعنی انہوں نے اللہ کے اولیاء (اور دوستوں) کی مخالفت کی ہے۔ اور الشقاق کا معنی ہر ایک کا مشقت میں پڑنا ہے (یا ہر ایک کا ایک طرف اور کنارہ میں ہو جانا ہے) یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ زجاج نے کہا ہے: ذالكم، الآمر یا القصہ مضمر ماننے کے سبب مرفوع ہے۔ یعنی الأمر ذالكم فذوقوه (معاملہ اور قصہ یہ ہے پس چکھو اسے) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذوقوا (فعل کا مفعول ہونے) کے سبب محل نصب میں ہو، جیسے تمہارا یہ قول: زیدا فاضربه۔ اور کلام کا معنی کافروں کو جھڑکنا اور زجر و توبیخ کرنا ہے۔ اور وان، ذلکم پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو بمعنی وبأن للكافرين۔

1۔ تفسیر طبری، سورۃ انفال، جلد 9، صفحہ 235، دار احیاء التراث العربیۃ
2۔ تفسیر طبری، سورۃ انفال، جلد 9، صفحہ 235

انہوں نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہاں واعلموا ان مضمر مان لیا جائے۔ زجاج نے کہا ہے: اگر واعلموا کو مضمر ماننا جائز ہے تو پھر زید منطلق وعمرا جالسا بھی جائز ہے، بلکہ ابتدا میں زیدا منطلقا کہنا جائز ہو، کیونکہ خبر دینے والا معلم ہے اور نحویوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦﴾

''اے ایمان والو! جب تم مقابلہ کرو کافروں کے لشکر جرار سے تو مت پھیرنا ان کی طرف (اپنی) پیٹھیں۔ اور جو پھیرے گا ان کی طرف اس روز اپنی پیٹھ بجز اس صورت کے کہ پینترا بدلنے والا ہو لڑائی کے لیے یا پلٹ کر آنے والا ہو اپنی جماعت کی طرف تو وہ مستحق ہوگا اللہ کے غضب کا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: زَحْفًا الزحف، الدنو قليلا قليلا یعنی اس کا معنی ہے آہستہ آہستہ قریب ہونا، آگے بڑھنا۔ اور اس کا اصل معنی ہے الاندفاع على الألية (سرین کے بل گھسٹ کر آگے بڑھنا) پھر جنگ میں آخر تک ہر چلنے والے کو زاحف کا نام دیا گیا ہے۔ اور التزاحف کا معنی ہے: باہم ایک دوسرے کے قریب ہونا۔ کہا جاتا ہے: زحف الى العدو زحفا (وہ دشمن کی طرف انتہائی قریب ہوگیا) اور ازدحف القوم کا معنی ہے ان میں سے بعض بعض کی طرف چلے۔ اور اسی سے زحاف الشعر بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دو حرفوں کے درمیان سے ایک حرف ساقط ہو جائے اور اس طرح ان میں سے ایک دوسرے کے قریب ہو جائے۔ پس رب کریم فرما رہا ہے: جب تم ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگو تو پھر تم ان سے مت بھاگو اور نہ تم ان کی طرف اپنی پیٹھیں کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مومنوں پر اس وقت حرام قرار دیا جب ان پر جہاد اور کافروں کا قتال فرض کیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ادبار، دبر کی جمع ہے۔ اس آیت میں لفظ دبر وضاحت کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بھاگنے والے پر اظہار ناپسندیدگی کے لیے اور اس کی مذمت بیان کرنے کے لیے ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے کہ مومنین کفار کے سامنے پیٹھ نہ پھیریں اور یہ امر اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ مومنین کے مقابلے میں دشمن کی تعداد دو مثل تک ہو، پس مومنین کا لشکر مشرکین کے ایسے لشکر کے مقابلہ میں ہو جس کی تعداد مومنین سے دوگنا تک ہو تو پھر فرض ہے کہ وہ اس کے سامنے سے نہ بھاگیں۔ پس جو کوئی دو کے مقابلے سے بھاگا تو وہ لشکر سے بھاگنے والا شمار ہوگا۔ اور جو کوئی تین کے مقابلہ سے بھاگا تو وہ لشکر سے بھاگنے والا نہ ہوگا، اور وعید اس کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔ اور فرار گناہ کبیرہ ہے، ہلاک کرنے والا ہے۔ یہ ظاہر قرآن سے اور اکثر ائمہ کے اجماع سے ثابت ہے (2)۔ ایک جماعت ان میں سے ابن ماجشون ہیں ''الواضحہ'' میں کہا ہے: بے شک ضعف، قوت اور تعداد کی رعایت کی

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ انفال، جلد 2، صفحہ 510، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

جائے گی، پس ان کے قول کے مطابق ایک سو گھڑسوار کا ایک سو گھڑسوار کے مقابلے سے بھاگنا بھی جائز ہے جب کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ مشرکین کے پاس موجود قوت وطاقت ان کی قوت وطاقت سے کئی گنا ہے، لیکن جمہور کے قول کے مطابق ایک سو کا فرار اختیار کرنا حلال نہیں ہوگا مگر تبھی جب کفار کی تعداد دو سو سے زائد ہو، پس جب ایک مسلمان کے مقابلے میں دو سے زیادہ ہوں تو پھر پسپائی اختیار کرنا جائز ہوتا ہے، لیکن ڈٹ جانا اور استقامت اختیار کرنا احسان ہے۔ مؤتہ کی جنگ میں تین ہزار کا لشکر دو لاکھ کے مقابلے میں کھڑا رہا، ان میں سے ایک لاکھ رومی تھے اور ایک لاکھ لخم اور جذام کے مستعربہ تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: فتح اندلس کی تاریخ میں یہ موجود ہے کہ طارق مولیٰ موسیٰ بن نصیر سترہ سو افراد کے ساتھ لے کر اندلس کی طرف چلا اور یہ رجب 93ھ کا واقعہ ہے، پس اس کا اور شاہ اندلس لذریک کے درمیان مقابلہ ہوا اس کے ساتھ ستر ہزار گھڑسوار تھے۔ پس طارق نے اس کے ساتھ جنگ لڑی اور اس کے مقابلے میں ڈٹ گیا تو اللہ تعالیٰ نے لذریک کی متکبر فوج کو شکست سے دوچار کیا اور طارق کو فتح و سرفرازی عطا فرمائی۔

ابن وہب نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے ایسی قوم کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جو دشمن کے مقابلے میں ہوتے ہیں یا وہ کسی قلعے میں محصور اور محفوظ ہوتے ہیں پھر ان کا دشمن ان پر چڑھائی کر دیتا ہے اور ان کی تعداد قلیل اور تھوڑی ہے، کیا وہ جنگ لڑیں گے یا پیٹھ پھیر کر واپس جائیں گے اور اپنے ساتھیوں کو اس بارے آگاہ کریں گے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر وہ جنگ کرنے اور لڑنے کی قوت رکھتے ہوں تو وہ ان کے ساتھ قتال کریں گے، ورنہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ جائیں گے اور انہیں اس پر آگاہ کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ لوگوں کا اس بارے اختلاف ہے کہ کیا جنگ کے دوران فرار اختیار کرنا بدر کے دن کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ حکم قیامت تک ہونے والی جنگوں کو عام ہے؟ تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ حکم صرف یوم بدر کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی قول نافع، حسن، قتادہ، یزید بن ابی حبیب اور ضحاک کا ہے (1)۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ یہ حکم اہل بدر کے ساتھ خاص ہے، پس ان کے لیے پسپائی اختیار کرنا جائز نہیں اور اگر انہوں نے پسپائی اختیار کی تو یقیناً انہوں نے مشرکین کے لیے پسپائی اختیار کی اور اس وقت ان کے سوا مسلمان نہ تھے اور نہ کوئی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی مسلمانوں کا لشکر تھا۔ تو رہا اس کے بعد کا زمانہ تو اس میں بعض دوسرے بعض کا لشکر تھے۔ الکیا نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں بہت سے انصار تھے جنہیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خروج کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ ان کا خیال تھا کہ یہ جنگ ہوگی، بلکہ ان کا گمان تو یہ تھا کہ یہ ایک قافلہ ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی لوگوں کے ہمراہ نکل پڑے جو قلیل تعداد میں آپ کے ساتھ تھے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام علماء سے روایت ہے کہ اس آیت (کا حکم) یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے (2)۔

اور پہلے گروہ نے اس سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد یومئذ سے بھی اور کہا ہے: کہ یہ اشارہ یوم بدر کی طرف ہے اور یہ کہ آیت کا حکم آیۃ الضعف سے منسوخ ہے اور لشکر سے فرار کا حکم باقی ہے لیکن وہ گناہ کبیرہ

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 238　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 843، سورۂ انفال دار الفکر

نہیں ہے۔ تحقیق لوگ غزوۂ احد کے دن بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا اور غزوۂ حنین کے دن ان کے بارے میں فرمایا: ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ (التوبہ) (پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے) اور اس پر کوئی عتاب واقع نہیں ہوا۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ اس یوم الزحف کی طرف اشارہ ہے جسے قول باری تعالیٰ: اِذَا لَقِيْتُمْ متضمن ہے اور آیت کا حکم یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے بشرطیکہ تعداد اتنے گنا موجود ہو جسے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے اور اس آیت میں نسخ نہیں ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ آیت، قتال کے بعد، جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد اور جو کچھ اس دن میں ہوا اس کے ساتھ دن کے گزر جانے کے بعد نازل ہوئی۔ یہی موقف امام مالک، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اجتناب کرو اور ان میں ایک والتولی یوم الزحف (1) (میدان جہاد سے پیٹھ پھیرنا بھی ہے) اور یہ اس مسئلہ میں نص ہے۔ اور رہا احد کا دن! تو بلاشبہ لوگ اپنے سے دوگنا سے زیادہ لوگوں سے بھاگے اور اس کے باوجود ہلاکت اور مشقت میں پڑے۔ اور جہاں تک غزوۂ حنین کا تعلق ہے تو اسی طرح اس میں بھی وہی بھاگا جسے کثرت اور زیادتی کا انکشاف ہوا، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن القاسم نے کہا ہے: اس کی شہادت جائز نہیں ہوتی جو لشکر سے بھاگ آئے اور نہ ہی لشکریوں کے لیے فرار جائز ہوتا ہے اگرچہ ان کا امام (سالار) بھاگ جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗ، الآیہ (اور جو پھیرے گا ان کی طرف اس روز اپنی پیٹھ) فرمایا: اگر مقابل لشکر کی تعداد دوگنا سے زیادہ ہو تو پھر فرار جائز ہوتا ہے۔ اور یہ تب ہے جب مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تک نہ پہنچے اور اگر بارہ ہزار تک پہنچ جائے تو پھر ان کے لیے فرار جائز نہیں اگرچہ مشرکین کی تعداد دوگنا سے زائد ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ولن يغلب اثنا عشر الفا من قلة (2) (تعداد بارہ ہزار ہو تو اس پر قلت کے سبب ہرگز غلبہ نہیں پایا جا سکتا) اکثر اہل علم نے اس حدیث کے ساتھ آیت کے عموم میں سے اس عدد کو خاص کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابوالبشر اور ابوسلمہ العاملی جو کہ حکم بن عبداللہ بن خطاف ہیں نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث متروک ہے۔ ان دونوں نے بیان کیا ہے: زہری نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے اکثم بن جون اپنی قوم کے سوا کے ساتھ مل کر جہاد کر وہ تیرے اخلاق کو اچھا کر دے گا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کرم اور مہربانی کا سلوک کرو۔ اے اکثم بن جون بہترین دوست چار ہیں، ہراول دستے کی بہترین اور اچھی تعداد چالیس ہے، سرایا میں سے بہترین وہ ہے جو چار سو افراد پر مشتمل ہو اور لشکروں میں سے بہترین وہ ہے جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہو اور بارہ ہزار کو قلیل ہرگز نہیں قرار دیا جائے گا'' (3)۔ اور امام مالک

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 64 2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 294

3۔ کنز العمال، فی آداب الجہاد، جلد 4، صفحہ 359-358

رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت ہے وہ ان کے مذہب کے مطابق اس پر دلالت کرتی ہے اور وہ عمری العابد (اس سے مراد عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن خطاب ہے یہ اپنے اہل زمانہ میں بہت زیادہ زاہد اور پرہیز گار تھے) کے لیے آپ کا قول ہے کہ جب انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ کے نزدیک اس کے خلاف جہاد ترک کرنے کی گنجائش ہے جو احکام کو بدل دے، ان میں تغیر پیدا کر دے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تیرے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر ہو تو پھر تیرے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر کوئی میدان جہاد سے بھاگ جائے تو پھر اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بلال بن یسار بن زید سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: مجھے میرے باپ نے میرے دادا سے حدیث بیان کی ہے انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: من قال أستغفر الله الذی لا إله إلا هو الحیّ القیوم وأتوب إلیه غفر الله له وإن کان قد فر من الزحف (1) (جس کسی نے کہا میں اس اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے اور میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا اگرچہ وہ لشکر سے بھاگا ہی ہو) فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں پہچانتے مگر صرف اسی سند سے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ، التحرف کا معنی ہے جهة استواء سے زائل ہو جانا، سیدھی جہت سے ایک طرف ہو جانا، پس جنگی چال کے لیے ایک جانب سے دوسری جانب ہٹ جانے والا شکست خوردہ نہیں ہوتا، اسی طرح پلٹنے والا جب مسلمانوں کی جماعت کی طرف پلٹنے کی نیت کرے تاکہ وہ ان سے مدد طلب کرے اور پھر جنگ کی طرف لوٹ آئے وہ بھی شکست خوردہ نہیں ہوتا۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرایا میں سے ایک سریہ میں تھے انہوں نے بیان کیا: پس لوگ اردگرد گھومنے لگے اور میں بھی ان اردگرد گھومنے والوں میں سے تھا (مقصود راہ فرار کی تلاش تھی) وہ کہتے ہیں: جب ہم ظاہر ہو گئے، ہم نے کہا: ہم کیا کریں گے، حالانکہ ہم لشکر سے فرار ہیں اور ہم غضب کے ساتھ پلٹے بھی ہیں۔ تو ہم نے کہا: ہم مدینہ طیبہ میں داخل ہوں گے اور اسی میں ٹھہرے رہیں گے اور ہم چلے جائیں گے اور ہمیں کوئی بھی نہیں دیکھے گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس ہم داخل ہوئے اور ہم نے کہا: اگر ہم اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کر دیں۔ اگر تو ہمارے لیے توبہ ہوئی تو ٹھہر جائیں گے، وگرنہ ہم واپس چلے جائیں گے (جنگ کی طرف لوٹ جائیں گے) فرماتے ہیں: پس ہم فجر کی نماز سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں بیٹھ گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو ہم آپ کے احترام کے لیے کھڑے ہو گئے اور عرض کی: ہم (اپنے لشکر سے) فرار ہو کر آنے والے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: لا بل انتم العکارون (نہیں بلکہ تم تو زبردست حملہ کرنے والے ہو) وہ فرماتے ہیں: فدنونا فقبلنا یدہ (پس ہم قریب ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک کا بوسہ لیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں مسلمانوں کا گروہ اور جماعت ہوں'' (2)۔ ثعلب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 356۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عکارون هم عطافون ہیں (وہ مہربانی کرنے والے اور مائل ہونے والے ہیں) اور کسی اور نے کہا ہے: وہ آدمی جو جنگ کے وقت پیٹھ پھیر کر آجاتا ہے پھر دوبارہ لوٹ جاتا ہے تو اس کے لیے عکہ اور اعتکہ کہا جاتا ہے۔

جریر نے منصور کے واسطے سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: قادسیہ سے ایک آدمی شکست خوردہ ہوا اور وہ بھاگ کر مدینہ طیبہ میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! میں ہلاک ہو گیا، میں تو لشکر سے بھاگ آیا ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تیری جماعت ہوں۔ اور محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب ابو عبیدہ کے قتل کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا: اگر وہ میری طرف لوٹ کر آجاتا تو میں اس کے لیے ایک جماعت تھا، پس میں ہر مسلمان کی جماعت اور گروہ ہوں (1)۔

ان احادیث کی بنا پر فرار گناہ کبیرہ نہیں، کیونکہ یہاں فئة سے مراد مدینہ ہے امام وقت مسلمانوں کی جماعت ہے جہاں بھی یہ ہوں۔ اور دوسرے قول کی بنا پر یہ گناہ کبیرہ ہے، کیونکہ وہاں فئة سے مراد جنگ کے لیے حاضر لوگوں کی جماعت ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مطابق ہے کہ لشکر سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول تمام مومنین کا احاطہ کرنے کے اعتبار سے ہے، کیونکہ وہ اس زمانے میں اپنے آپ کو دو چند کرنے کے لیے کئی بار ثبات اختیار کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: والتولی یوم الزحف میں اتنا کافی ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔ باء کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ یعنی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور یہ ہمیشہ اس میں رہنے پر دلالت نہیں کرتا، جیسا کہ کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من قال أستغفر اللہ الذی لا إلہ إلا ھو الحیّ القیوم غفر لہ وإن کان قد فر من الزحف۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۷ ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۸

"پس تم نے نہیں قتل کیا انہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا انہیں اور (اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ تو ہوا اور بلاشبہ اللہ کمزور کرنے والا ہے کفار کے مکر و فریب کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ یعنی بدر کے دن تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کیا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب غزوۂ بدر سے واپس لوٹے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنا کارنامہ ذکر کیا:

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 609، سورۃ انفال

میں نے اس طرح قتل کیا، میں نے اس طرح کیا۔ تو اس وجہ سے ان میں تفاخر اور اس جیسی دیگر چیزیں آنے لگیں۔ تو اس حقیقت پر آگاہ کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی (1) کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی مارنے والا ہے اور وہی تمام چیزوں کی قدرت عطا کرنے والا ہے اور یہ کہ بندہ تو صرف اپنے کسب اور اپنے قصد کے ساتھ اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور یہ آیت ان کا رد کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق خود ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری طرف ہانک کر انہیں قتل کیا ہے، یہاں تک کہ اس نے تمہیں ان پر قدرت دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان ملائکہ کے ساتھ قتل کیا ہے جن کے ساتھ اس نے تمہاری مدد کی ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ اسی کی مثل ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اس رمی کے بارے میں علماء کے مابین چار مختلف اقوال ہیں:

(۱) بے شک اس رمی سے مراد غزوۂ حنین کے دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کنکریاں پھینکنا ہے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس دن کوئی باقی نہیں بچا مگر اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنکری لگی۔ اسی طرح ان سے ابن القاسم نے بھی روایت کیا ہے۔

(۲) یہ غزوۂ احد کے دن کا واقعہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کی گردن میں چھوٹا نیزہ مارا تو ابی شکست کھا کر واپس لوٹ گیا۔ تو مشرکین نے اسے کہا: قسم بخدا تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تو اس نے جواب دیا: والله لو بصق علی لقتلنی (قسم بخدا! اگر آپ مجھ پر تھوک دیتے تو یقیناً مجھے قتل کر دیتے) کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا: بل أنا أقتله (بلکہ میں اسے قتل کروں گا) ابی نے مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کی دھمکی دی تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا تھا: بل أنا أقتلك (2) (بلکہ میں تجھے قتل کروں گا) پس وہ دشمن خدا مکہ مکرمہ کی طرف واپس لوٹتے ہوئے مقام سرف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ضرب سے مر گیا۔

موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: جب غزوۂ احد کا دن تھا تو ابی لوہے میں لپٹا ہوا گھوڑے پر بیٹھ کر آیا اور کہنے لگا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نجات پا گئے تو پھر میں نہیں بچ سکوں گا۔ چنانچہ اس نے قتل کے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیا۔ موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا کہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس مومنین میں سے کچھ لوگ اس کے سامنے آ گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ تم اس کا راستہ چھوڑ دو۔ پھر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے اس کے مقابلے میں آئے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کی ہنسلی کی ہڈی کو خود اور زرہ کو ملانے والی جگہ کے درمیان ایک سوراخ سے دیکھ لیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چھوٹے نیزے کے ساتھ اسے مارا تو ابی اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور اسے نیزہ لگنے کی جگہ سے خون نہ نکلا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: پس آپ نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی توڑ دی۔ اور فرمایا: پس اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 511　　2۔ البدایہ والنہایہ، فصل فی قتل رسول اللہ ابی بن خلف، جلد 4، صفحہ 35

(۳) اس سے مراد وہ تیر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قلعہ میں پھینکا تھا پس وہ ہوا میں چلتا رہا یہاں تک کہ ابن ابی الحقیق کو اس کے بستر پر جا لگا۔ یہ قول بھی فاسد ہے، خیبر کی فتح تو احد سے بھی بہت بعد میں ہوئی۔ ابن ابی الحقیق کے قتل کے بارے میں صحیح قول اس کے سوا ہے۔

(۴) بلاشبہ یہ واقعہ بدر کے دن پیش آیا۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے: اور یہی اصح ہے، کیونکہ یہ سورت بدری ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: ''آپ مٹی کی ایک مٹھی لیں'' (1)، پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اسے ان کے چہروں پر پھینکا اور مشرکین میں سے کوئی بھی نہیں بچا مگر یہ کہ وہ مٹی ان کی آنکھوں، نتھنوں اور اس کے منہ میں پڑی، اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے، عنقریب اس کا بیان آئے گا۔

ثعلب نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وَ مَا رَمَیْتَ ان کے دلوں میں گھبراہٹ، خوف اور رعب آپ نے نہیں ڈالا۔ اِذْ رَمَیْتَ جب آپ نے کنکریاں پھینکیں اور وہ پسپا ہو گئے۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اور آپ کو فتح و کامرانی عطا فرمائی۔ عرب کہتے ہیں: رمی اللہ لک یعنی اللہ تعالیٰ نے تیری مدد کی اور تجھے کامیاب کیا اور تیرے لیے ایسا کیا۔ اسے ابو عبیدہ نے کتاب المعاذ میں بیان کیا ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: آپ نے اپنی قوت کے ساتھ نہیں پھینکی جب آپ نے پھینکی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قوت کے ساتھ آپ نے پھینکی ہے۔ وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا یہاں البلاء سے مراد نعمت (واحسان) ہے۔ اور ''لام'' محذوف کے ساتھ تعلق کے لیے ہے، یعنی ولیبلی المؤمنین فعل ذالك (تاکہ اس طرح مومنوں پر احسان فرمائے) ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَیْدِ الْكٰفِرِیْنَ یہ اہل حرمین اور ابو عمرو کی قراءت ہے۔ اور اہل کوفہ کی قراءت موھن کید الکافرین ہے اور تشدید میں مبالغہ کا معنی ہے اور حسن سے مُوْهِنُ كَیْدِ الکافرین اضافت اور تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دے گا یہاں تک کہ وہ تمام کے تمام متفرق ہو جائیں گے اور کمزور ہو جائیں گے اور کید کا معنی مکر ہے۔ اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹﴾

''(اے کفار!) اگر تم فیصلہ کے طلب گار تھے تو (لو) آ گیا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر تم (اب بھی) باز آ جاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے لیے اور اگر تم پھر شرارت کرو گے تو ہم پھر سزا دیں گے اور نہ فائدہ پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی چاہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہو اور یقیناً اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس میں تین اقوال ہیں: (۱) یہ خطاب کفار کے لیے ہوگا، کیونکہ انہوں نے فیصلہ طلب کیا اور کہا: اے اللہ! جو ہم میں سے زیادہ قطع رحمی کرنے والا ہے اور اپنے ساتھی پر زیادہ ظلم کرنے والا ہے تو اس کے خلاف دوسرے کی مدد فرما، یہ حسن اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما وغیرہما نے کہا ہے۔ انہوں نے یہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 611

قول قافلے کی مدد کے لیے نکلتے وقت کہا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ابو جہل نے جنگ کے وقت کہا تھا۔ اور نضر بن حارث نے کہا تھا: اللّٰھمّ إن کان ھذا ھو الحق من عندك فأمطر علینا حجارۃ من السمآء أو ائتنا بعذاب ألیم (اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب) اور یہ بھی مقتولین بدر میں سے تھا۔ اور الاستفتاح کا معنی ہے مدد طلب کرنا، یعنی تحقیق تمہارے پاس فتح اور مدد آ گئی لیکن وہ تمہارے خلاف مسلمانوں کے لیے ہے، یعنی تمہارے پاس وہ فیصلہ آ گیا جس کے ساتھ معاملہ واضح ہو گیا اور تمہارے لیے حق منکشف ہو گیا۔ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا یعنی اگر تم کفر سے (اب بھی) باز آ جاؤ۔ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا اور اگر تم پھر اس قول کی طرف اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قتال کی طرف لوٹو گے۔ نَعُدْ تو ہم بھی دوبارہ مومنوں کی مدد و نصرت فرمائیں گے۔ وَ لَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَیْـًٔا اور تمہاری جماعت تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ وَّ لَوْ كَثُرَتْ اگرچہ تعداد میں وہ بہت زیادہ ہو۔

(۲) یہ خطاب مومنین کو ہے، یعنی اگر تم مدد طلب کرتے ہو تو تحقیق تمہارے پاس مدد و نصرت آ گئی اور اگر تم باز رہے اس قسم کے کاموں سے جو تم نے کیے (مثلاً) اجازت سے قبل مال غنیمت اور قیدیوں کو پکڑنا وغیرہ۔ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا اور اگر تم پھر اس قسم کے کاموں کی طرف لوٹ آئے تو ہم بھی دوبارہ تمہیں زجر و توبیخ کریں گے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ الآیہ (الانفال: 68) (اگر نہ ہوتا حکم الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے)

(۳) کہ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ میں خطاب مومنین کو ہو اور جو اس کے بعد ہے وہ کفار کے لیے ہو، یعنی اگر تم قتال کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر واقعہ بدر کی مثل تمہیں سزا دیں گے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ یہ خطاب کفار کو ہے، کیونکہ وہ جب قافلے کی مدد کے لیے چلے تھے تو وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹ گئے اور یہ کہا: اللّٰھمّ انصر اھدی الطائفتین وأفضل الدینین (اے اللہ! دونوں گروہوں میں سے جو زیادہ ہدایت یافتہ ہے اور دو دینوں میں سے افضل ہے اس کی مدد فرما)۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ مشرکین نکلے تو ان کے پاس کعبہ معظمہ کا غلاف تھا وہ اس کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے رہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس احتمال کی وجہ سے کہ انہوں نے دو حالتوں میں ایسا کیا ہو اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ اس میں استیناف کی بنا پر ان کا ہمزہ مکسور ہے۔ اور یہ ہمزہ مفتوح ہوگا اگر اس کا عطف اس ارشاد پر ہو: وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَیْدِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۸﴾ (الانفال) یا اس کا عطف اَنِّیْ مَعَكُمْ پر ہو۔ اور اس کا معنی ہے: ولأنّ اللہ (کیونکہ اللہ تعالیٰ) اور تقدیر کلام ہے لکثرتھا وأنّ اللہ یعنی جس کا مددگار اور ناصر اللہ تعالیٰ ہو تو کوئی جماعت اس پر غالب نہیں آ سکتی اگرچہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نہ روگردانی کرو اس سے حالانکہ تم سن رہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یہ خطاب تصدیق کرنے والے مومنین کو ہے۔ ان کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنے کے لیے انہیں منفرد خطاب فرمایا اور منافقین کو اس میں شامل نہ کیا۔ الله تعالیٰ نے انہیں از سر نو اپنی اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں اس سے روگردانی کرنے سے منع فرمایا۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: اس آیت سے خطاب صرف منافقین کو ہے۔ اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو! جو صرف اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اگرچہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے لیکن یہ بہت ضعیف اور کمزور ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے اس آیت میں جنہیں خطاب کیا ہے انہیں ایمان کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ اور ایمان تصدیق کا نام ہے اور منافقین کسی شے کے سبب تصدیق سے متصف نہیں۔ اور اس سے زیادہ بعید وہ ہے جس نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے، کیونکہ یہ قول تو آیت سے بالکل اجنبی ہے (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ، التولی کا معنی اعراض کرنا ہے۔ اس میں عَنْهُ فرمایا ہے۔ عنهما نہیں کہا، کیونکہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت الله تعالیٰ کی اطاعت ہی ہے۔ اور یہ الله تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ: 62) (اس میں بھی ہ ضمیر واحد ذکر کی ہے هما تثنیہ ذکر نہیں کی) وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ یہ مبتدا اور خبر حال کے محل میں ہیں۔ اور معنی یہ ہے: حالانکہ تم سن رہے ہو وہ دلائل و براہین جو قرآن کریم میں تم پر تلاوت کیے جاتے ہیں۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۲۱ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۲۲

"اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا: ہم نے سن لیا، حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ بے شک سب جانوروں سے بدتر الله کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا یعنی تم یہود یا منافقین یا مشرکین کی طرح نہ بن جانا۔ اور اس میں مراد کانوں سے سننا ہے۔ وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ یعنی وہ اس میں تدبر نہیں کرتے جو وہ سنتے ہیں اور نہ وہ اس میں غور و فکر کرتے ہیں۔ پس وہ اس کی طرح ہیں جس نے کچھ نہیں سنا اور حق سے اعراض کر لیا۔ الله تعالیٰ نے مومنوں کو ان کی مثل ہونے سے منع فرمایا ہے۔ پس آیت اس پر دلیل ہے کہ مومن کا قول: سمعتُ و أطعتُ (میں نے سنا اور پیروی کی) اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے جب تک امتثال فعل کی صورت میں اس پر اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ پس جب اس نے اوامر میں کوتاہی اور سستی برتی تو پھر وہ اس پر عمل پیرا نہ ہوا۔ اور اس نے نواہی پر اعتماد کیا اور ان کا ارتکاب کیا تو پھر اس کے نزدیک کون سی سمع ہے اور کون سی طاعت ہے، بلاشبہ اس وقت تو وہ اس منافق کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے اور الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ سے مراد یہی ہے، یعنی یہ منافقین کے بارے ہے یا یہود کے بارے یا مشرکین کے بارے ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پھر الله تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بے شک کفار زمین پر چلنے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 513

والوں میں سے سب سے زیادہ شریر ہیں۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ فرمایا: یہ بنی عبدالدار کے لوگ ہیں (1)۔ اور شرا اصل میں اشر تھا کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ وحذف کر دیا گیا اسی طرح خیر اصل میں اخیر تھا۔

وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

''اور اگر جانتا اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی تو انہیں ضرور سنا دیتا اور اگر سنا دیتا انہیں (قبول حق کی استعداد کے بغیر) تو وہ پیٹھ پھیر دیتے روگردانی کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ کہا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی جانتا تو انہیں ضرور دلائل و براہین اس طرح سنا دیتا کہ وہ انہیں سمجھ سکتے، لیکن ان کی شقاوت اور بدبختی پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ اگر وہ انہیں سمجھا دیتا تو وہ ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: تو وہ یقیناً انہیں ان مردوں کا کلام سنوا دیتا جنہیں زندہ کرنے کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا، کیونکہ انہوں نے قصی بن کلاب وغیرہ کو زندہ کرنے کا، مطالبہ کیا تھا تاکہ وہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دیں۔

زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر اس کا جواب سنا دیا جس کے بارے انہوں نے سوال کیا۔ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں اس امر کی طرف جو زندہ کرتا ہے تمہیں اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان بے شک اسی کی طرف تم اٹھائے جاؤ گے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ بلا اختلاف یہ خطاب تصدیق کرنے والے مومنین کو ہے۔ اور استجابۃ کا معنی الاجابۃ (جواب دینا) ہے۔ اور يُحْيِيْكُمْ اصل میں يُحْيِيُكم تھا، پھر یا پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے یا سے حذف کر دیا گیا اور ادغام جائز نہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: استجیبوا کا معنی أجیبوا (تم جواب دو) ہے لیکن عرف کلام یہ ہے کہ استجاب لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور اجاب بغیر لام کے متعدی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰقَوْمَنَاۤ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ (الاحقاف: 31) (اے ہماری قوم! قبول کر لو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو) اور کبھی استجاب بھی بغیر لام کے متعدی ہوتا ہے۔ اور اس پر شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

1۔ تفسیر ابن عباس، سورۃ انفال، جلد 1، صفحہ 440

وداعٍ دعا یا مَنْ یُجیب إلی النَّدَی　　فلم یَستجِبْه عند ذاك مُجِیبُ(1)

آپ کہتے ہیں: اجابه و أجاب عن سواله (اس نے اسے جواب دیا اور اس نے اس کے سوال کا جواب دیا) اس میں مصدر الاجابة ہے، اور اسم الجابة ہے، جیسا کہ الطاقة اور الطاعة ہے۔ تو کہتا ہے: أساء سَمْعًا فأساء اجابة (اس نے غلط سنا اور غلط جواب دیا) اس حرف کے بارے اسی طرح کلام کی جاتی ہے۔ اور المجاوبة و التجاوب کا معنی ہے باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرنا، تبادلہ خیال کرنا۔ اور تو کہتا ہے: إنه لحَسن الجِیبة اس میں الجیبه (جیم کے کسرہ کے ساتھ) بمعنی الجواب ہے یعنی (بے شک اس نے خوبصورت جواب دیا)

لِمَا یُحْیِیْكُمْ یہ استجیبوا کے متعلق ہے۔ اس کا معنی ہے: إستجیبوا لما یحییکم إذا دعاکم (تم جواب دو اس امر کا جو تمہیں زندہ کرتا ہے جب وہ رسول تمہیں بلائے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی إلی ہے۔ أي إلی ما یحییکم یعنی جب وہ تمہیں ایسے امر کی طرف بلائے جو تمہارے دین کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں (نور) علم عطا فرماتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی تمہیں بلاتا ہے ایسے امر کی طرف جس کے ساتھ تمہارے دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ پس تم نے اسے واحد اور یکتا تسلیم کر لیا، یہ احیاء مجازی ہے، کیونکہ یہ کفر اور جہالت کی موت سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت مجاہد اور جمہور نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم طاعت کو اور اوامر و نواہی میں سے جتنے احکام کو قرآن کریم متضمن ہے تمام کو قبول کرو (2)، اسی میں ابدی حیات ہے اور یہی نعمت سرمدیہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: لِمَا یُحْیِیْكُمْ سے مراد جہاد ہے، کیونکہ ظاہر میں یہی زندگی کا سبب ہے کیونکہ دشمن کے ساتھ جب نہ لڑا جائے تو پھر وہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اور اس کے حملے میں موت ہے اور جہاد میں مرنا ابدی حیات ہے، جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ (آل عمران: 169) (اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں الله کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں) اور صحیح قول یہی ہے کہ یہ آیت عام ہے جیسا کہ جمہور نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا (لیکن) میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں حاضر خدمت ہوا اور عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا الله عزوجل نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (3) اور حدیث ذکر کی''۔ یہ سورۃ فاتحہ میں پہلے گزر چکی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ فعل فرض یا قول فرض جب حالت نماز میں کیا جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی، کیونکہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے کا حکم ارشاد فرمایا اگرچہ وہ نماز میں ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی حجت اور دلیل ہے کہ اگر آدمی نماز پڑھ رہا ہو پھر اس نے کسی بچے کو دیکھا کہ وہ کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے پس اس نے اس کے بارے شور مچایا اور اس کی طرف گیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 514　2۔ ایضاً　3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ انفال، جلد 2، صفحہ 699

اور اسے اس پر ڈانٹ پلائی تو (اتنے عمل سے) نماز میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ کہا گیا ہے: یہ اس بارے میں نص ہونے کا تقاضا کرتی ہے کہ کفر اور ایمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پس وہ کافر آدمی اور اس ایمان کے درمیان جس کے بارے اس نے حکم دیا ہے حائل ہو جاتا ہے، پس بندہ اسے حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے اس پر قدرت نہ دے بلکہ اس نے اسے اس (ایمان) کی ضد پر قدرت دے رکھی ہے اور وہ کفر ہے، اور اسی طرح مومن ہے کہ اللہ کریم اس کے درمیان اور کفر کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ پس اس نص سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے جملہ اعمال کا خالق ہے چاہے وہ اعمال خیر ہوں یا شر ہوں۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: لا و مقلب القلوب(1) (قسم ہے اس کی جو دلوں کو پھیرنے والا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا فعل اس کے بارے میں عین عدل ہے جسے اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا، کیونکہ اس نے انہیں اس حق سے روکا نہیں جو اس پر واجب ہو کہ صفت عدل زائل ہو جائے، بلکہ اس نے تو انہیں اس فضل اور مہربانی سے روکا ہے جو اس کے پاس تھی چاہتا تو ان پر فرما سکتا تھا مگر وہ ان کے لیے واجب نہ تھی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے پس وہ اس کی اجازت کے بغیر ایمان لانے کی استطاعت نہیں رکھتا اور وہ کفر بھی نہیں کر سکتا مگر اس کی مشیت کے ساتھ۔ اور قلب (دل) غور و فکر کا محل ہے۔ اس کا بیان پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، جب وہ چاہتا ہے بندے اور اس کے درمیان کسی بیماری یا آفت کے سبب حائل ہو جاتا ہے تاکہ وہ سمجھ ہی نہ سکے۔ یعنی تم قبولیت کی طرف جلدی کر لو اس سے پہلے کہ تم عقل زائل ہونے کے سبب اس پر قادر ہی نہ رہو۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ آدمی اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آدمی جو کر رہا ہوتا ہے اسے سمجھ نہیں سکتا اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: 37) اس میں قلب سے مراد عقل ہے۔

(بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل (بینا) رکھتا ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آدمی اور اس کے عمل کے درمیان موت کے ساتھ حائل ہو جاتا ہے، لہٰذا جو عمل آدمی سے فوت ہو چکا ہوتا ہے اس کا تدارک اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غزوۂ بدر کے دن مسلمان دشمن کی کثرت کے سبب خوفزدہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمایا کہ وہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اس طرح کہ وہ انہیں خوف کے بعد امن سے بدل دے اور ان کے دشمن کو امن سے خوف میں بدل دے۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ امور کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلتا رہتا ہے۔ اور یہی جامع معنی ہے۔ اور علامہ طبری کی پسند یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہے کہ وہ بندوں کے دلوں کا مالک ہے اور یہ کہ وہ جب چاہتا ہے ان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کسی شے کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ معطوف ہے۔ فراء نے کہا ہے: اگر جملہ مستانفہ ہوتا تو پھر ان کو کسرہ دیا جاتا۔ لہٰذا وَ اَنَّهٗۤ ہی درست اور صحیح ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 616

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿25﴾

''اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر اور گناہ کو جڑ نہ پکڑنے دیں کہ ان تمام کو عذاب عام ہو جائے (1)۔ (اور بعض لوگوں کے گناہ کے سبب وہ سارے اس عذاب کی لپیٹ میں آجائیں) اسی طرح حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی تاویل کی ہے کیونکہ انہوں نے جمل کے دن کہا اور وہ 36ھ کا زمانہ تھا: آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اس آیت سے ہم ہی مراد لیے گئے ہیں اور میں اس کو اسی کے بارے گمان کر رہا ہوں جسے اس وقت مخاطب بنایا گیا۔ اور اسی طرح حضرت حسن بصری (2) اور سدی وغیرہما رحمۃ اللہ علیہما نے بھی تاویل کی ہے۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت صرف اہل بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پس انہیں جمل کے دن فتنہ آپہنچا اور وہ آپس میں لڑ پڑے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر اور گناہ کو پختہ نہ ہونے دیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب عام میں مبتلا کر دے۔

اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اصحاب میں سے لوگوں کے درمیان فتنہ برپا ہوگا میرے ساتھ انہیں شرف صحبت ہونے کے سبب اللہ کریم ان کو اس میں معاف فرما دے گا اور ان کے بعد آنے والے لوگوں میں جو اس میں ان کی پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ اس کے سبب انہیں جہنم میں داخل کرے گا'' (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وہ تاویلات ہیں جنہیں احادیث صحیحہ سے تقویت حاصل ہوتی ہے پس صحیح مسلم میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ ہم میں صالحین ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں جب خبث (نجاست، گناہ وغیرہ) زیادہ ہو جائے گا'' (4)۔ اور صحیح ترمذی میں ہے۔ ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے ان تمام کو سزا دے'' (5)۔ یہ احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

اور صحیح بخاری اور ترمذی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم رہنے والا اور ان میں واقع ہونے والا اس قوم کی مثل ہیں جو ایک جہاز پر سوار ہوں، ان میں سے بعض اس کی اوپر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 515　2۔ ایضاً　3۔ صحیح مسلم کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 388
4۔ ایضاً　5۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 39

والی منزل میں ہوں اور بعض نیچے والی منزل میں، پس وہ جو نیچے والے حصے میں ہیں جب انہیں پانی کی طلب ہو تو انہیں اوپر والوں کی طرف جانا پڑتا ہو چنانچہ انہوں نے یہ کہا: اگر ہم اپنے حصے میں سوراخ کر لیں اور ہم اوپر والوں کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ پس اگر اوپر والے انہیں چھوڑ دیں تو جو انہوں نے ارادہ کیا ہے وہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تو وہ بھی نجات پا گئے اور ان کے ساتھ سبھی نجات پا جائیں گے'' (1)۔ پس اس حدیث میں خاص لوگوں کے گناہوں کے سبب تمام لوگوں کو عذاب دینے کا تذکرہ ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس عذاب اور سزا کا استحقاق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کرنے کے سبب ثابت ہوا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس فتنہ، جب اس پر عمل کیا جائے تو تمام ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا گناہوں کے عام ہونے، منکر کے پھیلنے اور تبدیلی نہ آنے کے سبب ہوتا ہے اور جب حالات میں تبدیلی نہ آئے تو مومنوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اس کا انکار کرتے ہوئے اس شہر کو چھوڑ دیں اور وہاں سے نکل جائیں۔ اور اسی طرح ان لوگوں کے لیے حکم تھا جو ہم سے پہلے امتوں میں سے تھے، جیسا کہ سبت کے قصہ میں ہے جس وقت انہوں نے نافرمانوں کو چھوڑا اور کہا: ہم تمہارے ساتھ سکونت اختیار نہیں کریں گے۔ اور اسی کے مطابق اسلاف رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اس زمین کو چھوڑ دیا جائے گا جس میں بدکاری علانیہ ہوتی ہو اور اس میں ٹھکانا نہیں بنایا جائے گا۔ اور انہوں نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ربا کا اعلان کیا اور سونے کے برتن کی بیع ایسے برتن کے ساتھ جائز قرار دی جو وزن میں اس سے زیادہ ہو تو آپ (حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ) اس زمین سے نکل گئے، اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو وہ عذاب اس میں موجود ہر آدمی کو پہنچتا ہے پھر انہیں ان کے اعمال پر اٹھایا جائے گا'' (2)۔ پس یہ روایت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس میں عام ہلاک کرنے والا عذاب مومنین کے لیے پاکیزگی کا سبب ہوتا ہے اور وہی فاسقوں کے لیے سزا اور عذاب ہوتا ہے۔ اور امام مسلم نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت نیند میں اضطراب کا اظہار کیا (یعنی اپنے اعضاء جسم کو حرکت دی جیسے کوئی کسی شے کو پکڑتا ہے) تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے حالت نیند میں ایسا عمل کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تعجب اور حیرانی ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ قریش کے ایک آدمی کو پکڑنے کے لیے اس بیت (مراد بیت اللہ شریف) کا ارادہ رکھتے تھے حالانکہ وہ آدمی بیت اللہ شریف میں پناہ لیے ہوئے تھا یہاں تک کہ جب وہ مقام بیداء پر پہنچے تو وہ دھنسا دیے گئے'' (3)۔ تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک راستہ تو بہت سے لوگوں کو جامع ہوتا ہے (یعنی راستہ تو ہر ایک کو اپنے اوپر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 40۔ ایضاً، حدیث نمبر 2099، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1053 3۔ ایضاً

چلنے کی اجازت دیتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں، ان میں کچھ عمداً قصد کرنے والے تھے، کچھ مجبور اور مکرہ تھے اور کچھ مسافر تھے وہ سب ایک ہی ہلاکت خیز جھٹکے کے ساتھ ہلاک ہو گئے ہیں اور مختلف مقامات سے نکلیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا"(1)۔

اور اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام:164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر) (ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے) لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ:286) (اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا) یہ ارشادات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسرے کے گناہ کے بدلے نہیں پکڑا جائے گا، بلاشبہ سزا گناہ کرنے والے کے ساتھ ہی متعلق ہوتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں میں جب گناہ ظاہر ہو جائے تو ہر دیکھنے والے پر فرض ہے کہ وہ اسے تبدیل کر دے (یعنی اسے روکنے کی کوشش کرے) اور جب وہ اس پر خاموش رہے تو تمام کے تمام سے گنہگار ہوں گے۔ (فرق صرف اتنا ہے) کچھ اس کا ارتکاب کر رہے ہیں (اس لیے وہ گنہگار ہیں) اور کچھ اس پر راضی ہونے کی وجہ سے گنہگار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم اور اپنی حکمت میں (گناہ پر) راضی ہونے والے کو (گناہ) کرنے والے کے قائم مقام قرار دیا ہے، پس سزا میں راضی بھی عامل کے ساتھ شامل ہوگا۔ یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہی ان احادیث کا مضمون ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور آیت کا مقصود یہ ہے کہ تم بچو ایسے فتنے سے جو ظالم سے تجاوز کر کے ہر نیک و بد تک پہنچ جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ نحویوں نے لَا تُصِيْبَنَّ میں نون کے داخل ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: انزل عن الدابة لا تطرحنك (تو سواری سے اتر آ وہ تجھے نہیں گرائے گی) تو یہ لفظ نہی کے ساتھ جواب امر ہے، یعنی معنی یہ ہے: ان تنزل عنها لا تطرحنك (اگر تو اس سے اتر آیا تو وہ تجھے نہیں گرائے گی) اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ (النمل:18) یعنی ان تدخلوا لا يحطمنكم (گھس جاؤ اپنی بلوں میں کہیں کچل کر نہ رکھ دیں تمہیں) تو اس میں نون اس لیے داخل کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جزا کے معنی پائے جا رہے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: چونکہ یہ کلام قسم کے محل میں ہے اور نون داخل نہیں ہوتا مگر فعل نہی پر یا جواب قسم پر۔ اور ابو العباس المبرد نے کہا ہے: بے شک یہ امر کے بعد نہی ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ ظالموں کے لیے نہی ہے یعنی تم ظلم کے قریب نہ جاؤ۔ اور سیبویہ نے بطور حکایت بیان کیا ہے: لا اريتك ههنا یعنی تو یہاں نہ ہو، کیونکہ جو یہاں ہوگا تو میں اسے دیکھوں گا۔ اور علامہ جرجانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا خاصة (تم بچو اس فتنہ سے جو صرف ان لوگوں تک نہ پہنچے گا جنہوں نے ظلم کیا) پس قول باری تعالیٰ لَا تُصِيْبَنَّ نکرہ کے وصف کے محل میں نہی ہے۔ اور اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کو فتنہ پہنچنے کی خبر ہے جنہوں نے ظلم کیا۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 847

حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے لتصیبن کو بغیر الف کے پڑھا ہے۔ مہدوی نے بیان کیا ہے: جنہوں نے لتصیبن پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ یہ لا تصیبن سے مقصود ہو اور اس میں الف کو اسی طرح حذف کر دیا گیا ہو جیسے ما میں حذف کیا گیا ہے اور یہ مماخت لا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے أمَ واللہ لأ فعلن اور اس کے مشابہ جملوں میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جمہور کی قراءت کی مخالفت ہو، پس معنی یہ ہوگا کہ یہ فتنہ صرف ظالم کو پہنچے گا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے ملک میں (ہر وقت) ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں اچک نہ لے جائیں تمہیں لوگ، پھر اللہ نے پناہ دی تمہیں اور طاقت بخشی تمہیں اپنی نصرت سے اور عطا کیں تمہیں پاکیزہ چیزیں تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ کلبی نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یعنی یہ ہجرت سے پہلے اور ابتدائے اسلام میں ان کی حالت کا بیان ہے۔ مُّسْتَضْعَفُوْنَ یہ صفت ہے فِي الْاَرْضِ مراد سرزمین مکہ ہے۔ تَخَافُوْنَ یہ بھی نعت (صفت) ہے۔ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ یہ محل نصب میں ہے اور الخطف کا معنی ہے تیزی کے ساتھ کسی چیز کو لے لینا (اچک لینا) النَّاسُ یہ فاعل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ حضرت قتادہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے: یہ اہل فارس اور روم ہیں (1)۔ فَاٰوٰىكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: (پس اللہ نے تمہیں پناہ دی) انصار کے پاس۔ سدی نے کہا ہے: پس اس نے تمہیں مدینہ طیبہ میں پناہ دی۔ دونوں کا معنی ایک ہے اوی الیہ مد کے ساتھ ہو تو معنی ہے ضم الیہ۔ اس نے تجھے اس کے ساتھ ملا دیا۔ اور أوی إلیہ (قصر کے ساتھ ہو) تو معنی ہے انضم الیہ (وہ اس کے ساتھ مل گیا) وَاَيَّدَكُمْ اور اس نے تمہیں قوت اور طاقت بخشی۔ بِنَصْرِهٖ اپنی مدد کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے تمہیں انصار کے ساتھ قوت و طاقت عطا کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس نے تمہیں بدر کے دن ملائکہ کے ساتھ قوت بخشی۔

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور اس نے تمہیں غنائم عطا کیں۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اے ایمان والو! نہ خیانت کرو اللہ اور رسول سے اور نہ خیانت کرو اپنی امانتوں میں اس حال میں کہ تم جانتے ہو''۔

روایت ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت انہوں نے بنی قریظہ کی طرف ذبح کا اشارہ کیا۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! میرے قدم نہیں پھسلے یہاں تک کہ مجھے علم ہو گیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کی ہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ اور کہا: قسم بخدا! نہ میں کھانا کھاؤں گا اور نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 619

پانی پیوں گا یہاں تک کہ میں مر جاؤں یا پھر اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے (1)۔ یہ خبر مشہور ہے۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب بنی قریظہ کا معاملہ پیش آیا تو حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے ساتھ بھیجا جو آپ ﷺ کے پاس موجود تھے۔ پس جب آپ ان کے پاس جا کر رکے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بارے نازیبا کلمات کہے اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ابلق (چتکبرہ گھوڑا) گھوڑے پر تشریف لائے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: گویا میں رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھ رہی ہوں کہ آپ حضرت جبریل امین علیہ السلام کے چہرے سے غبار صاف کر رہے ہیں۔ تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کیا یہ دحیہ (رضی اللہ عنہ) ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں''۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کون سی شے آپ کو بنی قریظہ سے روک رہی ہے کہ آپ ان کی طرف آئیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے لیے ان کے قلعے میں پہنچنا کیسے ممکن ہے''؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: میں اپنا یہ گھوڑا ان پر داخل کروں گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ ننگے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا، عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ بہتر ہوتا کہ آپ تشریف نہ لاتے، کیونکہ وہ آپ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں بے شک عنقریب سلامتی ہو جائے گی''۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو''۔ تو انہوں نے کہا: اے ابا القاسم! آپ تو فحش کہنے والے نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: ہم محمد (ﷺ) کے حکم پر (نیچے) نہیں اتریں گے، البتہ ہم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اتر آئیں گے۔ پس وہ اترے۔ اور ان کے بارے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولادوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسی (فیصلے) کے ساتھ فرشتہ سحری کے وقت میرے پاس آیا (2)، پس ان کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ یہ آیت حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی کہ انہوں نے بنی قریظہ کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب انہوں نے کہا: ہم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اتریں گے کہ تم اس طرح نہ کرو، کیونکہ یہ ذبح ہے اور ساتھ ہی اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ حضور نبی مکرم ﷺ سے کوئی بات سنتے تھے تو وہ اسے مشرکین تک پہنچا دیتے تھے اور اسے افشا کر دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مال غنیمت میں خیانت کرنا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، کیونکہ وہی وہ ہے جس نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، کیونکہ آپ ﷺ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا کرنے والے اور اسے قائم اور پختہ کرنے والے ہیں۔ اور الخیانۃ سے مراد غدر (دھوکا) اور کسی شی کو چھپانا ہے۔ اور اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: یَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْیُنِ (غافر:19) (وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو) اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کرتے ہیں: ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کیونکہ یہ بہت برا ساتھی ہے اور خیانت سے کیونکہ یہ انتہائی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 619
2۔ تفسیر درمنثور، جلد 3، صفحہ 323

برا باطن ہے"(1)۔ نسائی نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کان رسول اللہ ﷺ یقول پھر آگے اسے ہی بیان کیا ہے۔

وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ یہ محل جزم میں ہے، کیونکہ اس کا عطف ماقبل پر ہے۔ اور کبھی جواب کی بنا پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: لا تاکلِ السمك و تشرب اللبن (اس میں تشرب، لاتاکل کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہو سکتا ہے) اور امانات سے مراد وہ اعمال ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو امین بنایا ہے۔ اور انہیں امانت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ انہیں حق کے روکنے سے محفوظ کر دیا جاتا ہے، یہ الأمن سے ماخوذ ہے۔ اور سورۃ النساء میں امانات اور ودیعتوں کی ادائیگی کے بارے میں اور دیگر چیزوں کے بارے میں بحث گزر چکی ہے وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی خیانت میں جو قبح اور عار (ندامت) ہے اسے تم جانتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم جانتے ہو کہ یہ امانت ہے۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾

"اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (سب) آزمائش ہے اور بے شک اللہ، اسی کے پاس اجر عظیم ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے اموال و اولاد بنی قریظہ میں تھے(2) اور یہی وہ شے تھی جس نے آپ کو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے پر ابھارا تھا۔ اور یہ اشارہ اسی طرف ہے۔ فتنة کا معنی ہے آزمائش، امتحان (اللہ تعالیٰ نے) انہیں اس کے ساتھ امتحان میں ڈال دیا۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ پس تم اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دو (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس اجر عظیم ہے)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

"اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت اور ڈھانپ دے گا تم سے تمہارے گناہ اور بخش دے گا تمہیں اور اللہ بڑے فضل (وکرم) والا ہے"۔

تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے بارے جانتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اسے لفظ شرط کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیونکہ اس نے بندوں کو ایسے انداز میں خطاب کیا ہے جیسے وہ آپس میں ایک دوسرے کو خطاب کرتے ہیں۔ اور جب بندہ اپنے رب سے ڈرنے لگے اور یہ اس کے اوامر کو بجالانے اور اس کی نواہی سے اجتناب کرنے سے، محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے شبہات کو ترک کرنے، اور اپنے دل کو خاص نیت کے ساتھ بھرنے سے، اور اپنے جوارح کو اعمال صالحہ میں مشغول رکھنے اور اعمال میں غیر اللہ کی رعایت کے سبب شرک خفی اور ظاہر کی آمیزش سے محفوظ رہنے، اور مال سے باز رہنے کے سبب دنیا کی طرف میلان سے بچنے سے حاصل ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 218۔ ایضاً، حدیث نمبر 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3344، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 620

تمیز اور فرق قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہر اس خیر اور نیکی میں رکھ دیا ہے جسے ممکن بنانے کا وہ ارادہ رکھتا ہے۔ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے قول باری تعالیٰ: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے مخرج (نکلنے کی جگہ) بنا دیا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (الطلاق)

ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بالکل اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس سے قبل اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اور شاعر کا قول ہے:

مَالَكَ مِن طُولِ الأَسَى فُرقَانُ بعد قَطِينٍ رَحلوا و بَانُوا(1)

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

وكيف أُرَجِّي الخلد والموت طالبي وما لي من كأس المنية فرقانُ

ابن اسحاق نے کہا ہے: فُرْقَانًا اس کا معنی ہے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا۔ ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی نجات ہے۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی فتح و نصرت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے آخرت میں فرقان بنا دیا ہے، پس یہ تمہیں جنت میں داخل کر دے گا اور کفار کو جہنم میں داخل کرے گا۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلا وطن کر دیں۔ وہ بھی خفیہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے''۔

یہ اس خفیہ تدبیر اور مکر کے بارے خبر دی جا رہی ہے جس پر مشرکین حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دار الندوہ میں جمع ہوئے تھے۔ پس انہوں نے مشاورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے پر اجماع کیا نتیجۃً انہوں نے آپ کی دربانی کی اور طویل رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے دروازے پر آپ کی تاک میں بیٹھے رہے کہ جونہی آپ باہر نکلیں تو وہ آپ کو شہید کر دیں۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ وہ ان پر اپنا اثر ڈال دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو ڈھانک دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ ان پر نیند چھائی ہوئی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سروں پر مٹی ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔ جب انہوں نے صبح کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس باہر تشریف لائے اور انہیں بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے گئے ہیں اور نجات پا گئے ہیں۔ سیرت وغیرہ میں یہ خبر مشہور ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 518

اور لِيُثْبِتُوْكَ کا معنی ہے تا کہ وہ آپ کو قید کر دیں۔ کہا جاتا ہے: أثبته یہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے قید کر لے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیثبتوك وثاقاً (تا کہ وہ آپ کو بیڑیاں پہنا لیں) آپ سے بھی اور عبداللہ بن کثیر سے یہ منقول ہے: لیُسجنوك (تا کہ وہ آپ کو جیل میں ڈال دیں) اور ابان بن تغلب اور ابو حاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تا کہ وہ آپ کو زخموں اور شدید مارنے کے سبب نڈھال اور کمزور کر دیں، جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلتُ ویحکما ما فی صحیفتکم	قالوا الحلیفة أمسی مُثبتًا وجعا

اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ یہ کلام معطوف ہے۔ وَيَمْكُرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اور المکر کا معنی ہے کسی معاملے میں خفیہ تدبیر کرنا۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکر کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر عذاب کے ساتھ ایسی جزا دے گا جس کے بارے انہیں شعور تک نہ ہوگا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتے ہیں (اجی رہنے دو) سن لیا ہم نے اگر ہم چاہیں تو کہہ لیں ایسی آیتیں نہیں ہیں یہ مگر کہانیاں اگلے لوگوں کی''۔

یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ تجارت کی غرض سے حیرہ کی طرف نکلا اور اس نے کلیلہ و دمنہ، کسریٰ اور قیصر کی کہانیاں خرید لیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماضی کی اخبار بیان فرماتے تو نضر کہتا: اگر آپ چاہیں تو میں بھی اس کی مثل بیان کروں۔ اور یہ انتہائی بے شرم اور جھوٹا تھا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: بے شک وہ اس وہم میں پڑ گئے کہ وہ اس کی مثل لا سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کو وہم ہوا تھا، پھر انہوں نے اس کا قصد کیا تو اس سے عاجز آ گئے اور از روئے عناد کہنے لگے: یہ تو فقط اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب انہوں نے کہا: اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب''۔

قراء نے الْحَقَّ کو كَانَ کی خبر ہونے کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور درمیان میں هُوَ ضمیر فصل ہے۔ اور هُوَ الْحَقُّ مرفوع بھی جائز ہے۔ مِنْ عِنْدِكَ (تیری طرف سے) زجاج نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس کے ساتھ پڑھا ہو۔ اور اس کے جائز ہونے میں علماء نحو کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، لیکن قرأت سنت ہے اور اس میں صرف قرات مرضیہ کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا۔ اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ یہ قول کس نے کیا ہے؟ پس حضرت مجاہد اور ابن جبیر نے کہا ہے: یہ کہنے

والا نضر بن حارث تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا: یہ کہنے والا ابو جہل ہے (1)۔ اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ قول اس شبہ کی بنا پر کیا ہو جو ان کے سینوں میں موجود تھا یا عناد کی وجہ سے کہا اور لوگوں کو یہ وہم دلانے کے لیے کہا کہ وہ صاحب بصیرت ہیں، پھر بدر کے دن ان پر وہ عذاب اترا جس کی انہوں نے دعا مانگی۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہودیوں میں سے ایک آدمی ملا تو اس یہودی نے کہا: آپ کن میں سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں قریش میں سے ہوں۔ تو اس نے پوچھا: آپ اس قوم میں سے ہیں جنہوں نے یہ کہا تھا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الآیہ تو انہیں کیا تھا کہ وہ یہ کہہ دیتے: ان كان هذا هو الحق من عندك فاهدنا له! (اگر یہ تیری جانب سے حق ہے تو ہمیں ان کی طرف ہدایت عطا فرما) بلاشبہ وہ جاہل قوم تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے اسرائیلی! تو اس قوم میں سے ہے جن کے پاؤں اس سمندر کی تری سے خشک نہیں ہوئے جس میں فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو نجات عطا فرمائی گئی۔ یہاں تک کہ وہ کہنے لگے: اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف: 138) (ہمارے لیے بھی ایسا الٰہ بنا دو جیسے ان کے الٰہ ہیں) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (الاعراف) (بلاشبہ تم جاہل قوم ہو) تو یہودی نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

فَاَمْطِرْ (عذاب کی بارش برسا) عذاب کے لیے امطر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور رحمت کے لیے مطر بولا جاتا ہے۔ یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

''اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ تشریف فرما ہیں ان میں اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں''۔

جب ابو جہل نے کہا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ، الآیہ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اہل بستی کو عذاب نہیں دیا یہاں تک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اس سے نکل گئے اور وہاں پہنچ گئے جہاں کا انہیں حکم دیا گیا (2)۔ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: وہ طواف میں کہا کرتے تھے: غفرانك اور استغفار اگرچہ فاجروں سے واقع ہو اس کے ساتھ کئی قسم کے شر اور تکالیف دور کر دی جاتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ استغفار ان مسلمانوں کی طرف راجع ہے جو ان کے درمیان تھے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دینے والا نہیں ہے حالانکہ ان میں وہ مسلمان بھی ہیں جو مغفرت طلب کر رہے ہیں، پس جب وہ نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یوم بدر اور دوسرے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں استغفار سے مراد اسلام ہے یعنی وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ، ای یسلمون حالانکہ وہ اسلام قبول کر رہے ہوں۔ یہ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ هُمْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ انفال، جلد 2، صفحہ 669　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 625

یَسْتَغْفِرُوْنَ اور وہ استغفار کر رہے ہوں ان کی صلبوں میں اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔

یہ بھی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَسْتَغْفِرُوْنَ کا معنی ہے لواستغفروا یعنی اگر وہ استغفار کریں تو وہ عذاب نہ دیئے جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں استغفار کرنے کی دعوت دی۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے یہی کہا ہے۔ مدائنی نے بعض علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں ایک آدمی تھا وہ اپنی ذات پر بہت فضول خرچی کرتا تھا اور وہ گناہ سے نہ بچتا تھا۔ پس جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو اس نے اونی لباس پہنا اور اپنے جملہ اعمال سے رجوع کر لیا اور دین اور طاعت و عبادت کو ظاہر کر دیا۔ تو اسے کہا گیا: اگر تو یہی عمل اس وقت کرتا جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو یقیناً آپ تجھ سے خوش ہوتے۔ تو اس نے جواباً کہا: میرے لیے دو امانیں تھیں پس ایک گزر گئی اور دوسری باقی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِیْهِمْ یہ ایک امان ہے اور دوسری وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ہے۔

وَ مَا لَهُمْ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِیَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''(مکہ سے آپ کی ہجرت کے بعد) اب کیا وجہ ہے ان کے لیے نہ عذاب دے انہیں اللہ حالانکہ وہ روکتے ہیں (مسلمانوں کو) مسجد حرام سے اور نہیں ہیں وہ اس کے متولی، اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا لَهُمْ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ اس کا معنی ہے: کون سی شے ان کے لیے اس سے مانع ہے کہ وہ عذاب دیئے جائیں، یعنی بلاشبہ وہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں ان برائیوں اور دیگر اسباب کے سبب جن کا انہوں نے ارتکاب کیا ہے، لیکن شے کے لیے ایک مقررہ وقت ہے، پس اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے (مکہ مکرمہ) سے نکلنے کے بعد انہیں تلوار کے ساتھ عذاب دیا۔ اور اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ (المعارج) اور اخفش نے کہا ہے: بے شک ان زائدہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اگر ایسے ہوتا جیسے انہوں نے کہا تو یُعَذِّبَهُمْ مرفوع ہوتا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی بلاشبہ متقین اس کے دوست ہیں۔

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِیَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجْعَلَ الْخَبِیْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ

فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾

''اور نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس بجز سیٹی اور تالی بجانے کے، سو چکھو اب عذاب بوجہ اس کے کہ تم کفر کیا کرتے تھے۔ بے شک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تا کہ روکیں (لوگوں کو) الله کی راہ سے اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے پھر ہو جائے گا یہ خرچ کرنا ان کے لیے باعث حسرت و افسوس پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔ تا کہ الگ کر دے الله تعالیٰ ناپاک کو پاک سے اور رکھ دے سب ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھر اکٹھا کر دے ان سب کو پھر ڈال دے اس مجموعہ کو جہنم میں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: قریش ننگے بدن بیت الله شریف کا طواف کرتے تھے، وہ تالیاں بجاتے تھے اور سیٹیاں مارتے تھے(1) اور یہ ان کے گمان میں عبادت تھی۔ مکاء کا معنی سیٹی مارنا ہے اور التصدیہ کا معنی تالی بجانا ہے۔ یہ حضرت مجاہد، سدی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اسی کے مطابق عنترہ کا قول بھی ہے:

وحَليلِ غانيةٍ تركت مُجَدَّلًا　　تَمْكُو فريصتُه كشِدْقِ الأعْلمِ(2)

یعنی اس میں تمکو بمعنی تصوت (آواز نکالنا، سیٹی مارنا کے) ہے۔ اور اسی سے مکتِ استُ الدابۃ یہ تب کہا جاتا ہے جب جانور ہوا خارج کرے۔ سدی نے کہا ہے: المکاء بمعنی الصفیر سیٹی مارنا ہے۔ یہ جب حجاز کے طائر ابیض (سفید پرندہ) کی آواز اور طرز پر ہو تو اس کے لیے المکاء کہا جاتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

إذا غَرَّدَ المُكّاء في غير رَوْضة　　فَوَيْلٌ لأهل الشاءِ والحُمُراتِ

حضرت قتادہ نے کہا ہے: المکاء سے مراد ہاتھوں کے ساتھ تالی بجانا ہے اور تصدیہ سے مراد چیخ مارنا، سیٹی مارنا ہے۔ دونوں تفسیروں کی بنا پر اس میں ان جاہل صوفیاء کا رد ہے جو رقص کرتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ یہ سب کا سب منکر (اور ممنوع) عمل ہے اور عقلاً ایسے عمل سے پرہیز کرتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں۔ ایسا کرنے والا مشرکین کے ساتھ اس عمل میں مشابہ ہو جاتا ہے جو وہ بیت الله شریف کے پاس کرتے تھے۔

ابن جریج اور ابن نجیح نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ان سے مراد ان کا اپنے مونہوں میں انگلیاں داخل کرنا ہے۔ اور تصدیہ سے مراد سیٹی بجانا ہے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس عمل کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے غافل کر دے (آپ کی نماز میں خلل پیدا کریں)۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں معروف وہ معنی ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: مَكَا يَمْكُو مَكْوًا و مُكَاء جب کوئی سیٹی بجائے۔ اور صَدّی یُصَدّی تصدیۃ کہا جاتا ہے جب کوئی تالی بجائے، اس معنی میں عمرو بن اطنابۃ کا قول بھی ہے:

وظلّوا جميعا لهم ضجّةٌ　　مُكاء لدى البيت بالتّصدِيَة

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 627　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 523

یعنی اس میں التصدیہ بمعنی التصفیق یعنی تالی بجانا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر اور ابن زید نے کہا ہے: التصدیۃ کا معنی ہے ان کا بیت اللہ شریف سے روکنا، اس معنی کی بنا پر یہ اصل میں تصددۃ ہے، پھر دو دالوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ کا معنی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ مومن کو کافر سے الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (حکم) ہر شے میں عام ہے چاہے اس کا تعلق اعمال سے یا نفقات سے یا کسی اور سے ہو۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

''فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آ جائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو ہو چکا۔ اور اگر وہ (پہلے کرتوت) دہرائیں تو گزر چکا ہے (ہمارا) طریقہ پہلے) نافرمانوں) کے ساتھ''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا حضور نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ کفار کو یہ بات کہیں، چاہے تو آپ انہیں الفاظ کے ساتھ کہیں یا ان کے علاوہ دوسرے الفاظ میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر ایسا ہے جیسے کسائی نے ذکر کیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس طرح ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ تو پھر نبی مکرم ﷺ نے اسے بعینہٖ ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا ہے، یہ اس کے لیے کافی ہے جس کا تقاضا الفاظ کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْتَهُوْا امراد یہ ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آ جائیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور یہی ضروری ہے۔ اور اس پر ابھارنے والا یہ جواب شرط ہے يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اور جو ہو چکا اس کی مغفرت فقط کفر سے باز رہنے کے سبب ہی ہو سکتی ہے (1)۔ ابوسعید احمد بن محمد زبیری نے بہت خوب کہا ہے۔

يستوجبُ العفوَ الفتى إذا اعترفْ　　ثم انتهى عما أتاه واقْتَرَفْ

نوجوان معافی کا مستحق ہو جاتا ہے جب وہ اعتراف کر لے پھر اس سے باز آ جائے جو اس نے کیا۔

لقوله سبحانه فى المعترِفْ　　إن ينتهوا يغفرلهم ما قد سَلَفْ

کیونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے معترف کے بارے فرمایا ہے: اگر وہ باز آ جائیں تو بخش دیا جائے گا جو ہو چکا۔

امام مسلم نے ابوشماسہ مہری سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: ہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اس حال میں کہ وہ نزع کی کیفیت میں تھے طویل وقت تک روتے رہے (2)۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تو نہیں جانتا کہ اسلام اپنے سے پہلے والے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے اور ہجرت اپنے سے پہلے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 527　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 76

والے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے والے گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے'' (1)۔ الحدیث

علامہ ابن عربی نے فرمایا: یہ الله سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے انتہائی لطف وکرم ہے جس کے ساتھ اس نے مخلوق پر احسان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ کفار اپنے آپ کو کفر اور جرائم میں پھنسائے رکھتے ہیں اور معاصی اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پس اگر ان کا یہ عمل ان کے لیے مواخذہ کو واجب کر دے تو وہ کبھی بھی توبہ کو نہ پاسکیں اور نہ مغفرت انہیں حاصل ہو سکے۔ پس الله تعالیٰ نے رجوع الی الله کے وقت توبہ قبول فرما کر ان پر معاملہ آسان کر دیا اور اسلام کے بدلے انہیں مغفرت عطا فرما کر اور سابقہ سارے گناہوں کو گرا کر ان پر معاملہ آسان فرما دیا، تاکہ یہ انہیں دین میں داخل ہونے کے زیادہ قریب کر دے اور مسلمانوں کے کلمہ کو قبول کرنے کی انہیں زیادہ دعوت دے اور اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ ان کا مواخذہ کیا جائے گا تو نہ وہ توبہ کریں اور نہ اسلام قبول کریں (2)۔ اور صحیح مسلم میں ہے: جو لوگ تم سے پہلے تھے ان میں سے ایک آدمی نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ ایک عبادت گزار کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا اس کے لیے کوئی توبہ کا ذریعہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تیرے لیے کوئی توبہ نہیں، پس اس نے اسے بھی قتل کر دیا اور اس کے ساتھ سو مکمل ہو گئے (3)۔ الحدیث۔ پس تم عابد کے اس قول کی طرف دیکھو: تیرے لیے کوئی توبہ نہیں۔ تو جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ اس سے مایوس اور ناامید ہو گیا نتیجۃً اس نے اسے بھی قتل کر دیا، تو یہ ہے رحمت سے مایوس ہونے والے کا فعل۔ پس بھگانا اور نفرت دلانا مخلوق کو بگاڑ دیتا ہے اور آسانی وسہولت پیدا کرنا مخلوق کی اصلاح کرتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آپ کے پاس کوئی ایسا آدمی آتا جس نے قتل نہ کیا ہوتا اور وہ آپ سے پوچھتا: کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ تو آپ فرماتے: اس کے لیے کوئی توبہ نہیں، آپ اسے ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا فرماتے۔ اور جب ایسا آدمی آتا جس نے قتل کیا ہوتا اور وہ سوال کرتا: کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ تو آپ اسے فرماتے: تیرے لیے توبہ ہے۔ آپ یہ اسے آسانی اور سہولت پہنچانے کے لیے اور تالیف قلب کے لیے فرماتے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن القاسم اور ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں نقل کیا ہے جس نے حالت شرک میں طلاق دی اور پھر اسلام قبول کر لیا کہ اس کی طلاق نہیں ہے اور اسی طرح وہ آدمی جس نے قسم کھائی پھر اسلام قبول کر لیا تو اس پر حانث ہوتا نہیں ہے۔ اور اسی طرح وہ آدمی جس پر یہ چیزیں واجب ہوئیں تو اس کے لیے (اسلام کے سبب) مغفرت اور بخشش ہے، لیکن وہ آدمی جس نے کسی مسلمان پر افتراء باندھا پھر اسلام قبول کر لیا یا سامان چوری کیا پھر اسلام قبول کر لیا تو اس پر افترا پردازی اور چوری کی حد قائم کی جائے گی۔ اور اگر کسی نے زنا کیا اور پھر اسلام لے آیا یا کسی مسلمان عورت کو غصب کیا پھر اسلام قبول کر لیا تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بلاشبہ الله تعالیٰ وہ سب مراد لے رہا ہے جو اسلام سے پہلے ہو چکا، چاہے اس کا تعلق مال سے ہو یا دم سے یا کسی اور شے سے۔

1۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 75، حدیث نمبر 299　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 853-852
3۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 359

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہی صحیح اور درست ہے، کیونکہ ہم پہلے قول باری تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اور حدیث طیبہ: الاسلام یهدم ما قبله کی عمومیت بیان کر چکے ہیں اور اس کی دلیل وہ بھی ہے جو ہم نے آسانی باہم پہنچانے اور نفرت نہ دلانے کا معنی بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جہاں تک حربی کافر کا تعلق ہے تو اس نے حالت کفر میں دارالحرب میں جو کچھ بھی کیا ہے اس کے (اسلام کے سبب) ساقط ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اگر وہ امان لے کر ہمارے پاس آیا اور کسی مسلمان پر تہمت لگا دی تو اسے حد لگائی جائے گی اور اگر اس نے چوری کی تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اور اسی طرح ذمی نے جب کسی پر قذف لگائی تو اسے اسی کوڑے حد لگائی جائے گی اور جب اس نے چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر اس نے کسی کو قتل کیا تو اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ اور اسلام اس سے ان کو ساقط نہیں کرے گا، کیونکہ اس نے اپنا عہد حالت کفر میں ہی توڑ دیا ہے۔ یہ ابن قاسم وغیرہ کی روایت کے مطابق ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ایسے نصرانی کے بارے میں اختلاف ہے جو زنا کرتا ہے پھر اسلام قبول کر لیتا ہے، حالانکہ اس پر مسلمانوں میں سے بینہ موجود ہے، پس حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا گیا جب کہ وہ عراق میں تھے کہ اس پر نہ حد ہے اور نہ تغریب (جلاوطنی) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ اس کے موافق ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور ابوثور نے کہا ہے: جب اس نے اقرار اس حال میں کیا کہ وہ مسلمان تھا کہ اس نے حالت کفر میں زنا کیا ہے تو اس پر حد قائم کی جائے گی۔ اور کوفی سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ رہا مرتد جب وہ اسلام قبول کر لے درآنحالیکہ اس کی کئی نمازیں فوت ہو چکی ہوں، اس نے کئی جرائم کا ارتکاب کیا ہو اور مال ضائع کیے ہوں، تو اس کے بارے کہا گیا ہے: اس کا حکم کافر اصلی جیسا ہے جب وہ اسلام قبول کرے یا اس سے کسی شے کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جو کچھ اس نے حالت ارتداد میں کیا۔ امام شافعی نے اپنے ایک قول میں کہا ہے: اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ اور آدمیوں کے تمام حقوق لازم ہوتے ہیں، دلیل یہ ہے کہ آدمیوں کے حقوق اس کے ذمہ لازم ہیں تو پھر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی اس پر لازم ہوں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں وہ ساقط ہو جائیں گے اور جو آدمی کے حقوق ہیں وہ ساقط نہ ہوں گے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہی ہمارے علماء کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے حق سے مستغنی ہے اور آدمی اپنے حق کا محتاج ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حقوق اللہ بچوں پر واجب نہیں ہوتے لیکن حقوق العباد ان پر لازم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں عام ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّعُوْدُوْا مراد قتال کی طرف لوٹنا ہے، کیونکہ لفظ عاد جب مطلق آئے تو اس حالت کی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 854-853

طرف لوٹنے کو متضمن ہوتا ہے جس پر انسان پہلے ہو اور پھر اس حالت سے (نئی حالت کی طرف) منتقل ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ہم اس آیت میں ان کفار کے لیے ایسی کوئی حالت نہیں پاتے جو سوائے قتال کے ہماری ذکر کردہ کسی کیفیت سے مشابہت رکھتی ہو۔ اور کفر کی طرف لوٹنے کی تاویل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ کفر سے جدا ہوئے ہی نہیں اور ہم نے عاد کے بارے میں جو کہا ہے کہ جب یہ مطلق ہو (تو اس کی وجہ یہ ہے) کیونکہ یہ کلام عرب میں کبھی مبتدا اور خبر پر داخل ہوتا ہے، تو اس وقت یہ بمعنی صار ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: عاد زید ملکا مراد ہے صار زید ملکا (زید بادشاہ ہو گیا) اور اسی پر امیہ بن ابی صلت کا قول ہے:

تلك المكارمُ لاقَعْبانِ من لبن شِيبَا بماء فعادا بعدُ أبوالاً(1)

اور یہ اس حالت کی طرف لوٹنے کو متضمن نہیں جس پر لوٹنے والا اس سے پہلے تھا۔ پس یہ اپنی خبر کے ساتھ مقید ہے اس کے بغیر اقتصار جائز نہیں، پس اس کا حکم صار کے حکم کی طرح ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ یہ عبارت وعید، تہدید اور تمثیل تمام کو جامع ہے ان کے ساتھ جو زمانہ ماضی کی امتیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ ہلاک ہوئیں۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾

"اور (اے مسلمانو!) لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ باقی نہ رہے کوئی فساد اور ہو جائے دین پورے کا پورا اللہ کے لیے تو پھر اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے، وہ کیا ہی بہترین کارساز ہے اور کتنا بہترین مددگار ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ یعنی اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہے (یعنی اس میں فتنہ سے مراد کفر ہے) آیت کے آخر تک معنی و مفہوم اور اس کے الفاظ کی تفسیر سورۃ البقرہ اور دیگر مقامات پر گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

"اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس پر جسے ہم نے اتارا اپنے (محبوب) بندہ پر فیصلہ کے دن جس روز آمنے سامنے ہوئے تھے دونوں لشکر۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 527

قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ اس میں چھبیس مسائل ہیں (☆):

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ لغت میں غنیمت سے مراد وہ (مال) ہے جسے آدمی یا جماعت محنت اور کوشش کے ساتھ حاصل کرے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

وقد طوّفت فی الآفاق حتی رضیت من الغنیمۃ بالإیاب(1)

اور دوسرے شاعر نے کہا:

ومُطْعَم الغُنْم یوم الغنم مُطْعَمَہُ أنَّی توجّہ والمحروم محروم(2)

مغنم اور غنیمت دونوں ہم معنی ہیں: کہا جاتا ہے: غَنِم القوم غُنْمًا (قوم کو مال غنیمت عطا کیا گیا) جاننا چاہیے کہ اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ قول باری تعالیٰ: غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ سے مراد کفار کا وہ مال ہے جسے مسلمانوں نے غلبہ اور جنگ کے ساتھ حاصل کیا ہو۔ لغت اس تخصیص کا تقاضا نہیں کرتی جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے، البتہ عرف شرع نے لفظ کو اس نوع کے ساتھ مقید کیا ہے۔ کفار کی جانب سے ہمیں جو اموال حاصل ہوتے ہیں شریعت نے انہیں دو نام دیئے ہیں: ایک غنیمت اور دوسرا فئی۔ پس وہ مال جسے مسلمان اپنے دشمن سے جد و جہد اور گھوڑوں، اونٹوں کو جنگ میں استعمال کر کے حاصل کرتے ہیں اسے مال غنیمت کہا جاتا ہے۔ اور یہ اسم اس معنی کے ساتھ لازم ہو چکا ہے حتی کہ یہ عرف بن گیا ہے۔ اور فئی، فاء یفی ء سے ماخوذ ہے جب کوئی لوٹ آئے، رجوع کرلے اور اس سے مراد ہر وہ مال ہے جو مسلمانوں کو بغیر جنگ کے اور گھوڑوں، اونٹوں کو کام میں لائے بغیر حاصل ہو جائے، جیسا کہ زمینوں کا خراج، لوگوں پر عائد ہونے والا جزیہ اور غنائم کا خمس (3)۔

اسی طرح سفیان ثوری اور عطاء بن سائب رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قسم کا مال ہیں اور ان دونوں میں خمس (پانچواں حصہ) ہے، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فئی ہر اس مال سے عبارت ہے جو مسلمانوں کو بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہو۔ دونوں معنی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور کے نزدیک یہ آیت سورت کی پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ اور ابن عبدالبر نے اس پر اجماع ہونے کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کے بعد نازل ہوئی ہے اور یہ کہ مال غنیمت کے چار خمس لشکریوں کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ اس وقت نازل ہوئی جب غنائم بدر کے بارے میں اہل بدر کے درمیان اختلاف رونما ہوا، جیسا کہ سورت کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا ہے وہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے انہوں نے کہا: محمد بن کثیر نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں سفیان نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے محمد بن سائب نے ابو صالح کے واسطہ سے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 528 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً ☆ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا: جب غزوۂ بدر کا دن تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: ''جس نے کسی آدمی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا اور جس نے کسی کو قیدی بنایا تو اس کے لیے اتنا ہوگا'' (1)۔ پس انہوں نے ستر آدمیوں کو قتل کیا اور ستر کو قیدی بنایا۔

ابوالیسر بن عمرو دو قیدیوں کو لے کر آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آپ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ جس نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لیے اتنا ہوگا، تحقیق میں دو قیدیوں کو لایا ہوں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بے شک ہمیں نہ تو اجر میں زیادتی کی خواہش نے روکا اور نہ دشمن کے سامنے بزدلی کے اظہار نے ہمیں روکا بلکہ ہم تو اس مقام پر اس خوف سے کھڑے رہے کہ کہیں مشرکین ادھر نہ مڑ آئیں، بلاشبہ آپ اگر انہیں عطا فرمائیں گے تو پھر آپ کے اصحاب کے لیے کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ راوی فرماتے ہیں: وہ کچھ کہتے رہے اور وہ کچھ کہتے رہے پس یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ پس انہوں نے مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا، بعد ازاں یہ آیت نازل ہوئی وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ، الآیہ۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت محکم ہے، غیر منسوخ ہے اور یہ کہ مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور یہ لشکریوں کے درمیان تقسیم شدہ نہیں ہے اور اسی طرح آپ کے بعد آنے والے ائمہ کے لیے حکم ہے۔ اسی طرح مازری نے ہمارے بہت سے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے: اور یہ کہ امام وقت کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے ان سے نکال لے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور قصہ حنین سے استدلال کیا ہے۔

ابوعبید کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ بزور شمشیر فتح کیا اور وہاں کے باسیوں پر احسان فرمایا اور اسے انہیں پر واپس لوٹا دیا اور اسے تقسیم نہ کیا اور نہ اسے ان کے لیے فئی قرار دیا۔ اور بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ آپ کے بعد ائمہ کے لیے بھی یہ جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر قول باری تعالیٰ: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ کا معنی یہ ہوگا چار خمس امام کے لیے ہوں گے، اگر چاہے تو انہیں روک لے اور اگر چاہے تو انہیں لشکریوں کے درمیان تقسیم کر دے۔ اور یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اسے ذکر کر دیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مال غنیمت کی اضافت لشکریوں کی طرف کی ہے اور فرمایا ہے: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ پھر خمس کو اس کے لیے معین کر دیا جس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا اور چار خمس سے سکوت اختیار کیا۔ جیسا کہ اس ارشاد وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (النساء: 11) میں دو ثلث کے ذکر سے سکوت اختیار فرمایا، اس میں تو بالاتفاق باپ کے لیے دو ثلث ہیں۔ اسی طرح چار خمس بالاجماع لشکریوں کے لیے ہوں گے، جیسا کہ ابن منذر، ابن عبدالبر، داؤدی، مازری، قاضی عیاض اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور اس معنی کے ساتھ خبر دینا بالکل ظاہر ہے اور اس کا کچھ بیان عنقریب آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 20
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَنْفَالِ الآیہ کا معنی ہوگا۔ وہ مال جس کی امام وقت جس کے لیے چاہے مصلحت کے پیش نظر تقسیم سے پہلے تنفیل کر سکتا ہے۔ حضرت عطا اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ اس مال کے ساتھ مخصوص ہے جو مشرکوں سے مسلمانوں کی طرف بھاگ کر آئے چاہے وہ غلام ہو یا لونڈی یا کوئی جانور۔ امام وقت اس کے بارے جو پسند کرے فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انفال السرایا یعنی اس کے غنائم ہیں، اگر چاہے تو امام اس سے خمس نکالے اور اگر چاہے تو سارے کا سارا بطور تنفیل ادا کر دے۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے الامام یبعث السرایۃ فیصیبون المغنم میں بیان کیا ہے: اگر چاہے تو امام سارے مال کو نفل بنا دے اور اگر چاہے تو اس کا خمس نکالے۔ اور اسے ابو عمر نے مکحول اور عطا سے بیان کیا ہے۔ حضرت علی بن ثابت نے کہا ہے: میں نے مکحول اور عطا سے امام کے بارے پوچھا جو قوم کو اس مال کی تنفیل کرتا ہے جو انہوں نے حاصل کیا، تو فرمایا: وہ ان کے لیے ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: جو اس طرف گئے ہیں انہوں نے قول باری تعالیٰ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ کی تاویل کی ہے کہ وہ مال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے آپ جہاں چاہیں اسے خرچ کر سکتے ہیں۔ اور یہ نظریہ نہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کے سوا ہے جو ہم نے اس کے بارے کتاب القبس فی شرح موطا مالک بن انس میں بیان کیا ہے۔

اور علماء میں سے کسی ایک نے اس بارے میں کوئی قول نہیں کیا جو میں جانتا ہوں کہ قول باری تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ، الآیہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ کے لیے ناسخ ہے، بلکہ جمہور نے کہا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے: بے شک قول باری تعالیٰ: ما غنمتم ناسخ ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کتاب اللہ میں تحریف و تبدیلی کا الزام جائز نہیں ہے۔

رہا فتح مکہ کا واقعہ تو اس میں کوئی دلیل نہیں، کیونکہ اس کی فتح میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم مکہ مکرمہ کے بارے نہیں جانتے کہ شہروں میں سے کسی کو اس کے ساتھ دو اعتبار سے مشابہت حاصل ہو: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انفال و غنائم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص فرمائے ہیں جب تک اس نے کسی دوسرے کے لیے انہیں مقرر نہیں کیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الآیہ، پس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے خاص ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ کے لیے ایسا طریقہ مقرر کیا جو دوسرے شہروں میں سے کسی کے لیے نہیں۔ اور جہاں تک حنین کے واقعہ کا تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو عوض عطا فرمایا جب انہوں نے کہا: آپ غنائم قریش کو عطا فرما رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کے خون ٹپک رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: أما ترضون أن یرجع الناس بالدنیا و ترجعون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی بیوتکم (1) (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ دنیا ساتھ لے کر لوٹیں اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ) اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ کسی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 533

غیر کے لیے ایسا قول کرنا جائز نہیں، یہ فقط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3۔** علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ قول باری تعالیٰ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ اپنے عموم پر نہیں ہے، بلکہ خصوص اس میں داخل ہوسکتا ہے۔ پس انہوں نے اسے اجماع کے ساتھ خاص کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قاتل کے لیے مقتول کا سامان چھیننا اور سلب کرنا جائز ہے جب امام وقت اس کے بارے اعلان کرے اور اسی طرح قیدیوں کا بھی حکم ہے، اس بارے میں اختیار بلا اختلاف امام کے پاس ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور اس سے زمین کو بھی خاص کیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے: جو مال غنیمت سونے، چاندی، تمام ساز و سامان اور قیدیوں میں سے تمہیں حاصل ہو۔ اور رہی زمین تو وہ اس آیت کے عموم میں داخل نہیں ہے، کیونکہ ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اگر دوسرے لوگ نہ ہوتے تو میں جس شہر کو بھی فتح کرتا اسے تقسیم کر دیتا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کو تقسیم فرمایا۔ اور جو دلیل اس مذہب کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے صحیح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عراق نے اپنا قفیز اور اپنا درہم روک لیا ہے اور شام نے اپنا مد اور اپنا دینار روک لیا ہے'' (1) الحدیث۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: حدیث طیبہ میں منعت بمعنی ستمنع ہے (یعنی عنقریب روک لیں گے)

تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لشکریوں کے لیے نہیں ہوں گے، کیونکہ لشکری جس سامان کے مالک ہیں اس میں قفیز اور درہم نہیں ہوتے۔ اور اگر زمین بھی تقسیم کر دی جاتی تو غانمین کے بعد آنے والوں کے لیے کوئی شے نہ بچتی۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (الحشر: 10)

اس کا عطف اس قول پر ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ (الحشر: 8) فرمایا: بے شک وہ سامان تقسیم کیا جائے گا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دار الحرب والوں سے مال غنیمت میں سے جو بھی حاصل ہو گا چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر گھر ہو یا زمین، ساز و سامان ہو یا اس کے علاوہ کچھ، سب تقسیم کر دیا جائے گا، سوائے بالغ مردوں کے کیونکہ ان کے بارے میں امام وقت کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ انہیں بطور احسان آزاد کر دے یا قتل کر دے یا قیدی بنا لے۔ اور جو بھی ان سے لیا گیا اور قیدی بنایا گیا اس (کی تقسیم کا) طریقہ وہی ہے جو مال غنیمت کا طریقہ ہے۔ اور انہوں نے آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے۔ فرمایا: زمین بھی بالیقین مال غنیمت میں شامل ہے، لہٰذا واجب ہے کہ اسے بھی دیگر تمام غنائم کی مثل تقسیم کیا جائے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کا جو حصہ طاقت کے ساتھ فتح کیا تھا اسے تقسیم فرما دیا۔ انہوں نے کہا ہے: اگر زمین میں خصوص کا دعویٰ کرنا جائز ہے تو پھر زمین کے علاوہ میں بھی یہ دعویٰ جائز ہوگا نتیجۃً آیت کا حکم باطل ہو جائے گا۔

اور جہاں تک سورۃ الحشر کی آیت کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حجت نہیں کیونکہ وہ تو مال فیٔ کے بارے میں ہے نہ کہ مال غنیمت کے بارے میں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (الحشر: 10) یہ نیا کلام ہے جو ان لوگوں کے لیے دعا کے متعلق ہے جو ایمان میں سبقت لے گئے یہ کسی اور معنی کے لیے نہیں۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل زمین

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، جلد 2، صفحہ 74

سے متعلق آپ کے توقف کے بارے میں دو وجہوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہے: یا تو وہ غنیمت ہے آپ نے اس کے رہنے والوں کو اچھا پایا اور وہ زمین اس بارے میں موزوں تھی تو آپ نے اسے وقف کر دیا اور اس طرح جریر نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے باسیوں میں سے اچھوں کو چن لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ہوازن کے قیدیوں میں اسی طرح کیا، جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے اپنے اصحاب میں سے اعلیٰ افراد کو ان چیزوں کے بارے چن لیا جو ان کے ہاتھوں میں تھیں یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو زمین وقف کی وہ مال فئی میں تھی پس اس صورت میں آپ کو کسی اور کی رضامندی کی ضرورت بھی نہ تھی۔

کوفیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ زمین کی تقسیم یا اسے قائم رکھنے اور اس پر خراج مقرر کرنے کا اختیار امام وقت کو ہے۔ اور یہ زمین اسی طرح ان کی ملکیت ہو جاتی ہے جیسے صلح سے حاصل کی ہوئی زمین۔

ہمارے شیخ ابو العباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: گویا یہ دو دلیلوں کو جمع کرنا اور دو مذہبوں کے درمیان ایک درمیانی رائے ہے اور یہی وہ ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ بالیقین سمجھے، اسی لیے آپ نے فرمایا: اگر دوسرے لوگ نہ ہوتے، پس آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کے منسوخ ہونے کی کوئی خبر نہ دی اور نہ ہی ان کے ساتھ ان کی تخصیص کی خبر دی ہے، مگر کوفیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل پر کچھ اضافہ کیا ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی مصالح پر اسے وقف کیا اور اہل صلح کو اس کا مالک نہیں بنایا اور انہوں (کوفیوں) نے یہ کہا ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ اہل صلح کو اس کا مالک بنا دے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے موقف اختیار کیا ہے کہ مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں ہے اور اس کا حکم مال غنیمت کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امیر کہے: جس نے کسی کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا سامان اس کے لیے ہوگا، تو اس صورت میں وہ سامان اسی کے لیے ہوگا۔

لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، اسحاق، ابوثور، ابوعبید، طبری اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ہر حال میں چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا، چاہے امام نے وہ اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے: بلاشبہ چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا بشرطیکہ اس نے اسے سامنے سے آتے ہوئے قتل کیا ہو۔ اور جب اس نے اسے پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے پیچھے سے جا کر قتل کیا تو سلب کیا ہوا مال اس کے لیے نہیں ہوگا۔ اصحاب شافعی میں سے ابو العباس بن سریج نے کہا ہے: یہ حدیث من قتل قتیلا فله سلبه (1) اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ جس نے کسی قیدی یا عورت یا بوڑھے کو قتل کیا تو ان میں سے کسی سے چھینا ہوا مال اس کا نہ ہوگا۔ اور اسی طرح جس نے کسی زخمی کو مار دیا اور اسے قتل کر دیا جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کٹے ہوئے تھے (تو ان کا سامان قاتل کے لیے نہ ہوگا) فرمایا: اس شکست خوردہ کا حکم بھی اسی طرح ہے، جس کے شکست کھانے میں اور پسپا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، تو وہ بندھے ہوئے آدمی کی مثل ہے۔ فرمایا: پس اس سے معلوم ہو گیا کہ سلب شدہ مال کو جو قاتل کے لیے بنایا گیا ہے تو وہ کسی زائد معنی کی وجہ سے ہے یا پھر اس کے لیے ہے جس کے قتل میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 87

فضیلت ہو اور وہ قاتل کے سامنے ہونا ہے، کیونکہ اس صورت میں (مقابلے کی) مشقت ہوتی ہے۔ اور رہا وہ جس کے لیے زخموں کے سبب مقابلہ کرنا یا بھاگنا دوڑنا مشکل ہو جائے تو اسے قتل کرنے میں سامان قاتل کے لیے نہ ہوگا۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا، چاہے وہ اسے سامنے سے آتے ہوئے قتل کرے یا پیٹھ کے پیچھے سے، بھاگتے ہوئے یا مقابلہ کرتے ہوئے بشرطیکہ وہ میدان جنگ میں ہو۔

اس کا رد اس روایت میں ہوتا ہے جس کا ذکر عبدالرزاق اور محمد بن بکر نے ابن جریج سے کیا ہے انہوں نے کہا میں نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ہم مسلسل یہ سنتے رہے ہیں کہ جب مسلمان اور کفار میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل ہوں اور مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کفار میں سے کسی آدمی کو قتل کر دے تو بلاشبہ اس کا چھینا ہوا مال اس کے لیے ہوگا، مگر یہ کہ وہ انتہائی زوردار جنگ کے دوران قتل ہو، کیونکہ اس وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے اسے قتل کیا ہے۔ پس اس قول کا ظاہر طبری کے اس قول کا رد کرتا ہے کہ انہوں نے چھینے ہوئے مال میں یہ شرط لگائی ہے کہ قتل میدان جنگ میں ہو۔ اور ابوثور اور ابن منذر نے بیان کیا ہے کہ چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا چاہے وہ میدان جنگ میں ہو یا باہر، سامنے کی جانب ہو یا پیچھے کی جانب، بھاگتے ہوئے یا مقابلے کے لیے شوخی کا اظہار کرتے ہوئے ہو، تمام حالتوں میں (چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوگا) کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عام ہے: مَنْ قتل قتیلا فله سلبه (1) (جس کسی نے کسی مقتول کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا مال اس کے لیے ہوگا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں بنی ہوازن کی جنگ میں شریک تھے پس اس اثناء میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک سرخ اونٹ پر ایک آدمی آیا، اس نے اپنا اونٹ بٹھایا، پھر اونٹ کے تنگ سے رسی کھولی اور اس کے ساتھ اونٹ کو باندھ دیا، پھر آگے بڑھا اور قوم کے ساتھ مل کر کھانا کھانے لگا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اور ہم میں کمزور لوگ بھی تھے ان کی سواریاں بھی نحیف اور لاغر تھیں اور بعض ہم میں پیدل تھے، جب کہ وہ تیزی کے ساتھ نکلا، اپنی سواری کے پاس آیا، اس کی رسی (ڈھنگا) کو کھولا پھر اسے بٹھایا اور اس پر بیٹھ گیا اور اسے تیز چلا دیا اور اونٹ اسے لے کر خوب تیزی سے چلنے لگا، تو ایک آدمی نے خاکستری رنگ کی اونٹنی پر اس کا پیچھا کیا۔

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں انتہائی تیزی کے ساتھ نکلا اور میں اونٹنی کی سرین کے قریب ہو گیا، پھر میں مزید آگے بڑھا یہاں تک کہ میں اونٹ کی سرین کے قریب ہو گیا، پھر مزید آگے بڑھا یہاں تک کہ اونٹ کی مہار کو پکڑ لیا اور اسے بٹھایا، پس جب اس نے اپنا گھٹنا زمین پر رکھا میں نے اپنی تلوار سونتی اور اس آدمی کے سر پر ماری تو وہ گر پڑا (یعنی مر گیا) پھر میں اس اونٹ کو پکڑ کر لے آیا، اس پر اس کا کجاوہ (بمع ساز و سامان) اور اس کے ہتھیار بھی تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا استقبال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور لوگ بھی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کس نے اس آدمی کو قتل کیا''؟ لوگوں نے عرض کی: ابن

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 87

اکوع نے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: له سلبه اجمع (1) اس سے چھینا ہوا تمام مال اس کے لیے ہے۔ پس یہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اسے بھاگتے ہوئے قتل کیا نہ کہ سامنے سے آتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے چھینا ہوا مال اسے عطا فرما دیا۔ اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے حجت ہے کہ امام کی اجازت کے بغیر قاتل سلب شدہ مال کا مستحق نہیں ہوتا، کیونکہ اگر نفس قتل کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے ثابت ہو جاتا تو آپ کو یہ قول مکرر لانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور آپ کی حجت وہ روایت بھی ہے جسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ابوالاحوص نے اسود بن قیس سے انہوں نے بشر بن علقمہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ جنگ قادسیہ کے دن میں نے ایک آدمی کو دعوت مبارزت دی اور میں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال لے لیا، پھر میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو خطاب کیا پھر فرمایا: یہ بشر بن علقمہ کا چھینا ہوا مال ہے اور یہ بارہ ہزار درہم سے بہتر (اور زیادہ) ہے۔ اور ہم نے یہ اسے بطور تنفیل (انعام) دے دیا۔ پس اگر چھینا ہوا مال قاتل کے لیے ہوتا اور محض حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضا سے ہوتا تو پھر اس چیز کی ضرورت نہ ہوتی کہ وہ اپنے اجتہاد کے ساتھ امر کی نسبت اپنی ذاتوں کی طرف کریں اور یقیناً قاتل ان کے امر کے بغیر اس سامان کو لے سکتا۔ واللہ اعلم

اور صحیح میں ہے کہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے اپنی تلواروں کے ساتھ ابوجہل پر حملہ کیا، یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر وہ دونوں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''تم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے''؟ تو ان دونوں میں سے ہر ایک نے عرض کی: میں نے اسے قتل کیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں تلواروں کو غور سے دیکھا اور فرمایا: ''تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے'' (2)۔ اور پھر اس سے چھینے ہوئے مال کا فیصلہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کے حق میں فرمایا۔ تو یہ اس پر نص ہے کہ سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں، کیونکہ اگر اس کے لیے ہوتا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ان دونوں کے درمیان تقسیم فرما دیتے۔

اور صحیح میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے انہوں نے کہا: میں ان کے ساتھ نکلا جو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں غزوۂ موتہ کے لیے نکلے تھے۔ اور یمن سے آنے والے معاونین اور مددگاروں میں سے ایک آدمی نے میری مرافقت اور سنگت اختیار کی۔ آگے حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اے خالد! کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلب کیے ہوئے مال کا فیصلہ قاتل کے لیے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، لیکن میں اسے کثیر سمجھتا ہوں (3)۔ ابوبکر برقانی نے اپنی اس اسناد کے ساتھ اسے روایت کیا ہے جس کے ساتھ مسلم نے اسے روایت کیا اور اس میں یہ زائد ذکر کیا کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلب کیے ہوئے مال کا خمس نہیں نکالا اور بے شک وہ معاون و مددگار غزوۂ موتہ میں ان کا ساتھی تھا جو شام کی طرف سے آیا ہوا تھا، اس نے کہا: ان میں سے ایک رومی بڑی شدت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرنے لگا اور وہ اشقر (سرخ وزرد رنگ) گھوڑے پر سوار تھا۔ زین سنہری تھی، کمر کا کپڑا لتھڑا ہوا تھا اور تلوار سونے کے ساتھ آراستہ کی ہوئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: وہ انہیں اکسار ہا تھا، فرمایا: پس میرا معاون

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 89-88　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 88　　3۔ ایضاً

ان کے لیے مہربان ہوا (یعنی اس نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا) یہاں تک کہ اس کے پاس سے گزرا اور اس کے گھوڑے کی کونچوں پر وار کیا اور وہ گر پڑا اور اس نے اسے تلوار کے ساتھ اٹھایا اور اسے قتل کر دیا اور اس کا اسلحہ لے لیا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے وہ اسے دیا اور اس میں سے کچھ روک لیا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس میں نے انہیں کہا: یہ سارے کا سارا اسے عطا فرما دو۔ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا ہے: السلب للقاتل (سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے ہے) انہوں نے فرمایا: ہاں، لیکن میں اسے زیادہ خیال کرتا ہوں۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میرے اور ان کے درمیان گفتگو ہوئی، تو میں نے انہیں کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور آگاہ کروں گا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم نے اسے کیوں نہیں دیا''؟ تو انہوں نے عرض کی: میں نے اسے بہت زیادہ سمجھا۔ آپ نے فرمایا: ''پس تم اسے وہ سب دے دو'' تو میں نے انہیں کہا: کیا میں نے آپ کے لیے وہ وعدہ پورا نہیں کر دیا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا؟ راوی کہتے ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں ہو گئے اور فرمایا: ''اے خالد تو اسے نہ دینا کیا تم میرے لیے میرے امراء (افسر) کو چھوڑ رہے ہو''(1)۔ تو یہ اس پر واضح دلیل ہے کہ قاتل سلب کیے ہوئے مال کا نفس قتل سے مستحق نہیں ہوتا، بلکہ امام کی رائے اور اس کی نظر سے اس کا مستحق ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے کہا ہے: سوائے خاص مقابلہ کے سلب کیا ہوا مال قاتل کے لیے نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ چھینے ہوئے مال سے خمس نکالنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور ابو اسحاق نے کہا ہے: اگر چھینا ہوا مال تھوڑا ہو تو وہ قاتل کے لیے ہوگا اور اگر زیادہ ہو تو پھر اس سے خمس لیا جائے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ہی کیا جس وقت وہ مرزبان کے مقابل ہوئے اور اسے قتل کر دیا، تو اس کے کمربند اور اس کے کنگنوں کی قیمت تیس ہزار تھی تو آپ نے اس کا خمس نکالا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے مشرکین کے سو آدمی قتل کیے مگر مقابلہ ایک آدمی کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے حب زارہ (بحرین کا ایک گاؤں) پر حملہ کیا تو الزارہ کے دہقان نکل آئے اور انہوں نے کہا: ایک ایک آدمی ایک دوسرے کے مقابل تھا، پس حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اس (مرزبان) سے مقابلہ کیا دونوں کی ایک دوسرے کے خلاف تلواریں چلیں، پھر دونوں نے ایک دوسرے کا گلا پکڑ لیا اور حضرت براء نے اسے سرین کے بل گرا دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گئے، پھر تلوار پکڑی اور اسے ذبح کر دیا۔ اس کے ہتھیار اور اس کا کمربند اٹھا لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے، تو آپ نے ہتھیار انہیں بطور انعام (نفل) عطا فرما دیئے اور کمربند کی تیس ہزار قیمت لگائی پھر اس سے خمس نکالا اور فرمایا: بے شک یہ مال ہے۔ اور امام اوزاعی اور مکحول رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: چھینا ہوا مال، مال غنیمت ہے اور اس میں خمس بھی ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی حجت وہ روایت ہے جسے ابو داؤد نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 88

عوف بن مالک اشجعی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول سے چھینے ہوئے مال کا قاتل کے لیے فیصلہ فرمایا اور اس چھینے ہوئے مال سے خمس نہیں لیا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سلب کیا ہوا مال قاتل کو نہیں دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ اس قتل کرنے پر گواہ پیش کرے۔ ان میں سے اکثر نے کہا ہے: ایک شاہد کی شہادت کافی ہوگی۔ ان کی بنیاد حضرت ابوقتادہ کی حدیث پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو گواہ ہوں یا پھر ایک شاہد ہو اور ساتھ قسم بھی ہو۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قاتل کو چھینا ہوا مال صرف دعویٰ کے ساتھ دے دیا جائے گا، اس کے استحقاق کے لیے بینہ شرط نہیں ہے، بلکہ اگر وہ اس پر متفق ہو جائے تو پھر تنازعہ ختم کرنے کے لیے بینہ لانا اولیٰ ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو مقتول سے چھینا ہوا مال بغیر کسی شہادت اور قسم کے عطا فرمایا۔ اور ایک آدمی کی شہادت کافی نہیں ہوگی اور نہ صرف اس کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ لیث بن سعد نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: میں نے اپنے شیخ الحافظ المنذری الشافعی ابو محمد عبدالعظیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسود بن خزاعی اور عبداللہ بن انیس کی شہادت کے ساتھ انہیں مقتول کا مال عطا فرمایا۔ اس بنا پر تو نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اشکال زائل ہو جاتا ہے اور حکم جاری رہے گا۔ اور رہے مالکیہ! تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ امام وقت کو اس بارے میں بینہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ ابتداءً امام کی طرف سے عطیہ ہے، پس اگر وہ شہادتیں شرط قرار دے تو اسے یہ اختیار ہے اور اگر شرط نہ قرار دے تو یہ جائز ہے کہ وہ اسے بغیر شہادت کے عطا کر دے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ سلب کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ بس ہتھیار اور وہ تمام چیزیں جو جنگ کے لیے ضرورت ہوتی ہے اس کے سلب ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے اور گھوڑا بھی اس میں داخل ہے اگر اس نے اس پر قتال کیا ہو اور اس سے اسے گرایا گیا ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے گھوڑے کے بارے کہا ہے کہ وہ سلب میں شامل نہیں ہے۔ اس طرح اگر اس کی تھیلی اور کمر بند میں دنانیر یا جواہر یا اسی طرح کی اور کوئی شی ہو تو بالاتفاق وہ مال سلب میں سے نہیں ہے۔ اور اس مال کے بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ وہ جنگ کے لیے مزین اور آراستہ ہوتا ہے، پس امام اوزاعی نے کہا ہے: وہ سارے کا سارا مال سلب میں سے ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: وہ سلب میں سے نہیں ہے۔ اور یہ حضرت سحنون رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، سوائے کمر بند کے کیونکہ ان کے نزدیک وہ سلب میں سے ہے۔ اور ابن حبیب نے "الواضحہ" میں کہا ہے: کنگن مال سلب میں سے ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ابوعبید نے کہا ہے: یہ اس سورت کی پہلی آیت قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ کے لیے ناسخ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم بدر میں سے خمس نہیں نکالا تھا، پس اس آیت کے ساتھ خمس نہ نکالنے کے بارے میں آپ کا فیصلہ منسوخ ہو گیا، مگر صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے: کہ "بدر کے دن

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت

مال غنیمت میں سے میرے حصے میں دو سال کی اونٹنی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اس دن خمس سے دو سال کی اونٹنی مجھے عطا فرمائی"(1) الحدیث۔ کہ آپ ﷺ نے خمس نکالا، پس اگر معاملہ اس طرح ہے تو پھر ابو عبید کا قول مردود ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ خمس جس کا ذکر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا ہے وہ ان غزوات میں سے کسی کا ہو جو بدر اور احد کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ اور وہ غزوۂ بنی سلیم، غزوہ بنی مصطلق، غزوہ ذی امر اور غزوہ بحران ہیں۔ ان میں کوئی یادگار جنگ تو نہیں ہوئی، لیکن یہ ممکن ہے کہ مال غنیمت حاصل کیا گیا ہو(2)۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول میں یومئذ کے الفاظ رد کرتے ہیں، کیونکہ اشارہ اس دن کی طرف ہے جس میں بدر کے غنائم کو تقسیم کیا گیا، مگر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ خمس سے ہو اگرچہ بدر کے غنائم سے خمس نہ بھی نکالا گیا ہو، (وہ) سریہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے خمس میں سے ہو، کیونکہ وہی پہلا مال غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوا اور پہلا خمس ہے جو اسلام میں نکالا گیا تھا۔ بعد ازاں قرآن کریم میں وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وا ارشاد نازل ہوا۔ اور یہ پہلی تاویل سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9**۔ قول باری تعالیٰ: ماغنمتم میں ما بمعنی الذی ہے اور اس میں ھا ضمیر محذوف ہے۔ (اصل میں) الذی غنمتموہ ہے۔ اور اس میں (یعنی فان فیہ) فا داخل کی گئی ہے کیونکہ کلام میں مجازات کے معنی ہیں اور دوسرا ان پہلے کے لیے تاکید ہے۔ اور اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور یہ ابو عمرو سے مروی ہے۔ حسن نے کہا ہے: یہ مفتاح کلام ہے۔ دنیا اور آخرت اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے، اسے نسائی نے ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فئی اور خمس کے بارے کلام کا آغاز اپنی ذات کے ذکر سے کیا ہے، کیونکہ یہ دونوں انتہائی اشرف و اعلیٰ کسب (کمائی) ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی میل ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ خمس کی تقسیم کی کیفیت میں علماء کے مابین اختلاف ہے اس بارے چھ اقوال ہیں:

(۱) ایک جماعت نے کہا ہے: خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، پس چھٹا حصہ کعبہ معظمہ کے لیے رکھا جائے گا اور یہی وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور دوسرا حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوگا۔ تیسرا حصہ ذوی القربیٰ کے لیے۔ چوتھا یتامیٰ کے لیے۔ پانچواں حصہ مساکین کے لیے۔ اور چھٹا حصہ ابن سبیل کے لیے ہوگا۔ یہ قول کرنے والوں میں سے بعض نے کہا ہے: وہ حصہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۲) ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے: مال غنیمت پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا، پھر ان میں سے ایک حصہ الگ کر لیا جائے گا اور بقیہ چار حصے لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے، پھر اس جدا کیے گئے حصہ پر اپنا ہاتھ مارا جائے گا پس اس میں سے جس شی پر قبضہ کر لیا گیا اسے کعبہ معظمہ کے لیے مقرر کر دیا جائے، پھر اس باقی ماندہ حصہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کر دیا جائے گا، ایک حصہ حضور نبی مکرم ﷺ کے لیے ہوگا، ایک حصہ ذوی القربیٰ کے لیے، ایک یتامیٰ کے لیے، ایک حصہ مساکین کے لیے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، جلد 2، صفحہ 63　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 529

ایک حصہ ابن سبیل کے لیے ہوگا۔

(۳) منہال بن عمرو نے کہا ہے: میں نے عبداللہ بن محمد بن علی اور علی بن حسین سے خمس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ ہمارے لیے ہے۔ میں نے علی کو کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ تو انہوں نے فرمایا: مراد ہمارے یتیم اور ہمارے مساکین ہیں۔

(۴) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اسے پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ کو ایک قرار دیا ہے اور یہ کہ اسے مومنین کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ اور بقیہ چار حصے آیت میں مذکور چار صنفوں پر خرچ کیے جائیں گے۔

(۵) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے تین حصوں پر تقسیم کیا جائے گا: یتامی، مساکین اور ابن سبیل پر۔ اور آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا حکم آپ کے وصال کے ساتھ ختم ہو چکا ہے، جیسا کہ آپ کے اپنے حصہ کا حکم ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: خمس کو پلوں کی اصلاح، مساجد کی تعمیر، قضاۃ اور لشکریوں کی تنخواہ وغیرہ کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح کا حکم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

(۶) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے امام کی رائے اور اجتہاد کے سپرد کر دیا جائے گا۔ پس وہ اس سے بغیر اندازے کے لے سکتا ہے اور اس سے اجتہاد کے ساتھ رشتہ داروں کو دے سکتا ہے اور باقی ماندہ مسلمانوں کے مصالح کے لیے خرچ کرے گا۔ اسی طرح خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اور اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: مالی مما أفاء اللہ علیکم إلا الخمس والخمس مردود علیکم (1) ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال غنیمت عطا فرمایا ہے میرے لیے اس میں سے سوائے خمس کے کچھ نہیں اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جائے گا''۔ کیونکہ آپ نے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور نہ تین حصوں میں اور آیت میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض ان پر تنبیہ کے لیے ذکر کر دیا گیا، کیونکہ وہ ان میں سے زیادہ اہم ہیں جنہیں وہ دیا جا سکتا ہے۔ زجاج نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمایئے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں''۔

اور آدمی کے لیے بالاجماع ان اصناف کے علاوہ کہیں اور خرچ کرنا جائز ہے جب وہ اسے زیادہ مستحق سمجھے۔ اور نسائی نے حضرت عطا سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا خمس اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس ایک ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے لیتے تھے اور اس سے عطا بھی فرماتے تھے اور اسے جہاں چاہتے خرچ کرتے اور اس سے جو چاہتے بناتے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَلِذِی الْقُرْبٰی اس میں لام بیان استحقاق اور ملکیت کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ مصرف اور

---

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصدقات، جلد 7، صفحہ 17

محل بیان کرنے کے لیے ہے اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ فضل بن عباس اور ربیعہ ابن عبدالمطلب دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ان میں سے ایک نے گفتگو کی اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تمام لوگوں سے زیادہ نیک ہیں (1) اور عام لوگوں سے بڑھ کر آپ لوگوں کو ملانے والے ہیں۔ تحقیق ہم نکاح کی عمر کو پہنچ چکے ہیں ہم آپ کے پاس حاضر ہیں تاکہ آپ ہمیں ان بعض صدقات پر امارت عطا فرما دیجئے، تو ہم آپ کو اسی طرح ادا کریں گے جیسے لوگ ادا کرتے ہیں اور ہم اسی طرح حصہ دیں گے جیسے لوگ دیتے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم طویل وقت تک خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے آپ سے کلام کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ فرماتے ہیں: حضرت زینب رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے ہمیں اشارہ فرما رہی تھیں کہ تم آپ سے کلام نہ کرنا۔ راوی کا بیان ہے: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں بلا شبہ وہ لوگوں کی میل ہے، تم دونوں محمیہ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ وہ خمس پر مامور تھے۔ اور نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو بلا کر لاؤ''۔ بیان فرمایا: پھر وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے محمیہ کو فرمایا: ''تو اس بچے یعنی فضل بن عباس کا نکاح اپنی بچی سے کر دے''۔ تو اس نے ان کا نکاح کر دیا اور نوفل بن حارث کو فرمایا: ''تو اس بچے یعنی ربیعہ بن عبدالمطلب کا نکاح اپنی بیٹی سے کر دے'' اور پھر محمیہ کو فرمایا: ''تو ان دونوں کی طرف سے خمس میں سے اتنا اتنا صدقہ کر دے''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال فئی عطا فرمایا ہے اس میں سے سوائے خمس کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور وہ خمس بھی تم پر لوٹا دیا گیا ہے''۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ تمام اصناف کو عطا کیا اور بعض کو بھی اور آپ نے اس میں سے مؤلفۃ قلوب کو بھی دیا۔ اور یہ ان میں سے نہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تقسیم میں فرمایا ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق بخشنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ علماء نے ذوی القربیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور اس بارے میں تین اقوال ہیں:

(۱) تمام کے تمام قریش، یہ قول بعض سلف نے کہا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صفا پہاڑی پر چڑھے اور آپ بلند آواز سے پکارنے لگے: ''اے بنی فلاں، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی کعبہ، اے بنی مرہ، اے بنی عبد شمس اپنے آپ کو آتش جہنم سے بچالو'' (الحدیث) عنقریب اس کا بیان سورۃ الشعراء میں آئے گا۔

(۲) امام شافعی، امام احمد، ابو ثور، مجاہد، قتادہ، ابن جریج اور مسلم بن خالد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ذوی القربیٰ کا حصہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے درمیان تقسیم فرمایا تو فرمایا: ''بلا شبہ انہوں نے مجھے جدا نہیں کیا نہ زمانہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں بے شک بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب (2) ایک ہی شے ہیں''۔ اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے جال بنایا، اسے نسائی اور بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیث نے بیان کیا کہ مجھے یونس نے بتایا اور یہ زائد بیان کیا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبد شمس اور بنی نوفل کے لیے کوئی شے تقسیم نہیں کی۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 344

2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 81

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: عبد شمس، ہاشم، مطلب یہ سب ماں کی جانب سے بھائی ہیں اور ان کی ماں عاتکہ بنت مرہ تھی اور نوفل ان کے باپ کی جانب سے ان کا بھائی تھا۔ امام نسائی نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوی القربیٰ کو حصہ دیا اور وہ (ذوی القربیٰ) بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں، ان میں غنی بھی ہیں اور فقیر بھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ان میں سے فقیر کے لیے تو حصہ ہے لیکن غنی کے لیے نہیں، جیسا کہ یتامی اور ابن سبیل کے لیے ہے۔ اور میرے نزدیک راہ صواب کے زیادہ قریب دونوں قولوں میں سے یہی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس میں صغیر و کبیر اور مونث و مذکر سبھی برابر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لیے قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اسے تقسیم فرمایا ہے۔ اور حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہو۔

(۳) ذوی القربیٰ سے مراد صرف بنو ہاشم ہیں۔ اسے مجاہد اور علی بن حسین نے بیان کیا ہے۔ اور یہی امام مالک، ثوری اور اوزاعی وغیرہم کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب اللہ تعالیٰ نے خمس کا بیان فرمایا ہے اور بقیہ چار حصوں سے سکوت فرمایا ہے، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ لشکریوں کی ملکیت ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ بیان کیا ہے: ''جس بستی کے رہنے والوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو بلاشبہ اس بستی کا خمس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے پھر وہ تمہارے لیے ہے'' (1)۔ اور یہ وہ ہے جس میں نہ امت کے درمیان اختلاف ہے اور نہ ہی ائمہ کے درمیان، جیسا کہ اسے علامہ ابن عربی نے احکام وغیرہ میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ کہ اگر امام قیدیوں کو رہا کر کے ان پر احسان کرنا چاہے تو وہ کر لے۔ اور ان میں غانمین کے حقوق باطل ہو جائیں گے، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال وغیرہ کے ساتھ کیا اور فرمایا: ''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا پھر وہ ان قیدیوں (مراد بدر کے قیدی ہیں) کے بارے گفتگو کرتا تو میں اس کے لیے انہیں چھوڑ دیتا'' (2)۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے درحقیقت قریش مکہ کے معاہدہ کو توڑنے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا اس کے بدلہ کے لیے آپ نے یہ فرمایا: اور امام کو اختیار ہے کہ وہ تمام قیدیوں کو قتل کر دے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط کو قیدیوں کے درمیان سے پکڑ کر قتل کر دیا اور اسی طرح نضر بن حارث کو صفراء کے مقام پر پکڑ کر قتل کیا اور یہ وہ حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دوسرے لشکریوں کے حصہ کی طرح حصہ ہوتا تھا چاہے آپ جنگ میں حاضر ہوتے یا وہاں سے غائب ہوتے۔ اور صفی کا حصہ بھی ہوتا، آپ تلوار، تیر یا خادم یا کوئی جانور چن سکتے تھے۔ حضرت صفیہ بنت حیی خیبر کے غنائم میں سے چنی ہی گئی تھیں (3)۔ اور اسی طرح ذوالفقار (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلوار کا نام ہے) بھی صفی میں سے تھی (4)۔ اور یہ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مگر ابو ثور کے نزدیک اب

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، صفحہ 74　　2۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الجہاد، جلد 5، صفحہ 209

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، حدیث نمبر 2600، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 1485۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بھی امام وقت کے لیے یہ حصہ باقی ہے وہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کے استعمال کی جگہ استعمال کر سکتا ہے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ اہل جاہلیت اپنے سردار کے لیے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ رکھتے تھے۔ ان کے شاعر نے کہا ہے:

لك المرباع منها والصفايا وحُكمُك والنشيطةُ والفضول

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

مِنَّا الذي رَبَعَ الجيوش لصُلبه عشرون وهو يُعَدّ في الأحياء

کہا جاتا ہے: رَبَعَ الجيشَ يَرْبَعهٗ رباعة جب وہ مال غنیمت کا چوتھائی حصہ لے لے۔ اصمعی نے کہا ہے: جاہلیت میں چوتھائی حصہ تھا اور اسلام میں پانچواں حصہ ہے۔ پس اس وقت سردار بغیر کسی شریعت اور دین کے مال غنیمت سے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور اس سے جو چاہتا چن لیتا تھا، پھر صفی کے بعد جس شی کے بارے چاہتا اسی کے مطابق وہ فیصلہ کر دیتا اور گھریلو سامان اور دیگر ساز و سامان میں سے کوئی شی جو اس سے الگ ہوتی اور اس سے بچتی وہ اس کے لیے ہوتی، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس کے لیے دین کا حکم نافذ فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صفی (چناؤ) کا حصہ باقی رکھا اور زمانہ جاہلیت کا حکم ساقط کر دیا۔

اور عامر شعبی نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک حصہ تھا وہ صفی کہلاتا تھا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غلام یا کنیز یا گھوڑے میں سے چاہتے تو آپ اسے خمس نکالنے سے پہلے چن سکتے تھے، اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا: پس کسی غلام سے ملتے اور کہتے: ''اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت عطا نہیں کی اور تجھے سردار نہیں بنایا اور تیری شادی نہیں کروائی اور تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ کو مسخر نہیں کیا اور تجھے چھوڑ نہیں دیا تو سردار بن جا اور چوتھائی لے'' (1) الحدیث۔

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں تربع کا معنی ہے تأخذ المرباع یعنی تیری قوم کو غنائم اور دیگر کمائی میں سے جو مال حاصل ہوتا ہے اس سے چوتھائی لے۔ بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ خمس کا خمس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا آپ اسے اپنی اولاد اور اپنی ازواج مطہرات کی حاجات پورا کرنے کے لیے خرچ کرتے تھے اور اپنے سال بھر کی خوراک اس سے ذخیرہ کر لیتے تھے۔ اور باقی ماندہ گھوڑوں اور اسلحہ وغیرہ میں خرچ کرتے تھے۔ اسے وہ روایت رد کرتی ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: بنی نضیر کے اموال ان میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے لیکن اس پر مسلمانوں نے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ کوئی سعی نہیں کی، پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھے، آپ اس میں سے اپنی ذات پر سال بھر کی خوراک خرچ کرتے تھے اور ماںقی فی سبیل اللہ گھوڑوں اور اسلحہ کی تیاری میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا: والخمس مردود علیکم ''اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا گیا ہے''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

**مسئلہ نمبر 14**۔ کتاب اللہ میں گھوڑ سوار کو پیدل پر فضیلت دینے کے بارے کچھ نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ ہے کہ وہ سب برابر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خمس کے بعد بقیہ چار حصے ان کے لیے رکھے ہیں اور اس میں پیدل کو گھوڑ سوار سے خاص نہیں کیا۔ اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخبار وارد نہ ہوتیں تو یقیناً گھوڑ سوار پیدل کی طرح ہوتا، غلام آزاد کی مثل ہوتا اور بچہ بالغ کے برابر ہوتا۔

علماء نے ان چار حصوں کی تقسیم میں اختلاف کیا ہے، پس وہ موقف جو اس بارے میں عام اہل علم نے اپنایا ہے اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ گھوڑ سوار کو دو حصے دیئے جائیں گے اور پیدل کو ایک حصہ۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے ان میں امام مالک بن انس ہیں اور اہل مدینہ میں سے جو ان کے متبعین ہیں۔ اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اہل شام میں سے وہ جنہوں نے ان سے موافقت کی ہے۔ اور اسی طرح ثوری اور اہل عراق میں جو ان کے ہم خیال ہیں نے کہا ہے اور یہی لیث بن سعد کا قول ہے اور ان اہل مصر میں سے جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب نے کہا ہے۔ اسی کے مطابق امام احمد بن حنبل، اسحاق، ابوثور، یعقوب اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے سوائے حضرت نعمان (امام ابوحنیفہ) کے جس نے اس میں اختلاف کیا ہو، کیونکہ آپ نے اس میں سنن اور جس نظریہ پر قدیم وجدید عظیم اہل علم ہیں سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: گھوڑ سوار کو بھی صرف ایک حصہ دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے شبہ واقع ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑ سوار کے لیے دو حصے رکھے اور پیدل کے لیے ایک حصہ۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: رمادی نے کہا ہے اسی طرح ابن نمیر کہتے ہیں کہ ہمیں نیشاپوری نے بتایا: یہ میرے نزدیک ابن ابی شیبہ یا رمادی کی جانب سے وہم ہے۔ کیونکہ امام احمد بن حنبل اور عبدالرحمن بن بشر وغیرہما نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی اور اس کے گھوڑے کے لیے تین حصے مقرر کیے، ایک حصہ آدمی کے لیے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے (1)۔ اسی طرح اسے عبدالرحمن ابن بشر نے عبداللہ بن نمیر سے انہوں نے عبیداللہ بن عمر سے انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور پوری حدیث ذکر کی ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے لیے دو حصے اور اس کے مالک کے لیے ایک حصہ مقرر کیا (2)۔ اور یہ نص ہے۔ اور تحقیق دارقطنی نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن مجھے چار حصے عطا فرمائے، دو حصے میرے گھوڑے کے لیے، ایک حصہ میرے لیے اور ایک حصہ ذوی القرابہ میں سے میری ماں کے لیے۔ اور ایک روایت میں ہے: اور ایک حصہ ان کی ماں کے لیے تھا وہ ذوی القربیٰ کا حصہ تھا۔ اور انہوں نے بشر بن عمرو بن محصن سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھوڑے کے لیے چار حصے عطا فرمائے اور میرے لیے ایک حصہ، پس میں نے پانچ حصے لیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے:

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 41
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 401

بے شک یہ امام کے اجتہاد کی طرف راجع ہے (یعنی ان کے سپرد ہے) جو اس کی رائے ہوگی وہ نافذ ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 15**۔ گھڑ سوار اور پیدل کے درمیان ایک سے زیادہ گھوڑوں کے ساتھ فرق نہیں کیا جائے گا (یعنی گھڑ سوار کے لیے صرف ایک گھوڑے کا اعتبار ہوگا اس سے زائد گھوڑوں کا اعتبار نہ ہوگا۔) یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک سے زیادہ گھوڑوں کا حصہ بھی دیا جائے گا، کیونکہ اس کی مشقت زیادہ ہے اور منفعت عظیم ہے۔ اس کے مطابق ہمارے اصحاب میں سے ابن الجہم نے بیان کیا ہے اور اسے سحنون نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ایک گھوڑے سے زیادہ کو حصہ عطا فرمایا اور اسی طرح آپ کے بعد ائمہ بھی ہیں، کیونکہ دشمن کے لیے قتال کرنا ممکن نہیں ہے مگر صرف ایک گھوڑے پر اور جو اس سے زائد ہوں گے وہ محض تیاری میں زیادتی اور سہولت و آسانی کے لیے ہوں گے۔ اور وہ حصوں کی زیادتی میں موثر نہیں ہوں گے۔ تو یہ اس کی طرح ہے جس کے پاس زیادہ تلواریں یا نیزے ہوں اور اسی میں قیاس تیسرے اور چوتھے نمبر کا ہے۔ اور سلیمان بن موسیٰ سے روایت ہے: اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا جس کے پاس گھوڑے ہوں۔ ہر گھوڑے کے لیے ایک حصہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ صرف عربی گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا، کیونکہ ان میں کر وفر ہے اور رومی گھوڑے اس معاملہ میں ان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور جو اس طرح نہیں ان کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر امام وقت ان کی اجازت دے دے تو پھر ان کے لیے حصہ بھی نکالے، کیونکہ گھوڑوں کے ساتھ نفع حاصل کرنا جگہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ پس رومی گھوڑے کٹھن اور مشکل جگہوں میں کام کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں مثلاً گھاٹیاں اور پہاڑ وغیرہ اور عربی گھوڑے ایسی جگہوں میں زیادہ کام آتے ہیں جن میں کر وفر (بار بار پلٹ کر حملہ کرنا) ہوتا ہے، پس یہ امام کی رائے کے متعلق ہوگا۔ کتاب میں العتاق سے مراد عربی گھوڑے ہیں اور الھجن والبراذین سے مراد رومی گھوڑے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ ہمارے علماء نے ضعیف اور کمزور گھوڑے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس اشہب اور ابن نافع نے کہا ہے: اس کے لیے کوئی حصہ نہ نکالا جائے گا، کیونکہ ایسے گھوڑے پر جنگ کرنا ممکن نہیں ہوتی پس وہ ٹوٹے ہوئے (کسیر) کے مشابہ ہو جائے گا۔ اب رہا مریض! تو اگر اسے ہلکی سی بیماری ہو مثلاً رہیص (گھوڑے کے کھر کے اندر زخم اور درد ہونا) اور اسی طرح کی کوئی ایسی بیماری جو اس سے مطلوبہ منفعت کے حصول میں مانع نہ ہو تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ اور ادھار لیے ہوئے اور اجرت پر لیے ہوئے گھوڑے کو حصہ دیا جائے گا۔ اور اسی طرح مغصوبہ گھوڑے کا حصہ بھی دیا جائے گا۔ اور اس کا حصہ اس کے مالک کے لیے ہوگا۔ اور وہ گھوڑے کے لیے حصہ کا مستحق ہو جاتا ہے اگرچہ وہ کشتیوں میں ہوں اور غنیمت سمندر میں حاصل ہو، کیونکہ وہ خشکی کی طرف اترنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ فالتو اور رذیل لوگوں کے لیے غنائم میں کوئی حق نہیں جیسا کہ مزدور اور وہ کاریگر جو کاروبار کے لیے لشکر کے ساتھ ہو جاتے ہیں، کیونکہ نہ وہ جنگ کا قصد کرتے ہیں اور نہ مجاہدین بن کر نکلتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کو حصہ

دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: الغنیمة لمن شهد الواقعة (1) (جو جنگ میں حاضر ہوا اس کے لیے غنیمت ہے) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس بارے کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث اس کے بیان اور وضاحت کے لیے ہے جو عملاً جنگ میں شریک ہوا اور اس کی طرف نکلا اور جنگجو اور اہل معاش (تجار) مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا بیان کافی ہے اس حدیث سے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو الگ الگ فرقے قرار دیا ہے، ہر ایک کے لیے حکم اس کی حالت کے مطابق ہے، پس ارشاد فرمایا: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (المزمل: 20) "وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کرتے ہوں گے زمین میں تلاش کر رہے ہوں گے اللہ کے فضل (رزق حلال) کو اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے"۔

مگر یہ کہ جب یہ لوگ (تجار) جنگ میں شریک ہوں پھر ان کا اپنے کاروبار میں مشغول ہونا ان کے لیے ضرر رساں نہیں، کیونکہ اب مال غنیمت میں استحقاق کا سبب ان کی جانب سے پایا گیا ہے۔ اور اشہب نے کہا ہے: ان میں سے کوئی اس کا مستحق نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ قتال بھی کرے، اسی طرح ابن قصار نے اجیر (مزدور) کے بارے کہا ہے کہ اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا اگرچہ وہ عملاً جنگ میں شریک ہو۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کا رد کرتی ہے انہوں نے فرمایا: میں طلحہ بن عبید اللہ کے تابع تھا میں اس کے گھوڑے کو پانی پلاتا تھا اور اس پر کھریرا مارتا تھا اور اس کی خدمت کیا کرتا تھا اور اس کے کھانے میں سے کھالیتا تھا، الحدیث۔ اس میں ہے: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو حصے عطا فرمائے، ایک گھوڑ سوار کا حصہ اور ایک پیدل کا حصہ، پس آپ نے دونوں کو میرے لیے جمع کر دیا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن قصار اور جس نے اس کے قول کے مطابق قول کیا ہے اس نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، اور اس میں ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "یہ تین دینار اس کی دنیا اور آخرت کے معاملہ میں اس کی جنگ میں سے حصہ اور نصیب ہیں" (2)۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ رہے غلام اور عورتیں! تو صاحب کتاب کا مذہب یہ ہے کہ نہ ان کے لیے کوئی حصہ نکالا جائے گا اور نہ انہیں بچا کھچا سامان دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں بچا کچھا تھوڑا تھوڑا مال دے دیا جائے گا۔ اور جمہور علماء نے یہی کہا ہے۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر عورت نے عملاً قتال کیا تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کو حصص عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک مسلمانوں نے اسی سے اخذ کیا ہے۔ اور ہمارے اصحاب میں سے ابن حبیب بھی اسی قول کی طرف مائل ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نجدہ کی طرف اپنے خط میں لکھا: تو مجھ سے سوال کرتا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو جنگ میں ساتھ لے جاتے تھے؟ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں غزوہ میں ساتھ لے جاتے اور وہ زخمیوں کی مرہم پٹی علاج وغیرہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 440

2۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الجہاد، جلد 5، صفحہ 229۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتی تھیں اور انہیں مال غنیمت میں سے کچھ عطیہ دیا جاتا تھا اور رہا سہم (حصہ) تو وہ آپ نے انہیں نہیں دیا۔ اور جہاں تک بچوں کا تعلق ہے پس اگر وہ جنگ لڑنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ہمارے نزدیک اس بارے میں تین اقوال ہیں: سہم مقرر کرنا اور سہم کی نفی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے (بالغ ہونے سے پہلے اس کے لیے مال غنیمت سے سہم نہیں ہے) اس کی وجہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنا اس طرح کہ اگر وہ (بچہ) عملاً جنگ میں شریک ہو تو اس کے لیے حصہ نکالا جائے گا اور اگر اس نے قتال نہیں کیا تو پھر اس کے لیے حصہ نہیں ہو گا۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ بنی قریظہ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم ارشاد فرمایا تھا کہ ان میں سے ان بچوں کو قتل کر دیا جائے جن کے بال پھوٹے ہوئے ہیں اور انہیں چھوڑ دیا جائے جن کے بال ابھی تک نہیں نکلے۔ اور اس میں جنگ کی طاقت رکھنے کا لحاظ رکھا گیا ہے نہ کہ بالغ ہونے کا (1)۔ اور ابوعمر نے ''الاستیعاب'' میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انصار کے بچوں کو پیش کیا جاتا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے صاحب ادراک کو (لشکر کے ساتھ) ملا دیتے۔ تو ایک سال مجھے آپ پر پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو ملحق کر لیا اور مجھے رد کر دیا۔ تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اسے شامل کر لیا ہے اور مجھے واپس لوٹا دیا ہے، حالانکہ اگر وہ مجھ سے کشتی لڑے تو میں اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔ راوی کا بیان ہے: پس اس نے مجھ سے کشتی لڑی تو میں نے اسے پچھاڑ دیا نتیجتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی ملا لیا (2)۔ رہے غلام! تو ان کے لیے بھی نہ کوئی حصہ نکالا جائے گا اور انہیں حقیر سا مال دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 20۔** کافر جب امام وقت کی اجازت سے جنگ میں حاضر ہو اور وہ عملاً قتال بھی کرے تو ہمارے نزدیک اس کو حصہ دینے کے بارے میں تین اقوال ہیں: سہم دینا اور اس کی نفی کرنا۔ اس کے مطابق امام مالک اور ابن قاسم نے کہا ہے۔ ابن حبیب نے یہ زائد کہا ہے کہ ان کے لیے کوئی حصہ نہ ہو گا۔ اور تیسرے میں تفریق کی جاتی ہے۔ اور وہ سحنون کا ہے۔ (فرق اس قدر ہے) کہ اگر مسلمان ذاتی اعتبار سے مستقل اور طاقتور ہوں تو پھر کافر کو کوئی حصہ نہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ مستقل نہ ہوئے اور انہیں کافر کی مدد کی ضرورت اور حاجت ہوئی تو اسے حصہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ عملاً جنگ میں شریک نہ ہوا تو وہ کسی شے کا مستحق نہ ہو گا۔ اسی طرح آزاد آدمیوں کے ساتھ غلاموں کا حکم ہے۔ امام ثوری اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: انہیں کوئی حصہ نہ دیا جائے گا، البتہ انہیں بچا کھچا حقیر سا مال دے دیا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام وقت مطلق مال کے ساتھ انہیں اجرت پر لے سکتا ہے نہ کہ بعینہٖ تیرا مال اس کے لیے ہو گا۔ اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ انہیں دے دے۔ اور دوسرے مقام پر کہا ہے: وہ مشرکین کو بچا کھچا تھوڑا سا مال دے سکتا ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر قتال کریں۔ ابوعمر نے کہا ہے: تمام اس پر متفق ہیں کہ غلام ان افراد میں سے ہیں جن کی امان جائز ہوتی ہے، جب وہ قتال کرے تو اس کے لیے سہم نہیں ہو گا بلکہ اسے بچا کچا تھوڑا سا مال دے دیا جائے گا، پس کافر کے لیے بدرجہ اولیٰ یہ حکم ہو گا کہ اسے سہم نہیں دیا جائے گا۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی　　2۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 21۔** اگر غلام اور اہل ذمہ چوری کرنے کے لیے نکلے اور وہ اہل حرب کا مال لے کر آگئے تو وہ انہیں کا ہوگا، اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا، کیونکہ ان میں سے کوئی آیت کے عموم میں داخل نہیں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ اور نہ ہی کوئی عورت اس عموم میں داخل ہے۔ اور رہے کفار تو ان کا بغیر کسی اختلاف کے کوئی دخل نہیں ہے۔ اور سحنون نے کہا ہے: جو غلام کے قائم مقام ہوگا اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: خمس نکالا جائے گا، کیونکہ یہ جائز ہے کہ اس کا آقا اسے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے اور وہ دین کی خاطر جنگ لڑے، بخلاف کفار کے۔ اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: جب غلام اور ذمی لشکر سے نکلیں اور مال غنیمت لے آئیں تو وہ مال غنیمت ان کے سوا لشکر کے لیے بھی ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 22۔** سہم کے استحقاق کا سبب مسلمانوں کی مدد و نصرت کے لیے جنگ میں حاضر ہونا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس اگر کوئی جنگ کے آخر میں بھی شریک ہوگا تو وہ اس کا مستحق ہوگا۔ اور اگر کوئی جنگ ختم ہونے کے بعد حاضر ہوا تو وہ مال غنیمت میں سے سہم (حصہ) کا مستحق نہ ہوگا اور اگر وہ شکست خوردہ ہو کر غائب ہو گیا تو اس کا حکم بھی اسی طرح ہے۔ اور اگر وہ جماعت کے ساتھ ملنے کے ارادہ سے نکلا (تا کہ قوت کے ساتھ پلٹ کر آئے) تو اس کا استحقاق ساقط نہ ہوگا۔ امام بخاری اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہما نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابان بن سعید کو ایک سریہ پر مدینہ طیبہ سے نجد کی جانب بھیجا۔ تو حضرت ابان بن سعید اور ان کے ساتھی اسے فتح کرنے کے بعد خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آملے اور ان کے گھوڑوں کے تنگ (کھجور کی) چھال کے تھے۔ تو حضرت ابان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں تقسیم فرما دیجئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں تقسیم نہ کیجئے۔ تو حضرت ابان نے کہا: اے وبر (بلی کی مثل چھوٹا سا جانور) تو اس کے ساتھ بیری کے اوپر سے ہمارے اوپر نیچے اترا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے ابان بیٹھ جا" (1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تقسیم نہ فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 23۔** علماء کا ان کے بارے اختلاف ہے جو کوئی جنگ میں شریک ہونے کے لیے نکلا پھر کسی عذر نے اسے اس سے روک دیا جیسا کہ بیماری وغیرہ، اس کے سہم کے ثابت ہونے اور اس کی نفی میں تین قول ہیں: تیسرے میں فرق کیا گیا ہے اور وہی مشہور ہے۔ پس سہم اس کے لیے ثابت ہوگا اگر عذر کے سبب اس کا جنگ سے غائب ہونا جنگ شروع ہونے سے پہلے اور میدان جنگ میں داخل ہونے کے بعد ہو، اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ علامہ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ اور اگر اس کا غائب ہونا اس سے پہلے ہو تو وہ اس کے لیے سہم کی نفی کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ وہ آدمی جسے امیر لشکر نے لشکر سے ایسے کام کے لیے بھیجا جو لشکر کے لیے نفع بخش تھا اور وہ جنگ میں شریک ہونے کی بجائے اس میں مشغول رہا تو اس کے لیے سہم ہوگا۔ یہ ابن المواز نے کہا ہے، اور اسے ابن وہب اور ابن نافع نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ اس کے لیے سہم نہیں ہوگا بلکہ اسے بچا کچھا تھوڑا سا مال دیا جائے گا، کیونکہ وہ سبب معدوم ہے جس کے ساتھ وہ سہم کا مستحق ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 17
ایضاً، حدیث نمبر 2347، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشہب نے کہا ہے: قیدی کا حصہ دیا جائے گا اگرچہ وہ پڑوس میں ہو۔ اور صحیح قول یہ ہے کہ اسے حصہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے جنگ کے ساتھ حاصل ہونے والی ملک ضروری ہے۔ پس جو غائب ہوا یا حالت مرض میں حاضر ہوا تو وہ اس کی طرح ہے جو حاضر نہیں ہوا۔

**مسئلہ نمبر 24۔** جو مطلق غائب ہوا اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا اور رسول اللہ ﷺ نے یوم خیبر کے سوا کبھی بھی کسی غائب کو حصہ نہیں دیا، کیونکہ اس دن آپ ﷺ نے اہل حدیبیہ میں سے جو حاضر تھے اور جو غائب تھے سبھی کو ان کا حصہ دیا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے: وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا (الفتح:20) ' (اے غلامان مصطفیٰ!) اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم (اپنے اپنے وقت پر) حاصل کرو گے''۔ یہ موسیٰ بن عقبہ نے کہا ہے۔ اور سلف کی پوری جماعت سے یہ مروی ہے۔ اور بدر کے دن حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت عثمان، حضرت سعید بن زید اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کو حصہ عطا فرمایا حالانکہ وہ غائب تھے، پس وہ ان کی طرح تھے جو وہاں حاضر تھے ان شاء اللہ تعالیٰ، چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی رفیقہ حیات حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی وجہ سے ان کی تیمارداری کے لیے آپ ﷺ کے حکم سے پیچھے رہے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا لہٰذا وہ ان کی طرح ہوئے جو وہاں حاضر تھے۔ اور رہے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تو وہ تجارت کے لیے شام میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا۔ پس اس وجہ سے وہ اہل بدر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور رہے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تو وہ بھی شام میں غائب تھے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی ان کا حصہ اور اجر عطا فرمایا اور وہ بدری صحابہ کرام میں شمار ہوئے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جہاں تک اہل حدیبیہ کا تعلق ہے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ تھا اس کے ساتھ وہی لوگ مختص ہیں اور اس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں۔

حضرت عثمان، سعید اور طلحہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو خمس سے حصص عطا فرمائے ہوں، کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو کوئی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تو اس کے لیے سہم نہ ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ وہ حضرات عثمان، طلحہ اور سعید رضی اللہ عنہم کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا ان پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور بلاشبہ ان کا حصہ اصل مال غنیمت سے تھا ان تمام افراد کے حصص کی طرح جو وہاں حاضر تھے وہ خمس میں سے نہ تھا۔ یہی احادیث سے ظاہر ہے، واللہ اعلم۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بدر سے غائب ہوئے (اس کی وجہ یہ تھی) کیونکہ آپ کے نکاح میں حضور نبی رحمت ﷺ کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ''بے شک تمہارے لیے اس آدمی کا اجر اور حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر تھا'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 25۔** قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ زجاج نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے پس تم

1۔ صحیح بخاری، کتاب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 523

جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو (فاعلموا أن الله مولاكم إن كنتم) تو اس میں ان اس وعدہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک اِن قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ کے متعلق ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی صحیح ہے، کیونکہ قول تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا امر غنائم کے بارے میں اللہ کے حکم کی پیروی کرنے اور اس کو تسلیم کرنے کے معنی کو متضمن ہے، پس اس معنی کی بنا پر ان، واعلموا کے ساتھ معلق ہوا، یعنی اگر تم اللہ کے ساتھ ایمان رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرو اور اسے تسلیم کرو اس بارے میں جو مال غنیمت کے بارے میں، میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ اس میں ما محل جر میں ہے اور اس کا عطف اسم اللہ پر ہے۔ يَوْمَ الْفُرْقَانِ سے مراد وہ دن ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا گیا اور وہ غزوہ بدر کا دن ہے۔ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اس میں جمعان سے مراد ایک اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور دوسرا شیطان کا گروہ ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰي مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿42﴾

''جب تم وادی کے نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ (لشکر کفار) دور والے کنارہ پر تھا اور (تجارتی) قافلہ نیچے کی طرف تھا تم سے۔ اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو پیچھے رہ جاتے وقت مقرر سے لیکن (یہ بلا ارادہ جنگ اس لیے تھی) تا کہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا تا کہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ رہے جسے زندہ رہنا ہے دلیل سے اور بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى، أي أنزلنا إذ أنتم الخ یعنی ہم نے نازل کیے جب تم اس حالت پر تھے۔ یا معنی ہوگا اذکروا إذ أنتم (اور یاد کرو جب تم تھے) العدوة کا معنی ہے وادی کا کنارہ۔ اسے عین کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ضمہ کی صورت میں جمع عدی ہوگی اور کسرہ کی صورت میں جمع عدیٰ ہوگی جیسا کہ لحیة کی جمع لحی اور فرية کی جمع فری ہے۔ اور الدنيا، أدنى کی مونث ہے۔ اور القصوى، أقصى کی مونث ہے۔ یہ دَنَا يَدْنُو اور قَصَا يَقْصُو سے ہے اور کہا جاتا ہے: القصيا اس میں اصل واؤ ہے اور یہ اہل حجاز کی لغت کے مطابق قصویٰ ہے پس الدنيا سے مراد وادی کا وہ کنارہ ہے جو مدینہ طیبہ کی جانب ہے اور قصویٰ وہ ہے جو مکہ مکرمہ کی طرف ہے، یعنی جب تم مدینہ طیبہ کی طرف جانب قریب میں وادی کے کنارے اترے ہوئے تھے اور تمہارا دشمن دور کی جانب تھا۔

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ یعنی ابوسفیان وغیرہ کا تجارتی قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ وہ ایسی جگہ میں تھے جو ان سے ساحل سمندر کی جانب بہت نیچی تھی اور اس میں ساز و سامان تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اونٹ ہیں جو ان کا ساز و سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ اور وہ ایسی جگہ میں تھے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے محفوظ و مامون تھے (یعنی انہیں سامان کے

ضیاع کا کوئی اندیشہ اور خطرہ نہ تھا) پس الله تعالیٰ نے انہیں اپنی وہ نعمت یاد دلائی جوان پر فرمائی۔ الرَّكْبُ مبتدا ہے اور أَسْفَلَ مِنكُمْ ظرف محل خبر میں ہے۔ یعنی مکانا أسفل منكم۔ اور اخفش اور کسائی اور فراء نے وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ کو بھی جائز قرار دیا ہے أی أشدّ تسفلا منكم (یعنی قافلہ تم سے بہت زیادہ نیچے کی طرف تھا) اور الركب راکب کی جمع ہے۔ اور عرب صرف اونٹ سواروں کی جماعت کے لیے الرکب کا لفظ بولتے ہیں۔ ابن سکیت اور اکثر اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ راکب اور رکب صرف اسی کے لیے بولا جاتا ہے جو اونٹ پر ہو، جو گھوڑے یا کسی اور شے پر سوار ہو اس کے لیے راکب نہیں کہا جاتا اور الرکب والأرکب والرکبان اور الراکبون صرف وہ ہوتے ہیں جو اونٹوں پر سوار ہوں۔ یہ ابن فارس سے منقول ہے۔ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ یعنی ان کی کثرت اور تمہاری قلت کے سبب اتفاق نہ ہوسکتا، کیونکہ تم اگر ان کی کثرت اور زیادتی کو پہچان لیتے تو تم پیچھے ہٹ جاتے پس الله تعالیٰ نے تمہیں توفیق عطا فرمادی۔ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا تاکہ الله تعالیٰ مومنین کی مدد اور دین کو غالب کرنے کا وہ کام کر دکھائے جو ہو کر رہنا تھا۔ لِّيَقْضِيَ میں لام فعل محذوف سے متعلق ہے۔ اور اس کا معنی ہے: جمعهم ليقضي الله (انہیں جمع کیا تاکہ الله تعالیٰ وہ کام کر دکھائے) پھر اسے مکرر ذکر کیا اور فرمایا: لِّيَهْلِكَ، أی جمعهم هنالك ليقضي أمرا (انہیں وہاں جمع کیا تاکہ وہ کام پورا کر دے)

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ اس میں من محل رفع میں ہے۔ وَيَحْيَىٰ یہ لِّيَهْلِكَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور بَيِّنَةٍ کا معنی ہے حجت اور دلیل ختم کرنا، یعنی تاکہ وہ مر جائے جسے مرنا ہے ایسی حجت اور دلیل کے ساتھ جسے اس نے دیکھ لیا ہے اور ایسی عبرت کے ساتھ جس کا اس نے معائنہ کر لیا ہے، پس اس پر حجت قائم ہو جائے۔ اور اسی طرح زندہ رہے (دلیل کے ساتھ) جس نے زندہ رہنا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: تاکہ کفر کرے جس نے کفر کرنا ہے ایسی حجت اور دلیل کے بعد جو اس پر قائم ہو چکی ہے اور اس نے اس کا عذر ختم کر دیا ہے اور اسی طرح وہ ایمان لائے جس نے ایمان لانا ہے(1)۔ من حيي دو یا کے ساتھ اصل پر رکھتے ہوئے بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ایک یا مشددہ کے ساتھ بھی، پہلی اہل مدینہ، بزی اور ابوبکر کی قراءت ہے۔ اور دوسری باقیوں کی قراءت ہے اور یہی ابو عبید کی پسند ہے، کیونکہ یہ اسی طرح مصحف (عثمانی) میں واقع ہے۔

**إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾**

"یاد کرو جب دکھایا الله نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل۔ اور اگر دکھایا ہوتا آپ کو لشکر کفار کثیر تعداد میں تو ضرور تم لوگ ہمت ہار دیتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے اس معاملہ میں لیکن الله نے (تمہیں) بچا لیا، بے شک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے"۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب میں انہیں قلیل دیکھا اور پھر اسے اپنے اصحاب کے سامنے بیان فرمایا تو اس کے ساتھ الله تعالیٰ نے انہیں پختہ اور ثابت قدم کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منام سے مراد سونے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 636

کی جگہ ہے اور وہ معین ہے، یعنی آپ نے اپنے سونے کی جگہ میں انہیں قلیل دیکھا، پھر اس سے مضاف (لفظ موضع) حذف کر دیا گیا۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، لیکن پہلا عربی میں زیادہ جائز ہے، کیونکہ یہ ارشاد بھی ہے: وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ (الانفال: 44) تو اس سے اس پر دلیل ہے کہ یہ مقابلہ کے وقت کی رؤیت کا ذکر ہے اور وہ نیند کی رؤیت کا ذکر ہے۔ اور لَفَشِلْتُمْ کا معنی ہے تم جنگ سے بزدلی کا اظہار کرتے (ہمت ہار دیتے) وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ اور اس معاملے میں تمہارا اختلاف ہو جاتا۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ یعنی اللہ نے تمہیں مخالفت سے بچالیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس نے تمہیں بزدلی سے بچالیا۔ یہاں دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سَلَّمَ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا معاملہ کامیابی و فتح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

''اور یاد کرو جب اللہ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل اور قلیل کر دیا تمہیں ان کی نظروں میں تاکہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں سارے معاملات''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا یہ رؤیت حالت بیداری میں تھی۔ اور پہلی آیت میں بھی رؤیت کو بیداری کی حالت پر محمول کرنا جائز ہے جب آپ یہ کہیں کہ منام سے مراد سونے کی جگہ ہے اور وہ معین ہے، پس اس بنا پر پہلی رؤیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور یہ تمام کے لیے ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے بدر کے دن ایک آدمی کو کہا جو میرے پہلو میں تھا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: وہ تقریباً سو ہیں۔ پھر ہم نے ایک آدمی کو قید کیا تو ہم نے اس سے پوچھا: تم کتنے تھے؟ تو اس نے بتایا: ہم ہزار تھے (1)۔ وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ یہ صورت حال جنگ کی ابتداء میں تھی یہاں تک کہ ابوجہل نے اس دن کہا: یہ تو اونٹ کے گوشت کا ایک نوالا ہیں۔ تم انہیں مضبوطی سے پکڑ لو اور تم انہیں رسیوں کے ساتھ باندھ دو۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمان ان کی نظروں میں بڑھ گئے اور بہت زیادہ ہو گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ (آل عمران: 13) ''دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے''، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا اس کا تکرار ہے، کیونکہ پہلے میں معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مقابلے سے وہ کام کر دکھائے اور اس دوسرے میں ہے کہ مشرکین کے قتل اور دین کو غالب کر کے اللہ تعالیٰ وہ کام کر دکھائے۔ اور یہ مسلمانوں پر اتمام نعمت ہے۔ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یعنی امور کا انجام اور ان کا لوٹنا اسی کی طرف ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 637

تُفْلِحُوْنَ۝

''اے ایمان والو! جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً، فِئَةً سے مراد جماعت اور لشکر ہے۔ فَاثْبُتُوْا یہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے وقت ثابت قدم رہنے کا حکم ہے، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں ان کے مقابلے سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا ہے، پس امر اور نہی بالکل برابر برابر ملے ہوئے ہیں اور یہ دشمن کے مقابلے میں ٹھہرے رہنے اور اس کے لیے مضبوطی دکھانے پر تاکید ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اس ذکر کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) تم اپنے دلوں کی گھبراہٹ کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کیونکہ اس کا ذکر شدائد اور سختیوں میں ثبات اختیار کرنے پر معاون ہوتا ہے۔ (۲) تم اپنے دلوں کو مضبوط اور پختہ رکھو اور اپنی زبانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کیونکہ دل مقابلہ کے وقت پر سکون نہیں رہتے اور زبان مضطرب ہو جاتی ہے۔ پس ذکر کا حکم ارشاد فرمایا یہاں تک کہ دل یقین پر ثابت اور پختہ ہو جائے اور زبان ذکر پر ثابت ہو جائے اور وہ کچھ کہے جو اصحاب طالوت نے کہا: رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝ (البقرہ) ''اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر''۔

اور یہ حالت صرف قوت معرفت اور نور بصیرت کے ساتھ ہی حاصل ہو سکتی ہے اور یہی وہ شجاعت اور بہادری ہے جو لوگوں میں قابل تعریف ہے۔ (۳) یاد کرو اسے جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اس بارے میں کہ اس نے تمہارے نفسوں کو خریدا ہے اور اسے تمہارے لیے عوض بنایا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر قول یہ ہے کہ مراد زبان کا ذکر ہے جو دل کے موافق ہو۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر ذکر چھوڑنے کے بارے میں کسی کو رخصت دی جاتی تو حضرت زکریا علیہ السلام کو رخصت دی جاتی۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا (آل عمران: 41) ''کہ نہ بات کر سکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت) اور اس آدمی کو رخصت دی جاتی جو جنگ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اور اس نے انہیں تلواروں کے ساتھ جنگ لڑتے وقت بھی اس میں مشغول رکھا ہے۔ اور اس ذکر کا حکم یہ ہے کہ وہ خفی ہو، کیونکہ جنگ کے مقامات میں آواز کو بلند کرنا ردی اور مکروہ ہے جب کہ ذکر کرنے والا ایک ہو، لیکن حملہ کے وقت جب ذکر کرنے والی جماعت ہو تو (آواز بلند کرنا) اچھا ہے، کیونکہ یہ دشمن کی قوت کو توڑ دیتا ہے۔ اور ابو داؤد نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جنگ کے وقت آواز بلند کرنا ناپسند کرتے تھے۔

ابو بردہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جنگ کے وقت ناک اور منہ پر کپڑا لپیٹنا مکروہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی وجہ سے سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں نے جنگ کے وقت ناک اور منہ پر کپڑا نہ لپیٹنے کا طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ وہ اس قول پر عمل پیرا ہو سکیں۔ واللہ اعلم

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۚ﴿۴۶﴾

''اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی۔ اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور اکھڑ جائے گی تمہاری ہوا اور (ہر مصیبت میں) صبر کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا یہ ان کے لیے وصیت پر استمرار ہے اور بدر کے معاملہ میں ان کے اختلاف اور ان کے تنازع کی صورت میں ان کے ہاتھوں کو پکڑتا ہے۔ فَتَفْشَلُوْا یہ فا کے سبب منصوب ہے اور جواب نہی ہے۔ سیبویہ فا کے حذف اور جزم دینے کی اجازت نہیں دیتے لیکن کسائی نے اس کی اجازت دی ہے۔ شین کے کسرہ کے ساتھ تفشلوا بھی پڑھا گیا ہے لیکن یہ غیر معروف ہے۔ وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ یعنی تمہاری قوت اور تمہاری مدد و نصرت ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ ایسے ہی ہے) جیسے تو کہتا ہے: الریح لفلان (ہوا تو فلاں کے لیے ہے) جب وہ امر میں غالب ہو۔ شاعر نے کہا ہے:

إذا هبّت رياحك فاغتنمها فإنّ لكلّ خافقة سكون

تو اس میں ریح اور ریاح سے مراد قوت اور مدد و نصرت ہی ہے۔

حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: بے شک کبھی بھی مدد و نصرت حاصل نہیں ہوتی مگر ہوا کے ساتھ جو چلتی ہے اور کفار کے مونہوں پر جا لگتی ہے۔ اس معنی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: نُصِرتُ بالصبا وأهلكت عادٌ بالدبور(1) ''میری باد صبا (مشرق سے چلنے والی ہوا) کے ساتھ مدد کی گئی اور عاد کو دبور (مغرب سے آنے والی ہوا) کے ساتھ ہلاک کیا گیا''۔ حکم نے کہا ہے: وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ یعنی تمہاری باد صبا چلی جائے گی، جب کہ اس کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی مدد کی گئی ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی ہوا اکھڑ گئی جب احد کے دن وہ آپس میں جھگڑ پڑے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ یہ صبر کے بارے حکم ہے اور یہ تمام مقامات میں قابل تعریف ہے بالخصوص میدان جنگ میں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۴۷﴾

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 638

''اور (دیکھو!) نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور (محض) لوگوں کے دکھلاوے کے لیے اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے (اپنے علم اور قدرت سے) گھیرے ہوئے ہے''۔

اس میں مراد ابوجہل اور اس کے وہ ساتھی ہیں جو بدر کے دن قافلے کی مدد و نصرت کے لیے نکلے تھے۔ وہ دوشیزاؤں گانا گانے والیوں اور آلات موسیقی کو ساتھ لے کر نکلے تھے۔ جب وہ جحفہ کے مقام پر پہنچے تو خفاف کنانی جو کہ ابوجہل کا دوست تھا اس نے اپنے بیٹے کے ہمراہ تحائف اور ہدایا اس کی طرف بھیجے اور کہلا بھیجا: اگر تو چاہے تو میں مردوں کے ساتھ تیری امداد کروں اور اگر چاہے تو میں بذات خود اپنی قوم کے اونٹوں سمیت تیری امداد کو آ جاؤں۔ تو ابوجہل نے کہا: اگر ہماری جنگ اللہ تعالیٰ سے ہوئی جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) گمان کرتے ہیں، تو قسم بخدا! ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کی کوئی طاقت نہیں۔ اور اگر ہماری جنگ لوگوں سے ہوئی تو قسم بخدا! ہمارے پاس لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے قوت اور طاقت ہے۔ قسم بخدا! ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کیے بغیر واپس نہیں لوٹیں گے بلکہ ہم بدر میں اتریں گے اور وہاں شراب پئیں گے، دوشیزائیں آلات موسیقی بجا کر ہمارے اوپر گیت پیش کریں گی، کیونکہ عرب کے میلوں میں سے بدر ایک میلہ ہے اور ان کی منڈیوں میں سے ایک منڈی ہے، یہاں تک کہ عرب ہمارے نکلنے کے بارے سن لیں گے اور پھر ہمیشہ تک ہم سے ڈرتے رہیں گے۔ پس وہ بدر میں جا اترے لیکن ان کی ہلاکت و بربادی میں سے جو ہوا سو ہوا۔ لغت میں البطر سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ اور جو اللہ تعالیٰ نے اسے عافیت عطا فرمائی ہے اس سے معاصی اور گناہ پر قوت حاصل کرنا ہے یہ مصدر ہے اور حال کے محل میں ہے۔ أی خرجوا بطرین مراءین صادین (یعنی وہ نکلے اس حال میں کہ اترانے والے تھے، ریاکاری کرنے والے تھے، روکنے والے تھے) اور ان کے روکنے سے مراد لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔

وَ اِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۟

''اور یاد کرو جب آراستہ کر دیئے ان کے لیے شیطان نے ان کے اعمال اور (انہیں) کہا کہ کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر آج ان لوگوں میں سے اور میں نگہبان ہوں تمہارا تو جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا میں بری الذمہ ہوں تم سے میں دیکھ رہا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھ رہے، میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

روایت ہے کہ اس دن شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں ان کے پاس آیا اور سراقہ بن بکر بنی کنانہ میں سے تھا، اور قریش بنی بکر کے بارے خوف رکھتے تھے کہ کہیں وہ ان کے پاس ان کے پیچھے آ جائیں، کیونکہ انہوں نے ان کا ایک

آدمی قتل کیا ہوا تھا۔ پس جب وہ اس شکل میں ان کے پاس آیا تو کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اسے کوئی خبر نہیں دی۔

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: غزوہ بدر کے دن ابلیس اپنے جھنڈے اور اپنے لشکر کے ساتھ ان کے پاس آیا اور ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ ہرگز شکست نہیں دیئے جاسکیں گے اور وہ اپنے آباء کے دین پر لڑ رہے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی ہزار ملائکہ کے ساتھ امداد فرمائی۔ پس حضرت جبرئیل امین علیہ السلام پانچ سو ملائکہ کے ساتھ ایک طرف (میمنہ) میں تھے اور پانچ سو ملائکہ کے ساتھ حضرت میکائیل علیہ السلام ایک طرف (میسرہ) میں تھے اور ابلیس شیاطین کے لشکر میں آیا اور ان کے ساتھ بنی مدلج کے لوگوں کی صورت میں دستہ تھا اور شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت میں تھا۔ اور شیطان نے مشرکین کو کہا: آج کے دن لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارا نگہبان ہوں۔ پس جب قوم نے صفیں بنالیں تو ابوجہل نے کہا: اے اللہ ہم میں سے جو حق کے زیادہ قریب ہے اس کی مدد فرما۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک بلند کیا اور عرض کی یا رب إنك إن تُهلك هذه العصابةُ فلن تُعبد في الأرض أبدًا (1) (اے میرے پروردگار! اگر یہ جماعت ہلاک کر دی گئی، تو پھر ہمیشہ کے لیے زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی) تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ''مٹی کی ایک مشت اٹھایئے''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشت مٹی لی اور اسے ان کے چہروں پر پھینک دیا۔ اور مشرکین میں سے کوئی بھی نہ تھا مگر اس کی آنکھوں، نتھنوں اور اس کے منہ میں وہ مٹی پہنچی۔ تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ابلیس کی طرف آئے پس جونہی اس نے آپ کو دیکھا وہ مشرکین میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے تھا ابلیس نے اپنا ہاتھ کھینچا اور پھر وہ اور اس کا گروہ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: اے سراقہ! کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ تو ہمارا نگہبان اور محافظ ہے؟ اس نے جواب دیا: بے شک میں تم سے بری الذمہ ہوں بے شک میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ اسے بیہقی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور موطا میں امام مالک نے ابراہیم بن ابی عبلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبیداللہ بن کریز سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان نے اپنے آپ کو یوم عرفہ سے بڑھ کر کسی دن بھی زیادہ ذلیل، حقیر، دھتکارہ ہوا اور غیظ وغضب کی حالت میں نہیں دیکھا اور ایسا نہیں ہوا مگر تب جب اس نے رحمت کے نزول کو دیکھا اور بڑے بڑے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کے درگزر کرنے کو دیکھا۔ مگر جتنا اس نے بدر کے دن (اپنے آپ کو ذلیل ورسوا دیکھا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کے دن اس نے کیا دیکھا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اس نے حضرت جبریل امین کو دیکھا کہ وہ ملائکہ کو منظم و مرتب فرما رہے ہیں'' (2)۔ نکص کا معنی لغت سلیم کے مطابق رجع (لوٹا ہے)۔ یہ مؤرج وغیرہ سے منقول ہے۔ اور شاعر نے بھی کہا ہے:

لیس النکوصُ علی الأدبار مَکرمۃً إن المکارم إقدامٌ علی الأسَل

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2 2۔ اوجز المسالک الی موطا امام مالک، کتاب الحج، جلد 8، صفحہ 238

وما ينفع المستأخرين نكوصهم　　ولا ضرّ أهل السابقات التقدمُ

یہاں الٹے پاؤں لوٹنا مراد نہیں بلکہ فرار ہونا مراد ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''جب وہ اذان کی آواز سنتا ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے (1) اور اس کی ہوا خارج ہو رہی ہوتی ہے''۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ کہا گیا ہے: ابلیس کو خوف لاحق ہوا کہ یوم بدر ہی وہ دن ہو (جس کے بارے کہا گیا) کہ اس کی طرف دیکھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ابلیس نے اپنے اس قول میں جھوٹ بولا ہے: اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ (کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں) لیکن اسے یہ علم تھا کہ اس کے پاس کوئی قوت و طاقت نہیں۔ اور جار کی جمع اجوار اور جیران لائی جاتی ہے۔ اور قلیل طور پر جیرۃ بھی آئی ہے۔

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُهُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

''یاد کرو جب کہہ رہے تھے منافق اور وہ جن کے دلوں میں (شک کا) روگ تھا کہ مغرور کر دیا ہے انہیں ان کے دین نے۔ اور جو شخص بھروسہ کرتا ہے اللہ پر تو بے شک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے''۔

کہا گیا ہے: منافق وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپائے رکھا۔ اور وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ سے مراد شک کرنے والے ہیں اور وہ منافقین کے سوا تھے، کیونکہ ابھی وہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کی نیتیں کمزور اور ضعیف تھیں۔ انہوں نے قتال کی طرف نکلتے وقت اور مقابلے کے لیے صفیں باندھتے وقت کہا: غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُهُمۡ ''انہیں ان کے دین نے مغرور کر دیا''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں سے مراد ایک ہی قسم ہے۔ اور یہی اولیٰ ہے، کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (البقرہ:3) پھر فرمایا: وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ (البقرہ:4) اور ان دونوں سے مراد ایک ہی قسم کے لوگ ہیں۔

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِکَةُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۵۱﴾

''اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر اور (کہتے ہیں) چکھو آگ کا عذاب۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور اللہ تعالیٰ ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے (اپنے) بندوں پر''۔

کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ لیے ہیں جو باقی بچے اور بدر کے دن مارے نہ گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے بارے میں ہے جو بدر میں قتل کر دیئے گئے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے، اس کی تقدیر عبارت یہ ہے: لرأيت أمرا عظيما ''اگر تو دیکھے

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 398

جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے ...... تو تو امر عظیم کو دیکھتا"۔ یَضْرِبُوْنَ یہ حال کے محل میں ہے۔ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ "اس حال میں کہ وہ مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر"۔ یعنی ان کی سرینوں پر، کنایۃً اسے ادبار کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: اَدْبَارَهُمْ سے مراد ان کی پشتیں ہیں اور کہا: بے شک کسی آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بے شک میں نے ابوجہل کی پیٹھ پر (جوتے کے) تسمے کی مثل دیکھا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ ملائکہ کی ضرب تھی" (1)۔ اور کہا گیا ہے: یہ ضرب موت کے وقت لگتی ہے۔ اور کبھی یہ قیامت کے دن لگے گی جس وقت وہ انہیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ویقولون ذُوقوا اور وہ کہتے ہیں: چکھو۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ قیامت کے دن ہوگا، انہیں جہنم پر مقرر فرشتے کہیں گے: تم آگ کا عذاب چکھو۔

اور یہ روایت ہے کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ ملائکہ کے پاس لوہے کے بھاری گرز ہیں جب بھی وہ ان کے ساتھ مارتے ہیں تو زخموں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پس اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ "اور چکھو آگ کا عذاب" اور ذوق محسوسا بھی ہوتا ہے اور معنیً بھی۔ اور کبھی اسے ابتلا اور امتحان کی جگہ رکھا جاتا ہے، جیسے تو کہتا ہے: ارکب هذا الفرس فذقه (تو اس گھوڑے پر سوار ہو اور اسے چکھ (یعنی اسے آزما)) اور أنظر فلانا فذق ما عنده (تو فلاں کی طرف دیکھ اور جو اس کے پاس ہے اسے چکھ یعنی اس کا امتحان لے) شماخ نے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فذاق فأعطته من اللِّين جانبا كفَى ولها ان يُغرِقَ السهمَ حاجزُ

اور اس کا اصل معنی منہ کے ساتھ کسی شے کو چکھنا ہے۔

ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے، یعنی الأمر ذالك یا ذالك جزاء كم (یہ تمہاری جزا اور بدلہ ہے) بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ ان کا جو گناہ تم نے کیے ہیں۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ جب اس نے راستہ واضح کر دیا ہے اور رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا ہے، تو پھر تم نے اس کا خلاف کیوں کیا ہے؟ اس میں ان محل جر میں ہے اس کا عطف ما پر ہے اور اگر چاہے تو اسے نصب دے لے، یعنی یہ بمعنی بان اور پھر با کو حذف کر دیا گیا یا بمعنی و ذالك أن الله هو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذالك پر عطف نسق کرتے ہوئے محل رفع میں ہو۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

"جیسے دستور تھا فرعونیوں کا اور جو (زبردست) لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے کفر کیا آیات الٰہی کے ساتھ تو پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے باعث، بے شک اللہ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے"۔

كَدَاْبِ کا معنی عادت اور دستور ہے۔ اور یہ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے، یعنی انہیں ارواح کو قبض کرنے کے

1۔ دلائل النبوۃ، باب سياق قصة بدر، جلد 3، صفحہ 116

وقت اور قبروں میں عذاب دینے کی عادت اور دستور فرعونیوں کی عادت اور دستور کی طرح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے انہیں قتل اور قید کے ساتھ بدلہ دیا گیا ہے جیسے فرعونیوں کو غرق کے ساتھ بدلہ دیا گیا، یعنی ان کا دستور فرعونیوں کے دستور کی طرح ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٣﴾

''یہ اس لیے کہ الله نہیں بدلنے والا کسی نعمت کو جس کا انعام اس نے فرمایا ہو کسی قوم پر یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہی اپنے آپ کو اور بے شک الله تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

یہ علت بیان ہو رہی ہے یعنی یہ سزا اس لیے ہے کہ انہوں نے تبدیل کر دیا اور بدل ڈالا اور قریش پر الله تعالیٰ کا انعام شادابی، خوشحالی اور امن و عافیت کی صورت میں تھا، (جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ الآیہ (العنکبوت: 67) ''کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے''۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان پر الله تعالیٰ کا عظیم انعام حضور نبی مکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی تو انہوں نے آپ کا انکار کیا اور کفر کا ارتکاب کیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے اور مشرکین پر سزا و عذاب نازل ہوا (1)۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٥٤﴾

''(کفار مکہ کا طرز عمل بھی) فرعونیوں اور ان (سرکشوں) کا سا ہے جو پہلے گزر چکے، انہوں نے جھٹلایا اپنے رب کی آیتوں کو پس ہم نے ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے اور ہم نے غرق کر دیا فرعونیوں کو اور (وہ) سبھی کے سب ظالم تھے''۔

یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ پہلی آیت تکذیب اور جھٹلانے میں عادت اور دستور کے بارے ہے اور دوسری تغییر میں عادت کے بارے ہے اور باقی آیت بالکل واضح اور مبین ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٥﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾

''بلاشبہ بدترین جانور الله کے نزدیک وہ انسان ہیں جنہوں نے کفر کیا پس وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے۔ وہ جن سے (کئی بار) آپ نے معاہدہ کیا پھر وہ توڑتے رہے اپنا عہد ہر بار اور وہ (عہد شکنی سے) ذرا نہیں

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 643

**مسئلہ نمبر 2**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر یہ کہا جائے کہ خیانت کے خوف کے ساتھ معاہدہ توڑنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، حالانکہ خوف ظن ہے جس کے ساتھ یقین نہیں ہے، تو عہد کا یقین خیانت کے ظن کے ساتھ کیسے ساقط ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب دو اعتبار سے ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ خوف کبھی یقین کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ رجاء (امید) علم (یقین) کے معنی میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح) (تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم پرواہ نہیں کرتے اللہ کی عظمت و جلال کی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب خیانت کے آثار ظاہر ہوجائیں اور اس کے دلائل ثابت ہوجائیں، تو معاہدہ کو توڑنا واجب ہوجاتا ہے تاکہ اس پر سرکشی کرنے والا ہلاکت میں نہ واقع کردے اور اس حالت میں ضرورۃً یقین کو ساقط کرنا جائز ہے(1)۔ اور رہی یہ صورت کہ جب یقینی علم حاصل ہوجائے تو پھر وہ ان کے پاس معاہدہ توڑنے کی اطلاع سے مستغنی ہوجاتا ہے، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال اہل مکہ کی طرف چل پڑے، جب ان کی طرف سے معاہدہ توڑنے کی خبر مشہور ہوگئی، بغیر اس کے کہ آپ انہیں معاہدہ توڑنے کی اطلاع کرتے۔ النبذ کا معنی پھینکنا (الرمی) اور چھوڑنا (الرفض) ہے۔

اور ازہری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے جب تو کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کرے تو تجھے ان کے بارے میں معاہدہ توڑنے کا علم ہوجائے تو تو معاہدہ توڑنے سے پہلے ان پر حملہ نہ کر، یہاں تک کہ تو ان سے ملے اس حال میں کہ تو معاہدہ اور باہمی وعدہ توڑ چکا ہو، تاکہ وہ معاہدہ توڑنے کے علم میں برابر ہوجائیں، پھر ان پر حملہ کردے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قرآن کریم کی ان آیات میں سے ہے جس کی مثل الفاظ کے اعتبار سے مختصر اور معانی کے اعتبار سے کثیر کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اور اس کا معنی ہے: اگر تمہیں اس قوم کے بارے میں خیانت کا اندیشہ ہو کہ جس قوم اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو تو ان کا معاہدہ توڑ دو، یعنی انہیں کہہ دو تحقیق میں نے تمہارا عہد توڑ دیا ہے اور میں تمہارے ساتھ جنگ کروں گا، تاکہ انہیں اس کا علم ہوجائے پس وہ تمہارے ساتھ علم میں برابر ہوجائیں گے اور تم ان سے قتال نہ کرو اس حال میں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور وہ تمہارے ساتھ یقین رکھتے ہوں، کیونکہ یہ خیانت اور غدر (دھوکہ) ہوجائے گا۔ پھر اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ بیان کیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

میں (مفسر) کہتا ہوں: معاہدہ توڑنے کے بارے میں جو ازہری اور نحاس نے ذکر کیا ہے کہ اس کے ٹوٹنے کا علم ہونا چاہیے فتح مکہ کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اسے رد کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے جب معاہدہ توڑا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ فرمایا: اللّٰھم اقطع خبرنا عنھم (2) (اے اللہ! ان کی جانب سے خبر کو یقین بنا دے) اور ان پر حملہ کردیا۔ اور یہ بھی آیت کا معنی ہے، کیونکہ ان کی طرف سے عہد توڑنے کے بارے میں (اطلاع ہونا) اور اس کا علم رکھتے ہوئے عہد کو توڑ دینا ان کی طرف سے عہد توڑنا ہی ہے اور ان کے ساتھ یہ مساوات اور عدل ہے، البتہ ان کی جانب سے علم نہ ہونے کے باوجود عہد کو توڑنا نہ یہ حلال ہے اور نہ ہی جائز۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 871 2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 113

ترمذی اور ابوداؤد نے سلیم بن عامر سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا اور آپ ان کے شہروں کی طرف چلتے رہے تاکہ قریب ہوجائیں یہاں تک کہ جب معاہدہ (کی مدت) ختم ہوگئی تو ان پر حملہ کردیا، تو اتنے میں گھوڑے یا ترکی گھوڑے پر سوار ہوکر ایک آدمی آیا اور وہ کہنے لگا: اللہ اکبر، اللہ اکبر (وعدہ وفا کرو، خیانت نہ کرو) پس انہوں نے اسے دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنی طرف بلا بھیجا اور ان سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''وہ آدمی جس کے اور اس کی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو وہ گرہ کو نہ مضبوط کرے اور نہ اسے کھولے یہاں تک کہ اس کی مدت گزر جائے یا برابری کی بنیاد پر ان سے وعدہ توڑے'' (1)۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس میں السواء کا معنی مساوات اور اعتدال ہے۔

اور راجز کا قول ہے:

فاضربْ وجوهَ الغدّرِ الأعداءِ حتى يجيبوكَ إلى السَّوَاءِ

اس میں سواء کا لفظ مساوات کے معنی میں ہے۔

اور کسائی نے کہا ہے: سواء کا معنی عدل ہے اور کبھی یہ بمعنی وسط (درمیان) بھی ہوتا ہے اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِي سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ (الصافات) (جہنم کے وسط میں)

اور اسی معنی میں حسان کا قول ہے:

يا وَيْحَ أصحابِ النبيّ ورهطِه بعد المغيَّبِ في سواء المُلْحَدِ

فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ پس اعلانیہ ان سے وعدہ توڑ دو نہ کہ سراً۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام مسلم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن ہر خیانت کرنے والے کے لیے جھنڈا ہوگا وہ اس کے لیے اس کی خیانت اور وعدہ خلافی کی مقدار سے بلند کیا جائے گا اور امیر عام (سلطان وقت) سے بڑھ کر خیانت کرنے والا کوئی نہ ہوگا'' (2)۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: امام وقت کے حق میں غدر اور خیانت کسی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اور فحش ترین ہے کیونکہ اس میں فساد اور بگاڑ زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ جب یہ خیانت کریں اور ان کی طرف سے یہ معلوم ہوجائے اور وہ معاہدہ نہ توڑیں تو پھر دشمن کو ان کے کسی عہد اور صلح پر اعتماد اور امن نہیں ہوگا، نتیجۃً اس کی قوت و طاقت سخت اور مضبوط ہوجائے گی اور اس کا ضرر و نقصان بڑھ جائے گا اور یہ دین میں داخل ہونے سے متنفر کردے گا اور ائمہ مسلمین کی مذمت کا موجب ہوگا۔ لیکن

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 191

ایضاً، حدیث نمبر 1506، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 83

جب دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر چاہیے کہ اس کے خلاف ہر حیلہ استعمال کرے اور ہر چال اس پر آزمائے۔ اور اس پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ابھارتا ہے: الحرب خدعة (1) (جنگ تو حیلہ اور چال ہے) اور علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ معاہدہ توڑنے والے امام کی معیت میں جہاد کیا جائے گا؟ تو اس بارے دو قول ہیں: اکثر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی معیت میں قتال نہیں کیا جائے گا، بخلاف خائن (خیانت کرنے والا) اور فاسق کے۔ اور بعض نے کہا کہ اس کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے گا۔ یہ دونوں قول ہمارے مذہب میں ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝

''اور ہرگز نہ خیال کریں کافر کہ وہ بچ کر نکل گئے یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا یعنی وہ واقعہ بدر سے بچ گئے اور حیات کی طرف نکل گئے۔ پھر نیا کلام فرمایا اور ارشاد فرمایا: اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ بے شک وہ دنیا میں عاجز نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان پر فتح و کامرانی عطا فرما دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد آخرت میں عاجز نہ کر سکنا ہے۔ اور یہی حسن کا قول ہے۔ ابن عامر، حفص اور حمزہ نے يَحْسَبَنَّ یا کے ساتھ اور باقیوں نے تا کے ساتھ قراءت کی ہے، اس بنا پر کہ فعل میں ضمیر فاعل ہو۔ اور الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مفعول اوّل ہو۔ اور سَبَقُوْا مفعول ثانی ہو۔ اور رہی یا کی قرات تو اس کے بارے نحویوں کی ایک جماعت جن میں سے ابو حاتم بھی ہیں، کا خیال ہے کہ یہ غلطی (لحن) ہے اس کے ساتھ قراءت جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے وسعت ہے جو اعراب کو جانتا ہے یا اسے پہچان کرادی جائے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: کیونکہ يَحْسَبَنَّ مفعول کے ساتھ مذکور نہیں حالانکہ وہ دو مفعولوں کا محتاج ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ انتہائی تکلیف دہ بات ہے، قراءت جائز ہے اور معنی یہ ہوگا: ولا یحسبن من خلفهم الذین کفروا سبقوا ''یعنی پیچھے رہ جانے والے کافر گمان نہ کریں وہ بچ کر نکل گئے''۔ پس ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے جو پہلے گزر چکا، مگر تا کے ساتھ قراءت کرنا زیادہ بین اور واضح ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اس میں یہ احتمال ہے کہ فعل میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو اور الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا دو مفعول ہوں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الذین کفروا فاعل ہو اور مفعول اوّل محذوف ہو۔

اس کا معنی ہوگا: ولا یحسبن الذین کفروا انفسهم سبقوا'' کافر اپنے بارے میں یہ گمان نہ کریں وہ بچ کر نکل گئے''۔

مکی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ سبقوا کے ساتھ ان مضمر ہو اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہو جائے اور تقدیر عبارت اس طرح ہو: ولا یحسبن الذین کفروا أن سبقوا پس یہ اس ارشاد کی مثل ہوا: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا (العنکبوت: 2) اس میں کہ أن قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

ابن عامر نے اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ میں ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم اور ابو عبید نے اس قراءت کو مستبعد قرار دیا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: یہ اس بنا پر جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: ولا تحسبن الذین کفروا انهم لا یعجزون۔ نحاس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 83

کہا ہے: جو کچھ ابو عبید نے ذکر کیا ہے بصری نحویوں کے نزدیک وہ جائز نہیں، (کیونکہ) حسبت زیدا أنه خارج کہنا جائز نہیں مگر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ (جائز ہے)

اور بلاشبہ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ مبتدا کے محل میں ہے، جیسے تو کہتا ہے: حسبت زیدا، أبوہ خارج، اور اگر آپ فتحہ دیں تو معنی ہوگا حسبتُ زیدا خروجہ اور یہ محال ہے اور اس میں یہ بعد بھی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے ساتھ معنی کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں، مگر یہ کہ لاکو زائدہ بنایا جائے اور کتاب اللہ میں کسی حرف کو قابل تسلیم حجت کے بغیر تطول اور زیادت کی طرف پھیرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور قرات جید یہ ہے کہ معنی اس طرح ہو: لأنھم لا یعجزون (کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کرسکتے۔) مکی نے کہا ہے: پس معنی یہ ہے: لا یحسبن الکفار أنفسھم فاتوا لانھم لا یعجزون ای لا یفوتون (کفار اپنے بارے میں یہ گمان نہ کریں کہ وہ بچ گئے کیونکہ وہ بچ نہیں سکتے) پس أن لام کے حذف کے ساتھ نصب کے محل میں ہے یا لام کے عمل کرنے کی صورت میں محل جر میں ہے، کیونکہ انکے ساتھ ان کا حذف کثرت سے پایا جاتا ہے اور یہی خلیل اور کسائی سے روایت کیا گیا ہے۔ اور باقیوں نے ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ماقبل سے منقطع ہے اور یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اس میں تاکید کا معنی ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا موقف یہی ہے۔

اور ابن محیصن سے روایت ہے کہ انہوں نے لا یعجّزون تشدید اور نون کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ دو وجہوں سے غلط ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عجزہ کا معنی ہے ضعفه و ضعف أمرہ (کسی کو کمزور کردینا اور کسی کے کام کو کمزور کردینا) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا دونوں کے ساتھ ہونا واجب ہے۔ اور أعجزہ کا معنی ہے سبقه و فاته حتی لم یقدر علیه (کسی سے بچ نکلنا اور مفقود ہوجانا یہاں تک کہ وہ اس پر قادر نہ ہوسکے)

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰

''اور تیار رکھو ان کے لیے جتنی استطاعت رکھتے ہو قوت و طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے تاکہ تم خوفزدہ کردو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور دوسرے لوگوں کو ان کھلے دشمنوں کے علاوہ تم نہیں جانتے ہو انہیں (البتہ) اللہ جانتا ہے انہیں اور جو چیز خرچ کرو گے راہ خدا میں اس کا اجر پورا پورا دیا جائے گا تمہیں اور (کسی طرح) تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو دشمنوں کے لیے قوت و طاقت تیار رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے بعد اس کے کہ پہلے تقویٰ کی تاکید فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو وہ انہیں محض کلام کے ساتھ، ان کے چہروں پر تھوکنے کے ساتھ اور مٹی کی ایک مشت ان پر ڈالنے کے ساتھ شکست اور ہزیمت سے دوچار کردے جیسا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا لیکن اس نے چاہا کہ وہ بعض لوگوں کو ایسی بعض چیزوں کے ساتھ آزمائے جو پہلے سے اس کے علم میں ہیں اور اس کی قضاوقدر ان میں نافذ ہے۔ جب بھی خیر اور نیکی میں سے کوئی شے تو اپنے دوست کے لیے یا شر اور تکلیف میں سے کوئی اپنے دشمن کے لیے تیار کرے گا تو وہ تیری اس تیاری میں داخل ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں قوت سے مراد ہتھیار اور قوسیں ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اس حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے: ''اور تم ان کے لیے تیار رکھو قوت و طاقت میں سے جتنی استطاعت رکھتے ہو خبر دار سنو! بے شک قوت تیر پھینکنا ہے، خبر دار سنو! بے شک قوت تیر مارنا ہے، خبر دار سنو! بے شک قوت تیر پھینکنا ہے'' (1)۔ یہ نص ہے جسے حضرت عقبہ سے ابوعلی ثمامۃ بن شفی ہمدانی نے روایت کیا ہے اور ان کی صحیح میں اس کے سوا (کوئی روایت) نہیں ہے۔

اور رمی کے بارے میں حضرت عقبہ سے ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''عنقریب تم پر زمین فتح کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ تمہیں کافی ہوگا پس چاہیے کہ تم میں سے کوئی اپنے تیروں کے ساتھ کھیلنے (یعنی انہیں چلانے) سے عاجز نہ ہو'' (2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر شے جس کے ساتھ آدمی کھیلتا ہے وہ باطل ہے سوائے اپنی قوس کے ساتھ تیر اندازی کرنے کے، اپنے گھوڑے کو ادب سکھانے (یعنی اسے سدھارنے کے) اور اس کے اپنی بیوی کے ساتھ کھیلنے (اور اظہار محبت کرنے) کے، کیونکہ یہ حق ہے'' (3)۔ اس کا معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہر وہ شے جس کے ساتھ آدمی کھیلتا ہے اور وہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی فائدہ نہ دے تو وہ باطل ہے اور اس سے اعراض کرنا، بچنا اولیٰ ہے۔ اور یہ تینوں امور ہیں کہ اگر آدمی انہیں اس ارادہ پر کرتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ کھیلے اور چست اور ہشاش بشاش ہو تو یہ حق اور درست ہیں کیونکہ ان کا اتصال نفع بخش اور مفید چیز کے ساتھ ہے، کیونکہ قوس کے ساتھ تیر اندازی کرنا اور گھوڑے کی تادیب بھی امور جنگ میں معاون و مددگار ہیں۔ اور اہلیہ کے ساتھ کھیلنا اور محبت کا اظہار کرنا اس امر تک پہنچاتا ہے کہ اس سے ایسا بچہ پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے گا اور اس کی عبادت کرے گا۔ پس اس حیثیت سے یہ تینوں امور حق اور صحیح ہیں۔

سنن ابی داؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ساتھ تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا ایک اسے بنانے والا جو اسے بناتے وقت خیر اور نیکی کی نیت کرتا ہے اور دوسرا اسے پھینکنے والا اور تیسرا وہ جس کو تیر مارا جائے یا دیا جائے'' (4)۔ تیر اندازی کی فضیلت عظیم ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کی منفعت اور فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اور کافروں پر اس کی مضرت اور تکلیف انتہائی شدید اور سخت

1۔ صحیح مسلم، باب فضل الرمی، جلد 2، صفحہ 143 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 647
4۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 59۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الرمی، حدیث نمبر 1561، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے بنی اسماعیل! تیر اندازی کیا کرو کیونکہ تمہارے آباء تیر اندازی کرتے تھے''۔ اور گھوڑوں کو سکھانا اور اسلحہ کا استعمال جاننا فرض کفایہ ہے۔ اور کبھی فرض عین ہو جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ حسن، عمرو بن دینار اور ابوحیوہ نے ومن ربط الخیل را اور با کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ رباط کی جمع ہے، جیسے کتاب کی جمع کتب ہے۔ ابو حاتم نے ابن زید سے نقل کیا ہے کہ رباط سے مراد پانچ یا اس سے کچھ زائد گھوڑوں کو باندھنا ہے اور اس کی جمع ربط ہے۔ اور مراد وہی ہیں جو بندھے ہوئے ہوں۔ اسی سے کہا جاتا ہے: رَبَطَ يَرۡبِطُ ربطا اور ارتبط یرتبط إرتباطاً۔ اور مربط الخیل اور مرابط الخیل سے مراد گھوڑوں کو دشمن کے مقابلے میں باندھنا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أمر الإلٰه بِرَبۡطها لعدوّه فی الحرب إنّ الله خیر موفّقِ

اللہ تعالیٰ نے جنگ میں اپنے دشمن کے مقابلے میں گھوڑے باندھنے کا حکم دیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ بہتر توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

اور مکحول بن عبداللہ نے کہا:

تلومُ علی رَبۡطِ الجیاد و حَبۡسِها وأوصَی بها اللهُ النبیَّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

تو گھوڑوں کے باندھنے اور انہیں روکنے پر ملامت کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی ہے۔

اور گھوڑوں کو باندھنا فضل عظیم اور باعث عزت و شرف رتبہ ہے۔ عروہ البارقی کے ستر گھوڑے تھے جو جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اور ان میں سے مستحب اور پسندیدہ مؤنث (گھوڑیاں) ہیں۔ یہ عکرمہ اور ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ مؤنث کا (باطن) خزانہ ہے اور اس کا ظاہر عزت و فخر ہے۔ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام کا گھوڑا بھی مؤنث تھا۔ اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''گھوڑا تین درجے کا ہے ایک آدمی کے لیے باعث اجر ہے اور ایک کے لیے باعث ستر ہے اور ایک آدمی کے لیے یہ بوجھ ہے'' (1)۔ الحدیث۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکر کو مؤنث سے خاص نہیں فرمایا۔ اور ان میں سے عمدہ اور اعلیٰ اجر کے اعتبار سے عظیم ہے اور بہت زیادہ نفع دینے والا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کون سا غلام افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جو ثمن کے اعتبار سے مہنگا ہو اور اپنے گھر والوں کے نزدیک نفیس اور عمدہ ہو'' (2)۔

نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو وہب جشمی سے روایت نقل کی ہے۔ اور انہیں بھی شرف صحابیت حاصل تھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اسماء پر نام رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ اسماء (عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں) اور گھوڑے باندھ کر رکھو اور ان کی پیشانیوں اور ان کی پشتوں کو رگڑو (پونچھو) اور انہیں قلادہ

1۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 59 2۔ ایضاً

پہناؤ اور انہیں تانت کا قلادہ نہ پہناؤ اور تم پر لازم ہے کہ سرخ سیاہی مائل گھوڑا رکھو جو پنج کلیان (یعنی چاروں پاؤں اور اس کی پیشانی سفید ہو) یا سرخ زردی مائل پنج کلیان یا خالص سیاہ رنگ کا پنج کلیان گھوڑا رکھو''(1)۔

ترمذی نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین گھوڑا سیاہ رنگ کا ہے جس نے دانت نکالا ہوا ہو اور اس کی ناک کے سرے پر سفید داغ ہو۔ (پھر وہ گھوڑا جس نے دانت نکالا ہو اور اس کے پاؤں سفید ہوں) پھر مطلق سیاہ رنگ کا گھوڑا اور اگر سیاہ رنگ کا گھوڑا نہ ہو تو پھر سرخ رنگ کا گھوڑا جو سیاہی مائل ہو اور مذکورہ اوصاف پر رہو''(2)۔ اور اسے دارمی نے بھی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تو میں کون سا گھوڑا خریدوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک پر سفید داغ ہو دائیں ہاتھ کے سوا بایاں ہاتھ اور دونوں پاؤں سفید ہوں یا پھر اسی طرح سرخ سیاہی مائل گھوڑا خرید لے تو نفع اٹھائے گا اور محفوظ رہے گا''(3)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑوں میں سے الشکال ناپسند کرتے تھے۔ اور الشکال وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کے دائیں پاؤں میں اور بائیں ہاتھ میں سفیدی ہو یا دائیں ہاتھ میں اور بائیں پاؤں میں سفیدی ہو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ گھوڑا جس پر حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو شہید کیا گیا وہ اشکل تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ پس اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کافی تھا۔ پھر خاص طور پر تیروں اور گھوڑوں کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو یہ کہا جائے گا: بلاشبہ گھوڑا جنگوں کی اصل اور ان کا وہ اسلحہ ہے جس کی پیشانی میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے اور یہ قوت کے اعتبار سے انتہائی طاقتور، دوڑ کے اعتبار سے انتہائی مضبوط اور شہسوار کو محفوظ رکھنے والا ہے اور اس کے ساتھ میدان میں چکر لگایا جا سکتا ہے، لہٰذا از روئے عظمت و شرف کے اس کا ذکر خاص طور پر کیا اور عزت و تکریم کی خاطر اس کے غبار کی قسم کھائی۔ پس ارشاد فرمایا: وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝ الآیہ (العادیات)

اور جب تیر جنگوں میں استعمال کیے جانے والے ہتھیاروں میں سے اور دشمن کو قتل کرنے کے اعتبار سے اور انہیں ارواح کے زیادہ قریب کرنے کے اعتبار سے زیادہ کامیابی دلانے والا ہتھیار ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لیے اور اس پر تنبیہ کرنے کے لیے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا۔ اور قرآن کریم میں اس کی نظیر و جبریل و میکال ہے (یعنی ان فرشتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا اس کی کثیر مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے گھوڑا اور ہتھیار رکھنے اور دشمن کے مقابلے کی تیاری کے لیے خزانے اور ان کے محافظ رکھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ اور علماء نے حیوان رکھنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے جیسے گھوڑا

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الخیل، جلد 2، صفحہ 122۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2181، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، حدیث نمبر 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131

اور اونٹ وغیرہ۔ اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ منع ہے، یہی قول ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ صحیح ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور یہی اصح ہے اور دلیل یہ آیت ہے۔ اور اس گھوڑے کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں حملہ کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حق میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: ''اور رہے خالد تو تم خالد پر زیادتی کرتے ہو کیونکہ اس نے اپنا گھوڑا باندھ کر رکھا اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں استعمال کیا'' (1)۔ الحدیث

اور یہ بھی روایت ہے کہ ایک عورت نے اونٹ فی سبیل اللہ رکھا ہوا تھا پھر اس کے خاوند نے حج کا ارادہ کیا، تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو وہ اونٹ اسے دے دے تا کہ وہ اس پر حج کرے کیونکہ حج بھی اللہ تعالیٰ کے راستوں میں سے ہے''۔ اور اس لیے بھی کہ یہ مال ہے جس سے بوجہ قربت نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، پس جائز ہے کہ انہیں اونٹ کے بچوں کی طرح باندھ کر رکھا جائے۔ اور علامہ سہیلی نے اس آیت کے ضمن میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں اور آلات حرب کے نام ذکر کیے ہیں، جو انہیں جاننا چاہے وہ انہیں کتاب ''الاعلام'' میں پا سکتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ یعنی تم اس کے ساتھ خوفزدہ کر دو۔

عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ یعنی یہود، قریش اور کفار عرب میں سے جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو) مراد اہل فارس اور روم ہیں۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد جن ہیں۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ ہے جس کی عداوت و دشمنی معروف نہ ہو۔ سہیلی نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ ان سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ جن ہیں اور علاوہ ازیں بھی قول کیے گئے ہیں۔ اور مناسب نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی خاص شے کہی جائے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا ہے: وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ تو پھر کیسے کوئی ان کے بارے حقیقی علم کا دعویٰ کر سکتا ہے، مگر یہ کہ حدیث صحیح ہے جو اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور وہ اس آیت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: هم الجن (کہ مراد جن ہیں) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک شیطان ایسے گھر میں کسی کو نہیں بگاڑ سکتا جس میں خوش منظر گھوڑا ہو'' اس روایت میں فرس عتیق کہا گیا ہے یعنی گھوڑے کا نام عتیق رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ حقارت اور نسل کی خرابی سے الگ اور محفوظ ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ نے ابی ملیکی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے اپنے باپ اور پھر دادا کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ جن اس گھر کے قریب نہیں آتے جس میں گھوڑا ہو اور وہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سے بھاگ جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ تا کہ تم صدقہ کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جو خرچ کرو گے اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑے پر۔ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ آخرت میں تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ (یعنی) ایک نیکی کا اجر

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 316

اس کی مثل دس سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر کثیر گنا تک۔ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا اس میں لَهَا فرمایا ہے کیونکہ السلم مونث ہے۔ اور جائز ہے کہ تانیث فعلۃ کے لیے ہو۔ اور جنوح کا معنی مائل ہونا ہے۔ وہ فرماتا ہے: اگر وہ مائل ہوں۔ یعنی وہ جن کے عہد توڑنے کا علم آپ کو ہوا۔ صلح کی طرف، تو پھر آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جایئے۔ اور جنح الرجل إلی الآخر کا معنی ہے آدمی دوسرے کی طرف مائل ہوا۔ اور اسی وجہ سے پسلیوں کو جوانح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ انتڑیوں پر جھکی ہوئی ہیں (1)۔ اور جنحت الإبل (یہ تب کہا جاتا ہے) جب چال میں اونٹ کی گردن جھک جائے۔ اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

إذا مات فوق الرَّحْل أحييتُ روحَه بذكراكِ والعِيسُ المراسيل جُنَّحُ

اور نابغہ نے کہا ہے:

جوانحُ قد أيقنّ أن قبيله إذا ما التقى الجمعان أوّل غالبِ

مراد پرندہ ہے۔ اور جنح اللیل جب رات آئے اور اپنا اندھیرا زمین پر پھیلا دے۔ اور السلم والسلام دونوں کا معنی صلح ہے۔ اعمش، ابوبکر، ابن محیصن اور مفضل نے سین کو کسرہ کے ساتھ للسلم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا مکمل معنی سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور کبھی السلام بمعنی التسلیم ہوتا ہے۔ اور جمہور نے نون کے فتحہ کے ساتھ فاجنح پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے۔ اشہب عقیلی نے نون کے ضمہ کے ساتھ فاجنُح پڑھا ہے اور یہ قیس کی لغت ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہی لغت قیاس کے مطابق ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں یہ اختلاف کیا گیا ہے، کیا یہ منسوخ ہے یا نہیں؟ حضرت قتادہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ: 5) نے منسوخ کر دیا ہے۔

وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (توبہ: 36) اور ان دونوں نے کہا ہے: ہر قسم کی صلح کی براءت منسوخ ہو چکی ہے یہاں تک کہ وہ کہہ دیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (یعنی باہمی صلح کے معاہدوں کی ذمہ داری منسوخ ہو چکی ہے یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جائیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا ناسخ فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ (محمد: 35) ہے۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، بلکہ اہل جزیہ سے جزیہ قبول کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور آپ کے بعد آنے والے بہت سے ائمہ نے بلاد عجم میں سے بہت

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

سے شہروں کی صلح اس بنا پر کی کہ ان سے جزیہ وصول کر لیا اور انہیں ان کے شہروں میں ہی رہنے دیا، حالانکہ وہ انہیں مکمل ختم کرنے پر قادر تھے۔ اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بلاد میں سے کثیر کے ساتھ اس مال پر صلح کی جو وہ آپ کو ادا کرتے تھے۔ ان میں سے خیبر بھی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ کے بعد وہاں کے باسیوں کو اس شرط پر وہیں رہنے دیا کہ وہ کام کرتے رہیں اور پیداوار کا نصف ادا کریں۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس آیت سے بنی قریظہ مراد لیے گئے ہیں، کیونکہ ان سے جزیہ قبول کیا جاتا تھا۔ اور رہے مشرک تو ان سے کوئی شی قبول نہیں کی جائے گی۔ اور سدی اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ آپ کو صلح کی دعوت دیں تو آپ ان کی دعوت قبول کر لیں اور اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی وجہ سے اس کا جواب مختلف ہوتا رہا(1)، اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ (محمد: 35) (اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے) پس جب مسلمان عزت وقوت میں طاقتور، متعدد جماعتوں میں اور انتہائی مضبوط ہوں تو پھر کوئی صلح نہیں ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فلا صلحَ حتى تُطعن الخيلُ بالقَنا　　و تُضرب بالبِيض الرقاق الجماجمُ

اور اگر مسلمانوں کے لیے صلح میں مصلحت ہو کسی ایسے نفع کے سبب جسے وہ اس کے ساتھ حاصل کر سکتے ہوں یا کسی ضرر اور نقصان کے سبب جسے وہ اس کے ساتھ دور کر سکتے ہوں، تو پھر کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمان اس کی ابتدا کریں جب انہیں اس کی ضرورت ہو۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ شرائط پر اہل خیبر سے صلح کی پھر انہوں نے ان شرائط کو توڑ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلح کو ختم کر دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضمری، اکیدر دومہ اور اہل نجران کے ساتھ صلح کی اور آپ نے قریش کے ساتھ دس برس کے لیے صلح کی یہاں تک کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا عہد توڑ دیا۔ اور خلفاء اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس راستے پر چلتے رہے ہیں جسے ہم نے مشروع قرار دیا ہے اور ان وجوہ اور اسباب کے ساتھ عمل کرتے رہے ہیں جن کی شرح اور وضاحت ہم نے کی ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: جب مسلمانوں کے پاس قوت اور طاقت ہو تو پھر چاہیے کہ صلح ایک سال تک نہ پہنچے (یعنی صلح کی مدت سال سے کم ہو) اور جب قوت وطاقت کفار کے پاس ہو تو پھر دس برس تک باہم صلح کرنا جائز ہے اور اس سے زیادہ جائز نہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے ساتھ دس سال کے لیے صلح کی۔

ابن منذر نے کہا ہے: علماء کا اس مدت کے بارے اختلاف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان حدیبیہ کے ساتھ مقرر ہوئی۔ پس حضرت عروہ نے کہا: وہ چار سال تھی۔ ابن جریج نے کہا: وہ مدت تین سال تھی۔ اور ابن اسحاق نے کہا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 876

ہے: وہ دس سال کا عرصہ تھا۔ (1)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرکین کے ساتھ دس سال سے زیادہ عرصہ کے لیے صلح کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے سال کیا۔ پس اگر مشرکوں سے اس سے زیادہ عرصہ کے لیے صلح کی گئی تو وہ ٹوٹ جائے گی، کیونکہ دراصل مشرکین کو قتل کرنا فرض ہے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں یا جزیہ ادا کریں۔ ابن حبیب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: مشرکین کے ساتھ صلح کرنا جائز ہے ایک سال کے لیے، دو سال کے لیے، تین سال کے لیے اور غیر معینہ مدت کے لیے۔ مہلب نے کہا ہے: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ یہ ایسا معاہدہ کیا جس میں بظاہر مسلمانوں کی کمزوری کا اظہار تھا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناقہ کو مکہ مکرمہ سے روک دیا، جس وقت آپ نے مکہ مکرمہ کی طرف منہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حبسها حابس الفيل (اسے ہاتھی کو روکنے والے نے روک دیا ہے)

اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مسور بن مخرمہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور یہ مشرکین سے بغیر کسی ایسے مال کے جو ان سے لیا جائے گا صلح اور امن قائم کرنے کے جواز پر دلیل ہے، جب کہ امام وقت اس میں مصلحت اور بہتری دیکھے۔ اور مسلمانوں کی حاجت کے وقت ایسے مال کے عوض عقد صلح کرنا بھی جائز ہے جسے وہ دشمن کے لیے خرچ کریں گے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب کے وقت عیینہ بن حصن فزاری اور حارث بن عوف المری کو اس شرط پر قریش سے علیحدہ ہو جانے کو کہا تھا کہ آپ ان دونوں کو مدینہ طیبہ کی کھجوروں کا تیسرا حصہ عطا کریں گے (2) اور وہ دونوں بنی غطفان کو ساتھ لے کر واپس پھرے اور انہوں نے قریش کو رسوا اور ذلیل کیا۔ اور اپنی قوم کو ساتھ لے کر واپس لوٹ گئے۔ اور یہ گفتگو انہیں بہلانے پھسلانے کی تھی یہ معاہدہ نہ تھا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ دونوں مائل ہیں اور راضی ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما سے مشورہ کیا، تو ان دونوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ایسا امر ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں تو ہم آپ کی خوشنودی کے لیے یہ کریں گے یا یہ ایسی شے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے تو ہم اسے سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں۔ یا یہ ایسا امر ہے جسے آپ ہمارے لیے کر رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ یہ ایسا امر (معاملہ) ہے جسے میں تمہارے لیے کر رہا ہوں کیونکہ عربوں نے ایک معاہدہ کے تحت تمہارا قصد کیا ہے''۔ تب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم بخدا! ہم اور وہ مشرک قوم تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے، نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور نہ اسے پہچانتے تھے اور انہوں نے کبھی یہ طمع نہیں کیا کہ وہ ہم سے پھل حاصل کریں، مگر خرید کر یا بطور مہمان کے (ہم نے انہیں پیش کیا) اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے سبب ہمیں عزت و تکریم عطا فرمائی ہے، اس نے ہمیں اس کی طرف رہنمائی اور ہدایت عطا فرمائی ہے اور اس نے آپ کے سبب ہمیں معزز بنا دیا ہے۔ ہم انہیں اپنے اموال دیں! قسم بخدا! تلوار کے سوا ہم انہیں کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس طرح تفسیر کی گئی ہے فرمایا: انتم وذاك اور عیینہ اور حارث کو

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 876

فرمایا: ''تم دونوں چلے جاؤ تمہارے لیے ہمارے پاس سوائے تلوار کے سوا کچھ نہیں''۔ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے صحیفہ پایا اور اس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت نہیں تھی تو آپ نے اسے مٹا دیا۔

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾

''اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں (تو آپ فکرمند کیوں ہوں) بے شک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ، وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی نصرت اور مومنوں (کی جماعت) سے۔ اور اسی نے الفت پیدا کر دی ان کے دلوں میں۔ اگر آپ خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تو نہ الفت پیدا کر سکتے ان کے دلوں میں لیکن اللہ تعالیٰ نے الفت پیدا کر دی، ان کے درمیان بلاشبہ وہ زبردست ہے حکمت والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ یعنی اس کے ساتھ کہ وہ آپ کے لیے صلح ظاہر کریں۔ اور باطن میں غدر اور خیانت رکھیں، تو آپ مائل ہو جائیے پس آپ کا ان کی نیتیں فاسد ہونے کے سبب کوئی نقصان نہیں۔ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کافی ہے، یعنی وہ ہی آپ کی کفایت اور آپ کی حفاظت کا والی اور ذمہ دار ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

إذا كانت الهيجاءُ وانشقّتِ العصا     فحسبُكَ والضحاكَ سيفٌ مُهَنَّدُ

یعنی تجھے اور ضحاک کو تلوار کافی ہے، تو اس میں بھی حَسْبَكَ بمعنی کافیك ہے۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ یعنی وہی ہے جس نے آپ کو اپنی نصرت کے ساتھ قوت عطا کی۔ مراد بدر کا دن ہے۔ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ نعمان بن بشیر نے کہا ہے: یہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ یعنی اوس اور خزرج کے دلوں کو (محبت والفت سے) جوڑ دیا۔ اور عرب میں شدید عصبیت کے باوجود حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات اور آپ کے معجزات کے سبب دلوں میں الفت اور محبت پیدا ہو گئی، کیونکہ ان میں سے کسی کو تھپڑ مارا جاتا تھا تو وہ اس کے عوض جھگڑ پڑتا تھا یہاں تک کہ وہ اس کا قصاص طلب کرتا تھا۔ اور وہ حمیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انتہائی شدید اور سخت تھے، پس اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ ان کے درمیان الفت پیدا کر دی، یہاں تک کہ ایک آدمی دین کے سبب اپنے باپ اور اپنے بھائی کے خلاف قتال کرنے لگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں مراد مہاجرین وانصار کے درمیان تالیف ہے۔ اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾

''اے نبی (مکرم) کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے''۔

یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ ماسبق کلام میں فرمایا ہے: وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ اور یہ کفایۃ خاصہ ہے اور

اس ارشاد یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ میں تعمیم کا ارادہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں آپ کو کافی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تینتیس آدمی اور چھ عورتیں اسلام لا چکی تھیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور وہ (مسلمان) چالیس ہو گئے۔ یہ آیت مکی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدنی سورت میں لکھی گئی ہے اسے قشیری نے ذکر کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں انہوں نے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے، تحقیق سیرت میں اس کے خلاف واقع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم کعبہ معظمہ کے پاس نماز پڑھنے پر قدرت نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے، پس جب آپ نے اسلام قبول کیا تو آپ نے قریش کے ساتھ جھگڑا کیا یہاں تک کہ آپ نے کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے جو حبشہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے ان کی ہجرت کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مسلمانوں میں سے وہ تمام جو سرزمین حبشہ کے ساتھ جا ملے اور اس کی طرف ہجرت فرما ہوئے۔ ان کے ان بیٹوں کے سوا جوان کے ساتھ چھوٹی عمر میں نکلے یا وہاں پیدا ہوئے۔ وہ تراسی آدمی تھے، اگر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ان میں شامل ہوں۔ کیونکہ ان کے بارے میں شک کیا جاتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت جنگ سے قبل غزوۂ بدر کے بارے میں مقام بیداء پر نازل ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے۔ اور مہاجرین و انصار آپ کو کافی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے اور انہیں کافی ہے جنہوں نے آپ کی اتباع کی۔ اسے شعبی اور ابن زید رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور پہلا قول حسن سے منقول ہے اور اسے نحاس وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ اور من پہلے قول کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اسم جلالت لفظ اللہ پر معطوف ہے۔ اور معنی یہ بنتا ہے: فإن حسبك الله واتباعك من المؤمنين (بے شک اللہ تعالیٰ اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین آپ کو کافی ہیں)

اور دوسرے قول کے مطابق عطف ضمیر پر ہے۔ اور اسی کی مثل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: یکفینیه الله وأبناء قیلة (اللہ تعالیٰ اور قیلہ کے بیٹے (مراد اوس وخزرج ہیں) مجھے اس کے لیے کافی ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ، حسبهم الله (مومنین میں سے جو آپ کی اتباع کرنے والے ہیں اللہ انہیں کافی ہے)۔ پس خبر مضمر ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ من محل نصب میں ہو اور معنی یہ ہو یکفیك الله ویکفی من اتبعك (اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے اور وہ انہیں کافی ہے جنہوں نے آپ کی اتباع کی)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ

مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

''اے نبی! برانگیختہ کیجئے مومنوں کو جہاد پر اگر ہوں تم سے بیس آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دوسو پر اور اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی (صبر کرنے والے) تو غالب آئیں گے ہزار کافروں پر کیونکہ یہ کافروہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔ (اے مسلمانو!) اب تخفیف کردی ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے تو اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دوسو پر اور اگر ہوئے تم میں سے ایک ہزار (صابر) تو وہ غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ یعنی آپ انہیں جہاد پر برانگیختہ کیجئے اور ابھاریئے۔ کہا جاتا ہے: حارض علی الأمرو واظب وواصب وأكبّ ان تمام کا معنی ایک ہے (یعنی اس نے کام پر ابھارا، برانگیختہ کیا) اور الحارض وہ ہے جو ہلاک ہونے کے قریب ہو جائے۔ اس معنی میں رب کریم کا ارشاد بھی ہے: حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا (یوسف:85) (کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت) یعنی تو غم سے پگھلنے لگے اور تو ہلاک ہونے کے قریب ہو جائے تو تو ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائے گا۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ یہ الفاظ تو خبر ہیں، ان کے ضمن میں شرط کے ساتھ ایک وعدہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے آدمی صبر کریں گے تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے إن يصبر منكم عشرون صابرون يغلبوا مائتين، عشرون، ثلاثون اور اربعون ان میں سے ہر ایک ایسا اسم ہے جو اس عدد کے لیے جمع کی صورت میں وضع کیا گیا ہے۔ اور یہ اسم قائم مقام فلسطین کے ہو جائے گا۔ اگر کوئی کہنے والا یہ کہے: عشرین کے پہلے حرف کو کسرہ کیوں دیا ہے حالانکہ ثلاثین اور اس کے مابعد ثمانین تک سوائے ستین کے تمام میں پہلا حرف مفتوح ہے؟ تو سیبویہ کے نزدیک جواب یہ ہے کہ عشرۃ سے عشرین ایسے ہی ہے جیسے واحد سے اثنین (واحد سے تثنیہ) ہے پس عشرین کے پہلے حروف کو کسرہ دیا گیا جیسے اثنان کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل ان کا قول ستون و تسعون ہے، جیسا کہ ستة و تسعة کہا گیا ہے۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: یہ آیت اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ نازل ہوئی اور یہ امر مسلمانوں پر گراں اور شاق گزرا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض قرار دیا کہ ان میں سے ایک دس کے مقابلے سے نہ بھاگے، پھر تخفیف کا حکم نازل ہوا اور فرمایا: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ ابو توبہ نے اس قول تک پڑھا: مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے انہیں عدد میں تخفیف فرمائی تو جتنی ان کے لیے تخفیف فرمائی اتنا صبر کم کر دیا۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے بے شک یہ حکم بدر کے دن تھا اور پھر منسوخ ہو

گیا۔ اور یہ کہنے والے کی خطا ہے۔ اور کہیں منقول نہیں کہ مشرکین نے مسلمانوں کے مقابلے میں اس پر صف بندی کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ان پر پہلے فرض کیا اور اسے اس کے ساتھ معلق کیا کہ بلاشبہ تم اسے سمجھتے ہو جس پر تم قتال کر رہے ہو اور وہ ثواب ہے۔ اور وہ اسے نہیں جانتے جس پر وہ قتال کرتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فرض ہے پھر جب ان پر یہ گراں گزرا تو دو کے مقابلے میں ایک کے ثابت قدم رہنے کے سبب یہ فرض ساقط ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں تخفیف فرما دی اور ان پر یہ فرض کر دیا کہ ایک سو دو سو کے مقابلے سے نہ بھاگیں۔ پس اس قول کی بنا پر تخفیف ہے نہ کہ نسخ۔ اور یہ حسن اور اچھا ہے۔ تحقیق قاضی ابن الطیب نے کہا ہے کہ حکم کا بعض حصہ اور اس کے بعض اوصاف جب منسوخ ہو جائیں یا اس کا عدد بدل دیا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ یہ نسخ ہے، کیونکہ اس وقت وہ بعینہٖ پہلا نہیں ہوتا بلکہ اس کا غیر ہوتا ہے۔ اور اس میں اختلاف ذکر کیا ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷

”نہیں مناسب نبی کے لیے کہ ہوں اس کے پاس جنگی قیدی یہاں تک کہ غلبہ حاصل کر لے زمین میں، تم چاہتے ہو دنیا کا سامان اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (تمہارے لیے) آخرت اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب (اور) دانا ہے“۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَسْرٰى یہ أسیر کی جمع ہے، جیسے قتیل کی جمع قتلی اور جریح کی جمع جرحی ہے اور أسیر کی جمع میں أساری (ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ) اور أساری (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ عالیہ کے ساتھ نہیں ہے (مراد الف مقصورہ ہے) وہ قیدی کو چمڑے کی رسی کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور وہ أسار کہلاتا ہے۔ اور پھر ہر پکڑے جانے والے کو أسیر کا نام دیا گیا اگرچہ اسے نہ بھی باندھا جائے۔ اعشی نے کہا ہے:

وقیّدنی الشعر فی بیتہٖ کما قیّد الآسراتُ الحمارا

اور یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: الاسری وہ قیدی ہیں جو اس وقت باندھیں نہ جائیں جب وہ پکڑے جاتے ہیں، اور الاساری وہ ہیں جنہیں رسی وغیرہ کے ساتھ باندھا جائے۔ ابو حاتم نے اسے بیان کیا ہے انہوں نے یہ عربوں سے سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت بدر کے دن نازل ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو عتاب کیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے: تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم ایسا فعل کرو جو واجب قرار دے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غلبہ سے پہلے قیدی ہوں۔ اور ان کے لیے یہ خبر اس ارشاد کے ساتھ ہے: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (تم دنیا کا سامان چاہتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 877

ہو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کے وقت مردوں کو باقی رکھنے کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا اور نہ کبھی آپ نے سامان دنیا کا ارادہ کیا، بلاشبہ جمہور جنگ کرنے والوں نے یہ فعل کیا۔ پس زجر و توبیخ اور عتاب اس کے سبب سے متوجہ ہے جس نے فدیہ لینے کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ دیا۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور یہی وہ قول ہے جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر آیت میں اس وقت آیا جس وقت آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا جب آپ نے اسے عریش سے دیکھا جب کہ حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم نے اسے ناپسند کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاملے کے اچانک آنے اور مدد و نصرت کے نازل ہونے نے اس سے مشغول رکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باقی رکھنے کے بارے نہی ترک کردی، یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ واللہ اعلم۔

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے اور اس کا پہلا حصہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے اور یہ اس کی تکمیل ہے۔

ابوزمیل نے بیان کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب مسلمانوں نے قیدیوں کو قید کرلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''ان قیدیوں کے بارے میں تم کیا رائے رکھتے ہو؟'' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ عمزاد اور خاندان کے لوگ ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں، وہ ہمارے لیے کفار کے خلاف قوت و طاقت کا باعث ہوگا اور یہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت عطا فرما دے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن الخطاب تو کیا رائے رکھتا ہے''؟ میں نے عرض کی: قسم بخدا! یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وہ رائے نہیں رکھتا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے ہے، بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ہمیں اختیار اور قدرت دیں تو ہم ان کی گردنیں ماردیں، پس آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عقیل کے بارے اختیار دیں کہ وہ اس کی گردن ماردیں اور مجھے فلاں (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب آدمی) پر قدرت دیں تو میں اس کی گردن ماردوں، کیونکہ یہ کفار کے ائمہ اور ان کے سردار ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پسند کیا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا اور اسے پسند نہ فرمایا جو میں نے کہا۔ جب دوسرا دن آیا تو میں حاضر خدمت ہوا تو اچانک دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ تو میں عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے بھی بتائیے کون سی وجہ سے آپ اور آپ کے ساتھی رو رہے ہیں۔ پس اگر میں نے رونے کو پالیا تو میں بھی رولوں گا، اور اگر میں نے رونا نہ پایا تو تم دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے کی شکل بنالوں گا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس وجہ سے رو رہا ہوں جو تمہارے ساتھیوں نے مجھ پر فدیہ لینے کی رائے پیش کی تحقیق مجھ پر ان کا عذاب اس درخت سے بھی قریب تر پیش کیا گیا ہے'' (1)۔ (مراد وہ درخت ہے جو اس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالکل قریب تھا) اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 93

ارشاد تک فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا تک نازل فرمائی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا۔

یزید بن ہارون نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یحییٰ نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں ابو معاویہ نے اعمش سے انہوں نے عمرو بن مرہ سے انہوں نے ابو عبیدہ سے اور انہوں نے عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب غزوہ بدر ہوا اور قیدی لائے گئے تو ان میں عباس بھی تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ان قیدیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟'' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کی قوم ہے اور آپ کے اہل ہیں، آپ انہیں باقی رہنے دیجئے شاید اللہ تعالیٰ انہیں توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: انہوں نے آپ کی تکذیب کی ہے اور انہوں نے آپ کو (شہر سے) نکالا ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ جنگ کی ہے۔ انہیں آگے لائیے اور ان کی گردنیں مار دیجئے (یعنی انہیں قتل کر دیجئے) اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کثیر لکڑیوں (ایندھن) والی وادی دیکھیے اور اسے ان پر بھڑکا دیجئے۔ تو عباس نے کہا درآنحالیکہ وہ یہ سن رہے تھے: تم نے قطع رحمی کی ہے۔ راوی کہتے ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اندر) داخل ہو گئے اور آپ نے انہیں کسی قسم کا جواب نہ دیا۔ تو لوگوں نے کہا: آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کریں گے۔ اور کچھ لوگوں نے کہا: آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول لے لیں گے اور بعض لوگوں نے کہا: آپ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کریں گے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بعض لوگوں کے دلوں کو نرم کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ دودھ سے زیادہ نرم ہو گئے ہیں اور اس نے بعض لوگوں کے دلوں کو سخت کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ اے ابوبکر! تیری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثل ہے انہوں نے کہا تھا: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم) (پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور رحیم ہے) اے ابوبکر! تیری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثل ہے جب انہوں نے کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدہ) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے ان کو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے)

اور اے عمر! تیری مثال حضرت نوح علیہ السلام کی مثل ہے جب کہ انہوں نے کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (نوح) (اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا) اور اے عمر! تیری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہے جب انہوں نے کہا: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ (یونس) (اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو تاکہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو) تم عیال دار ہو تو کوئی بھی فدیہ یا قتل کیے جانے کے بغیر نہیں چھوٹے گا''۔ تو عبداللہ نے کہا: سوائے سہیل بن بیضاء کے کیونکہ میں نے اسے اسلام کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔ پس رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ فرمایا: میں نے اپنے آپ کو اس دن سے بڑھ کر خوفزدہ نہیں دیکھا کہ مجھ پر آسمان سے پتھر گرنے لگیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیتیں نازل فرمائیں: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ، الی آخر الآیتین (الانفال) (1) اور ایک روایت میں ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک قریب ہے کہ ہمیں ابن خطاب کی مخالفت میں عذاب آ پہنچے اور اگر عذاب نازل ہوا تو سوائے عمر کے کسی کو نہ چھوڑے گا'' ابو داؤد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا: جب بدر کا دن تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے لیا، تو اللہ تعالیٰ نے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ، تا قولہ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ (یعنی تم نے فدیہ لیا) عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ (الانفال) تک دو آیتیں نازل فرمائیں۔ بعد ازاں غنائم کو حلال کیا۔

اور علامہ قشیری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہمارا مشرکین کے ساتھ یہ پہلا معرکہ ہے پس غلبہ پانا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور الاثخان کا معنی ہے کثرت سے قتل کرنا۔ یہ حضرت مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ یعنی وہ مشرکوں کو قتل کرنے میں مبالغہ کریں۔ عرب کہتے ہیں: أثخن فلان فی هذا الأمر یعنی فلاں نے اس کام میں مبالغہ کیا۔ اور بعض نے کہا ہے: یہاں تک کہ آپ غلبہ پالیں اور اس کے ساتھ انہیں قتل کریں۔
اور مفضل نے شعر کہا ہے:

تصلی الضحی ما دهرها بتعبد وقد أثخنت فرعون فی کفره کفرا

اور یہ بھی کہا گیا ہے: حَتّٰى يُثْخِنَ یہاں تک کہ آپ قدرت پالیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاثخان سے مراد قوت اور شدت ہے پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ بدر کے وہ قیدی جن سے فدیہ لیا گیا انہیں قتل کرنا ان کے فدیہ سے اولیٰ اور بہتر تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یہ بدر کا دن تھا اور اس دن مسلمان قلیل تھے، پس جب یہ بڑھ گئے اور ان کی سلطنت مضبوط اور مستحکم ہو گئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں یہ فرمان نازل کیا: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) (بعد ازاں یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تحقیق کہا گیا ہے: بے شک انہیں عتاب کیا گیا کیونکہ واقعہ بدر بہت عظیم واقعہ تھا اور صنادید قریش، ان کے اشراف، ان کے سرداروں اور ان کے مالوں میں قتل، قید کیے جانے اور ان کا مالک بننے کے اعتبار سے یہ بہت بڑا تصرف تھا۔ اور یہ تمام کا تمام ہی انتہائی عظیم واقعہ تھا، پس ان کا حق یہ تھا کہ وہ وحی الٰہی کا انتظار کرتے اور جلدی نہ کرتے، لیکن جب انہوں نے جلدی کی اور انہوں نے انتظار نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس انداز سے توجہ فرمائی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فرمایا: اگر تم چاہو تو قیدیوں کا فدیہ لے لو اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر ستر افراد جنگ میں شہید کر دیئے جائیں گے اور اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دیا جائے اور تم

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 383

سلامت رہو‘‘۔ لوگوں نے عرض کی: ہم فدیہ لے لیتے ہیں اور ہم میں سے ستر آدمی شہید ہو جائیں گے (1)۔ اور عبد بن حمید نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام لوگوں کو اس طرح کا اختیار دینے کے بارے پیغام لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے (2)۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

اور عبیدہ سلمانی نے کہا ہے: انہوں نے دونوں اختیار طلب کیے (یعنی دونوں کی انہوں نے خواہش کی فدیہ اور شہادت) پس ان میں سے ستر آدمی غزوۂ احد میں شہید کر دیئے گئے۔ اور یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اشکال میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب اختیار دیا گیا تو پھر لمسکم کے قول کے ساتھ زجر و توبیخ کیونکر واقع ہوئی' تو جواب یہ ہے کہ پہلے ان کے فدیہ لینے کی حرص کی وجہ سے زجر و توبیخ واقع ہوئی اور پھر اس کے بعد اختیار دیا گیا۔ اور اس پر حضرت مقداد کا قول دلالت کرتا ہے جو انہوں نے اس وقت کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط کو قتل کرنے کے بارے حکم دیا۔ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ میرا قیدی ہے۔ اور حضرت مصعب بن عمیر جن کے بھائی کو قیدی بنایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا: اس پر اپنا ہاتھ مضبوط کر لو، کیونکہ اس کی ماں خوشحال ہے۔ علاوہ ازیں بھی واقعات ہیں جو ان کے فدیہ لینے پر ان کی حرص کی دلیل ہیں۔ پس جب قیدی حاصل ہو گئے اور انہیں مدینہ طیبہ کی طرف چلایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نضر اور عقبہ وغیرہ کو قتل کا حکم نافذ فرمایا اور ان تمام پر سختی ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تخییر کا فرمان نازل ہوا۔ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ قتل کے بارے میں اپنی پہلی رائے پر ہی قائم رہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدیہ کے مال کے ساتھ مسلمانوں کی قوت کی مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف مائل ہوئے۔ یہ دونوں آراء تخییر کے بعد اجتہاد ہے۔ اس لیے اس کے بعد اس بارے میں کوئی سخت یا ناراضگی کا حکم نازل نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن وہب نے کہا ہے: امام مالک نے بیان کیا ہے کہ بدر کے قیدی مشرک تھے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل فرمایا: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ وہ اس وقت مشرک تھے انہوں نے فدیہ دیا اور واپس لوٹ گئے اور اگر وہ مسلمان ہوتے تو یقیناً وہیں ٹھہر جاتے اور واپس لوٹ کر نہ جاتے۔ ان میں سے جو قتل کیے گئے ان کی تعداد چوالیس تھی، اور انہیں کی مثل قیدی بنائے گئے۔ اور شہداء کی تعداد کم تھی۔ اور عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے: بے شک مقتول ستر تھے اور اتنے ہی قیدی تھے۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور یہی صحیح ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں بھی ہے، پس اس دن ستر قتل کر دیئے گئے اور ستر قیدی بنا لیے گئے۔

اور بیہقی نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: پس قیدی لائے گئے اور ان پر شقران مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقرر تھے اور وہ انچاس آدمی تھے جو گنے گئے اور دراصل وہ ستر تھے، اسی پر اجماع ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ''اور وہ مشرک تھے'' کیونکہ مفسرین نے روایت کیا ہے کہ عباس نے حضور

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 54　2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی قتل الاساری، حدیث نمبر 1492، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نبی مکرم ﷺ سے کہا: بلاشبہ میں مسلمان ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ قیدیوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے کہا: ہم آپ کے ساتھ ایمان لائے۔ اس سب کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور اس کے بطلان پر استدلال اس روایت سے کیا ہے جس میں ان کے واپس لوٹنے کا ذکر ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ انہوں نے احد کے میدان میں پھر آپ ﷺ سے جنگ لڑی (1)۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے وقت میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ وہ غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی عباس سے ملے تو وہ انہیں قتل نہ کرے کیونکہ انہیں مجبوراً نکالا گیا ہے''۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن فرمایا: ''بے شک بنی ہاشم وغیرہ کے کچھ لوگ بالجبر نکالے گئے ہیں ہمیں انہیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں پس تم میں سے کسی کا بنی ہاشم کے کسی فرد سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ اسے قتل نہ کرے اور جو ابوالبختری سے ملے وہ اسے قتل نہ کرے اور جس کا سامنا عباس سے ہو جائے تو چاہیے کہ وہ اسے قتل نہ کرے کیونکہ انہیں بالاکراہ نکال کر لایا گیا ہے''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت اسلام لائے جب بدر کے دن قیدی بنائے گئے۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ غزوۂ خیبر کے سال اسلام لائے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مشرکین کی خبریں لکھتے تھے اور وہ ہجرت کرنا پسند کرتے تھے پس رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف لکھا: أمكث بمكة فمقامك بها أنفع لنا (2) (تم مکہ میں ہی رہو پس تمہارا وہاں رہنا ہمارے لیے زیادہ نفع بخش ہے)

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

''اگر نہ ہوتا حکم الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے) تو ضرور پہنچتی تمہیں بوجہ اس کے جو تم نے لیا ہے بڑی سزا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ اگر پہلے سے اس بارے میں حکم الٰہی نہ ہوتا کہ وہ کسی قوم کو عذاب نہیں دے گا یہاں تک کہ ان کے لیے اس چیز کو بیان کر دے جس سے وہ بچیں اور پرہیز کریں۔ لوگوں نے کتاب اللہ السابق کے بارے میں مختلف قول کیے ہیں۔ ان میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ اگر غنائم کو حلال کرنے کے بارے میں پہلے سے فیصلہ نہ ہوتا، کیونکہ ہم سے پہلی امتوں پر غنائم کو حرام کیا گیا تھا۔ پس جب غزوہ بدر کا دن تھا، تو لوگ غنائم کی طرف بڑی تیزی سے بڑھے تو اللہ تعالیٰ نے غنائم کو حلال کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ۔ ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔

سلام نے اعمش سے، انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 881 2۔ جامع ترمذی، سورۂ انفال، جلد 2، صفحہ 134

انہوں نے کہا: جب بدر کا دن تھا لوگ بڑی جلدی سے غنائم کی طرف بڑھے اور انہوں نے انہیں پالیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الغنيمة لا تحل لأحد سود الرؤس غيركم (1) بے شک مال غنیمت تمہارے علاوہ سیاہ بالوں والے کسی بندے کے حلال نہیں کیا گیا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب جب مال غنیمت حاصل کرتے اور اسے ایک جگہ جمع کر دیتے تو آسمان سے ایک آگ اترتی اور اسے کھا جاتی۔ تب اللہ تعالیٰ نے لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ دو آیتوں کے آخر تک نازل فرمائی۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور حضرت مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے۔ ان دونوں سے بھی اور حضرت سعید بن جبیر سے یہ بھی مروی ہے کہ کتاب سابق سے مراد اللہ تعالیٰ کا اہل بدر کے اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت فرما دینا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: الکتاب السابق سے مراد اللہ تعالیٰ کا ان کے اس معین گناہ کو معاف فرما دینا ہے (یعنی مال غنیمت کی طرف تیزی سے بڑھنا) لیکن اس میں عموم اصح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اہل بدر کے بارے میں فرمایا: ''تجھے کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر مطلع ہوا اور اس نے فرمایا تم عمل کرو جو چاہو، تحقیق میں نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے'' (2)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتاب سابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہیں دے گا درآنحالیکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ کتاب سابق یہ ہے کہ وہ کسی کو اس گناہ کے بدلے عذاب نہ دے گا جو اس نے عہد جاہلیت میں کیا یہاں تک کہ وہ پھر اس کی طرف بڑھے (یعنی اسلام کے بعد دوبارہ اس کا ارتکاب کرے) اور ایک گروہ نے کہا ہے: کتاب سابق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے کے سبب صغیرہ گناہوں کو مٹا دینے کے بارے فیصلہ کیا ہے۔ اور علامہ طبری اس طرف گئے ہیں کہ یہ جملہ معانی اس لفظ کے تحت داخل ہیں اور یہ لفظ ان تمام کو شامل ہے۔ اور کسی معنی کی تخصیص کا فائدہ نہیں دے رہا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بندہ جب ان اقوال میں سے کوئی فعل کر بیٹھے جن کے حرام ہونے کا وہ اعتقاد رکھتا ہے اور وہ فعل اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کے لیے حلال ہو تو اس پر کوئی سزا نہیں، جیسا کہ روزے دار جب کہے: یہ میرے سفر کا دن ہے پس میں اب روزہ افطار کرتا ہوں یا عورت کہتی ہے: یہ میرے حیض کا دن ہے پس میں روزہ افطار کرتی ہوں، پھر دونوں نے عملاً ایسا کر لیا اور سفر اور حیض دونوں روزہ افطار کرنے کا موجب ہیں۔ تو اس بارے میں مشہور مذہب یہ ہے کہ اس میں کفارہ ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اور یہ دوسری روایت ہے۔ پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ اباحت کے طرق تحریم کی سزا میں عذر ثابت نہیں کرتے جب اس حرام کا ارتکاب کیا جائے، جیسا کہ اگر کوئی کسی عورت سے پہلے وطی کرے اور پھر اس سے نکاح کر لے۔ اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی حرمت ساقط ہو چکی ہے پس اس نے ہتک کا ارتکاب ایسے محل میں کیا ہے جو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں حرام نہیں ہے، پس یہ اس کے قائم مقام ہو گیا کہ اگر کوئی عورت سے وطی کرنے کا قصد کرے جو اس کی طرف شب زفاف بھیجی گئی اور وہ اس کے بارے یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ وہ اس

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 302　　2۔ ایضاً

کی بیوی نہیں ہے جب کہ وہی اس کی بیوی ہو۔ اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ اور پہلی تعلیل لازم نہ آئے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہمارے علم کے ساتھ تحریم کے مسئلہ میں برابر ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ہمارا علم اور اللہ تعالیٰ کا علم مختلف ہیں پس اس کا حکم اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہوگا(1)، جیسا کہ اس نے فرمایا: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

''سو کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی ہے حلال (اور) پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس ارشاد کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ سارے کا سارا مال غنیمت لشکریوں کے لیے ہو اور وہ تمام کے تمام اس میں برابر شریک ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال: 41) نے اس سے خمس نکالنے کے وجوب کو بیان کیا ہے اور اسے مذکورہ وجوہ کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس بارے میں مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

''اے نبی (کریم!) آپ فرمائیے ان قیدیوں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں اگر جان لی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کوئی خوبی تو عطا فرمائے گا تمہیں بہتر اس سے جو لیا گیا ہے تم سے اور بخشے گا تمہارے (قصور) اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کریں آپ سے دھوکہ بازی کا (تو حیرت کیوں ہو) انہوں نے تو دھوکہ کیا ہے اللہ سے پہلے ہی (اسی لیے) تو اللہ نے قابو دے دیا (تمہیں) ان پر اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب صرف آپ کو ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس آیت میں قیدیوں سے مراد عباس اور ان کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم اس (دین) کے ساتھ ایمان لائے جو آپ لے کر آئے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یقیناً ہم آپ کے لیے آپ کی قوم پر مخلص رہیں گے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے اس کا بطلان پہلے گزر چکا ہے۔

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اہل جاہلیت کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 883

فدیہ چار سو مقرر کیا۔ اور ابن اسحاق سے مروی ہے: قریش نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا۔ اور ہر قوم نے اپنے قیدیوں کا اتنا فدیہ دیا جس پر وہ راضی ہوئے۔ اور عباس نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ بلا شبہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے پس اگر ایسا ہوا جیسے تم کہتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزا عطا فرمائے گا اور جہاں تک تمہارے معاملے کا ظاہر ہے تو وہ ہم پر عیاں ہے پس تم اپنی ذات، اپنے بھتیجوں نوفل بن حارث بن عبد المطلب اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو جو کہ حارث بن فہر کے بیٹوں کا بھائی ہے کا فدیہ ادا کرو''۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: فاین المال الذی دفنته أنت و أم الفضل فقلت لها إن أصبتُ فی سفر هذا فهذا المال لبنی الفضل و عبد الله وقثم (1) (وہ مال کہاں گیا جسے تو نے اور ام فضل نے دفن کیا اور تو نے اسے کہا اگر میں اپنے اس سفر میں کام آ جاؤں تو یہ مال میرے بیٹوں فضل، عبد اللہ اور قثم کے لیے ہے) تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ انی لأعلم إنك رسول الله، إن هذا الشئ ما علمه غیری و غیر ام الفضل (یا رسول اللہ! ﷺ بے شک میں یقیناً جان گیا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، بے شک یہ وہ شے ہے جس کا میرے اور ام فضل کے بغیر کسی کو علم نہیں) پس آپ میرے لیے حساب لگائیے یا رسول اللہ! ﷺ جو مال تم نے مجھ سے لینا ہے مال میں سے بیس اوقیہ میرے پاس ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں (صرف) وہ شے جو اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ہمیں عطا فرمائی ہے''۔ (صرف وہی لینی ہے) پس اس نے اپنا، اپنے بھتیجوں اور اپنے حلیف کا فدیہ ادا کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى، الآیہ

ابن اسحاق نے کہا ہے: تمام قیدیوں میں سے زیادہ فدیہ عباس بن عبد المطلب کا تھا، کیونکہ وہ خوشحال آدمی تھے، پس انہوں نے سو اوقیہ سونا اپنا فدیہ دیا (2)۔ اور بخاری میں ہے: موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا ہے کہ ابن شہاب نے کہا، مجھے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ ہمیں اجازت عطا فرمائیں کہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں قسم بخدا! تم ایک درہم بھی نہ چھوڑو'' (3)۔ اور نقاش وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ قیدیوں میں سے ہر ایک کا فدیہ چالیس اوقیہ تھا، سوائے عباس کے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''عباس پر فدیہ دوگنا کر دو'' اور آپ نے انہیں پابند کیا کہ وہ اپنے بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی دیں چنانچہ انہوں نے ان کی طرف سے اسی اوقیہ اور اپنی طرف سے اسی اوقیہ فدیہ ادا کیا اور جنگ کے وقت ان سے بیس اوقیہ لیے گئے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے اہل بدر کو کھانا کھلانے کا ذمہ اٹھایا تھا اور ان کی باری بدر کی جنگ کے دن تھی پس ان کے کھانا کھلانے سے پہلے ہی جنگ شروع ہو گئی اور ان کے پاس بیس باقی بچ گئے جو جنگ کے وقت ان سے لے لیے گئے۔ اور اس دن ان سے سو اوقیہ اور اسی اوقیہ لیے گئے۔ پس عباس نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: تحقیق تم نے مجھے اس حال میں کر چھوڑا ہے کہ جب تک میں

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۃ انفال، جلد 2، صفحہ 369-368 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 428

زندہ رہوں ہاتھ پھیلا کر قریش سے مانگتا رہوں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: این الذهب الذی ترکته عند إمراتك أم الفضل؟ (وہ سونا کہاں گیا جو تو نے اپنی بیوی ام الفضل کے پاس چھوڑا تھا) عباس نے کہا: کون سا سونا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انك قلت لها لا أدری ما یصیبنی فی وجهی هذا فإن حدث بی حدث فهو لك ولولدك (بے شک تو نے اسے کہا تھا میں اسے نہیں جانتا جو مجھے پیش آئے گا پس اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہے) تو عباس نے پوچھا: اے بھتیجے! تجھے اس کے بارے کس نے خبر دی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے''۔ تب عباس نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں اور مجھے آپ کے رسول اللہ ہونے کا کبھی یقین نہیں ہوا مگر آج اور تحقیق میں نے جان لیا ہے کہ آپ کو اس پر کسی نے مطلع نہیں کیا مگر اس نے جو پوشیدہ اور مخفی چیزوں کو جاننے والا ہے۔ أشهد ان لا إله الا الله وانك عبده ورسوله اور میں اس کے سواہر (معبود باطل) کا انکار کرتا ہوں۔ اور پھر انہوں نے اپنے بھتیجوں کو بھی حکم دیا تو وہ بھی اسلام لے آئے، پس ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی اور جس نے عباس کو قید کیا تھا وہ ابو الیسر کعب بن عمرو بنی سلمہ کے بھائی تھے اور وہ بالکل چھوٹے قد کے آدمی تھے اور عباس موٹے تازے طویل القامت تھے پس جب وہ انہیں لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: لقد اعانك علیه ملك (تحقیق اس پر فرشتے نے تیری مدد کی ہے)

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا اس میں خیر سے مراد اسلام ہے (یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں اسلام جان لیا) یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ تو وہ تمہیں اس فدیہ سے بہتر عطا فرمائے گا جو تم سے لیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دنیا میں عطا فرمائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بحرین کا مال آیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: بے شک میں نے اپنا فدیہ بھی دیا تھا اور عقیل کا فدیہ بھی دیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''لے لو'' پس انہوں نے اپنا کپڑا بچھایا اور اتنا مال لے لیا جتنا اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے۔ یہ مختصر کیا گیا ہے۔

اور غیر صحیح میں ہے: تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یہ اس سے بہتر ہے جو مجھ سے لیا گیا اور اس کے بعد میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے (1)۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: آپ نے مجھے زمزم عطا کیا۔ اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس کے بدلے اہل مکہ کے تمام اموال میرے لیے ہوں۔ اور طبری نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ تک سند بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میرے بارے میں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی جس وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام کے بارے میں آگاہ کیا اور میں نے آپ سے عرض کی کہ آپ میرے ان بیس اوقیہ کے بارے میں جانچ پرکھ کریں جو فدیہ کی ادائیگی سے پہلے مجھ سے لے لیے گئے تو آپ نے انکار کر دیا' اور فرمایا: وہ فی ہے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے بدلے بیس غلام عطا فرمادیئے وہ سب کے سب میرے مال کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز　　2۔ ایضاً

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضرت زینب (بنت رسول اللہ ﷺ) نے ابوالعاص کے فدیہ کے لیے کچھ مال بھیجا اور اس میں انہوں نے اپنا وہ ہار بھی بھیجا جو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور ابوالعاص کے ساتھ شادی کے وقت انہوں نے وہ انہیں پہنایا تھا۔ آپ فرماتی ہیں: پس جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ پر انتہائی رقت طاری ہوگئی۔ اور آپ نے فرمایا: ''اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کے لیے ان کے قیدی کو رہا کر دو اور اس کا یہ ہار اسے واپس لوٹا دو''۔ تو انہوں نے عرض کی: ہاں (ہم ایسا ہی کرتے ہیں) تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس پر اس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ زینب کو آپ کے پاس بھیج دے گا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور انصار میں سے ایک آدمی کو بھیجا اور فرمایا: ''تم دونوں بطن یاجج میں جا کر رکو یہاں تک کہ زینب تمہارے پاس سے گزرے پس تم دونوں اس کے ساتھ ہو جانا یہاں تک کہ تم اسے لے آؤ''۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: یہ غزوۂ بدر کے ایک مہینہ بعد کا واقعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت زینب بنت رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ابوالعاص مکہ میں آیا تو اس نے مجھے کہا: تو تیاری کر اور اپنے باپ کے پاس چلی جا۔ پس میں نکلی تیاری کرنے لگی تو مجھے ہند بنت عتبہ ملی اور اس نے کہا: اے محمد کی بیٹی! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو اپنے باپ کے پاس جانے کا ارادہ رکھتی ہے؟ تو میں نے اسے کہا: میں نے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ تو اس نے کہا: اے چچا کی بیٹی! تو ایسا نہ کر، بے شک میں خوشحال عورت ہوں اور میرے پاس تیری حاجت اور ضرورت کا سامان ہے۔ پس اگر تو سامان کا ارادہ کرے تو میں تجھے وہ بیچ دوں یا نفقہ کے لیے قرض چاہیے تو میں تجھے قرض دے دیتی ہوں، کیونکہ وہ کچھ عورتوں کے درمیان نہیں ہوتا جو مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں: قسم بخدا! میں اسے دیکھ رہی تھی کہ اس نے یہ بہتان تراشی کے لیے کہا ہے۔ پس میں اس سے ڈر گئی اور میں نے اس سے اسے چھپائے رکھا اور میں نے کہا: میں اس کا ارادہ نہیں رکھتی۔ پس جب زینب اپنی تیاری سے فارغ ہوگئیں تو آپ وہاں سے چل پڑیں اور ان کے ساتھ ان کا دیور اونٹ کی مہار پکڑ کر (قائد) کنانہ بن ربیع بھی نکلا اور یہ دن کے وقت گھر سے نکلے تھے۔ اور اس بارے میں اہل مکہ نے بھی سن لیا، چنانچہ ان کی تلاش میں ہبار بن اسود اور نافع بن عبدالقیس الفہری نکلے اور سب سے پہلے جو آپ کی طرف آگے بڑھا وہ ہبار تھا اس نے نیزے کے ساتھ آپ کو خوفزدہ کیا اور دھمکایا درآنحالیکہ آپ ہودج میں تھیں۔ کنانہ نے اونٹ بٹھایا اور اپنے تیر پھیلا دیئے، پھر اپنی قوس پکڑی اور کہا: قسم بخدا! جو آدمی بھی میرے قریب آئے گا میں اسے تیر ماروں گا۔ اشراف قریش میں سے ابوسفیان آیا اور اس نے کہا: اے فلاں! اپنا تیر ہم سے روک لے یہاں تک کہ ہم تیرے ساتھ گفتگو کرلیں۔ پس ابوسفیان اس کے پاس آیا اور کہا: بے شک تو نے کچھ نہیں کیا، تو لوگوں کے سامنے ایک عورت کے ساتھ نکلا ہے، حالانکہ تو ہماری اس مصیبت کو جانتا ہے جو بدر کے مقام پر ہمیں پہنچی پس عرب یہ گمان کرتے ہیں اور ہم یہ گفتگو کرتے ہیں کہ یہ ہماری طرف سے کمزوری اور ضعف ہے کہ تو ہمارے درمیان سے لوگوں کے سامنے ان کی بیٹی کو ساتھ لے کر ان کی طرف نکلے۔ تو اس عورت کو ساتھ لے کر واپس لوٹ جا اور چند دن یہیں قیام کرو، پھر رات کے وقت آہستہ سے اسے ساتھ لے کر چلے جاؤ اور اسے اس کے باپ کے پاس پہنچا دو۔ پس

مجھے اپنی عمر کی قسم! ہمیں اسے اپنے باپ سے روکنے کی کوئی حاجت نہیں اور ہمارے لیے اب اس بارے میں تکلیف کے وہ جذبات بھڑکے ہوئے ہیں جو ہمیں پہنچی ہے۔ پس اس نے ایسا کر لیا، پس جب دو دن یا تین دن اس طرح گزر گئے تو وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ پس میں چلتی رہی یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئی۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب ہبار بن ام درہم نے انہیں خوفزدہ کیا تو جو خوف اور ڈر آپ کو لاحق ہوا اس کی وجہ سے وہ حمل ساقط ہو گیا جو آپ کے پیٹ میں تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرکین میں سے جب لوگوں کو قیدی بنایا گیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسلام لانے کی گفتگو کی اور اس بارے میں وہ پرعزم نہ تھے اور نہ ہی اس بارے انہوں نے اعتراف یقینی کیا۔ اور شبہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے قریب ہونے کا ارادہ کیا اور وہ مشرکین سے دور نہ ہوئے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر کوئی کافر دل اور زبان سے ایمان کے بارے کلام کرے اور اس میں اسے عزیمت حاصل نہ ہو تو وہ مومن نہیں۔ اور جب اس کی مثل صورت مومن سے پائی جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، مگر یہ کہ وہ ایسا وسوسہ ہو جس کو روکنے پر وہ قادر نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہے اور اسے ساقط کر دیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور فرمایا ہے: وَ اِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ یعنی اگر ان کی طرف سے یہ قول بطور خیانت اور مکر ہے۔ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ تحقیق انہوں نے اس سے قبل اپنے کفر کے ساتھ اور آپ کے ساتھ اپنے مکر اور آپ کے ساتھ قتال کر کے اللہ تعالیٰ سے خیانت کی ہے۔ اور اگر ان کی طرف سے یہ قول خیر ہے اور اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے تو وہ ان سے اسے قبول کر لے گا اور انہیں اس سے بہتر عوض عطا فرمائے گا جو ان سے نکالا ہے اور ان کے سابقہ گناہ، ان کا کفر، ان کی خیانت اور ان کا مکر سبھی بخش دے گا(1)۔ اور خیانۃ کی جمع خیائن ہے۔ اور واجب تھا کہ یہ کہا جاتا: خوائن کیونکہ یہ واوی الفاظ میں سے ہے، مگر انہوں نے اس کے اور خائنۃ کی جمع کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: خائن و خوان و خونۃ و خانۃ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 885

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور وہ جنہوں نے پناہ دی (مہاجرین کو) اور (ان کی) مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی، نہیں تمہارے لیے ان کی وراثت سے کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملہ میں تو فرض ہے تم پر ان کی امداد مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح) کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، اگر تم (ان حکموں پر) عمل نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور (پھیل جائے گا) بڑا فساد۔ اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اور جنہوں نے پناہ دی اور ان کی امداد کی وہی (خوش نصیب) لوگ سچے ایمان دار ہیں انہیں کے لیے بخشش ہے اور باعزت روزی۔ اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہیں میں سے ہیں اور رشتہ دار (ورثہ میں) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں حکم الٰہی کے مطابق یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سورت کا اختتام موالاۃ کے ذکر کے ساتھ کیا تا کہ ہر فریق اپنے اس دوست اور ولی کو جان لے جس سے وہ مدد طلب کر سکتا ہے۔ ہجرت اور جہاد کا لغوی اور اصطلاحی معنی ومفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا یہ اس پر معطوف ہے۔ اور مراد وہ انصار ہیں جو ان سے پہلے ایمان کے ساتھ اپنے گھروں میں اقامت گزیں تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین ان سے آملے۔ اولئك یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ بَعْضُهُمْ یہ دوسرا مبتدا ہے۔ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یہ اس کی خبر ہے اور پھر سب مل کر ان کی خبر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اولیاء بعض، فی المیراث (یعنی وہ میراث میں ایک دوسرے کے ولی ہیں) پس وہ ہجرت کے سبب ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے۔ اور وہ آدمی جو ایمان تو لایا لیکن اس نے ہجرت نہ کی تو وہ اس کا وارث نہ بن سکتا جس نے ہجرت کی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ، الآیہ کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اسے ابو داؤد نے بیان کیا ہے۔

اور میراث مومنین میں سے ذوی الارحام کے لیے ہوگی۔ اور دو دین رکھنے والے باہم کسی شے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد سامنے آیا: ''فرائض (حصص) کو ان کے اہل کے ساتھ ملحق کر دو'' (1)۔ اس کا بیان پہلے آیۃ المواریث میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں نسخ نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی ہے وہ نصرت اور مدد کرنے میں ایک

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 997

دوسرے کے دوست ہیں، جیساکہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ مبتدا اور خبر ہے۔ مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ یحییٰ بن وثاب، اعمش اور حمزہ نے واو کے کسرہ کے ساتھ مِّنْ وِّلَايَتِهِمْ پڑھا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ولیت الشیٔ (میں شے کا والی بنا) سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: ولی بین الولایۃ جس کی دوستی واضح ہو وہ ولی کہلاتا ہے اور وال بین الولایۃ (اور جس کی امارت بین ہو وہ والی کہلاتا ہے) اس مقام پر فتحہ یعنی ولایۃ زیادہ واضح اور احسن ہے، کیونکہ یہ نصرت اور نسب کے معنی میں ہے۔ اور کبھی وَلایۃ اور وِلایۃ دونوں کا اطلاق امارت پر کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ مراد یہ ہے کہ وہ مومنین جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگر وہ تمہیں دار الحرب سے اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لیے افرادی یا مالی امداد کے لیے پکاریں تو تم ان کی امداد کرو اور یہ تم پر فرض ہے پس تم انہیں ذلیل ورسوا نہ کرو، مگر یہ کہ اگر وہ تم سے ایسی کافر قوم کے خلاف مدد طلب کریں جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہو تو پھر ان کے خلاف تم مدد نہ کرو اور اپنا عہد نہ توڑو یہاں تک کہ اس کی مدت مکمل ہو جائے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ انتہائی کمزور اور ضعیف ہوں تو پھر ان کے ساتھ دوستی اور موالات قائم رہے گی اور ان کی مدد و نصرت واجب ہوگی، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک جھپکنے والی آنکھ بھی باقی رہے گی یہاں تک کہ وہ انہیں بچانے کے لیے ضرور نکلے گی، اگر ہماری تعداد اسے برداشت کر سکتی ہو یا پھر انہیں وہاں سے نکالنے کے لیے ہم اپنے سارے مال خرچ کر دیں گے یہاں تک کہ کسی کے پاس ایک درہم بھی باقی نہ رہے۔ اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمیع علماء نے کہا ہے: لیکن اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، اس پر جس نے مخلوق کے لیے اپنے بھائیوں کو دشمن کی قید میں چھوڑے رکھنے کو حلال قرار دیا ہے اس کے باوجود کہ ان کے قبضے میں اموال کے خزانے بھی ہوں اور وافر احوال وقدرت، تعداد اور قوت وطاقت بھی میسر ہو۔ زجاج نے کہا ہے: اغراء کی بنا پر فعلیکم النصر نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے کفار اور مومنین کے درمیان موالات کو ختم کر دیا ہے۔ اور مومنین کو آپس میں ایک دوسرے کا دوست اور کفار کو آپس میں ایک دوسرے کا حمایتی قرار دیا ہے، وہ اپنے دین کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنے اعتقاد کے مطابق باہم معاملات کرتے ہیں۔ ہمارے علماء نے ایسی کافرہ عورت کے بارے میں کہا ہے جس کا بھائی مسلمان ہو کہ وہ اس کی شادی نہیں کر سکتا، کیونکہ ان دونوں کے درمیان ولایت موجود نہیں، اور اس عورت کی مثل دین رکھنے والا اس کی شادی کر سکتا ہے۔ بس جس طرح مسلمان عورت کی شادی مسلمان ہی کر سکتا ہے، اسی طرح کافرہ کی شادی بھی وہ کافر ہی کر سکتا ہے جو اس کا قریبی ہو یا اس کا بشپ ہو، اگرچہ وہ کسی مسلمان سے ہو، مگر یہ کہ وہ عورت آزاد ہو، پس اگر اس کا عقد غیر آزاد پر کیا گیا تو وہ فسخ کر دیا جائے گا اگر وہ کسی مسلمان کا ہو اور نصرانی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ اور اصبغ نے کہا ہے: وہ عقد فسخ نہیں کیا جائے گا، (کیونکہ) مسلمان کا عقد تو اولیٰ اور افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا تَفْعَلُوْهُ اس میں ضمیر موارثت اور اس کے التزام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کا معنی یہ

ہے: مگر تم انہیں چھوڑ دو وہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے جیسے وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ ضمیر تناصر (ایک دوسرے کی مدد کرنا) موازرۃ (اظہار ہمدردی اور غم خواری کرنا) معاونۃ اور اتصال الایدی (ہاتھ ملانا) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ اگر نہ کیا گیا تو قریب ہے اس سے فتنہ واقع ہو جائے اور یہ پہلے سے زیادہ مؤکد ہے۔

ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز سے انہوں نے عبید کے دو بیٹوں محمد اور سعد سے اور انہوں نے ابوحاتم مزنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے پاس وہ آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو تم اس کا نکاح کر دو اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ کفو اور مال کے اعتبار سے کچھ کمی بھی ہو؟ تو آپ نے فرمایا: إذا جاء کم من ترضون دینہ و خلقہ فأنکحوہ(1) آپ نے یہ تین بار فرمایا: ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر اس عہد میثاق کی حفاظت کی طرف لوٹ رہی ہے جسے یہ ارشاد متضمن ہے: **اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ** اور یہ اگر نہ کیا جائے تو یہ بذات خود ایک فتنہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دین کے بارے میں مسلمانوں کی مدد کرنے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہی دوسرے قول کا معنی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کو دین میں اپنی ولایت کا اہل قرار دیا ہے ان کے سوا کسی کو نہیں۔ اور کافروں کو ایک دوسرے کا حمایتی قرار دیا ہے۔ پھر فرمایا ہے: **اِلَّا تَفْعَلُوْهُ** اور وہ یہ ہے کہ مومن کافر کا ولی ہے نہ کہ مومنین کا۔ **تَكُنْ فِتْنَةٌ** یعنی جنگ کی مشقت آپڑے گی اور وہ جو اس کے ساتھ جاری ہوتی ہے مثلاً حملے، جلاوطنی اور قید وغیرہ۔ اور فساد کبیر سے مراد شرک کا ظاہر ہونا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ **تَكُنْ فِتْنَةٌ** میں نصب بھی جائز ہے اور معنی یہ ہوگا تکن فِعلتُکم فتنۃ و فسادا کبیرا (تمہارا ایسا کرنا فتنہ اور فساد کبیر کا باعث بن جائے گا) حقا یہ مصدر ہے، یعنی انہوں نے ہجرت اور نصرت کے ساتھ اپنے ایمان کو پختہ اور ثابت کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی اس بشارت کے ساتھ تصدیق کر دی ہے کہ فرمایا: **مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ** یعنی ان کے لیے جنت میں بہت بڑا ثواب ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا** مراد وہ لوگ ہیں جو حدیبیہ اور بیعت رضوان کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی۔ اور وہ یہ کہ اس کے بعد ہجرت پہلی ہجرت سے رتبہ میں کم تھی۔ اور دوسری ہجرت وہ ہے جس میں صلح واقع ہوئی اور دو سال تک جنگ نے اپنے ہتھیار ڈالے رکھے پھر مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں''۔ تو یہ واضح ہو گیا کہ جو اس کے بعد ایمان لایا اور ہجرت کی تو وہ ان کے ساتھ مل جائے گا۔ اور منکم کا معنی ہے نصرت و موالات میں تمہاری مثل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: **وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ** یہ مبتدا ہے۔ أولوا کی واحد ذو ہے اور الرحم مونث ہے، اس کی جمع

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 128۔ ایضاً، حدیث نمبر 1005-1004، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارحام ہے۔ اور یہاں اس سے مراد عصبات ہیں نہ کہ وہ جو رحم سے پیدا ہوا ہو۔ اور وہ جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ رحم سے مراد عصبات ہیں وہ عربوں کا یہ قول ہے: وصلتك رحم (عصبہ نے تجھے ملا دیا، جوڑ دیا) وہ اس سے ماں کی قرابت مراد نہیں لیتے۔ قتیلہ بنت حارث جو کہ نضر بن حارث کی بہن ہے نے کہا، اسی طرح ابن ہشام نے کہا ہے: سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ وہ نضر کی بیٹی ہے اس کی بہن نہیں، ''کتاب الدلائل'' میں اسی طرح ہے۔ وہ اپنے باپ کا مرثیہ کہتی ہے جس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بند کر کے وادی صفراء میں قتل کیا:

يا راكباً إن الأثيل مظِنةٌ من صُبح خامسةٍ وأنت مُوَفَّقُ

اے سوار! مقام اثیل کے متعلق مجھے پانچویں روز کی صبح سے بدگمانی ہے اور تو بڑے ٹھیک وقت پر آیا ہے (جب تیری ضرورت تھی)

أبلِغ بها مَيْتًا بأن تحيّة ما إن تزال بها النجائب تخفِقُ

وہاں کی ایک میت کو پیغام پہنچا دینا کہ اسے سلام ہو جب تک شریف اونٹنیاں وہاں تیزی سے آتی جاتی رہیں۔

منّی إليك و عبرةٌ مسفوحةٌ جادت بواكفِها و أخرى تخنقُ

میری طرف سے تیرے لیے وہ بہائے گئے آنسو ہیں جو اپنے محل سے کثرت سے بہتے ہیں اور وہ رونے میں پھندا لگائے ہوئے ہیں۔

هل يسمعَنّي النضرُ إن ناديتُه أم كيف يسمعُ ميّت لاينطق

اگر میں پکاروں تو کیا نضر میری پکار سنے گا یا وہ مردہ کیسے سن سکتا ہے جو بول نہیں سکتا۔

أمحمّدٌ يا خيرَ ضِنءِ كريمةٍ في قومها والفحلُ فحلٌ مُعرِق

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اے اپنی قوم کی شریف عورت کی بہترین اولاد! اور شریف تو وہی ہوتا ہے جو نسلاً شریف ہو۔

ما كان ضرّك لو مننتَ وربّما منّ الفتى وهو المَغيظ المُحْنَق

اگر آپ احسان کرتے (اور اسے چھوڑ دیتے) تو آپ کا کیا نقصان ہوتا اور ایسا کم ہوا ہے کہ نوجوان ایسی حالت میں احسان کرے جب کہ وہ غصہ سے بھرا کینہ ور ہو۔

لوكنتَ قابِلَ فديةٍ لفديتُه ياعزَّ ما يُفْدى به ما يُنْفِق

اگر آپ فدیہ قبول کر لیتے تو میں اس کا فدیہ اس معزز (اور قیمتی) شے کے ساتھ ادا کرتی جس کے ساتھ فدیہ دیا جا سکتا ہے اور جو خرچ ہو سکتی ہے۔

فالنضرُ أقربُ مَن أسَرْتَ قرابةً وأحقُّهم إن كان عِتْق يُعْتَق

کیونکہ نضر ان تمام لوگوں میں زیادہ قریبی رشتہ دار ہے جن کو آپ نے اسیر کیا اور ان سب سے زیادہ اس بات کا حق دار ہے کہ اگر آزادی ممکن ہو تو آزاد کر دیا جائے۔

ظلّت سیوفُ بنی أبیه تنوشُه ۔ للہ أرحام هناك تُشقَّق

اس کے بھائیوں کی تلواریں اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہیں۔ ہائے خدایا وہاں قرابتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہے۔

صَبْرًا یُقاد إلی المنیّة مُتْعَبا ۔ رَسْفَ المُقَیَّد وهو عانٍ مُوثَق

اسے موت کی جانب اس حالت میں کھینچا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں، تھکا ماندہ ہے، بیڑیوں میں بمشکل پاؤں اٹھا رہا ہے اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ سلف اور ان کے بعد آنے والوں نے ذوی الارحام کو وارث بنانے میں اختلاف کیا ہے۔ اور ذوی الارحام وہ ہیں جن کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ مقرر نہیں۔ اور یہ میت کے رشتہ دار تو ہیں لیکن عصبہ نہیں ہیں، جیسے بیٹیوں کی اولاد، بہنوں کی اولاد، بھائی کی بیٹیاں، پھوپھی اور خالہ اور چچا جو باپ کا ماں کی طرف سے بھائی ہو، نانا، نانی اور جوان کے قریبی ہیں۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: ذوی الارحام میں سے جس کا کوئی حصہ نہیں وہ وارث نہیں بن سکتا۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے۔ اور حضرت مکحول اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور جنہوں نے انہیں وارث بنائے جانے کا قول کیا ہے وہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود، حضرت معاذ، حضرت ابودرداء اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور یہی اہل کوفہ، امام احمد، اسحاق کا قول ہے۔ اور انہوں نے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: ذوی الارحام میں دو سبب جمع ہیں ایک قرابت اور دوسرا اسلام۔ پس وہ وراثت کا اس سے زیادہ حق دار ہے جس میں صرف ایک سبب پایا جاتا ہے اور وہ سبب اسلام ہے۔ پہلے فریق نے جواب دیتے ہوئے کہا ہے: یہ آیت مجمل اور جامع ہے۔ اور ظاہراً یہ ہر رشتہ دار کو شامل ہے چاہے وہ قریبی ہو یا بعیدی اور آیات مواریث مفسر ہیں اور مفسر مجمل پر راجح ہوتا ہے اور اس کی وضاحت اور بیان ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء کو سبب ثابت قرار دیا ہے اور اس میں مولی کو قائم مقام عصبہ کے رکھا ہے اور ارشاد فرمایا: الولاء لمن أعتق (1) (ولاء اس کے لیے ہے جس نے آزاد کیا) اور ولاء کو بیچنے اور اسے ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور دوسروں نے اس سے استدلال کیا ہے جیسے ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی بوجھ (یعنی قرض وغیرہ) چھوڑا تو وہ میرے سپرد ہے''۔ اور بسا اوقات یوں فرمایا'' پس وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے ہیں۔ اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے پس میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں میں ان کی طرف سے دیت اور تاوان ادا کروں گا اور میں ہی اس کا وارث ہوں گا اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا اور کوئی وارث نہ ہو اور اس کی طرف سے تاوان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 48

اور دیت ادا کرے گا اور اس کا وارث بنے گا'' (1)۔ اور دار قطنی نے حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کا مولیٰ ہے جس کا کوئی مولیٰ نہیں اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہیں''۔ یہ روایت موقوف ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ماموں وارث ہے''۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نہیں جانتا یہاں تک کہ جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئیں''۔ پھر فرمایا: ''پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے پوچھنے والا سائل کہاں ہے''؟ راوی کا بیان ہے: پس وہ آدمی حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل امین نے مجھے ابھی پیغام پہنچایا ہے کہ ان دونوں کے لیے کوئی شے نہیں''۔ دار قطنی نے کہا ہے: اسے مسعدہ کے بغیر محمد بن عمرو سے کسی نے مسند ذکر نہیں کیا اور یہ ضعیف ہے۔ اور درست یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ زیاد بن ابی سفیان نے اپنے ہمنشین کو کہا: کیا تو جانتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھوپھی اور خالہ کے بارے میں کیسے فیصلہ کیا؟ تو انہوں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: بے شک میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے زیادہ جانتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے بارے میں کیسے فیصلہ کیا؟ آپ نے خالہ کو قائم مقام ماں کے اور پھوپھی کو قائم مقام باپ کے رکھا ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 46-45

ایضاً، حدیث نمبر 2512، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب ذوی الارحام، حدیث نمبر 2727، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۂ براءۃ

آیاتہا ۱۲۹ ۹ سُورَۃُ التَّوبَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۳ رکوعاتہا ۱۶

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①

"یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے الله اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا مشرکوں میں سے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ پہلا مسئلہ اس کے اسماء کے بارے میں ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورت براءت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ فاضحہ (برائیاں ظاہر کرنے والی ہے) (حکم) مسلسل نازل ہوتا رہا کچھ ان کے بارے اور کچھ ان کے بارے، یہاں تک کہ ہم ڈرنے لگے کہ یہ کسی ایک کو نہیں چھوڑے گی (1)۔ ابونصر عبدالرحیم قشیری نے کہا: یہ سورت غزوہ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے بعد نازل ہوئی، اور اس کی ابتدا میں کفار کا ان کے ساتھ معاہدوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ اور اس سورت میں منافقین کے مخفی اور پوشیدہ رازوں کو کھولا گیا ہے۔ اور اس کا نام الفاضحہ اور البحوثہ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ منافقین کے رازوں کے بارے بحث کرتی ہے۔ اور اس کا نام مبعثرہ اور بعثرہ بھی ہے اور اس کا معنی بھی البحث ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے اس سورت کے اوّل سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ساقط ہونے کے سبب میں اختلاف کیا ہے اس بارے میں پانچ اقوال ہیں۔ (۱) یہ کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کے درمیان اور کسی دوسری قوم کے درمیان معاہدہ ہوتا تو جب وہ اسے توڑنے کا ارادہ کرتے تو ان کی طرف ایک تحریر لکھتے اور اس میں بسم الله نہ لکھتے تھے۔ پس جب اس معاہدہ کو توڑنے کے بارے میں سورت براءت نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس کے ساتھ بھیجا اور آپ نے حج کے دنوں میں یہ سورت ان پر جا کر پڑھی اور اس میں بِسْمِ اللّٰهِ نہ پڑھی گئی اس بنا پر کہ عہد توڑنے کی صورت میں بسم الله ترک کرنا ان کی عادت جاریہ تھی۔

اور دوسرا قول یہ ہے: امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن المثنی نے یحییٰ بن سعید سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عوف نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں یزید الرقاشی نے بیان کیا ہے انہوں

---

1۔ تفسیر ابن عباس، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 449

نے کہا ہمیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: تمہیں کس شے نے اس طرف برانگیختہ کیا کہ تم نے ''الانفال'' کا اور یہ مثانی میں سے ہے۔ اور براءت کا قصد کیا ہے اور یہ مئین میں سے ہے اور تم نے ان دونوں کو ملا دیا ہے اور تم نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی سطر نہیں لکھی اور تم نے اسے سات طویل سورتوں میں رکھا ہے۔ پس تمہیں کس شے نے اس پر ابھارا ہے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی شے (آیت) نازل ہوتی تو آپ اپنے پاس کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے: ''اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں جگہ پر رکھو (یعنی لکھ دو)'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیات نازل ہوتیں تو آپ فرماتے: ''ان آیات کو اس سورت میں لکھ دو جس میں اس طرح کا ذکر کیا جاتا ہے'' (1)۔

اور ''انفال'' پہلے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اور ''براءت'' آخر قرآن میں سے ہے اور اس کا قصہ اس کے قصہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا اور ابھی آپ نے ہمارے لیے یہ وضاحت نہ کی تھی کہ یہ اس میں سے ہے تو میں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ (براءت) اس (الانفال) میں سے ہے۔ پس اسی وجہ سے ان دونوں کو ملا دیا گیا ہے اور ان کے درمیان بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی سطر نہیں لکھی گئی۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے: اور یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں کہا ہے جسے ابن وہب، ابن قاسم اور ابن عبد الحکم نے روایت کیا ہے کہ جب اس کا اول حصہ ساقط ہوا تو اس کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بھی ساقط ہو گئی۔ اور اسے ابن عجلان سے روایت کیا گیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ سورۃ براءۃ، سورۂ بقرہ کے برابر تھی یا اس کے قریب تھی۔ پس اس میں سے کچھ حصہ ختم ہو گیا، پس اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (2) نہیں لکھی گئی۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: یہ سورۂ بقرہ کی مثل تھی۔

اور چوتھا قول ہے: یہ خارجہ اور ابو عصمہ وغیرہما نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: جب انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصحف لکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں اختلاف ہوا، ان میں سے بعض نے کہا: سورۂ براءت اور الانفال ایک سورت ہے۔ اور بعض نے کہا: یہ دو سورتیں ہیں۔ پس ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا گیا ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا کہ یہ دو سورتیں ہیں۔ اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ چھوڑ دی گئی ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا: یہ دونوں ایک سورت ہے۔ پس دونوں فریق ایک ساتھ راضی ہو گئے اور دونوں کی حجت مصحف میں ثابت ہو گئی۔

اور پانچواں قول یہ ہے: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: سورت براءت میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ امان ہے۔ اور سورت براءت تلوار کے ساتھ نازل ہوئی اس میں امان نہیں ہے۔ اور مبرد سے اس کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ ایضاً، حدیث نمبر 3011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، باب من جهر بها، حدیث نمبر 668، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 891

انہوں نے کہا: اسی لیے ان دونوں کو جمع نہیں کیا گیا کیونکہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ رحمت ہے اور سورت براءت ناراضگی کے ساتھ نازل ہوئی۔ اور اس کی مثل سفیان سے بھی مروی ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: اس سورت کی ابتداء میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نہیں لکھی گئی کیونکہ تسمیہ رحمت ہے اور رحمت امان ہے اور یہ سورت منافقین کے بارے میں اور تلوار کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اور منافقین کے لیے امان نہیں ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کے شروع میں تسمیہ نہیں لکھا گیا، کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سورت میں تسمیہ کے ساتھ نازل ہی نہیں ہوئے۔ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ نے ہمارے لیے یہ بیان نہیں فرمایا کہ یہ اس میں سے ہے، یہ اس پر دلیل ہے کہ تمام سورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپ کے بیان کے ساتھ مرتب ہوئیں اور یہ کہ اکیلے براءت کو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سورۂ انفال کے ساتھ ملایا گیا۔ اس لیے کہ اس بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے سے پہلے ہی موت آپ کو جلدی آ گئی۔ اور ان دونوں کو قرینتین پکارا جاتا ہے، پس واجب ہے کہ ان دونوں کو جمع کیا جائے اور ان میں سے ایک کو دوسری کے ساتھ ملایا جائے، اس وصف اقتران کی وجہ سے جو ان دونوں کو لازم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باحیات تھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس دین میں اصل (اور حجت) ہے، کیا آپ حضرت عثمان اور مقتدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف دیکھ نہیں رہے کہ انہوں نے نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس الشبہ کی طرف کیسے پناہ لی اور انہوں نے دیکھا کہ ''براءت'' کا قصہ ''الانفال'' کے قصہ کے مشابہ ہے پس انہوں نے اسے اس کے ساتھ ملا دیا؟ تو جب اللہ تعالیٰ نے تالیف قرآن میں دخول قیاس کو بیان کر دیا ہے تو دیگر تمام احکام میں تیرا کیا خیال ہے (یعنی قیاس حجت شرعیہ تسلیم کیا جائے گا)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: بَرَآءَةٌ آپ کہتے ہیں: برئت من الشیء ابرأ براءۃ فأنا منه بری جب تو اپنی ذات سے کسی شے کو زائل کر دے اور تیرے اور اس کے درمیان جو سبب ہے اسے قطع کر دے۔ اور بَرَآءَةٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ھذہ براءۃ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسے مبتدا ہونے کے سبب رفع دیا جائے اور خبر قول باری تعالیٰ الی الذین میں ہو۔ اور نکرہ کو مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ یہ نکرہ موصوفہ ہے اور یہ من وجہ معرفہ ہو چکا ہے لہٰذا اسے اخبار عنہ بنانا جائز ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے براءۃ نصب کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے التزموا براءۃ پس اس میں اغراء کا معنی پایا گیا۔ اور یہ فعالۃ کے وزن پر مصدر ہے، جیسا کہ شناءۃ اور دناءۃ مصدر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ یعنی ان لوگوں کے ساتھ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا تھا، کیونکہ آپ عقد کرنے کے والی اور مختار تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام اس کے ساتھ راضی تھے، تو گویا انہوں نے باہمی عقد اور معاہدہ کیا پس یہ عقد ان کی طرف منسوب ہوا۔ اور اسی طرح کفار کے ائمہ اپنی قوم کی طرف سے جو معاہدہ کریں گے وہ ان کی طرف منسوب ہوگا وہ تمام کو شامل ہوگا اور اس کے ساتھ ان کا مواخذہ کیا جائے گا، جب کہ اس کے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

سوا کچھ ممکن نہیں، کیونکہ تمام سے رضامندی حاصل کرنا متعذر رہے (1)، پس جب امام وقت کسی ایسے امر کے بارے معاہدہ کر لے جس میں وہ مصلحت دیکھتا ہے تو وہ تمام رعایا پر لازم ہو جائے گا (اور اس کی پابندی تمام پر لازم ہوگی)

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ۝

"(اے مشرکو!) پس چل پھر لو ملک میں چار ماہ اور جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَسِيحُوا یہ خبر سے خطاب کی طرف رجوع ہے، ای قل لهم سیحوا تم ان مشرکوں سے کہہ دو تم زمین میں چل پھر لو درآنحالیکہ تم آتے جاتے رہو، محفوظ و مامون ہو تمہیں مسلمانوں میں سے کسی سے جنگ، مال چھیننے، قتل کرنے اور قید کرنے کا کوئی خوف نہیں۔ کہا جاتا ہے: ساح فلان فی الأرض یسیح سیاحة و سیوحا و سیحانا (فلاں نے زمین میں سیر کی) اور اسی سے السیح فی الماء الجاری المنبسط (پھیلے ہوئے جاری پانی میں تیرنا) ہے۔ اور اس معنی میں طرفہ بن عبد کا قول ہے:

لو خفتُ هذا منك ما نِلْتَنِي حتى ترى خيلا أمامي تَسِيحُ

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے تاجیل اور مہلت کی کیفیت میں اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں (اختلاف کیا ہے) جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع تعلق کا اعلان کیا ہے۔ پس محمد بن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے: یہ مشرکین کی دو قسمیں ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جن کے معاہدہ کی مدت چار ماہ سے کم تھی پس انہیں چار ماہ مکمل کرنے کی مہلت دی گئی اور دوسری وہ ہے جن کے معاہدہ کی کوئی معین اور محدود مدت نہ تھی پس اسے چار ماہ میں محصور کر دیا تاکہ وہ اپنے آپ کو پابند کر لیں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے اعلان جنگ ہے، جہاں کوئی پایا گیا وہیں قتل کر دیا جائے گا اور قیدی بنا لیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔ اور اس مدت کی ابتداء حج اکبر کے دن سے ہے اور اس کا اختتام دس ربیع الآخر کو ہوگا۔ اور رہے وہ جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تو ان کی مدت چار اشہر حرام کے گزرنے تک ہے۔ اور وہ پچاس دن ہیں: بیس ذوالحجہ اور محرم میں سے ہیں۔

اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ چار مہینے ان کے لیے تھے جن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ چار ماہ سے کم تھا اور جن کا معاہدہ چار مہینوں سے زیادہ تھا تو وہ وہ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ (توبہ: 4) کے ساتھ حکم فرمایا کہ ان کا عہد مکمل کیا جائے۔ اور یہی موقف علامہ طبری وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

محمد بن اسحاق اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال قریش کے ساتھ صلح کی، اس شرط پر کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، اس عرصہ میں لوگ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

پرامن رہیں گے۔ اور ایک دوسرے پر (حملہ وغیرہ کرنے) سے باز رہیں گے۔ پس بنو خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاہدہ میں داخل ہو کر آپ کے حلیف ہو گئے اور بنو بکر قریش کے عہد میں داخل ہو کر ان کے حلیف بن گئے، پھر بنو بکر نے خزاعہ پر زیادتی کی اور انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔ اور اس کا سبب وہ دم تھا جو بنی بکر کا اسلام سے کچھ مدت پہلے خزاعہ پر لازم ہوا تھا (یعنی خزاعہ نے ان کا آدمی قتل کیا تھا اور اس کا بدلہ ابھی باقی تھا) پس جب حدیبیہ کے مقام پر صلح واقع ہو گئی، تو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پرامن ہو گئے، تو بنو بکر میں سے بنو دیل نے اسے غنیمت جانا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا دم واجب تھا۔

یعنی انہوں نے اس فرصت اور خزاعہ کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بنی اسود بن رزن کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور یہی وہ ہیں جنہیں خزاعہ نے قتل کیا تھا، پس نوفل بن معاویہ الدیلی ان لوگوں کے ہمراہ نکلا جنہوں نے بنی بکر بن عبد منات میں سے ان کی اتباع و پیروی کی (اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوئے) یہاں تک کہ انہوں نے رات کے وقت خزاعہ پر حملہ کر دیا اور وہ قتل ہو گئے اور قریش نے ہتھیاروں کے ساتھ بنی بکر کی معاونت کی اور قریش کی ایک جماعت نے تو بنفس نفیس ان کی مدد کی، پس خزاعہ نے شکست خوردہ حالت میں حرم میں پناہ لی جیسا کہ یہ مشہور واقعہ لکھا ہوا ہے۔ پس یہ اس صلح کو توڑنا ہے جو حدیبیہ میں واقع ہوئی تھی، چنانچہ عمرو بن سالم، بدیل بن ورقاء الخزاعی اور بنی خزاعہ کی ایک جماعت یہ سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد طلب کرنے کے لیے اس معاملہ میں جو انہیں بنو بکر اور قریش کی طرف سے پیش آیا۔ اور عمرو بن سالم نے اسے شعر کی صورت میں اس طرح کہا:

یا ربّ إنّی ناشدٌ محمدا　　حِلفَ أبینا وأبیه الأتلَدا

اے میرے رب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اور ان عظیم آباء واجداد کے درمیان قائم معاہدہ کو یاد دلاتا ہوں۔

کنتَ لنا أبًا و کنّا وَلَدَا　　ثُمّتَ أسلمنا ولم ننزِع یَدَا

آپ ہمارے لیے باپ ہیں اور ہم اولاد ہیں پھر ہم نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔

فانصرْ هداكَ الله نصرًا عَتَدَا　　وادْعُ عبادَ الله یأتوا مَدَدَا

اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے آپ فوراً مدد فرمایئے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بلایئے کہ وہ مدد کو آئیں۔

فیهم رسولُ الله قد تجرّدَا　　أبیضُ مثلَ الشمس ینمُو صُعُدَا

ان (لشکر) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں جو مقام و مرتبہ میں منفرد اور یکتا ہیں مثل آفتاب روشن ہیں بلندیاں چڑھ رہے ہیں۔

إن سِیمَ خَسْفًا وجهُه تَربّدَا　　فی فَیلَقٍ كالبحرِ یجری مُزْبِدَا

اگر ان پر زیادتی کی جائے تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے ایسے عظیم لشکر میں جو سمندر کی جھاگ اچھالتے ہوئے چلتا ہے۔

إنّ قریشا أخلفوك الموعِدَا　　و نقضوا میثاقَكَ المؤكَّدَا

بے شک قریش نے آپ کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ کیا ہوا پختہ وعدہ توڑ دیا ہے۔

وزعموا أن لست تدعو أحدًا وهم أذلُّ و أقلُّ عددًا

اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ آپ کسی کو نہیں بلائیں گے اور وہ خود ذلیل (کمزور) اور تعداد میں تھوڑے ہیں۔

هم بيّتونا بالوتير هُجّدًا وقتلونا رُكّعًا و سُجّدًا

انہوں نے وتیر کے مقام پر رات کے وقت حملہ کیا جب کہ ہم سوئے ہوئے تھے یا نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے ہمیں رکوع و سجود کرتے ہوئے (اسلام کی حالت میں) قتل کیا۔

پس رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''میں غالب نہیں آ سکتا اگر میں بنی کعب کی مدد نہیں کرتا''۔ پھر آپ ﷺ نے بادل کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''بے شک یہ بھی بنی کعب کی مدد کے لیے رو رہا ہے''۔ بنی کعب سے مراد خزاعہ ہیں۔ اور رسول الله ﷺ نے بدیل بن ورقاء اور ان کے ساتھیوں کو فرمایا: ''بے شک ابوسفیان عنقریب آئے گا تا کہ معاہدہ کو پختہ کرے اور صلح میں اضافہ کرے اور وہ بغیر مقصد اور حاجت (حاصل کیے) واپس لوٹ جائے گا''۔ قریش نے جو کیا وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہوئے، پس ابوسفیان مدینہ طیبہ کی طرف نکلا تا کہ معاہدہ کو برقرار رکھے اور صلح میں اضافہ کرے، لیکن وہ بغیر حاجت کے لوٹ آیا جیسا کہ رسول الله ﷺ نے خبر دی ہے۔ اور آپ کی یہ خبر معروف ہے۔

اور رسول الله ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی اور الله تعالیٰ نے اسے فتح فرما دیا۔ اور یہ 8 ہجری میں ہوا۔ پس جب ہوازن میں فتح مکہ کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری نے انہیں جمع کیا، جیسا کہ غزوۂ حنین کے بارے میں مشہور و معروف ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ عنقریب آئے گا۔ اور کافروں کے خلاف مسلمانوں کو فتح و کامرانی اور مدد و نصرت حاصل ہوئی۔ حنین کے دن غزوۂ ہوازن یکم شوال 8 ہجری کو پیش آیا۔ اور رسول الله ﷺ نے غنائم میں سے اموال اور عورتوں کی تقسیم چھوڑ دی۔ آپ نے اسے تقسیم نہ کیا یہاں تک کہ آپ طائف میں آ گئے اور آپ ﷺ نے بیس سے کچھ زائد راتیں ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور اس کے سوا بھی کہا گیا ہے اور آپ نے ان کے خلاف منجنیق نصب کی اور ان پر اس کے ساتھ پتھر برسائے، جیسا کہ اس غزوہ میں یہ معروف ہے۔ پھر رسول الله ﷺ جعرانہ کی طرف واپس تشریف لائے اور حنین کے مال غنیمت کو وہاں تقسیم فرمایا، جیسا کہ اس کے بارے امر و خبر سب مشہور ہے۔ پھر رسول الله ﷺ واپس لوٹے اور الگ الگ ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے اس سال لوگوں کے لیے حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا۔ اور آپ پہلے امیر ہیں جنہوں نے اسلام میں حج ادا کروایا۔ مشرکوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا۔ اور حضرت عتاب بن اسید انتہائی نیکوکار، فضیلت رکھنے والے، متقی، زاہد تھے۔ کعب بن زہیر بن ابی سلمی رسول الله ﷺ کے پاس آیا اور آپ کی مدح بیان کی اور آپ کے سامنے اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا آغاز اس طرح ہے:

بانت سعاد فقلبي اليوم متبول

(میری سعاد جدا ہو گئی جس کی وجہ سے آج میرا دل ہلاک ہوا چاہتا ہے) اور اس نے آخر تک یہ قصیدہ کہہ دیا اور اس میں مہاجرین کا ذکر بھی کیا اور ان کی تعریف کی۔ اور اس سے پہلے اس کی حضور نبی کریم ﷺ کے بارے ہجو محفوظ تھی۔ پس انصار

نے اس پر نکتہ چینی کی اور اعتراض کیا جب اس نے ان کا ذکر نہ کیا، تو وہ دوسرے دن ایک اور قصیدہ لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں آیا اور اس میں وہ انصار کی مدح کرتا ہے۔ پس اس نے کہا:

من سَرّہ کرم الحیاۃ فلا یزل　　فی مِقْنَب من صالحی الأنصار

جسے زندگی کی شرافت خوش کرتی ہو تو وہ انصار کی صالح جماعت کے ساتھ رہے۔

وَرِثوا المکارم کابِرًا عن کابِرٍ　　إنّ الخیار هُمُبنُو الأخیار

یہ نسل در نسل بزرگی کے وارث چلے آ رہے ہیں، بہترین لوگ تو صرف بہترین لوگوں کی اولاد ہوتے ہیں۔

المکرِهین السَّمهرِیَّ بأذرع　　کسوافل الهِندِی غیرِ قِصار

وہ اپنے ہاتھوں سے سمہری نیزے چلاتے ہیں ہندی تلواروں کی طرح جو لمبی ہیں چھوٹی نہیں۔

والناظرین بأعینٍ محمَرّۃ　　کالجَمر غیرِ کَلِیلۃ الأبصار

وہ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہیں گویا وہ آگ کے انگارے ہیں ان کی آنکھیں تھکی ماندی ہیں۔

والبائعین نفوسَهم لنبیّهم　　للموت یوم تَعانُقٍ و کِرار

یہ اپنے نبی کی خاطر اپنے نفوس کو موت کے عوض بیچنے والے ہیں اس روز جو لشکروں کے ملنے کا دن ہے اور بار بار حملے کا دن ہے۔

یتطهّرون یرونه نُسکاً لهم　　بدماءِ مَن عَلِقوا من الکفار

یہ پاکیزگی حاصل کرتے ہیں اور اسے اپنی عبادت خیال کرتے ہیں ان کے خونوں سے جنہیں وہ کفار میں سے قتل کرتے ہیں۔

دَرِبوا کما دَربت ببطنِ خَفِیۃٍ　　غُلْبُ الرِّقابِ من الأسود ضَوَارِ

یہ عادی ہو گئے ہیں جس طرح خفیہ وادی میں موٹی گردنوں والے اور چیر پھاڑ کرنے والے شکاری شیر عادی ہو گئے ہیں۔

وإذا حَللت لیمنعوك إلیهُم　　أصبحت عند معاقل الأغفار

جب تو ان کے پاس اترے تا کہ وہ تیری حفاظت کریں تو گویا تو پہاڑی بکروں کی پناہ گاہ میں پہنچ گیا ہے۔

ضربوا علیًّا یوم بدرٍ ضربۃً　　دانت لوقعتها جمیعُ نِزار

انہوں نے بدر کے دن قریش پر ایسا وار کیا جس کے پڑنے سے قبیلہ نزار کے تمام افراد نے اطاعت اختیار کر لی۔

لو یعلم الأقوامُ عِلمِی کلّه　　فیهم لصَدّقنی الذین أمارِی

اگر لوگ ان کے بارے میں میرے علم جیسا علم رکھیں تو وہ بھی میری تصدیق کریں جو میرے بارے میں شک رکھتے ہیں۔

قومٌ إذا خَوَت النجوم فإنهم　　للطارقین النازلین مَقَارِی

وہ ایسی قوم ہیں جب ستارے غروب ہونے لگیں تو یہ رات کے وقت آنے والے مہمانوں کی خوب میزبانی کرتے ہیں۔

پھر طائف سے واپس لوٹنے کے بعد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحجہ، صفر، ربیع الاول، ربیع الآخر، جمادی الاولی اور جمادی

الآخرہ میں مدینہ طیبہ مقیم رہے اور رجب 9 ہجری میں مسلمانوں کا لشکر ساتھ لے کر غزوۂ روم، غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے۔ یہی وہ آخری غزوہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا پھر فرمایا کہ "وہ بیت اللہ شریف میں حاضر ہوں ننگے بدن مشرک بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہوں تو میں پسند نہیں کرتا کہ میں حج کروں یہاں تک کہ اس طرح نہ ہو" چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سورۂ براءت کی ابتدائی چالیس آیات بھیجیں تاکہ آپ انہیں حاجیوں کے سامنے پڑھیں۔ جب وہ چلے گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: "سورۂ براءت کی ابتدا سے اس قصہ کو لے کر جاؤ اور اس کے بارے لوگوں میں اعلان کر دو جب وہ جمع ہوں" پس حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ناقہ عضباء پر سوار ہو کر نکلے یہاں تک کہ مقام ذوالحلیفہ پر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پا لیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا: "أمیر أو مأمور"؟ (کیا امیر ہو یا مامور (تابع) ہو) تو انہوں نے جواب دیا: بلکہ میں تو مامور ہوں، پھر دونوں اٹھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کے لیے ان مراتب پر کھڑا کیا جن پر وہ دور جاہلیت میں تھے (1)۔ نسائی کی کتاب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم ترویہ (آٹھویں ذی الحجہ کا دن) سے ایک دن قبل لوگوں پر سورت براءت پڑھی یہاں تک کہ اسے ختم کیا۔ (یعنی مکمل سورت براءت پڑھ کر سنائی) اور یوم عرفہ اور یوم نحر (نویں اور دسویں ذی الحجہ کے دن) میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبہ ختم ہونے کے بعد تین دنوں میں (اسے پڑھا) اور جب وہاں سے واپس لوٹنے کا پہلا دن تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور انہیں بتایا وہ کیسے واپس چلیں گے اور کیسے رمی کریں گے، آپ انہیں ان کے مناسک سکھاتے رہے۔ پس جب آپ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں پر پوری سورت براءت پڑھی (2)۔

سلیمان بن موسیٰ نے کہا ہے: جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عرفات میں خطبہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے علی! اٹھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دو، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور وہ عمل کیا (یعنی سورت براءت پڑھ کر سنائی) فرمایا: میرے دل میں یہ بات آئی کہ تمام لوگ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر نہیں، چنانچہ میں نے یوم نحر کو خیموں کی تلاش شروع کر دی (اور وہاں جا کر انہیں پیغام پہنچایا)۔ ترمذی نے زید بن یثیع سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کون سی شے کے ساتھ آپ کو حج پر بھیجا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا: چار چیزوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے کہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے اور وہ جن کے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین معاہدہ ہے تو وہ اپنی پوری مدت تک ہے اور جن کا کوئی عہد نہیں تو ان کے لیے مدت چار ماہ ہے اور جنت میں سوائے مومن نفس کے کوئی داخل نہ ہوگا اور اس سال کے بعد مسلمان اور مشرک اکٹھے نہ ہوں گے (3)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور نسائی نے اسے نقل کیا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899 2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، جلد 2، صفحہ 42
3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 106۔ ایضاً، حدیث نمبر 3017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کہا ہے کہ آپ نے فرمایا: پس میں اعلان کرتا رہا یہاں تک کہ میری آواز بیٹھ گئی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تا کہ آپ ہر عہد والے کے ساتھ اس کا عہد توڑ دیں۔ اور ان سے یہ عہد لیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور اس سال 9 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کروایا۔ پھر آئندہ سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وہ حج ادا فرمایا جس کے بغیر آپ نے مدینہ طیبہ سے کوئی حج نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حج ذوالحجہ میں ادا ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک زمانہ گردش کناں ہے'' الحدیث۔ اس کا بیان آیۃ النسئ میں آئے گا۔ اور حج یوم قیامت تک ذوالحجہ میں ثابت اور پختہ ہو گیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے 9 ہجری میں ذوالقعدہ میں حج ادا کیا تھا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورت ''براءۃ'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ براءت اس نقض عہد کو متضمن ہے جس کا عقد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور عربوں کا عمل اور طریقہ یہ تھا کہ عقد کوئی نہیں کھول سکتا تھا مگر وہی جس نے وہ عقد کیا ہوتا یا پھر اس کے خاندان میں سے کوئی آدمی ایسا کر سکتا تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجت کے ساتھ عربوں کی زبانوں کو بند کرنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے اہل بیت میں سے اپنے عم زاد ہاشمی کو نقض عہد کے اعلان کے لیے بھیجا تا کہ ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی باقی نہ رہے (1)۔ اس مفہوم کو زجاج نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے کہا ہے: یہ آیت ہمارے اور مشرکین کے درمیان عہد توڑنے کے جواز کو متضمن ہے۔ اور اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان مدت گزر جاتی ہے تو ہم انہیں جنگ کے بارے آگاہ کرتے ہیں۔ ایذان کا معنی اختیار دینا ہوتا ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے: ہمیں ان کی طرف سے دھوکہ دہی کا خوف ہوتا ہے، تو ہم ان کے ساتھ معاہدہ توڑ دیتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا پھر آپ نے عہد توڑ دیا جب آپ کو قتال کا حکم دیا گیا۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ﴿۳﴾

''اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لیے بڑے حج کے دن کہ اللہ تعالیٰ بری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی، اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے۔ اور اگر تم منہ پھیرے رہو تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور خوشخبری سنا دو کافروں کو دردناک عذاب کی''۔

اس میں تین مسئلے ہیں:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَذَانٌ، الأذان کا لغوی معنی بغیر کسی اختلاف کے الاعلام (اطلاع کرنا، اعلان کرنا) ہے اور یہ براءۃ پر معطوف ہے۔ اِلَى النَّاسِ یہاں الناس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ یہ ظرف ہے اور اس میں عامل أذان ہے اگرچہ اس کی صفت مِّنَ اللّٰهِ کے قول سے لگائی گئی ہے، کیونکہ اس میں فعل کی بو باقی ہے اور یہ ظروف میں عمل کر سکتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں عامل مخزی ہے۔ اور أذان کا عمل کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی صفت لگائی گئی ہے اور یہ فعل کے حکم سے خارج ہو گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حج اکبر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس بعض نے کہا ہے: اس سے مراد یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) ہے یہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت طاؤس اور حضرت مجاہد سے مروی ہے۔ اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن ابی اوفیٰ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حج اکبر یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) ہے اور اسے ہی علامہ طبری نے پسند کیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال حج کے دوران جس میں آپ نے حج ادا فرمایا دسویں کے دن وقوف کیا اور فرمایا: ''یہ کون سا دن ہے؟''۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی: یوم نحر ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ حج اکبر کا دن ہے'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے ان لوگوں میں بھیجا جو دسویں ذی الحجہ (یوم نحر) کو منیٰ میں اعلان کریں گے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور حج اکبر کا دن یوم نحر ہے۔ اور اسے لوگوں کے اس قول کی وجہ سے حج اکبر کہا گیا ہے: (کہ وہ) حج اصغر بولتے ہیں۔ پس اس سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے معاہدے توڑ دیئے۔ پس حجۃ الوداع کے سال جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج ادا فرمایا کسی مشرک نے حج نہیں کیا (2)۔

اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یوم نحر ہی حج اکبر کا دن ہے، اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اس میں بال کٹوائے جاتے ہیں (یعنی حلق وغیرہ کیا جاتا ہے) اس میں میل کچیل اتاری جاتی ہے اور اس میں احرام کھل جاتے ہیں۔ اور یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ اس میں مکمل حج یوم نحر میں ہے، کیونکہ وقوف اس کی رات کو ہے، رمی جمار، قربانی، حلق اور طواف اس کی صبح کے وقت ہیں۔

فریق اوّل نے حدیث مخرمہ سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حج اکبر کا دن یوم عرفہ ہے'' (3)۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 2

سنن ابن ماجہ، باب الخطبۃ یوم النحر، حدیث نمبر 3048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 451

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

اسے قاضی اسماعیل نے روایت کیا ہے اور امام ثوری اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: حج اکبر تمام کے تمام ایام منیٰ ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: یوم صفین، یوم الجمل اور یوم بعاث وغیرہ۔ پس اس سے مراد مطلق وقت اور زمانہ ہوتا ہے صرف وہ دن مراد نہیں ہوتا۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: حج اکبر سے مراد حج قران ہے۔ اور حج اصغر حج مفرد ہے۔ اس آیت میں ان میں سے کوئی شے مراد نہیں ہے۔ اور انہیں سے اور حضرت عطا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حج اکبر وہ ہے جس میں وقوف عرفات ہو اور حج اصغر عمرہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد تمام ایام حج ہیں۔ اور حسن اور عبداللہ بن حارث بن نوفل نے کہا ہے: اسے یوم الحج الاکبر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس سال مسلمانوں اور مشرکوں نے حج کیا(1) اور اس میں اس وقت کئی دینوں کی عیدیں اکٹھی اور متفق ہوئیں، مثلاً یہود، نصاریٰ اور مجوسی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس لیے اسے اکبر کی صفت سے متصف کرے۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: بے شک اس حج کا نام اکبر رکھا کیونکہ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا اور اس میں معاہدے توڑ دیئے گئے (2)۔ اور یہ وہ ہے جو حسن کے نظریہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن سیرین نے کہا ہے: یوم الحج الاکبر وہ سال ہے جس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا۔ اور اس میں آپ کی معیت میں امتیوں نے بھی حج ادا کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ اس میں أن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے بأن اللہ ہے اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس طرح تقدیر ذکر کی ہے قال ان اللہ، بری یہ ان کی خبر ہے۔ وَ رَسُوْلُهٗ یہ محل پر معطوف ہے اور اگر آپ چاہیں تو برء میں ضمیر مرفوع پر عطف کر لیں۔ یہ دونوں حسن ہیں، کیونکہ کلام طویل ہوگیا ہے۔ اور اگر چاہیں تو اسے مبتدا پر معطوف کر لیں اور خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام ہو: و رسوله بریء منھم اور جنہوں نے و رسولہ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ حسن وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اس کا عطف اسم جلالت لفظ اللہ پر کیا ہے۔ اور شواذ میں سے یہ ہے کہ و رسولہ قسم کی بنا پر مجرور بھی ہے۔ تقدیر عبارت ہے وحق رسوله (اور اس کے رسول کے حق کی قسم) اور یہ حسن سے مروی ہے۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ اول کتاب میں گزر چکا ہے۔ فَاِنْ تُبْتُمْ پس اگر تم توبہ کر لو شرک سے۔ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ وَ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اور اگر تم منہ پھیرے رہو ایمان سے۔ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ تو خوب جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، کیونکہ وہ تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اپنی سزا تم پر اتارنے والا ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝

''بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 146 2۔ ایضاً

نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک، بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیزگاروں کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ یہ استثنا متصل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بری ہے سوائے ان کے جو ایک معینہ مدت تک معاہدہ کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان سے بری ہے لیکن وہ جن سے تم نے معاہدہ کیا اور وہ اس عہد پر ثابت قدم رہے پس تم ان کا معاہدہ مدت مقررہ تک مکمل کرو۔ اور قول باری تعالیٰ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ معاہدہ کرنے والوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور بعض وہ ہیں جو اسے پورا کرنے پر ثابت قدم رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے معاہدہ کو توڑنے کی اجازت عطا فرمائی جنہوں نے معاہدہ میں خلاف ورزی کی اور ان کے معاہدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا جو معینہ مدت تک اپنے عہد پر باقی رہے (1)۔ اور لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ کا معنی ہے کہ انہوں نے معاہدہ کی شرائط میں ذرہ بھر کمی نہیں کی۔ وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا اور انہوں نے (تمہارے خلاف) کسی کی مدد اور معاونت نہیں کی۔ حضرت عکرمہ اور عطا بن یسار رحمۃ اللہ علیہما نے ثُمَّ لَمْ یَنْقُضُوْكُمْ ضاد کے ساتھ مضاف کو حذف کر کے پڑھا ہے تقدیر عبارت ہے ثم لم ینقضوا عهدهم کہا جاتا ہے: بے شک یہ (حکم) مخصوص ہے اور اس سے خاص کر بنو ضمرہ مراد لیے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا: فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ پس تم ان کے عہد کی معینہ مدت پوری کرو اگرچہ وہ چار ماہ سے زیادہ ہو۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

"پھر جب گزر جائیں حرمت والے مہینے تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں اور گرفتار کرو انہیں اور گھیرے میں لے لو انہیں اور بیٹھو ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ یعنی جب نکل جائیں حرمت والے مہینے اور سلخت الشهر جب تو مہینے کے آخری ایام میں پہنچ جائے (تو یہ جملہ کہتا ہے) تسلخه سلخا و سلوخا بمعنی خرجت منه (یعنی میں اس سے نکل گیا) اور شاعر نے بھی کہا ہے:

إذا ما سلختُ الشهرَ أهللتُ قبله     كفى قاتلا سلخي الشهور و إهلالي

اور انسلخ الشهر (مہینہ گزر گیا، نکل گیا) اور انسلخ النهار من الليل المقبل (آنے والی رات سے دن نکل گیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 900

اور سلخت المرأۃ درعھا (عورت نے اپنی قمیص اتار دی) اور قرآن کریم میں ہے: وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (یٰسین: 37) (اور دوسری نشانی ان کے لیے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو) اور نخلة مسلاخ یہ وہ درخت ہوتا ہے جس کی سبز خشک کھجوریں بکھر جائیں۔

الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ معروف مہینے ہیں، تین مہینے لگاتار ہیں اور ایک مہینہ الگ اور مفرد ہے۔ اصم نے کہا ہے: مراد وہ ہیں جن کا مشرکوں سے کوئی عقد نہیں پس ان پر لازم ہے کہ وہ ان کے قتال سے رکے رہیں یہاں تک کہ حرمت والے مہینے گزر جائیں۔ اور یہ پچاس دنوں کی مدت ہے جیسا کہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اس کے بارے اعلان یوم نحر کو ہوا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ معاہدہ کے چار مہینے ہیں۔ یہ مجاہد، ابن اسحاق، ابن زید اور عمرو بن شعیب نے کہا ہے۔ اور انہیں حرم کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر ان میں مشرکوں کا خون اور ان کے ساتھ تعرض کرنا سوائے سبیل خیر کے حرام قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ یہ حکم عام ہے اور ہر مشرک کے بارے میں ہے، لیکن سنت نے اسے خاص کر دیا ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ عورت، راہب اور بچے وغیرہ کا قصہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ (التوبہ: 29) (یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں)

مگر یہ جائز ہے کہ مشرکین کا لفظ اہل کتاب کو شامل نہ ہو اور یہ بتوں کی پوجا کرنے والوں اور دوسروں سے جزیہ لینے کے منع کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ جاننا چاہیے کہ مطلق ارشاد باری تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ان کے قتل کے جائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے وہ کسی وجہ سے بھی مشرک ہوں، مگر مثلہ سے نہی کے بارے احادیث موجود ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ جائز ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس وقت مرتدوں کو آگ کے ساتھ جلا کر، پہاڑوں کی چوٹیوں سے پتھر اور تیر مار کر اور کنوؤں میں الٹا لٹکا کر قتل کیا یہ آیت کے عموم کے ساتھ متعلق ہے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتدوں کی ایک جماعت کو جلا دینا بھی جائز قرار دیتا ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف مائل ہیں۔ اور اس کا اعتماد لفظ کے عموم پر ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یہ ہر جگہ کے بارے عام ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد حرام کو خاص کیا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ پھر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسین بن فضل نے کہا ہے: اس نے قرآن کریم کی ہر اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے جس میں دشمنوں کی اذیت پر صبر کرنے اور ان سے اعراض کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت ضحاک، سدی اور عطا رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) اور یہ کہ کسی قیدی کو پکڑ کر قتل نہیں کیا جائے گا، (بلکہ) یا تو اس پر احسان کیا جائے گا (یعنی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا جائے گا) یا پھر اس سے فدیہ لیا جائے گا۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلکہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لیے ناسخ ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً اور یہ کہ مشرک قیدیوں میں سوائے قتل کے اور کوئی شی جائز نہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: دونوں آیتیں محکم ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ احسان کرنا، قتل کرنا اور فدیہ لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان

میں اس پہلی جنگ سے مسلسل جاری رہا جو آپ نے ان کے ساتھ لڑی اور وہ غزوۂ بدر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ خُذُوْهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے اور اخذ کا معنی قید کرنا، گرفتار کرنا ہے۔ اور گرفتاری قتل کے لیے ہوتی ہے یا فدیہ کے لیے یا احسان کرنے کے لیے جس پر امام وقت کی رائے قائم ہو جائے۔ اور احْصُرُوْهُمْ کا معنی ہے جو کوئی تمہارے شہروں میں تصرف کرنے اور تمہارے پاس آنے کا ارادہ کرے تو تم اسے روک لو، مگر یہ کہ تم انہیں اجازت دو اور وہ تمہارے پاس امان لے کر داخل ہوں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، المرصد سے مراد وہ جگہ ہے جس میں دشمن کی تاک میں بیٹھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رصدتُ فلانا أرصدہ یعنی میں فلاں کی تاک میں بیٹھا (1)۔ یعنی تم ان کے لیے ایسی مخفی اور پوشیدہ جگہوں میں بیٹھو جہاں سے انہیں تاکا جا سکتا ہو۔ عامر بن طفیل نے کہا ہے:

ولقد علمت وما إخالك ناسيا　　أن المنيّة للفتى بالمَرْصَد

اور عدی نے کہا ہے:

أعاذل إنّ الجهل من لذة الفتى　　وإن المنايا للنفوس بمرصد

ان دونوں میں مرصد تاک میں بیٹھنے کی جگہ کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس میں انہیں دعوت اسلام دینے سے پہلے بھی قتل کرنے اور انہیں پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے (2)۔ اور کل ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ زجاج کی پسند ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ذهبت طريقا و ذهبت كلّ طريق یا یہ حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہے اور تقدیر عبارت ہے: في كل مرصد و على كل مرصد اور مرصد کو طریق کا اسم بنایا جائے گا۔ اور ابو علی نے زجاج کو اس بارے میں غلط قرار دیا ہے کہ انہوں نے الطریق کو ظرف بنایا ہے اور کہا: طریق مخصوص جگہ ہوتی ہے جیسا کہ بیت اور مسجد (مخصوص مقام ہیں) پس اس سے پہلے حرف جر کو حذف کرنا جائز نہیں ہوگا سوائے ان مقامات کے جن میں حذف سائغ ہو، جیسا کہ سیبویہ نے بیان کیا ہے: دخلتُ الشام و دخلتُ البيت اور جیسا کہ کہا گیا ہے:

كما عسل الطريق الثعلب

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَابُوْا پس اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اس آیت میں تامل اور غور و فکر ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قتل کو شرک پر معلق کیا ہے، پھر فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا اور اس میں اصل یہ ہے کہ قتل جب شرک کے سبب ہے تو وہ اس کے زوال کے سبب زائل ہو جائے گا۔ اور یہ صرف توبہ کے ساتھ قتل کے زوال کا تقاضا کرتا ہے، اس میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اور اسی لیے نماز اور زکوٰۃ کا وقت آنے سے پہلے صرف توبہ کے ساتھ قتل ساقط ہو جاتا ہے اور یہ اس معنی میں بین اور واضح ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ دوسری دو شرطیں ذکر کی ہیں۔ اور انہیں لغو قرار دینے کا کوئی ذریعہ اور

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سبب نہیں۔ اس کی نظیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کرلیں تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے بچا لیے، محفوظ کر لیے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے''۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں اسے ضرور قتل کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ کتنے عظیم فقیہ تھے۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: پس قرآن وسنت دونوں منظم ہیں اور دونوں پر عمل جاری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے نماز اور تمام فرائض حلال سمجھ کر ترک کیے وہ کافر ہے اور جس نے غفلت اور سستی کرتے ہوئے سنن کو ترک کردیا وہ فاسق ہو گیا اور جس نے نوافل کو چھوڑ دیا تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں، مگر یہ کہ اگر وہ ان کی فضیلت کا انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس کے بارے آپ نے خبر دی وہ اسے رد کرنے والا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے نماز کو ترک کر دیا لیکن نہ اس کا انکار کیا اور نہ اسے حلال سمجھا۔

یونس بن عبد الاعلیٰ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے ابن وہب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی اور نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور یہی ابوثور اور تمام اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور یہی قول حماد بن زید، مکحول اور وکیع کا بھی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے قید کر دیا جائے گا اور مارا جائے گا (لیکن) اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول ابن شہاب کا ہے اور اسی طرح داؤد بن علی کہتے ہیں۔ اور ان کی حجت اور دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: أمرت أن أقاتل النّاس حتی یقولوا لا اله إلا الله فإذا قالوا ذالك عصموا منی دماء هم و أموالهم إلا بحقها۔ (1) اور انہوں نے کہا: ان کا حق وہ تین چیزیں ہیں جن کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین چیزوں میں سے ایک کے پائے جانے کے ساتھ: ایمان کے بعد پھر کفر کرنا یا احصان کے بعد زنا کا ارتکاب کرنا یا کسی آدمی کو بغیر قصاص کے قتل کرنا'' (2)۔ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جس نے ایک نماز جان بوجھ کر بغیر عذر کے چھوڑی یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور اس نے اسے ادا کرنے اور قضاء کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: میں نماز نہیں پڑھوں گا، تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا خون اور مال دونوں حلال ہوں گے، اس کے مسلمان ورثا میں سے کوئی اس کا وارث نہیں بنے گا اور اسے توبہ کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ پس اگر اس نے توبہ کر لی (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے مال کا حکم مرتد کے مال کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور یہی قول اسحاق کا ہے۔ اسحاق نے کہا ہے:

---

1۔ سنن النسائی، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، حدیث نمبر 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس سے لے کر ہمارے اس زمانے تک اہل علم کی رائے اسی طرح رہی ہے۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے تارک نماز کو کب قتل کیا جائے گا؟ پس بعض نے کہا ہے: مختار وقت کے آخر میں۔ اور بعض نے کہا ہے: وقت ضرورت کے آخر میں۔ اور اس میں سے یہی صحیح ہے۔ اور وہ یہ کہ عصر کے وقت میں چار رکعتیں سورج کے غروب ہونے تک اور رات کے وقت چار رکعتیں عشاء کے وقت کی انتہا تک اور صبح کے وقت دو رکعتیں سورج طلوع ہونے سے پہلے تک (وقت ضرورۃ) باقی ہوتا ہے۔ اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ذھاب الوقت (وقت نکل جانا) سے مراد یہ ہے کہ ظہر کی نماز کو غروب آفتاب تک موخر کر دیا جائے اور مغرب کی نماز کو طلوع فجر تک موخر کر دیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے کہا: میں نے توبہ کر لی ہے، تو اس کا یہ قول کافی نہ ہوگا یہاں تک کہ توبہ کو ثابت کرنے والے اس کے افعال اس کی طرف منسوب ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں توبہ کے ساتھ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط ذکر کی ہے تاکہ ان کے ساتھ وہ توبہ کو ثابت کر سکے۔ اور آیت ربا میں فرمایا: وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (البقرہ: 279) (اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال) اور مزید فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا (البقرہ: 160) (البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ظاہر کر دیں) اس کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے، تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام پھر پہنچا دیجئے اسے اس کی امن گاہ میں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو (قرآن کو) نہیں جانتے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی ان میں سے جنہیں قتل کرنے کے بارے میں آپ کو حکم دیا ہے۔ اسْتَجَارَكَ یعنی آپ سے پناہ طلب کرے، یعنی آپ کی امان اور آپ کی ذمہ داری کا مطالبہ کرے، تو اسے وہ امان عطا فرما دیجئے تاکہ وہ قرآن کریم کو سنے، یعنی اس کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کو سمجھے۔ پس اگر اس نے ایک امر بھی قبول کر لیا تو یہ اچھا ہے اور اگر وہ انکار کر دے تو پھر اسے ان کی امن گاہ تک پہنچا دو (1) اور یہ وہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مسلمان ملکوں کے راستے میں کوئی حربی پایا گیا اور اس نے کہا: میں امان طلب کرنے کے لیے آیا ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ مشتبہ امور ہیں (2) اور میری رائے یہ ہے کہ اسے اس کی امان گاہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسی طرح وہ ہے جو پایا جائے درآنحالیکہ وہ تجارت کے لیے ہمارے ساحل پر اترا ہو اور کہتا ہو: میرا گمان یہ تھا کہ تم اس کے ساتھ تعرض نہیں کرو گے جو تجارت کے لیے آئے یہاں تک کہ وہ (سامان) بیچ لے۔ ظاہر آیت بلاشبہ اسی کے بارے میں ہے جو قرآن کریم سننے اور دین اسلام میں نظر و فکر کا ارادہ رکھتا ہے۔ رہا اس کے علاوہ کسی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 891
2۔ ایضاً

کو پناہ دینا تو یہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر ہے اور ان امور میں نظر وفکر کے اعتبار سے جن کی منفعت اور فوائد اس کے سبب انہیں پہنچیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ تمام علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ سلطان وقت کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ نظر وفکر اور مصلحت کو پیش نظر رکھنے کے اعتبار سے تمام سے آگے اور مقدم ہے۔ اور منافع کے حصول اور نقصانات کو دور کرنے میں تمام کا نائب ہے، البتہ غیر خلیفہ کی امان میں اختلاف ہے۔ پس تمام علماء کے نزدیک آزاد آدمی کی امان قبول اور نافذ ہوتی ہے۔ مگر ابن حبیب نے کہا ہے: اس میں امام وقت غور وفکر کرے گا۔ اور رہا غلام تو مشہور مذہب میں اس کی امان جائز ہے۔ امام شافعی اور آپ کے اصحاب امام احمد، اسحاق، اوزاعی، ثوری، ابوثور، داؤد اور محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: غلام کی امان جائز نہیں ہے اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے: کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمانوں کے خون کی نگرانی اور دفاع کیا جائے گا اور ان کے ادنی ان کے ذمہ کے بارے کوشش کریں گے''۔ انہوں نے کہا ہے: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے أدناھم فرمایا ہے (تو یہ اس طرف اشارہ ہے) کہ غلام کی امان جائز ہے۔ اور آزاد عورت اس کے زیادہ لائق اور مناسب ہے اور اس علت کا کوئی اعتبار نہیں کہ ''اس کے لیے (یعنی غلام کے لیے) وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا''۔ اور عبدالملک بن ماجشون نے کہا ہے: عورت کی امان جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ امام وقت اس کی اجازت دے اور یہ اپنے اس قول کے ساتھ جمہور سے الگ اور جدا ہیں۔ اور جہاں تک بچے کا تعلق ہے تو جب وہ قتال کی طاقت رکھتا ہو تو اس کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ بھی من جملہ قتال کرنے والوں سے ہوتا ہے اور حفاظت کرنے والے گروہ میں داخل ہے۔ اور حضرت ضحاک اور سدی رحمۃ اللہ علیہما اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور قیامت تک ثابت ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت کا حکم ان چار ماہ کی مدت باقی رہا جو مدت ان کے لیے بیان کی گئی اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ مشرکوں میں سے ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اگر ہم میں سے کوئی آدمی چار ماہ گزرنے کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آنے کا ارادہ کرلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے یا کسی حاجت کے لیے آپ کے پاس آئے تو وہ قتل کردیا جائے گا؟ تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ اور یہی صحیح ہے اور آیت محکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ وَاِنْ اَحَدٌ، احد مرفوع ہے اسی طرح کے فعل مضمر کے سبب جو اس کے بعد ہے اور یہ ان میں تو اچھا ہے لیکن اس کے اخوات میں قبیح ہے۔ ان اور اس کے اخوات کے درمیان فرق کے بارے میں سیبویہ کا مذہب ہے کہ یہ جب حروف شرط کی اصل ہے تو اسے اس کے ساتھ خاص کردیا گیا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ (وصف) اس کے علاوہ میں نہیں ہوتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ ان کا قول لأنھا لا تکون فی غیرہ یہ غلط ہے، کیونکہ یہ (ان) بمعنی ما ہوتا ہے اور ثقیلہ سے

مخففہ ہوتا ہے لیکن یہ مبہم ہے۔ اور اس کے سوا دوسرے اس طرح نہیں۔ اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

لا تَجْزِعِي إِن مُنْفِسًا أهلكْتُه	وإذا هلكتُ فعند ذالكِ فاَجْزَعِي

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ میں اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام قاری کی قرأت کے وقت سنا جائے۔ یہ شیخ ابوالحسن، قاضی ابوبکر، ابوالعباس القلانسی، ابن مجاہد اور ابواسحاق الاسفرائنی رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ نے کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ پس یہ اس پر نص ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کا کلام ہونے کی وجہ سے قاری کو قراءت کے وقت سنا جائے۔ اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی دلالت کرتا ہے کہ قاری جب فاتحۃ الکتاب یا کوئی سورت پڑھتا ہے تو کہتے ہیں: ہم نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھے جانے اور امرء القیس کا شعر پڑھے جانے کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور کلام اللہ تعالیٰ کے معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور یہ کہ نہ اس کے حرف ہیں اور نہ آواز۔ والحمدللہ

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ⑦

''کیونکر ہو سکتا ہے (ان عہد شکن) مشرکوں کے لیے کوئی معاہدہ اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مسجد حرام کے پاس۔ تو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے معاہدہ پر تم بھی قائم رہو ان کے لیے، بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے''۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہاں کیف تعجب کے لیے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیف یسبقنی فلان (کیونکر فلاں مجھ سے سبقت لے جائے گا) یعنی اسے نہیں چاہیے کہ وہ مجھ پر سبقت لے جائے۔ اور عہد یکون کا اسم ہے۔ اور آیت میں اضمار ہے، ای کیف یکون للمشرکین عہد مع اضمار الغدر (1) (یعنی کیونکر مشرکین کے لیے عہد ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کہ غدر اور دھوکہ دہی مخفی ہو) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

خبرتمانِي إنما الموت بالقُرَى	فكيف وهَاتَا هَضْبةٌ و كَثِيبُ

تقدیر عبارت ہے: فکیف مات، یہ زجاج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کیونکہ ان مشرکوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ کل اس کے سبب اس کے عذاب سے پرامن اور محفوظ ہو جائیں اور کیونکر ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے سبب دنیا کے عذاب سے پرامن اور محفوظ ہو جائیں، پھر استثنیٰ کی اور فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ بنو بکر ہیں۔ یعنی معاہدہ نہیں مگر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نہ معاہدہ توڑا اور نہ اسے فسخ کیا۔

1۔ تفسیر الرازی

قولہ تعالیٰ: فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ یعنی جب تک تمہارے عہد کو پورا کرنے پر وہ قائم رہیں تو تم بھی ان کے لیے اسی کی مثل پر قائم رہو۔ ابن زید نے کہا ہے: پس وہ قائم نہیں رہے تو ان کے لیے چار مہینے مدت مقرر کر دی گئی۔ اور رہے وہ جن کے لیے کوئی عہد نہیں تو تم انہیں قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞

”کیونکر (ان کے معاہدہ کا لحاظ رکھا جائے) حالانکہ اگر وہ غالب آ جائیں تم پر تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا، راضی کرنا چاہتے ہیں تمہیں (صرف) اپنے منہ (کی باتوں) سے اور انکار کر رہے ہیں ان کے دل اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ اس پر تعجب کا اعادہ فرمایا کہ ان کے لیے ان کے خبث اعمال کے باوجود عہد ہو، یعنی کیونکر ان کے لیے معاہدہ ہو سکتا ہے حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا۔ کہا جاتا ہے: ظهرتُ على فلان یعنی میں اس پر غالب آ گیا اور ظهرت البيت میں مکان پر چڑھا۔ اور اسی سے ہے: فما اسطاعوا أن يظهروه پس انہوں نے طاقت نہ رکھی کہ وہ اس پر غالب آ ئیں۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً، يَرْقُبُوْا وہ محافظت کریں۔ اور رقیب حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِلًّا اس سے مراد عہد ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس کا معنی قرابت اور رشتہ داری ہے۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی جوار اور پڑوس ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد حلف (دوستی یا قسم) ہے اور ذِمَّةً سے مراد عہد ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: مراد قسم، یمین ہے۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے الا العهد اور الذمة بمعنی التذمم (بچنا) ہے۔ ازہری نے کہا ہے: یہ عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ اور اس کی اصل الأليل سے ہے اور اس کا معنی ہے چمکدار، روشن۔ کہا جاتا ہے: ألّ لونه يؤلّ ألاّ یعنی اس کا رنگ صاف اور چمک دار ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الحدة سے ہے (تیز دھار ہونا) اور اسی سے الألة للحربة (تیز دھار نیزہ) اور اسی سے أُذُن مُؤَلّلة (تیز کان) اور اسی سے طرفہ بن العبد کا قول ہے وہ اپنی ناقہ کے کانوں کی تیزی اور کھڑے ہونے کا وصف بیان کرتا ہے:

مُؤَلّلتان تعرف العِتق فيهما كما مِعَقَيْ شاةٍ بحَوْمَل مُفْرَدِ

پس جب عہد، جوار اور قرابت کو اِل کہا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ کان ان جہتوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں، یعنی ان کے لیے تیز کر لیے جاتے ہیں۔ اور عہد کو اس کے صاف و شفاف اور ظاہر ہونے کی وجہ سے اِل کہا جاتا ہے۔ اور اس کی جمع قلت آلال آتی ہے۔ اور جمع کثرت إلالٌ آتی ہے۔ اور جوہری وغیرہ نے کہا ہے: الإل کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور الإل کا معنی عہد اور قرابت بھی ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

لعمرك ان الك من قريش كال السقب من رأل النعام

قولہ تعالیٰ: ولا ذمۃً یعنی وہ کسی عہد کا لحاظ نہ رکھیں گے۔ اور اس سے مراد ہر وہ حرمت ہے جو تجھ پر لازم ہو جب تو اسے ضائع کرے تو گناہ ہو۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور ابن زید نے کہا ہے: الذمۃ کا معنی عہد ہے۔ اور جنہوں نے الإلّ سے مراد بھی عہد لیا ہے تو پھر یہ تکرار دو مختلف لفظوں کے سبب ہے۔ اور ابو عبید معمر نے کہا ہے: الذمۃ سے مراد التذمم ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں ذمہ سے مراد امان ہے: ویسعی بذمتهم أدناهم اور ذمہ کی جمع ذمم ہے۔ اور بئر ذمۃ (ذال کے فتحہ کے ساتھ) تھوڑے پانی والا کنواں۔ اور اس کی جمع ذمام ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

على حِمْيَرِيَّات كَأَنَّ عيونَها ذِمامُ الرَّكايا أَنْكَزَتْها المَوَاتِحُ

اس میں انکزتها کا معنی ہے اس نے اپنے پانی کو ختم کر دیا، کم کر دیا۔ اور اھل الذمہ اہل عقد ہوتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یعنی وہ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جس کا ظاہر راضی اور خوش کر دیتا ہے۔ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ یعنی وہ عہد توڑنے والے ہیں۔ اور ہر کافر فاسق ہے، لیکن یہاں مراد وہ ہیں جو اعلانیہ برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اور عہد توڑنے والے ہیں۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑨

"انہوں نے بیچ دیں اللہ کی آیتیں تھوڑی سی قیمت پر (مزید برآں) روکا انہوں نے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے، بے شک وہ بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے"۔

یعنی مشرکوں نے چند لقموں کے عوض معاہدے توڑ دیئے جو انہیں ابوسفیان نے کھلائے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے قرآن کے بدلے دنیوی ساز و سامان لے لیا۔ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی انہوں نے اعراض کر لیا اور صدوا، الصدود سے ماخوذ ہے۔ یا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ سے (لوگوں کو) روکا۔ اس صورت میں یہ الصد سے ماخوذ ہے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ⑩

"نہیں لحاظ کرتے کسی مومن کے حق میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی وعدہ کا۔ اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں"۔

نحاس نے کہا ہے: یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ پہلا ارشاد تمام مشرکوں کے لیے اور یہ دوسرا یہودیوں کے لیے خاص ہے۔ اور اس پر دلیل اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ہے یعنی یہودیوں نے اللہ عزوجل کے دلائل اور اس کے بیان کو طلب ریاست اور دیگر چیزوں کے طمع اور حرص کے عوض بیچ دیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ یعنی وہ معاہدہ توڑنے کے ساتھ حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞

''پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) آیتیں اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنۡ تَابُوۡا یعنی اگر وہ شرک سے توبہ کرلیں اور احکام اسلام کو لازم پکڑ لیں۔ فَاِخۡوَانُكُمۡ تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ فِی الدِّیۡنِ (دین میں)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت نے اہل قبلہ کے خون حرام کر دیئے ہیں۔ اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض کی ہیں اور اس سے منع کیا ہے کہ کوئی ان دونوں کے درمیان فرق کرے اور اس کا بھی انکار کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے بغیر نماز کو قبول کرے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: تمہیں نماز اور زکوٰۃ کے بارے حکم دیا گیا ہے پس جس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کی نماز بھی نہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تین چیزوں کے درمیان فرق کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے اور اپنی رحمت کے درمیان فرق کر دے گا، جس نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہوں اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا''۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ (المائدہ: 92) اور جس نے کہا: میں نماز قائم کروں گا اور زکوٰۃ نہیں دوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 43) اور جس نے اللہ تعالیٰ کے شکر اور اپنے والدین کے شکر کے درمیان فرق کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اَنِ اشۡكُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡكَ (لقمان: 14) (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا)

قولہ تعالیٰ: وَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ یعنی ہم اپنی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ اللہ تعالیٰ نے ذکر میں اہل علم کو خاص کیا ہے کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَىِٕمَّةَ الۡكُفۡرِ ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ یَنۡتَهُوۡنَ ۞

''اور اگر یہ لوگ توڑ دیں اپنی قسمیں اپنے معاہدہ کے بعد اور طعن کریں تمہارے دین پر تو جنگ کرو کفر کے پیشواؤں سے، بے شک ان لوگوں کی کوئی قسمیں نہیں ہیں (ایسوں سے جنگ کرو) تاکہ یہ لوگ (عہد شکنی سے) باز آجائیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا، النکث کا معنی توڑنا ہے اور اصل میں یہ ہر اس شے کے لیے ہے جسے پہلے بٹا جائے اور پھر کھول دیا جائے۔ اور یہ قسم اور معاہدوں میں مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

وان حَلَفَتْ لا ينقض النائي عهدها  فليس لمخضوب البَنَان يَمِينُ

اس میں یمین بمعنی عہد (معاہدہ) ہے اور قولہ: وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِكُمۡ اور وہ تمہارے دین میں طعن کریں معاہدے توڑ کر،

جنگ کے ساتھ اور دیگر ایسے امور کے ساتھ جو مشرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: طعنه بالرمح (اس نے اسے نیزے کے ساتھ کچوکا لگایا) اور طعن بالقول السیء فیه، یطعن (اس نے برے قول کے ساتھ طعنہ دیا) اس میں وہ طعنہ زنی کرتا ہے، دونوں مثالوں میں یہ لفظ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یطعن بالرمح (یہ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے) اور یطعن بالقول (یہ عین کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ یہاں استعارۃ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ قول ہے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا۔ "اگر تم ان کی امارت پر طعن کرو گے تو تحقیق اس سے پہلے تم نے ان کے باپ کی امارت پر طعن کیا اور اللہ کی قسم بلاشبہ وہ امارت کے لیے انتہائی موزوں اور اہل تھے" (1)۔ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ دین میں طعن کرنے والے ہر آدمی کو قتل کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ کافر ہے۔ اور طعن کا معنی یہ ہے کہ اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کرنا جو اس کے لائق اور مناسب نہ ہو یا کسی امر دینی کو حقیر سمجھتے ہوئے اس پر اعتراض کرنا، جب کہ اس کے اصول کا صحیح ہونا اور اس کے فروع کا درست ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کی اس کی سزا قتل ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے ان میں سے امام مالک، لیث، احمد اور اسحاق ہیں اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور حضرت نعمان (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) سے بیان ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی گلوچ دی اسے قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کسی آدمی نے کہا: کعب بن اشرف کو قتل نہیں کیا گیا مگر دھوکے کے ساتھ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اور ایک دوسرے آدمی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کہا تو حضرت محمد بن مسلمہ اٹھے اور کہا: کیا آپ کی مجلس میں یہ کہا جارہا ہے اور آپ خاموش ہیں؟ قسم بخدا! میں آپ کو اس چھت کے نیچے ہمیشہ نہیں رہنے دوں گا اور اگر مجھے اس کے ساتھ علیحدہ موقع ملا تو میں اسے ضرور قتل کروں گا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غدر کی نسبت کی۔ اور یہی وہ مفہوم ہے جو حضرت علی اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما اس کہنے والے کے قول سے سمجھے، کیونکہ یہ زندقہ ہے۔ اور اگر اس نے اس کے قتل کی نسبت مباشرین (عملاً قتل کرنے والے) کی طرف کی ہے اس حیثیت سے کہ وہ کہتا ہے: بے شک انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا پھر اسے توڑ دیا تو یقیناً یہ نسبت کذب محض ہے، کیونکہ اس کے ساتھ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا ہو اور نہ انہوں نے اسے یہ صراحتاً کہا ہے اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ امان نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قتل کی طرف متوجہ کیا نہ کہ اسے امان دینے کی طرف۔ اور آپ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں اجازت دی کہ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرے۔ اور اسی بنا پر اسے قتل کرنے کے بارے میں نظر اور تردد ہے جس نے اس کی نسبت ان کی طرف کی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کیا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 11-12

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا لازم آتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فعل کو درست قرار دیا اور اس کے ساتھ راضی ہوئے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ غدر کے ساتھ راضی ہوئے اور جس نے صراحۃً ایسا کیا وہ قتل کر دیا جائے گا یا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف لازم نہیں آتی پس وہ قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور جب ہم کہتے ہیں: اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ تو وہاں اس قائل کو قابل عبرت سزا دینا، اسے جیل میں قید کرنے کی سزا دینا، شدید مارنا اور بہت زیادہ ذلیل و رسوا کرنا ضروری ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور رہا ذمی تو جب وہ دین کے بارے میں طعن کرے تو اس کا عہد توڑ دیا جائے گا یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَیْمَانَهُمْ، الآیہ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے (1)۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں کہا ہے: بے شک اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا اور بے شک صرف طعن کے ساتھ معاہدہ نہیں ٹوٹتا مگر جب عملاً ٹوٹنے کا وجود پایا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو شرطوں کے ساتھ انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں سے ایک ہے ان کا معاہدہ کو توڑنا اور دوسری ہے ان کا دین میں طعن کرنا۔ ہم نے کہا ہے: اگر انہوں نے ایسا عمل کیا جو معاہدہ کے خلاف ہو تو ان کا عہد ٹوٹ جائے گا اور دو امروں کا ذکر اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ اس کا قتل ان دونوں کے پائے جانے پر موقوف ہے، کیونکہ معاہدہ توڑنا ہی انفرادی طور پر ان کے لیے قتل کو عقلاً و شرعاً مباح کر دے گا۔ اور ہمارے نزدیک تقدیر آیت اس طرح ہے: فان نکثوا عهدهم حلّ قتالهم وان لم ینکثوا بل طعنوا فی الدین مع الوفاء بالعهد حلّ قتالهم (پس اگر وہ اپنا معاہدہ توڑ دیں تو ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے اور اگر معاہدہ نہ توڑیں بلکہ عہد کو پورا کرنے کے باوجود دین میں طعن کریں (تب بھی) ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے) تحقیق روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ذمی کو پیش کیا گیا جس نے ایک جانور کو کیل (یا نوک دار لکڑی) چبھویا اس پر ایک مسلمان عورت سوار تھی پس سواری اچھلی اور اس نے اسے گرا دیا اور اس کی کچھ شرمگاہ ننگی ہوگئی۔ تو آپ نے اسی جگہ اسے سولی دینے کا حکم دیا (2)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب ذمی نے جنگ میں حصہ لیا تو اس کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور اس کا مال اور اس کی اولاد اس کے ساتھ مال فے بن جائیں گے۔ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کے سبب اس کی اولاد کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس اکیلے نے عہد توڑا ہے۔ اور فرمایا: جہاں تک اس کے مال کا تعلق ہے تو وہ لے لیا جائے گا۔ اور یہ ایسا تعارض ہے جو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے منصب کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ اس کا معاہدہ تو وہی ہے جس نے اس کے مال اور اس کی اولاد کو محفوظ کیا ہے۔ تو جب اس سے مال نکل گیا تو پھر اس سے اس کی اولاد بھی نکل جائے گی (یعنی دونوں میں سے کوئی شے بھی محفوظ نہ ہوگی)

اور اشہب نے کہا ہے: جب ذمی نے اپنا عہد توڑ دیا تو وہ اپنے عہد پر ہی رہے گا اور کبھی بھی غلامی کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اور یہ تعجب خیز ہے، گویا کہ اس نے عہد کو معنیٰ اور محسوس دیکھ لیا۔ بلاشبہ اقتضاء عہد کا حکم برائے نظر و فکر ہے اور مسلمانوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی والمحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

اس کے لیے اس کا التزام کیا ہے، تو جب اس نے عہد توڑ دیا تو وہ دیگر تمام عقود کی طرح ٹوٹ گیا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں یا آپ سے تعرض کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت یا آپ کے وصف کو کسی ایسی وجہ کے بغیر حقیر سمجھا جس سے وہ کافر ہو جائے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ ہم نے اس پر اس سے عقد ذمہ یا معاہدہ نہیں کیا۔ مگر امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری اور اہل کوفہ میں سے ان دونوں کے متبعین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ قتل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ جس نظریہ پر ہے وہ شرک سے بڑھ کر نہیں ہے، لیکن اسے ادب ضرور سکھایا جائے گا اور اسے تعزیز لگائی جائے گی۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا (اور اگر وہ توڑ دیں) الآیہ

اور بعض نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا حالانکہ اس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی پر غصے اور ناراض ہوئے تو حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا میں اس کی گردن نہ ماردوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے اس کی اجازت نہیں (1)۔ اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک اندھا آدمی تھا اس کی ایک ام ولد (لونڈی) تھی، اس کے موتیوں کی مثل اس سے دو بیٹے تھے۔ پس وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھی اور وہ اس طرح کا فعل کرتی رہتی تھی تو وہ اسے منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہ آئی اور وہ اسے جھڑکتا اور ڈانٹتا تھا لیکن وہ اس کا اثر قبول نہ کرتی تھی۔ پس جب ایک رات حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تو اس کا آقا صبر نہ کر سکا پس وہ کلہاڑے کی طرف اٹھ کر گیا اور اس کے پیٹ پر رکھ دیا پھر اس پر زور لگایا یہاں تک کہ اسے آر پار کر دیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار گواہ رہو بے شک اس کا خون رائیگاں ہے''۔(2)

اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پس اس نے اسے قتل کر دیا، جب صبح ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے بتایا گیا۔ پس وہ نابینا شخص اٹھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا مالک ہوں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں اور آپ کے بارے میں الزام تراشی کرتی تھی، میں اسے اس سے منع کرتا لیکن وہ نہ رکتی اور میں اسے جھڑکتا اور وہ اس سے باز نہ آتی اور میرے اس سے موتیوں کی مثل دو بیٹے ہیں۔ اور وہ میرا ساتھی تھی، پس جب گزشتہ رات آئی تو وہ آپ کو گالیاں دینے شروع ہو گئی اور آپ کے بارے میں الزام تراشیاں کرنے لگی تو میں نے اسے قتل کر دیا۔

تب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار سنو! تم گواہ رہو بلا شبہ اس کا خون رائیگاں ہے''۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ جب کوئی گالیاں دے پھر قتل سے بچنے کے لیے اسلام قبول کرے، تو بعض نے کہا ہے: اس کا اسلام لانا اس کے قتل کو ساقط کر دے گا اور یہی مشہور مذہب ہے، کیونکہ اسلام اپنے ماقبل ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ جب اس نے سب و شتم کیا اور پھر توبہ کر لی۔ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: 38) (فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، حدیث نمبر 3797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3795

جائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو کچھ ہو چکا)

اور بعض نے کہا ہے: اسلام اس کے قتل کو ساقط نہیں کرے گا۔ یہ قول عتبیہ میں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہاء حرمت اور اس نقص اور عیب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ملانے کے قصد کی وجہ سے واجب اور ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا اسلام کی طرف رجوع کرنا ایسا نہیں ہے جو اسے ساقط کر سکے۔ اور نہ ہی وہ کسی مسلمان سے احسن اور بہتر حالت میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** قولہ تعالیٰ: فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ اس میں ائمۃ امام کی جمع ہے۔ بعض علماء کے قول کے مطابق مراد صنادید قریش ہیں مثلاً ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف۔ اور یہ قول بعید از حقیقت ہے، کیونکہ یہ آیت سورت براءۃ میں ہے اور جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اور لوگوں پر پڑھی گئی تو اللہ تعالیٰ قریش کی قوت وطاقت کو پامال کر چکا تھا پس اب سوائے اسلام لانے یا صلح کرنے کے کچھ باقی نہ تھا۔ پس یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ سے مراد ہو، جو معاہدہ توڑنے اور دین میں طعن کرنے کا اقدام کرے وہی کفر میں اصل اور سردار ہوگا۔ پس اس بنا پر وہ ائمہ کفر میں سے ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے متقدمین اور رؤساء ہوں اور یہ کہ انہیں قتل کرنا ان کے متبعین کو قتل کرنا ہے اور یہ کہ ان کے لیے کوئی حرمت (اور عزت) نہیں ہے۔ اور ائمۃ اصل میں أأممة ہے جیسے مثال اور أمثلة ہے، پھر میم کو میم میں مدغم کیا گیا اور حرکت کو ہمزہ کی طرف منتقل کر دیا گیا اب دو ہمزے جمع ہو گئے اور پھر دوسرے ہمزہ کو یا سے بدل دیا گیا۔ اور اخفش کا خیال ہے کہ تو کہتا ہے: ھذا أیم من ھذا یعنی یہ یا کے ساتھ ہے۔ اور مازنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أدم من ھذا یعنی واؤ کے ساتھ۔ اور حمزہ نے ائمۃ پڑھا ہے۔ اور اکثر نحوی اس طرف گئے ہیں کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ انہوں نے دو ہمزے ایک کلمہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ بے شک ان کا کوئی معاہدہ نہیں، یعنی ان کے معاہدے سچے نہیں ہیں جنہیں وہ پورا کریں گے۔ ابن عامر نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ لَاۤ اِيْمَانَ لَهُمْ پڑھا ہے یہ ایمان سے ہے، یعنی ان کا کوئی اسلام (اور دین) نہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آمنتہ ایمانا کا مصدر ہو اور یہ اس امن سے ہو جس کی ضد خوف ہے، یعنی وہ امن میں نہیں ہوں گے۔ یہ آمنتہ ایمانا سے ہے یعنی میں نے اسے پناہ دی۔ پس اسی لیے فرمایا: فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ۔

لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ تاکہ وہ شرک سے باز آجائیں۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے ایک سال معاہدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں تھے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ شریف سے روک لیا، پھر انہوں نے اس شرط پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی کہ آپ واپس لوٹ جائیں، پس وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف خزاعہ کی بنی امیہ کی حلفاء جو کنانہ سے تھے، کے ساتھ جنگ ہوگئی اور بنوامیہ نے ہتھیاروں اور خوراک کے ساتھ اپنے حلیفوں کی امداد کی، تو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی پس یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے حلفاء کی امداد کریں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور بخاری میں حضرت زید بن وہب سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ہم حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے تو انہوں نے فرمایا: اس آیت فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ کے مصداق سے سوائے تین کے کوئی باقی نہیں۔ اور منافقین

میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ تو ایک اعرابی نے کہا: بے شک تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو تم ایسی خبریں دیتے ہو کہ ہم نہیں جانتے وہ کیا ہیں؟ تم گمان کرتے ہو کہ سوائے چار کے کوئی منافق نہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ہمارے گھروں میں گھس آتے ہیں اور ہمارا قیمتی اور عمدہ سامان چوری کر لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ فاسق لوگ ہیں، ہاں ان میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ ان میں سے ایک شیخ کبیر ہے کہ اگر وہ ٹھنڈا پانی پیے تو اس کی ٹھنڈک کو نہیں پاتا۔ قولہ تعالیٰ: لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ تاکہ وہ اپنے کفر سے اپنے باطل (عقائد) سے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے سے باز آ جائیں۔ اور یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کے ساتھ قتال اور جنگ کرنے سے غرض اور مقصود ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنا ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے رک جائیں اور وہ ہمارے دین میں داخل ہو جائیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳

''کیا نہیں جنگ کرو گے تم اس قوم کے ساتھ جنہوں نے توڑ ڈالا اپنی قسموں کو اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکال دینے کا اور انہی نے آغاز کیا تھا تم پر (زیادتی کا) پہلی مرتبہ، کیا تم ڈرتے ہو ان سے (سنو!) اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر ہو تم (سچے) ایمان دار''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور اس میں تحضیض کا معنی ہے۔ یہ آیت کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ یعنی نکلنے کا سبب ان کی طرف سے تھا۔ پس نکالنے کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے اہل مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکالا اس معاہدہ کو توڑنے کی وجہ سے جسے انہوں نے توڑا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اور انہوں نے ہی تم سے لڑنے کا آغاز کیا۔ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی انہوں نے معاہدہ توڑا اور بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کر دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر کے دن انہوں نے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کا آغاز کیا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو قافلے کے لیے نکلے تھے اور جب انہوں نے اپنا قافلہ بچا لیا تو ان کے لیے واپس لوٹنا ممکن تھا، لیکن انہوں نے بدر تک پہنچے اور وہاں شراب پینے کے بغیر واپس جانے سے انکار کر دیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم ان کے ساتھ قتال ترک کرنے کی صورت میں اس کی سزا سے ڈرو، اس سے کہ تم ان کے ساتھ لڑنے کی صورت میں کسی تکلیف اور ضرر کے پہنچنے سے ڈرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے سے مراد ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج، عمرہ اور طواف سے روکنا ہے اور یہی ان کی طرف سے ابتدا تھی۔ واللہ اعلم

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۴ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۵

''جنگ کرو ان سے عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے اور رسوا کرے گا انہیں اور مدد کرے گا تمہاری ان کے مقابلے میں اور (یوں) صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔ اور (یوں) دور فرما دے گا غصہ ان کے دلوں کا اور اپنی رحمت سے توجہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوْهُمْ یہ امر ہے (یعنی تم ان سے جنگ کرو) یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ یہ جواب امر ہے۔ اور اس کی جزم بمعنی مجازات ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: إن تقاتلوهم يعذبهم الله...... الآیہ (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور یوں صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کا غصہ انتہائی شدید تھا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد خزاعہ قبیلے والے ہیں جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اور یہ سب معطوف ہے۔ اور اس میں یہ بھی جائز ہے کہ پہلی کلام سے منقطع ہونے کی وجہ سے یہ سب مرفوع ہوں۔ اور اس میں أن کو مضمر ماننے کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے کوفیوں کا موقف یہی ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فإن يَهلِك أبو قابوس يَهلِك  رَبيعُ الناس والشهرُ الحرامُ
و نأخذ بعده بِذِناب عيش  أَجَبّ الظهر ليس له سَنام

اس میں اگر آپ چاہیں تو ونأخذ کو رفع دیں اور اگر چاہیں تو اسے نصب دیں۔ (1)

اور قول باری تعالیٰ: وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ میں مراد بنوخزاعہ ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے، کیونکہ قریش نے ان کے خلاف بنی بکر کی مدد کی اور بنی خزاعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ بنی بکر کے کسی آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو بیان کی، تو خزاعہ میں سے کسی نے اسے کہا: اگر تو نے دوبارہ ایسا کیا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ چنانچہ اس نے اس کا اعادہ کیا اور اس نے اس کا منہ توڑ دیا اور ان کے درمیان جنگ بھڑک اٹھی۔ اور انہوں نے خزاعہ قبیلے کے کئی افراد قتل کر دیئے۔ پس عمرو بن سالم خزاعی ایک جماعت کے ہمراہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہوئے اور فرمایا: ''مجھ پر پانی انڈیلو''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کرتے رہے اور یہ کہنے لگے: ''میری مدد نہیں کی جائے گی اگر میں نے بنی کعب کی مدد نہ کی''۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری کی اور مکہ مکرمہ کی طرف خروج کا حکم ارشاد فرمایا نتیجۃً مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

قولہ تعالیٰ: وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ رفع کے ساتھ قراءت استیناف کی بنا پر ہے، کیونکہ یہ پہلی کلام کی جنس میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزم کے ساتھ ویتب نہیں کہا۔ کیونکہ جنگ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کو ان کے لیے ثابت نہیں کرتی، بلکہ یہ تو ان کے لیے عذاب اور رسوائی ہے اور مومنین کے سینوں کے لیے شفا اور ان کے دلوں سے غصے کو نکالنے اور دور

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 205

کرنے کا موجب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے۔ فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ (الشوریٰ:24) کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا وَ یَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ:24) (اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو)

اور وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے توجہ فرمائی مثلاً ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور سلیم بن ابی عمرو کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ابن ابی اسحاق نے ویتوب نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح عیسیٰ الثقفی اور اعرج سے مروی ہے۔ اور اس بنا پر توبہ جواب شرط میں داخل ہوگی، کیونکہ معنی یہ ہے: ان تقاتلوهم یعذبهم الله اور اسی طرح وہ ہیں جو اس پر معطوف ہیں۔ پھر فرمایا: وَ یَتُوْبُ اللّٰهُ، ای إن تقاتلوهم (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر توجہ فرمائے گا) پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھوں کے ساتھ انہیں عذاب دینے، تمہارے سینوں کو شفا دینے، تمہارے دلوں سے غصہ دور کرنے اور تم پر توجہ دینے کو جمع کر دیا۔ اور رفع پڑھنا احسن ہے، کیونکہ توبہ کا سبب قتال نہیں ہے، کیونکہ کبھی یہ بغیر قتال کے بھی پایا جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اس پر ہر حال میں توجہ دے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

”کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تک پہچان نہیں کرائی اللہ نے ان کی جو جہاد کریں گے تم سے اور جنہوں نے نہیں بنایا بغیر اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے (کسی کو اپنا) محرم راز، اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو تم کرتے ہو“۔

قولہ تعالیٰ: اَمْ حَسِبْتُمْ ایک شے سے دوسری شے کی طرف خروج ہے۔ اَنْ تُتْرَكُوْا یہ سیبویہ کے قول کے مطابق دو مفعولوں کے محل میں ہے۔ اور مبرد کے نزدیک دوسرا مفعول حذف کر دیا گیا ہے(1)۔ اور کلام کا معنی ہے: أم حسبتم أن تتركوا من غير أن تبتلوا بما يظهر به المؤمن والمنافق الظهور الذي يستحق به الثواب والعقاب (کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں اس کے بغیر ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ تم ایسی شے کے ساتھ آزمائے جاؤ جس کے ساتھ مومن اور منافق اس طرح ظاہر ہو جاتے ہیں جس کے سبب وہ ثواب و عقاب کے مستحق بنتے ہیں) یہ معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لَمَّا یَعْلَمِ اس کی جزم لما کے سبب ہے اگرچہ ما زائدہ ہے، کیونکہ سیبویہ کے نزدیک یہ تیرے اس قول کا جواب ہوتا ہے: قد فعل، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ دیا گیا ہے۔ ولیجة ہمراز، اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ یہ دلوج سے ہے اور اس کا معنی داخل ہونا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کچھار جس میں وحشی جانور داخل ہوتے ہیں اس کا نام تولج رکھا گیا ہے۔ ولج یلج ولوجا جب وہ داخل ہو۔ اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بغیر کسی کی محبت و مودت میں داخل ہونے والا۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے: ہر وہ شے جسے تو ایسی شے میں داخل کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہی ولیجہ ہے۔ اور آدمی کسی قوم

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 206

میں شامل ہو حالانکہ وہ ان سے نہ ہو تو وہ ولیجۃ ہوتا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ولیجہ کا معنی دخیلہ (اندرونی معاملات میں داخل ہونے والا) ہے اور الولجاء کا معنی الدخلاء ہے۔ پس ولیجۃ الرجل وہ ہوتا ہے جو عام لوگوں کے سوا کسی کے اندرونی معاملات کے لیے مختص ہو یعنی محرم راز۔ تو کہتا ہے: ہو ولیجتی (وہ میرا محرم راز ہے) اور ہم ولیجتی اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں۔ ابان بن تغلب رحمہ اللہ نے کہا ہے:

فبئس　الولیجة　للهاربین　والمعتدین　واهل　الرِّیَب

پس بھاگنے والوں اور ظلم وزیادتی کرنے والوں اور شک کرنے والوں کی نیت اور ان کا اندر کتنا برا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ وَلِيجَةً کا معنی بطانۃ ہے۔ اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ اس کی نظیر لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ (آل عمران: 118) ہے (نہ بناؤ اپنا رازدار غیروں کو) اور فراء نے کہا ہے: وَلِيجَةً سے مراد مشرکین میں سے محرم راز جنہیں وہ بناتے ہیں اور وہ ان کے اسرار ورموز ان کے پاس افشاء کر دیتے ہیں اور ان کے معاملات کے بارے انہیں آگاہ کر دیتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِينَ عَلٰٓى أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ ۚ أُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُونَ ﴿١٧﴾

''نہیں ہے روا مشرکوں کے لیے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو حالانکہ وہ خود گواہی دے رہے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی یہ وہ (بدنصیب) ہیں ضائع ہو گئے جن کے تمام اعمال اور (دوزخ کی) آگ میں ہی یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسٰجِدَ اللّٰهِ، أَن يَعْمُرُوا سے جملہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ شٰهِدِينَ حال ہے۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد ان کے لیے کوئی حج نہیں جب ان میں مسجد حرام سے روکنے کے بارے اعلان کر دیا گیا ہے۔ اور بیت اللہ شریف کے امور مثلاً خدمت کرنا، پانی پلانا اور نیابت کی ذمہ داری ادا کرنا مشرکین کے سپرد تھے، تو یہ بیان کر دیا کہ وہ اس کے اہل نہیں، بلکہ اس کے اہل مومن ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو (اسلام قبول کرنے سے قبل غزوہ بدر میں) جب قید کیا گیا اور انہیں کفر اور قطع رحمی کی عار دلائی گئی تو انہوں نے کہا: تم ہماری برائیاں تو ذکر کرتے ہو اور ہمارے محاسن اور خوبیاں ذکر نہیں کرتے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمہارے محاسن بھی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں بے شک ہم مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کعبہ معظمہ کی خدمت اور دربانی کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور مشقت میں پھنسے ہوئے اور تکلیف زدہ کو رہائی دلاتے ہیں۔ تو یہ آیت اس کے رد میں نازل ہوئی۔

پس تب مسلمانوں پر مساجد کے احکام کی تولیت واجب ہو گئی اور مشرکوں کو ان میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ اس میں عام قراءت یعمر یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ عمر یعمر سے ماخوذ ہے۔ ابن السمیقع نے یا کو ضمہ اور میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی (مشرکین کے لیے نہیں کہ) وہ اسے آباد کرنے والے یا اس کی آبادی اور تعمیر پر معاونت کرنے والے

ہوں۔ اور مَسْجِدَ اللّٰهِ واحد کی صورت میں بھی قراءت کی گئی ہے۔ مراد مسجد حرام ہے۔ اور یہ قراءت حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، ابن کثیر، ابوعمرو، ابن محیصن اور یعقوب رحمہم اللہ کی ہے۔ اور باقیوں نے مَسٰجِدَ تعیم کی صورت میں قراءت کی ہے۔ اور یہی ابوعبید کی پسند ہے، کیونکہ اعم اور اخص عام کے تحت داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جمع کی قراءت سے بھی صرف مسجد حرام مراد ہو۔ اور یہ ان میں جائز ہے جو اسماء جنس میں سے ہو، جیسے کہا جاتا ہے: فلاں یرکب الخیل اگرچہ وہ سوار تو صرف ایک گھوڑے پر ہوا۔ اور مساجد پڑھنا زیادہ درست ہے، کیونکہ یہ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ میں جمع کی قراءت پر قراء نے اجماع کیا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: بے شک مساجد کہا ہے اور مراد مسجد حرام ہے، کیونکہ وہ تمام مساجد کا قبلہ اور ان کی امام ہے۔ (1)

قولہ تعالیٰ: شٰهِدِيْنَ کہا گیا ہے کہ مراد وهم شاهدون به (درآنحالیکہ وہ شہادت دیتے ہیں) اور جب ھم کو گرادیا گیا تو اسے (یعنی شاھدین) کو منصوب پڑھا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی اپنے نفسوں پر کفر کی گواہی ان کا اپنے بتوں کو سجدہ کرنا ہے (2) اور ان کا یہ اقرار کرنا ہے کہ وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کی کفر کے بارے شہادت یہ ہے کہ تو نصرانی کو کہتا ہے تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: نصرانی اور یہودی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: یہودی اور صابی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: صابی۔ اور کسی مشرک کو کہا جائے: تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: مشرک۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ⑱

''صرف وہی آباد کرسکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہو اللہ کے سوا کسی سے پس امید ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں ہدایت پانے والوں سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ یہ اس پر دلیل ہے کہ مساجد کو آباد کرنے والوں کے لیے ایمان کی شہادت دینا صحیح ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اس کے ساتھ ہی مربوط کیا ہے اور اسی کے بارے مساجد کو لازم پکڑنے کی خبر دی ہے۔ اور بعض سلف نے کہا ہے: جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد آباد کر رہا ہے تو تم اس کے ساتھ حسن ظن رکھو۔ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد کے اہتمام کا عادی ہے تو تم اس کے لیے ایمان کی شہادت دو''۔ (3) (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ

1۔ تفسیر بغوی 2۔ ایضاً

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی حرمۃ الصلاۃ، حدیث نمبر 2542، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب لزوم المساجد وانتظار الصلاۃ، حدیث نمبر 793، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اور ایک روایت میں ہے ''وہ مسجد کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتا ہے'' فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ظاہراً درست اور صحیح ہونے کے بارے میں ہے شہادت کے قطعی مقام کے بارے میں نہیں ہے، کیونکہ عارفین کے نزدیک شہادت کے مختلف احوال ہیں، کیونکہ ان میں کوئی انتہائی ذہین وفطین ہوتا ہے وہ ایسی شے کو حاصل کر لیتا ہے جس سے اسے کسی چیز کے اعتقاد اور خبر کا علم ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے بعض اس سے عاری ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے مقام اور مرتبہ پر ہوتا ہے اور اپنے وصف پر قائم ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللہَ اگر کہا جائے: کوئی مومن نہیں ہے مگر وہ غیر اللہ سے ڈرتا ہے۔ اور مومنین اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اپنے سواد دشمن سے ڈرتے رہے۔ تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اس کا معنی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان میں سے کسی سے نہ ڈرتا ہو جن کی عبادت کی جاتی ہے، کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان سے ڈرتے بھی ہیں اور ان سے امیدیں بھی وابستہ رکھتے ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ دین کے باب میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈرتا ہو۔(1)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آیت میں ان کے لیے ایمان ثابت کیا ہے جنہوں نے مساجد کو نماز کے ساتھ، ان کی صفائی اور ان کی کسی بوسیدہ چیز کی مرمت اور اصلاح کر کے آباد کیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا۔ اور اس میں ایمان بالرسول کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس کا کوئی ایمان نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان نہیں لایا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: آیت میں جو اقامت صلوٰۃ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے وہی ایمان بالرسول پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ پس نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بلاشبہ اس کی طرف سے صحیح ہوتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو۔ پس اسی لیے اسے علیحدہ ذکر نہیں کیا اور عسیٰ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب (اور ثابت) کے معنی میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عسیٰ بمعنی خلیق ہے ای فخلیق۔ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (پس لائق اور مناسب ہے کہ وہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں)

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۘ﴿۱۹﴾

''کیا تم نے ٹھہرا لیا ہے حاجیوں کو پانی پلانے (والے) کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے (والے) کو اس شخص کی مانند جو ایمان لے آیا اللہ پر اور روز قیامت پر اور جہاد کیا اس نے اللہ کی راہ میں۔ وہ نہیں یکساں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ان لوگوں کو جو ظالم ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ عربی میں تقدیر یہ ہے: أجعلتم أصحاب سقاية الحاج أو أهل سقاية الحاج، مثل من أمن بالله و جاهد في سبيله (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والوں کو ان کی مثل بنالیا ہے جو اللہ

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 436
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 376

تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا) اور صحیح یہ ہے کہ من امن میں حذف کو مقدر مانا جائے یعنی أجعلتم عمل سقی الحاج کعمل من أمن (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے کے عمل کو ایمان لانے والے کے عمل کی مثل بنا لیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام ہے کایمان من آمن (یعنی اس کے ایمان کی مثل جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا) السقایۃ یہ مصدر ہے جیسا کہ السعایۃ اور الحمایۃ مصدر ہیں۔ اور اسم کو مصدر کے محل میں رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کا معنی معلوم ہے، جیسے کہا جاتا ہے: انما السخاء حاتم، وانما الشعر زھیر (بلاشبہ سخاوت تو حاتم کی ہے اور شعر زہیر کا ہے)

**مسئلہ نمبر 2۔** عمارۃ المسجد الحرام، وأسأل القریۃ کی مثل ہے۔ ابو وجزہ نے أجعلتم سقاۃ الحاج و عمرۃ المسجد الحرام پڑھا ہے۔

سقاۃ، ساق کی جمع ہے۔ اور اصل میں یہ سقیۃ ہے یہ فُعلتہ کے وزن پر ہے، اس سے معتل کی جمع اسی طرح بنائی جاتی ہے، جیسے قاض کی جمع قضاۃ اور ناس کی جمع نساۃ ہے۔ اور اگر یہ معتل نہ ہو تو فعلۃ کے وزن پر جمع بنائی جائے گی جیسے اسی کی جمع نساۃ ہے، یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مہینوں میں نسی کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح ابن زبیر اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے سقاۃ و عمرۃ پڑھا ہے، مگر ابن جبیر نے عمرۃ میں تنوین کے ارادہ پر المسجد کو نصب دی ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سقایۃ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور الحاج، الحجاج کی اسم جنس ہے۔ اور عمارۃ المسجد الحرام سے مراد اس کی حفاظت، دیکھ بھال اور اس کے مصالح کا اہتمام کرنا ہے۔

اس آیت کا ظاہر بلاشبہ اس کے قول کو باطل کرتا ہے مشرکین میں سے جس نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے پر فخر کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام اور جہاد کے ساتھ اظہار فخر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصدیق کر دی اور ان دونوں کو جھٹلا دیا اور یہ خبر دے دی کہ مسجد کی آبادی کفر کے ساتھ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ایمان، عبادت اور طاعت و فرمانبرداری کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور یہ اتنا بین اور واضح ہے جس پر کوئی غبار نہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ مشرکوں نے یہودیوں سے سوال کیا اور کہا: ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کیا ہم افضل ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب؟ تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عناد رکھنے کی وجہ سے انہیں کہا: تم افضل ہو۔ اور یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر شریف کے پاس تھا تو ایک آدمی نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں حاجیوں کو پانی پلاؤں۔ اور دوسرے نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں مسجد حرام کو آباد کرتا رہوں۔ اور ایک تیسرے نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اس سے افضل ہے جو تم نے کہا ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر کے پاس اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ اور وہ جمعہ کا دن تھا۔ لیکن جب جمعہ کی نماز پڑھ لی گئی تو میں آپ کے پاس داخل ہوا اور آپ سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا جس میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ الی آخر الآیہ

اور یہ سیاق تقاضا کرتا ہے کہ بے شک یہ آیت مسلمانوں کے ان اعمال میں سے افضل کے بارے اختلاف کے وقت نازل ہوئی۔ اور اس وقت یہ مناسب نہیں کہ ان کے لیے آیت کے آخر میں یہ کہا جائے: وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ پس اشکال متعین ہو گیا۔ اور اس کا ازالہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا: بے شک بعض راویوں سے اپنے اس قول فانزل اللہ الآیۃ (پس اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی) میں تسامح ہوا ہے۔ بلاشبہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس وقت یہ آیت پڑھی جس وقت انہوں نے آپ کے سامنے عرضداشت پیش کی تو اس سے راوی کو یہ گمان ہوا کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔ اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جہاد اس سے افضل ہے جو ان لوگوں نے کہا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا اور ان کے لیے فتویٰ طلب کیا اور تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ پر وہ آیت تلاوت فرمائی جو آپ پر نازل کی گئی تھی، نہ یہ کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم

پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس بنا پر تو مسلمانوں پر استدلال کرنا اس سے جائز ہوا جو کافروں کے بارے نازل کیا گیا اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اس کے احکام مختلف ہیں۔ تو کہا جائے گا: یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مشرکوں کے بارے میں نازل کیا ہے اس سے وہ احکام نکال لیے جائیں جو مسلمانوں کے لائق اور مناسب ہوں۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک اگر ہم چاہیں تو ہم بھنا ہوا گوشت لے لیں اور اسے بڑے پیا۔ لے میں، کھ دیا جائے اور دوسرے کو پیش کر دیا جائے، لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن رکھا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھالیا تھا تم نے ان سے) ور یہ آیت ۔ ر کے بارے میں نص ہے اور اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اس زجر و توبیخ کے حکم کو سمجھ لیا جو من وجہ ان کے احوال سے مناسبت رکھتا تھا اور صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پس یہ ممکن ہے کہ یہ آیت اسی نوع سے ہو۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس ہے اور اس سے اشکال زائل ہو جاتا ہے اور ابہام اٹھ جاتا ہے، واللہ اعلم۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰

”جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، بہت بڑا ہے (ان کا) درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ اور یہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ اور دَرَجَةً بیان (اور تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے (1)، یعنی (ان کا درجہ ان کی نسبت بہت بڑا ہے) جنہوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کو آباد کرنے کے ساتھ فخر کیا۔ اور کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی درجہ نہیں کہ کہا جائے: المومن اعظم درجۃ (کہ مومن درجہ کے اعتبار سے بہت بڑا ہے) اور مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لیے مسجد کو آباد کرنے اور حاجیوں

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 207

کو پانی پلانے کے سبب ایک درجہ اور رتبہ کا اندازہ لگایا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر خطاب کیا جو انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں اندازہ لگایا اگرچہ وہ اندازہ مقرر کرنا غلطی اور خطا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَعْظَمُ دَرَجَةً، من کل ذی درجة یعنی ان کا درجہ ہر صاحب درجہ سے زیادہ اور بلند رتبہ ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ اور یہی ہیں جو اس کے سبب کامیاب ہونے والے ہیں۔

یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۲﴾

"خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور (ایسے) باغات کی کہ ان کے لیے ان میں دائمی نعمت ہوگی۔ ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ اس میں تا ابد، بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی اجر عظیم ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں بتارہا ہے اس بہت بڑے ثواب اور ہمیشہ رہنے والی نعمت کے بارے جو آخرت میں ان کے لیے ہوگی۔ اور نعیم سے مراد زندگی کا پرسکون اور خوشحال ہونا ہے۔ خٰلِدِیْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ اور الخلود کا معنی مقیم رہنا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے دار کرامت میں وہ ثواب تیار کر رکھا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اے ایمان والو! نہ بنالو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دلی دوست اگر وہ پسند کریں کفر کو ایمان پر اور جو دوست بناتا ہے انہیں تم میں سے تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں"۔

اس آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب تمام کے تمام مومنوں کے لیے ہے اور مومنوں اور کافروں کے مابین ولایت کو منقطع کرنے والا یہ حکم یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اور ایک جماعت نے یہ روایت کیا ہے کہ یہ آیت بلاشبہ ہجرت پر ابھارنے کے لیے اور کافروں کے شہروں کو چھوڑنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر یہ خطاب ان مومنوں کے لیے ہے جو مکہ مکرمہ اور اس کے علاوہ بلاد عرب میں سے دیگر شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں خطاب کیا گیا کہ وہ باپوں اور بھائیوں کو والی اور دوست نہ بنالیں کہ وہ بلاد کفر میں رہائش کے دوران ان کے تابع ہو جائیں۔ (1)

اِنِ اسْتَحَبُّوا یعنی اگر وہ پسند کریں: (اس میں استحبوا بمعنی احبوا ہے) جیسے کہا جاتا ہے: کہ استجاب بمعنی اجاب ہے۔ یعنی تم ان کی اطاعت نہ کرو اور نہ تم انہیں خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آباء اور بھائیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ان سے بڑھ کر اور کوئی قریب تر قرابت نہیں۔ پس ان کے درمیان موالات اور دوستی کی نفی ایسی ہی ہے جیسے لوگوں کے درمیان اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17

تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اس کی نفی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ (المائدہ:51)
تاکہ وہ یہ بیان کر دے کہ بے شک حقیقی قرب ادیان کا قرب ہے نہ کہ ابدان کا قرب۔ اور اس کی مثل میں صوفیہ کہتے ہیں:

يقولون لي دار الأحبة قد دنت وأنت كئيبٌ إنّ ذا لعجيب

وہ مجھے کہتے ہیں محبوبوں کی بستی قریب ہے اور تو غمگین ہے بے شک یہ عجیب بات ہے۔

فقلت وما تغني ديارٌ قريبة إذا لم يكن بين القلوب قريب

تو میں نے کہا: گھروں کا قریب ہونا کیا فائدہ دے سکتا ہے جب دلوں کے درمیان قرب اور نزدیکی نہ ہو۔

فكم من بعيد الدار نال مُرادَه و آخر جارُ الجَنْب مات كئيب

پس کتنے دور رہنے والے ہیں کہ اس نے اپنا مقصود پالیا ہے اور دوسرا پہلو میں رہنے والا پڑوسی غمزدہ حالت میں مایوس ہو کر مر گیا۔

اس آیت میں بیٹوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ انسانوں میں اغلب یہی ہے کہ بیٹے باپوں کے تابع ہوتے ہیں (1)۔ اور احسان اور ہبہ ولایت سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک میری ماں انتہائی رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی اور وہ مشرک ہے کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلی أمك تو اپنی ماں سے مل (حسن سلوک سے پیش آ) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (2)۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اور جو تم میں سے انہیں دوست بناتا ہے) وہ انہی کے مثل مشرک ہے، کیونکہ جو شرک کے ساتھ راضی ہوا تو وہ مشرک ہی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾

"(اے حبیب!) آپ فرمائیے: اگر ہیں تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو نافرمان ہے"۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو ایک آدمی اپنے باپ کو اور باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو اور آدمی اپنی بیوی کو کہنے لگا: بے شک ہمیں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے۔ تو ان میں سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17
2۔ صحیح بخاری، باب صلة المرأة امها ولها زوج، حدیث نمبر 5521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بعض نے اس کے لیے تیزی اور جلدی کی۔ اور بعض نے ہجرت کرنے سے انکار کیا۔ تو وہ کہتا: قسم بخدا! اگر تم دار الہجرت کی طرف نہ نکلے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں دوں گا اور نہ تم پر کبھی کوئی شی خرچ کروں گا۔ اور ان میں سے وہ بھی تھے جس کے ساتھ اس کی بیوی اور اولاد چمٹ گئی اور وہ اسے کہنے لگے: میں تجھے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو نہ نکل پس تیرے بعد ہم ضائع ہو جائیں گے۔ پھر ان میں سے بعض تھے جو نرم ہو گئے اور انہوں نے ہجرت کو چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ مقیم ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ رب کریم فرما رہا ہے: اگر انہوں نے مکہ مکرمہ میں رہنے کو پسند کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے پر وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں) پھر جو پیچھے رہ گئے اور انہوں نے ہجرت نہ کی ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ اور یہ (عشیرہ) وہ جماعت ہے جو ایک عقد کی طرف راجع ہو جیسے دس یا زیادہ افراد کا عقد کرنا۔ اور اسی سے المعاشرہ ہے اور اس کا معنی کسی شے پر جمع ہونا ہے۔ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وہ فرما رہا ہے: اور وہ اموال جو تم نے مکہ مکرمہ میں کمائے۔ اور اقتراف کا اصل معنی کسی شے کا اپنی جگہ سے دوسرے کی طرف کٹ جانا، منتقل ہو جانا ہے۔

وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بیٹیاں اور بہنیں ہیں جب گھر میں ان کا مندا ہو جائے تو وہ اپنے لیے کوئی دعوت نکاح دینے والا نہیں پاتیں۔ شاعر نے کہا ہے:

كَسَدْنَ من الفقر فی قومهنّ	وقد زادهنّ مقامی كُسودا

وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ وہ فرما رہا ہے: اور وہ گھر جن میں اقامت اختیار کرنا تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔

اَحَبَّ اِلَیْكُمْ (یہ تمہارے نزدیک زیادہ محبوب ہو جائے) اس سے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ طیبہ میں ہجرت کرو۔ واحب یہ کان کی خبر ہے اور غیر قرآن میں مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر أحب کو مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے، اور کان کا اسم اس میں مضمر ہے، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

إذا متُّ كان الناسُ صنفان شامِتٌ	وآخَرُ مُثْنٍ بالذی كنتُ أصنَعُ

هی الشفاء لدائی لو ظفِرتُ بها	ولیس منها شفاءُ الداء مبذول

اور آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واجب ہے اور امت کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ کہ یہ ہر محبوب پر مقدم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا معنی و مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا اس میں تربصوا صیغہ امر ہے اور اس کا معنی تہدید ہے۔ وہ فرما رہا ہے: پس تم انتظار کرو۔ حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قتال اور فتح مکہ کے بارے حکم لے آئے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

حسن نے کہا ہے: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اخروی یا دنیوی سزا کا حکم لے آئے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ میں فضیلت جہاد پر دلیل ہے اور اسے راحت نفس اور اسے اہل و مال کے ساتھ چمٹائے رکھنے پر ترجیح دینے پر دلیل ہے۔ سورت کے آخر میں جہاد کی فضیلت کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہجرت سے متعلقہ احکام سورۃ النساء میں گزر چکے ہیں اور وہ کافی ہیں۔ والحمدللہ۔ اور حدیث صحیح میں ہے "بے شک شیطان ابن آدم کے لیے تین مقامات پر بیٹھا وہ اس کے لیے اسلام کی راہ میں بیٹھا اور کہا: تو اپنا دین اور اپنے آباؤ اجداد کا دین کیوں چھوڑتا ہے؟ تو اس نے اس کی مخالفت کی اور اسلام قبول کر لیا پھر وہ اس کے لیے ہجرت کی راہ میں بیٹھا، کیا تو اپنے مال اور اپنے گھر والوں کو چھوڑتا ہے؟ پس اس نے اس کی مخالفت کی اور ہجرت کی۔ پھر وہ جہاد کے راستے میں بیٹھا اور اسے کہا: تو جہاد کرے گا تو تو قتل کر دیا جائے گا اور تیری بیوی (نیا) نکاح کرے گی اور تیرا مال تقسیم کر دیا جائے گا، تو اس نے اس کی مخالفت کی اور جہاد کیا، پس اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے"۔ امام نسائی نے اسے سبرہ بن ابی فاکہ کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الشیطان...... اور آگے مذکورہ حدیث ذکر کی ہے۔ بخاری نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور اس میں اختلاف ذکر نہیں کیا۔ اور ابن ابی عدی نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور ابن ابی الفاکہ کہا جاتا ہے۔ انتہی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ۝٢٥ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٢٧

"بے شک مدد فرمائی تمہاری اللہ نے بہت سے جنگی میدانوں میں اور حنین کے روز بھی، جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) کچھ بھی اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے، پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ پھر نازل فرمائی اللہ نے اپنی (خاص) تسکین اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر اور اتارے وہ لشکر جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے کافروں کی۔ پھر رحمت سے توجہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ جب بنی ہوازن کو مکہ مکرمہ فتح ہونے کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری جو بنی نصر بن مالک میں سے تھا، نے انہیں جمع کیا اور تمام لشکر میں ریاست وحکومت اسی کی تھی اور وہ کفار کو ان کے مالوں، مویشیوں، عورتوں اور ان کی اولاد سمیت ساتھ لے کر چلا۔ اور اس کا خیال یہ تھا کہ اس کے سبب ان

کی جائیں محفوظ رہیں گی اور اس طرح جنگ میں ان کی قوت و طاقت انتہائی مضبوط ہوگی۔ حضرت حسن اور مجاہد رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ہوازن و ثقیف میں سے چار ہزار تھے۔ اور ہوازن پر مالک بن عوف اور ثقیف پر کنانہ بن عبد سالار تھا۔ پس وہ اوطاس میں اترے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے (یعنی جاسوسی کرنے کے لیے) بھیجا پس وہ آئے اور جو کچھ ان کے بارے میں دیکھا تھا اس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر دی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے بارے پختہ عزم کیا۔ اور صفوان بن امیہ بن خلف جمحی سے کچھ زر ہیں عاریۃً لیں، کہا گیا ہے کہ وہ سو زر ہیں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ چار سو زر ہیں تھیں۔ اور ربیعہ مخزومی سے تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیے، پھر جب آپ آئے تو آپ نے اسے وہ ادا کر دیئے۔ پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھے تیرے گھر والوں میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ بے شک قرض کی جزا اور بدلہ اسے پورا کرنا اور شکر ادا کرنا ہے'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بارہ ہزار مسلمانوں کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ ان میں سے دس ہزار وہ صحابہ کرام تھے جو مدینہ طیبہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے اور یہ اس کے بارے میں آزاد تھے جو کوئی اعرابیوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ملا۔ یہ سلیم بن کلاب، عبس اور ذبیان میں سے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر عامل مقرر کیا۔ اور آپ کے اس سفر کے دوران جاہل اعرابیوں نے ایک سرسبز شاداب درخت دیکھا اور ان کے لیے زمانہ جاہلیت میں معروف درخت تھا اس کا نام ذات انواط تھا۔ کفار سال میں ایک معین دن میں اس کی طرف نکلتے تھے اور وہ اس کی تعظیم بجا لاتے تھے۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے لیے بھی اسی طرح ایک ذات انواط بنا دیجئے جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اکبر قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم نے اس طرح کہا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا (کہ) ہمارے لیے الٰہ بنا دیجئے جیسے ان کے لیے الٰہ ہیں تو فرمایا: بلاشبہ تم جاہل قوم ہو تو یقیناً تم بھی برابر برابر اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو تم بھی اس میں داخل ہو گے''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اٹھے یہاں تک کہ آپ وادی حنین میں آ گئے۔ اور یہ تہامہ کی وادیوں میں سے ہے اور ہوازن وادی کی دونوں طرفوں میں چھپے ہوئے تھے اور یہ صبح کے وقت آخر شب کی تاریکی میں تھے، پس انہوں نے ایک آدمی کی طرح یکبارگی مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور جمہور مسلمان پسپا ہو گئے اور کسی نے کسی کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ثابت قدم رہے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور آپ کی اہل بیت میں سے حضرت علی، حضرت عباس، ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے حضرت جعفر اور حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمن بن عبید اور وہ ایمن بن ام ایمن تھے جو اس دن حنین میں شہید ہوئے۔ اور حضرت ربیعہ ابن حارث اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہم بھی ثابت قدم رہے۔ اور جعفر بن ابی سفیان کی جگہ میں قثم بن عباس بھی کہا

1۔ سنن ابن ماجہ، باب حسن القضاء، حدیث نمبر 2414، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گیا ہے۔ پس یہ دس افراد تھے۔ اسی لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا:

نصرنا رسولَ الله فی الحرب تسعةً وقد فرّ مَن قد فرّ عنه وأقشعوا

ہم نو نے جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی حالانکہ جو آپ سے بھاگ گئے وہ بہت دور چلے گئے۔

وعاشرنا لاقی الحمام بنفسه بما مَسّه فی الله لا یتوجّع

اور ہم میں سے دسویں کی ذات نے موت سے جا ملاقات کی اس تکلیف کے سبب جو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں آئی اور اس نے کوئی درد محسوس نہیں کیا۔

ام سلیم بھی ان تمام کے ساتھ ثابت قدم رہی جو ثابت قدم رہے، درآنحالیکہ وہ حضرت ابوطلحہ کے اونٹ کی رسی کو کمر سے باندھ کر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسپا نہیں ہوئے اور نہ ہی ان میں کوئی پسپا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شہباء خچر پر سوار تھے اور اس کا نام دلدل تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھا اور میں اس ارادے سے اسے روکتا تھا کہ وہ تیز نہ چلے اور ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عباس! ببول کے درخت والوں کو بلاؤ" (مراد اصحاب شجرہ ہیں جو بیعت رضوان میں شریک تھے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ بہت بلند آواز والے آدمی تھے۔ اور آپ کی آواز کی شدت کے بارے روایت کیا جاتا ہے کہ ایک دن مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیا گیا تو انہوں نے آواز لگائی واصباحاہ! تو جس حاملہ عورت نے آپ کی آواز سنی اس نے اپنا جنین گرا دیا۔ پس میں نے بلند آواز کے ساتھ کہا: اصحاب شجرہ کہاں ہیں؟ آپ فرماتے ہیں: قسم بخدا! جس وقت انہوں نے میری آواز سنی تو وہ اس کی طرف مائل ہوئے اور لپک کر آئے جیسے گائے اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا: یا لبیک یا لبیک (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) انہوں نے بیان کیا: پھر وہ کفار کے ساتھ لڑنے میں مشغول ہو گئے الحدیث (1)۔

اور اس میں ہے: فرمایا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگریزے اٹھائے اور انہیں کفار کے چہروں پر پھینک دیا"۔ پھر فرمایا: "حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم وہ شکست کھا گئے"۔ فرمایا پس میں دیکھتا چلا گیا تو جنگ اپنی اسی ہیئت پر تھی جس میں میں اسے دیکھتا رہا۔ فرمایا: قسم بخدا! وہ نہیں ہوا مگر ان سنگریزوں کے سبب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پھینکے۔ پس میں مسلسل ان کی تیز دھار تلواروں کو کند ہوتا اور ان کے معاملے کو پیٹھ پھیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ابوعمرو نے کہا ہے: ہم نے کئی اسناد سے ان بعض افراد سے روایت بیان کی ہے جو مشرکین میں سے اسلام لائے تھے اور غزوۂ حنین میں حاضر تھے کہ انہوں نے بیان کیا درآنحالیکہ ان سے غزوۂ حنین کے بارے پوچھا گیا: ہم مسلمانوں سے ملے (مقابلہ کیا) زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہم نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا اور ہم نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ ہم اس آدمی تک پہنچ گئے جو سفید خچر پر سوار تھا، پس جب اس نے ہمیں دیکھا تو اس نے ہمیں سخت جھڑکا اور ہم سہم گئے، خوفزدہ ہو گئے اور اس نے اپنی ہتھیلی میں کنکریاں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1775

اور مٹی اٹھائی اور اسے پھینک دیا اور زبان سے فرمایا: شاهت الوجوه (چہرے بدشکل ہوں)
پس کوئی آنکھ نہ بچی جس میں وہ مٹی داخل نہ ہوئی ہو اور ہم اپنے نفسوں کے مالک نہ رہے کہ ہم الٹے پاؤں واپس لوٹ جائیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہمیں مشرکوں میں سے ایک آدمی نے حنین کے دن کے بارے بیان کیا کہ جب ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے آمنا سامنا ہوا تو وہ بکری دوہنے کی مقدار بھی ہمارے سامنے نہ ٹھہرے، یہاں تک کہ جب ہم شہباء خچر والے...... یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم...... کے پاس پہنچے تو سفید چہروں والے خوبصورت آدمی ہمارے سامنے آ گئے۔ اور انہوں نے ہمارے لیے کہا: شاهت الوجوه واپس لوٹ جاؤ، پس ہم واپس لوٹ گئے اور وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے اور وہ وہ تھے یعنی ملائکہ تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ شاهت الوجوه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہو اور ملائکہ کا قول بھی ہو اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ملائکہ نے حنین کے دن جنگ لڑی۔ فاللہ اعلم۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ حنین میں اپنے ہاتھ سے چالیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار ہزار افراد کو قیدی بنایا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ قیدی چھ ہزار تھے اور بارہ ہزار اونٹ تھے یہ اس کے سوا ہے جو مال غنیمت معلوم نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس غزوہ کے بارے میں علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی آدمی کو قتل کیا اور اس کے پاس اس پر بینہ موجود ہو تو اس سے چھینا ہوا مال اسی کے لیے ہوگا''۔ اور اس کا بیان سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی نکتہ اور دیگر قرائن کی وجہ سے احکام بیان کرنے والوں نے اس آیت کو احکام میں داخل کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس میں یہ بھی ہے کہ ہتھیار عاریۃً لینا جائز ہے، عاریۃً لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس معہود کی مثل ہو جس کے لیے عاریۃً لیا جا سکتا ہو اور امام کا حاجت کے وقت مال کو خرچ کرنا جائز ہے اور پھر وہ اسے اس کے مالک تک واپس لوٹا دے۔ اس باب میں صفوان کی حدیث اصل ہے۔ اور اس غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ''کسی حاملہ سے وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ وضع حمل کر لے اور غیر حاملہ سے بھی وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ ایک کامل حیض گزار لے''۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ قید عصمت کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس کا مکمل بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے کہ صفوان اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلا کہ وہ کافر تھا، پس وہ حنین اور طائف میں حاضر ہوا اور اس کی بیوی مسلمان تھی۔ الحدیث۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نہیں ہوا اور میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ مشرکوں سے مشرکوں کے خلاف مدد طلب کی جائے مگر یہ کہ وہ خادم ہوں یا ملاح ہوں۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، ثوری اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اسلام کا حکم غالب ہو اور ان سے مدد طلب کرنا مکروہ ہے جب کہ شرک کا حکم بھی ظاہر ہو۔ ان کے حصص کے بارے میں گفتگو سورۃ الانفال میں گزر

چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ، حُنَيْنٍ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے اور یہ لفظ منصرف ہے کیونکہ یہ مذکر کا اسم ہے اور یہ قرآن کی لغت ہے۔ اور عربوں میں سے جو اسے غیر منصرف بناتے ہیں، وہ اسے بقعہ کا اسم بناتے ہیں۔ اور انہوں نے یہ شعر بیان کیا ہے:

نصروا نبيّهم و شدّوا أزره　بحنينَ يومَ تواكلُ الأبطال

تو اس میں بحنین کو غیر منصرف پڑھا گیا ہے۔ اور یوم ظرف ہے اور اس معنی کی بنا پر یہاں منصوب ہے: د نصرکم یوم حنین اور فراء نے کہا ہے: مواطن منصرف نہیں ہے کیونکہ مفرد میں اس کی کوئی نظیر نہیں اور نہ اس کی جمع آتی ہے۔ مگر شاعر بسا اوقات مجبور ہوتے ہیں اور وہ جمع لے آتے ہیں اور نثر کلام میں وہ جائز نہیں ہوتا ہر وہ جو شعر میں جائز ہوتا ہے اور شعر بیان کیا:

فهنّ يَعْلُكْنَ حدائداتها

اور نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس پر تعجب کرتے ہوئے دیکھا ہے انہوں نے کہا ہے: انہوں نے خلیل کا قول لیا ہے اور اس میں خطا کی ہے، کیونکہ خلیل اس بارے میں کہتے ہیں: یہ منصرف نہیں ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی واحد میں کوئی نظیر نہیں ہے اور نہ اس کی جمع مکسر بنائی جاسکتی ہے اور رہی جمع الف اور تا کے ساتھ تو یہ ممتنع نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ کہا گیا ہے کہ لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گیارہ ہزار پانچ سو تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ سولہ ہزار تھے۔ تو ان میں سے بعض نے کہا: آج کے دن قلت کے سبب ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔ پس انہیں اسی کلمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ تو پھر وہ ہوا جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ ابتدا میں ہزیمت کا سامنا ہوا یہاں تک کہ واپس لوٹ گئے، پس مسلمانوں کی مدد و نصرت اور کامیابی و کامرانی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی۔ تو اس آیت میں الله تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا کہ غلبہ الله تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب ہوتا ہے نہ کہ کثرت کے ساتھ۔ تحقیق ارشاد فرمایا: وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (آل عمران: 160) (اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد)

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ یعنی خوف کے سبب زمین تم پر تنگ ہوگئی باوجود اپنی وسعت کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

كأن بلادَ الله وهي عريضةٌ　على الخائف المطلوب كِفّةُ حابِلِ

اور الرحب (را کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی وسعت ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: فلان رحب الصدر (فلاں وسیع سینے والا ہے) اور الرحب (را کے فتحہ کے ساتھ) کا معنی الواسع ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: بلد رحب (کھلا شہر) اور أرض رحبة (کھلی زمین) اور تحقیق رَحُبت ترحُب رحُبا و رَحابة (وسیع ہونا) اور کہا گیا ہے کہ بما یہاں بامعنی مع ہے، ای مع رحبها اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی علی ہے، یعنی علی رحبها۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی برحبها ہے اور ما مصدریہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ مسلم نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک آدمی حضرت براء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابا عمارہ! کیا تم غزوۂ حنین کے دن پیٹھ پھیر کر مڑے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت دیتا ہوں کہ آپ پیٹھ پھیر کر نہیں مڑے، بلکہ لوگوں میں سے جلد باز اور ہتھیار رو ل سے خالی لوگ بنی ہوازن کے اس قبیلہ کی طرف چلے۔ اور وہ تیر انداز قوم تھی انہوں نے یکبارگی ان پر تیروں کی بارش کر دی گویا کہ وہ مکڑی کا جتھہ ہے اور وہ ظاہر ہو گیا ہے۔ پس ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور ابو سفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کو پکڑے ہوئے تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے۔ دعا کی اور مدد طلب کی اور آپ یہ فرما رہے تھے: أنا النبی لا کذب أنا ابن عبد المطلب (میں یقیناً نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبد المطلب کا پوتا ہوں) اللّٰھُمَّ نَزِّلْ نصرك ''اے اللہ! اپنی مدد و نصرت نازل فرما'' حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: قسم بخدا! جب جنگ شدت کے ساتھ بھڑک گئی تو ہم اس سے ڈر رہے تھے اور جو ہم میں سے شجاع اور بہادر تھا وہ اس کے مقابلہ میں تھا۔ شجاع سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر انہیں سکون پہنچانے والی اور ان سے خوف دور کرنے والی چیز نازل فرمائی، یہاں تک کہ وہ پیٹھ پھیرنے کے بعد پھر مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے پر جری ہو گئے۔ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا اور اللہ تعالیٰ نے وہ لشکر اتارے جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور وہ ملائکہ ہیں، وہ مومنوں کو ان خواطر اور ثابت قدم رہنے کے جذبات کے ساتھ طاقتور اور قوی بناتے رہے جو وہ ان کے دلوں میں ڈال رہے تھے اور کافروں کو بزدلی کے جذبات کے ساتھ کمزور کرتے رہے اس حیثیت سے کہ نہ وہ انہیں دیکھ سکے اور نہ وہ جنگ میں عملاً شریک ہوئے، کیونکہ ملائکہ نے غزوۂ بدر کے سوا کسی دن عملاً جنگ نہیں لڑی۔

اور روایت ہے کہ جنگ کے بعد بنی نصر کے ایک آدمی نے مومنوں کو کہا: وہ ابلق (چتکبرے) گھوڑے کہاں ہیں؟ اور وہ لوگ کہاں ہیں جو ان پر خود پہنے ہوئے تھے؟ ہم ان کے سامنے نہیں تھے مگر ناک کے بال کی طرح اور ہم فقط انہیں کے ہاتھوں سے قتل کیے گئے؟ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے اس بارے خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے''۔

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تلواروں کے ساتھ کافروں کو عذاب دیا۔

وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۞ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ یعنی پھر اللہ تعالیٰ رحمت سے ان پر توجہ فرمائے گا جو شکست خوردہ ہوئے اور انہیں اسلام کی طرف ہدایت اور رہنمائی فرمائے گا (جنہیں چاہے گا) جیسا کہ مالک بن عوف نصری حنین کا سردار تھا اس کے ساتھ اس کی قوم بھی اسلام لے آئی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ کے مقام پر حنین کے مال غنیمت تقسیم فرمائے، تو ہوازن کا ایک وفد اسلام کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے اوپر عطف و مہربانی چاہتے ہوئے اور اپنے اوپر احسان کرنے کی خواہش اور طلب لے کر حاضر ہوا اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آپ سارے لوگوں سے بہتر اور لوگوں سے بڑھ کر نیکوکار ہیں۔ تحقیق آپ نے ہماری اولاد، ہماری عورتیں اور ہمارے اموال لے لیے ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''بلاشبہ

میں تمہارے بارے میں غور وفکر کرتا رہا حالانکہ تقسیم واقع ہو چکی ہے اور میرے پاس وہ ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو اور بے شک بہترین قول وہی ہے جو زیادہ سچا ہو پس تم اپنی اولاد یا اپنے مالوں میں سے (ایک کو) اختیار کر لو"۔ تو انہوں نے عرض کی: ہم کسی شے کو بھی اولاد کے برابر قرار نہیں دیتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: "یہ لوگ مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئے ہیں اور ہم نے انہیں اختیار دیا ہے اور انہوں نے اولاد کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا پس تم ان کی اولاد واپس لوٹانے پر راضی ہو جاؤ پس جو میرے اور بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم کے حصہ میں ہیں تو وہ ان کے لیے ہیں" (یعنی میں انہیں واپس لوٹاتا ہوں) تو یہ سن کر مہاجرین وانصار نے کہا: جو ہمارے حصہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہیں۔ اور اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن نے اپنی قوم کے ساتھ اس سے انکار کر دیا کہ وہ انہیں اس میں سے کوئی شے واپس لوٹائیں جو ان کے حصہ میں ہے اور اسی طرح عباس بن مرداس سلمی نے بھی انکار کر دیا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ اس کی قوم اس کے ساتھ اسی طرح تعاون کرے گی جیسا کہ اقرع اور عیینہ کے ساتھ ان کی قوم نے تعاون کیا، لیکن بنو سلیم نے انکار کر دیا اور کہا: بلکہ جو کچھ ہمارے لیے ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کسی نے تم میں سے اس کے بارے بخل کا اظہار کیا جو اس کے قبضے میں ہے تو ہم اسے اس کا معاوضہ ادا کریں گے"۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی عورتیں اور بچے واپس لوٹا دیئے۔ اور جو اپنا حصہ خوشی کے ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے انہیں اتنا عوض عطا فرمایا کہ وہ اس سے راضی ہو گئے (1)۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہمیں بتایا گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دایہ جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا وہ بنی اسد سے تھی، وہ حنین کے دن آپ کے پاس حاضر ہوئی اور حنین کے قیدیوں کے بارے آپ سے درخواست کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک میں صرف اسی کا مالک ہوں جو حصہ مجھے ان سے ملا ہے البتہ تم کل صبح میرے پاس آؤ اور مجھ سے اور میرے پاس موجود لوگوں سے یہ درخواست کرو تو جب میں اپنا حصہ تمہیں عطا کر دوں گا تو لوگ بھی آپ کو دے دیں گے"۔ پس وہ دوسرے دن صبح حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے اپنا کپڑا بچھایا اور اس پر انہیں بٹھایا۔ پھر انہوں نے آپ سے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا حصہ عطا فرما دیا۔ تو جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے حصص دے دیئے (2)۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوازن کے قیدیوں کی تعداد پورے چھ ہزار تھی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھی۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: ان میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بھی تھی اور یہ حارث بن عبد العزی جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھا اور حضرت حلیمہ سعدیہ کی بیٹی تھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عزت وتکریم دی اور اسے بہت نوازا اور اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کیا اور وہ انتہائی خوشی خوشی اپنے دین کے ساتھ اور اس مال کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا اپنے شہر واپس لوٹ گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم اوطاس کو ایک عورت کو

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6729-7073　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 389

دیکھا وہ دوڑ رہی ہے اور چیخ و پکار کر رہی ہے اور اسے قرار حاصل نہیں ہو رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے پوچھا تو آپ کو بتایا گیا: اس نے اپنا بچہ گم کر دیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنے بچے کو پا لیا ہے وہ اس سے پیار کر رہی ہے اور اسے قریب لا رہی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اپنے اصحاب کو فرمایا: اطارحة هذه ولدها فی النار؟ (کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟) صحابہ کرام نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں؟''۔ انہوں نے عرض کی: اپنی شفقت (اور پیار و محبت) کی وجہ سے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله أرحم بكم منها (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اس سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے)۔ اسی معنی میں مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۸

''اے ایمان والو! مشرکین تو بڑے ناپاک ہیں سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجد حرام سے اس سال کے بعد اور اگر تم اندیشہ کرو تنگ دستی کا تو غنی کر دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اگر چاہے گا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ مشرک کے نجس (ناپاک ہونے) کے ساتھ متصف ہونے کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت قتادہ اور معمر بن راشد وغیرہما نے کہا ہے: کیونکہ وہ جنبی ہوتا ہے (اس لیے ناپاک ہے) کیونکہ جب وہ غسل جنابت کرے تو وہ غسل نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: بلکہ شرک ہی وہ شے ہے جس نے اسے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس نے مشرک کے ساتھ مصافحہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ اور تمام مذاہب اس پر متفق ہیں کہ کافر جب اسلام قبول کرے تو اس پر غسل کرنا واجب ہوتا ہے، سوائے ابن عبدالحکم کے کیونکہ اس نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہے (1)، کیونکہ اسلام سابقہ سارے گناہ مٹا دیتا ہے۔ اور اس پر غسل کے واجب ہونے کا قول ابو ثور اور احمد نے کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ساقط کر دیا ہے اور کہا ہے: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ وہ غسل کرے اور اسی طرح ابن قاسم نے بیان کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ غسل کو نہیں پہچانتے۔ اسے ان سے ابن وہب اور ابن ابی اویس نے روایت کیا ہے اور حضرت ثمامہ اور قیس بن عاصم کی حدیث ان اقوال کا رد کرتی ہے ان دونوں کو ابو حاتم البستی نے اپنی صحیح مسند میں روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ثمامہ کے پاس سے گزرے اور وہ اسلام لا چکا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کرنے کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعتیں نماز پڑھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

نے فرمایا: ''تحقیق تمہارے ساتھی کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا ہے''۔ اسی معنی میں اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ثمامہ پر جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان فرمایا تو وہ مسجد کے قریب ایک نخلستان کی طرف چلا گیا اور غسل کیا۔ اور قیس بن عامر نے حکم دیا ہے کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل کرے۔ پھر اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے اسلام لائے تو اس کا غسل کرنا مستحب ہے اور جب وہ اپنے بالغ ہونے کے بعد اسلام لائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے غسل جنابت کی نیت کرے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی مذہب کا ماحصل ہے۔

ابن قاسم نے کافر کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسلام کی شہادت کا اظہار کرنے سے پہلے غسل کر لے، بشرطیکہ اپنے دل کے ساتھ اسلام کا اعتقاد رکھتا ہو۔ یہ نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف قول ہے اور اثر کے مخالف ہے۔ اور وہ اس لیے کہ کوئی بھی قول کے بغیر صرف نیت کے ساتھ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اہل السنت والجماعت کا ایمان کے بارے میں یہ قول ہے: بے شک یہ زبان کے ساتھ اقرار کرنے اور دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے اور عمل کے ساتھ یہ نمو پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر: 10) (اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے)(1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ، فَلَا يَقْرَبُوا یہ نہی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے نون حذف کر دی گئی ہے۔ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اس لفظ کا اطلاق پورے حرم پر کیا جاتا ہے، یہی حضرت عطا کا مذہب ہے۔ تب پورے حرم میں کسی مشرک کو داخل ہونے کی قدرت دینا حرام ہو گا پس جب کوئی ان کی طرف سے ہمارے پاس قاصد آئے تو امام مقام حل کی طرف نکلے تاکہ وہ (پیغام) سن سکے جو وہ کہتا ہے اور اگر کوئی مشرک چھپ کر حرم پاک میں داخل ہوا اور وہ مر گیا تو اس کی قبر اکھیڑ کر اس کی ہڈیاں نکال لی جائیں گی، نتیجۃً اس کے لیے اس کے اندر داخل ہونا جائز نہیں اور نہ اس سے گزرنا جائز ہے۔ اور رہا جزیرۃ العرب اور یہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمامہ، یمن اور اس کی بستیوں پر مشتمل ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو بھی دین اسلام پر نہیں وہ ان مقامات سے نکل جائے اور اس کے بارے متردد مسافروں کو نہیں روکا جائے گا اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، مگر آپ نے اس سے یمن کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ان کے لیے تین دنوں کی مدت مقرر کی جائے گی جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے اتنی مدت مقرر کی جس وقت آپ نے انہیں جلاوطن کیا۔ انہیں نہ تو اس میں دفن کیا جائے گا اور نہ انہیں حل کی طرف پناہ دی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا کفار کے مساجد اور مسجد حرام میں داخل ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس کے بارے پانچ قول ہیں: پس اہل مدینہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین اور تمام مساجد کے بارے عام ہے۔ اور اسی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کی طرف لکھا اور اپنے خط میں اس آیت سے استدلال کیا۔ اور اس کی تائید یہ ارشاد گرامی بھی کرتا ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (النور: 36) (ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 209

کہ بلند کیے جائیں اور لیا جائے ان میں الله تعالیٰ کا نام) اور کفار کا ان میں داخل ہونا ان کی رفعت شان کے خلاف ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے: ''بے شک یہ مساجد بول وقذر میں سے کسی شی کی صلاحیت نہیں رکھتیں'' (1)۔ الحدیث (یعنی غلاظت سے انہیں پاک اور محفوظ رکھنا چاہیے) اور کافر ان سے خالی نہیں ہوتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں مسجد کو کسی حائضہ عورت اور جنبی کے لیے حلال نہیں کروں گا''۔ اور کافر جنبی ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ میں تو الله تعالیٰ نے اسے نجس کا نام دیا ہے۔ پس یہ اس سے خالی نہیں کہ یہ نجس العین ہوگا یا پھر بطریق حکم اسے دور رکھا گیا ہوگا۔ اور جو صورت بھی ہو اسے مسجد سے روکنا واجب ہے، کیونکہ ان میں علت جو کہ نجاست ہے وہ موجود ہے اور مسجد میں حرمت موجود ہے۔

کہا جاتا ہے: رجل نجس، امرأۃ نجس، رجلان نجس، إمراتان نجس، رجال نجس اور رجال نجس و نساء نجس چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے نہ اس کا تثنیہ بنایا جائے گا اور نہ ہی جمع بنائی جائے گی۔ اور النجس (نون کے کسرہ اور جیم کی جزم کے ساتھ) تو یہ نہیں کہا جائے گا مگر تب جب اس کے ساتھ گندگی اور پلیدی (رجس) بھی ہو۔ پس جب مفرد ہو تو نَجِس (نون کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) اور نَجُس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) کہا جائے گا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین کے بارے میں عام ہے اور مسجد حرام کے بارے میں خاص ہے، لہٰذا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے انہیں نہیں روکا جائے گا۔ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے تمام مساجد میں داخل ہونے کو مباح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ان کی طرف سے ظاہر پر جمود ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ شرک اور نجاست کے ساتھ علت پر تنبیہ ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثمامہ کو مسجد میں باندھا تھا اور وہ مشرک تھا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: ہمارے علماء نے اس حدیث کے کئی جوابات دیئے ہیں اگر یہ صحیح ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ واقعہ نزول آیت سے پہلے کا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے اسلام لانے کے بارے میں علم تھا اس لیے آپ نے اسے وہاں باندھا۔ اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک معین فرد کا قضیہ ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ اس کے ساتھ ان ادلہ کا دفاع کیا جائے جو ہم نے ذکر کی ہیں، کیونکہ وہ قاعدہ کلیہ کے حکم کو مقید کرتی ہیں اور یہ کہا جانا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مسجد میں باندھا ہو تا کہ وہ مسلمانوں کی نماز کے حسن اور ان کے اجتماع کو اور مسجد میں ان کے بیٹھنے کے آداب کے حسن و جمال کو دیکھے، تو وہ اس سے مانوس ہو جائے اور اسلام قبول کر لے۔ اور اسی طرح ہوا۔ اور یہ کہا جانا بھی ممکن ہے کہ ان کے پاس مسجد کے سوا اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ اسے باندھ سکتے۔ والله اعلم

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: یہود و نصاریٰ کو مسجد حرام یا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا اور مشرکوں اور بت پرستوں کے سوا کسی کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا۔ اور یہ ایسا قول ہے جسے آیت وغیرہ میں سے جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ سب رد کرتا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

الکیا طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذمی کے لیے بغیر حاجت کے تمام مساجد میں داخل ہونا جائز ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حاجت کا اعتبار کیا جائے گا اور حاجت کے ساتھ بھی مسجد حرام میں داخل ہونا جائز نہیں۔ اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرم پاک سارے کا سارا قبلہ اور مسجد ہے، پس چاہیے کہ انہیں حرم پاک میں داخل ہونے سے منع کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الاسراء: 1) ((ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے) اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ام ہانی کے گھر سے اٹھایا گیا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب نہ جائے، سوائے اس کے جو صاحب جزیہ (جزیہ دینے والا) ہو یا کسی مسلمان کا کافر غلام ہو۔ اسماعیل بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ یحییٰ بن عبد الحمید نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا ہمیں شریک نے اشعث سے انہوں نے حسن سے انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی مشرک مسجد کے قریب نہ جائے سوائے اس کے کہ وہ کسی کا غلام یا کنیز ہو پس وہ کسی حاجت اور ضرورت کے لیے اس میں داخل ہو سکتا ہے“ (1)۔ اور اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: عموم مشرک کو مسجد حرام کے قریب جانے سے روکتا ہے اور اسے غلام اور لونڈی کے حق میں خاص کر دیا گیا ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری کا سال ہے جس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ مراد 10 ہجری ہے۔ یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ عنہ نے کہا ہے: اور یہی وہ صحیح قول ہے لفظ کا مقتضی جس کی موافقت کرتا ہے اور بلاشبہ یہ عجیب بات ہے کہ کہا جائے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری ہے۔ اور یہی وہ سال ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا (کہ آئندہ کوئی مشرک حرم پاک میں داخل نہیں ہو سکتا) اگر کسی آدمی کا غلام کسی دن اس کے گھر میں داخل ہو اور اس کا آقا اسے یہ کہے: لا تدخل هذه الدار بعد یومك (تو آج کے بعد اس گھر میں مت داخل ہو) تو اس سے مراد وہ دن نہیں ہو سکتا جس میں وہ داخل ہوا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً عمرو بن فائد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے واذ خفتم (اور جب تمہیں خوف ہو) اور یہ عجمہ ہے اور اس کا معنی عمدہ اور حسین ہے اِنْ کے ساتھ۔ مسلمانوں نے جب مشرکوں کو حج سے روک دیا حالانکہ وہ اناج اور دیگر سامان تجارت لے کر آتے تھے، تو شیطان نے ان کے دلوں میں فقر و افلاس کا خوف ڈال دیا اور کہنے لگے: ہم زندگی کہاں سے گزاریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے فضل سے انہیں غنی فرما دے گا۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اہل ذمہ کی جانب سے جزیہ کا دروازہ کھول دیا اپنے اس ارشاد گرامی کے ساتھ: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ (التوبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر)

---

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 89　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 901　　3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 903

اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں موسلا دھار بارش، نباتات اور زمین کی سرسبز و شادابی کے ساتھ غنی فرما دیا۔ پس یمن کے شہر اور نواحی بستیاں بھی سرسبز شاداب ہو گئیں اور وہ اناج، گوشت کی چربی اور تیل اور دیگر کثیر نفع بخش چیزیں مکہ مکرمہ لے کر آئے۔ اور عرب اسلام لے آئے مراد نجد، صنعاء اور دوسرے علاقے کے لوگ ہیں۔ پس ان کا حج اور ان کی تجارت انتہا تک پہنچ گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جہاد اور دیگر امتوں پر غلبے کے سبب انہیں غنی کر دیا۔ عیلہ کا معنی فقر و افلاس ہے۔ کہا جاتا ہے: عالَ الرجلُ یَعیل جب کوئی آدمی محتاج اور فقیر ہو جائے (1) (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وما یَدرِی الفقیر متی غِنَاہ وما یدرِی الغنیّ متی یَعیلُ

فقیر نہیں جانتا کہ کب (اللہ تعالیٰ) اسے غنی کر دے اور غنی (دولت مند) نہیں جانتا کہ وہ کب محتاج ہو جائے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے علقمہ وغیرہ نے اسے عائلۃ پڑھا ہے اور یہ مصدر ہے، جیسا کہ قال یقیل سے قائلۃ ہے۔ اور اسی طرح عافیۃ بھی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ محذوف موصوف کی نعت ہو اور تقدیر عبارت ہو: حالا عائلۃ اور اس کا معنی ہو مشکل اور تکلف دہ خصلت۔ اسی سے یہ کہا جاتا ہے: عالنی الأمر یعولنی یعنی معاملہ مجھ پر شاق اور سخت ہو گیا۔ اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: عال یعول جب کوئی محتاج اور فقیر ہو جائے (2)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رزق کے بارے میں دل کا تعلق اسباب کے ساتھ قائم کرنا جائز ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے، اگرچہ رزق مقدر ہے، اللہ تعالیٰ کا امر ہے اور اس نے اسے تقسیم کیا ہوا ہے، لیکن اس نے اسے حکمت کے تحت اسباب کے ساتھ معلق کر دیا ہے تاکہ وہ ان دلوں کو جان لے جو اسباب کے ساتھ متعلق ہیں ان دلوں میں سے جو رب الارباب پر توکل رکھتے ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ سبب توکل کی نفی نہیں کرتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جیسے اس کے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے گا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے وہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں'' (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے پس اس میں خبر دی ہے کہ رزق کی تلاش میں صبح و شام آنا جانا توکل حقیقی کے خلاف نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیکن مشائخ صوفیہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ صبح و شام آنا جانا طاعات (اور تعمیل حکم) میں ہے۔ اور یہی وہ سبب ہے جو رزق کو کھینچ لاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل دو امر ہیں: ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ** (طٰہٰ: 132) (اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہیے اس پر نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو)

اور دوسرا یہ قول باری تعالیٰ ہے: **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ** (فاطر: 10) پس وہ اپنے محل......

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 21 2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 400

3۔ جامع ترمذی، باب فی التوکل علی اللہ، حدیث نمبر 2266، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو کہ آسمان ہے...... سے رزق نازل نہیں کرتا مگر وہی جو اس کی طرف بلند ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ ذکر اور عمل صالح ہے اور وہ زمین میں سعی اور دوڑ دھوپ کرنا نہیں ہے، کیونکہ اس میں رزق نہیں ہے۔ اور صحیح وہ ہے جسے فقہاء ظاہر کے نزدیک سنت نے ثابت اور مستحکم کر دیا ہے اور وہ اسباب دنیوی کے ساتھ کام کرنا ہے، مثلاً زمین میں ہل چلانا (کاشتکاری کرنا) بازاروں میں تجارت کرنا، اموال (کاروبار) کے لیے تعمیرات کرنا اور باغات لگانا وغیرہ۔ تحقیق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس طرح عمل کرتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس پاکیزہ مال میں سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو انہوں نے کمایا، علاوہ ازیں دیگر آیات بھی ہیں۔ اور فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ (البقرہ: 173) (لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں) پس اللہ تعالیٰ نے مضطر اور مجبور آدمی کے لیے وہ (کھانا) حلال قرار دیا ہے جو اس پر حرام ہے جب اس کے پاس کھانے کے لیے وہ موجود نہ ہو جسے کمانے اور غذا بنانے کا اس نے حکم دے رکھا ہے اور اس نے اسے آسمان سے کھانا نازل ہونے کے انتظار کرنے کا حکم نہیں دیا اور اگر وہ شے جسے عذاب بنایا جا سکتا ہے اسے چھوڑ کر اس نے سعی اور کوشش ترک کر دی تو وہ اپنی جان کا قاتل ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھوک سے بل کھاتے رہتے تھے جو آپ پاتے تھے وہ کھا لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آسمان سے کھانا نازل نہیں ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے لیے سال کی خوراک جمع کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتوحات عطا فرمائیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اونٹ کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اسے ڈھنگا ڈال دوں اور توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے رسی ڈال اور پھر توکل کر''۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کے لیے اہل صفہ میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ وہ فقراء تھے مسجد میں بیٹھتے تھے نہ وہ ہل چلاتے تھے اور نہ تجارت کرتے تھے، ان کے لیے نہ کمائی تھی اور نہ کوئی مال، بلاشبہ وہ شہروں کی تنگی کے وقت اسلام کے مہمان تھے اور اس کے باوجود وہ دن کے وقت لکڑیاں (ایندھن) چنتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں پانی بھر کر لاتے تھے اور رات کے وقت قرآن کریم پڑھتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح ان کا وصف بیان کیا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی سبب پیدا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی ہدیہ آتا تو آپ اسے ان کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ اور اگر صدقہ آتا تو وہ انہیں کو عطا فرما دیتے تھے، پس جب فتوحات کثیر ہو گئیں اور اسلام پھیل گیا تو وہ بھی نکل گئے اور حکم کی تعمیل میں لگ گئے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور وہ بیٹھے نہ رہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ وہ اسباب جن سے رزق حاصل کیا جاتا ہے ان کی چھ قسمیں ہیں:

(۱) ان میں سے سب سے اعلیٰ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے) میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھا ہے اور ذلت اور حقارت کو اس پر ڈال دیا ہے جس نے میرے حکم کے خلاف

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث نمبر 2441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا''۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رزق اپنے فضل سے ان کی کمائی اور کسب میں رکھا ہے اور اسے کسب کی افضل ترین نوع کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے شرف و عظمت کے سبب (دشمن پر) غلبہ اور (فتح) حاصل کرنا ہے۔

(۲) آدمی کا اپنے ہاتھ کے عمل سے کھانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک آدمی جو کچھ کھاتا ہے اس میں سے اطیب اور پاکیزہ وہ ہے جو اس کے ہاتھ کی کمائی سے ہو اور بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے کھاتے تھے''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80) (اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے) اور روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے (سوت) کاتنے کی کمائی کھاتے تھے۔(1)

(۳) تیسری قسم تجارت ہے اور یہ بزرگ اور اجل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تھا بالخصوص مہاجرین صحابہ کرام کا اور قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس کی رہنمائی کی ہے۔

(۴) کاشتکاری کرنا اور باغات اور درخت لگانا۔ تحقیق ہم اسے سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

(۵) قرآن کریم پڑھنا اور اس کی تعلیم دینا اور دم کرنا وغیرہ، اس کا بیان سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

(۶) کسی سے اس ارادہ اور نیت کے ساتھ لینا کہ پھر اسے ادا کر دے گا بشرطیکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ پر لیے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دے گا اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ پر لیا تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ شَآءَ اس پر دلیل ہے کہ رزق اجتہاد اور کوشش کے ساتھ نہیں، بلکہ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے وہی اسے اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کرنے کا والی ہے۔ اور اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیہ (الزخرف: 32) (ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝۲۹

''جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 17، صفحہ 59

یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں''۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جب اللہ تعالیٰ نے کفار پر مسجد حرام کے قریب آنا حرام قرار دیا، تو مسلمانوں نے اپنے دلوں میں اس تجارت کے بارے خوف سا محسوس کیا جو ان سے ختم کر دی گئی (کیونکہ) مشرکین اسے اپنائے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً، الآیہ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اس آیت میں جزیہ کو حلال قرار دیا اور یہ اس سے پہلے نہیں لیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا عوض بنا دیا جو انہیں مشرکین کے ساتھ تجارت میں شریک ہونے سے منع کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ اس وصف پر وہ تمام متفق ہیں اور اہل کتاب کا ذکر ان کی کتاب کی تکریم کے لیے خاص طور پر علیحدہ کیا، کیونکہ وہ توحید و رسالت، شرائع اور ادیان کو جانتے تھے اور خصوصاً حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، آپ کی ملت اور آپ کی امت کے بارے علم رکھتے تھے۔ تو جب انہوں نے اس کا انکار کیا تو ان پر حجت موکد ہوگئی اور ان کا جرم بڑھ گیا۔ پس پہلے ان کے مقام و محل پر آگاہ فرمایا پھر قتال کے لیے غایت کو ذکر کیا اور وہ قتل کے بدلے جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے ایک مجلس نظر و فکر میں ابوالوفاء علی بن عقیل کو سنا ہے وہ یہ آیت پڑھتے تھے اور اس سے استدلال کرتے تھے۔ پس فرمایا: قَاتِلُوا یہ سزا کے بارے امر ہے۔ پھر فرمایا: الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ اس گناہ کا بیان ہے جس نے عقوبت (سزا) کو واجب کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یہ جانب اعتقاد میں گناہ کی تاکید ہے۔ پھر فرمایا: وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ یہ اعمال کی مخالفت میں گناہ کے بڑھ جانے اور زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا: مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ حجت کے لیے تاکید ہے، کیونکہ وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں اسے لکھا ہوا پاتے تھے۔ پھر فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ پس اس غایت کو بیان کر دیا جس تک سزا ممتد ہو سکتی ہے اور اس بدل اور عوض کو معین کر دیا جس کے سبب وہ سزا اٹھ سکتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جن لوگوں سے جزیہ لیا جاتا ہے ان کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا مگر صرف اہل کتاب سے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی۔ دلیل یہی آیت ہے، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے پس حکم صرف انہیں کی طرف متوجہ ہوگا ان کے سوا دوسروں کی طرف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ: 5) (تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں) اور آگے یہ نہیں فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں جیسا کہ اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے اور (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) نے مزید یہ کہا ہے: جزیہ مجوسیوں سے قبول کیا جائے گا اور یہ سنت سے ثابت ہے۔ اسی طرح امام احمد اور ابو ثور نے کہا ہے۔ اور یہی ثوری، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بتوں کی عبادت کرنے والے، آتش پرست، منکر اور جھٹلانے والے سبھی سے ہی جزیہ لیا جائے گا اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے، کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ شرک اور انکار کی تمام اجناس سے جزیہ لیا جائے گا چاہے وہ عربی ہو یا عجمی، تغلبی ہو یا قریشی، جو بھی ہو سوائے مرتد کے (سبھی سے جزیہ لیا جائے گا) ابن القاسم، اشہب اور سحنون نے کہا ہے: جزیہ عرب کے مجوسیوں اور تمام امتوں سے لیا جائے گا۔ اور رہے عرب بت پرست تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جزیہ کا تذکرہ نہیں کیا، ان میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہے گا، بلاشبہ ان کے لیے یا قتال ہے یا اسلام۔ اور ابن القاسم کا یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اور یہ ابن جلاب کی تفریع میں ہے اور یہ احتمال ہے نص نہیں۔

اور ابن وہب نے کہا ہے: عرب کے مجوسیوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے سوا سے قبول کر لیا جائے گا۔ فرمایا: کیونکہ عرب میں مجوسی کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ ان تمام نے اسلام قبول کر لیا۔ پس ان میں سے کوئی خلاف اسلام پایا گیا تو وہ مرتد ہوگا، ہر حال میں اسے قتل کیا جائے گا اگر وہ اسلام نہ لایا اور ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور ابن الجہم نے کہا ہے: جزیہ ہر اس سے قبول کیا جائے گا جو اسلام کے سوا کسی بھی دین پر ہو سوائے ایسی شی کے جس پر کفار قریش کا اجتماع ہوا اور اس کی علت بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ذلت اور حقارت کے بدلے ان کی تکریم کے لیے ہے، کیونکہ ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اور کسی اور نے یہ کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام کے تمام فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور رہے مجوس! تو ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ اور مؤطا میں ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجوس کا معاملہ ذکر کیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا میں ان کے بارے کیا کروں؟ تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: سنوبھم سنة اهل الكتاب (تم ان سے اہل کتاب جیسا برتاؤ کرو) ابو عمر نے کہا ہے: یعنی خاص طور پر جزیہ میں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، سنوابهم سنة اهل الكتاب میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اور یہی مذہب جمہور فقہاء کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ وہ اہل کتاب تھے پھر بدل دیئے گئے۔ اور میرا گمان یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اس کی طرف گئے ہیں جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک سند سے مروی ہے اور اس میں ضعف ہے، اس کا دارومدار ابو سعید البقال پر ہے۔ اسے عبدالرزاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: روایت ہے کہ مجوس کی طرف ایک نبی مبعوث کیے گئے جن کا نام زرادشت تھا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں جزیہ کی وہ مقدار ذکر نہیں کی جو ان سے لی جائے گی۔ تحقیق علماء نے جزیہ کی اس مقدار میں اختلاف کیا ہے جو ان سے لی جائے گی۔ پس حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس میں کوئی مقرر مقدار نہیں، بلکہ یہ اتنا ہی ہوگا جس پر ان سے صلح کی گئی۔ اسی طرح یحییٰ بن آدم، ابو عبید اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا

ہے، مگر علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے: اس کی کم سے کم مقدار ایک دینار ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ اور انہوں نے استدلال اس روایت سے کیا ہے جسے اہل الصحیح نے حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے جزیہ پر صلح کی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: غنی اور آزاد بالغ فقیر پر ایک دینار ہوگا اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد وغیرہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ہر بالغ سے جزیہ میں ایک دینار وصول کریں (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی ارشاد اللہ تعالیٰ کے مراد بہ کے لیے مبین اور اس کی وضاحت کرنے والا ہے اور یہی ابوثور کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اور اگر ایک دینار سے زیادہ پر ان سے صلح کر لی گئی تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر انہوں نے زیادہ دیا اور اس پر ان کے دل مطمئن اور خوش ہوں تو وہ ان سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر ان سے صلح تین دنوں کی ضیافت پر کی گئی تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ ضیافت معلوم ہو مثلاً روٹی، جو، پنیر اور سالن وغیرہ۔ اور اس کا ذکر کرے جو ان میں سے متوسط پر ہوگا اور جو ان میں سے خوشحال اور دولت مند پر ہوگا اور سردی، گرمی اترنے اور واپس لوٹنے کی جگہ کا بھی ذکر ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں کہا ہے جو آپ سے ابن قاسم، اشہب اور محمد بن حارث بن زنجویہ نے روایت کی ہے کہ جزیہ سونے والوں پر چار دینار ہوگا اور چاندی والوں پر چالیس درہم، اس میں غنی اور فقیر برابر ہیں اگرچہ وہ مجوسی ہو۔ جو مقدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کر دی ہے نہ اس پر اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس میں کمی کی جائے گی، ان سے اس کے سوا کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کمزور اور ضعیف کو اتنی مقدار تخفیف کر دی جائے گی جتنی امام وقت مناسب سمجھے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: تنگی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ مقدار میں کمی نہیں کی جائے گی اور خوشحالی اور دولت کی وجہ سے اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا ہے: ان کے فقراء سے اتنی مقدار میں لیا جائے گا جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں اگرچہ وہ ایک درہم ہی ہو۔ اور اسی کی طرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے رجوع کیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام محمد بن حسن اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے: جزیہ کی مقدار بارہ، چوبیس اور چالیس ہے۔ امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں مختلف مقداروں کا ذکر مروی ہے، پس والی کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے لے لے، جب کہ وہ اہل ذمہ ہوں۔ اور رہے اہل صلح تو ان پر اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا جس پر صلح کی گئی ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ہمارے علماء رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ جس پر قرآن کریم دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جزیہ جنگ لڑنے والے مردوں سے لیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا**

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب فی زکوٰۃ البقر، حدیث 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ پس یہ ارشاد ان پر جزیہ کے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو قتال کرتے ہیں۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ غلام پر جزیہ نہیں ہے اگرچہ وہ جنگ لڑنے والا ہو، کیونکہ اس کے پاس کوئی مال نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا اور جو کسی شے کا مالک نہ ہو اس کے لیے حتی یعطی نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جزیہ آزاد، بالغ مردوں کے سروں پر لگایا جائے گا اور وہ وہی ہیں جو قتال کرتے ہیں نہ کہ عورتیں، بچے، غلام، ایسے مجنون افراد جن کی عقلیں مغلوب ہوں اور بوڑھے، پیر فرتوت وغیرہ۔ اور راہبوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب وہ جزیہ لگ جانے کے بعد راہب نہ بنا ہو اور اگر جزیہ پہلے لگا دیا گیا پھر وہ راہب بنا تو اس کی رہبانیت جزیہ کو ساقط نہیں کر سکتی۔

**مسئلہ نمبر 6۔** جب اہل جزیہ جزیہ ادا کر دیں تو پھر ان کے پھلوں، سامان تجارت اور ان کی فصلوں کی پیداوار میں سے کوئی شے ان سے نہ لی جائے، مگر یہ کہ وہ ان شہروں کے علاوہ دوسرے شہروں میں تجارت کریں جن میں انہیں ٹھہرایا گیا اور جن پر ان سے صلح کی گئی۔ پس اگر وہ تجارت کی غرض سے اپنے مقیمی شہروں سے دوسرے شہروں کی طرف نکلے تو ان سے (محصول، عشر ٹیکس) لیا جائے گا جب وہ سامان بیچیں اور اس کے ثمن نقد ان کے پاس موجود ہوں، اگرچہ سال میں ان کا گزر کئی بار ہو، مگر یہ کہ وہ طعام گندم اور زیتون وغیرہ لے کر مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کی طرف خاص طور پر لے جائیں، تو اس صورت میں ان سے نصف العشر لیا جائے گا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کیا ہے۔ اور اہل مدینہ میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ اہل ذمہ سے ان کے سامان تجارت کا محصول ٹیکس سال میں صرف ایک بار لیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ یہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ فقہاء کی جماعت کا مذہب ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** جب اہل جزیہ نے اپنا وہ جزیہ ادا کر دیا جو ان پر لگایا گیا یا جس پر ان سے صلح کی گئی تو پھر انہیں ان کے تمام مالوں، ان کی انگور کی بیلوں اور ان کے اس عصیر (نچوڑ) کو جس کی شرابوں کو انہوں نے چھپا رکھا ہو اور وہ انہیں کسی مسلمان کو بیچنے کا اعلان نہ کریں تو ان سب کو چھوڑ دیا جائے (اور درمیان میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے) اور انہیں شراب (خمر) اور خنزیر کو مسلمانوں کے بازاروں اور ظاہراً لانے سے منع کیا جائے، پس اگر وہ ان سے کوئی شے ظاہراً لائیں تو شراب کو ان پر انڈیل دیا جائے اور جو خنزیر کو لے کر آئے اسے تادیبی سزا دی جائے۔ اور اگر کسی مسلمان نے شراب کے اظہار کے بغیر اسے بہا دیا تو یہ تعدی اور زیادتی ہے، لہٰذا اس پر ضمان واجب ہوگی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمان نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی نے شراب غصب کر لی تو اس پر اسے واپس لوٹانا واجب ہے۔ ان کے احکام میں اور ان کے آپس میں سودی کاروبار میں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر وہ اپنا کوئی مقدمہ ہمارے پاس فیصلہ کے لیے پیش کریں تو پھر حاکم کو اختیار ہے، اگر چاہے تو ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کر دے اور اگر چاہے تو اعراض کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے باہمی مظالم کے بارے میں ہر حال میں ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور ان کے طاقتوروں سے ان کے

کمزوروں کا حق لیا جائے گا، کیونکہ یہ ان سے دفع مضرت کے باب سے ہے۔ اور امام وقت پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف سے ان کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑے اور دشمنوں سے جنگ لڑنے میں ان سے مدد بھی طلب کرے۔ مال فے (غنیمت) میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا اور عبادت گاہوں میں جن پر صلح کی گئی ہے وہ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے (یعنی مزید ان کی تعمیر کو بڑھا نہیں سکتے) البتہ ان میں سے جو بوسیدہ ہو جائے اس کی اصلاح اور مرمت سے انہیں نہ روکا جائے۔ اور ان کے لیے ان کے علاوہ نئی تعمیر کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اور وہ ایسا لباس اور ہیئت اختیار کریں گے جس کے ساتھ وہ خود مسلمانوں سے الگ اور جدا ہو جائیں اور اہل اسلام کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے انہیں روکا جائے گا۔ اور ان سے دشمن کے بچوں کو خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ ان کے لیے ذمہ نہ ہو۔ اور جزیہ ادا کرنے میں جس کسی نے جھگڑا کیا تو اسے اس جھگڑنے پر تادیبی سزا دی جائے گی۔ اور اس سے جزیہ لیا جائے گا اس حال میں کہ وہ مغلوب ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جس کے سبب جزیہ واجب ہے اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس علماء مالکیہ نے کہا ہے: یہ اس قتل کے بدل کے طور پر واجب ہے، جو کفر کے سبب لازم ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جان کی حفاظت اور دار کی سکونت کے بدل کے طور پر واجب ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے یہ کہا کہ یہ قتل کے بدلے واجب ہے پھر وہ اسلام لے آیا تو اس سے گزری ہوئی مدت کا جزیہ ساقط ہو جائے گا، اگرچہ اس نے سال مکمل ہونے سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد اسلام قبول کیا۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جزیہ ایک دین (قرض) ہے جو اس کے ذمہ پختہ ہو چکا ہے پس اسلام اسے ساقط نہیں کر سکتا جیسا کہ دار کی اجرت (ساقط نہیں ہوتی) اور بعض حنفیہ نے ہمارے قول کی مثل ہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جزیہ مدد و نصرت اور جہاد کے بدل کے طور پر واجب ہے۔ اور قاضی ابوزید نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور ان کا گمان یہ ہے کہ یہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا سر اور راز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کسی مسلمان پر کوئی جزیہ نہیں ہے'' (1)۔

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ذمی اپنے اوپر جزیہ واجب ہونے کے بعد جب اسلام لے آئے تو اس سے جزیہ باطل ہو جائے گا۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ کیونکہ اسلام کے سبب یہ معنی زائل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا نہیں کریں گے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے بعد اس وجہ اور سبب کی بنا پر نہیں لیتے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ بے شک وہ یہ فرماتے ہیں کہ جزیہ ایک دین ہے، جو اس پر سبب سابق کے ساتھ واجب ہوا ہے اور وہ سبب سکنیٰ (رہائش) یا قتل کے شر سے بچنا اور حفاظت ہے، پس یہ تمام قرضوں کی مثل ہو گیا۔

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء لیس علی المسلمین جزیۃ، حدیث نمبر 574، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 9۔** اگر امام وقت کسی شہر یا قلعہ کے باسیوں کے ساتھ معاہدہ کرے پھر وہ اپنا عہد توڑ دیں اور جزیہ وغیرہ میں سے جو ان کے ذمہ لازم ہوتا ہے اسے ادا کرنے سے رک جائیں (انکار کر دیں) اور وہ اسلام کے حکم سے بھی انکار کر دیں بغیر اس کے کہ ان پر کوئی ظلم و زیادتی کی جائے اور امام وقت بھی ان پر جبر اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو مسلمانوں پر اپنے امام کی معیت میں ان کے ساتھ جنگ اور قتال کرنا واجب ہے، پس اگر وہ قتال کریں اور مغلوب ہو جائیں تو ان کے بارے میں بالکل اسی طرح حکم ہو گا جو دار الحرب والوں کے بارے حکم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کی عورتیں مال فے ہو گا اور ان میں خمس نہیں ہو گا۔ اور یہ ایک مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔** اور اگر وہ چوریاں کرتے ہوئے اور ڈاکے ڈالتے ہوئے خروج کریں تو وہ لوٹ مار کرنے والے مسلمانوں کے قائم مقام ہوں گے جب کہ وہ جزیہ دینے سے انکار نہ کریں اور اگر وہ ظلم و زیادتی کی شکایت کرتے ہوئے نکلیں تو ان کے معاملہ میں غور و فکر کیا جائے گا اور انہیں اصل ذمہ اور معاہدہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور انہیں ان کے ساتھ ظلم کرنے والوں سے انصاف دلایا جائے اور ان میں سے کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور وہ آزاد ہوں گے۔ اور اگر ان میں سے بعض نے معاہدہ توڑ دیا تو جنہوں نے نہیں توڑا وہ اپنے معاہدہ پر باقی رہیں گے اور انہیں کسی دوسرے کے توڑنے کے سبب نہیں پکڑا جائے گا اور انہیں معاہدہ پر قائم رہنے کو اسی طرح پہچانا جائے گا کہ وہ توڑنے والوں کے خلاف ہوں اور ان کا انکار کرتے ہوں۔

**مسئلہ نمبر 11۔** اَلْجِزْیَۃَ یہ فعلۃ کے وزن پر ہے۔ اور جزی یجزی سے ہے جب کوئی بدلہ دے اس احسان کا جو اس پر کیا گیا ہو (تو اس کو جزی یجزی بدلہ دینا کہا جاتا ہے) تو گویا انہوں نے جزیہ اس جزا اور بدلے کے طور پر دیا جو انہیں امن و سلامتی عطا کی گئی اور یہ لفظ القعد کا اور الجلسۃ کی طرح ہے۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

يُجزيك اويُثنِي عليك وانّ مَن أثنى عليك بما فعلت كمن جزى

**مسئلہ نمبر 12۔** مسلم نے ہشام بن حکیم بن حزام سے روایت نقل کی ہے کہ وہ شام کے کسانوں میں سے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ انہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے: اور ان کے سروں پر تیل انڈیلا گیا تھا۔ تو انہوں نے پوچھا: ان کا کیا معاملہ ہے؟ تو بتانے والے نے کہا: انہیں جزیہ میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ تو ہشام نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں''۔ اور ایک روایت میں ہے ان دنوں ان کا امیر عمیر بن سعد فلسطین میں تھا، پس وہ اس کے پاس گیا اور اس سے بات کی تو اس نے ان کے بارے حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: رہی ان کی سزا! تو جب وہ جزیہ دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود جزیہ ادا کرنے سے انکار کر دیں تو انہیں سزا دینا جائز ہے، لیکن جب ان کا عجز ظاہر ہو تو پھر انہیں سزا دینا حلال نہیں، کیونکہ جو جزیہ دینے سے عاجز آ جائے ان سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور امیر لوگوں کو فقراء کی طرف سے جزیہ ادا کرنے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اور ابو داؤد نے صفوان بن سلیم سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے متعدد بیٹوں سے اور انہوں نے اپنے آباء سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: ''جس نے کسی معاہدہ کرنے والے کے ساتھ ظلم کیا یا اسے نقصان پہنچایا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے کام کا مکلف بنایا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس کا حجیج ہوں گا'' (1)۔ (یعنی دلیل سے اس پر غالب آؤں گا)

**مسئلہ نمبر 13**۔ قولہ تعالیٰ: عَنْ يَّدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بذات خود جزیہ دے گا اس میں کسی کو نائب نہیں بنائے گا۔ ابوالبختری نے سلمان سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: اس کا معنی ہے انتہائی مذموم حالت میں دے گا۔ اور معمر نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس سے مراد ہے عن قھر (مغلوب اور مجبور ہو کر دے گا) اور بعض نے کہا ہے: عَنْ يَّدٍ یعنی تمہاری طرف سے ان پر جو انعام ہے اس کے عوض دے گا، کیونکہ جب ان سے جزیہ لیا گیا تو تحقیق ان پر اس سے انعام کیا گیا۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: وہ جزیہ دے گا اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو گا اور لینے والا بیٹھا ہوا ہو گا۔ اور یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول باری تعالیٰ عن ید سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ سے ثابت ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ ائمہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا مانگنے والا ہے''۔ اور یہ بھی روایت ہے، ''اور اوپر والا ہاتھ ہی عطا کرنے والا ہے''۔ پس آپ نے صدقہ میں دینے والے ہاتھ کو علیا (اوپر والا ہاتھ) قرار دیا ہے اور جزیہ میں دینے والے ہاتھ کو سفلیٰ (نیچے والا ہاتھ) قرار دیا ہے۔ اور لینے والے ہاتھ کو علیا قرار دیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کیونکہ وہی بلند کرنے والا اور پست کرنے والا ہے، جسے چاہتا ہے بلند کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پست کر دیتا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور عرض کی: بے شک خراج والی زمین سے اس کے باسی عاجز آرہے ہیں کیا میں اسے آباد کر سکتا ہوں اور اسے کاشت کر کے اس کا خراج ادا کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں۔ اور پھر ایک دوسرا آیا تو اس نے بھی آپ کو اسی طرح کہا، تو آپ نے فرمایا: نہیں اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ کیا تم میں سے کوئی اس ذلت و حقارت کا قصد کرتا ہے جو ان میں سے کسی کی گردن میں ہے کہ وہ اسے اتار لے اور اسے اپنی گردن میں ڈال لے۔ اور کلیب بن وائل نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: میں نے زمین خریدی ہے۔ انہوں نے فرمایا: خریدنا اچھی شے ہے۔ میں نے کہا: پس میں زمین کی ہر جریب کے بدلے ایک درہم اور ایک قفیز اناج دوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو اپنی گردن میں ذلت اور حقارت کو نہ ڈال۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی تعشیر اھل الذمۃ، حدیث نمبر 2654، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ باعث مسرت نہیں کہ میرے لیے ساری زمین پانچ درہم جزیہ کے بدلے ہو میں اس میں اپنے نفس کے لیے ذلت و رسوائی کا اقرار کرتا ہوں۔

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

''اور کہا یہود نے کہ عزیر اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور کہا نصرانیوں نے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی (بے سروپا) بات ہے ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی، نقل اتار رہے ہیں ان لوگوں کے قول کی جنہوں نے کفر کیا پہلے، ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ، کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ عاصم اور کسائی نے عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ عزیر کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ اس بنا پر ابن، عزیر مبتدا کی خبر ہے اور عزیر منصرف ہے چاہے عجمی ہو یا عربی ہو۔ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو اور ابن عامر نے عزیر ابن اجتماع ساکنین کی وجہ سے تنوین کو ترک کر کے پڑھا ہے۔ اور اسی سے ان کی قراءت ہے جنہوں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (الاخلاص) پڑھا ہے (1)۔ ابو علی نے کہا ہے: شعر میں ترک تنوین کا استعمال زیادہ ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں یہ شعر بیان کیے ہیں:

لَتَجِدَنِّي　بالأمير　بَرًّا　وبالقناة　مِدْعَسا　مِكَرًّا

إذا غُطَيْفُ السُّلَمِيُّ فَرًّا (2)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَالَتِ الْيَهُودُ یہ لفظ بظاہر عام ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے، کیونکہ تمام یہودیوں نے اس طرح نہیں کہا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (آل عمران: 173) اور یہ تمام لوگوں نے نہیں کہا۔ اور کہا گیا ہے کہ جو بیان کیا گیا ہے یہودیوں میں سے اس کے قائل سلام بن مشکم، نعمان بن ابی اوفی، شاس بن قیس اور مالک بن صیف تھے۔ انہوں نے یہ قول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا۔ نقاش نے بیان کیا ہے: کوئی یہودی باقی نہیں رہتا جو یہ کہتا ہو، بلکہ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ پس جب ایک نے یہ کہا پھر وہ اس طرف متوجہ ہوا کہ قول کی برائی اور نقصان پوری جماعت کو لازم ہوگی۔ اس لیے کہ ان میں کہنے والے کی شہرت ہے۔ اور شریف اور بیدار مغز لوگوں کے اقوال ہمیشہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے۔ پس یہاں یہ صحیح ہے کہ جماعت اپنے قائد اور شریف فرد کا قول کرنے لگے۔ واللہ اعلم

روایت کیا گیا ہے کہ اس قول کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کو قتل کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے تورات کو اٹھا لیا اور ان کے دلوں سے اسے محو کر دیا، پھر حضرت عزیر علیہ السلام زمین میں تسبیح بیان کرتے ہوئے نکلے، تو ان کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھا: ''تم کہاں جا رہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 23　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 412

ہو؟'' انہوں نے کہا: میں علم کی طلب میں ہوں، تو آپ نے انہیں پوری تورات سکھا دی پس حضرت عزیر علیہ السلام تورات لے کر بنی اسرائیل کی طرف آئے اور انہیں اس کی تعلیم دی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو تورات حفظ کرا دی اور یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عزت افزائی ہے، تو انہوں نے بنی اسرائیل کو کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات حفظ کرا دی ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اس کی تدریس شروع کر دی، حالانکہ تورات دفن کی جا چکی تھی، ان کے علماء نے اس وقت اسے دفن کر دیا تھا جب انہیں طرح طرح کے فتنے، جلاوطنی اور بیماری جیسی چیزیں پہنچی جن میں وہ مبتلا ہوئے اور بخت نصر نے انہیں قتل کیا۔ پھر دفن شدہ تورات پائی گئی وہ بالکل اس کی مثل تھی جو عزیر علیہ السلام پڑھا رہے تھے، تو اس وقت وہ گمراہ ہو گئے اور وہ کہنے لگے: بے شک یہ حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے تیار نہیں کی گئی مگر تبھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس قول ''کہ مسیح ابن اللہ ہیں'' کا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے اس سے بنوت النسل کا ارادہ کیا ہے، جیسا کہ عربوں نے ملائکہ کے بارے میں کہا۔ اسی طرح حضرت ضحاک اور طبری وغیرہ کا قول تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ انتہائی شنیع اور برا کفر ہے۔

ابوالمعالی نے کہا ہے: نصرانیوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام الٰہ ہیں اور یہ کہ وہ الٰہ کے بیٹے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے بے شک ان میں سے بعض بنوت شفقت و رحمت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہ معنی بھی درست نہیں ہے کہ اس پر بنوۃ (بیٹا ہونے) کا اطلاق کیا جائے اور یہ کفر ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 3**۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اس میں ہمارے رب تبارک و تعالیٰ کے قول سے اس پر دلیل موجود ہے کہ جو کوئی کسی دوسرے کے ایسے کفر کے بارے خبر دے جس سے ابتدا کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، اس پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ اس کا انکار کرتے ہوئے اور اس کا رد کرنے کے لیے اس کے بارے گفتگو کر رہا ہے۔ اور اگر ہمارا رب چاہے تو کوئی اس کے بارے کلام نہ کرے۔ تو جب اس کے بارے زبانیں کھولنے کی قدرت دے دی ہے تو پھر اس کے بارے خبر دینے کی بھی اجازت ہے، اس معنی میں کہ دل اور زبان اس کا انکار کرتے ہوں۔ اور دلیل و برہان کے ساتھ اس کا رد مقصود ہو۔(2)

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی تاکید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں ہے: يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (البقرہ:79) وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (الانعام:38) فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ (الحاقۃ) اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب یہ قول ہی جھوٹا ہے نہ اس میں کوئی بیان ہے اور نہ کوئی دلیل، تو یقیناً یہ فقط ''منہ'' کی بات ہے، ایسا دعویٰ ہے جس کے تحت کوئی صحیح معنی نہیں ہے، کیونکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کسی کو بیوی نہیں بنایا تو پھر وہ کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، تو یہ کذب ہے اور فقط زبان کا قول ہے، بخلاف ان اقوال صحیحہ کے جنہیں دلائل مضبوط اور پختہ کرتے ہیں اور ان پر دلائل قائم ہوتے ہیں۔ اہل معانی نے کہا ہے: بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جہاں بھی قول کو افواہ (مونہوں) اور السن (زبان) کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24	2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 913

ذکر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے تو وہاں یقیناً مراد قول زور (جھوٹا قول) ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران: 167) (کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جونہیں ہیں ان کے دلوں میں) اور كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ (الکہف) (کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے وہ نہیں کہتے مگر (سراسر) جھوٹ) اور یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ (الفتح: 11) (اے حبیب!) یہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں)

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ، یُضَاهِـُٔوْنَ وہ مشابہت اختیار کرتے ہیں (نقل اتارتے ہیں) اور اسی معنی میں عربوں کا قول ہے: امرأۃ ضهیا یہ اس عورت کو کہتے ہیں جسے حیض نہ آتا ہو یا جس کے پستان نہ ہوں، گویا کہ وہ مُردوں کے مشابہ ہے۔

اور قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا بت پرستوں کا قول ہے: اللات والعزی و مناۃ الثالثہ الاخری (لات وعزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے) اور دوسرا قول، کافروں کا قول ہے: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (الملائکۃ بنات اللہ) اور تیسرا ان کے اسلاف کا قول ہے، پس تم انہوں نے باطل میں ان کی تقلید کی اور کفر میں ان کی اتباع اور پیروی کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (الزخرف: 23) (کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر) (1)

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا ضهیا کے بارے اختلاف ہے کہ کیا اس میں مد ہوگی یا نہیں؟ پس ابن ولاء نے کہا ہے: امرأۃ ضهیا اور یہ وہ عورت ہے جسے حیض نہ آئے۔ یہ مہموز ہے اور بغیر مد کے ہے۔ اور بعض اسے مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور وہ سیبویہ ہیں پس وہ اسے فعلاء کے وزن پر مد کے ساتھ بناتے ہیں۔ اور اس میں ہمزہ زائد ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: نساء ضُهْی پس وہ ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں۔

ابوالحسن نے بیان کیا ہے کہ نجیرمی نے مجھے کہا: ضهیاۃ یعنی مد اور ہاء کے ساتھ۔ اس نے تانیث کی دو علامتیں جمع کر دیں۔ اس نے اسے ابوعمرو شیبانی سے نوادر میں بیان کیا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

ضهیأۃ أو عاقر جماد

ابن عطیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ یضاهئون عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: امرأۃ ضهیاء تو ان کا قول غلط ہے (2)۔ یہ ابوعلی نے کہا ہے، کیونکہ ضاهأ میں ہمزہ اصلی ہے اور ضهیاء میں ہمزہ زائدہ ہے جیسا کہ حمرآء میں زائد ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں، کیونکہ ملعون مقتول کی مثل ہی ہوتا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ یہ تعجب کے معنی میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن کریم میں قتل سے مراد لعن (لعنت کرنا) ہی ہے۔ اور اسی معنی میں ابان بن تغلب کا قول ہے:

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 914　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24

قاتلها الله تَلْحانِي وقد علمتُ انّي لنفسي إفسادي و إصلاحي

نقاش نے بیان کیا ہے کہ قاتل اللہکی اصل تو دعا ہے، پھر ان کا استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے خیر وشر میں اظہار تعجب کے لیے کہنے لگے اور اب وہ اس سے دعا کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور اصمعی نے شعر کہا ہے:

یا قاتل الله لَيْلَى كيف تعجبني وأخبر النّاس أنّي لا أباليها

اس میں مراد تعجب کا معنی ہی ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

”انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو اپنے پروردگار اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح فرزند مریم کو بھی، حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں بجز اس کے کہ وہ عبادت کریں (صرف) ایک خدا کی، نہیں کوئی خدا بغیر اس کے، وہ پاک ہے اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ احبار، حبر کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ ہے جو اچھا قول کرتا ہو، اسے منظم کر سکتا ہو اور اپنے حسن بیان کے ساتھ اسے انتہائی مضبوط اور پختہ بنا سکتا ہو۔ اور اسی سے ثوب محبر ہے یعنی ایسا کپڑا جو حسن خوبصورتی کو جامع ہو(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاحبار کی واحد حبر حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور مفسرین حا پر فتحہ اور اہل لغت اس کے نیچے کسرہ پڑھتے ہیں۔ یونس نے کہا ہے: میں نے اسے نہیں سنا مگر حا کے کسرہ کے ساتھ، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے (مداد) حبر مراد عالم کی سیاہی ہے، پھر استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے مداد (سیاہی) کو ہی حبر (سیاہی) کہہ دیا۔ فراء نے کہا ہے: اس میں کسرہ اور فتحہ کی دونوں لغتیں ہیں۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: حبر کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی سیاہی ہے اور حبر فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عالم ہے۔ اور الرھبان، راھب کی مع ہے۔ یہ رھبۃ سے ماخوذ ہے، مراد وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر برانگیختہ کرے کہ وہ نیت کو اس کے لیے خالص کر دے نہ کہ لوگوں کے لیے۔ اور اپنا وقت اسی کے لیے، اپنا عمل اس کی معیت میں اور اپنا انس اسی کے ساتھ بنائے۔

قولہ تعالیٰ: اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اہل معانی نے کہا ہے: انہوں نے اپنے پادریوں اور راہبوں کو پروردگار کی طرح بنالیا تھا اس طرح کہ انہوں نے ہر شے میں ان کی اطاعت و پیروی کی۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (الکہف: 96) یعنی آگ کی طرح بنا دیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

وهل أفسد الدّينَ إلا الملوكُ وأحبارُ سوء ورهبانها

کیا بادشاہوں، علماء سوء اور راہبوں کے سوا کسی نے دین کو فاسد کیا؟ (یعنی دین میں فساد انہوں نے ہی برپا کیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی

اعمش اور سفیان نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابوالبختری سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد باری تعالیٰ: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے بارے پوچھا گیا کیا انہوں نے ان کی عبادت اور پرستش کی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، لیکن انہوں نے ان کے لیے حرام کو حلال قرار دیا تو انہوں نے اسے حلال سمجھ لیا اور انہوں نے ان پر حلال کو حرام قرار دیا تو انہوں نے اسے حرام ہی قرار دیا۔ اور ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عدی! یہ کیا ہے؟ اس بت کو اپنے سے پھینک دے'' اور میں نے آپ کو سورت براءت میں یہ پڑھتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ پھر فرمایا: ''خبردار سنو بے شک انہوں نے ان کی عبادت تو نہیں کی لیکن وہ جب کسی شے کو ان کے لیے حلال قرار دیتے تھے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب وہ ان پر کوئی شے حرام قرار دیتے تھے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے''۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، عبدالسلام بن حرب کی حدیث کے سوا اس کی کوئی پہچان نہیں۔ اور غطیف بن اعین حدیث میں معروف نہیں ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ اس کے اشتقاق کے بارے میں کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور مسیح سے مراد وہ پسینہ ہے جو پیشانی سے بہتا ہے، بعض متاخرین نے بہت خوب کہا ہے:

افرح فسوف تألف الأحزانا　　إذا شهدت الحشر والميزانا

تو خوش رہ پھر تو غموں سے مرکب ہوگا جب تو میدان حشر اور میزان کے پاس حاضر ہوگا۔

وسال من جبينك المسيح　　كأنه جداول تسيح

اور تیری پیشانی سے پسینہ بہے گا گویا کہ نالیاں بہہ رہی ہیں۔

اور مسیح کی نسبت اپنی ماں مریم کی طرف، اس کا معنی و مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

## یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲

''(یہ لوگ) چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچادے اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر''۔

قولہ تعالیٰ: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ مراد اللہ تعالیٰ کی توحید پر اس کے دلائل اور حجتیں ہیں۔ تو اس میں براہین و دلائل کو نور کے قائم و مقام رکھا ہے، کیونکہ ان میں بیان اور وضاحت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کا معنی نور اسلام ہے، یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنی تکذیب کے ساتھ بجھادیں (ختم کردیں) بِاَفْوَاهِهِمْ یہ اصل کی بنا پر فوہ کی جمع ہے، کیونکہ فم میں اصل فوہ ہے، جیسے حوض اور احواض ہے۔ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ کہا جاتا ہے: الا کیسے

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داخل کر دیا گیا حالانکہ کلام میں حرف نفی نہیں ہے اور ضربت إلا زیدا کہنا جائز نہیں ہے۔ تو فراء کا خیال یہ ہے کہ الا اس لیے داخل ہوا ہے کیونکہ کلام میں انکار کی ایک طرف (قسم) موجود ہے۔ زجاج نے کہا: انکار اور اثبات دونوں ذوی الطراف نہیں ہیں۔ اور ادوات نفی: ما، لا، ان اور لیس ہیں۔ ان کی کوئی اطراف نہیں ہیں جن کے ساتھ کلام کی جاتی ہو اور اگر معاملہ اس طرح ہے جیسے انہوں نے ارادہ کیا ہے تو پھر کرھت الا زیدا کہنا جائز ہے، لیکن جواب یہ ہے کہ عرب اسے ابی کے ساتھ حذف کر دیتے ہیں۔ اور تقدیر کلام ہے: ویأبی الله کل شئ إلا أن یتم نورہ (اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے) اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: بلاشبہ ابی میں ایسا جائز ہے کیونکہ اس کا معنی روکنا یا رکنا ہے، پس یہ نفی کے مشابہ ہی ہے۔ اور یہ قول اچھا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وهل لیَ أمٌّ غیرُها إن ترکتها أبی الله إلا أن أکون لها ابنَمَا

کیا میرے لیے اس کے سوا کوئی ماں ہے اگر میں اسے چھوڑ دوں، اللہ انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔

**هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳**

"وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: **هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ** مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ **بِالْهُدٰى** یعنی فرقان (قرآن مجید) کے ساتھ۔ **وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ** یعنی دلائل اور براہین کے ساتھ (تمام دینوں پر اس دین حق کو غالب کر دے) تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے شرائع (اور احکام) پر غالب کر دیا یہاں تک کہ آپ پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہ رہی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **لِیُظْهِرَهٗ** یعنی تاکہ وہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام مہدی کے خروج کے وقت ہوگا، اس وقت کوئی باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے گا یا پھر جزیہ ادا کرے گا (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہدی فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں اخبار صحیحہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں کہ امام مہدی علیہ السلام حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت میں سے ہوں گے (2)، لہٰذا انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر محمول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جو اس بارے میں وارد ہے کہ "مہدی نہیں ہیں مگر عیسیٰ علیہ السلام" وہ صحیح نہیں ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب البعث والنشور" میں

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 428

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المہدی، حدیث نمبر 3735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب خروج المہدی، حدیث نمبر 4075، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: کیونکہ اس کے راوی محمد بن خالد جندی ہیں اور وہ مجہول ہیں، وہ ابان بن ابی عیاش سے روایت کرتے ہیں اور وہ متروک راوی ہیں اور وہ حسن سے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور وہ منقطع ہے۔ اور وہ احادیث جو اس سے قبل حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے بیان ہوئی ہیں اور ان میں یہ بیان ہے کہ امام مہدی علیہ السلام رسول اللہ کی عترت میں سے ہوں گے وہ اسناد کے اعتبار سے اصح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے اسے اپنی کتاب "کتاب التذکرہ" میں خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم نے امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں روایات مکمل طور پر ذکر کی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** سے جزیرہ عرب میں غلبہ مراد لیا ہے۔ تحقیق اس نے ایسا کر دیا۔

**يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾**

"اے ایمان والو! بے شک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی"۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: **لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ** اس میں فعل مضارع پر لام داخل ہوا ہے (فَعَلَ) فعل ماضی پر لام داخل نہیں ہوا۔ اس لیے کہ **یفعل** (فعل مضارع) اسماء کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور الاحبار سے مراد علماء یہود ہیں۔ اور الرھبان سے مراد وہ عیسائی ہیں جو عبادت میں مستغرق رہنے والے اور انتہائی کوشش کرنے والے ہیں۔ بالباطل کہا گیا ہے کہ بے شک وہ اپنے متبعین اور پیروکاروں کے اموال کئی شکلوں اور معین طریقوں سے کنیسوں، عبادت گاہوں اور کئی دوسرے ناموں پر لیتے تھے۔ جس سے وہ انہیں یہ وہم دلاتے تھے کہ ان میں مال خرچ کرنا شرعی حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ اور سبب ہے اور وہ اس دوران ان اموال کو روک لیتے تھے، جیسا کہ اسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس راہب سے ذکر کیا ہے جس نے اپنا جمع کیا ہوا مال نکالا۔ اسے ابن اسحاق نے سیر میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ دین کی حمایت اور شریعت کے قیام کے نام پر کئی طریقوں سے ان کے غلے (اناج) اور ان کے اموال لے لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ احکام میں رشوت لیتے تھے، جیسا کہ آج بہت سے والی اور حکمران کرتے ہیں۔ اور قولہ: **بِالْبَاطِلِ** ان تمام صورتوں کو جامع ہے۔ **وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** یعنی وہ اپنے دین والوں کو دین اسلام میں داخل ہونے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: **وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ** لغت میں کنز کا اصلی معنی ملانا، جوڑنا اور جمع کرنا ہے۔

اور یہ سونے اور چاندی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں جانتے: ألا أخبركم بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة (1) (کیا میں تمہیں اس خیر اور بھلائی کے بارے خبر نہ دوں جسے ایک آدمی جمع کرتا ہے (اور وہ) نیک اور صالح عورت ہے، یعنی وہ اسے اپنے نفس کے لیے جوڑتا ہے اور اسے جمع کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

ولم تزوّد من جميع الكنز غير حنوط و رَثيثِ بَزّ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لا دَرَّدرّي إن أطعمتُ جائعهم قِرْف الحَيّ و عندي البُرّ مكنوز

میری یہ خوبی خوبی نہیں ہے اگر میں ان کے بھوکوں کو گوگل کا پھل کھلاؤں حالانکہ میرے پاس گندم جمع پڑی ہوئی ہو۔

تو اس میں قرف الحی سے مراد گوگل کا پھل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ ایک قوم کے پاس ٹھہرا ان کے نزدیک اس کی ضیافت گوگل کے پھل سے ہوئی اور وہی الحی ہے، پھر جب وہ لوگ اس کے پاس آئے اس وقت اس نے کہا: لَادَرَّ دَرِّی...... شعر۔ سونے اور چاندی کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جن پر مطلع نہیں ہوا جا سکتا، بخلاف دیگر ساز و سامان اور اموال کے (کہ ان پر اطلاع ہو سکتی ہے) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کنز سے مراد ہر وہ شے ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی اور جمع شدہ ہو، چاہے وہ زمین کے اندر ہو یا اس کے اوپر ہو۔ ذھب (سونے) کو ذھب اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلا جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے اور الفضۃ (چاندی) کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر متفرق ہو جاتی ہے اور بکھر جاتی ہے۔ اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد ہے: انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11)...... لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اس کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس آیت کے مراد بہ میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں اور یہی نظریہ اصم کا ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ اس قول کے بعد مذکور ہے: اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب اور ان کے علاوہ مسلمان بھی ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ صرف اہل کتاب کا ارادہ فرماتا تو پھر کلام اس طرح فرماتا: يَكْنِزُوْنَ یعنی اس کے ساتھ والذین مذکور نہ ہوتا۔ پس جب فرمایا: وَالَّذِيْنَ تو یہ ایک دوسرا نیا معنی ہے جو اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ یہاں جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ پس الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ نیا کلام ہے اور یہ مبتدا کی بنا پر مرفوع ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد اہل قبلہ ہیں (2)۔ پس یہ تین اقوال ہیں۔ اور صحابہ کرام کے قول کے مطابق اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ان کے نزدیک کفار شریعت کے فروعی احکام کے مخاطب ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن وہب سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: میں مقام ربذہ سے گزرا تو اچانک میری ملاقات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی تو میں نے ان سے کہا: تمہیں اس منزل پر کس نے اتارا ہے؟ تو انہوں نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 426

فرمایا: میں شام میں تھا تو میرا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بارے اختلاف ہو گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور میں نے کہا: یہ ہمارے اور ان کے بارے نازل ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان یہی اختلاف تھا۔ تو انہوں نے میرے بارے شکایت لکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھے مدینہ طیبہ آنے کا لکھ بھیجا۔ پس میں وہاں حاضر ہوا تو بہت سے لوگ مجھ پر جمع ہو گئے یہاں تک کہ (یہ محسوس ہوا) گویا انہوں نے اس سے قبل مجھے نہیں دیکھا تھا۔ تو میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: اگر آپ چاہیں کہ کنارہ کش ہو جائیں تو بھی آپ ہمارے قریب ہی ہوں گے تو یہی وہ جملہ ہے جس نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے اور اگر آپ مجھ پر کسی حبشی کو امیر مقرر کر دیں تو میں یقیناً بات سنوں گا اور اس کی اطاعت کروں گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت سونے چاندی کی زکوٰۃ کے حکم کو بھی متضمن ہے اور وہ چار شرطوں کے ساتھ واجب ہوتی ہے: آزاد ہونا، مسلمان ہونا، سال کا گزرنا اور نصاب کا قرض سے محفوظ اور سلامت ہونا۔ نصاب دو سو درہم یا بیس دینار ہے یا دونوں میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا اور چالیسواں حصہ اس سے اور چالیسواں حصہ اس سے نکالا جائے گا۔ ہم نے کہا ہے کہ آزاد ہونا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ غلام کی ملکیت ناقص ہوتی ہے۔ اور ہم نے یہ کہا ہے کہ اسلام شرط ہے، کیونکہ زکوٰۃ پاکیزگی اور طہارت ہے اور کافر کو طہارت اور پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 110) تو اس میں زکوٰۃ کا مخاطب انہیں کو بنایا گیا ہے جنہیں نماز کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے: بے شک سال گزرنا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مال میں زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے'' اور پھر ہم نے یہ کہا ہے کہ نصاب شرط ہے۔ تو یہ اس لیے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو سو درہم سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور بیس دینار سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں''

سال کے شروع میں نصاب کے مکمل ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سال کے آخر میں اس کے مکمل ہونے کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ اس پر تمام (ائمہ) کا اتفاق ہے کہ نفع اصل کے حکم میں ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس آدمی کے پاس دو سو درہم ہوں پھر وہ انہیں تجارت اور کاروبار میں لگائے اور وہ سال کے آخر میں ایک ہزار ہو گئے تو وہ ایک ہزار کی زکوٰۃ ادا کرے گا، نفع کے لیے اسے ازسرنو پورا سال گزارنے کی ضرورت نہیں۔ تو جب صورت حال اس طرح ہے تو پھر نفع کا حکم مختلف نہیں ہوگا، چاہے وہ نصاب سے حاصل ہو یا اس سے کم۔ اور اسی طرح اس پر بھی تمام نے اتفاق کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہوں، پھر انہوں نے سال کے شروع میں بچوں کو جنم دیا پھر ان میں سے سوائے ایک کے ساری مائیں (یعنی بڑی بکریاں) مر گئیں اور ان کے بچے نصاب کو مکمل کر رہے ہوں تو بلا شبہ ان سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے اس کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے کہ آیا اسے کنز کا نام

دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: ہاں (اسے کنز کہا جاسکتا ہے) اور اسے ابوالضحیٰ نے جعدہ بن ہبیرہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار ہزار اور جو اس سے کم ہے وہ نفقہ اور خرچہ ہے۔ اور جو اس سے زیادہ ہے تو وہ کنز ہے اگرچہ تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: وہ مال جس سے تو زکوٰۃ ادا کر دے یا جس مال کی کسی دوسرے مال کے ساتھ زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ کنز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی تو وہ کنز نہیں ہے اگرچہ وہ سات زمینوں کے نیچے ہو اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو وہ کنز ہے اگرچہ وہ زمین کے اوپر ہو: ما أدی زکاته فلیس بکنز وإن کان تحت سبع أرضین، وکل مالم تؤد زکاته فهو کنز وإن کان فوق الأرض اور اسی کی مثل حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ صحیح ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے اسے قیامت کے دن گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جس پر دو سیاہ نشان ہوں گے اور وہ قیامت کے دن اس کے گلے میں لپٹ جائے گا پھر اس کی باچھوں کو پکڑ کر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الآیہ (آل عمران: 180) (اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے)

اور اس میں بھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! یا قسم ہے اس کی جس کے بغیر کوئی الٰہ نہیں یا جیسے بھی آپ نے قسم کھائی۔ ہر وہ آدمی جس کے پاس اونٹ یا گائیں یا بکریاں ہوں اور وہ ان کا حق ادا نہ کرتا ہو تو قیامت کے دن انہیں اس سے بڑا اور موٹا کر کے لایا جائے گا جتنا وہ ہوتے ہیں اور وہ اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روند ڈالیں گے اور اسے اپنے سینگوں کے ساتھ ماریں گے جب بھی ان میں سے آخری آگے گزر جائے گا تو ان میں سے پہلے کو پھر اس پر لوٹا دیا جائے گا یہاں تک کہ اسے لوگوں کے درمیان ڈال دیا جائے گا“۔ پس ان دونوں حدیثوں کے خطاب کی دلیل اس مفہوم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس معنی کو صحیح بخاری میں بیان کیا ہے، ایک اعرابی نے آپ کو کہا: مجھے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کے بارے بتایئے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے انہیں جمع کیا اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے ہلاکت ہے، بلاشبہ یہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا، پس جب زکوٰۃ کا حکم نازل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مالوں کے لیے طہارت اور پاکیزگی بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز سے مراد وہ مال ہے جو حاجت اور ضرورت سے زائد اور فالتو ہو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور یہ جو نقل کیا گیا ہے یہ ان ہی کا مذہب ہے اور یہ ان کے ان شدائد اور سختیوں میں سے ہے جن کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ وہ مجمل ہے جو اس بارے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ جو روایت کیا گیا ہے کہ آیت انتہائی شدید حاجت کے وقت نازل ہوئی اور مہاجرین کی انتہائی کمزوری اور ضعف کے وقت اور ایسے وقت میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک ان کی کفایت سے انتہائی تنگ تھا اور بیت المال میں بھی ان کے لیے کوئی وسعت اور خوشحالی نہ تھی۔ اور خشک سالی ان پر حملہ آور تھی، تو اس حالت میں انہیں حاجت اور ضرورت کی مقدار سے زیادہ مال میں سے کوئی شے رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس جیسے وقت میں سونا، چاندی ذخیرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور انہیں وسعت وخوشحالی عطا فرما دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسو دراہم میں سے پانچ درہم اور بیس دینار میں سے نصف دینار واجب کر دیا۔ اور کل واجب نہ کیے اور بڑھنے کی مدت کا اعتبار کیا، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیان اور وضاحت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز وہ مال ہے جس سے پیش آمدہ حقوق ادا نہ کیے جائیں، جیسا کہ قیدی کی رہائی، بھوکے کو کھانا کھلانا اور دیگر اسی طرح کے امور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کنز لغوی طور پر سونے چاندی کے مجموعہ اور ان کے علاوہ اس مال کو کہا جاتا ہے جسے قیاس کے ساتھ ان دونوں پر محمول کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان دونوں کا مجموعہ ہے جب کہ وہ زیور نہ ہو، کیونکہ ان سے زیور بنانے کی اجازت دی گئی ہے اور اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور صحیح وہی ہے جس کے ذکر سے ہم نے آغاز کیا اور بلاشبہ وہ سب کا سب لغۃً اور شرعاً کنز ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6۔** زیورات کی زکوٰۃ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، امام احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم کا نظریہ یہ ہے کہ ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور عراق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی تھا اور اس کے بعد مصر میں آپ نے اس میں توقف کیا ہے اور فرمایا ہے: میں اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کروں گا۔ امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان تمام میں زکوٰۃ ہے۔ پہلے گروہ نے حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: نمو اور بڑھوتری کا پایا جانا سامان میں زکوٰۃ کو واجب کرتا ہے حالانکہ وہ زکوٰۃ واجب کرنے کا محل نہیں ہے۔ اسی طرح سونے چاندی سے اپنی ذات کے لیے زیور بنانے کے سبب نمو کا ختم ہو جانا زکوٰۃ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سونے چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے بارے عموم الفاظ سے استدلال کیا ہے اور آپ نے زیورات اور ان کے غیر میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اور حضرت لیث بن سعد نے فرق کیا ہے پس انہوں نے ان زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے جو محض زکوٰۃ سے بچنے کے ارادہ سے بنائے جائیں اور ان میں زکوٰۃ کو ساقط کر دیا ہے جو پہننے کے لیے اور عاریۃً دینے کے لیے بنوائے جائیں۔ زیورات کے بارے میں مذاہب میں تفصیل ہے، اس کا بیان کتب فروع میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی: **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ** فرمایا: مسلمانوں پر یہ گراں ثابت ہوئی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم سے اس مشقت کو دور کر دوں گا، چنانچہ آپ چلے اور حضور کی بارگاہ میں عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ کے اصحاب پر یہ آیت بھاری اور گراں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی مگر اس لیے تاکہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور بے شک اس نے میراث کا حق مقرر کیا ہے۔ اور ایک کلمہ ذکر کیا...... تاکہ وہ تمہارے بعد آنے والوں کے لیے ہو جائے''۔ راوی کا قول ہے: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تکبیر بلند کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

''کیا میں تمہیں اس بہترین خزانہ کے بارے خبر نہ دوں جسے آدمی جمع کر سکتا ہے وہ نیک اور صالح بیوی ہے جب آدمی اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کر دے اور جب اسے حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ اس سے غائب ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے۔ ألا أخبرك بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة إذا نظر إليها سرته وإذا أمرها اطاعته وإذا غاب عنها حفظته (1) اور ترمذی وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بیان کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی کی مذمت بیان کی ہے، پس اگر ہمیں علم ہو کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسے ہی کمائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کروں گا۔ پس آپ نے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایسی بیوی جو دین کے معاملے میں آدمی کی معاون اور مددگار ہو۔ لسان ذاكر وقلب شاكر وزوجة تعين المرء على دينه۔(2)

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں ولا ينفقونهما نہیں فرمایا۔ تو اس کے چھ جواب ہیں (۱) ابن الانباری نے کہا ہے: رب کریم نے اغلب اور اعم کا قصد کیا ہے اور وہ چاندی ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (البقرہ:45) اس میں ہا ضمیر صلوٰۃ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ وہی اعم ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11) تو اس میں بھی ہا ضمیر تجارۃ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہ اعم ہے اور لهو کو چھوڑ دیا ہے، بہت سے مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے اس کا انکار بھی کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ او نے تجارت کو لھو سے جدا کر دیا ہے پس ضمیر کو ان دو میں سے ایک کی طرف لوٹانا اچھا ہے۔ (۲) اس کا برعکس ہے، اور وہ یہ ہے کہ ينفقونها سونے کے لیے ہو اور دوسرا اس پر معطوف ہو۔ اور الذهب (سونے) کو عرب مؤنث پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں: هي الذهب الحمراء (یہ سرخ سونا ہے) اور کبھی مذکر بھی پڑھا جاتا ہے لیکن تانیث زیادہ مشہور ہے۔ (۳) کہ یہ ضمیر کنوز کے لیے ہو۔ (۴) ضمیر جمع کیے گئے مالوں کے لیے ہو۔ (۵) ضمیر زکوٰۃ کے لیے ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ولا ينفقون زكاة الأموال المكنوزة (وہ جمع کیے گئے اموال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) (۶) صرف ایک ضمیر پر اکتفا کرنا جب کہ معنی سمجھا جا سکے اور یہ عرب کلام میں بہت زیادہ ہے۔ سیبویہ نے شعر بیان کیا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأي مختلفِ

اس میں راضون جمع نہیں کہا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

رَماني بأمرٍ كنتُ منه ووالدي بريئا ومن أجل الطَّوِيّ رماني

اس میں بريئين نہیں کہا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3019، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسی طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

إن شرخ الشباب والشعر الأسود　　مالم يُعاص كان جنونا

اس میں آپ نے یعاصیا تثنیہ نہیں کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اگر کہا جائے: جس نے مال جمع نہیں کیا اور نہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا بلکہ اسے گناہوں میں خرچ کیا، کیا وعید میں اس کا حکم اس کے حکم کی مثل ہی ہوگا جس نے مال جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا؟ تو جواب یہ ہے: بلاشبہ یہ اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، کیونکہ جس نے اپنا مال گناہوں اور معاصی میں خرچ کیا اس نے دو اعتبار سے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا۔ خرچ کرنے کے اعتبار سے اور مال حاصل کرنے کے اعتبار سے، جیسا کہ شراب کو خریدنا اور پھر اسے پینا، بلکہ کئی جہتوں سے وہ معصیت ہے جب کہ معصیت متعدی گناہوں میں سے ہو، جیسا کہ وہ آدمی جس نے کسی مسلم پر ظلم کرنے میں کسی کی مدد کی مثلاً اسے قتل کرنے میں یا اس کا مال چھیننے میں وغیرہ وغیرہ۔ اور مال جمع کرنے والے نے دو اعتبار سے معصیت کی ہے۔ اور وہ زکوٰۃ نہ دینا اور مال کو روکنا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور کبھی مال کو روکنے کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عذاب کی اپنے اس ارشاد کے ساتھ تفسیر اور وضاحت بیان کی ہے: ''ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بشارت دے دو داغ دینے کی جو ان کی پشتوں میں لگیں گے (اور) ان کے پہلوؤں میں ظاہر ہو جائیں گے اور ان کی گدی کی جانب سے لگائے جائیں گے اور ان کی پیشانیوں کی طرف سے نکل آئیں گے''۔ الحدیث اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک روایت میں بیان کیا ہے: ''ذخیرہ اندوزوں کو بشارت اس پتھر کے بارے جسے جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اسے ان میں سے ہر ایک کے سر پستان پر رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے کندھے کے اوپر کی جانب سے نکل جائے گا اور اسے اس کے کندھے کی اوپر کی جانب رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے سر پستان سے نکل جائے گا اور وہ لرز جائے گا''۔ الحدیث۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: پتھر کا سر پستان سے داخل ہو کر کندھے کے اوپر کی جانب سے نکلنا اس کے دل اور اس کے باطن کو عذاب دینے کے لیے ہے جب کہ دنیا میں وہ مال کی کثرت، فرحت و سرور سے بھرا رہا، تو اب آخرت میں غم و اندروہ اور عذاب کے ساتھ اسے سزا دی جائے گی (1)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ ہمارے علمائے نے کہا ہے: آیت کا ظاہر وعید کو اس آدمی کے ساتھ معلق کیے ہوئے ہے جو مال جمع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتا اور وہ واجب وغیرہ کے لیے تعرض کرتا ہے، مگر کنز کے خاص طریقہ کا اعتماد کرنا مناسب نہیں، کیونکہ جس نے مال جمع نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روکتا رہا ضروری ہے کہ وہ بھی اس طرح ہو، مگر وہ آدمی جو زمین کے نیچے مال چھپا دیتا ہے وہ وہی ہے جو عرفاً اسے واجبات میں خرچ کرنے سے روکتا ہے، پس اسی لیے وعید کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 922

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

''جس دن تپایا جائے گا (یہ سونا چاندی) جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں (اور انہیں بتایا جائے گا) کہ یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے لیے تو (اب) چکھو (سزا اس کی) جو تم جمع کیا کرتے تھے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، يَّوْمَ ظرف ہے اور تقدیر عبارت ہے: یعذبون یوم یحمی (وہ عذاب دیئے جائیں گے اس دن جس دن اسے تپایا جائے گا) اور یہ صحیح نہیں ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: فبشرھم یوم یحمی علیھا کیونکہ اس دن بشارت نہیں ہوگی۔ کہا جاتا ہے: أحميت الحديدة في النار، ای أو قدت علیھا (یعنی لوہے کو آگ پر جلایا گیا) اور کہا جاتا ہے: أحميته (میں نے اسے گرم کیا) اور یہ نہیں کہا جاتا: أحميت عليه (میں نے اس پر گرم کیا) اور یہاں علیھا فرمایا ہے: کیونکہ یہاں علی، احماء کے معنی کا صلہ بنایا ہے اور احماء کا معنی ایقاد (بھڑکانا) ہے یعنی اسے آگ پر خوب گرم کیا جائے گا اور داغ دیئے جائیں گے۔ الکی کا معنی ہے: گرم ہونے والے لوہے اور آگ کو عضو کے ساتھ چپکانا یہاں تک کہ جلد جل جائے۔ اور الجباہ جبھۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد حاجب (ابرو) اور ناصیہ (پیشانی کے بال) کے درمیان والی ہموار جگہ ہے یعنی پیشانی۔ اور جبھت فلانا بکذا اس کا معنی ہے میں نے اس کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس کی پیشانی پر ضرب لگائی اور جنوب جنب کی جمع ہے (یعنی پہلو) اور چہرے پر داغ دینا زیادہ واضح اور زیادہ عیب ناک ہے اور پہلو اور پشت میں زیادہ دردناک اور زیادہ تکلیف دہ ہے، پس اسی وجہ سے تمام اعضاء کے درمیان سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا۔ اور علماء صوفیہ نے کہا ہے: جب انہوں نے مال و جاہ کو طلب کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو عیب ناک بنا دیا اور جب انہوں نے فقیر سے اعراض کیا، پہلو تہی اختیار کی جب وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھا تو ان کے پہلوؤں میں داغ دیئے گئے۔ اور جب انہوں نے اپنی پشتوں کو اپنے اموال کے ساتھ لگایا ان سے وثوق حاصل کرتے ہوئے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی پشتوں کو داغا گیا۔(1)

اور علماء ظاہر نے کہا ہے: بلاشبہ ان اعضاء کو خاص اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ غنی اور دولت مند آدمی جب فقیر کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھوں کی درمیانی جگہ کو اکٹھا کر لیتا اور وہ اپنا منہ چڑھا لیتا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

يَزِيد يَغُضّ الطرف عني كأنما زوى بين عينيه علي المحاجِمُ
فلا ينبسط من بين عينيك ما انزوى ولا تَلْقَنِي إلا وأنفُك راغِمُ

اور جب اس سے وہ مانگے تو وہ اعراض برت لیتا ہے اور جب وہ سوال میں اضافہ کرے اور کثرت سے اسے کہے تو وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 924

اس سے اپنی پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے معصیت کی حالت پر ہی سزا کو مرتب کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کے ساتھ داغ دینے کی کیفیت میں روایات مختلف ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اس میں پتھر کا ذکر ہے۔ اور اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بھی سونے اور چاندی کا مالک نہیں جو اس سے اس کا حق ادا نہیں کرتا مگر جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کے لیے آگ پر چوڑی سلاخیں بنائی جائیں گی پھر انہیں جہنم کی آگ پر گرم کیا جائے گا اور ان کے ساتھ اس کے پہلو، چہرے اور اس کی پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے اور جب بھی وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی تو اس کے لیے انہیں دوبارہ لوٹایا جائے گا اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ جنت یا جہنم کی طرف اپنا راستہ دیکھ لے گا'' (1)۔ الحدیث۔ اور بخاری میں ہے: ''بے شک اس کے خزانے کو اس کے لیے گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا''۔ اور غیر صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس کا کوئی مال ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اسے گنجے سانپ کا طوق پہنایا جائے گا اور وہ اس کے سر میں ڈنگ لگائے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید ایسا مختلف جگہوں میں ہوگا۔ ایک جگہ پر اس مال کو اژدہا کی مثل بنا دیا جائے گا۔ اور ایک جگہ وہ سلاخیں ہو جائے گا اور ایک جگہ وہ پتھر ہو جائے گا پس صفات بدلتی رہیں گی لیکن جسمیت ایک ہوگی۔ پس سانپ بھی ایک جسم ہے اور مال بھی ایک جسم ہے۔ اور یہ تمثیل حقیقت ہے، بخلاف اس قول کے: ''موت کو لایا جائے گا گویا کہ وہ ایک چتکبرہ مینڈھا ہے''۔ کیونکہ یہ ایک دوسرا طریقہ ہے۔ (3)

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور سانپ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ مخلوق کا دوسرا دشمن ہے اور الشجاع سانپوں میں سے وہ سانپ ہے جو شہسوار اور پیدل پر جھپٹ پڑتا ہے، حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنی دم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات گھڑسوار تک جا پہنچتا ہے اور یہ صحراؤں میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اژدھا ہے۔ اللحیانی نے کہا ہے: سانپ کو شجاع کہا جاتا ہے اور ثلاثۃ اشجعہ ہیں اور پھر شجعان ہے۔ اور اقرع سانپوں میں سے وہ ہے جس کے سر کے بال گر جاتے ہیں (یعنی گنجا ہوتا ہے) اور زہر کے سبب سفید ہوتا ہے۔ اور موطا میں ہے: اس کی باچھوں میں دو نقطے (نشان) سے ابھرے ہوتے ہیں جیسا کہ جھاگ ہوتی ہے اور وہ انسان کی باچھوں میں بھی بن جاتے ہیں جب وہ غصے میں ہو اور گفتگو بہت زیادہ کرے (ام) غیلان بنت جریر نے کہا ہے: بسا اوقات میں اپنے باپ کے شعر پڑھتی رہتی ہوں یہاں تک کہ میری باچھوں میں جھاگ بن آتی ہے۔ یہ اس سانپ کی مثال بیان کی گئی ہے جس کا زہر بہت زیادہ ہوتا ہے پس مال کو اس حیوان کی مثل بنا دیا جائے گا جو اپنے مالک کو غصے میں گرا دیتا ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے: اس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ رنگ کے نقطے ہوتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے: اس کو ایسے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جو اس کا پیچھا کرے گا اور اسے مجبور کر دے گا پس وہ اسے اپنا ہاتھ دے گا اور وہ اسے چبا

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7563
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 921

ڈالے گا جیسے نر دانتوں کے ساتھ کاٹ ڈالتا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کسی کو جمع شدہ مال کے ساتھ عذاب نہیں دے گا پس نہ کوئی درہم درہم کو مس کرے گا اور نہ دینار دینار کو مس کرے گا، مگر اس کی جلد کو وسیع کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ہر درہم اور دینار کو علیحدہ علیحدہ رکھا جائے گا۔ اور یہ کافر کے بارے میں بلاشبہ صحیح ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ نہ کہ مومن کے بارے میں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ علامہ طبری نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ تک سند بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اہل صفہ میں سے ایک آدمی فوت ہوا اس کی چادر میں ایک دینار پایا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ایک داغ ہے'' پھر دوسرا فوت ہوا اور اس کے پاس دو دینار پائے گئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ دو داغ ہیں'' (1) اور یہ یا تو اس لیے ہے کہ یہ دونوں مال صدقہ سے زندگی گزارتے تھے حالانکہ دونوں کے پاس سونا تھا اور یا اس لیے کہ یہ صدر اسلام کا دور تھا، پھر شریعت نے مال جمع کرنے اور اس کے حق ادا کرنے کے احکام مضبوط اور پختہ کر دیئے۔ اور اگر مال کو جمع کرنا ممنوع ہوتا تو پھر اس کا حق یہ ہوتا کہ وہ سارے کا سارا نکال دیا جائے اور امت میں ایسا کوئی نہیں جو یہ لازم کرتا ہو۔ اور تیرے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اموال ہی کافی ہیں۔ اور وہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے تو وہ انہی کا مذہب ہے۔ اور موسیٰ بنت عبیدہ نے عمران بن ابی انس سے، انہوں نے مالک بن اوس بن الحدثان سے اور انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دینار یا درہم یا سونا یا چاندی جمع کی اور اسے کسی قرض خواہ کو نہ دیا اور نہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو وہ کنز ہے قیامت کے دن اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لائق اور مناسب ہی ہے کہ وہ یہ کہیں اور یہ کہ جو حاجت اور ضرورت سے زائد ہے وہ کنز نہیں ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ کے لیے تیار کیا جائے۔

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جس نے چاندی یا سونا پیچھے چھوڑا اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا چاہے اس کی مغفرت کی گئی ہو یا مغفرت نہ کی گئی ہے۔ خبردار سنو! بلاشبہ تلوار پر لگا ہوا زیور بھی اسی میں سے ہے۔ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی اس حال میں فوت ہوتا ہے کہ اس کے پاس سونا یا چاندی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر قیراط کے ساتھ ایک سلاخ بنا دے گا اس کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں تک داغا جائے گا اس کے بعد اس کی بخشش ہو یا اسے عذاب دیا جائے''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اس صورت پر محمول کیا جائے گا جب اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور اس کی دلیل آیت کے ضمن میں ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی: وعندہ أحمر أو أبیض لم یؤد زکاتہ اور اسی طرح وہ روایت ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جس نے دس ہزار چھوڑے اس کی سلاخیں بنائی جائیں گی اور اس کے ساتھ اس کے مالک کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا (2)، یعنی اگر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تاکہ احادیث میں

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 429 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923

تناقص لازم نہ جائے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی ان کو کہا جائے گا: یہ ہے وہ جو تم نے جمع کیا۔ پس اس سے یقال لهم کے الفاظ محذوف ہیں۔ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ یعنی چکھو اس کا عذاب جو تم جمع کرتے رہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۝۳۶

"بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ہے کتاب الٰہی میں جس روز سے اس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو، ان میں سے چار عزت والے ہیں، یہی دین قیم ہے پس نہ ظلم کرو ان مہینوں میں اپنے آپ پر اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ، شهور، شهرٌ کی جمع ہے۔ پس جب کوئی آدمی اپنے بھائی سے کہے: لا اكلمك الشهور (میں تیرے ساتھ مہینے کلام نہیں کروں گا) اور وہ اس پر ہر قسم کھائے تو وہ ایک سال تک اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ یہ بعض علماء نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس کی کوئی نیت نہ ہو تو یہ قول تین مہینوں کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ وہ کم سے کم جمع ہے جس کا تقاضا فعول کا صیغہ کرتا ہے اور یہ فعل کی جمع ہے (1)۔ اور عند اللہ کا معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم میں اور اس میں جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اثنا عشر شهرا، اثنا عشر شهرا کو معرب پڑھا گیا ہے، بخلاف اس کی نظائر کے، کیونکہ اس میں اعراب کا حرف اور اس کی دلیل موجود ہے۔ عام قراء نے عشر عین اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے عشر شین کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔

فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ عِنْدَ اللّٰهِ کہنے کے بعد اس کا اعادہ کیا کیونکہ بہت سی اشیا کا وصف اس کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے (کہ وہ اللہ کے پاس ہیں) اور یہ نہیں کہا جا سکتا انه مکتوب فی کتاب الله (کہ وہ کتاب اللہ میں لکھی ہوئی ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان: 34) (بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بے شک اس نے کہا ہے: یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 925

وَالْاَرْضَ، تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ اس کی قضا وقدر اس سے پہلے تھی۔ اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان مہینوں کو وضع کیا اور ان کے نام ان اسماء کے ساتھ رکھے جن پر انہیں مرتب فرمایا اس دن سے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ اور انہیں اپنے انبیاء علیہم السلام پر اپنی نازل کردہ کتابوں میں نازل فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا کا یہی معنی ہے۔ اور ان کا حکم اسی حال پر باقی ہے جس پر یہ تھے مشرکوں نے ان کے ناموں کو بدلنے کے ساتھ انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا اور ان سے اسم میں مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے نے (انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا) اور اس سے مقصود ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرنا ہے اور اس طریقہ کو چھوڑنا ہے جسے مہینوں کے ناموں کو مقدم و موخر کرنے اور احکام کو ان اسماء پر جن کو انہوں نے ان پر مرتب کیا تھا معلق کرنے میں سب اہل جاہلیت اپنائے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا: "اے لوگو! بے شک زمانہ اپنی اس حالت پر گردش کناں ہے جس روز سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے"۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور وہ جو اہل جاہلیت نے کیا کہ انہوں نے محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنایا تو اس سے وہ وصف تبدیل نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ یوم میں عامل وہ مصدر ہے جو فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں ہے اس سے مراد کتب کی واحد نہیں، کیونکہ اعیان ظروف میں عمل نہیں کر سکتے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے: فيما كتب الله يوم خلق السموات والأرض اور عند، عدة مصدر کے متعلق ہے اور وہی اس میں عامل ہے اور فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں فی محذوف کے متعلق ہے، وہ قول باری تعالیٰ: اثْنَا عَشَرَ کی صفت ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: اثنا عشر شهرا معدودة أو مكتوبة في كتاب الله اور یہ جائز نہیں کہ یہ عدة کے متعلق ہو، کیونکہ اس میں صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ تفرقہ موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادات وغیرہ میں سے احکام کو معلق کرنا واجب ہے بلاشبہ وہ ان مہینوں اور سالوں کے ساتھ ادا ہوتے ہیں جنہیں عرب جانتے ہیں، نہ کہ ان مہینوں کے ساتھ جو عجم، روم اور قبط میں معتبر ہیں، اگرچہ یہ بارہ مہینوں سے زائد نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دنوں کی تعداد مختلف ہے، ان میں سے کچھ تیس دنوں سے زائد ہوتے ہیں اور کچھ تیس دنوں سے کم ہوتے ہیں اور عربوں کے مہینے تیس دنوں سے زائد نہیں ہوتے اگرچہ ان میں سے بعض ان سے کم ہوتے ہیں اور وہ جو کم ہوتا ہے وہ کوئی مہینہ متعین نہیں، بلاشبہ ان میں کم ہونے اور مکمل ہونے کے درمیان تفاوت بروج میں چاند کی چال کے مختلف ہونے کی بناء پر ہوتا ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ وہ حرمت اور عزت والے مہینے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور وہ رجب ہے جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔ اور وہی رجب مضر ہے اور اس کو رجب مضر کہا گیا ہے: کیونکہ ربیعہ بن نزار رمضان کے مہینے کو حرام اور عزت والا مہینہ قرار دیتے تھے اور وہ اسے رجب کا نام دیتے تھے۔ اور مضر نفس رجب کو بھی حرمت والا مہینہ کہتے تھے، پس اس لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری

**الذی بین جمادی و شعبان** (یعنی وہ جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے) اور اس کے نام میں جو خلل تھا اسے اس بیان کے ساتھ ختم کر دیا۔ عرب بھی اسے **منصل الاسنہ** کا نام دیتے تھے (کیونکہ ان کا طریقہ تھا کہ جب رجب آتا تو وہ اپنے تیر اور نیزوں کے بھالے اتار کر رکھ چھوڑتے تھے تاکہ اس مہینے میں کوئی ایسا فعل نہ صادر ہو جو اس کی حرمت کے خلاف ہو)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رجاء عطاردی سے روایت نقل کی ہے۔ اور ان کا نام عمران بن ملحان ہے اور یہ قول بھی ہے کہ نام عمران بن تیم ہے...... انہوں نے بیان کیا: ہم پتھروں کی پوجا کرتے تھے، پس جب ہم کسی پتھر کو پاتے کہ وہ اس (پہلے) سے بہتر اور اچھا ہے تو ہم اسے پھینک دیتے اور دوسرے کو اٹھا لیتے اور جب ہم کوئی پتھر نہ پاتے تو ہم کچھ مٹی جمع کرتے پھر ہم اسے بکریوں کے پاس لے کر آتے اور اس پر انہیں دوہتے پھر اسے لے کر گھومتے پھرتے رہتے اور جب رجب کا مہینہ آ جاتا تو ہم کہتے **منصل الاسنہ**، پس ہم کسی نیزے میں اس کا بھالہ اور نہ کسی تیر میں اس کا لوہا چھوڑتے مگر ہم اسے اتار لیتے اور اسے پھینک دیتے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ مراد صحیح حساب اور پورا عدد ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے: ذٰلِكَ الدِّيْنُ سے مراد ذلك القضاء (وہ فیصلہ) ہے۔ حضرت مقاتل نے کہا ہے: مراد حق ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہاں دین سے مراد اس کی مشہور وجوہ ہوں، مراد وہ شرع اور طاعت ہے۔ الْقَيِّمُ یعنی سیدھا قائم ہونے والا، یہ قام یقوم سے ہے۔ اور یہ سید کی مثل ہے جو کہ سادیسود سے ہے۔ اور اس کی اصل قیوم ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ھن ضمیر تمام مہینوں کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ صرف اشہر حرم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ یہ ان کے زیادہ قریب ہے اور ظلم بڑھنے کی صورت میں ان کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 197) (تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ من مانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں)

یہ مطلب نہیں کہ ان دنوں کے علاوہ میں ظلم جائز ہے جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ ظلم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے تم ان میں قتال کے ساتھ اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو، پھر تمام مہینوں میں قتال کو مباح قرار دے کر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ یہ حضرت قتادہ، عطا خراسانی، زہری اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ لوگوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ حرم پاک میں لڑیں اور نہ یہ حلال ہے کہ وہ اشہر حرام میں لڑیں مگر یہ کہ وہ ان میں باہم لڑیں اور یہ منسوخ نہیں ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہوازن کے ساتھ حنین میں اور ثقیف کے ساتھ طائف میں جنگ لڑی اور آپ نے شوال اور ذوالعقدہ کے کچھ دن ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور یہ بیان سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ تم ان مہینوں میں گناہوں کا ارتکاب کر کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 31

اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب ایک جہت سے کسی شے کو عظیم بنا دیتا ہے تو اس کے لیے ایک حرمت ہو جاتی ہے اور جب وہ اسے دو جہتوں سے یا کئی جہتوں سے عظیم بنا دے تو پھر اس کی حرمت بھی متعدد ہوتی ہے پس اس میں برے عمل کے سبب سزا دوگنا کر دی جاتی ہے اور اسی طرح عمل صالح کے سبب ثواب بھی دوگنا کر دیا جاتا ہے، کیونکہ جس نے حرمت والے مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس کا ثواب اس آدمی کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے حلال مہینے میں شہر حرام میں اس کی اطاعت کی اس کا ثواب اس کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حلال میں اس کی اطاعت کی۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دوچند کر دیا جائے گا) (1)

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس معنی کے اعتبار سے علماء نے اس آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے شہر حرام میں کسی کو خطاءً قتل کر دیا کہ کیا اس پر دیت مغلظہ ہوگی یا نہیں؟ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دیت کے بارے میں جو ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے شہر حرام میں اور حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس میں دیت مغلظہ لازم کی جائے گی، لہٰذا وہ دیت اور ایک ثلث مقرر ہوگی اور شبہ عمد کی صورت میں اونٹوں کی عمروں میں اضافہ کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرام مہینے اور بلد حرام اور ذوی الرحم میں کسی کو قتل کرنے اور زخم لگانے کی صورت میں دیت مغلظہ لازم ہوگی۔ قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، ابن شہاب اور ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے: جس نے حرام مہینے میں یا حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس کی دیت میں تہائی دیت کے برابر اضافہ کیا جائے گا۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور امام مالک امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: حل اور حرم پاک میں قتل کرنا برابر ہے۔ اسی طرح حرام مہینے میں اور دوسرے مہینے میں قتل کرنا برابر ہے اور یہی تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیتوں کا ذکر کیا اور ان میں حرم پاک اور حرام مہینوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حرام مہینے یا کسی دوسرے مہینے میں کسی کو خطاءً قتل کیا اس پر ایک جیسا کفارہ ہوگا، (یعنی کفارہ میں دونوں برابر ہوں گے) تو پھر قیاس یہ ہے کہ دیت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ نے چار اشہر حرام کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے اور ان میں ظلم سے منع کیا ہے: یہ ان کے شرف اور عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہے، اگرچہ ہر زمانے میں ظلم ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 197) اکثر اہل تاویل کا موقف یہی ہے، یعنی تم چار مہینوں میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اور حماد بن مسلم نے علی بن زید سے، انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ کا معنی ہے تم بارہ مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو (2)۔ اور قیس بن مسلم نے حسن

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 927
2۔ تفسیر الطبری، جلد 11، صفحہ 444

سے اور انہوں نے محمد بن حنفیہ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: فیھن کلھن (ان تمام مہینوں میں) پس اگر پہلے قول کی بنا پر کہا جائے: فیھن کیوں فرمایا اور فیھا نہیں فرمایا؟ تو وہ اس لیے ہے کہ عرب لوگ تین سے لے کر دس تک کے لیے ھن اور ھولاء بولتے ہیں اور جب وہ دس سے تجاوز کر جائیں تو پھر ھی اور ھذہ بولتے ہیں، یہ ارادہ کرتے ہوئے کہ قلیل کو کثیر کا نام دینا معروف ہے (یعنی جمع قلت کا جمع کثرت سے نام رکھنا معروف ہے) اور کسائی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں عربوں کے اس فعل سے بڑا متعجب ہوں۔ اسی طرح وہ دس سے کم راتوں کے لیے کہتے ہیں: خلون اور اس سے زیادہ کے لیے خلت بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ بعض زمانوں کو بعض سے حرمت کے اعتبار سے عظیم کیسے بنا دیا گیا ہے؟ کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے فضیلت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے، اس کے عمل کی نہ کوئی علت ہے اور نہ اس پر کوئی پابندی، بلکہ جو وہ اپنی حکمت کے مطابق ارادہ فرماتا ہے وہ کر دیتا ہے، اور کبھی اس میں حکمت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مخفی ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اس میں ایک مسئلہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا یہ قتال کے بارے امر ہے۔ اور کافۃ کا معنی ہے جمیعا (سب کے سب) یہ مصدر ہے اور حال کے محل میں واقع ہے ای محیطین بھم و مجتمعین (اور تم جنگ کرو مشرکوں سے اس حال میں کہ تم ان تمام کو گھیرے ہوئے ہو اور وہ اکٹھے ہوں) زجاج نے کہا ہے: اس قسم کے مصادر عافاہ اللہ عافیۃ اور عاقبہ عاقبۃ بھی ہیں ان کی تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی اور اسی طرح عامۃ اور خاصۃ بھی ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے فرض عین قرار دیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور فرض کفایہ بنا دیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو انہوں نے کہا ہے یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں سے کبھی نہیں جانا گیا کہ انہوں نے ساری امت کو نفر (بھاگنے) کا الزام دیا ہے، بلکہ اس آیت کا معنی مشرکوں کے قتال پر ابھارنا، ان کے خلاف جماعت بندی کرنا اور کلمہ کو جمع کرنا ہے، پھر اسے اپنے اس قول کے ساتھ مقید کر دیا: كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ان کے ہمارے ساتھ قتال کرنے اور ہمارے خلاف جمع ہونے کے اعتبار سے ہمارا بھی ان کے لیے جمع ہونا فرض ہے (1)۔ واللہ اعلم

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۷

"(حرمت والے مہینوں کو) ہٹا دینا، تو اور اضافہ کرتا ہے کفر میں۔ گمراہ کیے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال تاکہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں حرام کیا ہے اللہ نے تاکہ اس حیلہ سے حلال کر لیں جسے حرام کیا ہے اللہ نے آراستہ کر دیئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 312

گئے ہیں ان کے لیے ان کے برے اعمال۔ اور اللہ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ اسی طرح اکثر ائمہ پڑھتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: جہاں تک ہم جانتے ہیں حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے سوائے اکیلے ورش کے کسی نے بھی انما النسی بغیر ہمزہ کے روایت نہیں کیا۔ اور یہ نسأہ اور أنسأہ سے مشتق ہے (اس کا معنی ہے) اس نے اسے موخر کر دیا۔ یہ دونوں لغتیں کسائی نے بیان کی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ النسئی فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: نسأت الشئ فھو منسوء جب تو اسے موخر کر دے۔ پھر منسوء کو نسئی کی طرف پھیر دیا گیا ہے جیسے مقتول کو قتیل کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور رجل ناسی اور قوم نساۃ یہ فاسق اور فسقۃ کی مثل ہے۔ علامہ طبری نے کہا ہے: النسئ ہمزہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے زیادتی کرنا۔ کہا جاتا ہے: نسأ ینسأ جب وہ زیادہ ہو جائے۔ فرمایا: اگر ہمزہ کے بغیر ہو تو وہ فقط نسیان سے ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمۡ (التوبہ: 67) اور یہ حضرت نافع کی قراءت کا رد ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے: کہا جاتا ہے: نسأ اللہ فی أجلك (اللہ تعالیٰ تیری موت کو مؤخر کر دے) جیسے تو کہتا ہے: زاد اللہ فی أجلك (اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے) اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے: من سرّہ أن یبسط لہ فی رزقہ وینسأ لہ فی أثرہ فلیصل رحمہ (جس کے لیے یہ باعث مسرت ہو کہ اس کے لیے اس کا رزق وسیع کر دیا جائے اور اس کے لیے اس کی موت مؤخر کر دی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے)

ازہری نے کہا ہے: أنسأت الشئ انساء و نسیئا یہ اسم ہے جو مصدر حقیقی کی جگہ رکھا گیا ہے۔ وہ محرم میں جنگ وجدال کو حرام قرار دیتے تھے اور جب انہیں اس کی ضرورت پیش آتی تو وہ اس کے بدلے صفر کو حرام کر دیتے اور محرم میں جنگ شروع کر دیتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ عرب جنگ اور غارت گری کے دلدادہ تھے اور ان پر یہ شاق اور گراں گزرتا تھا کہ وہ لگاتار تین مہینے رکے رہیں جن میں وہ کوئی جنگ وجدال نہ کریں۔ تو انہوں نے کہا: اگر ہم پر مسلسل تین مہینے آ جائیں جن میں ہم کوئی شے حاصل نہ کریں تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ پس جب وہ منیٰ سے واپس لوٹتے تو بنی کنانہ میں ٹھہرتے تھے پھر بنی فقیم میں ایک آدمی تھا جسے قلمس کہا جاتا تھا، تو وہ کہنے لگا: میں وہ ہوں کہ میرا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جائے گا۔ تو وہ کہنے لگے: تو ہم سے محرم کی حرمت کو مؤخر کر دے اور اسے صفر میں رکھ دے۔ پس وہ ان کے لیے محرم کو حلال کر دیتا۔ تو وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک مہینہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ تحریم پورے سال میں گھوم گئی۔ پھر اسلام آیا اور محرم اپنی اسی جگہ کی طرف لوٹ گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا تھا (1)۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والأرض اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرک ہر مہینے میں دو سال حج کرتے رہے، پس انہوں نے دو سال ذوالحجہ میں حج کیا، پھر دو سال محرم میں حج کیا، پھر دو سال صفر میں حج کیا، اسی طرح تمام مہینوں میں وہ کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ حج جو آپ نے حجۃ الوداع سے پہلے کیا تھا وہ 9 ہجری میں ذوالقعدہ

1۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 290

کے موافق آیا، پھر آئندہ سال حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اور وہ ذوالحجہ کے موافق آیا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا یہ ارشاد ہے: إنّ الزمان قد إستدار (1) الحدیث۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ حج کے مہینے اپنے اصل محل کی طرف لوٹ آئے ہیں اور حج ذوالحجہ کی طرف لوٹ آیا ہے اور نسئی باطل ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ ایاس بن معاویہ نے کہا کہ مشرک سال کا بارہ مہینے اور پندرہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے تھے، پس حج رمضان المبارک میں اور ذوالقعدہ میں اور سال کے ہر مہینے میں ہوتا رہتا پندرہ دنوں کی زیادتی کے سبب مہینے کی گردش کرنے کے حکم سے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی گردش کے حکم کے تحت 9 ھ میں ذی القعدہ میں حج ادا کیا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا نہ فرمایا، پھر جب آئندہ سال 10 ھ میں حج ذوالحجہ کے موافق ہوگیا اور وہ چاندوں کے موافق بھی ہو گیا۔ اور یہ قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے: إنّ الزمان قد إستدار یعنی حج کا زمانہ اپنے اس اصلی وقت کی طرف لوٹ آیا جسے اللہ تعالیٰ نے معین فرمایا تھا جس روز اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا اس اصل مشروعیت کے ساتھ جس کے بارے اسے پہلے علم تھا اور اس کے بارے اس کا حکم نافذ ہے۔ پھر فرمایا: سال بارہ مہینے کا ہے۔ اس کے ساتھ اس زیادتی کی نفی ہو رہی ہے جو انہوں نے اپنے فیصلے کے ساتھ سال میں اضافہ کر رکھا تھا۔ اور وہ پندرہ دن ہیں، پس وقت اصلی متعین ہوگیا اور تحکم جہلی باطل ہوگیا۔ امام مازری نے خوارزمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے سورج کو تخلیق فرمایا اور اسے برج حمل میں رکھا اور وہ زمانہ جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے وہ سورج کے برج حمل میں اترنے کے موافق ہے۔ اور یہ توقیف کا محتاج ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے نقل کیے بغیر اس تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس بارے ان سے کوئی صحیح قول منقول نہیں۔ اور جو اس کا دعویٰ کرے اسے چاہیے کہ وہ اس کی سند بیان کرے۔ اور اس کے خلاف جو قول ہے عقل اسے جائز قرار دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بروج سے پہلے سورج کو تخلیق فرمایا ہے اور عقل اسے بھی جائز قرار دیتی ہے کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی بار تخلیق فرمایا ہے۔ پھر علماء تعدیل نے اس بارے تحقیق کی تو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: إنّ الزمان قد استدار کے وقت سورج کو برج الحوت میں پایا اور اس کے اور برج حمل کے درمیان بیس درجے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: یہ دس درجات ہیں۔ واللہ اعلم

اہل تاویل نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے جس نے پہلی بار (شہر حرام کو) مؤخر کیا۔ پس حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ مالک بن کنانہ کے بیٹے تھے اور وہ تین تھے (2)۔ اور جویبر نے حضرت ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس نے پہلی بار یہ عمل کیا وہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے پہلی بار یہ فعل کیا وہ بنی کنانہ کا ایک آدمی تھا اسے نعیم بن ثعلبہ کہا جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک آدمی تھا اس کو جنادہ بن عوف کہا جاتا تھا اور یہ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پایا ہے۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پہلے بنی کنانہ کا ایک قبیلہ پھر بنی فقیم کا ان میں سے ایک آدمی تھا جسے القَلَمّس کہا جاتا تھا اور اس کا نام حذیفہ بن عبید تھا۔ اور ایک

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 455 2۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 291

روایت میں ہے: وہ مالک بن کنانہ تھا۔ اور وہ جونسئ ثانی اور مختار تھا وہ ریاست اور حکومت کے ساتھ کامیاب تھا، کیونکہ عرب اس کی ریاست کو قبول کرتے تھے اور اسی بارے میں ان کا شاعر کہتا ہے:

ومنا ناسیٔ الشھرِ القلمّس

اور ہم میں سے مہینے کو مؤخر کرنے والا القلمس ہے

اور کمیت نے کہا ہے:

ألسنا الناسئین علی مَعَدٍّ شھورَ الحِلِّ نجعلھا حراماً

کیا ہم معد پر حلال مہینوں کو مؤخر کرنے والے نہیں ہیں کہ ہم انہیں حرام بنادیتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ یہ اس کا بیان ہے جو عربوں نے انواع کفر میں سے مجموعی طور پر کیا، کیونکہ انہوں نے وجود تعالیٰ کا انکار کیا اور کہا: وَمَا الرَّحْمٰنُ (الفرقان: 60) اصح وجوہ میں یہی ہے۔ اور انہوں نے بعث بعد الموت کا انکار کیا اور کہا: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ (یٰسین) (جی! کون زندہ کرسکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہوچکی ہوں) اور انہوں نے رسل علیہم السلام کی بعثت کا انکار کیا اور انہوں نے کہا: اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (القمر: 24) (کیا ایک انسان جو ہم میں سے ہے (اور) اکیلا ہے ہم اس کی پیروی کریں)

اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ حلال و حرام کرنا ان کے اختیار میں ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اپنی شہوات کو پورا کرنے کے لیے اس بدعت کا ارتکاب کیا اور اسے حلال قرار دیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا۔ اور کوئی اس کے کلمات کو تبدیل کرنے والا نہیں اگرچہ مشرک ناپسند بھی کریں۔

قولہ تعالیٰ: يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اس میں تین قراءتیں ہیں: اہل حرمین اور ابوعمرو نے يَضِل پڑھا ہے اور کوفیوں نے يُضَل فعل مجہول پڑھا ہے۔ حسن اور ابورجا نے يُضِل پڑھا ہے۔ تینوں قراءتوں میں سے ہر ایک ایک معنی کو ادا کرتی ہے مگر تیسری قراءت کے مطابق اس سے مفعول محذوف ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: ويُضِل به الذین کفروا من یقبل منھم (اور اس کے ساتھ وہ کفر کرنے والے اسے گمراہ کرتے ہیں جو ان سے اسے قبول کرتا ہے) اور الذین محل رفع میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر اللہ عزوجل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اور تقدیر عبارت یہ ہو: يُضِل اللہ به الذین کفروا (اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں گمراہ کرتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا) جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: یضل من یشآء (وہ گمراہ کردیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور جیسا کہ آیت کے آخر میں اس کا قول ہے: وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہوئے ہے)۔ اور دوسری قراءت يُضَلُّ به الذین کفروا یعنی اسے ان کے لیے شمار کیا گیا ہے۔ اس قراءت کو ابوعبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (ان کے لیے ان کے برے اعمال آراستہ کردیئے گئے) اور پہلی قراءت کو ابوحاتم نے اختیار کیا ہے، کیونکہ وہ اس یعنی نسئ کے سبب

گمراہ ہوئے، کیونکہ وہ اسے شمار کرتے تھے اور اس کے سبب گمراہ ہو جاتے تھے اور یحلونه میں ہاضمیر نسیٔ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ابو رجا سے یَضَل یا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور یہ ایک لغت ہے: کہا جاتا ہے: ضللت أضل اور ضللت أضل (یہ باب سمع یسمع اور باب ضرب یضرب دونوں ہے) لیوا طئوا لام کی کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، تاکہ وہ برابر اور پورے ہو جائیں۔ تو أطأ القوم علی کذا ای إجتمعوا علیه (یعنی وہ اس پر جمع اور متفق ہو گئے) یعنی انہوں نے ایک مہینے کو حلال نہیں کیا مگر ایک مہینے کو حرام بھی قرار دیا تاکہ حرام مہینے چار ہی باقی رہیں۔ اور یہی صحیح ہے، نہ کہ وہ جو ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پانچواں مہینہ بنا دیا۔ حضرت قتادہ نے کہا: بے شک انہوں نے صفر کا قصد کیا اور اس کا حرام مہینوں میں اضافہ کر دیا اور اسے تحریم میں محرم کے ساتھ ملا دیا۔ قطرب اور طبری نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے(1)۔ اور اسی کی بنا پر النسئی بمعنی زیادتی (اضافہ کرنا) ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

"اے ایمان والو! کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب کہا جاتا ہے تمہیں کہ نکلو راہ خدا میں تو بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو، کیا تم نے پسند کر لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں، سو نہیں ہے سرو سامان دنیوی زندگی کا آخرت میں مگر قلیل"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ اس میں ما حرف استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے، تقدیر عبارت ہے: أی شیٔ یمنعکم عن کذا (کون سی شی تمہیں اس طرح کرنے سے منع کرتی ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیا ہے تجھے کہ تو فلاں سے اعراض کر رہا ہے؟ مالك عن فلان معرضا؟ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے والوں کے لیے ان کے پیچھے رہنے پر بطور عتاب نازل ہوئی اور یہ فتح مکہ کے ایک سال بعد 9ھ کا واقعہ ہے، عنقریب اس کا ذکر سورہ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور النفر کا معنی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی نئے ہونے والے کام کی وجہ سے سرعت اور تیزی کے ساتھ منتقل ہونا۔ ابن آدم کے بارے میں کہا جاتا ہے: نَفَرَ إلی الأمر ینفر نفوراً (وہ بڑی تیزی کے ساتھ کام کی طرف گیا) اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ (الاسراء) (تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے) اور دابۃ (جانور) کے بارے کہا جاتا ہے: نَفَرَت تَنْفِرُ (فا کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے) نفارا و نفوراً۔ اور کہا جاتا ہے: فی الدابة نفار (جانور کا بدکنا وغیرہ) اور یہ الحران کی مثل اسم ہے۔ اور نفر الحاج من مِنًی نَفْرًا (اور حاجی منیٰ سے تیزی

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 454

کے ساتھ چل پڑے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ مفسرین نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم زمین کی نعمتوں کی طرف یا زمین پر اقامت اختیار کرنے کی طرف بوجھل ہو کر جھک جاتے ہو۔ اور یہ جہاد ترک کرنے پر زجر و توبیخ ہے اور نکلنے میں جلدی نہ کرنے پر عتاب ہے اور یہ اس کی طرح ہے جو زمین پر دوام اور ہمیشگی اختیار کر لے۔ اثَّاقَلْتُمْ اصل میں تثاقلتم ہے۔ تا کو ثا میں مدغم کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس کے قریب المخرج ہے اور پھر ہمزہ وصل کی ضرورت پیش آئی تا کہ ساکن کو بولنا ممکن ہو سکے، اور اسی کی مثل ادَّارَکوا اور ادّارأتم اور اطَّيَّرْنَا اور ازَّيَّنَتْ ہیں۔ اور کسائی نے شعر بیان کیا ہے:

تُولِي الضَّجِيعَ إذا ما استافها خَصِرًا عذبَ المَذاق إذا ما اتَّابعَ القُبَلُ

اعمش نے تثاقلتم اصل کے مطابق قراءت کی ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے (1)۔ غزوۂ تبوک کی طرف شدید گرمی، پھل پکنے اور ٹھنڈے سایوں کے موسم میں آپ نے لوگوں کو دعوت دی، جیسا کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ پس لوگوں پر سستی اور کاہلی غالب آ گئی، تو وہ بیٹھ گئے اور بوجھ سا محسوس کرنے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اس قول کے ساتھ زجر و توبیخ فرمائی اور ان پر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب کیا۔ اور أَرَضِيتُم بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ کا معنی ہے کیا تم نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پسند کر لی ہے؟ تقدیر کلام ہے: أرضيتم بنعيم الدنيا بدلاً من نعيم الآخرة (کیا تم نے اخروی نعمتوں کے بدلے دنیوی نعمتوں کو پسند کر لیا ہے؟) اس میں من بدل کے معنی کو متضمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَٰٓئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ۝ (الزخرف) ای بدلا منکم (اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے)

اور شاعر نے کہا ہے:

فليت لنا من ماء زمزم شربةً مُبرَّدةً باتت على طَهَيان

اے کاش! ہمارے لیے ماء زمزم کے بدلے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی ہوتا جو رات کے وقت لکڑی پر پڑا ہوتا اس میں ماء حمنان (مکہ کا پانی) روایت کیا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے: ليت لنا بدلا من ماء زمزم شربة مبردة اور الطهيان سے مراد وہ لکڑی ہے جو گھر کی ایک طرف میں ہوا کے لیے نصب کی جاتی ہے، اس پر پانی لٹکا دیا جاتا ہے تا کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے (2)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی راحت اور سکون کو آخرت کی راحت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب فرمایا ہے، جب کہ آخرت کی راحت دنیا کی مشقت اور تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا در آنحالیکہ انہوں نے سوار ہو کر طواف کیا: أجركِ على قدر نصبكِ (تیرا اجر تیری مشقت کی مقدار کے مطابق ہو گا) اسے بخاری نے نقل کیا ہے۔ (3)

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 34 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 937 3۔ ایضاً

''اور اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب۔ اور بدل کر لے آئے گا کوئی دوسری قوم تمہارے علاوہ اور تم نہ بگاڑ سکو گے اس کا کچھ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلَّا تَنْفِرُوْا شرط ہے، اسی لیے اس کے آخر سے نون حذف ہے۔ اور اس کا جواب یُعَذِّبْكُمْ اور وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ہے اور یہ شدید جھڑک ہے اور (جہاد پر) نکلنے کو ترک کرنے میں وعید موکد ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پختہ اور مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ امر جب وارد ہو تو اس کے ورود میں فعل کے اقتضا سے زیادہ کچھ مقصود نہیں ہوتا، پس رہا ترک امر کے وقت عقاب اور سزا تو وہ نفس امر سے اخذ نہیں کی جاتی اور نہ اقتضا اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ عقاب اور سزا اس کے بارے خبر سے ثابت ہوتی ہے، جیسے کسی کا یہ قول: ان لم تفعل کذا عذبتُك بكذا (اگر تو نے اس طرح نہ کیا تو میں تجھے اس طرح سزا دوں گا) اسی طرح اس آیت میں وارد ہے، پس اس کے مقتضی کے مطابق جہاد کے لیے نکلنا اور کفار کے ساتھ قتال کرنے کے لیے ان کی طرف جانا اس بنا پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہو۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا اور مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ...... تا قولہ...... یَعْمَلُوْنَ ﴿﴾ (التوبہ) اسے اس کے پیچھے آنے والی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے: وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) اور یہی حضرت ضحاک، حسن اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ یُعَذِّبْكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ان سے بارش کو روک لینا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر یہ ان سے صحیح ہے تو وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہاں کہا ہے، ورنہ دنیا میں عذاب الیم دشمن کے غلبہ کے ساتھ ہے اور آخرت میں آگ کے ساتھ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ابن نفیع سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے پوچھا اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور یہی ان کے لیے عذاب تھا (1)۔ اور اسے امام ابومحمد بن عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبائل میں سے ایک قبیلہ والوں کو نکلنے کے لیے فرمایا تو وہ بیٹھ گئے (یعنی وہ نہ نکلے) تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور اس کے ساتھ انہیں عذاب دیا اور الیم کا معنی ہوتا ہے درد پہنچانے والا، یعنی انتہائی تکلیف دہ۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ یہ ایک وعید ہے کہ وہ اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک قوم کو بدل دے گا جو آپ کے انہیں نکلنے کا حکم دینے کے وقت پیچھے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کہا گیا ہے: مراد ابناء فارس ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد اہل یمن ہیں۔ وَّ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا یہ معطوف ہے۔ اور اس میں ہا ضمیر کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی نسخ نفیر العامۃ الخ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے۔ اور جہاد سے بوجھل ہو کر بیٹھ جانا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ہر ایک پر حرام ہے۔ اور رہا وہ جس میں کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو تو جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معین فرما دیا تو اس پر کاہلی اور سستی کا اظہار کرنا اور بوجھل ہو کر بیٹھ جانا حرام ہے اور اگر وہ ان دونوں سے مامون و محفوظ ہو تو پھر یہ فرض کفایہ ہے۔ اسے علامہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حاجت کے وقت، کافروں کے غلبے کے وقت اور ان کی قوت و شوکت کے زیادہ ہونے کے وقت نکلنا واجب ہے، کیونکہ اس کا وجوب دعوت دینے کے ساتھ مختص نہیں، کیونکہ وہ متعین ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو جائے تو دعوت دینا اور نکلنے کا مطالبہ کرنا بعید ہے کہ وہ کسی ایسی شے کا موجب ہو جو اس سے پہلے واجب نہیں، مگر یہ کہ امام جب کسی قوم کو معین کر دے اور انہیں جہاد کی طرف بلائے تو ان کے لیے اس تعیین کے وقت بوجھل ہونا جائز نہیں اور اس تعیین کے سبب یہ ان کے لیے فرض عین ہو جائے گا، محل جہاد کی وجہ سے نہیں بلکہ امام کی اطاعت کی وجہ سے۔ واللہ اعلم

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تو (کیا ہوا) ان کی مدد فرمائی ہے خود اللہ نے جب نکالا تھا ان کو کفار نے۔ آپ دوسرے تھے دو سے جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ فرما رہے تھے اپنے رفیق کو کہ مت غمگین ہو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر نازل کی اللہ نے اپنی تسکین ان پر اور مدد فرمائی ان کی ایسے لشکروں سے جنہیں تم نے نہ دیکھا اور کر دیا کافروں کی بات کو سرنگوں اور اللہ کی بات ہی ہمیشہ سر بلند ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: اگر تم غزوۂ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں نکل کر آپ کی مدد نہ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوہ تبوک سے واپس لوٹنے کے بعد ان کو عتاب کیا۔ نقاش نے کہا ہے: پہلی آیت ہے جو سورۂ براءت میں سے نازل ہوئی۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اگر تم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرنا چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ آپ کا ضامن اور کفیل ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے قلت کے مواقع میں آپ کی مدد و نصرت فرمائی اور آپ کو اپنے دشمن پر عزت و غلبہ کے ساتھ واضح غلبہ عطا فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے غار میں آپ کے صاحب اور رفیق کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی اس طرح کہ وہ آپ کے ساتھ مانوس تھے، انہوں نے آپ کو کندھوں پر اٹھایا، آپ کے ساتھ وفا کی اور اپنی جان کے ساتھ آپ کی حفاظت کی اور اپنے مال کے ساتھ آپ کے لیے اظہار ہمدردی کیا (1)۔ لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

نے کہا: ہے، انبیاء علیہم السلام کے اصحاب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثل تھے۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس آیت کے ساتھ اس عتاب سے نکل گئے جس کا ذکر اِلَّا تَنْصُرُوْهُ کے ارشاد میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذات خود ان سے دور ہو کر نکلے تھے، لیکن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر مجبور کر دیا تھا یہاں تک کہ آپ نے ایسا کیا، پس رب کریم نے فعل کی نسبت ان کی طرف کی اور اس میں حکم ان پر مرتب کیا۔ پس اسی وجہ سے قتل پر مجبور کرنے والے کو قتل کیا جاتا ہے اور بالاکراہ ضائع ہونے والے مال کا ضامن مکرہ کو بنایا جاتا ہے، کیونکہ وہی قاتل کو قتل پر اور مال ضائع کرنے والوں کو مال ضائع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: ثَانِيَ اثْنَيْنِ یعنی دو میں سے ایک۔ اور یہ اسی طرح ہے ثالث ثلاثۃ (تین میں سے ایک) اور رابع اربعۃ (چار میں سے ایک) اور جب لفظ مختلف ہوں تو یہ کہے: رابع ثلاثۃ و خامس اربعۃ تو اس کا معنی ہے تین کو اپنی ذات کے ساتھ چار بنانے والا اور چار کو پانچ بنانے والا۔ اور ترکیب کلام میں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکالا اس حال میں کہ آپ تمام لوگوں سے منفرد اور الگ تھے سوائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے (یعنی وہ آپ کے ساتھ تھے)۔ اس میں عامل نصرہ اللہ ہے نصرہ منفردا او نصرہ أحد اثنین (اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی اس حال میں کہ آپ منفرد تھے اور اس حال میں کہ آپ دو میں سے ایک تھے)۔ حضرت علی بن سلیمان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے فخرج ثانی اثنین (پس دو میں سے دوسرا نکلا) جیسا کہ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور جمہور لوگوں نے ثانی یا کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کے سوا کوئی معروف نہیں۔ اور ایک جماعت نے ثانی یا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو عمرو بن علاء نے اسے بیان کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یا کو الف کے مشابہ قرار دیتے ہوئے ساکن پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: پس یہ حسن کی قراءت کی طرح ہے مابقی من الربا اور اسی طرح جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فَارْضَوا مَارضِي لكُمُ ماضِي العزيمةِ ماڨي حُكْمه جَنَفُ

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ، الْغَارِ سے مراد پہاڑی کی کھوہ ہے، مراد غار ثور ہے۔ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ ایسا مضبوط شر ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا، پس انہوں نے آپ کے لیے رات مقرر کر دی اور طویل رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاشانہ اقدس کے دروازے پر آپ کی تاک میں رہے تاکہ جب آپ باہر نکلیں تو وہ آپ کو قتل کر دیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ وہ ان پر اپنا اثر ڈال دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلے اس حال میں کہ ان پر نیند چھائی ہوئی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سروں پر مٹی ڈال دی اور چلے گئے، جب صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس باہر تشریف لائے اور انہیں بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو نکل گئے اور نجات پا گئے۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کا وعدہ فرما رکھا تھا۔ اور ان دونوں نے اپنی سواریاں عبداللہ بن ارقط کے حوالے کی ہوئی تھیں۔ اسے ابن اریقط بھی کہا جاتا ہے، وہ کافر تھا لیکن ان دونوں کو اس پر اعتماد اور یقین تھا اور یہ راستہ دکھانے کے لیے راہبر تھا۔ پس ان دونوں نے اسے اجرت پر لیا تا کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس گھر کے پچھلے دروازے سے نکلے جو بنی جمح میں تھا اور دونوں جبل ثور میں غار کی طرف چلے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ وہ باتیں سنے جو لوگ کریں اور اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ وہ اپنا ریوڑ چرائے اور رات کے وقت وہ اسے ان کے پاس لے آئے پس وہ اس طرح ان کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں چلے اور غار میں داخل ہو گئے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما ان کے پاس کھانا لاتی تھیں اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما خبریں لے کر آتے تھے، پھر ان کے پیچھے عامر بن فہیرہ ریوڑ لے کر آتا اور وہ ان کے نشانات کو مٹا دیتا تھا۔ پس جب قریش نے آپ ﷺ کو مفقود اور گم پایا تو وہ آپ ﷺ کو قیافہ شناسوں کے ساتھ تلاش کرنے لگے ایسے قیافہ شناس جو نشانات قدم کی پہچان میں بڑے معروف اور مہارت رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ (چلتے چلتے) غار پر جا ٹھہرے اور کہا: یہاں نشان ختم ہو گیا ہے پھر انہوں نے دیکھا تو مکڑی نے غار کے منہ پر اس وقت جالا سا بن رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پس جب انہوں نے مکڑی کا جالا دیکھا تو انہوں نے یقین کر لیا کہ اس میں کوئی نہیں ہے، چنانچہ وہ واپس لوٹ گئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے بارے میں اس آدمی کے لیے سو اونٹوں کا انعام مقرر کر دیا جو آپ کو ان کے پاس لوٹا کر لائے گا۔ یہ خبر مشہور ہے۔ اور سراقہ بن مالک بن جعشم کا قصہ اس میں مذکور ہے۔ اور حضرت ابوالدرداء اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبوتری کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے مکڑی کے جالے پر انڈے دے دیئے اور وہ اپنے انڈوں پر بیٹھنے لگی، پس جب کفار نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غار سے واپس لوٹا دیا (1)۔

**مسئلہ نمبر 5۔** بخاری نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنی دیل کے ایک آدمی کو اجرت پر لیا اور وہ ماہر راہبر تھا اور وہ کفار قریش کے دین پر تھا، پس دونوں نے اپنی سواریاں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے تین راتوں کے بعد غار ثور آنے کا معاہدہ کیا، پس وہ تیسری صبح کو دونوں کی سواریاں لے کر آ گیا اور دونوں نے وہاں سے رخت سفر باندھا اور آپ کی معیت میں عامر بن فہیرہ اور دیلی راہبر بھی چلا اور وہ انہیں لے کر ساحل (ایک جگہ کا نام ہے) کے راستہ پر چلا۔

مہلب نے کہا ہے: اس میں فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اہل شرک کو راز اور مال پر امین بنانا جائز ہے، بشرطیکہ ان کے بارے وفا اور مروت کا یقین ہو جیسا کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اس مشرک کو مکہ مکرمہ سے اپنے نکلنے کے بارے اور اونٹنیوں پر امین بنایا۔ ابن منذر نے کہا ہے: اس میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو راستے کی رہنمائی کے لیے کفار کو اجرت پر لینا جائز ہے۔ اور امام

1۔ الطبقات لابن سعد، جلد 1، صفحہ 229

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے: "باب استئجار المشرکین عند الضرورة أو إذا لم یوجد اهل الاسلام ابن بطال نے کہا ہے: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے أو إذا لم یوجد اهل الاسلام یا جب اہل اسلام میں سے کوئی نہ پایا جائے۔ اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاشبہ اہل خیبر کے ساتھ معاملہ کیا کہ وہ وہاں کی زمین پر کام کریں گے جب مسلمانوں میں سے ایسے نہ پائے گئے جو زمین پر کام کرنے میں ان کے نائب بن سکتے ہوں، یہاں تک کہ اسلام قوی ہو گیا اور ان کی ضرورت باقی نہ رہی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ اور عام فقہاء ضرورت کے وقت اور اس کے بعد بھی انہیں اجرت پر لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ دو آدمیوں کا ایک آدمی کو اس شرط پر اجرت پر لینا کہ وہ ان دونوں کے لیے کام کرے گا (یہ بھی جائز ہے) اور اس میں دشمن کے خوف سے دین کے ساتھ فرار اختیار کرنے کے جواز پر بھی دلیل ہے۔ اور غیرت وغیرہ کے معاملہ میں حقیر جاننے کے خوف سے فرار اختیار کرنا بھی جائز ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس کے لیے صلح اور سلامتی چاہتے ہوئے بذات خود دشمن کے حوالے نہ ہو جائے۔ اور اگر تمہارے رب نے چاہا تو وہ اسے ان کے ساتھ ہونے کے باوجود اس سے محفوظ رکھے گا، یہ انبیاء اور دیگر لوگوں کے لیے اللہ کا طریقہ ہے (1) اور تو اللہ کے طریقہ کو ہرگز بدلا ہوا نہ پائے گا۔ اور جس نے اس سے منع کیا ہے اس کے نظریہ کے فاسد ہونے پر یہ بہت بڑی دلیل ہے اور کہا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر سے بھی ڈرے تو یہ اس کے توکل میں نقص ہے اور اس کا تقدیر پر ایمان نہیں۔ اور یہ سب کا سب آیت کے معنی میں ہے۔ وللہ الحمد والہدایۃ۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: **اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل کو متضمن ہے۔ اصبغ اور ابوزید نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ **ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** میں صاحب سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو اپنے کلام کے ساتھ ثابت کر دیا ہے اور اپنی کتاب میں آپ کے وصف صحابیت کو بیان کیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے: جو کوئی حضرت عمر، حضرت عثمان یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب ہونے کا انکار کرے تو وہ کذاب اور بدعتی ہوگا۔ اور جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب ہونے کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہے، کیونکہ اس نے قرآن کریم کی نص کا رد کیا ہے۔ اور **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** کا معنی ہے یعنی مدد و نصرت کرنے، لحاظ رکھنے اور حفاظت و نگہبانی کرنے کے اعتبار سے بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

ترمذی اور حارث بن ابی اسامہ دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ہمام نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خبر دی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی اس حال میں کہ ہم غار میں تھے، اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہ یقیناً ہمیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا ابابکر، ما ظنك باثنین اللہ ثالثهما (اے ابوبکر تیرا ان دو کے بارے کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے) (1)۔ محاسبی نے کہا ہے: یعنی اللہ تعالیٰ مدد و نصرت اور دفاع کے اعتبار سے ان دو کے ساتھ ہے نہ کہ اس معنی کی بنا پر جس کے ساتھ وہ ساری مخلوق کو شامل ہے۔ پس فرمایا: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے) تو اس کا معنی عام ہے کہ وہ کفار اور مومنین میں سے سبھی کی سنتا ہے اور انہیں دیکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امامیہ نے کہا ہے: غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غمزدہ اور پریشان ہونا ان کے جہل، نقص اور دل اور رائے کی کمزوری پر دلیل ہے۔ تو ہمارے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ کی طرف حزن اور پریشانی کی نسبت کرنا یہ نقص نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں کوئی نقص نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے: نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ہود: 70) (تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اس قول سے کوئی نقص نہیں: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا ہم نے فرمایا (اے کلیم) مت ڈرو) اور حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے: لَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ (العنکبوت: 33) (اور نہ رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تمہیں اور تیرے کنبہ کو)

پس یہ وہ عظیم انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات ہیں جن میں (خوف تقیہ) نصاً پایا گیا ہے۔ اور یہ نہ ان پر طعن ہے اور نہ ان کے لیے ایسا وصف ہے جو باعث نقص ہو۔ تو اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات میں بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس اظہار میں احتمال ہے، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کے نیچے (جھک کر) دیکھا تو یقیناً وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ حزن و ملال حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے اس خوف کی وجہ سے تھا کہ آپ کو کوئی ضرر اور تکلیف پہنچے اور اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معصوم اور محفوظ نہ تھے، بلاشبہ یہ ارشاد گرامی وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: 67) (اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے) مدینہ طیبہ میں نازل ہوا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوالفضائل العدل نے ہمیں کہا ہے کہ جمال الاسلام ابوالقاسم نے ہمیں کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (الشعراء) (ہرگز نہیں، بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا) اور حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، تو یقیناً جب اللہ تعالیٰ اکیلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے تو ان کے اصحاب ان کے بعد مرتد ہو گئے پس جب وہ اپنے رب کے پاس سے واپس لوٹ کر آئے تو انہیں پایا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کر رہے ہیں۔ اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہدایت یافتہ، موحد، عالم اور امر کے ساتھ یقیناً قائم رہنے والے باقی رہے اور کوئی خلل و فساد آپ تک راہ نہ پا سکا۔(1)

**مسئلہ نمبر 9**۔ ترمذی نے نبیط بن شریط کی حدیث نقل کی ہے انہوں نے حضرت سالم بن عبید رضی اللہ عنہ سے (انہیں شرف صحبت بھی حاصل ہے) بیان کی انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری کر دی گئی...... الحدیث۔ اور اس میں ہے: مہاجرین مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے اور کہنے لگے: چلو ہمارے ساتھ ہمارے انصار بھائیوں کی طرف ہم انہیں اس معاملہ میں اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں پھر انصار نے کہا: ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر تم میں سے ہوگا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کون ہے جس کے لیے اس کی مثل تین وصف ہوں؟ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کون ہے جو ان دو کی مثل ہو؟ راوی کا بیان ہے: پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر لوگوں نے بھی انتہائی حسین و جمیل انداز میں آپ کی بیعت کر لی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ خلیفہ ہمیشہ ثانی (دوسرا) ہی ہوتا ہے۔ اور میں نے ہمارے شیخ امام ابو العباس احمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے لیے ثانی اثنین کہا جائے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انہوں نے معاملات کو اسی طرح قائم کیا جیسے پہلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قائم کیا۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو سارا عرب مرتد ہو گیا اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور جعواث (بحرین میں ایک جگہ ہے) کے بغیر کہیں اسلام باقی نہ رہا۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور آپ نے انہیں دین میں داخل کرنے کے لیے ان کے ساتھ قتال کیا جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ پس اس اعتبار سے آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ کے حق میں ثانی اثنین (دو میں سے دوسرے) کہا جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث صحیحہ موجود ہیں، جن کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفہ ہیں اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور کوئی مخالف باقی نہیں رہا۔ اور آپ کی خلافت میں شک اور جرح، قدح کرنے والا بالیقین خطا کار اور فاسق ہے۔ کیا وہ کافر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الفتح میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کتاب و سنت اور اقوال علماء سے جو بات قطعی ہے اور واجب ہے کہ دل اس کے ساتھ ایمان لائیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام سے افضل و اعلیٰ ہے اور اہل تشیع اور اہل بدعت کے اقوال کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کفر کرنے والوں جن کی گردنیں ماری جاتی ہے اور بدعت و فسق کا ارتکاب کرنے والوں کے درمیان ہیں ان کی کوئی بات قبول نہ کی جائے گی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ افضل

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 939

ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں لوگوں کے درمیان چناؤ اور انتخاب کا اختیار دیا جاتا تھا تو ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہلے پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو چنتے تھے۔ ائمہ اہل سلف نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف کیا ہے؟ ان میں سے جمہور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم جانتے ہیں۔ اور امام مالک کے بارے روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں توقف کیا ہے۔ اور ان کے بارے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے جمہور کے موقف کی طرف رجوع کر لیا ہے اور یہی اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: **فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ** اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی تسکین نازل فرمائی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے علماء نے کہا ہے: یہی زیادہ قوی ہے، کیونکہ آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے قوم سے خوف لاحق ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امن عطا فرما کر آپ پر تسکین اور راحت کو نازل فرمایا اور آپ کا اضطراب پرسکون ہو گیا، آپ کا ڈر اور خوف ختم ہو گیا اور امن وسکون حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ثمامہ (ایک بوٹی کا نام ہے) کو اگا دیا اور اس میں کبوتری کے گھونسلا بنانے کا الہام کیا۔ اور مکڑی کو بھیجا پس اس نے اس پر جالا بن دیا۔ تو ظاہر دکھائی دینے میں یہ لشکر کتنا کمزور ہے اور باطنی معنی کے اعتبار سے یہ کتنا قوی ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت فرمایا جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھگڑا کیا: ''کیا تم میرے لیے میرے صاحب (رفیق) کو چھوڑ دو گے، بے شک تمام لوگوں نے کہا: آپ جھوٹے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا آپ سچے ہیں''۔ اسے ابو درداء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: **وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا** یعنی ملائکہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ أیدہ میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور دونوں ضمیریں مختلف ہیں۔ اور قرآن کریم اور کلام عرب میں یہ کثیر الاستعمال ہے۔ **وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى** اس سے مراد کلمہ شرک ہے۔ **وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا** کہا گیا ہے کہ مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مدد ونصرت کا وعدہ ہے۔ اعمش اور یعقوب نے **كَلِمَةُ اللّٰهِ** کو جعل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے استئناف کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور فراء نے یہ گمان کیا ہے کہ نصب کی قراءت بعید ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ تیرا قول یہ ہوتا ہے أعتق فلان غلام أبيه (فلاں نے اپنے باپ کا غلام آزاد کیا) اور تو یہ نہیں کہتا: غلام ابی فلان اور ابو حاتم نے جو کہا ہے وہ اس کے قریب قریب ہے۔ انہوں نے کہا: واجب ہے کہ کہا جائے: وکلمته هی العليا۔ نحاس نے کہا ہے: جو کچھ فراء نے کہا ہے وہ آیت سے مشابہت نہیں رکھتا، لیکن سیبویہ نے جو شعر بیان کیا ہے وہ اس سے مشابہت رکھتا ہے:

لا أرى الموتَ يسبق الموتَ شيءٌ  نغّص الموتُ ذا الغِنَى والفقيرَا

پس یہ بہت اچھا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں، بلکہ ماہر نحوی کہتے ہیں: اس طرح کے محل میں دوبارہ ذکر کرنا فائدہ مند ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں تعظیم کا معنی ہے۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ (الزلزلۃ) پس اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اور کلمہ کی جمع کلم ہے۔ اور تمیم کہتے ہیں: ھی کلمۃ یعنی کاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس میں تین لغات بیان کی ہیں: کَلِمة و کِلْمة و کَلْمة جیسا کہ کَبِد، کِبْد اور کَبْد اور وَرِق، وِرْق اور وَرْق ہے۔ اور الکلمہ ایک طویل قصیدہ بھی ہے، اسے جوہری نے کہا ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"(جہاد کے لیے) نکلو (ہر حال میں) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے الله کی راہ میں، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم (اپنا نفع نقصان) جانتے ہو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت سفیان نے حصین بن عبدالرحمن سے انہوں نے ابو مالک غفاری سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: سورۂ براءت میں سے جو آیت سب سے اوّل نازل ہوئی وہ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ہے۔ اور ابو الضحاء نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس کے بعد اس کا اوّل اور اس کا آخر نازل ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس میں دس اقوال ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انفروا ثبات کا معنی ذکر کیا گیا ہے، متفرق جماعتوں اور دستوں کی صورت میں نکلو (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نکلو اس حال میں کہ چست ہو اور غیر چست ہو (۳) خفیف سے مراد غنی اور امیر ہے اور ثقیل سے مراد فقیر اور مفلس ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (۴) خفیف سے مراد جوان ہے اور ثقیل سے مراد بوڑھا ہے۔ یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۵) خفیف سے مراد وہ ہے جو کاروبار میں لگا ہوا ہو اور ثقیل سے مراد وہ جس کا کوئی کاروبار نہ ہو۔ یہ زید بن علی اور حکم بن عتیبہ نے کہا ہے (۶) ثقیل سے مراد وہ ہے جس کے اہل و عیال ہوں اور خفیف سے مراد وہ ہے جو عیال دار نہ ہو، یہ زید بن اسلم نے کہا ہے (۷) ثقیل وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین ہو جسے چھوڑنا وہ ناپسند کرتا ہو اور خفیف وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین نہ ہو۔ یہ ابن زید نے کہا ہے (۸) خفاف سے مراد پیدل ہیں اور ثقال سے مراد گھڑسوار ہیں۔ یہ امام اوزاعی نے کہا ہے (۹) خفاف سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ کی طرف آگے بڑھ جاتے ہیں جیسا کہ مقدمۃ الجیش وغیرہ اور ثقال سے مراد سارے کا سارا لشکر ہے (۱۰) خفیف سے مراد شجاع اور بہادر ہے اور ثقیل سے مراد بزدل ہے۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ آیت کے معنی میں صحیح یہ ہے کہ تمام لوگوں کو حکم دیا گیا ہے، یعنی نکلو تم پر حرکت کرنا سہل اور آسان ہو یا مشکل۔ روایت ہے کہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: کیا مجھ پر بھی نکلنا لازم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں" یہاں تک کہ الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ عَلَى

الْاَعْمٰى حَرَجٌ (النور:61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے)

اور یہ اقوال بلاشبہ ثقل وخفت میں مثال کے معنی کی بنا پر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لَیْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى (التوبہ:91) (نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر)

بعض نے کہا ہے: اس کے لیے ناسخ یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ (التوبہ:122) (تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی۔

اور صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مراد جوان اور بوڑھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی کا عذر نہیں سنا، پس وہ شام کی طرف نکلے اور جہاد کیا یہاں تک کہ فوت ہو گئے رضی اللہ عنہ۔

حماد نے ثابت اور علی بن زید سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے سورت براءت پڑھی پس وہ اس آیت پر پہنچے اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا تو فرمایا: اے میرے بچو! میرے لیے تیاری کرو میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ تو آپ کے بیٹوں نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، تحقیق آپ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معیت میں مصروف جہاد رہے یہاں تک کہ وہ بھی وصال فرما گئے پس اب ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ چنانچہ انہوں نے سمندر میں جہاد کیا اور سمندر میں ہی فوت ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے لیے کوئی جزیرہ نہ پایا جس میں انہیں دفن کرتے مگر سات دن گزرنے کے بعد۔ اور پھر انہوں نے آپ کو اس میں دفن کیا اور آپ میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔ (1)

علامہ طبری نے اس آدمی کی سند سے بیان کیا ہے جس نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو حمص میں صراف کے تابوت پر دیکھا اور وہ اپنے موٹا ہونے کے سبب تابوت پر بھاری تھے اور وہ جہاد کی تیاری کر رہے تھے۔ تو آپ کو عرض کی: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہمارے پاس سورۃ البعوث اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا آ چکی ہے۔ اور زہری نے کہا ہے: حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ غزوے کی طرف نکلے درآنحالیکہ آپ کی ایک آنکھ کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ آپ کو کہا گیا: بلاشبہ آپ بیمار ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر خفیف (صحت مند) اور ثقیل (بیمار) کو نکلنے کے لیے فرمایا ہے۔ پس اگر اس نے مجھے جنگ لڑنے کی قدرت نہ دی تو میں تعداد میں اضافہ کروں گا اور سامان کی حفاظت کروں گا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ بعض لوگوں نے شام کے غزوات میں ایک آدمی کو دیکھا بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے تھے، تو اس آدمی نے اسے کہا: اے چچا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھے معذور قرار دیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا: اے

1۔ طبقات ابن سعد، جلد 3، صفحہ 507

میرے بھتیجے! تحقیق ہمیں جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اس حال میں کہ ہم خفیف (جوان) ہوں یا ثقیل (بوڑھے) ہوں۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے دن کہا۔ ان کا اسم گرامی عمرو تھا: میں نابینا آدمی ہوں، تو انہوں نے جھنڈا میرے سپرد کر دیا، کیونکہ جب علمبردار شکست کھا جائے تو پورا لشکر شکست سے دوچار ہو جاتا ہے اور میں نہیں جانتا تھا کہ کون اپنی تلوار کے ساتھ میرا قصد کرے گا پس میں کھڑا رہا۔ اس دن علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا تھا اس کا بیان سورۂ آل عمران میں پہلے گزر چکا ہے۔ پس اس وجہ سے اور جو کچھ اس کی مثل صحابہ کرام اور تابعین علیہم الرضوان سے مروی ہے ہم نے کہا ہے کہ نسخ کا بیان صحیح نہیں ہے۔ اور کبھی ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام کا نکلنا واجب ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب جہاد ملک کے حصص میں سے کسی حصہ میں دشمن کے غلبہ پا لینے کے سبب یا اس کے اپنا لشکر اتار لینے کے سبب متعین ہو جائے (یعنی فرض عین ہو جائے) تو ایسے حالات میں اس ملک کے جملہ باسیوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی طرف نکلیں، کوچ کریں ہلکے ہوں یا بوجھل، جوان ہوں یا بوڑھے، ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق شریک ہوگا، جس کا باپ ہو وہ اس کی اجازت کے بغیر نکلے اور وہ بھی جس کا باپ (زندہ) نہ ہو، جو بھی خروج کی قدرت رکھتا ہے وہ پیچھے نہیں رہے گا، چاہے وہ جنگجو ہو یا تعداد میں اضافہ کرنے والا۔ اور اگر اس ملک کے باسی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں تو پھر جو ان کے قریب رہ رہے ہیں اور ان کے پڑوس اور جوار میں واقع ہیں ان پر اسی طرح خرچ لازم ہے جس طرح اس ملک کے اپنے باسیوں پر یہاں تک کہ وہ جان لیں کہ ان میں دشمن کے سامنے کھڑا ہونے اور ان کا دفاع کرنے کی طاقت آ گئی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس پر خروج لازم ہے جسے دشمن کے مقابلے میں ان کی کمزوری کا علم ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ انہیں پالے گا اور ان کے لیے ان کی مدد کرنا ممکن ہوگا تو اس پر بھی ان کی طرف نکلنا لازم ہے۔ پس مسلمان تمام کے تمام ان کے خلاف ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں جو ان کے سوا ہیں، یہاں تک کہ جب اس علاقے کے لوگ دشمن کو روکنے پر قادر ہو گئے جہاں دشمن اترا ہوا تھا تو پھر دوسروں سے وہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر دشمن دارالاسلام کے قریب آ گیا اور وہ اس میں داخل نہ ہوا تو پھر بھی اس کی طرف خروج کرنا ان پر لازم ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آ جائے، ملک بچا لیا جائے، سرحدیں محفوظ ہو جائیں اور دشمن کو ذلیل و رسوا کر لیا جائے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (1)

واجب جہاد میں دوسری قسم یہ ہے کہ امام وقت پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر سال ایک بار ایک طائفہ دشمن کی طرف بھیجے اور بذات خود ان کے ساتھ نکلے یا اسے بھیجے جس پر اسے مکمل یقین اور وثوق ہو تاکہ وہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دے اور انہیں رغبت دلائے اور ان کی اذیتوں کو روکے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ان پر کھول کر بیان کرے، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا وہ (احسان کے بدلے) جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اور جہاد میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ نفل ہے۔ اور وہ امام وقت کا یکے بعد دیگرے مختلف دستے روانہ کرنا اور غفلت و بے خبری کے اوقات میں اور فرصت کے لمحات میں سرایا بھیجنا ہے، ایسی جگہوں میں چھاؤنیاں بنا کر ان کی تاک میں رہنا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 943

جہاں سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہو اور اپنی قوت وطاقت کا اظہار کرنا ہے۔ پس اگر کہا جائے: ایک آدمی کیسے کرسکتا ہے جب بقیہ تمام کوتاہی اور غفلت برت رہے ہوں۔ تو وہ یہ ہے:

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: وہ ایک قیدی کا قصد کرسکتا ہے اور وہ اس کا فدیہ دے سکتا ہے، کیونکہ جب اس نے ایک کا فدیہ دے دیا تو اس نے ایک کے بارے میں اس سے زیادہ ذمہ داری ادا کردی جو پوری جماعت پر لازم تھی، کیونکہ اگر اغنیاء قیدیوں کا فدیہ تقسیم کرلیں تو ان میں سے ہر ایک فقط درہم سے کم ہی ادا کرے گا۔ اور وہ آدمی بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوگا اگر وہ اس پر قادر ہو ورنہ وہ لڑنے کے لیے ایک آدمی تیار کرے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی لڑنے والے کو ساز وسامان کے ساتھ تیار کیا تحقیق اس نے خود جنگ میں حصہ لیا اور جس نے خیر اور بھلائی کے ساتھ اس کے گھر والوں کی خبر گیری اور دیکھ بھال کی تحقیق وہ بھی جنگ میں شریک ہوا'' (1)۔ اسے الصحیح نے نقل کیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ اس کا مکان اسے مستغنی نہیں کرسکتا اور اس کا مال اس کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ روایت ہے کہ کسی بادشاہ نے کافروں کے ساتھ معاہدہ کیا اس شرط پر کہ وہ کسی کو قیدی بنا کر محبوس نہیں کریں گے، پھر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی ان کے کسی شہر میں گیا اور اس کا گزر ایک بند گھر کے پاس سے ہوا، تو اسے ایک عورت نے آواز دی: میں قیدی ہوں، تو اپنے امیر تک میری خبر پہنچا دینا۔ پس جب وہ اس (امیر) سے ملا اور اسے اپنے پاس کھانے کی دعوت دی اور دونوں باتوں کے ضمن میں کش مکش کرنے لگے، تو اس نے بالآخر اس قیدی عورت کی خبر اس تک پہنچائی، ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ امیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور بالفور لڑنے کے لیے نکل پڑا اور سرحد کی طرف پیدل چل کر گیا یہاں تک کہ اس قیدی عورت کو نکال لایا اور اس جگہ کو اپنی ولایت میں لے لیا۔ رضی اللہ عنہ۔

اسے علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: تحقیق 527ھ میں دشمن ہماری طرف آنکلا (اللہ اسے ہلاک و برباد کرے) اور لوٹ مار کے لیے ہمارے گھروں میں آگھسا، اس نے ہمارے شرفاء کو قیدی بنا لیا اور وہ ہمارے شہروں میں اتنی تعداد میں داخل ہوا جس نے لوگوں کو خوفزدہ کردیا اور وہ تعداد بہت زیادہ اور کثیر تھی اگرچہ وہ اس حد کو نہ پہنچے جو انہوں نے بیان کی۔ تو میں نے والی اور مولی علیہ کو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تحقیق یہ جال اور پھندے میں آچکا ہے، پس چاہیے کہ تمہارے پاس برکت ہو اور چاہیے کہ تم سے دین کی مدد ونصرت کا اظہار ہو تم پر حرکت کرنا (نکلنا) فرض عین ہو چکا ہے، پس چاہیے کہ اس کی طرف مقابلے کے لیے تمام لوگ نکلیں یہاں تک کہ تمام اطراف میں لوگوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے اور اس کا گھیراؤ کرلیا جائے، کیونکہ یہ لامحالہ ہلاک ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے سبب خوش کرنا ہے۔ پس گناہ غالب آگئے اور دل گناہوں کے سبب کانپ گئے اور لوگوں میں سے ہر کوئی لومڑ کی مثل ہوگیا جو اپنی بل میں پناہ لیتا ہے اگرچہ وہ اپنے پڑوس میں فریب اور جال دیکھ بھی لے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ، وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ (2)

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَ جَاهِدُوْا یہ جہاد کے بارے حکم ہے اور یہ امر الجھد سے مشتق ہے۔ بِاَمْوَالِكُمْ وَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 944 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 943

اَنۡفُسِكُمۡ ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مشرکوں کے ساتھ اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ساتھ جہاد کرو''۔ اور یہ وصف ہے جو جہاد کو کامل بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے نفع بخش بناتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کمال اوصاف پر برانگیختہ کیا اور ذکر میں مال کو اس لیے مقدم کیا، کیونکہ یہ جہاد کی تیاری میں پہلے خرچ ہونے والا ہے، لہٰذا امر کو اسی طرح مرتب کیا جیسے وہ فی نفسہ ہے۔ (1)

لَوۡ كَانَ عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡكَ وَلٰـكِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَكُمۡ ۚ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾

''اگر ہوتا وہ مال نزدیک یا سفر آسان تو ضرور پیچھے چلتے آپ کے لیکن دور معلوم ہوتی ہے انہیں مسافت۔
اور ابھی قسم کھائیں گے اللہ کی (اور کہیں گے) کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور نکلتے تمہارے ساتھ،
ہلاک کر رہے ہیں اپنے آپ کو اور اللہ جانتا ہے کہ وہ قطعاً جھوٹے ہیں''۔

جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے قوم کا نفاق ظاہر کر دیا۔ العرض سے مراد وہ جو منافع دنیا میں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: اگر مال غنیمت قریب ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے خبر دی ہے کہ اگر انہیں مال غنیمت کی طرف بلایا جاتا تو وہ ضرور اس کی اتباع کرتے۔

عَرَضًا یہ کان کی خبر ہے۔ قَرِيۡبًا یہ اس کی صفت ہے۔ وَّسَفَرًا قَاصِدًا یہ اس پر معطوف ہے۔ اور کان کا اسم محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: لو كان المدعو اليه عرضا قريبا و سفرا قاصدا لاتبعوك (اگر وہ جس کی طرف دعوت دی گئی ہے وہ قریب ترین مال غنیمت ہوتا اور سفر آسان ہوتا جس کے راستے معلوم ہوتے تو وہ ضرور آپ کے پیچھے چلتے) یہ اشارہ منافقین کے لیے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ وہ فی الجملہ ان لوگوں میں داخل ہیں جنہیں جہاد کے لیے نکلنے کا خطاب کیا گیا ہے اور یہ کلام عرب میں موجود ہے، وہ جملہ کا ذکر کرتے ہیں پھر وہ ضمیر لاتے ہیں جو ان میں سے بعض کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: وَ اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا) کہ اس ہاء سے مراد قیامت ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا ﴿﴾ (مریم) (پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ نے ھا ضمیر سے مراد جہنم لی ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس آیت کی نظیر سنت میں بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو يعلم أحدهم إنه يجد عظما سمينا أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء (اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو نرم گوشت والی بوٹیاں پالے گا تو وہ ضرور عشاء کی نماز میں حاضر ہو) آپ فرما رہے ہیں: اگر ان میں سے کوئی جانتا کہ وہ کسی شے کو موجود اور جلدی پالے گا تو وہ یقیناً اس کی وجہ

1۔ المحرر الوجیز

سے مسجد میں آئے۔ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ابوعبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے: الشقه سے مراد دور دراز زمین کی طرف سفر کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: منه شقه شاقة (یہاں سے سفر مشقت آمیز ہے) اور اس سے مراد غزوۂ تبوک ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ شُقه اور شِقه کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الشقه ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد ہے کپڑوں کی پھٹن۔ اور الشقه کا معنی دور دراز کا سفر بھی ہے اور بسا اوقات انہوں نے اسے کسرہ کے ساتھ الشقة بھی کہا ہے۔ اور الشققوہ پھٹن ہے جو تختی یا لکڑی میں پائی جاتی ہے۔ اور غصے والے آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: احتد فطارت منه شقة (وہ غضبناک ہوا پس اس سے مشقت دور ہو گئی۔)

وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا یعنی اگر ہمارے لیے سواری اور مال کی وسعت ہوتی۔ لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: 97) (اور الله کے لیے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی) حضور نبی مکرم ﷺ نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: مراد "زاد راہ اور سواری ہے" اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یعنی وہ جھوٹ اور نفاق کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اور الله تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس علت اور سبب کے بیان میں قطعاً جھوٹے ہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۞

"درگزر فرمایا ہے الله نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپ پر وہ لوگ جنہوں نے سچ کہا اور آپ جان لیتے جھوٹوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ افتتاح کلام ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصلحك الله و أعزك و رحمك (الله تعالیٰ نے تیری اصلاح فرما دی، تجھے عزت عطا فرما دی اور تجھ پر رحم فرمایا) یہ بھی اسی طرح کا جملہ ہے۔ اس تاویل کی بنا پر اس قول عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا ہے۔ اسے مکی، مہدوی اور نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور الله تعالیٰ نے آپ کو ذنب سے قبل عفو کی خبر دی ہے تاکہ آپ کا قلب اطہر کسی خوف و اضطراب میں واقع نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے الله تعالیٰ نے آپ سے درگزر فرمایا ہے آپ کے اس ذنب کے بارے میں جو آپ کے انہیں اجازت دینے کی صورت میں صادر ہوا۔ تو اس تقدیر پر عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا نہیں (عفا الله عنك ما كان من ذنبك في أن أذنت لهم) اسے مہدوی نے بیان کیا ہے اور اسے نحاس نے اختیار کیا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اذن (اجازت دینے) کے بارے دو قول ہیں (۱) آپ نے انہیں اپنے ساتھ نکلنے کی کیوں اجازت دے دی تھی، حالانکہ بغیر تیاری اور سچی نیت کے بغیر ان کے نکلنے میں فساد ہے (۲) آپ نے انہیں بیٹھے رہنے کی اجازت کیوں دے دی تھی جب انہوں نے طرح طرح کے عذر پیش کیے، ان دونوں کو علامہ قشیری نے بیان کیا ہے، فرمایا: یہ لطف بھرا عتاب ہے۔ کیونکہ پہلے فرما دیا: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے اس بارے میں وحی نازل ہوئے بغیر ہی اجازت عطا فرما دی تھی۔ حضرت قتادہ اور عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ نے

کہا ہے: دو کام ہیں جو حضور نبی مکرم ﷺ نے کیے درآنحالیکہ آپ کو ان کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ایک آپ ﷺ کا منافقین کی جماعت کو اپنے سے پیچھے رہنے کے بارے میں اجازت دینا، حالانکہ اس کے بارے وحی کے ذریعہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور دوسرا آپ ﷺ کا قیدیوں کا فدیہ لینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عتاب فرمایا جیسا کہ تم سن رہے ہو۔ بعض علماء نے کہا ہے: آپ ﷺ سے ترک اولیٰ صادر ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے عفو و درگزر کا ذکر اس خطاب سے مقدم کیا جو عتاب کی صورت میں فرمایا۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِیْنَ تاکہ آپ کے لیے ظاہر ہو جاتے وہ جنہوں نے سچ بولا ان سے جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت منافقین کو نہ پہچانتے تھے، بلاشبہ آپ ﷺ نے انہیں سورۃ التوبہ نازل ہونے کے بعد پہچانا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے کہا: ہم (پیچھے) بیٹھے رہنے کی اجازت طلب کریں، پس اگر آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی تو ہم بیٹھ رہیں گے اور اگر آپ نے ہمیں اجازت نہ دی تو بھی ہم بیٹھ رہیں گے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت سورۃ النور کی اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (النور: 62) (پس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لیے، تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں) اسے نحاس نے معانی القرآن میں ذکر کیا ہے۔

لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ۝ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ۝

''نہ اجازت مانگیں گے آپ سے جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر کہ نہ (جہاد) کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ صرف وہی اجازت مانگتے ہیں آپ سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر اور شک میں مبتلا ہیں ان کے دل تو وہ شک میں ڈانواں ڈول ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی وہ بیٹھنے کے بارے میں اجازت نہیں مانگیں گے اور نہ خروج کے بارے میں، بلکہ جب آپ انہیں کسی شے کے بارے حکم دیں گے تو وہ فوراً اسے بجالائیں گے، تو گویا اس وقت بغیر عذر کے اجازت مانگنا نفاق کی علامات میں سے تھا۔ اسی لیے فرمایا: اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اسے اس آیت نے منسوخ کیا ہے جو سورۃ النور میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ...... تا قولہ......

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾ (النور)۔

اَنْ یُّجَاهِدُوْا یہ فی کو مضمر کرنے کے سبب محل نصب میں ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر عبارت یہ ہے کراھیۃ ان یجاھدوا (جہاد کرنے کو ناپسند کرتے ہوئے) جیسا کہ یہ ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء:176) صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ) وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ اور ان کے دلوں نے دین میں شک کیا ہے۔ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ یعنی وہ اپنے شک میں ہی جا رہے ہیں اور لوٹ رہے ہیں (یعنی ڈانواں ڈول ہیں)

وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر انہوں نے ارادہ کیا ہوتا (جہاد پر) نکلنے کا انہوں نے تیار کیا ہوتا اس کے لیے کچھ سامان لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑے ہونے کو اس لیے پست ہمت کر دیا اور کہہ دیا گیا تم بیٹھے رہو بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً یعنی اگر انہوں نے جہاد کا ارادہ کیا ہوتا تو وہ سامان سفر ضرور تیار کرتے۔ پس ان کا تیاری کو ترک کرنا ہی ان کے پیچھے رہنے کے ارادہ پر دلیل ہے۔

وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ لیکن ان کے آپ کے ساتھ نکلنے کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا۔ فَثَبَّطَهُمْ اس لیے اس نے انہیں آپ سے روک دیا اور انہیں رسوا کر دیا، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر آپ نے ہمیں بیٹھے رہنے کی اجازت نہ دی تو ہم فساد برپا کریں گے اور ہم مومنین کے خلاف (لوگوں کو) اکسائیں گے، برانگیختہ کریں گے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کے بعد اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو بجز فساد کے تم میں کچھ اضافہ نہ کرتے۔ وَ قِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ یہ اس قول میں سے ہے جو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں سے ہے۔ اور یہی وہ اجازت ہے جو آپ نے انہیں دی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

کہا گیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کی حالت میں انہیں یہ فرمایا اور انہوں نے اس کے ظاہر الفاظ کو پکڑ لیا اور کہنے لگے: تحقیق آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خذلان اور رسوائی سے عبارت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں بیٹھے رہنے کا تصور ڈال دیا۔ اور مَعَ الْقٰعِدِیْنَ کا معنی ہے یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو تکلیف زدہ، اندھے، اپاہج، عورتیں اور بچے ہیں تم بیٹھے رہو۔

لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾

"اگر نکلتے تمہارے (لشکر) میں تو نہ زیادہ کرتے تم میں بجز فساد کے اور دوڑ دھوپ کر کے تمہارے درمیان فتنہ پردازی کرتے۔ اور تم میں ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا یہ مومنوں کو تسلی دی جارہی ہے اس بارے میں کہ منافق ان سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور الخبال سے مراد فساد برپا کرنا، چغل خوری کرنا، اختلاف پیدا کرنا اور جھوٹی خبریں اڑانا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے، ای ماز اد و کم قوة ولکن طلبوا الخبال (یعنی وہ تمہاری قوت اور طاقت میں اضافہ نہ کرتے بلکہ وہ فساد اور اختلاف پیدا کرتے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے اس میں اضافہ نہ کرتے سوائے فساد کے جس بارے میں وہ رائے کے اعتبار سے ڈانواں ڈول ہیں۔ تو اس صورت میں یہ استثنا منقطع نہ ہوگا۔ لا یزید ونکم فیما یترددون (فیہ) من الرأی إلا خبالا۔

قولہ تعالیٰ: وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ اس کا معنی ہے کہ وہ بڑی تگ و دو اور محنت کے ساتھ تمہارے درمیان فساد برپا کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ راجز نے کہا ہے:

یا لیتنی فیها جَذَع أَخُبُّ فیها وَأَضَعُ

کہا جاتا ہے: وَضَعَ البعیر جب اونٹ دوڑنے لگے یضع وضعا و ضوعا جب چال زیادہ تیز ہو۔ اور أوضعته اس کا معنی ہے میں نے اسے دوڑنے پر ابھارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الایضاع سے مراد ایسی چال ہے جو دوڑ کی چال کی مثل ہو۔ اور الخلل کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان شگاف کا ہونا، اس کی جمع الخلال ہے، مراد وہ شگاف ہیں جو صفوں کے درمیان ہوتے ہیں، یعنی وہ فساد برپا کر کے اور چغل خوری کے ذریعے تمہارے درمیان خلل اور دراڑیں ڈالنے کی کوشش کرتے۔ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے فتنہ تلاش کرتے، یعنی فساد برپا کر کے اور (فساد پر) اکسا کر۔ اور کہا جاتا ہے: أبغیته کذا میں نے اس کی طلب اور تلاش میں اس کی مدد کی اور بغیته کذا میں نے اسے اس کے لیے تلاش کیا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے۔

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ اور تم میں ان کے جاسوس ہیں جو ان کی طرف تمہاری خبریں پہنچاتے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور تم میں وہ لوگ ہیں جو ان کی بات قبول کرتے ہیں اور ان کی اطاعت و پیروی کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: پہلا قول زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ دونوں معنوں میں سے غالب معنی یہ ہے کہ سماع کا معنی ہے وہ کلام کو سنتا ہے۔ اور اسی کی مثل سماعون للکذب بھی ہے اور دوسرا قول اس میں فقط سامع کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ قائل۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

"(اے حبیب!) وہ کوشاں رہے فتنہ انگیزی میں پہلے بھی اور الٹ پلٹ کرتے تھے آپ کے لیے تجویزیں یہاں تک کہ آ گیا حق اور غالب ہوا اللہ کا حکم اور وہ ناخوش تھے"۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ یعنی انہوں نے فساد برپا کرنے اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش اور تگ ودو کی اس سے پہلے کہ ان کا معاملہ ظاہر ہوا اور اس کے بارے وحی نازل ہو جسے انہوں نے مخفی اور پوشیدہ رکھا اور اس کے بارے جو وہ عنقریب کریں گے۔ ابن جریج نے کہا ہے: مراد منافقین کے بارہ آدمی ہیں، وہ عقبہ کی رات ثنیۃ الوداع پر ٹھہرے تاکہ (نعوذ باللہ) وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ یعنی جو دین آپ لے کر آئے ہیں اس کو باطل کرنے کے بارے میں اپنی آراء اور تجاویز کو بدلتے رہتے تھے اور گھماتے رہتے تھے

حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ یعنی حق آ گیا اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو گیا۔ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (اور وہ ناخوش تھے)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰

''اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: اجازت دیجئے مجھے (کہ گھر ٹھہرا رہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، خبردار فتنہ میں تو وہ گر چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔ پہنچے آپ کو کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے آپ کو کوئی مصیبت تو کہیں گے کہ ہم نے درست کر لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ یہ أذن یأذن سے ہے۔ اور جب امر بنایا گیا تو اس میں ہمزہ مکسور زائد کیا گیا اور اس کے بعد ایک ہمزہ ہے جو فعل کا فاکلمہ ہے اور دو ہمزے جمع نہیں ہو سکتے۔ پس دوسرے کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا تو تو نے ایذن کہا۔ اور جب یہ وصل کلام میں ہو تو دو ہمزوں کے جمع ہونے کی علت ساقط اور زائل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ یا پھر ہمزہ ہوئی۔ اور تو نے یہ پڑھا: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ۔

ورش نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے: ومنهم من يقول أوذن لي انہوں نے ہمزہ کو مخفف کیا ہے (یعنی اس کا ماقبل لام مضموم ہونے کی وجہ سے اسے واؤ سے بدل دیا ہے) نحاس نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ایذن لفلان ثم ایذن له پہلے اور دوسرے کے ہجے لکھنے میں ذال سے پہلے الف اور یا کے ساتھ ایک ہیں۔ اور اگر تو کہے: ایذن لفلان و أذن لغیرہ اس میں دوسرا بغیر یا کے ہے اور اسی طرح فاکلمہ بھی ہے۔ اور ثم اور واؤ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ثم پر وقف کیا جاتا ہے اور کلام منفصل ہو جاتی ہے اور واؤ اور فا ان دونوں پر وقف نہیں کیا جاتا اور نہ یہ دونوں جدا ہو سکتے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو بنی مسلمہ کے بھائی جد بن قیس کو فرمایا: ''اے جد! کیا تیرے لیے بنی الاصفر کی اونٹنیوں میں رغبت ہے تو ان سے لونڈیاں اور خدمت گار غلام بھی پالے گا''۔ تو جد نے کہا: میری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں کا دلدادہ ہوں اور بلاشبہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے بنی الاصفر کو دیکھ لیا تو پھر میں ان سے صبر نہیں کر سکوں گا، اس لیے آپ مجھے آزمائش اور فتنہ میں نہ ڈالیے اور مجھے گھر پر ہی بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور میں آپ کے

ساتھ مالی تعاون کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض فرما لیا اور فرمایا: ''تیرے لیے اجازت ہے''۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، یعنی آپ مجھے ان کے چہروں کی چمک اور خوبصورتی کے ساتھ فتنہ میں نہ ڈالیے۔ اور اس کا سبب نفاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اصفر حبشہ میں رہنے والا ایک آدمی تھا اس کی بیٹیاں تھیں ان کے وقت میں ان سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا اور اس کی رہائش بلاد روم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ حبشہ والے روم پر غالب آگئے اور ان کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں پس انہوں نے روم کی سفیدی اور حبشہ کی سیاہی اپنے اندر سمو لی نتیجۃً وہ سیاہی مائل سرخ رنگ کی ہوگئیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن اسحاق کے قول میں فتور اور کمزوری ہے۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جہاد کرو تم بنات اصفر کو غنیمت میں پاؤ گے''۔ تو جد نے آپ کو کہا: آپ ہمیں اجازت عطا فرما دیجئے اور عورتوں کے ساتھ ہمیں فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے۔ یہ (قول) پہلے کے سوا اور سے نکالا گیا ہے اور یہ نفاق اور عداوت کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سلمہ کو کہا...... اور جد بن قیس ان میں سے تھا: ''اے بنی سلمہ! تمہارا سردار کون ہے؟'' انہوں نے کہا: جد بن قیس، مگر وہ بخیل اور بزدل ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کون سا عیب ہے جو بخل سے بڑھ کر قبیح ہو بلکہ تمہارا سردار خوبرو نوجوان بشر بن براء بن معرور ہے''۔ پس حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں فرمایا:

و سوّد بشر بن البراء لجوده     وحق لبشر بن البراء أن يُسَوَّدَا

إذا ما أتاه الوفد أذهب ماله     وقال خذوه إنني عائد غدا

**اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا** یعنی وہ گناہ اور معصیت میں واقع ہو چکے۔ اور وہ نفاق اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنا ہے۔

**وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ** یعنی بلاشبہ ان کا سفر جہنم کی آگ کی طرف ہے اور وہ انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔

قولہ تعالیٰ: **اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ** یہ شرط و جزا ہے اور اسی طرح **وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا** اس پر معطوف ہے۔ اور الحسنة سے مراد غنیمت اور کامیابی ہے۔ اور المصيبة سے مراد شکست اور پسپائی ہے۔ اور ان کے اس قول: **اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ** کا معنی ہے ہم نے اپنے نفسوں کے بارے احتیاط برتی ہے اور ہم نے انتہائی حزم و احتیاط کو لازم پکڑا ہے لہٰذا ہم قتال کی طرف نہیں نکلے۔ **وَ يَتَوَلَّوْا** اور وہ ایمان سے پیٹھ پھر لیتے ہیں۔ **وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ** درآنحالیکہ وہ اس پر اتراتے اور اظہار فخر کرتے ہیں۔

**قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝**

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایئے ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف بجز اس کے جو لکھ دی ہے اللہ نے ہمارے لیے وہی ہمارا حامی و ناصر ہے اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے مومنوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا** کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جس کے بارے اس نے ہمیں اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ میں کون ہوں یا تو ہم کامیاب ہوں گے پس

کامیابی و کامرانی ہمارے لیے اچھی ہوگی اور یا ہم شہید کر دیئے جائیں گے تو شہادت ہمارے لیے بہت عظیم نیکی اور سعادت ہوگی، چنانچہ معنی یہ ہے ہر شے قضا و قدر کے مطابق ہے۔ سورۂ اعراف میں پہلے یہ گزر چکا ہے کہ علم، قدر اور کتاب سب برابر اور یکساں ہیں۔ ھُوَ مَوْلٰىنَا یعنی وہ ہمارا حامی اور ناصر ہے۔ اور توکل سے مراد اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور جمہور کی قراءت میں یصیبنا، لن کے سبب منصوب ہے۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ بعض عرب اس کے ساتھ جزم دیتے ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے ھل یصیبنا پڑھا ہے۔ اور رے کے قاضی اعین کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَّآ نون مشددہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ غلطی ہے، کیونکہ نون کے ساتھ اسے مؤکد نہیں کیا جاتا جو خبر ہو اور اگر یہ طلحہ کی قراءت میں ہوتا تو جائز ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ یُذْهِبَنَّ كَیْدُهٗ مَا یَغِیْظُ ﴿۱۵﴾ (الحج) (آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو) (1)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَیَیْنِ ؕ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ یُّصِیْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَیْدِیْنَا ۖ٘ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

"فرمایئے کیا تم منتظر ہو ہمارے متعلق (کہ ہم مارے جائیں، یہ مرنا نہیں) مگر ایک بھلائی ان دو بھلائیوں سے (جن کے ہم خواہاں ہیں) اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے لیے کہ پہنچائے تمہیں اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ کوفی لام کو تا میں ادغام کرتے ہیں، پس جہاں تک لام المعرفہ کا تعلق ہے تو اس میں ادغام کے سوا کچھ جائز نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: التائبون کیونکہ ان (عربوں) کے کلام میں لام معرفۃ کا استعمال کثیر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: قل تعالوا میں ادغام جائز نہیں، کیونکہ اس میں قل معتل ہے، لہٰذا اس میں دو تعلیلیں جمع نہیں ہو سکتیں اور التربص کا معنی انتظار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: تربص بالطعام یعنی تو اناج کا انتظار کر اس کے مہنگا ہونے کے وقت تک۔ اور الحسنی، الاحسن کی تانیث ہے۔ اور حسنیین کا واحد حسنیٰ ہے اور جمع الحسن ہے۔ اور اسے فقط معرف باللام بولنا جائز ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا: رأیت امرأۃ حسنی، اور الحسنیین سے مراد غنیمت اور شہادت ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ سے منقول ہے۔ اس میں لفظ استفہام موجود ہے اور وہ زجر و توبیخ کے معنی کے لیے ہے۔ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ یُّصِیْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ یعنی اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایسی سزا اور عذاب دے جو تمہیں ہلاک و تباہ کر دے، جیسا کہ اس نے تم سے پہلے امم ماضیہ کو پہنچایا۔ اَوْ بِاَیْدِیْنَا یعنی وہ ہمیں تمہارے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرما دے۔ فَتَرَبَّصُوْۤا یہ تہدید (جھڑک) اور وعید ہے یعنی تم شیطان کے وعدوں کا انتظار کرو بے شک ہم تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے منتظر ہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ یُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۳﴾

"فرمایئے خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تم سے، بے شک تم ایک نافرمان قوم تھے"۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 219

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت جد بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جب اس نے یہ کہا: مجھے گھر بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور یہ میرا مال ہے میں اس کے ساتھ آپ کی اعانت کروں گا۔ اور اَنْفِقُوْا کا لفظ امر ہے اور اس کا معنی شرط اور جزا ہے۔ عرب اسی طرح اس معنی میں استعمال کرتے ہیں، وہ او کے ساتھ لاتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أسيئى بنا أو أحسنى لا ملومةٌ لدينا ولا مَقْلِيَّةٌ إن تَقَلَّتِ

اور اس کا معنی ہے إن أساتِ أو أحسنتِ فنحن على ما تعرفين (اگر تو نے گناہ کیا یا نیکی کی پس ہم اسی حال پر ہیں جس پر تو جانتی ہیں) اور آیت کا معنی ہے: إن أنفقتم طائعين أو مكرهين فلن يقبل منكم (اگر تم خرچ کرو گے خوشی سے یا نا خوشی سے وہ ہرگز تم سے قبول نہیں کیا جائے گا) پھر اللہ تعالیٰ نے وضاحت بیان فرمائی کہ ان سے کیوں نہیں قبول کیا جائے گا؟ تو ارشاد فرمایا: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ (اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ) پس اس بارے میں واضح ترین دلیل یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافر کے افعال جب نیکی اور خیر کے ہوں مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ ان پر ثواب نہیں دیا جائے گا اور نہ آخرت میں اسے ان سے کوئی نفع حاصل ہو گا، مگر یہ کہ دنیا میں ان کے عوض اسے رزق اور نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے آپ فرماتی ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا، تو کیا وہ اسے کوئی نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اسے نفع نہیں دے گا، بے شک اس نے ایک دن بھی نہیں کہا: اے میرے رب! قیامت کے دن میرے گناہوں کی مغفرت فرما دے''۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کسی مومن پر ظلم نہیں کرے گا اس کی نیکی کا اجر اسے دنیا میں بھی عطا فرمایا جائے گا اور آخرت میں بھی اس کے بدلے اسے جزا دی جائے گی۔ اور رہا کافر تو دنیا میں اس نے جو نیک اعمال کیے ان کے بدلے دنیا میں اسے اجر عطا کیا جاتا ہے مگر جب وہ آخرت میں جا پہنچے گا تو اس کے لیے کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے'' اور یہ نص ہے۔

پھر کہا گیا ہے: کیا اس سچے وعدہ کے حکم کے مطابق ضروری ہے کہ وہ کافر کو عطا کرے اور دنیا میں اس کی نیکیوں کا بدلہ اسے دے یا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مقید ہے جس کا ذکر اس ارشاد میں کیا گیا ہے: عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء: 18) (ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں)۔ دونوں قولوں میں سے یہی صحیح ہے، واللہ اعلم۔

کافر سے صادر ہونے والے عمل کو نیکی کا نام دینا بلاشبہ یہ کافر کے ظن اور گمان کے مطابق ہے ورنہ اس سے قربت کا حاصل ہونا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ شرط جو اسے صحیح قرار دیتی ہے وہ موجود نہیں ہے اور وہ ایمان ہے۔ یا پھر اسے حسنہ (نیکی) کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہ صورۃً اور ظاہراً مومن کی نیکی کے مشابہ ہوتی ہے اس میں بھی دو قول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ پس اگر کہا جائے: امام مسلم نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا ان امور کے بارے کیا خیال ہے جو عبادت، صدقہ، غلام کو آزاد کرنے یا صلہ رحمی وغیرہ میں زمانہ جاہلیت میں کرتا تھا کیا ان کا اجر ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان پر ہی اسلام لایا ہے جو تو نے ماضی میں خیر کے اعمال کیے''۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: أسلمتَ علی ما أسلفتَ من خیرٍ اس کا ظاہر اصول کے خلاف ہے، کیونکہ کافر کو اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کی طاعت و عبادت پر ثواب ہو جائے، کیونکہ قرب حاصل کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ اسے پہچانتا ہو جس کے وہ قریب ہو رہا ہے، پس جب شرط معدوم ہوگئی تو مشروط کے صحیح ہونے کی بھی نفی ہوگئی۔ پس حدیث میں معنی یہ ہے: بے شک تو نے جاہلیت میں حسین و جمیل مزاج اور طبیعت بنائی تو اسی اچھی اور خوبصورت عادت نے تجھے اسلام میں پہنچا دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت حکیم رضی اللہ عنہ ایک سو بیس برس تک زندہ رہے، ساٹھ سال اسلام میں اور ساٹھ سال جاہلیت کی حالت میں رہے۔ پس آپ نے جاہلیت میں ایک سو غلام آزاد کیے اور سو اونٹوں پر سوار کیا؟ اور اسی طرح آپ نے اسلام میں بھی کیا اور یہ بالکل واضح ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے اس فعل پر ثواب عطا فرمائے جو اس نے اسلام کے سبب کیا، جیسا کہ وہ اس سے ان گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے جن کا ارتکاب اس نے حالت کفر میں کیا۔ اور بلاشبہ اسے اجر و ثواب نہیں دیا جائے گا جو نہ اسلام لایا، نہ اس نے توبہ کی اور حالت کفر میں ہی مر گیا۔ اور یہ حدیث کا ظاہر معنی ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نیکی اور خیر کا جو عمل وہ کرتا ہے اس پر ثواب نہ ہونے کا سبب ایمان کی شرط کا نہ پایا جانا نہیں ہے، پھر وہ اسلام لایا اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہی فوت ہوا شرط عقلی کے مطابق وہ تبدیل نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع کردے جب کہ اس کا اسلام حسین ہو۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جود و عطا اور کرم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع نہ کرے جب کہ اس کا اسلام حسین اور خوبصورت ہو) حربی نے حدیث کی اس معنی پر تاویل کی ہے اور کہا ہے: أسلمتَ علی ما اسلفتَ یعنی تو نے جو پہلے نیکی اور خیر کے اعمال کیے ہیں پس وہ تیرے لیے ہی ہیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أسلمتَ علی ألف درهم تو اسلام لایا ہزار درہم کی شرط پر یعنی اس شرط پر کہ اس نے اپنے لیے انہیں محفوظ کرلیا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ پس اگر کہا جائے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کی مدد و نصرت کرتے تھے، تو کیا اس کا انہیں کوئی نفع اور فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، میں نے انہیں آگ کی شدت اور سختی میں پایا تو میں نے انہیں تھوڑی آگ کی طرف نکال دیا''۔ آپ کو عرض کی گئی: بعید نہیں ہے کہ وہ کافر سے اس کے عمل خیر کے بدلے عذاب میں

تخفیف کر دے، لیکن شفاعت ملنے اور حاصل ہونے کے ساتھ جیسا کہ ابو طالب کے بارے میں آیا ہے، لیکن رہا اس کے بغیر تو قرآن کریم نے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ﴿﴾ (المدثر) (پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت) اور کافروں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ﴿﴾ وَ لَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ﴿﴾ (الشعراء) (تو (آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی اور نہ کوئی غم خوار دوست)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے چچا حضرت ابو طالب کا ذکر کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا: ''شاید قیامت کے دن میری شفاعت انہیں فائدہ اور نفع دے گی پس انہیں تھوڑی سی آگ میں رکھا جائے گا جو ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس سے ان کا دماغ کھول جائے گا''۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے درک اسفل میں ہوتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ اس میں فاسقین سے مراد کافرین ہیں۔

**وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾**

''اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور نہیں آتے نماز ادا کرنے کے لیے مگر سست سست اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ اس میں پہلا اَنْ محل نصب میں ہے اور دوسرا محل رفع میں ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اور انہیں نہیں منع کیا ہے کہ ان کے اخراجات ان سے قبول کیے جائیں سوائے ان کے کفر کے۔ اور کوفیوں نے اَنْ یقبل منھم یا کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ نفقات اور انفاق دونوں ایک ہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اگر وہ جماعت کے ساتھ ہو تو نماز پڑھے اور اگر منفرد ہو تو نماز نہ پڑھے اور یہی وہ ہے جو نماز پر کسی اجر و ثواب کی امید نہیں رکھتا اور وہ اسے ترک کرنے میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتا نہیں ہے، پس نفاق بالیقین عبادت میں سستی کا وارث بنا دیتا ہے۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے اور وہاں ہم نے حضرت علاء کی حدیث مکمل طور پر ذکر کر دی ہے۔ والحمدللہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ کیونکہ وہ اسے ایک جرمانہ اور چٹی شمار کرتے ہیں۔ اور اسے غنیمت جان کر روک کر رکھتے ہیں۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو وہ قبول نہیں اور نہ ہی کوئی اس پر اجر و ثواب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝

''سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں''۔

یعنی آپ اسے اچھا نہ سمجھیں جو ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اور نہ آپ اس کی طرف مائل ہوں کیونکہ وہ استدراج ہے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے زکوٰۃ نکالنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور معنی یہ ہے پس دنیوی زندگی میں ان کے مال اور ان کی اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں۔ یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں آخرت میں ان کے ساتھ عذاب دے۔ اور یہ اکثر اہل العربیہ کا قول ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انہیں ان تمام میں تگ و دو اور مشقت کرنے کے سبب عذاب دے۔ اور اس تاویل اور حضرت حسن کے قول کی بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور یہ حسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس ان کے مال تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں اور نہ ان کی اولاد یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں ان کے ساتھ دنیا میں عذاب دے کیونکہ وہ منافق ہیں۔ چونکہ وہ ناخوش ہو کر خرچ کرتے ہیں پس وہ ان کے سبب عذاب دیئے جائیں گے جو وہ خرچ کرتے ہیں (1)۔ وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یہ اس بارے میں نص ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ مریں اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اس کے بارے پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ بیان فرمایا کہ منافقین کے اخلاف میں سے یہ قسم اٹھانا ہے کہ وہ مومن ہیں اس کی نظیر یہ آیت ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ الآیہ (المنافقون: 1) ((اے نبی مکرم!) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں) الفرق کا معنی خوف ہے، یعنی وہ ڈرتے ہیں وہ نظریہ ظاہر کرنے سے جس پر وہ ہیں کہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝

''اگر مل جائے انہیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو (دیکھیے گا) وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اسی طرح اس پر وقف ہے۔ اور لکھنے میں دو الف ہیں: پہلا ہمزہ ہے اور دوسرا تنوین کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 218

عوض ہے۔ اور اسی طرح رایت جزا ہے۔ اور ملجا کا معنی قلعہ ہے۔ یہ حضرت قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی پناہ گاہ ہے۔ اور یہ دونوں معنی برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: لجات إلیه لجاء و ملجا اور التجات الیه (میں نے اسی کی طرف پناہ لی) یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اور وہ جگہ بھی لجا و ملجا کہلاتی ہے۔ اور التلجئة کا معنی اکراہ، مجبور کرنا ہے۔ اور ألجاته إلی الشیٔ کا معنی ہے (میں نے اسے اس کی طرف مجبور کر دیا) اور ألجات أمری إلی الله میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اور عمرو بن لجا تیمی شاعر ہے اور یہ جوہری سے منقول ہے۔

**أَوْ مَغٰرٰتٍ** یہ مغارۃ کی جمع ہے اور یہ غار یغیر سے ماخوذ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ أغار یغیر سے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الحمد لله مُمسانا و مُصْبَحَنَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المغارات سے مراد غاریں اور تہہ خانے ہیں اور یہ وہ جگہیں ہیں جن میں چھپا جا سکتا ہے۔ اور اسی سے غار الماء اور غارت العین (پانی نیچے اتر گیا) ہے۔

**أَوْ مُدَّخَلًا** یہ مفتعل کے وزن پر ہے اور دخول سے بنایا گیا ہے، مراد ایسا راستہ ہے جس میں داخل ہونے کے ساتھ ہم چھپ جاتے ہیں۔ اور لفظ مختلف ہونے کی وجہ سے اس کا اعادہ کیا (کیونکہ مفہوم تو دونوں لفظوں کا ایک ہے) نحاس نے کہا ہے: اس میں اصل مدتخل ہے، تا کو دال سے بدلا گیا ہے۔ کیونکہ دال حروف مجہورہ میں سے ہے اور تا مہموسہ میں سے اور یہ دونوں ایک مخرج سے ادا ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں اصل متدخل بروزن متفعل ہے، جیسا کہ حضرت ابی کی قراءت میں ہے: أو متدخلا اور اس کا معنی ہے دخول بعد دخول (یکے بعد دیگرے داخل ہونا) یعنی وہ قوم جو ان کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: متدخلا یہ تدخل سے ہے جیسے تفعل جب کوئی دخول میں تکلف کرے۔ اور حضرت ابی سے یہ بھی مروی ہے: مندخلا یہ اندخل سے ہے اور یہ شاذ ہے، کیونکہ یہ سیبویہ اور اس کے اصحاب کے نزدیک ثلاثی غیر متعدی ہے۔ اور حسن، ابن ابی اسحاق اور ابن محیصن نے أو مَدْخلا میم کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: او مدخلا میم کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ پہلا دخل یدخل سے ہے اور دوسرا أدخل یدخل سے۔ اسی طرح مصدر، ظرف مکان اور ظرف زمان بھی ہیں جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

مُغَارَ ابنِ همّامٍ علی حَیِّ خَثْعَمَا

اور حضرت قتادہ، عیسیٰ اور اعمش رحمہم اللہ سے **أَوْ مُدَّخَّلًا** دال اور خا کی تشدید کے ساتھ مروی ہے (1)۔ اور جمہور نے صرف دال کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ مکان جس میں وہ اپنے نفسوں کو داخل کر لیتے ہیں۔ پس یہ چھ قراءتیں ہیں۔

**لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ** یعنی وہ اس کی طرف لوٹ جائیں۔ **وَهُمْ يَجْمَحُونَ** یعنی وہ تیزی کرتے ہیں کوئی شے ان کے چہروں کو واپس نہیں لوٹا سکتی۔ یہ جمح الفرس سے ہے جب لگام گھوڑے کو نہ لوٹا سکے۔ شاعر نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 46

سَبُوحًا جَمُوحًا واحضارها كَمُعْمعة السَّعَف المُوقَدِ

اوراس کا معنی ہے: اگر وہ ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی کو پالیں تو وہ مسلمانوں سے بھاگتے ہوئے تیزی کے ساتھ اس کی طرف پھر جائیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝

''اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں سو اگر انہیں دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو اس وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ یعنی ان میں سے بعض آپ پر طعن کرتے ہیں، یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حسن نے کہا ہے: وہ آپ پر عیب لگاتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ آپ کا امتحان لیتے ہیں اور آپ سے سوال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اہل لغت کے نزدیک وہی قول ہے جو حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب وہ اس کو عیب لگائے۔ اور اللمز لغت میں وہ عیب ہے جو سراً اور خفیہ طور پر لگایا جائے (1)۔ جوہری نے کہا ہے: اللمز کا معنی عیب ہے اور اس کا اصل معنی تو آنکھ وغیرہ کے ساتھ اشارہ کرنا ہے۔ اور لَمَزَ کا يَلْمِزُهُ اور يَلْمُزُهُ دونوں طرح (یعنی باب ضرب یضرب اور باب نصر ینصر) آتا ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم کے بارے میں)

اور رجل لماز ولمزۃ یعنی بہت زیادہ عیب لگانے والا آدمی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب کوئی کسی کو دور ہٹائے اور اسے مارے۔ اور الھمز بھی اللمز کی طرح ہی ہے۔ اور الھامز اور الھماز بھی کثرت سے عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے اور الھمزۃ بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل همزة اور امرأة همزة بھی ہے۔ اور همزہ کا معنی ہے اس نے اسے دور کیا اور اسے مارا۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ اللمز وہ عیب ہے جو چہرے پر اور سامنے لگایا جائے، اور الھمز جو پیٹھ کے پیچھے لگایا جائے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک قوم کے بارے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدقات کی تقسیم کے بارے طعنہ زنی کی۔ اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ فقراء ہیں تاکہ آپ انہیں عطا فرمائیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اچانک خوارج کا سردار بلکہ اصل حرقوص بن زہیر آپ کے پاس آگیا اور اس کو ذوالخویصرۃ تمیمی کہا جاتا ہے، تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصاف اور عدل کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ہلاکت ہو اور کون عدل کرے گا جب میں عدل نہ کروں''۔

تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی معنی کے مطابق ایک صحیح حدیث ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اجازت عطا فرمائیے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ تو

---

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 220

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاذ اللہ لوگ باتیں کریں گے کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں بے شک یہ اور اس کے ساتھی قرآن کریم پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا وہ اس سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے نشانہ سے پار نکل جاتا ہے''(1)۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿59﴾

''اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ خوش ہو جاتے اس سے جو دیا تھا انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ۔ عطا فرمائے گا ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اس کا رسول، ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت کرنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ، لو کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہے لکان خیرا لھم تو وہ یقیناً ان کے لیے اچھا ہوتا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿60﴾

''زکوٰۃ تو صرف ان کے لیے ہے جو فقیر، مسکین اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والے ہیں اور جن کی دلداری مقصود ہے، نیز گردنوں کو آزاد کرانے اور مقروضوں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، یہ سب فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

اس میں تیس مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بعض کی نسبت بعض لوگوں کو وافر مال عطا فرمایا ہے اور یہ اس کی جانب سے ان پر بہت بڑا انعام اور احسان ہے اور ان پر بطور شکرانہ ایک خاص حصہ نکالنا لازم کر دیا ہے کہ وہ وہ حصہ اس کو ادا کریں جس کے پاس مال نہیں ہے۔ اور یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے نیابت ہے اس بارے میں جس کی ضمانت اس نے اپنے اس قول میں دی ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)(2)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ یہ مصارف صدقات اور محل کی وضاحت ہے، تاکہ تو ان سے باہر نہ نکلے۔ پھر اختیار اور پسند تقسیم کرنے والے کے پاس ہے (یعنی ان میں سے جسے چاہے دے دے) یہ قول امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: السرج للدابۃ والباب للدار (زین گھوڑے کے لیے اور دروازہ گھر

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11537
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 945

کے لیے ہے)۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں لام تملیک کے لیے ہے، جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے: المال لزید و عمرو و بکر تو ان تمام مذکورہ افراد کے درمیان مساوات اور برابری قائم کرنا لازم اور ضروری ہے۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی دو معین صنفوں کے لیے یا دو معین قوموں کے لیے وصیت کرے۔ اور انہوں نے إنما کے لفظ سے استدلال کیا ہے کہ یہ آٹھوں اصناف پر صدقات کے موقوف ہونے کے بارے حصر کا تقاضا کرتا ہے اور انہوں نے اسے زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تقویت دی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ میری قوم کی طرف لشکر بھیجنے والے تھے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لشکر کو روک لیجئے پس میں آپ کو ان کے اسلام لانے اور طاعت اختیار کرنے کے بارے میں یقین دلاتا ہوں، پھر میں نے اپنی قوم کی طرف لکھا تو انہوں نے اسلام اور طاعت کو اختیار کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یا اخاصداء المطاع فی قومہ (اے صدائی مطاع (جس کی اطاعت کی جاتی ہے) اپنی قوم میں) آپ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: بل من اللہ علیہم وھداھم بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اور انہیں ہدایت عطا فرما دی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پھر ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور وہ آپ سے صدقات کے بارے سوال کرنے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقات کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ راضی اور خوش ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے آٹھ اجزاء میں تقسیم کر دے پس اگر تو ان اجزاء والوں میں سے ہوا تو میں تجھے عطا کر دوں گا'' (1)۔ اسے ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ الفاظ دار قطنی کے ہیں۔ اور زین العابدین سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس مقدار کے بارے بتا دیا ہے جو زکوٰۃ میں سے دی جائے گی اور اس کے بارے جس کے ساتھ ان اصناف کی کفایت ہو سکے گی اور اسے ان تمام کا حق قرار دیا ہے، پس جس کسی نے انہیں اس سے روکا تو وہ ان کے لیے ان کے رزق کے بارے میں ظالم اور زیادتی کرنے والا ہے۔ اور ہمارے علماء نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ: 271) (اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لیے)

اور صدقہ جب قرآن کریم میں مطلق ذکر کیا جائے تو مراد فرض صدقہ ہوتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء پر لوٹا دوں''۔ اور یہ قرآن وسنت میں سے آٹھ اصناف میں سے کسی ایک کے ذکر کے بارے نص ہے (2)۔ اور حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ اور تابعین کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آدمی زکوٰۃ اور صدقہ آٹھوں اصناف کو دے اور ان میں سے جس صنف کو بھی تو نے دے دیا تو وہ جائز ہے۔ منہال بن عمرو نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قول باری تعالیٰ: إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ کے

1۔ سنن ابی داؤد، باب من یعطی من الصدقۃ، حدیث نمبر 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 947

بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان اصناف کا ذکر کیا ہے تا کہ انہیں پہچان لیا جائے اور ان میں سے کسی صنف کو تو نے دے دیا تو وہ تیرے لیے جائز ہوگا۔

حضرت سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ کے بارے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس صنف کو بھی تو نے صدقہ دے دیا وہ تیری طرف سے جائز ہے۔ اور یہی قول حسن اور ابراہیم رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ کا بھی ہے۔ الکیا طبری نے کہا ہے: حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ اجماع صحابہ مراد لے رہے ہیں، کیونکہ ان کو ان میں سے کوئی مخالف معلوم نہیں جیسا کہ ابو عمر نے کہا ہے، واللہ اعلم۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جسے ہم نے اپنے اور ان کے درمیان فیصل قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ہر صنف کو اس کا حصہ عطا کر دیا جائے تو اس کی تعمیم واجب نہیں۔ پس اسی طرح اصناف کی تعمیم بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء لغت اور اہل فقہ نے فقیر اور مسکین کے درمیان فرق بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے لہٰذا اس کے بارے نو اقوال ہیں۔ پس یعقوب بن سکیت، قتبی اور یونس بن حبیب نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ فقیر، مسکین سے احسن اور بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی بعض حاجات وضروریات کو پورا کر سکتا ہو اور وہ انہیں ادا کر سکتا ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی شے نہ ہو۔ اور انہوں نے راعی کے قول سے استدلال کیا ہے:

أما الفقير الذی كانت حَلُوبَتُه وَفْقَ العِيال فلم يُترك له سَبَدُ

فقیر وہ ہے جس کے پاس عیال کے مطابق دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو اور اس کے لیے (ضرورت سے زائد) کچھ نہ چھوڑا جائے۔

اہل لغت اور حدیث میں سے ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے امام ابوحنیفہ اور قاضی عبدالوہاب ہیں۔ اور الوفق اس موافقت سے ہے جو دو چیزوں کے درمیان پائی جاتی ہے جیسا کہ التحام (دو چیزوں کا آپس میں جڑ جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے: حلوبته وفق عياله یعنی اس کا دودھ ان کی کفایت اور ضرورت کے برابر ہے، اس سے فالتو اور زیادہ نہیں ہے۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے اس کے برعکس کہا ہے، پس انہوں نے مسکین کو فقیر سے احسن اور بہتر حالت میں قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (الکہف: 79) (وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں)

پس اس میں خبر دی گئی ہے کہ ان کے لیے سمندر کی کشتیوں میں سے ایک کشتی ہے اور بسا اوقات یہ تمام مال کے اعتبار سے مساوی اور برابر ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے اس نظریہ کو اس حدیث سے تقویت دی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر سے پناہ مانگی (2) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے دعا میں یہ عرض کی: اللّٰهم أحيني مسكينا

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری، جلد 3، صفحہ 206

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی الاستعاذۃ، حدیث نمبر 1320، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وأمتني مسكينا (اے اللہ! مجھے مسکین حالت میں زندہ رکھ اور مسکین حالت میں موت عطا فرما) پس اگر مسکین کی حالت فقیر کی حالت سے زیادہ کمزور اور بری ہو تو دونوں خبروں کے درمیان تناقض آجائے گا، کیونکہ یہ محال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقر سے پناہ مانگیں اور پھر اس کے بارے سوال اور التجا کریں جو حالت کے اعتبار سے اس سے برا اور کمزور ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی اور آپ کی روح اس حال میں قبض فرمائی کہ آپ کے پاس اس مال میں سے کچھ تھا جو اللہ تعالیٰ نے بطور فے آپ کو عطا فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ جملہ ضروریات کی کفایت نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے: رہارائی کا شعر تو اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس فی الحال دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کلام عرب میں فقیر کا معنی یہ ہے کہ وہ مفلس جس کی پیٹھ سے شدت فقر و افلاس کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی نکال لی جائے پس اس سے زیادہ شدید اور سخت اور کوئی حال نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (البقرہ: 273)

اور انہوں نے شاعر کے قول سے بھی استدلال کیا ہے:

لما رأى لُبَدُ النُّسورِ تطايرت رفعَ القوادمَ كالفقيرِ الأعزلِ

یعنی وہ اڑنے کی طاقت نہیں رکھتا پس وہ اس کی طرح ہو گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور وہ زمین کے ساتھ چپک جائے۔ اسی کی طرف اصمعی وغیرہ بھی گئے ہیں اور اسے امام طحاوی نے کوفیوں سے بیان کیا ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک اور آپ کے اکثر اصحاب کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دوسرا قول بھی ہے: وہ یہ کہ فقیر اور مسکین دونوں برابر ہیں، معنوی اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں اگرچہ اسم اور نام کے اعتبار سے وہ الگ الگ ہیں۔ اور یہی تیسرا قول ہے اور اسی کو ابن القاسم اور تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسکین فقیر کا غیر ہے اور یہ کہ یہ دونوں صنفیں ہیں، مگر ان دونوں میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ حاجت مند ہے۔ پس اسی وجہ سے یہ اس کے قول کے قریب ہے جس نے دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ان کے قول میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ (الکہف: 79) کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ وہ ان کے لیے اجرت پر لیا گیا ہو، جیسے کہا جاتا ہے: یہ فلاں کا گھر ہے، جب وہ اس میں رہ رہا ہو اگرچہ وہ ملکیت کسی اور کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے وصف میں کہا ہے: وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (الحج) (اور ان (کو مارنے) کے لیے گرز ہوں گے لوہے کے) پس اللہ تعالیٰ نے اس کی اضافت ان کی طرف کی۔ اور مزید ارشاد گرامی ہے: وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من باع عبدا وله مال (جس نے غلام بیچا اور اس کا مال ہو) اور اس کا استعمال بہت زیادہ ہے کہ ایک شے کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے حالانکہ وہ اس کی نہیں ہوتی اور اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: بباب

الدار (گھر کا دروازہ) حِلی العدابة (جانور کی کل) سرج الفرس (گھوڑے کی زین) اور اس کی مشابہ تمام مثالیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انہیں رحمت اور مہربانی کی جہت پر مساکین کا نام دیا گیا ہو، جیسا کہ جس کو مصیبت اور تکلیف کے ساتھ آزمایا جائے یا جسے آزمائش اور تکلیف میں ڈال دیا جائے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: مساکین اهل النار (اہل جہنم میں سے مساکین) اور شاعر نے کہا ہے:

مساكين أهل الحب حتى قبورهم علیها تراب الذل بين المقابر

اہل محبت میں سے مساکین وہ ہیں کہ قبرستان کے درمیان ان کی قبور پر بھی ذلت کی مٹی ہوتی ہے۔ اور رہی وہ جو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد سے تاویل کی ہے: اللهم أحيني مسكينا، الحدیث اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، تو وہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہاں اس کا معنی یہ ہے: وہ تواضع اور انکساری جو الله تعالیٰ کے لیے ہو اس میں نہ کوئی جبر ہو اور نہ رعونت ونخوت اور نہ اس میں بڑائی ہو اور نہ فخر اور نہ اس میں تکبر ہو اور نہ کوئی شر، ابوالعتاہیہ نے کتنا خوب کہا ہے:

إذا أردت شريف اقوام كلهم فانظر الى ملك فى زى مسكين

جب تو ساری قوم کے شریف اور سردار کا ارادہ کرے تو تو بادشاہ کی طرف مسکین کے لباس میں دیکھ۔

ذاك الذى عظمت فى الله رغبته وذاك يصلح للدنيا و للدين

یہی وہ ہے جس کی رغبت اور چاہت الله تعالیٰ کی بارگاہ میں عظیم ہے اور وہ دین ودنیا کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور وہ سوال کرنے والا نہ ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کو ناپسند کیا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ نے اس سیاہ عورت کے بارے میں فرمایا جس نے آپ کے راستے سے ہٹنے سے انکار کر دیا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ انتہائی سرکش اور متکبر ہے''۔ اور رہا الله تعالیٰ کا یہ ارشاد: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (البقرہ: 273) ((خیرات) ان فقیروں کے لیے جو روکے گئے ہیں الله کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لیے) چلنے پھرنے کی زمین میں) تو یہ ان کے لیے کوئی شے ہونے کے مانع نہیں ہے۔ والله اعلم۔ اور جس طرف امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب گئے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں وہ اچھا ہے۔ اور اس کے قریب قریب ہے وہ قول جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے۔ فرمایا: فقیر وہ محتاج ہے جو متعفف (بتکلف پاک دامن بنا) ہو اور مسکین وہ ہے جو مانگنے والا ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور یہ زہری نے کہا ہے اور اسے ابن شعبان نے اختیار کیا ہے اور یہی چوتھا قول ہے۔ اور پانچواں قول وہ ہے جو محمد بن مسلمہ نے کہا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کی رہائش گاہ اور خادم ہو یہاں تک کہ جو اس کے نیچے اور اسفل ہے وہ اس کے لیے ہو اور مسکین وہ ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے برعکس ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبدالله بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ کسی آدمی نے آپ سے سوال کیا اور کہا: کیا ہم مہاجرین کے فقراء میں سے نہیں ہیں؟ تو حضرت عبدالله رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: کیا تیری

1۔ الناسخ والمنسوخ للنحاس، جلد 2، صفحہ 443

بیوی ہے جس کے ساتھ تو رہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا تیرا گھر ہے جس میں تو رہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو اغنیاء میں سے ہے۔ اس نے کہا: میرا ایک خادم بھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو ملوک میں سے ہے۔ (یعنی تو بادشاہ ہے)۔ اور چھٹا قول یہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ نے فرمایا: فقراء مہاجرین میں سے ہیں اور مساکین ان اعراب میں سے ہیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ یہ ضحاک نے کہا ہے۔

اور ساتواں قول یہ ہے کہ مسکین وہ ہے جو عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا ہے اگرچہ وہ سوال نہ بھی کرے۔ اور فقیر وہ ہے جو لے لیتا ہے اور شے کو سراً قبول کر لیتا ہے اور عاجزی کا اظہار نہیں کرتا۔ عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے۔ اور آٹھواں قول جو کہ حضرت مجاہد، عکرمہ اور زہری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مساکین وہ ہیں جو گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اور فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں۔ اور نانواں قول جو عکرمہ نے بھی کہا ہے وہ یہ ہے کہ فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں، عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور یہ فقراء اور مساکین کے درمیان اختلاف کا فائدہ ہے، کیا یہ دونوں ایک صنف ہیں یا ایک سے زیادہ؟ اس کا اظہار اس میں ہوتا ہے جو کوئی اپنے ثلث مال کی فلاں اور فقراء اور مساکین کے لیے وصیت کرتا ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک صنف ہیں انہوں نے کہا ہے: فلاں کے لیے ثلث کا نصف ہوگا اور فقراء و مساکین کے لیے ثلث کا دوسرا نصف ہوگا۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دو صنفیں ہیں ان کے مطابق ثلث ان تینوں کے درمیان تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فقر کی اس حد میں علماء کا اختلاف ہے جس کے ساتھ لینا جائز ہوتا ہے۔ محققین اہل علم میں سے اکثر کے اجماع کے بعد...... کہ جس کا گھر اور خادم ہو وہ ان سے مستغنی نہ ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور دینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے دے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر گھر اور خادم کی قیمت سے فالتو رقم اس قدر نہ ہو جس کا ان کے ہوتے ہوئے وہ محتاج اور ضرورت مند ہے تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نخعی اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس بیس دینار یا دو سو درہم ہوں تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ پس انہوں نے نصاب کا اعتبار کیا ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء میں لوٹا دوں'' (1)۔ یہ بالکل واضح ہے۔ اور اسے مغیرہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوری، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: جس کے پاس پچاس درہم ہوں یا ان کی مقدار سونا ہو تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور نہ ہی پچاس درہم سے زیادہ زکوٰۃ میں سے کسی کو دیئے جا سکتے ہیں مگر یہ کہ وہ مقروض ہو۔ یہ امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 959

سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم ہوں''(1)۔اس کی سند میں عبدالرحمن بن اسحاق ضعیف راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا بکر بن خنیس بھی ضعیف ہے۔ اور اسے حکیم بن جبیر نے محمد بن عبدالرحمن بن یزید سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور پچاس درہم کا ذکر کیا ہے۔ اور حکیم بن جبیر ضعیف ہے اسے شعبہ وغیرہ نے ترک کر دیا ہے۔ یہ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابوعمر نے کہا ہے: یہ حدیث حکیم بن جبیر کے گرد گھومتی ہے اور وہ متروک راوی ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم یا ان کی قیمت کا سونا ہو(2)۔ اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس چالیس درہم ہوں وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور اسے واقدی نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے لوگوں سے مانگا اس حال میں کہ وہ غنی ہو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں لگی ہوں گی اور وہ چھیلا ہوا ہوگا''(3)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کا غنا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چالیس درہم''۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے جو انہوں نے زید بن اسلم سے، انہوں نے عطا بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جس نے اس حال میں مانگا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ ہو یا اس کے برابر (مال سونا وغیرہ) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار مانگا اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے''(4)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت مشہور ہے اسے ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا اسے زکوٰۃ دی جائے گی جس کے پاس چالیس درہم ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ابوعمر نے بیان کیا ہے: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ آدمی ہو جو کمانے کی طاقت رکھتا ہو اور اچھی طرح تصرف کر سکتا ہو۔ اور دوسرا وہ ہو جو کمانے سے کمزور اور ضعیف ہو یا وہ عیال دار ہو۔ واللہ اعلم

اور امام شافعی اور ابوثور رحمہما اللہ علیہما نے کہا ہے: جو کمانے کی اور کوئی پیشہ اپنانے کی قوت رکھتا ہو اس کے ساتھ ساتھ اس کا بدن قوی اور طاقتور ہو اور اچھی طرح تصرف پر قادر ہو یہاں تک کہ وہ اسے لوگوں سے غنی کر دے تو اس پر صدقہ حرام ہے۔ اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا ہے: ''کسی غنی کے لیے اور کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے''(5)۔ اسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد، ترمذی اور دارقطنی نے اسے نقل کیا

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121۔ سنن ابن داؤد، باب من یعطی من الصدقۃ، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب من مثل عن ظہر غنی، حدیث نمبر 1829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 122 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1392۔ ابن ماجہ، من سئل عن ظہر غنی، حدیث 1828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صدقہ آیا پس لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ کسی غنی کے لیے، کسی صحیح الاعضاء (یا تندرست) کے لیے اور کسی کام کرنے والے (عامل) کے لیے مناسب اور جائز نہیں'' (1)۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

اور ابوداؤد نے عبید اللہ بن عدی بن خیار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مجھے دو آدمیوں نے خبر دی ہے کہ وہ دونوں حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ صدقہ تقسیم فرما رہے تھے تو انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس میں سے کچھ مانگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری طرف نظر اٹھائی اور پھر اسے جھکا لیا، پس آپ نے ہمیں مضبوط دیکھا تو ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں ورنہ اس میں کسی غنی اور کسی کمانے والے قوی آدمی کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے'' (2)۔ کیونکہ وہ اپنی کمائی کے سبب اس طرح غنی ہے جیسے کوئی دوسرا اپنے مال کے سبب غنی ہو پس دونوں میں سے ہر ایک سوال کرنے سے غنی ہو گیا ہے۔ اور یہ ابن خویز منداد نے کہا ہے، اور اسے ''المذہب'' سے بیان کیا ہے، اور یہ مناسب نہیں کہ اس پر بھروسہ کر لیا جائے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقراء کو عطا فرماتے تھے اور اسے (صدقہ کو) اپاہج پر موقوف کرنا باطل ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں کہا ہے: جب آدمی قوی البدن محتاج ہو اور اس کے پاس کوئی شے نہ ہو اور اس پر صدقہ کر دیا جائے تو اہل علم کے نزدیک صدقہ کرنے والے کی طرف سے یہ جائز ہے (3)۔ اور بعض اہل علم کے نزدیک حدیث کی اطلاق سوال کی صورت میں ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوت اور اپنے بدن کے تندرست ہونے کے باوجود فقیر ہے۔ اور اسی طرح امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے۔

اور عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے: وہ آدمی جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اسے کافی ہو اور سال بھر اسے قائم رکھ سکتا ہو تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے ابن شہاب نے مالک بن اوس بن حدثان سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مال سے سال بھر کی خوراک جمع رکھتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور مال فے عطا فرمایا، پھر اس سے جتنا زائد ہوتا اسے گھوڑے اور ہتھیار خریدنے میں لگا دیتے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ (الضحیٰ)

اور بعض اہل علم نے کہا ہے: ہر ایک کے لیے صدقہ میں سے لینا ایسی حالت میں جائز ہے جس سے اسے کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: جس کے پاس رات کا کھانا ہو تو وہ غنی ہے۔ اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے ظہر غنیٰ کے ہوتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اس کے ساتھ جہنم میں گرم کیے گئے پتھروں کو کثرت سے طلب کیا'' (4)۔ صحابہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 119، حدیث نمبر 66　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 589، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121

کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ظہر الغنی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رات کا کھانا''۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند میں عمرو بن خالد ہے اور وہ متروک ہے۔ اور اسے ابوداؤد نے سہل بن حنظلیہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے: ''جس نے سوال کیا اس حال میں کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کر رہا ہو تو بلاشبہ وہ آگ کی کثرت طلب کر رہا ہے اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام پر کہا ہے: ''وہ جہنم کے انگارے (کثرت سے اکھٹے کر رہا ہے) تو صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے اسے غنی کر سکتی ہے؟ اور نفیلی نے دوسری جگہ بیان کیا: وہ کون سا غنا ہے جس کے ہوتے ہوئے سوال نہیں کرنا چاہیے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اتنی مقدار جو صبح و شام کے کھانے میں کافی ہو''۔ اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام میں کہا ہے کہ ''اس کے پاس دن اور رات یا رات اور دن پیٹ بھرنے کے لیے کھانا موجود ہو'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ذکر ہوا یہ اس فقر کا بیان ہے جس کے ساتھ زکوٰۃ لینا جائز ہوتی ہے اور مطلق لفظ فقراء اہل ذمہ کے بغیر صرف مسلمانوں کے ساتھ اختصاص کا تقاضا نہیں کرتا، البتہ اس بارے میں اخبار بالکل ظاہر ہیں کہ صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لیے جائیں گے اور ان کے فقراء کو دے دیئے جائیں گے۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فقراء سے مراد فقراء المسلمین ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں (2)۔ اور ابوبکر العبسی نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو نابینا حالت میں شہر کے دروازے پر پڑا ہوا دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے عرض کی: انہوں نے مجھے اس جزیہ میں کرایہ پر لیے رکھا، یہاں تک کہ جب میری نظر ختم ہوگئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور میرے لیے اب کوئی نہیں ہے جو مجھے کوئی شے دے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تب تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، چنانچہ آپ نے اس کے لیے اس کی خوراک اور اس شے کا حکم دیا جو اس کی ضرورت پوری کر سکتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: یہ ان میں سے ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِیْنِ، الآیہ اور وہ اہل کتاب کے اپاہج لوگ ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِیْنِ، الآیہ اور جملے کا مقابلہ جملے کے ساتھ کیا اور یہ تمام صدقہ جملہ مصارف کے مقابل ہے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا جب انہیں یمن کی طرف بھیجا: ''تم انہیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے وہ ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء میں لوٹا دیا جائے گا'' (3)۔ پس ہر شہر کے باسی اپنے شہر کی زکوٰۃ کے ساتھ خاص ہیں۔ اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ زیاد یا کسی اور امیر نے عمران بن حصین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، پس جب وہ لوٹ کر آئے تو اس نے عمران سے پوچھا: مال کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: مال کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا! ہم نے اسے وہاں سے لیا جہاں سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لیتے تھے اور ہم نے اسے وہاں رکھ دیا جہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 67 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 223

کے زمانہ میں رکھتے تھے۔ اور دارقطنی اور ترمذی نے عون بن ابی جحیفہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہمارے پاس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ وصول کرنے والا آیا پس اس نے ہمارے اغنیاء سے صدقہ لیا اور اسے ہمارے فقراء کو ادا کر دیا پس میں ایک یتیم بچہ تھا تو اس نے مجھے اس میں سے ایک جوان اونٹنی دی (1)۔

ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جحیفہ کی حدیث مروی ہے وہ حدیث حسن ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** زکوٰۃ کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے اور اس بارے میں تین قول ہیں: وہ منتقل نہیں کی جائے گی۔ یہ سحنون اور ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور یہ صحیح ہے ان دلائل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ابن قاسم نے یہ بھی کہا ہے: اگر ضرورت کے تحت زکوٰۃ کا کچھ حصہ منتقل کیا گیا تو میں اسے صحیح اور درست قرار دیتا ہوں۔ اور سحنون سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: اگر امام وقت کو یہ خبر موصول ہو کہ کچھ علاقہ شدید حاجت مند ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بعض کی فرض زکوٰۃ ان کی طرف منتقل کر دے، کیونکہ جب وہ حاجت ظاہر ہو جائے تو پھر اسے اس پر مقدم کرنا واجب ہے جو محتاج نہیں "اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اسے (کسی ظالم یا مصیبت) کے حوالے کرتا ہے اور نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے" (2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے اور اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو اس طرح مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو کہا: تم مجھے خمیس (پانچ گز کپڑا) یا بوسیدہ پہننے کے کپڑے دے دو میں تم سے وہ جو (مکئی) اور جو کی جگہ صدقہ میں لوں گا کیونکہ یہ تم پر آسان ہیں اور مدینہ طیبہ کے مہاجرین کے لیے زیادہ نفع بخش ہیں (3)۔ اسے دارقطنی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس روایت میں لفظ الخمیس مشترک ہے اور یہاں اس سے مراد پانچ گز لمبا کپڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ جس نے سب سے پہلے یہ عمل کیا وہ یمن کے بادشاہوں میں سے اخمس بادشاہ تھا۔ اسے ابن فارس نے مجمل میں اور جوہری نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یمن سے مدینہ طیبہ کی طرف زکوٰۃ منتقل کی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تقسیم کے والی تھے۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے: **اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِیْنِ** اور اس میں ایک شہر کے فقیر اور دوسرے شہر کے فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم

دوسرا قول: زکوٰۃ میں قیمت لینا ہے۔ تحقیق زکوٰۃ میں قیمت نکالنے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت مختلف ہے۔ آپ نے ایک بار اس کی اجازت عطا فرمائی اور دوسری بار اس سے منع کر دیا، جواز کی وجہ یہ حدیث ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی جواز کا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: "وہ آدمی جس کا اونٹوں میں سے صدقہ جذعہ (چار سال کا اونٹ) تک پہنچ چکا ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو بلکہ اس کے پاس حقہ (ایسا اونٹ جس کی عمر تین سال مکمل ہو چکی ہو) ہو تو اس سے وہ لے لیا جائے اور اس کے ساتھ دو بکریاں یا بیس درہموں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 330　3۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100، حدیث نمبر 24

میں سے جو آسان ہو'' (1)۔ الحدیث۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں اس دن سوال سے غنی کر دو'' (2)۔ مراد یوم فطر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ انہیں اس چیز کے ساتھ غنی کیا جائے جو ان کی حاجت کو پورا کر سکتی ہے، پس جو چیز بھی ان کی حاجت ختم کر سکتی ہے وہ جائز ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (التوبہ:103) (تم ان کے مالوں سے صدقہ لو) اسے رب کریم نے کسی شے کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوٰۃ کے بدلے گھر کی رہائش نہیں دی جا سکتی، مثلاً کسی پر پانچ درہم واجب ہوں اور وہ ان میں ایک فقیر کو ایک مہینہ گھر میں رہائش دے دے تو یہ جائز نہیں۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے کیونکہ رہائش مال نہیں ہے۔

اور ان کے اس قول ''قیمت دینا جائز نہیں ہے''۔ اور یہی ان کا ظاہر مذہب ہے۔ کی وجہ یہ ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ اونٹوں میں (بطور زکوٰۃ) ایک بکری ہے اور چالیس بکریوں میں ایک بکری ہے'' (3)۔ پس یہ بکری کے بارے نص ہے پس جب اس نے اس پر عمل نہ کیا تو گویا اس نے مامور بہ پر عمل نہ کیا اور جب مامور بہ پر عمل نہ ہو تو امر اپنی حالت پر باقی رہتا ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ فقراء اور مساکین کا حصہ اس جگہ تقسیم کیا جائے گا اور بقیہ تمام حصص امام کے اجتہاد کے ساتھ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7**۔ کیا سال مکمل ہونے کے وقت مال کی جگہ کا بھی اعتبار ہے کہ صدقہ وہیں تقسیم کیا جائے یا مالک کی جگہ کا اعتبار ہے جب کہ مخاطب وہ ہے۔ اس بارے میں دو قول ہیں۔ دوسرے کو ابو عبداللہ محمد بن خویز منداد نے اپنے احکام میں اختیار کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ انسان ہی زکوٰۃ نکالنے کے حکم کا مخاطب ہے اور مال اس کے تابع ہے۔ پس واجب ہے کہ اس میں حکم مخاطب کے اعتبار سے ہو، جیسا کہ ابن سبیل (مسافر) وہ اپنے شہر میں غنی ہوتا ہے اور دوسرے شہر میں فقیر ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے حکم اس دوسرے اعتبار سے ہے۔

**مسئلہ**: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں جس نے کسی مسلمان فقیر کو صدقہ دیا پھر ایک دوسری حالت میں یہ ظاہر ہوا کہ اس نے غلام یا کافر یا غنی کو دے دیا تو آپ نے ایک بار فرمایا: وہ اس کی طرف سے جائز ہو گا اور پھر فرمایا جائز نہیں ہو گا۔ وجہ الجواز...... اور یہی اصح ہے۔ وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ''ایک آدمی نے کہا میں آج کی رات ضرور صدقہ ادا کروں گا چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اس نے وہ زانیہ کے ہاتھ میں دے دیا جب انہوں نے صبح کی تو آپس میں باتیں کرنے لگے آج کی رات زانیہ کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے حیران ہو کر کہا: اے اللہ! تیرے لیے ہی حمد ہے کیا زانیہ کو دے دیا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 195　　2۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 153، حدیث نمبر 67

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 219۔ ایضاً، حدیث نمبر 1340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء فی زکوٰۃ الذہب الخ، حدیث نمبر 564، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے؟ میں اس صدقہ کے بدلے ضرور صدقہ کروں گا، پھر وہ صدقہ لے کر نکلا اور ایک غنی کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو باتیں کرنے لگے: غنی کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے کہا: اے اللہ! حمد کے لائق تو ہی ہے کیا غنی کو دے دیا ہے؟ میں اس صدقہ کے عوض ضرور صدقہ دوں گا۔ چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اسے چور کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو وہ باتیں کرنے لگے: چور کو صدقہ دیا گیا ہے، تو اس نے کہا: اے اللہ! حمد تیرے لیے ہی ہے کیا زانیہ، غنی اور چور کو صدقہ دیا گیا ہے؟ چنانچہ اسے لایا گیا اور اسے کہا گیا: جہاں تک تیرے صدقہ کا تعلق ہے وہ قبول کر لیا گیا ہے، رہی زانیہ تو شاید وہ اس کے سبب اپنے زنا سے بچ جائے پاک دامن ہو جائے۔ اور شاید غنی اس لیے معتبر ہے کہ وہ اس سے خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے اور شاید چور اس کے ساتھ چوری سے محفوظ ہو جائے" (1)۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی اور اس نے وہ اپنے باپ کو دے دی۔ پس جب صبح ہوئی تو اسے اس بارے علم ہوا۔ پھر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تحقیق تیرے لیے تیری زکوٰۃ کا اجر اور صلہ رحمی کا اجر لکھ دیا گیا ہے پس تیرے لیے دو اجر ہیں"۔ اور معنی کی جہت سے یہ ہے کہ اس کے لیے معطی (جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے) کے بارے اجتہاد اور تتبع وتلاش کو جائز قرار دیا ہے، پس جب اس نے اجتہاد کیا اور اسے دیا جسے وہ اس کا اہل گمان کرتا ہے تو اس نے اپنا واجب ادا کر دیا۔

اور اس قول "کہ وہ جائز نہیں ہے" کی وجہ یہ ہے کہ اس نے وہ صدقہ اس کے مستحق کو نہیں دیا۔ پس یہ عمد (جان بوجھ کر عمل کرنا) کے مشابہ ہو گیا، کیونکہ اموال کی ضمان میں عمد اور خطا ایک ہی ہے پس واجب ہے کہ وہ اس کا ضامن ہو جو اس نے مساکین کا حصہ ضائع کیا ہے یہاں تک کہ اسے ان تک پہنچا دے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اگر کسی نے زکوٰۃ اس کے محل کے وقت نکالی پھر وہ بغیر تفریط کے ضائع ہو گئی تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ وہ فقراء کا وکیل ہے۔ اور اگر اس نے اسے اس کی مدت گزرنے کے بعد نکالا پھر وہ ضائع ہو گئی تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ اسے اس کے محل سے مؤخر کرنے کے سبب وہ اس کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو چکی ہے اس لیے وہ اس کا ضامن ہوگا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب امام وقت زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے خرچ کرنے میں عدل کر رہا ہو تو پھر مالک کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بذات خود دراہم و دنانیر یا کسی اور مال میں تصرف کرنے کا والی بنے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دراہم و دنانیر کی زکوٰۃ ان کے مالکوں پر ہے۔ اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب صرف فقراء اور مساکین کے لیے خرچ کرنا ہو۔ اور اگر ان دو کے علاوہ دیگر اصناف میں خرچ کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو پھر ان پر امام کے سوا کوئی تقسیم نہیں کر سکتا۔ اس باب کی فروع کثیر ہیں اور یہ ان کی اصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا مراد وہ بھاگ دوڑ کرنے والے اور خرچ وصول کرنے والے ہیں جنہیں امام وقت اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو حمید ساعدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 329

ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسد کے ایک آدمی کو بنی سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل مقرر فرمایا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا، پس جب وہ آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا(1)۔ اور علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے جو زکوۃ وصول کرنے والے لے سکتے ہیں اس بارے میں تین قول ہیں:

حضرت مجاہد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ آٹھواں حصہ ہے۔ ابن عمر اور امام مالک نے کہا ہے: انہیں ان کے کام کے برابر اجرت دی جائے گی، اور یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے(2)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس نے فقراء کی مصلحت اور منفعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہے، پس اس کی کفایت اور اس کے معاونین کی کفایت ان کے مال سے ہوگی، جیسا کہ عورت نے جب اپنے آپ کو خاوند کے حق کے لیے معطل کر دیا تو اس کا نفقہ اور اس کے متبعین چاہے وہ ایک خادم ہو یا دو ہوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہے۔ اسے ثمن (آٹھواں حصہ) کے ساتھ مقرر نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں کفایت کا اعتبار کیا جائے گا چاہے وہ آٹھواں حصہ ہو یا اس سے زیادہ، جیسا کہ قاضی کی تنخواہ وغیرہ۔ اور ہمارے زمانے میں معاونین کی کفایت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ محض اسراف اور فضول خرچی ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ انہیں بیت المال سے دیا جائے گا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے یہی قول صحیح ہے اس روایت کے مطابق جو ابن ابی اویس اور داؤد بن سعید بن زنبوعہ سے ہے اور یہ دلیل کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے حصے کے بارے خبر دی ہے وہ اس میں نص ہے تو پھر استقراء اور سبر کے ذریعہ اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے(3)۔ اور صحیح یہ ہے کہ اجرت مقرر کرنے میں اجتہاد کرنے، کیونکہ یہ بیان اصناف شمار کرنے کے بارے ہے بلاشبہ وہ محل کے لیے ہے نہ کہ مستحق کے لیے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

علماء نے ایسے عامل کے بارے میں اختلاف کیا ہے جب وہ ہاشمی ہو، پس امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں ہے بلاشبہ یہ لوگوں کی میل ہے''(4)۔ اور یہ بھی من وجہ صدقہ ہے، کیونکہ یہ (زکوۃ) صدقہ کا ایک جز ہے۔ پس اسے کرامۃً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو لوگوں کے غسالہ اور دھوون سے بچانے کے لیے من کل الوجوہ صدقہ سے ملحق کیا جائے گا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے کام کی اجرت بھی اسے دی جائے گی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اور آپ کو یمن کی طرف زکوۃ کا عامل بنا کر بھیجا(5) اور آپ کو بنی ہاشم کی ایک جماعت کا والی بنایا اور آپ کے بعد اسی طرح خلفاء والی بنے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ عامل مباح عمل پر بطور اجیر ہوتا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 203
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 344
5۔ سنن ابی داؤد، باب کیف القضاء، حدیث نمبر 3111، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب ذکر القضاء، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی برابر ہوں جیسا کہ دیگر تمام کاروبار میں ہوتا ہے۔ احناف نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ کے لیے صدقہ میں سے کچھ مقرر کیا گیا، پس اگر آپ کے لیے صدقہ کے علاوہ (کسی اور مال) سے اجرت مقرر کی گئی تو وہ جائز ہے اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام امور جو فرض کفایہ میں سے ہیں جیسے صدقات کی وصولی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، کاتب، قسام (زمین کی تقسیم کرنے والا) اور محصول چنگی لینے والا (عاشر) وغیرہ پس ان امور کو سرانجام دینے والے کے لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور اس میں سے امامت بھی ہے، کیونکہ نماز اگرچہ تمام مخلوق کی طرف متوجہ ہے لیکن ان میں سے بعض کا امامت کے لیے آگے بڑھنا فروض کفایہ میں سے ہے، لہٰذا بلاشک اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہ باب کی اصل ہے اور اس کی طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا ہے: ''میں نے اپنی زوجات کے نفقہ اور اپنے عاملین کی محنت اجرت کے سوا جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے''۔ یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ قرآن کریم میں صدقات کی تقسیم کے سوا کہیں مولفۃ قلوب کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو ابتدائے اسلام میں ان لوگوں میں سے تھے جو اسلام ظاہر کرتے تھے، ان کے یقین کمزور ہونے کی وجہ سے صدقہ میں سے انہیں حصہ دیئے جانے کے سبب وہ دوستی قائم رکھتے تھے۔ زہری نے کہا ہے: المولفہ وہ ہیں جو یہود و نصاریٰ میں سے اسلام لائے اگرچہ وہ غنی اور دولت مند ہوں (1)۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: ان کی صفت اور تعریف میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ کفار کی ایک صنف ہیں انہیں اس لیے (صدقات) دیئے جاتے تھے تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل رہیں اور وہ غلبہ اور تلوار کے زور پر اسلام قبول نہ کرتے تھے، لیکن وہ عطا اور احسان کے ساتھ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام لائے لیکن ان کے دلوں نے یقین نہ کیا، پس انہیں عطا کیا جاتا تھا تاکہ اسلام ان کے سینوں میں راسخ ہو جائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مشرکین کے عظماء کی ایک جماعت ہے ان کے متبعین بھی تھے انہیں دیا جاتا تھا تاکہ ان کے متبعین اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ فرمایا: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان تمام سے مقصود ان کو عطا کرنا ہے جو عطا کے بغیر حقیقۃً اسلام لانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ تو گویا یہ جہاد کی ایک قسم ہے۔ اور مشرکین تین قسم کے ہیں: ایک قسم کی طرف دلائل قائم کر کے رجوع کیا جاتا ہے اور ایک قسم کی طرف قہر و غلبہ کے ساتھ اور ایک قسم کی طرف احسان و عطا کے ساتھ۔ اور وہ امام جو مسلمان کے لیے نظر و فکر کرنے والا ہے وہ ہر صنف کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جسے وہ کفر سے نجات اور خلاصی پانے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: ''بے شک میں ان لوگوں کو عطا کرتا ہوں جن کا زمانہ ابھی کفر کے قریب ہے تو میں ان کی تالیف قلوب کرتا ہوں'' (2)۔ الحدیث

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 49
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 338

ابن اسحاق نے کہا ہے: آپ انہیں عطا فرماتے اور ان کی تالیف قلوب فرماتے اور آپ ان کے سبب ان کی قوم کی بھی تالیف کرتے تھے اور وہ اشراف اور سردار تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب کو سو اونٹ دیئے اور اس کے بیٹے کو بھی سو اونٹ عطا فرمائے۔ حکیم بن حزام کو سو اونٹ دیئے، حارث ابن ہشام کو سو اونٹ دیئے، سہیل بن عمرو کو سو اونٹ عطا فرمائے، حویطب بن عبدالعزیٰ کو سو اونٹ دیئے اور صفوان بن امیہ کو سو اونٹ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح مالک بن عوف اور علاء بن جاریہ کو بھی عطا فرمائے۔ فرمایا: یہ سب اصحاب المئین ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں سے بعض لوگوں کو سو سے کم بھی دیئے ان میں سے مخرمہ بن نوفل الزہری، عمیر بن وہب جمحی، ہشام بن عمرو العامری ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: یہ وہ ہیں جن کے بارے میں نہیں جانتا کہ آپ نے انہیں کتنے عطا فرمائے؟ اور سعید بن یربوع کو پچاس اونٹ دیئے اور عباس بن مرداس السلمی کو تھوڑے اونٹ دیئے تو وہ اس پر ناراض ہو گیا۔ تو اس نے اس بارے میں یہ کہا:

كانت نِهابًا تَلافَيْتُها بكَرّي على المُهْرِ في الأجْرَع
وإيقاظِيَ القومَ أن يرقدوا إذا هَجَعَ النّاس لم أهجع
فأصبحَ نَهْبِي ونَهْب العُبَيْدِ بين عيَيْنه والأقْرَع
وقد كنتُ في الحرب ذاتُدْرَءٍ فلم أُعْطَ شيئًا ولم أمْنَع
إلّا أفائلَ أُعطِيتُها عديدَ قوائِمه الأربع
وما كان حِصْنٌ ولا حابِسٌ يفوقان مِرْداس في المَجْمَع
وما كنتُ دون أمرئ منهما ومن تضِع اليومَ لا يُرْفَع

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جاؤ اور میرے بارے میں اس کی زبان بند کرو'' (1)۔ چنانچہ انہوں نے اسے اتنا دیا یہاں تک کہ وہ راضی ہو گیا۔ تو گویا اس طرح اس کی زبان کٹ گئی۔ ابوعمر نے کہا ہے: مولفۃ قلوب میں نضیر بن حارث بن علقمہ ابن کلدہ کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس نضر بن حارث کا بھائی تھا جو بدر میں ڈٹا رہا اور مارا گیا۔ اور دوسروں نے ذکر کیا ہے کہ یہ ان میں سے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پس اگر یہ ان میں سے ہے تو پھر اس کا مولفۃ قلوب میں سے ہونا محال ہے، کیونکہ جس نے سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کی تو وہ ان مہاجرین اولین میں سے ہوا جن کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا اور اس نے اپنے سوا کے ساتھ قتال کیا اور وہ ان میں سے نہیں جن کی تالیف قلوب کی جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن عوف بن سعد بن یربوع نصری کو ان پر عامل مقرر کیا جو قبائل قیس میں سے اس کی قوم سے اسلام لائے اور اسے ثقیف کی لوٹ مار کرنے کا حکم دیا پس اس نے ایسا ہی کیا اور اس پر جینا تنگ کر دیا اور اس کا اسلام اور ان کے مولفۃ قلوب کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا، سوائے عیینہ بن حصن کے وہ ہمیشہ متہم رہتا۔ تمام مولفۃ قلوب فاضل لوگ تھے، ان میں سے بہترین اور عمدہ فاضل بھی ہیں جن کے فضل پر اجماع ہے، مثلاً حارث

1۔ دلائل النبوۃ، رجوع النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلی الجعرانۃ، جلد 5 صفحہ 183

بن ہشام، حکیم بن حزام، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور ان میں سے کچھ ان میں سے کم ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے تمام مومن بندوں کو آپس میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور وہ انہیں بہتر جانتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حکیم بن حزام نے وہ مال نکال دیا جو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں مولفۃ قلوب کی صورت میں عطا فرمایا تھا پس انہوں نے اس کے بعد اسے صدقہ کر دیا(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت حکیم بن حزام اور حضرت حویطب بن عبدالعزی میں سے ہر ایک ایک سو بیس برس تک زندہ رہا، ساٹھ سال اسلام کی حالت میں اور ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں۔ اور میں نے امام الشیخ، الحافظ ابو محمد عبدالعظیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو آدمی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ساٹھ برس تک اور زمانہ اسلام میں بھی ساٹھ برس تک زندہ رہے اور وہ دونوں مدینہ طیبہ میں 54ھ میں فوت ہوئے۔ ان میں سے ایک حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ہیں، ان کی ولادت جوف کعبہ میں عام الفیل سے تیرہ سال پہلے ہوئی۔ اور دوسرے حضرت حسان بن ثابت بن منذر بن حرام الانصاری ہیں۔ اور اسے ابو عمر اور عثمان الشہر زوری نے بھی کتاب ''معرفۃ انواع علم الحدیث'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں نے ان کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا۔ اور حویطب کا ذکر ابو الفرج علامہ الجوزی نے کتاب الوفاء فی شرف المصطفیٰ ﷺ میں کیا ہے۔ اور اسے ابو عمر نے کتاب الصحابہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی اور ایک سو بیس سال کی عمر میں ان کا وصال ہوا۔ اور انہوں نے حمنن ابن عوف جو کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ حالت اسلام میں ساٹھ برس تک زندہ رہے اور جاہلیت میں بھی ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ اور مولفۃ قلوبھم میں حضرت معاویہ اور ان کے والد ابوسفیان بن حرب کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو آپ کا ان میں سے ہونا بعید ہے۔ اور آپ ان میں سے کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی قراءت پر امین بنایا اور انہیں اپنی ذات کے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں ان کی حالت اس سے زیادہ مشہور اور اظہر تھی۔ اور جہاں تک ان کے باپ کا تعلق ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ ان میں سے تھے۔ اور مولفۃ قلوبھم کی تعداد میں اختلاف ہے، بالجملہ وہ سب کے سب مومن تھے اور ان میں کوئی بھی کافر نہیں تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم واحکم۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ علماء نے ان کے باقی رہنے میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت عمر، حسن اور شعبی وغیرہم نے کہا ہے: اسلام کے غلبے اور ظہور کے ساتھ یہ صنف ختم ہو چکی ہے۔ یہی امام مالک اور اصحاب رائے رحمۃ اللہ علیہم کا مشہور مذہب ہے۔ بعض علمائے حنفیہ نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اس کے ماننے والوں کو غلبہ عطا فرمایا اور کافروں کی جڑ کاٹ دی..... اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو..... تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دور میں ان کے حصہ کے ساقط ہونے پر اجماع کیا(2)۔ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ ابھی باقی ہیں، کیونکہ امام وقت کو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 963　2۔ تفسیر آیات احکام القرآن، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 84

بسا اوقات ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اسلام پر مائل کرے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دین کو غالب آتے دیکھا تو آپ نے انہیں ختم کر دیا۔ یونس نے کہا ہے: میں نے زہری سے ان کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں ان کے بارے میں نسخ کو نہیں جانتا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: پس اس بنا پر حکم ان کے بارے میں ثابت ہے، پس اگر کوئی ہو جس کی تالیف قلب کی ضرورت ہو اور ان کے بارے یہ خوف ہو کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی آفت آ پہنچے گی یا یہ امید ہو کہ اس کا اسلام اس کے بعد اچھا ہو جائے گا تو اسے دے دیا جائے۔ قاضی عبدالوہاب نے کہا ہے: اگر بعض اوقات ان کی حاجت اور ضرورت پیش آ جائے تو انہیں صدقے میں سے دے دیا جائے۔ اور قاضی ابن عربی نے کہا ہے: جو میرے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام قوی اور طاقتور ہو تو وہ زائل ہو چکے ہیں (انہیں کچھ بھی نہ دیا جائے) اور اگر ان کی احتیاج اور ضرورت ہو تو ان کا حصہ انہیں دیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیتے تھے (1)، کیونکہ صحیح روایت میں ہے: ''اسلام کا آغاز غریب حالت میں ہوا اور عنقریب وہ پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جائے گا جس پر وہ شروع میں تھا'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ پس جب ہم نے اس پر تفریع ذکر کی ہے کہ ان کی طرف ان کا حصہ نہیں لوٹایا جائے گا کیونکہ وہ تمام اصناف کی طرف لوٹ جائیں گے یا اس کی طرف جسے امام مناسب دیکھے گا۔ اور زہری نے کہا ہے: ان کا نصف حصہ مساجد بنانے والوں کو دے دیا جائے گا۔ اور یہ تیری اس پر رہنمائی کرتی ہے کہ آٹھوں اصناف محل ہیں اور وہ سب برابر مستحق نہیں ہیں۔ اور اگر وہ مستحق ہوتے تو یقیناً ان کا حصہ ان کے سقوط کے ساتھ ساقط ہو جاتا اور وہ ان کے غیر کی طرف نہ لوٹتا، جیسا کہ اگر کوئی دو معین قوم کے لیے وصیت کرے پھر ان میں سے ایک مر جائے تو اس کا حصہ ان میں سے باقی رہنے والوں کی طرف نہیں لوٹتا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِي الرِّقَابِ یعنی گردنیں آزاد کرانے میں۔ اسے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ پس امام کے لیے جائز ہے کہ مال صدقہ سے گردنیں (غلام) خریدے اور انہیں مسلمانوں کی جانب سے آزاد کر دے اور ان کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہو گی۔ اور اگر صاحب زکوٰۃ (زکوٰۃ ادا کرنے والا مالک) انہیں خریدے اور پھر انہیں آزاد کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور امام احمد، اسحاق، اور ابو عبید وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: صاحب زکوٰۃ کسی نفس کو زکوٰۃ سے نہیں خرید سکتا کہ وہ اسے ولاء کے حصول کے لیے پھر آزاد کر دے۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب الرائے کا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ فِي الرِّقَابِ پس جب صدقات میں گردنوں کی آزادی کا حصہ ہے تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک غلام خریدے اور اسے آزاد کر دے۔ اور اہل علم کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لیے گھوڑا خریدنا جائز ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سوار ہو کر جائے گا۔ (یعنی جہاد کے لیے) تو جب اس کے لیے گھوڑا مکمل طور پر

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 966 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84

زکوٰۃ سے خریدنا جائز ہے تو پھر اس کے لیے غلام مکمل طور پر خریدنا بھی جائز ہوگا۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِي الرِّقَابِ یہ ولاء میں اصل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ گردن آزاد ہو جائے گی اور اس کی ولاء مسلمانوں کے لیے ہوگی۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اسے امام وقت نے آزاد کیا، تحقیق حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء بیچنے اور اسے ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولاء بھی نسبی قرابت کی طرح قرابت ہے لہٰذا نہ اسے بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولاء اس کے لیے ہوگی جس نے آزاد کیا''۔ اور عورتیں ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں ہو سکتیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''عورتیں ولاء میں کسی شے کی وارث نہیں ہوں گی سوائے اس کے جسے وہ آزاد کریں یا جسے اس نے آزاد کیا جسے انہوں نے آزاد کیا'' (1)۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو غلام کی جانب سے نصف کا اور نصف کا اس کی بیٹی کو وارث بنایا (2)۔ اور جب آزاد کرنے والا مذکر اور مونث اولاد چھوڑے تو ولاء اس کی اولاد میں سے مذکر افراد کے لیے ہوگی نہ کہ مونث کے لیے۔ اور اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے۔ اور ولاء کا وارث محض وہ ہوتا ہے جسے عصبہ بنایا جاتا ہے اور عورتیں عصبہ نہیں بن سکتیں پس وہ ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں بن سکتیں۔ پس تو سمجھ لے تو منزل کو پالے گا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ کیا مکاتب کی صدقات سے مدد کی جائے گی؟ تو کہا گیا ہے: نہیں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب گردن (غلام آزاد کرنے) کا ذکر کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اس نے کامل آزادی کا ارادہ کیا ہے۔ اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروض) کے کلمہ میں داخل ہے اس وجہ سے کہ اس پر کتابت کا دین (قرض) ہے۔ پس وہ الرقاب میں داخل نہ ہوگا (3)۔ واللہ اعلم۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مدنیین کی روایت سے مروی ہے اور زیاد نے ان سے روایت کی ہے کہ مال صدقہ سے مکاتب کی اس کی کتابت کی آخر میں اتنے مال سے مدد کی جائے گی کہ وہ آزاد ہو جائے (4)۔ اور اسی بناء پر جمہور علماء نے قول باری تعالیٰ: وَ فِي الرِّقَابِ کی تاویل کی ہے۔ اور ابن وہب، امام شافعی، لیث اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے۔ اور علی بن موسیٰ القمی الحنفی نے اپنی احکام میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مکاتب مراد ہے۔ اور گردنیں آزاد کرنے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے: الکیا طبری نے کہا ہے: اور انہوں نے اس کے انکار اور منع میں واضح اور بین وجہ ذکر کی ہے اور کہا ہے: بے شک آزاد کرنا ملکیت کو باطل کرنا ہے اور تملیک (مالک بنانا) نہیں ہے اور جو مکاتب کو دیا جائے گا وہ تملیک (مالک بنانا) ہے اور صدقہ کے حق میں سے ہے کہ وہ جائز نہیں ہوتا مگر تب جب اس میں تملیک جاری ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات بھی باعث تقویت ہے کہ اگر مقروض کی جانب سے اس کے حکم کے بغیر کوئی زکوٰۃ میں سے اس کا قرض ادا کر دے تو وہ اس حیثیت سے

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب البیوع، جلد 8، صفحہ 363، حدیث نمبر 16030
2۔ سنن ابن ماجہ، باب میراث الولاء، حدیث نمبر 2723، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 967		4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 968

جائز نہیں کہ وہ اس کا مالک نہیں بنا تو وہ ادائیگی عتق میں بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عتق بھی ولاء کو اپنی ذات کی طرف لانا ہوتا ہے اور وہ مکاتب کو دینے میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ غلام کے ثمن جب اس نے ایک غلام کو دے دیئے تو غلام اس کا مالک نہیں ہوسکتا اور اگر اس نے وہ اس کے آقا کو دیئے تو اس نے اسے آزاد کرنے کا مالک بنا دیا۔ اور اگر اس نے اسے شراء اور عتق کے بعد دیئے تو وہ قرض کو پورا کرنے والا ہوگا اور وہ زکوٰۃ میں جائز نہ ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث موجود ہے جو اس معنی پر نص ہے جو ہم نے غلام کو آزاد کرنے اور مکاتب کی مدد کرنے کے جواز کے بارے ذکر کیا ہے، دارقطنی نے اسے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور اس نے عرض کی: آپ میری ایسے عمل پر راہنمائی فرمایئے جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور مجھے جہنم کی آگ سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خطبہ مختصر اور چھوٹا کرے تو تو نے مسئلہ (سوال) سے اعراض کیا، تو ایک آدمی کو آزاد کرا اور گردن چھوڑ دے''۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، نفس اور آدمی کو آزاد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ تو اسے آزاد کرنے میں منفرد ہو اور فك الرقبة کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کے ثمن میں معاونت کرے'' (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ مال زکوٰۃ سے قیدیوں کو آزاد کرانے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ اور ابن قاسم کا قول ہے اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ جائز ہے (2)، کیونکہ یہ گردن ہے جس کا غلامی کی ملکیت کے ساتھ مالک بنایا گیا ہے پس یہ غلامی سے آزادی کی طرف نکل جاتی ہے اور یہ ان گردنوں کو آزاد کرنے کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، کیونکہ جب مسلمان کی غلامی سے مسلمان کو آزاد کرانا عبادت اور صدقہ کے مال سے جائز ہے، تو پھر زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے کہ کافر کی غلامی اور ذلت سے مسلمان کی گردن آزاد ہو۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ قولہ تعالیٰ: وَالْغٰرِمِیْنَ مراد وہ لوگ ہیں جن پر قرض ہو اور ان کے پاس اسے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، مگر وہ آدمی جس نے سفاہت اور بے وقوفی کی وجہ سے قرض لیا تو اس کی طرف سے مال زکوٰۃ یا کسی دوسرے مال سے قرض ادا نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے (3)۔ اور اس کا قرض مال زکوٰۃ میں سے ادا کیا جائے گا جس کے پاس مال ہو اور اس پر اتنا قرض ہو جو اس سارے مال کو محیط ہو جس کے ساتھ وہ اپنا قرض پورا کرسکتا ہے اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ فقیر بھی ہے اور غارم (مقروض) بھی لہٰذا دونوں وصفوں کے عوض اسے دیا جائے گا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس پھل میں جو اس نے خریدا تھا خسارہ پڑ گیا اور اس کا قرض بہت زیادہ ہوگیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس پر صدقہ کرو''۔ چنانچہ لوگوں نے اس پر صدقہ کیا اور وہ اس کے قرض کی پوری مقدار کو نہ پہنچ سکا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 135 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 968 3۔ ایضاً

قرض خواہوں کو فرمایا: ''تم وہ لے لو جو تم پاؤ اور تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ صلح اور نیکی کے لیے دیت یا جرمانہ وغیرہ کا بوجھ برداشت کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ اسے صدقہ میں سے اتنا دیا جائے جس سے وہ اسے ادا کر سکے جو بوجھ اس نے اٹھایا ہے بشرطیکہ وہ اس پر واجب ہوا گرچہ وہ غنی ہو، جب کہ وہ اپنے مال سمیت برباد کیا جا رہا ہو جیسا کہ مقروض۔ اور یہ امام شافعی، آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اور کئی دوسروں نے کہا ہے۔ اور جس نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اس نے قبیصہ بن مخارق کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے ایک ذمہ داری (بوجھ) اٹھائی اور میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تا کہ اس بارے میں آپ سے سوال کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو ٹھہر یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقہ آ جائے تو ہم تیرے لیے اس سے حکم دیں گے...... پھر فرمایا...... اے قبیصہ! بے شک مانگنا، سوال کرنا تین آدمیوں میں سے ایک کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہوتا ایک وہ جس نے کسی کا بوجھ (دیت، خون بہا وغیرہ) اٹھا رکھا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہو جائے پھر وہ مانگنے سے رک جائے۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے کوئی تکلیف اور مصیبت آ پہنچی ہو اس کا مال برباد ہو گیا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے فاقے نے آ لیا ہو یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین آدمی شہادت دیں کہ تحقیق فلاں کو فاقے نے آ لیا ہے تو اس کے لیے سوال کرنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط اور صحیح زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اے قبیصہ! ان کے سوا سوال کرنا حرام ہے اور سوال کرنے والا اس طرح حرام کھائے گا'' (2)۔ پس آپ کا قول: ثم یمسك اس پر دلیل ہے کہ اب وہ غنی ہے، کیونکہ فقیر پر رکنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک سوال کرنا، مانگنا حلال نہیں ہے مگر تین میں سے ایک کے لیے ایک وہ جو شدید فقر میں مبتلا ہو یا وہ جو شدید اور پریشان کن قرض میں مبتلا ہو (3) یا جو دردناک اور تکلیف دہ دیت اور خون بہا کے بوجھ میں مبتلا ہو''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: ''سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہو گا'' (4)۔ الحدیث۔ عنقریب آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اس میں اختلاف ہے کیا صدقہ کے مال سے میت کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صدقہ سے میت کا قرض ادا نہیں کیا جا سکتا اور یہی قول ابن المواز کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید کہا: مال صدقہ میں سے اسے بھی نہیں دیا جا سکتا جس پر کفارہ ہو اور حقوق اللہ میں سے اسی طرح کی کوئی اور شے لازم ہو، بے شک غارم وہ ہے جس پر ایسا قرض ہو جس میں اسے قید کیا جا سکتا ہو (5)۔ ہمارے علماء وغیرہم نے کہا ہے: مال صدقہ میں سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 50

میت کا قرض ادا کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ غارمین میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں ہر مومن کے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں، جس کسی نے مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جس نے قرض یا عیال (فقیر اور محتاج اولاد) چھوڑے تو وہ میری طرف اور میرے ذمہ ہے''(1)۔

**مسئلہ نمبر 22۔** قولہ تعالیٰ: وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس سے مراد جنگ لڑنے والے لشکری اور چھاؤنیوں کی جگہیں ہیں، انہیں وہ مال دیا جائے گا جو وہ اپنی جنگ میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ اغنیاء ہوں یا فقراء۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے ہیں۔ امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اسے ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ ان دونوں نے کہا ہے: سبیل اللہ حج ہے(2)۔ اور بخاری میں ہے: اور ابولاس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم نے حج کے لیے صدقہ کے اونٹ پر سوار کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا جاتا ہے: آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ سے (غلام) آزاد کرا سکتا ہے(3) اور حج میں دے سکتا ہے۔ ابومحمد عبدالغنی الحافظ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن خیاش نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا ابوغسان مالک بن یحییٰ نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا: یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا مہدی بن میمون نے محمد بن ابی یعقوب سے انہوں نے عبدالرحمن ابن ابی نعم سے اور ان کی کنیت ابوالحکم ہے، ہمیں خبر دی کہ انہوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! بے شک میرے خاوند نے اپنے مال کے بارے میں فی سبیل اللہ کے لیے وصیت کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس وہ اسی طرح ہے جیسے اس نے فی سبیل اللہ کہا ہے۔ تو میں نے ان کو کہا: جس بارے اس نے سوال کیا ہے تم نے اس کے لیے سوائے غم اور پریشانی کے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا: اے ابن ابی نعم تو مجھے یہ مشورہ دے رہا ہے کہ میں اسے یہ حکم دیتا کہ وہ اپنا مال وصیت ان لشکروں کو دے دے جو نکلتے ہیں اور زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔ تو میں نے پوچھا: تو آپ اسے کیا حکم دو گے؟ انہوں نے فرمایا: میں اسے حکم دے رہا ہوں کہ وہ یہ مال صالحین کی جماعت کو دے۔ بیت اللہ الحرام کو حج کرنے والوں کو دے۔ وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ شیطان کے وفد کی مثل نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ جملہ تین بار کہا۔ میں نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! شیطان کا وفد کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ قوم ہے جو ان امراء پر داخل ہوتے ہیں اور ان کے پاس جا کر باتوں کی چغلی کھاتے ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔ پس انہیں انعامات دیئے جاتے ہیں اور اس پر انہیں عطایا دیئے جاتے ہیں اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: صدقہ کے مال سے گھوڑوں، ہتھیاروں اور دیگر تمام آلات جن کی جنگ میں ضرورت ہوتی ہے دیا جاسکتا ہے اور سرحد سے دشمن کو روکنے کے لیے، کیونکہ یہ سب کا سب جنگ کی راہ اور اس کی منفعت میں سے ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سہل بن ابی حثمہ پر آنے والی آفت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 285

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 969

3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

میں اس فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لیے سو اونٹ عطا فرمائے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابوداؤد نے بشیر بن یسار سے بیان کیا ہے کہ انصار کا ایک آدمی جسے سہل بن ابی حثمہ کہا جاتا تھا اس نے انہیں خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ بطور دیت دیئے (2) یعنی اس انصاری کی دیت جو خیبر میں قتل ہوا تھا۔ اور عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے صدقہ حلال ہوتا ہے، بلاشبہ یہ اس کے لیے حلال ہوتا ہے جس کے پاس اس کا مال موجود نہ ہو اور یہ مذہب امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور جمہور اہل عالم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین نے کہا ہے: مجاہد کو صدقہ کا مال نہیں دیا جائے گا مگر جب کہ وہ فقیر ہو اور لشکر سے کٹ جانے والا ہو۔ اور یہ نص پر زیادتی ہے اور آپ کے نزدیک نص پر زیادتی نسخ کہلاتی ہے۔ اور نسخ ثابت نہیں ہوتا مگر قرآن کریم کے ساتھ یا خبر متواتر کے ساتھ اور وہ یہاں معدوم ہے (3)، بلکہ صحیح سنت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اس کا خلاف ثابت ہے: ''کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا سوائے پانچ کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے یا زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس نے صدقہ کو اپنے مال سے خرید لیا ہو یا غارم (مقروض) کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس کے پڑوس میں کوئی مسکین ہو اور وہ اس مسکین پر صدقہ کرے پھر وہ مسکین کسی غنی کو بطور ہدیہ دے دے'' (4)۔ اسے امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم عن عطاء بن یسار سے مرسل ذکر کیا ہے اور معمر نے زید بن اسلم عن عطا بن یسار عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرفوع ذکر کیا ہے۔ پس یہ حدیث آیت کے معنی کے لیے مفسر ہے۔ اور یہ کہ بعض اغنیاء کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے لیے مفسر ہیں: ''صدقہ حلال نہیں کسی غنی کے لیے اور نہ کسی طاقت ور تندرست کے لیے'' (5)۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مجمل ہے اور یہ اپنے عموم پر نہیں ہے اس کی دلیل مذکورہ پانچ اغنیاء والی روایت ہے۔ اور ابن القاسم کہتے تھے: کسی غنی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ صدقہ میں سے ایسا مال لے جس سے جہاد میں وہ مدد حاصل کر سکتا ہے اور اسے فی سبیل اللہ خرچ کر سکتا ہے اور بلاشبہ یہ فقیر کے لیے جائز ہے۔ فرمایا: اور اسی طرح غارم (مقروض) بھی ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صدقہ سے اتنا مال لے جس کے ساتھ وہ اپنا مال بچا سکتا ہو اور اس سے وہ اپنا قرض ادا کرے حالانکہ وہ اس (صدقہ) سے غنی ہو۔ فرمایا: جب مجاہد اپنے غزوہ میں محتاج ہو جائے حالانکہ وہ غنی تھا اس کا مال ہو جو اس سے غائب ہو (یعنی اس کے پاس موجود نہ ہو) تو وہ صدقہ میں سے کوئی شی نہ لے اور قرضہ لے لے اور پھر جب وہ اپنے شہر پہنچے تو اپنے مال سے اسے ادا کر دے۔ یہ سب کچھ ابن حبیب نے ابن القاسم سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے یہ

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 969    2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 266    3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 269

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1393، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب لی تحل لہ الصدقۃ، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

گمان کیا ہے کہ ابن نافع وغیرہ نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی ہے۔ ابوزید وغیرہ نے ابن قاسم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: زکوٰۃ سے غازی کو حصہ دیا جائے گا اگرچہ دوران جنگ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے کافی ہو اور وہ اپنے شہر میں غنی (دولت مند) ہو یہی صحیح ہے، کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے: ''سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا'' (1)۔ اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ مال زکوٰۃ میں سے مجاہدین اور گھوڑے باندھنے کی جگہوں یا سرحد کے قریب ان کی حفاظت کے لیے چھاؤنیوں وغیرہ کے لیے دیا جائے گا چاہے وہ فقراء ہوں یا اغنیاء۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ قولہ تعالیٰ: وَابْنِ السَّبِيْلِ سبیل کا معنی راستہ ہے اور مسافر کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اسے لازم پکڑنے والا ہوتا ہے اور اس کا گزر اس پر ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إن تسألوني عن الهوى فأنا الهَوَى　　وابن الهَوَى وأخو الهَوَى وأبوهُ

مراد یہ ہے کہ جب کسی نے اپنے شہر، اپنی قیام گاہ اور اپنے مال سے سفر اختیار کر لیا اور راستے میں اس کے اسباب ختم ہو گئے، تو مال زکوٰۃ میں سے اسے دیا جائے گا اگرچہ وہ اپنے شہر میں غنی ہو اور اس میں یہ لازم نہیں کہ اس کا ذمہ قرض حسنہ سے مشغول ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے: جب وہ ایسے آدمی کو پالے جو اس کا قرض ادا کر دے گا تو پھر اسے مال زکوٰۃ میں سے نہ دیا جائے گا (2)۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک کے احسان کے نیچے داخل ہو حالانکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے احسان کو پا لیا ہے۔ اور اگر اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کر دے تو پھر ابن سبیل ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے مال زکوٰۃ لینے کے جواز میں دو روایتیں ہیں: مشہور یہ ہے کہ اسے مال زکوٰۃ نہیں دیا جائے گا۔ اور اگر اس نے لے لیا تو پھر اسے لوٹانا اس کے ذمہ لازم نہ ہوگا جب وہ اپنے شہر کی طرف جائے اور نہ بطور زکوٰۃ اسے (دیگر افراد کو دینا) اس پر لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ اگر کوئی آئے اور مذکورہ اوصاف میں سے کسی وصف کا دعویٰ کرے، تو کیا اس کا قول قبول کیا جائے گا یا نہیں اور اسے یہ کہا جائے گا کہ جو تو کہہ رہا ہے اسے ثابت کر؟ تو جہاں تک دین کا تعلق ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اسے ثابت کرے اور رہیں تمام صفات تو ظاہر حال اس کی شہادت دیتا ہے اور ان میں اسی پر اکتفا کر لیا جائے گا۔ اور اس پر دلیل دو صحیح حدیثیں ہیں۔ دونوں کو اہل الصحیح نے روایت کیا ہے اور یہی قرآن کریم کا ظاہر معنی بھی ہے۔ امام مسلم نے جریر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا: دن کے آغاز میں ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے۔ فرمایا: پس ایک قوم آپ کے پاس حاضر ہوئی وہ پراگندہ حال، ننگے پاؤں، سیاہ و سفید دھاری دار قمیصیں یا عبائیں پہنے ہوئے تھے اور تلواریں لٹکائے ہوئے تھے، ان میں سے عام قبیلہ مضر سے تھے بلکہ وہ تمام کے تمام ہی مضر میں سے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مقدس اس وقت متغیر ہو گیا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فاقے کی حالت میں دیکھا، پس آپ اندر تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 970

پڑھی۔ پھر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ...... الآیہ تا قولہ ...... رَقِیْبًا۝ (النساء) (اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں الخ)

اور وہ آیت جو سورۂ حشر میں ہے: وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر: 18) (اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے کل کے لیے) ہر آدمی اپنے درہم و دینار میں سے، اپنے کپڑے میں سے اور اپنی گندم کے صاع میں سے صدقہ کرے، حتیٰ کہ فرمایا: اگرچہ وہ آدھی کھجور ہی ہو"۔ فرمایا: پس انصار میں سے ایک آدمی ایک تھیلی لے کر آیا جس سے اس کا پہلو جھکنے کے قریب تھا بلکہ وہ جھکا ہوا تھا، فرمایا: پھر لوگ لگاتار تسلسل کے ساتھ آنے لگے یہاں تک کہ میں نے وہاں کھانے پینے کی چیزوں کے دو ڈھیر لگے ہوئے دیکھے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا تو وہ چمک رہا تھا گویا کہ اس پر سونے کا طلاء کیا گیا ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہوگا اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اجروں میں سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی اور جس نے اسلام میں برا طریقہ رائج کیا اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور اس کا بوجھ بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اپنے بوجھ اور گناہوں میں سے کسی شے کی کمی نہیں کی جائے گی" (1)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ظاہر حال پر اکتفاء کیا اور آپ نے صدقہ دینے پر برانگیختہ کیا اور ان سے کوئی گواہ طلب نہ کیا اور نہ اس کی چھان بین کی کہ کیا ان کے پاس مال ہے یا نہیں؟ اور اسی کی مثل ابرص، اقرع اور اعمیٰ والی حدیث ہے جسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور یہ ان کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک بنی اسرائیل میں ایک برص کا مریض، ایک گنجا اور ایک اندھا تھا پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ انہیں آزمائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا وہ پہلے برص والے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کون سی شی تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا خوبصورت رنگ اور اچھی جلد اور مجھ سے یہ بیماری دور ہو جائے جس کے سبب لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں، فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اس سے سارے داغ ختم ہو گئے اور اسے خوبصورت رنگ اور اچھی جلد عطا کر دی گئی۔ اس نے کہا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا اونٹ یا کہا گائیں، یہ شک اسحاق کو ہے، مگر یہ کہ برص والے یا گنجے میں سے ایک نے اونٹ کہا اور دوسرے نے گائے کہا۔ بیان کیا: پس اسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی دے دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے بعد ازاں وہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: خوبصورت بال اور وہ مجھ سے ختم ہو گئے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: پس اس نے اسے ہاتھ پھیرا تو اس سے گنجا پن دور ہو گیا اور اسے خوبصورت بال عطا کر دیئے گئے پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ تو اس نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 327

گائے چنانچہ اسے حاملہ گائے عطا کر دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس میں برکت عطا فرمائے۔ فرمایا: پھر وہ اندھے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ اس نے کہا: یہ کہ اللہ تعالیٰ میری نظر مجھے واپس لوٹا دے کہ میں اس کے ساتھ لوگوں کو دیکھ سکوں۔ فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت اسے واپس لوٹا دی، پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: بکریاں پس اسے بچے جننے والی بکری عطا کر دی گئی۔ پس ان دونوں ( گائے اور اونٹنی ) اور اس بکری نے بچوں کو جنم دیا۔ فرمایا پس اس کے لیے اونٹوں کی ایک وادی ہوگئی اور دوسرے کے لیے گائیوں کی وادی ہوگئی اور تیسرے کے لیے بکریوں سے وادی بھر گئی۔ فرمایا: پھر وہ فرشتہ ایک اور صورت اور ہیئت میں اس برص والے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین آدمی ہوں میرے پاس اسباب سفر ختم ہو چکے ہیں آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی نہیں ہے میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے حسین رنگ، خوبصورت جلد اور اونٹوں کی صورت میں مال عطا فرمایا کیا تو میرے اس سفر میں اس میں سے کچھ معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: حقوق بہت زیادہ ہیں۔ تو اس نے اسے کہا: میں تجھے پہچانتا ہوں کیا تو برص زدہ نہ تھا لوگ تجھے فقیر ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تجھے ( یہ مال ) عطا فرمایا؟ تو اس نے جواب دیا: بلاشبہ میں تو اپنے جد اعلیٰ کی جانب سے پشت در پشت اس مال کا وارث ہوں۔ تو اس نے کہا: اگر تو جھوٹ بول رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا، پھر وہ گنجے کے پاس اپنی صورت میں آیا اور اس سے اسی طرح کی گفتگو کی جیسے اس پہلے سے کی تھی، تو اس نے بھی اسے اس پہلے کی طرح جواب دیا تو اس ( فرشتے ) نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا۔ فرمایا: پھر وہ اپنی اسی صورت اور ہیئت میں اندھے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین اور ابن سبیل ( مسافر ) آدمی ہوں مجھ سے میرے اسباب سفر منقطع ہو گئے پس آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی سہارا نہیں میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے بصارت اور بکریاں عطا فرمائیں کیا تو ان کے ساتھ میرے سفر میں کوئی معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تحقیق میں اندھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف میری بصارت لوٹا دی تو جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے قسم بخدا! آج کے دن میں تجھے کسی مشقت میں نہیں ڈالوں گا تو اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر لے لے تو اس نے کہا: تو اپنا مال اپنے پاس رکھ، کیونکہ تم آزمائے گئے تجھ سے رضا اور خوشی حاصل ہوئی اور تیرے دونوں ساتھیوں پر ناراضگی ہوئی'' (1)۔ اس میں اس پر بڑی واضح دلیل ہے کہ جس نے اپنے فقیر پر زیادتی کا دعویٰ کیا عیال یا غیر عیال وغیرہ کا تو اس سے کوئی شواہد نہیں لیے جائیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے شواہد لیے جائیں گے اگر وہ قادر ہو، کیونکہ حدیث میں ہے '' کہ ایک مسکین آدمی اور ابن سبیل ( مسافر ) نے کہا میں تجھ سے بکری کا سوال کرتا ہوں'' تو وہ اسے سفر ثابت کرنے کا مکلف اور پابند نہ بنائے اور رہا مکاتب تو وہ کتابت ثابت کرنے کا پابند ہوگا، کیونکہ اس میں غلامی اصل ہے یہاں تک کہ حریت ( آزادی ) ثابت ہو جائے (2)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 2، صفحہ 408　2۔ احکام القرآن لابن العربی

**مسئلہ نمبر 25**۔ زکوٰۃ کی رقم اسے دینا جائز نہیں ہوتا جس کا نفقہ (خرچہ) آدمی کے ذمہ لازم ہوتا ہے اور وہ والدین، اولاد اور بیوی ہے اور اگر امام وقت نے کسی آدمی کا صدقہ اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کی بیوی کو دے دیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر اس نے یہ بذات خود دیا تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ سے ایک فرض ساقط کر دیتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی مال زکوٰۃ اپنے پوتے، اپنے نواسے کو نہیں دے سکتا اور نہ ہی وہ اپنے مکاتب غلام، مدبر غلام، ام ولد لونڈی (اور لونڈی جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) اور وہ غلام جس کا نصف حصہ اس نے آزاد کر رکھا ہو کو دے سکتا ہے''۔ کیونکہ اسے فقیر کو (سوال سے) روکنے کے واسطہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زکوٰۃ دینے اور نکالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور املاک کے منافع اس کے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، اسی وجہ سے ان میں سے بعض کی شہادت بعض کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ فرمایا: مکاتب وہ غلام ہے جس پر ابھی ایک درہم بھی باقی ہو(1) اور بسا اوقات وہ عاجز ہوتا ہے اور کمائی اس کے لیے ہو جاتی ہے۔ وہ غلام جس کا بعض حصہ آزاد کیا گیا ہو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مکاتب کے قائم مقام ہے۔ اور صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک وہ اس آزاد کے قائم مقام ہے جس پر قرض ہو پس اسے زکوٰۃ دینا جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ اور اگر زکوٰۃ انہیں دی جن کا نفقہ اس کے ذمہ لازم نہیں تو پھر اس میں اختلاف ہے۔ پس ائمہ میں سے بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے اسے مکروہ کہا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں تعریف کا خوف ہے۔ اور مطرف نے بیان کیا ہے: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زکوٰۃ اپنے اقارب کو دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور واقدی نے کہا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: افضل ترین آدمی جسے تو اپنی زکوٰۃ دے سکتا ہے وہ تیرے وہ رشتہ دار ہیں جن کا تو محتاج نہ ہو۔ تحقیق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ کو فرمایا: ''تیرے لیے دو اجر ہیں ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر''۔ عورت کا اپنی زکوٰۃ اپنے خاوند کو دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن حبیب سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ کے بارے میں اس مال سے مدد لیتے تھے جو وہ انہیں (بطور زکوٰۃ) دیتی تھیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے، لیکن صاحبین نے ان سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: یہ جائز ہے۔ اور یہی اصح ہے، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی: بے شک میں اپنے خاوند پر صدقہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں کیا وہ میرے لیے جائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں تیرے لیے دو اجر ہوں گے ایک صدقہ کا اجر اور دوسرا قرابت کا اجر''(2)۔

اور صدقہ مطلقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر خاوند کا نفقہ لازم نہیں ہے، پس وہ اجنبی آدمی کے قائم مقام ہو گئی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ان دونوں کے درمیان املاک کے منافع مشترک ہیں، یہاں تک کہ ان دونوں میں سے ایک کی شہادت دوسرے کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ اور حدیث طیبہ کو نفلی صدقہ پر محمول کیا جائے گا۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی المکاتب، حدیث نمبر 3425، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

امام شافعی، ابوثور اور اشہب رحمۃ اللہ علیہم نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جب کہ وہ اسے عورت کی طرف اس مال (نفقہ) میں خرچ نہ کر دے جو مرد پر اس کے لیے لازم ہوتا ہے۔ بے شک وہ اسے اپنے نفقہ اور لباس میں اپنی ذات پر خرچ کر سکتا ہے جو وہ اس سے لیتا ہے اور اس پر اپنے مال سے خرچ کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 27۔** دی جانے والی مقدار میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے، پس غارم (مقروض) کو اس کے قرضے کی مقدار کے برابر دیا جائے گا اور فقیر اور مسکین کو ان کی کفایت اور ان کے اہل وعیال کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا۔ نصاب کے برابر یا اس سے کم مقدار میں دینے کے جواز میں اختلاف ہے اور اس کا دارومدار اس سابقہ اختلاف پر ہے جو فقر کی تعریف میں ہے جس کے ساتھ اس کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے۔

علی بن زیاد اور ابن نافع نے بیان کیا ہے: اس میں کوئی مقرر حد نہیں ہے، بلکہ اس کا انحصار والی کے اجتہاد پر ہے۔ کبھی کبھی مساکین قلیل ہوتے ہیں اور صدقہ زیادہ ہوتا ہے پس ایک فقیر کو سال بھر کی خوراک دے دی جائے گی۔ اور مغیرہ نے بیان کیا ہے: نصاب سے کم مقدار دی جائے گی اور اسے نصاب تک نہیں پہنچایا جائے گا۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر شہر میں دو زکاتیں ہوں ایک نقد (درہم و دینار) اور دوسری حرث (عشر وغیرہ) تو وہ اتنی لے لے جو اسے دوسری تک پہنچا دے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ نصاب کی مقدار زکوٰۃ دے دے اگرچہ شہر میں دو یا اس سے زیادہ زکاتیں ہوں، کیونکہ غرض فقیر کو غنی کرنا ہے یہاں تک کہ وہ غنی ہو جائے۔ پس جب اس نے ایک لے لی تو اگر دوسری زکوٰۃ کا وقت آ گیا اور اس کے پاس اتنی مقدار ہو جو اسے کافی ہو تو اسے کوئی دوسرا لے لے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: نصاب کے برابر دینے میں یہ اصحاب الرائے کا مذہب ہے، تحقیق اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کے ساتھ ساتھ مکروہ قرار دیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ بعض اپنی حاجت کی وجہ سے فی الحال مشغول ہوتے ہیں۔ پس فی الحال اس کی حالت سے فالتو دو سو سے کم ہو اور جب اس نے اسے مجموعی طور پر دو سو سے زیادہ دیئے اور فی الحال اس کی حاجت سے فالتو دو سو کی مقدار ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ اور متاخرین حنفیہ میں سے بعض نے کہا ہے: یہ تب ہے جب اس کے اہل وعیال نہ ہوں اور نہ اس پر قرض ہو اور اگر اس پر قرض ہو تو پھر اسے دو سو یا اس سے زیادہ اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں جس کے ساتھ اگر وہ اپنا قرض ادا کر دے تو اس کے پاس باقی دو سو سے کم رہ جائے۔ اور اگر وہ عیال دار ہو تو اسے اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں کہ اگر وہ اسے اپنے بچوں پر تقسیم کرے تو ان میں سے ہر ایک کو دو سو سے کم ملے، کیونکہ اس پر صدقہ کرنا معنوی طور پر اس پر اور اس کے اہل وعیال پر صدقہ کرنا ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 28۔** تو جان کہ قول باری تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ مطلق ہے اس میں نہ کوئی شرط ہے اور نہ کوئی قید، بلکہ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جملہ فقراء پر خرچ کرنا جائز ہے چاہے وہ بنی ہاشم میں سے ہوں یا ان کے سوا ہوں، مگر سنت کئی شروط کے اعتبار کے ساتھ وارد ہے۔ ان میں سے یہ ہے کہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ ہوں اور وہ ان میں سے بھی نہ ہوں جن کا نفقہ صدقہ

1۔ احکام القرآن، جلد 2 صفحہ 973

کرنے والے پر لازم ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کمانے کی قوت نہ رکھتا ہو، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے اور نہ ہی کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے" (1)۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اور مسلمان علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فرضی صدقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے حلال نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ہاشمی کا ہاشمی کو صدقہ دینا جائز ہے، اسے الکیا طبری نے بیان کیا ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس سے علیحدگی اختیار کی ہے اور کہا: بے شک بنی ہاشم کے اموال پر صدقات میں سے کوئی شے حرام نہیں۔ اور یہ اختلاف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو رافع کے غلام کو کہا تھا: "بے شک کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے" (2)۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ بنی ہاشم کے لیے نفلی صدقہ کے جائز ہونے میں اختلاف ہے۔ پس وہ نظریہ جس پر جمہور اہل علم ہیں اور وہی صحیح ہے...... کہ نفلی صدقہ بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے جائز ہے، دینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرات علی، عباس اور فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے صدقہ کیا اور بنی ہاشم کی جماعت پر ہی اسے وقف رکھا۔ اور ان کے صدقات موقوفہ معروف و مشہور ہیں۔ اور ابن ماجشون، مطرف، اصبغ اور ابن حبیب نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نہ فرضی صدقہ میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ نفلی صدقہ میں سے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نفلی صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: وہ حدیث جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے: "آل محمد کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے"۔ بلاشبہ وہ نفلی زکوٰۃ کے بارے ہی ہے (3)۔ اور اس قول کو ابن خویز منداد نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: اور ان کے موالی کو دونوں صورتوں میں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے "الواضحہ" میں کہا ہے: نفلی صدقہ میں سے آل محمد کو نہیں دیا جائے گا۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: تو ان کے موالی کو؟ انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا موالی کیا ہیں؟ تو میں نے ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول سے استدلال کیا: "کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے" (4)۔ تب کہا تحقیق آپ نے کہا ہے: "کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ حکم نیکی اور حرمت میں ہے (5)۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ قولہ تعالیٰ: فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ سیبویہ کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فرض الله الصدقات فریضة (اللہ تعالیٰ نے یقیناً صدقات فرض کیے ہیں) اور امام کسائی کے قول کے مطابق قطع کی بنا پر رفع بھی جائز ہے، یعنی ھن فریضة۔ زجاج نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ اسے اس کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابراہیم بن عبلہ نے اس کو (رفع) کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے خبر بنایا ہے جیسا کہ آپ کہتے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83 2۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 366 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974

4۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 1000 5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974

ہیں: إنما زید خارج۔

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۱

''اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو (اپنی بدزبانی سے) اذیت دیتے ہیں نبی (کریم) کو اور کہتے ہیں یہ کانوں کا کچا ہے۔ فرمائیے وہ سنتا ہے جس میں بھلا ہے تمہارا، یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مومنوں (کی بات) پر اور سراپا رحمت ہے ان کے لیے جو ایمان لائے تم میں سے اور جو لوگ دکھ پہنچاتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ منافقین میں سے کچھ تھے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کے لیے غیبت اور تصادم کی زبان لمبی کرتے تھے اور کہتے تھے: اگر آپ نے مجھے جھڑکا تو میں قسم اٹھادوں گا کہ میں نے یہ نہیں کہا ہے، تو آپ اسے قبول کر لیں گے، کیونکہ آپ کانوں کے کچے ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل اذن جب وہ آدمی ہر ایک کی بات سنتا ہو۔ اس میں واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں۔ اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: هُوَ اُذُنٌ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جو سننے والا اور قبول کرنے والا ہو۔ یہ آیت عتاب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی، اس نے کہا: بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سنتے ہیں اور ہر اس بات کو قبول کرتے ہیں جو انہیں کہی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نبتل بن حارث تھا۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ نبتل عظیم الجثہ آدمی تھا اس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، رنگ گندمی تھا، آنکھیں سرخ تھیں، رخسار سرخی مائل سیاہ رنگ کے تھے اور وہ بہت بدشکل تھا اور یہ وہی ہے جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شیطان کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ نبتل بن حارث کو دیکھ لے''(1)۔ السفعة (ضمہ کے ساتھ) ایسی سیاہی جس میں سرخی کی آمیزش ہو۔ اور الرجل أسفع (ایسا آدمی جس کا رنگ سیاہ سرخی مائل ہو) یہ جوہری کے نزدیک ہے اور اذن ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ، ای هو أذن خير لا أذن شر یعنی وہ خیر اور بھلائی کی بات سنتا ہے اور شر اور برائی کی نہیں سنتا۔ اور قُلْ اُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ رفع اور تنوین کے ساتھ حسن اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اضافت کے ساتھ اور حمزہ نے رحمة کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے أذن پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے: قل هو أذن خير وهو رحمة یعنی وہ خیر اور بھلائی سننے والا ہے شر سننے والا نہیں، یعنی وہ اسے سنتا ہے جس کا سننا وہ پسند کرتا ہے اور وہ رحمت ہے۔ اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ خیر پر عطف کی وجہ سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اہل عربیہ کے نزدیک بعید ہے، کیونکہ اس

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130، دار الکتب العلمیہ بیروت

کا دو اسموں کے درمیان ہونا بعید ہے اور مخفوض (مجرور) میں قبیح ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: اور جس نے رحمۃ کو جر دی ہے تو وہ خیر پر عطف کی بنا پر ہے اور معنی ہے خیر کو سننے والا اور رحمت کو سننے والا، کیونکہ رحمۃ خیر اور بھلائی میں ہی ہے اور رحمت کا عطف المومنین پر کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا معنی بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور مومنین کی تصدیق کرتا ہے۔ تو کوفیوں کے قول کے مطابق اس میں لام زائدہ ہے اور اس کی مثال لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝ (الاعراف) ای یرھبون ربھم (وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) اور ابو علی نے کہا ہے: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے رَدِفَ لَكُمْ (النمل: 72) اور یہ مبرد کے نزدیک اس مصدر کے متعلق ہے جس پر فعل دلالت کرتا ہے، تقدیر عبارت ہے: ایمانه للمؤمنین یعنی اس کا مومنین کی تصدیق کرنا نہ کہ کفار کی یا یہ اس معنی پر محمول ہوگا کیونکہ یؤمن کا معنی یصدق (تصدیق کرنا) ہے پس اسے لام کے ساتھ متعدی کیا گیا جیسا کہ اس قول میں لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران: 3)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

"(منافق) قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی تمہارے سامنے تاکہ خوش کریں تمہیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی کریں اگر وہ ایمان دار ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ روایت ہے کہ منافقین کی ایک قوم جمع ہوئی، ان میں جلاس بن سوید، ودیعہ ابن ثابت تھے اور ان میں انصار کا غلام بھی تھا جسے عامر بن قیس پکارا جاتا تھا، تو انہوں نے اسے بہت حقیر قرار دیا اور گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا: اگر وہ حق ہے جو محمد (مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں تو یقیناً ہم گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ تو وہ غلام غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ جو وہ کہتے ہیں وہ حق ہے اور تم گدھوں سے زیادہ شریر ہو، پھر اس نے ان کے قول کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، تو انہوں نے قسم اٹھا دی کہ عامر جھوٹا ہے، تو عامر نے کہا: وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور اس پر اس نے قسم کھائی اور کہا: اے اللہ! تو ہمیں متفرق نہ کرنا یہاں تک کہ سچ بولنے والے کا سچ اور جھوٹ بولنے والے کا جھوٹ واضح اور ظاہر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ۔(1)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ تقدیر عبارت ہے: واللہ أحق أن یرضوہ و رسولہ أحق أن یرضوہ (حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اسے راضی کریں) پھر اس سے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأي مختلفُ(2)

ہم اس کے ساتھ جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ جو تیرے پاس ہے راضی ہیں اور رائے مختلف ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130
2۔ المحرر الوجیز، جلد 11، صفحہ 53

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: کلام میں کوئی عبارت محذوف نہیں ہے اور تقدیر عبارت و الله أحق أن یرضوہ و رسولہ (الله تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کے رسول کو) یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے و رسولہ أحق أن یرضوہ اور لفظ الله افتتاح کلام میں ہے، جیسے تو کہتا ہے: ما شاء الله و شئت (جو الله تعالیٰ چاہے اور تو چاہے) نحاس نے کہا ہے: سیبویہ کا قول ان میں سے اولیٰ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح روایت میں اس سے نہی وارد ہے کہ یہ کہا جائے: ماشاء الله و شئت اور کسی شی میں تقدیم و تاخیر مقدر نہیں کی جاسکتی اور اس کا معنی صحیح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں، کہا گیا ہے کہ بے شک الله تعالیٰ نے اپنی رضا کو ان کی رضا میں رکھا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ اس نے فرمایا ہے: مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء: 80) (جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی الله کی) اور ربیع بن خثیم جب اس آیت سے گزرتے تو وقف کرتے اور کہتے: ایک حرف ہے اور کتنا ہی شاندار حرف ہے، ان کے سپرد کر دیا گیا ہے پس وہ ہمیں خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت قسم کھانے والے کی قسم کو قبول کرنے کو متضمن ہے اگرچہ محلوف لہ کی رضامندی لازم نہیں اور قسم مدعی کا حق ہے۔ اور یہ اس کو متضمن ہے کہ قسم الله تعالیٰ کی ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”جو قسم اٹھائے تو اسے چاہیے کہ وہ الله تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے اور وہ جس کے لیے قسم اٹھاتا ہے پس اسے چاہیے کہ وہ اس کی تصدیق کرے“ (1)۔ قسم اور اس میں استثنا کے متعلق مکمل بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّہٗ مَنۡ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خَالِدًا فِیۡہَا ؕ ذٰلِکَ الۡخِزۡیُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۶۳﴾

”کیا وہ نہیں جانتے کہ جو کوئی مخالفت کرتا ہے الله اور اس کے رسول کی تو اس کے لیے آتش جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں یہ بہت بڑی رسوائی ہے“۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا یعنی کیا وہ منافق نہیں جانتے۔ ابن ہرمز اور حسن نے تعلموا صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہ یہ یعلموا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور ہا، حدیث یعنی گفتگو سے کنایہ ہے۔ مَنۡ یُّحَادِدِ اللّٰہَ، مَنۡ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور المحادۃ اس کا معنی ہے اس کا اس کی حد میں داخل ہونا اور اس کا اس کی حد میں واقع ہونا، جیسا کہ المشاقۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: حاد فلان فلانا یعنی فلاں اپنی حد کے سوا دوسرے کی حد میں داخل ہو گیا۔ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ کہا جاتا ہے: شرط میں فا کا مابعد مبتدا ہے۔ پس واجب ہے کہ فان ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہو۔ تحقیق خلیل اور سیبویہ نے فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ میں ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: اور یہ جید اور عمدہ ہے اور یہ شعر بھی کہا ہے:

وعِلمِی بأسْدام المیاہ فلم تزَل	قلائصُ تَخدِی فی طریق طلائحُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 983

وأني إذا مَلَّتْ رِكابي مُناخَها　　فإني على حَظّي من الأمر جامحُ

مگر عام قراءت فان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پس خلیل نے بھی اور سیبویہ نے کہا ہے: بے شک أنّ ثانیہ پہلے سے بدل ہے (1)۔ اور مبرد کا گمان ہے کہ یہ قول مردود ہے اور صحیح وہ ہے جو جرمی نے کہا ہے، انہوں نے کہا: بے شک دوسرا أنّ تو کید کے لیے مکرر لایا گیا ہے کیونکہ کلام طویل ہو گیا اور اس کی نظیر وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝ (النمل) ہے اور اسی طرح فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا (الحشر: 17) ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فوجوب النار لہ پس آگ کا وجوب اس کے لیے ہے۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس وجہ سے غلط ہے بے شک أنّ مفتوحہ مشددہ سے ابتدا نہیں کی جا سکتی اور خبر کو مضمر کیا جا رہا ہے۔ اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فالواجب أن لہ نار جھنم پس واجب ہے کہ اس کے لیے جہنم کی آگ ہو، کیونکہ دوسرا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے فلہ أنّ لہ نار جھنم کیونکہ اسے فا اور ان کے درمیان ضمیر مجرور کی بنا پر ظرف مستقر کے ساتھ رفع دیا گیا ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝

"ڈرتے رہتے ہیں منافق کہ کہیں نازل (نہ) کی جائے اہل ایمان پر کوئی سورت جو آگاہ کر دے انہیں جو کچھ منافقوں کے دلوں میں ہے، آپ (انہیں) فرمائیے کہ مذاق کرتے رہو یقیناً اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم خوفزدہ ہو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ یہ خبر ہے اور امر نہیں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خبر ہے اس کی جو اس کے بعد اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ہے کیونکہ انہوں نے عناد کی وجہ سے کفر اختیار کیا اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ منافقوں میں سے ایک نے کہا: میں تو پسند کرتا ہوں اگر مجھے آگے لایا جائے اور سو کوڑے مجھے مارے جائیں لیکن ہمارے بارے میں کوئی ایسی شے نازل نہ ہو جو ہمیں رسوا کر دے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یحذر بمعنی یتحرز وہ بچتے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے چاہیے کہ وہ ڈرے، پس یہ امر ہے (3)، جیسے کہا جاتا ہے: یفعل ذالك (چاہیے کہ وہ کرے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ اس میں أن محل نصب میں ہے۔ یعنی مِن أنْ تنزل اور سیبویہ کے قول کی بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ یہ من کے حذف ہونے کی بنا پر محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یحذر کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو (4)، کیونکہ سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے: حذرت زیدا اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

حَذِرٌ أمورا لا تَضِير و آمِنٌ　　ما ليس مُنْجِيَه من الأقدار

اور مبرد نے اسے جائز نہیں قرار دیا، کیونکہ حذر (ڈرنا) ہیئت میں ایک شی ہے۔ اور علیھم کا معنی ہے علی المومنین۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54　　2۔ اسباب النزول، صفحہ 130　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54　　4۔ ایضاً

سورۃ یعنی ایسی سورت جو منافقین کی شان میں ہو جو انہیں ان کی عداوت و دشمنی، ان کی برائی اور ان کے عیوب و نقائص کے بارے آگاہ کر دے۔ اسی وجہ سے اس کا نام الفاضحہ المثیرہ اور المبعثرہ کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: مسلمان اس سورت کو الحفارہ کا نام دیتے تھے، کیونکہ جو کچھ منافقین کے دلوں میں تھا اس نے اسے کھود کر ظاہر کر دیا۔

**مسئلہ نمبر3**۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ اسْتَهْزِءُوْا یہ امر وعید اور تہدید کے لیے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ بے شک اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ مَّا تَحْذَرُوْنَ اسے جس کے ظاہر ہونے سے تم ڈرتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اسماء نازل کیے اور وہ ستر آدمی تھے، پھر رافت و رحمت کے سبب انہیں قرآن کریم سے مٹا دیا، کیونکہ ان کی اولاد مسلمان تھی اور لوگ آپس میں ایک دوسرے کو عار دلاتے رہتے ہیں، پس اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اسے ظاہر کر کے پورا فرما دیا جب کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے احوال اور ان کے اسماء سے آگاہ کر دیا نہ یہ کہ وہ قرآن کریم میں نازل ہوئے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد:30) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے) اور یہ الہام کی قسم ہے۔ اور منافقین میں سے کچھ متردد تھے نہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا اعتقاد رکھتے تھے اور نہ آپ کی تصدیق کا اور ان میں بعض وہ تھے جو آپ کی سچائی کو پہچانتے تھے اور آپ کے ساتھ عناد رکھتے تھے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝65

''اور اگر آپ دریافت فرمائیں ان سے تو کہیں گے: بس ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ آپ فرمایئے (گستاخو!) کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسول سے تم مذاق کیا کرتے تھے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی۔ علامہ طبری وغیرہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: اس اثنا میں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی طرف چل رہے تھے آپ کے آگے منافقوں کی ایک جماعت بھی چل رہی تھی تو انہوں نے کہا: تم دیکھو، یہ شام کے محلات فتح کرتا ہے اور بنی الاصفر کے قلعے لیتا ہے! تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع کر دیا جو ان کے دلوں میں تھا اور جس کے بارے وہ بات کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس جماعت کو میرے لیے روک لو''۔ پھر آپ ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''تم نے اس اس طرح کہا ہے''۔ تو انہوں نے قسمیں اٹھا دیں: ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہم اس معاملہ میں سنجیدہ نہ تھے۔ اور علامہ طبری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے یہ بات کرنے والے ودیعہ بن ثابت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے تنگ کے ساتھ چمٹے ہوئے دیکھا وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے

اور وہ کہتا تھا: بلاشبہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے: اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (1) (کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسولوں سے تم مذاق کیا کرتے تھے) اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہ لٹکنے والا عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ اسی طرح قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ وہ تبوک میں حاضر نہ تھا۔ قشیری نے کہا ہے: اور کہا گیا ہے بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ودیعہ بن ثابت کے لیے ہے'' اور وہ منافقین میں سے تھا اور وہ غزوۂ تبوک میں حاضر تھا۔ اور الحوض کا معنی ہے پانی میں داخل ہونا، پھر یہ ہر اس دخول میں استعمال کیا گیا جس میں تلویث اور اذیت ہو۔

**مسئلہ نمبر** 2۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے: یہ اس سے خالی نہیں ہے کہ اس بارے میں جو انہوں نے کہا ہے وہ سنجیدہ ہو یا تمسخر اور مذاق ہو، وہ جس حالت میں بھی تھا وہ کفر تھا، کیونکہ کفر کے ساتھ تمسخر کرنا بھی کفر ہے اس میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ تحقیق أخو العلم والحق ہے اور ٹھٹھا مذاق أخو الباطل والجهل (2) ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھ: اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (البقرہ) (کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ نے کہا: میں پناہ مانگتا ہوں خدا کی اس سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں)

**مسئلہ نمبر** 3۔ تمام احکام میں مثلاً بیع، نکاح اور طلاق وغیرہ میں ہزل (ٹھٹھا، مذاق) میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے: مطلقاً حکم لازم نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ ہے کہ مطلق حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ بیع وغیرہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اور نکاح، طلاق میں حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور یہ طلاق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے۔ اور بیع میں حکم لازم نہیں ہوتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب عہد میں کہا ہے: ہازل کا نکاح لازم ہو جاتا ہے۔ اور ابوزید نے ابن القاسم سے العتبیہ میں کہا ہے: وہ لازم نہیں ہوگا۔ اور علی بن زیاد نے کہا ہے: پہلے اور بعد اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اور ہازل کی بیع کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے علماء سے دو قول ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ طلاق سنجیدہ حالت میں ہو یا مذاق کی حالت میں دونوں برابر ہیں (یعنی دونوں حالتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی)۔ اور ہمارے اصحاب میں سے بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر دونوں فریق نکاح اور بیع کی صورت میں ہزل (تمسخر) پر متفق ہوں تو پھر وہ لازم نہ ہوگا اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہو تو پھر سنجیدگی ہزل پر غالب ہوگی (3)۔ اور ابوداؤد، ترمذی اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں ہیں جن میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں تمسخر و مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ) نکاح، طلاق اور رجعت ہیں'' (4)۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 195 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 976 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 977

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142۔ سنن ابی داؤد، باب فی الطلاق علی الهزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح حدیث میں والرجعة کے الفاظ ہیں۔ اور مؤطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن سعید سے اور انہوں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جن میں لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتق (آزاد کرنا) ہیں (1)۔ اور اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ان تمام نے کہا: تین چیزیں ہیں جن میں نہ لعب ہے (اور نہ ان میں رجوع ہے) ان میں خوش طبعی کرنے والا بھی سنجیدگی سے کرنے والا شمار ہوگا (اور وہ) نکاح، طلاق اور عتق ہیں۔ اور حضرت سعید بن مسیب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: چار چیزیں ہیں جو ہر ایک پر جائز ہیں عتق (آزاد کرنا) طلاق، نکاح اور نذر ماننا۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تین چیزیں ہیں جن میں کوئی لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور نذر ماننا ہیں۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

"(اب) بہانے مت بناؤ، تم کافر ہو چکے (اظہار) ایمان کے بعد، اگر ہم معاف بھی کر دیں ایک گروہ کو تم سے تو عذاب دیں گے دوسرے گروہ کو کیونکہ وہی (اصلی) مجرم تھے"۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ یہ زجر و توبیخ کے انداز میں (نہی) ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: تم وہ نہ کرو جو نفع بخش نہ ہوگا، پھر ان پر کفر اور گناہ سے معذرت (اور توبہ) نہ کرنے کا حکم لگا دیا۔ اس میں اعتذر بمعنی اعذر ہے ای صار ذا عذر یعنی وہ عذر والا ہو گیا۔ لبید نے کہا ہے:

ومَنْ یَبْكِ حَوْلًا كاملا فقد اعتذر

اور جو پورا سال روتا رہا تحقیق اس نے عذر پیش کر دیا۔

اور الاعتذار کا معنی ہے: موجود شے کا اثر (نشان) مٹا دینا۔ کہا جاتا ہے: اِعتذرتِ المنازلُ منزلیں مٹ گئیں (ختم ہو گئیں) اور الاعتذار کا معنی الدروس (مٹانا) ہے۔ شاعر کا قول ہے۔

أم كنتَ تعرِف آياتٍ فقد جعلتْ		أطلالُ إلْفِك بالودْكاءِ تَعتذِرُ

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے کاٹ دینا۔ اور اِعتذرت إليه کا معنی ہے میں نے وہ سب کاٹ دیا (ختم کر دیا) جو اس کے دل میں پایا جا رہا تھا۔ اور اسی سے عذرة الغلام ہے یعنی وہ چمڑا جو بچے کے ختنہ کے وقت کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور اسی سے عذرة الجاریہ بھی ہے کیونکہ اس کے کنوارپن کی مہر کو کاٹ دیا جاتا ہے (مراد پردہ بکارت کو زائل کرنا ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ کہا گیا ہے: یہ تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو نے استہزاء کیا اور ایک ہنسا۔ پس ان میں سے جسے معاف کیا گیا وہ وہی ہے جو ہنسا اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ اور

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 510

الطائفة سے مراد جماعت ہے۔ اور نفس معنی کی بنا پر واحد کو بھی طائفہ کہا جاتا ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے: جمع کے لفظ کا اطلاق واحد پر کیا جا سکتا ہے، جیسے تیرا قول ہے: خرج فلان علی البغال۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ الطائفة سے جب واحد مراد لیا گیا ہے تو وہ طائف ہو (1) اور ہا مبالغہ کے لیے ہو۔ اور وہ آدمی جس کو معاف کر دیا گیا اس کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ اس کا نام مخشی بن حمیر ہے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے اور ابن ہشام نے کہا ہے: اس کے بارے میں ابن مخشی کہا جاتا ہے۔ اور خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: اس کا نام مخاشن بن حمیر ہے۔ اور ابن عبدالبر نے مخاشن حمیری ذکر کیا ہے۔ (اور سہیلی نے مخشن بن حمیر ذکر کیا ہے) اور تمام نے یہ ذکر کیا ہے کہ اسے جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا، اس نے توبہ کر لی تھی اور اس کا نام عبدالرحمن رکھا گیا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اسے شہادت کی موت عطا کی جائے، اس کی قبر کے بارے معلوم نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی ہے کہ کیا وہ منافق تھا یا مسلمان؟ بعض نے کہا ہے: وہ منافق تھا پھر اس نے خالص سچی توبہ کر لی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ مسلمان تھا، مگر یہ کہ اس نے منافقین سے بات سنی تو ان کے ساتھ ہنس پڑا اور ان کا انکار نہ کیا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں، حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے اور بند رکھتے ہیں اپنے ہاتھ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے بھلا دیا ہے اللہ کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں، بے شک منافق ہی نافرمان ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ یہ مبتدا ہے۔ بَعْضُهُمْ یہ مبتدا ثانی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس سے بدل ہو اور مِّنْۢ بَعْضٍ خبر ہو۔ اور بَعْضُهُمْ، مِّنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے وہ دین سے نکلنے میں ایک شے کی مثل ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ متصل ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (التوبہ: 56) یعنی وہ مومنین میں سے نہیں ہیں۔ ولکن بعضهم من بعض یعنی وہ برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں باہم متشابہ اور ایک جیسے ہیں۔ ان کا اپنے ہاتھوں کو بند رکھنے سے مراد جہاد کو ترک کرنا ہے اور ہر اس چیز میں ہے جو ان پر حق میں سے واجب ہوتی ہے۔ اور یہاں نسیان کا معنی چھوڑنا ہے، یعنی انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کے بارے انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا، پس اللہ کریم نے انہیں اس شک کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ منسی (بھلا دیا گیا) کی طرح ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ثواب سے منسی کے قائم مقام کر دی۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: نسیهم یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں خیر اور نیکی سے فراموش کر دیا۔ اور رہا شر تو وہ انہیں نہ بھولا (2)۔ اور فسق سے مراد اطاعت اور دین سے نکلنا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 56 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 351

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

''وعدہ کیا ہے الله نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے دوزخ کی آگ کا ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں، یہی کافی ہے انہیں، نیز لعنت کی ہے ان پر الله نے اور انہی کے لیے ہے دائمی عذاب''۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ کہا جاتا ہے: الله تعالیٰ کے خیر اور بھلائی کے وعدہ کو وعدہ اور شر کے وعدہ کو وعید کہا جاتا ہے۔ خٰلِدِيْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا عامل محذوف ہے۔ یعنی یصلونها خالدین وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ جلیں گے۔ هِيَ حَسْبُهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی یہ ان کے اعمال کی جزا کے طور پر کافی و وافی ہے۔ اور اللعن کا معنی بعد (دوری) ہے یعنی الله تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی ان کے لیے ہمیشہ ثابت رہنے والا عذاب ہے۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

''(منافقو!) تمہاری حالت بھی ایسی ہے جیسے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے وہ زیادہ تھے تم سے قوت میں اور مال اور اولاد کی کثرت میں، سو لطف اٹھایا انہوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور تم نے بھی لطف اٹھایا اپنے (دنیوی) حصہ سے اسی طرح جیسے لطف اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور (لذتوں میں) تم بھی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے رہے تھے، یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ زجاج نے کہا ہے: کاف محل نصب میں ہے، الله تعالیٰ نے کفار کے ساتھ جہنم کی آگ کا اسی طرح وعدہ کیا جیسے اس نے ان لوگوں سے وعدہ کیا جو ان سے پہلے گزرے (ای وعد الله الکفار نار جهنم وعداً کما وعد الذین من قبلهم) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم نے برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں ان لوگوں کے افعال کی طرح افعال کیے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ (فعلتم کافعال الذین من قبلکم فی الأمر بالمنکر والنهی عن المعروف) (1) پس مضاف حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم ان کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے (أنتم کالذین من قبلکم) تو کاف محل رفع میں ہوا، کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور أشدّ غیر منصرف ہے کیونکہ افعل

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 78

کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ اور یہ اصل میں اشدد ہے، یعنی وہ قوت کے اعتبار سے تم سے زیادہ مضبوط تھے پس ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا اور نہ انہیں کسی نے اللہ تعالیٰ کا عذاب دور کرنے کی قدرت دی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سعید بن نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں نے لیا ذراع کے بدلے ذراع، بالشت کے بدلے بالشت اور کرو کے بدلے کرو (دو بازوؤں کو پھیلانے کی جگہ تقریباً چھ فٹ) یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کی بل میں داخل ہوا تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے'' (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو: **كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الخلاق سے مراد دین ہے۔ **فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ** یہاں تک کہ وہ آیت سے فارغ ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود و نصاریٰ نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ نہیں ہیں مگر وہی''۔ اور صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم یقیناً اپنے سے پہلے والے لوگوں کے طریقہ کار کی اتباع اور پیروی کرو گے بالشت کے بدلے بالشت اور گز کے بدلے گز یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم اس میں داخل ہو گے''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا یہود و نصاریٰ؟ تو آپ نے فرمایا: ''تو اور کون ہیں''؟ (2) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آج کی رات گزشتہ رات کے ساتھ کتنی مشابہت رکھتی ہے، وہ بنی اسرائیل ہیں ہم نے ان کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: **فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ** یعنی انہوں نے دین میں سے اپنے حصے کے ساتھ نفع حاصل کیا جیسا کہ انہوں نے کیا جو ان سے پہلے گزرے۔ **وَخُضْتُمْ** یہ غیب سے خطاب کی طرف خروج ہے۔ **كَالَّذِيْ خَاضُوْا** یعنی ان کے لذتوں میں ڈوبنے کی طرح تم بھی لذتوں میں ڈوبے رہے، پس کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے (یعنی وخضتم خوضا كالذين خاضوا) اور الذی، من کی مثل اسم ناقص ہے، اس کے ساتھ واحد اور جمع کو تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: خضت الماء أخوضه خوضا وخياضا (میں پانی میں غوطہ زن ہو گیا) اور اسم ظرف مخاضة ہے، مراد وہ جگہ جہاں لوگوں کے لیے پیدل اور سوار ہو کر جانا جائز ہو۔ اور اس کی جمع المخاض اور المخاوض بھی ہے۔ یہ ابو زید سے منقول ہے۔ اور أخضت دابتي في الماء (میں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا) اور اخاض القوم یعنی ان کے گھوڑے داخل ہو گئے۔ اور خضت الغمرات (میں سختیوں میں گھس گیا)۔ اور کہا جاتا ہے: خاضه بالسيف یعنی اس نے اپنی تلوار کو مضروب میں حرکت دی۔ اور خوض في نجيعه (وہ اس کے خون میں اندر تک گھس گیا) اس کی تشدید مبالغہ کے لیے ہے۔ اور المِخوَض للشراب كالمِجدح للسويق (شراب بنانے کا آلہ اسی طرح ہے جیسے ستو گھولنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199 2۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339 3۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199

کا آلہ) اسی سے کہا جاتا ہے: خصت الشراب (میں نے شراب بنائی) اور خاض القوم فی الحدیث و تخاوضوا یعنی قوم گفتگو میں مشغول ہوگئی اور باہم ایک دوسرے میں مشغول ہو گئے۔ پس اس کا معنی یہ ہے: تم لہو ولعب کے ساتھ اسباب دنیا میں ڈوب گئے، کھو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم تکذیب اور جھٹلانے کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے میں مشغول ہو گئے۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ان کی نیکیاں باطل ہوگئیں، ضائع ہوگئیں۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

''کیا نہیں آئی ان کے پاس خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا، آئے تھے ان سب کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور نہ تھا اللہ (کا یہ دستور) کہ ظلم کرتا ان پر بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ اس میں نبا کا معنی خبر ہے (کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی) الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ہمزہ استفہام تقریر وتحذیر کے لیے ہے، یعنی کیا انہوں نے اس سے پہلے ہمارے کفار کو ہلاک کرنے کے بارے نہیں سنا۔ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ یہ الذین سے بدل ہے۔ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ یعنی نمرود بن کنعان اور اس کی قوم۔ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ اس میں مدین اس شہر کا نام ہے جس میں حضرت شعیب علیہ السلام سکونت پذیر تھے، وہ سب بادل کے دن کے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیئے گئے۔ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ کہا گیا ہے: اس سے قوم لوط مراد لی جارہی ہے(1)، کیونکہ ان کی زمین ان کے ساتھ الٹ گئی تھی۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الْمُؤْتَفِكٰتِ سے مراد ہر وہ ہے جو ہلاک کیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: انقلبت علیهم الدنیا (ان پر دنیا بدل گئی، الٹ گئی) اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان بستیوں کے رہنے والوں کے پاس ان کے رسول آئے۔ اس بنا پر تو ان کے رسول اکیلے حضرت لوط علیہ السلام تھے، لیکن انہیں ہر بستی میں رسول بنا کر بھیجا گیا(2)۔ اور وہ تین بستیاں تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چار تھیں۔ اور دوسری جگہ پر قول باری تعالیٰ ہے: وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ یہ جنس کے طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسل سے مراد واحد لیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ (المومنون: 51) (اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ) اور آپ کے زمانے میں اور کوئی نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 80
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 201

مومنین کو خطاب کیا ان چیزوں کے بارے جن کا اس نے رسولوں کو حکم فرمایا(1) ''الحدیث۔ اور اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور مراد تمام رسول ہیں۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ دستور نہ تھا کہ وہ انہیں ہلاک کرتا یہاں تک کہ اس نے ان کی طرف انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن انہوں نے حجت قائم ہونے کے بعد خود ہی اپنے اوپر ظلم کیے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، حکم کرتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی، یہی لوگ ہیں جن پر ضرور رحم فرمائے گا اللہ، بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ یعنی باہم مودت، محبت اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے میں ان کے دل متحد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (توبہ:67) کیونکہ ان کے دلوں میں اختلاف تھا لیکن وہ حکم میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کی توحید اور وہ تمام امور جو ان کے تابع ہیں ان کا حکم کرتے ہیں۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ بتوں کی عبادت اور وہ تمام امور جو اس کے تابع ہیں ان سے روکتے ہیں۔ علامہ طبری نے ابو العالیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے تو وہ بتوں اور شیاطین کی عبادت سے نہی مراد ہے(2)۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے تفصیلی بحث سورۂ المائدہ اور آل عمران میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اس کے بارے گفتگو سورۂ بقرہ کے شروع میں ہو چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں اور اسی اعتبار سے یہاں زکوٰۃ مفروضہ مراد ہو سکتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک نوافل پر مدح و تعریف کرنا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ جو نوافل پر کاربند ہوتا ہے وہ فرائض کی ادائیگی کے زیادہ لائق ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ اور وہ فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ وَرَسُوْلَهٗ اور اس کے رسول کی ان امور میں جو اس نے ان کے لیے سنت قرار دیے ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ میں سین

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 326
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 202

وعدہ میں مہلت (اور وقفے) کو داخل کرنے کے لیے ہے تاکہ نفوس اس کی امید پر خوشحال اور خوش ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل اسے پورا کرنے کا ضامن ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۟

''وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغات کا رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں یہ ہمیشہ رہیں گے ان میں نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ، جنات سے مراد باغات ہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جنت کے درختوں اور کمروں کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی۔ اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ وہ کھائیوں کے بغیر ہی منضبط اندازے اور مقدار کے مطابق بہہ رہی ہوں گی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً یعنی ان میں زبرجد، موتیوں اور یاقوت کے محلات ہوں گے اور اس کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے مہک رہی ہوگی۔ فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ مراد دار الاقامۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمکان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو جائے۔ اور اسی سے معدن (کان) ہے۔ اور عطا خراسانی نے کہا ہے: جَنّٰتِ عَدْنٍ یہ جنت کا قصبہ ہے اور اس کی چھت عرش الرحمن ہے۔ اور حضرت ابن مسعود نے کہا ہے: اس سے مراد جنت کا وسط ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ سونے کا محل ہے جس میں سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا عادل حاکم کے کوئی داخل نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: عدن، جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے اور اسی میں تسنیم کا چشمہ ہے اور باغات اردگرد سے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور یہ اس دن سے ڈھانپی ہوئی ہے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق فرمایا ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین اور جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ اس میں اتر پڑیں گے(1)۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اس سے بھی بڑی اور عظیم ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یہی تو بڑی کامیابی ہے)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۟

''اے نبی کریم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے ان پر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 81

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور اس میں آپ کے بعد آپ کی امت داخل ہے۔ کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کفار کے ساتھ تلوار سے جہاد کرنے اور منافقوں کے ساتھ زبان سے اور شدید جھڑک اور غصے کے اظہار کا حکم ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: منافقین کے ساتھ جہاد کیجئے اپنے ہاتھ سے اور اگر طاقت نہ رکھیں تو پھر اپنی زبان سے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھیں تو پھر ان سے انتہائی ترش روئی اور سختی سے پیش آؤ۔ اور حسن نے کہا ہے: منافقین سے جہاد کرو ان پر حدود قائم کرنے کے ساتھ اور زبان کے ساتھ...... اور اسے حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے...... اور وہ اکثر حدود کے مرتکب ہو جاتے ہیں (1)۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: رہا زبان کے ساتھ حجت قائم کرنا یہ تو دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے اور جہاں تک حدود کا تعلق ہے کہ اکثر حدود تک پہنچنا ان کے پاس ہوتا ہے (یعنی حدود کا اکثر ارتکاب ان کے پاس ہوتا ہے) تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں، حالانکہ گناہ اور معصیت کا ارتکاب کرنے والا منافق نہیں، بلاشبہ منافق اس شے کے سبب ہوتا ہے جو نفاق میں سے اس کے دل میں پوشیدہ ہوتی ہے، نہ کہ اس کے سبب جس کے بارے جوارح ظاہر التباس میں پڑ جاتے ہیں۔ اور محدودین کی اخبار کا سیاق اس کی شہادت دیتا ہے کہ وہ منافق نہیں ہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ، الغلظ (سختی) یہ رأفت (نرمی) کی ضد ہے اور اس سے مراد امر کو نافذ کرنے کے لیے امر (حاکم) کا دل کو سخت کرنا ہے۔ اور یہ زبان میں نہیں ہوتی، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے حد کے کوڑے لگائے اور اس پر اسے جھڑکے نہیں'' (3)۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اور اسی سے وہ قول بھی ہے جو عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا: ''تم تو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تندخو اور سخت مزاج ہو (انت أفظ وأغلظ من رسول الله ﷺ) (4) اور الغلظ کا معنی ہے پہلو کا سخت ہونا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ضد ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۱۵﴾ (شعراء) (اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع وانکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) اور اس آیت نے عفو، صلح اور درگزر میں سے ہر شے کو منسوخ کر دیا ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 383
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 978
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70
4۔ صحیح بخاری، فضائل الصحابہ، جلد 1، صفحہ 520

خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۞

''قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا حالانکہ یقیناً انہوں نے کہی تھی کفر کی بات اور انہوں نے کفر اختیار کیا اسلام لانے کے بعد اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے۔ اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے، سو اگر وہ توبہ کر لیں تو یہ بہتر ہوگا ان کے لیے اور اگر وہ روگردانی کریں تو عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ عذاب الیم دنیا اور آخرت میں۔ اور نہیں ہوگا ان کا روئے زمین میں کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا روایت ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید بن صامت اور ودیعہ بن ثابت کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے کہا: قسم بخدا! اگر محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ان بھائیوں کے خلاف سچے ہیں جو ہمارے سردار اور ہمارے اشراف ہیں تو ہم یقیناً گدھوں سے برے ہیں۔ تو عامر بن قیس نے اسے کہا: ہاں! قسم بخدا بلاشبہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور آپ کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور بلاشبہ تو گدھے سے زیادہ برا اور شریر ہے۔ اور عامر نے اس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ اور پھر جلاس آیا اور اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا کہ عامر نے جھوٹ بولا ہے۔ اور عامر نے قسم کھائی۔ یقیناً اس نے یہ کہا ہے۔ اور پھر کہا: اے اللہ! اپنے سچے نبی پر اس بارے کوئی شے نازل فرما، پس یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور کہا گیا ہے: بے شک وہ جس نے یہ سنا وہ عاصم بن عدی تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ حذیفہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اسے اس کی بیوی کے بیٹے نے سنا تھا اور اس کا نام عمیر بن سعد تھا، اس بارے میں یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اس کا نام مصعب تھا۔ پس جلاس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ اس کی خبر کے بارے خبر نہ دے۔ تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جلاس کو جب اس کے ساتھی نے کہا تھا: بلاشبہ میں تیرے قول کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کروں گا، تو اس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا، پھر وہ ایسا نہ کر سکا، بلکہ اس سے عاجز آ گیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا کے ساتھ اسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے نازل ہوئی، اس نے بنی غفار کے ایک آدمی کو دیکھا جو جہینہ قبیلے کے ایک آدمی کے ساتھ لڑ رہا تھا اور جہینہ انصار کے حلیف تھے پس غفاری جہینی پر غالب آ گیا۔ تو ابن ابی نے پکار کر کہا: اے بنی اوس اور خزرج، اپنے بھائی کی مدد کرو! قسم بخدا! ہماری اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال تو اس طرح ہے جیسے کسی کہنے والے نے کہا: ''اپنے کتے کو موٹا کرتا کہ وہ تجھے کھائے''۔ اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 82

وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا(1)۔ حضور نبی مکرم ﷺ کو اس بارے خبر دی گئی، تو عبداللہ بن ابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے قسم اٹھادی کہ اس نے یہ بات نہیں کی، یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام منافقین کا قول ہے، یہ حسن نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ صحیح ہے، کیونکہ قول میں عموم ہے اور اس میں اور ان میں معنی موجود ہے اور اس میں ان تمام کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ نبی نہیں ہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ نقاش نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا اس وعدے کو جھٹلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فتح کے بارے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد جلاس کا قول ہے: بے شک حضرت محمد (ﷺ) جو لے کر آئے اگر وہ حق ہے تو ہم یقیناً گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ اور عبداللہ بن ابی کا یہ قول ہے: اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو یقیناً وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد حضور نبی مکرم ﷺ کو گالیاں دینا اور اسلام میں طعن و تشنیع کرنا ہے(3)۔ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور انہوں نے کفر اختیار کیا اس کے بعد کہ ان کے لیے اسلام کا حکم لگ چکا تھا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ منافقین کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا (المنافقون) ((ان کا) یہ (طریق کار) اس لیے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لائے پھر وہ کافر بن گئے) میں قطعی دلیل ہے۔

اور یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ کفر ہر اس (قول) کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے جو تصدیق اور معرفت کی نقیض اور ضد ہو، اگرچہ ایمان ثابت نہیں ہوتا مگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اس کے سوا اقوال و افعال میں سے کسی سے ثابت نہیں ہوتا مگر نماز میں (ثابت ہو جاتا ہے)۔ اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: تحقیق علماء نے نماز میں ایسی شے پر اجماع کیا ہے جس پر باقی ساری شریعت میں انہوں نے اجماع نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے بالا جماع کہا ہے: جس کا کفر پہچان لیا جائے پھر لوگوں نے اسے نماز اپنے وقت میں پڑھتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ اس نے کثیر نمازیں پڑھیں اور انہیں اس کے اقرار باللسان کا علم نہ ہوا تو اس کے لیے ایمان کا حکم لگایا جائے گا اور انہوں (علماء) نے اس کے لیے روزے اور زکوۃ میں اس قسم کا حکم نہیں لگایا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا یعنی منافقین نے غزوۂ تبوک کے دوران لیلۃ العقبہ میں حضور نبی مکرم ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بارہ آدمی تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام بیان کیے حتی کہ آپ نے ان تمام کو شمار کیا۔ تو میں نے عرض کی: کیا آپ ان کی طرف (پیغام) نہیں بھیجیں گے کہ آپ انہیں قتل کر دیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ عرب کہیں کہ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کامیاب ہو گیا تو وہ انہیں قتل کرنے لگا بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں دبیلہ کے ساتھ کافی ہوگا'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ یہ دُبیلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جہنم کا شعلہ ہے جو ان میں سے ہر ایک کی رگ دل پر پڑے گا یہاں تک کہ اس کی روح نکل جائے گی''۔(4) (اور وہ

---

1۔ اسباب النزول، صفحہ 131　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979

3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83　4۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 369

ہلاک ہو جائے گا) پھر اسی طرح ہوا۔ اسی کے ہم معنی مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابن ابی کے سر پر تاج رکھنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ اس پر جمع ہو جائیں۔ اس بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی وہ کسی شے کو ناپسند نہیں کرتے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے نابغہ نے کہا ہے:

ولا عَيْبَ فيهم غير أن سيوفهم بهنّ فُلول من قِراعَ الكَتائب(1)

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں لشکروں کو کاٹنے کے سبب کند ہو چکی ہیں۔

اور کہا جاتا ہے: نَقَمَ ينقِم اور نَقِم ينقَم شاعر نے عین کے کسرہ کی صورت میں کہا ہے:

ما نقِموا من بنى أميّة إلا أنهم يحلُمون إن غضبوا

اور زہیر نے کہا ہے:

يؤخَّر فيوضع فى كتاب فَيُدَّخَرْ ليوم الحساب أو يُعَجَّلْ فينقِمَ

یہ قاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ شعر میں کہا جاتا ہے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ دیت طلب کرتے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بارے ان کے لیے فیصلہ فرما دیتے تو وہ غنی (دولت مند) ہو گئے۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ بارہ ہزار تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ بے شک مقتول جلاس کا غلام تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے وہ انتہائی تنگ زندگی گزارتے تھے، نہ وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے اور نہ غنیمت تقسیم کرتے تھے، پس جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو وہ غنائم کے سبب غنی ہو گئے (2)۔ اور یہ مثل مشہور ہے (اتق شرّ من أحسنت إليه) تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے۔

علامہ ابو نصر قشیری نے کہا ہے: بجلی کو کہا گیا کیا آپ قرآن کریم میں یہ پاتے ہیں تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے)

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ روایت ہے کہ جلاس اس وقت کھڑا ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے استغفار اور توبہ کی۔ تو یہ ایسے کافر کی توبہ پر دلیل ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہی وہ ہے جسے فقہاء زندیق کا نام دیتے ہیں۔ تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زندیق کی توبہ معروف نہیں ہے، کیونکہ وہ ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے اور اس کا ایمان معلوم نہیں ہو سکتا مگر اس کے قول کے ساتھ۔ اور اسی طرح اب وہ کرتا ہے اور ہر وقت وہ کہتا ہے: میں مومن ہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 60
2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83

حالانکہ جو کچھ وہ ظاہر کر رہا ہے اس کا خلاف وہ چھپا رہا ہے، پس جب وہ اس پر مطلع ہوا اور اس نے کہا: میں نے توبہ کی، تو اس کی حالت اس سے تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ پہلے تھا۔ پس جب وہ ہمارے پاس اپنی طرف سے توبہ کرتے ہوئے آیا اس سے پہلے کہ وہ اس پر مطلع ہو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی (1)۔ اور آیت سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا یعنی اگر وہ روگردانی کریں ایمان اور توبہ سے یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں قتل کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ عذاب دے گا۔ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ یعنی ان کے لیے روئے زمین پر کوئی بچانے والا نہ ہوگا جو انہیں بچائے گا۔ وَّلَا نَصِيْرٍ اور نہ کوئی معاون و مددگار ہوگا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

''اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا اللہ کے ساتھ کہ اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے اور ضرور ہو جائیں گے نیکوکاروں میں۔ پس جب اس نے عطا فرمایا انہیں اپنے فضل سے تو کنجوسی کرنے لگے اس کے ساتھ اور روگردانی کر لی اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔ پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے نفاق جما دیا ان کے دلوں میں اس دن تک جب ملیں گے اس کو اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف ورزی کی اللہ سے جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کے راز کو اور ان کی سرگوشی کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سارے غیبوں کا''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہ انصار میں سے ایک آدمی تھا اس نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی شے عطا فرمائی تو میں ضرور اس میں اس کا حق ادا کروں گا اور یقیناً خیرات دوں گا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرمایا تو اس نے وہ کیا جو تم پر بیان کیا گیا ہے۔ پس تم جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور تک پہنچا دیتا ہے۔ علی بن یزید نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی: اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979

ہے اے ثعلبہ! وہ قلیل جس کا شکر ادا کیا جائے اس کثیر سے بہتر ہے جس کی تو طاقت نہ رکھے"۔ پھر وہ دوبارہ حاضر ہوا تو پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی کی مثل ہو اگر میں چاہوں کہ پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ چلیں تو وہ یقینا چل پڑیں"۔ (أما ترضى أن تكون مثل نبي الله لوشئتُ أن تسير معي الجبال ذهبا لسارت) تو اس نے پھر عرض کی: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے تو میں ضرور ہر حق دار کو اس کا حق دوں گا۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی، پس اس نے بکریاں لیں تو وہ اس طرح بڑھیں جیسے کیڑے بڑھتے ہیں، تو اس پر مدینہ طیبہ تنگ ہو گیا پس وہ اس سے دور چلا گیا اور اس کی وادیوں میں سے ایک وادی میں جا کر رہنے لگا یہاں تک کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھنے لگا اور ان کے سوا اس نے جماعت چھوڑ دی۔ پھر وہ اور بڑھیں اور اتنی زیادہ ہو گئیں کہ اس نے سوائے جمعہ کے ساری نمازیں چھوڑ دیں اور وہ بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اس نے جمعہ بھی چھوڑ دیا۔ تو رسول اللہ نے فرمایا: یا ویح ثعلبه (ثعلبہ ہلاک ہو گیا) آپ نے یہ جملہ تین بار کہا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ:103) ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے اور آپ نے دونوں کو فرمایا: تم دونوں ثعلبہ اور فلاں کے پاس جاؤ ..... یہ فلاں بنی سلیم کا ایک آدمی تھا ...... اور تم ان سے زکوٰۃ لے آؤ"۔ چنانچہ وہ دونوں ثعلبہ کے پاس آئے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھ کر سنایا، تو اس نے کہا: یہ تو اخت جزیہ ہی ہے (یعنی زکوٰۃ جزیہ کی مثل ہی ہے) تم دونوں آگے جاؤ یہاں تک کہ جب فارغ ہو جاؤ تو پھر آنا۔ الحدیث اور یہ حدیث مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثعلبہ کے غنا کا سبب یہ بنا کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے کا وارث بنا۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب وہ ہے جس کے بارے وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ، الآیہ والی آیت نازل ہوئی (1)۔ جب اس نے زکوٰۃ کو روکا، فاللہ اعلم۔ اور جو اس کے بارے میں آیا ہے جو بدر میں حاضر ہوا تو اس کا معارض آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ، الآیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آیت کے سبب نزول کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ سے اس کا مال شام میں پیچھے رہ گیا، تو اس نے انصار کی ایک مجلس میں قسم کھائی، اگر وہ محفوظ رہا تو میں ضرور اس سے خیرات کروں گا اور اس سے صلہ رحمی کروں گا پس جب اسے صحیح سالم مل گیا تو اس نے اس کے ساتھ بخل کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثعلبہ بدری انصاری اور ان میں سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایمان کی شہادت دی ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ممتحنہ کے شروع میں آئے گا۔ پس اس کے بارے جو روایت کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: شاید اس کا قول جس نے ثعلبہ کے بارے یہ کہا ہے کہ اس نے اس زکوٰۃ کا انکار کیا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی وہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ آیت منافقین میں سے نبتل بن

1۔ اسباب النزول، صفحہ 132

حارث، جد بن قیس اور معتب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ نزول کے اعتبار سے ان کے ساتھ زیادہ موافق ہے، مگر یہ کہ قول باری تعالیٰ: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا وہ اس سے پہلے منافق نہ تھا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو: اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق میں اضافہ کر دیا پس وہ موت تک اس پر ثابت رہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ، جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

**مسئلہ نمبر2۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ تو یہ اس کا احتمال رکھتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ اپنی زبان کے ساتھ کیا ہو اور اپنے دل سے اس کا اعتقاد نہ رکھا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ دونوں (زبان اور دل) کے ساتھ ہو پھر اسے سوء خاتمہ نے آلیا ہو، کیونکہ اعمال اپنے خاتمہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور دل اپنے انجام اور اواخر کے ساتھ۔

اور من مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر مجرور میں ہے۔ اور قسم کا لفظ حدیث میں وارد ہے اور قرآن کریم کے ظاہر الفاظ میں یمین نہیں ہے مگر صرف ارتباط و التزام کے ساتھ، البتہ یہ معنوی اعتبار سے صیغہ قسم میں ہے کیونکہ لام اس پر دلالت کرتا ہے، یہ لفظ دو لاموں کے ساتھ مذکور ہے پہلا لام قسم کے لیے اور دوسرا لام الجواب ہے۔ اور یہ دونوں تاکید کے لیے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک یہ دونوں لام برائے قسم ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ واضح اور اظہر ہے، واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر3۔** وعدہ اور طلاق اور ہر وہ حکم جس کے ساتھ آدمی منفرد ہوسکتا ہے اور کسی غیر کا اس میں محتاج نہیں ہوتا، بے شک وہ اسے لازم ہو جاتا ہے جب وہ اپنے قصد و ارادہ سے اس کا التزام کرتا ہے اگرچہ وہ اس کے الفاظ نہ بھی کہے۔ یہ ہمارے علماء نے کہا ہے۔ امام شافعی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کسی پر کوئی حکم لازم نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے الفاظ ادا کرے۔ اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو موقف ان دونوں ائمہ نے اپنایا ہے اس کے صحیح ہونے پر دلیل وہ روایت ہے جسے اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، تحقیق آپ سے پوچھا گیا: جب آدمی اپنے دل سے طلاق کی نیت کر لے اور زبان کے ساتھ اس کا تلفظ نہ کرے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ اسے لازم ہو جائے گی، جیسا کہ آدمی اپنے دل کے ساتھ مومن ہو جاتا ہے اور اپنے دل کے ساتھ ہی کافر ہو جاتا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ایک عمدہ اصل ہے اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ کہا جائے: ایسا عقد جس میں آدمی اس کے التزام کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو تو فقط نیت کے ساتھ وہ اس پر منعقد ہو جائے گا۔ اس کی اصل ایمان اور کفر ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دوسرے قول کی حجت اور دلیل وہ روایت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے تجاوز اور

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 358
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 982

درگزر کی ہے ہر اس شے سے جو ان کے نفوس ان پر القا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کریں یا اس کے بارے کلام نہ کریں'' (1)۔ اور اسے ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی پر اہل علم کے نزدیک عمل بھی ہے کہ جب آدمی کا نفس طلاق کے بارے اس کے ذہن میں وسوسہ ڈالے تو کوئی شے واقع نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس بارے کلام کرے (2)۔ ابوعمر نے کہا ہے: جس کسی نے دل کے ساتھ طلاق کا اعتقاد رکھا اور اپنی زبان کے ساتھ اس بارے کچھ نہ بولا تو اس سے کوئی شے واقع نہ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی زیادہ مشہور ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے طلاق لازم ہو جائے گی جب اس نے اپنے دل سے اس کی نیت کر لی جیسا کہ وہ اپنے دل کے ساتھ کافر ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اپنی زبان سے اس بارے کچھ نہ بولے۔ نظر وفکر اور ترجیح کے اعتبار سے پہلا قول اصح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ہر اس شے سے تجاوز فرمایا ہے جس کے بارے ان کے نفوس نے ان میں وسوسہ اندازی کی جب تک زبان اس کے بارے گفتگو نہ کرے یا ہاتھ اس کے مطابق عمل نہ کرے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر یہ نذر ہے تو بلا اختلاف نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اسے ترک کرنا معصیت ہے اور اگر یہ قسم ہے تو بالاتفاق قسم کو پورا کرنا واجب نہیں، مگر اس میں معنی یہ ہے اگر آدمی فقیر ہو تو اس پر فرض زکوٰۃ متعین نہیں ہوتی، پس اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے مال کی التجا کی جس میں زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور وہ اسے ادا کرے گا جو اس پر فرض زکوٰۃ میں سے متعین ہوگی، پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا جو اس میں سے چاہا تو اس نے اسے چھوڑ دیا جس کا اس نے التزام کیا تھا، اس میں سے جو اصل دین میں اسے لازم تھا اگر وہ اس کا التزام نہ کرتا، لیکن مال کی طلب کے ساتھ مال لینا حقوق کو ادا کرنے کے لیے ہے یہ وہ ہے جسے اس نے چھپا رکھا ہے جب اس نے اللہ تعالیٰ سے بغیر خالص نیت کے مال کا مطالبہ کیا یا خالص نیت کے ساتھ کیا لیکن اس میں اس کے بارے شروع سے لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے گئی اس میں شقاوت تھی (4)۔ نعوذ باللہ من ذالک

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی تمنا اور آرزو کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں غور وفکر کرے جس کی تمنا کر رہا ہے، کیونکہ وہ اسے نہیں جانتا جو اس کے لیے اس کی امیدوں میں سے اللہ تعالیٰ کے غیب میں لکھا ہوا ہے'' (5)۔ یعنی ان کے انجام میں سے۔ پس کتنی امیدیں ہیں جن کے ساتھ وہ فتنے میں پڑ جاتا ہے یا سرکش ہو جاتا ہے پس یہی دنیا وآخرت میں ہلاک ہونے کا سبب بن جاتا ہے، کیونکہ امور دنیا کے نتائج اور انجام مبہم ہیں اور ان کے فاسد ہونے کا خطرہ ہے۔ اور رہی امور دین اور آخرت کی آرزو تو بلاشبہ ان کی تمنا کرنا اس کا نتیجہ قابل ستائش ہے ان پر برانگیختہ کیا گیا اور ان کی طرف بلایا گیا ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142
3۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 104
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 983
5۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 357

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے کہا: اگر میں فلاں فلاں چیز کا مالک بن گیا تو وہ صدقہ ہے (إن ملكتُ كذا و كذا فهو صدقة) کیونکہ یہ اس کے ذمہ لازم ہو جاتی ہے۔ یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اس کے ذمہ لازم نہ ہوگی۔ اور طلاق میں اسی کی مثل اختلاف ہے اور اسی طرح عتق میں بھی ہے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عتق میں اس پر لازم ہو جائے گا اور طلاق کی صورت میں لازم نہ ہوگا (1)، کیونکہ آزاد کرنا قربت ہے اور یہ نذر کے ساتھ ذمہ میں ثابت ہو جاتی ہے۔ بخلاف طلاق کے کیونکہ وہ محل میں تصرف کرنا ہے اور وہ ذمہ میں ثابت نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو داؤد اور ترمذی وغیرہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کے لیے ان چیزوں میں کوئی نذر نہیں ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا اور ان میں اس کے لیے کوئی عتق نہیں جن کا وہ مالک نہیں اور نہ ہی ان میں اس کے لیے طلاق کا کوئی حق ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا'' (2)۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: اس باب میں حضرت علی، حضرت معاذ، حضرت جابر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور وہی بہترین شے ہے جو اس باب میں مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں ان میں سے کوئی شے صحیح نہیں اور اسے ان پر محمول کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ظاہر آیت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا (3)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کر دیا۔ بَخِلُوْا بِهٖ تو وہ بطور صدقہ مال دینے، خیر کے کاموں میں مال خرچ کرنے اور ان (نذروں) کو پورا کرنے میں جن کے وہ ضامن بنے تھے اور انہوں نے جن کا التزام کیا تھا، وہ کنجوسی کرنے لگے۔ بخل کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَ تَوَلَّوْا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کر لی۔ وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ اور وہ اسلام سے منہ پھیرنے والے ہیں، یعنی اس سے اعراض کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا دو مفعول ہیں، ای أعقبهم الله تعالى نفاقاً في قلوبهم (یعنی بطور نتیجہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق راسخ کر دیا) اسی لیے کہا: بَخِلُوْا بِهٖ (وہ اس کے ساتھ بخیل ہو گئے) اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ یہ محل خفض (جر) میں ہے: ای یلقون بخلهم اس دن تک جب وہ اپنے بخل کو جا ملیں گے یعنی اپنے بخل کی جزا کو جا ملیں گے، جیسے کہا جاتا ہے: أنت تلقى غداً عملك (تو کل اپنے عمل کو جا ملے گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ، ای یلقون الله (اس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 141۔ ایضاً، حدیث نمبر 1101، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، باب فی الطلاق قبل النکاح، حدیث نمبر 1873، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

دن تک جب وہ اللہ تعالیٰ سے جاملیں گے) اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ نفاق کی حالت میں ہی مرا۔ اور یہ بعید ہے کہ اس میں جو حکم نازل کیا گیا ہے وہ ثعلبہ یا حاطب کے بارے ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''تجھے کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر مطلع ہوا اور اس نے فرمایا تم جو چاہو کرو تحقیق میں نے تمہیں بخش دیا ہے''(1)۔ اور ثعلبہ اور حاطب ان میں سے ہیں جو بدر میں حاضر ہوئے اور اس کا مشاہدہ کیا۔ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ان کے کذب سے مراد ان کا وعدہ کو توڑنا اور ان کا اسے پورا کرنے کو ترک کرنا ہے جسے انہوں نے اپنے ذمے لازم کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: نِفَاقًا نفاق جب دل میں ہو تو وہ کفر ہے، لیکن جب وہ اعمال میں ہو تو وہ معصیت ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چار خصلتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو گی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دے''۔ اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا: اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر(2) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس کلمہ کے مادہ اشتقاق پر بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کی تاویل میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جو ایسی بات کرتا ہے جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور وہ ایسا وعدہ کرتا ہے جسے پورا کرنے کا وہ اعتقاد نہیں رکھتا اور وہ امانت میں خیانت کرنے کے لیے اس کا منتظر رہتا ہے۔ اور انہوں نے اسے ضعیف الاسناد حدیث کے ساتھ جوڑ دیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اس حال میں کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے باہر آرہے تھے اور وہ دونوں بوجھل تھے (یعنی رو رہے تھے) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مجھے کیا ہے میں تم دونوں کو روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ تو دونوں نے جواب دیا: ایک حدیث ہے جسے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافق کی خصلتوں کے بارے میں سنا ہے ''جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے''۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا نہیں؟ تو دونوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی۔ تو آپ نے کہا: لیکن میں اس کے بارے پوچھوں گا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس حال میں نکلے ہیں کہ وہ دونوں رو رہے تھے، پھر آپ نے وہ ذکر کیا جو ان دونوں نے کہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے ان دونوں کو حدیث بیان کی اور میں نے اسے اس معنی میں نہیں بیان کیا جس میں ان دونوں نے اسے رکھا ہے کیونکہ منافق جب بات کرتا ہے درآنحالیکہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جب وہ وعدہ

1۔ صحیح بخاری، باب لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء، جلد 2، صفحہ 726　2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 10

کرتا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے گا اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے درآنحالیکہ وہ دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ خیانت کرے گا''۔علامہ ابن عربی نے کہا ہے: تحقیق اس پر واضح دلیل قائم ہوگئی کہ ان خصائل پر اعتماد کرنے والا کافر نہیں ہوگا، بلکہ وہ کافر ایسے اعتقاد کے ساتھ ہوگا جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے جہالت اور اس کی تکذیب کی طرف لوٹ جائے۔(تعالیٰ اللہ و تقدس عن اعتقاد الجاھلین وعن زیغ الزائغین)۔اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کے ساتھ مخصوص ہے(1)۔اور انہوں نے اس روایت کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے جسے مقاتل بن حیان نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے ان دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کے ہمراہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ نے فرمایا ہے:''تین خصلتیں ہیں جس میں موجود ہوں گی تو وہ منافق ہوگا اگرچہ اس نے روزہ بھی رکھا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو اور اس کا یہ گمان ہو کہ وہ مومن ہے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کا تہائی حصہ موجود ہے''(2)۔تو ہم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم ان سے یا ان میں سے بعض سے محفوظ اور سلامت نہیں اور لوگوں میں سے اکثر ان سے محفوظ و مامون نہیں۔راوی نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا:''تم کو اور ان کو کیا ہے بلاشبہ میں نے انہیں منافقین کے ساتھ خاص کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں خاص کیا ہے پس میرا قول اذا حدث کذب (جب وہ بات کرے تو وہ جھوٹ بولے) تو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ......الآیہ۔

''کیا تم اس طرح ہو''؟ ہم نے عرض کی: نہیں۔تو آپ نے فرمایا:''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو''۔اور میرا قول اذا وعد أخلف (کہ جب وہ وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ الآیات الثلاث''کیا تم اس طرح ہو؟''ہم نے عرض کی نہیں۔قسم بخدا! اگر ہم نے کسی شی کے بارے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تو ہم اسے ضرور پورا کریں گے۔آپ نے فرمایا:''تم پر کچھ نہیں تم اس سے بری ہو۔ اور رہا میرا قول واذا ائتمن خان (اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ الآیہ (الاحزاب:72) پس ہر انسان کو اپنے دین پر امین بنایا گیا ہے پس مومن غسل جنابت کرتا ہے سراً بھی اور علانیۃً بھی (اور منافق صرف علانیۃ ایسا کرتا ہے) کیا تم اس طرح ہو؟''ہم نے عرض کی نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو''(3)۔بہت سے تابعین اور ائمہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: یہ اس کے بارے میں ہے جس پر یہ خصلتیں غالب ہوں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اہل علم کے مذہب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بری خصلتیں اسے منافق بنانے والی ہیں جو ان کے

1۔احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 984 2۔ایضاً 3۔احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 985

ساتھ یوم قیامت تک متصف رہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر اس پر معاصی اور گناہ غالب آجائیں تو ان کے ساتھ وہ کافر نہیں ہوگا جب تک وہ اعتقاد میں موثر نہ ہوں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا پھر انہوں نے اس کا خلاف کیا اور انہوں نے ان سے گفتگو کی تو انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا اور آپ نے انہیں یوسف علیہ السلام پر امین بنایا تو انہوں نے اس میں خیانت کی اور وہ منافق نہیں ہوئے۔ حضرت عطا بن ابی رباح نے کہا ہے: ان خصلتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنایا اور وہ منافق نہیں ہوئے بلکہ وہ انبیاء ہوئے (۱) اور حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے: نفاق دو قسم کا ہے، ایک نفاق الکذب اور دوسرا نفاق العمل۔ جہاں تک نفاق الکذب کا تعلق ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا نفاق العمل تو وہ یوم قیامت تک ختم نہیں ہوگا (2)۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا آج (کا زمانہ) تو اس میں ایمان کے بعد فقط کفر ہے (3)۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور جب وہ جاننے والا ہے تو وہ عنقریب انہیں جزا اور بدلہ بھی دے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۷۹

”جو لوگ (ریاکاری کا) الزام لگاتے ہیں خوشی خوشی خیرات کرنے والوں پر مومنوں سے اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ یہ بھی منافقین کی صفات میں سے ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یَلْمِزُوْنَ کا معنی ہے وہ عیب اور الزام لگاتے ہیں (4)۔ فرمایا: وہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال صدقہ کر دیا اور ان کا مال آٹھ ہزار تھا پس انہوں نے اس میں سے چار ہزار صدقہ کر دیئے، تو ایک قوم نے کہا: اس کا احسان کتنا زیادہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ اور انصار میں سے ایک آدمی کھجوروں کا نصف ڈھیر لے کر آیا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اس سے کتنا غنی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ، الآیہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مسعود سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے بیان کیا: ہم بوجھ اٹھاتے تھے۔ ایک روایت میں ہے: اپنی پشتوں پر۔ فرمایا: پس ابو عقیل نے نصف صاع صدقہ کیا اور ایک آدمی اس سے کچھ زیادہ چیز لے کر آیا تو منافقوں

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 987　2۔ ایضاً　3۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1054
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 88　(۱) صحیح یہ ہے کہ وہ انبیاء نہیں ہوئے کیونکہ ان کا عمل عصمت کے منافی ہے۔ حاشیہ 214

نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تو اس صدقہ سے غنی ہے (اسے اس کی حاجت نہیں ہے) اور اس دوسرے نے محض ریاکاری کے لیے کیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ مراد ابو عقیل ہیں اور ان کا نام حبحاب تھا (1)۔ اور الجهد سے مراد وہ تھوڑی سی شے ہے جس کے ساتھ ایک تنگ دست زندگی گزارتا ہے اور الجُهد اور الجَهد دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یلمزون کا معنی ہے وہ عیب لگاتے ہیں۔ اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ اور المطوعین اصل میں المتطوعین ہے اس میں تا کو طا میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو کوئی کام اپنی مرضی اور خوشی سے کرتے ہیں اس کے بغیر کہ وہ ان پر واجب ہو۔ والذین یہ محل جر میں ہے اور اس کا عطف المؤمنین پر ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ اسم پر اس کے مکمل ہونے سے پہلے معطوف ہو۔ اور فَیَسْخَرُوْنَ اس کا عطف یلمزون پر ہے۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ یہ مبتدا کی خبر ہے اور یہ ان کے لیے بددعا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ خبر ہے یعنی سخر منهم حیث صاروا الی النار (اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مذاق کی سزا اس طرح دی کہ وہ جہنمی ہو گئے) اور سخر اللہ کا معنی ان کے مذاق پر انہیں جزا اور بدلہ دینا ہے۔ اور یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۸۰﴾

"آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار جب بھی نہ بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، یہ محض اس لیے کہ انہوں نے انکار کیا اللہ کا اور اس کے رسول (مکرم) کا۔ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا نافرمان قوم کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اس کا بیان اس ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: 84) کے تحت آ رہا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا یَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

"خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور (دوسروں کو بھی) کہتے مت نکلو اس سخت گرمی میں، فرمایئے: دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، کاش! وہ کچھ سمجھتے"۔

قولہ تعالیٰ: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ یعنی اپنے بیٹھے رہنے کے سبب پیچھے چھوڑے جانے والے خوش ہو گئے۔ قعد

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327

قعودا و مقعداً اس کا معنی ہے وہ بیٹھا۔ واقعدہ غیرہ اور اسے کسی دوسرے نے بٹھا دیا۔ یہ جوہری سے مروی ہے اور المخلف کا معنی متروک (چھوڑا گیا) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا اور انہیں کمزور کر دیا یا رسول اللہ ﷺ اور مومنین نے پیچھے چھوڑ دیا جب انہوں نے ان کے جہاد پر نکلنے میں دیر اور سستی کرنے کو جان لیا۔ یہ دو قول ہیں: اور یہ غزوۂ تبوک کے وقت ہوا (1)۔ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ یہ مفعول من اجلہ ہے۔ اور اگر چاہیں تو مصدر بنالیں۔ اور خلاف بمعنی مخالفت ہے۔ اور جنہوں نے خلف رسول اللہ پڑھا ہے انہوں نے جہاد سے پیچھے رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ وَ قَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو یہ کہا (مت نکلو اس سخت گرمی میں) قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ آپ انہیں کہیے اے محمد! ﷺ جہنم کی آگ۔ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَفۡقَهُوۡنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ حَرًّا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کا امر چھوڑ دیا تو اس نے اس آگ کو طلب کر لیا۔

فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۸۲﴾

"تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ، یہ سزا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا یہ امر ہے اور یہ تہدید کے معنی کے لیے ہے اور یہ ہنسنے کے بارے امر نہیں ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ اس میں لام مکسور ہوتا پھر کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا انہیں چاہیے کہ وہ دنیا میں تھوڑا ہنسیں۔ وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا اور زیادہ روئیں جہنم میں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر بمعنی خبر ہے۔ ای أنهم سيضحكون قليلا و يبكون كثيرا (بے شک وہ عنقریب تھوڑا ہنسیں گے اور زیادہ روئیں گے) جزاء یہ مفعول من اجلہ ہے، ای للجزاء (سزا کے لیے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ لوگوں میں سے بعض شدید خوف کی وجہ سے اپنے نفس کو بچانے کی خاطر اور اپنے اعتقاد میں اپنی حالت کے فساد سے بچنے کی خاطر ہنستے نہیں ہیں اگرچہ وہ آدمی نیک اور صالح ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قسم بخدا! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم تھوڑا ہنسو اور روؤ زیادہ اور تم کھلے راستوں کی طرف نکل جاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگو کہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا" (3)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت حسن بصری ان میں سے تھے کہ کبھی آپ پر حزن و ملال غالب ہوتا تو آپ نہ ہنستے تھے۔ اور ابن سیرین ہنستے تھے اور حسن کے خلاف حجت بیان کرتے ہوئے کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہنسایا بھی ہے اور رلایا بھی۔ اور صحابہ کرام ہنستے تھے، مگر یہ کہ اس میں کثرت کرنا اور اسے لازم پکڑنا یہاں تک کہ وہ اپنے صاحب پر غالب آجائے مذموم ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بے وقوف اور بیکار لوگوں کا فعل ہے اور حدیث میں ہے: "بے شک زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے"۔

اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خوف، اس کے عذاب اور اس کی سزا کی شدت سے رونے کا تعلق ہے تو وہ قابل تعریف

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 88  2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 228  3۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم رؤ اور اگر رونہ سکو تو رونے کی شکل بنالو کیونکہ اہل جہنم روئیں گے یہاں تک کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر بہیں گے گویا کہ وہ نالیاں ہیں یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے پھر خون بہنے لگ جائے گا اور آنکھیں زخمی ہو جائیں گی پس اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو وہ چل پڑیں'' (1)۔ اسے ابن المبارک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾

''(اے حبیب!) پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ ان کے کسی گروہ کے پاس پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے جہاد پر نکلنے کی تو آپ فرمایئے نہیں نکلو گے تم میرے ہمراہ کبھی اور ہرگز جنگ نہیں کرو گے میری معیت میں کسی دشمن سے تم نے تو (خود) پسند کیا تھا (گھر) بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ یعنی پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ منافقین کے کسی گروہ کے پاس۔ بے شک فرمایا: اِلٰى طَآىِٕفَةٍ کیونکہ وہ تمام جو مدینہ طیبہ میں مقیم رہے وہ منافقین نہیں تھے، بلکہ ان میں معذور بھی تھے اور وہ بھی جن کا کوئی عذر نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول فرمالی، جیسا کہ وہ تین جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ ان کا ذکر عنقریب آئے گا۔ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا یعنی ان کا انجام اور نتیجہ یہ ہے کہ آپ کبھی بھی انہیں ساتھ نہ ملائیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے سورۃ الفتح میں فرمایا: قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا (الفتح: 15) (فرمایئے تم قطعاً ہمارے پیچھے نہیں آسکتے) اور الْخٰلِفِیْنَ یہ خالف کی جمع ہے، گویا کہ وہ نکلنے والوں سے پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْخٰلِفِیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو منافقین میں سے پیچھے رہ گئے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جو عورتوں اور مردوں میں سے ضعیفوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے (2)، پس مذکر کو غلبہ دیا (اور جمع مذکر ذکر کی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس تم بیٹھے رہو فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ ان کے اس قول سے ہے فلان خالفة أهل بيته جب وہ ان میں فساد برپا کرنے والا ہو (اور یہ) خلوف فم الصائم سے ہے (روزے دار کے منہ کی بو) اور تیرے اس قول سے: خلف اللبن یعنی جب دودھ زیادہ دیر مشکیزے میں پڑے رہنے کے سبب خراب ہو جائے۔ پس اسی بنا پر فاقعدوا مع الفاسدین مراد لی گئی ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنگوں میں مدد چھوڑ دینے والوں کو ساتھ لینا جائز نہیں ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 89۔ سنن ابن ماجہ، باب صفة النار، حدیث نمبر 4314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 362

وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴

"اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑے ہوں اس کی قبر پر، بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول مکرم کے ساتھ۔ اور وہ مرے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے"۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ روایت ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحیحین وغیرہ میں ثابت ہے۔ اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی اور یہ آیت اس کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آگے بڑھے تاکہ آپ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں تو آپ کے پاس حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے آپ کا کپڑا کھینچا اور آپ پر یہ آیت تلاوت کی: وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا الآیہ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس پھر آئے اور اس پر نماز جنازہ نہ پڑھائی۔ اور اس کے خلاف اور برعکس روایات بھی ثابت ہیں۔ پس بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روا ت ہے، آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی پھر آپ واپس لوٹ آئے اور آپ بالکل تھوڑی ہی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورت براءت کی دو آیتیں نازل ہوئیں: وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا۔ (1) اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب عبداللہ بن ابی بن سلول فوت ہوا تو اس کا بیٹا عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی کہ آپ اسے اپنی قمیص عنایت فرمائیں وہ اس میں اپنے باپ کو کفن پہنائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اسے عطا فرما دی پھر اس نے عرض کی کہ آپ اس پر نماز جنازہ بھی پڑھائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تاکہ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز جنازہ پڑھنے سے آپ کو منع فرمایا ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار عطا فرمایا ہے پس فرمایا: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (التوبہ: 80) (آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار) اور میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں گا"۔ فرمایا: بلاشبہ وہ منافق ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (2) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نماز چھوڑ دی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے الفاظ اسلام کے ظاہر پر بنا کرتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا جب آپ کو منع کر دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے کہہ دیا: کیا آپ اس پر نماز پڑھیں گے جس پر نماز

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276

جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرما دیا ہے، حالانکہ پہلے ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے نہی وارد نہ تھی تو جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ بات آپ کے دل میں واقع ہوئی ہو اور وہ اس الہام اور تحدث کے قبیلہ سے ہو جس کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اور کبھی قرآن کریم آپ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کی مراد و مقصود پر نازل ہوتا تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے تین امور میں موافقت کی ہے (1)۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ چار میں (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے اور چاہت کے مطابق قرآن کریم کا حکم نازل کیا) اور یہ پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پس یہ بھی اس میں سے ہوسکتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ، الآیہ (آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں یا نہ کریں یہ نہیں کہ نہی اس پر مقدم ہو جس پر بخاری اور مسلم کی حدیث نے دلالت کی ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (التوبہ: 113) (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے) کیونکہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ، الآیہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں تو وہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اگرچہ استغفار کتنا زیادہ ہو۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: وہ ثابت نہیں جو یہ روایت کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں ضرور ستر سے زیادہ بار بخشش طلب کروں گا'' (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ثابت ہے: ''سازید علی سبعین (میں ستر سے زائد بار طلب کروں گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''اگر میں یہ جانتا کہ اگر میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں تو انہیں بخش دیا جائے گا تو میں یقیناً اس سے زیادہ بار بخشش طلب کرتا''۔ فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ کی تاویل میں اختلاف کیا ہے کیا یہ ناامید کرنا ہے یا اختیار دینا ہے؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مقصود ناامید کرنا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (4) (جب بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا) اور ستر بار کا ذکر محض اتفاق ہے یا یہ ان کی عادت کے مطابق عبارت میں کثرت اور انتہا کا ذکر ہے پس جب ان میں سے کوئی کہنے والا کہتا: لا أكلمه سبعين سنة (میں اس سے ستر برس تک کلام نہیں کروں گا) تو یہ ان کے نزدیک اس قول کے قائم مقام ہے: لا أكلمه أبدًا (میں اس سے ہمیشہ کلام نہیں کروں گا) اور انتہا اور غایت کے بیان میں اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (الحاقہ: 32) (پھر ستر گز لمبی زنجیر

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276　　2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 673

3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 674　　4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 990

میں اس کو جکڑ دو) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من صام یوما فی سبیل اللہ باعد اللہ وجهه عن النار سبعین خریفا (1) (جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آتش جہنم سے ستر برس تک دور کر دے گا)

اور ایک جماعت نے کہا: یہ تخییر ہے (2)۔ ان میں سے حسن، قتادہ اور عروہ رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے لیے بخشش طلب کیجئے اور اگر آپ چاہیں تو بخشش طلب نہ کریں یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے دشمن پر نماز جنازہ پڑھیں گے جس نے فلاں فلاں دن ایسے ایسے کہا؟ تو آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ مجھے اختیار دیا گیا ہے سو میں نے اختیار کر لیا ہے'' (3)۔ انہوں نے کہا ہے: پھر یہ اختیار منسوخ ہو گیا جب یہ آیت نازل ہوئی: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (المنافقون: 6) ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوْا (اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیہ (التوبہ: 113) یہ آیت حضرت ابو طالب کی موت کے وقت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جیسا کہ اس کا بیان آئے گا اور اس سے اس کے بارے میں استغفار کرنے سے نہی سمجھی جا سکتی ہے جو حالت کفر میں فوت ہوا۔ اور اس آیت پر متقدم ہے جس سے تخییر سمجھی گئی ہے آپ کے اس قول کے ساتھ: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے'' (4) اور یہ مشکل ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک آپ کا اپنے چچا کے لیے استغفار کرنا بلاشبہ آپ کا مقصود قبولیت کی امید پر استغفار تھا تا کہ انہیں مغفرت حاصل ہو جائے۔ اور اس استغفار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ انہیں اپنی ماں کے لیے استغفار کرنے کی اجازت عطا فرمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کو اجازت نہ دی (5) (ا)۔ اور رہا منافقین کے لیے استغفار کرنا تو یہ وہ ہے جس بارے میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے اور یہ ایسا زبانی استغفار ہے جو نفع نہیں دے سکتا۔ اور اس کی غایت اور مقصود یہ ہے کہ ان زندوں میں سے بعض کے دلوں کو پاک کرنا جن کا اس کے ساتھ قرابت کا تعلق ہے جس کے لیے بخشش طلب کی گئی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6**۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عبداللہ کو قمیص عطا کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لیے عطا فرمائی کیونکہ عبداللہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بدر کے دن اپنی قمیص دی تھی۔ اور وہ اس لیے کہ بدر کے دن عباس کو قیدی بنا کر لایا گیا تو ان سے کپڑے چھین لیے گئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھا تو آپ پر گراں گزرا، چنانچہ آپ نے ان کے لیے قمیص طلب کی تو عبداللہ کی قمیص کے سوا کوئی قمیص نہ پائی گئی جسے وہ پہن سکتے ہوں، کیونکہ طویل القامۃ ہونے میں دونوں قریب قریب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص دینے سے یہ ارادہ فرمایا کہ دنیا میں اس کا احسان اتار دیا جائے تا کہ وہ آخرت میں آپ کو اس حال میں نہ ملے کہ اس کا آپ پر

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 314　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 991
3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674　4۔ ایضاً　5۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 314

(ا) اس بارے میں ضیاء النبی جلد دوم میں ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے مفصل بحث کی ہے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مترجم

احسان ہو اور آپ کو اس کا بدلہ دینا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی تکریم، اس کی حاجت اور طلب کو پورا کرنے کے لیے اور اس کے دل کی پاکیزگی کے لیے اسے قمیص عطا فرمائی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اسے امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: جب بدر کا دن تھا قیدیوں کو لایا گیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی لائے گئے اس حال میں کہ ان پر کپڑا نہ تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے قمیص کا مطالبہ کیا تو انہوں نے عبداللہ بن ابی کی قمیص پائی جو وہ پہن سکتے تھے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ قمیص پہنادی، پس اسی لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اتاری جو آپ نے اسے پہنائی (1)۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن قميصي لا يغني عنه من الله شيئا وإني لأرجو أن يسلم بفعلي هذا ألف رجل من قومي (2) (بلاشبہ میری قمیص اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی کسی شے کو اس سے دور نہیں کر سکے گی اور بلاشبہ مجھے یہ توقع ہے کہ میرے اس عمل سے میری قوم کے ہزار افراد اسلام قبول کر لیں گے) اسی طرح بعض روایات میں ہے من قومی سے مراد عرب کے منافقین ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: رجال من قومه (3) (یعنی اس کی قوم کے ہزار افراد) اور مغازی ابن اسحاق اور بعض کتب تفسیر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے خزرج قبیلے کے ہزار آدمیوں نے توبہ کی اور مسلمان ہو گئے (فاسلم و تاب لهذه الفعلة من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ألف رجل من الخزرج)

**مسئلہ نمبر 7**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے رکنے کے بارے نص ہے اور اس میں مومنین پر نماز جنازہ پڑھنے پر دلیل نہیں ہے۔ اس بارے اختلاف ہے کہ کیا اس کے مفہوم مخالف سے مومنین پر نماز جنازہ واجب ہونے کے بارے حکم اخذ کیا جائے گا؟ تو اس بارے میں دو قول ہیں: وہ حکم اخذ کیا جائے گا، کیونکہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کی علت ان کے کفر کو قرار دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا انکار کیا) تو جب کفر زائل ہو گیا تو نماز واجب ہو گئی۔ اور یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہو گا: كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۝ (المطففین) (یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا) یعنی اس دن کفار کو رب کریم کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ غیر کفار اسے دیکھ سکیں گے اور وہ مومنین ہیں۔ پس یہ بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم۔ یا نماز کا حکم آیت کے علاوہ دلیل خارجی سے لیا جائے گا اور وہ اس باب میں وارد ہونے والی احادیث ہیں اور اجماع ہے۔ اختلاف کا منشاء دلیل خطاب کے ساتھ قول کرنا اور اسے چھوڑنا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک تمہارا بھائی فوت ہو چکا ہے پس تم اٹھو اور اس پر نماز جنازہ پڑھو'' (4)۔ آپ نے بیان کیا: پس ہم اٹھے اور دو صفیں بنائیں۔ اس میں مراد نجاشی (شاہ حبش) ہے۔ اور

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 442　2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 91
3۔ ایضاً　4۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نجاشی کی موت کی خبر اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا تھا، پس آپ انہیں ساتھ لے کر جنازہ گاہ کی طرف نکلے اور آپ نے چار تکبیریں کہہ کر نماز جنازہ پڑھائی (1)۔ اور مسلمانوں نے اس پر اجماع کر لیا کہ مسلمانوں کی میتوں پر نماز جنازہ ترک کرنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ کبیرہ گناہ کرنے والوں سے ہوں یا نیکوکاروں میں سے اور یہ قولاً و عملاً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ والحمدللہ۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے سوائے شہید کے اور سوائے اہل بدعت اور باغیوں کے (کہ ان کے بارے میں اختلاف ہے)

**مسئلہ نمبر 8**۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ تکبیریں چار ہیں۔ ابن سیرین نے کہا ہے: (نماز جنازہ میں) تکبیریں تین تھیں پھر انہوں نے ایک کا اضافہ کر دیا۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: پانچ تکبیریں کہی جائیں گی اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چھ تکبیریں مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ تکبیرات تین ہیں اور ان پر چوتھی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نماز جنازہ پڑھی اور انہوں نے آپ پر چار تکبیریں کہیں اور انہوں نے کہا: اے بنی آدم! یہی تمہارے لیے (طریقہ) اور سنت ہے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ نماز جنازہ میں قراءت نہیں ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہی ہے۔ اور اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء (4) (جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا مانگو) اسے ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق، محمد بن مسلمہ ہمارے علماء میں سے اشہب اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے'' (5)۔ اور انہوں نے اسے اپنے عموم پر محمول کیا ہے۔ اور اس روایت کے سبب جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جنازہ پر نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ کی قراءت کی اور فرمایا جان لو بلاشبہ یہ سنت ہے (6)۔ اور امام نسائی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا: جنازوں پر نماز پڑھنے میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ آہستہ آواز سے پڑھی جائے، پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور آخر میں سلام پھیرا جائے (7)۔

اور محمد بن نصر مروزی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309
2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281
3۔ سنن دارقطنی، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 70
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 100
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 118
6۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 178
7۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281

تکبیر کہے، پھر سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھے، پھر میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف پہلی تکبیر میں کی جائے گی پھر سلام پھیر دیا جائے گا۔ ہمارے شیخ ابو العباس نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور یہ دونوں علماء اصول کے نزدیک مسند کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول لا صلوٰۃ اور میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا دونوں جمع ہیں اور اس میں سورۂ فاتحہ کی قراءت یہ دعا کے آغاز کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ مرد کے سر کی جانب تھوڑا ہٹ کر اور عورت کے سرین کی جانب ہو کر کھڑا ہو، کیونکہ ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی تو حضرت علاء بن زیاد نے انہیں کہا: اے ابوحمزہ! اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازوں پر نماز پڑھتے تھے جیسے تم نے پڑھی ہے، آپ چار تکبیریں کہتے اور آدمی کے سر کے نزدیک اور عورت کے سرین کی جانب کھڑے ہوتے؟(1) انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور اسے مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے کعب کی ماں کی نماز جنازہ پڑھائی وہ فوت ہوئی اس حال میں کہ وہ حالت نفاس میں تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نماز پڑھانے کے لیے اس کے وسط میں کھڑے ہوئے (2)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ جب میت کو دفن کر دیا جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی قبر پر ٹھہرتے اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا فرماتے (3)، جیسا کہ ہم نے اسے (التذکرہ میں) بیان کیا ہے۔ والحمد للہ

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۸۵

''اور نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان سے دنیا میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں''۔

اسے تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا۔ اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝۸۶

''اور جب نازل کی جاتی ہے کوئی سورت (جس میں حکم ہوتا ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اللہ کے رسول کے ہمراہ تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے جو طاقت والے ہیں ان میں سے اور کہتے ہیں رہنے دیجئے ہمیں تاکہ ہوں ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ''۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 99 — 3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 311

2۔ التذکرۃ فی احوال الموتی، الوقوف عند القبر قلیلاً بعد الدفن، جلد 1، صفحہ 157، دار ابن زیدون بیروت

مومنوں نے دعوت کو قبول کرنے میں جلدی کی اور منافقوں نے عذر اور بہانے بنانے میں جلدی کی۔ پس مومنوں کے لیے یہ حکم ایمان پر قائم رہنے اور ثابت قدم رہنے کے بارے ہے اور منافقوں کے لیے یہ امر ابتدا ایمان لانے کے بارے میں ہے۔ اور ان محل نصب میں ہے۔ ای بأن أمنوا (یعنی اصل میں بأن ہے) اور الطول کا معنی ہے غنی، دولت مند اور اس کا ذکر پہلے چکا ہے۔

اور انہیں ذکر کے ساتھ خاص اس لیے کیا ہے، کیونکہ جو غنی اور طاقت ور نہ ہو اسے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو معذور ہے۔ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ہمیں رہنے دیجئے تاکہ ہم نکلنے سے عاجز لوگوں کے ساتھ ہوں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٨٧ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٨٨ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٨٩

''انہوں نے یہ پسند کیا کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور انہی کے لیے ساری بھلائیاں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ تیار کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہنے والے ہیں ان میں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ اس میں الْخَوَالِفِ، خالفة کی جمع ہے یعنی وہ عورتوں، بچوں اور مردوں میں سے معذوروں کے ساتھ ہو جائیں۔ اور آدمی کے لیے خالف اور خالفة بھی کہا جاتا ہے جب وہ نجیب اور شریف نہ ہو، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان خالفة أهله جب وہ ان سے گھٹیا ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی اصل خلف اللبن يخلف سے ہے جب دودھ طویل وقت پڑے رہنے کے سبب کھٹا اور خراب ہو جائے اور خلف فم الصائم روزے دار کے منہ کی بو بدل جائے اور اسی سے فلان خلف سؤ (فلاں برا پیچھے رہنے والا ہے) مگر یہ فاعلة کی جمع فواعل ہے اور فاعل صفت کی فواعل کے وزن پر جمع نہیں بنائی جاتی مگر شعر میں، مگر دو حرفوں میں۔ اور وہ دونوں فارس اور ہالک ہیں۔ اور مجاہدین کے وصف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ کہا گیا ہے: مراد خوبصورت عورتیں ہیں۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝٧٠ (الرحمٰن) (ان میں اچھی سیرت والیاں اچھی صورت والیاں ہوں گی)

اور کہا جاتا ہے: هي خيرة النساء (یہ عورتوں میں سے اچھی اور خوبصورت ہے) یہ اصل میں خيرة ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، جیسے هَيِّنَة اور هَيْنَة ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خیر کی جمع ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ ان کے لیے دونوں جہان کے منافع ہیں۔ اور فلاح کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور جنات سے مراد بساتین (باغات) ہیں۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِیُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِیْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

''اور آئے بہانہ بنانے والے بدو تا کہ اجازت مل جائے انہیں اور بیٹھ رہے وہ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ اور اس کے رسول سے، عنقریب پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے عذاب دردناک''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ، اعرج اور ضحاک نے تخفیف کے ساتھ المُعْذِرون پڑھا ہے۔ اور ابو کریب نے اسے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسے اصحاب القراءات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وجاء المُعْذِرُون تخفیف کے ساتھ پڑھتے تھے(1)، یہ اعذر سے ہے۔ اور کہتے: قسم بخدا! یہ اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: مگر یہ کہ اس (قراءت) کا مدار کلبی پر ہے۔ اور یہ اعذر سے ہے، اور اسی سے ہے قد أعذر من أنذر یعنی جو آپ کے پاس آیا اس نے عذر میں اتنا مبالغہ اور غلو کیا کہ اس نے آپ کو ڈرا دیا۔ اور رہا المعذرون تشدید کے ساتھ تو اس میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سچ بیان کرنے والا ہو۔ پس یہ المعتذر کے معنی میں ہے، کیونکہ اس کا عذر ہے۔ پس المعذرون اس بنا پر اس کی اصل المعتذرون ہے، لیکن اس میں تا کو ذال سے بدل دیا گیا ہے اور پھر اس میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت عین کو دے دی گئی ہے، جیسے یخصمون خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور المعذرون اجتماع ساکنین کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ اور میم کی اتباع میں اس کا ضمہ بھی جائز ہے۔ اسے جوہری اور نحاس نے ذکر کیا ہے، مگر یہ کہ نحاس نے اسے اخفش، فراء، ابو حاتم اور ابو عبید سے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اصل المعتذرون ہو، پھر تا کو ذال میں ادغام کر دیا گیا۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا عذر ہو۔ لبید نے کہا ہے:

إلى الحَوْل ثم إسم السلام عليكما　　ومن يَبْكِ حولاً كاملاً فقد اعتذر(2)

اس میں اعتذر حقیقی عذر والے کے معنی میں ہی ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ المعذر کبھی اپنے عذر میں سچا نہیں ہوتا اور یہ وہ ہوتا ہے جو بہانہ بناتا ہے اور اس کا عذر نہیں ہوتا۔ جوہری نے کہا ہے کہ یہ معذر، مفعل کے وزن پر ہے، کیونکہ یہ بیماری کا بہانہ بنانے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوتا ہے یہ بغیر عذر کے عذر پیش کرتا ہے۔ اور دوسروں نے کہا: کہا جاتا ہے عذر فلان في أمر كذا تعذيرا یعنی اس نے کوتاہی کی اور اس میں مبالغہ نہیں کیا۔ اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے جھوٹے عذر پیش کیے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: لعن الله المعذرين (اللہ تعالیٰ نے بہانے بنانے والوں پر لعنت کی ہے) گویا ان کے نزدیک امر یہ ہے کہ معذر تشدید کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے عذر کو ظاہر کرنے والا، بہانہ بناتے ہوئے اس کے عذر میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

نحاس نے کہا ہے: ابو العباس محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اس میں اصل المعتذرون ہو، اور نہ ادغام جائز

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 236　　2۔ ایضاً

ہے کہ اس سے التباس واقع ہوجاتا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق ادغام سے اجتناب کیا گیا ہے کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی مذمت کی گئی ہے ان کا کوئی عذر نہیں ہے، فرمایا: کیونکہ وہ آئے تا کہ انہیں اجازت دی جائے۔ اور اگر وہ ضعیف اور مریض ہوتے اور وہ ہوتے جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے تو انہیں اجازت طلب کرنے کی حاجت اور ضرورت نہ تھی۔ نحاس نے کہا ہے: معذرۃ، اعذار اور تعذیر کی اصل ایک شے سے ہے اور وہ اس میں سے ہے جو مشکل اور معتذر رہوتی ہے۔ اور عربوں کا قول ہے: مَنْ عَذِیرِی من فلان اس کا معنی ہے تحقیق اس نے امر عظیم سرانجام دیا وہ یہ استحقاق رکھتا ہے کہ میں اسے اس پر اچھا بدلہ دوں اور لوگوں کو اس کے بارے علم نہ ہو (پس کون مجھے معذور جانے گا) اگر میں نے اسے اچھا بدلہ دیا۔ پس تخفیف کی قراءت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بہانے کے ساتھ پیچھے رہ گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ عامر بن طفیل کا گروہ تھا(1) انہوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم آپ کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں تو طئی قبیلے کے بدو ہماری بیویوں، ہماری اولاد اور ہمارے مویشیوں پر حملہ کردیں گے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذر کو قبول کرلیا۔ اور تشدید کی قراءت کی بنا پر دوسرے قول میں کہا ہے: وہ غفار قبیلے کے لوگ تھے انہوں نے اپنے عذر پیش کیے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذروں کو قبول نہ کیا، کیونکہ آپ کو علم تھا کہ یہ سچے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور ایک قوم بغیر عذر کے بیٹھ گئی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جرأت کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور فرمایا: وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللهَ وَرَسُولَهُ ان کے جھوٹ سے مراد ان کا یہ قول ہے: بے شک ہم مومن ہیں اور لیؤذن کولام کی کے سبب نصب دی گئی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۹۲﴾

''نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو نہیں پاتے وہ مال جسے خرچ کریں (اگر یہ پیچھے رہ جائیں) کوئی حرج جب کہ وہ مخلص ہوں اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے، نہیں ہے نیکوکاروں پر الزام کی کوئی وجہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور نہ ان پر (کوئی الزام ہے) جو جب حاضر ہوئے آپ کے پاس تا کہ آپ سوار کریں انہیں تو فرمایا آپ نے: میں نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ وہ لوٹتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں بہا رہی ہوتی ہیں آنسو اس غم میں کہ افسوس! نہیں ان کے پاس جو وہ خرچ کریں''۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 93

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ الآیہ، یہ ارشاد عاجز آدمی سے تکلیف اور پابندی کے ساقط ہونے میں اصل ہے۔ پس ہر وہ جو کسی شی سے عاجز ہو تو وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے، کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو فعل ہوتا ہے اور کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو کہ تاوان اور جرمانہ ہوتا ہے اور قوت و طاقت کے اعتبار سے عاجز ہونے یا مال کے اعتبار سے عاجز ہونے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اس آیت کی نظیر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ:286) (ذمہ داری نہیں ڈالتا الله تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی) اور الله تعالیٰ کا یہ ارشاد: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (النور:61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے)

ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام کو چھوڑا ہے کہ تم نے کوئی سفر طے نہیں کیا اور نہ تم نے نفقہ میں سے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی عبور کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ ہیں"۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں عذر نے روک لیا ہے" (1)۔ پس اس آیت نے اور اس کے ساتھ اس کی نظائر میں سے جو ہم نے ذکر کی ہیں یہ واضح کر دیا ہے کہ معذوروں پر کوئی حرج نہیں اور یہ وہ قوم ہے جن کا عذر معروف ہے مثلاً اپاہج ہونا، بوڑھا ہونا، نابینا ہونا، لنگڑا ہونا اور وہ اقوام جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ پائیں۔ تو فرمایا: ان تمام پر کوئی حرج نہیں ہے۔

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ جب وہ حق کو پہچان لیں اور اس کے اولیاء سے محبت کریں اور اس کے دشمنوں سے بغض رکھیں۔ علماء نے کہا ہے: پس حق سبحانہ وتعالیٰ نے عذر والوں کو معذور قرار دیا ہے اور دلوں نے اسے برداشت نہ کیا، چنانچہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ احد کے لیے نکلے اور مطالبہ کیا کہ علم انہیں عطا کیا جائے لیکن اسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا ہوا تھا۔ پس کفار میں سے ایک آدمی آیا اور اس نے ان کے اسی ہاتھ پر تلوار ماری جس میں وہ علم پکڑے ہوئے تھے تو اس نے اسے کاٹ دیا، آپ نے دوسرے ہاتھ کے ساتھ اسے پکڑ لیا پھر اس نے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو آپ نے اسے اپنے سینے سے تھام لیا اور یہ آیت پڑھی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران:144) (اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (الله کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول) یہ اس قوم کے عزائم تھے۔ اور الله تعالیٰ فرماتا ہے: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ (النور:61) اور یہ اول کے بارے میں ہے۔ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ (النور:61) اور حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ انصار کے نقباء میں سے تھے آپ لنگڑے تھے اور آپ لشکر کے اگلے حصہ میں موجود تھے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: "بے شک الله تعالیٰ نے تمہیں معذور قرار دیا ہے"۔ تو انہوں نے عرض کی: قسم بخدا! میں یقیناً اپنے اسی لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں نشان زد کرتے ہوئے چلوں گا۔ اس سورت میں اس طرح کی مثالیں گزر چکی ہیں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 340

جن میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کسی آدمی کو اس حال میں لایا جاتا تھا جیسے دو آدمیوں کے درمیان سہارا دے کر چلایا جاتا تھا یہاں تک کہ اسے صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: اِذَا نَصَحُوْا، النصح کا معنی ہے اخلاص العمل من الغش عمل کا کسی کدورت کی آمیزش سے خالص ہونا اور اسی سے ہے التوبة النصوح (خالص توبہ) ہے۔ نفطویہ نے کہا ہے: جب کوئی شے خالص ہو تو کہا جاتا ہے: نصح الشیٔ اور نصح له القول کا معنی ہے اس نے بات کو اس کے لیے خالص کر دیا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحة (دین نصیحت (خالص) ہے) آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ ہم نے عرض کی: کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا: لله ولکتابه ولرسوله ولائمة المسلمین وعامهم (1) (اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، ائمہ مسلمین کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے) علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے خالص ہونے کا معنی یہ ہے اس کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا، اسے صفات الوہیۃ کے ساتھ متصف کرنا، اسے نقائص سے پاک اور منزہ تسلیم کرنا، اس کی پسندیدہ چیزوں میں رغبت رکھنا اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے دور رہنا۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کرنا، امر و نہی میں نبی کی اطاعت کو لازم پکڑنا، ان سے محبت کرنا جن سے وہ محبت کرے، ان سے عداوت رکھنا جن سے وہ عداوت رکھے، اس کی عزت و توقیر کرنا، ان سے محبت کرنا اور ان کی آل سے محبت کرنا، ان کی تعظیم کرنا اور ان کی سنت کی تعظیم کرنا، نبی کے وصال کے بعد سنت سے بحث کر کے سنت کو زندہ کرنا، اس میں خوب غور و فکر کرنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی اطاعت کرنا، اس کی طرف دعوت دینا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کریمہ سے آراستہ اور مزین ہونا۔ اسی طرح کتاب اللہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے: اسے پڑھنا اور اس میں غور و فکر کر کے اسے سمجھنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی تعلیم دینا، اس کی تکریم کرنا اور اس کے مطابق عادات واخلاق سے آراستہ ہونا۔ اور مسلمانوں کے ائمہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے ان کے خلاف خروج نہ کرنا، حق کی طرف ان کی رہنمائی کرنا، مسلمانوں کے امور میں سے جس امر سے وہ غافل ہوں اس پر انہیں متنبہ کرنا، ان کی اطاعت کو لازم پکڑنا اور ان کے حق کے اثبات میں کوشش کرنا۔ اور عام مسلمانوں کے لیے خالص ہونے کا معنی ہے، ان کی عداوت اور دشمنی ترک کرنا، ان کی رہنمائی کرنا اور ان میں سے نیکوکاروں سے محبت کرنا، ان تمام کے لیے دعا کرنا اور ان تمام کے لیے خیر اور بھلائی کا ارادہ کرنا۔ اور حدیث صحیح میں ہے: ''مومنوں کی باہم ایک دوسرے سے محبت کرنے، آپس میں رحم کرنے اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے کی مثال ایک بدن اور جسم کی مثل ہے جب اس میں سے کوئی عضو شکایت کرے تو سارا بدن اس کے لیے جاگنے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ، مِنْ سَبِيْلٍ یہ ما کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی من طریق الی العقوبة (یعنی نیکوکاروں پر سزا کا کوئی راستہ نہیں ہے) یہ آیت ہر نیکوکار سے سزا کے اٹھ جانے (ختم ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 54 2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 321

جانے) کے بارے میں اصل ہے۔ اسی لیے ہمارے علماء نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنا ہاتھ کاٹنے والے سے قصاص (بدلہ) لیتا ہے پھر وہ اسے سرایت میں جان سے ہلاک کرنے تک پہنچا دیتا ہے تو بلاشبہ اس کے لیے کوئی دیت نہیں، کیونکہ وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والے سے قصاص لینے میں محسن ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لیے دیت لازم ہوگی۔ اور اسی طرح جب کوئی نر کسی آدمی پر حملہ کردے اور وہ اسے اپنی جان کی دفاع میں قتل کردے تو اس پر کوئی ضمان نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے مالک کے لیے قیمت اس پر لازم ہوگی۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اسی طرح تمام مسائل شرعیہ میں گفتگو ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: **وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ** روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عرباض بن ساریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ عائذ بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی مقرن کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے، وہ سات بھائی تھے تمام کے تمام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ تھے، اور ان کے علاوہ کوئی بھی سات بھائی صحابہ میں شامل نہ تھے اور وہ نعمان، معقل، عقیل، سوید اور سنان تھے اور ساتویں کا نام ذکر نہیں کیا گیا (قاموس میں مذکورہ پانچ کے علاوہ عبداللہ اور عبدالرحمن کے دو نام بھی ہیں) یہ مقرن کے بیٹے تھے مزینہ سے ان کا تعلق تھا۔ ساتوں بھائیوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہوئے اور اس اعزاز میں ان کے سوا کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا، اسے ابن عبدالبر اور ایک جماعت نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام غزوۂ خندق میں حاضر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان سات افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو مختلف پیٹوں سے تھے اور وہ روتے ہوئے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں، لیکن آپ نے ایسی کوئی شے نہ پائی جس پر آپ انہیں سوار کرتے۔ ''پس وہ واپس لوٹے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھی اس غم میں کہ افسوس ان کے پاس وہ نہیں جو وہ خرچ کریں''۔ پس انہیں رونے والوں کا نام دیا گیا (یعنی بکائین) اور وہ سالم بن عمیر، بنی عمرو بن عوف میں سے اور علیہ بن زید، بنی حارثہ میں سے تھے۔ اور ابولیلیٰ عبدالرحمن بن کعب بنی مازن بن نجار میں سے، عمرو بن حمام بنی سلمہ میں سے اور عبداللہ بن مغفل مزنی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ عبداللہ بن عمرو مزنی تھے اور ہرمی بن عبداللہ بنی واقف میں سے اور عرباض بن ساریہ فزاری تھے، اسی طرح ابوعمر نے ''کتاب الدرر'' میں ان کے نام ذکر کیے ہیں۔ اور ان میں اختلاف ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: معقل بن یسار اور صخر بن خنسا اور عبداللہ بن کعب انصاری، سالم بن عمیر، ثعلبہ بن غنمہ اور عبداللہ بن مغفل اور دوسرے تھے۔ انہوں نے کہا: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحقیق آپ نے ہمیں اپنے ساتھ نکلنے کی دعوت دی ہے۔ پس آپ ہمیں ''تیز رفتار گھوڑوں اور چمڑے کے نعلوں پر سوار کیجئے ہم آپ کی معیت میں جنگ لڑیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں کوئی چیز نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں'' پس وہ واپس چلے اس حال میں کہ وہ رو رہے تھے۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 995 2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 239

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ آپ انہیں سواریوں پر سوار کریں (1)، اس وقت ایک آدمی کو دو اونٹوں کی ضرورت تھی، ایک اونٹ جس پر وہ سوار ہوگا اور ایک اونٹ پر وہ اپنا پانی اور زادراہ لادے گا کیونکہ سفر دور کا تھا۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابوموسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ سے سواری کا مطالبہ کریں۔ اور آپ نے ذرا غصے کی حالت میں موافقت کی اور فرمایا: ''قسم بخدا! میں تمہیں سوار نہیں کروں گا اور نہ میں کوئی ایسی شے پاتا ہوں جس پر میں تمہیں سوار کروں'' (2)۔ پس وہ روتے ہوئے واپس چلے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور انہیں اونٹ عطا فرمائے۔ تو حضرت ابوموسیٰ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے قسم نہیں کھائی تھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان شاء اللہ میں جو قسم بھی کھاتا ہوں اور پھر اس کے غیر کو بہتر اور اچھا دیکھتا ہوں تو میں وہ کرتا ہوں جو بہتر اور اچھا ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں'' (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے، اسے بخاری اور مسلم نے انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور مسلم میں یہ بھی ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا اور ہمارے لیے پانچ سفید کوہانوں والے اونٹوں کا حکم دیا...... الحدیث۔ اور اس کے آخر میں ہے: ''پس تم چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سوار کر دیا ہے'' (4)۔ اور حسن نے بھی اور بکر بن عبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ سواری کا مطالبہ لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ جرجانی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے ای ولا علی الذین إذا ما أتوك لتحملهم وقلت لا أجد (اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں جب وہ آپ کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں اور آپ نے یہ کہا: میں نہیں پاتا) پس یہ مبتدا ہے اور یہ اپنے ماقبل پر بغیر واؤ کے معطوف ہے اور جواب تولوا ہے۔

**وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ** یہ جملہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ حزنا یہ مصدر ہے۔ **اَلَّا يَجِدُوْا** یہ ان کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: فراء نے کہا ہے ان لا یجدون بھی جائز ہے۔ اور وہ لا بمعنی لیس بناتے ہیں اور وہ بصریوں کے نزدیک أنهم لا یجدون کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جو وہ چیز نہ پائے جسے وہ اپنے غزوہ میں خرچ کر سکے تو وہ اس پر واجب نہیں ہے۔ اور ہمارے علماء نے کہا ہے: جب آدمی کی عادت مانگنا اور سوال کرنا ہو تو پھر اس پر لازم ہوتا ہے جیسا کہ حج۔ اور وہ عادت کے مطابق نکلا کیونکہ اس کی حالت جب تبدیل نہیں ہوئی تو اس کی طرف فرض اسی طرح متوجہ ہوگا جیسا کہ فرض نفقہ پانے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اسی قول باری تعالیٰ: **وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ** میں وہ موجود ہے جس کے ساتھ احوال کے قرائن پر استدلال ہوتا ہے، پھر ان سے وہ بھی جو علم ضروری کا فائدہ دیتے ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو تردید کا احتمال رکھتے

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 95
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 980
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47

ہیں۔ پس پہلی قسم جیسا کہ جو آدمی گھر کے پاس سے گزرے تحقیق اس میں رونے کی آواز بلند ہو، رخسار نوچیں جارہے ہوں، بال مونڈ دیئے گئے ہوں اور آوازیں انتہائی بلند ہوں، گریبان چاک کردیئے گئے ہوں اور وہ گھر کے مالک کو یا ثبورا (ہائے ہلاکت) پکار رہے ہوں، تو اس سے یقیناً جان لیا جائے گا کہ وہ مر گیا ہے۔ اور رہی دوسری قسم تو یہ حکام کے دروازوں پر یتیموں کے آنسو بہانے کی طرح ہے۔ الله تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾ (یوسف) (اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے) اور وہ جھوٹے تھے، الله تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ (یوسف: 18) (اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر) اور اس کے ساتھ چونکہ ایسے قرائن ہیں جن کے سبب غالب طور پر استدلال کیا جاسکتا ہے اور ظاہر اور غالب احوال کی بنا پر اس پر شہادات کی بنا رکھی جاسکتی ہے(1)۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا اشتبكتْ دموعٌ في خدودٍ تبيّن مَنْ بكَى ممن تباكَى

یہ معنی عنقریب سورۂ یوسف میں تفصیلاً آئے گا۔ ان شاء الله تعالیٰ۔

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِیَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾

''الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو اجازت مانگتے ہیں آپ سے حالانکہ وہ مال دار ہیں، وہ راضی ہو گئے اس پر کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی الله تعالیٰ نے ان کے دلوں پر پس وہ (کچھ) نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا السَّبِیْلُ بے شک سزا اور گناہ ان پر ہے۔ عَلَى الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِیَآءُ مراد منافقین ہیں، ان کے افعال بد سے ڈرانے کے لیے برائے تاکید ان کا دوبارہ ذکر کیا۔

یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾

''وہ بہانے پیش کریں گے تمہارے پاس جب تم لوٹ کر جاؤ گے ان کی طرف، فرمایئے: بہانے مت بناؤ ہم نہیں اعتبار کریں گے تم پر، آگاہ کردیا ہے ہمیں الله تعالیٰ نے تمہاری خبروں پر۔ اور دیکھے گا الله تعالیٰ تمہارا عمل اور اس کا رسول پھر لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے''۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 996

قولہ تعالیٰ: يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ یعنی منافقین بہانے پیش کریں گے۔ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكُمۡ یعنی ہم ہرگز تمہاری بات تسلیم نہیں کریں گے۔ قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے رازوں اور خفیہ باتوں کے بارے خبر دے دی ہے۔ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ اور اللہ تعالیٰ تمہارا عمل دیکھے گا اس بارے میں جو تم نیا کرو گے۔ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ یعنی وہ تمہیں تمہارے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝٩٥

”وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی طرف تاکہ تم معاف کر دو انہیں، سو منہ پھیر لو ان سے، یقیناً وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم تبوک سے ان کی طرف لوٹو گے۔ اس میں محلوف علیہ محذوف ہے، یعنی وہ قسمیں کھائیں گے کہ وہ نکلنے پر قادر نہ تھے۔ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ تاکہ تم انہیں ملامت کرنے سے درگزر کرو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تم ان سے کلام نہ کرو۔ اور حدیث میں ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے آئے تو آپ نے فرمایا: ”نہ تم ان کے ساتھ بیٹھو اور نہ ان سے کلام کرو“ (1)۔ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ یعنی ان کا عمل ناپاک اور پلید ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: انهم ذو رجس یعنی ان کا عمل قبیح اور برا ہے۔ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ یعنی ان کی منزل اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: ماوی سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس میں رات یا دن کے وقت کوئی شے پناہ لیتی ہے۔ وقد أوی فلاں الی منزله یأوی أویا (تحقیق فلاں نے اپنے گھر میں پناہ لی) یہ فعول کے وزن پر ہے اور اواء بھی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاٰوِىۡۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعۡصِمُنِىۡ مِنَ الۡمَآءِ (ہود: 43) (میں پناہ لے لوں گا پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے) اور آویته أنا ایواء و أویته جب تو اسے اپنے ساتھ اتارے۔ یہ فعلت اور افعلت دونوں ایک معنی میں ہیں۔ یہ ابوزید نے کہا ہے۔ اور ماوِی الإبل (واؤ کے کسرہ کے ساتھ) ایک لغت ہے جو ماْوی الإبل میں خاص ہے اور یہ شاذ ہے۔

يَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝٩٦

”وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے“۔

عبداللہ بن ابی نے قسم کھائی کہ وہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہے گا اور اس نے خواہش یہ کی کہ آپ اس سے راضی اور خوش ہو جائیں۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 96

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۹۷﴾

''اعرابی زیادہ سخت ہیں کفر اور نفاق میں اور حق دار ہیں کہ نہ جانیں وہ احکام جو نازل کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کے منافقین کے احوال ذکر کیے تو ان بدوؤں اور اعرابیوں کے احوال بھی ذکر کیے جو مدینہ طیبہ سے باہر اور دور تھے۔ پس فرمایا: ان کا کفر انتہائی شدید اور سخت ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کیونکہ وہ سنن کی معرفت سے بہت دور تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ وہ دل کے اعتبار سے سخت، قول کے اعتبار سے انتہائی خشک، مزاج کے لحاظ سے انتہائی اکھڑ اور قرآن کے سماع سے بہت دور تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا: وَّ اَجۡدَرُ یعنی اور حق دار ہیں (موزوں اور مناسب ہے) اَلَّا يَعۡلَمُوۡا اس میں أن با کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ تو کہتا ہے: جدیر بأن تفعل وأن تفعل (تیرے لیے مناسب ہے کہ تو اس طرح کرے) پس جب با کو حذف کر دیا گیا تو یہ درست نہیں ہوا مگر أن کے ساتھ، اور اگر با کو لے آئیں تو پھر یہ أن کے ساتھ بھی اور اس کے بغیر بھی درست ہے۔ تو کہتا ہے: أنت جدیر أن تقوم وجدیر بالصیام اور اگر تو کہے: أنت جدیر القیام تو یہ غلط ہے۔ اور بلاشبہ أن کے ساتھ درست ہے کیونکہ أن استقبال پر دلالت کرتا ہے تو گویا یہ محذوف کے عوض ہے۔ حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مراد شریعت کے فرائض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ربوبیت اور رسولوں کی بعثت میں اللہ تعالیٰ کی دلیلیں ہیں (یعنی) اپنی قلت نظر و فکر کی وجہ سے (وہ انہیں نہ جانیں)

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب صورت حال اس طرح ہے اور یہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے ناقص ہونے اور مرتبہ کاملہ سے ان کے گرے ہوئے ہونے پر دلیل ہے تو پھر اس پر تین احکام مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں کوئی حق نہیں، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث ہے۔ اس میں ہے: ''پھر تم انہیں دعوت دو اپنے گھروں سے مہاجرین کے گھروں کی طرف منتقل ہونے کی اور انہیں بتاؤ کہ انہوں نے اگر اس طرح کیا تو اس کے لیے وہ حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے لیے ہیں اور ان پر وہ فرائض ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں پس اگر وہ وہاں سے منتقل ہونے اور پھرنے سے انکار کر دیں تو پھر انہیں بتا دو کہ وہ مسلمان اعرابیوں کی طرح ہوں گے ان پر اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جاری ہوگا جو مومنوں پر جاری ہوتا ہے اور ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں سے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں'' (2)۔

(۲) شہریوں کے بارے جنگل میں رہنے والوں کی شہادت کو ساقط کرنا اس لیے ہے کیونکہ اس میں تہمت متحقق اور ثابت ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے انہوں نے فرمایا: کیونکہ ہر تہمت کی رعایت اور لحاظ نہیں رکھا جاتا اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 8 2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 82

تمام کے تمام مسلمان آپ کے نزدیک صفت عدالت پر ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ (شاہد) عادل اور پسندیدہ ہو اور یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے اسے سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے یہاں اعرابیوں کو تین اوصاف سے متصف کیا ہے: ان میں سے ایک کفر اور نفاق کے ساتھ۔ دوسرا اس کے ساتھ کہ وہ ایسا مال لیتا ہے جسے وہ تاوان میں خرچ کرتا ہے اور تمہارے بارے میں مصائب و آفات کا انتظار کرتا ہے۔ اور تیسرا اس کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور ایسا مال جمع کرتا ہے جسے وہ ایسے امور میں خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربت کا سبب ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور خوشنودی کا ذریعہ ہیں۔ پس وہ جو اس صفت کے ساتھ متصف ہے تو اس کے بارے میں تو بعید ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے کہ اسے دوسرے اور پہلے فریق کے ساتھ ملا دیا جائے۔ یہ باطل ہے۔ اور اس بارے میں گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

(۳) کہ ان کا اہل شہر کی امامت کرانا ممنوع ہے، کیونکہ یہ سنت سے جاہل اور جمعہ کو ترک کرنے والے ہیں۔ ابو مجلز نے اعرابی کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ امامت نہیں کرائے گا اگرچہ وہ ان سے بڑھ کر قاری ہو۔ اور حضرت سفیان ثوری، امام شافعی، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کیا ہے: اعرابی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے جب وہ نماز کی حدود قائم کرے۔

قولہ تعالیٰ: اَشَدُّ اس کی اصل اشدد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ کُفْرًا یہ بیان (تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّنِفَاقًا یہ اس پر معطوف ہے۔ وَاَجْدَرُ اس کا عطف اَشَدُّ پر ہے اور اس کا معنی ہے اخلق (زیادہ لائق اور مناسب ہونا) کہا جاتا ہے: فلان جدیر بکذا ای خلیق بہ (فلاں اس کے لائق اور مناسب ہے) اور أنت جدیر أن تفعل کذا (تیرے لیے مناسب اور لائق ہے کہ تو اس طرح کرے) اس کی جمع جدراء اور جدیرون ہے۔ اور اس کی اصل جدار الحائط سے ہے اور اس سے مراد دیوار کو بنیاد سے اٹھانا ہے۔ پس اس کا قول: ھو اجدر بکذا کا معنی ہے وہ اس کے زیادہ قریب ہے اور وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اَلَّا یَعْلَمُوْا یہ اصل میں بأن لا یعلموا ہے۔ اور عرب: لوگوں کی نسل ہیں اور ان کی طرف عربی کی نسبت عربیہ کے درمیان ہے اور وہ اہل امصار (شہروں میں رہنے والے) ہیں اور ان میں اعراب صرف جنگل میں رہنے والے ہیں۔ اور شعر فصیح میں اعاریب آیا ہے۔ اور اعراب کی طرف نسبت سے اعرابی ہوا کیونکہ اس کی واحد کوئی نہیں اور اعراب عرب کی جمع نہیں ہے جیسا کہ انباط انبط کی جمع ہے، بلکہ عرب اسم جنس ہے۔ اور عرب عاربہ وہ ہیں جو ان میں سے خالص ہیں۔ اسے اپنے ہی لفظ سے لے کر اس کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے، جیسے تیرا قول: لیل لائل اور بسا اوقات انہوں نے کہا: العرب العرباء اور تعرب کا معنی ہے عرب کے ساتھ مشابہ ہونا۔ اور تعرب بعد هجرته یعنی اپنی ہجرت کے بعد وہ اعرابی ہو گیا۔ اور العرب المستعربہ وہ ہیں جو خالص نہیں ہیں۔ اور اسی طرح متعربہ ہیں۔ اور العربیہ یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور یعرب بن قحطان نے سب سے پہلے عربی میں گفتگو کی اور وہ سارے یمن کا باپ ہے۔ اور العُرب اور العَرب دونوں ایک ہیں، جیسے العُجم اور العَجم ہیں۔ اور العُریب، العرب کی تصغیر ہے۔ شاعر کا قول ہے:

ومَكَن الضَّباب طعام العَرِيبِ . ولا تَشْتهيه نفوسُ العَجَم

بلا شبہ تعظیماً ان کی تصغیر بنائی، جیسا کہ کہا: أنا جُذَيْلُها المحكك وعُذَيْقها المَرَجّب میں امور کا تجربہ کار اور ان کا پاسبان ہوں (اس لکڑی کی مثل جو اجرب اونٹ کی خارش کے لیے گاڑھی جاتی ہے اور اس کھجور کے درخت کی طرح جس کے اردگرد حفاظت کے لیے پتھروں کی منڈیر بنادی جائے)

قشیری نے بیان کیا ہے کہ عربی کی جمع عرب ہے اور اعرابی کی جمع اعراب اور اعاریب ہے۔ اور اعرابی کو جب کہا جائے یا عربی تو وہ خوش ہوتا ہے اور عربی کو جب کہا جائے: یا اعرابی تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اور مہاجرین و انصار عرب ہیں اعراب نہیں۔ اور عرب کا نام عرب رکھا گیا کیونکہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں جنہوں نے عربہ میں نشوونما پائی اور یہ تہامہ میں سے ہے پس وہ اس کی طرف منسوب ہوئے اور قریش عربہ میں مقیم ہوئے اور وہ مکہ مکرمہ ہے اور تمام عرب اس کے جزیرہ میں پھیل گئے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۹۸

''اور بعض بدو ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جو وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور منتظر ہیں تمہارے لیے (زمانہ کی) گردشوں کے (حقیقت میں) انہی پر ہے بری گردش اور اللہ تعالیٰ سمیع (و) علیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ اس میں من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا یہ دو مفعول ہیں: تقدیر کلام ینفقه ہے۔ پھر طول اسم کی وجہ سے ہا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مغرما اس کا معنی تاوان اور خسارہ ہے۔ اس کا اصل معنی کسی شی کا لازم ہونا ہے۔ اور اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝۶۵ (الفرقان) اس میں غراما بمعنی لازماً ہے، یعنی جو وہ جہاد اور صدقہ میں خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور اس پر کسی ثواب کی امید نہیں رکھتے۔ وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ اس میں التربص کا معنی انتظار کرنا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوائر، دائرۃ کی جمع ہے، اس سے مراد وہ حالت ہے جو نعمت سے آزمائش اور مصیبت کی طرف بدلی ہوئی ہو، یعنی وہ جہالت کے سبب خرچ کرکے باطن کی برائی اور دل کے خبث کو جمع کرتے ہیں۔ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ اسے ابن کثیر اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ الفتح میں سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے(1)۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ (مریم:28) میں سین کے فتحہ پر اجماع کیا ہے۔ اور دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ السوء ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یعنی ان پر ہزیمت (شکست) اور شر کی گردش ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ان پر عذاب و بلاء کی گردش ہے۔ دونوں نے کہا ہے: امرا سوء ضمہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ نہیں کہا جاتا: هو امرء عذاب ولا شر۔ اور محمد ابن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: السوء فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی رداءۃ ردی ہونا اور گھٹیا ہونا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: مررت برجل صدق اس کا معنی ہے میں ایک صالح آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور یہ صدق اللسان (زبان کا سچا ہونا) میں سے نہیں ہے اگرچہ وہ زبان کا سچا ہو کیونکہ تو یہ بھی کہتا ہے: مررت بثوب صدق (میں نے اچھا کپڑا دیکھا) اور مررت برجل سوء اس سے مراد اس کی ابتلاء اور عذاب نہیں، بلکہ اس کا معنی ہے میں ایک فسادی آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور فراء نے کہا ہے: السوء فتحہ کے ساتھ مصدر ہے سوته سوأ و مساءة و سوائية۔ دوسروں نے کہا ہے: اس سے فعل ساء یسوء ہے۔ اور السوء ضمہ کے ساتھ اسم ہے مصدر نہیں اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: علیهم دائرة البلاء والمكروه (ان پر ابتلاء اور مکروہ کی گردش ہے)

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

''اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر اور سمجھتے ہیں جو وہ خرچ کرتے ہیں قرب الٰہی اور رسول (پاک) کی دعائیں لینے کا ذریعہ ہے، ہاں ہاں وہ ان کے لیے باعث قرب ہے، ضرور داخل فرمائے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں، بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو سچ تسلیم کیا ہے اور ان سے مراد مزینہ قبیلے کے بنو مقرن ہیں۔ اس کا ذکر مہدوی نے کہا ہے۔ قربات یہ قربۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جمع قرب، قُربات، قَربات اور قُرُبات ہے۔ اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور القربات ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوا جاتا ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: قربت لله قربانا (میں اللہ تعالیٰ کے انتہائی قریب ہوا) اور القربۃ قاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مشکیزہ ہے جس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ یہ تھوڑی تعداد میں ہوں تو جمع قربات، قِربات اور قربات آتی ہے، اور کثیر تعداد کے لیے قرب آتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس کی جمع آتی ہے جو فعلۃ کے وزن پر ہو، مثلاً سدرۃ اور فقرۃ، تیرے لیے عین کلمہ کو فتح دینا، کسرہ دینا اور سکون دینا سب جائز ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور نافع نے ورش کی روایت میں قربۃ را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اصل ہے۔ اور باقیوں نے اسے تخفیفاً سکون کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً کتب اور رسل اور قربات میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن سعدان نے بیان کیا ہے کہ یزید بن القعقاع نے الا انها قربة لهم پڑھا ہے۔ اور وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ کا معنی رسول کا استغفار کرنا اور دعا کرنا ہے۔ اور صلوٰۃ کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ کا معنی رحمت فرمانا اور خیر و برکت عطا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (الاحزاب: 43) (اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم

پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں)) اور ملائکہ کی طرف سے صلوٰۃ کا مطلب دعا کرنا ہے (1)۔ اور اسی طرح یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بھی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ:103) (نیز دعا مانگیے ان کے لیے بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے) یعنی آپ کی دعا ان کے لیے ثابت قدمی اور طمانیت کا باعث ہے۔ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ یعنی ان کے اخراجات انہیں اللہ تعالیٰ کے رحمت کے قریب کرتے ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

''اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اللہ تعالیٰ نے اعرابیوں کی اقسام ذکر کیں تو پھر اس نے مہاجرین و انصار کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ ان میں سے پہلے پہلے ہجرت کرنے والے بھی ہیں اور ان میں سے ان کی اتباع اور پیروی کرنے والے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی۔ تحقیق ان کے طبقات اور ان کی اصناف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ہم اس میں سے کچھ ذکر کریں گے اور اس میں غرض اور مدعیٰ بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے وَالْاَنْصَارُ کو السّٰبِقُوْنَ پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ اخفش نے کہا ہے: الْاَنْصَارِ میں جر اور کسرہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقون مہاجرین و انصار دونوں میں سے تھے۔ اور الْاَنْصَارِ اسلامی نام ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: تمہارے لیے لوگوں کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے۔ الْاَنْصَارِ کیا یہ نام اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے یا زمانہ جاہلیت میں تمہیں اس کے ساتھ پکارا جاتا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا: بلکہ یہ وہ اسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں یاد فرمایا ہے۔ اسے ابو عمر نے ''الاستذکار'' میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مہاجرین و انصار میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے پر قرآن کریم کی نص موجود ہے۔ اور وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے قول کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو بیعت رضوان میں حاضر ہوئے اور اس سے مراد

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

بیعت حدیبیہ ہے۔ یہ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (1)۔ اور محمد بن کعب اور عطا بن یسار نے کہا ہے: وہ اہل بدر ہیں۔ اور تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جس نے تحویل قبلہ سے پہلے ہجرت کی تو وہ مہاجرین اولین میں سے ہے اس میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اور رہے ان میں سے افضل تو وہ یہ ترتیب ہے:

**مسئلہ نمبر 3۔** ابو منصور بغدادی تمیمی نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہوا ہے کہ ان میں افضل خلفائے اربعہ ہیں، پھر باقی چھ دس کی تکمیل تک، پھر اصحاب بدر، پھر اصحاب احد پھر بیعت رضوان یا حدیبیہ والے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اور رہا وہ جوان میں سے سب سے اول اسلام لایا تو مجالد نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، لوگوں میں اسلام لانے کے اعتبار سے اول کون ہے؟ تو انہوں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ کیا تو نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قول نہیں سنا:

إذا تذكرتَ شَجْوًا من أخي ثقة      فاذكر أخاك أبابكر بما فعلا

جب تو قابل اعتماد اور ثقہ بھائی کے کارناموں اور جرأت کا تذکرہ کرے تو اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں کا ذکر کر جو انہوں نے کیے۔

خيرَ البرية أتقاها وأعدلها      بعد النبيّ وأوفاها بما حَمَلا

وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تقویٰ اور عدل کے اعتبار سے ساری مخلوق سے بہتر اور افضل ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں پورا کرنے والے ہیں۔

الثانِيَ التالِيَ المحمود مشهدُه      وأوّلَ الناس منهم صدّق الرسلا (2)

وہ دوسرے ہیں، پیچھے آنے والے ہیں ان کی شہادت قابل ستائش ہے اور لوگوں میں سے سب سے پہلے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

اور ابو الفرج علامہ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف بن یعقوب بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے اپنے باپ اور اپنے مشائخ محمد بن منکدر، ربیعہ بن ابی عبدالرحمن، صالح بن کیسان، سعد بن ابراہیم، عثمان بن محمد اخنسی کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ اس بارے میں ذرا شک نہ کرتے تھے کہ قوم میں سے سب سے اول اسلام قبول کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہی قول حضرت ابن عباس، حضرت حسان اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے اول اسلام لایا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں (3)۔ حضرت زید ابن ارقم، حضرت ابو ذر اور حضرت مقداد وغیرہم رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے، حاکم ابو عبداللہ نے کہا ہے: میں اصحاب تواریخ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے پہلے

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 98 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1003 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 98

اسلام لائے وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں (1)۔ معمر نے حضرت زہری سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت سلیمان بن یسار، عروہ بن زبیر اور عمران بن ابی انس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا (2)۔ یہ کئی اسناد سے حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور یہی قول حضرت قتادہ، محمد بن اسحاق بن یسار اور ایک جماعت کا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور ثعلبی مفسر نے اس پر علماء کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے اسلام لائیں اور ان کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد کون اسلام لایا؟ اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ حنظلی ان روایات کے درمیان تطبیق کرتے ہیں، پس وہ فرماتے ہیں: مردوں میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلام لائے، عورتوں میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آزاد کیے ہوئے غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ (3) (سب سے پہلے اسلام لائے)۔ واللہ اعلم

اور محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے کہ مجھے مصعب بن ثابت نے خبر دی ہے انہوں نے کہا مجھے ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور وہ چوتھے یا پانچویں اسلام قبول کرنے والے فرد ہیں۔ لیث بن سعد نے بیان کیا ہے اور ابوالاسود نے مجھے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اس وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سات سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی عمر دس برس تھی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ محدثین کے طریقہ میں سے معروف یہ ہے کہ ہر وہ مسلمان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار کیا وہ آپ کے اصحاب میں سے ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ جس مسلمان نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی یا آپ کا دیدار کیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے ہے (4)۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کسی کو صحابی شمار نہ کرتے تھے مگر اسے جو ایک یا دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقیم رہا اور آپ کی معیت میں ایک یا دو غزوں میں شریک ہوا۔ اگر حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ قول صحیح ہے تو پھر یہ لازم کرتا ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو یا جو کوئی اس ظاہری شرط کے نہ پائے جانے میں ان کے ساتھ شریک ہے انہیں صحابہ کرام میں شمار نہ کیا جائے حالانکہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں صحابہ کرام میں سے شمار کرنے میں ہمیں کوئی اختلاف معلوم نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مہاجرین میں سے اوّل السابقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور علامہ ابن عربی نے بیان کیا ہے: یہ سبقت تین چیزوں کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ الصِّفَةُ اور وہ ایمان ہے (5) اور زمان و مکان۔ ان وجوہ میں اصل صفات میں سبقت لینا ہے۔ اور اس پر دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو صحیح میں موجود ہے۔ ''ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 99 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 515 5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002

بعد میں آنے والے اوّلون ہیں مگر یہ کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہمیں کتاب ان کے بعد دی گئی پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے پس الله تعالیٰ نے ہمیں اس کے لیے ہدایت اور رہنمائی فرمائی پس یہودیوں کے لیے آنے والا کل ہے اور عیسائیوں کے لیے آنے والے کل کے بعد آنے والا دن (یعنی پرسوں) ہے'' (1)۔ تو رسول الله ﷺ نے خبر دی ہے کہ سابقہ امم میں سے جنہوں نے زمان کے اعتبار سے ہم سے سبقت لی ہے تو ہم ایمان، الله تعالیٰ کے امر کی پیروی، اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری، اس کے امر کو تسلیم کرنے، اس کی تکلیف کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرنے اور اس کے فرائض و ذمہ داریوں کو برداشت کرنے میں سبقت لے گئے ہیں، ہم اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے اور نہ اس کے ساتھ کسی اور کو اختیار کرتے ہیں، نہ رائے سے اس کی شریعت کو بدلتے ہیں جیسا کہ اہل کتاب نے کہا اور یہ الله تعالیٰ کی توفیق سے ہے جو وہ عطا فرمائے۔ اس کے آسانی پہنچانے کے ساتھ ہے جس پر وہ راضی ہو۔ ہم ہدایت نہ پا سکتے اگر الله تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ عطا فرماتا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شریعت کے مناقب میں سے ہر منقبت کی طرف السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے کو متضمن ہے چاہے وہ علم ہو یا دین، شجاعت یا اس کے سوا کوئی اور وصف، اس کا تعلق مال عطا کرنے سے ہو یا اعزاز و اکرام میں رتبہ سے ہو۔ اس مسئلہ میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسروں پر عطا کے سبب سابقین کو فضیلت دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اس سے لوگوں کے درمیان کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے کہ ان میں سے بعض بعض کو عطا کرنے میں سبقت لے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کو کہتے تھے: کیا آپ سبقت لے جانے والے کو اس کی طرح قرار دیتے ہیں جس کے لیے سبقت نہیں ہے؟ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ انہوں نے الله تعالیٰ کے لیے عمل کیا اور اس کا اجر بھی اسی پر ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دور میں فضیلت دیتے تھے۔ پھر آپ نے اپنے وصال کے وقت کہا: اگر میں کل تک زندہ رہا تو میں ضرور ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ کے ساتھ ملا دوں گا، پھر اسی رات آپ کا وصال ہو گیا اور خلافت ہمارے آج دن تک اس اختلاف پر قائم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وَالْاَنْصَارُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ الَّذِيْنَ کو انصار کی صفت قرار دے کر اس سے واؤ کو ساقط کر دیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں رجوع کرا لیا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے زید کی تصدیق کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور کہا: ہم نہیں دیکھ رہے مگر یہ کہ ہم اتنے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے کہ ہمارے ساتھ کوئی اور اسے نہیں پائے گا۔ تو حضرت ابی نے کہا: بلاشبہ میں کتاب الله میں سورۂ جمعہ کے شروع میں اس کا مصداق پاتا ہوں: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعہ: 3) (اور دوسرے لوگوں کا بھی ان

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمع، جلد 1، صفحہ 120

میں سے (تزکیہ کرتا ہے تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان سے آ کر نہیں ملے) اور سورۂ حشر میں ہے: وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر: 10) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے)

اور سورۂ الانفال میں یہ قول ہے: وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (الانفال: 75) (اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہی میں سے ہیں) پس قراءت واوٴ کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول باحسان کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ امور خیر جن میں وہ ان کے افعال و اقوال کی اتباع کرتے ہیں، نہ کہ ان میں جو ہفوات وزلات ان سے صادر ہوئیں، کیونکہ وہ معصوم نہیں رضی اللہ عنہم۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے تابعین اور ان کے مراتب میں اختلاف کیا ہے۔ پس الخطیب الحافظ نے کہا ہے: تابعی وہ ہے جسے صحابی کی صحبت اور معیت حاصل ہو، ان میں سے ہر ایک کو تابع اور تابعی کہا جاتا ہے اور حاکم ابو عبد اللہ وغیرہ کا کلام یہ شعور دلاتا ہے کہ اس میں اتنا کافی ہے کہ اس نے صحابی سے سماع کیا ہو یا اس سے ملاقات کی ہو اگرچہ صحبت عرفہ نہ پائی جائے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اسم تابعین کا اطلاق ان پر ہوتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے۔ جیسا کہ حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور وہ جو فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں میں سے ان کے قریب قریب ہیں، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو فرمایا: ''میرے لیے میرے صحابہ کو بلاؤ، پس قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی ہر روز احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان کے ایک مد کو اور نہ اس کے نصف کو پہنچ سکتا ہے'' (1)۔

اور تعجب کی بات ہے کہ حاکم ابو عبد اللہ نے مقرن مزنی کے دو بیٹوں نعمان اور سوید کو تابعین میں شمار کیا ہے جب انہوں نے تابعین میں سے بھائیوں کا ذکر کیا، حالانکہ وہ دونوں معروف صحابی ہیں اور ان کا ذکر صحابہ کرام میں کیا گیا ہے اور وہ دونوں غزوۂ خندق میں حاضر تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اکبر التابعین اہل مدینہ میں سے فقہائے سبعہ ہیں اور وہ حضرت سعید بن مسیب، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید، ابو سلمہ بن عبد الرحمن، عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور بعض بزرگوں نے انہیں ایک شعر میں نظم کر دیا ہے اور کہا ہے:

فخذهم عبيدُالله عروةُ قاسمٌ سعيدٌ أبوبكر سليمانُ خارجه

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تابعین میں سے سب سے افضل حضرت سعید بن مسیب ہیں۔ تو آپ کو کہا گیا: ان کے متصل بعد علقمہ اور اسود ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت سعید بن مسیب اور علقمہ اور اسود۔ (یعنی یہ تینوں فضیلت کے ایک درجے میں ہیں) اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تابعین میں سے افضل قیس، ابو عثمان، علقمہ اور مسروق

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 310

ہیں۔ یہ تمام فاضل ہیں اور تابعین کے بلند رتبہ میں سے ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا: حضرت عطا مکہ مکرمہ کے مفتی تھے اور حضرت حسن، بصرہ کے مفتی تھے۔ پس یہ دو ہیں جو دوسروں کی نسبت زیادہ مال دار اور عام میل جول سے بچنے والے تھے۔ اور ابو بکر بن ابی داؤد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: عورتوں میں سے تابعین کی سردار حفصہ بنت سیرین اور عمرہ بنت عبدالرحمن ہیں اور ان کے ساتھ تیسری ام الدرداء ہیں اور وہ ان دو کی طرح نہیں ہے۔ حاکم ابو عبداللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ایک طبقہ تابعین میں شمار کیا جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا صحابہ کرام سے سماع صحیح نہیں۔ ان میں سے حضرت ابراہیم بن سوید نخعی ہیں اور یہ ابراہیم بن یزید نخعی فقیہ نہیں ہے۔ اور بکر بن ابی السمیط اور بکر بن عبداللہ الاشج ہیں۔ اور ان کے سوا کئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: اور ایک طبقہ ہے جن کا شمار لوگوں کے نزدیک اتباع التابعین میں ہے، حالانکہ انہوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے ان میں سے ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان ہیں، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی ہے۔ اور ہشام بن عروہ ہیں، انہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس لایا گیا اور حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہم کے پاس لایا گیا۔ تحقیق انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی پایا ہے۔ اور ام خالد بنت خالد بن سعید بھی ہیں۔ اور تابعین میں ایک طبقہ ہے جنہیں مخضرمین کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عہد جاہلیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو پایا اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور انہیں شرف صحبت حاصل نہ ہوا۔ ان کی واحد مخضرم (راء کے فتحہ کے ساتھ) ہے کأنہ خضرم، یعنی گویا یہ اپنے ہم زمانہ ان لوگوں سے کٹ گیا جنہوں نے صحابیت وغیرہ کا رتبہ پالیا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعداد بیس افراد تک پہنچی ہے، ان میں سے ابو عمرو شیبانی، سوید بن غفلہ کندی، عمرو بن میمون الاودی، ابو عثمان النہدی عبد خبر بن یزید الخیرانی (یہ خا کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ ہمدان خاندان سے ہے، عبدالرحمن بن مل، ابو الحلال العتکی ربیعہ بن زرارہ ہیں۔ اور ان میں سے وہ جن کا مسلم نے ذکر نہیں کیا، ان میں سے ابو مسلم الخولانی عبداللہ بن ثوب اور احنف بن قیس ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام اور تابعین کی معرفت کے بارے مختصر تذکرہ ہے جن کی فضیلت کا ذکر قرآن کریم نے کیا، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** (آل عمران: 110) (ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے (لوگوں) کی ہدایت و بھلائی کے لیے) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا** الآیہ (البقرہ: 143) (اور اسی طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے پسند کیا کہ اگر ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ لیں'' (1) ...... الحدیث پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنا بھائی قرار دیا۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اور اس کے احکام کی ہم نے پیروی کی تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے گروہ میں اٹھائے گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے وسیلہ سے وہ ہمیں اپنے راستے اور اپنے دین سے نہیں ہٹائے گا۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے، پکے ہو گئے ہیں نفاق میں، تم نہیں جانتے ان کو، ہم جانتے ہیں انہیں، ہم عذاب دیں گے انہیں دوبارہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ یعنی قوم منافقون۔ اور یہ مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار اور اشجع کے قبائل تھے(1)۔ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ رہی قوم مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (یعنی اہل مدینہ میں سے ایک قوم ہے جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوا منافقین کی نعت میں سے ہے، پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی، اس کا معنی ہوگا: ومن حولکم من الأعراب منافقون مردوا علی النفاق، ومن اهل المدينة مثل ذالك (تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے بھی اسی طرح ہیں) اور مردوا کا معنی ہے وہ قائم اور مضبوط ہو گئے ہیں اور انہوں نے توبہ نہیں کی۔ یہ ابن زید سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: وہ اس سے ڈٹ گئے ہیں اور اس کے سوا کا انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں معنی باہم ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور کلمہ کا اصل معنی نرمی، ملائمت و ملامست اور خالی ہونا ہے اور خالص ہونا ہے۔ تو گویا وہ نفاق کے لیے خالص ہو گئے ہیں اور اسی سے رملة مرداء ہے یعنی ایسی خالص ریت (صحراء) جس میں کوئی بوٹی نہ ہو۔ اور غصن امرد ایسی ٹہنی جس پر کوئی پتا نہ ہو اور فرس امرد وہ گھوڑا جس پر لٹکنے والے بال نہ ہوں۔ اور غلام امرد ایسا بچہ جس کی جلد صاف ہو، بے ریش ہو۔ اور یہ نہیں کہا جائے گا: جارية مرداء اور تمريد البناء سے مراد بناء کا ملائم اور نازک ہونا ہے۔ اور اسی سے یہ ارشاد بھی ہے: صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ (النمل: 44) ((یہ پانی نہیں) یہ چمک دار محل ہے) اور تمريد الغصن سے مراد ٹہنی کو پتوں سے خالی کرنا ہے، کہا جاتا ہے: مرد يمرد مرودا و مرادة۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ یہ اس ارشاد کی مثل ہے: لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ (الانفال: 60) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے امور کے انجام کو نہیں جانتے بلاشبہ ہم نے ان کا علم اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اور یہ معنی اس سے روک رہا ہے کہ کسی کے بارے جنت یا دوزخ کا حکم لگایا جائے۔

قولہ تعالیٰ: سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک بار (عذاب) دنیا میں بیماریوں کے ساتھ اور دوسرا عذاب آخرت (ہم انہیں دیں گے) پس مومن کی بیماری (گناہوں کا) کفارہ ہوتی ہے اور کافر کی بیماری سزا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلا عذاب رسوائی کا ہے (کہ ان کے بارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 396

دے کر (انہیں رسوا کیا) جیسا کہ اس کا بیان منافقین میں آئے گا۔ اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ایک دنیا کا عذاب ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: پہلا اموال و اولاد کے بارے میں مصائب و آلام میں مبتلا کرنا ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے (1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک بھوک اور دوسرا قتل کا عذاب ہے۔ فراء نے کہا ہے: ایک قتل اور دوسرا عذاب قبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک قید اور دوسرا قتل ہے۔ یہ قول بھی ہے: ایک ان کے مالوں سے زکوٰۃ لینا اور ان پر حدود جاری کرنا ہے اور دوسرا عذاب قبر ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دو عذابوں میں سے ایک وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (التوبہ: 55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں)

اور آیت سے مقصود عذاب کی اتباع ہے یا ان پر عذاب کو دوگنا کرنا ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰۲﴾

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

یعنی اہل مدینہ میں سے اور تمہارے آس پاس رہنے والوں میں سے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کر لیا ہے اور دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا امر مؤخر کر دیا گیا ہے وہ ان کے بارے میں وہی فیصلہ فرمائے گا جو چاہے گا۔ پس پہلی قسم یہ احتمال رکھتی ہے کہ وہ منافق تھے اور نفاق پر پختہ نہ ہوئے تھے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مومن ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت ان دس افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: اور ان کے بارے میں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً نازل ہوئی۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور زید بن اسلم نے کہا ہے: وہ آٹھ افراد تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چھ تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ پانچ تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابولبابہ انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں خاص کر بنی قریظہ کے ساتھ ان کے معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی (3)۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے ان سے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر قلعے سے نیچے اترنے کے بارے گفتگو کی تو آپ نے ان کے لیے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ مراد یہ تھی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ذبح کر دیں گے اگر وہ نیچے اترے۔ پھر جب غلطی کا احساس ہوا تو توبہ کی، ندامت ہوئی اور اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 101　　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 16　　3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 20

کے ساتھ باندھ دیا اور یہ قسم کھائی کہ وہ کوئی چیز نہ کھائے گا نہ پئے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے یا وہ مر جائے۔ پس وہ اسی حالت پر رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا اور یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھولنے کا حکم فرما دیا۔ اسے علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے۔ اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وآخرون حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی شان میں نازل ہوئی اور اس وقت کہا جب ان سے گناہ صادر ہوا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں آپ کے پڑوس میں رہوں گا اور اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے ثلث تیرے لیے کافی ہوگا (1) تحقیق رب کریم نے ارشاد فرمایا: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا** ((اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تا کہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں) اسے ابن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو اسی طرح باندھ دیا تھا جیسے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انہیں کھولیں گے اور آپ ان سے راضی ہوں گے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں میں انہیں نہیں کھولوں گا اور نہ میں انہیں معذور قرار دوں گا یہاں تک کہ انہیں کھولنے کا حکم دیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے اعراض کیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں جانے سے پیچھے رہے ہیں'' (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں کھولا اور ان کا عذر قبول فرما لیا۔ جب وہ کھول دیئے گئے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے وہ اموال ہیں جنہوں نے ہمیں آپ سے پیچھے رکھا، پس آپ ہماری طرف سے انہیں صدقہ کر دیجئے اور ہمیں پاک کیجئے اور ہمارے لیے مغفرت طلب کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالوں میں سے کوئی شے لوں'' (3)۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** الآیہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ دس افراد تھے ان میں سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالوں سے تیسرا حصہ لیا اور یہ ان کے ان گناہوں کا کفارہ تھا جن کا انہوں نے ارتکاب کیا۔ پس ان کا برا عمل پیچھے رہنا ہے اس پر اس بارے گفتگو کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کا اجماع ہے۔ اور عمل صالح کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس علامہ طبری وغیرہ نے کہا ہے: (اپنے گناہ کا) اعتراف کرنا، توبہ کرنا اور اس (گناہ) پر نادم ہونا (4)۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کا وہ عمل صالح جو انہوں نے کیا وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا اور انہوں نے کہا: ہم نہ اپنی بیویوں کے قریب جائیں گے اور نہ اپنی اولاد کے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عذر کے بارے حکم نازل فرما دے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلکہ عمل صالح ان کا ان غزوات میں شریک ہونا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے گزر چکے تھے۔ اور یہ آیت اگرچہ اعراب کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یوم قیامت

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 20 2۔ اسباب النزول، صفحہ 135 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 17

تک ہر اس آدمی کے حق میں عام ہے جس کے اعمال صالحہ بھی ہوں اور اعمال سیئہ بھی۔ پس یہ امید دلاتی ہے۔ علامہ طبری نے حجاج بن ابی زینب سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا میں نے ابوعثمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میرے نزدیک اس امت کے لیے قرآن کریم میں اس آیت سے بڑھ کر زیادہ امید افزا کوئی آیت نہیں: وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا (التوبہ: 102) (1)

اور بخاری میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''آج کی رات میرے پاس دو آنے والے آئے اور وہ مجھے لے گئے پس ہم ایک ایسے شہر کے پاس رکے جس کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں کے ساتھ بنے ہوئے تھے ہمیں کچھ لوگ ملے جن کی خلقت میں نصف اتنا زیادہ حسین تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا اور نصف اتنا زیادہ قبیح تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا۔ ان دونوں نے انہیں کہا: تم جاؤ اور اس نہر میں کود جاؤ پس وہ اس میں داخل ہو گئے پھر ہماری طرف واپس لوٹ کر آئے تو ان سے وہ بدصورتی اور سیاہی دور ہو چکی تھی اور وہ انتہائی حسین وجمیل صورت میں بدل چکے تھے، تو ان دونوں نے مجھے بتایا: یہ جنت عدن ہے اور یہی آپ کی منزل اور مقام ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا: رہی وہ قوم جن کا نصف حصہ حسین اور خوبصورت تھا اور ان کا نصف قبیح اور بدصورت تھا (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرمائی ہے'' (2)۔

علامہ بیہقی نے ربیع بن انس کی حدیث سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث اسراء ذکر کی ہے اور اس میں آپ نے فرمایا ہے: ''پھر مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا...... '' پھر انہوں نے یہاں تک حدیث ذکر کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں آسمان کی طرف اپنے بلند ہونے اور چڑھنے کا ذکر فرمایا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھائی اور خلیفہ کے نام سے سلام فرمایا ہے پس کتنا اچھا بھائی اور کتنا اچھا خلیفہ ہے اور آنے والا کتنا اچھا ہے، پس اچانک دیکھا سامنے جنت کے دروازے کے پاس کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے جس کے سر کے بال سیاہ وسفید ہیں اور اس کے پاس ایک قوم ہے ان کے چہرے سفید ہیں اور ایک قوم ہے ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان کے رنگوں میں کوئی شے ہے، پس وہ نہر کے پاس آئے اور اس میں غسل کیا پھر وہ اس سے نکلے درآنحالیکہ ان کے رنگوں سے وہ شے صاف ہو چکی تھی، پھر وہ دوسری نہر پر آئے اور اس میں انہوں نے غسل کیا، پس اس سے نکلے تو ان کے رنگوں سے کوئی شے نکل چکی تھی بعد ازاں وہ تیسری نہر میں داخل ہوئے جب اس سے نکلے تو اس کے رنگ اپنے ساتھیوں کے رنگوں کی مثل ہو چکے تھے پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا: اے جبرئیل! یہ سفید چہروں والے کون لوگ ہیں اور یہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی پھر وہ نہر میں داخل ہوئے تو ان کے رنگ صاف ہو گئے؟ تو انہوں نے بتایا: یہ آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یہ پہلے آدمی ہیں سطح زمین پر جن کے بال سیاہ اور سفید ہے۔ اور سفید اور چمکتے چہروں والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا اور رہے وہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اور پھر اللہ

1۔ تفسیر طبری جلد 11، صفحہ 21
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674

تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ اور رہی پہلی نہر تو وہ الله تعالیٰ کی رحمت ہے اور رہی دوسری نہر تو وہ الله تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور رہی تیسری نہر تو ان کے رب نے انہیں شراب طہور کے ساتھ سیراب فرمایا"۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا میں واؤ کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی با ہے اور یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ بمعنی مع ہے، جیسے کہ تیرا قول ہے: استوی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ برابر ہو گیا) کوفیوں نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: کیونکہ خشبہ کو الماء پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے اور آیت میں آخر کو پہلے پر مقدم کرنا جائز ہے لہٰذا یہ خلطت الماء باللبن کے قائم مقام ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"(اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے نیز دعا مانگیے ان کے لیے، بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے۔ اور الله تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یہ صدقہ جس کے بارے حکم دیا گیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ فرض صدقہ ہے۔ یہ جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور یہی عکرمہ کا قول ہے جس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ مخصوص ہے جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے مالوں کا تیسرا حصہ لیا۔ اور فرض زکوٰۃ میں سے یہ کسی میں نہیں ہے۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی آدمی اپنا تمام مال صدقہ کر دے تو ثلث نکالنا اس کے لیے جائز ہے۔ اور استدلال حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ پہلے قول کی بنا پر یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے آپ پر ہی محصور ہونے کا تقاضا کرتا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی یہ صدقہ نہیں لے سکتا اور اس بنا پر آپ کے ساقط کرنے کے ساتھ صدقہ کا ساقط ہونا اور آپ کے وصال کے ساتھ اس کا زائل ہونا لازم آتا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منکرین زکوٰۃ نے اسی کے ساتھ تعلق قائم کیا اور انہوں نے کہا: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے عوض ہمیں پاکیزگی اور برکت عطا فرماتے تھے اور آپ ہمارے لیے دعا فرماتے تھے، حالانکہ آپ کے سوا کسی اور سے ہم نے اسے معدوم پایا ہے اور اس بارے میں ان کے شاعر نے یہ کہا ہے:

أطعنا رسول الله ما كان بيننا فيا عجبا ما بال مُلْك أبي بكر(1)

ہم نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ہے آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں پس تعجب ہے ابوبکر کی بادشاہی کو کیا ہوا۔

وان الذی سألوکم فمنعتم لکالتمر او أحلی لدیهم من التمر(2)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006

2۔ ایضاً

اور بے شک وہ جو انہوں نے تم سے مانگا اور تم نے انکار کیا وہ کھجور کی مثل یا ان کے نزدیک کھجور سے زیادہ میٹھا ہے۔

سنمنعهم مادام فينا بقية كرام على الضراء في العسر واليسر(1)

ہم ان کا انکار کرتے رہیں گے جب تک ہم میں تنگی اور خوشحالی کی حالت میں مصیبت زدہ لوگوں پر سخاوت اور مہربانی کرنے والے باقی ہیں۔

یہ قسم ان لوگوں کی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف مضبوط اور پختہ طریقہ سے کھڑے تھے اور ان کے حق میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں ضرور ان کے ساتھ جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا(2)۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہا ان کا یہ قول کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لہٰذا آپ کے سوا کوئی اس کے ساتھ ملحق نہیں، تو یہ قرآن سے جاہل، ماخذ شریعت سے غافل اور دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا کلام ہے، کیونکہ قرآن کریم میں خطاب کوئی ایک طرز پر وارد نہیں بلکہ مختلف وجوہ پر وارد ہے، پس ان میں سے ایک خطاب تمام امت کی طرف متوجہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لیے)۔ اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ (البقرہ:183) (اے ایمان والو! فرض کیے گئے تم پر روزے) اور اسی طرح کی اور آیات۔

اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں نہ لفظوں میں نہ معنی میں، مثلاً ارشاد گرامی ہے: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء:79) (اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز زائد ہے) اور قول باری تعالیٰ: خَالِصَةً لَّكَ (النور:50) یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے) اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے لفظی طور پر لیکن معنی اور فعلاً تمام امت اس میں شریک ہے، جیسا کہ فرمان ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الآیہ (الاسراء:78) (نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک الخ) اور قول باری تعالیٰ: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (النحل:98) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ کی الخ) اور یہ ارشاد گرامی: وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (النساء:102) (اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز) پس ہر وہ جس پر سورج غروب ہوا وہ نماز کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جس نے قرآن کریم پڑھا وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنے کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو ڈرا وہ اس صفت کے ساتھ نماز قائم کرے گا۔ پس اسی قبیلے سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّیْهِمْ بِهَا اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی بھی ہیں: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب:1) (اے نبی مکرم!) (حسب سابق ڈرتے رہیے اللہ تعالیٰ سے) اور یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق:1) (اے نبی (مکرم) (مسلمانوں سے فرمائیں) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو)(3)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006 2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 188 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1008

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ اَمْوَالِهِمْ بعض عرب اور وہ قبیلہ دوس کے آدمی تھے نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بے شک مال سے مراد کپڑے، ساز وسامان اور سامان تجارت ہے، عین (یعنی سونا، چاندی) کو مال کا نام نہیں دیا جاسکتا اور یہ معنی اس سنت میں آیا ہے جو مالک عن ثور بن زید الدیلی عن ابی الغیث سالم مولی ابن مطیع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم فتح خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ہم نے سونے اور چاندی میں سے کوئی مال غنیمت نہ پایا مگر اموال، کپڑے اور ساز وسامان (پایا) (1) الحدیث۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے کہ مال صامت سے مراد سونا اور چاندی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صرف اونٹ ہیں اور اسی سے ان کا قول ہے: المال الابل (مال تو اونٹ ہیں) اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد تمام جانور ہیں۔ ابن الانباری نے احمد بن یحییٰ (ثعلب) النحوی سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: سونے اور چاندی میں سے اتنا جو اس مقدار تک پہنچنے سے کم ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ مال نہیں ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

واللہ ما بلغتْ لی قطُّ ماشیۃٌ حدّ الزکاۃ ولا إبل ولا مال

قسم بخدا! میرے لیے کبھی کوئی جانور زکوٰۃ کی حد کو نہیں پہنچا نہ اونٹ اور نہ ہی مال۔

ابو عمر نے کہا ہے: کلام عرب سے معروف ومشہور یہ ہے کہ ہر وہ جس سے خوشحالی حاصل کی جائے اور امارت حاصل کی جائے وہ مال ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال بلاشبہ مال میں سے اس کا وہ ہے جو اس نے کھایا اور فناہ کر دیا یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر دیا اور ختم کر دیا'': یقول ابن آدم مالی مالی وانما لہ من مالہ ما أکل فأفنی أو لبس فأبلی أو تصدق فأمضی (2)۔ اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: پس آپ نے مجھے ایک زرہ عطا فرمائی تو اس کے عوض میں نے بنی سلمہ میں کھجوروں کا چھوٹا سا قطعہ خریدا۔ وہ پہلا مال تھا جو میں نے اسلام میں حاصل کیا، کمایا۔ پس جس کسی نے اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے بارے قسم کھائی تو اس کا اطلاق اس کے مال کی ہر نوع اور ہر قسم پر ہوگا چاہے وہ اس میں سے ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہ ہو، مگر یہ کہ وہ اس میں سے معین شے کی نیت کرے تو پھر قسم کا اطلاق اسی پر ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق اموال زکوٰۃ پر ہوگا۔ اور علم محیط ہے اور زبان شاہد ہے کہ ہر وہ شی جس کا وہ مالک بنا اسے مال کا نام دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یہ مطلق ہے ماخوذ اور ماخوذ منہ میں موجود کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں اور نہ اس میں ماخوذ اور ماخوذ منہ (وہ مال جو لیا جائے اور جس سے لیا جائے) کی مقدار کی وضاحت اور بیان ہے۔ بلاشبہ اس کا بیان سنت اور اجماع میں ہے، جیسا کہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔ پس زکوٰۃ تمام مالوں سے لی جائے گی۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں، اناج اور سونے چاندی میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں اور جو کچھ ان کے سوا ہے مثلاً گھوڑے اور تمام سامان واسباب ان میں اختلاف ہے۔ عنقریب گھوڑوں اور شہد کا ذکر سورۃ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 407 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 74

ائمہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھجوروں کے پانچ وسقوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور چاندی کے پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں بھی صدقہ نہیں ہے'' (1)۔ دانوں اور زمین سے اگنے والی ہر شے کی زکوٰۃ کے بارے گفتگو مکمل طور پر سورۂ الانعام میں گزر چکی ہے۔ اور معادن کے بارے میں سورۃ البقرہ میں اور زیورات کے بارے اس سورت میں کلام گزر چکی ہے۔ اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے۔ پس جب ایک آزاد مسلمان چاندی سے بنے ہوئے دو سو درہموں کا مالک ہو، تو یہی وہ پانچ اوقیہ ہیں جن کا بیان حدیث طیبہ میں ہوا ہے۔ اور ان پر پورا سال گزر گیا تو ان کی زکوٰۃ اس پر واجب ہے اور وہ ان کا چالیسواں حصہ یعنی پانچ درہم ہے۔ اور سال کی شرط لگائی گئی ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مال میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے'' (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور چاندی میں سے جو دو سو درہم سے زائد ہو تو اس کے حساب سے ہر شے میں چالیسواں حصہ ہے مقدار کم ہو یا زیادہ۔ یہ قول امام مالک، امام لیث، امام شافعی، امام ابوحنیفہ کے اکثر اصحاب، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل، ابوثور اور اسحاق اور ابوعبید رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: دو سو درہم سے جو زائد ہوں گے ان میں کوئی شے لازم نہ ہوگی یہاں تک کہ زیادتی چالیس درہم تک پہنچ جائے۔ اور جب وہ مقدار چالیس ہو جائے تو ان میں ایک درہم واجب ہوگا اور وہی چالیسواں حصہ ہے (3)۔ یہ قول حضرت سعید بن مسیب، حسن، عطا، طاؤس، شعبی، زہری، مکحول اور عمرو بن دینار اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور رہی سونے کی زکوٰۃ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جب وہ بیس دینار ہو جائے تو اس کی قیمت دو سو درہم ہوگی اور جو زیادہ ہوگا اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بنا پر ہے، اسے امام ترمذی نے ضمرہ سے اور حارث سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے محمد بن اسماعیل سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: میرے نزدیک دونوں ابواسحاق سے صحیح ہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ حدیث دونوں سے اکٹھی مروی ہو (5)۔ اور الباجی نے ''المنتقی'' میں کہا ہے: یہ حدیث وہاں اس کی اسناد نہیں ہے، مگر علماء کا اس کے مطابق لینے پر اتفاق کرنا اس کے حکم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ واللہ اعلم

اور امام حسن اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی کے بعض اصحاب بھی مائل ہوئے ہیں کہ سونے میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چالیس دینار تک پہنچ جائے۔ اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی حدیث رد کرتی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیس دینار سے نصف دینار لیتے تھے اور چالیس

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 196
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80
3۔ کتاب الاثار، کتاب الزکوٰۃ، صفحہ 92
4۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79

دینار میں سے ایک دینار لیتے تھے (1)۔ اسی پر اہل علم کی جماعت ہے سوائے ان کے جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ پانچ سے کم اونٹوں میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور جب ان کی تعداد پانچ ہو جائے تو ان میں ایک بکری لازم ہو جاتی ہے اور ''شاۃ'' کا اطلاق غنم (ریوڑ) میں سے ایک پر ہوتا ہے اور غنم بکری اور بھیڑ دونوں کے لیے ہے۔ اور اس پر بھی علماء کا اختلاف ہے کہ پانچ اونٹوں میں صرف ایک بکری لازم ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے اور جانوروں کی زکوٰۃ کو اس کتاب (تحریر) میں بیان کیا گیا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے لکھی جب کہ آپ نے انہیں بحرین کی طرف بھیجا۔ اسے امام بخاری، ابوداؤد، دار قطنی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور تمام اس پر متفق ہیں (2)۔ اور دو مقامات پر اس میں اختلاف ہے۔ ان میں ایک اونٹوں کی زکوٰۃ میں اور وہ یہ کہ جب ان کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچ جائے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صدقہ وصول کرنے والے کو اختیار ہے اگر چاہے تو تین بنات لبون (یعنی ایسی اونٹنی جس کی عمر دو سال مکمل ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) لے اور اگر چاہے تو دو حقے (ایک حقہ جس کی عمر تین سال مکمل ہو اور وہ چوتھے سال میں داخل ہو چکا ہو) لے لے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے کہ ابن شہاب نے کہا ہے: اس میں تین بنات لبون ہیں یہاں تک کہ تعداد ایک سو تیس تک پہنچ جائے تو پھر اس میں ایک حقہ اور دو بنت لبون لازم ہوں گی۔ ابن قاسم نے کہا ہے: میری رائے ابن شہاب کے قول کے مطابق ہے۔ اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور عبدالعزیز بن ابی حازم اور ابن دینار امام مالک کے قول کے مطابق کہتے ہیں۔ اور رہا دوسرا مقام تو وہ غنم (ریوڑ) کے صدقہ کے بارے ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کی تعداد تین سو ایک بکری سے زیادہ ہو جائے تو حسن بن صالح بن حیی نے کہا ہے: ان میں چار بکریاں لازم ہوں گی۔ اور جب تعداد چار سو ایک ہو جائے تو ان میں پانچ بکریاں لازم ہوں گی۔ اسی طرح جب بھی تعداد زیادہ ہو گی، تو ہر سو میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اور اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: دو سو ایک بکریوں میں تین بکریاں ہیں، پھر ان میں چار سو تک کوئی شے نہیں ہے اور پھر چار سو میں چار بکریاں ہو جائیں گی، پھر جب بھی ان میں ایک سو زائد ہوں گی تو ان میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں ابن المنذر کو وہم ہوا ہے اور اس میں علماء سے خطا ہوئی ہے، مسئلہ میں اختلاط اور اکثر غلط ہو گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے گائے کی زکوٰۃ کی تفصیل صحیحین میں ذکر نہیں کی اور اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دار قطنی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے موطا میں روایت کیا ہے اور یہ روایت مرسل، مقطوع اور موقوف ہے (3)۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسے ایک قوم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، مگر وہ جنہوں نے اسے مرسل ذکر کیا ہے وہ ان سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہیں جنہوں نے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اسے مسند ذکر کرنے والوں میں سے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1339، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1789، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بقیہ نے مسعودی سے، انہوں نے حکم سے اور انہوں نے طاؤس سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اس روایت میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ بقیہ ثقہ راویوں سے منفرد ہوتے ہیں اور اسے حسن بن عمارہ نے حکم سے اسی طرح روایت کیا ہے جیسے اسے بقیہ نے مسعودی سے اور انہوں نے حکم سے روایت کیا ہے اور حسن کے ضعف پر اجماع ہے۔ اور یہ خبر طاؤس کی روایت کے علاوہ سے سند متصل کے ساتھ صحیح ثابت ہے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں معمر اور ثوری نے اعمش سے انہوں نے ابو وائل سے انہوں نے مسروق سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا اور حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ہر تیس گاؤں میں سے ایک تبیع یا تبیعہ (ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی) لے اور چالیس گاؤں میں سے ایک مسنہ (دو سال کا بچھڑا، بچھڑی) لے اور ہر عاقل بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر معافر کا کپڑا (1) (معافر یمن کا ایک قبیلہ ہے اس کی طرف منسوب چادر کو معافر کہا جاتا ہے) اسے دار قطنی اور ابو عیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (2)۔

ابو عمر نے کہا ہے: علماء کے درمیان اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گائیوں کی زکوٰۃ کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو زکوٰۃ مروی ہے وہ وہ ہے جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ تیس گائیں میں ایک تبیع اور چالیس میں ایک مسنہ ہے، مگر وہ جو حضرت سعید بن مسیب، ابو قلابہ، زہری اور قتادہ سے مروی ہے، کیونکہ وہ ہر پانچ گائیوں میں تیس تک ایک بکری واجب کرتے ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلقہ یہ تمام تفصیل اپنے اصول و فروع کے ساتھ کتب فقہ میں موجود ہے اور شرکت کا ذکر سورۂ ''ص'' میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: صَدَقَةً یہ الصدق سے ماخوذ ہے، کیونکہ ان کے ایمان کے صحیح ہونے اور اس کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کے سچا ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ یہ ان منافقین میں سے نہیں ہیں جو اطاعت و پیروی کرنے والے مومنین کو صدقات کے بارے میں الزام دیتے ہیں۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا یہ دونوں مخاطب کے لیے حال ہیں، تقدیر کلام یہ ہے: خذها مطهرا لهم و مزكيا لهم بها (تم صدقہ وصول کرو ان کو پاک کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ ان کو بابرکت بناتے ہوئے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ان دونوں کو صدقہ کی صفت بنا دیا جائے ای صدقة مطهرة لهم مزكية (ان کو پاک کر دینے والا صدقہ اور بابرکت بنانے والا) اور تُزَكِّيهِمْ کا فاعل مخاطب ہوگا اور وہ ضمیر جو بها میں ہے وہ موصوف نکرہ کی طرف لوٹے گی۔ اور نحاس اور مکی نے بیان کیا ہے کہ تُطَهِّرُهُمْ صدقہ کی صفت ہے اور وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، خذ کی ضمیر سے حال ہے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الصدقہ سے حال ہو۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ یہ نکرہ سے حال ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: عمدہ یہ ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہو، یعنی بے شک آپ انہیں پاک کر دیں اور اس کے سبب انہیں بابرکت بنا دیں۔ یہ قطع (ماقبل سے تعلق کا منقطع ہونا) اور استئناف کی بنا پر ہے۔ اور جواب امر کی بنا پر جزم بھی جائز ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اگر آپ ان کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالوں سے صدقہ لیں گے تو وہ انہیں پاک کر دے گا اور بابرکت بنا دے گا اور اسی سے امرء القیس کا قول بھی ہے:

**قفانبك من ذكرى حبيب و منزل**

(تم دونوں ٹھہرو تا کہ ہم اپنے محبوب اور اس کی گھر کی یاد میں رولیں)

اور حسن نے طا کے سکون کے ساتھ تطھرھم پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے ساتھ طھر و أطھرته سے منقول ہے، مثلاً ظھرو أظھرته۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ہر وہ امام جو صدقہ وصول کرتا ہے اس کے فعل میں اصل یہ ہے کہ وہ صدقہ دینے والے کے لیے برکت کی دعا کرے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ فرماتے: اللھم صل علیھم اے اللہ! ان پر رحمتیں نازل فرما۔ پس حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! آل ابی اوفی پر رحمتیں نازل فرما'' (1)۔ ایک قوم اسی طرف گئی ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (التوبہ: 84) (اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی) انہوں نے کہا ہے: پس یہ جائز نہیں ہے کہ کسی پر صلوٰۃ بھیجی جائے مگر یہ کہ یہ صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے، کیونکہ آپ کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا الآیہ (النور: 63) (نہ بنالو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو)

اور اس وجہ سے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی پر صلوٰۃ نہیں بھیجی جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ محصور نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور آیت میں اس کے بعد اس کا بیان آئے گا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنا اور اس کے ساتھ تسلی دینا اور دلجوئی کرنا واجب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل بنتا ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یعنی جب آپ ان کے لیے دعا کریں گے جس وقت وہ اپنے صدقات لے کر آئیں گے تو اس سے ان کے دلوں کو سکون حاصل ہوگا اور وہ اس سے خوش ہو جائیں گے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی کو کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کے بارے سوال نہ کرنا۔ تو اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے نکل جائیں گے اور ہم آپ سے کسی شی کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ پھر اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے خاوند کے لیے دعا فرمائیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے خاوند پر رحمت فرمائے''۔ یہاں پر صلوٰۃ کا لفظ رحمت اور ترحم (رحم کرنے) کے معنی میں ہے۔ صلی اللہ علیک و علی زوجك۔ نحاس نے کہا ہے: تمام اہل لغت نے اس بارے میں بیان کیا ہے کہ ہم اسے جانتے ہیں کہ کلام عرب میں لفظ صلوٰۃ دعا کے معنی میں ہے۔ اور اسی سے الصلوٰۃ علی الجنائز بھی ہے (یعنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 346

معیوں کے لیے دعا مانگنا)۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے اِنَّ صَلٰوتَكَ صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور اسی طرح اختلاف اصلاتك تأمرك میں ہے۔ اور سکن کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہ ان کے لیے وقار ہے اور السکن سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ نفوس کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

**اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾**

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے اور لیتا ہے صدقات کو اور بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ کہا گیا ہے: پیچھے بیٹھے رہنے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی انہوں نے کہا: یہ لوگ گزشتہ کل تو ہمارے ساتھ تھے، نہ وہ کلام کرتے ہیں اور نہ وہ (ہمارے ساتھ) بیٹھتے ہیں، تو اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟ اور یہ کون سی خصوصیت ہے جس کے ساتھ ہمارے سوا وہ خاص کر دیئے گئے ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا پس يَعْلَمُوْۤا میں ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے توبہ نہیں کی پیچھے رہنے والوں میں سے۔ ابن زید نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہو جنہوں نے توبہ کی اور اپنے آپ کو باندھ دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: هُوَ، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان امور کے ساتھ منفرد اور یکتا ہونے کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر اس نے کہا ہوتا: إن الله يقبل التوبة تو اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس کے رسول کا قبول کرنا اس کی طرف سے ہی قبول کرنا ہو۔ پس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ ان امور میں سے ہے جس تک نہ کوئی نبی پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ یہ اس بارے میں صریح نص ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی صدقات لینے والا ہے اور ان پر ثواب و جزا عطا فرمانے والا ہے اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ جل وعز کا حق ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں اور اگر آپ کا وصال ہو گیا تو آپ کے بعد آپ کا نائب اور خلیفہ ہی واسطہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اور یہ اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر محصور نہیں ہے۔

اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ قبول فرماتا ہے اور اسے اپنے دائیں دست قدرت کے ساتھ لیتا ہے پھر وہ اسے تم میں سے کسی کے لیے بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کی تربیت اور پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور اس کی تصدیق کتاب میں موجود ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 79

ربا (سود) کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے'' (1)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''کوئی بھی حلال اور طیب کمائی سے ایک کھجور صدقہ نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں دست قدرت سے لیتا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''پھر وہ رحمن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بڑھ جاتی ہے'' (2)۔ الحدیث۔

اور یہ بھی روایت ہے: ''بے شک صدقہ رحمن کی ہتھیلی میں واقع ہوتا ہے اس سے پہلے کہ سائل کے ہاتھ میں جائے پس وہ اسے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے یا اونٹنی کے بچے کی تربیت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اسے کئی گنا کر دیتا ہے'' (3)۔ ہمارے علماء نے احادیث کی تاویل میں کہا ہے: بلاشبہ یہ صدقہ کے قبول ہونے اور اس پر جزا واقع ہونے سے کنایہ ہے، جیسا کہ اس نے مریض پر انتہائی رحم اور مہربانی فرماتے ہوئے مریض سے اپنی ذات کریمہ و مقدسہ کنایۃً مراد لی ہے اور فرمایا: ''اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت اور بیمار پرسی نہیں کی'' (4)۔ الحدیث

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یمین اور کف کے الفاظ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ کسی شی کو قبول کرنے والا ہر کوئی بلاشبہ اسے اپنی ہتھیلی اور دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی اسے پکڑتا ہے یا اسے اس میں رکھا جاتا ہے۔ تو اسی بنا پر اسے ہی ذکر کیا جسے وہ جانتے اور پہچانتے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہر عضو سے پاک اور منزہ ہے۔ اور یمین کا لفظ عضو خاص (دایاں ہاتھ) کے بغیر بھی کلام عرب میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إذا ما رایةٌ رفعت لمجدٍ تلقّاها عَرابة بالیمینِ

یعنی اسے ہی مجد و شرف کا اہل بنایا گیا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد دایاں ہاتھ نہیں ہے، کیونکہ یہ معنوی طور پر بزرگی و شرف ہے پس وہ بزرگی اور شرف جو اس کے ساتھ حاصل ہوتا ہے میں نے اسے معنیً دیکھ لیا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی لفظ یمین ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ ''وہ رحمٰن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے'' (5) کا معنی ہے کہ یہ اس میزان عدل کے پلڑے سے عبارت ہے جس میں اعمال کا وزن کیا جائے گا، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہوگا، گویا کہ فرمایا: **فتربو کفة میزان الرحمٰن** (پس وہ رحمٰن کے میزان کے پلڑے میں بڑھ جائے گی) اور امام مالک، ثوری اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے کہ انہوں نے ان احادیث اور جو ان کے مشابہ ہیں ان کی تاویل میں کہا ہے: تم اسے بلا کیف پر ہی محمول کرو۔ یہ ترمذی وغیرہ نے کہا ہے اور اسی طرح اہلسنت والجماعت کے اہل علم کا قول ہے۔

**وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۚ﴿۱۰۵﴾**

''اور فرمایئے عمل کرتے رہو پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مومن۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 84۔ ایضاً، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 326 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1011

4۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 318 5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 84

اور لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کا پس وہ خبردار کرے گا تمہیں اس سے جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ اعْمَلُوْا یہ خطاب تمام کو ہے (کہ تم عمل کرتے رہو) فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں تمہارے اعمال پر اطلاع دینے کے سبب (وہ تمہارے اعمال کو دیکھیں گے) اور حدیث میں ہے اگر کوئی آدمی ایسی چٹان میں عمل کرلے جس کا کوئی دروازہ نہ ہو اور نہ اسے کوئی سوراخ ہو تو پھر بھی اس کا عمل لوگوں کی طرف نکل جائے گا جیسے بھی وہ ہوا''۔

وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

''اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کردیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے تو بہ قبول فرمائے ان کی۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

یہ آیت ان تین کے بارے میں نازل ہوئی جن کی توبہ قبول کرلی گئی: وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ یہ بنی واقف سے تھے اور مرارہ بن ربیع تھے (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ابن ربعی العمری تھا۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے حالانکہ یہ خوشحال تھے، جیسا کہ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اور تقدیر کلام ہے ومنهم آخرون مرجون یہ أرجاته سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کردیا۔ اور اسی سے مرجئة کہا گیا ہے، کیونکہ ان کا معاملہ ملتوی اور مؤخر کردیا گیا۔ حمزہ اور کسائی نے مرجون بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أرجیته سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کردیا (أخرته) اور مبرد نے کہا ہے: أرجیته بمعنی أخرته نہیں کہا جاسکتا، البتہ یہ الرجاء سے ہوگا۔ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ، إما عربی میں دو امروں میں سے ایک کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ چیزوں کے انجام کو جاننے والا ہے، البتہ بندوں کو خطاب اس بنا پر کیا جاتا ہے جسے وہ جانتے ہیں، یعنی چاہیے کہ ان کا معاملہ تمہارے نزدیک امید افزا ہوجائے کیونکہ بندوں کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

''اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد نقصان پہنچانے کے لیے، کفر کرنے کے لیے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مومنوں کے درمیان اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 105

سے اب تک۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا یہ کلام معطوف ہے، یعنی ومنهم الذين اتخذوا مسجدا (اور ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے مسجد بنائی) اس میں جملہ کا عطف جملہ پر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو مثلاً انهم يعذبون (بے شک وہ عذاب دیئے جائیں گے) یا اسی کی مثل کوئی اور۔ اور جنہوں نے بغیر واؤ کے الذين پڑھا ہے اور یہ اہل مدینہ کی قراءت ہے تو یہ ان کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ اور خبر لا تقم ہے تقدیر کلام ہے: الذين اتخذوا مسجدا لا تقم فيه أبدا، اى لا تقم فى مسجدهم (جنہوں نے مسجد بنائی آپ ان کی مسجد میں (نماز کے لیے) کبھی کھڑے نہ ہوں) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: مبتدا کی خبر یہ ہوگی۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (التوبہ: 110) (ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خبر يعذبون ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قیصر کے پاس گیا اور عیسائی ہو گیا اور قیصر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ عنقریب ان کے پاس آئے گا، پس انہوں نے مل کر مسجد ضرار بنائی اور وہ اس میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے اور اس کا واقعہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

اور اہل تفسیر نے کہا ہے: بے شک عمرو بن عوف نے مسجد قبا بنائی اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور اس میں نماز ادا فرمائی، پس ان کے بھائیوں بنو غنم بن عوف نے ان کے ساتھ حسد کیا اور یہ کہا: ہم مسجد بنائیں گے اور ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجیں گے اور آپ ہمارے پاس تشریف لائیں گے تاکہ آپ ہمیں اسی طرح نماز پڑھائیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بھائیوں کی مسجد میں نماز پڑھائی اور اس میں ابو عامر نماز پڑھے گا جب وہ شام سے آئے گا، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ تبوک کی طرف جانے کی تیاری فرما رہے تھے۔ اور انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق ہم نے صاحب حاجت، بیمار، سخت آندھی والی رات وغیرہ کے لیے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں ہمیں نماز پڑھائیں اور برکت کے لیے دعا فرمائیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ اب میں سفر پر جانے لگا ہوں اور انتہائی مشغول حالت میں ہوں پس اگر ہم واپس آئے تو ہم تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں اس میں نماز پڑھائیں گے'' (1)۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو وہ آپ کے پاس آئے درآنحالیکہ وہ اس کے کام

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012

سے فارغ ہو چکے تھے اور انہوں نے اس میں جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی نمازیں پڑھ لی تھیں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص منگائی تا کہ آپ اسے پہنیں اور آپ ان کے پاس جائیں تو اتنے میں آپ پر مسجد ضرار کے خبر کے بارے قرآن کریم نازل ہوا۔ پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن دخشم، معن بن عدی، عامر بن سکن اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو بلایا، اور انہیں فرمایا: ''جاؤ اس مسجد کی طرف اس کے بنانے والے ظالم ہیں اور تم اسے گرا دو اور اسے جلا کر راکھ کر دو'' (1)۔ پس وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نکلے اور مالک بن دخشم نے اپنے گھر سے آگ کا انگارہ لیا اور اٹھے پھر مسجد کو جلا دیا اور اسے گرا دیا اور جنہوں نے اسے بنایا تھا وہ بارہ آدمی تھے: خذام بن خالد یہ بنی عبید بن زید سے تھا اور یہ بنی عمرو بن عوف میں سے ایک تھا اور اس کے گھر سے مسجد ضرار ( کی جگہ ) نکالی گئی، معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن الازعر، عباد ابن حنیف یہ سہل بن حنف کا بھائی تھا جو بنی عمرو بن عوف میں سے تھا، جاریہ بن عامر اور اس کے دو بیٹے مجمع اور زید ابنا جاریہ، نبتل بن حارث، بحزج، بجاد بن عثمان، ودیعہ بن ثابت اور ثعلبہ بن حاطب کا ذکر بھی ان میں کیا گیا ہے (2)۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ بدر میں حاضر تھا۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک آدمی سے پوچھا تو نے اس مسجد میں کیا مدد کی تھی؟ تو اس نے کہا: میں نے اس میں ایک ستون کے ساتھ مدد کی۔ تو آپ نے فرمایا: اس کے بارے تجھے بشارت ہو! جہنم کی آگ کا ایک ستون تیری گردن میں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: ضِرَارًا یہ مصدر مفعول من اجلہ ہے۔ وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا یہ سارا معطوف ہے۔ اور اہل تاویل نے کہا ہے: ضرارا بالمسجد (مسجد کے ساتھ نقصان پہنچانے کے لیے) نہ کہ للمسجد ضرار (مسجد کو نقصان پہنچانے کے لیے) بلاشبہ یہ نقصان مسجد بنانے والوں کو ہوا (3)۔ اور دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی نقصان نہیں اور کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں جس نے کسی کو نقصان اور ضرر پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اسے ضرر اور نقصان پہنچائے گا اور جس نے کسی کو تنگ کیا اللہ تعالیٰ اسے اس پر شاق پہنچائے گا'' (4)۔ بعض علماء نے کہا ہے: ضرر وہ ہے جس کے سبب تجھے منفعت حاصل ہو اور اس میں تیرے پڑوسی کے لیے نقصان ہو۔ اور ضرار وہ ہے جس میں تیرے لیے منفعت نہ ہو اور تیرے پڑوسی کے لیے اس میں نقصان ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ایک معنی میں ہیں، تاکید کی بنا پر دونوں کے ساتھ اکٹھی کلام کی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائی جائے اور اسے گرا دینا واجب ہے اور اس کو بنانے سے روکنا لازم ہے تا کہ پہلی مسجد والے پھر نہ جائیں کہ وہ اس حال میں باقی رہ جائے کہ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ محلہ بڑا ہو اور اس کے باسیوں کے لیے ایک مسجد کافی نہ ہو تو اس وقت دوسری مسجد بنائی جاسکتی ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: یہ مناسب نہیں کہ ایک شہر میں دو یا تین جامع مساجد بنائی جائیں، دوسری کو روکنا

1۔ اسباب النزول، صفحہ 136
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 29
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 228

واجب ہے اور جس نے اس میں جمعہ کی نماز پڑھی تو وہ جائز نہ ہوگی۔ تحقیق حضور نبی مکرم ﷺ نے مسجد ضرار کو جلانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور اسے گرا دیا تھا۔ علامہ طبری نے شقیق سے بیان کیا ہے کہ وہ آئے تا کہ مسجد بنی غاضرہ میں نماز پڑھیں تو انہوں نے نماز کو پایا کہ وہ فوت ہو چکی ہے (یعنی اس کا وقت گزر چکا ہے) تو آپ کو کہا گیا کہ بنی فلاں کی مسجد میں اس کے بعد نماز نہ پڑھیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس میں نماز پڑھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ ضرر پہنچانے کی نیت سے بنائی گئی ہے(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: ہر وہ مسجد جو ضرر پہنچانے یا ریا کاری اور شہرت کی خاطر بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کے حکم میں ہے اس میں نماز جائز نہ ہوگی۔ اور نقاش نے کہا ہے: اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آدمی کنیسہ (عیسائیوں کی عبادت گاہ) اور اس طرح کے دیگر مقامات میں نماز نہ پڑھے کیونکہ اسے شر کے ارادہ پر بنایا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے یہ لازم نہیں آتا، کیونکہ گرجا گھر کی تعمیر سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہوتا، اگرچہ اس کی اصل بنیاد شر پر ہے، عیسائیوں نے کنیسہ اور یہودیوں نے بیعہ (یہودیوں کا عبادت خانہ) بنایا یہ وہ جگہ ہے جس میں وہ اپنے زعم کے مطابق عبادت کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے لیے مسجد ہے، پس یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ تحقیق علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی نے کنیسہ یا بیعہ میں پاک جگہ پر نماز پڑھی اس کی نماز جائز گی اور ادا ہو جائے گی۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیعہ میں نماز پڑھ لیتے تھے جب اس میں بت اور تصاویر وغیرہ نہ ہوتیں (2)۔ اور ابوداؤد نے حضرت عثمان بن ابی العاص سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ طائف میں وہاں مسجد بنائیں جہاں ان کے بت تھے (3)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے کہا ہے: بے شک جو کوئی ظالم کا امام ہو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی، مگر یہ کہ اس کا عذر ظاہر ہو جائے یا وہ توبہ کر لے، کیونکہ وہ بنی عمرو بن عوف جنہوں نے مسجد قبا بنائی انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کے زمانہ خلافت میں پوچھا کہ آپ مجمع بن جاریہ کو اجازت عطا فرمائیں کہ وہ انہیں ان کی مسجد میں نماز پڑھائیں۔ تو آپ نے فرمایا: نہیں اور نہ یہ کوئی معین اور خاص انعام ہے! کیا یہ مسجد ضرار کا امام نہیں رہا۔ تو مجمع نے آپ کو عرض کی: اے امیر المومنین! آپ میرے بارے میں جلدی نہ کیجئے، قسم بخدا! میں نے اس میں نماز پڑھی اور میں اسے نہیں جانتا تھا جو انہوں نے اس بارے میں (اپنے ذہنوں میں) چھپا رکھا تھا، اگر میں جانتا ہوتا تو میں انہیں اس میں نماز نہ پڑھاتا، میں ایک قرآن پڑھنے والا بچہ تھا اور وہ شیوخ تھے، تحقیق انہوں نے اپنی جاہلیت پر ہی زندگی گزاری اور وہ قرآن میں سے کوئی شے نہ پڑھتے تھے، سو میں نے انہیں نماز پڑھائی اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ میں اس کے بارے جانتا ہوں جو ان کے دلوں میں تھا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معذور قرار دیا اور اسے تسلیم کیا اور انہیں مسجد قبا میں نماز کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 33 2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 62

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی بناء المساجد، حدیث نمبر 380۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب این یجوز بناء المساجد، حدیث نمبر 734، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے حکم ارشاد فرمایا۔(1)

**مسئلہ نمبر 5۔** ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب وہ مسجد جو عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے اور شریعت نے اس کے بنانے پر برانگیختہ کیا ہے اور کہا ہے: ''جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ اس گڑھے کی مانند ہو جو کونج نے انڈے دینے کے لیے بنایا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا''۔ اسے گرادیا جائے گا اور اکھیڑ دیا جائے گا جب کہ اس میں دوسروں کے لیے ضرر اور نقصان ہو، تو پھر اس کے سوا کے لیے تیرا کیا خیال ہے، بلکہ وہ زیادہ اس لائق ہے کہ اسے زائل کیا جائے اور گرادیا جائے یہاں تک کہ پرانی کسی چیز کے لیے ضرر اور نقصان نہ ہو۔ اور یہ اس کی طرح ہے جس نے تنور کے علاوہ روٹیاں پکانے کی جگہ یا چکی بنائی یا کنواں کھودا یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے بنائی جس کے سبب ضرر اور نقصان کسی دوسری شے کو پہنچ سکتا ہے، تو اس بارے ضابطہ یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی کو ضرر اور نقصان میں ڈال دیا تو اسے منع کیا جائے گا۔ اور اگر اس نے اپنے بھائی کو نقصان میں ڈالا ایسے فعل کے ساتھ جو فعل اس نے اپنے مال میں کیا تھا اور اس نے اپنے پڑوسی یا غیر پڑوسی کو نقصان پہنچایا تو پھر اس کے کام کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر اسے چھوڑنا فاعل کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو اس ضرر سے جو اسے کرنے سے ہے تو پھر دونوں نقصانوں اور ضرروں میں سے بڑے اور اعظم کو ختم کردیا جائے گا اور ان دونوں میں سے اعظم اصول میں حرمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی آدمی نے اپنے گھر میں روشن دان کھولا وہ اس سے اپنے بھائی کے گھر جھانکتا ہو اور اس میں اس کے اہل وعیال ہوں اور عورتوں کی حالت اپنے گھروں میں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعض کپڑے اپنے کام کاج کے وقت اتار دیتی ہیں اور انہیں کھول دیتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ شرمگاہوں (عورتوں) پر جھانکنا حرام ہے اور اس بارے میں نہی وارد ہے۔ پس شرمگاہوں (یعنی عورتوں) پر جھانکنے کی حرمت کی وجہ سے علماء نے یہ رائے دی ہے کہ وہ کھلے دروازہ کو بند کردیں اور اس روشن دان کو جو اس نے کھولا بلاشبہ اس کے کھولنے میں اس کے لیے منفعت اور راحت ہے اور اسے بند کرنے میں اس کا ضرر اور نقصان ہے لیکن انہوں (علماء) نے دو ضرروں میں سے بڑے کو ختم کرنے کا قصد کیا ہے، کیونکہ ان دو میں سے ایک کو ختم کرنے سے کوئی چارہ کار نہیں اور اس باب میں حکم اسی طرح ہے، بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی مملوکہ زمین میں کنواں کھودا اور دوسرے نے اپنی ملکیتی زمین میں کنواں کھودا کہ وہ اس میں پہلے کنوئیں کا پانی چرالے تو یہ جائز ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی ملکیت میں کنواں کھودا ہے لہٰذا اسے منع نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کی مثال ان کے نزدیک یہ ہے: اگر کسی نے اپنے پڑوسی کے کنوئیں کے پہلو میں (بیت الخلاء کا) گڑا کھودا جو اس کے پانی کو خراب اور فاسد کردے تو اس کے لیے اسے منع کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے، حالانکہ قرآن وسنت دونوں اس قول کو رد کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق

اور اس باب میں ضرر کی دوسری وجہ ہے جس سے علماء نے منع کیا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً تنور کا دھواں، حمام کا دھواں، گندم وغیرہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 327

دانے گاہنے کا گردوغبار، وہ کیڑے جو کھلی زمین میں پھیلی ہوئی لید اور گوبر میں پیدا ہوتے ہیں اور جو بھی ضرر اس قسم کا ہو تو جونہی اس کا ضرر ظاہر ہو اور اس کے پھیلنے اور بڑھنے کا خدشہ ہو تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور رہا وہ جو تھوڑے سے وقت کے لیے ہو مثلاً کپڑے جھاڑنا اور دروازوں پر پڑا ہوا گردوغبار جھاڑنا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس سے لوگوں کو کوئی چارہ کار نہیں۔ اور یہ ان میں سے بھی نہیں ہے جس کے ساتھ کوئی شے لازم ہوتی ہو، پس اس کی مثل سے روکنے میں ضرر کی نفی تھوڑی دیر اس پر صبر کرنے سے اعظم اور بڑی ہے۔ اور ایک پڑوسی کے لیے اپنے پڑوسی کے ساتھ آداب معاشرت میں سے یہ ہے کہ وہ اس کی اذیت رسانی پر اتنا صبر کرے جس پر وہ قدرت رکھتا ہے، جیسا کہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اذیت نہ دے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اور اس باب میں داخل ہونے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے جسے اسماعیل بن ابی اویس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایک عورت کے بارے میں پوچھا گیا جسے جنوں میں سے کسی نے مس کیا ہو، پس جب اس کا خاوند اس کے پاس آتا ہے اور وہ جنبی ہو جائے یا وہ اس کے قریب ہو تو اس کے سبب وہ حملہ شدید ہو جاتا ہے (یعنی جن کی تکلیف اور اذیت بڑھ جاتی ہے) تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ وہ اس کے قریب جائے، بلکہ میں تو حاکم وقت کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس آدمی اور اس کی عورت کے درمیان حائل ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ كُفْرًا جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ نہ مسجد قبا کی کوئی حرمت ہے اور نہ ہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی (کوئی تکریم ہے) تو کیا وہ اس اعتقاد کے ساتھ کافر نہیں ہوئے؟ (1) یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَّ كُفْرًا یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو آپ لے کر آئے (کفر کرتے ہوئے انہوں نے مسجد بنائی) یہ علامہ قشیری وغیرہ نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ان کی جماعت اس کے ساتھ تفرقہ ڈال رہی ہے تاکہ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جائیں۔ اور یہ اس بات پر تیری راہنمائی کرتی ہے کہ جماعت قائم کرنے سے سب سے بڑا مقصد اور واضح اور ظاہر غرض تالیف قلوب ہے اور اطاعت پر کلام کرنا ہے اور ایک دینی فعل کے ساتھ عزت و حرمت کو لانا ہے تاکہ باہم ملنے سے انس و محبت واقع ہو جائے اور دل حسد اور کینے کی میل سے صاف ہو جائیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ سمجھا اور کہا: ایک مسجد میں دو اماموں کے ساتھ دو جماعتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ نظریہ تمام علماء کے خلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منع کا حکم مروی ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ کو متفرق کرنا ہے اور جماعت کی حکمت کو باطل کرنا ہے اور یہ اس قول کا ذریعہ اور سبب ہے جو جماعت سے الگ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے لیے عذر ہو پس تو وہ اپنی جماعت کا اہتمام کر لے اور اپنا امام آگے کر لے نتیجۃً اختلاف پیدا ہو جائے گا اور نظام باطل ہو جائے گا اور یہ چیز ان پر مخفی ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہی نظریہ ہے جس کی یہ شان ان کے ساتھ ہے اور یہ حکمت میں ان سے زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہے اور شریعت کی قطعیت کے بارے زیادہ آگاہ کرنے والا ہے (3)۔

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1013　　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 10** ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اس میں مراد ابو عامر راہب ہے (1)۔ اسے راہب کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ عبادت گزار تھا اور علم کی تلاش میں لگا رہتا تھا پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے قنسرین میں حالت کفر میں مرگیا۔ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا: میں جو قوم بھی تمہارے ساتھ قتال کرتے ہوئے پاؤں گا تو میں ان کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ قتال کروں گا، پس وہ غزوۂ حنین تک لگاتار آپ کے خلاف جنگ لڑتا رہا۔ اور جب بنو ہوازن شکست سے دوچار ہوئے تو وہ روم کی طرف نکل گیا اور عیسائی ہوگیا اور اس نے منافقوں کی طرف پیغام بھیجا تم طاقت اور ہتھیاروں میں سے جتنی استطاعت رکھتے ہو اس کے مطابق تیاری کرو اور ایک مسجد بناؤ کیونکہ میں قیصر کی طرف جارہا ہوں اور میں رومیوں کے ایک لشکر کے ساتھ آؤں گا اور میں یقیناً حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال دوں گا، چنانچہ انہوں نے مسجد ضرار بنائی (2)۔ اور یہی ابو عامر حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ کا والد ہے۔ اور الارصاد کا معنی ہے انتظار کرنا، آپ کہتے ہیں: أرصدت کذا جب تو کام کے بارے اسے تیار کرے اس کا انتظار کرتے ہوئے۔ ابوزید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رصدتہ وأرصدتہ فی الخیر (یعنی یہ دونوں فعل مجرد اور مزید فیہ۔ خیر اور بھلائی کے کاموں کے لیے بولے جاتے ہیں) اور شر کے بارے میں أرصدت لہ بولا جاتا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: صرف أرصدت کہا جاتا ہے اور اس کا معنی ارتقبت (میں نے انتظار کیا) ہے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے مسجد ضرار بنانے سے پہلے۔ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى یعنی ہم نے اسے بنانے سے سوائے نیکی اور خیر کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور دوستی کرتا ہے جیسا کہ انہوں نے بیماروں اور حاجت مندوں کا ذکر کیا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ افعال مقصود اور ارادوں کے ساتھ مختلف ہوجاتے ہیں، اسی لیے فرمایا: وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے خبث باطن کو جانتا ہے اور جس پر وہ قسم کھا رہے ہیں اس میں ان کے جھوٹا ہونے کو بھی جانتا ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝۱۰۸

"آپ نہ کھڑے ہوں اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو۔ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ قولہ تعالیٰ: لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا، فِيْهِ کی ضمیر کا مرجع مسجد ضرار ہے، یعنی آپ اس میں نماز کے لیے کبھی کھڑے نہ ہوں۔ اور کبھی نماز کو قیام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یقوم اللیل یعنی فلاں رات کے وقت نماز

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013 2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 32 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013

پڑھتا ہے۔ اور اسی طرح صحیح حدیث بھی ہے: من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه (1) (جس نے رمضان المبارک میں ایمان اور اخلاص نیت کے ساتھ نماز پڑھی تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے گئے) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:...... پس اسے ذکر کیا۔ تحقیق یہ بھی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس راستے سے بھی نہ گزرتے تھے جس میں مسجد تھی اور اس کی جگہ کوکوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ بنانے کا حکم دے دیا کہ اس میں مردار، گندگیاں اور کوڑا پھینکا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَبَدًا یہ ظرف زمان ہے اور ظرف زمان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ظرف جو مقدر اور معین ہے مثلاً الیوم، اور دوسری ظرف مبہم ہے جیسے الحین اور الوقت اور ابد بھی اسی قسم سے ہے اور اسی طرح دھر بھی ہے (2) اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ابد اگرچہ ظرف مبہم ہے اس میں عموم نہیں ہے لیکن جب یہ لا نافیہ کے ساتھ متصل ہوا تو اس نے عموم کا فائدہ دیا، پس اگر فرماتا: لَا تَقُمْ تو یہ مطلق رکھنے میں کافی ہوتا۔ اور جب فرمایا: ابدا تو گویا یہ فرمایا: فی وقت من الاوقات ولا فی حین من الأحیان (یعنی اوقات میں سے کسی بھی وقت میں اس میں کھڑے نہ ہوں) رہا وہ نکرہ جو مثبت کلام میں ہو تو جب وہ کسی واقعہ کے بارے خبر ہو تو وہ عام نہیں ہوتا، تحقیق اہل لسان نے یہی سمجھا ہے اور فقہائے اسلام نے اسی کے بارے فیصلہ کیا ہے پس انہوں نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی بیوی کو کہا: انت طالق ابدا تو وہ ایک طلاق کے ساتھ مطلقہ ہوگی (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یعنی اس کی دیواریں بنائی گئیں اور اس کی بنیادیں اٹھائی گئیں تقویٰ پر۔ اور الاس کا معنی عمارت کی اصل اور بنیاد ہے اور اسی طرح اساس بھی ہے۔ اور الأسس یا سے محصور و مقصور ہے۔ اور الاس کی جمع اساس ہے، جیسا کہ عس کی جمع عساس ہے۔ اور الاساس کی جمع اُسُس ہے، مثلاً قذال کی جمع قذل ہے۔ اور الاسس کی جمع اساس ہے، مثلاً سبب کی جمع اسباب ہے۔ اور أسست البناء تاسیسا (میں نے مضبوط عمارت بنائی) اور ان کا قول ہے: کان ذالك علی أسّ الدهر، وأسِ الدهر، واسّ الدهر اس میں یہ تینوں لغات ہیں، یعنی وہ قدم الدہر اور وجہ الدہر پر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ میں لام قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام ابتدا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لزید احسن الناس فعلا (یعنی زید کام کرنے کے اعتبار سے لوگوں میں انتہائی حسین ہے) اور یہ (لام) تاکید کا تقاضا کرتا ہے۔ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یہ لَمَسْجِدٌ کی صفت ہے۔ أحق یہ اس مبتدا کی خبر ہے جو لمسجد ہے اور یہاں تقویٰ کا معنی وہ خصلتیں ہیں جن کے ساتھ سزا سے بچا جاتا ہے اور یہ فعلیٰ کے وزن پر وقیت سے ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور علماء کا اس مسجد کے بارے میں اختلاف ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور انہوں نے قول باری تعالیٰ: مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ سے استدلال کیا ہے اور مدینہ طیبہ میں پہلے دن مسجد قبا ہی بنائی گئی تھی، کیونکہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد سے پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد 1، صفحہ 269 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014 3۔ ایضاً

بنائی گئی تھی۔ یہ حضرت ابن عمر اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے (1)۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں بیان کیا ہے جسے آپ سے ابن وہب، اشہب اور ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: انہوں نے فرمایا: دو آدمی اس مسجد کے بارے جھگڑ پڑے جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ تو ایک آدمی نے کہا: وہ مسجد قبا ہے اور دوسرے نے کہا: وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ھو مسجدی ھذا وہ میری یہ مسجد ہے (2)۔ امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔

پہلا قول واقعہ کے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ: فیہ میں ظرف کی ضمیر رجال متطھرین کا تقاضا کرتی ہے پس وہ مسجد قبا ہے۔ اور اس پر دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: یہ آیت اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ فرمایا: وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے پس ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی (3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل قبا کو فرمایا: ''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہاری پاکیزگی کی تعریف کرتے ہوئے تم پر احسان فرمایا ہے، تم کیا کرتے ہو''؟ انہوں نے عرض کی: بے شک ہم بول و براز کے اثر کو پانی کے ساتھ دھوتے ہیں (4)۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے حضرت طلحہ بن نافع سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے حضرت ابوایوب، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالک انصاریوں رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے گروہ انصار! بے شک اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی اور طہارت کے بارے میں تمہاری بہت اچھی تعریف فرمائی ہے تمہاری یہ پاکیزگی کیسی ہے''؟ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: اس کے سوا کوئی نہیں، بے شک ہم میں سے کوئی جب بول و براز کے لیے نکلے تو وہ زیادہ پسند کرتا ہے کہ پانی کے ساتھ استنجا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ وہی ہے پس تم اسے لازم پکڑے رکھو'' (5)۔ اور یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ آیت میں جس مسجد کا ذکر ہے وہ مسجد قبا ہے، مگر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر نص بیان کی ہے کہ وہ آپ کی مسجد ہے پس اس کے ساتھ کوئی نظر و فکر کا عمل نہیں ہے۔

اور ابوکریب نے بیان کیا ہے ہمیں ابواسامہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا، ہمیں صالح بن حیان نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن بریدہ نے قول باری تعالیٰ: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (النور: 36)

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014
2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3024، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 136
4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 36
5۔ سنن دارقطنی، کتاب الطھارۃ، جلد 1، صفحہ 62۔ سنن ابن ماجہ، باب الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 348، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے میں بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: بے شک یہ چار مساجد ہیں جنہیں انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ کعبہ معظمہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اور بیت اریحا بیت المقدس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اور مدینہ طیبہ کی مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد قباوہ ہیں جن کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ، من نحویوں کے نزدیک یہ منذ کے مقابلے میں ہے، پس منذ ظرف زمان میں اور مکان میں من کے قائم مقام ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک یہاں من کا معنی منذ کے معنی کی مثل ہے اور تقدیر کلام ہے: منذ أوّل یوم أبتدی بنیانه (پہلے دن سے اس کی بنیادوں کی ابتدا کی گئی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے من تأسیس اول الایام (پہلے دن کی بنیاد سے) پس یہ اس فعل کے مصدر پر داخل ہے جو اس سے ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لمن الدیار بقنة الحِجْرِ　　أَقْوَيْن من حِجَجٍ ومن دَهْرِ(1)

یعنی من مَرّحجج و من مَرّدھر

اور جس نے اس طرف دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ علمائے نحو کا یہ اصول ہے کہ من کے ساتھ ازمان کو جر نہیں دی جائے گی، بلکہ ازمان کو منذ کے ساتھ جر دی جائے گی، آپ کہتے ہیں: ما رأیته منذ شهر أو سنة أو یوم اور یہ نہیں کہہ سکتے: من شهر اور نہ من سنة اور نہ ہی من یوم کہہ سکتے ہیں، پس جب کلام میں من واقع ہو اور اس کے پیچھے متصل زمانہ ہو تو وہاں کوئی مضمر لفظ مقدر مانا جائے گا جسے من کے ساتھ جر دی جاسکتی ہو، جیسا کہ ہم نے شعر کی تقدیر میں ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اچھا یہ ہے کہ یہ آیت تقدیر عبارت سے مستغنی ہو اور یہ کہ من لفظ اوّل کو جر دے رہا ہو کیونکہ یہ البداءة (ابتداء) کے معنی میں ہے گویا کہ من مبتدء الأیام کہا ہے۔(2)

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ یعنی یہ بان تقوم ہے۔ پس یہ محل نصب میں ہے اور احق یہ حق سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور افعل دو مشترک چیزوں کے درمیان داخل ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک میں وہ مشترک معنی دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ پس مسجد ضرار اگرچہ باطل ہے اس میں کوئی حق نہیں ہے، لیکن یہ دونوں حق میں مشترک ہیں یا تو اسے بنانے والے کے اعتقاد کی وجہ سے یا اس کے اعتقاد کی وجہ سے جو یہ گمان کرتا ہے کہ مسجد ہونے کی وجہ سے اس میں قیام جائز ہے، لیکن دونوں اعتقادوں میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطنا باطل ہے۔ اور دوسرا ظاہراً اور باطنا حق ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی)

اور یہ بات معلوم ہے کہ خیر اور اچھائی کو جہنم سے دور کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ہر فرقہ کے اس اعتقاد کے مطابق ہے کہ وہ خیر پر ہے اور اس کی طرف اس کا لوٹنا خیر ہے، کیونکہ ہر گروہ انہی کے ساتھ خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور یہ العسل أحلی من الخل (کہ شہد سرکے سے زیادہ شیریں ہے) کے قبیل سے نہیں ہے، کیونکہ شہد اگرچہ میٹھا ہے پس ہر وہ شی جو ملائم ہو وہ میٹھی

---

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 378　　2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہوتی ہے، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ بعض لوگ سرکے کو شہد پر مقدم کرتے ہیں درآنحالیکہ مفرد کے مقابلے میں مفرد ہو اور کسی غیر کی طرف مضاف مضاف کے مقابلے میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ جنہوں نے کہا ہے کہ مسجد سے مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد لی جائے گی تو پھر اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ میں ہاضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور فِيْهِ رِجَالٌ میں بھی ضمیر اسی کے لیے ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے تو پھر فیہ میں ہاضمیر اس کی طرف لوٹے گی۔ یہ اس اختلاف کی بنا پر ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کی تعریف بیان کی ہے جنہوں نے نظافت اور طہارت کو پسند کیا اور نظافت و پاکیزگی کو ترجیح دی اور یہ انسانی مروت ہے اور شرعی وظیفہ ہے (1)۔ ترمذی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم اپنے خاوندوں کو کہو کہ وہ پانی کے ساتھ صفائی اور پاکیزگی حاصل کریں، کیونکہ میں ان سے شرم و حیا محسوس کرتی ہوں۔ فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے (2)۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ استنجا کے لیے پانی لے جاتے تھے۔ پس آپ تخفیف اور خشک کرنے کے لیے پتھر استعمال کرتے تھے اور پاکیزگی اور طہارت کے لیے پانی (3)۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: قیروان کے علماء اپنے وضو کی جگہوں میں مٹی کے ڈھیلے رکھتے تھے ان کے ساتھ صفائی کرتے تھے پھر پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ مخرج سے نکلنے والی نجاست کو صاف کرنا لازم ہے اور تمام بدن اور کپڑے کی نجاست میں تطہیر (یعنی اسے پاک کرنا) لازم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں کے لیے پانی کے موجود ہونے اور نہ ہونے کی دونوں حالتوں میں رخصت ہے۔ اور اسی کے مطابق عام علماء نے کہا ہے۔ اور ابن حبیب نے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: پتھروں کا استعمال نہیں کیا جائے گا مگر صرف پانی نہ ہونے کی حالت میں (4)۔ اور وہ اخبار جو پانی کے موجود ہونے کے باوجود پتھروں کے استعمال کے بارے میں ثابت ہیں وہ اسے رد کرتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ بدنوں اور کپڑوں سے نجاست زائل کرنے کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے، حالانکہ ان کا پسوؤں کے خون کی معافی اور اس سے تجاوز پر اجماع ہے جب تک کہ وہ انتہائی فحش اور زیادہ نہ ہو۔ نجاست کے ازالہ میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ واجب فرض ہے، اس کی نماز جائز نہیں ہوتی جس نے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھی چاہے وہ اس کے بارے جاننے والا ہو یا بھولنے والا، یہ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی امام شافعی، امام احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اسے ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور یہی قول ابوالفرج المالکی اور علامہ طبری کا ہے، مگر علامہ طبری نے کہا ہے: اگر نجاست درہم کی مقدار ہو تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے دبر کے حلقہ پر قیاس کرتے ہوئے درہم کی مقدار کی رعایت کرنے کا قول کیا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 5 2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 19، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1015 4۔ ایضاً

اور ایک گروہ نے کہا ہے: کپڑوں اور بدنوں سے نجاست کو زائل کرنا سنت سے ثابت ہے، یعنی یہ وجوب سنت ہے فرض نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: جس نے نجس کپڑے کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے اور اگر وقت نکل گیا تو پھر اس پر کوئی شی نہیں ہے۔

یہ قول امام مالک اور ابو الفرج کے سوا آپ کے اصحاب کا ہے اور آپ سے ابن وہب کی ہدایت بھی ہے اور خون تھوڑا ہونے کی صورت میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا نہ وقت میں اور نہ ہی وقت کے بعد اور بول و براز میں سے تھوڑا بھی ہو تو نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں سے یہ سب لیث کا قول ہے۔ اور ان سے ابن القاسم نے کہا ہے: یاد دھونے کی حالت میں نجاست کو زائل کرنا واجب ہوتا ہے نہ کہ نسیان اور بھول کی حالت میں اور یہ ان کے مفردات میں سے ہے۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: انهما ليعذبان وما يعذبان في كبير أما أحدهما فكان يمشي بالنميمة وأما الآخر فكان لا يستتر من بوله الحديث (1) (بے شک ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور انہیں کسی بڑے گناہ میں عذاب نہیں دیا جا رہا ان میں سے ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہ بچتا تھا) اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور عنقریب اس کا ذکر سورۂ سبحان میں آئے گا۔ انہوں نے کہا ہے: اور آدمی کو عذاب نہیں دیا جاتا مگر واجب ترک کرنے پر اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: "اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہے" (2)۔ دوسروں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں اپنے نعلین مبارک اتارنے سے استدلال کیا ہے جب کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ ان میں قذر اور اذیت رساں شے لگی ہوئی ہے..... الحدیث۔ اسے ابو داؤد وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے، اس کا ذکر عنقریب سورہ طٰہٰ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ انہوں نے کہا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کا اعادہ نہیں کیا جو آپ پڑھ چکے تھے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اسے زائل کرنا سنت ہے اور آپ کی نماز صحیح ہے اور کامل نماز کے حصول کے لیے آدمی نماز کا اعادہ کر سکتا ہے جب تک وقت موجود ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے: اور رہا قلیل و کثیر کے درمیان فرق تو یہ بغلی درہم کی مقدار کے برابر ہے (یعنی بڑے دراہم وہ ہیں جن کی گولائی دینار کی گولائی کی مقدار کے برابر ہو) اور اسے دبر کے حلقہ پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہ دو وجہوں سے فاسد ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ مقداریں قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں لہٰذا یہ مقدار قبول نہیں کی جائے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دبر کے بارے میں اس میں جو تخفیف کی گئی ہے وہ ضرورت اور حاجت کے سبب رخصت ہے اور حاجت اور رخصتوں پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ قیاس سے خارج ہیں پس انہیں اس کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا (3)۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 182 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 29۔ ایضاً، حدیث نمبر 341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1016

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

''تو کیا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی الله کے تقویٰ پر اور (اس کی) رضا جوئی پر بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی وادی کے کھوکھلے دہانے کے کنارے پر جو گرنے والا ہے پس وہ گر پڑا اسے لے کر دوزخ کی آگ میں۔ اور الله تعالیٰ راہ حق پر نہیں چلاتا ظالم قوم کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ اَسَّسَ یعنی کیا وہ جس نے بنیاد رکھی، یہ استفہام برائے تقریر ہے۔ اور من بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر خیر ہے۔ حضرت نافع، ابن عامر اور ایک جماعت نے أُسِّسَ بنیانُهٗ پڑھا ہے یعنی یہ صیغہ فعل مجہول ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو رفع دیا گیا ہے۔ اور ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ، کسائی اور ایک جماعت نے أسس بنیانه پڑھا ہے یعنی صیغہ فعل معروف ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو نصب دی گئی ہے (1) اور یہی ابوعبید کی پسند ہے، کیونکہ جنہوں نے اس طرح پڑھا ہے وہ کثیر ہیں اور فاعل کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور نصر بن عاصم بن علی نے أفمن اسس کو رفع کے ساتھ اور بنیانه کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے أساس بنیانه بھی مروی ہے۔ اور ان سے أُسُّ بنیانِه جر کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور مراد عمارت کی بنیاد اور اصل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو حاتم نے چھٹی قراءت بیان کی ہے اور وہ أفمن آساسُ بنیانه ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ أس کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: خف و أخفاف اور کثیر استعمال أساس خفاف کی مثل ہے، شاعر نے کہا ہے:

أصبح المُلْك ثابتَ الآسَاسِ    في البهَالِيل من بني العباس

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ عیسیٰ ابن عمر کی قراءت جس کے بارے سیبویہ نے بیان کیا ہے تنوین کے ساتھ ہے، اور آخر میں الف، الف الحاق ہے جیسا کہ تَتْرٰی کا الف جب کہ اسے تنوین دی جائے (2) اور شاعر نے کہا ہے:

یَسْتَنُّ فی عَلْقَی وفی مُکُورِ

اور سیبویہ نے تنوین کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے؟ عَلٰی شَفَا۔ الشفا کا معنی کنارہ اور حد ہے، سورۂ آل عمران میں پوری بحث گزر چکی ہے۔ اور جُرُفٍ را کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ابوبکر اور حمزہ نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً الشُّغُل اور الشُّغْل، الرُّسُل اور الرُّسْل، یعنی ایسا کھوکھلا دھانہ جس کی کوئی بنیاد اور اصل نہ ہو۔ اور الجرف وہ کھوکھلے دہانے جو وادیوں میں سیلاب کے سبب بن جاتے ہیں اور یہ وہ کنارے ہیں جو پانی کے ساتھ کھد جاتے ہیں۔ اور اس کی اصل الجرف اور الاجتراف سے ہے۔ اور یہ کسی بھی شے کا اپنی اصل اور بنیاد سے پھٹ جانا ہے۔

هَارٍ اس کا معنی ہے گرنے والا۔ کہا جاتا ہے: تهوّر البناء جب کوئی عمارت گر جائے اور اس کی اصل هائر ہے اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 84
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 85

اسمائے مقلوب میں سے ہے اس میں قلب کیا جاتا ہے اور اس کی یا کو مؤخر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: ھار و ھائر یہ زجاج نے کہا ہے: اور اسی کی مثل لاث الشی بہ ہے جب وہ شے کو اس کے ساتھ گھمائے۔ فھو لاث ای لائث اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: شاکی السلاح و شائك (السلاح) (ہتھیاروں سے مسلح) عجاج نے کہا ہے:

لاثٍ بہ الأشَاء والعُبْرِی (1)

اس میں الأشاء سے مراد کھجور کا درخت ہے اور العبری سے مراد وہ بیری کا درخت ہے جو نہروں کے کنارے پر ہوتا ہے۔ اور لاث بہ کا معنی مطیف بہ (گھمانے والا) ہے۔ اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ اس میں اصل ھاود ہے، پھر کہا جاتا ہے: ھائر جیسا کہ صائم، پھر قلب کیا جاتا ہے اور ھار کہا جاتا ہے۔ اور کسائی کا خیال ہے کہ یہ واوی الفاظ میں سے بھی ہے اور یائی الفاظ میں سے بھی اور کہا جاتا ہے: تھوّر اور تھیّر۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے اس میں امالہ کیا جاتا ہے اور فتحہ دیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ اس میں انھار کا فاعل الجرف ہے، گویا کہ یہ فرمایا: فانھار الجرف بالبنیان فی النار (پس عمارت کا کھوکھلا کنارہ جہنم میں گر پڑا) کیونکہ کنارہ (حرف) مذکر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ بہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہو اور وہ بنانے والا ہے اور تقدیر کلام ہے: فانھا من أسس بنیانہ علی غیر تقویٰ (پس وہ گر پڑا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد غیر تقویٰ پر رکھی) اور یہ آیت ان کے لیے ضرب المثل ہے یعنی جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اسلام پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد شرک اور نفاق پر رکھی۔ اور یہ بیان کیا کہ کافر کی بنیاد اس بنیاد کی طرح ہے جو جہنم کے کھوکھلے کنارے پر ہو وہ اپنے باسیوں سمیت اس میں گر پڑتا ہے۔ اور الشفاء کا معنی کنارہ ہے اور أشفی علی کذا کا معنی ہے وہ اس کے قریب ہوا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ہر شے جس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی نیت کے ساتھ اور اس کی ذات کریم کے ارادہ اور قصد کے ساتھ ہو تو وہی وہ ہے جو باقی رہتی ہے اور اس کا مالک اس کے ساتھ سعادت اندوز ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتی اور بلند ہوتی ہے، اور اس کے بارے وہ اپنے اس قول کے ساتھ خبر دیتا ہے: وَّ یَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۞ (الرحمٰن) (اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے) یہ دونوں وجہوں میں سے ایک پر دلیل ہے۔ اور وہ اس کے بارے اپنے اس قول سے بھی خبر دیتا ہے: وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ (الکہف: 46) (اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اور علماء نے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے: فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ کیا یہ حقیقت ہے یا مجاز؟ اس کے بارے دو قول ہیں (1) کہ یہ حقیقت ہے اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کی طرف بھیجے گئے تو اسے گرا دیا گیا اور اس سے نکلنے والا دھواں دکھائی دیا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کی روایت ہے (2)۔ اور بعض نے کہا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 85
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1017

ہے: آدمی کو اس میں داخل کیا جائے گا اس حال میں کہ اسے سر اور منہ پر پھنسیاں ہوں گی جیسا کہ کھجور کے درخت کے تنا کی حالت ہوتی ہے اور اسے اس سے نکالا جائے گا درآنحالیکہ وہ سیاہ جلی ہوں گی۔ اور اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ جگہ کھودی جائے گی جو گر پڑی پس اس سے دھواں نکلے گا۔ اور عاصم بن ابی النجود نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہنم زمین میں ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک میں نے وہ دھواں دیکھا ہے جو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نکلتا رہا (1)۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے: وہ عمارت جہنم کی آگ میں ہوگی، تو گویا وہ اس میں گر پڑی اور اس میں جھک گئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعۃ) (تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا) اور ظاہر پہلا قول ہے کیونکہ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

"ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں مگر یہ کہ پارہ پارہ ہو جائیں ان کے دل اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا اس میں عمارت سے مراد مسجد ضرار ہے۔ رِيْبَةً یعنی ان کے دلوں میں شک اور نفاق رہے گا (2)، یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور نابغہ نے کہا ہے:

حلفتُ فلم أترك لنفسك رِيبةً	وليس وراء الله للمرء مَذْهَبُ

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے تیری ذات کے لیے کوئی شک نہیں چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے سوا آدمی کے لیے کوئی اور مذہب نہیں۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد حسرت اور ندامت ہے، کیونکہ وہ اسے بنانے پر نادم ہوئے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اسی طرح حبیب اور مبرد نے بھی کہ ریبۃ سے مراد شدید غیظ وغضب ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: یعنی ان کے دل پھٹ جائیں اور وہ مر جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (الحاقۃ) (پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگِ دل) کیونکہ رگِ دل کٹ جانے کے سبب زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حضرت سفیان نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: مگر یہ کہ ان کے دل ان کی قبروں میں پارہ پارہ ہو جائیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب یہ قراءت کرتے تھے: ريبة في قلوبهم ولو قطعت قلوبهم (3) (ان کے دلوں میں کھٹکا رہے گا اگرچہ ان کے دل کٹ جائیں) حسن، یعقوب اور ابو حاتم نے غایت کی بنا پر إلى أن تقطع پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے مسلسل شک میں رہیں گے یہاں تک کہ وہ مر جائیں اور انہیں یقین حاصل ہو جائے اور سب واضح ہو جائے۔ قراء نے قول باری تعالیٰ: تَقَطَّعَ میں اختلاف کیا ہے پس جمہور نے تقطع تا کے

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018	2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 41	3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 405

ضمہ، قاف کے فتحہ اور طا کی شد کے ساتھ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

ابن عامر، حمزہ، حفص اور یعقوب نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے تا کو فتحہ دیا ہے، اور یعقوب اور ابو عبدالرحمن سے تقطع فعل مجہول قاف کی تخفیف کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور شبل اور ابن کثیر سے تقطع قاف کی تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ قُلُوْبِهِمْ یہ منصوب ہے، یعنی تم ان کے ساتھ ایسا کرو۔ تحقیق ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی قراءت ذکر کی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے اللہ نے اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے (اے ایمان والو!) پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے۔ اور یہی تو سب سے بڑی فیروز مندی ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ کہا گیا ہے یہ تمثیل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ:16) ((یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے) اور یہ آیت بیعت ثانیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ بیعت عقبہ کبریٰ ہے اور یہ وہ ہے جس میں انصار کے مردوں کی تعداد ستر سے کچھ زائد تھی اور ان میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے (1) اور وہ اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عقبہ (گھاٹی) کے نزدیک جمع ہوئے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ اپنے رب کے لیے اور اپنے لیے جو چاہیں شرط لگالیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے رب کے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور تم اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری ہر اس شے سے حفاظت کرو جس سے تم اپنی جانوں اور اپنے مالوں کی حفاظت کرتے ہو''۔ انہوں نے عرض کی: جب ہم ایسا کریں گے تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت''۔ انہوں نے عرض کی: سودا نفع بخش

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہے، ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اس کے فسخ کا مطالبہ کریں گے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، الآیہ (1)۔ پھر اس کے بعد یہ حکم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر جہاد کرنے والے کے لیے عام ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت آقا کے اپنے غلام کے ساتھ معاملہ کرنے کے جواز پر دلیل ہے، اگرچہ سب آقا کا ہوتا ہے لیکن جب وہ اسے مالک بنا دے تو وہ اس کے ساتھ اس بارے میں معاملات کرے جو اس نے اس کے سپرد کیا ہے (2)۔ اور آقا اور اس کے غلام کے درمیان وہ جائز ہے جو اس کے اور کسی دوسرے کے درمیان جائز نہیں ہوتا، کیونکہ اس (غلام) کا مال اسی (آقا) کا ہے اور اس کے لیے اسے چھین لینا بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** مخلوق کے درمیان شراء (خرید و فروخت) کی اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے ہاتھوں سے نکلے وہ اس کے عوض اور بدلے میں ایسی چیز لیتے ہیں جو ان کے لیے ان کی نسبت زیادہ نفع بخش ہو یا نفع میں اس کی مثل اور برابر ہو جو ان کے ہاتھ سے نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں جانوں اور اپنے مالوں کو ضائع کرنے اور اپنی رضا اور خوشی میں انہیں ہلاک کرنے کو خریدا اور انہیں اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا جب وہ ایسا کریں گے۔ اور یہ اتنا عظیم عوض اور بدلہ ہے کہ معوض (جس کا بدلہ دیا گیا) نہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پس اسے مجازاً ایسی شے میں جاری کر دیا جسے بیع اور شراء میں لوگ جانتے ہیں۔

پس بندے کی طرف سے اپنی جان اور مال کو حوالے کرنا ہے اور اللہ کریم کی جانب سے اجر و ثواب اور بخشش و عطا ہے پس اسے شراء کا نام دیا گیا ہے۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ہر نیکی کے اوپر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ بندہ اپنا خون بھی قربان کر دیتا ہے پس جب اس نے ایسا کر لیا تو پھر اس سے اوپر اور کوئی نیکی نہیں''۔ اور شاعر نے بر (نیکی) کے معنی میں کہا ہے:

الجود بالماء جود فيه مكرمة　　والجود بالنفس أقصى غاية الجود

پانی کے ساتھ سخاوت کرنا بھی سخاوت ہے اس میں عزت و تکریم ہے لیکن جان قربان کرنا سخاوت کی آخری حد ہے۔

اور اصمعی نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو کہا:

أُثَامِنُ بالنفس النفيسة ربَّها　　وليس لها في الخلق كلِّهِم ثَمَنْ

میں اس عمدہ اور نفیس جان کا سودا اس کے رب سے کروں گا اور اس کی ساری مخلوق میں اور کوئی قیمت نہیں۔

بها تُشْتَرى الجناتُ، إن أنا بعتها　　بشيء سواها إن ذالكُم غَبَنْ

اس کے ساتھ جنتیں خریدی جا سکتی ہیں اگر میں اسے بیچوں اس کے سوا کسی شے کے عوض تمہیں خسارہ ہوگا۔

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1019

لئن ذهبت نفسی بدنیا أصبتها لقد ذهبت نفسی وقد ذهب الثمن

اگر میری جان دنیا کے عوض چلی جائے اور میں اسے (دنیا کو) پالوں تو تحقیق میری جان بھی گئی اور ثمن یعنی قیمت بھی ضائع ہوگئی۔

حسن نے بیان کیا ہے: ایک اعرابی حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس سے گزرا اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ تو اس نے عرض کی: یہ کس کا کلام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ الله تعالیٰ کا کلام ہے''۔ اس نے کہا: قسم بخدا یہ بیع نفع بخش ہے ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اسے توڑنے کا مطالبہ کریں گے۔ پس وہ ایک غزوہ کی طرف نکلا اور شہید کر دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے کہا ہے: جس طرح الله تعالیٰ نے بالغ اور مکلف مومنوں سے جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح اس نے بچوں سے بھی اسے خرید لیا ہے پس انہیں درد پہنچایا اور انہیں بیمار کر دیا، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے اور اس میں بالغوں کا اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کسی چیز کے لاحق ہونے کے وقت زیادہ فائدہ اور نفع حاصل نہیں کرتے اور بچوں کے دکھ درد کے وقت ان کی طرف سے فساد بہت کم ہوتا ہے اور وہ بھی ہے جو کفالت کرنے والے والدین کو اس بارے میں اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے جو غم اور تکلیف میں سے انہیں پہنچتا ہے اور جو تربیت و کفالت میں سے ان کے متعلق ہوتا ہے(1)، پھر وہ رب کریم ان بچوں کو ایک عوض عطا فرماتا ہے جب وہ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں اس کی نظیر یہ ہے کہ تو ایک مزدور کرائے پر لیتا ہے تا کہ وہ عمارت بنائے اور مٹی منتقل کرے اور اس تمام کام میں اس کے لیے درد اور اذیت ہے، لیکن یہ جائز ہے کیونکہ اس کے عمل اور کام میں مصلحت اور فائدہ ہے اور اس لیے کہ اسے اس کی اجرت ملتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ اس کا بیان ہے جس کے لیے اور جس کے خلاف وہ قتال کرتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ نخعی، اعمش، حمزہ اور خلف نے مفعول کو فاعل پر مقدم پڑھا ہے(2)۔ اور اسی سے امری القیس کا قول ہے

فإن تَقْتُلونا نُقَتِّلكم......

(پس اگر تم ہمیں قتل کرو گے تو ہم تمہارے ساتھ قتال کریں گے یعنی اگر تم نے ہمارے بعض کو قتل کیا تو ہمارے بعض تمہیں قتل کریں گے (ان تقتلوا بعضنا یقتلکم بعضنا) اور باقیوں نے مفعول پر فاعل کو مقدم کر کے پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جا رہی ہے کہ یہ ان کتب میں ہے اور جہاد اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا اصلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ہے۔ اور وعدًا اور حقًا دونوں مصدر ہیں اور تاکید کے لیے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ یعنی کوئی بھی نہیں ہے جو اپنا وعدہ الله تعالیٰ سے بڑھ کر پورا

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1019 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 381

کرنے والا ہو اور وہ وعدے اور وعید دونوں کو پورا کرنے کا ضامن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی وفا تمام کو متضمن نہیں ہوتی۔ پس جہاں تک اس کا وعدہ ہے تو وہ تمام کو شامل ہے (اور وہ اسے پورا کرتا ہے) اور رہی وعید تو وہ بعض گنہگاروں، بعض گناہوں اور بعض احوال کے ساتھ مخصوص ہے (1)۔ اور اس کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ یعنی تم اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرو۔ اور البشارۃ کا معنی پیشانی میں خوشی اور سرور کا اظہار کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! زمین پر کوئی مومن نہیں مگر وہ اس سودے میں داخل ہے، ہو سکتا ہے۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جنت حاصل کرنا اور اس میں ہمیشہ رہنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"توبہ کرنے والے (اللہ کی) عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور نگہبانی کرنے والے اللہ کی (مقررہ) حدوں کی (اے میرے رسول!) خوشخبری سنا دیجئے ان (کامل) مومنوں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ، اَلتَّآئِبُوْنَ سے مراد وہ ہیں (2) جو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں حالت مذموم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں حالت محمودہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور التائب سے مراد رجوع کرنے والا (3) اور لوٹنے والا ہے اور اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا (فقط) معصیت سے رجوع کرنے والے سے افضل و اعلیٰ ہے کیونکہ وہ دونوں امروں کو جمع کیے ہوتا ہے (یعنی معصیت سے پھر کر اطاعت کی طرف رجوع کرنا) الْعٰبِدُوْنَ یعنی وہ اطاعت کرنے والے جنہوں نے اپنی اطاعت سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قصد و ارادہ کیا۔ الْحٰمِدُوْنَ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے ساتھ راضی اور خوش ہونے والے ہیں اور اس کی نعمت و احسان کو اس کی اطاعت میں صرف اور خرچ کرنے والے ہیں (4)۔ اور وہ جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔

السَّآئِحُوْنَ روزے رکھنے والے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (التحریم: 5) (عبادت کرنے والیاں، روزہ دار) اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: بے شک صائم کو سائح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ کھانے پینے اور نکاح کی تمام لذات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور حضرت ابوطالب نے کہا ہے:

وبالسائحين لايذوقون قطرة لربهم والذاكرات العوامل

---

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 408
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020

اور قسم ہے ان روزے داروں کی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں چکھتے اور کام کے دوران اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والیوں کی۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

بَرًّا یصلِّی لیلَه و نَهارَهٗ یَظَلّ کثیر الذکر لله سائحا

نیکوکار اپنے دن رات نمازیں پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر روزے دار کرتا ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: اس امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے (1)۔ اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرفوع روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے'' (2)۔ زجاج نے کہا ہے: حسن کا مذہب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فرض روزہ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ روزے رکھتے رہتے ہیں۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: السَّآئِحُوْنَ سے مراد جہاد کرنے والے، مجاہدین ہیں۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیاحت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میری امت کی سیاحت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے'' (3)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سائحون سے مراد ہجرت کرنے والے، مہاجرین ہیں۔ یہ عبدالرحمن بن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو حدیث اور علم کی طلب اور تلاش میں سفر کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے افکار کے ساتھ اپنے رب کی توحید اور اس کی بادشاہی میں غور وفکر کرتے ہیں اور ان چیزوں میں جو اس نے اپنی توحید اور تعظیم پر دلالت کرنے والی علامات اور نشانیاں تخلیق فرمائی ہیں۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ بعض بندوں نے لوٹا پکڑا تا کہ وہ رات کی نماز کے لیے وضو کرے اور اپنی انگلی اس کے دستے میں داخل کی اور غور وفکر کرتے ہوئے بیٹھ گیا یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی، تو اسے جب اس بارے میں کہا گیا تو اس نے جواب دیا: میں نے اپنی انگلی لوٹے کے دستے میں داخل کی تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آگیا: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ (غافر: 71) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں) اور میں نے یہ یاد کیا میں کیسے اس طوق کو ملوں گا اور میری بقیہ ساری رات اسی میں گزر گئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ لفظ ''س ی ح'' ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ سیاحت کا اصل معنی سطح زمین پر چلنا ہے جیسے پانی بہتا ہے، پس روزے دار ان چیزوں کو چھوڑنے میں اطاعت وفرمانبرداری پر مسلسل قائم رہتا ہے جنہیں وہ طعام وغیرہ میں سے چھوڑ دیتا ہے، پس وہ سائح (سیاحت کرنے والے) کے قائم مقام ہی ہوگا۔ اور غور وفکر کرنے والوں کے دل ان چیزوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں جن کے بارے انہوں نے ذکر کیا ہے اور حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 48 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 1، صفحہ 407

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 336۔ ایضاً، حدیث نمبر 2127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے کچھ فرشتے کائنات میں سیاحت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہیں وہ میری امت کا درود پاک مجھے پہنچاتے ہیں'' (1)۔ اور یہ لفظ صاد کے ساتھ صیاحین بھی روایت کیا جاتا ہے۔ اور یہ الصیاح سے ماخوذ ہے۔ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ یعنی وہ فرض اور دوسری نماز میں رکوع و سجود کرنے والے ہیں۔ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی سنت کے بارے حکم دینے والے ہیں اور بعض نے کہا ہے: ایمان کے بارے حکم دینے والے۔ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بعض نے کہا ہے: وہ بدعت سے روکنے والے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ کفر سے روکنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہر نیکی اور برائی کو شامل ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ یعنی وہ اس پر قائم رہنے والے ہیں جس کے بارے اللہ کریم نے انہیں حکم دیا ہے اور اس سے باز رہتے ہیں جس سے اللہ کریم نے انہیں منع کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اہل تاویل نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ ماقبل آیت کے ساتھ متصل ہے یا منفصل؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: پہلی آیت بذات خود ایک مستقل آیت ہے اور اس سودے کے تحت ہر ایک موحد آتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کیا تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اگرچہ وہ اس دوسری آیت میں مذکور صفات کے ساتھ یا ان سے زیادہ کے ساتھ متصف نہ ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ اوصاف شرط کی جہت پر مذکور ہیں اور دونوں آیتیں باہم مربوط ہیں، پس اس سودے کے تحت داخل نہیں ہوں گے مگر وہی مومنین جو ان اوصاف پر ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرتے ہوں۔ یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حرج میں مبتلا کرنے والا اور تنگی میں ڈالنے والا ہے اور آیت کا معنی اس بنا پر جس کا تقاضا علماء اور شریعت کے اقوال کرتے ہیں کہ یہ کامل مومنین کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ہے تاکہ اہل توحید ان پر قائم اور برقرار رہیں یہاں تک کہ وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو جائیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہیں۔ اور اس کی خبر مضمر ہے۔ یعنی اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ ...... الی اخر الآیۃ ...... لھم الجنۃ ایضا یعنی ان تمام کے لیے بھی جنت ہے، اگرچہ انہوں نے جہاد نہ بھی کیا، بشرطیکہ ان کی طرف سے عناد اور جہاد ترک کرنے کا قصد اور ارادہ نہ ہو، کیونکہ جہاد میں بعض مسلمان بعض کی طرف سے کافی ہوتے ہیں۔ اس قول کو علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ بہت اچھا ہے (ہذا حسن) کیونکہ اگر یہ صفت ان مومنوں کی ہو جن کا ذکر اس قول باری میں ہے: اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تو پھر یہ وعدہ مجاہدین کے لیے خاص ہو جائے گا۔ اور حضرت عبداللہ کے مصحف میں ہے: التائبین العابدین، الیٰ آخرہا اور اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اتباع کے طریقہ پر یہ مومنین کی صفت ہے (لہٰذا حالت جری میں ہیں) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ مدح کی بنا پر حالت نصبی میں ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قول باری تعالیٰ: وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں واؤ کے بارے علماء کا اختلاف ہے پس کہا گیا ہے کہ یہ ناہین (روکنے والوں کی) صفت میں داخل ہے (3) جیسا کہ اس ارشاد میں داخل ہے: حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 595
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 88
3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382

الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (المومن) پس بعض کو واؤ کے ساتھ اور بعض کو بغیر واؤ کے ذکر کیا۔ اور یہ کلام میں جائز اور مروج ہے اور اس کی مثل کی نہ کوئی حکمت تلاش کی جائے گی اور نہ کوئی علت۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ برائی سے روکنے والے اور نیکی کا حکم دینے والے کی مصاحبت کے لیے داخل ہوئی ہے پس قریب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کا مفرد ذکر کیا جائے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ: ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (التحریم:5) ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالْحٰفِظُوْنَ میں یہ اس کے معطوف کے قریب ہونے کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زائد ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے اس کا کوئی معنی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ ثمانیہ ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک سات صحیح اور کامل عدد ہے(1)۔ اور اسی طرح انہوں نے اس قول میں کہا ہے: ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (التحریم:5) اور اسی طرح جنت کے دروازوں کے بارے میں ارشاد ہے: وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر:73) (اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے) اور قول باری تعالیٰ ہے: وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکہف:22) (اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا)

اسے ابن خالویہ نے ابوعلی فارسی کے ساتھ مناظرہ میں وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر:73) کے معنی میں ذکر کیا ہے اور ابوعلی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ النحو ابو عبد اللہ الکفیف المالقی سے مجھے بیان کیا ہے ور یہ ان میں سے تھے جو غرناطہ میں سکونت پذیر رہے اور ایک مدت تک وہاں ابن حبوس کے زمانہ میں پڑھایا کہ انہوں نے کہا: بعض عربوں کے نزدیک یہ لغت فصیحہ ہے۔ ان کا طریقہ اور ان کی عادت یہ ہے کہ جب وہ عدد گنتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں: واحد اثنان ثلاثة اربعة خمسة ستة سبعة و ثمانية تسعة عشرة اسی طرح یہ ان کی لغت ہے۔ اور جب بھی ان کے کلام میں امر آٹھ تک پہنچتا ہے تو وہ واؤ داخل کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ قریش کی لغت ہے۔ اس کا بیان اور اس کا نقض عنقریب سورۂ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور سورۂ زمر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے اس کا بیان آئے گا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

''درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے اگرچہ وہ مشرک ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، جب کہ واضح ہو گیا ان پر کہ یہ دوزخی ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب ابو طالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے (2) اور آپ نے ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ ابن مغیرہ کو ان کے پاس پایا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے چچا! کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس بارے تیری شہادت پیش کروں گا''۔ تو ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90-89

کہا: اے ابو طالب! کیا تو عبد المطلب کے دین سے اعراض کرے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل وہ کلمہ ان پر پیش کرتے رہے اور اس قول کا ان کے لیے اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ آخر میں ابو طالب نے ان سے کلام کرتے ہوئے کہا: وہ عبد المطلب کے دین پر ہے اور لآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کر دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم بخدا! میں تمہارے لیے ضرور مغفرت طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے تم سے منع نہ کیا گیا'' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ (القصص)(1) (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں، البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو)

پس اس بنا پر یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے لیے ناسخ ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی موت کے بعد ان کے لیے مغفرت طلب کی جیسا کہ صحیح کے علاوہ دیگر کتب میں روایت موجود ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ یہ سورت قرآن کریم میں سے آخر میں نازل ہونے والی (سورتوں) میں سے ہے اور ابو طالب نے عنفوان اسلام کے وقت وصال فرمایا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ مکرمہ میں تھے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت کفار کے ساتھ دوستی ختم کرنے کو متضمن ہے چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اجازت نہیں دی کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار کریں۔ پس مشرک کے لیے مغفرت طلب کرنا ان امور میں سے ہے جو جائز نہیں۔ پھر اگر کہا جائے: تحقیق یہ بات صحیح ہے کہ غزوۂ احد کے دن جب کفار نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے والے دانت شہید کر دیئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا: اللّٰھم اغفر لقومی فانّھم لا یعلمون(2) (اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے) تو یہ اس کلمہ کے ساتھ جمع کیسے ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنوں کو مشرکین کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع فرما دیا ہے؟ تو یہ کہا جائے گا: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ قول سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی سے بر سبیل حکایت بیان ہوا ہے۔ اور اس پر دلیل وہ آیت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: گویا میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرف دیکھ رہا ہوں کہ آپ سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کے بارے بیان فرما رہے ہیں کہ اس کی قوم نے اسے مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ربّ اغفر لقومی فانّھم لا یعلمون(3) (اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)۔ اور بخاری میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بارے خبر دینے لگے کہ اس نے یہ کہا: اللّٰھم اغفر لقومی فانّھم لا یعلمون(4) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 40
2۔ صحیح مسلم، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 108
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 495

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت اس بارے میں صریح ہے کہ یہ آپ سے قبل کسی اور نبی علیہ السلام کی جانب سے بطور حکایت ہے، نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ابتداء اپنی طرف سے ارشاد فرمایا جیسا کہ بعض کا گمان ہے۔ واللہ اعلم۔ اور وہ نبی علیہ السلام جن کی آپ نے حکایت بیان کی وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورت ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں استغفار سے مراد نماز ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: میں نہیں ہوں کہ میں اہل قبلہ میں سے کسی پر نماز (جنازہ) پڑھنا چھوڑ دوں اگرچہ وہ حبشہ کی رہنے والی زنا سے حاملہ ہو، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کو نہیں سنا کہ اس نے مشرکین کے سوا کسی کی نماز سے روکا ہو، کیونکہ اس نے مشرکین کے بارے میں فرمایا ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ، الآیہ (1)۔

حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت مشرکوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کے بارے میں ہے۔ اور یہاں استغفار سے مراد صلوٰۃ (نماز جنازہ) ہی ہوگا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ زندوں کے لیے استغفار کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کے ایمان لانے کی امید اور توقع ہو سکتی ہے اور اچھے اور خوبصورت قول کے ساتھ ان کی تالیف قلوب کرنا اور دین کی طرف انہیں راغب کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آدمی اپنے کافر والدین کے لیے دعا مانگے اور ان کے لیے بخشش طلب کرے جب تک وہ زندہ ہوں۔ اور رہا وہ جو فوت ہو گیا تو اس سے امید منقطع ہو گئی لہٰذا اس کے لیے دعا نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنے مردوں کے لیے مغفرت طلب کرتے تھے پھر یہ آیت نازل ہوئی، تو وہ استغفار کرنے سے رک گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں زندوں کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع نہیں کیا یہاں تک کہ مر جائیں (2) (یعنی مرنے کے بعد ان کے لیے مغفرت کی دعا نہیں ہے)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اہل معانی نے کہا ہے: ما کان قرآن کریم میں دو صورتوں میں آتا ہے۔ ایک نفی کے معنی میں جیسے ارشاد گرامی ہے: مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا (النمل: 60) (تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت) اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (آل عمران: 145) (اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے)

اور دوسرا نہی کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو) اور مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾

''اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا اور جب ظاہر ہو گئی آپ پر یہ بات کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو آپ بیزار ہو گئے اس سے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90　2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 52

بے شک بڑے ہی نرم دل (اور) بردبار تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ نسائی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے ایک آدمی کو اپنے والدین کے لیے استغفار کرتے ہوئے سنا حالانکہ وہ دونوں مشرک تھے، تو میں نے کہا: کیا تو ان دونوں کے لیے مغفرت طلب کر رہا ہے حالانکہ وہ دونوں مشرک ہیں؟ تو اس نے کہا: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا نہیں کی؟ چنانچہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اس کا ذکر کیا تب یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ (1) اس کا معنی یہ ہے: اے مومنو! تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ وہ فقط ایک وعدہ کو پورا کرنے کی وجہ سے تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور شرکاء کو چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ کفر پر مر گیا تو آپ کو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، تو آپ نے اس کے لیے دعا چھوڑ دی، کلام میں اِيَّاهُ کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے اور وعدہ کرنے والا آپ کا باپ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدہ کرنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے اپنے باپ سے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ حالت شرک میں ہی فوت ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔ اور اس وعدے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) (میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے)

قاضی ابوبکر بن العربی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے لیے استغفار کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ ہی تعلق قائم کیا: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے کی وجہ اس کا کفر ظاہر ہونے سے پہلے ایک وعدہ تھا، پس جب آپ کے لیے اس کی طرف سے کفر ظاہر ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے، تو اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے چچا کے لیے کیسے استغفار کر سکتے ہیں حالانکہ اس کی موت حالت کفر میں واقع ہو چکی ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ موت کے وقت آدمی کی ظاہر حالت کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے گا، پس اگر کوئی حالت ایمان پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس (ایمان) کا حکم لگایا جائے گا اور اگر حالت کفر پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔ اور اس کے باطن کی حالت تیرا رب بہتر جانتا ہے، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے اپنے چچا کو کسی شے کا نفع دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ اور وہ عذاب کی تخفیف کے بارے شفاعت اور سفارش ہے نہ کہ جہنم سے نکلنے کے بارے میں، جیسا کہ ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں بیان کیا ہے۔

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 286۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3026، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1023

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۔ الأواہ کے بارے میں علماء کے پندرہ مختلف اقوال ہیں۔ (۱) کہ وہ ایسی دعا کرنے والے ہیں جو کثرت اور اصرار کے ساتھ ہو۔ یہ حضرت ابن مسعود اور عبید بن عمیر نے کہا ہے (۲) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ انتہائی رحم کرنے والے ہیں۔ یہ حسن اور قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلا قول اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے: (۳) کہ وہ یقین کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عطا اور عکرمہ نے کہا ہے اور اسے ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ (۴) کہ وہ مومن ہیں، یہ لغت حبشہ کے مطابق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہ کہا ہے(1)۔ (۵) کہ وہ ایسی تسبیح کرنے والا ہے جو چٹیل اور وحشت ناک زمین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ یہ کلبی اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے (۶) کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے والا ہے۔ یہ عقبہ بن عامر نے کہا ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح بیان کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: انہ لأواہ۔ (۷) کہ وہ وہ ہے جو کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اقوال ایک دوسرے میں داخل ہیں اور تلاوت قرآن ان تمام کو جامع ہے۔

(۸) کہ وہ آہ نکالنے والے ہیں۔ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے تھے: ''آتش جہنم سے آہ اس سے پہلے کہ آہ تجھے کوئی فائدہ نہ دے''۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک آدمی بیت اللہ شریف کا طواف کثرت سے کرتا تھا اور اپنی دعا میں کہتا تھا: أَوْهِ أَوْهِ تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسے چھوڑ کیونکہ وہ آہیں بھرنے والا ہے''۔ پس میں ایک رات نکلا تو اچانک دیکھا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی کو رات کے وقت دفن کر رہے ہیں اور آپ کے پاس چراغ بھی تھا(2) (۹) کہ وہ فقیہ ہیں۔ یہ حضرت مجاہد اور نخعی نے کہا ہے۔ (۱۰) کہ آپ بڑی عاجزی وانکساری اور خشوع کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن شداد بن الہاد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی شے کے بارے گفتگو کی، آپ نے اسے ناپسند کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے روک دیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ اواھۃ ہے''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم الأواھۃ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الخاشعۃ (خشوع کرنے والی، ڈرنے والی) (۱۱) کہ یہ وہ ہے جب اس کے گناہوں کا ذکر کیا جائے تو یہ ان سے استغفار کرے یہ حضرت ابوایوب نے کہا ہے۔ (۱۲) کہ یہ گناہوں سے کثرت سے آہیں نکالنے والا ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ (۱۳) کہ یہ خیر کی علامت اور نشانی ہے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے (۱۴) کہ یہ شفیق ہے۔ یہ عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی شفقت اور نرمی کی وجہ سے الاواہ کا نام دیا جاتا تھا (۱۵) کہ یہ ہر اس شے سے رجوع کرنے والا ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔ یہ حضرت عطا نے کہا ہے۔ اور اس کی اصل التأوہ سے ہے اور اس سے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 61 2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 62

مراد سینے سے سنائی دینے والی وہ آواز ہے جو سانس اوپر چڑھنے کے سبب ہوتی ہے۔ حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام جب جہنم کا ذکر کرتے تو آہ نکالتے تھے۔ جوہری نے کہا ہے: شکایت اور تکلیف کے وقت ان کا قول أوْہ من کذا (واؤ ساکنہ کے ساتھ) بلاشبہ وہ درد کا اظہار کرنا ہی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

فأوْہِ لذکراھا إذا ما ذکرتھا ومن بُعد أرضٍ بیننا و سماء

اور بسا اوقات وہ واؤ کو الف سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آہ من کذا اور بسا اوقات واؤ کو شد اور کسرہ دیتے ہیں اور ہا کو ساکن کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أوِّہْ من کذا اور بسا اوقات انہوں نے تشدید کے ساتھ ہا کو حذف کر دیا ہے اور کہا ہے: أوِّ من کذا اسے بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: آوِّہْ یعنی مد اور تشدید کے ساتھ اس میں واؤ پر فتحہ اور ہا ساکن ہے یعنی یہ لمبی آہ بھرنے کے لیے ہے۔ اور بسا اوقات وہ اس میں تا کو بھی داخل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أوّتاہ وہ اسے مد کے ساتھ بھی اور بغیر مد کے بھی پڑھتے ہیں۔ تحقیق کہا جاتا ہے أوّہ الرجل تأویھا و تأوّہ تأوّھا جب کوئی أوّہْ (آ) کہے اور اس سے اسم الآھۃ مد کے ساتھ ہے۔ مثقب عبدی نے کہا ہے:

إذا ما قمتُ أرحلُھا بلیلٍ تأوّہ آھۃَ الرجلِ الحزین

اور الحلیم کا معنی بہت زیادہ حلم والا، بردبار ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جو گناہوں اور غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور تکلیفوں اور اذیتوں پر صبر کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس نے کبھی بھی کسی کو سزا نہیں دی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی میں اور کسی کی مدد نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی طرح تھے اور جب آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہوتے تو دو میل تک آپ کے دل کا اضطراب اور دھڑکن سنائی دیتی۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

"اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دستور کہ گمراہ کر دے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کر دے ان کے لیے وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہیے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے (ساری) بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی اور نہ کوئی مددگار"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور نہیں ہے کہ وہ ان کے دلوں میں ہدایت کے بعد گمراہی اور ضلالت واقع کر دے یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں بیان کر دے جن سے انہیں بچنا چاہیے اور وہ ان سے نہ بچیں، تو اس وقت وہ گمراہ کرنے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں اس بات پر بہت واضح دلیل ہے کہ گناہوں کا جب ارتکاب ہو اور ان کے پردے

پھٹ جائیں تو یہ گمراہ اور ردی ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اور رشد و ہدایت کو ترک کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے احسان سے ثبات، توفیق اور ہدایت کی التجا کرتے ہیں۔

ابو عمرو بن علاء نے قول باری تعالیٰ: حَتّٰی یُبَیِّنَ لَهُمْ میں کہا ہے: یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے امر کے ساتھ ان پر حجت قائم کر دے، جیسا کہ فرمایا: وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا (الاسراء: 16) (اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حَتّٰی یُبَیِّنَ لَهُمْ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ خاص کر مشرکین کے لیے استغفار نہ کریں اور وہ ان کے لیے طاعت اور معصیت عام طور پر ظاہر اور واضح کریں۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا اور اس میں سختی کی گئی تو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو اس حال میں فوت ہوئے کہ وہ شراب پیتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ اور یہ آیت معتزلہ اور ان کے علاوہ ان کا رد ہے جو اپنی ہدایت اور اپنے ایمان کے خلق کے بارے قول کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۱۶﴾ کئی مقام پر اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے پیروی کی تھی نبی کی مشکل گھڑی میں اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ٹیڑھے ہو جائیں دل ایک گروہ کے ان میں سے پھر رحمت سے توجہ فرمائی ان پر، بے شک وہ ان سے بہت شفقت کرنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے کہ عبد بن حمید نے ہمیں بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں عبدالرزاق نے بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں معمر نے زہری سے، انہوں نے عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ہمیں خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک تک جتنے غزوات لڑے ہیں میں سوائے بدر کے کسی غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا اور غزوۂ بدر سے جو پیچھے رہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی کو عتاب نہیں فرمایا۔ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے اور قریش اپنے قافلے کی مدد کے لیے نکلے تھے، پس بغیر کسی معین پروگرام کے فریقین کا آمنا سامنا ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ مجھے میری عمر کی قسم! بلاشبہ لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی جنگوں میں سب سے اشرف اور بلند مرتبہ جنگ بدر کا ہے اور میں یہ پسند کرتا تھا اے کاش! میں لیلۃ العقبہ کی بیعت کی جگہ میں اس میں حاضر ہوتا اس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور یقین کیا تھا، پھر اس کے بعد میں کبھی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا یہاں تک کہ غزوۂ تبوک ہو گیا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے آخری غزوہ تھا۔ اور حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا، پھر آگے طویل حدیث ذکر کی۔ بیان کیا: پس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں چل کر حاضر ہوا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور مسلمان آپ کے اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کا چہرہ مقدس) چاند کے چمکنے کی طرح چمک رہا تھا (اور روشن تھا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام سے خوش اور مسرور ہوتے تو آپ کا رخ زیبا چمک اٹھتا۔ پس میں آیا اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: ''اے کعب بن مالک تجھے بشارت اور مبارک ہو اس خیر و برکت والے دن کی جو تجھ پر آیا (اور وہ ان تمام دنوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے) جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ تو میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ حتی کہ اس مقام تک پہنچ گئے...... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ انہوں نے بیان کیا: اور ہمارے بارے میں یہ آیت بھی نازل کی گئی: اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۝ (ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ) اور آگے حدیث ذکر کی (1)۔ عنقریب صحیح مسلم کے حوالہ سے مکمل حدیث تین آدمیوں کے قصہ میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء نے اس توبہ اور توجہ کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار پر فرمائی اس کے بارے کئی اقوال ہیں۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: وہ توبہ جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت کی توجہ فرمائی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقوں کو بیٹھے رہنے کی اجازت دینے کی وجہ سے تھی۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ: 43) (درگزر فرمایا ہے اللہ نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں) اور مومنین پر ان میں سے بعض کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے کی طرف میلان اور رغبت آنے کی وجہ سے تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت کی توجہ یہ تھی کہ انہیں تنگی کی شدت اور سختی سے بچا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کی اذیت اور تکلیف سے خلاصی اور نجات دلانا ہے۔ اور اسے توبہ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں توبہ کا معنی موجود ہے اگرچہ یہ اس کی تعریف سے خارج ہے اور وہ پہلی حالت کی طرف لوٹنا اور رجوع کرنا ہے۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: بے شک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر توبہ میں کیا گیا ہے کیونکہ جب آپ ہی ان کی توبہ کا سبب ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41) (تو اللہ تعالیٰ کے لیے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 137-136

ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے)

قولہ تعالیٰ: الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ یعنی جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کی اتباع کی۔ اور مراد اس غزوہ کے تمام اوقات ہیں۔ اور اس سے اس کی معین ساعت مراد نہیں لی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سَاعَةِ الْعُسْرَةِ سے مراد وہ شدید ترین ساعت ہے جو اس غزوہ کے دوران ان پر گزری۔ اور العسرۃ سے مراد معاملے کی صعوبت اور شدت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ان پر سواریوں کی تنگی، زادراہ کی تنگی اور پانی کی تنگی یہ سب ان پر جمع ہو گئی تھیں (1)۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں کی تنگی کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک اونٹ پر نکل رہے تھے جسے وہ اپنے درمیان رو کے ہوئے تھے۔ اور ان کا زادراہ گھن لگی کھجوریں، متغیر جو اور بدبودار چربی تھی اور کوئی گروہ نکل رہا ہے کہ ان کے پاس سوائے کھجوروں کے اور کچھ نہیں تھا اور جب ان میں سے کسی کو بھوک لگتی تو وہ کھجور کا ایک ٹکڑا لیتا یہاں تک کہ اس کا ذائقہ پالیتا، پھر وہ اسے اپنے ساتھی کو دے دیتا یہاں تک کہ وہ اس پر پانی کا گھونٹ پی لیتا اسی طرح وہ کرتے رہتے یہاں تک کہ وہ کھجور ان کے آخری ساتھی تک پہنچ جاتی اور کھجور میں سوائے گٹھلی کے کچھ باقی نہ بچتا۔ پس وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورے صدق و یقین کے ساتھ چلتے رہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سَاعَةِ الْعُسْرَةِ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہم شدید گرمی میں نکلے اور ایک منزل پر جا اترے وہاں شدید پیاس نے ہمیں آلیا یہاں تک کہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ ہماری گردنیں پیاس سے کٹ جائیں گی، یہاں تک کہ ایک آدمی اپنا اونٹ ذبح کرتا اور اس کے گوبر کو نچوڑتا اسے پیتا اور باقی اپنے جگر پر رکھ لیتا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر و برکت کی دعا کا عادی بنایا ہے سو آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟'' عرض کی: ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک اٹھائے اور انہیں واپس نہ لوٹایا یہاں تک کہ آسمان نے سایہ کر دیا اور پھر برسنے لگا۔ پس انہوں نے وہ سب برتن بھر لیے جو ان کے پاس تھے، پھر ہم اسے دیکھنے کے لیے گئے اور ہم نے اسے نہ پایا اور لشکر آگے گزر گیا۔ (2)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان کیا ہے: ہم غزوۂ تبوک میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے پس لوگوں کو بھوک نے آلیا اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ہمیں اجازت عطا فرمائیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کر لیں اور ہم انہیں کھائیں اور چکنائی حاصل کریں۔ (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کر لو'')۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر انہوں نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، البتہ آپ انہیں ان کے فالتو زادراہ لانے کا کہیے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں برکت کی دعا فرمائیے شاید اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر چمڑے کا ایک ٹکڑا منگایا اور اسے بچھا دیا گیا، پھر آپ نے بچا ہوا زادراہ لانے کی دعوت دی، پس ایک آدمی ایک مشت مکئی لا رہا ہے اور دوسرا ایک مشت کھجور لے کر آتا ہے اور ایک اور گوشت کا ٹکڑا لے کر آتا ہے یہاں تک کہ اس چمڑے کے ٹکڑے پر تھوڑی سی شی جمع ہو گئی۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 67
2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: پس میں نے اسے پھیلایا تو وہ بکریوں کے باڑے کی مقدار تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: ''تم اپنے برتنوں میں ڈال لو''۔ پس انہوں نے اسے اپنے برتنوں میں ڈال لیا، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے! یہاں تک کہ لشکر میں کوئی برتن باقی نہ رہا مگر انہوں نے اسے بھر لیا اور قوم نے اسے کھایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گئے۔ اور کچھ فالتو بھی بچ گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جو بندہ بھی اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے ساتھ ان میں شک کرتے ہوئے ملاقات کرے گا تو اسے جنت سے روک دیا جائے گا'' (1)۔ اسے مسلم نے اپنی صحیح میں انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور ابن عرفہ نے کہا ہے: جیش تبوک کو جیش عسرہ کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید گرمی میں لوگوں کو غزوہ کی دعوت دی۔ پس یہ ان پر انتہائی سخت اور تنگی کا باعث بنا اور پھلوں کا پکنا بھی ظاہر ہو چکا تھا۔ فرمایا: جیش عسرہ کے ساتھ مثال بیان کی گئی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل اتنی تعداد کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد غزوۂ بدر میں تین سو، اس سے کچھ زائد تھی اور احد کے دن سات سو اور خیبر کے دن ایک ہزار پانچ سو فتح مکہ کے دن دس ہزار اور غزوۂ حنین میں تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور غزوۂ تبوک میں آپ کا لشکر تیس ہزار سے زائد تھا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجب میں نکلے اور تبوک میں شعبان اور رمضان کے کچھ دن قیام کیا اور اپنے دستے بھیجے اور کئی اقوام کے ساتھ جزیہ پر صلح کی۔ اور اس غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تو منافقوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے بغض کی وجہ سے پیچھے چھوڑا۔ پس وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نکلے اور آپ کو اس کی اطلاع دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أما ترضی أن تکون لی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ (2) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے پیچھے اسی طرح ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہارون علیہ السلام تھے)

اور بیان فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کا بیٹھنا اجر میں آپ کے ساتھ نکلنے والے کے برابر ہے، کیونکہ اس کا دارومدار شارع کے حکم پر ہے۔ بے شک اس کو غزوۂ تبوک کہا گیا ہے کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ تبوک کی دلدلی زمین میں پیالے لے کر داخل ہو رہے ہیں اور اسے حرکت دے رہے ہیں تاکہ پانی نکل آئے، تو آپ نے فرمایا: مازلتم تبوکونھا بوکا پس اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ تبوک رکھ دیا گیا۔ الحسی (کسرہ کے ساتھ) وہ دلدل (پانی) جسے ریتلی زمین جذب کر لیتی ہے، پس وہ صلابت (سخت زمین) تک پہنچ جائے تو وہ اسے روک لیتی ہے پس تو اس سے ریت کو کھود کر اسے نکال سکتا ہے اور یہی احتساء (کھودنا) ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ فَرِيۡقٍ مِّنۡهُمۡ، قلوب سیبویہ کے نزدیک تزیغ کے ساتھ مرفوع ہے اور کاد میں کان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے الحدیث مضمر ہوگا، کیونکہ خبر اسے اسی طرح لازم ہوتی ہے جیسے کان کو لازم ہوتی ہے۔ اور

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 42

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 633

اگر تو چاہے تو کاد کے ساتھ اسے رفع دے، اور تقدیر عبارت ہوگی: من بعد ما کاد قلوب فریق منهم تزیغ اور اعمش، حمزہ اور حفص نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے یہ گمان کیا ہے کہ جس نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قلوب کو کاد کے ساتھ رفع دے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جسے انہوں نے جائز نہیں کہا وہ دوسرے کے نزدیک تمام کو مذکر قرار دینے کی بنا پر جائز ہے۔ فراء نے بیان کیا ہے: رَحُبَ البلاد و أرحبت (یعنی اس میں مذکر و مونث دونوں جائز ہیں) اور رحبت اہل حجاز کی لغت ہے اور تزیغ کے معنی میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ تھکاوٹ، مشقت اور شدت کے ساتھ وہ (دل) ضائع ہو جائیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ ممانعت اور نصرت میں حق سے پھر جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے بعد کہ ان میں سے ایک فریق نے پیچھے بیٹھے رہنے اور نافرمانی کا قصد کیا پھر وہ آپ کے ساتھ مل گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے واپس پلٹنے کا قصد کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی اور انہیں اس کے بارے حکم دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا ان پر توجہ فرمانا یہ ہے کہ اس نے ان کے دلوں کا تدارک کیا یہاں تک کہ وہ ٹیڑھے نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء اور دوستوں کے ساتھ یہی سنت ہے جب وہ کسی ہلاکت پر جھانکنے لگیں اور وہ اپنے آپ کو ہلاکت پر ٹھہرا لیں تو وہ ان پر سخاوت کا بادل برساتا ہے اور ان کے دلوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

منك أرجو ولستُ أعرف رَبًّا ... يُرتَجى منه بعضَ ما منك أرجو

وإذا اشتدت الشدائد في الأرض ... على الخلق فاستغاثوا و عجُّوا

وابتليتَ العباد بالخوف والجوع ... و صَرُّوا على الذنوب ولَجُّوا

لم يكن لي سواك ربِّ ملاذ ... فتيقَّنت أنني بك أنجو

اور اللہ تعالیٰ نے ثلاثہ (تین) کے حق میں فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا (تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تا کہ وہ بھی رجوع کریں) پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق دی تا کہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں وسعت دے دی اور انہیں سزا دینے میں جلدی نہ کی تا کہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ قول بھی ہے: ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تا کہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تا کہ وہ ان سے حالت رضا کی طرف لوٹ آئیں۔ المختصر یہ کہ اگر ان کے بارے میں پہلے اس کے علم میں نہ ہوتا کہ اس نے ان کے لیے توبہ کا فیصلہ کیا ہے تو وہ توبہ نہ کرتے، اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "تم عمل کرو پس ہر وہ کام آسان بنا دیا گیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے (اعملوا فكلٌّ مُيَسَّرٌ لما خلق له)(1)

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 334

اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اوران تینوں پر بھی (نظر رحمت فرمائی) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ تعالیٰ سے مگر اسی کی ذات، تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تا کہ وہ بھی رجوع کریں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا کہا گیا ہے: اور ان تینوں پر بھی نظر رحمت فرمائی جنہیں توبہ سے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ حضرت مجاہد اور ابو مالک سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جو غزوۂ تبوک سے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ اور محمد بن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ خلفوا کا معنی ترکوا (چھوڑ دیئے گئے) ہے، کیونکہ خلفت فلانا کا معنی ہے ترکتہ (میں نے اسے چھوڑ دیا) وفارقتہ قاعدا عما نہضت فیہ (اور میں نے اسے بیٹھے ہوئے چھوڑا اس وقت جب میں اس سے اٹھا)۔ اور عکرمہ بن خالد نے خَلَفُوا پڑھا ہے، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مقیم رہے۔ اور جعفر بن محمد سے روایت ہے کہ انہوں نے خالفوا پڑھا ہے (انہوں نے آپ کی مخالفت کی)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خلّفوا کا معنی ہے انہیں منافقین سے مؤخر کر دیا گیا اور ان کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ منافقین کی توبہ قبول نہیں کی گئی۔ اور کئی اقوام نے عذر پیش کیے تو آپ نے ان کے عذر قبول کر لیے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہی صحیح ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ان لوگوں کے معاملے سے ہم تینوں کا فیصلہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول کر لیے جب انہوں نے آپ کو حلف دے دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فیصلہ فرمادے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے وہ اس میں سے نہیں ہے خُلِّفنا تَخَلُّفَنا عن الغزو (ہمارے غزوہ سے پیچھے رہنے کو مؤخر کر دیا گیا) بے شک یہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملہ کو موخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ کے سامنے قسم کھائی اور عذر پیش کیے پس آپ نے ان سے وہ عذر قبول کر لیے (1)۔ اس بارے میں یہ حدیث طویل ہے۔ یہ اس کا آخر ہے۔

اور وہ تین جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا وہ حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع عامری اور ہلال ابن امیہ الواقفی رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ تمام انصار میں سے تھے۔ بخاری اور مسلم نے ان کی حدیث بیان کی ہے۔ پس مسلم نے حضرت کعب بن مالک سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے غزوات میں تشریف لے گئے میں کبھی بھی کسی غزوہ میں آپ سے پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے اور یہ کہ میں غزوۂ بدر میں پیچھے رہ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پیچھے رہنے والے کو عتاب نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 360

فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان قریش کے قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر کسی مقررہ وعدہ کے اکٹھا کر دیا۔ اور تحقیق میں عقبہ کی رات رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا جس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور وثوق کا اظہار کیا اور میرے لیے اس کے بدلے بدر کی حاضری زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہ تھی، اگرچہ لوگوں میں بدر کا تذکرہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور میرا امتحان اور آزمائش اس وقت تھی جب میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہا، کیونکہ میں کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں اس غزوہ میں آپ ﷺ سے پیچھے رہ گیا، قسم بخدا! اس سے پہلے کبھی میں نے دو سواریاں جمع نہیں کیں حتیٰ کہ میں نے اس غزوہ میں دو جمع کیں، پس رسول اللہ ﷺ شدید گرمی میں اس غزوہ پر تشریف لے گئے اور آپ نے انتہائی دور اور جنگل کا سفر اختیار کیا اور آپ کا مقابلہ کثیر التعداد دشمن کے ساتھ تھا، پس آپ ﷺ نے مسلمانوں کے لیے ان کا معاملہ واضح کیا تاکہ وہ اپنے غزوے (جنگ) کی تیاری خوب اچھی طرح کریں اور آپ نے انہیں اس وجہ اور سبب کے بارے بتایا جو آپ ارادہ رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمان بھی کثیر تعداد میں تھے اور انہیں حافظ کی کتاب جامع نہیں اس سے مراد دیوان ہے حضرت کعب نے کہا: بہت کم ہی کوئی آدمی تھا جو غائب ہونے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کا یہ گمان تھا کہ وہ اس وقت تک مخفی اور چھپا رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بارے میں وحی نازل نہ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ اس غزوہ پر اس وقت تشریف لے گئے جب پھل پکے ہوئے تھے اور سائے گھنے تھے۔ اور میں ان کی طرف زیادہ مائل تھا، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمان اس کے لیے تیار ہو گئے اور میں صبح کے وقت نکلتا تاکہ میں ان کے ساتھ تیار ہو جاؤں پھر لوٹ آتا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتا اور اپنے دل میں کہتا: جب میں نے ارادہ کر لیا تو میں اس کی طاقت اور قدرت رکھتا ہوں۔ پس اسی طرح مسلسل مجھ سے دیر ہوتی رہی اور لوگوں نے تیاری جاری رکھی پس ایک صبح رسول اللہ ﷺ اور آپ کی معیت میں مسلمان غزوہ کے لیے چل پڑے اور میں نے اپنی تیاری کے بارے کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پھر میں صبح کے وقت گیا اور لوٹ آیا اور کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پس اسی طرح مجھ سے دیر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ غزوہ کی طرف آگے بڑھ گئے، پس میں نے کوچ کرنے کا ارادہ کیا کہ میں انہیں پالوں گا، اے کاش میں ایسا کرتا! پھر مجھے وہ قدرت نہ دی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب بھی میں لوگوں میں باہر نکلتا تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہو جاتی کہ میں اپنے لیے کوئی اسوہ اور نمونہ نہیں دیکھتا مگر ایسا آدمی جس پر نفاق کا طعن کیا گیا ہے یا ایسا آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے ضعفاء میں سے معذور قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مجھے یاد نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ تبوک پہنچ گئے پس آپ نے تبوک میں ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے فرمایا: ''کعب بن مالک نے کیا کیا ہے''؟ تو بنی سلمہ کے ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ اسے اس کی خوشحالی اور اپنی ذات میں اترانے نے روک لیا ہے۔ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: کتنا برا ہے جو تو نے کہا ہے! قسم بخدا! یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کے بارے میں سوائے خیر کے کچھ نہیں جانتے۔ پس رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔

پس اس اثنا میں کہ آپ اسی حال پر تھے کہ آپ نے سفید لباس میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے ساتھ سراب چل رہا ہے، تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوخیثمہ ہو''، تو وہ حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی نکلے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے ایک صاع کھجوریں صدقہ کیں یہاں تک کہ منافقوں نے آپ پر عیب لگایا اور طعنہ دیا۔ پس کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس چل پڑے ہیں تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ تو میں نے جھوٹ گھڑنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگا: میں کس کے سبب کل آپ کی ناراضگی سے بچ سکتا ہوں اور میں اپنے گھر والوں میں سے ہر صاحب رائے سے اس پر (مشاورت کے ذریعہ) مدد لینے لگا۔ پس جب مجھے بتایا گیا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں تو مجھ سے باطل زائل ہوگیا یہاں تک کہ میں نے جان لیا کہ میں ہرگز کبھی بھی آپ سے کسی شے کے سبب نہیں بچ سکوں گا، چنانچہ میں نے سچائی اور صدق کو جمع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت قدم رنجہ فرما ہوئے اور جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور اس میں دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر لوگوں کے لیے تشریف رکھتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو پیچھے رہنے والے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور وہ آپ کے پاس عذر پیش کرنے لگے اور آپ کو حلف دینے لگے اور وہ اسی سے کچھ زائد لوگ تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے ان کے ظاہر اعلان (عذر) کو قبول فرمایا اور ان سے بیعت لی اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ان کے باطن (یعنی مخفی امر اور راز) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، یہاں تک کہ میں حاضر ہوا پس جب میں نے سلام عرض کیا تو آپ نے اسی طرح تبسم فرمایا جیسے اس پر تبسم کیا جاتا ہے جس پر غصہ اور ناراضگی ہو۔ پھر فرمایا: ''آؤ'' پس میں آگے چلتا آیا یہاں تک کہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تجھے کس چیز نے پیچھے چھوڑ دیا، کیا تو نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ قسم بخدا! اگر میں آپ کے سوا اہل دنیا میں سے کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو مجھے یقین ہوتا کہ میں عذر کے سبب اس کی ناراضگی سے نکل جاؤں گا۔ تحقیق مجھے فصاحت اور قوت کلام عطا کی گئی ہے، لیکن قسم بخدا! میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے آج آپ کے ساتھ جھوٹی بات کر بھی دی اور اس کے ساتھ آپ مجھ سے راضی ہو بھی جائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ پر ناراض کر دے گا۔ اور اگر میں نے سچی بات آپ سے کر دی تو آپ اس میں مجھ پر ناراض ہوں گے تو بلاشبہ میں اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اچھے انجام کی امید رکھتا ہوں۔ قسم بخدا! میرے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ قسم بخدا! میں کبھی بھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں آپ سے پیچھے رہ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تک اس کی بات کا تعلق ہے تو اس نے بالکل سچ کہا ہے پس تو اٹھ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تیرے بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے''۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بنی سلمہ کے لوگ جھپٹ پڑے اور میرے پیچھے ہو گئے انہوں نے مجھے کہا: قسم بخدا! ہمیں تیرے بارے میں یقین ہے کہ تو نے اس سے پہلے کوئی گناہ اور غلطی نہیں کی! تحقیق تو اس بارے میں عاجز آ گیا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس طرح کا کوئی عذر پیش نہیں کیا جس طرح پیچھے رہنے والوں نے آپ کے پاس عذر پیش کیے۔ پس تیرے گناہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیرے لیے استغفار کرنا ہی کافی تھا۔ وہ کہتے ہیں: قسم بخدا! وہ مجھے لگاتار اور مسلسل تنبیہ کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ جاؤں اور اپنے آپ کو جھٹلا دوں۔

پھر میں نے ان کو کہا: کیا اس میں میرے ساتھ کوئی اور بھی ملا ہے؟ انہوں نے بتایا: ہاں تیرے ساتھ دو اور آدمی بھی اس میں شامل ہیں ان دونوں نے بھی اسی طرح کہا ہے جیسے تو نے کہا ہے۔ تو انہیں بھی اسی طرح کہا گیا ہے جیسے تجھے کہا گیا، میں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا: مرارہ بن ربیعہ عامری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ کعب کہتے ہیں: پس انہوں نے میرے سامنے دو نیک اور صالح آدمیوں کا ذکر کیا۔ تحقیق یہ دونوں غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور یہ دونوں قابل تقلید اور اسوہ تھے۔ پس میں بھی ڈٹ گیا جس وقت انہوں نے میرے سامنے ان دونوں کا ذکر کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہم تینوں سے کلام کرنے سے منع کر دیا۔ ان میں سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے۔ پس لوگوں نے ہم سے اجتناب کر لیا اور وہ ہمارے لیے بدل گئے یہاں تک کہ زمین بھی میرے لیے اجنبی ہوگئی اور اس زمین میں کوئی شے نہ تھی جسے میں پہچانتا، پس ہم پچاس راتیں اسی حالت پر رہے۔ پس رہے میرے دونوں ساتھی تو انہوں نے عاجزی اور اطاعت اختیار کی اور اپنے گھروں میں بیٹھے رونے لگے اور میں قوم کا جوان اور مضبوط آدمی تھا، لہٰذا میں باہر نکلتا رہا پس میں نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں چکر لگاتا لیکن کوئی آدمی مجھ سے کلام نہ کرتا اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کو سلام عرض کرتا درآنحالیکہ آپ نماز کے بعد اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے۔ تو میں دل میں کہتا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے جواب کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں؟ پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھنے لگتا اور نظر بچا کر آپ کی طرف دیکھتا، پس جب میں اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اعراض فرما لیتے، یہاں تک کہ جب مجھ پر مسلمانوں کی زیادتی طویل ہوگئی، بڑھ گئی تو میں چل پڑا یہاں تک کہ میں ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور وہ میرے چچا کا بیٹا تھا اور مجھے تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب تھا میں نے اسے سلام کیا، [illegible] اس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا۔ تو میں نے اسے کہا: اے ابوقتادہ میں تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں! کیا تو جانتا [illegible] میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس وہ خاموش رہا تو میں نے دوبارہ اسے کہا اور میں نے اسے قسم دی لیکن وہ خاموش رہا، میں نے پھر کہا اور اسے پکارا تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں، تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں پیٹھ پھیر کر چل پڑا یہاں تک کہ میں دیوار کو پھلانگ آیا، پس اس اثنا میں کہ میں مدینہ طیبہ کے بازار میں چل رہا تھا تو اہل شام کے ان نبطیوں میں سے ایک نبطی سامنے آیا جو اناج لاتے تھے اور مدینہ طیبہ میں بیچتے تھے۔

وہ کہہ رہا تھا: کون کعب بن مالک پر میری رہنمائی کرے گا؟ آپ کہتے ہیں: پس لوگ اس کے لیے میری طرف اشارے کرنے لگے حتی کہ وہ میرے پاس آ گیا اور اس نے شاہ غسان کا ایک خط مجھے دیا، میں خود کاتب تھا پس میں نے اسے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا: اما بعد! چونکہ میرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تیرے صاحب نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی کھلا یا تنگ گھر تیرے لیے نہیں بنایا، پس تو ہمارے ساتھ مل جا ہم تیری غمگساری کریں گے۔ پس جونہی میں نے اسے پڑھا تو کہا: یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ پس میں اسے لے کر تنور پر آیا اور اسے اس میں جلا دیا، یہاں تک کہ جب پچاس

میں سے چالیس دن گزر گئے اور وحی رکی رہی تب رسول اللہ ﷺ کا قاصد میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ تجھے حکم دے رہے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جا۔ تو میں نے پوچھا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے اور اس کے قریب نہ جا۔ کعب کہتے ہیں: پس آپ ﷺ نے میرے دونوں ساتھیوں کی جانب بھی اسی طرح کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو کہا: تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا اور انہیں کے پاس رہ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے۔

آپ کہتے ہیں: ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ بے شک ہلال بن امیہ بوڑھا اور ناکارہ آدمی ہے اس کے پاس کوئی خادم نہیں ہے، تو کیا آپ ناپسند کرتے ہیں کہ میں اس کی خدمت کروں؟ آپ نے فرمایا: "نہیں لیکن وہ تیرے قریب نہ آئے"۔ تو اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ اس میں کوئی حرکت نہیں ہے! اور قسم بخدا! جب سے اس کا معاملہ ہوا ہے وہ اس دن سے آج دن تک مسلسل رو رہا ہے۔ کعب کہتے ہیں: تو میرے بعض گھر والوں نے کہا: اگر تو بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت مانگ لے، تحقیق آپ نے ہلال بن امیہ کو اجازت عطا فرما دی ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے۔ تو میں نے کہا: میں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب نہیں کروں گا اور مجھے کیا معلوم کہ رسول اللہ ﷺ کیا فرمائیں گے جب میں اس بارے اجازت طلب کروں اور میں جوان آدمی ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس اسی طرح دس راتیں گزر گئیں۔ اور ہمارے لیے اس وقت سے پچاس راتیں مکمل ہو گئیں جب سے ہمارے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ فرمایا: پھر میں نے پچاسویں رات کی صبح کو اپنے گھروں میں سے ایک مکان کی چھت پر فجر کی نماز پڑھی، پس اس اثنا میں کہ میں اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں کیا ہے کہ میری جان مجھ پر بوجھ ہے اور زمین وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہے میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز سنی جو سلع پہاڑ پر چڑھا ہوا تھا وہ اپنی بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! تجھے بشارت اور مبارک ہو۔ آپ فرماتے ہیں: پس میں سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ وسعت آ گئی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ہماری توبہ قبول کرنے کے بارے لوگوں میں اعلان کیا۔ جس وقت آپ نماز فجر پڑھ چکے، تو لوگ ہمیں مبارکباد دینے چل پڑے اور میرے ساتھیوں کی جانب بھی بشارت اور خوشخبری دینے کے لیے گئے۔ اور ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے ہوئے میری طرف آیا اور ایک دوڑنے والا بنی اسلم میں سے میری جانب دوڑا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ پس آواز گھوڑے سے زیادہ تیز تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی وہ مجھے خوشخبری سنا رہا تھا تو میں نے اس کے لیے اپنے کپڑے اتار دیئے اور میں نے اس کی بشارت کے عوض وہ اسے پہنا دیئے۔ قسم بخدا! میں اس دن ان کے سوا کسی شی کا مالک نہ تھا اور میں نے دو کپڑے عاریۃً لیے اور انہیں خود پہنا پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ کا قصد کرتے ہوئے چل پڑا۔ اور لوگ گروہ در گروہ مجھے ملے اور وہ مجھے توبہ کی قبولیت پر مبارکباد دینے لگے، وہ کہتے: تجھے مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے رحمت کی توجہ تجھ پر فرمائی ہے، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد لوگ جمع تھے۔ پس طلحہ بن

عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھے، دوڑتے ہوئے آئے یہاں تک کہ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی۔ قسم بخدا! ان کے سوا مہاجرین میں سے کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ فرمایا: پس کعب ہے کہ وہ طلحہ کے اس عمل کو نہیں بھولے گا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مقدس فرحت و سرور سے چمک رہا تھا اور آپ نے فرمایا: ''تجھے وہ خیر و برکت والا دن مبارک ہو جو تجھ پر گزرا ہے اس وقت سے جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا ایسے لگتا گویا آپ کا چہرہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ آپ کہتے ہیں: اور ہم یہ جانتے تھے۔ پس جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی توجہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صدقہ کر دوں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے لیے اپنا بعض مال روک لے یہ تیرے لیے بہتر ہے''۔ تو میں نے عرض کی: میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ کے ساتھ نجات عطا فرمائی ہے۔ اور بلاشبہ میری توبہ میں سے یہ ہے کہ میں جب تک باقی رہا سچ کے سوا کوئی بات نہیں کروں گا۔ فرماتے ہیں: قسم بخدا! میں مسلمانوں میں سے کسی کو نہیں جانتا جسے اللہ تعالیٰ نے بات کی سچائی میں آزمایا ہو اس وقت سے لے کر میرے آج تک جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا وہ احسن (اور عمدہ) ہو اس سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمایا، قسم بخدا! میں نے آج تک جھوٹ کا قصد نہیں کیا۔ جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عرض کیا، اور بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ باقی عمر میں بھی میری حفاظت فرمائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: قسم بخدا! جب اللہ تعالیٰ نے مجھے دین اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کبھی کوئی احسان اور انعام نہیں فرمایا جو میرے خیال کے مطابق میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچ بولنے سے بڑا اور عظیم ہو، کیونکہ اگر میں آپ کے پاس جھوٹ بولتا تو ہلاک کر دیا جاتا جیسا کہ وہ ہلاک ہوئے جنہوں نے جھوٹ بولا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے کہا جنہوں نے جھوٹ بولا جس وقت اس نے وحی نازل فرمائی جو اس کی نسبت شر اور برا ہے جو کچھ اس نے کسی کو کہا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾ (التوبہ) (قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی

طرف تاکہ تم معاف کردو انہیں سو منہ پھیر لو ان سے یقیناً وہ ناپاک ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم تینوں کا معاملہ ان کے معاملے سے مؤخر کیا گیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول فرما لیے جس وقت انہوں نے قسمیں کھالیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمادی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ مؤخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے فیصلہ فرمادے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا وہ اس میں سے نہیں ہے کہ غزوے سے ہمارے پیچھے رہنے کے سبب ہم چھوڑ دیئے گئے، بے شک وہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملے کو مؤخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قسم کھائی اور آپ کے پاس عذر پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرمالیا(1)۔

قولہ تعالیٰ: ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ یعنی ان پر زمین تنگ ہوگئی وسیع ہونے کے باوجود، کہا جاتا ہے: منزل رحب و رحیب و رحاب (وسیع منزل) اور ما مصدر یہ ہے ای ضاقت علیهم الأرض برحبها کیونکہ وہ چھوڑ دیئے گئے تھے نہ ان کے ساتھ معاملات کیے جاتے تھے اور نہ کلام کی جاتی تھی۔ اور اس میں گناہوں اور معصیت کا ارتکاب کرنے والوں کو چھوڑ دینے پر دلیل موجود ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی ان کے سینے غم اور وحشت کے ساتھ تنگ ہو گئے اور اس بدسلوکی کے سبب (ان کے سینے بوجھل ہو گئے) جسے انہوں نے صحابہ کرام سے پایا۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی جائے پناہ نہیں جہاں وہ پناہ لے سکیں ان سے درگزر فرمائے جانے اور ان کی توبہ قبول ہو جانے کی صورت میں مگر اسی کی ذات (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں) ابوبکر الوراق نے کہا ہے: التوبۃ النصوح (خالص توبہ) یہ ہے کہ توبہ کرنے والے پر زمین وسیع ہونے کے باوجود تنگ ہو جائے اور اس پر اس کی جان بوجھل ہو جائے، جیسا کہ حضرت کعب اور ان کے ساتھیوں کی توبہ رضی اللہ عنہم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کا آغاز ہوا۔ ابوزید نے کہا ہے: میں نے چار چیزوں میں غلطی کی ہے (اور وہ) اللہ تعالیٰ سے ابتداء ہونے کے بارے میں ہیں، میں نے گمان کیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ: 54) (محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے) اور میرا گمان تھا کہ میں اس سے راضی ہوتا ہوں تب وہ مجھ سے راضی ہوتا ہے۔ (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (المائدہ: 119) (راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ سے)

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 63-360

اور میں نے گمان کیا کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں تب وہ میرا ذکر کرتا ہے، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (العنکبوت: 45) (اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے) اور میں نے گمان یہ کیا کہ میں توبہ کروں گا تب وہ میری طرف رحمت کی توجہ فرمائے گا، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پھر ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تاکہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (النساء: 136)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ان کو وسعت دے دی اور ان کی سزا میں جلدی نہ کی جیسا کہ اس نے ان کے سوا کے ساتھ کیا۔ اللہ جل وعز نے ارشاد فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لیے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یہ اہل صدق کے ساتھ ہونے کے بارے امر ہے اور تین کے قصے کے بعد بہت اچھا ہے جنہیں سچ نے نفع پہنچایا اور انہیں منافقوں کے مراتب سے دور ہٹا دیا گیا۔ مطرف نے کہا ہے: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے ہوئے سنا ہے: جب کبھی کوئی آدمی سچ بولتا ہے اور وہ جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی عقل سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ بڑھاپے سے فساد عقل میں سے اس حد تک نہیں پہنچتا جہاں تک کوئی دوسرا پہنچ جاتا ہے (یعنی بڑھاپے اور فساد کے سبب اس کی عقل مختل اور ماؤف نہیں ہوتی)

یہاں مومنین اور صادقین سے جو مراد ہیں ان کے بارے مختلف اقوال ہیں، پس کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان کو ہے جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ خطاب تمام مومنین کو ہے، یعنی تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی تم ان کے ساتھ ہو جاؤ جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکلے نہ کہ منافقین کے ساتھ، یعنی تم سچ بولنے والوں کے مذہب اور ان کے راستے پر ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں، یعنی تم اعمال صالحہ کر کے جنت میں ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد وہ ہیں جن کا ذکر اس قول میں ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ...... الآیہ تا قولہ...... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (البقرہ: 177) (نیکی (بس یہ) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ...... یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں)

اور یہ قول بھی ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب: 23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد مہاجرین ہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ کے دن کہا تھا: بے

شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں صادقین کا نام دیا ہے پس فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ، الآیہ (الحشر: 8) (نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لیے ہے) پھر اس نے جنہیں مفلحین کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ، الآیہ (الحشر: 9) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حکم ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن کے ظاہر اور باطن برابر ہیں، ایک جیسے ہیں۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول ہی حقیقت ہے اور یہی وہ غایت ہے جس پر انتہا ہوتی ہے، کیونکہ یہی صفت ہے جس کے ساتھ عقیدے سے نفاق اور فعل اور عمل سے مخالفت اٹھ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے اور اس صفت والے کو صدیق کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اور جو مراتب اور زمانے میں ان سے کم اور ادنیٰ ہیں (1)۔ اور رہے وہ جنہوں نے کہا: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو آیۃ البقرہ سے مراد ہیں تو وہ انتہائی اعلیٰ اور عظیم صدق ہے اور بہت کم لوگ اس کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہی آیت احزاب کا معنی ہے۔ اور رہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تفسیر تو وہ وہی ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے، کیونکہ ان میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کا حق ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے عقل وفہم حاصل کی کہ وہ اقوال میں سچ، اعمال میں اخلاص اور احوال میں صفا اور درستی کو لازم پکڑے، پس جو اس طرح ہوا وہ ابرار (نیکو کار لوگوں) کے ساتھ مل گیا اور غفار (بہت زیادہ مغفرت والا فرمانے) کی رضا اور خوشنودی تک پہنچ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم پر سچ کو اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور بے شک نیکی جنت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور سچ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صدیق لکھ دیا جاتا ہے'' (2)۔ اور جھوٹ اس کی ضد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فجور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور فجور جہنم کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کذاب لکھ دیا جاتا ہے'' (3)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس کذب (جھوٹ) عار اور شرم ہے اور جھوٹ بولنے والوں سے شہادت (گواہی) کا حق چھین لیا گیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جھوٹ میں آدمی کی شہادت رد کر دی جو اس نے بولا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے: میں نہیں جانتا کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ بولا یا لوگوں میں سے کسی کے بارے میں جھوٹ بولا؟

اور شریک بن عبد اللہ سے پوچھا گیا: اے ابو عبد اللہ! ایسا آدمی جس کے بارے میں نے سنا ہو کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک جھوٹ کے بارے کوئی صلح نہیں ہو سکتی نہ سنجیدگی کے ساتھ اور نہ استہزا اور تمسخر کے ساتھ۔ اور نہ اس کی کہ تم میں سے کوئی کسی شے کا وعدہ کرے پھر اسے پورا نہ کرے، اگر چاہو تو یہ پڑھ لو: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کیا تم کذب میں کوئی رخصت دیکھتے ہو؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کی بات میں جھوٹ بولنے کی خبر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1027 2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 326 3۔ ایضاً

قبول نہیں کی جائے گی اگر چہ وہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سچ بولے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس کی حدیث قبول کی جائے گی۔ اور صحیح یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے کی شہادت اور اس کی خبر قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ قبول عظیم مرتبہ ہے اور ولایت شریفہ ہے لہٰذا یہ حاصل نہیں ہو سکتی مگر اس کو جس کی خصلتیں کامل ہوں اور جھوٹ سے بڑھ کر بری خصلت کوئی نہیں پس یہ ولایت سے معزول کر دیتی ہے اور شہادتوں کو باطل کر دیتی ہے (1)۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''نہیں مناسب تھا مدینہ والوں کے لیے اور جو ان کے اردگرد دیہاتی لوگ ہیں کہ پیچھے بیٹھ رہتے الله کے رسول پاک سے اور نہ یہ کہ متوجہ ہوتے اپنے نفسوں کی طرف ان سے بے فکر ہو کر، یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی تکلیف اور نہ بھوک راہ خدا میں اور نہ وہ چلتے ہیں کسی چلنے کی جگہ جس سے کافروں کو غصہ آئے اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ مگر یہ کہ لکھا جاتا ہے ان کے لیے ان (تمام تکلیفوں) کے عوض نیک عمل، بے شک الله تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکیوں کا اجر۔ اور وہ (مجاہدین) نہیں خرچ کرتے تھوڑا اور نہ زیادہ اور نہ طے کرتے ہیں کسی وادی کو مگر یہ کہ لکھ لیا جاتا ہے ان کے لیے تاکہ صلہ دے الله تعالیٰ بہترین ان کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ یہ کلام ظاہر کے اعتبار سے خبر ہے لیکن اس کا معنی ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ الله کے رسول کو) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا یہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ اور یہ عتاب اور جھڑک ہے ان مومنین کے لیے جو اہل یثرب میں سے تھے اور اس کے پڑوس میں رہنے والے عرب قبائل سے تھے، جیسا کہ مزینہ، جہینہ، اشجع، غفار اور اسلم جو غزوۂ تبوک میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے بیٹھے رہے تھے۔ اور اس کا معنی ہے: ان مذکورہ لوگوں کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ پیچھے بیٹھے رہتے، کیونکہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1028

جنگ کے لیے کوچ ان میں ہوا، بخلاف ان کے علاوہ کے کیونکہ انہیں جنگ کے لیے جمع کیا ہی نہیں گیا، یہ ان میں سے بعض کے قول کے مطابق ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جنگ کے لیے کوچ کرنے کا مطالبہ ہر مسلم کے لیے ہو اور ان کے قرب و جوار میں ہونے کی وجہ سے انہیں عتاب کے ساتھ خاص کیا گیا اور یہ کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: **وَ لَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ** یعنی نہ یہ کہ وہ راضی ہوئے اپنے نفسوں کے لیے آسودگی اور راحت کے ساتھ اس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشقت میں ہوں۔ کہا جاتا ہے: رغبت عن کذا یعنی میں نے اسے اپنی برتری جتائی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا یُصِیْبُهُمْ ظَمَاٌ** یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس (اس میں ظمأ کا معنی پیاس ہے) عبید ابن عمیر نے ظماء مد کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں مثلا خطأ و خطاء، ولا نصب یہ ماقبل پر معطوف ہے، یعنی تکلیف، تھکاوٹ اور اس میں لاتاکید کے لیے زائدہ ہے۔ اور اسی طرح ولا مخمصة اور نہ بھوک۔ اس کا اصل معنی بطن کی کمزوری ہے۔ اور اسی سے رجل خمیص اور امراۃ خُمصانۃ (نحیف مرد اور نحیف عورت) ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔

**فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں **وَ لَا یَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا** یعنی وہ کسی زمین کو طے نہیں کرتے)۔ **یَّغِیْظُ الْكُفَّارَ** یعنی ان کے اسے طے کرنے کے ساتھ کافروں کو غصہ آئے۔ اور یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ موطئا کی صفت ہے بمعنی غائظا، **وَ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا** اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ یعنی قتل یا ہزیمت۔ اس کی اصل نلتُ الشیٔ أنال سے ہے یعنی میں نے اسے پالیا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ ان کے اس قول سے ہے أمر منیل منه (وہ امر جو اس سے پایا گیا) یہ التناول سے نہیں ہے، کیونکہ التناول نلته العطیة (میں نے اسے عطیہ دیا) سے ہے۔ کسی دوسرے نے کہا ہے: نلت أنول من العطیة (میں نے عطیہ پایا) یہ واوی ہے اور النیل یہ یائی ہے۔ تو کہتا ہے: نلته فأنا نائل یعنی میں نے اسے پالیا (ای أدرکته) **وَ لَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا** عرب کہتے ہیں: وادٍ و اودیة یہ خطاب قیاس ہے۔ نحاس نے کہا ہے: جو میں جانتا ہوں اس میں اس کے سوا فاعل اور افعلة معروف نہیں۔ اور قیاس یہ ہے کہ جمع ووادی بنائی جاتی، پس انہوں نے دو واوؤں کے اجتماع کو ثقیل سمجھا حالانکہ وہ کبھی ایک واؤ کو بھی ثقیل جانتے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے وُقِّتَت میں أُقِّتت کہا ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ نے واصل جو کہ آدمی کا نام ہے کی تصغیر میں أویصل بیان کیا ہے اور وہ اس کے سوا میں یہ نہیں کہتے اور فراء نے واد کی جمع اوداء بیان کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی جمع أوداۃ بنائی جاتی ہے جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

عرفت بِبُرْقَة الأوداۃِ رَسْمًا مُحِیلا طال عَهدُك مِن رُسومِ

**اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر خوف اور ڈر کے عوض ستر ہزار نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور صحیح روایت میں ہے: ''گھوڑے تین قسم کے ہیں...... اس روایت میں ہے...... رہا وہ گھوڑا جو اس کے لیے اجر ہے کہ آدمی نے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اہل اسلام کے لیے چراگاہ یا باغ میں باندھ رکھا ہو پس اس نے اس چراگاہ یا باغ میں سے جو بھی کھایا اس کی تعداد کے مطابق اس کی نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی لید اور بول کی تعداد

کے بدلے بھی اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی'' ۔الحدیث ۔ یہ تو وہ ہے جو ان کے لیے اپنی جگہوں میں ہے تو پھر کیا حالت ہوگی جب وہ اس کے دشمن کی زمین میں داخل ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مال غنیمت میں استحقاق دشمن کی زمین میں داخل ہونے اور ان کے شہروں میں پہنچنے سے ثابت ہو جاتا ہے، پس اگر وہ اس کے بعد فوت بھی ہو جائے تب بھی اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا، یہ قول اشہب اور عبدالملک کا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور امام مالک اور ابن القاسم رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس کے لیے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجر کا ذکر کیا ہے اور سہم (مال غنیمت کا حصہ) کا ذکر نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے علاقوں کو روندنے، ان کے اموال پانے اور انہیں ان کے گھروں سے نکالنے کے لیے اس کو اجر و ثواب قرار دیا ہے اور یہی چیز انہیں غصہ دلاتی ہے اور ان پر ذلت و رسوائی داخل کرتی ہے، پس یہی مال غنیمت پانے اور قتل کرنے اور قیدی بنانے کے قائم مقام ہوا۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو پھر غنیمت کا استحقاق ان کی زمین میں داخل ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے نہ کہ فقط اونٹ ہانکنے سے، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو قوم بھی اپنے گھروں کے درمیان میں روندی گئی وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ منسوخ ہے: وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے) اور یہ کہ اس کا حکم اس وقت تھا جب مسلمان قلیل تھے، جب زیادہ ہو گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو پیچھے رہنا چاہے اس کے لیے اسے مباح قرار دیا۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جماعت دیہاتیوں کی طرف بھیجی تا کہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور واپس لوٹ آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جب آپ بذات خود جنگ کے لیے تشریف لے جائیں تو پھر کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر عذر کے آپ سے پیچھے بیٹھا رہے۔ اور رہے آپ کے سوا دیگر ائمہ اور حکمران! تو جو چاہے مسلمانوں میں سے اس سے پیچھے رہ جائے بشرطیکہ اسے لوگوں کی اشد حاجت اور ضرورت نہ ہو۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ ولید بن مسلم نے کہا ہے: میں نے اوزاعی، ابن مبارک، فزاری، سبیعی اور سعید بن عبدالعزیز کو اس آیت کے بارے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ آیت اس امت کے پہلوں کے لیے بھی ہے اور آخر کے لیے بھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قتادہ کا قول اچھا ہے اور اس کی دلیل تبوک کے غزاۃ ہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام چھوڑی ہیں جو کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی

طے کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ رہے"۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے ہمارے ساتھ ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں عذر نے روک لیا ہے" (1)۔

مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ نے فرمایا: "بے شک مدینہ طیبہ میں ایسے لوگ ہیں کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کسی وادی کو طے کیا مگر وہ تمہارے ساتھ تھے (کیونکہ) انہیں مرض نے روک لیا ہے" (2)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذور کو اسی کی مثل اجر عطا کیا جتنا آپ نے طاقتور عمل کرنے والے کو اجر عطا فرمایا۔ اور بعض لوگوں نے کہا: بے شک معذور کے لیے اجر دوگنا کیے بغیر ہوتا ہے اور بذات خود کام کرنے والے کے لیے اجر دوگنا کر دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ تو اللہ تعالیٰ پر اپنی مرضی اور رائے کو ٹھونسنا ہے اور اس کی رحمت کی وسعت کو تنگ کرنا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے عیب قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک انہیں قطعی طور پر دوگنا ثواب دیا جائے گا اور ہم کسی بھی جگہ دوگنا ہونے کے بارے قطعیت کا قول نہیں کرتے، کیونکہ اس کا دارومدار نیتوں کی مقدار پر ہے اور یہ ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے اور وہ جس کے ساتھ یقین کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ وہاں تضعیف ہے اور تیرا رب اس کے بارے خوب جانتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث اور آیات میں سے ظاہر یہ ہے کہ اجر میں مساوات اور یکسانیت ہے۔ ان میں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: "جس نے خیر اور نیکی پر راہنمائی کی تو اس کے لیے نیکی کرنے والے کے اجر کی مثل اجر ہوگا" (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے وضو کیا اور نماز کی طرف نکلا پھر اس نے لوگوں کو پایا کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مثل اجر عطا فرمائے گا جس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور اس میں حاضر ہوا" (5)۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظاہر ہے: وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء: 100) (اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آ لے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ)

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سچی نیت ہی اصل اعمال ہے، پس جب فعل طاعت میں نیت صحیح ہوئی اور پھر کسی مانع کے سبب اسے کرنے والا اس سے عاجز آ گیا تو اس عاجز کے اجر اور قدرت رکھنے والے فاعل کے اجر کے مساوی اور برابر ہونے میں کوئی بعد اور دوری نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔ واللہ اعلم

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 340
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 141
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1029
4۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 137
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے، تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تا کہ تفقہ حاصل کر سکیں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تا کہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ بات یہ ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں) کیونکہ اگر تمام نکل پڑیں تو ان کے پیچھے اہل و عیال ضائع ہو جائیں، ہلاک ہو جائیں، پس چاہیے کہ ان میں سے ایک فریق جہاد کے لیے نکلے اور ایک فریق مقیم رہے تا کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں اور وہ حرام کی ہوئی اشیاء کو خوب یاد کریں، یہاں تک کہ جب جہاد پر جانے والے لوٹ کر آئیں تو مقیم رہنے والے انہیں وہ بتائیں جو احکام شرع میں سے انہوں نے سیکھیں ہیں اور وہ جن کا نزول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تازہ ہوا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قول الا تنفروا اور اس سے پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی بناء پر ہے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ یہ آیت طلب علم کے واجب ہونے میں اصل ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہیں اور آپ نہ نکلیں پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ دیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ یہ جاننے کے بعد کہ تمام کے نکلنے کی وسعت نہیں ہے پھر کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ہر قبیلہ سے چند آدمی۔ اور ان کے باقی ماندہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقی رہیں تا کہ وہ آپ سے دین کا علم حاصل کریں اور اس میں تفقہ حاصل کریں، پھر جب جہاد پر جانے والے ان کی طرف لوٹ کر آئیں تو یہ انہیں وہ سب بتائیں جو انہوں نے سنا اور جس کا علم حاصل کیا۔ اس میں کتاب و سنت میں تفقہ کے واجب ہونے کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ یہ کفایہ ہے عین نہیں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے) پس اس میں ہر وہ داخل ہے جو کتاب و سنت کو نہیں جانتا۔

**مسئلہ نمبر3**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَوْلَا نَفَرَ اخفش نے کہا ہے: یہ فھلا نفر کے معنی میں ہے پس کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لغت میں طائفہ سے مراد جماعت ہے اور کبھی اس کا اطلاق اس سے کم پر ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ آدمیوں تک پہنچ جاتا ہے اور ایک کے لیے اس کا اطلاق نفس طائفۃ کے معنی میں ہوتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً (التوبہ: 66) میں طائفہ سے مراد ایک آدمی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں مراد جماعت ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک عقلی وجہ ہے اور دوسری لغوی۔ عقلی وجہ یہ ہے کہ امر غالب یہ ہے کہ فرد واحد کے ساتھ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور رہی لغوی وجہ تو قول باری تعالیٰ: لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ جمع کی ضمیر کے ساتھ مذکور ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قاضی ابو بکر اور ان سے پہلے شیخ ابو الحسن کی رائے ہے کہ یہاں طائفہ سے مراد واحد (ایک) ہے اور اس میں وہ اس دلیل سے قوت حاصل کرتے ہیں کہ خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور یہ صحیح ہے اس جہت سے نہیں کہ طائفہ کا اطلاق واحد پر ہوتا ہے بلکہ اس جہت سے کہ ایک شخص یا کئی اشخاص کی خبر خبر واحد ہے(1) اور یہ کہ خبر واحد کے مقابل خبر متواتر ہے جو غیر محصور ہوتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کیا ایسی نص ہے جس سے اس پر استدلال کیا جا سکتا ہو کہ واحد کو طائفہ کہا جا سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا (الحجرات:9) یعنی نفسین (دو نفس)۔ اگر مومنین میں سے دو آدمی لڑ پڑیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ (الحجرات:10) (پس صلح کرا دو اپنے دو بھائیوں کے درمیان) پس یہ لفظ تثنیہ کے ساتھ مذکور ہے اور اقتتلوا میں ضمیر اگرچہ جمع کی ہے، پس اور جمع کا اقل فرد دو ہے یہ علماء کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: لِّیَتَفَقَّهُوْا، لِّیَتَفَقَّهُوْا اور لِیُنْذِرُوْا میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقیم رہنے والوں کے لیے ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ دونوں ضمیریں جہاد پر نکلنے والے گروہ کے لیے ہیں۔ علامہ طبری نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ کا معنی ہے تاکہ وہ بصیرت اور یقین حاصل کریں اس کے ساتھ جو اللہ کریم انہیں مشرکوں پر غلبے اور نصرت دین میں سے دکھائے۔ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اور تاکہ وہ کفار میں سے اپنی قوم کو ڈرائیں۔ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ جب وہ ان کی طرف جہاد سے لوٹ کر آئیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس مدد و نصرت کے بارے انہیں مطلع کریں جو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی فرمائی۔ اور یہ کہ ان کے لیے ان کے ساتھ قتال کرنے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قتال کرنے کی طاقت نہیں ہے، پس وہ ان پر وہ کچھ نازل کرتا ہے جو اس نے ان کافر ساتھیوں پر نازل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ کا قول زیادہ بین اور واضح ہے، یعنی تاکہ وہ طائفہ تفقہ حاصل کرے جو سرایا میں کوچ کرنے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیچھے رہا۔ اور یہ علم کی طلب پر ابھارنے اور اس کے مندوب ہونے کا (متقاضی ہے) نہ کہ وجوب اور لازم ہونے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ کلام کی قوت میں نہیں ہے، بلاشبہ علم کو اس کے ادلہ کے ساتھ طلب کرنا لازم ہے۔ یہ ابو بکر بن عربی نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** علم کی طلب، دو قسموں میں منقسم ہوتی ہے: فرض عین، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی میں حدیث طیبہ موجود ہے: ''بے شک علم طلب کرنا فرض ہے''۔ عبد القدوس بن حبیب نے روایت کیا ہے۔ ابو سعید الوحاظی نے حماد بن ابی سلیمان سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1031

ہے: ''علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' (1)۔ ابراہیم نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوائے اس حدیث کے اور کوئی نہیں سنی۔

علم طلب کرنا فرض کفایہ ہے، جیسے حقوق حاصل کرنا، حدود قائم کرنا اور جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا وغیرہ۔ جب یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگ اسے سیکھیں کیونکہ اس سے ان کے احوال اور ان کے سراپا کے احوال فاسد اور ضائع ہو جائیں گے۔ اور ان کے معاملات معاش میں نقصان ہوگا یا وہ باطل ہو جائیں گے، پس دونوں حالوں کے درمیان متعین یہ ہوا کہ بغیر کسی تعیین کے بعض اس فریضہ کو ادا کریں اور یہ اس اعتبار سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں کے لیے آسان فرما دے اور اسے ان کے درمیان اپنی رحمت اور حکمت سے سابقہ قدرت اور کلام کے ساتھ تقسیم فرما دے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** علم کی طلب عظیم فضیلت ہے اور ایک شریف اور عالی شان مرتبہ ہے کوئی عمل اس کے مساوی نہیں ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو بندہ کسی راستے پر چلا وہ اس میں علم تلاش کرنے لگا تو اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کے راستے پر گامزن کر دیا اور بلاشبہ ملائکہ طالب علم کی خوشنودی اور رضا کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور بے شک عالم کے لیے زمین و آسمان میں رہنے والے استغفار کرتے ہیں اور پانی میں رہنے والی مچھلیاں بھی۔ اور بے شک عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے۔ اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء علیہم السلام نے بطور میراث دینار و درہم نہیں چھوڑے بلکہ انہوں نے علم کو میراث قرار دیا ہے پس جس نے اسے حاصل کیا تو اس نے حظ وافر حاصل کر لیا'' (2)۔

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابو المغیرہ نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں امام اوزاعی نے حسن سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا گیا وہ دونوں بنی اسرائیل میں سے تھے، ان میں سے ایک عالم تھا وہ فرض نماز پڑھتا پھر بیٹھ جاتا اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا۔ اور دوسرا دن کو روزہ رکھتا اور رات کو قیام کرتا تھا، ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس عالم کی فضیلت جو فرض نماز پڑھتا ہے پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے اس طرح ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ پر مجھے فضیلت حاصل ہے'' (3)۔ اسے ابو عمر نے کتاب (بیان العلم) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند ذکر کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے میری فضیلت میری امت پر ہے'' (4)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: افضل جہاد اس کا ہے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، للمقدمہ باب فضل العلماء، جلد 1، صفحہ 20 2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

3۔ سنن دارمی، کتاب العلم، جلد 1، صفحہ 82۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، حدیث نمبر 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

جس نے مسجد بنائی اور اس میں قرآن، فقہ اور سنت کی تعلیم دیتا ہو۔ (افضل الجهاد من بنى مسجدا يعلم فيه القرآن والفقه والسنة) اسے شریک نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انہوں نے علی ازدی سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا: کیا میں تیری اس پر رہنمائی نہ کروں جو تیرے لیے جہاد سے بہتر ہے؟ تو مسجد میں آ اور اس میں قرآن کریم پڑھا اور اس میں فقہ کی تعلیم دے۔ اور ربیع نے کہا ہے میں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: علم حاصل کرنا نفلی نماز پڑھنے سے زیادہ واجب اور بہتر ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں'' (1)۔ یہ حدیث دو وجہوں کا احتمال رکھتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ وہ اس پر مہربان اور شفیق ہوتے ہیں اور اس پر رحم فرماتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر فرمایا ہے جہاں اس نے اولاد کو والدین کے ساتھ احسان کرنے کی نصیحت کی ہے فرمایا: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع اور انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) یعنی ان دونوں کے ساتھ تواضع سے پیش آ۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پر رکھنے سے مراد انہیں بچھانا ہو، کیونکہ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: وإن الملائكة تفرش أجنحتها یعنی بے شک ملائکہ جب کسی طالب علم کو دیکھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے اسے حاصل کر رہا ہے اور اس کے تمام احوال طلب علم کے موافق ہوں تو وہ اس کے لیے اس کے سفر میں اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور اسے ان پر اٹھا لیتے ہیں۔ پس جو وہاں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ ننگے پاؤں نہیں رہتا اگرچہ وہ چلتا ہے اور نہ وہ تھکتا ہے اور اس کے لیے دور کا راستہ قریب ہو جاتا ہے اور مختلف انواع کا ضرر اور تکلیف جو کسی اور مسافر کو پہنچتی ہے وہ اسے نہیں پہنچتی، جیسا کہ مرض، مال کا ضائع ہو جانا اور راستے سے بھٹک جانا۔ اور ان میں سے کچھ چیزیں سورۂ آل عمران میں قول باری تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ ... آیہ (آل عمران: 18) کے تحت گزر چکی ہیں۔

عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت سے ایک گروہ مسلسل حق پر قائم اور ثابت رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی'' (2)۔ یزید بن ہارون نے کہا ہے: اگر وہ اصحاب الحدیث نہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی تاویل میں یہ عبد الرزاق کا قول ہے، بے شک وہ اصحاب حدیث ہی ہیں۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے شیخ الاستاذ المقری النحوی المحدث ابو جعفر احمد بن محمد بن محمد القیسی القرطبی المعروف با بن ابی حجۃ رحمہ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی تاویل میں کہتے ہیں: لا يزال أهل الغرب ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة (3) (اہل غرب حق پر غالب رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے) کہ بلا شبہ وہ علماء ہیں۔ انہوں نے کہا: وہ اس لیے کہ الغرب لفظ مشترک ہے اس کا اطلاق بڑے ڈول پر بھی کیا جاتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کی سمت پر بھی اور اس کا اطلاق آنسو بہنے پر بھی کیا جاتا ہے، پس لا يزال أهل الغرب کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو بہانے

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93 2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 143 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 144

والے اس کا اور اس کے احکام کا علم رکھنے کے سبب ہمیشہ غالب رہیں گے۔ الحدیث۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:28) (اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد جو صحیح مسلم میں ہے تقویت دیتا ہے: "جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرماتا ہے اور مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر قتال کرتی رہے گی یوم قیامت تک ان پر غالب آتے ہوئے جو ان سے لڑے" (1)۔ اس بیان کا ظاہر یہ ہے کہ اس کا اول اس کے آخر کے ساتھ مربوط ہے۔ واللہ اعلم۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۝

"اے ایمان والو! جنگ کرو ان کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے اور چاہیے کہ وہ پائیں تم میں سختی اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں جہاد کی کیفیت سے آگاہ فرمایا اور یہ کہ ابتداء قریبی دشمن سے ہو پھر جو اس کے بعد قریبی ہو، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز عرب سے کیا اور جب ان سے فارغ ہوئے تو روم کا قصد کیا اور وہ شام میں تھے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے قتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے نازل ہوئی۔ پس یہ اس تدریج میں سے ہے جو قبل از اسلام تھی۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس آیت سے اس کے نازل ہونے کے وقت مراد عرب تھے، پس جب آپ ان سے فارغ ہوئے تو پھر روم وغیرہم کے بارے میں قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (التوبہ:29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر) نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے دیلم مراد لیے گئے ہیں۔ اور مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کس سے ابتدا کی جائے گی روم یا دیلم سے؟ تو انہوں نے فرمایا: روم سے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ دیلم، ترک اور روم سے جنگ کرنا ہے (2)۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ الاقرب فالاقرب اور ادنی فالادنی (قریب تر پھر اس کے بعد قریب الخ) کے قتال میں آیت اپنے عموم پر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی آیت کا ظاہر ہے۔ اور ابن عربی نے یہ اختیار کیا ہے کہ دیلم سے پہلے روم سے ابتدا کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس کی تین وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، پس ان پر حجت زیادہ اور پختہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ وہ ہمارے یعنی اہل مدینہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے شہر ان کے شہروں میں زیادہ ہیں پس ان کو ان سے بچانا زیادہ واجب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 144 2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 84، مفہوم

اور ضروری ہے(1)۔ واللہ اعلم

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً اور چاہیے کہ وہ تم میں شدت، قوت اور حمیت پائیں۔ اور فضل نے اعمش سے اور انہوں نے عاصم سے غلظة غین کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت غین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بنی تمیم کی لغت غلظة غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

”اور جب کبھی نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعض ان میں سے وہ ہیں جو (شرارتاً) کہتے ہیں کہ کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا ہے اس سورت نے ایمان، تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں“۔

اس میں مسئلہ ہے اور مراد منافقین ہیں۔ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور سورت کا معنی بھی مقدمۃ الکتاب میں گزر چکا ہے، پس اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور حسن نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا: ”بے شک ایمان کے فرائض اور سنتیں ہیں جس نے انہیں مکمل کیا تحقیق اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے انہیں مکمل نہ کیا اس نے ایمان کو مکمل نہ کیا“۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: ”اگر میں زندہ رہا تو میں تمہارے لیے ان کی وضاحت کر دوں گا اور اگر میں فوت ہو گیا تو پھر میں تمہاری صحبت پر حریص نہیں ہوں“ (2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے کہا ہے: میں نے اس سے کوئی چارہ نہ پایا کہ میں ایمان کی زیادتی کے بارے قول کروں، ورنہ میں قرآن کو رد کر دیتا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

”اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورت نے ان میں اور پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے“۔

قولہ تعالیٰ: وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی جن کے دلوں میں شک، ریب اور نفاق ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ یعنی اس سورت نے ان کے سابقہ شک پر شک کا اور سابقہ کفر پر کفر کا اضافہ کر دیا۔ اور مقاتل نے کہا ہے: ان کے سابقہ گناہ پر گناہ کو بڑھا دیا۔ تمام معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1032

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 6

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ عام قرات یا کے ساتھ ہے اور یہ منافقین کے بارے خبر ہے۔ اور یہ حمزہ اور یعقوب نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ان کے بارے خبر ہے اور خطاب مومنین کو ہے۔ اور اعمش نے أولم یروا پڑھا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے أولا تری قراءت کی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے۔

اور یُفْتَنُوْنَ علامہ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ آزمائے جاتے ہیں (1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قحط اور شدت کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور عطیہ نے کہا ہے: وہ آزمائے جاتے ہیں بیماریوں اور بھوک کے ساتھ (2)۔ اور یہ موت کی علامات اور جاسوس ہیں۔ اور حضرت قتادہ، حسن اور مجاہد نے کہا ہے: وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد اور جنگ کرنے کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ اسے دیکھتے ہیں۔

ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ پھر بھی وہ اس کے لیے توبہ نہیں کرتے۔ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ اور نہ وہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو دیکھنے لگتے ہیں ایک دوسرے کی طرف کیا دیکھ تو نہیں رہا تمہیں کوئی پھر چل دیتے ہیں، پھیر دیئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کیونکہ یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ اس میں ما صلہ ہے اور مراد منافقین ہیں، یعنی جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوں اس حال میں کہ آپ قرآن کریم پڑھ رہے ہوں جس میں ان کی فضیحت و رسوائی یا ان میں سے کسی ایک کی فضیحت و رسوائی نازل کی گئی ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف علی جهة التقریر خوف کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کیا کوئی تمہیں دیکھتا ہے جب تم اس بارے گفتگو کرتے ہو کہ وہ اسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے ان کی جہالت ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب میں سے جس پر چاہتا ہے آپ کو مطلع کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس آیت میں نظر بمعنی انبا (خبر دینا) ہے۔ اور علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس آیت میں نظر، قال کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ انْصَرَفُوْا یعنی ہدایت کے راستے سے پھر جاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جس وقت ان کے لیے ان کے اسرار و رموز کھول کر بیان کر دیئے اور ان کے مخفی اور غیبی امور پر انہیں آگاہ کر دیا تو لامحالہ انہیں تعجب، توقف اور نظر و فکر لاحق ہوئی پس اگر وہ ہدایت پا لیتے تو یقیناً وہی وقت ان کے ایمان پائے جانے کا محل تھا، لیکن وہ جب کفر پر مصمم ارادہ رکھتے تھے اور اسی کا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 87
2۔ معالم التنزیل، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 132

ارتکاب کرتے تھے تو گویا وہ اس حالت سے پھر گئے جو نظر صحیح اور ہدایت کے پائے جانے کی حالت تھی۔ اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی قراءت کو اس کے سماع کی طرح نہیں سنا جو اس کی آیات میں تدبر اور غور و فکر کرتا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (الانفال) (بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)

قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یہ ان کے لیے بددعا ہے، یعنی تم ان کے لیے یہ کہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دلوں کو خیر اور نیکی سے پھرنے کے بارے خبر ہو۔ ان کے عمل پر یہ جزا دی گئی ہو۔ اور یہ ایسا کلمہ ہے جس کے ساتھ دعا کی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ (التوبہ:30) (اللہ انہیں قتل کرے) اور بأنهم میں باصرف کا صلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یہ مکروہ ہے کہ اس طرح کہا جائے: انصرفنا من الصلوٰۃ (ہم نماز سے پھر گئے) کیونکہ قوم جب پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دل پھیر دیتا ہے البتہ تم یہ کہو: قضینا الصلوٰۃ (1) (ہم نے نماز پوری کر لی)۔ علامہ طبری نے آپ سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے اور میں اسے صحیح گمان نہیں کرتا، کیونکہ نظم کلام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جاتا: کوئی یہ نہ کہے ہم نماز سے پھر گئے (لا یقل أحد إنصرفنا من الصلواۃ) کیونکہ ایک قوم کے بارے میں یہ کہا گیا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (التوبہ:127)(2) (پھر وہ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پھیر دیئے)

محمد بن عبدالملک القیسی الواعظ نے ہمیں خبر دی ہے (انہوں نے کہا) ابوالفضل جوہری نے اس سے یہ سنتے ہوئے ہمیں بتایا جو کہتا ہے: ہم ایک جنازہ میں تھے تو اس سے ڈرانے والے نے کہا: انصرفوا رحمکم اللہ (پھر جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) تو اس نے کہا: کوئی یہ نہ کہے: انصرفوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت میں کہا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بلکہ تم یہ کہو: انقلبوا رحمکم اللہ (تم پلٹ جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مدح میں یہ کہا ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (آل عمران:174) (کہ واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے)

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہی دلوں کو پھیرنے اور تبدیل کرنے والا ہے اور وہی انہیں پلٹنے اور الٹنے والا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ مخلوق کے دل ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں اور ان کے اعضاء ان کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق تصرف کرتے ہیں اور اپنے ارادے اور اختیار کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033 2۔ ایضاً

مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کہا ہے جسے ان سے اشہب نے روایت کیا ہے: قدریہ کے رد میں یہ کتنا واضح اور بین ارشاد ہے: لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ (التوبہ: 110) (ان کی وہ عمارت جو انہوں نے اپنے دلوں میں شک کی بنا پر بنائی وہ مسلسل رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل کٹ جائیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ہے: أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے) پس یہ نہ ہمیشہ ہوسکتا ہے اور نہ اس سے رجوع ہوسکتا ہے اور نہ یہ زائل ہوسکتا ہے (1)۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾

”بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت ہی خواہش مند ہے تمہاری بھلائی کا مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (اے حبیب!) پھر اگر منہ موڑ لیں تو آپ فرمادیں کافی ہے مجھے اللہ، نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے“۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ دونوں آیتیں از روئے عہد کے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر کے قول میں ہے: قرآن کریم میں سے جو آیت آخر میں نازل ہوئی وہ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (البقرہ: 281) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس ارشاد: وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ کے بعد یہ دونوں آیتیں عہد کے اعتبار سے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ واللہ اعلم

جمہور کے نزدیک یہ خطاب عربوں کو ہے اور یہ ان پر احسانات اور نعمتیں شمار کرنے کی جہت پر ہے، کیونکہ آپ ان کی زبان میں وہ لے کر آئے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کے ساتھ بقیہ ایام میں شرف وعظمت عطا کی گئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطاب تمام عالم کو ہے اور معنی یہ ہے: لقد جاءکم رسول من البشر (تحقیق تمہارے پاس انسانوں میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرب کا کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنم دیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: اے گروہ عرب! تحقیق تمہارے پاس بنی اسماعیل میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا۔ اور دوسرا قول حجت کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لیے ہے، یعنی وہ تمہاری مثل بشر ہیں تا کہ تم ان سے (احکام) سمجھ سکو اور آپ کی اقتدا اور پیروی کرسکو۔

قولہ تعالیٰ: مِّنْ أَنفُسِكُمْ یہ ارشاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور یہ کہ آپ خالص اور سچے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033

عرب تھے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو چنا ہے اور کنانہ میں سے قریش کو چنا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب کیا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا ہے'' (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ میں نکاح سے (پیدا ہوا) ہوں اور میں زنا سے نہیں ہوں''۔ اس کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک اس میں ولادت نکاح سے ہوئی ہے، اس میں زنا نہیں ہوا۔

اور عبداللہ بن قسیط المکی نے مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ فا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ نفاسۃ سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کی گئی ہے (2)، یعنی جاء کم رسول من أشرفکم و أفضلکم (تم میں سے زیادہ شرف وفضل والا رسول تمہارے پاس تشریف لایا) یہ تیرے اس قول سے ہے: شیٔ نفیس جب وہ شی مرغوب فیہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: من أنفسکم یعنی تم میں سے بہت زیادہ اطاعت کرنے والا (رسول تمہارے پاس تشریف لایا)

قولہ تعالیٰ: عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ یعنی تمہاری مشقت آپ پر گراں گزرتی ہے۔ اور العنت کا معنی مشقت ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: اَکَمَةٌ عَنُوتٌ جب ٹیلہ مشقت آمیز اور مہلک ہو۔ اور ابن انباری نے کہا ہے: تعنت میں اصل معنی تشدد کرنا، تکلیف پہنچانا ہے پس جب عرب کہیں: فلان یتعنت فلانا و یُعنته تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں اس پر تشدد کر رہا ہے اور اسے ایسی شے کے ساتھ لازم کر رہا ہے جس کی ادائیگی اس پر مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ اس کا ذکر سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور مَا عَنِتُّمۡ میں ما مصدریہ ہے، اور یہ مبتدا ہے اور عزیز خبر مقدم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا عَنِتُّمۡ عزیز کے ساتھ فاعل ہو۔ اور عزیز، رسول کی صفت ہو، اور زیادہ صحیح ہے۔ اور اسی طرح حَرِیۡصٌ عَلَیۡكُمۡ اور رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔ فراء نے کہا ہے: اور اگر عزیزا علیہ ما عنتم حریصا رؤفا رحیما پڑھا جائے تو یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوں گے اور یہ جائز ہے۔

ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: اس کے معنی میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن جو کلام عرب سے موافقت رکھتا ہے وہ ہے کہ احمد بن محمد الازدی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا عبداللہ بن محمد خزاعی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا میں نے عمرو بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبداللہ بن داود خریبی کو رب کریم کے اس ارشاد میں یہ کہتے ہوئے سنا: لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ فرمایا (ان پر گراں گزرتا ہے) کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ حَرِیۡصٌ عَلَیۡكُمۡ فرمایا (وہ تمہارے بارے میں بہت خواہشمند ہیں) کہ تم جنت میں داخل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں بہت خواہش مند ہیں کہ تم ایمان لاؤ۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ بخیل ہیں اس بارے کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ اور الحرص علی الشیٔ کا معنی ہے الشح علیہ أن یضیع و یتلف (اس پر بخل کرنا کہ وہ اسے ضائع کرے اور تلف کرے)

بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ، الرءوف کا معنی ہے، بہت زیادہ نرمی اور شفقت کرنے والا۔ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ کا مکمل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 245 2۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 100

معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں سے دو اسم انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کے لیے بھی سوائے حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع نہیں فرمائے، پس اس نے ارشاد فرمایا: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ) اور عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: نظم آیت لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ سے مقصود تمہاری شان اور حالت ہے اور وہ تمہارے لیے شفاعت قائم کرنے والا ہے، پس تم مَا عَنِتُّمْ سے ان کا قصد نہ کرو جو تمہیں ان کی سنت پر قائم رکھیں کیونکہ تمہارا جنت میں داخل ہونا ہی انہیں راضی اور خوش کر سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر کفار اعراض کریں ان نعمتوں کے بعد بھی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے تو پھر کہو حَسْبِيَ اللّٰهُ! اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ نہیں کوئی معبود بجز اس کے میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا، اور اپنے تمام امور میں نے اسی کے سپرد کر دیئے۔ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ عرش کو خاص کیا، کیونکہ وہ اعظم المخلوقات ہے جب اس کا ذکر کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے اس میں داخل ہو جائے گی۔ اور قراءت عامہ کے مطابق العظیم مجرور ہے کیونکہ وہ عرش کی صفت ہے اور رب کی صفت بناتے ہوئے اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

یہ قراءت ابن کثیر سے مروی ہے اور یہی قراءت ابن محیصن کی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: جس نے صبح و شام سات مرتبہ پڑھا حَسْبِيَ اللّٰهُ ڭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہے اس کام میں جس کا اس نے ارادہ اور قصد کیا چاہے وہ اس میں سچا ہو یا جھوٹا اور ''نوادر الاصول'' (1) میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ہر نماز کے بعد دس کلمات کہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو ان کے پاس کافی اور جزا دینے والا پائے گا۔ ان میں سے پانچ دنیا کے لیے ہے اور پانچ آخرت کے لیے حسبی اللہ لدینی (اللہ تعالیٰ میرے دین کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لدنیاہ (اللہ تعالیٰ میری دنیا کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لما أهمنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس شے کے لیے جو مجھے غم میں ڈال دے) حسبی اللہ لمن بغی علی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو مجھ پر زیادتی کرے) حسبی اللہ لمن حسدنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو میرے ساتھ حسد کرے) حسبی اللہ لمن کادنی بسوء (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو برائی کے ساتھ میرے قریب ہو) حسبی اللہ عند الموت (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے موت کے وقت) حسبی اللہ عند المسألة فی القبر (اللہ تعالیٰ قبر میں سوال کے وقت مجھے کافی ہے) حسبی اللہ عند المیزان (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے میزان کے پاس) حسبی اللہ عند الصراط (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے پل صراط کے پاس) حسبی اللہ لا إله إلا هو علیه توکلت وإلیه أنیب (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میں نے اعتماد کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹایا جانا ہے)

1۔ نوادر الاصول، الکلمات العشر بعد الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 217

نقاش نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: عہد کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے قریب ترین قرآن کی یہ دو آیتیں ہیں: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ سے آخر سورت تک ہم اسے بیان کر چکے ہیں۔ اور یوسف بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوئی: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اور یہ آیت ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف ذکر کیا ہے، جیسا کہ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا پہلے نزول مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ اس میں بعد ہے، کیونکہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ واللہ اعلم

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصحف میں کوئی آیت ثبت نہ فرماتے تھے یہاں تک کہ اس پر دو آدمی شہادت دے دیں، پس انصار میں سے ایک آدمی سورت براءت کی آخری دو آیتیں لے کر آیا۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں تجھ سے ان پر کوئی بینہ (گواہ) طلب نہیں کروں گا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تھے، پس آپ نے ان دونوں کو لکھوا دیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو اکیلے آپ کی شہادت کے ساتھ لکھوا دیا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں اس کے صحیح ہونے پر دلیل قائم تھی، پس یہی قرینہ ہے جس نے دوسرے گواہ کی طلب سے مستغنی کر دیا، بخلاف سورۂ احزاب کی آیت کے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب: 23)

کیونکہ یہ آیت حضرت زید اور حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہما کی شہادت کے ساتھ ثابت ہوئی کہ ان دونوں نے اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ یہ بحث مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

تمت بالخیر

سورۃ توبہ کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 419

# سورۂ یونس

﴿ آیاتھا ۱۰۹ ﴾ ﴿ ۱۰ سورۃ یونس مکیۃ ۵۱ ﴾ ﴿ رکوعاتھا ۱۱ ﴾

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق سورۂ یونس علیہ السلام مکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سوائے تین آیات کے جو قول باری تعالیٰ: اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ شَكٍّ سے شروع ہو کر تین آیتوں کے آخر تک ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے: سوائے دو آیتوں کے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ شَكٍّ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورت مکیہ ہے سوائے اس ارشاد کے: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يُّؤۡمِنُ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا يُؤۡمِنُ بِهٖ یہ آیت یہود کے بارے میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: اس کے اول سے تقریباً چالیس آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اس کی بقیہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (1)۔

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ①

''الف، لام، را، یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی''۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ نحاس نے کہا ہے: اسے ابوجعفر احمد بن شعیب بن علی ابن حسین بن حریث پر پڑھا گیا تو انہوں نے کہا: ہمیں علی بن حسین نے اپنے باپ سے اور انہوں نے یزید سے یہ خبر دی ہے کہ عکرمہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: الٓرٰ، حٰمٓ اور نون یہ الرحمٰن کے حروف ہیں جو الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ تو میں نے اس کا ذکر اعمش سے کیا تو انہوں نے کہا: تیرے پاس اس کی مثل (اور) بھی ہیں اور تو مجھے اس کے بارے خبر نہ دے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا: الٓرٰ کا معنی ہے أنا الله أرى (2) (میں اللہ ہوں دیکھ رہا ہوں) نحاس نے کہا ہے: میں نے ابواسحاق کو دیکھا کہ وہ اس قول کی طرف مائل ہیں، کیونکہ سیبویہ نے عربوں سے اس کی مثل بیان کیا ہے اور شعر بھی بیان کیا ہے:

بالخير خيرات وإن شرًّا فَا ولا أريد الشرّ إلا أنْ تَا

اور حسن اور عکرمہ نے کہا ہے: الٓرٰ قسم ہے۔ اور سعید نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے: الٓرٰ سورت کا نام ہے۔ مزید کہا: قرآن کریم میں تمام حروف تہجی اسی طرح ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ سورتوں کے فواتح اور آغاز ہیں۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ حروف تنبیہ ہیں اور اسی طرح تمام حروف تہجی ہیں۔ اور الٓرٰ کو بغیر امالہ کے پڑھا گیا ہے۔ اور امالہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے تاکہ یہ حروف میں سے ما اور لہ کے مشابہ نہ ہو جائیں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 102 2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 93

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی یہ جن کا ذکر جاری ہے کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کتاب سے مراد تورات، انجیل اور سابقہ کتب ہیں (1)، کیونکہ تِلْكَ مونث غائب کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تِلْكَ بمعنی ھذہ ہے، یعنی ھذہ آیات الکتاب الحکیم (یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں) اور اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

تلك خَیْلِی منه وتلك رِكَابِی هُنَّ صُفْرٌ أولادها كالزَّبِیب

مراد ھذہ خیلی ہے (2)۔ اور الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے اور یہی صواب کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ سابقہ کتابوں کا ذکر جاری نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ الْحَكِیْمِ قرآن کی صفت ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ (ہود: 1)

یہ معنی سورۃ البقرہ کے اوّل میں ہو چکا ہے۔ اور الحکیم: جس کے ساتھ حلال و حرام، حدود اور احکام کے بارے فیصلہ کیا جائے۔ یہ ابوعبیدہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حکیم بمعنی حاکم ہے، یعنی بے شک یہ حلال وحرام کے بارے فیصلہ کرنے والا ہے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (البقرہ: 213) (اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کردے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکیم بمعنی محکوم فیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں عدل و احسان کرنے اور ذوالقربیٰ کو دینے کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس میں فحشاء اور منکر سے نہی کے بارے فیصلہ کیا اور اس کے بارے جنت کا فیصلہ کیا جس نے اطاعت کی اور اس کے بارے جہنم کا فیصلہ کیا جس نے نافرمانی کی، تو یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکیم بمعنی محکم من الباطل (جو باطل سے محفوظ ہو) ہے اس میں نہ کذب ہے اور نہ اختلاف۔ یہ فعیل بمعنی مفعل ہے، جیسے اعشیٰ کا قول ہے وہ اپنا وہ قصیدہ بیان کرتا ہے جو اس نے کہا ہے:

و غریبة تأتی الملوكَ حكیمة قد قلتها لیقال من ذا قالها

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ۝

"کیا (یہ بات) لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دو انہیں جو ایمان لائے کہ ان کے لیے مرتبہ بلند ہے ان کے رب کے ہاں، کفار نے کہا بلاشبہ یہ جادوگر ہے کھلا ہوا"۔

قولہ تعالیٰ: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یہ استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے۔ اور عَجَبًا، کان کی خبر ہے اور اس کا اسم اَنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 102 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 420

اَوْحَيْنَاۤ ہے اور یہ محل رفع میں ہے: ای کان ایحاؤنا عجبا للناس (یعنی کیا ہمارا وحی کرنا لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے) اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں عجب ہے اس بنا پر یہ کان کا اسم ہوگا۔ اور خبر اَنْ اَوْحَيْنَاۤ ہوگی۔ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اس کو رجل جیم کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کے سبب نزول کے بارے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفار نے اس وقت کہا جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا: بے شک اللہ تعالیٰ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو(1)۔ اور انہوں نے کہا: ابو طالب کے یتیم کے سوا اللہ تعالیٰ نے کوئی نہیں پایا جسے وہ رسول بنا کر بھیجے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا یعنی کیا اہل مکہ کو تعجب ہوا؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں بعث (بعد الموت) کے ذکر سے تعجب ہوا۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا یہ حرف جار کے اسقاط کے سبب محل نصب میں ہے ای بأن انذر الناس اور اسی طرح اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ بھی ہے اور نذارت بشارت اور آیت کے دوسرے الفاظ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور قَدَمَ صِدْقٍ کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد منزل صدق (صدق کی منزل، مرتبہ) ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (الاسراء: 80)

اور آپ سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد ان اعمال کا اجر حسن ہے جو انہوں نے آگے بھیجے۔ اور یہ بھی مروی ہے: قَدَمَ صِدْقٍ کا معنی ذکر اول میں سعادت کا سبقت لے جانا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی بلند مرتبہ ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

لكم قدم لا ينكر الناس أنها	مع الحسب العالي طمّت على البحر

اس میں قدم بلند مرتبہ کے معنی میں ہی ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی سلف صدق (صحیح کا عمل) ہے(2)، ربیع نے کہا ہے: اس کا معنی ثواب صدق (سچ کا ثواب) ہے۔ عطا نے کہا ہے: مراد مقام صدق ہے۔ یمان نے کہا ہے: مراد ایمان صدق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ملائکہ کی دعوت ہے (فرشتوں کا دعا کرنا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ صالح بچہ ہے جسے وہ آگے بھیجیں۔ ماوردی نے کہا ہے تاکہ صدق طاعت، صدق جزا کے موافق ہو جائے (3)۔ اور حضرت حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ شفاعت فرمانے والے ہیں جن کی اطاعت کی گئی ہے آپ ان سے آگے ہوں گے، جیسا کہ آپ نے فرمایا: أنا فرطكم على الحوض (4) (میں تم سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: هي شفاعتي توسلون بي إلى ربكم (یہ میری شفاعت ہے تم مجھے اپنے رب کی بارگاہ میں بطور وسیلہ پیش کرو گے) اور ترمذی الحکیم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر مقدم کرے گا۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: مراد حضور

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 421	2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 422	4۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کا مصیبت اور تکلیف میں پڑنا ہے۔ اور عبد العزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) اور مقاتل نے کہا ہے: مراد وہ اعمال ہیں جنہیں انہوں نے آگے بھیجا۔ اس کو علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔ الوضاح نے کہا ہے:

صلّ لذی العرش واتخذ قدمًا تُنجیك یوم العِثار والزلل

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس امت کو قبروں سے اٹھائے جانے میں اور جنت میں داخل کرنے میں مقدم کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: نحن الآخرون السابقون یوم القیامة المقضیٰ لهم قبل الخلائق (1) (ہم بعد میں آنے والے قیامت کے دن سبقت لے جانے والے ہیں ان کے لیے مخلوقات سے پہلے اس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے) اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل صالح میں سعی کرنے سے کنایہ ہے۔ پس اس کو بطور کنایہ قدم سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ انعام کا ذکر بطور کنایہ ید (ہاتھ) سے کیا جاتا ہے اور ثنا (تعریف) کو بطور کنایہ لسان (زبان) سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

لنا القدم العلیا إلیك وخلفُنا لأولنا فی طاعة الله تابع

ہمارے لیے تیری طرف عمل صالح کی کوشش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں ہمارے پیچھے آنے والے پہلوں کے تابع ہیں۔

وہ السابقة سے مراد اخلاص فی الطاعة لیتے ہیں (2)۔ واللہ اعلم۔ اور ابو عبید اور کسائی نے کہا ہے: خیر یا شر میں سے ہر سبقت لے جانے والا اعربوں کے نزدیک قدم ہے: کہا جاتا ہے: لفلان قدم فی الإسلام (فلاں اسلام میں سبقت لے جانا والا ہے) له عندی قدم صدق و قدم شر و قدم خیر (اس کی میرے نزدیک سچ میں سبقت ہے اور شر میں سبقت ہے اور خیر میں سبقت ہے)

یہ لفظ مونث ہے اور کبھی مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قدم حسن اور قدم صالحة۔ اور ابن الاعرابی نے کہا ہے: القدم سے مراد شرف میں آگے بڑھنا ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

زلّ بنو العوام عن آل الحکم وترکوا المُلك لملك ذی قدم

اور صحاح میں ہے کہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پانچ اسماء ہیں: میں محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں، میں وہ ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کفر کو مٹا دے گا اور میں وہ حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں عاقب ہوں'' (3)۔ اس سے مراد آخر الانبیاء (تمام انبیاء سے آخر میں آنے والا) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1116
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 422
3۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 501-500

خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب:40)

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ابن محیصن، ابن کثیر، کوفیوں، عاصم، حمزہ، کسائی، خلف اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم ان تمام نے لساحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور باقیوں نے لسحر پڑھا ہے اس لیے کہ یہ قرآن کی صفت ہے۔ سحر کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

''بے شک تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے، کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے سو عبادت کرو اس کی، تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ اس کی تفسیر سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ اکیلے ہر کام کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کو مقرر کرتا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اپنی خلق کی تدبیر میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ امر کے ساتھ بھیجتا ہے۔ یہ قول بھی ہے وہ امر کے سات نازل کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ہر کام کے بارے حکم دیتا ہے اور اسے کر گزرتا ہے۔ یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ پس حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی کے لیے اور حضرت میکائیل علیہ السلام بارش کے لیے، حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لیے اور حضرت عزرائیل علیہ السلام (روح) قبض کرنے کے لیے مقرر ہیں۔ اور یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کا حقیقی معنی امور کو ان کے انجام کے احکام کی بنا پر ان کے مراتب پر رکھنا ہے۔ اور یہ التدبر سے مشتق ہے اور الامر جنس امور کا اسم ہے۔ مَا مِنْ شَفِیْعٍ یہ محل رفع میں ہے اس کا معنی ما شفیع (کوئی شفاعت کرنے والا نہیں) ہے۔

اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ شفاعت کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ فلا یشفع أحد نبی ولا غیرہ إلا باذنہ سبحانہ (پس کوئی نبی شفاعت نہیں کر سکے گا اور نہ کوئی اور مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ) یہ کفار کے اس قول کا رد ہے جو انہوں نے ان کے بارے کہا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے: هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:18) (یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرما دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا پس بتوں کی شفاعت کیسے ممکن ہو سکتی ہے جو عقل ہی نہیں رکھتے؟

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ یعنی یہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں سے یہ کام کیے ہیں یہی

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 104

تمہارا رب ہے اس کے سوا تمہارا کوئی رب نہیں۔ فَاعْبُدُوْهُ پس تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اسی کے لیے عبادت کو خالص کرو۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو کیا تم غور وفکر نہیں کرتے کہ یہ اس کی مخلوقات ہیں پس تم ان سے اس کی ذات پر استدلال کرو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

”اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے، یہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ بے شک وہی ابتدا کرتا ہے پیدائش کی پھر وہی دہرائے گا اسے تاکہ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ کفر کرتے رہتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور رجوع الی اللہ کا معنی اس کی جزا کی طرف لوٹنا ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا یہ دونوں مصدر ہیں، یعنی وعد الله ذالك وعدا و حققه، حَقًّا، صدقا لاخلف فيه یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرما رکھا ہے اور اس نے اسے سچ ثابت کیا ہے اس میں اس کا خلاف قطعاً نہیں۔ اور ابراہیم بن ابی عبلہ نے وَعْدُ اللهِ حَقٌّ پڑھا ہے اور اسے استیناف پر محمول کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ بے شک وہی مٹی سے پیدائش کی ابتدا کرتا ہے۔ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے گا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہی اسے پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے مارتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھانے کے لیے اسے زندہ کرے گا(1) یا بے شک وہی اسے پانی سے پیدا کرتا ہے پھر اسے ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لوٹاتا ہے۔

یزید بن قعقاع نے أنه يبدأ الخلق پڑھا ہے اس میں ان محل نصب میں ہوگا۔ ای وعدکم أنه يبدأ الخلق (اس نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ وہی پیدائش کی ابتدا کرے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو لأنه يبدأ الخلق (کیونکہ وہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے)۔ جیسے کہا جاتا ہے: لَبَّيْكَ أنَّ الحمد والنعمة لك اور اس میں کسرہ عمدہ ہے اور فراء نے جائز قرار دیا ہے کہ ان محل رفع میں ہو اور وہ اسم ہو۔ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہوگی حقا إبداؤه الخلق اس کی پیدائش کی ابتداء کرنا حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ تاکہ وہ انہیں عدل کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ یعنی کافروں کے لیے ایسا گرم پانی ہوگا جس کی گرمی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوگی، الحميمة بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: حَمَمْت الماء أحُمّه فهو حميم، ای محموم۔ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے (سخت گرم کیا ہوا) اور عربوں کے نزدیک ہر گرم کی ہوئی شی حمیم کہلاتی ہے۔ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی دردناک عذاب، اس کا درد اور تکلیف ان کے دلوں تک پہنچے گی۔ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب (یہ عذاب ہوگا) بڑے بڑے قریش یہ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 99

اعتراف کرتے تھے کہ الله تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس ان کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے اور فرمایا ہے: جو ابتداء پر قادر ہے وہ فناہ کرنے کے بعد یا اجزاء کو متفرق کرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤

''وہی ہے جس نے بنایا سورج کو درخشاں اور چاند کو نور اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تا کہ تم جان لو گنتی برسوں کی اور حساب، نہیں پیدا فرمایا الله تعالیٰ نے اسے مگر حق کے ساتھ، تفصیل سے بیان کرتا ہے (اپنی قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً یہ دونوں (الشمس اور ضیاء) مفعول ہیں، ضیاء بمعنی مضیئة (روشن کرنے والا) اور اسے مونث ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ مصدر ہے، یا پھر یہ بمعنی ذات ضیاء ہے (روشنی والا) وَّالْقَمَرَ نُوْرًا یہ ماقبل پر معطوف ہے۔ یہ بھی نور بمعنی منیرا یا ذانور ہے (نور والا) پس ضیاء سے مراد وہ روشنی ہے جو چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اور نور وہ ہے جو ظاہر ہوتا ہے اور چھپ جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک ہی اصل نار سے ہے۔ اور ضیاء ضؤ کی جمع ہے، جیسا سیاط سوط (کوڑا) کی جمع ہے اور حیاض حوض کی جمع ہے۔ قنبل نے ابن کثیر سے ضئاء یا کو ہمزہ سے بدل کر پڑھا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی یاء واؤ مفتوحہ تھی اور یہ فعل کا عین کلمہ ہے، اس کی اصل ضواء ہے پھر اس میں قلب کیا گیا اور اسے یاء بنا دیا گیا جیسا کہ صیام اور قیام میں کیا گیا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے ضئاء ہمزہ کے ساتھ پڑھا تو وہ قلب کیا گیا ہے، الف کے بعد والے ہمزہ کو مقدم کیا گیا تو وہ الف سے پہلے آ گیا اور ضیایا ہو گیا، پھر یا کو ہمزہ سے بدل دیا گیا کیونکہ وہ الف زائدہ کے بعد واقع ہے۔ اسی طرح اگر تو مقدر مان لے کہ یاء جس وقت مؤخر ہو تو وہ اس واؤ کی طرف لوٹ جائے گی جس سے وہ بدلی تھی۔ اور پھر وہ بھی ہمزہ سے بدل جائے گی پس اس کا وزن فلاع ہے جو فعال سے مقلوب ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک سورج اور چاند ان دونوں کے چہرے سات آسمانوں کے باسیوں کو اور ان کی پشتیں سات زمینوں کے رہنے والوں کو روشن کرتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ یعنی اس کو منزلوں والا بنایا یا اس کی منزلیں مقرر کیں۔ پھر کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وقدرھما (یعنی دونوں کے لیے منزلیں مقرر کیں) لیکن ایجاز و اختصار کے لیے ضمیر واحد ذکر کی، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعة: 11) (اور (بعض لوگوں نے) جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو بکھر گئے اس کی طرف) اور جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأی مختلِفُ

ہم اس کے ساتھ راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ راضی ہے جو تیرے پاس ہے اور رائے مختلف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ اکیلے چاند کے بارے میں خبر ہو، کیونکہ اسی کے ساتھ ان مہینوں کو شمار کیا جاتا ہے جن پر معاملات وغیرہ میں عمل ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور سورۂ یاسین میں ہے: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ

(یٰسین: 39) یعنی مہینے کے عدد پر اس کی منزلیں مقرر کیں اور وہ اٹھائیس منزلیں ہیں۔ اور دو دن (اس کے) نقصان (کم ہونے) اور محاق (دکھائی نہ دینے) کے لیے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان وہاں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ دو سورج بناتا ایک سورج دن کے لیے اور ایک سورج رات کے لیے تو ان دونوں میں نہ تاریکی ہوتی اور نہ رات، نہ سالوں کی گنتی اور مہینوں کا حساب معلوم ہوتا۔ اور السِّنِيْنَ کی واحد سنۃ ہے۔ اور بعض عرب کہتے ہیں: جمع سنوات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: سنہات ہے اور تصغیر سنیۃ اور سنیہۃ ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق سے محض حکمت اور صواب کا ارادہ کیا ہے اور اپنی صنعت و حکمت کے اظہار کے لیے اور اپنی قدرت اور اپنے علم پر دلالت کرنے کے لیے ایسا کیا اور تاکہ ہر نفس کو اس کی جزا دی جائے جو اس نے کمایا۔ اور یہی حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ آیات کی تفصیل سے مراد ان کی تبیین اور وضاحت کرنا ہے تاکہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کیا جائے، اس لیے کہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ اور دن اپنی روشنی کے ساتھ خاص ہے لیکن نہ یہ ان دونوں کا استحقاق ہے اور نہ اللہ کریم پر واجب ہے، پس یہ ان کے لیے اس پر دلیل ہے کہ یہ مرید (ارادہ کرنے والے) کے ارادہ سے ہوا ہے۔ اور ابن کثیر، ابوعمرو، حفص اور یعقوب نے یفصل یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوعبید اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ اور اس کے بعد یہ ہے: وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ پس یہ اس کے تابع ہوگا۔ اور ابن السمیقع نے تُفَصَّل تاء کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ فعل مجہول پڑھا ہے۔ اور الْاٰيٰتِ کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ نُفَصِّل پڑھا ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

"بے شک گردش لیل و نہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں (ان میں اس کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو متقی ہے"۔

سورۃ البقرہ وغیرہ میں اس کا معنی و مفہوم گزر چکا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک اس کا سبب نزول یہ ہے کہ اہل مکہ نے علامت و نشانی کے بارے سوال کیا تو انہیں جواب یہ دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں تامل اور نظر و فکر کریں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: لِقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ یعنی اس قوم کے لیے جو شرک سے بچتے ہیں۔ پس جس نے شرک کا ارتکاب کیا اور راہنمائی حاصل نہ کی تو پھر یہ نشانی (آیت) اس کے لیے نشانی نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

''بے شک وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی اور خوش وخرم ہیں دنیوی زندگی سے اور مطمئن ہو گئے ہیں اس (کے ساز وسامان) سے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت برتتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے بہ سبب ان عملوں کے جو وہ کماتے رہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا اس میں یَرْجُوْنَ بمعنی یخافون ہے یعنی بے شک وہ لوگ جو ڈرتے نہیں۔ اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

إذا لسعته النحل لم يَرْجُ لَسْعَها و خالفها فی بَيْتِ نُوبٍ عواسل(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یَرْجُوْنَ بمعنی یطمعون ہے بے شک وہ لوگ جو حرص اور طمع نہیں رکھتے اور اس معنی میں ایک دوسرے شاعر کا قول ہے:

أيرجو بنو مروان سمعی وطاعتی وقومی تميمٌ والفلاةُ ورائيا(2)

پس رجاء خوف اور طمع کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی نہ وہ سزا سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی حرص رکھتے ہیں۔ اور عذاب اور ثواب سے ملنے کو ان دونوں کو تفخیم کی خاطر لقاء اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لقاء اپنے ظاہر معنی پر بھی جاری ہے اور وہ رؤیت (دیکھنا) ہے یعنی وہ جو ہماری رؤیت کی حرص اور طمع نہیں رکھتے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: رجاء خوف کے معنی میں واقع نہیں ہوتا مگر تب جب انکار کے ساتھ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ (نوح) اور بعض نے یہ کہا ہے: بلکہ ہر جگہ اس معنی میں واقع ہو سکتا ہے یہ معنی اس پر دلیل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ آخرت کے عوض اس دنیوی زندگی سے خوش وخرم ہیں پس انہوں نے اسی کے لیے عمل کیے۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا یعنی وہ اس کے ساتھ خوش ہو گئے اور اسی میں راحت وسکون پالیا، اطمأن کی اصل طأمن طمانينة ہے پس اس کی میم کو مقدم کیا گیا اور نون اور الف وصل (ہمزہ وصل) زائد کر دیا گیا، اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا اور وہ لوگ جو ہمارے دلائل سے غٰفِلُوْنَ غفلت برتتے ہیں یعنی نہ وہ ان کا اعتبار کرتے ہیں اور نہ ان میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ دوزخ ہے بسبب کفر اور تکذیب کے جس کا ارتکاب وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث، رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں نعمت (وسرور) کے باغوں میں''۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 423
2۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یقیناً وہ لوگ جنہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ اور نیک عمل کیے ان کے لیے ان کا رب ہدایت میں اضافہ فرما دے گا، جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: 17) (اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے الله تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی ایسے مکان کی طرف کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور ابو روق نے کہا ہے: ان کے ایمان کے باعث ان کا رب ان کی رہنمائی جنت کی طرف کر دے گا۔ اور عطیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ وہ انہیں ثواب اور جزا دے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ ان کا رب نور کے ساتھ پل صراط پر ان کی راہنمائی جنت کی طرف کرے گا، (یعنی) وہ ان کے لیے ایک نور پیدا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ چلتے رہیں گے (1)۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو اسے تقویت پہنچاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کو اس کا عمل انتہائی حسین صورت میں ملے گا پس وہ اسے مانوس کرے گا اور اس کی راہنمائی کرے گا اور کافر کا عمل انتہائی قبیح صورت میں اس سے ملے گا پس وہ اسے وحشت زدہ کر دے گا اور اسے گمراہ کر دے گا'' (2)۔ یہ حدیث کا معنی ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: ان کا رب ان کے عمل کو ان کے لیے ہادی بنا دے گا۔ اور حسن نے کہا ہے: یَهْدِیْهِمْ، یرحمهم کے معنی میں ہے (یعنی ان کا رب ان پر رحم فرمائے گا)

قولہ تعالیٰ: تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کہا گیا ہے کہ کلام میں واؤ محذوف ہے، ای و تجری من تحتهم یعنی ان کے باغوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے تختوں اور محلات کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اور سیر و تفریح اور کشادگی میں یہی احسن ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿10﴾

''(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے الله اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں الله تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، دَعْوٰىهُمْ یعنی ان کی پکار (اور دعا) اور الدعوی دعا یدعو کا مصدر ہے، جیسا الشکوی شکا یشکو کا مصدر ہے، یعنی جنت میں ان کی دعا اور پکار یہ ہوگی کہ وہ کہیں گے پاک ہے تو اے الله۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ کوئی چیز مانگنے کا ارادہ کریں گے تو وہ سوال لفظ تسبیح سے شروع کریں گے اور اسے حمد کے ساتھ ختم کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی پکار اور ندا خدام کو ہوگی تاکہ وہ ان کے پاس وہ چیز لے کر آئیں جو ان کی خواہش اور چاہت ہے، پھر وہ الله تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں گے اور یہ قول بھی ہے: بے شک یہاں دعا بمعنی تمنی ہے الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَكُمْ فِیْهَا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11 صفحہ 104 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2 صفحہ 24-423

مَا تَدَّعُوْنَ (حم السجدہ) ای ما تتمنون (اور تمہارے لیے اس میں وہ ہوگا جس کی تم تمنا اور خواہش کرو گے)۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی دعا یا فرشتے کی دعا یا ان میں سے بعض کی بعض کے لیے دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور تحیہ کا مکمل مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ کہا گیا ہے: بےشک اہل جنت کے پاس سے جب کوئی پرندہ گزرے گا اور وہ اس کی خواہش کریں گے تو کہیں گے: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (پاک ہے تو اے اللہ!) تو فرشتہ اسے ان کے پاس لے آئے گا جس کی انہوں نے خواہش کی ہو گی، پس جب وہ کھا چکیں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں گے پس ان کا سوال لفظ تسبیح کے ساتھ ہوگا اور اس کا اختتام لفظ حمد کے ساتھ ہوگا۔ اور ابوعبید نے ان کو تخفیف کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے مابعد کو رفع دیا ہے۔ فرمایا: بلاشبہ ہم نے انہیں دیکھا ہے انہوں نے اسے اختیار کیا ہے اور انہوں نے اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے درمیان فرق کیا ہے: اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ (النور: 7) اور اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ (النور: 9) کیونکہ انہوں نے حکایت کا ارادہ کیا ہے جس وقت کہا جائے گا الحمدللہ۔

نحاس نے کہا ہے: خلیل اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اور اس کا معنی ہے انه الحمد لله۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی جائز ہے اس میں خفیہ ثقیلہ کے عمل کی طرح عمل کرتا ہے، لیکن رفع عمدہ اور زیادہ بہتر ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابوحاتم نے بیان کیا ہے کہ بلال بن ابی بردہ نے وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ابن محیصن کی قراءت ہے، اسے غزنوی نے بیان کیا ہے کیونکہ وہ ان سے بیان کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سبحان اللہ، الحمد للہ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو دعا کا نام دیا جا رہا ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت اور کرب کے وقت کہا کرتے تھے: لا الہ الا اللہ العظیم الحلیم، لا الہ إلا اللہ رب العرش العظیم، لا الہ إلا اللہ ربّ السلوات و رب الأرض و رب العرش الکریم (1) علامہ طبری نے کہا ہے: سلف اس دعا کے ساتھ پکارتے تھے اور اسے دعاء الکرب کا نام دیتے تھے۔ اور ابن عیینہ نے کہا ہے اس حال میں کہ ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کیا تو جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جب میرے بندے کو مجھ سے کچھ مانگنے سے ثناء مشغول رکھتی ہے تو میں اسے اس سے افضل اور بہتر عطا فرماتا ہوں جو میں سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں''۔ اور وہ چیز جس سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہ اس کا نام دعا رکھا جاتا ہے اگرچہ اس میں دعا کے معنی کی کوئی شے نہیں ہے تو بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے ہے اور اس کی ثنا اور تعریف کی بنا پر ہے، جیسا کہ وہ روایت جسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ مچھلی والے کی دعا ہے جب انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ مچھلی کے پیٹ میں دعا کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء) پس اب کوئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 939

مسلمان ان الفاظ کے ساتھ کسی شے کے بارے میں ہرگز دعا نہیں کرے گا مگر اس کی دعا قبول کی جائے گی (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ سنت میں سے ہے کہ جو بندہ کھانا شروع کرے تو وہ اہل جنت کی اقتداء کرتے ہوئے کھانے، پینے کے آغاز میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھے اور جب اس سے فارغ ہو تو الحمد للہ کہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو ایک لقمہ کھاتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے یا ایک گھونٹ پانی پیتا ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ دعا مانگنے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنی دعا کے آخر میں اسی طرح کہے جو اہل جنت کہیں گے۔ ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے اور بہت خوب ہے کہ وہ سورۂ والصافات کی آخری آیات پڑھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور پاکی کو جامع ہیں ان چیزوں سے جو اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اور مرسلین پر سلام بھیجنے کو اور اختتام الحمد للہ رب العالمین کے ساتھ ہے۔

وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَہُمۡ بِالۡخَیۡرِ لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۱﴾

''اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لیے تو پوری کردی گئی ہوتی ان کی میعاد (لیکن یوں نہیں بلکہ) ہم چھوڑے رکھتے ہیں انہیں جو توقع نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَہُمۡ بِالۡخَیۡرِ لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتا جیسے وہ ثواب اور بھلائی کے لیے جلد بازی کرتے ہیں تو وہ یقیناً مرچکے ہوتے، کیونکہ وہ دنیا میں ضعیف اور کمزور مخلوق کی صورت میں پیدا کیے گئے ہیں اور قیامت کے دن وہ اس طرح نہ ہوں گے، کیونکہ قیامت کے دن انہیں باقی رہنے کے لیے تخلیق کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ مکروہ اور تکلیف دہ دعا کو قبول کرنے میں اسی طرح کرتا جیسے وہ چاہتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کی دعا قبول کرنے میں وہ ان کے ساتھ کرے تو یقیناً وہ انہیں ہلاک کرچکا ہوتا۔ اور لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ کا معنی یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ کافر کے ساتھ خاص ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کافر کو اس کے کفر پر عذاب دینے میں جلدی کرتا جیسا کہ اس نے اس کو مال اور اولاد میں سے دنیا کی بھلائی عطا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 188، (بتغیر قلیل) ایضاً، حدیث نمبر 3427، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، جلد 2، صفحہ 352

کرنے میں جلدی کی ہے تو یقیناً وہ اس کے لیے اس کی میعاد پوری کرنے میں جلدی کرتا تاکہ وہ آخرت کے عذاب کو جلدی پائے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے (1)۔

مقاتل نے کہا ہے: وہ نضر بن حارث کا یہ قول ہے: اے اللہ! اگر یہی تیری طرف سے سچ ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، پس اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے اس کی جلدی کرتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو جاتے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی ذات یا اپنے مال یا اپنی اولاد کو بددعا دیتا ہے جب وہ غصے میں ہوتا ہے: اے اللہ اسے ہلاک کر دے، اے اللہ! اس کے لیے اس میں برکت نہ دے اور اس پر لعنت بھیج یا اسی طرح کی اور بد دعائیں (2)۔ پس اگر اسے اس کی طرف سے قبول کر لیا جائے جیسے خیر اور بھلائی کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے تو ان کی میعاد پوری کر دی گئی ہوتی۔ پس یہ آیت اخلاق ذمیمہ کی مذمت کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ یہ ان بعض لوگوں کے بارے میں ہے جو خیر اور بھلائی کی دعا کرتے ہیں اور اس کی جلدی قبولیت کی خواہش رکھتے ہیں پھر کبھی کبھار بد اخلاقی انہیں شر کے بارے دعا پر ابھارتی ہے۔ پس اگر وہ ان کے لیے (اس کے بارے) جلدی کرتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔

**مسئلہ نمبر** 2۔ اس دعا کی قبولیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک میں نے اللہ تعالیٰ عزوجل سے التجا کی ہے کہ وہ کسی دوست کی دعا اپنے دوست کے خلاف قبول نہ کرے''۔ اور شہر بن حوشب نے کہا ہے: میں نے بعض کتب میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ملائکہ کو فرماتا ہے جو بندوں پر مقرر کیے گئے ہیں: تم میرے بندے کے خلاف اس حال میں کچھ نہ لکھو جو اسے غمزدہ کر کے کسی شی پر مجبور کر دے۔ یہ اللہ تالیٰ کی جانب سے اس پر لطف وعنایت ہے۔

بعض نے کہا ہے: کبھی ایسی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔ اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب کے آخر میں بیان کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں غزوۂ بطن بواط (بواط جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے) میں چلے اور آپ مجدی بن عمرو جہنی کو تلاش کر رہے تھے اور ہم میں سے پانچ، چھ یا سات آدمیوں کے پاس ایک اونٹ تھا اور ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، پس انصار میں سے ایک آدمی کی باری اونٹ پر سوار ہونے کی آئی پس اس نے اسے بٹھایا اور اس پر سوار ہو گیا، پھر اس نے اسے اٹھایا اس نے توقف کیا اور نہ اٹھا۔ پس اس نے اسے کہا: شاء (یعنی اونٹ کو جھڑکا) اللہ تعالیٰ تجھ پر لعنت کرے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے اونٹ کو لعنت کرنے والا کون ہے''؟ اس نے کہا: میں ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس سے نیچے اتر آ اور تو ملعون کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ چل۔ تم نہ بددعا دو اپنی ذاتوں کو اور نہ بددعا دو اپنی اولاد کو اور نہ بددعا کرو اپنے مالوں کے لیے تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ساعت میں موافقت نہ کرو کہ جس میں اس سے عطا کا سوال کیا جاتا ہے اور تمہارے لیے وہ اسے قبول فرمالیتا ہے'' (3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 425　2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 108　3۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 416

کتاب مسلم کے علاوہ کسی اور میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے تو ایک آدمی نے اپنی اونٹنی کو لعنت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہاں ہے وہ جس نے اپنی ناقہ پر لعنت کی ہے؟"۔ تو اس آدمی نے کہا: میں یہ ہوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اسے اپنے پیچھے چھوڑ دے تحقیق اس کے حق میں تیری بددعا قبول ہو چکی ہے"۔ اسے حلیمی نے منہاج الدین میں ذکر کیا ہے، شأ، یہ لفظ سین اور شین دونوں کے ساتھ روایت کیا جاتا ہے اور اس کا معنی اونٹ کو جھڑکنا ہے اور یہ بمعنی سر (تو چل) ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰهُ علماء نے بیان کیا ہے کہ تعجیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور استعجال (عجلت کا مطالبہ) بندے کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے: یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور کلام میں حذف ہے ای ولو یعجل الله للناس الشر تعجیلا مثل إستعجالهم بالخیر (اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں اتنی ہی جلدی کرے جیسے وہ انہیں خیر اور بھلائی پہنچانے کے لیے جلدی کرتا ہے) پھر تعجیلا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا، پھر اس کی صفت کو حذف کر دیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اخفش اور فراء کے قول کے مطابق یہ کاستعجالهم ہے پھر کاف کو حذف کر دیا اور اسے نصب دے دی۔ فراء نے کہا ہے: جیسے تو کہتا ہے: ضربت زیدٌ اضربك ای کضربك (یعنی اس میں کاف کو حذف کیا گیا ہے)

اور ابن عامر نے لَقُضِىَ اِلَیۡهِمۡ اَجَلُهُمۡ پڑھا ہے اور یہ قراءت عمدہ ہے کیونکہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ۔

قولہ تعالیٰ: فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا یعنی وہ انہیں شر پہنچانے میں جلدی نہیں کرتا بسا اوقات ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کر لیتا ہے یا ان کی پشتوں سے کوئی مومن پیدا ہوتا ہے۔ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ تاکہ وہ اپنی سرکشی میں متحیر رہیں۔ طغیان کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اہل مکہ مراد ہیں۔ اور یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا: اَللّٰهُمَّ اِنۡ کَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ الآیہ (الانفال: 32) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، واللہ اعلم

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا کَشَفۡنَا عَنۡهُ ضُرَّهٗ مَرَّ کَاَنۡ لَّمۡ یَدۡعُنَاۤ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

"اور جب پہنچتی ہے انسانوں کو کوئی تکلیف (تو اس وقت) پکارتا ہے ہمیں لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا ہو، پھر جب ہم دور کر دیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف (تو) چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں (کبھی) پکارا ہی نہیں تھا کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی، اسی طرح آراستہ کر دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لیے وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ کہا گیا ہے کہ یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ابو

حذیفہ بن مغیرہ مشرک ہے، اسے کوئی تکلیف، شدت اور مشقت پہنچی تھی۔ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ وہ ہمیں پکارتا اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے۔

اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا (یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہو) اس سے مراد اس کے جمیع حالات ہیں، کیونکہ انسان ان تین حالات میں سے کسی ایک سے بھاگ نہیں سکتا (1)۔ بعض نے کہا ہے: بے شک آغاز لیٹنے سے کیا ہے کیونکہ اسے امر غالب میں تکلیف جتنی شدید ترین ہوتی ہے، تو وہ اتنا زیادہ پکارتا ہے اور اس کی کوشش میں بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے، پھر بیٹھنے کا ذکر کیا اور پھر کھڑے ہونے کا۔

فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُ ضُرَّهٗ مَرَّ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے یعنی اپنے کفر پر برقرار رہتا ہے اور شکر ادا نہیں کرتا اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت سے مخلوط موحدین کی صفت ہے، جب اسے عافیت پہنچتی ہے تو وہ گناہوں کی اسی روش پر چل دیتا ہے جس پر وہ پہلے تھا۔ پس یہ آیت کافر اور غیر کافر تمام کو عام ہے۔ كَاَنۡ لَّمۡ يَدۡعُنَاۤ اخفش نے کہا: یہ کان ثقیلہ سے مخففہ بنایا گیا ہے اور اس کا معنی کأنه ہے اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

وَیْ کَاَنْ مَنْ یکن له نَشَبٌ یُحْبَبُ  ومن یفتقر یعش عیش ضُرّ

كَذٰلِكَ زُيِّنَ یعنی جس طرح اس کے لیے تکلیف اور آزمائش کے وقت دعا کو اور آسودگی اور خوشحالی کے وقت اعراض کو آراستہ کیا گیا۔ زُيِّنَ لِلۡمُسۡرِفِيۡنَ اسی طرح مشرکوں کے لیے کفر و معاصی میں سے ان کے اعمال آراستہ کر دیئے گئے۔ اور اس تزیین کے بارے میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہو۔ اور اس کا گمراہ کرنا اس کا کفر کی طرف دعوت دینا ہے۔

**وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾**

''اور بے شک ہم نے ہلاک کر دیا کئی قوموں کو جو تم سے پہلے تھیں جب وہ زیادتیاں کرنے لگے۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرم قوم کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا یعنی جب اہل مکہ سے قبل گزشتہ امتوں نے زیادتیاں کیں تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ لَمَّا ظَلَمُوۡا یعنی جب انہوں نے کفر اور شرک کیا۔ وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح معجزات اور روشن دلیلیں لے کر۔ وَ مَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر دیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ الله تعالیٰ کفار مکہ کو گزشتہ امتوں کے عذاب سے ڈرا رہا ہے، یعنی ہم ان کے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کے سبب انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہیں لیکن ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 142

وہ بھی ہیں جو ایمان لے آئیں گے یا ان کی صلبوں سے وہ نکلیں گے جو ایمان لائیں گے۔ یہ آیت ان گمراہ لوگوں کا رد ہے جو ہدایت اور ایمان کے مخلوق ہونے کا قول کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا کا معنی ہے یعنی الله تعالیٰ نے ان کے کفر پر انہیں جزا یہ دی کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ (کم اور خلائف) دونوں مفعول ہیں۔ اور الخلائف خلیفہ کی جمع ہے اور اس کا ذکر سورۂ انعام کے آخر میں گزر چکا ہے، یعنی ہم نے تمہیں زمین میں سکونت اختیار کرنے والا بنایا۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہلاک ہونے والی بستیوں کے بعد۔ لِنَنْظُرَ یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اور اس کی نظائر اور مثالیں پہلے گزر چکی ہیں، یعنی تاکہ تم سے وہ عمل واقع ہو جس کے سبب تم ثواب اور عقاب کے مستحق بن جاؤ گے اور وہ اسے مسلسل غیب جانتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ وہ تمہارے ساتھ اظہار عدل کے لیے مخیر (امتحان لینے والا) کے معاملہ کی طرح معاملہ کرے۔ اور یہ قول بھی ہے: نظر کی نسبت رسل کی طرف ہے، یعنی تاکہ ہمارے رسول اور ہمارے اولیاء دیکھ لیں تمہارے اعمال کیسے ہیں۔ اور كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کے سبب منصوب ہے، کیونکہ استفہام کے لیے صدر کلام ضروری ہے اور اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کر سکتا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری روشن آیتیں (تو) کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کر دیجئے اسی میں، فرمایئے مجھے اختیار نہیں کہ ردوبدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے، میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف، میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا، تُتْلٰى یعنی تقرء (اور جب ان پر پڑھی جاتی ہیں ہماری آیات) اور بینات حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی واضح اور بین آیتیں جن میں نہ کوئی التباس ہے اور نہ کوئی اشکال۔ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یعنی جو نہ یوم بعث اور حساب سے ڈرتے ہیں اور نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں (وہ کہنے لگتے ہیں) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد مکہ کے رہنے والے مشرک ہیں (1)۔ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 144

تبدیلی کرنے اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں فرق یہ ہے کہ اس کو تبدیل کرنے میں یہ جائز نہیں کہ یہ اس کے ساتھ ہو اور اس کے علاوہ دوسرا (قرآن) لانے میں یہ جائز ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ ہو۔ ان کے اس قول میں تین وجوہ ہیں۔ (۱) کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ وہ وعدہ کو وعید میں اور وعید کو وعدہ میں، حلال کو حرام میں اور حرام کو حلال میں بدل دیں، یہ ابن جریر طبری کا قول ہے۔ (۲) انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ ان کے معبودوں کے عیوب کے بارے میں اور ان کے عقل مندوں کو احمق اور بے وقوف کہے جانے کے بارے میں جو کچھ قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کردیں، ختم کر دیں۔ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ (۳) کہ انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ موت کے بعد زندہ کیے جانے اور اٹھائے جانے کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے اسے ساقط کردیں، زائل کردیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجئے میرے اختیار میں نہیں۔ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ کہ میں اپنی طرف سے اس میں رد و بدل کردوں، جیسا کہ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے رد کردوں اور جھٹلا دوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ یعنی میں اتباع نہیں کرتا مگر اس کی جس کی میں تم پر وعدہ و وعید، حرام و حلال اور امر و نہی میں سے تلاوت کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اور اس استدلال میں خاصا بعد ہے، کیونکہ آیت مشرکوں کے اس مطالبے کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ نظم (والفاظ) کے اعتبار سے قرآن کی مثل لاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر قادر نہیں اور انہوں نے آپ سے الفاظ کے بغیر حکم تبدیل کرنے کا سوال نہیں کیا، کیونکہ وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں تبھی ہوسکتا ہے جب یہ وحی ہو آپ کی اپنی مرضی سے نہ ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ یعنی میں ڈرتا ہوں اگر میں اس میں تغیر و تبدل کر کے یا اس کے مطابق عمل ترک کر کے اپنے رب کی مخالفت کروں۔ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ یعنی یوم قیامت کے عذاب سے (2)۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

”آپ فرما دیجئے اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو میں نہ پڑھتا اسے تم پر اور نہ وہ آگاہ کرتا تمہیں اس سے، میں تو گزار چکا ہوں تمہارے درمیان عمر (کا ایک حصہ) اس سے پہلے، کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ مجھے تمہاری طرف نہ بھیجتا اور (نہ) میں تم پر قرآن کریم پڑھتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بارے آگاہ کرتا اور نہ تمہیں خبر دیتا۔ کہا جاتا ہے: دریتُ الشیء (میں نے کسی شی کو جان لیا) و أدرانی اللہ بہ (اور اللہ نے مجھے اس کے بارے آگاہ کیا) و دریتہ و دریتُ بہ (میں نے اسے جان لیا اور مجھے اس کے بارے آگاہ کیا گیا) اور درایت میں دھوکہ اور فریب دینا کا معنی پایا جاتا ہے اور اسی سے ہے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 426 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 427

دریتُ الرجل یعنی ختلته (میں نے اسے دھوکا دیا)۔ اسی وجہ سے الداری مطلق اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں استعمال کیا جا سکتا اور یہ بھی کہ اس میں توقیف نہیں ہے۔ اور ابن کثیر نے ولأدراکم بہ لام اور ہمزہ کے درمیان بغیر الف کے اسے پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں اس کے بارے آگاہ کر دیتا بغیر اس کے کہ میں تم پر اس کی تلاوت کرتا پس یہ لام تاکید ہے جو فعل کے الف پر داخل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے ولا أدراتکم بہ یاء کو الف سے تبدیل کر کے پڑھا ہے، اور یہ بنی عقیل کی لغت پر ہے، شاعر نے کہا ہے:

لعمرك ما أخشى التّصعلك مابقي　　على الأرض قيْسِي يسوق الأباعرا(1)

اور دوسرے نے کہا ہے:

ألا آذنتْ أهلَ اليمامة طيّئ　　بحرب كناصات الأغرّ المشهّرِ(2)

ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے عمرو بن علاء سے پوچھا: کیا حسن کی قراءت ولا ادراتکم بہ کی کوئی وجہ اور دلیل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: حسن کی قراءت ولا أدراتکم بہ کی سوائے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ابو عبید کے قول کا معنی ہے: کوئی وجہ نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے غلط ہونے پر، کیونکہ کہا جاتا ہے: دریتُ أي علمتُ (میں نے جان لیا) اور أدریت غیری (میں نے اپنے غیر کو آگاہ کیا) اور کہا جاتا ہے: درأت أي دفعت (میں نے دور کیا، میں نے دفاع کیا) پس دریت اور درآت کے درمیان غلطی واقع ہو رہی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حسن اس میں ولا أدریتکم بہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس انہوں نے بنی حارث بن کعب کی لغت کے مطابق یا کو الف سے بدل دیا ہے، (کیونکہ) وہ یا کو الف سے بدل دیتے ہیں جب اس کا ماقبل مفتوح ہو، جیسا کہ اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ (طٰہٰ: 63)

مہدوی نے کہا ہے: جس نے أدراتکم پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمزہ کی اصل یا ہے پس اس کی اصل أدریتکم ہے پھر یاء کو الف سے بدل دیا گیا اگرچہ وہ ساکن ہے، جیسا کہ کہا: یایس یہ اصل میں ییبس ہے۔ اور طائی اصل میں طیئ ہے۔ پھر الف کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے العالم میں العألم اور الحاتم اور الحأتم کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور حسن سے ایک روایت ولا أدرأتکم ہمزہ کے ساتھ بھی ہے اور ابو حاتم وغیرہ نے کلام کی ہے کہ وہ ہمزہ کے بغیر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ درأت بمعنی دفعت سے ہو، یعنی میں تمہیں حکم نہ دیتا تھا کہ تم دور ہو جاؤ اور قرآن کے بدلے کفر کو چھوڑ دو۔

قولہ تعالیٰ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا یہ ظرف ہے، یعنی زمانے کی ایک مقدار اور وہ چالیس برس ہے (یعنی میں تم میں اتنا عرصہ گزار چکا ہوں) مِّنْ قَبْلِهٖ قرآن کریم سے پہلے۔ تم مجھے صدق اور امانت کے سبب پہچانتے ہو، نہ میں پڑھتا ہوں اور نہ لکھتا ہوں، پھر میں تمہارے معجزات لے کر آیا۔

---

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 113　　2۔ ایضاً

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ نہیں ہو سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہ کہ میری جانب سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا کا معنی ہے میں نے اپنی جوانی کی مدت تمہارے درمیان گزاری ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی، کیا تم اب مجھ سے یہ چاہتے ہو حالانکہ میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کروں اور میں اس میں ردو بدل کروں جو وہ مجھ پر نازل فرماتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: آپ نے ان میں چالیس برس گزارے اور دو سال اس حال میں گزارے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب دیکھتے رہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باسٹھ برس کی عمر میں وصال فرمایا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

''پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افتراء باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا یا جھٹلائے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے''۔

یہ استفہام بمعنی انکار ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھا اور اس کے کلام کو بدل دیا اور اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کر دی جو اس نے نازل نہیں کی۔ اور اسی طرح تم سے زیادہ کوئی ظلم کرنے والا نہیں جب تم نے قرآن کریم کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افترا باندھا اور تم نے یہ کہا: یہ اس کا کلام نہیں۔ اور یہ اس میں سے ہے جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ انہیں یہ کہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ افترا باندھنے والا مشرک ہے اور آیات کو جھٹلانے والا اہل کتاب میں سے ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور (یہ مشرک) عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ (معبود) ہمارے سفارشی ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں، آپ فرمایئے: کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس بات سے جو وہ نہیں جانتا نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، پاک ہے وہ اور بلند وبالا ہے اس شرک سے وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ (اس میں من دون اللہ سے) مراد بت ہیں۔ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ یہ ان کی طرف سے جہالت کی انتہا ہے، اس حیثیت سے کہ انجام کار کے طور پر شفاعت کا انتظار ان سے کر رہے ہیں جن سے حال میں نہ نفع پایا جا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شُفَعَآؤُنَا یعنی یہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا میں ہماری معاشی اصلاح کے بارے میں سفارش کریں گے۔

قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ عام قراءت تنبئون تشدید کے ساتھ ہے۔ اور ابو السمال

العدوی نے أتنبئون اللہ مخفف کر کے پڑھا ہے۔ یہ أنبا ینبیٔ سے ہے۔ اور عام قراءت نبا ینبی تنبئۃ سے ہے۔ اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دونوں جمع ہیں: مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ (التحریم) یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کو خبر دے رہے ہو کہ اس کا اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے یا اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارشی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا آسمانوں میں اور زمین میں، کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں پس اسی لیے وہ اسے نہیں جانتا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: 33) پھر اس نے اپنی ذات کی پاکی بیان کی اور اسے شرک سے پاکیزہ قرار دیا اور فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ یعنی وہ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ عبادت کرتے ہیں ان کی جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ (معبود) اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ پس وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا اس نے تمہیں تیار کیا ہے کہ تم اسے اس بات کے بارے آگاہ کرو جو وہ نہیں جانتا، اس کی ذات پاک ہے اور اس سے بلند تر ہے جسے وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے تشرکون تا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہی ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور نہیں تھے لوگ (ابتداء میں) مگر ایک ہی امت پھر (اپنی کجروی سے) باہم اختلاف کرنے لگے اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں''۔

اس کا معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ عرب شرک پر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر وہ بالغ ہونے کے وقت مختلف ہو جاتے ہیں۔ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ یہ قضاء و قدر کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگر اس کے حکم میں پہلے سے نہ ہوتا کہ وہ ان کے درمیان ان امور میں قیامت سے پہلے فیصلہ نہیں کرے گا جن میں ثواب و عقاب کے اعتبار سے وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کے درمیان دنیا میں فیصلہ کر دیا جاتا، پس وہ مومنوں کو ان کے اعمال کے عوض جنت میں اور کافروں کو ان کے اعمال کے بدلے جہنم میں داخل کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے کرتوتوں کا علم رکھنے کے باوجود پہلے سے ایک مدت مقرر ہے اور اس نے ان کے لیے جائے وعدہ قیامت کو بنا رکھا ہے(1)۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور ابو روق نے کہا ہے: لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ تو ان پر قیامت قائم کر دیتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو وہ ان کی ہلاکت سے فارغ ہو چکا ہوتا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الکلمۃ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مہلت دی ہے کہ وہ انہیں دنیا میں یوم قیامت تک عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا، پس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 146

اگر یہ مہلت نہ ہوتی تو ان کے درمیان عذاب نازل کرتے یا قیامت قائم کر کے فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث تسلی ہے ان لوگوں سے عذاب کی تاخیر کے بارے میں جنہوں نے آپ کے ساتھ کفر اختیار کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلمہ سابقہ یہ ہے کہ وہ کسی کو بغیر حجت اور دلیل کے نہیں پکڑے گا اور وہ رسولوں کو بھیجتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ (الاسراء)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: سبقت رحمتی غضبی (1) (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے) اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گنہگاروں کو توبہ کی مہلت نہ دیتا۔ اور عیسیٰ نے لَقَضِیَ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

''اور کہتے ہیں کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت ان کے رب کی طرف سے؟ سو آپ فرمایئے: غیب تو صرف اللہ کے لیے ہے پس انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں''۔

مراد اہل مکہ ہیں، یعنی کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت، یعنی معجزہ جو اس معجزہ کے سوا ہوتا کہ وہ ہمارے لیے پہاڑوں کو سونا بنا دے اور اس کے لیے انتہائی خوبصورت (سونے کا) گھر ہو اور ہمارے لیے انہیں زندہ کرے جو ہمارے آباء واجداد میں سے مر چکے ہیں۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد عصا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا (یعنی ایسا معجزہ کیوں نہ نازل کیا گیا) فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ یعنی آپ فرما دیجئے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آیت کا نازل ہونا غیب ہے۔ فَانْتَظِرُوا پس تم انتظار کرو۔ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ بے شک میں بھی اس کے نازل ہونے کا تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: حق کو باطل پر غالب کرنے کے بارے ہمارے درمیان تم اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرو۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

''اور جب ہم لطف اندوز کرتے ہیں لوگوں کو (اپنی) رحمت سے اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تو فوراً وہ مکر وفریب کرنے لگتے ہیں ہماری آیتوں میں، فرمایئے: اللہ زیادہ تیز ہے اس فریب کی سزا دینے میں، بے شک ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قلم بند کر رہے ہیں جو فریب تم کر رہے ہو''۔

مراد کفار مکہ ہیں۔ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ کہا گیا ہے: مراد شدت اور تنگی کے بعد آسودگی اور خوشحالی کا آنا ہے اور خشک سالی کے بعد شادابی کا آنا ہے (2)۔ إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا اس میں مکر سے مراد استہزا اور تکذیب ہے۔ (تو فوراً وہ ہماری آیتوں کے ساتھ استہزا اور ان کی تکذیب کرنے لگتے ہیں) اور خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق وَإِذَا أَذَقْنَا کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، جلد 2، صفحہ 1127
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 429

جواب اِذَا لَهُمۡ ہے۔ قُلِ اللّٰهُ اَسۡرَعُ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَكۡرًا یہ بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی وہ ان کے مکروفریب کی جزا کے طور پر سزا دینے میں بہت جلدی کرنے والا ہے، یعنی جو کچھ انہوں نے مکروفریب سے کیا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ انہیں ہلاک کرنے کے لیے وہ ان پر عذاب لا سکتا ہے۔ اِنَّ رُسُلَنَا یَكۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡكُرُوۡنَ یہاں رسل سے مراد کراما کاتبین ہیں۔ اور قراءت عامہ تمکرون تا خطاب کے ساتھ ہے اور یعقوب نے اردیس کی روایت میں اور ابوعمرو نے ہارون العتکی کی روایت میں یمکرون یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قول کی وجہ سے: اِذَا لَهُمۡ مَّكۡرٌ فِیۡۤ اٰیَاتِنَا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوسفیان نے عرض کی: آپ کی دعا سے ہم پر قحط مسلط کر دیا گیا ہے پس اگر آپ ہمیں سیراب کر دیں تو ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارش کی دعا کرنے کے ساتھ انہیں بارش عطا کر دی گئی لیکن وہ ایمان نہ لائے، پس یہی ان کا مکر اور دھوکا تھا۔

هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُكُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡكِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِهِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوۡا بِهَا جَآءَتۡهَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِیۡطَ بِهِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ۚ۬ لَئِنۡ اَنۡجَیۡتَنَا مِنۡ هٰذِهٖ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡیُكُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِكُمۡ ۙ مَّتَاعَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۫ ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُكُمۡ فَنُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

”وہی ہے جو سیر کراتا ہے تمہیں خشک زمین اور سمندر میں یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر موافق ہوا کی وجہ سے اور وہ مسرور ہوتے ہیں اس سے (تو اچانک) آلیتی ہے انہیں تند و تیز ہوا اور آلیتی ہیں انہیں موجیں ہر جگہ (طرف) سے اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں گھیر لیا گیا تو (اس وقت) پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے (کہتے ہیں اے کریم!) اگر تو نے بچا لیا ہمیں اس (طوفان) سے تو ہم یقیناً ہو جائیں گے (تیرے) شکر گزار (بندوں) سے۔ پھر جب وہ بچا لیتا ہے انہیں تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق، اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تمہیں پر پڑے گا لطف اٹھا لو دنیوی زندگی سے پھر ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تمہیں، پھر ہم آگاہ کریں گے تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُكُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡكِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِهِمۡ یعنی وہ تمہیں خشکی میں چوپاؤں پر اور سمندر میں کشتیوں پر سوار کرتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ سیر میں تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ اور یہ آیت ان نعمتوں کے شمار کرنے کو متضمن ہے جو اس کے راستے میں لوگوں کو جانوروں پر اور سمندر میں سوار کرنے میں سے پائی جاتی ہیں۔ سمندر میں سوار ہونے کے بارے میں کلام سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور یُسَیِّرُكُمۡ قراءت عامہ ہے۔ ابن عامر

نے ینشہ کم نون اور شین کے ساتھ قراءت کی ہے، یعنی وہ تمہیں پھیلاتا ہے اور متفرق کر دیتا ہے۔ اور الفلک کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے۔ اور اس کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور قولہ: وَ جَرَيْنَ بِهِمْ یہ خطاب سے غیب کی طرف خروج ہے اور قرآن کریم اور اشعار عرب میں ایسا کثرت سے موجود ہے، جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

یا دارمیّة بالعَلْیاء فالسَّند　　أقْوَت وطال علیها سالف الأمَد

ابن انباری نے کہا ہے: لغت میں یہ جائز ہے کہ غیب کے خطاب سے صراحۃ لفظ خطاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ (الدہر) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں) تو اس میں کاف کو ہا کے بدلے لایا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ، جاءتھا میں ہا ضمیر سفینہ (کشتی) کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مرجع ریح طیبة ہے۔ اور العاصف کا معنی شدید اور تند و تیز (ہوا) ہے۔ کہا جاتا ہے: عصفت الریح و أعصفت، فھی عاصف و معصف و معصفه أی شدیدة (یعنی شدید آندھی) شاعر کا قول ہے:

حتی إذا أعصفت ریح مُزَعزِعة　　فیها قطار ورعد صوته زَجِل(1)

اور فرمایا: عاصف مذکر لایا گیا ہے، کیونکہ لفظ ریح مذکر ہے اور یہی قاصف (ہر شے کو توڑنے والی) بھی ہے۔ اور طیبہ سے مراد ایسی ہوا ہے جو نہ تند و تیز ہو اور نہ انتہائی سست ہو۔ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ موج سے مراد وہ لہر ہے جو پانی سے اٹھتی ہے۔ وَّ ظَنُّوْٓا یعنی وہ یقین کر لیں۔ اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ کہ انہیں مصیبت اور آزمائش نے گھیر لیا ہے۔ جو کوئی کسی مصیبت اور آزمائش میں واقع ہو جائے تو کہا جاتا ہے: قد أحیط به گویا آزمائش اور مصیبت نے اسے گھیر لیا ہے۔ اور اس کی اصل یہ ہے کہ دشمن جب کسی جگہ کو گھیر لے اور وہاں کے رہنے والے ہلاک ہو جائیں۔ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی اس وقت صرف اکیلے اسی کو پکارتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں جن کی پرستش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ مخلوق کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے کہ وہ شدائد اور مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتی ہے اور یہ کہ مضطر (مجبور محض) کی دعا کو قبول کر لیا جاتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو، اس لیے کہ اس کے اسباب ختم ہو چکے ہیں اور اس نے وحدہ لاشریک رب الارباب کی طرف رجوع کر لیا ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: بے شک انہوں نے اپنی دعا میں أهیا شراهیا یعنی یاحی یا قیوم کہا ہے۔ اور یہ عجم کی لغت ہے۔

**مسئلہ**: یہ آیت مطلق سمندر میں سوار ہونے پر دلالت کرتی ہے اور سنت سے ثابت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 117

میں ہے: بے شک ہم سمندر میں سوار ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی بھی اٹھا لیتے ہیں (1)...... الحدیث۔ اور ام حرام کے قصہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جنگ کے دوران سمندر میں سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور سورۂ اعراف کے آخر میں سمندر کے موجیں مارنے اور اس میں طوفان آنے کی حالت میں اس میں سوار ہونے والے کا حکم گزر چکا ہے کیا اس کا حکم تندرست آدمی کا حکم ہے یا اس مریض کا جس کو روک دیا گیا ہے؟ وہاں اس میں غور کرلو۔

قولہ تعالیٰ: لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ اگر تو ہمیں بچالے اس شدید طوفان اور ہولناکی سے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس ہوا سے۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم یقیناً اس نجات اور خلاصی پانے کی نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے تیری اطاعت و فرمانبرداری میں عمل کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ پس جب وہ انہیں بچالیتا ہے اور خلاصی عطا فرما دیتا ہے۔ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ تو پھر وہ زمین میں فساد اور معاصی کا عمل ہی کرتے ہیں۔ اور البغی کا معنی فساد اور شرک ہے: یہ بغی الجرح سے ہے جب زخم فاسد اور خراب ہو جائے۔ اس کا اصل معنی طلب ہے یعنی وہ فساد برپا کر کے غلبہ چاہتے ہیں۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ یعنی جھٹلانے کے ساتھ۔ اور اسی سے بغت المرأۃ ہے جب عورت خاوند کے سوا کسی اور کی خواہش کرے (یعنی زنا کا ارتکاب کرے)

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ یعنی اس کا وبال تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ یہاں کلام مکمل ہو گئی۔ پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی یہ دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، اس کے لیے کوئی بقا نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بَغْيُكُمْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہے اور عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ، البغی کے فعل کے معنی کا مفعول ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو اور مبتدا مضمر ہو یعنی ذالك متاع الحیاۃ الدنیا یا ھو متاع الحیاۃ الدنیا اور دونوں معنوں کے درمیان انتہائی لطیف اور باریک سا فرق ہے۔ جب تو متاع کو بَغْيُكُمْ کی خبر ہونے کی وجہ سے رفع دے تو معنی یہ ہوگا: بے شک تم میں سے بعض کا وبال بعض پر پڑے گا، مثلاً فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) (تم سلامتی کی دعا دو اپنوں کو) اور اسی طرح لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے) اور جب خبر عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ہو تو معنی ہوگا بے شک تمہارا فساد تمہیں پر لوٹے گا۔ جیسا کہ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7)

سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ارادہ یہ کیا ہے کہ فساد دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے، یعنی اس کی سزا دنیا میں اس کے مالک کے لیے جلدی آتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: البغی مصرعۃ (فساد تو پچھاڑ ہے) اور ابن ابی اسحاق نے متاع کو منصوب پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدر ہے، یعنی تم دنیوی زندگی سے انتہائی لطف اندوز ہوتے ہو یا پھر حرف جر کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے اصل میں لمتاع تھا یا یہ مصدر ہے اور حال ہونے کی بنا پر بمعنی مفعول ہے، ای متمتعین یا یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1048

ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فی متاع الحیاۃ الدنیا اور ظرف، جار مجرور اور حال کا متعلق البغی میں فعل کا معنی ہے اور علیٰ اَنۡفُسِکُمۡ اس معنی کا مفعول ہے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا يَاۡكُلُ النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّيَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَيۡهَاۤ ۙ اَتٰٮهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۝

''پس حیات دنیوی (کے عروج و زوال) کی مثال ایسی ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے سو گھنی ہو کر اگی پانی کے باعث سر سبزی زمین کی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور وہ خوب آراستہ ہو گئی اور یقین کر لیا اس کے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پا لیا ہے اس پر (تو اچانک) آ پڑا اس پر ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کے وقت پس ہم نے کاٹ کر رکھ دیا اسے گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں، یونہی ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ آیت کے معنی میں تشبیہ اور تمثیل ہے، یعنی دنیوی زندگی اپنے فناہ ہونے، زوال پذیر ہونے، اپنے رتبہ کے کم ہونے اور اس پر فخر کرنے کے اعتبار سے پانی کی مثل ہے، پس آیت میں کاف رفع کے محل میں ہے۔ اس تشبیہ کا مزید بیان سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ یہ ماء کی صفت ہے۔ فَاخۡتَلَطَ حضرت نافع سے روایت ہے کہ انہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف کیا ہے یعنی پانی زمین کے ساتھ مل گیا، پھر ابتدا کی۔ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ یعنی پانی کے ساتھ زمین کی سر سبزی ہے۔ پس زمین نے طرح طرح کی نباتات نکالیں پس اس بنا پر نبات مبتدا ہے اور اس کے مذہب کے مطابق جنہوں نے فَاخۡتَلَطَ پر وقف نہیں کیا نبات اختلط کے سبب مرفوع ہے یعنی نباتات بارش کے ساتھ مل گئیں یعنی نباتات بارش سے سیراب ہوئیں اور نمی حاصل کی، خوبصورت ہوئی اور خوب سر سبز و شاداب ہو کر اگی اور اختلاط کا معنی ہوتا ہے ایک چیز کا آپس میں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو جانا۔

قولہ تعالیٰ: مِمَّا يَاۡكُلُ النَّاسُ جس سے انسان بھی کھاتے ہیں مثلاً دانے (اناج) پھل اور سبزیاں وَالۡاَنۡعَامُ اور حیوان بھی، مثلاً گھاس، بھوسہ اور جو وغیرہ۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا یہاں تک کہ جس زمین نے اپنا حسن اور اپنا سنگار لے لیا۔ اور الزخرف کا معنی ہے کسی شے کا حسن و کمال۔ اور اسی وجہ سے سونے کو بھی زخرف کہا گیا ہے۔ وَازَّيَّنَتۡ یعنی وہ دانوں، پھلوں اور پھولوں کے ساتھ خوب آراستہ ہو گئی۔ یہ لفظ اصل میں تزینت ہے اس میں تا کو زا میں ادغام کیا گیا ہے اور ابتدا میں ہمزہ وصل لایا گیا ہے، کیونکہ حرف مدغم قائم مقام دو حرفوں کے ہوتا ہے ان میں سے پہلا ساکن ہوتا ہے اور ساکن

سے ابتدا ممکن نہیں ہوتی۔ اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے وتزینت اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور حسن، اعرج اور ابو العالیہ نے وازینت پڑھا ہے یعنی غلہ اور کھیتی اس پر زینت اور سنگار لائی۔ اور یہ فعل کو اپنے اصل کے مطابق لائے ہیں اگرچہ اس کی تعلیل کی ہے اور کہا ہے: وازانت۔ اور عوف بن ابی جمیلہ اعرابی نے کہا ہے: ہمارے اشیاخ نے واز یانت پڑھا ہے اس کا وزن اسوادت ہے۔ اور مقدمی کی روایت میں واژاینت ہے اور اس میں اصل تزاینت ہے، اس کا وزن تقاعست ہے پھر اس میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور حضرت شعبی اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے وازینت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ابو عثمان نہدی نے وازْيَنَت، أفعلت کی مثل پڑھا ہے۔ اور ان سے وازیانت، أفعالت کی مثل بھی ہے اور ان سے ازیأنت ہمزہ کے ساتھ بھی مروی ہے، یہ تین قراءتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: **وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ** اور اس کے مالکوں نے یقین کر لیا۔ **اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ** کہ اب وہ اس کے کاٹنے اور اس سے نفع اٹھانے پر قادر ہیں۔ زمین کے بارے خبر دی ہے اور اس سے مقصود نباتات ہے جب اس کو سمجھا گیا اور رد اسی سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر غلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زینت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ **اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا** تو اس پر اچانک ہمارا عذاب آ پڑا یا اسے ہلاک کرنے کے بارے ہمارا حکم آ پڑا۔ **لَيْلًا اَوْ نَهَارًا** یہ دونوں ظرفیں ہیں۔ **فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا** یہ دو مفعول ہیں، یعنی پس ہم نے اسے کٹا ہوا بنا دیا (گویا) اس میں کوئی شے نہ تھی اور فرمایا: **حَصِيْدًا** اور اسے مونث ذکر نہ کیا گیا کیونکہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: الحصید کا معنی مستاصل جڑ سے کٹا ہوا ہے۔ **كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ** یعنی گویا کہ وہ کل آباد نہ تھی، یہ غنی سے ہے جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے آباد کرے۔ اور لغت میں مغانی سے مراد وہ منازل (گھر) ہیں جنہیں لوگ آباد کرتے ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: گویا وہ خوشگوار اور سرسبز ہوئی ہی نہیں۔ لبید نے کہا ہے:

وغَنِيتُ سَبْتًا قبل مَجْرَى داحس　　لو كان للنفس اللَّجُوج خلودُ(1)

عام قراءت تغن تا کے ساتھ ہے، کیونکہ الارض مونث ہے۔ اور حضرت قتادہ نے یغن یاء کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ اس کی نسبت زخرف کی طرف کرتے ہیں، یعنی جس طرح وہ اس کھیتی کو ہلاک کر سکتا ہے اسی طرح وہ دنیا کو بھی ہلاک و برباد کر دے گا۔ **نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ** یعنی ہم نشانیاں اور علامات بیان کرتے ہیں۔ **لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ** اس قوم کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں۔

**وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝**

"اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف۔ اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف"۔

قولہ تعالیٰ: **وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ** جب اللہ تعالیٰ اس دار یعنی دار دنیا کا وصف ذکر کر چکا تو اس نے آخرت کا وصف

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 431-430

بیان فرمایا اور کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا جمع کرنے کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ وہ تمہیں طاعت کی طرف بلاتا ہے تا کہ تم دار السلام یعنی جنت کے اہل ہو جاؤ۔ حضرت قتادہ اور حسن نے فرمایا: السلام تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا دار جنت ہے (1)۔ اور جنت کو دار السلام کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جو اس میں داخل ہو گیا وہ آفات سے محفوظ و مامون ہو جائے گا۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں سے ''السلام'' ہے، تحقیق ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں بیان کیا ہے اور اس کا ذکر سورۃ الحشر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور السلام اور السلامۃ ایک ہی معنی میں ہیں جیسے الرضاع اور الرضاعۃ ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

تُحییَ بالسلامة أمُّ بكرٍ وهل لكِ بعد قومِكِ من سلام

اور کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دار التحیہ کی طرف بلاتا ہے، کیونکہ اس کے باسی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تحیہ اور سلام پائیں گے اور اسی طرح ملائکہ کی طرف سے بھی (سلام پائیں گے)۔ حسن نے کہا ہے: بے شک اہل جنت سے سلام منقطع نہ ہوگا اور یہ ان کا تحیہ ہے، جیسا کہ فرمایا: وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (یونس: 10) اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور یحییٰ بن معاذ نے کہا ہے: اے ابن آدم! اللہ تعالیٰ تجھے دار السلام کی طرف بلا رہا ہے سو تو دیکھ ہم اسے کہاں سے جواب دے رہے ہیں۔ پس اگر تو نے اسے اپنی دنیا سے جواب دیا تو تو اس میں داخل ہو جائے گا اور اگر تو نے اسے اپنی قبر سے جواب دیا تو تو اس سے روک دیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جنتیں سات ہیں: دار الجلال، دار السلام، جنت عدن، جنۃ الماوی، جنۃ الخلد، جنۃ الفردوس اور جنۃ النعیم۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اپنی حجت کے اظہار کے لیے دعوت کو عام کیا اور اپنی مخلوق سے استغنا برتتے ہوئے ہدایت کو خاص کر دیا۔ اور صراط مستقیم کے بارے کہا گیا ہے کہ مراد کتاب اللہ ہے (2)۔ اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اسے نواس بن سمعان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حق ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں صحابی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے سر کے پاس اور حضرت میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کے پاس کھڑے ہیں تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ان کی مثال بیان کیجئے، تو اس نے اسے کہا: تو سن تیرے کان سنیں اور اپنے دل کی عقل کے ساتھ اسے سمجھ بلاشبہ تیری اور تیری امت کی مثال اس بادشاہ کی مثل ہے جس کا ایک دار ہو پھر وہ اس میں گھر بنائے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 121
2۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 114، (مفہوم)

پھر اس میں ایک دعوت کا اہتمام کرے پھر وہ ایک قاصد بھیجے جو لوگوں کو اس کے کھانے کی دعوت دے پس ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اس قاصد کی دعوت کو قبول کیا اور بعض وہ ہیں جنہوں نے اسے چھوڑ دیا، پس اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے اور وہ دار السلام ہے اور وہ بیت (گھر) جنت ہے اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ وہ قاصد اور رسول ہیں پس جس نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو جنت میں داخل ہو گا وہ اس سے کھائے گا جو کچھ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) اس میں ہیں'' (1)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ تلاوت فرمائی۔ پھر حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے یہ آیت تلاوت کی وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ اور یہ آیت قدریہ کے خلاف ان کے رد میں واضح اور بین دلیل ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے: وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ پر نصوص قرآن کو واپس لوٹا دیا (اور انہیں قبول نہ کیا)

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ ؕ وَ لَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

''ان کے لیے جنہوں نے نیک عمل کیے نیک جزا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور نہ چھائے گا ان کے چہروں پر (رسوائی کا) غبار اور نہ ذلت (کا اثر ہوگا)، یہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قول باری تعالیٰ و زیادة کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: للذین أحسنوا العمل فی الدنیا لهم الحُسنیٰ وهی الجنة والزیادة النظر الی وجه الله الکریم (2) (ان کے لیے جنہوں نے دنیا میں نیک عمل کیے ان کے لیے نیک جزا ہے اور وہ جنت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ اللہ کریم کے چہرہ قدرت کا دیدار ہے) یہی قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور حضرت حذیفہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے اور یہی تابعین کی جماعت کا قول ہے اور یہی اس باب میں صحیح ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے، آپ نے فرمایا: ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تم کوئی چیز چاہتے ہو میں تمہارے لیے اس کا اضافہ کر دوں، تو وہ عرض کریں گے: کیا تو نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا، کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا فرما دی؟ آپ نے فرمایا: پس اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دے گا پھر انہیں کوئی چیز عطا نہیں کی گئی جو اس کے نزدیک اپنے رب کریم کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو'' (3)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 109۔ ایضاً، حدیث نمبر 2787، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 115 3۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال، جلد 2، صفحہ 535

اور ایک روایت میں ہے: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ اور اسے نسائی نے بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یہ آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک نداد ینے والا پکارے گا: اے اہل جنت! بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے وہ چاہتا ہے کہ اسے تمہارے لیے پورا کر دے تو وہ کہیں گے: کیا اس نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا اور ہمارے میزانوں کو بھاری نہیں کر دیا اور ہمیں جہنم سے نجات عطا نہیں فرمادی؟ آپ نے فرمایا: پس وہ حجاب اٹھا دے گا اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں گے پھر قسم بخدا! اللہ کریم نے انہیں کوئی چیز عطا نہیں فرمائی جو ان کے نزدیک اس رؤیت سے زیادہ محبوب ہو اور ان کی آنکھوں کو زیادہ ٹھنڈا کرنے والی ہو'' (1)۔

اور اسے ابن المبارک نے اپنے دقائق میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کیا ہے اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ہم نے وہاں کشف الحجاب کا معنی بھی ذکر کیا ہے۔ والحمدللہ۔ اور ترمذی حکیم ابو عبداللہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں علی بن حجر نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں ولید بن مسلم نے زہیر سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے اور انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو زیادتیوں کے بارے پوچھا جن کا ذکر کتاب اللہ میں ہے۔ ایک اس قول میں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: النظر الی وجہ الرحمن (2) (رحمٰن کے چہرہ قدرت کا دیدار کرنا) اور دوسرا اس ارشاد میں: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۞ (الصافات) تو آپ نے فرمایا: ''(اس سے مراد) بیس ہزار ہیں''۔

تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک زیادۃ سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزا کو دس نیکیوں سے لے کر اس سے زیادہ گنا تک کر دیا جائے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زیادۃ ایک موتی سے بنا ہوا کمرہ ہے جس کے چار ہزار دروازے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد نیکی کی مثل نیکی ہے، اور زیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رضامندی کا حاصل ہونا ہے (3)۔ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد جنت ہے، اور زیادۃ سے مراد وہ افضل ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور قیامت کے دن وہ اس کے بارے ان کا محاسبہ نہیں کرے گا (4)۔ اور عبدالرحمن بن سابط نے کہا ہے: الحسنیٰ سے مراد بشارت اور خوشخبری ہے اور زیادۃ سے مراد رب کریم کے چہرہ قدرت کی طرف دیکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۞ (القیامہ)

اور یزید بن شجرہ نے کہا ہے: زیادۃ یہ ہے کہ اہل جنت کے پاس سے ایک بادل گزرے گا اور وہ ان پر ایسی تمام نادر

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 137
2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 198
3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 126
4۔ ایضاً

نعتیں برسائے گا جو انہوں نے نہ دیکھی ہوں گی اور وہ کہے گا: اے اہل جنت! کیا تم کوئی شے چاہتے ہو کہ میں تم پر اسے برسا دوں؟ پس وہ جو بھی خواہش کریں گے وہ ان پر اسے برسا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زیادۃ یہ ہے کہ ان پر ایام دنیا میں سے ایک دن کی مقدار بھی نہیں گزرے گی مگر یہ کہ ان میں سے ہر ایک گھر کا ستر ہزار فرشتے طواف کریں، ہر فرشتے کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسے تحائف اور ہدایا ہوں گے جو اس کے ساتھی فرشتے کے پاس نہ ہوں گے اور انہوں (اہل جنت) نے ان ہدایا کی مثل کبھی نہ دیکھے ہوں گے، پس پاک ہے وہ جو الواسع، العلیم، الغنی، الحمید، العلی، الکبیر، العزیز، القدیر، البر، الرحیم، المدبر، الحکیم اور اللطیف، الکریم ہے جس کی مقدورات لامتناہی اور لامحدود ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أحسنوا جنہوں نے لوگوں کے ساتھ معاملہ نیکی اور اچھائی کے ساتھ کیا۔ اور الحسنیٰ ان کے لیے شفاعت ہے اور زیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اس (شفاعت) کی اجازت دینا اور اسے قبول کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا يَرْهَقُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یلحق (اور لاحق نہ ہوگا) اور اسی معنی میں کہا گیا ہے: غلام مراھق جب بچہ (بالغ ہونے کے قریب پہنچ کر) مردوں کے ساتھ مل جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یعلو (بلند ہونا، غالب ہونا)۔ اور بعض نے کہا ہے: یغشی (ڈھانپ لینا) یہ معنوی اعتبار سے آپس میں قریب قریب ہیں۔ قتر اس کا معنی ہے غبار۔ ولاذلۃ اور نہ ذلت و رسوائی، جیسا کہ اہل جہنم کو لاحق ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب انہیں اٹھائے جانے کے وقت غبار انہیں لاحق نہیں ہوگا اور نہ ذلت و رسوائی انہیں ڈھانپے گی۔ ابو عبیدہ نے فرزدق کا یہ شعر بیان کیا ہے:

مُتَوَّجٌ　برداء　الملك　يتبعه　　مَوج ترى فوقه الراياتِ والقَتَرا(1)

حسن نے قَتْرٌ تا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور القَتَر و القَتَرَة و القَتْر تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور القَتَر کی واحد قَتَرَة ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ (عبس) یعنی ان پر گرد و غبار غالب یعنی چھایا ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے: قتر کا معنی غمزدہ ہونا اور حالت کا خراب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: القتر سے مراد چہروں کا سیاہ ہونا ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: اس سے مراد آگ کا دھواں ہے۔ اور اسی سے قتار القدر (ہنڈیا کی بھاپ) ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے: یہ ان کا اپنے رب کے دیدار سے محروم رہنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ ...... تا قولہ ...... لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی، تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے ...... نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور دوسری آیت میں فرمایا: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (یونس) (اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لیے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور مزید فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا، الآیہ (حم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 433

السجدہ:30) (بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قوم پر پختگی سے قائم رہے اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو)۔ اور یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ نیکی کرنے والے کا چہرہ غم واندوہ کی سیاہی کے ساتھ کسی مقام میں بھی متغیر اور تبدیل نہیں ہوگا نہ دیدار الٰہی سے پہلے اور نہ اس کے بعد اور جہنم وغیرہ کے دھوئیں میں سے کوئی شے اس پر غالب نہیں آئے گی۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران) (اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی اور چھا رہی ہوگی ان پر ذلت، نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے، وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ اور جنہوں نے گناہ کے اعمال کیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد شرک ہے (یعنی جنہوں نے شرک کیا) جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا، جَزَآءُ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر بِمِثْلِهَا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: اس میں با زائدہ ہے اور اس کا معنی ہے جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا (برائی کی سزا اس کی مثل ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: با اپنے مابعد سمیت خبر ہے اور یہ محذوف کے متعلق ہے اور یہ اس کے قائم مقام ہے اور اس کا معنی ہے: جزاء سیئة کائن بمثلها (برائی کی سزا اسی جیسی ہوگی) جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: إنما أنا بك یعنی إنما انا کائن بك اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جزا کے متعلق ہو، تقدیر کلام ہو: جزاء سیئة بمثلها کائن پھر مبتدا کی خبر حذف کر دی گئی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ جزاء مرفوع ہو اور تقدیر کلام یہ ہو فلهم جزاء سیئة پس یہ اس قول کی مثل ہو جائے گا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (البقرہ:185) یعنی فعلیه عدة اور اس کے مشابہ کوئی شے۔ اور اس تقدیر کے مطابق با محذوف کے متعلق ہوگی، گویا کہ یہ کہا: لهم جزاء سیئة ثابت بمثلها (ان کے لیے برائی کی سزا اسی کی مثل ثابت ہے) یا پھر یہ با مؤکدہ یا زائدہ ہوگی۔

اور اس مثلیت کا معنی یہ ہے کہ وہ سزا جو شمار کی جا رہی ہے وہ ان کے گناہوں کے مماثل ہے، یعنی وہ مظلوم نہیں ہیں، ان پر کوئی زیادتی نہیں کی جا رہی۔ اور اللہ تعالیٰ کا فعل کسی علت کے ساتھ معلل نہیں ہوتا۔ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ یعنی انہیں یبوست اور ذلت و رسوائی ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ان کے لیے اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا جو انہیں اس سے بچالے گا۔ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں۔ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا ان کے چہرے۔ قطع، قطعة کی جمع ہے اور اس بنا پر مظلما، اللیل سے حال ہوگا، یعنی ان کے چہرے ڈھانپ دیئے گئے ہیں رات کے ٹکڑے سے اس

حال میں کہ وہ تاریک اور اندھیری تھی۔

کسائی اور ابن کثیر نے قطعا طا کو ساکن پڑھا ہے۔ اور اس بنا پر مظلما صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللیل سے حال ہو۔ اور القطع نام ہے اس شے کا جس کو کاٹ دیا جائے اور وہ گر جائے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: رات کا ایک حصہ اور طائفہ ہے۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝

''اور (ان کی پشیمانی کا تصور کرو) جس روز ہم جمع کریں گے ان سب کو (میدان حشر میں) پھر ہم حکم دیں گے مشرکوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ تم اور تمہارے جھوٹے معبود، پھر ہم منقطع کر دیں گے ان کے باہمی تعلقات اور کہیں گے ان کے معبود (اے مشرکو!) تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ اور جس دن ہم انہیں جمع کریں گے اور حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔ جَمِيْعًا یہ حال ہے۔ ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پھر ہم حکم دیں گے ان کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنائے۔ مَكَانَكُمْ یعنی تم اپنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو اور اسی پر ثابت قدم رہو۔ اور اپنی جگہوں پر ٹھہرے رہو۔ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ (تم اور تمہارے جھوٹے معبود) اور یہ وعید ہے۔

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ یعنی ہم تفریق ڈال دیں گے اور ہم اس دوستی اور تعلق کو توڑ دیں گے جو ان کے درمیان دنیا میں قائم تھا، کہا جاتا ہے: زيلته فتزيل، أي فرقته فتفرق (میں نے اسے علیحدہ کیا پس وہ علیحدہ ہو گیا) اور یہ فعلت، کیونکہ اس کے مصدر میں تو تزییلا کہتا ہے (مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ باب تفعیل ہے) اور اگر فیعلت ہوتا تو پھر تو مصدر زیلة کہتا۔ اور المزایلة کا معنی المفارقة ہے: کہا جاتا ہے: زایله الله مزایلة و زیالا جب اللہ تعالیٰ اسے جدا اور علیحدہ کر دے۔ اور التزایل کا معنی التباین (جدا ہونا) ہے۔ فراء نے کہا ہے: بعض نے فزایلنا بینهم پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: لا أزایل فلانا، ای لا أفارقه (میں اسے جدا نہیں کروں گا) اور اگر تو کہے: لا ازاوله تو اس کا معنی دوسرا ہے اور وہ ہے لا أخاتله (میں اسے فریب اور دھوکہ نہیں دوں گا)۔

وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ اس میں شرکاء سے مراد ملائکہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے: شیاطین ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: بت ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی قدرت دے گا اور یہ گفتگو ان کے اپنے درمیان ہو گی۔ اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ان شیاطین کے خلاف دعویٰ کیا جن کی انہوں نے اطاعت و پیروی کی اور ان بتوں کے خلاف دعویٰ کیا جن کی وہ عبادت کرتے رہے کہ انہوں نے انہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا اور وہ کہیں گے: ہم نے تمہاری عبادت نہیں کی یہاں تک کہ تم نے ہمیں حکم دیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ بتوں کو بولنے کی قدرت دے گا، پس وہ کہیں گے: ہم تو اس بارے شعور ہی نہیں رکھتے تھے کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو اور نہ ہم نے تمہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا۔ اور اگر شرکاء کو شیاطین پر محمول کیا جائے تو معنی یہ ہو گا کہ وہ مدہوش ہو کر یہ کہتے ہیں یا وہ جھوٹ اور خلاصی کا حیلہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ اور اس کی

مثل کل جاری ہوگا، اگر چہ معارف ضروریہ اور بدیہی ہے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝۲۹

''پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے''۔

قولہ تعالیٰ: فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ، شَهِيْدًا یہ مفعول ہے یعنی کفی اللہ شھیدا یا یہ تمیز ہے، یعنی اکتف بہ شھیدا بیننا و بینکم یعنی اللہ تعالیٰ پر اکتفا کرو بطور گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان اگر ہم نے تمہیں اس بارے حکم دیا ہے یا ہم نے اسے تم سے پسند کیا ہے (اور رضامندی کا اظہار کیا ہے) اِنْ كُنَّا یعنی ہم نہیں تھے۔ عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ تمہاری پرستش کے بارے میں بالکل بے خبر، نہ ہم سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے اور نہ عقل رکھتے تھے، کیونکہ ہم تو جمادات تھے ہم میں روح نہ تھی۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۳۰

''وہاں آزمالے گا ہر شخص جو اس نے آگے بھیجا تھا اور انہیں لوٹا دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا باندھا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تَبْلُوْا یعنی اس وقت میں (آزمالے گا) تبلو بمعنی تذوق یعنی چکھ لے گا۔ اور کلبی نے کہا: بمعنی تعلم ہے یعنی ہر شخص جان لے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بمعنی تختبر ہے یعنی آزمالے گا۔ كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ یعنی اس عمل کی جزا جو اس نے کیا اور آگے بھیجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بمعنی تسلم (وہ حوالے کر دے گا) یعنی حقوق میں سے جو اس پر تھے وہ ان کو ان کے مالکوں کے حوالے کر دے گا ان کے اختیار اور ان کی پسند کے بغیر۔ اور حمزہ اور کسائی نے تتلوا پڑھا ہے یعنی ہر نفس اپنے اس نامہ عمل کو پڑھ لے گا جو اس میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تتلوا بمعنی تتبع ہے یعنی ہر نفس اس کی اتباع کرے گا جو اس نے دنیا میں آگے بھیجا۔ یہ سدی نے کہا ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

إن المُرِيبَ يتبعُ المُرِيبَا　　كما رأيت الذِّيب يتلو الذِّيبا(1)

قولہ تعالیٰ: وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ، الْحَقِّ بدل یا صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ اور حق کو نصب دینا بھی جائز ہے اس کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں: تقدیر کلام ہو: و ردوا حقا (اور انہیں لوٹا دیا جائے گا حق) پھر اسے الف لام کے ساتھ لایا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: مولاھم حقا لا ما یعبدون من دونہ (جو ان کا مالک ہے از روئے حقیقت کے نہ کہ وہ جن کی وہ اس کے سوا عبادت کرتے ہیں)۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ بطور مدح کے منصوب ہو أي أعني الحق (میری مراد حق ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ الحق کو رفع دیا جائے۔ اس صورت میں معنی ہوگا: مولاھم الحق یہ مبتدا اور خبر ہوگا

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 434

اور ماقبل سے منقطع ہوگا۔ (اللہ ان کا حقیقی مالک ہے) نہ کہ وہ جن کو وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بالحق کے ساتھ اپنا وصف بیان کیا ہے کیونکہ حق اسی کی طرف سے ہوتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی ذات کو عدل کے ساتھ متصف کیا ہے کیونکہ عدل اسی سے ہوتا ہے، یعنی ہر عدل اور حق وہ اسی کی طرف سے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ یعنی وہ جو انہیں حق کے ساتھ جزا دے گا۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ یعنی باطل ہے۔

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ، يَفْتَرُوْنَ محل رفع میں ہے اور یہ مصدر کے معنی میں ہے، أی افتراؤهم (یعنی ان کا افتراء باندھنا باطل ہے) پس اگر کہا جائے: کیسے یہ کہا: وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ حالانکہ خبر یہ دی گئی ہے کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا: ان کے لیے مدد و نصرت کرنے کا کوئی مالک نہیں اور وہ رزق اور نعمتیں عطا کرنے میں تو ان کا مولیٰ ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱

"آپ پوچھیے کون رزق دیتا ہے تمہیں آسمان اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھ کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زمین سے اور کون ہے جو انتظام فرماتا ہے ہر کام کا؟ تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ! پس آپ کہیے: (جب حقیقت یہ ہے) تو تم (شرک سے) کیوں نہیں بچتے"۔

اس کلام کو چلانے کا مقصد مشرکوں کا رد ہے اور ان کے خلاف حجت کو پختہ کرنا ہے۔ پس جنہوں نے ان میں سے اعتراف کر لیا تو ان پر تو حجت بالکل ظاہر ہے اور جنہوں نے اعتراف نہیں کیا تو ان پر اسے پختہ اور مضبوط کیا کہ یہ آسمان اور زمین ہیں ان دونوں کے لیے خالق کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ اور کوئی عقل مند اس میں شک نہیں کر سکتا۔ اور یہ مرتبہ ضرورت کے بالکل قریب ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ یعنی بارش کے ساتھ۔ وَ الْاَرْضِ یعنی زمین سے اگنے والے اناج کے ساتھ (1)۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ یعنی کون ہے جس نے ان دونوں (کان اور آنکھ) کو بنایا ہے اور انہیں تمہارے لیے پیدا کیا ہے؟ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ یعنی کون ہے جو نباتات کو زمین سے اور انسان کو نطفہ سے اور کھیتی (کی) بالی کو دانے سے، پرندے کو انڈے سے اور مومن کو کافر سے نکالتا ہے؟ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی کون ہے جو امور کو مقرر کرتا ہے اور ان کا فیصلہ کرتا ہے؟ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ (تو وہ (جواباً) کہیں گے: اللہ، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے یا وہ کہیں گے: وہ اللہ ہی ہے اگر وہ غور و فکر کریں اور انصاف سے کام لیں۔ فَقُلْ، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیے۔ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ یعنی کیا وہ دنیا اور آخرت میں اس کی سزا اور اس کے عذاب سے ڈرتے نہیں؟

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 117

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲

''یہ ہے اللہ جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے، پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے، پھر تمہیں (حق سے) کدھر موڑا جارہا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی وہ جو اس قسم کے کام کرتا ہے وہ تمہارا حقیقی پروردگار ہے، نہ کہ وہ جنہیں تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ، ذا صلہ ہے أی ما بعد عبادۃ الإله الحق إذا ترکت عبادته إلا الضلال (یعنی الٰہ حقیقی کی عبادت کے بعد جب تو اس کی عبادت کو چھوڑ دے گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے) اور بعض متقدمین نے کہا ہے: اس آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد جو ہے وہ گمراہی ہے، کیونکہ اس کا اول حصہ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ہے اور آیت کا آخر فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ہے پس یہ ایمان اور کفر کے بارے میں ہے، اعمال کے بارے میں نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا: بے شک کفر حق کو ڈھانپ دیتا ہے اور ہر وہ جو حق کے سوا ہے وہ اس کے قائم مقام ہوگا، پس حرام گمراہی ہے اور مباح ہدایت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مباح کرنے والا اور حرام کرنے والا ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ پہلے فرمایا: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ پھر فرمایا: فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ یعنی یہ ہے وہ جو تمہیں رزق دیتا ہے اور یہ سب اس کا فعل ہے۔ رَبُّكُمُ الْحَقُّ وہی تمہارا حقیقی پروردگار ہے الوہیت جس کا حق ہے اور اس کی عبادت واجب ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو پھر کسی اور کا شریک ٹھہرانا گمراہی اور غیر حق ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس آیت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان کوئی تیسری منزل نہیں یہ اس مسئلہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے ہے اور اس کی نظائر میں بھی حکم اسی طرح ہے اور یہ ان اصولی مسائل میں سے ہے جن میں ایک طرف میں حق ہے، کیونکہ کلام اسی میں ہے بلاشبہ وہ وجود ذات کے بیان میں ہے کہ وہ کیسے ہے اور یہ ان فروعی مسائل کے خلاف ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''حلال بین اور واضح ہے اور حرام بھی بین اور واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان امور متشابہات ہیں'' (1)۔ اور کلام فروع کے بارے ہے اور بلاشبہ یہ ایسے احکام کے بارے ہے جو طاری ہوتے ہیں ایسے پختہ اور مضبوط اصول پر جن میں کوئی اختلاف نہیں کیا جاتا بلکہ ان سے متعلقہ احکام میں اختلاف کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وسط میں نماز کے لیے قیام فرما ہوتے تو کہتے: ''اے اللہ تیرے لیے ہی حمد ہے'' الحدیث۔ اور اس میں یہ ہے ''تو حق ہے اور تیرا وعدہ حق ہے اور تیرا قول حق ہے اور تیری ملاقات حق ہے اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور قیامت حق ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 13

اور انبیاء حق ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں'' (1) الحدیث۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: انت الحق اس کا معنی ہے تو واجب الوجود ہے۔ اور اس کی اصل حق الشیء سے ہے، یعنی جب کوئی شے ثابت اور واجب ہو جائے۔ حقیقی طور پر یہ وصف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کیونکہ اس کا وجود اپنا ذاتی ہے نہ اس سے پہلے عدم تھا اور نہ اسے عدم لاحق ہوگا (یعنی کوئی ایسی ساعت نہیں گزری جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات موجود نہ ہو اور کوئی ایسی ساعت نہیں آئے گی جس میں وہ موجود نہ ہوگا وہ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ تک رہے گا) اور اس کے سوا جس پر بھی یہ اسم بولا جائے گا اس سے پہلے عدم ہے اور اور اس پر عدم کا لاحق ہونا جائز ہے اور اس کا وجود اپنے موجد کی جانب سے ہے اپنی ذات کی طرف سے نہیں ہے۔ اور اس معنی کے اعتبار سے صحیح ترین کلام وہی ہے جو شاعر نے کہا ہے، لبید کا قول ہے:

ألا کل شی ما خلا اللہ باطل

خبردار سنو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے۔

اور اسی کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۸﴾ (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا)

**مسئلہ نمبر 4**۔ حق کا مقابلہ ضلال کے ساتھ کرنا لغۃً اور شرعاً معروف ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اسی طرح حق کا مقابلہ باطل کے ساتھ کرنا بھی لغۃً اور شرعاً معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (الحج: 62) (نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے)

اور ضلال کا حقیقی معنی حق سے نکلنا ہے۔ یہ ضلال الطریق سے لیا گیا ہے اور یہ ہے راستے کی سمت سے پھر جانا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک ضلالۃ سے مراد ایسے راستے پر چلنا ہے جو مقصود اور منزل کا نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ضل عن الطریق (وہ راستے سے بھٹک گیا) اور أضل الشیٔ جب وہ کسی شے کو ضائع کر دے۔ اور شرعاً یہ اس عبارت کے ساتھ خاص ہے۔ العدول عن السداد فی الأعتقاد دون الأعمال (اعتقاد میں صحیح (سمت) سے پھر جانا نہ کہ اعمال میں) اور اس کے بارے میں غریب قول یہ بھی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے بارے معرفت نہ ہونے کو ضلال سے تعبیر کیا جاتا ہے جب اس کے مقابلے میں غفلت ہو اور اس کے عدم کے ساتھ جہالت یا شک مقترن نہ ہو۔ اور اسی پر علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو محمول کیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿۷﴾ (الضحیٰ) ای غافلا یہ اس کی کئی تاویلات میں سے ایک ہے اور اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ: 52) (نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ عبداللہ بن عبدالحکم اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول باری تعالیٰ: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، جلد 1، صفحہ 151

الضَّلٰلُ میں روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: شطرنج اور چوسر (نرد) کھیلنا گمراہی میں سے ہے۔ اور یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ چودہ گوٹیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میرے لیے یہ کتنی تعجب کی بات ہے، حالانکہ یہ مومنین کی شان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (پس حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے) اور یونس نے اشہب سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شطرنج کھیلنے کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں خیر اور بھلائی نہیں ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور یہ باطل ہے اور کھیل تمام کے تمام باطل میں سے ہیں۔ بلاشبہ صاحب عقل کو چاہیے کہ اس کی ریش اور بڑھاپا اسے باطل سے روکے (1)۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ سے جب شطرنج کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: یہ باطل میں سے ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے شطرنج وغیرہ کھیلنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے جب یہ جوئے کی صورت پر نہ ہو۔ پس شطرنج کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقہاء کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ جوا نہ کھیلے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ گھر میں چھپ کر مہینے میں یا سال میں ایک بار کھیلے۔ اس پر نہ کوئی مطلع ہو اور نہ اس کے بارے کسی کو علم ہو تو وہ اس کے لیے معفو عنہ ہے، نہ اس پر حرام ہے اور نہ اس کے لیے مکروہ ہے۔ اور اگر وہ اس میں منہمک ہو گیا اور اس میں مشہور ہو گیا تو اس کی مروت اور عدالت ساقط ہو جائے گی اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ اور رہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو ان کے اصحاب کے مذہب میں نرد (چوسر) اور شطرنج کھیلنے والے کی شہادت ساقط نہیں ہوتی، جب کہ وہ اپنے جمیع ساتھیوں میں عادل ہو اور اس کی طرف سے سفاہت، شک اور گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو مگر یہ کہ وہ اس کے ساتھ جوا کھیلنے لگے، پس اگر اس کے ساتھ اس نے جوا کھیلا اور وہ اس کے ساتھ معروف ہو گیا تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی اور باطل کے ذریعے مال کھانے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو سفیہ (بے وقوف) بنا دیا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شطرنج، نرد، اربعہ عشر کھیلنا اور ہر لہو مکروہ ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ کھیلنے والے سے گناہ کبیرہ ظاہر نہ ہو اور اس کی خوبیاں اور نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں تو ان کے نزدیک اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شافعیہ نے کہا ہے بے شک شطرنج نرد کے مخالف ہے، کیونکہ اس میں فہم کو تیز کرنے اور طبیعت کو عمل کے قابل بنانے کی صلاحیت ہے اور نرد جوا ہے، دھوکا ہے وہ اسے نہیں جانتا جو اس میں اس کے لیے نکلے گا جیسا کہ فال کے تیروں کے ساتھ تقسیم کا مطالبہ کرنا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: نرد وہ کٹا ہوا ٹکڑا ہے جو بقس کی لکڑی سے اور ہاتھی کی ہڈی سے بھرا ہوا ہو اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، کیونکہ یہ اس کا بھائی ہے اسی کے دودھ سے اسے غذا دی گئی ہے اور نرد وہ ہے جو باطل کے نام سے معروف ہے، اس کی پہچان کعاب کے نام سے بھی ہے اور اسے دور جاہلیت میں ارن کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور یہ نردشیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 1052

کے نام سے بھی معروف ہے۔

اور صحیح مسلم میں سلیمان بن بریدہ سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی نردشیر کے ساتھ کھیلا تو گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور اس کے خون میں ڈالا'' (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت میں ڈالا جو اس نے تیار کیا ہوا تھا تاکہ اسے کھائے اور خنزیر میں ایسا کرنا حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسے بیان کرتا ہے: ''جو نرد کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے الله تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی'' (2)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور آپ نرد کے ساتھ کھیلنا کلی طور پر حرام قرار دے رہے ہیں اور اسی طرح شطرنج بھی ہے، آپ نے کسی وقت کی استثنا نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی حال کی استثنا کی ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ایسا کرنے والا الله تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا ہے، مگر اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نرد جس کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد جوئے کی طرز پر کھیلنا ہو، کیونکہ بغیر جوئے کے شطرنج کھیلنے کی اجازت تابعین سے مروی ہے، (لیکن) اسے عموم پر محمول کرنا چاہیے اس میں جوا ہو یا نہ ہو زیادہ اولیٰ ہے اور اس میں احتیاط زیادہ ہے ان شاء الله تعالیٰ۔

ابوعبدالله حلیمی نے کتاب ''منہاج الدین'' میں کہا ہے: شطرنج کے بارے میں جو حدیث آئی ہے اس میں اسی طرح روایت کیا گیا ہے جیسے نرد کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی شطرنج کے ساتھ کھیلا تحقیق اس نے الله تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بنی تمیم کی مجالس میں سے ایک مجلس کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور فرمایا: ''خبردار سنو! قسم بخدا! تم اس کے سوا کے لیے پیدا کیے گئے ہو! خبردار سنو! قسم بخدا! اگر یہ سنت نہ ہوتی (ا) تو میں اسی کے ساتھ تمہارے چہروں پر مارتا''۔

اور آپ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ آپ ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ نے فرمایا: یہ کیسے بت ہیں جن کے ساتھ تم چمٹے پڑے ہو، کیونکہ تم میں سے کسی کا (آگ کا) انگارہ پکڑنا اسے پکڑنے سے بہتر ہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بجھا دے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے شطرنج کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ نرد سے زیادہ بری ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج کے ساتھ نہیں کھیلتا مگر خطا اور گناہ کرنے والا۔ اور ابوجعفر سے شطرنج کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: ہم نے اس مجوسیت کو چھوڑ دیا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث میں ہے: ''بے شک جو کوئی نرد، شطرنج، جوز (اخروٹ) اور کعاب کے ساتھ کھیلا الله تعالیٰ اس سے نفرت رکھتا ہے اور جو کوئی نرد اور شطرنج کھیلنے والوں کے پاس بیٹھا تاکہ ان کی طرف دیکھے تو اس سے اس کی ساری نیکیاں مٹا دی گئیں اور وہ ان میں سے ہو گیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب تحریم اللعب، جلد 2، صفحہ 240　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 275۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 724

ا۔ المنہاج میں یہاں لفظ سبۃ ہے۔ مترجم

جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبغوض بنادیا''۔ یہ تمام آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بغیر جوئے کے بھی ان کے ساتھ کھیلنا حرام ہے، واللہ اعلم۔ اور ہم نے سورۃ المائدہ میں اس کی تحریم کا بیان ذکر کیا ہے اور یہ کہ یہ تحریم میں خمر (شراب) کی مثل ہے، کیونکہ یہ اسی کے ساتھ مقترن ہے، واللہ اعلم۔

ابن عربی نے قبس میں کہا ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور ان میں سے بعض کی حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ کہنے لگے: یہ مندوب (مستحب) ہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے مدرسہ میں رکھ دیا اور جب طالب پڑھنے سے تھک جاتے تو وہ اس کے ساتھ مسجد میں کھیلتے۔ اور انہوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت کی طرف اس کی نسبت کی ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوا۔ قسم بخدا! کسی متقی کے ہاتھ نے اسے مس نہیں کیا۔ اور وہ کہتے ہیں: بے شک یہ ذہن کو تیز کرتی ہے اور ظاہر ان کی تکذیب کرتا ہے، کسی ذہین آدمی نے اس میں کبھی تجربہ حاصل نہیں کیا۔ میں نے امام ابوالفضل عطا مقدسی کو مسجد اقصیٰ میں مناظرہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ (فن) حرب سکھاتی ہے، تو انہیں طرطوشی نے کہا: بلکہ یہ تو جنگ کی تدبیر کو فاسد کرتی ہے، کیونکہ جنگ سے مقصود تو بادشاہی اور اس کی مدہوشی ہوتا ہے۔ اور شطرنج میں تو کہتا ہے: شاہ تو بچ! بادشاہ کو میرے راستے سے دور کردے، پس اس نے حاضرین کو ہنسادیا۔

اور کبھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں سختی کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے اور اس بارے میں کہا ہے: **فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ** اور کبھی اس میں تھوڑی سہولت اور آسانی پیدا کی ہے۔ لیکن پہلا قول ہی اصح ہے۔ واللہ اعلم

اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے شطرنج کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے پوچھا: شطرنج کیا ہے؟ تو آپ کو بتایا گیا: بے شک ایک عورت کا ایک بیٹا تھا اور وہ بادشاہ تھا پس وہ جنگ میں اپنے ساتھیوں کے بغیر مارا گیا، تو اس نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے تم مجھے یہ واضح اور ظاہر کرکے دکھاؤ، تو اس کے لیے شطرنج کا عمل کیا گیا، پس جب اس نے اسے دیکھا تو اسے اس سے تسلی ہوگئی اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شطرنج کا وصف بیان کیا تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے۔ تو اسے جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ آپ نے شطرنج کے بارے لا باس (کوئی حرج نہیں) کے الفاظ نہیں کہے بلکہ آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلۃ الحرب (اس میں کوئی حرج نہیں جو آلہ حرب میں سے ہے) بلاشبہ آپ نے یہ کہا: کیونکہ آپ پر یہ مشتبہ ہوگیا کہ شطرنج کے ساتھ کھیلنا ان میں سے ہے جن کے ساتھ اس جنگ کی پہچان میں مدد حاصل کی جاتی ہے۔ پس جب آپ کو یہ بتایا گیا اور آپ کا علم اسے محیط نہ ہوا تو آپ نے کہا: لا باس بما کان من آلۃ الحرب اگر اسی طرح ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح صحابہ کرام میں سے وہ جس نے آپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ نے اس سے منع نہیں کیا، تو بے شک آپ سے اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ آپ کا گمان تھا کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ مشغولیت اور غفلت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے جنگ اور اس کے دوران باہم ضرب لگانے کے علم کا سبب بننے کا ارادہ کیا جاتا ہے یا اس بنا پر کہہ دیا کہ خبر مسند ان تک پہنچی ہی نہیں۔ حلیمی نے کہا ہے: جب خبر صحیح ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی کے لیے کوئی حجت نہیں، بلاشبہ اس میں تمام کے

خلاف حجت ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** ابن وہب نے اپنی اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بچوں کے پاس سے گزرے وہ کجہ کے ساتھ کھیل رہے تھے اور یہ (چھوٹا سا) گڑھا کھود کر اس میں سنگریزوں کے ساتھ کھیلتے تھے، ابن وہب نے بیان کیا ہے: پس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بند کر دیا اور انہیں اس سے منع فرمایا۔ اور ہروی نے باب (الکاف مع الجیم) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ذکر کیا ہے: ہر شے میں جوا ہے حتی کہ کجہ کے ساتھ بچوں کے کھیل میں بھی ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ ایک بچہ کپڑے کا ٹکڑا لیتا ہے اور اسے گول بنالیتا ہے گویا کہ وہ گیند ہے۔ پھر اس کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ اور دکج جب کوئی کجہ کے ساتھ کھیلے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ یعنی تمہاری عقلوں کو کیسے ان کی عبادت کی طرف پھیرا جا رہا ہے جو نہ رزق دے سکتے ہیں، نہ زندہ کر سکتے ہیں اور نہ موت دے سکتے ہیں۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

''یونہی ثابت ہو چکی ہے آپ کے رب کی بات ان پر جو فسق و فجور کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ یعنی یونہی آپ کے رب کا حکم، اس کا فیصلہ اور اس کا علم سابق ثابت ہو چکا ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا ان پر جو طاعت سے نکل گئے اور انہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی۔ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ وہ تصدیق نہیں کریں گے۔ اور اس میں قدریہ کے خلاف مکمل دلیل موجود ہے۔ نافع اور ابن عامر نے یہاں اور اس کے آخر میں كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اور سورۂ غافر میں تینوں مقامات پر اسے جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ مفرد کے ساتھ۔ اور ان محل نصب میں ہے، یعنی بانھم یا لانھم۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ فراء نے کہا ہے: استیناف کی بنا پر کسرہ کے ساتھ انھم پڑھنا بھی جائز ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

''(اے حبیب!) آپ پوچھیے کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو آغاز آفرینش بھی کرے پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے، آپ ہی فرمایئے: اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹاتا بھی ہے پس (ہوش کرو) تم کدھر پھرے جاتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ یعنی کیا تمہارے الٰہوں اور تمہارے معبودوں میں کوئی ہے؟ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم زجر و توبیخ اور تقریر کی جہت پر آپ انہیں فرمایئے (جو آغاز آفرینش بھی کرے اور پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے) پس اگر وہ آپ کو جواب دیں (تو بہتر) ورنہ آپ انہیں فرمائیں: قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (اللہ ہی آفرینش کی ابتدا بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دیتا ہے) اور اس کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ یعنی تم کیسے حق سے باطل کی طرف پلٹ رہے ہو اور پھر رہے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝

''آپ فرمائیے کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے (خود ہی جواباً) فرمائیے اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے، تو کیا جو راہ دکھائے حق کی وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہ پائے مگر یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے (اے مشرکین!) تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے غلط فیصلے کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ کہا جاتا ہے: هداه الطريق والى الطريق دونوں کا معنی ایک ہے (اس نے اسے راستے کی رہنمائی کی) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی کیا تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو دین اسلام کی طرف رہنمائی کر سکتا ہو۔ پس جب وہ کہیں نہیں اور یہ ضروری ہے۔ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ تو پھر آپ انہیں فرمائیے: اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی فرماتا ہے۔ پھر آپ انہیں زجر و توبیخ کرتے ہوئے اور بات کو پختہ کرتے ہوئے فرمائیے: اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ تو کیا وہ جو رہنمائی کرتا ہے۔ اِلَى الْحَقِّ (حق کی طرف) اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى مراد وہ بت ہیں جو کسی کی رہنمائی نہیں کر سکتے، نہ وہ چل سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں اٹھایا جائے اور نہ وہ اپنی جگہ سے منتقل ہو سکتے ہیں مگر یہ کہ انہیں منتقل کیا جائے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

للفتى عقلٌ يعيش به حيث تَهْدِي ساقه قدَمُه

نوجوان کے لیے عقل ہے جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے اس طرح کہ اس کے پاؤں اس کی پنڈلی کی رہنمائی کرتے ہیں۔
اور کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ رؤسا اور گمراہ کرنے والے ہیں جو اپنی بھی ہدایت کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے مگر یہ کہ ان کی رہنمائی کی جائے اور یَهِدِّیْ میں چھ قراءتیں ہیں: (۱) سوائے ورش کے اہل مدینہ نے یَهْدِّیْ یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پس انہوں نے اپنی قراءت میں دو ساکنوں کو جمع کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول: لَا تَعْدُوْا اور تَخِصِّمُوْنَ میں کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: دو ساکنوں کے جمع ہونے کی صورت میں کوئی بھی اسے بولنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: جو بھی اس طرح کا قصد کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسرہ کی طرف مائل کر کے خفیف سی حرکت دے اور سیبویہ اسے اختلاس حرکت کا نام دیتے ہیں۔

(۲) ابو عمرو اور قالون نے ایک روایت میں اسے فتحہ اور اسکان کے درمیان پڑھا ہے، یہ اخفا اور اختلاس کے بارے میں ان کے مذہب کی بنا پر ہے۔

(۳) ابن عامر، ابن کثیر، ورش اور ابن محیصن نے یَهَدِّیْ یا اور ہا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے

کہا ہے: یہ قراءت عربی میں بین اور واضح ہے، یہ اصل میں یھتدی ہے تا کو دال میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت ہا کو دے دی گئی ہے۔

(۴) حفص، یعقوب اور اعمش نے ابوبکر سے ابن کثیر کی قراءت کی مثل قراءت کی ہے، مگر یہ کہ انہوں نے ہا کو کسرہ دیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ جزم کو جب مجبوراً حرکت دی جائے تو اسے کسرہ کی حرکت دی جاتی ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے: یہ سفلی مضر کی لغت ہے۔

(۵) ابوبکر نے عاصم سے یِھِدّی یا اور ہا کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے، یہ تمام کسرہ کی اتباع کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں یَخِطّف کے تحت گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی لغت ہے جنہوں نے نِستعین اور لن تِمَسّنا النار وغیرہ پڑھا ہے۔ اور سیبویہ یِھِدّی کو جائز قرار نہیں دیتے البتہ تِھِدّی، نِھِدّی اور اِھِدّی میں جائز قرار دیتے ہیں انہوں نے فرمایا: کیونکہ یا میں کسرہ ثقیل ہوتا ہے۔

(۶) حمزہ، کسائی، خلف، یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے یَھْدِی یا کے فتحہ، ہا کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ھَدَی یَھْدِی سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں اس قراءت کی دو وجہیں ہیں اگرچہ وہ بعید ہیں، دو وجہوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسائی اور فراء دونوں نے کہا ہے: یھدی بمعنی یھتدی ہے۔ ابوالعباس نے کہا ہے: یہ معروف نہیں ہے، لیکن تقدیر عبارت ہے أمن لا یھدی غیرہ (کیا وہ جو غیر کی رہنمائی نہیں کر سکتا) کلام مکمل ہوگئی۔ پھر کہا: اِلَّآ اَنْ یُّھْدٰی یہ اول سے نیا کلام ہے، یعنی لیکن وہ محتاج ہے کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔ پس یہ استثنا منقطع ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان لا یُسمِع غیرہ إلا أنْ یُسمَع ای لکنه یحتاج أنْ یُسمَع (فلاں غیر کو سنا نہیں سکتا لیکن وہ محتاج ہے کہ اسے سنایا جائے)

ابواسحاق نے کہا ہے: فَمَا لَكُمْ یہ کلام تام ہے اور اس کا معنی ہے: پس بتوں کی عبادت میں تمہارے لیے کون سی شے ہے۔ پھر انہیں کہا گیا: كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ تم اپنے لیے کیسے فیصلے کرتے ہو اور تم یہ صریح باطل فیصلے کر رہے ہو، تم ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہو جو اپنے آپ کو بھی کسی چیز کا نفع نہیں دے سکتے مگر یہ کہ ان کے ساتھ کوئی عمل کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور تم اس کی عبادت چھوڑ رہے ہو۔ پس كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہے۔

## وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

''اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی، بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا مراد ان کے رؤسا (سردار) ہیں، یعنی وہ اس بارے میں محض تیز فہمی اور ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں کہ وہ معبود ہیں اور وہ شفاعت کریں گے اور ان کے پاس اس پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اور رہے ان کی اتباع کرنے والے تو وہ صرف تقلید کے طور پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔـا یعنی اللہ

تعالیٰ کے عذاب سے (وہم وگمان انہیں بے نیاز نہیں کر سکتا) اور حق تو خود الله تعالیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الحق سے مراد یقین ہے، یعنی ظن یقین کی مثل نہیں ہے۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ عقائد میں صرف ظن پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ بے شک الله تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کفر اور تکذیب کا عمل کرتے ہیں، یہ آیت تہدید (جھڑک) کے محل میں واقع ہے۔

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾

''اور نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو الله تعالیٰ (کی وحی آئے بغیر) بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے ذرہ شک نہیں اس میں کہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس میں أن، یفتری کے ساتھ مل کر مصدر ہے اور اس کا معنی ہے: وما کان ھذا القرآن إفتراء (یہ قرآن گھڑا ہوا نہیں ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: فلان یحب أن یرکب، ای یحب الرکوب (فلاں سوار ہونے کو پسند کرتا ہے) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو، جیسا کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران: 161) (اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے) وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أن بمعنی لام اور تقدیر کلام یہ ہو: وما کان ھذا القرآن لیفتری(1) (اور نہیں ہے یہ قرآن کہ اسے گھڑ لیا گیا ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی لا ہے، ای لا یفتری (اسے گھڑا نہیں گیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ غیر الله کی جانب سے اس قرآن کی مثل لائے پھر اسے الله تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے اس قرآن کے اعجاز، اس کے وصف، اس کے معانی اور اس کی تالیف و ترکیب کی وجہ سے۔ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ کسائی، فراء اور محمد بن سعدان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے ولکن کان تصدیق (بلکہ یہ تصدیق کرنے والا ہے) الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے) یعنی تورات، انجیل اور دیگر کتب، کیونکہ انہوں نے اس کی بشارت دی اور یہ اس بشارت میں اور توحید اور قیامت کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت میں ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے بلکہ یہ تو اس نبی کی تصدیق کرنے والا ہے جو قرآن سے پہلے آیا ہے اور وہ حضرت محمد مصطفی صلی الله علیہ وسلم ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کا مشاہدہ کیا ہوا تھا اس سے پہلے کہ وہ آپ سے قرآن سنتے۔ وَ تَفْصِيْلَ میں نصب اور رفع دونوں جائز ہیں انہی دو وجہوں کی بنا پر جو تصدیق میں مذکور ہیں۔ اور التفصیل کا معنی تبیین (وضاحت کرنا) ہے، یعنی قرآن کریم اس کی

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 157

وضاحت کرتا ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتابوں میں لکھا۔ اور الکتاب اسم جنس ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تفصیل الکتاب سے مراد وہ ہے جو قرآن کریم میں احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ اس میں ہاضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی قرآن کریم میں کوئی شک نہیں یعنی اس کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۸

”کیا یہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے، آپ فرمایئے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور (امداد کے لیے) بلالو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو“۔

قولہ تعالیٰ: اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ یہاں أم ہمزہ استفہام کے محل میں ہے، کیونکہ یہ اپنے ماقبل کے ساتھ متصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ أم منقطعہ ہے جو بل اور ہمزہ کے معنی کے ساتھ مقدر ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: الٓمّٓ ۝۱ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ (السجدہ) ای بل أیقولون افتراہ (بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: أم بمعنی واؤ ہے، اور یہ جائز ہے: و یقولون افتراہ (اور وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اسے گھڑ لیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میم صلہ ہے اور تقدیر کلام ہے: أیقولون افتراہ، ای إختلق محمد القرآن من قبل نفسہ (کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے) پس یہ استفہام تقریع اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے معنی میں ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ کلام کا معنی حجت بیان کرنا ہے، کیونکہ پہلی آیت اس پر دلیل ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، کیونکہ یہ اپنے سے پہلے ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے ساتھ موافقت کرتا ہے بغیر اس کے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اور یہ آیت ان پر یہ لازم کر رہی ہے کہ وہ اس کی مثل ایک سورت لے آئیں اگر یہ گھڑا ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کے اعجاز کے بارے میں کلام پہلے مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے کہ یہ معجز ہے۔ والحمدللہ۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ۝۳۹

”بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام، اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے پھر دیکھ لو کیسا انجام ہوا ظالموں کا“۔

قولہ تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ یعنی انہوں نے قرآن کو جھٹلایا اور وہ اس کے معانی اور اس کی تفسیر سے جاہل اور ناواقف تھے اور ان پر لازم ہے کہ وہ اسے سوال کے ذریعے جانیں۔ پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ واجب ہے کہ تاویل میں غور و فکر کی جائے۔ اور قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ یعنی ان پر عذاب نازل ہو کر جھٹلانے کے انجام کی حقیقت ظاہر نہیں

ہوئی یا انہوں نے اسے جھٹلایا جو موت کے بعد اٹھائے جانے، جنت اور دوزخ کے ذکر میں سے قرآن کریم میں موجود ہے اور جو ان کے لیے کتاب میں وعید کی گئی اس کی حقیقت ان کے پاس نہیں آئی، یہ حضرت ضحاک نے کہا ہے۔ اور حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم قرآن کریم میں یہ پاتے ہو (جو کسی شی سے جاہل ہو وہ اس کا دشمن ہوتا ہے)؟ آپ نے فرمایا: ہاں، یہ دو مقام پر ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ۔ اور ایک قول باری تعالیٰ ہے: وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪ (الاحقاف) (اور کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی قرآن سے تو اب ضرور کہیں گے کہ (اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے) كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں مراد گزشتہ امتیں ہیں (1)، یعنی جیسے ان کا طریقہ تھا۔ اور کاف محل نصب میں ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ یعنی کیسے انہیں ہلاکت اور عذاب نے پکڑ لیا (اس میں دیکھ لو)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۟

''ان میں سے کچھ ایمان لائیں گے اس پر اور ان میں سے کچھ ایمان نہیں لائیں گے اس پر اور آپ کا رب خوب جانتا ہے مفسدوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ کہا گیا ہے: اس سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی ان میں سے کچھ مستقبل میں آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اگرچہ ان کی تکذیب طویل ہو جائے، کیونکہ ان کے بارے میں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ انہیں یہ سعادت حاصل ہوگی۔ اور مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر جار و مجرور ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی ہے وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ اور اس کا معنی ہے اور ان میں سے کچھ اپنے کفر پر مصر رہیں گے یہاں تک کہ مر جائیں گے، جیسا کہ ابو طالب، ابولہب وغیرہما۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اہل کتاب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کفار کے لیے عام ہے۔ اور یہی صحیح ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک به میں ضمیر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بتادیا ہے کہ اس نے سزا اور عذاب کو مؤخر اس لیے کیا ہے کیونکہ ان میں سے کچھ عنقریب ایمان لے آئیں گے۔ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ یعنی آپ کا رب انہیں خوب جانتا ہے جو اپنے کفر پر اصرار کر رہے ہیں۔ اور یہ ان کے لیے تہدید اور جھڑک ہے۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ، عَمَلِيْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کا معنی ہے: تبلیغ کرنے، ڈرانے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بارے میں میرے عمل کا ثواب میرے لیے ہے۔ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ اور تمہارے عمل شرک وغیرہ کی جزا تمہارے لیے ہے۔ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ اس کی مثال یہ ہے، یعنی کسی ایک سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 158

دوسرے کے گناہ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ آیت آیت السیف سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد، کلبی، مقاتل اور ابن زید کے قول میں ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۞ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۞

''اور ان میں سے کچھ (بظاہر) کان لگاتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ سناتے ہیں بہروں کو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں سے کچھ (بظاہر) دیکھتے ہیں آپ کی طرف، تو کیا آپ راہ دکھاتے ہیں اندھوں کو خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ مراد ان کے ظواہر ہیں۔ اور ان کے دل تو اس میں سے کسی چیز کو محفوظ نہیں کرتے جو آپ انہیں حق میں سے کہتے ہیں اور جو قرآن کریم میں سے ان پر تلاوت کرتے ہیں، اسی لیے فرمایا ہے: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ، ای لا تُسْمِع (یعنی آپ نہیں سناتے) کلام میں بظاہر استفہام ہے لیکن اس کا معنی نفی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دلوں پر مہر لگ جانے کی وجہ سے بہروں کی مانند بنا دیا، یعنی آپ اسے ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے جسے ہدایت کی بات سننے سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ کر دیا ہو۔ اور اسی طرح معنی اس میں بھی ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ کوئی بھی اس کی توفیق اور اس کی ہدایت کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا(1)۔ یہ اور جو کلام اس کی مثل ہو وہ قدریہ کے اقوال کا رد کرتا ہے۔ جب کہ کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اور فرمایا ہے: یستمعون تو یہ من کے معنی کے اعتبار سے ہے اور ینظر، من کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، یعنی جس طرح آپ اسے سنانے ت نہیں رکھتے جس کی قوت سماعت سلب کر لی گئی ہو اور آپ یہ قدرت نہیں رکھتے کہ اندھے کے لیے بصارت کو پیدا کر دیں کہ وہ اس کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکے، پس اسی طرح آپ ان کو ایمان کی توفیق دینے کی قدرت نہیں رکھتے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور يَّنْظُرُ اِلَيْكَ کا معنی ہے یعنی وہ مسلسل آپ کی طرف دیکھتا ہے، جیسا کہ فرمایا: يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (الاحزاب: 19) (کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو) کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت استہزا کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۞

''یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں''۔

جب شقی (اور بدبخت) لوگوں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا کہ اس نے ان کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا اور یہ کہ ان پر شقاوت کا چھا جانا اور دل کی سماعت اور بصارت کا سلب ہو جانا اس کی طرف سے ظلم اور زیادتی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ملکیت

1۔ تفسیر الطبری، زیر آیت ہذہ

میں جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے اور وہ اپنے جمیع افعال میں عادل ہے۔ وَلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن لوگ اپنے نفسوں پر کفر، معصیت اور اپنے خالق کے حکم کی مخالفت کر کے ظلم کرتے ہیں (1)۔

حمزہ اور کسائی نے وَلٰكِنْ مخفف اور النَّاسُ کو مرفوع پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: نحویوں کی جماعت جس میں فراء بھی ہیں ان کا خیال ہے کہ عرب جب کہیں ولکن واؤ کے ساتھ تو تشدید کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی ولکن پڑھتے ہیں) اور جب واؤ کو حذف کردیں تو تخفیف کو ترجیح دیتے ہیں (یعنی لکن پڑھتے ہیں) اور اس میں علت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جب بغیر واؤ کے ہو تو یہ بل کے مشابہ ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مخفف کردیا تا کہ اس کا مابعد بل کے مابعد کی طرح ہوجائے اور جب یہ واؤ کے ساتھ آئے تو بل کے مخالف ہوتا ہے پس انہوں نے اسے مشدد کردیا اور اس کے ساتھ (مابعد کو) نصب دی، کیونکہ یہ ان ہے جس پر لام اور کاف کا اضافہ کیا گیا ہے اور اسے ایک حرف بنادیا گیا ہے اور شاعر کا قول ہے:

ولكنني من حبها لعميد

پس لعمید لام کے ساتھ ہے، کیونکہ (لکن) اصل میں أن ہے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۴۵

''اور جس روز اللہ تعالیٰ جمع کرے گا انہیں (وہ خیال کریں گے) گویا وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی دن کی پہچانیں گے ایک دوسرے کو (تب حقیقت کھلے گی کہ) گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْۤا یہ بمعنی کأنهم ہے پھر اسے مخفف کردیا گیا، یعنی گویا کہ وہ اپنی قبروں میں نہیں ٹھہرے۔ اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یعنی دن کی ایک گھڑی کی مقدار، مراد یہ ہے کہ وہ قبروں میں اپنے طویل قیام کو اس خوف اور ڈر کی وجہ سے کم اور قلیل سمجھیں گے جو خوف دوبارہ اٹھائے جانے کے سبب وہ دیکھ رہے ہوں گے، اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (ہم ٹھہرے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت اس ہول اور خوف سے کم ہے جو انہیں مستقبل میں ہوگا نہ کہ ان کے قبروں میں ٹھہرنے کی مدت۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنی عمروں کی طوالت کو خلود (اور دوام) کے مقابلہ میں ایک گھڑی کی مثل دیکھیں گے۔ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ یہ یحشرهم میں ہا اور میم (ہم) سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ (اس سے) منقطع ہو اور گویا یہ فرمایا: فهم يتعارفون (پس وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے)۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ان میں سے بعض بعض کو پہچان لیں گے جیسا کہ وہ دنیا میں پہچانتے تھے جب وہ اپنی قبور سے نکلیں گے اور یہ تعارف زجر و توبیخ اور ذلت و رسوائی کا تعارف ہوگا۔ ان میں سے بعض بعض کو کہیں گے: تو نے مجھے گمراہ کیا تھا اور تو نے مجھے بھٹکایا تھا اور تو نے مجھے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 159

کفر پر ابھارا تھا۔ یہ شفقت، نرمی اور مہربانی و رحم کا تعارف نہیں ہوگا۔ پھر معرفت اور پہچان ختم ہو جائے گی جب قیامت کے دن کی ہولنا کیوں کو دیکھیں گے جیسا کہ فرمایا: وَ لَا یَسْـَٔلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) (اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کا حال نہ پوچھے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زجر و توبیخ کا تعارف باقی رہے گا اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ...... تا قولہ...... وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (سبا) (کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے ہو جائیں گے اپنے رب کے روبرو...... اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے)

اور قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا، الآیہ (الاعراف: 38) (جب بھی داخل ہوگی کوئی امت وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر)

اور قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا، الآیہ (الاحزاب: 67) (اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی)

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ لَا یَسْـَٔلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ (المعارج) اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) (تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان) تو اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی رحمت و شفقت کا سوال اس سے نہیں پوچھے گا، واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے کئی مقامات اور جگہیں ہیں (ان کے احکام مختلف ہوں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَتَعَارَفُوْنَ کا معنی یتسألون ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے تم کتنی مدت ٹھہرے ہو، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) (اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے) اور یہ اچھا ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ مومنین کے ایک دوسرے پر مہربان ہونے اور رحم کرنے کا تعارف ہے۔ اور کافروں پر کوئی مہربانی اور رحم نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (المومنون: 101) اور پہلا قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کو جھٹلایا۔ پھر کہا گیا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہو بعث و نشور پر دلالت کرنے کے بعد، یعنی وہ جنت کے ثواب سے محروم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کی حالت میں خسارے میں رہے، کیونکہ خسارہ اس حالت میں ہوتا ہے جس میں اقالہ کی امید نہ ہو اور نہ ہی توبہ فائدہ اور نفع دے۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ہو، وہ یہ کہتے ہیں۔ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہدایت یافتہ نہ تھے۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ ۝

”اور خواہ ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان سے یا (پہلے ہی) ہم اٹھا لیں

آپ کو (ہر حالت میں) ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ یہ شرط ہے۔ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ یعنی آپ کی حیات میں آپ کے دین کو غالب کرنے کا (جو وعدہ ہم نے کیا ہے) اور مفسرین نے کہا ہے: وہ بعض جس کا ان کے ساتھ وعدہ تھا وہ ان کے قتل اور قید کا تھا جو بدر میں قتل کر دیئے گئے اور قیدی بنا لیے گئے۔

اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ اس کا عطف نُرِیَنَّكَ پر ہے یعنی یا ہم آپ کو اس سے پہلے اٹھا لیں۔ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ یہ اِما کا جواب ہے۔ اور مقصود یہ ہے اگر آپ نے ان سے جلدی انتقام نہیں لیا تو ہم نے ان سے تاخیر کے ساتھ انتقام لے لیا۔ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ یعنی اللہ تعالیٰ شاہد (گواہ) ہے جو کسی شاہد کا محتاج نہیں۔ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ اس پر جو وہ آپ کے ساتھ جنگ اور آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور اگر کہا جائے: ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بمعنی هناك (پھر اللہ تعالیٰ وہاں گواہ ہوگا) یہ بھی جائز ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول (اور انہوں نے اس کو جھٹلایا) تو فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ معنی یہ ہوگا: ہر امت کے لیے ایک رسول ہے وہ ان پر شاہد ہوگا، جب ان کا رسول قیامت کے دن آئے گا تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کی مثل یہ ہے فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ (النسا: 41) (تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کل (قیامت کے دن) کفار اپنے پاس رسولوں کے آنے کا انکار کر دیں گے، تو ایک رسول لایا جائے گا اور وہ کہے گا: تحقیق میں نے تم تک پیغام پہنچایا، تو اس وقت ان کے خلاف عذاب کا فیصلہ کر دیا جائے گا، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا (البقرہ: 43) (اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہوگا)

اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو بے شک وہ دنیا میں عذاب نہیں دیئے جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجے پس جو ایمان لایا وہ کامیاب ہوا اور نجات پا گیا اور جو ایمان نہ لایا وہ ہلاک ہو گیا اور اسے عذاب دیا گیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو) اور القسط کا معنی عدل ہے۔ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ یعنی بغیر گناہ کے نہ انہیں عذاب دیا جائے گا اور نہ بغیر حجت کے ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۸﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (عذاب کا) وعدہ اگر تم سچے ہو"۔

مراد کفار مکہ ہیں کیونکہ وہ اپنے انکار کی زیادتی اور اپنے لیے عذاب کے جلدی آنے کی طلب میں یہ کہتے تھے: عذاب کب آئے گا یا وہ قیامت کب آئے گی جس کے بارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے وعدہ کرتے ہیں؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عام

ہے ہر اس امت کو جس نے اپنے رسول کو جھٹلایا۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۴۹

”آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مگر جتنا چاہے اللہ تعالیٰ، ہر قوم کے لیے میعاد مقرر ہے، جب آئے گی ان کی مقرر میعاد تو نہ وہ پیچھے رہ سکیں گے ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکیں گے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا جب انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا مالک نہیں ہوں، یعنی اس کی ملکیت نہ اپنے لیے ہے اور نہ اپنے سوا کسی اور کے لیے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے کہ میں اس کا مالک ہوں اور اس پر قادر ہوں۔ تو میں کیسے قادر ہو سکتا ہوں کہ میں اس کا مالک بنوں جس کے جلدی آنے کا تم نے مطالبہ کیا پس تم جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ یعنی ہر قوم کی ہلاکت اور اس پر عذاب آنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں ایک معین وقت ہے۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ جب ان کی میعاد گزرنے کے ساتھ وہ معین وقت آئے گا۔ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ تو پھر ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں باقی رہتے ہوئے ایک لمحہ بھی پیچھے رہ سکیں اور نہ وہ آگے بڑھ سکیں گے پس انہیں مہلت دی جا رہی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۵۰

”آپ فرمائیے (اے منکرو!) ذرا غور کرو اگر آ جائے تم پر اس کا عذاب راتوں رات یا دن دہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) کس چیز کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں اس سے مجرم“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا یہ دو ظرفیں ہیں۔ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (یونس: 48) اور یہ ان کے عذاب کے جلدی آنے کے مطالبہ میں ان کی آراء کی بے وقوفی اور احمقانہ پن ہے، یعنی اگر تم پر عذاب آ جائے تو اس میں تمہارا نفع کیا ہے اور اس وقت ایمان تمہیں کوئی نفع نہیں دے سکے گا۔ مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی تہویل و تعظیم ہے، یعنی کتنی بڑی اور عظیم ہے وہ شے جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں، جیسے اس کے لیے کہا جاتا ہے جو ایسے امر کا مطالبہ کرتا ہو جس کا انجام مضر ہو: تو اپنے خلاف کون سی چیز چن رہا ہے؟ منہ میں ضمیر کے بارے بعض نے کہا ہے: وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اگر تو منہ میں ھاء ضمیر کو بنائے کہ وہ عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تیرے لیے ماذا میں دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور ذا بمعنی الذی ہو اور وہ ما کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو۔ اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ ماذا ایک اسم مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور مابعد جملہ اس کی خبر ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور اگر منہ کی ہا ضمیر کو بنائیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے تو پھر تو ما اور ذا کو ایک

شے بنائے گا اور یہ یستعجل کے سبب محل نصب میں ہوگا۔ اور اس کا معنی ہوگا: أیّ شئ یستعجل منه المجرمون من الله عزوجل (کون سی شے کو مجرم الله تعالیٰ سے جلدی طلب کر رہے ہیں)

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۵۱

''کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا تب ایمان لاؤ گے اس پر (فرشتے انہیں کہیں گے) اب (آنکھیں کھلیں) تم تو اس عذاب کے لیے بڑی جلدی مچا رہے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ اس کلام میں حذف ہے، تقدیر کلام ہے: أتأمنون أن ينزل بكم العذاب ثم يقال لكم إذا حل: آلان آمنتم به؟ (کیا تم ایمان لاؤ گے کہ تم پر عذاب نازل کیا جائے پھر تم کو کہا جائے گا جب وہ آ جائے: اب تم اس کے ساتھ ایمان لاؤ گے؟ کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ بطور استہزا ملائکہ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ الله تعالیٰ کے قول میں سے ہے اور ہمزہ استفہام ثم پر داخل ہوا ہے یہ تقریر و توبیخ کے لیے ہے اور تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ دوسرے جملے کا معنی پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہاں ثم بمعنی ثَم (ثا کے فتحہ کے ساتھ) ہے پس یہ ظرف ہوگی اور اس کا معنی ہوگا: أهنالك یہ علامہ طبری کا مذہب ہے (1)، اور اس وقت اس میں استفہام کا معنی نہ ہوگا۔ اور الآن کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں حان کی مثل فعل مبنی ہے اور پھر اسے اسم کی طرف پھیرنے کے لیے اس پر لام لگایا گیا ہے۔ اور خلیل نے کہا ہے: اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے بنایا گیا ہے اور الف لام عہدی ہے اور اشارہ وقت کی طرف ہے، اور یہ دو زمانوں کی حد ہے۔ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تم تو اس عذاب کے لیے تَسْتَعْجِلُوْنَ جلدی مچا رہے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۵۲

''پھر کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو (اب) دائمی عذاب (کا مزہ) کیا تمہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو تم کمایا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی ان کو جہنم کے داروغے کہیں گے۔ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ یعنی چکھو وہ عذاب جو ختم نہیں ہوگا۔ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ یعنی تمہارے کفر کا بدلہ تمہیں دیا جائے گا۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۳

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے کیا یہ واقعی سچ ہے؟ آپ فرمایئے: ہاں! بخدا یہ سچ ہے اور تم (الله تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ سے عذاب آنے اور قیامت قائم ہونے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اَحَقٌّ یہ مبتدا ہے۔ هُوَ یہ سد مسد الخبر ہے۔ اور سیبویہ کا قول ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ھو مبتدا ہو اور أحق خبر ہو۔ یہ قسم ہے۔ اِنَّهٗ لَحَقٌّ یہ جواب قسم ہے، یعنی بے شک یہ ہونے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 141

یعنی تم اس کے عذاب اور اس کے بدلے سے بچ نہیں سکتے۔

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر ہر ظالم شخص کے لیے روئے زمین کی دولت ہو تو بھی وہ ساری دولت بطور فدیہ دے دے۔ اور وہ ظالم دل ہی دل میں پچھتانے لگے جب دیکھا انہوں نے عذاب کو اور فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ یعنی اگر ہر شخص کے لیے جس نے شرک کیا اور کفر کیا۔ مَا فِي الْاَرْضِ یعنی وہ سب اس کی ملکیت ہو جو زمین میں ہے۔ لَافْتَدَتْ بِهٖ وہ ساری دولت اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بدلے فدیہ دے دے، تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى (آل عمران: 91) (جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا) اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ یعنی انہوں نے ندامت کو مخفی رکھا، یعنی ان کے سرداروں نے۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ندامت کو اپنے تبعین سے چھپا کر رکھا(1)۔ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ (جب انہوں نے عذاب کو دیکھا) اور یہ آگ میں جلائے جانے سے پہلے ہے۔ اور جب وہ جہنم میں واقع ہوں گے تو آگ انہیں ایسا کرنے سے غافل کر دے گی۔ اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (المومنون: 106) (اے ہمارے رب! غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی) پس ظاہر ہو گیا کہ وہ اسے نہیں چھپا سکیں گے جو انہیں لاحق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: أسروا بمعنی أظهروا (یعنی وہ ظاہر کر دیں گے) اور یہ کلمہ اضداد میں سے ہے اور اس پر دلیل یہ بھی ہے کہ آخرت مضبوطی اور صبر دکھانے کا دار نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنے دلوں میں حسرت کا درد پانے لگے، کیونکہ ندامت کو ظاہر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کثیر نے کہا ہے:

فأسررتُ الندامة يوم نادى　　بردّ جمال غاضرة المنادى

اور مبرد نے اس میں ایک تیسری وجہ ذکر کی ہے کہ ان کے چہروں کے خطوط ندامت کو ظاہر کر دیں اور یہ پیشانی کی لکیریں (اور خدوخال) ہیں، اور اسرۃ کا واحد سرار ہے۔ اور ندامت سے مراد وہ حسرت ہے جو کسی شے کے واقع ہونے یا فوت ہونے کی وجہ سے ہو۔ اور اس کا اصل معنی تو لازم ہوتا ہے۔ اور اسی سے ندیم ہے کیونکہ وہ مجالس کو لازم پکڑتا ہے۔ اور فلان نادم سادم (فلاں نادم اور غمگین ہے)

اور السَّدَم اللَّهَج بالشئ (سدم کا معنی شیفتہ ہونا ہے) اور ندم وتندّم بالشئ یعنی کسی شی کے سبب غمگین ہوا۔ جوہری نے کہا ہے: السَّدَم کا معنی ندامت اور حزن ہے۔ اور سَدِم کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی غمگین ہونا اور پریشان ہونا ہے۔ اور رجل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 438

نادم سادم، وندمان سدمان۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس (نادم) کے تابع ہے اور مالہ ھمٌ ولا سدمٌ إلا ذالك یعنی اس کے لیے نہ کوئی غم ہے نہ پریشانی سوائے اس کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الندم الدمن کا مقلوب ہے۔ اور الدمن کا معنی لازم ہونا ہے۔ اور اس سے ہی فلان مد من الخمر فلاں شراب کو لازم پکڑنے والا ہے یعنی ہمیشہ شراب پینے والا ہے) اور الدمن سے مراد وہ شے ہے جو گھر میں جمع ہو اور تلبّد من الأبوال والأبعار (اور بول و براز اور گوبر (کھاد) جمع ہو گیا) اس کے لازم ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ اور الدّمنة اس سے مراد وہ کینہ ہے جو سینے کو لازم پکڑے ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع دمن ہے۔ اور قد دَمِنتِ قلوبھم (ان کے دل کینے سے بھر گئے) کہا جاتا ہے: دَمِنتُ علی فلان ای ضَغِنتُ (یعنی میں نے فلاں کے لیے کینہ رکھا)۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ یعنی رؤسا اور ادنی لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کر دیا گیا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

"سن لو! بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

أَلَا سامع کے لیے یہ حرف تنبیہ ہے یہ کلام کے اوّل میں زائد کیا جاتا ہے، یعنی تم ان کے بارے آگاہ ہو جاؤ جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔ إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (بے شک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے) لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (البقرہ: 107) (آسمانوں اور زمین میں اسی کی بادشاہی ہے) اور کوئی مانع نہیں جو اسے اپنے وعدہ کو نافذ کرنے سے روک سکے(1)۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾

"وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"۔

اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾

"اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آگئی ہے) شفا ان روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں اور (آگئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لیے"۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 259

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ مراد قریش ہیں۔ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ اس میں موعظة کا معنی نصیحت ہے۔ مِّنْ رَّبِّكُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یعنی قرآن کریم جس میں نصیحتیں اور حکمت آموز باتیں ہیں۔ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ اور (آگئی ہے) ان روگوں سے شفا جو شک، نفاق، اختلاف اور افتراق میں سے سینوں میں ہیں۔ وَهُدًی اور ان کے لیے رشد وہدایت جنہوں نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ وَّرَحْمَةٌ اور رحمت ونعمت لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (اہل ایمان کے لیے) انہیں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہی ایمان کے ساتھ نفع حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قرآن کی صفات ہیں اور عطف مدح کی تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إلی المَلِكِ القَرْمِ و ابنِ الهُمامِ ولیثِ الكَتِیبة فی المُزْدَحَمْ

اس میں بھی یہ تمام صفات بادشاہ کی ہیں اور عطف برائے تاکید ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝۵۸

''(اے حبیب!) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں، یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم اور رحمت سے مراد اسلام ہے۔ اور انہی دونوں سے یہ بھی روایت ہے کہ فضل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں اس کے اہل بنایا (1)۔ اور حضرت حسن، ضحاک، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے: فضل اللہ سے مراد ایمان ہے اور رحمتہ سے مراد قرآن ہے (2)، یہ پہلے قول کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یہ اشارہ فضل اور رحمت کی طرف ہے۔ اور عرب، ذالک کو واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے بطور اشارہ لاتے رہتے ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فبذالك فلتفرحوا تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ یزید بن قعقاع اور یعقوب وغیرہ کی قراءت ہے۔ اور حدیث میں ہے۔ لتأخذوا مصافکم (3) (چاہیے کہ تم اپنی صفوں میں رہو) اور الفرح سے مراد لذة فی القلب بادراك المحبوب (وہ لذت ہے جو محبوب کے ملنے سے دل میں محسوس ہوتی ہے) اور کئی مقامات پر فرح (خوشی) کی مذمت بیان کی گئی ہے، مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ۝ (القصص) (زیادہ خوش نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو) اور اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ (ہود) (بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا اترانے والا ہے) لیکن یہ مطلق ہے اور فرحت کو مقید کر دیا جائے تو وہ مذموم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا ارشاد ہے: فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 170) (شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے) اور یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا یعنی قرآن

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 144 2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164

3۔ جامع ترمذی، باب من سورة ص، حدیث نمبر 3159، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسلام کے ساتھ چاہیے کہ وہ خوشی منائیں، پس یہ مقید ہے۔

ہارون نے کہا ہے: حضرت ابی کی قراءت میں فذالك فافرحوا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لام کے ساتھ ہوتا کہ اس کے ساتھ حرف جازم ہو جیسا کہ نہی کے ساتھ حرف ہوتا ہے، مگر وہ امر سے مخاطب کے لیے حذف کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے خطاب کے سبب اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات وہ اسے اپنے اصل کے مطابق لے آتے ہیں۔ اور اسی سے فبذالك فلتفرحو ہے۔

**هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** یعنی یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ دونوں فعلوں میں عام قراءت یا کے ساتھ ہے۔ اور ابن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے فليفرحوا یا کے ساتھ اور تجمعون تا کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ اس لیے کہ یہ خطاب کافروں کو ہے۔ اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے پہلے میں تا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور **يَجْمَعُوْنَ** میں یا کے ساتھ یعنی پہلے قول کا برعکس ہے۔ اور ابان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور قرآن کریم کا علم سکھایا پھر وہ فاقہ کی شکایت کرے اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے درمیان فقر لکھ دے گا اس دن تک جس میں وہ اسے ملے گا''۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی......

**قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** (من هداه الله الإسلام و علمه القرآن ثم شكا الفاقة كتب الله الفقر بين عينيه الى يوم يلقاه) (2)

**قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾**

''آپ فرمائیے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا پس بنا لیا ہے تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال، پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: **قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا** اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ اَرَءَيْتُمْ** یہ کفار مکہ کو خطاب ہو رہا ہے۔ **مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ** اس میں ما محل نصب میں ہے، أرایتم کے سبب۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ أنزل کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور أنزل بمعنی خلق ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: **وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ** (الزمر: 6) (اور پیدا کیے تمہارے لیے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے) اور **وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ** (الحدید: 25) (اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے) پس یہ بھی جائز ہے کہ خلق کو انزال کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا گیا ہو کیونکہ زمین میں جو بھی رزق ہے وہ وہی ہے جو آسمان سے بارش کے سبب نازل ہوتا ہے۔ **فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا** حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو انہوں نے بحیرہ،

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 164
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 439، تفسیر درمنثور

سائبہ، وصیلہ اور حام کی تحریم کے بارے حکم لگایا۔ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (الانعام:136) (اور انہوں نے بنا رکھا ہے اللہ کے لیے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ) قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال و حرام کرنے کی اجازت دی ہے۔ اَمْ عَلَى اللّٰهِ اس میں ام بمعنی بل ہے۔ تَفْتَرُوْنَ یہ ان کا قول ہے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے (یعنی یہ کہہ کر تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہو)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت سے قیاس کی نفی کے بارے استدلال کیا گیا ہے اور یہ بعید (از حقیقت) ہے کیونکہ قیاس اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے، پس تحریم و تحلیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے ایسی دلیل کے پائے جانے کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے حکم پر قائم کی ہے، پس اگر کوئی قیاس کے اللہ تعالیٰ کی دلیل ہونے میں اختلاف کرے تو یہ اس غرض (اور مقصد) سے خروج ہے اور اس کے غیر کی طرف رجوع ہے۔

وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

"اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا کہ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا، بے شک اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس میں یوم ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا ظن کی وجہ سے جیسا کہ ما ظننت زیدا ہے اور اس کا معنی ہے کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ان کا مواخذہ نہیں فرمائے گا(1)۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ بے شک اللہ تعالیٰ (اس میں) تاخیر کر کے اور مہلت دے کر لوگوں پر فضل و کرم فرماتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے اہل مکہ کا ارادہ کیا ہے جس وقت انہیں حرم پاک میں پر امن بنا دیا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یعنی کفار لَا يَشْكُرُوْنَ اللہ تعالیٰ کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے سے عذاب کو موخر کرنے میں (اس کا شکر ادا کرتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لا یشکرون کا معنی ہے لا یوحدون یعنی اس کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتے۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

"اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کچھ قرآن اور (اے لوگو!) نہ تم کچھ عمل کرتے ہو مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں۔ اور

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 165

نہیں چھپا ہوتا آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ اس میں ما برائے انکار ہے، یعنی آپ کسی حال میں نہیں ہوتے، مراد یہ کہ چاہے وہ عبادت کی حالت ہو یا اس کے سوا کی مگر اللہ تعالیٰ آپ پر مطلع ہے۔ شان حالت اور امر (کام) کو کہتے ہیں اس کی جمع شئون ہے۔ اخفش نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: ما شأنت شأنه یعنی میں نے اس کا کام نہیں کیا (ما عملت عمله)، وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ فراء اور زجاج نے کہا ہے: منہ کی ہا ضمیر شان کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی آپ جو نیا کام کرتے ہیں پھر اس کی وجہ سے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا حکم کیا ہے یا اس بارے میں قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: منه سے مراد من کتاب الله تعالیٰ ہے(1) (یعنی نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے) مِنْ قُرْاٰنٍ تفخیم شان کے لیے اس کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ (القصص: 30) (بے شک میں اللہ ہوں) وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اللہ تعالیٰ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو خطاب فرما رہا ہے: (اور نہ تم کچھ عمل کرتے ہو)

اور قول باری تعالیٰ: وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مراد آپ اور آپ کی امت ہے۔ اور کبھی خطاب رسول کو کیا جاتا ہے اور مراد وہ اور اس کے متبعین ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں مراد کفار قریش ہیں۔ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا (مگر ہر حال میں ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں) یعنی ہم اسے جانتے ہیں، اور اس کی نظیر یہ ارشاد ہے۔ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلة: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے)

اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ یعنی جب تم اس میں شروع ہوتے ہو۔ فیہ میں ہا ضمیر عمل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے: أفاض فلان فی الحدیث والعمل جب وہ بات اور کام میں لگ جائے۔ الراعی کا قول ہے:

فأفضن بعد كظومهن بجرّة من ذی الأباطح إذ رعين حقيلا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ، تفعلونه (جب تم اس میں داخل ہوتے ہو) ابن کیسان نے کہا ہے: تنشرون القول (جب تم بات مشہور کرتے ہو)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ہا ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا معنی ہوگا: جب تم قرآن میں جھوٹ ملاتے ہو۔

وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آپ کے رب سے غیب نہیں ہوتا(2)۔ اور ابوروق نے کہا ہے: آپ کے رب سے دور نہیں ہوتا۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: وہ آپ کے رب سے جا نہیں سکتا۔ اور کسائی نے یعزب زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں واقع ہوا ہے اور باقیوں نے عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، جیسے یَعْرِشُ اور یَعْرُشُ ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 149 2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 151

مِنْ مِّثْقَالِ اس میں من صلہ ہے۔ ذرۃ یعنی ذرے کا وزن۔ مراد یہ ہے کہ آپ کے رب سے ذرے کے وزن کے برابر بھی کوئی شی مخفی اور چھپی ہوئی نہیں، یعنی سرخ رنگ کی چھوٹی سی چیونٹی کے برابر بھی۔ اور سورۃ النساء میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اس کا عطف لفظ مثقال پر ہے اور اگر چاہیں تو ذرہ پر کر لیں۔

اور یعقوب اور حمزہ نے دونوں میں را کو رفع کے ساتھ مثقال کے محل پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ من زائدہ تاکید کے لیے ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: مبتدا ہونے کی بنا پر رفع بھی جائز ہے اور اس کی خبر اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونے کے ساتھ لوح محفوظ میں بھی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: اِلّا واؤ نسق کے معنی میں ہے یعنی وھو فی کتاب مبین (اور وہ لوح محفوظ میں ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ (النمل) ای و من ظلم (میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) اور قول باری تعالیٰ: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (البقرہ:150) ای والذین ظلموا منھم (تا کہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے) پس الا بمعنی واؤ نسق ہے، اور اس کے بعد ھو مضمر ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ (البقرہ:58) ای ھی حطۃ (اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں)

اور قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ (النساء:171) ای ھم ثلاثۃ (اور نہ کہو تین خدا ہیں) اور اس کی نظیر اس میں بھی ہے جس میں ہم ہیں: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الانعام) ای وھو فی کتاب مبین (اور نہیں گرتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں)

## اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

”سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔

قولہ تعالیٰ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یعنی بے شک آخرت میں اولیاء اللہ کو کوئی خوف نہیں۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ دنیا کے مفقود ہونے کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یعنی جس کا والی اللہ تعالیٰ ہو اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اس نے لی ہوئی ہو اور وہ اس سے راضی اور خوش بھی ہو تو قیامت کے دن نہ اسے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا...... یعنی جہنم سے ...... مُبْعَدُوْنَ ۝ ...... تا قولہ ...... لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء:103) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے نہ غمناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ)

اور حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: الذین یذکر اللہ برؤیتھم (یعنی وہ جنہیں دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی (وضاحت) میں فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں (لیکن) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مرتبے کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام اور شہداء ان پر رشک کریں گے"۔

عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمیں خبر دیجیے وہ کون ہیں اور ان کے اعمال کیا ہیں تاکہ ہم ان سے محبت کرنے لگ جائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ ایسی قوم ہے جو آپس میں نسبی رشتہ داری کے بغیر اور ایسے مالوں کے بغیر جن کے سبب وہ ایک دوسرے سے مہربانی کرتے ہوں محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ قسم بخدا! بے شک ان کے چہرے نور ہوں گے اور بلاشبہ وہ نور کے منبروں پر ہوں گے وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے جب لوگوں کو خوف ہوگا اور وہ غمگین نہیں ہوں گے جب لوگ غمزدہ ہوں گے"۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (1) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اولیاء اللہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے جاگنے کے سبب زرد ہوں، آنسوؤں کے سبب آنکھیں کمزور ہوں، بھوک کے سبب پیٹ دبلے اور خالی ہوں اور ان کے ہونٹ گرمی یا پیاس کے سبب خشک ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ یعنی انہیں اپنی اولاد کے بارے میں کوئی خوف نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ اور نہ انہیں اپنی دنیا پر کوئی غم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں عوض عطا فرما دیتا ہے ان کے پہلوں میں بھی اور ان کے پچھلوں میں بھی کیونکہ وہ ان کا ولی اور ان کا مددگار ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیزگاری کرتے رہے"۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی صفت ہے پس اَلَّذِیْنَ، اِنَّ کے اسم سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور وہ اولیاء ہے اور اگر چاہیں تو اس سے پہلے اعنی مقدر مان لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ہے پس اس طرح یہ (ترکیبی اعتبار سے) ماقبل سے کٹ جائے گا، یعنی وہ جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۴﴾

"انہیں کے لیے بشارت ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں، نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں یہی بڑی کامیابی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "جب سے یہ آیت نازل ہوئی ہے تیرے سوا کسی نے اس کے بارے مجھ سے نہیں پوچھا، یہ سچے خواب ہیں جنہیں ایک مسلمان دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں" (2)۔ اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرحم، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138

ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے۔ اور زہری، عطا اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بشارت سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ ملائکہ دنیا میں موت کے وقت ایک مومن کو خوشخبری دیتے ہیں۔ اور محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب بندہ مومن کی روح نکلنے کے ارادہ سے جمع ہو جائے اس کے پاس ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور کہتے ہیں: السلام علیك ولی اللہ اللہ یقرئك السلام (1) (اے اللہ تعالیٰ کے دوست (ولی) تجھ پر سلام ہو اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرما رہا ہے) پھر وہ اس آیت کے ساتھ نکال لیتے ہیں: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (النحل: 32) (وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو!) سلامتی ہو تم پر۔ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت قتادہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: بشارت یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے جان لیتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی کتاب میں جنت اور عظیم ثواب کے بارے عطا فرما دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ (التوبہ: 21) (خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی) مزید ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ (البقرہ: 25) (اور خوشخبری دیجیے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لیے باغات ہیں) مزید فرمایا: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (فصلت) (تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اور اسی لیے ارشاد فرمایا: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدوں کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ اس لیے ہے کیونکہ اس کے وعدے اس کے کلمات ہیں۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ کہا گیا ہے: آخرت میں جنت کے بارے بشارت ہوگی جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے: جب روح نکلتی ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی بشارت دی جاتی ہے۔ اور ابو اسحاق ثعلبی نے ذکر کیا ہے: میں نے ابو بکر محمد بن عبداللہ جوزقی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے ابو عبداللہ الحافظ کو خواب میں ترکی گھوڑے پر سوار دیکھا وہ اپنے اوپر کمبل لیے ہوئے اور عمامہ باندھے ہوئے تھے، میں نے انہیں سلام کیا اور انہیں کہا: خوش آمدید، بے شک مسلسل تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں اور تمہارے محاسن اور خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں، تو انہوں نے کہا: اور ہم بھی تمہارا ذکر کرتے ہیں اور تمہاری خوبیاں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (ان کے لیے) اچھی تعریف ہے اور اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ بھی کیا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ یعنی اس کے وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خبریں تبدیل نہیں ہوتیں، یعنی وہ انہیں کسی شے کے ساتھ منسوخ نہیں کرتا اور وہ نہیں ہوتیں مگر اسی طرح جیسے وہ فرمائے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جس مقام پر اولیاء اللہ ہوں گے وہی عظیم کامیابی ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 361، حدیث نمبر 402 (بتغیر قلیل)
2۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 168

''اور نہ غمزدہ کریں آپ کو ان کی باتیں یقیناً ساری عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز جاننے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ کلام مکمل ہوگئی، یعنی ان کا افترا باندھنا اور ان کا آپ کو جھٹلانا آپ کو غمزدہ نہ کرے، پھر کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ یعنی بے شک قوت کاملہ، غلبہ شاملہ اور قدرت تامہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہے پس وہی آپ کا ناصر، مددگار اور محافظ ہے۔ جَمِیْعًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس کے معارض نہیں ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون: 8) (حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے) کیونکہ تمام عزتیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں اور وہ تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (الصافات) پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان (ناسزا باتوں سے) جو وہ کیا کرتے ہیں) هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وہ ان کی باتیں اور ان کی آوازیں سننے والا ہے اور ان کے اعمال، ان کے افعال اور ان کی جمیع حرکات کو جاننے والا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

''خبردار! بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور کس کی پیروی کر رہے ہیں جو لوگ پکار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے) شریکوں کو؟ نہیں پیروی کر رہے مگر وہم و گمان کی اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یعنی (بے شک جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک میں ہے) وہ ان کے بارے میں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جو وہ ارادہ فرماتا ہے اور ان میں وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اس میں مانفی کے لیے ہے، یعنی وہ حقیقۃً دوسرے شریکوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ شفاعت کریں گے یا نفع دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے، یعنی کون سی شی ہے جس کی وہ پیروی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے شریکوں کو پکار رہے ہیں (1)۔ (یہ) ان کے فعل کی قباحت (اور برائی) بیان کرنے کے لیے ہے، پھر جواب دیا اور فرمایا: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ یعنی وہ محض تخمینے لگا رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

''وہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا بے شک اس میں

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 169

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: ھُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ یہ بیان فرمایا کہ واجب اس کی عبادت ہے جو رات اور دن کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو اس چیز پر قدرت نہیں رکھتا وہ عبادت کے لائق نہیں۔ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ تا کہ تم اس میں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ آرام کرو تا کہ تم سے تھکاوٹ اور سستی زائل ہو جائے۔ اور سکون سے مراد اضطراب اور پریشانی سے پر سکون ہونا ہے، آرام پانا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالنَّھَارَ مُبۡصِرًا اور دن کو روشن بنایا تا کہ تم اس کے ساتھ اپنی حوائج وضروریات میں ہدایت اور رہنمائی پاسکو اور المبصر وہ ہوتا ہے جو دیکھنے والا ہو، اور دن میں دیکھا جاتا ہے۔ اور فرمایا: مُبۡصِرًا یہ مجازا ہے اور عربوں کی عادت کے مطابق اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ ان کا قول ہے، لیل قائم (رات قیام پذیر ہے) اور نہار صائم (اور دن روزے دار ہے) اور جریر نے کہا ہے:

لقد لُمۡتِنا یا أمَّ غَیۡلان فی السُّرَی　　ونمتِ وما لیلُ المَطِیِّ بنائم(1)

اور قطرب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے أظلم اللیل یعنی رات تاریکی والی ہوگی۔ (صار ذا ظلمة) اور أضاء النھار و أبصر (دن روشن اور دیکھنے والا ہو گیا) أی صار ذا ضیاء و بصر۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ بے شک اس میں علامات اور دلائل ہیں۔ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ یعنی ان لوگوں کے لیے جو گہری غور وخوض سے سنتے ہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ ؕ ھُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِھٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾

''انہوں نے کہا بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا، وہ پاک ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں تمہارے پاس کوئی دلیل اس (بیہودہ بات) کی، کیا بہتان باندھتے ہو اللہ تعالیٰ پر جس کا تمہیں علم ہی نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا یعنی کافروں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا بنالیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ سُبۡحٰنَہٗ اس نے اپنے آپ کو بیوی اور اولاد سے اور شرکاء اور مدمقابل الٰہوں سے پاک رکھا ہوا ہے۔ ھُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مطلق غنی اور بے نیاز ہونے کی خبر دی اور یہ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملک، اس کی مخلوق اور اس کی غلام ہے: اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾ (مریم)

اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِھٰذَا یعنی تمہارے پاس اس بیہودہ بات پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے کو ثابت کر کے (کیا تم اس پر بہتان باندھتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں) کیونکہ بیٹا تو

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 130

مجانست اور مشابہت کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نہ کسی شے سے مجانست رکھتا ہے اور نہ کسی شے سے مشابہت رکھتا ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''آپ فرمایئے جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ یعنی بے شک وہ جھوٹ گھڑتے ہیں۔ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ یعنی نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ پر امن ہو سکتے ہیں، کلام مکمل ہوئی۔ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا یعنی ذالك متاع او هو متاع فی الدنیا (یہ دنیا میں (چند روزہ) لطف اندوزی ہے) یہ کسائی نے کہا ہے اور اخفش نے کہا ہے: لهم متاع فی الدنیا (ان کے لیے لطف اندوزی ہے دنیا میں) ابو اسحاق نے کہا ہے: قرآن کے علاوہ (دوسری عبارت میں) نصب پڑھنا بھی جائز ہے معنی یہ ہوگا یتمتعون متاعا (وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں دنیا میں) ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ پھر ہماری طرف ان کا رجوع ہے۔ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ پھر ہم انہیں انتہائی سخت عذاب چکھائیں گے۔ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ یعنی ان کے کفر کے سبب۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْكِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

''اور آپ پڑھ سنایئے انہیں نوح (علیہ السلام) کی خبر جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر گراں ہے تم پر میرا قیام اور میرا پند و نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا سو تم بھی کوئی متفقہ فیصلہ کر لو اپنے شریکوں سے مل کر پھر نہ ہو تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی پھر کر گزرو میرے ساتھ (جو جی میں آئے) اور مجھے مہلت نہ دو''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان کے سامنے پہلے لوگوں کے قصے اور واقعات بیان فرمائیں اور انہیں کفر اختیار کرنے پر دردناک عذاب سے ڈرائیں (اور خوفزدہ کریں) اتل میں واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ امر ہے، یعنی آپ ان پر حضرت نوح علیہ السلام کی خبر پڑھ کر بیان کریں۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اس میں اذ محل نصب میں ہے۔ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ یعنی اگر تم پر بھاری اور ثقیل ہے۔ مَّقَامِیْ، المقام (میم کے فتحہ کے ساتھ ہو) تو معنی وہ جگہ ہے جس میں قیام ہوتا ہے۔ اور المقام (میم کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی الاقامة (قیام کرنا ہوتا ہے)۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کے ساتھ نہیں پڑھا گیا، یعنی اگر تم میں میرا ٹھہرنا تم پر گراں ہے۔ وَتَذْكِیْرِیْ اور

تمہیں میرا پند و نصیحت کرنا اور تمہیں میرا اڈرانا۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی آیات سے) اور تم نے میرے قتل کا اور مجھے بھگانے کا ارادہ کر لیا ہے(1)۔ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ تو میں نے اللہ پر اعتماد کر لیا۔ اور یہ جواب شرط ہے۔ اور آپ علیہ السلام تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکل کرتے رہے، لیکن یہاں خاص طور پر بیان فرمایا کہ وہ متوکل ہیں تا کہ ان کی قوم جان لے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ میں آپ کے لیے کافی ہوگا، یعنی اگر تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں بلا شبہ اس پر اعتماد اور توکل کرتا ہوں جو میری مدد کرے گا۔

قولہ تعالیٰ: فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ عام قرات میں فاجمعوا ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے اور شرکاء کم منصوب ہے اور عاصم جحدری نے فاجمعوا ہمزہ وصلی اور میم کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے یہ جمع یجمع سے ماخوذ ہے اور شرکاء کم نصب کے ساتھ ہے۔ اور حسن، ابن اسحاق اور یعقوب نے فاجمعوا کو ہمزہ قطعی کے ساتھ اور شرکاء کم کو مرفوع پڑھا ہے۔ پس پہلی قرات أجمع علی الشیٔ سے ہے جب کوئی اس کا عزم کرلے۔ اور فراء نے کہا ہے: أجمع الشیٔ کا معنی ہے اس نے اسے تیار کیا۔ اور مورج نے کہا ہے: أجمعت الأمر، أجمعت علیه سے زیادہ فصیح ہے۔ اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

يا ليت شعري والمُنَى لا تنفع     هل أَغْدُوَنْ يوما و امري مُجْمَعُ

نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے مطابق شرکاء کی نصب میں تین وجہیں ہیں: کسائی اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی وادعوا شرکاءکم لنصرتکم ہے (اور تم اپنے شریکوں کو اپنی مدد کے لیے بلا لو) ان دونوں کے نزدیک اس فعل مضمر کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ معنی پر معطوف ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

يا ليت زوجَك في الوَغَى     متقلّد سيفاً و رُمْحًا(2)

تو اس رمح (نیزہ) کو لٹکایا نہیں جاتا، مگر یہ کہ وہ تلوار کی طرح اٹھایا جاتا ہے (لہٰذا اس معنوی مشابہت کی وجہ سے رمحاً سیفاً پر معطوف ہے) اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: مع شرکائکم علی تناصرکم (پس تم بھی اپنے شریکوں سمیت ایک دوسرے کی مدد کرنے پر جمع ہو جاؤ) جیسے کہا جاتا ہے: التقی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ مل گیا) اور دوسری قراءت جمع کے بارے ہے، اس میں اس قول باری تعالیٰ کا اعتبار کیا گیا ہے: فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝ (طٰہٰ) (اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا)۔ ابو معاذ نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہے کہ جمع اور أجمع دونوں ایک ہی معنی میں ہوں، اس قراءت کے مطابق وشرکاءکم، أمرکم پر معطوف ہے یا پھر یہ معنی ہے فأجمعوا أمرکم وأجمعوا شرکاءکم (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کرلو) اور اگر چاہیں تو بمعنی مع بنالیں (پس تم متفقہ فیصلہ کرلو اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر)۔

ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو سنا ہے وہ قام زید و عمرا کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور تیسری قراءت اس بنا پر ہے کہ شرکاءکم اجمعوا میں ضمیر مرفوع پر عطف کیا جائے۔ اور یہ اچھا ہے، کیونکہ کلام طویل ہو چکی ہے۔ نحاس وغیرہ نے

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 171 2۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 163

کہا ہے: اور یہ قراءت بہت بعید ہے، کیونکہ اگر یہ مرفوع ہوتا تو پھر واجب تھا کہ اسے واؤ کے ساتھ لکھا جاتا اور مصاحف میں و شرکاءکم میں واؤ نہیں دیکھی گئی اور یہ بھی کہ ان کے شرکاء بت تھے اور بت کچھ نہیں کر سکتے اور ان کا کوئی فعل نہیں یہاں تک کہ انہیں جمع بھی کر لیا جائے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ شرکاء مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، یعنی و شرکاءکم لیجمعوا أمرھم (اور تمہارے شرکاء چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر متفق ہو جائیں) اور اس کی نسبت شرکاء کی طرف کی گئی ہے حالانکہ یہ نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمیز کر سکتے ہیں، تو یہ ان کی عبادت کرنے والوں کی زجر و توبیخ کے لیے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً یہ یکن کا اسم اور اس کی خبر ہے۔ اور غمۃ اور غم دونوں برابر ہیں اور اس کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: غم الھلال جب چاند چھپ جائے، یعنی چاہیے کہ تمہارا فیصلہ ظاہر ہو اور واضح ہو تم اس میں اس کی قدرت رکھتے ہو جو تم چاہو۔ اس کی طرح نہ ہو جس کا فیصلہ مخفی ہوتا ہے اور وہ اس پر قادر نہیں ہوتا جو وہ ارادہ کرتا ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

لعمرك ما أمري علىٰ بغُمّة　　نهاري ولا ليلي علىٰ بسَرمَد

زجاج نے کہا ہے: غمۃ کا معنی ذاغم ہے اور الغم والغمۃ کرب اور کربۃ (غم و پریشانی، تکلیف) کی طرح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک غمۃ سے مراد امر کی وہ تنگی ہے جو غم اور پریشانی کو واجب کر دیتی ہے پس جسے یہ لاحق ہو وہ اپنے لیے کوئی ایسا ماخذ اور مصدر نہیں پاتا جس کے سبب وہ اس کیفیت سے نکل جائے جو اسے پریشان اور غمزدہ کر رہی ہے۔ اور صحاح میں ہے کہ الغمۃ کا معنی الکربۃ (تکلیف) ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

بل لو شهدت الناس إذ تُكُمُّوا　　بغُمّة لو لم تَفَرَّج غُمُّوا(1)

کہا جاتا ہے: أمر غُمّة یعنی ایسا امر جو مبہم ہو اور اس میں التباس ہو۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ابو عبیدہ نے کہا ہے: اس کا مجازی معنی ظلمۃ (تاریکی) اور تنگی ہے اور الغمۃ کا معنی گھی کی مشک کا پیندا بھی ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس میں اصل یہ ہے کہ یہ تمام الغامۃ سے مشتق ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ، اقْضُوْٓا میں الف ہمزہ وصل ہے، یہ قضی یقضی سے ہے۔ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: اور اسی کی مثل یہ ہے: وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ (الحجر: 66) یعنی ہم نے اسے اس تک پہنچا دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ کے معنی میں فرمایا: پھر تم کر گزرو اور تم مجھے مہلت نہ دو۔

نحاس نے کہا ہے: لغت کے مطابق یہ قول صحیح ہے اور اسی سے قضی المیت یعنی (میت گزر گیا) ہے۔ اور انہیں یہ بتایا کہ وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور یہ نبوت کے دلائل میں سے ہے۔

اور فراء نے بعض قراء سے ثُمَّ اَفْضُوْٓا اِلَيَّ بیان کیا ہے یعنی یہ فا اور ہمزہ قطعی کے ساتھ ہے، یعنی پھر تم میری طرف توجہ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 132

کرو۔ کہا جاتا ہے: أفضت الخلافة إلى فلان و أفضى إلى الوجع (میں نے فلاں کی طرف خلافت (نیابت) کو متوجہ کیا اور اس نے مجھے درد اور تکلیف پہنچائی) اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی جا رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ساتھ یقین رکھتے تھے اور ان کی تدبیر اور مکر و فریب سے خوفزدہ نہ ہوئے، کیونکہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ خود اور ان کے معبود نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان اور نہ تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے دل کے لیے باعث تقویت ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

''پس ہمہ اگر تم منہ موڑے رہو تو نہیں طلب کیا میں نے تم سے کچھ اجر، نہیں میرا اجر مگر اللہ کے ذمہ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں مسلمانوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ یعنی پس اگر تم نے اس سے اعراض کر لیا ہے جو میں لے کے تمہارے پاس آیا ہوں تو یہ اس لیے نہیں کہ میں نے تم سے کوئی اجر طلب کیا ہے پس میرا معاوضہ اور بدلہ تم پر بھاری اور ثقیل ہو جائے گا۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں میرا اجر تو فقط اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک ماننے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اہل مدینہ ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے أجریَ میں یاء کو فتحہ دیا ہے جہاں بھی واقع ہوا اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

''تو آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلایا پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے بنا دیا انہیں ان کا جانشین اور ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ذرا دیکھو کیسا انجام ہوا ان کا جنہیں ڈرایا گیا تھا''۔

قولہ تعالیٰ: فَكَذَّبُوْهُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے جھٹلایا۔ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ پس ہم نے آپ کو اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دی۔ فِي الْفُلْكِ یعنی جو کشتی میں آپ کے ساتھ سوار تھے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ اور ہم نے انہیں زمین کی باسی اور غرق ہونے والوں کا جانشین بنا دیا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ یعنی ذرا دیکھو ان کے معاملے کا انجام کیسا ہوا جنہیں رسولوں نے ڈرایا اور وہ ایمان نہ لائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر ہم نے بھیجے نوح (علیہ السلام) کے بعد اور رسول ان کی قوموں کی طرف پس وہ لائے ان کے پاس روشن دلیلیں تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ جھٹلا چکے تھے پہلے یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی پھر ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھیجے۔ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ رسول جیسے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ۔ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ پس وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے۔ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ تقدیر کلام ہے: تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سے پہلے جھٹلا چکی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ یعنی جسے وہ پہلے یوم الذر (یوم میثاق) کو جھٹلا چکے تھے، کیونکہ ان میں وہ تھے جنہوں نے اپنے دل سے جھٹلایا تھا اگرچہ تمام نے بلیٰ (ہاں) کہا تھا۔ نحاس نے کہا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اس قوم کے سرداروں کے بارے ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ (البقرہ) (چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے) كَذٰلِكَ نَطْبَعُ یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ کفر اور تکذیب میں حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر، پس وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اور یہ آیت قدریہ کے قول کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ﴿۷۵﴾

''پھر ہم نے بھیجا ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام) کو فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ تو فرعونیوں نے غرور و تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ پھر ہم نے ان رسولوں اور امتوں کے بعد بھیجا۔ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے اشراف کی طرف۔ بِاٰیٰتِنَا یہاں مراد آیات تسع (نو معجزات) ہیں، ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ فَاسْتَكْبَرُوْا تو انہوں نے حق (قبول کرنے سے) غرور و تکبر کیا۔ وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ اور وہ مشرک لوگ ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

''پھر جب آیا ان کے پاس حق ہماری طرف سے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یقیناً یہ کھلا جادو ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا (عقل کے اندھو) کیا تم کہتے ہو (ایسی بات) حق کے متعلق جب وہ تمہارے پاس آیا (سوچو!) کیا یہ جادو ہے؟ اور نہیں کامیاب ہوتے جادوگر''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا اس سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے (یعنی جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا) قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ توانہوں نے معجزات کو سحر (جادو) پر محمول کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا: اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا۔ کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو یہ سحر ہے، پس اتقولون یہ انکار ہے اور ان کا قول هٰذَا لَسِحْرٌ (یہ جادو ہے) محذوف ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے از سر نو دوسرا انکار ہوا اور فرمایا: اَسِحْرٌ هٰذَا (کیا یہ جادو ہے) پس ان کا پہلا قول ان کے دوسرے قول پر اکتفاء کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا، درآنحالیکہ اس میں فرعون اور اس کے درباریوں کا انکار کیا گیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ ان کے قول میں سے ہے اور ان کے قول کی حکایت کے لیے اس پر الف استفہام داخل کر دیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: اَسِحْرٌ هٰذَا تو انہیں کہا گیا: کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آیا: کیا یہ جادو ہے؟ اور یہ حسن سے مروی ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ یعنی وہ کامیاب نہیں ہوتے جو اس کے ساتھ آئے (یعنی جادو لے کر آئے)

## قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

"کہنے لگے کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس تا کہ ہٹا دو ہمیں اس (دین) سے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو اور ہو جائے صرف تم دونوں کے لیے بڑائی سرزمین (مصر) میں اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے"۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو تا کہ ہمیں پھیر دو اور موڑ دو۔ کہا جاتا ہے: لفتہ یلفتہ لفتا جب وہ اسے موڑ دے اور پھیر دے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

تلفتُّ نحو الحيِّ حتى رأيتُني وجِعْتُ من الإصغاء لِيتًا وأخدَعا

اور اسی سے التفت (میں مڑ گیا) ہے بے شک اس کا معنی سامنے کی جہت سے پھر جانا اور مڑ جانا ہے۔

عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا مراد بتوں کی عبادت سے ہٹا دینا ہے۔ وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ اور صرف تم دونوں کے لیے عظمت، بادشاہی اور سلطنت ہو جائے۔ فِي الْاَرْضِ مراد سرزمین مصر ہے۔ اور بادشاہی (ملک) کے لیے الکبریاء کہا جا رہا ہے کیونکہ یہ سب سے بڑی (شے) ہے جس کی طلب دنیا میں کی جاتی ہے۔ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے)۔ حضرت ابن مسعود اور حسن رضی اللہ عنہما وغیرہ نے ویکون یا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مونث غیر حقیقی ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: حضر القاضی الیوم امرأتان (آج قاضی کے پاس دو عورتیں حاضر ہوئیں)

## وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝

"اور فرعون نے حکم دیا (فوراً) لے آؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر"۔

اس نے یہ تب کہا جب اس نے عصا مبارک اور ید بیضا دیکھا اور یہ اعتقاد بنایا کہ یہ دونوں چیزیں جادو ہیں۔ حمزہ، کسائی، ابن وثاب اور اعمش نے سحار پڑھا ہے اور سورۃ الاعراف میں ان دونوں کی بحث گزر چکی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۞

''پھر جب آ گئے جادوگر تو کہا انہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے ڈالو (میدان میں) جو تم ڈالنے والے ہو''۔

یعنی انہیں زمین پر پھینکو جو تمہارے پاس رسیاں اور لاٹھیاں ہیں۔ اس کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۞

''پھر جب ڈال دیا انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ جو تم لائے ہو یہ جادو ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ ملیا میٹ کر دے گا اسے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سنوارتا شریروں کے کام کو''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ اس میں ما مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہوگا اور اس کی خبر جِئْتُمْ بِهٖ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: أیّ شیٔ جئتم به (جو شے بھی تم لے کر آئے ہو) یہ ایک تو زجر و توبیخ کے لیے ہے اور دوسرا جو جادو لے کر آئے اس کی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عمرو کی قراءت السحر استفہام کی طرز پر ہے اس صورت میں مبتدا مضمر ہوگا اور تقدیر عبارت ہوگی أھو السحر (کیا وہ جادو ہے)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو اور تقدیر عبارت ہو: السحر جئتم به۔ اور جنہوں نے استفہام کی صورت میں قراءت کی ہے ان کے مطابق ما بمعنی الذی نہیں ہوگا، کیونکہ اس کی کوئی خبر نہیں۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر السحر پڑھا ہے۔ اور اس قراءت کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے: ما جئتم به سحر اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت: ما آتیتم به سحر (جو تم لائے ہو جادو ہے) پس ما بمعنی الذی ہے اور جئتم به صلہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے ما محل رفع میں ہے۔ اور السحر مبتدا کی خبر ہے اور ما کو جب بمعنی الذی بنائیں گے تو پھر وہ منصوب نہیں ہوگا کیونکہ صلہ موصول میں عمل نہیں کر سکتا۔ اور فراء نے السحر کو جئتم کے سبب نصب دینے کو جائز قرار دیا ہے اور ما شرط کے لیے ہو، اور جئتم محل جزم میں ہو اور فاء محذوف ہو۔ اور تقدیر ہوگی: فان اللہ سیبطله (تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے باطل (ختم) کر دے گا) اور یہ بھی جائز ہے کہ السحر کو مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی جائے۔ ای ما جئتم به سحرا، پھر اس پر الف لام زائدہ داخل کر دیا گیا ہو، پس اس تقدیر پر حذف فا کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوگی اور نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اور کہا ہے: مجازات میں فاء کے حذف کو اکثر نحوی جائز قرار نہیں دیتے مگر ضرورت شعر کے لیے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

من يفعل الحسنات الله يشكرها

''جو نیکیاں کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی قدر کرتا ہے''۔

بلکہ بسا اوقات بعض نے کہا ہے: یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، مجھے محمد بن یزید نے بیان کیا اس نے کہا مجھے مازنی نے بیان کیا، اس نے کہا میں نے اصمعی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نحویوں نے اس شعر کو بدل دیا ہے اور روایت یہ ہے: من یفعل الخیر فالرحمن یشکرہ۔ اور میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: مجازاۃ میں فا کا حذف جائز ہے، انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ:30)

وما اصابکم من مصیبة بما کسبت ایدیکم اس میں یہ دونوں قراءتیں (فا کے ساتھ اور فا کے بغیر) مشہور و معروف ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ مراد سحر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو کوئی رات کے وقت اپنے بستر پر گیا پھر یہ آیت پڑھی: مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۸۱﴾ کسی جادوگر کی تدبیر اور مکر اسے نقصان نہیں دے گا اور اگر کسی سحر زدہ کو یہ لکھ کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ اس سے سحر دور فرما دے گا۔

وَ یُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور اللہ تعالیٰ حق کو حق کر دکھاتا ہے اپنے ارشادات سے اور خواہ ناپسند ہی کریں (اسے) مجرم"۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ یعنی اللہ تعالیٰ حق کو بیان کرتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ بِكَلِمٰتِهٖ یعنی اپنے کلام، حجج اور اپنے دلائل کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اپنی مدد و نصرت عطا کر کے (حق کو حق کر دکھاتا ہے) وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ آل فرعون کے مجرم اسے ناپسند ہی کریں۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۸۳﴾

"پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر بجز ان کی قوم کی اولاد کے (وہ بھی) ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اپنے سرداروں سے کہ کہیں وہ انہیں بہکا نہ دے۔ اور واقعی فرعون بڑا سرکش (بادشاہ) تھا ملک میں اور واقعی وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا"۔

قولہ تعالیٰ: فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ اس میں ہا ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کوئی ایمان نہ لایا، بلاشبہ بنی اسرائیل میں سے ان کی اولاد ایمان لائی جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، طویل وقت گزر گیا آباؤ اجداد ہلاک ہو گئے اور بیٹے باقی رہے پس وہ ایمان لائے (1)۔ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے اور ذریت سے مراد انسان کی پیچھے آنے والی نسل ہے اور کبھی یہ کثیر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت سے بنی اسرائیل کے مومن مراد لیے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ چھ لاکھ تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں بہتر افراد کے ساتھ داخل ہوئے پھر وہ مصر میں بچوں کی ولادت کے سبب بڑھتے رہے یہاں تک کہ چھ لاکھ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 172، (مفہوم)

تک پہنچ گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا: مِّنْ قَوْمِهٖ یعنی فرعون کی قوم سے۔ ان میں سے آل فرعون کے مومن اور فرعون کا خازن اور اس کی بیوی اور فرعون کی بیٹی کی ماشطہ (اسے بناؤ سنگار کرنے والی) اور اس کے خازن کی بیوی (یہ مومن تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ اقوام ہیں جن کے آباء قبطی تھے اور ان کی مائیں بنی اسرائیل میں سے تھیں پس انہیں ذریت کا نام دیا گیا جیسا کہ ان گھوڑوں کی اولاد کو ابناء کا نام دیا جاتا ہے جو یمن اور بلاد عرب سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی مائیں ان کے باپوں کی جنس سے نہیں۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اس بنا پر قومہ میں ہا ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ انہیں ماؤں کی جہت سے قرابت حاصل ہے اور فرعون کی طرف لوٹتی ہے جب وہ (آباء) قبطی ہوں۔

قولہ تعالیٰ: عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ کیونکہ وہ سرکشی کرتے ہوئے ان پر مسلط ہے (اس لیے وہ فرعون سے ڈرتے ہیں) وَ مَلَاۡئِهِمْ (اور اپنے سرداروں سے) یہاں و ملئہ نہیں کہا۔ اس کے چھ جواب دیئے گئے ہیں: (۱) کہ فرعون جب جابر و ظالم تھا تو اس کی طرف سے تمام کے فعل کی خبر دی گئی (۲) کہ فرعون کا جب ذکر کیا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ اور بھی ہیں پس ضمیر اس (فرعون) کی طرف اور دوسرے تمام کی طرف لوٹائی۔ یہ فراء کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ (۳) کہ فرعون کو ثمود کی طرف جماعت کا نام دیا گیا ہے (اس لیے ضمیر جمع لوٹائی گئی) (۴) تقدیر عبارت یہ ہو: علی خوف من آل فرعون پس یہ مضاف کے حذف کے باب سے ہوگا جیسا کہ واسئل القریۃ میں ہے اور یہ فراء کا دوسرا قول ہے۔ اور یہ جواب سیبویہ اور خلیل کے مذہب کے مطابق غلط ہے۔ ان دونوں کے نزدیک یہ جائز نہیں قامت ھند کہہ کر تیری مراد اس کا غلام ہو۔ (۵) اخفش سعید کا مذہب یہ ہے کہ ضمیر ذریۃ کی طرف لوٹ رہی ہے مراد ذریۃ (اولاد) کے سردار ہیں اور یہی علامہ طبری کی پسند ہے (۶) کہ ضمیر فرعون کی قوم کی طرف لوٹ رہی ہو۔ نحاس نے کہا ہے: یہ جواب گویا زیادہ بلیغ ہے۔ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ فرعون کے بارے خبر دینے کی بنا پر یفتنھم کو واحد ذکر کیا ہے کہ وہ انہیں سزاؤں کے سبب اپنے دین سے پھیر دے اور یہ محل جر میں ہے اس بنا پر کہ یہ بدل اشتمال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خوف کے سبب نصب کے محل میں ہو اور فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمی اسم ہے اور یہ معرفہ ہے۔ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ یعنی فرعون سرکشی کرنے والا متکبر ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ اور بے شک وہ کفر میں حد سے بڑھنے والوں میں سے ہے، کیونکہ وہ بندہ ہے اور اس نے دعویٰ ربوبیت کا کیا ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! اگر تم ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ (کا موجب) ظالم قوم کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ یعنی اگر تم نے تصدیق کی ہے۔ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اللہ تعالیٰ کی تو اسی پر اعتماد کرو۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ شرط بطور تاکید مکرر ذکر کی گئی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کمال ایمان امر کو اللہ تعالیٰ کے حوالے

اور سپرد کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا انہوں نے عرض کی ہم نے اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے۔ اور ہم اس کی قضاء وقدر کے ساتھ راضی ہیں اور ہماری انتہا اس کے امر تک ہے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی تو ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کر، پس وہ ہمارے لیے دین کے بارے فتنہ ہو جائے گا یا تو ہمیں نہ مٹا دے کہ تو ہمیں ان کے سامنے عذاب دے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہمیں ہمارے دشمنوں کے سامنے ہلاک نہ کر اور ہمیں اپنی طرف سے کوئی عذاب نہ دے، پس ہمارے دشمن کہیں گے: اگر وہ حق پر ہوتے تو ہم ان پر مسلط نہ کیے جاتے پس کہ وہ آزمائے جائیں (1)۔ ابو مجلز اور ابو الضحاء نے کہا ہے: مراد یہ ہے تو انہیں ہم پر غلبہ نہ دے کہ وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ وہ ہم سے بہتر ہیں، پس ان کی سرکشی بڑھ جائے گی۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۶

''اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم وستم) سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ یعنی ہمیں خلاصی عطا فرما اپنی رحمت کے ساتھ۔ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی فرعون اور اس کی قوم سے، کیونکہ وہ انہیں مشقت آمیز اور تکلیف دہ کاموں کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۷

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر اور بناؤ اپنے گھروں کو قبلہ رخ اور قائم کرو نماز۔ اور (اے موسیٰ!) خوشخبری دو مومنوں کو''۔

قولہ تعالیٰ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ تم بناؤ۔ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا کہا جاتا ہے: بوأت زيدا مكانا اور بوأت لزيد مكانا (میں نے زید کے لیے مکان بنایا) اور المبواوہ گھر اور منزل ہے جسے لازم پکڑا گیا ہو۔ اور اسی سے ہے بواه الله منزلا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے لازم کر دیا ہے اور اسے سکونت عطا کر دی۔ اور اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے: ''جس نے جان بوجھ کر میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے'' (2)۔ اور راجز کا قول ہے:

نحن بنو عدنان ليس شك　　تبوأ المجد بنا والملك (3)

ہم بنو عدنان ہیں اس میں کوئی شک نہیں بزرگی اور بادشاہی ہمارے ساتھ لازم ہے۔

اس آیت میں مصر سے مراد اسکندریہ شہر ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہ ایک

1۔ تفسیر طبری، سورۂ یونس، جلد 11، صفحہ 175　　2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 90
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ یونس، جلد 2، صفحہ 446

شہر ہے جس کا نام مصر ہے اور مصر بحر (سمندر) سے اسوان کی طرف جاتے ہوئے درمیان میں واقع ہے اور اسکندریہ سرزمین مصر میں سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل صرف اپنی مساجد اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے اور وہ ظاہر تھے، پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا گیا تو فرعون نے بنی اسرائیل کی مساجد کے بارے میں حکم دیا اور تمام کی تمام گرا دی گئیں اور انہیں نماز سے روک دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ دونوں بنی اسرائیل کے لیے مصر میں چند گھر بنائیں اور پسند کریں، مراد مساجد ہیں، اللہ تعالیٰ نے رہائشی گھر مراد نہیں لیے۔ یہ قول ابراہیم، ابن زید، ربیع، ابی مالک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: تم اپنے گھر بناؤ جو بعض بعض کے بالمقابل ہوں، آمنے سامنے ہوں۔ پہلا قول اصح ہے، یعنی تم قبلہ رخ اپنی مساجد بناؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ بیت المقدس ہے اور وہی آج تک یہودیوں کا قبلہ ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد کعبہ معظمہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ کعبہ معظمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (1) اور ان کے ساتھیوں کا قبلہ تھا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ نماز میں قبلہ (رخ ہونا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی۔ (لہٰذا) نماز میں طہارت، ستر عورت اور قبلہ سمت منہ کرنے کی شرط لگانے سے اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تکلیف اور پابندی تک زیادہ پہنچانے والی ہیں اور عبادت کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے تم اپنے گھروں میں چھپ کر نماز پڑھو تا کہ تم امن میں رہو۔ اور یہ اس وقت ہوا جب فرعون نے انہیں خوفزدہ کیا تو انہیں صبر اختیار کرنے اور گھروں میں مساجد بنانے کا حکم دیا گیا اور نماز اور دعا کا اقدام کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما دے۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے: قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا الآیہ (الاعراف: 128) (فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و استقامت سے کام لو) اور ان کے دین میں سے یہ تھا کہ وہ فقط عبادت گاہوں اور گرجا گھروں میں نماز پڑھتے تھے جب تک وہ امن و سلامتی میں رہے اور جب انہیں خوف لاحق ہوا تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: دونوں قولوں میں سے پہلا زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ دوسرا تو دعویٰ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قولہ دعوی یہ صحیح ہے، کیونکہ صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرے لیے زمین کو مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے''۔ اور یہ ان میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے نہ کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، پس ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے ساتھ مساجد اور گھروں میں نماز پڑھتے ہیں اور ہر اس جگہ جہاں نماز (کا وقت) ہمیں پالے، مگر گھروں میں نفل نماز ادا کرنا مساجد میں پڑھنے کی نسبت افضل ہے، یہاں تک کہ جمعہ سے پہلے اور بعد کی

1۔ معالم التنزیل، سورۂ یونس، جلد 3، صفحہ 176

رکعتیں بھی۔ اور فرض نمازوں سے پہلے اور بعد میں (بھی دیگر نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے) کیونکہ نوافل میں ریا کا امکان ہوتا ہے اور فرائض میں اس کا امکان نہیں ہوتا۔ اور جب بھی کوئی عمل ریا سے خالص اور پاک ہو تو وہ زیادہ وزنی اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والا ہوتا ہے۔

مسلم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شقیق سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا، میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نماز کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرہ میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ مسجد میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز ادا فرماتے تھے، پھر آپ (حجرہ میں) تشریف لاتے اور دو رکعتیں پڑھتے تھے، پھر آپ لوگوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے اور میرے حجرہ میں تشریف لاتے اور دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے..... الحدیث''۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں، پس جہاں تک مغرب، عشاء اور جمعہ کا تعلق ہے تو میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے کاشانہ اقدس میں نماز پڑھی ہے۔ اور ابو داؤد نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی اشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور اس میں مغرب کی نماز پڑھائی۔ پس جب وہ اپنی نماز پوری کر چکے تو آپ نے انہیں اس کے بعد نفل پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ گھروں میں پڑھی جانے والی نماز ہے''۔(1)

**مسئلہ نمبر 3۔** اس باب میں قیام رمضان کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، کیا گھر میں رمضان کی تراویح ادا کرنا افضل ہے یا مسجد میں؟ تو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے اس کے لیے گھر میں قیام کرنا افضل ہے جو اس کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور یہی امام ابو یوسف اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن عبدالحکم، امام احمد اور بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ انہیں جماعت کی صورت میں پڑھنا افضل ہے۔ اور لیث نے کہا ہے: اگر لوگ اپنے گھروں میں قیام کریں اور کوئی بھی مسجد میں قیام نہ کرے تو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس (مسجد) کی طرف نکلیں۔ امام مالک اور جس نے یہ قول کیا ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے، کیونکہ فرض نماز کے سوا آدمی کی بہترین نماز اس کے گھر میں ہے''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

مخالف کا استدلال یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں جماعت کے ساتھ یہ نماز پڑھائی، پھر اس مانع کے بارے بھی بتایا جس نے آپ کو اس پر دوام اختیار کرنے سے روک دیا اور وہ ان پر فرض ہونے کا خوف اور اندیشہ تھا پس اسی لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب رکعتی المغرب این تصلیان، حدیث نمبر 1106، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما ذکر فی الصلاۃ بعد المغرب، حدیث نمبر 549، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: فعلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم (پس تم پر اپنے گھروں میں نماز پڑھنا لازم ہے) پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسجد میں متفرق گروہوں کی صورت میں نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک قاری پر جمع کر دیا اور اسی پر یہ امر پختہ ہو گیا اور سنت ثابت ہو گئی۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اور جب ہم اس پر آ چکے ہیں کہ ان کے لیے اپنے گھروں میں نماز پڑھنا مباح ہے جب کہ انہیں اپنے آپ پر خوف اور خطرہ ہو تو پھر اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ معذور آدمی کے لیے خوف کے ساتھ اور خوف کے بغیر دونوں حالتوں میں جماعت اور جمعہ ترک کرنا جائز ہے۔ اور وہ عذر جو اس کو مباح قرار دیتا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً وہ بیماری جو روکنے والی ہو یا خوف کا زیادہ ہونا یا مال یا بدن میں بغیر کسی حق کے فیصلے کے حاکم وقت کے ظلم کا خوف ہونا اور موسلا دھار بارش کیچڑ کے ساتھ یہ بھی عذر ہے اگر وہ نہ رکے اور وہ آدمی جس کے لیے وہ قریبی ولی ہے وہ قریب المرگ ہو جائے اور اس کے پاس اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ ہو (تو یہ بھی ایک عذر ہے) تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ کہا گیا ہے: یہ خطاب حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ اور یہ زیادہ واضح اور بین ہے، یعنی بنی اسرائیل کو بشارت دے دو کہ عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دشمن پر غالب کر دے گا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

''اور عرض کی موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! تو نے بخشا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامان آرائش اور مال و دولت دنیوی زندگی میں اے ہمارے مولا! کیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرتے پھریں (لوگوں کو) تیری راہ سے۔ اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو اور سخت کر دے ان کے دلوں کو تاکہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ اس میں اٰتَيْتَ بمعنی اعطیت (تو نے عطا کیا ہے) زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی مال دنیا، ان کے لیے فسطاط مصر سے لے کر سرزمین حبشہ تک ایسے پہاڑ تھے جن میں سونے، چاندی، زبرجد، زمرد اور یاقوت کی کانیں تھیں۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ اس لام کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کہا گیا ہے اصح وہ ہے جو خلیل اور سیبویہ کا قول ہے وہ یہ کہ لام برائے عاقبت اور صیرورت ہے۔ اور حدیث میں ہے'' بے شک اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو ہر روز ندا دیتا ہے جنو موت کے لیے اور بناؤ ویران اور خراب ہونے کے لیے''، یعنی جب ان کے معاملہ کا انجام گمراہی ہے تو وہ اس طرح ہو گیا گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا کہ وہ گمراہ ہو جائیں۔

یعنی میں نے انہیں (مال) دیا تا کہ وہ گمراہ ہوں اور رعونت و تکبر اختیار کریں (1)۔ اور یہ بھی
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے
کہا گیا ہے کہ یہ لام اجل ہے یعنی میں نے انہیں عطا کیا ان کے آپ سے اعراض کرنے کی وجہ سے کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں کہ ان
سے اعراض کر لیا گیا ہے۔ اور ایک قوم نے گمان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: میں نے انہیں یہ اس لیے دیا ہے تا کہ وہ گمراہ نہ
ہوں۔ پھر لا کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے (اعطیتہم ذالك لئلا یضلوا، فحذفت لا) جیسا کہ الله تعالیٰ کے اس ارشاد میں
ہے: **یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا** (النساء: 176) اس کا معنی ہے لان لا تضلوا (تا کہ تم گمراہ نہ ہو)
نحاس نے کہا ہے: ظاہراً یہ جواب اچھا ہے، مگر عرب ان کے بغیر صرف لا کو حذف نہیں کرتے۔ اور اس جواب والے نے
قول باری تعالیٰ: **اَنْ تَضِلُّوْا** کے بارے میں محض بناوٹ کی ہے (یعنی جھوٹ بولا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام دعا کے
لیے ہے، یعنی تو انہیں اپنے راستے سے گمراہ کر کے آزما، کیونکہ اس کے بعد یہ ارشاد ہے: **اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ** (برباد
کردے ان کے مالوں کو اور سخت کردے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فعل مصدر کے معنی میں ہے یعنی اضلالھم
جیسا کہ الله تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: **لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ** (توبہ: 95) (یعنی یہ بمعنی اعراضھم ہے) اور کوفیوں نے
لیضلوا یاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضلال سے ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: **رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى
اَمْوَالِهِمْ** یعنی انہیں ان کے کفر پر ان کے مالوں کو ہلاک و برباد کر کے سزا دے۔ زجاج نے کہا ہے: طمس الشئ کا معنی ہے کسی
چیز کو اپنی اصل صورت سے ختم کر دینا (شکل بگاڑ دینا)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: ان
کے اموال اور ان کے دراہم منقش پتھر بن گئے جیسا کہ ان کی ہیئت تھی مکمل، تہائی اور نصف۔ اور ان کی کوئی معدن باقی نہ رہی
مگر الله تعالیٰ نے اسے مٹا دیا اور اس کے بعد کوئی اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہم تک یہ
خبر پہنچی ہے کہ ان کے اموال اور ان کی کھیتیاں پتھر ہو گئیں۔ اور حضرت مجاہد اور حضرت عطیہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے
انہیں ہلاک و برباد کر دیا یہاں تک کہ وہ دکھائی نہ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے: عین مطموسۃ (ایسی آنکھ جس کی بینائی جاتی رہے)
اور طمس الموضع جب کسی جگہ کو مٹا دیا جائے بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے دنانیر و دراہم، ان کے
قالین اور ان کی ہر شی پتھر ہو گئی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: ان میں سے ایک آدمی اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے بستر میں تھا اور وہ
دونوں پتھر ہو گئے۔ بیان کیا: حضرت عمر بن عبد العزیز نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس کے بارے آپ کو ذکر کیا تو آپ نے
ایک تھیلا منگایا جو مصر سے لایا گیا تھا تو آپ نے اس سے پھل، دراہم اور دنانیر نکالے اس حال میں کہ وہ سب پتھر تھے اور
علامہ سدی نے کہا ہے یہ نو معجزات میں سے ایک تھا۔ **وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تو انہیں
ایمان لانے سے روک دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو انہیں (ان کے دلوں کو) سخت کر دے اور ان پر مہر لگا دے تا کہ وہ
ایمان کے لیے کھل نہ سکیں۔ اس کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے۔ **فَلَا یُؤْمِنُوْا** کہا گیا ہے: اس کا عطف **لِیُضِلُّوْا** پر ہے۔
ای آتیتھم النعم لیضلوا ولا یومنوا (یعنی میں نے انہیں سامان دنیا عطا فرمایا تا کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور ایمان نہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 262

لائیں) یہ زجاج اور مبرد نے کہا ہے: اس بنا پر اس میں دعا کے معنی میں سے کوئی شے نہ ہوگی۔ اور قولہ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ کلام معترض ہوگا اور فراء اور کسائی اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ دعا ہے، پس وہ ان کے نزدیک جزم کے محل میں ہے۔ ای اللھم فلا یؤمنوا (اے اللہ! پس چاہیے کہ وہ ایمان نہ لائیں) یعنی پس وہ ایمان نہ لائے۔ اور اس سے اعشیٰ کا قول ہے:

فلا ينبسطْ من بين عينَيْك ما انزَوى ولا تَلْقَنِى الا وأنفُسك راغِمُ

یعنی لا أنبسط ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ لِيُضِلُّوا دعا ہے یعنی تو انہیں گمراہی میں مبتلا کر دے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر فلا یؤمنوا کا عطف کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے ای واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا (تو ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ وہ ایمان نہ لائیں) یہ قول اخفش اور فراء کا بھی ہے۔ اور فراء نے یہ شعر بھی کہا ہے:

یا ناق سیری عَنَقًا فسیحا الی سلیمان فنستریحا

پس اسی بنا پر فلا یؤمنوا میں نون کو حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ منصوب ہے۔ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہی فرق ہے۔ تحقیق بعض لوگوں نے اس آیت میں اشکال ظاہر کیا ہے اور کہا ہے: یہ ان کے لیے بددعا کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ رسل علیہم السلام کو تو حکم اپنی قوم کے ایمان لانے کی دعا کرنے کا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کہ کوئی نبی علیہ السلام اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بددعا کرے اور اس اطلاع کے بغیر کہ ان میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لائے گا اور نہ ان کی پشتوں سے کوئی ایسا نکلے گا جو ایمان لائے گا، اس کی دلیل حضرت نوح علیہ السلام (کی طرف وحی کیا گیا اللہ تعالیٰ) کا یہ قول ہے: اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے) اور اس وقت آپ نے یہ دعا مانگی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝۲۶ ، الآیہ (نوح) واللہ اعلم (اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا)

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قبول کر لی گئی تمہاری دعا پس تم ثابت قدم رہو اور ہرگز نہ چلنا اس طریقہ پر جو جاہلوں کا (طریقہ) ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا ابو العالیہ نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہی، چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا پر امین کہی اسی وجہ سے انہیں داعی (دعا مانگنے والا) کہا گیا اور التامین علی الدعاء کا معنی آمین کہنا ہے۔ اور تیرا قول ''آمین'' یہ بھی دعا ہے، یعنی اے میرے پروردگار! میرے لیے اسے قبول فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دعا بھی کی۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: یہ اس قبیل میں سے ہے جس میں عرب واحد کو خطاب تثنیہ کے صیغے کے ساتھ خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فقلت لصاحبی لا تُعجلانا بنزع أصوله فأجتز شیحا

یہ اس بنا پر ہے کہ آمین دعا نہ ہو اور یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا نہ کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اس پر دلیل کہ دعا دونوں نے کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ربنا ہے کیونکہ آپ نے رب (اے میرے رب) نہیں کہا۔ اور علی اور سلمی نے دعواتکما پڑھا ہے اور اس کے بعد دعوتکونصب دی ہے۔ اور آمین کے بارے میں مکمل بحث سورۃ الفاتحہ کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو خاص کیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں اسلام اور اہل جنت کا تحیہ اور سلام ہے اور ملائکہ کا صفیں بنانا اور آمین مگر یہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے پاس بھی تھی'' (1)۔ اسے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِيْمَا فراء وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں کو اپنے امر پر استقامت اختیار کرنے اور فرعون اور اس کی قوم کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے معاملہ میں ثابت قدم رہنے کا حکم ہے یہاں تک کہ دونوں پر دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہو جائے۔ محمد بن علی اور ابن جریج نے کہا ہے: فرعون اور اس کی قوم اس دعا کے قبول ہونے کے بعد چالیس برس تک باقی رہے پھر ہلاک کر دیئے گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: استقیماتم دونوں دعا پر استقامت اختیار کرو۔ اور دعا میں استقامت کا معنی حصول مقصود میں جلدی کرنے کو ترک کرنا ہے اور یہ جلدی کا مطالبہ دل سے زائل نہیں ہوتا مگر اس میں راحت اور سکون کے آنے کے ساتھ اور وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا مگر اس سب کے ساتھ حسن رضامندی کے ساتھ جو غیب سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ نون مشددہ کے ساتھ ہے اور صیغہ نہی ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور نون تو کید ہے اور اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دی گئی ہے اور اس کے لیے کسرہ کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نون تثنیہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن ذکوان نے نفی کی بنا پر نون کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استقیما سے حال ہے ای استقیما غیر متبعین اور اس کا معنی ہے تم دونوں اس کے راستے پر نہ چلو جو میرے وعدہ اور وعید کی حقیقت کو نہیں جانتا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

''اور ہم پار لے گئے بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے حتیٰ کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو (بصد یاس) کہنے لگا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 185

کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل اور (میں اعلان کرتا ہوں کہ) میں مسلمانوں میں سے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں اس قول وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (البقرہ:50) کے تحت گزر چکی ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے وجوّزنا قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ کہا جاتا ہے: تبع اور اتبع دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جب کوئی پیچھے سے جا ملے اور اسے پالے اور اتّبع (تشدید کے ساتھ) جب کوئی کسی کے پیچھے چلے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: اتبعه (ہمزہ قطعی کے ساتھ) جب وہ اسے پیچھے سے جا ملے اور اسے پالے۔ اور اتبعه (ہمزہ وصلی کے ساتھ ہو) جب وہ اس کے پیچھے چلے چاہے اسے پائے یا نہ پائے۔ اور اسی طرح ابوزید نے کہا ہے۔ اور قتادہ نے فَاتَّبَعَهُمْ ہمزہ وصل کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اتبعه (ہمزہ وصل کے ساتھ ہو) فی الامر یعنی اس نے کام میں اس کی اقتدا کی۔ اور اتبعه (ہمزہ قطعی کے ساتھ ہو) خیرا و شرا (اور اس نے خیر یا شر میں اس کی اتباع کی) یہ ابوعمرو کا قول ہے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور ان کی تعداد چھ لاکھ بیس ہزار تھی اور فرعون صبح کے وقت چھبیس لاکھ کا لشکر لے کر ان کے پیچھے نکلا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ بغیا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّ عَدْوًا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی سرکشی اور ظلم وزیادتی کی حالت میں (نکلا)۔ کہا جاتا ہے: عدا یعدو عدوا جیسا کہ غزا یغزو غزوا ہے۔ اور حسن نے وعدوا یہ عین اور دال کے ضمہ کے ساتھ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ ہے، جیسے علا یعلو علوا ہے۔

اور مفسرین نے کہا ہے: بغیا کا معنی ہے قول میں بغیر حق کے بلندی اور غلبے کا طالب ہونا۔ وعدوا فعل میں (غلبے کا طالب ہونا) اور یہ دونوں مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ یہاں تک کہ جب غرق نے اسے پالیا اور اس تک پہنچ گیا (مراد یہ کہ وہ ڈوبنے لگا) قَالَ اٰمَنْتُ تو کہنے لگا میں نے تصدیق کی۔ اَنَّهٗ یعنی بأنه، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ پس جب حرف جار حذف کر دیا گیا تو فعل متعدی ہوا اور اس نے اسے نصب دی اور اسے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی میں مومن ہو گیا پھر یہ نیا کلام ہے۔ اور ابوحاتم کا خیال یہ ہے کہ قول محذوف ہے، یعنی أمنت فقلت أنه اور اس وقت کا ایمان نفع بخش ثابت نہیں ہوتا اور توبہ وہ مقبول ہوتی ہے جو عذاب دیکھنے سے پہلے ہو اور رہی وہ توبہ جو عذاب دیکھنے یا اس کے آجانے کے بعد ہو تو وہ قبول نہیں کی جاتی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک فرعون سمندر میں داخل ہونے سے ڈر گیا وہ سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی بھی مونث گھوڑا نہ تھا، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام ہامان کی صورت میں انتہائی شہوت والی گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور اسے کہا: آگے بڑھ، پھر وہ سمندر میں اتر گئے اور اس کے پیچھے فرعون کا گھوڑا بھی اتر گیا۔ اور حضرت میکائیل علیہ السلام انہیں پیچھے سے ہانکتے رہے تا کہ ان میں سے کوئی بھاگ نہ جائے۔ پس جب ان میں سے آخری آدمی سمندر میں اتر گیا اور ان کے پہلے نے باہر نکلنے کا قصد کیا تو ان پر سمندر مل گیا اور پانی فرعون کو منہ تک آ گیا تو اس نے کہا: میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے۔ تو حضرت جبرئیل علیہ

السلام نے اس کے منہ میں سمندر کی مٹی ڈال دی۔(1)

اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا: میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! ﷺ کاش تم مجھے دیکھتے اس حال میں کہ میں سمندر کی مٹی لے رہا ہوں اور اسے اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اس ڈر اور خوف سے کہ رحمت اسے پا لے گی''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔(2)

حال البحر سے مراد وہ سیاہ مٹی ہے جو سمندر کی تہہ میں ہوتی ہے۔ یہ اہل لغت نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ ذکر کیا گیا ہے: ''حضرت جبرائیل علیہ السلام فرعون کے منہ میں مٹی دینے لگے اس ڈر اور خوف سے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگے اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمادے یا اس خوف سے کہ وہ اس پر رحم کردے''۔ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے(3)۔ اور عون بن عبد اللہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور نبی مکرم ﷺ کو بتایا: ابلیس نے میرے نزدیک فرعون سے زیادہ مبغوض کسی کو جنم نہیں دیا، کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے کہا ''میں ایمان لایا'' الآیہ۔ تو مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ یہ کلمہ کہے اور اس پر رحم ہو جائے، تو میں نے مٹی اٹھائی اور اسے اس کے منہ میں دبا دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے ساتھ اس عمل کی سزا کے طور پر کیا گیا جو وہ انتہائی سرکشی کا عمل کر رہا ہے۔ اور کعب الاحبار نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے میں دریائے نیل کو چلنے سے روک لیا، تو قبطی نے اس کو کہا: اگر تو ہمارا رب ہے تو ہمارے لیے پانی جاری کردے، پس وہ سوار ہوا اور اپنے لشکر کو آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور وہ اپنے درجات پر ٹھہرنے لگے اور وہ وہاں بیٹھ گیا جہاں وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور اپنی سواری سے نیچے اترا اور اپنا دوسرا لباس پہنا اور سجدہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی خشوع وخضوع اور زاری کی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پانی جاری کردیا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس آئے اس حال میں کہ وہ اپنی ہی حالت پر اکیلا تھا اور اس سے فتویٰ طلب کرنے لگے: امیر اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا ہے جس کا ایک غلام ہے اور وہ اس کے احسان اور نعمت میں ہی پروان چڑھا اور اس کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں، پھر اس نے اس کی نعمت کی ناشکری کی اور اس کے حق کا انکار کردیا اور اس نے اس کے سوا کسی کے سردار ہونے کا دعویٰ کردیا۔ پس فرعون نے لکھ دیا: ابو العباس الولید بن مصعب بن ریان کہتے ہیں اس کی سزا یہ ہے کہ اسے سمندر میں غرق کردیا جائے۔ پس حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے لے لیا اور چلے گئے پس جب وہ ڈوبنے لگا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کا لکھا ہوا اسے دے دیا۔ یہ سورۃ البقرہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مسند روایت کے ساتھ گزر چکا۔ اور یہ عاشورا کا دن تھا۔ اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ
2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ یونس، حدیث نمبر 3032، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 3033

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی موحدین میں سے ہوں اور طاعت و پیروی کے ساتھ تسلیم کرنے والوں میں سے ہوں۔

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱

''کیا اب؟ اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور تو فتنہ و فساد برپا کرنے والوں سے تھا''۔

کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ حضرت میکائیل علیہ السلام کا قول ہے یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور فرشتے کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرعون کا اپنی ذات کے بارے میں قول ہے۔ اور وہاں زبان کے ساتھ یہ قول نہیں ہوا بلکہ یہ اس کے دل میں واقع ہوا ہے پس اس نے اپنے دل میں کہا ہے جو کہا ہے اس حیثیت سے کہ ندامت نے اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور اس کی نظیر یہ ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر: 9) اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے اس کے سبب جو ان کے دلوں میں مخفی تھا، نہ کہ انہوں نے یہ اپنے لفظوں میں کہا اور حقیقی کلام دل کا کلام ہی ہے۔

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲

''سو آج ہم بچا لیں گے تیرے جسم کو (سمندر کی تند موجوں سے) تاکہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی) نشانی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ یعنی ہم تجھے زمین کے ایک بلند حصے پر پھینک دیں گے اور یہ اس لیے کہا کیونکہ بنی اسرائیل تصدیق نہ کرتے کہ فرعون غرق ہو چکا ہے۔ اور وہ کہتے: اس کی شان اس سے کہیں زیادہ اور عظیم ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اسے زمین کے ایک بلند حصہ پر پھینک دیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا مشاہدہ کر لیا۔ اوس بن حجر بارش کا وصف بیان کرتا ہے۔

فَمَن بَعقوتَه كَمن بنَجْوَته والمُسْتَكِنّ كمَنْ يَمْشِي بِقِرْوَاحِ

یزیدی اور ابن السمیقع نے ننحیك حا کے ساتھ پڑھا ہے یہ تحیۃ سے ماخوذ ہے اور اسے علقمہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، یعنی تو سمندر کے کنارے پر ہوگا۔ ابن جریج نے کہا ہے: پس اسے ساحل سمندر پر پھینک دیا گیا یہاں تک کہ اسے بنی اسرائیل نے دیکھ لیا، وہ چھوٹے قد کا اور سرخ رنگ کا تھا گویا کہ وہ بیل ہے۔ علقمہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بندائك پڑھا ہے اور یہ النداء سے ماخوذ ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: اور یہ ہمارے مصحف کے حروف ہجا کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے یا اور دال کے بعد کاف سے لکھا جائے، کیونکہ مصحف کے خط کی ترتیب میں ندائك سے الف گر جاتا ہے جیسا کہ ظلمات اور سموات سے ساقط ہو گیا ہے، پس جب اس میں حذف واقع ہوا تو بدنك اور ندائك کے حروف ہجا برابر ہو گئے، اسی بنا پر اس قراءت سے اعراض برتا گیا ہے، کیونکہ یہ شاذ ہے اور جو عام مسلمانوں کی قراءت ہے وہ اس کے خلاف ہے، قراءت سنت ہے اسے بعد میں آنے والا پہلے سے لیتا ہے اور ہماری قراءت کی تاویل کے سبب اس کے معنی میں نقص ہے، کیونکہ اس میں زرہ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور وہ معنی جس کے بارے مسلسل آثار

ہیں وہ یہ ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بارے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ انہیں غرق شدہ فرعون دکھائے چنانچہ انہوں نے اسے زمین کے بلند حصہ پر اس کے بدن سمیت پالیا اور یہ اس کی وہ زرہ ہے جو وہ جنگوں میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اس کی زرہ پروئے ہوئے موتیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سونے کی تھی اور وہ اسی کے سبب پہچانا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ لوہے کی تھی۔ ابوالصخر نے کہا ہے: البدن سے مراد چھوٹی سی زرہ ہے۔

اور ابوعبیدہ نے اعشیٰ کا شعر بیان کیا ہے:

وبیضاء كالنِّهْي مَوْضُونة لها قَوْنَسٌ فوق جَيْب البَدَنْ

اور عمرو بن معدیکرب کا بھی شعر بیان کیا ہے:

ومضى نساءُهم بكل مُفاضةٍ جَدْلَاء سابغةٍ وبالأبدانِ

اور کعب بن مالک نے کہا ہے:

ترى الأبدان فيها مسبغات على الأبطال واليَلَب الحصِينا

اس میں ابدان سے مراد زرہیں ہیں اور یلب سے مراد یمنی زرہیں ہیں، یہ چمڑے سے بنائی جاتی تھیں اسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سیا جاتا تھا۔ اور یہ اسم جنس ہے اس کا واحد یلبة ہے عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

علينا البيضُ واليَلَبُ اليمانِي وأسيافٌ يُقمن و يَنْحَنِينا

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ببدنك سے مراد وہ جسم ہے جس میں روح نہ ہو۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: رہا ان کا قول جنہوں نے بدرعك (تیری زرہ کے ساتھ) تو یہ کوئی شے نہیں ہے۔ ابوبکر نے کہا ہے: کیونکہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زاری کی اور غرق شدہ فرعون کو دیکھنے کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لیے ظاہر کر دیا اور انہوں نے وہ جسم دیکھ لیا جس میں روح نہ تھی، پس جب بنی اسرائیل نے اسے دیکھ لیا تو کہا: ہاں، اے موسیٰ! یہ فرعون ہی ہے اور غرق کر دیا گیا ہے۔ پس ان کے دلوں سے شک نکل گیا اور سمندر نے فرعون کو نگل لیا جیسے وہ پہلے تھا۔ اس بنا پر نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے؟ ایک یہ ہے کہ ہم تجھے زمین کے بلند حصے پر پھینک دیں گے اور دوسرا یہ کہ ہم نے تیرے اس جسم کو ظاہر کر دیں گے جس میں روح نہیں۔ اور شاذ قراءت بندائك اس کا معنی جمہور کی قراءت کے معنی کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ ندا کی دو تفسیریں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے ہم تجھے تیرے کلمہ توبہ کہنے کے سبب بلند جگہ پر ڈال دیں گے اور تیرے اس قول کے سبب جو اس کا دروازہ بند ہونے کے بعد اور اس کے قبول ہونے کا وقت گزر جانے کے بعد تو نے کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آج ہم تجھے سمندر کی گہرائی سے تیری ندا کے سبب جدا کر دیں گے جو تو نے یہ کہا: أنا ربكم الأعلى پس اسے بدن سمیت نجات دینا رب العالمین کی طرف سے بطور سزا تھا اس کے اس کفر میں انتہائی غلو اور زیادتی کرنے کے سبب جس میں اس نے اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا اور مبہوت ہو

گیا۔ اور قدرت اور ایسے امر کا دعویٰ کیا جس کے بارے وہ جانتا تھا کہ وہ اس میں جھوٹ بول رہا ہے، اس سے عاجز ہے اور اس کا مستحق نہیں ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا ہے: پس ہماری قراءت ان معانی کو متضمن ہے جو قرأت شاذہ میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان سے زائد کو بھی متضمن ہے۔ قولہ تعالیٰ: لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً یعنی بنی اسرائیل کے لیے اور قوم فرعون کے ان باقی ماندہ لوگوں کے لیے جو غرق نہیں ہوئے اور ان تک یہ خبر نہیں پہنچی۔

وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ یعنی بہت سے لوگ ہماری آیات میں غور و فکر کرنے اور ان میں سوچ و بچار کرنے سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور لِمَنْ خَلَفَكَ لام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی ان کے لیے جو تیرے بعد باقی رہیں گے اور تیری زمین میں تیرے پیچھے آئیں گے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لمن خلقك قاف کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی تا کہ تو اپنے خالق کی نشانی ہو جائے۔

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳

"اور ہم نے عطا فرمایا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق بخشا، پس انہوں نے اختلاف نہ کیا حتی کہ آ گیا ان کے پاس حقیقت کا علم (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت جن باتوں میں وہ جھگڑا کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ قابل ستائش اور بہترین ٹھکانا عطا فرمایا، مراد مصر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اردن اور فلسطین ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ مصر اور شام ہے۔ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق یعنی پھل وغیرہ عطا فرمایا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد قریظہ، نضیر اور بنی اسرائیل میں سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لوگ ہیں، کیونکہ وہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لاتے تھے اور آپ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ آپ کے ساتھ حسد کرنے لگے اور اسی لیے فرمایا: فَمَا اخْتَلَفُوْا پس انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے معاملہ میں اختلاف نہ کیا۔ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ یہاں تک کہ ان کے پاس قرآن کریم اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ اس میں علم بمعنی معلوم ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو آپ کے خروج سے پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ علامہ ابن جریر طبری نے کہا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ یعنی آپ کا رب ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور فرق کر دے گا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ قیامت کے دن جن باتوں میں وہ دنیا میں جھگڑا کیا کرتے تھے، پس وہ طاعت کرنے والے کو ثواب دے گا اور نافرمانی کرنے والے کو سزا دے گا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور (اے سننے والے!) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے ذریعے) تیری طرف اتارا تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بے شک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے۔ اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کے سوا دوسرے ہیں، یعنی آپ تو شک میں نہیں ہیں لیکن آپ کے علاوہ دوسرے شک میں ہیں۔ ابو عمر محمد بن عبد الواحد الزاہد نے کہا ہے: میں نے دو اماموں ثعلب اور مبرد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ کا معنی ہے: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کافر کو فرما دیجئے کہ اگر تو اس سے متعلق شک میں ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ فَسْــَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی اے بتوں کی پوجا کرنے والے اگر تجھے قرآن کریم کے بارے میں کوئی شک ہے تو ان لوگوں سے دریافت کر لے جو یہود میں سے اسلام لا چکے ہیں، یعنی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور انہی کی مثل دیگر افراد کیونکہ بتوں کی پرستش کرنے والے یہودیوں کے بارے میں یہ اقرار کرتے تھے کہ وہ اس بارے ان سے زیادہ عالم ہیں، کیا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی اور رسول مبعوث فرمائے گا؟ اور قتبی نے کہا ہے: یہ خطاب ان کو ہے جو نہ یقین کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اور نہ تصدیق کرتے ہیں، بلکہ شک میں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خطاب سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کوئی اور نہیں اور اس کا معنی ہے: اگر آپ کو کوئی شک لاحق ہو جائے اس بارے میں جس کے متعلق ہم نے آپ کو خبر دی ہے تو آپ اہل کتاب سے دریافت کر لینا میں آپ سے شک زائل کر دوں گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شک سے مراد سینے کی تنگی ہے، یعنی اگر آپ کا سینہ ان کے کفر کے سبب تنگ ہو جائے تو آپ صبر کیجئے۔ اور ان سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں وہ آپ کو بتائیں گے آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کی اذیت پر کیسے صبر کیا اور ان کے معاملے کا انجام کیا ہوا؟ لغت میں شک کا اصل معنی تنگی ہے۔ کہا جاتا ہے: شك الثوب یعنی وہ اس کے سوراخوں کو بند کر دے یہاں تک کہ وہ برتن کی طرح ہو جائے۔ اور اسی طرح مسافر کا توشہ دان ہے اس کے علائق (یعنی باندھنے کے دھاگے) کو کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بند ہو جائے، پس شک سینے کو بند کر دیتا ہے اور اسے سکیڑ دیتا ہے یہاں تک کہ وہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: حروف شرط کے ساتھ فانہ فعل کو واجب کرتی ہے اور نہ اسے ثابت کرتی ہے، اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی: واللہ لا اشك قسم بخدا میں شک نہیں کرتا۔ پھر نیا کلام کیا اور فرمایا: لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ یعنی شک کرنے والوں سے نہ ہو جانا۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ان دونوں آیتوں میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے

اور مراد کوئی اور ہے۔(1)

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۹۷﴾

''بے شک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے، اگر چہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اسی سورت میں اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی وہ لوگ جن پر ان کی معصیت اور گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور اس کی ناراضگی ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ اس میں کلا کو مونث ذکر کیا ہے اس لیے کہ اس کلام کا معنی یہ ہے۔ ولو جاءتھم الآیات (اگر چہ ان کے پاس نشانیاں آ جائیں) حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے (لیکن) وہ انہیں نفع نہیں دے گا۔

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِیْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۹۸﴾

''پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونس کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ اخفش اور کسائی نے کہا ہے: فلولا بمعنی فھلا (پس کیوں ایسا نہ ہوا) ہے اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصحف میں فھلا ہی ہے۔ دراصل کلام میں لولا تحضیض (ابھارنے اور برانگیختہ کرنے) کے لیے آتا ہے یا غیر کے پائے جانے کی وجہ سے کسی کام سے روکنے پر دلالت کرنے کے لیے۔ اور آیت کے معنی سے بستی والوں کے ایمان کی نفی سمجھی جارہی ہے پھر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی استثنا کی گئی ہے، پس یہ لفظ کے اعتبار سے تو استثنا منقطع ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے استثنا متصل ہے، کیونکہ اس کی تقدیر عبارت یہ ہے ما أمن أھل قریة إلا قوم یونس (یعنی بستی والوں میں سے سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کوئی ایمان نہ لایا) اور قوم کے منصوب ہونے کی یہی وجہ ہے اور اسی طرح سیبویہ نے اسے باب مالا یکون إلا منصوبا (یعنی ان کا بیان جو فقط منصوب ہوتے ہیں) میں داخل کیا ہے(2)۔ اور نحاس نے کہا ہے: اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ اسے نصب دی گئی ہے، کیونکہ یہ استثنا ہے جو اول (کلام میں) سے نہیں ہے۔ ای لکن قوم یونس (یعنی لیکن حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لائی) یہ کسائی، اخفش اور فراء کا قول ہے۔ اور یہ بھی

1۔ بغوی، (معالم التنزیل) زیر آیت ہذہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 143-144

جائز ہے کہ یہ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ رفع کے ساتھ ہو۔ اور رفع کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے احسن وہ ہے جو ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہوگا غیر قوم یونس، پس جب کلام اِلَّا کے ساتھ آیا تو اس کے مابعد اسم کو غیر کا اعراب دے دیا گیا، جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

وکلُّ أخٍ مفارِقه أخوه لَعَمْرُ أبِیك إلّا الفرْقدانِ

(اس میں اِلَّا بمعنی غیر ہے)

مفسرین کی ایک جماعت سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم موصل کی سرزمین میں نینویٰ کے مقام پر آباد تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا اور آپ انہیں اسلام کی طرف اور جن نظریات پر وہ تھے انہیں ترک کرنے کی دعوت دینے لگے لیکن انہوں نے انکار کیا۔ پس کہا گیا ہے کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نو سال تک دعوت دیتے رہے بالآخر آپ ان کے ایمان سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔ تو آپ کو کہا گیا: آپ انہیں اطلاع کریں کہ تین دن تک ان پر عذاب آنے والا ہے چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور وہ کہنے لگے: یہ آدمی جھوٹ نہیں بولتا ہے پس تم اس کی تاک میں رہو پس اگر یہ تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان مقیم رہے تو پھر تم پر کچھ بھی نہیں آئے گا اور اگر یہ تم سے کوچ کر جائے (نکل جائے) تو بلاشک وہی عذاب کے نازل ہونے کا وقت ہوگا۔ پس جب رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام نے زادِ راہ لیا اور ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی تو آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگے اور انہوں نے ٹاٹ پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں میں سے ماؤں اور بچوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس حالت میں انہوں نے مظالم چھوڑ دیئے۔(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ایک آدمی پتھر لا رہا تھا اور اس پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھتا تو وہ اسے اکھیڑنے لگا اور اسے رد کرنے لگا۔ جو کچھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اس کے مطابق عذاب ان سے ایک میل کے دو تہائی فاصلے پر تھا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہیں بادل نے ڈھانپ لیا اور اس میں سرخی تھی پس وہ مسلسل قریب آ رہا تھی کہ وہ اس کی گرمی اپنے کندھوں کے درمیان پانے لگے۔ اور حضرت ابن جبیر نے بیان کیا ہے: عذاب نے انہیں اس طرح ڈھانپ لیا جیسے کپڑا قبر کو ڈھانپ لیتا ہے، پس جب انہوں نے صحیح توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب اٹھا لیا۔ اور علامہ طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے: تمام امتوں میں سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا یہ خاصا ہے کہ عذاب کا معائنہ کر لینے کے بعد ان پر رحمت کی توجہ کی گئی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔ اور انہوں نے اسے مفسرین کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: بے شک ابھی ان پر عذاب واقع نہیں ہوا تھا، بلکہ انہوں نے فقط اس علامت اور نشانی کو دیکھا تھا جو عذاب پر دلالت کرتی ہے اور اگر وہ عین عذاب کو دیکھ لیتے تو پھر ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: زجاج کا قول اچھا ہے، کیونکہ وہ مشاہدہ جس کے ساتھ توبہ نفع بخش نہیں ہوتی وہ عذاب کے ساتھ

1۔ تفسیر الطبری، المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ملتبس ہونا اور اس میں واقع ہو جانا ہے جیسا کہ فرعون کا واقعہ ہے۔ اور اسی لیے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا واقعہ فرعون کے قصہ کے پیچھے ذکر ہوا کیونکہ وہ اس وقت ایمان لایا جب اس نے عذاب دیکھ لیا پس وہ اس کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہوا اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے اس سے پہلے توبہ کر لی۔ اور اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی تقویت دیتا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک غرغر کی آواز نہ نکلے''۔ اور الغرغرۃ کا معنی ہے جان کنی کے وقت سانس کا غرغرانا۔ اور یہ موت کے ساتھ ملنے کی حالت ہوتی ہے۔ اور اس سے پہلے اس طرح نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

اور جو معنی ہم نے بیان کیا ہے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب ان سے تین دن تک عذاب آنے کا وعدہ کیا اور آپ ان سے نکل گئے پس جب انہوں نے صبح کی اور آپ کو نہ پایا تو وہ توبہ کرنے لگے اور انہوں نے ماؤں کو اپنے بچوں سے علیحدہ کر دیا (1)۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی توبہ عذاب کی علامت دیکھنے سے پہلے ہوئی۔ عنقریب سورۂ والصافات میں اس کا واضح اور کھلا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

اور كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ کا معنی ہوگا یعنی ہم نے ان سے وہ عذاب دور کر دیا جس کے بارے حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان پر نازل ہوگا، نہ یہ کہ انہوں نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور نہ یہ کہ انہیں اس کا خیال تھا۔ اس بنا پر اس میں نہ کوئی اشکال ہے، نہ تعارض اور نہ ہی کوئی خصوصیت ہے واللہ اعلم۔ المختصر یہ کہ نینویٰ کے باسی اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں سعادت مند تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بے شک خوف اور ڈر تقدیر کو رد نہیں کرتا، بلکہ دعا تقدیر کو رد کر دیتی ہے، یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۚ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عاشوراء کا دن تھا (یعنی دسویں محرم)

قولہ تعالیٰ: وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ کہا گیا ہے: اور ہم نے انہیں ان کی مقررہ مدت تک لطف اندوز ہونے دیا۔ یہ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: اور ہم نے انہیں لطف اندوز ہونے دیا اس وقت تک کہ وہ جنت کی طرف چلے جائیں یا جہنم کی طرف۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔

**وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹**

''اور اگر چاہتا آپ کا رب تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب، کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا یعنی وہ ان تمام کو ایمان لانے پر مجبور کر دیتا۔ كُلُّهُمْ، من کی تاکید ہے اور جَمِيْعًا سیبویہ کے نزدیک حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے کہ جمعیا کا لفظ بھی کل کے بعد تاکید کے لیے آیا ہے، جیسا کہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (النحل: 51) (یعنی اس میں اثنین الھین کی تاکید کے لیے ہے) قولہ تعالیٰ: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

1۔ تفسیر الطبری، جلد 12، صفحہ 296

حضور نبی مکرم ﷺ تمام لوگوں کے ایمان لانے کے حریص تھے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ کوئی ایمان نہیں لا سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے سعادت مند ہو اور کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا مگر وہی جو ذکر اول میں پہلے شقی ہو (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد ابو طالب ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

”اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں کہ وہ ایمان لا سکے بغیر حکم الٰہی کے۔ اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ ڈالتا ہے (گمراہی کی) آلودگی ان لوگوں پر جو بے سمجھ ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اس میں ما نافیہ ہے، یعنی یہ مناسب نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور اس کی مشیت و ارادہ کے بغیر ایمان لا سکے۔ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ حسن، ابوبکر اور مفضل نے و نجعل تعظیم کے لیے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اس کی دو لغتیں ہیں۔ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ یعنی ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو نہیں سمجھتے۔ (2)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

”فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یہ کفار کے لیے ان مصنوعات میں غور و فکر اور تدبر کرنے کے بارے امر ہے جو صانع پر اور اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بارے میں مکمل بحث کئی مقامات پر پہلے گزر چکی ہے۔ وَ مَا تُغْنِي یہ ما نافیہ ہے ای ولن تغنی (یعنی آیتیں ہرگز فائدہ نہیں پہنچائیں گی) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما استفہامیہ ہے اور تقدیر کلام ہے أی شیء تغنی (کون سی شے کا نفع آیات پہنچا سکتی ہیں)

الْاٰيٰتُ مراد دلالات اور نشانیاں ہیں۔ وَ النُّذُرُ یعنی رسل علیہم السلام اور یہ نذیر کی جمع ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اس قوم کو جن کے بارے پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

”پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات کا جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے، آپ فرمایئے اچھا انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں“۔

قولہ تعالیٰ: فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ یہاں ایام سے مراد واقعات ہیں یعنی بمعنی وقائع

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 298 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 370

ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان عالم بایام العرب یعنی فلاں عرب میں پیش آنے والے واقعات کا عالم ہے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ میں پیش آئے۔ اور عرب عذاب اور انعام دونوں کو ایام کا نام دیتے ہیں، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ (ابراہیم: 5) اور ہم وہ جو خیر و شر میں سے گزر چکا ہے وہی ایام ہے۔ فَانْتَظِرُوْٓا یعنی تم انتظار کرو یہ تہدید (ڈانٹ ڈپٹ) اور وعید ہے۔ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ بے شک میں بھی تمہارے ساتھ اپنے رب کے وعدہ کا انتظار کرنے والوں سے ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

''(جب وہ عذاب آجائے گا) پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے بلاشبہ ایسا ہی ہوگا، یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم بچالیں گے اہل ایمان کو''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی ہماری سنت میں سے ہے کہ جب ہم کسی قوم پر عذاب نازل کریں تو ان کے درمیان سے اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو نکال لیتے ہیں۔ اور ثُمَّ اس کا معنی ہے ثم اعلموا إنا ننجی رسلنا (پھر تم جان لو کہ ہم اپنے رسولوں کو بچالیں گے)

كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا یعنی ہم پر واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے اور اس کی خبر میں خلاف نہیں ہوسکتا۔ اور یعقوب نے ثُمَّ نُنَجِّیْ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی، حفص اور یعقوب نے ننجی المؤمنین کو مخفف پڑھا ہے اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں فصیح ہیں۔ انجی ینجی انجاء اور نجی ینجی تنجیۃ دونوں کا معنی ایک ہے۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

''فرمایئے اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو میرے دین کے بارے میں تو (سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان (بتوں) کی جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا، لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جو مارتا ہے تمہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں اہل ایمان سے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ مراد کفار مکہ ہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ اگر تمہیں اس دین اسلام کے بارے میں کوئی شک ہو جس کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں۔ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو (سن لو) میں ان بتوں کی عبادت نہیں کرتا جو عقل اور سمجھ نہیں رکھتے جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ کے سوا۔ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں مارتا ہے اور تمہاری ارواح قبض کرتا ہے۔ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان اہل ایمان سے ہو جاؤں جو اپنے رب کی آیات کی تصدیق کرتے ہیں۔ (1)

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ وَ لَا تَدْعُ مِنْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 203

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَ لَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۶﴾

"نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کر لے اس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے۔ اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے۔ اور اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہوگا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ، أن کا عطف ان اکون پر ہے یعنی مجھے کہا گیا ہے کہ مومنین سے ہو جا اور اپنا رخ سیدھا کر لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اور اپنا عمل سیدھا کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنا آپ سیدھا کر لے، یعنی اپنی توجہ اس پر مرکوز کر لے دین میں سے جس بارے آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ حَنِیْفًا یعنی ہر دین سے بچتے ہوئے سیدھا اس کی طرف کر لے (جس کا حکم دیا گیا ہے) حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

حمدتُ الله حين هدى فؤادى　　من الإشراك الدين الحنيف

میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جس وقت اس نے میرے دل کو شرک سے خالص دین کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔

اس کے مادہ اشتقاق کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے والحمد للہ۔ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یعنی اور مجھے کہا گیا ہے: تو شرک نہ کر۔ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد غیر ہے۔ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَدْعُ یعنی تو عبادت نہ کر۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ اگر تو نے اس کی عبادت کی (تو وہ تجھے کوئی نفع نہ دے گا) وَ لَا یَضُرُّكَ اگر تو نے اس کی نافرمانی کی (تو وہ تجھے ضرر نہ دے سکے گا) فَاِنْ فَعَلْتَ یعنی اگر تو نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کی۔ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ تو بے شک تو عبادت کو تو اس کے غیر محل میں رکھنے والا ہو جائے گا۔ (1)

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۷﴾

"اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے۔ اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لیے کسی بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو، سرفراز فرماتا ہے اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور وہی بہت مغفرت فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ یعنی اگر تجھے اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے۔ فَلَا كَاشِفَ یعنی کوئی دور کرنے والا نہیں۔ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ اس کو بجز اس کے اور اگر وہ تجھے آسودگی اور نعمت پہنچائے۔ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ تو کوئی رد کرنے والا نہیں ہر اس کو جس کا خیر و شر میں سے وہ ارادہ فرمائے۔ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ اور وہی اپنے بندوں کے گناہوں اور ان کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے الرَّحِیْمُ اور آخرت میں اپنے اولیاء کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔ (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 371　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 305

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡكُمۡ بِوَكِیۡلٍ ﴿۱۰۸﴾

''(اے حبیب!) فرمایئے اے لوگو! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے، تو جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ ہدایت قبول کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو وہ گمراہ ہوتا ہے اپنی تباہی کے لیے اور میں تم پر نگران نہیں ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الۡحَقُّ اس میں حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰی یعنی جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اور اس (دین) کے ساتھ ایمان لایا جو آپ لے کر آئے۔ فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ وہ اپنے نفس کی نجات اور خلاصی کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے۔

وَمَنۡ ضَلَّ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور بتوں کی پیروی اور اتباع کی۔ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا تو بلا شبہ اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡكُمۡ بِوَكِیۡلٍ یعنی میں تم پر محافظ و نگران نہیں ہوں کہ تمہارے اعمال کی نگرانی کروں بلاشبہ میں تو رسول اور پیغامبر ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: آیۃ السیف نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔

وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَیۡرُ الۡحٰكِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور (اے حبیب!) آپ پیروی کرتے رہیں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور (ظلم کفار پر) صبر کیجئے یہاں تک فیصلہ فرما دے اللہ، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ وَاصۡبِرۡ کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے اطاعت کرنے پر اور معصیت سے بچنے پر صبر کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو جمع کیا اور آپ نے ان کے ساتھ کسی غیر کو جمع نہ کیا اور فرمایا: ''بے شک تم میرے بعد بلا استحقاق دوسروں کی فضیلت اور ترجیح کو پاؤ گے پس تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھے حوض پر آملو''۔ إنکم ستجدون بعدی أثرة فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض (2) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت ہے، پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس انہوں نے صبر نہ کیا تو آپ نے انہیں صبر کرنے کا حکم دیا جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ اس بارے میں عبدالرحمٰن بن حسان کہتے ہیں:

ألا أبلغ معاویة بن حرب أمیر المومنین نثا کلامی
بأنا صابرون و منظروکم إلی یوم التغابن والخصام

حَتّٰی یَحۡكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَیۡرُ الۡحٰكِمِیۡنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سوائے حق کے کوئی فیصلہ نہیں فرماتا۔

تمت ترجمہ سورۂ یونس

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف، حدیث نمبر 3986، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

## الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد پنجم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف


ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن ( جلد پنجم ) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، باراول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350 ۔فیکس042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-32212011-32630411 ۔فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

## سورۂ رعد



## سورۂ ابراہیم کی تفسیر

# سورۂ ہود

آیاتہا ۱۲۳ ۱۱ سورۃ ھود مکیۃ ۵۲ رکوعاتہا ۱۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا کہ سوائے ایک آیت کریمہ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ کے باقی مکی ہے۔ ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں حضرت کعب سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھو'' (1)۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ہود، الواقعہ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا (2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس میں سے کچھ حصہ مرسل روایت کیا گیا ہے۔ ترمذی حکیم ابو عبداللہ نے ''نوادر الاصول'' (3) میں اس کو روایت کیا ہے کہ ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن بشر نے علی بن صالح عن ابی اسحق عن ابی جحیفہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ ابو عبداللہ نے کہا کہ خوف بوڑھا کر دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف نفس کو کمزور کر دیتا ہے اور جسم کی رطوبت کو خشک کر دیتا ہے۔ ہر بال کے نیچے ایک چشمہ ہوتا ہے اس سے پسینہ پھوٹتا ہے جب خوف اس کی رطوبت کو خشک کرتا ہے تو وہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں پس بال بھی خشک ہو کر سفید ہو جاتے ہیں۔ جس طرح آپ کھیتی کو سیرابی کی وجہ سے شاداب دیکھتے ہیں اور جب اس کی سیرابی ختم ہوتی ہے تو وہ خشک ہو کر سفید ہو جاتی ہے پس بوڑھے آدمی کے بال اس کی رطوبت خشک ہونے کی وجہ سے سفید ہو جاتے ہیں اور اس کی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ پس نفس اللہ کی وعید اور ان خوفوں کی وجہ سے جن کے بارے میں اللہ کی طرف سے خبر آئی ہو کمزور ہو جاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ وہ وعید اور اس کے ساتھ آنے والا خوف اس کے پانی کو خشک کر دیتا ہے پس اس کے سبب بڑھاپا آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبًا ۝ (المزمل) پس وہ خوف کی وجہ سے بوڑھے ہو گئے۔ اور جہاں تک سورۃ ''ہود'' کا تعلق ہے تو اس میں کئی امتوں کا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے جو انہیں جلدی لاحق ہوا اس کا ذکر ہے۔ لہٰذا اہل یقین جب اس کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کی بادشاہی، سلطانی اور دشمنوں کو اس کی پکڑ جیسے معاملات ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اگر خوف کے سبب وہ مر جائیں تو ان کا حق ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اسم گرامی ان اوقات میں ان

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب فضائل القرآن، صفحہ 189، وزارت تعلیم
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ واقعہ، جلد 2، صفحہ 162
3۔ نوادر الاصول، باب الخوف یورث الشیب، صفحہ 224

پر مہربانی فرماتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے کلام کو پڑھتے ہیں۔

اور جہاں تک سورۂ ہود جیسی سورتوں کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ سورتیں ہیں جو سورۂ ہود کے مشابہ ہیں جیسے اَلْحَآقَّةُ، سَاَلَ سَآىِٕلٌ، اِذَاالشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اَلْقَارِعَةُ وغیرہ۔ پس ان سورتوں میں ایسی چیزیں ہیں جو عارفین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے عذاب کو واضح کرتی ہیں تو ان کی وجہ سے نفوس کمزور ہوتے ہیں اور انہیں کے سبب سروں میں بڑھاپا آتا ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورۂ ہود میں سے جس چیز نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ جس کا بیان انشاء اللہ بعد میں آئے گا۔ یزید بن اَبان نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپ کے سامنے سورۂ ہود پڑھی جب میں نے اس کو ختم کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے یزید بن اَبان یہ قراءت ہے تو رونا کہاں ہے''۔

ہمارے علماء نے کہا کہ جعفر نحاس نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہود ہے بغیر تنوین کے اس بنیاد پر کہ یہ سورت کا نام ہے کیونکہ اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو وہ منصرف نہ ہوگا۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر کہتے ہیں کہ یہ ''ہودٌ'' ہے تنوین کے ساتھ اس وجہ سے کہ یہ سورت کا نام ہے اسی طرح اگر آپ کسی عورت کا نام زید رکھیں تو بھی، کیونکہ جب اس کا درمیانی حرف ساکن ہو تو وہ خفیف ہو جاتا ہے تو منصرف ہو جائے گا اور اگر آپ لفظ سورۃ کو حذف کرنا چاہیں تو تمام کے نزدیک منصرف ہوگا۔ پس میں نے کہا: یہ ہود ہے اور آپ اس سے مراد سورۂ ہود لیتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ آپ ھذہ الرحمٰن کہتے ہیں، اگر آپ اس سے ھذہ سورۃ الرحمٰن مراد نہ لیتے تو یہ نہ کہتے۔

الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴﴾

''الف۔ لام۔ را۔ یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں، پھر ان کی وضاحت کر دی گئی ہے بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اللہ کی، بے شک میں تمہیں اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (صدق دل سے) متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف وہ لطف اندوز کرے گا تمہیں زندگی کی راحتوں سے اچھی طرح مقرر معیاد تک اور عطا کرے گا ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو اس کی زیادہ نیکی (کا ثواب) اور اگر تم (یونہی) روگرداں رہے تو میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ كِتٰبٌ سے مراد ھذا کتاب ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ یہ محل

رفع میں ہے کتاب کی صفت ہے۔ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کے معنی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے عمدہ قول حضرت قتادہ کا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سارے کے سارے کو محکم بنا دیا گیا ہے نہ اس میں کوئی خلل ہے اور نہ ہی یہ باطل ہے۔ الاحکام سے مراد کلام کا فساد سے محفوظ ہوتا ہے یعنی اس کی نظم، نظم محکم ہے نہ اس میں تناقض ہے اور نہ کوئی خلل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس سے مراد ہے کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہیں کیا بخلاف تورات اور انجیل کے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس کی بعض آیات کو اس طرح مضبوط بنا دیا گیا ہے کہ وہ ناسخ تو ہیں منسوخ نہیں۔ اس بارے میں گفتگو پہلے ہو چکی ہے (ایتہ سے بعض آیات مراد لینے کی وضاحت کرتے ہیں) بعض اوقات اسم جنس کا اطلاق نوع پر بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: اکلت طعام زید تو اس سے مراد زید کا بعض کھانا ہوتا ہے۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا کہ اس کی آیات کو امر اور نہی کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ ثُمَّ فُصِّلَتْ یعنی وعدے، وعید، ثواب اور عقاب کے ساتھ اس کی وضاحت بیان کی گئی۔ قتادہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے باطل سے اس کو (محفوظ کر کے) پختہ کیا پھر حلال و حرام کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی (1)۔ مجاہد نے کہا: اس کو مکمل طور پر مضبوط کیا گیا پھر توحید، نبوت، بعث بعد الموت اور دیگر عقائد پر حسب ضرورت دلیل کو ایک ایک آیت کر کے بیان کیا گیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوح محفوظ میں اس کو جمع کیا گیا پھر نزول میں تفریق کی گئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ فُصِّلَتْ سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایک ایک آیت کر کے نازل کیا گیا تا کہ اس میں غور و فکر کیا جا سکے۔ عکرمہ نے اس کو فُصِلَتْ بصورت تخفیف پڑھا ہے۔ اس سے مراد ہوگا حکمت بالحق۔

مِنْ لَّدُنْ، لَدُنْ بمعنی عند ہے۔ حَكِيْمٍ سے مراد امور کو پختہ کرنے والی ذات ہے اور خَبِيْرٍ سے مراد وہ ذات ہے جو باخبر ہے ہر اس کام سے جو ہو چکا اور جو نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ کسائی اور فراء نے کہا کہ اَلَّا اصل میں بأنْ لَّا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی اس کے ساتھ کہ تم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ زجاج نے کہا کہ یہ لئلا ہے یعنی اس کو پختہ کیا گیا پھر اس کی تفصیل بیان کی گئی تا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو ارشاد فرمائیں کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ، مِّنْهُ کی ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی اللہ سے۔ نَذِيْرٌ یعنی اس کی نافرمانی کرنے والے کو اس کے عذاب اور اس کی سطوت سے ڈرانے والا۔ بَشِيْرٌ اس کی اطاعت کرنے والے کو رضا اور جنت کی خوشخبری سنانے والا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اول و آخر اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں سے ہے یعنی تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بے شک میں تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ اللہ تمہیں غیر کی عبادت سے ڈرانے والا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (آل عمران: 28) اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ پہلے پر اس کا عطف ہے۔ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ یعنی اللہ کی طرف لوٹو اطاعت اور عبادت کے ساتھ۔ فراء نے کہا: یہاں ثُمَّ واؤ کے معنی میں ہے یعنی تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ کیونکہ استغفار ہی توبہ ہے اور توبہ ہی استغفار

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 11، صفحہ 207-206

ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ تم اپنے پہلے گناہوں سے استغفار کرو اور نئے گناہ سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرو جب تم سے سرزد ہو۔ بعض صلحاء نے کہا کہ گناہ کو چھوڑے بغیر استغفار کرنا یہ جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے۔ یہ معنی مکمل طور پر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور سورۂ بقرہ میں وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ: 231) کے تحت گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کے ذکر کو مقدم فرمایا ہے کیونکہ مغفرت غرض مطلوب ہے اور توبہ اس کا سبب ہے پس مغفرت مقصود میں اوّل ہے جب کہ سبب میں آخر۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ تم صغیرہ گناہوں سے استغفار کرو اور کبیرہ گناہوں سے توبہ کرو۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا یہ استغفار اور توبہ کا ثمر ہے یعنی وہ تم کو رزق کی وسعت اور زندگی کی خوشحالی سے منافع کے ذریعے لطف اندوز کرے گا اور تمہیں عذاب کے ذریعے جڑ سے نہیں اکھیڑے گا جس طرح اس نے ان کے ساتھ کیا جن کو اس نے تم سے پہلے ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ يُمَتِّعْكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تم کو عمر دے گا۔ الامتاع کی اصل لمبا کرنا ہے (طوالت دینا) ہے۔ اس سے أمتع الله بك و متع به (درازی عمر کی دعا) ہے۔ سہل بن عبداللہ نے کہا کہ المتاع الحسن مخلوق کو ترک کرنا اور حق کی طرف توجہ دینا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد موجود پر قناعت کرنا اور مفقود پر پریشانی کو ترک کرنا ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ایک قول یہ ہے کہ اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد موت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے جب کہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جنت کا داخلہ ہے۔ اس بنیاد پر المتاع الحسن سے مراد قبر اور اس کے علاوہ قیامت کی ہولناکیوں اور قیامت میں خوف دلانے والے امور اور ہر ناپسندیدہ چیز سے بچانا ہوگا۔ پہلا معنی (یعنی موت) زیادہ ظاہر ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ یہ (معاملہ) موت کی وجہ سے ختم ہوگا اور یہی اجل مسمی ہے۔ واللہ اعلم۔

مقاتل نے کہا کہ انہوں نے انکار کیا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا کی وہ سات سال قحط میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں، گندگی، مردار اور کتوں کو کھایا۔

وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ یعنی وہ نیک اعمال میں سے ہر صاحب عمل کو اس عمل کی جزا دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ بندہ جس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر فضیلت پا گئیں اس کو وہ اپنا فضل یعنی جنت دے گا اور یہی اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَضْلَهٗ میں ہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ مجاہد نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کلام میں سے جو وہ اپنی زبان سے کرتا ہے یا عمل میں سے جو وہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کے ذریعے کرتا ہے جس کو شمار کرتا ہے یا اپنے مال میں سے جس کو بطور صدقہ دیتا ہے پس وہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ اس کو (اس کا اجر) دیتا ہے اگر وہ ایمان لائے اور اس کو وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کرتا اگر وہ کافر ہو تو وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ۔ يَوْمٍ كَبِيْرٍ سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہ دن بڑا ہوگا اس میں واقع ہونے والی ہولناکیوں کی وجہ سے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم بدر (1) اور اس کے علاوہ (غزوات کے ایام) ہیں۔ وتولوا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 150

کہ اگر وہ روگرداں رہے تو آپ ان کو فرمادیں کہ میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو اور اس کی ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ان کو فرمادیں کہ اگر تم نے روگردانی کی تو میں تم پر اندیشہ کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ یعنی موت کے بعد، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی ثواب اور عقاب میں سے ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

''سنو! وہ دہرا کر رہے ہیں اپنے سینوں کو تاکہ وہ چھپالیں اللہ تعالیٰ سے (اپنے دلوں کا بغض) سنتے ہو! جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں بلاشبہ وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (پوشیدہ) ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے ساتھ مشرکین کے رویے کی خبر دی اور وہ (مشرکین) یہ گمان کرتے کہ ان کے حالات اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہیں یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عداوت و دشمنی کے جذبات کو لپیٹتے (یعنی چھپاتے) ہیں اس میں علی عداوۃ المسلمین کے الفاظ حذف ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود بغض اور دشمنی کو چھپاتے ہیں اور اس کے برعکس ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ ایک شیریں لسان اور شیریں کلام آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسندیدہ طریقے سے ملتا اور آپ کے لیے اپنے دل میں موجود برے جذبات کو چھپالیتا(1)۔

مجاہد نے کہا کہ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ کہ وہ اپنے سینوں کو دہرا کر لیتے شک اور شبہ کی وجہ سے۔ اور حسن نے کہا کہ وہ اپنے سینوں میں موجود کفر کو چھپالیتے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت بعض منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتے تو بعض منافقین اپنا سینہ اور اپنی پیٹھ دہری کر لیتے، اپنے سر کو جھکا لیتے اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر ایمان کی دعوت نہ دے دیں اس کا معنی عبداللہ بن شداد نے بیان کیا ہے۔ مِنْهُ میں ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ منافقین نے کہا کہ جب ہم اپنے دروازے بند کرلیں گے، اپنے کپڑے خوب اوڑھ لیں گے اور اپنے سینے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر دہرے کرلیں گے تو ہمیں کون جانے گا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اپنے بدنوں کو ڈھانپ کر عبادت کرتے اور آسمان کے نیچے اپنے بدنوں کو ظاہر نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عبادت تو وہ ہے جس پر ان کے دل قائم ہیں عقیدت میں سے اور جس کو وہ اپنے قول اور عمل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ ابن جریر نے محمد بن عباد بن جعفر سے روایت بیان کی ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اَلَاۤ اِنَّهُمْ تَثْنُوْنِیْ صُدُوْرُهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ کہ وہ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 191

آسمان کی طرف کھلے ہونے کی حالت میں نہ اپنی بیویوں سے جماع کرتے اور نہ ہی پیشاب کرتے (1)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ محمد بن عباد کے علاوہ (کسی اور نے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یہ الا انھم تثنون صدور ھم یعنی واو کے بعد بغیر نون کے ہے تنطوی کے وزن پر۔ تثنوی کا معنی اور آخری دونوں قرائتیں قریب قریب ہیں، کیونکہ وہ خود تو دہرا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس (سینہ) کو دہرا نہ کریں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں پر طعن کرتے ہوئے سرگوشیاں کرتے تو ایک دوسرے پر جھک جاتے اور اپنی جہالت کی وجہ سے یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ یہ سمجھتے کہ ان کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی مخفی ہے۔ یستخفوا سے مراد ہے کہ تا کہ وہ اس سے چھپالیں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یا اللہ تعالیٰ سے۔

اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ یعنی وہ اپنے کپڑوں کے ذریعے اپنے سروں کو ڈھانپتے۔ قتادہ نے کہا کہ بندے کی سب سے زیادہ پوشیدگی والی حالت تب ہوتی ہے جب وہ اپنی پیٹھ کو جھکائے، اپنے کپڑے اوڑھ لے اور اپنے دل میں اپنے غم کو چھپالے (2)۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝

”اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس میں ما نافیہ ہے اور من زائدہ ہے اور دابۃ محل رفع میں ہے تقدیر عبارت میں وما دابۃ ہے۔ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا، علی بمعنی من ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق ہے اس پر مجاہد کا قول دلالت کرتا ہے کہ رزق میں سے جو کچھ بھی آیا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (3)۔ ایک قول یہ ہے کہ علی اللہ سے مراد اللہ کے فضل کے طور پر ہے نہ کہ اس سے وجوب مراد ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی طرف سے سچے وعدے کے طور پر ہے۔ اس معنی کا بیان ”سورۃ النساء“ میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کوئی چیز واجب نہیں۔ رِزْقُهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جب کہ کوفیوں کے نزدیک صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ آیت کا ظاہر عموم پر دلالت کر رہا ہے جب کہ اس کا معنی مخصوص ہے، کیونکہ (دواب) جانداروں میں سے بہت سارے رزق دیے جانے سے پہلے ہی ہلاک ہو گئے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عام ہے ہر ایک کے بارے میں ہے اور ہر وہ جاندار جس کو ایسا رزق نہ دیا گیا جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا تو اس کی روح کو تو رزق دیا گیا۔ اور ماقبل کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کے رزق کی خبر دی اور وہ ذات اس چیز کی تربیت سے غافل نہیں تو اے گروہ کفار! تمہارے حالات اس پر کیسے مخفی ہو سکتے ہیں اس حال

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 677
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 212
3۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 5

میں کہ وہ تمہیں رزق دیتا ہے؟ الدابۃ سے مراد ہر وہ حیوان ہے جو رینگ کر چلتا ہے اور حقیقت میں رزق وہ ہے جس کے ذریعے زندہ کو غذا دی جاتی ہے اور اس میں اس کی روح کی بقا اور اس کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے۔ رزق کا معنی ملک ہونا صحیح نہیں کیونکہ جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے جب کہ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ اپنے چارے کے مالک بھی ہیں۔

اسی طرح بچوں کو دودھ بطور رزق دیا جاتا ہے مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ پستان میں جو دودھ ہے وہ بچے کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: 22) کہ آسمان میں تمہارا رزق ہے حالانکہ آسمان میں ہماری کوئی ملکیت نہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ رزق اگر ملکیت ہوتا تو جب کوئی آدمی کسی غیر کی ملکیت میں سے کھاتا تو وہ کسی غیر کے رزق میں سے کھاتا حالانکہ یہ محال ہے، کیونکہ بندہ صرف اپنا ہی رزق کھاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ والحمدللہ۔ کسی آدمی کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: جس نے چکی کو پیدا کیا ہے وہ اسے پیسنے کے ذریعے دیتا ہے اور وہ ذات جس نے وادیوں کے کناروں کو وسیع کیا وہی رزق پیدا کرنے والا ہے۔

ابو اُسید کو کہا گیا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: پاک ہے اللہ کی ذات اور اللہ سب سے بڑا ہے! اللہ تعالیٰ کتے کو رزق دیتا ہے تو کیا وہ ابو اُسید کو رزق نہیں دے گا۔ حاتم الاصم کو کہا گیا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ تو اس نے کہا: اللہ کی طرف سے، اس کو کہا گیا: اللہ تمہارے لیے آسمان سے دراہم اور دینار اتارتا ہے؟ تو اس نے کہا: گویا اس کا صرف آسمان ہے یا یہ زمین بھی اس کی ہے اور آسمان بھی اس کا ہے۔ پس اگر وہ آسمان سے مجھے میرا رزق نہ دے تو وہ اسے زمین میں سے میرے لیے بھیج دیتا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا۔

وكيف أخافُ الفقرَ والله رازقي ورازقُ هذا الخلقِ في العُسرِ واليُسرِ
تكفَّلَ بالأرزاقِ للخلقِ كلِّهم وللضَّبِّ في البيداءِ والحوتِ في البحرِ

اور مجھے فقر کا کیا خوف اس حال میں کہ اللہ میرا رازق ہے اور وہ اس مخلوق کا رازق ہے تنگی اور خوشحالی میں۔ وہ ساری مخلوق کے رزق کا کفیل ہے، وہ گوہ کے رزق کا کفیل ہے اس کے بل میں اور مچھلی کے رزق کا کفیل ہے سمندر میں۔

حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" (1) میں اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اشعریوں کی ایک جماعت جو حضرت موسیٰ، حضرت ابو مالک اور حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھی۔ جب انہوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ سفر میں جو کھانا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کا سوال کرنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا جب وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے ایک آدمی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اس شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشعریوں کی بہ نسبت چوپایوں کو رزق دینا زیادہ آسان تو نہیں ہے۔ وہ واپس آ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گیا اور اس نے اپنے اصحاب سے کہا: تم کو خوشخبری ہو تمہارے پاس مدد آنے

1۔ نوادر الاصول، باب ابو موسیٰ، صفحہ 253

والی ہے۔ اس کے اصحاب نے یہی سمجھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا ہوگا اور آپ نے کھانا بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہوگا، اسی دوران دو آدمی ان کے پاس برتنوں میں کھانا لے کر آ گئے جن میں گوشت کا سالن اور روٹیاں تھیں۔ انہوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا، پھر اس شخص نے اپنے بعض اصحاب سے کہا: تم یہ کھانا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤ کیونکہ ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں، پھر جب وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے لیے جو کھانا بھیجا تھا اس سے عمدہ اور لذیذ کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے تو تمہیں کوئی کھانا نہیں بھیجا''۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے کیا کیا تھا اور اپنے اصحاب سے کیا کہا تھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم کو اللہ نے یہ رزق دیا تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: **وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا** یعنی زمین میں سے جہاں اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ **وَمُسْتَوْدَعَهَا** یعنی وہ جگہ جس میں وہ مرے گا اور اس کو دفن کیا جائے گا۔ یہ بات مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہی ہے۔ اور ربیع بن انس نے کہا کہ **مُسْتَقَرَّهَا** سے مراد اس کی زندگی کے دن ہیں (1)۔ **وَمُسْتَوْدَعَهَا** سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ مرے گا اور جہاں سے اٹھایا جائے گا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ **مُسْتَقَرَّهَا** سے مراد رحم (مادر) ہے۔ **وَمُسْتَوْدَعَهَا** سے مراد صلب (باپ) ہے۔ اور ایک قول یہ ہے **يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا** سے مراد جنت یا دوزخ میں (ان کا ٹھکانہ ہے) اور **مُسْتَوْدَعَهَا** سے مراد قبر میں (ٹھکانہ ہے) اہل جنت اور اہل دوزخ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد **حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا** ۝ (الفرقان) اور **سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا** ۝ (الفرقان) اس (معنی) پر دلالت کرتا ہے۔ **كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ** یعنی لوح محفوظ میں۔

**وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ** ۝

''اور وہی (خدا) ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا (زمین اور آسمان پیدا کیے) تاکہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا ہے عمل کے لحاظ سے اور اگر آپ (انہیں) کہیں کہ یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ** اس کا بیان ''سورۂ اعراف'' میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ **وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ** اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عرش اور پانی کی تخلیق، زمین اور آسمان کی تخلیق سے پہلے ہے (2)۔ حضرت کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا فرمایا پھر جلال کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 6-7 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 8

کے خوف سے کانپتا ہوا پانی ہو گیا۔ اس وجہ سے ابھی تک پانی مضطرب رہتا ہے اگر چہ وہ رکا ہوا ہی ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا اور پانی کو ہوا کی پشت پر رکھ دیا پھر عرش کو پانی پر رکھ دیا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا: ان سے اللہ تعالیٰ عزوجل کے ارشاد وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: پانی کس چیز پر تھا؟ تو آپ نے فرمایا: ہوا کی پشت پر۔

امام بخاری نے حضرت عمران بن حصین (1) سے روایت کیا: انہوں نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو تمیم کے لوگ آئے۔ آپ نے فرمایا: ''اے بنو تمیم! بشارت کو قبول کرو''۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں بشارت تو دے چکے ہیں اب ہم کو عطا فرمائیں۔ (یہ مکالمہ دو بار ہوا) پھر اہل یمن میں سے کچھ لوگ آئے، آپ نے فرمایا: ''اے اہل یمن! بشارت کو قبول کرو اگر چہ بشارت کو بنو تمیم نے قبول نہیں کیا''۔ انہوں نے کہا: ہم نے قبول کر لیا، ہم آئے تا کہ ہم دین کے بارے میں سمجھیں اور تا کہ ہم آپ کے پاس اس امر (دنیا) کے متعلق پوچھیں کہ وہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور ذکر (لوح محفوظ) میں اس نے ہر چیز لکھ دی۔ پھر میرے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا: اے عمران! اپنی اونٹنی پکڑ وہ تو چلی گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں نکلا تو وہ میرے سامنے والے سراب کو عبور کر چکی تھی اور اللہ کی قسم! میں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ چلی گئی اور میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے) نہ اٹھوں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا تا کہ وہ اپنے بندوں کو اپنی قدرت کے کمال اور بعث بعد الموت پر استدلال اور نصیحت کے ذریعے آزمائے۔ قتادہ نے کہا: اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی ہے تم میں سے ازروئے عقل کے کون زیادہ کامل ہے؟ حضرت حسن اور سفیان ثوری نے کہا: تم میں سے دنیا میں سب سے زیادہ زہد والا کون ہے؟ اور بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سوئے ہوئے آدمی کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے سونے والے اٹھ اور عبادت کر، اس نے کہا: اے روح اللہ! میں عبادت کر چکا۔ آپ نے فرمایا: تم نے کس طرح عبادت کی؟ اس نے کہا: میں نے دنیا کو اس کے اہل کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: تو سو جا تو نے عبادت گزاروں پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ ضحاک نے کہا: تم میں سب سے زیادہ شکر ادا کرنے والا کون ہے؟ مقاتل کے نزدیک تم میں سے اللہ سے زیادہ ڈرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سب سے زیادہ عمل کرنے والا کون ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تلاوت فرمائی۔ آپ نے فرمایا: ''تم میں سے ازروئے عقل کے کون بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کے محارم سے کون زیادہ بچنے والا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کون سب سے زیادہ جلدی کرنے والا ہے (2)؟ تمام تاویلات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ ان شاء اللہ ''سورۂ کہف'' میں بھی آئے گا۔ جب کہ ابتلا کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بعث بعد الموت پر رہنمائی فرمائیں۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، وفد بنی تمیم، جلد 2، صفحہ 626　　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 460

بعث بعد الموت کو مشرکین کے سامنے ذکر کریں تو وہ کہیں گے: یہ جادو ہے۔ انکم میں ان مکسور ہے کیونکہ یہ قول کے بعد واقع ہے اور سیبویہ نے فتحہ بیان کیا ہے (یعنی انکم) لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا، لَيَقُوْلَنَّ لام مفتوح ہے کیونکہ یہ ایسا فعل مقدم ہے جس میں ضمیر نہیں ہے اور اس کے بعد لَيَقُوْلَنَّ ہے کیونکہ اس میں ضمیر ہے۔ وسحر یعنی غرور اور باطل ان کے نزدیک جادو کے باطل ہونے کی وجہ سے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ پڑھا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کنایۃ۔

وَ لَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟۠

''اور اگر ہم ملتوی کر دیں ان سے عذاب کچھ عرصہ تک تو (از راہ مذاق) کہیں گے کہ کس چیز نے روک دیا ہے اس عذاب کو۔ وہ کان کھول کر سن لیں جس دن عذاب آجائے گا ان پر تو نہیں پھیرا جا سکے گا ان سے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا وہ تمسخر اڑایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ، لَىِٕنْ میں ''لام'' قسم کا ہے اور لَيَقُوْلُنَّ کا ''لام'' جواب قسم ہے۔ اِلٰۤى اُمَّةٍ کا معنی ہے معدود مدت اور معلوم زمانے تک (1)، یہاں اُمَّةٍ کا معنی مدت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور جمہور مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور اُمَّةٍ کی اصل جماعت ہے اور حین اور سنین کو اُمَّةٍ کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ اُمَّةٍ اس میں ہوتی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا مضاف الیہ حذف ہے اور معنی ہے الی مجئ امۃ جس میں کوئی ایسا نہیں جو ایمان لاتا پس وہ ہلاکت کے مستحق ہو جاتے یا الی انقراض امۃ یعنی ایسی امت کے گزرنے تک جس میں وہ ہے جو ایمان لاتا ہے پس اس کے گزرنے کے بعد جو ایمان لاتا وہ باقی نہ رہتا۔ اور امت اسم مشترک ہے اس کی آٹھ صورتیں بنتی ہیں۔

امت جماعت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ (القصص: 23) اس پر اس نے لوگوں کی جماعت کو پایا۔ اور امت انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں کو بھی کہتے ہیں، امت سے مراد بھلائی کا وہ جامع آدمی ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (النحل: 120) بے شک ابراہیم ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار۔ امت سے مراد دین اور ملت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (الزخرف: 22) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا۔ امت سے مراد حین اور زمان ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ وَ لَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ اور اگر ہم ملتوی کر دیں عذاب کچھ عرصہ تک اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف: 45)

امت سے مراد قد و قامت بھی ہے اس سے مراد انسان کی لمبائی اور اس کی بلندی ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: فلان حسن الامۃ یعنی فلاں اچھی قامت والا ہے۔ اور امت سے مراد وہ آدمی بھی ہے جو اپنے دین میں منفرد ہو اس میں کوئی بھی اس کا شریک نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يُبْعَثُ زَيْدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ اُمَّةً وَحْدَهٗ (2) زید بن عمرو بن نفیل کو اکیلا اٹھایا جائے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 11
2۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 496

گا۔ امت سے مراد ماں (الام) ہے کہا جاتا ہے: ھذہ امۃ زید یعنی زید کی ماں۔ لَيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ یعنی عذاب۔ انہوں نے یہ یا تو اس عذاب کی تکذیب کرتے ہوئے کہا ان سے اس عذاب کے مؤخر ہونے کی وجہ سے یا پھر جلدی کرتے ہوئے اور استہزا کرتے ہوئے کہا، اس سے مراد یہ ہے: کس چیز نے ہم سے اس کو روک کے رکھا۔ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ کہا گیا ہے: یہ غزوۂ بدر میں مشرکین کا قتل ہے، اور جبرئیل کا قتل کرنا ہے ان مذاق کرنے والوں کو جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔ وَ حَاقَ بِهِمْ یعنی وہ نازل ہوا اور اس نے احاطہ کیا۔ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی جزا اس کی جس کا وہ مذاق کیا کرتے تھے۔ اس میں مضاف محذوف ہے۔

وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

”اور اگر ہم چکھائیں کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت (کا مزہ) پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے تو وہ بڑا مایوس (اور) ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے کوئی نعمت اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دور ہو گئیں سب تکلیفیں مجھ سے۔ بے شک وہ بڑا خوش ہونے والا، اترانے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے کم ظرف نہیں ہوتے) وہی ہیں جن کے لیے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، الْاِنْسَانَ تمام کفار کے بارے میں جنس کے لیے مشترک نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انسان سے مراد ولید بن مغیرہ ہے اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی۔ رَحْمَةً یعنی بطور نعمت۔ ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ یعنی ہم اس (نعمت) کو اس سے سلب کر لیں گے۔ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ یعنی رحمت سے مایوس ہونے والا۔ كَفُوْرٌ یعنی نعمتوں کا انکار کرنے والا۔ ابن اعرابی نے یہ کہا ہے۔ نحاس نے کہا: لیؤوس، یئس ییأس سے ہے۔ سیبویہ نے کہا: یئس ییأس اور یأس ییئس ہے اور بعض کہتے ہیں: یئس ییئس ہے۔ کلام عرب میں سوائے ان چار حروف کے سالم سے فَعِل یَفعِل کے وزن پر کوئی اور صیغہ نہیں جانا گیا اور ان میں سے ایک میں اختلاف ہے اور وہ ہے یئیس ویؤوس کثرت کے طور پر جس طرح مبالغہ کے لیے فخور آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ یعنی صحت، خوشحالی اور رزق میں وسعت بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ یعنی نقصان، فقر اور شدت کے بعد۔ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ یعنی وہ غلطیاں جو غلطی کرنے والے کو بری لگتی ہیں نقصان اور فقر میں سے۔ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ یعنی وہ خوش ہوتا ہے اور وسعت میں سے جو کچھ اس کو ملا اس کی وجہ سے فخر کرتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا بھول جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فاخر جب وہ فخر کرے اور فخور مبالغہ کے لیے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا: بعض اہل مدینہ نے لفرُح پڑھا ہے را کے ضمہ کے ساتھ جس طرح کہا جاتا ہے: رجلٌ فطنٌ وحذرٌ وندسٌ۔ اور ان دونوں لفظوں کو

ساکن کرنا بھی جائز ہے ضمہ اور کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا یعنی مومنین، اللہ تعالیٰ نے شدائد پر صبر کی وجہ سے ان کی تعریف فرمائی اور یہ محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: یہ استثنا ہے مگر پہلے میں سے نہیں، یعنی لیکن وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نعمت اور محنت دونوں حالتوں میں نیک عمل کیے۔ فراء نے کہا: یہ ولئن أذقناه سے استثنا ہے یعنی انسان سے پس انسان بمعنی ناس (لوگ) ہے۔ اور الناس کافر اور مومن دونوں کو شامل ہے پس یہ استثنا متصل ہے اور یہ عمدہ ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَّ اَجْرٌ معطوف ہے۔ كَبِیْرٌ اس کی صفت ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾

"پس کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ کا سینہ (اس اندیشہ سے) کہ کافر کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے، آپ فرمایئے: (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لیے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم (اس الزام تراشی میں) سچے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ یعنی شاید آپ ان کی طرف سے جو کفر اور تکذیب دیکھتے ہیں اس کو بڑا خیال کریں اور یہ گمان کریں کہ وہ آپ کو وحی کے بعض حصہ سے ہٹا دیں گے۔ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے کہا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ آپ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ کلام کا معنی استفہام ہے یعنی کیا آپ چھوڑ دیں گے جو قرآن میں ان کے بتوں کو برا بھلا کہا گیا ہے جس طرح کہ وہ آپ سے سوال (مطالبہ) کرتے ہیں؟ اور آپ پر تبلیغ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے امر کو اور زیادہ پختہ فرما دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ: 67) اے رسول! تبلیغ کیجئے اس کی جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: کلام کا معنی نفی مع استبعاد ہے (اس بات کو بعید خیال کرنا) یعنی آپ کی طرف سے ایسا نہیں ہوگا بلکہ آپ کی طرف جو نازل کیا گیا آپ اس کو (جوں کا توں) پہنچا دیں گے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ مشرکین مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: اگر آپ ہمارے لیے کوئی ایسی کتاب لے آئیں جس میں ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو تو ہم آپ کی اتباع

کریں گے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنا ترک کرنے کا ارادہ فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ، تَارِكٌ پر اس کا عطف ہے اور صَدْرُكَ اس کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بِهٖ کی ہ ضمیر کا مرجع ما ہے یا بعض ہے یا تبلیغ ہے یا پھر تکذیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ضَآئِقٌ فرمایا ضَیِّقٌ نہ فرمایا تا کہ یہ تَارِكٌ جو کہ اس سے پہلے ہے اس کا ہم شکل (ہم وزن) ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضَآئِقٌ عارض ہے جب کہ ضیق اس سے زیادہ لازم ہے۔ اَنْ یَّقُوْلُوْا محل نصب میں ہے یعنی اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ کہیں گے یا اس سے مراد ہے لئلا یقولوا تا کہ وہ یہ نہ کہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) یہاں اَنْ تَضِلُّوْا سے مراد لئلا تضلوا ہے یا پھر یہ لأن یقولوا ہے۔ لَوْلَآ سے مراد ہے ھلا یعنی کیوں نہ۔ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ جو اس کی تصدیق کرتا، عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی نے یوں کہا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِیْرٌ یعنی آپ پر ان کو ڈرانا ہے نہ یہ کہ آپ ان کے لیے لائیں ایسی آیات جن کی وہ تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ یعنی حفاظت کرنے والا اور نگہبان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ، ام بمعنی بل ہے۔ یہ ''سورۂ یونس'' میں گزر چکا ہے یعنی آپ کی نبوت کے بارے میں ان کے اشکال اور ان کے اعتراضات اس قرآن کے ذریعے ختم ہو گئے اور آپ نے اس کے ذریعے ان پر حجت قائم کر دی۔ پس اگر وہ کہیں: تو نے اس کو گھڑ لیا ہے یعنی تو نے خود اس کو تخلیق کر لیا ہے۔ پس وہ اپنے گمان کے مطابق اس جیسا گھڑا ہوا لے آئیں۔ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کاہنوں اور مددگاروں میں سے جس کو بلا سکتے ہیں بلا لیں۔

فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ⑭

''پس اگر وہ نہ قبول کر سکیں تمہاری دعوت تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ یعنی معارضت (چیلنج) کے بارے میں اور یہ اس کے لیے تیار نہیں تو ان پر حجت قائم ہو چکی کیونکہ وہ بلیغ لغت اور فصیح زبان والے ہیں۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ یعنی تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو جان لو۔ اور جان لو وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ استفہام بمعنی امر ہے اس آیت کے معنی کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور یہ کہ قرآن معجز ہے (مقدمہ کتاب میں) والحمد للہ

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ فَاْتُوْا اور اس کے بعد فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ (اس میں لَكُمْ کے بجائے) لك نہیں کہا۔ ایک قول یہ ہے: یہ مخاطب کو بطور تعظیم و تفخیم مفرد سے جمع کی طرف پھیرنا ہے۔ بعض اوقات رئیس کو (ایسے الفاظ کے ساتھ) خطاب کیا جاتا ہے جن کے ذریعے جماعت کو مخاطب ہوا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْٓا میں ضمیر تمام کے لیے ہے یعنی سب کو جان لینا چاہیے کہ اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ مجاہد نے یوں کہا ہے، اور ایک قول یہ ہے لَكُمْ اور فَاعْلَمُوْٓا میں ضمیر مشرکین

کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا اگر وہ جن کو تم نے معاونت کی دعوت دی وہ تمہاری دعوت کا جواب نہ دیں اور تمہارے لیے مقابلہ ممکن نہ ہو۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تو پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے لَكُمْ میں ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور فَاعْلَمُوْٓا میں مشرکین کے لیے ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝

''جو طلب گار ہیں دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے انہیں ان کے اعمال کا اس زندگی میں اور انہیں اس میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان مَنْ كَانَ میں كَانَ زائدہ ہے، اسی وجہ سے جواب (شرط) مجزوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نُوَفِّ اِلَيْهِمْ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مَنْ كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے اور اس کا جواب نُوَفِّ اِلَيْهِمْ ہے اس سے مراد من تكن يريد ہے۔ لفظ پہلا ماضی ہے اور دوسرا مضارع جس طرح زہیر نے کہا:

ومن هابَ أسبابَ المنية يَلْقَها ولو رامَ أسبابَ السماء لسلم

جو موت کے اسباب سے بھاگا وہ اس کو ملے گا اگرچہ سیڑھی کے ذریعہ آسمان کے اسباب کا ہی قصد کیوں نہ کرے۔

استشهاد (اس میں ''هاب'' ماضی ہے جب کہ يلقها مضارع)

اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ ضحاک نے کہا ہے اور نحاس نے اس کو اختیار کیا ہے اس کے بعد آنے والی آیت کی دلیل کی وجہ سے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ یعنی ان میں سے جس شخص نے صلہ رحمی اور صدقہ کیا ہم اس کو دنیا میں ہی جسمانی صحت اور کثرت رزق کے ذریعے اس کا بدلہ دیں گے لیکن آخرت میں اس کے لیے کوئی نیکی نہیں۔ ''سورۂ براۃ'' میں یہ معنی مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے آیت سے مراد مومنین ہیں، یعنی جس نے اپنے عمل کے ذریعے دنیا کے ثواب کا ارادہ کیا اسے جلدی ثواب دیا جائے گا اور دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لیے عذاب ہوگا کیونکہ اس کا ارادہ صرف دنیا کا تھا اور یہ (ایسے ہی ہے) جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''(1)۔

پس بندے کو اس کے ارادے کے سبب اور اس کے ضمیر کے فیصلے پر عطا کیا جاتا ہے اور یہ ہر ملت میں تمام قوموں میں متفق علیہ بات ہے۔ ایک قول یہ ہے یہ ریا کاروں کے لیے ہے(2)، حدیث طیبہ میں ہے کہ ریا کاروں کو کہا جائے گا: ''تم نے روزہ رکھا، تم نے نماز پڑھی، تم نے صدقہ کیا، تم نے جہاد کیا اور تم نے تلاوت کی تاکہ تمہیں ایسا کہا جائے پس یہ کہہ دیا گیا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک یہ پہلے لوگ ہوں گے جن پر آگ جلائی جائے گی'' (دوزخ میں ڈالے جائیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، کیف کان بدأ الوحی، جلد 1، صفحہ 2 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 18

گے) اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا پھر آپ بہت زیادہ روئے اور کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا(1)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا اور آپ نے دو آیتیں پڑھیں۔

امام مسلم نے اس کو اس کے معنی کے ساتھ اپنی صحیح (مسلم) میں روایت کیا اور ترمذی نے بھی روایت کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت ہر اس آدمی کے بارے میں عام ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی نیت کرتا ہے وہ مومن ہو یا نہ ہو۔ مجاہد اور میمون بن مہران نے یوں کہا ہے، اس جانب حضرت معاویہ گئے ہیں اور میمون بن مہران نے کہا: کوئی بھی آدمی اچھا عمل کرے تو اس کا پورا پورا ثواب دیا جاتا ہے پس اگر مخلص مسلمان ہو تو دنیا و آخرت (دونوں) میں (ثواب) دیا جاتا ہے اور اگر وہ کافر ہو تو دنیا ہی میں پورا بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں دنیا چاہتا ہے تو وہ اس کو دے دی جاتی ہے یعنی غازیوں والا اجر پورا دے دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی (اس معنی کے اعتبار سے) یہ مخصوص ہے جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت کا معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: انما الاعمال بالنیات ہے یعنی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے رمضان میں رمضان کے علاوہ (کوئی اور) روزہ رکھا تو وہ رمضان کا روزہ نہیں ہوگا اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے ٹھنڈک (کے حصول) اور نظافت کی خاطر وضو کیا تو وہ نماز کی طرف سے بطور قربت واقع نہ ہوگا اور اسی طرح ہر وہ حکم جو اس معنی میں ہو (اس کا یہی حکم ہے) (عند المالکیہ)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت مطلق ہے اور اس طرح سورۃ الشوریٰ والی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا الایۃ (الشوریٰ: 20) اس طرح وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا۔ سورۂ سبحان میں موجود آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ سے مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: 18 تا 20) کے ارشاد تک نے اس کی قید اور تفسیر بیان کی ہے۔ اللہ سبحانہ نے خبر دی کہ بندہ نیت اور ارادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کے بارے میں روایت کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ (بنی اسرائیل: 18) کے ذریعے منسوخ ہے اور صحیح وہ ہے جو ہم (قرطبی) نے ذکر کیا ہے اور اس کا تعلق مطلق اور مقید کی بحث سے ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) بھی ہے اس کا ظاہر تو یہ ہے کہ ہر حال میں ہمیشہ ہر پکارنے والے کے جواب کے متعلق خبر ہے حالانکہ اس طرح نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: 41) کی وجہ سے۔ اور اخبار میں نسخ جائز نہیں ہوتا کیونکہ واجبات عقلیہ کی تبدیلی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ محال ہے،

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ، جلد 2، صفحہ 61

جہاں تک احکام شرعیہ کے متعلق اخبار کا تعلق ہے تو ان کا نسخ جائز ہے اس میں اختلاف ہے جس طرح کہ اصول میں مذکور ہے اور اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

**اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٦**

''یہ وہ لوگ ہیں نہیں ہے جن کے لیے آخرت میں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا اور (در حقیقت) مٹ جانے والا تھا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ میں ہمیشہ (جہنم میں) رہنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ مومن ہمیشہ (جہنم میں) نہیں رہے گا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ الآیۃ (النساء: 116) بے شک اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ معاف فرمادے گا۔ پس اس کو اس ریاکار کی کفر پر وفات ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ ایک قول یہ ہے لیس لھم الا النار کا معنی یہ ہے کہ وہ معلوم دن آگ میں رہیں گے پھر ان کو نکال لیا جائے گا یا تو شفاعت کے ذریعے یا مٹھی بھرنے کے ذریعے (یعنی پکڑ کر) اور آیت کریمہ ایمان کو سلب کرنے کے ذریعے وعید کا تقاضا کرتی ہے اور گزشتہ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی) حدیث میں کفر اور بالخصوص ریا مراد ہے، کیونکہ یہ بھی شرک ہے جس طرح کہ سورۃ النساء میں اس کا بیان گزر چکا ہے اور سورۃ الکہف کے آخر میں بھی آئے گا۔ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: ھا کو حذف کر دیا گیا ہے، نحاس نے کہا: اس کو حذف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی وباطل عملہ کہ اس کا عمل باطل ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبداللہ کے حرف میں وباطلا ما کانوا یعملون، ما زائدہ ہوگا یعنی وکانوا یعملون باطلا کہ وہ باطل کام کیا کرتے تھے۔

**اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٧**

''تو کیا وہ شخص (انکار کرسکتا ہے) جس کے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس کے پیچھے ایک سچا گواہ بھی آ گیا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس سے قبل کتاب موسیٰ بھی آ چکی ہو جو امام اور سراپا رحمت ہے؟ (قطعاً نہیں بلکہ) یہ لوگ تو ایمان لائیں گے اس پر اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں میں سے تو آتش (جہنم) ہی اس کے وعدہ کی جگہ ہے پس (اے سننے والے!) نہ پڑ جا شک میں اس کے متعلق۔ بلاشبہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں

میں سے وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہے اور اس کے پاس وہ فضل ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بیان فرماتا ہے وہ اپنے علاوہ کسی ایسے آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو دنیوی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتا ہے؟ یہ علی بن حسین اور حسن بن ابی الحسن سے مروی ہے۔ اور اسی طرح ابن زید نے بھی کہا ہے۔ بے شک جو روشن دلیل پر ہے وہ وہ ہے جس نے نبی کریم ﷺ کی اتباع کی وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یعنی اللہ کی طرف سے، اور وہ (شاہد)(1) نبی کریم ﷺ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں اور کلام اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ کی طرف راجع ہے یعنی کیا وہ شخص جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان ہو، قرآن کی طرح کا معجزہ ہو، اس کے ساتھ جبریل کی طرح کا گواہ ہو۔ جس طرح کہ آئے گا۔ اور گزشتہ کتب اس کو اس کی خوشخبری سنا چکی ہوں، تبلیغ کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو سکتا ہے؟ اور وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اور رَّبِّهٖ کی ہ ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ کے بارے میں عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ وہ جبریل ہیں۔ یہی مجاہد اور نخعی کا قول ہے۔ مِّنْهُ کی ہ ضمیر اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہے۔ یعنی بیان اور برہان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ آ گیا ہے، مجاہد نے کہا: شاہد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ ہے جو اس (کتاب) کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور قتادہ نے کہا: شاہد رسول اللہ ﷺ کی زبان ہے۔ حضرت محمد بن علی بن حنفیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو کہا: کیا آپ شاہد ہیں؟ تو انہوں نے کہا: میں پسند کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان ہے۔

ایک قول یہ ہے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ انہوں نے کہا: وہ حضرت علی بن ابی طالب ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: قریش میں سے کوئی آدمی نہیں مگر اس کے بارے میں ایک یا دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ تو کسی آدمی نے آپ کو کہا: آپ کے بارے میں کیا نازل ہوا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ ایک قول یہ ہے شاہد نبی کریم ﷺ کی صورت، آپ کا چہرہ اور آپ کی ہیئت و صورت ہے، کیوں کہ جس شخص کو عقل و فضل حاصل ہو وہ نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھے تو وہ جان لے گا کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اس صورت میں مِّنْهُ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہوگی ابن زید اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق۔

ایک قول یہ ہے: شاہد قرآن ہے اپنی نظم، اپنی بلاغت اور ایک لفظ کے کثیر معانی میں۔ حسین بن فضل نے یوں کہا ہے۔ مِّنْهُ کی ضمیر (اس صورت میں) قرآن پاک کے لیے ہوگی۔ فراء نے کہا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ سے مراد انجیل ہے اگرچہ یہ قرآن سے پہلے ہے مگر تصدیق میں قرآن سے پیچھے ہے، (اس صورت میں) مِّنْهُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگی۔ اور ایک قول یہ ہے بَیِّنَةٍ اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت ہے جو دلوں کو روشن کرتی ہے اور شاہد جو اس کے پیچھے آتا ہے وہ وہ عقل ہے جو اس کے دماغ میں ترکیب پاتی ہے اور اپنے نور کے ذریعے اس کے سینے کو روشن کرتی ہے۔ وَ مِنْ قَبْلِهٖ یعنی انجیل سے پہلے كِتٰبُ مُوْسٰۤى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا کہ معنی یہ ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 21

کی کتاب اس کے پیچھے آئی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کتاب موسیٰ میں موصوف ہیں۔ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ (الاعراف: 57) وہ اس کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ ابو حاتم نے بعض سے بیان کیا کہ انہوں نے اس کو وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبَ مُوْسٰۤى پڑھا ہے نصب کے ساتھ۔ مہدوی نے کلبی سے اس کو بیان کیا اس کا یَتْلُوْهُ کی ہٗ ضمیر پر عطف ہے اور معنی یہ ہوگا، جبریل علیہ السلام کتاب موسیٰ علیہ السلام کو تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: معنی یہ ہوگا اس سے پہلے جبریل نے کتاب موسیٰ کو موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا۔ وہ بھی درست ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا۔ کتاب مرفوع ہوگی اس بنیاد پر کہ اس کا معنی یہ ہوگا اس سے پہلے کتاب موسیٰ بھی اسی طرح ہے، یعنی جبریل نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تلاوت کیا جس طرح اس نے قرآن کو حضرت محمد ﷺ پر تلاوت کیا۔ اِمَامًا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے وَّ رَحْمَةً معطوف ہے اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ ایمان لاتے ہیں اس بشارت پر جو تورات میں آپ کے متعلق ہے اور ان کے بعد میں آنے والوں نے آپ کا انکار کر دیا، پس یہی ہیں آتش (جہنم) جن کے وعدہ کی جگہ ہے، قشیری نے اس کو بیان کیا ہے۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے لیے ہو۔ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ یعنی جو بھی کفر کرے قرآن کا یا نبی کریم ﷺ کا۔ مِنَ الْاَحْزَابِ یعنی تمام ملتوں میں سے۔، قتادہ سے ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا: الْاَحْزَابِ سے مراد تمام ادیان والے ہیں، کیونکہ ان کے دل اور اعمال مشابہت رکھتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ قریش اور ان کے حلیف ہیں۔ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ یعنی وہ دوزخیوں میں سے ہیں۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے شعر کہا ہے:

أوردتموها حياضَ الموتِ ضاحية فالنارُ موعدُها والموتُ لاقيها

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ یَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ۙ۝ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا۔ یہ لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور کہیں گے گواہ، یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔ خبردار! اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر جو بدنصیب روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور چاہتے ہیں کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں''۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ یعنی ان لوگوں سے زیادہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کسی اور کی طرف منسوب کیا اور یہ گمان کیا کہ وہ اس کا شریک

اور بیٹا ہے۔ اور بتوں کے بارے میں کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے سفارشی ہیں۔ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ۔ یعنی وہ ان کے اعمال پر ان کا محاسبہ کرے گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو یونس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت ہے: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے میرے بارے میں کسی یہودی اور نصرانی نے سنا پھر وہ میری تعلیمات پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا''۔

فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ، شک میں نہ ہو جاؤ۔ مِّنْهُ ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے۔ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ مقاتل نے کہا۔ کلبی نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ کافر کے دوزخ میں ہونے میں شک نہ کرو۔ اِنَّهُ الْحَقُّ، مراد قول حق ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد تمام مکلفین ہیں۔

وَ یَقُوْلُ الْاَشْهَادُ یعنی حفاظت کرنے والے فرشتے مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ سفیان نے کہا: میں نے اعمش سے اشہاد کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے کہا: اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ ضحاک نے کہا: وہ انبیاء و مرسلین ہیں، ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا۝ (النساء) ہے۔ اور ایک قول کے مطابق وہ فرشتے اور انبیاء ہیں اور وہ علماء ہیں جنہوں نے رسالت کی تبلیغ کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ صحیح مسلم میں صفوان بن محرز عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: جہاں تک کفار اور منافقین کا تعلق ہے تو لوگوں کے سامنے ان کے بارے میں یہ صدا لگائی جائے گی کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر کذب و افتراء سے کام لیا ہے۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ یعنی جن لوگوں نے عبادت کو ایسے مقام پر رکھا جو عبادت کے لیے نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان پر اپنا غضب نازل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ، الظّٰلِمِیْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل رفع میں ہو یعنی هم الذين اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب کی ابتدا ہے، یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو ایمان اور اطاعت سے روکتے ہیں وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی اس طریقے سے وہ لوگوں کو گناہ اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ، هُمْ ضمیر کا اعادہ تاکید اً کیا گیا ہے

اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ۘ یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ۝

''یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں تھے زمین میں اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار تھا۔ دوگنا کر دیا جائے گا ان کے لیے عذاب نہ وہ (آواز حق) سن سکتے تھے اور نہ وہ (نور حق) دیکھ سکتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے بچنے والے نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: وہ مجھے اس بات سے عاجز نہیں کر سکتے کہ میں زمین کو حکم دوں کہ وہ ان کو نگل لے۔ وَ مَا كَانَ لَهُمْ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ اولیاء سے مراد مددگار ہیں اور من زائدہ ہے اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی الذی ہے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی: اولئك لم یکونوا معجزین لاهم ولا الذین کانوا لهم من اولیاء من دون الله یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ یعنی ان کے کفر اور ان کی نافرمانیوں سے دوگنا۔ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ، ما اس بنیاد پر محل نصب میں ہے کہ اس کا معنی ہوگا مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (1) یعنی وہ اسے حق کو سننے اور اسے دیکھنے میں استعمال نہیں کرتے۔

اور عرب اس طرح کلام استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً وہ جس طرح جزيته ما فعل کہتے ہیں اسی طرح جزيته بما فعل بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات با کو حذف کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اسے ثابت رکھتے ہیں سیبویہ نے شعر پڑھا ہے:

أمرْتكَ الخيرَ فافعل ما أمِرتَ به فقد تركتكُ ذا مالٍ و ذا نَشَبِ

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما ظرفیہ ہو اور معنی ہو: ان کے لیے ہمیشہ دوگنا فرمائے گا، یعنی ان کے (آواز حق) کو سننے اور (نور حق) کو دیکھنے کی ان کی استطاعت کے وقت، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں جہنم میں ڈالے گا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما نافیہ ہو اور اس کا کوئی محل نہ ہو، کیونکہ کلام اس سے پہلے مکمل ہو چکا ہے۔ اور الْعَذَابُ پر وقف کافی ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں ایسا سننے کی استطاعت نہیں رکھتے جو انہیں نفع دے، اور نہ ہی ایسا دیکھ سکتے ہیں جو ہدایت یافتہ کا دیکھنا ہو۔ فراء نے کہا: وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لوح محفوظ سے خارج کر دیا ہے۔ زجاج نے کہا: ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے آپ سے نہ سن سکتے تھے اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ کلام عرب میں معروف ہے کہ جب کسی کے لیے دوسرے کو دیکھنا ثقل کا باعث ہو تو کہا جاتا ہے فلاں، فلاں کو دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝

''یہی وہ (بدقسمت) لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی ان سے ان کی بہتان تراشی ضائع اور گم ہو گئی۔

قولہ تعالیٰ: لَا جَرَمَ علماء کے اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں، خلیل اور سیبویہ نے کہا: لَا جَرَمَ بمعنی حق ہے۔ ان دونوں کے نزدیک فلا جرم ایک ہی کلمہ ہے، اور ان ان کے نزدیک محل رفع میں ہے۔ یہ فراء اور محمد بن یزید کا قول ہے۔ اور نحاس نے اس کو بیان کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: خلیل سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی لابدّ اور لا محالۃ ہے یہ بھی فراء کا قول ہے۔ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور زجاج نے کہا: یہاں لا نافیہ ہے، اور یہ ان کے اس قول کا رد ہے کہ بت انہیں نفع دیں گے،

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 29

گویا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں نفع نہیں دیں گے، اور جَرَمَ بمعنی کسب ہے، یعنی اس فعل نے ان کے لیے خسارہ کمایا اور کسب کا فعل مضمر ہے اور ان جرم کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: کسب جفاء ك زيد اغضبه عليك شاعر نے کہا:

نَصبنا رأسه فی جِذْعِ نَخْلٍ بما جَرَمَتْ يداه وما اعتدينا(1)

شعر میں بما جرمت کا معنی بما کسبت ہے۔ کسائی نے کہا: لاجرم کا معنی لا صد ولا منع ہے ایک قول کے مطابق معنی لا قطع قاطع ہے کثرت استعمال کی وجہ سے فاعل کو حذف کر دیا گیا اور الجرم سے مراد القطع ہے۔ جرم النحل واجترمه سے مراد صرمه ہے اسی طرح قوم جرم اور جرام اور هذا زمن الجرام والجرام استعمال ہوتا ہے اور جرمت صوف الشاة کا مطلب ہے میں نے بکری کی اون کو کاٹا۔ اور جرمت منه یعنی اخذت منه ہے جیسے جلمت الشئ جلماً یعنی میں نے کاٹا۔ اور اگر آپ اس کی ہڈیوں سے گوشت کو اتار لیں تو جلمت الجزور اجلمها جلماً کہا جاتا ہے اور اخذت الشیء بجلمته لام ساکن بولا جاتا ہے جب آپ اس باری کو لے لیں اور هذه جلمة الجزور لام کی حرکت کے ساتھ کا معنی ہے اس کا سارا گوشت، یہ جوہری کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی کا خیال ہے کہ اس کی چار لغتیں ہیں۔ لا جرم لا عن ذا جرم، لا ان ذا جرم اور کسائی نے کہا، بنی فزارہ کے لوگ کہتے ہیں: لا جرانهم یعنی بغیر میم کے پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس کے بارے میں دو اور لغتیں بیان کی ہیں اس نے کہا: بنو عامر لا ذا جرم کہتے ہیں اور عرب کے کچھ لوگ لا جرم پڑھتے ہیں جیم کے ضمہ کے ساتھ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور عجز و نیاز سے جھک گئے اپنے پروردگار کی طرف۔ یہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے“۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، الَّذِیْنَ، اِنَّ کا اسم ہے اور اٰمَنُوْا صلہ ہے یعنی انہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ صلہ پر عطف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَخْبَتُوْۤا کا معنی ہے وہ جھک گئے۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے اطاعت کی۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے خشوع و خضوع کیا۔ مقاتل نے کہا: انہوں نے اخلاص کا مظاہرہ کیا(2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اخبات سے مراد دل میں موجود خوف کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا خشوع ہے اور اخبات کی اصل استواء ہے، یہ خبت سے مشتق ہے اور اس سے مراد کھلی اور ہموار زمین ہے، لہٰذا اخبات سے مراد خشوع، اطمینان یا مکمل طور پر مسلسل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جھکاؤ ہے۔ اِلٰی رَبِّهِمْ فراء نے کہا: اِلٰی رَبِّهِمْ اور لربهم دونوں ایک ہی ہیں اور اس کا معنی ہوگا انہوں نے اپنے جھکاؤ کا مرکز اپنے رب کو بنایا۔ اُولٰٓئِكَ یہ ان کی خبر ہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰی وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 464 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 465-464

''ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو۔ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال کیا تم (اس مثال میں) غور و فکر نہیں کرتے''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ یہ مبتدا ہے اور كَالْاَعْمٰى اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی کمثل الاعمی ہے۔ نحاس نے کہا: تقدیر عبارت: مثل فریق الکافر کالأعمی والأصم ہے اور مثل فریق المومن کالسمیع والبصیر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ يَسْتَوِيٰنِ اس کو فریقین کی طرف لوٹایا گیا اور وہ دو ہیں۔

اس کا معنی حضرت قتادہ اور دیگر سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: الاعمی والأصم کافر کے لیے مثال ہے اور السَّمِيعِ اور الْبَصِيرِ مومن کے لیے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں، اور کیا بہرا اور سننے والا برابر ہیں۔ مثلاً تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم ان دونوں وصفوں میں غور و فکر نہیں کرتے اور نہیں دیکھتے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾

''اور بیشک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا: اے قوم) میں تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ تم نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ تعالیٰ کے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انبیاء علیہم السلام کے قصص کو ذکر کیا تاکہ آپ کفار کی اذیتوں پر صبر کو لازم پکڑیں اور اللہ تعالیٰ ان کے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی ہو جائے گا۔ انی یعنی حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: انی یعنی میں، کیونکہ ارسال میں قول کا معنی موجود ہے۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے انی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ارسلناہ بانی لکم نذیر مبین۔ (2) انہ نہیں فرمایا کیونکہ غیب سے حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم کو خطاب کی طرف رجوع فرمایا۔ جس طرح وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ فرمایا اور پھر فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ (الاعراف: 145) فرمایا یعنی پہلے غیب اور پھر مخاطب کے صیغے۔

قولہ تعالیٰ: اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بتوں کو چھوڑ دو، ان کی عبادت نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ جو یکتا ہے اس کی اطاعت کرو، اور جس نے انی کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اسے کلام میں جملہ معترضہ بنایا ہے، اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو بھیجا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ یعنی میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آجائے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 162 2۔ ایضاً

بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

''تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا (اے نوح) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل (اور) ظاہر بین ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَقَالَ الْمَلَاُ ابو اسحاق زجاج نے کہا: الْمَلَاُ سے مراد سردار ہیں، یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے ذریعے وہ بھر دیتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا بشر سے مراد آدمی ہے۔ مِّثْلَنَا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مِّثْلَنَا معرفہ کی طرف مضاف ہے اور یہ نکرہ ہے تنوین اس میں مقدر ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

یا رُبَّ مِثْلِكِ فِي النِّسَاءِ غَرِيرَةٍ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا، اراذل، أرذل کی جمع ہے اور أرذل رذل کی جمع ہے(1)۔ جس طرح کلب کی جمع اکلب اور اکلب کی جمع اکالب آتی ہے۔

اور ایک قول کے مطابق: اذل، أرذل کی جمع ہے جس طرح اساود، اسود کی جمع ہے جس کا معنی سانپ ہے اور رذل سے مراد کسی چیز کا گھٹیا حصہ ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی اتباع کرتے ہیں وہ ہم میں سے گھٹیا، حقیر اور رسوا لوگ ہیں۔ زجاج نے کہا: انہوں نے انہیں پیشہ کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ پیشوں کا دیانت میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نحاس نے کہا: اراذل سے مراد وہ فقراء اور وہ لوگ ہیں جن کا کوئی حسب نہیں اور گھٹیا پیشہ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''وہ جولا ہے اور حجام ہیں''۔ اور یہ ان کی طرف سے جہالت تھی کیونکہ انہوں نے اللہ کے نبی پر ایسا عیب لگایا جو ان میں نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر تو دلائل و براہین اور آیات کو لانا لازم ہوتا ہے ان پر ہیئتیں اور صورتیں تبدیل کرنا تو لازم نہیں ہوتا اور انہیں تمام لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی گھٹیا آدمی ایمان لے آئے تو اس وجہ سے انہیں کوئی نقص لاحق نہیں ہوتا، کیونکہ ان پر تو ہر اسلام قبول کرنے والے کے اسلام کو قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اراذل سے یہاں مراد فقراء اور ضعفاء ہیں، جس طرح ہرقل نے ابوسفیان کو کہا تھا کہ لوگوں میں سے اشراف اس (نبی) کی پیروی کرتے ہیں یا ضعفاء؟ تو ابوسفیان نے کہا: ان میں سے ضعفاء (ایمان لائے ہیں) تو ہرقل نے کہا: یہی لوگ انبیاء کے پیروکار ہوتے ہیں(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اشراف پر ریاست و حکومت غالب ہوتی ہے اور ان کا اس سے علیحدگی اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، اور غیر کی اطاعت کرنا ان کے لیے ذلت کا باعث ہوتا ہے، جب کہ فقیر ان موانع سے خالی ہوتا ہے، لہٰذا وہ بات کو قبول کرنے اور اطاعت کرنے میں تیزی کرتا ہے، اور یہ اہل

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 465

2۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 4، صفحہ 1787

دنیا کے اکثر حالات ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا گھٹیاپن کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے کہ گھٹیا لوگ وہ ہیں جو بادشاہوں کے آنے کے وقت لہو ولعب کی اصناف کے ذریعے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اور قاضیوں اور بادشاہوں کے دروازوں پر حاضری کے لیے آتے ہیں۔ ثعلب نے ابن اعرابی سے نقل کرتے ہوئے کہا: گھٹیا لوگوں سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دین کے ذریعے دنیا حاصل کرتا ہے، انہیں کہا گیا کہ پھر گھٹیا ترین کون ہوا؟ تو انہوں نے کہا: وہ آدمی جو اپنے دین کی بربادی کے ذریعے کسی کی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گھٹیاپن کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان سے مراد ایسے لوگ ہیں کہ جو اگر اکھٹے ہو جائیں تو غالب آ جائیں اور اگر جدا جدا ہوں تو پہچانے بھی نہ جائیں۔ حضرت مالک بن انس سے ان کے بارے میں پوچھا گیا کہ گھٹیا لوگ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: جو صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ارذلون سے مراد جولاہے اور حجام ہیں۔ یحییٰ بن اکثم نے کہا: ان سے مراد ایسے غیر عرب لوگ ہیں جو کھالیں رنگ کرتے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب عورت اپنے شوہر کو یا سفلہ کہے اور مرد اسے کہے: اگر میں ان میں سے ہوں تو تجھے طلاق۔ نقاش نے بیان کیا کہ ایک آدمی امام ترمذی کے پاس آیا اس نے کہا: میری بیوی نے مجھے یا سفلہ کہا ہے تو میں نے اسے کہا: اگر میں سفلہ ہوں تو تجھے طلاق، امام ترمذی نے کہا: تیرا پیشہ کون سا ہے؟ اس نے کہا: مچھیرا، تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم سفلہ، اللہ کی قسم سفلہ۔

میں (قرطبی) نے کہا کہ جس طرح حضرت ابن مبارک نے سفیان سے ذکر کیا ہے اس طرح تو اسے طلاق واقع نہیں ہو گی، اسی طرح امام مالک اور ابن اعرابی کے قول کے مطابق بھی اسے کوئی چیز واقع نہیں ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: بَادِيَ الرَّأْيِ اس سے مراد رائے کا ظاہر ہے اور ان کا باطن اس کے خلاف ہے

جب کوئی چیز ظاہر ہو تو اس وقت بدا یبدو کہا جاتا ہے۔ جس طرح کسی نے کہا:

فاليوم حين بَدَوْن للنُّظار

صحرا کو بھی ظاہر ہونے کی وجہ سے بادیۃ کہا جاتا ہے اور بدالی ان أفعل کذا کا مطلب ہوتا ہے کہ میرے لیے پہلی رائے کے علاوہ رائے ظاہر ہوئی ہے۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی رائے میں سے جو کچھ ہمارے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ ہے۔ ہوسکتا ہے بادی الرای، بدأ یبدأ سے مشتق ہو اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہو۔ ابوعمرو نے ہمزہ کو ثابت کرتے ہوئے بادئ الرای پڑھا ہے یعنی پہلی رائے، یعنی وہ لوگ تیری پیروی کرتے ہیں جب وہ پہلی نظر سے تمہیں دیکھتے ہیں، اگر انہوں نے گہری نظر و فکر سے کام لیا ہوتا تو وہ تیری اتباع نہ کرتے، یہاں پھر ہمزہ کے ساتھ اور ہمزہ کے بغیر معنی میں کوئی فرق نہیں اور اس کی نصب فی کے حذف کی وجہ سے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی اس کی اتباع میں اور یہ ان کی طرف سے آپ کی نبوت کا انکار ہے۔ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ یہ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ان کا خطاب ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

’’آپ نے فرمایا: اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کر دی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآنحالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اور اے میری قوم! میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی مال۔ نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور میں (تمہیں خوش کرنے کے لیے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں کہ ہرگز نہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ کچھ بھلائی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کر دوں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے‘‘۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ یعنی یقین پر، یہ ابو عمران جونی کا قول ہے (1)۔ اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ معجزہ پر سورۂ انعام میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ رحمت سے مراد نبوت و رسالت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ (نبوت و رسالت) مخلوق پر رحمت ہے۔

اور ایک قول کے مطابق رحمت سے مراد دلائل کے ساتھ اللہ کی طرف ہدایت دینا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایمان اور اسلام ہے (2)۔ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ یعنی رسالت اور ہدایت تم سے پوشیدہ ہو گئی ہو اور تم اسے نہ سمجھ سکے ہو۔ عمیت عن کذا اور عمی علی کذا کہا جاتا ہے یعنی میں اسے نہ سمجھ سکا۔ اور معنی رحمت کا پوشیدہ ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ قلب ہے کیونکہ رحمت پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے پوشیدہ یا اندھا ہوا جاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کا قول ادخلت فی القلنسوۃ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466-465　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 466

راسی یعنی میں نے ٹوپی میں اپنا سر داخل کیا اور موزا میرے پاؤں میں داخل ہوا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے اسے فعمیت عین کے ضمہ اور میم کی شد کے ساتھ مجہول پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے اوپر پوشیدہ کر دیا۔ ابی کی قراءت بھی اسی طرح ہے۔ فعماھا اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا ایک قول کے مطابق اس دعوت سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ہا ضمیر رحمت کی طرف راجع ہے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ بینتکی طرف راجع ہے، یعنی کیا ہم اس کو قبول کرنے پر تمہیں مجبور کریں اور اس کو تمہارے اوپر لازم کریں؟ یہ استفہام انکار ہے۔ یعنی مجھے اس بات پر قدرت نہیں دی گئی کہ میں تمہیں اس کی معرفت پر مجبور کروں۔ اس قول کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی تردید کرنے کا قصد فرمایا ہے۔ کسائی اور فراء نے اسے اَنُلْزِمْكُمُوھا پہلی میم کے سکون کے ساتھ حکایت کیا ہے اور سیبویہ نے ایسا جائز قرار دیا ہے۔ اس نے شعر پڑھا:

فالیوم أشرت غیرَ مستَحقِبٍ إثْمًا مِنَ اللهِ ولَا وَاغِلِ

نحاس نے کہا: حضرت یونس علیہ السلام کے قول کے مطابق قرآن کے علاوہ انلزمکمھا بھی جائز ہے مضمر کو مظہر کی جگہ رکھتے ہوئے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں انلزمکم ذالك، وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ یعنی تمہارا اسے ناپسند کرتے ہوئے قبول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام استطاعت رکھتے ہوتے تو ضرور اسے اپنی قوم پر لازم کرتے، لیکن وہ اس کے مالک نہ تھے۔

دعوت اور اس پر ایمان لانے پر اجر یعنی ''مالاً'' مال (کا تم سے سوال نہیں کرتا) کہ تم پر بوجھ کا سبب بنے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ یعنی تبلیغ رسالت میں میرا ثواب اللہ کے ذمہ کرم میں ہے۔ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا انہوں نے آپ کو کہا کہ آپ ان گھٹیا لوگوں کو نکال دیں جو آپ پر ایمان لائے، جس طرح قریش نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ آپ غلاموں اور فقیروں کو نکال دیں۔ جس طرح سورۃ الانعام میں اس کا بیان گزر چکا، تو آپ نے ان کو اپنے اس قول کے ساتھ جواب دیا: وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کو عظیم قرار دیتے ہوئے یہ کہا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علی وجہ الاختصام (بطور جھگڑا) یہ کہا۔ یعنی اگر میں ایسا کروں تو وہ اللہ کے ہاں میرے ساتھ جھگڑیں گے پس وہ ان کو ان کے ایمان پر جزا دے گا اور وہ اسے بھی جزا دے گا جس نے ان کو نکال دیا۔

وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ ان کو گھٹیا سمجھنے میں اور ان کے نکال دینے کا مطالبہ کرنے میں میں نے تمہیں جاہل قوم سمجھا (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ فراء نے کہا: یعنی جو اس کے عذاب کو مجھ سے روکے گا۔ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ یعنی ان کے ایمان کی وجہ سے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تا کو ذال میں مدغم کیا گیا۔ اس کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی عاجزی اور

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 466
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 467

تواضع کی خبر دی اور جو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ان کے پاس نہیں اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اور یہ اللہ کا انعام ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اور یہ کہ وہ غیب نہیں جانتے کیونکہ غیب کو وہ نہیں جانتے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ یعنی میں نہیں کہتا کہ لوگوں کے ہاں میرا مقام فرشتوں جیسا ہے اور علماء نے کہا: کلام میں اس بات پر دلالت ہے کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں اطاعت میں ان کے دوام اور قیامت تک ان کی عبادت کے اتصال کی وجہ سے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ سورۃ البقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ یعنی جن کو تمہاری آنکھیں بوجھ سمجھتی ہیں اور حقیر جانتی ہیں اور اصل میں تزدریھم تھا اور میم کو اسم کی طوالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور دال تاء سے بدلی ہوئی ہے کیوں کہ تزدری میں اصل تزتری ہے، مگر ''زا'' کے بعد تا کو دال سے بدل دیا گیا، کیونکہ ''زا'' مجہورہ ہے اور تا مہموسہ پس تا کو اس کے ہم مخرج حرف مجہور کے ساتھ بدل دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: اَزْرَیتُ علیہ جب تو اس کو عیب لگائے اور زَریتُ علیہ (کہا جاتا ہے) جب تو اس کو حقیر خیال کرے۔ فراء نے شعر پڑھا:

یُباعِدُہ الصدیقُ و تَزْدَرِیہِ حَلِیلتُہٗ وَیَنْھَرُہٗ الصَّغِیرُ (1)

دوست اس کو دور کرتا ہے اور اس کی بیوی اسے حقیر سمجھتی ہے اور چھوٹا اس کو جھڑکتا ہے۔ (وجہ استشہاد تزدریہ ہے)

لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا یعنی تمہارا ان کو حقیر سمجھنا ان کے اجروں کو باطل نہیں کرتا یا ان کے ثواب کو کم نہیں کرتا، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ، پس وہ ان کو اس پر جزا دے گا اور اس وجہ سے ان کا مواخذہ فرمائے گا (2)۔ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی اگر میں وہ کہوں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اِذًا، ملغیٰ عن العمل ہے، کیونکہ یہ درمیان کلام میں ہے۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

''وہ (برافروختہ ہو کر) بولے: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور لے آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس اگر چاہے گا اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے۔ اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی، اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ تمہیں گمراہ کر دے، وہ پروردگار ہے تمہارا۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے خود

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 468

2۔ ایضاً

گھڑ لیا ہے اسے؟ آپ فرمایئے: اگر میں نے خود گھڑا اسے تو مجھ پر ہوگا وبال میرے جرم کا۔ اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا یعنی تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور جھگڑے کو طول دیا اور اس میں مبالغہ کیا۔ جدل کلام عرب میں جھگڑے میں مبالغہ کے لیے (استعمال ہوتا) ہے۔ الجدل سے مشتق ہے اور یہ رسی کو مضبوطی سے بنانا (بٹنا) ہے۔ شکرے کو بھی اجدل کہا جاتا ہے اڑنے میں اس کی سختی کی وجہ سے (1)۔ یہ معنی سورۃ الانعام میں اس سے زیادہ واضح طریقے سے گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فَاَكْثَرْتَ جَدَلَنَا پڑھا ہے، نحاس نے اس کو ذکر کیا۔ دین میں جدال کرنا محمود ہے۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے جدال کیا یہاں تک حق غالب ہو جائے پس جس نے اس کو قبول کیا وہ کامیاب اور کامران ہو گیا اور جس نے اس کو رد کیا وہ ناکام اور نامراد ہو گیا اور ناحق جدال کرنا تاکہ باطل کو غلبہ ہو مذموم ہے اور ایسا جدال کرنے والا دنیا و آخرت میں ملامت کیا جاتا ہے۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ یعنی عذاب سے (2)۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی اپنے قول میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ یعنی اگر اس نے تمہاری ہلاکت کا ارادہ کیا تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ اس معجزین کا معنی فائتین ہے۔ ایک قول یہ ہے تم اپنی کثرت کی وجہ سے غالب نہیں ہو، کیونکہ وہ اس وجہ سے تکبر کرتے تھے، انہوں نے زمین کے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا تھا جس طرح کہ بعد میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ یعنی میری تبلیغ اور کوشش تمہارے ایمان میں۔ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ یعنی اس وجہ سے کہ تم اس کو بطور نصیحت قبول نہیں کرتے۔ سورۂ براءۃ میں نصح کا لغوی معنی گزر چکا ہے۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یعنی یہ کہ وہ تمہیں گمراہ کرے، اور یہ معتزلہ قدریہ اور ان کے موافق مذہب رکھنے والے کے مذہب کے بطلان پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی نافرمانی کرنے والا نافرمانی کرے، کفر کرنے والا کفر کرے اور کوئی گمراہ گمراہی کرے اور جو ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ نہیں فرماتا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے ان کی تردید فرما دی کہ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں اور اس کے علاوہ (دیگر سورتوں) میں گزر چکا ہے، اور ان کے شیخ لعین ابلیس نے اپنی گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فبما اغویتنی کے ذریعے کر کے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے ارشاد: اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے تو ان کے لیے کوئی مفر ہی نہیں کہ آپ نے ان کی گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا، کیونکہ وہی ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا ہے جو کچھ منکر اور ظالم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت بڑا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں ہلاک کرے گا، کیونکہ گمراہی ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ طبری نے کہا: اَنْ یُّغْوِیَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 166 2۔ ایضاً

ہلاک کرے گا اپنے عذاب کے ذریعے، طغی سے بیان کیا گیا: أصبح فلان غاویا یعنی فلاں مریض ہو گیا اور أغویتہ سے مراد ہے میں نے اس کو ہلاک کر دیا(1)، اور اسی سے ہے فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ (مریم) هُوَ رَبُّكُمْ پس اسی کی طرف سے گمراہی ہے اور اسی کی طرف سے ہدایت وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ اس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لیتے ہیں، افتری باب افتعال ہے۔ یعنی اس نے قرآن اپنی طرف سے بنالیا ہے(2)، اور جو اس کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق خبر دی ہے (وہ بھی اپنی طرف سے بنالی ہے) مقاتل نے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے لیے محاورہ ہے۔ اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد صرف حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم ہی کا ذکر ہے، پس خطاب انہی کی طرف سے اور ان کے لیے ہے۔ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ یعنی اگر میں وحی اور رسالت کو (اپنی طرف سے) بنالوں۔

فَعَلَيَّ إِجْرَامِي تو میرے جرم کی سزا مجھ پر ہے اور اگر میں اپنی گفتگو میں سچا ہوں تو تم پر میری تکذیب کی سزا ہو گی۔ الاجرام، اجرم کا مصدر ہے اور اس سے مراد گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہے: میرے جرم اور میرے عمل کی جزا مجھ پر ہے اور جرم اور أجرم کا ایک ہی معنی ہے۔ نحاس اور اس کے علاوہ سے ہے انہوں نے کہا:

طَرِيدُ عَشِيرَةٍ ورَهِينُ جُرْمِ بِمَا جَرَمَتْ يَدِي وَ جَنَى لِسَانِي(3)

جس نے أجرامی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ اس جانب گیا ہے کہ یہ جرم کی جمع ہے، نحاس نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرِمُونَ یعنی کفر اور تکذیب میں سے۔

**وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾**

اور وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے اس لیے آپ غمگین نہ ہوں اس سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔ اور بنائیے ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کیجئے مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا وہ ضرور غرق کر دیئے جائیں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ، أَنَّهُ محل رفع میں ہے۔ أُوحِيَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل نصب میں ہو۔ أَنَّهُ اور آمَنَ، يُؤْمِنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوں اور کلام کا مطلب ان کے ایمان سے مایوسی اور ان کے کفر کا دوام چاہنا ہے اور مقصد ان پر وعید کے نزول کو ثابت کرنا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 40
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 46
3۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 167

ضحاک نے کہا: جب (اللہ) نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے ان پر بددعا (1) کی عرض کیا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (نوح) دو آیتیں (تلاوت کیں) اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ ایک قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے آدمی نے اپنے بیٹے کو اپنے کندھے پر اٹھایا۔ بچے نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے باپ سے کہا: مجھے پتھر دو اس نے اس کو پتھر دیا اور اس نے یہ پتھر حضرت نوح علیہ السلام کو مارا تو اس نے آپ کو زخمی کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ۔

فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ یعنی ان کی ہلاکت کی وجہ سے آپ غمگین نہ ہوں یہاں تک کہ آپ غمزدہ نہ ہو جائیں۔ بائسا یعنی غمگین ہونے والا اور البؤس کا معنی ہے الحزن(2)۔ اسی سے شاعر کا قول ہے۔

وکم مِن خلیل أوحمیم رُزِئتہ		فلم أبتئسْ والرُّزءُ فیہ جَلِیلُ(3)

ابتأس الرجل کہا جاتا ہے جب اس کو کوئی ناپسندیدہ خبر پہنچے اور الابتئاس، عاجزی میں غم کو (کہا جاتا) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا یعنی کشتی بناتا کہ آپ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے اس میں سوار ہوں۔ بِاَعْيُنِنَا یعنی ہماری طرف سے نگرانی کے ساتھ اور اس طرح کہ ہم تجھے دیکھیں۔ ربیع بن انس نے کہا: ہماری طرف سے تمہاری حفاظت کے ساتھ ایسے شخص کی حفاظت کی طرح جو تجھے دیکھ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہماری حفاظت کے ساتھ، معنی ایک ہی ہے۔ پس رؤیت کو اعین کے ساتھ تعبیر کیا گیا کیونکہ رؤیت اسی کے ساتھ ہوتی ہے(4)۔ اعین کو جمع ذکر کرنا عظمت کے لیے ہے نہ کہ کثرت کے لیے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ (المرسلات) فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ (الذاریات) اور وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ (الذاریات) (ان تمام میں قادرون، ماہدون اور موسعون کو اظہار عظمت کے لیے جمع ذکر کیا گیا ہے)

اس آیت کریمہ میں اور اس کے علاوہ میں الاعین کا معنی عین کے معنی کی طرف راجع ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ (طٰہٰ) اور یہ سارے کا سارا عبارت ہے ادراک اور احاطہ کرنے سے اور وہ حواس، تشبیہ اور کیفیت سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ایک قول یہ ہے: بِاَعْيُنِنَا کا معنی ہے یعنی ہمارے ان فرشتوں کی نگرانی میں جن کو ہم نے تمہاری حفاظت اور معاونت (5) پر آنکھوں (کی مثل) بنادیا ہے۔ اس کثرت کی بنیاد پر جمع اپنے باب پر ہوگی۔ ایک قول یہ ہے بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے علم کے ساتھ، یہ مقاتل نے کہا ہے۔ ضحاک اور سفیان نے کہا: بِاَعْيُنِنَا یعنی ہمارے حکم کے ساتھ۔ ایک قول ہے ہماری وحی کے ساتھ، ایک قول ہے اس کے بنانے پر ہماری مدد کے ساتھ تمہارے لیے(6)۔ وَ وَحْيِنَا یعنی اس کے بنانے کے لیے جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے مطابق وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ یعنی ان کے لیے مہلت نہ مانگو، میں ان کو غرق کرنے والا ہوں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 469		2۔ ایضاً		3۔ ایضاً
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470-469		5۔ ایضاً		6۔ ایضاً

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

''اور نوح کشتی بنانے لگے اور جب بھی گزرتے ان کے پاس سے ان کی قوم کے سردار (تو) آپ کا مذاق اڑاتے۔ آپ کہتے: اگر تم مذاق اڑاتے ہو ہمارا تو (ایک روز) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو۔ سو تم جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو رسوا کر دے گا اسے اور (کون ہے) اترتا ہے جس پر عذاب ہمیشہ رہنے والا۔ یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم اور ابل پڑا تنور تو ہم نے (نوح کو) فرمایا: سوار کر لو کشتی میں ہر جنس سے نر و مادہ دو اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور (سوار کر لو) جو ایمان لا چکے ہیں اور نہیں ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ مگر تھوڑے لوگ''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ یعنی آپ بنانے لگے۔ زید بن اسلم نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام سو سال درخت لگاتے رہے، ان کو کاٹتے رہے اور خشک کرتے رہے (1)، اور سو سال ان میں کام کرتے رہے (کشتی بناتے رہے) ابن قاسم نے ابن اشرس عن مالک روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: مجھ تک خبر پہنچی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے زمین کو بھر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے میدانوں اور پہاڑوں کو بھر دیا، پس وہ (پہاڑ والے) ان (میدان والوں) کی طرف نہیں اتر سکتے تھے اور نہ یہ (میدان والے) ان (پہاڑ والوں) کی طرف چڑھ سکتے تھے، پس حضرت نوح علیہ السلام سو سال کشتی بنانے کے لیے درخت لگاتے رہے، پھر ان کو جمع کیا سو سال تک خشک کرتے رہے اور آپ کی قوم مذاق اڑاتی رہی، اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے آپ کو یہ (کشتی) بناتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے تھا جو کچھ تھا، عمرو بن حارث سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دمشق کے علاقے میں کشتی بنائی اور اس کی لکڑی لبنان کے پہاڑ سے کاٹی۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو نکالا جو مومنین کے اصلاب اور ارحام میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ، فاصنع الفلك آپ نے عرض کیا: اے رب! میں بڑھئی نہیں ہوں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: ہاں بے شک یہ میری نگرانی میں ہوگا آپ نے کلہاڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ کا ہاتھ صحیح صحیح کام کرنے لگا۔ پس انہوں نے آپ کے پاس سے گزرنا شروع کر دیا اور کہتے: یہ ہے وہ جو گمان کرتا ہے کہ یہ نبی ہے،

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470

(اب) بڑھئی بن گیا ہے۔ پس آپ نے اس (کشتی) کا کام چالیس سال میں کیا۔

ثعلبی اور ابونصر قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے دو سال میں کشتی بنائی۔ ثعلبی نے (اس میں یہ) اضافہ کیا، اور یہ اس وجہ سے کہ آپ کو پتہ نہ تھا کہ کشتی کیسے بنتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ اس کو پرندے کے سینے کی طرح بناؤ، حضرت کعب نے کہا: آپ نے اس کو تیس سال میں بنایا۔ واللہ اعلم

مہدوی نے کہا: حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ ملائکہ آپ کو سکھاتے تھے کہ آپ اس کو کس طرح بنائیں۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں (علماء نے) اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع، چوڑائی پچاس ذراع اور بلندی تیس ذراع تھی (1) اور یہ ساکھو کی لکڑی سے (بنائی گئی) تھی۔ اور اسی طرح کلبی، قتادہ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ذراع تھی اور ذراع کندھے تک ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کشتی کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع ہے۔ ثعلبی نے اس کو کتاب ''العرائس'' میں بیان کیا ہے۔ علی بن زید نے یوسف بن مہران سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (ان کے) حواریوں نے کہا: اگر آپ ہمارے لیے کسی ایسے آدمی کو اٹھائیں جس نے کشتی کو دیکھا ہو تو وہ ہمارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کرے۔ آپ ان کے ساتھ چل پڑے یہاں تک کہ آپ مٹی کے ایک ڈھیر کے پاس رکے۔ اس مٹی میں سے مٹھی بھر لی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ حام بن نوح کی کہنی ہے۔ انہوں نے کہا: آپ نے اپنا عصا اس ریت کے ٹیلے کو مارا اور فرمایا: اللہ کے اذن سے اٹھ، پس وہ اپنے سر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور وہ بوڑھا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا: کیا تو اسی طرح ہلاک ہوا تھا؟ اس نے کہا: نہیں بلکہ میں مرا تو جوانی کی حالت میں تھا لیکن میں نے سمجھا کہ یہ قیامت ہے پس اس وجہ سے بوڑھا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے بارے میں خبر دے۔ اس نے کہا: اس کی لمبائی ایک ہزار دو سو ذراع اور چوڑائی سات سو ذراع تھی اور اس کی تین منزلیں تھیں، ایک منزل میں چوپائے اور وحشی جانور، ایک منزل میں انسان اور ایک منزل میں پرندے تھے (2)۔ انہوں نے باقی حدیث کو ذکر کیا جس طرح کہ اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کلبی نے کہا جو اس کو نقاش نے بیان کیا: اس میں چار ذراع پانی داخل ہوا، اس کے تین دروازے تھے، ایک دروازے میں درندے اور پرندے، ایک دروازے میں وحشی جانور اور چوپائے اور ایک دروازے میں مرد اور عورتیں تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تین منزلیں بنائی ہیں۔ نیچے والی منزل وحشی جانوروں، درندوں اور چوپاؤں کے لیے، درمیانی کھانے، پینے کے لیے اور اوپر والی منزل میں آپ خود سوار ہوئے۔ اور اپنے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کو مردوں اور عورتوں کے درمیان چوڑائی کی صورت میں اٹھایا، پھر بعد میں بیت المقدس میں ان کو دفن کر دیا اور شیطان ان کے ساتھ کشتی کے پچھلے حصے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 470
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 44

میں تھا۔ کہا گیا: سانپ اور بچھو کشتی میں داخل ہونے کے لیے آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں تم دونوں کو سوار نہیں کروں گا، کیونکہ تم دونوں نقصان اور مصیبت کا سبب ہو، تو انہوں نے کہا: ہمیں سوار کر لیجئے، ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں کہ ہم کسی بھی ایسے شخص کو نقصان نہیں دیں گے جو آپ کو یاد کرے گا۔ پس جس نے بھی ان سے نقصان کے خوف کے وقت سلام علی نوح فی العالمین پڑھا تو انہوں نے اسے کوئی نقصان نہ دیا۔ قشیری اور ان کے علاوہ نے اس کو ذکر کیا۔ حافظ ابن عساکر (1) نے اپنی تاریخ میں حضرت ابی امامہ کی حدیث سے مرفوعاً ذکر کیا انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے شام کے وقت صَلَّى اللّٰهُ عَلَى نُوْحٍ وَعَلَى نُوْحٍ السَّلَامُ کہا تو اس رات بچھو اس کو نہیں ڈسے گا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد كُلَّمَا ظرف ہے۔ مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ اخفش اور کسائی نے کہا کہ سخرت به و منه کہا جاتا ہے (یعنی سخر کا صلہ ب اور من دونوں ہو سکتے ہیں) اور ان (کفار) کے مذاق کے بارے میں دو قول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آپ کو خشکی میں کشتی بناتے ہوئے دیکھتے تھے تو آپ کا تمسخر اڑاتے اور استہزا کرتے تھے اور کہتے: اے نوح! تو نبوت کے بعد بڑھئی بن گیا۔ دوسرا۔ جب انہوں نے آپ کو کشتی بناتے ہوئے دیکھا جب کہ اس سے قبل انہوں نے کشتی بنتی نہیں دیکھی تھی تو انہوں نے کہا: اے نوح! تو کیا بنا رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا، تو وہ آپ کی بات سے حیران ہوئے اور آپ کا تمسخر اڑایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: طوفان (نوح) سے پہلے زمین پر کوئی نہر اور دریا نہیں تھا پس اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا، اور دریاؤں کا پانی یہ طوفان کا ہی باقی ماندہ ہے۔ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا یعنی جس نے کشتی بناتے وقت آج ہمارے ساتھ (مذاق) کیا۔ فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ کل غرق کے وقت (ہم تم سے مذاق کریں گے) اور یہاں مذاق سے مراد حقیر سمجھنا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم ہمیں حقیر سمجھو گے تو ہم تمہیں حقیر سمجھیں گے جس طرح تم ہمیں حقیر سمجھتے ہو (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ (یہ) دھمکی (ہے) اور مَنْ، سوف تعلمون کی وجہ سے متصل ہے۔ تَعْلَمُوْنَ یہاں متعدی ہے۔ یعنی فسوف تعلمون الذی یاتیه العذاب، تم جان لو گے اس عذاب کو جو آئے گا، یہ بھی جائز ہے کہ من استفہامیہ ہو، یعنی ہم میں سے کس پر وہ عذاب آتا ہے؟ ایک قول یہ ہے: من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور یاتیه خبر ہے اور یخزیه عذاب کی صفت ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ اہل حجاز میں سے کچھ لوگ سوف تعلمون کہتے ہیں اور انہوں (کسائی) نے کہا کہ جس نے ستعلمون کہا ہے اس نے واؤ اور فا دونوں کو ساقط کر دیا ہے۔ کوفیوں نے سَفَ تعلمون بیان کیا ہے، اور بصری سوائے سوف تفعل اور ستفعل کے (کوئی اور صورت) نہیں جانتے یہ دو لغتیں ہیں ان میں سے ایک دوسری میں سے نہیں۔ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ یعنی (کون ہے) جس پر ثابت ہوتا ہے اور اترتا ہے عَذَابٌ مُّقِيْمٌ یعنی ہمیشہ رہنے والا مراد آخرت کا عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ علماء (کا) تنور کے بارے میں اختلاف ہے (اس کے بارے میں) سات اقوال ہیں۔

1۔ تاریخ مدینہ دمشق لابن العساکر، جلد 62، صفحہ 256
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 471

پہلا: کہ یہ زمین کی اوپر والی سطح ہے(1)، عرب زمین کی اوپر والی سطح کو تنور کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، زہری اور ابن عیینہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ آپ (حضرت نوح علیہ السلام) کو کہا گیا: جب آپ زمین کی سطح پر پانی دیکھیں تو آپ اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ سوار ہو جائیں۔

دوسرا: یہ وہ روٹی والا تنور ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے یہ تنور پتھر سے (بنا) ہوتا تھا اور یہ حضرت حواء کا تھا یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہو گیا آپ کو کہا گیا: جب آپ پانی کو تنور سے ابلتا ہوا دیکھیں تو آپ اور آپ کے اصحاب (دوست) سوار ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے تنور سے پانی کو جاری فرمایا، پس آپ کی بیوی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا: اے نوح علیہ السلام! پانی تنور سے ابل پڑا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میرے رب کا وعدہ آ گیا جو کہ سچا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے، مجاہد اور عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بیان کیا ہے۔

تیسرا: یہ کشتی میں پانی جمع ہونے کی جگہ تھی، حسن رضی اللہ عنہ سے بھی (یہی منقول ہے)۔

چوتھا: یہ فجر کا طلوع ہونا اور صبح کی روشنی ہے، ان (عربوں) کے اس قول سے نور الفجر تنویرا یعنی فجر روشن ہو گئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا ہے۔

پانچواں: یہ کوفہ کی مسجد ہے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے یہ مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تنور کی سمت کوفہ میں تھی، انہوں نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے کوفہ کی مسجد کے درمیان میں کشتی بنائی اور تنور باب کندہ سے متصل اندر دائیں جانب تھا اور اس سے پانی کا نکلنا حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ان کی قوم کی ہلاکت کی نشانی اور دلیل تھی۔ شاعر نے کہا جو کہ امیہ ہے:

فار تنورُهم جاش بماءٍ صار فوق الجبالِ حتّٰى علاها(2)

ان کا تنور ابل پڑا اور پانی کے ذریعے جوش میں آ گیا۔ تو آپ (حضرت نوح علیہ السلام) پہاڑوں کے اوپر ہو گئے یہاں تک کہ آپ ان پر چڑھ گئے۔

چھٹا: یہ زمین کی بلندی ہے اور زمین میں سے بلند مقامات (کو تنور کہا جاتا ہے) یہ قتادہ کا قول ہے۔

ساتواں: یہ وہ چشمہ ہے جو ''عین الوردة'' کے جزیرہ میں ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ حضرت آدم علیہ السلام کا (تنور) چشمہ تھا اور یہ شام کے ایک مقام پر تھا جس کو ''عین الوردة'' کہا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کا تنور ہند میں ابل پڑا(3)۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں کوئی تناقض نہیں، کیونکہ اللہ نے ہمیں خبر دی ہے کہ پانی آسمان اور زمین (دونوں) سے آیا (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ (القمر) پس ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے موسلا دھار بارش سے۔ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (القمر: 12) اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔ پس یہ سارے اقوال اس بات کو جامع ہیں کہ یہ (تنور کا ابلنا عذاب کی) علامت تھا۔ فوران سے مراد ابلنا، جوش کھانا

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 171 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472 3۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 343

ہے، تنور عجمی نام ہے جس کو عربوں نے عربی بنالیا ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے، کیونکہ اس کی بنا کی اصل تنن ہے اور کلام عرب میں راسے پہلے نون نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے فار التنور کا معنی عذاب کے آجانے کے لیے بطور تمثیل ہے جس طرح عربوں کا قول حمی الوطیس (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب جنگ سخت ہو جائے۔ الوطیس سے مراد التنور ہے، کہا جاتا ہے: فارت قدر القوم (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب ان کی جنگ سخت ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

ترکتم قِدْرَکم لاشئ فیها وقِدْرُ القوم حامیةٌ تَفُورُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی مذکر اور مونث، (مرد اور عورت) طوفان کے بعد نسل کی اصل کو باقی رکھنے کے لیے۔ حفص نے من کلٍ زوجین اثنین پڑھا ہے۔ کل کی تنوین کے ساتھ یعنی ہر چیز میں سے جوڑا جوڑا۔ دونوں قراءتیں ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتی ہیں (یعنی) ایک چیز جس کے ساتھ دوسری ایسی چیز ہو جس سے وہ مستغنی نہ ہو ایسی دو چیزوں کے بارے میں "هما زوجان" کہا جاتا ہے۔ جس میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی سے مستغنی نہ ہو پس ان دونوں میں سے ہر ایک کو زوج کہتے ہیں، کہا جاتا ہے له زوجا نعل جب اس کے پاس دو جوتے ہوں، اور اسی طرح (کہا جاتا ہے) "عنده زوجا حمام" اس کے پاس دو حمام ہیں اور علیه زوجا قیود اس پر دو قیود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ۝ (النجم) اس نے جوڑا یعنی مذکر اور مونث کو پیدا فرمایا۔

عورت کو کہا جاتا ہے: یہ مرد کا زوج ہے جب کہ مرد کو کہا جاتا ہے: یہ اس (عورت) کا زوج ہے۔ اور بعض اوقات دو کے بارے میں کہا جاتا ہے: هما زوج یعنی وہ دونوں زوج ہیں اور بعض اوقات زوجین بمعنی ضربین اور صنفین ہوتا ہے اور ہر قسم کو زوج کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ (الحج) یعنی ہر رنگ اور صنف میں سے۔ اعشیٰ نے کہا:

وکل زوج من الدِّیباجِ یَلبَسه أبو قُدامة محبوٌّ بذاك مَعاً

اس نے ہر قسم اور رنگ مراد لیا، مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ، احْمِلْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اثْنَيْنِ (اس کی) تاکید ہے۔ وَ اَهْلَكَ یعنی اور آپ اپنے گھر والوں کو سوار کریں۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ، مَنْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ان میں سے یعنی ہلاکت کا، اور وہ آپ کا بیٹا کنعان اور آپ کی بیوی واعلة ہے جو دونوں کافر تھے۔ وَ مَنْ اٰمَنَ۔ ضحاک اور ابن جریج نے کہا: یعنی تو سوار کر اس کو جو مجھ پر ایمان لایا یعنی جس نے آپ کی تصدیق کی۔ پس منا، أحمل کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے اسی انسان ایمان لائے (1)۔ ان میں سے تین آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث تھے اور تین ان کی بیویاں تھیں، جب وہ کشتی سے نکلے تو انہوں نے ایک گاؤں بنایا، وہ آج بھی موصل کے نواح میں "قریۃ الثمانین" اسی اشخاص کا گاؤں کہلاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کشتی میں آٹھ آدمی تھے، حضرت نوح علیہ السلام آپ کی بیوی۔ سزا یافتہ بیوی کے علاوہ، آپ کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں۔ یہ قتادہ، حکم بن عتیبہ، ابن جریج

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 472

اور محمد بن کعب کا قول ہے: حام نے کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کر لیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کے نطفے کو تبدیل کر دے تو اس نے سیاہ رنگ والے کو جنم دیا(1)۔

عطا نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے حام کے خلاف دعا کی کہ اس کی اولاد کے بال ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھیں اور یہ کہ وہ جہاں ہوں اس کی اولاد سام اور یافث کی اولاد کی غلام ہو کر رہے۔ اعمش نے کہا: وہ سات تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، تین ان کے بیٹوں کی بیویاں اور تین بیٹے، انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کو ساقط کر دیا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: ان کی عورتوں کے علاوہ وہ دس تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، آپ کے بیٹے سام، حام اور یافث چھ آدمی ان لوگوں میں سے جو آپ پر ایمان لائے تھے اور ان سب کی بیویاں اور قَلِيْلٌ، اٰمَنَ (کا فاعل ہونے) کی وجہ سے مرفوع ہے۔ استثناء کی وجہ سے اس کو نصب دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے پہلے کلام مکمل نہیں ہوتا، مگر یہ کہ "الا" اور "ما" کے دخول میں فائدہ ہے کیونکہ آپ کہیں آپ کے ساتھ فلاں فلاں ایمان لایا تو ممکن ہے ان کے علاوہ بھی ایمان لائے ہوں اور جب آپ "الا" اور "ما" لگاتے ہیں تو جو "الا" کے بعد ہیں وہ ثابت ہو جائیں گے اور ان کے علاوہ کی نفی ہو جائے گی۔

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"اور نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں، اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے۔ بے شک میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔ اور وہ چلنے لگی انہیں لے کر ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اور وہ (ان سے) الگ تھا۔ بیٹا سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ اور نہ ملو کافروں کے ساتھ۔ بیٹے نے کہا: (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں پناہ لے لوں گا کسی پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے۔ آپ نے کہا: (بیٹا!) آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مگر جس پر وہ رحم کرے اور (اسی اثنا میں) حائل ہو گئی ان کے درمیان موج پس ہو گیا وہ ڈوبنے والوں سے اور حکم دیا گیا: اے زمین! نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان! تھم جا۔ اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا اور ٹھہر گئی کشتی جودی (پہاڑ) پر اور کہا گیا: ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لیے"۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 473

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا سوار ہونے کا حکم ہے۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کو ہو۔ رکوب کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی پشت پر بلند ہونا۔ کہا جاتا ہے: رکبه الدین دین اس پر سوار ہوا۔ اور کلام میں حذف ہے یعنی ارکبوا الماء فی السفینة کشتی میں پانی پر سوار ہو جاؤ۔ ایک قول یہ ہے (اس کا) معنی ''ارکبوها'' ہے یعنی اس پر سوار ہو جا۔ اور فی تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (یوسف) (لِلرُّءْيَا میں لام تبیین کے لیے ہے) اور فی کا فائدہ یہ ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ کشتی کے پیٹ میں (اندر) ہو جائیں نہ کہ اس کی پشت پر۔ عکرمہ نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی دس محرم کو جودی (پہاڑ) پر رکی۔ تو یہ چھ ماہ ہیں، یہ قول قتادہ نے کیا اور اس نے (اس بات کا) اضافہ کیا اور وہ یوم عاشورہ ہے۔ پس آپ (نوح) نے اپنے ساتھیوں کو کہا: جو روزہ دار ہے وہ اپنا روزہ پورا کرے اور جو روزہ دار نہیں وہ روزہ رکھے (1)۔ طبری نے اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام رجب کی یکم کو کشتی میں سوار ہوئے اور پورا مہینہ روزہ رکھا کشتی یوم عاشورہ تک ان کو لے کر چلی اور اس (یوم عاشورہ) (2) میں جودی (پہاڑ) پر رکی، تو حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے اس دن کا روزہ رکھا۔

طبری نے ابن اسحاق سے جو ذکر کیا ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ پانی پر ایک سال تک مقیم رہے، کشتی بیت اللہ کے پاس سے گزری تو اس نے اس کے سات چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس (بیت اللہ) کو غرق نہ ہونے دیا۔ پھر کشتی یمن کی طرف گئی اور جودی (پہاڑ) کی طرف واپس ہوئی پس اس پر ٹھہر گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اہل حرمین اور اہل بصرہ نے ان دونوں کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا سوائے اس آدمی کے جو جدا ہو گیا، اس معنی پر کہ اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہوتا ہے۔ پس مَجْرٖىهَا اور مُرْسٰىهَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو (اس صورت میں) تقدیر عبارت ہوگی: اللہ کے نام سے اس کے چلنے کا وقت ہے۔ پھر وقت کو حذف کر دیا گیا اور مَجْرٖىهَا کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے ''بسم الله مجريها'' میم کے فتحہ کے ساتھ اور مرساها میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یحییٰ بن عیسیٰ نے اعمش عن یحییٰ بن وثاب بسم الله مجراها و مرساها دونوں میں میم کے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس بنیاد پر کہ یہ مصدر ہے جرت تجری جریا و مجری اور رست رسوا و مَرْسیً سے جب وہ لنگر انداز ہو جائے۔ مجاہد، سلمان بن جندب، عاصم جحدری اور ابو رجاء نے ''بسم الله مجريها و مرسيها'' پڑھا ہے اللہ عزوجل کی صفت کے طور پر محل جر میں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا مضمر ہونے کی بنیاد پر یعنی هو مجريها و مرسيها حال ہونے کی وجہ سے بھی نصب جائز ہے۔ ضحاک نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام جب بسم الله مجراها کہتے تو وہ چل پڑتی اور جب بسم الله مرساها کہتے تو وہ رک جاتی۔ مروان بن سالم نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے حضرت حسین بن علی سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 473
2۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 58-57

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے لیے غرق سے امان ہے جب وہ کشتی پر سوار ہوں (اور یہ پڑھیں) اللہ کے نام سے جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے(1)۔ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ (الزمر) بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ (ہود) اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے۔

اس آیت میں ہر کام کی ابتداء کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ کے ذکر پر دلیل ہے، جیسا کہ ہم (قرطبی) نے اس کو بِسْمِ اللّٰهِ میں بیان کر دیا۔ والحمدللہ۔

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی کشتی والوں کو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب گوبر اور گندگی زیادہ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ ہاتھی کی دم کو ہاتھ سے ٹٹولو۔ تو اس سے خنزیر اور خنزیرہ گرے تو وہ دونوں گوبر کی طرف آئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اگر میں اس خنزیر کی دم ٹٹولوں: پس آپ نے ایسا کیا تو اس سے چوہا اور چوہیا نکلے جب وہ دونوں گرے تو کشتی اور اس کی رسی کی طرف آئے۔ اس (چوہیا) نے اس کو کاٹا اور اس نے سامان اور زادراہ کو کاٹا یہاں تک کہ ان (کشتی والوں) کو کشتی کی رسیوں کے بارے میں خطرہ لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ شیر کی پیشانی پر ہاتھ پھیرو تو آپ نے اس کو ہاتھ پھیرا، تو اس سے دو بلیاں نکلیں انہوں نے چوہیا کو کھالیا۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے شیر کو کشتی میں سوار کیا تو عرض کیا: اے رب! میں اس کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں عنقریب اس کو مشغول کر دوں گا۔ تو اس کو بخار نے آلیا تو وہ سارا زمانہ (ہمیشہ) بخار زدہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بہائم میں سے سب سے پہلے جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے سوار کیا وہ بلغ ہے جب کہ جس کو سب سے آخر میں سوار کیا وہ گدھا ہے۔ انہوں نے کہا: شیطان اس (گدھے) کی دم سے لٹک گیا۔ اور اس (گدھے) کی اگلی ٹانگیں کشتی میں داخل ہو چکی تھیں جب کہ پچھلی ٹانگیں باہر تھیں، تو گدھا اچھلنے لگا اور داخل نہ ہو سکا، حضرت نوح علیہ السلام نے بلند آواز سے کہا: داخل ہو، تیرے لیے ہلاکت ہو، تو وہ اچھلنے لگا، آپ نے فرمایا: داخل ہو تیرے لیے ہلاکت ہو، اگرچہ تیرے ساتھ شیطان ہی کیوں نہ ہو، یہ کلمہ غلطی سے آپ کی زبان پر جاری ہوگیا۔ (گدھا) داخل ہوا اور شیطان جھپٹا اور داخل ہوگیا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی میں گانے گاتے ہوئے دیکھا تو اس کو کہا: اے لعنتی! تجھے میرے گھر میں کس نے داخل کر دیا؟ اس نے کہا: آپ نے مجھے اجازت دی اس نے (واقعہ) آپ کے سامنے ذکر کیا، آپ نے اس کو فرمایا: اٹھ نکل جا۔ اس نے کہا: آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ اٹھائیں۔ پس ان کے گمان کے مطابق وہ کشتی کی پشت پر تھا۔

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 220

حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پتھر کے دو چمک دار نگینے تھے۔ ایک سورج کی جگہ اور دوسرا چاند کی جگہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے ایک دن کی سفیدی کی طرح سفید تھا اور دوسرا رات کی سیاہی کی طرح سیاہ تھا۔ آپ ان کے ذریعے نماز کے اوقات کو پہچانتے تھے۔ جب شام ہوتی اس کی سیاہی دوسرے کی سفیدی پر غالب آجاتی اور جب وہ صبح کرتے تو اس کی سفیدی دوسرے کی سیاہی پر غالب آجاتی اوقات کے حساب سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ، مَوْجٍ، موجة کی جمع، اس سے مراد وہ (لہریں ہیں) جو ہوا کی شدت کے وقت زیادہ پانی سے اٹھتی ہیں۔ کاف تشبیہ کے لیے ہے۔ یہ موج کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ تفسیر میں آیا ہے کہ پانی ہر چیز سے پندرہ ذراع تجاوز کر گیا۔ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ ایک قول ہے: وہ کافر تھا اور اس کا نام کنعان تھا، ایک قول ہے: یام۔ سیبویہ کے قول کے مطابق وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ لفظوں میں ابنه سے واؤ کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے اور اس نے شعر پڑھا:

لَهُ زَجَلٌ كَأَنَّهُ صوتُ حادٍ

اور جہاں تک وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ کا تعلق ہے تو یہ قراءت شاذہ ہے یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ ابو حاتم نے گمان کیا کہ یہ جائز ہے اس بنیاد پر کہ اس سے ان کی مراد ابنها ہے۔ الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح آپ ابنه کہتے ہیں۔ پس آپ واؤ کو حذف کر دیتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اور یہ جو ابو حاتم نے کہا ہے یہ سیبویہ کے مذہب کے مطابق درست نہیں کیونکہ الف خفیف ہے اس کو حذف کرنا جائز نہیں جب کہ واؤ ثقیل ہے اس کا حذف کرنا جائز ہے۔ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ یعنی اپنے باپ کے دین سے۔ ایک قول ہے: کشتی سے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پتہ نہ تھا کہ ان کا بیٹا کافر ہے جب کہ ان کا گمان تھا کہ وہ مومن ہے، اسی وجہ سے آپ نے اسے فرمایا: وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ اس کا بیان آئے گا۔ یہ ندا قوم کو غرق ہونے کے یقین اور ناامیدی کی صورت سے پہلے تھی، بلکہ یہ تنور کے پھوٹنے اور حضرت نوح علیہ السلام کے لیے علامت کے ظاہر ہونے کے آغاز میں تھی۔ عاصم نے يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اس کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا بنی کی اصل یہ ہے کہ یہ تین یا کے ساتھ ہو۔ یا تصغیر، یا فعل اور یا اضافت۔ یا تصغیر کو فعل کے لام کلمہ میں مدغم کر دیا گیا، یا اضافت کی وجہ سے فعل کے لام کلمہ کو کسرہ دیا گیا اور یا اضافت کو تنوین کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا، یا اس کے اور را کے ساکن ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ یہ یا کی کسرہ کے قراءت کی اصل ہے اور یہی (اس جگہ پر) فتح کی قراءت کی اصل بھی ہے، کیونکہ یا اضافت کو الف کے خفیف ہونے کی وجہ سے الف کے ساتھ بدل دیا گیا پھر الف کے حذف ہونے والے حرف کے عوض میں آنے کے سبب یا الف اور را کے ساکن ہونے کے سبب حذف کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: جہاں تک عاصم کی قراءت کا تعلق ہے تو یہ مشکل ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس سے مراد یا بنیاہ ہے پھر الف اور ہا کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ ان کا نقطۂ نظر اس کے عدم جواز کا تھا، کیونکہ الف خفیف ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: مجھے معلوم نہیں کہ نحویوں میں سے سوائے ابو اسحاق کے کسی نے اس کلام کو جائز

قرار دیا ہو۔ پس اس نے یہ گمان کیا ہے کہ فتحہ دو جہتوں سے ہے اور کسرہ بھی دو جہتوں سے ہے۔ پس فتحہ اس صورت میں (ہوگا) کہ وہ یا کو الف سے بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا: یا ویلتا جس طرح کہ شاعر نے کہا:

فیاعجبًا من رَحْلِها المتحمَّلِ

پس وہ یا بنیتا مراد لیتے ہی پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا، جس طرح آپ کہتے ہیں: جاء عبداللہ تثنیہ کے بارے میں۔

اور دوسری جہت یہ ہے کہ الف کو حذف کر دیا جائے کیونکہ نداء مقام حذف ہوتا ہے۔ اور کسرہ اس بنیاد پر ہوگا کہ ندا کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا جائے اور دوسری جہت یہ ہے کہ اس کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ سَاٰوِیۡۤ یعنی میں لوٹ جاؤں گا اور مل جاؤں گا۔ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ یعنی وہ مجھے بچا لے گا۔ مِنَ الۡمَآءِ پس میں غرق نہیں ہوں گا۔ قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ یعنی کوئی بچانے والا نہیں، پس یہ دن وہ ہے جس میں کفار پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ عاصم منصوب ہوگا۔

یہ بھی جائز ہے کہ ''لا عاصم الیوم میں لا بمعنی لیس'' ہو۔ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ یہ محل نصب میں ہے پہلے سے استثنا ہے، یعنی لیکن اللہ تعالیٰ جس پر رحم فرمائے پس وہ اس کو بچا لے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اس بنیاد پر کہ عاصم بمعنی معصوم ہو، جس طرح ماء دافق میں دافق بمعنی مدفوق ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہوگی، شاعر نے کہا:

بطئُ القیامِ رخیمُ الکلامِ أمسَی فؤادِی به فَاتِنَا

اس میں فاتن بمعنی مفتون ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

دَعِ المکارِمَ لا تَنۡهَضۡ لبغیتها واقعدۡ فإنَّك أنتَ الطاعمُ الکاسی

یعنی ''المطعوم المکسو''۔ نحاس نے کہا: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ من محل رفع میں ہے، معنی ہوگا۔ آج اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے رحم فرمانے والے کے یعنی سوائے اللہ کے، یہ طبری کا اختیار کردہ (موقف) ہے (1)۔ اور یہ عمدہ ہے اس اعتبار سے کہ آپ کو نہ تو عاصم بمعنی معصوم کرنا پڑے گا (2) کہ آپ اس کو اس کے باب سے ہی خارج کر دیں اور نہ ہی الا بمعنی لکن کرنا پڑے گا۔

وَ حَالَ بَیۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان (3)۔ فَکَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ کہا گیا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار تھا تو اس نے اپنی شخصیت پر غرور کیا اور اس کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو گیا، جب اس نے دیکھا کہ پانی آ گیا ہے تو اس نے کہا: اے میرے باپ! تنور ابل پڑا، تو اس کے باپ نے اسے کہا: اے بیٹے! سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ، وہ واپس نہ لوٹا تھا کہ ایک بڑی موج آئی تو اس نے اس کو اور اس کے گھوڑے کو نگل لیا اور وہ اس کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان حائل ہو گئی پس وہ غرق ہو گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے لیے شیشے کا ایک ایسا گھر بنایا تھا جس میں پانی (کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 55 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 175 3۔ ایضاً

عذاب) سے اس نے پناہ لینی تھی۔ پس جب تنور ابلا تو وہ اس میں داخل ہو گیا اور اندر سے اس کو تالا لگا دیا اس میں غوطے کھاتا رہا اور پیشاب کرتا رہا یہاں تک کہ اسی کے سبب غرق ہو گیا۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ پہاڑ جس کی اس نے پناہ لی تھی وہ طور سیناء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ یہ مجاز ہے کیونکہ وہ (زمین، آسمان) موات (جن میں زندگی نہ ہو) ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ان میں وہ قوت رکھ دی گئی ہے جس کے ذریعے امتیاز ہو سکتا ہے اور جس نے کہا کہ یہ مجاز ہے اس نے کہا ہے: اگر عرب و عجم کے کلام کو تلاش کر کے اس میں غور و فکر کیا جائے تو اس آیت کا حسن نظم اس کی بلاغت اور اس میں موجود معانی کے حوالے سے کوئی کلام اس کا مثل نہیں ہے۔

حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ زمین کو سال یا دو سال میں بارش سے خالی نہیں چھوڑتا اور اس نے آسمان سے کبھی بھی پانی نازل نہیں فرمایا مگر ایک ایسے فرشتے کی حفاظت میں جو اس کا ذمہ دار ہوتا ہے سوائے طوفان (نوح) کے پانی کے کہ یہ آسمان سے بغیر کسی فرشتے کی حفاظت کے نازل ہوا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ (الحاقہ) کشتی ان کو لے کر چلی یہاں تک کہ (کفار کی ہلاکت اور مومنین کی نجات) کا امر پورا ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے موسلا دھار بارش کے پانی کو رکنے اور زمین کو پانی نگلنے کا کلمہ ارشاد فرمایا، کہا جاتا ہے: بلع الماء يبلعه، منع يمنع باب سے اور بلع، يبلع، حمد، يحمد باب سے یہ دو لغتیں ہیں جو کسائی اور فراء نے بیان کیا۔ اور ایسی جگہ جو پانی پیتی ہو اس کو بالوعۃ کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: دونوں پانی جو زمین میں تھا اور جو آسمان سے نازل ہوا، جمع ہو گئے اس امر کی وجہ سے جو مقدر کر دیا گیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اترنے والے پانی کو تھمنے کا حکم دیا، اس میں سے زمین نے ایک قطرہ بھی جذب نہ کیا اور زمین کو صرف وہی پانی نگلنے کا حکم دیا جو اس سے نکلا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی جدا جدا فرمائے پس جو زمین کا پانی تھا تو اس کو حکم دیا کہ تو اس کو نگل جا اور آسمان کا پانی دریا (سمندر) بن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ غِيْضَ الْمَآءُ یعنی وہ کم ہو گیا، کہا جاتا ہے: غاض الشئ وغضته أنا جس طرح کہا جاتا ہے: نقص بنفسه و نقصه غيره کہ وہ خود بخود کم ہو گیا اور کسی اور نے اسے کم کر دیا۔ اس کو غیض غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی صحیح ہے۔ وقضی الأمر یعنی ان نے مضبوطی سے کیا اور اس سے فارغ ہو گیا۔ یعنی اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو مکمل طور پر اور مضبوطی سے ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عورتوں کے رحموں کو غرق سے چالیس سال پہلے بانجھ کر دیا تھا، پس جو ہلاک ہوئے ان میں کوئی چھوٹا نہ تھا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے طوفان کے ذریعے بچوں کو بھی ہلاک کیا جس طرح پرندے اور درندے ہلاک ہوئے، اور یہ غرق بچوں، جانوروں اور پرندوں کے لیے بطور سزا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنی طبعی موت کے سبب مرے۔ حکایت بیان کی گئی ہے کہ جب گلیوں میں پانی زیادہ ہو گیا تو ایک بچے کی ماں بچے کے بارے میں ڈر گئی، وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی، وہ اس کو لے کر پہاڑ کی طرف نکلی حتی کہ پہاڑ کے تیسرے حصے تک پہنچ گئی جب پانی وہاں پہنچا، وہ نکلی حتی کہ اس کے دو تہائی تک پہنچ گئی، جب پانی وہاں پہنچا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی، جب پانی اس کی گردن تک

پہنچا تو اس نے اپنے بچے کو ہاتھ پر اوپر اٹھالیا حتیٰ کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو اس بچے کی ماں پر رحم فرماتا(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ان کے لیے ہلاکت ہے۔ جودی، موصل کے قریب ایک پہاڑ ہے، اس پر وہ (کشتی) محرم کی دس یعنی یوم عاشورہ کو رکی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے سب ساتھیوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لوگوں، وحشی جانوروں، پرندوں، چوپاؤں اور ان کے علاوہ نے بھی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: وہ دن جمعہ کا تھا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی طرف وحی فرمائی کہ کشتی ان میں سے کسی ایک پر رکے گی تو انہوں نے تکبر کیا، اور جودی باقی بچ گیا جس نے تکبر نہ کیا اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتے ہوئے تو کشتی اس پر رکی اور اسی پر اس کی لکڑیاں باقی رہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اس (کشتی) کی کوئی چیز باقی رہ گئی جس کو اس امت کے ابتدائی لوگوں نے پایا ہے''۔ مجاہد نے کہا: پہاڑ بلند ہوئے اور انہوں نے تکبر کیا تا کہ غرق ان کو نہ پہنچ سکے، پس پانی ان سے پندرہ ذراع بلند ہو گیا اور جودی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے خشوع و خضوع اختیار کیا تو وہ غرق نہ ہوا اور کشتی اس پر رک گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ جودی ہر پہاڑ کا نام ہے۔ اسی سے زید بن عمرو بن نفیل کا قول ہے:

سُبحانه ثم سُبحاناً يَعودُلَهُ و قَبْلَنا سَبَّحَ الجُودِيُّ والجَمَدُ(2)

کہا جاتا ہے کہ جودی جنت کے پہاڑوں میں سے ہے اس لیے وہ (کشتی) اس پر رکی، کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے تین آدمیوں کی وجہ سے تین پہاڑوں کو عزت بخشی، جودی کو حضرت نوح علیہ السلام، طور سینا کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حرا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے۔

**مسئلہ:** جب جودی نے تواضع اور خضوع اختیار کیا (تو اللہ تعالیٰ نے) اسے عزت دے دی اور جب اس کے علاوہ (دیگر پہاڑ) بلند ہوئے اور انہوں نے بلندی کو چاہا تو اس نے انہیں ذلت دی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے اپنی مخلوق کے بارے میں، وہ اٹھاتا ہے جو خشوع کرے اور گراتا ہے جو بلندی چاہے۔ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

وإذا تذللتِ الرِّقابُ تَخشُّعًا مِنّا إليكَ فعِزُّها لی ذُلِّها

''اور جب ہم میں سے لوگوں نے ڈرتے ہوئے تیری بارگاہ میں تذلل اختیار کیا تو ان (لوگوں) کی عزت ان کے تذلل میں ہے''۔

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(3) انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا، اس سے سبقت نہ لی جا سکتی تھی، ایک اعرابی اپنی سواری پر آیا تو وہ اس سے سبقت لے گیا تو مسلمانوں کو

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 254
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 474
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، ناقۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 402

اس سے بہت زیادہ رنج ہوا۔ انہوں نے کہا: عضباء پیچھے رہ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے اپنے اوپر یہ لازم کرلیا ہے کہ جس چیز کو دنیا میں سربلند کرتا ہے اس کو (ایک بار) سرنگوں بھی کرتا ہے''۔

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی (1) جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے لی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا اور معافی مانگنے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ کرتا ہے اور جو شخص بھی اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سربلند کرتا ہے''۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (2): ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تم تواضع کرو حتی کہ کوئی شخص دوسرے پر ظلم نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے''۔ اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ**۔ اس میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کا ان کی قوم کے ساتھ واقعہ ذکر کریں گے اور کشتی کا کچھ ذکر کریں گے۔ حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا** (العنکبوت: 14) اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ایک ہزار سال ٹھہرے مگر پچاس سال۔

اور ان میں گناہ گار اور جابر لوگ بہت زیادہ تھے اور انہوں نے بہت زیادہ تکبر کیا، حضرت نوح علیہ السلام ان کو رات، دن مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر دعوت دیتے رہے، آپ بہت زیادہ صبر کرنے والے بردبار تھے، انبیاء میں سے کسی پر اتنی سختیاں نہیں آئیں جتنی کہ حضرت نوح علیہ السلام پر آئیں۔ وہ لوگ آپ کے پاس آتے تو آپ کا گلہ دباتے یہاں تک کہ ادھ موا کر کے چھوڑتے، مجالس میں وہ آپ کو مارتے اور مجالس سے باہر نکال دیتے، آپ ایسا کرنے والے پر بددعا نہ فرماتے بلکہ ان کے لیے دعا کرتے اور کہتے: رب اغفر لقومی فانهم لا یعلمون اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ یہ چیز ان پر کسی قسم کا اضافہ نہ کرتی سوائے ان (حضرت نوح علیہ السلام) سے فرار کے حتیٰ کہ اگر آپ ان میں سے کسی آدمی سے گفتگو کرتے تو وہ اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتا اور اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتا تاکہ وہ آپ کے کلام میں سے کچھ بھی نہ سن سکے۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد (دلالت کرتا) ہے۔ **وَ اِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ** (نوح: 7) اور میں جب بھی انہیں دعوت دیتا ہوں تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں (3)۔

مجاہد اور عبید بن عمیر نے کہا: وہ آپ کو مارتے حتی کہ آپ پر غشی طاری ہوتی جب آپ کو افاقہ ہوتا تو آپ کہتے: اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما پس یہ نہیں جانتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کو مارا جاتا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب فی البر والصلة والادب، استحباب العفو، جلد 2، صفحہ 321

2۔ صحیح مسلم، کتاب فی کتاب الجنة، الصفات التی یعرف بها الدنیا اهل الجنة واهل النار، جلد 2، صفحہ 385

3۔ تاریخ مدینہ دمشق، جلد 62، صفحہ 244

پھر کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا اور آپ کو اپنے گھر میں پھینک دیا جاتا وہ (یہ) خیال کرتے کہ آپ فوت ہو گئے ہیں پھر آپ نکلتے اور ان کو دعوت دیتے، حتی کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ ایک آدمی آپ کے پاس آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا وہ شخص عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھا، اس آدمی نے کہا: اے میرے بیٹے! دیکھ یہ شیخ تمہیں دھوکہ نہ دے، اس (بیٹے نے) کہا: اے باپ! عصا مجھے دیجئے، اس نے اس کو عصا دیا اس (لڑکے) نے عصا لیا پھر کہا: مجھے زمین پر چھوڑ دو اس کے (باپ) نے اسے چھوڑ دیا وہ عصا کے ساتھ آپ کی طرف چلا تو اس نے آپ کو مارا اور آپ کے سر میں موضحہ (جس میں سر کی ہڈی ظاہر ہو جاتی ہے) زخم لگایا اور خون بہنے لگا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اے رب! تو دیکھ رہا ہے جو تیرے بندے میرے ساتھ کرتے ہیں پس اگر تیرے بندوں میں تیرے لیے کوئی بہتری ہے تو تو ان کو ہدایت نصیب فرما اور اگر (ان میں) اس کے علاوہ ہو تو تو مجھے صبر دے یہاں تک کہ تو فیصلہ فرمائے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اس حال میں کہ آپ اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ مردوں کی صلبوں میں اور عورتوں کے رحموں میں کوئی مومن باقی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ یعنی آپ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا آپ نے عرض کی: اے رب! لکڑی کہاں (سے لوں)؟ فرمایا: درخت لگا۔ کہا: بیس سال آپ نے ساکھو کا درخت لگایا، دعوت دینے سے رک گئے اور وہ استہزا سے رک گئے حالانکہ وہ آپ کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، جب درخت نے اپنے رب کے امر کو پالیا تو آپ نے اسے کاٹا اور خشک کیا۔ عرض کیا: اے رب! میں اس گھر کو کیسے بناؤں؟ اللہ نے فرمایا: اس کو تین صورتوں پر بناؤ، اس کا سر مرغ کے سر کی طرح، اس کا سینہ پرندے کے سینہ کی طرح اور اس کی دم مرغ کی دم کی طرح بناؤ۔ اور اس کی منزلیں بناؤ اور ان کے پہلوؤں میں ان منزل کے لیے دروازے رکھو اور آپ نے اس کو میخوں کے ساتھ مضبوط کیا۔ دسر سے مراد لوہے کے کیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا تو اس نے آپ کو کشتی بنانا سکھائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کا گھر دمشق میں تھا آپ نے اپنی کشتی لبنان کی لکڑی سے زمزم، رکن (یمانی) اور مقام (ملتزم) کے درمیان بنائی۔ جب مکمل ہو گئی تو اس میں درندے اور چوپائے پہلے دروازے میں سوار کیے۔ وحشی جانور اور پرندے دوسرے دروازے میں سوار کیے اور ان دونوں کے دروازے بند کر دیئے۔ اور اولاد آدم، چالیس مرد اور چالیس عورتوں کو سب سے اوپر والے دروازے میں سوار کیا اور ان پر دروازہ بند کر دیا اور چھوٹی چیونٹیوں کو ان کے کمزور ہونے کی وجہ سے سب سے اوپر والے دروازے میں اپنے ساتھ سوار کیا تاکہ چوپائے ان کو روند نہ ڈالیں (1)۔

زہری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا پس اس نے درندے، پرندے، وحشی جانور اور چوپاؤں میں ہر جوڑے کو کشتی میں سوار کر دیا۔ جعفر بن محمد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیجا اس نے ان کو جمع کر دیا، پھر جبریل نے جوڑے پر اپنے ہاتھ پھیرے۔ اس کا دایاں ہاتھ مذکر پر اور بایاں مونث پر ہوتا۔ پس ان کو اس نے کشتی میں داخل کر دیا۔ حضرت زید بن ثابت

1۔ تاریخ مدینۃ دمشق، جلد 62، صفحہ 248

نے کہا: ماعزہ (وہ بھیڑ جو بغیر دم اور لاٹ کے ہوتی ہے) کا کشتی میں داخل کرنا حضرت نوح علیہ السلام پر مشکل ہو گیا تو آپ نے اس کی دم میں ہاتھ ڈال کر اس کو دھکیلا، اسی وجہ سے اس کی دم ٹوٹ گئی تو وہ مڑی ہوئی ہو گئی اور اس کا حیا (دبر اور فرج) ظاہر ہو گیا۔ نعجة (لاٹ یا چکی والی بھیڑ) چلی گئی حتی کہ داخل ہو گئی تو آپ نے اس کی دم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا حیا (دبر اور فرج) مستور ہو گیا۔ اسحاق نے کہا: ہمیں ایک اہل علم نے خبر دی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی والوں کو سوار کیا اور اس ہر چیز کا جوڑا جوڑا رکھا تو ہدہد کا بھی جوڑا سوار کیا، ہدہدۃ (مونث) زمین ظاہر ہونے سے پہلے ہی کشتی میں مرگئی۔ ہدہد نے اس کو اٹھالیا، اس کو لے کر دنیا کا چکر لگایا تا کہ اس کے لیے جگہ پالے لیکن اس نے کوئی مٹی وغیرہ نہ پائی، تو اس کے رب نے اس پر رحم فرمایا اس کے لیے اس (نر) کی گدی میں قبر کھود دی تو اس نے اسے اس میں دفن کر لیا، پس ہدہد کی گدی میں اگنے والے بال قبر کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے ہدہد کی گدی ابھری ہوئی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت نوح علیہ السلام (1) نے کشتی میں اپنے ساتھ تمام درخت لادے اور عجوۃ (کا درخت) جنت میں سے کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تھا''۔ صاحب کتاب ''العروس'' وغیرہ نے ذکر کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب چاہا کہ زمین کے بارے میں خبر لانے کے لیے وہ کسی کو بھیجیں تو مرغ نے کہا: میں (لاؤں گا) آپ نے اس کو پکڑا اور اس کے پر پر مہر لگا دی اور اس کو کہا: تو میری مہر کی وجہ سے مختومہ ہے تو کبھی بھی نہیں اڑ سکے گا۔ تجھ سے میری امت نفع اٹھائے گی۔ آپ نے کوے کو بھیجا تو اس نے مردار پالیا تو اس پر بیٹھ گیا اور دیر کر دی تو آپ نے اس پر لعنت کی، اسی وجہ سے حل وحرم میں اس کو قتل کر دیا جاتا ہے اور آپ نے اس کے خلاف خوف کی بددعا کی، اسی وجہ سے یہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ کبوتری کو بھیجا تو اس نے قرار نہ پایا، سیناء کی زمین میں ایک درخت پر بیٹھی اور زیتون کے درخت کا پتہ اٹھالیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ آئی تو آپ جان گئے کہ یہ زمین میں قرار حاصل نہیں کر سکے گی۔ پھر اس کو اس کے بعد بھیجا، یہ اڑی یہاں تک کہ حرم کی وادی میں پہنچ گئی تو کعبہ کے مقامات سے پانی جذب ہو چکا تھا اور اس کی مٹی سرخ تھی، وہ اس کی ٹانگوں میں لگ گئی پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئی اور کہا: میرے لیے آپ کی طرف سے خوشخبری ہے کہ آپ نے مجھے میری گردن میں طوق ہبہ کر دیا اور میری ٹانگ میں خضاب اور میں حرم میں رہوں گی۔ تو آپ نے اس کی گردن اور طوق پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اس کی ٹانگوں میں اس کو سرخی ہبہ کر دیا اور اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے برکت کی دعا کی۔

ثعلبی نے ذکر کیا کہ آپ نے کوے کے تدارج کو بھیجا اور یہ مرغ کی جنس میں سے تھا۔ اس کو کہا: معذرت کرنے سے بچنا، تو اس نے شادابی اور فراخی کو پالیا۔ اور واپس نہ لوٹا اور اپنی اولاد کو قیامت تک آپ کے پاس رہن رکھ دیا۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ

1۔ تاریخ مدینہ دمشق، جلد 62، صفحہ 261

مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ تَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کی: اے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میری اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں پس نہ سوال کیا کرو مجھ سے جس کا تجھے علم نہ ہو میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نہ ہو جانا نادانوں سے۔ عرض کرنے لگے: میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ میں سوال کروں تجھ سے ایسی چیز کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں ہو جاؤں گا زیاں کاروں سے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ یعنی اس نے اس (اللہ) سے دعا کی۔ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ یعنی میرے ان اہل میں سے جن کے غرق سے نجات کا تو نے وعدہ فرمایا ہوا ہے، پس کلام میں حذف ہے۔ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ یعنی سچا۔ ہمارے علماء نے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ اَهْلَكَ کی وجہ سے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کو ترک کر دیا۔ جب ان کے نزدیک وہ انکے اہل سے تھا تو عرض کیا: رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ اس بات پر ان کا قول وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ دلالت کرتا ہے، یعنی تو ان میں سے نہ ہو جا جن سے تو نہیں ہے، کیونکہ وہ آپ کے گمان کے مطابق مومن تھا اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے رب کو اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ کہنے والے نہیں تھے مگر وہ ان کے نزدیک ایسا ہی تھا، کیونکہ یہ تو محال ہے کہ آپ کفار کی ہلاکت کا سوال کریں پھر ان میں سے بعض کی نجات کا بھی سوال کریں، آپ کا بیٹا کفر کو چھپاتا اور ایمان کو ظاہر کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی جو علم غیب میں سے اس کے ساتھ خاص تھی یعنی میں تمہارے بیٹے کی حالت کو جانتا ہوں جو تو نہیں جانتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ منافق تھا اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے لیے دعا مانگنے کو جائز سمجھا۔ اور ان ہی سے روایت ہے: یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا، اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے کہ ونادی نوح ابنها وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے یعنی تو نے ایک قوم کی نجات اور ایک قوم کے غرق کا حکم فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یعنی یہ تیرے ان اہل میں سے نہیں جن کی نجات کا میں نے ان سے وعدہ فرمایا، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ جمہور نے کہا: یہ تیرے دین اور نہ ہی تیری ولایت کا اہل ہے(1)، تو یہ (ترجمہ) مضاف کے حذف کی صورت میں ہوگا (یعنی اهل دینك وولايتك) اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476

دین میں متفق ہونے کا حکم نسب کے حکم کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ حضرت ابن عباس، حضرت عروہ، عکرمہ، یعقوب اور کسائی نے اس کو ''انه عَمِلَ غَيْرَ صالح'' پڑھا ہے۔ یعنی کفر اور تکذیب وغیرہ۔ ابوعبید نے اسی کو اختیار کیا ہے اور باقی لوگوں نے عَمَلٌ پڑھا ہے یعنی تیرا بیٹا غیر صالح عمل والا ہے ابنك ذو عمل غير صالح مضاف کو حذف کر دیا گیا، یہ زجاج اور دیگر کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

تَرْتَعُ مَا رَتَعَتْ حَتّٰى إذا ادَّكَرتْ فَإنّما هِي إقبالٌ و إدبارٌ(1)

یعنی ذات اقبال و ادبار، یہ قول اور جو اس سے قبل ہے ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ انه کی ضمیر سوال کے لیے ہو یعنی بے شک تیرا مجھ سے اس کی نجات کا سوال کرنا عمل غیر صالح ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: عمل غیر صالح کا معنی یہ ہے کہ یہ پیدا آپ کے فراش میں ہوا، حالانکہ آپ کا بیٹا نہیں، اور یہ ناجائز شادی کا تھا، مجاہد کا بھی یہی قول ہے(2)۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! وہ ان کا بیٹا نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ تو انہوں (حسن) نے کہا: آپ (نوح) نے ''منی'' نہیں کہا اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ یہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا کسی اور خاوند سے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت نوح علیہ السلام سے حکایت کیا کہ انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ، وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ اور اہل کتاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ان کا بیٹا تھا، تو حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: کون شخص اہل کتاب سے اپنا دین لیتا ہے، وہ تو جھوٹے ہیں اور انہوں نے پڑھا فخانتاهما (کہ ان دونوں نے خیانت کی)

ابن جریج نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو بلایا اور ان کا گمان یہ تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے اور وہ آپ کے فراش پر پیدا ہوا اور اس معاملے میں ان کی بیوی نے ان کے ساتھ خیانت کی۔ اسی وجہ سے فرمایا: فخانتاهما۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا(3): کسی نبی کی بیوی نے کبھی بھی بغاوت (بدکاری) نہیں کی، وہ آپ کا اصلی بیٹا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر کو کہا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں: اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ کیا وہ آپ کے اہل سے تھا؟ کیا وہ آپ کا صلبی بیٹا تھا؟ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی لمبی تسبیح کی پھر فرمایا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلام فرماتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا ہے، اور تو کہتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا نہیں۔ ہاں وہ ان کا بیٹا تھا، لیکن وہ نیت، عمل اور دین میں مخالف تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قول کرنے والے کی جلالت کی وجہ سے اس باب میں زیادہ صحیح ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یہ ان اقوال میں سے نہیں جن کے ذریعے اس کے ان کا بیٹا ہونے کی نفی کی جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فخانتاهما یعنی دین میں (خیانت کی) نہ کہ فراش میں، اور یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو بتاتی تھی کہ یہ مجنون ہے، اور اس وجہ سے کہ اس نے آپ کو کہا: کیا تیرا رب تیری مدد کرے گا؟ آپ نے اسے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: کب؟ آپ نے فرمایا جب تنور ابل پڑے گا، تو وہ اپنی قوم کو یہ کہتے ہوئے نکل کھڑی ہوئی: اے قوم! اللہ کی قسم یہ مجنون ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 177 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476 3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 62

یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا رب اس تنور کے ابل پڑنے سے اس کی مدد کرے گا۔ پس یہ اس کی خیانت ہے اور دوسری خیانت یہ ہے کہ وہ مہمانوں کے خلاف رہنمائی کرتی تھی جس طرح کہ عنقریب آئے گا اگر اللہ نے چاہا تو۔ واللہ اعلم۔ ایک قول یہ ہے ولد بعض اوقات عمل کو بھی کہتے ہیں جس طرح کہ کسب کو کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تمہاری اولاد تمہارے کسب سے ہے''(1)۔ قشیری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں مخلوق کو ان کی اولادوں کے فساد کے بارے میں تسلی دینا (مقصود) ہے اگرچہ وہ (خود) نیکوکار ہی کیوں نہ ہوں۔ روایت ہے کہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ اوپر سے اترے اور آپ کے پاس ایک حمام تھا جس نے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ راوی نے کہا کہ حضرت مالک کو پتہ چل گیا کہ لوگ اس کو سمجھ گئے ہیں، تو حضرت مالک نے کہا: ادب اللہ کا ادب ہے نہ کہ والدین کا ادب اور بھلائی اللہ کی بھلائی ہے نہ کہ آباء اور امہات کی بھلائی۔

اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ بیٹا اہل اور اہل بیت میں سے ہے لغوی اور شرعی طور پر، پس جس نے اپنے اہل کے لیے وصیت کی تو اس میں اس کا بیٹا بھی داخل ہوگا اور وہ بھی داخل ہوگا جس کو اس کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے ہو، اس حال میں کہ وہ اس کے عیال میں ہو۔ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ** (الصافات) **فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ** (الانبیاء) وہ تمام لوگ جن کو ان کا گھر اپنے اندر لیے ہوئے تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کا اھل فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حسن، مجاہد اور ان کے علاوہ کے قول کے مطابق آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچہ فراش کے لیے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جو کچھ کہا فراش کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبید بن عمیر کو کہتے ہوئے سنا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی وجہ سے فیصلہ فرمایا کہ بچہ فراش کے لیے ہے(2)، اس کو ابوعمر نے کتاب ''التمہید'' میں ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بچہ فراش کے لیے ہے اور زانی کے لیے حجر ہے''۔ حجر سے مراد نا کامی و نامرادی ہے، اور کہا گیا: (اس سے مراد) پتھر سے رجم کرنا ہے۔ عروۃ بن زبیر نے پڑھا۔ ونادی نوح ابنھا اس سے مراد آپ (نوح) کی بیوی کا بیٹا ہے، اور یہ آپ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی گزشتہ قراءت کی تفسیر ہے۔

اور یہ حسن اور مجاہد کے لیے حجت ہے مگر یہ قراءت شاذہ ہے اس کی وجہ سے ہم متفق علیہ قراءت کو ترک نہیں کریں گے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** یعنی میں تجھے اس سوال سے روکتا ہوں اور تم کو ڈراتا ہوں کہ تم نہ ہو جاؤ (جاہلین میں سے) یا (اس بات کو) ناپسند کرتے ہوئے کہ آپ ہو جائیں جاہلین یعنی گناہ گاروں

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، ماجاء ان الولد ان یأخذ من مال والدہ، جلد 1 صفحہ 162

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، الولد للفراش، جلد 1 صفحہ 471

میں سے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا (النور: 17) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ڈراتا ہے اور روکتا ہے۔ کہا گیا: معنی یہ ہے کہ میں تمہیں اس بات سے بلند کردوں گا کہ تو جاہلین میں سے ہو(1)۔

ابن عربی نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ اور نصیحت ہے جس کے ذریعے وہ حضرت نوح علیہ السلام کو جاہلین کے مقام سے اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے ان کو علماء اور عارفین کے مقام پر بلند فرماتا ہے۔ پس حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ اور یہ انبیاء کے ذنوب ہیں۔ تو آپ نے اپنے تذلل اور تواضع کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کیا۔ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ جو سوال کی وجہ سے زیادتی ہو۔ تَرْحَمْنِیْۤ یعنی توبہ کے ذریعے۔ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ یعنی ازروئے اعمال کے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا۔

**قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۴۸**

''ارشاد ہوا اے نوح! (کشتی سے) اتریئے امن و سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو آپ پر ہیں اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں اور (آئندہ) کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں پھر پہنچے گا انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی آپ کو فرشتوں نے کہا، یا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کشتی سے زمین کی طرف اتریئے یا پہاڑ سے زمین کی طرف (اتریے) پس اس نے پانی کو نگل لیا اور خشک ہوگئی۔ بِسَلٰمٍ مِّنَّا یعنی سلامتی اور امن کے ساتھ۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سلام ہے وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ یعنی ثابت شدہ نعمتیں۔ یہ بروک الجمل سے مشتق ہے اور یہ اس کا ثابت ہونا اور اس کا قائم ہونا ہے۔ اور اسی سے البرکۃ (حوض) ہے اس میں پانی کے ٹھہرنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام آدم اصغر ہیں، اب ساری مخلوق آپ کی نسل میں سے ہے۔ قتادہ وغیرہ کے قول کے مطابق کشتی میں مردوں اور عورتوں میں آپ کے ساتھ سوائے آپ کی اولاد کے کوئی سوار نہ تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تنزیل میں وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ۝ (الصافات) ہے۔ اور ہم نے ان کی اولاد کو بنایا کہ وہی باقی رہنے والے ہیں۔ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں۔ کہا گیا ہے: اس میں قیامت تک (آنے والا) ہر مومن داخل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ میں قیامت تک (آنے والا) ہر کافر داخل ہے(2)، یہ محمد بن کعب سے روایت کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر تقدیر عبارت یہ ہوگی، وعلی ذریۃ امم معک و ذریۃ امم سنمتعھم، وامم کو اس وجہ سے رفع دیا گیا کہ اس کا معنی ہے وتکون امم۔ اخفش سعید نے کہا کہ جس طرح تم کہتے ہو کلمت زیدا و عمرو جالس میں نے زید سے کلام کیا اور عمر بیٹھنے والا ہے۔ فراء نے غیر قراءت میں واُمماً پڑھنے کی اجازت دی اور اس کی تقدیر ہوگی: ونمتع اُمما اور علی کو اُمم کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا کیونکہ عَلَیْكَ کی کاف ضمیر پر اس کا عطف ہے اور ضمیر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 476		2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 67

مجرور ہے اور سیبویہ وغیرہ کے قول کے مطابق ضمیر مجرور پر حرف جار کے اعادہ کے بغیر عطف نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (النساء: 1) وَالْاَرْحَامَ کے جر کے ساتھ اس کا بیان مکمل طور پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بسلام میں با محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ حال کی جگہ ہے یعنی اهبط مسلما علیك اور منا محل جر میں محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ برکات کی صفت ہے۔ وعلی امم اسی کے متعلق ہے جس کے متعلق علیك ہے کیونکہ کاف پر عطف کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مِّمَّنْ مَّعَكَ میں من محذوف کے متعلق ہے کیونکہ یہ محل جر میں اُمم کی صفت ہے اور معك فعل محذوف کے متعلق ہے، کیونکہ یہ من کا صلہ ہے یعنی فمن استقر معك (جو آپ کے ساتھ ٹھہرا) یا آمن معك (جو آپ پر ایمان لایا) یا رکب معك (جو آپ کے ساتھ سوار ہوا)

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۹﴾

”یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم وحی کر رہے ہیں آپ کی طرف نہ آپ جانتے تھے اسے اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے پس آپ صبر کریں یقیناً نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ یعنی جو خبریں، اور ایک اور مقام پر ذالك ہے یعنی خبروں میں سے وہ خبریں اور قصص جو آپ سے غیب ہیں (1)۔ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ یعنی تاکہ آپ ان سے آگاہ ہو جائیں۔ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ یعنی وہ طوفان کے معاملہ سے ناواقف تھے حالانکہ مجوسی اب اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد ان کا حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قصے سے ناواقف ہونا ہے اگرچہ من جملہ انہوں نے طوفان کا معاملہ سن رکھا ہے۔ فَاصْبِرْ صبر کر رسالت کی مشقتوں اور قوم کی اذیتوں پر جس طرح نوح علیہ السلام نے صبر کیا، یعنی اے محمد! اللہ کے امر اور اپنی رسالت کی تبلیغ کے ذریعے قیام پر صبر کیجئے اور جو عرب کفار کی طرف سے آپ کو اذیت ملتی ہے اس پر اس طرح صبر کیجئے جس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر صبر کیا۔

اِنَّ الْعَاقِبَةَ دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی (کا انجام) لِلْمُتَّقِیْنَ شرک اور گناہوں سے (بچنے والوں کے لیے ہے)۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 179

اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

”اور عاد کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی ہود کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا معبود اس کے سوا، نہیں تم مگر افترا پرداز۔ اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت، نہیں ہے میری اجرت مگر اس (ذات پاک) کے ذمہ جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ کیا تم (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے؟ اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے اور نہ منہ موڑو (اللہ تعالیٰ سے) جرم کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا: اے ہود! نہیں لے آیا تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے خداؤں کو تمہارے کہنے سے اور نہیں ہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ مبتلا کر دیا ہے تجھے ہمارے کسی خدا نے دماغی خلل میں۔ ہود نے کہا: میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس کے سوا، پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلا شبہ میں نے بھروسہ کر لیا اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے، پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تمہاری طرف اور جانشین بنا دے گا میرا رب کسی اور قوم کو تمہارے علاوہ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ بوجہ اپنی رحمت کے اور ہم نے نجات دے دی انہیں سخت عذاب سے۔ اور یہ قوم عاد (کی داستان) ہے انہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی اور پیروی کرتے رہے ہر متکبر منکر حق کے حکم کی اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی۔ سنو! عاد

نے انکار کیا اپنے رب کا، سنو! ہلاکت و بربادی ہو عاد کے لیے جو ہود کی قوم تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی اور ہم نے بھیجا۔ اَرْسَلْنَا نُوْحًا پر اس کا عطف ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان (قوم عاد) کا بھائی کہا گیا ان میں سے ہونے کی وجہ سے، قبیلہ نے ان کو جمع کر دیا تھا، جس طرح آپ کہتے ہیں: یا اخا تمیمہ ایک قول یہ ہے ان کو ان کا بھائی کہا گیا کیونکہ وہ (ہود علیہ السلام) اولاد آدم علیہ السلام سے ہیں جس طرح کہ وہ (قوم عاد) اولاد آدم سے ہے۔ یہ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور وہ بتوں کے پجاری تھے۔ کہا گیا ہے: عاد (نام کی) دو (قومیں) تھیں عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ۔ تو یہ عاد اولیٰ ہے، رہے عاد ثانیہ تو وہ شداد اور لقمان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ارم ذات العماد میں مذکور ہیں۔ عاد ایک آدمی کا نام ہے پھر اس کی طرف منسوب ایک قوم پر اس کا اطلاق ہوا۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ غیرہ لفظاً مجرور اور غیرہ محلاً مرفوع اور غیرہ استثنا کی بنیاد پر منصوب اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ یعنی تم غیر کو معبود بنانے میں اس (اللہ تعالیٰ عزوجل) پر جھوٹ بولنے والے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ اور فطرت (سے مراد) مخلوق کی ابتدا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اس کو جو قوم نوح پر جاری ہوا جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ سورت کی ابتداء میں یہ گزر چکا ہے۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ، یرسل مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب ہے اور اس میں جزا کا معنی ہے۔ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس میں کثرت کا معنی ہے، یعنی آسمان موسلا دھار بارش برسائے گا (1)۔ اور عرب مفعال میں نسب کی صورت میں ہا کو حذف کر دیتے ہیں۔

اکثر اوقات مفعال کا وزن افعل باب افعال سے آتا ہے جب کہ یہاں فعل سے آیا ہے کیونکہ یہ درّت السماء تدِر اور تدُر سے مشتق ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم یعنی قوم عاد باغوں، کھیتوں اور عمارتوں والی قوم تھی اور ان کی رہائش گاہیں شام اور یمن کے درمیان والے ٹیلے تھے جس طرح کہ سورۂ اعراف میں گزر گیا۔

وَّيَزِدْكُمْ یرسل پر اس کا عطف ہے۔ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ مجاہد نے کہا: (قوت سے مراد) شدت ہے۔ ضحاک نے کہا: شادابی، علی بن عیسیٰ کے نزدیک: عزت۔ اور عکرمہ کے نزدیک: اولاد ہے (2)۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال ان سے بارش روک لی اور رحموں کو بانجھ کر دیا پس ان کا کوئی بچہ پیدا نہ ہوا، تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہارے شہروں کو زندہ (آباد) کر دے گا اور تمہیں مال اور اولاد عطا فرمائے گا۔ پس یہی قوت ہے۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہے کہ وہ قوت کا اضافہ فرما دے گا نعمتوں میں۔ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ یعنی تم اس سے اعراض نہ کرو جس کی طرف میں تم کو دعوت دیتا ہوں اور کفر پر قائم نہ ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ یعنی واضح حجت۔ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ان کی طرف سے کفر پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 477 2۔ ایضاً

اصرار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ یعنی تجھے مبتلا کر دیا ہے۔ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا اس سے مراد بت ہیں۔ بِسُوْٓءٍ یعنی جنون نے آپ کا ان کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہ مروی ہے، کہا جاتا ہے: عراه الامر واعتراه جب کوئی اس میں مبتلا ہو جائے۔ اور اسی سے ہے: وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج: 36)

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ یعنی اپنی ذات پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ وَاشْهَدُوْٓا یعنی میں تم کو گواہ بناتا ہوں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ اہل شہادت میں سے تھے بلکہ یہ تقریر کی انتہا ہے، یعنی اس لیے کہ تم پہچان لو۔ اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ یعنی ان بتوں کی پوجا سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا یعنی تم اور تمہارے بت میری دشمنی اور مجھے نقصان دینے میں مکر کریں۔ ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ یعنی تم مجھے مہلت نہ دو۔ دشمنوں کی کثرت کے باوجود یہ قول اللہ تعالیٰ کی مدد پر کامل بھروسہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ نبوت کی علامات میں سے ہے کہ رسول اکیلا اپنی قوم کو کہتا ہے: فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو کہا اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ الایۃ (یونس: 71) تم اپنا معاملہ اور اپنے شرکاء کو جمع کر لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ یعنی میں اس کے حکم پر راضی ہوں اور اس کی مدد کے بارے میں پر امید ہوں۔ مَا مِنْ دَآبَّةٍ یعنی وہ نفس جو زمین پر رینگتا ہے۔ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ ہر وہ چیز جس میں روح ہو اس کو داب یا دابۃ کہا جاتا ہے اور اس دابۃ میں ہا مبالغہ کے لیے ہے۔ فراء نے کہا: (اس سے مراد ہے کہ وہ) اس کا مالک اور اس پر قادر ہے۔ قتبی نے کہا: وہ اس پر غالب ہے، کیونکہ جس بندے کی پیشانی کو تو پکڑ لے تو (گویا) تو اس پر غالب آ گیا ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ اس کو پیدا کرتا ہے پھر اس کو مارتا ہے، اور معنی قریب قریب ہے اور ناصیۃ سے مراد سر کے اگلے حصے کے بال ہیں۔ نصوت الرجل انصوه نصواً (کہا جاتا ہے) جب تم اس کی پیشانی کو کھینچو۔

ابن جریج نے کہا: اس کو ناصیۃ کے ساتھ خاص کیا کیونکہ عرب یہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی آدمی کی صفت عاجزی اور خضوع کے ساتھ بیان کی جائے۔ پس وہ کہتے ہیں: فلاں کی پیشانی فلاں کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ اس کا مطیع ہے جس طرح چاہے وہ اس میں تصرف کرے۔ اور (عرب) جس کسی قیدی کو گرفتار کرتے اور پھر اس پر احسان کر کے اس کو آزاد کرنا چاہتے تو وہ اس کے پیشانی کے بالوں کو پکڑتے تا کہ اس طرح وہ اس پر فخر کا اظہار کریں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب فرمایا ایسے محاورہ کے ذریعے جس کو وہ اپنے کلام میں جانتے تھے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اعمال کے مقادیر مقرر فرمائے پھر ان کی طرف دیکھا پھر انسان کی تخلیق فرمائی اور نگاہ قدرت ان کی تخلیق سے پہلے ہی ان کے ان اعمال سے پار ہو گئی جو وہ کرنے والے تھے پس جب ان کو پیدا فرمایا تو اس نظر کے نور کو ان کی پیشانیوں میں لکھ دیا پس یہ نور ان کی پیشانیوں کو پکڑنے والا ہے۔ یہ انہیں ان اعمال کی طرف لے جاتا ہے جو مقادیر والے دن ان پر مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین

وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے پیدا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اسے روایت کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے مقادیر کو زمین وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مقرر فرمایا'' (1)۔ اسی وجہ سے رسولوں کو تقویت ملی اور وہ اولوالعزم میں سے ہو گئے کیونکہ انہوں نے پیشانیوں کے نور کو ملاحظہ فرمایا اور انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اس کی ساری مخلوق ان انوار کے سبب اتباع کر رہی ہے جہاں تک اعمال میں سے ان میں اس کی بصارت پار ہو چکی ہے، پس ان میں سے جو مشاہدہ کے اعتبار سے زیادہ ہیں وہ عزم میں زیادہ پختہ ہیں، اسی وجہ سے اللہ کے نبی حضرت ہود علیہ السلام اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ یہاں تک کہہ دیا: فَكِيۡدُوۡنِيۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ۞، اِنِّيۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيۡ وَرَبِّكُمۡ‌ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔

اس کو ناصیۃ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اعمال غیب الغیب سے ظاہر ہوئے اور مقادیر میں منصوص ہو گئے، خالق کی بصارت مخلوق کی تمام حرکات سے قدرت کے ذریعے پار ہو گئی، پھر زمین پر چلنے والے ہر حیوان کی حرکت اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان اس کی پیشانی میں رکھ دی گئی، پس اس کی اس جگہ کو ناصیۃ کہہ دیا گیا، کیونکہ وہ تقدیر کے مطابق بندوں کی حرکات کو ظاہر کرتی ہے، ناصیۃ ان حرکات کے اظہار سے ماخوذ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کرنے سے پہلے دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے ابوجہل کی پیشانی کے بارے میں نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۞ (العلق) فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ پیشانیوں میں کاذبۃ اور خاطئۃ بھی ہوتی ہیں۔ ان کی بیان کردہ تاویل کے مطابق ناصیۃ کو کذب اور خطا کی طرف منسوب کرنا محال ہے۔

اِنَّ رَبِّيۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ نحاس نے کہا: صراط کا لغوی معنی واضح راستہ ہے، معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اگرچہ ہر چیز پر قادر ہے مگر بغیر حق کے وہ لوگوں کو نہیں پکڑتا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی تدبیر میں کوئی خلل نہیں اور اس کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں وہ پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِنۡ تَوَلَّوۡا محل جزم میں ہے۔ اس وجہ سے اس میں سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور یہ اصل میں تتولوا تھا اجتماع تائین کی وجہ سے تا کو حذف کر دیا گیا۔ فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖۤ اِلَيۡكُمۡ‌ؕ اس کا معنی ہے کہ میں نے تمہارے لیے بیان کر دیا ہے۔ وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّيۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ‌ۚ یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دے گا اور وہ ان کو پیدا فرمائے گا جو تمہاری نسبت زیادہ اس کی اطاعت کرنے والے ہوں گے وہ اس کی وحدانیت کا اعلان کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے۔ وَيَسۡتَخۡلِفُ یہ ماقبل سے مقطوع ہے اس وجہ سے مرفوع ہے۔ فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ کے ارشاد میں فا کے بعد جو ثابت ہو رہا ہے یہ اس پر معطوف ہے۔ حفص سے روایت کی گئی ہے انہوں نے عاصم سے روایت کی وَيَسۡتَخۡلِفُ جزم کے ساتھ فا کی جگہ اور اس کے مابعد پر محمول کرتے ہوئے جس طرح وَيَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۞ (الاعراف)

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حجاج آدم موسیٰ علیہما السلام، جلد 2، صفحہ 335

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــٴًـا یعنی تم اپنی روگردانی اور اعراض کے ذریعے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ یعنی ہر چیز کا نگہبان علی بمعنی لام ہے۔

پس وہ میری حفاظت فرماتا ہے اس سے کہ تم مجھے کوئی برائی پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی جب آیا ہمارا عذاب قوم عاد کی ہلاکت کے ذریعے۔ نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کیونکہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر نجات نہیں پاتا اگرچہ اسے نیک اعمال ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ صحیح مسلم، صحیح بخاری اور دیگر (کتب) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے "تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دے سکتا"۔ انہوں نے عرض کیا: اور نہ آپ کو یا رسول اللہ؟ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے فرمایا: "اور نہ مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے" (1)۔ ایک قول یہ ہے کہ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے اس ہدایت کو بیان کر دیا جو رحمت ہے۔ اور وہ چار ہزار تھے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ یعنی قیامت کے دن کے عذاب (سے) اور کہا گیا ہے: وہ سخت آندھی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات وغیرہ میں ذکر فرمایا اور اس کا بیان آئے گا۔ قشیری ابونصر نے کہا: وہ عذاب جس کے ذریعے نبی اپنی امت کو دھمکی دیتا ہے جب آ جائے تو اللہ نبی اور اس کے ساتھ مومنین کو اس سے نجات عطا فرماتا ہے۔ ہاں! اللہ کا نبی اور اس کی قوم کو مبتلا کرنا بعید (از قیاس بات) نہیں پس وہ ان کو آزمائش میں مبتلا فرمائے تو وہ کافروں کے لیے سزا ہوگی اور مومنوں کے لیے آزمائش، جب یہ اس میں سے نہ ہو نبی نے جس کی دھمکی دی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ تِلْكَ عَادٌ مبتدا اور خبر ہے۔ کسائی نے بیان کیا کہ عربوں میں سے جو عاد کو منصرف نہیں بناتا پس وہ اس کو قبیلہ کا نام بنا دیتا ہے۔ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے معجزات کی تکذیب کی اور ان کا انکار کیا۔ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ یعنی صرف حضرت ہود علیہ السلام کا، کیونکہ ان کی طرف سوائے آپ کے کوئی اور رسول نہ بھیجا گیا۔ اس کی مثال (یعنی جمع بول کر واحد مراد لینا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ (المومنون: 51) (الرُّسُلُ سے مراد) صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آپ کے علاوہ کوئی رسول نہ تھا۔ اور یہاں جمع ہے کیونکہ جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو (گویا) اس نے سب رسولوں کی تکذیب کی۔ اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام اور آپ سے پہلے رسولوں کی تکذیب کی، اور وہ اس طرح تھے کہ اگر ان کی طرف ہزار رسول بھی بھیجے جاتے تو وہ سب کا انکار کر دیتے۔ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ یعنی ان کے کمتر لوگوں نے اپنے رئیسوں کی اتباع کی۔

جبار سے مراد تکبر کرنے والا ہے اور عنید سے مراد وہ سرکش ہے جو حق کو قبول نہیں کرتا اور نہ اس کا اقرار کرتا ہے۔ ابوعبید نے کہا: عنید، عنود، عاند اور معاند سے مراد مخالفت کی وجہ سے اعراض کرنے والا ہے۔ اور اسی سے اس رگ کو عاند کہا جاتا ہے جو خون کے ذریعے بہہ پڑتی ہے۔ راجز نے کہا:

إِنِّي كَبِيْرٌ لَا أُطِيْقُ الْعُنَّدَا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب تمنی المریض الموت، جلد 2، صفحہ 957

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً یعنی ان کو اس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ان کے پیچھے لگائی جائے گی قیامت کے دن اس کی مثل پس یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پر تمام ہو رہی ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ فراء نے کہا: یعنی انہوں نے اپنے رب کی نعمت کا انکار کیا، اس نے کہا: کفرتہ اور کفرت بہ کہا جاتا ہے جس طرح شکرتہ اور شکرت لہ کہا جاتا ہے (یعنی یہ با کے صلہ کے ساتھ اور صلہ کے بغیر دونوں طرح آتا ہے) اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور رہیں گے اور بعد سے مراد ہلاکت ہے اور بعد بھلائی سے دوری کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: بعد یبعد بعد جب وہ پیچھے رہ جائے اور دور ہو جائے۔ اور بعد یبعد بعدا (کہا جاتا ہے) جب وہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا:

لا یَبْعَدَنْ قومی الذین هُمُ سَمُّ العُدَاةِ وآفَةُ الجُزُرِ

نابغہ نے کہا:

فلا تَبْعَدنْ إنّ المنیةَ مَنْهَلٌ وکلُّ امرئٍ یومًا به الحالُ زائلُ

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝۶۱

''اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی صالح کو بھیجا آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اس نے پیدا فرمایا تمہیں زمین سے اور بسا دیا تمہیں اس میں۔ پس مغفرت طلب کرو اس سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب قریب ہے (اور) التجائیں قبول فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِلٰی ثَمُوْدَ یعنی ہم نے ثمود کی طرف بھیجا۔ اَخَاهُمْ یعنی نسب میں ان کا بھائی صٰلِحًا یحییٰ بن وثاب نے اِلٰی ثَمُوْدٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حسن سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے اور تمام قراء نے پورے قرآن میں اس میں اختلاف کیا ہے پس انہوں نے کسی جگہ اس کو منصرف پڑھا ہے اور کسی جگہ غیر منصرف۔ ابو عبیدہ نے گمان کیا کہ اگر جماعت کی مخالفت نہ ہو تو مناسب صرف کو ترک کرنا ہے، کیونکہ اس میں تانیث غالب ہے۔ نحاس نے کہا: جو ابو عبید نے کہا۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ کہ اس پر تانیث غالب ہے (یہ) کلام مردود ہے، کیونکہ ثمود امحلے کو بھی کہا جاتا ہے اور قبیلہ کو بھی اور اس پر قبیلہ غالب نہیں، بلکہ سیبویہ کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس ہے اور جس کے بارے میں بنو فلاں نہ کہا گیا ہو اس میں سیبویہ کے نزدیک عمدہ اس کو منصرف پڑھنا ہے جس طرح قریش، ثقیف اور جوان دونوں کے مشابہ ہو، اسی طرح ثمود بھی ہے۔ اس میں علت یہ ہے کہ جب مذکر اصل ہے اور اس کا مذکر اور مونث (دونوں) ہوں تو اصل اخف اولیٰ ہے اور تانیث عمدہ اور حسن ہے۔ سیبویہ نے تانیث میں شعر کہا:

غَلَبَ المسامیحَ الولیدُ سَمَاحةً وکَفَی قریشَ المعضِلاتِ وسَادَهَا

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ گزر چکا ہے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی زمین سے اور یہ اس وجہ سے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین سے پیدا کیا گیا جس طرح کے ''سورۂ بقرہ'' اور ''سورۃ الانعام'' میں گزر چکا ہے۔ اور لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیے گئے۔ ایک قول یہ ہے اس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا۔ غیرہ کی ھو کی ھا میں ادغام جائز نہیں سوائے اس شخص کی لغت کے جس نے ادراج کی صورت میں واؤ کو حذف کر دیا ہو۔ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا یعنی اس نے تمہیں اس کا آباد کرنے والا اور رہائشی بنایا۔ مجاہد نے کہا: اسْتَعْمَرَكُمْ کا معنی ہے اعمرکم یعنی اس نے تمہیں عمر بھر (زمین میں) رکھا، جیسے اعمر فلان فلانا دارہ یعنی فلاں نے فلاں کو اپنا گھر عمر بھر کے لیے دیا پس یہ عمر بھر اس کا ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس نے تمہیں اس میں آباد کیا، ان دونوں قولوں کے مطابق استفعل بمعنی افعل ہوگا جیسے استجاب بمعنی اجاب۔ ضحاک نے کہا: اس نے تمہاری عمروں کو دراز کیا اور ان کی عمریں تین سو سے ہزار (سال) تک تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک معنی ہے: اس نے تمہیں اس میں زندہ رکھا۔ زید بن اسلم کے نزدیک اس نے تمہیں حکم دیا اس میں رہائش گاہوں کی تعمیر اور درخت لگانے میں سے جس کی تمہیں ضرورت ہو اس کے بنانے کا (2)۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ اس نے کھیتی باڑی، درخت لگانا اور نہروں کی کھدوائی وغیرہ میں سے اس کی آبادی کا تمہیں الہام کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا (3) کہ بعض شافعی علماء نے کہا: استعمار سے مراد طلب عمارت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق مطالبہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ قاضی ابوبکر نے کہا: استفعل کا کلمہ عربوں کی زبان پر کئی معانی کے لیے آتا ہے ان میں سے ایک استفعل بمعنی طلب فعل ہے جس طرح کسی کا قول استحملته یعنی میں نے اس سے لادنے کا مطالبہ کیا، اور بمعنی اعتقد بھی ہے جس طرح ان کا قول: استسھلت ھذا الامر یعنی میں نے اس کے آسان ہونے کا اعتقاد رکھا یا میں نے اس کو آسان پایا اور استعظمته یعنی میں نے اس کے عظیم ہونے کا اعتقاد رکھا اور اس کو عظیم پایا، اور اسی سے استفعلت بمعنی اصبت ہے جس طرح ان کا قول: استجدته یعنی میں نے اس کو عمدہ پایا، اور اسی سے بمعنی فعل ہے جس طرح اس کا قول قرّ فی المکان واستقر یعنی وہ مکان میں قرار پذیر ہوا اور اس نے قرار چاہا، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یستھزءون اور یستسخرون اسی قبیل سے ہے پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا (کا معنی ہوگا) اس نے تمہیں اس کی آبادی کے لیے پیدا فرمایا۔ استجدته اور استسھلته کے معنی پر نہیں یعنی میں نے اسے عمدہ اور سہل طریقے سے پالیا۔ یہ خالق کی طرف سے محال ہے تو یہ اس طرف راجع ہوگا کہ اس نے پیدا فرمایا، کیونکہ یہ (پیدا کرنا) اس کا فائدہ ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو مجازاً اس کے فائدہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی آبادی کی طلب ہے کیونکہ یہ لفظ اس (اللہ تعالیٰ کی ذات) کے حق میں جائز نہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے اس کی آبادی کو چاہا پس وہ استفعل کے لفظ کے ذریعے اسے لایا۔ اور یہ قول کے ذریعے اپنے سے کم مرتبہ ذات سے فعل کی استدعا ہے جب کہ یہ امر ہو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 478 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 479 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1059

اور جب ادنیٰ کی طرف سے اعلیٰ سے عقل کا مطالبہ ہو تو وہ رغبت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: استفعل بمعنی افعل ذکر نہیں کیا گیا جس طرح کے استوقد بمعنی اوقد ہے اور ہم نے اسے ذکر کر دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس میں اسکان اور عمریٰ پر دلیل ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں سکنیٰ اور رقبیٰ کے بارے میں قول گزر گیا ہے۔ جہاں تک عمریٰ کا تعلق ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے جس کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) کہ یہ معمر (عمریٰ کرنے والا) کی زندگی میں گردن (ذات) کے منافع کا مالک بنانا ہے اس کی عمر کی مدت میں پس اگر وہ اس کی انتہا کو ذکر نہ کرے اور معمر فوت ہو جائے تو یہ اسی کے پاس واپس آ جائے گا جس نے اس کو دیا تھا یا اس کے ورثاء کے لیے ہوگا، یہ قاسم بن محمد، یزید بن قسیط اور لیث بن سعد کا قول ہے۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے اور امام شافعی کے اقوال میں سے ایک ہے، اس قول کی دلیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

2۔ یہ گردن (ذات) اور اس کے منافع کا مالک بنانا ہے اور یہ نافذ شدہ ہبہ ہے جو واہب کی طرف واپس نہ ہو سکے گا یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی ان دونوں کے اصحاب، ثوری، حسن ابن حی، امام احمد بن حنبل، ابن شبرمۃ اور ابوعبید کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: جس نے عمریٰ کیا کسی بندے کو اس کی زندگی کا تو یہ اس کی زندگی میں اس کا ہوگا اور اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کے لیے ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی گردن کا مالک بن چکا ہے اور دینے والے کا زندگی اور عمر کی شرط لگانا باطل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمریٰ جائز ہے''، اور ''عمریٰ اس کے لیے ہے جس کو ہبہ کیا گیا'' (1)۔ (۳) اگر اس نے ''عمرت'' کہا اور اس کے جانشین کا ذکر نہ کیا تو یہ پہلے قول کی طرح ہے اور اگر اس نے عمرك لعقبك کہا تو یہ دوسرے قول کی طرح ہے۔ یہی زہری، ابوثور، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابن ابی ذئب نے کہا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا اور یہی مؤطا میں ان کے قول کا ظاہر ہے۔ آپ سے اور آپ کے اصحاب سے (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) معروف یہ ہے کہ معمر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جب معمر کی اولاد ختم ہو جائے اگر معمر (عمریٰ کرنے والا) زندہ ہو ورنہ اس کی طرف جو اس کے ورثاء میں سے زندہ ہو اور اس کی میراث کا لوگوں میں زیادہ حق دار ہو۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب کے نزدیک معمر (جس کے لیے عمریٰ کیا گیا) عمریٰ کے لفظ کے ذریعے اشیاء میں سے کسی چیز کی گردن کا مالک نہیں بنے گا، عمریٰ کے لفظ سے وہ منفعت کا مالک ہوگا نہ کہ گردن کا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے وقف شدہ چیزوں کے بارے میں بھی کہا ہے: جب کسی نے کوئی چیز کسی آدمی کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے وقف کی تو وہ اس کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور اگر کسی معین آدمی کے لیے اس کی زندگی میں وقف کیا تو وہ رجوع کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح عمریٰ بھی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے یہی مؤطا کا ظاہر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس آدمی نے کسی آدمی اور اس کی اولاد کے لیے عمریٰ کیا، اس نے کہا یہ میں نے تجھے اور تیری اولاد کو دیا جو تم میں سے بچ گیا تو یہ اس کے لیے ہوگا جس کو عطا کیا گیا اور یہ (عمریٰ) اپنے مالک کی طرف نہیں لوٹے گا اس وجہ سے کہ اس نے یہ ایسی عطا کی ہے جس میں وارثت واقع ہوگی'' (2)، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الهبة، ما قيل العمرىٰ والرقبیٰ، جلد 1، صفحہ 357 2۔ صحیح مسلم، کتاب الهبة، العمرىٰ، جلد 2، صفحہ 38

انہی سے ہے کہ انہوں نے کہا: وہ عمریٰ جس کو رسول اللہ ﷺ نے جائز قرار دیا وہ یہ ہے کہ وہ کہے: یہ تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے ہے اور اگر اس نے کہا: یہ تیرے لیے ہے جب تک تو زندہ رہے تو یہ (عمریٰ) اپنے مالک کے پاس لوٹ جائے گا۔ معمر نے کہا اس پر زہری فتویٰ دیا کرتے تھے (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: قرآن کا معنی دوسرے قول والوں کے ساتھ چلتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: وَاسْتَعْمَرَكُمْ یعنی اعمرکم پس نیک آدمی نے اس میں اپنی زندگی کی مدت نیک عمل اور اپنی موت کے بعد ذکر جمیل اور عمدہ تعریف کے ذریعے عمریٰ کیا اور فاجر آدمی نے اس کے برعکس (عمریٰ کیا) پس دنیا ان دونوں کے لیے زندگی اور موت کے اعتبار سے ظرف ہے۔ کہا جاتا ہے: بے شک عمدہ تعریف اولاد کے قائم مقام ہے۔ تنزیل میں وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (الشعراء) سے مراد عمدہ تعریف ہے، کہا گیا ہے، وہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (الصافات) اور ہم نے بنا دیا فقط ان کی نسل کو باقی رہنے والا اور فرمایا: وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (الصافات) اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاسْتَغْفِرُوْهُ یعنی اس سے بتوں کی عبادت سے مغفرت کا سوال کرو۔ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی اس کی عبادت کی طرف رجوع کرو۔ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ یعنی جواب دینے کے قریب اس آدمی کے لیے جو اس سے دعا مانگے، سورۂ بقرہ میں اللہ کے ارشاد فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ: 186) میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

''انہوں نے کہا: اے صالح! تم ہی ہم میں (ایک شخص) تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں اس سے پہلے۔ کیا تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الھبۃ، العمریٰ، جلد 2، صفحہ 38

روکتے ہو ہمیں اس سے کہ ہم عبادت کریں ان (بتوں) کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ اور بے شک ہم اس امر کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا کی ہو مجھے اپنی جناب سے خاص رحمت تو کون ہے جو بچائے گا مجھے الله (کے عذاب سے) اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم تو نہیں زیادہ کرنا چاہتے میرے لیے سوا نقصان کے۔ اور اے میری قوم! یہ الله کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اسے کھاتی پھرے الله تعالیٰ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب بہت جلد۔ پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے فرمایا: لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن تک یہ (الله کا) وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے بچا لیا صالح کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے نیز (بچا لیا) اس دن کی رسوائی سے۔ بے شک (اے محبوب!) تیرا رب ہی بہت قوت والا بہت عزت والا ہے اور پکڑ لیا ظالموں کو ایک خوفناک کڑک نے اور صبح کی انہوں نے اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے گرے پڑے تھے۔ (انہیں یوں نابود کر دیا گیا) گویا وہ یہاں کبھی آباد ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے انکار کیا اپنے رب کا۔ سنو! بربادی ہو ثمود کے لیے"۔

الله تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ یعنی اس سے پہلے ہم امید کرتے تھے کہ آپ ہی ہم میں سے سردار ہوں گے، یعنی آپ کے دعویٰ نبوت سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کے معبودوں کو عیب کی طرف منسوب کرتے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور وہ آپ سے انہی کے دین کی طرف لوٹنے کی امید کرتے تھے، پس جب آپ نے ان کو الله تعالیٰ کی طرف بلایا تو انہوں نے کہا: ہماری تم سے وابستہ امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ اَتَنْهٰىنَاۤ استفہام ہے جس کا معنی انکار ہے۔ اَنْ نَّعْبُدَ یعنی (عن ان نعبد) اس بات سے کہ ہم عبادت کریں۔ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا، ان محل نصب میں ہے عن حرف جر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے۔ وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ سورۂ ابراہیم میں دانا ہے اور اصل میں داننا ہے تین نون ثقیل ہوئے پس تیسرے نون کو ساقط کر دیا۔ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ، خطاب حضرت صالح علیہ السلام کو ہے۔ سورۂ ابراہیم میں تدعوننا ہے کیونکہ مخاطب تمام رسول صلوٰات الله وسلامہ علیہم ہیں۔ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ یہ اربته فأنا أربيه سے ہے جب تو کوئی ایسا کام کرے جو تیرے پاس بے چینی کو ثابت کر دے۔ ہذلی نے کہا:

كنتُ إذا أتوتُه من غَيْبِ    يَشُمُّ عِطْفِي و يَبُزُّ ثَوْبِي

كأنما   أربتُه   بِرَيْبِ

الله تعالیٰ کا فرمان: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً اس کا معنی حضرت نوح علیہ السلام کے قول میں گزر چکا ہے۔ فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ استفہام ہے جس کا معنی نفی ہے یعنی کوئی بھی اس کی طرف سے میری مدد نہیں کرے گا اگر میں نے اس کی نافرمانی کی۔ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ یعنی گمراہی اور بھلائی سے دور۔ فراء کا

یہی قول ہے اور نقصان ان (کفار) کے لیے ہے نہ کہ آپ علیہ السلام کے لیے گویا کہ آپ نے یوں کہا: سوائے تمہارے لیے نقصان کے نہ کہ میرے لیے۔ اور کہا گیا: اپنے خسارے کو دیکھے بغیر اپنے آباء کے دین کے ذریعے حجت پکڑنے میں تم میرے لیے زیادہ نہیں کرتے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ مبتدا اور خبر ہے۔ لَكُمْ اٰیَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور عامل ھذہ میں تنبیہ یا اشارہ کا معنی ہے۔ اور کہا گیا: نَاقَةُ اللّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (اونٹنی) کو ان کے لیے پہاڑ سے نکالا ان کے مطالبہ پر، اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائیں گے۔ ایک قول یہ ہے: حجر کے ایک طرف صماء کی منفرد چٹان سے اللہ تعالیٰ نے اسے نکالا جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے، جب اونٹنی نکلی ان کے مطالبہ پر تو ان کو اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً، فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ، امر اور جواب امر ہے، فَذَرُوْهَا سے نون کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ یہ امر ہے اور وذر اور واذ نہیں کہا جاتا مگر شاذ اور نحویوں کے اس میں دو قول ہیں، سیبویہ نے کہا: (واو) کو چھوڑ کر اس سے مستغنی ہو گئے اور کسی اور نے کہا: جب واؤ ثقیل تھی اور کلام میں اس کے معنی کا فعل بھی تھا جس میں واؤ نہیں تو انہوں (نحویوں) نے اس کو لغو کر دیا، ابو اسحاق زجاج نے کہا: تاکل، کا رفع بھی جائز ہے حال اور جملہ مستانفہ ہونے کی بنیاد پر۔ وَلَا تَمَسُّوْهَا نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔ بِسُوْٓءٍ فراء نے کہا: کونچ کاٹنے کے ذریعے۔ فَیَاْخُذَكُمْ نہی کا جواب ہے۔ عَذَابٌ قَرِیْبٌ یعنی اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹنے کے قریب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ۔ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَعَقَرُوْهَا اس کی کونچیں تو ان میں سے بعض نے کاٹیں اور اس کو تمام کی طرف منسوب کر دیا گیا کیونکہ یہ باقی لوگوں کی رضامندی سے تھا۔ اور اس کی کونچوں کے کاٹنے کے بارے میں سورۂ اعراف میں کلام گزر گیا ہے اور آئے گا بھی۔ فَقَالَ تَمَتَّعُوْا یعنی ان کو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: تم لطف اندوز ہو لو، یعنی عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ عزوجل کی نعمتوں کے ذریعے۔ فِیْ دَارِكُمْ، فی بلادکم مراد ہے یعنی اپنے شہر میں، اگر آپ دار سے گھر مراد لیتے تو آپ دورکم فرماتے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے گھر اور اپنی رہائش گاہ میں لطف اندوز ہو لے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) یعنی ہر ایک بچہ۔ اور زندگی کے ساتھ لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کو تعبیر کیا، کیونکہ میت نہ لذت حاصل کرتی ہے اور نہ کسی چیز کے ساتھ لطف اندوز ہوتی ہے۔ بدھ کے دن کونچیں کاٹی گئیں، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے دن وہ رہے اور اتوار کے دن ان پر عذاب آیا۔ وہ تین دن مقیم رہے، کیونکہ اس اونٹنی نے تین بار آواز نکالی تھی جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ پہلے دن ان کے رنگ زرد ہو گئے، پھر دوسرے دن سرخ ہو گئے اور پھر تیسرے دن سیاہ ہو گئے اور چوتھے دن وہ ہلاک ہو گئے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء مالکیہ نے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم سے تین دن اللہ کے عذاب کو مؤخر کرنے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جب مسافر چار راتوں کی اقامت نہ کرے تو وہ قصر کرے گا، کیونکہ تین دن اقامت کے حکم سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 480

خارج ہیں، اس سلسلہ میں علماء کے جو اقوال ہیں وہ سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ یعنی مکذوب بمعنی کذب ہے ایک قول یہ بھی ہے: غیر مکذوب فیه ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا یعنی ہمارا عذاب نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا یہ گزر چکا ہے۔ وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ یعنی اور ہم نے ان کو نجات دی اس دن کی رسوائی سے، یعنی اس کی رسوائی اور ذلت سے۔ کہا گیا ہے: واؤ زائدہ ہے یعنی ''نجیناھم من خزی یومئذ'' ہے کہ ہم نے ان کو اس دن کی رسوائی سے نجات دی۔ سیبویہ اور اہل بصرہ کے نزدیک اس کو زائد کرنا جائز نہیں اور کوفیوں کے نزدیک لما اور حتی کے ساتھ اس کو زائد کرنا جائز ہے ان کے علاوہ نہیں۔ نافع اور کسائی نے یومئذٍ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یوم کی اذ کی طرف اضافت کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوحاتم نے کہا: ہم سے ابوزید نے ابوعمرو سے بیان کیا کہ اس نے ومن خزی یومئذ پڑھا یعنی اس نے یا کو یا میں ادغام کیا اور مضاف کیا اور یومئذ میں میم کو کسرہ دیا۔ نحاس نے کہا: جس کو سیبویہ اور ان کے قریب قریب والے نحوی ابوعمرو سے اس قسم کی قراءت روایت کرتے ہیں وہ اخفا ہے جہاں تک ادغام کا تعلق ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ التقاء ساکنین ہے اور زا کا کسرہ جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ یعنی چوتھے دن میں ان پر چنگھاڑ ہوئی تو وہ مر گئے اور (اخذ) کو مذکر ذکر کیا کیونکہ الصیحۃ اور الصیاح ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ جبریل امین کی چیخ تھی۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ آسمان سے ایک چنگھاڑ آئی تھی جس میں ہر بجلی کی کڑک اور زمین کی ہر چیز کی آواز تھی پس ان کے دل پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فرمایا اور سورۃ اعراف میں فاخذتهم الرجفة فرمایا، اس کا بیان وہاں گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے، جب انہیں عذاب کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ایک دوسرے کو کہا: اگر اچانک عذاب آ گیا تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا پھر ہم کیا کریں گے؟ پس انہوں نے اپنی تلواریں، نیزے اور اپنے جتھے لے لیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ ہزار قبیلے تھے، ہر قبیلہ میں بارہ ہزار جنگجو تھے۔ وہ راستوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو گئے، ان کا گمان تھا کہ وہ عذاب سے لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو حکم دیا جو سورج کے ساتھ موکل ہے کہ وہ ان کو اپنی گرمی کا عذاب دے پھر ان پر اس کا کم از کم عذاب یہ تھا کہ ان کے ہاتھ جل گئے اور پیاس سے ان کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹک گئیں اور جو جانور وغیرہ ان کے پاس تھے وہ مر گئے اور چشموں کا پانی جوش سے ابلنے لگا یہاں تک کہ وہ آسمان تک پہنچ گیا، وہ جس چیز پر گرتا اس کو اپنی گرمی کی شدت سے ہلاک کر دیتا۔ اسی طرح جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ وہ ان کی روحوں کو قبض نہ کرے ان کو عذاب دینے کے لیے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے (1)۔ وہ مٹی کے ساتھ اس پرندے کی طرح چمٹ گئے جو اپنا سینہ زمین پر لگا دے۔ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 481

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍؕ۝ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ١ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ۝

''اور بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر انہوں نے کہا: (اے خلیل!) آپ پر سلام ہو۔ آپ نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو۔ پھر آپ جلدی لے آئے (ان کی ضیافت کے لیے) ایک بچھڑا بھنا ہوا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں، ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔ اور آپ کی اہلیہ (سارہ پاس) کھڑی تھیں وہ ہنس پڑیں تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى یہ حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ ہے اور وہ قرابت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم کے چچا کے بیٹے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں شام کے نواح میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بستیاں فلسطین کے شہروں میں تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو اتارا تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرے اور ان کے پاس مہمان بنے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو بھی مہمان بنتا آپ اس کی ضیافت بہت اچھے طریقے سے کرتے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت لے کر گزرے تو آپ نے انہیں مہمان سمجھا۔ جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: یہ نو فرشتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ گیارہ فرشتے تھے جو نہایت خوبصورت اور روشن چہروں والے جوانوں کی شکل میں تھے۔

بِالْبُشْرٰى ایک قول یہ ہے: بچے کی (خوشخبری) ایک قول یہ ہے: قوم لوط کی ہلاکت کی خوشخبری اور ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو خوشخبری دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں (2)، اور یہ کہ آپ پر کوئی خوف نہیں۔ قَالُوْا سَلٰمًا یہ منصوب ہے اس پر فعل کے واقع ہونے کی وجہ سے، جس طرح آپ کہتے ہیں: قالوا خیرا انہوں نے اچھی بات کہی۔ یہ طبری کا اختیار کردہ قول ہے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ (الکہف:22) کا تعلق ہے، اس میں ثلاثۃ اسم ہے مقولہ نہیں۔ اور اگر دونوں کو رفع دیا جائے یا دونوں کو نصب دیا جائے قَالُوْا سَلٰمًا١ؕ قَالَ سَلٰمٌ تو لغت عرب میں جائز ہے۔ ایک قول یہ ہے: مصدر ہونے کی وجہ سے نصب دی گئی۔ ایک قول یہ ہے: قَالُوْا سَلٰمًا یعنی انہوں نے آپ کو صحیح قول کے ذریعے مخاطب کیا۔ جس طرح فرمایا: وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ (الفرقان) یعنی صحیح بات۔ پس سَلٰمًا ان کے قول کا معنی ہے نہ کہ اس کا لفظ، ابن عربی نے اس کو اس کا معنی کہا اور اسی کو اختیار کیا۔ ابن عربی نے کہا (3): کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے جب لفظ کے ذکر کا ارادہ فرمایا تو بعینہ یہ فرمایا پس فرشتوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد:24) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ (الزمر:73) اور کہا گیا ہے: انہوں نے آپ کے لیے دعا کی اور معنی ہوگا سلمت سلاما، قَالَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 482
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1060

سَلٰمٌ اس کے رفع کی دو وجہیں ہیں: ایک مبتدا کے مضمر ہونے کے طور پر یعنی ھو سلام اور امری سلام اور دوسری (وجہ یہ ہے کہ) بمعنی سلام علیکم ہے جب اس کو تحیۃ کے معنی میں لیا جائے پس خبر کو مضمر کر دیا گیا اور سلام کو کثرت استعمال کی وجہ سے نکرہ ذکر کرنا جائز ہے۔ الف لام کو حذف کر دیا گیا جس طرح اللھم میں الف لام کو حذف کیا جاتا ہے اور سلم بھی پڑھا گیا ہے، فراء نے کہا: السلم اور السلام ایک ہی معنی میں ہیں جس طرح الحل اور الحلال (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ اَنْ بمعنی حتی ہے یہ بڑے بڑے نحویوں کا قول ہے، ابن عربی نے اسے بیان کیا۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی فما لبث حتی جاء یعنی بچھڑے کو لانے میں آپ نے سستی نہ کی۔ پس جب حرف جر کو حذف کیا گیا تو ان محل نصب میں باقی رہا۔ اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کی ہے اور ما نافیہ ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور فراء نے کہا: فما لبث مجیہ یعنی اس کا آنا سست نہ ہوا۔ پس ان محل رفع میں ہے اور لبث میں کوئی ضمیر نہیں جب کہ ما نافیہ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ما بمعنی الذی ہو اور لبث میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو (یعنی اس کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں) اور ان جاء، ما کی خبر ہو یعنی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلدی کیا وہ آپ کا بھنے ہوئے بچھڑے کو لانا ہے اور حنیذ بھنا ہوا۔ ایک قول یہ ہے: وہ پتھر کی گرمی کے ذریعے بھنا ہوا تھا آگ کا اس کو چھوئے بغیر۔

کہا جاتا ہے: حنذت الشاۃ احنذھا حنذا یعنی میں نے اسے بھونا، اور میں نے اس کے اوپر گرم پتھر رکھا تا کہ وہ اسے بھون دے پس وہ بھنا ہوا ہے۔ اور حنذت الفرس أحنذہ (کہا جاتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ تو اسے ایک یا دو چکر دوڑائے پھر اس کو دھوپ میں جل ڈال دے تا کہ اسے پسینہ آئے تو وہ محنوذ اور حنیذ کہلائے گا اور اگر اسے پسینہ نہ آئے تو اسے کبا کہا جائے گا۔ حنذ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے حنیذ سے مراد بال صاف کیا ہوا، بھنا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: حنیذ سے مراد پکا ہوا گوشت ہے اور حنیذ بمعنی محنوذ ہے اور آپ بچھڑا لائے کیونکہ آپ کے مال میں گائے زیادہ تھیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں مہمان کے آداب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی ضیافت میں جلدی کی جائے پس جو اس وقت موجود اور میسر ہو وہ پیش کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس کے علاوہ پیش کر دیا جائے اگر اس کو پیش کرنا ضروری ہو تو اسے اس چیز کا مکلف نہ بنایا جائے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ ضیافت مکارم اخلاق، آداب اسلام اور انبیاء وصلحاء کے اخلاق میں سے ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے آدمی ہیں جنہوں نے ضیافت کی جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر گیا۔

عام اہل علم کے نزدیک یہ واجب نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ "ضیافت تین دن ہے اور اس کا جائزہ ایک دن اور ایک رات ہے جو اس کے بعد ہے تو وہ صدقہ ہے" (2) اور جائزہ سے مراد عطیہ اور وہ صلہ ہے جس کی اصل استحباب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کی عزت کرنی چاہیے اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 82

2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے'' (1)۔ اور پڑوسی کا اکرام واجب نہیں تو ضیافت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم۔ لیث اس کے وجوب کی طرف گئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑتے ہوئے لیلۃ الضیف حق (2) اور دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے۔

اس سلسلہ میں جو ہم نے اشارہ کیا وہ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔ ابن عربی نے کہا (3): یہ بہت سارے لوگوں کا قول ہے: ضیافت کا وجوب ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ ضعیف ہے، کیونکہ وجوب ثابت نہیں اور ناسخ وارد ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اس میں فاستضفناھم فابوا ان یضیفونا فَلُدِغَ سیّد ذالك الحیی (4) الحدیث کے الفاظ ہیں یعنی ہم نے ان کا مہمان بننا چاہا تو انہوں نے ہمیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا تو اس گاؤں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ روایت اس بات میں ظاہر ہے کہ اگر ضیافت لازم ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضیافت سے انکار کرنے والے لوگوں کو ضرور ملامت فرماتے اور ان کے سامنے اس کو ضرور بیان فرماتے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے؟ امام شافعی اور محمد بن عبد الحکیم اس جانب گئے ہیں کہ اس کے مخاطب شہری اور دیہاتی لوگ ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: شہری لوگوں پر ضیافت نہیں۔ سحنون نے کہا: ضیافت صرف دیہاتیوں پر ہے جہاں تک شہریوں کا تعلق ہے تو شہروں میں مسافر ہوٹلوں میں آتے ہیں۔

انہوں نے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دلیل پکڑی انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ضیافت دیہاتی لوگوں پر ہے اور شہریوں پر نہیں''۔ یہ حدیث صحیح نہیں، ابراہیم بن اخی عبد الرزاق متروک الحدیث اور جھوٹ کی طرف منسوب ہے اور یہ روایت ان روایات میں سے ہے جن کو اس نے اکیلا روایت کیا ہے اور اس کی وضع کی طرف منسوب ہے۔ یہ ابو عمر بن عبد البر کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: ضیافت درحقیقت فرض کفایہ ہے، کسی آدمی نے کہا: یہ دیہاتوں میں واجب ہے جہاں کوئی کھانا اور ٹھکانا نہیں ہوتا، بخلاف شہروں کے کیونکہ یہ تو ٹھکانوں اور کھانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان کریم ہے اور ضیافت کرامت ہے، پس اگر وہ اجنبی ہو تو یہ فرض ہوگی (5)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت تھوڑی تھی پس حبیب نے حبیب کی طرف سے اس کا شکر ادا کیا۔ یہ قطعیت کے مقام پر ظنیت اور نقل کی جگہ قیاس کے ذریعے فیصلہ ہے، ان کو کہاں سے پتہ چلا کہ وہ تھوڑی تھی؟ بلکہ مفسرین نے نقل کیا کہ فرشتے تین تھے، جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور تین کی خاطر بچھڑا تو بہت زیادہ ہے، پس کتاب اللہ کی یہ تفسیر رائے کے ساتھ کیسی ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی امانت کی قسم! یہی وہ تفسیر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حق الضیف، جلد 2، صفحہ 906

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، ما جاء فی الضیافة، جلد 2، صفحہ 170 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1061

4۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارة، ما یعطی فی الرقیة علی أحیا، جلد 1، صفحہ 304 5۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1062

مذموم ہے پس اس سے اجتناب کرو، پس تم نے اس کو جان لیا(1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ سنت یہ ہے کہ جب مہمان کو کھانا پیش کیا جائے تو پیش کرنے والا کھانے میں جلدی کرے پس مہمان کی تکریم پیش کرنے میں جلدی کرنا ہے اور گھر والے کی تکریم اس کے قبول کرنے میں جلدی کرنا ہے۔ پس جب انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اجنبی خیال کیا، کیونکہ وہ عادت سے نکل گئے اور انہوں نے معمول کی مخالفت کی۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ بات ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود (نوک اور پر کے بغیر) تیروں کے ذریعے غور وفکر کرتے ہوئے گوشت کو کرید رہے تھے اور ان کے ہاتھ گوشت تک نہیں پہنچ رہے تھے تو آپ نے جب ان کی طرف سے یہ دیکھا تو **نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً** یعنی دل میں، اور ایک قول ہے: آپ نے محسوس کیا، وجوس سے مراد دخول ہے۔ شاعر نے کہا:

جاء البريدُ بقرطاسٍ يَخُبُّ به فأوجسَ القلبُ من قرطاسهٖ جزعًا(2)

**خِيْفَةً** یعنی دہشت زدہ ہونا اور وہ جب مہمان کو نہ کھاتے ہوئے دیکھتے تو اس کو برا سمجھتے تھے تو فرشتوں نے کہا: **لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ** ڈریے نہیں ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ کھانے کے آداب میں سے ہے کہ میزبان کو اپنے مہمان کے بارے میں دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ کھا رہا ہے یا نہیں؟ یہ کام توجہ اور اچٹتی نظر ڈالنے سے ہونا چاہیے نہ کہ نظر گاڑ دینے سے، بیان کیا گیا ہے کہ ایک بدوی نے سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ کھانا کھایا، سلیمان نے بدوی کے لقمے میں بال دیکھ لیا تو اسے کہا: بال کو اپنے لقمے سے ہٹائیے۔ اس (بدوی) نے کہا: کیا تو میری طرف اس آدمی کی طرح دیکھ رہا ہے جو میرے لقمے میں بال کو دیکھتا ہے؟ (یعنی اتنی توجہ سے دیکھ رہا ہے) اللہ کی قسم میں تیرے ساتھ نہیں کھاؤں گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: ذکر کیا گیا ہے کہ یہ قصہ ہشام بن عبدالملک کے ساتھ ہوا نہ کہ سلیمان کے ساتھ اور بدوی اس کے پاس سے یہ کہتا ہوا نکلا:

وللموتُ خيرٌ من زيارة باخلٍ يلاحظُ أطرافَ الأكيلِ على عَمْدِ

''موت بہتر ہے ایسے بخیل کی زیارت سے جو کھانے والے کی اطراف کو جان بوجھ کر ملاحظہ کرتا ہے''۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ** نكر بمعنی انکر ہے یعنی آپ نے ان کو نہ جانا، آپ کہتے ہیں: نكرتك وانكرتك واستنكرتك جب آپ اسے وعدہ خلافی پر پائیں۔ شاعر نے کہا:

وأنكرتني وما كان الذي نكرتْ من الحوادثِ إلا الشيبَ والصَّلَعَا

دونوں لغتوں کو جمع کر دیا گیا اور نکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھے اور انکرت اس کے لیے ہے جسے تو اپنے دل کے ساتھ دیکھے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ہود، جلد 3، صفحہ 1063 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 283

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ مبتدا اور خبر ہے یعنی وہ کھڑی فرشتوں کو دیکھ رہی تھی، کہا گیا ہے: وہ پردے کے پیچھے تھی۔ ایک قول یہ ہے: وہ فرشتوں کی خدمت کر رہی تھی اور آپ (ابراہیم علیہ السلام) بیٹھے تھے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: وہ کھڑی نماز پڑھ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں (1)۔ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ وھو قاعد ہے (یعنی آپ کی بیوی کھڑی تھی اور آپ بیٹھے تھے)

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَضَحِكَتْ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کو حیض آیا (2)، حالانکہ وہ آیسہ تھی، بشارت کو ثابت کرنے کے لیے، اس پر لغویوں نے شعر پڑھا:

وإنی لآتی العِرسَ عند طُهورها وأهجُرها یوماً إذا تَكُ ضاحِكًا

دوسرے نے کہا:

وضِحْكُ الأرانبِ فوق الصَّفَا كمثلِ دمِ الجوفِ یوم اللِّقاء (3)

اور عرب کہتے ہیں: ضحکت الأرنب جب اسے حیض آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ سے روایت ہے کہ یہ عربوں کے قول ضحکت الکافورہ سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اس گابھے کا چھلکا ہے جب وہ پھٹ جائے۔

بعض لغویوں نے کلام عرب میں ضحکت بمعنی حاضت ہونے کا انکار کیا ہے اور جمہور نے کہا: یہ ضحک معروف ہے اور اس میں ان کا اختلاف ہے۔ ایک قول ہے: وہ تعجب کا ہنسنا ہے ابوذؤیب نے کہا:

فجاءَ بمزجٍ لم یَرَ النّاسُ مثله هو الضَّحْكُ إلا أنه عمل النَّحْلِ (4)

مقاتل نے کہا: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف سے ہنسی اور تین آدمیوں کی جماعت کے سبب آپ سے لرز اٹھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے سو آدمی کے قائم مقام تھے۔ اس نے کہا: لغت میں ضحک سے مراد حیض لینا درست نہیں، ابوعبید اور فراء نے اس کا انکار کیا، فراء نے کہا: میں نے یہ کسی ثقہ آدمی سے نہیں سنا، یہ صرف کنایہ ہے۔ روایت میں ہے کہ فرشتوں نے بچھڑے پر ہاتھ پھیرا۔ آپ علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنی ماں کے پاس چلے گئے، اس وقت حضرت سارہ ہنسیں تو انہوں نے آپ (حضرت سارہ) کو اسحاق کی خوشخبری دی۔ کہا جاتا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے مہمانوں کی تکریم کا ارادہ کیا تو سارہ کو ان کی خدمت کے لیے کھڑا کیا، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ ہے یعنی وہ ان کی خدمت کے سلسلہ میں کھڑی ہوئی اور کہا جاتا ہے: قَآىِٕمَةٌ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی وجہ سے۔ فَضَحِكَتْ یعنی ان کے قول لَا تَخَفْ کی وجہ سے امن کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی۔ فراء نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہے: پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی تو وہ ہنس پڑی یعنی بچے کی وجہ سے خوش ہوتے ہوئے ہنسی اس حال میں کہ وہ بوڑھی تھی، اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ (ہنسنا) کس وجہ سے تھا۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں کئی اقوال ہیں: ان میں سے سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ جب انہوں نے نہ کھایا آپ علیہ السلام نے ان کو نہ پہچانا اور ان سے خوف زدہ ہوئے پھر جب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 484 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

انہوں نے کہا: آپ نہ ڈریئے اور انہوں نے آپ کو خبر دی کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں تو آپ اس وجہ سے خوش ہوئے، پس آپ کی بیوی بھی آپ کی خوشی کی وجہ سے خوش ہو کر ہنسی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس (سارہ) نے آپ کو کہا تھا میرا گمان ہے کہ یہ لوگ عنقریب ان پر عذاب لے کر آئیں گے پس وہ حضرت لوط علیہ السلام کو آپ سے ملا دے گا، پس جب فرشتے وہ لے آئے جو اس نے کہا تو وہ اس کی وجہ سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔ نحاس نے کہا: اگر اس کی سند صحیح ہے تو یہ حسن ہے۔ ضحاک دانتوں کا ظاہر ہونا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضحک چہرے کا روشن ہونا ہو آپ کہتے ہیں: رایت فلانا ضاحکا تو اس سے مراد ہے مشرقا اور أتیت علی روضة تضحك یعنی مشرقة، حدیث میں ہے ''اللہ تعالیٰ بادلوں کو بھیجتا ہے فیضحك احسن الضحك نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بجلی سے اس کے روشن ہونے کو ضحک بنا دیا۔ یہ کلام مستعار ہے۔ (اس میں استعارہ ہے) مکہ کے قراء میں سے ایک آدمی سے روایت ہے جس کو محمد بن زیاد اعرابی کہا جاتا ہے۔ فضحکت حا کے فتحہ کے ساتھ۔ مہدوی نے کہا: فضحکت میں حا کا فتح غیر معروف ہے اور ضَحِكَ يَضْحَكُ، ضَحْكا و ضِحكا و ضِحِكا و ضَحِكا چار لغتیں ہیں اور الضَّحْكة سے مراد ایک مرتبہ کا ہنسنا ہے۔ اسی سے کثیر کا قول ہے:

غَلِقت لضَحْكتِهِ رقابُ المال

یہ جوہری نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ابو اسید ساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی شادی کے ولیمہ میں دعوت دی۔ اس کی بیوی اس دن ان کی خدمت کرنے والی تھی حالانکہ وہ دلہن تھی۔ حضرت سہل نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا پلایا؟ کیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے رات کے وقت کھجوروں کا رس نکالا تور (برتن جس میں عربی پیتے تھے) میں، پس جب آپ نے تناول فرمایا تو اس نے وہی رس آپ کو پلایا(1)۔ امام بخاری نے اس کو روایت کیا ہے(2) اور اس کا عنوان باندھا باب قیام المراة علی الرجال فی العرس وخدمتهم بالنفس ہمارے علماء نے کہا: اس میں بیوی کا اپنی شادی کے موقع پر اپنے شوہر اور اس کے دوستوں کی خدمت کا جواز ہے۔ اور اس میں یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے اہل (بیویاں) کو اپنے نیک دوستوں کے سامنے پیش کرے اور ان سے ان (دوستوں) کی خدمت لے، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ پردہ کے نزول سے پہلے ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ طبری نے ذکر کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بچھڑا پیش کیا تو انہوں نے کہا: ہم کھانا بغیر قیمت کے نہیں کھاتے۔ تو آپ نے ان کو کہا: اس کی قیمت یہ ہے کہ تم اس کی ابتدا میں اللہ کا ذکر کرو اور اس کے آخر میں اس کی حمد کرو۔ جبریل امین نے اپنے اصحاب کو کہا: حق کی قسم اللہ نے اس کو خلیل بنایا(3)۔ ہمارے علماء نے کہا: انہوں نے نہ کھایا کیونکہ فرشتے نہیں کھاتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے اس بات کو آسان بنا دیا ہے کہ وہ جسم

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، اباحة النبیذ، جلد 2، صفحہ 168
2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حق اجابة الولیمہ، جلد 2، صفحہ 778
3۔ تفسیر طبری، سورۂ ہود، جلد 12، صفحہ 86

اور ہیئت کے اعتبار سے آدمی کی شکل اختیار کر لیں اس نے ان کے لیے کھانا کھانا بھی آسان بنا دیا ہو، مگر یہ کہ علماء کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو آدمی کی صفت پر بھیجا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضیافت کا مکلف بنایا یہاں تک کہ جب آپ نے توقف کو دیکھا اور ڈرے تو اچانک وہ آپ کے پاس خوشخبری لے آئے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ یہ (آیت) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کھانے کی ابتدا میں بسم اللہ اور اس کے آخر میں الحمدللہ ہم سے پہلی امتوں میں بھی مشروع رہا، اسرائیلیات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے کھانا تناول نہیں فرماتے تھے، جب کھانا حاضر ہوتا تو آپ کسی کو بھیجتے جو پوچھتا کہ آپ کے ساتھ کون کھانا کھائے گا؟ تو وہ ایک دن ایک آدمی کو ملا، جب وہ آپ کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے فرمایا: بسم اللہ پڑھو، آدمی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ اللہ کون ہے؟ آپ نے اسے فرمایا: میرے کھانے سے نکل جا، جب وہ نکل گیا تو آپ پر جبرئیل امین نازل ہوئے، اس نے آپ کو کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ اس کو اس کی ساری عمر اس کے کفر کے باوجود رزق دیتا رہا اور آپ نے ایک لقمہ کا بخل کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پریشان حال نکلے اس حال میں کہ اپنی چادر کو کھینچ رہے تھے اور فرمایا: لوٹ آ، اس نے کہا: میں نہیں لوٹوں گا یہاں تک کہ تو مجھے خبر دے کہ تو مجھے بغیر کسی سبب کے کیوں واپس لوٹا رہا ہے؟ آپ نے اس کو معاملہ کے بارے میں خبر دی۔ تو اس نے کہا: یہ کریم پروردگار ہے، میں اس پر ایمان لایا، اور وہ داخل ہوا اور اس نے بسم اللہ پڑھی اور حالت ایمان میں کھانا کھایا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ جب حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو حضرت سارہ نے خواہش کی کہ اس کا بھی بیٹا ہو اور وہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے مایوس ہو چکی تھی، تو انہوں نے ایسے بیٹے کی خوشخبری دی جو نبی ہوگا اور نبی کو پیدا کرے گا، تو یہ اس (سارہ) کے لیے خوشخبری تھی کہ وہ اپنے پوتے کو دیکھے گی۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ حمزہ اور عبداللہ بن عامر نے یعقوب نصب کے ساتھ پڑھا اور باقیوں نے اس کو مرفوع پڑھا۔

رفع اس معنی کی بنیاد پر ہوگا: ویحدث لها من وراء اسحق یعقوب یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل کی وجہ مرفوع ہو جو من میں عامل ہے گویا کہ معنی یہ ہوگا: وثبت لها من وراء اسحق یعقوب یہ جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، اور یہ حال کے مقام پر ہو، یعنی بشرها باسحق مقابلا له یعقوب اور نصب اس معنی پر ہوگی: ووهبنا لها من وراء اسحق یعقوب، کسائی، اخفش اور ابو حاتم نے اس بات کو جائز قرار دیا کہ یعقوب محل جر میں ہو اس معنی کی بنیاد پر وبشرناها من وراء اسحق بیعقوب۔ فراء نے کہا: جر جائز نہیں مگر حرف جر کے اعادے کے ساتھ، سیبویہ نے کہا اگر آپ کہیں مررت بزید أول من أمس وأمس عمرو تو یہ قبیح اور غلط ہوگا کیونکہ آپ نے مجرور اور جو اس کے ساتھ شریک ہے اور وہ واؤ ہے اس میں تفریق کر دی جس طرح آپ جار اور مجرور کے درمیان تفریق کرتے ہیں، کیونکہ جار اور مجرور کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی جار اور واؤ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝

''سارہ نے کہا: وائے حیرانی! کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے میاں ہیں یہ بھی بوڑھے ہیں، بلاشبہ یہ تو عجیب وغریب بات ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰوَیْلَتٰۤى زجاج نے کہا: اس کی اصل یا ویلتی ہے۔ یا کو الف سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ یا اور کسرہ سے زیادہ خفیف ہے، اس نے ویل کے ساتھ اپنے لیے بددعا کا ارادہ نہیں کیا بلکہ یہ ایک کلمہ ہے جو عورتوں کی زبان پر آتا ہے جب ان پر کوئی ایسی چیز طاری ہو جس سے وہ حیران ہوں، اور (سارہ) اس کی ولادت اور اپنے میاں کے بوڑھے ہونے کی وجہ سے حیران ہوئیں کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا، اور ہر وہ کام جو عادت سے خارج ہو وہ عجیب وغریب سمجھا جاتا ہے (1)۔ اور ءَاَلِدُ یہ استفہام ہے اس کا معنی تعجب ہے۔ وَاَنَا عَجُوْزٌ یعنی بوڑھی۔ ولقد عجزت تعجز عجزا و عجزت تعجیزا یعنی وہ بڑھاپے میں داخل ہوئی۔ اور عجوزۃ بھی کہا جاتا ہے۔ اور عجزت المراۃ جیم کے کسرہ کے ساتھ، (کہا جاتا ہے) جس کی سرین بڑھ جائے یہ عُجْزا اور عَجَزا دونوں طرح آتا ہے۔

مجاہد نے کہا: وہ ننانوے سال کی تھیں، ابن اسحاق نے کہا: وہ نوے سال کی تھیں، اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هٰذَا بَعْلِىْ یعنی میرا شوہر، شَیْخًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور اس میں عامل تنبیہ یا اشارہ ہے۔ وَّهٰذَا بَعْلِىْ مبتدا اور خبر ہے اخفش نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی کی قراءت میں وھذا بعلی شیخ ہے۔ نحاس نے کہا: جس طرح آپ کہتے ہیں: ھذا زید قائم۔ تو زید، ھذا سے بدل ہے اور مبتدا کی خبر کے قائم مقام ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھذا مبتدا اور زید قائم دونوں خبریں ہوں، سیبویہ نے حکایت کیا: ھذا حلو حامض اور کہا گیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک سو بیس سال کے تھے، ایک قول یہ ہے: سو سال کے تھے۔ مجاہد کے قول کے مطابق آپ حضرت سارہ سے ایک سال زائد عمر کے تھے، ایک قول یہ ہے کہ اس نے اپنے قول وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَیْخًا کے ذریعے عذر پیش کیا حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی اور ہاران بن ناحور بن شاروع بن ارغو بن فالغ کی بیٹی تھی، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی تھی۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ یعنی جس کی تم نے مجھے بشارت دی یہ عجیب وغریب بات ہے۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

''فرشتے کہنے لگے: کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ کے حکم پر؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے ابراہیم کے گھرانے والو! بے شک وہ ہر طرح تعریف کیا ہوا بڑی شان والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ جب اس نے کہا: وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَیْخًا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 486

اور حیران ہوئی تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اس کی قضا اور تقدیر سے اس کے تعجب کو ناپسند کیا، یعنی اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو بچہ عطا فرمائے اور وہ حضرت اسحاق ہے۔ اس آیت سے بہت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہ حضرت اسحاق سے عمر میں بڑے ہیں، کیونکہ حضرت سارہ کو بشارت دی گئی کہ اسحاق زندہ رہیں گے یہاں تک کہ ان سے یعقوب پیدا ہوں گے۔ عنقریب اس بارے میں گفتگو آئے گی اور اس کا بیان سورۃ صافات میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ مبتدا ہے اور خبر علیکم ہے۔ سیبویہ نے اس کو عَلَیْکُمْ کاف کے کسرہ کے ساتھ بیان کیا ہے یا کی مجاورت کی وجہ سے۔ کیا یہ خبر ہے یا دعا؟ اس کا خبر ہونا زیادہ شرافت وفضیلت کا باعث ہے، کیونکہ یہ ان کے لیے رحمت اور برکت کے حصول کا تقاضا کرتی ہے، معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور برکت تم پر بھیجی اے اہل بیت، اور اس کا دعا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی امید کی جاتی ہے اور بعد میں حاصل نہ ہوا۔ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ کی نصب اختصاص کی وجہ سے ہے۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے، ایک قول یہ ہے کہ ندا کی وجہ سے (منصوب ہے)

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی کی بیوی اہل بیت میں سے ہے، اس نے اس بات پر دلالت کی کہ انبیاء کی ازواج اہل بیت میں سے ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا ۝ (الاحزاب:33) اور عنقریب یہ آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سلام کی انتہاء وَبَرَكٰتُهٗ پر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں خبر دی۔ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ برکت سے مراد بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ ان برکات میں سے یہ بات ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین حضرت ابراہیم وسارہ کی اولاد تھے۔ مالک نے وہب بن کیسان ابی نعیم عن محمد بن عمرو بن عطا روایت کیا انہوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا، اس نے کہا: السلام علیک و رحمۃ اللہ وبرکاتہ، پھر اس نے اس کے ساتھ کچھ اور اضافہ کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اور اس وقت آپ کی بصارت چلی گئی تھی۔ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: وہ یمنی جس نے آپ کو چھپا دیا تھا، لوگوں نے آپ کو اس کا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا: بے شک سلام برکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(1) انہوں نے فرمایا: میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ کے صحابہ کی جماعت میں تھا، میں نے کہا: السلام علیکم، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمۃ اللہ بیس میرے لیے اور دس تیرے لیے۔ انہوں نے کہا: میں دوبارہ داخل ہوا، تو میں نے کہا: السلام علیکم و رحمۃ اللہ، آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ تیس میرے لیے اور بیس تیرے لیے۔ میں تیسری دفعہ داخل ہوا تو میں نے کہا، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ تو آپ نے فرمایا: وعلیك السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ تیس میرے لیے اور تیس تیرے لیے۔ میں اور آپ سلام میں برابر

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، کیف السلام، جلد 2، صفحہ 350

ہیں۔ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ یعنی تعریف کیا گیا شان والا۔ ان دونوں کو ہم (قرطبی) نے اسماء حسنیٰ میں بیان کر دیا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

''پھر جب دور ہو گیا ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف اور مل گیا انہیں مژدہ تو وہ ہم سے جھگڑنے لگے قوم لوط کے بارے میں۔ بے شک ابراہیم بڑے بردبار، رحم دل (اور) ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس بات کو رہنے دیجئے، بے شک آ گیا تیرے رب کا حکم۔ اور ان پر آ کر رہے گا عذاب جو پھیرا نہیں جا سکتا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ یعنی خوف، ارتاع عن کذا کہا جاتا ہے جب وہ خوف زدہ ہو۔ نابغہ نے کہا:

فارتاعَ من صَوتِ کَلّابٍ فباتَ لهُ طوعَ الشَّوامِتِ من خوفٍ و من صَرَدِ

وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یعنی اسحاق اور یعقوب کی۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے اس کو بشارت دی کہ وہ قوم لوط پر عذاب لائیں گے اور یہ کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں۔ یُجَادِلُنَا یعنی یجادل رسلنا وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ وہ اس کے حکم سے اترے۔ اس مباحثہ کو حمید بن ہلال نے جندب عن حذیفہ روایت کیا ہے اور یہ اس لیے تھا کہ جب ان (فرشتوں) نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ (العنکبوت: 31) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس میں پچاس مسلمان ہوں تو تم ان کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں آپ نے کہا: چالیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: تیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: بیس؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے کہا: اگر اس میں دس ہوں یا پانچ؟ حمید کو شک ہوا۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ قتادہ نے کہا، اسی کے قریب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وہ قوم جس میں دس مسلمان بھی نہ ہوں اس میں کوئی بھلائی نہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر اس (قوم) میں ایک مسلمان ہو تو تم اسے ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بے شک اس میں لوط ہے۔ انہوں نے کہا: ہم جانتے ہیں جو اس میں ہے ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ عبدالرحمن بن سمرہ نے کہا وہ چار لاکھ تھے۔ ابن جریج نے کہا: قوم لوط کی بستیوں میں چالیس لاکھ لوگ تھے۔ اخفش اور کسائی کا موقف یہ ہے کہ یُجَادِلُنَا (مضارع) جادلنا (ماضی) کی جگہ میں واقع ہے۔ نحاس نے کہا: جب یہ لما کے جواب میں ہے تو لازم تھا کہ ماضی ہوتا، تو مضارع کو ماضی کے قائم مقام بنا دیا گیا جس طرح شرط کو مضارع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا واجب ہوتا ہے تو

ماضی کے صیغہ کو اس کے قائم مقام بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک اور جواب بھی ہے کہ یُجَادِلُنَا حال کی جگہ ہو یعنی اقبل یجادلنا یہ فراء کا قول ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ، ''لاواہ حلیم'' کا معنی سورۂ براءت میں گزر چکا ہے اور منیب کا معنی لوٹنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اناب جب وہ لوٹے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے: الاواہ سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اس بات پر افسوس کرتے ہوئے جو قوم لوط کے ایمان میں سے فوت ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی قوم لوط کے بارے میں بحث کو چھوڑ یئے۔ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ یعنی اس کا عذاب ان کے لیے۔ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ یعنی ان پر نازل ہونے والا ہے۔ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ یعنی ان سے نہ ٹلنے والا اور نہ اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ﴿۸۰﴾
وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ
هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ
رَّشِیْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ
اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا
اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ
مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ
اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾
مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾

''اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس وہ دلگیر ہوئے ان کے آنے سے اور بڑے پریشان ہوئے ان کی وجہ سے اور بولے آج کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے اور (مہمانوں کی خبر سنتے ہی) آئے ان کے پاس ان کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اور اس سے پہلے ہی وہ کیا کرتے تھے برے کام۔ لوط نے کہا: اے میری قوم! (دیکھو) یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں پاک اور حلال ہیں تمہارے لیے تم خدا کا خوف کرو اور مجھے رسوا نہ کرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں، کیا تم میں ایک بھی سمجھ دار آدمی نہیں؟ کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ لوط نے (بصد حسرت) کہا: اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی۔ فرشتوں نے کہا: اے لوط! ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں

گے پس آپ لے کر نکل جایئے اپنے اہل وعیال کو جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی نہ دیکھے، مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جایئے۔ بے شک وہی (عذاب) اسے بھی پہنچے گا جو ان (دوسرے مجرموں) کو پہنچا۔ ان پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا نہیں صبح (بالکل) قریب؟ پھر جب آپہنچا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کی بلندی کو اس کی پستی اور ہم نے برسائے ان پر پتھر آگ میں پکے ہوئے پے در پے، جو نشان زدہ تھے آپ کے رب کی جانب سے اور نہیں (لوط کی) بستی (مکہ کے) ظالموں سے کچھ دور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ جب فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے نکلے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کے درمیان چار فرسخ (بارہ شرعی میل) کا فاصلہ تھا۔ (قوم) لوط کی دو بیٹیوں نے فرشتوں کو دیکھا اور وہ دونوں پانی بھر رہی تھی۔ اور ان دونوں نے خوبصورت شکل کو دیکھا۔ تو انہوں نے کہا: تم کون ہو؟ اور کہاں سے تم آئے؟ انہوں نے کہا: فلاں جگہ سے، ہم اس گاؤں کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اس کے رہنے والے فحش (کام کرنے والے) لوگ ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیا اس میں وہ شخص ہے جو ہمیں پناہ دے گا؟ انہوں نے کہا: ہاں، یہ شیخ ہے اور انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی ہیئت دیکھی تو آپ کو ان پر اپنی قوم (کی زیادتی) کا اندیشہ ہوا۔ سِیْٓءَ بِهِمْ یعنی ان کی آمد نے آپ کو پریشان کیا۔ کہا جاتا ہے: ساء یسوء تو یہ لازم ہوگا اور ساءہ یسوءہ تو یہ متعدی ہوگا۔ اور اگر آپ چاہیں تو سین کو ضمہ دے دیں کیونکہ اس کی اصل ضمہ ہے اور اصل میں یہ سوء سے سوی بھم ہے، واؤ کی حرکت سین کی طرف منتقل کر دی گئی اور واؤ کو یا سے بدل دیا گیا اور اگر آپ ہمزہ کو شد نہ دیں تو اس کی حرکت یا کو دے دیں اور کہیں: سی بھم تخفیف کے ساتھ اور تشدید کے ساتھ بھی ایک شاذ لغت ہے۔ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا یعنی ان کے آنے کے سبب آپ کا دل تنگ ہوا اور آپ نے اسے ناپسند کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ کی وسعت اور طاقت تنگ ہوگئی۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اونٹ چلتے وقت اپنے اگلے پیروں سے اپنے قدموں کی گنجائش کی پیمائش کرے اور جب اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بار لادا جائے تو وہ اس سے تنگ ہوتا ہے کمزور ہوتا ہے اور اپنی گردن کو کھینچتا ہے۔ پس ضیق الزرع، ضیق الوسع سے عبارت ہوگا۔ اور کہا گیا: یہ ذرعه القئی سے ہے یعنی وہ غالب آ گئی یعنی وہ کسی ناموافق چیز کو اپنے اندر روکنے سے تنگ ہو گیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا دل اس وجہ سے تنگ ہوا کہ آپ نے ان (فرشتوں) کی خوبصورتی کو دیکھا اور اس وجہ سے کہ آپ اپنی قوم کے فسق کو جانتے تھے۔ وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ یعنی شر میں سخت۔ شاعر نے کہا:

وأنك إلّا تُرضِ بكر بن وائلٍ يكنْ لكَ يومٌ بالعراقِ عصيبُ

''اور تو اگر بکر بن وائل کے ساتھ راضی نہ ہوا تو عراق میں تیرا دن بہت سخت ہوگا''۔

اور دوسرے نے کہا:

يومٌ عصيبٌ يَعصِبُ الأبطالا عَصْبَ القَوِيّ السَّلَمَ الطِّوالا

اور کہا جاتا ہے: عَصِیْبٌ اور عَصَبْصَبٌ کسی چیز کی کثرت کو ظاہر کرنا، یعنی ناگوار شر کا مجموعہ اور قد عصب (کہا جاتا ہے)

یعنی عصب بالشئ عصابۃ (جس سے مراد جماعت ہے) اس سے عصبۃ اور عصابۃ کہا جاتا ہے یعنی کلمہ کو جمع کرنے والے مراد اپنی ذات میں جمع کرنے والے ہیں۔ اور عصبۃ الرجل سے مراد اس کے ساتھ نسب میں جمع ہونے والے ہیں اور تعصبت لفلان یعنی میں اس کے عصبہ کی طرح ہو گیا۔ اور رجل معصوب سے مراد وہ آدمی ہے جس میں خلقت کا اجتماع ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ حال واقع ہو رہا ہے۔ یُهْرَعُوْنَ سے مراد یسرعون ہے یعنی وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ کسائی، فراء اور دیگر اہل لغت نے کہا: اهراع سے مراد ایسی تیزی ہے جس کے ساتھ خوف کی وجہ سے لاحق ہونے والی کپکپی ہو۔ کہا جاتا ہے: أهرع الرجل اهراعا یعنی اس نے جلدی کی سردی، غصے یا بخار سے کپکپی میں (1)، وهو مهرع۔

مہلہل نے کہا:

فجاءوا یُهْرَعون وهُمْ أسارَی نَقودُهُمْ علی رَغْمِ الأُنوفِ

ایک اور شاعر نے کہا:

بمعجلاتٍ نحوه مَهارِعِ

اور یہ اسی طرح ہے جیسے أُولِعَ فلان بالأمر، أُرعِدَ زید اور زُهِیَ فلان ہے یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ أهرع سے مراد اهرعه حِرصُه ہے یعنی اس کے لالچ نے اس میں جلدی کی۔ اس بنیاد پر یهرعون سے مراد ہے کہ وہ اس پر ابھارتے ہیں اور جس نے پہلے قول کے مطابق بات کی ہے اس نے کہا: اس کو سوائے اهرع الرجل یعنی اسرع کے سنا ہی نہیں گیا، یعنی اس کو مجہول ہی بیان کیا گیا ہے۔ ابن قوطیہ نے کہا: هُرِعَ الانسان هَرَعا، وأُهرِعَ یعنی وہ چلا اور اس نے جلدی کی۔ ہروی نے کہا: هُرِعَ الرجل و أُهرِعَ کہا جاتا ہے یعنی اسے ابھارا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور سدی نے کہا: یهرعون بمعنی یهرولون ہے۔ ضحاک نے کہا: یسعون کے معنی میں ہے۔ ابن عیینہ نے کہا: گویا کہ وہ دفاع کر رہے تھے۔ شمر بن عطیہ نے کہا: یہ تیز چلنے اور تیز دوڑنے کی درمیانی چال ہے۔ حسن نے کہا: دو چالوں کے درمیان کی چال ہے اور معنی قریب قریب ہے۔ ان کی تیزی کا سبب یہ تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی جب اس نے مہمانوں کو دیکھا اور ان کی خوبصورتی اور جمال کو دیکھا تو وہ نکلی یہاں تک کہ اپنی قوم کی مجلس میں آ گئی اور ان کو کہا کہ لوط علیہ السلام کے پاس آج رات ایسے نوجوان مہمان ہیں خوبصورتی میں ان جیسا نہیں دیکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔ تو اس وقت وہ تیز تیز آپ کی طرف آئے۔ اور ذکر کیا جاتا ہے کہ جب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے شہر پہنچے تو انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو کھیتی باڑی میں مصروف پایا۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی بیٹی کو نہر سدوم سے پانی بھرتے ہوئے پایا انہوں نے اس بیٹی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو ان کی ضیافت کرے بیٹی نے ان کی ہیئت کو دیکھا اور ان کے بارے میں قوم لوط سے ڈر گئی بیٹی نے کہا تم یہیں ٹھہرو، پھر اپنے باپ کی طرف گئی اور اسے خبر دی۔ تو انہوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آج رات آپ ہماری میزبانی کریں، آپ نے ان کو کہا: کیا تم نے اس قوم کے عمل کے بارے میں نہیں سنا؟

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 99

انہوں نے کہا: ان کا عمل کیا ہے؟ آپ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ زمین میں بدترین قوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرما دیا تھا کہ انہیں عذاب نہ دینا یہاں تک کہ حضرت لوط علیہ السلام چار مرتبہ ان کے خلاف گواہی دیں۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے یہ گفتگو کی۔ جبریل علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو کہا: یہ ایک (مرتبہ گواہی) ہے اور کلام ان کے درمیان چلا حتی کہ حضرت لوط علیہ السلام نے چار مرتبہ گواہی کو مکرر فرمایا پھر ان کو لے کر شہر میں داخل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مِنْ قَبْلُ یعنی فرشتوں کے آنے سے پہلے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے۔ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی مردوں کے ساتھ بدفعلی ان کی عادت تھی۔ جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کے مہمانوں کا قصد کیا تو حضرت لوط علیہ السلام دفاع کرتے ہوئے ان کی طرف گئے اور فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ آپ کے قول هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: آپ کی تین صلبی بیٹیاں تھیں، ایک قول ہے: دو بیٹیاں تھیں۔ زیتا اور زعوراء۔ ایک قول یہ ہے: ان کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی آپ نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: اس حالت میں آپ نے ان کو نکاح کا کہا اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ (ان کی شریعت میں) کافر کا نکاح مومن عورت کے ساتھ جائز تھا۔ یہ آغاز اسلام میں بھی جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابوالعاص بن ربیع سے فرمایا وحی سے پہلے اور وہ دونوں کافر تھے۔ اور ایک گروہ، جس میں مجاہد اور حضرت سعید بن جبیر ہیں نے کہا: آپ نے اپنے قول بناتی کے ذریعے تمام عورتوں کی طرف اشارہ کیا، کیونکہ قوم کا نبی ان کا باپ ہوتا ہے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عالیٰ عنہ کی قراءت سے تقویت ملی ہے۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب: 6) و هو أب لهم یعنی نبی مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی ازواج (مطہرات) ان کی مائیں ہیں اور وہ (نبی) ان کا باپ ہے۔ ایک گروہ نے کہا: یہ کام مدافعانہ تھا اور آپ نے اس کو نافذ کرنے کا ارادہ نہ فرمایا تھا، یہ قول ابوعبیدہ سے مروی ہے جس طرح اس آدمی کو کہا جاتا ہے جسے غیر کا مال کھانے سے روکا جاتا ہے، خنزیر تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ حلال ہے۔ عکرمہ نے کہا: آپ نے ان پر اپنی اور اپنی امت کی بیٹیاں پیش نہیں کی تھیں بلکہ یہ انہیں اس لیے کہا تھا تا کہ وہ واپس لوٹ جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی میں تمہاری ان سے شادی کر دیتا ہوں، جو تم چاہتے ہو اس میں سے وہ تمہارے لیے طاہر ہیں یعنی حلال ہیں۔ تطہر سے مراد ایسی چیز سے بچنا ہے جو حلال نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح دیا تو آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

اطہر میں الف تفضیل کے لیے ہے کہ یہ وہم پیدا ہو کہ مردوں کے ساتھ نکاح کرنا طاہر ہے بلکہ یہ آپ کے اس قول کی طرح ہے: اللہ اکبر و أعلی و أجل یعنی اللہ سب سے بڑا، سب سے بلند اور سب سے اجل ہے اگرچہ یہ ازروئے تفضیل کے نہیں، یہ جائز ہے اور کلام عرب میں عام ہے اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے بڑا نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ بڑا ہو۔ ابوسفیان بن حرب نے غزوۂ احد والے دن کہا: اعل هبل اعل هبل یعنی ہبل (بت کا نام) بہت بڑا ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کہہ دو اللہ تعالیٰ اعلیٰ اور اجل ہے(1)۔ اور ھبل کبھی بھی بلند اور جلیل نہیں ہوا''۔ عام قراء نے را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن اور عیسیٰ بن عمرو نے ھن اطھر پڑھا حال کی وجہ سے نصب کے ساتھ ھن ضمیر عماد (فصل) ہے۔ خلیل، سیبویہ اور اخفش نے یہاں ھن کے عماد ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ ضمیر عاد اس صورت میں ہوتی ہے جس میں کلام اس کے مابعد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا جیسے کان زید ھو أخالتا کہ اس کے ذریعے یہ استدلال کیا جاسکے کہ الاخ صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اور اس کے ذریعے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ کان کو خبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نے کہا: اس کے ذریعے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ خبر معرفتہ ہوتی ہے یا جو معرفتہ کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ یعنی تم میری توہین نہ کرو اور تم مجھے ذلیل نہ کرو۔ اسی سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ شعر ہے۔

فأخزاكَ ربی یا عتیبَ بن مالِكٍ		ولقاكَ قبل الموت إحدی الصَّواعقِ

مددتَ یمینًا للنبی تَعمُّدًا		ودَمَّیتَ فاهُ قُطِعتْ بالبَوارقِ

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خزایۃ سے ہو جس کا معنی حیا اور شرم ہے۔ ذوالرمۃ نے کہا:

خزایة أدرکته بعد جولتِهِ		من جانبِ الحبلِ مخلوطا بها الغضب

دوسرے شاعر نے کہا:

من البیضِ لا تَخزَی إذا الریحُ ألصقتْ		بها مِرْطَها او زایلَ الحَلْیُ جِیدَها

ضیف کا اطلاق واحد ہونے کے باوجود تثنیہ اور جمع پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

لا تَعدمی الدھرَ شِفار الجازِرِ		لِلضیفِ والضیفُ أحقّ زائر

اس میں تثنیہ اور جمع بھی جائز ہے اور پہلا اکثر آتا ہے جس طرح کہ تیرا قول: رجال صوم و فطر و زور روزہ دار آدمی، افطار کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے۔

اور خزی الرجل خزایۃً یعنی اس نے حیا کیا جس طرح کہ وہ ذلیل ہوا اور حقیر ہوا اور خزی خزیا کہتے ہیں جب کوئی رسوا ہو جائے، ان دونوں صورتوں میں مضارع تخزی ہی آتا ہے۔ پھر ان کو اپنے اس ارشاد کے ذریعے جھڑکا۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ یعنی سخت آدمی جو نیکی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، ایک قول یہ ہے: رشید، سے مراد ہدایت والا ہے۔ یا رشید بمعنی راشد یا بمعنی مرشد ہے یعنی صالح یا مصلح۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس سے مراد) مومن (ہے) ابو مالک نے کہا: برائی سے روکنے والا۔ ایک قول ہے: رشید بمعنی الرشد ہے۔ الرشد اور الرشاد سے مراد ہدایت اور استقامت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بمعنی مرشد ہو جس طرح حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 579

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ روایت ہے کہ قوم کے لوگوں نے آپ علیہ السلام کی بیٹیوں سے منگنی کی پس آپ نے ان کو رد کر دیا، اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جس عورت کی منگنی کو رد کر دیا ہو وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ مروی ہے کہ قوم لوط نے آپ کی بیٹیوں کے لیے پیغام نکاح بھیجا تو آپ نے انہیں رد کر دیا۔ پس کلام کی توجیہہ یہ ہوگی ہمارا تیری بیٹیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم نے ان کا قصد کیا ہے اور نہ ہی یہ ہماری عادت ہے کہ ہم اس کا مطالبہ کریں۔ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ مہمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً جب آپ نے ان کی گمراہی میں استمرار، اپنی کمزوری اور ان کے دفاع پر قادر نہ ہونے کو دیکھا تو تمنا کی کاش آپ ان کو روکنے کے لیے کسی مددگار کو پا لیتے، تو آپ نے گھبراہٹ اور عجز کے طور پر کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً یعنی انصار اور مددگار ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے آپ نے بیٹے کا ارادہ فرمایا۔ اور ان فعل مضمر کی وجہ سے محل رفع میں ہے جس کی تقدیر لو اتفق یا وقع ہے، اور یہ لو کے تابع آنے والے ان میں عام (قاعدہ) ہے۔ لو کا جواب محذوف ہے، یعنی لرددت اهل الفساد، یعنی میں فساد کرنے والوں کو ضرور ہٹا دیتا اور ان کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا۔ اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ یعنی میں پناہ لیتا اور مل جاتا۔ اَوْ اٰوِیَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قوۃ پر عطف کرتے ہوئے گویا کہ آپ نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیَ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ یعنی ان آوی ہے۔ ان مضمرہ کے ساتھ یہ منصوب ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی رکن سے مراد خاندان اور کثرت کے ساتھ رکاوٹ اور دفاع کرنے والے ہیں۔ ان کے فعل کی قباحت نے آپ کو اس قول تک پہنچا دیا اس کے باوجود کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت سے واقف تھے۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ فرشتوں نے جب ان کلمات کے کہتے وقت آپ علیہ السلام پر (رنج و غم) کو پایا تو انہوں نے کہا: بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک وہ رکن شدید کی پناہ کی خواہش کرتے تھے''(1)۔ الحدیث۔

سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو روایت کیا ہے(2) اور اس میں یہ اضافہ کیا ''اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر ان کی قوم کی ثروت میں''۔ محمد بن عمرو نے کہا: ثروت سے مراد کثرت اور قوت ہے، یہ حدیث حسن ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام پر ان کی قوم غالب آگئی اور انہوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اس حال میں کہ آپ اس کو روکے ہوئے تھے (اس وقت) فرشتوں نے آپ کو کہا: آپ دروازے سے ہٹ جائیے، آپ ہٹ گئے اور دروازہ کھل گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا تو ان کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھے ہو گئے اور الٹے پاؤں بھاگے یہ کہتے ہوئے: بچاؤ بچاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْیُنَهُمْ (القمر: 37) اور انہوں نے لوط کے مہمانوں کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام نے اپنا دروازہ بند کر دیا اور فرشتے آپ کے ساتھ گھر میں تھے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 478 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139

آپ اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور دروازے کے پیچھے سے انہیں قسمیں دلا رہے تھے اور وہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، جب فرشتوں نے ان کی طرف سے ملنے والی آپ علیہ السلام کی محنت، کرب اور تھکاوٹ کو دیکھا تو انہوں نے کہا: اے لوط! بے شک تیری پناہ گاہ بڑی مضبوط ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے، اور ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں، دروازہ کھول دیجئے اور ان کو اور ہم کو چھوڑ دیجئے۔ آپ نے دروازہ کھول دیا تو جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا جس طرح کہ گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے: جبریل علیہ السلام نے مٹھی بھر مٹی لی اور اس کو ان کے چہروں پر ڈال دیا، پس الله تعالیٰ نے اس مٹی کو قریب اور دور والوں کی آنکھوں تک پہنچا دیا پس الله تعالیٰ نے ان کی آنکھوں (بصارت) کو مٹا دیا، وہ رستے کو نہ پہچان سکے اور اپنے گھروں تک راہ نہ پا سکے اور کہنے لگے: بچاؤ بچاؤ بے شک لوط کے گھر ایسے لوگ ہیں جو روئے زمین پر سب سے زیادہ جادوگر ہیں۔ انہوں نے ہمارے اوپر جادو کر دیا اور ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اور کہنے لگے: اے لوط! جس طرح تو ہے یہاں تک کہ ہم صبح کر لیں تو تو دیکھ لے گا، وہ آپ کو دھمکیاں دینے لگے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ جب فرشتوں نے آپ علیہ السلام کی پریشانی، بے چینی اور مدافعت کو دیکھا تو انہوں نے آپ کو اپنا تعارف کرایا، پس جب آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ نے اپنی قوم کو داخلہ دے دیا۔ جبریل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر مارا پس وہ اندھے ہو گئے اور ان کے ہاتھوں پر مارا تو وہ خشک ہو گئے۔ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ یعنی کسی برائی کے ساتھ۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ اس کو فَاسْرِ بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہمزہ وصلی اور قطعی دونوں طرح، دونوں فصیح لغتیں ہیں۔ الله تعالیٰ نے فرمایا وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۞ (الفجر) اور فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى (بنی اسرائیل: 1) (پہلی آیت میں ہمزہ وصل جب کہ دوسری میں قطعی ہے)

نابغہ نے کہا: اس نے دونوں لغتیں جمع کر دی ہیں:

أسرت عليه من الجوزاء سارية　　تُزجي الشمالُ عليهِ جامِدَ البَرَدِ

ایک اور شاعر نے کہا:

حَيِّ النَّضِيرَةَ رَبَّةَ الخِدْرِ　　أَسْرَتْ إِلَيكَ ولم تَكُن تَسْرِي

یہ بھی کہا گیا ہے: فاسر ہمزہ قطعی کے ساتھ جب کوئی ابتدائی رات میں چلے اور سری جب کوئی رات کے آخری حصہ میں چلا ہو اور دن میں چلنے کے لیے صرف سار ہی آتا ہے۔ لبید نے کہا:

إذا المرءُ أَسْرَى ليلةً ظَنَّ أَنَّهُ　　قَضَى عملاً والمرءُ ما عاش عامِلُ

جب آدمی رات کے ابتدائی حصہ میں چلتا ہے تو اس کا گمان ہوتا ہے کہ اس نے کام پورا کر لیا حالانکہ آدمی جب تک زندہ ہے کام کرنے والا ہے۔

حضرت عبدالله بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

عند الصَّباحِ يَحْمَدُ القومُ السُّرَى　　وتَنجلِي عنهم غَيَاباتُ الكَرَى

بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رات کا کچھ حصہ (1)۔ ضحاک نے کہا: رات کا بقیہ حصہ۔ قتادہ نے کہا: رات کا ابتدائی حصہ گزر جانے کے بعد کا حصہ۔ اخفش نے کہا: رات کے آجانے کے بعد۔ ابن اعرابی نے کہا: رات کی کسی گھڑی میں۔ ایک قول یہ بھی ہے: رات کی تاریکی میں۔ ایک قول یہ ہے: رات کے سکون کے بعد۔ ایک قول ہے: رات کا حصہ، یہ تمام قریب قریب ہیں، ایک قول یہ ہے: یہ رات کا نصف حصہ ہے، یہ قطعہ نصفین سے ماخوذ ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ونائحةٍ تَنوحُ بِقِطعِ لیلٍ علی رجلٍ بقارعةِ الصَّعیدِ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سری کہتے ہیں رات کے وقت چلنے کو تو بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ نہ فرمایا ہوتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ یہ رات کے ابتدائی حصے میں ہوتا۔ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ یعنی تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے نہ دیکھے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا: تم میں سے کوئی بھی مال و اسباب میں سے جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے اس میں مشغول نہ ہو۔ اِلَّا امْرَاَتَكَ منصوب اور یہی قراءت معنی کے اعتبار سے واضح ہے، یعنی آپ رات کے وقت اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جایئے سوائے آپ کی بیوی کے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ..... اِلَّا امْرَاَتَكَ اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ.... اِلَّا امْرَاَتَكَ پس اہل سے اس کی استثنا ہے، اسی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ نہ نکلی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۳﴾ (العنکبوت) یعنی باقی رہ جانے والوں میں سے۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے اِلَّا امْرَاَتُكَ، اَحَدٌ سے بدل کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے اس قراءت کا انکار کیا ہے جن میں سے ایک ابو عبید ہیں۔ انہوں نے کہا یہ صرف یلتفت کے رفع کے ساتھ صحیح ہے اور یہ صفت ہے کیونکہ ابدال اور جزم کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عورت کی طرف توجہ اور التفات مباح ہے حالانکہ معنی اس طرح نہیں۔ نحاس نے کہا: ابو عبید اور ان کے علاوہ ابو عمرو جیسے لوگوں کی جانب ان کی جلالت شان اور عربی میں ذی مرتبہ ہونے کے باوجود ایسا ہونا ضروری نہیں۔

اَحَدٌ سے بدل ہونے کی وجہ سے اس کو مرفوع پڑھنا صحیح ہے، اس کی تاویل وہ ہوگی جو محمد بن ولید نے محمد بن یزید سے بیان کی ہے کہ جس طرح آدمی اپنے دربان کو کہتا ہے: لا یخرج فلان، فلاں نہ نکلے، تو نہی کا لفظ تو فلاں کے لیے ہے جب کہ اس کا معنی مخاطب کے لیے ہے اس کا مطلب یہ ہوگا لا تدعہ یخرج یعنی تو اس کو اس حال میں نہ چھوڑ کہ وہ نکلے۔ اس کی مثل آپ کا یہ قول بھی ہے: لا یقم احد الا زید اس کا معنی یہ ہوگا: میں نے ان کو کھڑا ہونے سے منع کیا سوائے زید کے، تو اس طرح نہی تو حضرت لوط علیہ السلام کو ہے جب کہ اس کے الفاظ دیگر لوگوں کے لیے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے ان کو اس بات سے روکا ہے کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہے سوائے آپ کی بیوی کے، یہ بھی جائز ہے کہ اس کی استثنا التفات کی نہی سے ہو کیونکہ یہ مکمل کلام ہے پھر معنی یہ ہوگا: تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ پیچھے دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اسے لے کر نکلے تو آپ نے رات کے وقت اپنے ساتھ نکلنے والے ساتھیوں کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 111

پیچھے مڑ کر دیکھنے سے منع فرما دیا، تو سوائے آپ کی بیوی کے کسی نے بھی پیچھے نہ دیکھا، اس نے جب عذاب کی سخت آواز کو سنا تو پیچھے دیکھا اور کہا: واقوماہ! پس ایک پتھر اسے آ لگا اور اس نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا یعنی عذاب سے۔ اِنَّهٗ کی ہ ضمیر سے مراد الامر اور الشان ہے یعنی فان الامر والشان والقصۃ، مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ جب فرشتوں نے کہا: اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ (العنکبوت: 31) کہ ہم اس گاؤں کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: ابھی ابھی، یعنی اپنی قوم پر اپنے غصے کی وجہ سے ان سے جلدی عذاب کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے کہا: اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ کیا صبح قریب نہیں ہے۔ عیسیٰ بن عمرو نے اس کو الیس الصبح پڑھا ہے۔ ب کے ضمہ کے ساتھ، یہ بھی ایک لغت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کو ان کی ہلاکت گاہ بنایا ہو، کیونکہ اس (صبح کے وقت) میں زیادہ ٹھہرے ہوئے اور جمع ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام طلوع فجر کے وقت اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر نکلے تو آپ کے ساتھ ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو فرشتوں نے آپ کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گاؤں فرشتوں کے سپرد فرما دیا ہے جن کے ساتھ بادلوں کے گرجنے کی آواز، بجلی کا کوندنا اور بادلوں کے گرجنے کی سخت آوازیں ہیں اور ہم نے ان کو کہہ دیا ہے کہ عنقریب حضرت لوط علیہ السلام نکلیں گے لہٰذا تم انہیں تکلیف نہ دینا اور اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ پیچھے نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی ان کی بیٹیاں پیچھے دیکھیں گی لہٰذا (اے لوط) جو کچھ آپ دیکھیں وہ آپ کو خوف میں مبتلا نہ کرے۔ پس حضرت لوط علیہ السلام نکلے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر زمین کو لپیٹ دیا یہاں تک کہ آپ نے نجات حاصل کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا، اَمْرُنَا سے مراد عذابنا ہے، یعنی ہمارا عذاب۔ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا اور یہ اس طرح ہوا کہ جبریل علیہ السلام نے قوم لوط کی بستیوں کے نیچے اپنے پر داخل فرمائے۔ اور وہ (بستیاں) پانچ تھیں، سدوم، یہ سب سے بڑی بستی تھی۔ عامورا، دادوما، وضعوہ اور قتم۔ تو ان (بستیوں) کو زمین کی سرحدوں سے اتنا اوپر اٹھالیا کہ وہ آسمان کے بالکل قریب ہوگئیں، یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے گدھوں کی رینگ اور ان کے مرغوں کی اذان سن لی، نہ کوئی گھڑا الٹا اور نہ کوئی برتن ٹوٹا پھر وہ اپنے سروں کے بل الٹے کر دیئے گئے اور ان پر پتھر برسائے۔ مقاتل نے کہا: چار (بستیوں) کو ہلاک کر دیا گیا اور ضعوہ بچ گئی۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے ان جیسا فعل کیا اس کا حکم رجم ہے، سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ تفسیر میں ہے اَمْطَرْنَا عذاب کے لیے اور مطرنا رحمت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک کلام عرب کا تعلق ہے تو اس میں مطرت السماء اور أمطرت السماء۔ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اس کو ھروی نے بیان کیا۔ سجیل کے بارے میں اختلاف ہے، نحاس نے کہا: سجیل (کا معنی) شدید اور کثیر ہے۔ سجیل اور سجین (دونوں ایک ہیں) لام اور نون اختین ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: سجیل سے مراد شدید ہے (1)، اس نے شعر کہا:

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 228

ضَرْبًا تَوَاصَى به الأبطالُ سِجِّينًا

نحاس نے کہا: عبداللہ بن مسلم نے اس کورد کیا اور کہا: یہ سجین ہے جب کہ وہ سجیل ہے تو اس کے ذریعے کیسے استشہاد کیا جا سکتا ہے؟ نحاس نے کہا: یہ رد لازم نہیں آتا کیونکہ ابوعبیدہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قرب کی وجہ سے لام، نون سے بدلا ہوا ہے، البتہ ابوعبیدہ کے قول کا ایک اور طریقہ سے رد کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر یہ آپ کے قول کے مطابق ہوتا تو پھر حجارۃ سجیلا ہوتا کیونکہ حجارۃ من شدید نہیں کہا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ شدید اصفت ہے۔ ابوعبیدہ نے فراء سے بیان کیا کہ ارحاء کے پتھر کو سجیل کہا جاتا ہے۔ محمد بن جہم نے ان سے حکایت کیا کہ سجیل ایسا کیچڑ ہے جسے پکایا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اَرحاء کی طرح ہوتی ہے۔ ایک گروہ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور ابن اسحاق ہیں نے کہا کہ سجیل غیر عربی لفظ ہے جس کو معرب بنایا گیا ہے، اس کی اصل سنج وجیل ہے اس کو ''سنک وکیل'' بھی کہا جاتا ہے یعنی جیم کی جگہ کاف کے ساتھ، اور یہ دونوں فارسی میں پتھر اور مٹی ہیں۔ عربوں نے ان کو معرب بنایا اور ان دونوں کو ایک ہی نام بنا دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: سجیل سے مراد مٹی ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ (الذاریات) حضرت حسن نے کہا: پتھروں کی اصل مٹی تھی پھر وہ سخت کر دیئے گئے۔ عربوں کے نزدیک ہر سخت چیز سجیل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد پکی اینٹیں ہیں۔ ابن زید نے کہا: ایسی مٹی جس کو پکایا گیا ہو حتیٰ کہ وہ پکی ہوئی اینٹ کی طرح ہو جائے۔ انہی سے روایت ہے کہ سجیل آسمان دنیا کا نام ہے۔ اس کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی نے ابوالعالیہ سے اس کو بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ منضود کے ساتھ اس کی صفت کا آنا اس کو رد کر دیتا ہے، عکرمہ سے ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے درمیان ہوا میں معلق سمندر ہے جس سے پتھر نازل ہوئے۔ ایک قول یہ ہے: یہ آسمان میں پہاڑ ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے اشارہ فرمایا: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور: 43) ایک قول یہ ہے کہ یہ سجل سے مشتق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دیا جو ان کو پہنچے گا۔ پس یہ سجین کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿٨﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٩﴾ (مطففین) یہ زجاج کا مختار قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ اسجلتہ سے فعیل کا وزن ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے چھوڑ دیا، گویا کہ وہ ان پر چھوڑی گئی چیز کی مثل تھے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ اسجلتہ سے مشتق ہے جب آپ کسی کو کوئی چیز عطا کریں (تو یہ بولا جاتا ہے) گویا کہ یہ عذاب تھا جو ان کو دیا گیا تھا، (شاعر) نے کہا:

مَنْ يُسَاجِلْنِى يُسَاجِلُ ماجِدًا　　يَمْلأُ الدَّلْوَ إلى عَقْدِ الكَرَب

اہل معانی نے کہا: پتھر اور مار میں سے جو چیز سخت ہو اسے سجیل اور سجین کہتے ہیں۔ ابن مقبل نے کہا:

ورَجْلَةٍ يضرِبون البَيْضَ ضَاحِيَةً　　ضَرْباً تَواصَى به الأبطالُ سِجِّينَا

**مَّنْضُوْدٍ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: (اس کا معنی ہے) پے درپے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے کسی چیز کا ایک دوسرے کے اوپر رکھنا۔ ربیع نے کہا: ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھا گیا یہاں تک کہ وہ ایک جسم ہو گئی۔ عکرمۃ نے کہا:

(منضود بمعنی) مصفوف ہے، بعض نے کہا: بمعنی مرصوص ہے دونوں کا معنی قریب قریب ہے۔ نضدت المتاع واللبن فھو منضود ونَضِیدٌ و نَضَدٌ کہا جاتا ہے جب آپ کسی چیز کو دوسری چیز پر رکھیں۔ (شاعر نے) کہا:

ورفَعْتَہٗ إلی السَّجْفَیْنِ فالنعضدِ

ابوبکر ہذلی نے کہا: (اس سے مراد) تیار شدہ ہے یعنی یہ اس عذاب میں سے تھا جو الله تعالیٰ نے اپنے ظالم دشمنوں کے لیے تیار فرما رکھا ہے۔ مُسَوَّمَۃً یعنی نشان زدہ یہ سیما سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، یعنی ان پر مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک قول یہ ہے: ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کو اس نے مارنا تھا۔ یہ زمین کے پتھروں سے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ فراء نے کہا: انہوں نے گمان کیا کہ سفیدی میں ان پتھروں پر سرخ اور سیاہ خطوط بنے ہوئے تھے پس یہی ان کی تسویم تھی۔ کعب نے کہا، ان پر سفید اور سرخ نشان لگے ہوئے تھے۔ شاعر نے کہا:

غلامٌ رماہ اللهُ بالحسنِ یافِعًا له سِیمیَا لا تَشُقُّ علی البَصَرْ

مُسَوَّمَۃً، حِجَارَۃً کی صفت ہے اور مَّنْضُوْدٍ، سِجِّیْلٍ کی صفت ہے۔ الله تعالیٰ کے ارشاد: عِنْدَ رَبِّكَ میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ زمین کے پتھروں میں سے نہیں تھے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ اس سے مراد قوم لوط ہے یعنی یہ سزا ان سے دور نہ تھی۔ مجاہد نے کہا: اس سے کفار قریش کو ڈرایا ہے معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پتھر (سزا) تیری قوم کے ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اس امت کے ظالم ہیں۔ قسم بخدا ان پتھروں سے الله تعالیٰ نے کسی ظالم کو نہ بچایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ مرد مردوں سے جنسی لذت حاصل کریں گے اور عورتیں عورتوں سے اور جب ایسا ہو تو تم قوم لوط کے عذاب کا انتظار کرنا کہ الله تعالیٰ ان پر سجیل کی کنکریاں برسائے گا''۔ پھر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ ایک اور روایت میں ہے۔ ''دن اور رات کا سلسلہ چلتا رہے گا حتی کہ اس امت کے مرد، مردوں کی پشت کو حلال کرلیں گے جیسا کہ انہوں نے عورتوں کی پشت کو حلال کرلیا ہے پھر امت کے ان لوگوں پر تیرے رب کی طرف سے سنگ باری ہوگی''۔ ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ یہ بستیاں ظالموں سے دور نہیں ہیں اور یہ شام اور مدینہ کے درمیان ہیں۔ ببعید اس وجہ سے مذکر آیا ہے کہ یہ بمکان بعید کے معنی میں ہے۔ پتھر برسانے کے بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھایا تو ان پر پتھر برسائے گئے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے جو اس وقت بستیوں میں نہ تھے بلکہ بستیوں سے باہر تھے۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۞ وَ یٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ﴿٨٧﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

”اور اہل مدین کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر اور نہ کمی کیا کرو ناپ اور تول میں، میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم خوشحال ہو اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اس دن کا عذاب نہ آجائے جو ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اور اے میری قوم! پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیئے سے وہی بہت ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان دار ہو۔ اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان، قوم نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں (از راہ تمسخر بولے) بس تم ہی ایک دانا (اور) نیک چلن رہ گئے ہو۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خود

تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں (نیز) نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے اور نہیں میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم! ہرگز نہ اکسائے تمہیں میری عداوت (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر) مبادا پہنچے تمہیں بھی ایسا عذاب جو پہنچا تھا قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور نہیں اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بے شک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے۔ وہ بولے: اے شعیب! ہم نہیں سمجھ سکتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے اور اگر تمہارے کنبہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا اور نہیں ہو تم ہم پر غالب۔ آپ نے فرمایا: اے میری قوم! کیا میرا کنبہ زیادہ معزز ہے تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے۔ اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت۔ بے شک میرا رب جو عمل تم کرتے ہو (اس کو اپنے علم سے) احاطہ کیے ہوئے ہے اور اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر (اور) میں (اپنے طور پر) عمل پیرا ہوں۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور جب آ پہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) تو ہم نے بچا لیا شعیب کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے اور آ لیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے تو صبح کی انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے۔ گویا کبھی وہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ہلاکت ہو مدین کے لیے جیسے ہلاک ہو چکے تھے ثمود"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا یعنی وأرسلنا إلى مدين ہم نے مدین کی طرف بھیجا، مدین حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مدین کہا گیا ہے جب کہ مراد بنو مدین ہیں۔ جس طرح مضر کہا جاتا ہے اور مراد بنو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ان کے شہر کا نام ہے اس لیے اس کی طرف ان کو منسوب کر دیا گیا۔ نحاس نے کہا: مدین غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ شہر کا نام ہے، سورۂ اعراف میں یہ معنی گزر چکا ہے اور کچھ اس سے زیادہ بھی۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (اس کی تفسیر) گزر چکی ہے۔ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ وہ اپنے کفر کے ساتھ کم تولنے والے تھے جب ان کے پاس کوئی کھانے کا سامان وغیرہ بیچنے والا آتا تو زائد وزن کے ساتھ اس سے لیتے، اپنی استطاعت کے مطابق وہ انتہائی وزن پورا کرتے اور ظلم کرتے تھے اور اگر کوئی کھانے کا سامان خریدنے کے لیے آتا تو وہ اس کو کم وزن کے ساتھ بیچتے اور اس کے ساتھ بخل کرنے میں انتہائی کوشش کرتے، تو انہیں شرک کا قلع قمع کر کے ایمان لانے اور کم تولنے سے روک کر پورا وزن دینے کا حکم دیا گیا۔ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ رزق میں وسعت اور نعمتوں کی کثرت مراد ہے۔ حضرت حسن نے کہا: ان کا بھاؤ سستا تھا (1)۔ وَ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 119

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ اللہ تعالیٰ نے یوم کی صفت احاطہ کے ساتھ بیان فرمائی حالانکہ اس دن کی احاطہ کے ساتھ صفت سے مراد ان (کفار) کا احاطہ ہے، کیونکہ عذاب کا دن جب ان کا احاطہ کرے گا تو عذاب ان (کفار) کا احاطہ کرلے گا یہ آپ کے قول یوم شدید کی طرح ہے یعنی وہ دن جس کی گرمی سخت ہوگی۔ اس عذاب کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے یہ آخرت میں جہنم کا عذاب ہے اور ایک قول ہے کہ یہ دنیا میں استیصال کا عذاب ہے (1) جب کہ ایک قول ہے کہ بھاؤ بلند ہو جانے (کا عذاب) ہے اس کا یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے ''ناپ اور تول میں جس قوم کا بھی کمی کرنا ظاہر ہوا اللہ تعالیٰ نے ان کو قحط اور مہنگائی میں مبتلا کردیا'' (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ کم تولنے سے روکنے کے بعد تاکیداً پورا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ ایفا سے مراد پورا کرنا ہے۔ بِالْقِسْطِ یعنی عدل اور حق کے ساتھ اور مقصود یہ ہے کہ ہر حصہ دار کو اس کا حصہ مل جائے کیل یا وزنی چیز کو پورا کرنا مراد نہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا: اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بلکہ مراد یہ ہے کہ معہود اور معین چیز کے حجم کو کم نہ کرو اسی طرح صنجات ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ یعنی جتنی چیز کے لوگ مستحق ہیں تم ان کو اس سے کم نہ دو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ ناپ، تول میں خیانت کرنا زمین میں فساد برپا کرنے تک پہنچا دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس سے کچھ مزید گزر چکا ہے۔ اور ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی عدل کے ساتھ حقوق کو پورا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کو باقی رکھا ہے وہ از روئے برکت کے زیادہ ہے اور ظلم و جبر کے ذریعے ناپ تول میں کمی کر کے جو کچھ تم اپنے لیے بچا لیتے ہو اس سے انجام کے اعتبار سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کا یہ معنی طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ سے مراد اس کی اطاعت ہے (3)۔ ربیع نے کہا: (اس سے مراد) اللہ کی وصیت ہے۔ فراء نے کہا: اللہ کی نگرانی (مراد ہے) ابن زید نے کہا: اللہ کی رحمت، قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: تمہارے رب کی طرف سے تمہارا حصہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے (4)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کا رزق تمہارے لیے بہتر ہے (5)۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ شرط لگائی گئی کیونکہ وہ اس کی صحت کو تبھی جان سکتے ہیں جب وہ ایماندار ہوں۔ ایک قول یہ ہے: یہ احتمال بھی ہے کہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے تو ان کو یہ خطاب فرمایا: وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی ایسا نگران جو تمہارے ناپ تول کے وقت تمہاری نگرانی کرتا ہو یعنی تمہاری طرف سے ہونے والے ہر معاملہ کو دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں حتی کہ میں حق کو پورا کرنے کے لیے تمہیں پکڑوں۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ میں اس بات پر تیار نہیں ہوں کہ تمہاری نافرمانی کی وجہ سے تمہارے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمتوں کو زائل ہونے سے بچا لوں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 121
5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 199

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ اس کو اَصَلٰوتُكَ مفرد بھی پڑھا گیا ہے۔ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ، ان محل نصب میں ہے۔ کسائی نے کہا: با کے مضمر ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے (1) اور عبادات پر مواظبت اختیار کرنے والے تھے خواہ فرائض ہوں یا نوافل اور آپ کہتے: نماز تمہیں بے حیائی کے کاموں اور گناہ سے روکتی ہے، جب آپ نے ان کو حکم دیا اور ان کو روکا تو انہوں نے نماز کی کثرت پر آپ کے استمرار کو دیکھ کر نکتہ چینی کی اور آپ کا مذاق اڑایا، انہوں نے کہا: اللہ نے ان کے بارے میں خبر نہیں دی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں صلاۃ بمعنی قراءت ہے (2)۔ یہ سفیان نے اعمش سے نقل کیا ہے، یعنی تیری قراءت تجھے حکم دیتی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ کافر تھے۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا نماز اور زکوٰۃ کو اس پر فرض کیا ہے (3)۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ فراء کا گمان ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: ''او تنهانا ان نفعل فی اموالنا ما نشاء'' سلمی اور ضحاک بن قیس نے أو ان تفعل فی اموالنا ما تشاء دونوں فعلوں میں تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: اے شعیب جو تو چاہتا ہے۔ نحاس نے کہا: اس قراءت کے مطابق أو أن کا پہلے أن پر عطف ہوگا۔ زید بن اسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا وہ ان دراہم کو کناروں سے کاٹنا ہے (4)۔

ایک قول یہ ہے: اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا معنی یہ ہے جب ہم کم تولنے پر باہم رضامند ہیں تو تو ہمیں اس سے کیوں روکتا ہے؟ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ان کی مراد یہ ہے کہ بزعم خویش (تم دانا اور نیک چلن ہو) ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۝ (الدخان) میں ابوجہل کی صفت بھی اسی کی مثل ہے یعنی بزعم خویش۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کو یہ ازراہ استہزاء و تمسخر کہا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ اسی (قبیل) سے ہے ان کا حبشی کو، ابو البیضاء کہنا (سفیدی کا باپ) اور سفید رنگ والے کو أبو الجون (سیاہی کا باپ) کہنا۔ اور اسی سے جہنم کے داروغوں کا ابوجہل کے لیے یہ قول ہے۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۝ (الدخان)

سفیان بن عیینہ نے کہا: عرب بعض اوقات کسی چیز کو اس کی ضد کے ساتھ متصف کرتے ہیں بدشگونی اور فال پکڑنے کے لیے۔ جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم اور فلاۃ (صحرا) کو مفازۃ (جنگل)، ایک قول یہ ہے: یہ تعریض ہے اس سے ان کی مراد گالی تھی۔ اور ان سب میں بہترین (تاویل) جس کی صحت پر ماقبل بھی دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ تم حقیقتاً دانا اور نیک چلن ہو تو تم ہمیں کیسے حکم دیتے ہو کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اس پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ جب انہوں نے آپ کی عبادت اور نماز کی کثرت کو دیکھا اور اس بات کو دیکھا کہ آپ دانا اور نیک چلن ہیں تو انہوں نے اس بات کا انکار کر دیا کہ آپ کو ان (بتوں) کو چھوڑ دینے کا حکم دیں گے جن کی عبادت ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ اور اس کا مابعد بھی اسی پر دلالت کرتا ہے یعنی قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا یعنی کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں؟ یہ سارے کا سارا اس بات

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 200 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 123

پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہ حقیقتاً کہا اور وہ آپ کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ معنی بنو قریظہ کے یہودیوں کی اس بات کی طرح ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہی جب آپ نے ان کو یا إخوة القردة(1) (اے بندروں کے بھائیو) کہا، تو انہوں نے کہا: اے محمد (ﷺ) ہم آپ کو جاہل نہیں سمجھتے تھے۔

**مسئلہ**۔ اہل تفسیر نے کہا: ان کو دراہم و دنانیر کو کاٹنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا(2)۔ اور اسی کام سے انہیں منع کیا گیا تھا وہ صحیح (دراہم و دنانیر) کی اطراف کو قینچی سے کاٹ لیتے تھے تاکہ کٹا ہوا حصہ ان کو بچ جائے۔ صحیح (دراہم و دنانیر) کے ساتھ گن کر جب کہ کٹے ہوؤں سے وزن کر کے باہم معاملات کرتے تھے اور وزن میں کمی کر دیتے تھے۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک نے کہا ہے: وہ دراہم و دنانیر کو توڑتے تھے(3)۔ متقدمین مفسرین کی ایک جماعت نے بھی یوں ہی کہا ہے(4) جن میں حضرت سعید بن میسب اور حضرت زید بن اسلم وغیرہ ہیں اور ان دونوں (دراہم و دنانیر) کا توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت علقمہ بن عبداللہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اس نے کہا: بغیر حرج کے مسلمانوں میں چلنے والے سکے کو توڑنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، کیونکہ جب تک یہ صحیح ہو تب تک اس کا مقصود بھی موجود ہے اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے اور جب اس کو توڑ دیا جائے تو یہ سامان (کی طرح) بن جاتا ہے اور اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے پس یہی چیز لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے لہٰذا یہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (النمل) کی تاویل میں کہا گیا ہے کہ وہ دراہم کو توڑتے تھے۔ یہ زید بن اسلم کا قول ہے۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: لوگوں کا گمان ہے کہ مدینہ میں محمد بن کعب قرظی کے بعد حضرت زید بن اسلم سے زیادہ تاویل قرآن کو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔

**مسئلہ**۔ اصبغ نے کہا حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم بن خالد بن جنادہ(5) جو زید بن حارث عتقی کا غلام تھا نے کہا: جس نے اس (دراہم) کو توڑا اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور اگر اس نے جہالت کا عذر پیش کیا تو یہ اس کا عذر نہ ہوگا اور یہ محل عذر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا کہ جہاں تک ان کے قول: لم تقبل شهادته(6) (اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی) کا تعلق ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اور کبیرہ گناہ عدالت کو ساقط کرتے ہیں جب کہ صغیرہ گناہ عدالت کو ساقط نہیں کرتے اور رہا ان کا قول کہ اس سلسلہ میں جہالت کا عذر قابل قبول نہیں تو یہ تو ایک واضح معاملہ ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں اور عذر تو صرف اس صورت میں قابل قبول ہوتا ہے جس میں صدق ظاہر ہو یا صدق کا سبب پوشیدہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ تو اس کو بندے کی نسبت زیادہ جانتا ہے جس طرح کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا۔

**مسئلہ**۔ جب یہ (قطع دراہم) ایسی نافرمانی اور فساد ہے جس کی وجہ سے شہادت رد کر دی جاتی ہے تو جو شخص ایسا کرے اس کو سزا بھی دی جائے گی۔ حضرت ابن میسب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جسے کوڑے مارے گئے تو آپ

---

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 35
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 122
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1064
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً

نے کہا: یہ کیا ہے؟ آدمی نے کہا: یہ دنانیر اور دراہم کو کاٹتا ہے، حضرت ابن مسیب نے کہا: یہ تو زمین میں فساد ہے(1) اور آپ نے اس کی کوڑوں (کی سزا) کا انکار نہ کیا، اسی طرح کا واقعہ سفیان سے بھی مروی ہے، ابوعبدالرحمٰن تجیبی نے کہا: میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا وہ اس وقت امیر مدینہ تھے تو آپ کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جو دراہم کو کاٹتا تھا اس کے خلاف شہادت قائم ہو چکی تھی تو آپ نے اس کو مارا، اس کا حلق کیا اور اسی حالت میں اس کو چکر لگوانے کا حکم دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ (چکر لگوانے والا) یہ کہے: یہ ہر اس آدمی کی سزا ہے جو دراہم کو کاٹتا ہے، پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کو آپ کے پاس واپس لایا جائے، تو آپ نے فرمایا: مجھے تیرا ہاتھ کاٹنے میں صرف یہ مانع ہے کہ آج کے دن سے پہلے میں نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کی، اس سلسلہ میں اب میں نے پہل کر دی ہے پس جو چاہے قطع ید بھی کرے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا(2): کوڑے کے ذریعے آپ کے ادب سکھانے میں تو کوئی کلام نہیں جہاں تک حلق کرنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں مارتا تھا اور حلق کرتا تھا اور میں ہر اس آدمی کے ساتھ ایسا کرتا رہوں گا جو اپنے بالوں کو نافرمانی پر معاون اور فساد کے سلسلہ میں ان کے ذریعے خوبصورتی کے حصول کا ذریعہ سمجھے گا۔ اور یہ (بالوں کا) کاٹنا نافرمانی کے ہر اس طریقے میں لازم ہے جو بدن میں غیر موثر ہو اور جہاں تک اس کا ہاتھ کاٹنے کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے چوری کے باب سے لیا ہے اور یہ سزا دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ہو نہ کہ ان کو توڑنے کی وجہ سے کیونکہ توڑنا تو وصف میں فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے جب کہ کاٹنا اس کی مقدار میں کمی کرنے کے مترادف ہے۔ تو یہ خفیہ طور پر مال لینا ہی ہوگا۔

**اگر یہ اعتراض کیا جائے:** کیا قطع ید کے سلسلہ میں حرز اصل نہیں؟ تو ہم نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خیال کرتے ہوں کہ مخلوق کے درمیان دینار یا درہم میں فرق کرنے کے لیے ان کی بناوٹ ہی ان کے لیے حرز ہے۔ اور ہر چیز کا حرز اس کی حالت کے مطابق ہوتا ہے اس کو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نافذ کیا اور آپ نے دنانیر اور دراہم کو کاٹنے کی وجہ سے ایک آدمی کا ہاتھ کاٹا۔ ہمارے مالکی علماء نے کہا(3): بے شک دنانیر و دراہم پر اللہ تعالیٰ کے نام کی مہریں ہیں اگر اہل تاویل کے قول کے مطابق اللہ کی مہر کو توڑنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ اس کا اہل تھا اور جس نے بادشاہ کے نام والی مہر کو توڑا تو اسے تادیبا سزا دی جائے گی۔

ابن عربی نے کہا: میرا خیال ہے کہ قطع ید دراہم کو کاٹنے کے سبب سے ہوگا ان کو توڑنے کی وجہ سے نہیں۔ میں اپنی ولایت کے زمانے میں یہی کرتا رہا ہوں مگر یہ کہ میں جہال کے ساتھ گھرا رہا۔ میں نے گمراہ حاسدین کی گفتگو کے سبب اس میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا پس اہل حق میں سے جو ایسا کر سکتا ہے اس کو اللہ سے اجر و ثواب کی امید کرتے ہوئے ایسا کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ** یہ گزر چکا ہے۔ **وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا** یعنی کھلا اور حلال۔ حضرت شعیب علیہ السلام کثیر المال شخص تھے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے۔ ایک قول یہ ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1064　　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1065　　3۔ ایضاً

اس سے مراد ہدایت و توفیق اور علم و معرفت ہے۔ کلام محذوف بھی ہے، یعنی افلا انھکم عن الضلال (کیا میں تمہیں گمراہی سے نہ روکوں) ایک قول یہ ہے: اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ کا معنی یہ ہے کہ کیا میں گمراہی کی اتباع کروں؟ ایک قول یہ ہے: اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ کا معنی ہے کہ کیا تم مجھے کم تولنے اور کسی کا حق گھٹانے کے سلسلہ میں نافرمانی کا حکم دیتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے غنی فرمایا ہے؟ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ، اُرید کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ یعنی میں ایسا نہیں کرتا کہ تم کو کسی کام سے روکوں اور خود اس کا ارتکاب کروں جس طرح میں اس کام کو چھوڑتا نہیں ہوں جس کو کرنے کا تمہیں حکم دوں۔ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ یعنی میں اصلاح کے کام کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ (میں یہ چاہتا ہوں) کہ تم عدل کے ذریعے اپنی دنیا کی اور عبادت کے ذریعے اپنی آخرت کی اصلاح کرلو۔

اللہ تعالیٰ نے مَا اسْتَطَعْتُ فرمایا کیونکہ کوئی کام سرانجام دینے کی شرط استطاعت ہے صرف ارادہ نہیں۔ ما مصدریہ ہے یعنی میں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اصلاح چاہتا ہوں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ یعنی میری ہدایت، توفیق سے مراد ہدایت ہے اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے بھروسا کیا۔ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ یعنی اپنے اوپر یہ تمام مصائب آنے کی صورت میں (اسی کی طرف) لوٹتا ہوں۔ ایک قول یہ ہے: آخرت میں اسی کی طرف لوٹوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ انابت سے مراد دعا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ اسی کی خاطر میں دعوت دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ یحییٰ بن وثاب نے يُجْرِمَنَّكُمْ پڑھا ہے۔ شِقَاقِيْۤ محل رفع میں ہے۔ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ محل نصب میں ہے، یعنی میری دشمنی تمہیں ایمان کو ترک کرنے پر نہ ابھارے ورنہ تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو تم سے پہلے کفار کے ساتھ ہوا یہ حضرت حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

يَجْرِمَنَّكُمْ کا معنی سورۂ مائدہ، شقاق اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ عداوت کے معنی میں ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ اسی سے اخطل کا یہ قول ہے:

اَلَا مَنْ مُبلِغٌ عنِیّ رسولا فکیف وجدتُمْ طَعْمَ الشِّقاقِ

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ شقاقی کا معنی اضراری ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی (فراق) میری جدائی ہے۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قوم لوط کی ہلاکت کے زمانے کے قریب تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ قوم لوط کے گھر تم سے دور نہیں (1) اصل میں بمکان بعید ہے اسی وجہ سے بعید کو واحد ذکر کیا گیا۔ کسائی نے کہا: یعنی ان کے گھر تمہارے گھروں میں (سے دور نہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ یہ اللہ سبحانہ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ہم (قرطبی) نے ان کو اپنی کتاب الاسنی فی شرح الاسماء الحسنی میں بیان کیا ہے۔ جوہری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202

نے کہا: جب آپ کسی کے ساتھ محبت کریں تو کہتے ہیں "وددت الرجل اودہ ودا" اور الوددد سے مراد محبت کرنے والا ہے الوَد، الوِد، الوُد اور المودۃ کا معنی محبت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ جب شعیب علیہ السلام کا ذکر ہوتا تو آپ فرماتے: "وہ انبیاء کے خطیب ہیں" (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ یعنی ہم نہیں سمجھتے، کیونکہ آپ بعث بعد الموت اور دوبارہ اٹھائے جانے میں سے غائب امور پر ہمیں ابھارتے ہیں اور آپ ہمیں ایسی نصیحتیں کرتے ہیں جیسی نصیحتوں کا ہمارے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے آپ کا کلام سننے سے اعراض برتتے ہوئے اور اسے حقیر سمجھتے ہوئے یہ بات کہی، فقه، يفقه کہا جاتا ہے جب کوئی فقہ کو سمجھے۔ کسائی سے فَقُه فَقْها اور فِقْها حکایت کیا گیا ہے جب کوئی فقیہ بن جائے۔

وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ نے کہا کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی بصارت کو مسئلہ تھا (2)۔ امام ثوری نے کہا: کہ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی نظر کمزور تھی (3)، ان سے نحاس نے حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہ کے قول کی مثل قول بیان کیا۔ نحاس نے کہا: اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ حِنیَر اندھے کو ضعیف کہتے ہیں یعنی اس کی بصارت جانے کی وجہ سے وہ ضعیف ہو گیا، جس طرح کہ اس کو ضریر کہا جاتا ہے یعنی اس کی بینائی جانے کے سبب اس کا نقصان ہو گیا۔ اسی طرح اس کو مکفوف بھی کہا جاتا ہے یعنی بینائی جانے کی وجہ سے وہ دیکھنے سے رک گیا۔ حضرت حسن نے کہا: اس کا معنی ضعیف البدن ہے یہ معنی علی بن عیسی نے بیان کیا ہے۔ سدی نے کہا: ضعیفا کا معنی وحیداً ہے یعنی اکیلا یعنی آپ کے پاس وہ لشکر اور معاون نہیں جن کے ذریعے آپ ہماری مخالفت کر سکیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد دنیا کے مصالح اور اہل دنیا کی سیاست کی معرفت کی کمی ہے۔ ضَعِيْفًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، آدمی کے رہط سے مراد وہ خاندان ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے اور جن کے ذریعے اسے تقویت ملتی ہے۔ اسی سے الراهطاء ہے جو کہ چوہے کے بل کو کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے وہ اعتماد حاصل کرتا ہے اور اسی میں اپنے بچوں کو چھپاتا ہے۔ لَرَجَمْنٰكَ یعنی ہم رجم کے ذریعے آپ کو قتل کر دیں گے وہ جب کسی آدمی کو قتل کرتے تو اسے پتھروں کے ساتھ رجم کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے رہط ان کی ملت کے لوگ تھے ایک قول یہ ہے: لَرَجَمْنٰكَ کا معنی ہے کہ ہم آپ کو برا بھلا کہیں گے۔ اس سے جعدی کا یہ قول ہے:

تراجمنا بمرّ القول حتیٰ　　نصیر کأننا فرسا رهانِ

رجم کا معنی لعنت بھی ہے اسی وجہ سے شیطان کو رجیم کہا جاتا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ یعنی آپ ہمارے اوپر غالب آنے والے نہیں نہ ہی جبر کرنے والے اور نہ روکنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ، اَرَهْطِيْۤ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کیا تمہارے دلوں میں میرا قبیلہ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اللہ سے زیادہ معزز ہے، زیادہ عزت والا اور زیادہ برتر ہے حالانکہ وہ تمہارا مالک ہے؟

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 568　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 202　　3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 126

وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا یعنی اللہ کے احکام میں سے (1) جو میں تمہارے پاس لایا ہوں انہیں تم نے پس پشت ڈال دیا ہے، تم نے انہیں اپنی پیٹھوں کے پیچھے ڈال دیا ہے، اور میری قوم کے ڈر سے تم مجھے قتل کرنے سے رک گئے ہو۔ جب کوئی آدمی کسی کام میں کوتاہی کرے تو جعلت أمرہ بظهرہ کہا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ان کے کرتوتوں سے مراد کفر اور معصیت وغیرہ ہیں۔ مُحِيْطٌ، مُحِيْطٌ بمعنی علیم ہے یعنی وہ جاننے والا ہے ایک قول کے مطابق محیط بمعنی حفیظ حفاظت کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ دھمکی اور وعید ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ ارشاد گزر چکا ہے۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ یعنی کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے ہلاک کر دے گا؟ من محل نصب میں ہے جیسے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ: 220) وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ معطوف علیہ ہے اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ عنقریب تم جان لوگے کہ ہم میں سے جھوٹا کون ہے؟ ایک قول یہ ہے: یہ محل رفع میں ہے، تقدیر عبارت یہ ہے يُخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ اور ایک قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے: من هو كاذب فسيعلم كذبه ويذوق وبال امرہ جو جھوٹا ہے عنقریب اپنے جھوٹ کو جان لے گا اور اپنے معاملے کے وبال کا مزہ چکھ لے گا۔ فراء کا خیال یہ ہے کہ وہ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ میں هُوَ ضمیر کو اس لیے لائے ہیں کیونکہ وہ من قائم نہیں کہتے بلکہ وہ من قام، ومن يقوم کہتے ہیں اور اگر من قائم کہنے کی ضرورت ہو تو من القائم کہتے ہیں، پس انہوں نے هو کا اضافہ اس لیے کر دیا تاکہ جملہ فعل یفعل کے قائم مقام ہو جائے۔ نحاس نے کہا: اس کے خلاف شاعر کا یہ شعر دلالت کرتا ہے:

مَنْ رَسُوْلِيْ إِلَى الثُّرَيَّا بِأَنِّيْ ضِقْتُ ذَرْعًا بِهَجْرِهَا وَالْكِتَابِ

وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ یعنی عذاب اور ناراضگی کا انتظار کرو، پس میں مدد اور رحمت کا منتظر ہوں۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا ایک قول یہ ہے: جبریل نے ایک چیخ ماری (2) تو ان کی روحیں ان کے جسموں سے باہر نکل آئیں۔ نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ چیخ سے مراد جبریل علیہ السلام کی چیخ ہے اور اخذت فعل مونث الصحیۃ کی وجہ سے لایا گیا ہے، جب کہ حضرت صالح علیہ السلام کے قصہ میں وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) میں فعل کی تذکیر الصیحۃ بمعنی الصیاح کی صورت میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوموں کے دو قوموں کو ایک عذاب سے ہلاک نہیں فرمایا، ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے کڑک کے ذریعے ہلاک فرمایا، صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو نیچے سے کڑک نے آلیا جبکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو اوپر سے۔ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ ابو عبد الرحمن سلمی نے كَمَا بَعُدَتْ ثَمُوْدُ عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف یہی ہے کہ جب کوئی ہلاکت ہو جائے تو بَعِدَ يَبْعَدُ بَعَدًا و بُعْدًا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 129 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 130

کہا جاتا ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے بعدت میں عین کو مضموم پڑھا تو یہ لغت خیر اور شر دونوں میں مستعمل ہے اور اس کا مصدر البعد ہے جب کہ بعدت بالخصوص شر میں استعمال ہوتا ہے۔ البعد جماعت کی قراءت کے مطابق لعنت کے معنی میں آتا ہے، بعض اوقات دو لغتوں کا معنی، معنی میں قربت کی وجہ سے جمع ہو جاتا ہے، تو یہ اس لفظ میں ہوتا ہے جس کا مصدر علی غیر لفظہ آتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور صریح غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے پیروی کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا۔ وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا روز قیامت اور لا ڈالے گا انہیں آتش (جہنم) میں۔ بہت بری داخل ہونے کی جگہ ہے جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور ان پر بھیجی جاتی رہے گی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی بہت برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اس نے نبی کو حجت قائم کرنے اور ہر قسم کی علت کو ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ بِاٰيٰتِنَا یعنی تورات کے ذریعے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد معجزات ہیں۔ وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ یعنی واضح حجت کے ساتھ اس سے مراد عصا ہے۔ سورۂ آل عمران میں سلطان کا معنی اور اس کا اشتقاق گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ، اَمْرَ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی شان اور حالت ہے حتی کہ انہوں نے اسے معبود بنالیا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ یعنی مضبوط حکم نہیں تھا کہ جو صحیح اور حق کی طرف لے جاتا۔ اور ایک قول کے مطابق برشید سے مراد بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے، یعنی وہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی وہ انہیں دوزخ میں لے کر جائے گا اور خود ان کا رئیس ہوگا۔ جب کوئی آگے آگے ہو تو قَدَمَهم يَقْدُمُهم قَدْمًا وقُدُومًا کہا جاتا ہے۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ یعنی وہ انہیں دوزخ میں داخل کرے گا۔ لفظ ماضی ذکر کیا گیا مگر معنی مضارع کا مراد ہے یعنی فیوردھم النار اور ایسا ہوتا رہتا ہے کیونکہ جس چیز کا وجود ثابت اور متحقق ہو وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہو چکی ہے، لہٰذا مستقبل کو ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ، الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ سے مراد المدخل المدخول ہے یعنی کتنی بری ہے داخل ہونے کی جگہ جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ اور بئست اس لیے نہیں کہا گیا کیونکہ کلام المورود کی طرف راجع تھا، اور یہ ایسے ہی ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: نعم المنزل دارك اور نعمت المنزل دارك اور المورود سے مراد وہ پانی ہے جس پر وارد ہوا جاتا ہے اور اسی طرح وہ مقام جس پر وارد ہوا جاتا ہے، یہ معنی مفعول ہے۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً یعنی دنیا میں (1) وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی ولعنۃ یوم القیٰمۃ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ کسائی اور ابو عبیدہ نے رَفَدْتُه أَرْفِد رَفْدًا حکایت کیا ہے یعنی میں نے اسے عطا کیا اور عطیہ کا اسم الرفد ہے، یعنی کتنی بری عطا اور اعانت ہے۔ اور الرفد بڑے برتن کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے، تقدیر عبارت ہوگی بئس الرفد رفد المرفود ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ الرفد را کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی برتن ہوتا ہے اور الرفد را کے کسرہ کے ساتھ ہو تو برتن میں جو شراب وغیرہ ہوتی ہے وہ مراد لی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ اصمعی سے نقل کیا ہے، گویا کہ وہ جہنم میں پینے کے لیے طلب کریں گے اس کے ذریعے اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے الرفد سے مراد زیادتی ہے۔ مراد یہ ہوگی کہ غرق ہونے کے بعد دوزخ کتنا برا اضافہ ہے جس میں وہ جائیں گے، یہ کلبی کا قول ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ﴿۱۰۴﴾ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ۙ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

''یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں آپ سے ان میں سے کچھ ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں اور نہیں ظلم کیا ہم نے ان پر بلکہ انہوں نے خود زیادتی کی تھی اپنی جانوں پر۔ پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے (جھوٹے) خداؤں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی جب آ گیا حکم آپ کے رب کا۔ ان دیوتاؤں نے تو فقط ان کی بربادی میں ہی اضافہ کیا اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو در آنحالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک (اور) سخت ہوتی ہے۔ بے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 133

شک ان واقعات میں (عبرت کی) نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے عذاب آخرت سے یہ وہ دن ہے جس دن اکٹھے کیے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا اور ہم نے نہیں مؤخر کیا ہے اسے مگر ایک مقرر مدت تک جو گنی ہوئی ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو (اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے، بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے اور بعض خوش نصیب۔ سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا پروردگار بے شک آپ کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور وہ جو خوش نصیب ہیں تو وہ (نعیم) جنت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا رب۔ یہ وہ عطا ہے جو ختم نہیں ہوگی۔ تو (اے سننے والے!) نہ ہو جا تو شک میں ان کے متعلق جن کی یہ پوجا کرتے ہیں۔ وہ نہیں پوجتے مگر ایسے ہی جیسے پوجتے تھے ان کے باپ دادا اس سے پہلے۔ اور ہم یقیناً پورا پورا دینے والے ہیں انہیں ان کا حصہ جس میں ذرا کمی نہیں ہوگی''۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ، ذٰلِكَ مبتدا کے مضمر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی الامر ذالك اور اگر آپ چاہیں تو اسے مبتدا ہونے کی حیثیت سے بھی مرفوع بنا سکتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا: یہ گزشتہ خبر ان بستیوں کی بعض خبروں میں سے جو ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں۔ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ حضرت قتادہ نے کہا(1): قائم سے مراد وہ ہیں جو برباد ہو چکی ہیں اور ان کے نشانات ہیں جب کہ حصید سے مراد وہ ہیں جن کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے: قائم سے مراد آباد ہیں (2) جب کہ حصید سے مراد بے آباد اور برباد ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: قائم سے مراد وہ ہیں جو اپنے ساز و سامان سمیت برباد ہو چکی ہیں اور حصید سے مراد کھیتی کی طرح کٹی ہوئی ہیں۔ شاعر نے کہا:

والناس فی قَسْم المنية بينهم   كالزرع منه قائِمٌ و حَصِيدٌ

لوگ اپنے اندر موت کی تقسیم میں کھیتی کی طرح ہیں اس میں سے کچھ ہے اور کچھ کٹی ہوئی ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

إنما نحنُ مثلُ خَامَةِ زَرْعٍ   فمتى يَأْنِ يَأْتِ مُحْتَصِدُهٗ

اخفش سعید نے کہا: حصید سے مراد محصود ہے یعنی فعیل بمعنی مفعول اور اس کی جمع حصدی اور حصاد آتی ہے جیسے مرضی اور مراض۔ اخفش ہی نے کہا: ذوی العقول کے لیے جمع حصدی آتا ہے جیسے قتیل اور قتلی۔ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ لغت میں ظلم کی اصل کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے جو اس کا مقام نہ ہو۔ سورۂ بقرہ میں یہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یعنی کفر اور گناہوں کے ذریعے۔ اور سیبویہ نے حکایت کہا ہے کہ ظلم ایاہ کہا جاتا ہے۔ فَمَاۤ اَغْنَتْ یعنی نہ دور کیا۔ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کلام میں حذف ہے، یعنی التی کانوا یدعون اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 134    2۔ ایضاً

یدعون کا معنی یعبدون ہے یعنی وہ عبادت کرتے تھے۔ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ، کا معنی خسارہ اور بربادی ہے(1)، یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ لبید نے کہا:

فقد بَلِيتُ وكلُّ صاحبِ جِدّةٍ لِبِلًى يَعُودُ و ذاكُمُ التَّتْبِيبُ

تَتْبِيْبٍ کا معنی ہلاکت، خسران اور بربادی ہے۔ آیت میں اضمار ہے، یعنی ما زادتهم عبادة الاصنام غير تتبيب مضاف کو حذف کر دیا گیا مراد یہ ہے کہ ان کے بتوں کی پوجا کرنے نے آخرت کے ثواب کو ضائع کر دیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى یعنی جس طرح قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیوں کو پکڑ لیا گیا اسی طرح تمام ان بستیوں کو پکڑا جائے گا جن کے باسی ظالم ہیں۔

عاصم جحدری اور طلحہ بن مصرف نے وكذالك أَخَذَ رَبُّكَ إذ اخذ القرى پڑھا ہے اور جحدری سے جماعت کی قراءت کی طرح وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى بھی مروی ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے وكذالك أَخَذَ رَبُّكَ إذ اخذ پڑھا ہے تو یہ گزشتہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کے سلسلہ میں جو عادت ہے اس کے متعلق خبر ہوگی اور معنی یہ ہوگا: اور اسی طرح تیرے رب نے ہلاک ہونے والی قوموں میں سے جس کو بھی پکڑا اسے پکڑا۔ اور جماعت کی قراءت اخذ کے مصدر ہونے کی بنیاد پر ہے اور معنی یہ ہے: اسی طرح تیرا رب جسے ہلاک کرنا چاہے اس کی پکڑ ہوتی ہے جب بھی وہ اسے پکڑ لے۔ اذ گزشتہ زمانے کے لیے آتا ہے جب کہ اذا مستقبل کے لیے آتا ہے۔ وَهِيَ ظَالِمَةٌ یعنی اس کے اہل ظالم ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا جیسے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) مراد واسأل اهل القرية ہے۔ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ یعنی مشرکین کو اس کی طرف سے ملنے والی سزا دردناک اور سخت ہے۔ صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے حتی کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا'' (2)۔ پھر آپ نے كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى کی تلاوت فرمائی۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً آیت سے مراد عبرت اور نصیحت ہے۔ لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ اس کے لیے جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ ذٰلِكَ يَوْمٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ مَّجْمُوْعٌ یوم کی صفت ہے۔ لَّهُ النَّاسُ مجموع کا نائب فاعل ہے، اسی وجہ سے مجموعون نہیں فرمایا گیا۔ اگر آپ الناس کو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع مانیں اور مجموع له کو بطور خبر تو پھر مجموعون ہونا چاہیے، کیونکہ له فاعل کے قائم مقام ہے اور جمع سے مراد حشر ہے یعنی اس دن کے لیے جمع کیے جائیں گے۔ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ یعنی نیک اور بدکار اس کی گواہی دیتا ہے اور آسمان والے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ دونوں اسماء اور ان کے علاوہ قیامت کے دیگر اسماء کو کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں کی وضاحت کی ہے۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ یعنی اس دن کو ہم مؤخر نہیں کریں گے اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ یعنی اس مدت کے لیے جس کے متعلق

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 135

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138۔ صحیح مسلم، تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 320

ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ ہمارے نزدیک معدود ہے۔

یوم یاتِ اس کو یَوْمَ یَاْتِ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ جب یا کا ماقبل مسکور ہو تو یا کو حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے آپ لا ادر کہتے ہیں۔ اس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ، ابو عمرو اور کسائی نے ادراج کی صورت میں یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں اسے حذف کر دیا ہے۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وقف و وصل دونوں صورتوں میں یوم یاتی یا کے اثبات کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اعمش اور حمزہ نے وقف و وصل میں بغیر یا کے یوم یات پڑھا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر وقف نہ کیا جائے اور یا کے اثبات کے ساتھ وصل کیا جائے۔ کیونکہ نحویوں کی ایک جماعت نے کہا ہے: یا کو حذف نہ کیا جائے اور بغیر جازم کے کسی چیز کو جزم نہ دی جائے، جہاں تک بغیر یا کے وقف کی بات ہے تو اس میں کسائی کا قول ہے۔ س نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل سالم پر مجزوم کی طرح وقف کیا جاتا ہے لہٰذا یا کو حذف کر دیا جائے گا جس طرح ضمہ کو حذف کر دیا جاتا ہے اور جہاں تک حمزہ کی قراءت کا تعلق ہے تو وصل وقف میں یا کے حذف پر ابو عبید نے دو دلیلیں ذکر کی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کو بغیر یا کے دیکھا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حکایت کی ہے کہ یہ ہذیل کی لغت ہے وہ ما ادر کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: ان کی جو مصحف عثمان رضی اللہ عنہ والی دلیل ہے یہ تو ایسی دلیل ہے جس کو اکثر علماء نے رد کیا ہے۔ حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: میں نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو مجھے کہا گیا کہ وہ تو چلا گیا ہے اور جہاں تک ما ادر کے ان کے قول کے ذریعے دلیل پکڑنے کی بات ہے تو اس میں کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس حذف کو تو قدیم نحویوں نے حکایت کیا ہے، اس کی علت بھی ذکر کی ہے اور اس پر اس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ فراء نے یا کے حذف پر شعر بھی پڑھا ہے:

كَفَّاكَ كَفٌّ ما تُلِيقُ درهما    جودًا وأخرى تُعْطِ بِالسَّيْفِ الدَّمَا

اس میں تعط اصل میں تعطی ہے اور سیبویہ اور خلیل نے حکایت کی کہ عرب لا ادر کہتے ہیں یا کو حذف کرتے ہیں اور کسرہ کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں مگر ان کا خیال یہ ہے کہ یہ کثرت استعمال کی وجہ سے ہے۔ زجاج نے کہا: نحو میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ یا کو ثابت رکھا جائے۔ انہوں نے کہا: جو اس کو مصحف کا اتباع اور قراء کا اجماع خیال کرتا ہے، (تو اس اعتبار سے بھی) کیونکہ قراءت سنت ہے اور اس طرح بھی کلام عرب میں وارد ہوا ہے۔ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اصل تتکلم ہے تخفیفاً ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کلام میں اضمار ہے، یعنی لا تتکلم فیہ نفس الا بالما ذون فیہ من حسن الکلام اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی دلیل کے بارے میں گفتگو کر سکے گا اور نہ ہی شفاعت کے متعلق۔

ایک قول یہ ہے کہ حشر میں اس کی اجازت کے بغیر ان کے لیے ایک ایسا وقت ہوگا جس میں اس کی اجازت کے بغیر ان پر کلام کرنے کی ممانعت ہوگی۔ اور یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں دین میں ملحد اکثر سوال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات) کیوں کہا گیا ہے حالانکہ قیامت کے ذکر میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الصافات) کہ وہ

ایک دوسرے کی طرف ملامت کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (النحل: 111) جس دن ہر نفس اپنے بارے میں جھگڑتے ہوئے آرہا ہوگا۔ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ (الصافات) اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی۔

فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ (الرحمٰن) تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ وہ ایسی حجت کے بارے میں نہیں بولیں گے جو انہیں لازم ہوگی بلکہ صرف اپنے گناہوں کے اقرار، ایک دوسرے کو ملامت کرنے، اور ایک دوسرے پر گناہ کا الزام ڈالنے کے حوالے سے گفتگو کریں گے البتہ انہیں حجت اور دلیل کے متعلق گفتگو اور کلام کی اجازت نہیں ہوگی۔

اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے ایک آدمی اکثر آپ کو مخاطب کرتا ہو اور اس کا خطاب حجت ودلیل سے خالی ہو تو اسے آپ کہتے ہیں: تو نے کوئی کلام کیا ہی نہیں، تو بولا ہی نہیں۔ لہٰذا جو آدمی بغیر حجت ودلیل کے بولا اسے کہا گیا کہ وہ بولا ہی نہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: وہ دن بہت لمبا ہوگا اور اس میں ٹھہرنے کے لیے کئی مقامات ہوں گے، جن میں سے بعض میں گفتگو کی ممانعت ہوگی اور بعض مقامات میں اجازت ہوگی۔ پس یہ صورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوئی نفس اس کی اجازت کے بغیر کلام نہیں کرے گا۔ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ یعنی نفوس میں سے یا لوگوں میں سے کچھ بدنصیب ہیں اور کچھ سعادت مند۔ الله تعالیٰ نے انہیں کو اپنے ارشاد یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ میں ذکر فرمایا ہے۔ شقی وہ ہے جس پر بدنصیبی لکھ دی گئی ہو اور سعید وہ ہے جس پر سعادت لکھ دی گئی ہو۔ لبید نے کہا:

فمنهم سعيدٌ آخذ بنصيبه ومنهم شقيٌّ بالمعيشةِ قانع

ان میں سے کوئی سعادت مند ہے جو اپنا حصہ وصول کر رہا ہے اور کوئی بدنصیب ہے زندگی پر قناعت کرنے والا ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: جب یہ آیت فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ نازل ہوئی تو میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میں نے عرض کی: اے الله کے نبی! ہم کس چیز کے مطابق عمل کرتے ہیں؟ کیا اس کے مطابق جن کاموں سے فراغت ہو گئی ہے یا جن سے فراغت نہیں ہوئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ جس چیز سے فراغت ہو گئی ہے(1)، اے عمر اس کے مطابق قلم لکھ چکے ہیں لیکن جس کے لیے بندے کو پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے''۔ هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه۔ ہم اس کو صرف حضرت عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہی جانتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا یہ مبتدا ہے۔ فَفِی النَّارِ یہ محل خبر میں ہے اور اسی طرح لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ابو العالیہ نے کہا: زفیر سینے سے (نکلی ہوئی آواز) ہے(2) اور شهيق حلق سے (نکلی ہوئی آواز) ہے۔ انہیں سے اس کے برعکس بھی مروی ہے۔ زجاج نے کہا: زفیر رونے کی شدت میں سے ہے اور شهيق بہت زیادہ بلند آواز سے رونے کی آواز ہے۔ زجاج ہی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 138، حدیث نمبر 3036، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139

نے کہا ہے: کوفی اور بصری اہل لغت کا خیال یہ ہے کہ زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز ہے اور شہیق اس کی آخری آواز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے برعکس ارشاد فرمایا ہے: آپ نے فرمایا زفیر سخت آواز جب کہ شہیق کمزور آواز ہے (1)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا: زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز کی طرح ہے اور شہیق اس کی آخری آواز ہے جب وہ ہینگنا ختم کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

حَشْرَجَ فی الجوفِ سَحِیلًا أو شَهَقْ    حتی یُقالَ ناهقٌ وما نَهَقْ

سحیل اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھے کے سینے میں گھومتی ہے اور شہق حلق سے نکلی ہوئی آواز ہے۔

ایک قول یہ ہے: زفیر سانس کا نکلنا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیٹ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو سانس کے ذریعے وہ نکلتا ہے اور شہیق اس کا واپس لوٹانا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: زفیر شدت غم سے سانس کو لوٹانا ہے یہ زفر سے ماخوذ ہے اور یہ پیٹھ پر بوجھ ہے اور شہیق لمبا کھنچا ہوا سانس ہے۔ یہ عربوں کے قول جبل شاهق سے ماخوذ ہے، یعنی لمبا اور بلند پہاڑ اور زفیر اور شہیق دونوں پریشان لوگوں کی آوازوں میں سے ہیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ، مَا دَامَتِ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مراد دوام السموات والارض ہے اور تقدیر وقت ذالك ہے یعنی اس کا وقت آسمانوں اور زمین کا دوام ہے۔ اس کی تاویل میں اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا جس میں ضحاک بھی ہیں: معنی یہ ہے کہ جب تک جنت و دوزخ کے آسمان اور ان کی زمینیں ہیں۔ السماء ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تیرے اوپر ہے اور تیرے اوپر سایہ کیے ہوئے ہیں اور الْاَرْضُ جس پر تیرے قدم قرار حاصل کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے: وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (زمر: 74) اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: ان سے مراد دنیا کے آسمان و زمین ہی ہیں اور عربوں کی عادت کے مطابق کسی چیز کے دوام اور ابدیت کے متعلق خبر دی جا رہی ہے۔ جس طرح ان کا قول: میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا جب تک رات ہے، یا پانی بہہ رہا ہے، جب تک رات اور دن کا اختلاف ہے، جب تک کبوتری کی آواز ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں، اور اس جیسے دیگر جملے جن سے وہ لامتناہی اور لمبا وقت مراد لیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آسمانوں اور زمین کے زوال کے ذریعے خبر دی مگر کفار کے ہمیشہ اس میں رہنے کی خبر دے دی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیدا ہونے والی تمام چیزوں کی اصل عرش کے نور سے ہے (3)، اور آخرت میں آسمان اور زمین اسی نور کی طرف واپس لوٹ جائیں گے جس نور سے انہیں لیا گیا تھا، لہٰذا یہ دونوں عرش کے نور میں ہمیشہ دائمی ہیں۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ استثنا منقطع ہے، اس کے بارے میں دس اختلافی اقوال ہیں۔ پہلا قول

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139    2۔ ایضاً    3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 208

یہ ہے کہ یہ فَفِی النَّارِ سے استثنا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سوائے اس کے کہ تیرا پروردگار کسی قوم سے اس کو مؤخر کرنا چاہے۔ اس قول کو ابونضرہ نے حضرت ابوسعید خدری یا حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے من شاء نہیں فرمایا کیونکہ مراد تعداد ہے اشخاص نہیں، جس طرح نکاح کے باب میں ما طاب لکم فرمایا جتنی تمہیں پسند آئیں۔ ابونضرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے۔ ''مگر جن کو چاہے اللہ تعالیٰ داخل نہ کرے اگرچہ وہ نافرمانی کی وجہ سے بدنصیب ہی کیوں نہ ہوں''۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ استثنا نافرمان مومنین کے لیے ہے کہ انہیں دوزخ میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نکال لیا جائے گا۔ اس اعتبار سے فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا کفار اور نافرمان مومنوں کے لیے عام حکم ہوگا اور خالدین سے ہی استثناء ہوگی۔ یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور ابوسنان وغیرہ کا قول ہے۔ صحیح میں حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے حتی کہ جب وہ راکھ اور کوئلہ ہو جائیں گے تو انہیں اس سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ جہنمی ہیں''۔ سورۃ النساء میں یہ گزر چکا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ استثنا زفیر اور شہیق سے ہے، یعنی ''لهم فیها زفیر و شهیق الا ما شاء ربك'' ان کے لیے زفیر اور شہیق ہے مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا ان کے لیے عذاب کی وہ اقسام ہوں گی جن کو اللہ نے ذکر نہیں کیا، اسی طرح اہل جنت کے لیے وہ نعمتیں ہوں گی جن کا اس نے ذکر کیا اور جن کا ذکر نہیں کیا۔ اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے۔

چوتھا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اس میں نہ وہ مریں گے (2)، اور نہ ہی انہیں اس سے نکالا جائے گا۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اور وہ یہ ہے کہ وہ آگ کو حکم دے گا تو وہ انہیں کھا جائے گی اور فنا کر دے گی، پھر اللہ تعالیٰ دوبارہ نئے سرے سے ان کی تخلیق فرمائے گا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول کافر کے ساتھ خاص ہے اور اس کے لیے کھانے اور نئی تخلیق میں استثنا ہے۔

پانچواں: الا بمعنی سوی ہے جس طرح آپ کلام میں کہتے ہیں: ما معی رجل إلا زید اور لی علیك الفا درهم الا الالف التی لی علیك میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں سوائے زید کے اور میرا تیرے اوپر دو ہزار درہم ہے سوائے اس ایک ہزار کے جو میرا تیرے اوپر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تک آسمان اور زمین ہیں سوائے اس کے کہ جتنا تیرا رب خلود میں سے چاہے گا۔

چھٹا: یہ اخراج سے استثنا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ انہیں جہنم سے نکالے، جس طرح آپ گفتگو میں کہتے ہیں: أردتُ أن أفعل ذالك إلا إن شاء غیرہ اور حال یہ ہے کہ آپ اس فعل پر قائم ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر اس نے انہیں نکالنا چاہا تو وہ انہیں نکال لے گا لیکن اس نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ دو قول زجاج نے اہل لغت سے نقل کر کے ذکر کیے ہیں، اور کہا کہ اہل معانی کے دو اور قول بھی ہیں: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی ان کی قبروں کے سرہانے پر ان کے موقف کی مقدار میں سے اور محاسبہ کے لیے، اور دنیا اور برزخ میں ان کے ٹھہرنے کی مقدار اور

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 505
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 142

حساب کے لیے وقوف کی مقدار میں سے جتنا تیرا پروردگار چاہے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ استثنا کا وقوع نعمت اور عذاب پر زیادتی میں ہے تقدیر یہ ہوگی: وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا تیرا پروردگار چاہے گا اہل جنت کے لیے نعمتوں کی زیادتی اور اہل دوزخ کے لیے عذاب کی زیادتی میں سے۔

میں (قرطبی) نے کہا: دنیا میں آسمان اور زمین کے ہونے کی مدت کی مقدار خلود سے زیادتی میں یہ استثنا ہے اور اس کو ترمذی حکیم ابو عبد اللہ محمد بن علی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار وہ جہنم میں رہیں گے، اور یہ دنیا کی موت ہے جب کہ آسمان اور زمین کے لیے ایسا وقت بھی ہے جس میں یہ تبدیل ہو جائیں گے، اللہ کا ارشاد ہے: یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ (ابراہیم: 48) اس دن زمین دوسری زمین سے تبدیل کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی اور ان کے عامل پیدا کیے، ان میں سے کچھ کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خریدا، اور اس پر میثاق والے دن ان سے عہد لیا، جس نے عہد پورا کیا اس کے لیے جنت ہے، اور جو اپنی جان لے کر چلا گیا وہ دوزخ میں آسمان اور زمین کے دوام کی مقدار رہے گا، یہ دونوں معاملہ کے لیے رہیں گے، اسی طرح اہل جنت کا جنت میں خلود اس کی مقدار کے مطابق ہوگا، جب یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا تو سارے کے سارے اللہ کی مشیت میں آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ (الانبیاء) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (الدخان: 39)

پس جنت و دوزخ دونوں کے باسی آسمان و زمین کے دوام کی مقدار رہیں گے، اس مقدار کے ساتھ یہ حق ربوبیت ہے، پھر ان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ یہی دونوں دار لازم فرما دے گا اور یہ حق احدیت کی وجہ سے ہے، پس جو اس کی احدیت کی وجہ سے موحد ہو کر اسے ملا تو وہ ہمیشہ اپنے دار میں باقی رہے گا، اور جو اس کی احدیت کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک ٹھہراتے ہوئے اسے ملا وہ ہمیشہ قید میں باقی رہے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خلود کی مقدار کے بارے میں بتا دیا، تو فرمایا: اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یعنی مدت کی اس زیادتی کے بارے میں جو اللہ چاہے گا جس زیادتی کا ادراک انسانی قلوب و اذہان کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ اس کی کوئی انتہا اور غایت نہیں۔ اعتقادی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے دارین میں ان کا خلود دائمی ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الا بمعنی واؤ ہے۔ یہ فراء اور بعض اہل نظر کا قول ہے اور یہی آٹھواں قول ہے۔ معنی یہ ہوگا(1): دنیا میں آسمان و زمین کے دوام کی مدت پر خلود میں اضافے اور زیادتی میں سے جتنا تیرا رب چاہے گا۔ قرآن مجید میں الا بمعنی واؤ استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (الطور: 47) یعنی والذین ظلموا اور شاعر نے کہا:

وکلُّ أخٍ مفارقُه أخوه لعَمْرُ أبیكَ إلّا الفرْقدان (2)

یہاں بھی إلا الفرقدان بمعنی و الفرقدان ہے۔ ابو محمد مکی نے کہا: بصریوں کے نزدیک یہ بڑے دور کی بات ہے کہ الا بمعنی واؤ ہو۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے اس کا معنی ہے کما شاء ربك یعنی جس طرح تیرا رب چاہے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 22) یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 143
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507

کیا قدسلف یہ نواں قول ہے۔

دسواں: دسواں قول یہ ہے کہ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ میں استثنا کا استعمال صرف ایسے ہی ہے جیسا کہ ہر کلام میں اس کا استعمال مستحب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ (الفتح: 27) اب یہ واجب میں استثناء ہے، اور یہ استثناء اسی طرح شرط کے حکم میں بھی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان شاء ربك اور اس کی صفت نہ متصل سے اور نہ ہی منقطع سے بیان کی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ اس کی تائید کرتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے اور اس قسم کی دلیل ابوعبید سے بھی منقول ہے اس نے کہا: اس سے پہلے دارین میں فریقین کے خلود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کی عزیمت گزر چکی ہے، فوراً بعد استثنا کا لفظ وارد ہوگیا ہے، جب کہ عزیمت خلود میں گزر چکی ہے۔ ابوعبید نے پھر کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ (الفتح: 27) کی طرح ہے کہ یہ بات معلوم ہے کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر داخل ہوں گے۔ لہٰذا ان دونوں مقامات پر استثنا خیار کو ثابت نہیں کرتی، کیونکہ دارین میں خلود کے بارے میں اور مسجد حرام میں دونوں کے بارے میں مشیت عزیمت کے ساتھ گزر چکی ہے، فراء سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ اور گیارہواں قول یہ ہے کہ اشقیاء ہی سعداء ہیں اور سعداء ہی اشقیاء ہیں ان کے علاوہ نہیں، دو مقامات پر استثنا انہیں کی طرف راجع ہے، اور اس کی وضاحت اور بیان یہ ہے کہ ما بمعنی من ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں میں سے استثناء ان لوگوں کی کی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے اپنے ایمان کی وجہ سے ان جہنمیوں میں سے نکل جائیں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہوں گے پھر دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل ہوجائیں گے پس یہی لوگ ہیں جن پر دوسری استثنا واقع ہوئی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جس کو آپ کا پروردگار چاہے گا تو اسے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رکھے گا، یعنی فَاَمَّا الَّذِيۡنَ شَقُوۡا فَفِى النَّارِ لَهُمۡ فِيۡهَا زَفِيۡرٌ وَّشَهِيۡقٌ ۝ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (ہود: 107) الا یخلدہ فیھا اور یہ وہ لوگ ہیں جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اپنے ایمان اور محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکلیں گے۔ لہٰذا جہنم میں ان کے داخل ہونے کی وجہ سے انہیں شقی اور بدنصیب کہا گیا اور جنت میں ان کے داخلہ کی وجہ سے سعید اور خوش نصیب کہلائے، جس طرح ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: جو لوگ خوش بخت اور سعادت مند ہیں وہ دوزخ میں داخل ہونے کی وجہ سے بدنصیب اور شقی ہوگئے پھر دوزخ سے نکلنے اور جنت میں داخل ہونے کی وجہ سے سعادت مند ہوگئے۔

اعمش، حفص، حمزہ اور کسائی نے وَاَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے کہا: اس کے سعدوا ہونے پر دلیل یہ ہے کہ پہلا شقوا ہے اشقوا نہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ وہ کسائی کی قراءت سعدوا پر تعجب کا اظہار کرتے حالانکہ کسائی عربی کو جانتے تھے، اگر یہ بولنے کی طرز تھی تو درست نہیں، کیونکہ سعد فلان وأسعدہ اللہ، وأسعد بروزن امرض کہا جاتا ہے، کسائی نے ان کے قول مسعود سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس میں ان کے لیے کوئی

حجت نہیں، کیونکہ مکان مسعود فیہ کہا جاتا ہے پھر اس میں سے فیہ کو حذف کر دیا جاتا اور مسعود نام بن گیا۔ مہدوی نے کہا: جس نے سعدوا کی سین کو ضمہ دیا تو اس صورت میں یہ عربوں کے قول مسعود پر محمول ہوگا، اور یہ شاذ اور قلیل ہے، کیونکہ سعدہ اللہ نہیں کہا جاتا بلکہ صرف ''أسعدہ اللہ'' کہا جاتا ہے۔ ثعلبی نے کہا: سعدوا سین کے ضمہ کے ساتھ کا مطلب ہے رزقوا السعادۃ کہ انہیں سعادت عطا فرمائی گئی۔ سعد اور اسعد ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں نے سعدوا کو شقوا پر قیاس کرتے ہوئے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

جوہری نے کہا: سعادت، شقاوت کے خلاف ہے۔ آپ سعد الرجل فھو سعید کہتے ہیں جیسے سلم اور سلیم ہے اور سعد فھو مسعود اس میں مسعد نہیں کیا جاتا، گویا وہ مسعود کے ذریعے اس سے مستغنی ہو گئے۔

ابونصر عبدالرحیم قشیری نے کہا: سعدہ اللہ فھو مسعود اور أسعدہ اللہ فھو مسعد بھی وارد ہوا ہے، یہ کوفیوں کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جس طرح شقی فلان نہیں کہا جاتا اسی طرح سعد فلان بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ متعدی نہیں۔ ''عطاء غیر مجذوذ، غیر مجذوذ'' سے مراد غیر مقطوع ہے (1) یعنی نہ ختم ہونے والی عطا، یہ جَذَّ یَجُذُّ سے ہے جس کا معنی ہے اس نے کاٹا، نابغہ نے کہا:

تَجُذُّ السَّلُوْقِیَّ المضاعفَ نَسْجُهٗ وتُوقِدُ بالصُّفَّاحِ نارَ الحُبَاحِبِ

تَجُذُّ کا معنی ہے وہ کاٹتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تَكُ نہی کی وجہ سے مجزوم ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے نون کو حذف کر دیا گیا ہے۔ فِیْ مِرْیَةٍ یعنی شک میں۔ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ یعنی اے سننے والے! جن معبودوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان کے باطل ہونے میں تو شک میں مبتلا نہ ہو جا۔ اور اس سے بھی خوبصورت اور عمدہ بات یہ ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس آدمی کو فرما دیجئے جو شک میں ہے: فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات کا حکم نہیں دیا۔ پس یہ ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباء واجداد نے ان کی عبادت کی تو یہ ان کی تقلید کرتے ہیں۔ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ان کے بارے میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ رزق میں ان کا حصہ مراد ہے (2)۔ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عذاب میں ان کا حصہ مراد ہے (3)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ خیر اور شر میں سے جن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ مراد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب پھر اختلاف کیا جائے گا اس میں اور اگر ایک بات پہلے طے نہ کر

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 145
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 507
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 146

دی گئی ہوتی آپ کے پروردگار کی جانب سے تو فیصلہ کر دیا گیا ہوتا ان کے درمیان اور بے شک وہ ایسے شبہ میں ہیں اس کے متعلق جو بے چین کر دینے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ قیامت تک ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا جائے کیونکہ اسی میں صلاح اور بہتری معلوم ہوتی ہے، اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان ان کی اجل کا فیصلہ ہو جاتا کہ مومن کو ثواب دیا جائے اور کافر کو سزا، ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ مراد ہے یا اس صورت میں وہ مصدق اور مکذب کے درمیان تھے۔ ایک قول یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی ذات کے بارے میں ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان اگر عقاب میں جلدی کے بارے میں فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو عذاب نازل کر دیا جاتا لیکن اس امت سے قیامت تک عقاب کی تاخیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر حکم لگاتے ہیں یعنی یہ کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں شک میں تھے تو یہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

''اور یقیناً ان سب (اختلاف کرنے والوں) کو پورا پورا بدلہ دے گا انہیں آپ کا رب ان کے کرتوتوں کا، بے شک اللہ تعالیٰ جو کام وہ کرتے ہیں ان سے خوب آگاہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ یعنی وہ تمام قومیں جنہیں ہم نے شمار کیا ہے اپنے اعمال کی جزاء کو دیکھ لیں گی۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح آپ کی قوم بھی دیکھ لے گی۔ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل حرمین، نافع، ابن کثیر اور ان کے ساتھ ابو بکر نے وان کلا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے ان مثقلہ سے مخففہ مُعْمَلَه بنایا ہے۔ خلیل نحوی اور سیبویہ نے بھی اسے ذکر کیا ہے، سیبویہ نے کہا: ہمیں ایک ایسے آدمی نے بیان کیا ہے جس پر میں اعتماد کرتا ہوں کہ اس نے عربوں کو اِن زیدًا لَمنطلقٌ کہتے سنا ہے۔ اور شاعر کا شعر بھی بطور استدلال اس نے پڑھا:

كَاَنْ ظِبْيَةً تَعْطُوالٰی وَارِقِ السَّلَمْ

اس کی مراد کأنها ظبية ہے یعنی اس کو مخفف کر دیا اور مابعد کو نصب دے دی، بصری أن مشددہ کو عاملہ بناتے ہوئے بھی اس کی تخفیف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جب کہ کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا: میں نہیں جانتا کہ کس بنیاد پر وان کلا پڑھا گیا ہے اور فراء کا خیال یہ ہے کہ جس نے تخفیف کی ہے اس نے کلا کو لَيُوَفِّيَنَّهُمْ کی وجہ سے نصب دی ہے وان لیوفینهم کلا جب کہ تمام نحویوں نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: یہ بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے۔ کسی کے نزدیک بھی زیدا لاضربنه جائز اور صحیح نہیں ہے اور باقیوں نے ان کو مشدد پڑھا اور کلا کو اس کی اصل کے مطابق اس کے ذریعے نصب دی ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور ابن عامر نے لما کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ان کلا لیوفینهم کے معنی پر اسے مخفف پڑھا ہے،

اور ماکو انہوں نے صلہ بنایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے یہ ان دو لاموں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لیے آیا ہے جو قسم پر آتی ہیں، اور وہ دونوں مفتوح ہیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا۔ زجاج نے کہا: لما کی لام تو ان کی وجہ سے ہے جب کہ ما زائدہ مؤکدہ ہے، جیسے آپ ان زیدا لمنطلق کہتے ہیں۔ ان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اسم یا خبر پر لام داخل ہو جیسے اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (التوبہ) اور اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی (ق: 37) اور لَیُوَفِّیَنَّهُمْ میں موجود لام وہ ہے جس کے ذریعے قسم کے ساتھ ملا جاتا ہے، یہ فعل پر داخل ہوتی ہے اور اسے نون مشددہ یا مخففہ لازم کر دیتی ہے اور جب دو لامیں جمع ہو گئیں تو ان کے درمیان ما کے ذریعے فاصلہ کیا گیا اور ما زائدہ مؤکدہ ہے۔ فراء نے کہا: ما بمعنی من ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ (النساء: 72) میں ہے یعنی وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ اور لَیُوَفِّیَنَّهُمْ میں لام قسم کے لیے ہے۔ اس کا معنی زجاج کے قول کے مطابق ہے البتہ یہ فرق ہے کہ زجاج کے نزدیک ما زائدہ ہے جب کہ فراء کے نزدیک ما بمعنی من اسم ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ زائدہ نہیں، بلکہ یہ اسم ہے اور اس پر لام تاکید داخل ہوئی اور یہ ان کی خبر ہے جب کہ لَیُوَفِّیَنَّهُمْ جواب قسم ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: وإنّ کلا خلق لیوفینهم ربك أعمالهم یقیناً سب کے سب مخلوق ہیں تیرا رب ضرور انہیں ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اور ایک قول کے مطابق ما بمعنی من ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: 3) میں ما بمعنی من ہے۔ اور یہ سارے کا سارا بعینہ فراء کا قول ہے۔ اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے لما اور ان دونوں کو مشدد یعنی وان کلا لما پڑھا ہے۔ اور وہ حمزہ اور اس کی موافقت کرنے والے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ ایک لہجہ ہے، جو محمد بن زید سے منقول ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ ان زیدا الا لاضربنه نہیں کہا جاتا اور نہ ہی ان زیدا لما لضربته کہا جاتا ہے اور کسائی نے کہا: اس قراءت کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کسائی اور ابو علی فارسی نے یہ بھی کہا ہے: ان دونوں کو مشدد پڑھنا مشکل ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا: نحویوں کے اس بارے میں کئی اقوال ہیں۔

پہلا: اس کی اصل لمن ما ہے نون کو میم سے بدلا، تین میمیں جمع ہو گئیں تو درمیان والی کو حذف کر دیا گیا تو لما بن گیا اس قول کے مطابق ما بمعنی مَن ہے اور اس کی تقدیر وان کلا لمن الذین ہے، جس طرح کہ ان کا یہ قول:

وإنّ لمّا أصدِرُ الأمْرَ وجهَهُ إذا هو أعْيَا بالسَّبيلِ مَصَادِرُه

اس شعر میں لما کی یہی صورتحال ہے۔

زجاج نے اس قول کو ناکارہ قرار دیا ہے اور کہا: من دو حرفوں پر مشتمل ایک اسم ہے لہٰذا اس کا حذف جائز نہیں۔

دوسرا: اصل لمن ہے اجتماع میمات کی وجہ سے میم مکسورہ کو حذف کر دیا گیا، تقدیر عبارت وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: لما، لم کا مصدر ہے اور وصل کو وقف پر محمول کرتے ہوئے بغیر تنوین کے آیا ہے، اس بنیاد پر یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر) کی طرح ہے اكلا لما سے مراد مال ماکول کو جامع ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت: وإنّ کلا لیوفینهم ربك أعمالهم توفیة لما ہو گی۔ اور معنی ہو گا: ان سب کے اعمال کو جامع، اور یہ آپ کے قول:

قیاماً لأ قومن کی طرح ہے۔ اورزہری نے اس معنی کی بنیاد پر لما تشدید اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔

تیسرا: لمّا، إلّا کے معنی میں ہے اہل لغت نے حکایت کیا ہے: سالتك بالله لما فعلت یعنی إلّا فعلت اور الله تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ (الطارق) اسی کی طرح ہے یعنی الاعلیها حافظ تو آیت کا معنی یہ ہوگا: ان میں سے کوئی بھی نہیں مگر وہ انہیں ضرور پورا پورا بدلہ دے گا۔ ماکل واحد منهم إلّا لیوفینهم۔ قشیری نے کہا: زجاج نے اس قول کو اس بنیاد پر ناکارہ قرار دیا ہے کہ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا میں نفی ہے ہی نہیں کہ إلّا کو مقدر مان لیا جائے اس پر دلیل یہ ہے کہ ذهب الناس لما زید تو نہیں کہا جاتا (یعنی بغیر نفی کے الا نہیں آتا)۔

چوتھا: ابو عثمان مازنی نے کہا: اصل میں وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَا، لَمَا کی تخفیف کے ساتھ ہے پھر اس پر شد ڈال دی گئی، جس طرح کہ یہ شعر ہے:

لقد خَشِيْتُ أنْ أرى جِدَبَّا   فی عامِنَا ذا بعدَ ما أَخْصَبَّا

اس میں جدبا، لقد اخصبا اصلاً بغیر شد کے ہیں بعد میں ان کو مشدد کر دیا گیا ہے۔

ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ غلط ہے: مثقل کو تو مخفف بنایا جاتا ہے مگر مخفف کو مثقل نہیں بنایا جاتا۔

پانچواں: ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا: ہوسکتا ہے کہ تشدید عربوں کے اس قول کے قبیل سے ہو: لَمَمْتُ الشیءَ أَلُمُّهُ لَمًّا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ اس چیز کو جمع کر لیں، پھر اس سے فعلی کا وزن بنالیا گیا ہو جس طرح ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون: 44) پڑھا جاتا ہے، یہ تنوین اور بغیر تنوین دونوں طرح آتا ہے، اس بنیاد پر الف تانیث کا ہوگا، اصحاب امالہ کے نزدیک اس قول پر امالہ کیا جائے گا۔

ابو اسحاق نے کہا: وہ بات کہ جس کے علاوہ میرے نزدیک کوئی اور جائز ہی نہیں وہ یہ ہے کہ یہ مخففہ من مثقلہ ہو اور ما کے معنی میں ہو جس طرح اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ (الطارق) ہے اور اسی طرح اپنی اصل کے مطابق یہ مشدد بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں بھی یہ بمعنی ما ہوگا اور لما بمعنی الا ہوگا۔ یہ خلیل، سیبویہ اور تمام مصریوں سے منقول ہے۔ اور لما بمعنی الا استعمال ہوتا رہتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ قول جس کو زجاج نے پسند کیا ہے اسے زجاج سے نحاس وغیرہ نے بیان کیا ہے، اسی جیسا قول اور زجاج کا اسے ضعیف قرار دینا گزر چکا ہے البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس قول میں ان نافیہ ہے اور وہاں مخففہ من مثقلہ ہے پس دونوں میں فرق ہے۔ اب دو قراءتیں باقی رہ گئیں۔ ابو حاتم نے کہا: ابی کے حرف میں وان کل إلّا لیوفینهم ہے اور اعمش سے وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا مروی ہے یعنی ان کی تخفیف کل کے رفع اور لما کی تشدید کے ساتھ۔ نحاس نے کہا: یہ قراءتیں جماعت کے مخالف ہیں اس میں ان بمعنی ما ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی، کیونکہ جماعت کے مخالف سوائے اس طریقے کے پڑھنا جائز نہیں۔ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

**فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝**

''پس آپ ثابت قدم رہیے جیسے حکم دیا گیا ہے آپ کو اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں اور سرکشی نہ کرو بے شک جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے خوب دیکھ رہا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر لوگوں کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: استقم یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دین پر قائم رہنے کی گزارش کرتا ہوں اور اس سے اس بات کا سوال کرتا ہوں لہٰذا استقم کی سین سوال کی سین ہوگی۔ جس طرح آپ استغفر اللہ کہتے ہیں یعنی میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ دائیں، بائیں کی طرف سے کوئی چیز لیے بغیر صرف ایک ہی جہت میں استمرار اختیار کرنا استقامت کہلاتا ہے، یعنی اللہ کے امر کی بجا آوری پر ثابت قدم رہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتایئے جس کے متعلق میں آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں؟ آپ نے فرمایا: قل أمنتُ باللہ ثم استقم کہہ دو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم ہو جا (1)۔

ابومحمد دارمی نے عثمان بن حاضر ازدی سے اپنی مسند میں روایت بیان کی ہے اس نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو میں نے کہا: مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ کا تقویٰ اور استقامت کو لازم پکڑ، اتباع کر اور بدعت اختیار نہ کر۔ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ یعنی آپ بھی ثابت قدم رہیں اور جو آپ کے ساتھ تائب ہو کر آئے ہیں ان سے مراد آپ کے وہ صحابہ ہیں جنہوں نے شرک سے توبہ کی اور ان کے بعد آپ کی امت میں سے جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی بھی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جو آپ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شدید ہو، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے جب آپ کو عرض کی کہ آپ پر بڑی تیزی سے بڑھاپا آگیا ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: ''مجھے (سورت) ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ سورت کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے۔

ابوعبدالرحمن سلمی سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے ابوعلی سری کو کہتے ہوئے سنا ہے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے ہود نے بوڑھا کر دیا''۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ میں نے آپ کو عرض کیا: اس میں سے کس چیز نے آپ کو بوڑھا کیا؟ انبیاء کے قصص نے یا امتوں کی ہلاکت نے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، اللہ کے ارشاد فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے''۔ وَلَا تَطْغَوْا سرکشی سے نہی ہے۔ طغیان، حد کو تجاوز کرنا ہے، اسی سے اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) ہے جب پانی نے حد سے تجاوز کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی پر بھی جبر نہ کرو۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 48

''اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ، اور (اس وقت) نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَرْكَنُوْٓا، رکون کی حقیقت کسی چیز سے سکون حاصل کرنا، اس پر اعتماد کرنا، اس کی طرف جھکنا اور اس پر راضی ہونا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت نہ کرو اور ان کی اطاعت نہ کرو(1)۔ ابن جریج نے کہا: ان کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرو۔ ابو العالیہ نے کہا: ان کے اعمال کو پسند نہ کرو(2)۔ یہ تمام کے تمام قریب قریب ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہاں رکون سے مراد مداہنت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کو وہ ناپسند نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جمہور نے تَرْكَنُوْٓا کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو نے کہا: یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ طلحہ بن مصرف، قتادہ اور دیگر لوگوں نے تَرْكُنُوْٓا کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، فراء نے کہا: یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔ اور بعض لوگوں نے رَكِنَ يَرْكَنُ بروزن مَنَعَ يَمْنَعُ کو بھی جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں جب کہ ایک قول کے مطابق اس سے مراد عام کافر اور نافرمان لوگ ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا الآیۃ (الانعام: 68) ہے۔ اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو ہماری آیتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کے معنی میں یہی صحیح ہے اور یہ کفار اور بدعتیوں میں سے نافرمان لوگوں کو چھوڑنے پر دلالت کرتی ہے۔ یقیناً ان کی صحبت کفر یا معصیت ہے، کیونکہ صحبت صرف محبت ہی سے ہوتی ہے، ایک حکیم نے کہا ہے:

عن المرء لا تسأل وسَلْ عن قرينه　　فكلُّ قرينٍ بالمُقارن يَقْتَدِي

آدمی کے بارے میں نہ پوچھ، ان کے دوست کے بارے میں پوچھ، ہر دوست اپنے دوست کی اقتدا کرتا ہے۔

اور اگر صحبت صرف ضرورت یا تقیہ کی بنیاد پر ہو تو اس کے بارے میں سورۂ آل عمران اور المائدہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اور مجبوری کی حالت میں تقیہ پر ظالم کی صحبت نہی سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی ان کے ساتھ ملنے، صحبت اختیار کرنے، ان کے اعراض کے باوجود ان کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے اور ان کے معاملات میں ان کی موافقت کرنے کی وجہ سے آگ تمہیں بھی جلائے گی۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اور قائم کیجئے نماز دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات کے حصوں میں، بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو، یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1066　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 508

اس میں چھ مسائل ہیں:۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ اہل تاویل میں سے کسی نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ اس آیت میں نماز سے مراد فرض نمازیں ہیں۔ اور ان کو بالخصوص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان کی ثانی ہیں اور مشکلات میں انہیں کی پناہ تلاش کی جاتی ہے، نبی کریم ﷺ جب بھی کوئی مصیبت و پریشانی آتی تو آپ نماز کی پناہ لیتے تھے۔ صوفیاء کے شیوخ نے کہا ہے: اس آیت سے فرض اور نفل عبادت میں اپنے سارے اوقات کو صرف کرنا مراد ہے (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے، یقیناً امر اس بات کو شامل نہیں حتیٰ کہ نہ واجب کو اور نہ ہی نفل کو شامل ہے۔ اوراد معلوم ہیں اور وہ اوقات جن میں نوافل کی ترغیب دی گئی ہے وہ محدود ہیں، ان کے علاوہ جتنے اوقات ہیں وہ مستحب اوقات ہیں بدل کی بنا پر نہ کہ عمومیت کی بنا پر اور یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: طَرَفَيِ النَّهَارِ مجاہد نے کہا: پہلی طرف صبح کی نماز ہے (2)، اور دوسری طرف ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ اس کو ابن عطیہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ دو طرفیں صبح اور مغرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت حسن ہی سے مروی ہے: دوسری طرف صرف عصر ہے اور حضرت قتادہ وضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: دو طرفیں ظہر اور عصر ہیں۔ اور زلف سے مغرب، عشاء اور صبح مراد ہے۔ گویا اس کہنے والے نے قراءت کے جہر کی رعایت کی ہے۔ ماوردی نے بیان کیا ہے کہ طرف اوّل بالاتفاق صبح کی نماز ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس اتفاق کو اس سے پہلے والا قول توڑ دیتا ہے اور طبری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دو طرفوں سے مراد صبح اور مغرب ہے اور یہ ظاہر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مغرب اس میں داخل نہیں کیونکہ یہ رات کی نماز ہے۔ ابن عربی نے کہا: طبری سے تعجب ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کو دو طرفیں خیال کر لیا ہے حالانکہ یہ دونوں رات کی طرفیں ہیں۔

فقلب القوس ركوة وحاد عن البرجاس غلوة

طبری نے کہا: اس پر دلیل تمام لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو طرفوں میں سے ایک صبح ہے، تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ دوسری طرف مغرب ہے، اور اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا۔

میں (قرطبی) نے کہا: رد کے سلسلہ میں یہ ابن عربی کی طرف سے ایک تکلیف وہ بات ہے جو انہوں نے اپنے ذمے لے لی ہے کہ اس بات پر ان کے ساتھ کوئی بھی جمع نہیں ہوا، ہم نے مجاہد سے ذکر کیا کہ طرف اوّل صبح کی نماز ہے، اس بات پر اتفاق ہے کہ جس نے طلوع فجر کے بعد کھالیا یا جماع کر لیا تو اس کا وہ دن فطر کا دن ہوگا، اور اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ اور یہ جان بوجھ کر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب طلوع فجر کے بعد والا وقت دن کا حصہ ہو۔ تو صبح کے سلسلہ میں تو جو طبری نے کہا یہ اس کی صحت پر دال ہے، اب اس پر صرف مغرب کا اعتراض باقی ہے اور اس سلسلہ میں اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1069
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1068

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ یعنی رات کے حصے میں اور زلف سے مراد وہ گھڑیاں ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ اس سے مزدلفہ کا نام مزدلفہ ہے، کیونکہ وہ عرفہ کے بعد ایک ایسا مقام ہے جو مکہ کے قریب ہے۔ ابن قعقاع اور ابن ابی اسحاق وغیرہ نے وزلفا لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے زلیف کی جمع کہا ہے، کیونکہ یہ زلیف کے ساتھ بولا جاتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا واحد زلفۃ ہو جیسے بسرۃ اور بسر یہ اس آدمی کی لغت کے مطابق ہوگا جو سین کو ضمے کے ساتھ پڑھتا ہے۔ ابن محیصن نے وَ زُلْفًا مِّنَ الَّيْلِ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور واحد زلفۃ ہے جیسے درۃ اور در، اور برۃ اور بر۔ اور مجاہد اور ابن محیصن نے زلفی بروزن قربی بھی پڑھا ہے اور باقیوں نے وزلفا لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے غرفۃ اور غرف۔ ابن اعرابی نے کہا: زلف سے مراد ساعات ہے، اس کا واحد زلفۃ ہے اور ایک قوم نے کہا ہے: زلفۃ سورج کے غائب ہونے کے بعد رات کے پہلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں زلف اللیل سے مراد رات کی پہلی تہائی کی نماز یا عشاء کی نماز ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔ ایک قول کے مطابق مغرب، عشاء اور صبح ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اخفش نے کہا: اس سے رات کی نماز مراد ہے البتہ معین نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ صحابہ و تابعین میں سے جمہور مفسرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں حسنات سے مراد پانچ نمازیں ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: حسنات سے مراد آدمی کا سبحان الله، والحمد لله، لا إله إلا الله اور الله اکبر کہنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: نیکیوں میں یہ مثال کے طریقہ پر ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اس چیز کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفظ حسنات میں عام ہے اور سیئات میں خاص، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے کبائر سے اجتناب نہیں کیا'' (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: سبب نزول جمہور کے قول کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ انصار کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، ایک قول کے مطابق وہ ابوالیسر بن عمرو تھا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا نام عباد تھا، اس نے کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار کی، اسے بوسہ دیا اور فرج کے علاوہ اس نے اس کے ذریعہ لطف حاصل کیا۔ ترمذی نے حضرت عبدالله رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: میں نے مدینہ کے کنارے میں ایک عورت کو گرالیا اور میں نے جماع کے سوا اس کے ساتھ سب کچھ کرلیا اور اب میں حاضر ہوں آپ میرے بارے میں جو چاہیں فیصلہ فرمادیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: الله نے تیری پردہ پوشی کی تھی، تو بھی اپنے اوپر پردہ ڈال لیتا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب ارشاد نہیں فرمایا۔ وہ آدمی چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے بندہ بھیج کر اسے بلوایا، اور اس کے سامنے وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ کی تلاوت فرمائی۔ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: کیا یہ حکم اس کے ساتھ خاص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے ہے'' (3)۔ ترمذی نے کہا: حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کا

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070
2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139
3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3037، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بوسہ لے لیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے کفارہ کے متعلق پوچھنے کے لیے آیا تو وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آدمی نے کہا: کیا یہ حکم میرے لیے ہی ہے اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیرے لیے اور میری امت میں سے جس نے بھی یہ کام کیا"۔ ترمذی نے کہا: ہذا حدیث حسن صحیح۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا: میرے پاس ایک عورت کھجور خریدنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا: کمرے میں اس سے زیادہ عمدہ کھجور پڑی ہے تو وہ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اسے بوسہ دے دیا، میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے بھی فرمایا: اپنے اس واقعہ کو چھپا، توبہ کر اور کسی کو اس کے بارے میں خبر نہ دے پس مجھ سے صبر نہ ہوسکا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: "کیا تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی غازی کے گھر والوں کی اس کی غیر حاضری میں خبر گیری کی ہے" (1)۔ حتیٰ کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس وقت اسلام لایا ہوتا اور میں نے یہ گمان کیا کہ میں دوزخیوں میں سے ہوں۔ راوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر جھکا کر بیٹھے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ وحی نازل فرمائی: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ۝ حضرت ابوالیسر نے کہا: میں آپ کے پاس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ میرے سامنے پڑھی تو آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا یہ صرف ان کے لیے خاص ہے یا تمام لوگوں کے لیے عام حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام لوگوں کے لیے عام ہے" (2)۔ حضرت ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے، وکیع وغیرہ نے قیس بن ربیع کو ضعیف قرار دیا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توجہ ہٹالی اور عصر کی نماز ادا کی گئی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو جبریل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور فرمایا: "کیا تم ہمارے ساتھ نماز میں حاضر تھے" (3)؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: "جا یہ تیری کارروائی کا کفارہ ہوگیا ہے" (4)۔ اور روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو فرمایا: "اٹھو اور چار رکعت ادا کرو" (5)۔ واللہ اعلم۔

اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث "نوادر الاصول" میں بیان کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے پرانے گناہ کے لیے نئی نیکی سے ازروئے طلب کے زیادہ خوبصورت اور ادراک کے اعتبار سے زیادہ تیز کوئی چیز نہیں دیکھی (6)، اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ۔

**مسئلہ نمبر 5۔** یہ آیت کریمہ بمعہ ان احادیث کے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حرام بوسہ اور حرام لمس کی صورت میں حد واجب نہیں ہوتی۔ اور اس کے ذریعے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں پر کوئی حد اور تادیب نہیں ہوگی

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ ہود، جلد 2، صفحہ 139۔ ایضاً، حدیث نمبر 3039، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1070

4۔ ایضاً۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً

6۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 120

اگر چہ وہ دونوں ایک ہی کپڑے میں پائے گئے۔ یہ ابن منذر کا مختار مسلک ہے، کیونکہ جب اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا گیا تو اس حدیث کو اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ذکر کر دیا جائے گا کہ ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، اور سورۂ نور میں اس کی تفصیل آئے گی کہ علماء نے اس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر** 6۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نماز کو رکوع، سجود، قیام، قراءت اور اسماء سمیت اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ، الایۃ نماز قائم کرو۔ فرمایا اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الایۃ (الاسراء: 78) سورج کے ڈھلتے وقت نماز قائم کرو۔ فرمایا: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝ (الروم) شام کے وقت اور صبح کے وقت اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝ (الروم) اور آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہے اور عشاء کے وقت اور ظہر کے وقت اس کی تسبیح بیان کرو۔ فرمایا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130) اپنے رب کی تسبیح بیان کر سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔ فرمایا: رکوع کرو اور سجدہ کرو یعنی ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا (الحج: 77) فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝ (البقرہ) اور اللہ کی خاطر ڈرتے ہوئے قیام کرو۔ فرمایا: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔ اور فرمایا وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا (الاسراء: 110) یعنی نماز میں بلند آواز سے قراءت نہ کر اور نہ ہی انتہائی پست آواز میں قراءت کرو۔ یہ سارے کا سارا اجمال ہے اور اس کی وضاحت اور بیان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا، اور ارشاد فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) اور ہم نے آپ پر ذکر (یعنی قرآن) اتارا تا کہ جو ان کی طرف اتارا گیا آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت صلوٰۃ، رکعات اور سجدوں کی تعداد، پوری نماز کا طریقہ، اس کے فرائض، سنتیں اور فرائض میں سے جن کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں اور جو اس میں سنن اور فضائل وغیرہ میں سے مستحبات ہیں انہیں بیان فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''صلوا کما رأیتمونی أصلی''(1) اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اور آپ سے مکمل تفصیلات منقول ہوئیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے پہلے لوگوں کی ضرورت کے جملہ معاملات کو بیان فرما دیا۔ دین مکمل ہو گیا، اور آپ نے راستہ واضح فرما دیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: 3) آج تمہارے لیے میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کر لیا۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ یعنی قرآن نصیحت اور توبہ ہے اس آدمی کے لیے جو نصیحت حاصل کرے۔ اور نصیحت حاصل کرنے والوں کو قرآن کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور الذکریٰ مصدر ہے جو الف تانیث کے ساتھ آیا ہے۔

وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 88

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾

''اور آپ صبر کیجئے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکوں کے اجر کو۔ تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے زیرک لوگ ہوتے جو روکتے زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے سے مگر وہ قلیل تھے جنہیں ہم نے نجات دی تھی ان سے اور پیچھے پڑے رہے ظالم اس عیش وطرب کے جس میں وہ تھے اور وہ مجرم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اصْبِرْ یعنی نماز پر صبر کیجئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ: 132) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! آپ کو جو تکلیف اور اذیت ملے اس پر صبر کیجئے۔ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ، محسنین سے مراد نماز قائم کرنے والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: فَلَوْلَا كَانَ، لولا بمعنی ھلا ہے۔ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ، قرون سے مراد امتیں اور قومیں ہیں یعنی ان امتوں میں سے جو تم سے پہلے تھیں۔ أُولُوْا بَقِيَّةٍ یعنی اطاعت، دین، عقل اور بصیرت والے لوگ (1)۔ يَّنْهَوْنَ اپنی قوموں کو روکتے۔ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ یعنی اس عقل کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی اور انہیں اپنی نشانیاں اور آیات دکھائی تھیں۔ یہ کفار کے لیے زجر وتوبیخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں لولا نفی کے لیے ہے، یعنی ما کان من قبلکم تم سے پہلے نہیں تھے۔ جیسے اللہ کا ارشاد فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ (یونس: 98) یعنی ما کانت قریۃ آمنت کوئی بستی نہیں جو ایمان لائی ہوتی۔ إِلَّا قَلِيْلًا استثنا منقطع ہے اس سے مراد لکن قلیلا ہے۔ مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ کہ وہ زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ (یونس: 98) فرمایا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ انبیاء کے متبعین اور اہل حق ہیں۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی انہوں نے شرک کیا اور نافرمانی کی۔ مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ یعنی مال اور لذات میں مشغول رہنے میں سے اور ان چیزوں کو آخرت پر ترجیح دینے جیسے کاموں میں پڑے رہے۔ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ اور وہ مجرم تھے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۗ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿١١٩﴾

''اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کردے بستیوں کو ظلم سے حالانکہ ان میں بسنے والے نیکوکار ہوں۔ اور اگر چاہتا آپ کا رب تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک ہی امت (لیکن حکمت کا یہ تقاضا نہیں اس لیے) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں گے) اور اسی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 510

(رحمت) کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے اور پوری ہوگئی آپ کے رب کی (یہ) بات کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن وانسان (دونوں) سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کردے بستیوں یعنی بستیوں والوں کو۔ القری سے مراد اھل القری ہے۔ بِظُلْمٍ یعنی شرک اور کفر سے وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ یعنی ان کے درمیان حقوق کی باہم ادائیگی ہورہی ہو، یعنی ایسا نہیں کہ وہ انہیں صرف کفر کی وجہ سے ہلاک کرے یہاں تک کہ اس کے ساتھ ساتھ فساد بھی برپا ہو جائے، جس طرح مثلاً اس نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو کم تولنے کی وجہ سے ہلاک کیا اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو لواطت کی وجہ سے ہلاک کیا، اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا میں شرک کی نسبت نافرمانی اور گناہ ہلاکت و بربادی کے عذاب تک پہنچانے میں زیادہ کردار ادا کرتے ہیں، اگرچہ آخرت میں شرک کا عذاب زیادہ مشکل ہوگا۔ صحیح ترمذی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "لوگ جب ظالم کو دیکھتے ہیں اور اپنے سامنے اسے نہیں پکڑتے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے سب پر عذاب کو عام کردے" (1)۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: معنی یہ ہے کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو برباد کردے، حالانکہ ان میں رہنے والے مسلمان ہوں وہ تو ان کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور حقوق کی پامالی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، یعنی اس نے اعذار اور انذار کے بعد ہی کسی قوم کو ہلاک اور برباد کیا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ کسی کو اس طرح ہلاک کرے کہ وہ اس پر ظلم کررہا ہو، اگرچہ وہ اصلاح وہدایت کی انتہاء پر ہے، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی پر ظلم نہ کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (یونس: 44) یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردے جب کہ وہ مخلص ہوں۔ مصلحون سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو ایمان میں مخلص ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ظلم سے مراد معاصی اور گناہ ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (2): اُمَّةً وَّاحِدَةً سے مراد صرف ملت اسلامیہ ہے یعنی اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو صرف ملت اسلامیہ بنا دیتا۔ ضحاک نے کہا (3): اس سے مراد ایک دین والے ہیں یعنی سب کو گمراہ کردیتا یا پھر سب کو ہدایت یافتہ بنا دیتا۔ وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ یعنی مختلف ادیان پر رہیں گے۔ یہ مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی جس پر تیرے رب نے ایمان اور ہدایت کے ذریعے رحمت فرمائی تو اس نے اختلاف نہیں کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مختلفین فی الرزق ہیں (4) یعنی رزق میں اختلاف کرتے رہیں گے یا مختلف ہوں گے، یعنی یہ کہیں گے کہ یہ غنی ہے اور یہ فقیر، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ مگروہ

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، ما جاء فی نزول العذاب، جلد 2، صفحہ 39۔ ایضاً، حدیث نمبر 2094، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511   3۔ ایضاً   4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071

لوگ جن پر تیرے رب نے قناعت عطا فرما کر رحم کیا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ حضرت حسن، مقاتل اور عطا نے کہا: یہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے (1)، یعنی الله نے انہیں اختلاف کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا (2): اس سے مراد یہ ہے کہ الله نے اپنی رحمت کے لیے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اور الرحمة کے مونث ہونے کے باوجود وَلِذٰلِكَ فرمایا ولتلك نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رحمت کی تانیث حقیقی نہیں تو اسے فضل کے معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ذالك کے ساتھ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض اوقات ذلك کے ذریعے دو متضاد چیزوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے، جس طرح الله تعالیٰ کے ارشاد لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (البقرہ: 68) میں ہے، بَيْنَ ذٰلِكَ فرمایا ہے بین ذینك ولا تینك نہیں فرمایا۔ اور ایک اور مقام پر فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان) پھر فرمایا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) اور اسی طرح الله تعالیٰ کا ارشاد قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: 58) (ان سب ارشادات میں دو متضاد چیزوں کی طرف ذالك کے ذریعے اشارہ کیا گیا مثلاً فارض اور بکر، اسراف اور بخل، جہر اور سر اور آخری آیت میں فضل اور رحمت (مذکر اور مونث) کی طرف بھی ذالك کے ذریعے ہی اشارہ کیا گیا ہے)

اور یہ سب اقوال سے بہتر قول ہے، کیونکہ یہ عام ہے۔ اس کی طرف حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے جسے آپ سے اشہب نے روایت کیا: اشہب نے کہا: میں نے اس آیت کے متعلق امام مالک سے پوچھا تو انہوں نے کہا: الله تعالیٰ نے انہیں اس لیے پیدا فرمایا ہے تاکہ ایک فریق جنت میں ہو اور ایک فریق دوزخ میں، یعنی اہل اختلاف کو اختلاف کے لیے پیدا فرمایا اور اہل رحمت کو رحمت کے لیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: الله نے انہیں دو فریقوں میں پیدا فرمایا، ایک فریق پر وہ رحم فرماتا ہے اور ایک فریق پر رحم نہیں فرماتا۔ مہدوی نے کہا: اس تقدیر کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اصل کلام یوں ہے: ولا یزالون مختلفین إلا من رحم ربك و تمت کلمة ربك لأ ملأن جهنم من الجنة والناس اجمعین، ولذالك خلقهم اور ایک قول کے مطابق یہ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ کے ارشاد کے متعلق ہے یعنی ولشهود ذلك القوم خلقهم اس دن کے شہود کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ کے متعلق ہے یعنی سعادت اور شقاوت کے لیے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے (3)۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ، تَمَّتْ کا معنی ثبت ہے، یعنی جس طرح اس نے ازل میں مقدر فرمایا اور خبر دی وہ ثابت ہو گیا، اور کلمے کے تمام سے مراد اس کا تغیر و تبدیل کو قبول کرنے سے ممتنع ہونا ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ، من بیان جنس کے لیے ہے۔ یعنی لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ تاکید ہے، جس طرح الله تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ جہنم کو بھرے گا اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس کے ذریعے یہ خبر بھی دی ہے کہ وہ جنت کو بھرے گا آپ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1071 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 511

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ایک کو تمہیں میں سے لوگوں کے ذریعے بھرے گا''، اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ گزر بھی چکی ہے۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لیے ہیں کہ پختہ کریں ان سے آپ کے قلب (مبارک) کو اور آیا ہے آپ کے پاس اس سورہ میں حق اور یہ نصیحت اور یاددہانی ہے اہل ایمان کے لیے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ، كُلًّا، نقص کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہوگا ہر وہ جس کو رسولوں کی خبروں کی ضرورت ہو تو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کلا حال مقدم ہے۔ جس طرح آپ کا قول کلا ضربت القوم، مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ یعنی ان کی خبریں اور اپنی قوم کی اذیتوں پر ان کا صبر۔ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ تاکہ ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو اداء رسالت اور اس سلسلہ میں آپ کو ملنے والی اذیتوں پر صبر پر پختہ کردیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کے ذریعے ہم آپ میں پختگی اور یقین میں اضافہ کردیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے ذریعے آپ کے قلب مبارک کو ہم مضبوط کردیں۔ ابن جریج نے کہا: ان کے ذریعے آپ کے دل کو ہم بہت زیادہ صبر کرنے والا بنادیں تاکہ آپ جزع فزع نہ کریں۔ اہل معانی نے کہا: ہم طیب و پاک کریں۔ تمام کا معنی قریب قریب ہے۔ ما، کلا سے بدل ہے معنی ہوگا: نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ۔

وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ، هٰذِهِ سے مراد ھذہ السورۃ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر سے مروی ہے کہ اس سورت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انبیاء، جنت اور دوزخ کی خبریں ہیں (1)۔

ایک قول یہ ہے: اس سورت کا بالخصوص ذکر تاکیداً ہے ورنہ حق تو پورے کے پورے قرآن میں ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن نے کہا: ھذہ الدنیا ہے اور مراد نبوت ہے۔ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، مَوْعِظَةٌ سے مراد گزشتہ امتوں کی ہلاکت اور جھوٹی اور برباد ہونے والی قوموں کے واقعات میں سے جن کے ذریعے نصیحت حاصل کی جاتی ہے، اور یہ اس سورت کی شرافت ہے، کیونکہ اس کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی حق، نصیحت اور یاددہانی ہے مگر ان میں بالخصوص اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح اس کے بارے میں ہے۔

وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی وہ ہلاک و برباد ہونے والوں کے اوپر نازل ہونے والی مصیبت کو یاد کرتے ہیں تو توبہ کر لیتے ہیں، اور مومنین کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کے واقعات کو سن کر وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 512

وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور آپ فرما دیجئے انہیں جو ایمان نہیں لائے کہ تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر اور ہم (اپنے طور پر) عمل پیرا ہیں۔ اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں اور الله ہی کے لیے ہیں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام، تو آپ بھی اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ کیجئے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ دھمکی اور وعید ہے۔ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ دوسری دھمکی ہے اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی زمین و آسمان کے غیب اور ان کی شہادت الله ہی کے لیے ہے۔ شہادت کو معنی کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد آسمان اور زمین کے خزانے ہیں۔

ضحاک نے کہا: اس سے آسمانوں اور زمین کی جو چیزیں بندوں سے غائب ہیں وہ ساری مراد ہیں۔ باقیوں نے کہا: غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے عذاب کا آسمان سے نزول اور زمین سے طلوع مراد ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں غائب ہے اس کو الله جانتا ہے۔ غیب کو مضاف کیا اور یہ مفعول کی طرف مضاف ہے تو اس کی اضافت توسعاً ہے، کیونکہ حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں: غبت فی الارض وغبت ببلد کذا میں زمین میں غائب ہوا اور میں فلاں شہر میں غائب ہوا۔ وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ یعنی قیامت کے دن سارے کام اسی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ مخلوق کو تو اس کے اذن کے بغیر امر کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ نافع اور حفص نے یرجع یاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی لوٹائے جائیں گے۔ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ یعنی اس کی پناہ لو اور اس پر بھروسہ و اعتماد کرو۔ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔ اہل مدینہ، اہل شام اور حفص نے تعملون تا کے ساتھ مخاطب کے صیغے کے طور پر پڑھا ہے۔ جب کہ باقیوں نے بطور خبر یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

اخفش سعید نے کہا: تعملون ہوگا بشرطیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مخاطب نہ ہوں، اس نے کہا: بعض نے تعملون تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے اور فرمایا: آپ ان کو کہہ دیجئے وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۔ کعب احبار نے کہا: تورات کا خاتمہ ہی سورت ہود کا خاتمہ ہے (1)۔ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے لے کر سورۃ کے آخر تک سورت ہود مکمل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ یوسف علیہ السلام ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 176

# سورۂ یوسف

آیاتہا ۱۱۱ ۱۲ سورۃ یوسف مکیۃ ۵۳ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یہ پوری سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: سوائے چار آیات کے یہ مکی ہے روایت ہے کہ یہود نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو یہ سورت نازل ہوئی۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو نازل فرمایا تو آپ نے ایک لمبا عرصہ اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ ہمارے سامنے قصہ بیان کرتے (1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ۔ تو آپ نے ایک لمبا عرصہ لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے کہا: اگر آپ کوئی بات بیان کرتے، تو اللہ نے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (الزمر: 23) نازل فرمائی۔ علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انبیاء کے قصص کو ذکر فرمایا۔ اور بلاغت کے درجات کے اعتبار سے مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف طریقوں سے ایک ہی معنی میں ان کا تکرار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قصہ یوسف کو ذکر فرمایا اور اس کا تکرار نہیں فرمایا تو کوئی مخالف نہ تو تکرار والے قصص کا مقابلہ کر سکا اور نہ ہی قصہ غیر مکررہ کا مقابلہ کر سکا۔ جس نے بھی اس میں غور وفکر کیا اس کے لیے اس میں اعجاز ہے۔

الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟۱

''الف۔ لام۔ را۔ یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی''۔

الٓرٰ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

قول تعالیٰ: الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہاں تقدیر عبارت: تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ہے۔ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ الٓرٰ سورت کا نام ہے یعنی یہ سورت جس کا نام الٓرٰ ہے یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی، کتاب مبین سے مراد قرآن مبین ہے یعنی جس کا حلال، حرام (2)، اس کی حدود، اس کے احکام، اس کی ہدایت اور اس کی برکت واضح ہے۔ ایک قول یہ ہے: یعنی یہ وہ آیات ہیں جن کا تمہارے ساتھ تورات میں وعدہ کیا گیا تھا۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۟۲

''بے شک ہم نے اتارا اسے یعنی قرآن عربی کو تا کہ تم (اسے) خوب سمجھ سکو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے: انا انزلنا القرآن عربیا (یعنی ہ ضمیر سے مراد قران

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 219 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 5

ہو) قُرْءٰنًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی سارا قرآن (عربی ہے) اور عَرَبِيًّا، قُرْءٰنًا کی صفت ہوگا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قُرْءٰنًا بطور تمہید و تاکید حال ہو جیسے مررت بزید رجلا صالحاً اور عَرَبِيًّا ضمیر سے حال ہوگا، یعنی اے گروہ عرب اس کو تمہاری زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ أعراب سے مراد بیین ہے اسی سے الثَّيِّبُ تُعرِب عن نفسها (1) ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یعنی تا کہ تم اس کے معانی کو جانو اور جو کچھ اس میں ہے اسے سمجھو۔ بعض عرب لعل کے ساتھ أن لاتے ہیں عسی کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے لعل میں لام تاکید کے لیے زائد ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

يا أَبَتَا عَلَّكَ أَوعَسَاكا

اس میں لعل کے بجائے علّ ہے۔

ایک قول یہ ہے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ سے مراد یہ ہے لتكونوا على رجاء من تدبره یعنی تا کہ اس کے غور و فکر سے تم پر امید ہو جاؤ، پس شک کا معنی ان کفار کی طرف راجع ہوگا نہ کہ کتاب اللہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور ایک قول یہ ہے: اَنْزَلْنٰهُ کا معنی ہے کہ ہم نے خبر یوسف علیہ السلام کو نازل کیا (2)۔ نحاس نے کہا: یہ معنی کے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ روایت ہے کہ یہود نے کہا: اس (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھو کہ آل یعقوب شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے؟ اور اس سے یوسف کی خبر کے بارے میں سوال کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت مکہ میں نازل فرمائی ان تعلیمات کے مطابق جو تورات میں تھیں۔ اور اس میں ان کے پاس موجود خبروں کی نسبت کچھ زیادہ خبریں تھیں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے ہی تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردہ کو زندہ کرنا کیونکہ آپ نے ان کو خبر دی حالانکہ آپ کبھی بھی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ کتاب والی جگہ میں تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

"ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ایک بہترین قصہ اس قرآن کے ذریعہ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے، اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے"۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ مبتدا اور خبر ہے۔ اَحْسَنَ الْقَصَصِ یہ مصدر کے معنی میں ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: قصصنا أحسن القصص۔ قصص کی اصل کسی چیز کے پیچھے چلنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (القصص: 11) ہے یعنی اس کے نشان قدم کی اتباع کر۔ پس قصہ گو آثار کی اتباع کرتا ہے اور ان کے متعلق خبر دیتا ہے۔ اور حسن قصص کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ قصہ کی طرف۔ کہا جاتا ہے فلان حسن الاقتصاص للحديث یعنی اس کا سیاق عمدہ ہوتا ہے۔

ایک قول یہ ہے: قصص مصدر نہیں بلکہ یہ اسم کے معنی میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: الله رجاءنا یعنی مرجونا۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا: ہم آپ کو عمدہ خبروں کے ذریعے خبر دیتے ہیں۔ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ یعنی ہماری وحی کے ذریعے پس ما فعل کے ساتھ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب استئمار البکر والثیب، حدیث نمبر 1861، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 6

هٰذَا الْقُرْاٰنَ، القران ھذا کی صفت ہونے کی وجہ سے یا اس سے بدل ہونے کے سبب یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے فراء نے اس کی جر کو بھی جائز کہا ہے۔ اس نے کہا: تکریر کی بنیاد پر مجرور ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک ما سے بدل کی بنیاد پر ہے۔ ابو اسحاق نے مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر اس کے رفع کو بھی جائز کہا ہے۔ وہ سائل تھا اس نے آپ سے وحی کے متعلق پوچھا تو اس کو کہا گیا: ھو القران۔ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ یعنی جو ہم نے آپ کو بتایا اس سے غافلین میں سے۔

**مسئلہ**۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کو باقی تمام قصص میں سے احسن القصص کیوں کہا گیا؟ ایک قول یہ ہے: کیونکہ قران میں کوئی ایسا قصہ نہیں جس میں وہ عبرتیں اور حکمتیں ہوں جو اس قصہ میں ہیں۔ اور اس کا بیان اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے بھائیوں کو درگزر کرنے، ان کی اذیتوں پر آپ کے صبر، ان کا آپ کو کنویں میں لٹکانے کے بعد آپ کا ان کو معاف کرنا اور ان کو معاف کرنے میں آپ کے کرم کے حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام احسن القصص رکھا ہے حتیٰ کے آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ۔ ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں انبیاء صالحین، فرشتوں، شیاطین، جن، انسان، جانور، پرندے، بادشاہوں کی سیرت، مختلف ممالک، تاجر، علماء، جاہل، مردوں، عورتوں اور ان کے حیلوں اور فریبوں کا ذکر ہے اور اس میں توحید، فقہ، بین الاقوامی قانون، خوابوں کی تعبیر، سیاست، معاشرت، تدبیر معاش کا اور ان تمام فوائد کا ذکر ہے جو دین و دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: کیوں کہ اس میں حبیب، محبوب اور ان دونوں کی سیرت کا تذکرہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں اَحْسَنَ بمعنی أعجب ہے۔ بعض اہل معانی نے کہا: اَحْسَنَ الْقَصَصِ اس وجہ سے ہے کہ ہر وہ شخص جس کا اس میں ذکر ہے اس کا انجام سعادت تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو، آپ کے باپ، آپ کے بھائیوں اور عزیز مصر کی بیوی کو دیکھو۔ اور ایک قول یہ ہے: بادشاہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے اسلام لایا اور اس کا اسلام عمدہ تھا۔ اور خوابوں کی تعبیر چاہنے والا ساقی اور گواہ ان تمام کا معاملہ بھلائی پر ہی مبنی تھا۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝

"(یاد کرو) جب کہا یوسف نے اپنے والد سے کہ اے میرے (محترم) باپ! میں نے (خواب میں) دیکھا ہے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو میں نے انھیں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ، اِذْ ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے،۔ یعنی انہیں یاد کراؤ جب یوسف نے کہا۔ عام قُراء کی قرأت سین کے ضمیر کے ساتھ ہے۔ طلحہ بن مصرف نے یوسف پڑھا ہے ہمزہ اور سین کے فتح کے ساتھ عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عربی ہے۔ ابو الحسن الاقطع جو کہ حکیم تھا اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا: لغت میں أسف حزن کو کہتے ہیں اور أسیف کا معنی بندہ ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت یوسف علیہ

السلام میں جمع تھیں اس وجہ سے آپ کو یوسف کہا گیا۔ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اَبوعمرو، عاصم، نافع، حمزہ اور کسائی کی قرأت ''تا'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک تانیث کی علامت ہے، بالخصوص ندا میں اَب پر یا اضافت کے بدلے داخل ہوتی ہے۔ بعض اوقات مذکر پر علامت تانیث داخل ہوتی ہے پس کہا جاتا ہے: رجل نکحة و هزَأة۔

نحاس نے کہا: جب آپ یٰۤاَبَتِ تا کے کسرہ کے ساتھ کہتے ہیں تو اس میں ''تا'' سیبویہ کے نزدیک یا اضافت کے بدلے میں ہے۔ سیبویہ کے قول کے مطابق ھا کے بغیر وقف جائز نہیں اور ان کے پاس اپنے قول پر کئی دلائل موجود ہیں جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کا قول: یاابه، یاأبی کا معنی دیتا ہے اور یٰۤاَبَتِ صرف معرفہ کی صورت میں کہا جا سکتا ہے جاءنی أبت نہیں کہا جا سکتا۔ اور عرب اس کو بالخصوص ندا میں ہی استعمال کرتے ہیں یا أبتی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ''تا'' ''یا'' کا بدل ہے لہٰذا دونوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ جب کوئی آدمی یٰۤاَبَتِ کہے تو اس کا کسرہ ''یا'' پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ اس وقت نیت میں ''یا'' موجود ہے اَبواسحاق کا گمان یہ ہے کہ یہ غلط ہے اور صحیح بات وہ ہے جو اس نے کی کہ ''یا'' نیت میں کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ یا أبتی نہیں کہا جا سکتا۔ اَبوجعفر، اعرج اور عبداللہ بن عامر نے یا أبت، تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ان قراء کی قرأت اصل میں یا أبتی یا کے ساتھ ہے پھر ''یا'' کو الف کے ساتھ بدل دیا گیا تو یا أبتا ہو گیا تو الف کو حذف کر دیا گیا اور ''تا'' پر فتح باقی رہ گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اصل کسرہ ہے، پھر کسرہ کو فتحہ سے بدل دیا گیا جس طرح ''یا'' کو الف سے بدل دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: یاغلاما أقبل۔ فراء نے یا أبتُ تا کے ضمہ کے ساتھ بھی قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا نحویوں کے درمیان: جاءنی احد عشر رایت و مررت باحد عشر، اسی طرح ثلاثة عشر، تسعة عشر اور ان دونوں اعداد کے درمیان والوں کا اس طرح پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں، انھوں نے کہا: دونوں اسموں کو ایک اسم بنا دیا اور ان دونوں کو خفیف ترین حرکات کے ساتھ اعراب دیا۔ سہیلی نے کہا: ان ستاروں کے اسماء کا ذکر مستند روایت میں آیا ہے جس کو حرث بن أبی أسامہ نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: بستانه۔ جو کہ اہل کتاب میں سے ایک آدمی ہے۔ آیا، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان گیارہ ستاروں کے بارے میں پوچھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حرثان، طارق، ذیال، قابس، مصبح، ضروح، ذوالکنفات، ذوالقرع، فلیق، وثاب اور عمودان (1)۔ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا''۔ حضرت ابن عباس (2) اور حضرت قتادہ نے فرمایا: کواکب سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی، شمس سے مراد آپ کی ماں اور قمر سے مراد آپ کے باپ ہیں۔ حضرت قتادہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ شمس سے مراد آپ کی خالہ ہے، کیونکہ آپ کی ماں تو فوت ہو چکی تھی اور آپ کی خالہ آپ کے باپ کے نکاح میں تھی۔ رَاَیۡتُهُمۡ تاکید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ھم ضمیر مذکر آئی ہے۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک بات یہ ہے کہ جب آپ نے ان اشیاء کے بارے میں اطاعت اور سجدے کی خبر دی اور یہ دونوں فعل ذوی العقول کے ہیں تو ان کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 180
2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 181

بارے میں اس طرح خبر دے دی جس طرح ذوی العقول کے بارے میں خبر دی جاتی ہے۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ (الاعراف: 198) میں گزر چکا ہے اور عرب جب غیر ذوالعقول کو ذوی العقول کے مقام پر لے آئیں تو اس کی جمع ذوی العقول کی طرح لاتے ہیں اگر چہ یہ خارج الاصل ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''آپ نے فرمایا: اے میرے بچے! نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں سے ورنہ وہ سازش کریں گے تیرے خلاف، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا یعنی وہ آپ کو ہلاک کرنے کی سازش کریں گے، کیونکہ اس کی تاویل ظاہر ہے بعض اوقات شیطان ان کو آپ کے ساتھ برائی پر ابھارتا ہے لَكَ میں لام تاکید کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ (یوسف) میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ خواب ایک شریف حالت اور بلند مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد مبشرات میں سے صرف سچے، نیک خواب باقی رہ گئے ہیں جن کو نیک آدمی دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں''(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو ازروئے خواب کے زیادہ سچا ہوگا وہی ازروئے کلام کے بھی زیادہ سچا ہوگا''(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کے بارے میں حکم بیان فرمایا کہ یہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق: ''نبوت کے ستر اجزاء میں سے (چھیالیسواں حصہ ہے)''(3)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث کے مطابق: ''چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''(4)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق: ''چھبیس اجزاء میں سے ایک جز ہے''۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''نبوت کے چوالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے'' ان میں سے صحیح چھیالیس والی حدیث ہے۔ اس کے بعد صحت میں حدیث سبعین (ستر والی حدیث) ہے۔ امام مسلم نے سوائے ان دو حدیثوں کے اور کوئی نقل نہیں کی، جہاں تک ان سب احادیث کا تعلق ہے تو یہ شیوخ کی احادیث میں سے ہیں یہ ابن بطال کا قول ہے۔ ابو عبداللہ مازری نے کہا: محدثین کے نزدیک اکثر اور اصح من ستة و اربعین ہے(5)۔ (چھیالیس والی حدیث) طبری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ ساری احادیث یا ان میں سے اکثر صحیح ہیں، اور ان میں سے ہر حدیث کا مخرج معقول ہے، جہاں تک أنها جزء من سبعين جزأ من النبوة کا تعلق ہے تو یہ ہر سچے اور نیک خواب کے بارے میں اور ہر مسلمان کے بارے میں جو اس خواب کو اپنی نیند کی حالت میں دیکھے اس

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185
2۔ صحیح مسلم، باب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 242
4۔ جامع ترمذی، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 52
5۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

کے لیے عام بات ہے خواہ وہ مسلمان جس بھی حالت میں ہو، جبکہ أنها من أربعين أو ستة وأربعين اس سے مراد اس آدمی کا خواب ہے جس کی حالت کا ذکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس ہوا یعنی جو سخت سردیوں میں وضو کو انتہائی عمدہ طریقے سے کرنے والا ہو، ناپسندیدہ باتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبر کرنے والا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنے والا ہو تو اس کا نیک خواب اگر اللہ نے چاہا تو نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ اور جس آدمی کی حالت ان دونوں حالتوں کے درمیان ہو اس کا سچا خواب بھی ان دونوں اجزاء کے درمیان والی کیفیت میں ہوگا یعنی چالیس سے ستر تک کے درمیان۔ ستر سے کم نہیں ہوگا اور چالیس سے زیادہ ہوگا۔ اسی معنی کی طرف ابوعمر بن عبداللہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:
خواب کے اجزاء کی تعداد کے بارے میں آثار میں پایا جانے والا اختلاف میرے نزدیک کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم۔
کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ خواب دیکھنے والا شخص جس طرح کلام کے صدق، امانت کی ادائیگی، دین متین اور حسن یقین کی قوت سے لبریز ہوگا اسی قدر اس کا خواب نبوت کے مختلف اجزاء کی تعداد کے مطابق ہوگا۔ پس جس قدر بندے کی نیت اپنے رب کی عبادت میں خالص ہوگی اس کا یقین پختہ ہوگا اور اس کا کلام سچا ہوگا اسی قدر اس کا خواب زیادہ سچا اور نبوت کے زیادہ قریب ہوگا۔ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو باہمی فضیلت حاصل ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ (الاسراء: 55) ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل بہت ساری احادیث کو جامع ہے اور یہی تاویل بہتر ہے بنسبت بعض کی بعض کے ساتھ تفسیر کرنے اور بعض کو چھوڑ دینے کے۔ أبو سعید الاسفاقیسی نے بعض اہل علم سے جزء من ستة وأربعين جزأمن النبوة کا یہ معنی ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں تئیس سال تک وحی فرمائی ہے جس طرح کہ عکرمہ اور عمرو بن دینار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے تو اگر ہم تئیس سال کے عرصے کو چھ ماہ کے حساب سے تقسیم کریں تو اس کے چھیالیس اجزاء بن جائیں گے۔ اسی قول کی طرف مازری نے اپنی کتاب "المعلم" میں اشارہ کیا ہے اور اس کو القونوی نے اپنی تفسیر میں "سورۂ یونس" کی آیت کریمہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (یونس: 64) کے تحت اختیار کیا ہے مگر یہ مؤقف دو اعتبار سے فاسد ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ أبو مسلمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ مدت بیس سال تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کے آخر میں ہوئی پھر دس سال آپ نے مکہ میں قیام فرمایا یہ عروہ، شعبی، ابن شہاب، حسن، عطا خراسانی اور سعید بن مسیب کے مختلف اقوال سے ثابت ہے اور یہی ربیعہ اور ابو غالب کی روایت ہے حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے پس اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو پھر یہ تأویل باطل ہو جائیگی۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ پھر اجزاء مختلفہ کے بارے میں وارد تمام احادیث بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** صرف خواب نبوت کے اجزاء میں سے تھا کیوں کہ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو عاجز کرتی ہیں اور مانع ہوتی ہے جس طرح کہ پرواز کرنا، ایمان کو بدل دینا اور علم غیب میں سے کسی چیز پر مطلع ہونا، جیسا کہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''نبوت کی مبشرات میں سے سوائے نیند کے سچے خواب کے کوئی شے باقی نہیں رہی (1)۔ الحدیث المختصر سچا خواب الله تعالیٰ کی طرف سے اور نبوت کے اجزاء میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواب الله کی طرف سے ہے اور پریشان خواب شیطان کی طرف سے'' (2)۔ اس بات کی تصدیق حق ہے اور اس کی عمدہ تاویل ہے اور بعض اوقات بعض چیزوں کی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور خواب میں الله تعالیٰ کے بدیع ہونے اور اس کی مہربانی کے ایسے دلائل ہوتے ہیں جو بندہ مومن کے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل دین اور اہل حق میں سے اہل رائے اور محدثین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور سوائے معتزلہ میں سے ملحد اور بے دین لوگوں کے خواب کا کوئی بھی منکر نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: جب سچا خواب نبوت کے اجزاء میں سے ہے تو پھر کافر، جھوٹا اور خلط ملط کرنے والا اس کا اہل کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بعض کفار اور دیگر ایسے لوگوں سے جن کا دین پسندیدہ نہیں ان سے بھی صحیح اور سچے خواب کا ظہور ہوا ہے جس طرح اس بادشاہ کا خواب جس نے خواب میں سات گائیں دیکھیں، قید خانے میں دونوں جوانوں کے خواب، بخت نصر کا وہ خواب جس کی تعبیر دانیال نے اس کی بادشاہت کے جانے کے ساتھ کی، ظہور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کسریٰ کا خواب اور عاتکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کا آپ کے بارے میں خواب حالانکہ وہ کافرہ تھی اسی طرح امام بخاری نے باب رؤیا اھل الجن کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر، فاسق، فاجر اور جھوٹے آدمی کا خواب اگرچہ بعض اوقات وہ سچا بھی ہوتا ہے وہ وحی اور نبوت میں سے نہیں ہے، کیونکہ ہر وہ آدمی جس کی غیب کی بات سچی ہو اس کی بات اور خبر نبوت میں سے نہیں ہوتی اس کی تفصیل ''سورۃ الانعام'' میں گزر چکی ہے کہ کاہن اور دیگر لوگ بعض اوقات سچی خبر دیتے ہیں لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تو اس طرح ان کے خوابوں کی بھی کیفیت ہوتی ہے۔ مہلب نے کہا: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ عنوان صرف اس لیے قائم کیا ہے تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ مشرکین کے خواب بھی سچے ہو سکتے ہیں جس طرح کہ دونوں جوانوں کے خواب سچے تھے مگر یہ درست نہیں کہ مومنین کے خوابوں کی طرح ان کے خوابوں کی نسبت نبوت کی طرف کی جائے، کیونکہ ہر وہ بات جس کی سچی تاویل کرنا ممکن ہو اس کا نبوت کے اجزاء میں سے ہونا ضروری نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الله تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے والے خواب وہ ہوتے ہیں جو پریشانی اور وہم سے خالی ہوں اور ان کی تاویل لوح محفوظ میں مرقوم تقدیر کے موافق ہو۔ وہ خواب جو اضغاث کی خبر میں سے ہوں وہ پریشان کن افکار ہیں جن کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ شیطان کی طرف منسوب ہوتے ہیں انہیں کو ضغث کہا جاتا ہے، کیونکہ ان میں متضاد چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کا معنی مہلب نے بیان کیا ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں جو ہر قائل کے قول سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''خواب تین ہیں ان میں سے ایک شیطان کے احوال ہیں تاکہ وہ ابن آدم کو پریشان کرے اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں کہ جو حالات حالت بیداری میں بندے کو درپیش ہوتے ہیں انہی کو وہ خواب میں دیکھتا ہے اور کچھ وہ خواب ہیں جو نبوت کے

1۔ شعب الایمان، جز 4، صفحہ 185 2۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 241

چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہیں'' (1)۔ سننے والے نے کہا کہ میں نے کہا: آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ الایۃ۔ الرؤیا، رأی فی المنام سے مصدر ہے، رؤیا فعلی کے وزن پر ہے سقیا اور عشریٰ، اس کا الف تانیث کا ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ علماء کا رؤیا کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایسے اجزا کا ادراک ہے جن کو آفت نہیں آتی جس طرح متفرق نیند وغیرہ۔ اسی وجہ سے نیند کے غلبہ کی قلت کے سبب اکثر خواب رات کے آخری حصہ میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خواب دیکھنے والے کے لیے علم ناشی پیدا فرماتا ہے اور دیکھنے والے کے لیے اس کے مشاہدے کے مطابق اس کو پیدا فرماتا ہے تاکہ ادراک صحیح ہو جائے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: خواب میں صرف وہی دکھایا جاتا ہے جس کا ادراک حالت بیداری میں صحیح ہو (2)۔ اسی وجہ سے خواب میں کوئی آدمی کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے کسی حالت میں نہیں دکھایا جاتا اور صرف معتاد چیزیں ہی دکھائی جاتی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو سونے والے کے محل مدرک میں دیکھی جانے والی چیزیں پیش کرتا ہے اور پھر اس کو محسوس صورتوں کی تمثیل دیتا ہے۔ کبھی وہ صورتیں پائی جانے والی چیزوں کے موافق تمثیلی صورت اختیار کرتی ہیں اور کبھی وہ عقل کے ذریعے سمجھے جانے والے غیر محسوس معانی کی صورت اختیار کرتی ہیں، البتہ دونوں حالتوں میں وہ بشارت دینے والی یا ڈرانے والی ہوتیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے، صحیح مسلم اور دیگر کتب میں: ''میں نے سیاہ پراگندہ سر (عورت) کو دیکھا جو مدینہ سے مہیعۃ (جحفہ کا مقام جو اہل شام کا میقات ہے) تک نکلتی ہے پس میں نے اس کی تعبیر بخار کے ساتھ کی ہے'' (3)۔ اور ''میں نے اپنی تلوار کو دیکھا جس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اور گائے کو دیکھا جس کا نحر کیا جاتا ہے تو میں نے ان دونوں کی تعبیر یہ کی ہے کہ میرے اہل بیت کے آدمی کو شہید کیا جائے گا اور گائے میرے صحابہ کی ایک جماعت ہے جن کو شہید کیا جائے گا'' (4)، اور ''میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ زرع میں داخل کیا ہے تو اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی ہے۔'' اور ''میں نے اپنے ہاتھ میں دو کنگن دیکھے تو ان دونوں کی تعبیر میں نے دو کذابوں سے کی جو میرے بعد نکلیں گے'' (5)۔ علاوہ ازیں ایسے خواب جن کی تمثیل ہو سکتی ہے۔ اور ان میں سے کچھ خواب وہ ہوتے ہیں جن کے معنی پہلے ہی ظاہر ہوتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کے معنی غور و فکر کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر سالوں سے کی اور آپ نے گیارہ ستارے، سورج اور چاند کو دیکھا تو ان کی تعبیر اپنے بھائیوں اور اپنے والدین سے کی۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اگر یہ اعتراض کیا جائے: حضرت یوسف علیہ السلام اپنی خواب کے وقت چھوٹے تھے اور صغیر کے فعل پر کوئی حکم نہیں لگایا جاتا تو آپ کا خواب ایسا کس طرح ہو گیا کہ جس پر حکم لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ آپ کے والد نے فرمایا: لَا

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1073، ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب تعبیر الرؤیا، باب الرؤیا ثلاث، حدیث نمبر 3896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1074

3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1042

4۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 244

5۔ جامع ترمذی تعبیر الرؤیا، جلد 2، صفحہ 53

تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خواب ایک حقیقت کا ادراک ہے، جس طرح کہ پہلے بیان ہوا تو یہ صغیر سے بھی ہوسکتا ہے جس طرح اس سے حالت بیداری میں ادراک حقیقی ممکن ہے اور جب وہ اپنی دیکھی ہوئی چیز کی سچی خبر دے تو یہی کیفیت ہوگی جب وہ ایسی چیز کی خبر دے جس کو اس نے حالت خواب میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب کے بارے میں خبر دی اور یہ خواب آپ کے مشاہدہ کے مطابق پایا بھی گیا تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ خواب غیر شفیق اور غیر مخلص آدمی کے سامنے بیان نہ کیا جائے اور نہ ہی ایسے آدمی کے سامنے اس کو بیان کیا جائے جو خواب کی تعبیر عمدہ طریقے سے نہیں کرسکتا۔ ابورزین عقیلی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور خواب پرندے کی ٹانگ کے ساتھ تب تک معلق رہتا ہے جب تک کہ خواب دیکھنے والا اس کو بیان نہ کرے اور جب وہ اس کو بیان کرے تو وہ واقع ہوجاتا ہے سو تم سوائے عقلمند، محبت کرنے والے اور مخلص آدمی کے کسی کے سامنے اس کو بیان نہ کرو“(1)۔ امام ترمذی نے اس کو روایت کیا اور اس کے بارے میں آپ نے کہا: حدیث حسن صحیح۔ ابورزین کا نام؛ لقیط بن عامر ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کیا ہر ایک خواب کی تعبیر کرسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا نبوت کے ساتھ کھیلا جاسکتا ہے؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی خواب کی تعبیر نہ کرے سوائے ایسے آدمی کے جو عمدہ طریقے سے تعبیر کرسکتا ہے۔ اگر اس میں کوئی بھلائی دیکھے تو اس کی خبر دے اور اگر اس میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو یا تو اچھی بات کرے یا پھر خاموشی اختیار کرے۔ ایک قول یہ ہے: کیا تعبیر کرنے والا اس کی اچھی تعبیر کرسکتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں پھر آپ نے کہا: خواب نبوت کا حصہ ہے لہٰذا نبوت کے ساتھ نہ کھیلا جائے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کو کسی خوفناک چیز سے ڈرانا مباح ہے اور یہ غیبت کے معنی میں داخل نہیں کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے ڈرایا کہ وہ اپنی سازش کریں گے۔ اور اس آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ جس آدمی کو اپنے خاندان میں سے کسی آدمی سے حسد اور سازش کا ڈر ہو اس کے سامنے نعمت کا اظہار نہ کرنا جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی ضروریات کو چھپانے کے ذریعے مدد طلب کرو کیونکہ ہر نعمت والے آدمی کے ساتھ حسد کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کو جاننے پر بھی واضح دلیل ہے۔ پس انہوں نے اس کی تعبیر کو جان لیا کہ عنقریب وہ تعبیر ان کے سامنے ظاہر ہوگی اور آپ نے اپنے دل میں اس کی پرواہ نہ کی۔ آدمی یہ بات تو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے بہتر ہوگا مگر بھائی اپنے بھائی کے بارے میں یہ نہیں چاہتا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں حسد و بغض کو محسوس کرلیا تھا تو آپ نے ان کو ان کے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، جلد 2، صفحہ 52۔ ایضاً، حدیث نمبر 2204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے خواب بیان کرنے سے روک دیا اس خوف سے کہ ان کے سینے اس کے حسد میں جلنے نہ لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کے بارے میں سازش کرنے لگیں۔ یہ وجہ اور ان (بھائیوں) کی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کارروائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اس وقت نبی نہیں تھے۔ ابن زید کی کتاب الطبری میں ہے کہ وہ انبیاء تھے مگر یہ بات دنیوی حسد، والدین کی نافرمانی، مومن کی ہلاکت پر ابھارنے اور مومن کے قتل کا کسی کو حکم دینے سے انبیاء کے محفوظ ہونے کے عقیدے کو قطعی رد کرتی ہے لہٰذا جس آدمی نے ان کے انبیاء ہونے کی بات کی ہے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔ عقل نبی کی لغزش کو محال نہیں سمجھتی البتہ اگر وہ لغزش کبیرہ گناہ کو جامع ہو تو مسلمان کا ان سے انبیاء کے معصوم ہونے پر اجماع ہے، جبکہ صغیرہ گناہوں کے بارے میں مسلمان کا اختلاف ہے جس طرح کہ پہلے بیان ہوا اور بعد میں بھی اس کا بیان آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(1) انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''نبوت میں سے سوائے مبشرات کے کوئی چیز باقی نہیں رہی'' انہوں نے کہا: مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نیک خواب''۔ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خواب مطلقاً بشارت ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ بے شک سچا خواب بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا ہے۔ اسے دیکھنے والا خوش نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ مومن کو ایسا خواب اس کے ساتھ مہربانی اور رحمت کرتے ہوئے دکھاتا ہے تاکہ مصیبت سے پہلے اس کے نزول کے لیے بندہ تیاری کر لے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مصر میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں خواب دیکھا جو ان کی محنت پر دلالت کرتا تھا تو آپ نے ان کی طرف یہ خواب لکھا تاکہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں۔ ''سورۂ یونس آیت 64'' میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر گزر چکی ہے کہ اس سے مراد ''نیک خواب ہے'' یہ اور امام بخاری کی حدیث کا مخرج اکثر واغلب ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ امام بخاری نے ابو سلمہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے خواب دیکھا تو اس نے مجھے بیمار کر دیا حتیٰ کہ میں نے ابو قتادہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: میں خواب دیکھا کرتا تھا تو وہ مجھے بیمار کر دیتا یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جب تم میں سے کوئی کسی پسندیدہ چیز کو دیکھے تو اس کو صرف اسی کے سامنے بیان کرے جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے اور جب وہ کسی ناپسندیدہ بات کو دیکھے تو اسے اس بات کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے۔ اور اسے تین مرتبہ تھوکنا چاہیے اور وہ کسی کو بھی وہ خواب بیان نہ کرے تو اس کو کوئی نقصان نہیں دے گا''(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس خواب سے استعاذہ کو اس سے اُذیت کے اٹھ جانے کا باعث بنایا ہے۔ کیا آپ نے اُبو قتادہ کا قول نہیں دیکھا: میں خواب دیکھا کرتا تھا یہ مجھ پر پہاڑ سے زیادہ بوجھل ہوتا۔ جب میں نے یہ حدیث سنی تو میں اس کو کوئی چیز شمار نہیں کرتا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں اضافہ کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اسے تین مرتبہ اپنے بائیں جانب تھوکنا چاہیے تین

1۔ صحیح بخاری، مبشرات، جلد 2، صفحہ 1035

2۔ ایضاً، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1043

مرتبہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے اور جس پہلو پر ہو اس سے اس کو پہلو بدل لینا چاہیے"(1)۔ حضرت ابو ہریرہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے آپ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اٹھے اور نماز پڑھے"(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ سارے کا سارا باہم متعارض نہیں، یہ معاملہ صرف جگہ بدلنے کا ہے اور نماز کا اس میں اضافہ ہے تو خواب دیکھنے والے پر یہ سارے کام کرنا لازم ہیں اور نماز کے لیے اٹھنا ان تمام افعال کو شامل ہے کیونکہ جب وہ نماز پڑھے گا تو نماز کے لیے اس کا عمل تمام امور کو شامل ہوگا کیونکہ جب نماز کے لیے اٹھے گا تو وہ پہلو کو بدلے گا، جب منہ میں پانی ڈالے گا تو تھوکے گا اور جب نماز شروع کرے گا تو تعوذ پڑھے گا، دعا کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس معاملے میں تضرع کرے گا کہ وہ خواب کے شر سے اس کو کافی ہو گا اس کی یہ زاری ایسی حالت میں ہوگی جو قبولیت کے زیادہ قریب ہے اور یہ رات میں صبح سے تھوڑا سا پہلے ہوگا۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

"اور اسی طرح چن لے گا تجھے تیرا رب اور سکھا دے گا تجھے باتوں کا انجام (یعنی خوابوں کی تعبیر) اور پورا فرمائے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر جیسے اس نے پورا فرمایا اپنا انعام اس سے پہلے تیرے دو بھائیوں ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر، یقیناً تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے"۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ میں کاف ضمیر محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ میں کاف اور ما کافہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَذٰلِكَ یعنی جس طرح اس نے خواب کے ذریعے تجھے عزت عطا فرمائی پس اسی طرح وہ تجھے چن لے گا اور خواب کو سچا ثابت کر کے تیرے اوپر احسان فرمائے گا۔ مقاتل نے کہا: تیرے لیے سجدوں کے ذریعے (تجھے چن لے گا) حضرت حسن نے کہا: نبوت کے ذریعے، اجتباء سے مراد مجتبیٰ کے لیے امور کی بلندی کو اختیار کرنا ہے۔ اس کی اصل جبیت الشییٔ ہے یعنی میں نے اس کو حاصل کر لیا۔ اسی سے جبیت الماء الی الحوض ہے، یہ نحاس کا قول ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی تعدید ہے جس طرح زمین میں اقتدار دینا اور خوابوں کی تعبیر کی تعلیم اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ انتخاب خوابوں کی تعبیر کے سلسلہ میں ہے۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تفسیر چالیس سال بعد ہوئی۔ اور یہ خواب کی انتہاء ہے۔

الاحادیث سے مراد وہ ہے جو لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے پس اس میں آپ کو

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، جلد 2، صفحہ 1037 2۔ جامع ترمذی، تعبیر الرؤیا، جلد 3، صفحہ 52

غلطی لاحق نہ ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام خوابوں کی تعبیر کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ جانتے تھے۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح تھے، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں میں اس کے سب سے زیادہ تعبیر بتانے والے تھے، ابن سیرین کو اس میں بہت زیادہ تقدم طبع اور احسان حاصل ہوا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ ان جیسے یا ان کے قریب قریب تھے۔ اپنے قول کی تاویل کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ یعنی قوموں اور کتابوں کی گفتگو اور دلائل توحید، یہ نبوت کی طرف اشارہ ہے یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ سے مقصود ہے یعنی نبوت کے ذریعے (وہ اپنی نعمت تیرے اوپر مکمل فرمائے گا) ایک قول یہ ہے: تیرے بھائیوں کا تیری طرف نکلنے کے ساتھ۔ اور ایک قول یہ ہے: تجھے ہر ناپسندیدہ کاروائی سے نجات عطا فرمانے کے ذریعے۔ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ خلت اور آگ سے ان کو نجات عطا فرمانے کے ذریعے وَ اِسْحٰقَ نبوت کے ذریعے۔ ایک قول یہ ہے: ذبح کے ذریعے۔ یہ عکرمہ کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ کے ذریعے آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ تمام بنی یعقوب کو نبوت عطا فرمائے گا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ اس کو جاننے والا ہے جو کچھ وہ تجھے عطا فرمائے گا: حَكِيْمٌ تیرے ساتھ اپنے فعل میں (حکمت والا ہے)۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝

”بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصہ) میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں دریافت کرنے والوں کے لیے جب بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے حالانکہ ہم ایک (مضبوط) جتھ ہیں، یقیناً ہمارے والد (ایسا کرنے میں) کھلی غلطی کا شکار ہیں۔ قتل کر ڈالو یوسف کو یا دور پھینک آؤ اسے کسی علاقے میں (یوں) تنہا ہو جائے گا تمہاری طرف تمہارے باپ کا رخ اور ہو جانا اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک قوم“۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ یعنی جس نے ان کی گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ اہل مکہ نے اٰيَةٌ واحد پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے اٰيٰتٌ جمع کو اختیار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ خیر کثیر ہے۔ نحاس نے کہا: یہاں ”آیۃ“ عمدہ قرات ہے یعنی جن لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر کے بارے میں ان کو ان کے بارے میں جو خبر دی گئی اس میں ان کے لیے نشانی ہے، کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپ مکہ میں تھے انہوں نے کہا: ہمیں انبیاء میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں خبر دیجیے جو شام میں تھا، اس کے بیٹے کو مصر لے جایا گیا تو وہ اس پر رویا یہاں تک کہ نابینا ہو گیا؟ اور مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی نہیں تھا اور نہ ہی انبیاء کی خبر کو کوئی جانتا تھا۔ یہودی مدینہ سے متوجہ ہوئے اور آپ سے انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف یکبارگی نازل فرما دی، اس میں وہ سب کچھ ہے جو تورات میں تھا اور اس

سے کچھ زائد بھی، تو یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسی طرح نشانی تھی جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے لیے مردہ کو زندہ کرنا۔ اٰیٰتٌ سے مراد نصیحت ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد عبرت ہے۔ ایک روایت کے مطابق بعض مصاحف میں عبرۃ ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد بصیرت ہے۔ ایک قول کے مطابق: عجب۔ جس طرح کہا جاتا ہے۔ فلان آیت فی العلم والحسن یعنی فلاں آدمی علم وحسن میں عجب ہے۔ ثعلبی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: جب خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں تک پہنچا تو انہوں نے آپ کے ساتھ حسد کیا۔ ابن زید نے کہا: وہ انبیاء تھے اور انہوں نے کہا: کیا اسے یہ بات پسند ہے کہ اس کے بھائی اسے سجدہ کریں حتیٰ کے اسے اس کے والدین سجدہ کریں! تو انہوں نے عداوت کے سبب آپ سے بغاوت کر دی۔ اس قول کا رد پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اور ان کے اسماء: روبیل یہ ان میں سے سب سے بڑا تھا۔ شمعون، لاوی، یہوذا، زیالون، یشجر ان کی ماں لیا بنت لیان تھی یہ حضرت یعقوب کی خالہ کی بیٹی تھی آپ کے چار بیٹے دو کنیزوں میں سے تھے۔ دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ پھر لیا فوت ہو گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کی بہن راحیل سے شادی کر لی، تو آپ کے بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ سہیلی نے کہا: حضرت یعقوب کی ماں کا نام رفقا تھا اور راحیل بنیامین کے نفاس میں فوت ہو گئی اور لیان بن ناہر بن آزر حضرت یعقوب کی خالہ تھی۔ ایک قول یہ ہے: دونوں لونڈیوں کے نام لیا اور تلتا تھا۔ ان میں ایک راحیل اور دوسری اس کی بہن لیا تھی یہ دونوں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہبہ کی گئیں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کو اپنے پاس جمع کیا اور آپ کے بعد یہ کسی کے لیے بھی حلال نہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 23) کے سبب جو کچھ ابن زید نے کہا اس کی تردید پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ، یوسف، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ لام تاکید کے لیے ہے۔ یہ وہ لام ہے جس کے ذریعے قسم اٹھائی جاتی ہے یعنی واللہ لیوسف، وَ اَخُوْهُ اس پر اس کا عطف ہے۔ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا اس کی خبر ہے اس کا تثنیہ آتا ہے اور نہ جمع کیونکہ یہ فعل کے معنی میں ہے۔ انہوں نے یہ صرف اس وجہ سے کہا کہ ان تک خواب کی خبر پہنچ گئی تو انہوں نے سازش شروع کی۔ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی جماعت اور وہ دس تھے۔ عصبہ ایک سے لے کر دس تک کے درمیان (بولا جاتا ہے) ایک قول ہے: پندرہ تک۔ ایک قول ہے: اس سے چالیس کے درمیان۔ اور لفظوں میں اس کا واحد نہیں جس طرح کہ نفر اور رھط (کا واحد نہیں ہوتا) اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس سے ان کی مراد دین کی گمراہی نہیں کیونکہ اگر وہ یہ مراد لیتے تو وہ کافر ہو جاتے، بلکہ ان کی مراد تدبیر کے رستے سے ہٹ جانا ہے اس طرح کہ اس پر دو کو ترجیح دے دی باوجود ان کے ساتھ نسبت کی برابری کے۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف اور ان کے بھائی کو ہمارے اوپر ترجیح کے ذریعے واضح غلطی میں ہونے کی وجہ سے۔

اقْتُلُوْا يُوْسُفَ کلام میں حذف ہے یعنی ان میں سے کہنے والے نے کہا: اقْتُلُوْا يُوْسُفَ یوسف کو قتل کر دو تاکہ یہ امر کے مادہ کو ہی ختم کرنے والا ہو جائے۔ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یعنی زمین میں فی حرف جر کو حذف کر کے اَرْضًا کو نصب دے دی گئی فی کے حذف کے حوالے سے سیبویہ نے شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے۔

لَدْنٌ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُهُ   فيه كما عَسَلَ الطَّرِيقَ الثَّعْلَبُ

مقام استشہاد عسل الطریق ہے جو کہ اصل میں عسل فی الطریق تھا۔

نحاس نے کہا: آیت کریمہ میں بہت سارے حسن ہیں کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ ان دو میں سے ایک حرف ہے پس جب حرف کو حذف کر دیا گیا تو فعل اس کی طرف متعدی ہو گیا۔ یہ (قتل اور پھینکنے کی) بات کہنے والے کے بارے میں ایک قول یہ ہے: وہ شمعون تھا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ کعب احبار نے کہا: دان۔ مقاتل نے کہا: روبیل۔ واللہ اعلم۔ اور اَرْضًا سے مراد ایسی زمین ہے جو ان کے باپ سے دور ہو۔ اس میں اضمار ضروری ہے کیونکہ وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) اپنے باپ کے پاس بھی تو زمین ہی میں تھے۔ يَخْلُ مجزوم ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے اس کا معنی ہے: خالص ہو جائے اور صاف ہو جائے لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ پس وہ مکمل طور پر تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور تم ہو جانا اس کے بعد یعنی گناہ کے بعد، ایک قول یہ ہے: یوسف کے بعد قَوْمًا صٰلِحِيْنَ یعنی توبہ کرنے والے لوگ یعنی اس عمل کے بعد توبہ کر لینا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ کو قبول فرمائے گا۔ اس مین اس بات پر بھی دلیل ہے کہ قاتل کی توبہ بھی قابل قبول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے آنے والی اس بات کا انکار اور رد نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: صٰلِحِيْنَ سے مراد ہے یعنی بغیر کسی ترجیح اور فضیلت کے تمہارے معاملات تمہارے باپ کے نزدیک درست ہو جائیں گے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

"(یہ سن کر) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ نہ قتل کرو یوسف کو (بلکہ) پھینک دو اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اٹھا لیں گے اسے کوئی راہ چلتے مسافر اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے"۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ کہنے والا یہوذا ہے، یہ حضرت یعقوب کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ روبیل ہے(1) اور یہ آپ کی خالہ کا بیٹا ہے یہ وہی ہے جس نے فلن ابرح الارض کہا۔ ایک قول یہ ہے: وہ شمعون ہے۔ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ اہل مکہ، اہل بصرہ اور اہل کوفہ نے فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ پڑھا ہے جبکہ اہل مدینہ نے فی غیابات الجب پڑھا ہے اُبوعبید کے نزدیک مختار واحد ہے کیونکہ اس سے مراد وہ ایک ہی مقام ہے جہاں انہوں نے آپ کو پھینکا تھا اس وجہ سے انہوں نے جمع کا انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ لغت میں تنگی لانے کے مترادف ہے۔ اس کو جمع یعنی غیابات پڑھنا دو اعتبار سے جائز ہے۔ سیبویہ نے سیر علیہ عشیانات و أصيلانات حکایت کیا ہے اور اس سے مراد عشية و اصیلا ہے تو اس نے اس میں سے ہر وقت کو عشية اور أصیلا بنا دیا ہے تو اسی طرح ہر وہ جگہ جہاں کوئی چیز چھپائی جائے وہ غیابة ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ گہرے کنوئیں میں کئی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ اور کہا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 184

جا تا ہے۔ غاب یَغِیبُ غَیْبًا وَغَیَابَۃ جس طرح شاعر نے کہا ہے:

أَلَا فالبثا شھرین أو نصفَ ثالثٍ     الی ذاکما قد غَیَّبَتِی غِیَابِیَا

ہروی نے کہا: غیابۃ حوض یا کنوئیں کی وہ ایک طرف جس کو پانی کھا جاتا ہے یا پانی کے او پر کنوئیں میں موجود طاق کے مشابہ ہے جو آنکھ سے کسی چیز کو چھپا لیتا ہے۔ ابن عزیر نے کہا: ہر وہ چیز جو آپ سے کسی چیز کو چھپا لے وہ غیابہ ہے۔ میں (قرطبی) نے کہا: اسی سبب سے قبر کو غیابہ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فإن أنا یومًا غَیَّبَتنی غَیَابَتِی     فَسِیروا بَسَیْرِی فی العَشِیرۃِ والأھلِ

اس شعر میں غیابتی سے مراد میری قبر ہے۔

اور ''جب'' سے مراد وہ حوض ہے جسے پتھروں سے نہ بنایا گیا ہو اور اگر اسے پتھروں سے بنایا جائے تو وہی کنواں کہلائے گا اعشی نے کہا:

لئن کنتَ فی جبٍّ ثمانین قامۃً     ورُقِّیتَ أسبابَ السّماءِ بسُلَّمِ

اس کو ''جب'' اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زمین میں ایک ٹکڑا کاٹا جاتا ہے اور ''جب'' کی جمع جبۃ وجباب واجباب آتی ہے۔ اس آیت میں غیابہ اور جب دونوں کو جمع کر دیا گیا کیونکہ اس سے کہنے والے کی مراد یہ تھی کہ اس کو کنوئیں کی کسی تاریک جگہ میں پھینکو تاکہ دیکھنے والے کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ ایک قول کے مطابق: یہ بیت المقدس کا کنواں ہے(1)، ایک قول یہ ہے: وہ اردن میں ہے یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ مقاتل کا قول ہے: یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ** جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مجاہد، ابورجاء، حسن اور قتادہ نے تلتقطه ''تا'' کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ اس معنی پر محمول ہوگا کہ بعض گزرنے والے سیارہ ہوتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: سقطت بعض أصابعه یعنی سقطت کو مؤنث استعمال کیا ہے۔ اس پر اس نے شعر پڑھا:

وتَشْرَقُ بالقولِ الذی قد أذعتَه     کما شَرِقَتْ صَدْرُ القناۃِ من الدَّمِ

ایک اور شاعر نے کہا:

أَرَی مَرَّ السِّنینَ أَخَذْنَ مِنِّی     کما أَخَذَ السِّرَارُ من الھِلالِ

شاعر نے شرق اور أخذت نہیں کہا۔ اور سیارہ سے مراد وہ جماعت ہے جو راستہ میں سفر کے لیے چلی ہے۔ کہنے والے نے یہ صرف اس وجہ سے کہا تاکہ انہیں آپ کو دور کسی جگہ لے جانے کی ضرورت بھی نہ پڑے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ پس گزرنے والوں میں سے جو آپ کو اٹھائے گا وہ آپ کو دور دراز مقام پر لے جائے گا تو گویا یہ ان کی تدبیر کی صورت تھی تاکہ ان کو بذات خود کوئی حرکت نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ ان کے والدان کو اجازت نہ دیتے اور یہ بھی ہو سکتا تھا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 185

کہ وہ ان کے ارادے سے آگاہ ہو جاتے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نہ اس واقعہ سے پہلے نبی تھے اور نہ ہی بعد میں کیونکہ انبیاء کسی مسلمان کے قتل کا منصوبہ نہیں بناتے البتہ وہ مسلمان تھے۔ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا پھر توبہ کر لی۔ ایک قول یہ ہے: وہ انبیاء تھے، عقلا نبی کی لغزش محال نہیں تو یہ ان کی لغزش تھی، ان کا یہ فعل اس عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ انبیاء گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس وقت وہ نبی نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے آگاہ فرمایا اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن وہب نے کہا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا گیا تو اس وقت وہ بچے تھے۔ اسی طرح ابن قاسم نے بھی آپ سے روایت کیا ہے، یعنی اس وقت آپ چھوٹے تھے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ ہے آپ نے کہا کہ اٹھایا تو چھوٹے کو ہی جا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ یہ چیز بھی بچوں کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ التقاط راستے سے کسی چیز کو اٹھانا ہے اسی طرح سے اللقیط اور اللقطہ ہے، ہم (قرطبی) ان کے وہ احکامات جن پر آیت اور حدیث دلالت کرتی ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ اہل علم اور اہل لغت نے کہا ہے ذکر کرتے ہیں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: التقاط سے مراد بغیر طلب کے کسی چیز کا پالینا ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ ہے یعنی وہ ان کو پالیں گے بغیر اس کے کہ وہ گزرنے والی جماعت آپ کی تلاش میں ہو۔ علما کا لقیط کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے: اس کی اصل آزادی ہے کیونکہ آزاد، غلاموں پر غالب ہیں۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے لقیط کے آزاد ہونے کا فیصلہ دیا، اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (یوسف: 20) کی تلاوت فرمائی اسی جانب اشہب گئے ہیں جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی ہیں اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک پوری جماعت سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے اس کی غلامی کی نیت کی تو وہ مملوک ہوگا۔ اور اگر اس نے اجر و ثواب کی نیت کی تو وہ آزاد ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے موطا میں لکھا ہے: ہمارے نزدیک لقیط کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آزاد ہے اور اس کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی، وہی اس کے وارث ہوں گے اور وہی اس کے عاقلہ بھی ہیں۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: وانما الوَلَاء لمن أعتق (1)، ولاء صرف اسی کی ہے جس نے آزاد کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معتق سے ولاء کی نفی کر دی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان دونوں کے اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ لقیط کسی کا وارث نہیں بنے گا۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اصحاب اور اکثر کوفیوں کا قول ہے: جو چاہے لقیط کا والی بن سکتا

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفرائض، جلد 2، صفحہ 34

ہے اور جو اس کا والی بنے گا وہی اس کا وارث ہوگا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا؛ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی ولاء کے ساتھ جہاں چاہے منتقل ہو سکتا ہے جب تک کہ جو اس کا والی بنا اس نے اس کی طرف سے دیت ادا نہ کی ہو اور اگر اس نے اس کی طرف سے دیت ادا کی ہے تو یہ کبھی بھی اپنی ولاء کے ساتھ منتقل نہیں ہو سکتا۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے: لقیط آزاد ہے۔ اگر وہ اس کا والی بننا چاہے جس نے اس کو اٹھایا تو وہ اس کا ولی بن جائے اور اگر وہ اس کے علاوہ اس کا والی بننا پسند کرتا ہے تو کسی اور کا والی بن جائے، اسی قسم کی بات حضرت عطا سے منقول ہے یہی ابن اشہاب رحمۃ اللہ علیہ اور اہل مدینہ کے ایک گروہ کا قول ہے، کہ لقیط آزاد ہے۔ ابن عربی نے کہا(1) کہ لقیط کی اصل آزادی ہے غلام پر آزاد لوگوں کے غلبہ کی وجہ سے، لہٰذا غالب اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا جس طرح کہ غلبہ ظن کی بنیاد پر اس کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، پس اگر وہ ایسے گاؤں میں تھا جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہیں تو ابن قاسم نے کہا: جو زیادہ اکثریت میں ہے اس پر اس کا حکم لگایا جائے گا، اگر اس پر یہودیوں کا لباس ہے تو وہ یہودی ہے۔ اگر اس کا لباس نصاریٰ والا ہے تو یہ نصرانی ہے۔ ورنہ وہ مسلمان ہوگا مگر یہ کہ اکثر گاؤں والے اگر اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر ہوں (تو پھر اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا) کسی اور آدمی کا قول ہے، اگر اس گاؤں میں ایک بھی مسلمان ہو تو لقیط کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اسلام کے اس حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کہ وہ غالب ہوتا ہے اور اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ اشہب کے قول کا مقتضی بھی یہی ہے: وہ ہمیشہ مسلمان ہوگا کیونکہ میں اس کو ہر حال میں مسلمان ہی بناتا ہوں جس طرح کہ میں اس کو ہر حال میں آزاد بناتا ہوں۔ فقہاء کا ایسے لقیط کے بارے میں اختلاف ہے بینہ جس کی غلامی پر دلالت کرے۔ اہل مدینہ کے گروہ نے کہا ہے: اس سلسلہ میں بینہ کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی جانب اشہب بھی گئے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی وجہ سے: وہ آزاد ہے، اور جس کی آزادی کا فیصلہ کر دیا گیا اس کی غلامی کی بینہ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ابن قاسم نے کہا: اس معاملہ میں بینہ کو قبول کیا جائے گا، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کوفی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لقیط کے بارے میں کہا: اگر ملتقط نے لقیط پر کچھ خرچ کیا ہو پھر کسی آدمی نے لقیط کے بارے میں بینہ پیش کر دی کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو اگر لقیط کے باپ نے جان بوجھ کر اس کو پھینکا تھا تو ملتقط باپ کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور اگر پھینکنا نہ پایا جائے بلکہ وہ اس سے گم ہو گیا ہو تو پھر باپ پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ملتقط نفقہ کے سلسلہ میں متطوع شمار کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر اس نے لقیط پر کچھ خرچ کیا تو وہ متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا مگر یہ کہ حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہو۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر وہ آدمی جس نے کسی ایسے آدمی پر خرچ کیا جس پر خرچ کرنا اس پر لازم نہ تھا تو یہ اس پر خرچ کردہ رقم کے ساتھ رجوع کر سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر لقیط کا مال نہ ہو تو اس کا نفقہ بیت المال پر ہوگا مال نہ ہونے کی صورت میں دو قول ہیں: ایک قول اس کے اپنے ذمہ میں اس کے لیے قرض لیا جائے گا اور دوسرا قول...... بغیر کسی عوض کے مسلمانوں پر قسط باندھی جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

**مسئلہ نمبر 7**۔ لقطہ اور ضوال (گمشدہ چیز) کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: لقطہ اور ضوال دونوں معنی میں برابر ہیں اور ان دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے یہ موقف امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، انہوں نے ابوعبید قاسم کے اس کا قول کا انکار کیا ہے کہ گمشدگی صرف حیوان میں ہوتی ہے جبکہ لقطہ حیوان کے علاوہ دیگر چیزوں میں ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ قول غلط ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان أمكم ضلت قلادتها کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ تمہاری ماں سے اس کا قلادہ گم ہو گیا۔ اس میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلادہ پر مطلقاً ضالہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ لقطہ کے بارے میں علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر وہ بالکل کوئی معمولی چیز ہو یا ایسی چیز ہو جو باقی نہیں رہ سکتی تو پھر پورا سال اس کا اعلان کیا جائے گا۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر اس چیز کا مالک آ گیا تو وہ ملتقط کی نسبت اس کا زیادہ حق دار ہو گا بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہی اس کا مالک ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر سال گزرنے کے بعد ملتقط اس چیز کو کھا گیا اور مالک اس کو اس کا ضامن بنانا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اگر ملتقط نے اسے صدقہ کر دیا ہو تو پھر مالک کو ضامن بنانے اور اس کا اجر و ثواب حاصل کرنے دونوں کا اختیار ہے ان دونوں میں سے جس کو مالک اختیار کرے اس کے لیے بالاجماع ایسا کرنا درست ہو گا۔ صدقہ کرنے کے سبب لقطہ میں ملتقط کا قبضہ نہیں چلے گا اور نہ ہی وہ سال سے قبل تصرف کر سکتا ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ گمشدہ یوڑ میں سے جس کا ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس کا کھانا ملتقط کے لیے جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ فقہاء کا لقطہ کو اٹھا لینے یا چھوڑ دینے کی افضلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں حدیث طیبہ میں لقطہ کو اٹھانے اور گمشدہ چیز کو لینے کے مباح ہونے پر دلیل ہے بشرطیکہ وہ اونٹ نہ ہو۔ بکری کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''تمہارے لیے یا تمہارے بھائی کے لیے یا بھیڑیے کے لیے'' (1)۔ اس میں آپ نے لقطہ کو اٹھانے پر ابھارا ہے اور کسی چیز کے بارے میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ ضائع ہو جائے یا اس کا مالک آ جائے۔ اگر لقطہ کو چھوڑ دینا افضل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم ارشاد فرماتے جس طرح آپ نے اونٹ کی گمشدگی کے بارے میں فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے مذہب میں اس معاملہ میں گنجائش ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس کو اٹھا لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، یہ اسماعیل بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے کہا: میں کسی کے لیے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ لقطہ کو پانے کی صورت میں اس کو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ اس پر امین ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لقطہ کا تھوڑا ہونا یا اس کا زیادہ ہونا (اس سلسلہ میں) برابر ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ نے حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، انہوں نے کہا: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ سے لقطہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''لقطہ کی تھیلی اور رسی کے بارے میں پہچان کروا پھر سال بھر اس کا اعلان کرا گر اس کا مالک آ جائے تو صحیح ورنہ اس کے بارے میں تمہارا فیصلہ'' (2) (صحیح ہو گا) پوچھنے والے نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گمشدہ بکری؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے، تیرے بھائی کے لیے یا

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالۃ الغنم، جلد 1، صفحہ 328
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 78

بھیڑیئے کے لیے'' (1)۔ اس نے کہا: گمشدہ اونٹ؟ آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے نہیں اور اس کے لیے ہے جس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور اس کے جوتے ہوں وہ پانی پر چلا جائے گا اور درخت کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا'' (2)۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تو اس کی تعداد، برتن اور رسی کی حفاظت کر اگر اس کا مالک آجائے تو صحیح ورنہ اس سے نفع حاصل کر'' (3)۔ اس حدیث طیبہ میں تعداد کا لفظ زیادہ ہے۔ اس کو مسلم وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ لقطہ کی تھیلی اور رسی اس کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ اور اس پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ جب لقطہ کا مالک اس کے تمام اوصاف کو بیان کردے گا تو لقطہ اس کے سپرد کردیا جائے گا؟ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کو دینے پر اٹھانے والے کو مجبور کیا جائے گا؛ اور اگر کوئی ایسا مستحق آگیا جو بینہ یعنی گواہی کی وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرا ہے تو ملتقط کسی چیز کا ضامن نہیں ہوگا۔ اور کیا وہ آدمی اوصاف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قسم اٹھائے گا یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں پہلا قول اشہب کا ہے اور دوسرا ابن قاسم کا۔ امام مالک آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کے نزدیک بینہ اسے لازم نہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی نے فرمایا: یہ اس کے سپرد تب تک نہیں کیا جائے گا جب تک وہ اس بات پر بینہ پیش نہیں کرتا کہ یہ اسی کی ہے۔ اور یہ حدیث کی نص کے خلاف ہے، کیونکہ اگر حوالے کرنے میں بینہ شرط ہو تو پھر تھیلی، رسی اور عدد کے ذکر کا کوئی معنی نہیں، پس وہ بینہ کے ذریعے تو ہر حال میں اس کا مستحق ہو جائے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے خاموشی اختیار فرمانا درست نہیں، لہٰذا یہ ضرورت کے وقت سے بیان کی تاخیر ہوگی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11**۔ حدیث طیبہ اونٹ اور ریوڑ پر نص ہے اور حدیث نے ان دونوں کے حکم کو بیان کردیا ہے اور ان کے علاوہ جتنے حیوان ہیں ان کے بارے میں حدیث میں سکوت ہے۔ ہمارے (قرطبی) علماء میں گائے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا یہ اونٹ کے ساتھ ملحق ہوگی یا ریوڑ کیساتھ؟ اسی طرح گھوڑے خچر اور گدھے کے التقاط کے بارے میں بھی ہمارے ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا ظاہر یہ ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اور اشہب اور ابن کنانہ نے کہا ہے: نہیں اٹھایا جائے گا۔ ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ صحیح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے: ''اپنے مومن بھائی کی گمشدہ چیز کی حفاظت کرو''۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ علماء کا ضوال (گمشدہ چیز) پر خرچ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے کہا: اگر ملتقط نے چوپائیوں اور اونٹ وغیرہ پر خرچ کیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ لقطہ کے مالک پر نفقہ کیساتھ رجوع کرے خواہ اس نے اس پر حاکم کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا یا اس کی اجازت کے بغیر آپ نے فرمایا: ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جو کچھ اس نے خرچ کیا اس نفقہ کے بدلے میں اس کو اپنے پاس روک کے رکھے اور یہ اس کا زیادہ حق دار ہے جس طرح کہ رہن ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جب گمشدہ چیز کو لینے والے نے اس پر خرچ کیا تو وہ

1۔ صحیح بخاری، باب فی ضالۃ الغنم، جلد 1، صفحہ 328	2۔ ایضاً، ضالۃ الابل، جلد 1، صفحہ 327
3۔ ایضاً، اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 327

متطوع (فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا) ہوگا ربیع نے یہ مسئلہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کیا ہے۔ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے کہا ہے: جب حاکم نے اسے اس پر خرچ کرنے کا حکم دیا تو وہ دین ہوگا۔ اور جتنے کا اس نے دعویٰ کیا اس کی طرف سے قبول کیا جائے گا بشرطیکہ اتنا خرچ ہو جاتا ہو۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب اس نے لقطہ اور اونٹ پر قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ کیا تو متطوع ہوگا اور اگر قاضی کی اجازت کے ساتھ خرچ کیا تو یہ لقطہ کے مالک پر دین ہوگا جب بھی وہ آیا اور ملتقط کے لیے جائز ہے کہ جب اس کا مالک آئے تو اس کو اپنے پاس روک لے اور تین دن یا اس کے لگ بھگ وہ اس پر خرچ کرے یہاں تک کہ قاضی بکری یا اس کی مثل چیز کو بیچنے کا حکم دے اور اس کے نفقہ کا فیصلہ کر دے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ لقطہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں تعریف کے بعد ایسے الفاظ نہیں ہیں جو تملیک پر اور لقطہ کے مالک کے آنے کے بعد ملتقط سے ضمان کے ساقط ہونے پر دلالت کریں مثلاً: واستمتع بھا تم اس سے لطف حاصل کرو (1) فشأنك بھا پس اس کے ساتھ تمہارا معاملہ (2) فھی لك پس وہ تمہارے لیے ہے (3)۔ فاستنفقھا پس تم اسے خرچ کرو (4)۔ ثم کلھا پھر تم اسے کھاؤ (5)، فھو مال اللہ یؤتیہ من یشاء پس وہ اللہ کا مال ہے وہ جس کو چاہے دے (6)۔ جس طرح کہ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے: ''پس اگر تو اس کا اعلان نہ کرے تو اس کو خرچ کرلے اور وہ تیرے پاس ودیعت بن جائے گی اور اگر زمانہ میں کبھی بھی اس کا مالک آگیا تو وہ اس کو ادا کرے''۔ ایک روایت میں ہے: ''پھر تو اس کو کھالے اگر اس کا مالک آجائے تو اس کو وہ ادا کرے'' (7)۔ اس کو امام مالک، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب بھی اس کا مالک آگیا وہ اس کا زیادہ حق دار ہوگا سوائے داؤد ظاہری کے ان کا موقف یہ ہے کہ ملتقط تعریف کے بعد لقطہ کا مالک بن جائے گا ان ظواہر کی بنیاد پر، مگر ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی ایک تو اس وجہ سے کہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فأدھا إلیہ کی وجہ سے کہ ''تو اس کو وہ ادا کر دے''۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۲

''(یہ طے کرنے کے بعد) انہوں نے (آ کر) کہا: اے ہمارے باپ! کیا ہوا آپ کو کہ آپ اعتبار ہی نہیں کرتے ہم پر یوسف کے بارے میں حالانکہ ہم تو اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ آپ بھیجئے اسے ہمارے ساتھ کل تاکہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور (کوئی فکر نہ کیجئے) ہم اس کے نگہبان ہیں''۔

**قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ** حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا مومن حسد کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تجھے بنی یعقوب کا معاملہ کیوں بھول گیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: باپ بہت زیادہ چلانے والا ہے اور بھائی بہت زیادہ چھیننے

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطۃ، جلد 2، صفحہ 79 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 — 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 79 — 6۔ ایضاً — 7۔ ایضاً، کتاب اللقطۃ، جلد 1، صفحہ 329

والا ہے۔ اس وقت وہ ایک حیلہ کے ذریعے باپ، بیٹے کو جدا کرنے پر جمع ہوئے اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: قَالُوْا یٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ ایک قول یہ ہے: جب انہوں نے باہم بات چیت کی اور متکلم ثانی کی رائے پر جدا جدا ہوئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس واپس لوٹ کے گئے اور یہ بات کہی، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے ساتھ نکلنے کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا مگر آپ نے انکار فرمایا جس طرح کہ آئے گا۔ یزید بن قعقاع، عمرو بن عبید اور زہری نے لَا تَاْمَنَّا کو ادغام اور بغیر اشمام کے پڑھا ہے اور یہی قیاس ہے کیونکہ ادغام کا طریقہ یہ ہے کہ جس کا ادغام کیا جائے وہ ساکن ہو۔ طلحہ بن معرف نے لَا تَاْمَنُنَا اصل پر رکھتے ہوئے دونوں نونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور ابو رزین نے لاتِیمنّا تا کے کسرہ کے پڑھا ہے یہ لغت تمیم ہے اور اعمش سے روایت ہے وہ کہتے ہیں أنت تضرب یہ پہلے گزر چکا ہے، تمام لوگوں نے اسے ادغام اور اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، تا کہ یہ ادغام سے پہلے حرف کی حالت پر دلالت کرے۔ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ یعنی ہم اس کی حفاظت میں (مخلص ہیں) حتی کہ ہم اسے آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔ مقاتل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کو کہا: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا الآیہ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجئے، تو اس وقت ان کے باپ نے کہا: اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ تو اس وقت انہوں نے ان کی بات کے جواب میں کہا: مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ الآیہ۔ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یعنی اس کو کل ہمارے ساتھ بھیجئے صحراء کی طرف، یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ، غدا ظرف ہے سیبویہ کے نزدیک اصل غدو ہے بعض اوقات اس کو اصل کے مطابق بھی بولا جاتا ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: فجر اور صبح کی نماز کے درمیان کے وقت کو غدوہ کہا جاتا ہے اسی طرح اس وقت کو بکرہ بھی کہا جاتا ہے۔ نرتع و نلعب نون اور عین کے سکون کے ساتھ اہل بصرہ کی قرأت ہے۔ اہل مکہ کی قرأت میں سے معروف نرتع نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اہل کوفہ کی قرأت یرتع و یلعب یا اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اور اہل مدینہ کی قرأت یا اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بہتر قرأت عربوں کے قول رتع الانسان و البعیر کے مطابق ہے۔ (یہ اس وقت بولتے ہیں) جب انسان اور اونٹ جس طرح چاہیں کھائیں۔ اور معنی یہ ہوتا ہے: ہم شادابی میں وسیع ہیں؛ اور ہر شاداب وادی خوشگوار ہے۔

شاعر نے کہا: فارعیٰ فزارۃُ لاھَنَاكِ المَرْتَعُ۔ المرتع معنی چراہ گاہ ہے

ایک اور شاعر نے کہا:

تَرْتَعُ ما غَفَلَتْ حتی إذا ادّکرتْ فإنّما هی إقبالٌ وإدبارُ

یہاں بھی ترتع اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا:

أکفراً بعد رَدِّ الموت عَنّی وبعد عطائِكَ المائةَ الرِّتَاعَا (1)

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 187

الرتاعا کا بیان بھی اسی معنی کو بیان کر رہا ہے، یعنی الرتاعا سے مراد الراتعۃ ہے۔
معمر نے قتادہ سے ترتع روایت کیا ہے یعنی تسعی۔ نحاس نے کہا: انہوں نے انا ذھبنا نستبق سے اسے اخذ کیا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے: ہم دوڑ میں اس کی معینہ انتہا میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح عین کے سکون کے ساتھ یرتع بھی ہے، البتہ یہ اکیلا حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ہے اور یَرْتَعْ عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ ہے جس نے ریوڑ کو چرایا یعنی یہ اس بات کی مشق اور تجربہ بھی کریں پس کبھی جی بھر کر کھائیں گے اور کبھی بچپن کی وجہ سے کھیلیں گے۔ قتبی نے کہا: یَرْتَعْ یعنی ہم چوکیداری کریں گے اور حفاظت کریں گے اور ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے۔ اس صورت میں یہ آپ کے قول: دعاك الله سے ہوگا جس کا معنی ہے الله تیری حفاظت کرے۔ اور نلعب لعب سے ہوگا۔ ابو عمرو بن علا کو کہا گیا: انہوں نے نلعب کیسے کہا حالانکہ وہ انبیاء ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: اس وقت وہ انبیاء نہیں تھے۔ ایک قول یہ ہے: لعب سے مراد خوشی و مسرت میں سے جو مباح ہے وہ ہوگا نہ کہ وہ ممنوع کھیل مراد ہے جو حق و سچ کی ضد ہے، اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے نلعب کے قول کو رد نہیں فرمایا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فھلاً بکرا تلاعبھا و تلاعبك ہے (1) پس کیوں نہ باکرہ عورت کے ساتھ تو نے شادی کی تو اس کے ساتھ ملاعبت کرتا اور وہ تیرے ساتھ ملاعبت کرتی (اس حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعب کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں) مجاہد اور قتادہ نے یُرْتِعْ بمعنی یرتع معطیۃ پڑھا ہے۔ مفعول کو حذف کر دیا گیا وَ یَلْعَبُ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور معنی ہوگا: وہ اس میں سے تھا جو کھیلتا ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہر اس چیز سے جس کا آپ کو اس پر خوف ہے۔ پھر یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سوار ہو کر نکلے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیدل تھے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تک اپنے کندھوں پہ اٹھائے رکھا جب تک حضرت یعقوب علیہ السلام ان کو دیکھ رہے تھے پھر جب وہ آپ کی آنکھوں سے غائب ہوئے تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تکلیف دینے کے لیے اتار دیا تاکہ آپ ان کے ساتھ دوڑیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"آپ نے فرمایا: بے شک مجھے غمزدہ بناتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کھا نہ جائے اس کو بھیڑیا اور تم (سیر و تفریح کے باعث) اس سے بے خبر ہو۔ کہنے لگے: اگر کھا جائے اسے بھیڑیا حالانکہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں بلاشبہ ہم تو بڑے زیاں کار ہوئے"۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ محل رفع میں ہے یعنی تمہارا اس کے ساتھ جانا، آپ نے اپنی عدم موجودگی کے سبب اپنی پریشانی سے باخبر کیا۔ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام پر حملہ آور ہوا تو آپ کو یہ خوف لاحق ہوا یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے خواب دیکھا کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، شری الدواب والحمیر، جلد 1، صفحہ 282

پہاڑ کی چوٹی پر ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام بطن وادی میں۔ اتنے میں دس بھیڑیوں نے آپ کو وحشت میں مبتلا کر دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو کھانا چاہتے تھے تو ایک آدمی نے آپ سے ان کو زور سے دھکیلا پھر زمین پھٹ گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک اس میں چھپ گئے پس وہ دس آپ کے بھائی تھے جب وہ آپ کے قتل کی طرف مائل ہوئے تو جس نے آپ سے ان کو ہٹایا وہ آپ کا بڑا بھائی یہوذا تھا اور زمین میں آپ کا چھپنا وہ تین دن آپ کا کنوئیں میں قیام تھا۔ اور ایک قول یہ ہے: آپ نے صرف اس لیے کہا کہ آپ کو ان کی طرف سے حضرت یوسف پر خوف تھا اور آپ نے بھیڑیے کے ذریعے وہ مراد لیے پس آپ کا خوف ان کی طرف سے آپ کا قتل تھا تو آپ نے ان کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے بھیڑیے کے ذریعے کنایۃً ان سے بات کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے ان کو بھیڑیا کہا۔ ایک قول یہ ہے: آپ علیہ السلام کو ان کی طرف سے کوئی خوف نہ تھا ورنہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے اور آپ نے بھیڑیے سے صرف اس لیے ڈرایا کہ صحراؤں میں اکثر ان سے خوف رہتا ہے۔ الذِّئْبُ، تذابت الریح سے مشتق ہے جب وہ من کل وجہ آ جائے اسی طرح احمد بن یحییٰ نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: الذئب مہموز ہے کیونکہ یہ من کل وجہ آتا ہے۔ ورش نے نافع سے الذیب بغیر ہمزہ کے روایت کیا ہے۔ جب ہمزہ ساکن ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو تو وہ مخفف ہو کر یا بن جاتا ہے۔ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ یعنی تم کھانے پینے میں مشغول رہو گے۔

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ یعنی ایسی جماعت جو بھیڑیئے کو دیکھے گی اور اسے آپ سے دور نہ ہٹائے گی۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ اپنے ریوڑ کی حفاظت کے سلسلہ میں یعنی جب ہم اپنے بھائی سے بھیڑیئے کو نہیں ہٹا سکیں گے تو اپنے ریوڑ سے اس کو دور کرنے میں تو اس سے بھی زیادہ عاجز ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے: لَّخٰسِرُوْنَ سے مراد ہے کہ اپنے حق سے ناواقف ہوں گے، جب کہ ایک قول یہ ہے: عاجز ہوں گے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''پھر جب (بڑے اصرار سے) اسے لے گئے اور سب نے یہی طے کر لیا کہ ڈال دیں اسے کسی گہرے کنوئیں کی تاریک تہہ میں اور (عین اس وقت) ہم نے اس کی طرف وحی کی (گھبراؤ نہیں) تم ضرور انہیں آگاہ کرو گے ان کے اس فعل پر اور وہ (تیرے رتبہ عالی کو) نہیں سمجھتے''۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ، ان محل نصب میں ہے یعنی علی أن یجعلوہ فی غیابۃ الجب اس قصہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب نے جب آپ کو ان کے ساتھ بھیجا تو ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ ضرور اس کی حفاظت کریں گے اور آپ کو روبیل کے سپرد کیا اور فرمایا: اے روبیل! یہ چھوٹا ہے اور اے میرے بیٹے تو اس پر میری شفقت کو جانتا ہے اگر اسے بھوک لگے تو اس کو کھانا کھلانا اور اگر پیاس لگے تو پانی پلانا یہ اگر تھک جائے تو اٹھا لینا پھر اس کو میرے پاس واپس لانے میں جلدی کرنا۔ انہوں نے آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا شروع کیا ایک نہ اتارتا تھا کہ دوسرا اٹھا لیتا اور حضرت یعقوب علیہ

السلام کئی میل ان کے پیچھے چلے پھر واپس لوٹ گئے جب وہ اپنے باپ کی نظروں سے اوجھل ہوئے تو جس نے آپ کو اٹھایا ہوا تھا اس نے آپ کو زمین پر دے مارا حتیٰ کہ ہڈیاں ٹوٹنے کے قریب ہوگئیں تو آپ نے دوسرے کے پاس پناہ لی مگر ہر ایک کی طرف سے دوسرے سے زیادہ غصہ اور تکلیف ملی تو آپ نے روبیل سے مدد طلب کی اور کہا: تو میرا بڑا بھائی ہے میرے والد کے بعد میرا نگران ہے میرے بھائیوں میں میرے سب سے زیادہ قریب ہے۔ مجھ پر اور میری کمزوری پر رحم کر'۔ تو اس نے آپ کو بہت سخت تھپڑ مارا اور کہا: میرے اور تیرے درمیان کوئی قرابت نہیں ان گیارہ ستاروں کو بلا جو تجھے ہم سے بچائیں تو آپ کو پتا چل گیا کہ ان کا حسد خواب کی وجہ سے ہے تو آپ اپنے بھائی یہوذا کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا: اے میرے بھائی! میری کمزوری، عاجزی اور کمسنی پر رحم کر اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کے دل پر رحم کھا، کتنی جلدی تم اس کی وصیت کو بھول گئے اور اس کے عہد کو تم نے توڑ دیا، تو یہوذا کا دل نرم ہوا اور اس نے کہا: اللہ کی قسم جب تک میں زندہ ہوں یہ تمہارے کبھی بھی قریب نہ آسکیں گے تو اس نے کہا: اے میرے بھائیو! جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہو اس کا قتل بہت بڑی غلطی ہے پس اس بچے کو اس کے باپ کے پاس واپس چھوڑ آؤ اور ہم اس کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کو اس واقعہ میں سے کچھ بھی نہیں بتائے گا، تو اس کے بھائی نے کہا: اللہ کی قسم تو فقط یعقوب علیہ السلام کے نزدیک اپنا مقام بنانا چاہتا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو ہم اس کے ساتھ تجھے بھی قتل کر دیں گے، تو اس نے کہا: اگر تمہیں یہ بات پسند نہیں تو لو یہ تاریک اور خوفناک کنواں ہے جو سانپوں اور کیڑے مکوڑوں کی پناہ گاہ ہے۔ اسے اس میں پھینک دو اگر اسے ان میں سے کسی چیز نے آلیا تو یہی اس کی مراد ہوگی اور تم اس کے خون سے محفوظ رہو گے اور اگر یہ گزرنے والی کسی جماعت کے ہاتھ لگ گیا تو وہی اس کی قسمت ہوگی تو یہ معاملہ ان کے نزدیک طے ہوگیا یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ، لما کا جواب محذوف ہے یعنی فلما ذھبوا به واجمعوا علی طرحه فی الجب عظمت فتنتھم۔ ایک قول یہ ہے: لما کا جواب ان کا یہ قول ہے: قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ۔ ایک قول کے مطابق: تقدیر عبارت یوں ہے فلما ذھبوا به من عند ابیھم واجمعوا انی غیابة الجب جعلوہ فیھا یہ بصریوں کے مذہب کے مطابق ہے۔ جہاں تک کوفیوں کا قول ہے تو ان کے نزدیک اس کا جواب اَوْحَیْنَاۤ ہے واو مقحمہ ہے ان کے نزدیک ''واو'' لما اور حتی کے ساتھ زائدہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی (اصل میں) فتحت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (ہود: 40) یعنی فار۔ امری القیس نے کہا:

فلما أجزنا ساحة الحيِ وانتحى

یہاں بھی واؤ زائدہ ہے یعنی اصل میں صرف انتحی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۞ (الصافات) ہے وَ نَادَیْنٰهُ (مریم: 52) یعنی نَادَیْنٰهُ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ میں اس وقت میں آپ کی نبوت پر دلیل ہے حضرت حسن، مجاہد، ضحاک اور حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حال میں نبوت عطا فرمائی کہ آپ تاریک کنویں میں پانی کے اوپر اٹھے ہوئے پتھر پر تھے۔ کلبی نے کہا: جس وقت آپکو کنوئیں میں پھینکا گیا اس وقت

آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی، اور آپ چھوٹے نہ تھے اور جس نے کہا ہے کہ آپ چھوٹے تھے تو عقلاً یہ بات بھی بعید نہیں کہ چھوٹے بچے کو بھی خبر دے دی جائے اور اس کی طرف وحی کر دی جائے۔ ایک قول یہ ہے: وحی دراصل الہام تھا۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل: 68) تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف الہام کیا۔ ایک قول یہ ہے: آپ خواب میں تھے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ جبرائیل امین آپ کے پاس وحی لے کر آئے۔

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ عنقریب انہیں اپنے کیے کی سزا مل جائے گی اس صورت میں وحی آپ کے دل کی تقویت اور سلامتی کی خوشخبری کے طور پر آپ کے کنویں میں پھینکے جانے کے بعد ہوئی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ وحی فرمائی جو آپ کے بھائی آپ کے ساتھ کرنے والے تھے اس صورت میں وحی آپ کے کنوئے میں پھینکے جانے سے پہلے آپ کو بروقت خبر دار کرنے کے لیے ہوئی۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ یہ شعور نہیں رکھتے کہ آپ یوسف ہیں۔ اور یہ اس وقت ہے جب مصر میں حکومت آپ کے سپرد کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنے باپ اور بھائیوں کو اپنے مکان کے بارے میں آگاہ نہ کریں، ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کے بارے میں جو وحی فرمائی (اس کا شعور نہیں) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے اور ایک قول یہ ہے ''ھا'' حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں بذریعہ وحی اس سے آگاہ فرما دیا کہ جو کچھ انہوں (آپ کے بھائیوں) نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا، اور عنقریب اللہ کے حکم سے آپ انہیں اس کے بارے میں بتائیں گے اور وہ (بھائی) اس بات کا شعور نہیں رکھتے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی۔ واللہ اعلم، حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کردہ قصہ جس کو سدی اور دیگر لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ جب آپ کو گہرے کنویں میں پھینکا گیا۔ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا تو آپ کنوئیں کی منڈیر کے ساتھ لٹک گئے تو انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیے اور آپ کی قمیص اتار دی۔ تو آپ نے کہا: اے میرے بھائیو! مجھے میری قمیص واپس کرو تا کہ اس کنوئیں میں اس کے ذریعے چھپ جاؤں پس اگر میں مر گیا تو وہ میرا کفن ہوگی اور اگر میں زندہ رہا تو اس کے ذریعے میں اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لوں گا۔ تو انہوں نے کہا: سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو بلا وہ تمہارے سر کو ڈھانپیں اور تجھے کپڑے پہنائیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا، پس انہوں نے آپ کو کنوئیں میں لٹکا دیا یہاں تک کہ جب آپ اس کے نصف تک پہنچ گئے تو انہوں نے آپ کو اس ارادے کے ساتھ پھینک دیا کہ آپ گریں گے اور مر جائیں گے۔ کنوئیں میں پانی تھا، آپ اس میں گرے پھر آپ نے ایک چٹان کی پناہ لی اور اس پر کھڑے ہو گئے۔ ایک قول یہ ہے: شمعون نے اس کو یہ چاہتے ہوئے کاٹا کہ وہ آپ کو چٹان پر ٹکڑے ٹکڑے کر دے، جبکہ جبرئیل امین ساق عرش کے نیچے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ میرے بندے تک پہنچ۔ جبرئیل نے فرمایا: میں نے بہت زیادہ تیزی کی اور زمین پر اترا یہاں تک کہ میں رسی اور وقوع کے درمیان حائل ہو گیا اور میں نے آپ کو صحیح سلامت چٹان پر بٹھا دیا وہ کنواں شیروں کی پناہ گاہ تھا، آپ چٹان پر کھڑے ہوئے اور رونے لگے تو انہوں نے آپ کو آواز دی آپ نے اس آواز کو اپنے اوپر ایسی رحمت سمجھا جس نے انہیں (بھائیوں کو) پکڑ لیا

ہے۔ تو آپ نے انہیں جواب دیا۔ انہوں نے آپ کو چٹان سے گرانا چاہا مگر یہوذا نے انہیں روکا، یہوذا آپ کے پاس کھانا لایا کرتا تھا، جب آپ ننگے ہو گئے تو جبرئیل آپ کے پاس پہنچا اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ننگا آگ میں ڈالا گیا تو جبرائیل ریشم کی ایک قمیص لے کر آئے اور اس نے آپ کو پہنا دی وہ حضرت براہیم علیہ السلام کے پاس تھی پھر حضرت اسحاق علیہ السلام اس کے وارث بنے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام وارث بنے جب حضرت یوسف علیہ السلام بڑے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو ایک تعویز میں ڈال کر آپ کے گلے میں ڈال دیا حضرت یوسف علیہ السلام اس کو علیحدہ نہیں کرتے تھے، جب آپ کو ننگا کنوئیں میں ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام نے وہ قمیص نکال کر آپ کو پہنا دی۔ وہب نے کہا: جب آپ چٹان پر کھڑے ہوئے تو آپ نے کہا: اے بھائیو! ہر میت کی کوئی نہ کوئی وصیت ہوتی ہے۔ میری وصیت کو سنو، انہوں نے کہا: وہ کیا ہے؟ آپ نے کہا: جب تم سارے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے مانوس ہو رہے ہو گے تو میری غربت کو یاد کرنا اور جب تم کسی نوجوان کو دیکھو گے تو میری جوانی کو یاد کرنا، جبریل نے کہا: اے یوسف! اس (وصیت) کو چھوڑ و اور دعا میں مشغول ہو جاو، دعا کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام ہے پھر جبریل علیہ السلام نے آپ کو دعا بتائی تو آپ نے عرض کیا: اے اللہ! اے ہر اجنبی کے مونس! اے ہر تنہا کے ساتھی! اے ہر خوف زدہ کے ملجا! اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے! اے ہر سرگوشی کو جاننے والے! اے ہر شکوہ کی انتہا اور اے ہر اجتماع کے حاضر! اے زندہ! اے زندہ رکھنے والے! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میرے نزدیک تیرے سوا نہ کوئی غم اور نہ کوئی مصروفیت رہے، اور میرے لیے میرے معاملہ میں وسعت اور نکلنے کی راہ پیدا فرما دے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، فرشتوں نے کہا: اے ہمارے معبود! ہم آواز اور دعا سنتے ہیں، آواز بچے کی ہے اور دعا نبی کی۔ ضحاک نے کہا: جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام پر اس حال میں اترے کہ آپ گہرے کنوئیں میں تھے تو جبریل علیہ السلام نے کہا: کیا میں آپ کو ایسے کلمات نہ سکھاوں کہ جن کو اگر تم کہو تو اللہ تعالیٰ جلدی تمہیں اس کنوئیں سے نکال لے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے ہر مصنوع کو بنانے والے، اے ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کرنے والے، اے ہر راز کے شاہد، اے ہر اجتماع کے حاضر، اے ہر مصیبت کو دور کرنے والے، اے ہر اجنبی کے دوست اور اے ہر تنہا کے مونس! میرے لیے کشادگی اور امید کو لا اور اپنی امید میرے دل میں ڈال دے یہاں تک کہ میں تیرے سوا کسی کی امید نہ کروں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دعا کو اس رات بار بار دہرایا تو اللہ تعالیٰ نے اس دن صبح آپ کو اس کنوئیں سے نکالا (1)۔

**وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾**

''اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً، عِشَآءً** سے مراد لیلاً ہے یعنی رات کے وقت یہ ظرف ہے اور حال کی جگہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1063

میں ہے، وہ رات کے وقت آئے تا کہ تاریکی میں زیادہ بہتر انداز میں عذر گھڑ سکیں، اسی وجہ سے کہا گیا ہے: رات کے وقت حاجت نہ مانگو، بے شک حیا دونوں آنکھوں میں ہے اور دن کے وقت گناہ سے عذر نہ کر تو عذر کرنے میں شرمندگی محسوس کرے گا۔ روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی گریہ زاری کو سنا تو فرمایا(1): تمہیں کیا ہوا؟ ریوڑ میں کوئی مسئلہ بن گیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: یوسف کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم دوڑ لگانے گئے تو بھیڑیا اسے کھا گیا، آپ روئے اور چیخے اور فرمایا: اس کی قمیص کہاں ہے؟ جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

سدی اور ابن حبان نے کہا: جب انہوں نے کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے تو انہوں نے آپ پر پانی ڈالا مگر آپ نے کوئی حرکت نہ کی اور انہوں نے آوازیں دیں مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا، وہب نے کہا: یہوذا نے اپنا ہاتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے منہ اور ناک پر رکھا تو اس نے سانس کی حرکت کو بھی محسوس نہ کیا اور نہ ہی آپ کی نبض چلی، تو یہوذا نے انہیں (دیگر بھائیوں کو) کہا: قیامت کے دن کے مالک کی طرف سے ہمارے لیے ہلاکت و بربادی ہو! ہم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا، اور اپنے باپ کو قتل کر دیا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو سحری کی ٹھنڈک سے کچھ افاقہ ہوا، آپ کو افاقہ ہوا تو آپ کا سر روبیل کی گود میں تھا، آپ نے فرمایا: اے روبیل! کیا میں نے تجھے اپنے بیٹے پر امین نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا؟ اس نے کہا: اے میرے باپ! اپنے رونے کو مجھ سے روکو، میں آپ کو بتاتا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رونا روکا تو اس نے کہا: اے میرے باپ: اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ہم ذرا دوڑ لگانے گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ آدمی کا رونا(2) اس کی گفتگو کی سچائی پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ تصنع کر رہا ہو، تو مخلوق میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا، کہا گیا ہے: بناوٹی آنسو نہیں چھپ سکتا، جس طرح کہ حکیم نے کہا ہے:

إذا اشتبكتْ دموعٌ في خُدودٍ      تَبَيَّنَ مَنْ بَكَى مِمَّنْ تَبَاكَى

جب آنسو رخساروں پر رہتے ہیں تو جو واقعی رو رہا ہو بناوٹی رونے والے سے واضح ہو جاتا ہے۔

**قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ⑰**

''انہوں نے کہا باوا جی! ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس (ہائے افسوس) کھا گیا اس کو بھیڑیا، اور آپ نہیں مانیں گے اگرچہ ہم سچے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** نَسْتَبِقُ باب افتعال ہے: مسابقہ (باہم دوڑ لگانا) سے، ایک قول ہے: یعنی ہم نیزہ بازی کر رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 193
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

تھے اسی طرح حضرت عبداللہ کی قراءت میں انا ذھبنا ننتضل ہے یہ بھی دوڑ کی ایک قسم ہے یہ زجاج کا قول ہے۔ازھری نے کہا: نضال، تیروں میں ہوتا ہے اور رھان گھوڑے میں ہوتا ہے جبکہ مسابقہ کا لفظ ان دونوں کو جامع ہے۔قشیری ابونصر نے کہا: نَسۡتَبِقُ یعنی تیر اندازی میں، یا گھوڑے پر یا پھر دوڑنے میں، دوڑنے میں مسابقہ سے مقصود دشمن کے خلاف سانس کی مشق ہے کیونکہ دشمن کے قتال میں اور ریوڑ سے بھیڑیے کو بھگانے میں یہ بھی ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔سدی اور ابن حبان نے کہا: نَسۡتَبِقُ سے مراد ہے کہ ہم نے دوڑ میں بہت زیادہ شدت اختیار کی تا کہ ہم دیکھیں کہ ہم سے کون زیادہ آگے بڑھتا ہے؟ ابن عربی نے کہا: سابقہ شریعت میں ایک طریقہ، عمدہ خصلت اور جنگ میں مددگار ہے (1)۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ایسا کیا اور اپنے گھوڑے کے ذریعے بھی مقابلہ فرمایا، اور آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ فرمایا تو آپ ان سے آگے نکل گئے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے (سن رسیدہ) ہو گئے تو آپ نے ان کے ساتھ مقابلہ کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے سبقت لے گئیں تو آپ نے فرمایا: ''یہ اس کا بدلہ ہے'' (2)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے ذی قرد سے مدینہ طیبہ کی طرف واپسی پر ایک آدمی کیساتھ مقابلہ کیا اور حضرت سلمہ بن اکوع سبقت لے گئے۔(خرجہ مسلم)

**مسئلہ نمبر 2۔** مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضمار شدہ گھوڑوں کے درمیان حفیاء سے لے کر ثنیۃ الوداع تک مقابلہ کرایا اور جن کو اضمار نہیں کیا گیا تھا ان کا مقابلہ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کرایا۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے درمیان مقابلہ کرایا گیا۔

اس باب میں یہ حدیث اپنے ضمن میں تین شرائط کو لیے ہوئے ہے جن کے بغیر مقابلہ جائز نہیں۔ایک یہ کہ مقابلہ کی مسافت معلوم ہونی چاہیے۔دوسری یہ کہ گھوڑے مساوی صفت کے ہونے چاہئیں۔تیسری یہ کہ مضمر گھوڑے کا مقابلہ غیر مضمر کے ساتھ ایک ہی مسافت اور ایک ہی مقصد کے لیے نہیں ہونا چاہیے، مقابلہ کی یہ سنت جن گھوڑوں میں ہوگی وہ وہ گھوڑے ہیں جن کو دشمن کے ساتھ جہاد کے لیے تیار کیا گیا ہو نہ کہ فتنوں میں مسلمانوں کے باہمی قتال کے لیے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** نیزہ بازی اور اونٹ میں دوڑ کا مقابلہ کرانے کے متعلق امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا ہم ایک مقام پر رکے ہم میں سے کوئی چھپن چھود کھیلنے لگا اور کوئی نیزہ بازی کرنے لگا اور انہوں نے حدیث کا ذکر کیا۔نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نیزہ بازی، اونٹوں کی دوڑ اور گھوڑوں کی دوڑ کے سوا کوئی مقابلہ نہیں''۔نیزہ بازی کا ذکر ابن ابی زئب عن نافع بن ابی نافع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔اس کو نسائی نے ذکر کیا ہے۔اور یہی حجاز اور عراق

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1075

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی السبق علی الرجل، جلد 1 صفحہ 348

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب حسن المعاشرۃ (روایت بالمعنی)، حدیث نمبر 1968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے فقہاء کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا وہ کبھی مقابلہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی تھی (حمید نے لاتسبق کے بعد اولا تکاد تسبق کے الفاظ بیان کیے ہیں)۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر آیا اور وہ اس سے آگے نکل گیا تو مسلمانوں کو اس بات سے رنج ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ جو چیز بھی دنیا میں سربلند ہو وہ اس کو سرنگوں کر دے''(1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ سوائے اونٹ، گھوڑے اور نیزہ بازی کے مقابلہ جائز نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ان تین کے علاوہ میں مقابلہ جوا ہے۔ ابوالبختری قاضی نے الخف والحافر والنصل والی حدیث میں أو جناح کے الفاظ کی زیادتی کی ہے۔ یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر بڑھائے علماء نے اسی وجہ سے اور اس کی دیگر موضوعات کی وجہ سے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہے۔ علماء کسی بھی صورت میں اس کی حدیث کو نہیں لکھتے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: گھوڑے اور نیزہ بازی کے علاوہ کسی چیز میں مقابلہ نہیں کیونکہ یہی اہل حرب کے خلاف قوت ہیں۔ اور کہا: ہمارے نزدیک نیزہ بازی کی نسبت گھوڑے کا مقابلہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

بعض علماء نے سوائے گھوڑے کے مقابلہ کے باقی ہر چیز میں شرط لگانے سے منع کیا ہے، کیونکہ عربوں کی یہی عادت تھی کہ وہ صرف گھوڑے میں ہی شرط لگاتے تھے۔ عطا سے روایت ہے کہ ہر چیز میں شرط لگانا جائز ہے اور ان کے قول کی یہ تاویل کی جاتی ہے کیونکہ ان کا اس کو عموم پر محمول کرنا تو جوئے کی اجازت کا سبب بنے گا حالانکہ یہ تو بالاتفاق حرام ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ گھوڑے اور اونٹ میں مقابلہ صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جب مسافت اور اس کی انتہا معلوم ہو جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح نیزہ بازی میں مقابلہ جائز نہیں مگر جب اس کی غایت معلوم ہو اور کمان بھی معلوم ہو، اور ٹارگٹ کی صورت کا علم ہو، اس ٹارگٹ کو پار کرنے کی شرط لگائی گئی ہو یا بغیر شرط کے پار ہو جائے۔ دوڑ میں سبقت کی تین صورتیں ہیں: حاکم یا حاکم کے علاوہ کوئی اور آدمی اپنے پاس سے رقم دے اور سبقت لے جانے والے کے لیے معلوم رقم کو مختص کر دے اب جو بھی سبقت لے گا وہ رقم لے لے گا۔ دو آدمی مقابلہ کریں، دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک رقم نکالے جبکہ دوسرا رقم نہ دے اگر دوسرا آدمی سبقت لے گیا تو وہ اس رقم کو حاصل کر لے گا۔ مقابلے کی تیسری صورت میں اختلاف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر ایک برابر رقم دیں اور یہ شرط لگالیں کہ جو بھی سبقت لے گیا وہ ساری رقم لے لے گا۔ پھر جو سبقت لے گیا اس نے دونوں کی رقم لے لی۔ یہ صورت جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے درمیان ایک ایسے محلل کو داخل کریں جس سے ان دونوں کو یہ خطرہ ہو کہ وہ ان سے سبقت لے جا سکتا ہے پس اگر محلل سبقت لے گیا تو وہ ان دونوں کی رقم حاصل کر لے گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی نے سبقت لی تو جس نے بھی سبقت لی وہ دونوں کی رقم لے لے گا۔ اور محلل کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی چیز دینی ہو گی اور اگر دوسرے نے صرف تیسرے پر سبقت حاصل کی تو گویا اس نے کسی پر بھی سبقت حاصل نہیں کی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ابوعلی بن خیران نے کہا: محلل گھوڑے کا حکم یہ ہے کہ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 447

اس کی دوڑ کے بارے میں معلوم نہ ہو اور اس کو محلل اس وجہ سے کہتے ہیں کیونکہ وہ دو مقابلہ کرنے والوں کے مقابلہ کو حلال کرتا ہے یا خود اپنے مقابلے کو حلال کرتا ہے۔ اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان محلل نہ ہو اور دو مقابلہ کرنے والوں نے یہ شرط لگائی ہو کہ جس نے بھی سبقت لی وہ اپنی رقم اور دوسرے کی رقم لے لے گا تو یہ صراحتاً جوا ہے اور جائز نہیں ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، آپ نے فرمایا: ''جس آدمی نے دو گھوڑوں کے درمیان ایک گھوڑا اڈالا جس کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ سبقت لے جائیگا تو یہ جوا نہیں اور اس نے ایسا گھوڑا اڈالا جس کے بارے میں سبقت لے جانے کا خطرہ نہیں تھا تو یہ جوا ہے''۔

موطاء میں حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے انہوں نے کہا: گھوڑوں کی دوڑ میں شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان میں محلل داخل ہو پس اگر وہ سبقت لے جائے تو انعام حاصل کر لے گا اور اگر دوسرے گھوڑے سبقت لے جائیں تو اس محلل پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔ اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، ایک قول یہ ہے کہ گھوڑوں میں محلل کو لانا لازم نہیں اور ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کو نہیں لیتے، پھر آپ نے کہا: محلل کے بغیر مقابلہ جائز نہیں، آپ کا یہی قول زیادہ عمدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ گھوڑے اور اونٹ کے مقابلے کے مقابلے میں صرف نوجوان (بالغ) آدمی کو ہی سوار کیا جائے گا، اور اگر گھوڑوں کے مالک خود سوار ہوں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: مقابلہ میں گھوڑوں پر صرف ان کے مالک ہی سوار ہوں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مقابلہ کی کم از کم صورت یہ ہے کہ وہ گردن سے آگے بڑھے یا اس کے بعض حصے سے آگے بڑھے، یا پھر اس کے پچھلے حصے یا اس کے بعض سے آگے بڑھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نیزہ بازی کے مقابلہ کی بھی یہی صورت ہوگی۔ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ مقابلہ کیا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہنچے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے کے دھڑ کے قریب تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تیسرے نمبر پر تھا۔

**وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا** یعنی اپنے کپڑوں اور سامان کے پاس نگرانی کے لیے۔ **فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ** جب انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: **وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ** مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے تو انہوں نے اس وجہ سے یہی کہا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں پائے جانے والے اندیشوں میں یہ زیادہ ظاہر تھا۔ **وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا** مومن سے مراد تصدیق کرنے والا۔ **وَلَوْ كُنَّا** یعنی ان کنا یہ مبرد اور ابن اسحاق کا قول ہے۔ **صٰدِقِيْنَ** یعنی اپنی بات میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تصدیق اس وجہ سے نہ کی کہ آپ کے سامنے ان کی طرف سے کہی جانے والی باتوں کے خلاف بہت سے دلائل ظاہر ہو چکے تھے جس طرح کہ ان کا بیان آئے گا۔ ایک قول یہ ہے: **وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ** یعنی اگر ہم آپ کے نزدیک سچے اور قابل اعتماد بھی ہوتے پھر بھی آپ ہم پر جھوٹ کی تہمت لگاتے اور آپ ہماری تصدیق نہ کرتے کیونکہ آپ

کو یوسف سے شدید محبت ہے۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر، آپ نے فرمایا: (غلط کہتے ہو یوں نہیں) بلکہ آراستہ کر دکھایا تمہیں تمہارے نفسوں نے اس (سنگین جرم) کو، (اس جانکاہ حادثہ پر) صبر جمیل کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا اس پر جو تم بیان کرتے ہو''۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بِدَمٍ كَذِبٍ مجاہد نے کہا: وہ بکری یا بھیڑ کے بچے کا خون تھا(1) جس کو انہوں نے ذبح کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ ہرن کا خون تھا وجاء و اعلیٰ قمیصہ بدم مکذوب فیہ دم کی صفت مصدر کیساتھ لگائی گئی تو تقدیر عبارت یوں ہوگی: بدم ذی کذب جیسے واسال القریہ بعض اوقات فاعل اور مفعول دونوں کا نام مصدر کے ذریعے رکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذا ضرب الامیر یعنی مضروبہ، اسی طرح ماء سکب یعنی مسکوب، ماء غور یعنی غائر اور رجل عدل یعنی عادل۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بدم کذب پڑھا ہے دال کیساتھ یعنی تازہ خون کے ساتھ، تازہ خون کو الکذب کہا جاتا ہے، اور انہوں نے یہ بھی حکایت کیا ہے کہ تبدیل ہوا خون ہے۔ یہ شعبی کا قول ہے۔ اور الکذب اس سفیدی کو بھی کہتے ہیں جو احداث کے ناخنوں میں نکلتی ہے؛ تو ہو سکتا ہے کہ قمیص میں خون اس سفیدی کے مشابہ ہو جو رنگوں کے اختلاف کی صورت میں ناخن میں نکلتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جب انہوں نے خون کو اپنی سچائی کی علامت بنانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے علامت کو اس کے معارض علامت بنا دیا اور وہ ہے قمیص کا پھٹنے سے محفوظ رہنا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کو پھاڑے اور آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہو اور قمیص پھٹنے سے محفوظ رہی۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص میں غور و فکر کیا اور اس میں کوئی پھٹن اور اثر نہ پایا تو اس کے ذریعے آپ نے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا اور انہیں کہا: یہ بھیڑیا حکیم کب کا بن گیا ہے کہ یوسف کو کھاتا ہے اور قمیص نہیں پھاڑتا (2)؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کا قول ہے۔ اسرائیل نے سماک بن حرب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: خون بکری کے بچے کا تھا۔ سفیان نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا آپ نے کہا: جب آپ (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اس کی طرف دیکھا تو فرمایا: تم نے جھوٹ بولا، اگر بھیڑیے نے کھایا ہوتا تو ضرور قمیص پھٹتی۔ ماوردی نے حکایت کی کہ قمیص کے بارے میں تین نشانیاں ہیں (3)۔ جب وہ اس پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے، جس وقت پیچھے سے آپ کی قمیص کو پھاڑا گیا اور جس وقت آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 194　　2۔ ایضاً　　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1077

کے باپ کے چہرے پر اسے ڈالا گیا اور بینائی لوٹ آئی۔

میں نے کہا: یہ مردود ہے، پس وہ قمیص جس پر وہ خون لگا کر لائے وہ اس کے علاوہ تھی جس کو پھاڑا گیا اور جس کے ذریعے خوشخبری لائی گئی۔ ایک قول یہ ہے: وہ قمیص جس کو پھاڑا گیا وہ وہی تھی جس کو لانے کی وجہ سے بینائی واپس آگئی جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ سورت کے آخر میں آئے گا، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا: بلکہ چوروں نے اسے قتل کیا ہے، ان کے قول مختلف ہو گئے تو آپ نے ان پر الزام لگایا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو کہا: تم یہ گمان کرتے ہو کہ بھیڑیے نے اسے کھالیا ہے، اگر اس نے اسے کھایا ہوتا تو اس کی جلد تک پہنچنے سے پہلے اس کی قمیص ضرور پھٹ گئی ہوتی حالانکہ مجھے قمیص میں کوئی پھٹن دکھائی نہیں دے رہی اور تمہارا یہ گمان ہے کہ چوروں نے اسے قتل کر دیا ہے، اگر وہ اسے قتل کرتے تو وہ اس کی قمیص ضرور لے لیتے وہ تو کپڑے ہی لیتے ہیں، تو اس وقت انہوں نے کہا: وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ حضرت حسن اور دیگر سے ہی روایت ہے یعنی اگر ہم سچائی کے ساتھ موصوف بھی ہوں تب بھی آپ ہم پر ضرور الزام لگائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** فقہاء نے اس آیت کے ذریعے فقہ کے مسائل میں نشانیوں کو عمل میں لانے پر استدلال کیا ہے جس طرح قسامت وغیرہ، اور اس پر اجماع ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص کے صحیح ہونے کے ذریعے ان کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اسی طرح اگر علامات میں تعارض واقع ہو جائے تو دیکھنے والے کو علامات اور نشانیوں کو دیکھنا چاہیے اور ان میں سے جو ترجیح پا جائیں جانب ترجیح کے ذریعے فیصلہ دینا چاہیے اور یہ الزام کی قوت ہے اور اس کے ذریعے فیصلہ دینے میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ابن عربی کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1۔** روایت ہے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو انہوں نے کہا: فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ آپ نے انہیں کہا: کیا بھیڑیے نے اس کا کوئی عضو نہیں چھوڑا وہ میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اس کے ذریعے انس حاصل کروں؟ کیا اس نے میرے لیے کوئی کپڑا نہیں چھوڑا جس میں میں اس کی خوشبو سونگھوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہ اس کی قمیص ہے جو اس کے خون میں لت پت ہے، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام روئے اور اپنے بیٹوں کو کہا: اس کی قمیص مجھے دکھاؤ، انہوں نے قمیص دکھائی آپ نے اس کو سونگھا اور چوما، پھر آپ اس کو الٹ پلٹ کرنے لگے تو اس میں کوئی سوراخ اور پھٹن دکھائی نہ دیا تو آپ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! میں نے آج تک ایسا مضبوط بھیڑیا نہیں دیکھا وہ میرے بیٹے کو کھا گیا اس نے اسے قمیص سے ایسے نکال لیا ہے کہ قمیص کو بالکل پھاڑا ہی نہیں اور آپ کو پتا چل گیا کہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے کہا ہے اور یہ معلوم ہو گیا کہ بھیڑیے نے اسے نہیں کھایا، آپ نے ناراض شخص کی طرح ان سے اعراض کر لیا اس حال میں کہ آپ پریشان بھی تھے اور رو بھی رہے تھے اور کہا: اے میرے بیٹوں کی جماعت! میرے بیٹے کی طرف میری رہنمائی کرو اگر وہ زندہ ہو تو میں اسے اپنے پاس لے

آؤں گا اور اگر مردہ ہوا تو میں اس کا کفن دفن کروں گا۔ تو اس وقت انہوں نے کہا: ہمارے باپ کو دیکھو کس طرح ہماری گفتگو کی تکذیب کرتا ہے؟ آؤ اسے کنویں سے نکالیں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اپنے باپ کے پاس اس کا کوئی عضو لے آئیں تا کہ یہ ہماری گفتگو کی تصدیق کرے اور اس کی امید ختم ہو، یہوذا نے کہا: اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو میں جب تک زندہ رہوں گا تمہارا دشمن بن جاؤں گا اور تمہارے باپ کو تمہاری بری کاروائی سے آگاہ کروں گا، انہوں نے کہا: اگر تو ہمیں اس کام سے روکتا ہے تو آؤ ہم کسی بھیڑیے کا شکار کریں، اس نے کہا: انہوں نے بھیڑیے کا شکار کیا اسے خون میں لت پت کیا اور رسیوں کے ساتھ باندھ دیا پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اے ہمارے باپ! یہ وہ بھیڑیا ہے جو ہمارے ریوڑ کا نقصان کرتا ہے ان کی چیر پھاڑ کرتا ہے اور شاید یہ وہی ہے جس نے ہمارے بھائی کو قتل کر کے ہمیں اذیت دی ہے ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں اور یہ اس پر اس کا خون بھی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو بھیڑیا آپ کی خاطر اپنی دم ہلانے لگا اور آپ کے قریب ہونے لگا حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: قریب آ، قریب آ یہاں تک کہ آپ نے اس کے رخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے کہا: اے بھیڑیے! تو نے مجھے میرے بیٹے کی وجہ سے کیوں تکلیف پہنچائی اور مجھے لمبی پریشانی کا وارث بنا دیا؟ پھر کہا: اے اللہ! اسے قوت گویائی دے، تو اللہ نے اسے قوت گویائی دے دی، اس نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو نبی چن لیا ہے نہ میں نے اس کا گوشت کھایا، نہ میں نے اس کے کپڑے پھاڑے اور نہ ہی میں نے اس کا کوئی بال بیکا کیا، اور اللہ کی قسم! اور نہ ہی مجھے آپ کے بیٹے کے بارے میں کوئی خبر ہے، میں تو ایک اجنبی بھیڑیا ہوں مصر کے نواحی علاقے سے اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش میں آیا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ پھر آپ کے بیٹوں نے مجھے شکار کر کے باندھ دیا ہے، بے شک انبیاء کے گوشت مجھ پر اور تمام وحشی جانوروں پر حرام ہیں، اور اللہ کی قسم! میں ایسے شہروں میں نہیں رہتا جن میں انبیاء کی اولاد یں جانوروں پر جھوٹے الزام لگائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا: اللہ کی قسم! تم تو اپنے خلاف میرے پاس حجت لائے ہو، یہ بھیڑیا ایک جانور ہے جو اپنے بھائی کی تلاش میں اس کے پیچھے نکلا ہوا ہے اور تم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ بھیڑیا اس الزام سے بری ہے جس میں پکڑ کے تم اسے لائے ہو۔ **بَلْ سَوَّلَتْ** یعنی مزین کر دیا **لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا** تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایسا معاملہ جو اس کے علاوہ ہے جس کو تم بیان کرتے ہو اور جس کا تم تذکرہ کرتے ہو۔ پھر آپ نے اپنی تسلی کے لیے فرمایا: **فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ**۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ زجاج نے کہا: یعنی میرا مقام اور جس کا میں عقیدہ رکھتا ہوں **فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ** ہے۔ قطرب نے کہا: یعنی میرا صبر، صبر جمیل ہے ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ صبر جمیل میرے لیے زیادہ مناسب ہے، یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبر جمیل کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: "صبر جمیل وہ ہے(1) جس کے ساتھ شکوہ نہ ہو"۔ انشاء اللہ اس کا بیان سورت کے آخر میں آئے گا۔ ابو حاتم نے کہا: عیسیٰ بن عمر نے سہل بن یوسف

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 197

کے گمان کے مطابق فصبراً جمیلاً پڑھا ہے، اس نے کہا: اور اسی طرح اشہب عقیلی نے پڑھا ہے، اسی طرح مصحف انس اور ابی صالح میں ہے۔ مبرد نے کہا: فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ رفع کے ساتھ پڑھنا نصب کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ معنی یہ ہے: قال رب عندی صبر جمیل اس نے کہا: نصب صرف مصدر کی بنیاد پر ہے، یعنی فلأ صبرن صبرا جمیلا، (شاعر نے) کہا:

شکا إلیّ جملی طول السُّری　　صبرا جمیلا فکلانا مبتلی

صبر جمیل وہ ہے جس میں نہ جزع ہو اور نہ شکوہ ہو۔ ایک قول یہ ہے۔ اس کا معنی یہ۔ ہے کہ میں تمہارے ساتھ غمگین چہرے اور پیشانی پر بل ڈال کر نہیں رہوں گا بلکہ میں تمہارے ساتھ جس حالت میں پہلے تھا اسی حالت میں رہوں گا، اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آپ نے انہیں مواخذہ سے معاف کر دیا تھا۔ حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھنویں ان کی دونوں آنکھوں پر گر گئی تھیں اور کسی کپڑے کے ساتھ انہیں اٹھاتے تھے۔ آپ کو کہا گیا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: زمانے کی طوالت اور پریشانیوں کی کثرت، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: اے یعقوب علیہ السلام! کیا مجھ سے شکوہ کرتا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! یہ غلطی ہے جو مجھ سے سرزد ہو گئی پس تو مجھے معاف فرما (1)۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ یہ مبتدا اور خبر ہے عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی اس احتمال پر جو تم کذب میں سے بیان کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن ابی رفاعہ نے کہا: اہل رائے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے گمان کے وقت (ایک مرتبہ آپ کا گمان درست تھا جبکہ دوسری دفعہ درست نہیں تھا) اپنی رائے کو درست کرنا چاہیے۔ جب آپ کے بیٹوں نے آپ کو کہا: اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ تو آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ تو یہاں آپ کا گمان درست تھا۔ پھر انہوں نے کہا: اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ۝ (یوسف) آپ نے فرمایا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا تو یہاں آپ کا گمان درست نہ تھا۔

وَ جَآءَتْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ یٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝

''اور (تھوڑی دیر بعد) ایک قافلہ آیا تو اہل قافلہ نے (پانی لانے کے لیے) آبکش بھیجا، اس نے لٹکایا اپنا ڈول، وہ پکار اٹھا: مژدہ باد! (تو کتنا من موہنا) بچہ ہے۔ اور انہوں نے چھپا دیا اسے متاع (گرانبہا) سمجھتے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَآءَتْ سَیَّارَةٌ یعنی گزرنے والا قافلہ جو شام سے مصر کی طرف چل رہا تھا وہ راستہ بھول گئے اور تھک گئے یہاں تک کہ انہوں نے کنویں کے قریب پڑاؤ ڈالا اور کنواں آبادی سے دور صحراء میں تھا۔ وہ چرواہوں کے لیے تھا اور اس کا پانی کھاری تھا لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تو وہ میٹھا ہو گیا۔ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا گیا کیونکہ اگر لفظوں کا اعتبار ہوتا تو فارسلت واردھم ہوتا جس طرح کہ وَ جَآءَتْ ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 198

وارد سے مراد وہ شخص ہے جو پانی کے پاس جاتا ہے تاکہ لوگوں کو پانی پلائے اس کا نام مالک بن دعر تھا وہ عرب عاربہ سے تھا۔ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ یعنی أرسله ادلی دلوہ کہا جاتا ہے جب وہ اس (ڈول) کو ڈالے تاکہ وہ اسے پانی سے بھرے۔ اور ''دلاھا'' سے مراد ہے کہ اس نے اسے نکالا۔ اصمعی وغیرہ سے منقول ہے: دلا یدلو دلوا سے مراد جَذَبَ اور اَخْرَجَ ہے اسی طرح ادلی ہے جب وہ اسے پھینکے، اور جب یہ ثقیل ہو جائے تو پھر یہ واوی کے بجائے یائی ہو جاتا ہے کیونکہ یا، واو کی نسبت زیادہ خفیف ہے یہ کوفیوں کا قول ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: جب یہ تین حروف سے تجاوز کر جائے تو یائی ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی اتباع کرتے ہوئے دلو کی جمع قلت أدل آتی ہے اور جب کثرت بنائی ہو تو ''دُلِیّ اور دِلِیّ آتی ہے پس واو کو یا سے بدل دیا جاتا ہے۔ البتہ جمع کا باب مختلف ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ واحد اور جمع میں فرق کیا جائے اور دلاء بھی آتی ہے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام رسی کے ساتھ چمٹ گئے جب باہر نکلے تو آپ چودھویں کے چاند کی طرح حسین بچے تھے اور عام بچوں کی نسبت زیادہ خوبصورت تھے۔ صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث اسراء میں فرمایا: ''تو میں یوسف کے پاس تھا جن کو حسن کا ایک حصہ عطا فرمایا گیا ہے'' (1)۔ کعب احبار نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام خوبصورت چہرے والے، گھنے بالوں والے، موٹی آنکھوں والے، معتدل تخلیق والے، سفید رنگ والے، سخت کلائیوں اور پنڈلیوں والے، دبلے پیٹ والے اور چھوٹی ناف والے تھے، جب آپ مسکراتے تو آپ کی مسکراہٹ سے روشنی دکھائی دیتی اور جب آپ گفتگو کرتے تو آپ کے کلام میں آپ کے دانتوں سے سورج کی شعاع دیکھتا، کوئی آدمی بھی اس صورت کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور آپ کا حسن رات کے وقت دن کی روشنی کی طرح تھا۔ جس دن حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا اور ان میں اپنی روح پھونکی اس دن جو کیفیت آپ کی تھی آپ سے خطا سرزد ہونے سے پہلے پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کی اس حالت کے مشابہ تھے۔ ایک قول یہ ہے: آپ کو یہ خوبصورتی اپنی جدہ حضرت سارہ سے وراثت میں ملی تھی ان کو حسن کا چھٹا حصہ عطا کیا گیا تھا۔ جب مالک بن دعر نے آپ کو دیکھا تو کہا: یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قرات ہے سوائے ابن ابی اسحاق کے کہ اس نے یٰبُشْرَیَّ هٰذَا غُلٰمٌ پڑھا۔ اس نے الف کو یا سے بدل دیا کیونکہ یا ماقبل کو کسرہ دیتی ہے اور جب الف کو کسرہ دینا جائز نہیں تو اس کے عوض اسے ''یا'' سے بدل دیا گیا، جبکہ اہل کوفہ نے ''یابشرٰی'' پڑھا ہے بغیر اضافت کے اس کے معنی کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ...... یہ بچے کا نام ہے۔ اور دوسرا...... اے بشریٰ یہ تیرا زمانہ اور تیرا مقام ہے۔

قتادہ اور سدی نے کہا: جب ڈول والے نے اپنا ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لپٹ گئے تو اس نے کہا: یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ۔ قتادہ نے کہا: اس نے اپنے دوستوں کو خوشخبری دی کہ اس نے غلام پالیا ہے۔

سدی نے کہا: اس نے ایک آدمی کو پکارا جس کا نام بشریٰ تھا (2)۔ نحاس نے کہا: قتادہ کا قول زیادہ بہتر ہے، کیونکہ قرآن میں بہت کم کسی کا نام آیا ہے، بلکہ قرآن میں کنایۃً ذکر آتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى یَدَیْهِ (الفرقان: 27) اس سے مراد عقبہ بن معیط ہے اس کے بعد فرمایا: یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ﴿۲۸﴾ (الفرقان) یہ امیہ بن

1۔ صحیح مسلم، حدیث الاسراء، جلد 1، صفحہ 91 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 199

خلف ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ بشری کی ندا کا معنی ہے: جو حاضر ہے اس کے لیے خوشخبری ہے۔ اور یہ تبشرات کے قول سے زیادہ مؤکد ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: یا عجباہ، یعنی یا عجب هذا من أيامك وأياتك، فاحضر، یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح سہیلی نے کہا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اس طرح ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: واسرور اہ! البشری۔ یہ الاستبشار سے مصدر ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اگر یہ اسم علم ہوتا تو ضمیر کی طرف مضاف نہ ہوتا۔ اس صورت میں بشری محل نصب میں ہوتا، کیونکہ یہ ندا مضاف ہے اور ندا کا معنی بیان تنبیہ ہے یعنی انبتهوا لفرحتی وسروری، اور سدی کے قول کے مطابق یہ محل رفع میں ہوگا جس طرح آپ کہتے ہیں: یا زید هذا غلام۔ اس کا محل نصب میں ہونا بھی ممکن ہے جس طرح: یا رجلا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (یٰسین: 30) البتہ بشری منون نہیں کیونکہ یہ غیر منصرف ہے۔

وَ اَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً، ہ ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام سے کنایۃ ہے جبکہ واو جمع آپ کے بھائیوں سے کنایۃ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ان تاجروں سے کنایۃ ہے جنہوں نے آپ کو خریدا تھا۔ ایک قول یہ ہے: یہ کنوئے پر وارد ہونے والے آدمی اور اس کے دوسرے دوستوں سے کنایہ ہے۔ بِضَاعَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مجاہد نے کہا: مالک بن دعر اور اس کے دوستوں نے آپ کو ان تاجروں سے چھپایا جو ان کے ساتھ اس جماعت میں تھے۔ انہوں نے انہیں کہا: یہ سامان ہے اہل شام میں سے کسی نے یا اس پانی والوں میں سے کسی نے یہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم اسے مصر پہنچا دیں۔ اور انہوں نے یہ بات صرف اس خوف سے کی کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک نہ ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو (قیمتی) سامان سمجھ کر چھپا لیا جب آپ نے کنوئے سے نکلنا چاہا۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: تم نے کتنا برا کام کیا ہے، یہ تو ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اور انہوں نے عبرانی زبان میں حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: یا تو ہماری غلامی کا اقرار کرو تو ہم تمہیں ان کے ہاتھوں بیچ دیں گے یا ہم تجھے لے لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ تو آپ نے کہا: میں تمہاری غلامی کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ نے ان کی غلامی کا اقرار کیا تو انہوں (بھائیوں) نے آپ کو ان (قافلے والوں) کے ہاتھوں بیچ دیا: ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے آپ کو کہا کہ آپ اپنے بھائیوں کی غلامی کا اعتراف کر لیں ورنہ مجھے ڈر ہے کہ یہ آپ کو قتل کر دیں گے۔ تو اس طرح شاید اللہ تعالیٰ آپ کے لیے نکلنے کی کوئی راہ بنا دے اور آپ قتل سے نجات پا لیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے قتل کے خوف سے اپنی حقیقی صورتحال چھپالی۔ مالک نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ غلام کی نشانی نہیں ہے۔ انہوں (بھائیوں) نے کہا: اس نے ہماری گود میں پرورش پائی ہے۔ ہمارے اخلاق سے مزین ہوا ہے اور ہمارے آداب سیکھے ہیں۔ تو اس نے کہا: اے بچے تو کیا کہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا ہے، میں نے ان کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ان کے اخلاق سے مزین ہوا ہوں، تو مالک بن دعر نے کہا: اگر تم اسے میرے ہاتھ بیچو تو میں اسے تم سے خرید لیتا ہوں۔ تو انہوں نے آپ کو اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب ہے۔

وَ شَرَوۡهُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَ كَانُوۡا فِيۡهِ مِنَ الزّٰهِدِيۡنَ ۝

''اور انہوں نے بیچ ڈالا یوسف علیہ السلام کو حقیر سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اور وہ (پہلے ہی) اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ شَرَوْهُ، شریت بمعنی اشتریت ہے۔ اسی طرح شریت بمعنی بعت بھی ہے یعنی (خریدنا اور بیچنا دونوں معنی میں یہ مستعمل ہے) شاعر نے کہا:

وشَرَيْتُ بُرْدًا لَيْتَنِي مِنْ بَعْدِ بُرْدٍ كنتُ هَامَهُ (1)

اس میں شریت بمعنی بعت ہے یعنی میں نے چادر بیچی

دوسرے شاعر نے کہا:

فلما شَرَاها فاضتِ العينُ عبرةً وفي الصَّدرِ حُزّازٌ من اللّوْمِ حامِزُ

اس میں بھی شرا سے مراد بیچنا ہے۔

بِثَمَنٍ بَخْسٍ یعنی تھوڑی قیمت۔ یہ یہاں مصدر ہے جسے اسم کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے، یعنی اصل میں ہے باعوہ بثمن مبخوس یعنی منقوص۔ آپ کے بھائی آپ کی قیمت کے ذریعے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ اپنے باپ سے دور ہو جائیں۔ ایک قول یہ ہے: آپ کے بھائی یہوذا نے دور سے دیکھا کہ یوسف کو کنوئے سے نکالا گیا ہے تو اس نے دوسرے بھائیوں کو بتایا، وہ آئے اور انہوں نے آپکو آبکش کے ہاتھوں بیچ دیا، جبکہ ایک قول یہ ہے: نہیں بلکہ وہ تین فرلانگ کے فاصلہ سے خبر کی تصدیق کرنے کیلئے واپس آئے تو انہوں نے قافلہ کے نشانات دیکھے تو وہ ان کے پیچھے گئے اور انہیں کہا: یہ ہمارا غلام ہے جو ہم سے بھاگا ہوا ہے تو اس طرح انہوں نے آپکو اس کے ہاتھ بیچا۔ قتادہ نے کہا: بخس بمعنی ظلم ہے۔ ضحاک، مقاتل، سدی اور ابن عطا نے کہا: بخس بمعنی حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کا کوئی خاص معنی نہیں بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری قیمت نہیں لگائی (2)، کیونکہ اگر آپ کے بھائیوں نے آپ کو بیچا تو وہ آپ کی قیمت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے بلکہ وہ تو صرف آپ کو باپ کے سامنے سے دور کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر وارد ہونے والوں نے آپ کو بیچا تو انہوں نے آپ کو اپنا بناتے ہوئے مخفی رکھا، یا انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا: ہمارے ساتھ کچھ سامان بھیجو تو انہوں نے سوچا کہ انہیں اس کے بدلے میں کوئی ثمن ادا نہیں کیے گئے اور جو کچھ انہوں نے اس میں سے لیا ہے وہ سارے کا سارا منافع ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: ابن عربی کا قول وانما الاشارة فيه الى انه لم يستوف ثمنه بالقيمة اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر وہ آپ کی پوری قیمت وصول کرتے تو پھر یہ بیع جائز ہوتی حالانکہ ایسا نہیں۔ یہ بات سدی وغیرہ کی بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے ایسی ذات پر بیع کی ہے جس کو بیچنا ہی جائز نہیں تھا پس اسی لیے ان کے لیے اس کی قیمت

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 202
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079

حلال نہ تھی۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: بخس کا معنی ہے قلیل یعنی تھوڑا (1)۔ ابن حیان نے کہا: اس کا معنی زیف یعنی کھوٹا ہے۔
حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ کو بیس درہموں میں فروخت کیا اور آپ کے بھائیوں میں سے ہر ایک نے دو درہم لیے اور وہ کل دس تھے۔ یہی قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے کہا: بائیس درہموں میں (انہوں نے آپ کو فروخت کیا) اور وہ کل گیارہ تھے ہر ایک نے دو دو درھم لیے۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: چالیس درہم کے بدلے آپ کو بیچا گیا۔ لیکن جو کچھ صحابہ سے مروی ہے وہ زیادہ اولیٰ ہے۔ اور بخس یہ ثمن کی صفت ہے۔ دراہم یہ ثمن کا بدل اور اس کی تفسیر ہے۔ اور کہا جاتا ہے دراہم اس بنیاد پر ہے کہ یہ درھام کی جمع ہے۔ اور بعض اوقات یہ اسم جمع بھی ہوتا ہے سیبویہ کے نزدیک۔ اور سیبویہ کے نزدیک ہی مد کسرہ کی وجہ سے یا بن جاتی ہے مگر یہ مد مقصور کی طرح نہیں کیونکہ بصریوں کے نزدیک مد مقصور جائز نہیں نہ شعر میں اور نہ ہی غیر شعر میں، نحویوں نے اس پر شعر بھی پیش کیا ہے:

تَنْفِي يداها الحصَى في كلِّ هاجِرةٍ　　نَفْيَ الدَّراهِيمِ تَنْقَادُ الصَّيَارِيفِ

اس میں بھی دراھم کے بجائے الداراھیم ہے۔

**مَعْدُوْدَةٍ** یہ صفت ہے۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ ان کے ہاں ثمن گن کر دیئے جاتے تھے نہ کہ وزناً۔ ایک قول یہ ہے۔ یہ قلت ثمن سے عبارت ہے، کیوں کہ دارہم اتنے نہ بنتے تھے کہ ان کا وزن کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "اوقیہ" سے کم کا وزن نہیں کرتے تھے اور اوقیہ سے مراد چالیس درہم ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے: نقدین کی اصل تو وزن ہے (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تبیعوا الذهب بالذهب ولا الفضته بالفضة إلا وزنًا من زاد او ازداد فقد اربی (3) تم سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر وزن کر کے جس نے زیادتی کی یا زیادتی چاہی تو اس نے سودی کام کیا۔

اور وزن کا فائدہ سوائے مقدار کے اور کوئی نہیں، جہاں تک عین وزن کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی منفعت نہیں، مگر اس میں عدد کو جاری کر دیا گیا کثرت معاملہ کی وجہ سے لوگوں سے تخفیف کرتے ہوئے، تو اس وجہ سے پھر وزن کرنا ختم ہو گیا، یہاں تک کہ اگر مثقال یا درہم بنائے جائیں تو ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز ہوگی بشرطیکہ اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور نہ ہی ایک دوسرے سے راجح ہوں۔ پس اگر اس میں نقصان ہو تو پھر معاملہ وزن کے ساتھ ہوگا، اسی وجہ سے اس کو توڑنا یا کاٹنا فساد فی الارض میں سے ہے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء کا دراہم و دنانیر کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ معین ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں امام مالک سے بھی مختلف روایات ہیں۔ اشہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معین نہیں یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر قول ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ ابن قاسم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معین ہے۔ اس نے یہ کرخی سے حکایت کیا ہے۔ یہی امام شافعی کا قول بھی ہے۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ یہ معین نہیں ہوتے تو اس صورت میں جب کوئی آدمی کہے گا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 205　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1079　　3۔ صحیح مسلم، باب الربا، جلد 2، صفحہ 24

بعتك هذه الدنانير بهذه الدراهم کہ میں نے تجھے یہ دینار ان دراہم کے بدلے میں بیچے تو اس صورت میں تو دینار، دینا روالے کے ذمے ہو جائیں اور دراہم، دراہم والے کے ذمے اور معین ہوں پھر ضائع ہو جائیں تو ان دونوں کے ذمے کوئی شے نہیں ہوگی اور جس طرح عروض وغیرہ میں سے اعیان کی بیع باطل ہو جاتی ہے اسی طرح یہ عقد بھی باطل ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لقیط کے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ آزاد ہے اور وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ پڑھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بھائی ہیں ۔ایک قول کے مطابق: قافلہ والے ہیں ۔ایک قول کے مطابق: آبکش مراد ہے۔ جو بھی مراد ہے یہ ان کے نزدیک قابل رشک نہیں تھے۔ نہ ہی بھائیوں کے نزدیک؛ کیونکہ ان کا مقصد مال کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف باپ کی آنکھوں سے ان کو اوجھل کرنا مقصود تھا۔ اور نہ ہی قافلہ والوں کے نزدیک کیونکہ انہیں آپ کے بھائیوں نے کہا تھا کے یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے ۔اور زھد سے مراد قلت رغبت ہے۔ اور نہ ہی آبکش کے نزدیک کیونکہ اس کو دوسرے دوستوں کی شراکت داری کا خوف تھا ۔اور ان کا خیال ہے کہ ثمن میں سے قلیل انفراد میں اولیٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اس آیت میں کسی بڑی چیز کو انتہائی تھوڑی قیمت کے بدلے میں خرید نے کے جواز پر دلیل ہے اور یہ بیع بھی لازم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کسی نے اگر کوئی بہت بڑا درہ ایک درھم کے بدلے بیچا پھر کہا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ درہ ہے، میں نے تو اسے مخشلبہ (موتی کی شکل کا سفید کچ) سمجھا تو اسے بیع لازم ہو جائے گی اور اس کی گفتگو کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔ ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ سے مراد ہے کہ وہ آپ کے حسن میں رغبت نہ رکھتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا نصف حصہ عطا فرمایا مگر آپ کی عزت و تعظیم کے طور پر قوم کے نفوس کی رغبت کو آپ سے پھیر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے: وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ آپ کے مقام و مرتبہ کو نہ جانتے تھے (1)۔ سیبویہ اور کسائی نے بیان کیا: زَهَدت و زَهِدت یعنی ھاء کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۲۱

''اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا اہل مصر سے اپنی بیوی کو عزت و اکرام سے اسے ٹھہراؤ شاید یہ ہمیں نفع پہنچائے یا بنا لیں ہم اسے اپنا فرزند اور یوں (اپنی حکمت کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین میں اور تاکہ ہم سکھا دیں اسے خوابوں کی تعبیر، اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے ہر کام پر لیکن اکثر لوگ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 207

(اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ ایک قول یہ ہے؛ یہاں الاشتراء یعنی الاستبدال ہے کیونکہ یہ عقد نہیں تھا۔ جس طرح: اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ: 16) ہے یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدا (تبدیل کیا)

ایک قول یہ ہے: انہوں نے ظاہری حالت میں اس کو خریداری گمان کیا، تو ظاہر گمان کے مطابق اس لفظ کو جاری کر دیا۔ ضحاک نے کہا: وہ آدمی جس نے آپ کو خریدا وہ مصر کا بادشاہ تھا اور اس کا لقب عزیز ہے۔ سہیلی نے کہا: اس کا نام قطفیر ہے ابن اسحاق نے کہا: اطفیر بن روحب نے اپنی بیوی راعیل کے لیے اسے خریدا(1)۔ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس کا نام زلیخاء تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عزیز (مصر) کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ڈال دی تھی تو اس نے اس کی وصیت اپنے اہل خانہ کو کی۔ اس بات کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اس (عزیز مصر کی بیوی) کے نام کے بارے میں ثعلبی وغیرہ نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کو مصر کے بادشاہ کے وزیر قطفیر نے خریدا اور وہ ریان بن ولید تھا(2)۔ ایک قول کے مطابق: ولید بن ریان اور یہ عمالقہ کا ایک آدمی تھا، جبکہ ایک قول کے مطابق: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک قول کی وجہ سے کہ: وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ (غافر: 34) اور اس نے چار سو سال زندگی گزاری۔ ایک قول یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کی اولاد میں سے تھا جس طرح کہ اس کا بیان سورۂ غافر میں آئے گا اور یہ عزیز جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کے خزانوں پر (نگرانی کے لیے) خریدا اس نے مالک بن دعر سے حضرت یوسف کو بیس دینار کے عوض خریدا اور اس کے ساتھ ایک حلۃ اور نعلین زائد دیے۔ ایک قول یہ ہے: اس نے آپ کو قافلہ والوں سے خریدا۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کی قیمت میں اتنی زیادتی کر لی کہ آپ کے وزن کے دوگنا وزن کے برابر مسک، عنبر، ریشم، چاندی، سونا، موتی اور جواہر تھے جنکی قیمت سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ قطفیر نے مالک بن دعر سے اس قیمت کے عوض آپ کو خرید لیا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ وہب نے اس کے علاوہ بھی ایک بات کی ہے: جب مالک بن دعر نے حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں سے خریدا تو ان کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا: یہ جس کو مالک بن دعر نے بنی یعقوب میں سے بیس درہم کے عوض خریدا ہے اور وہ فلاں فلاں ہیں ان کا غلام ہے۔ اور انہوں نے یہ شرط رکھی کہ یہ بھاگا ہوا ہے اور یہ اس کو بغیر قید اور بیڑیوں کے نہیں رکھے گا اور اس نے ان کو اس بات پر اللہ تعالیٰ کا عہد دیا۔ اس نے کہا: اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں الوداع کہا اور آپ کہہ رہے تھے: اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے اگرچہ تم نے مجھے ضائع کر دیا، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے اگرچہ تم نے مجھے رسوا کیا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم کرے اگرچہ تم نے میرے اوپر رحم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: اس الوداع کی شدت کے سبب ریوڑ نے اپنے پیٹوں میں موجود تازہ خون باہر پھینک دیا۔ انہوں نے آپ کو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 19 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 208

اونٹ کے ایسے پالان پر بٹھایا جس پر کوئی فرش اور بچھونا وغیرہ نہیں تھا اور آپ کو قید کر کے بیڑیاں پہنا دیں۔ آپ آل کنعان کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنی ماں کی قبر کو دیکھا اور ایک سیاہ فام حبشی ان کے پہرے پر مامور تھا وہ غافل ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو اپنی والدہ کی قبر پر گرا دیا اور ان کی قبر پر لوٹ پوٹ ہونے لگے اور ان کی قبر سے گلے لگ گئے اور اضطراب سے کہنے لگے: اے میری ماں! سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھ۔ وہ کس طرح زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے انہوں نے میرے والد اور میرے درمیان جدائی ڈال دی ہے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو اپنی رحمت کے مستقر میں جمع کر دے، بے شک وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جب اس حبشی نے حضرت یوسف کو پالان پر نہیں دیکھا تو وہ پیچھے دوڑا تو آپ ایک قبر پر تھے اس نے غور کیا تو وہ آپ ہی تھے تو اس نے اپنے پیر سے خاک پر ٹھوکر ماری اور آپ کو لوٹ پوٹ کر دیا اور آپ کو دردناک مار لگائی، تو آپ نے اسے فرمایا: ایسا مت کرو! اللہ تعالیٰ کی قسم! میں بھاگا ہوا نہیں، جب میں اپنی ماں کی قبر کے پاس سے گزرا تو میں نے چاہا کہ میں اپنی ماں کو الوداع کہوں اور میں ایسا کام دوبارہ نہیں کروں گا جو تم کو ناپسند ہو۔ حبشی نے کہا: اللہ کی قسم! تو بہت برا غلام ہے تو کبھی اپنے باپ کو پکارتا ہے اور کبھی اپنی ماں کو تو نے اپنے مالکوں کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور عرض کی: اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرے یہ کام خطا ہیں تو میں اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما، تب آسمان کے فرشتوں نے چیخ و پکار کی اور حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اے یوسف: اپنی آواز کو پست رکھیں، آپ نے تو آسمان کے فرشتوں کو رلا دیا ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں زمین کو الٹ پلٹ کر دوں اس کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دوں؟ آپ نے فرمایا: اے جبریل ٹھہرو! اللہ تعالیٰ حلیم ہے جلدی نہیں کرتا۔ تو جبریل نے زمین پر اپنا پر مارا تو زمین پر اندھیرا چھا گیا اور گرد و غبار اڑنے لگا اور سورج کو گہن لگ گیا اور قافلہ ایسا تھا کہ کوئی آدمی دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا، قافلہ کے سردار نے کہا: تم میں سے ضرور کسی نے ایسا کام کیا ہے جو پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ میں اتنے لمبے عرصہ سے اس علاقہ میں سفر کر رہا ہوں، اور میرے ساتھ کبھی اس قسم کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ تو اس حبشی نے کہا: میں نے اس عبرانی غلام کو تھپڑ مارا تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کچھ ایسا کلام کیا جس کو میں نہیں جانتا، کوئی شک نہیں کہ اس نے ہمارے خلاف دعا کی۔ سردار نے ان سے کہا: تو نے ہمیں ہلاک کرنا چاہا، اس (غلام) کو ہمارے پاس لاؤ۔ وہ آپ کو لایا، سردار نے آپ کو کہا: اے لڑکے! اس نے تم کو تھپڑ مارا جس کے نتیجہ میں ہم پر وہ عذاب آیا جس کو تم نے دیکھا، اگر تم بدلہ لینا چاہو تو تم جس سے چاہو بدلہ لے لو اور اگر تم معاف کر دو تو تم سے یہی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس امید پر اس کو معاف کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا تو گرد و غبار چھٹ گیا اور سورج ظاہر ہو گیا اور مشرق و مغرب میں روشنی پھیل گئی اور وہ تاجر صبح شام آپ کی زیارت کرنے لگا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرنے لگا یہاں تک کہ آپ مصر پہنچ گئے اور آپ نے دریائے نیل میں غسل کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے سفر کی تھکاوٹ دور کر دی اور آپ کا حسن و جمال لوٹا دیا وہ سردار آپ کو دن کے وقت لے کر شہر میں داخل ہوا اس حال میں کہ آپ کے چہرے

کا نور شہر کی دیواروں میں پڑ رہا تھا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے لیے پیش کیا تو بادشاہ کے وزیر قطفیر نے آپ کو خرید لیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو گزر چکا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بادشاہ مرنے سے پہلے آپ پر ایمان لے آیا تھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کی پھر جن دنوں میں حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے خزانوں پر مامور تھے وہ بادشاہ مر گیا تو اس کے بعد قابوس بادشاہ بنا، وہ کافر تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے اس کا انکار کر دیا۔ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ یعنی اس کی منزل اور اس کے مقام کو کھانے اور اچھے لباس کی عمدگی کے ذریعے۔ یہ ثوی بالمکان سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے أقام بہ سورۂ آل عمران وغیرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ یعنی جب بالغ ہوگا تو ہماری مہمات میں ہمیں کافی ہوگا۔ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ نامرد تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی، اسی طرح امام ابن اسحاق نے کہا: قطفیر عورتوں کی مقاربت نہیں کرتا تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے: اس نے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا کیسے کہہ دیا حالانکہ وہ بادشاہ تھا اور غلامی کے ساتھ اسے بیٹا بنانا تو دو متضاد چیزیں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا: وہ اسے آزاد کرے گا اور پھر منہ بولا بیٹا بنا لے گا اور منہ بولا بیٹا بنانا ان کے ہاں ایک مروج اور معلوم امر تھا۔ اور اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہ عام تھا جس طرح کہ اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: فراست کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے اچھے تین آدمی تھے (1)۔ ایک عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے سعادت کے آثار بھانپ لیے اور کہا: عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا شاید یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں۔ (دوسری) حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شرافت کے آثار دیکھ کر اپنے باپ سے کہا تھا: اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ (القصص) اے ابا جان! آپ انہیں اجرت پر رکھ لیں۔ بے شک جن کو آپ اجرت پر رکھیں ان میں بہترین شخص وہ ہے جو طاقتور اور ایماندار ہو (تیسرے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ابن عربی نے کہا: اس خبر کو نقل کرنے پر اتفاق کر لینے میں مفسرین پر تعجب ہے (2) فراست عجیب و غریب علم ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ ''الحجر'' میں آئے گا اور ان کی نقل کردہ اس بات میں، یہ یوں نہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا والی بنایا تو یہ اعمال میں تجربہ، محبت میں مواظبت اور طوالت، اور ان کی طرف سے علم و احسان کا مشاہدہ کر لینے کے بعد تھا اور یہ فراست کے طریقہ پر نہیں ہے، جہاں تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا تعلق ہے تو اس کے پاس بھی واضح علامات موجود تھیں جس طرح کہ سورۃ القصص میں آئے گا، البتہ عزیز مصر کے معاملہ کو فراست بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی ظاہری علامت نہیں تھی۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ کاف ضمیر محل نصب میں ہے، یعنی جس طرح ہم نے اس (یوسف) کو اس کے بھائیوں سے اور کنویں سے نکالا اسی طرح ہم نے اسے قرار بخشا؛ یعنی وہ بادشاہ جس نے اسے خریدا اس کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1080　2۔ ایضاً

دل ہم نے اس پر مہربان کر دیا یہاں تک کہ وہ بادشاہ کی حکومت والے شہر میں امر اور نہی پر قادر ہو گیا۔ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ہم نے اسے قرار بخشا تا کہ ہم اپنی طرف سے کلام کے ذریعے اس کی طرف وحی کریں اور اسے اس کی تاویل و تفسیر سکھا دیں اور خوابوں کی تعبیر اور کلام کی اتمام سکھا دیں۔ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں بلکہ وہ خود اپنے امر پر غالب ہے جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کہہ دیتا ہے: ہو جا، پس ہو جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ یوسف کے معاملہ پر غالب ہے اس کی تدبیر کرتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو کسی اور کے سپرد نہیں کرتا یہاں تک کہ اس تک کوئی فرد بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اس کے غیب پر مطلع نہیں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اَكْثَرَ سے مراد تمام لوگ ہیں کیونکہ کوئی بھی (خود بخود) غیب نہیں جانتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ اپنے ظاہر پر جاری ہے، کیونکہ بعض اوقات وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بعض غیب پر مطلع کر دیتا ہے اور ایک قول یہ ہے: وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ کا معنی یہ ہے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے اور وہ مشرک ہیں اور وہ لوگ ہیں جو تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے۔ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ کے بارے میں حکماء نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ نے خواب بیان کر دیا، پھر آپ کے بھائیوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کا امر غالب آیا یہاں تک کہ آپ بادشاہ بن گئے اور انہوں نے آپ کے سامنے سجدہ کیا۔ پھر بھائیوں نے چاہا کہ وہ اپنے باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیں تو اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ ان کے باپ کا دل ان کے بارے میں تنگ ہو گیا۔ اور ستر یا اسی سال کے بعد انہوں نے سوچا تو کہا: یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ (یوسف: 84) پھر انہوں نے غور و فکر کیا کہ اس کے بعد وہ نیک لوگ ہو جائیں۔ یعنی توبہ کرنے والے ہو جائیں، پس اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ وہ گناہ بھول گئے اور انہوں نے اس پر اصرار کیا یہاں تک کہ ستر سال کے بعد اس معاملہ کے آخر میں انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اپنے باپ کو کہا: اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ ﴿۹۷﴾ (یوسف) ہم غلطی پر تھے۔ پھر انہوں نے چاہا کہ رونے کے ذریعے اور قمیص کے ذریعے وہ اپنے باپ کو دھوکہ دیں تو اللہ کا امر غالب آیا اور وہ دھوکہ نہ دے سکے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یعنی تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے یہ معاملہ آراستہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کوشش کی کہ اپنے باپ کے دل سے اس (یوسف) کی محبت کو زائل کریں تو اللہ تعالیٰ کا حکم غالب آیا اور ان کے دل میں محبت اور شوق اور زیادہ ہو گیا۔ پھر عزیز کی بیوی نے تدبیر کی کہ وہ عزیز مصر سے شکایت کرنے میں پہل کرے گی اور آپ پر غالب آجائے گی لیکن اللہ کا حکم غالب آیا یہاں تک کہ عزیز مصر نے کہا: وَ اسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ﴿۲۹﴾ اپنے گناہ سے توبہ کرو بیشک تو خطاکاروں میں سے ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کے ذکر کے ذریعے قید خانے سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کی مگر اللہ کا امر غالب آیا ساقی بھول گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کئی سال تک قید خانے میں ٹھہرے رہے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

"اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم اور یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھا کام کرنے والوں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ سیبویہ کے نزدیک اَشُدَّهٗ جمع ہے اور اس کا واحد شِدَّةٌ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا واحد شد ہے (1)۔ جس طرح کہ شاعر نے کہا۔

عَهْدِي بِهِ شَدَّ النَّهارِ كَأَنَّمَا خُضِبَ اللَّبانُ ورأسُه بالعِظْلِم

شدّ النہار سے مراد دن کا جوبن اور عروج ہے۔

ابو عبید کا گمان ہے کہ عربوں کے نزدیک لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے (2)۔ اور اس کا معنی قوت کا کمال چاہنا ہے پھر اس کے بعد نقصان ہوتا ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: الاشد "تینتیس سال کی عمر ہے (3)۔ حضرت ربیعہ، حضرت زید بن اسلم اور حضرت مالک بن انس نے کہا: الاشد نوجوان کی بلوغت کی عمر ہے (4)۔ اس سلسلہ میں سورۃ "النساء" اور الانعام میں علماء کے مکمل اقوال گزر چکے ہیں۔ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ایک قول یہ ہے: ہم نے اس کو حکومت کا والی بنا دیا۔ اور وہ بادشاہ کی سلطانی میں فیصلہ کرتے تھے ہم نے ان کو فیصلہ کا علم دیا۔ مجاہد نے کہا: (اس سے مراد) عقل، فہم اور نبوت ہے۔ ایک قول یہ ہے: حکم سے مراد نبوت اور علم سے مراد علم دین ہے۔ ایک قول کے مطابق: خواب کی تعبیر کا علم (مراد ہے) اور جس نے کہا: آپ کو بچپن میں نبوت دے دی گئی تھی اس نے کہا کہ جب آپ جوبن کو پہنچے تو ہم نے ان کی سمجھ اور علم میں اضافہ کر دیا۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اس سے مراد مومنین ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد مصائب پر صبر کرنے والے ہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ طبری نے کہا: اس آیت کریمہ میں اگرچہ ظاہرا ہر محسن ہو سکتا ہے مگر اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جس طرح میں نے تمام کاروائی کے بعد یوسف کے ساتھ کیا پھر اسے عطا کیا جو کچھ عطا کیا اسی طرح میں آپ کو بھی آپ کی قوم کے ان مشرکوں سے نجات دوں گا جو آپ کے ساتھ دشمنی کا ارادہ رکھتے ہیں اور زمین میں تجھے قرار بخشوں گا۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ۝

"اور بہلانے پھسلانے لگی انہیں وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب براری کرے اور (ایک دن) اس نے تمام دروازے بند کر دیے اور (بصد ناز) کہنے لگی: بس آ بھی جا۔ یوسف (پاکباز) نے فرمایا: خدا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 211
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1081

کی پناہ! (یوں نہیں ہوسکتا) وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے بڑی عزت سے ٹھیرایا ہے۔ بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے اور اس عورت نے تو قصد کرلیا تھا ان کا اور وہ بھی قصد کرتے اس کا اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی (روشن) دلیل، یوں ہوا تا کہ ہم دور کردیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کو، بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو چن لیے گئے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وہ عزیز مصر کی بیوی ہے(1) اس نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ اس سے مطلب براری کریں۔ المراودۃ کی اصل نرمی اور مہربانی کیساتھ ارادہ اور طلب ہے۔ اور الرود اور الریاد سے مراد کسی چیز کو بار بار طلب کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ روید سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یمشی روید الیعنی فلاں نرمی سے چلتا ہے۔ مراودۃ سے مراد طلب میں نرمی ہے۔ مرد کے بارے میں کہا جاتا ہے: راودھا عن نفسھا اور عورت کے بارے میں: راودتہ عن نفسہ اور الرود سے مراد التأنی ہے۔ کہا جاتا ہے: أرودنی یعنی اس نے مجھے مہلت دی۔ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ غلق کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ غلق الباب نہیں کہا جاتا۔ جبکہ اغلق کثیر و قلیل دونوں کے لیے آتا ہے، جس طرح فرزدق نے ابو عمرو بن العلاء کے بارے میں کہا:

مازلتُ أُغلق أبوابًا و أفتحُها حتی أتیتُ أبا عمر وبن عمّارِ

میں دروازے بند کرتا رہا اور انہیں کھولتا رہا یہاں تک کہ میں ابو عمرو بن عمار کے پاس پہنچ گیا۔

اس میں أغلق کئی دروازوں کے لیے استعمال ہوا۔

کہا جاتا ہے: وہ سات دروازے تھے اس نے ان کو بند کردیا پھر آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ یعنی ھلم أقبل اور تعال آگے بڑھو۔ اس کا نہ کوئی مصدر ہے اور نہ ہی اس کی کوئی گردان ہوسکتی ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں سات قرائتیں جائز ہیں۔ اس سلسلہ میں ازروئے اسناد کے صحیح وہ ہے جسے اعمش نے أبی وائل سے روایت کیا انہوں نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو هَیْتَ لَكَ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے کہا: تو میں نے کہا: بعض لوگ اس کو ھِیتَ لك پڑھتے ہیں تو آپ (حضرت عبداللہ بن مسعود) نے کہا: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا ہے(2)۔ ابوجعفر نے کہا: بعض لوگ عن عبداللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں، کیونکہ ان کا قول: میں اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مجھے سکھایا گیا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔ اور یہ قرأت تا اور ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے یہی حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد اور عکرمہ کی قرأت میں سے صحیح قرأت ہے اور یہی ابو عمرو بن علاء، عاصم، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں تقطیع نہ کرو؛ پس یہ تمہارے قول ھلم اور تعال کی طرح ہے۔ ابن ابی اسحاق نحوی نے قالت هَیْتِ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے فتحہ اور تا کے کسرہ کے ساتھ۔

طرفہ نے کہا:

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث نمبر 3491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لیس قومی بالأبعدین إذا ما　　قال داعٍ من العشیرۃ هَیتُ(1)

طرفہ کے اس شعر میں محل استشہاد هَیتُ ہے اس میں ھا کے فتحہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

پس یہ تین قراءتیں ہیں ان میں ھا مفتوح ہے۔ ابوجعفر، شیبہ اور نافع نے وَقَالَتْ هِیتَ لَكَ پڑھا ہے یعنی ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ۔ یحییٰ بن وثاب نے وَقَالَتْ هِیتُ لَك پڑھا ہے ھا کے کسرہ اس کے بعد ساکن اور تا مضموم کے ساتھ۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور عکرمہ سے وَقَالَتْ هِئْتُ لَكَ روایت ہے۔ ھا کے کسرہ کے بعد ہمزہ ساکن اور تا مضمومہ کے ساتھ۔ ابن عامر اور اہل شام سے وَقَالَتْ هِئتَ منقول ہے ھا کے کسرہ اور تا کے فتحہ کے ساتھ؛ ابو جعفر نے کہا: هیتَ لَكَ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا کے فتحہ کیساتھ کیونکہ یہ ایک آواز ہے جس طرح مۃ اور صۃ وغیرہ ضروری ہے کہ یہ معرب نہ ہو۔ اور فتحہ خفیف حرکت ہے کیونکہ تا سے پہلے یا ہے جیسے این اور کیف اور جس نے تا کو کسرہ دیا اس نے اس وجہ سے اس کو کسرہ دیا کیونکہ اصل کسرہ ہی ہے کیونکہ ساکن کو جب حرکت دی جائے تو کسرہ کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے۔ اور جس نے ضمہ دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غایت کا معنی پایا جاتا ہے؛ یعنی اس (عورت) نے کہا: تیرے لیے میری پکار۔ جب اضافت کو حذف کیا گیا تو اس کو مبنی بر ضمہ پڑھا گیا ہے، جیسے حیث اور بعد وغیرہ۔ اس کے بارے میں اہل مدینہ کی قرأت کے دو قول ہیں: ایک التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ فعل ہو هَاءَ یَهِیءُ جیسے جاء یجیء پس هِئْتُ کی صورت میں معنی ہوگا حسنت هیئتك یعنی تیری ہیئت عمدہ ہے اور لكَ الگ کلام ہوگا جس طرح آپ کہتے ہیں! لكَ أعنی اور جس نے ہمزہ اور تا کا ضمہ پڑھا تو اس صورت میں یہ فعل ہوگا تهیات لك کے معنی میں ہوگا۔ اسی طرح جس نے هِئْتُ لَكَ پڑھا۔ اور ابو عمرو نے اس قراءت کا انکار کیا ہے۔ ابوعبیدہ۔ معمر بن المثنی نے کہا: ابو عمرو سے اس آدمی کی قرأت کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ھا کے کسرہ اور تا کے ضمہ کے ساتھ اس کو مہموز پڑھا تو ابو عمرو نے کہا: باطل ہے۔ اس نے اس کو تهیات سے بنایا ہے! جا پورے عرب سے تعرض کر یہاں تک کہ یمن تک پہنچ جا کیا تو کسی ایک آدمی کو بھی پہچان لے گا جو یوں کہے؟ کسائی نے بھی کہا: هِئْتُ عربوں سے حکایت نہیں کیا گیا۔ عکرمہ نے کہا: هِئْتُ لَكَ یعنی تهیات لك و تزینت و تحسنت، اور یہ ناپسندیدہ قرأت ہے، کیونکہ یہ عربی میں سنی ہی نہیں گئی۔ نحاس نے کہا: یہ بصریوں کے نزدیک عمدہ ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: هَاءَ الرجل یَهاء ویَهِیء ھیاۃً پس ھاء یهیء، جاء یجیء کی طرح ہے اور هِئْتُ جئت کی طرح ہے۔ اور هیت میں ھا کا کسرہ ایسے لوگوں کی قرأت ہے جو ھا کے فتحہ پر اس کے کسرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عمدہ ترین قرأت هَیتَ لك ھا اور تا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ طرفہ نے کہا:

لیس قومی بالأبعدین إذا ما　　قال داعٍ من العشیرۃ هَیتَ(2)

اس شعر میں طرفہ نے هیت ھا اور تا کے فتحہ کیساتھ ہی پڑھا ہے۔

شاعر نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 216　　2۔ ایضاً

أَبلغْ أمير المؤمنينَ أخا العراقِ إذا أَتيتَا
إنّ العراقَ وأهلَهُ سِلْمٌ إليك فَهَيْتَ هَيْتَا (1)

اس شعر میں بھی ھَیْتَ ہی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا: ھیت یہ سریانی زبان کا کلمہ ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں۔ سدی نے کہا قبطی زبان میں اس کا معنی ھلم لك ہے۔ ابو عبید نے کہا: کسائی کہا کرتا تھا: یہ اہل حوران کی لغت ہے۔ جو اہل حجاز میں آ گئی اس کا معنی تعال ہے۔ ابو عبید نے کہا: حوران کے ایک بوڑھے عالم سے میں نے پوچھا تو اس نے ذکر کیا کہ یہ ان کی لغت ہے۔ یہ عکرمہ نے بھی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ عربی لغت ہے اس کے ذریعے وہ اپنی طرف بلاتے ہیں اور یہ اشیاء پر آنے اور ابھارنے کا کلمہ ہے۔ جوہری نے کہا: جب کوئی آدمی چیخے اور کسی کو بلائے تو اس وقت ھَوَّتَ بہ اور ھَیَّتَ بہ کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا:

قد رَابَنِي أَنَّ الكَرِيَّ أَسْكَتَا لو كان مَعْنِيا بها لَهَيَّتَا

جوہری نے ھیت کے ثبوت پر یہ شعر پڑھا جس میں لھیتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ وہ چیخا، دوسرے نے کہا:

يَحْدُو بها كلُّ فتىً هَيَّاتِ

اس مصرعہ میں بھی ھیات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور جس طرف تو نے مجھے بلایا ہے اس سے اللہ کی امان طلب کرتا ہوں۔ یہ مصدر ہے یعنی أعوذ باللہ معاذاً فعل کو حذف کر دیا گیا ہے اور فعل محذوف کے سبب مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: مررتُ بزيدٍ مرورَ عمروٍ یعنی مروری بعمرو۔ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ یعنی اس (عورت) کا شوہر یعنی وہ میرا سردار ہے اس نے میری تکریم کی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کروں گا۔ یہ سدی، ابن اسحاق اور مجاہد کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک اللہ میرا رب ہے اس نے اپنی مہربانی سے مجھے والی بنایا، پس میں اس کام کا ارتکاب نہیں کروں گا جس کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ حدیث میں ہے (2) کہ اس نے آپ کو کہا: اے یوسف! تیرے چہرے کی صورت کتنی خوبصورت ہے! آپ نے جواب دیا: رحم میں میرے پروردگار نے میری تصویر بنائی، اس نے کہا: تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا: میری قبر میں سب سے پہلے مجھ سے جدا ہوں گے۔ اس نے کہا: اے یوسف! تیری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں! آپ نے جواب دیا ان کے ساتھ میں اپنے پروردگار کو دیکھوں گا۔ اس نے کہا: اے یوسف! اپنی نگاہ کو اٹھاؤ اور میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ آپ نے جواب دیا: میں اپنی آخرت میں اندھا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں تیرے قریب ہوتی ہوں اور تو مجھ سے دور ہوتا ہے۔ آپ نے کہا: میں اس طریقے سے اپنے پروردگار کا قرب چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: اے یوسف! میں نے تیری خاطر علیحدہ کمرہ بنا دیا ہے پس میرے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ آپ نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 212 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 218

فرمایا: کمرہ مجھے میرے پروردگار سے نہیں چھپا سکتا۔ اس نے کہا: اے یوسف! ریشم کا بستر میں نے تیری خاطر بچھا دیا ہے۔ اٹھو اور میری حاجت پوری کرو۔ آپ نے فرمایا: تب تو جنت میں سے میرا حصہ جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے گفتگو کی اور آپ اس کا جواب دیتے رہے یہاں تک کے آپ اس کی طرف مائل ہوئے (٭)۔ بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف شہوت کے ساتھ مائل ہوتی رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبوت کی ہیبت ڈال دی بعد ازاں جس نے بھی آپ کو دیکھا اس کو اس ہیبت نے آپ کے حسن سے مشغول رکھا۔ آپ کے ھم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس عورت کا ھم نافرمانی تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لیکن جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھ لیا تو آپ نے قصد نہ کیا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ عصمت انبیاء لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ اس صورت میں کلام میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ هم بها ہے

ابوحاتم نے کہا: میں غریب القرآن ابوعبیدہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا جب میں وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا پر پہنچا تو ابو عبیدہ نے کہا: اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ گویا کہ وہ یہ مراد لے رہے تھے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لهم بها اگر آپ اپنے رب کی طرف سے (روشن) دلیل نہ دیکھ لیتے تو آپ بھی ضرور اس کا قصد کرتے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یعنی زلیخا نے نافرمانی کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اس پر مصر تھی اور حضرت یوسف مائل ہوئے مگر جس طرف آپ مائل ہوئے اس میں واقع نہیں ہوئے لہٰذا دونوں کے ارادے میں فرق ہے۔ یہ دونوں قول ہروی نے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ جمیل نے کہا:

هَمَمْتُ بِهَمٍ من بُثَيْنَةَ لو بَدَا　　شَفَيتُ غَلِيلاتِ الهَوَى من فُؤَادِيَا

دوسرا

هَمَمْتُ ولم أفعلْ وكِدتُ وليتني　　تركتُ على عثمان تبكي حلائله

یہ ساری نفس کی گفتگو ہے بغیر عزم کے۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اس کی زوجیت کا قصد کیا۔ ایک قول یہ ہے: هَمَّ بِهَا سے مراد ہے آپ نے اس کو مارنے اور اپنے آپ سے دور کرنے کا قصد کیا اور رب کی دلیل نے مارنے سے روک لیا، کیونکہ اگر آپ اس کو مارتے تو یہ وہم پیدا ہو جاتا کہ آپ نے حرام کا قصد کیا اور اس نے اس سے روک دیا پس اس وجہ سے آپ نے اسے مارا۔ اور ایک قول یہ ہے: یوسف کا قصد بھی معصیت تھا اور وہ اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ اس قول کی طرف اکثر وعام مفسرین مائل ہوئے ہیں، جن میں سے قشیری ابونصر، ابن الانباری، نحاس اور ماوردی وغیرہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ نے سروال کا بندھن کھولا اور اس کے پاس

٭ روایت کے آخری الفاظ کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف: 24) پس برہان کے پائے جانے کی وجہ سے آپ کے ارادہ کا پایا جانا ممتنع ہے۔

خاتن کے بیٹھنے کی طرح بیٹھے(1)۔ آپ سے ہی روایت ہے: وہ (زلیخا) اپنی گدیوں پر چت لیٹی اور آپ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھے اور آپ نے اپنے کپڑے اتارے، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے اپنی سروال کا بندھن کھولا(2)۔ مجاہد نے کہا: آپ نے سروال کو کھولا یہاں تک کہ آپ الیتین تک پہنچ گئے اور اس کے پاس اس طرح بیٹھے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پاس بیٹھتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اور جب آپ نے کہا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (یوسف:52) یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ جان لے کہ میں نے چھپ کر خیانت نہیں کی۔ تو جبریل نے آپ کو کہا: اور نہ ہی اس وقت جب آپ نے قصد کیا تھا اے یوسف علیہ السلام؟ تو اسوقت آپ نے فرمایا: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (یوسف:53) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا۔ مفسرین نے کہا: اس حالت میں (غلط کاری سے) رک جانا اخلاص پر دلالت کرتا ہے اور ثواب کے حصول کے لیے بہت بڑا کام ہے (☆)۔

میں (قرطبی) نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو حضرت ذوالکفل کی تعریف کی ہے اس کا یہی سبب ہے جس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ص میں آئے گا۔ اس بنیاد پر ''لولا'' کا جواب محذوف ہے؛ یعنی اگر آپ نے اپنے رب کی روشن دلیل کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ آپ کر گزرتے جس کا آپ نے قصد کیا تھا۔ اور اسی کی طرح كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ (تکاثر) ہے اور اس کا جواب لتروا فسوا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اسلاف کی ایک جماعت سے مروی ہے؛ انہوں نے کہا: اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے لیے مثال بن جائیں تا کہ وہ دیکھیں کہ ان کی توبہ کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کی معافی اور عفو و درگزر ہے جس طرح اس آدمی کی توبہ کا انجام معافی ہوا جو ان سے بہتر ہے (یعنی حضرت یوسف کی توبہ) اور گناہ کے قرب نے ان کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ ساری صورتحال اس صورت میں ہوگی جس طرح اس گروہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد یہاں تک پہنچ گیا کہ آپ زلیخا کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اور ازار بند کو کھولنا شروع کر دیا اور وہ زلیخا ان کے لیے چت لیٹ گئی اس کو طبری نے بیان کیا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا قصد کیا۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کتاب کی تاویل کو زیادہ جانتے ہیں، اسی طرح انبیاء کی بہت زیادہ تعظیم کرنے والے ہیں اور بغیر علم کے ان کے بارے میں گفتگو کرنے والے نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معاصی کو اس لیے ذکر نہیں کیا کہ ان کے ذریعے ان پر عار نہ لگے بلکہ ان کا ذکر اس لیے کیا تا کہ تم توبہ سے مایوس نہ ہو۔ غزنوی نے کہا: انبیاء علیہ السلام کی لغزش میں کئی حکمتیں ہیں، مثلاً خوف کی زیادتی، شرمندگی کی وجہ سے حیاء کی شدت، عجب عمل سے خالی ہو جانا، امید کے بعد عفو و درگزر کی نعمت سے لطف اندوز ہونا اور ان کا لغزش والے لوگوں کی امیدوں کا امام ہونا وغیرہ۔ ابو نصر قشیری نے کہا: ایک قوم نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے قصد کا ظہور ہوا اور ان کا یہ قصد طبعی تھا اور اس میں وہ فعل کرنے کا عزم مصمم نہیں تھا۔ اور جو قصد اس قبیل سے ہو اس کی وجہ سے بندے پر کوئی سزا نہیں ہوتی، جس طرح بعض اوقات ایک روزہ دار کے دل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 219 2۔ ایضاً، جلد 12، صفحہ 220 ☆ یہ سب روایات قرآن حکیم کی صریح نص کے خلاف ہیں۔

میں ٹھنڈا پانی پینے اور لذیذ کھانا کھانے کی سوچ پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اس نے نہ کھایا، نہ پیا اور نہ ہی کھانے پینے کا عزم مصمم کیا تو دل میں پیدا ہونے والے اس کلام کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اب رب کی روشن دلیل نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس قصد سے پھیر دیا تو وہ عزم مصمم نہ رہا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ عمدہ بات ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس آیت کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت یوسف کا نبی ہونا صحیح نہیں اور نہ ہی اس حوالے سے روایات ظاہر ہیں۔ اور اگر معاملہ یوں ہو تو پھر آپ ایک بندہ مومن ہیں آپ کو سلطنت اور علم عطا کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ قصد جو فقط کسی کام کرنے کا ارادہ ہے اور اس میں فعل کا وقوع نہیں اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خطا کا دل کے اندر ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اور اگر ہم اس وقت آپ کو نبی فرض کریں تو پھر میرے نزدیک سوائے اس قصد کے جو صرف دل کے اندر کھٹکتا ہے کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔ اس صورت میں جو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنا ازار بند کھولا وغیرہ یہ صحیح نہ ہوگا، کیونکہ نبوت کے ساتھ تو عصمت (لازمی) ہوتی ہے۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ کو کہا گیا: تکون فی دیوان الانبیاء و تفعل فعل السفھاء تو اس کا معنی اس واقعے کے بعد انبیاء میں شمار ہونا ہوگا۔

میں (قرطبی) نے کہا: انہوں نے اس تفصیل میں سے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نبی تھے جس طرح ہم نے ذکر کیا اور یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور آپ نبی تھے تو پھر قصد سے مراد وہ ہوگا جو دل میں کھٹکتا ہے اور سینے میں ثابت نہیں ہوتا؛ اور یہی وہ چیز ہے جس پر مواخذے کو اللہ نے مخلوق سے اٹھا لیا ہے (یعنی وسوسہ) کیونکہ اس کو انسان دور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (یوسف: 53) اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے۔ لیکن معنی یہ ہے کہ اس قصد سے میرا نفس بری نہیں یا پھر آپ کا یہ قول تواضع اور اعتراف عجز کے طور پر ہوگا کیونکہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاک کیا آپ کا نفس اس کی مخالفت کر رہا تھا؛ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بلوغت کے وقت آپ کے حال کی خبر دی اور ارشاد فرمایا: وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا جس طرح کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی خبر سچی، اس کا وصف صحیح اور حق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے زنا اور اس کے مقدمات کی حرمت، سردار، پڑوسی اور اجنبی کے ساتھ خیانت کی حرمت وغیرہ میں سے جو کچھ سکھایا آپ نے اس پر عمل کیا۔ اور آپ نے عزیز مصر کی بیوی سے اعراض برتا۔ اور اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس سے پیٹھ پھیر لی اور اس سے بھاگے یہ ایسی حکمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص کیا اور حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے مقتضیٰ پر آپ کا عمل تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فرشتوں نے عرض کیا: اے پروردگار! یہ تیرا بندہ ہے جو برائی کرنا چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس کی نگرانی کرو اگر اس نے برائی کی تو اس کی مثل اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو اور اگر اس نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کے حق میں نیکی لکھ دو پس اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

نے صرف میری خاطر برائی کو چھوڑ دیا''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کی طرف سے خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جب میرا بندہ کوئی برائی کرنے کا قصد کرتا ہے اور پھر کرتا نہیں تو میں اس کی نیکی لکھ دیتا ہوں''۔ پس اگر بندہ برائی کا قصد کرے تو اس کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے نہ کہ گناہ۔ صحیح میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کی دل میں پیدا ہونے والے وسوسے کا گناہ اٹھالیا ہے جب تک کہ بندہ اس پر عمل نہ کرے یا اس کے بارے میں گفتگو نہ کرے''۔ ابن عربی نے کہا: مدینہ السلام میں صوفیاء کے اماموں میں سے کوئی امام تھا جو ابن عطا کے نام سے معروف تھا؛ اس نے ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کی یہاں تک کہ اس نے آپ کی طرف منسوب ناپسندیدہ باتوں سے آپ کی برأت کا تذکرہ کیا؛ اس کی مجلس میں ایک آدمی اٹھا جو تمام لوگوں کے نزدیک مبغوض تھا اس نے کہا: اے شیخ: اے ہمارے سردار: تب تو یوسف نے قصد کیا البتہ اس نے پورا نہ کیا؟ امام نے کہا: ہاں! کیونکہ وہاں (رب کی بارگاہ) سے مہربانی تھی۔ عالم اور معلم دونوں کی مٹھاس کو دیکھو، سوال کرنے والے کے بارے میں ایک عام آدمی کی ذہانت اور عالم نے جو جواب دیا اس کے اختصار اور مکمل ہونے کو دیکھو؛ اسی وجہ سے علماء صوفیہ نے کہا: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا کے ارشاد کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و علم غلبہ شہوت کو جدا کرنے کے لیے دیا تا کہ یہ ان کی عصمت کا سبب اور ذریعہ بن جائے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب اللہ نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کی اس کی وجہ سے ان کی عصمت و برأت پختہ ہوگئی تو جو مصعب بن عثمان نے کہا ہے وہ صحیح نہ ہوا۔ مصعب نے کہا: سلیمان بن یسار لوگوں میں خوبصورت ترین آدمی تھا۔ ایک عورت اس کی مشتاق ہوگئی اور اس عورت نے اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا مگر وہ رک گیا اور اسے نصیحت کی اس عورت نے کہا: اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیری مشہوری کروں گی تو وہ نکلا اور اس نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔ تو اس نے خواب میں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا: آپ یوسف ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں وہ یوسف ہوں جس نے قصد کیا تھا۔ اور تو سلیمان ہے جس نے قصد ہی نہ کیا؟ یہ واقعہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ولایت کا درجہ نبوت کے درجے سے بلند ہو حالانکہ یہ محال ہے۔ اگر ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کرلیں کہ وہ نبی نہیں تھے تو آپ کا درجہ بھی ولایت ہوا۔ پھر تو آپ کو بھی اسی کی طرح محفوظ ہونا چاہیے؛ اور اگر سلیمان پر دروازے بند کر دیے جاتے اور لمبی دیر تک گفتگو اور خطاب کے ذریعے اور کلام و جواب کے ذریعے متوجہ کیا جاتا تو اس پر بھی فتنہ اور بہت بڑے ابتلاء کا اندیشہ ضرور تھا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ، اَنْ محل رفع میں ہے یعنی لولا رویة برھان ربه اگر اپنے رب کی دلیل کی رؤیت نہ ہوتی۔ اور سامع کو معلوم ہونے کی وجہ سے جواب محذوف ہے یعنی لکان ما کان پھر ہوتا جو کچھ بھی ہوتا۔ یہ دلیل قرآن میں مذکور نہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زلیخا گھر کے کونے میں پڑے یاقوت اور جواہرات سے ڈھکے بت کی طرف گئی اور اسے کپڑے کے ساتھ ڈھانپ دیا تو آپ نے کہا: تو کیا کر رہی ہے؟ اس نے کہا: مجھے اپنے اس معبود سے حیاء آتی ہے کہ یہ مجھے اس صورت میں دیکھ لے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ میں اللہ سے حیاء کروں۔ اس سلسلہ میں کی گئی گفتگو میں یہ عمدہ ترین بات ہے کیونکہ اس میں دلیل کا قائم کرنا ہے۔ ایک

قول یہ ہے: آپ نے گھر کی چھت میں وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) لکھا ہوا دیکھا۔ (اور تم زنا کے قریب مت جاؤ یہ فحش کام ہے اور برا راستہ ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس پر۔ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ (الانفطار) لکھا ہوا تھا۔ (اور بے شک تم پر نگران ہیں) بعض لوگوں نے کہا: آپ نے اللہ تعالیٰ کا عہد اور میثاق یاد کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: ندا دی گئی کہ اے یوسف: آپ کا نام انبیاء علیہم السلام کے دیوان میں لکھا ہوا ہے اور آپ بے وقوفوں کا سا عمل کر رہے ہو؟ ایک قول یہ ہے: آپ نے دیوار پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ان کی انگلیوں کو پکڑ کر دھمکی دے رہے تھے تو آپ رک گئے اور آپ کی انگلیوں سے آپ کی شہوت نکل گئی۔ یہ قتادہ، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، ابو صالح اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعمش نے مجاہد سے روایت کیا: آپ نے اپنی سروال اتاری تو حضرت یعقوب علیہ السلام مثالی صورت میں آپ کے سامنے آئے اور فرمایا: اے یوسف! علیہ السلام تو آپ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سفیان نے ابو حصین سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے سامنے مثالی صورت میں آئے اور آپ کے سینے پر ہاتھ مارا تو آپ کی شہوت آپ کی انگلیوں سے نکل گئی۔ مجاہد نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہر ایک کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے ان کے صرف دو بیٹے پیدا ہوئے اور اس شہوت کی وجہ سے آپکی اولاد کم ہوئی۔ اس کے علاوہ اقوال بھی ہیں (☆)۔ المختصر: وہ برہان اللہ کی آیات میں ایک آیت تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دکھائی یہاں تک کہ آپ کا ایمان مضبوط ہوا اور نافرمانی سے رک گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ كَذٰلِكَ میں کاف ضمیر محل رفع میں بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی، تقدیر عبارت ہوگی: البراهين كذلك اور یہ مصدر محذوف کی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی أريناه البراهين رؤية كذلك، السُّوْٓءَ سے مراد شہوت ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد مباشرت ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد بری تعریف ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد زنا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد اپنے صاحب سے خیانت کرنا ہے اور الْفَحْشَآءَ سے مراد فاحشہ عورت پر سوار ہونا ہے۔ ایک قول یہ ہے: السُّوْٓءَ سے مراد عزیز مصر کی سزا ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے الْمُخْلِصِيْنَ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی اطاعت کو خالص کیا، جبکہ قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے چنا ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہ دونوں صفات موجود تھیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مخلص تھے اور اللہ تعالیٰ کی رسالت کے لیے چنے گئے تھے۔

**وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝**

☆ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ ضیاء القرآن میں یہاں امام رازی، ابو حیان اور دوسرے محققین کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں، یہ اقوال آپس میں اتنے متضاد ہیں اور ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں کہ انہیں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا نیز یہ کسی مستند روایت سے ان اسلاف سے ثابت نہیں۔

''اور دونوں دوڑ پڑے دروازے کی طرف اور اس عورت نے پھاڑ ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور (اتفاق ایسا ہوا کہ) ان دونوں نے کھڑا پایا اس کے خاوند کو دروازے کے پاس۔ جھٹ بول اٹھی: (میرے سرتاج! بتائیے) کیا سزا ہے اس کی جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا بجز اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے یا (اسے) دردناک عذاب دیا جائے''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ کے بارے میں علماء نے کہا: یہ قرآن معجز کے ان اختصارات میں سے ہے جن میں بہت سے معانی جمع ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھا تو اس عورت سے بھاگے تو دونوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی وہ اس لیے دوڑی تا کہ آپ کو اپنی طرف واپس لوٹا لے اور آپ اس لیے تیز دوڑے کہ اس سے بھاگ جائیں تو اس نے آپ کے نکلنے سے پہلے آپ کو پا لیا۔ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ اور اس عورت نے پیچھے سے آپ کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ مِنْ دُبُرٍ، مراد من خلفه، ہے۔ اس نے قمیص کو اوپر سے پکڑا (1) تو قمیص گردن کے پاس سے پھٹی اور وہ پھٹن قمیص کے نیچے تک پہنچ گئی الاستباق سے مراد کسی چیز کی طرف سبقت کو طلب کرنا ہے، اسی سے سباق ہے اور قد سے مراد کاٹنا ہے اور اکثر طور پر لمبائی میں کاٹنے کے لیے یہ استعمال ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

تَقُدُّ السَّلُوقِيَّ الْمُضَاعَفَ نَسْجُهٗ ۔۔۔ وتُوقِدُ بِالصُّفَّاحِ نَارَ الْحُبَاحِبِ

محل استشہاد تَقُدُّ ہے یعنی قَدَّ يَقُدُّ سے جس کا معنی ہے کاٹنا۔

جبکہ القط طاء کے ساتھ چوڑائی میں کاٹنے کیلئے استعمال ہوتا ہے مفضل بن حرب نے کہا: میں نے ایک مصحف میں فَلَمَّا رَأَى قَمِيْصَهٗ عُطَّ مِنْ دُبُرٍ پڑھا ہے عط کا معنی ہے پھٹنا۔ یعقوب نے کہا: القط سے مراد صحیح جلد اور صحیح کپڑے میں پھٹن ہے۔

اسْتَبَقَا میں الف اور اس کے بعد لام کے ساکن ہونے کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا جس طرح تثنیہ کی صورت میں جاءنی عبد اللہ کہا جاتا ہے۔ اور عربوں میں جاءنی عبد اللہ بھی کہتے ہیں یعنی بغیر ہمزہ کے الف کو ثابت کر کے دونوں ساکنوں کو جمع کرتے ہیں کیونکہ دوسرا مدغم ہے جبکہ پہلا حرف مد و لین ہے۔ اور بعض ''عبد اللہ'' کہتے ہیں یعنی الف اور ہمزہ دونوں کو ثابت رکھ کے جس طرح وقف کی صورت میں کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ آیت میں قیاس اور اعتبار پر بھی دلیل ہے اسی طرح عرف و عادت پر عمل کرنے پر بھی دلیل ہے اس کی وجہ قمیص کے آگے اور پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے۔ اور یہ ایسا معاملہ ہے جو صرف مالکیوں کی کتابوں میں ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جب قمیص کو پیچھے سے کھینچا جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور جب سامنے سے کھینچی جائے تو اس طرف سے پھٹتی ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے۔ وَ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ یعنی ان دونوں نے عزیز مصر کو دروازے پر پایا اور سَیِّدَ سے مراد خاوند لیا گیا ہے۔ اور قبطی خاوند کو سید کہتے ہیں اور ألفاه، صادفه، وارطه، اور لاطته تمام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جب اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 235

(زلیخاء) نے اپنے خاوند کو دیکھا تو بہانہ بنانے کے لیے اس نے اس کی توجہ مبذول کروانا چاہی اور کہنے لگی: قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اس کی کیا سزا ہے جو تیرے گھر والوں کے ساتھ زنا کرنا چاہے؟ سُوْٓءًا سے مراد زنا ہے۔ اِلَّآ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ضرب کی صفت وجمع بیان کی جاتی ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں یضرب ضربا وجیعا اور مَا جَزَآءُ مبتدا ہے اور اَنْ یُّسْجَنَ اس کی خبر ہے۔ جب کہ اَوْ عَذَابٌ، اَنْ یُّسْجَنَ پر معطوف ہے کیونکہ اَنْ یُّسْجَنَ کا معنی الا السجن ہے اس کو عَذَابٌ اَلِیْمٌ پڑھنا بھی جائز ہوگا اس صورت میں عبارت ہوگی او یعذب عذابا الیما یہ کسائی کا قول ہے۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَ اسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ﴿۲۹﴾

''آپ نے (جوابا) فرمایا: (میں نے نہیں بلکہ) اس نے بہلانا چاہا ہے مجھے کہ مطلب براری کرے اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا (کہ دیکھو) اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے سچ کہا، وہ جھوٹوں میں سے ہے اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہوئی ہو پیچھے سے تو پھر اس نے جھوٹ کہا اور یوسف سچوں میں سے ہے، پس جب عزیز نے دیکھا پیراہن یوسف کو کہ پھٹا ہوا ہے پیچھے سے تو بول اٹھا: یہ سب تم عورتوں کا فریب ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے۔ اے یوسف! (پاکباز) اس بات کو جانے دو اور (اے عورت) اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی قصورواروں میں سے ہے''۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا: جب اس عورت نے اپنے آپ کی برأت ظاہر کردی تو پتہ چلا وہ محبت میں سچی نہ تھی کیونکہ محب کی شان تو محبوب کو ترجیح دینا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے بہتان اور جھوٹ کے مقابلے میں سچ بیان کیا۔ نوف شامی وغیرہ نے کہا ہے: گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس واقعہ سے پردہ نہ اٹھایا اور جب اس نے آپ سے بغاوت کی تو آپ کو غصہ آیا اور آپ نے سچ کہہ دیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا کیونکہ جب ان دونوں کے قول میں تعارض واقع ہوا تو بادشاہ کو گواہ کی ضرورت پڑی تاکہ وہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کر سکے تو اس عورت کے گھر کے آدمی نے گواہی دی یعنی اس کے گھر کے آدمی نے فیصلہ کر دیا، کیونکہ یہ اس کی طرف سے فیصلہ تھا نہ کہ شہادت۔ اس گواہ کے بارے میں چار مختلف اقوال ہیں۔ پہلا: وہ بچہ تھا(1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

گود میں اس نے کلام کیا۔ سہیلی نے کہا: یہ صحیح ہے۔ اس حدیث طیبہ کی وجہ سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لم یتکلم فی المهد الا ثلاثة(1) گود میں سوائے تین بچوں کے اور کسی نے کلام نہیں کیا۔ ان میں آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر بھی فرمایا۔ ابونصر قشیری نے کہا: اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گھر میں گود میں ایک بچہ تھا اور وہ زلیخا کی خالہ کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: "بچپنے میں چار نے کلام کیا" (2)۔ اور آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی ایک قول ہے۔ دوسرا: کہ گواہ اصل میں قمیص کا پھٹنا تھا۔ اس کو ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے۔ اور یہ لغوی اعتبار سے صحیح مجاز ہے۔ کیونکہ زبان حال زبان مقال کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتی ہے اور بعض اوقات عرب کلام کو جمادات کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کی صفات کی خود اسی کے بارے میں خبر دیتے ہیں اور یہ ان کے اشعار اور کلام میں بہت زیادہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی کا بڑا خوبصورت قول ہے: دیوار نے کیل کو کہا کہ تو نے مجھے کیوں چیرا؟ اس نے اسے کہا: اس سے پوچھ اس نے مجھے کیوں گاڑا؟ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا اس کے قمیص ہونے کو باطل قرار دے دیتا ہے۔

تیسرا: وہ اللہ کی مخلوق میں سے مخلوق ہے نہ تو انسان، نہ ہی جن۔ یہ بھی مجاہد کا قول ہے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مِّنْ اَهْلِهَا رد کر دیتا ہے۔

چوتھا: وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا۔ وزیر اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لیتا تھا اور وہ عورت کے اہل میں سے تھا اور رہتا اس کے خاوند کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا: میں نے دروازے کے پیچھے سے کھینچنے، خود کر ترجیح دینے اور قمیص کے پھٹنے کے بارے میں سنا یہ معلوم نہیں کہ تم میں سے کون آگے تھا؟ پس اگر قمیص کی پھٹن اس (یوسف) (3) کے آگے کی طرف سے ہے تو تو سچی ہے اور وہ اس کے پیچھے سے ہے تو پھر وہ سچا ہے۔ پھر ان سب نے قمیص کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ حضرت حسن بصری، عکرمہ، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ سدی نے کہا: یہ اس کے چچا کا بیٹا تھا اور اس نے یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس باب میں یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسرائیل عن سماک عن عکرمہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ داڑھی والا آدمی تھا۔ سفیان عن جابر عن ابن ابی ملیکہ عن ابن عباس کہا کہ آپ نے فرمایا: وہ بادشاہ کے خاص آدمیوں میں سے تھا۔ عکرمہ نے کہا: وہ بچہ نہیں تھا البتہ ایک حکیم آدمی تھا۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے: وہ ایک آدمی تھا۔ ابوجعفر نحاس نے کہا کہ وہ عقلمند اور حکیم آدمی تھا بادشاہ نے اس سے مشورہ لیا تو اس نے یہ دلیل پیش کی؟ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کی شہادت تو عادت کو بطور دلیل پیش کرنے سے مستغنی کر دیتی کیونکہ بچے کا کلام کرنا تو معجزہ و کرامت ہے اور یہ عادت سے استدلال کرنے کی نسبت زیادہ واضح تھا۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ تکلم أربعة وهم صغار، منهم صاحب یوسف، (4) کے مخالف بھی نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 489
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084
3۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 233
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1084

کیونکہ اس کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ صغیر تھا، بوڑھا نہ تھا۔ اور اس سلسلے میں ایک اور دلیل بھی ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے اور یہ روایت بھی متواتر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ بچہ نہیں تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن جبیر، ہلال بن یساف اور ضحاک سے روایت ہے کہ وہ بچہ تھا گود میں۔ اگر وہ بچہ ہوتا تو اس کا صرف کلام کر دینا ہی دلیل ہوتا اور قمیص کے ذریعے استدلال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور اس صورت میں یہ خلاف عادت اور معجزہ کی ایک قسم بنتی۔ واللہ اعلم، ان شاء اللہ سورۂ ''البروج'' میں ان بچوں کا بیان آئے گا جنہوں نے پنگھوڑے میں گفتگو کی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب ہم یہ بات کہیں کہ وہ شاید چھوٹا بچہ تھا تو اس میں نشانیوں پر عمل کرنے کی کوئی دیل نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ بڑا آدمی ہو تو پھر لقطہ اور بہت سے مقامات پر علامت کے ذریعے کیے جانے والے فیصلہ کا حجت ہونا صحیح ہو جائے گا۔

حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے چوروں کے بارے میں کہا: جب ان کے پاس سامان ہو اور بہت سارے لوگ آ کر اس کا دعویٰ کر دیں جب کہ ان کے پاس کوئی بینہ نہ ہو تو سلطان اس سلسلہ میں غور وفکر اور تدبر کرے گا اور اگر ان کے علاوہ دیگر لوگ نہ آئیں تو وہ سامان وہ ان کے سپرد کر دے گا۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر گھر کے سامان میں مرد اور عورت کا اختلاف ہو گیا تو وہ مال جو مردوں کا ہوسکتا ہے وہ مرد کا ہوگا اور جو عورتوں کا ہوسکتا ہے وہ عورتوں کا ہوگا اور جو مرد اور عورت دونوں کا ہو سکتا ہے وہ مرد کا ہوگا۔ شریح قاضی اور ایاس بن معاویہ فیصلہ کے سلسلہ میں علامات پر ہی عمل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں دلیل یہی آیت ہے۔ واللہ اعلم۔

**اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ**، كَانَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ اور نحوی اعتبار سے اس میں اشکال ہیں کیونکہ حرف شرط ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں لیکن یہ قانون كَانَ میں جاری نہیں ہوتا۔ مبرد محمد بن یزید نے کہا: یہ کان میں پائی جانے والی قوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعے تمام افعال کو تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: اِنْ كَانَ کا معنی ان یکن ہے یعنی ان یعلم اگر پتہ چل جائے اور علم کا وقوع ہوا نہیں (کہ اسے ماضی کہیں) تو اسی طرح کون (کا وقوع بھی نہیں ہوا) کیونکہ یہ علم کی طرف لے جاتا ہے۔

**قُدَّ مِنْ قُبُلٍ** یہ فعل ماضی کے ذریعے كَانَ کے بارے میں خبر ہے۔

جس طرح زہیر نے کہا:

وكان طَوَى كَشْحًا على مُسْتَكِنَّةٍ فلا هو أبداها ولم يَتَقدَّمِ

اس شعر میں فلا هو أبداها ولم يَتَقدَّمِ ماضی ہے جو کہ کان کی خبر ہے۔

یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق نے مِنْ قُبُلٍ قاف، با اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح دُبُرٍ۔ زجاج نے کہا: ان دونوں کو غایت بنایا جائے گا جس طرح قبل اور بعد۔ گویا کہ اس نے کہا: من قبله و من دبره (1)۔ اور جب مضاف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 236

الیہ کو حذف کر دیا گیا جو مراد تھا تو مضاف خود اپنی غایت بن گیا اس کے بعد کہ مضاف الیہ اس کی غایت تھی۔ اور غیر مضاف کے ساتھ مشابہت دیتے ہوئے مِنْ قُبُلِ اور مِنْ دُبُرِ یعنی لام اور را کے فتحہ کا ساتھ بھی جائز ہے۔ اور محبوب نے ابوعمرو سے مِنْ قُبْلٍ اور مِنْ دُبْرٍ بھی روایت کیا ہے، یعنی مخفف اور مجرور۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر نے زلیخا کو اس کے اس قول مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا کے وقت کہا۔ ایک قول کے مطابق: گواہ نے اسے کہا۔ كَیْد کا معنی مکر اور بہانہ ہے۔ سورۃ ''الانفال'' میں یہ گزر چکا ہے۔ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ اس نے عظیم کہا ان کے فتنہ اور کسی مشکل سے نکلنے کے لیے ان کے حیلہ کے بڑے ہونے کی وجہ سے۔ مقاتل نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے بڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ۝ (النساء) اور اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ۔

یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کر اور اسے چھپاؤ، پھر زلیخا کی طرف اس نے توجہ کی اور کہا: اور تو وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ اپنے گناہ کی معافی مانگ یعنی اپنے شوہر سے اپنی غلطی کی معافی مانگ تاکہ وہ مجھے سزا نہ دے۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ اس نے من الخاطئات نہیں کہا کیونکہ اس نے مذکر اور مونث دونوں کے متعلق خبر دینے کا قصد کیا ہے اور مذکر کو اس نے غلبہ دیا ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا: من الناس الخاطئین یا من القوم الخاطئین جیسے انها كانت من قوم كافرين، وكانت من القانتين ایک قول یہ ہے: یوسف کو اَعْرِضْ اور زلیخا کو اسْتَغْفِرِیْ کہنے والا اس کا شوہر تھا۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک: کہ وہ غیرت مند نہیں تھا، اس وجہ سے وہ ساکن رہا اور مصریوں میں سے اکثر میں غیرت موجود نہیں ہے۔

دوسرا: کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی غیرت کو سلب کر لیا اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام پر مہربانی تھی یہاں تک کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا اور اس نے زلیخا کو معاف کر دیا۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَىِٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ۝

''اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی بہلاتی ہے اپنے (نوجوان) غلام کو تاکہ اس سے مطلب براری کرے، اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی محبت، ہم دیکھ رہی ہیں اسے کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ پس جب

زلیخا نے سنا ان کی مکارانہ باتوں کو تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور تیار کیں ان کے لیے مسندیں اور (جب وہ آ گئیں تو) دیدی ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری اور یوسف کو کہا کہ (ذرا) نکل (تو) آ ؤ ان کے سامنے۔ پس جب (یوسف آئے اور) انہوں نے اس کو دیکھا تو اس کی عظمت (حسن) کی قائل ہو گئیں اور (وارفتگی کے عالم میں) کاٹ بیٹھیں اپنے ہاتھوں کو اور کہہ اٹھیں: سبحان اللہ! یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ زلیخا (فاتحانہ انداز میں) بولی: یہ ہے وہ (پیکر رعنائی) جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں بخدا! میں نے اسے بہت بہلایا پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ نہ بجالایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں''۔

**وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ، نِسْوَةٌ** کو نون کے ضمہ کے ساتھ نُسوہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ اعمش، مفضل اور سلمی کی قرأت ہے اس کی جمع کثرت نساء ہے اس کو قالت نسوہ اور **قَالَ نِسْوَةٌ** دونوں طرح پڑھنا جائز ہے جیسے قالت الاعراب اور قال الاعراب یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اہل مصر میں یہ قصہ مشہور ہو گیا اور عورتوں نے گفتگو کی۔ ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کے ساقی کی بیوی تھی، اس کے نان بائی کی بیوی تھی، اس کے قیدی ساتھی کی بیوی تھی وغیرہ۔ ایک قول یہ ہے: حاجب کی بیوی تھی یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ **تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ** کلام عرب میں الفتی نوجوان کو کہتے ہیں جبکہ عورت فتاۃ کہلاتی ہے **قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا** ایک قول کے مطابق: **شَغَفَهَا** سے مراد ہے غلبہا جبکہ ایک قول یہ ہے: اس کی محبت اس کے اندر داخل ہو گئی (1)۔ مجاہد وغیرہ سے منقول ہے عمرو بن دینار نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اس کے دل کی تہہ میں محبت داخل ہو گئی۔ حسن بصری نے کہا الشغف دل کے باطن کو کہتے ہیں۔ سدی اور ابو عبید نے کہا: شغاف القلب سے مراد دل کا غلاف ہے اور اس سے مراد اس کی اوپر والی جلد ہے ایک قول کے مطابق: یہ دل کا درمیانی حصہ ہے۔ ان تمام اقوال کی روشنی میں معنی قریب قریب ہے۔ اور معنی یہ ہوگا: اس کی محبت اس کے شغاف (دل کے باطن) میں داخل ہو گئی پس وہ اس پر غالب آ گئی:

نابغہ نے کہا:

وقد حال هَمٌّ دون ذالك داخلٌ دخولَ الشِّغافِ تبتغيه الأصابعُ (2)

ایک قول یہ ہے: شغاف، بیماری ہے۔ اصمعی نے رجز کہنے والے کو کہا:

یتبعها وهي شَغافُ

ابو جعفر بن محمد بن محیصن اور حسن بصری نے اسے **شَعَفَهَا** عین غیر معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی محبت نے اس (زلیخاء) کے دل کو جلا دیا اور اس نے کہا: عمل پہلی قرأت پر ہے۔ جوہری نے کہا: و شعفه الحب احرق قلبه۔ ابو زید نے کہا: اس نے اس کو بیمار کر دیا، یعنی شغف کا معنی أمرض ہے جیسے کہا جاتا ہے: قد شغف بكذا فهو

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 236 2۔ ایضاً

مشغوف۔ حسن بصری نے قد شعفها پڑھا اور کہا: اس کا باطن محبت سے بھرپور تھا۔ نحاس نے کہا: اکثر اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر مذہب چلا گیا، کیونکہ شتان الجبال سے مراد ان کا بلند ترین حصہ ہے قد شغف بن الك شغفاغین کے سکون کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ جب اس کا شوق دلایا جائے۔ مگر ابو عبیدہ نے امری القیس کا شعر پڑھا:

ایقتلنی وقد شَعَفْتُ فؤادها كَمَا شَعَفَ المَهْنُوَّةَ الرَّجلُ والطَّالِي(1)

اس نے کہا: محبت کی سختی اور اس کے جوش کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

شعبی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: الشغف غین کے ساتھ کا معنی ہے محبت اور الشعف عین کے ساتھ کا معنی جنون ہے نحاس نے کہا: قَدْ شَغَفَهَا غین کے کسرہ کے ساتھ بھی اس کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ کلام عرب میں شغفها غین کے فتحہ کے بغیر معروف ہی نہیں۔ اسی طرح شَغَفَهَا، یعنی اس نے اس کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ جنون میں مبتلا ہو چکا تھا۔ سعید بن ابی عروبہ نے حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: الشغاف، سے مراد دل کا حجاب ہے(2)۔ اور الشعاف سے مراد دل کا سیاہ نشان ہے۔ پس اگر محبت شغاف تک پہنچ جاتی تو وہ مر جاتی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الشعاف، دل کے ساتھ ملی ہوئی اس جلد کو کہتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتی اور وہ سفید جلد ہوتی ہے۔ اس (یوسف) کی محبت زلیخاء کی جلد کے ساتھ یوں چمٹ گئی جس طرح جلد دل کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یعنی اس کام میں۔ قتادہ نے کہا: فَتٰىهَا سے مراد فتی زوجها ہے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک تو حضرت یوسف علیہ السلام غلاموں کے حکم میں تھے۔ اور ان کے بارے میں زلیخا کا حکم نافذ تھا۔ مقاتل نے عن ابی عثمان نہدی عن سلمان فارسی کہا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر کو ہبہ کیا تو اس نے پھر ان کو زلیخاء کو ہبہ کر دیا اور کہا: تو اس کو کیا کرے گی؟ تو اس نے کہا: میں اس کو بیٹا بناؤں گی۔ اس نے کہا: یہ تیرا ہے۔ اس نے اس کی پرورش کی حتیٰ کہ وہ جوان ہو گئے اور اس کے (زلیخاء) دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں (کوئی خاص بات نہ تھی) تو وہ بے پردہ ان کے سامنے آتی، بناؤ سنگھار کرتی اور بڑی نرمی سے انہیں بلاتی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ یعنی ان عورتوں کی زلیخاء کی غیبت کو اور اس کے حوالے سے ان کے مکر و فریب کو سنا۔ ایک قول یہ ہے: زلیخاء نے ان عورتوں کو اس محبت پر مطلع کیا اور اس راز پر امین بنایا تو انہوں نے اس کے راز کو ظاہر کر دیا تو اس کو "مکر" کہا گیا ہے۔ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ کلام میں حذف ہے یعنی أرسلت إليهن تدعوهن إلى وليمة لتوقعهن فيما وقعت فيه مجاہد نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: عزیز مصر کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ میں کھانا تیار کروں اور ان عورتوں کو دعوت دوں تو عزیز مصر نے اسے کہا: اس طرح کر لو، تو اس نے کھانا بنایا پھر ان کے لیے گھر کو مزین کیا اور ان کی طرف دعوت بھیجی کہ ان کے لیے کھانا تیار ہے اور تم میں سے جس جس عورت کو دعوت دی گئی ہے وہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 238 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 237

غیر حاضر نہ ہو۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ چالیس عورتیں تھیں اور ناپسندیدگی کے باوجود وہ آئیں ان کے بارے میں امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

حتى إذا جئنها قسرا ومهدت لهن أنضادا وكبابا

وہب بن منبہ نے کہا: وہ آئیں اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً یعنی اس نے ان کی جگہیں تیار کیں جن کے ساتھ وہ ٹیک لگاتیں گئیں۔ ابن جبیر نے کہا: ہر مجلس میں ایک جام تھا جس میں شہد، مالٹا، اور تیز چھری تھی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے مُتْكًا پڑھا ہے یعنی مخفف غیر مہموز اور قبطیوں کی لغت میں ''المتك'' مالٹے کو کہتے ہیں۔ اور مجاہد نے بھی اسی طرح اس کی تفسیر کی ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: المتكاء، متقل ہونے کی صورت میں اس کا معنی کھانا ہوگا جبکہ ''المتك'' مخفف ہونے کی صورت میں اس سے مراد مالٹا ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الإِثْمَ بِالصُّوَاعِ جِهَارًا وَتَرَى الْمُتْكَ بَيْنَنَا مُسْتَعَارًا

از دشنوہ کہتے ہیں: اس سے مراد لیموں کا کٹا ہوا درخت ہے۔ جوہری نے کہا: المتك سے مراد وہ ہے جس کو ختنہ کرنے والی باقی چھوڑتی ہے۔ اور المتك کی اصل گوشت کے ساتھ لپٹی ہوئی جھلی ہے۔ اور عورتوں میں سے المتكاء وہ ہے جس کا ختنہ نہ ہوا ہو فراء نے کہا: اہل بصرہ کے ثقہ لوگوں میں سے ایک شیخ نے مجھے بیان کیا ہے کہ ''المتك'' مخفف ہونے کی صورت میں گوشت میں لپٹی ہوئی جھلی ہے اور ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ یہ لیموں کا درخت ہے۔ اس کو اخفش نے بیان کیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد لیموں کا درخت اور شہد ہے جس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فَظِلْنَا بنعمةٍ واتَّكَأْنَا وشَرِبْنا الحلالَ من قُلِله

اس میں اتكانا سے مراد أكلنا ہے یعنی ہم نے کھایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اَعْتَدَتْ العتاد سے مشتق ہے۔

اور مُتَّكَاً کے بارے میں سب سے عمدہ بات وہ ہے جو علی بن ابی طلحہ (2) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد مجلس ہے۔ اور جہاں تک مفسرین کی ایک جماعت کا تعلق ہے جنہوں نے اس سے مراد کھانا لیا ہے تو یہ اس تقدیر پر درست ہوگا۔ طعام متكاء' جیسے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور اس حذف پر یہ آیت وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دلالت کرتی ہے کیونکہ عورتوں کا چھریوں سمیت آنا وہ کسی ایسے کھانے کے لیے ہی ہے جو چھریوں کے ساتھ کاٹا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اعراب القران'' میں یوں ہی کہا ہے جبکہ اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں انہوں نے کہا: معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے(3): المتكاء سے مراد کھانا ہے اور ایک قول یہ ہے ''المتكاء'' سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ کھاتے، پیتے یا گفتگو کرتے ہوئے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جائے، یہ اہل لغت کے یہاں معروف بات ہے اور اس کے حوالے سے صحیح روایات بھی ہیں۔ قتبی نے کہا کہ کہا جاتا ہے: اتكانا عند فلان یعنی أكلنا، متكاء کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 242 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 238 3۔ ایضاً

اصل موتکاً ہے اسی کی طرح ہیں مُتَّزن اور مُتَّعد، کیونکہ یہ وزنت، وعدت اور وکأت سے مشتق ہیں۔ اس کا باب اتکأ، یتکئ اتکاء آتا ہے۔ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا دونوں مفعول ہیں۔ کسائی اور فراء نے حکایت کیا ہے کہ سکین مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ فراء نے شعر پڑھا ہے:

فَعَيَّثَ فِي السَّنَامِ غَدَاةَ قُرٍّ بِسكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَاب

محل استشہاد بسكِّينٍ مُوَثَّقَةِ النِّصَاب ہے یہاں سکین مونث استعمال ہوتی ہے۔

جوہری نے کہا: اس میں غالب تذکیر ہے، اس نے کہا:

يرى ناصحا فيما بَدَا فإذا خَلَا فذالك سكِّيْنٌ على الحَلْق حَاذِقُ

جبکہ اس شعر میں سکین کی صفت حاذق استعمال ہوئی جس سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ مذکر ہے۔

اصمعی نے کہا: سکین میں صرف تذکیر ہی معروف ہے۔

وَ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ التقائے ساکنین کی وجہ سے تا مضموم ہوگا، کیونکہ جب بعد میں ضمہ ہو تو کسرہ ثقیل ہوتا ہے اور اصل میں تو تا مکسور ہوگا۔ ایک قول یہ ہے زلیخاء نے ان عورتوں کو کہا: تم نے پھلوں کو کاٹنا اور کھانا نہیں یہاں تک کہ میں تمہیں بتاؤں۔ پھر اس نے اپنے خادم کو کہا: جب میں تجھے کہوں کہ میرے لیے ایلاء کو بلاؤ تو یوسف کو بلانا۔ ایل بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام مٹی میں کام کرتے تھے اس لیے آپ نے اپنی کمر کسی ہوئی تھی اور کلائیوں سے کپڑا لپٹا ہوا تھا تو اس نے اپنے خادم کو کہا: میرے لیے ایل کو بلاؤ یعنی میرے لیے رب کو بلاؤ۔ عبرانی زبان میں ایل رب کو کہتے ہیں۔ عورتیں حیران ہوئیں اور انہوں نے کہا: وہ کیسے آئے گا؟ خادم اوپر چڑھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا۔ پس جب آپ نیچے اترے تو زلیخاء نے عورتوں کو کہا: جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے کاٹو۔ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ یہاں تک کہ چھریاں ہڈیوں تک پہنچ گئیں۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ ان کے سامنے تب گئے جب زلیخاء نے ان کا بناؤ سنگھار کیا، تو اچانک آپ ان کے سامنے گئے تو وہ مدہوش ہوگئیں اور آپ کے چہرے کے حسن اور اس کی زیب و زینت کے سبب حیران ہوگئیں تو انہوں نے ہاتھوں کو کاٹنا شروع کر دیا اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ مالٹے کاٹ رہی ہیں۔ اَكْبَرْنَهٗ کے معنی میں اختلاف ہے۔ جویبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہوں نے آپ کو عظیم خیال کیا۔ انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ وحشت کی وجہ سے ان کی منی اور مذی خارج ہوگئی۔ شاعر نے کہا:

إذا ما رأين الفحلَ من فوق قارةٍ صَهَلْنَ وأكْبَرْنَ المنيَّ المدفقا

شعر میں اکبرن سے مراد وحشت وخوف کی وجہ سے منی کا خارج ہونا ہے۔

ابن سمعان نے اپنے اصحاب سے روایت کرتے ہوئے کہا: انہوں نے کہا کہ عشق کی وجہ سے ان کی مذی نکل گئی۔ وہب نے کہا: وہ آپ کے عشق میں یوں مبتلا ہوئیں کہ ان میں سے دس عورتیں دہشت، حیرت اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سبب

وجد کی وجہ سے مرگئیں۔ ایک قول یہ ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ دہشت کے سبب ان کو حیض آ گیا (1)۔ یہ قتادہ، مقاتل اور سدی کا قول ہے۔ شاعر نے کہا (2):

نأتي النساءَ على أطهارهنّ　　ولا نأتي النّساءَ إذا أكبرنَ إكبارا

ہم عورتوں کے پاس ان کے طہر میں آتے ہیں اور جب انہیں حیض آ جائے تو ہم ان کے پاس نہیں آتے۔ اکبرن سے مراد حیض کا آنا لیا گیا ہے۔

ابو عبیدہ اور دیگر نے اس کا انکار کیا ہے انہوں نے کہا: کلام عرب میں یہ معنی نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ کو بہت بڑا خیال کرنے کی شدت کے سبب ان کو حیض آ گیا ہو، کیونکہ بعض اوقات عورت پر فزع وخوف کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ حمل کو گرا دیتی ہے یا اسے حیض آ جاتا ہے۔ زجاج نے کہا: اَكْبَرْنَهٗ کہا گیا ہے حضنہ نہیں کہا گیا پس پتا چلا اکبار بمعنی حیض نہیں ہے۔ زہری نے جواب دیا اور کہا: ''اکبرت'' کا بمعنی حاضت ہونا ممکن ہے کیونکہ جب ابتدا میں عورت کو حیض آتا ہے تو وہ صغر سنی سے نکل کر کبر میں پہنچ جاتی ہے۔ انہوں نے کہا: اکبرنه کی ھا، ھا وقف بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یہ کنایہ نہ ہوگی۔ اور یہ نا کارہ بات ہے، کیونکہ ھا وقف وصل کی صورت میں گر جاتی ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ھا فعل کے مصدر سے کنایہ ہے یعنی اکبرن اکبارا بمعنی حضن حیضا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پہلے قول کے مطابق تو ھا ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہوگی یعنی أعظمن یوسف وأجللنه۔

**وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ** مجاہد نے کہا: قطعنها سے مراد القينها ہے (3)۔ ایک قول یہ ہے: خدشنها یعنی زخمی کر دیا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: چھری کے ساتھ زخمی کر دیا۔ نحاس نے کہا: مجاہد کی مراد یہ ہے کہ ایسا کاٹنا نہیں تھا کہ جس میں ہاتھ علیحدہ ہو گئے ہوں بلکہ یہ صرف زخم اور خراشیں تھیں اور یہ بات تو لغت میں معروف ہے کہ جب کوئی انسان اپنے دوسرے دوست کے ہاتھ کو زخمی کر دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ عکرمہ نے کہا: **اَيْدِيَهُنَّ** سے مراد اکمامھن ہے (4) مگر اس معنی میں بعد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ **اَيْدِيَهُنَّ** سے مراد ان کی انگلیوں کے پورے ہیں، یعنی انہوں نے کٹنے اور زخم لگنے کی وجہ سے کوئی درد محسوس نہ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل حضرت یوسف علیہ السلام میں مشغول تھے اس لیے انہوں نے کوئی درد محسوس نہ کیا۔ تقطیع کثرت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہاتھ کئی جگہوں سے کٹ گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کٹنے والے ہاتھوں کی تعداد ہی زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ** یعنی معاذ اللہ۔ اصمعی نے نافع سے روایت کیا ہے کہ اس نے اسے اسی طرح پڑھا ہے جس طرح ابو عمرو بن العلاء نے پڑھا **وَقُلْنَ حَاشَا لِلّٰهِ** یعنی الف کو ثابت رکھ کے اور یہی اصل ہے۔ اور جس نے الف کو حذف کیا ہے اس نے للہ کے لام کو اس کے عوض بنا دیا ہے۔ اس میں چار لغتیں ہیں حَاشَاكَ، حَاشَا لَكَ، حَاشَ لَكَ اور حَشَا لَكَ۔ اور اسی طرح حَاشَا زيدٍ اور حاشا زيدًا کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن زید سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　　2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 245　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239　　4۔ ایضاً

سنا: نصب اولی ہے (1) کیونکہ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ فعل ہے جیسے ان کا قول: حاش لزید اور اس میں سے کسی حرف کو حذف بھی نہیں کیا جاتا۔ نابغہ نے کہا ہے:

وَلَا أحاشِي من الأقوامِ من أحَدِ

احاشی واحد متکلم کا صیغہ ہے یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حاش حرف ہے اور احاشی فعل ہے اور حاش کے بعد جر کا واقع ہونا اس کے فعل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ابوزید نے ایک اعرابی سے حکایت کی ہے: اللھم اغفرلی ولمن یسمع، حاشا الشیطان وأبا الأصبغ، تو اس نے بھی نصب ہی دی ہے۔ حسن بصری نے وقلن حاش للہ سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے حاش الالہ۔ بھی مروی ہے، جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے ''حاش اللہ'' بغیر لام کے پڑھا ہے۔ اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

حاشا أبي ثَوبانَ إنَّ بهِ ضَنًّا عنِ المَلْحَاةِ والشَّتْم (2)

یعنی حاشا لأبی ثوبان نہیں بلکہ حاشا أبی ثوبان ہے۔

زجاج نے کہا: کلمہ کی اصل حاشیہ سے ہے اور الحَشَا معنی الناحیة ہے۔ آپ کہتے ہیں: کنتُ فی حَشَا فلانٍ یعنی میں فلاں کے کونے میں تھا، اور آپ کا قول حاشا لزید یعنی زید اس سے جدا ہوا اور اس سے دور ہوا۔ اس صورت میں تمام مذکورین میں سے باہر نکلنے اور جدا ہونے کی استثنا ہوگی۔

ابوعلی نے کہا: یہ المحاشاة سے فاعل ہے یعنی حاشا یوسف وصار فی حاشیة وناحیة مما قُرِف به، یا اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف بشر ہونے سے دور ہے، پس حاشا اور حاش سیبویہ کے نزدیک استثنا کی صورت میں حرف جر ہیں اور مبرد اور ابوعلی کے قول کے مطابق فعل ہیں۔

مَا هٰذَا بَشَرًا خلیل اور سیبویہ نے کہا کہ ما، لیس کی طرح ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لیس زید قائماً، اور مَا هٰذَا بَشَرًا اور مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ کوفیوں نے کہا: جب با کو حذف کیا جائے تو پھر نصب دی جاتی ہے۔ اس کی تشریح احمد بن یحییٰ نے کی کہ جب آپ ما زید بمنطلقٍ کہتے ہیں تو با کا محل نصب ہوتا ہے، اسی طرح تمام حروف جر کی صورتحال ہے اور جب با کو حذف کیا جائے تو نصب دی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے محل پر دلالت کرے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: یہ فراء کا قول ہے۔ اس نے کہا مَا کوئی عمل نہیں کرتا۔ بصریوں نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ انہیں یوں کہنا چاہیے: زید القمر کیونکہ اس کا معنی ہے زیدٌ کالقمر۔ احمد بن یحییٰ نے یہ کہتے ہوئے اس کی تردید کی ہے کہ با کو حروف جر میں کاف سے زیادہ داخل کیا گیا ہے، کیونکہ کاف اسم ہے۔ نحاس نے کہا: بصریوں کی بات ہی درست ہے اور اس بات میں تناقض ہے کیونکہ فراء نے ما بمنطلقٍ زیدٌ کو جائز قرار دیا ہے اور شعر بھی پڑھا ہے۔

أمَا واللهِ أنْ لو كنتَ حُرًّا وما بالحُرِّ أنتَ ولا العَتيق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 239		2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 248

شعر میں مابالحرّ محل استشہاد ہے۔

اور اس نے نصب سے منع کیا ہے، اور ہم نحویوں کے درمیان اس قول کے جواز پر کسی اختلاف کو نہیں جانتے: مافیكَ براغبٍ زیدٌ اور ما الیك بقاصدٍ عمروٌ پھر وہ با کو حذف کر دیتے ہیں اور انہیں رفع دے دیتے ہیں۔ بصریوں اور کوفیوں نے مازیدٌ منطلقٌ رفع کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے کہ یہ لغت تمیم ہے اس پر انہوں نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

أَتیمًا تَجعلون إِلَیَّ نِداً وما تَیمٌ لِذِی حَسَبٍ نَدِیدٌ

ماتیمٌ محل استشہاد ہے۔

النّد والندیدُ والنَّدیدۃُ کا معنی ہے مثل اور نظیر۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ یہ تہامہ اور نجد کی لغت ہے۔ اور فراء کا گمان یہ ہے کہ رفع دونوں صورتوں میں سے زیادہ قوی صورت ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ غلط ہے، کتاب اللہ اور لغت رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ قوی اور اولیٰ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصحف حفصہ رضی اللہ عنہا میں مَا هٰذَا بِبَشَرٍ ہے۔ اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: عورتوں نے یہ بات ذکر کی کہ حضرت یوسف، صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے بلکہ یہ تو ملکی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین) دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہوگی ان کا قول: حَاشَ لِلّٰهِ یہ فی الحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے بہلانے کے الزام سے برأت کا اظہار ہے یعنی یوسف تو اس سے دور ہے۔ اور ان کا قول لِلّٰهِ سے مراد لخوفہ یعنی براۃ للہ من ھذا یعنی یوسف اس سے نجات پا گیا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ یہ گناہوں سے بری ہونے میں فرشتوں کی طرح ہے۔ اس صورت میں کوئی تناقض اور تضاد باقی نہیں رہتا۔

ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے بہت زیادہ جمال اور خوبصورتی کی وجہ سے صورت میں بشر کے ساتھ مشابہت سے پاکی کو بیان کرنا ہے۔ اور لِلّٰهِ کا قول اسی معنی کی تاکید ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے عورتوں نے یہ بات اس گمان پر کہی کہ ان کے نزدیک فرشتے کی صورت بشر سے زیادہ خوبصورت ہے اور ان تک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین) نہیں پہنچا کیونکہ یہ تو ہماری کتاب میں ہے۔ بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں کا یہ گمان ہے کہ اگر ان عورتوں کی یہ بات گمان باطل ہوتا تو اللہ تعالیٰ پر ان کی اس بات کی تردید اور ان کے جھوٹ کو واضح کرنا واجب تھا۔ اور یہ باطل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی واجب اور لازم نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ پر یہ لازم ہے کہ جہاں بھی وہ کافروں کے کفر اور جھوٹوں کے جھوٹ کے متعلق خبر دے تو اس کے ساتھ ہی ان کا رد بھی کرے۔ اور اسی طرح اہل عرف قبیح چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ شیطان ہے اور عمدہ چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کی مثل نہیں دیکھی کیونکہ انسان فرشتوں کو نہیں دیکھتے اس کی بنیاد بھی اسی گمان پر ہے کہ فرشتوں کی صورت زیادہ خوبصورت ہے۔ یا پھر اس کی بنیاد فرشتے کے اخلاق کی طہارت اور تہمت سے اس کے دور ہونے پر ہے۔ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ یعنی یہ نہیں مگر فرشتہ۔ شاعر نے کہا:

فلستَ لِانْسِیّ ولکن لِمَلْأَکٍ تَنَزَّلَ مِنْ جَوِّ السَّماءِ یَصُوبُ

تو انسان نہیں بلکہ ایسا فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترا ہے۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے: مَاهٰذَا بِشِرًى با اور شین کے کسرہ کے ساتھ، یعنی یہ خریدا ہوا غلام نہیں اس جیسے آدمی کو بکنا نہیں چاہیے پس مصدر کو اسم مفعول کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ جس طرح فرمایا گیا اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) یعنی مصید ہ۔ اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ما هذا بثمن یعنی اس جیسے آدمی کے ثمن اور قیمت نہیں لگائی جاسکتی ہے۔ اور اس صورت میں شراء سے مراد وہ ثمن ہونگے جن کے ذریعے خریدا جاتا ہے، جس طرح کہ جب کوئی آدمی کہے هذا بألف تو اس کی بات کو رد کرنا مقصود ہو تو اس کو کہا جائے ماهذا بألِف اس اعتبار سے با اس محذوف کے متعلق ہوگی جو کہ خبر ہے گویا کلام یوں ہے: ما هذا مقدرا بشراء اور عام قراء کی قراءت اس کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ اس کے بعد اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ آپ کی فضیلت میں مبالغہ ہے ملائکہ کی جنس میں آپ کی شان کی تعظیم کے طور پر۔ اور بِشْرًى جیسے الفاظ قرآن کریم میں یا کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ جب عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو زلیخا نے اپنے عذر (محبت) کو الفاظ میں ظاہر کیا لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ، فیه کی ہ ضمیر سے مراد ہے فی حبه اور ذالك کا معنی هذا ہے یہ طبری کا مختار موقف ہے اور ایک قول یہ ہے کہ "ہ" ضمیر محبت کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا۔ ذالکن الحب الذی لمتننی فیه یعنی حُبّ هَذَا هُوَ ذَالِكَ الْحُبُّ اور "اللوم" سے مراد قباحت و برائی کے ساتھ کسی کی صفت بیان کرنا ہے۔ پھر زلیخا نے اقرار کرتے ہوئے کہا: وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ، فَاسْتَعْصَمَ کا معنی ہے وہ رک گیا اور عصمت کو اسی لیے عصمت کہا جاتا ہے کہ یہ معصیت اور نافرمانی کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "اِسْتَعْصَمَ" کا معنی اِسْتَعْصی ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ وَ لَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ زلیخا نے دوبارہ ان عورتوں کی موجودگی میں آپ کو گناہ کی ترغیب دلائی اور حیاء کی چادر اتار پھینکی اور گناہ نہ کرنے کی صورت میں آپ کو قید کی دھمکی دی اور اس نے یہ کاروائی اس وقت کی جب اسے نہ ملامت کا ڈر تھا اور نہ ہی گفتگو کا خوف بخلاف پہلی دفعہ کے۔ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ یعنی ذلیل و رسوا۔ مصحف میں وَ لَيَكُوْنًا کو الف کے ساتھ لکھا گیا اور تاکید کے لیے نون مخففہ کے ساتھ پڑھا گیا اور نون تاکید ثقیلہ بھی ہوتا ہے اور خفیفہ بھی اور لَيُسْجَنَنَّ پر نون کے ساتھ وقف کیا گیا کیونکہ یہ مثقلہ ہے اور لَيَكُوْنًا پر الف کے ساتھ وقف کیا گیا اس کے مخففہ ہونے کی وجہ سے اور یہ رایتُ رجلاً و زیداً و عمراً کی طرح نون اعراب کے مشابہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ (العلق) اس کے مشابہ ہے۔ جس طرح کہ اعشی کا قول ہے:

ولا تَعْبُدِ الشیطانَ واللهَ فاعبداً

یعنی تو شیطان کی عبادت نہ کر اور اللہ کی عبادت کر۔ اس کی مراد یہاں "فاعبداً" ہے تو جب اس نے اس پر وقف کیا تو الف کے ساتھ کیا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝۳۳ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۳۴

''یوسف نے عرض کی: اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں) مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے مکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے۔ پس قبول فرمالی اس کی دعا اس کے رب نے اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکروفریب کو، بے شک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور (ان کے حالات) خوب جاننے والا ہے''۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ، اَلسِّجْنُ اصل میں دخول السجن ہے مضاف کو حذف کر دیا گیا یہ قول زجاج اور نحاس کا ہے۔ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی یہ میرے لیے معصیت و نافرمانی میں مبتلا ہونے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جیل میں داخل ہونا کوئی پسندیدہ اور محبوب بات ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ تو الله تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: اے یوسف! اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ کہہ کے تو نے اپنے آپ کو قید کر لیا، اگر آپ کہتے کہ عافیت میرے نزدیک پسندیدہ ہے تو میں آپ کو عافیت دے دیتا۔ ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اَلسَّجْنُ کو سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ ابن ابی اسحاق، عبدالرحمٰن، اعرج اور یعقوب کی قرآت ہے اور، سجنہ سَجْنًا کا مصدر ہے۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ، كَیْدَهُنَّ سے مراد عورتوں کا مکر ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان عورتوں کا مکر ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا، کیونکہ انہوں نے آپ کو عزیز مصر کی بیوی کی بات مان لینے کو کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ مظلوم ہے اور آپ نے اس پر ظلم کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے عزیز کی بیوی کے بارے میں نصیحت کرنے کے لیے خلوت کا مطالبہ کیا اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ زلیخا کے حق میں وہ آپ کو علیحدہ کریں اور اس کی مدد و تعاون کرنے کی بات کریں کہ شاید آپ مان جائیں، تو ہر ایک نے خلوت حاصل کر لی اور ہر ایک نے آپ کو کہا: اے یوسف! میری ضرورت کو پورا کرو میں تمہارے لیے تمہاری مالکہ کی نسبت بہتر ہوں تو ہر ایک نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی اور آپ کو بہلایا پھسلایا، تو آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! وہ ایک تھی اب پوری جماعت ہو گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عزیز کی بیوی کا مکر ہے جو اس نے آپ کو گناہ کی دعوت دی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے کیدھا کہنے کے بجائے جمع کی ضمیر یا تو اس کے بڑے پن کی وجہ سے استعمال کی یا پھر تصریح سے تعریض کی طرف خروج کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا، اور کید سے مراد دھوکے بازی کی کوشش ہے، اسی وجہ سے عرب جنگ کو کید کہتے ہیں کیونکہ اس میں لوگوں کا مکروفریب اور دھوکہ بازی کا عمل ہوتا ہے۔ عمرو بن لحار نے کہا:

تَراثٌ کَیْ تکیدَکَ اُمُّ بِشْرٍ　　وکیدٌ بالتبرج ما تکیدُ

اَصْبُ اِلَیْهِنَّ جواب شرط ہے یعنی میں ان کی طرف مائل ہو گیا ہوتا۔ یہ صَبَا یَصْبُو، صُبُوًّا وصَبوۃً سے ہے یہ اس وقت

بولا جاتا ہے جب کوئی مائل ہو جائے اور اس میں اشتیاق پیدا ہو جائے۔

شاعر نے کہا:

إِلَى هِنْدٍ صَبَا قَلْبِي وَهِنْدٌ مِثْلُهَا يُصْبِي(1)

ہند کی طرف میرا دل مائل ہوا اور ھند جیسی عورت کی طرف مائل ہوا جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو گناہ سے بچنے کے سلسلہ میں مجھ پر مہربانی نہ فرماتا تو میں اس میں واقع ہو جاتا۔ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان جاہلین میں سے ہو جاتا جو گناہ کا ارتکاب کر کے مذمت کے مستحق بن جاتے ہیں یا اس سے مراد یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو جاہلوں جیسے کام کرتے ہیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ کوئی آدمی الله تعالیٰ کی مدد کے بغیر اس کی نافرمانی سے نہیں بچ سکتا اور یہ جہالت کی قباحت اور جاہل کی مذمت پر بھی دلیل ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: اے الله! مجھ سے ان کے مکر کو دور کر، تو الله تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا اور آپ پر مہربانی فرماتے ہوئے آپ کو زنا میں واقع ہونے سے بچا لیا پھر الله تعالیٰ نے ان کے مکر کو دور فرما دیا۔ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ، كَيْدَهُنَّ کو جمع ذکر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے مل کر آپ کو بہلایا تھا یا اس سے مراد عورتوں کا مکر ہے یا پھر عزیز مصر کی بیوی کا مکر ہے جس طرح کہ سابق آیت میں گزر چکا ہے۔ اس کو عموم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

''پھر مناسب معلوم ہوا انہیں اس کے باوجود کہ وہ (یوسف کی پاکبازی کی) نشانیاں دیکھ چکے تھے کہ وہ اسے قید کر دیں کچھ عرصہ تک''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ یعنی عزیز اور اس کے مشیروں کے لیے ظاہر ہوا مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ اس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کی علامات اور نشانیاں ہیں، جس طرح کہ قمیص کا پیچھے سے پھٹنا، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا، حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات سے ان عورتوں کا قلت صبر وغیرہ۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ آپ کو قید کر دیں تا کہ وہ اس قصہ کو عام لوگوں میں مشہور ہونے سے چھپا سکیں اور قید کو حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے درمیان حائل کر سکیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آیات سے مراد وہ برکات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ان میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے ان پر ظاہر ہوئیں لیکن پہلی توجیہ زیادہ صحیح ہے۔

مقاتل نے مجاہد عن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما الله تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ کے بارے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 252

کہا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمیص، گواہ کی گواہی، ہاتھوں کا کٹنا اوران عورتوں کا آپ کو بہت بڑا سمجھنا یہ سب نشانیوں میں سے ہے۔ آپ کو قید کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔ ایک قول کے مطابق لوگوں میں رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا اور زلیخا کو شرمندگی اور مایوسی کے خوف نے اسے پردے میں رکھنے پر راضی ہونے پر مجبور کر دیا یہ حیلہ اس نے اس لیے کیا تھا تا کہ جب اسے اس کے دیدار سے روک دیا جائے تو (اس کی خبروں سے اپنے بے تاب دل کو) تسلی و تشفی دے گی۔ شاعر نے کہا:

وما صَبابةُ مشتاقٍ على أملٍ من اللِقاء كمشتاقٍ بلا أَمَلِ

ملاقات کی امید پر مشتاق کی سوزش عشق اس طرح نہیں جس طرح بغیر امید کے مشتاق کی محبت ہوتی ہے۔

یا پھر اس کو یہ توقع تھی کہ قید ان کو میری اطاعت پر مجبور کر دے گی اور یہ اس بات پر راضی ہو جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** لَيَسْجُنُنَّهٗ ارشاد گرامی میں يَسْجُنُنَّهٗ فاعل کی جگہ میں ہے، ای ظھرلھم ان یسجنوہ یعنی ان کے سامنے یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ آپ کو قید میں ڈال دیں، یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مبرد نے کہا: یہ غلط ہے۔ فاعل پورا جملہ نہیں ہوتا البتہ فاعل وہ ہے جس پر بَدَا دلالت کر رہا ہے اور وہ ہے مصدر؛ یعنی بَدَا لَهُمْ بَدَاءٌ تو فاعل کو اس وجہ سے حذف کر دیا گیا کہ فعل اس پر دلالت کر رہا ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

وحقَّ لمن أبوموسیٰ أبوهُ يُوَفِّقه الذی نصب الجبالَ

یہاں وحقَّ الحقُّ تھا تو الحقُّ فاعل کو حذف کر دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: ثم بَدَا لَهُمْ رَأْیٌ لَمْ یَکُوْنُوْا یَعْرِفُوْنَهٗ اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام میں اس پر دلالت موجود ہے اسی طرح قول کو بھی حذف کر دیا گیا یعنی اصل میں تھا قالوا لَيَسْجُنُنَّهٗ لام مفتوح یمین مضمر کے جواب میں ہے یہ فراء کا قول ہے۔ اور یہ فعل مذکر ہے مونث نہیں کیونکہ اگر مونث ہوتا تو يَسْجُنَّانِهٖ ہوتا۔ اس پر لَهُمْ کا قول دلیل ہے لَهُنَّ ارشاد نہیں ہوا، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور ان کے معاونین کی طرف سے خبر دی اور مذکر کو غلبہ دے دیا یہ ابوعلی کا قول ہے۔ سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا سبب یہ تھا کہ عزیز کی بیوی کو یہ شک ہوا کہ آپ نے اس کی تشہیر کی اور اس کی اس خبر کو پھیلا دیا ہے اس صورت میں لَهُمْ کی ضمیر بادشاہ کے لیے ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰى حِيْنٍ یعنی نامعلوم مدت تک۔ یہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شہر میں پھیلی ہوئی خبر کے ختم ہونے تک، سعید بن جبیر نے کہا: چھ ماہ تک۔ الکیا نے بیان کیا کہ اس نے تیرہ ماہ مراد لیے ہیں۔ عکرمہ نے 9 سال کی مدت بیان کی ہے۔ کلبی نے پانچ سال اور مقاتل نے سات سال بیان کی ہے۔ البقرہ میں حین اور اس پر مرتب ہونے والے احکام گزر چکے ہیں۔ وہب نے کہا: آپ بارہ سال قید میں رہے۔ اور حَتّٰى بمعنی اِلٰی ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (القدر) اللہ تعالیٰ نے قید کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اس عورت کا ارادہ کرنے کی خطا سے طہارت کا سبب بنا دیا اور عزیز مصر اگر چہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جرات کو

جان چکا تھا اس کے باوجود آپ کو قید کرنے میں گویا اپنی بیوی کی اطاعت کر رہا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام سے تین مرتبہ فروگزاشت ہوئی ہے: جب آپ نے زلیخا کا ارادہ کیا تو قید میں ڈالے گئے، جب آپ نے نوجوانوں کو اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ کہا تو کئی سال جیل میں ٹھہرے رہے اور جب بھائیوں کو اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ۝ (یوسف) کہا تھا تو انہوں نے کہا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (یوسف: 77) (تم چور ہو تو انہوں نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے اس سے قبل چوری کی تھی)

**مسئلہ نمبر 4۔** حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ پر قید کے ذریعے مجبور کیا گیا اور پانچ سال تک آپ قید خانہ میں رہے اور اپنے مقام و مرتبہ کی عظمت کی وجہ سے اس کو ترجیح دی، اور اگر کسی آدمی کو قید کے ذریعے زنا پر مجبور کیا جائے تو بالاجماع اس کے لیے جائز نہیں۔ اور اگر مارنے کے ذریعے مجبور کیا جائے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ مشکل ہو تو اس سے زنا کا گناہ اور حد ساقط ہو جائے گی۔ ہمارے (مالکیہ) بعض علماء نے کہا: یہ بات اس سے حد کو ساقط نہ کرے گی لیکن یہ ضعیف قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر دو عذاب جمع نہیں کرتا اور نہ ہی دو مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ یہ تو دین میں بہت بڑا حرج ہے جبکہ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور اس نے دین میں تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں بنائی۔ اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ ''النحل'' میں آئے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر کیا اور مکر و فریب سے اس کی پناہ مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۳۸

''اور داخل ہوئے آپ کے ساتھ ہی قید خانہ میں دو نوجوان ان میں سے ایک نے (آکر) کہا کہ میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اٹھائے ہوئے ہوں اپنے سر پر کچھ روٹیاں، پرندے کھا رہے ہیں اس سے، آپ بتائیے ہمیں اس کی تعبیر، بے شک ہم دیکھ رہے ہیں آپ کو نیکوکاروں سے۔ آپ نے فرمایا: نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں کھلایا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتادوں گا اس کی تعبیر اس سے پیشتر کہ کھانا تمہارے پاس آئے، یہ ان

علموں میں سے ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رب نے، میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، اور میں تو پیرو بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لیے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو، یہ (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ اس احسان پر شکر ہی بجا نہیں لاتے''۔

**وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ**۔ **فَتَيٰنِ**، فتی کا تثنیہ ہے؛ اور یہ یائی ہے اور عربوں کا قول: الفَتُوُّ شاذ ہے۔ وہب اور دیگر لوگوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کر کے قید خانے کی طرف گدھے پر سوار کر کے لایا گیا اور کہا گیا: هٰذَا جَزَاءُ مَنْ يَعْصِي سَيِّدَتَهُ یہ سزا ہے اس کی جس نے اپنی مالکن کی نافرمانی کی، جبکہ آپ فرما رہے تھے: یہ آگ کے لباس، تارکول کی قمیص، پیپ کے پینے اور زقوم کھانے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ پہنچے تو آپ نے اس میں کچھ ایسے لوگ پائے جن کی امیدیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی آزمائش و ابتلا انتہائی سخت ہو چکی تھی تو آپ نے ان سے فرمایا: صبر کرو اور خوش رہو تمہیں اس پر اجر ملے گا تو انہوں نے آپ کو کہا: اے نوجوان: تیری گفتگو کتنی خوبصورت ہے، ہمیں تیرے پڑوس کی وجہ سے برکتیں نصیب ہوئیں اے نوجوان! تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحٰق بن خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب عورت نے اپنے شوہر کو کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے رسوا کیا، میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے قید کر دیں تو اس نے آپ کو قید خانے میں قید کر دیا تو آپ اس میں پریشان حال کو دلاسہ دیتے، بیمار کی عیادت کرتے، زخمی کا علاج کرتے، ساری رات عبادت کرتے اور روتے یہاں تک کہ آپ کے ساتھ گھروں کی دیواریں، ان کی چھتیں اور دروازے بھی روتے، آپ کے سبب قید خانے کو پاکیزگی حاصل ہوئی اور قیدی آپ سے مانوس ہوئے؛ یہ صورتحال ہوگئی کہ جب کوئی آدمی قید خانے سے نکلتا تو وہ واپس لوٹ آتا اور قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بیٹھتا، قید خانے کے انچارج نے آپ کے ساتھ محبت کرتے ہوئے اسے آپ کے لیے وسیع کر دیا، پھر آپ کو کہا: اے یوسف! میں آپ کے ساتھ اتنی محبت کرتا ہوں جتنی کسی اور چیز کے ساتھ نہیں کرتا، تو آپ نے فرمایا: میں تیری محبت سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس نے کہا: ایسا کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرے باپ نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے بھائیوں نے میرے ساتھ کیا جو کچھ کیا، میری مالکن نے میرے ساتھ محبت کی تو میرے اوپر وہ مصیبت نازل ہوئی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔

آپ قید میں تھے کہ بادشاہ اپنے نانبائی اور اپنے ساقی پر ناراض ہو گیا، سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے لوگوں کے درمیان لمبا عرصہ گزارا تو وہ اس سے تنگ ہو گئے تو انہوں نے خباز اور ساقی کے ذریعے سازش کی وہ دونوں کھانے اور شراب میں زہر ملا دیں، خباز نے ان کی بات مان لی اور ساقی نے انکار کر دیا، ساقی بادشاہ کے پاس گیا اور اسے اس بات کی خبر دی تو بادشاہ نے ان دونوں کو قید کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ تو یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام سے مانوس ہو گئے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ** ایک قول یہ ہے کہ خباز نے کھانے میں زہر ملا دی، جب کھانا پیش کیا گیا تو ساقی نے

کہا: اے بادشاہ! نہ کھایئے کھانا زہر آلود ہے۔ خباز نے کہا: اے بادشاہ نہ پیجئے! شراب زہر آلود ہے۔ تو بادشاہ نے ساقی کو کہا: پیو! تو اس نے شراب پی لی اور شراب نے اسے کوئی نقصان نہ دیا، بادشاہ نے خباز کو کہا: تم کھاؤ؛ تو اس نے انکار کر دیا، کھانا ایک جانور کو کھلایا گیا تو وہ اسی جگہ مر گیا، تو بادشاہ نے ان دونوں کو ایک سال کے لیے قید کر دیا، اور وہ دونوں اس مدت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں رہے ساقی کا نام منجا اور دوسرے کا مجلث ہے، یہ ثعلبی نے کعب سے بیان کیا ہے۔ نقاش نے کہا: ایک کا نام شرہم تھا اور دوسرے کا سرہم؛ طبری نے کہا: جس نے (خواب میں) دیکھا تھا کہ وہ شراب نچوڑتا ہے وہ نبو تھا، سہیل نے کہا: دوسرے کا نام بھی ذکر کیا گیا ہے اور میں نے اس کو محفوظ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فَتَيٰنِ فرمایا، کیونکہ وہ دونوں غلام تھے اور غلام کو فتی کہتے ہیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا؛ اس بات کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: شاید ان کے عرف میں غلام کا نام فتی تھا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتی خادم کا نام ہو اگرچہ وہ مملوک نہ ہو۔

ممکن ہے کہ بادشاہ نے ان دونوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید کیا ہو ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کے بعد ان کو قید کیا ہو یا آپ سے پہلے ان کو قید کیا گیا ہو البتہ جس کمرے میں آپ تھے اس میں وہ آپ کے ساتھ داخل ہوئے۔ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا اس سے مراد انگور کو نچوڑنا ہے حضرت یوسف علیہ السلام قیدیوں کو فرماتے تھے کہ میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ دونو جوانوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: آؤ ہم اس عبرانی غلام کا تجربہ کریں؛ تو انہوں نے کسی چیز کو دیکھے بغیر آپ سے سوال کیا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں نے آپ سے آپ کے علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: میں خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ تو انہوں نے اپنے خوابوں کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: ان کے سچے خواب تھے جو انہوں نے دیکھے اور ان کے متعلق آپ سے پوچھا: اسی وجہ سے ان کی تعبیر بھی صحیح اور سچی تھی۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(1) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: ''تم میں سے جو از روئے خواب کے جتنا سچا ہوگا اتنا ہی وہ از روئے کلام کے سچا ہوگا۔'' ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے خواب جھوٹے تھے اور انہوں نے صرف تجربہ کرنے کے لیے آپ سے ان کے متعلق پوچھا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: ان دونوں میں سے جس کو پھانسی دی گئی وہ جھوٹا تھا اور دوسرا سچا، یہ ابو مجلز کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کی: ''جس نے جھوٹا خواب بیان کیا قیامت کے دن اس کو دو جو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا اور وہ ان دونوں کو نہیں باندھ سکے گا'' (2)۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی آپ نے فرمایا: ''جس نے اپنے خواب کے بارے میں جھوٹ بولا اسے قیامت کے دن جو کو باندھنے کا مکلف بنایا جائے گا'' (3)۔ (ابو عیسیٰ نے) کہا: حدیث حسن۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب ان دونوں نے اپنے خواب دیکھے تو وہ پریشان ہو گئے؛ حضرت یوسف علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الوصایا، جلد 2، صفحہ 241

2۔ جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، ما جاء فی الذی یکذب حلمہ، جلد 2، صفحہ 52، ایضاً، حدیث نمبر 2208، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ ایضاً

السلام نے انہیں فرمایا: میں تمہیں پریشان کیوں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے کہا: اے ہمارے سردار! ہم نے خواب میں ناپسندیدہ بات دیکھی ہے؛ آپ نے فرمایا: مجھے بتاؤ، تو انہوں نے آپ کو وہ بات بتائی اور کہا: ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتایئے؛ یہ بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان کے خواب تھے۔ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ آپ کا احسان یہ تھا کہ آپ مریض کی عیادت کرتے اور اسے دوا دیتے تھے، پریشان وغمزدہ کو دلاسہ دیتے، جب اس کو ضرورت ہوتی تو اس کی خدمت کرتے اور اس کے لیے (لوگوں کو) کہتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ سے مراد العَالِمِينَ الَّذِيْنَ أَحْسَنُوا العِلْم یہ فراء کا قول ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ لَنَا اِنْ فَسَّرْتَهُ کہ اگر آپ اس کی وضاحت کردیں تو آپ ہمارے محسنین میں سے ہوں گے۔ جس طرح کوئی آدمی کہتا ہے: ایسا کرو تو تم احسان کرنے والے ہوگے۔ آپ نے فرمایا: تم نے کیا دیکھا ہے؟ خباز نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے تین تنوروں میں روٹیاں پکائیں انہیں تین ڈبوں میں رکھ دیا، اور ان کو اپنے سر پر رکھ لیا تو ایک پرندہ آیا اور اس میں سے کھا گیا۔ دوسرے نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں نے سفید انگور کے تین گچھے لیے انہیں تین برتنوں میں نچوڑا، پھر اپنی پہلی عادت کے مطابق وہ میں نے بادشاہ کو پلا دیا، یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا یعنی انگور لغت عمان کے مطابق (انگور کو خمر کہتے ہیں) (1)۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اسے اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا پڑھا ہے۔ اصمعی نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے بتایا ہے کہ وہ ایک اعرابی کو ملے اس کے پاس انگور تھے تو انہوں نے اسے کہا: تیرے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا: ''خمر'' ایک قول یہ ہے: اَعْصِرُ خَمْرًا کا معنی ہے ''عنب خمر'' تو مضاف کو حذف کردیا گیا۔ اور خَمْرَةٌ، خمرٌ اور خُمُورٌ کہا جاتا ہے جس طرح کھجور کے بارے میں تمرةٌ، تمرٌ اور تُمُورٌ کہا جاتا ہے۔ قَالَ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو فرمایا: لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یعنی کل تمہارے گھر سے تمہارے لیے کھانا نہیں لایا جائے گا۔ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ مگر میں تمہیں اس کی تاویل بتادوں گا تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میں تمہارے خوابوں کی تعبیر جانتا ہوں، تو انہوں نے کہا: بیان کرو! آپ نے انہیں فرمایا: تمہارے پاس ایسا ایسا کھانا لایا جائے گا۔ تو کھانا اسی طرح کا تھا جس طرح آپ نے فرمایا؛ یہ علم غیب تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ اور آپ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس علم کے ساتھ اس لیے خاص فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی قوم کی ملت کو چھوڑا تھا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی تھی یعنی بادشاہ کے دین کو۔ میرے (قرطبی) کے نزدیک اس کلام کا معنی ہے: تمہارے خوابوں کی تعبیر کا علم، تمہارے پاس لائے جانے والے کھانے کا علم اور اللہ کے دین کا علم، پس سب سے پہلے وہ سنو جو دین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ اسی وجہ سے آپ نے ان کو تعبیر نہ بتائی بلکہ پہلے اسلام کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ ایک قول یہ ہے: آپ کو علم تھا کہ ان میں سے ایک کو قتل کردیا جائے گا تو آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی، تاکہ وہ یہ سعادت حاصل کرلیں۔ ایک قول یہ ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں تعبیر بتانے کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ ایک کے لیے یہ تعبیر ناپسندیدہ ہے لہٰذا آپ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 257

نے ان کے سوال سے اعراض برتا اور دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کردی اور فرمایا: لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یعنی نیند کی حالت میں اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا مگر میں تمہیں اس کی تفسیر بیداری کی حالت میں بتادوں گا، یہ سدی کا قول ہے۔ انہوں نے آپ کو کہا: یہ تو کاہنوں اور قیافہ شناسوں کا عمل ہے تو آپ نے انہیں فرمایا: میں کاہن نہیں ہوں، یہ تو ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے میں تمہیں کہانت اور ستاروں کے ذریعے ان کی خبر نہیں دوں گا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے ہوگا۔ ابن جریج نے کہا: بادشاہ جب کسی آدمی کو قتل کرنا چاہتا تو اس کے لیے کھانا تیار کراتا اور اس کی طرف بھیجتا تھا (1)۔ تو معنی یہ ہوگا: تمہارے پاس حالت بیداری میں کھانا نہیں لایا جائے گا تو اس اعتبار سے تُرْزَقٰنِهٖۤ کا معنی ہوگا بادشاہ یا اس کے علاوہ کسی اور کی طرف سے تمہارے پاس آئے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جو تمہیں اللہ تعالیٰ رزق دے گا۔ حضرت حسن نے کہا: آپ انہیں غیب چیز کی خبر دے رہے تھے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے ان دونوں کو اس طریقے سے اسلام کی دعوت دی اور آپ نے اس کو ایسا معجزہ بنادیا جس کے ذریعے انہوں نے غیب کے ذریعے خبر کی طرف راہنمائی حاصل کی۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ کیونکہ یہ انبیاء برحق تھے مَا كَانَ یعنی نہیں چاہیے کہ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ''من'' تاکید کے لیے ہے۔ جس طرح تیرا قول: مَا جَاءَنِي مِنْ أَحَدٍ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا یہ آپ کے زنا سے بچنے کی طرف اشارہ ہے وَ عَلَى النَّاسِ یعنی ان مومنین پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرک سے بچایا ہے۔ ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا کہ اس نے ہمیں انبیاء بنایا، وَ عَلَى النَّاسِ کہ ہم کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور ایمان پر (اکثر لوگ شکر نہیں کرتے)۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو! (یہ بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ تم نہیں پوجتے اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی دلیل، نہیں ہے حکم (کا اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو بجز اس کے یہی دین قیم ہے لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ یعنی اے قید خانے کے دو باسیو۔ آپ نے صحبت کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ اس میں لمبی دیر مقیم رہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 259

جس طرح کہ اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کہا جاتا ہے۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ یعنی بچپن، بڑھاپے اور جوانی میں، یا اس سے مراد تعداد میں متفرق ہونا ہوگا۔ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ایک قول کے مطابق خطاب ان دونوں جوانوں اور دیگر قیدیوں کے لیے ہے اور ان کے سامنے ایسے بت تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے تو آپ نے حجت کو لازم کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا یعنی کئی معبود کوئی نفع ونقصان نہیں دے سکتے خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ جس نے ہر چیز پر غلبہ پایا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ (النمل) ایک قول یہ ہے: تفرق کے ذریعے آپ نے اس جانب اشارہ فرمایا کہ اگر معبود متعدد ہو جائیں تو وہ ارادہ میں مختلف ہو جائیں گے اور بعض بعض سے بلند ہو جائیں گے اور آپ نے واضح کر دیا کہ جب ان میں تفرق ہوگا تو وہ معبود نہیں ہوں گے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً آپ نے بتوں کے عجز اور کمزوری کو بیان کیا ارشاد فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی تم عبادت نہیں کرتے مگر ایسے اسماء والوں کی عبادت کرتے ہو جن کا کوئی معنی نہیں۔ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ یعنی جو نام تم نے اپنی طرف سے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے: اسماء سے مراد مسمیات ہیں یعنی تم ایسے بتوں کی عبادت کرتے ہو جن کے لیے سوائے معبودیت کے نام کے اور کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ وہ جمادات ہیں۔ فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا حالانکہ آغاز میں خطاب صرف دو کو تھا کیونکہ آپ نے ان تمام لوگوں (کو سمجھانے کا) قصد کیا جو شرک کے حوالے ان دونوں جیسے تھے۔

اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مفعول ثانی کو دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا ہے معنی ہوگا: سَمَّيْتُمُوْهَا آلِهَةً مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ، مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ، اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل نہیں فرمایا۔ سعید بن جبیر نے کہا: مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی حجت میں سے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ جو سب کا خالق ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ قَيِّم بمعنی القویم ہے وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

## يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! (اب خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک (یعنی پہلا) تو پلایا کرے گا اپنے مالک کو شراب لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور (نوچ) کھائیں گے پرندے اس کے سر سے، (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی کو کہا: تو تین دن کے بعد بادشاہ کو شراب پلانے والی سابقہ ڈیوٹی پر واپس چلا جائے گا اور دوسرے سے کہا: تجھے تین دن تک بلایا جائے گا اور سولی چڑھا دیا جائے گا پرندے تیرے سر سے (نوچ) کھائیں گے، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے کوئی

(خواب) نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: تو نے دیکھا ہے یا نہیں قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ (اٹل) فیصلہ ہو چکا ہے اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ اہل زبان نے بیان کیا ہے کہ سقی اور اسقی دونوں لغتیں ہیں معنی دونوں کا ایک ہے، جس طرح کہ شاعر نے کہا:

سَقَی قومی بَنِی مَجْدٍ وأَسْقَی نُمَیْرًا والقبائلَ من هِلال

اس شعر میں سقی اور أسقی ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی میری قوم نے بنی مجد، نمیر اور ہلال کے قبائل کو پلایا۔

نحاس نے کہا: جس بات پر اکثر اہل زبان کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ سقا کا معنی یہ ہے کہ اس نے اس کو پکڑا اور پی لیا یا اس نے اپنے حلق میں پانی انڈیلا اور أسقا کا معنی ہے اس نے اسے پلایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَّ اَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا (المرسلات: 27) یعنی ہم نے تمہیں پلایا ماء فرات۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے (مالکی) علماء نے کہا: اگر یہ کہا جائے کہ جس نے اپنے خواب میں جھوٹ بولا اور تعبیر کرنے والے نے اس کی تفسیر بیان کر دی تو آیا اس کا حکم اسے لازم ہو جائے گا؟ ہم نے کہا: اسے یہ لازم نہ ہوگا۔ البتہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی کی تعبیر فیصلہ ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمادیا کہ یہ معاملہ یوں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے معاملہ اسی طرح کر دیا جس طرح آپ نے خبر دی اور یہ آپ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے: عبد الرزاق عن معمر عن قتادہ روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس نے کہا: میں نے دیکھا کہ گویا میں ہرے بھرے مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک جگہ پر پہنچا ہوں پھر شاداب مقام پر پہنچا ہوں پھر خشک مقام پر پہنچا ہوں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو ایک ایسا آدمی ہے کہ تو ایمان لائے گا پھر کفر اختیار کرے گا پھر ایمان لائے گا اور پھر کفر اختیار کرے گا، پھر تو کفر کی حالت میں مرے گا، تو آدمی نے کہا: میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تیرے لیے فیصلہ ہو چکا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے (قیدی) ساتھی کے لیے ہو گیا تھا، تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ معاملہ کسی اور کے لیے نہیں کیونکہ آپ کی زبان پر حق جاری تھا اور آپ کی کیفیت یہ تھی کہ جب آپ گمان کرتے وہ گمان ہوتا تھا اور جب آپ کلام فرمادیتے تو واقع ہو جاتا تھا جس طرح کہ روایات میں ہے اور ایسی روایات کثیر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا تو آپ نے اسے فرمایا: میں آپ کو کاہن گمان کرتا ہوں تو وہ ویسا ہی تھا جیسا آپ نے گمان کیا؛ اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ آپ نے ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا تو اس نے آپ کو کہا کہ اس کے دوزخ کے سارے نام ہیں، تو آپ نے اسے فرمایا: تو نے اپنے اہل کو پالیا اور وہ سارے جل چکے ہیں تو وہ اسی طرح تھا جس طرح آپ نے ارشاد فرمایا، یہ روایت صاحب موطا نے بیان کی ہے اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ ''الحجر'' میں آئے گی۔

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ٘ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَؕ۝

''اور کہا (یوسف علیہ السلام) نے اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے آقا کے پاس لیکن فراموش کرادیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے بادشاہ کے پاس، پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں ظَنَّ بمعنی أَیقن ہے اور قتادہ نے ظَنَّ کی تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے جو یقین کے برعکس ہوتی ہے، انہوں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی نجات کا گمان کیا کیونکہ تعبیر کرنے والا گمان ہی کرتا ہے اور تیرا رب جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے: لیکن پہلا قول زیادہ صحیح اور انبیاء کے حال کے زیادہ مشابہ ہے اور (اس وجہ سے بھی کہ) آپ نے جو دو جوانوں کو خواب کی تعبیر بتائی وہ وحی تھی اور لوگوں کے حق میں یہ گمان ہوتا ہے جہاں تک انبیاء کی بات کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس کا حکم حق اور سچ ہے خواہ وہ جس طرح بھی ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اپنے آقا کے پاس اور لغت میں آقا کو رب کہنا معروف ہے اعشیٰ نے کہا:

رَبِّی کَرِیْمٌ لا یُکَدِّرُ نِعْمَةً وإذا تُنُوشِدَ فی المَهَارِقِ أَنْشَدَا

ربی کریم سے مراد ہے کہ میرا آقا کریم ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ تو نے دیکھا اور خواب کی تعبیر کے حوالے سے میری جو صورتحال ہے بادشاہ کے سامنے اس کا ذکر کرنا اور اس کو یہ کہنا کہ میں مظلوم ہوں اور بغیر جرم کے قید ہوں۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو پلا (1)، اپنے رب کو کھلا، اپنے رب کو وضو کروا بلکہ اسے ربی کے بجائے سیدی، مولای کہنا چاہیے''۔ اور قرآن کریم میں اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ، الی ربك اور اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ سے مراد 'صاحبی'' میرا صاحب یعنی عزیز مصر ہے۔ اور ہر وہ آدمی جو کسی چیز کی اصلاح واتمام کرتا ہے اسے رَبَّهُ یَرُبُّهُ، فهو رَبٌّ له کہا جاتا ہے۔ علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی (جس میں رب کہنے کے بجائے سیدی، مولای کہنے کی ترغیب ہے) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ فقط نصیحت کے طور پر ہے نہ کہ اس وجہ سے ہے کہ اس نام کا اطلاق حرام ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: أَن تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّهَا یعنی لونڈی اپنے مالک اور آقا کو جنے گی۔ آپ کا ارشاد آدمی پر ''رب'' کے لفظ کے اطلاق کے حوالے سے قرآن کے مطابق ہے تو اس سلسلہ میں نہی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان اسماء کے اطلاق کو اپنی عادت نہ بنالیں بلکہ ان کو ترک کرنا زیادہ عمدہ اور اولیٰ ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ آدمی کا عبدی اور أمتی کہنا دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ایک معنی یہ ہے کہ عبودیت فی الحقیقت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے؛ تو کسی کا لوگوں میں سے اپنے مملوک کو عبدی اور أمتی کہنا اور اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف ان الفاظ کے ساتھ کرنا جن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نام کی وجہ سے مملوک کے دل میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا خیال پیدا ہوگا، اور یہ چیز اسے نافرمانی پر ابھارے گی۔ ابن شعبان نے الزاھی کے بارے میں کہا: لا یقل السید عبدی وأمتی ولا یقل المملوك رَبِّي ولا رَبَّتِي کہ آقا عبدی اور امتی نہ کہے اور غلام ربی اور ربتی نہ کہے'' تو یہ اسی معنی پر محمول ہوگا جس کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یقل العبد ربی ولیقل سیدی (1) کہ غلام ربی نہ کہے بلکہ سیدی کہے، کیونکہ رب اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور بالاتفاق اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ جبکہ ''سید'' میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں نہیں تو فرق واضح ہو گیا کیونکہ اس صورت میں کوئی التباس اور اشکال نہیں رہتا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس صورت میں بھی یہ فرق ہوگا کہ اس کا استعمال اور شہرت اس طرح نہیں جس طرح رب کا استعمال اور شہرت ہے اور ابن عربی نے کہا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ہوسکتا ہے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں جائز ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ۔ فَاَنْسٰىهُ میں ہٖ ضمیر کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی شیطان نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا یہ اس طرح کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی کو کہا: اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو گویا آپ نے اس لیے کہا کہ وہ آپ کو نجات دلائے گا اور پہلی حالت میں واپس لوٹا دے گا تو اس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا بھول گئے اور مخلوق سے استغاثہ کی طرف مائل ہوئے تو آپ کو قید میں ٹھہرا کر اس پر عقاب کیا گیا۔ عبدالعزیز بن عمیر کندی نے کہا: جبرئیل امین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانہ میں آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اسے پہچان گئے تو کہا: اے ڈرانے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیسے دیکھ رہا ہوں؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے طاہر بن طاہرین! اے پاکبازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: کیا تمہیں بندوں سے مدد طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا؛ تو آپ نے کہا: اے جبریل! کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ جبریل نے کہا: ہاں، تو آپ نے کہا: مجھے (اس مشقت کی) کوئی پرواہ نہیں۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب کیا اور آپ کی قید کو لمبا کر دیا۔ جبریل نے آپ سے کہا: اے یوسف! آپ کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل سے کس نے نجات دلائی؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: کنوئیں سے آپ کو کس نے نکالا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: فاحشہ عورت سے آپ کو کس نے بچایا؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: عورتوں کے مکر کو آپ سے کس نے دور کیا؟ آپ نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، حکم الطلاق لفظة، جلد 2، صفحہ 238

کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: پھر تو نے کیسے مخلوق پہ اعتماد کرلیا اور اپنے رب کو چھوڑ دیا کہ تو نے اس سے سوال نہیں کیا؟ آپ نے کہا: اے پروردگار! مجھ سے یہ کلمہ لغزش میں سرزد ہو گیا۔ اے ابراہیم، اسحٰق اور شیخ یعقوب علیہم السلام کے معبود! میں تجھ سے رحم کا سوال کرتا ہوں، جبریل نے آپ سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو کئی سال قید میں رہے گا۔ ابو سلمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحم الله يوسف لولا الكلمة التي قال(1): اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ۔ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ اللہ تعالیٰ یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ کا کلمہ نہ کہتے تو کئی سال قید خانہ میں نہ رہتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے نجات پانے والے جوان سے کہا: اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ تو کئی سال تک قید کو لمبا کر کے آپ کو سزا دی گئی۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کو یاد کیا ہوتا تو وہ آپ کو چھٹکارا نصیب فرماتا۔ اسماعیل بن ابراہیم عن یونس عن الحسن روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یوسف کا کلمہ یعنی اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ ہوتا آپ قید میں اتنا عرصہ نہ رہتے جتنا رہے''۔ راوی نے کہا: پھر حسن روتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں بھی کوئی مسئلہ بنتا ہے تو ہم لوگوں کے سامنے اس کی شکایت کرتے ہیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ فَاَنْسٰىهُ کی ''ہ'' ضمیر نجات پانے والے جوان کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ بھولنے والا ہے؛ یعنی ساقی کو شیطان نے اس بات سے بھلا دیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرے۔ اس آیت میں حذف ہے اصل میں ہے أنساه الشيطان ذكره لربه بعض علماء نے اس قول کو ترجیح دی ہے انہوں نے کہا: اگر شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلایا ہوتا تو آپ کو قید میں ٹھہرانے کی سزا کا مستحق قرار نہ دیا جاتا کیونکہ بھولنے والا مؤاخذہ کا مستحق نہیں ہوتا۔ پہلے قول والوں نے یہ جواب دیا ہے کہ نسیان بعض اوقات ترک کے معنی میں ہوتا ہے تو جب آپ نے اللہ کا ذکر ترک کیا اور شیطان نے آپ کو اس طرف بلایا تو آپ کو سزا دی گئی؛ دوسرے قول والوں نے ان کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ذریعے کی: وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف: 45) اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد۔ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بھولنے والا وہ ساقی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: 42) بے شک میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ شیطان کو انبیاء پر غلبہ حاصل ہی نہیں؟ ایک قول یہ ہے: نسیان سے سوائے ایک صورت کے انبیاء بھی معصوم نہیں اور وہ ایک صورت یہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگوں تک پیغام پہنچاتے ہیں یعنی وحی الٰہی کی تبلیغ میں اس میں وہ معصوم ہیں۔ اور اگر ان سے ایسے معاملات میں نسیان سرزد ہو جائے جن میں سرزد ہو سکتا ہے تو اسے مطلق شیطان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور یہ نسبت نہیں کی جا سکتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نسیان کی خبر دی ہو اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان کی طرف نسیان کی نسبت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نسی آدم

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 265

فنسیت ذریته(1) حضرت آدم علیہ السلام کو نسیان ہوا تو ان کی اولاد کو بھی نسیان ہوا، آپ نے فرمایا: إنما أنا بشر أنسی کما تنسون (2) میں بشر ہوں میں بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ اس پر بحث گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ، بِضْعَ زمانے کا ایک حصہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ یعقوب نے عن ابی زید کہا: بَضْع اور بِضْع کہا جاتا ہے یعنی با کے فتح اور کسرہ کے ساتھ۔ اکثر علماء نے کہا: بضع و مائة نہیں کہا جاتا، اس کا اطلاق نوے تک ہوتا ہے، ہروی نے کہا: عرب بِضْع کو تین سے لیکر نو کے درمیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بِضْع اور بضعة ایک ہی ہے ان دونوں کا معنی عدد کا ایک حصہ ہے۔ ابوعبیدہ نے بیان کیا کہ بِضْع چار کے نصف سے کم حصے کو کہتے ہیں ان کی مراد ایک سے لے کر چار کے درمیان کے اعداد ہیں۔ مگر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا: و کم البضع، بِضْع کیا ہے (3)؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تین سے نو تک کے درمیان۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اذھب فزاید فی الخطر۔

اکثر مفسرین کے نزدیک بِضْع سے مراد سات ہے یہ ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ ماوردی نے کہا: یہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور قطرب کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تین سے نو تک (4)، یہ اصمعی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تین سے دس تک۔ زجاج نے کہا: یہ تین سے پانچ کے درمیان ہے۔ فراء نے کہا: بِضْع کو دس اور بیس سے لے کر نوے تک کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور سو کے بعد اس کو ذکر نہیں کیا جاتا۔

وہ مدت جس میں حضرت یوسف علیہ السلام قید رہے اس کے بارے میں تین قول ہیں۔ ایک: سات سال (5)، یہ ابن جریج قتادہ اور وہب بن منبہ کا قول ہے، وہب نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں مبتلا رہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں رہے۔

دوسرا: بارہ سال، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

تیسرا: چودہ سال، یہ ضحاک کا قول ہے۔ مقاتل نے مجاہد عن ابن عباس کہا: حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پانچ اور کچھ سال رہے۔ اس کا اشتقاق بضعت الشیء سے ہے یعنی تطعته۔ پس یہ عدد کا ایک قطعہ ہے پس اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گزشتہ پانچ سال کی قید کے بعد سات یا نو سال قید کی سزا دی پس بِضْع عقوبت کی مدت ہے نہ کہ کل قید کی مدت۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانہ میں قید رہے اور حضرت ایوب علیہ السلام سات سال آزمائش میں رہے اور بخت نصر کو سات سال مسخ کا عذاب دیا گیا۔ عبداللہ بن راشد بصری نے عن سعید بن ابی عروبہ کہا کہ بِضْع کا اطلاق پانچ سے لے کر بارہ سال کے عرصے کے درمیان پر ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت میں یقین کے حصول کے باوجود اسباب کو پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے۔ بے شک تمام

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اعراف، جلد 2، صفحہ 132　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، سورۂ روم، جلد 2، صفحہ 151

4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 267　　5۔ ایضاً

امور مسبب کے قبضہ میں ہیں لیکن اس نے ایک سلسلہ بنایا ہے اور بعض معاملات کو بعض کے ساتھ ملا دیا ہے پس ان اسباب کو اختیار کرنا سنت ہے اور ان کو انتہا تک پہنچا دینا یقین ہے اور جو چیز اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے وہ نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کرنا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے وقت پیش آیا۔ یہ واضح ہے پس اس میں غور کرو۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝

''اور (کچھ عرصہ بعد ایک روز) بادشاہ نے کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی کھا رہی ہیں انہیں سات دبلی گائیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات خشک سوکھے ہوئے، آؤ درباریو بتاؤ مجھے میرے خواب کی تعبیر اگر تم خوابوں کی تعبیر بتایا کرتے ہو''۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی آزادی قریب آئی تو بادشاہ نے خواب دیکھا۔ جبریل امین نازل ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو سلام کیا اور آزادی کی خوشخبری سنائی اور کہا: اللہ تعالیٰ تجھے قید سے نکالنے والا ہے اور مین میں تجھے اقتدار دینے والا ہے، بادشاہ کو اور جابر لوگوں کو تیرا مطیع و فرمابردار بنائے گا اور تجھے تیرے بھائیوں پر کلمہ علیا عطا فرمائے گا اور یہ اس خواب کی وجہ سے ہے جو بادشاہ نے دیکھا اور وہ یہ ہے اور اس کی تاویل ایسی، ایسی ہے پس آپ قید میں اس سے زیادہ نہیں رہے جتنا کہ بادشاہ نے خواب دیکھا تھا حتی کہ باہر آ گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلے خواب کو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے آزمائش اور سختی بنایا اور دوسری مرتبہ اسی کو خوشخبری اور رحمت بنایا۔ اور وہ یوں کہ بڑے بادشاہ ریان بن ولید نے خواب میں دیکھا کہ گویا خشک نہر سے سات موٹی گائیں نکلیں اور ان کے پیچھے سات دبلی پتلی، عجاف سے مراد کمزور گائیں ہیں۔ تو دبلی گائیں موٹی پر حملہ آور ہوئیں انہیں کانوں سے پکڑا اور سوائے سینگوں کے انہیں کھا گئیں، اور سات سرسبز خوشے دیکھے ان پر سات خشک خوشے حملہ آور ہوئے اور انہیں کھا گئے اور اب ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ بچی اور وہ خشک خوشے سرسبز و شاداب خوشوں کو کھانے کے باوجود خشک ہی رہے اسی طرح دبلی پتلی گاؤں میں بھی موٹی گاؤں کو کھانے کے باوجود کوئی اضافہ نہ ہوا۔ خواب نے بادشاہ کو پریشان کیا تو اس نے لوگوں کو اہل علم کو، جادو، علم نجوم اور کہانت کو جاننے والوں اور معززین قوم کی طرف پیغام بھیجا، اس نے انہیں کہا: یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اس نے اپنا خواب ان کے سامنے بیان کیا، لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ابن جریج نے کہا کہ مجھے عطا نے کہا ہے: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد جھوٹے اور غلط خواب ہیں۔ جویبر نے عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا: کچھ خواب سچے ہوتے ہیں اور کچھ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ یعنی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ہروی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ سے مراد اخلاط احلام ہے۔ لغت میں الضغث سے مراد کسی چیز کا گٹھہ ہوتا ہے جس طرح کہ سبزی، گھاس اور ان کے مشابہ دیگر اشیاء یعنی انہوں نے کہا: آپ کا خواب واضح نہیں ہے۔ احلام سے مراد غلط ملط خواب ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا:

اَضْغَاثُ سے مراد وہ خواب ہے جس کی کوئی تاویل نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ، سَبْعَ کے آخر سے ھا کو حذف کر دیا گیا تا کہ مذکر اور مونث میں فرق رہے۔ سِمَانٍ بقرات کی صفت ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ سَبْعَ بَقَرٰتٍ سمانا بھی جائز ہے اس صورت میں سمانا سبع کی صفت ہوگا اسی طرح خضرا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (الملک: 3) اسی کی طرح ہے، جبکہ ''بقرۃ'' کا مادہ اشتقاق اور معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: بکری اور گائے جب شہر میں داخل ہوں تو اگر وہ موٹی ہوں تو یہ خوشحالی کا سال ہوتا ہے اور اگر وہ دبلی ہوں تو وہ سال سخت ہوتا ہے اور اگر وہ شہر سمندری شہر ہو تو اس میں ان کی تعداد اور حالت کے مطابق کشتیاں آتی ہیں ورنہ وہ پے در پے آزمائشیں ہیں، گویا کہ وہ آزمائشیں گائیں کا منہ ہیں، جس طرح کہ حدیث میں یشبه بعضها بعضا کے الفاظ ہیں اور متن کے حوالے سے ایک اور حدیث میں ہے کانها صیاصی البقر یعنی گویا وہ گائیوں کے سینگ ہیں۔ اس میں مراد ان فتنوں کو گاؤں کے سینگوں کے ساتھ مشابہت دینا ہے اور اگر وہ مکمل طور پر زرد ہوں تو پھر وہ بیماریاں ہیں جو لوگوں پر حملہ آور ہیں اور اگر ان کے رنگ مختلف ہوں، بڑے سینگوں والی ہوں اور لوگ ان سے بھاگ رہے ہوں یا ان کے منہ سے آگ اور دھواں نکل رہا ہو تو وہ لشکر ہے یا غارت گری یا وہ ایسا دشمن ہے جو ان پر حملہ آور ہے اور ان کے گھروں میں اترا ہوا ہے۔ اور بعض اوقات ''بقرۃ'' بیوی، خادم، غلہ اور سال پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں بچہ، غلہ اور بنات ہوتا ہے۔ ''یَاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ''، ''عِجَافٌ'' عَجُفَ یَعْجُفُ بروزن عَظُمَ یَعْظُمُ ہے جبکہ عَجِفَ یَعْجِفُ بروزن حَمِدَ یَحْمَدُ بھی آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ، رؤیا کی جمع رؤی ہے یعنی مجھے اس خواب کے انجام کے متعلق خبر دو اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ یہ عبور النہر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عبرت النهر یعنی میں نہر کے کنارے پر پہنچا، خواب کی تعبیر سے مراد اس کا انجام ہوتا ہے۔ للرؤیا میں لام تبیین کے لیے ہے یعنی اگر تم تعبیر کر سکتے ہو تو بیان کرو۔ زجاج نے کہا: رؤیا کے لیے ہے۔

## قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝

''درباریوں نے کہا: (اے بادشاہ) یہ خواب پریشان ہیں، ہم پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ فراء نے کہا: أَضغاثَ أَحلام بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: نصب بہت دور کی بات ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تو نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کی تعبیر ہو، یہ تو صرف اضغاث احلام یعنی غلط ملط خواب ہیں۔ أضغاث کا واحد ضغث ہے۔ سبزی اور گھاس وغیرہ کے گٹھے کو ضغث کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

کضغث حلم غرّ منه حالمه

وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ زجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم غلط ملط خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

انہوں نے اپنے آپ سے اپسے علم کی نفی کی جس کی تعبیر نہ ہو نہ کہ انہوں نے اپنے آپ سے علم التاویل کی نفی کی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سے تعبیر کے علم کی ہی نفی کر دی۔ اس بنیاد پر اضغاث سے مراد خوابوں کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں سے کچھ صحیح اور کچھ باطل ہوں اسی وجہ سے ساقی نے کہا: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ اس کو پتہ چل گیا کہ لوگ تعبیر کرنے سے عاجز آ گئے ہیں یہ نہیں کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تعبیر ہے ہی نہیں۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے تفسیر و تعبیر کا قصد و ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے بادشاہ کے سینے سے ان کو مٹانا چاہا تا کہ اس کا دل ان میں مشغول نہ ہو۔ اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس کا علم تھا۔ الْاَحْلَامِ ''حلم'' کی جمع ہے اور حلم اسے کہتے ہیں جس کو سونے والا دیکھتا ہے اسی سے حلم اور احتلم ہے اسی طرح حَلَمْتُ بکذا وحلمته بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَحَلَمْتُهَا وبَنُو رُفَيْدَةَ دُونَهَا لَايَبْعَدَنَّ خَيَالُهَا الْمَحْلُومُ

اس کی اصل اناۃ ہے جبکہ اسی سے حلم ہے جو طیش کی ضد ہے نیند کے اندر دکھائی دی جانے والی بات کو حلم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ نیند اطمینان اور سکون کی حالت ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اس آدمی کے قول کے بطلان پر دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ خواب اس آدمی پر واقع ہو جاتی ہے جو اس کی تعبیر بتاتا ہے کیونکہ لوگوں نے کہا: اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ حالانکہ ایسا ہوا نہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر خشک سالی اور خوش حالی کے ساتھ کی اور معاملہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آپ نے اس کی تعبیر کی۔ اس میں اس بات کے فاسد ہونے پر دلیل ہے کہ خواب اڑتے پرندے کی ٹانگ پر ہوتا ہے، جب اس کی تعبیر کی جائے تو واقع ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد میں بتاتا ہوں تمہیں اس خواب کی تعبیر، مجھے (قید خانہ) تک جانے دیجئے۔ اے یوسف! اے صدیق! بتائیے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازہ گائیں ہیں، کھا رہی ہیں انہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک تا کہ میں (آپ کا جواب لے کر) واپس جاؤں لوگوں کی طرف شاید وہ (آپ کے علم و فضل کو) جان لیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا یعنی بادشاہ کا ساقی وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ یعنی عرصہ بعد (1) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سے مروی ہے، اور اسی سے الی اُمة معدودة ہے۔ ابن درستویہ نے کہا: اُمته سے مراد حین نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ اس میں مضاف کو حذف نہ مانا جائے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام نہ رکھا جائے گویا کہ وادکر بعد حین اُمة یا

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 270

بعد زمن أمة یا اس جیسے الفاظ کہے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور اُمة لوگوں کی بڑی جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ لفظا واحد ہے جبکہ معنی میں جمع، اور حیوانات کی ہر جنس ایک امت ہے حدیث طیبہ میں ہے: لولا أن الکلاب أمة من الأمم لأمرت بقتلها (1) یعنی اگر کتے ایک امت نہ ہوتے تو میں انہیں قتل کرنے کا حکم دیتا۔

اللہ کے ارشاد وَادَّكَرَ سے مراد یہ ہے کہ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی ضرورت یاد آئی اور وہ آپ کا قول اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ہے۔ عفان نے ہمام عن قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وادکر بعد أمة پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس، عکرمہ اور ضحاک کی معروف قرأت وادکر بعد أمة ہے ہمزہ کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ معنی ہوگا کہ وہ اس کو یاد آیا بھول جانے کے بعد۔ شاعر نے کہا:

أَمِهْتُ وكنتُ لَا أَنسَى حديثًا كذاكَ الدهرُ يُودِي بالعقولِ

جمیل بن عزرۃ الضبعی سے ہے: بعد أمه الف کے فتحہ، میم کے سکون اور ہا کے ساتھ اور یہ الأمه کی مثل ہے یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی نسیان ہے۔ جب کوئی بھول جائے تو کہا جاتا ہے: أَمِهَ يَأْمَهُ أَمَهًا۔ اس بنیاد پر وادکر بعد أمه ہوگا۔ اس کو نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور رجل امه سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل جاتی رہی ہو۔ جوہری نے کہا: جوزہری کی حدیث میں أمه بمعنی اقرار اور اعتراف ہے تو یہ لغت غیر مشہورہ ہے۔ اُشہب عقیلی نے کہا: بعد إمة یعنی بعد نعمة، یعنی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نجات کے ذریعے انعام فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: وہ نوجوان حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قضا کی وجہ سے بھول گیا تا کہ آپ کچھ مدت قید خانہ میں رہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: وہ بھولا نہیں تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں بادشاہ کو دوبارہ اس کا وہ جرم یاد نہ آجائے جس کی وجہ سے بادشاہ نے اسے اور نانبائی کو قید کیا تھا وَادَّكَرَ یعنی اس نے ذکر کیا اور خبر دی۔ نحاس نے کہا: اذکر کی اصل اذتکر ہے ذال، تا کا قریب المخرج حرف ہے اس کو اس میں ادغام کرنا جائز نہیں کیونکہ ذال مجہورہ ہے اور تا مہموسہ، اگر ادغام کیا جائے تو جہر جاتا رہے گا سو تا کا حرف مجہورہ کے ساتھ ابدال کیا گیا جو کہ دال ہے اور تا کو دال سے بدلنا اس کو طا کے ساتھ بدلنے سے بہتر ہے کیونکہ طا مطبقہ ہے تو اس طرح یہ اذدکر ہوگیا پس ذال کو دال میں ادغام کر دیا گیا دال کی رخاوت اور لین کی وجہ سے۔ پھر ارشاد فرمایا: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ یعنی میں تمہیں خبر دیتا ہوں۔ حضرت حسن نے أنا آتیکم بتاویله پڑھا ہے۔ بادشاہ نے کہا: ایک عجمی کافر انہیں کیسے بتائے گا؟ نحاس نے کہا: اُنَبِّئُكُمْ کا معنی ہے: میں تمہیں صحیح اور عمدہ خبر دوں گا، یعنی میں پوچھوں گا پھر تمہیں خبر دوں گا۔

فَاَرْسِلُوْنِ وہ مخاطب تو بادشاہ کو ہوا مگر تعظیما جمع کا صیغہ استعمال کیا یا پھر وہ بادشاہ اور اہل مجلس کو مخاطب ہوا۔ يُوْسُفُ ندا مفرد ہے اسی طرح الصِّدِّيْقُ یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ اَفْتِنَا یعنی انہوں نے اسے بھیجا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: اے صدیق! اور آپ سے بادشاہ کے خواب کے متعلق پوچھا۔ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ یعنی بادشاہ اور اس کے اصحاب کی طرف۔ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس کا مفعول التعبیر ہے یا پھر اس کا مفعول مکانك من الفضل والعلم ہے یعنی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصید، حدیث 2462۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، باب النهی عن اقتناء الطلب حدیث 2195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شاید وہ علم و فضل میں آپ کے مقام و مرتبہ کو جان لیں اور آپ کو آزاد کر دیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ النّاس سے مراد بادشاہ ہو اور تعظیماً اسے ایسا کہا گیا ہو۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝

''آپ نے فرمایا کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسب دستور تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لیے نکال لو) جسے تم کھالو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ تَزْرَعُوْنَ جب اس نے آپ کو خواب کے بارے میں بتایا تو آپ نے اس کے سامنے اس کی تفسیر کرنا شروع کی، آپ نے فرمایا: سات موٹی تازہ گائیں اور شاداب خوشوں سے مراد سات سرسبز و شاداب سال ہیں۔ اور دبلی پتلی اور لاغر گائیں اور خشک خوشے سات قحط والے سال ہیں۔ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا یعنی لگاتار، مسلسل، یہ مصدر علی غیر المصدر ہے کیونکہ تَزْرَعُوْنَ کا معنی تدأبون کعادتکم فی الزراعة سبع سنین یعنی تم اپنی عادت کے مطابق سات سال کاشت کرتے رہو گے۔ ایک قول یہ ہے: یہ حال ہے یعنی دائبین۔ ایک قول یہ ہے: سَبْعَ سِنِيْنَ کی یہ صفت ہے یعنی دائبة۔ ابو حاتم نے یعقوب سے دأبا حکایت کیا ہے حمزہ کی حرکت کے ساتھ۔ اسی طرح حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں، ابو حاتم کا قول ہے: یہ دئب سے ہے۔ نحاس نے کہا: اہل لغت صرف دأب کو ہی جانتے ہیں۔ دوسرا قول۔ یہ متحرک ہے کیونکہ اس میں حروف حلق میں سے ایک حرف ہے یہ فراء کا قول ہے فراء نے کہا: اور اسی طرح ہر وہ حرف جس کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہو تو اس کی تثقیل جائز ہے جب اس کا دوسرا حرف ہمزہ، ہا، عین، غین، حا اور خا ہو اور اس کی اصل عادت ہے، شاعر نے کہا:

كَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا (1)

جس طرح حویرث کی ماں سے پہلے تمہاری عادت اور طریقہ ہے۔
اس کے متعلق گفتگو سورۃ ''آل عمران'' میں گزر چکی ہے۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ ایک قول یہ ہے: (آپ نے یہ حکم اس لیے دیا) تاکہ اسے گھن نہ لگ جائے اور وہ زیادہ باقی رہنے والا ہو جائے؛ دیار مصر میں ایسا ہی ہوتا ہے اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ یعنی ضروری مقدار اس میں سے نکال لو، آپ کی طرف سے یہ قول امر ہے جبکہ پہلا خبر یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا بھی امر ہو مگر زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ وہ خبر ہے، تو تَزْرَعُوْنَ کا معنی ''ازرعوا'' ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت کریمہ مصالح شرعیہ یعنی حفظ الادیان، حفظ النفوس، حفظ العقول، حفظ الانساب اور حفظ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 274

الاموال کے حوالے سے اصل وضابطہ ہے پس ہر وہ چیز جو ان امور میں سے کسی امر کے حصول کی ضامن ہو تو وہ مصلحت ہے اور جو ان میں سے کسی چیز کو ختم کرنے والی ہو وہ مفسدہ ہے اس کو دور کرنا مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شرائع کا مقصود لوگوں کو ان کے دنیوی مصالح کی طرف رہنمائی کرنا ہے تا کہ ان کے ذریعے ان پر اللہ تعالیٰ کی معرفت وعبادت حاصل ہو جائے جو اخروی سعادت تک پہنچانے والی ہیں۔ اس کی رعایت اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ورحمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر فرمایا جو نہ تو اس پر واجب ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا استحقاق ہے یہ تمام اہل سنت کے جملہ محققین کا مذہب ہے اس کی تفصیلات اصول فقہ میں ہیں۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۞

''پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا ان کے لیے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: سَبْعٌ شِدَادٌ یعنی قحط والے سال۔ يَّاْكُلْنَ مجاز ہے اور معنی ہوگا یاکلن أهلهن، مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ یعنی جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہوگا۔ جس طرح کہ کہنے والے کا قول:

نهارُك یا مغرورُ سَهوٌ وغَفلَةٌ ولَیلُكَ نَومٌ والرَّدَی لَكَ لازمُ (1)

اے مغرور! تیرا دن بھول اور غفلت ہے اور تیری رات نیند ہے اور گھٹیا پن تجھے لازم ہے۔ (سہو وغفلت کی نسبت دن کی طرف اور نیند کی نسبت رات کی طرف)

حالانکہ دن نہیں بھولتا اور رات نہیں سوتی بلکہ دن میں بھولا جاتا ہے اور رات میں سویا جاتا ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے بیان کیا: حضرت یوسف علیہ السلام دو آدمیوں کا کھانا رکھتے اور اسے ایک آدمی کے قریب کرتے تو وہ اس کا بعض حصہ کھا لیتا یہاں تک کہ جب وہ دن آیا تو آپ نے وہ اس کے قریب کیا تو وہ سارا کھا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ ان سات سخت سالوں میں سے پہلا دن ہے۔ اِلَّا قَلِيْلًا استثنا کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ یعنی اس میں سے جو تم محفوظ رکھتے ہو تا کہ تم اسے کاشت کرو، کیونکہ بیج کو باقی رکھنے میں خوراک کی حفاظت ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: تم جس کو حرز میں رکھتے ہو۔ قتادہ نے کہا: تُحْصِنُوْنَ کا معنی تدخرون یعنی تم ذخیرہ کرتے ہو۔ معنی ایک ہی ہے، یہ بات ضرورت کے وقت کے لیے کھانے کو ذخیرہ کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت کافر کے خواب کے صحیح ہونے میں اصل ہے اور اس کی تعبیر وہی کی جائے گی جو اس نے دیکھا بالخصوص جب اس کا تعلق کسی مومن کے ساتھ ہو۔ (اگر کافر کے خواب کی یہ صورتحال ہے تو) اس خواب کی کیا کیفیت ہوگی جو نبی کے لیے اللہ کی نشانی، رسول کے لیے معجزہ، مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے لیے تصدیق اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 275

درمیان واسطہ کے لیے محبت بن رہا ہو۔

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝

''پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کے لیے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ایسی خبر ہے جو بادشاہ کے خواب میں نہیں تھی بلکہ یہ اس علم غیب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک سال کے علم کا اضافہ فرمادیا جس کے متعلق انہوں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا اس کا سبب آپ کی فضیلت کا اظہار اور علم و معرفت میں آپ کا مقام و مرتبہ کا اعلان تھا۔ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ یہ الإغاثه یا الغوث سے مشتق ہے۔ آدمی نے مدد طلب کی، اس نے کہا: واغوثاہ۔ اور اسم الغوث، الغُواث اور الغَواث ہے اور استغاثنی فلان فأغثته یعنی فلاں نے مجھ سے مدد طلب کی تو میں نے اس کی مدد کی۔ اور اسم الغیاث ہے، واؤ، ماقبل کے کسرہ کی وجہ سے یا ہوگیا۔ اور الغیث بارش کو کہتے ہیں۔ قد غاث الغیث الارض سے مراد بارش کا زمین کو پہنچنا ہے۔ اور غاث اللہ البلاد یُغیثها غیثا، اور غِیثتِ الارض تغاث غیثاً فهی ارض مَغیثة مغیوثه، تو یغاث الناس کا معنی ہوگا ان پر بارش برسائی جائے گی۔ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ انگور اور تیل نچوڑیں گے، امام بخاری نے اس کو ذکر کیا ہے۔ حجاج نے ابن جریج سے روایت کیا: وہ انگور کو بطور شراب، تل اور زیتون کو بطور تیل نچوڑیں گے۔ ایک قول یہ ہے: دودھ دُھنا مراد ہے (اس کو نچوڑنے کے قول کے ساتھ ذکر کرنا) اس کی کثرت کی وجہ سے ہوگا۔ اور یہ نباتات کی کثرت پر دلالت ہے۔ ایک قول یہ ہے: يَعْصِرُوْنَ سے مراد ہے کہ وہ نجات پائیں گے اس صورت میں یہ العصرة سے مشتق ہوگا۔ ابو عبیدہ نے کہا: ''العصر'' ص کی حرکت کے ساتھ ملجاء و منجاء کو کہتے ہیں۔ اسی طرح العصرة بھی ہے۔ ابو زبید نے کہا:

صَادِيًا يَسْتَغِيثُ غَيْرَ مُغَاثٍ ولقد كَانَ عُصْرَةَ المنجود (1)

المنجود سے مراد فزع ہے اور اعتصرت بفلان و تعصرت یعنی میں نے اس کی پناہ لی۔ ابو الغوث نے کہا: يَعْصِرُوْنَ سے مراد يَسْتَغِلُّون ہے کہ وہ غلہ حاصل کریں گے اس صورت میں یہ عصر العنب سے مشتق ہوگا۔ اور اعتصرت ماله سے مراد یہ ہوگا کہ میں نے اس کے قبضہ سے اس کو نکالا۔ عیسیٰ نے تُعْصَرُون پڑھا ہے یعنی تا کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ، معنی ہوگا: تم پر بارش برسائی جائے گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ (النباء) اور یہی معنی ہوگا تُعْصِرُونَ کا یعنی تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 276

رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''(یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا: (فوراً) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا: لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے پوچھو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ، بے شک میرا پروردگار تو ان کے مکر (وفریب) سے خوب آگاہ ہے۔ بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا: کیا معاملہ ہوا تمہارا جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا اس سے مطلب براری کے لیے (بیک زبان) بولیں: حاشاللہ! نہیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرہ برائی، عزیز کی بیوی (گویا رائے ضبط نہ رہا) کہنے لگی: اب تو آشکار ہو گیا حق میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا اپنی مطلب براری کے لیے بخدا وہ تو سچا ہے''۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ یعنی قاصد گیا اور بادشاہ کو خبر دی تو بادشاہ نے کہا: ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ یعنی اس نے آپ کو نکلنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا: ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ یعنی عورتوں کی حالت الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ تو آپ نے نکلنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ بادشاہ کے نزدیک آپ کی برأت ثابت ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ آپ بغیر جرم کے قید میں رہے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن اسحاق بن ابراہیم ہیں''(1)۔ آپ نے فرمایا: ''اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے، پھر مجھے قاصد بلانے آتا تو میں اس کے بلانے پر چلا جاتا''۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ۔

آپ نے فرمایا: ''اور اللہ کی رحمت ہو لوط علیہ السلام پر انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی جب انہوں نے کہا: لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (ہود) پس ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا وہ اپنی قوم میں سے اعلیٰ ترین خاندان سے مبعوث فرمایا''۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے انہوں نے رکن شدید کی پناہ لی تھی اور اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف علیہ السلام رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (بقرہ:260) کیا تو ایمان نہیں رکھتا آپ نے کہا: کیوں نہیں لیکن (میں نے ایسا اس لیے کیا) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے آپ صبر کرنے والے، بردبار تھے اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 139
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 680

جتنی آپ رہے تھے تو میں بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا اور (اپنے بے قصور ہونے کے) عذر تلاش نہ کرتا''۔

اسی طرح کی حدیث عبدالرحمٰن بن قاسم جو امام مالک کے۔ تھی ہیں ان کی سند سے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں مروی ہے، اور دیوان میں ابن قاسم کی اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں۔ طبری کی روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام پر رحم فرمائے اگر میں قید ہوتا پھر میری طرف قاصد بھیجا جاتا تو میں جلدی جلدی نکلتا، حضرت یوسف علیہ السلام بردبار اور پرسکون طبیعت کے مالک تھے'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور ان کے کرم پر تعجب ہوتا ہے اللہ ان کی مغفرت کرے جب ان سے گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا، اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو بالکل جواب نہ دیتا اور یہ شرط رکھتا کہ (پہلے) وہ مجھے قید خانے سے نکالیں اور مجھے ان پر تعجب ہوتا ہے جب ان کے پاس قاصد آیا، اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو میں دروازے کی طرف جلدی کرتا''۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فعل اطمینان اور صبر تھا اور گھر کی براءت کا مطالبہ تھا، روایت کے مطابق اس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ آپ نکلیں، بادشاہ کے ہاں مقام و مرتبہ حاصل کرلیں اور وہ درگزر کرتے ہوئے آپ سے جرم سے خاموشی اختیار کرلے تو لوگ ہمیشہ اسی آنکھ سے آپ کو دیکھتے رہیں گے اور کہتے رہیں گے: یہ ہے وہ جس نے اپنے آقا کی بیوی کو بہلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ آپ اپنی براءت کو واضح کردیں اور پاکدامنی اور بھلائی میں سے اپنے مقام و مرتبہ کو ثابت کردیں اور اس وقت آپ مقام و مرتبہ کے لیے نکلیں گے، پس اس وجہ سے آپ نے قاصد کو کہا: اپنے مالک کے پاس لوٹ جا اور اسے کہہ کہ عورتوں کا کیا معاملہ ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد صرف یہ تھا کہ تو اس کو کہہ کہ میرے جرم کو دیکھ اور میرے معاملہ میں غور و فکر کر کہ کیا تو نے حق کے ساتھ قید کیا یا ظلم کے ساتھ اور آپ نے عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا یا تو یہ آپ کی حسن معاشرت ہے یا پھر عزیز کی مذمت کے حوالے سے اس کی رعایت فرماتے ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر، اناءت اور جلدی نہ نکلنے کی تعریف کیسے فرمائی حالانکہ اپنے آپ کو اس مقام سے ہٹالیا جس مقام کی وجہ سے آپ نے ان کی تعریف فرمائی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ایک اور رائے اختیار فرمائی اس میں بھی عمدگی موجود ہے آپ فرماتے ہیں: اگر میں ہوتا تو نکلنے میں جلدی کرتا، پھر اس کے بعد میں نے اپنا عذر پیش کیا، اور وہ یہ ہے کہ یہ قصص اور واقعات اس لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ قیامت تک کے لیے لوگ ان کی اقتدا کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو زیادہ محتاط بات پر ابھارنا چاہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات میں احتیاط کو چھوڑنا بعض اوقات قید میں رہنے ہی کو لازم کردیتا ہے اور اس کے قید سے نکلنے کی صورت کو دوبارہ ختم بھی کرسکتا ہے اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی وجہ سے اس سے امن حاصل تھا جبکہ آپ کے علاوہ دیگر لوگوں کو یہ امن حاصل نہیں ہوتا تو وہ حالت جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو بیان فرمایا وہ احتیاط کی حالت ہے اور جو کچھ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا وہ بہت بڑا صبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ آپ نے تمام عورتوں کا ذکر کیا تاکہ کنایۃً ان میں عزیز کی بیوی بھی داخل

1۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 279

ہو جائے اور صراحۃً اس کا ذکر نہ ہو یہ آپ کا حسن معاشرت ہے۔ کلام میں حذف ہے اصل میں فاسألہ أن یتصرف ماہال النسوۃ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بادشاہ نے عورتوں اور عزیز مصر کی طرف پیغام بھیجا۔ عزیز مصر فوت ہو چکا تھا۔ پس اس نے انہیں بلایا قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اور کہا: تمہارا معاملہ کیا ہے۔ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عورتوں میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اپنی مطلب براری کے لیے کہا تھا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے یا پھر ہر ایک کے قول سے مراد یہ ہے کہ عزیز کی بیوی نے ظلم کیا تو یہ ان عورتوں کی طرف سے مطلب براری ہی تھا۔ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی معاذ اللہ۔ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ، سُوْٓءٍ سے مراد زنا ہے قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ جب اس نے عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کا اقرار کرتے دیکھا اور اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ انکار کی صورت میں عورتیں اس کے خلاف گواہی دیں گی تو اس نے بھی اقرار کر لیا۔ اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔ حَصْحَصَ الْحَقُّ یعنی واضح اور ظاہر ہو گیا۔ اس کی اصل حصص ہے ایک قول یہ ہے: اصل حَصْحَصَ ہی ہے جس طرح کببوا کے بارے میں کُبْكِبُوا اور کفف کے بارے میں کفکف ہے، یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ الحص کی اصل کسی چیز کا استیصال ہے۔ حص شعرۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس کو جڑ سے اکھیڑ دے۔

ابو القیس بن الاسلت نے کہا:

قد حَصَّتِ البيْضَةُ رأسِي فَمَا أطْعَمُ نومًا غيرَ تَهْجاعِ

اور سَنَةٌ حصاء سے مراد ایسا سال ہے جس میں بھلائی نہ ہو۔ جریر نے کہا:

يأوِي إليكم بلَامَنٍّ ولا جَحَدٍ مَن ساقه السَّنةُ الحَصَّاءُ والذِّيبُ

شاعر نے گویا کہ ''الضبع'' کہنا چاہا ہے، اور اس سے مراد قحط زدہ سال ہے؛ قافیہ کی وجہ سے ان کی جگہ ''الذیب'' کو ذکر کر دیا ہے۔ حَصْحَصَ الْحَقُّ کا معنی یہ ہے کہ حق اپنے ظاہر اور ثابت ہونے کی وجہ سے باطل سے جدا ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

ألَا مُبلِغٌ عنّيَ خِدَاشًا فإنّهُ كذوبٌ إذا ما حَصْحَصَ الحقُّ ظالمُ

ایک قول یہ ہے: یہ حصۃ سے مشتق ہے معنی یہ ہوگا: حق کا حصہ باطل سے جدا ہو گیا۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: اس کی اصل عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے، حصّ شعرۃ جب اسے جڑ سے اکھیڑ لیا گیا ہو، اسی سے الحصۃ من الأرض ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اسے کاٹ لیا جائے اور الحصحص کسرہ کے ساتھ مٹی اور پتھر کو کہتے ہیں، جوہری نے یہ ذکر کیا ہے۔ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یہ بھی عزیز کی بیوی کا قول ہے اگرچہ اس سے اس کے بارے میں پوچھا نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ بات توبہ کے اظہار کے لیے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی اور کرامت کو ثابت کرنے کے لیے کی، کیونکہ اقرار کرنے والے کا اپنے خلاف اقرار کرنا اس کے خلاف دی جانے والی شہادت کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے شہادت اور اقرار دونوں کو جمع کر دیا تا کہ گمان کسی آدمی کی عقل کو نہ ڈھانپ لے اور نہ ہی اس میں شک کی آمیزش ہو۔ خَطْبُكُنَّ اور رَاوَدْتُّنَّ میں نون کے مشدد ہونے کی وجہ یہ ہے

کہ یہ مذکر میں پائی جانے والی میم اور واؤ کی طرح ہے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

''یہ میں نے اس لیے کہا تھا تا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں خیانت نہیں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو۔ اور میں اپنے نفس کی برأت (کا دعویٰ) نہیں کرتا۔ بے شک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمادے، یقیناً میرا رب غفور رحیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بات کس نے کہی، ایک قول یہ ہے: یہ عزیز مصر کی گفتگو میں سے ہے اور یہ اس کے قول الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ کے ساتھ متصل ہے یعنی اس نے کہا کہ میں نے سچائی کا اقرار کیا تا کہ وہ جان لے کہ میں نے غیب میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی یعنی اس کے خلاف جھوٹ نہیں بولا اور اس کی عدم موجودگی میں برائی کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ میں نے سچ بولا اور خیانت سے نکل گئی پھر اس نے کہا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ بلکہ میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا؛ اسی بنیاد پر وہ صانع کا اقرار کر رہی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کہا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ قاصد کو واپس لوٹانے والا جو کام میں نے کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے تا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ یہ حسن، قتادہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ بِالْغَيْبِ کا معنی وھو غائب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ گفتگو بادشاہ کی موجودگی میں کی اور فرمایا: لِيَعْلَمَ (غیب کا صیغہ استعمال کیا) اس سے مقصود بادشاہ کی توقیر و احترام تھا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے یہ گفتگو اس وقت کی جب قاصد دوبارہ آپ کے پاس آیا اور آپ ابھی قید خانہ میں تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس خبر لے کر آیا، اور جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے؛ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ یعنی میں نے اپنے آقا کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا: اے یوسف! (اس وقت بھی آپ نے خیانت نہیں کی) جب آپ نے چادر کھولی اور اس طرح بیٹھے جس طرح مرد (اپنی) عورت کے پاس بیٹھتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ الایۃ۔ سدی نے کہا: عزیز کی بیوی نے آپ کو کہا کہ اس وقت بھی خیانت نہیں کی جس وقت اے یوسف! تو نے اپنی سروال اتار دی تھی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (☆) اور ایک قول یہ ہے: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے؛ یعنی یہ اس وجہ سے ہوا تا کہ یوسف جان لے

☆ ایسی روایات کے بارے میں تبصرہ گزر چکا ہے۔ مترجم

کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی، اور میں اس کی امانت پر اسے انعام و جزا دینے سے غافل نہیں ہوا۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآىٕنِیْنَ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ان کے فریب کے ہوتے ہوئے ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ایک قول یہ ہے: یہ عورت کی گفتگو کا حصہ ہے۔ قشیری نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اور وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: جب یہ احتمال ہے کہ یہ عورت کے کلام میں سے ہو تو پھر اس احتمال پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تا کہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کو چادر اور سروال کھولنے سے بری قرار دیں اور جب ہم اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا کلام سمجھیں گے تو پھر یہ ان امور میں سے ہوگا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں آئے تھے جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے وَ هَمَّ بِهَا (یوسف: 24) کے متعلق مختار قول گزرا ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: بعض لوگوں نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک عزیز کی بیوی کی گفتگو کا حصہ ہے، کیونکہ یہ اس کے قول اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ کے ساتھ متصل ہے۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے هم کی نفی کرتے ہیں۔ پس جس نے ان کے قول پر بناء کی ہے اس نے کہا: قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک کا کلام متصل ہے اور اس میں فی الحقیقت وقف تام نہیں ہے۔ ہم (قرطبی) نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس جانب گئے ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ تو اللہ کے نبی کو اپنے ہی نفس کا تزکیہ اچھا نہ لگا تو فرمایا: وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کیونکہ اپنے ہی نفس کا تزکیہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النجم: 32) اپنے آپ کو پاک و طاہر قرار نہ دو۔ ہم (قرطبی) نے اس کو سورۃ ''النساء'' میں بیان کر دیا ہے ایک قول یہ ہے: یہ عزیز کی گفتگو کا حصہ ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بدگمانی سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دیتا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یعنی اس میں برائی کی خواہش ہوتی ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ استثنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور مَا بمعنی من ہے یعنی الا من رحم ربی جس پر میرا رب رحم فرمائے تو وہ اس سے بچ جاتا ہے۔ اور مَا کا بمعنی من استعمال ہونا کثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: 3) یہاں بھی بمعنی من ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے، کیونکہ یہ نفس امارہ کے زنا سے بچنے کے ذریعے رحم کیے جانے کی استثنا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے ایسے ساتھی کے بارے میں کیا کہتے ہو کہ اگر تم اس کی عزت کرو، اطاعت کرو اور اسے کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں برائی کی انتہا تک لے جائے اور اگر تم اس کی اہانت کرو، اسے ننگا کرو اور اس کی مخالفت کرو تو وہ تمہیں بھلائی کی انتہا تک لے جائے''۔ ان (صحابہ) نے کہا: یا رسول اللہ! یہ زمین میں برا دوست ہے، آپ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ تمہارے ان نفوس کا دوست ہے جو تمہارے پہلوؤں میں ہیں۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا

مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

''اور بادشاہ نے حکم دیا کہ لے آؤ اسے میرے پاس میں چن لوں گا اسے اپنی ذات کے لیے، پھر جب اس نے آپ سے گفتگو کی (اور مطمئن ہو گیا) تو کہا: آپ آج سے ہمارے ہاں بڑے محترم (اور) قابل اعتماد (درباری) ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ جب بادشاہ کے سامنے آپ کی برأت ثابت ہوگئی، اس واقعہ میں آپ کی امانت متحقق ہوگئی اور وہ آپ کے صبر اور حوصلے کو بھی پہچان گیا تو اس کے نزدیک آپ کا مقام بڑھ گیا اور اسے آپ کی دوستی کی عمدگی کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا: ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ بادشاہ کی گفتگو کو ملاحظہ کرو کہ جب آپ کا علم ثابت ہوا تو اس نے صرف ائْتُوْنِیْ بِهٖ کہا اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دوبارہ یہ معاملہ کیا تو اس نے ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ کہا۔ حضرت وہب بن منبہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا گیا تو آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: مخلوق میں سے مجھے میرا رب کافی ہے، اس کا پڑوس عزت والا ہے، اس کی تعریف اعلیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر آپ داخل ہوئے، جب بادشاہ نے آپ کی طرف دیکھا تو اپنے تخت سے نیچے اترا اور آپ کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑا پھر بادشاہ نے آپ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور کہا: اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ حضرت یوسف نے اسے کہا: اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ یعنی خزانوں کی (حفاظت کرنے والا) عَلِیْمٌ اس کے اندر تصرف کے طریقوں کو (جاننے والا)۔ ایک قول یہ ہے: حساب کو یاد کرنے والا، زبانوں کو جاننے والا۔ حدیث میں ہے: ''اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو اسی وقت وہ آپ کو بنا دیتا لیکن اس نے اس معاملہ کو ایک سال تک مؤخر کر دیا''۔ ایک قول یہ ہے: آپ کی ملکیت کو ایک سال تک اس لیے مؤخر کیا گیا کہ آپ نے اِن شاء اللہ نہ کہا۔ اور اس واقعہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پاس گئے تو آپ نے کہا: یا اللہ! اس کی بھلائی میں سے میں تیری بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور اس کے شر اور دیگر لوگوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، پھر آپ نے بادشاہ کو عربی میں سلام کیا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے پھر آپ نے اسے عبرانی میں بلایا تو اس نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے باپ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی زبان۔ بادشاہ ستر زبانوں میں گفتگو کرتا تھا تو جب بھی بادشاہ کسی زبان میں گفتگو کرتا حضرت یوسف علیہ السلام اسے اسی زبان میں جواب دیتے تو بادشاہ آپ کی اس صورتحال سے متعجب ہوا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ پھر اس نے آپ کو اپنے تخت پر بٹھایا اور کہا: میں آپ سے اپنا خواب سننا چاہتا ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ہاں اے بادشاہ! تو نے سات موٹی تازہ چمکدار گائیں دیکھیں۔ آپ کے سامنے دریائے نیل کو ان سے ظاہر کر دیا گیا وہ نیل کے کنارے سے تیرے پاس آئیں ان کے تھن دودھ سے بھر رہے تھے اسی دوران تو نے ان کی طرف دیکھا اور ان کی خوبصورتی سے تو حیران ہوا۔ اس دوران نیل کا پانی جذب ہو گیا اور اس کی خشکی ظاہر ہوگئی تو اس کے کیچڑ سے سات دبلی پتلی گائیں نکلیں جن کے بال بکھرے ہوئے، پراگندہ اور پیٹ سکڑے ہوئے تھے، ان کی نہ کوئی کھیریاں

تھیں اور نہ ہی تھن۔ ان کے دانت داڑیں تھیں اور کتے کے پاؤں جیسے پاؤں تھے اور سونڈ درندوں جیسے تو وہ موٹی تازہ گائیوں کے ساتھ مل گئیں انہوں نے انہیں درندوں کی طرح چیرا پھاڑا، ان کے گوشت کھا گئیں، ان کی جلدوں کو پھاڑ دیا، ان کی ہڈیوں کو انہوں نے توڑ دیا اور ان کے دماغ نکال دیئے اس دوران تو ان کو دیکھتا رہا اور حیران ہوا کہ انہوں نے کیسے غلبہ حاصل کرلیا حالانکہ وہ کمزور ہیں؟ پھر ان میں کوئی موٹا پا ظاہر نہ ہوا اور نہ ہی انہیں کھانے کے بعد ان میں کوئی اضافہ ہوا۔

سات سرسبز و شاداب اور نرم و نازک خوشے تھے جو دانوں اور پانی سے بھرے ہوئے تھے، ان کی دوسری جانب سات خشک خوشے تھے جن میں نہ کوئی پانی تھا اور نہ ہی شادابی، ان کی ٹہنیاں مٹی اور پانی میں تھیں اسی دوران تو اپنے آپ سے کہتا ہے: یہ کون سی چیز ہے؟ یہ شاداب پھل ہیں اور وہ سیاہ خشک جبکہ ان کا اگنے والا تنا ایک ہی ہے، ان کی جڑیں پانی میں ہیں، تب ہوا چلی تو اس نے سیاہ خشک پتوں کو شاداب پھلدار پتوں پر ڈال دیا تو ان میں آگ بھڑک اٹھی تو اس نے انہیں جلا دیا تو وہ سیاہ راکھ بن گئے تو اے بادشاہ! تو خوف زدہ ہو کر بیدار ہوگیا، بادشاہ نے کہا: اللہ کی قسم! اس کی حقیقت کیا ہے اگرچہ یہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھی جو میں نے آپ سے سنی اے صدیق! میرے خواب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تو کھانا جمع کرے گا اور ان شاداب سالوں میں بہت زیادہ کھیتی کاشت کرے گا، اگر تو کسی پتھر یا کیچڑ پر کاشت کرے گا تو وہ بھی اگے گا اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ بڑھوتری اور برکت ظاہر فرمائے گا پھر تو ان خوشوں سے فصل اٹھائے گا اس کے لیے بڑے بڑے بھڑولے بنائے جائیں گے؛ تو خوشے اور پودے جانوروں کا چارہ بنیں گے جبکہ دانے لوگوں کے لیے ہوں گے، تو لوگوں کو حکم دے گا، وہ اپنے کھانے میں سے تیرے بھڑولوں میں پانچواں حصہ پہنچائیں گے تو جو کھانا تو جمع کرے گا وہ تمام شہر والے لوگوں اور اردگرد رہنے والے لوگوں کے لیے کافی ہوگا گرد و نواح سے لوگ تیرے پاس آئیں گے اور تجھ سے لے کر جائیں گے اور تیرے پاس اتنا خزانہ جمع ہوجائے گا کہ تم سے پہلے کسی کے پاس بھی جمع نہیں ہوا ہوگا۔ تو بادشاہ نے کہا: ان امور کی تدبیر کون کرے گا؟ اگر سب شہر والوں کو جمع کیا جائے تو وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ اس سلسلہ میں امانت سے کام لینے والے نہیں ہیں، تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ۔ خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ سے مراد علی خزائن ارضك ہے یہ خزانۃ کی جمع ہے اور اضافت کے عوض اس پر الف، لام آیا ہے، جس طرح نابغہ کا قول ہے:

لَهُمْ شِيمَةٌ لم يُعْطِهَا الله غَيْرَهُمْ مِنَ الْجُودِ وَالْأَحْلَامُ غَيْرُ كَوَاذِبِ

(والاحلام اصل میں احلامہ ہے تو اضافت کے عوض احلام پر الف لام آیا ہے۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ قید خانے میں جاری ہوا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کے پاس کیا گیا ہو پھر اس نے دوسری مجلس میں ائْتُوْنِیْ بِهٖ تاکیداً کہا ہو۔ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ یعنی میں اس کو اپنے لیے خالص بنالوں گا، اپنی مملکت کے امور اس کے سپرد کروں گا۔ تو وہ گئے اور آپ کو لے آئے۔ اس بات پر فَلَمَّا كَلَّمَهٗ دلالت کرتا ہے، یعنی بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام

کے ساتھ کلام کیا اور آپ سے خواب کے بارے میں پوچھا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا، قَالَ بادشاہ نے کہا: اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ مکین سے مراد متمکن ہے جس کا قول نافذ ہو'امین' تجھے دھوکے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝

''آپ نے فرمایا: مجھے مقرر کر دے زمین کے خزانوں پر بے شک میں (ان کی) حفاظت کرنے والا (اور معاشی مسائل کا) ماہر ہوں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ حضرت سعید بن منصور نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے سنا ہے: مصر زمین کا خزانہ ہے؛ جہاں تک اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ کا تعلق ہے تو اس میں حذف ہے یعنی اجعلنی علی حفظ خزائن الارض مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ یعنی جو میرے سپرد کیا جائے گا میں اس کی حفاظت کرنے والا ہوں گا عَلِيْمٌ اس کے معاملات کو جاننے والا ہوں۔ تفسیر میں ہے: میں حساب کرنے والا اور لکھنے والا ہوں، اور آپ سب سے پہلے آدمی تھے جس نے کاغذوں میں لکھا۔ ایک قول یہ ہے: حَفِيْظٌ خوراک کے اندازے کو عَلِيْمٌ خوشحالی کے سالوں کو۔ جویبر نے ضحاک عن حضرت ابن عباس کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر آپ نے اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ نہ کہا ہوتا تو وہ اسی وقت آپ کو یہ عہدہ سونپ دیتا لیکن اس نے یہ عہدہ آپ سے ایک سال مؤخر کر دیا(1)۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: امارت کا سوال کرنے والے دن سے جب سال گزرا تو بادشاہ نے آپ کو بلایا۔ آپ کی طرف متوجہ ہوا، آپ کو قلادہ پہنایا، آپ کے لیے سونے کا تخت بچھایا گیا جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، آپ کو استبرق کا حلہ پہنایا گیا، چارپائی کی لمبائی تیس ذراع اور چوڑائی دس ذراع تھی، اس پر تیس بستر اور ساٹھ تکیے تھے پھر اس نے آپ کو نکلنے کا حکم دیا تو آپ جھومتے ہوئے نکلے، آپ کا رنگ برف کی طرح (سفید) اور چہرہ چاند کی طرح تھا، دیکھنے والا آپ کے چہرے کی رنگت کی صفائی سے اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا، آپ تخت پر براجمان ہوئے، بادشاہ آپ کے قریب ہوئے اور بادشاہ عورتوں کے ساتھ آپ کے کمرہ میں داخل ہوا، مصر کی شاہی اس نے آپ کے سپرد کی اور قطفیر اپنے عہدے سے الگ ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی جگہ لی۔ ابن زید نے کہا: مصر کے بادشاہ فرعون کے پاس کھانے کے علاوہ بہت سارے خزانے تھے، بادشاہ نے وہ سارے خزانے آپ کے سپرد کر دیئے اور ان راتوں میں قطفیر ہلاک ہو گیا، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی راعیل سے شادی کر لی جب آپ اس کے پاس گئے تو آپ نے کہا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں جو تو چاہتی تھی؟ اس نے کہا: اے صدیق! مجھے ملامت نہ کرو، میں حسین وجمیل اور نرم و نازک عورت تھی جس طرح کہ آپ نے دیکھا، اور میرا شوہر عورتوں کے پاس نہیں آتا تھا اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے حسن عطا فرمایا اس کی وجہ سے میرا نفس مجھ پر غالب آگیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے باکرہ پایا، اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 9

کے قریب گئے تو اس سے دو بچے پیدا ہوئے: افراثیم بن یوسف اور منشا بن یوسف۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا جو کہ عزیز مصر کی بیوی تھی کے ساتھ بھائیوں کے کہنے پر ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ زلیخا، کا شوہر مر گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تھے، اس کا مال ضائع ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے روتے روتے اس کی بینائی جاتی رہی، لوگ اس سے دور ہو گئے، بعض اس پر رحم کرتے اور بعض رحم نہ کرتے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی قوم کے ایک لاکھ لوگوں کے ساتھ ہر ہفتے کچہری لگاتے۔ زلیخا کو کہا گیا کہ تو اپنی بات ان کے سامنے بیان کرنا شاید آپ تیرا مسئلہ حل کر دیں، پھر اسے کہا گیا: ایسامت کرنا، ہوسکتا ہے تیری طرف سے جو بہلاوا اور قید والا معاملہ ہوا تو وہ انہیں یاد آ جائے تو وہ تیرے ساتھ ناروا سلوک کریں گے۔ زلیخا نے کہا: میں اپنے حبیب کے اخلاق کو جانتی ہوں۔ پھر زلیخا نے آپ کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب آپ کچہری میں بلند جگہ پر کھڑے ہوئے تو اس نے بآواز بلند ندا دی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ کون ہے؟ اس کو لے آؤ۔ وہ بولی: میں وہی ہوں جو آپ کی خدمت کرتی تھی، آپ کے بال سنوارتی تھی، میں نے اپنے گھر میں آپ کی تربیت کی، آپ کو عمدہ طریقے سے ٹھہرایا لیکن مجھ سے جہالت کی وجہ سے وہ زیادتی ہو گئی جو ہوئی۔ سو میں نے اپنے کیے کی مصیبت کو پالیا، میرا مال ضائع ہو گیا، میری ذلت و رسوائی کا سلسلہ دراز ہو گیا، بصارت چلی گئی، ان میں سے کوئی میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے اور کوئی مہربانی نہیں کرتا۔ اور یہ مفسدین کی جزا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بہت سخت روئے۔ پھر آپ نے اسے فرمایا: کیا تیرے دل میں میری محبت میں سے کچھ باقی ہے؟ اس نے کہا: الله کی قسم! آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھے اپنے گھوڑے کا اگلا حصہ پکڑا دیں۔ آپ نے اسے وہ پکڑا دیا، اس نے اسے اپنے سینے پر رکھ دیا، تو آپ نے زلیخا کے دل کی دھڑکن کی حرکت اور ارتعاش کو اپنے ہاتھ میں محسوس کیا، آپ روئے پھر آپ اپنے مقام پر تشریف لے گئے اور زلیخا کی طرف ایک قاصد بھیجا، اگر تو بغیر شوہر کے ہے تو ہم تیرے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور اگر تو شوہر والی ہے تو ہم تجھ سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اس نے قاصد کو کہا: میں الله کی پناہ میں آتی ہوں اس بات سے کہ بادشاہ میرے ساتھ مذاق کرے! انہوں نے میری جوانی، میری غنا، میرے مال اور عزت کے ہوتے ہوئے مجھے نہیں چاہا تو آج جب کہ میں بوڑھی، اندھی اور فقیر ہو چکی ہوں تو وہ مجھے کیسے چاہیں گے؟ قاصد نے آپ کو اس کی گفتگو سے آگاہ کیا، جب اگلے ہفتے آپ تشریف لائے تو اس نے آپ کو پھر پکارا۔ تو آپ نے فرمایا: کیا قاصد نے تجھے پیغام نہیں پہنچایا؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ کے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھنا میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ آپ نے اس کے معاملات کی اصلاح کی اور شادی کر لی۔ پھر اس نے آپ کے ساتھ شب زفاف گزاری، حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے نماز پڑھی اور الله تعالیٰ سے دعا کی، وہ بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہو گئی، آپ نے الله تعالیٰ سے اس کی جوانی، حسن و جمال اور بصارت کے لوٹانے کی دعا کی۔ الله تعالیٰ نے اس کا شباب اور حسن و جمال واپس لوٹا دیا حتیٰ کہ وہ بہلاوے والے دن سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی، الله تعالیٰ نے حضرت

یوسف علیہ السلام کے اللہ کے محارم سے بچنے کے صلہ میں یہ اکرام فرمایا۔ آپ نے اس کے ساتھ جماع کیا اس حال میں کہ وہ کنواری تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے (گزشتہ معاملات کے متعلق) پوچھا تو اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! میرا شوہر نامرد تھا، عورتوں کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا تھا اور آپ بے مثال حسن و جمال والے تھے۔

پھر دونوں نے بڑی ہی خوبصورت زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ ہر روز ان کے لیے بھلائی کو تازہ فرماتا، پھر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے دو بچے پیدا کیے۔ ایک افرائیم اور دوسرا منشاء۔ اور روایت ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا سے بھی دوگنی محبت زلیخا کی پیدا کر دی۔ آپ نے اسے فرمایا: تجھے کیا ہوا ہے کہ تو میرے ساتھ اس طرح محبت نہیں کرتی جس طرح پہلے کرتی تھی؟ تو اس نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذائقہ چکھا ہے تو اس نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** بعض اہل علم نے کہا: اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ ایک فاضل آدمی فاجر آدمی اور کافر بادشاہ کی طرف سے کوئی ذمہ داری سرانجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اسے کوئی کام سپرد نہیں کرے گا جو وہ نہیں کرنا چاہتا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق معاملات کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کام اس فاجر کے اختیار اس کی خواہش اور اس کے فجور کے مطابق ہوا تو یہ جائز نہیں ہوگا اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے اور آج کے زمانے میں کسی کے لیے جائز نہیں، بہر حال پہلی صورت بہتر ہے بشرطیکہ اس شرط کے مطابق ہو جو ذکر کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ ماوردی نے کہا: اگر بادشاہ ظالم ہو تو پھر اس کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے حوالے سے دو طرح کا اختلاف ہے۔

(۱) ولایت کو قبول کرنے کا جواز بشرطیکہ امور مفوضہ میں حق کے مطابق کرے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون کی طرف سے والی بنے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے حق میں اس کا دنیاوی فعل معتبر ہوگا نہ کہ کسی اور کا۔

(۲) یہ جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں ظالموں کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا ان کی معاونت کرنے اور ان کے اعمال کو درست سمجھنے کے مترادف ہے ان کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی فرعون کی طرف سے ولایت کے قبول کرنے کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون نیک سیرت آدمی تھا، اور سرکش فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی املاک کو دیکھا نہ کہ اس کے اعمال کو لہٰذا آپ کی طرف سے اس کی متابعت کا معاملہ نہ رہا۔ ماوردی نے کہا ہے: ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنے کے معاملہ میں ان دونوں قولوں کے اطلاق کے بجائے تفصیل کو بیان کرنا زیادہ صحیح ہے اور اس کی تین اقسام بنتی ہیں۔

نمبر 1۔ ایسے معاملات کہ جن کا نفاذ بغیر کسی اجتہاد کے جائز ہوتا ہے جیسے زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ تو ان میں ظالم کی طرف سے ولایت جائز ہوگی۔ اس کے مستحق پر نص نے اس میں اجتہاد سے مستغنی کر دیا ہے۔

نمبر 2۔ وہ معاملات جن میں کسی کے لیے علیحدگی اختیار کرنا ممکن نہ ہو اور جن کے مصارف میں اجتہاد لازم آتا ہو جیسے

مال فئی وغیرہ تو ان معاملات میں ظالم کی طرف سے ولایت کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں وہ بغیر حق کے تصرف کرے گا اور ایسے معاملات میں پڑے گا جن کا وہ استحقاق نہیں رکھتا۔

نمبر 3۔ وہ امور جن کو وہ تفویض کر سکتا ہو اور ان میں اجتہاد کا عمل دخل بھی ہو جیسے قضایا اور احکام تو اگر نظر و فکر دو باہم رضا مند آدمیوں کے درمیان فیصلے کی تنفید کے بارے میں ہو اور دو مجبور آدمیوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کے طور پر ہو تو جائز ہے اور اگر بالجبر کوئی معاملہ لازم کرنا مقصود ہو تو پھر جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر**3۔ آیت کریمہ میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی جس کام کا اہل ہو اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے: امام مسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا (1): ''اے عبدالرحمٰن! امارت کا سوال نہ کر، اگر تیرے سوال کی وجہ سے تجھے امارت دی گئی تو تجھے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر بغیر سوال کے تجھے ملی تو اس پر تیری مدد کی جائے گی۔'' حضرت ابی بردہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور میرے ساتھ دو اشعری آدمی تھے، ان میں سے ایک میری دائیں جانب تھا جبکہ دوسرا بائیں جانب تو ان دونوں نے کسی عہدہ کا سوال کیا جبکہ نبی کریم ﷺ مسواک فرما رہے تھے آپ نے فرمایا: ''اے ابو موسیٰ یا (آپ نے فرمایا) اے عبداللہ بن قیس! تو کیا کہتا ہے؟ حضرت ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! انہوں نے مجھے اپنی دل کی بات سے آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ عہدہ کے طالب ہیں۔ آپ نے فرمایا: گویا میں آپ کی مسواک کو آپ کے ہونٹ کے نیچے دیکھتا ہوں کہ اسے دبا دیا گیا، آپ نے فرمایا: ''ہم ایسے آدمی کو عہدہ نہیں دیتے جو عہدہ لینا چاہے''۔ حضرت ابو موسیٰ نے پوری حدیث کو ذکر کیا، امام مسلم وغیرہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ولایت کا مطالبہ اس وجہ سے کیا کہ آپ کو علم تھا کہ عدل، اصلاح اور فقراء کو ان کے حقوق دینے کے حوالے سے کوئی بھی ان کی طرح نہیں تھا تو آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ آپ پر فرض ہے کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ اور ایسا کوئی نہیں تھا، آج بھی یہی حکم ہے (یعنی اگر ایسی صورت ہو تو مطالبہ جائز ہے) اگر کوئی آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ قضاء و حساب میں حق کو قائم رکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں جو اصلاح کر سکے اور اس کے قائم مقام ہو سکے تو یہ کام اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ والی بنے اور اس کا مطالبہ کرے، اور علم و فضل میں جن اوصاف کے سبب وہ اس کا مستحق ہے ان کے بارے بتائے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اور اگر وہاں کوئی ایسا آدمی ہو جو حق کو قائم کر سکتا ہے اور ان امور کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس آدمی کو بھی علم ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ مطالبہ نہ کرے اس کی وجہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے جو آپ نے حضرت عبدالرحمن کو فرمایا: ''امارت کا سوال نہ کرو'' کیوں کہ ایسی صورت میں اس کا مطالبہ، اس میں پائی جانے والی آفات کی کثرت کے جاننے کے باوجود اس عہدہ کا لالچ اور اس سے چھٹکارا کے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا، جلد 2، صفحہ 120

حصول کا مشکل ہونا، اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے اور ذاتی اغراض کے لیے مطالبہ کر رہا ہے۔ جس آدمی کی کیفیت یہ ہو ممکن ہے اس پر اس کا نفس غالب آ جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؛ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''اس کو اس کے سپرد کر دیا جائے گا'' کا یہی معنی ہے۔ اور جس آدمی نے اس کی آفات کو جاننے کی وجہ سے اور حقوق میں کوتاہی کے خوف کی وجہ سے اس کا انکار کیا اور اس سے بھاگا، پھر اس کو اس میں مبتلا کر دیا گیا تو اس کے لیے اس سے چھٹکارے کی امید کی جا سکتی ہے، یہی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''اس پر اس کی مدد کی جائے گی'' کا معنی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا: میں کافی ہوں، کریم ہوں، اگرچہ آپ اس طرح تھے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کریم ابن کریم ابن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (1)'' اور نہ ہی آپ نے فرمایا: میں خوبصورت ہوں، جمال والا ہوں، بلکہ آپ نے فرمایا: اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ تو آپ نے تو حفظ و علم کی وجہ سے مطالبہ کیا، نسب اور جمال کی وجہ سے نہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے آپ نے یہ بات اس آدمی کے سامنے کہی جو آپ کو جانتا نہیں تھا تو آپ نے اپنا تعارف کرانا چاہا، تو اس وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النجم: 32) سے مستثنیٰ ہو گئے۔

چوتھا جواب: آپ نے اس کو اپنے اوپر فرض متعین سمجھا کیونکہ وہاں آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ آدمی میں پائے جانے والے علم و فضل کے ذریعے لوگوں کے سامنے اپنی صفات کو بیان کرنا جائز ہے۔ ماوردی نے کہا: مطلقاً تمام صفات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے بلکہ صرف اسی معاملے کے ساتھ خاص ہے جو اس کو درپیش ہو یا بیان کرنے والے کے ساتھ جس کا تعلق ہو، اور اس کے علاوہ تمام صورتوں میں ممنوع ہے کیونکہ اس میں اپنا ہی تزکیہ اور دکھلاوا ہے، اور اگر اس نے اپنے سے زیادہ فضیلت والے آدمی کو ممتاز کر دیا تو یہ خود اس کی اپنی فضیلت و شرافت کے زیادہ مناسب ہوگا؛ پس حضرت یوسف علیہ السلام کو جیسا کہ آپ کے حالات میں گزر چکا ہے ضرورت نے اس اظہار کی طرف دعوت دی اور دوسری بات یہ تھی کہ اہلیت کی وجہ سے آپ کامیابی کی امید بھی رکھتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

''یوں ہم نے تسلط (اور اقتدار) بخشا یوسف کو سرزمین مصر میں تاکہ رہے اس میں جہاں چاہے، ہم سرفراز کرتے ہیں اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر عمدہ کام کرنے والوں کا اور آخرت کا اجر (اس سے) یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیے رہے''۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ یعنی ان کو بادشاہ کے دل کے قریب کر کے اور قید سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ یوسف، جلد 2، صفحہ 193

نجات دے کر ہم نے جوان پر انعام فرمایا اس انعام کے ذریعے ہم نے ان کو زمین میں تسلط و اقتدار بخشا، یعنی جس طرح وہ چاہتے تھے اسی طرح ہم نے ان کو اقتدار عطا فرمایا۔ الکیا طبری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ مباح چیز تک پہنچنے کے لیے اور جو اس میں خوشی، اصلاح اور حقوق کا حصول ہوتا ہے اس کے لیے حیلہ کے جواز پر دلیل ہے، اسی کی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ (ص: 44) ہے (اور اپنے ہاتھ میں سبز و خشک گھاس کا مٹھا پکڑ پس اس کے ساتھ مار اور حانث نہ ہو) اسی طرح ''حیلہ کے جواز'' پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ وہ روایت ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کھجور پیش کی تھی اور پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ تاویل آنے والی وضاحت کی بنیاد پر باطل ہے۔

(مَكَّنَّا کو لام کے بغیر اور لام کے ساتھ ذکر کرنے کی دونوں صورتیں صحیح ہیں) جیسے کہا جاتا ہے مَكَّنَاه و مَكَّنَا لَهُ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ (الانعام: 6) طبری نے کہا: بڑے بادشاہ ولید بن ریان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اطفیر کی ذمہ داری پر خلیفہ مقرر کیا اور اس کو معزول کر دیا۔ مجاہد نے کہا: اس نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس نے ڈیڑھ سال بعد آپ کو بادشاہ بنا دیا۔ مقاتل نے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ کے ساتھ انشاء اللہ کہا ہوتا تو اسی وقت آپ کو بادشاہ بنا دیا گیا ہوتا''۔ پھر اطفیر فوت ہوا تو ولید نے آپ کی شادی اطفیر کی بیوی راعیل سے کر دی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے ساتھ دخول کیا تو آپ نے اسے باکرہ پایا۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے اِفراثیم اور منشا پیدا ہوئے اور جس کا گمان یہ ہے کہ وہ زلیخا تھی تو اس کے حوالے سے حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی تھی بلکہ جب اس نے آپ کو بھیڑ میں دیکھا تو رو پڑی پھر اس نے کہا: ''ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلام بنا دیا اور سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اطاعت کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہ بنا دیا'' تو آپ نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا پھر وہ آپ کے عیال میں رہی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا جبکہ آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی۔ اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ یہ وہب کی بیان کردہ بات کے برعکس ہے اس کو ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے ''واللہ اعلم''۔ جب بادشاہ نے مصر کی حکومت حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کی تو آپ نے لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک فرمایا اور انہیں اسلام کی دعوت دینا شروع کی یہاں تک کہ انہوں نے ایمان قبول کر لیا اور آپ نے ان میں عدل قائم فرمایا تو مرد اور عورتیں آپ کے ساتھ محبت کرنے لگے۔ حضرت وہب، حضرت سدی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر نے کہا: پھر سرسبز و شاداب سال آ گئے تو آپ نے زراعت کی اصلاح کا حکم ارشاد فرمایا اور کسانوں کو زراعت میں وسعت دینے کو کہا، جب غلہ حاصل ہوا تو آپ نے اسے ذخیرہ کرنے کا حکم دیا پھر آپ نے اس کے لیے گودام بنوائے اس سال ان گوداموں میں اتنا غلہ جمع ہوا کہ وہ غلہ کی کثرت کی وجہ سے تنگ پڑ گئے پھر اسی طرح ہر سال غلہ جمع ہوتا رہا یہاں تک کہ

شاداب سال گزر گئے اور قحط زدہ سال آ گئے تو جبریل امین اترے اور کہا: اے مصر والو! بھوکے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر سات سال بھوک مسلط فرمادی۔ یہ بعض اہل عقل نے کہا ہے کہ بھوک اور قحط کی دو علامتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نفس عادت سے زیادہ کھانے کو پسند کرتا ہے اور پہلے کی نسبت اسے بھوک بھی جلدی لگتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ کھانا مفقود ہو جاتا ہے تو یہ دونوں علامتیں حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جمع ہو گئیں۔ مرد، عورتیں اور بچے الجوع الجوع پکارتے! کھانا کھاتے مگر سیر نہ ہوتے اور بادشاہ بھی الجوع الجوع کی صدا لگاتا۔ پھر بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے نجات بخشی پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے مصر میں یہ پیغام عام کر دیا کہ اے لوگو! کوئی آدمی بھی کھیتی کاشت نہ کرے اس طرح وہ بیج ضائع کرے گا اور کوئی چیز نہیں اگے گی اور وہ سال اتنے خطرناک آئے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب قحط کی ابتدا ہوئی تو بادشاہ کو آدھی رات کے وقت بھوک لگ گئی، تو اس نے کہا: اے یوسف! الجوع الجوع! تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ قحط کی علامت ہے۔

پھر جب قحط زدہ سالوں میں سے پہلا سال آیا تو اس میں وہ سب کچھ ختم ہو گیا جو ان لوگوں نے شاداب سالوں میں جمع کیا ہوا تھا تو اہل مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کھانا خریدنا شروع کر دیا۔ آپ نے پہلے سال انہیں کھانا نقدی کے بدلے میں بیچا یہاں تک کہ مصر میں کوئی درہم و دینار نہ بچا تو آپ نے دوسرے سال زیورات اور جواہر کے بدلے میں انہیں کھانا بیچا حتیٰ کہ لوگوں کے پاس زیورات میں سے بھی کوئی چیز نہ بچی۔ تیسرے سال آپ نے انہیں مویشیوں اور چوپایوں کے بدلے میں کھانا بیچا، یہاں تک کہ وہ بھی سارے بک گئے۔ چوتھے سال غلاموں اور لونڈیوں کے بدلے دیا اور سب پر قبضہ کر لیا۔ پانچویں سال زمین کے بدلے میں کھانا بیچا یہاں تک کہ آپ سب زمینوں کے مالک ہو گئے۔ چھٹے سال ان کے بچوں اور بیویوں کے بدلے میں انہیں کھانا دیا اور ان سب کو غلام بنا لیا اور ساتویں سال خود ان کے اپنے بدلے ان کو کھانا دیا حتیٰ کہ ساتویں سال مصر میں ہر کوئی آپ کا غلام تھا، تو لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم نے اس سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کو کہا: میرے رب کی اس قدرت کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس کا اظہار اس نے میرے حوالے سے فرمایا: اب یہ سب کچھ تمہارا ہے، اس کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ بادشاہ نے کہا: میں نظام حکومت آپ کے سپرد کرتا ہوں آپ جس طرح چاہیں کریں۔ ہم آپ کے تابعدار ہوں گے اور میں آپ کی اطاعت وفرمانبرداری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں تو آپ کے غلاموں میں سے ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں نے انہیں بھوک سے اس لیے آزاد نہیں کیا تھا کہ ان کو غلام بنا لوں، میں نے ان سے مصیبت کو اس لیے نہیں ہٹایا تھا کہ میں خود ان پر مصیبت بن جاؤں، میں اللہ کو اور آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے سب مصریوں کو آزاد کیا اور ان کے مال ان کو واپس لوٹائے اور خود تیری ملکیتیں تجھ پر اس شرط کے ساتھ واپس لوٹاتا ہوں کہ تو میرے طریقے پر چلے گا۔ اور روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان سالوں میں سیر ہو کر کھانا نہ کھاتے تھے، آپ کو کہا گیا: کیا آپ بھی بھوکے ہوتے ہیں حالانکہ آپ کے قبضہ میں

(مصر کی) سرزمین کے خزانے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں گا تو بھوکے کو بھول جاؤں گا، حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہی باورچی کو فرمایا کہ وہ آپ کا کھانا نصف دن کو بنایا کرے تاکہ بادشاہ بھی بھوک محسوس کرے اور بھوکوں کو بھول نہ جائے اسی وجہ سے بادشاہوں نے نصف دن کو اپنے کھانے پکوانے شروع کیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ یعنی اپنے احسان کے ذریعے رحمت کا معنی نعمت اور احسان ہے۔ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی ان کا ثواب۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت وہب نے کہا کہ محسنین سے مراد صابرین ہیں۔ اس کی وجہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کنویں، غلامی اور قید میں صبر کرنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے محارم سے صبر کرنا جبکہ عورت نے آپ کو اپنی طرف دعوت دی۔

ماوردی نے کہا: اس حالت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کچھ ملا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ابتلا اور آزمائش پر ثواب تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبتلا کیا تھا جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انعام فرمایا جبکہ ثواب آخرت اسی حالت پر باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یعنی جو کچھ ہم آخرت میں دیتے ہیں وہ اس سے بہتر اور زیادہ ہے جو ہم دنیا میں عطا کرتے ہیں، کیونکہ آخرت کا اجر دائمی ہے جبکہ دنیا کا اجر ختم ہونے والا ہے آیت کا ظاہر تو ہر مومن اور متقی کے لیے عموم پر دلالت کر رہا ہے۔ انہوں نے شعر پڑھا:

أَمَا فی رسول الله يوسفَ أُسْوَةٌ لمثلكَ محبوسًا على الظُّلم والإفْكِ

أَقام جَميلَ الصَّبرِ فی الحبس بُرهةً فآل به الصَّبرُ الجميلُ إلى المُلْك

اور ان میں سے کسی نے اس کے دوست کی طرف لکھا:

وراء مَضيقِ الخوف مُتَّسَعُ الأَمْنِ وأوّلِ مفروحٍ به آخرُ الحزنِ

فلا تيأسن فالله مَلَّكَ يوسفًا خزائنه بعد الخلاصِ من السِّجن

اور کسی نے یہ شعر پڑھا ہے:

إذا الحادثاتُ بَلَغْنَ النُّهى وَكادتْ تَذوبُ لَهُنَّ المُهَجْ

وحلَّ البلاءُ وقَلَّ العَزَاء فعند التَّنَا هِي يكونُ الفَرَجْ

اور اس معنی میں بہت زیادہ اشعار ہیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸

''اور ایک روز آنکلے برادران یوسف (علیہ السلام) اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکے''۔

قولہ تعالیٰ: وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ یعنی جب انہیں قحط لاحق ہوا تو وہ مصر آئے تاکہ غلہ حاصل کریں۔ یہ قرآن کریم کا

معجزانہ اختصار ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو کنعان میں بھی قحط آ گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بھیجا، جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ ان کی نرمی، مہربانی، حسن سلوک، عدل اور سیرت کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل چکا تھا۔ جب لوگوں پر مصیبت آئی تو حضرت یوسف علیہ السلام لوگوں کی خاطر سودے کے وقت خود موجود ہوتے اور ان کی تعداد کے مطابق انہیں کھانا دیتے۔ ہر آدمی کو ایک وسق (ساٹھ صاع) ملتا۔

**وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ** یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا **وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ** اور انہوں نے نہ پہچانا کیونکہ انہوں نے تو آپ کو بچپن میں چھوڑا تھا اور ان کا یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ غلامی کے بعد اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مدت بھی بڑی لمبی گزر چکی تھی۔

چالیس سال کی مدت گزری اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس لیے نہ پہچانا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کافر بادشاہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: انہوں نے آپ کو ریشمی لباس میں ملبوس دیکھا جبکہ آپ کی گردن میں سونے کا ہار تھا اور سر پر تاج اور آپ نے فرعون مصر کا سا لباس اور حلیہ بنا رکھا تھا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں اسی دور کے لباس اور حلیہ میں دیکھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس وجہ سے نہ پہچانا ہو کہ یہ ایک خلاف عقل اور خارق عادت معاملہ تھا اور اس سے مقصود امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیا۔

**وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٥٩﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾**

''سو جب مہیا کر دیا ان کے لیے ان (کی رسد وخوراک) کا سامان تو فرمایا: (دوبارہ آؤ) تو لے آنا میرے پاس اپنے پدری بھائی کو کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں۔ اور اگر تم اسے نہ لے آئے میرے پاس تو (سن لو) کوئی پیمانہ تمہارے لیے میرے پاس نہیں ہوگا اور نہ تم میرے قریب آسکو گے۔ وہ بولے ہم ضرور مطالبہ کریں گے اس کے بھیجنے کے متعلق اس کے باپ سے اور ہم ضرور ایسا کریں گے''۔

**وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ** کہا جاتا ہے: جهزتُ القومَ تجهيزًا یعنی میں نے ان کو ان کے سفر کے لیے ان کا سامان دے دیا اور شادیوں کا جہیز وہی ہوتا ہے جس کی شوہر کو بطور ہدیہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض کوفیوں نے الجهاز جیم کے کسرہ کو بھی جائز قرار دیا ہے اس آیت کریمہ میں الجهاز سے مراد کھانے کا وہ سامان ہے جو انہیں آپ کے پاس سے ملا۔ سدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس گیارہ اونٹ تھے جبکہ وہ خود دس تھے۔ انہوں نے حضرت یوسف کو کہا: ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے جو پیچھے رہ گیا ہے اور اس کا اونٹ ہمارے ساتھ ہے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں پیچھے رہ گیا؟ تو انہوں نے کہا: اس کے باپ کی اس کے ساتھ محبت کی وجہ سے۔ اور انہوں نے آپ کو بتایا کہ اس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جو

جنگل میں گیا اور ہلاک ہو گیا، آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے اس بھائی کو دیکھنا چاہتا ہوں جس کا تم نے ذکر کیا ہے تا کہ میں تمہاری صداقت اور اس کے ساتھ اس کے باپ کی محبت کا سبب جان سکوں۔ روایت ہے کہ وہ شمعون کو بطور رہن آپ کے پاس چھوڑ آئے اور پھر آپ کے بھائی بنیامین کو لے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام نے ترجمان کو کہا کہ انہیں کہو: تمہاری زبان ہماری زبان کے مخالف اور تمہارا لباس ہمارے لباس کے مخالف ہے تم کہیں جاسوس تو نہیں تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم جاسوس نہیں بلکہ ہم سب ایک باپ کے بیٹے ہیں اور وہ بوڑھا آدمی ہے، اس نے کہا: تمہاری تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم بارہ تھے ہمارا ایک بھائی جنگل کی طرف گیا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: دوسرا کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے باپ کے پاس؛ آپ نے فرمایا: کون تمہاری سچائی کو جانتا ہے؟ انہوں نے کہا: یہاں ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم نے آپ کو اپنے نسب کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے، تو اب آپ کو ہم پر کس طرح اطمینان ہو سکتا ہے؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ (اپنے باپ سے اپنے بھائی کو میرے پاس لے آؤ) اگر تم سچے ہو؛ تو میں مطمئن ہو جاؤں گا اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ یعنی میں وزن پورا کرتا ہوں اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتا اور تمہارے بھائی کے لیے ایک اونٹ کا وزن زیادہ دے رہا ہوں فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ اگر تم اس کو میرے پاس لے کر نہ آئے تو پھر میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے ان کو دھمکی دی کہ اگر وہ اسے نہ لے کر آئے تو آپ انہیں غلہ نہیں بیچیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ کے دو احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے انہیں بھاؤ میں رخصت دی تو گویا وزن زیادہ ہو گیا اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے انہیں زیادہ وزن دیا ہو۔ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ آپ بہتر مہمان نواز ہیں، کیونکہ آپ نے ان کی عمدہ ضیافت فرمائی، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس تم آئے ہو ان میں میں امانت داری کے اعتبار سے بہتر ہوں۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ النزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''کھانا'' اور دوسری صورت میں المنزل سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھر ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ یعنی میں اس کے بعد تمہیں کوئی چیز نہیں بیچوں گا کیوں کہ آپ نے انہیں اس حالت میں پورا وزن دے دیا۔ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ یعنی میں تمہیں اپنے ہاں قربت کا یہ مقام نہیں دوں گا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ آپ سے دور ہو جائیں گے اور واپس لوٹ کے نہیں آئیں گے کیونکہ آپ نے انہیں واپس لوٹنے پر ابھارا ہے۔ سدی نے کہا: آپ نے ان سے واپس لوٹنے تک رہن کا مطالبہ کیا، تو شمعون آپ کے پاس رہن کے طور پر رہا۔ کلبی نے کہا: آپ نے ان میں سے شمعون کو اس لیے منتخب فرمایا کہ کنویں کے واقعہ کے دن اس کی رائے اور گفتگو سب سے عمدہ تھی۔ اور تَقْرَبُوْنِ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے اسی وجہ سے اس میں سے نون اور یا کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ آیت کے آخر میں ہے۔ اگر یہ خبر ہوتی تو تَقْرَبُوْنِ نون کے فتح کے ساتھ ہوتا۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ یعنی ہم اس سے اس کا مطالبہ کریں گے اور یہ گذارش کریں گے وہ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں۔

وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ یعنی ہم اس کو یہاں تک لانے کے ضامن ہیں اور اس سلسلہ میں کوشش کریں گے۔

**مسئلہ:** اگر یہ کہا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کا مطالبہ کر کے اپنے باپ پر پریشانی ڈالنے کو کیسے جائز سمجھا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ اس کے چار جواب ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کرنے کے لیے آپ کو اس کا حکم دیا ہوتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت زیادہ ثواب عطا فرمایا جائے۔ اور آپ نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی ہو۔ 2۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے آگاہ کرنا مراد ہو۔ 3۔ اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ان کے دونوں بیٹے اکٹھے واپس جائیں گے تو ان کی خوشی دوگنی ہوجائے گی۔ 4۔ اپنے بھائی کے سامنے رشتے کے ظاہر ہونے سے پہلے ملاقات کے ذریعے محبت وخوشی پیش کرنا مقصود ہو۔

البتہ پہلا معنی اور توجیہ زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

## وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

”اور آپ نے فرمایا اپنے غلاموں کو کہ (چپکے سے) رکھ دو ان کا سامان (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا) ان خورجیوں میں تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب وہ واپس لوٹیں اپنے گھر والوں کے پاس شاید وہ لوٹ کر آئیں“۔

وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ یہ اہل مدینہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرات ہے اور یہی ابوحاتم، نحاس اور دیگر لوگوں کے نزدیک مختار ہے، جبکہ سب کوفیوں نے اسے لفتیانه پڑھا ہے اور ابوعبید کے نزدیک مختار ہے۔ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے مصحف میں بھی اس طرح ہے، ثعلبی نے کہا: یہ دونوں عمدہ لغتیں ہیں۔ جس طرح کہ الصبیان اور الصبیه۔ نحاس نے کہا: لِفِتْیٰنِهِ سواد اعظم کے مخالف ہے کیونکہ سواد اعظم کے نزدیک نہ اس میں الف ہے اور نہ نون لہٰذا اس منقطع سند کی بنیاد پر سواد اعظم کو نہیں چھوڑا جائے گا اور یہ وجہ بھی ہے کہ فتیة، فتیان کی نسبت زیادہ مناسب ہے کیونکہ فتیة عربوں کے نزدیک کم تعداد کے لیے بولا جاتا ہے اور تھوڑے لوگوں کا خورجیوں میں سامان رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور ان غلاموں نے ان کے سامان کو برابر کر دیا تھا اسی وجہ سے ان کے لیے اپنا سامان اپنی خورجیوں میں رکھنا ممکن ہوا تھا۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ غلام نہ ہوں بلکہ آزاد ہوں اور آپ کے معاونین ہوں۔ اور ان کا سامان وہ دراہم اور دینار تھے۔ حضرت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جوتے، وہ سامان جس کو بطور سالن استعمال کیا جاتا ہے اور زاد راہ تھا اور اسے رحل کہتے ہیں۔ ابن انباری نے کہا: برتن کو بھی رحل کہا جاتا ہے اور گھر کو بھی رحل کہتے ہیں اور لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ ہوسکتا ہے کہ راستے میں وہ محفوظ نہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے ایسا اس لیے کیا تاکہ جب وہ اسے پائیں تو واپس لوٹیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وہ بغیر قیمت کے کھانے کو قبول نہیں کریں گے۔ ایک قول کے مطابق یہ آپ نے اس لیے کیا تاکہ وہ کھانے کی خریداری کے لیے دوبارہ آپ کے پاس آئیں۔ ایک قول کے مطابق آپ نے ایسا اس لیے کیا کہ آپ نے اپنے باپ اور بھائیوں سے کھانے کی

قیمت لینے کو برا سمجھا۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا کرنے کی حکمت یہ تھی کہ وہ لوگ آپ کی فضیلت و مہربانی کو دیکھیں اور دوبارہ آپ کے پاس آنے کی طرف راغب ہوں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا ۚ وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾

''پھر جب واپس لوٹے اپنے باپ کے پاس تو عرض کرنے لگے: اے ہمارے پدر! (بزرگوار) روک دیا گیا ہم سے غلہ (ازراہ نوازش) بھیجئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی (بنیامین) کو تا کہ ہم غلہ لاسکیں اور ہم یقیناً اس کی نگہبانی کریں گے۔ آپ نے (جواباً) فرمایا: کیا میں اعتماد کروں تم پر اس بارے میں بجز اس کے جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں اس سے قبل، پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ زیادہ مہربان ہے تمام مہربانی کرنے والوں سے۔ اور جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مال انہیں واپس لوٹا دیا گیا ہے (ترغیب دینے کے لیے) کہنے لگے: اے ہمارے پدر (محترم)! ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ (دیکھیے) ہمارا مال بھی لوٹا دیا گیا ہے ہماری طرف اور (اگر بنیامین ساتھ گیا تو) ہم رسد لائیں گے اپنے اہل خانہ کے لیے اور رکھوالی کریں گے اپنے بھائی کی اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ یہ غلہ بہت تھوڑا ہے''۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ انہوں نے یہ اس وجہ سے کہا کیونکہ انہیں فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ کہا گیا تھا۔ اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے ساتھ ہونے والے معاملے اور ملنے والی عزت و آرام سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ شمعون بطور رہن ان کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ وہ (یوسف) ان کی سچائی و صداقت کو جان نہیں لیتے۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ یعنی انہوں نے اس وقت کہا: ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے۔ نَكْتَلْ اصل میں نکتال تھا لام کلمہ سے ضمہ کو جزم کے لیے حذف کر دیا گیا۔ اور پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اہل حرمین، ابو عمرو اور عاصم کی قرات (نکتل) نون کے ساتھ ہے جبکہ سارے کوفیوں نے یکتل یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا ابو عبید کا مختار ہے تا کہ جو کچھ انہیں ملے اس میں وہ سب شریک ہو جائیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب یا کے ساتھ ہو تو اس وقت یہ صرف بھائی کے لیے ہوگا۔ نحاس نے کہا: یہ لازم نہیں؛ کیونکہ کلام دو صورتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں؛ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: فأرسل أخانا یکتل معنا (ہمارے بھائی کو بھیجئے وہ ہمارے ساتھ وزن کرے گا؛) تو اس صورت میں یہ سب کے لیے ہوگا یا تقدیر کلام تقدیم و تاخیر کے بغیر ہوگا جبکہ کلام میں ان سب کے داخل ہونے پر دلیل ہوگی،

اس (توجیہہ) پر حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ۔

وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم اسے کسی تکلیف کے پہنچنے سے اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ یعنی تم نے یوسف کے ساتھ زیادتی کی تو اس کے بھائی کے حوالے سے میں تم پر کیسے اعتماد کرسکتا ہوں؟ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا بیان کی بنیاد پر یہ منصوب ہے۔ یہ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات ہے۔ سارے کوفیوں نے اسے حال کی بنیاد پر حافظا پڑھا ہے۔ زجاج نے کہا: بیان کی بنیاد پر ہے اس آیت کریمہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے حوالے سے جواب ارشاد فرمایا؛ آیت کا معنی یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ کا اس کی حفاظت کرنا تمہارے حفاظت کرنے سے بہتر ہے۔ کعب احبار نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت اور جلال کی قسم! تیرے میرے اوپر توکل کرنے کے بعد میں تیرے دونوں بیٹوں کو تیرے پاس واپس لوٹاؤں گا۔

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ آیت کریمہ میں کوئی بھی مشکل معنی نہیں یعنی واضح ہے۔ مَا نَبْغِیْ، مَا محل نصب میں استفہام کے مقام پر ہے؛ معنی یہ ہوگا: ہم اس کے علاوہ کس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اس نے ہمارے لیے وزن پورا کیا اور ثمن بھی ہمیں واپس لوٹا دیئے اس سے انہوں نے اپنے باپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ایک قول یہ ہے کہ مَا نافیہ ہے یعنی ہم آپ سے دراہم اور سامان نہیں چاہتے بلکہ ہمیں ہمارا ہی سامان کافی ہے جو ہماری طرف لوٹا دیا گیا۔ علقمہ سے روایت ہے ردت الینا را کے کسرہ کے ساتھ کیونکہ اصل میں ''رددت'' ہے جب دال کو دال میں مدغم کیا گیا تو دال کی حرکت کو را کی حرکت سے بدل دیا گیا۔ اور نَمِیْرُ اَهْلَنَا سے مراد ہے ہم ان کے لیے کھانا لائیں گے شاعر نے کہا:

بَعَثْتُكَ مَائِرًا فَمَكَثْتَ حَوْلًا     مَتَى يَأْتِي غِيَاثُكَ مَنْ تُغِيثُ(1)

میں نے تجھے کم عقلی کی حالت میں بھیجا تو پورا سال ٹھہر گیا، کب تیرا مددگار آئے گا جو مدد کرے گا۔

سلمی نے نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہم کھانا لانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ یعنی بنیامین کے اونٹ کا بوجھ (زیادہ لائیں گے)۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ۝۶۶

''آپ نے کہا: میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ یہاں تک کہ کرو تم میرے ساتھ وعدہ جو پختہ کیا گیا ہو اللہ کی قسم سے کہ تم ضرور لے آؤ گے میرے پاس اسے مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے پس جب وہ لے آئے آپ کے پاس اپنا پختہ وعدہ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: تُؤْتُوْنِ کا مطلب ہے تعطون، مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی ایسا عہد جس پر یقین کیا جاسکے۔سدی نے کہا: انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی کہ وہ ضرور اسے واپس لوٹائیں گے اور اسے کسی کے سپرد نہیں کریں گے لَتَاْتُنَّنِیْ میں ''لام'' لام قسم ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ مجاہد نے کہا: (اس کا مطلب ہے) مگر تم ہلاک ہوجاؤ یا مرجاؤ(1)۔قتادہ نے کہا: مگر یہ کہ تم پر غلبہ پالیا جائے(2)۔زجاج نے کہا: یہ محل نصب میں ہے۔فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ یعنی اس قسم کی حفاظت کرنے والا ہے۔ایک قول یہ ہے: عہد کی حفاظت کرنے والا، تدبیر و عدل کے ذریعے اسے قائم کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔یہ آیت کریمہ کفالت بالعین اور وثیقہ بالنفس کے جواز میں اصل ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر علماء نے کہا ہے: یہ اس صورت میں جائز ہے جب متحمل بہ مال ہو۔امام شافعی نے مال میں کفالت بالوجہ کو ضعیف قرار دیا ہے؛ اور ان کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے۔عثمان بتی نے کہا: جب کسی نے قصاص یا زخم کی کفالت بالنفس کی تو اس کو نہ لانے کی صورت میں اس پر دیت اور زخم کا تاوان لازم ہوگا اور اسے ظلم کرنے والے کے مال میں سے ادا کیا جائے گا کیونکہ کفیل پر قصاص لازم نہیں ہوتا۔یہ کفالت بالوجہ کے بارے میں تین اقوال ہیں۔اور صحیح وہ تفریق ہے جو امام مالک نے کی کہ کفالت یا ضمانت مال میں ہوسکتی ہے اور حد اور تعزیر میں نہیں ہوسکتی جس طرح کہ اس کا بیان آئے گا۔

وَ قَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور آپ نے کہا: اے میرے بچو! (شہر میں) نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے بلکہ داخل ہونا مختلف دروازوں سے اور نہیں فائدہ پہنچا سکتا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی نہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کے لیے، اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔جب انہوں نے جانا چاہا تو آپ کو انہیں نظر بد لگنے کا اندیشہ لاحق ہوا؛ تو آپ نے انہیں شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونے کا حکم فرمایا۔شہر کے چار دروازے تھے۔آپ کو انہیں اس وجہ سے نظر بد کا اندیشہ ہوا کہ ایک آدمی کے گیارہ بیٹے ہوسکتے ہیں اور وہ سب خوبصورت، کمال کے حامل اور بھاری بھر کم تھے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور قتادہ وغیرہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔اگر آیت کا معنی یہ ہو تو اس میں نظر سے بچنے پر دلیل ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ نظر حق ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک نظر آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کرسکتی ہے''۔اور اس سے بچنے کے حوالے سے

1۔تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 16　　2۔ایضاً، جلد 13، صفحہ 18

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ (1) بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام مالک نے حضرت محمد بن ابی امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ابو سہل بن حنیف نے خرار (مدینہ کی وادی) سے غسل کیا، اپنا جبہ اتارا تو عامر بن ربیعہ دیکھ رہے تھے۔ راوی نے کہا: سہل سفید رنگت والا اور خوبصورت جلد والا تھا۔ تو عامر بن ربیعہ نے انہیں کہا: اتنے گورے رنگ کا اتنا خوبصورت شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار چڑھ گیا اور بخار شدت اختیار کر گیا نبی کریم ﷺ کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ سہل کو بخار چڑھ گیا ہے اور وہ آپ کے پاس نہیں جا سکتا رسول اللہ ﷺ سہل کے پاس تشریف لائے تو حضرت سہل نے عامر کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں آپ کو بتایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی کیوں اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے؟ تم نے تبارک اللہ أحسن الخالقین اللھم بارک فیہ کیوں نہ کہا بے شک نظر کا لگنا حق ہے تم اس کے لیے وضو کرو'' (2)۔ حضرت عامر نے وضو کیا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے گئے اور وہ بالکل تندرست تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عامر کو کچھ اعضاء دھونے کا حکم دیا تو حضرت عامر نے اپنا چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے اور پاؤں کے اطراف اور ازار کے اندر جسم کا حصہ ایک برتن میں دھویا پھر اسے (غسالہ) کو حضرت سہل کے اوپر بہا دیا گیا تو حضرت سہل نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلے گئے اور انہیں کوئی مسئلہ نہ رہا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ایک دن سوار ہوئے آپ کی طرف ایک عورت نے دیکھا تو کہا: تمہارا یہ امیر دونوں پہلوؤں میں پتلی اور نازک کمر والا ہے۔

آپ اپنے گھر واپس لوٹے تو گر پڑے آپ کو وہ بات بتائی گئی جو اس عورت نے کہی تو آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اس نے آپ کے لیے غسل کیا۔

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ نظر کا لگنا حق ہے اور یہ آدمی کو مار ڈالتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے یہ علماء امت کا قول اور اہل سنت کا مذہب ہے، جبکہ بدعتیوں کے ایک گروہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ سنت، اس امت کے اجماع اور ایک امر واقع کے منکر ہیں، اس لیے کہ کتنے ہی لوگ ہیں جن کو نظر بد نے قبر میں داخل کر دیا ہے اور کتنے ہی خوبصورت اونٹ ہیں جن کو اس نے ہنڈیا میں پہنچا دیا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** (البقرہ: 102) (اور وہ اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے) اصمعی نے کہا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کی نظر لگتی تھی اس نے سنا کہ ایک گائے بہت زیادہ دودھ دیتی ہے اس کو یہ بہت اچھا لگا اس نے پوچھا: وہ کون سی گائے ہے؟ لوگوں نے کوئی اور گائے بتائی اور اس کو مخفی رکھا تو وہ دونوں گائیں مر گئیں۔ اصمعی نے کہا: میں نے اس آدمی کو کہتے ہوئے سنا: جب میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگتی ہے تو میں ایک حرارت پاتا ہوں جو میری آنکھوں سے نکلتی ہے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، ماعوذ بہ النبی ﷺ، صفحہ 260

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، العین، صفحہ 259۔ ایضاً، حدیث نمبر 3499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے کوئی چیز اچھی لگے تو وہ بارك الله فيه کہے کیونکہ جب وہ برکت کی دعا کرے گا تو لازمی طور پر برائی کو اس سے ہٹالیا جائے گا۔ کیا آپ حضرت عامر کو کہے جانے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو نہیں دیکھتے: أَلَا بَرَّكْتَ تو نے بارك الله فيه کیوں نہ کہا۔ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب نظر لگانے والا بارك الله فيه کہہ دیتا ہے تو نظر نہ لگتی ہے اور نہ ہی نقصان کرتی ہے، البتہ اگر وہ یہ الفاظ نہ کہے تو پھر نظر لگ جاتی ہے۔ پوری تبریک یہ ہے: تبارك الله أحسن الخالقين اللهم بارك فيه۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ نظر لگانے والی کی نظر جب لگ جائے اور وہ بارك الله فيه نہ کہے تو اسے غسل کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ انکار کرے تو اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے، بالخصوص یہ امر، کیونکہ بعض اوقات نظر لگنے والے کی ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے اور کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کو ایسے کام سے روکے جس کی وجہ سے اس کے ایک بھائی کو فائدہ ہوسکتا ہے اور وہ نقصان سے بچ سکتا ہے بالخصوص اس صورت میں کہ جب وہ نقصان اس کی وجہ سے ہو رہا ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جس آدمی کو اپنی آنکھ لگنے کا پتہ چل جائے اسے لوگوں میں جانے سے روک دیا جائے گا تا کہ لوگ اس کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: امام اسے گھر میں نظر بند کرنے کا حکم دے گا اور اگر اس کے رزق کا مسئلہ ہو تو اس کی کفالت کرے گا اور لوگوں سے اس کی اذیت کو روکا جائے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے ملک بدر کیا جائے گا؛ البتہ امام مالک کی وہ روایت جو ہم نے ذکر کی ہے وہ ان اقوال کی تردید کرتی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو حضرت عامر کی قید کا حکم دیا اور نہ ہی ملک بدری کا، بلکہ بعض اوقات نیک آدمی کی بھی نظر لگ جاتی ہے اور نہ تو اس میں یہ بات قدح کا باعث ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس پر فسق کا حکم لگایا جاسکتا ہے؛ اور جس آدمی نے کہا ہے: اسے قید کیا جائے اور نظر بندی کا حکم دیا جائے گا تو یہ احتیاطاً ہے اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک نے حمید بن قیس کی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جعفر بن ابی طالب کے دو بیٹے لائے گئے تو آپ نے ان کی دائی کو فرمایا: ''کیا بات ہے میں ان دونوں کو کمزور دیکھتا ہوں؟'' تو دائی نے کہا: یا رسول اللہ! ان دونوں کو جلدی نظر لگ جاتی ہے، اور آپ نے ہمیں ان کو دم کرنے سے نہ روکا البتہ ہم نہیں جانتے کہ آیا وہ تمہارے موافق آتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کو دم کرو کیونکہ اگر تقدیر سبقت لے گئی تو نظر سبقت لے جائے گی۔'' یہ حدیث منقطع ہے۔ البتہ حضرت اسماء بنت عمیس خثعمی والی روایت محفوظ ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ اس میں ہے کہ دم ان چیزوں میں سے ہے جن کے ذریعے مصیبت کو روکا جاتا ہے اور نظر انسان میں اثر بھی کرتی ہے اور تکلیف بھی دیتی ہے یعنی اسے کمزور کرتی ہے اور اس میں نقاہت پیدا کرتی ہے؛ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے ہے اور کہا جاتا ہے کہ نظر بڑوں کی نسبت چھوٹوں میں جلدی اثر کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ حدیث ابو امامہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگانے والے کو اس آدمی کے لیے غسل کرنے کا حکم فرمایا

ہے جس کو نظر لگی ہے اور اس روایت میں دم کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔'' ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: دم اس صورت میں ہوگا جب نظر لگانے والے کا پتہ نہ ہو، اور جب نظر لگانے والے کا پتہ چل جائے تو پھر حدیث ابوامامہ کے مطابق اسے وضو کا حکم دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

**وَ مَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ** یعنی ایسی چیز سے جس سے میں تمہیں محتاط رہنے کا حکم دیتا ہوں یعنی احتیاط، تقدیر کے ساتھ کوئی نفع نہیں دیتی۔ **اِنِ الْحُكْمُ** یعنی امر اور قضاء **اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ** یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا۔ **وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ** اور اسی پر توکل کرنے والوں کو توکل کرنا چاہیے۔

**وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۟۶۸ وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۶۹ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ۝۷۰**

''اور جب وہ (مصر میں) داخل ہوئے جس طرح حکم دیا تھا انہیں ان کے باپ نے، وہ نہیں فائدہ پہنچا سکتا تھا انہیں اللہ کی تقدیر سے کچھ بھی مگر (یہ احتیاطی تدبیر) ایک خیال تھا نفس یعقوب میں جسے انہوں نے پورا کیا اور بے شک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ اور جب پہنچے یوسف کے پاس تو یوسف نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو (نیز) اسے فرمایا: میں تمہارا بھائی ہوں نہ غمزدہ ہو (ان حرکتوں پر) جو یہ کیا کرتے تھے پھر جب فراہم کر دیا انہیں ان کا سامان (خوراک) تو رکھ دیا (اپنا) پیالہ اپنے بھائی کی خورجی میں پھر پکارا ایک پکارنے والا: اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو''۔

**وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ** یعنی مختلف دروازوں سے **مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ** یعنی اگر وہ ان پر کوئی ناپسندیدہ بات واقع کرنے کا ارادہ فرمالے تو اللہ کی تقدیر سے انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ **اِلَّا حَاجَةً** یہ استثنا ہے مگر متصل نہیں **فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا** یعنی خدشہ تھا جو ان کے دل میں کھٹکا؛ اور وہ ان کی وصیت تھی کہ وہ جدا جدا رہیں۔ مجاہد نے کہا: نظر کا اندیشہ تھا، اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ ہے: (متفرق داخل ہونے کی بنیاد اس خدشے پر تھی) کہ بادشاہ ان کی تعداد اور قوت کو نہ دیکھ لے کہ کہیں حسد کے مارے یا احتیاطاً ان کو پکڑ ہی نہ لے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ نحاس نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس نے کہا: یہاں نظر کا کوئی مطلب نہیں ہے اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اندیشے اور خوف والے کام سے محتاط کرے اور اس کی رہنمائی ایسے عمل کی طرف کرے جس میں سلامتی اور نجات ہو کیونکہ دین خیر خواہی ہے اور مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنَّهٗ یعنی یعقوب علیہ السلام لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ یعنی اپنے دین کے معاملے کے بارے میں۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اپنے دین کے معاملے میں جو کچھ حضرت یعقوب علیہ السلام جانتے تھے وہ وہ نہیں جانتے تھے۔ ایک قول کے مطابق لَذُوْ عِلْمٍ سے مراد عمل والا ہے؛ کیونکہ علم، عمل کا پہلا سبب ہے لہٰذا یہاں سبب بول کر مسبب مراد لے لیا گیا ہے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ (1) قتادہ نے کہا: اٰوٰۤى اِلَیْهِ سے مراد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو اپنے پاس بٹھایا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے حکم دیا کہ دو دو آدمی ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ، تو ایک بھائی اکیلا رہ گیا سواسے اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا: میں نے تنہائی کی وجہ سے اس پر شفقت کی ہے اور دیگر بھائیوں سے علیحدہ راز میں اس بھائی کو فرمایا: اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ یعنی میں تمہارا بھائی ہوں تو پریشان نہ ہو بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ان کی ان حرکتوں پر جو یہ کیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ جب بنیامین نے جان لیا کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں تو اس نے آپ کو کہا: مجھے ان کے حوالے نہ کرنا، تو آپ نے فرمایا: تو میرے بارے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے غم کو جانتا ہے تو اس طرح تو ان کے غم میں اضافہ ہو جائے گا تو بنیامین نے نکلنے سے انکار کر دیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تمہیں بغیر کسی نامناسب عمل کے قید کرنا ممکن نہیں، بنیامین نے کہا: مجھے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے صاع کو ان کے سامان میں ڈال دیا؛ یا تو خود ڈالا کہ کسی کو بھی اس کا پتہ نہ چلا یا پھر اپنے کسی خاص آدمی کو یہ کام کرنے کا حکم دیا۔ اور التجهیز سے مراد کھولنا اور کام کو فوراً کرنا ہے، اسی سے جهز علی الجریح ہے یعنی اس کو اس نے قتل کر دیا اور اس کا معاملہ جلدی جلدی ختم کر دیا۔ السِّقَایَةَ اور صاع ایک ہی چیز ہیں یہ ایک ایسا برتن ہے جس کے دوسرے ہوتے ہیں اور درمیان میں ایک پکڑنے والا قبضہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اس کے ایک سرے سے پیتا تھا اور دوسرے سرے سے کھانے کو لیتا تھا؛ یہ نقاش کا قول ہے جو اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے پیا جائے تو وہ صواع ہے۔ شاعر نے کہا:

نَشْرَبُ الْخَمْرَ بِالصَّوَاعِ جِهَارًا

ہم صواع کے ذریعے اعلانیہ شراب پیتے ہیں۔

اس کی جنس میں اختلاف ہے؛ شعبہ نے ابو بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بادشاہ کا صواع چاندی کی ایسی چیز تھی جو مکوک کے مشابہ تھی ایسی چاندی سے بنا ہوا تھا جو جواہرات سے مرصع تھا اس کو سر پر رکھا جاتا تھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی زمانہ جاہلیت میں ایک صاع تھا۔ نافع بن ازرق نے آپ سے پوچھا: صواع کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: برتن؛ اس کے بارے میں اعشیٰ نے کہا ہے:

له دَرْمَكٌ فی رأسه و مَشارِبٌ　　وقِدْرٌ وطَبَّاخٌ وصاعٌ ودَیسَقُ

عکرمہ نے کہا: یہ چاندی کا تھا (2)۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: سونے کا تھا؛ اسی کے ذریعے آپ نے ان کے کھانے کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 21　　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 24

تو لا مقصود ان کی عزت و احترام میں مبالغہ تھا۔ ایک قول کے مطابق اس کے ذریعے اس وجہ سے کیل کیا جاتا تھا کہ کھانا کم تھا۔ اور صاع مذکر اور مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔ جس نے اس کو مونث کہا اس نے اصوع بروزن ''أدور'' کہا ہے اور جس نے مذکر استعمال کیا ہے اس نے اصواع بروزن اثواب کہا ہے۔

اس کی کئی قرآتیں ہیں: صواع عام قرآت ہے؛ صوغ غین کے ساتھ یہ یحیٰی بن یعمر کی قرآت ہے؛ انہوں نے کہا: یہ ایک ایسا برتن تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ صوع عین کے ساتھ یہ ابو رجاء کی قرأت ہے صوع صاء مضموم، واو ساکنہ اور عین کے ساتھ حضرت ابی کی قرأت ہے۔ صاع صاد اور عین کے درمیان الف کے ساتھ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی قرآت ہے۔

**ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ** یعنی منادی کرنے والے نے منادی کی اور اعلان کیا۔ دأذن تکثیر کے لیے ہے گویا کہ نداد ینے والے نے بار بار منادی کی اَيَّتُهَا الْعِيْرُ، الْعِيْرُ سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوجھ لادا جاتا ہے جیسے گدھا، اونٹ اور خچر وغیرہ۔ مجاہد نے کہا: ان کی سواریاں گدھے تھے (1)۔ ابو عبید نے کہا: الْعِيْرُ سے مراد وہ اونٹ ہے جو سفر کرتا ہے اور اس پر سواری کی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی ہوگا یا اصحاب العیر جس طرح اللہ کا ارشاد وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) یعنی واسأل اهل القرية ہے۔ اور یا خیل الله ارکبی یعنی یا اصحاب خیل اللہ ہے۔ یہاں دو اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر کہا جائے بنیامین اپنی خوشی سے وہاں بیٹھنے پر کس طرح راضی ہوئے حالانکہ اس میں غم کی زیادتی کے ساتھ باپ کی نافرمانی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ان کی موافقت کر لی؟ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کیسے کر لی حالانکہ وہ بری تھے یہ دوسرا اعتراض ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام پر پریشانی وغم اتنا غالب آ چکا تھا کہ بنیامین کی گمشدگی نے اس میں کوئی اثر نہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب بنیامین گم ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ (یوسف: 84) اور بنیامین کی طرف آپ نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور شاید حضرت یوسف علیہ السلام نے وحی کی وجہ سے ان کے ساتھ اتفاق کر لیا ہو۔ اس صورت میں کوئی اعتراض ہی نہیں۔ اور جہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کرنے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود انہیں ان کے باپ سے چوری کیا اور کنویں میں پھینک دیا تھا پھر بیچ دیا تھا، لہٰذا وہ اس عمل کی وجہ سے اس نام کے مستحق تھے سو اس نام کا اطلاق ان پر صادق آتا تھا۔ جبکہ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس سے یہ مراد لیا تھا کہ اے قافلہ والو! تمہاری حالت چوروں کی سی ہے؛ اور مطلب یہ ہوگا کہ کسی اور آدمی کی چیز بادشاہ کی رضامندی اور علم کے بغیر تمہارے پاس ہے۔ اس کا ایک اور جواب یہ بھی ہے کہ یہ اپنے بھائی کو ساتھ رکھنے اور ان سے جدا کرنے کا ایک حیلہ تھا، یہ جواب اس صورت میں ہوگا جب بنیامین کو ان کی خورجی میں صاع کے رکھے جانے کا علم نہ ہو اور نہ ہی آپ نے خود ان کو اس بات کی خبر دی ہو۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کلام کا معنی استفہام ہے، یعنی کیا تم چور ہو؟ جس طرح کہ وتلك نعمة یعنی أوتلك نعمة عنها علی؟ اور مقصود یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 25

طرف جھوٹ کی نسبت نہ کی جائے۔

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ۝

''(حیرت زدہ ہوکر) بولے درانحالیکہ وہ ان کی طرف متوجہ تھے کون سی چیز تم نے گم کی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے گم کیا ہے بادشاہ کا پیالہ اور وہ شخص جو (ڈھونڈ) لائے گا اسے (بطور انعام) بار شتر (غلہ) دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں بَعِيْرٍ سے مراد اونٹ ہے۔ جبکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ گدھا ہے یہ بعض عربوں کی لغت ہے یہ مجاہد کا قول ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے اور مجاہد نے کہا: زَعِيْمٌ سے مراد وہ منادی کرنے والا ہے جس نے أیتها العیر کہا تھا (1)۔ زعیم، کفیل، حمیل، ضمین اور قبیل برابر ہیں اور زعیم سے مراد رئیس ہے۔

شاعر نے کہا:

وإنّی زَعِيمٌ إنْ رَجعتُ مُمَلَّكا بِسَيْرٍ تَرَى مِنْهُ الفُرَانِقُ أَزْوَرَا

أنی زعیم یعنی میں رئیس ہوں۔

لیلی اخیلیہ نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

ومُخَرَّقٍ عنهُ القميصُ تَخَالُهُ يومَ اللِّقاءِ من الحياءِ سَقِيمَا

حتیٰ إذا رَفَعَ اللّوَاءَ رأيتَهُ تحتَ اللِّواءِ على الخَمِيسِ زَعِيمَا(2)

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر کہا جائے: آپ نے اونٹ کے بوجھ کی ضمانت کیسے قبول کر لی حالانکہ وہ مجہول ہے اور مجہول کی ضمانت صحیح نہیں؟ تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ اونٹ کا بوجھ ان کے نزدیک معین و معلوم تھا جس طرح کہ وسق؛ لہٰذا اس کی ضمانت صحیح ہے البتہ یہ چور کے مال کا بدلہ تھا اور چور کے لیے ایسا صحیح نہیں اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شاید یہ ان کی شریعت میں صحیح ہو یا پھر یہ جعل (کسی چیز کو ڈھونڈنے کی اجرت) ہو۔ اور اس آدمی کے لیے مال خرچ کرنے کے مترادف ہو جو تفتیش کرتا ہے اور ڈھونڈتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: ایک جُعل کے جواز کی اس کو ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے اس میں جہالت جائز ہے جو کہ کسی اور عقد میں جائز نہیں؛ جب آدمی نے کہا: جس نے ایسا کیا تو اس کے لیے یہ ہوگا تو یہ صحیح ہے۔ جُعل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک طرف معلوم ہوتی ہے جبکہ دوسری ضرورت کی بنا پر مجہول ہوتی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 26 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 28

ہے بخلاف اجارہ کے؛ اس میں عوض اور معوض دونوں جہتوں سے مقرر ہوتا ہے؛ یہ ان عقود جائزہ میں سے ہے جن کو کسی ایک کے لیے فسخ کرنا جائز ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مجعول لہ کے لیے اس کو شروع سے پہلے اور بعد میں دونوں صورتوں میں فسخ جائز ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے حق کو ساقط کرنے پر راضی ہو جبکہ جاعل کے لیے اسے اس وقت فسخ کرنا جائز نہیں ہوتا جب مجعول لہ کام میں شروع ہو جائے۔ عقد جعل میں متعاقدین کا حاضر ہونا شرط نہیں ہوتا جس طرح کہ دیگر عقود میں شرط ہوتا ہے؛ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ یہ سب امام شافعی نے فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب آدمی نے کہا: جو میرے بھاگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے اتنے دینار، تو جب کوئی آدمی اسے لے آیا تو اسے وہ رقم لازم ہو جائے گی اور اگر بغیر ضمان کے لے کر آیا تب بھی مال لازم ہوگا جب وہ اجرت کے مطالبے پر اسے لے کر آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جاء بابق فله اربعون درهما جو بھاگے ہوئے غلام کو لے کر آیا تو اس کے لیے چالیس درہم ہوں گے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات میں کوئی تفریق بیان نہیں فرمائی کہ وہ عقد ضمان کی صورت میں لایا یا بغیر عقد کے لایا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اور اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا: جس نے کسی آدمی کا کوئی ایسا کام کیا جس کا کرنا اس پر اس کے مصالح میں سے بذات خود لازم تھا تو اس کے لیے یہ مال لازم ہوگا، اور اگر وہ ایسا آدمی ہے اور اجرت پر کام کرتا ہے تو اس کے لیے اجرت مثل ہوگی۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس سبب میں ہم نے امام شافعی کی مخالفت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ دوسری دلیل۔ کفالت کا جواز آدمی پر ہوگا؛ کیونکہ ضامن منادی حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ تھا، ہمارے علماء نے کہا: جب آدمی نے کہا تحملت، تکفلت، ضمنت، أنا حميل، أنا زعيم، أنا كفيل، أنا ضامن، أنا قبيل، هولك عندی، هولك علیّ، هولك إلیّ یا هولك قبلی تو یہ ساری کفالت ہے اور اسے لازم ہوگی۔ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی تو کیا اسے مال کی ضمانت لازم ہوگی یا نہیں؟ کوفیوں نے کہا: جس نے کسی آدمی کی کفالت بالنفس کی تو اسے وہ حق لازم نہیں ہوگا جو مطلوب پر تھا اگر مطلوب فوت ہو جائے۔ یہی امام شافعی کے دو مشہور قولوں میں سے ایک ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: جب کسی نے کفالت بالنفس کی اس حال میں کہ اس پر مال لازم تھا تو اگر وہ اسے لے کر نہ آیا تو بطور تاوان اس پر مال لازم ہوگا اور پھر مطلوب پر رجوع کرے گا؛ اور اگر اس نے کفالت بالنفس یا کفالت بالوجہ کی اور کہا: میں مال کا ضامن نہیں ہوں گا تو اس پر مال میں سے کچھ نہیں ہوگا۔ اور جس نے بطور تاوان مال کو لازم قرار دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کفیل کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کفیل بالوجہ سے خون کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے؛ پس جب وہ اس کا ضامن بنا اور پھر اسے نہ لایا تو گویا وہ اس پر غالب آ گیا اور اس کے ہاتھوں سے نکل گیا لہٰذا اسے مال لازم ہو جائے گا۔ امام طحاوی نے احناف کی دلیل کو بیان کرتے ہوئے کہا: مکفول بہ کی موت کی وجہ سے مال کی ضمانت کے کوئی معنی نہیں کیونکہ اس نے کفالت بالنفس کو قبول کیا تھا نہ کہ کفالت بالمال کو، اور یہ تو محال ہے کہ جس کی اس نے ضمانت دی ہی نہیں وہ اسے لازم ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے کی طرف سے مال کا کفیل بنا؛ تو کیا مطالبہ کرنے والے کے لیے ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام ثوری، احناف، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد اور اسحق نے کہا: وہ جس سے چاہے لے سکتا ہے یہاں تک کہ اپنا حق پورا کر لے؛ اور یہی امام مالک کا قول تھا پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا اور کہا: وہ کفیل سے نہیں لے سکتا البتہ اگر مقروض کی مفلسی کا اعلان کر دیا جائے یا وہ غیب ہو جائے تو پھر کفیل سے مطالبہ جائز ہوگا؟ کیونکہ جس پر حق لازم ہے اسی سے لینا زیادہ بہتر ہے، ہاں اگر وہ نہ رہے تو پھر کفیل سے لیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں تو وہ اس سے لینے میں معذور ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ اور قیاس یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جس سے چاہے مطالبہ کر سکے۔ ابن ابی لیلی نے کہا: جب آدمی کسی کے لیے مال کا ضامن بنا تو وہ مال کفیل پر لازم ہو جائے گا اور اصل اس سے بری ہو جائے گا، البتہ اگر مکفول لہ نے ان دونوں سے مطالبہ کرنے کی شرط لگا لی ہو تو پھر ان دونوں میں سے جس سے چاہے لے سکتا ہے، انہوں نے حضرت ابو قتادہ (1) کی ضمانت کی وجہ سے میت کے بری ہو جانے والے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ یہی ابو ثور کا بھی قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ضمانت صرف ان حقوق میں دی جا سکتی ہے جن کی نیابت ہو سکتی ہے جن کا تعلق اموال کے ساتھ ہو اور وہ پختہ طریقہ سے ثابت بھی ہو؛ کفالت بالکتابت صحیح نہیں کیونکہ یہ ثابت و مستقر دین نہیں؛ کیونکہ غلام اگر بدل کتابت دینے سے عاجز آ جائے تو وہ پھر غلام بن جاتا ہے اور اس کی کتابت فسخ ہو جاتی ہے۔ اور جہاں تک ان حقوق کا تعلق ہے جو کوئی آدمی کسی کی طرف سے ادا نہیں کر سکتا تو ان میں کفالت و ضمانت بھی نہیں ہوگی اور مدعی اسے قید کرے گا جس پر حد لازم ہے یہاں تک کہ اس کے معاملے کو وہ دیکھے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے حدود و قصاص میں کفالت کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: جب مقذوف یا مدعی قصاص نے کہا کہ میرے پاس بینہ حاضر ہے تو وہ تین دن کی ضمانت لے گا؛ امام طحاوی نے ان کے حق میں حمزہ بن عمرو عن عمرو بن مسعود و جریر بن عبد اللہ و اشعث کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے صحابہ کی موجودگی میں کفالت بالنفس کا فیصلہ کیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾

"کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو کہ ہم (یہاں) اس لیے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں زمین میں اور نہ ہی ہم چوری پیشہ ہیں (خدام یوسف) نے کہا: پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ اس کی سزا

1۔ سلمہ بن اکوع نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جنازہ کے لیے تشریف لائے آپ نے فرمایا: "کیا اس پر کوئی قرض ہے" لوگوں نے کہا: "ہاں" آپ نے فرمایا: "کیا اس نے کوئی چیز چھوڑی ہے، انہوں نے کہا: "نہیں" آپ نے فرمایا: "اپنے دوست کا جنازہ پڑھ لو" حضرت ابو قتادہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ جنازہ پڑھیے اس کا قرض میرے ذمے رہا" تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

یہ ہے کہ جس کے سامان میں یہ پیالہ دستیاب ہوتو وہ خود ہی اس کا بدلہ ہے، اسی طرح ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ روایت ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی کھیتی کا نقصان کرتے تھے انہوں نے اپنے اونٹوں کے مونہوں کو باندھا ہوا تھا تا کہ وہ لوگوں کی کھیتیوں کو خراب نہ کریں۔ پھر کہا: وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ روایت ہے کہ انہوں نے وہ سامان واپس لوٹا دیا جوان کی خورجیوں میں تھا؛ تو اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ جوآدمی حاصل شدہ مال واپس لوٹا دے وہ چور کیسے ہوسکتا ہے؟

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ معنی یہ ہوگا: اگر تمہارا جھوٹ ظاہر ہوجائے تو پھر ایسا کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جواب دیا: جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ یعنی اسے غلام بنالیا جائے گا۔ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ مبتدا ہے اور مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ اس کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: جَزَاءُهٗ اِسْتِعْبَادُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهٖ یہ غلام بنانے سے کنایہ ہے جس طرح کہا جاتا ہے: جزاء من سرق القطع فهذا جزاءه جس نے چوری کی اس کی سزا قطع ید ہے پس یہی اس کی سزا ہے تو جملہ میں تاکید کا معنی پایا جارہا ہے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی ہم اس طرح ظالموں کے ساتھ کرتے ہیں یعنی جب وہ چوری کریں تو انہیں غلام بنالیتے ہیں، تو یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین میں تھا اوران کا یہ قول ان میں سے اس کا ہے جس کو چوری کے حوالے سے کوئی شک وشبہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے اس کی غلامی کو ثابت کیا جس کی خورجی میں سے پیالہ ملے، اور اہل مصر کے ہاں چور کا حکم یہ تھا کہ جس سے مال مل جائے اس سے دوگنا مال وصول کیا جاتا؛ یہ حضرت حسن اور سدی وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ۔ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ چوری کی وجہ سے قطع ید کا ہونا پہلی سب شریعتوں کا ناسخ ہے اسی طرح جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کو غلام بنانے کا قانون تھا یہ اس کا بھی ناسخ ہے۔ واللہ اعلم۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝

''پس تلاشی لینی شروع کی ان کے سامانوں کی یوسف کے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے آخر کار نکال لیا وہ پیالہ اس کے بھائی کی خورجی سے، یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لیے، نہیں رکھ سکتے تھے یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ مصر کے قانون میں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، ہم بلند کرتے ہیں درجے جن کے چاہتے ہیں، اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی خورجیوں سے شروع کیا کیونکہ اگر اپنے بھائی کی خورجی سے شروع کرتے تو ان کے دلوں میں الزام اور شک پیدا ہوسکتا تھا تو گویا اس طرح الزام اور شک کی نفی کر

دی۔ الوعاء واو کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں؛ اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں سامان کی حفاظت کی جاتی ہے اور اسے بچایا جاتا ہے۔ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ یعنی بنیامین کی خورجی سے نکالا؛ استخرج کے ساتھ آنے والی ھا ضمیر سے مراد سقایۃ ہے یا پھر صواع ہے یہ اس آدمی کے نزدیک ہوگا جو اسے مونث سمجھتا ہے؛ اور وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ فرمایا یہ ضمیر مذکر کی ہے تو یہ اس کے نزدیک ہے جو اس کو مذکر سمجھتا ہے۔

جب آپ کے بھائیوں نے یہ صورتحال دیکھی تو اپنے سر جھکا لیے اور مختلف سوچیں سوچنے لگے، بنیامین کے پاس آئے اور کہا: اے بنیامین! تیری بربادی ہو! ہمیں آج کے دن کی طرح کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی، تیری ماں راحیل نے دو بیٹے جنے اور وہ دونوں چوری کے لیے، انہوں نے اپنے بھائیوں کو کہا: اللہ کی قسم! میں نے اسے چوری نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے پتہ ہے کہ کس نے میرے سامان میں اسے رکھا؟ راویت ہے کہ انہوں نے بنیامین کو کہا: اے بنیامین! کیا تو نے چوری کی ہے؟ بنیامین نے کہا: اللہ کی قسم! نہیں؛ انہوں نے کہا: کس نے تیری خورجی میں پیالہ رکھا؟ بنیامین نے کہا: جس نے تمہاری خورجیوں میں سامان رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ چیک کرنے والا جب آدمی کی خورجی سے فارغ ہوا تو اس نے اپنے اس فعل پر توبہ کرتے ہوئے استغفار کیا؛ حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ استغفار کرنے والے حضرت یوسف علیہ السلام تھے؛ کیونکہ وہی انہیں چیک کرنے والے تھے اور جانتے تھے کہ پیالہ کہاں ہے یہاں تک کہ بنیامین کی خورجی کی چیکنگ پر انہوں نے اختتام کیا اور کہا: میرا نہیں خیال کہ یہ نوجوان اس بات پر راضی ہو اور نہ ہی اس نے کوئی چیز لی ہے، تو بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: اللہ کی قسم! ہم تب تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک آپ اس کو چیک نہیں کریں گے؛ یہ بات آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اطمینان قلب کا باعث ہوگی؛ آپ نے اس کی تلاشی لی اور پیالہ نکال لیا؛ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے لی جانے والی یہ تلاشی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ منادی نے یہ کاروائی آپ کی رائے اور مشاورت سے کی؛ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ بھی اس کو تقویت دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اس میں تین مسائل ہیں؛

**مسئلہ نمبر 1**۔ كِدْنَا کا معنی ہے صنعنا ہم نے کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا بمعنی دبرنا یعنی ہم نے تدبیر کی منقول ہے۔ ابن الانباری نے کہا: أردنا یعنی ہم نے ارادہ کیا۔ شاعر نے کہا:

كَادَتْ وَ كِدْتُ وَ تِلْكَ خَيْرُ إِرَادَةٍ لو عاد مِنْ عهد الصِّبَا ما قد مَضَى

اس نے ارادہ کیا اور میں نے ارادہ کیا اور یہ اچھا ارادہ ہے کہ اگر وہ بچپن کے عہد سے واپس لوٹ آئے جو کہ گزر چکا ہے۔

اور اس واقعہ سے مقاصد کو حیلہ کے ذریعے حاصل کرنے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، بشرطیکہ وہ حیلہ شریعت کے مخالف نہ ہو اور نہ ہی شریعت کے کسی قانون کو ختم کرنے والا ہو، بخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کہ انہوں نے حیلہ کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور حلت کو ختم ہی کیوں نہ (1) کر دے۔

1۔ امام قرطبی نے امام اعظم پر جو اعتراض کیا ہے اس کے علماء احناف نے بڑے مسکت جوابات دیے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سال پورا ہونے سے پہلے آدمی اپنے مال میں بیع وہبہ کے ذریعے تصرف کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی نیت زکوٰۃ سے فرار کی نہ ہو۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جب سال پورا ہوجائے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت ہوجائے تو پھر اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کرنا یا مال میں کمی کرنا جائز نہیں اس طرح نہ اکٹھے مال میں تفریق کرنا اور نہ ہی متفرق مال کو جمع کرنا درست ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جب آدمی نے سال پورا ہونے سے ایک ماہ یا اس کے لگ بھگ کے عرصہ سے پہلے زکوٰۃ سے فرار کی نیت سے اپنے مال میں کمی کی تو بھی سال مکمل ہونے پر اسے زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد خشیة الصدقة (1) سے استدلال کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی اس نے مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار اختیار کرتے ہوئے تفریق کی تو یہ بات اس کے لیے نقصان دہ نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا لزوم صرف سال کی تکمیل کی صورت میں ہوتا ہے اور سال کی تکمیل سے پہلے خشیة الصدقة کے ارشاد کا اطلاق اس پر ہوتا ہی نہیں۔

ابن عربی نے کہا: میں نے ابوبکر محمد بن ولید فہری وغیرہ کو کہتے ہوئے سنا ہے: ہمارے شیخ قاضی القضاۃ ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی دس ہزار دینار کے مالک تھے۔ جب سال کا اختتام آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور انھیں کہا: میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میری طاقت کمزور ہوگئی ہے، جبکہ یہ مال ہے جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں لہٰذا یہ تمہارا ہے۔ پھر انہوں نے مال دے دیا لوگ اٹھا کر ان کے بیٹوں کے گھر لے گئے، پھر جب سال کا اختتام آیا تو انھوں نے کسی کام کے لیے اپنے بیٹوں کو بلایا۔ بیٹوں نے کہا: اے ہمارے باپ! ہمیں آپ کی زندگی کی امید ہے اور جب تک آپ زندہ ہیں ہمیں مال میں کوئی رغبت نہیں، کیونکہ آپ اور آپ کا مال ہمارا ہی ہے۔ سو یہ مال لے لیجئے۔ لوگوں نے مال اٹھایا اور ان کے ساتھ رکھ دیا اور مال کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق انھوں نے اکٹھے مال کو متفرق اور متفرق کو پھر جمع کر کے اسقاط زکوٰۃ کا حیلہ کیا ہے اور یہ بہت بڑی بحث ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ایک مربوط کتاب لکھی ہے جس کا نام انہوں نے ''کتاب الحیل'' رکھا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس میں پھر کئی باب بنائے ہیں جن میں ایک باب باب الزکوۃ وان لا یفرق بین مجتمع ولا یجمع بین متفرق خشیة الصدقه کے عنوان سے ہے۔ اس میں حضرت انس بن مالک والی حدیث بھی انھوں نے بیان کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف زکوٰۃ کے فریضہ کے بارے میں لکھا اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ والی حدیث بھی بیان کی کہ ایک اعرابی جس کے بال پراگندہ تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ الحدیث، اور اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں افلح ان صدق (2) یا یہ الفاظ ہیں دخل الجنة ان صدق اور بعض لوگوں (امام ابوحنیفہ) نے کہا ایک سو بیس اونٹوں میں دو حصے زکوٰۃ ہے۔ اگر مالک نے جان بوجھ کر ان کو ہلاک کر دیا یا انہیں ہبہ کر دیا یا اس نے زکوٰۃ سے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لایجمع بین متفرق ویتفرق بین مجتمع، جلد 1، صفحہ 195

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، وجوب صوم رمضان، جلد 1، صفحہ 254

بچنے کا کوئی حیلہ کیا تو اس پر کچھ بھی لازم نہ ہوگا۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث انہوں نے فوراً بعد بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن تم میں سے کسی کا خزانہ قوت والا گنجا سانپ ہوگا جس کی آنکھ پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور وہ کہے گا: میں تیرا خزانہ ہوں'' (1)۔ مہلب نے کہا: اس باب میں امام بخاری نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بتائیں کہ ہر وہ حیلہ جو کوئی آدمی اسقاط زکوٰۃ کے لیے اختیار کرے گا تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا، کیونکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے خوف سے ریوڑ کو جمع کرنے اور علیحدہ علیحدہ کرنے سے منع فرمایا ہے تو اس سے یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اور آپ کے ارشاد أفلح إن صدق سے بھی یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی کو کم کرنے کے لیے کوئی حیلہ اختیار کیا تو وہ فلاح نہیں پائے گا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا یہ عذر قابل قبول ہوگا۔ اور جس نے سال پورے ہونے کے قریب مال میں صاحب مال کے تصرف کو جائز قرار دیا ہے تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں کہ اس طرح وہ زکوٰۃ سے فرار اختیار کرے۔ اور جس نے ایسا اس نیت سے کیا تو اس پر سے اس کا گناہ ساقط نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، اسی طرح ہے جیسا کہ کوئی آدمی رمضان کے چاند کے طلوع سے ایک دن قبل رمضان کے روزے سے بچنے کے لیے کوئی ایسا سفر اختیار کرلے جس سفر کی اسے ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرض سے اعراض مقصود ہے جو اس نے مومنین پر لازم قرار دیا ہے، تو اس پر وعید صادق آئے گی، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ قیامت کے دن جان بوجھ کر زکوٰۃ سے روکنے کی سزا کیا ہوگی اسے اونٹ کیسے روندے گا اور اس کے مال کو اس کے لیے قوت والے گنجے سانپ کی تمثیل دی جائے گی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ سے فرار جائز نہیں اور آخرت میں اس کا مطالبہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: بعض شافعی علماء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۚ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ کے بارے میں کہا کہ یہ مباح کام کے لیے حیلہ اختیار کرنے پر دلیل ہے۔ مگر یہ بہت بڑا وہم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ (یوسف: 21) کے بارے میں رکھا گیا ہے کہ کما مکنا لیوسف مِلك نفسه عن امرأة العزيز مكنا له ملك الأرض عن العزيز یعنی جس طرح ہم نے عزیز کی بیوی سے خود یوسف کو اپنے اوپر ملکیت و تسلط بخشا اسی طرح عزیز سے حکومت کی ملکیت و اقتدار بھی یوسف کو بخش دیا۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص: 44) ہے۔ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک جھاڑو لے کر اسے ماریں اور حانث نہ ہوں۔ لیکن یہ حیلہ نہیں بلکہ یہ تو قسم کو الفاظ یا مقاصد پر محمول کرنا ہے۔ شفعوی نے کہا: اسی طرح حضرت ابو سعید خدری والی وہ حدیث ہے جو خیبر کے عامل کے بارے میں ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوریں لے آیا۔ الحدیث۔ اس حدیث کو بیان کرنے سے شافعیہ کا مقصود یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ساری کھجوریں بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور پھر جس آدمی کو بیچیں ہیں اس سے یا کسی اور سے جنیب کھجوریں خریدنے کا حکم ارشاد فرمایا جبکہ مالکیہ نے کہا: اس کا مقصود ہی اور ہے اور وہ یہ کہ تاکہ جنیب اور دراہم جمع نہ ہو جائیں جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غلہ، غلہ کے بدلے میں اور دراہم سود ہیں۔

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 379

فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ یعنی بادشاہ کی بادشاہت میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عیسیٰ سے اس کا معنی بادشاہ کی عادات میں، روایت ہے یعنی وہ بغیر دلیل کے ظلم کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فی حکمہ اور وہ ہے چوروں کو غلام بنالینا۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اس کی خورجی میں پیالے کے رکھنے کے لیے کوئی علت اور عذر بنا دے۔ قتادہ نے کہا: بلکہ بادشاہ کا فیصلہ مارنے اور جرمانہ کرنے کا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کی زبانوں پر بنی اسرائیل کا حکم (چوروں کا غلام بنانا) جاری ہوگیا، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ یعنی علم و ایمان کے ذریعے اس کو نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی ہے نرفع من نشاء درجات، سورۃ الانعام میں یہ گزر چکا ہے۔ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اسرائیل نے سماک عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کیا ہے کہ یہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور وہ اس سے زیادہ علم والا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر علم والے سے اوپر ہے (1)۔ سفیان نے عن عبدالاعلی عن سعید بن جبیر روایت کیا ہے (2) انہوں نے کہا: ہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھے آپ نے گفتگو کی تو ایک آدمی نے حیرانگی کا اظہار کیا اور کہا: سبحان اللہ! وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کتنی بری بات تو نے کی ہے؟ اللہ علیم ہے اور وہ ہر عالم سے برتر ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝

''بھائی بولے: اگر اس نے چوری کی ہے (تو کیا تعجب ہے) بے شک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے پس چھپالیا اس بات کو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے جی میں اور نہ ظاہر کیا اسے ان پر (جی ہاں) کہا: تم بہت بری جگہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ وہ کہنے لگے: اے عزیز! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا) پس ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے، بے شک ہم تجھے نیکوکاروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے کہا: ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ پکڑ لیں ہم مگر اس کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے ورنہ ہم ظالم ہوں گے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ معنی یہ ہوگا: یعنی اس نے اپنے بھائی کی پیروی کی ہے، اگر ہماری پیروی کرتا تو چوری نہ کرتا۔ انھوں نے یہ صرف اس لیے کہا تا کہ وہ اس کے فعل سے بری ہو جائیں، کیوں کہ وہ ان کی ماں کا بیٹا نہیں تھا۔ اور اگر اس نے چوری کی ہے تو اس نے اپنے چور بھائی کا اثر قبول کر لیا ہے۔ کیونکہ نسب میں اشتراک اخلاق پر

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 35
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 34

بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اس چوری کے بارے میں اختلاف ہے جس کی نسبت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی ہے؛ مجاہد وغیرہ سے روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی حضرت اسحق کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی بڑی تھی، اس کے بڑے ہونے کی وجہ سے حضرت اسحق کا پٹکا اس کے پاس تھا کیونکہ وہ عمر کے اعتبار سے وارث بنتے تھے یہ حکم ہماری شریعت کے ذریعے منسوخ ہوگیا ہے تو وہ پٹکا جس نے چوری کیا تھا اسے غلام بنالیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور وہ آپ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتی تھی جب آپ کی پرورش مکمل ہوگئی اور آپ بڑے ہوگئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں کہا: یوسف کو میرے حوالے کردو، میں اس کو اپنی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل نہیں رکھ سکتا؛ میں اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور اس کی جدائی کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ تو آپ کی بہن نے آپ کو کہا: کچھ دن اسے میرے پاس چھوڑ دو تاکہ میں اس کا دیدار کرسکوں، جب حضرت یعقوب علیہ السلام باہر گئے تو اس نے حضرت اسحق کا پٹکا لیا اور اسے حضرت یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، پھر کہا: حضرت اسحق کا منطقہ گم ہوگیا ہے، اسے تلاش کرو کس نے لیا ہے؟ اس نے تلاش کیا پھر کہا: گھر والوں کے کپڑوں میں تلاش کرو، تلاشی لی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے ملا۔ تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! اب یہ میرا ہے میں اس کے ساتھ جو چاہوں وہ سلوک کروں پھر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کے پاس آئے تو اس نے آپ کو بھی اس کے بارے میں بتایا، تو آپ نے اس کو کہا: اگر اس نے ایسا کیا ہے تو اس کو تیرے سپرد کرتا ہوں؛ پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئیں۔ اس وجہ سے آپ کے بھائیوں نے یہ کہا: اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ اسی سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کی خورجی میں پیالہ رکھنے کا طریقہ سیکھا کیونکہ آپ کی پھوپھی نے بھی آپ کو اپنے ہاں رکھنے کے لیے ایسا ہی کیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا(1): حضرت یوسف علیہ السلام کی ماں نے آپ کو اپنے نانا کے بت چوری کرنے کا حکم دیا، آپ نے انہیں چوری کیا، توڑا اور راستے پر پھینک دیئے، ماں، بیٹے کا یہ عمل برائی کو ختم کرنے کے لیے تھا، اسی چوری کی طرف بھائیوں نے نسبت کی تھی۔ حضرت قتادہ نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ زجاج کی کتاب میں ہے: وہ سونے کا بت تھا۔ عطیہ عوفی نے کہا: آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھانے کے دستر خوان پر تھے کہ آپ نے گوشت کا ایک ٹکڑا دیکھا تو اسے چھپالیا اس وجہ سے انہوں نے چوری کی نسبت کردی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کھانے کے دستر خوان سے مساکین کے لیے چرا لیتے تھے؛ اس کو ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: انہوں نے آپ کی طرف چوری کی نسبت کر کے آپ پر الزام تراشی کی ہے یہی حضرت حسن نے کہا ہے۔

فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی بات اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ کو اپنے جی میں چھپالیا۔ یہ ابن شجرہ اور ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے اپنی بات اَنْتُمْ شَرٌّ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 36

مَكَانًا کو اپنے جی میں چھپالیا پھر اس کو ظاہر کرتے ہوئے کہا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہے یعنی تم نے جس کی طرف اس چوری کی نسبت کی ہے اس سے بہت بری جگہ پر ہو۔ اور وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے یہ جھوٹ ہے، اور اگر ہے بھی تو اللہ کی مرضی سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے بھائی انبیاء نہیں تھے۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ انہوں نے آپ کو عزیز کے نام سے مخاطب کیا کیونکہ اس وقت وہ پہلا معزول ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ اور ان کے قول: اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا سے مراد قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا ہے نہ کہ عمر کے اعتبار سے۔ فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ یعنی اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو غلام بنا لو۔ ایک قول کے مطابق یہ مجاز ہے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس پر غلامی کا حکم ثابت ہو چکا ہے اس کی جگہ کسی اور کو غلام بنانا جائز نہیں۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کسی کے کام کو ناپسند کرتے ہوئے اسے کہیں: تم مجھے قتل کر دو مگر اس طرح نہ کرو، تو اس سے تمہاری یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ تمہیں قتل کر دے بلکہ اسے اس کام سے روکنے میں مبالغہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ کہنا حقیقت پر مبنی ہو؛ تو ایسی صورت میں ان کے انبیاء ہوتے ہوئے (اگرچہ پہلے گزر چکا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ نبی نہ تھے) ان کا کسی آزاد کو غلام بنا لینے کی بات کرنا بعید از قیاس ہے، تو اس سے مراد یہی ہوگا کہ انہوں نے ایسا کہا کہ بنیامین کی آزادی کا ایک حیلہ اختیار کیا؛ یعنی اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو پکڑ لو یہاں تک کہ آپ تک آپ کے صاحب کو لوٹا دیا جائے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بنیامین اپنے باپ تک پہنچ جائے اور حضرت یعقوب علیہ السلام حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں؛ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بات کو رد کر دیا کیونکہ حدود وغیرہ میں ضمانت۔ وہ بھی صرف مضمون کو حاضر کرنے کی۔ باہم رضامندی سے جائز ہے لازم نہیں۔

جبکہ ایسی ضمانت کہ جس میں ضامن پر وہ سزا لاگو کر دی جائے جو مضمون پر تھی یہ بالاجماع جائز نہیں۔ اور ''الواضحۃ'' میں ہے کہ کفالت بالوجہ تمام حدود میں جائز ہے، سوائے نفس کے اور جمہور فقہاء کے نزدیک نفس میں بھی جائز ہے البتہ امام شافعی کا اختلاف ہے انہوں نے ایک مرتبہ اسے ضعیف قرار دیا اور ایک مرتبہ جائز قرار دیا ہے۔

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ جو تمام معاملات میں آپ نے ان کے ساتھ سلوک کیا اس کا انہوں نے اظہار کیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ اگر آپ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ مہربانی کر دیں تو ہم اس کو اپنے اوپر بہت بڑا احسان خیال کریں گے۔ یہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تاویل ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یہ مصدر ہے اَنْ نَّاْخُذَ محل نصب میں ہے؛ یعنی من ان ناخذ، اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا، ناخذ کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ یعنی ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بری کو مجرم کے بدلے پکڑ لیں، اور تمہارے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کریں۔ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ یعنی اس کے علاوہ کسی اور کو پکڑنے کی صورت میں ہم ظلم کرنے والے ہوں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے۔ ان کے بڑے بھائی نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے لیا تھا تم سے وعدہ جو پختہ کیا گیا تھا اللہ کے نام سے اور اس سے پہلے جو زیادتی یوسف کے حق میں تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہیں یاد ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک کہ اجازت نہ دیں مجھے میرے باپ یا فیصلہ فرمائے اللہ تعالیٰ میرے لیے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے''۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ یعنی وہ مایوس ہو گئے یہاں اسْتَيْـَٔسُوْا بمعنی ییئسوا ہے جیسے عجب اور استعجب، سخر اور استسخر دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ خَلَصُوْا یعنی وہ علیحدہ ہو گئے اور وہ ان کے ساتھ نہیں تھا نَجِيًّا، خَلَصُوْا میں پائی جانے والی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ واحد ہے اور جمع کا معنی دے رہا ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے اور اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے جیسے وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ (مریم) اس کی جمع أنجیة آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

إنِّ إذا ما القومُ كانوا انْجِيَة　　　واضْطَرَبَ القومُ إضطِرابَ الأَرْشِيَةْ

هُنَاكَ أَوْصِينِي وَلَا تُوصِي بِيَهْ

ابن کثیر نے استایسوا، ولا تایسوا۔ إنه لایایس، أفلم یایس پڑھا ہے یعنی بغیر ہمزہ کے الف کے ساتھ؛ یعنی پہلے ہمزہ اور بعد میں یا پھر ہمزہ کو الف سے بدل دیا کیونکہ یا ساکن ماقبل مفتوح تھا جبکہ اصل جماعت کی قرات ہے کیونکہ مصدر یا کی تقدیم کے ساتھ ہی آتا ہے یأسا اور الإیاس، أیس کا مصدر نہیں بلکہ یہ أُسْتُهٗ أَوْسًا وإيَاسًا کا مصدر ہے جس کا معنی ہے اعطیته میں نے اسے عطا کیا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: أیس اور یئس دونوں لغتیں ہیں؛ یعنی جب وہ اپنے بھائی کو لوٹانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا جس میں ان کے علاوہ کوئی اور آدمی شامل نہیں تھا، اور جو مسئلہ انہیں درپیش تھا اس میں انہوں نے باہم سرگوشی کی۔ اور نجی فعیل بمعنی مناجی ہے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ حضرت قتادہ نے کہا: وہ روبیل تھا، جو عمر میں ان سے بڑا تھا۔ مجاہد نے کہا: وہ شمعون تھا (1)، کیونکہ وہ رائے میں بڑا تھا۔ کلبی نے کہا: وہ یہوذا تھا، کیونکہ وہ ان میں زیادہ عقلمند تھا۔ محمد بن کعب اور ابن اسحاق نے کہا: وہ لاوی تھا، کیونکہ وہ ابو الانبیاء تھا۔ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی اپنے بیٹے کی حفاظت اور اس تک اسے واپس لوٹانے کا عہد جو اللہ کے نام سے پختہ کیا گیا تھا۔ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ، مَا، أن پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور معنی یہ ہوگا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے وعدہ لیا ہوا ہے جو اللہ کے نام کے ساتھ پختہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 43

کیا گیا ہے، اور تم یوسف کے بارے میں اپنی زیادتی کو جانتے ہو؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے اور مِنْ قَبْلُ میں مِنْ، تَعْلَمُوْٓا کے متعلق ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا زائدہ ہو۔ اور مِنْ قَبْلُ اور فِيْ يُوْسُفَ میں پائے جانے والے حروف جر فعل فَرَّطْتُّمْ کے متعلق ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَا اور فعل مصدر ہوں اور مِنْ قَبْلُ فعل مضمر کے متعلق ہو؛ تقدیر عبارت یہ ہو: تفریطکم فی یوسف واقع من قبل؛ ما اور فعل مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوں اور خبر وہ فعل مضمر ہو جس کے متعلق مِنْ قَبْلُ ہے۔ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ یعنی اس سرزمین کو لازم پکڑوں گا اور اسی میں مقیم رہوں گا؛ برح براحا وبرُوحا کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ''زال'' اور جب اس پر نفی داخل ہو جائے تو یہ مثبت بن جاتا ہے۔ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ یعنی میرا باپ مجھے واپس لوٹنے کی اجازت دے دے کیونکہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ یعنی اللہ تعالیٰ بھائی کے ساتھ واپس لوٹنے کا فیصلہ فرمادے تو میں اس کے ساتھ اپنے باپ کے پاس جاؤں گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تلوار کے ذریعے فیصلہ فرمادے تو میں جنگ کروں گا اور اپنے بھائی کو حاصل کروں گا یا پھر عاجز آ جاؤں تو کسی عذر کے ساتھ تو واپس پلٹوں گا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا لتاتننی بہ إلا أن یحاط بکم اور جس نے جنگ کی اور عاجز آ گیا تو گویا اسے گھیر لیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہوذا جب غصے میں ہوتا اور تلوار لے لیتا تو ایک ہزار آدمی بھی اسے واپس نہ کرسکتا؛ وہ اپنے بال سینے پہ ڈال لیتا۔ حدیث میں ہے کہ یہوذا نے اپنے بھائیوں کو کہا۔ اور یہ غصے کے حوالے سے سب سے زیادہ سخت تھا۔ یا تم بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہو جاؤ اور میں اہل مصر کے لیے کافی ہوں یا پھر تم اہل مصر کا بندوبست کرو اور میں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے کافی ہوں؛ انہوں نے کہا: آپ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کا بندوبست کرو جبکہ ہم اہل مصر کے لیے کافی ہیں؛ تو اس نے ایک بھائی کو بھیجا کہ مصر کے بازار گن کر آؤ تو اس نے مصر میں نو بازار دیکھے، تو ان میں سے ہر ایک نے ایک بازار کو لے لیا؛ پھر یہوذا حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گیا اور کہا: اے بادشاہ! اگر تو نے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ نہ بھیجا تو میں ایسی چیخ ماروں گا کہ جس کی وجہ سے تیرے شہر کی حاملہ عورتیں اپنے حمل گرا دیں گی؛ اور یہ ان میں بالخصوص غصہ کے وقت ہوتا تھا؛ اس بات نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی غصہ دلا دیا۔ تو یہوذا غصے میں آ گیا اور اس کا غصہ شدت اختیار کر گیا، اس کے بال کھڑے ہو گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹوں کی یہی حالت تھی جب انہیں غصہ آتا تو ان کی جلد کانپنے لگتی، جسم پھول جاتا اور ان کی پیٹھ کے بال کپڑوں کے نیچے سے ظاہر ہو جاتے، یہاں تک کہ ہر بال سے خون کا قطرہ بہنے لگتا اور اگر وہ زمین پر پاؤں مار دیتا تو زلزلہ بپا ہو جاتا تھا اور عمارتیں گر جاتی تھیں، اور اگر وہ چیخ مارتا تو عورتوں، جانوروں اور پرندوں میں سے جو بھی اسے سن لیتا وہ اپنے پیٹ میں جو کچھ ہوتا اسے گرا دیتا تھا، پھر اس کا غصہ تب تک نہیں تھمتا تھا جب تک کہ وہ خون نہ بہتا یا پھر نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کوئی ہاتھ اسے نہ روکتا؛ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو پتہ چل گیا کہ ان کے بھائی یہوذا کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے تو آپ نے اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ قبطی زبان میں گفتگو کی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنا ہاتھ یہوذا کے دونوں کندھوں کے درمیان اس طرح رکھے کہ وہ دیکھ نہ پائے؛ تو بچے نے اسی طرح کیا تو یہوذا کا غصہ ختم ہو گیا، اس نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنے دائیں

بائیں دیکھا کہ شاید اسے اپنے بھائیوں میں سے کوئی نظر آئے لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا؛ تو وہ جلدی جلدی اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور کہا: کیا تم میں سے کوئی میرے پاس آیا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں؛ اس نے کہا: شمعون کہاں چلا گیا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ پہاڑ کی طرف گیا ہے: وہ نکلا اور اس کو مل گیا، اور وہ ایک بڑی چٹان کو اٹھا رہا تھا؛ اس نے کہا: اس کے ساتھ کیا کرو گے؟ اس کو اس بازار میں لے کر جاؤں گا جو میرے حصے میں آیا ہے اور اس کے ذریعے بازار میں موجود ہر آدمی کو کچل دوں گا اس نے کہا: واپس لوٹ اور اسے چھوڑ دے یا اسے دریا میں پھینک دے، تو اس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا، اس ذات کی قسم جس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا ہے؛ مجھے نسل یعقوب علیہ السلام میں سے کسی ہاتھ نے مس کیا ہے پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام پکڑنے کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ سخت تھے آپ نے فرمایا: اے عبرانیو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ قوت میں تم سے زیادہ کوئی نہیں پھر طاحونہ کے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر آپ نے لیا اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور اسے دیوار کے پیچھے پہنچا دیا۔ الوکل کا لفظ یہاں استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے پاؤں سے ٹھوکر مارنا وقد رکلہ یرکلہ یہ جوہری کا قول ہے۔ پھر یہوذا کو آپ نے اپنے ایک ہاتھ سے پکڑا اور اپنے پہلو میں کھینچ لیا، اور کہا: میرے پاس لوہے کی سلاخیں لے آؤ میں ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹوں اور ان کی گردنیں اڑا دوں؛ پھر آپ اپنے تخت پر براجمان ہوئے اپنی مسند پر بیٹھے اور اپنے ہیٹ کے بارے میں حکم فرمایا تو وہ آپ کے سامنے رکھا گیا تو اس سے گھنٹی کی آوازیں آئیں، آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: یہ کہہ رہی ہے کہ ان کے باپ کے دل پر جو پریشانی، غم اور کرب ہے وہ انہی کی وجہ سے ہے پھر دوبارہ آواز آئی اور آپ نے فرمایا: یہ آواز مجھے بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ایک چھوٹے بھائی کو پکڑا، حسد میں مبتلا ہوئے اور اسے اپنے باپ سے چھین لیا اور پھر اسے ضائع کر دیا۔ انہوں نے کہا: اے عزیز! ہماری پردہ پوشی کر اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے گا، ہمارے اوپر احسان کر اللہ تعالیٰ تیرے اوپر احسان کرے گا۔ پھر تیسری مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ آواز بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو کنویں میں پھینکا ہے، پھر اسے انتہائی سستا غلاموں کی قیمت پر بیچ دیا، اور اپنے باپ کو بتایا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے، پھر چوتھی مرتبہ صدا آئی تو آپ نے فرمایا: اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ اسی سال سے گناہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے انہوں نے استغفار نہیں کیا اور نہ ہی توبہ کی ہے، پھر پانچویں مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا: یہ کہتی ہے کہ جس بھائی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا ہے چند دنوں میں وہ واپس لوٹے گا اور ان کی کاروائی سے لوگوں کو آگاہ کرے گا۔ پھر چھٹی مرتبہ آواز آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کہہ رہی ہے: اگر تم انبیاء یا انبیاء کی اولاد ہوتے تو تم نے جھوٹ نہ بولا ہوتا اور نہ ہی اپنے والد کی نافرمانی کی ہوتی۔ میں تمہیں سارے جہانوں کے لیے ضرور عبرت بناؤں گا، میرے پاس سلاخیں لاؤ میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹوں تو انہوں نے آہ وزاری کی، روئے اور توبہ کی اور کہنے لگے: اگر ہمیں بھائی یوسف علیہ السلام مل جائے اگر وہ زندہ ہے تو ہم اس کے تابعدار بن جائیں گے اور ہم مٹی بن جائیں گے جسے وہ اپنے پاؤں سے روندے گا؟ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف سے اس منظر کو دیکھا تو آپ رو پڑے اور انہیں فرمایا: میرے پاس سے

چلے جاؤ! میں نے تمہارے باپ کی عزت کی خاطر تمہیں چھوڑ دیا اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دیتا۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝

''تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر (انہیں یہ) عرض کرو: اے ہمارے محترم باپ! بلاشبہ آپ کے بیٹے نے چوری کی (اس لیے وہ گرفتار کر لیا گیا) اور ہم نے (آپ سے) وہی کچھ بیان کیا جس کا ہمیں علم تھا اور ہم نہیں تھے غیب کی نگہبانی کرنے والے''۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ کا قول اسی نے کہا جس نے فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ کہا تھا فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ضحاک اور ابورزین نے اس کو اِنَّ ابنك سرق پڑھا ہے، نحاس نے کہا: مجھے محمد بن احمد بن عمر نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ابن شاذان نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن ابی سریج بغدادی نے بیان کیا انہوں نے کہا: میں نے کسائی کو یا أبانا إنّ ابنك سرق پڑھتے ہوئے سنا ہے، یعنی سین کے ضمہ اور راء مکسورہ کی شد کے ساتھ، یعنی تیرے بیٹے کی طرف چوری کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے خونته، و فسقته و فجرته کہا جاتا ہے جب ان عادات کی طرف کسی کی نسبت کی جائے۔ زجاج نے کہا: سرق میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس سے چوری کا پتہ چلا ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر چوری کی تہمت لگی ہے۔ جوہری نے کہا السرق اور السرقة را مکسورہ کے ساتھ یہ اس چوری شدہ چیز کو کہتے ہیں اور سَرَقَ يَسْرِقُ کا مصدر فتحہ کے ساتھ آتا ہے۔

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا ان کی مراد یہ تھی کہ انہوں نے وہی کچھ بیان کیا جس کا ان کو علم تھا۔ اور جہاں تک اب کی صورتحال ہے تو ہم نے ظاہر کی گواہی دی ہے اور ہم غیب کو نہیں جانتے، گویا بنیامین کے قول: میری خورجی میں اسے اس نے رکھا ہے جس نے تمہاری خورجیوں میں تمہارا سامان رکھا، نے تمہیں تہمت میں مبتلا کر دیا؛ اس کا یہ معنی ابن اسحق نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ ما شهدنا عند يوسف بأن السارق يسترق إلّا بما علمنا من دينك یہ ابن زید کا قول ہے۔ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ یعنی جس وقت ہم نے اسے آپ سے لیا ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ چوری کرے گا ورنہ ہم اسے لیتے ہی نہ۔ مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا: ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا اور ہمارے اس کام کا یہ انجام ہوگا۔ اور ہم نے تو صرف یہ کہا تھا: ہم اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی مراد یہ تھی (1) کہ اس نے رات کے وقت چوری کی ہے جبکہ وہ سو رہے تھے اور حمیر کی لغت میں غیب سے مراد رات ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے: ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ اپنی رات، دن اور آنے جانے میں کیا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: جب تک ہمارے سامنے رہا کوئی گڑبڑ نہ ہوئی اور جب ہم سے غائب ہو گیا تو اس کے حالات ہم

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 46

سے پوشیدہ ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے: چوری کا سامان اس کی خورجی سے پکڑا گیا ہے۔ اور ہم نے اس سامان کو نکالا اور اس کی طرف دیکھتے رہے اور ہمیں غیب کا کوئی علم نہیں۔ شاید انہوں نے اس کی طرف چوری کو منسوب کر دیا ہو اور اس نے چوری نہ کی ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جس طرح بھی پتہ چل جائے اس کی شہادت دینا جائز ہے، کیونکہ شہادت کا تعلق عقلاً اور شرعاً علم کے ساتھ ہے، لہٰذا یہ صرف اسی سے سنی جاتی ہے جس کو اس کا علم ہو، اور انہیں کی طرف سے اسے قبول کیا جاتا ہے۔ شہادات کے سلسلہ میں یہ قانون ہے، اسی وجہ سے ہمارے (مالکیہ) علماء نے کہا ہے: اندھے کی گواہی جائز ہے، کوشش کر کے سننے والے کی شہادت جائز ہے، اور گونگے کی شہادت جبکہ اس کا اشارہ سمجھ آ جائے جائز ہے، اسی طرح خط پر شہادت بشرطیکہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اس کا خط ہے یا فلاں کا خط ہے صحیح ہے پس ہر وہ آدمی جسے کسی چیز کا علم ہو جائے تو اس کے لیے شہادت دینا جائز ہوگی اگرچہ اسے اس پر گواہ نہ بھی بنایا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ** ۝ (الزخرف) یعنی مگر وہ جس نے سچی گواہی دی اس حال میں کہ وہ جانتے ہوں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میں تمہیں گواہوں کی اچھائی کے متعلق بتاؤں، گواہوں کی بھلائی یہ ہے کہ وہ گواہی دیں قبل اس کے کہ ان سے گواہی کے بارے میں پوچھا جائے'' (1)۔ اس کی تفصیل سورۃ ''البقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ گزرنے والے کی شہادت کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کہے: میں فلاں کے پاس سے گزرا تو میں نے اسے یوں کہتے ہوئے سنا تو اگر اس نے پوری بات کو سن لیا ہو تو وہ شہادت دے سکتا ہے جبکہ امام مالک کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب تک اسے گواہ نہ بنایا جائے تب تک وہ گواہی نہیں دے سکتا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ پوری بات سمجھ آ جانے کی صورت میں اداء شہادت درست ہے۔ یہی علماء کی جماعت نے کہا ہے۔ اور یہی حق ہے، کیونکہ اس صورت میں اس نے مطلوب کو حاصل کر لیا ہے، اور اس پر علم کی ادائیگی لازم ہو چکی ہے، پس گواہوں کی بھلائی اس میں ہے جب وہ اس کو ظاہر کر دیں اور برائی اس میں ہے جب وہ اس کو چھپالیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب کسی آدمی نے ایسی گواہی دی کہ اس کی عمر اس کی متحمل نہیں تھی تو اس کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ اس نے باطل دعویٰ کیا ہے اور ظاہر نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔

**وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا وَالۡعِيۡرَ الَّتِىۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِيۡهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ** ۝

''اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے اور (پوچھیے) اس قافلے سے جس میں ہم آئے اور یقیناً ہم سچ عرض کر رہے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ **وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا وَالۡعِيۡرَ** اس کے ذریعے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس اپنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، بیان خیر الشہود، جلد 2، صفحہ 77

شہادت کو ثابت کر رہے ہیں اور اپنے آپ سے الزام کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ آپ ان پر الزام نہ لگائیں ۔اور وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ سے مراد اہل قریہ ہیں مضاف محذوف ہے اور قریہ سے مراد مصر ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جس میں وہ اترے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ قریہ اگرچہ جمادات پر مبنی ہے مگر آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جمادات کو بھی آپ کی خاطر زبان عطا فرمائے گا اور وہ گفتگو کریں گے۔ اگر یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر اضمار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سیبویہ نے کہا: کلم هند کہہ کر غلام هند مراد لینا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ اشکال کا باعث ہے اور الْعِيْرَ میں وہی گفتگو ہے جو الْقَرْيَةَ میں تھی۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ یعنی اپنی بات میں ہم سچے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اس آیت میں فقہ کا ایک قاعدہ بھی ہے کہ ہر وہ آدمی جو حق پر ہے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر نہیں یا اس کا خیال ہو کہ اس طرح وہ تہمت و الزام کو دور کر سکتا ہے اور اس حق کی وضاحت کر سکتا ہے جس پر وہ ہے تو اسے ایسا کر لینا چاہیے تا کہ کسی کا کوئی اعتراض باقی نہ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت صفیہ کے ساتھ مسجد سے انہیں رخصت کرتے ہوئے گزرتے ہوئے دو آدمیوں کو یہ کہہ کر کہ ''یہ صفیہ بنت حی'' ہے(1) ایسا ہی کیا، تو ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ! اور ان پر یہ بات گراں گزری، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان انسان کے خون تک پہنچ جاتا ہے اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ تمہارے دل میں کوئی تہمت نہ ڈال دے''۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

''آپ نے (یہ سن کر) کہا: بلکہ آراستہ کر دی ہے تمہارے لیے تمہارے نفسوں نے یہ بات، (میرے لیے) اب صبر ہی زیبا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو، بے شک وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ یعنی اس نے آراستہ کر دیا لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اس بات کو کہ میرے بیٹے نے چوری نہیں کی، بلکہ یہ تو صرف ایسے کام کے لیے ہوا ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ یعنی میرا طریقہ صبر جمیل ہے یا صبر جمیل ہی مجھے زیبا ہے جس طرح کہ سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب اسے اس کی اولاد کو یا اس کے مال کو کوئی مصیبت لاحق ہو تو صبر جمیل کے ذریعے تسلی حاصل کرے اسی طرح اس حلیم و حکیم کی رضا اور تسلیم کو حرز جان بنائے اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام اور سارے انبیاء کی پیروی کرے۔ سعید بن ابی عروبہ نے عن قتادہ عن حسن کہا ہے: بندے کے دو گھونٹوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ گھونٹ نہیں جن کو بندہ بھرتا ہے ایک وہ مصیبت کا گھونٹ جس کو بندہ خوبصورت صبر اور خوبصورت تسلی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصیام، هل یخرج المعتکف لحوائجه، جلد 1، صفحہ 272

کے ذریعے بھرتا ہے اور دوسرا وہ غصہ کا گھونٹ جس کو بردباری اور عفو کے ذریعے بھرتا ہے۔ ابن جریج نے مجاہد سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کے بارے میں کہا: یعنی میں کسی کو بھی اس کی شکایت نہیں کروں گا۔ مقاتل بن سلیمان نے عطا بن ابی رباح عن ابی ہریرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے کسی کو آگاہ کردیا اس نے صبر نہیں کیا''۔ اور سورۃ ''البقرہ'' میں گزر چکا ہے کہ صبر صدمہ کے آغاز میں ہوتا ہے۔ اور ثواب اسے حاصل ہوتا ہے جس نے مصیبت کا ذکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اگرچہ مصیبت کا وقت گزر ہی کیوں نہ چکا ہو۔ جویبر نے ضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے سو شہیدوں کا ثواب عطا کیا گیا۔ اور اسی طرح اس امت میں سے جس نے مصیبت کو برداشت کیا تو اس کو بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اجر جیسا اجر دیا جائے گا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا کیونکہ آپ کے نزدیک یہ بات ثابت تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا بلکہ صرف آپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں، کیونکہ جب یوسف کو اٹھایا گیا تو وہ غلام تھے خود اپنے لیے کسی چیز کے مالک نہیں تھے پھر بادشاہ نے انہیں خرید لیا تو آپ اس کے گھر رہتے تھے اور لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے پھر آپ کو قید میں ڈال دیا گیا اور جب قدرت حاصل ہوئی تو آپ نے ایک ایسا حیلہ کیا جس کے ذریعے آپ کے متعلق آپ کے باپ کو پتہ چل جائے۔ اور آپ نے قاصد کی طرف کوئی توجہ نہ دی کیونکہ آپ کے بھائیوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اس سلسلے کو پہنچاتے اور آپ نے بِهِمْ کہا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تین بھائی تھے؛ ایک حضرت یوسف علیہ السلام، آپ کا بھائی بنیامین اور تیسرا جو بنیامین کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا اور جس نے کہا تھا: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ یعنی میرے حال کو جانتا ہے۔ الْحَكِيْمُ اور جو کچھ گزر چکا اس میں دانا ہے۔

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾

''اور منہ پھیر لیا آپ نے ان کی طرف سے اور کہا: ہائے افسوس! یوسف کی جدائی پر اور سفید ہوگئیں ان کی آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کیے ہوئے تھے''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ یعنی آپ نے ان سے اعراض کیا؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام تک بنیامین کی خبر پہنچی تو آپ کی پریشانی بہت زیادہ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے جو مصیبت آپ کو لاحق ہوئی تھی اسے تازہ فرمادیا۔ آپ نے فرمایا: يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ اور اپنے بیٹے بنیامین کو بھول گئے اس کا کوئی ذکر نہ کیا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف کے واپس لوٹنے کی امید نہیں تھی ورنہ آپ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ نہ کہتے۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کا معنی یاحزناہ ہے (1)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: ''یا جزعاہ'' کثیر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 48

فیا أسفا للقلب کیف انصرافهُ       وللنّفسِ لمّا سلّیت فتسلّتِ

ہائے افسوس دل کے لیے اس کا پھیرنا کیسے ممکن ہوگا اور نفس کو جب میں نے تسلی دی تو اس نے تسلی پالی۔

الأسف فوت شدہ چیز پر شدت غم کو کہتے ہیں۔ اور ندا کا مطلب یہ ہوگا: اے افسوس آ کہ یہ تیرا وقت ہے۔ زجاج نے کہا: اصل میں یا اسفی تھا یا کو الف سے بدل دیا گیا فتحہ کی خفت کی وجہ سے وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ کہا گیا ہے کہ چھ سال تک آپ نے نہ دیکھا اور آپ نابینا ہو گئے، یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: آنکھ سفید ہوگئی مگر تھوڑا سا نظر آتا تھا اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کی حالت کو بہتر جانتا ہے۔ اور آپ کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سفید ہوگئیں اور چونکہ رونے کا سبب حزن تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْحُزْنِ کہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام آپ کے سامنے لمبے لیٹے ہوئے تھے تو آپ نے نیند میں خراٹا لیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام آپ کی طرف متوجہ ہوئے پھر دوبارہ خراٹا لیا تو دوبارہ متوجہ ہوئے پھر تیسری مرتبہ خراٹا لیا تو انتہائی خوشی و مسرت سے آپ نے توجہ فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی فرمائی: میرے صفی اور میرے خلیل کے بیٹے کو دیکھو کھڑا میری مناجات میں ہے اور دیکھتا غیر کو ہے۔ مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! میں ضرور وہ دونوں آنکھیں چھین لوں گا جن کے ذریعے وہ متوجہ ہوا ہے۔ اور اس کے درمیان اور جس کی طرف اس نے توجہ کی اس کے درمیان اسی سال تک جدائی ڈال دوں گا تا کہ عالمین کو پتہ چل جائے کہ جو میرے سامنے کھڑا ہو تو اس پر میری نظر کی نگہبانی لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ نماز میں توجہ۔ اگرچہ نماز کو باطل نہیں کرتی ..... مگر اس میں نقص اور پکڑ پر دلالت کرتی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز میں توجہ کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''یہ وہ جھپٹا ہے جو شیطان بندے کی نماز سے مار لیتا ہے''(1)۔

سورۃ ''المومنون'' میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا کہ علماء اس حوالے سے کیا کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ نحاس نے کہا: اگر لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حزن کی شدت کے متعلق پوچھیں تو اس کے تین جوابات ہیں جو علماء نے بیان کیے ہیں۔

نمبر 1: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چلا کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں تو انہیں ان کے دین کا خوف لاحق ہوا۔ اس وجہ سے ان کی پریشانی شدت اختیار کر گئی۔

نمبر 2: ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ آپ نے بچپن میں انہیں بھائیوں کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے پریشان ہوئے اور اس پر شرمندہ بھی ہوئے۔

نمبر 3۔ یہ تیسرا جواب زیادہ واضح ہے اور وہ یہ کہ پریشانی کوئی ممنوع چیز نہیں ممنوع تو واویلا، کپڑوں کو پھاڑنا اور ایسا کام کرنا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، الالتفات فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 104

ہے جو نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آنکھیں بہتی ہیں دل پریشان ہوتا ہے اور ہم ایسی بات نہیں کہتے جو رب کو ناراض کر دے'' (1)۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے ارشاد: فَهُوَ كَظِيْمٌ کے ذریعے بیان فرما دیا۔ اس کا معنی ہے کہ حزن و پریشانی سے بھرا ہوا ہے اور اس پر کنٹرول کیے ہوئے اس کی شکایت اور اظہار نہیں کرتا اسی سے کظم الغیظ ہے اس سے مراد غصے کا چھپانا ہے۔ مکظوم سے مراد یہ کہ جس پر حزن کے راستے مسدود ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿٤٨﴾ (القلم) یعنی کرب و پریشانی سے بھرا ہوا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مکظوم بمعنی کاظم ہو اس سے مراد وہ ہے جو خوف پر مشتمل ہو اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کظیم سے مراد مغموم ہے۔ شاعر نے کہا:

فإنْ أَكُ كاظِمًا لِمُصابِ شَاسٍ     فإنّي اليومَ مُنطلقٌ لسانِي

ابن جریج نے مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کہ آپ نے فرمایا: آپ کی آنکھیں پریشانی کی وجہ سے چلی گئیں (2) فَهُوَ كَظِيْمٌ آپ نے فرمایا: فهو مكروب یعنی آپ رنج و مشقت میں تھے۔ مقاتل بن سلیمان نے عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فَهُوَ كَظِيْمٌ کے بارے میں کہا: فهو كمد آپ پوشیدہ پریشانی میں تھے۔ کہتے ہیں: آپ جانتے تھے کہ یوسف زندہ ہے جبکہ یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، اس وجہ سے آپ باطنی طور پر پریشان تھے۔ جوہری نے کہا: الكمد سے مراد پوشیدہ غم ہے۔ اس سے كَمِدَ الرَّجُلُ كَمِدٌ وَ كَمِيْدٌ کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ فلان كظيم و كاظم یعنی ایسا پریشان جو اپنی پریشانی کی شکایت نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

فَحَضَضْتُ قَوْمِي واحتسبتُ قِتَالَهم     والقومُ من خوف المَنَايا كُظَّم

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾

''بیٹوں نے عرض کی: بخدا! آپ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں یوسف کو کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت یا آپ ہلاک نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں اور میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کو آپ کے بیٹے نے کہا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ کسائی نے کہا: فَتَأْتُ و فَتِئْتُ افعل ذالك یعنی مازلت۔ فراء کا خیال ہے کہ لا مضمرہ ہے یعنی لا تفتا اس نے شعر بطور استشہاد بیان کیا ہے:

فقلتُ يمينُ الله أبرحُ قَاعِدًا     ولو قَطعوا رأسِي لدَيكِ وأوصَالِي

یہاں ابرح اصل میں لا ابرح ہے۔ نحاس نے کہا: جو حسن نے کہا ہے وہ صحیح ہے۔ خلیل اور سیبویہ کا خیال ہے کہ ''لا'' قسم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ما جاء فی البکاء علی المیت، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث نمبر 1577، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 50

میں مضمر ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی اشکال نہیں اور اگر واجب ہوتا تو لام اور نون کے ساتھ ہوتا۔ اور آپ کے بیٹوں نے آپ کو یہ بات اس لیے کہی کیونکہ وہ یقین سے جانتے تھے کہ آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے؟ کہا جاتا ہے: مازال یفعل کذا اور مافتی اور فتأ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں انکار کے ساتھ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فما فَتئتُ حتّی کأنّ غُبارَھا ... سُرادِقُ یومٍ ذی ریاحٍ تُرَفَّعُ (1)

یعنی مابرحت فتفتا تبرح۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تزال ہے۔

**حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا** یعنی آپ بیمار ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: بیماری کی وجہ سے قریب الموت ہونا مراد ہے اور یہ موت سے کم درجہ ہے۔ شاعر نے کہا:

سَرَی ھمّی فأمرضنی ... وقِدْمًا زادنی مَرَضَا

کذاکَ الحبُّ قبل الیومِ مِمّا ... یُورِثُ الحَرَضَا

قتادہ نے کہا: اس کا معنی بڑھاپا ہے (2)۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی نشان کا مٹنا ہوا اور محو ہونا ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: اس سے مراد ذہنی توازن کا کھونا ہے (3)۔ فراء نے کہا: حارض سے مراد فاسد الجسم اور فاسد العقل ہے۔ اسی طرح حرض کا معنی بھی یہی ہے۔ حضرت ابن زید نے کہا: حرض سے مراد ارزل العمر کی طرف لوٹنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہڈیوں پر جسم کا خشک ہو جانا مراد ہے مؤرج نے کہا: غم سے پگھلنا مراد ہے۔ اخفش نے کہا: غم سے چل بسنا مراد ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ہلاک ہونے والا معنی ہے۔ یہ تمام معنی قریب قریب ہیں۔ اور حرض کی اصل پریشانی عشق یا بڑھاپے کی وجہ سے جسم اور عقل میں فساد کا آ جانا ہے عرجی نے کہا:

إنّی امرؤٌ لَجَّ بی حُبٌّ فأَحْرَضَنِی ... حتّی بَلِیتُ وحتّی شَفَّنِی السَّقَمُ (4)

نحاس نے کہا: حَرَضَ حَرَضًا، حَرُضَ حُرُوضًا، حُرُوضۃ کہا جاتا ہے جب آدمی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے بخار ہو جائے۔ اسی طرح رجل حارِض و حَرَض'' البتہ حرضا کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ اسی طرح قَمِن اور حری میں ان کا بھی تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ ثعلبی نے کہا: عربوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مذکر کے لیے حارض اور مؤنث کے لیے حارضہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں پس جب اس لفظ کے ساتھ وصف بیان کرتے ہیں تو تثنیہ جمع اور مؤنث استعمال کرتے ہیں۔ اور حَرِضَ یَحْرَضُ، حَرَاضۃً فھو حَرِیض، وحَرِضٌ کہا جاتا ہے اور ''رجل مُحْرَض'' کہا جاتا ہے شاعر نے کہا:

طَلَبَتْہُ الخیلُ یوما کاملا ... ولو الْفَتْہُ لَأَضْحَی مُحْرَضَا (5)

امرؤ القیس نے کہا:

أَرَی المرءَ ذا الأَذْوَاد یُصْبِحُ مُحْرَضًا ... کإحْرَاضِ بِکْرٍ فی الدّیارِ مَرِیضِ (6)

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 52
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54
3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 55
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 54

نحاس نے کہا: اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ جب غم کسی کو بیمار کردے تو احرضه الهم کہتے ہیں اور رجل حارض سے مراد احمق آدمی لیا جاتا ہے۔ انس نے حرضا حا کے ضمہ اور را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اشنان کی لکڑی کی طرح۔ حضرت حسن نے حا اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: الحَرَض والحُرُض دونوں کا معنی اشنان ہے۔ اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ یعنی مردہ۔ یہ ان سب کا قول ہے اور ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام رونے سے اور پریشان رہنے سے باز آجائیں یہ ان کی محبت پر دال ہے جبکہ اس کا سبب بھی وہی تھے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ لغت میں بث کی حقیقت وہ مہلک اشیاء ہیں جو انسان پر وارد ہوتی ہیں جن کو پوشیدہ رکھنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ بثثته سے مشتق ہے جسکا معنی ہے فرقته، تو مصیبت کو مجاز أبث کہہ دیا گیا۔

ذوالرمہ نے کہا:

وَقفتُ على رَبْع لِمَيّةَ نَاقتی　　فما زِلْتُ أَبْكِي عندَهُ وأُخَاطِبهُ

وأَسْقِيه حتّى كاد مما أبثُّهُ　　تُكَلِّمُنى　　أَحْجَارُهُ　　ومَلَاعِبُهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بثی سے مراد ہے همی میرا غم۔ حضرت حسن نے کہا: حاجتی، اپنی حاجت۔ ایک قول ہے: غم کی سختی، اور اس کی حقیقت وہی ہے جو ذکر کردی گئی ہے۔ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ معطوف علیہ ہے۔ یہ اسی کا اعادہ ہے مترادف لفظ کے ذریعے۔ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے (1) اور میں اسے سجدہ کروں گا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے اپنے ساتھ احسانات کو جانتا ہوں جو مجھے اس کے ساتھ حسن ظن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام نے ملک الموت کو کہا: کیا تو نے یوسف کی روح قبض کرلی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو اس گفتگو نے آپ کی امید کو اور زیادہ پختہ کردیا۔ سدی نے کہا: آپ اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کے بیٹے نے آپ کو بادشاہ کی سیرت، عدل، اخلاق اور گفتگو کے بارے میں بتایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے سو آپ کو لالچ پیدا ہوا اور آپ نے کہا: شاید وہ یوسف ہو اور آپ نے کہا: زمین میں صدیق صرف نبی ہوتا ہے (2)۔ ایک قول یہ ہے: میں مجبور کی دعا کی قبولیت کو زیادہ جانتا ہوں جتنا تم نہیں جانتے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے بلا شبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ''۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کو حضرت یوسف علیہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 57　　1۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 61

السلام کی زندگی کا یقین تھا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں: یا تو خواب کے ذریعے، یا اللہ تعالیٰ نے بھیڑیے کو بولنے کی طاقت دی اور بھیڑیے نے بتایا جس طرح کہ واقعہ کی ابتدا میں ہے یا ملک الموت نے خبر دی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی روح کو قبض نہیں کیا اور یہ زیادہ ظاہر ہے۔ التحسس حواس کے ذریعے کسی چیز کو طلب کرنا ہے۔ یہ حس سے باب تفعل ہے یعنی اس آدمی کے پاس جاؤ جس نے تم سے تمہارا بھائی طلب کیا اور تم سے اسے لینے کا حیلہ اختیار کیا اور اس کے متعلق اور اس کے مذہب کے متعلق پوچھو اور روایت ہے کہ ملک الموت نے آپ کو کہا: اسے یہاں تلاش کرو! اور اس نے مصر کی جانب اشارہ کیا۔ اور ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام سامان کی واپسی، بھائیوں کی قید اور کرامت کے اظہار کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام پر آگاہ ہوئے اسی وجہ سے آپ نے انہیں مصر کی طرف ہی متوجہ کیا کسی اور طرف نہیں، وَ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کشادگی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ مومن اللہ کی کشادگی کی امید رکھتا ہے اور کافر سختی میں ناامید ہوتا ہے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا: روح اللہ سے مراد اللہ کی رحمت ہے (1)۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔ سورۂ "الزمر" میں ان شاء اللہ اس کا بیان آئے گا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

"پھر جب وہ گئے (یوسف) کے پاس تو انہوں نے عرض کی: اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو مصیبت اور (اس مرتبہ) ہم لے آئیں ہیں حقیری پونجی پس پورا ناپ کر دیں ہمیں پیمانہ اور (اس کے علاوہ) ہم پر خیرات بھی کریں، بے شک اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو"۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ یعنی روکنے والے مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یہ ان کے مصر آنے کی تیسری دفعہ تھی۔ کلام میں حذف ہے یعنی وہ مصر کی طرف نکلے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: مَسَّنَا یعنی ہمیں پہنچی ہے۔ وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ یعنی بھوک اور حاجت، اس میں مصیبت یعنی بھوک کے وقت شکوہ کے جواز پر دلیل ہے، بلکہ جب فقر کی وجہ سے اسے اپنے اوپر کسی مصیبت کا خوف ہو تو اس پر واجب ہے۔ اور اس کے علاوہ جس آدمی سے نفع کی امید ہو اس کے سامنے اپنی حاجت کو ظاہر کرنا چاہیے، جس طرح کہ ڈاکٹر کے سامنے درد وغیرہ کی شکایت کرنا واجب ہے تاکہ وہ علاج کرے۔ اور یہ چیز توکل میں قدح کا باعث نہیں یہ اس صورت میں ہوگا جب شکوہ ناراضگی کی صورت میں نہ ہو۔ اور مصائب میں صبر اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اور سوال کرنے سے باز رہنا افضل ہے اور شکوہ میں عمدہ کلام یہ ہے کہ غلام کا سوال مصیبت کا زوال ہے اور یہی حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول ہے: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کی کاریگری کی خوبصورتی، مہربانی کی عجیب صورت اور اپنے بندوں پر اس کی توجہ، جہاں تک ایسے آدمی کے سامنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 61

شکوہ کرنے کا تعلق ہے جو اس کا ازالہ نہ کر سکے تو یہ بے وقوفی ہے، البتہ وہ فقط تسلی اور معاملے کو ظاہر کرنے کے لیے ہو تو (پھر درست ہے) جس طرح کے ابن درید نے کہا:

لَاتَحْسَبَنْ یَا دھرُ اِنِّی ضَارِعٌ لِنَکْبَۃٍ تَعْرِقُنِی عَرْقَ الْمُدَی

مَارَسْتَ مَنْ لَوْ ھَوَتِ الأَفلاکُ مِنْ جَوَانِبِ الجوِّ علیہ ماشَکَا

لکنھا نَفْثَۃٌ مَصْدورٍ إذا جَاشَ لُغَامٌ مِن نَوَاحِیھَا غَمَا

وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ۔ البضاعۃ سے مراد مال کا وہ ٹکڑا ہے جس کے ذریعے کسی چیز کی خریداری کا قصد کیا جاتا ہے۔آپ کہتے ہیں: أبضعتُ الشیٔ واستبضعتہ یعنی میں نے اسے مال بنایا۔ضرب المثل میں ہے: کمستبضع التمرالی ھجر (بحرین کا ایک شہر) مزجاۃ، بضاعۃ کی صفت ہے۔ الازجاء کسی چیز کو دور پھینک دینا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا (النور: 43) ہے معنی یہ ہوگا کہ یہ مسترد کر دیا جانے والا مال ہے جس کو ہر ایک قبول نہیں کرتا۔ثعلب نے کہا: البضاعۃ المزجاۃ سے مراد تھوڑا مال ہے جو پورا نہ ہو۔ یہاں اس کے تعین میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے: وہ جنگلی جانوروں کے گوشت کے خشک ٹکڑے تھے۔اس کو واقدی نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ایک قول یہ ہے: کہ اس کا معنی رسیوں اور کپڑوں کی بوسیدگی ہے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ایک قول یہ ہے۔ بدوؤں کا سامان اون اور گھی تھا (2)۔ یہ عبداللہ بن حارث کا قول ہے۔ایک قول ہے: سبز دانے اور صنوبر تھا اور وہ بطم ہے یعنی شام میں پائے جانے والے ایک درخت کا بیج ہے۔اسے کھایا جاتا ہے اور صابن بنانے کے لیے اس سے تیل بھی نچوڑا جاتا ہے یہ ابو صالح کا قول ہے۔پس انہوں نے اسے دراہم کے بدلے بیچا جو کھانے میں مروج نہیں تھے اور لوگوں کے درمیان رائج تھے، تو انہوں نے کہا: اس نے ہم سے اسے ایسے عمدہ دراہم کے حساب سے لیا جو کھانے میں مروج ہوتے ہیں۔اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ردی دراہم ہیں (3)، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔اور ایک قول یہ ہے: ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر نہیں تھی جبکہ مصر کے دراہم پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تصویر ہوتی تھی۔ اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد جوتے اور چمڑا ہے اور انہیں سے مروی ہے کے وہ چھانا ہوا ستو تھا۔

فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح عمدہ دراہم کے بدلے میں آپ بیچتے ہیں ہمارے دراہم کے بدلے میں بھی ہمارے لیے آپ اس میں کوئی کمی نہ کریں، یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ابن جریج نے کہا: فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ سے ان کی مراد وہ کیل تھا جو آپ پہلے اپنے بھائیوں کے لیے کر چکے تھے۔ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا یعنی عمدہ اور ردی سکوں کے بھاؤ کے حوالے سے ہمارے اوپر مہربانی کیجئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر، سدی اور حسن کا قول ہے۔ کیونکہ صدقہ تو اولاد انبیاء پر حرام ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے: وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا یعنی ہمارے حق سے زیادہ دے کر مہربانی کریں۔ یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 63 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 64 3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 65

سفیان بن عیینہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: صدقہ صرف ہمارے نبی پر حرام تھا۔ ابن جریج نے کہا: ہمارے بھائی کو ہماری طرف لوٹا کر مہربانی کیجئے (1)۔ ابن شجرہ نے کہا: تَصَدَّقْ عَلَيْنَا کا مطلب ہے کہ ہم سے درگزر فرمائیے۔ بطور استشہاد شاعر کا شعر پیش کیا ہے:

تصدّقْ علينا يا بن عَفّان واحْتَسِبْ وأَمِّرْ علينا الأشعرِيَّ لَيَالِيَا

اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔ یہ تعریض ہے، کیونکہ ان کے نزدیک بادشاہ ان کے دین پر نہ تھا، اسی وجہ سے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ آپ کو اپنے صدقہ کی جزا دے گا، بلکہ انہوں نے ایسے لفظ بولے جن میں اس مراد کا وہم بھی ہے۔ اور ایسا وہم بھی ہے جس سے تاویل کے ذریعے ان کا نکلنا بھی ممکن ہے۔ یہ نقاش کا قول حدیث طیبہ میں ہے۔ ''تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی وسعت ہے'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مالک اور دیگر علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کیل کرنے والے کی اجرت بائع پر ہے۔ ابن قاسم اور ابن نافع نے کہا کہ امام مالک نے فرمایا: انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ تو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کیل کرنے والے تھے اسی طرح وزن کرنے والے اور گنتی کرنے والے کی صورتحال ہوگی، کیونکہ جب آدمی کھانے کے سامان میں سے کوئی معلوم پیمانے بیچتا ہے اور اس پر عقد لازم کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ مشتری کے حق کو اپنے حق سے علیحدہ اور جدا کرے، مگر یہ کہ اس میں سے معین کو بیچے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جہاں تک گننے کی اجرت کا تعلق ہے تو وہ بھی بائع پر ہوگی کیونکہ مشتری تو اپنے دراہم دینے والا ہے، دیتے ہوئے کہے گا: یہ صحیح ہے تو آپ نے ان کے ردی ہونے کا دعویٰ کرنا ہے سو خود ان کو دیکھ لو اور یہ وجہ بھی ہے کہ نفع بائع کے لیے ہے تو اجرت بھی اسی پر ہونی چاہیے، اسی طرح جس پر قصاص لازم ہے اس پر گننا لازم نہیں، کیونکہ اس پر خود اپنا ہاتھ کاٹنا تو لازم نہیں بلکہ اس پر تو لازم ہے کہ قصاص لینے والے کے مطالبہ کی صورت میں فدیہ دے اور اس فدیے پر صلح کرے، لہٰذا ہاتھ کاٹنے والے کی اجرت قصاص لینے والے پر ہے جبکہ امام شافعی نے اپنے مشہور قول میں کہا ہے کہ یہ اجرت اس پر ہوگی جس سے قصاص لیا جاتا ہے جس طرح کہ بائع پر ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آدمی کے لیے اپنی دعا میں اللّٰھم تصدّق علی کہنا مکروہ ہے، کیونکہ صدقہ اس کی طرف سے ہوتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہ رہا ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو تمام نعمتوں کے ذریعے ثواب عطا فرما کے فضل فرمانے والا ہے اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں۔ حضرت حسن نے ایک آدمی کو اللّٰھم تصدّق علیّ کہتے ہوئے سنا، تو فرمایا: اے فلاں! اللہ تعالیٰ صدقہ نہیں کرتا صدقہ تو وہ کرتا ہے جو ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ نہیں سنا تو تو یہ کہہ: اللّٰھم أعطنی و تفضّل علیّ یا الٰہی! مجھے عطا فرما اور میرے اوپر اپنا فضل فرما۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝۸۹ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ

1۔ السنن الکبری، کتاب الشہادت، جلد 10، صفحہ 199
2۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 67

لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ
وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا
وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ
الرّٰحِمِيْنَ ﴿٩٢﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ
بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٣﴾

''آپ نے پوچھا: کیا تمہیں علم ہے جو سلوک تم نے کیا یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ جب تم نادان تھے (سراپا حیرت بن گئے) کہنے لگے: کیا (سچ سچ) آپ ہی یوسف ہیں، فرمایا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ بڑا کرم فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یقیناً جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے (وہ آخر کار کامیاب ہوتا ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ بھائیوں نے کہا: خدا کی قسم! بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر اور بے شک ہم ہی خطا کار تھے۔ آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرمادے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈالوا سے میرے باپ کے چہرے پر وہ بینا ہو جائیں گے اور (جا کر) لے آؤ میرے پاس اپنے سب اہل و عیال کو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ استفہام بمعنی تذکیر و توبیخ ہے، اور یہی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی: لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا (یوسف: 15) میں تجھے ضرور ان کے اس معاملے سے آگاہ کروں گا۔ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب انہوں نے پکڑا تھا اس وقت وہ ابھی چھوٹے تھے اور نبی نہیں تھے، کیونکہ جہالت کی صفت اسی صورت میں بیان کی جاسکتی ہے اور یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اب ان کی حالت بہتر ہے۔ یعنی یہ تم نے اس وقت کیا جب تم چھوٹے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور ان کا قول اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ (اگرچہ ہم غلطی پر تھے) اس بنیاد پر ہے، کیونکہ بڑے ہو گئے مگر اپنے باپ سے شرم محسوس کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے انہوں نے اپنی کاروائی سے اپنے باپ کو آگاہ نہ کیا۔

ایک قول کے مطابق: اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اس کاروائی کے انجام سے ناواقف تھے۔ واللہ اعلم۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ جب وہ آپ کے پاس پہنچے اور انہوں نے کہا: مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ تو وہ آپ کے سامنے جھک گئے اور آپ کے سامنے انہوں نے عاجزی اختیار کی تو آپ کا دل ان کے لیے نرم ہو گیا اور آپ نے انہیں اپنا تعارف کرایا۔ فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ تو وہ متنبہ ہوئے اور کہا: اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مسکرائے تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ سمجھا تو سمجھ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ پھر حضرت یوسف مسکرائے۔ جب آپ

مسکرائے تو گویا آپ کے اوپر والے دانت پروئے ہوئے موتی تھے، تو انہوں نے آپ کو یوسف کے مشابہ جانا تو استفہامیہ انداز میں کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ کے بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا یہاں تک کہ آپ نے تاج اتارا تو آپ کے سر مبارک میں ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت شامہ کی مثل تھی تو جب آپ نے انہیں فرمایا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ پھر اپنا تاج اتارا تو وہ آپ کو پہچان گئے اور انہوں نے کہا: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے آپ کی طرف ایک خط لکھا جس میں آپ نے اپنے بیٹے کا مطالبہ کیا خط میں تھا: یعقوب صفی اللہ ابن اسحاق ذبیح اللہ ابن ابرہیم خلیل اللہ کی طرف سے عزیز مصر کی طرف۔ امابعد۔ بے شک ہم آزمائش اور امتحان کا گھرانہ ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دادا ابراہیم علیہ السلام کو نمرود اور اس کی آگ کے امتحان میں مبتلا کیا، پھر میرے باپ اسحاق کو ذبح کے ذریعے آزمایا، پھر اس نے مجھے اپنے ایسے بیٹے کے ذریعے آزمایا جو مجھے ساری اولاد سے محبوب تھا یہاں تک کہ رورو کے میری بینائی چلی گئی بے شک نہ میں نے چوری کی اور نہ ہی کوئی چور میں نے پیدا کیا۔ والسلام۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خط پڑھا تو آپ کے اعضاء کانپنے لگے جلد میں تھرتھراہٹ طاری ہوگئی اور آنکھوں سے رونے کی وجہ سے آنسوں بہنے لگے اور آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تو یہ بھید کھل گیا۔ ابن کثیر نے انك پڑھا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ قراءت بھی بطور استفہام ہو جیسے تلك نعمة کیا یہ نعمت ہے؟ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ یعنی میں مظلوم ہوں اور مراد آپ کا قتل ہے۔ اور آپ نے انا ھو یوسف نہ کہا اس واقعہ کی تعظیم کی وجہ سے۔ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا یعنی نجات اور بادشاہ کے ذریعے اللہ نے ہمارے اوپر احسان فرمایا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے، مصائب پر صبر کرتا ہے اور گناہوں سے اجتناب کر کے صبر اختیار کرتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جو اس کی آزمائش میں صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور اس کی اطاعت کو برقرار رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے کہا: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِيْ یا کو ثابت رکھ کے پڑھا ہے یہ قرأت بھی جائز ہے اس صورت میں مَنْ بمعنی الذی ہوگا اور یتقی صلہ میں داخل ہوگا یا ثابت رہے گی اور يَصْبِرْ کو رفع دیا جائے گا۔ اور یصبر کو اس بنیاد پر جزم دینا بھی جائز ہوگا کہ یتقی کو آپ محل جزم میں بنائیں اور من شرطیہ ہو اور یا ثابت رہے۔ اور جزم کی علامت اس ضمہ کے حذف کو بنالیں جو اصل میں یا پر تھا جس طرح شاعر نے کہا ہے:

ثم نادِي إذا دَخلتَ دِمَشْقَا يا يزيدُ بنَ خالدِ بنِ يزيد

پھر تو جب دمشق میں داخل ہو تو ندا دے اے یزید بن خالد بن یزید اس میں نادی میں ''ی'' ثابت ہے۔

ایک شاعر نے کہا:

ألم يأتيك والأنباءُ تَنمِي بما لَاقتْ لَبونُ بني زيادِ

جماعت کی قرات ظاہر ہے ''انہ'' میں ''ھاء'' گفتگو سے کنایہ اور جملہ اس کی خبر ہے۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا اصل میں دو ہمزہ تھے دوسرے کو مخفف کر دیا گیا اس کو ثابت رکھنا جائز نہیں اسم فاعل مؤثر ہے جبکہ مصدر ایثار ہے۔ کہا

جا تا ہے أثرت التراب إثارة فأنا مثیر یہ بھی افعل کا وزن تھا پھر اس میں تعلیل کر دی گئی اصل میں اثْيَرَتھا یا کی حرکت ثا کو دی یا (ماقبل مفتوح) کو الف سے بدلا پھر الف کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ اور اثرت بروزن فعلت ہو گیا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی اور آپ کو علم، بردباری، حکمت، عقل اور بادشاہی کے ذریعے منتخب فرمایا۔

وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ یعنی گناہ کار، یہ خطئ یخطأ سے مشتق ہے اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی غلطی کر دے۔ اور اس کے ضمن میں معانی کا سوال بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ انہوں نے وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ کیسے کہا حالانکہ انہوں نے تو جان بوجھ کے یہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ انہوں نے جان بوجھ کے ایسا کیا تھا مگر جان بوجھ کر بھی تب ہی کیا تھا کہ راہ حق سے غلطی کر لی تھی، اور اسی طرح ہر وہ آدمی جو گناہ کرتا ہے تو وہ اس راستے سے ہٹ جاتا ہے جو صحیح اور حق کا راستہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شبہ اور گناہ میں پڑ جاتا ہے۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ اور آپ نے بردباری کی انتہا کر دی۔ الْیَوْمَ کا معنی الوقت ہے اور التثریب سے مراد التعییر و التوبیخ ہے یعنی اب نہ تم پر کوئی عار ہے، نہ سختی اور نہ ہی ملامت، یہ سفیان ثوری وغیرہ کا قول ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو وہ اسے حد لگائے ولا یُثَرِّبُ علیہا یعنی اس کو عار نہ دلائے''۔ بشر نے کہا:

فَعَفَوْتُ عنهم عَفْوَ غَيْرِ مُثَرِّبِ وتركتهم لعقابِ يومِ سَرْمَدِ

میں نے انہیں ایسا معاف کیا کہ ان پر کوئی عار نہیں اور میں نے انہیں قیامت کے دن کی سزا کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

اصمعی نے کہا: ثَرَّبْتُ علیه و عَرَّبْتُ علیه اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے یہ تب کہا جب تو اس کے ساتھ برائی سے پیش آیا۔ زجاج نے کہا: معنی یہ ہوگا کہ جو میرے اور تمہارے درمیان حرمت اور بھائی چارے کے حقوق ہیں ان میں اب کوئی فساد نہیں تمہارے لیے میرے پاس معافی اور درگزر ہے۔ تثریب کی اصل افساد ہے اور یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن دروازے کے دونوں کواڑ پکڑے اور لوگوں نے بیت اللہ کی پناہ لی ہوئی تھی آپ نے فرمایا: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور گروہ کو شکست دی'' (1)۔ پھر فرمایا: ''اے معشر قریش! تمہارا کیا خیال ہے''۔ انہوں نے عرض کی: بھلائی، کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے اگرچہ آپ قدرت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''میں بھی وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے حیاء محسوس کرتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تھے تو میں نے ان کو کہا تھا: آج ہم تم سے انتقام لیں گے اور تمہارا بندوبست کریں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو مجھے اپنی بات سے شرم آ رہی تھی۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ اس میں دعا کا معنی ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی پردہ پوشی فرمائے اور ان پر رحم فرمائے۔ اخفش نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ پر

---

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 9، صفحہ 83

وقف کو جائز قرار دیا ہے جبکہ پہلی صورت مستعمل ہے، کیونکہ عَلَیۡکُمُ پر وقف اور الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰهُ لَكُمۡ سے ابتدا کی صورت میں آج ہی مغفرت کے یقین کا اظہار ہے اور یہ تو صرف وحی کی صورت میں ہی ہوسکتا ہے۔ عطا خراسانی نے کہا: نوجوان سے ضروریات کو طلب کرنا بوڑھے سے طلب کرنے کی نسبت آسان ہے، آپ نہیں دیکھتے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰهُ لَكُمۡ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّیۡ عنقریب میں تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا۔

اِذۡهَبُوۡا بِقَمِیۡصِیۡ هٰذَا، هٰذَا قمیص کی صفت ہے اور قمیص مذکر ہے۔

جہاں تک شاعر کے قول کا تعلق ہے:

تَدْعو هَوَازِنُ والقميصُ مُفَاضَةٌ فوق النِطاقِ تُشَدُّ بالأزرار

شعر میں القمیص مفاضة سے معلوم ہو رہا ہے کہ قمیص مؤنث ہے۔

اس میں تقدیر عبارت: والقمیص درع مفاضة ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ ابن سدی نے اپنے باپ سے عن مجاہد روایت کی: حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کہا: اِذۡهَبُوۡا بِقَمِیۡصِیۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰی وَجۡهِ اَبِیۡ یَاۡتِ بَصِیۡرًا اس نے کہا: حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات سے آگاہ کیا گیا تھا کہ ان کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کو لوٹا دے گی، لیکن وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ قمیص تھی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کے ریشم سے آگ میں پہنائی تھی، آپ نے حضرت اسحاق کو پہنائی، حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے وہ قمیص چاندی کے ایک ٹکڑے میں ڈال کر حضرت یوسف علیہ السلام کی گردن میں لٹکا دی اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے نظر کا خوف رہتا تھا۔ جبریل امین نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خبر دی کہ اپنی قمیص بھیجو اس میں جنت کی خوشبو ہے اور جنت کی خوشبو کسی بیمار یا مصیبت میں مبتلا آدمی پر پڑے تو اس کو شفا مل جاتی ہے۔ حسن نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے متعلق نہ بتایا ہوتا تو آپ کو پتہ نہ چلتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی انہیں واپس مل جائے گی۔ اور جس نے قمیص اٹھائی تھی وہ یہوذا تھا، اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا: میں نے ہی آپ کی قمیص کو جھوٹا خون لگا کر ان تک پہنچائی تھی اور ان کو پریشان کیا تھا اور میں ہی اب اسے اٹھاؤں گا تاکہ ان کو خوش کروں اور ان کی بینائی ان تک واپس لوٹے، سو اسی نے قمیص اٹھائی، سدی نے اسے بیان کیا ہے۔ وَاۡتُوۡنِیۡ بِاَهۡلِكُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ تاکہ مصر کو اپنا گھر بنالیں۔ مسروق نے کہا: ان کے مردوں اور عورتوں کی تعداد ترانوے تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ قمیص وہ تھی جس کو پیچھے سے پھاڑا گیا تھا تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتہ چل جائے کہ آپ زنا سے محفوظ رہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوعاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے واللہ اعلم

وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِیۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِیۡمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِیۡرُ اَلۡقٰهُ عَلٰی وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ

بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٩٦ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۝٩٧ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝٩٨ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝٩٩

''اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے باپ نے فرمایا کہ میں تو یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اگر تم مجھے بے وقوف خیال نہ کرو۔ گھر والوں نے کہا: بخدا! (باباجی) آپ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ پس جب آ پہنچا خوشخبری سنانے والا (اور) اس نے ڈالا وہ پیراہن آپ کے چہرے پر تو وہ فوراً بینا ہو گئے آپ نے (فرط مسرت سے) کہا: (دیکھو) کیا میں نہیں کہا کرتا تھا تمہیں کہ میں جانتا ہوں اللہ تعالیٰ (کے جتانے) سے جو تم نہیں جانتے۔ بیٹوں نے عرض کی: اے ہمارے پدر! (محترم) مغفرت مانگیے ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی، بے شک ہم ہی قصوروار تھے۔ فرمایا: عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لیے اپنے رب سے، بے شک وہی غفور رحیم ہے۔ پھر جب وہ سب یوسف کے روبرو ہوئے آپ نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو اور (انہیں) کہا: داخل ہو جاؤ مصر میں، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم خیر و عافیت سے رہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ یعنی جب قافلہ مصر سے شام کی طرف نکلا، کہا جاتا ہے: فصل فصولا، وفصلتہ فصلا، یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قَالَ اَبُوْهُمْ، یعنی آپ نے قریبیوں میں سے جو آپ کے پاس تھا اور مصر نہیں گیا تھا اسے کہا اور وہ آپ کے پوتے تھے اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے کچھ بیٹے گئے ہوں اور باقیوں کو آپ نے فرمایا ہو: اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہوا چلی اور وہ حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو آپ تک اٹھا لائی حالانکہ دونوں کے درمیان آٹھ راتوں کی مسافت تھی (1)۔ حضرت حسن نے کہا: دس راتوں کی مسافت تھی۔ انہیں سے ایک ماہ کی مسافت بھی مروی ہے۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: پیراہن کی خشبو تخت بلقیس کی طرح پہنچی کہ وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ مجاہد نے کہا: ہوا چلی اس نے پیراہن کو الٹ پلٹ کیا تو دنیا میں جنت کی خوشبوئیں پہنچ گئیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گئیں، آپ نے جنت کی خوشبو پائی تو آپ کو پتہ چل گیا کہ دنیا میں جنت کی خوشبو صرف اسی پیراہن کی وجہ سے ہو سکتی ہے، تو اس وقت آپ نے فرمایا: اِنِّيْ لَاَجِدُ یعنی میں سونگھ رہا ہوں۔ تو وہ سونگھنے کی حس کی وجہ سے پائی گئی۔ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اگر تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو (2)۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے:

إلاَّ سليمان إذقال المليكُ لَهُ قُمْ فِي البَرِيّةِ فاحْدُدْها عنِ الفَنَدِ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 71
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

عن الفند یعنی عن السفه، حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: لولا أن تکذبون یعنی اگر تم مجھے نہ جھٹلاؤ۔ الفند سے مراد الکذب ہے۔ قد أفند إفنادا یعنی اس نے جھٹلایا۔ اسی سے شاعر کا شعر ہے:

هل فی افتخار الکریم من أَوَدِ أم هَلْ لقول الصَّدُوقِ من فَنَدِ

یعنی من کذب ایک قول کے مطابق: لولا أن تقبحون ہے یہ ابوعمرو کا قول ہے۔

التنفید سے مراد التقبیح ہے، شاعر نے کہا:

یا صاحبیّ دعا لومی و تَفْنِیدِی فلیس مافاتَ مِن أمری بمردودِ(1)

ابن الاعرابی نے کہا: لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ یعنی اگر تم میری رائے کو کمزور نہ سمجھو تو یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ الفند سے مراد بڑھاپے کی وجہ سے رائے کا کمزور ہونا ہے۔ چوتھا قول تضللون تم مجھے گمراہ نہ خیال کرو تو یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: تلومون، یعنی تم مجھے ملامت نہ کرو تو۔ التفنید سے مراد ملامت اور رائے کا ضعف ہے۔ حضرت، حسن حضرت قتادہ اور مجاہد نے بھی کہا: تھرمون یعنی تم مجھے بوڑھا نہ سمجھو تو (2)۔ یہ تمام کے تمام اقوال قریب المعنی ہیں، یہ عاجزی اور رائے کے ضعف کی طرف راجع ہے، جب کوئی چیز کسی کو عاجز کردے تو کہا جاتا ہے: فندہ تفنیدا جس طرح کسی نے کہا:

أهلکنی باللوم والتفنید

اس نے مجھے ملامت اور عاجز کر کے ہلاک کر دیا۔

جب کوئی غلط کلام کرے تو کہا جاتا ہے: أفند، الفند سے مراد کلام اور رائے میں خطا ہے، جس طرح نابغہ نے کہا:

فاحددها عن الفَنَدِ

یعنی عقل میں فساد بپا کرنے سے تو اسے روک۔ اور اسی سے کہا گیا ہے کہ ملامت تفنید ہے، شاعر نے کہا:

یا عاذِلَیَّ دَعَا المَلَامَ وأَقْصِرَا طالَ الهَوَی و أطلتما التَّفْنِیدَا(3)

اور أفند فلانًا الدھر کہا جاتا ہے جب وہ اسے خراب کردے۔ اسی سے مقبل کا قول ہے:

دَعِ الدَّهْرَ یَفْعَلُ مَا أَرَادَ فإنَّهُ إذا کُلِّف الإفنادَ بالنَّاسِ أَفْنَدَا(4)

**قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ** یعنی صحیح رستے سے چلے جانے میں۔

حضرت ابن عباس اور ابن زید نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں سے آپ اپنی ماضی کی غلطی میں ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: آپ اپنے پرانے جنون میں ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: یہ نافرمانی ہے۔ حضرت قتادہ اور سفیان نے کہا: آپ اپنی پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ان کے نزدیک حضرت یوسف فوت ہو چکے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اولاد میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا جبکہ ان کو کوئی خبر نہ تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے: آپ کے اہل اور قرابت داروں میں سے جو آپ کے پاس تھا اس نے یہ کہا تھا۔ ایک قول کے مطابق پوتوں نے کہا اور وہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 73 2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 75 3۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 76 4۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 73

چھوٹے تھے۔ واللہ اعلم۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ، عَلٰى وَجْهِهٖ سے مراد علی عینیه ہے یعنی آپ کی دونوں آنکھوں پر فَارْتَدَّ بَصِیْرًا، اَنْ زائدہ ہے، اور بشیر سے مراد شمعون یا یہوذا ہے۔ یہوذا نے کہا: آج میں پیراہن لے کر جاؤں گا جس طرح کہ خون سے لت پت قمیص لے کے گیا تھا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سدی سے مروی ہے کہ اس نے بھائیوں کو کہا: تم جانتے ہو کہ پریشانی والی قمیص میں لے کے گیا تھا سو مجھے جانے دو تا کہ خوشی والی قمیص بھی میں لے کر جاؤں۔ یحییٰ بن یمان نے حضرت سفیان سے روایت کرتے ہوئے کہا: جب خوشخبری سنانے والا حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: تو نے یوسف کو کس دین پر چھوڑا ہے؟ اس نے کہا: اسلام پر۔ آپ نے فرمایا: اب نعمت مکمل ہوگئی۔ حضرت حسن نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خوشخبری لانے والا آیا تو آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ذریعے آپ اسے بدلہ دیتے تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور سات راتوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا، لیکن (اس کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے تیرے اوپر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ دعا سارے انعامات سے بڑی ہے اور سب تحائف اور ذخائر سے زیادہ فضیلت والی ہے اور یہ آیت کریمہ خوشخبری کے وقت کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے جواز پر دلیل ہے۔ باب میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے جس میں یہ بھی ہے: ''جب وہ آدمی میرے پاس آیا جس کی خوشخبری دیتے ہوئے میں نے آواز سنی تو میں نے اپنے کپڑے اتارے اور اس کی خوشخبری کے بدلے اسے وہ پہنا دیئے''۔ اس کے بعد انہوں نے پوری حدیث ذکر کی ہے، اور یہ پوری حدیث ان تین آدمیوں کے واقعے کے بیان میں گزر چکی ہے جو پیچھے رہ گئے تھے اور حضرت کعب کا خوشخبری سنانے والے کو اپنے کپڑے دے دینا باوجود اس کے کہ ایسا کرنے کے جواز پر کوئی اور دلیل بھی نہیں تھی کہ جب آدمی کو کسی کے ذریعے خوشخبری کے حصول کی امید ہو (تو کیا وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں)، تو یہ غم اور مصیبت کے زوال کے بعد خوشی کے اظہار کے جواز کی دلیل ہے۔ اس باب سے بچوں کے قرآن مقدس سیکھنے کی وجہ سے خوشی کے اظہار کا جواز اور اس سبب سے لوگوں کو کھانا کھلانے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ ''البقرہ'' کے حفظ کے بعد اونٹ ذبح کیا تھا۔ واللہ اعلم

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ انہیں اپنا ارشاد: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یاد کروایا۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِیْنَ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت: فلما رجعوا من مصر قالوا یا أبانا ہے یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے آپ کو کہا تھا: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ وہ آپ کے پوتے تھے یا آپ کے قریبی رشتہ دار تھے آپ کا بیٹا نہیں تھا، کیونکہ وہ تو غائب تھے۔ اور انہوں نے آپ سے مغفرت کا سوال اس لیے کیا کہ انہوں نے آپ کو پریشان کیا جس کا گناہ سوائے آپ کی معافی کے ساقط نہیں ہو سکتا تھا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ حکم اس آدمی کے لیے بھی ثابت ہوگا جس نے کسی مسلمان کی جان، مال یا اس کے علاوہ کسی چیز

میں زیادتی کی ہو، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے معافی مانگے اور اسے ظلم اور اس کی مقدار کے متعلق بتائے، کیا مطلق معافی مانگنا اسے نفع دے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ نفع بخش نہیں، کیونکہ اگر اس نے اسے زیادتی کے بارے میں آگاہ کیا جس کی ایک خاص حد اور نقصان تھا تو بعض اوقات مظلوم کا دل اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

صحیح بخاری میں (1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے کسی بھائی کی عزت یا کسی چیز میں زیادتی کی ہوئی ہو تو اسے چاہیے کہ آج اس سے معافی مانگ لے قبل اس کے کہ دراہم و دینار نہیں ہوں گے اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوا تو اس کی زیادتی کی مقدار اس کے نیک عمل سے لیا جائے گا اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہ اس سے لے کر ظالم کو دے دیئے جائیں گے۔'' مہلب نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے: اخذ منه بقدر مظلمة ارشاد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زیادتی کی مقدار معلوم ہونی چاہیے اور واضح طور پر اس کی طرف اشارہ ہونا چاہیے واللہ اعلم۔

**قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ نے اپنی دعا کو سحری تک موخر فرمایا۔ مثنی بن صباح نے طاؤس سے روایت کرتے ہوئے کہا: جمعہ کی رات کی سحری تھی، اور یہ عاشوراء کی رات تھی۔ ترمذی کی کتاب میں حافظہ کی دعا کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اتنے میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ قرآن میرے سینے میں خلط ملط ہو گیا اور میں اس پر قابو نہ پا سکا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھا دوں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تجھے بھی فائدہ دے گا اور جس کو تو وہ سکھائے گا اسے بھی فائدہ دے گا اور جو کچھ تو حاصل کرے گا اسے تیرے سینے میں ثابت کر دے گا'' (2)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وہ کلمات سکھائے، آپ نے فرمایا: ''جب جمعہ کی رات ہو تو ہو سکے تو رات کے آخری ثلث میں اٹھ وہ ساعت مشہودہ ہے اور اس میں کی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے، میرے بھائی یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کہا تھا۔ **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** وہ کہہ رہے تھے یہاں تک کہ جمعہ کی رات آئی'' حضرت ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** یعنی عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا ایام بیض کی راتوں میں یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں کی رات میں کیونکہ ان راتوں میں دعا قبول ہوتی ہے۔ عامر شعبی سے مروی ہے انہوں نے کہا: **سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ** سے مراد یہ ہے کہ میں یوسف کو کہوں گا اگر اس نے تمہیں معاف کر دیا تو میں اپنے رب سے تمہارے لیے استغفار کروں گا؛ سنید بن داؤد نے اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حدثنا هشيم قال حدثنا

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، القصاص یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 967

ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی شان الحساب والقصاص، حدیث نمبر 2343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، حفظ الدعاء، جلد 2، صفحہ 194۔ ایضاً، حدیث 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبد الرحمن بن اسحق عن محارب بن دثار عن عمه انہوں نے کہا کہ میں سحری کے وقت مسجد میں آتا تھا تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرتا تو انہیں یہ کہتے ہوئے سنتا تھا: اے اللہ! تو نے حکم دیا تو میں نے اطاعت کی، تو نے دعوت دی تو میں نے اسے قبول کیا، اور یہ سحری کا وقت ہے مجھے معاف فرما دے، تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ملا اور کہا: کچھ ایسے کلمات ہیں جو میں آپ سے سنتا ہوں آپ سحری کے وقت کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی تو سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ کے قول کے ذریعے اپنے بیٹوں کو سحری تک مؤخر کیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ یعنی اس محل میں داخل ہوئے جو آپ کا تھا۔ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوشخبری سنانے والے کے ساتھ دو سو سواریاں اور زادراہ بھیجا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گزارش کی کہ وہ اپنے اہل خانہ اور سب بیٹوں کو ساتھ لائیں۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ یعنی اپنے پاس بلایا اور اَبَوَيْهِ سے مراد آپ کا باپ اور خالہ ہے کیونکہ آپ کی ماں تو بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال فرما گئیں تھیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر آپ کی ماں کو زندہ کیا تاکہ وہ آپ کو سجدہ کرے اور آپ کا خواب ثابت ہو جائے، یہ حضرت حسن کا قول ہے اور سورۂ ''بقرہ'' میں یہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لائے۔

ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ابن جریج نے کہا: یعنی سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ان شاء الله ہے (1) انہوں نے کہا: یہ قرآن کی تقدیم و تاخیر ہے؛ (یعنی اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کے الفاظ پہلی آیت کے ساتھ ہیں) نحاس نے کہا: ابن جریج کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ مصر میں داخل ہو چکے تھے تو انہیں آپ نے ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کیسے کہا؟ یہ قول بھی ہے کہ آپ نے اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تبرکاً کہا۔ اٰمِنِيْنَ یعنی قحط سے امن میں یا فرعون سے امن میں، کیونکہ وہ فرعون کی اجازت کے بغیر مصر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

''اور (جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے اور یہ (منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا: اے میرے پدر بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا ہے اور اس نے بڑا کرم فرمایا مجھ پر جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے اور لے آیا تمہیں صحرا سے اس کے بعد کہ ناچاقی ڈال دی تھی شیطان نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 81

میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان، بے شک میرا رب لطف و کرم فرمانے والا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

**وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ** حضرت قتادہ نے کہا: عرش سے مراد چار پائی ہے۔ اس کے محامل پہلے گزر چکے ہیں اور بعض اوقات بادشاہی اور خود بادشاہ کو عرش کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے اسی سے نابغہ ذبیانی کا قول ہے:

عُرُوشٌ تَفَانَوْا بعد عِزٍّ و أَمْنَةٍ

پہلے گزر چکا ہے۔

**وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا** اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** **وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا** میں لَهٗ کی ضمیر کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے؛ معنی یہ ہوگا: اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ سجدے میں گر گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے خواب کے ثبوت کے لیے قبلہ کی طرح تھے، یہ حضرت حسن سے مروی ہے، جبکہ نقاش نے کہا: یہ غلطی ہے (صحیح بات یہ ہے کہ) ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے کیونکہ سورت کے آغاز میں رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ہے اور ان کا سلام یہ تھا کہ ادنیٰ، اعلیٰ کو اور چھوٹا بڑے کو سجدہ کرے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، آپ کی خالہ اور بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہوئی اور آپ نے کہا: هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان ایک سو بیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی اور عبداللہ بن شداد نے کہا: چالیس سال کا عرصہ تھا(1)۔ سدی، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: چھتیس سال کا عرصہ تھا۔ حضرت حسن، جسر بن فرقد اور فضیل بن عیاض نے کہا: اسی سال حضرت وہب بن منبہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کنویں میں پھینکا گیا تو آپ کی عمر سترہ سال تھی اور اسی سال آپ اپنے باپ سے غائب رہے اور اپنے باپ کی ملاقات کے بعد تیئس سال تک زندہ رہے اور وصال کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی جبکہ تورات میں ایک سو چھبیس سال مرقوم ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیز مصر کی بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد افرائیم، منشاء اور رحمت حضرت ایوب علیہ اسلام کی بیوی ہے، جبکہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیس سال رہے اور پھر آپ کا وصال ہو گیا۔ ایک قول کے مطابق: اٹھارہ سال رہے۔ بعض محدثین نے کہا: چالیس سال اور کچھ عرصہ رہے۔ اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے درمیان تینتیس سال کا عرصہ تھا پھر اللہ نے ان کو ملا دیا۔ ابن اسحاق نے کہا: اٹھارہ سال کا عرصہ تھا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2۔** حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت قتادہ عن حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: **وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا** میں یہ نہیں تھا کہ انہوں نے سجدہ کیا ہو بلکہ ان کا ایک طریقہ تھا کہ وہ اپنے سروں سے اشارہ کرتے تھے، یہی ان کا سلام ہوتا تھا۔ ثوری، ضحاک

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 85

اور دیگر لوگوں نے کہا کہ وہ اسی طرح کا سجدہ تھا جس طرح ہمارے ہاں ہوتا ہے اور یہی ان کا سلام تھا۔ ایک قول کے مطابق وہ رکوع کی طرح جھکنا تھا اور خر در علی الارض نہیں تھا اور اسی طرح جھک کر اور اشارہ کر کے ان کے سلام کا طریقہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سارے عمل کو ہماری شریعت میں منسوخ فرما دیا اور جھکنے کے بدلے کلام کو ہمارا سلام بنا دیا۔ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ سجدہ جس بھی طریقے سے تھا صرف سلام کے طور پر تھا سجدہ عبادت نہیں تھا۔ قتادہ نے کہا: ان کے نزدیک بادشاہوں کا یہی سلام ہوتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اہل جنت کا سلام السلام علیکم عطا فرمایا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ جھکنا اور اشارہ کرنا جس کو منسوخ کر دیا گیا ہے یہ مصر کے علاقوں میں عجمیوں میں عادت بن چکا ہے، اسی طرح لوگوں کا کسی کے لیے کھڑا ہونا حتی کہ اگر وہ کھڑا نہ ہو تو آنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے دل میں اس کی کوئی قدر نہیں، اسی طرح جب وہ ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے جھکنا ان کی مستقل عادت اور مستقل وراثت ہے، بالخصوص امراء اور سرداروں سے ملاقات کے وقت۔ ان لوگوں نے ان لوگوں کے طریقے کو اپنا لیا اور سنن سے اعراض کر لیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم ایک دوست کو ملیں تو کیا ایک دوسرے کے لیے جھکیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ ہم نے عرض کیا: کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ معانقہ کریں! آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ ہم نے کہا: کیا ہم مصافحہ کریں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ اس روایت کو ابو عمر نے التمہید میں روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ''تم اپنے سردار اور اپنے سے بہتر آدمی کے لیے کھڑے ہو جاؤ'' (1)۔ مراد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ ان مخصوص حالات کی بنیاد پر حضرت سعد کے ساتھ ہی خاص ہوگا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا قیام اس لیے تھا تا کہ وہ آپ کو گدھے سے اتاریں اور یہ بڑی عمر کے آدمی کے لیے جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنے لگے اور اگر وہ اس عمل کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنے لیے اس کو لطف اور راحت محسوس کرے تو علماء نے اسے بھی جائز قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس کو اس بات نے خوش کیا کہ لوگ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کریں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ٹھکانہ جہنم میں بنا لے''۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر کوئی بھی زیادہ عزت والا نہ تھا اس کے باوجود وہ اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے آپ کو دیکھ کر آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اگر یہ کہا جائے کہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ تو اسے کہا جائے گا: یہ اس صورت میں جائز ہے جب بندہ آپ سے دور ہو، تا کہ آپ سلام کے وقت اس کی تعیین کر دیں، اور اگر وہ قریب ہو تو پھر جائز نہیں جبکہ ایک قول قرب و بعد کی دونوں صورتوں میں منع کا ہے اس کا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''جس نے کسی اور کی مشابہت اختیار کی تو وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ اور آپ نے فرمایا: ''یہود و نصاریٰ کی طرح سلام نہ کرو، پس یہود کا سلام

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 95

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 100۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4552۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہتھیلی کے ذریعے اور نصاریٰ کا سلام اشارہ کے ساتھ ہے" (1)۔ اور جب کوئی سلام کرے تو وہ نہ جھکے اور نہ ہی سلام کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چومے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جھکنا تواضع پر دلالت کرتا ہے اور تواضع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اور جہاں تک ہاتھوں کو بوسہ دینے کا تعلق ہے تو یہ عجمیوں کا عمل ہے اور ان کے ایسے افعال کی اتباع نہیں کی جائے گی جو انہوں نے اپنے بڑوں کی تعظیم کے لیے خود بنا لیے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میرے سر کے پاس اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو جس طرح عجمی اپنے سے برتر لوگوں کے سر کے پاس کھڑے ہوتے ہیں''۔ تو یہ عمل اسی کے مثل ہے البتہ مصافحہ میں کوئی حرج نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ سے واپسی کے موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کا حکم بھی ارشاد فرمایا اور فرمایا: ''باہم مصافحہ کیا کرو یہ کھوٹ کو دور کرتا ہے'' (2)۔ غالب تمار نے حضرت شعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے تھے اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کرتے تھے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام مالک نے تو مصافحہ کو بھی ناپسند کیا ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے مصافحہ اور معانقہ کو ناپسند کیا ہے، سحنون اور دیگر اصحاب مالک نے یہی موقف اختیار کیا ہے تاہم امام مالک سے اس کے برعکس جواز مصافحہ کے حوالے سے بھی روایت موجود ہے۔ مؤطا کی روایت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اور سلف وخلف میں سے علماء کی ایک جماعت جواز مصافحہ کی قائل ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے صرف اس وجہ سے مصافحہ کو ناپسند کیا ہے کہ آپ نے اسے دین کا کوئی معاملہ خیال نہیں کیا اور نہ ہی یہ سلام کی طرح منقول ہے، اگر یہ سلام کا حصہ ہوتا تو ذکر کے اعتبار سے بھی اس کے برابر ہوتا۔

میں (قرطبی) نے کہا: مصافحہ کے حوالے سے تو ایک حدیث بھی ہے جس میں اس کے بارے میں ترغیب ہے اور جو اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی محافظت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آپ نے فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے عرض کیا: یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو یہ گمان کرتا تھا کہ مصافحہ عجمیوں کا (طریقہ) ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہم ان سے زیادہ مصافحہ کے حقدار ہیں جب بھی دو مسلمان ایک دوسرے کو ملتے ہیں اور باہم محبت اور اخلاص کی بنیاد پر ان میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتا ہے تو ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے'' (3)۔

قولہ تعالیٰ: وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ۔ من الجب نہیں فرمایا یہ مہربانی اور کرم نوازی کے طور پر ہے تاکہ آپ اپنے بھائیوں کو تثریب علیکم کے قول کے ساتھ معاف کرنے کے بعد ان کی کارائی یاد نہ دلا دیں۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہی صوفیاء کرام کے نزدیک اصل ہے کہ صفا کے وقت جفا کو ذکر کرنا بھی جفا ہے، صوفیاء کا یہ قول صحیح ہے جس پر کتاب اللہ بھی دال ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ آپ کے قید میں جانے میں خود اپنا اختیار تھا کہ آپ نے خود کہا تھا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ (یوسف: 33) جبکہ کنویں میں جانا اللہ تعالیٰ کے ارادے سے تھا۔ جبکہ ایک قول یہ ہے کہ قید خانے میں آپ چوروں اور نافرمان لوگوں کے ساتھ تھے جبکہ کنویں میں اللہ تعالیٰ

1۔ کنز العمال، جلد 9، صفحہ 118 2۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 130 3۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 134

کے ساتھ، تو اسی طرح قید خانے سے نجات دینے میں احسان بھی بہت بڑا تھا اور چونکہ قید خانہ میں آپ ایسے معاملے کی وجہ سے گئے جس کا آپ نے ارادہ کیا تھا اور اسی طرح اپنے اختیار سے گئے جب آپ نے خود کہہ دیا: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ تو اس میں مصیبت اور کرب بھی زیادہ تھا۔ اور اس میں آپ نے یہ بھی کہا تھا: عِنْدَ رَبِّكَ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا تو اس پر آپ کا عتاب ہوا۔ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا مسکن کنعان کی سرزمین تھی، اور اہل کنعان مویشیوں والے اور صحرائی لوگ تھے۔ ایک قول کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام صحراء کی طرف نکل گئے اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ میں سے کسی کو نبی مبعوث نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ بدا مقام کی طرف چلے گئے شاعر نے بھی اس شعر میں بدا سے مراد وہ مقام لیا ہے۔

وأنتِ التی حَبّبتِ شَغْبًا إلی بَدَا إلیّ وأوطانی بلادٌ سِواھُما

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہاڑ کے نیچے اس جگہ پر ایک مسجد تھی۔ بَدَا کہا جاتا ہے جب وہ لوگ بدا آئیں جس طرح غَارَ داغور آ کہا جاتا ہے یعنی جب وہ غور کے مقام پر آئے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ تمہیں بدا کے مقام سے لے آئے گا، اس کو امام قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے ضحاک عن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے۔ مِنۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ یعنی حسد کو پیدا کر کے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔ ایک قول کے مطابق نَزَغَ کا معنی ہے افسد یعنی اس نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد بپا کیا۔ آپ کا ان کے گناہ کو شیطان پر ڈال دینا آپ کی طرف سے بطور مہربانی تھا۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ یعنی وہ اپنے بندوں کے لیے نرم ہے۔ خطابی نے کہا: لطیف سے مراد وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر لطف و کرم فرماتی ہے اور اس کا لطف و کرم ایسے طریقے سے ہوتا ہے جن کو بندے جانتے بھی نہیں ہوتے اور وہ ان کے لیے ایسے اسباب مہیا فرما دیتا ہے جو ان کے گمان میں بھی نہیں ہوتے، جس طرح کے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ (الشوریٰ: 19) ایک قول کے مطاق لطیف سے مراد معاملات کے دقائق کو جاننے والا ہے۔ یہاں اس سے مراد اکرام اور نرمی ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکال کر ان کے خاندان کو صحراء سے وہاں پہنچا کر اور آپ کے دل سے شیطانی وسوسے کو نکال کر لطف و کرم فرمایا (1)۔

روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل اور بچوں کے ساتھ آئے اور مصر کی سرزمین کو شرف بخشا تو جب اس کی اطلاع حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچی تو آپ نے فرعون مصر سے اجازت مانگی جس کا نام ریان تھا کہ وہ آپ کو اپنے باپ یعقوب کو ملنے کی اجازت دے اور اسے آپ کے آنے کی خبر دی تو اس نے آپ کو اجازت دے دی اور اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا حکم دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور بادشاہ نکلے تو آپ کے ساتھ چار ہزار افراد تھے اور ہر امیر کے ساتھ اللہ کی اتنی مخلوق تھی جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اہل مصر بھی ان کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملنے کے لیے سوار ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام یہوذا کے ہاتھ پر ٹیک لگا کر چل رہے تھے۔ حضرت یعقوب

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 88

علیہ السلام نے گھوڑے، لوگ اور لشکر کو دیکھا تو فرمایا: اے یہوذا! یہ فرعون مصر ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ یہ آپ کا بیٹا یوسف ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے سلام میں پہل کرنا چاہا تو آپ کو اس سے روک دیا گیا کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام آپ سے زیادہ اس کے حقدار تھے اور افضل بھی تھے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے سلام کا آغاز فرمایا اور فرمایا: تم پر سلام ہو اے غموں کو دور کرنے والے! اور رو پڑے تو حضرت یوسف علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ رو پڑے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام خوشی سے روئے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد گرامی کی پریشانی کو دیکھ کر روئے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ رونا چار طرح سے ہوتا ہے، خوف سے رونا، تکلیف سے رونا، خوشی سے رونا اور دکھلاوے کا رونا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے غموں اور پریشانیوں کے بعد میری آنکھ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے گھرانے کے بیاسی آدمیوں کے ساتھ آپ مصر میں داخل ہوئے اور پھر وہ لوگ مصر سے تب نکلے جب ان کی تعداد چھ لاکھ اور کچھ ہزار ہوگئی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دریا کو عبور کیا، اس بات کو عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں ملا کر وہ کل ترانوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔ ربیع بن خثیم نے کہا: جب داخل ہوئے تو ان کی تعداد بہتر ہزار تھی اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو چھ لاکھ تھے۔ حضرت وہب نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹے مصر میں داخل ہوئے تو مرد، عورتیں اور بچے ملا کر نوے آدمی تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون سے بھاگ کر نکلے تو چھ لاکھ پانچ سو ستر اور کچھ مجاہدین تھے۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں چوبیس سال بڑی خوشحالی اور نعمت کی حالت میں مقیم رہے، مصر میں ہی آپ نے وصال فرمایا اور اپنے بیٹے یوسف کے نام وصیت لکھی کہ ان کے جسد اقدس کو یہاں سے اٹھا کر شام میں اپنے باپ حضرت اسحٰق کے پہلو میں دفن کیا جائے تو آپ نے ایسا ہی کیا، اور پھر مصر واپس لوٹ آئے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام کو ساج کے بنے ہوئے تابوت میں بیت المقدس منتقل کیا گیا۔ اسی دن عیصو فوت ہوا، تو دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا، اسی وجہ سے یہودی اپنے مردوں کو بیت المقدس لے جاتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور عیصو اکٹھے پیدا ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن ہوئے دونوں کی عمر ایک سو چوہتر سال تھی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

”اے میرے رب! عطا فرمایا تو نے مجھے یہ ملک نیز تو نے سکھایا مجھے باتوں کے انجام کا علم، اے بنانے والے آسمانوں اور زمین کے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں مجھے وفات دے درآنحالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ“۔

قولہ تعالیٰ: رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ قتادہ نے کہا: کسی نبی یا غیر نبی (1) نے موت کی تمنا نہیں کی سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے، اور وہ بھی تب جب آپ پر نعمتیں تمام ہوگئیں اور تمام معاملات مکمل ہوگئے تو آپ اپنے پروردگار کی ملاقات کے مشتاق ہوگئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی تمنا نہیں کی بلکہ اسلام پر وفات کی تمنا کی ہے، یعنی جب میری موت آئے تو مجھے حالت اسلام میں موت دے، یہ جمہور کا قول ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: موت کی تمنا صرف تین آدمی کرتے ہیں، ایسا آدمی جو موت سے بعد کے معاملات سے ناواقف ہوتا ہے یا وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مشتاق اور محب ہوتا ہے۔ صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے جو اس پر نازل ہوئی ہے اگر تمنا کرنا ضروری ہی ہو تو اسے یہ کہنا چاہیے۔ یا اللہ! جب تک زندگی تو میرے لیے بہتر جانتا ہے مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے موت دے دے''۔ اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم میں ہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے اور اس کے آنے سے پہلے اسے کوئی نہ بلائے، جب تم میں سے کوئی مرے گا تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہوجائے گا اور مومن کی عمر اس میں بھلائی اور خیر کا اضافہ کرتی ہے''۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت، دنیا سے جانے اور عمل کے خاتمے کی تمنا کی؟ یہ بعید از قیاس بات ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہوسکتا ہے ان کی شریعت میں یہ جائز ہو، کیا فتنوں کے ظہور اور غلبہ کے وقت اور دین کے ضائع ہوجانے کے خوف کے وقت موت کی تمنا اور دعا جائز نہیں جس طرح کہ ہم (قرطبی) نے کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کردیا ہے۔ اللہ کے ارشاد: مِنَ الْمُلْكِ میں مِنَ تبعیضیہ ہے کیونکہ مصر کی بادشاہی کل بادشاہی نہیں ہے اسی طرح علم تعبیر بھی کل علم نہیں ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مِن جنس کے لیے ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاجتنبوا الرجس من یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، یعنی آتیتنی الملك وعلمتنی تاویل الاحادیث۔

قولہ تعالیٰ: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ندا کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور وہ ہے رب یہ ندا مضاف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: یا رب! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ندا ثانی ہو اور فاطر سے مراد خالق ہے، فھو سبحانہ فاطر الموجودات یعنی موجودات کا خالق، ان کا آغاز کرنے والا، ان کی نشوونما کرنے والا اور بغیر کسی چیز اور نمونے کے ان کو ایجاد فرمانے والا اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں بدیع السموات والارض کے ارشاد گرامی کے تحت تفصیل سے گزر چکی ہے اور ہم (قرطبی) نے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں اس پر مزید اضافہ کیا ہے۔ اَنْتَ وَلِیّٖ یعنی تو میرا مددگار اور دنیا و آخرت میں میرے معاملات کا والی ہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ صالحین سے مراد آپ کے تین آباء ہیں یعنی حضرت

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 89

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، کراھۃ تمنی الموت، جلد 2، صفحہ 342

3۔ ایضاً

ابراہیم، حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں حالت طہارت و پاکیزگی میں وفات نصیب فرمائی اور سنگ مرمر کے صندوق میں دریائے نیل میں آپ کی تدفین ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ جب آپ کا وصال ہوا تو لوگ جمع ہو گئے، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کے محلے میں آپ کی تدفین ہو تو اس محلے میں برکت کا نزول ہو۔ تمام لوگ اس معاملے پر بضد ہو گئے حتیٰ کے قتال کی نوبت آ گئی، تو پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو دریائے نیل میں ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں سے پورے مصر میں پانی جاتا ہے۔ آپ کی قبر پر سے پانی گزرے گا پھر پورے مصر میں وہ پانی منتشر ہو جائے گا، (تو سب کو برکت حاصل ہوگی) تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو انہوں نے آپ کو دریائے نیل سے نکالا اور چار سو سال کے بعد آپ کا تابوت بیت المقدس منتقل کیا گیا اور آپ کو ایک دعا، وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی وجہ سے اپنے آباء کے ساتھ دفن کیا گیا۔ آپ کی عمر ایک سو سات سال تھی، حضرت حسن سے روایت ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کو سترہ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالا گیا اور غلامی، قید خانے اور بادشاہت میں اسی سال گزارے پھر آپ کے بکھرے ہوئے کاموں کو جمع کیا گیا اس کے بعد آپ نے تیئس سال زندگی گزاری (اس طرح کل عمر ایک سو بیس سال ہوئی)۔ آپ کی اولاد میں ابن لہیعہ کے قول کے مطابق افرائیم، منشا اور رحمت ہیں جو کہ حضرت ایوب کی زوجہ تھیں۔

امام زہری نے کہا: افرائیم بن یوسف کا بیٹا نون بن اَفرائیم تھا اور نون کا بیٹا حضرت یوشع بن نون تھا اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آپ کے معاون تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں نبی بنایا، تو ان کے بعد آپ نبی تھے۔ اور یہ وہی ہیں جنھوں نے اریحاء کو فتح کیا اور اس میں جابر لوگوں میں سے جو تھا اسے قتل کیا اور جس طرح سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے کہ سورج نے آپ کی خاطر رکنا چاہا۔ منشا بن یوسف کا بیٹا موسیٰ بن منشا تھا موسیٰ بن عمران سے پہلے۔ اہل تورات کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ ہیں جنھوں نے ایک عالم سے ملاقات کی خواہش کی تھی تا کہ اس سے علم حاصل کریں یہاں تک آپ نے اسے پا لیا۔ اور عالم وہ تھا جس نے کشتی کو توڑا، بچے کو قتل کیا اور دیوار بنائی۔ اور موسیٰ بن منشا آپ کے ساتھ رہے یہاں تک کہ یہ آپ کے ساتھ وہاں تک پہنچے جہاں تک آپ پہنچے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس بات کا انکار کرتے ہیں اور صحیح بھی وہ بات ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی اسی طرح قرآن میں بھی ہے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کئی قومیں اور زمانے تھے ان کے درمیان حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ۝ وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

”(اے حبیب) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کرتے ہیں آپ کی طرف اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر درآنحالیکہ مکر کر رہے تھے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ، خواہ آپ کتنا

ہی چاہیں ایمان لانے والے اور نہیں طلب کرتے آپ ان سے اس (درس ہدایت) پر کچھ معاوضہ، نہیں ہے یہ مگر نصیحت سب جہانوں کے لیے"۔

قولہ تعالیٰ۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ مبتدا اور خبر ہے نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ خبر ثانی ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكَ بمعنی الذی ہو اور نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ اس کی خبر ہو، یعنی اَلَّذِی مِن انبائِ الغیب نوحیه إلیك یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف کے معاملے میں سے غیب کی خبروں میں سے جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ یعنی ہم اس وحی کے ذریعے آپ کو سکھاتے ہیں۔ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ یعنی بھائی یوسف کے ساتھ آپ ان کے پاس نہیں تھے اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنے پر وہ متفق ہوئے وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ یعنی کنویں میں پھینکنے کے سلسلہ میں وہ یوسف کے ساتھ مکر کر رہے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود قمیص لا کر آپ کے ساتھ مکر کر رہے تھے یعنی وہ احوال آپ نے مشاہدہ نہیں کیے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مطلع کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ آپ کا خیال یہ تھا کہ جب عربوں نے اس قصہ کے متعلق پوچھا ہے اور آپ نے ان کو اس کے متعلق بتایا ہے تو وہ ایمان لے آئیں گے مگر وہ ایمان نہ لائے، تو یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے نازل ہوئی یعنی جس کو آپ ہدایت دینا چاہیں اس کو آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ حَرَصَ یَحْرِصُ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے اور ضعیف لغت میں حَرِصَ یَحْرَصُ بھی ہے یعنی باب سَمِعَ یَسْمَعُ اور حرص اختیار کے ساتھ کسی چیز کا مطالبہ کرنے کو کہتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ، مِنْ صلہ ہے یعنی ما تسالهم جعلاً، اِنْ هُوَ یعنی ما هو، هُوَ سے مراد قرآن اور وحی ہے اِلَّا ذِكْرٌ یعنی نصیحت اور تذکرہ لِّلْعٰلَمِیْنَ سب جہانوں کے لیے۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۞ وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۞ اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۞ قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۞

"اور کتنی ہی (بے شمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشے) میں (سجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح و شام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کیے ہوتے ہیں اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیا وہ بے غم ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آئے ان پر چھا جانے والا اللہ تعالیٰ کا عذاب یا آ جائے ان پر قیامت اچانک اور انھیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ آپ فرما دیجیے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں، اور ہر عیب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ اور نہیں ہوں میں مشرکوں سے"۔

قولہ تعالیٰ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خلیل اور سیبویہ نے کہا: یہ أی ہے اس پر کاف تشبیہ کا داخل ہوا تو این بن گیا، یہاں یہ کم کے معنی میں ہے سورۂ آل عمران میں اس کے حوالے سے گفتگو گزر چکی ہے اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے حوالے سے سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیات گزشتہ امتوں کی سزاؤں کے آثار ہیں، یعنی وہ غافل تھے اور ان میں غور وفکر سے اعراض کرتے تھے۔ عکرمہ اور عمرو بن فائد نے وَالْاَرْضِ کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں یہ متبدا ہوگا اور اس کی خبر يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا ہوگی۔ سدی نے فعل کو مضمر مانتے ہوئے وَالْاَرْضِ پڑھا ہے۔ ان دونوں قرأتوں کے مطابق وقف السَّمٰوٰتِ پر ہوگا۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے يَمُرُّوْنَ کے بجائے يمشون عليها پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا اور سب اشیاء کا خالق ہے جبکہ وہ پوجا بتوں کی کرتے ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد، عامر، شعبی اور اکثر مفسرین کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے(1) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو پیدا کرنے والا کون ہے تو ضرور کہیں گے: اللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا کلمات کہتے ہیں اور اس کے شریک بناتے ہیں۔ حضرت حسن سے یہ بھی مروی ہے یہ اہل کتاب ہیں ان کے پاس شرک وایمان دونوں ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لاتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفیر کرتے ہیں تو ان کے ایمان صحیح نہیں۔ ابن الانباری نے یہ روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت مشرکین عرب کے تلبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان کا تلبیہ یہ تھا۔ لبيك لا شريك لك إلا شريكا هو لك تملكه وما ملك ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ تیرا شریک ہے جس کو تو نے اپنا شریک بنایا ہے تو اس کا مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی تو مالک ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ مشبهه ہیں اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں اور تفصیلی طور پر شرک کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، معنی یہ ہوگا وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ یعنی زبان سے ایمان لاتے ہیں مگر دل سے وہ کافر ہیں۔ یہ ماوردی نے حضرت حسن سے روایت کی ہے۔ عطا نے کہا: یہ دعا کے متعلق ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار خوشحالی میں اپنے رب کو بھول جاتے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو بڑے خلوص سے دعا مانگتے اس کی تفصیل ان آیات میں ہے وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ الآیہ (یونس: 22) اور انہوں نے گمان کیا کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ الآیہ (یونس: 12) اور جب انسان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو دور کرنے کے لیے ہم سے دعا مانگتا ہے۔ اور ایک اور آیت میں ہے وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۞ (فصلت) اور جب اسے کوئی برائی لاحق ہو تو وہ لمبی چوڑی دعا والا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہلاکت کی نجات کے لیے دعا مانگتے ہیں اور جب اللہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو کوئی کہتا ہے: اگر فلاں نہ ہوتا تو ہم نجات نہ پاتے، اگر فلاں نہ ہوتا تو چور ہمارے پاس آجاتے اور اس طرح کے کلمات کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمت کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

فلاں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جوان کو چور سے بچایا ہوتا ہے اس کو کتے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔
میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی باتیں تو اکثر عام مسلمانوں سے بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت واقعہ دُخان کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ قحط کے سالوں میں اہل مکہ کو دھویں نے ڈھانپ لیا تو انھوں نے کہا: رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿۱۲﴾ (الدخان) اے ہمارے پروردگار! ہم سے عذاب کو دور فرما ہم ایمان دار ہیں تو یہ ان کا ایمان تھا اور عذاب کے چھٹ جانے کے بعد ان کا شرک، کفر کی طرف لوٹ گیا اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿۱۵﴾ (الدخان) تم لوٹ کر جانے والے ہو۔ لوٹ کر جانا ابتدا کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تو إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ کا معنی ہوگا: إلا و هم عائدون۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ، غاشية کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مُجللة کیا ہے یعنی ڈھانپا ہوا۔ مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد ایسا عذاب ہے جو ان کو ڈھانپ لیتا ہو، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (العنکبوت: 55) جس دن ان کو ڈھانپ لے گا عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ لڑائی ہے جو ان کے لیے بپا ہوگی۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد کڑک اور پھڑ پھڑانے والی ہے۔ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ یعنی قیامت بَغْتَةً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کی اصل مصدر ہے۔ مبرد نے کہا: عربوں سے نکرہ کے بعد حال کے جملے آئے ہیں جیسا کہ ان کا یہ قول: وقع أمرهم بغتة و فجأة نحاس نے کہا: بَغْتَةً کا معنی مصیبت کا ایسی جگہ سے آنا ہے جہاں سے توقع نہ ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ یہ تاکید ہے بَغْتَةً کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ چیخنے والی لوگوں پر چیخے گی اس حال میں کہ وہ اپنے بازاروں اور اپنے مقامات پر ہوں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿۴۹﴾ (یٰسین) وہ ان کو پکڑے گی درآنحالیکہ کر وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي متبدا اور خبر ہیں یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے یہ میرا رستہ، سنت اور طریقہ ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ربیع نے کہا: سَبِيلِي سے مراد دعوتی ہے، یعنی میری دعوت، مقاتل نے کہا: اس سے مراد دینی یعنی مراد دین ہے۔ معنی سب کا ایک ہی ہے، یعنی وہ طریقہ جس پر میں ہوں اور جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں وہ جنت کی طرف لے جاتا ہے۔ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ یعنی حق اور یقین پر، اسی سے فلان مستبصر بهذا ہے۔ أَنَا تاکید ہے وَمَنِ اتَّبَعَنِي مضمر پر عطف ہے۔ وَسُبْحَانَ اللَّهِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرما دیجیے وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ میں ان مشرکین سے نہیں ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مد مقابل بناتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 94

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۱۰

''اور ہم (نے رسول بنا) کر نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے، کیا یہ (منکر) لوگ سیر و سیاحت نہیں کرتے زمین میں تا کہ وہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان (منکرین) کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے، اور دار آخرت یقیناً بہتر ہے ان کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (اے سننے والو!) کیا تم نہیں سمجھتے جب (نصیحت کرتے کرتے) مایوس ہو گئے رسول اور وہ منکرین گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے اس وقت آ گئی ان کے پاس ہماری مدد۔ پس بچا لیا گیا (عذاب سے) جس کو ہم نے چاہا اور نہیں ٹالا جا سکتا ہمارا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یہ ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے تھے: لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (انعام: 8) کیوں نہ اترا اس پر فرشتہ، یعنی ہم نے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے، جن میں نہ کوئی عورت ہے نہ جن اور نہ کوئی فرشتہ، یہ اس روایت کی بھی تردید ہے جو نبی اکرم ﷺ سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''عورتوں میں چار نبی ہیں، حوا، آسیہ، ام موسیٰ اور مریم''۔ اس کے متعلق کچھ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى سے مراد مدائن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحراؤں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں سے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا کیونکہ دیہاتیوں میں جفا اور سختی کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ شہروں میں رہنے والے زیادہ عقلمند، حلیم، افضل اور زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اہل بادیہ سے کبھی بھی نبی مبعوث نہیں فرمایا اسی طرح نہ جنوں اور عورتوں میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجا۔ حضرت قتادہ نے کہا: مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، سے مراد من اهل الأمصار ہے کیونکہ وہ زیادہ حلم اور علم والے ہوتے ہیں۔ علماء نے کہا: رسول کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ مرد ہو، آدمی ہو اور شہری ہو، آدمی کی شرط علماء نے صرف ان کے اس قول سے بچنے کے لیے لگائی ہے کہ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) وہ جنوں میں سے مردوں کی پناہ مانگتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا کیا یہ لوگ زمین میں سیر و سیاحت نہیں کرتے تا کہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے انجام کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ دار ہی آخرت البتہ کسی چیز کو خود اس کی طرف لفظی اختلاف کی وجہ سے مضاف کر دیا جاتا ہے، جیسے یوم الخمیس، بارحۃ الاولی وغیرہ۔ شاعر نے کہا۔

ولو أَقْوَتْ علیكَ دیارُ عَبْسٍ عَرَفْتَ الذُّلَّ عِرْفَانَ الیَقِینِ (1)

عرفان بھی یقین ہی ہوتا ہے مگر عرفان اور یقین دو مختلف لفظ تھے اس لیے شاعر نے عرفان الیقین کہہ دیا ہے۔ مراد عرفانا یقینا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 98

کسائی نے صلاۃ الاولی کے قول سے استدلال کیا ہے۔ اخفش نے مسجد الجامع سے استدلال کیا جبکہ نحاس نے کہا: اضافة الشیٔ الی نفسہ محال ہے، کیونکہ کسی چیز کی اضافت دوسری چیز کی طرف اس لیے کی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعے اس کی معرفت حاصل ہو جائے سو عمدہ بات یہ ہے کہ الصلاۃ الاولی کہا جائے اور جس آدمی نے صلاۃ الاولی کہا اس کا مطلب عند صلاۃ الفریضة الاولی ہوگا۔ اس کو اولی اس وجہ سے کہا گیا کہ نماز کی فرضیت کے بعد سب سے پہلے یہی نماز ادا کی گئی اسی طرح سب سے پہلے جو سب سے زیادہ ظاہر ہوئی وہ بھی یہی ہے اسی وجہ سے اس کو ظہر بھی کہا جاتا ہے۔

تقدیر عبارت ہوگی، ولدار الحال الآخرۃ خیر یہ بصریوں کا قول ہے اور اس دار سے مراد جنت ہے اور خیر سے مراد ھی خیر للمتقین ہے۔ اس کو وَلَلدَّارُ الآخِرَةُ بھی پڑھا گیا ہے۔ نافع، عاصم اور یعقوب وغیرہ نے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے خبر کے طور پر یعقلون پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ اس کی قرات اور معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا اس آیت کریمہ میں انبیاء کی ایسے امور سے تنزیہ اور عصمت بیان کی گئی ہے جو ان کے شایان شان نہیں۔ یہ باب بہت بڑا ہے اور اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے اس پر توقف کرنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان بھٹک جائے اور جہنم کا حقدار بن بیٹھے۔ معنی یہ ہوگا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا پھر ہم نے ان کی امتوں کو کوئی سزا نہیں دی حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ یہاں تک کہ رسول مایوس ہو گئے، یعنی اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے۔ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوْا یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے انبیاء نے گمان کیا کہ قوم کے جو لوگ ان پر ایمان لائے ہیں وہ ان کی تکذیب کریں گے نہ کہ قوم نے تکذیب کی بلکہ انبیاء نے گمان کیا کہ وہ ان کی تکذیب کریں گے (کہ رسولوں نے کافروں پر جس عذاب کا وعدہ کیا تھا وہ عذاب اب تک نہیں آیا) یعنی انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کے پیروکاروں کے دلوں میں شک داخل ہو جائے گا، تو اس طرح ظنوا کی اس سورت میں یہ تاویل ہوگی۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی، حضرت ابو جعفر بن قعقاع، حضرت حسن، حضرت قتادہ، ابو رجاء عطاری، عاصم، حمزہ، کسائی، یحییٰ بن وثاب، اعمش اور خلف نے كُذِبُوْا کو مخفف پڑھا ہے یعنی قوم نے یہ گمان کیا کہ ان کے رسولوں نے انہیں جو عذاب کی خبر دی تھی اس میں انہوں نے ان سے جھوٹ بولا ہے اور سچ نہیں بولا۔ ایک قول یہ ہے معنی یہ ہوگا ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو ان سے اللہ کی مدد کا وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا نکلا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ) یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ رسول ایسا گمان نہیں کر سکتا۔ اور جو ایسا گمان کرے وہ مدد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی؟ ابو نصر قشیری نے کہا: اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ بشر کے دل میں یہ بات کھٹکی ہو البتہ ان کے دلوں میں وہ متحقق اور ثابت نہ ہوئی ہو، حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ایسی باتوں سے درگزر فرمایا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، جب تک زبان نے وہ بات کہی نہ ہو یا اس

پر عمل نہ کیا گیا ہو" (1)۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ کہا گیا ہو: وہ اس گمان کے قریب پہنچ گئے تھے جس طرح کہ آدمی کا قول: بلغت المنزل یعنی میں منزل کے قریب پہنچ گیا۔ ثعلبی اور نحاس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ بشر تھے اور لمبی آزمائش سے کمزور پڑ گئے اور بھول گئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرہ: 214) حتیٰ کہ رسول اور ایمان لانے والوں نے کہا: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ حکیم ترمذی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ تعالیٰ کی مدد کے وعدے کے بعد خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کا خوف زدہ ہونا اللہ تعالیٰ کے وعدے میں کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کے دلوں کی کمزوری کی وجہ سے تھا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو گئی ہو جس نے اس شرط اور وعدوں کو توڑ دیا ہو جو ان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ تو جب مدت طویل ہو گئی تو اس بنا پر ناامیدی اور گمانات در آئے۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، کہ بشری تقاضوں کے مطابق انبیاء نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی ہو گئی ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ: 260) سے آپ نے استشہاد کیا۔ (بہر حال) پہلی قرأت زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ مجاہد اور حمید نے قَدْ كَذَبُوْا کاف کے فتحہ اور ذال مخفف کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہوگا کہ قوم نے جب عذاب کی تاخیر میں اللہ کے فضل کو دیکھا تو رسولوں کی قوم نے گمان کیا کہ رسولوں نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معنی یہ ہو: جب رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے کفر اختیار کر کے اللہ پر جھوٹ بولا ہے تو رسول ہماری مدد کو لے آئے۔ بخاری میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے حَتّٰى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ کے متعلق سوال کیا۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا: یہ كُذِّبُوْا ہے یا کذبوا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: كُذِّبُوْا۔ میں نے کہا: ان کو یقین تھا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے تو پھر گمان کیسا؟ آپ نے فرمایا: مجھے قسم انہیں یقین نہیں تھا۔ میں نے آپ کو کہا: وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! رسول اپنے رب کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا: تو اس آیت کا کیا مطلب ہوگا؟ آپ نے فرمایا: یہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی تھی وہ اللہ کی مدد آنے سے مایوس ہو گئے اور رسولوں نے یہ گمان کر لیا کہ اب ان کے پیروکار ان کی تکذیب کریں گے تو اس وقت ہماری مدد آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَآءَهُمْ نَصْرُنَا کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی مدد رسولوں کے پاس آ گئی یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی قوم پر اللہ کا عذاب آ گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک قول یہ ہے کہ انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں (کو نجات ملی) عاصم سے فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ایک نون اور یا مفتوح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مَنْ فعل مجہول کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ ابو عبید نے اس قرات کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر مصاحف میں ہے۔ ابن محیصن نے فنجا فعل ماضی پڑھا ہے۔ اور مَنْ فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، جبکہ باقیوں کی قرات کے مطابق مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَلَا يُرَدُّ

1۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 155

بَاْسُنَا یعنی عذابنا ہمارا عذاب نہیں ٹالا جا سکتا۔

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ یعنی کافرین ومشرکین سے۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''بلاشبہ پہلی قوموں (کے عروج وزوال) کی داستانوں میں (درس) عبرت ہے سمجھداروں کے لیے، نہیں ہے یہ قران ایسی بات جو (یونہی) گھڑلی گئی ہو بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو ان سے پہلے نازل ہوئیں ہیں اور یہ قران ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ یعنی حضرت یوسف، آپ کے باپ اور بھائیوں کے قصہ میں یا قوموں کے قصوں میں۔ عِبْرَةٌ یعنی فکر، تذکرہ اور نصیحت۔ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی بہت زیادہ عقلمندوں کے لیے۔ محمد بن اسحاق نے عن زہری عن محمد بن ابراہیم بن حارث تیمی کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو چھتر سال زندہ رہے۔ اور آپ کے بھائی عیصو آپ کے ساتھ ایک دن میں فوت ہوئے اور دونوں ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ اس وجہ سے اللہ کا ارشاد: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ سورت کے آخر تک ہے۔ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی یعنی یہ قران ایسی بات نہیں جو گھڑی گئی ہو یا یہ قصہ ایسی بات نہیں جو گھڑا گیا ہو۔ وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ یعنی جو اس سے پہلے ہیں تورات، انجیل اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتب میں سے۔ یہ تاویل اس آدمی کی نزدیک ہوگی جس کا خیال ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے، وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ ایسی چیزیں جن کی بندوں کو ضرورت ہوتی ہے حلال وحرام اور شرائع واحکام وغیرہ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

# سورۂ رعد

ایاتھا ۴۳ ﴿۱۳ سُوۡرَۃُ الرَّعۡدِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۶﴾ رکوعاتھا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے جبکہ کلبی اور مقاتل کے نزدیک مدنی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ کا ارشاد ہے: سوائے دو آیتوں کے جو مکے میں نازل ہوئیں باقی ساری سورت مدنی ہے اور وہ وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ سے لے کر آخر تک دو آیتیں ہیں۔

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ①

''الف۔ لام۔ میم۔ را۔ یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی) کی اور جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے، وہ حق ہے لیکن اکثر لوگ (اپنی کج فہمی کے باعث) ایمان نہیں لاتے''۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ یعنی یہ قرآن جو آپ پر اتارا گیا ہے مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ تیرے رب کی جانب سے حق ہے نہ کہ جس طرح مشرک کہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے اسے پیش کرتے ہیں، سو اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرو۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت تب نازل ہوئی جب مشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔ وَ الَّذِیۡۤ، اٰیٰتُ پر عطف کی وجہ سے محل رفع میں ہے یا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور الۡحَقُّ اس کی خبر ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محل جر میں ہو اور تقدیر عبارت یوں ہو: وآیاتُ الذی أنزلَ الیكَ اور الۡحَقُّ کا رفع مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر ہوگا، تقدیر عبارت: ذالك الحقُّ ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ الحقُّ یعنی ذالك الحقُّ فراء نے کہا: اور اگر آپ چاہیں تو وَ الَّذِیۡۤ کو الۡکِتٰبِ کی صفت بنا کر مجرور پڑھ لیں، اگرچہ اس میں واو بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے: آتانا هذا الكتاب عن ابی حفص والفاروق۔ اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

إلى الملِكِ القَرمِ وابن الهُمامِ　　ولَیثِ الكَتِیبَةِ فِی المُزدَحَم (1)

اس سے مراد إلى الملك القرم بن الهمام، لیث الکتیبہ ہے۔

وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 111

الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝

''اللہ وہ (قدرت وحکمت والا ہے) جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے (جیسے) تم انھیں دیکھ رہے ہو پھر وہ متمکن ہوا عرش پر اور پابند حکم بنا دیا سورج اور چاند کو، ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک، اللہ تعالیٰ تدبیر فرماتا ہے ہر کام کی کھول کر بیان کرتا ہے (اپنی) نشانیوں کو شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرلو''۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ قرآن حق ہے، تو یہ بھی بیان فرمایا کہ اِس کو نازل کرنے والا کمال پر قدرت رکھتا ہے، اس کی کاریگریوں کو دیکھو تا کہ اس کی قدرت کے کمال کو پہچان سکو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا کے ارشاد کے متعلق دو قول ہیں: ایک یہ کہ بغیر ستونوں کے بلند ہیں جیسے تم دیکھ رہے ہو، یہ حضرت قتادہ، ایاس بن معاویہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے ستون ہیں لیکن ہم وہ دکھاتے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آسمان کے ستون قاف پہاڑ پر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر یہ بات کی جائے کہ ستون اس کی وہ قدرت ہے جس کے ذریعے وہ آسمان اور زمین کو روکتا ہے۔ اور وہ قدرت ہمیں نظر نہیں آتی، زجاج نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ جب کافر کے کفر سے آسمان پھٹنے کے قریب ہو گیا تو مومن کی توحید آسمان بن گئی، اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے عمد، عمود کی جمع ہے۔ نابغہ نے کہا ہے:

وخيِّسِ الجنَّ إنِّي قد أذِنتُ لهُمْ　　يَبْنُونَ تَدْمُرَ بالصُّفَّاحِ والعَمَدِ(1)

اس میں العَمَد عمود کی جمع ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ یعنی ان دونوں کو اپنی مخلوق کے منافع اور اپنے بندوں کے مصالح کے لیے مسخر فرمایا اور ہر مخلوق اپنے خالق کی تابعدار ہے۔ كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی معلوم وقت تک اور وہ دنیا کی فنا کا ہے اور اس وقت کے قیام کا ہے جس وقت سورج کو لپیٹ دیا جائے گا، چاند کو گرہن لگ جائے گا، ستارے محو ہو جائیں گے اور کواکب اُڑ جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لِاَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد ان دونوں کے وہ درجات اور منازل ہیں جہاں ان کی انتہا ہوئی ہے اور اِن مقامات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ایک قول کے مطابق لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کا معنی یہ ہے کہ چاند مہینے میں اپنے فلک کو طے کرتا ہے اور سورج سال میں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف فرماتا ہے يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ یعنی ان کو بیان فرماتا ہے مراد یہ ہے کو جو اِن امور پر قدرت رکھتا ہے وہ اِن کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہوگا، اسی وجہ سے فرمایا: لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ شاید تم اپنے ربّ سے ملاقات کا یقین کرلو۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 112

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ③

''اور وہی ہے جس نے پھیلا دیا زمین کو اور بنا دیئے اُس میں پہاڑ اور دریا اور ہر قسم کے پھلوں میں سے دو دو جوڑے بنا دیئے وہ ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو، بے شک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ جب آسمان کی نشانیوں کو بیان فرمادیا تو اب زمین کی نشانیوں کو بیان فرمایا یعنی زمین کو طول و عرض میں پھیلا دیا۔

وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ یعنی ایسے پہاڑ جو بہت زیادہ ثابت ہیں، اِس کا واحد راسیۃ ہے کیونکہ زمین اِن کے ذریعے ثابت رہتی ہے اور الارساء کا معنی الثبوت ہے۔ عنترہ نے کہا ہے:

فَصَبَرْتُ عَارِفَةً لذالك حُرَّةً  تَرْسُو اِذا نَفْسُ الجَبَانِ تَطَلَّعُ

جمیل نے کہا:

اُحِبُّهَا والذی اَرْسَی قواعِدَهُ  حُبًّا اِذَا ظَهَرَت آیاتُهُ بَطَنَا

ان دونوں اشعار میں ترسو اور ارسی کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: زمین پر قائم ہونے والا پہلا پہاڑ اُبوقُبیس ہے۔

**مسئلہ**۔ ان آیات میں ان لوگوں کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین ایک کرہ ہے، اسی طرح ان کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین کے دروازے اِس پر جھکتے ہیں۔ ابن راوندی کا خیال ہے کہ زمین کے نیچے بہت زیادہ بلند ہونے والے اجسام ہیں جس طرح کہ اوپر اُٹھنے والی ہوا ہوتی ہے۔ اور یہ ڈھلوان ہے تو قوت اور مدار میں نیچے آنے والی زمین اوپر اُٹھنے والے اجسام معتدل ہو جاتے ہیں تو اس طرح اِن دونوں میں موافقت پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ دیگر لوگوں کا گمان یہ ہے کہ زمین دو جسموں سے مرکب ہے ایک نیچے آنے والا ہے اور دوسرا اُوپر اُٹھنے والا، دونوں میں اعتدال آیا تو اِس وجہ سے زمین ٹھہر گئی، جبکہ مسلمان اور اہل کتاب کا عقیدہ زمین کے وقوف، اس کے ساکن ہونے اور اس کے پھیلنے کا ہے اور اس کی حرکت عام طور پر زلزلہ کے ذریعے ہوتی ہے جو (بعض اوقات) اس میں بپا ہوتا ہے۔ وَ اَنْهٰرًا یعنی زمین پر جاری پانی، اس میں مخلوق کا فائدہ اور منافع ہے۔ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ۔ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ، بمعنی صنفین ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: الزوج واحد ہے اور جوڑے دو ہیں۔ فراء نے کہا: الزوجین سے یہاں مراد مذکر اور مونث ہے لیکن یہ نص کے خلاف ہے۔ ایک قول ہے: زَوْجَیْنِ کا معنی نوعین ہے جس طرح کہ میٹھا اور کڑوا، خشک اور تر، سفید اور سیاہ، چھوٹا اور بڑا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ یعنی دلالت اور علامات لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ

صِنْوَانٌ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

''اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے، سیراب کیا جاتا ہے ایک ہی پانی سے (اس کے باوجود) ہم فضیلت دیتے ہیں بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بُو میں، بے شک ان میں (اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کلام میں فرق ہے: معنی ہوگا: وفی الأرض قطع متجاورات وغیر متجاورت جس طرح فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) جبکہ مطلب ہے سرابیل تقیکم الحر و تقیکم البرد پھر وغیر متجاورات کو سامع کے علم کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ المتجاورات سے مراد شہر اور وہ علاقے ہیں جو آباد ہوں اور غیر متجاورات سے مراد صحراء اور غیر آباد علاقے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَجٰوِرٰتٌ سے مراد قریب قریب کے شہر ہیں، ان کی مٹی ایک ہے، ان کا پانی ایک ہے، ان میں کھیتیاں اور باغات ہیں لیکن پھلوں اور کھجوروں میں واضح فرق ہے۔ بعض پھل میٹھے ہوتے ہیں جبکہ بعض تُرش؛ بعض درخت کی ایک ٹہنی کا پھل چھوٹا، بڑا ہونے میں رنگ و ذائقہ میں مختلف ہو جاتا ہے اور ان تمام پر سورج و چاند کا پھیلاؤ ایک ہی نظم و نسق کے مطابق ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بے نیازی پر بہت بڑی دلیل ہے اور ایسے آدمی کے لیے بڑی نصیحت ہے جو اس کی معرفت سے گمراہی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ کے ذریعے اس بات پر آگاہ فرمایا کہ یہ سب کچھ اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ذات اپنی قدرت پر عمل فرمانے والی ہے۔ یہ طبیعت کے قول کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے؛ کیونکہ اگر یہ سب کچھ پانی اور مٹی کے ذریعے ہوتا اور اس کا فاعل طبیعت ہو تو پھر اختلاف وقوع پذیر نہ ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ استدلال کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ٹکڑوں کے درمیان فرق کو ثابت فرمایا۔ مٹی کے ایک ٹکڑے سے میٹھی چیز پیدا ہو رہی ہے اور دوسرے سے تُرش حالانکہ وہ بالکل ایک دوسرے کے قریب ہے۔

یہ بھی اس کی قدرت کے کمال کی دلیلیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ظالموں اور منکروں کی کہی ہوئی باتوں سے بلند تر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ کفار لعنۃ اللہ علیہم کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر حادث چیز خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اس کا کوئی صانع اور بنانے والا نہیں ہوتا اس پر درختوں سے پیدا ہونے والے پھلوں کو بطور استشہاد انہوں نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان کے پیدا ہونے کا اقرار جبکہ پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا، اسی طرح اعراض کا انہوں نے انکار کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا: پھل بغیر صانع کے پیدا ہوتا ہے، اور اعراض کا فاعل ہوتا ہے، اور حادث کے لیے کسی محدث کے ضروری ہونے پر دلیل یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں اسے پیدا کرتا ہے اور جو چیز اس کی ہم جنس ہے اسے دوسرے وقت میں پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ

اختصاص کی وجہ سے اس کے وقت میں اس کا حدوث ہوتا تو ضروری تھا کہ ہر وہ چیز جو اس کی ہم جنس ہے وہ اس کے وقت میں ہی پیدا ہوتی۔ جب اس کے وقت کے ساتھ اس کا اختصاص باطل ہے تو اس کے ساتھ اس کا اختصاص صحیح ہوگا اس مخصص کی وجہ سے جس نے اس کے ساتھ خاص کیا ہے، اگر اس کی تخصیص اس کے ساتھ نہ ہو تو اس کا حدوث اس کے وقت میں، اس کے وقت سے پہلے یا بعد اس کے حدوث سے اولی نہ ہو۔ اور اس کی تفصیل علم کلام میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ حضرت حسن نے وَّ جَنّٰتٌ تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی: وجعل فیھا جنات یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ (فصلت:10) پر محمول ہے۔ اور کل پر محمول کرتے ہوئے اس کا مجرور ہونا بھی صحیح ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومن کل الثمرات ومن جنات باقی قراء نے جَنّٰتٌ پڑھا ہے تقدیر عبارت ہوگی: وبینھما جنات، وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ وابن کثیر، ابوعمرو اور حفص نے جنات پر عطف کرتے ہوئے ان کو مرفوع پڑھا ہے یعنی وفی الأرضِ ذرعٌ ونخیلٌ اور باقی قراء نے اَعْنَابٍ پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ تو کھیتی اور کھجور باغوں میں سے ہی ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وَّ جَنّٰتٌ کی طرح کل پر ان کا عطف کیا جائے۔ مجاہد اور سلمی وغیرہ نے صُنوان صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں یہ دونوں "صنو" کی جمع ہیں اور یہ کھجور کے بہت سے درخت ہیں یا دو درخت ہیں۔ ان کی ایک ہی اصل ہوتی ہے اس سے کئی سرے نکلتے ہیں تو وہ کھجور کئی درخت بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال قِنوان ہے جس کا واحد قِنو ہے۔ ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ صَنوان سے مراد جھنڈ ہے (1) اور غیر الصنوان سے مراد متفرق درخت ہیں۔ نحاس نے کہا: لغت میں یہ اس طرح ہے کہ جب اس میں کوئی اور کھجور کا درخت ہو یا زیادہ درخت ہوں تو صنوان کہا جاتا ہے اور الصّنو سے مراد مثل ہے اسی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: عَمُّ الرجُلِ صِنوُابیہ ہے یعنی آدمی کا چچا اس کے باپ کی مثل ہے۔

اس میں تثنیہ اور جمع کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

العلمُ والحلمُ خُلّتاَ كَرَمٍ　للمرءِ زَينٌ إذاهُمَا اجْتَمَعاَ
صِنْوانِ لايُستَتَمُّ حُسْنُهُمَا　الاّ بجمعِ ذا وذاكَ مَعاَ

شعر میں صنوان تثنیہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ جس طرح کہ بنی آدم کے نیک اور خبیث سب کا باپ ایک ہے۔ یہ نحاس اور بخاری کا قول ہے۔ عاصم اور ابن عامر نے يُسقى، یاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس سب کچھ کو سیراب کیا جاتا ہے، جبکہ باقیوں نے جَنّٰتٌ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم اور ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ابو عمرو نے کہا ہے کہ تانیث بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ فرمایا ہے بعضہ نہیں فرمایا۔ حمزہ اور کسائی نے يُدبرالامرَ يُفصِلُ اور يُغشِي کا قیاس کرتے ہوئے يُفَصِّلُ پڑھا ہے اور باقیوں نے نُفَضِّلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 119

نحنُ نفصّلُ حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت محمد ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''لوگ مختلف درختوں سے ہیں، میں اور آپ ایک درخت سے ہیں''۔ پھر حضرت محمد ﷺ نے وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کی يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ تک تلاوت فرمائی۔ اور الْاُكُلِ سے مراد پھل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد میٹھا، ترش، فارسی اور ردی کھجور ہے(1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ کے بارے میں فرمایا: الفارسی والدقل والحلو والحامض (2) اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: اس آیت سے مراد ضرب المثل ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کہ ان کی اصل ایک ہے جبکہ یہ بھلائی، برائی، ایمان اور کفر میں اس طرح مختلف ہیں جس طرح ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

النّاسُ کالنّبتِ والنّبْتُ ألوان منها شجرالصّندلِ والکافورِ والبان

ومنها شجرینضحُ طول الدّهرِ قطران

اس شعر میں اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ یعنی ایسے آدمی کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنے والا دل رکھتا ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اے سننے والے! اگر تو (ان کے تعصب پر) حیران ہوتا ہے تو حیرت انگیز ان کا یہ قول بھی ہے کہ کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائے گا، یہی (منکرین قیامت) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا اور انہیں (بدنصیبوں) کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس (آگ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ یعنی اے محمد ﷺ! اگر آپ ان کے اس رویے پر حیران ہیں (3) کہ آپ کو صادق وامین تسلیم کرنے کے بعد انہوں نے آپ کی تکذیب کی تو ان کا بعث بعد الموت کی تکذیب کرنا اس سے زیادہ حیران کن ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حیران نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے حیران ہونا چاہیے، کیونکہ تعجب تو اسباب مخفیہ کی وجہ سے نفس کی تبدیلی کو کہتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ تو اس سے منزہ ومبرا ہے)، یہاں صرف اس لیے ذکر فرمایا ہے تاکہ اس سے اللہ کا نبی اور مومنین حیران ہوں۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے: اے محمد ﷺ! اگر آپ اس بات سے حیران ہیں کہ یہ مجھے آسمانوں، زمین

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 124 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 140

3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 95

اور ایک زمین سے مختلف پھلوں کا خالق مانتے ہیں اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں تو ان کی یہ گفتگو حیران کن ہے جس سے ساری مخلوق حیران ہے کیونکہ اعادہ اور بعث بعد الموت ابتدا ہی کی طرح ہے۔ ایک قول کے مطابق: آیت صانع کے منکرین کے بارے میں ہے، یعنی اگر آپ اتنے واضح دلائل کے باوجود ان کے صانع کے انکار سے حیران ہیں کیونکہ متغیر کے لیے کسی تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہوتا ہے تو یہ بات (واقعتا) محل تعجب ہے۔ اور نظم آیت پہلے اور دوسرے دونوں معنوں پر دلالت کرتی ہے، ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ یعنی جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اس کو إنا بھی پڑھا گیا ہے۔ والأغلال، غُلٌّ کی جمع ہے اس سے مراد ایسا طوق ہے جس کے ساتھ ہاتھ سے گردن تک باندھ دیا جاتا ہے یعنی قیامت کے دن باندھ دیے جائیں گے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ۔۔۔۔۔ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝ (غافر) تک ہے۔ ایک قول کے مطابق اغلال سے مراد ان کے وہ برے اعمال ہیں جو انہیں لازم ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

"اور یہ تیزی سے مطالبہ کرتے ہیں آپ سے برائی (عذاب) کا نیکی (بخشش) سے پہلے اور (ان نادانوں کو یاد نہیں کہ) گزر چکے ہیں ان سے پہلے نزول عذاب کے کئی واقعات اور (اے محبوب) بلاشبہ آپ کا رب بہت بخشنے والا (بھی) ہے لوگوں کے لیے ان کے ظلم (زیادتی) کے باوجود اور بے شک آپ کا رب سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے آپ ہادی ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ یعنی اپنے انکار اور تکذیب کی زیادتی کی وجہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کا یہ قول ہے: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) یا اللہ! اگر تیری طرف سے یہی حق ہے تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے معافی سے پہلے سزا کا مطالبہ کیا ہے (1)، جبکہ پروردگار عالم نے اس امت سے سزا کو قیامت تک مؤخر کرنے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: قَبْلَ الْحَسَنَةِ سے مراد قبل الایمان ہے جس کی وجہ سے امان اور نیکیوں کی امید ہوتی ہے۔ الْمَثُلٰتُ سے مراد عقوبات ہیں (2)، اس کا واحد مُثْلَة ہے۔ اعمش سے روایت ہے کہ اس نے المُثْلَات میم کے ضمہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مُثْلَة کی جمع ہے اور المثلات بھی صحیح ہے یعنی ضمہ کے ثقیل ہونے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ رعد، جلد 13، صفحہ 127　　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 94-95

کی وجہ سے ضمہ کو فتحہ سے تبدیل کر دیا جائے۔ ایک قول یہ ہے: ھا کے عوض فتحہ کو لایا جاتا ہے۔ اَعمش سے یہ بھی روایت ہے کہ اس نے المَثْلَاتُ میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو یہ مُثْلَہ کی جمع ہے پھر ضمہ کے ثقل کے باعث ضمہ کو حذف کر دیا گیا۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بیان کیا ہے۔ جماعت کی قرأت کے مطابق اس کا واحد مَثُلہ ہے جیسے صَدُقہ اور بنو تمیم ثا اور میم دونوں کو ضمہ دیتے ہیں، ان کی لغت کے مطابق اس کا واحد مُثلہ یعنی میم کے ضمہ اور ثا کی جزم کے ساتھ ہے؛ جیسے غُرفۃ اور غُرُفات۔ اور اس سے فعل مَثَلْتُ، اَمْثُلُ، مثلاً میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ آتا ہے۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ یعنی مشرکین (1) کے ایمان لانے کی صورت میں ان سے درگزر کرنے والا اور گناہگاروں کی توجہ کی صورت میں انہیں معاف فرمانے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیت وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ سے امید رکھتا ہوں۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ جب وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں تو تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے عن سعید بن مسیب بیان کیا ہے کہ آپ نے کہا: جب وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اللہ کی معافی، رحمت اور درگزر کا سلسلہ نہ ہوتا تو کسی کی زندگی پرسکون نہ ہوتی اور اگر اس کی سزا، وعید اور عذاب نہ ہوتا تو ہر ایک توکل کر لیتا'' (2)۔ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ یعنی ھلّا، اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ جب انہوں نے آیات کی خواہش کی اور ان کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ، منذر کا معنی معلم ہے۔ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ یعنی ایسا نبی جو ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے (3)۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے الھادی اللہ (4)۔ یعنی آپ پر انذار لازم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے تو اللہ ہر قوم کا ہادی ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۸﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴿۹﴾

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوتی ہے کوئی مادہ اور (جانتا ہے) جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ چیز کو اور ہر ظاہر چیز کو سب سے بڑا اعالی مرتبہ ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى یعنی بچہ، بچی، عمدہ، قبیح، نیک اور نافرمان میں سے اور سورۃ انعام میں گزر چکا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علم غیب میں منفرد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور ہم نے وہاں امام بخاری کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بھی ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غیب کی چابیاں پانچ ہیں'' (5)۔ الحدیث اور اس

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235
2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 514
3۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 229
4۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235
5۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681

میں یہ بھی ہے کہ ''جو رحم کم کرتے ہیں اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا'' (1)۔

وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یعنی یہ ہے کہ جو نو ماہ سے پہلے بچہ گرا دیتی ہیں اور جو نو ماہ سے زیادہ عرصے میں جنتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: جب عورت حالت حمل میں حائضہ ہو جاتی ہے (2) تو یہ اس کے بچے کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اگر حیض چھ دن سے زیادہ ہو جائے تو جو نقصان ہو چکا ہوتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ مجاہد سے ہی روایت ہے: الغیض سے مراد ہے'' خون میں سے جو رحم کم کر دیتے ہیں'' اور زیادتی سے مراد جو ان سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: کمی اور زیادتی دونوں بچے کی طرف راجع ہوتی ہیں جس طرح مثلاً ایک انگلی یا کسی اور عضو کا کم ہو جانا یا انگلی یا کسی عضو کا زیادہ ہو جانا۔ ایک قول یہ بھی ہے: الغیض سے مراد حیض کے خون کا ختم ہونا ہے اور وَ مَا تَزْدَادُ سے مراد وضع حمل کے بعد نفاس کا خون ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ کو حیض آ سکتا ہے یہ امام مالک اور ایک قول کے مطابق امام شافعی کا بھی قول ہے۔ عطا، شعبی اور دیگر کا قول ہے کہ اسے حیض نہیں آ سکتا۔ یہی امام (اعظم) ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے آپ کی دلیل یہی آیت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تاویل کے بارے میں فرمایا: یہ حمل کا حیض ہوتا ہے، عکرمہ اور مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے اور یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے اور جب حاملہ عورتوں کو حیض آ جاتا تو آپ ان کو ترک نماز کا فتوی دیتی تھیں، اور اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کثرت سے موجود تھے کسی نے بھی آپ کی اس بات کا انکار نہیں کیا تو گویا اس پر سب کا اجماع ہو گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن قصار نے کہا ہے: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو آدمیوں کا بچے کے بارے میں تنازعہ ہو گیا، تو وہ کیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے یہ کیس قیافہ شناسوں کے سامنے پیش کر دیا۔ قیافہ شناسوں نے وہ بچہ ان کے ساتھ ملایا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ کی زیادتی کے سبب اس کا فیصلہ فرمایا اور قریشی عورتوں سے آپ نے پوچھا آپ نے فرمایا: دیکھو اس بچے کی کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے کہا: پہلے شوہر نے اس کے ساتھ خلوت کی اور اسے فارغ کر دیا تو حالت حمل میں اسے حیض آ گیا اس نے یہ سوچا کہ شاید اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ تو دوسرے مرد نے اس کے ساتھ دخول کیا بچہ دوسرے کے پانی کے ذریعے پروان چڑھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ اکبر! اور بچے کو پہلے مرد کے حوالے کر دیا اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ حاملہ کو حیض نہیں آتا اور نہ صحابہ میں سے کسی نے کہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر اجماع ہے۔ واللہ اعلم۔ مخالف کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ حاملہ کو حیض آ سکتا ہے اور حاملہ عورت جو خون دیکھے گی وہ حیض ہوگا تو پھر حیض کے ذریعے استبرا صحیح نہیں ہوگا حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ حیض کے ذریعے استبرا ہو جاتا ہے۔ امام مالک سے امام محمد کی کتاب میں ایک روایت ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ حیض نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ بعض اوقات نو ماہ سے کم یا زیادہ مدت میں بھی وضع حمل کرتی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ عبد الملک بن مروان چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہوا تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681 2۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 230

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ چھ ماہ چاند کے اعتبار سے ہوں گے جس طرح کہ سارے شرعی مہینے۔

اسی وجہ سے امام مالک کے بعض اصحاب سے مذہب کے بارے میں روایت ہے، میرا (قرطبی) خیال ہے ابن حارث کی کتاب میں ہے کہ اگر وہ چھ ماہ سے تین دن کم ہوا تو بچہ مہینوں کی کمی یا زیادتی کی علت کے سبب کسی کے ساتھ ملحق ہوگا اس کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ حمل کی اکثر مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن جریج نے جمیلہ بنت سعد سے عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوگا، اس کو دارقطنی نے ذکر کیا ہے جمیلہ بنت سعد، عبید بن سعد کی بہن نے لیث بن سعد سے بیان کیا (1): اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے چار سال مروی ہے۔ امام مالک سے ایک روایت کے مطابق اور یہی مشہور ہے پانچ سال کی مدت منقول ہے۔ آپ سے ایک روایت مالا نہایۃ کی بھی ہے اگرچہ وہ مدت دس سال سے بھی زائد کیوں نہ ہو جائے۔ آپ سے یہ تیسری روایت ہے۔ زہری سے چھ اور سات سال مروی ہیں۔ ابوعمر نے کہا: صحابہ کرام میں سے کسی نے اس کی مدت سات سال کہی ہے۔ امام شافعی سے کئی مدتیں منقول ہیں۔ جن میں سے آخری چار سال ہے۔ کوفی (یعنی احناف) کہتے ہیں: دو سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ محمد بن عبدالحکیم کہتے ہیں: ایک سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ داؤد کہتے ہیں: نو ماہ ہے، ان کے نزدیک حمل اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ ابوعمر نے کہا: یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی سوائے اجتہاد کے اور عورتوں کے معروف معاملات کی طرف لوٹنے کے کوئی اصل نہیں وباللہ التوفیق۔ دارقطنی نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہا (2) کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا'' تو آپ نے کہا: سبحان اللہ! یہ کون کہتا ہے؟ یہ ہماری لونڈی ہے جو کہ محمد بن عجلان کی بیوی ہے، حاملہ ہوتی ہے اور چار سال میں حمل وضع کرتی ہے، بہت زیادہ سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بہت زیادہ سچا ہے۔ اس نے تین حمل بارہ سال کی مدت میں وضع کیے ہیں۔ اس کا ہر حمل چار سال کا ہوتا۔ مبارک بن مجاہد نے اس بات کو ذکر کیا ہے اور کہا: ہمارے ہاں مشہور تھا کہ محمد بن عجلان کی بیوی چار سال میں حمل وضع کرتی تھی اور اسے حاملۃ الفیل کہا جاتا تھا۔ اس نے ہی روایت کیا ہے کہ ایک دن حضرت مالک بن دینار بیٹھے تھے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: اے ابویحییٰ! چار سال سے حاملہ عورت کے لیے دعا مانگو وہ شدید تکلیف میں ہے، مالک سخت غصے ہوئے اور مصحف کو بند کیا پھر کہا: یہ قوم ہمیں انبیاء خیال کرتی ہے پھر پڑھا پھر دعا مانگی پھر کہا: اے اللہ! اگر اس عورت کے پیٹ میں ہوا ہے تو اسے ابھی خارج فرما اور اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، تیرے پاس ''ام الکتاب'' ہے۔ حضرت مالک نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے، قاصد اس آدمی کے پاس آیا اور کہا: تیری بیوی کو کوئی مسئلہ ہے، وہ آدمی گیا۔ حضرت مالک نے ابھی

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 280
2۔ ایضاً، حدیث 282

اپنے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ مسجد کے دروازے سے وہ آدمی سامنے ہوا اس کی گردن پر ایک بچہ تھا جس کے بال سخت گھنگریالے تھے، (تقریباً) چار سال کا بچہ، اس کے دانت بالکل برابر تھے اور اس کی ناف کٹی ہوئی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا (1) اس نے کہا: اے امیر المومنین! میں دو سال اپنی عورت سے غائب رہا میں واپس آیا تو وہ حاملہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے رجم کے بارے میں لوگوں کے ساتھ مشاورت کی، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! اگرچہ آپ کو اس عورت پر اختیار حاصل ہے لیکن اس کے پیٹ پر کوئی اختیار نہیں۔ اس کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ یہ وضع حمل کر لے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا، تو اس نے ایسا بچہ جنا جس کے سامنے والے دانت نکل چکے تھے، آدمی نے مشابہت کو پہچان لیا اور کہا: رب کعبہ کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتیں معاذ جیسا انسان پیدا نہیں کر سکیں، اگر معاذ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ ضحاک نے کہا: میری ماں نے مجھے جنا اس حال میں کہ دو سال اس نے مجھے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اس نے مجھے جنا تو میرے دانت نکل چکے تھے۔ امام سے ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بھی دو سال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہے، ایک قول کے مطابق تین سال رہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن عجلان تین سال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہا، ان کی ماں فوت ہو گئی اور وہ بہت زیادہ الٹ پلٹ ہو رہے تھے، تو اس کا پیٹ چاک کیا گیا اور انہیں نکالا گیا تو ان کے دانت نکل چکے تھے۔ حماد بن سلمہ نے کہا ہے کہ ہرم بن حیان کو ہرم کہتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ اپنی ماں کے پیٹ میں چار سال رہے۔ غزنوی نے ذکر کیا کہ ضحاک دو سال میں پیدا ہوا۔ اور اس کے دانت نکل چکے تھے تو اس کا نام ضحاک رکھ دیا گیا۔ عباد بن عوام نے کہا: ہماری ایک لونڈی نے چار سال میں بچہ جنا جس کے بال کندھوں تک پہنچ چکے تھے اس کے پاس سے پرندہ گزرا تو اس نے کہا: ''کش''۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ابن خویز منداد نے کہا: حیض اور نفاس کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت اور حمل کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت بطریق اجتہاد ماخوذ ہے، کیونکہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا ان میں سے کسی چیز پر اتنا ہی حکم لگانا درست ہوگا جتنا ہمارے سامنے ظاہر ہوا ہو یا جتنا عورتوں میں عادتاً پایا جاتا ہو یا نادر طور پر جتنا پایا گیا ہو۔ جب ہم نے کسی عورت کے حمل کو چار یا پانچ سال دیکھ لیا تو ہم نے اس کا حکم لگا دیا، اور جب حیض اور نفاس کے سلسلہ میں ہم نے کوئی مستقل صورت نہ دیکھی تو ہم نے دیکھا کہ عورتوں میں شاذ و نادر پائی جانے والی مدت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ابن عربی نے (2) کہا: بعض تساہل پسند مالکیوں سے منقول ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت نو ماہ ہے۔ اور یہ قول سوائے ہلاکت میں پڑنے والے کے کسی نے کبھی بھی نہیں کیا، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ رحم میں تدبیر کرنے والے سات سیارے ہیں وہ ایک ایک ڈیوٹی کرتے ہیں۔ چوتھا مہینہ سورج کا ہوتا ہے، اسی وجہ سے بچہ حرکت کرتا ہے اور اضطراب میں ہوتا ہے۔ جب سات ماہ میں سات سیاروں کے درمیان چکر مکمل ہو جاتا ہے تو آٹھویں ماہ میں وہ کام زحل کے سپرد ہوتا ہے تو وہ اپنی ٹھنڈک کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے، کاش میں ان کے ساتھ مناظرہ کرنے یا جنگ کرنے پر

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 323، حدیث 281

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1109

قادر ہوتا، کتنا عجیب ہے چکر تمام ہونے کے بعد وہ زحل پر ہی آ سکتا ہے کسی اور کے پاس نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی خبر دی ہے یا تم اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی کرتے ہو؟ اور جب یہ ممکن ہے کہ ان میں سے دو کے پاس تدبیر دوبارہ لوٹ سکتی ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ وہ تدبیر تین یا چار کے پاس دوبارہ آ جائے یا تمام کے پاس دو، تین مرتبہ لوٹ آئے؟ امور باطنہ پر یہ کیسا باطل گمانات کے ساتھ فیصلہ ہے؟

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ یعنی نقصان اور زیادتی میں سے بِمِقْدَارٍ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ماں کے پیٹ سے بچے کے نکلنے کی مقدار اور نکلنے تک اس کے پیٹ میں اس کے ٹھہرنے کی مقدار ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد رزق اور زندگی کی مقدار ہے (1)۔ مقدار سے مراد قدر ہے۔ اور آیت کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم

میں (قرطبی) نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مدح بیان کرتی ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، یعنی وہ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو مخلوق سے غائب ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جس کا مخلوق نے مشاہدہ کر رکھا ہے۔ غیب بمعنی غائب مصدر ہے اور شہادۃ بمعنی شاھد مصدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں منفرد ہونے اور مخلوق پر مخفی چیزوں کا باطن کے ذریعے احاطہ کرنے پر آگاہ فرمایا ہے، اس معاملے میں کسی کی شرکت جائز نہیں، جہاں تک اہل طب کا تعلق ہے جو نشانیوں اور علامات کے ذریعے استدلال کرتے ہیں تو اگر وہ اس کے بارے میں قطعی بات کرتے ہیں تو یہ کفر ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ تجربہ ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ عادت و تجربہ تو ناکام بھی ہو سکتا ہے جبکہ علم میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ الکبیر یعنی وہ ذات کہ ہر چیز اس سے کم درجے میں ہے المتعال اس سے بلند ہے جو مشرکین کہتے ہیں۔ ہر چیز سے اپنی قدرت اور قہر کے ذریعے بلند و برتر ہے۔ ان دونوں صفات کا ذکر ہم (قرطبی) نے ''شرح الاسماء'' میں مکمل طور پر کر دیا ہے۔ والحمد للہ

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ⑩

''(اس کے علم میں) سب یکساں ہیں تم میں سے وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور وہ بھی جو چھپا رہتا ہے رات کے وقت اور جو چلتا پھرتا رہتا ہے دن کے وقت''۔

قولہ تعالیٰ: سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ۔ اَسَرَّ الْقَوْلَ سے مراد وہ بات ہے (2) جو بندہ اپنی ذات کے ساتھ کرے اور جَهَرَ سے مراد وہ بات ہے جو بندہ کسی اور کے ساتھ کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خیر و شر میں جو بندہ پوشیدہ طور پر کرے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس طرح کہ وہ اسے جانتا ہے جو ظاہری طور پر ہو۔ مِّنْكُمْ کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سَوَآءٌ کی صفت ہو اور تقدیر کلام یوں ہو: سرّ من اَسَرَّ و جَهْرُ مَنْ جَهَرَ سواء منکم اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سَوَآءٌ کے متعلق ہو کلام یوں ہو: یستوی منکم جس طرح کہ آپ کا قول: مررت بزید اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 97　　2۔ ایضاً

عبارت یہ ہو: سِرٌّ من أسَرَّ منکم و جھرُ مَنْ جھَرَ منکم تقدیر عبارت یہ بھی ہو سکتی ہے: ذو سواء منکم من أسرّ القول و من جھر بہ جس طرح کہا جاتا ہے: عدل زید و عمرو یعنی ذوا عدل۔ ایک قول یہ ہے کہ سَوَآءٌ بمعنی مستوٍ ہے اس صورت میں مضاف کے حذف کی تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی پوشیدہ و ظاہر، راستوں میں ظاہر اور تاریکیوں میں چھپا ہوا اللہ کے علم میں برابر ہیں۔ اُخفش اور قطرب نے کہا: رات میں چھپا ہوا ظاہر ہے۔ اسی سے خَفَیتُ الشئی و أخفیتُه ہے یعنی أظھرتُه اور أخفیتُ الشئی یعنی استخرجتُه۔ اسی سے کفن چور کو مختفی کہا جاتا ہے۔ امرؤالقیس نے کہا:

خَفَاهُنَّ مِنْ أَنْفَاقِهِنَّ كَأَنَّمَا خَفَا هُنَّ وَدْقٌ من عَشِيٍّ مُجلَّبِ

السارب کا معنی المتواری یعنی سرنگوں میں چھپنے والا ہے۔

السارب المتواری سے مراد داخل سربا ہے اسی سے عربوں کا قول انسرب الوحشیّ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اپنی کچھار میں داخل ہو جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مُسْتَخْفٍ بمعنی پوشیدہ اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ مجاہد نے کہا: مُسْتَخْفٍ یعنی وہ گناہوں کے ساتھ چھپتا ہے اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ ایک قول کے مطابق سَارِبٌ کا معنی ذاہب ہے۔ کسائی نے کہا: سَرَبَ یسرب سَرَباً و سُرُوباً کہا جاتا ہے جب کوئی چلا جائے۔ شاعر نے کہا:

وكُلُّ أُناسٍ قَارَبوا قَيْدَ فَحْلِهِمْ ونَحْنُ خَلَعْنا قَيْدَهُ فهو ساربٌ(1)

سَارِبٌ سے مراد ذاہب ہے۔ ابورجاء نے کہا: السارب سے مراد زمین میں اپنے اعتبار پر چلنے پھرنے والا آدمی ہے۔ شاعر نے کہا:

أَنَّى سَرَبْتِ وكنتِ غيرَ سَرُوبِ(2)

قتبی نے کہا: سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی اپنی ضروریات کے سلسلہ میں تیزی سے گھومنے پھرنے والا۔ یہ عربوں کے قول انسرب الماء سے مشتق ہے۔ اصمعی نے کہا: خَلِّ سَرْبَه یعنی اس کا راستہ خالی کردو۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

"انسان کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے، اور جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اسے اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے"۔

1۔ تفسیر زادالمسیر، جلد 2، صفحہ 237
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

قولہ تعالیٰ: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ یعنی الله تعالیٰ کے ایسے فرشتے ہیں جو رات، دن انسان کا تعاقب کرتے رہتے ہیں، جب رات کے فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں تو دن کے فرشتے ان کے پیچھے آجاتے ہیں(1)۔ الله تعالیٰ نے مُعَقِّبٰتٌ فرمایا ہے۔ فرشتے مذکر ہیں کیونکہ معقبات، معقبہ کی جمع ہے اور کہا جاتا ہے: ملكٌ مُعَقِّبٌ اور ملائكةٌ مُعَقِّبَةٌ، پھر معقباتٌ جمع الجمع ہے۔ بعض لوگوں نے لَهٗ مَعَاقِيْبُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ پڑھا ہے۔ معاقیب، معقب کی جمع ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکۃ کے لیے معقبۃٌ کا لفظ ملائکۃ کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کی طرف سے تعاقب کی کثرت کی وجہ سے مُعقبۃ مؤنث ہے جیسے نسابة، علامۃ اور راویۃ وغیرہ۔ یہ جوہری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور تَعَقَّب شروع کرنے کے بعد لوٹنے کو کہتے ہیں۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ (النمل: 10) یعنی لم یرجع۔ اور حدیث میں ہے: مُعَقِّبَاتٌ لَایَخِیْبُ قَائِلُهُنَّ۔ أو۔ فاعلهنّ (2) پھر آپ نے تسبیح تحمید اور تکبیر کا ذکر فرمایا ہے۔ ابوالہیثم نے کہا: ان کو معقباتٌ اس لیے کہا گیا کہ یہ بار بار لوٹتے رہتے ہیں یہ ایسے آدمی کا فعل کہ جو ایک کام کرے پھر دوبارہ وہی کام کرے تو اس وقت کہا جائے گا: فقد عَقَّبت اور اونٹنیوں میں سے معقبات وہ ہوتی ہیں جو حوض پر وارد ہونے والے اونٹوں کے پچھلے حصے کے پاس کھڑی ہوتی ہیں اور جب ایک اونٹنی اس جگہ سے نکلتی ہے تو دوسری اس کی جگہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ یعنی رات کے وقت چھپنے والے(3) اور دن کے وقت چلنے پھرنے والے کے آگے۔ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ حفظ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ بھی احتمال ہے کہ الله تعالیٰ کی طرف سے بطور مہربانی وحشیوں، درندوں اور نقصان دہ چیزوں سے ان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کی ڈیوٹی لگائی گئی ہو، اور جب تقدیر (غالب) آجائے تو وہ فرشتے بندے اور اس نقصان دہ چیز کے درمیان سے ہٹ جاتے ہوں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ابومجلز نے کہا: مراد قبیلے کا ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا: بچ کے رہیے مراد قبیلے کے کچھ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں بشرطیکہ تقدیر نہ آئی ہو، اور جب تقدیر آجائے تو وہ بندے اور الله کی تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، بے شک موت بذات خود بہترین قلعہ ہے۔ اسی بنیاد پر یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی الله کے امر اور اس کے اذن سے من بمعنی با ہے اور حروف صفات ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے رہتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے من بمعنی عن ہو یعنی یحفظونه عن أمر الله، یہ پہلے معنی کے قریب تر ہے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے: جس طرح کسوته عن عُرْیٍ و من عُرْیٍ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ ہے یعنی عَنْ جوعٍ ایک قول ہے: وہ عذاب کے فرشتوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو سزا دینا روا نہیں ہوتی۔ کیونکہ الله تعالیٰ کسی قوم کی نعمت و عافیت کو تبدیل نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ خود کفر پر اصرار کے ذریعے تبدیل نہ کردیں، جب وہ کفر پر ڈٹتے ہیں تو ان کی سزا کی مدت قریب آجاتی ہے، ان پر مصیبت نازل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 98
2۔ تاریخ بغداد، جلد 6، صفحہ 112، العربیۃ بغداد
3۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 341

ہوتی ہے اور حفاظت کرنے والے فرشتے ان سے ہٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے: وہ جنات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ حضرت کعب نے کہا(1): اگر الله تعالیٰ تمہیں ایسے فرشتوں کے سپرد نہ کرتا جو تمہارے کھانے، پینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں تو جن اور عذاب کے فرشتے تمہیں الله کے امر سے ضرور چھین لیتے۔ الله تعالیٰ نے انہیں مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ فرما کے خاص فرمایا کیونکہ وہ دیکھ نہیں رہے ہوتے جس طرح الله نے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء: 85) فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے یعنی یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کا تم مشاہدہ کرتے ہو۔ فراء نے کہا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے(2)، تقدیر عبارت یہ ہے: له معقبات من أمرالله من بين يديه و من خلفه يحفظونه، یہ مجاہد، ابن جریج اور نخعی سے مروی ہے۔ اور اگر يحفظونه من ملائكة العذاب والجن من أمرالله ہو تو پھر کوئی تقدیم و تاخیر نہیں۔ ابن جریج نے کہا: وہ فرشتے بندے کے عمل کو محفوظ کرتے ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ اس کے اقوال و افعال کو لکھتے ہیں۔ جب مُعَقِّبٰتٌ فرشتے ہوں تو لَهٗ کی ھا ضمیر الله تعالیٰ کی ذات کے لیے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستخفی کے لیے ہو۔ ایک قول کے مطابق: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ (الرعد: 7) سے چلا ہے یعنی تم میں سے سب اس بات میں یکساں ہیں وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور وہ بھی جو بلند آواز سے بات کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ نقصان نہیں دے سکتا بلکہ الله کے ایسے فرشتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمام انبیاء کی طرف راجع ہو، کیونکہ الله تعالیٰ نے وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۝ ارشاد فرمایا ہے، یعنی يحفظون الهادي من بين يديه و من خلفه اور چوتھا قول یہ ہے کہ آیت سے مراد وہ سلاطین و امراء ہیں جن کی قوم ان کے آگے اور پیچھے سے ان کی حفاظت کرتی ہے اور جب الله کا امر آ جاتا ہے تو الله سے وہ انہیں ذرہ بھر بھی نہیں بچا سکتے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت علی کا قول ہے۔ اور اسی طرح ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ مشرک بادشاہ ہے جو اپنے آپ کو الله کے امر سے بچاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس تاویل کی صورت میں کلام میں نفی محذوف ہے یعنی لا يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ کو محافظ بنانے کی صورت میں معنی ہوگا: يحفظونه من أمرالله على ظنه وزعمه، ایک قول یہ ہے: یکساں ہے جو آہستہ بات کرتا ہے اور بلند آواز سے بات کرتا ہے تو اس کے محافظ اور مددگار ہیں جو اس کا تعاقب کرتے ہیں اور اسے گناہ و نافرمانی پر ابھارتے ہیں، اور اس میں نصیحت کے مؤثر ہونے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ قشیری نے کہا: یہ پروردگار عالم کو مہلت دینے سے نہیں روکتی یہاں تک کہ وہ عذاب کو ثابت کر دے۔ تو اس صورت میں اس نافرمان نے بذات خود گناہ پر اصرار کو لمبا کر کے اس حکم کو تبدیل کر دیا تو یہی چیز سزا کا سبب بن جائے گی تو گویا وہ ایسا آدمی ہے جس نے بذات خود سزا کو حلال کر لیا ہے، تو الله کا ارشاد: يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ سے مراد يحفظونه من انتقال أمرالله ہوگا۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ سے مراد وہ ہیں جو الله کے امر اور اس کی قضا سے اس کے بندوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: جس آدمی نے یہ بات کی ہے تو اس کے مطابق يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ

---

1۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 239
2۔ ایضاً

اللہ کے ارشاد کی تاویل کی دوصورتیں ہوں گی۔

نمبر 1:۔ وہ اس کی تب تک موت سے حفاظت کریں گے جب تک موت نہیں آتی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

نمبر 2:۔ وہ اس کی جنوں اور موذی درندوں سے حفاظت کریں گے جب تک تقدیر غالب نہیں آتی (1)، یہ ابوامامہ اور کعب الاحبار کا قول ہے اور جب تقدیر آجائے گی تو وہ راستہ خالی چھوڑ دیں گے اور صحیح بات یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد فرشتے ہیں۔ یہی حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور نحاس نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''رات اور دن کے فرشتے تمہارا تعاقب کرتے ہیں'' (2)۔ الحدیث اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ ائمہ نے عمرو عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ آپ نے اس کی تلاوت یوں کی ہے: **معقبات من بین یدیه و رقباء من خلفه (من أمرالله) یحفظونه** تو اس نے معنی کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ کنانہ عدوی نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بندے کے بارے میں بتایئے کہ اس کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ایک فرشتہ آپ کے دائیں طرف ہوتا ہے جو نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا بائیں جانب جو برائیاں لکھتا ہے اور جو دائیں جانب والا ہے وہ بائیں جانب والے پر امیر ہوتا ہے جب آپ نیک عمل کرتے ہیں تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب آپ برا عمل کرتے ہیں تو بائیں جانب والا، دائیں جانب والے کو کہتا ہے کیا میں لکھوں؟ وہ کہتا ہے نہیں شاید یہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے اور توبہ کرلے۔ جب وہ تین دفعہ کہتا ہے تو یہ کہتا ہے: ہاں لکھ، ہمیں اللہ تعالیٰ اس سے بچائے پس کتنا برا ساتھی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی نگرانی کو کم خیال کرتا ہے اور اپنے حیاء کے حوالے سے تھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ** ﴿۱۸﴾ (ق) وہ کوئی بات نہیں کرتا مگر اس کے پاس ایک سخت تاڑنے والا ہوتا ہے اور دو فرشتے آپ کے سامنے اور پیچھے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** (اور ایک فرشتہ آپ کی پیشانی پر قابض ہوتا ہے جب آپ اللہ کے لیے جھکتے ہیں تو وہ آپ کو اٹھا دیتا ہے اور جب تو اللہ تعالیٰ کو مجبور کرتا ہے تو وہ تجھے ہلاک کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے ہونٹوں پر ہوتے ہیں اور وہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی آل پر پیش کیا گیا درود محفوظ کرتے ہیں اور ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہوتا ہے وہ تیرے منہ میں سانپ کو داخل نہیں ہونے دیتا اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہوتے ہیں تو یہ دس فرشتے ہیں جو ہر آدمی پر مسلط ہوتے ہیں رات کے فرشتے، دن کے فرشتوں سے بدلتے رہتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے، دن کے فرشتے نہیں ہوتے تو یہ کل بیس فرشتے ہر آدمی پر مسلط ہوئے اور ہر آدمی کے ساتھ ابلیس دن کے وقت ہوتا ہے جبکہ اس کا بیٹا رات کے وقت، اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: **مُعَقِّبٰتٌ**، چار فرشتے ہیں (3) جو فجر کی نماز کے وقت جمع ہوتے ہیں اور طبری کا مختار یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد امراء کے سامنے اور پیچھے والی بھیڑ ہے اور لَهٗ کی ھا ضمیر ان کے لیے ہے۔ علماء نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 99

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ العصر، جلد 1، صفحہ 79

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کو دو طرح بنایا ہے ایک وہ جن کے وقوع پذیر ہونے کا اس نے فیصلہ فرما دیا ہے ان کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہی ان کو کوئی تبدیل کر سکتا ہے، جبکہ دوسرے احکامات وہ ہیں جن کے آنے کا اس نے فیصلہ فرما دیا البتہ وقوع پذیر ہونے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ توبہ، دعا، صدقہ اور حفاظت کے ذریعے ان کے ٹل جانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ کسی قوم کو تب تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ ان کی طرف سے تبدیلی دقوع پذیر نہ ہو یا تو یہ تبدیلی ان کی طرف سے ہو، یا ان کے دیکھنے والوں کی طرف سے یا کسی ایسے آدمی کی طرف سے ہو جو ان میں سے ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد کے دن تیر اندازوں کی بذات خود تبدیلی کے سبب انہیں شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ بدل دیا، اس کے علاوہ بھی شریعت کی مثالیں موجود ہیں۔ آیت کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف گناہ کے سرزد ہونے کی صورت میں ہی عذاب نازل فرماتا ہے بلکہ بعض اوقات دوسرے لوگوں کے گناہوں کے سبب بھی مصائب نازل ہوتے ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم نیک لوگوں کی موجودگی میں بھی ہلاک کر دیے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں جب خبث (زنا) زیادہ ہو جائے گا" (1)۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا یعنی ہلاک کرنے اور عذاب نازل کرنے کا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ایک قول یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ بیماریوں وغیرہ میں سے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو برائی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو ان کی بصارت کو اندھا کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسا کام اختیار کرتے ہیں جس میں مصیبت ہوتی ہے اور اسی کو عملی جامہ پہنا دیتے ہیں اور خود اپنے قدموں پر چل کر ہلاکت کی طرف جاتے ہیں یہاں تک کہ آدمی خود اپنے ہاتھ سے بربادی تلاش کرتا ہے اور اپنے قدم پر چل کر اپنے خون کو بہانے کی طرف جاتا ہے وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ یعنی کوئی پناہ گاہ۔ یہ سدی کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ ہے: وہ کوئی مددگار نہیں پاتا جو اسے اس عذاب سے بچا سکے۔ شاعر نے کہا:

مالی السماء سوی الرحمن من وَال (2)

آسمان میں رحمٰن کے علاوہ کوئی مدد کرنے والا نہیں

والِ اور والی ایسے ہیں ہے جیسے قادر اور قدیر۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

"وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی (کبھی) ڈرانے کے لیے اور (کبھی) وعید دلانے کے لیے اور اٹھاتا ہے (دوش

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام، جلد 1، صفحہ 508 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

ہوا پر) بھاری بادل اور رعد اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے، اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ یعنی بارش کے ذریعے۔ السَّحَابُ جمع ہے اور واحد سَحَابَة ہے، سُحُبٌ اور سَحَائِبُ بھی جمع آتی ہے۔ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ رعد، برق اور صواعق کے بارے میں سورۃ البقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے اس لیے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور آیت سے مقصود اپنی قدرت کے کمال کو بیان کرنا ہے۔ اور سزا میں تاخیر عاجزی کی وجہ سے نہیں، یعنی مسافر کو ڈرانے کے لیے آسمان میں تمہیں بجلی دکھاتا ہے، تو وہ بارش، دھول اور کڑکتی بجلی سے پہنچنے والے نقصان کی اذیت سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ (النساء:102) اور مقیم کو اس بات کی امید دلانے کے لیے کہ اس کڑک کے بعد بارش اور شادابی ہوگی؛ یہ معنی حضرت قتادہ، مجاہد اور دیگر لوگوں نے بیان کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: بجلی کی کڑک سے ڈراتے ہوئے اور اس کی بارش جو قحط کو زائل کرنے والی ہوگی اس سے امید دلاتے ہوئے (1)۔ وَ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ مجاہد نے کہا: پانی کے ذریعے وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ جس نے کہا کہ کڑک بادل کی آواز ہے تو اس صورت میں ممکن ہے کہ کڑک پاکی بیان کرتا ہو، اس قول کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ یہی اگر رعد فرشتہ ہوتا تو پھر تو سب فرشتوں کے تحت داخل تھا۔ جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رعد فرشتہ ہے تو اس کے نزدیک مِنْ خِیْفَتِهٖ کا معنی مِنْ خیفة الله ہوگا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: فرشتے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں مگر وہ ابن آدم کی طرح نہیں ڈرتے بلکہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں پہچانتا کہ اس کے دائیں کون ہے اور بائیں کون ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہ انہیں کھانا روکتا ہے اور نہ پینا۔ آپ نے ہی فرمایا: رعد فرشتہ ہے جو بادلوں کو ہانکتا ہے اور پانی کے بخارات اس کے انگوٹھے کے پورے میں ہوتے ہیں وہ بادلوں کا موکل ہے ان میں اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اسے حکم ہوتا ہے اور وہ اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رعد تسبیح کرتا ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ تسبیح کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتا ہے، تو اس وقت بارش برستی ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ جب آپ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان الذی سبحت له پاک ہے وہ ذات جس کی تو نے پاکی بیان کی ہے۔ امام مالک نے حضرت عامر بن عبداللہ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ جب وہ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: پاک ہے وہ ذات کہ رعد جس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں)۔ پھر کہتے کہ یہ اہل زمین کے لیے سخت وعید ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایک فرشتہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے، اس کے دائیں جانب ایک ہزار فرشتہ ہے اور بائیں جانب بھی اتنے ہی فرشتے ہیں، جب دائیں جانب والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تسبیح کرتا ہے تو سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں اور جب بائیں جانب متوجہ ہو کر تسبیح کرتا ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

تو وہ سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں۔ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ ماوردی نے حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور مجاہد سے یہ بات ذکر کی ہے یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی (1) جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے بتایئے آپ کا رب کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا لولو سے یا یاقوت سے؟ تو بجلی کی کڑک آئی اور اس نے اسے جلا دیا۔ ایک قول یہ ہے، یہ عرب کے کسی کافر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حسن نے کہا: عرب کے سرکشوں میں سے ایک آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت اس کی طرف بھیجی تا کہ وہ اسے اللہ، اس کے رسول اور اسلام کی طرف دعوت دیں تو اس نے انہیں کہا: مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے بارے میں بتاؤ کہ کیا ہے اور کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا چاندی سے یا لوہے سے یا نحاس سے؟ قوم نے اس کی بات کو بہت بڑا سمجھا، تو اس نے کہا: میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے رب کے بارے میں جواب دیتا ہوں جس کو وہ پہچانتا ہی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی طرف وفد بھیجا تو وہ ایسا ہی کہتا، تو وہ جماعت اس کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی اور اسے دعوت دے ہی رہی تھی کہ ایک بادل اٹھا اور ان کے سروں پر آ گیا، وہ کڑکا، چمکا اور اس نے بجلی پھینکی، تو اس بجلی نے کافر کو جلا دیا اور وہ بیٹھے رہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹ کے آئے تو بعض صحابہ کرام نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا: تمہارا صاحب (مخالف) جل گیا۔ وفد نے کہا: تمہیں کہاں سے پتہ چلا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ اس کو ثعلبی نے حضرت حسن سے ذکر کیا ہے اور قشیری نے حضرت انس سے روایت بالمعنی بیان کی ہے۔ وہ عنقریب آئے گی۔ ایک قول یہ ہے: یہ آیت لبید بن ربیع کے بھائی اربد بن ربیع اور عامر بن طفیل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عامر بن طفیل اور اربد بن ربیع دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے کے ارادے سے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی جماعت میں مسجد میں تشریف فرما تھے۔ دونوں مسجد میں داخل ہوئے، لوگوں نے عامر کے جمال کو دیکھنا چاہا وہ بھینگا تھا اور بڑا خوبصورت تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو اگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے ہدایت دے دے گا۔ وہ آگے بڑھا حتیٰ کہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا: اے محمد! اگر میں اسلام قبول کر لوں تو میرے لیے کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے وہی ہوگا جو مسلمانوں کے لیے ہے اور تیری ذمہ داری وہی ہوگی جو دوسرے مسلمانوں کی ہے۔'' اس نے کہا: کیا اپنے بعد آپ مجھے خلیفہ بنائیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ کام میرے سپرد نہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہ جس کو چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا''۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے مکان میں رکھیں گے اور خود خیمے میں رہیں گے، آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ اس نے کہا: آپ مجھے کیا دیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''میں تجھے گھوڑوں کی مدد دوں گا جن کے ذریعے تو اللہ کے رستے میں جہاد کرے گا۔'' اس نے کہا: کیا آج میرے پاس گھوڑے نہیں ہیں؟ میرے ساتھ اٹھو میں آپ کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اٹھے اور عامر نے اُربد کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب تو مجھے ان کے ساتھ گفتگو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102-101

کرتے دیکھے گا تو ان کے پیچھے چکر لگانا اور تلوار کے ساتھ ان کو شہید کر دینا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا۔ اَربد تلوار لے کر ایک بالشت چلا پھر اللہ نے اسے روک لیا، اور وہ تلوار کو نہ سونت سکا اور تلوار پر ہی اس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ اللہ نے آندھی اور چیخ و پکار والے دن اس پر بجلی کی کڑک ڈالی جس نے اسے جلا دیا اور عامر سرپٹ بھاگتا ہوا واپس لوٹا اور کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے اُربد کے لیے بدعا کی یہاں تک کہ اس نے اسے مار دیا، اللہ کی قسم! میں تم پر باریک بالوں والے گھوڑے اور بے ریش جوانوں کی بھرمار کر دوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور قیلیے کے بیٹے (یعنی اوس وخزرج) کے نوجوان تجھے اس کام سے روکیں گے۔'' عامر سلولیہ عورت کے گھر پہنچا اور صبح کے وقت کہتا جا رہا تھا: اللہ کی قسم! اگر محمد اور اس کا دوست یعنی ملک الموت مجھے صحراء میں مل گئے تو میں دونوں سے اپنا تیر گزار دوں گا، تو اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کے ساتھ اسے طمانچہ مارا اور اسے مٹی میں گرا دیا اور اس کے گھٹنے پر ایک بہت بڑا پھوڑا نکل آیا۔ وہ سلولیہ کے گھر واپس لوٹا اور کہتا جا رہا تھا: اونٹ کے پھوڑے کی طرح پھوڑا اور سلولیہ کے گھر میں موت، پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کی پیٹھ پر ہی مر گیا۔ لبید بن ربیع نے بھائی کا مرثیہ کہا ہے:

يا عينُ هلاّ بَكَيتِ أَرْبَدَ إذقُمنا     وقامَ الخُصُومُ فى كَبَدِ
أَخْشَى على أَرْبَدَ الحُتُوفَ وَلاَ     أَرْهَبُ نَوْءَ السِّمَاكِ والأَسَدِ
فَجَّعنِى الرَّعدُ والصَّوَاعِقُ بالفا     رِسِ يَوْمَ الكَرِيهَه النَّجِدِ(1)

اور اس کے متعلق اس نے یہ بھی کہا ہے:

إنّ الرَّزِيَّةَ لَا رَزِيَّةَ مِثلُهَا     فِقْدَانُ كُلِّ أخٍ كضوءِ الكَوْكَبِ
يا أَرْبَدَ الخيرِ الكَرِيمَ جُدُودُهُ     أَفردتَنِى أَمشِى بقَرنٍ أَعْضَبِ

**مسئلہ**۔ حضرت اَبان نے حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو بجلی نہیں پکڑتی (2)۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کڑک کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته وهو على كل شئى قدير (جس نے یہ کلمات کہے) اسے اگر بجلی آلے تو اس کی دیت مجھ پر ہے۔ خطیب بغدادی نے سلیمان بن علی کی حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس عن أبیہ عن جدہ ذکر کی ہے آپ نے کہا: ہم ایک سفر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ ہمیں کڑک اور بادلوں کی ہوا نے آلیا، تو حضرت کعب نے ہمیں کہا: جس آدمی نے کڑک کی آواز سن کر سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته کے کلمات تین مرتبہ کہے تو اس کڑک میں موجود (نقصان) سے اسے معافی مل گئی، تو ہم نے ایسا ہی کیا تو ہم بچ گئے، پھر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ملا تو بادلوں کی ہوا آپ کے ناک کو لگی اور اثر انداز ہوگئی، میں نے کہا: اے امیر المومنین یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بادلوں کی ہوا میرے ناک کو لگی اور اثر انداز ہوگئی، تو میں نے کہا: کڑک کی آواز سن کر حضرت کعب نے ہمیں کہا تھا: جس نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 101     2۔ ایضاً

کڑک کی آواز سن کر سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ تین بار کہا تو اسے کڑک میں موجود (نقصان) سے نجات مل گئی، تو ہم نے یہ کلمات کہے تو ہمیں نجات مل گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ہمیں کیوں نہ کہا تا کہ ہم بھی کہہ لیتے؟ اس کی تفصیل سورۂ ''بقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ یعنی یہودی کا جھگڑا جب اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اربد کا جھگڑا ہے (1) جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ حال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عطف منقطع ہو۔ حضرت انس نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے ایک بڑے آدمی کے پاس وفد بھیجا تا کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے، تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے اپنے معبود کے بارے میں بتاؤ! کیا وہ چاندی کا ہے، سونے کا ہے یا نحاس کا؟ تو اس وفد نے اس کو بڑی جسارت سمجھا۔ آپ کے پاس وفد واپس آیا اور اس نے آپ کو اس بات سے آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے پاس واپس جاؤ اور اسے دعوت دو''۔ وفد واپس پہنچا تو بجلی کی کڑک اسے اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور وہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹا تو وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ کا ارشاد نازل ہوا۔ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ابن اعرابی نے کہا: الْمِحَالِ کا معنی مکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکر کا معنی حق کی تدبیر ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: اللہ کی طرف سے مکر ناپسندیدہ چیز کو ایسے طریقے سے اس کے مستحق کے سپرد کرنا ہے کہ جس سے احساس بھی نہ ہو۔ ابن یزیدی نے ابوزید سے روایت کیا کہ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی ہے کہ وہ سخت بدلہ لینے والا ہے۔ ازہری نے کہا: الْمِحَالِ یعنی قوت اور شدت اور المحل سے مراد شدت ہے اس کی میم اصلی ہے، ماحلت فلاناً مَحالاً یعنی میں نے اسے پکڑا یہاں تک کہ واضح ہوگیا کہ کون سخت ہے۔ ابوعبید نے کہا: الْمِحَالِ یعنی سزا اور ناپسندیدہ بات۔ ابن عرفہ نے کہا: الْمِحَالِ سے مراد جلال اور جھگڑا ہے۔ مَاحَلَ عن أمرہ کہا جاتا ہے جس کا معنی ہی جَادَلَ اس نے جھگڑا کیا۔ قتیبی نے کہا: اس سے مراد سخت چال ہے، اس کی اصل حیلہ سے ہے، اس کی میم مکان کی میم کی طرح ہے جس کی اصل کون ہے۔ ازہری نے کہا: ابن قتیبہ نے اس کی میم کو زائدہ کہہ کر غلطی کی ہے بلکہ اس کی میم اصلی ہے، جب تو کسی لفظ کو فِعال کے وزن پر دیکھے جس کا پہلا حرف مکسور ہو تو وہ اصلی ہوتا ہے، جیسے مِہاد، مِلاك اور مِراس وغیرہ۔ اور مِفعل جب ثلاثی ہو تو یہ واو کے اظہار کے ساتھ آتا ہے جیسے مِزود، مِحوَل اور مِحوَر وغیرہ۔ ازہری نے کہا: اعرج نے اسے وَهُوَ شَدِيْدُ الْمَحَالِ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرآت کے مطابق اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ حول سے مشتق ہے۔ یہ سارا ابوعبید ہروی نے ذکر کیا ہے سوائے اس کے جو پہلے ابن اعرابی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ صحابہ و تابعین کی اس کے معنی کے متعلق تاویلات آٹھ ہیں۔

1: ۔شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی شدید العداوۃ یعنی دشمنی کی شدت ہے (2)، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

2: ۔اس کا معنی شدید الحول یعنی قوت و قدرت کی شدت والا ہے، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102 2۔ ایضاً

3:۔ معنی شدید الاخذ یعنی پکڑ کی شدت والا ہے، یہ حضرت علی بن اُبی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

4:۔ شدید الحقد، لی دشمنی کی سختی والا، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

5:۔ شدید القوۃ قوت کی شدت والا، یہ مجاہد کا قول ہے۔

6:۔ شدید الغضب غضب کی سختی والا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔

7:۔ شدید الھلاک بالمحل یعنی قحط کے ذریعے ہلاکت کی شدت والا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

8:۔ شدید الحیلۃ یعنی حیلہ کی شدت والا، یہ حضرت قتادہ کا قول ہے۔

ابو عبیدہ معمر نے کہا: اَلْمِحَالِ اور المماحلۃ سے مراد مماکرۃ اور مغالبہ ہے۔

اَعشیٰ نے شعر کہا ہے۔

فرع نبع یھتز فی غُصُنِ المجد کثیر النَّدیٰ شدید المحال(1)

ایک اور شاعر نے کہا:

ولَبْسٍ بینَ أقوامٍ فکلٌّ أعَدَّلہ الشَّغَازِبَ والمَحالا

عبدالمطلب نے کہا:

لاھُمَّ إنَّ المرئَ یَمْنَعُ رَحْلَہٗ فامْنَعْ حِلَالَکَ

لَا یَغْلِبَنَّ صَلِیبُھُمْ وَ مَحالُھُمْ عَدْواً مِحَالَکَ

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''اسی کو پکارنا سچ ہے اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا وہ نہیں جواب دے سکتے انہیں کچھ بھی مگر اس شخص کی طرح جو پھیلائے ہوا اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تا کہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے اور (یوں تو) پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہیں کافروں کی دعا بجز اس کے کہ وہ بھٹکی پھرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ یعنی اللہ کو پکارنا سچ ہے۔ حضرت ابن عباس (2)، حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: بے شک اللہ ہی حق ہے، پس اس کی دعوت، دعوت حق ہے۔ ایک قول یہ ہے: دعا میں اخلاص حق کی پکار ہے، یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق: حق کی دعوت، خوف کے وقت اس سے دعا ہے، خوف میں صرف اسی سے دعا کی جاتی ہے، جس طرح کہ اللہ کا ارشاد ہے: ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ (الاسراء: 67) جس نے اس کے علاوہ کو پکارا وہ گمراہ ہوگیا۔ ماوردی نے کہا: یہ سیاق آیت کے مشابہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اس سے مراد بت (اصنام واوثان) ہیں۔ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کی دعا کو وہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 520 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

قبول نہیں کرتے اور نہ ان کی ندا کو سنتے ہیں۔ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ان کی دعاؤں کے جواب سے ان کی مایوسی کی پانی کے ساتھ ضرب المثل بیان کی ہے کیونکہ عرب لاحاصل کام کی سعی کرنے والے کی ضرب المثل ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

فاصبحتُ مما كان بَيْني وبينها　　من الودّ مثلَ القابِضِ الماء باليدِ (1)

میری اور اس (عورت) کے درمیان جو محبت تھی اس میں میں ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے والے کی طرح ہو گیا۔

اس ضرب المثل کے معنی کی تین صورتیں ہیں (2):

1:۔ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور معبود کو پکارتا ہے تو وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو دور سے پانی کو اپنے منہ کی طرف بلاتا ہے اور زبان کے ذریعے اس پر قادر نہیں ہوتا، اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں آئے گا کیونکہ پانی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی پانی اس تک پہنچ پاتا ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔

2:۔ وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو اپنے خیال میں پانی کو دیکھتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیتا ہے تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خیال جھوٹا اور اس کے وہم میں فساد ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

3:۔ وہ ایسے آدمی کی طرح ہے جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلی کو پھیلاتا ہے تاکہ اس کو پکڑ لے مگر اس کی ہتھیلی میں پانی میں سے کچھ بھی نہیں ٹھہرتا۔ فراء کا خیال ہے کہ ''الماء'' سے یہاں مراد کنواں ہے، کیونکہ یہ پانی کا معدن ہوتا ہے اور ضرب المثل یہ ہے کہ یہ آدمی اس آدمی کی طرح ہے جو بغیر رسی و ڈول کے اپنے ہاتھ کو کنویں کی طرف پھیلاتا ہے۔ بطور استشہاد یہ شعر ہے:

فإنّ الماءَ ماءُ أَبِي وجَدّي　　وبِئرِي، ذُو حَفَرْتُ و ذُو طَوَيْتُ

اس شعر میں ماء سے مراد کنواں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آدمی اس پیاسے کی طرح ہے جو کنویں کے کنارے پر ہوتا ہے، وہ کنویں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی پانی اس تک بلند ہوتا ہے۔ اور اِلَّا كَبَاسِطِ کا معنی ہے اِلَّا کاستجابة باسط کفیہ ہے۔ مصدر باسط کی طرف مضاف ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور مصدر مضاف کا فاعل ہی معنی میں مراد ہے اور وہ ہے ''الماء'' معنی یہ ہوگا: إلا كإجابة باسط كفيه إلى الماء اور لِيَبْلُغَ فَاهُ میں لام باسط کے متعلق ہوگی اور اللہ کا ارشاد: وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ پانی سے کنایۃ ہے، یعنی وما الماء ببالغ فاه اور پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ هُوَ منہ سے کنایۃ ہو یعنی ما الفم ببالغ الى الماء منه پانی تک پہنچنے والا نہیں۔ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کا بتوں کی پوجا کرنا سوائے گمراہی کے کچھ نہیں، کیونکہ یہ شرک ہے۔ ایک قول کے مطابق: اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ کا معنی یہ ہے کہ وہ دعا ان سے دور ہو جاتی ہے پس وہ اس سے کوئی حصہ نہیں پاتے جس طرح اللہ نے ارشاد فرمایا: اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

عَنَّا (المومن) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں کی آواز اللہ تعالیٰ سے چھپ جاتی ہے پس وہ ان کی دعائیں سنتا ہی نہیں (1)۔

وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ۩

''اور اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا حضرت حسن اور قتادہ وغیرہ نے کہا: مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور کافر تلوار سے مجبور ہو کر۔ حضرت قتادہ سے ہی مروی ہے کہ کافر کو جب ایمان کوئی فائدہ نہیں دیتا تو وہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے۔ زجاج نے کہا: کافر کا سجدہ مجبوراً ہوتا ہے اس میں نہ خضوع ہوتا ہے اور نہ ہی عمل کا اثر۔ ابن زید نے کہا: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جو اسلام میں رغبت وشوق سے داخل ہوا (2) اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو تلوار سے ڈر کر اسلام میں داخل ہوا۔ ایک قول یہ ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے (3) جس کے اسلام کی مدت لمبی ہے اور اس نے اس لمبی عمر کو سجدوں میں مصروف رکھا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ذات کو حقیر اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے، تو اس صورت میں آیت مومنوں کے حوالے سے ہی ہے اس اعتبار سے وَ الْاَرْضِ سے مراد بعض من فی الأرض ہے۔ قشیری نے کہا: آیت میں دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ آیت عام ہے اور اس کی مراد مخصوص ہے، مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے (4) اور بعض کفار منافقین کی طرح مجبوراً اور خوف سے سجدہ کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت مومنین کے بارے میں ہے۔ ان میں سے بعض خوشی سے سجدہ کرتے ہیں ان پر سجدہ بھاری نہیں ہوتا اور بعض پر بھاری ہوتا ہے کیونکہ امور تکلیفیہ کا التزام مشقت ہے مگر وہ مشقت کو اخلاص اور ایمان کے ساتھ برداشت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ حق کو پا لیتے ہیں اور اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے جبکہ کافر کو سجدہ کا حکم ہے اور اس پر اس کا مواخذہ بھی ہوگا۔ دوسرا مسلک اور یہی حق ہے کہ مومن اپنے بدن کے ساتھ خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور مومن و کافر ہر مخلوق اس اعتبار سے سجدہ کرتی ہے کہ وہ مخلوق ہے، جس طرح اللہ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الاسراء: 44) کوئی شے نہیں مگر وہ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ تو یہ تسبیح دلالۃً ہوتی ہے عبادۃً نہیں۔ وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ یعنی مخلوق کے سائے صبح و شام اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ (سائے) ان دو وقتوں میں جدا ہوتے ہیں، اور ایک طرف سے دوسری طرف جھکتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے جس طرح وہ چاہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآىِٕلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ۝ (النحل) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104

3۔ ایضاً 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1110

اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر لوگوں کا قول ہے ۔مجاہد نے کہا: مومن کا سایہ خوشی سے سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ خوش ہوتا ہے جبکہ کافر کا سایہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ مجبور ہے۔ ابن انباری نے کہا: سایوں کی بھی عقلیں بنادی جاتی ہے جن کے ذریعے وہ سجدہ کرتے ہیں اور ان پر خشوع طاری ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی سمجھ بنادی ہے یہاں تک کہ وہ مخاطب ہوتے ہیں اور انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے، کیونکہ پہاڑ کی تو آنکھ ہے ممکن ہے زندگی کی تقدیر کی شرط کے ساتھ اس کی عقل بھی ہو جبکہ سائے تو آثار اور اَعراض ہیں، ان کے لیے زندگی متصور نہیں۔ اور سجود جھکنے کے معنی میں ہے، پس سایوں کے سجود سے مراد ان کا ایک طرف سے دوسری طرف جھکنا ہے، سجدت النخلة کہا جاتا ہے یعنی کھجور کا درخت جھک گیا۔ الْاٰصَالِ، اُصُل کی جمع اور أُصُل، أَصِيل کی جمع ہے، اس سے مراد عصر سے لے کر غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔ پھر أصائل جمع الجمع ہے۔ اُبوذ ؤیب ہذلی نے کہا:

لَعَمْرِي لَأَنْتَ البيتُ أُكْرِمُ أَهْلَهُ وأقعدُ في أَفْيَائِهِ بالأَصَائِلِ(1)

اور ظِلٰلُهُمْ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَنْ پر اس کا عطف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، تقدیر عبارت یوں ہو: وظلالهم سُجّدٌ بالغدو والاصال۔ الغدو مصدر بھی ہوسکتا ہے اور غداۃ کی جمع بھی ہوسکتا ہے، اور الْاٰصَالِ جمع کے مقابلے میں اس کا آنا اس کے جمع ہونے کو تقویت دیتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶

''آپ (ان سے) پوچھیے: کون ہے پروردگار آسمانوں اور زمین کا؟ (خود ہی) فرمایئے: اللہ (انہیں) کہیے: کیا تم نے بنالیے ہیں اللہ کے سوا ایسے حمایتی جو اختیار نہیں رکھتے اپنے لیے کسی نفع کا اور نہ کسی نقصان کا (ان سے) پوچھیے: کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور بینا یا کیا یکساں ہوتے ہیں اندھیرے اور نور کیا انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے لیے ایسے شریک جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا پس یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی ہو، فرمایئے: اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ (2) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ آپ مشرکین کو فرمائیں:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 105

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ پھر اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ اس کا جواب نہ دیں یا وہ اس سے ناواقف ہوں تو آپ خود ہی فرمایئے کہ وہ اللہ ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ یہ آیت کریمہ ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کے اعتراف پر دلالت کرتی ہے ورنہ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ کے ذریعے استدلال نہ کیا جاتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد بطور دلیل پیش بھی کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان: 25) اور اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے اعتراف کرلیا تو پھر اس کے علاوہ کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور وہ غیر کوئی نفع اور نقصان بھی نہیں دے سکتا۔ یہ الزام صحیح ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے ایک ضرب المثل بیان فرمائی ہے فرمایا: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ پس اسی طرح وہ مومن جو حق کو دیکھتا ہے وہ اور مشرک جو حق کو نہیں دیکھتا برابر نہیں ہوسکتے۔ ایک قول یہ ہے: اَعْمٰی ان لوگوں کی مثال ہے جو اللہ کے علاوہ کی پوجا کرتے ہیں اور بصیر ان کی مثال ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ یعنی شرک اور ایمان۔ ابن محیصن، ابوبکر، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پہلے فعل کی وجہ سے "یستوی" یا کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ الظُّلُمٰتُ کی تانیث حقیقی نہیں، جبکہ باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے ابوعبید کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل اور مؤنث کے درمیان کوئی فاصلہ بھی نہیں۔ اور الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ایمان اور کفر کی طرح ہے اور اس کی کیفیت سے واقف ہیں۔ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ یہ آیت استدلال کی تکمیل ہے، یعنی غیر اللہ نے اللہ کی طرح کوئی چیز تخلیق کی ہے تو یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے معبودوں نے کس چیز کو تخلیق کیا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایئے: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہر چیز اس کی عبادت کرے (1)۔ یہ آیت ان مشرکین اور قدریہ کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی طرح تخلیق کی ہے۔ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ یعنی ہر چیز سے پہلے الْقَهَّارُ یعنی ہر چیز پر غالب، ابونصر قشیری نے کہا: یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ آیت کریمہ ایسے لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہو جو صانع کا اعتراف نہیں کرتے، یعنی آپ ان سے آسمانوں اور زمین کے خالق کے بارے میں پوچھیں، کیونکہ یہ ان کے خلاف اس سلسلہ میں حجت قائم کرنے کے لیے اور تقریب الی الافہام کے لیے آسان تھا۔ کہ جمادات اور ہر مخلوق کا آسمانوں اور زمین سے عاجز آنا تو (سب کے نزدیک) معلوم ہے۔ جب یہ بات پختہ ہوجائے گی اور ظاہر ہوجائے گا کہ صانع تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر اس کا شریک ٹھہرانا کیسے ممکن رہے گا؟ اور دوران کلام یہ بات تو واضح ہوچکی ہے کہ اگر اس جہان کے دو صانع ہوں تو تخلیق مشتبہ ہو جائے گی اور ایک کا فعل دوسرے کے فعل سے جدا نہیں ہوسکے گا، تو کیسے معلوم ہوگا کہ فعل دو کی طرف سے ہے؟

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَ مِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 105

الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

''اس نے اتارا آسمان سے پانی پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق، تو اٹھالیا سیلاب کی روانی نے ابھرا ہوا جھاگ۔ اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا دیگر سامان بنانے کے لیے اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے یوں اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے حق اور باطل کی۔ پس (بیکار) جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے اور جو چیز نفع بخش ہے لوگوں کے لیے تو وہ باقی رہے گی زمین میں، یونہی اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا بھلائی (ہی بھلائی) ہے اور جنہوں نے نہیں مانا اس کا حکم تو اگر ان کے ملک میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) اسے بطور فدیہ دے دیں۔ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لیے سخت باز پرس ہوگی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے، نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کفر کو اس جھاگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پانی پر اٹھتی ہے، یہ ختم ہو جاتی ہے اور وادیوں کی ایک جانب میں جمع ہوتی ہے اور ہوائیں اسے دھکیل کر لے جاتی ہیں پس اسی طرح کفر بھی چلا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا، بِقَدَرِهَا سے مراد بقدر ملئہا ہے یعنی اپنے بھرنے کے اندازے کے مطابق۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اپنے چھوٹے اور بڑے ہونے کے حساب سے۔ اشہب عقیلی اور حضرت حسن بصری نے بِقَدْرِهَا دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمایا۔ الأودیہ وادی کی جمع ہے اور اس کو وادی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ نکلتی اور بہتی ہے۔ اس بنیاد پر وادی بہنے والے پانی کا نام ہے۔ ابوعلی نے کہا: أودیۃ توسع ہے یعنی اس کا پانی بہنے لگا تو اسے حذف کر دیا گیا، یعنی سال ماءُھا اور بقدرھا کا معنی بقدر میاہہا ہے، کیونکہ وادی بذات خود اپنے اندازے سے نہیں بہتی۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا یعنی پانی کے اوپر اٹھنے اور بلند ہونے والی، مجاہد کا کہا گیا کلام یہاں ختم ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ یہ دوسری ضرب المثل ہے۔ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ یعنی سونے اور چاندی کے زیور۔ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ مجاہد

نے کہا: متاع سے مراد لوہا، نحاس اور کچ ہے اور زَبَدٌ مِّثْلُهٗ سے مراد ہے کہ یہ چیزیں جھاگ پھینکتی ہیں جس طرح کہ پانی کا بہاؤ پھینکتا ہے اور صرف پانی کا بہاؤ جھاگ پھینکتا ہے کیونکہ پانی میں زمین کی مٹی شامل ہو جاتی ہے تو وہ اس کو جھاگ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح جواہرات، سونے اور چاندی وغیرہ میں سے وہ چیزیں جو زمین کے معادن میں سے ہیں ان کو جب آگ پر گرم کیا جاتا ہے تو مٹی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، تو انہیں آگ پر گرم کیا جاتا ہے تاکہ وہ پگھل جائیں تو زمین کی مٹی زائل ہو جاتی ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً مجاہد نے جُفَآءً کا معنی جمود کیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ابوعمرو بن علاء نے کہا ہے: جب ہانڈی میں ابال آئے اور جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفأت القدر کہا جاتا ہے۔ اور جُفاء سے مراد وہ ہے وادی نے جسے باہر پھینک دیا ہو۔ ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے رُؤبۃ کو جُفالاً پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: جب ہانڈی جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفلَتِ القدر کہا جاتا ہے، اور جب ہوا بادلوں کو ختم کر دے تو أجلفت الريح السحاب کہا جاتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ مجاہد نے کہا: اس سے مراد خالص اور صاف شفاف پانی ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد پانی اور سونے، چاندی، لوہے، نحاس اور کچ میں سے جو خالص ہو چکا ہو وہ ہے۔ ان دونوں ضرب الامثال کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبات کے سلسلہ میں حق کے لیے اور باطل کے اضمحلال کے سلسلہ میں باطل کے لیے بیان کیا ہے، باطل اگرچہ بعض حالات میں بہت بلند ہوتا ہے تاہم جھاگ اور خبث کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ضرب المثل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قران اور قران میں سے جو دلوں میں داخل ہوتا ہے اس کی مثال بیان فرمائی ہے، قران کو بارش کے ساتھ تشبیہ دی وجہ شبہ اس کی بھلائی کا عام ہونا اور اس کے نفع کا باقی ہونا ہے اور دلوں کو وادیوں کے ساتھ تشبیہ دی کہ ان میں قران داخل ہوتا ہے جس طرح کہ وادیوں میں ان کی وسعت اور تنگی کے حساب سے داخل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ''یعنی قرانا۔ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا آپ نے فرمایا: أودية بندوں کے دل ہیں (1)۔ صاحب ''سوق العروس'' نے کہا: اگر یہ معنی صحیح ہے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں قران کی مثال پانی کے ساتھ بیان فرمائی اور دلوں کی وادیوں کے ساتھ اور محکم کی صافی جبکہ تشابہ کی ''زبد'' کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے۔

ایک قول کے مطابق جس طرح کہ وادی کا پانی صاف ستھرا چلتا ہے تو وادی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو اٹھا لے جاتا ہے اور جہاں تک سونے اور چاندی کے زیورات کی بات ہے تو یہ ان اچھے احوال اور پاکیزہ اخلاق کی طرح ہیں جن کی وجہ سے مردوں کی خوبصورتی اور اعمال کی نیکی کی بنیاد ہے، جس طرح سونے اور چاندی سے عورتوں کی زینت ہے اور ان کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ہے۔ حمید، ابن محیصن، اُعمش، حمزہ، کسائی اور حفص نے يُوْقِدُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوعبیدہ نے بھی يَنْفَعُ النَّاسَ کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا تو اس لیے خبر دینا مقصود ہے اور یہاں مخاطبت کی کوئی صورت نہیں جبکہ باقی قرآء نے کلام کے آغاز میں اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فِي النَّارِ محذوف کے متعلق ہوگا یہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 106

حال کی جگہ پر ہے جبکہ ذوالحال عَلَيْهِ کی ھا ضمیر ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومما توقدون عليه ثابتاً في النار أو كائناً اور فِي النَّارِ میں ایک ضمیر مرفوع ہے جو اس ھا کی طرف لوٹتی ہے جو ذوالحال کا اسم ہے۔ اور فِي النَّارِ کو یُوْقِدُوْنَ کے متعلق کرنا درست نہیں کیونکہ أوقدتُ عليه في النار درست نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ موقد علیہ نار میں ہوگا تو اس صورت میں تو فِي النَّارِ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ مفعول لہ ہے۔ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی زبدٌ مثل السيل ایک قول یہ ہے کہ زَبَدٌ کی خبر فِي النَّارِ ہے۔ کسائی کے نزدیک زَبَدٌ مبتدا ہے اور مِّثْلُهٗ اس کی صفت ہے اور خبر اس سے ماقبل جملے میں ہے اور وہ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ کا جملہ ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ یعنی جس طرح اس نے تمہارے لیے یہ مثالیں بیان فرمائیں ہیں اسی طرح وہ دلائل بیان فرماتا ہے۔ پھر فرمایا: لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ یعنی جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا، استجاب بمعنی أجاب ہے شاعر نے کہا ہے:

فلَمْ يَسْتَجِبْهُ عند ذاك مُجيبٌ

لم يستجبه بمعنی لم يُجِبْهُ ہے۔

یعنی انہوں نے توحید اور نبوت وغیرہ میں سے جن کی طرف اللہ نے دعوت دی ہے ان کو مان لیا۔ الْحُسْنٰى کیونکہ یہ بات بھلائی کی انتہا میں ہے۔ ایک قول یہ ہے: الْحُسْنٰى سے مراد دنیا میں مدد اور کل باقی رہنے والی نعمت یعنی جنت ہے۔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ یعنی اس پر ایمان لانے کو جنہوں نے نہیں مانا۔ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا یعنی مال وغیرہ میں سے وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ یعنی یہ ان کی ملکیت میں ہو۔ لَافْتَدَوْا بِهٖ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں، اس کی مثال سورۂ ''آل عمران'' میں ہے کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا (آل عمران: 10) بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ (آل عمران: 91) جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ یعنی ان کی کسی نیکی کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے کسی گناہ سے صرف نظر کیا جائے گا۔ فرقد سخی نے کہا کہ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: اے فرقد! کیا تو جانتا ہے کہ سُوْٓءُ الْحِسَابِ کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں! انہوں نے کہا: سُوْٓءُ الْحِسَابِ یہ ہے کہ آدمی کے تمام گناہوں کا حساب لیا جائے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا جائے۔ وَمَاْوٰىهُمْ یعنی ان کا مسکن اور مقام جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی وہ بستر جو خود انہوں نے اپنے لیے تیار کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى

یہ ضرب المثل اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کے لیے بیان فرمائی ہے، روایت ہے کہ یہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اَعْمٰى سے مراد دل کا اندھا ہے اور جو دین سے جاہل ہوتا ہے وہ دل کا اندھا ہے۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝

''وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ یہ عقلمندوں کی صفت ہے یعنی نصیحت صرف وہی عقلمند قبول کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ العہد اسم جنس ہے یعنی اللہ کے تمام وعدے اور وہ اس کے وہ اوامر اور نواہی ہیں جو اس نے اپنے بندوں کو فرمائے ہیں۔ ان الفاظ کے تحت تمام فرائض کا التزام اور تمام گناہوں سے بچنا شامل ہے۔ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تو تمام وعدوں کی جنس مراد ہو یعنی جب وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اس کو نہیں توڑتے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے وعدوں کو توڑنے اور ان سے روکنے کے بارے میں بیس اور کچھ آیات اپنے بندوں کو دی ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے ذریعے کسی معین وعدہ کی طرف اشارہ مقصود ہو، اور یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اس وقت لیا تھا جب اس نے انہیں اپنے باپ آدم علیہ السلام کی صلب سے نکالا تھا۔ قفال نے کہا: اس سے مراد توحید و نبوت کے وہ دلائل ہیں جو اس نے بندوں کی عقل میں ڈال دیئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابوداؤد اور دیگر لوگوں نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم سات، آٹھ یا نو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہیں کرتے (1)؟'' اور ہم بیعت کے ذریعے عہد کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے عرض کیا: ہم نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ آپ نے تین دفعہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے، تو ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور آپ کی بیعت کر لی، ایک کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نے آپ کی بیعت کر لی تھی تو ہم کس بات پر آپ کی بیعت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، پانچ نمازیں پڑھو گے، توجہ سے سنو گے اور اطاعت کرو گے''۔ اور آپ نے رازداری سے ایک کلمہ ارشاد فرمایا۔ اور فرمایا ''لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کرو گے'' حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس جماعت کے کسی بندے کا چابک بھی گر جاتا تو وہ اسے بھی پکڑانے کے لیے کسی سے سوال نہ کرتا۔ ابن عربی نے کہا: نصیحت میں بڑے وعدوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کیا جائے۔ حضرت ابو حمزہ خراسانی اللہ کے (نیک) بندوں میں سے تھے انہوں نے سنا کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر بیعت کی ہے کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے، تو ابو حمزہ نے کہا: اے پروردگار! ان لوگوں نے تو تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یہ وعدہ کیا میں تیرے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا۔ شام سے مکہ کی طرف حج کے ارادے سے نکلے رات کے وقت راستے میں چل رہے تھے کہ اپنے دوستوں سے کسی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ گئے پھر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، اسی دوران راستے کے کنارے پر واقع ایک کنوئے میں گر گئے۔ جب کنوئے کے پیندے میں پہنچے تو سوچا کہ کسی سے مدد طلب

1۔ سنن ابن ماجہ، باب البیعۃ، صفحہ 398، حدیث 2867۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1399، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں ہوسکتا ہے کوئی سن لے۔ پھر سوچا کہ جس کے ساتھ میں نے عہد کیا ہوا ہے وہ مجھے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے، الله کی قسم! کسی انسان کے لیے ایک حرف بھی نہیں بولوں گا، پھر تھوڑی ہی دیر گزری کہ اس کنویں سے ایک وفد گزرا جب انہوں نے کنویں کو راستے کے کنارے پر دیکھا تو انہوں نے کہا: اس کنویں کو بند کر دینا چاہیے، انہوں نے لکڑیاں کاٹیں اور انہیں کنویں کے منہ پر رکھ کر مٹی کے ساتھ انہیں ڈھانپ دیا، جب ابوحمزہ نے یہ دیکھا تو سوچا: یہ تو ہلاکت گاہ ہے، پھر لوگوں سے مدد طلب کرنا چاہی مگر کہا: الله کی قسم! میں کبھی بھی اس عہد سے نہیں نکلوں گا، پھر اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تو نے اس کے ساتھ عہد نہیں کر رکھا جو تجھے دیکھ رہا ہے؟ پس خاموش ہو گئے اور توکل کر لیا، پھر اپنے معاملہ میں غور وفکر کرتے ہوئے کنویں کے پیندے میں ٹیک لگائی تو اچانک مٹی پڑی اور لکڑی اوپر اٹھ گئی اور اسی دوران کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اپنا ہاتھ لاؤ! ابوحمزہ نے کہا: میں نے اسے اپنا ہاتھ دے دیا تو اس نے ایک جست میں مجھے کنویں کے کنارے پر پہنچا دیا، باہر نکلا تو کسی کو بھی نہ پایا، غیب سے آواز سنی جو کہہ رہا تھا: تو نے توکل کا پھل کیسا پایا؟ تو ابوحمزہ نے یہ اشعار کہے:

نهانِي حيائي منك أن أكشفَ الهوى فاغنيتَني بالعلم منكَ عن الكَشْف
تَلَطَّفتَ لي امري فأبديتَ شاهدي إلى غائبي واللطفُ يُدرَكُ باللُّطفِ
ترائيتَ لِي بالعلم حتّى كانما تُخبِرُني بالغيب أنَّكَ في كَفِّ
أرانِي وبي من هَيْبَتي لَكَ وَحْشَةٌ فتونِسُنِي باللُّطفِ مِنكَ وبالعطفِ
وتُحيِي مُحِباً أنتَ لي الحبِّ حَتْفُهُ وذَا عَجبٌ كيف الحياةُ مَعَ الحَتْفِ

ابن عربی نے کہا(1): یہ ہے وہ آدمی جس نے الله کے ساتھ عہد کیا تو اسے تمام و کمل پورا کیا، پس اس کی اقتدا کرو ان شاء الله ہدایت پا جاؤ گے۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: اس آدمی نے اس مقام پر بزعم خویش جو توکل اختیار کیا یہ درست نہیں۔ اگر وہ توکل کا معنی سمجھ لیتا تو اسے پتہ چل جاتا کہ اس حالت میں کسی سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں، جس طرح رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے چھپ کر نکلنا توکل سے خارج نہیں پھر آپ کا کوئی حیلہ سوچنا، اس معاملہ کا پوشیدہ رکھنا اور اپنے آپ کو غار میں چھپانا اور سراقہ کو اخفِ عنا کے الفاظ ارشاد فرمانا (توکل کے منافی نہیں) پس وہ توکل جو قابل تعریف ہے وہ کسی ممنوع فعل کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور کنویں میں یہ صورت اختیار کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ الله تعالیٰ نے آدمی کے لیے آلات پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ ضرر کو دور کر سکتا ہے اور ایسے آلات بھی پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ نفع حاصل کر سکتا ہے، اگر وہ ان آلات کو توکل کا دعویٰ کرتے ہوئے معطل کر دے تو یہ اس کی توکل سے عدم واقفیت اور تواضع کی حکمت کی تردید پر دلیل ہے، کیونکہ توکل تو الله تعالیٰ کی ذات پر دل کے اعتماد کا نام ہے اور اسباب کو ختم کر دینا توکل کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی بھوکا ہو اور کسی سے کچھ نہ مانگے اور مر جائے تو جہنم میں جائے گا، یہ حضرت سفیان ثوری اور دیگر لوگوں کا قول ہے، کیونکہ اسلام کے طریقوں کی جانب اس کی رہنمائی کی گئی ہے، اب اگر اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1112

نے وہ طریقے اختیار نہیں کیے تو خود اپنے قتل پر اپنی معاونت کی ہے۔ ابو الفرج نے کہا: ابو حمزہ کے قول فَجَاءَ اَسَدٌ فَاَخْرَجَنِي (شیر آیا تو اس نے مجھے نکالا) قابل التفات نہیں کیونکہ اگر یہ صحیح بھی ہو تب بھی ایسا اتفاقاً ہوا ہے اور ایک جاہل آدمی پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی ہے اور اس کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مہربانی کی ہوگی، انکار تو اس کے اپنے فعل کا ہے جو اس نے کیا، کیونکہ اس کا اپنا فعل خود اس کی اپنی جان کے قتل پر معاونت تھی جو جان اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اور اللہ نے اسے اس کی حفاظت کا حکم فرما رکھا تھا۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾

''اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور خائف رہتے ہیں سخت حساب سے۔ اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرتے رہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور خرچ کرتے رہے اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی انہیں لوگوں کے لیے دار آخرت کی راحتیں ہیں (یعنی) سدا بہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادوں، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے) اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے: سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت کا گھر''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ حضرت قتادہ اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ صلہ رحمی کے بارے میں ظاہر ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تمام علامات کو بھی شامل ہے۔ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ایک قول یہ ہے: قطع رحم کے بارے میں وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جبکہ ایک قول کے مطابق تمام نافرمانیوں اور گناہوں سے ڈرتے ہیں۔ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ، سُوْٓءَ الْحِسَابِ سے مراد یہ ہے کہ حساب میں سختی اور مناقشہ کیا جائے گا اور جس سے تفصیلی حساب سختی سے لیا گیا اسے عذاب دیا (ہی) جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ کا معنی تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلہ رحمی کے بارے میں ہے اور چوتھا احتمال یہ بھی ہے کہ نیک عمل کے ساتھ ایمان پر کاربند رہیں (1)، وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ اور ایسے معاملات کے بارے میں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 108

اپنے رب سے ڈرتے ہیں جن کو بجالانے کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ان معاملات کو چھوڑنے کے حوالے سے حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں؛ پہلا قول ان سب اقوال کو شامل ہے۔ باللہ توفیقنا۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ایک قول کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ صَبَرُوا فعل ماضی ہے لہٰذا یوفون پر اس کا عطف نہیں ہوسکتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ بھی گزشتہ لوگوں کی ہی صفت ہے۔ اور صفت کبھی لفظ ماضی کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور کبھی مضارع کے لفظ کے ساتھ، کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا من یفعل کذا فلہ کذا جو ایسا کرے گا تو اس کے لیے ایسا ہوگا۔ جب وَالَّذِيْنَ متضمن بمعنی شرط ہے اور شرط میں ماضی، مضارع کے معنی میں ہوتی ہے تو ایسا جائز اور درست ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ فرمایا پھر وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا فرمایا اور پھر اس پر عطف کرتے ہوئے يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کیا اور اللہ کی نافرمانی سے صبر کیا۔ عطا نے کہا: انہوں نے مصائب و آلام اور حوادث و نوائب پر صبر کیا۔ ابو عمران جونی نے کہا: جنہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے دین پر صبر کیا۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ یعنی انہوں نے نمازوں کو ان کے فرائض سمیت اور ان کے اوقات میں خشوع و خضوع سے ادا کیا۔ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ ''بقرہ'' میں تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ یعنی وہ برے اعمال کو نیک اعمال کے ذریعے رد کرتے ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: بھلائی کے ذریعے برائی کو روکتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر کے نزدیک نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرتے ہیں۔ ضحاک نے کہا: سلام کے ذریعے فحش کو دور کرتے ہیں۔ جویبر نے کہا: عفو کے ذریعے ظلم کو روکتے ہیں۔ ابن شجرہ نے کہا: توبہ کے ذریعے گناہ کو دور کرتے ہیں۔ قتیبی نے کہا: بردباری کے ذریعے جاہل کی بے وقوفی کو روکتے ہیں اور بے وقوفی سے مراد برائی اور بردباری سے مراد نیکی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جب وہ گناہ کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے رجوع کر لیتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں، جبکہ ایک قول کے مطابق: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی کے ذریعے وہ شرک کو دور کرتے ہیں۔ یہ اقوال ہیں اور تمام کا معنی قریب قریب ہے، پہلا معنی بالعموم سب کو شامل ہے اور اس کی مثال: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود: 114) ہے (بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں) اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کیلئے ارشاد ہے: أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (1) گناہ کے بعد نیکی کر یہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح معاملہ کر۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی آخرت کی عاقبت اور وہ دوزخ کے بدلے میں جنت ہے۔ اور مستقبل میں دار دو ہی ہوں گے، فرماں بردار کے لیے جنت اور نافرمان کے لیے دوزخ، پس جب اطاعت گزاروں کی صفات کو بیان فرمایا تو لامحالہ طور پر ان کا دار جنت ہی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: دار سے مراد دار دنیا ہے، یعنی جو انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری والے کام کیے ہیں ان کی جزا انہیں دار دنیا میں ہی مل جائے گی۔

---

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس، حدیث 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یعنی ان کے لیے سدابہار باغات ہیں، جَنّٰتُ عَدۡنٍ، عُقۡبَی سے بدل ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عُقۡبَی الدَّارِ کی تفسیر ہو یعنی لهم دخول جنّاتِ عدنٍ کیوں کہ عُقۡبَی الدَّارِ حدث ہے اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ عین، اور حدث اپنے جیسے حدث کی تفسیر بیان کرتا ہے، پس محذوف مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جَنّٰتُ عَدۡنٍ مبتدا محذوف کی خبر ہو اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ جنت کا درمیانی اور سب سے بڑا حصہ ہے، اور اس کی چھت رحمٰن کا عرش ہے۔ یہ ابونصر عبدالرحیم قشیری کا قول ہے اور صحیح بخاری میں ہے(1): ''جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس کا سوال کرو بے شک یہ اوسط الجنة اور اعلی الجنة ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں''۔ ہوسکتا ہے جَنّٰتُ عَدۡنٍ بھی اسی طرح ہو، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جنت میں ایک محل ہے جسے عدن کہا جاتا ہے اس کے اردگرد بروج اور مروج ہیں، اس میں ایک ہزار دروازہ ہے، ہر دروازے پر پانچ ہزار یمنی منقش چادریں ہیں اس میں صرف نبی، صدیق اور شہید ہی داخل ہوسکتے ہیں۔ عَدۡنٍ، عَدَن بالمکان سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی مکان میں مقیم ہوجائے، اس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ''کہف'' میں آئے گا۔ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ، اُولٰٓئِكَ پر اس کا عطف بھی ہوسکتا ہے، معنی ہوگا أولئك ومن صلح من آبائهم وأزواجهم وذرياتهم لهم عقبى الدار اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ میں ضمیر مرفوع پر اس کا عطف ہو اور یہ عطف صحیح وعمدہ بھی ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان ضمیر منصوب حائل ہے اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے: يدخلونها ويدخلها من صلح من آبائهم یعنی وہ جو نیک ہو، اور نام ونسب کی وجہ سے وہ داخل نہیں ہوں گے، اور ''من'' محل نصب میں بھی ہوسکتا ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: وہ ان نیکوں کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اگرچہ ان کے اعمال ان کی طرح نہیں ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کی عزت کی وجہ سے انہیں بھی ملا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ صلاح یا نیکی، اللہ اور رسول پر ایمان لانا ہے اور اگر ان کے پاس ایمان کے ساتھ ساتھ دیگر نیکیاں بھی ہوں گی تو وہ اپنی طاعات کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ ان کے تابع ہونے کی وجہ سے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ ایمان تو ضروری ہے، پس عمل صالح کی شرط کا قول ایسا ہی ہے جیسا کہ ایمان کی شرط کا قول ہے۔

اظہر یہ ہے کہ یہ صلاح تمام اعمال میں ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کل بروز قیامت ان پر نعمت اس طرح مکمل ہوگی کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سمیت جنت میں جمع ہوں گے، اور ہر انسان اپنے ذاتی عمل کے ذریعے جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مہربانی کرتے ہوئے ہدایا اور تحائف کے ساتھ فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے آئیں گے۔ سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ یعنی وہ کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ، قول کو مضمر کردیا یعنی تم آفات اور ابتلاء سے سلامت ہو۔ ایک قول یہ ہے: اگرچہ وہ سلامت اور محفوظ ہیں تاہم یہ ان کے لیے ہمیشہ کی سلامتی کی دعا ہے: یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے گا، یہ خبر ہے اور اس کا معنی دعا ہے، اور عبودیت کے اعتراف کو متضمن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرد علی الجهمية، جلد 2، صفحہ 1104

ہے۔ بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی بصبرکم، ما فعل کے ساتھ آئے تو فعل مصدری معنی میں ہو جاتا ہے اور ما کے ساتھ آنے والی با، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کے متعلق ہوگی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہو یعنی ھذہ الکرامۃ بصبرکم یہ عزت تمہارے صبر کی وجہ سے ہے، یعنی جو الله کے امر اور نہی پر تم نے صبر کیا(1)، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے دنیا میں فقر پر صبر مراد ہے۔ یہ ابو عمران جونی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: الله کے راستے میں جہاد پر صبر، جس طرح کہ حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ الله کی مخلوق میں سے کون جنت میں داخل ہوگا؟'' صحابہ نے عرض کیا: الله اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ مجاہد جن کے ذریعے سرحدیں محفوظ ہوتی ہیں اور جن کے ذریعے ناپسندیدہ کاموں سے بچا جاتا ہے جب ان میں سے کوئی فوت ہوتا ہے اور خود اپنی حاجت کو پورا نہیں کرسکتا تو فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں کہ تم پر تمہارے صبر کی وجہ سے سلامتی ہو پس یہ آخرت کا گھر کیا عمدہ ہے''۔ محمد بن ابراہیم نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے آخر میں شہداء کی قبور پر آتے اور فرماتے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یہی معمول حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کا تھا۔ بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کے پاس آتے، جب دو پہاڑوں کے درمیان گھاٹی میں پہنچتے تو فرماتے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسا کرے۔، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی دنیا کی فضولیات سے۔ ایک قول یہ ہے: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی طاعت کی ملازمت اور معصیت کی مفارقت پر، یہ معنی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی جب کوئی ایسی چیز تم سے بچھڑ جاتی جس کے ساتھ تم محبت کرتے ہوتے تو اس پر صبر۔ اور بِمَا صَبَرْتُمْ کا ساتواں احتمال یہ ہے کہ شہوات کی اتباع سے صبر۔ حضرت عبدالله بن سلام اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو پکارنے والا پکارے گا کہ صبر والے کھڑے ہو جائیں، تو لوگوں میں سے کچھ کھڑے ہوں گے انہیں کہا جائے گا: تم جنت کی طرف چلے جاؤ، تو فرشتے انہیں ملیں گے اور کہیں گے: کدھر جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف، فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: ہاں! فرشتے کہیں گے: تم کون ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہم صبر والے ہیں، فرشتے کہیں گے: تمہارا صبر کیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم نے الله کی طاعت پر اپنے نفس کو صابر رکھا، الله کی نافرمانی سے اسے صابر رکھا اور دنیا میں آزمائش اور امتحان میں اسے صابر رکھا۔ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فرشتے انہیں کہیں گے: جنت میں داخل ہو جاؤ عمل کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہے۔ ابن سلام نے کہا: فرشتے انہیں کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ یعنی دار آخرت جس میں تم ہو یہ کتنا عمدہ ہے، اس میں تم نے وہی کام کیا جو تم اس سے پہلے والے دار میں کرتے رہے: عُقْبٰى اسی بنیاد پر اسم ہے اور الدَّارِ یہ دنیا ہے۔ ابو عمران جونی نے کہا: فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یعنی جنت، دوزخ کی نسبت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

کتنا عمدہ گھر ہے اور انہیں سے مروی ہے: فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یعنی جنت، دنیا کی نسبت کتنا عمدہ گھر ہے(1)۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

''اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کیے ہوئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے اور (فتنہ و) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے) اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیوی زندگی (کی راحتوں) سے اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر متاع حقیر''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ جب اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرنے والوں اور اپنے حکم پر عمل پیرا ہونے والوں کا ذکر فرما چکا تو اب ان کا ذکر فرما رہا ہے جو ان کے برعکس ہیں۔ ''نقض المیثاق'' سے مراد اس کے حکم کا ترک ہے۔ ایک قول یہ ہے: اپنے عقلوں کو مہمل چھوڑ دینا مراد ہے، کہ وہ عقل کے ذریعے تدبر نہیں کرتے تا کہ اللہ کو پہچان لیں۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ یعنی قطع تعلق کرتے ہیں اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کے عہد کو قطع کرتے ہیں۔ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی کفر اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ یعنی رحمت سے دوری اور محرومی۔ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ اس سے مراد سؤ المنقلب ہے اور وہ جہنم ہے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! یہ آزاد لوگ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ جب اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کے انجام کو ذکر فرمایا تو پھر یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کیونکہ یہ دار الامتحان ہے، پس کافر پر رزق کی کشادگی اس کی عزت کی دلیل نہیں اور نہ ہی کسی مومن پر رزق کی تنگی اس کی اہانت کی دلیل ہے۔ يَقْدِرُ کا معنی ''یضیق'' ہے یعنی وہ تنگ کرتا ہے۔ اسی سے وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الطلاق: 7) ہے یعنی اس نے تنگ کیا اور ایک قول کے مطابق يَقْدِرُ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضرورت کی مقدار عطا فرماتا ہے۔ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی مشرکین مکہ دنیا پر خوش ہیں اور اس کے علاوہ سے واقف نہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس سے جاہل ہیں۔ یہ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ پر معطوف ہے۔ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت یہ ہے: والذین ینقضون عہداللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما أمراللہ بہ أن یوصل

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

ویفسدون فی الأرض وفرحوا بالحیاۃ الدنیا۔

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ ، فِي الْاٰخِرَةِ سے مراد فی جنب الاخرۃ ہے یعنی آخرت کے پہلو میں اِلَّا مَتَاعٌ یعنی متاعٌ من الأمتعۃ جس طرح پیالا اور وہ چھوٹا برتن جس میں سالن کھایا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: تھوڑی چیز جو چلی جانے والی ہے، دن چڑھا تو اسے زوال لازمی آئے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس طرح کا زادِ راہ ہے جس طرح ایک چرواہے کے پاس زادِ راہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: متاع الحیاۃ الدنیا سے مراد دنیوی زندگی کا وہ حصہ ہے جس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس سے مراد تقویٰ اور نیک عمل میں سے جو اس دنیا سے آخرت کی طرف بطورِ زادِ راہ لے جاتا ہے وہ ہے۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝۲۷ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

''اور کفار کہتے ہیں: (اگر یہ سچے نبی ہیں) تو کیوں نہ اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے، آپ فرمائیے: (نشانیاں تو بہت ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور رہنمائی فرماتا ہے اپنی (بارگاہ قرب کی) طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکرِ الٰہی سے دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرما دیا ہے کہ کفار کا سچائی پر دلالت کرنے والی ایک نشانی کو دیکھ لینے کے بعد رسولوں پر کئی نشانیوں کو پیش کرنے کا مطالبہ جہالت پر مبنی ہے اور یہ کہنے والے عبداللہ بن ابی امیہ اور اس کے وہ ساتھی ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ عزوجل يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ یعنی جس طرح اس نے کئی آیات کے نزول کے بعد تمہیں گمراہ کیا اور ان سے استدلال سے تمہیں محروم رکھا اسی طرح وہ ان کے علاوہ کئی آیات کے نزول کے وقت تمہیں گمراہ کرے گا۔ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۔ اَنَابَ سے مراد ہے جس نے رجوع کیا۔ اور اِلَيْهِ کی ضمیر حق، اسلام یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی وہ اپنے دین اور اطاعت کی طرف اسے ہدایت دیتا ہے جو اپنے دل کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اِلَيْهِ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اَلَّذِيْنَ مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے؛ یعنی یَهْدِی اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مَنْ اَنَابَ کے ارشاد سے بدل ہے۔ وہ بھی محل نصب میں ہے۔ وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذریعے سکون پذیر اور مانوس ہوتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی وہ اپنی زبانوں کے ذریعے اللہ کا ذکر کر کے ہمیشہ اپنے دلوں کو اطمینان دیتے ہیں، یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مجاہد اور قتادہ وغیرہ نے کہا: ذکر سے مراد قرآن ہے۔ حضرت

سفیان بن عیینہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا امر ہے۔ مقاتل کے نزدیک اللہ کا وعدہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس کے نام کی قسم ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فضل و انعام کے ذکر کے ذریعے وہ اطمینان حاصل کرتے ہیں، جس طرح اس کے عدل، انتقام اور قضا کے ذکر سے کانپتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی آیات میں غور وفکر کرتے ہیں تو بصیرت سے اس کی قدرت کے کمال کو پہچانتے ہیں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ یعنی مومنین کے دل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا تعلق قسم کے ساتھ ہے، جب مدمقابل اللہ کے نام کی قسم اٹھاتا ہے تو بندہ مومن کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس سے اللہ کا ثواب مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق اللہ کا وعدہ مراد ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل (بھی) نیک کیے مژدہ ہو ان کے لیے اور (انہی کے لیے) اچھا انجام ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ مبتدا اور خبر ہے ایک قول یہ ہے: اس کا معنی لَهُمْ طُوْبٰى ہے، طُوْبٰى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اس صورت میں تقدیر عبارت: جَعَلَ لَهُمْ طُوْبٰى ہوگی اور مذکورہ دونوں صورتوں میں وَحُسْنُ مَاٰبٍ کا اس پر عطف ہوگا، تو اس کو رفع بھی دیا جا سکتا ہے اور نصب بھی۔

عبدالرزاق نے ذکر کیا: ہمیں معمر نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن عمرو بن ابی یزید بکالی عن عتبہ بن عبد السلمی بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے آپ سے جنت اور حوض کوثر کے بارے میں پوچھا اس نے کہا: کیا اس میں پھل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے''۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہماری زمین میں کون سا درخت اس کے مشابہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تیری زمین کے درختوں میں سے کوئی بھی اس کے مشابہ نہیں کیا تو شام گیا ہے وہاں ایک درخت ہے جسے ''جوزہ'' کہا جاتا ہے جو تنے پر اگتا ہے اور اپنے اوپر والے حصے کو پھیلا دیتا ہے''۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کے تنے کی موٹائی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں میں سے جذعۃ کے ساتھ سفر کرے تو تب بھی تو اس کے تنے کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بڑھاپے کے سبب اس کی ہنسلی کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں''۔ اور راوی نے حدیث ذکر کی، اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں ''ابواب الجنۃ'' میں مکمل طور پر لکھ دیا ہے۔ والحمدللہ۔

ابن مبارک نے ذکر کیا اور کہا: أخبرنا معمر عن الأشعث عن عبد اللہ عن شهر بن حوشب عن ابی هريرة رضی اللہ عنه آپ نے فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے اسے ''طوبیٰ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے وہ پیدا کر جو یہ چاہے تو وہ اس کے لیے زین، لگام اور اس کی ہیئت سمیت ایک گھوڑا پیدا کرے گا جس طرح وہ چاہے گا، اور سواری والے جانور سے کجاوے، مہار اور اس کی ہیئت سمیت پیدا کرے گا جو وہ چاہے گا یعنی خالص حصے اور کپڑے۔

حضرت ابن وہب نے شہر بن حوشب والی حدیث حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کی ہے آپ نے کہا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے ہر گھر میں اس کی کوئی نہ کوئی ٹہنی ہوگی، کوئی خوبصورت پرندہ نہیں جو اس میں نہ ہو اور نہ ہی کوئی پھل ہے جو اس

میں نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل جنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محل میں ہوگی، پھر اس کی ٹہنیاں اہل جنت کے گھروں میں تقسیم ہوں گی جس طرح تمام اہل دنیا میں آپ کی بارگاہ سے علم اور ایمان پھیلتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: طُوْبٰى لَهُمْ کا مطلب ہے کہ ان کے لیے خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ طوبیٰ حبشی زبان میں جنت کا نام ہے، یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔

حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہندی زبان میں یہ باغ ہے، قشیری نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ دو زبانوں کو جوڑتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: طُوْبٰى لَهُمْ یعنی ان کے لیے بھلائی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ان کے لیے نعمت ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: ان کے لیے بہتری ہے، انہیں سے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے عزت ہے۔ ضحاک نے کہا: ان کے لیے خوشی و سرور ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سارے اقوال قریب قریب ہیں، کیونکہ ''طوبیٰ'' طیب سے فعلی کا وزن ہے، یعنی ان کے لیے پاکیزہ زندگی ہوگی اور یہ ساری چیزیں پاکیزہ چیز کی طرف ہی راجع ہیں۔ زجاج نے کہا: ''طوبیٰ'' طیب سے فُعلیٰ کا وزن ہے، اور یہ ان کی پاکیزگی کی حالت ہے، اس کی اصل طُیبیٰ ہے، ''یا'' ساکن ماقبل مضموم واو سے بدل گئی جس طرح کہ: موسرٌ اور موقن۔

میں (قرطبی) نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ یہ درخت ہے، اس کی دلیل ہماری ذکر کردہ مرفوع حدیث ہے، یہ روایت سہیلی کی ذکر کردہ شرائط کے مطابق صحیح ہے، اس کو ابو عمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اسے ذکر کیا ہے۔ المہدوی اور قشیری نے بھی اسے معاویۃ بن قرۃ عن ابیہ روایت کیا ہے(1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست (قدرت) سے لگایا اور اس میں اپنی روح پھونکی زیورات اور حُلّے اگاتا ہے اور اس کی ٹہنیاں جنت کی دیواروں کے پیچھے سے دکھائی دیتی ہیں۔'' جو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ثعلبی کا مطالعہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے اس کی اصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہے اور ہر مومن کے گھر میں اس کی ایک ٹہنی ہے۔ حضرت ابو جعفر محمد بن علی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں اور اس کی ٹہنیاں جنت میں ہیں''۔ آپ کو عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! آپ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اصلھا فی دار علی و فرعھا فی الجنۃ۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل جنت میں میرا گھر اور علی کا گھر ایک ہی جگہ پر ایک ہی ہوگا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی مروی ہے: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں ہے اور تم میں سے ہر ایک کے گھر میں اس کی ٹہنی لٹکی ہوئی ہے''۔ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ جب کوئی واپس لوٹے تو ''آب'' کہا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہوگا: الذین آمنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ و عملوا الصالحات طوبیٰ لھم۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْۤ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 354

اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ‌ؕ قُلۡ هُوَ رَبِّىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ۚ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ مَتَابِ ۝

''اسی طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ایک قوم میں جس سے پہلے گزر چکی ہیں کئی قومیں تا کہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں وہ (کلام) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمن کا، فرمایئے: وہی میرا پروردگار ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اسی پر ہی میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی جناب میں رجوع کیے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِىۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهَاۤ اُمَمٌ یعنی ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا، یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا اس پر ہونے والے انعام کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر ہونے والے انعام کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی طرف آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا گیا۔ لِّتَتۡلُوَا۟ عَلَيۡهِمُ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ یعنی قران وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ مقاتل اور ابن جریج نے کہا: یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی جب انہوں نے کتاب الصلح لکھنا چاہی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا(1): بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لکھو'' سہیل بن عمرو اور مشرکین نے کہا: ہم سوائے صاحب یمامہ کے رحمن کو نہیں جانتے، صاحب یمامہ سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا، لہٰذا اکتب باسمك اللهم اسی طرح زمانہ جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''یہ لکھو جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح ہوئی ہے''(2)۔ قریش کے مشرکین نے کہا: اگر آپ رسول تھے تو ہم نے آپ کے ساتھ جنگ کی اور تیرا راستہ روکا تو گویا ہم نے آپ کے ساتھ ظلم کیا ہے، (وہ نہ لکھو) بلکہ یہ لکھو: یہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کہا: ہمیں چھوڑ دیجیے ہم ان کے ساتھ جنگ کریں گے، آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ وہ لکھو جو یہ چاہتے ہیں''۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ قریش کفار کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اُسجدوا للرحمن رحمن کو سجدہ کرو۔ تو انہوں نے کہا: رحمن کون ہے؟ تو یہ حکم نازل ہوا کہ قُلۡ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جنہوں نے آپ کا انکار کیا ہے انہیں فرمایئے هُوَ رَبِّىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اگرچہ اس کے صفاتی نام مختلف ہیں۔ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا وَاِلَيۡهِ مَتَابِ یعنی کل میرا لوٹنا اسی کی طرف ہوگا اور آج بھی میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے میں اس کی قضا پر راضی اور اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔ ایک قول یہ بھی ہے: ابو جہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ اے رحمٰن تو اس نے کہا: محمد ہمیں کئی معبودوں کی عبادت سے روکتا ہے اور خود دو معبودوں کو پکارتا ہے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ بھی نازل ہوئی قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ (الاسراء:110)

وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُيِّرَتۡ بِهِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِهِ الۡاَرۡضُ اَوۡ كُلِّمَ بِهِ الۡمَوۡتٰى‌ؕ بَلْ لِّلّٰهِ

1۔ کنز العمال، غزوۂ حدیبیہ، جلد 10، صفحہ 480، حدیث 3151 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 342

الْاَمْرُ جَمِیْعًا ؕ اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۳۱﴾

''اور اگر کوئی ایسا قران اترتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس کے اثر سے پھٹ جاتی زمین یا مردوں سے اس کے ذریعہ بات کی جا سکتی (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں (باینہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اور کفار اس حالت میں رہیں گے کہ پہنچتا رہے گا انہیں (آئے دن) اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی صدمہ یا اترتی رہے گی کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے گھروں کے گردونواح میں یہاں تک کہ آ جائے اللہ کے وعدہ (کے ظہور کا دن) بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کے ساتھ متصل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ جس میں ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی بھی تھے کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا آپ ان کے پاس آئے تو عبداللہ نے آپ کو کہا: اگر آپ کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں تو قران کے ذریعے ہمارے پہاڑ کو چلا، اس کو ہم سے دور لے جا یہاں تک کہ یہ پھٹ جائے، یہ تنگ زمین ہے اور اس میں ہمارے لیے چشمے اور نہریں بنا دے تاکہ ہم اس میں درخت لگائیں اور فصلیں کاشت کریں، آپ کے خیال کے مطابق آپ اپنے رب کے نزدیک داؤد سے زیادہ کمزور نہیں ہیں کہ ان کے لیے اللہ نے پہاڑوں کو مسخر کیا وہ ان کے ساتھ چلتے تھے۔ اور ہمارے لیے ہوا کو مسخر کرو، ہم ان پر سوار ہو کر شام کو جائیں اسی پر اپنی ضروریات اور کام کریں، پھر آج ہی واپس لوٹ آئیں، آپ کے خیال کے مطابق سلیمان کے لیے ہوا مسخر تھی آپ اپنے رب کے نزدیک سلیمان بن داؤد سے زیادہ کمزور نہیں۔ ہمارے لیے اپنے دادا کی پرانی ہڈی کو زندہ کیجیے یا ہمارے مردوں میں سے جس کو چاہو زندہ کر دو تاکہ ہم اس سے سوال و جواب کریں کہ کیا جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ حق ہے یا باطل؟ عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور آپ اپنے رب کے نزدیک ان سے زیادہ کم مرتبہ نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے (1): وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ الآیہ نازل فرمایا: زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ اور ضحاک نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور جواب محذوف ہے اس کی تقدیر لکان ھذا القران ہے، لیکن اسے ایجاز اً حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام کے ظاہر میں اس پر دلالت موجود تھی۔

جس طرح امرؤ القیس نے کہا:

فَلَوْ اَنَّهَا نفسٌ تَمُوتُ جمیعۃً ولٰکِنَّهَا نفسٌ تَسَاقَطُ اَنْفُسَا

اس سے مراد ہے کہ لَهَانَ علیّ یہ حضرت قتادہ کے قول کا معنی ہے، آپ نے کہا: اگر تمہارے قران سے پہلے کسی قران

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 357

نے ایسا کیا ہے تو تمہارا قرآن بھی ضرور ایسا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا جواب مقدم ہے، اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی وهم یکفرون بالرحمن لو أنزلنا القرآن وفعلنا بهم ما اقترحوا۔ فرا نے کہا: جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اگر قرآن ان کے ساتھ یہ بھی کر دیتا تو بھی وہ رحمن کا انکار کرتے"۔ زجاج نے کہا: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سے لے کر الموتی تک پڑھنے کے بعد جواب ہے لما آمنوا کہ تب بھی وہ ایمان نہ لاتے یہاں تو مضمر جواب وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ سے لے کر مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ (انعام: 111) تک کے ارشاد سے زیادہ ظاہر ہے۔ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا یعنی وہ تمام امور کا مالک ہے، اس میں سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو تم چاہتے ہو یہ قرآن کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ الله کے امر کے ذریعے ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا، فراء نے کہا کہ کلبی نے کہا ہے: نخع کی لغت یہ ہے کہ ییئس بمعنی یعلم ہے اس کو قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے؛ یعنی أفلم یعلموا جوہری نے "الصحاح" میں بھی یہی بیان کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ ہوازن کی لغت ہے؛ یعنی أفلم یعلم؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور حسن سے بھی مروی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: أفلم یعلموا و یتبیّنوا یعنی کیا وہ نہیں جانتے اور ان کو واضح نہیں ہوا، اس سلسلہ میں ابو عبیدہ نے مالک بن عوف نصری کا شعر پڑھا ہے:

أَقُولُ لَهُمْ بِالشِّعْبِ إِذْ يَيْسِرُونَنِي     أَلَمْ تَيْأَسُوا أَنِّي ابْنُ فَارِسِ زَهْدَمِ(1)

أَلَمْ تَيْأَسُوا شعر میں بھی أَلَمْ یعلموا کے معنی میں ہے۔

یَیسِرونَنی، میسر سے ہے سورۂ "بقرہ" میں یہ گزر چکا ہے اور یاسرونی کا الأسر سے مشتق ہونا بھی مروی ہے۔ رجاح بن عدی نے کہا:

أَلَمْ يَيْئَسِ الأَقْوَامُ أَنِّي أَنَا ابْنُهُ     وَإِنْ كُنْتُ عَنْ أَرْضِ الْعَشِيرَةِ نَائِيًا

یہاں بھی اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ بمعنی أَلَمْ یعلم ہے۔ اور کتاب الرد میں أنی أنا ابنه ہے۔ غزنوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے: یعنی ألم یعلم معنی یہ ہوگا: کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر الله تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو بغیر ان کے نشانیاں دیکھنے کے ہدایت دے دیتا۔ ایک قول یہ ہے: یہ یأس جو کہ معروف ہے اسی سے ہے، یعنی کیا ایمان والے ان کافروں کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر الله تعالیٰ انہیں ہدایت دینا چاہتا تو ہدایت دے دیتا، کیونکہ مومنین نے کفار کے ایمان میں طمع کرتے ہوئے نزول آیات کی تمنا کی۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے: أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے جو کہ "البیان" سے ہے۔ قشیری نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا گیا کہ لکھا ہوا تو اَفَلَمْ یَایْــٴَـسْ ہے آپ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ کاتب نے اسے لکھا تو وہ اونگھ کی حالت میں تھا، یعنی اس نے کچھ حروف زیادہ کر دیے حتیٰ کہ یَاْیْــٴَـسْ ہو گیا۔ ابو بکر انباری نے کہا: عکرمہ نے ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس نے أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اور جس نے اس کی تلاوت میں درست سمجھا اس نے اس سے ہی استدلال کیا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باطل ہے، کیونکہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 530

مجاہد اور سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے۔ پھر اس کا معنی: أَفَلَمْ يَتَبَيَّنْ ہے، پس اگر اللہ کی مراد اس لفظ کے تحت ہے جس کے ذریعے انہوں نے اجماع کی مخالفت کی ہے تو ہماری قرأت اس پر واقع ہوگی اور اس کی تاویل آئے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے وہ دوسرا معنی مراد لیا ہے جس میں یاس ہے جو علم کے طریق سے نہیں تو جو اعتراض انہوں نے کیا ہے وہ ساقط ہوگیا، اور جہاں تک اس کے سقوط کا تعلق ہے تو یہ قرآن کو باطل کر دیتا ہے اور قرآن والوں پر بہتان لازم آتا ہے۔ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ، اَنْ مخففہ من المثقلہ ہے۔ یعنی اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ، لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا یہ قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ یعنی مصیبت جو ان کو ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے پریشان کرے گی، جب کسی کو مصیبت لاحق ہو تو قرعہ أمرٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع قوارع ہے اور قرع میں اصل ضرب المثل ہوتی ہے شاعر نے کہا:

أَفْنَى تِلَادِي وَمَا جَمَّعْتُ من نَشَبٍ   قَرْعُ القَوَاقِيزِ أَفْوَاهَ الأَبَارِيقِ

یعنی کفار اس حالت میں رہیں گے کہ جس طرح مشرکین کے سرداروں کو استہزاء کی وجہ سے عذاب نے پکڑا تھا اسی طرح ان کو بھی بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دینے والی مصیبت و صدمہ پہنچتا رہے گا جس طرح اربد کو لاحق ہوا تھا اسی طرح قتل، قید، قحط سالی یا اس کے علاوہ عذاب و آزمائش کی صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صدمہ انہیں ملتا رہے گا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا: القارعة کا معنی النكبة یعنی مصیبت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ نے یہ بھی کہا ہے: القارعة سے مراد وہ جنگیں اور سرایا ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بھیج دیئے تھے۔ اَوْ تَحُلُّ یا مصیبت اترتی رہے گی قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ یہ حضرت قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: أوتحل أنت قريباً من دارهم۔ ایک قول یہ ہے: آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی پس وہ ان کے صحن میں یا ان کے بالکل قریب نازل ہوئی جس طرح مدینہ اور مکہ کے گاؤں ہیں۔ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ یعنی فتح مکہ میں، یہ حضرت مجاہد و قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مکہ میں نازل ہوئی، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی، اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس سے نکل کر مدینہ چلے جائیں گے، تو یہ مصیبت ان کے گھروں کے قریب یا ان کا محاصرہ کرتے ہوئے اترے گی اور یہ محاصرہ اہل طائف کا اور خیبر کے قلعہ کا تھا اور آپ کے پاس ان کے ساتھ جنگ اور سختی کرنے کی اجازت کے ذریعے اللہ کا وعدہ آجائے گا۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ کے وعدہ سے مراد قیامت کا دن ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

''اور بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گزرے پس میں نے ڈھیل دی کافروں کو (کچھ عرصہ تک) پھر میں نے پکڑ لیا انہیں تو (دیکھو) کیسا (بھیانک) تھا میرا عذاب۔ کیا وہ جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ (ان کے بتوں جیسا ہے؟ ہرگز نہیں) اور ان مشرکین نے بنا لیے ہیں اللہ تعالیٰ کے شریک۔ فرمایئے: ذرا نام تو لو ان کا (نادانو!) کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو ایسی بات سے جسے وہ (ہمہ دان) ساری زمین میں نہیں جانتا یا یونہی یاوہ گوئی کر رہے ہو، بلکہ آراستہ کر دیا گیا ہے کافروں کے لیے ان کے مکر و فریب اور روک دیئے گئے ہیں راہ (راست) سے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ان (بدبختوں) کے لیے عذاب ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بڑا سخت ہوگا اور نہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی بچانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ۔ الاستهزاء کا معنی سورۂ ''بقرہ'' میں اور الاملاء کا معنی ''آل عمران'' میں گزر چکا ہے، یعنی ان کا تمسخر اڑایا گیا اور ان کے ساتھ زیادتی کی گئی، پس میں نے کافروں کو کچھ مدت مہلت دی تا کہ جو میرے علم میں تھے کہ ایمان لائیں گے وہ ایمان لے آئیں، جب قضاء پوری ہوئی تو میں نے عقوبت کے ذریعے انہیں پکڑ لیا۔ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ یعنی آپ نے کیسا دیکھا جو میں نے ان کے ساتھ کیا؟، پس آپ کی قوم کے مشرکین کے ساتھ بھی میں اسی طرح کروں گا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ یہ قیام وہ نہیں جو قعود کی ضد ہوتا ہے بلکہ مخلوق کے امور کی ولایت کے معنی میں ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: قام فلان بشغل كذا، فانه قائم على كل نفس بما كسبت یعنی وہ ہر نفس کے اعمال کی نگہبانی کرتا ہے، اسے پیدا کرتا ہے، اسے رزق دیتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے عمل پر اسے جزا دیتا ہے، معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسا حفاظت کرنے والا ہے جو غافل نہیں ہوتا، جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا: کیا غافل نہ ہونے والا نگہبان اس کی طرح ہے جو غافل ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ میں قَآىِٕمٌ کا معنی عالم جاننے والا ہے۔ یہ اعمش کا قول ہے۔

شاعر نے کہا:

فلولا رجالٌ من قريش أعزةٌ سَرَقْتُمْ ثيابَ البيت واللهُ قائمٌ

اللہ جانتا ہے کہ اگر قریش کے سرداروں کا تجھے خوف نہ ہوتا تو تم بیت اللہ کا غلاف بھی چرا لیتے۔

واللہ قائم یعنی واللہ عالم، پس اللہ تعالیٰ ہر نفس کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ ایک قول کے مطابق ضحاک کے نزدیک: اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو بنی آدم کے موکل ہیں وَ جَعَلُوْا حال ہے، یعنی قد جعلوا یا اسْتُهْزِئَ پر عطف ہے یعنی استهزئ

وَجَعَلُوا، یعنی انہوں نے نام رکھ دیا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ جو اللہ کے شریک ہیں، شُرَكَآءَ سے مراد وہ بت ہیں جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے۔ قُلْ سَمُّوْهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان کو فرمائیے: سَمُّوْهُمْ یعنی ان کے نام تو بیان کرو، یہ دھمکی کے طور پر ہے، یعنی انہوں نے نام بھی رکھے ہوئے ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ اور ہبل وغیرہ۔ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ۔ اَمْ استفہامیہ بطور توبیخ ہے یعنی کیا تم اسے آگاہ کرتے ہو۔ درحقیقت یہ گزشتہ استفہام پر عطف معنوی ہے، کیونکہ سَمُّوْهُمْ کا معنی ہے أَلَهُم أَسْمَاءُ الخَالِقِينَ۔ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ؟ ایک قول یہ بھی ہے: معنی یہ ہے کہ آپ ان کو فرمائیے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو کسی باطنی بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جسے وہ نہیں جانتا یا ظاہری قول کی بات کرتے ہو جسے وہ جانتا ہے، اگر وہ کہیں کہ باطن کے متعلق جس کو وہ نہیں جانتا تو یہ محال ہے اور اگر وہ کہیں ظاہر کی بات ہے جسے وہ جانتا ہے تو آپ انہیں فرمائیے: ان کے نام تو بتاؤ، پھر اگر وہ لات و عزیٰ کا نام لیں تو آپ انہیں فرمائیں: اللہ تو اپنے لیے کسی کو شریک نہیں جانتا۔ ایک قول کے مطابق: اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ کا عطف اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ پر ہے یعنی کیا وہ جو نگہبان ہے یا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جس کو وہ نہیں جانتا، یعنی تم اللہ کا شریک بناتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا، کیا تم اسے زمین میں اپنے کسی شریک سے آگاہ کرتے ہو حالانکہ وہ اسے نہیں جانتا؟ اور زمین میں شریک کے ہونے کی نفی اس لیے کی ہے کہ زمین کے علاوہ کسی اور مقام پر تو اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں کیونکہ مشرکین نے زمین میں ہی اس کے شرکاء کا دعویٰ کیا ہے۔ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کا معنی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل فرمایا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس کا معنی باطل ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

أَعَيَّرْتَنَا أَلْبَانَهَا وَلُحُومَهَا وَذَالِكَ عَارٌ يا بن رَيطةَ ظَاهِرُ

عار ظاهر سے مراد باطل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد بکذب من القول یعنی یاوہ گوئی ہے۔ اور پانچواں احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ایک ایسی محبت ہوگی جس کو وہ اپنی گفتگو کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں اور کلام کا معنی یہ ہوگا: کیا تم اسے اس کی خبر مشاہدہ کر کے دیتے ہو یا بطور دلیل تم یہ بات کرتے ہو؛ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ یعنی اس کو چھوڑیئے، بلکہ کافروں کے لیے ان کا مکر و فریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس طریقے سے یہ استدراک ہے، یعنی اللہ کا کوئی شریک نہیں، لیکن کافروں کے لیے ان کا مکر و فریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے بَل زَيَّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكرَهُم پڑھا ہے یعنی فعل مجہول کے بجائے فعل معروف۔ اور جماعت کی قرات کے مطابق جس ذات نے کافروں کے لیے ان کے مکر و فریب کو آراستہ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول کے مطابق: وہ شیطان ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفر کو ہی مکر کہہ دیا گیا ہو، کیونکہ رسول کے ساتھ ان کا مکر کفر ہی تھا۔ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں راہ (راست) سے روک دیا، یہ حمزہ اور کسائی کی قرات ہے جبکہ باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے یعنی صَدُّوا ابوحاتم نے بھی اللہ تعالیٰ کے دیگر ارشادات کی وجہ سے اسے ہی اختیار کیا ہے جیسے وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ''(الاعراف: 86) اور هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الفتح: 25) اور زین اور صدوا میں ضمہ کی قرات بھی عمدہ ہے کیونکہ اہل سنت کے مذہب میں یہ معلوم بات ہے کہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے؛ تو اس آیت میں قدر کا اثبات ہے یہی ابو

عبید کا مختار ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور علقمہ نے اسے صدُّوا صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح ھٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رِدَّتْ اِلَیْنَا میں رِدَّتْ کو را کے کسرہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے۔ ان کی اصل صُدِدُوا اور رُدِدَتْ ہے، جب پہلی دال کا دوسری دال میں ادغام کیا گیا تو اس کی حرکت ماقبل کو دی گئی تو پہلے حرف پر کسرہ آ گیا۔ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ یعنی اس کی ذلت و رسوائی کے ذریعے فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ هَادٍ سے مراد توفیق دینے والا ہے۔ اس صورت میں کوفیوں اور ان کے متبعین کی قرات کا ثبوت ہے، اس کی دلیل اللہ کا ارشاد وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ اور وَ صُدُّوا ہے، جبکہ بڑے بڑے قراء بغیر یا کے دال پر وقف کرتے ہیں، اسی طرح والٍ اور واقٍ وغیرہ کیونکہ آپ کسی آدمی کے بارے میں کہتے ہیں: ھذا قاضٍ و والٍ وھادٍ تو آپ یا کو اس کے ساکن ہونے اور تنوین کے ساتھ التقاء کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس کو فمالہ من ھادی و والی و واقی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت کے مطابق ہوگا جو ھذا داعی و والی و واقی یا کے ساتھ پڑھتے ہیں، کیونکہ یا کا حذف تو حالت وصل میں تنوین کے ساتھ التقاء ساکنین کی وجہ سے ہوتا ہے، اور ہماری یہ قرات وقف کی صورت میں ہے، لہٰذا یا واپس لوٹ آئے گی تو ھادی، والی اور واقی ہو جائے گا۔ خلیل نے قاضٍ کی ندا کے بارے میں: یا قاضی یا کو ثابت رکھ کے کہا ہے، کیونکہ نداء کی صورت میں تنوین نہیں آتی جس طرح الداعی اور المتعالی کی صورت میں تنوین نہیں آتی۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ عَذَابٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی راہ راست سے روکے ہوئے مشرکین کے لیے دنیا میں قتل، قید و بند اور اس کے علاوہ بیماریوں اور مصائب کی صورت میں عذاب ہے۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ یعنی اشد زیادہ سخت، جس طرح آپ کا قول: شَقَّ عَلَیَّ کذا یَشُقُّ۔ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ یعنی کوئی ایسا مانع نہیں جو انہیں اس کے عذاب سے بچا سکے اور نہ ہی کوئی دفاع کرنے والا ہے۔ اور مِن زائدہ ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

"اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسی ہے کہ رواں ہیں اس کے نیچے ندیاں، اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا سایہ بھی نہیں ڈھلتا، یہ انجام ہے ان کا جو (اپنے رب سے) ڈرتے رہے اور کفار کا انجام آگ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ، مَثَلُ کے رفع میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے یعنی فیما یتلی علیکم مثل الجنۃ خلیل نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، جبکہ اس کی خبر تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہے یعنی صفۃ الجنۃ التی وعد المتقون تجری من تحتھا الانھار، جس طرح کہ تیرا قول: قولی یَقُوْمُ زَید میں قولی مبتدا ہے اور یَقُوْمُ زَید اس کی خبر، اور مَثَلُ بمعنی صفت تو موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (الفتح: 29) مَثَلُھم سے مراد صِفتھم ہے۔ اور وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (النحل: 60) یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے صفت علیا ہے، ابوعلی نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: مثل بمعنی صفت سنا ہی نہیں گیا،

اس کا معنی شبہ ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اسے اس کی جگہوں اور متصرفات میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے عربوں کا قول: مررت برجل مثلك اور یوں بھی کیا جاتا ہے: مررت برجل شبهك اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ درست نہیں کیونکہ مثل کا معنی جب صفت لیا جائے گا تو تقدیر کلام ہوگا: صفة الجنة التی فیها أنهار۔

اس کی جنت کی صفت جس میں نہریں ہیں، تو یہ معنی درست نہیں، کیونکہ جنت میں انھار بذات خود ہیں جنت کی صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہم سے غیب چیز کی مثال ایسی چیز کے ساتھ بیان فرمائی جس کو ہم دیکھتے ہیں، معنی یہ ہوگا کہ جنت کی مثال ایسی جنت (باغ) کی طرح ہے جس کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ ابوعلی نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا: اس قول کے مطابق مثل یا صفت ہوگی یا شبہ، تو ان دونوں صورتوں میں جو کچھ کہا گیا وہ درست نہیں، کیونکہ اگر یہ بمعنی صفت ہو تب بھی صحیح نہیں کیونکہ جب آپ ،؛ صفة الجنة جنة کہیں گے تو آپ نے جنة کو خبر بنا دیا جو کہ درست نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ الجنة صفت نہیں ہوتی، اسی طرح جنت کی شبہ جنت بھی نہیں ہوتی، آپ نہیں دیکھتے کہ شبہ تو دو متماثل چیزوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلت ہوتی ہے تو یہ حدث ہے جب کہ جنت تو حدث نہیں، وہ تو پہلی اور دوسری نہیں ہوتی۔ فراء نے کہا: المثل صرف تاکید کے لیے ہے، اور معنی ہوگا: الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۭ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ اور عرب مَثَل کے ذریعے ایسا اکثر کرتے ہیں جس طرح اللہ کا ارشاد: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) یعنی لیس هو کشیء ایک قول کے مطابق تقدیر پر کلام ہی صفة الجنة التی وعد المتقون۔ صفة جنة، تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے: اس جنت کا حسن، نعمت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت جس کا پرہیزگاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح ہے جس طرح دوزخ کا عذاب، شدت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے، اُكُلُهَا دَآئِمٌ ختم نہیں ہوتا، حدیث میں ہے: ''جب ایک کھجور لے لی جائے گی تو اس کی جگہ دوسری آجائے گی''۔ ہم (قرطبی) نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے۔ وَظِلُّهَا یعنی اس کا سایہ بھی اسی طرح ہے۔ اس کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی اس کا پھل ختم نہیں ہوتا اور اس کا سایہ زائل نہیں ہوتا۔ یہ جہمی فرقے کا رد ہے جن کا خیال یہ ہے کہ جنت کی نعمت زائل بھی ہوتی ہے اور فنا بھی۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۚ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ یعنی مکذبین کے معاملے کی عاقبت اور ان کی آخرت دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

''اور جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ خوش ہو رہے ہیں اُس کتاب پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو بعض قرآن کا انکار کرتے ہیں، فرما دیجئے: (مجھے تمہاری مخالفت کی پرواہ نہیں) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراوں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی بعض اہل کتاب قرآن کی وجہ سے خوش ہو رہے ہیں

جس طرح ابن سلام اور سلمان، اور وہ لوگ جو حبشہ سے آئے، لفظ عام ہے جب کہ مراد مخصوص۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو قران کے نور سے خوش ہوتے ہیں (1)۔ مجاہد اور ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔ اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کے مومن ہیں۔ ایک قول یہ ہے: یہ یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب کی ایک جماعت ہے جو نزول قران کی وجہ سے اس لیے خوش ہیں کہ یہ ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اکثر علماء نے کہا: ابتدائی نزول میں قران میں الرحمٰن کا ذکر کم تھا، جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں نے اسلام قبول کیا تو قران میں الرحمٰن کے ذکر کی کمی انھیں اچھی نہ لگی کیونکہ تورات میں ان کا ذکر زیادہ تھا۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا، تو اللہ نے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل فرمایا۔ قریش نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا دعوت تو ایک معبود کی طرف دیتا ہے تو آج اس نے دو معبودوں کی دعوت دینا شروع کر دی، ایک اللہ اور ایک الرحمٰن، اللہ کی قسم! ہم تو سوائے یمامہ کے رحمٰن کے کسی اور کو نہیں جانتے یمامہ کے رحمٰن سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھی، تو یہ آیت نازل ہوئیں: وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (الانبیاء) وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد: 30) تو اہل کتاب رحمٰن کے ذکر کی وجہ سے خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے: وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَمِنَ الْاَحْزَابِ یعنی مشرکین مکہ، اور یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں میں سے جو ایمان نہ لائے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ عرب ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر آتے رہے۔ ایک قول یہ ہے: مسلمانوں کے دشمنوں میں سے وہ مراد ہیں جو قران کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، چونکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ۔ اُشْرِكَ میں جماعت کی قراءت اعبد پر عطف کی وجہ سے نصب دی ہے۔ ابو خالد نے جملہ مستانفہ کی حیثیت سے اس کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی میں عبادت کے سلسلہ میں اسے یکتا مانتا ہوں کوئی اس کا شریک نہیں اور مشرکین سے جس نے المسیح بن اللہ، عزیر بن اللہ کہا اور یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھنے والے سے بیزار ہوں۔ اِلَيْهِ اَدْعُوْا یعنی اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہوں وَاِلَيْهِ مَاٰبِ یعنی اپنے تمام اُمور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

''اور اسی طرح ہم نے اُتارا ہے اسے فیصلہ عربی زبان میں، اور اگر تم پیروی کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آچکا تمہارے پاس صحیح علم تو نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ''۔

قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا یعنی جس طرح ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تو بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا

1۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 256

اسی طرح ہم نے اسے عربی زبان میں فیصلہ نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت، عربیا، بیان فرمائی کیونکہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو اس حالت میں نازل فرمایا کہ یہ عربی ہے، تو انھیں لوگوں نے اس فیصلے کا بھی انکار کیا۔ ایک قول کے مطابق نظم آیت ہے کہ جس طرح ہم نے رسولوں پر ان کی زبان میں کتابیں نازل کیں اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن کو عربی زبان میں فیصلہ نازل فرمایا، عَرَبِيًّا سے مراد ''عربی زبان میں'' ہے۔ اور حکم سے مراد وہ احکامات ہیں جو اس میں ہیں۔ ایک قول یہ ہے: ''حکم عربی'' سے مراد سارا قرآن ہے کیونکہ یہ حق و باطل میں فرق اور فیصلہ کرتا ہے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی عبادت اور غیر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے میں مشرکین کی خواہشات (کی اگر آپ نے پیروی کی) بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ یعنی ایسا مددگار جو تیری مدد کرے گا۔ وَّلَا وَاقٍ جو تمہیں اس کے عذاب سے بچائے گا۔ خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد اُمت ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ۭ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝

''اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لیے بیویاں اور اولاد اور نہیں ممکن کسی رسول کے لیے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر، ہر میعاد کے لیے ایک نوشتہ ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ازواج مطہرات کے حوالے سے نقطہ چینی کی انھوں نے کہا: ہم اس آدمی کے سوائے بیویوں اور نکاح کے کوئی خواہش نہیں دیکھتے، اگر یہ نبی ہوتا تو امر نبوت اس کو نکاح سے مشغول رکھتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو حضرت داود و سلیمان علیہما السلام کا معاملہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً یعنی ہم نے ان کو بشر بنایا اور شہوات دنیا میں جو اللہ نے حلال کیں ان کو وہ پورا کرتے ہیں ان کی تخصیص صرف وحی میں ہے (یعنی ان کے پاس وحی آتی ہے)

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت نکاح میں ترغیب پر دلالت کرتی ہے اور اس پر ابھارتی ہے، جبکہ تبتُّل یعنی ترک نکاح سے روکتی ہے، اس آیت کے مطابق یہ رسولوں کی سنت ہے اور سنت بھی اس کے معنی پر وارد ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم شادیاں کرو، میں تمہاری وجہ سے دیگر اُمتوں پر کثرت دکھانے والا ہوں گا'' (1)۔ الحدیث، سورۂ ''آل عمران'' میں یہ گزر چکی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جس نے شادی کی اس نے نصف دین کی تکمیل چاہی پس اسے دوسرے نصف کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے'' (2)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح زنا سے بچاتا ہے اور پاکدامنی ان دو خصلتوں میں سے ہے جن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی ضمانت دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کو اللہ تعالیٰ نے دو کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں داخل ہو گیا (ایک) جو دو جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) اور (دوسرا) جو ٹانگوں کے درمیان ہے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 4561		2۔ ایضاً

(شرمگاہ)"(1)۔ اس کو مؤطا اور دیگر کتب کے مصنفین نے روایت کیا ہے۔ اور صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: تین آدمیوں کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھتے رہے، جب انھیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اپنی عبادت کو کم سمجھا، انھوں نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اگلے پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا، ان میں سے ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات کو نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ساری زندگی روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا بس شادی نہیں کروں گا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے آپ نے فرمایا: "تم وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ، یہ کہا، اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تمہیں اللہ سے ڈراتا ہوں اور اس کی پرہیزگاری اختیار کرنے کا حکم دیتا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں"(2)۔ امام مسلم نے اس کو بالمعنی روایت کیا، اور یہ واضح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے کہا: اگر آپ انہیں اجازت دے دیتے تو ضرور ہم اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔ "آل عمران" میں بچے کی طلب پر ابھارنا اور جو اس سے ناواقف ہے اس کی تردید گزر چکی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے تھے: میں عورت کے ساتھ شادی کرتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور میں اس کے ساتھ وطی کرتا ہیں حالانکہ مجھے اس کی کوئی خواہش نہیں۔ آپ کو کہا گیا: اے امیر المومنین! کون سی چیز آپ کو اس پر ابھارتی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس بات کی محبت کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں سے وہ اولاد پیدا کرے جس کی وجہ سے قیامت کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیگر انبیاء پر فخر کریں گے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: "تمہارے اوپر باکرہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا لازم ہے بے شک وہ منہ کے اعتبار سے بہت زیادہ میٹھی، اخلاق کے لحاظ سے بہت زیادہ عمدہ اور بچے پیدا کرنے کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور میں قیامت کے دن تمہارے ذریعے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا(3)۔" انتق ارحاما سے آپ نے زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت مراد لی ہے؛ زیادہ بچے پیدا والی عورت کو ناتق کہا جاتا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت معقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا: ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا: مجھے ایک حسب نسب والی عورت مل رہی ہے لیکن وہ بچے نہیں جنتی، کیا میں اس کے ساتھ شادی کرلوں؟ آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ پھر وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پھر منع فرمایا، پھر تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بہت زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت کے ساتھ شادی کرو، میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا"(4)۔ ابومحمد عبدالحق نے اس کو صحیح قول قرار دیا ہے۔

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الکلام، ما جاء فیما یخاف من اللسان، جلد 2، صفحہ 988

2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 757

3۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 294، حدیث 44549۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب تزویج الابکار، حدیث 1850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 44561

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ انھوں نے آیات کے نزول کی خواہش کی تھی جس کا ذکر اسی سورت میں ہی گزر چکا ہے۔ دوبارہ اسی کے بارے میں کلام فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا۔ کلام کا ظاہر تو ممانعت پر دلالت کرتا ہے مگر اس کا معنی نفی ہے کیونکہ جس کی کوئی استطاعت ہی نہ رکھتا ہو اس کے حوالے سے اس کو منع نہیں کیا جاسکتا۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ یعنی ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا وہ اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، یہ حضرت حسن کا قول ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہوگا: لکل کتاب اجل یہ فرآء اور ضحاک کا قول ہے یعنی ہر کام جس کو اللہ نے لکھ دیا ہے اس کی مدت مقرر اور وقت معلوم ہے، اس کی مثال لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ عذاب کے نازل ہونے میں قوموں کے مطالبے بنیاد نہیں ہوتے بلکہ اس کی بنیاد لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مدت کے لیے لکھی ہوئی کتاب اور اُمر مقدر ہوتا ہے جس پر فرشتے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں شہر بن حوشب عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور سیناء میں ارتقا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی انگلی میں انگوٹھی ملاحظہ فرمائی تو فرمایا: اے موسیٰ! یہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ ان سے زیادہ اس کو جانتا تھا، آپ نے عرض کیا: مرد کے زیورات میں سے ایک چیز ہے، اللہ نے فرمایا: کیا اس پر میرے اسماء یا کلام میں سے کچھ لکھا ہوا ہے؟ آپ نے عرض کیا: نہیں، تو اللہ نے فرمایا: اس پر لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ لکھ دو۔

## يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹

''مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا ہے) اور اُسی کے پاس ہے اصل کتاب''۔

قولہ تعالیٰ: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ یعنی اس کتاب سے جس کو چاہتا ہے وہ اس کے اہل پر واقع ہو اور اس کو پہنچے تو اسے مٹاتا ہے وَ يُثْبِتُ جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے یعنی اس کے وقت تک اس کو مؤخر کر دیتا ہے۔ محوتُ الکتاب محوًا کہا جاتا ہے یعنی میں نے اس کا اثر ختم کر دیا۔

وَ يُثْبِتُ یعنی یُثبِتُہ جس طرح اللہ کا ارشاد: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (الاحزاب: 35) یعنی والذاکرات اللہ۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے وَ يُثْبِتُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات ہے اور زیادہ لوگوں کی قرأت ہونے کی وجہ سے ابو حاتم نے اور ابو عبیدہ نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد دلیل بھی ہے: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (ابراہیم: 27) ابن عمر نے کہا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے سوائے سعادت، بدبختی اور موت کے'' (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سوائے چند اشیاء کے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، تخلیق، اخلاق، موت، رزق، سعادت اور شقاوت۔ آپ ہی سے مروی ہے (2): سوائے ام الکتاب کے یہ دو کتابیں ہیں، ان دونوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ وہ جس میں سے کوئی چیز

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 361
2۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 259

تبدیل نہیں ہوتی۔ قشیری نے کہا: کہا جاتا ہے کہ سعادت، شقاوت، تخلیق، اخلاق اور رزق میں کوئی تبدیلی نہیں، لہٰذا آیت کریمہ ان چیزوں کے علاوہ کے بارے میں ہے اور اس قسم میں گویا تحکم کی صورت پائی جاتی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی چیزوں کو رائے اور اجتہاد کے ذریعے نہیں جانا جا سکتا بلکہ یہ توقیفی ہوتی ہیں، پس اگر یہ صحیح ہے تو اس کے مطابق قول لازم ہوتا ہے اور اس کے ہاں روک دیا جاتا ہے ورنہ آیت تمام چیزوں کو عام ہوگی، اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اللہ اعلم۔ اور یہ معنی حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو وائل، حضرت کعب احبار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور یہی کلبی کا قول ہے۔ حضرت ابو عثمان نہدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں ثابت رکھ اور اگر اہل شقاوت اور گنہگاروں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں سے مٹا دے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھ دے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھا ہے تو ان میں مجھے باقی رکھو، اور اگر بدبختوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں سے مٹا دے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہے باقی رکھتا ہے، اور تیرے پاس اُمّ الکتاب ہے۔ اور حضرت ابو وائل اکثر دعا مانگتے تھے: یا اللہ! اگر تو نے ہمیں بدبختوں میں لکھا ہوا ہے تو مٹا دے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، اور اگر سعادت مندوں میں لکھا ہوا ہے تو باقی رکھ، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، حضرت کعب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کہا: اگر اللہ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے میں تجھے اس سے ضرور آگاہ کر دیتا، آیت سے مراد یَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ حضرت مالک بن دینار نے جس عورت کے متعلق دعا کی تھی (یہی کہا تھا): اے اللہ! اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور تیرے پاس اُمُّ الْكِتٰبِ ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت گزر چکی ہے (1) کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے''۔ اسی طرح کی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَحَبَّ جس کو یہ بات پسند ہے'' باقی حدیث بعینہ وہی ہے یعنی پہلی روایت میں مَنْ سَرَّہٗ کے الفاظ ہیں جبکہ اس میں مَنْ اَحَبَّ کے علاوہ باقی الفاظ میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی دو تاویلیں ہیں ایک معنوی تاویل ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اچھی تعریف، عمدہ ذکر اور اجر متکرر میں سے اس کے بعد باقی رہ جائیں گی، تو ایسا ہوگا کہ گویا وہ مرا ہی نہیں۔ اور دوسری تاویل یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی اجل اور وہ اجل جس کے بارے میں اللہ کے علم میں یہ تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس کو مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح اللہ کا ارشاد: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح روایت کی کہ آپ نے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، من بسط لہ فی الرزق، جلد 2، صفحہ 885 | 2۔ ایضاً

فرمایا: ''جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی عمر اور اجل لمبی ہو جائے اور اس کے رزق میں اضافہ کر دیا جائے تو وہ الله سے ڈرے اور صلہ رحمی کرے'' (1)۔ تو کہا گیا کہ عمر اور اجل میں کیسے اضافہ کیا جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الله عزوجل نے فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (الانعام: 2) وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اجل کا فیصلہ کیا اور اجل اس کے ہاں مقرر ہے۔ پہلی اجل بندے کی وہ اجل ہے جو اس کی ولادت سے لیکر وفات تک ہوتی ہے جب کہ دوسری اجل یعنی جو الله کے ہاں مقرر ہے وہ بندے کی وفات سے لیکر اس دن تک ہے جس دن برزخ میں اس کی ملاقات ہوگی اس کو سوائے الله کے کوئی نہیں جانتا، جب بندہ تقوی اختیار کرے اور صلہ رحمی کرے تو الله تعالیٰ بندے کی برزخ کی اجل سے پہلی عمر کی مدت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے اور اگر وہ نافرمانی کرے اور قطع رحمی کرے تو الله تعالیٰ اس کی دنیا میں جتنی چاہتا ہے عمر کم کرتا ہے، اور اس کی برزخی زندگی کی مدت میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ اور جب الله کے علم میں اس کی سابق اجل حتمی ہو تو پھر زیادتی اور کمی ممتنع ہے جیسا کہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف) یعنی جب اس کی اجل آ جائے گی تو نہ ایک لمحہ تاخیر سے آئے گی اور نہ ہی پہلے۔ پس اس طرح حدیث اور آیت میں مطابقت ہو گئی۔ اور یہی نفس عمر اور اجل میں ظاہری لفظوں کے اعتبار سے اضافہ ہے اس کو حبر الأمة نے اختیار کیا ہے، والله اعلم۔ مجاہد نے کہا: الله تعالیٰ سال کے معاملات کا رمضان المبارک میں قطعی فیصلہ فرما دیتا ہے پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے سوائے زندگی و موت، اور شقاوت و سعادت کے، اس کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ ضحاک نے کہا: الله تعالیٰ کراماً کاتبین کے رجسٹروں سے ایسے امور جن کی کوئی ثواب و سزا نہیں ہوتی ان میں جن کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جن میں ثواب و عقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے، اس کا معنی ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے کہا: رزق میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور اجل میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ پھر کلبی سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: وہ ساری کی ساری باتیں لکھتا ہے یہاں تک کہ جب جمعرات کا دن آتا ہے تو اس میں سے ہر اس چیز کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے جس میں ثواب و عقاب نہیں ہوتا، جیسے مثلاً تمہارا قول: میں نے کھایا، میں نے پیا، میں داخل ہوا اور میں نکلا وغیرہ اور اس گفتگو میں بندہ سچا بھی ہو، اور جن میں ثواب و عقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے۔ حضرت قتادہ، ابن زید اور سعید بن جبیر نے کہا: الله تعالیٰ فرائض و نوافل میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے پس انہیں منسوخ کر دیتا ہے اور بدل دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے ان کو منسوخ نہیں کرتا، اور جملہ ناسخ و منسوخ اس کے ہاں ام الکتاب میں ہیں۔ نحاس اور مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت کیا ہے، نحاس نے کہا: حدثنا بکر بن سہل قال حدثنا ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن أبی طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ یعنی الله تعالیٰ قرآن سے جو چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے اور اسے منسوخ کر دیتا ہے۔ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ یعنی اسے تبدیل نہیں کرتا، وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ آپ فرماتے ہیں: ناسخ و منسوخ سب اس کے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 475

ہاں اُمّ الکتاب میں ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: یمحو مایشاء یعنی یغفر مایشاء ہے یعنی اپنے بندوں کے گناہوں میں سے جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور یثبت مایشاء یعنی یترک مایشاء یعنی جو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے اور معاف نہیں کرتا۔ عکرمہ نے کہا: یمحو مایشاء ویثبت یعنی توبہ کے ذریعے تمام گناہوں کو مٹاتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں لکھ دیتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا آیۃ (الفرقان: 70) حضرت حسن نے فرمایا: یمحو مایشاء یعنی جس کی اجل آجائے اسے مٹا دیتا ہے وَ یُثْبِتُ اور جس کی اجل نہ آئے اسے باقی رکھتا ہے۔ اور حضرت حسن ہی نے کہا: اباء کو مٹاتا ہے اور ابناء کو باقی رکھتا ہے۔ اور آپ ہی سے مروی ہے: کراماً کاتبین کو گناہوں میں سے کچھ بھلا دیے جاتے ہیں اور کچھ نہیں بھلائے جاتے۔ سدّی نے کہا(1): یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ یعنی چاند کو مٹاتا ہے وَ یُثْبِتُ اور سورج کو باقی رکھتا ہے، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً (الاسراء: 12) پس ہم نے رات کی نشانی کو مٹایا اور دن کی نشانی کو دکھائی دینے والا بنایا۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ نیند کی حالت میں ارواح کے حوالے سے ہے، نیند کے وقت وہ اس پر قبضہ کرتا ہے، پھر جب اچانک اس کی موت کا ارادہ کرتا ہے تو اسے روک لیتا ہے، اور جس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور اسے اپنے صاحب کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا الایۃ (الزمر: 42) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نسلوں اور قوموں میں سے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد: اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ (یٰسٓ: 31) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور ان میں جن کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد گرامی: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ۝ (المومنون) پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔

پس ایک نسل کو مٹاتا ہے اور دوسری نسل کو ثابت رکھتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو عرصہ دراز تک اللہ کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے پھر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور گمراہی پر ہی مر جاتا ہے، پس یہی ہے جس کو وہ مٹاتا ہے اور جو باقی رہتا ہے اس سے مراد وہ آدمی ہے جو طویل عرصہ تک اللہ کی نافرمانی پر ہی عمل کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ گناہوں کے رجسٹر سے اسے مٹاتا ہے اور نیکیوں کے رجسٹر میں اسے باقی رکھتا ہے، ثعلبی اور ماوردی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ سے مراد دنیا اور یُثْبِتُ سے مراد آخرت ہے۔ قیس بن عباد نے رجب کے دسویں دن کہا: یہی وہ دن ہے جس میں اللہ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے؛ جبکہ مجاہد سے مروی روایت گزر چکی ہے کہ یہ رمضان میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی سفید پتھر سے بنی ہوئی ایک لوح محفوظ ہے جس کی مسافت پانچ سو سال کی ہے، سیاہ یاقوت کی اس کی دو جلدیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہر روز تین سو ستر مرتبہ اسے دیکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب رات کی تین ساعتیں باقی ہوتی ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''الذکر'' کو کھولتا ہے، اس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 362

کتاب کو دیکھتا ہے جس کو اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے''۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، تو یہ مٹانا اور ثابت رکھنا ان امور میں ہوتا ہے جن کے بارے میں قضا گزر چکی ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قضا میں وہ بھی ہوتی ہے جو حتمی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہے تو یہ ثابت ہے اور قضا کی ایک صورت ایسی ہے جو اسباب کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے یہ مٹنے والی ہے۔ واللہ اعلم۔ غزنوی نے کہا: میرے نزدیک یہ ہے کہ لوح میں بعض ملائکہ کے احاطہ کر لینے کی وجہ سے جو غیب سے نکل چکی ہو تو وہ تبدیلی کا احتمال رکھتی ہے، کیونکہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے سارے علم کا احاطہ کرنا محال ہے اور اشیاء کی تقدیر میں جو اللہ کے علم میں ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی وہ اصل جن میں آجال وغیرہ لکھی ہوئی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: امّ الکتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے (1) جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس میں بھی تبدیلی جاری رہتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: یہ صرف دوسرے جرائد میں جاری رہتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امّ الکتاب (2) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کا وہ خالق ہے اور جس کو اس نے پیدا کیا ہے وہ اس کے علم کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے سو اللہ نے اپنے علم کو فرمایا: ''تو کتاب بن جا، اور اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں، اور آپ ہی سے مروی ہے کہ یہ الذکر ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ (الانبیاء: 105) اور ہم نے زبور میں الذکر کے بعد لکھ دیا ہے۔ یہ اس کے معنی کو پہلے کی طرف راجع کرتا ہے اور یہی حضرت کعب کے قول کا معنی ہے۔ حضرت کعب احبار نے فرمایا: اُمُّ الْكِتٰبِ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق اور جن کا وہ خالق ہے کے بارے میں علم ہے۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴۱

''اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے (تو ہماری مرضی) یا ہم (پہلے ہی) اٹھا لیں آپ کو (تو ہماری مرضی) سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ (ان سے) حساب لیں۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو ہر طرف سے (رفتہ رفتہ) کم کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کوئی نہیں ردّ و بدل کر سکتا اس کے حکم میں، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ''ما'' زائد ہے، تقدیر عبارت: وان نرینک بعض الذی نعدھم ہے اس سے مراد عذاب ہے؛ دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (رعد: 34) دنیوی زندگی میں ان کے لیے عذاب ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ (رعد: 31) یعنی اگر ہم آپ کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 362 2۔ ایضا

اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ پس آپ پر سوائے ابلاغ یعنی تبلیغ کے کچھ نہیں۔ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ حساب سے مراد جزاء وسزا ہے۔

قولہ تعالیٰ:۔ اَوَ لَمْ يَرَوْا یعنی کیا اہل مکہ نے نہیں دیکھا۔ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ یعنی ہم اس کا قصد کر رہے ہیں۔ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ہے یعنی ان کے علماء وصلحاء کی موت کے ذریعے ہم انہیں کم کر رہے ہیں۔ قشیری نے کہا: اس بنیاد پر اطراف سے مراد اشراف ہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: الطَّرَفُ والطَّرِفُ سے مراد کریم آدمی ہے، لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے، کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے: ہم ان کو ان کے معاملات میں نقصان دکھاتے ہیں، تا کہ وہ جان لیں کہ ان سے سزا کی تاخیر عجز کی وجہ سے نہیں۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو یہود ونصاری کے علماء کی موت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور حسن نے کہا: اس سے مراد مشرکین کے قبضہ میں موجود چیزوں میں سے جن پر مسلمانوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا وہ ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد بے آباد زمین ہے حتی کہ اس کے ایک کونے میں آبادی ہوتی ہے۔ مجاہد سے مروی ہے: اس کے نقصان سے مراد اس کی خرابی اور اس کے اہل کی موت ہے۔ وکیع بن جراع نے عن طلحۃ بن عمیر عن عطاء بن ابی رباح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کا ذکر کرتے ہوئے کہا: اس سے اس کے فقہاء اور باسیوں میں سے بہتریں لوگوں کا جانا مراد ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: اس آیت کی تاویل میں عطا کا قول بہت عمدہ ہے، اہل علم نے اسے تلقی قبول سے نوازا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس کو مہدوی نے مجاہد اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور یہ بذات خود پہلے قول کی نص ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا سے مراد فقہاء وعلماء کی موت ہے، اور لغت میں یہ بات معروف ہے کہ الطرف ہر چیز کے بہترین اور کریم حصہ کو کہا گیا ہے۔ اور ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال میں سے جس قول کو منتخب کیا ہے یہ اس کے برعکس ہے۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: اس سے مراد نقصان اور لوگوں کی موت ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا: اگر زمین کم ہوتی تو تجھ پر وضو کرنے کی جگہ تنگ ہو جاتی اور دوسرے نے کہا: تجھ پر وہ جگہیں تنگ ہو جاتیں جن میں تو بول وبراز کرتا ہے۔

ایک قول کے مطابق: اس سے مراد قریش سے پہلے ہلاک ہونے والی قوموں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی ہے، اور معنی یہ ہے: کیا قریش نے اپنے سے پہلے لوگوں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی نہیں دیکھی؟ کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو جائے؟ یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ابن مریم سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے زمین کی برکات، اس کے پھل اور اس کے باسیوں کو کم کر دیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے: اس نے اس سرزمین کے حکمرانوں کے ظلم کی وجہ سے اس کو کم کر دیا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ معنی صحیح ہے، بے شک ظلم وستم شہریوں کے قتل، اس زمین سے ان کے انخلاء اور زمین سے برکت

کے اُٹھ جانے کے سبب شہروں کو برباد کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ یعنی کوئی بھی اس کے حکم میں نقص یا تبدیلی کے ذریعے رد و بدل نہیں کر سکتا۔ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یعنی کافروں سے انتقام لینے میں اور مومن کو ثواب عطا کرنے میں وہ بہت جلدی کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: اسے اپنے حساب میں دل کے سوچ بچار اور انگلیوں کے پوروں پر گننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

"اور مکاریاں کرتے رہے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، سو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ان سب کو مکر کی سزا دینا وہ جانتا ہے جو کماتا ہے ہر شخص اور عنقریب کفار بھی جان لیں گے کہ دار آخرت (کی ابدی مسرتیں) کس کے لیے ہیں۔ اور کفار کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں، فرمایئے: (میری رسالت پر) اللہ تعالیٰ بطور گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ لوگ (بطور گواہ کافی ہیں) جن کے پاس کتاب کا علم ہے"۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی مشرکین مکہ سے پہلے، ان لوگوں نے رسولوں کے ساتھ مکر کیا، ان کے ساتھ فریب کیا اور ان کا انکار کیا۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا یعنی مکر کرنے والوں کا مکر اسی کا پیدا کردہ ہے، لہٰذا اس کے اذن کے بغیر کوئی نقصان نہیں دیتا۔ ایک قول کے مطابق: فللّٰہ خیر المکر یعنی وہ ان کو اس کی سزا دے گا۔ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ یعنی خیر اور شر میں سے جو کوئی کرتا ہے وہ جانتا ہے پس اس پر وہ سزا دے گا۔ وَيَعْلَمُ الْكَافِرُ نافع، ابن کثیر اور ابو عمر کی یہی قرآت ہے جبکہ باقیوں نے الکفار پڑھا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کو مراد لیا ہے۔ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی ثواب و عقاب کے اعتبار سے دار دنیا کا انجام یا یہ مراد ہے کہ دار آخرت میں ثواب و عقاب کس کے لیے ہے، یہ تہدید اور وعید ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا حضرت قتادہ نے کہا (1): یہ عرب کے مشرکین تھے۔ لَسْتَ مُرْسَلًا یعنی تو نہ نبی ہے اور نہ رسول تو صرف جھوٹ بولنے والا ہے (نعوذ باللہ) وہ کسی چیز کا مطالبہ کرتے تو پورا نہ ہونے کی صورت میں یہ کہتے۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما دیجیے۔ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی کفی اللہ، اللہ کافی ہے۔ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ یعنی میری سچائی اور تمہارے جھوٹ پر بطور گواہ کافی ہے۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ یہ مشرکین مکہ کے خلاف بطور حجت ہے، کیونکہ وہ تفاسیر میں اہل کتاب کے ایمانداروں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق: ان کی گواہی مدمقابل کے قول کے لیے قاطع ہوتی تھی اور وہ اہل کتاب کے مومن ہیں جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت سلمان فارسی، حضرت تمیم داری، حضرت نجاشی اور اس کے دوست، یہ حضرت قتادہ اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت کیا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی کوشش کی گئی تو حضرت عبداللہ بن سلام آئے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 119

تو حضرت عثمان نے انہیں کہا: کیا لے کے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: میں آپ کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں مجھ سے دور کرو، آپ کا باہر ہونا میرے لیے اندر ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام لوگوں کے پاس گئے اور کہا: اے لوگو! زمانہ جاہلیت میں میرا نام فلاں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام عبداللہ رکھا، میرے بارے میں کتاب اللہ کی کچھ آیات نازل ہوئی ہیں: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الاحقاف) بنی اسرائیل کے ایک گواہ نے اپنے جیسے آدمی کے خلاف گواہی دی، پس وہ ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ میرے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ آیت کریمہ میرے متعلق نازل ہوئی ہے۔ الحدیث۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ پوری حدیث کتاب ''التذکرہ'' میں لکھ دی ہے۔ اس کے بارے میں ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: ہذا حدیث حسن غریب۔ زمانہ جاہلیت میں آپ کا نام حصین تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رکھا۔ ابو بشر نے کہا: میں نے سعید بن جبیر کو کہا: وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ کس کے بارے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن سلام کیسے مراد ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ سورت مکی ہے اور حضرت عبداللہ بن سلام نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے؟ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: ابن جبیر نے کہا کہ سورت مکی ہے اور حضرت ابن سلام نے اس سورت کے نزول کے بعد مدینہ میں اسلام قبول کیا، لہٰذا اس آیت کو ابن سلام پر محمول کرنا درست نہیں۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے جبریل امین مراد ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: اور وہ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ پڑھتے تھے اور جو یہ کہتا کہ یہ حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہیں اس کا یہ انکار کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق سورت مکی ہے اور انھوں نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے وَمِنْ عِنْدِهٖ عِلْمُ الْكِتٰبِ پڑھا، اگرچہ روایت میں ضعف ہے۔ اس کو سلیمان بن ارقم نے عن الزہری عن سالم عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے اور محبوب نے اسمٰعیل بن محمد یمانی سے روایت کیا ہے آپ نے اسی طرح پڑھا ہے یعنی وَمِنْ عِنْدِهٖ میم، عین اور دال کے کسرہ کے ساتھ عُلِمَ الْكِتٰبُ عین کے ضمہ اور کتاب کے رفع کے ساتھ۔ عبداللہ بن عطا نے کہا: میں نے ابو جعفر بن علی بن حسین بن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، محمد بن حنفیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ایک قول کے مطابق: سارے مومنین مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے کہا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، تو اس کو دو صورتوں میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا یا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کے نزدیک وہ سب مومنین سے زیادہ عالم ہوں گے جبکہ معاملہ ایسا نہیں، بلکہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ان سے زیادہ عالم تھے یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 365۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاحقاف، حدیث نمبر 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارشاد أنا مدينة العلم وعلی بابها (1) کی وجہ سے تو یہ روایت باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ علم کا شہر ہیں اور آپ کے صحابہ اس کے دروازے، علوم میں قدرو منزلت کے مطابق ان میں سے کچھ کھلے دروازے ہیں اور کچھ درمیانی درجے کے البتہ جس نے کہا ہے کہ سارے مومنین مراد ہیں اس نے صحیح کہا، کیونکہ ہر مومن کتاب کو جانتا ہے، اس کے اعجاز کی وجہ کا ادراک رکھتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے سچا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس بنیاد پر کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اور جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے اس نے ترمذی کی حدیث پر بھروسہ کیا ہے، اور یہ ممتنع نہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کوئی بات نازل ہوئی ہو اور مراد سارے مومنین ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا ذکر سب کافروں کا ہے اور مراد قریش ہیں، پس جن کے پاس کتاب کا علم ہے وہ یہود و نصاریٰ کے مومنین ہو سکتے ہیں یعنی وہ لوگ وہ ہیں جو بتوں کی پوجا کرنے والوں کی نسبت نبوت اور کتاب کی معرفت کے زیادہ قریب ہیں۔ نحاس نے کہا: اور جس آدمی نے کہا کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر ہیں تو اس کی بات کا احتمال بھی ہے کیونکہ جب دلائل بھی صحیح ہوں اور یہ بھی معروف ہو کہ نزول قرآن سے پہلے وہ کتابوں کو پڑھتے تھے تو بات اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1114

# سورۂ ابراہیم

(آیاتہا ۵۲) (۱۴ سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْمَ مَکِّیَّۃٌ ۷۲) (رکوعاتہا ۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت حسن، عکرمہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کے نزدیک ساری سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ نے کہا: سوائے دو آیتوں کے باقی ساری سورت مکی ہے جب کہ دو آیات مدنی ہیں، جب کہ ایک قول کے مطابق تین آیات (مدنی) ہیں جو ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کی وہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا سے لے کر فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۞ تک ہیں۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ۞

''الف، لام، را، یہ (عظیم الشان) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے آپ کی طرف تا کہ آپ نکالیں لوگوں کو (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نور (ہدایت وعرفان) کی طرف ان کے رب کے اذن سے (یعنی) عزیز وحمید کے راستہ کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ یعنی آپ نکالیں کتاب کے ذریعے اور وہ قرآن ہے، یا اس کی طرف بلانے کے ذریعے لوگوں کو نکالیں۔ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ یعنی کفر، گمراہی اور جہالت کی تاریکیوں سے ایمان اور علم کے نور کی طرف اور یہ بطور تمثیل ہے، کیونکہ کفر بمنزلہ ظلمت اور اسلام بمنزلہ نور ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: بدعت سے سنت اور شک سے یقین کی طرف۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق ملنے سے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بِاِذْنِ رَبِّهِمْ میں باتخراج کے متعلق ہے اور فعل کی اضافت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس لیے ہے کیونکہ دعوت دینے والا اور ڈرانے والا ہادی ہوتا ہے۔ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ عزیز اور حمید کے درمیان واؤ اس لیے نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں جس طرح خرجتُ إلی زید العاقل الفاضل عاقل و فاضل کے درمیان واؤ نہیں کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور اللہ وہ بے مثل ذات ہے جس کے کوئی مثل اور مشابہ نہیں۔ اور ایک قول یہ ہے الْعَزِيْزِ سے مراد وہ ذات ہے جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ ایک قول کے مطابق الْعَزِيْزِ سے مراد اپنی ملکیت اور سلطنت میں کنٹرول کرنے والا ہے۔ الْحَمِيْدِ یعنی جس کی ہر زبان کے ذریعے تعریف کی گئی ہو، اور ہر حال میں ہر جگہ میں جس کی شان بیان کی جاتی ہو۔ مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور کچھ نے آپ کا انکار کیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا تھا وہ

آپ پر ایمان لے آئے، اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے آپ کا انکار کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔

اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۣ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾

”وہی اللہ جس کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بربادی ہے کفار کے لیے سخت عذاب کے باعث جو پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت (کی ابدی زندگی) پر اور (دوسروں کو بھی) روکتے ہیں راہ خدا سے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس راہ راست کو ٹیڑھا بنادیں یہ لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ یعنی ملکیت، بندگی، ایجاد اور تخلیق کے اعتبار سے آسمان و زمین کی سب چیزیں اللہ کی ہیں۔ نافع، ابن عامر اور دیگر قراء نے لفظ اللہ کو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ الَّذِیۡ اس کی خبر ہوگی۔ جب کہ یہ بھی کہا گیا ہے الَّذِیۡ اس کی صفت ہے اور خبر مضمر ہوگی، یعنی اللہ الذی لہ مافی السموات والارض قادر علی کل شی اور باقیوں نے الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ کی صفت کی بنیاد پر مجرور پڑھا ہے تو اس صورت میں صفت موصوف سے مقدم ہوگی، جیسے آپ مررت بالظریف زید کہتے ہیں (یعنی زید موصوف اور ظریف صفت ہے) یہ بھی قول ہے کہ صفت نہیں بلکہ الۡحَمِیۡدِ سے بدل ہے، کیونکہ اللہ کا اسم علم بن چکا ہے لہٰذا اس کی صفت کی ضرورت نہیں ہوگی البتہ معنوی اعتبار سے اس کی صفت بیان ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جو قدرت ایجاد کے ذریعے منفرد ہے۔ ابوعمرو نے کہا: تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے یہ مجرور ہوگا یعنی الی صراط اللہ العزیز الحمید الذی لہ مافی السموات و مافی الارض۔

اور یعقوب الحمید پر وقف کی صورت میں اور وصل کی صورت میں جر دیتے ہیں۔ ابن انباری نے کہا: جس نے خبر دی ہے اس نے وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ پر وقف کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ ویل کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ ایسا کلمہ ہے جو عذاب اور ہلاکت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ یعنی جہنم میں۔ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا یعنی وہ دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں اختیار کرتے ہیں اور یہ کافروں کا طریقہ ہے۔ الَّذِیۡنَ کافروں کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ ایک قول کے مطابق مضمر مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی ہم الذین۔ ایک قول یہ بھی ہے: الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ مبتدا ہے اور اس کی خبر اولئک ہے۔ ہر وہ آدمی جس نے دنیا اور اس کی لذات کو آخرت پر ترجیح دی، دنیا کی نعمتوں میں باقی رہنے کو آخرت میں ملنے والی نعمتوں کے مقابلے میں پسند کیا اور لوگوں کو اللہ اور اس کے دین سے جو اللہ کے رسول لے کر آئے پھیرا وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس آیت میں داخل ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 121

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اپنی امت کے حوالے سے جو خوف ہے اس میں سب سے زیادہ خوف گمراہ ائمہ کا ہے''۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ان ادوار کی نسبت اب یہ بہت زیادہ ہے (1)۔ واللہ المستعان۔

ایک قول یہ ہے: يَسْتَحِبُّوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی نعمت اس کی اطاعت کے ذریعے ہی حاصل کی جاتی ہے مصیبت اور نافرمانی کے ذریعے نہیں۔

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور حاجات واغراض کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے راستے کو ٹیڑھا کر دیں۔ السبیل مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے، دین، امر، ارض اور ہر وہ چیز جو قائم اور کھڑی نہ ہو تو اس میں العوج عین کے کسرہ کے ساتھ آتا ہے، جب کہ وہ چیزیں جو سیدھی کھڑی ہوتی ہے جیسے دیوار اور نیزہ وغیرہ ان کے لیے عین کے فتح کے ساتھ آتا ہے، سورۂ آل عمران اور دیگر مقامات پر یہ گزر چکا ہے۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ یعنی وہ حق سے دور ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لیے (احکام الٰہی کو) پس گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، بہت دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیک وسلم! آپ سے پہلے ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا۔ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ، تاکہ وہ ان کے سامنے ان کے دین کے معاملات کو کھول کر بیان کریں۔ اور لسان کا قوم کی طرف مضاف ہونے کے باوجود واحد ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس سے مراد لغت ہے۔ اور یہ اسم جنس ہے قلیل وکثیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس آیت میں عجم وعرب کے لیے کوئی حجت نہیں، کیونکہ ہر وہ آدمی جس کے سامنے نبی کے لائے ہوئے پیغام کو ایسے ترجمے کے ساتھ پیش کیا جائے جو اس کو سمجھ آتا ہو تو اس سے حجت لازم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: 28) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور بروقت خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کو اس کی امت کی طرف اس کی زبان کے ساتھ بھیجا گیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ہر سیاہ وسرخ کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! مجھے اس امت کے جس بھی یہودی اور نصرانی نے سنا اور پھر میرے لائے ہوئے پیغام پر ایمان نہ لایا تو وہ دوزخی ہے'' (2)۔ اس روایت کو امام مسلم نے بیان کیا ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ مشیت کے نفاذ کے حوالے سے قدریہ کا رد ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ لیبین پر

1۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، جلد 10، صفحہ 188، حدیث 28986

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، وجوب الایمان برسالۃ نبینا، جلد 1، صفحہ 86

اس کا عطف نہیں، کیونکہ ارسال ہوتا ہی تبیین کے لیے ہے گمراہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اور یضل کو منصوب پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ ارسال اضلال کا سبب ہو سکتا ہے، تو یہ اسی طرح ہوگا جیسے اللہ کا ارشاد: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص: 8) پس ارسال، اضلال کا سبب ہوگا کیونکہ جب آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کا انکار کر دیا، تو یہ ایسا ہی ہوا گویا کہ یہ ان کے کفر کا سبب بن گیا۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ (اور انہیں حکم دیا) کہ نکالو اپنی قوم کو (گمراہی کے) اندھیروں سے نور (ہدایت) کی طرف اور یاد دلاؤ انہیں اللہ تعالیٰ کے دن یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بہت صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ آیات سے مراد حجت و براہین ہیں یعنی ہم نے موسیٰ کو اپنی سچائی پر دلالت کرنے والے معجزات کے ساتھ بھیجا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ (نشانیاں) نو آیات ہیں (1)۔ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ اس کی مثال سورت کے آغاز میں ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ: لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ایک قول کے مطابق اَنْ بمعنی أی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا (ص: 6) یعنی ای امشوا۔

قولہ تعالیٰ: وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ یعنی انہیں ایسی بات کہو جس کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ کے ایام یاد آئیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا: یعنی ان کو ان پر ہونے والی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلاؤ (2)، اس کو حضرت ابی بن کعب نے بیان فرمایا اور مرفوعاً روایت کیا ہے یعنی انہیں فرعون اور وادی تیہ سے نجات دلا کر اللہ نے جو نعمت فرمائی وہ اور دیگر نعمتیں انہیں یاد دلاؤ۔ بعض اوقات نعمتوں کو ایام کا نام دے دیا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

وأيامٍ لنا غُرٍّ طوالِ

اس میں ایام سے مراد نعمتیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل سے مروی ہے: اس سے مراد سابقہ امتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے واقعات ہیں (3)، جیسے کہا جاتا ہے: فلان عالم بایام العرب یعنی فلاں عرب کے واقعات کو جانتا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں گزشتہ امتوں سے انتقام لیا گیا۔ اسی طرح ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے: اس سے مراد اللہ کی آزمائش اور امتحان ہے۔ طبری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں ماضی کے ایام میں ہونے والے معاملات کی نصیحت کی یعنی اللہ کے ایام میں جو نعمتیں اور آزمائش تھیں وہ یاد دلائیں۔ اور اس وقت وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا غلام تھے اور صرف

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 122　　2۔ ایضاً　　3۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 367

الایام کے ذکر پر اللہ تعالیٰ نے اکتفاء فرمایا کیونکہ وہ ان کے نزدیک معروف و معلوم تھے۔

حضرت سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے آپ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے درمیان اللہ تعالیٰ کے ایام کی یاد دلا رہے تھے اور اللہ کے ایام سے مراد اس کی آزمائش اور نعمتیں ہیں۔ اور حدیث خضر کا ذکر کیا۔ یہ آیت کریمہ دلوں کو نرم کرنے والے، یقین کو مضبوط کرنے والے، ہر بدعت سے خالی اور ہر قسم کی گمراہی اور شکوک وشبہات سے منزہ وعظ کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ یعنی اللہ تعالیٰ کے ایام کی تذکیر میں لَاٰیٰتٍ یعنی دلائل ہیں۔ لِّكُلِّ صَبَّارٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اور اس کی نافرمانی سے، بہت زیادہ صبر کرنے والے کے لیے شَكُوْرٍ اللہ کی نعمتوں کا بہت زیادہ شکر کرنے والے کے لیے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یہ وہ بندہ ہے کہ جب اسے عطا کیا جائے تو شکر کرے اور جب آزمائش میں مبتلا کیا جائے تو صبر کرے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایمان دو نصف پر مشتمل ہے نصف صبر اور نصف شکر پر'' (2)۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ کی تلاوت فرمائی۔ شعبی سے بھی اسی قسم کی موقوف روایت مروی ہے۔ حضرت حسن بصری حجاج سے سات سال تک پوشیدہ رہے (3) جب آپ کے پاس اس کی موت کی خبر پہنچی تو آپ نے عرض کیا: یا اللہ! تو نے اسے موت دے دی تو اس کے طریقوں کو بھی موت دے دے، پھر آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ پڑھی۔ آیات کو ہر بہت زیادہ صبر اور شکر کرنے والے کے ساتھ خاص کیا کیونکہ وہی ان کے ذریعے عبرت حاصل کرتے ہیں اور ایسی باتوں سے غافل نہیں ہوتے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَا (النازعات) آپ صرف اسے ڈراتے ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں، اگرچہ نبی تو سب کو ڈرانے والا ہوتا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۟ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۟

''اور جب فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت (واحسان) کو جو تم پر ہوا جب اس نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب اور ذبح کرتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے اور یاد کرو جب (تمہیں) مطلع فرمایا تمہارے رب نے (اس حقیقت سے) کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب شدید ہے''۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 122 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 36، حدیث 726

اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ کی تفسیر سورۃ بقرہ میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ والحمدللہ

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ ایک قول کے مطابق: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو ارشاد ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرو جب آپ کے رب نے یہ ارشاد فرمایا ہے: تاذن اور اذن بمعنی اعلم ہے جس طرح أوعد اور توعد۔ یہ معنی حضرت حسن بصری وغیرہ سے مروی ہے اسی سے الأذان ہے، کیونکہ یہ اعلام ہے۔ شاعر نے کہا:

فلم نَشْعُر بِضَوءِ الصبح حتی سِمعنا فی مجالِسِنا الأَذِينَا (1)

ہمیں صبح کی روشنی کا احساس نہ ہوا حتیٰ کہ ہم نے اپنی مجلسوں میں اذان سنی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ پڑھتے تھے، معنی ایک ہی ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ یعنی اگر تم میرے انعامات پر شکر ادا کرو گے تو میں اپنے فضل میں اضافہ کروں گا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اگر تم میری نعمت پر شکر ادا کرو گے تو میں اپنی اطاعت کو تمہارے اندر زیادہ کر دوں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر تم موحد بنو گے اور اطاعت کرو گے تو میں تمہارے ثواب میں اضافہ کروں گا، ان تمام اقوال میں معنی قریب قریب ہے۔ آیت کریمہ اس بات کے حوالے سے نص ہے کہ شکر اضافہ کا سبب ہے سورۂ بقرہ میں علماء کے شکر کے بیان کردہ معانی گزر چکے ہیں۔ کسی صحابی سے اللہ تعالیٰ سے شکر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تیرا اللہ کی نعمتوں کے ذریعے اس کی نافرمانی پر قوی نہ ہونا۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے بیان کیا گیا ہے (2) کہ آپ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں کیسے تیرا شکر ادا کروں؟ اور میرا شکر ادا کرنا تیری طرف سے میرے اوپر نعمت کی تجدید ہوتا ہے۔ (اللہ) نے فرمایا: اے داؤد! اب تو نے میرا شکر ادا کیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس بنیاد پر شکر کی حقیقت یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اعتراف کیا جائے۔ اور اپنے بدن کو اس کی اطاعت کے علاوہ میں بندہ صرف نہ کرے۔ اور ہادی نے کھانا کھاتے ہوئے شعر کہا ہے:

أناَلَكَ رِزقَه لتقومَ فيهِ بطاعتِهِ و تشكرَ بعض حقِّه

فلم تشكرْ لِنعمتِهِ ولكِنْ قَوِيتَ على معاصِيهِ برزقه

یہ شعر اسی سابقہ معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: جب تو نعمت شکر کے بارے میں سنے تو مزید کے لیے تیار ہو جا۔ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ یعنی اگر تم نے میرے حق کا انکار کیا۔ ایک قول کے مطابق: اللہ کی نعمتوں کا کفران مراد ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے کفران نعمت یا کفر پر عذاب کا وعدہ فرمایا ہے، جس طرح شکر کی صورت میں اضافے کا وعدہ فرمایا ہے اور ان سے فاشرطیہ مشہور ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 123 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛؕ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝

''نیز (یہ بھی) فرمایا موسیٰ نے: اگر تم ناشکری کرنے لگو (صرف تم ہی نہیں بلکہ) جو بھی سطح زمین پر ہے (ناشکری کرے) تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی (اور) سب تعریفوں کا مستحق ہے۔ کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان (قوموں) کی جو پہلے گزر چکی ہیں یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد گزرے، نہیں جانتا انہیں مگر اللہ تعالیٰ، لے آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں پس انہوں نے (ازراہ تمسخر) ڈال لیے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں اور (بڑی بے باکی سے) کہا: ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی (صداقت کے بارے میں) ہم شک میں ہیں جو تذبذب میں ڈالنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ یعنی تمہاری اس کاروائی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان نہیں، بلکہ وہ غنی ہے۔ الحمید بمعنی المحمود ہے۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ، النبأ کا معنی خبر ہے اس کی جمع الانباء ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

أَلَمْ یَأْتِیكَ وَالأَنْبَاءُ تَنْمِی

ایک قول کے مطابق: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جب کہ ایک قول یہ ہے: یہ اللہ کے ارشادات میں سے ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد کرو جب آپ کے رب نے یوں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی ابتدا اور حضرت نوح، حضرت عاد اور حضرت ثمود علیہم السلام کی قوم کی مشہور خبر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ان کی تعداد کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی ان کے نسب کو جانتا ہے اور نسبت بیان کرنے والے اگرچہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں تاہم وہ بھی تمام قوموں کے اُحصاء کا دعویٰ نہیں کر سکتے، بعض کا نسب بیان کرتے ہیں اور بعض کا بیان نہیں کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ جب نسب بیان کرنے والوں نے انہیں معد بن عدنان کی طرف منسوب کیا اور مزید اضافہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، سوائے اللہ کے انہیں کوئی نہیں جانتا'' (1)۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: عدنان و اسماعیل کے درمیانی نسب کو جاننے والا ہم نے نہیں پایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (2): عدنان و اسماعیل کے درمیان تیس باپ ہیں جو معروف نہیں ہیں۔ حضرت ابن

1۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، العلوم المذمومۃ، جلد 10، صفحہ 218، حدیث 29157 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 124

مسعود رضی اللہ عنہ جب لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتے تو فرماتے (1): نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے۔ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ یعنی حجتوں اور دلائل کے ساتھ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ یعنی ان لوگوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈال لیے تاکہ رسول کے لائے ہوئے پیغام کی وجہ سے وہ ان کو کاٹ لیں، کیونکہ اس پیغام میں ان کی بے وقوفیوں اور ان کے بتوں کی برائیوں کا بیان تھا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور عبدالرحمٰن بن زید نے بھی اس کی مثل بات کی ہے۔ اور عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ (آل عمران: 119) کی تلاوت کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب انہوں نے کتاب اللہ کو سنا تو متعجب ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں ڈال دیا۔ حضرت ابو صالح نے کہا (2): جب انہیں ان کے نبی نے فرمایا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں تو انہوں نے اپنی انگلیوں سے اپنے مونہوں کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش ہو جا، مقصود رسول کی تکذیب اور ان کی بات کو رد کرنا تھا، یہ تینوں قول قریب المعنی ہیں اور دونوں ضمیریں کفار کے لیے ہیں، اور سند کے اعتبار سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حدثنا عبدالرحمن بن مھدی عن سفیان عن ابی اسحاق عن ابی الاحوص عن عبداللہ۔

ابوعبید نے اس سند کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ غصے سے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے، شاعر نے کہا ہے:

لو انّ سَلْمَی أَبْصَرَتْ تَخَدُّدِی　　دِقَّةً لی عظم ساق ویَدِی

وبُعْدَ أَهْلِی وجَفَاءَ عُوَّدِی　　عَضَّتْ من الْوَجْدِ بأطراف الیدِ

یعنی اگر وہ ان سب چیزوں کو دیکھ لے تو غصے سے ہاتھ کے پوروں کو کاٹ لے (تو گویا غصے سے ایسا ہو سکتا ہے)

سورۂ آل عمران میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ حضرت مجاہد و قتادہ نے کہا: انہوں نے اپنی بات رسولوں پر لوٹائی اور اپنے مونہوں سے ان کی تکذیب کی، پہلی ضمیر رسولوں کے لیے ہے اور دوسری کفار کے لیے۔

حضرت حسن وغیرہ نے کہا ہے: انہوں نے اپنے ہاتھ رسولوں کے مونہوں پر رکھے، مقصود ان کی بات کی تردید تھی، اس صورت میں پہلی ضمیر کفار کے لیے اور دوسری رسولوں کے لیے ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے: انہوں نے رسولوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مقاتل نے کہا: انہوں نے رسولوں کے ہاتھ پکڑے اور انہیں خاموش کرنے کے لیے اور گفتگو کو ختم کرنے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے رسولوں کے مونہوں پر رکھ دیئے۔ ایک قول یہ بھی ہے: رسولوں نے قوم کے ہاتھ ان کے مونہوں پر لوٹا دیئے۔ ایک قول یہ ہے: یہاں ہاتھوں سے مراد نعمتیں ہیں، یعنی رسولوں کی نعمتوں کو انہوں نے اپنے مونہوں کے ذریعے رد کر دیا۔ مونہوں کے ساتھ رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو اور تکذیب کر کے تردید کی۔ اور رسولوں کا شریعتیں لے کر آنا نعمتیں ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ رسول جو لے کر آئے انہوں نے اپنے مونہوں کے ذریعے ان کی تکذیب کی۔ اور فی بمعنی با ہوگا، جیسے کہا جاتا ہے: جلست فی البیت و بالبیت اور حروف صفات ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے ہیں۔

1۔ تفسیر کشاف، سورۂ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 542　　2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 124

ابوعبید نے کہا: یہ ضرب المثل ہے، مراد یہ ہے کہ وہ ایمان نہ لائے اور انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور جب کوئی آدمی جواب نہ دے اور خاموشی اختیار کر لے تو عرب کہتے ہیں: قد رد یدہ ٖ فی فیہ۔ یہ اخفش کا بھی قول ہے۔ قتیبی نے کہا: مامور بہ کو ترک کرنے کی وجہ سے عربوں میں سے کسی سے بھی ہم نے یہ نہیں سنا کہ وہ یہ کہتے ہوں: رد یدہ ٖ فی فیہ لہٰذا معنی یہ ہوگا: انہوں نے غصے و ناراضگی سے ہاتھوں کو کاٹا۔ شاعر کا قول بھی ہے:

تَرُدُّون فی فِیهِ غِشَّ الحَسُود حتی یَعَضَّ عَلَیَّ الأکُفَّا

''یعنی وہ حسد کرنے والوں کے ساتھ دشمنی اور غصے کا اظہار کرتے ہیں حتی کہ وہ اپنی انگلیوں اور ہتھیلی کو کاٹتا ہے''۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قَدْ أَفْنَی أنَامِلَهُ أَزْمَةٌ فأضحَی یَعَضُّ علیَّ الوَظِیْفَا

انہوں نے کہا: امتوں سے مراد رسولوں کی امتیں ہیں (1)۔ اِنَّا کَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ۔ اس میں انہوں نے ان کے رسول ہونے کا اقرار نہیں کیا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے گمان کے مطابق جس دین کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اس کا ہم نے انکار کیا۔ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ یعنی شکوک وشبہات اور تردد میں مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ یعنی توحید مُرِیْبٍ یعنی جو شک کا باعث ہے۔ جب تو کوئی ایسا کام کرے جو تردد اور شک کا باعث بنے تو اربتہ کہا جاتا ہے، یعنی ہمارا خیال ہے کہ تم بادشاہی اور دنیا کے طالب گار ہو۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۞

''ان کے پیغمبروں نے پوچھا: کیا (تمہیں) الله تعالیٰ کے متعلق شک ہے جو پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا جو (اتنا کریم ہے کہ) بلاتا ہے تمہیں تا کہ بخش دے تمہارے گناہ اور جو (اتنا مہربان ہے کہ پیہم نافرمانی کے باوجود) تمہیں مہلت دیتا ہے ایک مقررہ میعاد تک، ان (نادانوں نے) جواب دیا: نہیں ہو تم مگر بشر ہماری طرح تم یہ چاہتے ہو کہ روک دو ہمیں ان (بتوں) سے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے، پس لے آؤ ہمارے پاس کوئی روشن دلیل''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ یہ استفہام بمعنی انکار ہے، کیا الله تعالیٰ کی توحید میں کوئی شک نہیں، یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد الله کی توحید نہیں بلکہ الله کی اطاعت ہے یعنی الله کی اطاعت میں کوئی شک نہیں۔ اور اس میں ایک تیسرا احتمال بھی ہے، یعنی کیا الله کی قدرت میں شک ہے؟ کیونکہ وہ اس بات پر متفق تھے جبکہ اس کے علاوہ دیگر صورتوں میں ان کا اختلاف ہے، اس پر الله تعالیٰ کا ارشاد (2): فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بھی دلالت ...

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 369

2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 125

ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کرنے والا، بنانے والا اور عدم کے بعد ان کو وجود بخشنے والا ہے، اس ارشاد سے مقصود اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آگاہ کرنا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں۔

یَدْعُوْكُمْ یعنی رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اس کی اطاعت کی طرف وہ تمہیں دعوت دیتا ہے۔ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ ابو عبید نے کہا: من زائدہ ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ تبعیضیہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض کو ذکر کر کے مراد سارے ہوں۔ ایک قول کے مطابق من بدل کے طور پر ہے نہ زائدہ ہے اور نہ تبعیضیہ، یعنی مغفرت گناہوں کے بدلے میں ہو جائے۔ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس سے مراد موت ہے۔ پس وہ تمہیں دنیا میں عذاب نہیں دے گا۔ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ، ان بمعنی ما ہے۔ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا یعنی ہیئت اور صورت میں، تم وہی کھاتے ہو جو ہم کھاتے ہیں اور تم وہی پیتے ہو جو ہم پیتے ہیں اور تم فرشتے نہیں۔ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا مراد بت وغیرہ ہیں۔ فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اس سے مراد حجت ظاہری ہے۔ یہ ان سے محال تھا، کیونکہ رسول بغیر معجزات کے دعوت نہیں دیتے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱ وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲

"کہا انہیں ان کے رسولوں نے کہ ہم تمہاری طرح انسان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے، اور ہمیں یہ طاقت نہیں کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل بجز اذن خداوندی اور مومنوں کو فقط اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اور ہم کیوں نہ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر حالانکہ اس نے دکھائی ہیں ہمیں ہماری (کامیابی کی) راہیں اور ہم ضرور صبر کریں گے تمہاری اذیت رسانیوں پر۔ پس اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یعنی جس طرح تم کہتے ہو ہم صورت اور ہیئت میں تمہاری طرح ہیں۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ یعنی جس پر چاہتا ہے نبوت کے ذریعے مہربانی فرماتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: توفیق، حکمت، معرفت اور ہدایت کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: اس سے مراد تلاوت قرآن اور اس کے فہم کے ذریعے احسان فرماتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ طبری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کہا: اے چچا! مجھے وصیت کرد۔ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح پوچھا جس طرح آپ نے پوچھا ہے تو آپ نے فرمایا: "کوئی دن، رات اور گھڑی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ صدقہ نہ فرماتا ہو جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے الہام کرنے کی

طرح کا احسان اپنے بندوں پر نہیں فرمایا''۔

وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ یعنی حجت اور آیت اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ الله کے اذن سے مراد اس کی مشیت ہے یعنی یہ ہمارے بس میں نہیں، ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ الله کے امر اور قدرت کے بغیر جس طرح تم مطالبہ کرتے ہو اس طرح ہم حجت اور دلیل لے آئیں، الفاظ خبر کی صورت میں ہیں مگر معنی نفی کا ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کام کا پابند نہیں جس پر وہ قادر نہ ہو(1)۔ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔

وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ، ما استفہامیہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور لنا خبر ہے، اور اس کے بعد والا جملہ حال ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: أيّ شيئ لنافي ترك التوكل على الله الله تعالیٰ پر بھروسے کو ترک کرنے کے سلسلہ میں ہمارے لیے کون سی شے ہے؟

وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا یعنی وہ راستہ جو الله کی رحمت تک پہنچاتا ہے، اور اس کی سختی اور انتقام سے نجات دلاتا ہے۔ وَ لَنَصْبِرَنَّ لام قسم کا ہے۔ اصل میں والله لنصبرن ہے۔ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا اس کے بعد بہ کے الفاظ بھی ہیں، توہین اور مارنا، تکذیب اور قتل وغیرہ جیسی اذیتیں مراد ہیں۔ ان اذیتوں کی برداشت الله تعالیٰ کی ذات پر اس بھروسے کی وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں کافی ہے اور وہ ہماری مدد فرمائے گا۔ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

''اور کہا کفار نے اپنے رسولوں کو کہ ہم ضرور باہر نکال دیں گے تمہیں اپنے ملک سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں، پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد، یہ (وعدۂ آخرت) ہر اس شخص کے لیے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑا ہونے سے اور خائف ہے میری دھمکی سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ، لَنُخْرِجَنَّكُمْ میں لام قسم ہے۔ یعنی والله لنخرجنکم۔ او لتعودن یعنی حتی تعودوا یا الا أن تعودوا یہ طبری اور دیگر مفسرین کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کو اس تقدیر (حتی یا الا ان) کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ او اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے تخییر پر دلالت کرتا ہے، کفار نے رسولوں کو اپنی ملت میں واپس لوٹنے یا انہیں اپنے ملک سے نکالنے کا اختیار دیا۔ اور یہ الله تعالیٰ کا اپنے رسولوں اور بندوں کے لیے طریقہ کار ہے، کیا آپ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (الاسراء) کو نہیں دیکھتے''(2)۔ اور انہوں نے ارادہ کر لیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 329
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1104

کہ پریشان و مضطرب کر دیں گے آپ کو اس علاقے سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ (یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر"۔

یہ معنی سورۂ اعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ فِیْ مِلَّتِنَا یعنی ہمارے دین کی طرف۔ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ یعنی قیامت کے دن میرے سامنے کھڑا ہونے سے، مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ مقام، قیام کی طرح مصدر ہے۔ قام قیامًا و مقامًا کہا جاتا ہے، اور اس کے اپنے ساتھ اختصاص کی وجہ سے اللہ نے یہ اضافت فرمائی ہے۔ اور مقام میم کے فتحہ کے ساتھ اقامت کی جگہ کو کہتے ہیں، اور میم کے ضمہ کے ساتھ اقامت کے فعل کو کہا جاتا ہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ یعنی میرے اس کے اوپر قیام اور اس کی نگرانی سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (الرعد: 33) کیا وہ خدا جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ۔

اخفش نے کہا: ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ میں مَقَامِیْ سے مراد، عذابی، یعنی میرا عذاب ہے۔ وَ خَافَ وَعِیْدِ یعنی قرآن اور اس کی دھمکیاں۔ ایک قول کے مطابق: یہ عذاب ہے اور الوعید وعد سے اسم ہے۔

وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ یَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ ﴿۱۷﴾

"اور رسولوں نے حق کی فتح کے لیے التجا کی (جو قبول ہوئی) اور نامراد ہو گیا ہر سرکش، منکر حق، اس (نامرادی) کے بعد جہنم ہے اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی، وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا اور آئے گی اس کے پاس موت ہر سمت سے اور وہ (بایں ہمہ) مرے گا نہیں، (علاوہ ازیں) اس کے پیچھے ایک اور سخت عذاب ہو گا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اسْتَفْتَحُوْا یعنی انہوں نے مدد کی التجا کی، یعنی رسولوں کو اپنی قوم کے خلاف فتح کی التجا اور ان کی ہلاکت کی دعا کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کا نقطہ نظر ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے اور اس سے حدیث طیبہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی کامیابی و کامرانی کے لیے فتح کی التجا کرتے تھے یعنی مدد طلب کرتے تھے۔

ابن زید نے کہا: مختلف امتوں نے دعا کے ذریعے فتح کی التجا کی جس طرح قریش نے کہا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الآیۃ (الانفال: 32) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انہوں نے میری تکذیب کی ہے پس میرے درمیان اوران کے درمیان فیصلہ فرما''۔ مختلف امتوں نے کہا: اگر یہ سچے ہیں تو ہمیں عذاب میں مبتلا کر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ اس کی مثال ائتنا بعذاب الله ان کنت من الصادقین ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لا اگر تو سچوں میں سے ہے۔ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (الاحقاف) ہمارے اوپر وہ لا جس کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے اگر تو رسولوں میں سے ہے۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ، جَبَّارٍ سے مراد وہ متکبر ہے جو اپنے اوپر کسی کا کوئی حق نہیں سمجھتا۔ نحاس کے ذکر کردہ بیان کے مطابق اہل لغت کے نزدیک اس کا یہی معنی ہے اور عَنِيْدٍ حق کا انکار کرنے والا اور اس سے پہلوتہی اختیار کرنے والا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سے مروی ہے: جب کوئی قوم سے دوری اختیار کر لے تو عَنَدَ عن قومه کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ العَنَد سے ہے اور العُنَد سے مراد ناحیہ اور کونہ ہوتا ہے اور عَانَدَ فلانٌ سے مراد ہے اس نے کونے میں اعراض کرتے ہوئے پکڑا۔ شاعر نے کہا:

إذا نزلت فاجعلوني وَسَطًا　　إنّي كبيرٌ لا أُطِيقُ العُنَدَا

ہروی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَبَّارٍ عَنِيْدٍ سے مراد میانہ روی کی نسبت ظلم اختیار کرنے والا ہے۔ اور یہ العنود، العنید اور العاند ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ سے مستحاضہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: انه عرق عاند۔ ابو عبید نے کہا: یہ وہ ہے جس نے سرکشی اور بغاوت اختیار کی جس طرح انسان بغاوت کرتا ہے۔ تو یہ رگ بھی اس سے نکلنے والے خون کی کثرت کی وجہ سے اسی کی طرح ہے۔ شمر نے کہا: عاند وہ ہے جس کا خون نہیں رکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی سیرت کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں میانہ روی سے ہٹنے والے کو اپنی طرف کھینچتا ہوں۔ لیث نے کہا: اونٹوں میں سے عنود وہ ہے جو دیگر اونٹوں کے ساتھ نہیں ملتا بلکہ ہمیشہ ایک طرف رہتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جو مخالفت کا ارادہ کرے یا جماعت سے علیحدہ ہونا چاہے میں اسے اس کے ساتھ ملا دیتا ہوں۔

مقاتل نے کہا: عَنِيْدٍ سے مراد متکبر ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اپنی ناک کے ذریعے بلند ہونے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے: العنود اور العنید سے مراد وہ ہے جو رسولوں کے خلاف تکبر اختیار کرتا ہے اور حق کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اس پر نہیں چلتا۔ عرب راستے سے ہٹ جانے والے اونٹ کے متعلق کہتے ہیں: شر الابل العنود۔ ایک قول کے مطابق: العنید سے مراد گناہگار اور نافرمان ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: عنید وہ ہے جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کیا۔

میں (قرطبی) نے کہا: آیت میں جَبَّارٍ اور عَنِيْدٍ کا معنی ایک ہی ہے اگرچہ لفظ مختلف ہیں۔ اور ہر وہ آدمی جو حق سے دور ہوتا ہے وہ جَبَّارٍ اور عَنِيْدٍ ہے یعنی متکبر ہے۔ ایک قول یہ ہے: آیت میں اس سے مراد ابو جہل ہے، اس کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے اپنی کتاب أدب الدنیا والدین میں حکایت بیان کی ہے کہ ولید بن یزید بن عبد الملک نے ایک دن قرآن کریم کو کھولا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ نکلا تو اس نے قرآن پاک کو پھاڑ دیا اور یہ اشعار پڑھنے لگا:

أتوعدُ كلَّ جبّارٍ عنيدٍ　　فها أنا ذاكَ جبّارٌ عنيدُ

إذا ما جئتَ ربك يوم حشرٍ فقُلْ يا رَبِّ مزّقني الوليدُ

کیا تو ہر جبار عنید کو دھمکی دیتا ہے یہ لو میں ہوں وہ جبار عنید۔ جب تو اپنے پروردگار کے پاس حشر والے دن آئے گا تو کہہ دینا: اے میرے پروردگار! مجھے ولید نے پھاڑا ہے۔

پھر کچھ ہی دن رہا کہ اسے بری طرح قتل کر دیا گیا اور اس کے سر کو اس کے محل پر لٹکا دیا گیا پھر اسے شہر کی چار دیواری پر لٹکایا گیا۔

قولہ تعالیٰ: مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ یعنی اس کافر کے پیچھے جہنم ہے یعنی اس کی ہلاکت کے بعد جہنم ہے اور وراء بمعنی بعد ہے نابغہ نے کہا:

حَلَفْتُ فلم أترُكْ لِنفسكَ رِيبةً وليس وراءَ اللهِ للمرءِ مذهبُ(1)

میں نے قسم اٹھائی اور تیرے نفس کے لیے کوئی شک نہ چھوڑا اور ان کے لیے اللہ کے بعد کوئی اور مفر نہیں۔

یہاں وراء اللہ سے مراد بعد اللہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ سے مراد من بعدہ ہے۔ اور اللہ کے ارشاد وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ: 91) سے مراد بما سواہ ہے۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کا معنی بما بعدہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: من ورائه سے مراد من أمامه ہے اسی سے شاعر کا قول ہے:

ومن ورائِكَ يومٌ أنتَ بالِغُه لا حاضرٌ مُعْجِزٌ عنه ولا بادِي(2)

من ورائك سے مراد من امامك یعنی تیرے سامنے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

أترجُو بنو مروان سَمْعِي و طاعتِي وقومِي تميمٌ والفلاةُ ورائيَا

ورائیا سے مراد امامی یعنی سامنے ہے۔

لبید نے کہا:

أليس ورائي ان تراخت منيتي لزومُ العصا تحنى عليها الأصابعُ

ورائی سے مراد أمامی ہے اور وکان وراءهم ملك سے مراد کان أمامهم ملك ہے۔ ابوعبیدہ اور ابوعلی قطرب وغیرہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔

اخفش نے کہا: یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ هذا الأمر من ورائك یعنی عنقریب تیرے پاس آ جائے گا اور أنا من وراء فلان یعنی میں اس کی تلاش میں ہوں اور عنقریب اس تک پہنچ جاؤں گا۔

نحاس نے کہا: اللہ کے ارشاد مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ میں وَّرَآىِٕهٖ سے مراد امامه ہے یہ اضداد میں سے نہیں بلکہ یہ توریہ ہے۔ ازہری نے کہا: وراء بمعنی امام اور خلف دونوں ہے یہ اضداد میں سے ہے، یہ ابوعبید کا بھی قول ہے۔ اور ان دونوں کا

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 128 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 127

اشتقاق ان میں سے ہے جو پوشیدہ ہوتی ہیں، پس جہنم پوشیدہ ہے اور ظاہر نہیں ہوتی، لہٰذا یہ د راھو گئی کیونکہ دکھائی نہیں دیتی، اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے اور یہ عمدہ بات ہے۔

وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ یعنی ایسا پانی پلایا جائے گا جو پیپ کی طرح ہوگا، جس طرح بہادر آدمی کو اسد کہا جاتا ہے، اس سے مراد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ اسد کی طرح ہے یہ تمثیل اور تشبیہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ وہ ہے جو دوزخیوں کے جسم سے قیح اور خون بہتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی اور ربیع بن انس نے کہا: یہ دوزخیوں کا غسالہ ہے، اور یہ پانی ہے جو زانی مردوں اور عورتوں کی شرمگاہوں سے نکلتا ہے۔ صدید، صد سے ماخوذ ہے۔ ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں صفوان بن عمرو نے عن عبید اللہ بن بسر عن ابی امامہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبر دی ہے کہ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اس کو ناپسند کریں گے۔ جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو یہ اس کے چہرے کو بھون دے گا اور اس کی حدت اس کے سر تک پہنچ جائے گی اور جب وہ اسے پیئے گا تو یہ اس کی انتڑیاں کاٹ دے گا یہاں تک کہ وہ اس کی دبر سے نکلے گا''۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾ (محمد) اور اللہ ارشاد فرماتا ہے: وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ (الکہف: 29) اس روایت کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ھذا حدیث غریب۔ (دونوں آیات حدیث کے معنی کی شرح ہیں) جس عبید اللہ بن بسر نے صفوان بن عمرو سے حضرت ابوامامہ کی حدیث روایت کی ہے شاید وہ عبد اللہ بن بسر کا بھائی ہو۔ يَّتَجَرَّعُهٗ یعنی وہ اس کو گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے، اس کی کڑواہٹ اور حرارت کی وجہ سے ایک ہی دفع نہیں پی سکیں گے۔ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ یعنی وہ اسے نگل نہیں سکے گا، جرع الماء و اجترعه و تجرعه کہا جاتا ہے اور اس کا معنی سَاغَ الشراب فی الحق يَسُوغُ سَوغًا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ آسانی سے نگل لے، اسی طرح أساغه الله إساغة ہے اور یکاد صلہ ہے، یعنی وہ اس کو دیر لگانے کے بعد نگلے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ (البقرہ) یعنی انہوں نے سستی کے بعد کام سرانجام دیا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ (الحج) تو یہ اساغت پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہ وہ اس کو جائز قرار دے گا اور نہ وہ اس کے ذریعے فائدہ حاصل کرے گا۔

وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ہر طرف سے اس کے دائیں بائیں، اوپر نیچے، آگے اور پیچھے سے موت کے اسباب اس کے پاس آئیں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ (الزمر: 16) ان کے اوپر سے دوزخ کا سایہ ہوگا اور ان کے نیچے سے سایہ ہوگا۔

ابراہیم تیمی نے کہا: اس کے جسم کے ہر حصے سے وہ اس کے پاس آئے گی یہاں تک کہ بالوں کے اطراف سے بھی، ان تکلیفوں کے لیے موت کا لفظ بولا گیا ہے جو اس کے جسم کے ہر حصے سے آئیں گی (1)۔ ضحاک نے کہا: ہر طرف اور ہر جگہ سے حتی کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے موت اس کے پاس آئے گی۔ اخفش نے کہا: اس سے مراد وہ مصیبتیں ہیں جو جہنم میں

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 128

کافر کو جھیلنا پڑیں گی اللہ تعالیٰ نے ان مصیبتوں کو موت فرمایا ہے اور یہ موت بھی بڑی ہوگی۔ ایک قول یہ ہے: اس کے ہر عضو پر عذاب کی ایک صورت مسلط ہوگی۔ عذاب کی ایک صورت کا ایک لحظہ کے لیے تسلط اس پر ستر مرتبہ کی موت سے زیادہ مشکل ہوگا۔ عذاب کی مختلف صورتوں میں ڈسنے والا سانپ، ڈنگ مارنے والا بچھو، جلا دینے والی آگ، پاؤں کی بیڑیاں، گردن میں گرم زنجیریں، زنجیروں کے ساتھ جکڑنا، تابوت میں بند کرنا، پیپ، گرم پانی اور اس کے علاوہ کئی اور صورتیں ہیں۔ محمد بن کعب نے کہا: جب کافر جہنم میں پانی مانگے گا تو اسے دیکھ کر کئی موتیں مرے گا، جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو پھر کئی موتیں مرے گا، اور پھر جب اسے پیے گا تو کئی موتیں مرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ سے یہی مراد ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ نہیں مرے گا تو راحت طلب کرے گا۔ ابن جریج نے کہا: اس کی روح اس کی پسلیوں میں معلق ہو جائے گی اور باہر نہیں نکلے گی تو وہ مرے گا، پھر اس کے پیٹ سے روح اپنی جگہ کی طرف نہیں لوٹے گی تو زندگی اسے فائدہ دے گی، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ﴿۱۳﴾ (الاعلیٰ) میں ہے یعنی اس میں نہ وہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کے جسم میں کئی آلام پیدا فرمائے گا جن میں سے ہر ایک موت کے الم کی طرح ہے۔ ایک قول یہ ہے: وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذریعے موت کے شدائد کو طوالت اور سکرات الموت کو لمبا کیا جا سکے گا تا کہ یہ صورت اس کے عذاب میں زیادتی کا سبب بنے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کافر مرے گا، حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یُقْضٰی عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا (فاطر: 36) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اسی طرح کے ہیں، کفار کے حالات ایسے ہوں گے جیسے اس آدمی کے حالات ہو سکتے ہیں جس پر ہمیشہ سکرات الموت طاری رہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ یعنی اس کے آگے۔ عَذَابٌ غَلِیْظٌ اس سے مراد سخت اور مسلسل تکلیف دہ عذاب ہے جس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً (التوبہ: 123) ہے۔ اس سے مراد بھی شدت اور قوت ہے۔ اللہ کے ارشاد: وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ کے بارے میں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس سے مراد سانسوں کو روکنا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ﴿۲۰﴾

"ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے ایسی ہے کہ ان کے اعمال راکھ کا ڈھیر ہیں جسے تند ہوا تیزی سے اڑا لے گی سخت آندھی کے دن، نہ حاصل کریں گے ان اعمال سے جو انہوں نے کمائے تھے کوئی فائدہ یہ (اعمال کا اکارت جانا ہی) بہت بڑی گمراہی ہے۔ کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے

آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اگر وہ چاہے تو سب ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں''۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ، مثل کے رفع میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ سیبویہ کے نزدیک یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جب کہ خبر مضمر ہوگی۔ تقدیر عبارت یہ ہے وفیما یتلی علیکم او یقص مثل الذین کفروا بربھم پھر نئے سرے سے کلام فرمایا اور فرمایا: اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ یعنی راکھ کے ڈھیر کی طرح۔ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہوگی مثل الذین کفروا فیما یتلی علیکم أعمالھم کرماد یہی فراء کے نزدیک بھی ہے۔ اس صورت میں مثل ملغیٰ ہوگا اصل کلام یہ ہوگا: والذین کفروا بربھم أعمالھم کرماد انہیں سے مضاف کے حذف کی صورت بھی مروی ہے یعنی مثل أعمال الذین کفروا بربھم کرماد پہلی صورت کو ان سے مہدوی نے ذکر کیا ہے اور دوسری کو قشیری اور ثعلبی نے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مبتدا ہو جیسے صفۃ فلان أسمر تو مثل بمعنی صفت ہو۔ اور کلام میں اَعْمَالُهُمْ کو الذین سے بدل اشتمال بناتے ہوئے مجرور پڑھنا بھی صحیح ہوگا اور یہ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کے ارشاد کے ساتھ متصل ہوگا جب کہ معنی یہ ہوگا کہ ان کے اعمال ضائع ہیں مقبول نہیں ہیں۔

اور رماد کسی چیز کے جلنے کے بعد جو باقی بچ جانے والا حصہ ہوتا ہے اسے کہتے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کے اڑ جانے کو بطور تمثیل بیان فرمایا ہے کہ یہ اسی طرح ہے جس طرح سخت آندھی والے دن تیز ہوا راکھ کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ العصف ہوا کی تیزی کو کہتے ہیں۔ ان کی یہ صورتحال اس وجہ سے ہوگی کہ انہوں نے اپنے اعمال میں اللہ کے علاوہ کئی اور لوگوں کو شریک کیا۔ یوم کی عصف کے ساتھ صفت لانے کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ عصف اگرچہ ہوا کی صفت ہے مگر چونکہ ہوا دن میں ہوتی ہے اس لیے اسے دن کی صفت کے طور پر ذکر کرنا صحیح ہوگا اور یوم عاصف کہا جائے گا جس طرح مثلاً دن میں سردی اور گرمی کے ہونے کی وجہ سے یوم بارد اور یوم حار کہنا صحیح ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ سے مراد ہوا ہی ہوگی کیونکہ جملہ کے آغاز میں ہوا کا ذکر کر دیا گیا ہے اس لیے یہاں اس کو حذف کر دیا جیسے شاعر کا شعر ہے:

إذا جاءَ یومٌ مظلمُ الشمسِ کاسِفُ

یہاں مراد کاسف الشمس ہے مگر شمس کا ذکر پہلے ہو جانے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ہروی نے ذکر کی ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ الریح کی صفت ہے۔ اس کا اعراب موصوف کے مطابق اس لیے نہیں ہوگا کیونکہ جب یوم کے بعد آئے گا تو اعراب بھی اس کے مطابق ہوگا جیسے حُجْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ کہا جاتا ہے۔

یہاں خرب جحر کی صفت ہے مگر ضب کے بعد آنے کی وجہ سے اس کے تابع ہے، اس کو ثعلبی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے اور ابن اسحاق اور ابراہیم بن ابی بکر نے فی یومِ عاصفٍ پڑھا ہے۔ لَا يَقْدِرُوْنَ یعنی کفار مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ اس سے مراد آخرت ہے، یعنی کفر کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اس لیے دنیا میں انہوں نے جو نیک عمل کیا ہوگا آخرت میں

اس کا ثواب حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ یعنی بہت بڑا خسارہ موت کی وجہ سے۔ اس کے استدراک کے فوت ہو جانے کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس کو کبیر اور بعید بنا دیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یہاں رؤیت سے مراد رؤیت قلبی ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ کیا تیرے علم کی انتہا اس بات پر نہیں ہوئی۔ حمزہ اور کسائی نے خالق السموات والارض پڑھا ہے اور بِالْحَقِّ کا معنی یہ ہوگا کہ تا کہ آسمانوں اور زمین کے ذریعے اس کی قدرت پر استدلال کیا جا سکے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ یعنی اے لوگو! وہ جس طرح اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے اسی طرح ان کو فنا کرنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا تم اس کی نافرمانی نہ کرو، اگر تم اس کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں ہلاک کر دے گا۔ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ جو تم سے زیادہ فضیلت والے اور تابعدار ہوں گے، کیونکہ اگر وہ بھی پہلے لوگوں کی طرح ہوں تو پھر تو تبدیلی کا کوئی فائدہ نہیں۔ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ عزیز سے مراد مشکل اور متعذر ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾

"اور (روز حشر) اللہ تعالیٰ کے سامنے (سب چھوٹے بڑے) حاضر ہوں گے تو کہیں گے کمزور (پیرو کار) ان (سرداروں) سے جو متکبر تھے (اے سردارو!) ہم تو (ساری عمر) تمہارے فرمانبردار رہے پس کیا (آج) تم ہمیں بچا سکتے ہو عذاب الٰہی سے، وہ کہیں گے: اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم بھی تمہاری رہنمائی کرتے۔ یکساں ہے ہمارے لیے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے لیے (آج) کوئی راہ فرار نہیں ہے اور شیطان کہے گا جب (سب کی قسمت کا) فیصلہ ہو چکے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت، سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو نہ میں (آج) تمہاری فریادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریادرسی کر سکتے ہو، میں انکار کرتا ہوں اس امر سے کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے، بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا یعنی قیامت کے دن اپنی قبروں سے ظاہر ہوں گے۔ البروز کا معنی ظہور ہوتا ہے۔ اور براز کھلی جگہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ظاہر ہوتی ہے، اسی سے لوگوں کے سامنے آنے والی عورت کو امرأۃ برزۃ کہا جاتا ہے۔ برزوا کا معنی ہوگا کہ وہ

اپنی قبروں سے ظاہر ہوئے۔ فعل ماضی ہے مگر معنی مضارع کا ہے اور وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۞ کے ساتھ یہ متصل ہے، یعنی جب رسولوں نے فتح کی التجا کی تو قریب ہے کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا، پھر روز حشر اٹھائے گا اور سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوں گے، کوئی چھپانے والا انہیں اللہ سے نہیں چھپا سکے گا۔ لِلّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں ظاہر کرنے کے حکم کی وجہ سے فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا ضعفاء سے پیروکار مراد ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا ان سے مراد قیادت کرنے والے ہیں۔ اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا، متبع مصدر بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت ذوی تبع ہوگا۔ اور یہ تابع کی جمع بھی ہوسکتی ہے جیسے حارس اور حرس، خادم اور خدم، راصد اور رصد اور باقر اور بقر۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا یعنی ہمیں دور کر سکتے ہو۔

مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ یعنی شیئا اور من صلہ ہے جب کوئی آدمی کسی سے اذیت کو دور کرے تو اغنی عنه کہا جاتا ہے اور جب کوئی کسی تک نفع پہنچا دے تو أغناه کہا جاتا ہے۔ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی ہدایت دیتا تو ہم بھی اس کی طرف رہنمائی کرتے۔ ایک قول یہ ہے: اگر اللہ تعالیٰ جنت کے راستے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا تو ہم اس کی طرف تمہاری رہنمائی کرتے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اگر اللہ ہمیں عذاب سے نجات دیتا تو ہم اس سے تمہیں نجات دلاتے۔ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اَجَزِعْنَآ ہے یعنی سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ، مَّحِيْصٍ سے مراد بھاگنے کی جگہ اور پناہ گاہ ہے۔ یہ مصدر کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور اسم کے معنی میں بھی۔ جب کوئی فرار ہو جائے اور بھاگ جائے تو حَاصَ فلانٌ عن كذا کہا جاتا ہے۔ یہ حَاصَ يَحِيصُ حَيْصًا وحَيُوصًا وحَيَصَانًا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی صورت نہیں جس کے ذریعے ہم دوزخ سے دور ہو جائیں۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''دوزخیوں پر جب عذاب کی شدت ہوگی تو وہ کہیں گے کہ آؤ ہم صبر کریں تو پانچ سو سال وہ صبر کریں گے جب وہ دیکھیں گے صبر نے تو انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا تو کہیں گے آؤ ہم جزع فزع کریں تو پانچ سو سال تک وہ جزع وفزع اور چیخ و پکار کریں گے، جب دیکھیں گے کہ اس نے بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا تو اس وقت کہیں گے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ یکساں ہے ہمارے لیے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے لیے (آج) کوئی راہ فرار نہیں۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ دوزخی ایک دوسرے کو کہیں گے: اے وہ لوگو! اللہ نے تم پر عذاب اور مصیبت نازل کی ہے جس کو تم ملاحظہ کر رہے ہو آؤ ہم صبر کریں، شاید صبر ہمیں فائدہ دے جس طرح اہل طاعت نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا تو صبر نے انہیں نفع دیا، تو تمام دوزخیوں کا صبر پر اتفاق ہو جائے گا سو انہوں نے صبر کیا، تو ان کا صبر لمبا ہو گیا تو انہوں نے جزع فزع کی، پھر پکارے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ تو اس وقت شیطان اٹھے گا کہے گا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وہ کہے گا: میں تمہیں کسی چیز سے نہیں بچا سکتا۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ۔'' یہ طویل حدیث ہے جس کو مکمل طور پر ہم (قرطبی) نے کتاب التذکرہ میں لکھ دیا ہے۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ حضرت حسن نے کہا (1): قیامت کے روز شیطان آگ کے منبر پر جہنم میں خطاب کرتا ہوا کھڑا ہوگا جس کو ساری مخلوق سنے گی۔ اور لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ کا معنی یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت حاصل ہو جائے گی اور دوزخیوں کو دوزخ جس طرح کہ سورۂ مریم میں اس کا بیان آئے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ اس سے مراد بعث بعد الموت، جنت، دوزخ، اطاعت گزار کا ثواب اور نافرمانی کی سزا کا وعدہ ہے پس اس نے اپنے وعدے کو تمہارے سامنے سچ کر دکھایا ہے، اور میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا کہ بعث بعد الموت نہیں ہوگا، نہ جنت ہوگی، نہ دوزخ، نہ ثواب اور نہ عقاب ہوگا سو میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔

ابن مبارک نے حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث شفاعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے (2) کہ تمہاری رہنمائی نبی امی کی طرف کرتا ہوں۔ پس لوگ میرے پاس آئیں گے اللہ تعالیٰ مجھے اذن فرمائے گا اور میں کھڑا ہوں گا اور میری مجلس سے ایسی خوشبو پھیلے گی جسے آج تک کسی نے نہ سونگھا ہوگا تو میں اپنے رب کے حضور میں آ کر اپنی امت کی شفاعت کروں گا اور اللہ تعالیٰ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور میرے گیسوئے عنبریں سے لے کر میرے قدموں کے ناخنوں تک نور ہی نور ہوگا یہ منظر دیکھ کر کافر کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفیع المذنبین مل گیا اب ہماری شفاعت کون کرے گا؟ پھر کہیں گے کہ شیطان کے پاس چلو اسی نے ہم کو گمراہ کیا تھا وہی ہماری شفاعت کرے گا، سب اس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اہل ایمان کو تو ان کا شفیع مل گیا اب تو ہماری شفاعت کر کیونکہ تو نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ اس کی مجلس سے ناقابل برداشت بدبو اٹھے گی وہ رونے چلانے لگیں گے تو شیطان انہیں یہ جواب دے گا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ الایۃ، وَعْدَ الْحَقِّ یہ ایک چیز کی خود اسی کی طرف اضافت ہے، جیسے مسجد الجامع وغیرہ۔

فراء نے کہا: بصریوں نے کہا ہے (اصل عبارت یوں ہے) وعدکم وعد الیوم الحق یا وعدکم وعد الوعد الحق فصدقکم تو مصدر کو دلالت حال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ، سلطان سے مراد حجت اور بیان ہے یعنی جو وعدہ میں نے دنیا میں تمہارے ساتھ کیا اور اسے مزین کر کے پیش کیا میں نے تمہارے لیے اس کی حجت اور بیان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ یعنی میں نے تمہیں گمراہ کیا اور تم نے میری پیروی اختیار کر لی۔ اور ایک قول یہ ہے: میں نے اپنی دعوت کی طرف تمہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ یہ استثناء منقطع ہے مراد یہ ہے کہ لیکن میں نے وسوسے کے ذریعے تمہیں دعوت دی اور تم نے خود اپنی مرضی اور اختیار سے اسے قبول کر لیا۔ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ سے مراد یہ ہے کہ مجھے تمہارے دلوں اور ایمان کی جگہ پر زور حاصل نہیں تھا لیکن میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے فوراً میری دعوت کو قبول کر لیا اور یہ اس صورت میں ہے کہ اس سے گناہگار مومنین اور منکر کافروں کو خطاب کیا گیا ہو، مگر اس میں نظر ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد: لما قضی الامر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان نے صرف کفار کو خطاب کیا نہ کہ گناہگار مومنوں کو۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 130
2۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 375

فَلَا تَلُوۡمُوۡنِيۡ وَلُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ یعنی جب تم بغیر دلیل کے میرے پاس آئے ہوتو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِكُمۡ یعنی میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِيَّ نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ صارخ اور مستصرخ وہ ہوتا جو مدد طلب کرتا ہے اور مصرخ مددگار کو کہتے ہیں۔ سلامہ بن جندل نے کہا:

كنا إذا ما آتانا صارِخٌ فَزِعٌ كَان الصُّراخُ له قَرْعُ الظُّنَا بِيبِ(1)

شعر میں صارخ سے مراد مدد و معاونت کا طلب گار ہے۔

امیہ بن ابی صلت نے کہا:

ولا تَجْزَعوا إِنّی لكم غيرُ مُصْرِخٍ وليس لكم عندی غَنَاءٌ ولانَصْرُ(2)

یہاں مصرخ سے مراد مدد کرنے والا ہے۔

صرخ فلان کہا جاتا ہے یعنی اس نے مدد طلب کی۔ یہ صَرَخَ يَصۡرُخُ صَرۡخًا و صُرَاخًا و صَرۡخَةً ہے اور اصطرخ بمعنی صرخ ہے اور التصرخ میں تصنع اور تکلف ہے اور المصرخ مددگار جب کہ المستصرخ مدد طلب کرنے والا ہے، اسی سے یہ جملہ بھی ہے کہ استصرخنی فأصرخته یعنی اس نے مجھ سے مدد طلب کی پس میں نے اس کی مدد کی اور الصریخ مدد طلب کرنے والے کی آواز ہے اور الصریخ مدد طلب کرنے والا بھی ہوتا ہے، اور اس سے مراد مدد کرنے والا اور مدد طلب کرنے والا دونوں ہیں، یہ اضداد میں سے ہے، یہ جوہری کا قول ہے۔ عام قراء کی قرات بمصرخی با کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ جب کہ اعمش اور حمزہ نے بمصرخی با کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی اصل بمصرخیین ہے اضافت کی وجہ سے نون حذف ہو گیا اور یا جمع کو یا اضافت میں مدغم کر دیا گیا۔ جس نے اس کو نصب دی اس کی ایک وجہ تضعیف ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یا اضافت کا ماقبل ساکن ہو تو اس پر فتحہ ہی آتا ہے جیسے ھوای اور عصای وغیرہ اور اگر ماقبل متحرک ہو تو پھر فتحہ اور اسکان دونوں جائزہ ہیں جیسے غلامی اور غلامیَ وغیرہ۔ اور جس نے کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو ساکن مل جائیں اور حرکت کی ضرورت پڑنے تو کسرہ کے ساتھ حرکت دی جاتی ہے کیونکہ یا اخت کسرہ ہے۔

فراء نے کہا: حمزہ کی قراءت اس کی طرف سے پائے جانے والے وہم کی وجہ سے ہے۔ زجاج نے کہا: یہ ردی قراءت ہے اور سوائے ایک ضعیف وجہ کے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ قطرب نے کہا: یہ بنی یربوع کی قراءت ہے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ یا اضافت پر ایک اور یا کا اضافہ کرتے ہیں۔ قشیری نے کہا: جو چیز اس سے مستغنی کرتی ہے وہ تواتر کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے اس کا ثابت ہونا ہے لہٰذا یہ درست نہیں کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ غلط ہے، قبیح ہے یا ردی ہے، بلکہ یہ قرآن میں فصیح ہے، اور اس میں ایسی صورتیں بھی ہیں جو اس سے بھی زیادہ فصیح ہیں، شاید ان کی مراد یہ ہوگی کہ جو حمزہ کے علاوہ دیگر کی قراءت ہے وہ زیادہ فصیح ہے۔ اِنِّيۡ كَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَكۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ یعنی جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے شریک ٹھہرایا ہے میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ ما مصدر کے معنی میں ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں آج اس بات کا انکار کرتا ہوں جو تم دنیا میں اللہ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 334 2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 131

تعالیٰ کے ساتھ شرک کا دعویٰ کرتے تھے۔

قتادہ نے کہا: كَفَرْتُ بمعنی عصیت ہے یعنی میں نے اللہ کی نافرمانی کی۔ ثوری نے کہا: جو تم نے دنیا میں میری اطاعت کی میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان آیات میں قدریہ، معتزلہ، امامیہ اور ان کے پیروکاروں کی تردید ہے۔ ان کے پیروکاروں کی بات پر غور کرو۔ انہوں نے کہا: لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ اور اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں ہدایت دیتے اور شیطان کا قول: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا۔ ان اقوال کو دیکھو ان میں انہوں نے کیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے سلسلے میں حق کا اعتراف کیا ہے حالانکہ یہ دوزخی ہیں؟ جس طرح قرآن مجید میں ایک اور مقام پر كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ سے لے کر فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (الملک: 8 تا 11) تک ہے اس میں انہوں نے دوزخ کی سختیوں میں حق کا اعتراف کیا مگر یہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوگا۔ یہ اعتراف دنیا میں اعتراف کرنے والے کے لیے نفع بخش اور سودمند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (التوبہ: 102) اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا نیک اور برے اعمال کو ملا جلا دیا اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عسیٰ کا استعمال وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور داخل کیا جائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے باغات میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اپنے رب کے حکم سے ان کی دعا وہاں ایک دوسرے کو یہ ہوگی کہ تم سلامت رہو"۔

قولہ تعالیٰ: وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، جَنّٰتٍ اس سے مراد فی جنات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دخول متعدی نہیں جس طرح کہ اس کی نقیض جو کہ خروج ہے وہ متعدی نہیں ہوتی، لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ مہدوی کا قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کی حالت کے متعلق بیان فرمایا تو اس کے بعد جنتیوں کے حالات کے بارے میں خبر دی ہے۔ جمہور کی قراءت کے متعلق یہ ادخل فعل مجہول ہے۔ جب کہ حضرت حسن بصری نے اسے اُدْخِلُ پڑھا ہے یعنی مضارع کا صیغہ بطور استئناف آیا ہے۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ یعنی اسکے حکم سے۔ ایک قول کے مطابق اللہ کی مشیت مراد ہے۔ باذنی کی جگہ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تعظیم اور تفخیم کے لیے فرمایا ہے۔ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ سورۂ یونس میں یہ گزر چکا ہے۔ والحمدللہ۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لیے تا کہ وہ (انہیں) خوب ذہن نشین کر لیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی مثال بیان فرمائی اور وہ ہے كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراہیم:18) تو مومنین کے احوال کی مثال بھی ذکر فرما دی۔ پھر اس مثال کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: كَلِمَةً طَيِّبَةً یعنی کلمة طيبة الثمر ایسا کلمہ جس کا پھل پاکیزہ ہے ثمر کو اس لیے حذف کر دیا گیا کہ کلام اس پر دلالت کر رہا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کلمہ طیبہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، جب کہ شجرہ طیبہ سے مراد مومن ہے (1)۔

مجاہد اور ابن جریج نے کہا: کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ عطیہ عوفی اور ربیع بن انس نے کہا: یہ بذات خود مومن ہے۔ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے کہ شجرہ سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ مومن کے دل میں کلمے کی اصل جو کہ ایمان ہے بڑھوتری میں اللہ تعالیٰ نے اسے کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہو، اور آسمان میں بندے کے عمل کی رفعت کو کھجور کے درخت کی ٹہنیوں کی رفعت کے ساتھ تشبیہ دی جب کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ثواب کو پھل کے ساتھ تشبیہ دے دی ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بے شک ایمان کی مثال ثابت درخت کی ہے ایمان اس کی رگیں ہیں، نماز اس کی اصل ہے، زکوٰۃ اس کی فرع، روزے اس کی ٹہنیاں، اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھانا اس کی بڑھوتری، حسن اخلاق اس کے پتے اور اللہ کے محارم سے رکنا اس کا پھل ہے''۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو: کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں ثابت ہیں یعنی اس کی جڑیں زمین سے پانی پیتی ہیں اور آسمان اوپر سے اسے سیراب کرتا ہے، لہٰذا یہ پاکیزہ بڑھنے والا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ حضرت انس نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک طشت لایا گیا جس میں تر کھجوریں تھیں، تو آپ نے فرمایا: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا آپ نے فرمایا: یہ کھجور کا درخت ہے''۔ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ آپ نے فرمایا: ''یہ تنبیہ ہے'' (2)۔ ترمذی نے حضرت انس سے ان کا قول روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ زیادہ صحیح ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 132　　2۔ جامع ترمذی، باب من سورة ابراہیم، حدیث نمبر 3044، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہ ﷺ نے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی تلاوت فرمائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے''۔ تو میرے دل میں یہ بات آئی کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ سہیلی نے کہا: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے کہ اس سے مراد ہندی اخروٹ ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث صحیح مروی ہے کہ ''درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور یہی مومن کی مثال ہے مجھے بتاؤ یہ کون سا درخت ہے؟ پھر فرمایا: یہ کھجور کا درخت ہے''(1)۔

امام مالک نے مؤطا میں اس کو بیان کیا ہے۔ امام مالک کی روایت ابن قاسم وغیرہ سے ہے سوائے یحییٰ کے انہوں نے یحییٰ کو اپنی روایت سے ساقط کر دیا ہے۔ اہل صحیح نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اس میں حارث بن اسامہ کا اضافہ کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اور یہ کھجور کا درخت ہے اس کے پتے نہیں گرتے اور اسی طرح مومن بھی ہے کہ اس کی دعوت نہیں گرتی''۔ اس ارشاد نے حدیث کے معنی اور مماثلت کو بیان کر دیا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: غزنوی نے نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا ہے کہ ''مومن کی مثال (2) کھجور کے درخت کی طرح ہے اگر آپ اس کی دوستی اختیار کریں گے تو یہ تمہیں فائدہ دے گی، اگر آپ اس کے پاس بیٹھیں گے تو یہ تیرے لیے نفع بخش ہوگا اور اگر آپ اس کے ساتھ مشاورت کریں گے تو بھی یہ تیرے لیے نفع بخش ہوگا جس طرح کھجور کا درخت ہے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کے حوالے سے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی پھوپھی سے کھاؤ''(3)۔ اس سے آپ کی مراد کھجور کا درخت ہے جس کو حضرت آدم علیہ السلام کی بقیہ مٹی سے پیدا کیا گیا، اور اسی طرح یہ اپنے سر کے ساتھ باقی رہتا ہے، اپنے دل کے ذریعے زندگی پاتا ہے اور اس کا پھل مذکر و مونث کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: درختوں میں سے جب یہ انسان کے زیادہ مشابہ ہے تو اسی کے ذریعے تشبیہ بیان کر دی گئی، اور اس کی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ تمام درخت ایسے ہیں کہ اگر ان کے سروں کو کاٹ دیا جائے تو ان کی ٹہنیاں ہر طرف سے پہلے کی نسبت زیادہ گھنی ہو کر اگتی ہیں جب کہ کھجور کے درخت کے سرے کو اگر کاٹ دیا جائے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور اصلاً ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ التقاح میں انسان اور تمام حیوانوں کے مشابہ ہے کیونکہ بغیر تلقیح کے یہ پھل لیتا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: خیر المال سکة مابورة و مهرة مامورة بہترین مال وہ ہے جو بڑھنے والا اور نتیجہ خیز ہو۔ اور الابار سے مراد تلقیح ہے اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا۔ اور چونکہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بقیہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا تو مٹی کا ایک ٹکڑا بچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے اس کی تصویر کشی کی اور جنت عدن میں اس کو گاڑ دیا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اکرموا عمتکم اپنی پھوپھی کی عزت کرو (4)۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہماری پھوپھی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھجور کا درخت''۔

---

1۔ کنز العمال، جلد 12 صفحہ 338، حدیث 35299
2۔ ایضاً فی صفات المومنین، جلد 1 صفحہ 147، حدیث 726
3۔ ایضاً
4۔ معالم التنزیل، جلد 3 صفحہ 377

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ ربیع نے کہا: كُلَّ حِيْنٍۢ سے مراد صبح اور شام ہے، اسی طرح مومن کا عمل دن کے آغاز اور اختتام پر اوپر چڑھتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ کے متعلق بھی آپ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: یہ ہند کا درخت ہے جس کا پھل ختم نہیں ہوتا، ہر ماہ اس پر پھل لگتا ہے، ہر وقت الله کے لیے کیے گئے مومنین کے عمل کو الله نے کھجور کے اس درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو مختلف اوقات میں پھل دیتا ہے۔ ضحاک نے کہا: موسم گرما ہو یا سرما، رات، دن کی ہر ساعت تمام اوقات میں کھایا جاتا ہے، پس اسی طرح تمام اوقات میں مومن بھی خیر اور بھلائی سے خالی نہیں ہوتا۔ نحاس نے کہا: یہ تمام اقوال قریب المعنی ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حین تمام اہل لغت کے نزدیک وقت کے معنی میں ہے اس کا اطلاق قلیل وکثیر دونوں زمانوں پر ہوتا ہے البتہ ان میں سے کوئی ایک ان سے علیحدہ ہوا ہے۔ اصمعی نے نابغہ کا شعر پڑھا ہے:

تَنَاذَرها الرَّاقُونَ من سُوءِ سُمِّها　　تُطَلِّقُه حِينًا و حينًا تُرَاجِعُ(1)

پس یہ شعر بھی اسی بات کو واضح کرتا ہے کہ حین بمعنی وقت ہے، پس ایمان مومن کے دل میں ثابت ہے اور اس کا عمل، قول اور تسبیح بلند ہے اور آسمانوں کی طرف یوں اٹھتی ہیں جس طرح کھجور کے درخت کی ٹہنیاں، اور ایمان کی برکت اور ثواب میں جو وہ کماتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے سال کے مختلف اوقات میں کھجور کا پھل حاصل ہوتا ہے رطب، بسر، بلح، زہو، تمر اور طلع کی صورت میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے کہ شجرہ طیبہ جنت کا ایک درخت ہے جو ہر وقت پھل دیتا ہے، مثلاً، ضرب کا مفعول ہے اور کلمۃ اس سے بدل ہے جب کہ کشجرۃ میں کاف کلمۃ سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے: کلمۃ طیبۃ مشبہۃ بشجرۃ طیبۃ کہ کلمہ طیبہ شجرہ طیبہ کے مشابہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ جب درخت ہر سال ایک مرتبہ اپنا پھل دیتے ہیں، تو یہ حین کے حکم کا بیان ہو گا، لہٰذا ہم نے کہا: جس نے قسم اٹھائی کہ الایکلم فلانا حیناکہ وہ فلاں کے ساتھ ایک حین تک گفتگو نہیں کرے گا تو اس میں حین سے مراد ایک سال ہوگا۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر حین کا لفظ آیا ہے جس سے مراد اکثر حصہ ہے جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1)

''التفسیر'' میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد چالیس سال ہیں۔ عکرمہ نے حکایت بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ان فعلت کذا و کذا الی حین فغلامہ حر وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آیا اور آپ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کہ حین میں سے ایسا حین بھی ہے جس کا ادراک نہیں ہو سکتا، جیسے الله کا ارشاد: وَ اِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (الانبیاء) میرا خیال ہے کہ اس سے مراد کھجور توڑنے سے لے کر اس کو اٹھانے تک کا زمانہ ہے تو اس قول نے آپ کو تعجب میں ڈال دیا۔

یہ حضرت ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ حین سے مراد چھ ماہ ہیں آپ نے عکرمہ وغیرہ کی اتباع میں یہ بات کہی ہے۔ سورۃ البقرہ میں حین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال تفصیلاً گزر چکے ہیں۔ الحمدلله۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 132

وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ یعنی لوگوں کے لیے تشبیہات بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ یعنی وہ نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةِ ﹰ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

''اور مثال ناپاک کلمہ کی ایسی ہے جیسے ناپاک درخت ہو جسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے (اور) اسے کچھ قرار نہ ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ، كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ سے مراد کلمہ کفر ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد بذات خود کافر ہے۔ اور شجرہ خبیثہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ایلوا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ ایسا درخت ہے جو زمین پر پیدا ہی نہیں ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک قول کے مطابق اس کا معنی تھوم کا پودا بھی بیان ہوا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد کھمبی یا کائی ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ کشوث ہے اور کشوث ایسا درخت ہے جس کے نہ پتے ہوتے ہیں اور نہ ہی زمین میں اس کی کوئی جڑ ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

وھُمْ كَشُوثٌ فلا أصلٌ ولا ورقٌ (1)

وہ کشوث ہیں نہ (ان کی) کوئی جڑ ہے اور نہ پتے

اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ اس کو اپنی جڑوں سے اکھیڑ لیا گیا۔ اسی سے لقیط کا یہ شعر ہے:

هو الجلاءُ الذی یَجْتَثُّ اُصُلَكُم فمن رأى مثلَ ذا یوما ومن سَمِعَا (2)

مؤرج نے کہا: اسے اس کے جثہ سے پکڑ لیا گیا اور اس سے مراد اس کی ذات ہے اور جثہ انسانی ذات ہے چاہے وہ بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہو۔ اور جثہ کا معنی ہے اس نے اسے اکھیڑ دیا جب کہ اجتثہ کا معنی ہے کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھڑ گیا یعنی اس کا ایسا مضبوط تنا نہیں ہے جو زمین سے اپنی جڑوں کے ذریعے تری حاصل کرتا ہو۔

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ یعنی زمین میں کوئی جڑ باقی نہیں رہے گی۔ ایک قول کے مطابق قرار کا معنی ثبات ہے، پس اسی طرح کافر کے لیے نہ کوئی حجت ہوگی، نہ ثبات اور نہ اس میں کوئی بھلائی ہے، اور نہ اس کا کوئی پاکیزہ قول بلند ہوگا اور نہ ہی نیک عمل۔ معاویہ بن صالح نے علی بن ابی طلحہ سے اللہ کے ارشاد ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً کے بارے میں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ شجرہ طیبہ، مومن ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ سے مراد یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مومن کے دل میں ثابت ہے۔ اور وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ سے مراد شرک جب کہ كَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ سے مراد مشرک ہے۔ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ سے مراد یہ ہے کہ مشرک کی کوئی اصل ہی نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر وہ عمل کرے۔ ایک قول کے مطابق: ضرب المثل کا تعلق ایمان کی طرف دعوت اور شرک کی طرف دعوت کے ساتھ ہے، کیونکہ کلمۃ سے قول اور دعوت الی

1۔ تفسیر کشاف، سورۂ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 553 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 135

الشیء مفہوم ہوتا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

''ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس پختہ قول (کی برکت) سے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا (1): قول ثابت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ نسائی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا آپ نے فرمایا: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ عذاب قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کہا جائے گا: تیرا رب کون ہے؟ بندہ کہے گا: میرا رب اللہ اور میرا دین دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، پس یہی اللہ کا ارشاد: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: امام مسلم کے بعض طرق میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اسی طرح مروی ہے کہ یہ آپ کا قول ہے جب کہ اس کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ مرفوع ہے جس طرح صحیح مسلم، نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت براء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے بھی اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے حدثنا جعفر بن عمر قال حدثنا شعبة عن علقمة بن مرثد عن سعد بن عبيدة عن البراء بن عازب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا: ''جب مومن کو اس کی قبر میں بٹھایا جائے گا تو اس کے پاس آنے والا آئے گا پھر وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں پس یہی اللہ کا ارشاد: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ہے'' (2)۔

ہم (قرطبی) نے اس باب کو کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے اور یہ بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ کس کو قبر میں آزمایا جائے گا اور اس سے سوال پوچھے جائیں گے؟ جو اس سے آگاہی چاہتا ہے وہ دوبارہ غور و فکر کرے۔ حضرت سہل بن عمار نے کہا: میں نے یزید بن ہارون کو ان کی موت کے بعد خواب میں دیکھا۔ میں نے انہیں کہا: اللہ نے تیرے ساتھ کیا (سلوک) کیا؟ اس نے کہا: میری قبر میں میرے پاس دو سخت قسم کے فرشتے آئے۔ انہوں نے کہا: تیرا دین کیا ہے، تیرا رب کون ہے، اور تیرا نبی کون ہے؟ میں نے اپنی سفید داڑھی کو پکڑا اور کہا: کیا مجھ جیسے آدمی کو یہ کہا جا سکتا ہے حالانکہ میں نے اسی سال تک تمہارے ان سوالوں کے جواب لوگوں کو سکھائے؟ وہ چلے گئے اور انہوں نے کہا: کیا تو نے حریز بن عثمان سے کوئی حدیث لکھی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ تو انہوں نے کہا: وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض رکھتا تھا تو اللہ نے اسے مبغوض و مردود بنا دیا۔ ایک قول کے مطابق يُثَبِّتُ اللّٰهُ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قول ثابت پر دوام نصیب فرمائے گا، اسی سے حضرت عبد اللہ بن رواحہ کا قول ہے:

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 553

2۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 378، سنن ابی داؤد، باب فی المسألة فی القبر الخ، حدیث نمبر 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب ذکر القبر والبلی، حدیث نمبر 4258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُثَبِّتُ الله ما آتاكَ من حَسَنٍ     تَثبِيتَ موسى و نصراً كالذى نُصِرَا(1)

ایک قول یہ ہے: اللہ تعالیٰ ان کی جزا کے طور پر انہیں دارین میں قول ثابت پر ثابت رکھے گا۔ قفال اور ایک جماعت نے کہا: فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سے مراد فی القبر ہے، کیونکہ بعث بعد الموت تک مردہ دنیا میں ہی ہوتا ہے اور فِي الْاٰخِرَةِ سے مراد عند الحساب، یعنی حساب کا وقت ہے۔ ماوردی نے اسے حضرت براء سے حکایت کیا ہے کہ آپ نے کہا: دنیوی زندگی سے مراد قبر میں سوال و جواب ہیں اور آخرت سے مراد قیامت کے سوال و جواب ہیں۔

وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ان کی قبروں میں ان کی حجتوں سے ایسے ہی بھٹکا دے گا جس طرح دنیا میں اس نے انہیں ان کے کفر کے سبب بھٹکایا پس وہ انہیں حق کے کلمہ کی تلقین نہیں کرے گا، جب ان کی قبروں میں ان سے پوچھا جائے گا تو وہ کہیں گے: ہم نہیں جانتے، وہ کہے گا: نہ تو نے جانا اور نہ پڑھا، اس وقت روایات کے مطابق انہیں لوہے کے چابک کے ساتھ مارا جائے گا۔

ہم (قرطبی) نے اسے کتاب "التذکرہ میں ذکر کیا ہے"۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ انہیں مہلت دے گا یہاں تک کہ دنیا میں وہ گمراہی میں بہت آگے چلے جائیں گے۔ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ یعنی کسی قوم کو عذاب دینے اور گمراہ کرنے کے حوالے سے جس طرح وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس آیت کے نزول کا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے کہ جب آپ نے منکر نکیر کے سوالات اور میت کے جواب کے متعلق بتایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے پاس میری عقل ہوگی؟ آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ آپ نے عرض کیا: کیا اس پر پردہ ڈال دیا جائے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

"کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر (یعنی) دوزخ میں، جھونکے جائیں گے اس میں اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اور بنا لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے مدمقابل تاکہ بھٹکا دیں (لوگوں کو) اس کی راہ سے آپ (انہیں) فرمایئے (کچھ وقت) لطف اٹھا لو پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے بدلے کفر کیا یعنی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں مبعوث فرمایا تو انہوں نے آپ کی تکذیب کرتے ہوئے کفر اختیار کر لیا، اس سے مراد قریش ہیں اور آیت انہیں کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔

ایک قول یہ ہے: یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر کے مقام پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 135

جنگ کی۔ ابوالطفیل نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے: یہ وہ قریش ہیں جنہیں بدر والے دن قتل کیا گیا۔ ایک قول یہ ہے: یہ قریش کے بنومخزوم اور بنوامیہ کے فاجروں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جہاں تک بنی امیہ کا تعلق ہے تو انہوں نے ایک وقت تک لطف اٹھایا جب کہ بنی مخزوم کو بدر میں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ عرب کے نصرانی جبلہ بن ایہم اور اس کے دوست ہیں کہ جب اس نے تھپڑ مارا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے بھی قصاص لازم کیا، تو اس نے اس بات کو پسند نہ کیا اور عیسائی بنتے ہوئے مرتد ہو گیا اور اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ روم چلا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے(1)۔ اور جب روم پہنچا تو پھر شرمندہ ہوا اور یہ اشعار کہے:

تَنَصَّرتِ الأشرافُ من عارِ لَطْمَةٍ ... وما كان فيها لو صَبَرْتُ لها ضَرَرْ
تَكَنَّفِنِي منها لَجَاجٌ و نَخْوَةٌ ... وبِعتُ لها العينَ الصحيحة بالعَوَرْ
فياليتني أرْعَى المَخَاضَ ببلدةٍ ... ولم أنكر القول الذي قاله عُمَرْ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تمام مشرکین کے متعلق عام حکم ہے(2)۔ وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ یعنی انہیں اتارا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بدر والے دن مشرکین کی قیادت کرنے والے لوگ ہیں انہوں نے اپنی قوم کو اتارا یعنی جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ دَارَ الْبَوَارِ ایک قول کے مطابق ابن زید کے نزدیک اس سے مراد جہنم ہے۔ ایک قول کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور مجاہد کے نزدیک اس سے مراد بدر کا دن ہے اور بوار ہلاکت کو کہتے ہیں اسی سے شاعر کا قول ہے:

فلم أرَ مثلهُمْ أبطالَ حَرْبٍ ... غداةَ الحرب إذْ خِيفَ البَوَارُ (3)

میں نے جنگ کی صبح ان جیسا بہادر نہیں دیکھا جب ہلاکت کا خوف ہو۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ دَارَ الْبَوَارِ سے مراد جہنم ہے۔ اس صورت میں دَارَ الْبَوَارِ پر وقف کرنا جائز نہیں، کیونکہ جہنم دَارَ الْبَوَارِ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں ھی مضمر ہوگا یعنی ھی جہنم یا پھر يَصْلَوْنَهَا میں پائی جانے والی ضمیر کی وجہ سے مرفوع ہوگا کیونکہ دَارَ الْبَوَارِ پر وقف کرنا عمدہ بات ہے۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۞، قرار سے مراد ٹھکانا ہے۔ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اس سے مراد بت ہیں جن کی انہوں نے عبادت کی۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ، سبیل سے مراد دین ہے، یعنی تا کہ لوگوں کو اس کے دین سے بھٹکا دیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح سورۃ الحج میں لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ (الحج: 9) اسی طرح سورۂ لقمان اور سورۃ الزمر میں ہے جب کہ باقیوں نے لیضلّوا الناس عن سبیله یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جس نے فتح دیا ہے تو اس نے ھم یضلّون عن سبیل اللہ لازم پڑھا ہے یعنی ان کا انجام گمراہ کرنا اور گمراہی ہے۔ یہ لام لام عاقبت ہے۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا ان کے لیے وعید ہے اور یہ دنیا میں پائی جانے والی لذت کے قلیل ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ ختم ہو جانے والی ہیں۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 136 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 137

فَاِنَّ مَصِیْرَكُمْ اِلَى النَّارِ یعنی ان کے لوٹنے کی جگہ اور ان کا ٹھکانہ جہنم کا عذاب ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

''آپ فرمایئے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ صحیح صحیح ادا کیا کریں نماز اور خرچ کیا کریں اس سے جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ اس سے پیشتر کہ آ جائے وہ دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی اہل مکہ نے الله کی نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کر لیا ہے سو آپ اسے فرمایئے جو ایمان لایا اور جس نے اپنی عبودیت کو ثابت کر دیا ہے کہ یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی پانچوں نمازیں ادا کریں، یعنی آپ ان کو ارشاد فرمائیں کہ قائم کرو، امر کے ساتھ شرط مقدر ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: الله کی اطاعت کرو وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا، یعنی اگر تو اس کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: یُقِیْمُوا مجزوم ہے اصل میں۔ لیقیموا ہے لام کو ساقط کر دیا گیا ہے کیونکہ قل کی وجہ سے غائب کا صیغہ ہونے کے باوجود امر پر دلالت کرتا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ یقیموا کہا جائے اور یہ امر محذوف کا جواب ہو، یعنی قل لهم اقیموا الصلاۃ یقیموا الصلاۃ...... وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً اس سے مراد زکوۃ ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ جمہور نے کہا: سر سے مراد وہ ہے جو مخفی ہے اور علانیہ سے مراد وہ جو ظاہر ہے۔ قاسم بن یحییٰ نے کہا(1) کہ سر سے مراد نفل اور علانیہ سے مراد فرض (صدقات) ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت 271 اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ کے تحت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ یہ بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور خلال، خلۃ کی جمع ہے جیسے قلۃ کی جمع قلال آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فلستُ بمقلي الخِلالِ ولا قالِ(2)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

''الله تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا بلندی سے پانی پھر پیدا کیے اس پانی سے پھل تمہارے کھانے کے لیے اور اس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے کشتی کو تاکہ وہ چلے سمندر میں اس کے حکم سے

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 137 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 139

اور تابع فرمان کر دیا تمہارے لیے دریاؤں کو۔ اور مسخر کر دیا تمہارے لیے آفتاب و مہتاب کو جو برابر چل رہے ہیں اور مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو۔ اور عطا فرمایا تمہیں ہر اس چیز سے جس کا تم نے اس سے سوال کیا، اور اگر تم گننا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے، بے شک انسان بہت زیادتی کرنے والا، از حد ناشکرا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ یعنی بغیر کسی مثال کے اس نے ان کو بنایا اور ایجاد فرمایا۔ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ یعنی بادلوں سے مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ یعنی درخت سے پھل نکالے۔ رِزْقًا لَّكُمْ تمہارے کھانے کے لیے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ اس کی تشریح سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ یعنی میٹھے دریا مسخر کیے تاکہ تم ان سے پانی پیو، کھیتیوں کو سیراب کرو اور کاشت کاری کرو، اور نمکین دریا مختلف فوائد کے حصول کے لیے مسخر کیے ہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ یعنی نباتات وغیرہ میں سے جن کی اصلاح ان کے ذریعے ممکن ہوتی ہے ان کی اصلاح میں اللہ تعالیٰ نے سورج و چاند کو مسخر کر دیا ہے اور الدُّؤوب سے مراد عادت جاریہ کے مطابق کام میں کسی چیز کا چلنا اور گزرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دائبین فی السیر اللہ کے امر کے لیے امتثال ہے اور معنی یہ ہے کہ قیامت تک یہ دونوں چلتے رہیں گے ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اس کا یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ یعنی تاکہ تم رات میں سکون کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) ہے یعنی اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن بنایا تاکہ تم اس میں سکون کرو اور اس کا فضل تلاش کرو۔

قولہ تعالیٰ: وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے: وأعطاکم من کل مسئول سألتموہ شیئا یعنی تمہیں ہر اس چیز سے عطا کیا جس کا تم نے اس سے سوال کیا، یہ اخفش کے نزدیک ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہوگا کہ تمہیں ہر اس چیز سے عطا کیا جس کا تم نے اس سے سوال کیا اور ہر اس چیز سے جس کا تم نے سوال نہیں کیا، بعد والے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے (یہ معنی اس لیے بھی صحیح ہوگا) کہ سورج، چاند اور بہت سی نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابتداء میں عطا فرمائیں ان کے بارے میں ہم نے اس سے سوال نہیں کیا، یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) ارشاد فرمایا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ایک قول کے مطابق من زائدہ ہے، یعنی أتاکم کل ما سألتموہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک وغیرہ نے وأتاکم من کلٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے یہ قراءت حضرت حسن بصری، ضحاک اور حضرت قتادہ سے مروی ہے اور نفی کی صورت میں یہ من کل مالم تسألوہ ہوگا یعنی ہر اس چیز سے جس کا تم نے سوال نہیں کیا، جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ ایک قول یہ ہے کہ ما سألتموہ، الذی سألتموہ ہے یعنی ما بمعنی الذی ہے۔ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی نعمتوں کو نہ تم گن سکتے ہو اور نہ ہی شمار کرنے کی طاقت رکھتے ہو، اور ان کی کثرت کی وجہ سے ان کا حصر ممکن نہیں جیسے سماعت، بصارت، انسانی شکل وصورت علاوہ ازیں عافیت اور رزق وغیرہ۔ یہ ساری کی ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ہیں، پس تم اللہ کی نعمتوں کو کفر کے ساتھ کیوں تبدیل کرتے ہو؟ اور ان نعمتوں کے ذریعے اللہ کی اطاعت پر مدد کیوں نہیں طلب کرتے؟ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، الْاِنْسَانَ لفظ تو جنس پر دلالت کرتا ہے مگر اس کی مراد مخصوص ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ابو جہل ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد سارے کفار ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

''اور (اے حبیب!) یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب! بنا دے اس شہر کو امن والا اور بچا لے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی: اے میرے پروردگار! ان بتوں نے تو گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور و رحیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، هٰذَا الْبَلَدَ سے مراد مکہ ہے سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ یعنی مجھے ان (بتوں) کی عبادت سے ایک طرف کر دے۔ اور بنیّ کے قول سے آپ کی مراد آپ کے صلبی بیٹے تھے جن کی تعداد آٹھ تھی، اور ان میں سے کسی ایک نے بھی بتوں کی عبادت نہیں کی۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ ہر اس آدمی کے لیے دعا ہے اللہ تعالیٰ جس کے لیے دعا چاہے۔

جحدری اور عیسیٰ نے واجنبني الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے، کہا جاتا ہے: جنبت ذالك الأمر، وأجنبتُه و جنبتُه إياه، فتجانبه واجتنبه ان کا معنی ہوگا: اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابراہیم تیمی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصص کے بارے میں کہتے تھے: حضرت خلیل کے بعد کون مطمئن ہوتا ہے جب آپ کہتے ہیں: مجھے بچا لے اور میرے بچوں کو کہ ہم بتوں کی پوجا کریں جس طرح میرے باپ اور قوم نے ان کی پوجا کی۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بت چونکہ گمراہی کا سبب تھے اس لیے مجازاً فعل کی اضافت ان کی جانب کر دی گئی ہے، ورنہ تو بت جمادات ہیں جو فعل کر ہی نہیں سکتے۔ فَمَنْ تَبِعَنِيْ یعنی توحید (خداوندی کو ماننے) میں جس نے میری پیروی کی۔ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ یعنی وہ میرے دین پر ہے۔ وَمَنْ عَصَانِيْ یعنی جس نے شرک پر اصرار کیا۔ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ایک قول یہ ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات تب کی تھی جب ابھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات سے آگاہ نہیں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔ اور ایک قول یہ ہے: تو اس کے لیے غفور اور رحیم ہے جس نے موت سے پہلے اپنی نافرمانی اور گناہ سے توبہ کر لی۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وَمَنْ عَصَانِيْ سے مراد یہ ہے کہ جس نے شرک سے کم معاملات میں میری نافرمانی کی۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں اے ہمارے رب! یہ اس لیے تا کہ وہ قائم کریں نماز پس کر دے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: عورتوں میں سب سے پہلے پٹی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں کی طرف سے باندھی گئی آپ نے اس لیے پٹی باندھی تا کہ حضرت سارہ کو آپ اپنے اثر سے بچا سکیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسماعیل کو لے کر آئے حضرت اسماعیل ابھی دودھ پیتے تھے حتی کہ ان دونوں کو آپ نے زمزم کے اوپر بیت اللہ میں چھوڑ دیا، اس وقت مکہ میں کوئی بھی آباد نہیں تھا، اور نہ ہی پانی تھا، ان دونوں کو وہاں چھوڑا، ایک تھیلا ان کے پاس رکھا جس میں کھجوریں تھیں اور ایک مشکیزہ رکھا جس میں پانی تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس پلٹے ام اسماعیل نے آپ کا پیچھا کیا، عرض کی: اے ابراہیم! آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ دیا ہے جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز؟ آپ مسلسل یہی کہتی رہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی توجہ نہ دی، پھر حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ آپ نے کہا: پھر وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ اور واپس لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے یہاں تک کہ جب ثنیہ میں ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے آپ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے، تو وہاں قبلہ کی طرف اپنا منہ کیا اور یہ دعائیں مانگی، اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور عرض کیا: رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ سے لے کر يَشْكُرُوْنَ تک۔

حضرت اسماعیل کی ماں حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی رہی اور اس پانی سے پیتی رہی، حتی کہ جب پانی ختم ہو گیا تو آپ کو بھی سخت پیاس لگی اور آپ کے بیٹے کو بھی اور آپ بیٹے کو مٹی پر لوٹتے ہوئے دیکھتی رہی، اس حالت میں جب نہ دیکھا گیا تو چل پڑیں، پاس ہی صفا پہاڑ کو آپ نے دیکھا، تو اس پر چڑھ گئیں، پھر وادی کی طرف منہ کیا کہ شاید کوئی آدمی نظر آ جائے، مگر کوئی بھی نظر نہ آیا تو صفا سے اتریں، وادی میں پہنچیں، اپنی اوڑھنی کے کنارے کو اٹھایا پھر مجبور انسان کی طرح دوڑنے لگیں، پھر وادی کو عبور کیا تو مروہ پہاڑ سامنے آیا اس پر چڑھ گئیں، دیکھا کہ شاید کوئی نظر آ جائے مگر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ سات مرتبہ آپ نے ایسے ہی کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس یہی لوگوں کی صفا و مروہ کے درمیان سعی ہے''۔ جب آپ مروہ پر سے جھانکیں تو آپ نے ایک آواز سنی آپ نے کہا: رک جا! پھر توجہ سے آواز سنی تو پھر وہی آواز سنائی دی تو آپ نے کہا: تو نے مجھے آواز سنائی کیا تیرے پاس کوئی مدد ہے؟ تو تب ایک فرشتہ مقام زمزم کے پاس تھا اس نے اپنا پیر مارا حتی کہ پانی ظاہر ہو گیا۔ آپ نے اسے بھرنا شروع کر دیا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے یہ (زمزم) کہہ رہی تھیں اور پانی

سے چلو بھر بھر کر اپنے مشکیزے میں ڈالنا شروع کر دیا مگر وہ ابلتا ہی رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم کرے اگر وہ زمزم کو یونہی چھوڑ دیتی تو زمزم ایک چشمہ جاری ہوتا''۔ آپ نے فرمایا'' آپ نے خود پانی پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا تو فرشتے نے آپ کو کہا: مت ڈرو یہاں بیت اللہ ہے اسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کے اہل کو کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا''۔ اور لمبی حدیث کو ذکر کیا۔

**مسئلہ**۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ عزیز و رحیم پروردگار پر بھروسہ کرتے ہوئے اس واقعہ کی وجہ سے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی اقتدا کرتے ہوئے اپنے بیٹے اور گھر والوں کو کسی ایسی زمین میں چھوڑ دے جہاں ان کے ضیاع کا خطرہ ہو، جس طرح غالی قسم کے صوفیہ حقیقت توکل کے بارے میں کہتے ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کیا تھا۔ حدیث طیبہ میں موجود یہ الفاظ کہ'' کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ اور آپ کا فرمانا: ہاں''۔ اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تو حضرت سارہ، حضرت ہاجرہ سے رشک کرنے لگیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں لے کر مکہ آ گئے۔ اور روایت ہے کہ آپ، حضرت ہاجرہ اور بچہ تینوں براق پر سوار ہوئے اور ایک ہی دن میں شام سے مکہ پہنچ گئے، اپنے بیٹے اور اس کی ماں کو وہیں چھوڑا اور اسی دن سوار ہو کر خود واپس لوٹ گئے۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی وجہ سے ہوا، جب واپس لوٹے تو یہ دعا کی جو اس آیت میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے حال کی بنیاد، مقام کے آغاز، عزت والے گھر اور حرمت والے شہر کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو فرشتے کو بھیجا، اس نے پانی تلاش کیا اور اس پانی کو غذا کے قائم مقام بنا دیا۔ الصحیح میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تیس دن اور رات اسی پر گزارا کیا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس سوائے ماءِ زمزم کے کوئی کھانا نہ تھا تو میں موٹا ہو گیا یہاں تک کہ میرے پیٹ کے بٹ (بل) ٹوٹ گئے اور مجھے بھوک کی وجہ سے کمزوری کا احساس تک نہ ہوا، لمبی حدیث کو انہوں نے ذکر کیا۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمزم کا پانی اسی مقصد کے لیے ہے جس کے لیے پیا جائے اگر تو اسے اس لیے پیئے گا کہ شفا حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے شفا دے گا اور اگر اس لیے پیئے گا کہ تو سیر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ تجھے اس کے ذریعے سیر کر دے گا اور اگر پیاس بجھانے کے لیے پیے گا تو وہ تیری پیاس بجھائے گا یہ جبریل کے پر مارنے کی وجہ سے پیدا ہوا اور حضرت اسماعیل کو اللہ نے سیراب کیا''۔ حضرت عکرمہ سے بھی مروی ہے کہ آپ نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب زمزم سے پیتے تو عرض کرتے: اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع، وسیع رزق اور ہر بیماری سے شفا کا سوال کرتا ہوں۔ ابن عربی نے کہا: اس میں یہ اثرات قیامت تک ہر اس آدمی کے لیے موجود ہیں جس کی نیت صحیح ہو اور اس کی خواہش سلامت ہو نہ تو وہ اس کی تکذیب کرنے والا ہو اور نہ ہی تجرباتی طور پر وہ اسے پی رہا ہو۔ بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کے ساتھ ہے اور وہ تجربہ کرنے والوں کو ناکام و نامراد کرتا ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن علی ترمذی نے کہا کہ مجھے میرے باپ رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا انہوں نے کہا: ایک تاریک رات میں میں نے طواف شروع کیا تو مجھے پیشاب کا مسئلہ لاحق ہو گیا جس نے مجھے

مصروف کر دیا، میں نے اسے روکنا شروع کیا حتیٰ کہ اس نے مجھے اذیت دی اور مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ اگر میں مسجد سے نکلا تو کوئی مجھے روند ڈالے گا اور وہ حج کے دن تھے، تو مجھے یہ حدیث یاد آ گئی۔ میں زمزم میں داخل ہوا اور اتنا پیا کہ میری پسلیاں اکڑ گئیں، تو صبح تک میرا مسئلہ ختم ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: زمزم رکن یمانی کی طرف جنت میں ایک چشمہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں من تبعیضہ ہے یعنی أسکنت بعض ذریتی یعنی اسماعیل اور اس کی ماں، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام تو شام میں تھے۔ ایک قول کے مطابق یہ صلہ ہے، یعنی اسکنت ذریتی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ یہ ارشاد بیت اللہ کے قدیم ہونے پر دلالت کرتا ہے جس طرح مروی ہے کہ یہ طوفان نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام (1) نے بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی کہ اللہ کے علاوہ کوئی اس کا مالک نہیں، اور اس کی صفت محرم کے ساتھ اس لیے بیان فرمائی کیونکہ کچھ چیزیں جماع اور دیگر امور میں سے ایسی ہیں جو اس میں حرام ہیں جب کہ دیگر بیوت میں مباح اور جائز ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت قتادہ وغیرہ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ یہ جابروں پر حرام ہے اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ دین کے جملہ معاملات میں سے نماز کو خاص کرنے کی وجہ ایک تو نماز کی فضیلت ہے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اہمیت ہے، اور یہ بندوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک عہد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لکھ دی ہیں'' (2)۔ الحدیث۔ لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ میں لام ہے۔ یہ اس کے متعلق ظاہر بات ہے اور یہ اَسۡکَنۡتُ کے متعلق ہوگی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لام امر ہو، گویا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف اس سلسلہ میں راغب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں نماز قائم کرنے کی توفیق دے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت اپنے ضمن میں اس بات کو لیے ہوئے ہے کہ مکہ میں نماز پڑھنا دیگر مقامات میں نماز کی ادائیگی کی نسبت افضل ہے، کیونکہ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کا معنی یہ ہے کہ میں نے انہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں بسا دیا تاکہ یہ اس میں نماز ادا کریں۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا مکے میں نماز افضل ہے یا مسجد نبوی میں؟ عام محدثین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک سو نماز کی ادائیگی سے افضل ہے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (3): ''میری اس مسجد میں نماز کی ادائیگی دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز کی ادائیگی سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں ایک سو نماز کی ادائیگی سے افضل ہے''۔ امام حافظ ابو عمر نے کہا: وہ ثقہ تھے۔ اور اس حدیث کو حبیب المعلم

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 138

2۔ کنز العمال، کتاب الاکمال، فی فضائل الصلوٰۃ، جلد 7، صفحہ 227، حدیث 18861۔

ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی المحافظۃ علی وقت الصلوٰت، حدیث 361، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب ما جاء فی فرض الصلوٰت الخمس، حدیث 390، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، فضائل مدینۃ وما حولھا، جلد 12، صفحہ 235، حدیث 34822

نے عطاء بن ابی رباح عن عبداللہ بن زبیر بیان کیا ہے اور اسے عمدہ قرار دیا ہے، نہ اس کے الفاظ میں کوئی ملاوٹ کی اور نہ ہی معنی میں۔ ابن ابی خیثمہ نے کہا کہ میں نے یحییٰ بن معین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: حبیب المعلم ثقہ ہے۔ عبداللہ بن احمد نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو کہتے ہوئے سنا: حبیب المعلم ثقہ ہے اس کی بیان کردہ حدیث کتنی زیادہ صحیح ہے۔ ابوزرعہ رازی سے حبیب المعلم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: یہ بصری ہے، ثقہ ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: حبیب المعلم کی اس حدیث کو عطاء بن ابی رباح عن عبداللہ بن زبیر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حافظ ابو حاتم محمد بن حاتم التمیمی البستی نے اپنی المسند الصحیح میں بیان کیا ہے۔ پس حدیث صحیح ہے اور تنازع اور اختلاف کی صورت میں حجت ہے والحمد للہ۔ موسیٰ جہنی نے نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور موسیٰ جہنی ثقہ ہیں ان پر قطان، احمد، یحییٰ اور ان کی جماعت نے اعتماد کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے اور شعبہ، ثوری اور یحییٰ بن سعید نے ان سے روایت کیا ہے اور حکیم بن سیف نے روایت بیان کی ہے حدثنا عبید اللہ بن عمر عن عبد الکریم عن عطاء بن ابی رباح عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام کی ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے'' (1)۔ اور یہ حکیم بن سیف اہل رقہ کے شیخ ہیں ان سے ابوزرعہ رازی نے روایت کیا ہے اور ابن وضاح نے ان سے لیا ہے، اور یہ ان کے نزدیک شیخ صدوق ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ پس اگر تو اس نے یاد کیا تھا تو پھر تو یہ دونوں حدیثیں ہیں ورنہ حبیب المعلم کا قول ہے۔ اور محمد بن وضاح نے روایت بیان کی ہے حدثنا یوسف بن عدی بن عمر بن عبید عن عبد الملک عن عطاء عن ابن عمر رضی اللہ عنہما آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد کی ایک نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے کیونکہ مسجد حرام کی نماز افضل ہے'' (2)۔ ابو عمر نے کہا: یہ سارے کا سارا اختلاف کے مقام میں نص ہے اور ہدایت یافتہ آدمی کے لیے قطعی ہے، اور اس کی وجہ سے اس کی عصبیت پر کوئی ملال نہیں آتا۔ ابن حبیب نے مطرف اور اصبغ سے عن ابن وہب ذکر کیا ہے کہ ان دونوں کا نظریہ مسجد نبوی میں نماز کی ادائیگی پر مسجد حرام کی نماز کی ادائیگی کی فضیلت کا تھا۔

امام مالک اور تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیدین کی نماز ہر شہر میں کھلے میدان میں پڑھی جائے گی سوائے مکہ مکرمہ کے وہاں مسجد حرام میں پڑھی جاتی ہے۔ اور حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو الدرداء اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم مکہ اور اس کی مساجد کو فضیلت دیتے تھے اور ان کی تقلید بعد والوں کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔ یہی نقطہ نظر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور یہی عطاء، اہل مکہ اور اہل کوفہ کا قول ہے۔ اسی طرح حضرت امام مالک سے بھی مروی ہے۔ ابن وہب نے اپنی جامع میں امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تو آپ نے عرض کیا: اے میرے

1۔ کنز العمال، فضائل مدینہ و ما حولہا، جلد 12، صفحہ 235، حدیث 34821

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل المساجد الثلاثۃ، جلد 1، صفحہ 447-446

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی فضل الصلاۃ فی المسجد الحرام الخ، حدیث نمبر 1395، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پروردگار! کیا یہ تیرے نزدیک پسندیدہ ہے کہ اس میں تیری عبادت کی جائے؟ اللہ نے فرمایا: بلکہ مکہ میں، جب کہ آپ سے اور اہل مدینہ سے مشہور مدینہ کی فضیلت کا قول ہے۔ اہل بصرہ اور بغداد نے اس سلسلے میں اختلاف کیا ہے ایک گروہ نے مکہ کی افضیلت کی بات کی ہے اور ایک جماعت نے مدینہ کی۔

قولہ تعالیٰ: فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ، الافئدۃ، فواد کی جمع ہے (1) اور اس سے مراد دل ہیں اور بعض اوقات قلب کو فواد سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جس طرح شاعر نے کہا ہے:

وانّ فؤاداً قادنی بصبابۃ إلیکِ علی طولِ المدیٰ لصبور (2)

اس میں فواد سے مراد دل ہے۔

ایک قول یہ ہے: یہ وفد کی جمع ہے اس کی اصل اوفدہ ہے، فا کو مقدم کیا گیا اور واؤ کو یا سے بدل دیا گیا تو أفئدہ ہو گیا، گویا کہ آپ نے فرمایا: واجعل وفوداً من الناس تھوی إلیھم یعنی وہ ان کی طرف مائل ہوں۔ جب کوئی چیز مائل ہو اور جھکے تو ھوی نحوہ کہا جاتا ہے، اور جب کوئی اونٹنی بہت زیادہ تیز دوڑے تو کہا جاتا ہے۔ ھَوَتْ الناقۃُ تَھْوِی ھَوِیًا فھی ھَاوِیَۃ گویا کہ وہ کھلی ہوا میں ہے۔ اور تھوی إلیھم اسی سے ماخوذ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اگر آپ نے افئدۃ الناس کہا ہوتا تو فارس، روم، ترک اور ہند کے لوگ اسی طرح یہودی، نصرانی اور مجوسی ان کے پاس پہنچ جاتے، لیکن آپ نے افئدۃ من الناس کہا تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ تھوی الیھم یعنی وہ ان کے مشتاق ہو جائیں، اور بیت اللہ کی زیارت کے مشتاق ہو جائیں۔ مجاہد نے تھوی الیھم پڑھا ہے یعنی وہ ان کی طرف مائل ہے اور ان کی تعظیم کرتا ہے۔ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ۔

پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی اور طائف میں ان کے لیے سارے درخت اگا دیئے، اور سارے شہروں کے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آئے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے جس کا بعض حصہ ہم نے ذکر کیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کرنے کے بعد تشریف لائے تو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، آپ کی بیوی سے آپ کے متعلق پوچھا، اس نے کہا: ہمارے لیے کچھ لینے نکلے ہیں، پھر آپ نے ان سے ان کی زندگی اور کیفیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ہم برائی میں ہیں، ہم تنگی اور سختی میں ہیں، اس نے آپ کے سامنے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور اسے کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کر، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا آپ کسی چیز سے مانوس ہوئے آپ نے کہا: کیا کوئی تمہارے پاس آیا ہے؟ بیوی نے کہا: ہاں ہمارے پاس اس طرح کا بوڑھا آیا تھا، اس نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا میں نے اسے بتایا، اس نے مجھ سے ہماری زندگی کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ ہم مشکل اور شدت میں ہیں۔ آپ نے کہا: کیا اس نے کسی چیز کے بارے میں وصیت بھی کی؟ بیوی نے کہا: اس نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو سلام دوں اور وہ کہتا تھا: اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کرو۔ آپ نے فرمایا: وہ میرا باپ تھا اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے جدا کر دوں

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 138 2۔ ایضاً

سوا اپنے گھروالوں کے پاس چلی جا، آپ نے اسے طلاق دے دی اور ایک اور عورت سے شادی کر لی، پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف نہ لائے پھر کچھ عرصہ کے بعد آپ ان کے پاس آئے تو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، آپ کی بیوی کے پاس گئے اور آپ کے بارے میں اس سے پوچھا، اس نے کہا: وہ ہمارے لیے کچھ لینے نکلے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیسے ہو؟ اور آپ نے اس سے زندگی اور ان کی کیفیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ہم بھلائی اور خیر سے ہیں اور اس نے اللہ کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا: تمہارا کھانا کیا ہے؟ اس نے کہا: گوشت۔ آپ نے فرمایا: تمہارا پینا کیا ہے؟ اس نے کہا: پانی۔ آپ نے کہا: اے اللہ! ان کے لیے گوشت اور پانی کو مبارک فرما۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس دن ان کے پاس کوئی دانہ نہیں تھا اگر ہوتا تو آپ اس میں برکت کی دعا بھی کرتے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: ''مکہ کے علاوہ جس نے بھی ان دونوں (پانی اور گوشت) پر اعتماد کیا یہ اسے موافق نہیں آئے''(1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ کہنا گویا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرنا تھا کہ لوگ مکہ کو رہائش گاہ بنالیں، اور یہ حرمت والا گھر ہو جائے، اور یہ سب کچھ قبول ہوا۔ والحمدللہ۔

سب سے پہلے جو آدمی رہائش پذیر ہوا وہ قبیلہ جرہم کا تھا۔ بخاری میں ہے کہ بیت اللہ زمین سے بلند تھا اور اس طرح تھا جس طرح جھاگ اٹھی ہوئی ہوتی ہے سیلاب آتا تو دائیں بائیں سے اسے کاٹتا چلا جاتا، اسی طرح صورتحال رہی حتیٰ کہ قبیلہ جرہم کا ایک قافلہ اس راستے سے گزرا، وہ مکہ کے زیریں علاقے میں اترے، انہوں نے ایک پرندے کو چکر لگاتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ پرندہ پانی پر چکر لگا رہا ہے، اس وادی میں پانی کی تلاش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے ایک یا کئی قاصد بھیجے تو وہ پانی تک پہنچ گئے، انہوں نے انہیں پانی کے بارے میں بتایا تو وہ سارے پانی کے پاس آ گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں پانی کے پاس تھیں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دیں گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں لیکن پانی پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا: ہاں (ٹھیک ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں نے اس قبیلے کو پالیا درآنحالیکہ آپ انس کو پسند کرتی تھیں۔ وہ اترے اور اپنے گھر والوں کی طرف پیغام بھیجا وہ بھی ان کے ساتھ رہائش پذیر ہو گئے یہاں تک کہ ان کے کئی گھر بن گئے، بچہ جوان ہو گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں کا انتقال ہو گیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد تشریف لائے''(2)، الحدیث۔

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ ؕ وَ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 475 2۔ معالم التنزیل، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 385

دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

"اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے الله تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ سب تعریفیں الله تعالیٰ کے لیے جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (جیسے فرزند) بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے دعاؤں کا۔ میرے رب! بنادے مجھے نماز کو قائم کرنے والا اور میری اولاد کو بھی، اے ہمارے رب! میری یہ التجا ضرور قبول فرما۔ اے ہمارے رب! بخش دے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں کو جس دن حساب قائم ہوگا"۔

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ یعنی تجھ پر ہمارے حالات میں سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل نے کہا: اسماعیل اور اس کی ماں کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کر ان کے متعلق جو میرے جذبات ہیں جن کو میں نے دل میں چھپا رکھا ہے اور جن کو میں نے ظاہر کر رکھا ہے تو سب کو جانتا ہے۔ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ایک قول یہ ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کا حصہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ الله تعالیٰ کا کلام ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ کہا تو الله تعالیٰ نے وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ یعنی میرے اور میری بیوی کے بڑھاپے میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیانوے سال تھی اور حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت ایک سو بیس سال کی عمر تھی۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک سو دس سال کی عمر میں حضرت اسحاق کی بشارت دی گئی۔ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ۔

قولہ تعالیٰ: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ یعنی اسلام پر ثابت قدم اور اس کے احکام کا التزام کرنے والا بنا وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ یعنی میری اولاد کو بھی یہ دونوں کام کرنے والا بنا۔ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ، دُعَآءِ سے مراد عبادت ہے یعنی میری عبادت کو قبول فرما، جس طرح الله تعالیٰ نے فرمایا وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) اور تمہارے رب نے فرمایا: میری عبادت کرو میں تمہاری (عبادت کو) قبول کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دعا عبادت کا مغز ہے" (1)۔ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ایک قول یہ ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کے لیے تب دعا مانگی جب ابھی آپ کے نزدیک یہ بات ثابت نہیں تھی کہ وہ دونوں الله کے دشمن ہیں۔ قشیری نے کہا: یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ آپ کی ماں مسلمان ہو کیونکہ الله تعالیٰ نے آپ کے اپنے باپ کے استغفار کے بارے میں عذر کو ذکر کیا ہے۔ ماں کے استغفار کے بارے میں عذر کو ذکر نہیں فرمایا۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس وجہ سے حضرت سعید بن جبیر کی قراءت رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدِيْ ہے یعنی میرے باپ کو بخش دے۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے ان دونوں کے ایمان کی لالچ میں دونوں کے لیے استغفار کیا۔ ایک قول یہ ہے: آپ نے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ما جاء فی فضل الدعاء، جلد 2، صفحہ 173

ان دونوں کے لیے اس شرط کے ساتھ استغفار کیا کہ وہ دونوں اسلام لے آئیں۔ اور ایک قول یہ ہے: والدین سے آپ کی مراد حضرت آدم علیہ السلام و حضرت حوا علیہما السلام ہیں۔

روایت ہے کہ بندہ جب رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ کہے اور اس کے والدین حالت کفر میں مر چکے ہوں تو مغفرت کی نسبت حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی طرف ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ساری مخلوق کے والدین ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: اس سے مراد آپ کے دونوں بیٹے حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق علیہما السلام ہیں۔ ابراہیم نخعی، وَلِوَلَدَیَّ پڑھتے تھے یعنی آپ کے دونوں بیٹے، یحییٰ بن یعمر نے بھی اسی طرح پڑھا ہے (1)۔ اس کو ماوردی اور نحاس نے ذکر کیا ہے۔ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مومنین ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے: تمام مومنین کے لیے دعا ہے اور یہی زیادہ ظاہر اور مناسب ہے۔ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ یعنی جس دن لوگ حساب کے لیے کھڑے ہوں گے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۟ۙ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۟ؕ

"اور تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں وہ تو انہیں صرف ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے لیے جب کہ (مارے خوف کے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی آنکھیں۔ بھاگم بھاگ جا رہے ہوں گے اپنے سر اٹھائے ہوئے ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی اور ان کے دل (دہشت سے) اڑے جا رہے ہوں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ مشرکین کے افعال اور ان کی دین ابراہیمی کی مخالفت سے نبی کو حیران کرنے کے بعد یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے، یعنی صبر کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صبر کیا اور مشرکین کو بتاؤ کہ عذاب کی تاخیر کا مطلب ان کی کارروائیوں پر رضامندی کا اظہار نہیں بلکہ کچھ مدت کے لیے نافرمانوں کو مہلت دینے کی سنت الہیہ ہے۔ میمون بن مہران نے کہا: یہ ظالم کے لیے وعید اور مظلوم کے لیے تعزیت و تسلی ہے (2)۔ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ، هُمْ ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں یعنی وہ انہیں مہلت دیتا ہے اور ان کے عذاب کو مؤخر کرتا ہے۔ عام لوگوں کی قراءت یُؤَخِّرُهُمْ یاء کے ساتھ ہے اور ابو عبید اور ابو حاتم نے وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حسن اور سلمی نے اسے نُؤَخِّرُهُمْ نون کے ساتھ تعظیماً پڑھا ہے اور ابو عمرو سے بھی یہی مروی ہے۔

لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ فراء کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن میں جو ہولناکی کا وہ مشاہدہ کریں گے اس سے آنکھ بند نہیں کر سکیں گے۔ شَخَصَ الرجل بَصَرَہ و شَخَصَ البصرُ نفسہ کہا جاتا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اس کی ہولناکی سے اس کی نظر اٹھی اور بلند ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شدت حیرت کے سبب

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 139
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 140

اس دن مخلوق کی آنکھیں ہوا کی طرف کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ بند نہیں کر سکیں گے۔ مُهْطِعِيْنَ یعنی جلدی جلدی، یہ حضرت حسن، حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے، یہ أهطع يُهطع إهطاعاً سے ماخوذ ہے، یہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی جلدی کرے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ (القمر:8) ہے یہاں مُّهْطِعِيْنَ کا معنی مسرعین ہے۔ شاعر نے کہا:

بدجلة دارُهُمْ ولقد أراهُمْ بدجلةَ مُهطِعِينَ إلى السَّماعِ(1)

شعر میں بھی مہطعین کا مطلب مسرعین ہے۔

ایک قول کے مطابق المهطع وہ جو خشوع و تذلل سے دیکھتا ہے یعنی آنکھیں اٹھائے بغیر دیکھنے والے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور مجاہد اور ضحاک نے کہا: مُهْطِعِيْنَ سے مراد مسلسل دیکھنا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف یہی ہے کہ أهطع اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی جلدی کرے۔ ابو عبید نے کہا: بعض اوقات دو صورتیں اکٹھی پائی جاتی ہیں یعنی اسراع مع ادامة النظر۔ ابن زید نے کہا: المهطع وہ ہے جو اپنے سر کو نہیں اٹھاتا۔ مُقْنِعِىْ رُءُوْسِهِمْ یعنی اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے، نیچے دیکھتے ہوئے۔ اقناع الراس سے مراد سر کا اٹھانا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے۔ ابن عرفہ اور قتبی وغیرہ کا قول ہے: المقنع وہ ہے جو اپنے سر کو اٹھاتا ہے اور اپنے سامنے دیکھتے ہوئے آتا ہے۔ اسی سے اقناع فی الصلاۃ یعنی نماز میں سر اٹھانا ہے اور اپنے سامنے دیکھنا ہے۔ اور جب کوئی آواز بلند کرے تو أقنع صوته کہا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس دن لوگوں کے چہرے آسمان کی طرف ہوں گے کوئی کسی کو نہیں دیکھے گا۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اپنے سروں کو جھکانے والے ہیں۔ مہدوی نے کہا: جب کوئی اپنے سر کو اٹھائے تب اقنع کہا جاتا ہے اور جب کوئی ذلت و خضوع سے اپنے سر کو پست کرے تب بھی أقنع کہا جاتا ہے۔ اور آیت دو احتمال رکھتی ہے، یہ مبرد کا قول ہے جب کہ پہلا قول لغت میں زیادہ معروف ہے۔ ایک رجز کہنے والے نے کہا:

أَنْغَضَ نَحْوِي رَأْسَهُ وَأَقْنَعَا كَأَنَّمَا أَبْصَرَ شيئًا أَطْمَعَا(2)

شعر میں أقنعا سے مراد سر اٹھانا ہے۔

شماخ نے اونٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

يُبَاكِرْنَ العضاةَ بِمُقْنَعاتٍ نَوَاجِذُهنّ كالحَدَأِ الوَقِيعِ

یعنی اپنے سروں کو درختوں کی طرف اٹھاتے ہیں تاکہ انہیں کھائیں۔

تو اس میں بھی سر کو اٹھانا ہی مراد ہے۔ اسی سے اوڑھنی کو مقنعة کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بلند ہوتی ہے۔ اور اسی سے قنع الرجل ہے یعنی وہ خوش ہوا، یعنی اس نے سوال کرنے سے سر اٹھالیا۔ اور جب آدمی سوال کرے تو قنع کہا جاتا ہے یعنی وہ بتکلف قناعت کرتا ہوا آیا، یہ نحاس سے منقول ہے۔ اور فم مقنع یعنی اس کے دانت اندر کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ اور

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 140 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 141

رجل مقنع شد کے ساتھ اس سے مراد وہ آدمی ہے جس نے سر پر خود پہنا ہوا ہو، یہ جوہری کا قول ہے۔ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ یعنی شدت نظر سے ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی پس یہ نظر کا کھلا رہنا ہے۔ جب ایک پلک دوسری کے ساتھ مل جائے تو طَرَفَ الرجلُ یَطْرِفُ طَرْفًا کہا جاتا ہے۔ نظر کو طرف کہا گیا کیونکہ نظر طرف ہی سے ہوتی ہے۔ اور طرف سے مراد آنکھ ہے۔ عنترہ نے کہا:

وأَغُضُّ طَرْفِي ما بَدَتْ لِي جارتِي　　حتّى يُوَارِي جارتِي مَأْوَاهَا

شعر میں طرفی سے مراد میری آنکھ ہے۔

جمیل نے کہا:

وأَقْصِرُ طَرْفِي دُونَ جُمْلٍ كَرَامَةً　　لِجُمْلٍ وللطَّرْفِ الذِي أَنَا قَاصِرُهُ(1)

اس میں بھی طرفی سے مراد میری آنکھ ہے۔

وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ یعنی شدت خوف سے وہ کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے خالی ہوں گے۔ سدی نے کہا: ان کے دل ان کے سینوں سے نکلیں گے اور ان کے حلقوں میں پیوست ہو جائیں گے۔ مجاہد، مرہ اور ابن زید نے کہا: بے آباد، برباد اور پھٹے ہوئے جن میں نہ کوئی بھلائی ہوگی اور نہ عقل، جس طرح کہ آپ اس گھر کے بارے میں انما هو هواء کہتے ہیں جس میں کچھ بھی نہ ہو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور لغت میں ھواء اسے کہتے ہیں جو کھوکھلا اور خالی ہو، اسی سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

أَلَا أَبْلِغْ أَبَا سُفْيَانَ عَنِّي　　فَأَنْتَ مُجَوَّفٌ نَخِبٌ هَوَاءُ(2)

خبردار ابوسفیان کو میری جانب سے پہنچا دو کہ تو کھوکھلا، بزدل اور خالی ہے۔

زہیر نے چھوٹے سر والی اونٹنی کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

كأنَّ الرَّحْلَ مِنْهَا فَوْقَ صَعْلٍ　　مِنَ الظِّلْمَانِ جُؤْجُؤُهُ هَوَاءُ(3)

جؤجؤه هواء یعنی جس کا اگلا حصہ ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ فارغ یعنی خالی ہے۔

قرآن مجید میں اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا (القصص: 10) ہے یعنی سوائے غم موسیٰ کے ہر چیز سے فارغ۔ ایک قول کے مطابق: کلام میں اضمار ہے، یعنی ذات هواء و خلاء۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝

”(اے میرے نبی!) ڈرایئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان پر عذاب تو بول اٹھیں گے ظالم: اے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 141　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر کشاف، سورۃ ابراہیم، جلد 2، صفحہ 563

ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لیے ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ (اے کافرو!) کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْذِرِ النَّاسَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل مکہ مراد ہیں۔ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ وہ قیامت کا دن ہوگا، یعنی انہیں اس دن سے ڈرایئے۔ انہیں صرف عذاب کے دن کے ساتھ مخصوص فرمایا(1) حالانکہ وہ ثواب کا دن بھی ہوگا کیونکہ کلام گناہگار اور نافرمان کے لیے دھمکی اور تہدید کے طور پر ہے۔ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی اس دن کہیں گے رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ یعنی ہمیں مہلت دے۔ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ جب آخرت میں حق ظاہر ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا میں لوٹنے کا سوال کریں گے۔ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ یعنی تیری دعوت اسلام پر لبیک کہیں گے۔ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے، تو انہیں جواب دیا جائے گا اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ، مِّنْ قَبْلُ سے مراد دار دنیا ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ مجاہد نے کہا: یہ قریش کی قسم تھی کہ انہیں مرنے کے بعد نہیں اٹھایا جائے گا۔ ابن جریج نے کہا: یہ ان کے اس قول کی حکایت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (النحل: 38) اور انہوں نے پختہ قسم اٹھائی اللہ کی کہ جو مرجائے گا اللہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ کے بارے میں دو تاویلیں ہیں: ایک تاویل یہ ہے کہ تمہیں دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہی نہیں ہونا، یعنی نہ تمہیں دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ ہی تمہارا حشر ہوگا، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اور دوسری تاویل یہ ہے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ سے مراد مالکم من العذاب ہے یعنی تمہارے لیے عذاب سے ہی نہیں۔ بیہقی نے محمد بن کعب قرظی سے ذکر کیا اس نے کہا: دوزخیوں کی پانچ گزارشات ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں چار کا جواب ارشاد فرمائے گا اور جب پانچویں گزارش تک پہنچیں گے تو اس کے بعد وہ کبھی بھی کلام نہیں کریں گے۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ (غافر) اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا پس اب ہم اعتراف کرتے ہیں اپنے گناہوں کا سو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ (غافر) اس کی وجہ یہ تھی کہ جب پکارا جاتا اللہ تعالیٰ کو اکیلا تو تم انکار کر دیتے اور اگر شریک بنایا جاتا کسی کو اس کا تو تم مان لیتے پس حکم کا اختیار اللہ کے لیے ہے جو برتر اور بزرگ ہے۔

پھر کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اور (کانوں سے) سن لیا پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب ہم نیک عمل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ) پس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو، ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا اور چکھو ابدی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 142

پھر وہ کہیں گے: رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اے ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لیے ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ الله تعالیٰ جواب ارشاد فرمائے گا: اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (اے کافرو!) کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا ہے۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ (فاطر: 37) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال، ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ الله تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۖ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ (فاطر) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا اور تشریف لے آیا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی) پس اب (اپنے کیے کا) مزہ چکھو ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔

وہ کہیں گے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ (المومنون) اے ہمارے رب! غالب آگئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے..... الله تعالیٰ انہیں جواب ارشاد فرمائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ (المومنون) پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ۔ تو اس کے بعد وہ کبھی بھی کلام اور گفتگو نہیں کریں گے۔ ابن مبارک نے اسے اپنے دقائق میں اس سے بہت زیادہ طویل انداز میں تخریج کیا ہے اور ہم (قرطبی) نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں لکھا ہے۔ حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کیے تھے اپنے آپ پر اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ کیسا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لیے (طرح طرح کی) مثالیں اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں اور الله تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کا توڑ تھا اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے۔

راوی نے کہا: یہ تیسرا جواب ہوگا۔ اور حدیث کا ذکر کرنے کے بعد الله کے ارشاد اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ (المومنون) کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ اس وقت ان کی دعا اور امید ختم ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح متوجہ ہوں گے کہ ایک دوسرے کو کتے کی طرح بھونک رہے ہوں گے۔ راوی نے کہا: مجھے ازہر بن ابی ازہر نے بیان کیا ہے کہ اس نے ذکر کیا کہ یہی الله تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات)

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝

''اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کیے تھے اپنے آپ پر اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی کہ کیسا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لیے (طرح طرح کی) مثالیں۔ اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کا توڑ تھا اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ یعنی قوم ثمود اور اس جیسی دیگر قوموں کے شہروں میں تم نے ان کے گھروں سے کیوں عبرت حاصل نہیں کی، حالانکہ تم پر واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے تمہارے لیے قرآن میں طرح طرح کی مثالیں بھی بیان کر دی تھیں۔ ابو عبد الرحمن سلمی نے ونبیّن لکم نون اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں صیغہ مستقبل کا ہے جب کہ معنی ماضی کا اور دوسری وجہ یہ ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ کے مناسب و مطابق ہو جائے جب کہ جماعت کی قراءت وتبیین ہے اور یہ معنی اس میں اس کی مثل ہے، کیونکہ یہ بھی ان پر اللہ ہی کے واضح کرنے سے واضح ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور رسولوں کی تکذیب اور دشمنی جیسی چالبازیاں انہوں نے کیں، وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ، اِنْ بمعنی ما ہے یعنی ان کا مکر ضعف اور کمزوری کی وجہ سے ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے۔ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر ان بمعنی ما استعمال ہوا ہے۔ ایک اس مقام پر، دوسرا فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ (یونس: 94) تیسرا، لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖۗ اِنْ كُنَّا (انبیاء: 17) یعنی ما کنا۔ چوتھا، قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ (الزخرف: 81) پانچواں، وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ (الاحقاف: 26) جماعت نے ان کان نون کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ عمرو بن علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی نے وان کاد دال کے ساتھ پڑھا ہے(1) اور عام لوگوں نے لتزول میں لام جحود ہونے کی وجہ سے اسے مکسور پڑھا اور نصب کی وجہ سے دوسری لام کو مفتوح پڑھا۔

اور ابن محیصن، ابن جریج اور کسائی نے لَتَزُوْلُ لام ابتدائیہ ہونے کی وجہ سے پہلی لام کو مفتوح پڑھا اور دوسری کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور ان کو مخففہ من مثقلہ بنایا ہے، اور اس قراءت کی صورت میں ان کے مکر کو بڑا سمجھنا مقصود ہے، یعنی ان کا فریب بہت بڑا تھا حتی کہ قریب تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جائیں۔ طبری نے کہا: مختار پہلی قراءت ہے، کیونکہ اگر پہاڑ زائل ہو جاتے تو وہ ثابت تو پھر نہ تھے۔ ابو بکر انباری نے کہا: اس حدیث میں مسلمانوں کے مصحف کے خلاف کوئی حجت نہیں جو ہمیں احمد بن حسین نے بیان کی ہے: حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ حدثنا وکیع بن الجراح عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن عبد الرحمن بن دانیل انہوں نے کہا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا ہے: جابر لوگوں میں سے ایک جابر نے کہا کہ میں تب تک نہیں رکوں گا جب تک یہ معلوم نہیں کر لیتا کہ آسمان میں کون ہے؟ تو اس نے گدھوں کے بچے پالے اور گوشت پکانے کا حکم

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 388

دیا یہاں تک کہ وہ سخت اور مضبوط ہو جائے۔ پھر اس نے ایک ایسا تابوت بنانے کا حکم دیا جس میں دو آدمیوں کی گنجائش ہو اور اس کو لمبی لکڑیاں لگانے کا حکم دیا جس کے سروں پر سخت سرخ رنگ کا گوشت لگایا جائے۔ اور میخوں کے ذریعے گدھوں کی ٹانگوں کے ساتھ اسے باندھ دیا جائے اور لکڑیوں کو تابوت کے قوائم کے ساتھ باندھا جائے پھر وہ اور اس کا دوست تابوت میں بیٹھے اور گدھ اسے لے کر اڑے۔ جب گدھوں نے گوشت کو دیکھا تو اس کی طلب میں تابوت کو اوپر اڑاتے گئے حتی کہ وہ وہاں تک پہنچ گئے جہاں الله نے چاہا۔ اس جابر نے اپنے دوست کو کہا: دروازہ کھول اور دیکھ تجھے کیا نظر آتا ہے؟ اس نے کہا: میں پہاڑوں کو یوں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مکھیاں ہیں، اس نے کہا: دروازہ بند کر۔ پھر وہ گدھ تابوت کو لے کر وہاں تک چڑھے جہاں تک الله نے چاہا کہ وہ چڑھیں۔ تو جابر نے اپنے دوست کو کہا: دروازہ کھول اور دیکھ تجھے کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا: اب تو مجھے آسمان نظر آرہا ہے اور یہ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ اس نے کہا: لکڑی کو توڑ دے اس نے اسے توڑ دیا، گدھیں گر گئیں۔ جب تابوت زمین پر گرا تو بہت بلند اور سخت آواز سنی گئی قریب تھا کہ پہاڑ اپنی جگہوں سے ہٹ جاتے۔ راوی نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لَتَزُوْلَ پہلے لام کے فتحہ اور دوسرے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے۔ ثعلبی نے اس خبر کو اپنے معنی کے ساتھ روایت کیا ہے اور جابر سے مراد نمرود تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا تھا۔

عکرمہ نے کہا: اس کے ساتھ تابوت میں ایک بغیر داڑھی کے لڑکا تھا، اس نے ایک کمان اور تیر اٹھایا ہوا تھا تو اس نے تیر پھینکا وہ خون کے ساتھ لت پت اس کے پاس واپس لوٹا۔ اس نے کہا: اے آسمان کے خدا! میں نے تیرا کام تمام کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: آسمان کی مچھلی کے خون سے تیر خون آلود ہوا جس مچھلی نے اپنے آپ کو سمندر سے ہوا میں پھینکا اور ہوا میں معلق ہو گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ایک پرندہ تھا جسے تیر لگا پھر نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا کہ لکڑی توڑ دے اور گوشت کو نیچے گرا دے، تو گدھیں تابوت سمیت گر گئیں۔ پہاڑوں نے تابوت اور گدھوں کے گرنے کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ اور انہوں نے گمان کیا کہ آسمان میں کوئی واقعہ پیش آگیا ہے اور قیامت قائم ہو گئی ہے، پس یہی الله تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ہے۔

قشیری نے کہا: یہ واقعہ پہاڑوں میں زندگی کی تخلیق کی تقدیر کے ساتھ جائز ہو سکتا ہے۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ نمرود بن کنعان نے کوفہ کے گرد و نواح میں رس نامی بستی میں ایک محل بنایا اس نے اس کی لمبائی پانچ ہزار پچاس ذراع اور چوڑائی تین ہزار پچیس ذراع بنائی، اس سے گدھوں کے ساتھ وہ اوپر چڑھا، جب اسے معلوم ہوا کہ آسمان میں اس کے لیے کوئی راستہ نہیں تو اس نے اسے قلعہ بنالیا اور اس میں گھر والوں اور بیٹوں کو جمع کیا تا کہ وہ اس میں ان کی حفاظت کرے، الله تعالیٰ نے اس کی عمارت اور محل کو بنیادوں سمیت اٹھایا، وہ محل ان پر گر پڑا اور وہ سارے ہلاک ہو گئے، وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ کا یہی معنی ہے اور ان کے مکر و فریب کی وجہ سے جن پہاڑوں کا زوال مراد لیا گیا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ زمین کے پہاڑ ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے مراد اسلام اور قرآن ہے، کیونکہ یہ اپنے ثبوت اور رسوخ میں پہاڑوں کی طرح ہیں۔ قشیری نے کہا: وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے فریب کو جانتا

ہے پس وہ انہیں اس کی سزا دے گا، یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مکر کی جزا ہے یعنی عند اللہ جزاء مکرھم تو جزا جو کہ مضاف ہے اسے حذف کر دیا گیا۔ وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ، لِتَزُوْلَ کی پہلی لام کے کسرہ کے ساتھ، یعنی ان کا مکر کوئی ایسا مکر نہیں کہ جس کا اللہ کے ہاں کوئی اثر ہو اور جس سے کوئی خطرہ ہو، اور پہاڑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی ضرب المثل ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ، فی تقدیرھم، لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ یعنی اگرچہ ان کا مکر ان کے انداز ے میں ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے اور اسلام کو باطل قرار دینے میں موثر تھا۔ اور اس کو لَتَزُوْلُ مِنْهُ الْجِبَالُ پہلی لام کے فتحہ اور دوسری کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی وہ بہت بڑا مکر تھا اس سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَکَرُوْا مَکْرًا کُبَّارًا ﴿۲۲﴾ (نوح) کی طرح ہے اور پہاڑ نہیں اکھڑتے یہ کسی چیز کے بڑا ہونے سے عبارت ہے، اور ایسا ہوتا رہتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ ﴿۴۷﴾

''تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی کرنے والا ہے اپنے رسولوں سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے (اور) بدلہ لینے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اللہ تعالیٰ کا اسم جلالت اور مخلف تحسبن کے مفعول ہیں۔ اور رسلہ، وعدہ کا مفعول ہے اس میں ایسا ہونے کی وسعت ہے اور اس کا معنی وعدہ رسلہ ہے۔

شاعر نے کہا:

تَرَی الثَّوْرَ فیها مُدْخِلَ الظِّلِّ رأسَهُ وسائِرُهُ بادٍ إلى الشَّمْسِ أَجْمَعُ(1)

اس میں مدخل الظل رأسہ کا معنی ہے، مدخلا لرأسہ فی ظل کتابہ۔ قتبی نے کہا: یہ اس مقدم میں سے ہے جس کا مؤخر اس کی وضاحت کرتا ہے اور اس مؤخر میں سے ہے جس کا مقدم اس کی وضاحت کرتا ہے۔ لہٰذا مخلف وعدہ رسلہ اور مخلف رسلہ وعدہ دونوں برابر ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ یعنی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے المنتقم بھی ہے یعنی انتقام لینے والا اور ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنی'' میں بیان کر دیا ہے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾
وَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ
وَّتَغْشٰی وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ
الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِیَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 346

وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''یاد کرو اس دن کو جب کہ بدل دی جائے گی یہ زمین دوسری (قسم کی) زمین سے اور آسمان بھی (بدل دیئے جائیں گے) اور سب لوگ حاضر ہو جائیں گے اللہ کے حضور میں (وہ اللہ) جو ایک ہے (اور) سب پر غالب ہے اور تم دیکھو گے مجرموں کو اس روز کہ جکڑے ہوئے ہوں گے زنجیروں میں۔ ان کا لباس تارکول کا ہوگا اور ڈھانپ رہی ہوگی ان کے چہروں کو آگ۔ یہ اس لیے تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس نے کمایا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ (قرآن) ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے (اسے اتارا گیا ہے) تاکہ انہیں ڈرایا جائے اس کے ذریعہ اور تاکہ وہ اس حقیقت کو خوب جان لیں کہ صرف وہی ایک خدا ہے اور تاکہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں (اس حقیقت کو) دانشمند لوگ''۔

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن زمین کو تبدیل کر دیا جائے گا، لہٰذا الیوم ماقبل کے متعلق ہوگا یعنی اذکر کے۔ اور ایک قول کے مطابق یہ یوم یقوم الحساب کی صفت ہے۔ زمین کی تبدیلی کی کیفیت میں اختلاف ہے، بہت سارے لوگوں نے کہا کہ زمین کی تبدیلی اس کی صفات کی تبدیلی، اس کے ٹیلوں کی برابری، اس کے پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے، اور اس کی زمین کی لمبائی سے عبارت ہے۔ اس کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور ابن مبارک نے اسے شہر بن حوشب کی حدیث سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو سطح زمین کو لمبا کر دیا جائے گا اور اس کی وسعت میں اتنا اتنا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اور انہوں نے حدیث کو ذکر کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمین کو دوسری قسم کی زمین سے بدل دیا جائے گا پس وہ اسے پھیلائے گا اور وہ اسے عکاظی سطح زمین کی صورت میں لمبا کرے گا تو اس میں نہ کوئی ٹیڑھا پن دیکھے گا اور نہ ہی کوئی اونچا مقام دیکھے گا پھر اللہ تعالیٰ مخلوق کو سخت جھڑکے گا تو لوگ دوسری زمین میں اپنی انہی جگہوں میں پہنچ جائیں گے جن جگہوں میں پہلی زمین میں تھے۔ جو زمین کے اندر تھا وہ اندر ہی ہوگا اور جو زمین کے اوپر تھا وہ اوپر ہی ہوگا''۔ اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور آسمان کی تبدیلی اس کے سورج اور چاند کی روشنی کا خاتمہ اور اس کے ستاروں کے بکھر جانے کے ساتھ ہوگی، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے: اس کے احوال مختلف ہونے کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوگی ایک دفعہ چاندی کی طرح اور دوسری دفعہ ادھوڑی کی طرح، اس کو ابن انباری نے حکایت کیا ہے۔ ہم (قرطبی) نے اس باب کو کتاب ''التذکرہ'' میں تفصیلی طور پر بیان کر دیا ہے اور علماء کے جملہ اقوال ہم نے اس میں ذکر کر دیے ہیں۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس زمین کا ازالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ارشادات کے مطابق ہوگا۔

امام مسلم نے حضرت ثوبان جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے ان سے روایت کیا ہے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا تھا کہ یہودی علماء میں سے ایک عالم آپ کے پاس آیا اس نے کہا: السلام علیکم پھر راوی

نے حدیث ذکر کی اس میں یہ بھی ہے کہ یہودی نے کہا: جس دن زمین کو دوسری زمین سے اور آسمان کو دوسرے آسمان سے بدل دیا جائے گا اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پل کے پیچھے تاریکی میں ہوں گے''۔ اور پھر حدیث کو ذکر کیا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ کے متعلق پوچھا گیا کہ اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا: ''پل صراط پر'' (1)۔ ابن ماجہ نے اسے مسلم کی اسناد سے ذکر کیا ہے اور ترمذی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تخریج کی اور آپ ہی سوال کرنے والی تھیں۔ ترمذی نے کہا: ہٰذا حدیث حسن صحیح۔ یہ احادیث اس بات پر نص ہیں کہ آسمان اور زمین تبدیل ہوں گے، زائل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دوسری زمین پیدا فرمائے گا پل پر ٹھہرنے کے بعد اس زمین پر لوگ ہوں گے۔

صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگ سفید مٹیالی زمین پر جمع ہوں گے جیسے صاف آٹے کی روٹی ہوتی ہے۔ اس میں کسی کے لیے کوئی نشانی نہیں ہوگی'' (2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے ابو جعفر محمد بن علی سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: اس کو روٹی کے ساتھ بدل دیا جائے گا قیامت کے دن لوگ اسی سے کھائیں گے۔ پھر انہوں نے وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ (الانبیاء: 8) کا ارشاد پڑھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کو ایک اور چاندی کی طرح سفید زمین کے ساتھ بدلا جائے گا جس پر کوئی غلطی نہیں ہوئی ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سفید چاندی کی زمین سے اسے تبدیل کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس دن زمین کو چاندی سے اور آسمان کو سونے سے بدلا جائے گا اور یہ عین اور ذات کی تبدیلی ہوگی۔ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ یعنی وہ اپنی قبروں سے ظاہر ہوں گے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ تَرَى الْمُجْرِمِیْنَ، مجرمین سے مراد مشرکین ہیں۔ یَوْمَئِذٍ یعنی قیامت کے دن۔ مُّقَرَّنِیْنَ یعنی باندھے ہوئے۔ فی الاصفاد یہ طوق اور بیڑیاں ہیں، اس کا واحد صفد اور صَفَد ہے اور صورتہ صفداً کہا جاتا ہے یعنی میں نے اسے قید کیا اور الصفد اسم ہے اور جب آپ کثرت کا ارادہ کریں تو صفدتہ تصفیداً کہیں گے۔ عمرو بن کلثوم نے کہا:

فَآبُوا بِالنِّهَابِ وَالسَّبَایَا وَأُبْنَا بِالْمُلُوكِ مُصَفَّدِینَا (3)

مصفدینا سے مراد مقیدینا ہے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا،

مِن كُلِّ مَأسُورٍ یَشُدُّ صِفَادُهُ صَقْرٍ إِذَا لَاقَى الْكَرِیهَةَ حَامِ (4)

صفادہ سے مراد غلہ یعنی اس کی ہتھکڑی ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 390
2۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب ذکر البعث، حدیث نمبر 4268 ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 145
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 144

اور أصفدتہ إصفادا سے مراد ہے کہ میں نے اسے عطا کیا۔ اور ایک قول یہ ہے: صفدتہ اور أصفدتہ قید اور عطا کرنے دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ نابغہ نے کہا:

فَلَمْ أُعَرِّض أَبَيْتَ اللَّعْنَ بالصَّفَدِ (1)

الصفد سے مراد عطا ہے کیونکہ یہ اسے قید کرتا ہے اور غلام بناتا ہے۔

ابوالطیب متنبی نے کہا:

وقَيَّدْتُ نفسِي فی ذَرَاكَ مَحَبَّةً ... ومَنْ وَجَدَ الإحسانَ قَيْدًا تَقَيَّدَا

میں نے اپنے آپ کو محبت سے تیرے پاس قید کر دیا ہے اور جس نے احسان کو قید پایا وہ قید ہو گیا۔

(تو اس سے معلوم ہوا کہ عطا اور احسان بھی قید ہے)

اور ایک قول یہ ہے کہ ہر کافر کو شیطان کے ساتھ جکڑا جائے گا، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) میں ہے۔ اَزْوَاجَهُمْ سے شیطانوں میں سے جو ان کے دوست ہیں وہ مراد ہیں (2)۔ اور ایک قول یہ ہے ان سے مراد کفار ہیں وہ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں اکٹھے ہوں گے جس طرح دنیا میں وہ گناہوں پر جمع ہوتے ہیں۔ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ، سَرَابِيْلُهُمْ سے مراد ان کی قمیصیں ہے۔ ابن درید وغیرہ سے منقول ہے کہ اس کا واحد سربال ہے اور فعل سربلت اور سربلت غیری آتا ہے، کعب بن مالک نے کہا:

تَلْقَاكُمْ عَصَبٌ حَوْلَ النَّبِي لَهُمْ ... مِنْ نَسْجِ دَاوُدَ فِی الْهَيْجَا سَرَابِيلُ

مِّنْ قَطِرَانٍ اس سے مراد اونٹوں کا وہ سیال ہے جس کو اونٹوں پر ملا جاتا ہے (تارکول) یہ حضرت حسن کا قول ہے (3)۔ اور یہ ان میں آگ کے بھڑکنے کے لیے زیادہ بلیغ ہے اور صحیح میں ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر اپنے مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں کھڑی ہو گی کہ اس پر تارکول کی قمیص اور آگ کی اوڑھنی ہو گی۔

حماد سے مروی ہے کہ عربوں نے کہا کہ یہ تانبا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے قطران قاف کے فتحہ اور طا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں ایک تیسری قراءت بھی ہے، وہ ہے قاف کے کسرہ اور طا کی جزم کے ساتھ۔ اسی سے ابوالنجم کا یہ شعر ہے:

جَوْنٌ كَأَنَّ الْعَرَقَ الْمَنْتُوحَا ... لَبَّسَهُ الْقِطْرَانَ والْمُسُوحَا

اس میں القطران اسی تیسری قراءت کے مطابق ہے۔

اور چوتھی قراءت مِنْ قِطْرٍ اٰنٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عکرمہ، حضرت سعید بن جبیر اور یعقوب سے مروی ہے: القطر سے مراد تانبا اور پگھلا ہوا پیتل ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد أتونی أفرغ علیه قطرا ہے اور ''ان'' انتہائی گرم، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ (الرحمٰن: 44) ہے۔ وَ تَغْشٰى یعنی وہ مارے گی۔ وُجُوْهَهُمُ

---

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 145
2۔ معالم التنزیل، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 391
3۔ تفسیر ماوردی، سورۃ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 145

النَّارُ اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپ لے گی۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ، مَّا كَسَبَتْ سے مراد بما كسبت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ پہلے گزر چکا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ یعنی یہ جو ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے یہ پیغام ہے۔ ابلاغ سے مراد تبلیغ اور نصیحت ہے(1)۔ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ یعنی تا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے انہیں ڈرائیں۔ اس کو ولینذروا یا اور ذال کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جب آپ کسی چیز کے متعلق جان لیں اور اس کی تیاری کرنے لگیں تو نذرتُ بالشئ أُنذر کہا جاتا ہے۔

جس طرح عسیٰ اور لیس کا مصدر استعمال نہیں ہوتا اسی طرح اس کا مصدر بھی استعمال نہیں ہوتا، گویا کہ وہ ان اور فعل کے ذریعے اس مصدر سے مستغنی ہو گئے جیسے آپ کا قول: سرنی أن نذرت بالشئی وليعلموا أنما هو إله واحد یعنی تا کہ دلائل و براہین کے قائم ہونے کے ذریعے وہ اللہ کی وحدانیت کو خوب جان لیں۔ وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں(2)۔ لینذروا، لیعلموا اور لیذکر میں موجود لا میں محذوف کے متعلق ہوں گی، تقدیر عبارت ہو گی: ولذلك انزلناه یمان بن رباب نے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے(3)۔ کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ کی کتاب کا کوئی عنوان بھی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں۔ کہا گیا: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ آخر تک۔ سورۂ ابراہیم علیہ السلام مکمل ہوئی۔ والحمدللہ

---

1۔ معالم التنزیل، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 391 2۔ ایضاً

3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ ابراہیم، جلد 3، صفحہ 146

# سورة الحجر

﴿ آیاتها ۹۹ ﴾ ﴿ ۱۵ سُورَةُ الحِجر مَکِّيَّةٌ ۵۴ ﴾ ﴿ رکوعاتها ۶ ﴾

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِيۡنٍ ①

''الف۔لام۔را۔یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی کی اور روشن قرآن کی۔''

الٓرٰ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ اور الۡکِتٰبِ کے بارے میں کہا گیا ہے: بے شک یہ اسم جنس ہے اور کتب سابقہ تورات اور انجیل کو شامل ہے، پھر ان دونوں کو کتاب مبین کے ساتھ ملا دیا(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے، اس کے لئے دو اسم جمع کئے گئے ہیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ كَانُوۡا مُسۡلِمِيۡنَ ②

''(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت آرزو کریں گے کفار کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔''

رُبَّ یہ فعل پر داخل نہیں ہوتا، لیکن جب اس کے ساتھ ما مل جائے تو وہ اسے فعل پر داخل ہونے کے قابل بنا دیتا ہے مثلاً تو کہتا ہے: ربما قام زید، اور ربما یقوم زید۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ما نکرہ بمعنی شئی ہو، اور یَوَدُّ اس کی صفت ہو، ای رُبَّ شئ یودّ الکافر (یعنی کافر بہت زیادہ آرزو کریں گے)۔ نافع اور عاصم نے رُبَمَا با کو مخفف پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے اور اس میں دونوں لغات ہیں (2)۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اہل حجاز رُبَمَا کو مخفف پڑھتے ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

رُبَمَا ضربةٍ بسيف صقيلٍ　　بين بُصَرَى و طعنةٍ نجلاء

اور تمیم، قیس اور ربیعہ اسے مشدد پڑھتے ہیں۔ اور اس میں: رُبَمَا اور رُبَمَا، رُبَّتَمَا اور رُبَتَمَا، با کو تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں اصل یہ ہے کہ یہ تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی کبھی یہ تکثیر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ أی یودّ الکفار فی أوقات کثیرة لو کانوا مسلمین، (یعنی کفار بہت سے اوقات میں یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے) یہ کوفیوں نے کہا ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

ألا ربَما أهدتْ لك العينُ نظرةً　　قُصاراك منها أنها عنك لا تُجدِی

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 147، دار الکتب العلمیہ
2۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 349

اوران میں سے بعض نے کہا ہے: یہ اس جگہ تقلیل کے لئے ہے، کیونکہ وہ یہ بعض مقامات میں کہیں گے نہ کہ تمام مقامات میں، عذاب میں مشغول ہونے کے سبب۔ واللہ اعلم۔

اور فرمایا: رُبَمَا يَوَدُّ بے شک یہ اس کام کے لئے ہوتا ہے جو واقع ہو جائے، کیونکہ یہ وعدے کی صداقت کے بارے میں ہے گویا کہ وہ عیاں ہو چکا ہے، اور طبرانی ابوالقاسم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میری امت کے کچھ لوگ اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہوں گے پس وہ جہنم میں رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا کہ وہ اس میں رہیں پھر مشرکین انہیں عار دلائیں گے اور وہ کہیں گے جو تم ہمارے ساتھ اپنی تصدیق اور ایمان میں مخالفت کرتے تھے ہم نہیں دیکھ رہے کہ اس نے تمہیں کوئی نفع دیا ہو پھر کوئی موحد باقی نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے نکال لے گا...... پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (1)۔ حسن نے کہا ہے: جب مشرک مسلمانوں کو دیکھیں گے کہ وہ جنت میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ انہیں جہنم میں نہ دیکھیں گے تو وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے (2)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ آرزو اور خواہش دنیا میں معاینہ کے وقت ہوگی جس وقت ان کے لئے گمراہی سے ہدایت واضح اور ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آرزو قیامت میں ہوگی جب وہ مومنوں کی عزت و کرامت اور کافروں کی ذلت و رسوائی کو دیکھیں گے (3)۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

''انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں اور غافل رکھے انہیں (جھوٹی) امید کچھ عرصہ بعد وہ (حقیقت کو خود بخود) جان لیں گے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا یہ ان کے لئے تہدید اور جھڑک ہے۔ وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ یعنی جھوٹی امید انہیں طاعت سے غافل اور مشغول رکھے۔ کہا جاتا ہے: ألهاه عن كذا یعنی اس نے اسے اس سے مشغول کر دیا، غافل کر دیا۔ اور لَهِيَ هو عن الشئ يَلْهَى (وہ فلاں شے سے غافل ہو گیا)۔ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (وہ حقیقت کو خود بخود جان لیں گے) جب وہ قیامت کو دیکھیں گے اور اپنے کرتوتوں کا وبال چکھیں گے۔ یہ آیت آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مسند بزار میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار چیزیں شقاوت اور بدبختی میں سے ہیں آنکھ کا خشک ہو جانا، دل کا سخت ہو جانا، لمبی امید رکھنا، اور دنیا کی حرص رکھنا (4)''۔ اور لمبی امید اور آرزو عاجز کر دینے والی بیماری اور اپاہج کر دینے والا مرض ہے، اور جب یہ دل پر قدرت پالے تو اس کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور علاج مشکل اور سخت ہو جاتا ہے، نہ اس سے بیماری جدا ہوتی ہے اور نہ اس میں کوئی دوا اثر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 689
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 148
3۔ مجمع الزوائد، کتاب الزهد باب فی جمود العین وقسوۃ القلب، جلد 10، صفحہ 389، دار الفکر کتب
4۔ ایضاً

انداز ہوتی ہے، بلکہ وہ اطباء کو تھکا دیتا ہے اور حکماء اور علماء اس کے صحت مند ہونے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور طویل امید کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا حریص ہونا اور اس پر گر پڑنا، اور اس کی محبت رکھنا اور آخرت سے اعراض کرنا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اس امت کے پہلے آنے والے لوگ یقین اور زہد کے سبب نجات پا گئے اور اس کے آخر میں آنے والے بخل اور امید کے سبب ہلاک ہو جائیں گے۔'' اور روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دمشق کی مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے اہل دمشق! کیا تم اپنے نصیحت کرنے والے بھائی کی بات نہیں سنو گے؟ بے شک جو تم سے پہلے تھے وہ کثرت سے جمع ہوتے تھے اور عمارتیں مضبوط بناتے تھے اور امیدیں دور کی رکھتے تھے، پس ان کے اجتماع ہلاک اور برباد ہو گئے، ان کی عمارتیں قبریں بن گئیں اور ان کی امیدیں غرور اور تکبر ہو گئیں۔ یہ (قوم) عاد تھی اس نے شہروں کو رہنے والوں، مال، گھوڑوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ پس آج مجھ سے کون خریدے گا میں نے انہیں دو درہم کے عوض چھوڑ دیا ہے اور یہ اشعار کہے:

يا ذا المؤمل آمالا وإن بَعُدتْ		منه ويزعم أنْ يَحْظى بأقصاها
أنى تفوزُ بما ترجوه وَيْكَ وما		أصبحتَ فى ثقة من نَيْل أدناها

اور حسن نے کہا ہے: کسی بندے نے امید کو طویل نہیں کیا مگر اس نے عمل کو برا کر دیا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے سچ کہا ہے! پس امید آدمی کو عمل سے سست کر دیتی ہے اور یہ تاخیر کرنے اور لاپرواہی برتنے کا وارث بناتی ہے، اور غفلت اور سستی کو اپنے پیچھے لاتی ہے، زمین کی طرف جھکا دیتی ہے، اور خواہش (نفس) کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اور یہ ایسا امر ہے جس کا مشاہدہ آنکھوں کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ کسی بیان اور وضاحت کا محتاج نہیں اور نہ ایسا کرنے والے سے دلیل طلب کی جائے گی، جیسا کہ امید کا مختصر ہونا کام اور عمل پر ابھارتا ہے، اور جلدی کی طرف پھیر دیتا ہے اور مسابقت پر برانگیختہ کرتا ہے۔

**وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝**

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا۔''

مراد وہ مقررہ وقت ہے جو ان کے لئے لوح محفوظ میں لکھا گیا تھا۔

**مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝**

''نہ آگے بڑھ سکتی ہے کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔''

اس میں مِنْ صلہ ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: ما جاءنی من احد (یعنی اس میں بھی من صلہ ہے) یعنی اس کی مقررہ مدت تجاوز نہیں کریگی کہ وہ اس سے زیادہ ہو جائے، اور نہ وہ اس سے پہلے آئے گی۔ اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝** (الاعراف) (سو جب آ جائے ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔)

وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡ نُزِّلَ عَلَیۡهِ الذِّکۡرُ اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ ؕ﴿۶﴾ لَوۡ مَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۷﴾

''اور وہ کہنے لگے: اے وہ شخص اتارا گیا ہے جس پر قرآن بے شک تو مجنون ہے تو کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے۔''

کفار قریش نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور استہزاء یہ کہا، بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی صداقت پر بطور دلیل ملائکہ کو لانے کا مطالبہ کیا۔ اور لَوۡ مَا یہ کسی کام پر ابھارنے کیلئے آتا ہے جیسا کہ لولا اور هلا ہیں۔ اور فراء نے کہا ہے: لَوۡمَا میں میم لولا میں لام کا بدل ہے اور اسی کی طرح استولی علی الشئ اور استومی علیه ہے۔ اور اس کی مثال خالمته اور خاللته بھی ہے، اور خِلمی اور خلی بھی یہی ہے یعنی صدیقی (میرا دوست) اور اس بنا پر یہ جائز ہے کہ لوما بمعنی خبر ہو، آپ کہتے ہیں: لو ما زید لضرب عمرو (اگر زید نہ ہوتا تو عمرو مارتا) کسائی نے کہا ہے: لولا اور لوما خبر اور استفہام میں دونوں برابر ہیں۔

ابن مقبل نے کہا ہے:

لوما الحیاءُ و لومَا الدِّیۡنُ عبتُکما ببعض ما فیکما إذ عبتما عوَری(1)

مراد لولا الحیاء ہے۔ اور نحاس نے لوما، لولا اور هَلَّا کو ایک ہی معنی میں بیان کیا ہے۔

اور اہل لغت نے اس پر یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

تَعدّون عقۡرَ النِیۡبِ افضلَ مجدِکم بَنِی ضَوۡطَرَی لولا الکَمِیُّ المقنّعا

یہ بمعنی هلا تعدّون الکمِیّ المقنعا ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ مَا کَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِیۡنَ ﴿۸﴾

''ہم نہیں اتارا کرتے فرشتوں کو مگر حق کے ساتھ اور انہیں اس کے بعد مزید مہلت نہیں دی جاتی۔''

حفص، حمزہ اور کسائی نے مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ اِلَّا بِالۡحَقِّ پڑھا ہے اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور ابو بکر اور مفضل نے مَا تُنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مَا تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر یہ ہے: ما تتنزل یعنی دو تاء کے ساتھ پھر ان میں سے ایک کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے، اور بزی نے تا کو مشدد کر دیا ہے۔ اور اسے ابو حاتم نے اس قول پر قیاس کرتے ہوئے اختیار کیا ہے: تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ (القدر: 4) (اترتے ہیں فرشتے اور روح) اور اِلَّا بِالۡحَقِّ کا معنی الا بالقرآن ہے (یعنی ہم فرشتوں کو نہیں اتارا کرتے مگر قرآن کے ساتھ) اور بعض نے کہا ہے: رسالة (پیغام) کے ساتھ: یہ حضرت مجاہد سے منقول ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: مگر عذاب کے ساتھ اگر وہ ایمان نہ لائیں (2)۔ وَ مَا کَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِیۡنَ یعنی اگر ملائکہ انہیں ہلاک کرنے کے ارادہ سے نازل ہوں تو پھر انہیں مہلت دی جاتی اور نہ ان کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر ملائکہ نازل ہوں، اور آپ کی شہادت دینے لگیں اور وہ اس کے بعد کفر کریں تو

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 351 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

پھر انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔ اِذًا اصل میں اذاْن ہے اور اس کا معنی حینئذ (اس وقت) ہے پھر اس کے ساتھ اَن ملا دیا گیا ہے، اور انہوں نے ہمزہ کو ثقیل سمجھا اور اسے حذف کر دیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

''بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ یعنی ہم نے ہی اس قرآن مجید کو نازل کیا ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس سے کہ اس میں کوئی اضافہ اور زیادتی کی جائے یا اس سے کوئی کمی کی جائے۔ حضرت قتادہ اور ثابت بنانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے کہ شیاطین اس میں کسی باطل کا اضافہ کریں یا اس سے کسی حق کی کمی کریں (1)؛ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود اس کا ولی اور محافظ ہے اس لئے یہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور قرآن کریم کے علاوہ دوسری کتب کے بارے فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا (المائدہ: 44) پس ان کی حفاظت ان کے سپرد کر دی تو انہوں نے انہیں بدل دیا اور ان میں تغیر کر دیا۔ ہمیں الشیخ الفقیہ الامام ابو القاسم عبد اللہ نے اپنے باپ الشیخ الفقیہ الامام المحدث ابو الحسن علی بن خلف بن معزوز الکومی التلمسانی سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: الشیخۃ العالمہ فخر النساء شہدۃ بنت ابی نصر احمد بن الفرج الدینوری پر پڑھا گیا اور وہ جمادی الآخر ۵۶۴ھ کے آخر میں اپنے گھر دار السلام میں تھیں۔ ان سے کہا گیا: الشیخ الاجل العامل نقیب النقباء ابو الفوارس طراد بن محمد الزینبی نے ان سے پڑھنے کی تمہیں خبر دی اور تم سن رہی تھیں (یہ) ۴۹۰ھ کی بات ہے، ہمیں علی بن عبد اللہ بن ابراہیم نے خبر دی (انہوں نے کہا) ہمیں ابو علی عیسیٰ بن محمد بن احمد بن عمر بن عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج المعروف بالطوماری نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں حسین بن فہم نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: میں نے یحییٰ بن اکثم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مامون مجلس نظر و فکر (اور مذاکرہ) میں تھا اور وہی اس وقت امیر اور حاکم تھا۔ تو ان تمام لوگوں میں ایک یہودی آدمی داخل ہوا اس کا لباس حسین تھا، چہرہ خوبصورت تھا اور عمدہ خوشبو لگائے ہوئے تھا، راوی نے بیان کیا اس نے کلام کی اور اس نے اپنی کلام اور عبارت کو خوب آراستہ اور مزین کیا، راوی نے بیان کیا: کہ جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تو اسرائیلی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو مامون نے اسے کہا: تو اسلام قبول کر لے تاکہ میں تیرے ساتھ معاملات کروں اور حسن سلوک کا برتاؤ کروں، اور اس نے اسے دھمکی بھی دی تو اس نے کہا: میرا دین وہی ہے جو میرے آباؤ اجداد کا دین ہے! اور وہ واپس چلا گیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر جب ایک سال گزرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آیا تو وہ مسلمان تھا، اور اس نے فقہ سے متعلق انتہائی خوبصورت اور حسین گفتگو کی، پس جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون نے اسے بلایا اور کہا: کیا کل تو ہمارا ساتھی نہ تھا؟ اس نے جواب دیا: ہاں کیوں نہیں۔ تو مامون نے کہا: پھر تیرے اسلام کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تمہارے پاس سے واپس لوٹ کر گیا تو میں نے پسند کیا کہ میں ان ادیان کو آزماؤں، اور اس کے ساتھ ساتھ تو مجھے خوشنویس دیکھ رہا ہے، چنانچہ میں نے تورات کا قصد کیا اور اس کے تین نسخے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

لکھے اور ان میں کچھ کمی بیشی کر دی، اور میں انہیں گرجا گھر میں لے گیا اور وہ مجھ سے خرید لئے گئے۔ پھر میں نے انجیل کو لیا اور اس کے تین نسخے لکھے اور اس میں کچھ زیادتی اور کچھ کمی کر دی، اور انہیں لے کر یہودیوں کی عبادتگاہ میں گیا اور وہ مجھ سے خرید لی گئی۔ اور پھر میں نے قرآن کریم کا ارادہ کیا اور اس کے تین نسخے لکھے اور ان میں کچھ کمی بیشی کر دی، اور انہیں لے کر کاغذ بیچنے والوں کے پاس گیا تو انہوں نے ان کو خوب غور سے دیکھا، پس جب انہوں نے ان میں کمی بیشی کو تلاش کر لیا تو انہوں نے انہیں پھینک دیا اور انہیں نہ خریدا؛ تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، پس یہی میرے اسلام لانے کا سبب ہے۔ یحیٰی بن اکثم نے کہا ہے: میں نے اس سال حج کیا اور میں حضرت سفیان بن عیینہ سے ملا اور ان سے اس خبر کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے فرمایا: اس کا مصداق کتاب اللہ میں موجود ہے۔ میں نے پوچھا: کون سی جگہ میں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات اور انجیل کے بارے میں فرمایا ہے: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (المائدہ:44) (اس واسطے کہ محافظ ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب کے۔) پس اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت ان پر ڈال دی تو یہ ضائع ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پس اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا تو یہ ضائع نہ ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اس سے حفاظت کرنے والے ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں کوئی جھوٹا قول کہیں یا ہم ان پر کوئی جھوٹ ڈال دیں۔ یا وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم ان کی حفاظت کرنے والے ہیں اس سے کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکہ کیا جائے یا انہیں قتل کیا جائے۔ اور اس کی نظیر وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: 67) ہے (اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔) اور نَحْنُ میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہو اور نَزَّلْنَا اس کی خبر ہو اور پھر مکمل جملہ اِنَّا کی خبر ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ نَحْنُ، اِنَّا کے اسم کی تاکید ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو اور یہ بطور فاصلہ (یا فارقہ) نہ ہو کیونکہ جو اس کے بعد ہے وہ معرفہ نہیں وہ بلاشبہ جملہ ہے، اور جملے نکروں کی صفت ہوتے ہیں لہٰذا یہ نکروں کے حکم میں ہوتے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ ⑩

''اور بے شک ہم نے بھیجے (پیغمبر) آپ سے پہلے اگلی امتوں میں۔''

اس کا معنی ہے: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رسلا بے شک ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول بھیجے، پس رسلاً کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور شیع، شیعۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی امت ہے یعنی پہلی امتوں میں؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: پہلے گروہوں اور فرقوں میں، اور الشیعۃ کا معنی فرقہ، لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو باہم محبت کرنے والے اور کلام میں متفق ہوں تو گویا الشِّیَع سے مراد الفِرَق (فرقے) ہوا؛ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا (الانعام:65) اور یہ اصل میں الشیاع سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی وہ چھوٹی لکڑیاں ہیں جن کے ساتھ بڑی جلائی جاتی ہیں، جیسا کہ سورۃ الانعام میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہاں الشِّیَع سے مراد بستیاں ہیں (1)۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 149

وَ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪

''اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔''

یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث تسلی ہے؛ یعنی جس طرح آپ کے ساتھ ان مشرکین نے کیا اسی طرح آپ سے قبل بھی رسولوں کے ساتھ کیا جاتا رہا۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬

''اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں۔ وہ نہیں ایمان لائیں گے اس پر اور گزر چکی ہے پہلوں کی یہی روش۔''

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی، کفر، استہزا اور شرک فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ مجرموں کے دلوں میں جو آپ کی قوم میں سے ہیں؛ یہ حضرت حسن اور قتادہ وغیرہ سے مروی ہے، یعنی جس طرح ہم نے اسے ان لوگوں کے دلوں میں داخل کیا جو پہلی امتوں میں سے گزر چکے ہیں اسی طرح ہم اسے آپ کی قوم کے مشرکوں کے دلوں میں بھی داخل کریں گے تاکہ وہ آپ کے ساتھ ایمان نہ لائیں، جیسا کہ ان سے پہلے والے لوگ اپنے رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائے۔ اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم تکذیب (جھٹلانا) داخل کرتے ہیں۔ اور السَّلْك کا معنی ہے: ایک شے کو دوسری شے میں داخل کرنا جیسا کہ دھاگہ سوئی میں داخل کرنا۔ کہا جاتا ہے: سلكه يسْلُكه سَلْكا و سُلوكا، أسلكه اسلاكا (داخل کرنا) اور سلك الطريق سُلوكا و سَلْكا و أسلكه دخله (یعنی وہ راستے میں داخل ہوا)، اور ایک شے کا اپنے غیر میں اسی کی مثل ہونا ہے، اور ایک شے کا نیزے کے ساتھ اسی طرح ہونا ہے اور دھاگے کا جوہر میں ہونا ہے، یہ سب فَعَلَ اور أَفْعَلَ کے وزن پر ہیں۔ اور عدی بن زید نے کہا ہے:

وقد سلكوك في يوم عصيب (1)

(انہوں نے تجھے سخت گرم دن میں داخل کیا) اور السِّلْك (کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی دھاگہ ہے۔ اور آیت میں قدریہ اور معتزلہ کا رد ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم قرآن کو ان کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اسے جھٹلا دیتے ہیں۔ اور حسن، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہی وہ قول ہے جس پر اکثر اہل التفسیر ہیں، اور یہی معتزلہ پر حجت لازم کرتا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی منقول ہے: ہم حجت کو لازم کرنے کے لئے ذکر کو داخل کرتے ہیں؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ یعنی کفار کو ہلاک کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی یہی سنت گزر چکی ہے، پس یہ ہلاک ہونے والوں کے بہت قریب ہو چکے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ یعنی جس طرح انہوں نے تکذیب اور کفر کا ارتکاب کیا ہے اسی کی مثل پہلوں کی روش گزر چکی ہے، پس یہ انہی کی اقتدا کر رہے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 353

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور اگر ہم کھول بھی دیتے ان پر دروازہ آسمان سے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے پھر بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری تو نظریں بند کر دی گئی ہیں بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

کہا جاتا ہے: ظل یفعل کذا، یعنی وہ اسے دن بھر کرتا رہا۔ اور مصدر الظلول ہے۔ یعنی اگر وہ علامات اور نشانیاں جو انہوں نے تجویز کی ہیں پوری کر بھی دی جائیں تو وہ یقیناً کفر پر مصر رہیں اور خیالات (اور توہمات) کے ساتھ مشغول ہو جائیں، جیسا کہ قرآن معجز کے بارے انہوں نے کہا: بے شک یہ سحر اور جادو ہے۔ يَعْرُجُوْنَ یہ عرج یعرج سے ہے اس کا معنی چڑھنا ہے۔ اور المعارج سیڑھیوں کو کہتے ہیں، یعنی اگر وہ آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور ملکوت و ملائکہ کا مشاہدہ کر لیں تو پھر بھی یقیناً کفر پر اصرار کریں؛ یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَلَيْهِمْ میں ضمیر مشرکین کے لئے ہے اور فَظَلُّوْا میں ضمیر ملائکہ کے لئے ہے، وہ آتے جاتے رہیں، یعنی اگر ان کے لئے عیاں کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ آسمان میں دروازوں کو دیکھنے لگیں کہ ان سے ملائکہ اوپر چڑھ رہے ہیں اور نیچے اتر رہے ہیں تو بھی وہ یقیناً کہیں گے: ہم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ جو دیکھا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ سے منقول ہے۔ اور سُكِّرَتْ کا معنی ہے سدت بالسحر (ہماری نظریں جادو کے ساتھ بند کر دی گئی ہیں)؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: سُحِرَت (جادو کر دیا گیا ہے) کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أُغشیت أبصارنا (ہماری آنکھیں ڈھانپ دی گئی ہیں۔) اور انہیں سے یہ بھی ہے عَمِيت (ہماری آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں)۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أُخذت (انہیں پکڑ لیا گیا ہے)۔ اور مؤرج نے کہا ہے: دِيرَبنا (ہمیں چکرا دیا گیا ہے) یہ دوران سے ہے؛ یعنی ہماری آنکھیں نشے میں ہو گئی ہیں۔ جویبر نے کہا ہے: خُدِعت ہماری آنکھوں کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اور ابو عمرو بن العلاء نے کہا ہے: سُكِّرَتْ انہیں ڈھانپ دیا گیا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

و طلعت شمس علیها مِغفَر   و جعلت عین الحَرور تَسكُر(1)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سُکِّرت، حبست (وہ روک دی گئی ہیں)۔

اور اس معنی میں اوس بن حجر کا قول ہے:

فصِرت علی لیلة ساهرة   فلیست بطَلْقٍ ولا سَاكِرَة(2)

میں (مفسر کہتا ہوں: یہ تمام اقوال باہم قریب قریب ہیں اور ان تمام کو آپ کا یہ قول جامع ہے: مُنِعت (ہماری نظریں روک دی گئی ہیں، انہیں منع کر دیا گیا ہے۔) ابن عزیز نے کہا ہے: سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ہماری نظریں بند کر دی گئی ہیں۔ یہ

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 151
2۔ ایضاً

تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: سکرت النهر جب تو نہر کو بند کر دے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سُکر الشراب (شراب کا نشہ) سے ماخوذ ہے، گویا کہ آنکھ کو وہ کچھ لاحق ہو جاتا ہے جو شراب پینے والے کو لاحق ہوتا ہے جبکہ وہ نشے میں ہو۔ اور ابن کثیر نے سَکِرتْ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تشدید کے ساتھ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے: سُکِرت بمعنی ملئت ہے (بھر دی گئیں) اور مہدوی نے کہا ہے: سکرت میں تخفیف اور تشدید دونوں بالکل ظاہر ہیں، تشدید تکثیر کے لئے ہے اور تخفیف اپنے معنی کو ادا کرتی ہے، اور معروف یہ ہے کہ سکر متعدی نہیں ہوتا۔ ابوعلی نے کہا ہے: جائز ہے کہ اسے بصر میں متعدی سنا گیا ہو۔ اور جنہوں نے سَکِرتْ پڑھا ہے چونکہ انہوں نے اس کے مشابہ قرار دیا ہے جو کچھ نشے کی حالت میں ان کی آنکھوں کو پیش آتا ہے، کیونکہ یہ نشے کے قائم مقام ہے کیونکہ اس صورت میں نشہ موجود نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ تخفیف کے ساتھ ہو تو سکر الشراب سے ماخوذ ہے، اور اگر تشدید کے ساتھ ہو تو اُخذت (جادو کر دیا گیا) کے معنی میں ہے، ان دونوں کو الماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور نحاس نے کہا ہے: حضرت مجاہد اور حسن رحمہما اللہ تعالیٰ کی قرأت میں سے معروف سکِرت تخفیف کے ساتھ ہے۔ حسن نے کہا ہے: بمعنی سحِرت ہے (یعنی جادو کر دیا گیا) اور ابوعبید نے ابوعبیدہ سے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: سُکِّرت ابصارهم جب ان پر بصارت کی کمزوری چھا جائے یہاں تک کہ وہ نہ دیکھ سکیں۔ اور فراء نے کہا ہے: جس نے سَکِرت پڑھا ہے اس نے اسے سکور الریح (ہوا کا پرسکون ہونا) سے لیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں۔ اس میں اصل وہ ہے جو ابوعمرو بن العلاء رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، انہوں نے کہا: یہ السکر فی الشراب (شراب میں نشہ ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور یہ قول اچھا ہے؛ یعنی ان پر وہ شے چھا گئی جس نے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا جیسے نشے والے پر وہ شے چھا جاتی ہے جو اس کی عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور سُکور الریح کا معنی ہوا کا ساکن ہونا اور اس کے تیزی کے بعد کم ہونا ہے پس یہ تحییر (حیرت میں ڈالنا) کے معنی کی طرف راجع ہے۔

**وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝**

"اور بے شک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے آراستہ کر دیا ہے آسمان کو دیکھنے والوں کے لئے۔"

جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر اور ان کے بتوں کے عجز کا ذکر کیا تو پھر ساتھ ہی اپنی قدرت کاملہ کا تذکرہ کیا تا کہ اس سے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ البروج سے مراد محلات (القصور) اور منازل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یعنی ہم نے آسمان میں سورج اور چاند کے بروج یعنی ان کی منازل بنائیں۔ اور ان بروج کے نام یہ ہیں: الحمل، الثور، الجوزاء، السرطان، الاسد، السنبلة، المیزان، العقرب، القوس، الجدی، الدلو اور الحوت۔ اور عرب علوم کی وجہ سے ستاروں کے واقع ہونے کی جگہوں اور ان کے دروازوں کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور ان سے راستوں، اوقات، شادابی (خوشحالی) اور خشک سالی پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک فلک میں بارہ برج ہیں، اور ہر برج اڑھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اور بروج کا اصل معنی الظهور (ظاہر ہونا) ہے (2)؛ اور اسی سے تبرج المرأة ہے یعنی عورت کا اپنی زینت اور سنگار کو

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 151
2۔ ایضاً

ظاہر کرنا(1)۔ یہ معنی سورۃ النساء میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: البروج سے مراد النجوم ستارے ہیں (2)۔ اور انہیں یہ نام ان کے ظاہر ہونے اور ان کے بلند ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں (3)، یہ ابو صالح نے کہا ہے، یعنی سات سیارے (4)۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: بُرُوْجًا سے مراد ایسے محلات اور گھر ہیں جن میں محافظ اور نگران ہوتے ہیں (5)، انہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان میں پیدا کیا ہے۔ فاللہ اعلم۔ وَ زَيَّنّٰهَا یعنی ہم نے آسمان کو آراستہ کر دیا؛ جیسا کہ سورۃ الملک میں فرمایا: وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے۔) لِلنّٰظِرِيْنَ اعتبار اور غور و فکر کرنے والوں کے لئے۔

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

''اور ہم نے محفوظ کر دیا ہے آسمان کو ہر شیطان سے جو راندہ ہوا ہے۔''

یہاں رَّجِيْمٍ بمعنی مرجوم (راندہ ہوا) ہے۔ اور الرجم کا معنی الرمی بالحجارۃ (پتھر مارنا) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرجم کا معنی لعنت کرنا اور بھگانا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ رجیم آیا ہے وہ بمعنی الشتم (گالی دینا) ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام آسمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک شیاطین سے محفوظ نہ تھے، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو ان میں سے تین آسمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک محفوظ کر لیا، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد تمام آسمانوں کو محفوظ کر لیا اور ان (شیاطین) سے شہابوں کے ساتھ ان کی حفاظت اور نگرانی کی گئی۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (6)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ شیاطین کو آسمان میں جانے سے نہیں روکا جاتا تھا، پس وہ اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہاں کی خبریں کاہنوں کے پاس پہنچاتے تھے، پس وہ ان پر نو کا اضافہ کرتے اور اس کے بارے اہل زمین کو بتاتے تھے؛ ایک کلمہ حق ہے اور نو باطل ہیں؛ پس جب وہ اسی شے کو دیکھتے جو انہوں نے کہی ہوتی تو وہ اس بارے میں ان کی تصدیق کرتے جو وہ لے کر آتے، پس جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی ولادت ہوئی تو تین آسمانوں سے انہیں روک دیا، اور جب حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو تمام آسمانوں سے وہ روک دیئے گئے، پھر جو بھی کوئی چوری چھپے سننے کا ارادہ کرتا تھا اسے شہاب کے ساتھ بھگا دیا جاتا) جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

''بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے تو (اس صورت میں) تعاقب کرتا ہے اس کا ایک روشن شعلہ۔''

لیکن وہ جو چوری چھپے سن لے، یعنی کوئی تھوڑی سی چیز اچک لے، پس یہ استثناء منقطع ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ استثنا متصل ہے، یعنی سوائے اس کے جو چوری چھپے سن لے، یعنی ہم نے آسمان کو شیاطین سے محفوظ کر دیا ہے کہ وہ وحی وغیرہ میں

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 151	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ ایضاً	5۔ ایضاً	6۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 152

سے کسی چیز کو سنیں، بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے کیونکہ ہم نے اسے اس سے محفوظ نہیں کیا کہ وحی کے سوا آسمان کی خبروں میں سے کوئی خبر سنی جائے، اور رہی وحی! تو اس میں سے کوئی شے نہیں سنی جا سکتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (شعراء) (نہیں (شیطان کو) تو اس کے سننے سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔) اور جب شیاطین کسی ایسی شے کی طرف کان لگا کر سنیں جو وحی نہیں تو وہ اسے آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ کاہنوں کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ پھر شہاب (شعلے) ان کا تعاقب کرتے ہیں پس وہ انہیں قتل کر دیتے ہیں یا ان کے اعضاء کو فاسد اور خراب کر دیتے ہیں؛ اسے حضرت حسن اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ۔ اَتْبَعَهٗ، اسے پا لیتا ہے اور اسے پیچھے سے لاحق ہو جاتا ہے اور شہاب سے مراد روشن ستارہ ہے۔ اور اسی طرح شہاب ثاقب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: بِشِهَابٍ قَبَسٍ (نمل: 7) یعنی آگ کے اس شعلے کے ساتھ جو لکڑی کے سرے پر ہوتا ہے) یہ ابن عزیز نے کہا ہے۔

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

كأنه كوكب فى إثْر عِفرِية مسوَّمٌ فى سواد الليل مُنْقَضِب(1)

اور ستارے کو اس کی چمک اور روشنی کی وجہ سے شہاب کا نام دیا گیا ہے کہ وہ آگ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہاب سے مراد آگ کا شعلہ ہے، جو اہل زمین کے لئے جلایا جائے پس وہ انہیں جلا دیتا ہے اور لوٹ کر نہیں آتا جب وہ جلا دے جیسا کہ جب آگ جلا دے تو وہ نہیں لوٹتی، بخلاف ستارے کے کیونکہ جب وہ جلائے تو اپنی جگہ (اور مقام) کی طرف لوٹ آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: شیاطین گروہ در گروہ اوپر چڑھتے ہیں اور چوری چھپے سنتے ہیں پھر ان میں سے زیادہ سرکش منفرد اور الگ ہو جاتا ہے اور وہ مزید بلند ہوتا ہے، تو اسے شہاب (شعلے) کے ساتھ بھگا دیا جاتا ہے پس وہ اس کی پیشانی یا اس کی ناک پر یا جہاں اللہ تعالیٰ چاہے آ لگتا ہے پس وہ جلنے لگتا ہے، اور وہ اپنے ساتھیوں کے پاس اسی حال میں آتا ہے کہ وہ جل رہا ہوتا ہے اور کہتا ہے: بے شک امر اس طرح ہے، پس وہ کاہنوں میں سے اپنے بھائیوں کے پاس جاتے ہیں اور اس پر نو کا اضافہ کر دیتے ہیں، اور وہ اس کے ساتھ اہل زمین سے گفتگو کرتے ہیں؛ ایک کلمہ حق ہے اور نو باطل ہیں۔ پس جب وہ ان کے کہنے کے مطابق کوئی شے دیکھ لیتے کہ وہ اسی طرح ہوئی ہے، تو وہ (اہل زمین) ان کی ہر اس بات کی تصدیق کر لیتے جو انہوں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے جھوٹ بھی بولے۔ یہی معنی مرفوع روایت کے ساتھ سورۃ السبا میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور شہاب کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ قتل کرتا ہے یا نہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ شہاب زخمی کر دیتا ہے، جلا دیتا ہے اور اعضاء کو خراب اور فاسد کر دیتا ہے، لیکن وہ قتل نہیں کرتا۔ حسن اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ قتل کر دیتا ہے؛ پس اس قول کی بنا پر جنوں تک سنی ہوئی بات پہنچانے سے پہلے شہابوں کے ساتھ ان کے قتل کے بارے میں دو قول

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153

ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بات جوانہوں نے چوری چھپے سنی ہے اسے اپنے غیر تک پہنچانے سے پہلے وہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؛ پس اس بنا پر آسمان کی خبریں غیر انبیاء تک نہیں پہنچ سکتیں، اسی لئے کہانت ختم ہو چکی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے چوری چھپے سنا ہے اسے اپنے غیر جنوں تک پہنچانے کے بعد وہ قتل کئے جاتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے چرانے کے لئے دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے، اور اگر وہ بات نہ پہنچتی تو یقیناً چرانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا اور جلانے کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا شہابوں کے ساتھ بھگانا بعثت سے پہلے بھی تھا؟ تو اکثر نے کہا ہے: ہاں (یہ سلسلہ تھا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہیں، بلکہ یہ بعثت کے بعد شروع ہوا۔ اس مسئلہ کا بیان عنقریب سورۃ الجن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۃ الصافات میں بھی۔

زجاج نے کہا ہے: شہابوں کے ساتھ بھگانا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان علامات اور نشانیوں میں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے بعد ظاہر ہوئیں؛ کیونکہ قدیم شعراء نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ انہوں نے کسی تیز رفتار شے کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ انہوں نے بجلی اور سیلاب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بعید نہیں کہ کہا جائے کہ ستاروں کا ٹوٹنا تو قدیم زمانے میں تھا لیکن وہ شیطانوں کو بھگانے کے لئے نہ تھا، پھر جس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو یہ انہیں بھگانے کے لئے ہو گیا۔ اور علماء نے کہا ہے: ہم ستاروں کا ٹوٹنا دیکھتے ہیں۔ پس یہ بھی جائز ہے کہ وہ اسی طرح ہو جیسے ہم دیکھتے ہیں پھر وہ آگ بن جاتا ہو جب وہ شیطان کو پالے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کہا جائے: وہ ہوائے نفس کی آگ کے شعلے کے ساتھ بھاگتے ہیں اور اس میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ستارہ چل رہا ہے۔ اور لغت میں شہاب سے مراد روشن آگ ہے۔ اور ابوداؤد نے عامر شعبی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو شیاطین کو ستاروں کے ساتھ بھگایا گیا اس سے قبل وہ اس کے سبب نہ بھگائے جاتے تھے، پس وہ عبد یالیل بن عمرو ثقفی کے پاس آئے اور کہا: بے شک لوگ خوفزدہ ہو گئے ہیں اور وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرنے لگے ہیں اور انہوں نے اپنے جانور چھوڑ دیئے ہیں جب سے انہوں نے ستاروں میں دیکھا ہے۔ تو اس نے انہیں کہا: اور وہ نابینا آدمی تھا......: تم جلدی نہ کرو اور حالات دیکھو اور غور و فکر کرو پس اگر ستارے وہ ہیں جو معروف ہیں اور پہچانے جاسکتے ہیں تو پھر یہ لوگوں کے فناہ ہونے کا وقت ہے، اور اگر وہ ستارے پہچانے نہیں جاسکتے تو یہ کوئی حادثہ ہے جو پیش آنے والا ہے۔ پس انہوں نے غور سے دیکھا تو وہ ستارے نہیں پہچانے جاسکتے تھے، تو انہوں نے کہا: یہ کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ پس ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے سن لیا۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ⑲
وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ⑳

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153

''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور گاڑ دیئے اس میں محکم پہاڑ اور ہم نے اگا دی اس میں ہر چیز اندازے کے مطابق اور ہم نے بنا دیئے تمہارے لئے بھی اس میں رزق کے سامان اور ان کے لئے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا یہ بھی الله تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے، اور ان میں سے جو اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: ہم نے زمین کو پانی کی سطح پر پھیلا دیا؛ جیسا کہ فرمایا: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؁ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا۔) یعنی ہم نے اسے بچھا دیا۔ اور فرمایا: وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ؁ (الذاریات) (اور زمین کا ہم نے فرش بچھا دیا پس ہم کتنے اچھے (فرش) بچھانے والے ہیں) اور یہ اس کا رد ہو رہا ہے جس کا گمان یہ ہے کہ یہ (زمین) گیند کی مثل ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ اور ہم نے اس میں ثابت اور محکم پہاڑ گاڑ دیئے ہیں تا کہ یہ اپنے رہنے والوں کے ساتھ حرکت نہ کرے۔ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ اور ہم نے اس میں ہر چیز معلوم اور معین مقدار کے ساتھ اگا دی؛ یہ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اور بے شک فرمایا: مَّوْزُوْنٍ کیونکہ وزن وہ ہے جس کے ساتھ کسی شی کی مقدار پہچانی جاتی ہے۔

چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

قد كنتُ قبل لقائكم ذامِرّة　　عندي لِكُلِّ مخاصِم مِيزانه(1)

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: موزون سے مراد مقسوم (2) (تقسیم کیا گیا) ہے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: موزون سے مراد معدود ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: هذا كلام موزون؛ یعنی یہ کلام منظم ہے منتشر نہیں ہے۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا یعنی ہم نے زمین میں اُگا دی ہر وہ چیز جس کا وزن کیا جاتا ہے جواہر، حیوانات اور معاون میں سے۔ تحقیق الله تعالیٰ نے حیوانوں کے بارے میں فرمایا: وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران: 37) اور یہاں اِنبات سے مقصود پیدا کرنا اور ایجاد کرنا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا یعنی پہاڑوں میں مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ یعنی ہم نے پہاڑوں میں ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا فرما دی سونے، چاندی، تانبے، سیسے، قزدیر (ایک دھات) میں سے حتیٰ کہ ہڑتال اور سرمہ اور ہر وہ شے جس کا وزن کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہر وہ شے جس میں ثمنوں کا وزن کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس شے کی نسبت قدر کے اعتبار سے اعلیٰ اور نفع کے اعتبار سے اعم ہوتی ہے جس کا کوئی ثمن نہ ہو۔ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ یعنی ہم نے تمہارے لئے اس میں کھانے پینے کی وہ چیزیں بنا دی ہیں جن کے ساتھ وہ زندگی گزارتے ہیں؛ مَعَايِش کا واحد معیشة (یاء کے سکون کے ساتھ) ہے۔

اور اسی سے جریر کا قول ہے:

تكلفني مَعِيشَةَ آلِ زيدٍ　　وَ مَنْ لي بالمرقّق والصِّناب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 153　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

یہ اصل میں مَعْيِشَة مَفْعِلَة کے وزن پر (یا متحرک کے ساتھ) ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: بے شک اس سے مراد ملابِس (پہننے کے کپڑے) ہیں، یہ حسن نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: بے شک اس سے مراد مدت حیات تک اسباب رزق میں تصرف کرنا ہے۔ ماوردی نے کہا ہے: اور یہی ظاہر ہے۔ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ مراد جانور اور چوپائے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ بھی ہے کہ ان سے مراد غلام اور وہ بچے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِیَّاكُمْ (الاسراء: 31) (ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی) اور لفظ مَنْ کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ غلاموں اور چوپاؤں تمام کو شامل ہو جب وہ جمع ہوں؛ کیونکہ جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول جمع ہو جائیں تو ذوی العقول غالب ہوتے ہیں، یعنی ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان رزق، غلام، کنیزیں، جانور اور اولاد پیدا فرما دی ہے ہم انہیں رزق دیتے ہیں، تم انہیں رزق نہیں دیتے۔ پس اس تاویل کی بنا پر مَنْ محل نصب میں ہے؛ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وحشی جانور ہیں۔ حضرت سعید نے بیان کیا ہے: ہم پر منصور نے وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ پڑھی اور کہا: یہ وحشی مراد ہیں۔ پس اس معنی کی بنا پر مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہوگا، جیسا کہ اس آیت میں ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ الآیہ (النور: 45) (تو ان میں کچھ تو رینگتے ہیں پیٹ کے بل ......) پس مَنْ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف لَكُمْ میں کاف اور میم پر ہے۔ اور یہ بصریوں کے نزدیک قبیح ہے؛ کیونکہ ان کے نزدیک ظاہر کا عطف مضمر پر جائز نہیں ہوتا مگر حرف جر کے اعادہ کے ساتھ؛ جیسے مررت به و بزيد۔ اور مررت به و زيد کہنا شعر کے بغیر جائز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فالیومَ قرّبت تهجونا و تَشْتِمنا ۔ فاذهبْ فما بك والأيام مِن عَجَب

اس میں الایام کا عطف بِكَ پر بغیر حرف جر کے اعادہ کے ہے۔

یہ بحث سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

''اور نہیں کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں، اور ہم نہیں اتارتے اسے مگر ایک معلوم اندازے کے مطابق''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ یعنی مخلوق کے رزقوں اور ان کے منافع میں سے کوئی شے نہیں ہے مگر ہمارے پاس اس کے خزانے بھرے پڑے ہیں؛ مراد آسمان سے نازل کی جانے والی بارش ہے، کیونکہ اسی کے ساتھ ہر شے اگتی ہے۔ حسن نے کہا ہے: بارش ہر شے کا خزانہ ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خزائن سے مراد مفاتیح (چابیاں) ہیں، یعنی رزق کی چابیاں آسمان میں ہیں؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ یعنی البتہ ہم اسے نازل نہیں کرتے مگر اپنی مشیت کے مطابق اور اتنی مقدار میں جتنی مخلوق کو اس کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے؛

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 155

جیسا کہ فرمایا: وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ (الشوریٰ: 27) (اور اگر کشادہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ رزق کو اپنے (تمام) بندوں کے لئے تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں، لیکن وہ اتارتا ہے ایک اندازے سے جتنا چاہتا ہے)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حکم بن عتیبہ وغیرہما سے روایت ہے کہ ایک سال دوسرے سال کی نسبت بارش کے اعتبار سے زیادہ اور کثیر نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ جیسے چاہے اسے تقسیم کرتا ہے، پس ایک قوم کو بارش عطا کی جاتی ہے اور دوسروں کو محروم رکھا جاتا ہے (1)۔ اور بسا اوقات سمندروں اور چٹیل میدانوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور الخزائن الخزانة کی جمع ہے، اور اس سے مراد وہ جگہ ہے جس میں انسان اپنا مال چھپا کر رکھتا ہے (محفوظ رکھتا ہے) اور الخِزانة بھی خَزَنَ یَخْزُنُ کا مصدر ہے۔ اور ہر وہ شے جو انسان کے خزانہ میں ہے وہ اس کے لئے تیار کی گئی ہے، پس اسی طرح جس چیز پر رب قدرت رکھتا ہے تو گویا وہ اسی کے پاس تیار کی گئی ہے؛ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور جعفر بن محمد نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: عرش میں ہر اس شے کی مثال موجود ہے جو اللہ تعالیٰ نے بحر و بر میں تخلیق فرمائی ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تاویل ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ اور اس میں انزال بمعنی انشاء (بنانا) اور ایجاد کرنا ہے؛ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) (اور پیدا کئے تمہارے لئے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے۔)

اور یہ ارشاد گرامی ہے: وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (الحدید: 25) (اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انزال بمعنی اعطاء (عطا کرنا) ہے، اور اس کا نام انزال اس لئے رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام آسمان سے ہی نازل ہوتے ہیں۔

وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

"پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر پھر ہم اتارتے ہیں آسمان سے پانی پھر ہم پلاتے ہیں تمہیں وہی پانی۔ اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ عام قراءت الرِّیَاحَ جمع کے ساتھ ہے۔ اور حمزہ نے اسے واحد پڑھا ہے؛ کیونکہ ریح کا معنی جمع بھی ہے اگرچہ اس کا لفظ واحد ہے، جیسے کہا جاتا ہے: جاءت الریح من کل جانب (ہر طرف سے ہوا آئی)۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: أرض سَبَاسِب (وہ زمین جو دور تک ہموار ہو) اور ثوب اخلاق (پرانے کپڑے) اسی طرح عرب ہر شے میں وسعت کر دیتے ہیں۔ اور رہی قرأت عامہ کی وجہ تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت لَوَاقِحَ ذکر کی ہے اور یہ جمع ہے۔ اور لَوَاقِحَ کا معنی حوامل (اٹھانے والیاں) ہے؛ کیونکہ ہوا پانی، مٹی، بادل، خیر اور دیگر منافع اٹھائے ہوئے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 155

ہوتی ہے (اس لئے اس کی صفت لواقح ذکر کی گئی ہے)۔ ازہری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ریح کو لاقح بنایا ہے کیونکہ وہ بادل کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہے؛ یعنی وہ اسے اٹھاتی ہے، اور اسے چلاتی ہے، اور پھر اسے برساتی ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا (الاعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل) اور ناقة لاقح اور نوق لواقح جب اونٹنیاں اپنے پیٹوں میں جنین اٹھائے ہوئے ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لواقح بمعنی مُلْقِحة ہے اور یہی اصل ہے (حاملہ کرنے والی) لیکن ہوا پر کوئی چیز ڈالی نہیں جاتی بلکہ یہ بذات خود لاقح (اٹھانے والی (حاملہ) ہوتی ہے، گویا ہوائیں خیر و بھلائی کے ساتھ حاملہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ذوات لقح (اٹھانے والی)، اور یہ سب صحیح ہے؛ یعنی ان میں سے وہ بھی ہیں جو درختوں میں تلقیح کا عمل کرتی ہیں: جیسے ان کا قول ہے: عیشة راضیة یعنی ایسی زندگی جس میں رضا اور خوشی ہے۔ اور لیل نائم یعنی ایسی رات جس میں نیند آئے۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو بادل لاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: لِقحت الناقة (عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ) لَقحا و لَقاحًا (لام کے فتحہ کے ساتھ) فھی لاقح (یعنی اونٹنی حاملہ ہوئی) اور القحها الفحل یعنی نر نے اس میں اپنا پانی ڈالا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ پس ہوائیں بھی بادلوں کے لئے فحل (نر) کی طرح ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: و ریاح لواقح اور مَلَاقح نہیں کہا جائے گا، اور یہ نوادر میں ہے۔ مہدوی نے ابوعبیدہ سے بیان کیا ہے: لواقح بمعنی مَلاقح ہے، اور یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ مُلْقِحة اور مُلْقِح کی جمع ہے، پھر اس سے حروف زائدہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ لاقحة اور لاقح کی جمع ہے، اس کا معنی ہے ذات اللقاح (حمل والی) اور یہ نسبت کی بنا پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لاقح کا معنی حامل (اٹھانے والا) ہو۔ اور عرب جنوب کے لئے لاقح اور حامل، اور شمال کے لئے حائل اور عقیم (بانجھ پن) کہتے ہیں۔ اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ مبشرۃ (بشارت دینے والی ہوا) بھیجتا ہے اور وہ زمین کو مکمل طور پر صاف کر دیتی ہے، پھر مثیرہ بھیجتا ہے اور وہ بادل کو چلاتی ہے، پھر مؤلفہ (اکٹھا کرنے والی) کو بھیجتا ہے اور وہ اسے اکٹھا اور جمع کر دیتی ہے پھر اللواقح بھیجتا ہے اور وہ درختوں میں پیوند کاری کا عمل کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الریح الملاقح وہ ہوا ہے جو شبنم اٹھائے ہوتی ہے پس وہ اسے بادل میں ڈالتی ہے، پس جب وہ اس میں جمع ہو جائے تو وہ بارش بن جاتی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جنوب کی ہوا جنت سے آتی ہے اور یہی وہ الریح اللواقح ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور اس میں لوگوں کے لئے منافع ہیں (1)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جنوب سے کوئی ہوا نہیں چلتی مگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وافر پانی والا چشمہ جاری فرما دیتا ہے (2)۔'' اور ابوبکر بن عباس نے کہا ہے: بادل سے کبھی بارش نہیں برستی مگر اس کے بعد کہ اس میں چار قسم کی ہوائیں عمل کریں: پس الصبا اسے ابھارتی اور جمع کرتی ہے، اور دبور اسے بارور بناتی ہے، اور جنوب اسے برساتی ہے اور شمال اسے منتشر اور متفرق کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن وہب، ابن قاسم، اشہب، اور ابن عبدالحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ

---

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 354　　2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 155

اشہب کے ہیں...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ پس میرے نزدیک گندم کا باروار ہونا یہ ہے کہ وہ دانہ لائے اور سٹہ بالیاں نکال لے، اور میں اسے نہیں جانتا جو اپنے شگوفوں میں خشک ہو جاتی ہے، لیکن جو دانے دار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر اس وقت وہ خشک ہو جائے تو یہ ایسا فساد نہیں جس میں کوئی نفع نہ ہو۔ اور تمام درختوں کا باروار ہونا یہ ہے کہ وہ پھلدار ہو جائیں پھر اس سے گر جاتا ہے جو گر جاتا ہے اور ثابت اور قائم رہتا ہے جو ثابت رہتا ہے، اور یہ پکنے کے ساتھ لازم نہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے(1): اس تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے درخت کے باروار ہونے کو حمل کے اٹھانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ کہ بچہ جب تیار ہو جائے اور اس کی خلقت مکمل ہو جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو وہ پھل کے دانے دار ہونے اور اس کے بالیاں نکالنے کے قائم مقام ہے؛ کیونکہ اسے ایسا نام دیا گیا ہے جس میں ہر حاملہ شریک ہوتی ہے اور وہ اللقاح ہے، اور اسی کے بارے حدیث بھی ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دانے کی بیع سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ وہ پک (کر سخت ہو) جائے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اہل علم کے نزدیک کھجور کے درخت میں پیوند کاری یہ ہے کہ کھجور کے نرگابھے اور شگوفے سے کوئی شے لی جاتی ہے اور اسے مادہ گابھے کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ اور باقی پھلوں میں اس کا معنی یعنی انجیر وغیرہ میں سے پھل کا ظاہر ہونا ہے یہاں تک کہ پھل دکھائی دینے لگے، اس کی طرف دیکھا جا سکتا ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک پھلوں میں سے وہ جن کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ جن کا ذکر نہیں کیا جاتا ان میں معتبر یہ ہے کہ اس کی کلی ثابت رہے جو ثابت رہتا ہے اور اس کی گر جائے جو گر جاتا ہے۔ اور کھیتی میں اس کی حد (تعریف) یہ ہے کہ وہ زمین سے ظاہر ہو جائے؛ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ان سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ کھیتی کا باروار ہونا یہ ہے کہ وہ دانے دار ہو جائے۔ اور علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ باغ جب شق (پھٹ) ہو جائے تو اس کا مونث ہونا ظاہر ہو گیا تو اس کی تلقیح کو موخر کر دیا جائے اور اس کے غیر کی تلقیح کر دی جائے جس کی حالت اس کی حالت کی مثل ہے، تو اس کا حکم اسی کے حکم کی مثل ہو گا جس کا گابھا لگایا گیا، کیونکہ اس پر گابھا لگانے کا وقت آیا اور اس کا پھل دانے میں غیب ہونے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور اگر کسی نے بعض باغ کی پیوند کاری کی تو جس حصے کی پیوند کاری نہیں کی گئی وہ اس کے تابع ہو گا، جیسا کہ وہ باغ جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہو جائے تو سارا باغ بیع کے جائز ہونے میں اس صلاحیت کے ظاہر ہونے والے حصے کے تابع ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ تمام ائمہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے جس کھجور کا درخت پیوند کاری کے بعد خرید اتو اس کا پھل اس کے لئے ہو گا جس نے اسے بیچا مگر یہ کہ مشتری اپنے لئے اس کی شرط لگا لے، اور جس نے غلام خرید اتو اس کا مال اس کے لئے ہو گا جس نے اسے فروخت کیا مگر یہ کہ مشتری اپنے لئے اس کی شرط لگا لے(2)۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک پیوند کاری کیا ہوا پھل بیع میں اصول (درختوں) کے ساتھ داخل نہیں ہوتا مگر شرط کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 126

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع باب ما جاء فی ابتیاع النخل، جلد 1، صفحہ 149

ساتھ، کیونکہ وہ عین موجود ہے جس کے ساتھ غالباً اس کے گرنے سے محفوظ ہونے کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، بخلاف اس کے جس کی پیوندکاری نہ کی جائے؛ کیونکہ جب وہ گرنے سے محفوظ نہیں تو پھر اس کے لئے وجود بھی متحقق نہیں، پس بیچنے والے کے لئے نہ اس کی شرط لگانا جائز ہے اور نہ اس کی استثنا کرنا؛ کیونکہ یہ جنین کی طرح ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے یہی مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی استثنا جائز ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر کھجور کا درخت خریدا جائے اور پھل بائع کے لئے باقی رہے تو درخت خریدنے والے کے لئے پھل پکنے سے پہلے اسے خرید لینا جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور قول کے مطابق ہے۔ وہ اس کے لئے تبعیۃ کا حکم لگاتے ہیں اگرچہ اس کی بیع الگ کی گئی ہے، اور آپ سے ایک روایت ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری، اہل ظواہر اور فقہاء الحدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے نہی والی احادیث سے ظاہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اور ان میں سے جو اس باب سے تعلق رکھتی ہیں وہ ملاقح کی بیع سے نہی بھی ہے؛ اور ملاقح سے مراد نر اونٹ ہیں، یہ مُلْقِح کی جمع ہے۔ اور ملاقح سے مراد وہ مونث بھی ہیں جن کے پیٹوں میں ان کے بچے ہوں، اس کی واحد ملقحة (قاف کے فتحہ کے ساتھ) ہے۔ اور ملاقیح وہ جنین ہیں جو اونٹنیوں کے پیٹوں میں ہوں، اس کی واحد ملقوحة ہے، اور یہ ان کے اس قول سے ہے: لُقِحت (اونٹنی حاملہ ہوگئی)؛ جیسا محموم حُمّ سے ہے، اور مجنون جُنّ سے ہے، اور اس بارے میں بھی نہی وارد ہے، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے مَجْر سے منع فرمایا اور یہ ان اَجنہ کی بیع ہے جو ابھی تک ماؤں کے پیٹوں میں ہوں۔ اور آپ نے مضامین اور ملاقیح سے بھی منع فرمایا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: مضامین وہ ہیں جو پیٹوں میں ہوں، اور وہ جنین ہیں۔ اور ملاقیح وہ ہیں جو ابھی نروں کی صلبوں میں ہوں۔ اور یہی حضرت سعید بن مسیب وغیرہ کا قول ہے۔ اور اس کا برعکس بھی کہا گیا ہے: بےشک مضامین وہ ہیں جو اونٹوں کے پیٹوں میں ہوں، اور ملاقیح وہ ہیں جو مونث (اونٹنیوں) کے پیٹوں میں ہوں۔ اور یہ ابن حبیب وغیرہ کا قول ہے۔ دونوں امروں میں سے جو بھی ہو، پس مسلمان علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہ بیع جائز نہیں ہے۔ اور مزنی نے ابن ہشام سے بطور شاہد یہ ذکر کیا ہے کہ ملاقیح وہ ہیں جو پیٹوں میں ہوں۔

کیونکہ بعض اعرابی کہتے ہیں:

مَنِیَّتِی مَلَاقِحًا فِی الْأَبْطُنِ ... تُنْتَجُ مَا تَلْقَحُ بَعْدَ أَزْمُنِ

اور جوہری نے اس پر بطور شاہد راجز کا قول ذکر کیا ہے:

إِنَّا وَجَدْنَا طَرَدَ الْهَوَامِلِ ... خَیْرًا مِنَ التَّأْنَانِ وَ الْمَسَائِلِ

وَعِدَةِ الْعَامِ وَ عَامٍ قَابِلِ ... مَلْقُوحَةً فِی بَطْنِ نَابٍ حَائِلِ

قولہ تعالیٰ: فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ یعنی بادل سے ہم اتارتے ہیں، اور ہر وہ شے جو تجھ پر بلند ہو اور تجھ پر سایہ فگن ہو اس کا نام سماء ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم اتارتے ہیں آسمان کی طرف سے۔ مَآءً یعنی بارش۔ فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ یعنی ہم نے اس

بارش کو تمہارے پینے کے لئے اور تمہارے مویشیوں اور تمہاری زمین کو سیراب کرنے کے لئے بنایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سقی اور اسقی دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور ان کے درمیان فرق کا قول بھی کیا گیا ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ مَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ یعنی تمہارے پاس اس کا ذخیرہ نہیں ہے؛ یعنی ہم اس پانی کو ذخیرہ کرنے والے ہیں جب ہم چاہتے ہیں ہم اسے برساتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اسے روک لیتے ہیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشادات ہیں: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ (الفرقان) (اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی) وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ (المومنون) (اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرا لیا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے بالکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں) اور سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم بارش کو روکنے والے نہیں ہو۔

## وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہیں۔''

یعنی بے شک ہم ہی زمین کو اور اس پر بسنے والوں کو زندہ کرتے ہیں، اور ہمارے سوا کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ (مریم) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے ہماری طرف ں سب لوٹائے جائیں گے) پس ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے (1)، لیکن اس نے اپنے بندوں کو املاک کا مالک بنایا ہے پس جب وہ مر جائیں گے تو ان کے دعوے ختم ہو جائیں گے، پس اس وجہ سے اللہ تعالیٰ وارث ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں احیاء (زندہ کرنے) سے مراد رحموں میں نطفہ کو زندہ کرنا ہے۔ اور رہا بعث بعد الموت تو اس کا ذکر اس کے بعد کیا اس ارشاد میں: وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ (الحجر: 25) (اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا۔)

## وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو گزر چکے ہیں تم میں سے اور یقیناً ہم جانتے ہیں بعد میں آنے والوں کو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ اس میں آٹھ تاویلات ہیں: (۱) الْمُسْتَقْدِمِيْنَ یعنی جو آج دن تک پیدا ہونے میں آگے بڑھنے والے ہیں (2) اور الْمُسْتَاْخِرِيْنَ وہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، یہ حضرت قتادہ اور عکرمہ وغیر ہما نے کہا ہے۔ (۲) الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد اموات (مرنے والے) ہیں (3)، اور الْمُسْتَاْخِرِيْنَ سے مراد احیاء (زندہ) ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا ہے۔ (۳) الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد وہ ہیں جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے پہلے گزر چکے ہیں اور الْمُسْتَاْخِرِيْنَ وہ ہیں (4) جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 358　2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 156　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

کی امت میں سے پیچھے آنے والے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۴) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ وہ ہیں (1) جو خیر اور طاعت میں آگے بڑھنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ ہیں جو شر اور معصیت میں پیچھے رہنے والے ہیں؛ یہ حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے۔ (۵) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ وہ (2) جو جنگ کی صفوں میں آگے بڑھنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ جو ان میں پیچھے رہنے والے ہیں؛ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ (۶) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ جو (3) جہاد میں قتل ہونے کے سبب آگے گزرنے والے ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وہ جو قتل نہیں کئے گئے؛ یہ قرظی نے کہا ہے۔ (۷) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے (4) مراد اول الخلق ہیں، اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ آخر الخلق ہیں؛ یہ شعبی نے کہا ہے۔ (۸) الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے (5) مراد نماز کی صفوں میں آگے نکلنے والے ہیں اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد ان میں پیچھے رہنے والے ہیں عورتوں کے سبب۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے؛ کیونکہ وہ ہر موجود و معدوم کو جاننے والا ہے، اور وہ انہیں جاننے والا ہے جنہیں اس نے پیدا کیا ہے اور ہر اس شے کو جسے وہ یوم قیامت تک پیدا کریگا، مگر آٹھواں قول آیت کے نازل ہونے کا سبب ہے جیسا کہ اسے نسائی اور ترمذی نے ابوالجوزاء سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا ہے: ایک عورت جو کہ حسین ترین لوگوں میں سے ایک تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھی (6)، تو قوم میں سے بعض آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ وہ پہلی صف میں ہو گئے تا کہ وہ اسے نہ دیکھیں، اور بعض پیچھے ہو گئے یہاں تک کہ وہ پیچھے والی صف میں ہو گئے، اور جب رکوع کرتے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے (اس کی طرف) دیکھتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ اور یہ ابوالجوزاء سے مروی ہے اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر نہیں کیا، اور یہی اصح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ نماز میں اول وقت کی فضیلت پر اور پہلی صف کی فضیلت پر بھی دلالت کرتی ہے (7)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑا ہونے کے (اجر و ثواب کو) جان لیں تو پھر وہ اسے نہ پا سکیں مگر یہ کہ وہ اس پر قرعہ اندازی کریں تو یقیناً اس پر قرعہ اندازی کرتے (8)۔'' پس جب ایک آدمی زوال کے وقت آئے اور پہلی صف میں امام کے پڑوس میں آ کر بیٹھ جائے، تو اس نے فضیلت کے تین مراتب حاصل کر لئے: (۱) اوّل وقت (۲) صف اوّل (۳) امام کی مجاورت۔ اور اگر کوئی زوال کے وقت آیا اور دوسری صف میں آ کر بیٹھ گیا یا پہلی صف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا، تو اس نے اوّل وقت کی فضیلت کو پا لیا اور پہلی صف اور امام کی مجاورت کی فضیلت کو نہ پا سکا۔ اور اگر کوئی زوال کے وقت آیا اور پہلی صف میں اس جگہ بیٹھ گیا جو امام کے قریب نہ تھی تو اس نے اوّل وقت اور صف اوّل کی فضیلت کو حاصل کر لیا اور امام کی مجاورت اس سے فوت ہو گئی۔ اور اگر کوئی زوال کے بعد آیا اور پہلی صف میں آ کر بیٹھ گیا تو اس سے اوّل وقت کی فضیلت جاتی رہی اور اس نے پہلی صف اور امام کی مجاورت کو پا لیا۔ اور اسی طرح امام کی مجاورت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی،

---

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 156 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

6۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب الخشوع فی الصلاۃ، حدیث نمبر 1035، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، صفحہ 1127 8۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1128

بلاشبہ یہ ایسے ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''چاہئے کہ میرے قریب تم میں سے عاقل بالغ لوگ ہوں (1)'' الحدیث۔ بس جو امام کے پیچھے قریب ہو اسے چاہئے کہ اس صف سے متصف ہو۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کی جگہ آ بیٹھے تو اسے پیچھے کر دیا جائے اور وہ اس جگہ آگے آ جائے؛ کیونکہ صاحب شرع کے حکم سے یہ اس کا حق ہے، جیسا کہ محراب امام کی جگہ ہے چاہے وہ پہلے آئے یا بعد میں، یہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو محمول کیا جائے گا: اے، فلاں! تو پیچھے ہو، اے فلاں! تو آگے ہو؛ پھر آپ آگے بڑھتے اور تکبیر کہی جاتی۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس امت میں سے ایک آدمی سجدہ کرتے ہوئے گر جائے گا اور اس کو بخش دیا جائے گا جو اس کے پیچھے ہوگا۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ اسی امید پر مسجد کی پچھلی صف کا قصد کرتے تھے، اور ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ تورات میں اسی طرح پایا ہے۔ اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اور اس باب سے متعلق زیادہ تفصیلی بیان سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور جس طرح یہ آیت نماز میں صف اوّل کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے، پس اسی طرح یہ جنگ میں بھی صف اوّل کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے؛ کیونکہ دشمن کے مقابلے میں کھڑا ہونا، اور بندے کا اپنی جان کو اللہ تعالیٰ سے فروخت کر دینا کوئی عمل اس کے مساوی نہیں ہو سکتا؛ پس اس کی طرف آگے بڑھنا افضل ہے، اس میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ اس میں کوئی خفا ہے۔ اور کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی عیب یا برائی بیان نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ دلیر اور شجاع تھے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! جب غصے کے سبب آپ کا رنگ سرخ ہوتا تو ہم آپ سے بچتے تھے۔ اور ہم میں سے بہادر وہ ہوتا جو آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ جاتا۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا بیشک وہ بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ یعنی حساب اور جزا کے لئے بے شک آپ کا رب ہی انہیں جمع کرے گا۔ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

''اور بلاشبہ ہم نے پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ یعنی بلاشبہ ہم نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ مِنْ صَلْصَالٍ یعنی خشک کھنکتی مٹی سے: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔ اور الصَّلْصَال: ایسی مٹی (گارا) جس میں ریت نہ ملی ہوئی ہو جب وہ ریت کے ساتھ مل جائے اور جب خشک ہو جائے، بجنے لگے، پھر جب اسے آگ پر پکا لیا جائے تو وہ فخار کہلاتی ہے: یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔ اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1128
2۔ ایضاً

كعَدْوِ المصَلْصِل الجوّال

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد بدبودار گارا ہے اور کسائی نے اسے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: یہ عربوں کے اس قول سے ہے: صلّ اللحم و أصلّ جب گوشت بدبودار ہو جائے چاہے وہ پکا ہوا ہو یا کچا ہو، یَصلّ صلولا۔ حطیہ نے کہا ہے:

ذاك فتىً يبذُل ذا قِدْرِہ لا يُفسِد اللحمَ لدَيْه الصُّلول (1)

اور طین صَلال و مصْلال، یعنی ایسی مٹی جو آواز دیتی ہو جب تو اسے کھٹکھٹائے جیسا کہ لوہا آواز دیتا ہے، پس وہ پہلے تراب تھی، یعنی اس کے اجزاء متفرق تھے پھر اسے تر کیا گیا، گوندھا گیا تو طین ہو گئی، پھر اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس میں بدبو پیدا ہو گئی تو وہ حمأ مسنون ہو گئی، یعنی متغیر ہو گئی (اس کی شکل خراب ہو گئی) پھر وہ خشک ہوئی تو صلصال ہو گئی؛ یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور الحمأ سے مراد سیاہ گارا ہے اور اسی طرح الحَمْأة بالتسکین بھی ہے؛ اسی سے تو کہتا ہے: حَمَئْتُ البئرحَمْأً (یعنی یہ میم کے سکون کے ساتھ ہے) جب کنوئیں کا کیچڑ نکالا جائے۔ اور حَمِئَتْ البئرحَمَأً (میم متحرک کے ساتھ) جب اس کا کیچڑ زیادہ ہو جائے۔ اور أحماتها إحماء میں نے اس میں کیچڑ ڈالا؛ یہ ابن السکیت سے منقول ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: الحمأةُ (میم کے سکون کے ساتھ) الكمْأة کی مثل ہے۔ اور اس کی جمع حَمْءٌ آتی ہے، جیسا کہ تَمْرَة اور اس کی جمع تَمْرٌ ہے۔ اور الحَمَأ مصدر ہے جیسا کہ الهلَع اور الجزَع ہے پھر اسی کے ساتھ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور المسنون کا معنی متغیر ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ مٹی جو گیلی اور بدبودار ہو، اور اسے صلصال بنایا گیا ہے جیسا کہ فخار ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، دونوں نے کہا ہے: بدبودار بدلی ہوئی مٹی یہ ان کے اس قول سے ہے: قد أسِن الماء جب پانی (کا رنگ اور ذائقہ) بدل جائے؛ اور اسی سے لَمْ يَتَسَنَّهْ (البقرہ: 259) (یہ باسی نہیں ہوا) اور مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ (محمد: 15) (وہ پانی جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا) ہے۔

اور اسی سے ابو قیس بن اسلت کا قول ہے:

سقت صدای رُضابا غیر ذی أسن كالمسك فُتّ علی ماء العناقيد(2)

اور فراء نے کہا ہے: اس سے مراد متغیر (وہ جس کی حالت بدل جائے) ہے، اور اس کی اصل ان کے اس قول سے ہے: سننت الحجر علی الحجر جب تو پتھر کو پتھر کے ساتھ رگڑے۔ اور جو کچھ دو پتھروں کو رگڑنے سے نکلتا ہے اسے السنانة اور السَّنِيْن کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ثم خاصرتُها الی القبة الحمراءِ تمشی فی مَرْمَر مسنون

یعنی رگڑا ہوا ملائم پتھر۔ بیان کیا گیا ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنے باپ کو کہا: کیا تم عبدالرحمٰن بن حسان کو دیکھ نہیں

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 157

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 158

رہے وہ تمہاری بیٹی کے محاسن بیان کرتا ہے؟ تو معاویہ نے کہا: اس نے کیا کہا ہے؟ اس نے بتایا وہ کہتا ہے:

ھی زھَرَاءُ مثل لؤلؤۃ الغو　　　اص مِیزَت من جَوْھرِ مَکْنُونِ

یہ غواصی کرنے والے کے موتی کی مثل کلی ہے جسے چھپے ہوئے جوہر سے الگ کیا گیا ہو۔

تو معاویہ نے کہا: اس نے سچ کہا ہے! تو یزید نے کہا: وہ یہ بھی کہتا ہے:

واذا ما نَسبتَھا لم تجدھا　　　فی سَناء من المکارم دونِ

اور جب بھی تو اس کا نسب بیان کرے تو تو اسے مکارم اور عظمت کی بلندیوں میں کم نہیں پائے گا۔

تو معاویہ نے کہا: اس نے سچ کہا ہے! پھر یزید نے کہا: اس کا یہ قول کہاں گیا: ثم خاصرتھا...... البیت۔ تو معاویہ نے کہا: یہ جھوٹ ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: المسنون کا معنی انڈیلا ہوا ہے، اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: سننت الماء وغیرہ علی الوجہ جب تو پانی وغیرہ کو چہرے پر انڈیلے(1) (تو مذکورہ جملہ کہا جاتا ہے)۔ اور السن کا معنی الصب انڈیلنا ہے۔ اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ المسنون کا معنی الرطب (تر) ہے اور یہ بمعنی مصبوب ہی ہے؛ کیونکہ وہ مصبوب (انڈیلا ہوا) تبھی ہو سکتا ہے جب وہ تر ہو۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے؛ کیونکہ کہا جاتا ہے: سننت الشیٔ یعنی میں نے شے کو انڈیل دیا۔ ابوعمرو بن علاء نے کہا ہے: اور اسی سے وہ اثر ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ پانی اپنے چہرے پر انڈیلتے تھے اور اسے چھڑکتے نہ تھے اور الشن (شین کے ساتھ) ہو تو معنی پانی جھڑکنا ہے اور سین کے ساتھ ہو تو معنی بغیر تفریق کے پانی انڈیلنا اور بہانا ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے: المسنون کا معنی مصوَّر ہے (یعنی وہ گارا جو بنایا گیا ہو) یہ سُنَّۃ الوجہ سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی اس کی صورت اور شکل ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

تُرِیك سُنَّۃَ وجہٍ غیرَ مُقْرِفۃ　　　مَلْسَاء لیس بھا خال ولاندَبُ

اور اخفش نے کہا ہے: المسنون کا معنی جو سیدھا کھڑا ہو، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے وجہ مسنون جب اس میں طوالت ہو۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: بے شک صلصال سے مراد گوندھی ہوئی مٹی (گارا) ہے؛ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلصال سے مراد بدبودار مٹی ہے تو اس کی اصل صلال ہے، پھر دو لاموں میں سے ایک کو صاد سے بدل دیا گیا ہے اور مِّنْ حَمَاٍ، صلصال کی جنس کی تفسیر بیان کر رہا ہے؛ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: أخذت ھذا من رجل من العرب (اس میں من العرب، رجل کی تفسیر کے لئے ہے۔)

## وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"اور جن کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے ایسی آگ سے جس میں دھواں نہیں۔"

قولہ تعالیٰ: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہم نے جن کو پیدا فرمایا۔ اور حسن نے کہا ہے:

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 158

مراد ابلیس ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا فرمایا۔ اور اسے آنکھوں سے چھپا رہنے کی وجہ سے جانٌ کا نام دیا گیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ثابت کی حدیث ہے (1) کہ وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر جنت میں بنائی اور اسے چھوڑ دیا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اسے چھوڑے رکھے تو ابلیس اس کے اردگرد گھومتا رہا اور غور سے دیکھتا رہا یہ کیا ہے پس جب اس نے اس کے درمیان (پیٹ وغیرہ) کو دیکھا تو اس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو اپنے نفس کی مالک نہیں ہوگی''۔ (یعنی شہوات سے اسے محفوظ نہیں رکھ سکے گی) مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: نار السموم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے جن کو پیدا کیا ہے اور یہ جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: السموم سے مراد وہ گرم ہوا ہے جو مار ڈالتی ہے۔ اور آپ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ یہ ایسی آگ ہے جس کا دھواں نہیں۔ اور صواعق (بجلی کی کڑک) اسی سے ہوتی ہے۔ اور یہ (صواعق) ایک آگ ہے جو آسمان اور حجاب کے درمیان ہوتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ حکم صادر کرے تو حجاب پھٹ جاتا ہے اور صاعقہ (بجلی کا گرنا) وہاں جا کر گرتی ہے جہاں اسے حکم دیا گیا ہو۔ پس وہ آواز (اور کڑک) جو تم سنتے ہو وہ اسی حجاب (پردے) کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: نار السموم وہ آگ ہے جس کے نیچے حجاب ہے، اور بادل کی جو گرج تم سنتے ہو یہ اسی کی آواز ہوتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ابلیس ملائکہ کے گروہوں میں سے ایک گروہ تھا ان کو جن کہا جاتا ہے وہ ملائکہ میں سے ہوتے ہوئے نار سموم سے پیدا کئے گئے ...... فرمایا ...... اور وہ جن جن کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے وہ آگ کے خالص شعلے سے پیدا کئے گئے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے؛ کیونکہ یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو عذر کو ختم کر دے؛ کیونکہ اس جیسا قول فقط رائے سے نہیں کیا جا سکتا۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ کی حدیث نقل کی ہے (2) انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور جن آگ کے خالص شعلے سے پیدا کئے گئے ہیں اور آدم علیہ السلام کو اس سے پیدا کیا گیا ہے جو تمہارے لئے بیان کیا گیا ہے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول: خلقت الملائكة من نور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور جوہری نے کہا ہے: مارج من نار سے مراد وہ آگ ہے جس کا دھواں نہیں اور اسی سے جن پیدا کئے گئے ہیں، اور سموم سے مراد گرم ہوا ہے یہ مؤنث ہے؛ اسی سے کہا جاتا ہے: سم یومُنا (ہمارا دن گرم ہو گیا) پس یہی یوم مسموم ہے، اور اس کی جمع سمائم ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: گرم ہوا کبھی دن کے وقت ہوتی ہے اور کبھی رات کے وقت، اور الحرور (گرم ہوا) کبھی رات کے وقت ہوتی ہے اور کبھی دن کے وقت۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: گرم ہوا کو سموم کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة و الادب، باب خلق الانسان، جلد 2، صفحہ 327

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد و الرقائق، باب فی احادیث متفرقة، جلد 2، صفحہ 413

یہ اپنی لطافت اور نرمی کے سبب بدن کے مساموں میں داخل ہو جاتی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾

''اور (اے محبوب!) یاد فرماؤ جب آپ کے رب نے کہا تھا فرشتوں کو میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کھنکھناتی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار کیچڑ تھی تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ بے شک میں بجنے والی مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ پس جب میں اس کی خلقت اور اس کی صورت درست فرما دوں۔ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ، النفخ کا معنی کسی شی میں ہوا کو جاری کرنا ہے۔ اور الروح یہ لطیف جسم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہ ہے کہ وہ اس جسم کے ساتھ بدن میں حیات پیدا فرماتا ہے۔ اور اس کی حقیقت خلق کی نسبت خالق کی طرف کرنا ہے پس روح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جس کی اضافت تشریف و تکریم کے لئے اس نے اپنی طرف کی ہے۔ جیسا کہ ان ارشادات میں اضافت تشریف کے لئے ہے: اَرضِی (میری زمین)، سَمَائی (میرا آسمان)، بیتی (میرا گھر)، ناقۃ اللہ (اللہ کی اونٹنی) اور شهر اللہ (اللہ تعالیٰ کا مہینہ) اور اسی کی مثل وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ہے اور یہ مفصل بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے کتاب (التذکرہ) میں اس بارے میں وارد ہونے والی وہ احادیث ذکر کی ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ روح ایک لطیف جسم ہے، اور یہ کہ نفس اور روح ایک مسمی کے دو نام ہیں۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جنہوں نے کہا ہے: بے شک روح ہی حیات (زندگی) ہے تو ان کی مراد یہ ہے کہ جب زندگی (حیات) اس سے مرکب کر دی جائے۔ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ یعنی تم اس کے لئے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا اور یہ سجدہ تعظیم و تکریم کے لئے ہے سجدۂ عبادت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ اسے فضیلت عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس اس نے انبیاء علیہم السلام کو ملائکہ پر فضیلت دی ہے۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور قفال نے کہا ہے: وہ آدم علیہ السلام سے افضل تھے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سجود کے ساتھ آزمایا اور یہ ان کو ثواب جزیل کے لئے پیش کرنا ہے۔ اور یہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرنے کے بارے میں حکم دیا گیا، اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے قبلہ تھے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۱﴾

''پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔''

قولہ تعالیٰ: فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) بے شک اسے اس سے تکبر کرنے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے نے روکا تھا؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پھر کہا گیا ہے: وہ ملائکہ میں سے تھا۔ اور یہ استثنا اپنی جنس سے ہی ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: وہ ملائکہ میں سے نہ تھا؛ لہٰذا یہ استثنا منقطع ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: الجآنّ ابوالجن (جنوں کا باپ) ہے اور وہ شیاطین نہیں ہیں۔ اور شیاطین ابلیس کی اولاد ہیں، اور وہ نہیں مریں گے مگر ابلیس کے ساتھ اور جن فوت ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر بھی ہیں، پس حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کے باپ ہیں۔ اور جآنّ جنوں کا باپ ہے۔ اور ابلیس شیطانوں کا باپ ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ اور اس کے خلاف سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے، پس وہاں غور کرلو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ایک جنس کی دوسری جنس سے استثنا کرنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی کہے: لفلان علی دینار الا ثوبا (مجھ پر فلاں کے دینار ہیں سوائے کپڑے کے) یا عشرۃ اثواب الا قفیز حنطۃ (مجھ پر دس کپڑے ہیں سوائے ایک قفیز گندم کے) یہ ہم جنس نہیں ہیں لیکن یہ مقبول ہے، اور مستثنیٰ منہ سے کپڑے اور گندم کی قیمت ساقط ہو جائے گی اور اس میں کیلی، وزنی اور عددی سب چیزیں برابر ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مکیلی کی استثنا موزونی سے کرنا اور موزونی کی استثنا مکیلی سے کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے دراہم کی استثنا گندم سے کی اور گندم کی استثنا دراہم سے کی تو وہ قبول کرلی جائے گی، لیکن جب کسی نے مقومات (جن کے ساتھ قیمت لگائی جاتی ہے) کی استثنا مکیلی یا موزونی چیزوں سے کی، اور مکیلی چیزوں کی استثنا مقومات سے کی، مثلاً وہ یہ کہے: علی عشرۃ دنانیر الا ثوبا (مجھ پر دس دینار ہیں سوائے کپڑے کے)، یا عشرۃ اثواب الا دینارا (مجھ پر دس کپڑے ہیں سوائے ایک دینار کے) تو یہ استثنا صحیح نہ ہوگی، اور اقرار کرنے والے پر مجموعی طور پر یہ سب چیزیں لازم ہو جائیں گی۔ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: غیر جنس سے استثنا کرنا صحیح نہیں ہوتا، اور اقرار کرنے والے پر وہ تمام چیزیں لازم ہو جاتی ہیں جن کا اس نے اقرار کیا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ لفظ استثنا جنس اور غیر جنس دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ (الواقعہ) (نہ سنیں گے وہاں لغو باتیں اور نہ گناہ والی باتیں، بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آواز آئے گی) پس اس میں تمام لغو کلام سے سلام کی استثنا کی گئی ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اور ابلیس من جملہ ملائکہ میں سے نہیں ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف: 50) (سوائے ابلیس کے، وہ قوم جن سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔)

---

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 158

اور شاعر نے کہا: —

و بلدۃٍ لیس بھا أنیس　　اِلّا الیعافیر والا العِیسُ

پس اس میں شاعر نے یعافیر جو کہ مذکر ہرن ہے، اور عیس جو کہ سفید اونٹ ہے کی أنیس سے استثنا کی ہے؛ (اور یہ استثنا من غیر جنسہ ہی ہے۔) اور اسی کی مثل نابغہ کا قول بھی ہے۔

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ۝۳۲ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۳۳ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۝۳۴ وَّ اِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳۵

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابلیس! کیا وجہ ہے کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ (گستاخ) کہنے لگا کہ میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب!) نکل جا یہاں سے تو مردود ہے، اور بلاشبہ تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابلیس! تیرے لئے کون سی شے مانع اور رکاوٹ تھی؟ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ یعنی اس بارے میں کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ یعنی اس نے اپنا تکبر اور اپنا حسد بیان کیا، اور یہ کہ وہ اس (آدم علیہ السلام) سے بہتر ہے، کیونکہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ مٹی کو کھا جاتی ہے؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب!) تو نکل جا آسمانوں سے، یا جنت عدن سے، یا تمام ملائکہ سے۔ فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ یعنی نو شہابوں کے ساتھ بھگایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو لعنتی اور منحوس ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَّ اِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ یعنی بلاشبہ تجھ پر میری لعنت ہے)، جیسا کہ سورۃ ص میں ہے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝۳۶ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝۳۷ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝۳۸

"کہنے لگا: اے میرے رب! پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے، (جنہیں) وقت مقرر کے دن تک مہلت دی گئی ہے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ یہ ابلیس کی طرف سے سوال اور درخواست ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے مقام و مرتبہ کے اعتماد اور ثقاہت کی وجہ سے نہیں ہے، اور یہ کہ وہ اس اہل ہے کہ اس کی دعا اور درخواست کو قبول کیا جائے؛ بلکہ اس نے اپنے عذاب کو موخر کرنے اور اپنی آزمائش اور امتحان میں اضافہ اور زیادتی کرنے کے لئے یہ سوال کیا:

جیسا کہ سلامتی سے مایوس اور ناامید کا فعل ہوتا ہے۔ اور اس نے اپنے سوال میں مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دینے سے ارادہ یہ کیا کہ وہ نہ مرے، کیونکہ قبروں سے اٹھائے جانے کے دن میں کوئی موت نہیں اور نہ اس کے بعد کوئی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ یعنی تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے اس سے نفخہ اولیٰ کا ارادہ فرمایا ہے، یعنی جس وقت مخلوق کو موت آئے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وقت معلوم سے مراد وہ وقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے۔ (یعنی کوئی دوسرا اس سے واقف نہیں) اور ابلیس اس سے جاہل ہے۔ پس ابلیس کو موت آئے گی پھر اسے اٹھایا جائے گا؛ (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن) (جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے) اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے کلام میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے...... کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے اس سے کلام کی۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعید میں شدت اور سختی پیدا کرنے کے لئے اس سے کلام کی نہ کہ تکریم وتقریب کے طور پر (1)۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

''وہ بولا: اے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بھٹکا دیا، میں (برے کاموں کو) ضرور خوشنما بنا دوں گا ان کے لئے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ اغواء اور زینۃ کا معنی پہلے سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور یہاں اس کی تزیین (خوشنما بنانا) دو وجہوں سے ہوسکتی ہے: یا تو گناہوں کے ارتکاب کے ساتھ، اور یا انہیں فعل طاعت سے ہٹا کر دنیوی زینت وآرائش میں مشغول کرنے کے ساتھ اور لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ میں انہیں ہدایت کے راستے سے گمراہ کروں گا۔ اور ابن لہیعہ عبداللہ نے دراج ابی السمح سے اس نے ابوالہیثم سے اور اس نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ابلیس نے کہا: اے میرے رب! تیری عزت وجلال کی قسم! میں اولاد آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کی ارواح ان کے جسموں میں موجود رہیں گی تو رب العالمین نے فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم میں ان کی مغفرت کرتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے رہے۔'' قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''ان ابلیس قال یا رب و عزتك و جلالك لا ازال اغوی بنی آدم ما دامت أرواحهم في أجسامهم قال الرب و عزتي و جلالي لا أزال اغفر لهم ما استغفروني'' (2)۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے''۔

اہل مدینہ اور اہل کوفہ نے لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یعنی وہ جنہیں تو نے چن لیا ہے اور تو نے انہیں خاص کرلیا ہے اور باقیوں نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یعنی وہ جنہوں نے عبادت کو تیرے لئے فساد یا ریاکاری سے خالص (اور پاک)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 160
2۔ شرح السنۃ، بغوی، 1239

کرلیا ہے۔ ابوثمامہ نے بیان کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخلصین کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: (الذی یعمل ولا یحب أن یحمدہ الناس)(1)۔ ''یعنی وہ جو عمل کرتا ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کی تعریف کریں''۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے۔''

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ یہ راستہ ہے جو اپنے صاحب (اپنانے والے) کو سیدھا لے آتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے سبب جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عَلَيَّ بمعنی اِلَيَّ (میری طرف) ہے حضرت مجاہد اور کسائی نے کہا ہے: یہ وعید اور تہدید (جھڑکنے) کی بناء پر ہے؛ جیسا کہ جسے تو نے جھڑکنا ہو اس کے لئے تیرا قول: طریقك علیّ و مصیرك الیّ (تیرا راستہ میرے خلاف ہے اور تیرا انجام میرے پاس ہے) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ (الفجر) (بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں) کی تاک میں ہے) پس کلام کا معنی یہ ہوا: یہ راستہ ہے اس کا رجوع میری طرف ہے پس میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دوں گا، مراد عبودیت اور بندگی کا راستہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کا معنی ہے مجھ پر لازم ہے کہ میں پوری وضاحت اور دلائل کے ساتھ صراط مستقیم پر راہنمائی کروں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں توفیق اور ہدایت کے ساتھ (راہنمائی کروں)۔ ابن سیرین، قتادہ، حسن، قیس بن عباد، ابورجاء، حمید اور یعقوب نے هٰذَا صِرَاطٌ عَلِيٌّ مُسْتَقِيْمٌ یعنی عَلِيٌّ کے رفع اور تنوین کے ساتھ قرأت کی ہے؛ اور اس کا معنی ہے رفیعٌ مستقیم، یعنی جو دین اور حق میں بلند ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: رفیع ان یُمال (وہ ایسا سیدھا اور پختہ ہے کہ اس کی طرف مائل ہوا جائے) مستقیم أن یُنال (وہ ایسا بلند ہے کہ اسے پایا جائے)

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝

''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ علماء نے کہا ہے: یعنی میرے بندوں کے دلوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔ اور ابن عیینہ نے کہا ہے: یعنی اس بارے میں کہ وہ انہیں گناہ میں ڈال دے جو انہیں میری عفو سے روک دے اور اسے ان پر تنگ کر دے (ان پر کوئی بس نہیں چلتا) اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی ہے اور انہیں چن لیا ہے، اور انہیں پسند فرمالیا ہے اور انہیں منتخب فرمالیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید کہنے والا کہہ رہا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کے بارے اپنے اس ارشاد کے ساتھ خبر دی ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (البقرہ: 36) (پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے) اور من جملہ اپنے نبی کے اصحاب کے بارے میں اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران: 155)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 161

( تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے ) پس وہ جواب جوذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے ان کے دلوں پر کوئی بس نہیں چلتا، اور نہ ان کے محل ایمان پر کوئی بس چلتا ہے، اور نہ وہ انہیں ایسے گناہ میں ڈال سکتا ہے جو انہیں عدم قبول کی طرف لوٹادے، بلکہ توبہ اسے زائل کر دیتی ہے اور (اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع اسے مٹا دیتا ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کا نکلنا اس کی سزا نہیں جو انہوں نے کھایا؛ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور رہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تو ان کے بارے کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول: لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ ان کے بارے میں خاص ہو جن کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی ہے، اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ اکثر اوقات اور اکثر احوال کے بارے میں ہو، اور کبھی اس کا تسلط تکلیف کو دور کرنے اور غم کو زائل کرنے کی صورت میں ہوتا ہے؛ جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کیا گیا، جب وہ آپ کے پاس آیا تو وہ آپ کو تھپکی دینے لگا (پرسکون کرنے لگا) جیسے بچے کو تھپکی دی جاتی ہے یہاں تک کہ آپ سو گئے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سب سو گئے پس وہ بیدار نہ ہوئے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا، اور وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے: اس کا کیا کفارہ ہے جو ہم نے اپنی نماز کے بارے سستی کی ہے؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''نیند کی حالت میں تفریط نہیں ہے'' (1)۔ پس آپ نے ان سے پریشانی اور اضطراب کو دور کر دیا۔ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ مگر جو گمراہوں اور مشرکوں میں سے تیری پیروی کرتے ہیں، یعنی ان پر اس کے غلبے کی دلیل یہ ہے اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿﴾ (النحل) (اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔)

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ اور اس سے پہلی والی آیت اس پر دلیل ہے کہ قلیل کی استثنا کثیر سے اور کثیر کی استثنا قلیل سے جائز ہے؛ مثلاً کوئی یہ کہے: عشرۃ الا درھما (دس سوائے ایک درہم کے) یا کوئی یہ کہے: عشرۃ الا تسعۃ (دس سوائے نو کے) اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: فقط نصف اور اس سے کم مقدار کی استثنا جائز ہوتی ہے۔ اور رہی کل سے اکثر کی استثنا تو یہ صحیح نہیں ہوتی۔ اور ہماری دلیل یہ آیت ہے، کیونکہ اس میں الغاوین کی استثنا عباد سے، اور عباد کی استثناء غاوین سے ہے، اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اقل کی استثنا کل سے اور اکثر کی استثنا کل سے سب جائز ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿﴾

''اور بے شک جہنم وعدہ کی جگہ ہے ان سب کے لئے اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ یعنی ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کے لئے (جہنم وعدہ کی جگہ ہے) لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ یعنی اس کے سات طبقات ہیں ہر طبق دوسرے طبق سے اوپر ہے۔ لِكُلِّ بَابٍ یعنی ہر طبقہ کے لئے مِّنْهُمْ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی من نام عن صلوۃ او نسیھا، جلد 1، صفحہ 80

**جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ** ان میں سے مخصوص اور معلوم حصہ ہے۔

ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابراہیم ابو ہارون الغنوی نے خبر دی انہوں نے کہا: میں نے حطان بن عبداللہ رقاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: کیا تم جانتے ہو جہنم کے دروازے کیسے ہیں؟ ہم نے کہا: وہ ہمارے دروازوں کی مثل ہوں گے، انہوں نے کہا: نہیں، وہ اس طرح ہیں یعنی ان میں سے بعض بعض سے اوپر ہیں...... ثعلبی نے یہ زیادہ کیا ہے: آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک کو دوسرے کے اوپر رکھا...... اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جنتوں کو زمین پر رکھا، اور جہنموں میں سے بعض کو بعض کے اوپر رکھا ہے، پس سب سے نیچے جہنم ہے، اور اس کے اوپر الحطمہ ہے، اس کے اوپر سقر ہے، اس کے اوپر الجحیم ہے، اور اس کے اوپر لظی ہے، اس کے اوپر سعیر ہے، اور اس کے اوپر الھاویہ ہے، اور ہر طبقہ اس سے ستر گنا زیادہ گرم ہے جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تفسیر اسی طرح واقع ہے۔ اور وہ موقف جس پر اکثر علماء ہیں وہ یہ ہے کہ جہنم کے درکات میں سے اعلیٰ (اوپر والا) درکہ ہے اور یہ حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے گنہگاروں کے ساتھ خاص ہے، اور یہ وہ ہے جو اپنے اہل سے خالی ہو جائے گا اور ہوائیں اس کے دروازے بجائیں گی، پھر اس کے بعد لظی ہے، پھر حطمہ ہے، پھر سعیر ہے، پھر سقر ہے، پھر جحیم ہے اور پھر ہاویہ ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: درک اعلیٰ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی (محمدیون) ہوں گے، دوسرے میں نصاریٰ، تیسرے میں یہودی، چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی، چھٹے میں مشرکین عرب، اور ساتویں میں منافقین، آل فرعون اور اہل مائدہ میں سے کافر لوگ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ** (النساء: 145) (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں سے) اور یہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور ارشاد فرمایا: **فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ** (المائدہ) (پھر جس نے کفر اختیار کیا اس کے بعد تم سے تو بے شک میں عذاب دوں گا اسے ایسا عذاب کہ نہیں دوں گا کسی کو بھی اہل جہان سے) اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ اس امت کے علماء سوء ان دروازوں پر تقسیم ہوں گے؛ ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔

اور ترمذی (1) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ اس کے لئے ہے جس نے میرے کسی امتی پر اپنی تلوار سونتی۔" ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: جہنم کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ حروریہ کے لئے ہے۔ اور وہب بن منبہ نے کہا ہے: ہر دو دروازوں کے درمیان ستر برس کی مسافت ہے۔ اور ہر دروازہ (درکہ) اپنے اوپر والے سے ستر گنا زیادہ گرم ہے، اور ہم نے اس تمام کو کتاب "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے۔ اور سلام الطویل نے ابوسفیان سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140۔ ایضاً، باب ومن سورۃ الحجر، حدیث 3048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے ارشاد: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ کے بارے میں روایت کیا ہے "ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کیا اور ایک حصہ ان کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہوئے، ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنی پسند اور خواہش کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دی، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنے غصے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ ٹھنڈا کیا، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اپنی رغبت کو اپنی پسند کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے پھیر لیا، اور ایک حصہ ان کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا۔" الحلیمی ابو عبد اللہ حسین بن حسن نے اسے کتاب (منہاج الدین) میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے: اگر یہ روایت ثابت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے وہ بت پرست ہیں، اور شک کرنے والے وہ ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کا کوئی الٰہ ہے یا ان کا کوئی الہ نہیں، اور وہ اس کے دین اور شریعت میں شک کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف سے ہے یا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے والے وہ ہیں جو بالکل اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے ثابت کرتے ہی نہیں، اور پھر دہریے ہیں۔ اور اپنی شہوات کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دینے والے وہ ہیں جو گناہوں میں منہمک ہونے والے ہیں، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور اس کے اوامر و نواہی کی تکذیب کرتے ہیں، اور اپنے غصے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ ٹھنڈا کرنے والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو اور اس کی طرف تمام دعوت دینے والوں کو قتل کرنے والے ہیں، اور اسے عذاب اور اذیت پہنچاتے ہیں جو انہیں نصیحت کرتا ہے یا ان کے مذہب کے سوا کسی اور کی پیروی کرتا ہے، اور اپنی رغبت کو اپنی پسند کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے (پھیرنے والے وہ ہیں) جو موت کے بعد زندہ کئے جانے اور حساب وغیرہ کا انکار کرتے ہیں، پس وہ ان کی عبادت کرتے ہیں جن میں وہ رغبت رکھتے ہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان تمام کا حصہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حدود سے تجاوز کرنے والے وہ ہیں جو لاپرواہ ہوتے ہیں، اس بارے میں کہ جس نظریہ پر وہ ہیں وہ حق ہے یا باطل، پس نہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، نہ قیاس کرتے ہیں اور نہ استدلال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ یعنی اس بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا ہے اگر یہ حدیث ثابت ہے۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت سنی وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ تو آپ خوف سے تین دن تک بھاگتے رہے کوئی سمجھ ہی نہ رکھتے تھے، پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا یہ آیت وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ نازل ہوئی ہے؟ تو قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اس نے میرے دل کو کاٹ دیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ (یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے) اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے مدینہ طیبہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک اعرابیہ عورت گزری تو اس نے آپ کے پیچھے نماز شروع کر دی اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ تو وہ اعرابیہ غش کھا کر گر پڑی، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرنے کی آواز سنی پس آپ نے پھر کر دیکھا اور پانی منگایا اور

اس کے چہرے پر انڈیلا حتیٰ کہ اسے افاقہ ہو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''اے فلانہ تجھے کیا ہوا ہے؟'' تو اس نے عرض کی: کیا یہ شئی (آیت) اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب میں سے ہے، یا آپ اسے اپنی جانب سے کہہ رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اعرابیہ! (نہیں) بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں سے ہے''۔ تو اس نے عرض کی: میرے اعضاء میں سے ہر عضو کو ان میں سے ہر دروازے پر عذاب دیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اعرابیہ! (نہیں) بلکہ ان میں سے ہر دروازے کے لئے ایک حصہ مخصوص ہے ان میں سے ہر ایک کے اہل کو ان کے اعمال کی مقدار کے مطابق عذاب دیا جائے گا''۔ تو اس نے عرض کی: قسم بخدا! بے شک میں ایک مسکین عورت ہوں، میرا کوئی مال نہیں ہے، اور میرے پاس سوائے سات غلاموں کے اور کچھ نہیں ہے، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو گواہ بناتی ہوں کہ ان میں سے ہر غلام جہنم کے دروازوں میں سے ہر دروازے کے بدلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے آزاد ہے۔ اتنے میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور یہ پیغام دیا: ''یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس اعرابیہ کو بشارت سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جہنم کے دروازے حرام قرار دیئے ہیں اور اس کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے ہیں۔''

**اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾**

''یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے (انہیں حکم ملے گا) داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں خیر و عافیت کے ساتھ بے خوف ہو کر۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ یعنی وہ لوگ جو فواحش اور شرک سے بچتے رہے۔ فِیْ جَنّٰتٍ یعنی وہ باغات میں وَّ عُیُوْنٍ (اور چشموں میں (آباد) ہوں گے) اور یہ چار نہریں ہیں: پانی، شراب، دودھ اور شہد کی نہریں۔ اور رہے وہ چشمے جن کا ذکر سورۃ الانسان میں کیا گیا ہے یعنی کافور، زنجبیل اور سلسبیل، اور سورۃ المطففین میں: تسنیم ہے ان کا ذکر اور ان کے باسیوں کا ذکر آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عُیُوْنٍ میں اصل کی بنا پر عین کو ضمہ، اور یا کی رعایت کرتے ہوئے اسے کسرہ بھی دیا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ عام قرأت اُدْخُلُوْهَا میں ہمزہ وصل اور خا کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ دَخَلَ یَدْخُلُ سے ماخوذ ہے۔ اور صیغہ امر ہے۔ اس کی تقدیر ہے: قیل أدخلوها۔ (انہیں کہا جائے گا: تم داخل ہو جاؤ)۔ اور حسن، ابو العالیہ اور رویس نے یعقوب سے أدخلوها تنوین اور ہمزہ وصل کے ضمہ اور خا کے کسرہ کے ساتھ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے، اور یہ أدخل سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان میں داخل فرمائے گا۔ اور ان کا مذہب یہ ہے کہ اس قسم کی مثالوں میں تنوین کو کسرہ دیا گیا ہے بِرَحْمَةٍ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (الاعراف: 49) اور جو بھی اس کے مشابہ ہیں، مگر یہاں انہوں نے ہمزہ کی حرکت تنوین پر ڈال دی ہے، کیونکہ یہ ہمزہ قطعی ہے، لیکن اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف انتقال ہوا ہے پھر ضمہ سے کسرہ کی طرف، اور یہ زبان پر ثقیل ہو جاتا ہے۔ بِسَلٰمٍ یعنی ہر بیماری اور آفت سے سلامتی کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لئے سلام ہے۔ اٰمِنِیْنَ یعنی موت اور عذاب سے بے خوف ہو کر۔

**وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا**

نَصَبٌ وَّ مَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۞

''اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ (وغیرہ) تھا وہ بھائی بھائی بن جائیں گے اور تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے نہیں پہنچے گی انہیں اس میں کوئی تکلیف اور نہ انہیں اس سے نکالا جائے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے پہلے جو اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو ان کو دو چشمے پیش کیے جائیں گے، پس وہ ان میں سے ایک چشمے سے پئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں جو کینہ تھا اسے نکال دے گا، ختم کر دے گا، پھر وہ دوسرے چشمے پر داخل ہوں گے اور ان میں غسل کریں گے تو ان کے رنگ روشن ہو جائیں گے اور ان کے چہرے صاف اور چمکنے لگیں گے، اور ان پر نعمتوں کی تازگی اور رونق نمایاں ہو جائے گی؛ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مراد وہ کینہ وغیرہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان تھا۔ اور پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے، اور آیت کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں امید رکھتا ہوں کہ میں، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم انہی میں سے ہوں گے (1)۔ اور الغل کا معنی کینہ اور عداوت ہے، اسی (معنی) سے کہا جاتا ہے: غَلَّ يَغِلُّ۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ غلول سے ہے اور اس سے مراد مال غنیمت سے مال چرانا ہے۔ اس کا باب غل یَغُلّ ہے۔ اور خیانت کرنے کے معنی میں بھی ہے اور اس کے لئے اَغَلَّ يُغِلُّ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

جَزَى الله عنا حَمْزَةَ ابنةَ نَوفَلٍ جزاء مُغِلّ بالأمانة كاذبِ

یہ معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ یعنی وہ باہم ایک دوسرے سے ملنے اور محبت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردن کی پشت نہیں دیکھیں گے؛ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تخت ادھر ہی گھوم جائیں گے جدھر وہ چاہیں گے، اور ان میں سے کوئی دوسرے کی گردن کی پشت نہیں دیکھے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مُّتَقٰبِلِيْنَ تحقیق وہ اور ان کی ازواج محبت کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (2)۔ اور سرر، سریر کی جمع ہے؛ جیسے جَدِید کی جمع جُدَدٌ ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ سرور سے ہے؛ تو گویا یہ وہ بلند اور رفیع مکان ہے جو سرور (خوشی) کے لئے تیار کیا گیا ہے (بچھایا گیا ہے) اور پہلا قول اظہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ ایسے تختوں پر ہوں گے جنہیں یاقوت، زبرجد، اور موتیوں کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہوگا، سجایا گیا ہوگا، اور ایک تخت اتنا ہوگا جتنا صنعا اور جابیہ کے درمیان فاصلہ ہے اور عدن سے لے کر ایلہ تک کا درمیانی فاصلہ ہے۔ اور اِخْوَانًا، الْمُتَّقِيْنَ سے یا اُدْخُلُوْهَا میں موجود ضمیر سے، یا اٰمِنِيْنَ میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا پھر یہ صُدُوْرِهِمْ کی ها اور میم سے حال مقدرہ ہو گا۔ وَّ مَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ یہ اس پر دلیل ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں وہ کبھی زائل اور ختم نہیں ہوں گی، اور یہ کہ اہل

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 162

جنت ان میں باقی رہیں گے۔ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ (الرعد:35) (اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے۔) اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ (ص) (بے شک یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔)

نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

''بتادو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں، اور (یہ بھی بتادو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔''

یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی مثل ہے: ''اگر مومن اس سزا اور عذاب کو جان لے(1) جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی بھی اس کی جنت کی طمع اور حرص نہ کرے اور اگر کافر اس رحمت کو جان لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو۔'' اسے امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور یہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنا اور دوسرے کا ذکر کرے پس اسے خوف بھی دلائے اور امید بھی دلائے، اور اس پر حالت مرض کے مقابلے میں حالت صحت میں خوف زیادہ اور غالب ہو۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے اور وہ ہنس رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم ہنس رہے ہو حالانکہ جنت اور دوزخ تمہارے سامنے ہیں''۔ تو یہ ان پر انتہائی گراں گزرا تب یہ آیت نازل ہوئی، اسے ماوردی (2) اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی کے الفاظ ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اس دروازے سے تشریف لائے جس سے بنوشیبہ داخل ہوتے تھے اور ہم ہنس رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا ہے تمہارے لئے تم ہنس رہے ہو میں تمہیں ہنستے ہوئے نہ دیکھوں''۔ پھر آپ پیٹھ پھیر کر تشریف لے گئے یہاں تک کہ جب مقام الحجر کے پاس پہنچے تو الٹے پاؤں واپس تشریف لائے اور ہمیں ارشاد فرمایا: ''بے شک جب میں نکلا تو میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میرے بندوں کو میری رحمت سے مایوس نہ کیجئے نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾ پس قنوط مایوسی اور ناامیدی ہے، اور الرجاء مہمل چھوڑ دینا ہے، اور امور میں سے بہترین درمیانہ امر ہے۔

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور بتایئے انہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ جب وہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: آپ پر سلام ہو۔ آپ نے کہا: (اے اجنبیو!) ہم تو تم سے خائف ہیں۔ مہمانوں نے کہا: مت ڈریئے ہم آپ کو مژدہ سنانے آئے ہیں ایک صاحب علم بچے کی پیدائش کا۔ آپ نے کہا: کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو

1۔ صحیح بخاری، باب الرجاء مع الخوف، جلد 2، صفحہ 958 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163

جب کہ مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے پس یہ کیسی خوشخبری ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ضیف ابراہیم سے مراد وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے آپ کو بچے کے ہونے اور قوم لوط کی ہلاکت کی بشارت دی۔ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کنیت ابو الضیفان تھی، اور آپ کے محل کے چار دروازے تھے تاکہ کوئی بھی (اس میں داخل ہونے سے) رہ نہ جائے۔ اور ضیف کو ضیف کا نام آپ کی طرف اس کی اضافت اور آپ کے پاس اس کے اترنے کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ اور ضیف کا حکم سورۂ ہود میں گزر چکا ہے جو کافی ہے۔ والحمد للہ۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ خبر جمع لائی گئی ہے کیونکہ لفظ الضیف واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مونث کی مصدر کی طرح صلاحیت رکھتا ہے۔ ضافہ اور اضافہ، کا معنی امالہ (وہ اس کی طرف مائل ہوا، جھکا) ہے؛ اور اسی معنی میں یہ حدیث ہے ''جس وقت سورج غروب کے لئے مائل ہوتا ہے'' اور ضيفوفة السهم، (تیر کا اپنے ٹارگٹ سے پھر جانا) اور اضافت نحو یہ ہے۔ فَقَالُوْا سَلٰمًا یعنی سلموا سلاماً (انہوں نے سلام کیا)۔ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ یعنی کہ ہم تم سے خوفزدہ ہیں اور ڈر رہے ہیں۔ اور یہ آپ نے اس کے بعد کہا کہ بچھڑا ان کے قریب کیا اور انہیں دیکھا کہ وہ نہیں کھا رہے، جیسا کہ سورۂ ہود میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے سلام پر تعجب (اور اس کا انکار) کیا کیونکہ ان کے شہروں میں سلام کی رسم نہ تھی۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ یعنی ملائکہ نے کہا: تم نہ ڈرو اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ بیشک ہم آپ کو ایک صاحب حلم بچے کی پیدائش کا مژدہ سنانے آئے ہیں؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: ایک صاحب علم بچے کی ولادت کا مژدہ سنانے آئے ہیں۔ اور وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں (1)۔ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ اس میں اَن مصدر یہ ہے؛ یعنی مجھے اور میری بیوی کو بڑھاپا لاحق ہونے کی حالت پر تم مجھے خوشخبری دینے آئے ہو، اور یہ سورۂ ہود اور ابراہیم میں پہلے گزر چکا ہے۔ اس حیثیت سے وہ کہتے ہیں: فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (پس یہ کیسی خوشخبری ہے؟) یہ استفہام برائے تعجب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ استفہام حقیقی ہے۔ اور حسن نے تُوجَلْ تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اعمش نے بَشَّرْتُمُوْنِيْ بغیر الف کے، اور نافع اور شیبہ نے تُبَشِّرُوْنَ نون کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ قرأت کی ہے؛ جیسا کہ اَتُحَآجُّوْنِّيْ اور اس کی تعلیل پہلے گزر چکی ہے۔ ابن کثیر اور ابن محیصن نے تُبَشِّرُوْنِّ نون کو کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اس کی تقدیر تبشروننی ہے، پس نون کو نون میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور باقیوں نے تبشرون نون کو نصب کے ساتھ بغیر اضافت کے پڑھا ہے۔

## قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝۵۵

''وہ بولے ہم نے تو آپ کو سچی خوشخبری دی پس نہ ہو جایئے آپ مایوس ہونے والوں سے۔''

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ یعنی ہم نے ایسی سچی خوشخبری دی ہے جس میں کوئی خلاف نہیں، اور یہ کہ بچے کا ہونا لازم اور ضروری ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ پس آپ اولاد سے مایوس ہونے والوں سے نہ ہو جایئے، حالانکہ آپ بڑھاپے کی زیادتی کی وجہ سے بچے سے مایوس ہو چکے تھے۔ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ میں عام قرأت الف کے ساتھ ہے۔ اور اعمش اور یحییٰ بن

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 163

وثاب نے مِنَ الْقَنِطِيْنَ بغیر الف کے پڑھا ہے، اور یہی ابو عمرو سے مروی ہے۔ اور یہ القانطین میں قصر کی گئی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جنہوں نے کہا ہے: قَنِطَ يَقْنَطُ؛ جیسا کہ حَذِرَ يَحْذَرُ۔ اور يَقْنَطُ کے نون کو فتحہ اور کسرہ دونوں دیئے ہیں، ان دونوں لغات کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اور اس میں يَقْنُطُ نون کے ضمہ کے ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں قَنَطَ يقنَطُ یعنی ماضی اور مضارع دونوں میں نون کا فتحہ نہیں آیا کیونکہ اس میں دو لغتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ پس ماضی میں اس کی لغت کو لیا گیا جو کہتے ہیں قَنَطَ يقنط، اور مضارع میں اس کی لغت کو جس نے کہا ہے قَنِطَ يقنَطُ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

## قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿٥٦﴾

"آپ نے فرمایا: کون ناامید ہوتا ہے اپنے رب کی رحمت سے، بجز گمراہوں کے۔"

یعنی جھٹلانے والے سیدھی راہ سے ہٹ جانے والے ہیں، یعنی آپ نے اپنی کبرسنی کی وجہ سے بچے کی ولادت کو بعید سمجھا ہے نہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید اور مایوس ہوئے۔

## قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٧﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾

"آپ نے کہا اے فرستادو! کس اہم کام کے لئے آئے ہو، انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف، مگر لوط کے گھرانے والے ہم ان سب کو بچالیں گے، بجز اس کی بیوی کے ہم نے (بامر الٰہی) یہ طے کیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب آپ نے جان لیا کہ یہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کو خارق عادت امر کے بارے خبر دی اور وہ ان کے بچے کی ولادت کے بارے خوشخبری دینا ہے۔ تو آپ نے کہا: تم کس اہم کام کے لئے آئے ہو؟ اور الخطب کا معنی ہے الامر الخطیر اہم ذی مرتبہ کام، یعنی تمہارا کام اور مقصد کیا ہے اور کس کام کی غرض سے تم آئے ہو؟ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ انہوں نے کہا: بے شک ہم مشرک اور گمراہ قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور کلام میں اضمار ہے: ای أرسلنا الی قوم مجرمین لنهلکهم (ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم انہیں ہلاک کردیں۔) اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ سوائے آپ کی پیروی کرنے والوں کے اور آپ کے دین کو ماننے والوں کے۔ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ حمزہ اور کسائی نے لَمُنْجُوهُمْ تخفیف کیساتھ پڑھا ہے یہ أنجی سے ماخوذ ہے۔ باقیوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ نجّی سے ماخوذ ہے، اور اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے اختیار کیا ہے۔ اور التنجیة اور الانجاء دونوں کا معنی تخلیص (نجات دینا، خلاصی دلانا) ہے۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ آل لوط میں سے آپ کی بیوی کی استثنا ہے اور وہ کافرہ تھی پس وہ ہلاکت میں مجرموں کے ساتھ مل گئی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکا ہے جو کچھ وہاں ہے وہ کافی ہے۔ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی ہم نے یہ فیصلہ کیا

ہے اور ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ عذاب میں باقی رہنے والوں سے ہوگی۔ اور الغابر کا معنی الباق (باقی رہنے والا) ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

لا تکسع الشول بأغبارها إنك لاتدری من الناتج

الأغبار کا معنی باقی رہنے والا دودھ ہے۔ ابوبکر اور مفضل نے قَدَرْنَا یہاں اور سورۂ نمل میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ ہروی نے کہا ہے: کہا جاتا ہے کہ قدّر اور قدر دونوں ہم معنی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اہل زبان اور ان کے سوا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نفی سے استثنا اثبات اور اثبات سے استثنا نفی ہوتا ہے؛ پس جب کوئی آدمی کہے: له علی عشرة دراهم الا أربعة الا درهما (اس کے مجھ پر دس درہم ہیں سوائے چار کے سوائے ایک درہم کے) تو اس سے سات درہموں کا اقرار ثابت ہوا؛ کیونکہ ایک درہم کی استثنا چار سے کی گئی ہے، اور یہ مثبت ہے کیونکہ یہ منفی سے مستثنیٰ ہے، اور اربعہ (چار) منفی ہے، کیونکہ اس کی استثنا کلام موجب سے کی گئی ہے اور وہ عشرة (دس) ہے، پس ایک درہم چھ کی طرف لوٹ گیا اور وہ سات ہو گئے۔ اور اسی طرح اگر کوئی کہے: علیَّ خمسة دراهم الا درهما الا ثلثيه (مجھ پر پانچ درہم ہیں سوائے ایک درہم کے سوائے اس کے دو تہائی کے) تو اس پر چار درہم اور ایک درہم کا ایک ثلث لازم ہو گا۔ اور اسی طرح جب کسی نے کہا: لفلان علی عشرة الا تسعة الا ثمانية الا سبعة (فلاں کے مجھ پر دس ہیں سوائے نو کے سوائے آٹھ کے سوائے سات کے) تو دوسری استثنا اپنے ماقبل کی طرف لوٹ جائے گی، اور تیسری دوسری کی طرف لوٹ جائے گی، نتیجتاً اس پر دو درہم لازم ہوں گے؛ کیونکہ دس اثبات ہے اور آٹھ بھی اثبات ہے پس یہ مجموعی طور پر اٹھارہ درہم ہو جائیں گے۔ پھر نو بھی نفی ہے اور سات بھی نفی ہے تو یہ سولہ درہم ہو گئے جو اٹھارہ سے ساقط ہو رہے ہیں پس باقی دو درہم رہ جائیں گے، اور یہی مقدار اقرار کے ساتھ واجب ہوئی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ پس قولہ سبحانہ وتعالیٰ: اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ پس اس میں مجرموں کی قوم سے آل لوط کی استثنا کی ہے، پھر فرمایا اِلَّا امۡرَاَتَهٗ پھر اس کی استثنا آل لوط سے کی، تو یہ تاویل میں مجرموں کی قوم کی طرف لوٹ گئی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی طرح کا حکم طلاق میں ہے، اگر کسی نے اپنی بیوی کو کہا: أنت طالق ثلاثا الا اثنتین الا واحدة (تجھے تین طلاقیں سوائے دو کے سوائے ایک کے) تو وہ دو طلاقوں کے ساتھ مطلقہ ہوگی (1)، کیونکہ ایک مستثنیٰ منہ جو کہ تین طلاقیں ہیں سے باقی رہنے والی طلاق کی طرف لوٹ جائے گی اور اسی طرح اس کا حکم ہے جو اس طرز پر آئے پس تو اسے سمجھ لے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ۣالۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوۡا بَلۡ جِئۡنٰكَ بِمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَيۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَهُمۡ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾

''پس جب آئے خاندان لوط کے پاس یہ فرستادے، آپ نے (انہیں دیکھ کر) کہا: تم تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1129

ہو۔ فرشتوں نے کہا: (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم لے آئے ہیں تمہارے پاس وہ چیز جس میں وہ شک کیا کرتے تھے اور ہم لے آئے ہیں آپ کے پاس حق (عذاب) اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں، تو چلے جائیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصہ میں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلئے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی، اور چلے جائیے جہاں (جانے کا) تمہیں حکم دیا گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ یعنی میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ جوان تھے اور آپ نے جب حسن و جمال دیکھا تو ان کے بارے میں اپنی قوم کے فتنے کا آپ کو خوف لاحق ہوا، پس یہی وہ انکار اور اجنبیت ہے۔ قَالُوۡا بَلۡ جِئۡنٰكَ بِمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ (فرشتوں نے کہا: (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم تمہارے پاس وہ چیز لے آئیں گے جس میں وہ شک کیا کرتے تھے کہ وہ ان پر نازل ہوگی، اور وہ عذاب ہے وَ اَتَيۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ اور ہم آپ کے پاس لے آئیں ہیں حق یعنی سچ۔ اور بعض نے کہا ہے: عذاب۔ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ اور بلاشبہ ہم ان کی ہلاکت کے بارے میں سچ کہہ رہے ہیں۔ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ اس کا ذکر سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَهُمۡ یعنی آپ ان کے پیچھے رہ کر چلئے تاکہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے کہ اسے عذاب آ پہنچے۔ وَ لَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ انہیں پیچھے مڑنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وہ چلنے میں پوری کوشش کریں اور گاؤں سے بہت دور نکل جائیں اس سے پہلے کہ ان پر صبح طلوع ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کوئی پیچھے نہ رہے۔ وَّامۡضُوۡا حَيۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ (اور چلے جائیے وہاں جہاں جانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد شام ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد صفد ہے، اور یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ ارض خلیل کی طرف چلے گئے اسے یقین کہا جاتا ہے، اور اس کا نام یقین اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جب پیغامبر (فرشتے) نکلے تو آپ ان کے پیچھے گئے، اور آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: انہیں کہاں سے دھنسایا جائے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: ''یہاں سے''۔ اور آپ نے مقررہ حد بیان کر دی، اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام چلے گئے، پس جب حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹھے اور دونوں اس عذاب کا انتظار کرنے لگے، پس جب زمین لرزہ براندام ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا أیقنت باللہ قسم بخدا! میں نے یقین کر لیا۔ تو اس وجہ سے اس کا نام یقین رکھ دیا گیا۔

وَ قَضَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۤءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۶۶﴾ وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَـنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَاۤءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۷۱﴾

''اور ہم نے (بذریعہ وحی) لوط کو آگاہ کر دیا اس حکم سے کہ یقیناً ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی جب وہ صبح کر رہے

ہوں گے، اور (اتنے میں) آ گئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے، آپ نے (انہیں) کہا: (ظالمو!) یہ تو میرے مہمان ہیں ان کے بارے میں تو مجھے شرمسار نہ کرو، اور ڈرو اللہ (کے غضب) سے اور مجھے رسوا نہ کرو، وہ بولے: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دیا کرو، آپ نے کہا: یہ میری (قوم کی) بچیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (تو ان سے نکاح کر لو)۔"

قولہ تعالیٰ: وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ یعنی ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف وحی کر دی۔ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ اس کی نظیر یہ قول ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (الانعام: 45) (تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا۔) مُّصْبِحِيْنَ یعنی صبح طلوع ہونے کے وقت اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ اور (اتنے میں) حضرت لوط علیہ السلام کے شہر والے آ گئے يَسْتَبْشِرُوْنَ مہمانوں کے سبب خوشیاں مناتے ہوئے اس حرص اور طمع میں کہ وہ ان سے برائی کا ارتکاب کریں گے۔ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَيْفِيْ بے شک یہ میرے مہمان ہیں۔ فَلَا تَفْضَحُوْنِ یعنی تم مجھے شرمسار نہ کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الخزی سے ہو اور اس کا معنی ذلت اور رسوائی ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الخزایۃ سے ہو اور اس کا معنی حیاء اور خجالت و شرمندگی ہے۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ وہ بولے: کیا ہم نے تمہیں کسی کو مہمان بنانے سے منع نہیں کیا تھا کیونکہ ہم ان سے برائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے فعل کے ساتھ اجنبیوں کا قصد کر رہے تھے؛ یہ حسن سے منقول ہے۔ اس کا ذکر سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیا ہم نے آپ کو اس سے منع نہیں کیا تھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کے بارے ہم سے کلام کریں جب ہم اس سے برائی کا قصد کریں قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِيْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ یعنی تم ان سے شادی کر لو اور حرام کی طرف مائل نہ ہو۔ اس کا بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

"(اے محبوب!) آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں (اور) بہکے بہکے پھر رہے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے بیان کیا ہے کہ مفسرین نے بالاجماع کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف و عظمت کے اظہار کے لئے ان کی حیات مبارکہ کی قسم کھائی ہے کہ آپ کی قوم قریش (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہے (اور) بہکے بہکے پھر رہے ہیں اور اپنی حیرت میں ڈوبے ہوئے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس بارے میں اہل تفسیر نے اجماع کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدت حیات کی قسم ہے (2)۔ اور اس کی اصل عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ العمر سے ہے لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے اسے فتحہ دیا گیا۔ اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیری بقا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130۔ 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1131

کی قسم۔ اور بعض نے کہا ہے: تیری حیات کی قسم۔ اور یہ تعظیم کی انتہا اور احسان اور شرف عطا کرنے کی حد ہے۔ ابو الجوزاء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے سوا کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی (1)، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق سے زیادہ معزز و مکرم ہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: وہ جو اس کے مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کی زندگی کی قسم کھائے اور اس کے سبب انہیں اس شرف وعظمت تک پہنچا دے جو چاہے، اور فضل وعظمت میں سے جو کچھ اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کو عطا فرمائے گا تو اس سے کئی گنا شرف اپنے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دے گا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ عزت والے ہیں؛ کیا آپ جانتے نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ عطا فرمائے، تو جب اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کی حیات کی قسم کھائے تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اس سے کہیں بلند اور ارفع ہے، (لہٰذا) کوئی ایک کلام سے دوسرے کلام کی طرف نہ نکلے اور بغیر ضرورت کے اس کا ذکر نہ کرے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ اچھا ہے؛ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی قسم کھانا حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں کلام معترض ہے (یعنی بطور جملہ معترضہ ہے) قشیری ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف راجع ہو، یعنی وہ اپنی طاقت کے نشے میں مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ کیا اور فرمایا: یہ میری (قوم) کی بیٹیاں ہیں، تو ملائکہ نے کہا: اے لوط! **لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ** اور یہ نہیں جانتے ان کے ساتھ صبح کے وقت کیا کچھ ہونے والا ہے؟ پس اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے انجیر، زیتون اور طور سینا کی قسم کھائی ہے؛ تو اس میں کیا ہے؟ تو کہا جائے گا: کوئی شے نہیں ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے مگر وہ اس کی اس فضیلت پر دلالت کرتی ہے جو اس کے شمار میں داخل ہوتی ہے، پس اسی طرح ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آپ ان سے افضل ہیں جو آپ کے شمار میں ہیں۔ اور العُمر اور العَمر (یعنی عین کے ضمہ اور اس کی فتحہ کے ساتھ) یہ دو لغتیں ہیں اور ان دونوں کا معنی ایک ہے؛ مگر یہ لفظ قسم میں کثرت استعمال کی وجہ سے فتحہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور تو کہتا ہے: عَمْرَكَ اللہ۔ ای أسأل اللہ تعميرك (یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری درازی عمر کی دعا کرتا ہوں)۔ اور لَعَمْرُكَ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اس کا معنی ہے لعمرك مما أقسم به (تیری عمر اس میں سے ہے جس کی میں قسم کھا رہا ہوں)

**مسئلہ نمبر2**۔ بہت سے علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے کہ کوئی انسان کہے لعمری، کیونکہ اس کا معنی ہے وحیاتی (میری زندگی کی قسم) اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: آدمی کے لئے مکروہ ہے کہ وہ کہے لعمری؛ کیونکہ یہ اس کی اپنی زندگی کی قسم ہے، اور یہ کمزور لوگوں کا کلام ہے۔ اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے: بے شک مردوں میں سے کمزور اور

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130

2۔ ایضاً

عورتیں (اور خنثے وغیرہ) تیری حیات اور تیری عیش (زندگی) کی قسم کھاتے ہیں، اور یہ ان کا کلام نہیں ہے جو مردانہ وصف سے متصف ہیں، اگرچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قصہ میں اس کی قسم کھائی ہے، اور یہ اس کے رتبہ کے شرف اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا بیان ہے، پس اس کے سوا کوئی معنی اس پر محمول نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اس کے سوا کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے گا۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: مناسب یہ ہے کہ لعمرک کو کلام میں اس آیت کی طرف پھیر دیا جائے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب میں سے ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہی میں بھی کہتا ہوں، لیکن شریعت نے استعمال میں اسے قطعی قرار دیا ہے اور قسم کو اس کی طرف لوٹا دیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: لعمرك اور لعمری اور اسی طرح کے الفاظ کے ساتھ قسم کھانا عرب کے اشعار میں اور ان کے فصیح کلام میں کثرت سے موجود ہے۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

لعَمْرِی و ما عمرِی علیّ بهیّنٍ لقد نَطقتْ بُطْلا علیّ الأقارع(1)

دوسرے نے کہا:

لعَمْرُك إن الموت ما أخطأ الفتی لکالطِّوَل المُرْخَی و ثِنْیاه بِالیَدِ(2)

ایک اور نے کہا:

أیها المنکح الثُّریا سُهیلاً عَمْرَكَ الله کیف یلتقان

ایک دوسرے نے کہا:

إذا رَضِیتْ علیّ بنو قُشیر لعَمْرُ اللهِ أعجبنی رضاها

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا للہ عمر، بلا شبہ اللہ تعالیٰ تو ازلی ہے۔ اسے زہراوی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** سورہ مائدہ میں ان (الفاظ) کے بارے گفتگو گزر چکی ہے جن کے ساتھ قسم اٹھائی جا سکتی ہے اور جن کے ساتھ قسم اٹھانا جائز نہیں ہے، اور وہاں ہم نے اس آدمی کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ذکر کیا ہے کہ جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے (نام کے) ساتھ قسم کھائی اس پر کفارہ لازم ہوگا (3)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: میں نے غیر اللہ کے ساتھ ان چیزوں میں سے جن کی تعظیم حقوق میں سے کسی حق کے سبب جائز ہے قسم اٹھانے کو جائز قرار دیا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا: بے شک یہ قسم ہے اس کے ساتھ کفارہ متعلق ہوتا ہے؛ مگر یہ کہ جس نے کذب اور جھوٹ کا قصد کیا وہ قابل ملامت ہے؛ کیونکہ باطن میں وہ اسے حقیر جان رہا ہے جس کی تعظیم اس پر واجب ہے۔ انہوں نے کہا: اور قول باری تعالیٰ لَعَمْرُكَ مراد تیری حیات اور زندگی کی قسم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی قسم کھائی ہے تو بلا شبہ اس نے

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 369 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1130

ہمارے لئے صراحۃً یہ بیان کرنے کا ارادہ فرمایا ہے کہ ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ہم آپ کی حیات طیبہ کی قسم کھائیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق قول باری تعالیٰ: لَعَمْرُكَ اور وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۝ (التین) وَ الطُّوْرِ ۝ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ (الطور) وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ (النجم) وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۝ (الشمس) لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝ (البلد) ان تمام کا معنی یہ ہے: انجیر اور زیتون کے خالق کی قسم، کتاب مسطور کے رب کی قسم، اس شہر کے رب کی قسم جس میں آپ اترے، اور آپ کی زندگی اور حیات کو پیدا کرنے والے کی قسم، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی قسم، تو ان تمام میں یمین اور قسم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نام سے حاصل ہوئی نہ کہ مخلوق کے ساتھ۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اور جس نے غیر اللہ کے ساتھ قسم کو جائز قرار دیا ہے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تاویل کی ہے: لاتحلفوا بابائكم (1) (اپنے آباء کے ساتھ قسم نہ کھاؤ) اور فرمایا: بے شک یہ کافر آباء کے ساتھ قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیا آپ دیکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنے آباء کے ساتھ قسم کھائی تو آپ نے فرمایا: ''پہاڑ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز و مکرم ہیں تمہارے ان آباء سے جو جاہلیت میں مرے ہیں۔'' اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کو اپنے ظاہر پر ہی محمول کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: جس نے اسے جائز قرار دیا ہے اس نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کی قسموں میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر ہمارے آج تک یہ طریقہ جاری ہے کہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قسم کھاتے ہیں، حتیٰ کہ اہل مدینہ ہمارے اس دن تک جب ان میں سے کوئی اپنے کسی ساتھی کے بارے فیصلہ کرے تو کہتا ہے: تو مجھے اس کے حق کی قسم دے جسے یہ قبر جمع کئے ہوئے ہے، اور اس قبر کے مکین کے حق کی قسم، مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور اس طرح حرم پاک، مشاعر عظام، رکن، مقام ابراہیم، محراب، اور جن کا اس میں ذکر کیا جاتا ہے (کی قسم کھائی جاتی ہے۔)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

''پس آلیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا پس ہم نے ان کی بستی کو زیر و زبر کر دیا اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر۔''

قولہ تعالیٰ: فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی سورج نکلنے کے وقت (انہیں ایک سخت کڑک نے آلیا)۔ کہا جاتا ہے: أشرقت الشمسُ یعنی سورج روشن ہو گیا، اور شرقت جب وہ طلوع ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور أشرق القوم یعنی وہ سورج طلوع ہونے کے وقت داخل ہوئے۔ اور اسی کی مثل اصبحوا اور أمسوا ہیں، اور یہی آیت میں مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد فجر کا طلوع ہونا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عذاب کا آغاز صبح کے وقت ہوا اور سورج کے طلوع کے وقت وہ خوب پھیل گیا، اور اس وقت ان کی ہلاکت مکمل ہوگئی۔ واللہ اعلم۔ اور الصَّيْحَةُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لاتحلفوا بآبائکم، جلد 2، صفحہ 983

کا معنی عذاب ہے۔ اور سِجِّيْلٍ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝

''بے شک اس واقعہ میں (عبرت کی) نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ترمذی الحکیم نے ''نوادر الاصول'' میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: للمتفرسین (1) (نظر جما کر دیکھنے والوں کے لئے، اہل فراست کے لئے) اور یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابوعیسیٰ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اتّقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله (2) (تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور مقاتل اور ابن زید نے کہا ہے: لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ بمعنی للمتفکرین (3) (غور وفکر کرنے والوں کے لئے) ہے اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ للناظرین (گہری نظر وفکر کرنے والے) کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أو كلّما وردتْ عُكَاظَ قبيلةٌ بعثوا إليّ عريفَهم يتوسّمُ

اور قتادہ نے کہا ہے: یہ بمعنی للمعتبرین (عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے) ہے۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و فيهنّ مَلْهىً للصديق و منظرٌ أنيقٌ لعينِ الناظرِ المتوسّمِ

اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: بمعنی للمتبصرین (بصیرت والے) ہے، مذکورہ تمام معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور حکیم ترمذی نے حضرت ثابت کی حدیث بیان کی ہے انہوں نے اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو لوگوں کو علامت اور نشانی سے پہچان لیتے ہیں۔'' إنّ لله عزّ وجل عبادا يعرفون النّاس بالتوسم۔ علماء نے بیان کیا ہے: التوسم تفعل کے وزن پر الوسم سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد ایسی علامت ہے جس سے اس کے سوا مطلوب پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے: توسّمت فيه الخير (یہ تب کہے گا) جب تو اس میں خیر اور بھلائی کی علامت دیکھ لے؛ اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

انّي توسّمت فيك الخير أعرفه والله يعلم أن ثابت البصر (4)

بلاشبہ میں نے آپ میں خیر کی علامت دیکھی ہے میں اسے پہچانتا ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں صحیح البصر ہوں۔

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 167
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140
3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 167
4۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1131

اور دوسرے نے کہا ہے:

توسّمتُه لمارأيتُ مَهابَةً عليه و قلتُ المرُمن آل هاشم(1)

اور اتسم الرجل جب آدمی اپنے لئے ایسی علامت بنالے جس سے اسے پہچانا جا سکتا ہو، اور توسم الرجل اس نے وسمی گھاس طلب کیا۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وأصبحن كالدوم النواعِم غدوة على وِجْهَةٍ من ظاعِنٍ مُتَوَسِّم

اور ثعلب نے کہا ہے: واسم وہ ہوتا ہے جو تجھے سر سے پاؤں تک دیکھے۔ اور التوسم کا اصل معنی التبت (ثابت رہنا) اور التفکر (غور وفکر کرنا) ہے؛ یہ الوسم سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے اونٹ وغیرہ کی جلد میں لوہے کے ساتھ نشان لگانا، اور یہ (قوت) طبیعت اور مزاج کی عمدگی، دماغ کی تیزی اور صاف ستھری فکر سے حاصل ہوتی ہے اور بعض نے یہ چیزیں زائد ذکر کی ہیں۔ اور دنیوی حشو وزوائد سے دل کو فارغ رکھنے، اور گناہوں کی میل، اخلاق کی کدورت اور دنیا کی فضولیات سے اسے پاک رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ نہشل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ کے بارے انہوں نے فرمایا: اہل صلاح وخیر کے لئے (اس واقعہ میں علامات ہیں) اور صوفیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ کرامت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ علامات کے ساتھ استدلال ہے۔ اور علامات میں سے وہ ہوتی ہے جو ہر ایک کے لئے ظاہراً ظاہر ہوتی ہے اور پہلی نظر کے ساتھ (ظاہر ہوتی ہے)، اور ان میں سے جو مخفی ہوتی ہے وہ کسی کے لئے بھی ظاہر نہیں ہوتی اور نہ بادی النظر میں اسے پایا جا سکتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: المتوسِّمون وہ ہیں جو امور میں غور وفکر کرتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ وہ جس نے قوم لوط کو ہلاک کر دیا ہے وہ ان کفار کو بھی ہلاک وبرباد کرنے پر قادر ہے، اور یہ دلائل ظاہرہ سے ثابت ہے۔ اور اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: مجھ سے کسی نے کسی شے کے بارے سوال نہیں کیا مگر میں اسے پہچان لیتا ہوں کہ آیا وہ فقیہ ہے یا غیر فقیہ ہے۔ ما سألني أحد عن شئ إلا عرفت أفقيه هو أو غير فقيه اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسن رحمہما اللہ تعالیٰ کے بارے مروی ہے کہ وہ دونوں کعبہ معظمہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی مسجد کے دروازے پر تھا تو ان میں سے ایک نے کہا: میں اسے نجار (بڑھئی) دیکھتا ہوں، اور دوسرے نے کہا: (نہیں) بلکہ یہ حداد (لوہار) ہے، پس حاضرین میں سے ایک آدمی جلدی سے اس کی طرف گیا اور اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا: كنت نجاراً و أنا اليوم حذاد (میں بڑھئی تھا اور آج کل میں لوہار ہوں) اور حضرت جندب بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس آئے جو قرآن پڑھ رہا تھا پس آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور کہا: جس نے شہرت کے لئے سنایا اللہ تعالیٰ نے اسے شہرت بنا دیا، اور جس نے دکھاوا کیا اللہ تعالیٰ نے اسے دکھاوا بنا دیا۔ تو ہم نے ان کو کہا: گویا آپ نے اس آدمی کے بارے میں تعریض کی ہے، تو انہوں نے فرمایا: بے شک یہ جو تجھ پر آج قرآن کریم پڑھ رہا ہے کل یہ حروریہ ہو کر نکل جائے گا؛ پس وہی

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 370

راس الحرور یہ تھا، اور اس کا نام مرداس تھا۔ اور حضرت حسن بصری کے بارے روایت ہے کہ وہ عمرو بن عبید کے پاس گئے اور فرمایا: یہ بصرہ کے نوجوانوں کا سردار ہے اگر چہ اس نے کوئی بات نہیں کی، پس اس کے بارے تقدیر کا فیصلہ یہی ہے جو ہو چکا ہے، یہاں تک کہ اس کے عام بھائیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور ایوب کو کہا: یہ اہل بصرہ کے جوانوں کا سردار ہے، اور کوئی استثنا نہیں کی۔ اور حضرت شعبی کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے داؤد ازدی کو کہا اس حال میں کہ وہ ان کے ساتھ جھگڑ رہا تھا: بے شک تو نہیں مرے گا یہاں تک کہ تیرے سر میں داغا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح ہوا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مذحج کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے ان میں اُشتر بھی تھا، پس آپ نے اس میں نظر جمادی اور خوب غور سے دیکھا اور فرمایا: یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ مالک بن حارث ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اسے کیا ہے اللہ اسے قتل کرے! بے شک میں مسلمانوں کے لئے اس کی طرف سے انتہائی سخت (تکلیف دہ) دن دیکھ رہا ہوں؛ پھر اس کی طرف سے فتنہ میں وہی ہوا جو ہوا۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ کے پاس گئے، اور وہ بازار سے گزر کر گئے تھے اور انہوں نے ایک عورت کی طرف دیکھا تھا، پس جب آپ نے ان کی طرف دیکھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میں سے کوئی مجھ پر داخل ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ کو کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی آ رہی ہے؟ تو آپ نے جواب فرمایا: نہیں۔ لیکن یہ برہان، فراست اور سچ ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کی مثل کثیر مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے: ''جب یہ ثابت ہے کہ علامت اور فراست سے پہچاننا معانی کی پہچان کے ذرائع میں سے ہے لیکن اس پر کوئی حکم مرتب نہیں ہو سکتا اور اس کے ساتھ موسوم (جس میں علامت پائی جائے) اور متفرس (جس کو فراست کے ساتھ پہچان لیا جائے) کو پکڑا نہیں جا سکتا۔ بغداد کے قاضی القضاۃ الشامی المالکی شام میں ہونے کے دوران احکام میں فراست کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے، ایاس ابن معاویہ کے طریقہ پر چلتے ہوئے، جن دنوں وہ قاضی تھے، اور ہمارے شیخ فخر الاسلام ابو بکر الشاشی نے اس کے رد میں ایک جز تصنیف کیا ہے انہوں نے اسے اپنے خط کے ساتھ میرے لئے لکھا اور وہ مجھے عطا فرما دیا۔ اور یہ صحیح ہے، کیونکہ احکام کی پہچان شرعاً معلوم ہے انہیں پانے کا ذریعہ قطعی ہے اور فراست ان قطعی ذرائع میں سے نہیں ہے (1)۔

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

''اور بے شک یہ بستی ایک آباد راستہ پر واقع ہے۔ یقیناً اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لئے۔ اور بے شک ایکہ کے باشندے بھی بڑے ظالم تھے۔ پس ہم نے ان سے بھی انتقام لیا اور یہ دونوں بستیاں کھلی شاہراہ پر واقع ہیں''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1131

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّهُمَا مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں۔ لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی قوم کے راستے پر شام کی طرف واقع ہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی یقیناً یہ تصدیق کرنے والوں کے لئے باعث عبرت ہیں۔ وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ اس میں اصحاب الایکہ سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے، وہ جنگلوں، باغوں اور پھلدار درختوں کے مالک لوگ تھے۔ اور الایکہ سے مراد الغیضۃ ہے اور اس سے مراد درختوں کا جھنڈ ہے۔ اور جمع الایك ہے۔ روایت ہے کہ ان کے درخت کھجور کے درخت کے مشابہ تھے اور وہ گوگل کے درخت تھے۔

نابغہ نے کہا ہے:

تَجْلُو بقادِمَتَیْ حمامة أَیْکَةٍ　　بَرَدًا أُسِفَّ لِثَاتُه بالاثِمِد

اور کہا گیا ہے کہ الأیکۃ بستی کا نام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شہر کا نام ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ الأیکۃ اور لَیکۃ ان کا شہر ہے، جیسا کہ مکہ سے بکہ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ اور یہ دونوں ایسے راستے پر واقع ہیں جو ذاتی اعتبار سے بڑا کھلا اور واضح ہے، مراد قوم لوط کا شہر اور اصحاب الایکۃ کی بستی ہے، جو بھی ان دونوں کے پاس سے گزرتا ہے وہ ان سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

## وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۸۰

اور بے شک جھٹلایا اہل حجر نے (اللہ تعالیٰ کے) رسولوں کو۔"

اَلْحِجْرِ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے: اس میں سے ایک حجر الکعبہ ہے، ایک الحرام ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ (الفرقان) یعنی حرام جو کہ حرام کیا گیا ہے۔ اور الحجر کا معنی عقل ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِذِيْ حِجْرٍ (صاحب عقل کے لئے) اور الحجر کا معنی حجر القمیص (قمیص کی بلکھی) ہے؛ اور فتحہ زیادہ فصیح ہے۔ اور الحجر کا معنی گھوڑی بھی ہے۔ اور الحجر سے مراد دیار ثمود بھی ہیں۔ اور یہاں یہی مراد ہیں، یعنی (قوم ثمود کا شہر)؛ یہ ازہری نے کہا ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو مکہ مکرمہ اور تبوک کے درمیان ہے، اور یہی وہ وادی ہے جس میں ثمود آباد تھے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: یہ وہ زمین ہے جو حجاز اور شام کے درمیان ہے، اور وہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی اور ارشاد فرمایا: الْمُرْسَلِيْنَ تو اس سے مراد اکیلے حضرت صالح علیہ السلام ہیں، لیکن جس نے ایک نبی علیہ السلام کو جھٹلایا تو تحقیق اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کو جھٹلا دیا؛ کیونکہ وہ تمام اصول میں ایک ہی دین پر ہیں، لہٰذا ان کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام، ان کی اتباع کرنے والوں، اور آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء علیہم السلام کو بھی جھٹلا دیا۔ واللہ اعلم۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کے درمیان حجر کے مقام پر اترے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کے کنوئیں سے نہ پانی پئیں اور نہ اس سے پانی لیں۔ تو انہوں نے عرض کی: ہم نے تو اس سے آٹا گوندھ لیا ہے اور ہم نے مشکیزے بھر لئے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ والی ثمود اخاھم صالحاً، جلد 1، صفحہ 478

ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ پانی بہادیں اور وہ آٹا بھی پھینک دیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت میں ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ثمود کی زمین الحجر پر اترے، انہوں نے وہاں کے کنوؤں سے پانی بھر لیا اور اس کے ساتھ آٹا وغیرہ گوندھ لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ جو انہوں نے پانی لیا ہے وہ اسے بہادیں اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کنوئیں سے پانی لیں جس پر (آپ کی) ناقہ وارد ہوتی۔ اور یہ بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے (1) روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقام حجر سے گزرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''تم ان کے گھروں میں داخل نہ ہو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا مگر اس خوف اور ڈر سے روتے ہوئے کہ کہیں اس کی مثل تمہیں نہ آپہنچے جو عذاب انہیں آپہنچا۔'' پھر آپ نے اپنی ناقہ کو ڈانٹا اور تیز چل پڑے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس آیت میں وہ چیزیں ہیں جن کا حکم شارع نے بیان کیا ہے اور ان کے حکم کی وضاحت کی ہے اور وہ آٹھ مسائل ہیں (☆)، علماء نے ان کا استنباط کیا ہے اور ان میں سے بعض میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ پس ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان جگہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے، اور اسی پر بعض علماء نے کفار کے قبرستانوں میں داخل ہونے کو محمول کیا ہے، پس اگر انسان ان جگہوں میں سے کسی میں اور قبرستان میں داخل ہو تو وہ اس طریقہ اور صفت پر ہو جس کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راہنمائی فرمائی ہے یعنی عبرت حاصل کرتے ہوئے، خوف کھاتے ہوئے اور انتہائی تیزی کے ساتھ۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم بابل کی زمین میں داخل نہ ہو کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے۔''

**مسئلہ**۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پانی کو بہادینے کا حکم دیا جو انہوں نے ثمود کے کنوئیں سے لیا تھا اور اس آٹے کو پھینک دینے کا حکم دیا جو اس سے گوندھا گیا تھا اور اس سے روٹی پکائی گئی تھی کیونکہ یہ ناراضگی اور سختی والا پانی ہے، پس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے فرار اختیار کرتے ہوئے اس سے انتفاع جائز نہیں۔ اور فرمایا: ''تم اسے اونٹوں کو کھلا دو (2)۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح نجس پانی کا حکم ہے اور اس آٹے کا جو اس سے گوندھا جائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور دوسرا یہ ہے...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بے شک طعام و شراب میں سے جس کا استعمال جائز نہیں ہوتا اسے اونٹوں اور جانوروں کو کھلانا جائز ہے، جبکہ انہیں تکلیف نہ ہو؛ اور اسی طرح نجس اور پلید شہد کے بارے میں بھی کہا ہے: بے شک اسے مکھیاں چاٹ سکتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ آٹا جو اس پانی کے ساتھ گوندھا گیا تھا وہ اونٹوں کو کھلانے کا حکم ارشاد فرمایا، اور اسے اس طرح پھینکنے کا حکم نہیں دیا جیسا کہ خیبر کے دن پالتو گدھوں کا گوشت پھینک دینے کا حکم دیا تھا؛ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گدھوں کا گوشت تحریم میں اشد اور نجس ہونے میں زیادہ غلیظ ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، نھی عن الدخول علی اھل الحجر، جلد 2، صفحہ 411

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1133

☆ متن میں بھی اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں سات مسائل مذکور ہیں۔

حکام کی کمائی کے بارے حکم دیا کہ وہ اونٹوں اور غلاموں کو کھلا دی جائے، حالانکہ نہ وہ حرام ہے اور نہ نجس ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر یہ حرام ہوتی تو آپ اس کے بارے حکم نہ دیتے کہ وہ اسے اپنے غلام کو کھلا دے)، کیونکہ وہ بھی اس میں عبادت کرنے والا ہے جیسے وہ خود عبادت کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ...... حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹا اونٹوں کو کھلانے کا حکم دینے میں اس پر دلیل ہے کہ آدمی کے لئے نجاست اٹھا کر اپنے کتے کو ڈالنا جائز ہے تا کہ وہ اسے کھائے؛ بخلاف ان کے جس نے ہمارے اصحاب میں سے اس کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے: اس پر کتوں کو چھوڑا جائے گا اور اسے ان کی طرف اٹھایا نہیں جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** پانچواں مسئلہ یہ ہے...... کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کنوئیں سے پانی لینے کا حکم دینا جس پر حضرت صالح کی اونٹنی پانی پینے آتی تھی یہ اس پر دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے آثار سے برکت حاصل کرنا جائز ہے، اگرچہ ان کا زمانہ کتنا قدیم ہو اور ان کے آثار مخفی ہوں، جیسا کہ پہلے حکم میں فساد برپا کرنے والوں کے بغض اور ان کے گھروں اور ان کے آثار کے مذموم ہونے پر دلیل ہے۔ اس میں تحقیق اگرچہ یہ ہے کہ جمادات پر مواخذہ نہیں ہے، لیکن جو چیز محبوب کے ساتھ مل جائے وہ بھی محبوب ہوتی ہے، اور جو مکروہ اور مبغوض کے ساتھ ملی ہوئی ہو وہ مبغوض ہوتی ہے۔

جیسا کہ بہت سے شعراء نے کہا ہے:

أحب لحبّها السودان حتّى أحبّ لحبّها سُودَ الكلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے سیاہ رنگ کو پسند کرتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کی محبت کی وجہ سے سیاہ رنگ کے کتوں کو بھی پسند کرتا ہوں۔

اور اسی طرح ایک دوسرے نے کہا ہے:

أمرّ على الدّيار ديارِ ليلىٰ أقبّل ذا الجدارَ و ذا الجدارَ

میں دیار لیلیٰ سے گزرتا ہوں اور ان کی ہر ہر دیوار کو بوسے دیتا ہوں۔

وما تلك الديارُ شغفْنَ قلبي ولكن حُبُّ من سكن الديارا

ان گھروں کی محبت میرے دل پر غالب نہیں ہے لیکن ان گھروں کے مکین کی محبت مجھ پر غالب ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اور چھٹا مسئلہ یہ ہے:...... بعض علماء نے ایسی جگہ نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے: اس میں نماز جائز نہیں ہوتی کیونکہ وہ ناراضگی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہونے کا ٹکڑا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس یہ علاقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے مستثنیٰ ہو گیا: ''میرے لئے زمین مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی۔'' پس وہاں کی مٹی سے تیمم جائز نہ ہوگا اور نہ اس کے پانی سے وضو جائز ہوگا اور نہ اس میں نماز جائز ہو گی۔ اور ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے: کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ میں، جانور ذبح کرنے کی جگہ میں، قبرستان میں، ہلاک کرنے والی آفت کی جگہ میں،

حمام میں، اونٹ باندھنے کی جگہ میں، اور بیت اللہ شریف کے اوپر(1)۔ اور اس باب میں حضرت ابومرثد، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی سند اتنی زیادہ قوی نہیں ہے کیونکہ زید بن جبیرہ میں ان کے حافظہ کے بارے کلام کی گئی ہے، اور ہمارے علماء نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ مغصوبہ گھر میں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادتگاہوں میں، اور اس مکان میں جس میں تصویریں اور بت پڑیں ہوں، غصب کی ہوئی زمین میں یا ایسی جگہ جس میں تیرا منہ سونے والے آدمی کی طرف ہو یا کسی آدمی کے چہرے کی طرف ہو یا ایسی دیوار پر جس پر نجاست ہو۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: ان جگہوں میں سے بعض وہ ہیں جن میں غیر کا حق ہونے کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کی وجہ سے منع کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن میں نجاست کے مکمل طور پر موجود ہونے یا اس کے غالب ہونے کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے، پس وہ جگہیں جن میں نجاست کی وجہ سے نماز سے منع کیا گیا ہے اگر اس میں پاک کپڑا بچھا دیا جائے جیسا کہ حمام اور قبرستان میں یا اس کی طرف تو بے شک وہ جائز ہے (یہ) مدونہ میں ہے۔ اور ابومصعب نے اس کے بارے کراہت کا ذکر کیا ہے۔

اور ہمارے علماء نے پرانے اور نئے قبرستان کے درمیان نجاست کی وجہ سے فرق کیا ہے، (اسی طرح) مسلمانوں اور مشرکوں کے قبرستان کے درمیان فرق کیا ہے؛ کیونکہ وہ دار عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کا علاقہ ہے جیسا کہ مقام حجر ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے المجموعہ میں کہا ہے: اونٹوں کے باڑے میں نماز نہیں پڑھی جائے گی اگرچہ کپڑا بھی بچھا یا جائے؛ گویا کہ آپ نے اس کی دو علتیں بیان کی ہیں: ایک ان کا نجاست سے ڈھکا ہوا ہونا اور دوسرا اونٹوں کے بدکنے یا دوڑنے کا خدشہ پس (اس طرح) نمازی کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر اس میں ایک اونٹ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں؛ جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے؛ یہ حدیث صحیح میں ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایسی قالین پر نماز نہ پڑھی جائے جس میں تصاویر ہوں مگر ضرورت کے تحت۔ اور ابن قاسم نے نماز کو مکروہ قرار دیا ہے جبکہ قبلہ سمت تصاویر ہوں، اور مغصوبہ گھر میں بھی نماز مکروہ ہے، اور اگر کسی نے پڑھ لی تو وہ ہو جائے گی۔ اور بعض نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ غصب شدہ گھر میں نماز جائز نہیں ہوتی۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک بخلاف زمین کے ہے کیونکہ گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوا جاتا، اور زمین اگرچہ وہ (کسی کی) ملکیت ہے بے شک اس میں مسجد ہونے کا وصف قائم ہے اور کسی کا اس کا مالک ہونا اسے باطل نہیں کرتا۔(2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان شاء اللہ وہ صحیح جس پر نظر و فکر اور خبر دلالت کرتی ہے کہ ہر پاک جگہ میں نماز جائز اور صحیح ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد میں یہ جو مروی ہے: ''بے شک یہ وادی ہے اس کے ساتھ شیطان ہے''۔ اور اسے معمر نے زہری سے روایت کیا ہے پس آپ نے فرمایا: ''تم اس جگہ سے نکل چلو جس میں تمہیں غفلت آ پہنچی ہے''۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے منع فرمایا کہ میں بابل کی زمین میں نماز پڑھوں کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے۔ اور آپ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1133　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1134

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہ جس وقت آپ ثمود کے مقام حجر سے گزرے: ''تم ان عذاب دیئے گئے لوگوں پر داخل نہ ہو مگر (اس طرح) کہ تم رو رہے ہو'' (1)۔ اور آپ کا اونٹوں کے باڑے میں نماز سے منع کرنا اور علاوہ ازیں جو اس باب سے متعلقہ ہیں، یہ ان اصولوں کے مطابق جن پر اجماع ہے اور اس بارے میں آنے والے صحیح دلائل کے مطابق مردود ہیں۔ امام حافظ ابو عمر نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس باب میں مختار یہ ہے کہ اس وادی اور اس کے علاوہ زمین کے دیگر حصص کے لئے جائز ہے کہ ان تمام میں نماز پڑھی جائے جب تک ان میں کوئی یقینی ایسی نجاست نہ ہو جو نماز کے مانع ہو، اور جس کسی نے یہ علت بیان کی ہے کہ نماز سے سونے کی جگہ شیطان کی جگہ ہے اس کا کوئی معنی (اور اس کی کوئی اصل) نہیں ہے۔ اور وہ جگہ جس میں لعنت کی گئی اس میں کوئی واجب اور ضروری نہیں کہ اس میں نماز پڑھی جائے، اور اس باب میں جو روایات مروی ہیں کہ قبرستان میں، بابل کی زمین میں، اونٹوں کے باڑے میں اور علاوہ ازیں ان جیسی جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے وہ تمام ہمارے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد جعلت لی الأرض مسجدًا و طهورًا (2) کی عمومیت کی وجہ سے منسوخ اور ختم ہو چکی ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد یہ خبر دے رہا ہے کہ یہ آپ کے فضائل میں سے ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جو آپ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اہل علم کے نزدیک آپ کے فضائل پر دلالت کرنے والی روایات کا نہ نسخ جائز ہے نہ ان میں تبدیلی اور نہ ہی کمی جائز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ یہ بھی روایت ہے کہ چھ عطا فرمائی گئی ہیں، اور اسی طرح تین اور چار کی روایت بھی ہے، اور ان کی انتہاء اس سے زیادہ نو تک ہے، آپ نے ان میں فرمایا ہے: ...... ''مجھ سے پہلے کسی کو وہ عطا نہیں کی گئیں مجھے سرخ و سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا اور رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میری امت کو تمام امتوں سے بہترین امت بنایا گیا، اور میرے لئے غنائم کو حلال کیا گیا، اور میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکیزگی کا ذریعہ بنایا گیا، اور مجھے شفاعت عطا فرمائی گئی، اور مجھے جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا، اور اس اثنا میں کہ میں سویا ہوا تھا مجھے زمین (کے خزانوں) کی چابیاں عطا فرمائی گئیں اور وہ میرے ہاتھ پر رکھ دی گئیں، اور مجھے کوثر عطا فرمایا گیا، اور میرے ساتھ سلسلہ انبیاء علیہم السلام ختم کر دیا گیا۔'' اسے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض نے ان میں سے بعض کو ذکر کیا ہے اور بعض نے وہ بعض ذکر کی ہیں جو ان کے سوا دوسروں نے ذکر نہیں کیں۔ اور یہ تمام کی تمام صحیح روایات ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل پر زیادتی جائز ہے لیکن ان میں کمی کرنا جائز نہیں ہے؛ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ نبی ہونے سے پہلے عبد تھے پھر رسول ہونے سے پہلے آپ نبی تھے؛ اسی طرح آپ سے مروی ہے۔ اور فرمایا: ''میں اسے نہیں جانتا جو میرے ساتھ کیا جائے گا اور نہ اسے جو تمہارے ساتھ کیا جائے گا''۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح: 2)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: یا خیر البریة (اے کائنات سے بہتر)؛ تو آپ نے فرمایا: ''وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب نهی عن الدخول، جلد 2، صفحہ 410

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 41 3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199

ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" اور فرمایا: "تم میں سے کوئی یہ نہ کہے، میں یونس بن متا سے بہتر ہوں" اور فرمایا: "سید حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔" پھر ان تمام کے بعد ارشاد فرمایا: أنا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں ہے) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مسلسل بڑھتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض فرمالی؛ پس اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے: بلاشبہ ان میں نسخ، استثنا، اور کمی جائز نہیں ہے البتہ ان میں زیادتی جائز ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد جعلت لی الارض مسجدا و طهورا (1) کی وجہ سے ہم نے حمام، قبرستان اور زمین کے ہر حصہ میں نماز جائز قرار دی ہے جبکہ وہ نجاستوں سے پاک ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "جہاں بھی تجھے نماز کا وقت آ پہنچے وہیں نماز پڑھ لے کیونکہ ساری زمین مسجد ہے (2)"۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور کسی جگہ کے ساتھ یہ خاص نہیں۔ اور رہے وہ جنہوں نے ابن وہب کی حدیث سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: مجھے یحییٰ بن ایوب نے زید بن جبیرہ سے، انہوں نے داؤد بن حصین سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مجھے خبر دی ہے، یہ ترمذی کی وہی حدیث ہے جسے ہم ذکر کر چکے ہیں پس اس حدیث کے ساتھ زید بن جبیرہ منفرد راوی ہیں اور محدثین نے اس پر اس کا انکار کیا ہے، اور یہ حدیث مسند معروف نہیں ہے مگر صرف اس روایت کے ساتھ یحییٰ بن ایوب عن زید بن جبیرۃ۔ اور لیث بن سعد نے عبداللہ بن نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا اور اس حدیث کے بارے پوچھا، تو عبداللہ بن نافع نے ان کی طرف لکھا: میں اسے نہیں جانتا جس نے اسے نافع سے بیان کیا ہے مگر یہ کہ یہ باطل ہے۔ حلوانی نے اسے سعید بن ابی مریم سے اور انہوں نے لیث سے ذکر کیا ہے، اور اس میں مشرکوں کے مقبرہ کی دوسروں سے کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، اور مجھے بابل کی زمین میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں لعنت کی گئی ہے (3)۔ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ اور اس کے ضعف پر اجماع ہے، اور وہ ابو صالح جنہوں نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ سعید بن عبدالرحمٰن غفاری، بصری ہیں وہ مشہور راوی نہیں ہیں اور ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع صحیح نہیں ہے، اور جو ان کے سوا راوی ہیں وہ مجہول ہیں، وہ معروف نہیں ہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ کا غیر مرفوع قول ہے وہ حدیث حسن الاسناد ہے، اسے فضل بن دکین نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: مغیرہ بن ابی الحر کندی نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا مجھے ابوالعنبس حجر بن عنبس نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حروریہ کی طرف نکلے، پس جب ہم سوریا سے آگے نکلے اور بابل کی زمین میں داخل ہوئے، ہم نے کہا: اے امیر المومنین! شام ہو گئی ہے، نماز نماز؛ تو آپ نے کسی سے کلام نہ کی۔ پھر لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! تحقیق شام کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں (شام

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی موضع لا یجوز صلاۃ، جلد 1، صفحہ 70

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ ولقد آتینا لقمان الحکمۃ، جلد 1، صفحہ 487

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، فی الموضع التی لا تجوز فیھا صلاۃ، جلد 1، صفحہ 70

ہو چکی ہے) لیکن میں اس زمین میں نماز نہ پڑھوں گا جسے اللہ تعالیٰ نے دھنسا دیا ہے۔ اور مغیرہ بن حر کوفی ثقہ راوی ہے: یہ یحییٰ بن معین وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حجر بن عنبس کبار اصحاب علی رضی اللہ عنہ میں سے ہیں۔ اور ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زمین ساری کی ساری مسجد ہے سوائے مقبرہ اور حمام کے (1)''۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے سفیان ثوری نے عمرو بن یحییٰ سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے، گویا یہ اثبت اور اصح ہے۔ ابوعمر نے کہا ہے: پس اس سے استدلال کرنا ان کے نزدیک ساقط ہے جو مرسل روایت کو حجت تسلیم نہیں کرتے، اگرچہ اس سند سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔

ہم اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ان بعض نے کہا ہے جو اہل مدینہ کے مذہب کو اپنانے والے ہیں کہ بے شک اس حدیث میں اور اس کے علاوہ دیگر احادیث میں مقبرہ سے مراد صرف مشرکوں کا قبرستان لیا گیا ہے)، کیونکہ المبقرۃ الحمام دونوں الف لام کے ساتھ ذکر فرمائے، پس یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر توقیف کے مراد بعض مقبروں کے سوا بعض مقبرے ہوں یا بعض حماموں کے سوا بعض حمام مراد لئے جائیں، کیونکہ یہ ایسا قول ہے جس پر کتاب وسنت میں سے کوئی دلیل نہیں ہے نہ کوئی خبر صحیح موجود ہے، اور نہ اس کے لئے قیاس اور عقل میں کوئی گنجائش ہے، اور نہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی خبر موجود ہے۔ اور جنہوں نے مشرکین کے مقبرہ کو خاص کیا ہے ان کی تخصیص دو وجہوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہوگی کہ یا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ وہاں کفار کی آمد ورفت لگی رہتی ہے لیکن اس سبب سے مقبرہ کے خصوصی ذکر کا کوئی معنی نہیں، کیونکہ ہر وہ جگہ جہاں وہ اپنے جسموں کے ساتھ اور اپنے قدموں کے ساتھ آتے جاتے ہوں تو اس کا حکم اسی طرح ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اس سے عظیم اور بلند تر ہے کہ آپ ایسی چیز کے بارے گفتگو فرمائیں جس کا کوئی معنی نہ ہو۔ یا پھر یہ اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ناراضگی اور غضب کے نازل ہونے کی جگہ ہے، تو اگر اس طرح ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکوں کے مقبرہ میں اپنی مسجد نہ بناتے نہ آپ انہیں اکھیڑتے، نہ ہموار کرتے اور نہ ان پر مسجد کی تعمیر کرتے۔ اگر مقابر میں سے کسی مقبرہ میں نماز ادا کرنے کے لئے قائل کا قول جائز ہوتا تو پھر اس حدیث کی وجہ سے مشرکین کا مقبرہ بدرجہ اولیٰ مخصوص اور مستثنیٰ ہوتا۔ اور ہر وہ جس نے مقبرہ میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے اس نے کسی مقبرہ کو خاص نہیں کیا؛ کیونکہ الف لام کا اشارہ جنس کی طرف ہے نہ کہ معہود کی طرف، اور اگر مسلمانوں اور مشرکوں کے مقبرہ کے مابین فرق ہوتا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ضرور بیان فرماتے اور اسے مہمل نہ چھوڑتے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضاحت اور بیان کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اگر کسی جاہل کے لئے یہ کہنا جائز ہو کہ مقبرہ اس طرح ہے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ حمام اس طرح ہے؛ کیونکہ حدیث میں مقبرہ اور حمام دونوں کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح آپ کا قول: المزبلۃ (کوڑے کرکٹ کا ڈھیر) اور المجزرۃ (ذبح خانہ) ہے؛ اس میں یہ جائز نہیں کہ یہ کہا جائے: ڈھیر اس طرح ہو اور نہ ہی جائز ہے کہ کہا جائے: ذبح خانہ اس طرح ہو اور نہ یہ کہنا جائز ہے کہ راستہ اس طرح ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، ان الارض کلھا مسجد، جلد 1، صفحہ 42

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مشرکین کے مقبرہ میں تیمم جائز ہے بشرطیکہ مٹی طیب، طاہر اور صاف ستھری ہو۔ اور اسی طرح انہوں نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ جس نے عیسائیوں یا یہودیوں کی عبادتگاہ میں پاک جگہ پر نماز پڑھی کہ اس کی نماز قضا ہو رہی ہو تو وہ جائز ہے۔ اور یہ سورۂ براءۃ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ کنیسہ (گرجا گھر) مقبرہ کی نسبت اس کے زیادہ قریب ہے کہ وہ ناراضگی اور غضب کے نازل ہونے کی جگہ ہو، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے، اور مقبرہ اس طرح نہیں ہے۔ اور یہودیوں کی عبادتگاہوں اور گرجا گھروں کو مساجد بنانے کے بارے میں سنت بھی موجود ہے۔ امام نسائی نے حضرت طلق بن علی سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: ہم ایک وفد کی صورت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلے اور ہم نے آپ کی بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز ادا کی، اور ہم نے آپ کو خبر دی کہ ہماری زمین میں ہمارے یہودیوں کی ایک عبادتگاہ ہے، اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور اس میں ہے: ''پس جب تم اپنی زمین پر پہنچو تو اپنی موجودہ عبادتگاہ کو توڑ دو اور اسے مسجد بنالو۔''

اور ابوداؤد نے عثمان بن ابی العاص سے ذکر کیا ہے (1) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ طائف کی مسجد اس جگہ بنائیں جہاں ان کے بت پڑے تھے۔ اور سورۂ براءۃ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تیرے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مسجد ہی (بطور حجت) کافی ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی درآنحالیکہ وہ مشرکین کے قبرستان میں بنائی گئی اور یہ ہر اس کے خلاف حجت ہے جس نے اس میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جنہوں نے مقبرہ میں نماز کو مکروہ کہا ہے چاہے وہ مسلمانوں کا ہو یا مشرکوں کا وہ حضرت ثوری، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا اعادہ نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز جائز ہوگی جب اس نے مقبرہ میں ایسی جگہ پڑھی جہاں کوئی نجاست نہ تھی یہ ان احادیث کی وجہ سے ہے جو اس بارے میں معلوم ہیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور تم انہیں قبریں نہ بناؤ (2)۔'' اور ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو (3)''۔ اور یہ دونوں حدیثیں سند کے اعتبار سے ثابت ہیں، اور ان میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں تاویل کا احتمال رکھتی ہیں، اور یہ واجب نہیں ہے کہ ہر پاک جگہ میں نماز پڑھنے سے رکا جائے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو تاویل کا احتمال نہ رکھتی ہو۔ اور مسلمان فقہاء میں سے کسی نے مسلمانوں اور مشرکوں کے مقبرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے مگر وہ جسے ہم نے بیان کیا ہے وہ ایسا لغو قول ہے جس کی مثل کے ساتھ آدمی مشغول نہیں ہو سکتا، اور نظر و فکر میں اس کی کوئی وجہ نہیں اور نہ اس بارے میں کوئی صحیح اثر ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اور آٹھواں مسئلہ یہ ہے...... کہ وہ باغ جس میں گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی ہوتا کہ وہ اس میں بیلیں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی بناء المسجد، جلد 1، صفحہ 65

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل التطوع فی البیت، جلد 1، صفحہ 104

3۔ ایضاً، کتاب الجنائز، باب فی کراھیۃ القعود المقبر، جلد 1، صفحہ 104

وغیرہ لگائے تو اس میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے یہاں تک کہ وہ تین بار اسے سیراب کر لے، جیسا کہ اسے دار قطنی نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے باغ کے بارے میں روایت بیان کی ہے جس میں گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی ہے، آپ نے فرمایا: "جب وہ تین بار سیراب کر لیا جائے تو پھر اس میں نماز پڑھ لے (1)۔" اور انہوں نے حضرت نافع کی حدیث بھی نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ان سے ایسے باغات کے بارے پوچھا گیا جن میں گندگیاں پھینکی جاتی ہیں اور یہ کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے، کیا ان میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب تو انہیں تین بار سیراب کر لے تو پھر ان میں نماز پڑھ لے (2)، انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان کیا ہے اور دونوں نے اسناد میں اختلاف کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

## وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۸۱﴾

"اور ہم نے عطا کیں انہیں اپنی نشانیاں مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا ای بآیتنا (اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا کیں) یہ قول اس قول کی طرح ہے: آتِنَا غَدَآءَنَا ای بغدائنا۔ (تو ہمارے پاس ہماری غذا لے آ) اور یہاں مراد ناقہ (اونٹنی) ہے۔ اور اس میں بہت سی نشانیاں تھیں: اس کا پتھر کی چٹان سے نکلنا، اور اس کے نکلنے کے وقت ہی اس کا حاملہ ہونا اور بچہ جننے کی حالت کے قریب ہونا، اور اس کا عظیم ہونا یہاں تک کہ کوئی اونٹنی اس کے مشابہ نہ تھی، اور اس کے دودھ کا کثیر ہونا یہاں تک کہ وہ ان تمام کو کافی ہوتا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ناقہ کے علاوہ دوسرے معجزے بھی ہوں، جیسا کہ کنواں وغیرہ فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ یعنی انہوں نے اعتبار نہ کیا، غور و فکر نہ کی۔

## وَكَانُوْا یَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

"اور وہ کھود کر بنایا کرتے تھے پہاڑوں کو اپنے گھر (اور) وہ بے خوف و خطر رہا کرتے تھے۔ پس پکڑ لیا انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے جب وہ صبح اٹھ رہے تھے۔ پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں اس (مال) نے جو وہ کمایا کرتے تھے۔"

کلام عرب میں النحت کا معنی تراشنا اور چھیلنا ہے۔ نحته ینحته (یہ عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے) نحتا یعنی اس نے اسے تراشا۔ اور النحاتة کا معنی البراية (تراشا) ہے۔ اور المِنحت سے مراد وہ آلہ ہے جس کے ساتھ کھودا اور تراشا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ (الصافات) (یعنی کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنہیں خود تراشتے اور بناتے ہو۔) پس وہ اپنی شدید قوت کے ساتھ اپنے لئے پہاڑوں میں اپنے گھر بناتے تھے۔ اٰمِنِیْنَ یعنی وہ ان کے ان پر گرنے سے یا خراب ہونے سے پر امن اور بے خوف و خطر رہتے تھے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ یعنی صبح کے وقت انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے پکڑ لیا، اور مُصْبِحِیْنَ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ الصَّیْحَةُ کا ذکر سورۂ ہود اور

---

1۔ دار قطنی، جلد 1، صفحہ 228 2۔ ایضاً

اعراف میں گزر چکا ہے۔ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ پس انہیں مالوں اور پہاڑوں میں موجود قلعوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا، اور نہ اس قوت و طاقت نے جو انہیں عطا کی گئی تھی انہیں کوئی فائدہ پہنچایا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ۝۸۵ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝۸۶

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور بے شک قیامت آنے ہی والی ہے پس (اے حبیب!) آپ درگزر فرمایا کیجئے ان سے عمدگی کے ساتھ، یقیناً آپ کا رب ہی سب کا خالق (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی (ہم نے ہر شے کو) زوال اور فناہ ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یعنی تاکہ میں نیکی کرنے والے اور برائی کرنے والے کو جزا اور بدلہ دوں؛ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۙ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝۳۱ (النجم) (اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ وہ بدلہ دے بدکاروں کو ان کے اعمال کا اور بدلہ دے نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا۔) وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ بے شک قیامت ہو کر رہنے والی ہے پس ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ اسی کی مثل یہ ارشاد ہے وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ۝۱۰ (المزمل) (اور ان سے الگ ہو جایئے بڑی خوبصورتی سے۔) یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے درگزر فرمایئے، اور انہیں خوب اچھی طرح معاف فرما دیجئے؛ پھر اسے آیۃ السیف کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے منسوخ کر دیا ہے: وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ (البقرہ: 191) (تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں۔) اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تحقیق میں تمہارے پاس ذبح (قربانی) کا حکم لے کر آیا ہوں اور مجھے حصاد (کٹائی) کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے اور میں زراعت کے ساتھ مبعوث نہیں کیا گیا''۔ یہ عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے، اور یہ کہ یہ اپنی ذات کے حق میں درگزر کرنے کا حکم ہے ان معاملات میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان ہیں۔ اور الصفح کا معنی اعراض کرنا ہے یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ یعنی بے شک آپ کا رب ہی خلق اور اخلاق کو مقرر کرنے والا اور ان کا فیصلہ کرنے والا ہے الْعَلِیْمُ وہ موافقت کرنے والوں اور نفاق رکھنے والوں کو جاننے والا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝۸۷

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی۔''

سبع مثانی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے؛ پس کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابو ہریرہ، ربیع بن انس، ابو العالیہ اور حسن وغیرہم رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ

اسناد کے ساتھ حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہما کی حدیث سے مروی ہے۔ اور یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اور امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الحمد للہ ام القرآن، ام الکتاب اور السبع المثانی(1) ہے۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ نص ہے، اور سورۃ فاتحہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

نشدتکم بمنزِل القرآن امِّ الکتاب السبعِ من مثانی (2)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد سات طویل سورتیں ہیں (اور وہ یہ ہیں) البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور انفال اور التوبہ یہ دونوں اکٹھی ہیں؛ کیونکہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ شریف نہیں ہے۔

نسائی نے بیان کیا ہے: علی بن حجر نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں شریک نے ابو اسحاق سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ کے بارے خبر دی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد سات طویل سورتیں ہیں، اور ان کا نام مثانی اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ عبرت، احکام، اور حدود کا ذکر ان میں بار بار کیا گیا ہے۔ اور ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل کی گئی ہے، اور طوال میں سے کوئی شے وہاں نازل نہیں کی گئی۔ اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم آسمان دنیا کی طرف نازل کیا اور پھر وہاں سے اسے بالتدریج آہستہ آہستہ (اور تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل فرمایا، پس جو اللہ تعالیٰ نے آسمان دنیا کی طرف نازل کیا تو گویا وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرما دیا اگرچہ اس کے بعد آپ پر نازل نہ بھی کیا گیا ہو۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ سات طویل سورتیں ہیں وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

جزی اللہ الفرزدق حین یُنسِی مُضِیعا للمفصّل والمثانی( 3)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: المثانی سے مراد سارا قرآن کریم ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (الزمر: 23) (یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں) یہی قول حضرت ضحاک، طاؤس اور ابو مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے، اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور اس کو مثانی کہا گیا ہے، کیونکہ اس میں اخبار اور قصص بار بار بیان کئے گئے ہیں۔ اور حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرثیہ کہتی ہیں:

فقد کان نورا ساطعا یُهتدی بہٖ یُخَصُّ بتنزیل المثانی المعظّم (4)

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 140
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 170
3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 171
4۔ ایضاً

تحقیق آپ روشن و منور نور تھے جس سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کی جاتی تھی اور قرآن عظیم کی تنزیل کے ساتھ آپ کو خاص کیا گیا ہے۔

اس میں المثانی العظیم سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السبع المثانی سے مراد قرآن کریم کی اقسام ہیں، مثلاً امر، نہی، بشارت دینا، انذار (ڈرانا) ضرب الامثال، نعمتیں شمار کرنا اور قرون ماضیہ کی خبریں بیان کرنا؛ یہ زیاد بن ابی مریم نے بیان کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ نص ہے۔ تحقیق ہم نے سورۂ فاتحہ میں ذکر کیا ہے کہ اسے مثانی کا نام دینے میں ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے سوا یہ نام دینے کے مانع ہو، مگر یہ کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شی کے بارے نص ثابت اور وارد ہو جو تاویل کا احتمال نہ رکھتی ہو تو آپ کے نزدیک اسی پر وقوف اور توقف ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ اس میں اضمار ہے تقدیر کلام یہ ہے: و ھوأن الفاتحہ القرآن العظیم اور وہ سورۂ فاتحہ ہی قرآن عظیم ہے کیونکہ وہ ان امور پر مشتمل ہے جو اصول اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں واؤ مقحمہ ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: ولقد آتیناک سبعا من المثانی القرآن العظیم۔

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

إلى الملِكِ القَرْمِ و ابنِ الهُمام　　و ليثِ الكَتِيبَةِ فی الْمُزْدَحَم

اور یہ پہلے اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (البقرہ:238) (پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی)۔

لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾

''اپنی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان (اموال) کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے ان کے مختلف طبقوں کو اور رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں ان (کی گمراہی) پر اور نیچے کیجئے اپنے پروں کو مومنوں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اس کا معنی ہے: تحقیق میں نے آپ کو غنی کر دیا ہے قرآن کریم کے ساتھ ہر اس شی سے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، کیونکہ وہ ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کے ساتھ مستغنی نہیں ہوا یعنی وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے یہ خیال کیا کہ قرآن کریم میں سے جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے ساتھ وہ غنی نہیں ہے یہاں تک کہ اس کی نظر دنیوی زیب و آرائش کی طرف اٹھتی رہی حالانکہ اس کے پاس معارف مولیٰ موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے: یہ اس بارے ہے کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودیوں کے سات قافلے ایک دن میں بصریٰ اور اذرعات سے آئے، اور ان کے پاس گندم، خوشبو، جواہرات اور سامان بحر موجود تھا، تو مسلمانوں نے کہا: اگر یہ اموال ہمارے پاس ہوتے تو یقیناً ہم ان کے ساتھ تقویت پاتے اور ہم انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ

**سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ** یعنی یہ تمہارے لئے ان سات قافلوں سے بہتر ہے، پس تم ان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھئے، اور اس طرف ابن عیینہ گئے ہیں، اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد بھی ذکر کیا ہے: لیس منا من لم یتغن بالقران (1)۔ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ مستغنی نہیں ہوا۔ اور یہ معنی کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اور **اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ** کا معنی ہے جو مال ونعم میں ان کی مثل ہیں، یعنی اغنیاء اور مالدار جو غنی اور مال میں بعض بعض کی مثل ہوتے ہیں، پس وہ ازواج ہی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت دائمی طور پر سامان دنیا سے آراستہ اور مزین ہونے سے زجر وتوبیخ کرنے اور بندے کو اپنے مولیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اسی کی مثل یہ آیت ہے ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیواة الدنیا لنفتنهم فیه الآیہ (اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب وزینت ہیں دنیوی زندگی کی اور (انہیں اس لئے دی ہیں) تا کہ ہم آزمائیں انہیں) حالانکہ اس طرح نہیں، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حبب الیّ من دنیا کم النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلواة (2) (تمہاری دنیا سے میرے لئے عورتوں اور خوشبو کو پسندیدہ بنایا گیا ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے انسانی فطرت کے اعتبار سے اور خلقت انسانیہ کی تزیین اور آراستگی کے لئے، اور خوشبو پر دوام اختیار فرماتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ فقط اپنے مولیٰ کی مناجات کے وقت نماز میں ٹھنڈی ہوتی تھی، اور آپ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مناجات اور عبادت کرنا کسی اور سے زیادہ موزوں، لائق اور اولیٰ ہے۔ اور حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں رہبانیت نہیں ہے اور نہ ہی کلی طور پر دنیا سے قطع تعلق کر کے ہمہ وقت اعمال صالحہ اور عبادت وریاضات میں متوجہ ہونا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں تھا، بے شک اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ تمسک اور میلان، فیاضی جو مشقت سے خالی ہو اور آدمی پر خفیف اور آسان ہو کو مشروع قرار دیا ہے۔ وہ آدمیت سے اس کی شہوات کو لیتا ہے اور قلب سلیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قراء اور فضلاء میں سے مخلصین نے لذات سے رکنا اور زمین وآسمان کے پروردگار کے لئے خلوص اختیار کرنا آج اولیٰ اور بہتر دیکھا ہے، کیونکہ دنیا پر حرام غالب آچکا ہے، اور بندہ اپنی معاش میں ایسے لوگوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور ہے جن کے ساتھ اس کا اختلاط اور ملنا جائز نہیں اور آدمی ان کے ساتھ کاروبار کرنے پر مجبور ہے جن کا کاروبار حرام ہے، پس قرأت کرنا افضل ہے، اور دنیا سے فرار اختیار کرنا بندے کے لئے زیادہ صحیح اور درست ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کا ریوڑ ہو گا وہ ان کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات پر پھرتا رہے گا اور اپنے دین کو فتنوں سے بچا لے جائے گا (3)۔"

قولہ تعالیٰ: **وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ** یعنی آپ مشرکوں پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں اگر وہ ایمان نہیں لائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے:

---

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 373 2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1137 3۔ ایضاً

اس کا معنی ہے آپ اس (مال) پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں جس سے انہیں دنیا میں لطف اندوز کیا گیا ہے بے شک آپ کے لئے آخرت میں اس سے افضل واعلیٰ ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ ان پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں اگر وہ عذاب کی طرف جارہے ہیں بے شک وہ اہل عذاب ہی ہیں۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی آپ اس کے لئے اپنا پہلو نرم کیجئے جو آپ کے ساتھ ایمان لایا ہے اور آپ ان کے لئے تواضع اختیار کیجئے۔ اور اس کا اصل معنی ہے کہ پرندہ جب اپنے بچے کو اپنے ساتھ ملا لے پھر اپنے پر پھیلائے اور انہیں بچوں پر بچھادے، پس کسی بھی انسان کے لئے اپنے پیروکاروں کو اپنے قریب لانے کے لئے یہی وصف بنایا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: فلان خافض الجناح، یعنی فلاں بڑے وقار اور سکون میں ہے۔ اور ابن آدم کے دو پر اس کے دو پہلو ہیں، اور اسی سے یہ ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ (طٰہٰ: 22) (اور (حکم ملا) دبالو اپنے ہاتھ اپنے بازو کے نیچے۔) اور پرندے کے پر اس کے ہاتھ ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وحَسْبُكَ فِتْيَةٌ لزعيم قوم يمدّ على أخي سُقم جناحا

یعنی تواضع اور نرمی کرتے ہوئے۔

وَقُلْ إِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٩﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾

"اور فرمایئے کہ میں تو بلاشبہ (ایسے عذاب سے) کھلا ڈرانے والا ہوں، جیسے اتارا ہم نے ان بانٹنے والوں پر۔"

اس کلام میں حذف ہے؛ یعنی انی انا النذیر المبین عذابا (بے شک میں عذاب سے کھلا ڈرانے والا ہوں) پس اس سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے، جبکہ انذار اس پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿١٣﴾ (فصلت) (میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کاف زائدہ ہے، یعنی أنذرتكم ما أنزلنا على المقتسمين (میں تمہیں اس سے ڈرانے والا ہوں جو ہم نے بانٹنے والوں پر اتارا)؛ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: أنذرتكم مثل ما أنزلنا بالمقتسمين (میں نے تم کو ڈرایا ہے جو ہم نے بانٹنے والوں پر نازل کیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ای من العذاب یعنی جس طرح ہم نے عذاب بانٹنے والوں پر اتارا۔ اور ہم آپ کی طرف سے استہزاء کرنے والوں کے لئے کافی ہیں، پس آپ اس کا اعلان کر دیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے جنہوں نے بغاوت کی، کیونکہ ہم آپ کے لئے ان سرداروں کے مقابلے میں کافی ہیں جو آپ ان سے پایا کرتے جو پایا کرتے۔

اور الْمُقْتَسِمِيْنَ کے بارے میں سات مختلف اقوال ہیں:

(۱) مقاتل اور فراء نے کہا ہے: یہ وہ سولہ آدمی ہیں جنہیں ولید بن مغیرہ نے حج کے ایام میں بھیجا تھا پس انہوں نے مکہ مکرمہ کی گھاٹیاں، وہاں کے درے اور کھلے راستے تقسیم کر لئے جو بھی ان پر چل کر آتا وہ اسے کہتے تھے: تم اس کے دعوے

میں نہ آتا جو ہم میں ظاہر ہوا ہے اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، کیونکہ وہ مجنون ہے اور بسا اوقات کہتے وہ ساحر (جادوگر) ہے، کبھی کہتے وہ شاعر ہے اور کبھی کہتے وہ کاہن ہے، پس ان کا نام مقتسمین اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہوں نے یہ راستے تقسیم کر لئے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں انتہائی بری موت کے ساتھ مار دیا۔ اور انہوں نے ولید بن مغیرہ کو بطور حکم (ثالث) مسجد کے دروازے پر کھڑا کیا، اور جب وہ اس سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتے تو وہ کہتا: انہوں نے سچ کہا ہے۔

(۲) حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ کفار قریش کی ایک جماعت اور گروہ ہے انہوں نے کتاب اللہ کو تقسیم کر لیا پس بعض کو شعر بنا دیا، بعض کو سحر بنا دیا، بعض کو کہانت بنا دیا، اور بعض کو پہلے لوگوں کے افسانے بنا دیا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: یہ وہ اہل کتاب ہیں جو قرآن کریم کے بعض کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا(1)۔ اور اسی طرح عکرمہ نے بھی کہا ہے: وہ اہل کتاب ہیں، اور ان کا نام مقتسمین اس لئے رکھا گیا کیونکہ وہ استہزاء کرنے والے تھے، پس ان میں سے کوئی کہتا تھا(2): یہ سورت میرے لئے اور یہ سورت تیرے لئے (نازل ہوئی ہے) اور یہی چوتھا قول ہے۔

(۵) حضرت قتادہ نے کہا ہے: انہوں نے اپنی کتاب کو تقسیم کر دیا اور اسے متفرق کر دیا اور اسے بکھیر دیا اور اس میں تحریف کر دی۔

(۶) حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: مراد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے(3)، انہوں نے آپ کے قتل کے بارے باہم قسمیں کھائیں، پس اسی وجہ سے ان کا نام مقتسمین رکھا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ (النمل: 49) (انہوں نے کہا: آؤ اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کر لیں کہ شبخون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے۔)

(۷) اخفش نے کہا ہے: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے قسم کھائی اور اس پر ایک دوسرے سے حلف لیا(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عاص بن وائل، عتبہ اور شیبہ، ربیعہ کے دونوں بیٹے، ابوجہل بن ہشام، ابوالبختری بن ہشام، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، اور منبہ بن حجاج تھے، اس کا ذکر ماوردی نے کیا ہے(5)۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۟

''جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ۔''

یہ بانٹنے والوں کی صفت ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ ہے۔ اور عِضِيْن کی واحد عِضَةٌ ہے، یہ عضیت الشیٔ تعضیۃ سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اسے متفرق کر دیا اور ہر فرقہ (اور گروہ) عضۃ کہلاتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اصل میں عِضْوَة تھا پس اس سے واؤ کم کر دی گئی، اور اسی وجہ سے اس کی جمع عضین ہے، جیسا کہ انہوں نے کہا ہے: عِزِيْن عِزَةٌ کی جمع ہے۔ اور یہ اصل میں عِزْوَة تھا، اور اسی طرح ثُبَة اور اس کی جمع ثبین ہے۔ اور معنی اسی کی طرف لوٹتا ہے جو ہم

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 172　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173　5۔ ایضاً

نے مقتسمین کے ضمن میں ذکر کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بعض (قرآن) کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کے ساتھ انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں متفرق جھوٹ گھڑے اور اسے جھوٹ، سحر، کہانت، اور شعر قرار دیا۔ عضوته ای فرقته (میں نے اسے بکھیر دیا۔)

رؤبہ شاعر نے کہا ہے:

ولیس دین اللہ بالمُعَضَّی (1)

اللہ تعالیٰ کا دین متفرق نہیں ہے۔

ای بالمفرّق (جس کو تقسیم کیا گیا ہو) اور کہا جاتا ہے: اس میں ھاء کم کردی گئی ہے اور اس کی اصل عضهة ہے کیونکہ العِضَه اور العِضین لغت قریش میں اس کا معنی سحر ہے۔ اور وہ ساحر کو عاضِہ اور اور ساحرۃ (جادوگر عورت) کو عاضِهة کہتے ہیں۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أعوذ بربي من النافثاتِ　فی عُقَد العاضِه المُعْضِه

اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العاضِهة اور المستعضهة پر لعنت کی ہے۔ اور اس کی تفسیر الساحرۃ (جادو کرنے والی) اور المستسحِرۃ (2) (جادو کرنے والی) سے کی گئی ہے۔ اور اس کا معنی ہے: انہوں نے قرآن کریم پر کثرت سے بہتان لگائے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی کذب بیانی کی، پس انہوں نے کہا: یہ جادو ہے اور پہلے لوگوں کے افسانے ہیں، اور یہ کہ یہ گھڑا ہوا جھوٹ ہے، علاوہ ازیں اسی طرح کی باتیں کی۔ اور حرف کم کرنے میں عضة کی نظیر شفة ہے، اس کی اصل شفهة ہے، جیسا کہ انہوں نے کہا ہے: سنَة اور اس کی اصل سنهة ہے، پس انہوں نے ھاء اصلیہ کو ساقط کر دیا اور ھا علامت تانیث کو قائم رکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ العَضه سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی النمیمة (چغلخوری) ہے۔ اور العَضِیهة سے مراد بہتان ہے، اور یہ انسان کا چغلی کھانا ہی ہوتا ہے اور آدمی اس میں وہ کچھ کہتا ہے جو اس میں نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے: عَضَهه عضها اس نے اس پر بہتان باندھا۔ وقد أعْضَهْت یعنی میں بہتان لے کر آیا۔ (میں نے بہتان تراشی کی)۔ کسائی نے کہا ہے: العِضة کا معنی جھوٹ اور بہتان ہے، اور اس کی جمع عِضون ہے، مثلاً عزة اور اس کی جمع عزون ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ (جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ۔) اور کہا جاتا ہے: عضوه یعنی وہ اس کے ساتھ ایمان لائے جسے انہوں نے پسند کیا اور باقی کے ساتھ کفر کیا، پس ان کے کفر نے ان کے ایمان کو ضائع کر دیا۔ اور فراء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ العِضاة سے ماخوذ ہے، اور یہ وادی کا ایک درخت ہے اور وہ کانٹے کی طرح نکلتا ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

''پس آپ کے رب کی قسم! ہم پوچھیں گے ان سب سے، ان اعمال کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ یعنی ہم ضرور ان کے بارے پوچھیں گے جن کا ذکر جاری ہے ان اعمال کے

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 173　2۔ ایضاً

بارے میں جو انہوں نے دنیا میں کئے۔ اور امام بخاری میں ہے: متعدد اہل علم نے قول باری تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ کے بارے کہا ہے (کہ مراد یہ ہے) کہ ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے بارے پوچھیں گے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث مرفوعا روایت کی گئی ہے، ترمذی حکیم نے بیان کیا ہے: ہمیں جارود بن معاذ نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہمیں فضل بن موسیٰ نے شریک سے انہوں نے لیث سے انہوں نے بشیر بن نھیک سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ کے بارے میں فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (2) کے قول (کے بارے ہم ان سے پوچھیں گے)۔ ابوعبداللہ نے کہا: ہمارے نزدیک اس کا معنی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی سچائی اور اسے پورا کرنے کے متعلق سوال ہوگا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں عمل کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا عما کانوا یقولون (یعنی اس کے بارے جو وہ کہتے ہیں) اگرچہ یہ جائز ہے کہ قول بھی زبان کا عمل ہوتا ہے، بے شک اس سے مراد وہ معنی ہے جسے اہل لغت پہچانتے ہیں کہ قول قول ہے اور عمل عمل ہے۔ اور بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عن قول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اس کے ساتھ وفا کرنے اور اس کے قول کی سچائی کے بارے سوال ہوگا، جیسا کہ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایمان آراستہ اور مزین ہونے کے ساتھ نہیں اور نہ دین تمنی کے ساتھ ہے لیکن یہ وہ ہے جو دلوں میں راسخ اور ثابت ہو اور اعمال اس کی تصدیق کریں، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: ''جس نے اخلاص کے ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اخلاص کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ اسے اللہ تعالیٰ کے محارم سے روکے رکھے۔'' اسے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ عہد کیا ہے کہ میری امت کا کوئی آدمی جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے گا اور اس کے ساتھ کسی اور شے کی آمیزش نہیں کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہے''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے ہے جسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا پر حریص ہونا، اس کو جمع کرنا اور پھر اسے روک کر رکھنا، وہ قول انبیاء کا کہتے ہیں اور عمل جابروں اور ظالموں کا کرتے ہیں۔'' اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے باز رکھتا ہے جب تک وہ اپنے دنیا کے معاملہ کو اپنے دین پر ترجیح نہ دیں پس جب اپنی دنیا کے معاملہ کو اپنے دین پر ترجیح دیں اور پھر کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو اسے ان پر لوٹا دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے جھوٹ کہا ہے۔'' اس کی اسانید نوادر الاصول میں ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے اعتبار سے تمام کے سوال اور ان کے محاسبہ پر دلالت کرتی ہے جو ان میں سے کافر ہیں اور جو ان میں سے مومن ہیں، سوائے ان کے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے۔ پس اگر کہا جائے: کیا کافر سے سوال کئے جائیں گے اور اس کا محاسبہ کیا جائے گا؟ تو ہم

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ الحجر، جلد 2، صفحہ 141 2۔ ایضاً

کہتے ہیں: اس میں اختلاف ہے، اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ اور جو اس کے سوال کو ظاہر کرتے ہیں وہ الله تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (الصافات) (اور (اب ذرا) روک لو انہیں، ان سے باز پرس کی جائے گی۔) اور اِنَّ اِلَيْنَاۤ اِيَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے) پس اگر کہا جائے: تحقیق الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (القصص) (اور نہیں دریافت کئے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ۔)

اور فرمایا: فَيَوْمَىٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (الرحمٰن) (تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا) اور فرمایا: وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ (البقرہ:174) (اور بات تک نہ کرے گا ان سے الله تعالیٰ۔) اور فرمایا: اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (المطففین) (یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا۔) تو ہم کہیں گے: قیامت کے کئی مقامات ہیں، پس کسی جگہ پر سوال و کلام ہوگی، اور کسی مقام پر ان میں سے کچھ نہ ہوگا۔ اور عکرمہ نے کہا: قیامت میں کئی مقامات ہوں گے، بعض میں سوال کئے جائیں گے اور بعض میں سوال نہیں کئے جائیں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان سے یہ سوال حصول خبر اور حصول علم کے لئے نہیں ہوگا کہ کیا تم نے اس اس طرح کیا؟ کیونکہ الله تعالیٰ تو ہر شے کو جاننے والا ہے، لیکن ان سے یہ سوال برائے ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کے ہوگا پس الله تعالیٰ ان سے فرمائے گا: تم نے قرآن کریم اور اس میں اپنے لئے موجود دلائل کی نافرمانی کیوں کی ہے؟ اور قطرب نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر) یعنی ہم مکلف مومنوں سے ضرور سوال کریں گے، اس کا بیان یہ قول باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (التکاثر) (پھر ضرور پوچھا جائے گا تم سے اس دن جملہ نعمتوں کے بارے میں) اور عموم کے مطابق قول کرنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ والله اعلم۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ

''سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے۔ ہم کافی ہیں آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ یعنی آپ اس کے بارے اعلان کر دیجئے جس کے بارے آپ کو حکم دیا گیا ہے، یعنی آپ الله تعالیٰ کا پیغام تمام مخلوق تک پہنچایئے تاکہ ان پر حجت قائم ہو جائے، تحقیق اسی کے بارے الله تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اور الصدع کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے۔ اور تصدّع القوم یعنی قوم متفرق ہوگئی اور اسی سے ہے يَوْمَىٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ (الروم) یعنی اس دن وہ متفرق ہو جائیں گے (بکھر جائیں گے) اور صدعته فانصدع ای انشق۔ (میں نے اسے پھاڑا پس وہ پھٹ گیا۔) اور الصدع کا اصل معنی جدا کرنا اور پھاڑنا ہے۔

ابو ذویب اپنے گدھوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وكأنهن رِبابة و كأنّه يَسَرٌ يُفيض على القِداح و يَصْدَع

اس میں یصدع بمعنی یفرق اور یشق (یعنی جدا جدا کرنا اور پھاڑنا) کے ہے۔

پس قول باری تعالیٰ: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ فراء نے کہا ہے: اس سے فاصدع بالأمر کا ارادہ کیا ہے، یعنی اپنے دین کا اظہار کیجئے، پس اس میں ما فعل کے ساتھ مل کر قائم مقام مصدر کے ہے۔ اور ابن الاعرابی نے کہا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا معنی ہے اس کا قصد کیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا معنی ہے آپ ان کی جمعیت اور ان کے کلمہ کو جدا جدا کر دیجئے اس کے ساتھ کہ آپ انہیں توحید کی طرف دعوت دیں کیونکہ یہ متفرق ہو جائیں گے اور جدا جدا ہو جائیں گے اس طرح کہ بعض اسے قبول کر لیں گے، پس اس تفسیر کے مطابق الصدع جماعت کفار کو متفرق کرنے کی طرف راجع ہوگا۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اور آپ مشرکوں کے استہزا کو اہمیت دینے سے اور ان کے قول کی کوئی پرواہ کرنے سے اعراض کر لیجئے، منہ پھیر لیجئے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بری قرار دیا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (التوبہ: 5) کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور عبداللہ بن عبید نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل (دعوت) چھپاتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل فرمایا: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب باہر نکلے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں اللہ تعالیٰ نے نماز میں قرآن بالجہر پڑھنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اور آپ ان کی پرواہ نہ کریں۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے: جب وہ شر میں انتہائی سرکش ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کثرت سے استہزا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ اور اس کا معنی ہے آپ اس کا اعلان کر دیجئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لئے کافی ہے جس نے آپ کو اذیت پہنچائی جیسا کہ وہ آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے کافی ہے، اور وہ اہل مکہ کے پانچ سردار تھے ان میں ولید بن مغیرہ تھا وہ ان کا سرخیل تھا، اور عاص بن وائل، اسود بن مطلب بن اسد ابوزمعہ، اور اسود بن عبد یغوث، اور حارث بن طلاطلہ، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو ہلاک کر دیا، کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں غزوہ بدر میں ایک ہی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ استہزا کرنے کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ اور ان کے ہلاک ہونے کے سبب سے متعلق ابن اسحاق نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور وہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے، پس وہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے تھے تو آپ کے پاس سے اسود بن مطلب گزرا اور آپ نے اس کے چہرے پر سبز پتہ پھینکا تو وہ اندھا ہو گیا اور اس کی آنکھ درد کرنے لگی، تو وہ اپنا سر دیوار کے ساتھ مارنے لگا۔ اور آپ کے پاس سے اسود بن عبد یغوث گزرا تو آپ نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا پس اس کا پیٹ پانی سے بھر گیا اور اس سوج کی وجہ سے مر گیا۔ کہا جاتا ہے: حبِن (کسرہ کے ساتھ) حبَنا اور حُبِن فعل مجہول کے لئے ہے یعنی اس کا پیٹ زرد پانی کے ساتھ بھر گیا، بڑھ گیا، فھو أحبَنُ (وہ بڑے پیٹ والا ہے) والمرأۃ حَبْناء (سوجے ہوئے پیٹ والی عورت)، اسی طرح الصحاح میں ہے۔ اور ولید بن مغیرہ آپ کے پاس سے گزرا پس آپ نے اس کے پاؤں

کے ٹخنے کے نیچے زخم کے نشان کی طرف اشارہ کیا، اور وہ اس کو کئی سال پہلے لگا تھا، اور وہ اپنی چادر تکبر کی وجہ سے زمین پر گھسیٹ کر چلا کرتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہوئی وہ خزاعہ کے ایک آدمی کے پاس سے گزرا وہ اپنے تیر کو پر لگا رہا تھا پس اس کا تیر اس کی چادر کے ساتھ اٹک گیا اور اس کے پاؤں میں خراش لگ گئی وہ فقط خراش تھی اور کچھ نہ تھا، تو وہ اس کے ساتھ جھگڑ پڑا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ اور عاص بن وائل آپ کے پاس سے گزرا اور آپ نے اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ طائف کے ارادہ سے گدھے پر نکلا، تو گدھا اس کے ساتھ ایک کانٹے دار بوٹی پر بیٹھ گیا اور ایک کانٹا اس کے پاؤں کے تلوے میں لگ گیا اور اسی نے اسے قتل کر ڈالا۔ اور حارث بن طلاطلہ آپ کے پاس سے گزرا، اور آپ نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا پس اس سے پیپ بہنے لگی اور اسی نے اسے مار ڈالا۔ اور ان کی موت کے سبب میں جو اختلاف ذکر کیا گیا ہے وہ اس کے قریب قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو اس قول باری تعالیٰ سے مراد ہیں: فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26) (پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اسے تشبیہ دی گئی ہے ان کے ساتھ جنہیں موت ان پر چھت گرنے کی وجہ سے واقع ہو، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''جو بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا، سو یہ (حقیقت حال کو) ابھی جان لیں گے۔''

یہ استہزا کرنے والوں کی صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ہے۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ یعنی ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، کیونکہ سینہ دل کا محل ہے۔ بِمَا يَقُوْلُوْنَ یعنی اس کے سبب جو آپ ان سے اپنی تکذیب اور اپنے قول کا رد سنتے ہیں، اور آپ اور آپ کے اصحاب اسے اپنے دشمنوں سے پاتے ہیں (1)۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

''سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جائیے سجدہ کرنے والوں سے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: فَسَبِّحْ پس آپ نماز کی پناہ لیجئے، یہ تسبیح کی غایت اور پاکی بیان کرنے کی انتہا ہے (2)، اسی لئے اس کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی: وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے کہ نماز میں غایت قرب حالت سجود میں حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ حالت سجدہ میں ہو پس تم اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔'' اور اسی وجہ سے سجود کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1138 2۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 2**۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں امر سے مراد نفس سجود ہی ہے، اور اس مقام کو قرآن میں محل سجود قرار دیا ہے (1)، اور بیت المقدس طہرہ اللہ میں محراب زکریا کے امام کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس مقام پر سجدہ کرتے ہیں اور میں نے بھی اس میں ان کے ساتھ سجدہ کیا ہے، لیکن جمہور علماء کا یہ موقف نہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہاں ابوحذیفہ اور یمان بن رئاب کے نزدیک سجدہ ہے اور وہ اسے واجب گمان کرتے ہیں۔

## وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

''اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آجائے آپ کے پاس الیقین۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ الیقین سے مراد موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی عبادت کا حکم دیا (3) جب اس کے بندے اس میں کوتاہی کریں کہ یہ آپ پر واجب ہے۔ اگر کہا جائے: قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ قول باری تعالیٰ: وَاعْبُدْ رَبَّكَ عبادت کا حکم دینے کے بارے میں کافی تھا، تو کہا جائے گا: اس میں فائدہ یہ ہے کہ اگر رب کریم مطلقاً وَاعْبُدْ رَبَّكَ فرماتا پھر آپ ایک بار اس کی عبادت کر لیتے تو آپ اطاعت کرنے والے ہو جاتے اور جب فرمایا: حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ تو اس کا معنی ہوا اس سے جدائی اور علیحدگی اختیار نہ کیجئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔ پھر اگر کہا جائے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کیسے کہہ دیا: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ اور ابدا نہیں کہا، تو جواب یہ ہے کہ الیقین، ابدا کے قول کی نسبت زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ لفظ ابدا ایک لحظہ اور ہمیشہ کے معنی کا احتمال رکھتا ہے۔ اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہاں مراد مدت حیات تک عبادت کو جاری رکھنا ہے، جیسا کہ عبد صالح نے کہا: وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم) (اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں۔) اور اسی پر یہ مسئلہ مرتب ہوتا ہے کہ جب کسی آدمی نے اپنی بیوی کو کہا: أنت طالق أبدا (تو ہمیشہ طلاق والی ہے) اور کہا: میں نے اس سے ایک دن یا ایک مہینے کی نیت کی ہے تو اس کے لئے رجعت کا حق حاصل ہوگا (4)۔ اور اگر اس نے کہا: میں نے اسے زندگی بھر کے لئے طلاق دی ہے تو پھر اسے رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اور اس پر دلیل کہ یقین سے مراد موت ہے (5) ام العلاء انصاریہ کی حدیث ہے، اور وہ بیعت کرنے والی عورتوں میں سے تھی۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہے عثمان یعنی عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ..... تحقیق انہیں موت آئی اور میں ان کے لئے خیر کی امید رکھتا ہوں قسم بخدا! میں نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں وہ جو اس کے ساتھ کیا جائے گا۔'' اور آگے حدیث ذکر کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: لوگوں کو موت کے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1138	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، سورۃ الحجر، جلد 3، صفحہ 1139	5۔ ایضاً

بارے جو یقین ہے اس سے زیادہ کوئی یقین شک کے مشابہ میں نے نہیں دیکھا کہ پھر وہ اس کی تیاری نہیں کرتے، یعنی گویا وہ اس میں شک کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہاں یقین سے مراد وہ حق ہے جس میں کوئی شک نہیں (کہ) آپ کی آپ کے دشمنوں کے خلاف مدد کی گئی ہے۔ یہ ابن شجرہ نے کہا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اور یہی حضرت مجاہد، قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔ جبیر بن نفیر نے ابو مسلم خولانی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا ہے بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف یہ وحی نہیں کی گئی کہ میں مال جمع کروں اور میں تاجروں میں سے ہو جاؤں لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور سجدہ کرنے والوں سے ہو جائیے اور اپنے رب کی عبادت کیجئے یہاں تک کہ آپ کے پاس الیقین آ جائے''۔

# سورۃ النحل

آیاتہا ۱۲۸ ۱۶ سورۃ النحل مکیۃ ۷۰ رکوعاتہا ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کے قول کے مطابق یہ ساری سورۃ مکیہ ہے۔ اور اس کا نام سورۃ النعم بھی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ان نعمتوں کو شمار کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں پر فرمائی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ سورۃ مکیہ ہے سوائے اس قول باری تعالیٰ کے: وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ الآیہ یہ آیت مدینہ طیبہ میں حضرت حمزہ اور شہداء احد کی تمثیل بیان کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور سوائے اس قول کے: وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ، اور سوائے اس قول کے: ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا الآیہ۔ اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا۔ یہ مکی ہے اور ہجرت حبشہ کی شان میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ سورہ مکی ہے سوائے تین آیات کے جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں، اور وہ یہ ہیں: وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجۡزِیَنَّ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾۔

**اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱﴾**

قریب آ گیا ہے حکم الٰہی پس اس کے لئے عجلت نہ کرو، پاک ہے اللہ تعالیٰ اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ کہا گیا ہے کہ اس میں اَتٰی بمعنی یاتی ہے، (یعنی آ رہا ہے) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: إن أكرمتني أكرمتك (اگر تو نے میری عزت کی تو میں تیری تکریم کروں گا)۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ماضی اور مستقبل میں خبر دینا برابر ہے، کیونکہ وہ لامحالہ ہو کر رہنے والا ہے، جیسا کہ اس کا قول ہے: وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ (الاعراف: 44) اور اَمۡرُ اللّٰہِ سے مراد اس کے لئے اس کی سزا اور عقاب ہے جو شرک کرنے اور اس کے رسول کی تکذیب کرنے پر قائم رہا۔ حسن، ابن جریج اور ضحاک نے کہا ہے: امر سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے فرائض و احکام کو بیان کیا ہے۔ اور اس میں بہت بعد ہے، کیونکہ یہ منقول نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے فرائض کی طلب میں عجلت کی ہو اس سے پہلے کہ وہ ان پر فرض کئے جائیں، البتہ عذاب و عقاب کی طلب میں جلدی کرنے والے ہیں اور وہ بہت سے کفار قریش وغیرہ سے منقول ہے حتیٰ کہ نضر بن حارث نے کہا: اَللّٰہُمَّ اِنۡ کَانَ ہٰذَا ہُوَ

الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ، تو اس نے عذاب کی طلب میں عجلت کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ضحاک کے قول سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں نے اور میرے رب نے تین چیزوں میں باہم موافقت کی ہے: مقام ابراہیم میں، حجاب میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں، اسے امام بخاری اور امام مسلم رحمہا اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر پر انہیں جزا دینے کا وعدہ کیا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ (المومنون: 27) (یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم اور ابل پڑا تنور)۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ قیامت کا دن ہے یا قیامت کی علامت میں سے وہ جو اس کے قرب پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) (قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند شق ہو گیا)۔ کفار نے کہا: بے شک یہ گمان کر رہے ہیں کہ قیامت قریب آ چکی ہے، پس تم ان بعض کاموں سے رک جاؤ جو تم کرتے ہو، پس وہ رک گئے اور انتظار کرنے لگے لیکن انہوں نے کوئی شے نہ دیکھی، تو پھر کہنے لگے: ہم تو کوئی شے نہیں دیکھ رہے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی، اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ الآیہ (الانبیاء: 1) (قریب آ گیا لوگوں کے لئے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت......) پس وہ خوفزدہ ہو گئے اور قرب قیامت کا انتظار کرنے لگے، پھر ایام طویل ہو گئے تو وہ کہنے لگے: ہم تو کوئی شے نہیں دیکھ رہے ہیں، پھر یہ آیت نازل ہوئی: اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان اچھل پڑے اور خوفزدہ ہو گئے، پھر یہ ارشاد نازل ہوا: فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ پس وہ مطمئن ہو گئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے قیامت کے ساتھ ان دو کی طرح مبعوث کیا گیا ہے“ (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو انگلیوں کے ساتھ اشارہ کیا اور وہ ایک سبابہ (شہادت کی انگلی) اور اس کے ساتھ والی انگلی تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ قریب تھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے جاتی لیکن میں اس پر سبقت لے گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہی ہے۔ اور یہ کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام جب آسمان والوں کے پاس سے گزرتے اس حال میں کہ انہیں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بھیجا جاتا تھا تو وہ کہتے: اللہ اکبر، قیامت قریب آ گئی۔ قولہ تعالیٰ: سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہر اس شے سے پاک ہے جس کے ساتھ وہ اسے متصف کرتے ہیں کہ وہ قیامت قائم کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، اور یہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے تھے: کوئی بھی مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، پس وہ اللہ تعالیٰ کو اس عجز کے ساتھ متصف کرتے تھے جس کے ساتھ صرف اور صرف مخلوق کو متصف کیا جا سکتا ہے، اور یہ شرک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عَمَّا یُشْرِكُوْنَ یعنی اس کی ذات ان کے شریک ٹھہرانے سے پاک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما بمعنی الذی ہے، یعنی وہ ذات جو ان سے بلند ہے جنہوں نے اس کے ساتھ شرک کیا۔

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ، جلد 2، صفحہ 406

''اتارتا ہے فرشتوں کو روح (یعنی وحی) کے ساتھ اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے کہ خبردار کرو (لوگوں کو) کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے پس مجھ سے ہی ڈرا کرو''۔

مفضل نے عاصم سے تَنَزَّلُ الملائکۃُ پڑھا ہے اور یہ اصل میں تتنزّل تھا، پس فعل کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور کسائی نے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے اس سے مختلف قرأت کی ہے، اور اعمش نے تُنُزِّل الملائکۃُ فاعل کا ذکر کئے بغیر (فعل مجہول) پڑھا ہے۔ اور جعفی نے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ نون کے ساتھ اور فعل معروف کے ساتھ قرأت کی ہے، اور باقیوں سے یُنَزِّلُ یا اور فعل معروف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے اسم کے لئے ہے۔ اور حضرت قتادہ سے نُنْزِلُ الملائکۃ نون اور تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ اور اعمش نے تَنْزِلُ تا کے فتحہ اور زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ نزول سے ماخوذ ہے۔ اور الملائکۃُ مرفوع ہے جیسا کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ میں ہے۔ بِالرُّوْحِ یعنی وحی کے ساتھ اور وہ نبوت ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اس کی نظیر یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (غافر: 15) ہے۔ ربیع بن انس نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ اور وہ قرآن کریم ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس حق کا بیان ہے جس کی اتباع اور پیروی واجب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد مخلوق کی ارواح ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ کوئی فرشتہ نہیں اترتا مگر اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جیسا کہ ابن آدم کی صورتیں اور شکلیں ہیں، اور آسمان سے کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ان میں سے ایک ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: رحمت کے ساتھ (یعنی ملائکہ کو رحمت کے ساتھ اتارتا ہے) یہ حسن اور قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہدایت کے ساتھ، کیونکہ دل اس کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں جیسا کہ بدن ارواح کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں (1)، اور یہی معنی زجاج کے قول کا ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: روح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے امر کی طرف ارشاد اور ہدایت سے حیات ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہاں روح سے مراد حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ بِالرُّوْحِ میں با بمعنی مع ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: خرج بثیابه، ای مع ثیابه (وہ اپنے کپڑوں کے ساتھ نکلا)۔ مِنْ اَمْرِهٖ، ای بأمرہ (اپنے حکم کے ساتھ)۔ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ یعنی ان پر جنہیں اللہ تعالیٰ نبوت کے لئے منتخب فرمالے۔ یہ ان کے اس قول کا رد ہے: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ۝ (الزخرف) (کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو دو شہروں میں بڑا ہے)۔

اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ یہ بتوں کی عبادت سے تحذیر اور ڈرانا ہے، اور اسی لئے انذار کا لفظ آیا ہے، کیونکہ اس کا اصل معنی اس سے ڈرانا اور آگاہ کرنا ہے جس سے ڈرا جاتا ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ: فَاتَّقُوْنِ دلالت کر رہا ہے۔ اور أنْ (یعنی اس کے ساتھ کہ تم کافروں کو اس بارے خبردار کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں)۔ پس أنْ حرف جر کے ساقط ہونے کے ساتھ محل نصب میں ہے یا اس پر انذار کے وقوع کے سبب (یہ محل نصب میں ہے)

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 178

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

''اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ یعنی زوال اور فناہ کے لئے (زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِالْحَقِّ یعنی اپنی قدرت پر دلالت کرنے کے لئے، اور یہ کہ بندے اس کی طاعت کرتے ہوئے عبادت کریں اور یہ کہ وہ موت کے بعد مخلوق کو زندہ کر سکتا ہے۔ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی وہ برتر ہے ان بتوں سے جو کسی چیز کو پیدا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝

''اس نے پیدا فرمایا انسان کو نطفہ سے پس اب وہ برملا جھگڑالو بن گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ جب الله تعالیٰ نے اپنی توحید پر دلیل ذکر فرمائی تو اس کے بعد انسان، اس کی درشتیوں، مشقتوں اور ایک حالت سے دوسری کی طرف تجاوز کرنے کا ذکر کیا۔ الْاِنْسَانَ یہ اسم جنس ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد ابی بن خلف جمحی ہے، وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند بوسیدہ ہڈیاں لے کر آیا اور کہا: کیا آپ یقین رکھتے ہیں کہ الله تعالیٰ انہیں زندہ کرے گا اس کے بعد کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں، گل سڑ چکی ہیں؟ اور اسی بارے میں یہ آیت بھی نازل ہوئی: اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ (یٰس) (کیا انسان (اس حقیقت کو) نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پس اب وہ (ہمارا) کھلا دشمن بن بیٹھا ہے) یعنی الله تعالیٰ نے انسان کو اس پانی سے تخلیق فرمایا جو آدمی کی صلب اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے، پھر اسے مختلف ہیئتوں میں منتقل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس حیثیت سے پروان چڑھتا ہے کہ امور میں جھگڑا کرنے لگتا ہے، پس کلام کا معنی انسان کے بارے میں تعجب کا اظہار کرنا ہے وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ (یٰسین: 78) (اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لئے (عجیب وغریب) مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا اپنی پیدائش کو) اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ یعنی مخاصِم جھگڑا کرنے والا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے نسیب معنی مناسب ہے، یعنی یہ الله تعالیٰ کے ساتھ اس کی قدرت کے بارے میں جھگڑتا ہے۔ اور مُّبِيْنٌ یعنی اس کا جھگڑنا بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی طرف سے باطل کے ساتھ جھگڑنے کا اظہار کرتا ہے۔ اور الْمُبِيْنُ سے مراد وہ ہے جو اپنے کلام کے ساتھ اس کی وضاحت کرنے والا ہو جو اس کے دل میں چھپا ہوا اور پوشیدہ ہے۔

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝

''نیز اس نے جانوروں کو پیدا کیا تمہارے لئے ان میں گرم لباس بھی ہے اور دیگر فائدے ہیں اور انہیں (کا گوشت) تم کھاتے ہو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ جب الله تعالیٰ نے انسان کا ذکر کیا تو پھر اس کا ذکر کیا جس کے

ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرمایا اور الْاَنْعَامَ سے مراد اونٹ، گائیں اور بکریاں ہیں۔ اور نَعم اور انعام کے الفاظ اکثر اونٹوں کے لئے بولے جاتے ہیں، اور یہ مجموعہ کے لئے بولے جاتے ہیں اکیلے بکریوں کے لئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا (1)۔

حضرت حسان نے کہا ہے:

عفت ذاتُ الأصابعِ فالجِوَاءُ إلى عَذْراءَ منزِلُها خلاءُ
دِيارٌ من بَنِي الحَسْحاس قَفْرٌ تُعَفِّيها الروامِسُ والسماء
وكانت لايزال بها أنيس خِلال مُرُوجها نَعَمٌ وشاءُ

پس اس میں نَعَم سے مراد صرف اونٹ ہیں۔ اور جوہری نے کہا ہے: النَّعَم الأنعام کی واحد ہے اور اس سے مراد چرنے والا مال ہے، اور اکثر اوقات اس اسم کا اطلاق اونٹوں پر ہوتا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هذا نعم وارد (یہ اونٹ آرہا ہے)، اور اس کی جمع نُعْمان آتی ہے جیسا کہ حَمَل اور اس کی جمع حُمْلان آتی ہے۔ اور الأنعام مذکر بھی آتا ہے اور مونث بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ (النحل: 66) اور دوسرے مقام پر فرمایا: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا (المومنون: 21) اور الانعام، الانسان پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا پھر فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: دِفْءٌ، الدف کا معنی السخانة (گرم ہونا) ہے (2)، اور اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ گرمائش حاصل کی جاتی ہے یعنی ان کی اون سے، اونٹوں کے بالوں سے اور دیگر جانوروں کے بالوں سے یعنی لباس، لحاف اور کمبل وغیرہ (بنا کر ان سے گرمائش حاصل کی جاتی ہے)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: دفؤها سے ان کی نسل مراد ہے (3)۔ واللہ اعلم۔

علامہ جوہری نے صحاح میں کہا ہے: الدفء سے مراد اونٹ کا بچے جننا، ان کا دودھ دینا اور دیگر منافع جو ان سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ اور حدیث میں ہے لنامن دِفئهم ما سلَموا بالميثاق (ہمارے لئے ان کے اونٹوں میں سے وہ ہیں جو انہوں نے معاہدہ کے ساتھ حوالے کئے) اور الدفء کا معنی السخونة (گرم ہونا) بھی ہے، اس معنی میں تو کہتا ہے: دَفِئَ الرجل دَفَاءَةً جیسا کہ كَرِهَ كراهة ہے۔ (آدمی نے گرمی محسوس کی)۔ اور اسی طرح دَفِئَ اور دَفَأَ ہے مثلاً ظَمِئَ اور ظمأ ہے۔ اور اسم الدِّفْءُ (کسرہ کے ساتھ) ہے اس سے مراد وہ شے ہے جو تجھے گرمائش پہنچائے، اور اس کی جمع الأدفاء ہے۔ آپ کہتے ہیں: ماعليه دِفٌ (اس پر گرم لباس نہیں ہے) کیونکہ یہ اسم ہے۔ اور آپ یہ نہیں کہتے: ما عليك دَفاءة، کیونکہ یہ مصدر ہے۔ اور آپ کہتے ہیں: اقعد في دِفْ هذا الحائط اي كِنّه (آپ اس دیوار کے پردے میں بیٹھیں)۔ اور رجل دفِئ على فَعِلٍ جب وہ ایسا لباس پہنے جو اسے گرمی پہنچائے۔ اور اسی طرح

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 379 2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 179
3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1140

رجل دفآن اور امرأۃ دفاء ہے۔ اور تحقیق أدفأہ الثوب (کپڑے نے اسے گرمائش دی) وتدفأ ھو بالثوب (اس نے کپڑے کے ساتھ گرمائش حاصل کی) واستدفأ بہ، اور ادّفأبہ اور یہ باب افتعال ہے، یعنی اس نے وہ لباس پہنا جو اسے گرمی پہنچاتا ہے۔ اور دَفُؤت لیلتنا (ہماری رات گرم ہوگئی) وھو یوم دفِیٔ (اور وہ گرم دن ہے) یہ فعیل کے وزن پر ہے۔ اور لیلۃ دفیئۃ، (گرم رات) اور اسی طرح کپڑا اور گھر ہے۔ اور المدفِئۃ بہت زیادہ اونٹ، کیونکہ وہاں بعض بعض کو اپنی سانسوں کے ساتھ گرمی پہنچاتے ہیں، اور کبھی اسے مشدد پڑھا جاتا ہے اور المُدْفَاۃ وہ اونٹ جس کے بال اور چربی بہت زیادہ ہو، یہ اصمعی سے منقول ہے۔

اور شماخ نے شعر بیان کیا ہے:

وکیف یَضِیع صاحبُ مُدْفآتٍ علی أثْبَاجِھن مِنَ القَقِیعِ

قولہ تعالیٰ: وَّ مَنَافِعُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: المنافع سے مراد ہر جانور کی نسل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد سوار ہونا، بوجھ اٹھانا، دودھ، گوشت اور گھی وغیرہ ہیں۔ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ صرف کھانے کی منفعت ذکر کی گئی ہے کیونکہ یہ تمام منافع میں سے عظیم منفعت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم ذبح کے وقت ان کا گوشت کھاتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اون کا لباس پہننے پر دلیل ہے (1)؛ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے قبل دیگر انبیاء علیہم السلام جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ نے اس کا لباس پہنا ہے۔ اور حدیث مغیرہ میں ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چہرہ مبارک دھویا اور اون کا بنا ہوا شامی جبہ پہنے ہوئے تھے اس کی آستینیں تنگ تھیں...... الحدیث، اسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ متقی لوگوں کا شعار اور علامت ہے، صالحین کا لباس ہے، صحابہ کرام اور تابعین کا حسن ہے، اور زہاد اور عارفین کی پسند ہے، اور وہ نرم، سخت (کھردرا)، عمدہ، درمیانہ اور ردی (گھٹیا) سبھی قسم کا لباس پہنتے ہیں، اور اسی کی طرف لوگوں میں سے صوفیہ کی جماعت منسوب ہے، کیونکہ اکثر ان کا لباس یہی ہوتا ہے۔ پس (صوفیہ میں) یا نسبت کی ہے اور ھا تانیث کے لئے ہے (2)۔ ان کے بعض اشیاخ نے مجھے بیت المقدس طھرہ اللہ کے یہ شعر بیان کئے ہیں:

تشاجر الناسُ فی الصوفیّ واختلفوا فیہ وظنوہ مشتقا من الصوف (3)

لوگوں نے صوفی کے بارے میں باہم جھگڑا کیا اور ان کا اس بارے میں اختلاف ہوا اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ الصوف سے مشتق ہے۔

ولست انحَلُ ھذا الاسمَ غیرفتیً صَافَی فصُوفِیَ حتی سُمّیَ الصوفی (4)

اور میں یہ نام اس جوان کے بغیر کسی کو نہیں دیتا جو خود خالص اور پاک ہوا اور اسے پاک صاف کیا گیا یہاں تک کہ اسے صوفی کا نام دے دیا گیا۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1140 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝

''اور تمہارے لئے ان میں زیب و زینت بھی ہے جب تم شام کو (چرا کر) انہیں گھر لاتے ہو اور جب تم صبح ان کو چرانے لے جاتے ہو۔''

الجمال وہ شے جس سے خوبصورتی اور زیب و زینت حاصل کی جائے۔ اور الجمال کا معنی حسن ہے۔ اور جمُل الرجل (ضمہ کے ساتھ) جمالاً فھو جمیل (آدمی حسین ہوا)، اور المرأۃ جمیلۃ (عورت حسین ہے) اور جملاء بھی صفت آتی ہے۔ یہ کسائی سے منقول ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فھی جَمْلاء کبدرٍ طالعٍ　　بَذّت الخلقَ جمیعا بالجمال

اور ابوذؤیب کا قول ہے:

جمالَکَ ایھا القلبُ القریح

مراد یہ ہے: تو اپنے حسن و جمال اور اپنے حیاء کو لازم پکڑ اور برمی اور قبیح جزع فزع نہ کر۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پس حسن و جمال صورت اور ترکیب اعضاء میں ہوتا ہے، اور اخلاق باطنہ میں ہوتا ہے (1)، اور افعال میں ہوتا ہے، پس جہاں تک خلقت اور صورت کے حسن و جمال کا تعلق ہے تو وہ ایسا امر ہے جس کا ادراک آنکھ کر سکتی ہے اور اسے نرمی اور ملائمت کے ساتھ دل کی طرف متوجہ کر سکتی ہے، اور اس کے چہرے کی پہچان کے بغیر اور انسانوں میں سے کسی کی طرف اس کی نسبت کے بغیر نفس اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ اور رہا اخلاق کا جمال تو یہ صفات محمودہ کی بنا پر ہوتا ہے مثلاً علم، حکمت و دانائی، عدل، پاکدامنی، غصہ کو پی جانا، اور ہر ایک کے لئے خیر کا ارادہ کرنا اور جہاں تک افعال کے جمال کا تعلق ہے تو اس کا وجود مخلوق کے مصالح اور منافع کے لئے ملائمۃ اور نرمی اختیار کرنے اور ان میں جلب منافع کے فیصلے کرنے اور ان سے شر اور برائی کو دور کرنے سے ہوتا ہے۔ اونٹوں اور چوپاؤں کا جمال جمال خلقت میں سے ہے، اور وہ آنکھوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور دیکھنے والوں کے موافق ہوتا ہے۔ اور ان کے حسن و جمال میں سے ان کا کثیر ہونا ہے اور لوگ جب انہیں دیکھیں تو ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ فلاں کے جانور ہیں؛ یہ سدی نے کہا ہے۔ اور اس لئے کہ جب وہ شام کو چر کر واپس آتے ہیں تو ان کا حسن زیادہ ہو چکا ہوتا ہے، ان کی شان عظیم ہو جاتی ہے، اور دل ان کے ساتھ معلق ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت چرنے کے سبب ان کا موٹاپا اور ان کے کھیر دودھ کے سبب بڑھے ہوئے ہوتے ہیں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اسی معنی کی وجہ سے رواح (شام کے وقت واپس آنا) کو سراح (صبح کے وقت چرانے کے لئے لے جانا) پر مقدم کیا ہے کیونکہ ان کا دودھ اور ان کے سبب نفس کا سرور اس حالت میں مکمل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ (النحل) اور یہ مویشیوں میں اس وقت ہوتا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1141

ہے جب وہ چراگاہ کی طرف آتے جاتے ہوں (1)۔ اور الرواح شام کے وقت چراگاہ سے واپس لوٹنا ہوتا ہے اور سراح صبح کے وقت اس کی طرف جانا ہوتا ہے، تو کہتا ہے: سرحت الابل أسرحها سرحا و سروحا جب تو صبح کے وقت اونٹ کو چراگاہ کی طرف لے جائے اور اسے چھوڑ دے، و سرحت یہ متعدی اور لازم دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی میں ہے۔

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۟ۙ

اور (یہ جانور) اٹھالے جاتے ہیں تمہارے بوجھ ان شہروں تک جہاں تم نہیں پہنچ سکتے مگر سخت مشقت سے، بے شک تمہارا رب بہت مہربان (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ، الأثقال سے مراد لوگوں کے بوجھ ہیں مثلاً ساز و سامان، اور اناج وغیرہ۔ اور یہی وہ ہے جسے اٹھانا انسان پر بھاری اور بوجھل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے بدن ہیں اور اس پر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۟ۙ (الزلزلہ) (اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو) اور عکرمہ کے قول کے مطابق البلد سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عموم پر محمول ہے (2) ہر اس شہر کے بارے میں جس کے لئے خشکی کا راستہ ہے۔ اور شق الانفس سے مراد ان کی مشقت اور ان کی غایۃ جُھد ہے۔ قرأت عامہ شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الشق کا معنی مشقت ہے اور اسی سے الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اور یہ کبھی مفتوح ہوتا ہے، اسے ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شِقِّ میں شین کے کسرہ اور اس کے فتحہ دونوں باہم متقارب ہیں، اور دونوں مشقت کے معنی میں ہیں اور یہ الشق فی العصا و نحوھا سے ماخوذ ہے۔ (ڈنڈے میں مشقت ہے) کیونکہ اس سے انسان سے پائی جانے والی مشقت کی مثل مشقت پائی جاتی ہے۔ اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوجعفر نے اِلَّا بِشَقِّ الْاَنْفُسِ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں، مثلاً رِق و رَق اور جِص و جَص اور رِطل و رَطل ہیں۔

اور شاعر کا قول شین کے کسرہ اور اس کے فتحہ دونوں کے ساتھ آتا ہے:

وذی إبل یَسْعَی و یحسبهاله أخِی نَصَب من شقّها و دؤوبِ

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر کے معنی میں ہو، یہ شققت علیه أشق شقًا (میں نے اسے مشقت میں ڈال دیا) سے ماخوذ ہے۔ اور الشق کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی نصف بھی ہے، کہا جاتا ہے: أخذتُ شِق الشاة و شقة الشاة۔ (میں نے بکری کا نصف لیا) اور کبھی آیت سے یہ معنی مراد ہوتا ہے، یعنی تم اس تک پہنچنے والے نہیں ہو مگر قوت کے نقصان کے ساتھ اور اس سے نصف ختم کرنے کے ساتھ، یعنی تم اس تک نہیں پہنچ سکتے مگر اپنی نصف قوت کے ساتھ اور دوسرا نصف ختم کرنے کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1141
2۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 180

ساتھ اور الشِق کا معنی پہاڑ کا کنارہ بھی ہے۔ اور ام زرع کی حدیث میں ہے: وجدنی فی اهل غُنیمه بشق (اس نے مجھے پہاڑ کے کنارے اہل غنیمہ میں پالیا)۔ ابوعبید نے کہا ہے: یہ جگہ کا نام ہے۔ اور الشق کا معنی الشقیق بھی ہے، کہا جاتا ہے: ھو أخی و شق نفسی (وہ میرا بھائی ہے اور میری جان کا حصہ ہے)۔ اور شِقّ عرب کے کاہنوں میں سے ایک کاہن کا نام ہے۔ اور الشق کا معنی الجانب (طرف) بھی ہے۔

اور اس معنی میں امرء القیس کا قول ہے:

إذا ما بکی مِن خَلْفها انصرفَتْ له بشِقّ و تحتِی شِقُّها لم یحوّل

پس یہ لفظ کئی معنوں میں مشترک ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عمومی جانوروں کے ساتھ احسان فرمایا ہے، لیکن یہاں بوجھ اٹھانے میں صرف اونٹ کے ذکر کو تمام جانوروں پر فوقیت اور خصوصیت دی ہے، کیونکہ بکریاں چرنے کے لئے جانے اور ذبح کے لئے ہیں، اور گائیں ہل جوتنے کے لئے ہیں، اور اونٹ بوجھ اٹھانے کے لئے ہیں (1)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (2) انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ ایک آدمی اپنی گائے ہانک کر لے جارہا تھا اور اس نے اس پر بوجھ لاد دیا تو وہ گائے اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کہا: بلاشبہ مجھے اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ مجھے تو ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو لوگوں نے تعجب اور گھبراہٹ کی حالت میں کہا: سبحان اللہ؟ کیا یہ گائے باتیں کر رہی ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک میں، ابوبکر اور عمر اس کی تصدیق کرتے ہیں۔'' تو یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ گائے پر نہ بوجھ لادا جاسکتا ہے اور نہ اس پر سوار ہوا جاسکتا ہے، بلکہ وہ ہل جوتنے کے لئے، کھانے کے لئے، نسل کشی کے لئے اور دودھ دینے کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جانوروں کے ساتھ سفر کرنا اور ان پر بوجھ لادنا جائز ہے، لیکن اتنی مقدار میں جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں، بوجھ حد سے بڑھا ہوا نہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ چال میں نرمی ہو (3)۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نرمی برتنے، انہیں راحت اور سکون پہنچانے اور ان کے چارے اور ان کے پانی کو تلاش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے (4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم خوشحالی (اور شادابی) میں سفر کرو تو اپنے اونٹ کو زمین سے اس کا حصہ دو (یعنی اسے چرنے دو) اور جب تم قحط سالی میں سفر کرو تو پھر اسے اس کی منزل پر پہنچانے میں جلدی کرو۔'' اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں ابوعبید سے اور انہوں نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے۔ اور معاویہ بن قرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا ایک اونٹ تھا اس کو دمون کہا جاتا تھا، تو آپ اسے کہتے تھے: اے دمون! تو اپنے رب کے پاس میرے ساتھ جھگڑا نہ کرنا۔ پس جانور تو گونگے (بے زبان) ہیں یہ اس کی قدرت نہیں رکھتے کہ وہ بذات خود اس شے کا حیلہ کریں جس کے وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1143 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

محتاج ہوتے ہیں، اور نہ وہ یہ قدرت رکھتے ہیں کہ وہ اپنی حاجات کو کھلے بیان کر سکیں، پس جس نے ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا پھر اس نے ان کی ضروریات و حاجات کو ضائع کر دیا تو اس نے شکر ضائع کر دیا اور خصومت کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوگی۔ اور مطر بن محمد نے بیان کیا ہے، ابو داؤد نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا ہمیں ابن خالد نے بیان کیا اس نے کہا ہمیں مسیب بن آدم نے بیان کیا اس نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا آپ نے ایک ساربان کو مارا اور فرمایا: تو اپنے اونٹ پر اتنا بوجھ لادتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا......؟

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑧

''اور اس نے پیدا کئے گھوڑے اور خچر اور گدھے تا کہ تم ان پر سواری کرو اور (تمہارے لئے ان میں) زینت ہے اور پیدا فرمائے گا ایسی سواریوں کو جو تم نہیں جانتے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَّالْخَيْلَ یہ نصب کے ساتھ ہے اور معطوف ہے، یعنی و خلق الخیل (اور اس نے گھوڑے پیدا کئے) اور ابن ابی عبلہ نے وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ ان تمام کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور گھوڑے کو خیل کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کی چال میں اکڑ اور تکبر ہوتا ہے۔ اور خیل کا واحد خائل ہے، جیسا کہ ضائن، ضأن کا واحد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا کوئی واحد نہیں۔ اور یہ پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے، اور ہم نے وہاں احادیث ذکر کی ہیں۔ اور جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا الگ ذکر کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ الانعام کے تحت داخل نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے تحت داخل ہیں لیکن انہیں الگ اور منفرد اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رکوب (سوار ہونا) ان کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، کیونکہ یہ عمل گھوڑوں، خچروں اور گدھوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں جانوروں اور چوپاؤں کا مالک بنایا ہے اور انہیں ہمارے لئے مطیع کر دیا ہے، اور ہمارے لئے انہیں مسخر کرنا اور ان سے نفع اٹھانا مباح قرار دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے رحمت ہے، اور حیوانوں میں سے جس کا انسان مالک ہے اسے مسخر کرنا (مطیع بنانا) اس کے لئے جائز ہے اور اس کو کرائے پر دینا بھی اس کے لئے جائز ہے اس پر اہل علم کا اجماع ہے، ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اونٹوں اور چوپاؤں کے کرائے کا حکم کتب فقہ میں مذکور ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جانوروں اور اونٹوں پر بوجھ لادنے اور ان کے ساتھ سفر کرنے کے لئے ان کا کرایہ لینے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ الآیہ۔ اور علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ ایک آدمی اپنا جانور اور سواری (اونٹ) ایک معین شہر تک کرائے پر دے اگرچہ وہ یہ ذکر نہ کرے کہ وہ کہاں اس سے اترے گا، اور کتنے گھاٹ ہیں جن پر وہ (اسے پانی پلانے کے لئے) اترے گا، اور اس کے چلنے کی رفتار کیسے ہوگی، اور کتنی بار وہ اپنے راستے میں اترے گا، اور انہوں نے اس بارے میں اس کی اجازت دی ہے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ ہمارے علماء نے کہا

ہے: اور کرائے پر دینا قائم مقام بیوع (خرید وفروخت) کے ہوتا ہے ان چیزوں میں جو حلال ہوتی ہیں اور حرام ہوتی ہیں (یعنی حلال وحرام ہونے میں حکم بیوع کا ہے جن کی بیع حلال ہے انہیں اجرت پر دینا بھی حلال ہے اور جن کی بیع حرام ہے انہیں اجرت پر دینا بھی حرام ہے۔) ابن القاسم نے کہا ہے: جس کسی نے جانور ایک معین جگہ تک ہروی کپڑے کے عوض کرائے پر لیا اور کپڑے کی اصل حقیقت (کوالٹی) اور اس کی پیائش بیان نہ کی، تو یہ جائز نہیں، کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بیع میں اسے جائز قرار نہیں دیتے، اور وہ کرائے کے ثمن میں جائز قرار نہیں دیتے ہیں مگر وہی چیز جو بیع کے ثمن میں جائز ہوتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ، کیونکہ یہ اجارہ ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم میں سے وہ جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے کوئی جانور کرائے پر لیا تاکہ وہ اسے اس پر دس قفیز گندم لادے گا پس اس نے اس پر اتنا بوجھ ہی لادا جس کی شرط لگائی پھر وہ جانور ضائع ہو گیا، ہلاک ہو گیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اس نے اس پر دس قفیز جو لاد دیئے۔ اور انہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے جانور کرائے پر لیا کہ وہ اس پر دس قفیز لادے گا پھر اس نے اس پر گیارہ قفیز لاد دیئے، تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو ثور رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں کہتے ہیں: وہ جانور کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس پر کرایہ بھی ہوگا۔ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے: اس پر اس کی قیمت ہوگی اور اس پر اجرت نہ ہوگی۔ اور اس میں تیسرا قول یہ ہے...... کہ اس پر کرایہ ہوگا اور اس پر اجرت میں سے ایک جز ہوگا اور جانور کی قیمت میں سے اس مقدار کے عوض ایک جز ہوگا جتنی مقدار معینہ بوجھ سے زائد لادی اور یہ حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ، یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس پر کوئی ضمان نہ ہوگی جبکہ زائد قفیز جانور کے لئے باعث مشقت نہ ہو، اور یہ معلوم ہو کہ اس کی مثل سے جانور ہلاک نہیں ہوسکتا، اور جانور کے مالک کے لئے پہلے کرائے کے ساتھ ساتھ زائد قفیز کی اجرت بھی ہوگی، کیونکہ اس کا ہلاک ہونا اس زیادتی کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور یہ مسافت میں مقررہ حد سے تجاوز کر جانے کے خلاف ہے، کیونکہ مسافت میں تجاوز کرنا مکمل طور پر تعدی اور زیادتی ہے لہٰذا وہ ضامن ہوگا جب جانور ہلاک ہو جائے چاہے وہ تجاوز قلیل مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں۔ اور مشروط بوجھ پر زیادتی میں اجازت اور تعدی دونوں چیزیں جمع ہیں، پس جب زیادتی ایسی ہے جس کی مثل سے جانور کی ہلاکت نہیں ہوسکتی تو اس سے معلوم ہو گیا کہ اس کی ہلاکت اس سے ہوئی جس کی اجازت دی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اور اہل علم نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو معلوم اجرت کے عوض مقررہ جگہ تک ایک جانور کرائے پر لیتا ہے، پھر وہ تعدی کرتا ہے اور اس مقررہ جگہ سے تجاوز کر جاتا ہے پھر لوٹ کر اس جگہ کی طرف آتا ہے جس کی اجازت دی گئی ہے (تو) اس کی طرف لوٹنے میں اختلاف ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب اس نے اس معین جگہ سے تجاوز کر لیا تو وہ اس کا ضامن ہو گیا اور اس تعدی میں اس پر کرایہ نہیں ہوگا؛ اسی طرح ثوری نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس کے لئے مقررہ مسافت کی اجرت ہوگی، اور جو مقرر نہیں اس کی اجرت نہ ہوگی، لیکن چونکہ اس نے (وعدہ کا) خلاف کیا ہے لہٰذا وہ ضامن ہوگا، اور یہی یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

ہے: اس پر اس کا کرایہ ہوگا جو مسافت مقرر تھی، اور اس کا کرایہ مثلی ہوگا جتنا اس نے تجاوز کیا، اور اگر جانور ہلاک ہو گیا تو اس کی قیمت لازم ہوگی، اسی طرح فقہائے سبعہ نے کہا ہے، اہل مدینہ کے مشائخ نے کہا ہے: جب وہ مقررہ مسافت تک پہنچ جائے پھر اس سے آگے نکل جائے تو اس پر اس زائد مسافت کا کرایہ ہوگا اگر وہ جانور محفوظ رہا اور اگر وہ ہلاک ہو گیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اور امام احمد، اسحاق اور ابوثور نے کہا ہے: اس پر کرایہ اور ضمان دونوں ہوں گے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی ہم بھی کہتے ہیں۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: جب وہ اس جگہ کی حد تک پہنچ جائے جہاں تک اس نے جانور کرائے پر لیا تھا پھر وہ ایک میل یا کئی میل یا بہت زیادہ آگے گزر گیا اور جانور ہلاک ہو گیا، تو اس کے مالک کے لئے پہلا کرایہ ہوگا اور جہاں تک وہ زائد آگے چلا گیا ہے اس کا کرایہ لینے میں اسے اختیار ہوگا یا پھر جانور کی وہ قیمت لے لے جو تعدی اور زیادتی بنتی ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: تحقیق یہ بھی روایت ہے کہ وہ اس کا ضامن ہوگا اگرچہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھے۔

ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے میل اور اس طرح کے پیمانے کی زیادتی کی صورت میں کہا ہے: اور رہی وہ مسافت (زیادتی) جس کو لوگ ایک مرحلہ کے برابر قرار دیتے ہیں تو وہ ضامن نہ ہوگا۔ اور ابن حبیب نے ابن ماجشون اور اصبغ سے بیان کیا ہے: جب زیادتی تھوڑی ہو یا وہ اس مقررہ حد سے تھوڑا سا تجاوز کر جائے جو اس نے کرایہ پر لی تھی اور وہ مر جائے یا اس جگہ تک پہنچنے والے راستے میں مر جائے جہاں تک اس نے اسے کرائے پر لے رکھا تھا، تو اس کے لئے زیادتی کے کرائے کے سوا کچھ نہیں ہوگا، جیسا کہ اس کا اس مال کو لوٹانا جو اس نے ودیعت سے قرض لے رکھا تھا۔ اور اگر اس نے بہت زیادہ زیادتی کی جس میں اتنے زیادہ دن ٹھہرا اور رہا جس کی مثل میں اس کی چال بدل سکتی ہے تو وہ ضامن ہوگا، اسی طرح حکم ہے اگر جانور مقررہ حد سے تجاوز کرنے یا سفر کرنے کے درمیان مر گیا، کیونکہ جب زیادتی اتنی تھوڑی ہو جس کے بارے یہ جانا جا سکتا ہو کہ یہ اس کے قتل پر معاون و مددگار نہیں ہے اور اس کی ہلاکت معینہ جگہ تک واپس لوٹنے کے بعد ہوئی تو یہ بالیقین اس مال کی ہلاکت کی طرح ہے جو اس نے مال ودیعت سے قرض لیا تھا اور اس کے لوٹانے کے بعد وہ ہلاک ہو گیا۔ اور اگر زیادتی زیادہ ہو تو پھر وہ زیادتی اس کے قتل اور ہلاک ہونے میں معاون ہوگی۔ (لہٰذا اس پر ضمان ہوگی۔)

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن القاسم اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً** پس اس نے انہیں سواری اور زیب و زینت کے لئے بنایا ہے اور انہیں کھانے کے لئے نہیں بنایا ہے؛ اور اسی طرح اشہب سے بھی منقول ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے سواری اور زیب و زینت پر نص بیان کر دی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ جو اس کے سوا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اور الانعام کے ذکر میں فرمایا: **وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ۝** (النحل) اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سے گرم لباس اور دیگر منافع کے ذکر کے ساتھ بھی احسان فرمایا۔ پس ان میں ذبح کو مشروع قرار دے کر ان کا کھانا ہمارے لئے مباح قرار دیا۔ اور اسی آیت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حکم بن عتیبہ نے استدلال کیا ہے، حکم نے کہا ہے: گھوڑوں کا گوشت کتاب اللہ میں حرام ہے، اور انہوں نے یہ اور اس سے پہلے والی آیت پڑھی اور کہا: یہ

کھانے کے لئے ہے اور یہ سواری کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے گھوڑے کے گوشت کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے اسے مکروہ قرار دیا، اور آپ نے یہی آیت تلاوت کی اور فرمایا: یہ سواری کے لئے ہے، اور آپ نے وہ آیت پڑھی جو اس سے پہلے ہے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ پھر فرمایا: یہ کھانے کے لئے ہے۔ اور اسی طرح امام مالک، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، اوزاعی، مجاہد اور ابو عبید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے کہا ہے، اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد، نسائی اور دارقطنی وغیرہم نے صالح بن یحییٰ بن مقدام بن معدیکرب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کے دن گھوڑوں، خچروں، گدھوں، تمام چیر پھاڑ کرنے والے درندوں اور پنجوں کے ساتھ شکار کرنے والے پرندوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا (1)۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔

اور نسائی نے بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانا حلال نہیں ہے۔'' اور جمہور فقہاء و محدثین نے کہا ہے: یہ مباح ہے۔ اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور ایک گروہ علیحدہ ہو گیا ہے اور اس نے تحریم کا قول کیا ہے، ان میں سے ایک حکم ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ ان سے تین روایات رویانی نے ''بحر المذہب علی مذہب الشافعی'' میں بیان کی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح مذہب جس پر نظر و فکر اور خبر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز ہے، اور رہی آیت اور حدیث تو ان دونوں میں حجت لازمہ نہیں ہے، جہاں تک آیت کا تعلق ہے تو اس میں گھوڑوں کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اگر آیت اس پر دلالت کرے تو پھر یقیناً گدھوں کے گوشت کے حرام ہونے پر بھی دلالت کرے، اور یہ سورۃ مکی ہے، اور پھر کون سی حاجت اور ضرورت تھی کہ غزوہ خیبر کے سال گدھوں کے گوشت کو حرام قرار دینے کی تجدید ہوئی حالانکہ اخبار میں گھوڑوں کا حلال ہونا ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان آرہا ہے، اور یہ بھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے الانعام کا ذکر کیا، تو ان کے اغلب اور اہم ترین منافع کا بھی ذکر کیا، اور وہ بوجھوں کو اٹھانا اور (ان کا گوشت) کھانا ہے، اور ان کے ساتھ سوار ہونے اور ہل جوتنے کا ذکر نہ کیا اور نہ علاوہ ازیں کسی کی تصریح کی، حالانکہ ان پر سوار بھی ہوا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہل بھی چلایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (غافر) اور گھوڑوں کے بارے میں فرمایا: لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً اور ان کے بھی اغلب منافع ذکر کئے اور جو ان سے مقصود ہے وہ ذکر کیا، اور ان پر بوجھ لادنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ ان پر لادا جاتا ہے جیسا کہ عام مشاہدہ ہے اور اسی طرح ان کے کھانے کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت کی جسے اس کا بیان بنایا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل لحوم الخیل، حدیث نمبر 3296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً سنن ابن ماجہ، باب لحوم البغال، حدیث نمبر 3188، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس سے کہ انہیں سواری اور زیب و زینت کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہ لازم نہیں آتا کہ انہیں نہ کھایا جائے، پس اس گائے کو اس کے اس خالق نے قوت گویائی عطا فرمائی جس نے ہر شے کو بولنے کی طاقت دی پس اس نے کہا: بے شک اسے ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے اس پر یہ لازم آتا ہے جس نے یہ علت بیان کی ہے کہ گھوڑوں کا گوشت نہیں کھایا جائے گا کیونکہ انہیں سواری کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ گائے کا گوشت بھی نہ کھایا جائے کیونکہ اسے ہل جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

حالانکہ مسلمانوں نے اس کے کھانے کے جواز پر اجماع کیا ہے، پس اسی طرح گھوڑے بھی ہیں اور ان کے بارے سنت ثابتہ موجود ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑوں کے گوشت کے بارے میں اجازت عطا فرمائی (1)۔ اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خیبر کے دن گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور آپ نے گدھوں کے گوشت سے ہمیں منع فرمایا (2)۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے اسے خیبر کے دن کھایا یہ حال کی حکایت ہے اور آنکھوں دیکھا فیصلہ ہے، پس اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ضرورت کے تحت ذبح کئے ہوں، اور مخصوص احوال کے تحت جو فیصلے کئے جائیں ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا (3)۔ تو ہم کہیں گے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے اور آپ کی جانب سے یہ خبر دی جا رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں گھوڑوں کا گوشت کھاتے تھے اور یہ اس احتمال کو زائل کر دیتا ہے، اور اگر ہم اسے تسلیم کر بھی لیں تو ہمارے پاس حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں گھوڑا ذبح کیا اس حال میں کہ ہم مدینہ طیبہ میں تھے (4) اور ہم نے اسے کھایا؛ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور نص کے مقابلہ میں بغیر ترجیح کے ہر تاویل بلاشبہ وہ دعویٰ ہوتا ہے، پس نہ اس کی طرف توجہ کی جائے گی اور نہ اس کی طرف مائل ہوا جائے گا۔ اور دارقطنی نے حدیث اسماء رضی اللہ عنہا میں حسین زیادتی روایت کی ہے جس پر ہر تاویل رفع ہو جاتی ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ایک گھوڑا تھا وہ مرنے کے قریب ہو گیا تو ہم نے اسے ذبح کر دیا اور پھر ہم نے اسے کھایا۔ پس اسے ذبح کرنا اس پر طاری ہونے والی موت کے خوف سے ہوا نہ کہ احوال میں سے کسی اور حاجت اور حالات کے سبب۔ وباللہ التوفیق۔

اور اگر کہا جائے: یہ حیوان ہے جو کھروں والا ہے پس اسے نہیں کھایا جائے گا جیسا کہ گدھے؟ تو ہم کہیں گے: یہ قیاس الشبہ ہے اور ارباب اصول نے اس کے بارے گفتگو میں اختلاف کیا ہے اور اگر ہم اسے تسلیم کر لیں تو پھر یہ خنزیر کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سینگوں والا ہے حالانکہ سینگوں والے جدا جدا ہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ قیاس جب نص کے مقابلہ میں ہو تو وہ وضعاً ہی فاسد ہے لہٰذا وہ قابل التفات نہیں ہوگا۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ہے اس پر اجماع ہے کہ جن کے کھانے کا ذکر کیا گیا ہے ان پر سوار ہونا جائز ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ جن کے لئے سواری کا ذکر کیا گیا ہے انہیں کھانا بھی جائز ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، باب اکل لحوم الخیل، جلد 2، صفحہ 150
2۔ جامع ترمذی، کتاب الصید، باب اکل لحوم الخیل، جلد 2، صفحہ 1
3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1144
4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 77

**مسئلہ نمبر 6**۔ اور رہے خچر تو انہیں گدھوں کے ساتھ ملایا جاتا ہے، اگر ہم کہیں کہ بے شک گھوڑا کھایا جاتا ہے، تو یہ (خچر) دو عینوں سے پیدا ہوتا ہے جو دونوں نہیں کھائے جاتے (یعنی گھوڑا اور گدھا) اور اگر ہم کہیں کہ گھوڑا کھایا جاتا ہے، تو بے شک یہ (خچر) ایسے دو عینوں سے پیدا ہوتا ہے جن میں سے ایک (گھوڑا) کھایا جاتا ہے اور دوسرا (گدھا) نہیں کھایا جاتا۔ پس اصول قاعدہ کے مطابق اس پر تحریم غالب ہوگی (1)۔ اور اسی طرح جب دو کافروں کے درمیان سے پیدا ہونے والا بچہ کسی جانور کو ذبح کرے ان (کافروں) میں سے ایک کا ذبیحہ حلال ہو اور دوسرا اس اہل نہ ہو، تو اس کا ذبح کرنا درست نہیں ہوگا اور اس کے سبب اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ اور گدھوں کی تحریم کے بارے میں کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور گدھا کھانے کے حرام ہونے کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کر دیا ہے جس وقت وہ مذکر (یعنی اپنے جیسے گدھے) پر کود پڑا اور اس نے لواطت کی، پس اسے رجس (پلید) کا نام دے دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ آیت میں اس پر دلیل ہے کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ الله سبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر ان چیزوں کے ساتھ احسان فرمایا جو اس نے ہمارے لئے مباح فرمائیں اور ہمیں ان کے منافع سے عزت وتکریم عطا فرمائی، تو پھر یہ جائز نہیں کہ ان میں کوئی تکلیف اور مشقت بغیر دلیل کے لازم ہو۔ تحقیق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالله بن دینار سے انہوں نے سلیمان بن یسار سے انہوں۔ نے عراک بن مالک سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان پر اس کے غلام میں اور اس کے گھوڑے میں کوئی صدقہ نہیں ہے (2)''۔ اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''گھوڑوں اور غلاموں میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے مگر غلام میں صدقۃ الفطر ہے (3)''۔ اور یہی امام مالک، امام شافعی، اوزاعی، لیث، ابو یوسف اور امام محمد رحمہم الله تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ الله تعالیٰ نے بیان کیا ہے: اگر یہ سارے مونث (گھوڑیاں) ہوں یا مذکر اور مونث ملے جلے ہوں، تو پھر ہر گھوڑے میں ایک دینار ہے جبکہ وہ چرنے والے ہوں، اور اگر چاہے تو وہ اس کی قیمت لگا لے اور پھر ہر دو سو درہم سے پانچ درہم ادا کرے۔ اور انہوں نے ایک اثر جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چرنے والے گھوڑوں میں سے ہر گھوڑے میں ایک دینار ہے (4)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''گھوڑے تین قسم کے ہیں (5)　''الحدیث۔ اور اس میں ہے: ''اور وہ ان کی گردنوں اور ان کی پشتوں میں الله تعالیٰ کا حق نہ بھولے (6)''۔

پہلی روایت کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو غورک سعدی کے سوا کسی نے جعفر بن محمد عن أبیہ عن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نہیں کیا۔ اور دار قطنی نے کہا ہے: جعفر سے روایت کرنے میں غورک منفرد ہے اور وہ بہت ضعیف ہے، اور اس کے نیچے بھی ضعفاء ہیں۔ اور رہی وہ حدیث جس میں حق کا ذکر کیا گیا تو وہ ان پر نکلنا ہے جب عام اعلان جنگ ہو جائے اور دشمن کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1145　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1146

3۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب صدقۃ الرقیق، حدیث نمبر 1359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

قتال کے لئے وہ متعین ہوجائیں جب وہ تعین اس پر ہوگیا اور وہ (لشکر سے) کٹ جانے والوں کو اس پر اٹھانے لگے جبکہ انہیں اس کی ضرورت ہو، تو اب اس پر یہ واجب ہوگیا جب یہ تعین ہو چکا، جیسا کہ اس پر متعین ہوجاتا ہے کہ وہ انہیں ضرورت کے وقت چارہ وغیرہ کھلائے، تو یہی ان کی گردنوں (ذاتوں) میں اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ اور اگر کہا جائے: یہ تو وہ حق ہے جو ان کی پشتوں میں ہے اور وہ حق باقی رہا جو ان کی گردنوں میں ہے۔ تو کہا جائے گا: تحقیق روایت یہ ہے لاینسی حق اللہ فیھا، تو آپ کے ارشاد حق اللہ فیھا اور فی رقابھا و ظھورھا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ معنی ایک ہی شے کی طرف لوٹ رہا ہے، کیونکہ حق ان کے سارے بدن کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اور تحقیق علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک یہاں حق سے مراد ان کی ملکیت کا حسن اور ان کے سیر ہونے (پیٹ بھرنے) کی دیکھ بھال کرنا، اور ان کے ساتھ اچھا اور خوبصورت سلوک کرنا، اور بغیر کسی مشقت کے ان پر سواری کرنا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تم ان کی پشتوں کو کرسیاں نہ بناؤ۔'' ان کی گردنوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ حقوق لازمہ اور فرائض واجبہ کے مقامات میں کثرت سے رقاب اور اعناق مستعار لی جاتی ہیں اور اسی سے یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء: 92) (پس مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔) اور عربوں کے نزدیک ان کا استعمال اور ان کا استعارہ کثیر ہے حتیٰ کہ انہوں نے اسے خوشحالی اور اموال میں بھی ذکر کیا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کثیر لوگوں کا یہ قول ہے:

غمر الرداء اذا تبسم ضاحکا غَلِقَتْ لِضَحْکَته رِقابُ المال

اور یہ بھی کیونکہ وہ حیوان جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کا نصاب اس کی جنس سے ہوتا ہے، تو جب گھوڑے اس سے خارج ہیں تو ہم نے جان لیا کہ ان میں زکوٰۃ ساقط ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی کہ صرف ان کی مونثات (گھوڑیوں) میں زکوٰۃ واجب کرنا بغیر مذکروں (گھوڑوں) کے تو یہ بھی ان کی طرف سے تناقض ہے حالانکہ حدیث میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اور ہم صدقہ وزکوٰۃ کی نفی میں مؤنثوں کو مذکروں پر قیاس کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ حیوان اپنی نسل کی حفاظت کے لئے رہیں نہ کہ دودھ کے لئے، اور اس کے مذکروں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لہٰذا اس کے مؤنثوں میں بھی واجب نہ ہوگی جیسا کہ خچر اور گدھے ہیں۔

اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس کی مؤنثوں میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اگرچہ وہ منفرد ہوں جیسا کہ اس کے مذکروں میں واجب نہیں ہوتی درآنحالیکہ وہ منفرد ہوں۔ یہی وہ مذہب ہے جس پر جمہور ہیں۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: گھوڑوں کی زکوٰۃ کے بارے میں جو خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حدیث زہری وغیرہ سے صحیح ہے۔ اور حدیث مالک سے مروی ہے، اسے ان سے جویریہ نے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت سائب بن یزید نے کہا: تحقیق میں نے اپنے باپ کو دیکھا وہ گھوڑوں کی قیمت لگاتے پھر ان کی زکوٰۃ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیتے۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے شیخ حماد بن ابی سلیمان رحمہم اللہ تعالیٰ کی حجت ہے، میں فقہائے امصار میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے ان دو کے سوا گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب کی ہو۔ اس کو روایت کرنے میں جویریہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** قولہ تعالیٰ: وَ زِيْنَةً یہ اضمار فعل کے ساتھ منصوب ہے، اس کا معنی ہے: وجعلها زينة (اور اس نے انہیں زینت (اور خوبصورتی) بنایا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے۔ اور الزينة سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ تزئین اور خوبصورتی حاصل کی جاتی ہے، اور یہ حسن و جمال اور زیب و زینت ہیں اگرچہ سامان دنیا میں سے ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس میں اجازت عطا فرمائی ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اونٹ اپنے مالکوں کے لئے عزت ہے اور بکری برکت ہے اور گھوڑے کی پیشانی میں خیر اور بھلائی ہے (1)''۔ اسے برقانی اور ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور سورۃ الانعام میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزت کو اونٹ میں جمع کیا ہے، کیونکہ اس میں لباس، کھانا، دودھ، بوجھ اٹھانا، اور جنگ میں شریک ہونا بھی امور ہیں اور اگرچہ حملہ اور فرار ہونا اسے نقصان پہنچائے اور آپ نے برکت بکریوں میں رکھی ہے اس لئے کہ ان میں لباس، کھانا، پینا اور کثرت اولاد ہے، کیونکہ یہ ایک سال میں تین بار بچے جنتی ہیں یہاں تک کہ سکون اور راحت ان کے پیچھے پیچھے ہوتی ہے اور یہ اپنے مالک کو اس پر پر جھکانے اور پہلو نرم کرنے کے بارے ابھارتی ہیں، بخلاف خیموں میں رہنے والے ان لوگوں کے جن کے پاس اونٹ کثیر مقدار میں ہوتے ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر اور بھلائی کو گھوڑوں کی پیشانیوں کے ساتھ ملا دیا ہے جب تک زمانہ باقی ہے کیونکہ ان میں ایسے فوائد اور منافع ہیں جو کسب اور معاش کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں، اور جو دشمنوں کے قہر اور کافروں کے غلبہ اور اعلاء کلمۃ اللہ تعالیٰ میں سے اس تک پہنچاتے ہیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جمہور نے کہا ہے: وہ پیدا فرمائے گا مخلوق سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ زمین خشکی اور تری کی نچلی تہوں میں کیڑے مکوڑوں اور دیگر موذی جانوروں کی اتنی اقسام پیدا فرمائے گا جن کو کسی انسان نے نہ دیکھا ہے اور نہ اس کے بارے سنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ان میں سے وہ نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے اہل کے لئے اور جہنم میں اس کے اہل کے لئے تیار کی ہیں، ان میں سے جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے اس کے بارے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں اس کا تصور تک نہیں آیا۔ حضرت قتادہ اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد کپڑوں میں سوس (گھن) اور پھلوں میں کیڑوں کو پیدا کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد عرش کے نیچے چشمہ پیدا کرنا ہے، اسے ماوردی نے بیان کیا ہے (3)۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرش کی دائیں جانب نور کی ایک نہر ہے جو سات آسمانوں، سات زمینوں، اور سات سمندروں کے ستر بار ہونے کی مثل ہے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر سحری کے وقت اس میں داخل ہو کر غسل کرتے ہیں اور اس کے نور سے اپنے نور میں، اس کے حسن و جمال سے اپنے حسن و جمال میں اور اس کی عظمت و بڑائی سے اپنی بڑائی میں اضافہ کرتے ہیں، پھر پروں کو جھاڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر پر سے ستر ہزار قطرے نکالتا ہے، اور ہر قطرے سے ستر ہزار فرشتے پیدا فرماتا ہے، ان میں سے ہر روز ستر ہزار فرشتے بیت

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1142۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب اتخاذ الماشیۃ، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً

3۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181

المعمور میں، اور کعبہ معظمہ میں ستر ہزار داخل ہوتے ہیں اور پھر یوم قیامت تک اس کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

اور پانچواں قول یہ ہے...... اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "وہ سفید زمین ہے، سورج کی مسافت تیس دنوں کی ہے وہاں ایک مخلوق پیدا فرمائے گا وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے" (1)۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا وہ آدم کی اولاد سے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: "وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے"۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو ان میں سے ابلیس کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا ہے"...... پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی **وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں، اسی معنی کی طرح وہ ہے جسے علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: بے شک اندلس سے اتنا پرے اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جتنا ہمارے اور اندلس کے درمیان فاصلہ ہے، وہ نہیں جانتے کہ مخلوق نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے، ان کے سنگریزے موتی اور یاقوت کے ہیں اور ان کے پہاڑ سونے اور چاندی کے ہیں، نہ وہ ہل چلاتے ہیں، نہ وہ کاشتکاری کرتے ہیں اور نہ کوئی اور کام وہ کرتے ہیں، ان کے درخت ان کے دروازوں پر ہیں ان کے ساتھ پھل ہیں اور یہی ان کا طعام اور کھانا ہے ان کے کچھ درخت ہیں ان کے پتے چوڑے چوڑے ہیں اور وہی ان کا لباس ہیں؛ انہوں نے اسے "کتاب الاسماء والصفات" کے باب بدء الخلق میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت موسیٰ بن عقبہ کی حدیث ذکر کی ہے جو انہوں نے محمد بن منکدر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے حاملین عرش ملائکہ میں سے کسی فرشتے سے گفتگو کروں جس کے کان کی لو سے لے کر اس کے کندھے تک سات سو سال کی مسافت ہے"۔ (3)

**وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹**

"اور اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے راہ راست کو دلائل سے واضح کرنا اور ان میں غلط راہیں بھی ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

قولہ تعالیٰ: **وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ** یعنی راہ راست کا بیان اور وضاحت اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے، اس کلام میں مضاف محذوف ہے اور وہ بیان ہے۔ اور **السَّبِيْلِ** سے مراد اسلام ہے یعنی رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور دلائل و براہین کے ساتھ اس کی وضاحت کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔ اور **قَصْدُ السَّبِيْلِ** سے مراد سیدھی راہ ہے؛ کہا جاتا ہے: طریق قاصد یعنی وہ راستہ جو مطلوب اور منزل تک پہنچانے والا ہو۔ **وَ مِنْهَا جَآىِٕرٌ** ای و من السبیل جائر، یعنی ایسے راستے بھی ہیں جو حق سے پھرنے والے ہیں پس ان سے ہدایت اور راہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اور اسی سے امرء القیس کا قول ہے:

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181　2۔ ایضاً　3۔ سنن ابی داؤد، باب فی الجھمیۃ، حدیث 4102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و من الطریقة جائر و هُدًی　　قَصْد السبیل و منه ذودَخَل

اور طرفہ نے کہا ہے:

عَدَوْلِیَّةٌ أو من سَفِین ابن یَامِنٍ　　یَجُور بها المَلّاح طَوْرًا و یَهتَدِی

اس میں العدولیة کشتی ہے جو عَدَوْلی کی طرف منسوب ہے اور یہ بحرین کا ایک گاؤں ہے اور العدولی سے مراد ملاح ہے؛ یہ صحاح میں ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (الانعام: 153) (اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی)۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے و منهم جائر عن السبیل الحق،(1) یعنی ان میں سے راہ حق سے پھرنے والے بھی ہیں پس اس کی طرف راہنمائی نہیں پائی گئی۔ اور ان کے بارے میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مختلف خواہشات رکھنے والے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول ہے...... وہ مِلَل الکفر ہیں مثلاً یہودیت، مجوسیت اور عیسائیت۔ اور مصحف حضرت عبداللہ میں و مِنکم جائر ہے اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے و مِنکم کاف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے و عنها جائر ای عن السبیل (یعنی راستے سے پھرنے والے۔) پس مِنْ بمعنی عن ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرمائے تو اس کے لئے ایمان کا راستہ سہل اور آسان کر دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرمائے تو اس پر ایمان اور اس کے احکام ثقیل اور بھاری کر دیتا ہے۔ (من اراد الله ان یهدیه سهل له طریق الایمان، و من اراد أن یضله ثقل علیه الایمان و فروعه)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَصْدُ السَّبِیْلِ کا معنی ہے تمہارا چلنا اور تمہارا لوٹنا۔ اور السبیل واحد ہے لیکن جمع کے معنی میں ہے، اسی لئے ضمیر مؤنث لائی گئی ہے اور فرمایا: وَ مِنْهَا اور لغت اہل حجاز کے مطابق سبیل مؤنث ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ یہ بیان فرمایا کہ مشیت اللہ تعالیٰ کیلئے ہی ہے، اور یہ اس موقف کو صحیح قرار دے رہا ہے جو آیت کی تاویل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اختیار کیا ہے، اور یہ قدریہ اور ان کے موافق لوگوں کا رد کرتا ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لئے اس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے اور اس سے سبزہ اگتا ہے جس میں تم (مویشی) چراتے ہو۔''

شراب سے مراد وہ (پانی) ہے جسے پیا جاتا ہے، اور شجر کا معنی تو معروف ہے یعنی وہ بارشوں سے درخت، بیلیں اور سبزہ اگاتا ہے۔ اور تُسِیْمُوْنَ اور تم (اسے) اپنے اونٹوں کو چراتے ہو۔ کہا جاتا ہے: سامت السائمة تسوم سَوْمًا (یعنی چرنے والا جانور چرا) فهی سائمة اور السَّوَام اور السائم دونوں ہم معنی ہیں، اور وہ چرنے والا مال ہے۔ اور السائم اور السائمة کی

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 181

جمع سوائم ہے۔ اور أستھا أنا یعنی میں نے اسے چرنے کے لئے نکالا۔ پس میں مُسِیم ہوں اور وہ مُسامة اور سائمة ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا:

أَوْلٰی لَکَ ابنَ مُسِیمه الأجمال (تیرے لئے اونٹ چرانے والے کا بیٹا ہونا اولیٰ اور بہتر ہے)

اور السوم کا اصل معنی چراگاہ میں دور تک چلے جانا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ السومة سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی علامت ہے، یعنی یہ اپنے چرنے کے سبب زمین میں علامات اور نشانات چھوڑ جاتے ہیں یا یہ اس لئے ہے کیونکہ انہیں چراگاہ میں بھیجنے کے لئے نشانات لگائے جاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الخیل المسومة وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کو چرایا جاتا ہے اور وہ ہوتا ہے جس کو کوئی علامت اور نشان لگایا گیا ہوتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مُسَوِّمِیْنَ (آل عمران) اخفش نے کہا ہے: وہ ہوتے ہیں جنہیں نشان لگائے گئے ہوں اور وہ ہوتے ہیں جو چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: سوّم فیھا الخیل ای أرسلھا یعنی اس نے گھوڑا اس میں چھوڑ دیا، اور اسی سے السائمة (چرنے والا) ہے، بے شک یہ (جمع) یاء اور نون کے ساتھ آئی ہے کیونکہ گھوڑوں کو بھیجا گیا اس حال میں کہ ان پر ان کے سوار بھی تھے۔

**یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱**

"اگاتا ہے تمہارے لئے اس کے ذریعے (طرح طرح کے) کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور (ان کے علاوہ) ہر قسم کے پھل، یقیناً ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔"

قولہ تعالیٰ: **یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ** ابوبکر نے حضرت عاصم سے تعظیم کی بنا پر ننبت نون کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ عام قرأت یا کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے ینبت اللہ لکم (یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اگاتا ہے)۔ کہا جاتا ہے: نبتت الأرض و أنبتت یہ دونوں ہم معنی ہیں (زمین نے اگایا)، اور نبت البقل و أنبت یہ دونوں ایک معنی میں ہیں (یعنی سبزی اگی)۔ اور فراء نے شعر کہا ہے:

رأیتُ ذوِی الحاجات حول بیوتھم قَطِینا بھا حتی اذا أنبت البقلُ

اس میں أنبت بمعنی نَبَتَ ہے۔ اور أنبتہ اللہ فھو منبوت (اللہ تعالیٰ نے اسے اگایا پس وہ اگ گئی)، تو یہ خلاف قیاس ہے۔ اور أنبت الغلام یعنی بچے کے زیر ناف بال نکل آئے۔ اور نَبَّتَ الشجر غرسه (اس کے درخت لگانے نے درخت کو اگایا)۔ کہا جاتا ہے: نَبِّتْ أجلك بین عینیك (تو اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ)۔ اور نَبَّتَ الصبی تنبیتا یعنی تو نے بچے کی پرورش اور تربیت کی۔ اور المنبت سے مراد سبزہ اگنے کی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ما أحسن نابتة بنی فلان یعنی اس پر ان کے اموال اور ان کی اولاد بڑھ رہی ہے۔ اور نَبَتَتْ لھم نابتة جب ان کے چھوٹے بچے جوان ہو جائیں۔ اور ان

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 382

بنی فلان لنابتۃ شرّ (بے شک بنی فلاں شر پھیلا رہے ہیں) اور النوابت من الأحداث الأغمار (نوجوان بچے ناتجربہ کار ہیں)۔ اور النبیت یہ یمن کا ایک محلہ ہے۔ اور الینبوت، خشخاش کا پودا۔

یہ سب جوہری سے منقول ہے۔ وَالزَّیْتُوْنَ یہ زیتونۃ کی جمع ہے۔ اور نفس درخت کو بھی زیتونۃ کہا جاتا ہے اور پھل کو بھی زیتونۃ کہا جاتا ہے۔ پھلوں کی زکوٰۃ کا حکم سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ بے شک اس اترنے اور اگانے میں لَاٰیَۃً نشانی اور دلالت ہے۔ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے مسخر فرما دیا تمہارے لیے رات، دن، سورج اور چاند اور تمام ستارے بھی اس کے حکم کے پابند ہیں، بے شک ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی) کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو دانشمند ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے راحت و سکون پانے اور کام کرنے کے لئے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) (اور محض اپنی رحمت سے اس نے بنا دیا ہے تمہارے لئے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے) وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ یعنی یہ سب اوقات کو پہچاننے کے لئے، پھلوں اور کھیتوں کے پکنے کے لئے اور اندھیروں میں ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے مطیع کر دیئے گئے ہیں۔ اور [حضرت ابن عباس اور] ابن عامر اور اہل شام نے وَالشمسُ والقمرُ والنجومُ مسخراتٌ پڑھا ہے۔ یعنی یہ مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہیں۔ اور باقیوں نے ماقبل پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور حفص نے عاصم سے رفع کے ساتھ قرأت کی ہے یعنی وَالنُّجُوْمُ اور مُسَخَّرٰتٌ اس کی خبر ہے۔ اور والشمسَ وَالقمرَ والنجومَ کو اللیلَ والنھارَ پر عطف کرتے ہوئے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور والنجومُ کو مبتدا ہونے کی بنا پر رفع دیا گیا ہے۔ اور مسخراتٌ کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ھی مسخراتٌ اور یہ اسے منصوب پڑھنے والوں کی قرأت میں حال مؤکدہ ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا (یعنی اس میں مصدقا حال مؤکدہ ہے) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ بے شک ان تمام چیزوں میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان چیزوں کی عقل اور سمجھ رکھتی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کیا اور جس کی انہیں توفیق دی۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور (علاوہ ازیں) جو پیدا فرمایا تمہارے لئے زمین میں (اسے بھی مسخر کر دیا) الگ الگ ہے ان کا رنگ و روپ، یقیناً ان میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا ذَرَاَ یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ سب مسخر کر دیا جو زمین میں تمہارے لئے پیدا فرمایا اس میں ذَرَاَ بمعنی خلق ہے (یعنی پیدا فرمایا) ذَرَأَ اللّٰہُ الخلق یذرؤھم ذرءًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پس وہ ذَارِیٌ (پیدا کرنے والا) ہوا۔ اور اسی سے الذُّرِّیَّۃ ہے یعنی جن وانس کی نسل (اولاد) مگر عربوں نے اس کا ہمزہ چھوڑ دیا ہے اور اس کی جمع الذراری ہے۔ کہا جاتا ہے: أنمی اللہ ذرأك و ذروك یعنی اللہ تعالیٰ تیری ذریت کو بڑھائے (اس میں برکت دے) اور الذرو اور الذّرء کا اصل معنی جمع (اجتماع) سے متفرق اور علیحدہ ہونا ہے۔ اور حدیث میں ہے ذرء النار یعنی بے شک وہ جہنم کے لئے پیدا کئے گئے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ مسخر اور مطیع ہے مثلاً چوپائے، اونٹ اور دیگر حیوانات اور درخت وغیرہ، اور جو چیزیں ان کے سوا ہیں۔ اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کعب الاحبار سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: اگر وہ کلمات نہ ہوتے جو میں پڑھتا ہوں تو یقیناً یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔ تو ان سے پوچھا گیا: وہ کلمات کیا ہیں؟ تو انہوں نے کہا: أعوذ بوجہ اللہ العظیم الذی لیس شئ اعظم منہ، و بکلمات اللہ التامات التی لا یجاوزھن برٌّ ولا فاجر، و بأسماء اللہ الحسنی کلھا ما علمت منھا و ما لم اعلم، من شرّ ما خلق و برأ و ذرأ۔ اور اس میں یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت سفر پر لے جایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں میں سے ایک عفریت کو دیکھا کہ وہ آپ کو آگ کے شعلے کے ساتھ تلاش کر رہا ہے، الحدیث۔ اور اس حدیث میں ہے و شرّ ما ذرأ فی الارض (اور اس کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدا کیا ہے) ہم نے اس کا اور اس کی ہم معنی روایات کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اس میں مُخْتَلِفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اَلْوَانُهٗ سے مراد اس کی ہیئتیں اور اس کے مناظر ہیں، مراد چوپائے اور درخت وغیرہ ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ یعنی بے شک ان کے رنگ وروپ کے اختلاف میں لَاٰیَةً عبرت اور سبق ہے لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان بنائی ہوئی چیزوں کی تسخیر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر علامات اور نشانیاں ہیں اور یہ کہ اس کے سوا کوئی اور اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۴

''اور وہی ہے جس نے پابند حکم کر دیا ہے سمندر کو تاکہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت اور نکالو اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو کہ موجوں کو چیر کر جا رہی ہوتی ہیں سمندروں میں تاکہ (ان کے ذریعہ) تم تلاش کرو اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو تاکہ اس کا شکر ادا کرتے رہو۔''

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ سمندر کو مسخر کرنے کا معنی انسان کو اس میں تصرف کرنے کی قدرت

دیتا ہے اور اسے سوار ہونے اور پناہ لینے کے لئے مطیع کرتا ہے (1)، اور یہ ہم پر الله تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات میں سے بہت بڑی نعمت اور احسان ہے، پس اگر وہ چاہے تو اسے ہم پر مسلط کر دے اور ہمیں غرق کر دے۔ سمندر اور اس کے شکار کے بارے بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور یہاں اس کا نام لحم (گوشت) رکھا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گوشت تین جنس کے ہیں: پس چار پاؤں والے جانوروں کا گوشت ایک جنس ہے، پروں والوں کا گوشت ایک جنس ہے، اور پانی میں رہنے والوں کا گوشت ایک جنس ہے، پس ایک جنس کی بیع کرنا اپنی ہی جنس کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہے، اور گائے اور جنگلی جانور کے گوشت کی بیع کرنا پرندے اور مچھلی کے گوشت کے ساتھ یہ متفاضلا جائز ہے (یعنی دونوں عوض مقدار میں برابر نہ ہوں)۔ اور اسی طرح پرندے کے گوشت کی بیع کرنا گائے، جنگلی جانور اور مچھلی کے گوشت کے عوض متفاضلاً جائز ہوئی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تمام گوشت مختلف انواع کے ہیں جیسا کہ اس کے اصول مختلف ہیں، پس گائے کا گوشت ایک نوع ہے، بکری کا گوشت ایک نوع ہے، اور اونٹ کا گوشت الگ نوع ہے۔ اور اسی طرح جنگلی جانور بھی مختلف ہیں، اسی طرح پرندے ہیں اور اسی طرح مچھلیاں ہیں۔ اور امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ شتر مرغ، شکار، پرندہ اور مچھلی یہ سب ایک جنس ہے ان میں تفاضل جائز نہیں ہے۔ اور ان کے مذہب میں سے ان کے اصحاب کے نزدیک پہلا قول مشہور ہے۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ الله تعالیٰ نے جانوروں کے ناموں میں ان کی زندگی میں فرق رکھا ہے پس فرمایا: ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ (الانعام:143) (پیدا فرمائے) آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) پھر فرمایا: وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ (الانعام:144) (اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) پھر جب ان تمام سے گوشت کا قصد کیا تو فرمایا: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (المائدہ: 1) (حلال کئے گئے ہیں تمہارے لئے بے زبان جانور) اور انہیں ایک گوشت کے ساتھ جمع کر دیا ان کے منافع قریب قریب ہونے کی وجہ سے جیسا کہ بکری کے گوشت کے منافع اور بھیڑ کے گوشت کے منافع باہم متقارب ہیں۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ (الواقعہ) (اور پرندوں کا گوشت بھی جس کی وہ رغبت کریں گے) اور یہ اس طائر کی جمع ہے جو واحد ہے۔ کیونکہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (الانعام:38) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) پس تمام پرندوں کے گوشت کو ایک اسم کے ساتھ جمع کر دیا۔ اور یہاں فرمایا: لَحْمًا طَرِيًّا پس مچھلی کی تمام اقسام کو ذکر واحد کے ساتھ جمع کر دیا، پس گویا چھوٹی مچھلیاں بڑی مچھلیوں کی طرح ہیں (کیونکہ) اس جمع میں دونوں داخل ہیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ ان سے بکری اور مینڈھے کے گوشت کے بارے پوچھا گیا کیا وہ ایک ہی شے ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اور کسی نے آپ سے اختلاف نہیں کیا پس یہ اجماع کی مثل ہو گیا۔ والله اعلم۔

اور اس کے خلاف کوئی حجت نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کی بیع سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ وہ برابر برابر ہو، تو بے شک لفظ طعام اپنے اطلاق میں گندم وغیرہ تمام ماکولات کو شامل ہوتا ہے لیکن گوشت کو شامل نہیں ہوتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 383

کہ جب کوئی کہنے والا یہ کہے: میں نے آج طعام کھایا۔ تو اس سے ذہن گوشت کھانے کی طرف نہیں جاتا، اور اس لئے بھی کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معارض ہے: ''جب دو جنسیں مختلف ہوں تو جیسے چاہو ان کی بیع کرو۔'' اور یہ دو جنسیں ہیں۔ اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ گوشت کی بیع کرنا پرندے کے گوشت کے ساتھ متفاضلاً جائز ہے اس کی علت یہ ہے کہ یہ طعام کی بیع ہے اس کی زکوٰۃ نہیں ہے اسے گوشت کے ساتھ بیچا گیا ہے جس میں زکاۃ نہیں ہے، اسی طرح مچھلی کی بیع تفاضل کیساتھ کرنا پرندے کے گوشت کے ساتھ یہ بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اور رہی مکڑی! تو یہ ہمارے نزدیک مشہور ہے کہ اس کے بعض کی بیع تفاضل کے ساتھ بعض کے عوض کرنا جائز ہے۔ اور سحنون کے بارے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اس سے منع کرتے ہیں، اور اسی کی طرف بعض متاخرین بھی مائل ہیں اور اسے ان چیزوں میں سے گمان کیا ہے جو ذخیرہ کی جاسکتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا۔ تو ابن القاسم نے کہا ہے: مذکورہ چاروں انواع میں سے کسی نوع کا گوشت کھانے سے وہ حانث ہو جائے گا۔ اور اشہب نے المجموعہ میں کہا ہے: وہ حانث نہیں ہوگا مگر وحشی جانوروں وغیرہ کے علاوہ دیگر جانوروں کا گوشت کھانے سے، کیونکہ اس میں عرف اور عادت کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور اسے لفظ کے اطلاق لغوی پر مقدم کیا گیا ہے (1)، اور یہی احسن ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا اس میں حلیۃ (زیور) سے مراد موتی اور مرجان ہیں (2)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ (الرحمٰن) (ان سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔) اور زیور کا نکالنا بلاشبہ صرف نمکین (سمندر) سے معروف ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ان فی الزمرد بحریا (بے شک زمرد سمندر سے حاصل کیا گیا ہے) اور ہذلی کو موتی کے وصف میں اپنے قول میں غلط قرار دیا گیا ہے:

فجاء بها من دُرّة لطَيِّة      على وجهها ماء الفرات يَدومُ (3)

پس انہوں نے اسے میٹھے پانی سے قرار دیا ہے۔ پس زیور حق ہے اور یہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد پر اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور انہیں تاج پہنایا گیا اور جنت کے جواہر کے ساتھ آراستہ اور مرصع کیا گیا تھا، اور آپ کو وہ انگوٹھی پہنائی گئی جس کے وارث آپ سے حضرت سلیمان بن داؤد صلوات اللہ علیہم بنے اور اس کو خاتم العِز (عزت اور غلبے کی انگوٹھی) کہا جاتا تھا جیسا کہ روایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مردوں اور عورتوں پر اس کے ساتھ احسان عام فرمایا جو کچھ سمندر سے نکلتا ہے، پس اس میں سے کوئی شے ان پر حرام نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مردوں پر سونا اور ریشم حرام قرار دیا ہے (4)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے صحیح میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ریشم مت پہنو کیونکہ جس نے دنیا میں اسے پہن لیا وہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1147    2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1148

3۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 383    4۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1148

اسے آخرت میں نہیں پہنے گا(1)''۔ اس کے بارے گفتگو عنقریب سورۃ الحج میں آ رہی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں ایسا نگینہ لگوایا جو آپ کی ہتھیلی کے باطن کے ساتھ ملا ہوتا تھا، اور اس میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نقش کروایا، تو لوگوں نے بھی اس کی مثل انگوٹھیاں بنوالیں، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا کہ انہوں نے یہ بنوالی ہیں تو آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا: لا البسہ ابدا (میں کبھی بھی اسے نہیں پہنوں گا) بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور لوگوں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنوالیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہنی پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وہ بئر اریس میں گر پڑی(2)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ جب آپ کے ہاتھ سے انگوٹھی گر پڑی۔ اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ تمام مردوں پر چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: عورتوں کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا مکروہ ہے، کیونکہ یہ مردوں کے لباس میں سے ہے، پس اگر وہ سونا نہ پائیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اسے زعفران یا اس کے مشابہ کسی شی کے ساتھ زرد بنادیں (یعنی سنہری بنادیں) اور سلف وخلف میں سے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی بنوانا حرام ہے، سوائے اس روایت کے جو ابوبکر بن عبدالرحمن اور خباب سے مروی ہے، وہ اس کے خلاف ہے اور شاذ ہے، اور ان دونوں میں سے کسی کو نہی اور نسخ کا حکم نہیں پہنچا۔ واللہ اعلم۔

اور رہی وہ روایت جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی دیکھی، پھر لوگوں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنوائیں اور پہن لیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگوٹھی پھینک دی تو لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں(3)۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے اور الفاظ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ علماء کے نزدیک یہ ابن شہاب کو وہم ہوا ہے، کیونکہ وہ انگوٹھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھینکی تھی بلاشبہ وہ سونے کی انگوٹھی تھی۔ اسے عبدالعزیز بن صہیب، ثابت اور قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور یہ اس کے خلاف ہے جسے ابن شہاب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے پس ایک کے مقابلے میں فیصلہ جماعت کے مطابق کرنا واجب ہے جبکہ وہ ایک جماعت کے مخالف ہو، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی جماعت کی شہادت دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جب مردوں کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا اور اس سے زینت حاصل کرنا جائز ہے اور یہ ثابت ہے، تو علماء میں سے ابن سیرین وغیرہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ وہ اس میں نقش کروائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو۔ اور علماء کی جماعت نے اس میں نقش کرانے کو جائز قرار دیا ہے، پھر جب وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم یا کلمہ حکمت یا قرآن کریم میں سے کوئی کلمات نقش کروائے اور اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پہنے، تو کیا وہ اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہو سکتا ہے اور اپنے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم الاستعمال اناء الذھب والفضہ، جلد 2، صفحہ 191

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب خاتم الفضہ، جلد 2، صفحہ 872		3۔ ایضاً

بائیں ہاتھ کے ساتھ استنجا کرسکتا ہے؟ تو حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں تخفیف کی ہے (اور رخصت دی ہے) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: اگر انگوٹھی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کندہ ہو اور آدمی اسے بائیں ہاتھ میں پہنتا ہو تو کیا وہ اس کے ساتھ استنجا کرسکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: میں امید کرتا ہوں کہ اسے رخصت ہوگی۔ اور آپ سے کراہت بھی مروی ہے اور یہی اُولیٰ ہے۔ اور آپ کے اکثر اصحاب نے اس سے منع کیا ہے۔

اور ہمام نے ابن جریج سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلا میں تشریف لے جاتے تھے تو اپنی انگوٹھی اتار لیتے (1)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ حدیث منکر ہے، اور بلاشبہ ابن جریج سے معروف ہے کہ انہوں نے زیادہ بن سعد سے انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے پھینک دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: اسے ہمام کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں ''محمد رسول اللہ'' نقش کروایا اور فرمایا: ''بے شک میں نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی ہے اور اس میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نقش کروایا ہے پس تم میں سے کوئی بھی اس نقش پر نقش نہ کروائے۔'' ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ آدمی کے لئے انگوٹھی پر اپنا نام لگوانا جائز ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: خلفاء اور قضاۃ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنے نام اپنی انگوٹھیوں پر کندہ کروائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی یہ ہے کہ کوئی بھی آپ کی انگوٹھی کے نقش کی طرح نقش نہ بنوائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم اور صفت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق کی طرف وصف رسالت کے ساتھ متصف ہے۔ اور اہل شام نے روایت کیا ہے کہ حاکم کے بغیر کسی کے لئے انگوٹھی بنوانا جائز نہیں ہے۔ اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بھی روایت کی ہے۔ وہ ابوریحانہ سے مروی ہے اور یہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف کی وجہ سے کوئی حجت نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لاینقشن أحد علی نقشه (2) بھی اسے رد کرتا ہے، اور یہ تمام لوگوں کے انگوٹھی بنوانے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، جبکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کے نقش پر منقش نہ ہو۔ اور حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ کی انگوٹھی کا نقش محمد یسأل اللہ العافیة تھا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی انگوٹھی کا نقش حسبی اللہ و نعم الوکیل تھا۔ ترمذی الحکیم نے (نوادر الاصول) میں ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۞ (الرعد) تھا اور یہ سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ ان کے بیٹے نے ایک ہزار درہم کے عوض انگوٹھی خریدی ہے تو آپ نے اس کی طرف دیکھا: بے شک مجھے یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ تو نے ہزار درہم کے عوض انگوٹھی خریدی ہے، پس تو اسے فروخت کردے اور اس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلا۔ اور ایک درہم کے ساتھ لوہے کی انگوٹھی خرید لے، اور اس پر یہ لکھ رحم

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطهارة و سننها، باب ذکر اللہ علی الخلاء، حدیث 298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 873

اللہ امرءا عرف قدر نفسہ (اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جس نے اپنے نفس کی قدر پہچان لی)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جس کسی نے قسم کھائی کہ وہ زیور نہیں پہنے گا پھر اس نے موتی پہن لئے تو وہ حانث نہ ہوگا، یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: کیونکہ یہ وہ ہے جسے لغوی طور پر اسم اگرچہ شامل ہے لیکن قسم کے ساتھ اس کا قصد اور ارادہ نہیں، اور قسم عرف کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ فراش پر نہیں سوئے گا پھر وہ زمین پر سویا تو حانث نہ ہوگا؟ اور اسی طرح کسی نے قسم کھائی وہ سراج (چراغ) سے روشنی حاصل نہیں کرے گا پھر وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ گیا تو وہ حانث نہ ہوگا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فراش کا اور سورج کو سراج کا نام دیا ہے۔ اور امام شافعی، امام ابو یوسف، اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ زیور نہیں پہنے گا اور اس نے موتی پہن لئے تو وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا اور جو کچھ اس (سمندر) سے نکلتا ہے وہ موتی اور مرجان ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ کشتی اور سمندر میں سوار ہونے کا ذکر سورۃ البقرہ وغیرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: مَوَاخِرَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: جَوَارِيَ (چلنے والیاں)، یہ جرت تجری سے ماخوذ ہے۔ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے: معترضة (چوڑی بچھی ہوئی)۔ اور حسن نے کہا ہے: مواقر (یعنی لدی ہوئی) اور حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: یعنی وہ جارہی ہیں اور آرہی ہیں درآنحالیکہ وہ ایک ہی ہوا کے ساتھ آنے والی ہیں اور واپس جانے والی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَوَاخِرَ سمندر کے اندر موجوں کو چیرتے ہوئے۔ المخر کا اصل معنی پانی کو دائیں بائیں سے چیرنا، شق کرنا ہے۔ مَخَرَتِ السفینة تَمْخَرُ وتَمْخُرُ مَخْرًا و مُخُوْرًا جب کشتی پانی کو چیرتے ہوئے آواز کے ساتھ چلے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ یعنی تو انہیں چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور مَخَرَ السابحُ جب تیرنے والا اپنے سینے کے ساتھ پانی کو شق کرے، چیرے۔ اور مخر الارض اس نے زمین کو کاشت کے لئے پھاڑا۔ اور مَخَرَها بالماء جب زمین میں پانی روک لیا جائے یہاں تک کہ وہ أریضة ہو جائے، یعنی وہ کھیتی کا بہترین اور عمدہ سبزہ اگانے کے قابل ہو جائے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لغت میں المخر کا معنی ہے ہوا کے چلنے کی آواز اور یہ پانی میں ہونے کے ساتھ مقید نہیں، اور کہا: بے شک اس بارے میں واصل مولی ابی عیینہ کا قول ہے: جب تم میں سے کوئی بول (چھوٹا پیشاب) کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ اجسام میں ہوا کی آواز میں غور و فکر کرے کہ وہ کس سمت سے آرہی ہے، پھر وہ اس کی طرف منہ کرنے سے اجتناب کرے تا کہ اس کا بول اس پر لوٹ کر نہ آئے۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ یعنی چاہئے کہ تم اس پر تجارت اور طلب منفعت کے لئے سوار ہو۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یہ سب سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ اور نہریں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1148

جاری کر دیں اور راستے بنا دیے تا کہ تم (اپنی منزل کی) راہ پا سکو۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین میں ثابت رہنے والے پہاڑ گاڑ دیے ہیں۔ رسا یرسو جب وہ ثابت اور پختہ ہو جائے۔

جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

فصبرتُ عارِفةً لذالك حُرّةً ترسو إذا نفسُ الجبَان تطلّعُ

اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ای لئلا تمید (تا کہ وہ لرزتی نہ رہے)، یہ کوفیوں کے نزدیک ہے۔ و کراهية أن تمید (یعنی اس کے لرزنے کو ناپسند کرتے ہوئے)؛ یہ بصریوں کے قول کے مطابق ہے۔ اور المید کا معنی ہے دائیں بائیں جھومنا اور لرزنا، اضطراب کا اظہار کرنا۔ ماد الشئ یمید مَيْدًا جب وہ شے حرکت کرے، اور مادت الأغصان جب ٹہنیاں جھک جائیں، اور ماد الرجل جب آدمی اکڑ کر چلے، تکبر کا اظہار کرے۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو وہ لرزنے لگی اور آگے پیچھے ہلنے لگی، تو فرشتوں نے کہا: بے شک یہ تو کسی کو اپنی پشت پر نہیں ٹھہرنے دے گی۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ اسے پہاڑوں کے ساتھ ثابت اور مضبوط کر دیا گیا تھا، اور ملائکہ نہ جان سکے کہ پہاڑ کس سے پیدا کر دیے گئے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو یہ ہلنے لگی اور جھک گئی اور کہنے لگی: اے میرے پروردگار! کیا تو مجھ پر اسے رکھے گا جو گناہوں اور خطاؤں کا عمل کریگا، اور مجھ پر مردار اور بدبو ڈالے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیے وہ جنہیں تم دیکھ رہے ہو اور وہ جنہیں تم نہیں دیکھ رہے۔ اور ترمذی نے کتاب التفسیر کے آخر میں روایت بیان کی ہے کہ محمد بن بشار نے ہمیں بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں یزید بن ہارون نے بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں عوام بن حوشب نے سلیمان بن ابی سلیمان سے، انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو یہ لرزنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ تخلیق فرمائے اور ان کے ساتھ اس پر توجہ کی (یعنی انہیں اس میں گاڑ دیا) تو یہ ٹھہر گئی، پختہ ہو گئی۔ تو ملائکہ کو پہاڑوں کی شدت اور سختی پر تعجب ہوا اور کہا: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے پہاڑوں سے زیادہ سخت بھی ہے تو رب کریم نے فرمایا: ہاں وہ لوہا ہے، انہوں نے عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے؟ رب کریم نے فرمایا: ہاں وہ آگ ہے۔ پھر عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے آگ سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ پانی ہے۔ انہوں نے عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے پانی سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ ہوا ہے۔ پھر عرض کی: اے رب! کیا تیری مخلوق میں سے کوئی شے ہوا سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں وہ ابن آدم (انسان) ہے جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے اور اسے اپنے بائیں ہاتھ سے مخفی رکھتا ہے (1)۔" ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب خلق الانسان خلقا لایتمالك، جلد 2، صفحہ 327

ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورة المعوذتین، حدیث نمبر 3291، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: یہ حدیث غریب ہے، ہم اس سند کے سوا اسے مرفوع نہیں پہچانتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت میں اسباب کے استعمال پر بہت بڑی دلیل ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ بغیر پہاڑوں کے اسے ساکن کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اَنْهٰرًا یعنی اس میں نہریں بنا دیں یا اس میں نہریں رکھ دیں۔ وَّ سُبُلًا یعنی اس میں راستے بنا دیئے۔ لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ان شہروں کی طرف راہ پا سکو جہاں جانے کا تم قصد کرتے ہو پس تم بھٹکتے نہیں اور نہ حیرت زدہ ہوتے ہو۔

## وَ عَلٰمٰتٍ ؕ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝

''اور (راستوں پر) علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ عَلٰمٰتٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: علامات سے مراد دن کے وقت راستوں پر لگائی گئی نشانیاں ہیں (1)، یعنی راستوں کے لئے ایسی علامات اور نشانیاں مقرر کر دی گئی ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ یعنی رات کے وقت وہ ستاروں کے ذریعے سے راہ یاب ہوتے ہیں، اور النجم سے النجوم (ستارے) مراد لئے جاتے ہیں۔ اور ابن وثاب نے و بالنُّجُمِ پڑھا ہے۔ اور حسن نے نون اور جیم دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد النجوم ہے، پس اسے کم کر دیا ہے۔ (یعنی قصر کیا ہے)۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إنّ الفقير بيننا قاضٍ حَكَمْ    أن تَرِد الماءَ إذا غاب النُّجُم

اور اسی طرح اس کے بارے قول ہے جس نے النُّجْم پڑھا ہے مگر یہ کہ اس نے تخفیف کے لئے جیم کو ساکن کر دیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ النُّجُم نَجْمٌ کی جمع ہو جیسا کہ سَقْفٌ کی جمع سُقُفٌ ہے اور النجوم کے بارے میں اختلاف ہے؛ پس فراء نے کہا ہے: مراد جَدْی (قطب کے پاس ایک ستارہ جس سے قبلہ کی شناخت کی جاتی ہے اور اس کو جدی الفرقد بھی کہتے ہیں) اور الفرقدان (فرقد وہ ستارہ جو قطب شمالی کے قریب ہے اور اس سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں اور اس کی دوسری جانب میں ایک دوسرا ستارہ ہے جو اس سے روشنی میں کم ہے پھر دونوں کو فرقدان کہتے ہیں [المنجد] ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد ثریا ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

حتى إذا ما استَقَلَّ النَّجْمُ في غَلَس    و غُودر البقْلُ مَلْوِيٌّ و محصودُ

ای منه ملوِيٌّ و منه محصود۔ (اسی ستارے) سے ان کا نشو و نما پانا، بڑھنا ہے اور اسی سے کاٹنے کے وقت کو پہنچنا ہے) اور یہ ثریا کے طلوع کے وقت ہوتا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: علامات سے مراد پہاڑ ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (2): یہ ستارے ہی ہیں؛ کیونکہ وہ ستارے ہی ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اور انہیں میں سے وہ ہیں جو

---

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 182
2۔ ایضاً

ایسی علامت ہوتے ہیں جس سے راہنمائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ: وَ عَلٰمٰتٍ پر کلام مکمل ہوگئی۔ پھر نئی کلام کا آغاز کیا اور فرمایا: وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ اور پہلے قول کے مطابق یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے علامات بنادی ہیں جن سے تم راہنمائی حاصل کرتے ہو۔ اور علامات میں سے ہوائیں ہیں جن سے راہنمائی لی جاتی ہے۔ اور اهتداء سے جو مراد ہے اس کے بارے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے...... سفروں میں راہنمائی حاصل کرنا(1)، یہ جمہور کا قول ہے۔ اور دوسرا۔ قبلہ سمت معلوم کرنے میں راہنمائی لینا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ کے بارے پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابن عباس! وہ الجدی (ستارہ) ہے، اسی پر تمہارا قبلہ ہے اور اس سے تم اپنے خشکی اور بحری سفر میں راہنمائی لے سکتے ہو'۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(3): رہے تمام ستارے تو ان سے راہنمائی وہ حاصل کرسکتا ہے جو ان کے طلوع و غروب ہونے کے مقامات کو جانتا ہو، اور ان میں سے جنوبی اور شمالی کے درمیان فرق کرسکتا ہو، اور بعد میں آنے والوں میں یہ بہت کم ہے۔ اور رہا ثریا تو اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرسکتا مگر وہی جو تمام ستاروں سے راہنمائی لے سکتا ہو۔ اور بلاشبہ ہر ایک کیلئے جدی اور فرقدین کے ساتھ راہنمائی ممکن ہے، کیونکہ یہ وہ ستارے ہیں جن کے مطالع ظاہرہ اور سمت ثابتہ معین جگہ اور محل کے ساتھ محصور ہے، کیونکہ یہ قطب ثابت کے ارد گرد معین مدار میں چکر لگاتے ہیں، پس یہ خشکی میں مخلوق کی راہنمائی کیلئے بالکل ظاہر ہیں جب راستہ گم ہو جائے، معلوم نہ ہو، اور سمندر میں کشتیوں کے چلنے کے وقت اور قبلہ سمت جب مجہول ہو جائے تو اس کیلئے یہ راہنمائی کرتے ہیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قطب کو اپنے بائیں کندھے کی پشت پر رکھو تو جس طرف آپ کا منہ ہوگا تو وہی جہت قبلہ ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے النجم کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا: ''وہ جدی ہے اسی پر تمہارا قبلہ ہے اور اسی کے ساتھ تم اپنے خشکی اور سمندر کے سفر میں راہنمائی حاصل کرتے ہو(4)''۔ وہ یہ کہ جدی کے آخر میں بنات نعش الصغری ہیں (بنات نعش الکبریٰ قطب شمالی کے رخ میں سات ستارے ہیں، انہیں کے قرب میں بنات نعش الصغریٰ کے سات ستارے ہیں۔ المنجد) اور قطب وہ ہے جس پر ان کے درمیان میں سیدھا قبلہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دو وجہوں پر ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اسے دیکھے اور اس کا معائنہ کر رہا ہو تو اس صورت میں لازم ہے کہ وہ سیدھا اس کی طرف منہ کرے اور اپنا سارا بدن اس کی طرف کرنے کا ارادہ کرے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ کعبہ معظمہ اس طرح ہو کہ وہ اسے دیکھ نہ رہا ہو تو اس صورت میں اس کی طرف منہ کرنا لازم ہوتا ہے اور دلائل سے اس کے سامنے ہونا ضروری ہے، اور وہ سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، اور ہر وہ

1۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 183
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1149
4۔ تفسیر الماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 183

شے ہے جس کے ساتھ اس کی جہت کو پہچاننا ممکن ہوتا ہے، اور جس سے قبلہ غائب ہو جائے اور اس نے اجتہاد کرتے ہوئے اس کے سوا دوسری سمت منہ کر کے نماز پڑھ لی اور یہ ان میں سے ہو جن کے لیے اجتہاد ممکن ہوتا ہے تو اس کی نماز نہ ہوگی اور جب کسی نے اجتہاد اور استدلال کرتے ہوئے نماز پڑھی پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے لئے ظاہر ہوا کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی ہے تو وہ نماز کا اعادہ کرے اگر نماز کا وقت ہو، اور یہ اس پر واجب نہیں ہے، کیونکہ اس نے اپنا فرض اس طریقہ پر ادا کیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ یہ مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۞

''کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہو سکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ مراد بت ہیں۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ان بتوں کے بارے خبر دی گئی ہے جو نہ کچھ بنا سکتے ہیں اور نہ کسی کو نقصان اور نفع پہنچا سکتے ہیں، جیسا کہ اس کے بارے خبر دی جارہی ہے جو اس طور پر عمل کرتا ہے جیسے عمل کا عرب اس سے مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان (بتوں) کی عبادت کرتے تھے اور اسے لفظ مَنْ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ یہ قول ہے اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ (الاعراف: 195) (کیا ان کے پاؤں ہیں۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ذکر میں ضمیر خالق کے ساتھ ملنے کی وجہ سے ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے: إشتبه علی الراکب و جمله فلا ادری مَن ذا و مَن ذا۔ (مجھ پر سوار اور اس کا اونٹ مشتبہ ہیں پس میں نہیں جانتا یہ کون ہے اور یہ کون ہے۔) اگر چہ ان دونوں میں سے ایک انسان نہیں ہے۔ اور مہدوی نے کہا ہے: کہ مَنْ کے ساتھ باری تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے اور اس کے بارے ما کے ساتھ سوال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ما کے ساتھ اجناس کے بارے سوال کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جنس نہیں، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا جس وقت ان کو فرمایا: فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ۞ (طٰہٰ) (پس تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ) اور یہ جواب نہ دیا جس وقت ان کو کہا وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ (الشعراء) مگر من کے جواب کے ساتھ اور ما کے جواب سے اضراب کیا جس وقت سوال فاسد تھا۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: من کان قادراً علی خلق الاشیاء المتقدمة الذکر کان بالعبادة أحق فمن هو مخلوق لا یضر و لا ینفع۔ (جو ان تمام چیزوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے جن کا ذکر پہلے ہوا وہ اس سے زیادہ عبادت کا مستحق ہے جو مخلوق ہے اور نفع و نقصان نہیں دے سکتا۔) هٰذَا خَلۡقُ اللّٰهِ فَاَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ (لقمان: 11) (یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکو!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں) اور اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ (الاحقاف: 4) (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے۔)

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۞ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ۞

''اور اگر تم شمار کرنا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم انہیں گن نہیں سکو گے، یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اس کا ذکر سورۂ ابراہیم میں گزر چکا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسے بھی جو تم چھپاتے ہو اور اسے بھی جو تم ظاہر کرتے ہو...... یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور جو لوگ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (غیروں کو) وہ نہیں پیدا کر سکتے کوئی چیز، بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں وہ زندہ نہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ کب انہیں اٹھایا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قرأۃ عامہ تَدْعُوْنَ، تا کے ساتھ ہے کیونکہ اس کا ماقبل خطاب ہے۔ ابوبکر نے عاصم سے اور ہبیرہ نے حفص سے يَدْعُوْنَ یا کے ساتھ روایت کیا ہے، اور یہی یعقوب کی قرأت ہے...... اور رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد: مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ تو سب خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ ہیں، سوائے اس کے جو ہبیرہ نے حفص سے اور انہوں نے حضرت عاصم سے روایت کیا ہے کیونکہ انہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا یعنی وہ کسی شے کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ (بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں)۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ای هم اموات یعنی وہ مردہ ہیں، مراد بت ہیں، نہ ان میں روحیں ہیں، نہ وہ سنتے ہیں اور نہ وہ دیکھتے ہیں، یعنی وہ جمادات ہیں تو تم کیسے ان کی عبادت کرتے ہو حالانکہ حیات کے سبب تم ان سے افضل ہو۔ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ (یعنی بت) نہیں سمجھتے۔ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ سلمی نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اِيَّان پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں، اور یہ يُبْعَثُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہے اور یہ استفہام کے معنی میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ اور انہیں اس سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمیوں کو تعبیر کیا جاتا ہے(2)، کیونکہ وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کے بارے عقل و سمجھ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں اور وہ ان کی اللہ تعالیٰ کے پاس شفاعت کریں گے، پس ان کا خطاب اسی انداز پر جاری ہوا۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بتوں کو اٹھائے گا اور ان کے لئے ارواح ہوں گی پس وہ ان کی عبادت سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے، اور وہ دنیا میں جمادات ہیں وہ نہیں جانتے کہ کب اٹھائیں جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بتوں کو اٹھایا جائے گا اور ان میں روحوں کو ملایا جائے گا اور ان کے ساتھ ان کے شیاطین بھی ہوں گے پس وہ اپنی پوجا کرنے والوں سے برأت کا اظہار کریں گے، پھر شیاطین اور مشرکین کو جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دے دیا جائے گا، اور کہا گیا ہے: بے شک بتوں کو ان کی پوجا کرنے والوں سمیت قیامت کے دن جہنم میں پھینکا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 386 2۔ ایضاً

اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء:98) (اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ پر کلام مکمل ہو گئی ہے۔ پھر آغاز کیا اور مشرکین کا وصف بیان کیا کہ وہ مردہ ہیں، اور یہ موت کفر کی موت ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ یعنی کفار نہیں جانتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا، یعنی اٹھائے جانے کا وقت کیا ہے، کیونکہ بعث بعد الموت کے بارے ایمان ہی نہیں رکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کرنے کی تیاری کریں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ نہیں جانتے کہ قیامت کب آئے گی، شاید وہ قریب آچکی ہو۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝

"تمہارا خدا (بس) خدائے واحد ہے، پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر ان کے دل منکر ہیں اور وہ مغرور ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ پسند نہیں کرتا غرور و تکبر کرنے والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ جب یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا محال ہے تو اب یہ بیان کیا کہ معبود واحد و یکتا ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے۔ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ یعنی ان کے دل نہ کوئی وعظ و نصیحت قبول کرتے ہیں اور نہ ان میں ذکر اثر انداز ہوتا ہے، یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ یعنی وہ حق قبول کرنے سے تکبر اور غرور کرنے والے ہیں۔ استکبار کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر وہ قول و عمل جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں پس وہ انہیں بدلہ اور جزا دے گا۔

خلیل نے کہا ہے: لَا جَرَمَ کلمہ تحقیق ہے اور یہ صرف جواب کے لئے آتا ہے۔ کہا جاتا ہے: فعلوا ذالك (انہوں نے ایسا کیا)، فیقال: لا جرم سیندمون۔ (تو کہا جائے گا: یقیناً وہ نادم اور شرمندہ ہوں گے) یعنی یہ لازم ہے کہ ان کے لئے جہنم ہو۔ اس بارے میں مکمل بحث سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ یعنی نہ وہ انہیں ثواب دیتا ہے اور نہ ان کی تعریف کرتا ہے۔ حضرت حسین بن علی سے روایت ہے کہ آپ مساکین کے پاس سے گزرے درآنحالیکہ انہوں نے اپنے سامنے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے اور وہ کھا رہے تھے تو انہوں نے کہا: اے ابا عبداللہ! کھانا کھاؤ، تو آپ اترے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ پس جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا: تحقیق میں نے تمہاری دعوت قبول کی ہے پس تم میری دعوت قبول کرو، تو وہ اٹھ کر آپ کے ساتھ آپ کے گھر کی طرف چلے تو آپ نے انہیں کھانا کھلایا اور انہیں پانی پلایا اور انہیں (تحائف سے) نوازا، اور پھر وہ واپس چلے گئے، علماء نے کہا ہے: سوائے تکبر کے ہر گناہ کو چھپانا اور اسے مخفی

رکھنا ممکن ہوتا ہے، کیونکہ یہ ایسا فسق ہے جس کا اعلان لازم ہوتا ہے، اور یہ تمام گناہوں کی اصل ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''بے شک تکبر کرنے والے قیامت کے دن چیونٹیوں کی مثل اٹھائے جائیں گے ان کے تکبر کی وجہ سے لوگ انہیں اپنے قدموں کے ساتھ روند ڈالیں گے۔'' یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''محشر میں ان کے اجسام چھوٹے ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان کا چھوٹا ہونا انہیں نقصان دے گا اور جہنم میں ان کے اجسام بڑے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ ان کا بڑا ہونا انہیں نقصان اور تکلیف دے گا (1)''۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۴﴾

''اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے، کہتے ہیں: (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ یعنی جب ان سے پوچھا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان لوگوں میں سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل بعث بعد الموت کے منکر ہیں مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے؟۔ کہا گیا ہے: کہنے والا النضر بن حارث تھا، اور یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ حیرہ کی طرف نکلا اور کلیلہ و دمنہ کی کہانیاں خرید کر لایا اور وہ قریش میں پڑھتا اور کہتا تھا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب پر نہیں پڑھتے ہیں مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے؛ یعنی یہ ہمارے رب کی طرف سے نازل کردہ کتاب نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک مومنین ہی بطور آزمائش ان کو یہ کہتے تھے تو وہ اپنے اس قول کے ساتھ جواب دیتے: اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ (یہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں) پس انہوں نے ایک شے کے انکار کے ساتھ یہ اقرار کر لیا کہ وہ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ہیں۔ اور اَسَاطِیۡرُ سے مراد جھوٹے اور باطل واقعات ہیں۔ یہ سورۃ الانعام میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ میں گفتگو اسی طرح ہے جیسے مَا ذَا یُنۡفِقُوۡنَ میں ہے۔ اور قولہ: اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، اور تقدیر عبارت ہے: الذی أنزله أساطير الاولين (وہ جو اس نے اتارا ہے وہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔)

لِیَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَہُمۡ کَامِلَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۙ وَ مِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِیۡنَ یُضِلُّوۡنَہُمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ ﴿۲۵﴾

''تاکہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں جہالت سے، کتنا برا (اور گراں) ہے یہ بوجھ جسے وہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لِیَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَہُمۡ کہا گیا ہے: یہ لام کی ہے، اور یہ اپنے ماقبل سے متعلق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لام عاقبت ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: لِیَکُوۡنَ لَہُمۡ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص: 8) سنو (تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6677

باعث رنج والم بنے) یعنی قرآن کریم اور نبی مکرم ﷺ کے بارے میں ان کے قول نے انہیں اس تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں۔ کَامِلَةً (مکمل بوجھ) یعنی وہ اس میں سے کوئی چیز بھی نہ چھوڑیں اس مصیبت کی وجہ سے جو انہیں دنیا میں اپنے کفر کے سبب پہنچی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لام امر ہے، اور اس کا معنی جھڑکنا اور دھمکانا ہے۔ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ اٹھائیں گے ان لوگوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا اور جن کو گمراہ کیا گیا ہے ان کے گناہ سے کوئی شے کم نہیں ہوگی۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''جس بھی دعوت دینے والے نے گمراہی کی طرف دعوت دی اور اس کی اتباع اور پیروی کی گئی تو بلاشبہ اس پر ان کے بوجھوں کی مثل بوجھ ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی مگر ان کے بوجھوں سے کوئی شے کم نہ ہوگی، اور جس بھی دعوت دینے والے نے ہدایت کی طرف دعوت دی اور اس کی اتباع و پیروی کی گئی تو اس کے لئے ان کے اجروں کی مثل اجر ہوگا مگر ان کے اجروں میں سے کوئی شے کم نہ ہوگی۔'' اسے امام مسلم نے اسی معنی میں بیان کیا ہے۔ اور مِنْ جنس کے لئے ہے تبعیض کے لئے نہیں، پس گمراہی کی دعوت دینے والوں پر ان کے بوجھوں کی مثل ہوگا جنہوں نے ان کی اتباع کی۔ اور قولہ: بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی وہ مخلوق کو گمراہ کرتے ہیں اس سے جاہل اور غافل رکھتے ہوئے جو ان پر گناہ لازم ہو رہے ہیں، کیونکہ اگر وہ جان لیں تو یہ انہیں گمراہ نہ کر سکیں۔ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ یعنی کتنا برا ہے وہ بوجھ جسے وہ اٹھا رہے ہیں۔ اور اس آیت کی نظیر یہ ہے وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت:13) (اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کئی بوجھ (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ) اور قول باری تعالیٰ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام:64) کے بیان میں سورۃ الانعام کے آخر میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۲۶

''(دعوت حق کے خلاف) مکر وفریب کیا کرتے تھے وہ لوگ جو ان منکرین سے پہلے گزرے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی، پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے اور آ گیا ان پر عذاب جہاں سے انہیں خیال وگمان بھی نہ تھا۔''

قولہ تعالیٰ: قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی وہ اقوام جو سابقہ رسولوں کے ساتھ کفر کرنے کے سبب ان سے سبقت لے گئی ہیں (وہ دعوت حق کے خلاف مکر وفریب کیا کرتی تھیں) لیکن حسین اور خوبصورت انجام رسل علیہم السلام کا ہوا۔ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ حضرت ابن عباس اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ نمرود بن کنعان اور اس کی قوم نے آسمان پر چڑھنے اور اس کے باسیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، پس انہوں نے ایک محل بنایا تاکہ وہ اس سے اوپر چڑھ سکیں اس کے بعد کہ اس نے گدھوں کے ساتھ بنایا جو بنایا، پس وہ گر پڑا۔ اس کا بیان سورۂ ابراہیم کے آخر میں گزر چکا ہے۔

اور فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا امر عمارت تک پہنچا یا تو زلزلہ کی صورت میں یا ہوا کی صورت میں اور اس نے اسے

گرا دیا۔ حضرت ابن عباس اور وہب رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: آسمان کی طرف اس محل کی طوالت پانچ ہزار گز تھی، اور اس کا عرض تین ہزار گز تھا۔ اور حضرت کعب اور مقاتل نے بیان کیا ہے: اس کا طول دو فرسخ تھا، پس ہوا چلی اور اس نے اس کا سرا سمندر میں پھینک دیا اور باقی ان پر گر پڑی۔ اور جب وہ محل گر گیا تو اس دن خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے لوگوں کی زبانیں مخلوط ہو گئیں، گڑگڑانے لگیں پس وہ تہتر زبانوں میں کلام کرنے لگے، پس اسی وجہ سے اس کا نام بابل رکھا گیا ہے، اور اس سے قبل ان کی زبان صرف سریانی تھی۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ ابن ہرمز اور ابن محیصن نے السُّقُفُ سین اور قاف دونوں کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے سین کو ضمہ دیا ہے اور قاف کو تخفیفاً ساکن کر دیا ہے؛ جیسا کہ د بِالنَّجْم کے تحت دو وجہوں کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ سقف کی جمع ہو۔ اور القواعد سے مراد عمارت کی بنیادیں اور جڑیں ہیں۔ اور جب بنیادیں خراب ہو جائیں تو عمارت گر جاتی ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: مِنْ فَوْقِهِمْ ابن الاعرابی نے کہا ہے: اس کے ساتھ تو کید لگائی تا کہ وہ تجھے بتائے کہ وہ اس کے نیچے رہ رہے تھے۔ اور عرب کہتے ہیں: خرّ علینا سقف ووقع علینا حائط (چھت یا دیوار ہم پر گر پڑی) جب وہ اس کے مالک ہوں اگرچہ وہ ان پر نہ بھی گرے۔ پس فرمایا: مِنْ فَوْقِهِمْ لائے تا کہ وہ اس شک کو نکال دے جو کلام عرب میں پایا جاتا ہے، پس فرمایا: مِنْ فَوْقِهِمْ یعنی وہ ان پر گرا اور وہ اس کے نیچے تھے پس وہ ہلاک ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سقف سے مراد آسمان ہے، یعنی بے شک اس آسمان کی طرف سے ان پر عذاب آیا جو ان کے اوپر ہے؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ یہ تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا تو وہ اس کی طرح ہو گئے جس پر اس کی عمارت گر پڑی ہو۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا پس وہ اس کی طرح ہو گئے جس کی عمارت گر پڑی ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب اور ان کی تدبیر کو باطل کر دیا اور وہ ہلاک ہو گئے جیسے وہ ہلاک ہو جاتا ہے جس پر اس کے اوپر سے چھت گر پڑے۔ اور اسی وجہ سے ان کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جن پر چھت گری، پس حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید رضی اللہ عنہم نے وہ کہا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بخت نصر اور اس کے ساتھی تھے؛ یہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ بانٹنے والے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر میں کیا ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور اس تاویل کی بنا پر تمثیل کی وجہ خارج ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ یعنی اس حیثیت سے کہ ان کا گمان تھا وہ امان میں ہیں (ان پر عذاب آ گیا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: (عذاب) سے مراد وہ مچھر ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے نمرود کو ہلاک کر دیا۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۲۷﴾

''اس کے بعد روز قیامت اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کرے گا اور (ان سے) پوچھے گا: کہاں ہیں وہ میرے

شریک جن کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے؟ کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ بلاشبہ آج ہر قسم کی رسوائی اور بربادی کافروں کے لئے ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ یعنی قیامت کے دن الله تعالیٰ انہیں عذاب کے ساتھ رسوا کرے گا اور اس کے ساتھ انہیں ذلیل کرے گا اور ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے گا۔ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ اور ان سے پوچھے گا: تمہارے گمان میں اور تمہارے دعوے کے مطابق جو میرے شریک ہیں وہ کہاں ہیں، یعنی وہ معبود جن کی تم میرے سوا عبادت اور پرستش کرتے ہو، اور یہ سوال برائے زجر و توبیخ ہے۔ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ یعنی جن کے سبب تم میرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عداوت رکھتے تھے اور جھگڑا کرتے تھے، پس چاہئے کہ وہ تم سے اس عذاب کو دور ہٹائیں۔ اور ابن کثیر نے شُرَكَایَ یا کو مفتوح بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت نافع نے تُشَآقُّوْنِ اضافت کی بنا پر نون کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تعادوننی فیھم (تم میرے ساتھ ان کے بارے میں جھگڑا کیا کرتے تھے) اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی ملائکہ نے کہا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مومنین ہیں۔ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ یعنی بلاشبہ قیامت کے دن رسوائی اور ذلت وَالسُّوْٓءَ اور عذاب، عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کافروں کے لئے ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸

''وہ کافر جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ اپنے پر ظلم کر رہے ہیں، تب وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم تو کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے (اہل علم جواب دیں گے) نہیں نہیں (تم بڑے بدکار تھے) بے شک الله تعالیٰ خوب جانتا ہے جو (برے کام) تم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ یہ کفار کی صفات میں سے ہے۔ اور ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے؛ ای وھم ظالمون أنفسھم یعنی درآنحالیکہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے ہیں جب انہوں نے انہیں ہلاکت کی جگہوں میں ڈال دیا۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ یعنی تب انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، یعنی انہوں نے الله تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور موت کے وقت تابعدار بن گئے اور کہنے لگے: مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ہم تو کوئی برا کام یعنی شرک وغیرہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس ملائکہ انہیں کہیں گے: بَلٰٓى نہیں بلکہ تم تو بہت برے اعمال کیا کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (بے شک الله تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اعمال تم کیا کرتے تھے) اور عکرمہ نے کہا ہے: یہ آیت مدینہ طیبہ میں ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں اسلام لائے اور انہوں نے ہجرت نہ کی، تو قریش نے انہیں بدر کی طرف بالجبر نکالا اور وہ وہاں قتل کر دیئے گئے، تو الله تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی وہ جنہیں فرشتے ان کی ارواح قبض کر کے موت دیتے ہیں۔ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وہ اپنے مقام میں مکہ مکرمہ رہنے اور ہجرت چھوڑنے کے سبب اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ فَاَلْقَوُا

السَّلَمَ یعنی انہوں نے ان کے ساتھ نکلنے میں ان کی تابعداری کی۔ اور اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ صلح ہو، یہ اخفش نے کہا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ تابعداری اختیار کرنا، یہ قطرب نے کہا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ خضوع ہو، یہ مقاتل نے کہا ہے۔ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ یعنی کفر میں سے کوئی برا عمل ہم نہیں کیا کرتے تھے۔ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تمہارے اعمال کفار کے اعمال کی طرح ہی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بعض مسلمانوں نے جب مومنوں کی تعداد کو کم دیکھا تو وہ مشرکوں کی طرف لوٹ گئے۔ پس یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پہلے قول کے مطابق کوئی کافر اور منافق دنیا سے نہیں جائے گا یہاں تک کہ وہ تابعدار ہو جائے گا اور سر تسلیم ختم کرلے گا، اور خضوع اختیار کرے گا اور اپنی ذلت کا اظہار کرے گا لیکن اس وقت توبہ اور کوئی ایمان انہیں فائدہ نہیں دے گا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (غافر: 85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب) یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے بے شک کفار ضرب اور ذلت و رسوائی کے ساتھ مرتے ہیں، اور اسی طرح سورۃ الانعام میں بھی ہے۔ اور ہم نے اسے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔

فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹

''(اے کفار!) پس داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں سے تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا وہاں، بے شک برا ٹھکانا ہے غرور و تکبر کرنے والوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ یعنی یہ ان کی موت کے وقت کہا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے لئے عذاب قبر کے بارے بشارت اور اطلاع ہے، کیونکہ یہ کافروں کے لئے جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: دوسرے درکہ والا اس تک نہیں پہنچے گا مگر پہلے درکہ میں داخل ہونے کے ساتھ پھر دوسرے اور پھر تیسرے میں آگے اسی طرح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ ہر درکہ کا الگ دروازہ ہے، پس بعض ایک دروازے سے داخل ہوں گے اور بعض دوسرے دروازے سے۔ واللہ اعلم۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی وہ اس میں پڑے رہیں گے۔ فَلَبِئْسَ مَثْوَى یعنی کتنا برا مقام ہے۔ الْمُتَكَبِّرِيْنَ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ایمان لانے سے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے تکبر کیا، تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے قول حق کے ساتھ ان کی وضاحت کی: اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۳۵ (الصافات) (کفار کا یہ حال ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں۔)

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۱ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۤىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا

الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور (یونہی) پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے؟ انہوں نے کہا: (سراپا) خیر! جنہوں نے اچھے کام کیے اس دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر۔ (ان کے لئے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں ان کے لئے وہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے، یوں بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو، وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں: (اے نیک بختو!) سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا یعنی انہوں نے کہا: سراپا خیر نازل کیا اور کلام مکمل ہو گئی۔ اور مَاذَآ اس بنا پر واحد اسم ہے۔ عرب سے کوئی آدمی ایام حج میں مکہ مکرمہ آتا تھا اور مشرکوں سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتا تو وہ کہتے: ساحر ہے یا شاعر ہے یا کاہن ہے یا مجنون ہے۔ اور وہ مومنوں سے پوچھتا تو وہ کہتے: اللہ تعالیٰ نے ان پر خیر اور ہدایت نازل کی ہے، اور اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قیامت کے دن یہ اہل ایمان کو کہا جائے گا۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اگر کہا جائے: اس قول باری تعالیٰ: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ میں جواب مرفوع اور اس قول: خَيْرًا میں منصوب کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین تنزیل قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لائے، تو گویا انہوں نے کہا: وہ جو کچھ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں وہ پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں۔ اور مومنین نزول کے ساتھ ایمان لائے پس انہوں نے کہا: اس نے سراپا خیر نازل کیا (1)۔ اور اعراب کے اعتبار سے اس کے معنی کا یہی مفہوم ہے، والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ کہا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ من جملہ ان لوگوں کے کلام سے ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور یہاں حَسَنَةٌ سے مراد جنت ہے، یعنی جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی تو اس کے لئے کل (قیامت کے دن) جنت ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا یعنی ان کے لئے آج دنیا میں نصرت وفتح اور غنیمت جیسی بھلائی ہے۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ یعنی آخرت میں جو وہ جنت کا ثواب پائیں گے وہ دار دنیا سے بہتر اور اعظم ہوگا، دنیا کے فناہ ہونے کی وجہ سے اور آخرت کے باقی رہنے کی وجہ سے۔ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ اس میں دو وجہیں ہیں: حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور پرہیزگاروں کا بہت اچھا اور عمدہ گھر دنیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس میں عمل کر کے آخرت کا ثواب کمایا اور وہ جنت میں داخل ہوئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور پرہیزگاروں کا بہت ہی عمدہ گھر آخرت ہے؛ اور یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اس بنا پر جَنّٰتُ عَدْنٍ الدار سے بدل ہوگا، پس اسی وجہ سے یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 14، صفحہ 210، زیر آیت ہذہ

مرفوع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس تقدیر پر مرفوع ہے ھی جنات عدن پس یہ قول باری تعالیٰ: دَارُ الْمُتَّقِيْنَ کے لئے بیان ہوگا۔ یا یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہوگا، اور تقدیر عبارت ہوگی: جَنَّاتُ عَدْنٍ نِعْمَ دَارُ الْمتقین۔ يَّدْخُلُوْنَهَا یہ صفت کے محل میں ہے، بمعنی مدخولة (جس میں داخل ہوا جائے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: جَنّٰتُ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور اس کی خبر يَّدْخُلُوْنَهَا ہے اور اسی بنا پر حسن کا قول بیان کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ یعنی ان کے لئے اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی وہ تمنا اور خواہش کریں گے۔ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ یعنی اسی قسم کی جزا اللہ تعالیٰ متقین کو عطا فرماتا ہے۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ اعمش اور حمزہ نے دونوں مقامات پر یا کے ساتھ يَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ پڑھا ہے، اور اسے ہی ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک قریش کا گمان ہے کہ ملائکہ مونث ہیں پس تم انہیں مذکر ذکر کرو۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ قرأت کی ہے، کیونکہ اس سے مراد ملائکہ کی جماعت ہے۔ اور طَيِّبِيْنَ میں چھ اقوال ہیں: (۱) طَيِّبِيْنَ درآنحالیکہ وہ شرک سے پاک ہیں۔ (۲) وہ صالحین ہیں۔ (۳) وہ اپنے افعال اور اپنے اقوال کا تزکیہ کرنے والے ہیں، انہیں پاک کرنے والے ہیں۔ (۴) اپنے آپ کو خوش کرنے والے ہیں اس پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے جو وہ اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کر رہے ہیں۔ (۵) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ اپنے نفوس کو پاک کرنے والے ہیں۔ (۶) طَيِّبِيْنَ خوش ہو رہے ہیں کہ ان کی وفات اچھی اور آسان ہوئی اس میں کوئی مشکل اور دکھ درد نہیں، بخلاف اس کے کہ جب فرشتے کسی کافر اور اوباش کی روح قبض کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ سلام ان کے لئے وفات کے بارے میں ڈراوا ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے لئے جنت کی بشارت ہو، کیونکہ سلام امان ہے۔ اور ابن المبارک نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے حیوہ نے بیان کیا انہوں نے کہا مجھے ابو صخر نے محمد بن کعب قرظی سے خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا: جب بندہ مومن کی سانس (مراد روح ہے) جمع ہو جاتی ہے تو حضرت ملک الموت علیہ السلام اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: السلام علیك ولی الله، الله یقرأ علیك السلام (تجھ پر سلام ہو اے اللہ تعالیٰ کے دوست، اللہ تجھ پر سلام فرما رہا ہے)، پھر وہ اس آیت کے ساتھ نکالتا ہے الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ۔ (1) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جب حضرت ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور وہ بندہ مومن کی روح قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں: تیرا رب تجھے سلام فرماتا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک بندۂ مومن اپنے بعد اپنی اولاد کی اصلاح سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی آنکھ اس سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔ اور وہاں ہم نے اس بارے میں آنے والی احادیث بھی ذکر کی ہیں، والحمد للہ۔ اور قول باری تعالیٰ: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے: اس کا معنی ہو تمہیں جنت میں داخل ہونے کی بشارت ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ انہیں یہ آخرت میں کہیں

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 123

گے۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی ان نیک اعمال کے باعث جو تم دنیا میں کرتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳

"یہ مشرک کس کے منتظر ہیں بجز اس کے کہ آجائیں ان کے پاس (عذاب کے) فرشتے یا آجائے آپ کے رب کا (اٹل) حکم، یونہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان کے پیشرو تھے، اور نہیں زیادتی کی تھی ان پر اللہ تعالیٰ نے بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر زیادتی کیا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اس میں ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی کفار انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر یہ کہ ملائکہ ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے ان کے پاس آئیں درآنحالیکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور کسائی اور خلف نے یاتیھم الملائکۃ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ یعنی یا تیرے رب کا اٹل حکم عذاب کے بارے میں آجائے چاہے وہ قتل کی صورت میں ہو جیسا کہ یوم بدر کو ہوا یا دنیا میں زلزلہ اور خسف (دھنسا دینا) ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد یوم قیامت ہے۔ اور وہ لوگ ان چیزوں کے منتظر اس لئے نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ایمان نہیں لائے، بلکہ ایمان سے ان کے انکار نے ان پر عذاب واجب کر دیا، پس اس کی نسبت ان کی طرف کی گئی، یعنی ان کا انجام عذاب ہے۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی وہ کفر پر مصر رہے تو اللہ تعالیٰ کا اٹل حکم ان پر آ گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب دے کر اور انہیں ہلاک کر کے ان پر کوئی زیادتی اور ظلم نہیں کیا، بلکہ شرک کر کے انہوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴

"پس ملی انہیں سزا ان کے برے اعمال کی اور گھیر لیا انہیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا کہا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے؛ تقدیر عبارت ہے: کذالك فعل الذين من قبلهم فاصابهم سيئات ما عملوا (اسی طرح انہوں نے کیا جو ان سے پہلے ہوئے ہیں پس انہیں ان کے برے اعمال کی سزا ملی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود اپنے آپ سے زیادتی کر رہے ہیں۔ پس انہیں ان کے کفر کی سزا اور ان کے خبیث اعمال کا بدلہ ملا ہے۔ وَ حَاقَ بِهِمْ یعنی ان کا احاطہ کر لیا اور انہیں گھیر لیا مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی ان کے استہزا کی سزا نے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۳۵

''اور کہنے لگے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ہم عبادت نہ کرتے اس کے سوا کسی اور چیز کی نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو، ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے ان کے پیشرو۔ (اے سننے والے!) کیا رسولوں کے ذمہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ وہ صاف طور پر (حکم الٰہی) پہنچادیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ای شیئًا (یعنی مشرکوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی شے کی عبادت نہ کرتے) اور اس میں من صلہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے: انہوں نے یہ قول استہزاء کیا، اور اگر وہ یہ قول اعتقاد اور یقین کے ساتھ کہتے تو وہ مومن ہوتے۔ اس کا معنی اور ترکیب مفصل طور پر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی اسی تکذیب اور استہزا کی مثل انہوں نے بھی رسولوں سے کیا جو ان سے پہلے تھے پس وہ ہلاک کر دیئے گئے۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ یعنی رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات پر سوائے تبلیغ (حکم الٰہی پہنچانے) کے اور کچھ نہیں، اور رہی ہدایت تو وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

**وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶**

''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہوگئی، پس سیر وسیاحت کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کس قدر عبرت ناک تھا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (تحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (یہ تعلیم دینے کے لئے) کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) اور اسے واحد و یکتا مانو۔ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود کو چھوڑ دو جیسا کہ شیطان، کاہن، بت اور ہر وہ جو گمراہی کی طرف دعوت دے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ یعنی ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنی عبادت کی طرف ہدایت دی، راہنمائی فرمائی۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے بارے پہلے (گمراہی کا) فیصلہ ہو چکا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے کفر پر ہی مرے۔ اور اس سے قدریہ کا رد ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ہدایت دی ہے اور انہیں ہدایت کی توفیق دی ہے، اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ اور یہ بحث کئی مقامات پر پہلے گزر چکی ہے۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی تم زمین میں غور وفکر کرتے ہوئے (اور عبرت حاصل کرتے ہوئے) سیر وسیاحت کرو۔ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (اور اپنی آنکھوں سے دیکھو ان جھٹلانے والوں کے معاملے کا انجام

کیسے ہوا (یعنی) ان کی بربادی، عذاب اور ہلاکت کی طرف دیکھو۔)

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

''(اے حبیب!) آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے اور نہیں ان کے لئے کوئی مدد کرنے والا۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اپنی جدوجہد اور کوشش کے ساتھ ان کے ہدایت یافتہ ہونے کی خواہش اور طلب کریں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ تو بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کر دے، یعنی جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلے گمراہی کا فیصلہ ہو چکا ہو وہ اسے ہدایت نہیں دیتا۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ کی قرأت ہے۔ پس يَهْدِيْ فعل مستقبل ہے اور اس کا ماضی هَدٰى ہے۔ اور مَنْ، يَهْدِيْ کے سبب محل نصب میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ هدی یهدی بمعنی اهتدی یهتدی ہو، اسے ابو عبید نے فراء سے روایت کیا ہے اس نے کہا: جیسا کہ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى (یونس: 35) بمعنی یهتدی قرأت کی گئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے فراء کے بغیر اسے روایت کیا ہو، اور وہ اس بارے میں متہم نہیں ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن یزید سے مجھے بیان کیا گیا ہے گویا لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ کا معنی ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم ہو اور اس کے نزدیک پہلے اس کا فیصلہ ہو چکا ہو، فرمایا: يَهْدِيْ بمعنی یهتدی نہیں ہو سکتا مگر تبھی جب وہ يُهْدٰى یا يُهْدِيْ ہو۔ اور فراء کے قول کے مطابق يَهْدِيْ بمعنی یهتدی ہے، پس مَنْ محل رفع میں ہو گا اور مَنْ کی طرف لوٹنے والی ها ضمیر صلہ میں محذوف ہو گی، اور اِنَّ کے اسم کی طرف لوٹنے والی ضمیر يُضِلُّ میں پوشیدہ ہے۔ اور باقیوں نے لا يُهْدٰى یا کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے اختیار کیا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے کوئی ہدایت دینے والا اسے ہدایت نہیں دے سکتا، من اضله الله لم یهده هاد اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (الاعراف: 186) (جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے) اور مَنْ اس بنا پر محل رفع میں ہے کہ وہ اسم مالم يُسَمَّ فاعله ہے، اور یہ بمعنی الذی ہے، اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر اس کے صلہ سے محذوف ہے، اور فَاِنَّ اللّٰهَ میں اِنَّ کے اسم کی طرف لوٹنے والی ضمیر يُضِلُّ میں پوشیدہ ہے۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور بڑی شدومد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے، ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کا وعدہ ہے اس پر لازم ہے اس کو پورا کرنا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ یہ ان کی کارکردگی پر اظہار تعجب ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں

کھاتے ہیں اور انہیں پختہ کرنے میں خوب مبالغہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو ایک بار مر جاتا ہے۔ اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی قسمیں کھاتے ہیں لیکن پھر اسے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز قرار دیتے ہیں۔ اور ابو العالیہ نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی کا ایک مشرک پر قرض تھا پس اس نے اس کا تقاضا کیا(1)، اور اس کے کلام میں یہ ہے: والذی أرجوه بعد الموت انه لکذا (وہ جس کی میں موت کے بعد امید رکھتا ہوں بے شک وہ اس طرح ہے) تو مشرک نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو ایک بار مر جاتا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ایک آدمی نے کہا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما، بے شک بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موت کے بعد قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور وہ اس آیت کی تاویل بیان کرتے ہیں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ کہا ہے! بلاشبہ یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہے، اگر قیامت سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوبارہ زندہ کیا جانا ہوتا تو ہم ان کی بیویوں سے نکاح نہ کرتے اور نہ ان کی میراث تقسیم کرتے (2)۔

بَلٰی یہ ان کا رد ہے؛ یعنی نہیں بلکہ وہ ضرور انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ اس کا قول: یبعثہم وعدہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس نے دوبارہ زندہ کرنے کا سچا اور پختہ وعدہ فرما رکھا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اور بخاری میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے حالانکہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں۔ اور اس نے مجھے سب وشتم کیا ہے حالانکہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں، پس اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ اس نے یہ کہا: وہ ہرگز مجھے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا، جیسے پہلی بار اس نے مجھے پیدا کیا۔ اور رہا اس کا مجھے سب وشتم کرنا تو یہ اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو) بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں واحد و یکتا ہوں بے نیاز ہوں اور نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے (3)''۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝

''(وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا) تاکہ واضح کر دے ان پر وہ بات جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے تاکہ خوب جان لیں کافر کہ بلاشبہ وہی جھوٹے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: لِيُبَيِّنَ لَهُمُ تاکہ وہ ان کے لئے ظاہر کر دے، واضح کر دے۔ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ دوبارہ زندہ کئے جانے کا معاملہ جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا تاکہ خوب جان لیں وہ جنہوں نے دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا اور اس پر قسمیں کھائیں۔ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ کہ بلاشبہ وہی جھوٹے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 127 2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 126

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ وقال اتخذ اللہ، جلد 2، صفحہ 644

معنی ہے تحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تا کہ وہ ان کے لئے اس بات کی وضاحت کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور وہ جس میں مشرکوں اور مسلمانوں نے اختلاف کیا ہے وہ کئی امور ہیں: ان میں سے دوبارہ زندہ کرنا ہے، بتوں کی عبادت کرنا ہے، اوران میں سے ایک قوم کا اس بارے اقرار کرنا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حق ہیں لیکن آپ کی اتباع سے تقلید نے انہیں منع کیا ہے جیسا کہ حضرت ابو طالب۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَآ أَرَدْنَٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝

''ہمارا فرمان کسی چیز کے لئے جب ہم ارادہ کرتے ہیں (اس کے پیدا کرنے کا) صرف اتنا ہے کہ ہم اسے حکم دیتے ہیں کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ اس پر پیدا کرنا کتنا آسان ہے، یعنی جب ہم ارادہ کریں گے کہ اسے ہم دوبارہ زندہ کریں جو ایک بار مر چکا ہے تو وہ ہم پر مشکل نہیں ہوگا اور نہ انہیں زندہ کرنے میں کوئی دقت ہوگی، اور علاوہ ازیں بھی جو کام ہم کرتے ہیں ان میں کوئی مشکل اور دقت نہیں، کیونکہ ہم اس کو کہتے ہیں تو ہوجا وہ ہوجاتا ہے۔ ابن عامر اور کسائی کی قرأت فَيَكُونَ ہے اور یہ أَن نَّقُولَ پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ وہ كُن کا جواب ہونے کی بنا پر منصوب ہو۔ اور باقیوں نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ معنی یہ ہے فھو یکون (پس وہ ہوجاتا ہے) اور اس بارے میں مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے: لفظ شے کو ہر اس پر واقع کیا گیا ہے جو اپنی خلقت سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس معلوم ہو کیونکہ یہ اس کے قائم مقام ہے جو پائی گئی اور اس کا مشاہدہ کر لیا گیا۔ اور آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ قرآن کریم غیر مخلوق ہے، کیونکہ اگر اس کا قول: كُن مخلوق ہو تو پھر وہ ایک دوسرے قول کا محتاج ہے، اور دوسرا تیسرے کا محتاج ہوگا اور پھر اسی طرح تسلسل جاری رہے گا اور یہ محال ہے۔ اور اس پر دلیل موجود ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جملہ واقعات و حوادث کا ارادہ فرماتا ہے چاہے ان میں خیر ہو یا شر، وہ نفع بخش ہوں یا ضرر رساں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ جو کوئی اپنی سلطنت میں ایسی چیز دیکھتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہے اور وہ اس کا ارادہ بھی نہیں کرتا تو اس کی دو میں سے ایک وجہ ہے: یا تو وہ اس کے جاہل اور ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے وہ اسے جانتا ہی نہیں، اور یا پھر اس وجہ سے کہ وہ مغلوب ہے اور اس کی طاقت نہیں رکھتا، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وصف میں ان میں سے کوئی شی بھی جائز نہیں ہے، تو پھر اس پر دلیل قائم ہوگئی کہ وہی بندوں کی کمائی کا خالق ہے، اور یہ محال ہے کہ وہ کوئی کام کرنے والا ہو اور اس کا ارادہ فرمانے والا نہ ہو، کیونکہ ہمارے اکثر افعال ہمارے مقصود اور ارادہ کے خلاف حاصل ہوتے ہیں، پس اگر حق سبحانہ وتعالیٰ بھی ارادہ کرنے والا نہ ہو تو یقیناً اس کے بھی وہ افعال بغیر قصد و ارادہ کے حاصل ہوں) اور یہ طبیعیین کا قول ہے، اور موحدوں کا اس کے خلاف اور اس کے فاسد ہونے پر اجماع ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

''اور جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے تو ہم ضرور ان کو

دنیا میں بھی بہتر ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش! یہ جان لیتے۔''

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ہجرت کا معنی سورۃ النساء میں گزر چکا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یا اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے وطن، اہل خانہ اور قرابتداروں کو چھوڑنا ہے، اور برائیوں اور گناہوں کو ترک کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِي بمعنی لام ہے یعنی هاجروا لله۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا یعنی اس کے بعد کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں طرح طرح کا عذاب دیا گیا۔ یہ آیت حضرت صہیب، حضرت بلال، حضرت خباب اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اہل مکہ نے انہیں اذیتیں دیں حتیٰ کہ انہوں نے ان کو وہ کہا جس کا انہوں نے ارادہ کیا، پس جب انہوں نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما ہو گئے، یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو جندل بن سہیل رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (1)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہیں، مشرکوں نے مکہ مکرمہ میں ان پر ظلم کیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ حبشہ چلا گیا، پھر اللہ کریم نے ان کے لئے دار الهجرۃ (مدینہ طیبہ) کو ٹھکانا اور قیام گاہ بنا دیا اور ان کے لئے اور مومنین کو انصار اور معاون و مددگار بنا دیا (2)۔ اور یہ آیت ان تمام کو شامل ہے۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً حسنہ کے بارے میں چھ اقوال ہیں: (۱) مدینہ طیبہ میں اترنا، یعنی ہم انہیں دنیا میں بہتر ٹھکانا دیں گے یعنی مدینہ طیبہ میں اتار دیں گے۔ یہ قول حضرت ابن عباس، حسن، شعبی اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ (۲) مراد رزق حسن ہے (3)، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ (۳) ان کے دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت کرنا، یہ ضحاک نے کہا ہے۔ (۴) بے شک یہ سچ کی زبان ہے، اسے ابن جریج نے بیان کیا ہے۔ (۵) جو انہوں نے علاقے فتح کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ اور ان میں ان کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ (۶) جو ان کے لئے دنیا میں ثناء و تعریف باقی رہی، اور ان کی اولاد کو اعزاز و شرف حاصل ہوا۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے لئے جمع ہوا ہے۔ والحمد لله۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ یعنی دار آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، یعنی وہ اس سے عظیم اور بڑا ہے کہ کوئی اس کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اسے جان سکے؛ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ (الانسان) (اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی) لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ یعنی کاش یہ ظلم کرنے والے اسے جان لیتے۔ کہا گیا ہے: یہ ضمیر مومنین کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ آخرت کا ثواب دیکھ لیتے اور اس کا معائنہ کر لیتے تو یقیناً وہ جان لیتے کہ وہ دنیا کے اجر سے بہت بڑا ہے۔ اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب مہاجرین کو عطیات دیتے تھے تو فرماتے: یہ وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے اور جو تمہارے لئے آخرت میں ذخیرہ کیا ہے وہ اس سے زیادہ ہے، پھر آپ ان پر یہ آیت تلاوت کرتے (4)۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۴۲

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 129
2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 128
3۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 129
4۔ تفسیر ماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 189

''جنہوں نے (مصائب میں) صبر کیا اور (مشکلات میں اب بھی) اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

کہا گیا ہے: الَّذِیْنَ یہ پہلے الَّذِیْنَ سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کی ضمیر سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین پر صبر کیا، اس پر ڈٹے رہے وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ وہ اپنے جملہ امور میں اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور بعض اہل تحقیق نے کہا ہے: مخلوق میں سے بہترین اور اعلیٰ وہ ہے جسے جب کوئی امر پیش آ جائے تو وہ صبر کرے، اور جب وہ کسی کام سے عاجز ہو تو وہ توکل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو ہم وحی بھیجتے ہیں ان کی طرف، پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔ (پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ 'ذکر' تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تا کہ وہ غور وفکر کریں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ قرأۃ العامہ یُوْحٰی یعنی یا کے ساتھ اور حا کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور حفص نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نُوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ نون عظمت اور حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت انہوں نے حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ اس سے عظیم تر ہے کہ اس کا رسول بشر (انسان) ہو پس اس نے ہماری طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ ان کا جواب دیا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپ سے پہلے بھی امم ماضیہ کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے مگر آدمی (یعنی مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔) فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ حضرت سفیان نے کہا ہے: یعنی تم ان سے پوچھ لو جو اہل کتاب میں سے مومن ہیں، اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تم خود نہیں جانتے تو وہ تمہیں خبر دیں گے کہ تمام انبیاء علیہم السلام بشر (انسان) تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس تم اہل کتاب سے دریافت کر لو سو اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے لیکن وہ یہ اعتراف کریں گے کہ رسل علیہم السلام بشر تھے۔

اس کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل ذکر سے مراد اہل قرآن ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اہل علم ہیں، اور یہ دونوں قریب المعنی ہیں۔ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ کہا گیا ہے: بِالْبَیِّنٰتِ، ارسلنا کے متعلق ہے۔ اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ ای ما ارسلنا من قبلك بالبینات و الزبر الا رجالا ...... ای غیر رجال (یعنی ہم نے آپ سے پہلے واضح نشانیاں اور کتابیں سوائے مردوں کے نہیں بھیجیں) پس اس

میں اِلَّا بمعنی غیر ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: لا الٰہ الا اللہ ای غیر اللہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) اور یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے...... ہم ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں حذف ہے اور اس پر اَرْسَلْنَا دلالت کرتا ہے۔ ای أرسلنا ھم بالبینات والزبر (یعنی ہم نے انہیں واضح نشانیوں کے ساتھ اور کتابوں کے ساتھ بھیجا)۔ اس قول کی بنا پر بِالْبَیِّنٰتِ کا پہلے ارسلنا کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا کیونکہ اِلَّا کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کا تعلق ارسلنا مقدرہ کے ساتھ ہوگا، یعنی أرسلنا ھم بالبینَاتِ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعلمون کا مفعول ہے اور با زائدہ ہے، یا اسے اَعْنِی کو مضمر مان کر نصب دی گئی ہے۔

جیسا کہ اعشیٰ نے کہا ہے:

ولیس مُجیراً ان أتی الحیّ خائف ولا قائلا الا ھو المتعیَّبَا (1)

ای اعنی اَلْمُتَعَیَّبَ (یعنی اعنی فعل کے سبب یہ منصوب ہے۔) اور البینات کا معنی دلائل و براہین ہیں۔ اور الزبر سے مراد کتب ہیں (2)۔ اس کا ذکر آل عمران میں ہو چکا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ ذکر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ (اور ہم نے آپ کی طرف قرآن کریم نازل کیا) لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ تا کہ آپ اپنے قول و فعل سے لوگوں کو کھول کر بیان کریں اس کتاب میں موجود احکام اور وعد و وعید جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مراد اور مفہوم کو کھول کر بیان کرنے والے اور وضاحت کرنے والے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مجمل ذکر کیا ہے مثلاً نماز اور زکوٰۃ کے احکام اور علاوہ ازیں وہ چیزیں جنہیں مفصل ذکر نہیں کیا۔ یہ مکمل بحث مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۷﴾

''کیا بے خوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برے مکر کئے کہ مبادا گاڑ دے اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں یا آ جائے ان پر عذاب اس طرح کہ (ان کو اس کی آمد کا) شعور ہی نہ ہو۔ یا پکڑ لے انہیں جب وہ (اپنے کاروبار میں) دوڑ دھوپ کر رہے ہوں پس نہیں وہ (اللہ کو) عاجز کرنے والے۔ یا پکڑ لے انہیں جب کہ وہ خوفزدہ ہو چکے ہوں، پس بے شک تمہارا رب بہت مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ ای بالسیئات (کیا بے خوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برائی اور گناہوں کے ساتھ مکر و فریب کئے، یہ ان مشرکوں کے لئے وعید ہے جنہوں نے اسلام کو باطل قرار دینے اور اسے مٹانے

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 132
2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 133

کے حیلے اور کوششیں کیں۔ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ ( کہ مبادا اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں گاڑ دے ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جیسا کہ قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا، کہا جاتا ہے: خَسَفَ المكانُ يَخْسِفُ خُسُوفًا مکان زمین میں چلا گیا، دھنس گیا۔ اور خسف الله به الأرض خسوفاً یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں غیب کر دیا، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص: 81) (پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں) اور خَسَفَ هو بِي الارض (وہ خود زمین میں دھنس گیا) اور خُسِفَ بِهٖ (اسے دھنسا دیا گیا) اور استفہام بمعنی انکار ہے یعنی واجب ہے کہ وہ سزا سے پر امن (اور نڈر) نہ ہوں جو انہیں لاحق ہوگی جیسا کہ وہ جھٹلانے والوں کو لاحق ہوئی۔ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ جیسا کہ قوم لوط وغیرہ کے ساتھ کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد یوم بدر ہے، کیونکہ وہ اس دن ہلاک کر دیئے گئے، اور اس سے کوئی شے ان کے حساب میں نہ تھی۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ یا وہ دوڑ دھوپ کر رہے ہوں اپنے سفروں میں اور اپنے کام کاج میں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ یعنی نہ وہ اللہ تعالیٰ سے آگے نکل جانے والے ہیں اور اس سے فوت اور گم ہونے والے ہیں (یعنی وہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِيْ تَقَلُّبِهِمْ یا وہ انہیں پکڑ لے اس حال میں کہ وہ ابھی اپنے بستروں پر ہوں جہاں بھی ہوں۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رات اور دن کے وقت۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: یا وہ انہیں پکڑ لے ان کے مالوں، مویشیوں اور ان کی کھیتیوں میں کمی کرتے ہوئے۔ اور اسی طرح ابن الاعرابی نے بھی کہا ہے، یعنی بتدریج مالوں، جانوں، اور پھلوں میں نقصان اور کمی کرتے ہوئے یہاں تک کہ وہ ان تمام کو ہلاک کر دے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ خوف سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: وہ ایک گروہ کو پکڑ لے اور دوسرے کو چھوڑ دے، پس باقی رہنے والے ڈر جائیں گے کہ ان پر بھی اسی طرح کا عذاب نازل ہوگا جیسا ان کے ساتھیوں پر نازل ہوا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: عَلٰى تَخَوُّفٍ کہ وہ ایک بستی والوں کو پکڑ لے تا کہ دوسری بستی والے ڈر جائیں، یہ معنی بعینہٖ اس قول کے معنی کی مثل ہے جو پہلے گزرا ہے، اور یہ دونوں پہلے معنی کی طرف راجع ہیں کہ التخوف کا معنی التنقص (آہستہ آہستہ کم کرنا) ہے، تَخَوَّفَهٗ تَنَقَّصَهٗ (اس نے اسے نقصان پہنچایا)، اور تخوفه الدهر و تخونه (یعنی فاء اور نون کے ساتھ) دونوں ایک ہی معنی میں ہیں (زمانے نے اسے خوفزدہ کر دیا، نقصان پہنچایا) کہا جاتا ہے: تخوّنني فلان حقي جب وہ تیرا نقصان کر دے (یعنی فلاں نے میرا حق مار لیا)۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

لا، بل هو الشَّوْقُ من دارٍ تخوّنها　　مَرًّا سحابٌ و مَرًّا بارِحٌ تَرِبُ

اور لبید نے کہا ہے:

تخوّنها نزولي و ارتحالي

یعنی اس کا گوشت اور اس کی چربی کم ہوگئی۔ اور ہیثم بن عدی نے کہا ہے: التخوف (فا کے ساتھ ہو) اس کا معنی التنقص

(کم کرنا) ہے۔ یہ ازدشنوءہ کی لغت ہے۔ اور شاعر کا شعر ہے

تخوّف غَدْرهم ما لی وأهدی سلاسلَ فی الحلوق لها صلیل (1)

اور حضرت سعید بن مسیب نے بیان کیا ہے: اس اثنا میں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے۔ فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا کہتے ہو: اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ؟ تو لوگ خاموش رہے، تو بنی ہذیل کے ایک شیخ نے کہا: اے امیر المومنین! یہ ہماری لغت ہے۔ التخوُّف بمعنی التنقص ہے، پھر ایک آدمی نکلا اور اس نے کہا: اے فلاں! تیرا دین کیا ہے؟ اس نے کہا: تخوفته، ای تنقصته (میں نے اسے کم کر دیا ہے) پس وہ لوٹ کر گیا اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا عرب اپنے اشعار میں اسے جانتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ ہمارے شاعر ابو کبیر ہذلی نے ناقہ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے سفر اونٹنی کی کوہان کے لمبا ہونے اور گوشت کے جمع ہونے کے بعد اس کو کم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تخوَّفَ الرحلُ منها تامِکاً قرِدًا کما تخوّفَ عُودَ النَّبْعَة السَّفَنُ (2)

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! تم پر لازم ہے کہ تم زمانہ جاہلیت کی شاعری پر مبنی دیوان پڑھو کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی موجود ہیں۔ تَمَكَ السنام يَتْمِكُ تَمْكًا یعنی کوہان لمبی ہوگئی اور اٹھ گئی، فهو تامك اور السَّفَنُ والمسفن وہ آلہ جس کے ساتھ لکڑی کو چھیلا جاتا اور ہموار کیا جاتا ہے (رندا)۔ اور لیث بن سعد نے کہا ہے: عَلٰى تَخَوُّفٍ یا وہ انہیں پکڑ لے جلدی میں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان گناہوں پر ڈانٹتے ہوئے جو انہوں نے آگے بھیجے، اور یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: عَلٰى تَخَوُّفٍ کہ وہ انہیں سزا دے یا درگزر کر لے۔ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ یعنی وہ جلدی نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔“

حمزہ، کسائی، خلف، یحییٰ اور اعمش نے تَرَوْا تا کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ کے بارے خبر ہے اور یہی مختار ہے۔ مِنْ شَیْءٍ یعنی ایسے کھڑے جسم کی طرف جس کا سایہ ہے چاہے وہ درخت ہو یا پہاڑ، (کیا انہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے، اگرچہ تمام کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کا حکم سننے والی اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والی ہیں۔ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ ابو

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 136
2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 135

عمرو اور یعقوب وغیرہ نے اسے تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ظلال مونث ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے ابو عبیدہ نے اختیار کیا ہے، یعنی وہ (سایہ) جھکتا ہے، مائل ہوتا ہے ایک جانب سے دوسری جانب کی طرف، اور وہ دن کے اوّل حصہ میں ایک حال پر ہوتا ہے اور وہ سکڑ جاتا ہے پھر دن کے آخر میں دوسری حالت پر لوٹ آتا ہے، پس ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف اس کا گھومنا اور اس کا مائل ہونا ہی اس کا سجدہ کرنا ہے اور اسی معنی میں شام کے وقت سائے کو فَیْءٌ کہا گیا ہے، کیونکہ وہ مغرب سے مشرق کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اور الفیٔ کا معنی الرجوع (لوٹنا) ہے؛ اور اسی سے حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰۤی اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات: 9) (یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے الله کے حکم کی طرف۔) ہے۔ اس قول کا معنی حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما سے مروی ہے اور یہ معنی سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: مراد جسم کا سجدہ کرنا ہے، اور اس کا سجود اس کا اطاعت و تابعداری کرنا ہے اور وہ جو اس میں کام کا اثر دکھائی دیتا ہے، اور یہ ہر جسم میں عام ہے۔ اور وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ کا معنی ہے اور وہ خضوع کر رہے ہیں، اپنی عاجزی کا اظہار کر رہے ہیں۔ الدخور کا معنی الصغار والذل (چھوٹا ہونے اور پست ہونے کا اظہار کرنا) ہے۔ کہا جاتا ہے: دَخَر الرجل (فتحہ کے ساتھ) فهو داخر، وأدخره الله (الله نے اسے ذلیل کر دیا)۔

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

فلم یَبْقَ إلاّ داخِرٌ فی مُخَیِّسٍ    و مُنْجَحِرٌ فی غیرِ أرْضِك فی جُحْرِ(1)

اسے ماوردی نے ذوالرمہ کی طرف منسوب کیا ہے اور جوہری نے فرزدق کی طرف اس کی نسبت کی ہے اور کہا ہے: المُخَیَّس یہ جیل کا نام ہے یہ عراق میں ہے، یعنی ذلت و رسوائی کی جگہ۔

اور کہا ہے:

أما ترانی کَیِّسًا مُکَیَّسا    بَنَیْتُ بعدَ نافعٍ مُخَیَّسا

اور اپنے قول: عَنِ الْیَمِیْنِ میں یمین کو واحد ذکر کیا ہے اور شمال کو جمع ذکر کیا ہے، کیونکہ یمین کا معنی جمع ہے اگرچہ یہ واحد ہے، اور اگر کوئی کہے: عن الأیمان والشمائل، والیمین والشمائل، یا الیمین والشمال، یا الأیمان والشمال تو (غیر قرآن میں) یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس کے معنی کثرت کے ہیں۔ اور یہ بھی کہ عربوں کا طریقہ ہے کہ جب ایک شے میں دو علامتیں جمع ہو جائیں تو ان میں سے ایک جمع لائی جاتی ہے اور دوسری مفرد، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ (البقرہ: 7) (مہر لگا دی الله تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) اور اسی طرح ارشاد ہے: یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرہ: 257) (اور وہ نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف) اور اگر کوئی کہے علی أسماعهم اور الی الأنوار تو یہ بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لفظ یمین کا رجوع لفظ ما کی طرف ہو اور لفظ شمال کا رجوع اس کے معنی کی طرف ہو۔ اور کلام میں اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 140

الواردون و تیم فی ذرا سباء قد عض أعناقهم جلد الجوا میس (1)

اس میں جلود نہیں کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یمین کو واحد ذکر کیا ہے کیونکہ سورج جب طلوع ہوتا ہے اور تیرا منہ قبلہ کی طرف ہو تو سایہ دائیں جانب سے پھیلتا ہے پھر ایک حال میں بائیں جہت کی طرف مڑ جاتا ہے پھر اس میں کئی حالات ہوتے ہیں، پس اس کا نام شمائل رکھا۔ (یعنی پہلی صورت میں ایک حال ہے لہٰذا لفظ یمین واحد ذکر کیا اور دوسری صورت میں کئی حالات ہیں اس لئے شمائل جمع ذکر کیا۔)

وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اور الله کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے یعنی ہر قسم کے جاندار اور فرشتے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے۔ ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے اور کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ اور الله کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے یعنی ہر وہ شی جو زمین پر رینگ کر چلتی ہے (مراد ہر قسم کے جاندار ہیں) وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی وہ ملائکہ جو زمین میں ہیں، اور ان کے شرف مرتبہ کی وجہ سے ان کی خصوصیت کے پیش نظر ان کا ذکر الگ فرمایا۔ اور دبیب (رینگنا) کی صفت سے انہیں ذکر کے ساتھ ممتاز کر دیا اگرچہ یہ ان میں داخل ہیں؛ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمٰن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہیں من جملہ ان جانداروں سے جو رینگتے ہیں یا ہاتھ پاؤں پر چلتے ہیں نکالنے کے لئے الگ ذکر کیا ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے ان کے لئے پر بنا دیئے ہیں، لہٰذا یہ ان میں داخل نہیں پس اسی لئے ان کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الله تعالیٰ نے وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے ملائکہ، سورج، چاند، ستارے، ہوائیں اور بادل کا ارادہ کیا ہے وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ اور زمین کے ملائکہ سجدہ کرتے ہیں۔ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ اور وہ اپنے رب کی عبادت سے غرور و تکبر نہیں کرتے۔ اور یہ ان قریش کا رد ہے جنہوں نے یہ گمان کیا کہ ملائکہ الله تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ کا معنی ہے یعنی وہ اپنے رب کی سزا اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، کیونکہ ہلاک و برباد کر دینے والا عذاب آسمان سے ہی نازل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے رب کی اس قدرت سے ڈرتے ہیں جو ان کی قدرت و اختیار سے زیادہ اور اس پر غالب ہے۔ پس کلام میں حذف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ کا معنی ہے کہ ملائکہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور یہ ان سے فائق اور اعلیٰ ہیں جو زمین میں جاندار وغیرہ ہیں اور اس کے باوجود وہ ڈرتے ہیں، تو جو رتبہ میں ان سے کم ہیں انہیں تو بدرجہ اولیٰ ڈرنا چاہئے، اس کی دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ یعنی ملائکہ وہ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 141

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝۵۱

''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہ بناؤ دو خدا، وہ تو صرف ایک ہی خدا ہے (اس نے فرمایا) پس فقط مجھ سے ہی ڈرا کرو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم دو خدا نہ بناؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اثْنَیْنِ کا قول تاکید کے لئے آیا ہے۔ اور جب سچا خدا متعدد نہیں ہو سکتا تو پھر ہر وہ جو متعدد ہوگا تو وہ الہ (خدا) نہیں ہے، اور اثنین کے ذکر پر اقتصار کیا گیا ہے، کیونکہ مقصود تعدد کی نفی ہے۔ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی بلاشبہ اس کی ذات مقدسہ تو فقط ایک ہے۔ اور اس کی وحدانیت پر عقلی اور شرعی دلیل قائم ہو چکی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور ہم نے اسے شرح الاسماء میں اس کے اسم پاک الواحد کے تحت ذکر کیا ہے، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ یعنی پس تم مجھ سے ہی ڈرا کرو۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝۵۲

''اور اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے۔ تو کیا اللہ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا اس میں الدِّیْنُ کا معنی طاعت اور اخلاص ہے۔ اور وَاصِبًا اس کا معنی ہے دائما (ہمیشہ) یہ فراء نے کہا ہے، اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ وَصَبَ الشیئُ یَصِب و صُوبًا، یعنی شے دائمی ہے۔ اور وصبَ الرجلُ علی الأمر (کہا جاتا ہے) جب کوئی آدمی کسی کام پر مواظبت اختیار کرے اور اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہمیشہ واجب ہے۔ اور جنہوں نے وَاصِبًا کا معنی دائما بیان کیا ہے وہ حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور ضحاک ہیں۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹ (الصافات) یعنی ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔

اور دؤلی نے کہا ہے:

لا أبتغی الحمد القلیل بقاؤہ  بذم یکون الدهرَ أجمع واصبًا(1)

اور غزنوی اور ثعلبی وغیرہما نے کہا ہے:

ما أبتغی الحمد القلیلَ بقاؤہ  یوما بِذَمِّ الدهر أجمع واصبا(2)

ان میں واصباً دائما کے معنی میں ہی واقع ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الوصب کا معنی التعب والاعیاء (تھک جانا اور تھکا دینا) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب رہتی ہے اگرچہ بندہ اس میں تھک جائے۔

اور اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

لا یُمسك الساقَ من أین ولا وَصَب  وَلا یَعَضّ علی شُرْسُوفه الصفر

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 142  2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 193

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے: وَاصِبًا بمعنی واجبًا ہے۔ اور فراء رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بمعنی خالصًا ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ یعنی یہ نہیں چاہیے کہ تم غیر اللہ سے ڈرو، پس "غیر" "تَتَّقُوْنَ" کے سبب منصوب ہے۔

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں، پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی جانب میں گڑگڑاتے ہو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ دور فرما دیتا ہے تکلیف کو تم سے تو فوراً ایک گروہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھالو چند روز، تمہیں (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ فراء نے کہا ہے: مَا بمعنی الجزاء ہے۔ اور بِكُمْ میں با فعل مضمر کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے: و ما یکن بکم۔ مِّنْ نِّعْمَةٍ یعنی جسمانی صحت، وسعت رزق اور اولاد وغیرہ فَمِنَ اللّٰهِ وہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ھی۔ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ یعنی پھر جب تمہیں بیماری، مصیبت اور قحط سالی (غربت وغیرہ) آ پہنچتی ہے۔ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ تو اسی کی جانب دعا کے ساتھ گڑگڑاتے ہو۔ کہا جاتا ہے: جأر یجأر جؤارًا اور الجؤار الخوار کی طرح ہے؛ کہا جاتا ہے: جأر الثور یجأر یعنی بیل نے شور مچایا۔ اور بعض نے عِجْلًا جسدًا له جؤار ........ قرأت کی ہے۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ اور جأر الرجل الی اللہ یعنی آدمی نے دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تضرع کا اظہار کیا۔

اور اعشیٰ نے گائے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فطافت ثلاثا بین یوم و لیلة و کان النکیر أن تضیف و تجأرا

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ پھر جب اللہ تعالیٰ تم سے بلا، مصیبت اور بیماری دور فرما دیتا ہے۔ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ تو اس مصیبت کے ازالہ کے بعد اور گڑگڑاہٹ کے بعد تم میں سے فوراً ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ پس کلام کا معنی ہلاک ہونے سے نجات پانے کے بعد شرک کرنے پر اظہار تعجب کرنا ہے، اور یہ معنی قرآن کریم میں کئی بار ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانعام اور یونس میں گزر چکا ہے، اور سبحان وغیرہ میں آ رہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اس کے ساتھ خاص ہے جس نے کفر کیا۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ یعنی اس طرح وہ انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا جو اس نے ان سے ضرر و نقصان اور مصیبت کو، دور فرما کر ان پر انعام فرمایا، یعنی انہوں نے شرک کیا تاکہ وہ انکار کریں، پس لام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام عاقبت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ یعنی اس طرح انہوں نے نعمت کو سبب کفر بنا دیا، اور یہ سب فعل خبیث ہے، جیسا کہ کسی نے کہا:

والکفر مخبثة لنفس المنعم

انعام کرنے والے کی ذات کے لئے انکار خبث ہے فَتَمَتَّعُوا یہ امر برائے تہدید وجھڑک ہے۔ اور عبداللہ نے فتمتعوا پڑھا ہے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (اے ناشکرو! چند روز لطف اٹھا لو تم عنقریب اپنے عمل کا انجام جان لو گے۔)

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾

''اور مقرر کرتے ہیں ان کے لئے جن کو یہ جانتے ہی نہیں حصہ اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے، اللہ کی قسم! تم سے ضرور باز پرس ہوگی اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ان کی جہالت کی دوسری نوع کا ذکر کیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ مقرر کرتے ہیں اپنے مالوں میں سے کچھ حصہ ان کے لئے جن کے بارے وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کوئی نقصان اور نفع دے سکتے ہیں اور وہ بت ہیں (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس کے سبب ان کے قریب ہو جائیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے، پس اس معنی کے مطابق يَعْلَمُوْنَ مشرکین کے لئے ہوگا (یعنی وہ نہیں جانتے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بتوں کے لئے ہے، اور اسے واؤ، نون کے ساتھ ذکر کر کے انہیں قائم مقام ذوالعقول کے رکھا ہے، اور یہ ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور یعلم کا مفعول محذوف ہے، اور تقدیر عبارت ہے: ویجعل ھولاء الکفار للأصنام التی لا تعلم شیئا نصیبا (اور یہ کفار ان بتوں کے لئے حصہ مقرر کر رہے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔) اور اس معنی کی تفسیر سورۃ الانعام میں اس قول کے تحت گزر چکی ہے: فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (الانعام: 136) (اور کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لئے) پھر خبر سے خطاب کی طرف رجوع فرمایا اور ارشاد فرمایا: تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ (قسم بخدا! تم سے ضرور باز پرس ہوگی) تو یہ سوال اور باز پرس برائے زجر وتوبیخ ہوگی۔ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ یعنی اس کے بارے میں جو تم اللہ تعالیٰ کے بارے مختلف نوعیت کے جھوٹ بولتے ہو کہ اس نے تمہیں اس بارے حکم دیا ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٥٧﴾

''اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں سبحان اللہ! اور ان کے لئے تو وہ (بیٹے) ہیں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ یہ آیت بنی خزاعہ اور کنانہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، پس وہ کہتے تھے بیٹیوں کو بیٹیوں کے ساتھ ملحق کر دو۔ سُبْحٰنَهٗ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی پاکی بیان فرمائی ہے اور اپنے آپ کا اس سے عظیم تر (اور بے نیاز) ہونے کا ذکر کیا ہے جس کی نسبت وہ اس کی طرف کرتے ہیں (یعنی) کسی کو اولاد بنانا۔ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ یعنی اپنے لئے تو وہ بیٹے پسند کرتے ہیں اور بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور ما مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، اور اس کی خبر لَهُمْ ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول سُبْحٰنَهٗ پر کلام مکمل ہوگئی۔ اور فراء نے اس کے محل نصب میں ہونے کو جائز قرار دیا ہے، تقدیر کلام ہوگی: ویجعلون لھم ما یشتھون۔ اور زجاج نے اس کا انکار کیا

ہے۔ اور کہا ہے: عرب اس جیسے کلام میں ویجعلون لأنفسھم استعمال کرتے ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾

''اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی تو (غم سے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ (رنج واندوہ سے) بھر جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى یعنی جب ان میں سے کسی کو بچی کی ولادت کی خبر دی جاتی ہے۔ ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا تو اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اور یہاں سواد (سیاہی) سے مراد وہ نہیں ہے جو بیاض (سفیدی) کی ضد ہے، بلکہ یہ اس کے بچی کے سبب غمزدہ اور پریشان ہونے سے کنایہ ہے۔ اور ہر وہ آدمی جسے کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ شے لاحق ہو اس کے لئے عرب کہتے ہیں: قد اِسودّ و جهه غمًا و حزنًا۔ (تحقیق اس کا چہرہ غم اور پریشانی کے سبب سیاہ ہو گیا)؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور ماوردی نے بیان کیا ہے کہ مراد رنگ کا سیاہ ہونا ہی ہے، فرمایا: یہی جمہور کا قول ہے (1)۔ وَّ هُوَ كَظِيْمٌ اور وہ غم اور رنج سے بھر جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی حزین (2) (غمزدہ، پریشان حال) ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو اپنا غصہ پی جاتا ہے اور اسے ظاہر نہیں کرتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ مغموم اور پریشان حال آدمی ہے جو اپنا منہ بند کر لیتا ہے اور غم کی وجہ سے کلام نہیں کرتا، یہ الکظامۃ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی مشکیزے کا منہ بند کرنا ہے؛ یہ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے۔ اور یہ معنی سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''چھپتا پھرتا ہے لوگوں (کی نظروں) سے اس بری خبر کے باعث جو دی گئی ہے اسے، (اب یہ سوچتا ہے کہ) کیا وہ اس بچی کو اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا گاڑ دے اسے مٹی میں، آہ! کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ یعنی لوگوں کی نظروں سے چھپتا پھرتا ہے اور غائب رہتا ہے۔ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ یعنی اس غم، ندامت اور شرم وحیا کے سبب جو اسے بیٹی کے سبب لاحق ہوگا۔ اَيُمْسِكُهٗ ضمیر کو مذکر ذکر کیا کیونکہ وہ ما کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ عَلٰى هُوْنٍ یعنی ذلت ورسوائی کے ساتھ (کیا اسے اپنے پاس رکھے) اور اسی طرح عیسیٰ ثقفی نے علی هوان پڑھا ہے۔ اور الھون اور الھوان لغت قریش کے مطابق ہیں، یہ یزیدی نے کہا ہے، اور اسے ابو عبید نے کسائی سے بیان کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ تھوڑا سا لغت تمیم کے مطابق ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس سے مراد بلاء (مصیبت وتکلیف) اور مشقت ہے۔

اور حضرت خنساء رحمۃ اللہ علیہا نے کہا ہے:

نُهِيْنُ النفوسَ و هُوْنُ النفوس يوم الكريهة أبقَى لها

(اس میں ھون کا لفظ ابتلاء اور مشقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔)

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 194 2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 148

اور اعمش نے أیمسکه علی سُوءٍ پڑھا ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے، اور کہا ہے: جحدری نے أمْ یَدُسُّهَا فی التُّرَابِ پڑھا ہے اور وہ اسے قول باری تعالیٰ بِالْاُنْثٰی کی طرف لوٹاتے ہیں۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ أیُمْسِکُهَا پڑھا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الھوان (ذلت ورسوائی) بیٹی (البنت) کی طرف راجع ہے، یعنی أیمسکها و هی مهانة عنده (کیا وہ اسے روکے رکھے اس حال میں کہ وہ اس کے پاس ذلیل ورسوا ہو)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کی طرف لوٹ رہی ہے جس کی ولادت اس کے پاس ہوگی، أیمسکه علی رغم أنفه أم یدسّه فی التراب (کیا وہ اسے اپنی ناک خاک آلود کر کے روکے رکھے یا اسے مٹی میں گاڑ دے) اور یہ وہی ہے جو وہ بیٹی کو زندہ دفن کرنے کا عمل کرتے تھے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: مضر اور خزاعہ قبیلے کے لوگ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے اور اس بارے میں ان سے زیادہ سخت تمیم تھے۔ انہوں نے گمان کیا کہ ان پر ظلم اور غلبے کا خوف اور غیر کفو کا طمع اور حرص انہیں (بچیوں) میں ہے۔ اور صعصعہ بن ناجیہ جو کہ فرزدق کا چچا تھا جب اس میں سے کوئی شے محسوس کرتا تو وہ بچی کے والد کی طرف اونٹ بھیجتا اور اس کے ساتھ وہ اس بچی پر شرم وحیا محسوس کرتا، پس فرزدق نے فخر کرتے ہوئے کہا ہے:

و عمی الذی منع الوائدات وأحیا الوئید فلم یُوأَدِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: دَسُّهَا کا معنی اسے لوگوں سے چھپانا ہے تاکہ اس کی پہچان ہی نہ ہو، جیسا کہ مدسوس فی التراب یعنی مٹی میں گاڑ دیا جانا اسے نظروں سے چھپانے کے لئے ہے اور اس کا احتمال بھی ہے۔

**مسئلہ**۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: میرے پاس ایک عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، تو اس نے مجھ سے مانگا، سوال کیا اور میں نے اپنے پاس سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہ پایا۔ پس میں نے وہ کھجور اسے دے دی، اس نے اسے لیا اور اسے اپنی دونوں بچیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور خود اس سے کچھ بھی نہ کھایا، پھر وہ اٹھی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر نکل گئی، میرے پاس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور میں نے اس کا واقعہ آپ کو عرض کیا، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے بیٹیوں میں سے کسی سے آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو وہ اس کے لئے آتش جہنم سے پردہ بن جائیں گی'' (1)۔ تو یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بیٹیاں آزمائش ہیں، پھر آپ نے یہ خبر بھی دی ہے کہ ان کے بارے صبر کرنے میں اور ان کے ساتھ احسان اور نیکی کرنے میں اتنا اجر ہے جو آتش جہنم سے بچا لے گا۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میرے پاس ایک مسکین عورت آئی وہ اپنے ساتھ دو بچیوں کو اٹھائے ہوئے تھی، تو میں نے اسے تین کھجوریں عطا کیں تو اس نے ان میں سے ہر ایک کو ایک کھجور دی، اور ایک کھجور اپنے منہ کی طرف اٹھائی تاکہ اسے کھائے اتنے میں اس کی دونوں بچیوں نے وہ مانگ لی پس اس نے اس کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جسے وہ کھانا چاہتی تھی اور دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، پس اس کی اس کیفیت اور طرز عمل نے مجھے بہت

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والادب، باب فضل الاحسان إلی البنات، جلد 2، صفحہ 330

متعجب کیا، تو جو عمل اس نے کیا تھا میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ عزوجل نے اس کے بدلے اس کے لئے جنت واجب کر دی ہے یا اس کے عوض اسے جہنم سے آزاد کر دیا ہے(1)''۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دو بچیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح ہوں گے''(2)۔ اور آپ نے اپنی انگلیوں کو ملا دیا۔ ان دونوں روایتوں کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور حافظ ابونعیم نے اعمش کی حدیث نقل کی ہے حضرت ابووائل حضرت عبداللہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جس کی ایک بیٹی ہو پس اس نے اسے ادب سکھایا اور اسے خوب اچھی طرح ادب سکھایا اور اسے تعلیم دلائی اور اسے خوب اچھی طرح تعلیم دلائی اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے اسے عطا کیں جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمائیں تو وہ اس کے لئے آتش جہنم سے ستر اور حجاب ہو گی''۔ عقیل بن علفہ کی طرف اس کی بیٹی جرباء کے بارے پیغام نکاح بھیجا گیا تو اس نے کہا:

إنّي وإن سِيق إلى المهر  أَلْفٌ و عُبدان و خُوزٌ عشَرُ

أَحَبّ أصهاری إلیّ القبر

اور عبداللہ بن طاہر نے کہا ہے:

لكل أبِي بنت يراعى شؤونها  ثلاثةٌ اصهار اذا حُمد الصِّهْرُ

فبَعْلٌ يُراعِيها و خِدْرٌ يُكِنُّها  و قبرٌ يوارِيها و خيرهم القبرُ

اَلَا سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ یعنی بیٹیوں کی نسبت اپنے خالق کی طرف اور بیٹوں کی اضافت اپنی طرف کرنے میں (کتنا غلط فیصلہ وہ کرتے ہیں) اس کی نظیر یہ ہے: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ (النجم) (کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور اللہ کے لئے نری بیٹیاں۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰى ﴿۲۲﴾ (النجم) (یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔) یعنی یہ ظلم کرنے والی ہے، اس کا بیان آگے آئے گا۔

## لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۶۰﴾

''ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بری صفتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے، اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں بیان کرتے ہیں مَثَلُ السَّوْءِ جہالت اور کفر جیسی بری صفتیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کو بیوی اور اولاد کے ساتھ متصف کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عذاب اور جہنم ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے اور وصف اعلیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب فضل الاحسان إلی البنات، جلد 2، صفحہ 330 2۔ ایضاً

سے مراد اخلاص اور توحید ہے، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: صفۃ علیا اس اعتبار سے ہے کہ وہ خالق ہے، رازق ہے، قادر ہے، اور جزا دینے والا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَثَلُ السَّوْءِ اس سے مراد جہنم ہے، اور الْمَثَلُ الْاَعْلٰى سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دینا ہے۔ اور کہا گیا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) (نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اس کے اس قول کی طرح ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ (النور: 35) (اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ......) اور اگر کہا جائے: یہاں کیسے مثل کی اضافت اپنی ذات کی طرف کر دی حالانکہ اس نے فرمایا ہے: فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل: 74) (پس (اے جاہلو!) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں) تو جواب یہ ہے کہ اس کے قول فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں امثال سے مراد وہ ہیں جو مشابہت اور نقائص کو ثابت کرتی ہیں؛ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی مثال نہ بیان کرو جو نقص اور مخلوق کے ساتھ تشبیہ کا تقاضا کرتی ہو۔ اور الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ایسی شے کے ساتھ اس کا وصف بیان کرنا ہے جس کی نہ کوئی مشابہت ہو اور نہ نظیر۔ اور جو کچھ ظلم کرنے والے اور انکار کرنے والے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند اور اعلیٰ ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

''اور اگر (فوراً) پکڑ لیا کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ظلم کے باعث تو نہ چھوڑتا زمین پر کسی جاندار کو لیکن وہ مہلت دیتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک، پس جب آ جاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کفر اور ان کی بہتان تراشی کے سبب جلدی پکڑ لیا کرتا مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا تو زمین پر کسی کو نہ چھوڑتا، پس یہ غیر مذکور سے کنایہ ہے، لیکن اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ دَآبَّةٍ کیونکہ جاندار زمین پر ہی چلتا، رینگتا ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ مِنْ دَآبَّةٍ سے مراد کافرۃ (کفر کرنے والا) ہے، پس یہ خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آباء کو ان کے کفر کے سبب ہلاک کر دیتا تو بیٹے بھی نہ ہوتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد عموم ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان کے کرتوتوں کے باعث پکڑ لیا کرتا تو اس زمین کی پشت پر نبی اور غیر نبی میں سے کسی جاندار کو نہ چھوڑتا اور یہ حسن کا قول ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی: اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کو گنہگاروں کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا کرتا تو اس کا عذاب تمام مخلوق کو پہنچتا حتیٰ کہ سیاہ رنگ کے (غلاظت کے) کیڑے کو اس کی بل میں، اور وہ آسمان سے بارش اور زمین سے نباتات روک لیتا تو سارے جاندار مر جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ عفو و فضل کو لیتا ہے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (المائدہ: 15) (اور درگزر فرماتا ہے بہت سی باتوں سے۔) فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ یعنی جب ان کی موت کا مقررہ وقت اور ان کی عمروں کے ختم ہونے

کا وقت آجائے۔ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور اگر کہا جائے: پس ہلاکت عام کیسے ہو سکتی ہے اس کے باوجود کہ ان میں مومن بھی ہیں جو ظالم نہیں ہیں؟ تو کہا جائے گا: ظالم کی ہلاکت کو انتقام اور جزا بنا دیا جائے گا، اور مومن کی ہلاکت کو آخرت کے ثواب کا عوض قرار دیا جائے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت مذکور ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب دینے کا ارادہ کرے تو عذاب ان تمام کو پہنچتا ہے جو ان میں ہوں پھر انہیں ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا(1)''۔ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور ان سے اس لشکر کے بارے میں پوچھا گیا جسے دھنسا دیا جائے گا اور وہ حضرت ابن زبیر کے ایام (حکومت) میں ہوا، تو انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی پناہ لینے والا گھر میں پناہ لیتا ہے پس اس کی طرف کوئی جماعت (دستہ) بھیج دیا جائے گا اور جب وہ زمین میں مقام بیداء پر ہوں گے تو انہیں دھنسا دیا جائے گا(2)''۔ تو میں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تو اس کے بارے کیا ہو گا جو مجبور ہو؟ تو آپ نے فرمایا: ''ان کے ساتھ اسے بھی دھنسا دیا جائیگا لیکن قیامت کے دن اسے اپنی نیت پر اٹھایا جائے گا۔'' ہم نے اس معنی پر عمدہ بحث ''کتاب التذکرہ'' میں کی ہے اور سورۃ المائدہ میں اور سورۃ الانعام کے آخر میں اتنی بحث گزر چکی ہے جو کافی ہے۔ والحمد للہ۔ اور کہا گیا ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ یعنی جب قیامت کا دن آجائے گا۔ واللہ اعلم۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے (بیٹیاں) جنہیں وہ (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں اور بیان کرتی ہیں ان کی زبانیں جھوٹ (جب وہ کہتی ہیں کہ) فقط انہیں کے لئے بھلائی ہے، یقیناً ان کے لئے تو آتش (جہنم) ہے اور انہیں کو (دوزخ میں) پہلے بھیجا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے تجویز کرتے ہیں وہ جنہیں وہ اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں یعنی بیٹیاں۔ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ یعنی ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں۔ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ان کے لئے بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں ہیں۔ الْكَذِبَ یہ تَصِفُ کا مفعول ہے۔ اور اَنَّ، الکذب سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ اس کا بیان ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الْحُسْنٰى سے مراد اچھی اور بہترین جزا ہے؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابو العالیہ، مجاہد، اور ابن محیصن نے الْكُذُبُ کاف، ذال اور با کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ السنۃ کی صفت ہے اور اسی طرح وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ ہے (النحل:16)۔ اور الکُذُبُ کَذوب کی جمع ہے، مثلاً رسولٌ کی جمع رُسُل، صَبور کی صُبُر، اور شکورٌ کی جمع شُکُر ہے۔ لَا یہ ان کے قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ عند الموت، جلد 2، صفحہ 387

2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 203، حدیث 34668

کا رد ہے، اور کلام مکمل ہو گئی، یعنی ایسا نہیں ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو۔ جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ یعنی یہ ثابت شدہ امر ہے کہ ان کے لئے آتش جہنم ہے۔ یہ مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ یعنی انہیں آتش جہنم میں چھوڑ دیا جائے گا اور بھلا دیا جائے گا؛ ابن الاعرابی، ابو عبیدہ، کسائی اور فراء نے یہ کہا ہے، اور یہی سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد رحمہا اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہ بھی کہا ہے: مبعدون (انہیں دور کر دیا جائے گا) حضرت قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: انہیں آتش جہنم کی طرف جلدی بھیجا جائے گا(1)، اس کی طرف انہیں فوراً آگے بھیج دیا جائے گا۔ اور الفارط وہ ہے جو پانی کی طرف آگے بڑھ جاتا ہے اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: اَنَا فرطکم علی الحوض (2) میں حوض پر تمہارے پیش پیش ہوں گا۔

اور قطامی نے کہا ہے:

فاستعجلونا وکانوا من صحابتنا كما تعجّل فُرّاطٌ لورّاد (3)

اور الفُرّاط کا معنی ہے پانی کی طلب اور تلاش میں آگے بڑھنے والے۔ اور الورّاد کا معنی ہے پیچھے رہنے والے۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے ورش کی روایت میں مُفْرِطُوْنَ راء کو کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت ہے، اور اس کا معنی ہے: گناہوں اور معصیت میں زیادتی کرنے والے، اسراف کرنے والے، یعنی افرطوا فیها (انہوں نے ان میں بہت زیادتی کی)۔ کہا جاتا ہے: أفرط فلان علی فلان (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ اس پر بہت زیادتی کرے، اور اس نے اس کو اس سے زیادہ برا کہا جتنا اس نے کہا۔ اور ابو جعفر القاری نے مُفَرِّطُوْنَ را کو کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو ضائع کرنے والے ہیں، پس یہ واجب میں تفریط کرنے (کمی کرنے) سے ماخوذ ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِیُّهُمُ الْیَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۳﴾

"بخدا! ہم نے بھیجا ہے (رسولوں کو) مختلف قوموں کی طرف آپ سے پہلے پس آراستہ کر دیا ان کے لئے شیطان نے ان کے (برے) اعمال کو پس وہی ان کا دوست ہے آج بھی اور ان کے لئے عذاب الیم ہے۔"

قولہ تعالیٰ: تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ یعنی شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کر دیا۔ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام آپ سے پہلے تشریف لائے ہیں ان کی قوم نے ان کے ساتھ بھی کفر کیا ہے۔ فَهُوَ وَلِیُّهُمُ الْیَوْمَ یعنی ان کے گمان کے مطابق وہی دنیا میں ان کا معاون و مددگار ہے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اور ان کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَهُوَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 154
2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ما جاء فی قول اللہ واتقوا فتنة، جلد 2، صفحہ 1045
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 196

وَلِيُّهُمُ پس وہی جہنم میں ان کا ساتھی ہوگا۔ الْيَوْمَ مراد قیامت کا دن ہے، اور اس کے مشہور ہونے کی وجہ سے اس پر اسم الیوم کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کو قیامت کے دن کہا جائے گا: یہ تمہارا دوست ہے پس تم اس سے مدد طلب کرو کہ وہ تمہیں عذاب سے نجات دلائے، یہ ان کو زجر و توبیخ کرنے کے انداز میں ہے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

''اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر اس لئے کہ آپ صاف صاف بیان کر دیں ان کے لئے وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور (یہ کتاب) سراپا ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مگر اس لئے کہ آپ ان کے لئے دین اور احکام میں سے وہ بات صاف صاف بیان کر دیں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں پس آپ کے بیان سے ان پر حجت قائم ہو جائے گی۔ اور هُدًى وَّرَحْمَةً کا لِتُبَيِّنَ کے محل پر عطف کیا گیا ہے کیونکہ اس کا محل نصب ہے۔ اور مجاز کلام یہ ہے: و ما أنزلنا علیك الکتاب الا تبیانا للناس (اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر لوگوں کو وضاحت سے بیان کرنے کے لئے)۔ هُدًى مراد رشد، راہنمائی ہے۔ وَّرَحْمَةً یعنی مومنین کے لئے یہ سراپا ہدایت اور رحمت ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کیا اس سے زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد، بے شک اس میں (کھلی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو (حق کی آواز) سنتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور اللہ تعالیٰ نے بادل سے (پانی) اتارا۔ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کلام نعمتوں کو شمار کرنے اور کمال قدرت کو بیان کرنے کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بے شک اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل ہے جب انہوں نے یہ جان لیا کہ ان کا معبود کسی شے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو یہ دلیل ہو جائے گی لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے (حق کی آواز) دلوں کے ساتھ سنتے ہیں نہ کہ کانوں کے ساتھ) فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔)

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝

''اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں ایک عبرت ہے، دیکھو! ہم تمہیں پلاتے ہیں جو ان کے شکموں میں گوبر اور خون ہے ان کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ جو بہت خوش ذائقہ ہے پینے والوں کے لئے۔''

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے، اور یہاں چو پاؤں کی چار قسمیں مراد ہیں: اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری۔ لَعِبْرَةً یعنی ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی وحدانیت اور اس کی عظمت پر دلیل ہے۔ اور العبرۃ دراصل ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ تشبیہ دینا ہے اور اس کی مثل قرار دینا ہے تا کہ اس کی حقیقت بطریق مشاکلہ پہچان لی جائے۔ اور اسی سے فَاعْتَبِرُوْا (پس عبرت حاصل کرو) ہے۔ اور ابوبکر وراق نے کہا ہے: مویشیوں میں عبرت ان کا اپنے مالکوں کے لئے مسخر ہونا اور ان کے لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے، اور تیرا اپنے رب کی سرکشی اختیار کرنا اور ہر شے میں اس کی مخالفت کرنا ہے، اور عظیم ترین عبرت اور سبق یہ ہے کہ وہ اس سے برأت کا اظہار کرے جو گنہگار کو گناہ پر ابھارتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: نُسْقِيْكُمْ اہل مدینہ، ابن عامر اور ابوبکر کی روایت میں عاصم کی قرأت (نون کے فتحہ) کے ساتھ ہے اور یہ سقی یسقی سے ماخوذ ہے۔ اور باقیوں نے اور حفص نے حضرت عاصم سے (نون کے ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ أسقی یُسقی سے ماخوذ ہے، اور یہی کوفیوں اور اہل مکہ کی قرأت ہے۔ کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔

اور لبید نے کہا ہے:

سَقَى قَومِي بني مَجْدٍ وأسقى　　　نُمَيْرًا و القبائلَ من هِلالِ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو شے تیرے ہاتھ میں ہو اور اسے کسی کے منہ میں ڈالے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: سقیتہ (میں نے اسے پلایا)۔ اور جب تو اس کے لئے گھاٹ بنائے یا اسے پانی پیش کرے کہ وہ خود اپنے منہ سے اسے پی لے یا وہ کھیتی کو لگائے تو کہا جائے گا: أسقیتہ (میں نے اسے سیراب کیا)؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ایک جماعت نے تسقیکم تا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضعیف ہے، مراد چوپائے ہیں۔ اور اسے یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی یسقیکم اللہ عزوجل (اللہ تعالیٰ تمہیں پلاتا ہے۔) اور قراء سابقہ دونوں قرأتوں پر ہیں، پس نون کا فتحہ قریش کی لغت ہے اور اس کا ضمہ حمیر کی لغت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ لوگوں نے قول باری تعالیٰ: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ میں ضمیر کے بارے اختلاف کیا ہے کہ کس کی طرف لوٹ رہی ہے؟ تو کہا گیا ہے کہ یہ اپنے ماقبل کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ جمع مونث ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: عرب الانعام کے بارے خبر واحد کے ساتھ بھی خبر دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے (2): میرا خیال ہے انہوں نے اسی آیت کی وجہ سے اس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ آپ کے منصب کے موافق نہیں ہے اور نہ اس کا ادراک آپ کے لائق اور مناسب

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 157　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1151

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب جمع کا لفظ اسم جنس ہو تو اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جا سکتا ہے پس کہا جائے گا: هو الأنعام اور هي الأنعام، لہٰذا مذکر ضمیر کا لوٹنا جائز ہوا۔ اور یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مما فی بطون ما ذکرنا (اس سے جو پیٹوں میں ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے پس ضمیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہوگی۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (المدثر) (یہ تو نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مثل الفراخ نتقت حواصله

اس میں بھی مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔ اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور کسائی نے کہا ہے: مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ یعنی اس سے جو ان میں سے بعض کے پیٹوں میں ہے، کیونکہ مذکر جانوروں کا دودھ نہیں ہوتا، اور یہ وہی ہے جس پر ابو عبیدہ نے اسے محمول کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: الأنعام اور النَّعَم دونوں ایک ہی (معنی میں) ہیں، اور النعم مذکر ذکر کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے عرب کہتے ہیں: هذا نعم وارد (یہ جانور قریب پہنچنے والے ہیں) پس یہ ضمیر اس لفظ نعم کی طرف لوٹ رہی ہے جو بمعنی الانعام ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: بلاشبہ مذکر ضمیر جمع کے معنی کی طرف، اور مونث ضمیر جماعت کے معنی کی طرف لوٹتی ہے، پس یہاں اسے لفظ جمع کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا ہے، اور سورۃ المومنون میں لفظ جماعت کے اعتبار سے اسے مونث ذکر کیا ہے پس فرمایا: نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا اور اس تاویل سے معنی خوب اچھی طرح درست اور صحیح ہو جاتا ہے (1)۔ اور لفظ جماعت کے اعتبار سے مونث ذکر کرنا اور لفظ جمع کے اعتبار سے مذکر ذکر کرنا یبرین کے صحراؤں اور فلسطین کے چٹیل میدانوں سے زیادہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** بعض اجل علماء نے اور وہ قاضی اسماعیل ہیں نے اس ضمیر کے لوٹانے سے یہ استدلال کیا ہے کہ نر کا دودھ تحریم کا فائدہ دیتا ہے، اور کہا ہے: بلاشبہ اسے مذکر لایا گیا ہے، کیونکہ یہ مذکر جانور کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ مذکر کے لئے دودھ شمار کیا گیا ہے، اسی لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ نر کا دودھ حرمت ثابت کر دیتا ہے جس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ابوالقعیس کے بھائی افلح کی حدیث میں اس کا انکار کیا فللمرأة السقی وللرجل اللقاح (پس عورت کے لئے سیراب ہونا ہے اور مرد کے لئے مادہ منویہ ڈالنا ہے) پس اس میں ان دونوں کے درمیان اشتراک جاری ہے۔ اور لبن فحل کی تحریم کے بارے بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ نکال کر اپنی عظیم قدرت پر آگاہ فرمایا ہے۔ اور الفرث: وہ گوبر ہے جو اوجھ کی طرف اتر آتا ہے پس جب وہ خارج ہو جائے تو اسے فرث نہیں کہا جاتا۔ کہا جاتا ہے: أفرثت الكرش جب تو اسے نکال دے جو کچھ اس میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ طعام (چارے) میں سے کچھ وہ ہوتا ہے جو اوجھ میں ہوتا ہے اور اس سے کچھ خون بن جاتا ہے، پھر دودھ خون سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1151

خالص ہو جاتا ہے، پس الله سبحانہ وتعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ یہ دودھ اس کے اور خون کے درمیان سے رگوں سے نکلتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بے شک جانور چارہ کھاتے ہیں اور جب وہ اس کی اوجھ میں قرار پکڑ جائے تو وہ اسے پکا دیتی ہے پس اس کا نچلا حصہ گوبر ہے، اس کا درمیانہ حصہ دودھ، اور اس کا اوپر والا حصہ خون ہوتا ہے، اور جگر اور کلیجہ کو ان اصناف پر غالب اور مسلط کیا گیا ہے، پس وہ خون کو تقسیم کرتا ہے، اسے الگ کرتا ہے اور اسے رگوں میں چلاتا ہے، اور وہ دودھ کو کھیری میں پہنچاتا ہے۔ اور گوبر اسی طرح باقی رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ اوجھ میں تھا: حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ (القمر) ((وہ خبریں) سراسر حکمت ہیں پس ڈرنے والوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا) خَالِصًا مراد یہ ہے کہ وہ اسے خون کی سرخی اور گوبر کی گندگی سے پاک صاف کر دیتا ہے حالانکہ اس نے دونوں کو ایک برتن میں جمع کر رکھا ہے۔ اور ابن بحر نے کہا ہے: خالصا بیاضہ اس کی سفیدی کو خالص کرتا ہے۔ نابغہ نے کہا ہے:

بخالصة الأردان خُضْرِ المناكب

مراد آستینوں کی سفیدی ہے۔ اور یہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی مگر اسے ہی جو ہر شے میں مصلحت اور فوائد قائم رکھنے والا ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ نقاش نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ منی نجس نہیں ہے، اور یہ ان کے سوا کئی دوسروں نے بھی کہا ہے اور استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: جس طرح دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے اور وہ لذیذ اور خالص ہوتا ہے اسی طرح یہ جائز ہے کہ ، پیشاب کے راستے سے نکلنے کے باوجود طاہر اور پاک ہو۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: بے شک یہ بہت بڑی جہالت ہے اور انتہائی شنیع عمل میں شروع ہونا ہے، دودھ کے بارے میں تو اس نعمت واحسان ہونے کی خبر آئی ہے جو قدرت سے صادر ہوتا ہے تاکہ وہ عبرت ہو جائے، پس یہ سب خلوص اور لذت کے وصف کا تقاضا کرتا ہے اور منی اس حالت میں نہیں ہے کہ اسے اس کے ساتھ ملایا جائے یا اس پر قیاس کیا جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے معارض آتا ہے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ کون سا احسان اس منی کے نکلنے سے عظیم تر اور بلند ہے جس سے معزز و مکرم انسان پیدا ہوتا ہے، تحقیق الله تعالیٰ نے فرمایا: يَّخْرُجُ مِنۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآىِٕبِ ۝ (الطارق) (جو (مرد و زن کی) پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے) اور فرمایا: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (النحل: 72) (اور الله تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے۔)

اور یہ احسان کی عنایت اور انتہا ہے، پھر اگر کہا جائے: بے شک یہ پیشاب کے راستے نکلنے کے سبب ناپاک اور پلید ہو جاتی ہے، تو ہم کہیں گے: یہ وہی ہے جس کا ہم نے ارادہ کیا ہے۔ پس نجاست ایک امر عارض ہے اور اس کی اصل پاک اور طاہر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کے نکلنے کا راستہ پیشاب کے راستہ کے سوا ہے اور خاص کر عورت میں، کیونکہ اس میں ذکر کو داخل کرنے کا راستہ اور بچے کا راستہ پیشاب کے راستہ کے سوا ہے جیسا کہ علماء نے کہا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اگر کہا جائے: چونکہ اس کی اصل خون ہے اور وہ ناپاک اور نجس ہے، تو ہم کہیں گے: یہ اعتراض کستوری

کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی اصل خون ہے اور وہ پاک اور طاہر ہے۔ اور جنہوں نے اس کی طہارت کا قول کیا ہے وہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں، اس کی وجہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کپڑوں سے اپنے ناخن کے ساتھ اسے کھرچ ڈالتی تھی درآنحالیکہ وہ خشک ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اگر وہ نہ بھی کھرچی جا سکے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے سے منی کھرچ ڈالتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ نخامہ (ناک سے بہنے والا مادہ) کی مثل ہے تو اسے اذخر (گھاس) کے ساتھ پھیلا لے اور پھر کپڑے کے ساتھ اسے صاف کر لے، پونچھ ڈالے۔ پھر اگر یہ کہا جائے: تحقیق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کپڑے سے منی دھو ڈالتی تھی پھر آپ اسی کپڑے میں نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور میں اس میں دھونے کے اثر (اور نشان) دیکھ رہی ہوتی تھی۔ تو ہم کہیں گے: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ اسے گندگی سمجھ کر دھو ڈالتی تھیں جیسا کہ دیگر وہ اشیاء جو کپڑے سے زائل کی جاتی ہیں نہ کہ نجاست کی وجہ سے، اور اس طرح ان احادیث کے درمیان تطبیق ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، ان کے اصحاب، اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ نجس اور پلید ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کپڑے سے احتلام کو دھونا امر واجب ہے اور ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ اور یہی علمائے کوفہ کا بھی قول ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنے کپڑوں سے دھوتے تھے۔ اور اس میں حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے اختلاف کیا گیا ہے۔ منی کی نجاست اور اس کی طہارت کے بارے میں انہی دو قولوں پر تابعین بھی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دودھ سے پینے وغیرہ کا نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن جہاں تک مردار کے دودھ کا تعلق ہے تو اس سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ وہ پاک مائع ہے جو ناپاک برتن میں پڑی ہوئی ہے، اور وہ اس طرح کہ مردار کی کھیری نجس اور ناپاک ہے اور دودھ پاک ہے پس جب اسے دوھیا گیا تو وہ اسی طرح ہو گیا گویا اسے ناپاک برتن سے لیا گیا ہے۔ اور رہا مردہ عورت کا دودھ تو اس بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ انسان طاہر ہے زندہ ہو یا مردہ تو وہ طاہر ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے: انسان مرنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک وہ نجس ہے۔ دونوں قولوں کے مطابق حرمت (رضاعت) ثابت ہو جاتی ہے؛ کیونکہ بچہ اس سے اسی طرح غذا حاصل کرتا ہے جیسے زندہ کے دودھ سے غذا حاصل کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''رضاع وہ ہے جو گوشت پیدا کرے اور ہڈیوں کو بڑھائے'' (1)۔ اور آپ نے اس میں کوئی تخصیص نہیں کی)، تفصیل سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ یعنی لذیذ، خوش ذائقہ اور پینے والوں کے لئے اتنا آسان اور سکون بخش کہ پیتے وقت گلے میں ذرا اٹکتا نہیں۔ کہا جاتا ہے: ساغ الشراب یسوغ سوغا یعنی جس کا حلق میں داخل ہونا آسان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی رضاعۃ الکبیر، جلد 1، صفحہ 281۔ ایضاً، حدیث نمبر 1763، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سہل ہو، اور أساغه شاربه (اس نے اسے پینے والے کے لئے آسان بنا دیا)، اور سغته أنا أسيغه و أسوغه، یہ متعدی بھی ہوتا ہے اور غیر متعدی بھی، اور عمدہ أسغته إساغة ہے کہا جاتا ہے: أسِغْ لی غُصّتی یعنی مجھے مہلت دے اور میرے لئے جلدی نہ کر اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ (ابراہیم: 17) (وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔) اور السِواغ (سین کے کسرہ کے ساتھ) وہ جس کے ساتھ تیرا غصہ اتر جائے۔ کہا جاتا ہے: الماء سِواغ الغصص (پانی غصے کو ٹھنڈا کر دینے والا ہے) اور اسی سے کمیت کا قول ہے:

فکانت سِوَاغًا ان جَئِزْتَ بغُصَّة

(پس یہ حلق کے پھندے کو دور کرنے والی شے ہے اگر اسے غصہ کے ساتھ پھندا لگ جائے) اور روایت ہے کہ دودھ کے ساتھ کبھی بھی کسی کا گلا نہیں گھٹا، اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس آیت میں میٹھی شے کے استعمال اور لذیذ کھانوں کے تناول کرنے پر دلیل موجود ہے، اور یہ نہیں کہا جائے گا: بے شک یہ زہد کو ختم کر دیتا ہے اور اسے دور کر دیتا ہے، لیکن جب جزوی طور پر ہو اور بغیر اسراف اور کثرت کے ہو۔ یہ معنی سورۃ المائدہ وغیرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیالے کے ساتھ یہ تمام مشروبات پلائے ہیں شہد، نبیذ، دودھ اور پانی۔ اور بعض قراء نے فالوذج (آٹے، پانی اور شہد سے بنا ہوا حلوہ) کھانے اور کھانے کے ساتھ دودھ پینے کو مکروہ قرار دیا ہے، اور عام علماء نے اسے مباح قرار دیا ہے۔ اور حسن سے روایت کی گئی ہے کہ وہ ایک دستر خوان پر تھے اور ان کے ساتھ مالک بن دینار بھی تھے، پس فالوذج لایا گیا تو انہوں نے اسے کھانے سے انکار کر دیا تو حسن نے انہیں کہا: کھاؤ! کیونکہ تم پر ٹھنڈے پانی میں اس سے زیادہ محاسبہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ ابو داؤد وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دودھ لایا گیا تو آپ نے اسے نوش فرمایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کھانا کھانے لگے تو اسے چاہئے کہ یہ کہے: اللّٰهم بارك لنا فيه وأطعمنا خيرا منه (اے اللہ! ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما اور ہمیں اس سے بہتر کھلا) اور جب دودھ پلایا جائے تو یہ کہنا چاہئے اللّٰهم بارك لنا فيه وزدنا منه (اے اللہ! ہمارے لئے اس میں برکت رکھ دے اور ہمیں اس سے زیادہ عطا فرما) کیونکہ دودھ کے سوا کوئی شے نہیں ہے جسے کھانے پینے کا بدل بنایا جا سکے (1)۔'' ہمارے علماء نے کہا ہے: ایسا کیسے نہیں ہو سکتا جب کہ یہ وہ ہے جس سے سب سے پہلے انسان غذا حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ اجسام و ابدان نشو و نما پاتے ہیں، پس یہ وہ قوت اور طاقت ہے جو مفاسد سے خالی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اجسام مضبوط اور طاقتور بنتے ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کے لئے اس امت کے ہدایت پر ہونے کی علامت قرار دیا ہے جو تمام امتوں سے بہترین امت ہے، پس صحیح میں فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرائیل امین

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات باب ما یقول إذا اكل طعاما، جلد 2، صفحہ 183۔ ایضاً، حدیث نمبر 3377، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، باب ما یقول إذا شرب اللبن، جلد 2، صفحہ 168

علیہ السلام ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے کر آئے تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبرائیل امین علیہ السلام نے مجھے کہا آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے بلاشبہ اگر آپ شراب کو پسند کر لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی''۔ پھر دعا میں اس کی زیادتی کی التجاء یہ خوشحالی، خیرات کے ظہور، اور برکتوں کے کثیر ہونے کی علامت ہے، پس یہ سراپا برکت ہی برکت ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

''اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے میٹھا رس اور پاک رزق، بلاشبہ اس میں بھی (ہماری قدرت کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھدار ہیں۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ علامہ طبری نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے و من ثمرات النخیل والاعناب ما تتخذون (یعنی کھجور اور انگور کے پھلوں سے جو کچھ تم بناتے ہو) پس ما کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے حذف پر دلیل قول باری تعالیٰ: مِنْهُ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس میں محذوف شئ ہے، اور امر قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منہ کا معنی ہے ای من المذکور (یعنی ان سے جن کا ذکر کیا گیا ہے)۔ پس کلام میں حذف نہ ہوگا اور یہی اَولیٰ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَمِنْ ثَمَرٰتِ کا عطف الْاَنْعَامِ پر ہو یعنی اور تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں عبرت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مِمَّا پر معطوف ہو یعنی اور ہم تمہیں پھلوں سے بھی مشروبات پلاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: سَكَرًا السکر ہر وہ شے جو نشہ دیتی ہے؛ لغت میں یہی مشہور ہے۔ سکر سے مراد خمر (شراب) لیا ہے، اور رزق حسن سے مراد ہر وہ حلال شے ہے جو ان دونوں درختوں سے کھائی پی جاتی ہے۔ اور یہی قول ابن جبیر، نخعی، شعبی اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک لغت حبشہ کے مطابق سکر سے مراد سرکہ ہے، اور رزق حسن سے مراد طعام ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السکر سے مراد میٹھا اور حلال رس (جوس) ہے، اور اسے سکر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جب یہ پڑا رہے تو یہ بھی مسکر (نشہ آور) ہو جاتا ہے، پس جب یہ نشہ دینے کی حد تک پہنچ جائے تو حرام ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان اقوال میں سے زیادہ صحیح اور مضبوط قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اور دو معنوں میں سے ایک پر ہو سکتا ہے، یا تو یہ کہ اس آیت کا نزول تحریم خمر سے پہلے ہو، اور یا اس کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھجور اور انگور کے پھلوں کے ساتھ انعام فرمایا ہے اور تم اس سے وہ شے بناتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہے (یہ) تمہاری طرف سے حد سے تجاوز اور زیادتی ہے، اور وہ شے بناتے ہو جو تمہارے لئے اس نے حلال کی ہے (اور) اس سے تمہاری منفعت کا قصد و ارادہ فرمایا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت تحریم خمر سے پہلے نازل ہوئی پھر یہ منسوخ ہو گئی، کیونکہ یہ آیت باتفاق علماء مکی ہے، اور شراب مدینہ طیبہ میں حرام ہوئی (1)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1153

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اس بنا پر کہ سکر سے مراد سرکہ یا میٹھا رس ہو تو اس میں کوئی نسخ نہیں ہے، اور یہ آیت محکم ہوگی اور یہی اچھا اور بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل حبشہ سرکہ کو سکر کا نام دیتے ہیں، مگر جمہور کا موقف یہ ہے کہ سکر سے مراد خمر (شراب) ہے، ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت ابورزین، حسن، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان تمام نے یہ کہا ہے: سکر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پھلوں میں سے حرام قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح اہل لغت نے بھی کہا ہے: السکر اسم الخمر و ما یسکر۔ (یعنی سکر خمر کا نام ہے اور ہر اس شے کا جو نشہ آور ہوتی ہے)۔ اور انہوں نے یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

بئس الصُّحاۃ و بئس الشَّرْبُ شَرْبُھم　　إذا جری فیھم المُزَّاء والسَّکَر (1)

اور رزق حسن سے مراد وہ ہے جو ان دونوں کے پھلوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قول باری تعالیٰ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا خبر ہے۔ اس کا معنی استفہام بمعنی انکار ہے، یعنی کیا اس سے شراب بناتے ہو اور پاکیزہ رزق (یعنی) سرکہ، کشمش، اور کھجور سب چھوڑ دیتے ہو؟ جیسا کہ یہ قول ہے: فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ یعنی کیا وہ ہمیشہ رہیں گے؟ یعنی یہ تیرے لئے خوراک ہے۔ اور شاعر کا قول بیان کیا ہے:

جَعلتَ عیبَ الأکرمین سَکَرًا (2)

(تو نے معززین کی عیب جوئی کو خوراک بنالیا ہے) یعنی تو نے ان کی مذمت کو خوراک بنالیا ہے۔ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے کہ السکر سے مراد ہر وہ شے جو کھانے میں سے کھائی جاتی ہے اور کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اس کا پینا حلال ہو اور یہی رزق حسن ہے، پس الفاظ مختلف ہیں لیکن معنی ایک ہے۔

اسی طرح یہ قول ہے: اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ (یوسف: 86) (میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں) یہ معنی مراد لینا اچھا ہے اور اس میں کوئی نسخ نہیں، مگر زجاج نے کہا ہے: ابو عبیدہ کا یہ قول معروف نہیں ہے، اور علماء تفسیر اس کے خلاف ہیں، اور جو شعر انہوں نے کہا ہے اس میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ ان کے سوا دوسروں کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ یہ بیان کر رہا ہے کہ وہ لوگوں کے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے، چھپا لیتی ہے۔ اور احناف نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ سَكَرًا سے مراد وہ ہے جو نبیذوں میں سے نشہ آور نہ ہو اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان چیزوں کے ساتھ احسان کیا ہے جو اس نے ان کے لئے تخلیق فرمائی ہیں، اور احسان صرف انہی چیزوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو حلال کی گئی ہیں نہ کہ ان کے ساتھ جو حرام ہیں، پس یہی ایسی نبیذ کے پینے کے جواز پر دلیل ہے جو مسکر نہ ہو، پس جب وہ نشہ کی حد تک پہنچ جائے تو وہ جائز نہ ہوگی، اور انہوں نے اسے اس حدیث کے ساتھ قوی اور مضبوط کیا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس خمر (شراب) کو حرام بعینہا اور سکر (نشہ آور شراب) کو حرام من غیرھا قرار دیا ہے (3)''۔ اور اس روایت سے جسے عبدالملک بن نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 198　2۔ ایضاً　3۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 162، حدیث 9984

سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے ایک آدمی کو دیکھا وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ رکن کے ساتھ تشریف فرما تھے، اور اس نے آپ کو ایک پیالہ پیش کیا سو آپ نے اسے اپنے منہ کی طرف اٹھایا تو اسے سخت (نشہ آور) پایا تو آپ نے اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دیا۔ تو اس وقت آپ کو لوگوں میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا وہ حرام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اس آدمی کو میرے پاس لاؤ''۔ اسے لایا گیا تو آپ نے اس سے پیالہ پکڑ لیا، پھر پانی منگایا اور وہ اس میں انڈیل دیا پھر اسے اپنے منہ کی طرف بلند کیا اور اسے ہلایا۔ پھر پانی منگایا اور وہ بھی اس میں انڈیل دیا پھر ارشاد فرمایا: ''جب تم پر یہ برتن جوش مارنے لگیں تو تم ان کی شدت اور سختی کو پانی کے ساتھ توڑ دو''۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے لئے نبیذ بنائی جاتی تھی اور اسی دن آپ اسے نوش فرما لیتے تھے۔ اور جب اسے دوسرا یا تیسرا دن ہو جاتا تو آپ خادم کو پلا دیتے جب اس میں معمولی تغیر ہوتا، اگر یہ حرام ہوتی تو آپ قطعاً اسے نہ پلاتے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابو عون ثقفی نے عبداللہ بن شداد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: خمر (شراب) بعینہا حرام ہے وہ قلیل ہو یا کثیر اور ہر مشروب سے سکر (نشہ آور) حرام ہے۔ اسے دار قطنی نے بھی نقل کیا ہے۔ پس اس حدیث میں اور ان میں جو اس کی مثل ہیں، یہ ہے کہ غیر خمر کا عین اس طرح حرام نہیں جس طرح خمر بعینہا حرام ہے۔ انہوں نے کہا: خمر انگور کی شراب ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور ان کے دلائل میں سے وہ روایت بھی ہے جسے شریک بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابو اسحاق ہمدانی نے عمرو بن میمون سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک ہم ان اونٹوں کا گوشت کھاتے ہیں اور اسے ہمارے پیٹوں میں سوائے نبیذ کے کوئی شے ہضم نہیں کر سکتی۔ شریک نے بیان کیا ہے: میں نے ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے زمانے کے جید عالم مالک بن معول کے گھر نبیذ پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ان کا یہ قول کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے اور اس کا احسان نہیں ہو سکتا مگر ان چیزوں کے ساتھ جو اس نے حلال فرمائی ہیں یہ بالکل صحیح ہے؛ مگر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد تحریم خمر سے پہلے کا ہو جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے تو پھر یہ منسوخ ہو گا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ کہا جائے اس کا نسخ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ یہ خبر ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا؟ تو ہم کہیں گے: یہ اس کا کلام ہے جس نے شریعت کی تحقیق نہیں کی، تحقیق ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خبر جب وجود حقیقی کے بارے میں ہو یا ثواب عطا کرنے کے بارے میں درآنحالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل ہو تو یہ وہ خبر ہے جس میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا، لیکن جب خبر حکم شرعی کو متضمن ہو تو احکام تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور منسوخ بھی ہو جاتے ہیں، چاہے وہ خبر کی صورت میں ہوں یا امر کی صورت میں، اور نسخ نفس لفظ کی طرف راجع نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کی طرف راجع ہوتا ہے جسے وہ متضمن ہوتا ہے، پس جب تم یہ سمجھ گئے تو تم ان کند ذہنوں کی صنف سے خارج ہو گئے جس کے متعلق کفار کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (النحل) (اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں تم

صرف افترا پرداز ہو، بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس سے جاہل اور ناواقف ہیں کہ رب کریم جس کے بارے چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے پابند اور مکلف بنا دیتا ہے اور اپنے عدل کے ساتھ اس میں سے جو چاہتا ہے اٹھالیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ انتہائی برا طعن و تشنیع ہے یہاں تک کہ اس میں نیکوکار علماء بھی فہم وفراست کی کمی میں کفار کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور یہ مسئلہ اصولی ہے، وہ یہ کہ احکام شرعیہ کے بارے اخبار کا نسخ جائز ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ نسخ جائز ہے اور اس کی وجہ یہ آیت اور اس کی مثل آیات ہیں، اور اس لئے بھی کہ کسی حکم کے مشروع ہونے کے بارے خبر اس مشروع کی طلب کو متضمن ہوتی ہے، اور وہی طلب وہ حکم شرعی ہے جس کے نسخ پر استدلال کیا جا رہا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور رہیں وہ احادیث جو انہوں نے ذکر کی ہیں تو ان میں سے پہلی اور دوسری دونوں ضعیف ہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ثابت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر شراب جو نشہ دے پس وہ حرام ہے(1)''۔ اور مزید فرمایا: ''ہر نشہ آور (مشروب) خمر ہے اور ہر نشہ آور (شراب) حرام ہے''۔ كلُّ مسكرٍ خمرٌ و كلُّ مسكرٍ حرامٌ(2) اور مزید فرمایا: ''جس شے کی کثیر مقدار نشہ آور ہو تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے(3)''۔ نسائی نے کہا ہے: ان احادیث کے تمام روات اہل ثبت و عدالت ہیں اور صحت نقل کے ساتھ مشہور ہیں، اور عبدالملک ان میں سے کسی ایک کے قائم مقام بھی نہیں ہو سکتا اگرچہ اس کے ہم مثلوں کی جماعت بھی اس کی تائید اور معاونت کرے۔ وباللہ التوفیق۔

اور رہی تیسری حدیث تو اگرچہ وہ صحیح ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خادم کو وہ اس لئے نہیں پلاتے تھے کہ وہ مسکر ہے بلکہ آپ اس لئے پلا دیتے تھے کہ اس کی بو تبدیل ہو چکی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند کرتے تھے کہ آپ سے بو پائی جائے، پس اسی لئے آپ اسے نہ پیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی ازواج نے عسل زینب کے بارے میں آپ پر یہ وہم اور شبہ کیا کہ آپ کو کہا گیا: بے شک ہم آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہیں، مراد ناپسندیدہ بو ہے، پھر اس کے بعد آپ نے اسے نہ پیا۔ اس کا بیان سورت تحریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور رہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث! تو آپ سے اس کے خلاف بھی مروی ہے اور وہ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ، طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اور مجاہد کی روایت سے ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وہ شے جس کی کثیر مقدار نشہ آور ہو تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے(4)''۔ اور اسے آپ سے حضرت قیس بن دینار نے روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح مسکر کے بارے میں آپ کا فتویٰ ہے؛ یہ دار قطنی نے کہا ہے۔ اور پہلی حدیث آپ سے حضرت عبداللہ بن شداد نے روایت کی ہے حالانکہ ایک جماعت نے ان سے مخالفت کی ہے، پس اس کے ساتھ قول ساقط ہو گیا اس کے ساتھ ساتھ کہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت بھی نہیں اور جہاں تک اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب لا یجوز الوضوء بالنبیذ، جلد 1، صفحہ 38

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب اباحة النبیذ الذی لم یشتد ولم یصر مسکرا، جلد 2، صفحہ 168

3۔ جامع ترمذی، کتاب الاشربہ، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام، جلد 2، صفحہ 9۔

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام، حدیث 3384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

روایت کا تعلق ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: ہمارے پیٹوں میں نبیذ کے سوا کوئی شے اسے ہضم نہیں کر سکتی، تو آپ اس سے غیر مسکر کا ارادہ فرما رہے ہیں اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور نسائی نے عتبہ بن فرقد سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: وہ نبیذ جسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پیا تھا اس کا سرکہ بنالیا گیا۔ نسائی نے بیان کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے پر حضرت سائب رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث دلالت کرتی ہے، حارث بن مسکین نے کہا ہے آپ پر پڑھا گیا اور میں ابن قاسم سے سنتا رہا: مالک نے ابن شہاب سے، انہوں نے سائب بن یزید سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے انہیں خبر دی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: بے شک میں نے فلاں سے شراب کی بو پائی ہے، تو آپ کو گمان ہوا کہ وہ شراب الطلاء ہو اور میں اس کے بارے پوچھنے لگا ہوں جو اس نے پیا ہے، پس اگر وہ مسکر ہوا تو میں اسے کوڑے لگاؤں گا، پس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے مکمل حد کے کوڑے لگائے۔ تحقیق آپ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: امابعد! اے لوگو! چونکہ شراب (خمر) کے حرام ہونے کا حکم نازل ہو چکا ہے اور یہ پانچ چیزوں سے تیار ہوتی ہے انگور، شہد، کھجور، گندم اور جو سے اور خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ اور سورۃ المائدہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی اور امام ابوجعفر طحاوی نے اس کے پینے کو حلال قرار دیا ہے اور وہ بھی اپنے اہل زمانہ کے امام تھے، اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اسے پیتے تھے۔ تو ہم کہیں گے: نسائی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے نبیذوں میں سے مسکر کو حلال قرار دیا وہ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اور یہ ایک عالم کی پھسلاہٹ (اور خطا) ہے اور ہمیں عالم کی پھسلاہٹ سے محتاط رکھا گیا ہے، اور سنت کے ہوتے ہوئے کسی کے قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ اور نسائی نے بھی ابن المبارک سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے مسکر کے بارے میں کسی سے ایسی رخصت نہیں پائی جو صحیح ہو سوائے ابراہیم کے۔ ابو اسامہ نے کہا ہے: میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو بلاد شام، مصر، یمن اور حجاز میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر علم کا طالب ہو۔ اور رہے حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ! اگر ان دونوں سے یہ قول صحیح ہے تو بھی ان سے ان کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا جن ائمہ کرام نے تحریم مسکر میں ان کی مخالفت کی ہے اس کے ساتھ ساتھ کہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

اس بنا پر کہ امام طحاوی نے اپنی کتاب ''الکبیر'' میں اختلاف میں اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کتاب التمہید میں ذکر کیا ہے کہ ابوجعفر طحاوی نے کہا ہے: امت اس پر متفق ہے کہ انگور کا رس (عصیر العنب) جب سخت ہو جائے، ابل جائے اور اس پر جھاگ بن جائے تو وہ خمر ہے اور اسے حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ اور نقیع التمر (بھگوئی ہوئی کھجوروں کا شربت) میں علماء نے اختلاف کیا ہے جب وہ ابل جائے اور نشہ پیدا کر دے۔ فرمایا: پس یہ تیری اس پر راہنمائی کر رہا ہے کہ یحییٰ بن ابی کثیر کی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''خمر ان دو درختوں سے بنتا ہے کھجور اور انگور (1)''۔ ان کے نزدیک اس کے مطابق عمل نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ حدیث کو قبول کرتے تو وہ نقیع التمر کو حلال قرار دینے والوں کو کافر قرار دیتے، تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ خمر جو حرام کیا گیا ہے اس میں انگور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، بیان ان جمیع ماینبذ مما یتخذ من النخل والعنب، جلد 2، صفحہ 163

کے اس رس کے سوا کوئی داخل نہیں جو سخت ہو گیا ہو اور اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ نشہ دینے لگے۔ فرمایا: پھر وہ اس سے خالی نہ ہو گا کہ تحریم صرف اسی کے ساتھ معلق ہو اور اس پر کسی غیر کو قیاس نہ کیا گیا ہو یا اس پر قیاس واجب اور ضروری ہو گا، تو ہم نے تمام کو پایا ہے کہ انہوں نے اس پر نقیع التمر کو قیاس کیا ہے جب وہ ابلنے لگے اور اس کی کثیر مقدار نشہ دینے لگے اور نقیع الزبیب بھی اسی طرح ہے۔ فرمایا: پس اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ واجب ہے کہ مشروبات میں سے ہر اس کو حرام قرار دیا جائے جو نشہ آور ہو۔ فرمایا: تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر مسکر حرام ہے (2)''۔ اور اس کی سند کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے تمام نے قبول کیا ہے۔ اور ان کے درمیان اختلاف اس کی تاویل میں ہے، پس ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ آپ نے اس سے اس جنس کا ارادہ کیا ہے جو نشہ دیتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ نے اس سے ارادہ اس کا کیا ہے جس کے ساتھ وہ نشہ میں مبتلا ہو جائے جیسا کہ کسی کو قتل کے وجود کے بغیر قاتل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ حرام ہے ان کے اس قول کی وجہ سے: پس اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ واجب ہے کہ ہر نشہ آور مشروب کو حرام قرار دیا جائے۔ اور دار قطنی نے اپنی سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے خمر کو اس کے نام کی وجہ سے حرام نہیں کیا بلکہ اس کے انجام کی وجہ سے اسے حرام کیا ہے، پس ہر شراب کا انجام خمر کے انجام کی مثل ہی ہوتا ہے پس وہ خمر کے حرام ہونے کی طرح ہی حرام ہو گی۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل کوفہ معلول اخبار لائے ہیں، اور جب لوگوں کا کسی شے کے بارے اختلاف ہو جائے تو پھر اسے کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف لوٹانا واجب ہے۔ اور بعض تابعین کے بارے میں جو یہ مروی ہے کہ انہوں نے وہ شراب پی ہے جس کی کثیر مقدار نشہ دیتی ہے تو یہ قوم کے گناہ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت طلب کریں گے، اور یہ دو معنوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہے کہ یا تو وہ خطا کار ہے اس حدیث کی تاویل میں اس نے خطا کی ہے جو اس نے سنی یا آدمی سے گناہ صادر ہوا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کثرت سے کرے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے اولین و آخرین پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں۔ اور آیت کی تاویل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک یہ عبرت کے لئے ذکر کی گئی ہے یعنی جو (ذات) ان اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ یقیناً دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، اور یہ اعتبار اس سے مختلف نہیں ہوتا کہ خمر حلال ہو یا حرام، پس السکر (رس) بنانا تحریم پر دلالت نہیں کرتا، اور یہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرہ:219) (آپ فرمایئے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے۔) واللہ اعلم۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

''اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات کہ بنایا کر پہاڑوں میں (اپنے) چھتے اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، بیان ان جمیع ماینبذ مما یتخذ من النخل والعنب، جلد 2، صفحہ 168

درختوں (کی شاخوں) میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ وحی کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے اور وہ یہ کہ یہ کبھی بمعنی الہام ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ابتداءً ہی بغیر کسی ظاہری سبب کے دل میں بات القا کر دیتا ہے۔" اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ (الشمس) (قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو) اور اسی سے چوپائے اور وہ چیز ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان میں اپنے منافع پانے، اپنے نقصان اور تکلیف کے مقام سے اجتناب کرنے اور اپنی معاش کی تدبیر کرنے کے بارے پیدا فرما دیتا ہے۔ اور تحقیق اللہ عزوجل نے بے جان چیزوں کے بارے میں اسی کی خبر دی اور فرمایا: تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۙ (الزلزلہ) (اس روز وہ بیان کر دے گی اپنے سارے حالات، کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا ہے۔)

ابراہیم حرمی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کو بے جان چیزوں میں قدرت ہے اس کے بارے معلوم نہیں وہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس سے اس کے بارے کچھ نہیں لائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بارے آگاہ کر دیا ہے یعنی ان کو الہام کر دیا ہے۔ اور تاویل کرنے والے علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہاں وحی بمعنی الہام ہے۔ اور یحییٰ بن وثاب نے حا کے فتحہ کے ساتھ اِلَى النَّحَلِ پڑھا ہے۔ اور اسے نحل کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے وہ شہد عطا فرمایا ہے جو اس سے نکلتا ہے؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: النحل اور النحلة الدبر (شہد کی مکھیوں کے انبوہ) کا اطلاق نر اور مادہ دونوں پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: یَعْسُوب (نر مکھی، شہد کی مکھیوں کا بادشاہ) اور اہل حجاز کی لغت میں النحل کو اور ہر اس جمع کو جس کے درمیان اور اس کی واحد کے درمیان صرف ھا کا فرق ہوتا ہے مونث لایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام مکھیاں جہنم میں ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں اہل جہنم کے لئے عذاب بنا دے گا سوائے شہد کی مکھی کے"۔ اسے حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" (1) میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد (لٹورا، موٹے سر، سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندوں کو شکار کرتا ہے) کو مارنے سے منع فرمایا ہے (2)، اسے ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے، اور اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ یہ تب ہے جب ان کا کوئی مالک نہ ہو وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کے چھتے ان تین قسموں میں بنائے ہیں یا تو پہاڑوں اور ان کی غاروں میں ہوں، درختوں

1۔ نوادر الاصول فی معرفة حدیث الرسول، باب الاصل الرابع والتسعون فی حکمة الله تعالیٰ فیما نهی من قتله، صفحہ 132

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قتل الذر، جلد، صفحہ 358۔ ایضاً، حدیث نمبر 4583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے درمیان (ان کی ٹہنیوں کے ساتھ) ہوں، یا پھر ان چھپروں، خالی جگہوں اور دیواروں وغیرہ کے ساتھ جنہیں لوگ بناتے ہیں۔ اور یہاں عرش بمعنی ھیأ (تیار کرنا) ہے۔ اور اس کا اکثر استعمال ایسے چھپر کے لئے ہوتا ہے جو لکڑیاں گاڑ کر، ٹہنیوں کو جوڑ کر سایہ حاصل کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اور اسی سے وہ عریش ہے جو غزوہ بدر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنایا گیا تھا، اور اسی سے لفظ عرش ہے۔ کہا جاتا ہے: عرش یعرِش و یعرُش (یعنی را کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ)، اور اسے دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ابن عامر نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور انہوں نے اس میں عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو پیدا فرمایا اور اس میں عجیب بات یہ ہے کہ اسے اپنا چھتہ مسدس (چھ کونوں والا) بنانے کا الہام کیا، پس اسی سبب سے وہ جڑا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک ٹکڑے کی مانند ہو جاتا ہے، اور وہ اس لئے کہ مثلث (تکون) سے معشر (دس کونوں والی شکل) تک تمام شکلیں جب ان میں سے ہر کوئی اپنی امثال کے ساتھ جمع ہو تو وہ آپس میں جڑتی نہیں اور ان دونوں کے درمیان شگاف آ جاتا ہے، سوائے مسدس شکل کے، کیونکہ یہ جب اپنی امثال کے ساتھ جمع ہو تو یہ جڑ جاتی ہے اور اس طرح ہو جاتی ہے (1) گویا کہ وہ ایک ٹکڑا ہے۔

ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

''پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے پھر چلتی رہا کر اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر، (یوں) نکلتا ہے ان کے شکموں سے ایک شربت مختلف رنگوں والا، اس میں شفا ہے لوگوں کے لئے، بے شک اس میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اور یہ اس لئے ہے کیونکہ یہ درختوں سے کلیاں کھاتی ہیں۔ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ پھر تو اپنے رب کی راہوں پر چلتی رہا کر۔ اور السبل کا معنی الطرق (راستے) ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت اپنی طرف کی ہے کیونکہ وہ ان کا خالق ہے، یعنی تو پہاڑوں اور درختوں کے درمیان میں رزق تلاش کرنے کے لئے اپنے رب کی راہوں پر داخل ہو جا۔ ذُلُلًا یہ ذلول کی جمع ہے اور اس سے مراد مطیع کیا ہوا ہے، یعنی وہ راہیں جو مطیع اور مسخر کر دی گئی ہیں، پس ذُلُلًا یہ النحل سے حال ہے، یعنی شہد کی مکھی تابعداری کرتی ہے اور وہاں جاتی ہے جہاں اس کا مالک چاہے، کیونکہ یہ اپنے مالکوں کی اتباع اور پیروی کرتی ہیں جہاں وہ جائیں؛ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ ذُلُلًا سے مراد راستے ہیں۔ اور یعسوب شہد کی مکھیوں کی سردار، ملکہ مکھی، جب وہ ٹھہر جائے تو یہ ٹھہر جاتی ہیں اور جب وہ چل پڑے تو یہ چل پڑتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا یہ خطاب سے خبر کی طرف رجوع ہے اس بنا پر کہ اس میں نعمتوں کو شمار

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 1156

کرنا اور عبرت پر تنبیہ کرنا ہے پس فرمایا: یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ یعنی ان کے شکموں سے شہد نکلتا ہے۔ اور جمہور لوگوں کا موقف یہ ہے کہ شہد شہد کی مکھیوں کے مونہوں سے نکلتا ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک قول منقول ہے(1) جو آپ نے اس دنیا کی حقارت بیان کرنے کے لئے کیا ہے کہ ابن آدم کا اشرف ترین اور عمدہ لباس وہ ہے جس میں ایک کیڑے کا لعاب ہے اور اس کا عظیم اور بہترین مشروب شہد کی مکھی کی بیٹ ہے۔ تو اس قول کا ظاہر اس پر دال ہے کہ شہد منہ کے سوا کسی اور مقام سے نکلتا ہے۔ الختصر یہ کہ وہ نکلتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اس کے منہ سے نکلتا ہے یا اس کے نیچے سے، لیکن اس کی صلاحیت اور منفعت ان کے سانسوں کی گرمائش کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ارسطاطالیس نے شیشے کا ایک مکان بنایا تا کہ وہ اس کیفیت کو دیکھ سکے جو وہ عمل کرتی ہیں، تو انہوں نے وہ عمل نہ کیا یہاں تک کہ شیشے کا اندرونی حصہ مٹی کے ساتھ لتھڑ گیا، لت پت ہو گیا؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور کہا: مِنْۢ بُطُوْنِهَا کیونکہ کھانوں میں تبدیلی اور تغیر پیٹ میں ہی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ اس سے مراد اس کی مختلف انواع اور اقسام ہیں یعنی سرخ، سفید، زرد، جامد اور سائل (بہنے والا) مائع۔ ماں ایک ہوتی ہے اور اولاد مختلف ہوتی ہے یہ اس پر دلیل ہے کہ قدرت نے اسے غذا کی تقسیم کے اعتبار سے تقسیم کر دیا ہے، جیسا کہ اس کا ذائقہ کھائی جانے والی چیزوں کے مختلف ہونے کے حساب سے مختلف ہوتا ہے، اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت زینب کا قول ہے: جَرَسَتْ نَحْلُهُ الْعُرْفُطَ (2) (اس شہد کی مکھی نے ببول کے درخت کو چوسا ہے) اس لئے اس کی بو مغافیر کی بو کے مشابہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ، فِیْهِ میں ضمیر شہد کے لئے ہے؛ یہ جمہور نے کہا ہے، یعنی شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، ضحاک، فراء، اور ابن کیسان سے روایت کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر قرآن کریم کے لئے ہے، یعنی قرآن میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے یا ان میں لوگوں کے لئے شفا ہے جو ہم نے تم پر آیات و براہین میں سے بیان کی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: شہد میں شفا ہے، اور یہ قول بھی بین اور واضح ہے، کیونکہ اکثر وہ مشروبات اور معجونیں جن کے ساتھ علاج کیا جاتا ہے ان کی اصل شہد ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے(3): جنہوں نے کہا ہے کہ مراد قرآن کریم ہے یہ اس سے بہت بعید ہے جو میں ان کی طرف سے صحیح خیال کرتا ہوں، اور اگر نقلاً صحیح بھی ہو تو عقلاً صحیح نہیں، کیونکہ سیاق کلام مکمل طور پر شہد کے بارے ہے، قرآن کریم کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جہلاء میں سے ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ اس آیت سے مراد اہل بیت اور بنو ہاشم ہیں کہ وہ نحل (شہد کی مکھی) ہیں، اور شراب قرآن اور حکمت ہے۔ ان میں سے کسی نے منصور ابو جعفر عباسی کی مجلس میں اس کا ذکر کیا، تو حاضرین میں سے کسی آدمی نے اس کو کہا: اللہ تعالیٰ نے تیرا کھانا، پینا اس میں سے بنایا ہے جو بنی ہاشم کے پیٹوں سے نکلتا ہے، پس اس نے حاضرین کو ہنسا دیا اور وہ دوسرا مبہوت ہو گیا اور اس پر اپنے قول کی کمزوری ظاہر ہو گئی (4)۔

---

1۔ المحرر الوجیز، سورۃ النحل، جلد 3، صفحہ 406
2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب لم تحرم ما أحل الله لك، جلد 2، صفحہ 793
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1158
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1157

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کا اس قول باری تعالیٰ: فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کے بارے میں اختلاف ہے کیا یہ اپنے عموم پر ہے یا نہیں؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: یہ اپنے عموم پر ہے اس میں ہر حال میں اور ہر ایک کے لئے شفا ہے(1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ آپ کو جب بھی کسی زخم یا کسی اور بیماری کی شکایت ہوتی تو اس پر شہد استعمال کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر پھوڑا نکل آتا تو اس پر شہد لگاتے تھے(2)۔ اور نقاش نے ابو وجرہ سے بیان کیا ہے کہ وہ شہد کے ساتھ سرمہ لگاتے تھے اور شہد ہی بطور دست آور دوا پیتے تھے اور پھر شہد کے ساتھ ہی علاج کرتے تھے۔ اور روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہو گئے تو ان کو کہا گیا: کیا ہم آپ کا علاج نہ کریں؟ تو انہوں نے فرمایا: میرے پاس پانی لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ نَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (ق: 9) (اور ہم نے اتارا آسمان سے برکت والا پانی۔) پھر فرمایا: میرے پاس شہد لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے) اور میرے پاس زیتون کا تیل لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (النور: 35) (برکت والے درخت سے) پس وہ فوراً یہ تمام چیزیں لے آئے تو آپ نے ان تمام کو آپس میں ملا دیا پھر یہ شربت پی لی تو وہ صحت یاب ہو گئے(3)۔

اور ان میں سے بعض علماء نے کہا ہے: بے شک یہ عموم پر ہے جب یہ سرکے کے ساتھ ملایا جائے اور اسے پکایا جائے تو یہ ایسا مشروب تیار ہو گا جو ہر حال میں ہر بیماری کے لئے نفع بخش ثابت ہو گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک یہ خاص معنی پر ہے اور یہ ہر بیماری میں، اور ہر انسان کے لئے عام ہونے کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ یہ تو اس کے بارے خبر ہے کہ یہ اسی طرح باعث شفا ہے جس طرح اس کے علاوہ دیگر ادویہ بعض کے لئے، بعض حالات میں باعث شفا ہوتی ہیں، پس آیت کا فائدہ اس کے بارے یہ خبر دینا ہے کہ یہ دوا ہے کیونکہ اس کے ساتھ اکثر شفا ہو جاتی ہے۔ اور یہ مشروبات اور معجونوں میں سے دیگر ادویہ کے لئے یہ جز اور ان کا معاون ہو گیا اور یہ کوئی پہلا لفظ نہیں ہے جسے خاص کیا گیا ہے بلکہ قرآن اس سے بھرا پڑا ہے اور لغت عرب میں بہت سے عام بمعنی خاص اور خاص بمعنی عام آتے ہیں۔ اور جو چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ اپنے عموم پر نہیں ہے وہ یہ کہ شفا نکرہ سیاق اثبات میں ہے، اور اس میں عموم نہیں ہوتا اس پر اہل زبان، محققین اہل علم، اور مختلف اہل اصول کا اتفاق ہے، لیکن اسے اہل الصدق والعزم میں سے ایک گروہ نے عموم پر محمول کیا ہے، پس وہ ہر قسم کے دردوں اور بیماریوں سے شہد کے ساتھ شفا حاصل کرتے ہیں، اور وہ اپنی بیماریوں سے قرآن کریم کی برکت اور تصدیق و ایقان کی صحت کے ساتھ شفا پاتے ہیں۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جس کی نیت کمزور ہو اور اس کی عادت دین پر غالب ہو تو اس نے اس کا مفہوم اطباء کے قول کے مطابق لیا ہے، اور یہ سب اسی حکیم کی حکمت میں سے ہے جو وہ سب کچھ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہیں شہد نفع دیتا ہے اور وہ بھی جنہیں یہ نقصان اور ضرر دیتا ہے، تو پھر یہ لوگوں کے لئے شفا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اسے کہا جائے گا: پانی ہر شے کے لئے حیات ہے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 407　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1158　3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1157

حالانکہ ہم نے کئی دیکھے ہیں جنہیں پانی ماردیتا ہے جب وہ اسے اس حال میں استعمال کریں جب ان کے بدن کی بیماری اس کی ضد اور اس کے خلاف ہو۔ اور ہم نے شہد کی شفا تو اس کے مشروبات میں سے اکثر میں دیکھی ہے؛ یہ معنی زجاج نے بیان کیا ہے۔ اور اطباء نے اپنے سرخیل بکرۃ سے سکنجبین کے ہر بیماری میں عام نفع بخش ہونے کی مدح پر اتفاق کیا ہے۔ اور اس کی اصل شہد ہے اور اسی طرح تمام معجونیں ہیں، اس بنا پر کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشکال کو ختم کر دیا اور احتمال کی وجہ کو دور کر دیا جس وقت آپ نے اس آدمی کے لئے شہد پینے کا حکم ارشاد فرمایا جو اپنے پیٹ میں بیماری کی شکایت کرتا ہے، سو جب اس کے بھائی نے آپ کو عرض کی کہ اسے استطلاق بطن (پیٹ کھلنے کی بیماری) میں اضافہ ہو گیا ہے تو آپ نے اسے دوبارہ یہی مشروب پینے کا حکم دیا تو وہ صحت یاب ہو گیا اور آپ نے فرمایا: صدق الله و كذب بطن أخيك(1) (اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اور تیرے بھائی کے پیٹ نے جھوٹ بولا ہے۔)

**مسئلہ نمبر 6۔** بعض زندیق اطباء نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے: تحقیق اطباء کا اس پر اجماع ہے کہ شہد دست لاتا ہے (پیٹ کو نرم کرتا ہے) تو پھر یہ اس کے لئے کیسے مفید ہو سکتا ہے جسے پہلے ہی اسہال کی بیماری ہو، تو جواب یہ ہے کہ وہ قول اس کے لئے فی نفسہ حق ہے جس کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تصدیق حاصل ہو چکی ہے، اور وہ اسے اسی طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو آپ نے معین فرمایا ہے اور یہ وہ محل ہے جس میں آپ نے اسے نیت اور حسن ضمیر کا اظہار کرنے کا حکم دیا ہے، تو وہ اس کی منفعت اور فوائد دیکھ لے گا اور اس کی برکت پالے گا، جیسا کہ اس شہد والے اور اس کے سوا دوسروں کو اتفاق ہوا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور رہا یہ کہ اس پر اجماع بیان کیا گیا ہے تو یہ ان کی جہالت پر نقلی دلیل ہے اس حیثیت سے کہ انہوں نے اسے مقید نہیں کیا بلکہ مطلق کہا ہے۔ امام ابو عبد اللہ مازری نے کہا ہے: یہ جان لینا چاہئے کہ اسہال کا عارضہ کثیر وجوہ سے ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ بدہضمی اور ہیضہ کی وجہ سے دست شروع ہو جاتے ہیں، تو اس کی مثل میں تمام اطباء کا اس پر اجماع ہے کہ اس کا علاج یہ ہے کہ طبیعت اور اس کے فعل کو (اپنے حال پر) چھوڑ دیا جائے اور اگر اسہال کی معاون دوا کی ضرورت ہو تو وہ استعمال کی جائے جب تک قوت باقی ہو، کیونکہ انہیں روکنا نقصان دہ ہے، تو جب یہ واضح ہو گیا تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے اس آدمی کو اسہال کی بیماری پیٹ (میں ہوا) بھرنے اور ہیضہ کے سبب لگی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہد پینے کا حکم ارشاد فرمایا ہو پس وہ زیادہ ہو گئے یہاں تک کہ وہ مادہ ختم ہو گیا اور اسہال رک گئے تو نتیجۃً شہد کا پینا اس کے لئے موافق اور نفع بخش ثابت ہوا، پس جب یہ بات طب کی صناعت سے نکلی ہے تو اس نے معترض کے اس صناعت سے جاہل اور ناواقف ہونے سے بھی آگاہ کر دیا۔

فرمایا: ہم ایسے نہیں کہ ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر یقین کریں اس لئے کہ اطباء آپ کی تصدیق کرتے ہیں (نہیں) بلکہ اگر وہ آپ کو جھٹلا دیں تو ہم یقیناً انہیں جھٹلا دیں گے اور یقیناً ہم ان کا انکار کر دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں گے۔ پس اگر ہم نے ان کے قول کی صحت کو مشاہدہ کے ساتھ پالیا تو اس وقت ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تاویل

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الدواء بالعسل، جلد 2، صفحہ 848

اور اس معنی پر اس کی تخریج کے محتاج ہوں گے جس پر وہ صحیح ہوسکتا ہے جبکہ اس پر دلائل موجود ہیں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ فی قولہ تعالیٰ: فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں دوا وغیرہ پینے کے ساتھ علاج کرنے کے جواز پر دلیل ہے بخلاف ان اجل علماء کے جنہوں نے اسے ناپسند کیا ہے، اور وہ ان صوفیہ کے طریقہ پر ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ولایت مکمل نہیں ہوتی مگر تب جب بندہ اس سب کے ساتھ راضی ہو جو اس پر مصیبت اور تکلیف وغیرہ نازل ہو، اور اس کے لئے علاج جائز نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جنہوں نے اس کا انکار کیا ہے، صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر بیماری کے لئے دوا ہے پس جب بیماری کی دوا استعمال کی جائے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ شفایاب ہو جاتا ہے (1)۔'' ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت اسامہ بن شریک سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: اعرابیوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم علاج نہ کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں۔ اے اللہ کے بندو! تم علاج کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر اس کے لئے شفا یا دوا بھی رکھی ہے سوائے ایک بیماری کے''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے (2)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بڑھاپا''۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں، اور انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ابو خزیمہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا دم کے بارے کیا خیال ہے جو ہم کراتے ہیں، اور دوا کے بارے جس کے ساتھ ہم علاج کرتے ہیں، اور وہ پرہیز اور احتیاط جسے ہم اپناتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے کسی شے کو رد کر دیتی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہے (3)'' (امام ترمذی نے) فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ اس حدیث کے سوا ابو خزیمہ سے کوئی حدیث معروف نہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تمہاری دواؤں اور علاج میں سے کسی شی میں خیر اور بھلائی ہے تو وہ پچھنے لگانے یا شہد پینے یا آگ کے ساتھ جلانے کی شرط میں ہے اور میں داغ لگانا پسند نہیں کرتا (4)''۔ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔ اور اس باب میں احادیث شمار سے زیادہ ہیں۔ اور جمہور علماء کا موقف یہی ہے کہ علاج کرنا اور دم کرانا مباح ہے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما لقوہ کی وجہ سے داغ لگاتے اور بچھو کے ڈسنے کا دم فرماتے۔ ابن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بچے کو تریاق پلاتے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جنہوں نے اسے (علاج کو) مکروہ قرار دیا ہے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک گروہ اپنے چھوٹے بڑوں سمیت اکٹھا جنت میں داخل ہوگا وہ تعویذ گنڈہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، لکل داء دواء و استحباب التداوی، جلد 2، صفحہ 225

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ما جاء فی الدواء والحث علیہ، جلد 2، صفحہ 25۔ ایضاً، حدیث نمبر 1961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ما جاء فی الرقی والادویۃ، جلد 2، صفحہ 28۔ ایضاً، حدیث نمبر 1991، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، بالدواء بالعسل، جلد 2، صفحہ 848

نہیں کراتے ہیں، نہ وہ داغ لگواتے ہیں، اور نہ وہ فال پکڑتے ہیں، اور صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (1)"۔ انہوں نے کہا: پس مومن پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو لازم پکڑتے ہوئے، اس پر توکل کرتے ہوئے، اس پر اعتماد کرتے ہوئے، اور ہر شے سے کٹ کر اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اسے چھوڑ دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایام مرض اور ایام صحت تمام کو جانتا ہے پس اگر مخلوق اس میں کمی کرنے یا زیادتی کرنے کی حریص ہو تو وہ اس پر قادر نہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا (الحدید:22) (نہیں آئی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی ہے کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔)

اور ان میں سے جو اس طرف گئے ہیں وہ اہل فضل واثر کی ایک جماعت ہے، اور یہی حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے اس بیماری کے دوران تشریف لے گئے جس میں ان کا وصال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم کیا تکلیف پا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میرے گناہ (باعث تکلیف ہیں)۔ آپ نے پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: اپنے رب کی رحمت، انہوں نے فرمایا: کیا میں تمہارے لئے کوئی طبیب نہ بلاؤں؟ تو انہوں نے کہا: طبیب نے ہی تو مجھے بیمار کیا ہے...... اور آگے حدیث ذکر کی۔ مکمل روایت سورۂ واقعہ کے فضائل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور وکیع نے ذکر کیا ہے: ابو ہلال نے معاویہ بن قرۃ سے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو وہ ان کی عیادت کو گئے اور کہا: کیا ہم آپ کے لئے کوئی حکیم نہ بلائیں؟ انہوں نے جواب دیا: طبیب نے ہی تو مجھے لٹا رکھا ہے۔ اور اسی طرف ربیع بن خثیم بھی گئے ہیں۔ اور سعید بن جبیر نے بھی تعویز، منتر کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور حسن دودھ اور شہد کے سوا تمام ادویہ پینا مکروہ جانتے تھے۔ اور پہلے فریق نے حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ داغ لگانے کی کسی خاص نوع کا ارادہ کرنا مکروہ ہو، دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب کے دوران ابی کو رگ اکحل پر داغ لگایا جب انہیں تیر مارا گیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "شفا تین میں ہے (2)"۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے منتر اور تعویذوں کا قصد مراد ہو جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ (الاسراء:82) (اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں۔) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دم فرمایا اور انہیں دم کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ شہد میں زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ یہ کھایا بھی جاتا ہے اور خوراک بھی ہے۔ اور اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، اور اپنے نئے قول میں انہوں نے جو قطعی بات کی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شہد میں زکوٰۃ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، من اکتوی او کوی غیرہ، جلد 2، صفحہ 850
2۔ ایضاً، باب الشفاء فی ثلاث، جلد 2، صفحہ 848

واجب ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، کیونکہ آپ کے نزدیک اس میں نصاب شرط نہیں ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس میں کوئی شے نہیں ہے یہاں تک کہ یہ آٹھ افراق تک پہنچ جائے اور ایک فرق میں چھتیس رطل عراقی ہوتے ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہر دس مشکیزوں میں سے ایک مشکیزہ، اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شہد کے ہر دس مشکیزوں میں سے ایک مشکیزہ ہے (1)''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: اس کی اسناد میں کلام ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس باب میں کوئی بڑی شے صحیح منقول نہیں ہے، اور اسی پر اکثر اہل علم کے نزدیک عمل ہے، اور یہی امام احمد اور اسحاق بھی کہتے ہیں، اور بعض اہل علم نے کہا ہے: شہد میں کوئی شی نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو غور وفکر کرتے ہیں یعنی عبرت حاصل کرتے ہیں اور شہد کی مکھی میں عبرت سے مراد اس کے عجیب معاملہ میں انصاف کی نظر سے اور گہری غور وفکر کرتے ہوئے دیکھنا ہے، تو یقیناً شہادت دیتا ہے کہ اسے کمزور اور ضعیف بنیاد کے باوجود لطیف صنعت کا الہام کرنے والا، اور اس کے متفرق احوال میں اسے حیلہ سازی کی مہارت عطا کرنے والا وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے؛ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ الآیہ۔ پھر یہ کھٹا، کڑوا، میٹھا، نمکین (رس)، اور نقصان دہ گھاس وغیرہ بھی چوستی ہے، اور اللہ تعالیٰ اسے شہد بنا دیتا ہے جو میٹھا بھی ہوتا ہے اور باعث شفا بھی، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ ۙ۫ وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تمہیں پھر جان قبض کرے گا تمہاری اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف تاکہ وہ کچھ نہ جانے جان لینے کے بعد، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ اس کا معنی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ یعنی وہ اسے بدکام بنا دیتا ہے اور اسے کمینہ بنا دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ ہے جس کی قوت وطاقت اور عقل کم ہو جاتی ہے، اور وہ اسے بے عقلی تک پہنچا دیتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد أسفل العمر (انتہائی گھٹیا اور ناکارہ عمر) ہے، یعنی وہ اس بچے کی مثل ہو جاتا ہے جس میں کوئی عقل نہیں ہوتی اور دونوں معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ مانگتے ہوئے کہتے تھے: اللّٰھم إنی أعوذ بك من الكسل و أعوذ بك من الجبن و أعوذ بك من الهرم و أعوذ بك من البخل (2) (اے اللہ! میں تیری پناہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، ما جاء فی زکاۃ العسل، جلد 1، صفحہ 80

2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من أرذل العمر، جلد 2، صفحہ 943

مانگتا ہوں کاہلی اور سستی سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بزدلی سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بڑھاپے سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں بخل سے) اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے وأعوذبك أن أرد إلى أرذل العمر (1) الحدیث (اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں ناکارہ عمر کی طرف لوٹا دیا جاؤں)۔ اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا یعنی وہ بچپنے کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ پس وہ ان امور کو بڑھاپے کی زیادتی کی وجہ سے نہیں جان سکتا جن کو اس سے پہلے جانتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ کیفیت بندہ مومن کو لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ مومن سے اس کا علم نہیں چھینا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تاکہ وہ چیزوں کو جاننے کے بعد ان پر عمل نہ کر سکے، پس عمل کو علم سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ عمل کے لئے علم کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے؛ کیونکہ اس کے عمل میں بڑھاپے کی تاثیر اس کے علم میں اس کی تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور معنی مقصود منکرین بعث پر استدلال کرنا اور حجت پکڑنا ہے، یعنی وہ ذات جو اسے اس حال کی طرف لوٹانے پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اسے مارے اور پھر اسے زندہ کر دے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے برتری بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر دولت کے لحاظ سے پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں برتری بخشی گئی ہے وہ لوٹانے والے ہیں اپنی دولت کو ان لوگوں پر جو ان کے مملوک ہیں تاکہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں؟ (ہرگز نہیں) تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو غنی، بعض کو فقیر (مفلس)، بعض کو آزاد، اور بعض کو غلام بنایا ہے۔ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں رزق میں برتری بخشی گئی ہے۔ بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ (وہ اپنی دولت ان لوگوں پر لوٹانے والے ہیں جو ان کے مملوک ہیں) یعنی کوئی آقا اپنے مملوک پر اس دولت میں سے کوئی شے نہیں لوٹائے گا جو اس کو بخشی گئی ہے کہ مملوک اور مالک مال میں برابر ہو جائیں۔ اور یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتوں کی پوجا کرنے والوں کی بیان کی ہے، یعنی جب تمہارے غلام تمہارے ساتھ برابر نہیں تو پھر تم میرے غلاموں کو میرے ساتھ برابر کیسے بناتے ہو؟ پس جب ان کے غلام ان کے مالوں میں ان کے شریک نہیں تو پھر ان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ غیر اللہ کو عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائیں مثلاً بت، پتھر اور دیگر وہ جن کی عبادت کی جاتی ہے جیسا کہ ملائکہ اور انبیاء وغیرہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی مخلوق ہیں۔ یہ معنی علامہ طبری نے بیان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس وقت انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فرمایا: فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ یعنی کوئی آقا اپنے مملوک پر وہ مال نہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من أرذل العمر، جلد 2، صفحہ 942

لوٹا تا جو اسے دیا گیا ہے کہ آقا اور غلام دونوں مال میں برابر برابر شریک ہو جائیں، تو پھر تم میرے لئے وہ کیسے پسند کرتے ہو جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے کہ تم میرے لئے میرے غلاموں اور بندوں سے بیٹا بنا رہے ہو اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ ۖ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ (الروم: 28) (اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے، (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ غلام مالک نہیں ہوتا جیسا کہ ابھی اس کا بیان آئے گا۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں اور پیدا فرمائے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے اور رزق عطا فرمایا تمہیں پاکیزہ، تو کیا (یہ لوگ) باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ناشکری کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا اس میں جعل بمعنی خلق ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ کا معنی ہے تمہاری جنس سے اور تمہاری نوع سے اور تمہاری خلقت پر پیدا فرمائیں، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ (التوبہ: 128) یعنی انسانوں میں سے ہی تمہارے پاس رسول آیا۔ اور اس میں ان عربوں کا رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس نے (فلانے) جن سے شادی کر رکھی ہے اور وہ اس سے جماع کرتا ہے، حتیٰ کہ یہ روایت ہے کہ عمرو بن ہند نے ان میں سے ایک بھتنی کے ساتھ شادی کی اور وہ اسے بجلی کی چمک سے چھپالیتا تھا تا کہ وہ اسے دیکھ نہ لے کہ پھر بھاگ جائے، پس جب ایک رات بجلی چمکی اور اس بھتنی نے اسے دیکھ لیا تو اس نے کہا: عمرو! اور بھاگ گئی، پھر کبھی اس نے اسے نہ دیکھا۔ اور یہ ان کے گھڑے ہوئے جھوٹوں میں سے ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت کے مطابق جائز ہے، پس یہ ان فلاسفہ کا بھی رد ہے جو جنوں کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور وہ ان کے طعام کو محال قرار دیتے ہیں۔ أَزْوَاجًا مرد کا زوج وہ اس کی بیوی ہے، کیونکہ وہ ایک فرد ہے اور جب وہ اس کی طرف منسوب ہوگئی تو وہ زوجین (جوڑا) ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اضافت مرد کی طرف کی گئی ہے نہ کہ عورت کی طرف کیونکہ وہی وجود میں عورت کی اصل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ یہ آیت بیٹوں کو نعمت شمار کرنے میں ظاہر ہے، اور بیٹوں کا وجود اکٹھا ان دونوں سے ہوتا ہے، لیکن جب بچے کی خلقت عورت میں ہوتی ہے اور یہ اسی سے الگ اور جدا ہوتا ہے (یعنی اس کے بطن سے خارج ہوتا ہے) تب اس کی اضافت اور نسبت اس کی طرف کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غلامی اور آزادی میں

اسی کے تابع ہوتا ہے اور یہ مالیت میں اس کی مثل ہوتا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے مدینۃ الاسلام میں حنابلہ کے امام ابوالوفاء علی بن عقیل کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک مالیت میں بیٹا ماں کے تابع ہے اور یہ غلامی اور آزادی میں اسی کے حکم میں ہے، کیونکہ باپ سے تو نطفہ خارج ہوا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں اور نہ اس میں کوئی مالیت اور منفعت ہے، بلاشبہ اس (مرد) نے جو حاصل کیا وہ عورت کے ساتھ اور اس سے ہی حاصل کیا، پس اسی وجہ سے بچہ عورت کے تابع ہے، جیسا کہ اگر کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کی زمین میں کھجور کھائے اور اس کی گٹھلی کھانے والے کے ہاتھ سے اس زمین پر گر پڑے اور اس سے کھجور کا درخت نکل آئے تو اس پر امت کا اجماع ہے کہ وہ درخت مالک زمین کی ملکیت ہوگا نہ کہ کھجور کھانے والے کی ملکیت ہوگا، کیونکہ جو شے کھانے والے سے الگ ہوئی ہے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَحَفَدَةً ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ان سے قول باری تعالیٰ: بَنِيْنَ وَحَفَدَةً کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میری رائے میں حَفَدَةً سے مراد خدام اور معاونین و مددگار ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَحَفَدَةً کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ مددگار اور معاونین ہیں۔ پس جس نے تیری معاونت اور مدد کی پس وہی تیرا حفید ہے۔ تو آپ سے پوچھا گیا: کیا عرب اسے جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں وہ تو اسے بولتے ہیں، کیا تو نے شاعر کا یہ قول نہیں سنا:

حَفَدَ الولائدُ حولهن وأُسلِمَتْ بأكُفِّهِنَّ أَزِمَّةُ الأجمال (1)

یعنی انہوں نے خدمت میں خوب تیزی کی۔ اور الولائد سے مراد خدام ہیں، اور اس کا واحد ولیدۃ ہے۔

اعشی نے کہا ہے:

كَلَّفتُ مجهولَها نُوقًا يمانية إِذا الحُداة على أكسائها حَفَدوا (2)

یعنی انہوں نے بہت تیزی اور جلدی کی۔ (حفدوا بمعنی أسرعوا ہے)

اور ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک الحفدۃ سے مراد أعوان و مددگار ہیں۔ پس ہر وہ جس نے کوئی کام کیا اس میں اس نے اطاعت کی اور تیزی کی تو وہی حافد کہلاتا ہے، فرمایا: اسی معنی میں یہ قول ہے: إليك نسعى و نحفد (تیری طرف ہی ہم کوشش کرتے ہیں اور خوب تیزی کرتے ہیں) اور الحَفَد ان کا معنی سرعت اور تیزی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: الحفد کا معنی عمل اور خدمت ہے۔ اور خلیل بن احمد نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک الحفدۃ سے مراد خدام ہیں، اور یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ الحفدۃ سے مراد اولاد کی اولاد یعنی بچوں کے بچے (پوتے) ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد داماد ہیں (3)؛ یہ حضرت ابن مسعود، علقمہ، ابوالضحیٰ، سعید بن جبیر اور ابراہیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 172 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 203 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1161

فلوأن نفسِي طاوعتني لأصبحتْ لها حَفَدٌ مما يُعَدُّ كثيرُ

ولكنها نفسٌ علىٰ أبيّة عَيُوفٌ لإصهار اللئام قذور(1)

اور زر نے عبداللہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ الحفدۃ سے مراد أصھار (داماد یا بہنوئی وغیرہ کی قرابت) ہے، (یا سسرال کی قرابت ہے)؛ اور یہ ابراہیم نے کہا ہے، اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے: الخَتَن وہ رشتہ دار جو عورت کی جانب سے ہو، مثلاً اس کا باپ (سسر) اس کا بھائی (سالا) اور انہی کی مثل دیگر رشتہ دار اور اصھار ان کا مجموعہ ہوتا ہے(2)۔ کہا جاتا ہے: أصھر فلان الی بنی فلان و صاھر (فلان نے بنی فلاں کو سسرال بنا دیا۔) اور عبداللہ کا قول ھم الأختان دونوں معنوں کا ایک ساتھ احتمال رکھتا ہے۔ یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس کی مراد عورت کا باپ اور اس کے مشابہ اس کے دیگر رشتہ دار ہوں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ مراد یہ ہو اور اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا کی ہیں، تم ان کا نکاح کرتے ہو، پس ان کے سبب سے تمہارے داماد ہوتے ہیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: الحفدۃ آدمی کا نفع جو اس کے بیٹے کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور اس کی اصل حَفَد یحفِد (یعنی ماضی میں عین کلمہ مفتوح اور مضارع میں یہ مکسور ہے) سے ہے جب کوئی اپنی چال میں خوب تیزی کرے، جیسا کہ کثیر نے کہا ہے:

حفد الولائد بینھن ......البیت۔

اور کہا جاتا ہے: حفدت اور أحفدت یہ دونوں لغتیں ہیں جب تو کسی کی خدمت کرے۔ اور کہا جاتا ہے: حافد و حفد، جیسا خادم و خدم ہے، اور حافد و حفدۃ کافر و کفرۃ کی مثل ہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے الحفدۃ سے مراد خدام لئے ہیں انہوں نے اسے اپنے ماقبل سے منقطع کر دیا ہے اور اسے مقدم کرنے کی نیت کی ہے، گویا کہ یہ فرمایا: جعل لکم حفدۃ و جعل لکم من ازواجکم بنین۔ (اس نے تمہارے لئے خدام پیدا کئے اور اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے پیدا کئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ جو ازہری نے کہا ہے کہ حفدۃ سے مراد بچوں کے بچے ہیں وہی قرآن کریم کا ظاہر ہے بلکہ اس کی نص ہے، کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ اس نے فرمایا ہے: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً پس اس نے حفدۃ اور بنین ان سے پیدا کئے ہیں۔ (یعنی پوتے اور بیٹے)۔

ابن عربی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس قول میں زیادہ ظاہر بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (بیٹے اور پوتے) ہیں کہ بیٹے آدمی کی اپنی صلبی اولاد ہے اور حفدۃ (پوتے) اس کے بیٹے کی اولاد ہے(3)۔ اور لفظ کی قوت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور اس معنی کی بنا پر آیت کی تقدیر یہ ہوگی: وجعل لکم من ازواجکم بنین و من البنین حفدۃ (اس نے تمہارے تمہاری بیویوں سے بیٹے پیدا کئے اور بیٹوں سے پوتے پیدا کئے۔) اور یہ معنی حسن نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** جب ہم نے حضرت مجاہد، حضرت ابن عباس، امام مالک اور علمائے لغت علیہم الرحمہ کے اس قول پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 202 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1161 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1162

تفریع بیان کی ہے کہ الحفدۃ سے مراد خدام اور اعوان و مددگار ہیں، تو پھر بیٹے اور بیوی کی خدمت عمدہ بیان کے ساتھ قرآن سے نکل آئی؛ یہ ابن عربی نے کہا ہے(1)۔

امام بخاری وغیرہ نے حضرت سہل بن سعد سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابو اسید ساعدی نے اپنی دعوت ولیمہ کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی پس ان کی بیوی ان کی خدمت کرتی رہی(2)......الحدیث۔ یہ سورۂ ھود میں گزر چکی ہے۔ اور صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے اونٹوں کے قلادے خود اپنے ہاتھوں سے بٹے(3)۔ الحدیث۔ اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: عورت پر لازم ہے کہ وہ بستر بچھائے، ہانڈی پکائے، اور گھر میں جھاڑو پھیرے، اپنی حالت اور اپنے رواج کا لحاظ رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف: 189) (اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تاکہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔ گویا ہمارے لئے ان میں سکون و راحت، لطف اندوز ہونا، اور عادت جاریہ کے مطابق خدمت کرنا سبھی امور جمع کر دیئے گئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آدمی اپنی بیوی کی خدمت کرے گا ان امور میں جن میں خدمت آسان ہو اور وہ اس کی مدد و معاونت کر سکتا ہو، جیسا کہ اسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے کام کاج میں شریک ہوتے تھے اور جب آپ اذان سنتے تو پھر آپ تشریف لے جاتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: اور وہ اس کی مدد کرے گا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں سے یہ ہے کہ آپ نعلین پاک کی مرمت کر لیتے تھے، گھر میں جھاڑو لگا دیتے تھے اور کپڑا سی لیتے تھے(4)۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا درآنحالیکہ آپ سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کام کرتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان تھے آپ اپنے کپڑے سے جوئیں نکالتے تھے، اپنی بکریاں دوہ لیتے تھے اور اپنے آپ کی خدمت کرتے تھے (یعنی اپنے کام خود کرتے تھے)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اور ایک خادمہ کا خرچہ دیا جائے گا، اور یہ بھی کہا گیا ہے: ایک سے زیادہ کا خرچہ دیا جائے گا، اس کا انحصار دولت و ثروت اور مقام و مرتبہ کی قدر پر ہے۔ اور یہ وہ امر ہے جس کا دارومدار اس عرف پر ہے جو اصول شریعت میں سے ایک اصل ہے، کیونکہ دیہاتیوں اور بادیہ نشینوں کی عورتیں اپنے خاوندوں کی خدمت کرتی ہیں حتیٰ کہ میٹھا پانی لانے اور جانوروں کو چرانے اور ہانکنے میں بھی معاونت کرتی ہیں، اور جہاں تک شہروں کی عورتوں کا تعلق ہے تو ان میں سے کمزور اور متوسط درجے کے لوگ اپنی بیویوں کی ان کاموں میں خدمت کرتے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں اور وہ ان کی معاونت کرتے ہیں، اور رہے اہل ثروت اور خوشحال لوگ تو وہ اپنی بیویوں کی خدمت کرتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ سکون اور آرام لیتی ہیں جب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1163
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربۃ، الانتباذ فی الاوعیۃ، جلد 2، صفحہ 837
3۔ ایضاً، کتاب المناسک الحج، من قلد القلائد بیدہ، جلد 1، صفحہ 230
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1163

ان کے لئے ایسا منصب ہو، اور اگر کام مشکل ہو تو بیوی اسے اسی پر ڈال دیتی ہے، اور یہ شہادت دیتی ہے کہ یہ تو معروف ہے کہ وہ (عورت) ان میں سے ہے جو اپنے آپ کی خدمت نہیں کر سکتیں پس اس کی خدمت کا انتظام کر، چنانچہ وہی نافذ ہو جاتا ہے اور اس بارے میں دعویٰ (کا حق) ختم ہو جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ یعنی پھلوں، اناج اور حیوانوں سے (اس نے تمہیں پاکیزہ رزق دیا) اَفَبِالْبَاطِلِ مراد بت ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ جمہور کی قرأت یا کے ساتھ ہے اور ابو عبدالرحمن نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ مراد اسلام ہے اور اسلام کے ساتھ هُمْ يَكْفُرُوْنَ وہ کفر کرتے ہیں۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

"اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی جو انہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ پس (اے جاہلو!) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ اس میں رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ سے مراد بارش ہے۔ وَ الْاَرْضِ اس سے مراد نباتات ہے۔ شَيْـًٔا اخفش نے کہا ہے: یہ رِزْقًا سے بدل ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس پر رزق کو واقع کرنے کے سبب یہ منصوب ہے، یعنی یعبدون مالا یملك أن یرزقهم شیئا (وہ عبادت کرتے ہیں ان معبودوں کی جو کچھ اختیار نہیں رکھتے کہ وہ انہیں کوئی شے عطا کریں۔) وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ یعنی وہ کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے، مراد بت ہیں۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ یعنی تم اس کے ساتھ ان جمادات کو تشبیہ نہ دو، کیونکہ وہ تو واحد اور یکتا ہے وہ قدرت رکھتا ہے اس کی کوئی مثل نہیں ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

"بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال (وہ یہ کہ) ایک بندہ ہے جو مملوک ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور (اس کے مقابلہ میں) ایک وہ بندہ ہے جسے ہم نے رزق دیا اپنی جناب پاک سے رزق حسن۔ پس وہ خرچ کرتا رہتا ہے اس سے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ برابر ہیں۔ الحمد للہ! (حقیقت حال واضح ہوگئی) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ضلالت و گمراہی پر متنبہ کیا ہے، اور یہ اپنے

ماقبل سمیت ان نعمتوں کے ذکر کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائی ہیں اور ان کے معبودوں میں سے کسی کے اس کی مثل نہ ہونے کو شامل ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا یعنی ایک مثال اور تشبیہ بیان فرمائی۔ پھر اس کا ذکر کیا اور فرمایا: عَبْدًا مَّمْلُوْكًا یعنی جس طرح تمہارے نزدیک عبد مملوک جو اپنے معاملات میں سے کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو اور وہ آزاد آدمی جسے رزق حسن دیا گیا ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ پس اسی طرح میں اور یہ بت برابر نہیں ہو سکتے۔ پس وہ جو اس آیت میں مثال ہے وہ ایسا غلام ہے جو اس صفت کے ساتھ متصف ہو کہ وہ کسی کی ملکیت میں ہو مال میں سے کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو اور نہ اپنے ذاتی معاملات پر قدرت رکھتا ہو، اور وہ صرف اور صرف اپنے آقا کے ارادہ کے تابع اور مطیع ہو۔ اور اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ سارے کے سارے غلام اسی صفت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں، کیونکہ کلام مثبت میں نکرہ اہل زبان کے نزدیک عموم کا تقاضا نہیں کرتا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، بلکہ یہ مفرد کا فائدہ دیتا ہے، اور جب یہ امر یا نہی کے بعد یا مصدر کی طرف مضاف ہو کر واقع ہو تو یہ اس عموم کا فائدہ دیتا ہے جو تمام کو شامل ہوتا ہے؛ جیسا کہ یہ قول: أعتق رجلا، لا تُهِن رجلا، اور مصدر کی مثال اعتاق رقبة، پس جس آدمی کو بھی اس نے آزاد کر دیا تو وہ خطاب (حکم) کی ذمہ داری سے نکل جائے گا۔ اور اس سے استثنا صحیح ہوگی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ مثال مومن اور کافر کی ہے؛ قتادہ اس طرف جاتے ہیں کہ عبد مملوک سے مراد کافر ہے، کیونکہ آخرت میں وہ اپنی عبادت سے کسی شے کا نفع حاصل نہیں کر سکے گا، اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا سے مراد مومن ہے۔ یہی موقف جمہور اہل علم و تاویل کا ہے۔ اصم نے کہا ہے: عبد مملوک سے مراد وہ ہے جو بسا اوقات اپنے آقا سے جثہ اور قوت کے اعتبار سے طاقتور اور چہرے کے اعتبار سے زیادہ حسین اور روشن ہوتا ہے، حالانکہ وہ اپنے آقا کے سامنے ذلیل اور مطیع ہوتا ہے وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا سوائے اس کے جس کے بارے آقا اسے اجازت دے، پس اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے۔ پس جب یہ حالت تمہاری اور تمہارے غلاموں کی ہے تو پھر تم کیسے پتھروں اور بے جانوں کو خلق اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہو، حالانکہ نہ وہ عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ وہ سنتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مسلمانوں نے اس آیت سے اور اس سے جو اس سے پہلے ہے یہ سمجھا ہے کہ غلام رتبہ ملکیت میں آزاد آدمی سے کم ہے اور یہ کہ وہ کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اگرچہ اس کی ملکیت میں کوئی شے ہو۔ اہل عراق نے کہا ہے: غلامی ملکیت کے منافی ہوتی ہے، پس وہ یقیناً کسی حال میں کسی شے کا مالک نہیں ہو سکتا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نیا قول یہی ہے، اور یہی حسن اور ابن سیرین نے کہا ہے۔ اور ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے: وہ مالک ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت ناقص ہوتی ہے، کیونکہ اس کے آقا کو اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے اس سے چھین لے، اور یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے متبعین کا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قدیم قول میں یہی کہا ہے۔ اور یہی اہل ظاہر کا قول ہے، اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: اس پر اموال کی عبادت یعنی زکوٰۃ اور کفارات وغیرہ واجب نہیں ہوتے، اور نہ ہی عبادت بدنیہ میں سے وہ واجب ہوتی ہیں جو آقا کی خدمت میں رکاوٹ اور مانع ہوں مثلاً حج اور جہاد وغیرہ۔ اور اس مسئلہ کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اس کا آقا اسے کسی کنیز کا مالک بنائے تو اس کے لئے ملک یمین کے طور پر اس سے وطی کرنا جائز ہوگا، اور اگر وہ اسے چالیس بکریوں کا مالک بنا دے اور ان پر سال

گزر جائے تو ان کی زکوٰۃ نہ آقا پر واجب ہوگی کیونکہ وہ اس کے غیر کی ملکیت ہیں، اور نہ اس غلام پر واجب ہوگی کیونکہ اس کی ملکیت مستقل نہیں ہے۔ اور عراقی کہتا ہے: اس کے لئے کنیز سے وطی کرنا جائز نہیں ہوگا، اور نصاب میں زکوٰۃ آقا پر پہلے کی طرح واجب ہوگی۔ اور اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل مختلف کتب میں موجود ہیں۔ اور ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ (الروم: 40) (اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا۔) پس اللہ تعالیٰ نے رزق اور خلق میں غلام اور آزاد کو برابر قرار دیا ہے۔ اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جس نے غلام آزاد کیا درآنحالیکہ اس کا مال ہو(1)...... '' پس اس میں آپ نے مال کی اضافت اس کی طرف کی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے غلام کو دیکھتے تھے کہ وہ اپنے مال میں سخاوت کا اظہار کر رہا ہے تو آپ اس پر کوئی عیب وغیرہ نہیں لگاتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کے غلام نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں کہ وہ اسے ملک یمین کے طور پر واپس لے آئے، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ (غلام) اس چیز کا مالک ہوتا ہے جو اس کے قبضے میں ہوتی ہے اور اس میں وہ ایسا تصرف کر سکتا ہے جیسا مالک اپنی مملوکہ شے میں تصرف کر سکتا ہے جب تک اس کا آقا اس سے چھین نہ لے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3۔** بعض علماء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ غلام کی طلاق اس کے آقا کے اختیار میں ہے، اور اس پر کہ لونڈی کو بیچنا اس کی طلاق ہے اور اس میں اس قول باری تعالیٰ میں تعویل کی گئی ہے: لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ فرمایا: پس اس کا ظاہر تو یہ فائدہ دیتا ہے کہ وہ بالکل کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا، نہ ملکیت پر اور نہ اس کے سوا کسی اور پر پس یہ ارشاد اپنے عموم پر ہے، مگر دلیل اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے اور اس بارے میں ہم نے جو کچھ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا ہے وہ تخصیص پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4۔** ابو منصور نے عقیدہ (کتاب کا نام) میں کہا ہے: الرزق یہ وہ ہے جس سے غذا حاصل ہو۔ اور یہ آیت اس تخصیص کو رد کرتی ہے اور اسی طرح یہ قول باری تعالیٰ بھی ہے: وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ) (اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں) اور اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ: 254) (اور خرچ کرلو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا۔) علاوہ ازیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھ دیا گیا ہے(2)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''میری امت کے رزق اس کے گھوڑوں کے اطراف اور اس کے نیزوں کے پھلوں میں ہیں۔'' پس غنیمت ساری کی ساری رزق ہے، اور ہر وہ شے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو وہی رزق ہے۔ اور اس کے کئی مراتب ہیں: ان میں سے اعلیٰ مرتبہ اس کا ہے جس کو غذا بنایا جاتا ہے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفع اٹھانے کی وجوہ کو اپنے اس ارشاد میں محصور کر دیا ہے: ''انسان کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ تیرے لئے تیرے مال سے اس کے سوا نہیں ہے جو تو نے کھا لیا اور اسے فنا کر دیا یا تو نے پہن لیا اور اسے بوسیدہ کر دیا یا تو نے صدقہ کر دیا اور اسے آگے بھیج دیا۔'' یقول ابن آدم مالی مالی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، من اعتق عبداً و لہ مال، جلد 2، صفحہ 196

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل فی الرماح، جلد 1، صفحہ 408

و هل لك من مالك إلّا ما أكلتَ فأفنيتَ أو لبستَ فأبليتَ أو تصدقتَ فأمضيتَ(1)، اور لباس کے معنی میں سوار ہونا وغیرہ داخل ہے۔ اور محدثین کی زبان میں سماع رزق ہے، اور وہ اس حدیث کا سننا مراد لیتے ہیں۔ اور یہ صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا اس سے مراد مومن ہے، جو اپنی ذات اور مال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے۔ اور کافر نے جب اطاعت میں کچھ خرچ نہیں کیا تو وہ اس غلام کی طرح ہو گیا جو کسی شے کا مالک نہیں ہوتا هَلْ يَسْتَوٗنَ یعنی وہ برابر نہیں ہو سکتے، اور یہاں مَنْ کے محل کی وجہ سے یستویان نہیں کہا کیونکہ یہ مبہم اسم ہے جو واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر ومونث کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک عَبْدًا مَّمْلُوْكًا اور وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ دونوں سے مراد ان کی جنس عام لی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی وہی حمد کا مستحق ہے نہ کہ وہ جن کی وہ اس کے سوا عبادت کرتے ہیں، کیونکہ بتوں کا ان پر کوئی احسان اور نیکی نہیں ہے کہ اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ بلاشبہ کامل تعریف صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، کیونکہ وہی نعمتیں عطا فرمانے والا اور خالق ہے۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ یعنی اکثر مشرک لَا يَعْلَمُوْنَ نہیں جانتے کہ حمد اور تعریف میرے لئے ہے، اور تمام نعمتیں میری طرف سے ہی ہیں۔ ذکر اکثر کا کیا ہے حالانکہ مراد تمام ہیں، پس یہ وہ خاص ہے جس سے عموم مراد لیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ مخلوق میں سے اکثر نہیں جانتے، اور یہ اس لئے ہے کہ ان میں سے اکثر مشرک ہی ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال، دو آدمی ہیں ان میں سے ایک تو گونگا ہے کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر جہاں کہیں وہ اس (نکمے) کو بھیجتا ہے تو وہ واپس نہیں آتا کسی بھلائی کے ساتھ، کیا برابر ہو سکتا ہے یہ (نکما) اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے عدل کے ساتھ اور وہ راہ راست پر گامزن ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ یہ دوسری مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور بتوں کے لئے بیان فرمائی ہے۔ پس اَبْكَمُ (گونگا) وہ جو کسی شے پر قادر نہ ہو وہ بت ہے۔ اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے(2) وہ اللہ تعالیٰ ہے؛ یہ حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: أبکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، اور آپ اس پر اسلام پیش کرتے تھے اور وہ انکار کر دیتا تھا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عدل کے ساتھ حکم دیتے تھے، اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور آپ کے آزاد کردہ غلام جو کہ کافر تھا اس کی مثال ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ أبکم سے مراد ابوجہل ہے، اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے وہ حضرت عمار بن یاسر عنسی رضی اللہ عنہ ہیں اور عنس (نون کے ساتھ) مذحج کا ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا اور یہ ابوجہل کے قبیلہ بنی مخزوم کا حلیف تھا، اور ابوجہل انہیں اسلام قبول کرنے پر ستاتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر، جلد 2، صفحہ 407 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 204

اور اذیتیں دیتا تھا اور ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو بھی عذاب دیتا تھا، آپ ابوجہل کی کنیز تھیں، ایک دن اس نے آپ کو کہا: بلاشبہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایمان لائی ہے اس لئے کہ تو انہیں ان کے حسن و جمال کی وجہ سے پسند کرتی ہے، پھر اس نے آپ کی شرمگاہ میں نیزہ مارا اور آپ شہید ہو گئیں، اور آپ ہی پہلی شہیدہ ہیں جنہوں نے حالت اسلام میں جام شہادت نوش کیا، یہ نقاش وغیرہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اور عنقریب آیۃ الاکراہ میں اس کا مفصل بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت عطا نے کہا ہے: أبکم ابی بن خلف ہے، وہ کبھی خیر اور بھلائی کی گفتگو نہ کرتا تھا۔ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ یعنی وہ اپنی قوم پر بوجھ ہے کیونکہ وہ انہیں اذیت پہنچاتا تھا اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ستاتا تھا۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت ہشام بن عمرو بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، وہ کافر تھا اس میں خیر اور بھلائی بہت کم تھی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک أبکم سے مراد کافر ہے، اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے وہ مومن ہے یہ جملہ کے بدلے ہے (یعنی جملہ کفار کے مقابلے میں جملہ مومن ہیں)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ حسن ہے کیونکہ یہ عام ہے۔ اور أبکم وہ ہوتا ہے جو بول نہ سکتا ہو (گونگا)، اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو عقل نہ رکھتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو نہ سنتا ہو اور نہ دیکھتا ہو۔ اور تفسیر میں ہے کہ یہاں أبکم سے مراد بت ہے۔ اور یہ بیان کیا کہ اس کے پاس نہ قدرت ہے اور نہ اس کا کوئی حکم ہے، اور یہ کہ کوئی دوسرا اسے منتقل کرتا ہے اور دوسرا ہی اسے تراشتا ہے۔ پس وہ اس پر بوجھ ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عدل کے ساتھ حکم دینے والا ہے، اور ہر شے پر غالب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ یعنی وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر اور اپنے قرابتداروں پر اور وبال ہے اپنے صاحب (ساتھی) پر اور اپنے چچا کے بیٹے پر۔ اور یتیم کو بھی کَلّ کا نام دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس پر ثقیل اور بھاری ہوتا ہے جو اس کا کفیل ہوتا ہے۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

أكول لمال الكَلّ قبل شبابه ۔۔۔ إذا كان عظم الكَلّ غيرَ شديد(1)

اور کَلٌّ وہ بھی ہوتا ہے جس کا نہ بیٹا ہو اور نہ اس کا والد ہو۔ اور کَلّ کا معنی عیال بھی ہے، اور اس کی جمع کلول آتی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: كَلَّ السِّكِّينُ يَكِلُّ كَلًّا یعنی چھری کی دھار موٹی ہو گئی پس وہ نہیں کاٹتی۔ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ جمہور نے۔ یُوَجِّهْهُ پڑھا ہے۔ اور یہی خط مصحف ہے، یعنی جہاں بھی اس کا مالک اسے بھیجتا ہے وہ خیر اور بھلائی کے ساتھ واپس نہیں آتا، کیونکہ نہ وہ جانتا ہے اور نہ اسے سمجھتا ہے جو اس کو کہا جاتا ہے اور نہ اس سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یحییٰ بن وثاب نے فعل مجہول کی بنا پر أینما یُوَجَّہُ پڑھا ہے۔ [اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے] اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تَوَجَّهْ صیغہ خطاب پر بھی مروی ہے۔ هَلْ یَسْتَوِیْ هُوَ ۙ وَ مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ یعنی کیا یہ أبکم (نکما) اور وہ جو عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے اور راہ راست پر ہے یہ برابر ہو سکتے ہیں؟

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 411

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۷۷

''اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی مخفی باتوں کو، اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ متصل ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل)

یعنی اس نے تحلیل (حلال قرار دینا) و تحریم (حرام قرار دینا) کا قانون بنایا اور بلاشبہ اسے اچھا وہ بنا سکتا ہے جو ان کے انجام اور مصالح کا علم رکھتا ہو اور انہیں محیط ہو، اور تم اے مشرکو! تم تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تو پھر تم فیصلے کیونکر کر سکتے ہو۔ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اور تمہیں اس (قیامت کے دن) میں اپنے اعمال کے بدلے جزا دی جائے گی۔ اور الساعة سے مراد وہ وقت ہے جس میں قیامت قائم ہوگی، اس کا نام ساعۃ رکھا گیا ہے کیونکہ اس ساعۃ میں لوگ گھبرا جائیں گے اور ساری مخلوق ایک چیخ کے ساتھ مر جائے گی۔ اور اللمح کا معنی ہے تیزی اور سرعت کے ساتھ دیکھنا، کہا جاتا ہے: لَمَحَهٗ لَمْحًا و لَمَحَانًا۔ اور تاویل کی وجہ یہ ہے کہ قیامت جب یقیناً آنے والی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اسے آنکھ جھپکنے کی مثل قریب قرار دیا جائے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ ارادہ نہیں کیا کہ قیامت آنکھ جھپکنے میں آئے گی، بلکہ اسے لانے پر قدرت کی تیزی اور سرعت کو بیان کیا ہے، یعنی وہ کسی شے کو کہتا ہے کن (تو ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جھپکنے کے ساتھ تشبیہ اور مثال بیان کی ہے کیونکہ یہ آسمان پر ظاہر ہوگا اس کے باوجود کہ اس پر زمین سے کوئی دوری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ قریب ہونے کی تمثیل ہے، جیسا کہ کہنے والا کہتا ہے: ما السنہ إلا لحظة، و شبهه (سال نہیں ہے مگر ایک لحظہ یا اس کے مشابہ) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح ہوگی نہ کہ مخلوق کے نزدیک، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِیْبًا ۝ (المعارج) (کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے (لیکن) ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں) اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (یا اس سے بھی جلد) اس میں اَوْ شک کے لئے نہیں تمثیل کے لئے ہے یعنی مثل دونوں میں سے جس قسم کا بھی ارادہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مخاطب کے شک کے لئے داخل ہوا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ اَوْ بمنزلہ بل کے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

## وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْــٴًـا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل، تاکہ تم (ان بیش بہا نعمتوں پر) شکر ادا کرو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْــٴًـا بیان فرمایا کہ اس کی نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے نکالا اس حال میں کہ تم بچے تھے اور تمہیں کسی شے کا بھی علم نہ تھا۔ اور اس میں تین اقوال

ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے...... تم اس میں سے کچھ نہیں جانتے تھے جو اس نے تم سے وعدہ لیا درآنحالیکہ تم ابھی اپنے باپوں کی صلبوں میں تھے۔دوسرا قول یہ ہے...... تم اس میں سے کچھ نہ جانتے تھے جو اس نے تمہارے بارے میں سعادت وشقاوت کا فیصلہ کیا ہے۔اور تیسرا قول یہ ہے...... تم اپنے منافع میں سے کچھ نہ جانتے تھے؛ کلام مکمل ہو گئی، پھر نئے سرے سے آغاز کیا اور فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ یعنی یہ وہ ہیں جن کے ساتھ علم حاصل کرتے ہو اور ادراک کرتے ہو۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے بندوں کیلئے انہیں پیٹوں سے نکالنے سے پہلے بنا دیا اور بلاشبہ انہیں علم وادراک شکموں سے نکالنے کے بعد عطا فرمایا) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کان بنائے تا کہ تم ان کے ساتھ امر و نہی کو سنو، اور آنکھیں بنائیں تا کہ تم ان کے ساتھ اس کی صنعت وکاریگری کے آثار دیکھو، اور دل بنائے تا کہ تم ان کے ساتھ اس کی معرفت اور پہچان حاصل کر سکو۔ وَالْاَفْـِٕدَةَ یہ الفؤاد کی جمع ہے جیسے غراب کی جمع أغربة ہے، اور قول باری تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ کے ضمن میں قوت گویائی کے اثبات کا قول بھی کیا گیا ہے کیونکہ جو سن نہیں سکتا وہ کلام بھی نہیں کر سکتا، اور جب سننے کا حاسہ پایا گیا تو نطق اور کلام بھی پائی گئی۔اور اعمش، ابن وثاب، اور حمزہ نے یہاں سورۃ النور، الزمر اور النجم میں ہمزہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ اُمَّهٰتِكُمْ پڑھا ہے۔اور رہے کسائی! تو انہوں نے ہمزہ کو کسرہ اور میم کو فتحہ دیا ہے اور بلاشبہ یہ (ہمزہ کا کسرہ ماقبل کی) اتباع کی وجہ سے ہے۔ اور باقیوں نے اصل پر رکھتے ہوئے ہمزہ کو ضمہ اور میم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اور أمھات کی اصل أمات ہے، پھر ھا بطور تاکید زیادہ کر دی گئی جیسا کہ انہوں نے أھرقت الماء میں ھا کو زیادہ کیا ہے حالانکہ یہ اصل میں أرقت ہے۔اور یہ بحث سورۃ الفاتحہ میں گزر چکی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس میں دو تاویلیں ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے۔تا کہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔اور دوسری یہ ہے...... مراد یہ ہے کہ تم اس کی صنعت وکاریگری کے آثار دیکھو کیونکہ انہیں دیکھنا شکر تک پہنچا دیتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

"کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں، کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، بے شک اس میں (کھلی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ یحییٰ بن وثاب، اعمش، ابن عامر، حمزہ اور یعقوب نے تَرَوْا تا کے ساتھ صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے، اور ابوعبید نے اسے پسند کیا ہے۔اور باقیوں نے خبر کے طور پر یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ مُسَخَّرٰتٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطیع وفرمانبردار بن کر؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے: مُسَخَّرٰتٍ کا مفہوم ہے تمہارے منافع کے لئے مطیع وفرمانبردار بن کر (اڑ رہے ہیں)۔ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ، الجو سے مراد وہ فضا ہے جو زمین وآسمان کے درمیان ہے اور فضا کی اضافت آسمان کی طرف کی اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہے۔اور قول باری تعالیٰ: مُسَخَّرٰتٍ میں مسخِر پر دلیل ہے جس نے انہیں مطیع وفرمانبردار بنایا ہے اور مدبر پر دلیل ہے جس نے انہیں تصرف کی قدرت

دی ہے۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ یعنی پروں کو بند کرنے، انہیں کھولنے اور صف بندی کی حالت میں سوائے الله تعالیٰ کے انہیں کوئی چیز تھامے ہوئے نہیں ہے۔ ان کے لئے واضح فرما دیا کہ وہ ان (پرندوں) سے الله تعالیٰ کی وحدانیت پر کیسا خوبصورت استدلال کر سکتے ہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ بے شک اس میں علامات، سامان عبرت اور کھلے دلائل ہیں۔ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو الله تعالیٰ کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں جسے لے کر اس کے رسل علیہم السلام تشریف لائے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

''اور الله تعالیٰ نے ہی (اپنے فضل وکرم سے) بنا دیا ہے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو آرام وسکون کی جگہ اور بنائے ہیں تمہارے لئے جانوروں کے چمڑوں سے گھر (یعنی خیمے) جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو سفر کے دن اور اقامت کے دن۔ اور (اسی نے بنائے ہیں) بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقت مقررہ تک۔''

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: جَعَلَ لَكُمْ اس کا معنی صیر ہے۔ اور ہر وہ شے جو تجھ پر بلند ہو اور تجھے سایہ کرے تو وہ سقف (چھت) اور سماء ہے، اور ہر وہ شے جو تیرے نیچے ہو وہ ارض (زمین) ہے، اور ہر وہ جو تجھے چاروں جہتوں سے ڈھانپ لے وہ دیوار ہے۔ اور جب یہ باہم منظم ہو جائیں اور آپس میں مل جائیں تو وہ بیت (گھر، کمرہ) کہلاتا ہے۔ اور اس آیت میں الله تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شمار ہے جو لوگوں پر گھروں میں ہیں، پس پہلے شہری گھروں کا ذکر کیا اور یہ وہ ہیں جو طویل اقامت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اور قولہ تعالیٰ: سَكَنًا یعنی تم ان میں سکونت اختیار کرتے ہو اور تمہارے اعضائے بدن حرکت سے راحت وسکون پاتے ہیں، اور کبھی ان میں متحرک ومضطرب رہتے ہیں اور ان سے باہر سکون پاتے ہیں، مگر قول کا اطلاق غالب صورت حال پر ہے۔ اور اسے بھی جملہ نعمتوں میں ہی شمار کیا ہے کیونکہ اگر وہ چاہتا تو بندے کو ایسی حالت میں پیدا کرتا کہ وہ ہمیشہ مضطرب اور متحرک رہتا جیسا کہ افلاک تو وہ یقیناً ایسا ہی ہوتا جیسے الله تعالیٰ تخلیق فرماتا اور چاہتا، اور اگر وہ اسے ساکن پیدا کرتا جیسا کہ زمین تو وہ یقیناً ایسا ہی ہوتا جیسے وہ پیدا کرتا اور ارادہ فرماتا، لیکن اس نے اس کی تخلیق اس انداز سے فرمائی ہے کہ یہ دونوں اعتبار سے تصرف کر سکتا ہے، اور اس کی حالت دونوں حالتوں کے درمیان بدلتی رہتی ہے، اور یہ اسے جس حال اور کیفیت پر اور جہاں چاہے لوٹا سکتا ہے۔ اور السَّكَنُ مصدر ہے اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جا سکتی ہے۔ بعد ازاں الله تعالیٰ نے ان گھروں کا ذکر فرمایا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ پس فرمایا: وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یعنی چمڑوں سے اس نے تمہارے لئے گھر بنائے ہیں۔ بُيُوْتًا گھروں سے مراد خیمے اور قبے وغیرہ ہیں جنہیں اٹھانا دوران سفر تم پر آسان اور ہلکا ہوتا ہے۔ يَوْمَ

ظَعۡنِكُمۡ۔ الظَّعۡنُ سے مراد گھاس کی تلاش میں جنگل کی طرف چلنا اور بادیہ نشین کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے۔

اسی معنی میں عنترہ کا قول ہے:

ظَعَنَ الذین فِراقُهم أَتَوَقَّعُ وجری بینهم الغراب الابقع

اور الظعن کا معنی ہودج بھی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

ألاهل هاجك الأظعان إذ بانوا وإذا جاءت یوشك البین غربان

اور اسے عین کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ الشَّعۡرُ اور الشَّعَرُ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ چمڑے، بالوں اور صوف کے خیموں سبھی کو شامل ہو، کیونکہ یہ سب جانوروں کی جلد اور کھال سے ہیں، کیونکہ بال اور اون اسی کھال میں ہی ثابت ہوتے ہیں؛ اس طرف ابن سلام گئے ہیں۔ اور یہ بہت اچھا احتمال ہے، اور قول باری تعالیٰ: وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا ابتدائے کلام ہو، گویا کہ یہ فرمایا اس نے أثاث (ساز وسامان) بنایا مراد لباس اور بستر وغیرہ ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أهاجتك الظعائن یوم بانوا بذی الذِّیّ الجمیل من الأثاث(1)

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ قول باری تعالیٰ: مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ سے مراد صرف چمڑے کے گھر (خیمے) ہوں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ اور اس کا قول: وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا کا اس کے قول مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ پر عطف ہو، یعنی اس نے صوف کے بھی گھر (خیمے) بنائے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ امر اور شے ہے جو ان علاقوں میں عام اور پھیلا ہوا تھا، اور ہمارے شہر اس سے دور ہیں، پس ہمارے پاس خیمے صرف کتان اور صوف کے بنائے جاتے ہیں، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ بھی چمڑے کا تھا۔ اور تیرے لئے طائف کا چمڑا قیمت میں مہنگا ہونے، بناوٹ میں اعلیٰ ہونے اور دکھائی دینے میں حسین ہونے کے اعتبار سے کافی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خوشحالی اور دولتمندی شمار کیا ہے اور نہ اس میں اسراف اور فضول خرچی دیکھی ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے شمار کیا ہے اور اس سے استفادہ کی اجازت دی ہے، اور اس کی منفعت کی وجوہ مثلاً اس میں (چیزوں کو) چھپانا اور ان سے سایہ حاصل کرنا وہ ہیں جن سے جنس انسان نکلنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ اور جو عادت جاریہ ہے اس میں سے عجیب یہ ہے کہ میں نے بعض مصنوعی غافل زاہدوں کی بعض محدثین کے ساتھ مل کر ملاقات کی۔ پس ہم کتان کے خیمے میں اس کے پاس گئے تو میرے محدث ساتھی نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اٹھا کر بطور مہمان اس کے گھر آ جائے، اور کہا: بے شک یہ ایسی جگہ ہے جہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے اور گھر آپ کے لئے آرام دہ ہوگا اور میرا دل بھی آپ کے بارے میں مطمئن اور خوش ہوگا۔ تو اس نے جواب دیا: ہمارے لیے یہ خیمہ بہت ہے، اور ہماری صنف میں بے وقعت چیز کو اپنایا جاتا ہے۔ تو میں نے کہا: ایسا نہیں جیسا تم نے گمان کیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے طائف کے چمڑے کا خیمہ تھا حالانکہ زہاد کے رئیس اور سرخیل تھے آپ سفر میں اسے ساتھ رکھتے تھے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 412

اس سے سایہ حاصل کرتے تھے، پس وہ مبہوت ہوگیا، اور میں نے اسے اپنے مقام پر عاجز اور تھکا ہوا دیکھا تو میں نے اسے اپنے ساتھی سمیت چھوڑ دیا اور اس سے نکل گیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھیڑوں کی صوف، اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے نفع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ اس نے ہڈیوں میں اجازت عطا کی ہے، اور یہ ان کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت کھانا ہے، اور روئی اور کتان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ بلاد عرب میں وہ اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کو شمار کیا جن کے ساتھ ان پر انعام فرمایا، اور انہیں چیزوں میں انہیں مخاطب بنایا گیا جنہیں وہ اپنی فہم و فراست کے ساتھ پہنچانتے تھے، لیکن جو چیز بھی ان کے قائم مقام اور ان کی نائب ہوگی پس وہ استعمال اور نعمت میں ان کے محل میں داخل ہوگی اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور: 43) (اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔)

پس انہیں بَرَد (اولے) کے ساتھ خطاب کیا کیونکہ وہ انہیں اپنے پاس کثرت سے نازل ہونے کے سبب پہچانتے تھے، اور ثلج (برف) کے ذکر سے سکوت اختیار فرمایا، کیونکہ یہ ان کے شہروں اور علاقوں میں نہ تھی، حالانکہ یہ بھی اپنے وصف اور منفعت میں اس (بَرَد) کی مثل ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے طہارت کے بیان میں آلہ تطہیر کے طور پر ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ فرمایا ہے: اللهم اغسلني بماء و ثلج و بَرَد(1) (اے اللہ! مجھے پانی، برف، اور اولوں کے ساتھ طہارت عطا کردے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الثلج (برف) سفید رنگ کی شے ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک روئی اور کتان کے ذکر کو چھوڑنا بلاشبہ یہ خوشحالی اور دولتمندی کے اظہار سے اعراض ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے صالح اور نیک بندوں کا لباس صوف (اون) ہے اور یہ محل نظر ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ (الاعراف: 26) (اے اولاد آدم! بے شک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو) اس کا بیان سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اور وہاں فرمایا: جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ اور لفظ سرابیل میں روئی اور کتان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اَثَاثًا خلیل نے کہا ہے: مراد وہ ساز و سامان ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہو، یہ أَثٌ سے ماخوذ ہے جبکہ وہ زیادہ اور کثیر ہو۔

شاعر نے کہا:

و فرعٍ یزین المتنَ أسودَ فاحمٍ أثیثٍ کقنو النخلة المتعثکِلِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اَثَاثًا سے مراد کپڑے ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ صوف، اون اور بالوں سے ہر حال میں نفع حاصل کرنا جائز ہے اسی لئے ہمارے اصحاب نے کہا ہے: مردار کی صوف اور اس کے بال پاک ہیں ان سے ہر حال میں نفع اٹھانا جائز ہے۔ اور اس خوف سے اسے دھوڑالا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من المأثم والمغرم، جلد 2، صفحہ 942

میل کچیل یا گندگی وغیرہ لگی ہوئی ہو۔ اور اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مردار کی کھال کے استعمال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کردی جائے اور اس کی اون اور اس کے بالوں میں کوئی حرج نہیں جب انہیں دھوڈالا جائے (1)''۔ کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جن میں موت داخل نہیں ہوتی، برابر ہے کہ وہ ان جانوروں کے بال ہوں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے یا ان کے جن کا نہیں کھایا جاتا، جیسا کہ انسان اور خنزیر کے بال، کیونکہ یہ سب طاہر اور پاک ہیں؛ یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، لیکن انہوں نے ہم سے یہ زائد بیان کیا ہے کہ سینگ، دانت اور ہڈیاں یہ بالوں کی مثل ہیں؛ فرمایا: چونکہ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن میں روح نہیں ہوتی اس لئے حیوان کی موت کے سبب وہ نجس اور پلید نہیں ہوتیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، لیث بن سعد اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک بال سارے کے سارے نجس اور پلید ہیں لیکن یہ دھونے کے ساتھ پاک ہوجاتے ہیں۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے تین روایتیں ہیں: (۱) یہ پاک ہیں موت کے سبب پلید نہیں ہوتے۔ (۲) نجس اور ناپاک ہوتے ہیں۔ (۳) انسان اور دوسروں کے بالوں میں فرق ہے، پس انسان کے بال پاک ہیں اور اس کے سوا دوسروں کے بال ناپاک ہیں۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ مِنْ اَصْوَافِهَا الآیہ کا عام ہونا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے کہ ہمارے لئے ان سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، اور مردار کے بالوں کو ذبح شدہ جانور کے بالوں سے خاص نہیں کیا ہے، پس یہ حکم عام ہی رہے گا مگر یہ کہ کوئی دلیل اس سے مانع ہو۔ اور یہ بھی کہ اصل یہ ہے کہ موت سے پہلے بالاجماع یہ پاک ہیں، پس جس کا گمان یہ ہے کہ یہ (موت کے ساتھ) نجاست کی طرف منتقل ہوگئے ہیں تو دلیل اسی پر ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قولہ تعالیٰ: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ: 3) (تم پر مردار حرام کیا گیا ہے) پورے بدن سے عبارت ہے۔ تو ہم کہیں گے: ہم اسے ان دلائل کے ساتھ خاص کرتے ہیں جو ہم نے ذکر کئے ہیں، کیونکہ یہ تو صوف کے ذکر میں بطور نص ہے اور تمہاری بیان کردہ آیت میں اس کا ذکر صراحۃً موجود نہیں ہے، پس ہماری دلیل اولیٰ اور ارجح ہوئی۔ واللہ اعلم۔

اور شیخ الامام ابواسحاق امام الشافعیہ بغداد نے اس پر یہ تعویل کی ہے کہ پیدائشی طور پر بال حیوان کا جزء متصل ہے، پس وہ اس کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتے ہیں اور دیگر تمام اجزاء کی طرح اس کی موت کے ساتھ وہ بھی نجس اور پلید ہوتے ہیں (2)۔ تو جواب یہ دیا گیا ہے: بے شک بڑھنا اور نمو پانا یہ حیات پر دلیل نہیں ہے، کیونکہ نباتات بڑھتی ہیں لیکن وہ زندہ نہیں۔ جب انہوں نے متصل نشو و نما پر محمول کرتے ہوئے ان کی زندگی پر استدلال کیا ہے تو ہم نے انہیں ان کی علیحدگی اور جدائی پر محمول کیا ہے تو انہیں اکھیڑنا اس عدم احساس پر دلالت کرتا ہے جو حیات نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور رہا وہ جو احناف نے ذکر کیا ہے کہ ہڈیاں، دانت اور سینگ بالوں کی مثل ہیں، تو ہمارے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ وہ گوشت کی طرح نجس ہیں۔ اور ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل کہا ہے۔ اور ہمارے لئے ایک تیسرا قول بھی ہے...... کیا سینگوں اور کھروں کی اطراف (کنارے) ان کی جڑوں کے ساتھ یا بالوں کے ساتھ ملائی جائیں گی؟ تو اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔ اور اسی

1۔ سنن دارقطنی، باب الدباغ، جلد 1، صفحہ 47، حدیث 19　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1170

طرح پروں کے بال ان کا حکم بالوں کے حکم کی مثل ہے، ان کی ہڈیوں کا حکم اس کے حکم کی مثل ہے۔ اور ہماری دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''تم مردار کی کسی شے سے نفع حاصل نہ کرو(1)''۔ اور یہ اس بارے میں اور اس کے ہر جز کے بارے میں عام ہے، سوائے اس کے جس پر دلیل قائم ہو جائے) اور اس پر دلیل قاطع اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ ۞ (یٰسین) ([گستاخ] کہتا ہے اجی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) اور مزید فرمایا: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا (البقرہ: 259) (اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں۔) اور فرمایا: فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (المومنون: 14) (پھر ہم نے پہنا دیا ان ہڈیوں کو گوشت) اور مزید فرمایا: ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۞ (النازعات) ([یعنی] جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے) پس اصل یہ ہڈیاں ہی ہیں، اور ان میں روح اور حیات اسی طرح ہیں جس طرح گوشت اور جلد میں ہیں۔ اور عبداللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے: ''تم مردار کی کھال سے نفع نہ اٹھاؤ اور نہ اس کے پٹھوں سے (2)''۔ اور اگر کہا جائے: تحقیق صحیح روایت میں ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بکری کے بارے فرمایا: ''کیا تم نے اس کی جلد سے نفع حاصل نہیں کیا؟'' تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! بلاشبہ وہ تو مردار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ اسے کھانا حرام ہے(3)''۔ اور ہڈی کھائی نہیں جاتی۔ تو ہم کہیں گے: ہڈی کھائی جاتی ہے، بالخصوص دودھ پینے والے بکری کے بچے، ایک سال کے بکری کے بچے، اور پرندوں کی ہڈیاں، اور بڑوں کی ہڈی کو بھونا جاتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔ اور جو کچھ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا وہ سب ہڈیوں میں حیات کے پائے جانے پر دلالت کرتا ہے، اور جو شے حیات کے سبب پاک ہو اور ذبح کرنے کے سبب وہ مباح سمجھی جاتی ہو تو موت کے سبب وہ نجس اور پلید ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ یہ زندہ اور مردہ کی جلد کے بارے میں عام ہے، پس مردار کے چمڑے سے نفع حاصل کرنا جائز ہے اگرچہ اس کی دباغت نہ بھی کی جائے۔ اور یہی ابن شہاب زہری اور لیث بن سعد نے کہا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہم نے لیث کے سوا فقہاء میں سے کسی کو نہیں پایا جس نے مردار کی کھال کو دباغت سے قبل بیچنا جائز قرار دیا ہو۔ ابو عمر نے کہا ہے: فقہاء سے مراد تابعین کے بعد امصار کے ائمہ فتویٰ ہیں، اور رہے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ زہری تو یہ ان سے صحیح ہے، اور یہ وہ قول ہے جس کا جمہور اہل علم نے انکار کیا ہے۔ اور دونوں سے اس قول کے خلاف بھی مروی ہے، اور پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ دار قطنی نے اپنی سنن میں یحییٰ بن ایوب کی حدیث یونس سے اور عقیل کی زہری سے، بقیہ کی حدیث زبیدی سے، محمد بن کثیر عبدی اور ابو سلمہ منقری کی حدیث سلیمان بن کثیر سے اور انہوں نے زہری سے بیان کی ہیں،

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، ما جاء فی جلود المیتۃ إذا دبغت، جلد 1، صفحہ 206 2۔ ایضاً

ایضاً، سنن ابی داؤد، باب من روی ان لا ینتفع باھاب المیتۃ، حدیث نمبر 3598۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من قال لا ینتفع من المیتۃ، حدیث نمبر 3602، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب الطھارۃ جلود المیتۃ بالدباغ، جلد 1، صفحہ 158

اوران کے آخر میں کہا: یہ اسانید صحاح ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مردار کی جلد کی جب دباغت کر دی جائے تو علماء کے مابین اختلاف ہے کیا وہ پاک ہو گی یا نہیں؟ ابن عبد الحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو ذکر کیا ہے وہ ابن شہاب کے مذہب کے ساتھ اس میں مشابہت رکھتا ہے۔ اسے ابن خویز منداد نے اپنی کتاب میں ابن عبد الحکم سے بھی ذکر کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: اور یہی زہری اور لیث کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب وہ ہے جو ابن عبد الحکم نے ذکر کیا ہے، اور وہ یہ کہ دباغت مردار کی کھال کو پاک نہیں کرتی، لیکن خشک اشیاء میں اس سے نفع اٹھانا مباح ہوتا ہے، اور اس پر نماز نہیں پڑھی جائے گی اور نہ اس میں ڈال کر کوئی چیز کھائی جائے گی، اور ''مدونہ'' میں ابن قاسم نے کہا ہے: جس نے مردار کی غیر مدبوغ کھال غصب کی پھر اس نے اسے ضائع کر دیا تو اس پر اس کی قیمت ہو گی۔ اور انہوں نے یہ بیان کیا کہ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ابوالفرج نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے کسی آدمی کے مردار کی غیر مدبوغ کھال غصب کر لی تو اس پر کوئی شی نہ ہو گی۔ اسماعیل نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ مجوسی کا ہو۔ اور ابن وہب اور ابن عبد الحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اس کی بیع جائز ہے، اور یہ ہر مردار کی جلد کے بارے میں ہے سوائے اکیلے خنزیر کے، کیونکہ ذبح کرنا اس میں کوئی عمل نہیں کرتا، تو پھر دباغت بدرجہ اولیٰ عمل نہیں کرے گی۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہر وہ جلد جس کو ذبح کیا جائے اس کا استعمال وضو اور اس کے سوا کے لئے جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دباغت کے بعد مردار کی کھال سے بنے ہوئے برتن میں وضو کرنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا قول مختلف ہے، اور ایک بار انہوں نے کہا: بے شک انہوں نے اسے مکروہ نہیں قرار دیا مگر صرف اپنے حق میں۔ اور اس پر نماز پڑھنا اور اس کو فروخت کرنا مکروہ ہے، اور آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے اس میں آپ کی اتباع کی ہے۔ اور رہے اکثر اہل مدینہ! تو وہ اس کی اباحت کے قائل ہیں اور اس کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس چمڑے کو بھی رنگ دیا گیا تو وہ پاک ہو جائے گا۔'' اکثر اہل حجاز اور عراق کے اہل فقہ و حدیث اسی مذہب پر ہیں اور یہی ابن وہب کی پسند ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مردار کی کھال سے کسی شی میں انتفاع جائز نہیں ہے اگرچہ اس کی دباغت کی جائے، کیونکہ وہ مردار کے گوشت کی مانند ہے اور وہ روایات جو دباغت کے بعد نفع حاصل کرنے کے متعلق ہیں وہ آپ کے اس قول کو رد کرتی ہیں۔ اور انہوں نے عبد اللہ بن عکیم کی حدیث سے استدلال کیا ہے...... اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے...... انہوں نے بیان کیا: ہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط پڑھا گیا جو ارض جہینہ کے بارے تھا اور میں جوان بچہ تھا: ''خبردار! تم مردار کے چمڑے سے نفع نہ اٹھاؤ اور نہ پٹھوں سے (1)''۔ اور ایک روایت میں ہے: یہ آپ کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا ہے۔ اسے قاسم بن مخیمرہ نے عبد اللہ بن عکیم سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے مشائخ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف لکھا...... داؤد بن علی نے کہا ہے: میں نے یحییٰ بن معین سے اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، من روی ان لا ینتفع باھاب المیتۃ، جلد 2، صفحہ 213

حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے اسے ضعیف قرار دیا اور کہا: لیس بشئ (یہ کوئی شی نہیں) بلاشبہ وہ کہتے ہیں اشیاخ نے مجھے بتایا، ابوعمر نے کہا ہے: اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو پھر یہ احتمال ہے کہ یہ ان احادیث کے مخالف ہو جو حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ اور حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہیں، کیونکہ یہ جائز ہے کہ ابن عکیم کی حدیث کا معنی یہ ہو ''کہ تم مردار کے چمڑے سے دباغت سے پہلے نفع نہ اٹھاؤ'' اور جب یہ احتمال ہے کہ یہ مخالف نہیں تو پھر ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اسے مخالف بنائیں، اور ہم پر لازم ہے کہ ہم دونوں خبروں کے مطابق عمل کریں جہاں تک ممکن ہو، اور عبداللہ بن عکیم کی حدیث اگرچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ قبل کی ہے جیسا کہ خبر میں موجود ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا قصہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا سماع ''کہ جس چمڑے کو رنگ دیا جائے وہ پاک ہو گیا (1)'' آپ کے وصال سے ایک ہفتہ یا اس سے بھی کم وقت پہلے ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ہمارے نزدیک مشہور یہ ہے کہ خنزیر کی جلد اس حدیث میں داخل نہیں اور نہ عموم اسے شامل ہے، اور اسی طرح کتا بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور امام اوزاعی اور ابوثور کے نزدیک یہ ہے کہ دباغت کے ساتھ صرف ان جانوروں کی جلد پاک ہوتی ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اور معن بن عیسیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے خنزیر کی جلد کے بارے میں پوچھا گیا جب اس کی دباغت کر لی جائے تو انہوں نے اسے مکروہ قرار دیا۔ ابن وضاح نے کہا ہے: میں نے سحنون کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح محمد بن عبدالحکم اور داؤد بن علی اور ان کے اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''جو چمڑا بھی رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے (2)''۔ ابوعمر نے کہا ہے: یہ ارشاد احتمال رکھتا ہے کہ آپ نے اس قول سے بالعموم وہ چمڑے مراد لئے ہوں جن سے نفع حاصل کرنا معہود اور مروج ہے، تو جہاں تک خنزیر کا تعلق ہے تو وہ اس معنی میں داخل نہیں کیونکہ اس کی جلد سے انتفاع معہود نہیں، کیونکہ اس میں ذبح کرنا بھی کوئی عمل نہیں کرتا۔ اور دوسری دلیل وہ ہے جو نضر بن شمیل نے بیان کی ہے: بے شک اھاب (چمڑا) کا اطلاق گائے، بکری اور اونٹ کی جلد پر ہوتا ہے اور ان کے سوا جو بھی ہیں ان کی کھال کو جلد کہا جاتا ہے نہ کہ اھاب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتے اور ان جانوروں کی جلد جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا اس سے انتفاع بھی غیر معہود ہے لہٰذا وہ پاک نہ ہوگی۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''درندوں میں ذی ناب کو کھانا حرام ہے (3)''۔ پس ان کو ذبح کرنا بھی ذبح کرنا نہیں ہے (یعنی یہ ان میں کوئی اثر نہیں کرتا) جیسا کہ خنزیر میں ذبح کرنا کوئی اثر نہیں کرتا۔ اور نسائی نے حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریشم، سونے اور جلدوں کو زینوں پر اور کجاوں میں بچھانے سے منع فرمایا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، ما جاء فی جلود المیتۃ اذا دبغت، جلد 1، صفحہ 206 2۔ ایضاً

ایضاً، سنن ابی داؤد، باب من روی ان لاینتفع باھاب المیتۃ، حدیث نمبر 3599، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصید، تحریم اکل کل ذی ناب، صفحہ 492

**مسئلہ نمبر 8**۔ فقہاء نے اس دباغت میں اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ مردار کی کھالیں پاک ہو جاتی ہیں کہ وہ کیا ہے؟ پس اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہی آپ کا مشہور مذہب ہے ہر وہ شے جس سے جلد کی دباغت کر دی جائے مثلاً نمک، بیری کے پتے، یا پھٹکڑی کی مثل نمک یا علاوہ ازیں کوئی شے تو اس سے انتفاع جائز ہے، اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے بھی کہا ہے، اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک تو یہی ہے، اور دوسرا قول یہ ہے: پھٹکڑی کی مثل نمک اور بیری کے پتوں کے سوا کوئی شے اسے پاک نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ دباغت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معہود تھی، اور اسی کو خطابی نے نقل کیا ہے...... واللہ اعلم ...... وہ روایت جسے نسائی نے حضرت میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ قریش کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے وہ گھوڑے کی مثل اپنی ایک بکری کھینچ کر لے جا رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کاش تم اس کا چمڑا اتار لیتے''۔ انہوں نے عرض کی: یہ مردار ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانی اور بیری کے پتے اسے پاک کر دیتے ہیں (1)''۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ قولہ تعالیٰ: اَثَاثًا، أثاث سے مراد گھر کا ساز و سامان ہے، اس کا واحد أثاثة ہے؛ یہ ابوزید انصاری کا قول ہے۔ اموی نے کہا ہے: الاثاث گھر کا ساز و سامان ہے، اور اس کی جمع آثّة اور أثُث ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: الاثاث سے مراد تمام قسموں کا مال ہے اور اس کے لفظوں میں اس کی کوئی واحد نہیں ہے۔ اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل معنی کثرت ہے اور سامان میں سے بعض کا بعض کے ساتھ جمع ہونا ہے یہاں تک کہ وہ کثیر ہو جائے، اور اسی سے شعر أثیث ہے بمعنی کثیر۔ اور أث شعرُ فلانٍ یأثُّ أثًّا جب بال زیادہ ہوں اور گھنے ہوں۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

وفرعٍ یزینُ المتن أسود فاحم	أثیث کقِنوِ النخلة المتعثکل

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الاثاث وہ ہوتا ہے جو پہنا جاتا ہے اور بچھایا جاتا ہے۔ اور قد تأثثت جب تو اثاث بنا لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اَثَاثًا بمعنی مال ہے۔ اور الحین کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے، اور یہاں اس سے مراد ہر انسان کے اعتبار سے غیر معین وقت ہے یا تو اس کی موت کے اعتبار سے اور یا ان اشیاء کے مفقود ہونے کے اعتبار سے جو اثاث ہیں۔

اور اسی لفظ کے بارے میں شاعر کا قول ہے:

أهاجتك الظعائن یوم بانوا	بذی الزی الجمیل من الاثاث (2)

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں تمہارے (آرام) کے لئے ان چیزوں کے سائے جن کو اس نے پیدا فرمایا اور

---

2۔ سنن أبی داود، کتاب اللباس، باب فی اهاب المیتة، جلد 2، صفحہ 213	2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 412

اس نے بنائی ہیں تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں اور اسی نے بنائے ہیں تمہارے لئے ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے اور (کچھ ایسے آہنی) لباس جو بچاتے ہیں تمہیں لڑائی کے وقت، اسی طرح وہ پورا فرماتا ہے اپنا احسان تم پر تا کہ تم سر اطاعت خم کر دو۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ قولہ تعالیٰ: ظِلٰلًا الظلال: اس سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے چاہے وہ گھر ہوں یا درخت ہوں۔ اور قول باری تعالیٰ: مِّمَّا خَلَقَ سایہ کرنے والے جمیع اشخاص کو عام ہے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ قولہ تعالیٰ: اَكْنَانًا الاکنان کِنّ کی جمع ہے، مراد وہ جگہ ہے جو بارش اور ہوا وغیرہ سے حفاظت کرتی ہے، اور یہاں مراد وہ غاریں ہیں جو پہاڑوں میں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کے لئے تیار بنایا ہے وہ ان میں پناہ لے سکتے ہیں، وہ انہیں اپنی حفاظت کا قلعہ بنا سکتے ہیں اور ان میں مخلوق سے علیحدگی اور تنہائی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور صحیح روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں غار حرا میں جا کر عبادت کرتے تھے اور کئی کئی راتیں اس میں قیام پذیر رہتے تھے ......الحدیث۔ اور صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر اپنی قوم سے تعلق توڑتے ہوئے اور اپنے دین کو دور تک پہنچانے کے لئے اپنے ساتھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں نکلے یہاں تک کہ دونوں جبل ثور کی غار تک پہنچ گئے، اور تین راتیں اس میں روپوش رہے ان دونوں کے پاس رات کے وقت حضرت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حاضر ہوا کرتے تھے آپ جوان آدمی تھے انتہائی تیز فہم اور سنی ہوئی بات کو فوراً یاد کر لینے والے تھے اور آپ ان کے پاس سے سحری کے وقت واپس چلے جاتے اور صبح مکہ مکرمہ میں قریش کے ساتھ کرتے گویا رات وہیں تھے اور جو بات بھی سنتے جس میں ان دونوں کے بارے ناپسندیدہ بات کی جاتی آپ اسے ضرور اپنے پاس محفوظ کر لیتے یہاں تک کہ ان کے پاس اس وقت اس کی خبر لے کر آتے جب اندھیرا چھا جاتا، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غلام عامر بن فہیرہ ریوڑ میں سے دودھ والی بکری چرا تا رہتا تھا اور شام کے وقت اسے ان کے پاس لے آتا تھا جبکہ عشاء (شام) کا کچھ وقت گزر جاتا پس یہ دونوں ہستیاں بڑے سکون اور وقار سے رات گزارتے اور وہ دونوں کو بکریوں کا دودھ پیش کرتا اور وہ گرم پتھر کے ساتھ گرم کیا ہوتا تھا یہاں تک کہ پھر تاریکی میں ہی عامر بن فہیرہ انہیں لے کر وہاں سے چلا جاتا، اور تین راتوں میں سے ہر رات وہ اسی طرح کا عمل کرتا رہا...... آگے حدیث ذکر کی اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔

**مسئلہ نمبر3**۔ قولہ تعالیٰ: وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ مراد قمیص اور کرتے ہیں، اور سرابیل کی واحد سربال ہے۔ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ اس میں مراد وہ زرہیں ہیں جو لوگوں کو جنگ میں محفوظ رکھتی ہیں۔

اور اسی سے کعب بن زہیر کا قول ہے:

شُمُّ العَرانِينِ أبطالٌ لَبُوسُهُمْ — من نَسْجِ داودَ في الهيجا سَرابِيلُ

**مسئلہ نمبر4**۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: کیسے فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا اور اس کے ساتھ میدان کا ذکر نہیں

کیا، اور فرمایا: تَقِيْكُمُ الْحَرَّ اور اس کے ساتھ برد (سردی) کا ذکر نہیں کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ لوگ پہاڑوں میں رہنے والے تھے اور ان کے پاس میدان نہ تھے، وہ گرمی میں رہنے والے تھے ان کے ہاں سردی نہ تھی، اس لئے ان کے لئے اس نعمت کا ذکر فرمایا جو ان کے ساتھ خاص تھی جیسا کہ انہیں صوف وغیرہ کے ذکر کے ساتھ خاص کیا، اور روئی، کتان اور برف وغیرہ کا ذکر نہیں کیا..... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے..... کیونکہ یہ چیزیں ان کے علاقوں اور شہروں میں نہیں تھیں؛ اس کا یہ معنی عطا خراسانی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ ان میں سے ایک شے کا ذکر دوسری پر دلالت کرتا ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

وما أدری اذا يَمَّمْت أرضا أريد الخير أيهما يَليني

أألخير الذی أنا أبتغيه أم الشر الذی هو يبتغينی(1)

**مسئلہ نمبر 5۔** علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بندوں کو سامان جہاد تیار رکھنا چاہئے تا کہ وہ اس کے ساتھ دشمن کے ساتھ قتال میں مدد لے سکیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی زخموں سے بچنے کے لئے زرہ وغیرہ پہنتے تھے اگر چہ آپ شہادت کے طالب تھے، بندے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس طرح شہادت کا طالب ہو کہ اپنے آپ کو موت، نیزوں کے پھلوں اور تلواروں کی ضربوں کے لئے جھکا دے، بلکہ وہ آلات جنگ پہنے تا کہ وہ اسے اپنے دشمن کے ساتھ لڑنے اور جنگ کرنے کی قوت اور طاقت دیں، اور وہ قتال کرے اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند و بالا ہو، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے گا کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ابن محیصن اور حمید نے دو تاؤں کے ساتھ تَتِمُّ اور نِعْمَتُهٗ کو مرفوع پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ فاعل ہے۔ اور باقیوں نے يُتِمُّ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہے جو اس نعمت کو مکمل کرتا ہے۔ اور تُسْلِمُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ تَسْلَمُوْنَ تا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، یعنی تم زخموں سے محفوظ رہتے ہو، اور اس کی اسناد ضعیف ہے؛ اسے عباد بن عوام نے حنظلہ سے انہوں نے شہر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور باقی تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور اس کا معنی ہے تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہوئے اس کی معرفت اور طاعت کے لئے سر تسلیم خم کر دو اور مطیع و فرمانبردار ہو جاؤ۔ ابو عبید نے کہا ہے: قرأت عامہ ہی پسندیدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو ہم پر اسلام کا انعام فرمایا وہ اس سے کہیں افضل ہے جس کے ساتھ اس نے زخموں سے سلامتی عطا فرمائی۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

"اے محبوب! اگر (ان روشن دلائل کے باوجود) وہ منہ پھیریں تو (فکر مند نہ ہو) آپ کے ذمہ تو صرف وضاحت سے پیغام پہنچانا ہے"۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1171

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ منہ پھیر لیں اس نظر و استدلال اور ایمان سے۔ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ یعنی آپ پر تو فقط تبلیغ کرنا، پیغام پہنچانا ہے، اور رہی ہدایت تو وہ ہمارے ذمہ ہے۔

یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

''وہ پہچانتے ہیں اللہ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا اور ان میں سے اکثر لوگ کافر ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ سدی نے کہا ہے: مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (1)، یعنی وہ آپ کی نبوت کو پہچانتے ہیں۔ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا اور آپ کو جھٹلاتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد وہ نعمتیں ہیں جو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر شمار کی ہیں، یعنی وہ پہچانتے ہیں کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور وہ ان کا انکار اپنے اس قول کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ ان کے اپنے آباء و اجداد کی جانب سے وارث بنے ہیں۔ اور اسی کی مثل حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور عون بن عبد اللہ نے کہا ہے: یہ کسی آدمی کا یہ قول ہے اگر فلاں نہ ہوتا تو اس طرح ہوتا، اور اگر فلاں نہ ہوتا تو میں اس مصیبت میں نہ پڑتا، حالانکہ وہ یہ پہچانتے ہیں کہ نفع اور نقصان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان تمام نعمتوں کے بارے پہچان کرائی تو انہوں نے انہیں پہچان لیا، اور کہا: ہاں، یہ تمام کی تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں، لیکن یہ ہمارے معبودوں کی سفارش و شفاعت کے ساتھ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں ان سے بہرہ اندوز ہونے کے سبب، اور ان پر شکر ادا نہ کر کے ان کا انکار کرتے ہیں۔ اور چھٹا احتمال یہ ہے...... کہ وہ انہیں شدت اور تنگی کی حالت میں پہچانتے ہیں اور پھر خوشحالی اور راحت کی حالت میں ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور ساتواں احتمال یہ ہے...... وہ انہیں اپنے اقوال کے ساتھ پہچانتے ہیں لیکن اپنے افعال و اعمال کے ساتھ ان کا انکار کرتے ہیں۔ اور آٹھواں احتمال یہ ہے...... وہ انہیں اپنے دلوں سے تو پہچانتے ہیں اور اپنی زبانوں کے ساتھ ان کا انکار کرتے ہیں؛ اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ (النمل: 14) (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے) وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ مراد یہ ہے کہ وہ تمام کے تمام کافر ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ یَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا ثُمَّ لَا یُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور قیامت کے دن ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ تب ان لوگوں کو اجازت نہیں ہوگی جنہوں نے کفر کیا اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا اس کی نظیر یہ آیت ہے: فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ (النساء: 41) اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ثُمَّ لَا یُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا یعنی انہیں عذر پیش کرنے اور کوئی کلام کرنے کے بارے میں اجازت نہیں دی جائے گی، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: وَ لَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ (المرسلات)

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 189

اور یہ اس وقت ہوگا جب ان پر جہنم بند کر دی جائے گی، جیسا کہ سورۃ الحجر کے شروع میں گزر چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے۔ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ یعنی نہ ان کی رضامندی کا مطالبہ کیا جائیگا، مراد یہ ہے کہ انہیں اس کا مکلف اور پابند نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کریں؛ کیونکہ آخرت دار تکلیف نہیں ہے اور نہ انہیں دنیا کی طرف رجوع کے لئے چھوڑا جائے گا کہ وہ توبہ کرلیں۔ یہ کلمہ دراصل العتب سے ماخوذ ہے اس کا معنی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرنا ہے، کہا جاتا ہے: عَتَبَ عَلَيهِ يعتب جب وہ اس پر ناراضگی اور عتاب کا اظہار کرے۔ اور جب وہ اس سے مذاکرہ کرے اس کے بارے جس کی وجہ سے اس نے اس پر عتاب کیا تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: عاتبہ، اور جب وہ تجھے خوش کرنے اور راضی کرنے کی طرف لوٹ آئے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے: أعْتَبَ، اور اس کا اسم العُتبی ہے اور اس سے مراد معتوب علیہ کا اس کی طرف رجوع کرنا ہے کہ وہ عتاب کرنے والے کو راضی اور خوش کر سکے؛ یہ ہروی نے کہا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

فإن كنتُ مظلوما فعبدا ظلمتَه وإن كنتَ ذا عُتْبَى فمثلُكَ يُعتبُ

وَ إِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا عذاب (آخرت کو) تو اس وقت وہ عذاب ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ انہیں (مزید) مہلت دی جائے گی۔''

قولہ تعالیٰ: وَ إِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا الْعَذَابَ یعنی جہنم کا عذاب اس میں داخل ہونے کے سبب۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہاں ان کے لئے کوئی توبہ نہ ہوگی۔

وَ إِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

''اور جب دیکھیں گے مشرک اپنے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں کو تو بول اٹھیں گے: اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے بنائے ہوئے شریک جنہیں ہم پوجا کرتے تھے تجھے چھوڑ کر، تو وہ شریک انہیں جواب دیں گے یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ پیش کر دیں گے بارگاہ الٰہی میں اس دن اپنی عاجزی اور فراموش ہو جائیں گے انہیں وہ بہتان جو وہ باندھا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ إِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ اس میں شرکاء سے مراد ان کے لکڑی اور پتھر کے وہ بت ہیں جن کی وہ پوجا کرتے رہے ہے، اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معبودوں کو اٹھائے گا کہ وہ ان کی اتباع کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ پھر انہیں جہنم میں ڈال دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''جو کسی شے کی پرستش کرتا رہا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس کے پیچھے اور

اس کی اتباع میں ہو جائے پس سورج کی پوجا کرنے والے سورج کے پیچھے ہو جائیں گے، چاند کی پرستش کرنے والے اس کے پیچھے ہو جائیں گے اور جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ ان کے پیچھے ہو جائیں گے۔'' الحدیث۔ انہوں نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے، اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے، اس میں ہے: ''پس صلیب والوں کے لئے اس کی صلیب کی تمثیل اور تصاویر والوں کے لئے اس کی تصاویر کی تمثیل اور آگ والوں کے لیے اس کی آگ کی مثل بنائی جائے گی پس وہ اس شے کی اتباع کریں گے جس کی وہ پرستش اور پوجا کرتے رہے (1)''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ یعنی یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے تیرا شریک بنا رکھا تھا۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ یعنی وہ معبودان باطلہ یہ قول انہیں پر ڈال دیں گے، یعنی جنہوں نے ان کی پوجا کی انہیں جھٹلاتے ہوئے وہ بول اٹھیں گے کہ وہ معبود اور الہ نہیں تھے اور نہ انہوں نے انہیں اپنی عبادت کا حکم دیا، پس اللہ تعالیٰ بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائے گا تا کہ اس وقت کافروں کی ذلت و رسوائی کا خوب اظہار ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کی وہ پوجا کرتے رہے۔ وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ السَّلَمَ یعنی مشرکین اس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی عاجزی پیش کر دیں گے، یعنی اس کے عذاب کی وجہ سے تابعدار ہو جائیں گے اور اس کے غلبے کی وجہ سے خضوع اور عاجزی اختیار کر لیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عابد و معبود دونوں تابعداری اختیار کر لیں گے اور اپنے بارے میں اس کے حکم کی پیروی و اطاعت کریں گے۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی ان سے وہ سب زائل ہو جائے گا جو شیطان نے ان کے لئے آراستہ و مزین کیا تھا اور وہ جو اپنے معبودان باطلہ کی شفاعت کے آرزومند اور امیدوار رہتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) روکا اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہم نے بڑھا دیا اور عذاب ان کے پہلے عذاب پر اس وجہ سے کہ وہ فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: وہ بچھو ہیں جن کی داڑھیں کھجور کے درخت کی طرح طویل ہوں گی (2)، اور سانپ ہیں جو اونٹ کی گردن کی مثل ہوں گے، اور اژدھا ہیں گویا کہ وہ لمبی گردن والے اونٹ ہیں وہ انہیں ماریں گے (اور ان پر مسلط ہوں گے) پس یہی زیادتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے انہیں آگ سے زمہریر کی طرف نکالا جائے گا پس وہ اس کی سخت اور شدید سردی اور ٹھنڈک کی وجہ سے آگ کی طرف بھاگیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے ان کی قیادت کرنے والوں پر ان کی اتباع کرنے والوں کی نسبت عذاب بڑھا دیا، پس دو عذابوں میں سے ایک ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا عذاب ان کے لئے دوسروں کو روکنے کی وجہ سے ہوگا۔ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ اس وجہ سے کہ وہ دنیا میں کفر اور معصیت کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، باب ما جاء فی خلود الجنة و اهل النار، جلد 2، صفحہ 79
ایضاً، باب ما جاء فی خلود اهل الجنة الخ، حدیث نمبر 2480، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 1191

سب فساد برپا کرتے تھے۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾

''اور وہ دن (بڑا ہولناک ہوگا) جب ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ ان پر انہیں میں سے اور ہم لے آئیں گے آپ کو بطور گواہ ان سب پر، اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا اور یہ سراپا ہدایت ہے اور یہ مژدہ ہے مسلمانوں کے لئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اور وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، جو قیامت کے دن اپنی امتوں پر یہ شہادت دیں گے کہ بلاشبہ انہوں نے ان تک پیغام پہنچایا تھا اور انہیں ایمان کی طرف دعوت دی تھی، اور ہر زمانے میں گواہ اور شاہد موجود رہتا ہے اگرچہ وہ نبی نہ ہو۔ اور ان کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ وہ ہدایت دینے والے اور راہنمائی کرنے والے ائمہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے ..... کہ وہ وہ علماء ہیں جن کے ساتھ اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی شریعت اور دین محفوظ فرما دیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر کوئی زمانہ فترت نہیں مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل موجود رہے ہیں، جیسا قس بن ساعدہ، اور زید بن عمرو بن نفیل وہ ہے جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے الگ امت کے طور پر اٹھایا جائے گا۔'' سطیح اور ورقہ ابن نوفل وہ ہے جس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اسے جنت کی نہروں میں غوطہ زن ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔'' پس یہ لوگ اور جو ان کی مثل ہیں وہ اپنے اہل زمانہ پر حجت اور ان پر گواہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ اس کا بیان سورۃ البقرہ اور النساء میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اس کی نظیر یہ ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) اس پر بحث گزر چکی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس میں حلال و حرام کا تفصیلی بیان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کرو اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے اور سرکشی سے، اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر پڑھا تو وہ بہت متعجب ہوئے

اور کہا: اے آل غالب! آپ کی اتباع اور پیروی کرو کامیاب ہو جاؤ گے، فلاح پا جاؤ گے۔ قسم بخدا! بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے بھیجا ہے تا کہ آپ تمہیں مکارم اخلاق کے بارے حکم دیں(1)۔ اور حدیث میں ہے۔ بے شک حضرت ابو طالب کو جب یہ کہا گیا: بے شک آپ کے بھتیجے نے یہ گمان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ نازل کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ الآیہ، تو انہوں نے کہا: تم میرے بھتیجے کی اتباع و پیروی کرو، قسم بخدا! وہ محاسن اخلاق کے بغیر کوئی حکم نہیں دیتا۔ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن مغیرہ پر یہ آیت آخر تک پڑھی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ تو اس نے عرض کی: اے میرے بھتیجے! اسے دوبارہ پڑھو! پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت دوبارہ پڑھی تو اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ اس میں بڑی شیرینی اور حلاوت ہے، اور اس پر بڑا حسن و جمال اور رونق ہے۔ اور بے شک اس کی اصل (جڑ) پتے لانے والی ہے، اور اس کی بلندی (شاخیں) پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ واللہ إن له لحلاوة، وإن عليه لطلاوة، وإن أصله لمورق، وأعلاه لمثمر، وما هو بقول بشر! اور غزنوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی قاری تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں ابتدا میں اسلام نہیں لایا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیاء کرتے ہوئے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا تو میرے دل میں ایمان راسخ اور پختہ ہو گیا۔ پھر میں نے اسے ولید بن مغیرہ پر پڑھا تو اس نے کہا: اے میرے بھتیجے! اسے دوبارہ پڑھ! تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو اس نے کہا: قسم بخدا! اس میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے...... اور آگے پوری خبر بیان کی۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: قرآن کریم میں یہ آیت اس خیر اور بھلائی کو جس کی پیروی کی جاتی ہے، اور اس شر اور برائی کو جس سے اجتناب کیا جاتا ہے زیادہ جامع ہے(2)۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے: کہا جاتا ہے عدل کی زکوٰۃ احسان ہے، اور قدرت کی زکوٰۃ عفو و درگزر ہے، اور غنی (دولتمندی) کی زکوٰۃ نیکی ہے اور جاہ و حشمت کی زکوٰۃ آدمی کا اپنے بھائیوں کی طرف کچھ لکھنا ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے عدل و احسان کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: عدل سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا، اور احسان سے مراد فرائض کو ادا کرنا ہے(4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عدل سے مراد فرض، اور احسان سے مراد نفل ادا کرنا ہے۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: یہاں عدل سے مراد ظاہر اور باطن کو برابر رکھنا ہے، اور احسان یہ ہے کہ خلوت کی حالت اعلانیہ حالت سے افضل ہو۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: عدل سے مراد انصاف کرنا، اور احسان سے مراد تفضل اور مہربانی کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: عدل سے مراد ہر وہ شے جو عقائد میں سے فرض ہے اور امانتیں ادا کرنے میں وہ دین اور شریعت ہے، اور ظلم کو ترک کرنا اور انصاف کرنا، اور حق ادا کرنا ہے۔ اور احسان سے مراد ہر وہ کام کرنا ہے جو اس کے لئے مندوب اور مستحب ہو، اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو فرض ہیں، مگر اس سے بدلہ دینے کی حد عدل میں داخل ہے، اور بدلے سے زائد کے ساتھ اس کی تکمیل کرنا احسان میں داخل ہے۔ اور رہا حضرت ابن عباس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 416
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1173
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 416
4۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 194

رضی اللہ عنہما کا قول تو وہ محل نظر ہے، کیونکہ فرائض کو ادا کرنا ہی اسلام ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث جبرائیل علیہ السلام میں اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے، اور وہی عدل ہے، اور بلاشبہ احسان سے مراد مکمل کرنے والے اور کامل بنانے والے امور ہیں اور وہ مندوب اور مستحب ہیں جیسا کہ حدیث جبرائیل علیہ السلام میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اسی کا تقاضا کرتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (احسان یہ ہے): أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك (1) (تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو بلاشبہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے) پس اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول صحیح ہے تو پھر آپ نے فرائض سے مراد مکمل کرنے والے امور لئے ہیں۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بندے اور اس کے رب کے درمیان عدل یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے نفس کے حصے پر ترجیح دینا ہے، اور اس کی رضا کو اپنی خواہش پر مقدم کرنا ہے، اور نواہی سے اجتناب کرنا اور اوامر کی پیروی اور اتباع کرنا ہے۔ اور رہا عدل بندے اور اس کے نفس کے درمیان! تو یہ اسے ہر اس شی سے روکنا ہے جس میں اس کی ہلاکت ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ (النازعات)

اور اتباع سے خواہش و لالچ کو دور رکھنا ہے، اور ہر حال اور معنی میں قناعت کو لازم پکڑنا ہے۔ اور وہ عدل جو اس کے اور مخلوق کے درمیان ہے تو وہ انہیں نصیحت کرنا ہے، خیانت کو ترک کرنا ہے چیز کم ہو یا زیادہ، اور اپنی طرف سے ان کے ساتھ ہر اعتبار سے انصاف کرنا ہے اور تیری طرف سے کسی کے ساتھ برائی نہ ہو نہ قولاً نہ فعلاً اور نہ سراً نہ اعلانیہ طور پر، اور ان کی طرف سے جو مصیبت اور تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کرنا، اور اس میں کم سے کم انصاف کرنا ہے اور اذیت دینے کو چھوڑ دینا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عدل میں یہ تفصیل انتہائی اچھی اور عین عدل ہے، اور رہا احسان تو ہمارے علماء نے کہا ہے: الاحسان مصدر ہے أحسن يُحسِن إحساناً۔ اور اسے دو معنوں پر بولا جاتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ بذات خود متعدی ہے، جیسے تیرا یہ قول: أحسنتُ كذا، یعنی میں نے اسے اچھا کیا اور اسے مکمل کیا، اور یہ ہمزہ کے ساتھ حَسُنَ الشئ سے نقل کیا گیا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے تیرا یہ قول: أحسنت إلى فلان، یعنی میں نے اس تک وہ شے پہنچائی جس کے ساتھ وہ نفع حاصل کر سکتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ لفظ اس آیت میں ان دونوں معنوں کے ساتھ اکٹھا مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بعض کا بعض کے ساتھ احسان کرنا پسند فرماتا ہے، یہاں تک کہ پرندہ تیرے پنجرے میں ہو اور بلی تیرے گھر میں ہو تو تیرے احسان کے بارے یہ مناسب نہیں کہ تو اس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں کوتاہی کرے، اور اللہ تعالیٰ تو ان کے احسان سے غنی اور بے نیاز ہے، اور اس کی طرف سے احسان، نعمتیں، فضل و مہربانی اور عنایتیں اور بخششیں ہیں۔ اور یہ حدیث جبرائیل میں پہلے معنی کے اعتبار سے ہے نہ کہ دوسرے معنی کے اعتبار سے، کیونکہ پہلا معنی عبادت کے اتقان، اور اسے ان امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرنے کی طرف راجع ہے جو اس عبادت کو صحیح بنانے والے اور مکمل کرنے والے ہیں، اور اس میں

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان، جلد 1، صفحہ 27 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1172

حق کا مراقبہ کرنا، اور عبادت کے شروع اور پھر اسے جاری رکھنے کی حالت میں اس (حق) کی عظمت و جلال کے تصور کو قائم رکھنا ہے۔ اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے مراد ہے۔ أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك (1) اور اصحاب دل کی اس مراقبہ میں دو حالتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ مشاہدہ حق اس پر غالب ہوتا ہے تو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور شاید حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت کی طرف اپنے اس ارشاد سے اشارہ کیا ہے: ''اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے (2)''۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ وہ اس مقام تک نہیں پہنچتا، لیکن اس پر یہ تصور غالب ہوتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اس پر مطلع ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اشارہ ہے: الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ (الشعراء) (جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور (دیکھتا رہتا ہے جب) آپ چکر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں کا)۔ اور قول باری تعالیٰ: اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (یونس: 61) (مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى مراد قرابت دار اور رشتہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وہ (آدمی) انہیں مال دیتا ہے جیسے اس نے فرمایا: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الاسراء: 26) (اور رشتہ دار کو اس کا حق یعنی صلہ ادا کرو) اور یہ واجب پر مندوب کے عطف کے باب سے ہے، اور اس سے امام شافعی نے مکاتب کو دینے کے وجوب کے بارے استدلال کیا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ نے ذوی القربیٰ کو خاص کیا ہے کیونکہ ان کے حقوق زیادہ موکد اور ان کا صلہ نسبتاً زیادہ واجب ہے، اس رحم کے حق کی تاکید کی وجہ سے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے، اور اس کا صلہ اپنے صلہ سے قرار دیا ہے، پس صحیح میں فرمایا: أمَا ترضينَ أن أصل من وصَلك وأقطع من قطعك (3) (کیا تم اس پر راضی نہیں کہ میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں جس نے تیرے ساتھ صلہ رحمی کی اور میں اس کے ساتھ قطع تعلقی کر لوں جس نے تیرے ساتھ قطع تعلقی کی) اور بالخصوص جب وہ فقراء ہوں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ الفحشاء سے مراد فحش ہے، اور اس کا اطلاق ہر قبیح پر ہے چاہے وہ قول قبیح ہو یا فعل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد زنا ہے۔ اور المنکر سے مراد ہر وہ شے ہے جس کا شریعت نے اس سے منع کر کے انکار کیا ہو، اور یہ تمام گناہوں، رذائل اور مختلف انواع کی کمینی حرکات کو شامل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ اور البغی سے مراد تکبر، ظلم، کینہ اور تعدی اور زیادتی کرنا ہے۔ اور اس کا حقیقی معنی حد سے تجاوز کرنا ہے، اور یہ منکر کے تحت بھی داخل ہے، لیکن اس کے ضرر اور نقصان کے شدید ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''بغاوت اور سرکشی

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان، جلد 1، صفحہ 27

2۔ سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حسب النساء، جلد 2، صفحہ 93

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطعیتها، جلد 2، صفحہ 315

سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ سزا (اور عذاب) کو لانے والا کوئی گناہ نہیں" (1)۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: "باغی کو بچھاڑ دیا گیا ہے" (2)۔ (یعنی وہ ہلاک کر دیا گیا ہے) تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی اور بعض کتب منزلہ میں ہے: اگر کسی پہاڑ نے کسی پہاڑ کے خلاف بغاوت کی تو ان میں سے باغی کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی صحیح میں عنوان ذکر کیا اور فرمایا: باب قول اللہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝، اور قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (یونس: 23) (تمہاری سرکشی کا وبال تمہیں پر پڑے گا۔) ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (الحج: 60) (پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائے گا) وترك اثارة الشر على مسلم أو كافر (مسلمان یا کافر پر شر بھڑکانے کو ترک کرنے کا بیان)۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر کی جو کہ حضور نبی مکرم ﷺ پر لبید بن اعصم کے جادو کرنے کے بارے میں ہے۔ ابن بطال نے کہا ہے: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات اور ترك إثارة الشر على مسلم أو كافر سے استدلال کیا ہے جیسا کہ حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس پر دال ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خبردار آگاہ رہو اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عطا فرما دی ہے اور رہا میں تو یہ ناپسند کرتا ہوں کہ میں لوگوں میں شر کو جوش دلاؤں (اور اسے پھیلا دوں)" (3)۔

اور اس کی وجہ ..... واللہ اعلم ..... یہ ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ میں تاویل کی ہے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ احسان (اور نیکی) کرنا اور اس کی برائی پر اس کی سزا کو چھوڑ دینا یہ مستحب ہے۔ پس اگر کہا جائے: بغی والی آیات میں تاویل کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ تو کہا جائے گا: اس کی وجہ ..... واللہ اعلم ..... یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو آگاہ کر دیا کہ سرکشی اور بغاوت کا ضرر و نقصان باغی کی طرف پھر جاتا ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (یونس: 23) اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد و نصرت کی ضمانت دی ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے۔ تو پھر جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے اس کا بدرجہ اولیٰ یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس کی مدد و نصرت کی ضمانت دی ہے تو اس کے مقابلے میں اس کی طرف سے عفو و درگزر ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے، اور اسی طرح حضور نبی مکرم ﷺ نے اس یہودی کے ساتھ کیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا، حالانکہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے ساتھ آپ ﷺ کے لئے اس سے انتقام لینے کی اجازت تھی: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) (اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے)۔ لیکن آپ ﷺ نے اس ارشاد کو لیتے ہوئے عفو و درگزر کو ترجیح دی: وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ (الشوریٰ) (اور جو شخص ان مظالم پر) صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 416
2۔ ایضاً
3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان، جلد 2، صفحہ 896

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متضمن ہے، اور ان دونوں کے بارے میں کلام پہلے گزر چکی ہے۔ روایت ہے کہ ایک جماعت نے اپنے ایک عامل کی شکایت ابوجعفر منصور عباسی کے پاس پیش کی تو عامل نے اس جماعت کے ساتھ مباحثہ کیا اور وہ ان پر غالب آ گیا، اس طرح کہ وہ اس پر کوئی بڑا ظلم ثابت نہ کر سکے اور نہ کسی شے میں اس کی زیادتی ثابت کر سکے، تو اتنے میں قوم سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے امیر المومنین! بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے، اور بلا شبہ اس نے عدل کیا ہے اور احسان نہیں کیا۔ راوی نے کہا: پس ابوجعفر اس کی اصابت رائے سے بہت متعجب ہوا اور اس نے عامل کو معزول کر دیا۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

''اور پورا کرو اللہ تعالیٰ کے عہد کو جب تم نے اس سے عہد کر لیا ہے اور نہ توڑو (اپنی) قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد حالانکہ تم نے کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ یہ لفظ عام ہے اور ان تمام عقدوں اور معاہدوں کو شامل ہے جو زبان کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور آدمی اسے لازم کر لیتا ہے بیع ہو یا صلہ ہو یا ایسے امر کے بارے معاہدہ ہو جو دین کے موافق ہو۔ اور یہ آیت اس قول کو ضمن میں لینے والی ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ کیونکہ اس کا معنی اس میں ہے: تم اس طرح کرو، اور اس سے باز رہو، پس اسی تقدیر پر اس کا عطف کیا گیا ہے۔ تحقیق یہ کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت اسلام پر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیعت لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اسی حلف کے لازم ہونے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو زمانہ جاہلیت میں وقوع پذیر ہوا اور پھر اسلام نے اسے پورا کرنے کے بارے حکم دیا؛ حضرت قتادہ، مجاہد اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے یہ کہا ہے۔ اور عموم ان تمام کو شامل ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ اور صحیح میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں اور جو معاہدہ جاہلیت میں ہوا اسلام نے سوائے شدت اور سختی کے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا'' (1)۔ یعنی (وہ معاہدہ) حق کی مدد کرنے، حق کے ساتھ قائم ہونے اور باہمی غمخواری کرنے کے بارے ہو۔ اور یہ اسی طرح ہو جیسا کہ وہ حلف الفضول ہے جسے ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا: قریش کے قبائل عبداللہ بن جدعان کے شرف ونسب کی وجہ سے اس کے گھر میں جمع ہوئے اور انہوں نے اس پر باہمی ایک عقد اور معاہدہ کیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں کوئی مظلوم نہیں پائیں گے چاہے وہ مکہ کے رہنے والوں سے ہو یا کوئی اور مگر وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ اس پر سے ظلم واپس لوٹا دیا جائے، اس معاہدہ کو قریش نے حلف الفضول کا نام دیا، یعنی حلف الفضائل۔ اور یہاں فضول فضل کی جمع کثرت ہے جیسا کہ فلس کی جمع فلوس ہے۔ ابن

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مواخاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 308

اسحاق نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں معاہدے کے وقت حاضر تھا میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس کے بدلے سرخ اونٹ دیئے جائیں اگر اسلام میں بھی مجھے اس کے بارے دعوت دی جائے تو میں یقیناً اسے قبول کروں گا۔'' اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ ولید بن عتبہ نے حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر ان کے مال کے بارے میں زیادتی کی، اس لئے کہ ولید کی حکومت تھی اور وہ مدینہ طیبہ کا امیر تھا۔ تو حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں تو میرے حق کے بارے میں میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گا یا پھر میں اپنی تلوار پکڑ لوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں کھڑا ہو جاؤں گا پھر حلف الفضول کے بارے دعوت دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں حلف اٹھاتا ہوں قسم بخدا! اگر آپ نے ہمیں دعوت دی تو میں یقیناً اپنی تلوار اٹھاؤں گا پھر میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا یہاں تک کہ آپ کے حق کے بارے انصاف ہو یا ہم سارے کے سارے مر جائیں۔ اور یہ خبر مسور بن مخرمہ تک پہنچی تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ اور یہ خبر عبدالرحمن بن عثمان بن عبیداللہ التیمی تک پہنچی تو اس نے بھی اسی طرح کہا۔ پس جب یہ خبر ولید کو پہنچی تو اس نے آپ کے ساتھ انصاف کیا۔ علماء نے کہا ہے: پس یہ وہی معاہدہ ہے جو دور جاہلیت میں ہوا تھا اور وہ وہی ہے جسے اسلام نے مزید مضبوط کیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے قول لا حلف فی الاسلام کے عموم سے خاص کیا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت کا حکم ظالم سے بچنے کے بارے ہے اور اس سے حق لینے کے بارے اور اسے مظلوم تک پہنچانے کے بارے میں ہے، اور اسے قانون شریعت کے ساتھ ایجاب عام کی صورت میں ہر اس آدمی پر واجب کیا ہے جو مکلفین میں سے قدرت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ظالموں پر راستہ اور اختیار دے دیا ہے۔ پس ارشاد فرمایا: اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (الشوریٰ) (بے شک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں زمین میں ناحق، یہی ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے)۔ اور صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تو اپنے بھائی کی مدد کر ظالم ہو یا مظلوم۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو معلوم ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کر سکتے ہیں لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس کے ہاتھ پکڑ لو ..... اور ایک روایت میں ہے: تم اسے ظلم سے روک دو ..... پس یہی اس کی مدد و نصرت ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے: ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے دی جانے والی سزا (عذاب) میں انہیں بھی شامل کر لے۔'' إن الناس إذا رأوا الظالم ولم يأخذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب من عنده (1)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اپنی قسموں کو مضبوط اور مغلظ کرنے کے بعد نہ توڑو؛ کہا جاتا ہے: توکید و تاکید، وکد اور اکد اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا یعنی شہیدا۔ (حالانکہ تم نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کو گواہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی نزول العذاب إذا لم يغير المنكر، جلد 2، صفحہ 39

بنالیا ہے )۔اور کہا جاتا ہے: محافظ بنالیا ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ضامن بنالیا ہے۔اور بے شک فرمایا: بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا تو یہ وہ قسم ہے جسے عزم وارادہ کے ساتھ موکد کیا گیا ہو اور یمین لغو کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے ہے۔اور ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: التوکید انسان کی وہ قسم جو ایک شے کے بارے میں بار بار ہو، وہ اس میں تین بار یا اس سے بھی زیادہ قسم کو دہراتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے، جیسے اس کا یہ قول: والله لا أنقصه من كذا، (قسم بخدا! میں اسے اس سے کم نہیں کروں گا)، والله لا أنقصه من كذا، والله لا أنقصه من كذا۔فرمایا: پس اس کا کفارہ کفارہ یمین کی مثل ایک ہی ہوگا۔یحییٰ بن سعید نے کہا ہے: یہ عہود اور عہد قسم ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عہد کا کفارہ نہیں دیا جائے گا۔حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر عہد توڑنے والے کے لئے قیامت کے دن اس کی سرین کے پاس اس کے معاہدہ توڑنے کی مقدار کے مطابق جھنڈا گاڑا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں کی خیانت اور وعدہ خلافی ہے(1)''۔اور رہی اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھانا! تحقیق اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک خصلت کے ساتھ کفارہ مشروع قرار دیا ہے، اور جس پر قسم منعقد ہوا سے کھول دیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: التوکید یہ ہے کہ آدمی دو مرتبہ قسم کھائے، اور اگر آدمی ایک بار قسم کھائے تو اس میں کفارہ نہیں ہوگا۔یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝92

''اور نہ ہو جاؤ اس عورت کی مانند جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد (اور اسے) پارہ پارہ کر ڈالا تم بناتے ہو اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ تاکہ اس طرح ہو جائے ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے، صرف آزماتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ ان قسموں سے۔اور واضح فرما دے گا تمہارے لئے قیامت کے روز ان باتوں کو جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا، النقض اور النکث (توڑنا) دونوں کا ایک ہی معنی ہے، اور اسم النکث اور النقض ہے، اور جمع الأنکاث ہے۔پس اس آیت نے اس آدمی کو جو حلف اٹھاتا ہے، معاہدہ کرتا ہے، اور وہ اپنے عہد کو خوب پختہ کرتا ہے اور پھر اسے توڑ دیتا ہے اسے اس عورت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو اپنا سوت کاتتی ہے اور اسے مضبوط بٹتی ہے اور پھر اسے کھول دیتی ہے، پارہ پارہ کر دیتی ہے۔اور روایت کی جاتی ہے کہ مکہ میں رہنے والی ایک بیوقوف عورت تھی، اس کا نام ریطہ بنت عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ تھا وہ اس طرح کرتی تھی، پس اس کے ساتھ یہ تشبیہ واقع ہوئی ہے؛ یہ فراء نے کہا ہے، اور اسے عبداللہ بن کثیر اور سدی نے بیان کیا ہے اور ان دونوں نے عورت کا نام ذکر نہیں

1۔صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب إذا قال عند قوم شيئا ثم خرج بخلافه، جلد 2، صفحہ 1053

کیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، یہ ضرب المثل ہے، کسی معین عورت کے ساتھ تشبیہ نہیں ہے (1)۔ اور اَنْكَاثًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور الدخل سے مراد فریب، دھوکا اور ملاوٹ ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: ہر وہ کام جو صحیح نہ ہو وہی دخل ہے۔ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت ان عربوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے ایک قبیلہ جب دوسرے قبیلہ سے معاہدہ کرتا، پھر ان میں سے ایک کسی ایسے قبیلے کے پاس آتا جو افرادی قوت کے اعتبار سے زیادہ اور قوی ہوتا تو وہ اس میں داخل ہو جاتا، پہلے کے ساتھ دھوکا کرتا اور اپنا عہد توڑ ڈالتا اور اس بڑے کی طرف لوٹ جاتا (2)...... یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے...... اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: تم اس وجہ سے معاہدہ نہ توڑو کہ ایک طائفہ افراد یا اموال کے اعتبار سے دوسرے طائفہ کی نسبت زیادہ ہو تو تم اپنی قسمیں توڑ دو جب تم اپنے مشرک دشمنوں کی دنیا میں خوشحالی اور کثرت تعداد کو دیکھو۔ اور مقصود کفار اور ان کے اموال کی کثرت کے سبب کفر کی طرف لوٹنے سے منع کرنا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم کسی قوم کے ساتھ ان کی قلت اور اپنی کثرت کے سبب یا اپنی قلت اور ان کی کثرت کے سبب معاہدہ نہ توڑو؛ حالانکہ تم انہیں قسم کے ساتھ قوی اور مضبوط کر چکے ہو۔ اَرْبٰى بمعنی اکثر ہے؛ یہ رَبَى الشئ یربو سے ماخوذ ہے جبکہ شے کثیر ہو جائے، زیادہ ہو جائے اور بِهٖ میں ضمیر احتمال رکھتی ہے کہ وہ اس وفا کی طرف لوٹ رہی ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ربا کی طرف لوٹ رہی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرنے، اور ان میں سے بعض کے بعض پر غلبہ پانے کی طلب کے ساتھ آزمایا ہے، اور اس نے اس کے ساتھ انہیں امتحان میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کون اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے کہ وہ اسے ان کے مخالف بنا دے جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور اس کی خواہش کے مقتضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور یہی اس قول باری تعالیٰ کا معنی ہے: اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ یعنی تم دوبارہ زندہ کئے جانے وغیرہ کے بارے میں اختلاف کرتے ہو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳

"اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تمہیں ایک امت لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، اور ضرور تم سے باز پرس کی جائے گی ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک ہی ملت اور دین پر بنا دیتا۔ وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے) اپنی طرف سے ان کی مدد چھوڑنے کے سبب اور اپنی طرف سے ان میں عدل کرتے ہوئے۔ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ انہیں اپنی توفیق سے نوازتے ہوئے اور اپنی طرف سے ان پر فضل و احسان فرماتے ہوئے، جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ تم سے پوچھا جائے گا: اور یہ آیت قدریہ کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 418-417　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 418

رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اور وَ لَيُبَيِّنَنَّ اور وَ لَتُسْئَلُنَّ میں لام اور نون مشددہ (ثقیلہ) دونوں مضمر قسم پر دلالت کرتے ہیں، یعنی وَاللهِ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ وَلَتُسْئَلُنَّ۔

وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ ورنہ (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد اور تمہیں چکھنا پڑے گا (اس کا) برا نتیجہ کہ تم نے (اپنی عہد شکنی اور فریب کاری) کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا اور تمہارے لئے بڑا (دردناک) عذاب ہوگا۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اسے بطور تاکید مکرر ذکر کیا۔ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا یہ اس سے روکنے اور منع کرنے میں مبالغے کا اظہار ہے اس لئے کہ دین میں اس کے وقوع کا محل عظیم ہے اور لوگوں کے معاملات میں بار بار دہرائی جاتی ہے، یعنی تم ایسی قسمیں نہ کھاؤ جن سے مقصود دھوکہ اور فساد ہو ورنہ قدم جم جانے کے بعد (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد قسم سے قدم پھسل جائے گا۔ اور یہ استعارہ ہے سیدھی راہ پر چلنے والے کے لئے جو بہت بڑے شر اور برائی میں واقع ہو جاتا ہے اور اس میں گر پڑتا ہے، کیونکہ قدم جب پھسل جائے تو انسان اچھی حالت سے بری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اور اسی معنی میں کثیر کا قول ہے:

فلما توافينا ثَبَتُّ وزَلَّت (پس جب ہم آ گئے تو میں ثابت قدم رہا اور وہ پھسل گئی)

اور عرب ہر اس آدمی کے لئے جو عافیت کے بعد کسی مصیبت میں مبتلا ہو یا کسی گڑھے میں گرنے والا ہو، کہتے ہیں زلت قدمہ (اس کا قدم پھسل گیا)۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

سَيُمْنَعُ منك السَّبْقُ ان كنت سابقا و تُقْتَل ان زَلّت بك القدمان(1)

اور جو آدمی کسی شے میں خطا کرے اس کے لئے کہا جاتا ہے: زلّ فیہ۔ (وہ اس میں پھسل گیا) پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عذاب کی اور آخرت میں عذاب عظیم کی وعید فرمائی ہے۔ اور یہ وعید بلاشبہ اس کے بارے میں ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے عہد کو توڑا، کیونکہ جس نے آپ کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اس نے اپنا عہد توڑ دیا وہ ایمان سے خارج ہو گیا، اور اسی لئے فرمایا: وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی تمہارے اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے سبب۔ اور دنیا میں برا نتیجہ چکھنا یہ ہے کہ جو ان پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 201

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

''اور مت بیچو اللہ تعالیٰ کے عہدوں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض، بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو۔ جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے، اور ہم ضرور عطا کریں گے انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا یہ عہد توڑنے پر اموال لینے اور رشوت سے نہی ہے، یعنی تم دنیا کے قلیل ساز و سامان کے عوض اپنے عہدوں کو نہ توڑو۔ وہ بلا شبہ قلیل ہی ہے اگرچہ وہ کثیر بھی ہو، کیونکہ یہ زائل ہونے والا اور ختم ہو جانے والا سامان ہے، پس یہ فی الحقیقت قلیل ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے) سے یہی مراد ہے۔ پس دنیا اور آخرت کی حالت کے درمیان فرق بیان کر دیا اس طرح کہ یہ ختم ہو جاتا ہے اور بدل جاتا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اس کا فضل و عطا ہے، اور اس کی جنت کی نعمتیں ثابت رہنے والی ہیں وہ اس سے زائل نہیں ہوں گی جس نے وعدہ وفا کیا اور اپنے عقد پر ثابت قدم رہا۔

کسی شاعر نے کتنا خوب کہا:

المال ينفدُ حِلّه و حرامه　　　يوما و تبقى فى غدٍ آثامُه

اس دن مال کی حلت و حرمت ختم ہو جائے گی اور کل اس کے گناہوں کی جزا باقی رہے گی۔

ليس التقِيُّ بمتّقٍ لِإلهه　　　حتى يطيب شرابه و طعامه

تقویٰ صرف اس کے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ساتھ نہیں ہے یہاں تک کہ اس کا کھانا، پینا بھی حلال اور طیب ہو۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے:

هَبِ الدنيا تساق إليك عفْوًا　　　أليس مصير ذاك إلى إنتقال

تو دنیا کو چھوڑ دے وہ تیری طرف معافی مانگتے ہوئے چل کر آئے گی کیا اس کا انجام انتقال نہیں ہے۔

و ما دنياك إلا مثالُ فَيْئٍ　　　أظلّك ثم آذن بالزوال

تیری دنیا تو فقط سائے کی مثل ہے اس نے تجھ پر سایہ کیا اور پھر زوال کا اعلان کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا یعنی ہم انہیں ضرور عطا کریں گے جنہوں نے اسلام اور طاعات پر صبر کیا اور جنہوں نے گناہ کرنے سے صبر کیا (اجتناب کیا)۔ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ان کا اجر ان کے ان اچھے کاموں کے

عوض ہے جو وہ طاعات میں سے کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں احسن قرار دیا کیونکہ حسن میں سے اس نے جو چیزیں شمار کرائی ہیں وہ مباح ہیں۔ اور طاعات پر جزا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے وعدہ کے مطابق ہوگی۔ عاصم اور ابن کثیر نے تعظیم کی بنا پر نون کے ساتھ وَ لَنَجْزِیَنَّ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت وَ لَا تَشْتَرُوْا یہاں تک امرؤ القیس بن عابس کندی اور اس کے خصم ابن اسوع کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ دونوں زمین کے بارے میں جھگڑ پڑے پس امرؤ القیس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا اور جب اس نے یہ آیت سنی تو قسم سے انکار کر دیا اور اس کے لئے اس کے حق کا اقرار کر لیا) واللہ اعلم۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی، اور ہم ضرور دیں گے انہیں ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ اور حیات طیبہ کے بارے میں پانچ قول ہیں: (۱) اس سے مراد رزق حلال ہے(1)؛ یہ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عطا اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ (۲) اس سے مراد قناعت ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، زید بن وہب (2) اور وہب بن منبہ نے کہا ہے، اور اسے حکم نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ (۳) اس کا طاعات (وعبادات) کی توفیق دینا ہے کیونکہ یہ اعمال اسے اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچا دیتے ہیں؛ یہ معنی ضحاک نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: جس نے نیک عمل کئے درآنحالیکہ وہ مومن ہو تنگی کی حالت میں اور خوشحالی کی حالت میں تو اس کی زندگی پاکیزہ ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کیا اور اپنے رب کے ساتھ ایمان نہ لایا اور کوئی نیک عمل نہ کیا تو اس کی معیشت تنگ ہوگئی اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہ ہوگی۔ اور حضرت مجاہد، قتادہ، اور ابن زید رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے(3): اس سے مراد جنت ہے، اور یہ حسن نے کہا ہے، اور فرمایا: کسی کی زندگی پاکیزہ نہیں ہوگی مگر جنت میں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سعادت ہے (4)، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ اور ابو بکر وراق نے کہا ہے: یہ طاعت کی حلاوت ہے۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ بندے سے اس کی تدبیر چھین لی جائے اور اس کی تدبیر کو حق کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کی تصدیق کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مخلوق سے بے نیاز ہونا اور حق کی طرف متوجہ ہونا اور اس کا محتاج ہونا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قضا کے ساتھ راضی ہونا ہے۔ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ اور آخرت میں ہم انہیں ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ان کے اچھے کاموں کے عوض جو وہ کرتے

1۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 203	2۔ ایضاً، جلد 14-13، صفحہ 204	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

تھے۔) اور فرمایا: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ پھر فرمایا: وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اس لئے کہ مَنْ واحد اور جمع دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے، پس ایک بار ضمیر لفظ کے اعتبار سے (واحد) لوٹائی اور ایک بار معنی کے اعتبار سے (جمع) لوٹائی اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو صالح نے کہا ہے: تورات کو ماننے والے کچھ لوگ، اور انجیل کو ماننے والے کچھ لوگ، اور بت پرستوں میں سے کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، تو ان میں سے ایک فریق نے کہا: ہم افضل ہیں، اور دوسروں نے کہا: ہم افضل ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

## فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۞

''سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے: ...... اور وہ یہ کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ کے ساتھ متصل ہے پس جب تو اس کی قرأت میں شروع ہو تو اللہ تعالیٰ سے اس بارے پناہ طلب کر کہ شیطان تیرے لئے ظاہر ہو اور وہ تجھے اس میں غور و فکر کرنے سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کرنے سے روکے اور اس سے یہ مراد نہیں کہ تو قرأت کے بعد پناہ طلب کر، بلکہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: إذا أكلت فقل بسم الله یعنی جب تو کھانے کا ارادہ کرے تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ۔ اور جبیر بن مطعم نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا جس وقت آپ نماز شروع کرتے تو کہتے: اللّٰهم إني أعوذ بك من الشيطان من همزه و نفخه و نفثه (1)۔ (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وساوس سے، اس کے کبر و نخوت سے، اور اس کے غزلیہ اشعار سے۔)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھتے تھے۔ الکیا طبری نے کہا ہے: بعض سلف سے یہ منقول ہے کہ تعوذ مطلقاً قرأت کے بعد ہے، اور ان کا استدلال اس قول باری تعالیٰ سے ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ تعوذ قرأت کے بعد ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے) مگر اس کے سوا دوسرے معنی کا اس میں احتمال ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (الانعام: 152) (اور جب بھی بات کہو تو انصاف کی کہو۔)

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب: 53) (اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر۔) اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے سوال کے بعد حجاب کے پیچھے سے وہ ان سے سوال کرے۔ اور اسی کی مثل قائل کا یہ قول ہے: إذا قلت فاصدق (جب تو بات کرے تو سچ بول) اور وإذا أحرمت فاغتسل (اور جب تو احرام باندھے تو غسل کر) یعنی احرام باندھنے سے پہلے۔ اور ان تمام میں معنی یہ ہے: جب تو اس کا ارادہ کرے۔ پس اسی طرح استعاذہ (پناہ طلب کرنا، تعوذ پڑھنا) بھی ہے۔ یہ معنی اور استعاذہ کی مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من رأی الاستفتاح بسبحانك، جلد 1، صفحہ 113۔ ایضاً، حدیث نمبر 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''یقیناً اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی بے شک اس کا ان لوگوں پر گمراہ کرنے اور کفر کے بارے زور نہیں چلتا جو (سچے دل سے) ایمان لائے، یعنی تجھے اس پر قدرت نہیں ہے کہ تو انہیں ایسے گناہ پر ابھارے جس کی مغفرت نہیں ہوسکتی؛ یہ سفیان نے کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے اس پر کوئی حجت نہیں ہے گناہوں میں سے جن کی طرف وہ انہیں دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کو ان پر کسی حال میں کوئی زور نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قوت ان پر ڈال دی ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس نے کہا اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو(1): وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ (الحجر) (اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ (الحجر) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ ایسا عام ہے جس میں تخصیص داخل ہے، تحقیق اس نے حضرت آدم وحواء علیہما السلام سے اپنے زور کے ساتھ لغزش کا ارتکاب کروایا، اور اس نے اپنے اپنے وقت کے فضلاء کو اپنے اس قول کے ساتھ کہ ''تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟'' تشویش میں مبتلا کیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاعراف کے آخر میں گزر چکا ہے۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ بلاشبہ اس کا زور صرف ان پر چلتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تولیتہ یعنی میں نے اس کی اطاعت کی، اور تولیتُ عنه، یعنی میں نے اس سے اعراض کرلیا۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ اور ان پر جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں بِهٖ ضمیر شیطان کی طرف لوٹ رہی ہے؛ یہ ربیع بن انس اور قتبی نے کہا ہے(2)۔ اور اس کا معنی ہے: اور وہ لوگ جو اس کی وجہ سے شرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: کفرتُ بھذہ الکلمة، یعنی میں نے اس کلمے کی وجہ سے کفر کیا۔ اور صار فلانٌ بك عالما، یعنی فلاں تیری وجہ سے عالم ہوگیا، یعنی وہ جو شیطان کی اطاعت کرتے ہیں (اور اس کے ساتھ یارانہ گانٹھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔)

وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 213
2۔ ایضاً

اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں: تم صرف افتراء پرداز ہو، بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے۔ فرمایئے: نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جب ہم سابقہ شریعت کوئی شریعت کے ساتھ بدلتے ہیں؛ یہ ابن بحر نے کہا ہے (1)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی جب ہم ایک آیت کو اٹھا لیتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری رکھ دیتے ہیں (2)۔ اور جمہور نے کہا ہے: جب ہم ایک آیت کو ایسی آیت کے ساتھ منسوخ کر دیتے ہیں جو پہلی سے ان پر زیادہ شدید اور سخت ہوتی ہے۔ نسخ اور تبدیل کا معنی ہے ایک چیز کو اٹھا لینا اس طرح کہ اس کی جگہ دوسری شے رکھ دی جائے (3)، اور نسخ کے بارے میں مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ قَالُوْۤا مراد کفار قریش ہیں یعنی یہ کہتے ہیں: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ تم تو فقط جھوٹ گھڑنے والے ہو، اور وہ یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ حکم کی تبدیلی کو دیکھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ نے احکام اور بعض کو بعض کے ساتھ تبدیل کرنے کو مشروع قرار دیا ہے (اکثر اسے جانتے ہی نہیں ہیں) اور قول باری تعالیٰ: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، وہ مکمل قرآن کریم یعنی اس کا ناسخ اور منسوخ سبھی لے کر نازل ہوئے۔ اور صحیح اسناد کے ساتھ عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقرر کیا گیا، پس وہ ایک ایک کلمہ کے ساتھ آپ کے پاس آتے تھے پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ پر قرآن کریم لے کر نازل ہوئے۔ اور صحیح مسلم میں بھی ہے کہ آپ پر سورۃ ''اَلْحَمْدُ'' کے ساتھ ایک فرشتہ نازل ہوا جو پھر کبھی زمین کی طرف نہیں اترا، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ یعنی تیرے رب کے کلام کو حق کے ساتھ (روح القدس نے نازل کیا ہے) لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تاکہ وہ ثابت قدم رکھے انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں دلائل اور آیات میں سے۔ وَ هُدًى اور یہ ہدایت ہے۔ وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ اور مسلمانوں کے لئے خوشخبری ہے۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے۔''

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 214 2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 210 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 214

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ اس کے نام میں اختلاف ہے جس کے بارے انہوں نے کہا کہ وہ آپ کو قرآن سکھاتا ہے۔ پس کہا گیا ہے: وہ الفاکہ بن مغیرہ کا غلام تھا اور اس کا نام جبر ہے، وہ نصرانی تھا پھر اسلام لے آیا اور جب وہ (کفار مکہ) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ آیات سنتے تھے جو گزر چکی ہیں اور جو آنے والی ہیں اس کے باوجود کہ آپ امی ہیں اور آپ نے کچھ نہیں پڑھا تو وہ کہتے: بے شک انہیں جبر سکھاتا ہے حالانکہ وہ عجمی ہے، تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ یعنی جبر آپ کو کیسے سکھا سکتا ہے حالانکہ وہ عجمی ہے اور یہ وہ کلام ہے کہ جن و انس میں سے کوئی اس کی ایک سورت یا اس سے زیادہ اس کے معارض لانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ جبر کا آقا اسے مارتا تھا اور اسے کہتا تھا: تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتا ہے؟ تو وہ کہتا: نہیں قسم بخدا! بلکہ آپ مجھے تعلیم دیتے ہیں اور میری راہنمائی کرتے ہیں۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے: جو خبر مجھ تک پہنچی ہے اس کے مطابق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات مروہ کے قریب نصرانی غلام کے پاس بیٹھتے تھے اس کو جبر کہا جاتا تھا، اور وہ بنی الحضرمی کا غلام تھا، اور وہ کتابیں پڑھتا رہتا تھا، تو مشرک کہنے لگے: قسم بخدا! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ انہیں جبر نصرانی کے سوا کوئی نہیں سکھاتا۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: اس کا نام یعیش تھا وہ بنی حضرمی کا غلام تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قرآن کی تلقین کرتے تھے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور ثعلبی نے حضرت عکرمہ اور قتادہ سے ذکر کیا ہے کہ وہ بنی مغیرہ کا غلام تھا اس کا نام یعیش تھا، اور وہ عجمی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، تو قریش نے کہا: بلاشبہ اسے بشر (کوئی انسان) سکھاتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مہدوی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے وہ بنی عامر بن لوی کا غلام تھا، اور اس کا نام یعیش تھا۔ اور عبداللہ بن مسلم حضرمی نے کہا ہے: ہمارے دو نصرانی غلام تھے جو عین التمر کے رہنے والے تھے، ان میں سے ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا(1)۔ اور اسی طرح ماوردی، قشیری اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے، مگر ثعلبی نے یہ کہا ہے: ان میں سے ایک کو نبت کہا جاتا تھا اور اس کی کنیت ابوفکیہہ تھی، اور دوسرے کو جبر، اور وہ دونوں تلواروں کو تیز کرنے اور انہیں صاف کرنے کا کام کرتے تھے اور وہ دونوں ان کی کتاب پڑھتے تھے۔

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ تورات اور انجیل پڑھتے تھے۔ ماوری اور مہدوی نے کہا ہے: وہ تورات پڑھتے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پاس سے گزرتے تھے اور ان کی قرآت سنتے تھے، تو مشرک کہنے لگے: آپ ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مراد لئے؛ یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ مکہ میں ایک نصرانی تھا اس کا نام بلعام تھا، اور وہ غلام تھا تورات پڑھتا تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور مشرک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے پاس داخل ہوتے اور اس سے نکلتے وقت دیکھتے تھے، تو کہتے تھے: بلاشبہ بلعام انہیں سکھاتا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: مکہ مکرمہ میں ایک عیسائی آدمی تھا اس کو ابومیسرہ کہا جاتا تھا وہ رومی زبان میں گفتگو کرتا تھا، پس بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 215 2۔ ایضاً

اس کے پاس بیٹھ جاتے، تو کفار کہنے لگے: بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے سیکھتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ عتبہ بن ربیعہ کا غلام عداس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حویطب بن عبدالعزی کا غلام عابس اور ابن حضرمی کا آزاد کردہ غلام یسار ابوفکیہہ تھا، اور دونوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان تمام کا احتمال ہو سکتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں کبھی کبھار ان کے پاس بیٹھتے تھے تاکہ آپ انہیں اس کے بارے تعلیم دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا، اور یہ مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اور نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال باہم متضاد اور متناقض نہیں ہیں، کیونکہ یہ جائز ہے کہ وہ ان تمام کی طرف اشارہ کرتے ہوں، اور یہ گمان رکھتے ہوں کہ وہ آپ کو سکھاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں وہ حقیقت سے بہت دور ہے، کیونکہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، اور یہ آیت مکی ہے۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ، الالحاد کا معنی مائل ہونا (المیل) (ٹیڑھا ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: لحد و ألحد، یعنی مال عن القصد (وہ ہدایت سے پھر گیا، ہٹ گیا) اور یہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے اور حمزہ نے یَلْحَدُوْنَ یا اور حا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کی زبان جس کی طرف وہ مائل ہو رہے ہیں اور جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے وہ اعجمی ہے۔ اور العُجمه کا معنی الاخفاء: (چھپانا) ہے اور یہ بیان کی ضد ہے۔ اور رجل أعجم و امرأة عجماء یعنی جو فصیح و بلیغ نہ ہو۔ اور اسی سے عجُم الذنب گناہ کو چھپانے کے لئے ہے۔ اور العجماء جانوروں کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے بارے میں وضاحت نہیں کر سکتے۔ اور أعجمت الکتاب کتاب کے بغیر اعراب کے ہونے نے پھسلا دیا۔ اور عرب ہر اس کو أعجمی کا نام دیتے ہیں جو ان کی زبان نہیں جانتا اور نہ ان کی کلام میں گفتگو کر سکتا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: أعجم وہ ہے جس کی زبان میں عجمہ ہو اگرچہ وہ عربی ہو، اور الأعجمی یا عجمی وہ ہے جو دراصل عجم سے ہو۔ اور ابوعلی نے کہا ہے: أعجمی وہ ہے جو فصیح و بلیغ نہ ہو برابر ہے وہ عرب سے ہو یا عجم سے، اور اسی طرح اعجم اور اعجمی جو عجم کی طرف منسوب ہوں، اگرچہ وہ فصیح و بلیغ ہوں۔ اور لسان سے مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ عرب قصیدہ اور شعر کے لئے لسان بولتے تھے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لسانُ الشرّ تهديها إلينا وخُنت و ما حسبتك أن تخونا

مراد لسان القصیدہ ہے۔ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ یعنی یہ عربی کلام میں سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾

"بے شک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ وہ مشرک ہیں جو قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لاتے۔ لَا یَهْدِیْهِمُ

اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑩

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ⑩

''وہی لوگ تراشا کرتے ہیں جھوٹ جو ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیات پر اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یہ اس کا جواب ہے جو انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کی طرف افتراء پردازی کی نسبت کی۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ یہ انہیں کذب کے ساتھ متصف کرنے میں مبالغے کا اظہار ہے، یعنی ہر جھوٹ ان کے جھوٹ کی نسبت سے قلیل اور تھوڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: کذب فلان (فلاں نے جھوٹ بولا) اور یہ نہیں کہا جاتا: انه کاذب (بے شک وہ جھوٹا ہے) کیونکہ فعل کبھی لازم ہوتا ہے اور کبھی لازم نہیں ہوتا۔ اور رہی لغت (صفت) تو وہ لازم ہوتا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے: عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ⑩ (طٰہٰ) (اور حکم عدولی ہوگئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا)۔ اور یہ نہیں کہا جاتا: انہ عاصٍ و غاوٍ (کہ وہ حکم عدولی کرنے والے اور راستہ بھٹکنے والے ہیں) پس جب کہا جائے: کذبَ فلانٌ فهو کاذب، تو یہ کذب کے وصف میں مبالغہ کا اظہار ہے؛ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑩

''جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ (تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا) لیکن وہ (بدنصیب) کھل جائے کفر کے ساتھ (جس کا سینہ) تو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔''

اس میں اکیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا پس یہ وصف بالکذب میں مبالغے کا بیان ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے تم رسول اللہ ﷺ کی بیعت سے مرتد نہ ہو، یعنی جس نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اور وہ مرتد ہوگیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت عبداللہ بن سعد بن اَبی سرح اور مقیس بن صبابۃ، عبداللہ بن خطل، اور قیس بن ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا۔ پھر فرمایا: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ، (1) اور زجاج نے کہا ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ، مَنْ يَفْتَرِي الْكَذِبَ سے بدل ہے؛ یعنی بلاشبہ وہ جھوٹ گھڑتا ہے جس نے اپنے ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ سے کفر کیا، کیونکہ اس نے کلام میں استثنائے غیر تام کے آخر کی طرف دیکھا ہے پس اس نے اسے ماقبل کے ساتھ معلق کردیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: مَنْ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اور دوسرے مَنْ کی خبر پر ہی اکتفا کرلیا گیا ہے، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: من یاتنا من یحسن نکرمه۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 216-215

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہی اہل تفسیر کا قول ہے کہ یہ اس بعض کے زیادہ قریب ہے جس کی طرف انہوں نے آپ کو بلایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مشرکوں نے آپ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کے والد اور والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت خباب اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم کو بھی پکڑ لیا اور انہیں بہت ستایا، اذیتیں پہنچائیں، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا اور ان کی شرمگاہ میں نیزہ مارا گیا۔ اور انہیں کہا گیا: بے شک تو نے ان مردوں کی وجہ سے اسلام قبول کیا ہے، پھر انہیں شہید کر دیا گیا اور ان کے خاوند حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا گیا، اور یہ دونوں اسلام میں پہلے مقتول ہیں۔ اور رہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ! تو آپ نے مجبوراً اپنی زبان سے ان کے سامنے وہ کہہ دیا جو انہوں نے ارادہ کیا، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: ''اپنے دل کو کیسا پاتے ہو؟'' انہوں نے عرض کی: وہ ایمان کے ساتھ مطمئن ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پس اگر وہ اعادہ کریں تو تم بھی دوبارہ کہہ دو(1)''۔ اور منصور بن معتمر نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: اسلام میں پہلی شہیدہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی ماں ہے، انہیں ابوجہل نے قتل کیا تھا، اور مردوں میں سے پہلے شہید مجمع مولی حضرت عمر ہیں۔ اور منصور نے بھی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ سب سے پہلے جنہوں نے اسلام ظاہر کیا وہ سات ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت صہیب، حضرت عمار اور حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم۔ پس رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ان کی حفاظت حضرت ابوطالب نے کی، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حفاظت ان کی قوم نے کی، اور دوسروں کو انہوں نے پکڑ لیا۔ اور انہیں لوہے کی زرہیں پہنا دیتے، پھر انہیں دھوپ میں ڈال دیتے یہاں تک کہ انہیں لوہے اور سورج کی گرمی سے حد درجہ مشقت اور تکلیف پہنچتی، اور جب شام ہوتی تو ابوجہل اپنے ساتھ نیزہ لے کر ان کے پاس آتا اور انہیں گالیاں دینے لگتا اور انہیں خوب جھڑکتا، اور پھر وہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انہیں گالیاں دینے لگا اور بے حیائی کرنے لگا، پھر ان کی شرمگاہ پر نیزہ مارا یہاں تک کہ وہ ان کے منہ سے باہر نکل گیا اور انہیں قتل کر دیا؛ رضی اللہ عنہا۔ انہوں نے بیان کیا: اور دوسروں نے وہ کچھ کہہ دیا جو ان سے پوچھا گیا، سوائے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کیونکہ ان پر ان کے نفس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر معاملہ آسان کر دیا، پس وہ انہیں عذاب اور اذیتیں دینے لگے اور ان کو کہنے لگے: اپنے دین سے رجوع کر لو۔ (واپس لوٹ آؤ) اور وہ فرماتے: أَحَدٌ أَحَدٌ (اللہ تعالیٰ ایک ہے، اللہ تعالیٰ ایک ہے)، یہاں تک کہ وہ آپ سے اکتا گئے، پھر انہوں نے آپ کو باندھ دیا اور آپ کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ڈال دی اور اپنے بچوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ مکہ کے ان دو پہاڑوں کے درمیان کھیلتے رہیں حتیٰ کہ وہ بھی آپ سے اکتا گئے اور پھر چھوڑ دیا۔ راوی نے بیان کیا پس حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم تمام نے سوائے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس بارے کلام کی جو انہوں نے کہا...... کاش اللہ تعالیٰ ہمارا تدارک فرماوے...... کیونکہ ان پر ان کے نفس نے اللہ کی راہ آسان کر دی، پس وہ اپنی قوم پر غالب آگئے یہاں تک کہ

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، سورۃ النحل، جلد 2، صفحہ 389، حدیث 3362

وہ آپ سے اکتا گئے اور انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید لیا اور انہیں آزاد کر دیا۔ اور ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ ایمان لائے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب نے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف لکھا کہ تم ہماری طرف ہجرت کر آؤ، کیونکہ ہم اپنی طرف سے تمہاری کوئی امداد نہیں کر سکتے یہاں تک کہ تم ہماری طرف ہجرت کر آؤ، پس وہ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے نکلے یہاں تک کہ قریش نے انہیں راستے میں پکڑ لیا، پس انہوں نے انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا تو انہوں نے مجبور ہو کر کفر اختیار کر لیا، پس ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ دونوں روایتیں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کی ہیں۔

اور ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو دو امروں کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر انہوں نے دونوں میں سے زیادہ درست اور صحیح کو اختیار کیا(1)''۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جنت تین افراد کی مشتاق ہے (یعنی) حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہم (2)''۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم حسن بن صالح کی حدیث کے سوا اسے نہیں جانتے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب اللہ تعالیٰ نے اکراہ کے وقت اپنے ساتھ کفر کرنے کو بخش دیا ہے حالانکہ وہی اصل شریعت ہے اور اس کے سبب کوئی مؤاخذہ نہیں کیا، تو علماء نے اس پر بہت سے شرعی فروعات کو محمول کیا ہے، پس جب ان پر اکراہ واقع ہو تو ان کے سبب مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی حکم مرتب ہوگا اور اسی کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشہور اثر مروی ہے: ''میری امت سے خطا اور نسیان اور وہ عمل جس پر انہیں مجبور کیا گیا اٹھا لئے گئے ہیں (3)''۔ الحدیث۔ یہ خبر اگرچہ اس کی سند صحیح نہیں ہے لیکن اس کا معنی باتفاق علماء صحیح ہے، یہ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔ اور ابو محمد عبدالحق نے بیان کیا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے، فرمایا: اسے ابوبکر الاصیلی نے ''الفوائد'' میں اور ابن منذر نے کتاب ''الاقناع'' میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جسے کفر پر مجبور کیا گیا یہاں تک کہ اسے اپنے اوپر قتل کا خوف (غالب) ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اگر اس نے کفر کیا بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو اور نہ اس سے اس کی بیوی جدا ہوگی اور نہ اس پر کفر کے حکم کے ساتھ کوئی حکم لگایا جائے گا، یہ قول امام مالک، امام شافعی اور کوفیوں کا ہے، مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بن حسن نے کہا ہے: جب اس نے شرک کا اظہار کیا تو وہ ظاہر میں مرتد ہو گیا، اور جو معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے اس میں وہ اسلام پر ہی رہے گا، اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو جائے گی، اور اگر وہ مر گیا تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اور وہ اپنے باپ کا وارث نہیں بنے گا بشرطیکہ وہ اسلام پر فوت ہوا ہو۔ اور یہ وہ قول ہے جسے کتاب وسنت رد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 220۔ ایضاً، حدیث نمبر 3734، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 220۔ ایضاً، حدیث نمبر 3732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المکرہ والناسی، صفحہ 148

نے ارشاد فرمایا: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ الآیہ۔ اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران:28) (مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ)۔ اور فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ الآیہ (النساء:97) (بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا کہ تم کس شغل میں تھے؟ (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا: ہم تو بے بس تھے زمین میں)۔ مزید فرمایا: اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الآیہ (النساء:98) (مگر واقعی کمزور و بے بس مرد اور عورتیں اور بچے...... الخ)

پس اللہ تعالیٰ نے ان کمزور لوگوں کو معذور قرار دیا ہے جو اس کام کو ترک کرنے سے باز رہتے ہیں جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے، اور مُکرَہ کا نہیں ہوتا مگر وہی کمزور جو اس عمل کو کرنے سے رکنے والا نہیں جس کے بارے اسے حکم دیا گیا ہے، یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ رخصت فقط قول میں ہے اور جہاں تک فعل کا تعلق ہے تو اس میں کوئی رخصت نہیں، مثلاً یہ کہ انہیں غیر اللہ کو سجدہ کرنے پر یا غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے یا کسی مسلمان کو قتل کرنے پر یا اسے مارنے پر یا اس کا مال کھانے پر مجبور کیا جائے یا زنا کرنے، اور شراب پینے اور سود کھانے پر مجبور کیا جائے؛ یہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون کا قول بھی یہی ہے۔ اور محمد رحمۃ اللہ علیہ بن حسن نے کہا ہے: جب کسی قیدی کو کہا جائے: اس بت کو سجدہ کر ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر وہ بت قبلہ سمت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ سجدہ کر لے اور اس کی نیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور اگر وہ قبلہ سمت نہ ہو تو پھر وہ سجدہ نہ کرے اگرچہ وہ اسے قتل کر دیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ سجدہ کر لے اگرچہ وہ غیر قبلہ کی طرف ہی ہو، اور اس وقت سجدہ کرنا ہی اس کے لائق اور مناسب ہے۔ اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آ رہے تھے تو آپ اپنی سواری پر ہی جدھر اس کا منہ ہوتا نماز پڑھتے تھے (1)۔ انہوں نے فرمایا: اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ:115) (سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔) پس جب یہ دوران سفر حالت امن میں محض سواری سے اترنے کی مشقت کے پیش نظر نفل نماز کے لئے مباح ہے تو پھر حالت اکراہ میں یہ کیسے نہیں ہو سکتا؟ اور انہوں نے رخصت کو قول میں محصور کرنے کے بارے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے: کوئی کلام نہیں ہے جو مجھ سے طاقتور کے دو کوڑے دور کر سکتا ہو مگر یہ کہ میں اس کے ساتھ کلام کروں۔ تو انہوں نے رخصت کو قول میں محصور کیا ہے اور فعل کا ذکر نہیں کیا، اور یہ وہ ہے جس کے بارے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ قول یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے کلام کو بطور مثال ذکر کیا ہو حالانکہ وہ یہ ارادہ رکھتے ہوں کہ فعل بھی اسی کے حکم میں ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ قول اور فعل میں اکراہ برابر ہے بشرطیکہ اندر ایمان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1181

موجود ہو۔ اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل عراق کے ایک گروہ کا قول ہے۔ اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا ہے کہ جسے شراب پینے پر، نماز چھوڑنے پر یا رمضان میں روزہ افطار کرنے (نہ رکھنے پر) مجبور کیا گیا، تو اس سے گناہ اٹھالیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جسے دوسرے کو قتل کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس پر اقدام قتل جائز نہیں اور اس کی حرمت کو ختم کرنا کوڑوں یا کسی اور شے کے بدلے جائز ہے، بلکہ وہ اس مصیبت اور اذیت پر صبر کرے جو اس پر آئی ہے، اور اس کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کا فدیہ کسی اور کے ساتھ دے، اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی التجا کرتا رہے۔

اور زنا کے بارے میں اختلاف ہے، پس مطرف، اصبغ، ابن عبدالحکم اور ابن ماجشون نے کہا ہے: کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا، اگرچہ وہ قتل کر دیا جائے وہ ایسا نہ کرے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو وہ گنہگار ہوگا اور اس پر حد لازم ہوگی؛ ابوثور اور حسن نے یہی کہا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ اس کے لئے اقدام زنا جائز ہوگا اور اس پر حد نہ ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اسے لازم کیا ہے، کیونکہ ان کی رائے ہے کہ یہ فطری شہوت ہے اس میں اکراہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اور وہ شہوت کا باعث بننے والے سبب سے غافل ہے اور وہی اسے اس پر مجبور کرنے والا ہے، اور یہی وہ ہے جس نے اس کا حکم ساقط کر دیا ہے، اور بلاشبہ حد اس شہوت پر واجب ہوتی ہے جس پر سبب اختیاری نے برانگیختہ کیا ہو، پس انہوں نے شے کو اپنی ضد پر قیاس کیا ہے، پس یہ اس کی طرف سے درست اور صحیح نہیں۔

اور ابن خویز منداد نے احکام میں کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اس بارے اختلاف کیا ہے جب آدمی کو زنا پر مجبور کیا جائے، پس بعض نے کہا ہے: اس پر حد ہوگی، کیونکہ وہ یہ عمل اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر حد نہ ہوگی۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اسے غیر سلطان نے مجبور کیا تو اسے حد لگائی جائے گی، اور اگر اسے سلطان نے مجبور کیا تو پھر قیاس یہ ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی، لیکن مستحسن یہ ہے کہ اسے حد نہ لگائی جائے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) نے ان سے اختلاف کیا ہے پس انہوں نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں اس پر حد نہ ہوگی، اور انہوں نے انتشار کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب یہ علم ہو کہ وہ فعل زنا کے ساتھ قتل سے نجات پا جائے گا تو انتشار جائز ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اس پر کوئی حد نہیں، اور اس میں سلطان اور غیر سلطان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مُکرَہ کی طلاق اور اس کے عتاق کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس کی کوئی شے لازم نہ ہوگی۔ ابن وہب نے حضرت عمر، حضرت علی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ اس کی طلاق کو کوئی شے نہیں جانتے۔ اسے ابن منذر نے حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، عطا، طاؤس، حسن، شریح، قاسم، سالم، امام مالک، امام اوزاعی، امام احمد، اسحاق، اور ابوثور رضی اللہ عنہم و رحمہم اللہ تعالیٰ سے ذکر کیا ہے۔

اور ایک گروہ نے اس کی طلاق کو جائز قرار دیا ہے؛ اور یہ حضرت شعبی، نخعی، ابوقلابہ، زہری اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے مروی ہے، اور یہی کوفیوں کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مکرہ کی طلاق لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس میں رضا سے زیادہ کوئی شے معدوم نہیں، اور اس کا وجود طلاق میں شرط نہیں جیسا کہ ھازل (ٹھٹھا مذاق کرنے والا)۔ اور یہ قیاس باطل ہے، کیونکہ ھازل طلاق واقع کرنے کا قصد کرتا ہے اور اس کے ساتھ راضی ہوتا ہے، اور مکرہ راضی نہیں ہوتا اور نہ طلاق میں اس کی نیت ہوتی ہے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے(1)''۔ اور بخاری میں ہے: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جسے چور مجبور کرتے ہیں پس وہ طلاق دے دیتا ہے: تو وہ کوئی شے نہیں ہے (یعنی طلاق واقع نہیں ہوتی) اور یہی حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عمر، شعبی، اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اگر چوروں نے اسے مجبور کیا تو وہ طلاق نہ ہوگی، اور اگر اسے سلطان نے مجبور کیا تو وہ طلاق ہو جائے گی۔ اور ابن عیینہ نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور کہا ہے: بے شک چور اس کے قتل کا اقدام کرے گا اور سلطان اسے قتل نہیں کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اور رہا وہ آدمی جسے بیع پر مجبور اور تنگ کیا جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں: (۱) کہ وہ اپنا مال اس حق کے بدلے بیچے جو اس پر واجب ہے؛ تو یہ بیع ہو جائے گی، جائز ہوگی اور فقہاء کے نزدیک اس میں رجوع نہ ہوگا، کیونکہ غیر مبیع سے حق اس کے مالک کو ادا کرنا اس پر لازم ہے، پس جب اس نے وہ نہیں کیا تو اس کی بیع اس کے اختیار سے ہوئی پس وہ لازم ہو جائے گی۔ اور رہی مکرہ کی بیع ظلماً یا جبراً، تو یہ وہ بیع ہے جو اس پر جائز نہ ہوگی، اور اس میں اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنا سامان بغیر ثمن کے لے لے، اور مشتری (خریدار) ثمن کے لئے اس ظالم کا پیچھا کرے، پس اگر سامان ضائع ہو گیا تو وہ اس کے ثمن یا اس میں سے اکثر کی قیمت کے ساتھ اس ظالم پر رجوع کرے جبکہ مشتری اس کے ظلم کو نہ جانتا ہو۔ مطرف نے کہا ہے: خریدنے والوں میں سے، جو مکرہ کی حالت کو جانتا ہو تو وہ اس کا ضامن ہوگا جو اس نے اس کے غلاموں اور سامان میں سے خریدا جیسا کہ غاصب کا حکم ہے، پس خریدنے والے نے اس میں آزاد کرنے یا مدبر بنانے یا وقف کرنے وغیرہ کا جو تصرف اور عمل کیا وہ مکرہ پر لازم نہیں ہوگا، اور اس کے لئے اپنا سامان لینا جائز ہوگا۔ سحنون نے کہا ہے: ہمارے اصحاب اور اہل عراق نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ظلم اور جور و ستم پر مکرہ کا بیع کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور ابہری نے کہا ہے: بے شک اس پر اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اور رہا مکرہ کا نکاح، تو سحنون نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے مکرہہ اور مکرلہ (مرد و عورت) کے نکاح کے باطل ہونے پر اجماع کیا ہے، اور انہوں نے کہا ہے: اس پر قائم رہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ منعقد ہی نہیں ہوا۔ محمد بن سحنون نے کہا ہے: اہل عراق نے مکرہ کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اگر اسے اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ (فلاں) عورت سے دس ہزار درہم کے عوض، اور ایک ہزار درہم مہر مثل کے عوض نکاح کرے، تو وہ نکاح جائز ہوگا اور ایک ہزار درہم اس پر لازم ہوں گے اور فضل (فالتو رقم) باطل ہوگا۔ امام محمد نے کہا ہے: پس جس طرح انہوں نے ہزار سے زائد کو باطل قرار دیا ہے پس اسی طرح اکراہ کے ساتھ نکاح کو باطل قرار دینا ان پر لازم ہے۔ اور ان کا قول خلاف سنت ہے جو کہ

1۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 2

حدیث خنساء بنت حذام انصاریہ میں ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے مہروں کے بارے میں مشورہ کرنے کے حکم کے سبب ثابت ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے، پس ان کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ پھر اگر وہ آدمی جسے نکاح پر مجبور کیا گیا اس نے عورت سے وطی کی درآنحالیکہ اسے وطی پر مجبور نہ کیا گیا اور نکاح کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے، تو ہمارے نزدیک نکاح لازم ہو جائے گا اور اس پر مہر مسمی لازم ہوگا اور اس سے حد ختم ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے کہا: میں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے نکاح پر رضامندی کے بغیر وطی کی ہے تو اس پر حد ہوگی اور مہر مسمی ہوگا، کیونکہ وہ مہر مسمی کو باطل کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے، اور عورت کو حد لگائی جائے گی اگر اس نے یہ اقدام کیا اور وہ یہ جانتی تھی کہ اسے نکاح پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور رہی وہ عورت جسے نکاح پر اور وطی پر مجبور کیا گیا تو اس پر حد نہیں ہوگی اور اس کے لئے مہر ہوگا۔ اور وطی کرنے والے کو حد لگائی جائے گی، پس تو اسے جان لے، یہ سحنون نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جب عورت کو زنا پر مجبور کیا جائے تو اس پر کوئی حد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا، نسیان اور وہ عمل جس پر انہیں مجبور کیا گیا کو اٹھا لیا ہے۔'' (اور ان سے درگزر فرما لی ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۳﴾ (النور) (تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانے والا ہے) مراد دوشیزائیں ہیں۔ اور اسی معنی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لونڈی کے بارے میں فیصلہ کیا جسے غلام نے مجبور کیا تھا اور اسے حد نہ لگائی۔ اور علماء اس پر متفق ہیں کہ وہ عورت جسے مجبور کیا گیا، اس پر کوئی حد نہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی عورت حاملہ پائی گئی اور اس کا خاوند نہ ہو اور اس نے کہا: مجھے مجبور کیا گیا تو اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا اور اس پر حد ہوگی، مگر جب اس کے پاس بینہ (گواہ) ہو یا اس نے وہ زخم ظاہر کر دیا جو اسے لگایا گیا یا کوئی شی جو اس کے مشابہ ہو۔ اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کتاب اللہ میں رجم اس پر لازم ہے جس نے مردوں اور عورتوں میں سے زنا کیا بشرطیکہ وہ محصن ہو جبکہ اس پر بینہ قائم ہو جائے یا حمل ظاہر ہو جائے یا وہ اعتراف کر لے۔ ابن منذر نے کہا ہے: پہلے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ وہ عورت جسے مجبور کیا گیا اس کے لئے مہر کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ پس حضرت عطا اور زہری نے کہا ہے: اس کے لئے مہر مثل ہوگا، اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب اس پر حد قائم کر دی گئی جس نے اس کے ساتھ زنا کیا تو مہر باطل ہو گیا۔ اور یہی حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اور یہی اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: پہلا قول صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب کسی انسان کو اس کے گھر والوں کے اسلام پر ایسی شے کے لئے مجبور کیا گیا جو حلال نہیں تو وہ اسے تسلیم کر لے، اور اپنے آپ کو اسے چھوڑ کر قتل نہ کرے اور اس سے خلاصی اور نجات پانے میں اذیت برداشت نہ کرے۔ اس کی اصل اس روایت میں ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کی اور وہ اس کے ساتھ ایک شہر میں داخل ہوئے اس میں بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ یا جابروں میں سے کوئی جابر تھا تو اس نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ تم اس کو میرے پاس بھیج دو، پس آپ نے اسے بھیج دیا اور خود اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے پس وہ کھڑی ہوئی، وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی۔ اور دعا مانگی: اے اللہ! اگر میں تیرے ساتھ اور تیرے رسول کے ساتھ ایمان لائی ہوں تو مجھ پر اس کافر کو مسلط نہ کرنا۔ پس (اس پر نیند طاری کر دی گئی) اور وہ خراٹے لینے لگا یہاں تک کہ اپنے پاؤں کے ساتھ اس نے دور ہٹا دیا (1)“۔ اور یہ حدیث بھی اس پر دلیل ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا پر جب کوئی ملامت نہیں ہے، تو اسی طرح مستکرہ بہ پر بھی کوئی ملامت نہ ہوگی، اور نہ اس میں حد ہوگی جو خلوت میں سے اس سے زیادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ جہاں تک مُکْرَہ کی قسم کا تعلق ہے تو وہ لازم نہیں ہوتی یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور، اور اکثر علماء کے نزدیک ہے۔ ابن ماجشون نے کہا ہے: برابر ہے اس نے ایسی شے کے بارے قسم کھائی جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہو یا ایسی چیز کے بارے میں جو معصیت اور گناہ ہو جب اسے قسم پر مجبور کیا جائے اور یہ اصبغ نے بھی کہا ہے۔ اور مطرف نے کہا ہے: اگر کسی کو ایسی شے کے بارے قسم پر مجبور کیا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو یا اس کے کرنے میں طاعت ہو نہ معصیت تو اس میں قسم ساقط ہو جائے گی، اور اگر اسے ایسی شے میں قسم کھانے پر مجبور کیا گیا جو طاعت ہو مثلاً یہ کہ والی کسی فاسق آدمی کو پکڑ لے اور اسے مجبور کرے کہ وہ طلاق کے ساتھ قسم اٹھائے کہ وہ شراب نہیں پیئے گا یا وہ فسق نہیں کرے گا یا وہ اپنے کام میں بددیانتی نہیں کرے گا یا والد اپنے بیٹے کو ادب سکھانے کے لئے یہ قسم دیتا ہے تو یہ قسم لازم ہو جائے گی، اگرچہ مکرہ ان چیزوں کے بارے میں خطا کار ہو جن کا وہ مکلف اور پابند بنایا جا رہا ہے۔ اور یہی ابن حبیب نے کہا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور کوفیوں میں سے آپ کے متبعین نے کہا ہے: بے شک اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر اس نے وہ کیا تو وہ حانث ہو جائے گا، انہوں نے کہا: کیونکہ جس کو مجبور کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنی تمام قسموں میں حقیقت کو چھپائے (یعنی توریہ استعمال کرے) اور جب اس نے نہ چھپایا اور نہ اس نے اس کے خلاف نیت کی جس پر اسے مجبور کیا گیا تو تحقیق اس نے قسم کا ارادہ کر لیا۔ اور پہلے فریق کے ائمہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: جب اسے قسم پر مجبور کیا گیا ہے پس تو اس کی نیت اس کے قول کے مخالف ہو گئی کیونکہ وہ مجبور اس شے کے لئے ہے جس پر اس نے قسم کھائی۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: عجیب معاملہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اکراہ کی صورت میں حانث ہونے پر اختلاف کیا ہے کہ کیا اس کے ساتھ حنث واقع ہوگا یا نہیں؟ اور یہ مسئلہ عراقیہ ہے جو ہمارے لئے ان سے چلا ہے، نہ یہ مسئلہ ہو اور نہ وہ ہوں!

اے ہمارے اصحاب کی جماعت! کون سا فرق ہے قسم پر مجبور کرنے کے درمیان اس بارے میں کہ وہ لازم نہیں ہوتی اور حنث کے درمیان اس بارے میں کہ وہ واقع نہیں ہوتا؟ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی بصیرتوں کی طرف رجوع کرو اور اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب إذا استکرهت المرأة علی الزنا، جلد 2، صفحہ 1028

روایت سے دھوکہ نہ کھاؤ کیونکہ یہ درایت میں عیب ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جب کسی آدمی کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ قسم اٹھائے ورنہ اس کا مال لے لیا جائے گا جیسا کہ ٹیکس وصول کرنے والے اور محصول لینے والوں کا ظلم اور ظلم وزیادتی کرنے والے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں اس کے لئے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ بے شک آدمی اپنی قسم کے ساتھ اپنے بدن سے تکلیف دور کر سکتا ہے اپنے مال سے نہیں۔ اور ابن ماجشون نے کہا ہے: وہ حانث نہیں ہوگا اگرچہ اس نے اپنے مال سے (نقصان کے خطرہ کو) دور کر دیا اور اسے اپنے بدن پر کوئی خوف نہ ہو۔ اور ابن القاسم نے مطرف کے قول سے کہا ہے، اور انہوں نے اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، اور یہ ابن عبدالحکم اور اصبغ نے کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجشون کا قول صحیح ہے، کیونکہ مال سے نقصان کو دور کرنا جان کی مدافعت کی مثل ہی ہے اور یہی حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور عنقریب آرہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔'' اور مزید فرمایا: ''ہر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے(1)''۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی آدمی آئے جو میرا مال اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو تو اسے اپنا مال نہ دے۔'' اس نے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے قتل کر دے۔'' اس نے عرض کی: ''آپ کی کیا رائے ہے اگر وہ مجھے قتل کر دے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس تو شہید ہوگا''۔ اس نے عرض کی: آپ کیا دیکھتے ہیں اگر میں اسے قتل کر دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جہنم میں ہوگا(2)''۔ اسے امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔ اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اور مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے: اگر کسی قسم کھانے والے نے ظالم والی کے سامنے قسم کے بارے سوال سے پہلے ہی قسم کھانے میں جلدی کر دی تاکہ وہ اس کے ساتھ اپنے مال اور اپنے بدن میں سے جس پر جو خوف ہے اسے دور کر سکے پس اس نے اس کے لئے قسم اٹھا دی تو وہ اس پر لازم ہو جائے گی۔ اور یہ ابن عبدالحکم اور اصبغ نے کہا ہے۔ اور ابن ماجشون نے بھی اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جسے کسی ظالم نے پکڑ لیا اور اس نے اس کے لئے طلاق البتۃ کے ساتھ قسم کھائی اور اس کے بغیر کہ وہ اسے قسم دے اور اس نے اسے چھوڑ دیا حالانکہ وہ جھوٹا ہے، بلاشبہ اس نے یہ قسم اس کے مارنے، قتل کرنے یا اس کا مال لینے کے خوف سے کھائی ہے، پس اگر وہ خوف کے غلبہ اور نجات کی امید کے ساتھ قسم کھانے کے سبب اس کے ظلم سے چھٹکارا پا گیا تو وہ اکراہ میں داخل ہوگا اور اس پر کوئی شے نہ ہوگی، اور اگر اس نے نجات کی امید پر قسم نہ کھائی تو وہ حانث ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ محققین علماء نے کہا ہے: جب مکرہ کفر کا تلفظ کرے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر توریہ کے اسے اپنی زبان پر لے آئے)، کیونکہ توریہ میں جھوٹ کی وسعت اور کشادگی ہوتی ہے اور جب اس طرح نہ ہوا تو وہ کافر ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ، جلد 2، صفحہ 317

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیرہ بغیر حق، جلد 1، صفحہ 81

جائے گا، کیونکہ توریہ پر اکراہ کی کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے...... کہ اس کو کہا جائے: اکفر باللہ (اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کر) تو وہ کہے گا ھو کافر بالنبیٔ، یعنی اسے مشدد کہے گا اور اس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ اور اس پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے جو کھجور کے پتوں سے دسترخوان کی طرح کی چیزیں بنانے کا کام کرتا ہے، پس وہ ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کا اپنے دل سے قصد اور ارادہ کرے گا اور کفر کے گناہ سے بری ہو جائے گی۔ اور اگر اس کو کہا گیا: اکفر بالنبیٔ (ہمزہ کے ساتھ) تو وہ کہے گا: ھو کافر بالنبیٔ اور اس سے ارادہ مخبر کا کرے گا، یعنی کوئی بھی خبر دینے والا ہو جیسا طلیحہ اور مسلیمہ کذاب تھے یا اس سے مراد وہ نبی لے گا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

فَأَصبح رَتْمًا دُقاق الحَصَی　　مکان النبیٔ من الکاثب

**مسئلہ نمبر 18**۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس آدمی کو کفر پر مجبور کیا گیا لیکن اس نے قتل کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا اجر اس سے زیادہ اور عظیم ہے جس نے رخصت کو اختیار کیا اور اس کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے جسے قتل کے سوا کسی ایسے فعل پر مجبور کیا گیا جو اس کے لئے حلال نہ ہو تو اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں شدت اور سختی کو لینا، اور قتل و ضرب کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک رخصت کو اختیار کرنے سے افضل ہے، اسے ابن حبیب اور سحنون نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن سحنون نے اہل عراق سے ذکر کیا ہے کہ جب کسی کو قتل یا قطع اعضاء یا مارنے کے ساتھ ڈرایا دھمکایا گیا اور اس سے جان ضائع ہونے کا خوف ہو تو اس کے لئے مباح ہے کہ وہ وہ عمل کرے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے، مثلاً شراب پینا یا خنزیر کھانا وغیرہ اور اس نے ایسا نہ کیا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا گیا تو ہمیں اس کے گنہگار ہونے کا خوف ہے کیونکہ وہ مضطر کی طرح ہے۔ اور حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت پیش کی درآنحالیکہ آپ کعبہ معظمہ کے سائے میں چادر کا تکیہ بنائے لیٹے ہوئے تھے میں نے عرض کی: کیا آپ ہمارے لئے مدد طلب نہیں کریں گے، کیا آپ ہمارے لئے دعا نہیں مانگیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کبھی تم میں سے پہلے لوگوں میں سے کوئی آدمی پکڑ لیا جاتا تھا اور اس کے لئے زمین میں گڑھا کھودا جاتا، پھر اس میں اسے رکھا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اسے اس کے سر پر رکھ دیا جاتا اور اسے دو حصوں میں نصف نصف کر دیا جاتا اور لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ اس کے گوشت اور اس کی ہڈیوں کو نوچ لیا جاتا تو یہ چیزیں اسے اپنے دین سے نہ روکتی تھیں، قسم بخدا! یہ امر (دین اسلام) ضرور مکمل ہوگا یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت کی طرف ایک سوار چلے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور اپنے ریوڑ پر بھیڑیئے کے سوا کوئی خوف نہ ہوگا لیکن تم بہت جلد بازی کرتے ہو (1)''۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امم ماضیہ کا یہ وصف بیان کرنا ان کی مدح کے طریقہ پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مکروہ اور تکلیف دہ چیز پر صبر کرنے کے بیان کے لئے ہے، اور یہ کہ انہوں نے ظاہر میں کفر نہیں کیا اور نہ ایمان کو چھپایا تاکہ وہ اپنے آپ سے عذاب اور اذیتیں دور کر لیں۔ اور یہ ان کی دلیل اور حجت ہے جنہوں نے ضرب، قتل اور ذلت و رسوائی کو رخصت پر اور دارالجنان میں رہنے کو ترجیح دی ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الاخدود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب والقتل والھون علی الکفر، جلد 2، صفحہ 1027

اور ابو بکر محمد بن محمد بن الفرج بغدادی نے ذکر کیا ہے: انہوں نے بیان کیا، ہمیں شریح بن یونس نے اسماعیل بن ابراہیم سے انہوں نے یونس بن عبید سے اور انہوں نے حسن سے بیان کیا ہے کہ مسیلمہ کے جاسوسوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو پکڑا اور وہ انہیں مسیلمہ کے پاس لے گئے، تو اس نے ان میں سے ایک کو کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا: ہاں۔ پس اس نے اسے چھوڑ دیا، آزاد کر دیا۔ پھر دوسرے آدمی کو کہا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ پھر اس نے پوچھا: کیا تو شہادت دیتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ اس نے جواب دیا: میں بہرہ ہوں کچھ نہیں سنتا؛ پس اس نے اسے آگے بلا بھیجا اور اس کی گردن مار دی۔ پس وہ پہلا آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: میں ہلاک ہو گیا! آپ نے فرمایا: ''کس چیز نے تجھے ہلاک کیا ہے؟'' پھر اس نے پوری بات ذکر کی، آپ نے فرمایا: ''جہاں تک تیرے ساتھی کا تعلق ہے تو اس نے یقین اور اعتماد کو اختیار کیا ہے اور تو نے رخصت کو لیا ہے اب اس وقت تو کون سی حالت پر ہے؟ اس نے عرض کی: میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسی حال پر رہ جس پر تو ہے۔''

اس آدمی کے بارے میں رخصت جسے ظالم حکمران نے قسم دی اپنی ذات پر یا اس پر کہ وہ فلاں آدمی پر یا فلاں آدمی کے مال پر اس کی راہنمائی کرے گا۔ تو حسن نے کہا: جب اس پر اور اس کے مال پر خوف ہو تو اسے چاہئے کہ وہ قسم اٹھا دے اور اپنی قسم کا کفارہ نہیں دے گا۔ یہی حضرت قتادہ کا قول ہے جبکہ اس نے اپنی ذات پر یا اپنے ذاتی مال پر قسم کھائی۔ اور اس بارے میں علماء کا نظریہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور موسیٰ بن معاویہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو سعید بن اشرس صاحب مالک سے سلطان تیونس نے ایک آدمی کے خلاف قسم لی سلطان نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا کہ اس نے اسے پناہ نہیں دی ہے، اور نہ یہ اس کی جگہ کو جانتا ہے، تو ابن اشرس نے اس کے لئے قسم دے دی، اور پھر اپنی بیوی کو کہا: تو مجھ سے علیحدہ ہو جا پس وہ اس سے علیحدہ ہو گئی، پھر ابن اشرس سوار ہوا یہاں تک کہ بہلول بن راشد قیروان کے پاس آیا، اور اسے اپنے واقعہ کی خبر دی، تو بہلول نے اسے کہا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے بے شک تو حانث ہے۔ تو ابن اشرس نے کہا: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے، اور بلاشبہ میں نے رخصت کا ارادہ کیا ہے، یا اس معنی کی کلام کی، تو بہلول بن راشد نے اس کو کہا: حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے بے شک تجھ پر کوئی حنث نہیں ہے۔ راوی کا بیان ہے: پس ابن اشرس نے اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لیا اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کیا۔

اور عبد الملک بن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ مجھے معبد نے مسیب بن شریک سے اور انہوں نے ابو شیبہ سے بیان کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جسے کسی آدمی کے بدلے پکڑ لیا جاتا ہے، آپ کیا رائے رکھتے ہیں کہ وہ قسم اٹھا دے تا کہ وہ اسے اپنی قسم کے ساتھ بچا لے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں، کیونکہ میں ستر قسمیں اٹھاؤں اور انہیں توڑ دوں میرے نزدیک یہ زیادہ پسندیدہ ہے اس سے کہ میں کسی مسلمان پر راہنمائی کروں۔

اور ادریس بن یحییٰ نے کہا ہے کہ ولید بن عبدالملک جاسوسوں کو حکم دیتا تھا وہ رعایا کی جاسوسی کرتے تھے اور خبریں اس کے پاس لاتے تھے، اس نے بیان کیا: پس ان میں سے ایک آدمی رجاء بن حیوہ کے حلقہ میں بیٹھا تو اس نے بعض کو سنا وہ ولید کے بارے میں کچھ اعتراض کر رہے ہیں، پس اس نے وہ خبر ولید تک پہنچائی تو اس نے کہا: اے رجاء! تیری مجلس میں برائی کے ساتھ میرا ذکر کیا گیا اور تو نے اسے تبدیل نہیں کیا؟ تو انہوں نے فرمایا: اے امیر المومنین! ایسا نہیں ہوا۔ تو ولید نے اس کو کہا: کہو: آللہ الذی لا الہ الا ھو (قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں) تو آپ نے کہا: اللہ الذی لا الہ الا ھو (اللہ وہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں)؛ پس ولید نے جاسوس کے بارے حکم دیا اور اسے ستر کوڑے مارے، پس وہ رجا کو ملتا تھا اور کہتا تھا: اے رجا! تیرے وسیلہ سے بارش برستی ہے، اور ستر کوڑے میری پشت پر لگتے ہیں! تو حضرت رجا فرماتے: تیری پشت پر ستر کوڑے لگنا اس سے بہتر ہے کہ ایک مسلمان آدمی کو قتل کر دیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ علماء نے اکراہ کی حد میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: آدمی اپنے بارے میں پر امن نہیں ہوتا جب تو اسے خوفزدہ کرے یا اسے مضبوط باندھ دے یا اسے مارے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کوئی کلام نہیں جو مجھ سے دو کوڑے دور کر سکتی ہو مگر میں وہ کلام کروں گا۔ اور حسن نے کہا: مومن کے لئے احتیاط و بچاؤ یوم قیامت تک جائز ہے، مگر یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قتل میں کوئی احتیاط و بچاؤ نہیں بنایا ہے۔ اور نخعی نے کہا ہے: قید اکراہ ہے اور سجن بھی اکراہ ہے۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، مگر یہ کہ انہوں نے کہا ہے: خوفزدہ کرنے والی وعید بھی اکراہ ہے اگرچہ وہ واقع نہ بھی ہو، جب کہ اس تعدی کرنے والے کا ظلم اور اس کا نفاذ متحقق اور ثابت ہو جس کے ساتھ وہ ڈرا رہا ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک ضرب اور قید میں کوئی مقرر حد نہیں ہے، بلا شبہ ضرب (مار) وہ ہے جو ضرر رساں اور دردناک ہو، اور قید اور جیل وہ ہے جس کی وجہ سے مکرہ پر تنگی واقع ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سلطان اور کسی دوسرے کا اکراہ اکراہ ہی ہے۔ اور کوفیوں نے اختلاف کیا ہے پس انہوں نے شراب پینے اور مردار کھانے پر جیل اور قید کو اکراہ نہیں قرار دیا، کیونکہ ان دونوں سے ضائع اور ہلاک ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے ان دونوں کو کسی کے اس اقرار میں کہ ”فلاں کے میرے پاس ہزار درہم ہیں“ اکراہ (مجبور کرنا) قرار دیا ہے۔ ابن سحنون نے کہا ہے: اس پر علماء کا اجماع ہے کہ درد اور شدید تکلیف اکراہ ہے یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اکراہ بغیر جان کے ضیاع کے بھی ہو سکتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جسے قسم پر مجبور کیا گیا کسی وعید (دھمکی) یا جیل بھیجنے یا مارنے کی دھمکی کے ساتھ، تو اس کے لئے ہے کہ وہ قسم اٹھا دے اور اس پر حانث ہونا نہیں ہے، یہی امام شافعی، امام احمد، ابوثور اور اکثر علماء رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اس باب سے یہ ثابت ہوا ہے کہ توریہ میں جھوٹ کی وسعت اور کشادگی ہے۔ اور اعمش نے حضرت ابراہیم نخعی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے جب تیری طرف سے کسی آدمی کو کوئی شے پہنچے کہ تو کہے: قسم بخدا! بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو کچھ اس میں سے میں نے تیرے بارے میں کہا ہے۔ عبدالملک بن

حبیب نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کچھ میں نے کہا ہے، اور یہ اپنے ظاہر میں قول کی نفی ہے، اور اس پر حنث نہیں ہے جس نے اپنی قسم میں یہ کہا ہے اور نہ اس پر اس کے کلام میں جھوٹ ہے۔ اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کا کلام قسم کو لغو کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنے آپ سے اسے دور ہٹا رہے ہیں، نہ وہ اس میں کوئی کذب اور جھوٹ دیکھتے ہیں اور نہ انہیں اس میں حانث ہونے کا کوئی خوف اور ڈر ہے۔ عبدالمالک نے کہا ہے: وہ کلام میں سے اسے توریہ کا نام دیتے ہیں جب اس میں کوئی مکر و فریب نہ ہو اور نہ کسی حق میں دھوکا ہو۔ اور اعمش نے کہا ہے: حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب کوئی آتا تو آپ اس کی طرف نکلنا (اس سے ملاقات کرنا) ناپسند کرتے تھے چنانچہ آپ اپنے گھر کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور اپنی کنیز کو کہہ دیتے: اسے کہہ دو قسم بخدا! وہ مسجد میں ہیں۔ اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت بیان کی ہے کہ وہ لشکر میں سے کسی آدمی کو یہ اجازت دیتے تھے کہ جب وہ اپنے امیر کے پاس پیش ہو تو وہ یہ کہے: قسم بخدا! میں راہ نہیں پا سکتا مگر یہ کہ کوئی دوسرا مجھے سیدھی راہ پر لگائے، اور میں سوار نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ کوئی دوسرا مجھے سوار کرے اور اسی طرح کا اور کلام۔ عبدالملک نے کہا ہے: اس کے قول: غیری سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، وہی اسے سیدھی راہ دکھانے والا ہے اور وہی اسے اٹھاتا ہے (سوار کرتا ہے)؛ پس وہ اس آدمی پر اس کی اس قسم میں حنث نہیں دیکھتے، اور نہ اس کے کلام میں کوئی کذب ہے، اور وہ یہ ناپسند کرتے تھے کہ یہ کلام دھوکہ دہی، ظلم اور حق کے انکار میں کہی جائے پس جس نے یہ جرأت کی اور ایسا کیا تو وہ اپنی دھوکہ دہی میں گنہگار ہوگا اور اس کی قسم میں اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا یعنی اس کے سینے کو کفر قبول کرنے کے سبب وسیع کر دیا، کھول دیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا اور یہ قدریہ کا رد کر رہا ہے۔ اور صَدْرًا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور وہ عذاب جہنم ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

''اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پسند کر لیا دنیا کی (فانی) زندگی کو آخرت کی (ابدی) زندگی پر اور بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کافر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر اور یہی لوگ (اپنے اعمال کے نتائج سے) غافل ہیں۔ ضرور یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ یعنی اس غضب کی وجہ یہ ہے۔ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا یعنی انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت پر پسند کر لیا۔ وَاَنَّ اللّٰهَ اس میں اَنَّ محل جر میں ہے اور اس کا عطف بِاَنَّهُمْ پر ہے۔ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ پھر ان کا

وصف بیان کیا اور فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی نصیحتوں کو سمجھنے سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ وَ سَمْعِهِمْ اور اللہ تعالیٰ کا کلام سننے سے ان کے کانوں پر وَ اَبْصَارِهِمْ اور آیات کو دیکھنے سے ان کی آنکھوں پر (مہر لگا دی ہے)۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ اور یہی لوگ اس سے غافل ہیں جس کا ان کے بارے ارادہ کیا جا رہا ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''پھر بے شک آپ کے پروردگار کا معاملہ ان کے ساتھ جنہوں نے ہجرت کی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد پھر جہاد بھی کیا اور (مصائب میں) صبر سے کام لیا، بے شک آپ کا رب ان آزمائشوں کے بعد (ان کے لئے) بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا یہ سب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کا معنی ہے انہوں نے جہاد پر صبر کیا؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی طرف نکلے اس کے بعد کہ مشرکوں نے انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کیا اور انہیں اذیتیں دیں، ان کا ذکر اس سورت میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ مرتد ہو گیا تھا اور مشرکین سے جا ملا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کا حکم دیا، تو اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے پناہ طلب کی پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے پناہ دے دی (1)؛ اسے نسائی نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: سورۃ النحل میں ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ ...... تا قولہ ...... وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ اور یہ منسوخ ہو گیا، اور اس میں سے استثناء کی اور فرمایا: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اور یہ وہی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ہیں جو مصر پر (حاکم) رہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا پس شیطان نے اسے پھسلا دیا اور وہ کفار کے ساتھ مل گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کے بارے حکم دیا، تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کے لئے پناہ طلب کی پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پناہ عطا فرما دی۔

یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝

''اس دن کو یاد کرو جب آئے گا ہر نفس کہ جھگڑا کر رہا ہو گا (صرف) اپنے متعلق اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہو گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب الحکم فی من ارتد، حدیث نمبر 3792، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا یعنی اس بارے میں بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے یا ذکرھم یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا یعنی انہیں یاد دلاؤ اس دن کی جب ہر نفس صرف اپنے متعلق جھگڑا کرتے ہوئے آئے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہر کوئی قیامت کے دن کہے گا: نفسی نفسی (ہائے میری جان، ہائے میری جان) اور یہ قیامت کے دن کی ہولناکی کی شدت کی وجہ سے ہوگا، سوائے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیونکہ آپ تو اپنی امت کے بارے التجا کر رہے ہوں گے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اے کعب! ہمیں ڈرایئے، ہمیں جوش دلایئے، ہمیں کچھ بیان کیجئے، ہمیں متنبہ کیجئے۔ تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے امیر المومنین! قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم نے قیامت کے دن ستر انبیاء علیہم السلام کے عمل کی مثل بھی اجر پالیا تو پھر بھی تم پر کچھ مراحل ایسے آئیں گے جن میں تمہارے نفس کے سوا کوئی شی تمہیں پریشان اور بے چین نہیں کرے گی، اور بے شک جہنم ایک سانس نکالے گی اور کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی منتخب نبی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑے گا، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنی خلت کا واسطہ دے کر عرض کریں گے: اے میرے رب! بے شک میں تیرا خلیل ابراہیم ہوں، میں آج کے دن سوائے اپنے نفس کے تیری بارگاہ میں کسی کی التجا نہیں کرتا! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے کعب! کتاب اللہ میں تو اسے کہاں پاتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ارشاد باری تعالیٰ ہے: یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا ہے: قیامت کے دن لوگوں کے ساتھ خصومت اور جھگڑا مسلسل رہے گا یہاں تک کہ روح اور جسم بھی آپس میں جھگڑنے لگیں گے، پس روح کہے گی: اے میرے پروردگار! روح تجھ سے ہے تو نے اسے پیدا فرمایا ہے، میرا کوئی ہاتھ نہیں جس کے ساتھ میں پکڑ سکتی ہوں، میرا کوئی پاؤں نہیں جن کے ساتھ میں چل سکتی ہوں، میری کوئی آنکھ نہیں جس کے ساتھ میں دیکھ سکتی ہوں، کوئی کان نہیں جس کے ساتھ سن سکتی ہوں، اور عقل نہیں جس کے ساتھ کچھ سمجھ سکتی ہوں، یہاں تک کہ میں آئی اور اس جسم میں داخل ہو گئی پس اس پر مختلف انواع کے عذاب کو دوگنا کر دے اور مجھے نجات عطا فرما دے؛ اور جسم کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا ہے تو میں لکڑی کی مثل تھا، میرے لئے ہاتھ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پکڑ سکتا، پاؤں نہیں تھے جن کے ساتھ دوڑ سکتا، آنکھیں نہ تھیں کہ ان کے ساتھ دیکھ سکتا، کان نہیں تھے کہ ان کے ساتھ سن سکتا پس یہ (روح) آئی نور کی شعاع کی مثل، پس اس کے سبب میری زبان بولنے لگی، اس کے ساتھ میری آنکھ دیکھنے لگی، اس کے ساتھ میرے پاؤں چلنے لگے اور اس کے ساتھ میرے کان سننے لگے، پس اس پر طرح طرح کے عذاب کو دوگنا کر دے اور مجھے اس سے نجات عطا فرما دے۔

راوی نے بیان کیا: پس اللہ تعالیٰ ان دونوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائے گا کہ ایک نابینا اور ایک اپاہج آدمی دونوں ایک ایسے باغ میں داخل ہوئے جس میں طرح طرح کے پھل ہیں، پس اندھا پھل کو دیکھ نہیں سکتا اور اپاہج اسے پا نہیں سکتا، پھر اپاہج نے اندھے کو بلایا: میرے پاس آ اور مجھے اوپر اٹھا میں خود بھی کھاؤں گا اور تجھے بھی کھلاؤں گا، پس وہ اس کے قریب آیا اور اسے اوپر اٹھا لیا، اور وہ پھل تک پہنچ گئے اور اسے پالیا، پس اب عذاب اور سزا کس پر ہوگی؟ [وہ دونوں کہیں گے: دونوں پر

عذاب ہوگا] تو رب کریم فرمائے گا: تو تم دونوں پر اکٹھا عذاب ہے؛ اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے پس اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً یہ مشرکین کے ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین قریش کے خلاف دعا کی اور عرض کی: ''اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت اور پکڑ سخت کر دے۔ اور ان پر قحط مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح (1)''۔ پس وہ قحط میں مبتلا کر دیئے گئے یہاں تک کہ وہ ہڈیاں کھانے لگے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف اناج بھیجا اور وہ ان میں تقسیم کیا گیا۔ كَانَتْ اٰمِنَةً اس کے رہنے والوں کو کوئی اضطراب اور پریشانی نہ تھی۔ يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ یعنی بحر و بر کے راستے سے اس کا رزق اس کے پاس آتا تھا؛ اس کی نظیر یہ آیت ہے: يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ الآیہ (القصص: 57) (کھچے چلے آتے ہیں اس کی طرف ہر قسم کے پھل) فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ اس میں الأنْعُم، النِعمة کی جمع ہے؛ جیسا کہ الأشُد، الشِدّة کی جمع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نُعْمٰی کی جمع ہے۔ مثلاً بُؤسٰی کی جمع أبْؤس ہے۔ اور اس کفران نعمت سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کرنا ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے رہنے والوں کو چھکایا۔ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ اس (عذاب) کو لباس کا نام دیا کیونکہ اس سے ان پر کمزوری، رنگ کی تبدیلی، اور بدحالی غالب آنے لگی تو یہ لباس کی طرح ہی ہوگیا۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ یعنی اس کفر و معاصی کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

حفص بن غیاث، نصر بن عاصم، ابن ابی اسحاق، حسن، اور ابو عمرو اس میں جوان سے عبدالوارث، عبید اور عباس نے روایت کیا ہے الخَوْفَ منصوب پڑھا ہے اس طرح کہ اس پر أذاقھا کو واقع کیا ہے، اور اس کا عطف لِبَاسَ الْجُوْعِ پر کیا ہے۔ [ای أذاقھا اللہ لباس الجوع] و أذاقھا الخوفَ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ عذاب چھکایا کہ انہیں بھوک کا لباس پہنا دیا اور ان پر خوف مسلط کر دیا)۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ان سرایا کو بھیجنا تھا جو ان کا چکر لگاتے تھے۔ اور چکھنا تو دراصل منہ کے ساتھ ہوتا ہے پھر اسے مستعار لیا گیا اور اسے ابتلاء کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اور دوسرے شہروں کے لئے مکہ مکرمہ کی مثال بیان فرمائی یعنی بلاشبہ یہ بیت اللہ اور اس کی مسجد کی عمارت کے جوار میں واقع ہے جب اس کے باسیوں نے کفر کیا، ناشکری کی تو ان پر قحط مسلط ہوگیا تو پھر اس کے سوا دوسرے شہروں کا حال کیا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بستی سے مراد

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ آل عمران، لیس لك من الأمر شیء، جلد 2، صفحہ 655

مدینہ طیبہ ہے، اس کے رہنے والے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے الله تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اور یہ وہ فتنے ہیں جو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے (وصال کے) بعد وہاں ظاہر ہوئے۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ مثال ہر اس بستی کی بیان کی گئی ہے جو تمام بستیوں میں سے اس حال اور صفت پر ہو(1)۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور آیا ان کے پاس رسول انہی میں سے پس انہوں نے اسے جھٹلایا پھر پکڑ لیا انہیں عذاب نے اس حال میں کہ وہ ظلم وستم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بستی مکہ مکرمہ ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ عذاب سے مراد وہ قحط ہے جو مکہ مکرمہ میں واقع ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہاں کی سختیاں اور قحط سالی ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

''پس کھاؤ اس سے جو رزق دیا تمہیں الله تعالیٰ نے جو حلال (اور) طیب ہے، اور شکر کرو الله تعالیٰ کی نعمت کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یعنی اے مسلمانوں کے گروہ تم غنائم سے کھاؤ۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف ان پر شفقت اور نرمی کرتے ہوئے کھانا بھیجا، اور یہ اس وقت ہوا کہ جب وہ سات سال تک قحط میں مبتلا رہے اور اہل عرب نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان سے ذخیرہ کی ہوئی خوراک روک لی، تو انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں، مردار، مردہ کتے، چمڑے اور خون میں لتھڑے ہوئے اونٹ کے بال تک کھائے، پھر سرداران مکہ نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی جس وقت خوب مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہوئے اور کہنے لگے: یہ تو مردوں کا عذاب ہے اور عورتوں اور بچوں کا حال کیا ہوگا؟ (و قال له ابو سفيان: يا محمد، انك جئت تأمر بصلة الرحم والعفو، و ان قومك قد هلكوا: فادع الله لهم۔ فدعا لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، و أذن للناس بحمل الطعام اليهم و هم بعد مشركون)۔ اور ابوسفیان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کی: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک آپ تشریف لائے اور آپ صلہ رحمی اور عفو و درگزر کا حکم دیتے ہیں، اور بے شک آپ کی قوم ہلاک ہوگئی ہے، سو آپ ان کے لئے الله تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ پس رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا فرمائی اور لوگوں کو طعام ان کی طرف لانے کی اجازت عطا فرمائی اور وہ اس کے بعد بھی شرک کرتے رہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 217

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''اس نے تم پر حرام کیا صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر بلند کیا گیا ہو غیر الله کا نام ذبح کے وقت، پس جو مجبور ہو جائے (ان کے کھانے پر بشرطیکہ) وہ لذت کا جویا نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو (تو کوئی حرج نہیں) بے شک الله تعالیٰ غفور رحیم ہے۔''

اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۪ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

''اور نہ بولو جھوٹ جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے اس طرح تم افتراء باندھو گے الله تعالیٰ پر جھوٹا، بے شک جو لوگ الله تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ (وہ) تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں (انجام کار) ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: لِمَا تَصِفُ یہاں مَا مصدر یہ ہے، ای لوصف (السنتکم) (تمہاری زبانوں کے بیان کی وجہ سے) اور کہا گیا ہے کہ یہ لام لام سببیہ اور اجلیہ ہے، یعنی تم نہ کہو اپنے بیان کی وجہ سے الْكَذِبَ (جھوٹ) یہ حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہے، یعنی لما تصف السنتکم من الکذب اور اسے الکُذُبُ کاف، ذال، اور با کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور یہ السنۃ کی صفت ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن نے یہاں خاص طور پر الکَذِبِ کاف کے فتحہ اور ذال اور با کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لِمَا کی صفت ہے، تقدیر کلام ہے: ولا تقولوا الوصف ألسنتکم الکذبِ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ما سے بدل ہونے کی بنا پر مجرور ہے یعنی ولا تقولوا للکذب الذی تصفہ ألسنتکم۔ (اور تم اس جھوٹ کو نہ کہو جسے تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں)، هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ الآیہ۔ یہ خطاب ان کفار کو ہے جنہوں نے بحائر اور سوائب جانوروں کو حرام قرار دیا اور انہیں حلال قرار دیا جو ابھی چوپاؤں کے پیٹوں میں تھے اگرچہ وہ مردہ ہوں۔ پس قول باری تعالیٰ: هٰذَا حَلٰلٌ یہ اشارہ ان مردہ جانوروں کی طرف ہے جو ابھی چوپاؤں کے پیٹوں میں ہوں، اور ہر اس کی طرف جسے انہوں نے حلال قرار دیا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ هٰذَا حَرَامٌ یہ اشارہ بحائر اور سوائب اور ہر اس کی طرف ہے جسے انہوں نے حرام قرار دیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ یعنی اس میں ان کے لئے جو دنیوی نعمتیں اور فوائد ہیں وہ عنقریب

زائل ہو جائیں گے، ختم ہو جائیں گے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یعنی ان کے فوائد قلیل فوائد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لئے تھوڑا سا فائدہ ہے پھر وہ دردناک عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے: ہمیں ہارون نے حفص سے اور انہوں نے اعمش سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابراہیم کو کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا یہ حلال ہے اور نہ یہ سنا کہ یہ حرام ہے، بلکہ وہ یہ کہتے تھے: وہ ناپسند کرتے تھے اور وہ پسند کرتے تھے۔ اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لوگوں میں اہل فتوی یہ نہیں کہتے: یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں تم اس اس سے بچو۔ (ایا کم کذا و کذا) اور میرے لئے نہیں کہ میں ایسا کروں۔

ولم آکن لأصنع هذا اور اس کا معنی یہ ہے کہ کسی کو حلال قرار دینا اور کسی کو حرام قرار دینا بلاشبہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اور کسی اور کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ کہے یا اعیان میں سے کسی معین چیز کے بارے اس کی تصریح کرے مگر یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی شے کے بارے اس کی خبر دے۔ اور وہ شے جس کے بارے میں اجتہاد اس تک پہنچائے کہ یہ حرام ہے اس کے بارے کہے: إنی أکرہ کذا۔ (بے شک میں اسے ناپسند کرتا ہوں، مکروہ قرار دیتا ہوں) اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس میں اپنے متقدمین اہل فتوی کی اقتدا کرتے تھے۔ پس اگر کہا جائے: تحقیق انہوں نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے اپنی بیوی کو کہا: انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے) بے شک وہ حرام ہو جاتی ہے اور تین طلاقیں ہو جاتی ہیں (1)۔ تو جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک وہ حرام ہے، تو انہوں نے آپ کی ہی اقتدا کی۔ کبھی مجتہد کے نزدیک تحریم پر دلیل قوی ہوتی ہے تو اس وقت اس کے حرام کہنے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ وہ چھ معین اشیاء کے سوا میں کہتے کہ سود (ربوا) حرام ہے، اور بسا اوقات اس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کا اطلاق کرتے ہیں، پس حرام کہنا نمو پذیر اموال میں اور ان امور میں جو مصالح کے خلاف ہوں مناسب نہیں ہے۔ اور آپ نے زیر بحث مسئلہ میں مقصد کے حصول کے لئے دلائل کی قوت کے ساتھ دامن بچا لیا۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾

''اور یہودیوں پر ہم نے حرام کر دیں وہ چیزیں جن کا ذکر ہم آپ سے پہلے کر چکے ہیں، اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا بیان فرمایا کہ چوپائے اور کھیتی اس امت کے لئے حلال ہے، اور رہے یہودی تو ان پر ان میں سے کچھ چیزیں حرام ہیں۔ حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ یعنی سورۃ الانعام میں ہم ان کا ذکر آپ سے کر چکے ہیں۔ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ اور جو چیزیں ہم نے ان پر حرام کی ہیں ان کو حرام کرنے کے ساتھ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1183

نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے پس ہم نے بطور سزا ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں، جیسا کہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان کے لئے جنہوں نے غلطی کی (لیکن) نادانی سے پھر انہوں نے توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا، بے شک آپ کا پروردگار اس کے بعد (ان کے گناہوں کو) بہت بخشنے والا (اور ان پر) نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ اس میں سوء سے مراد شرک ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۰﴾

''بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو ملت (دین) ابراہیم علیہ السلام کی طرف دعوت دی، کیونکہ آپ ان کے اباء اور اس گھر کے بانی تھے جس کے ساتھ انہیں عزت حاصل تھی۔ اور الامۃ سے مراد وہ کامل مرد ہے جو خیر اور بھلائی کی صفات کا جامع ہو۔ اور اسے جن جن معنوں پر محمول کیا جا سکتا ہے وہ پہلے گزر چکے ہیں۔ اور ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ مجھ تک خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت معاذ پر رحم فرمائے! وہ امۃ قانتاً (مرد کامل اللہ تعالیٰ کے مطیع) تھے۔ تو آپ کو کہا گیا: اے ابا عبدالرحمن! بے شک اللہ عزوجل نے تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک امت سے مراد وہ ہے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے، اور بے شک قانت وہ ہے جو مطیع و فرمانبردار ہو (1)۔ تحقیق قنوت کا معنی سورۃ البقرہ میں اور حَنِیْفًا کا معنی سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

''وہ (ہر لمحہ) شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ کی (پیہم) نعمتوں کے لئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں ہدایت فرمائی سیدھے راستہ کی طرف۔ اور ہم نے مرحمت فرمائی انہیں دنیا میں بھی (ہر طرح کی) بھلائی اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1184

قولہ تعالیٰ: شَاكِرًا یعنی وہ شکر گزار تھے۔ لِّاَنْعُمِهٖ، الأنعم نِعمة کی جمع ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے اِجْتَبٰىهُ یعنی الله تعالیٰ نے انہیں چن لیا۔ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝ وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (اور انہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرمائی۔ اور ہم نے انہیں مرحمت فرمائی دنیا میں بھی (ہر طرح کی بھلائی)۔ کہا گیا ہے: اس سے مراد نیک طیب بچہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: مراد اچھی تعریف ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ مراد نبوت ہے(1)۔ یہ قول بھی ہے: مراد یہ ہے کہ تشہد میں حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے ساتھ آپ پر درود پڑھنے کو ملا دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اہل دین نہیں ہیں مگر وہی جو آپ کے ساتھ محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ آپ کی ضیافت (مہمان نوازی) اور آپ کی قبر کی زیارت کو باقی رکھا(2)۔ اور یہ سب چیزیں الله تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور زیادہ عطا فرمائیں۔ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ اس میں مِنْ بمعنی مع ہے، ای مع الصالحین یعنی وہ آخرت میں نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے، کیونکہ وہ دنیا میں بھی نیک لوگوں کے ساتھ تھے۔ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۝

''پھر ہم نے وحی فرمائی (اے حبیب!) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مناسک حج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں سے برأت اختیار کرنے اور اسلام سے آراستہ اور مزین ہونے میں آپ علیہ السلام کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین میں آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے سوائے ان احکام کے جنہیں چھوڑنے کا آپ کو حکم دیا گیا؛ یہی بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، جیسا کہ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ عقائد شرع میں اتباع کا حکم ہے نہ کہ فروعات میں، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ: 48) (ہر ایک کے لئے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ۔)

**مسئلہ**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ افضل کا مفضول کی اتباع کرنا جائز ہے، جبکہ وہ راہ صواب اور اس کے مطابق عمل کرنے میں مقدم اور پہلے ہو، اور اس میں فاضل (فضیلت رکھنے والا) پر کوئی تاوان نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں، حال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: 90) (تو انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَیَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 219 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''صرف ان لوگوں پر سنیچر کی پابندی تھی جنہوں نے اختلاف کیا تھا اس میں، اور بلاشبہ آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت ان امور کے متعلق جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی (یہ پابندی) نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں تھی اور نہ ان کے دین میں، بلکہ وہ تو بڑا وسیع تھا اس میں کوئی مشکل اور سختی نہ تھی۔ اور سنیچر کی پابندی اور سختی یہودیوں پر تھی اس لئے کہ کاروبار چھوڑنے اور معاش میں پھیلاؤ ترک کرنے کے بارے میں اس میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا (اسی سبب سے ان پر سنیچر کی پابندی عائد کر دی گئی)، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جمعہ کے دن کے ساتھ آئے اور فرمایا: ہر سات دنوں میں سے ایک دن عبادت کے لئے فارغ رہو۔ تو انہوں نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ان کی عید ہماری عید کے بعد ہو، پس انہوں نے اتوار کا دن پسند کیا (اور اسے منتخب کر لیا) ان میں جو اختلاف واقع ہوا اس کی کیفیت میں علماء کے مابین اختلاف ہے؛ چنانچہ ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جمعہ کے دن کے بارے حکم ارشاد فرمایا اور اسے ان کے لئے معین کر دیا۔ اور انہیں دوسرے دنوں پر اس کی فضیلت کے بارے میں بھی آگاہ کیا، لیکن انہوں نے آپ سے مناظرہ اور مباحثہ کیا کہ سنیچر کا دن افضل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ارشاد فرمایا: ''تم انہیں اور اسے جو انہوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے چھوڑ دو'' اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے معین نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے انہیں یوم جمعہ کی تعظیم کی خاطر اس کا حکم دیا پس ان کا اجتہاد اس کی تعیین میں مختلف ہو گیا، تو یہودیوں نے سنیچر کا دن معین کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دن (کائنات) کی تخلیق سے فارغ ہوا۔ اور عیسائیوں نے اتوار کا دن معین کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دن (کائنات کی) تخلیق کا آغاز کیا۔ پس ان میں سے ہر گروہ کو اسی دن کے ساتھ لازم کر دیا گیا جس تک اس کے اجتہاد نے انہیں پہنچایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے جمعہ کا دن معین فرمایا بغیر اس کے کہ وہ انہیں ان کے اجتہاد کے حوالے کرے یہ اس کی طرف سے فضل واحسان ہے، پس یہ امت ہونے کے اعتبار سے تمام امتوں سے بہتر ہے۔ اور صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم آخر میں آنے والے قیامت کے دن اوّل ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے مگر یہ کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی ہے اور ہمیں وہ ان کے بعد عطا کی گئی ہے پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے ہماری راہنمائی فرما دی جس میں حق میں سے انہوں نے اختلاف کیا، پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت (اور راہنمائی) فرما دی ...... فرمایا جمعہ کا دن ...... پس آج کا دن ہمارے لئے ہے اور آنے والا کل (سنیچر کا دن) یہودیوں کے لئے ہے اور اس کے بعد (اتوار) کا دن عیسائیوں کے لئے ہے''(1)۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول: ''پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے'' ان کے قول کو تقویت دیتا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، باب فرض الجمعہ لقول اللہ تعالیٰ، جلد 1، صفحہ 120

جنہوں نے یہ کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اسے معین نہیں کیا، کیونکہ اگر یہ ان کے لئے معین کیا جاتا اور پھر وہ سرکشی کرتے تو اخْتَلَفُوْا نہ کہا جاتا، بلکہ یہ کہا جانا زیادہ موزوں اور مناسب تھا فخالفوا فیہ و عاندوا۔ (پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور سرکشی کی)۔ اور جو چیزیں اسے تقویت دیتی ہیں ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے انہیں جمعہ سے غافل اور گمراہ کر دیا جو ہم سے پہلے تھے۔'' اور یہ اس معنی میں نص ہے۔ اور اس کے بعض طرق میں یہ آیا ہے: ''پس یہ ان کا وہ دن ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا (اور) انہوں نے اس میں اختلاف کیا (1)''۔ اور یہ پہلے قول کی حجت اور دلیل ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر جمعہ فرض کیا جو ہم سے پہلے تھے پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے لئے ہدایت عطا فرما دی پس اس میں لوگ ہماری اتباع کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مراد جمعہ کے دن میں اختلاف کا ہونا ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کر چکے ہیں، انہوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختلاف کیا۔ اور اس کی اپنے ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو آپ کے ساتھ اختلاف کرنے سے ڈرایا کہ ان پر بھی ایسی سختی اور پابندی عائد کر دی جائے گی جیسا کہ یہودیوں پر پابندی لگائی گئی ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۲۵

''(اے محبوب!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث (و مناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ آیت مکہ مکرمہ میں قریش کی صلح کے بارے معاملات کرنے کے وقت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی شریعت کی طرف بڑی شفقت اور نرمی کے ساتھ دعوت دیں نہ کہ درشتی اور سختی کے ساتھ، اور اسی طرح قیامت کے دن تک مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کرنی چاہئے۔ پس یہ آیت موحدین میں سے گنہگاروں اور نافرمانوں کے اعتبار سے محکم ہے، اور کافروں کے حق میں قتال کرنے کے بارے منسوخ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ جسے یہ احوال کفار میں سے کسی پر قدرت دیں اور بغیر قتال کے اس کے ایمان کی امید کی جا سکتی ہو تو یہ آیت اس کے بارے میں محکم ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝۱۲۶

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1186-1185

''اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہو، تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اور اگر تم (ان کی ستم رانیوں پر) صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جمہور علمائے تفسیر نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا غزوہ احد کے دن مثلہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور یہ صحیح بخاری اور کتاب السیر میں موجود ہے۔ اور نحاس اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے، اور اس کا معنی اس کے ماقبل مکی آیت کے ساتھ انتہائی خوبصورت اتصال کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ رفتہ رفتہ رتبے ان لوگوں سے جنہیں دعوت دی جاتی ہے اور نصیحت کی جاتی ہے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کے ساتھ مناظرہ اور مباحثہ کیا جاتا ہے، اور پھر ان کی طرف جنہیں ان کے فعل پر جزا دی جائے گی، لیکن جو جمہور نے روایت کیا ہے وہ زیادہ پختہ اور ثابت ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب مشرکین مقتولین احد سے واپس پھرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف گئے اور انتہائی بھیانک اور دردناک منظر دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے، ان کی ناک کاٹ لی گئی ہے، اور ان کے کان بھی کاٹ لئے گئے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر عورتیں غمزدہ نہ رہتیں یا میرے بعد یہ سنت نہ بن جاتی تو میں انہیں چھوڑ دیتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں درندوں اور پرندوں کے شکموں سے دوبارہ زندہ کرتا میں ضرور ان کی جگہ ستر افراد کا مثلہ کروں گا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر منگائی اور اس کے ساتھ ان کے چہرے کو ڈھانپ دیا، اور آپ کے پاؤں اس سے باہر نکل گئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا چہرہ ڈھانپ دیا اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دی، پھر انہیں سامنے رکھا اور ان پر دس تکبیریں کہیں۔ بعد ازاں ایک ایک شہید کو لایا جاتا اور اسے وہاں رکھا جاتا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ پر رہنے دیا گیا، یہاں تک کہ آپ پر ستر مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی، اور شہدائے احد بھی ستر تھے، پس جب وہ دفن کر دیئے گئے اور آپ ان سے فارغ ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر کیا اور کسی کا مثلہ نہ کیا۔ اسے اسماعیل بن اسحاق نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث زیادہ مکمل ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک گروہ سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے ساتھ مظالم کئے گئے کہ جب انہیں اپنے ساتھ ظلم کرنے والے پر قدرت حاصل ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ اس کے ظلم کی مثل ہی سلوک کریں اس سے زیادہ کی طرف تجاوز نہ کریں۔ اسے ماوردی نے ابن سیرین اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اہل علم نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے کہ جس آدمی پر کسی نے مال چھین کر ظلم کیا پھر ظالم نے اسی مظلوم کو مال پر امین بنا دیا، کیا اس کے لئے اس میں اتنی مقدار خیانت جائز ہے جتنا اس نے اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی

ہے؟؛ تو ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے؛ ان میں حضرت ابن سیرین، حضرت ابراہیم نخعی، سفیان اور حضرت مجاہد ہیں اور انہوں نے اس آیت اور اس کے عموم لفظ سے استدلال کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: اس کے لئے خیانت کرنا جائز نہیں ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''اس تک امانت پہنچا دے جس نے تجھے امین بنایا ہے اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تیرے ساتھ خیانت کی ہے۔'' اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ مکمل بحث گزر چکی ہے۔

اور مسند ابن اسحاق میں ہے کہ یہ حدیث اس آدمی کے بارے میں وارد ہوئی ہے جس نے کسی دوسرے آدمی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا، پھر اس دوسرے نے اس کی بیوی پر قدرت پالی اس طرح کہ اس نے بیوی کو اس کے پاس چھوڑا اور خود سفر پر چلا گیا، پس اس آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: أد الامانة الی من ائتمنک ولا تخن من خانک(1)۔ اور اسی بنا پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مال کے بارے میں قوی ہو جاتا ہے، کیونکہ خیانت اس میں لاحق ہو چکی ہے، اور یہ ایسی رذالت اور کمینگی ہے جس سے وہ جدا اور الگ نہیں ہو سکتا، پس چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے۔ اور اگر وہ مال سے حق لینے پر قادر ہو تو وہ اس پر امین نہ بنے تو یہ اس کے جائز ہونے کے مشابہ ہوگا، گویا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ اگر کوئی حاکم سے حکم اور فیصلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ قصاص میں تماثل اور برابری جائز ہے، پس جس نے لوہے کے ساتھ قتل کیا اسے اسی کے ساتھ قتل کیا جائے، اور جس نے پتھر کیساتھ قتل کیا اسے پتھر کے ساتھ قتل کیا جائے، اور واجب مقدار سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، اور یہ بحث مکمل طور پر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے، والحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اذیتوں کو عقوبت کا نام دیا ہے، حالانکہ حقیقۃً عقوبت وہ ہے جو دوسری ہے (یعنی اذیت کے مقابلے میں جو سزا دی جائے وہ عقوبت کہلاتی ہے)، تو بے شک ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ دونوں لفظ برابر ہو جائیں اور تاکہ قول کا آغاز اس کے مناسب ہو جائے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ان اقوال کے برعکس ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ (آل عمران: 54) اور اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ: 15) کیونکہ ان میں دوسرا لفظ مجاز ہے اور پہلا حقیقت ہے؛ یہ ابن عطیہ نے کہا ہے(2)۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

''اور آپ صبر فرمائیے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان (کی ہٹ دھرمی) پر اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے)

1۔ تاریخ دمشق الکبیر، جلد 4، صفحہ 359، دار المسیرہ بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 432

ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ابن زید نے کہا ہے: یہ آیت آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے(1)۔ اور جمہور لوگ اس پر ہیں کہ یہ محکم ہے، یعنی آپ اس کی مثل سزا دینے سے عفو و درگزر کے ساتھ صبر کیجئے جیسی انہوں نے مثلہ وغیرہ کے ساتھ سزا دی۔ **وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ** یعنی آپ شہدائے احد پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ **وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ**، ضيق ضيقة کی جمع ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كَشَفَ الضَيقَةَ عنَّا و فَسَحَ (2)

(اس نے ہم سے تنگی دور کردی اور وسعت وخوشحالی عطا کردی)

اور جمہور کی قرأت ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن کثیر نے ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے نافع سے روایت کیا گیا ہے، اور یہ اس کی غلطی ہے جس نے اسے روایت کیا ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے: ضاد میں فتحہ اور کسرہ مصدر میں دونوں لغتیں ہیں۔ اخفش نے کہا ہے: الضَيق اور الضِيق ضاق يضيق کا مصدر ہے۔ اور اس کا معنی ہے: آپ کا سینہ ان کے کفر سے تنگ نہ ہو (یعنی آپ پریشان نہ ہوں) اور فراء نے کہا ہے: الضَيق وہ ہے جس پر تیرا سینہ تنگ ہو جائے، اور الضِيق وہ ہے جو اس شی میں ہوتی ہے جو وسیع اور تنگ ہوتی رہتی ہے: مثلاً گھر اور کپڑا وغیرہ۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: یہ دونوں لفظ مساوی اور برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: في صدره ضَيق و ضِيق (اس کے سینے میں تنگی ہے) اور قتبی نے کہا ہے: ضَيْق ضيّق کا مخفف ہے، یعنی لا تكن في أمر ضيّق (تو کسی تنگ معاملے میں نہ پڑ) پھر اس میں تخفیف کردی گئی، جیسا کہ هَيْن اور هَيِّن ہیں۔ اور ابن عرفہ نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: ضاق الرجل تب جب آدمی بخیل ہو جائے، اور أضاق تب جب وہ محتاج ہو جائے۔ اور قولہ تعالیٰ: **اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ** یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس کی مدد و نصرت، معاونت، فضل، نیکی اور اس کی تائید کے ساتھ فواحش اور کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ اور احسان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہرم بن حبان کو ان کی موت کے وقت کہا گیا: ہمیں کوئی وصیت فرمائیے، تو انہوں نے کہا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی آیات اور سورۃ النحل کے آخر کی وصیت کرتا ہوں: **اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ** سے تا آخر۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 221
2۔ تفسیر طبری، جلد 14-13، صفحہ 234

# سورۃ الاسراء

آیاتہا ۱۱۱ ۱۷ سورۃ بنی اسرائیل مکیۃ ۵۰ رکوعاتہا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے (اور وہ یہ ہیں) قول باری تعالیٰ: وَ اِنۡ كَادُوۡا لَيَسۡتَفِزُّوۡنَكَ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور اس وقت یہودیوں نے کہا: یہ انبیاء علیہم السلام کی زمین نہیں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ الآیہ۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اور یہ قول باری تعالیٰ بھی: اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ الآیہ۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم کے بارے میں کہا ہے: بے شک یہ عتاق اوّل میں سے ہیں، اور یہ میری پرانی کمائی میں سے ہیں (1)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ①

"(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گردونواح کو تاکہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں، بے شک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں: (☆)

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: سُبۡحٰنَ۔ سبحان اسم ہے جو مصدر کی جگہ رکھا گیا ہے، اور یہ غیر متمکن ہے، کیونکہ اس میں وجوہ اعراب جاری نہیں ہو سکتیں، اور نہ اس پر الف لام داخل ہو سکتا ہے، اور نہ اس سے فعل آتا ہے، اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدتان ہے، تو کہتا ہے: سبّحتُ تسبیحا و سُبحانا، جیسا کہ کفرتُ الیمین تکفیرا و کفرانا ہے۔ اور اس کا معنی ہے التنزیہ والبرأۃ لِلّٰہ عزوجل من کل نقص (ہر نقص سے اللہ تعالیٰ کی براءت اور پاکی بیان کرنا ہے)۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر عظیم ہے اس کے سوا کوئی اور اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اور رہا شاعر کا یہ قول:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 434

☆ نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے تاہم مسائل چھ ہیں۔ مترجم

أقول لمّا جاءني فَخْرُهٗ سُبْحانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الفاخِرِ(1)

تو بلاشبہ شاعر نے یہ بطریق نادر ذکر کیا ہے۔ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ الفیاض رضی اللہ عنہ جو کہ اصحاب عشرہ میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: سبحان اللہ کا معنی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تنزیه الله من کل سُوءٍ(2) (اللہ تعالیٰ کو ہر کمزوری اور نقص سے پاک قرار دینا)۔ سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل وہ فعل ہے جو اس کا ہم معنی ہو نہ کہ اس کے لفظوں سے ہو، جبکہ اس کے لفظ سے فعل آتا ہی نہیں، اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قعد القُرْفُصاءَ (وہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ احتباء کی حالت میں بیٹھا) اور اشتمل الصَّمّاءَ (وہ کپڑے میں مکمل طور پر لپٹ گیا) (دونوں مثالوں میں دونوں فعل ہم معنی ہیں) پس ان کے نزدیک تقدیر عبارت یہ ہے: أنزہ اللہ تنزیھا، تو ''سبحان اللہ'' آپ کے قول تنزیھا کی جگہ واقع ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ۔ أسریٰ میں دو لغتیں ہیں: سریٰ اور أسریٰ، جیسا کہ سقی اور أسقی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أَسْرَتْ علیه من الجَوْزاء سارِيَةٌ تُزْجِی الشَّمال علیه جامدَ البَرَد

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

حَيِّ النَّضِيرة ربة الخِدْرِ أسرت إلیّ ولم تکن تَسْرِی

دونوں شعروں میں دونوں لغتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور اسراء کا معنی رات کو چلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: سَرَیت مَسْرًی وَ سُرًی، اور أسریت إسراءً۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ولیلة ذات ندیً سَرَیتُ ولم یَلْتِنِی من سُراها لَیْتُ (3)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أسریٰ وہ رات کے پہلے حصہ میں چلا۔ اور سریٰ وہ رات کے آخری حصہ میں چلا۔ پہلا قول زیادہ معروف ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: بِعَبْدِهٖ علماء نے کہا ہے: اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور اسم گرامی اس سے اشرف ہوتا تو یقیناً اس حالت علیا میں اللہ تعالیٰ آپ کا ذکر اس کے ساتھ فرماتا۔

اور اس معنی میں انہوں نے یہ شعر بیان کیے ہیں:

یاقومِ قلبی عند زهراءِ یعرفه السامعُ والرائی

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 223
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 435
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 224

لا تدعُني إلا بيا عبدها فإنه أشرف أسمائي (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بارگاہ عالی کی طرف اٹھایا، اور آپ کو ستاروں کی بلندی سے بھی اوپر لے گیا، تو امت کے سامنے تواضع کے لئے آپ کا ذکر اسم عبودیت کے ساتھ فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** تمام کتب حدیث میں اسراء ثابت ہے، اور جملہ اطراف اسلام میں یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے پس یہ اس وجہ سے متواتر اخبار میں سے ہے، اور نقاش نے اس سے ذکر کیا ہے جس نے اسے بیس صحابہ کرام سے روایت کیا ہے۔ اور صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا اور یہ سفید رنگ کا طویل جانور ہے جو گدھے سے بڑا ہے اور خچر سے ذرا کم ہے وہ اپنا پاؤں اپنی حد نظر پر رکھتا ہے...... فرمایا...... پس میں اس پر سوار ہوا یہاں تک کہ میں بیت المقدس میں آگیا...... فرمایا...... پھر میں نے اسے اس حلقہ کے ساتھ باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام سواریاں باندھتے تھے...... فرمایا...... پھر میں مسجد میں داخل ہوا اور میں نے اس میں دو رکعتیں نماز پڑھی پھر میں (باہر) نکلا تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے کر آئے تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے...... فرمایا...... پھر وہ ہمارے ساتھ آسمان کی طرف چڑھے...... (2)'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور ان روایات میں سے جو صحیحین میں نہیں ہیں وہ ہے جسے آجری اور سمرقندی نے ذکر کیا ہے، آجری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت ذکر کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رات کے بارے بتایا جس میں آپ کو سفر معراج پر لے جایا گیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس ایک جانور لایا گیا جو جانوروں میں سے خچر کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا تھا اس کے دونوں کان حرکت کر رہے تھے اور وہ وہی براق ہے جس پر اس سے قبل انبیاء علیہم السلام سواری کرتے تھے پس میں اس پر سوار ہوا اور وہ چل پڑا وہ اپنا قدم انتہا نگاہ پر رکھتا تھا پس میں نے اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر جایئے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ دریافت کرلوں، پس میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا (کوئی توجہ نہ دی) پھر میں نے اپنی بائیں جانب سے ایک ندا سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر جایئے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا پھر میرے سامنے ایک عورت آئی جس پر دنیا کی ہر زینت و آرائش تھی وہ اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جایئے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پھر میں بیت المقدس مسجد اقصیٰ آیا اور اس جانور سے اتر گیا اور میں نے اسے اسی حلقے سے باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام باندھتے تھے۔ بعد ازاں میں مسجد میں داخل ہوا اور اس میں نماز پڑھی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم نے کیا سنا ہے! تو میں نے کہا: میں نے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1192 2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 387، حدیث 3184

اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ یہود کی دعوت دینے والا تھا۔ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت یہودی ہو جاتی ...... فرمایا ...... پھر میں نے ایک ندا اپنی بائیں جانب سے سنی ہے ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ عیسائیت کی دعوت دینے والا تھا۔ بلاشبہ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت عیسائی ہو جاتی ...... فرمایا ...... پھر میرے سامنے ایک عورت آئی اس پر دنیا کی ہر قسم کی زیب و زینت تھی وہ اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جائیے لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ دنیا تھی اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے۔ اور اسے پسند کرتے ...

فرمایا ...... پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی، سو مجھے کہا گیا: پکڑو اور پیو جسے چاہو، تو میں نے دودھ لے لیا اور اسے پیا، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: آپ نے فطرت کو اپنا لیا ہے اور اگر آپ شراب لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ پھر وہ سیڑھی (معراج) لے کر آئے جس کے ساتھ بنی آدم کی ارواح اوپر چڑھتی ہیں تو وہ اس سب سے حسین تھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا، کیا تم نے مرنے والے کی طرف نہیں دیکھا وہ کیسی تیز نظر سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر ہمیں اوپر لے جایا گیا یہاں تک کہ ہم آسمان دنیا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے کھولنے کو کہا تو پوچھا گیا: یہ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جبریل۔ انہوں نے پوچھا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہوں نے پوچھا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ پس انہوں نے میرے لئے دروازہ کھولا اور مجھے سلام کیا وہاں آسمان کا محافظ فرشتہ تھا اس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے اور ہر فرشتے کے ساتھ ایک لاکھ تھے ...... فرمایا وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (المدثر: 31) (اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے) اور آگے حدیث ذکر کی یہاں تک کہ فرمایا: ''پھر ہم پانچویں آسمان پر پہنچے تو وہاں میری ملاقات حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام سے ہوئی وہ اپنی قوم میں بڑے محبوب تھے اور ان کے اردگرد ان کی امت کے کثیر متبعین تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا: ان کی ریش مبارک طویل تھی حتیٰ کہ وہ ان کی ناف تک پہنچنے کے قریب تھی، پھر ہم چھٹے آسمان کی طرف چلے تو وہاں میرے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے انہوں نے مجھے سلام پیش کیا اور مرحبا کہا ...... حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا ...... وہ بہت زیادہ بالوں والے آدمی تھے اگر ان پر دو قمیصیں بھی ہوتیں تو ان سے ان کے بال باہر نکلے رہتے ...... '' الحدیث۔

اور بزار نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھوڑا لایا گیا اور آپ کو اس پر سوار کیا گیا۔ اس کا ہر قدم اپنی حد نگاہ پر پڑتا تھا ...... اور آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں براق کی صفت میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے میرے پاؤں کو حرکت دی تو میں نے پلٹ کر ایک شخص کو دیکھا اور وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جو مسجد کے

دروازے پر کھڑے تھے ان کے ساتھ ایک جانور تھا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اس کا چہرہ انسان کے چہرہ کی مثل تھا اس کے پاؤں کھر والے جانور کے پاؤں کی مثل تھے، اس کی دم بیل کی دم کی مثل تھی اور اس کی کلغی گھوڑے کی کلغی (مراد گردن کے بال تھے) کی مثل تھی پس جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے میرے قریب کیا تو وہ بدکنے لگا اور اس کی کلغی کے بال بکھر گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے ہاتھ پھیرا اور کہا: اے برقہ تو محمد ﷺ سے مت بدک قسم بخدا! کوئی مقرب فرشتہ تجھ پر سوار نہیں ہوا اور نہ کوئی نبی مرسل جو حضرت محمد ﷺ سے افضل ہو اور کوئی بھی ان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز و مکرم نہیں۔ و قال یا بُرقه لا تنفری من محمد ﷺ فوالله ما رکبك ملك مقرب ولا نبیّ مُرسَل افضلُ من محمد ﷺ ولا اکرم علی الله منه۔ اس نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ آپ اسی طرح ہیں اور یہ کہ آپ صاحب شفاعت ہیں اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں بھی اس کی شفاعت میں ہو جاؤں تو میں نے کہا: تو میری شفاعت میں ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ...... '' الحدیث۔

ابوسعید عبدالملک بن محمد نیشاپوری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب حضور نبی مکرم ﷺ چوتھے آسمان میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: مرحباً بالاخ الصالح و النبیّ الصالح (خوش آمدید صالح بھائی اور صالح نبی) جس کے بارے ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم اسے دیکھیں گے پس ہم نے اسے آج کی رات کے سوا نہیں دیکھا فرمایا: پس اس میں مریم بنت عمران تھیں ان کے لئے موتیوں کے بنے ہوئے ستر محل تھے اور حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی والدہ کے لئے ستر محل تھے جو سرخ مرجانہ کے بنے ہوئے تھے ان کے دروازے موتیوں سے مرصع تھے اور ان کے پلنگ ایک ہڈی سے بنے ہوئے تھے۔ پس جب معراج (سیڑھی) پانچویں آسمان کی طرف بلند ہوئی اور اس کے باسیوں کی تسبیح سبحان من جمع بین الثلج والنار (پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو اکٹھا کیا) جس نے یہ تسبیح ایک بار کہی اس کے لئے ان کے ثواب کی مثل ثواب ہوگا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا پس ان کے لئے دروازہ کھول دیا گیا پس وہاں ایک بوڑھا تھا اس سے زیادہ خوبصورت بوڑھا کبھی نہیں دیکھا گیا ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں ان کی ریش مبارک ناف کے قریب پہنچی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ وہ سیاہ و سفید رنگ میں ہو۔ اور ان کے اردگرد قوم بیٹھی ہوئی تھی وہ ان پر قصے بیان کر رہے تھے تو میں نے پوچھا: اے جبرائیل! یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جو اپنی قوم میں محبوب ہیں...... '' آگے پوری حدیث ذکر کی۔

یہ ان احادیث معراج کا مختصر خلاصہ ہے جو صحیحین سے خارج ہیں، انہیں ابوالربیع سلیمان ابن سبع نے مکمل طور پر کتاب ''شفاء الصدور'' میں ذکر کیا ہے۔ اہل علم اور جماعت اہل السیر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز حضور نبی مکرم ﷺ پر مکہ مکرمہ میں اس وقت فرض کی گئی جس وقت آپ کو آسمان کی طرف سفر معراج پر لے جایا گیا۔ اور انہوں نے واقعہ معراج کی تاریخ اور نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ معراج روح کو ہوئی یا آپ کے جسم کے ساتھ ہوئی؟ پس یہ تین مسائل ہیں جو اس آیت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اور یہ ان میں سے ہیں جن پر واقفیت ہونی چاہئے اور ان کے بارے بحث ہونی چاہئے،

اور یہ ان احادیث کو بیان کرنے سے زیادہ اہم ہے، اور اب میں وہ ذکر کرتا ہوں جس پر علماء کے اقوال سے اور فقہاء کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ میں واقف ہوا ہوں۔

جہاں تک پہلا مسئلہ ہے...... وہ یہ ہے کہ کیا معراج روح کے ساتھ ہوئی یا جسم کے ساتھ؟ اس کے بارے میں سلف و خلف کا اختلاف ہے، پس ایک گروہ کا موقف یہ ہے کہ معراج روح کو ہوئی، اور یہ کہ آپ کا جسم اقدس آپ کے بستر سے الگ نہیں ہوا، اور یہ کہ یہ خواب تھا جس میں آپ نے حقائق کو دیکھا، اور انبیاء علیہم السلام کے خواب حق ہیں۔ یہ نظریہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے، اور اسے حضرت حسن اور حضرت ابن اسحاق سے بیان کیا گیا ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں بیت القدس تک ہوئی، اور آسمان تک روح کے ساتھ ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا پس انہوں نے مسجد اقصیٰ کو اسراء کی غایت قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگر اسراء آپ کو جسم کے ساتھ مسجد اقصیٰ سے آگے تک ہوتی تو یقیناً اس کا ذکر ہوتا کیونکہ یہ مدح و تعریف میں مزید مبالغہ اور اضافہ ہے۔ اور عظیم اسلاف اور مسلمانوں نے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوئی، اور یہ کہ آپ مکہ مکرمہ سے براق پر سوار ہوئے، اور آپ بیت المقدس تک پہنچے، اس میں نماز پڑھی پھر وہاں سے جسم کے ساتھ معراج پر لے جایا گیا۔ اور اس پر وہ اخبار دلالت کرتی ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور معراج کے جسم کے ساتھ اور حالت بیداری میں ہونے میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور ظاہر اور حقیقت سے تاویل کی طرف عدول تب کیا جاتا ہے جب کوئی استحالہ لازم آئے، اور اگر یہ خواب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کہتا: بروح عبدہ (اپنے بندے کی روح کو) اور یہ نہ کہتا بعبدہ۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ۝ (النجم) اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگر یہ خواب ہوتی تو اس میں کوئی نشانی اور معجزہ نہ ہوتا، اور نہ ام ہانی آپ کو یہ کہتیں: آپ لوگوں کے سامنے بیان نہ کریں وہ آپ کو جھٹلا دیں گے۔ اور نہ اس کے سبب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی جاتی، اور نہ قریش کے لئے تشنیع و تکذیب ممکن ہوتی، حالانکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے خبر دی تو قریش نے آپ کو جھٹلایا حتیٰ کہ کچھ لوگ مرتد ہو گئے جو ایمان لا چکے تھے۔ پس اگر یہ خواب ہوتی تو کوئی اس کا انکار نہ کرتا، حالانکہ مشرکین نے آپ کو کہا: اگر آپ سچے ہیں تو پھر ہمیں قافلے کے بارے بتائیے کہ کہاں آپ اس سے ملے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فلاں فلاں جگہ میں اس کے پاس سے گزرا اور فلاں آدمی پریشان اور گھبرایا ہوا تھا"۔ تو اس کو کہا گیا: اے فلاں! تو نے کیا دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کوئی شے نہیں دیکھی! سوائے اس کے کہ اونٹ بدکنے لگا ہے۔ پھر انہوں نے کہا: پس آپ ہمیں بتائیے: ہمارا قافلہ کب آئے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ تمہارے پاس فلاں فلاں دن پہنچے گا۔" انہوں نے پوچھا: کون سے وقت؟ آپ نے فرمایا: "میں نہیں جانتا، ادھر سے سورج پہلے طلوع ہوگا یا ادھر سے قافلہ پہلے آئے گا۔" پس اس دن ایک آدمی نے کہا: یہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ تو ادھر دوسرے آدمی نے کہا: یہ تمہارا قافلہ بھی آ گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت المقدس کی صفات و کیفیات

کے بارے معلومات طلب کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب بیان فرما دیں حالانکہ اس سے پہلے آپ نے اسے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تحقیق میں حجر میں تھا اور قریش مجھ سے سفر معراج کے بارے پوچھنے لگے، تو انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کے بارے میں کچھ چیزیں پوچھیں میں نے انہیں اچھی طرح محفوظ نہیں کیا ہوا تھا تو مجھے اتنی شدید پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کی مثل پریشانی کبھی نہیں ہوئی تھی ..... فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ نے اسے میرے لئے اٹھایا میں اس کی طرف دیکھنے لگا تو انہوں نے اس کے بارے مجھ سے جو شے بھی پوچھی میں نے اس کے بارے انہیں بتا دیا(1)''۔ الحدیث۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر اعتراض یہ ہے: ''بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو معراج پر لے جایا گیا'' اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چھوٹی عمر میں تھیں آپ نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، اور نہ آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بیان کیا ہے۔ اور رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو وہ اس وقت کافر تھے انہوں نے بھی نہ اس حال کا مشاہدہ کیا، اور نہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث بیان کی۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے جو اس سے زیادہ معلوم کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی ''کتاب الشفاء'' کا مطالعہ کرے اس سے وہ شفاء پالے گا۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نظریہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (الاسراء:60) (اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے) پس اسی وجہ سے انہوں نے اسے (معراج کو) رؤیا کا نام دیا ہے۔

اور اس کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا اور حالت خواب (کے سفر) کو اَسْرٰى نہیں کہا جاتا۔ اور یہ بھی کہ رؤیۃ العین (آنکھ کے ساتھ دیکھنے) کو بھی رؤیا کہا جاتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان اسی سورت میں آئے گا۔ اور اخبار ثابتہ کی نصوص میں اس پر واضح دلالت ہے کہ معراج بدن کے ساتھ ہوئی، اور جب ایک شے کے بارے میں خبر بھی وارد ہو، عقل بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہونے کو جائز قرار دیتی ہو تو پھر اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بالخصوص خلاف عادات امور کے زمانہ میں، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی معراجیں ہوئیں؛ اور یہ بعید نہیں کہ ان میں سے بعض حالت خواب میں ہوئی ہوں، اور اسی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کو محمول کیا جائے گا جو صحیح میں ہے: بینا انا عند البیت بین النائم والیقظان(2) (اس اثنا میں کہ میں بیت اللہ شریف کے پاس حالت نیند اور بیداری کے درمیان تھا۔) الحدیث۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اسراء سے نیند کی طرف لوٹے ہوں۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر5۔** یہ معراج کی تاریخ کے بارے ہے، علماء نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے، اور اس میں اختلاف ابن شہاب پر ہے، پس آپ سے موسیٰ بن عقبہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے ایک سال قبل بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا۔ اور آپ سے یونس نے عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے یہ روایت کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا وصال نماز فرض کئے جانے سے پہلے ہوا۔

---

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الرؤیا، باب فی المعراج، صفحہ 529 2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ، جلد 1، صفحہ 455

ابن شہاب نے کہا ہے: یہ واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سات سال بعد پیش آیا۔ اور ان سے وقاصی نے یہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پانچ سال بعد آپ کو معراج پر لے جایا گیا۔ ابن شہاب نے کہا ہے: روزے مدینہ طیبہ میں بدر سے پہلے فرض کے گئے، اور زکوٰۃ اور حج مدینہ طیبہ میں فرض کیے گئے، اور شراب غزوہ احد کے بعد حرام کی گئی۔ اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہی بیت المقدس ہے کی طرف رات کے وقت لے جایا گیا، اور اسلام مکہ مکرمہ کے قبائل میں پھیلا۔ اور ان سے یونس بن بکیر نے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز ادا کی۔ عنقریب اس کا ذکر آرہا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ قول تیری اس پر راہنمائی کرتا ہے کہ معراج ہجرت سے کئی سال پہلے ہوئی، کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوا۔ بعض نے کہا: تین سال پہلے ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار سال پہلے ہوا ہے۔ اور ابن اسحاق کا قول ابن شہاب کے قول کے مخالف ہے، اس بنا پر ابن شہاب سے اختلاف ہوا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حربی نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے ایک برس پہلے ماہ ربیع الثانی کی ستائیسویں رات کو معراج ہوئی۔ اور ابو بکر محمد بن علی بن قاسم ذہبی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا اور وہاں سے آسمان کی طرف بلند کیا گیا اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اٹھارہ مہینے بعد پیش آیا۔ ابو عمر نے کہا ہے: اہل سیر میں سے میں کسی کو نہیں جانتا جس نے وہ کہا ہو جو ذہبی نے بیان کیا ہے، اور نہ انہوں نے اپنے قول کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کیا ہے جن کی طرف اس علم کی نسبت کی جاتی ہے، اور نہ اسے ان میں سے کسی پر پیش کیا ہے جن سے حجت پکڑی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ رہی نماز کی فرضیت اور اس کی ہیئت، جس وقت نماز فرض کی گئی، تو اہل علم اور اہل سیر کی جماعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز مکہ مکرمہ میں شب معراج اس وقت فرض کی گئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان کی طرف بلندی پر لے جایا گیا، صحیح وغیرہ میں اس پر نصوص موجود ہیں۔ البتہ انہوں نے نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے جس وقت یہ فرض ہوئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی ہے، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور چار رکعتیں مکمل کر دی گئیں، اور حالت سفر کی نماز کو دو رکعتوں پر برقرار رکھا گیا، اسی طرح حضرت شعبی، میمون بن مہران اور محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سوائے مغرب کے۔ یونس رحمۃ اللہ علیہ بن بکیر نے کہا ہے: اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے جب آپ پر نماز فرض ہوئی یعنی اسراء میں پس انہوں نے وادی کے کنارے پر اپنی ایڑی ماری تو اس سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس سے وضو کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے رہے۔ پس انہوں نے اپنا چہرہ دھویا، ناک میں پانی ڈالا اور کلی کی، اپنے سر اور اپنے کانوں کا مسح کیا اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا، پھر اٹھے اور دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی آنکھ کو ٹھنڈا کر دیا، آپ کا دل انتہائی خوش اور مطمئن تھا اور آپ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے پسندیدہ امر لے کر آئے، پس آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا

ہاتھ پکڑا اور اسی چشمے پر لے آئے اور اسی طرح وضو کیا جیسے حضرت جبرائیل امین نے وضو کیا تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا برابر نماز پڑھتے رہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں نماز فرض ہوئی، اسی طرح نافع بن جبیر، حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے اور یہی ابن جریج کا قول ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مروی ہے وہ اس سے موافقت کرتا ہے (1)۔

اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام شب معراج کی صبح کو زوال کے وقت نازل ہوئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور اس کے اوقات سکھائے۔ یونس بن بکیر نے سالم مولی ابی المہاجر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا میں نے میمون بن مہران کو کہتے سنا ہے کہ پہلے نماز دو رکعتیں تھی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتیں نماز پڑھی تو وہی سنت ہو گئی، اور مسافر کے لئے اسی نماز کو برقرار رکھا گیا اور وہی مکمل نماز ہے۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے: یہ ایسی اسناد ہے جس کی مثل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، اور ان کا قول: فصارت سنة (پس وہی سنت ہو گئی) یہ قول منکر ہے، اور اسی طرح شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی اکیلے مغرب کی نماز کی استثنا کرنا بھی ہے اور انہوں نے صبح کا ذکر نہیں کیا تو یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی معنی نہیں۔ تحقیق مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حضر میں نماز کے فرض چار ہیں سوائے مغرب اور صبح کی نماز کے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے نہ عملاً اور نہ کسی خبر مستفیض سے نقلاً۔ اور جو اختلاف بھی اصل فرض میں ہے وہ ان کے لئے قطعاً ضرر رساں اور نقصان دہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اذان کے بارے میں بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے، والحمد للہ۔ اور سورۂ آل عمران میں یہ گزر چکا ہے کہ پہلی مسجد جو زمین میں بنائی گئی وہ مسجد حرام ہے، پھر مسجد اقصیٰ ہے۔ اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان چالیس برس کا فرق ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد اقصیٰ اور آپ کا اس کے لئے بلانا حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے مروی ہے اور ان میں تطبیق کی وجہ بھی مذکور ہے، پس وہیں غور کر لو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور یہاں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ذکر کریں گے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثلاثة مساجد إلى المسجد الحرام وإلى مسجدي هذا وإلى مسجد ايلياء ...... او بيت المقدس (2) (کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مساجد کی طرف (یعنی) مسجد حرام کی طرف اور میری اس مسجد (مسجد نبوی) کی طرف، اور مسجد اقصیٰ کی طرف) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں جو ہے وہ تمام مساجد پر ان تین مساجد کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے علماء نے کہا ہے: جس نے کسی مسجد میں نماز کی نذر مانی جس تک وہ سواری اور کجاوے کے بغیر نہ پہنچ سکتا ہو تو وہ اس پر عمل نہ کرے، اور وہ اپنی مسجد میں نماز پڑھ لے، سوائے مذکورہ تین مساجد کے، کیونکہ جس نے ان میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو وہ ان کی طرف نکلے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے سرحد پر لشکر کی حفاظت کے لئے چھاؤنی بنانے کی نذر مانی کہ وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی الافطار للحامل، حدیث نمبر 1656، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب لاتشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد، حدیث نمبر 2525، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسے بند کر دے گا، تو وہیں اسے پورا کرنا اس پر لازم ہے جہاں چھاؤنی ہو کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اور ابوالبختری نے اس حدیث میں مسجد الجند کا اضافہ کیا ہے، اور یہ صحیح نہیں ہے اور حدیث موضوع ہے، کتاب کے مقدمہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کے درمیان بہت دوری اور بعد ہونے کی وجہ سے اس کا نام اقصیٰ رکھا گیا ہے، اور وہ زمین میں اہل مکہ سے بہت دور مسجد تھی زیارت کے ساتھ جس کی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی، پھر فرمایا: الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ کہا گیا ہے: اس کے اردگرد پھلوں کے ساتھ اور نہریں جاری کرنے کے ساتھ ہم نے برکت رکھ دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے سبب جو اس کے اردگرد مدفون ہیں ہم نے وہاں برکت رکھ دی ہے۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس بنا دیا ہے۔ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے شام تو میری جگہوں (زمین) میں سے عمدہ اور چنا ہوا علاقہ ہے اور میں اپنے بندوں میں سے انتہائی مخلص دوست تیری طرف بھیجنے والا ہوں (1)''۔ (شام کی اصل سام ہے اسے معرب بنایا گیا ہے) لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ اور آیات اور نشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان عجائبات میں سے دکھائے جن کے بارے آپ نے لوگوں کو خبر دی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف ایک رات میں لے جانا حالانکہ ایک مہینے کی مسافت تھی، اور آپ کا آسمان کی طرف اوپر جانا اور آپ کا انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک کر کے وصف بیان کرنا، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ؘ

''اور دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا ہم نے اس کتاب کو باعث ہدایت بنی اسرائیل کے لئے (اس میں انہیں حکم دیا) کہ نہ بناؤ میرے بغیر کسی کو (اپنا) کارساز''۔

یعنی ہم نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے ساتھ شرف و تکریم عطا فرمائی، اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب کے ساتھ عزت و تکریم عطا کی اور وہ تورات ہے۔ وَ جَعَلْنٰهُ اور ہم نے اس کتاب کو بنایا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ھا ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں (2) (یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بنایا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی یہ ہے پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں اور موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) پس اس طرح کلام غیب سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دینے (اخبار) کی طرف نکل گئی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: بے شک سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا کا معنی ہے اَسْرَیْنَا (ہم نے سیر کرائی) اور اس پر اس کا مابعد قول لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا دلالت کرتا ہے۔ اور وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اسی معنی پر محمول ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا ابو عمرو نے یتخذوا یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے، پس یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ وَكِیْلًا یعنی میرے بغیر کسی اور کو شریک نہ بنانا، پھر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 227-226 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 227

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم میرے سوا کسی کو اپنے امور کا کفیل نہ بنانا؛ اسے فراء نے بیان کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: تم میرے سوا کسی کو رب نہ بنانا جس پر وہ اپنے امور کے بارے توکل اور بھروسہ کرتے ہوں؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی کافیاً ہے، اور تقدیر کلام ہے: عهدنا إليه في الكتاب الاّ تَتَّخِذُوا من دوني وكيلاً (ہم نے انہیں کتاب میں نصیحت کی کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لئلا تتخذوا (تاکہ تم نہ بناؤ) اور الوکیل: وہ ہے جس کی طرف معاملہ (امر) سپرد کیا جاتا ہے۔

## ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

''اے ان لوگوں کی اولاد! جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا نوح علیہ السلام کے ساتھ، بے شک نوح علیہ السلام ایک شکر گزار بندہ تھا''۔

یعنی یا ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا، اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا! یہ ندا کی بنا پر ہے؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور ان سے اسے ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے اور ذریۃ سے مراد ہر وہ ہے جس پر قرآن سے حجت پیش کی گئی، اور وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگ ہیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے کہا ہے (1): مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل میں سے آپ کی قوم ہے، اور اس کا معنی ہے اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا! تم شرک نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ وہ انہیں ان کے آباء کو غرق ہونے سے نجات دلانے کی نعمت یاد دلائے۔ اور سفیان نے حمید سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ذَرِّيَّة ذال کے فتحہ اور را اور یا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس قرأت کو عامر بن واجد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی ذِرِّيَّة ذال کا کسرہ اور را اور یا کی شد مروی ہے۔ پھر بیان فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام شکر گزار بندے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا اس کی ہر نعمت پر شکر ادا کرتے تھے اور ہر خیر اور بھلائی اس کی طرف سے جانتے تھے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: جب وہ کپڑا پہنتے تھے تو کہتے: بسم اللہ، اور جب اتارتے تو کہتے: الحمد للہ۔ اسی طرح ان سے معمر نے روایت کیا ہے اور معمر نے منصور سے اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جب کھانے لگتے تو کہتے: بسم اللہ۔ اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو کہتے: الحمد للہ (2)۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: چونکہ وہ اپنے طعام پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے (اس لئے وہ عبد شکور تھے۔) اور عمران بن سلیم نے بیان کیا ہے: بے شک حضرت نوح علیہ السلام کو عبداً شکوراً کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جب آپ کھانا تناول فرماتے تھے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے کھانا کھلایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے بھوکا رکھتا، (الحمد لله الذی أطعمنی ولو شاء لأجاعنی)، اور جب (پانی وغیرہ) پیتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے سیراب کیا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے پیاسا رکھتا۔ (الحمد لله الذی سقانی ولو شاء لأظمأنِی) اور جب آپ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ الاسراء، جلد 3، صفحہ 228 2۔ ایضاً

لباس پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے لباس پہنایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگا رکھتا۔ (الحمد للہ الذی کسانی ولو شاء لأعرانی) اور جب جوتا پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے جوتا پہنایا ہے اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگے پاؤں رکھتا۔ (الحمد للہ الذی حذانی ولو شاء لأحفانی)، اور جب قضاء حاجت کرتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے اذیت (اور تکلیف دہ شے) کو باہر نکال دیا اور اگر وہ چاہتا تو اسے میرے اندر روک لیتا۔ (الحمد للہ الذی أخرج عنی الأذی ولو شاء لحبسہ فی)(1) اور آیت کا مقصود یہ ہے: بے شک تم حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہو اور وہ شکر گزار بندے تھے پس ان کی اقتدا کرنا تمہارا زیادہ حق ہے نہ کہ اپنے جاہل آباء واجداد کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شکر گزار بندے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے بنایا(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ، تَتَّخِذُوْا کا دوسرا مفعول ہو۔

اور قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے مراد جمع ہو پس یہ تمام دونوں قرأتوں میں جائز ہے، دونوں قرأتوں سے مراد تَتَّخِذُوْا میں یا اور تا کی قرأت ہے۔ اور دونوں قرأتوں میں ایک ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے بدل ہو کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے؛ تو گویا اس نے یہ فرمایا: لاتتخذوا ذریۃ من حملنا مع نوح۔ (تم ان کی اولاد کو نہ بناؤ جنہیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا۔ اور اس کی نصب اعنی اور امدح فعل مضمر کے ساتھ بھی جائز ہے، اور عرب مدح وذم پر نصب دیتے ہیں۔ اور تَتَّخِذُوْا میں مضمر ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر رفع دینا بھی جائز ہے اس کی قرأت میں جس نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اچھا نہیں جنہوں نے تا کے ساتھ قرأت کی ہے، کیونکہ مخاطب سے غائب بدل نہیں بن سکتا۔ اور دونوں صورتوں میں بنی اسرائیل سے بدل قرار دے کر اسے جر دینا بھی جائز ہے۔ پس رہا ان۔ قول باری تعالیٰ: اَلَّا تَتَّخِذُوْا میں تو یہ ان کی قرأت میں حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے جنہوں نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر کلام ہے: ھدیناھم لئلا یتخذوا (ہم نے ان کی راہنمائی فرمائی تاکہ وہ نہ بنائیں)۔ اور تا کی قرأت پر یہ زائدہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں قول مضمر ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان مفسرہ بمعنی اَیْ ہو، اور اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو، اور لانہی ہو پس یہ خبر سے نہی کی جانب خروج ہوگا۔

## وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝

''اور ہم نے آگاہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم ضرور فساد برپا کرو گے زمین میں دو مرتبہ اور تم (احکام الٰہی سے) بڑی سرکشی کرو گے۔''

قولہ تعالیٰ: وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ حضرت سعید بن جبیر اور ابو العالیہ نے لفظ جمع کے ساتھ (3) فِي الْكُتُبِ پڑھا ہے۔ اور کبھی لفظ واحد ہوتا ہے اور اس کا معنی جمع ہوتا ہے، پس دونوں قرآتیں ایک ہی معنی میں ہوں گی۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 25 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 228 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

قَضَيْنَآ کا معنی (1) أعلمنا اور أخبرنا (ہم نے آگاہ کیا، اور ہم نے خبر دی) ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی حکمنا ہے یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ اور قضا کا اصل معنی کسی شے کا فیصلہ کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قضینا بمعنی أوحینا (ہم نے وحی کی) ہے؛ اسی لئے فرمایا: اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اِلٰى بمعنی علی ہے؛ یعنی قضینا علیهم و حکمنا (ہم نے ان پر وحی کی اور ہم نے فیصلہ کیا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہ کہا ہے۔ اور الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ لَتُفْسِدُنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لَتُفْسَدُنَّ اور عیسیٰ ثقفی نے لَتَفْسُدُنَّ پڑھا ہے۔ اور دونوں قراءتوں میں معنی قریب قریب ہے، کیونکہ جب انہوں نے فساد برپا کیا تو وہ فاسد ہو گئے، اور یہاں فساد سے مراد تورات کے احکام کی مخالفت کرنا ہے۔ فِي الْاَرْضِ اس سے مراد شام، بیت المقدس اور اس کے آس پاس کی زمین ہے۔ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ۔ لَتُفْسِدُنَّ اور لَتَعْلُنَّ میں لام لام قسم مضمر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ عُلُوًّا كَبِيْرًا اس سے مراد تکبر، بغاوت، سرکشی، رعونت، غلبہ اور عداوت و دشمنی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

"پس جب آ گیا پہلا وعدہ ان دونوں وعدوں سے تو ہم نے (تمہاری سرکوبی کے لئے) بھیج دیئے اپنے چند بندے جو بڑے کرخت (اور) سخت تھے پس وہ گھس گئے (تمہاری) آبادیوں میں، اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہنا تھا۔"

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا یعنی جب ان کے فساد کی دو باریوں میں سے پہلی بار آ گئی۔ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ وہ اہل بابل تھے، اور ان پر پہلی بار میں بخت نصر حاکم تھا جس وقت انہوں نے حضرت ارمیاء کو جھٹلایا، انہیں زخمی کر دیا اور انہیں قید کر لیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان پر جالوت کو بھیجا اور اس نے انہیں قتل کر دیا، پس وہ اور اس کی قوم بڑے کرخت اور سخت تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فارس سے ایک لشکر ان کے پاس آیا وہ ان کی خبروں کی جاسوسی کرنے لگے اور ان کے ساتھ بخت نصر بھی تھا پس اس نے اپنے ساتھیوں کے درمیان سے ان کی باتیں یاد کر لیں، پھر وہ فارس کی طرف لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی، اور یہ پہلی بار میں ہوا، پس ان کی طرف سے آبادیوں میں گھسنا اور گھومنا پھرنا ہوا قتال اور جنگ نہ ہوئی)، اسے قشیری ابونصر نے ذکر کیا ہے۔ اور مہدوی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان کے پاس بخت نصر آیا اور بنی اسرائیل نے اسے شکست دی، پھر وہ دوسری بار ان کے پاس آیا اس نے انہیں قتل کیا اور انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اور ابن ابی نجیح نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور محمد بن اسحاق نے ایک طویل خبر میں کہا ہے: بے شک شکست کھانے والا اسخاریب بادشاہ بابل تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے اور ہر جھنڈے کے نیچے ایک لاکھ شہسوار تھے پس وہ بیت المقدس کے گرد آ کر اترا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

اسے شکست سے دو چار کیا اور سخاریب اور اس کے کاتبوں میں سے پانچ آدمیوں کے سوا سبھی کو مار دیا، اور بنی اسرائیل کے بادشاہ جس کا نام صدیقہ تھا اسے سخاریب کی تلاش میں بھیجا پس وہ اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت پکڑا گیا، ان میں سے ایک بخت نصر تھا، پس ان کی گردنوں میں طوق ڈالے گئے اور انہیں ستر دن تک بیت المقدس اور ایلیاء کے ارد گرد گھمایا اور چکر لگوایا جاتا رہا۔ اور وہ ان میں سے ہر آدمی کو ہر روز جو کی دو روٹیاں دیتا تھا، پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا اور وہ بابل کی طرف واپس لوٹ گئے، پھر سات برس بعد سخاریب فوت ہو گیا، اور اس نے بخت نصر کو اپنا خلیفہ اور نائب بنایا اور بنی اسرائیل میں نئے واقعات اور بدعات بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے محارم کو حلال قرار دیا تھا اور اپنے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا، پس بخت نصر وہاں آیا اور وہ اپنے لشکر سمیت بیت المقدس میں داخل ہو گیا اور بنی اسرائیل کا قتل عام کیا یہاں تک کہ انہیں فناہ اور بالکل تباہ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ پہلا فساد حضرت زکریا علیہ السلام کا قتل ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا: پہلی بار میں ان کا فساد اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو درخت میں قتل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ صدیقہ فوت ہو گیا تو ان کے بادشاہ نے ان کا معاملہ (کام) خراب کر دیا اور وہ بادشاہ پر غالب آ گئے اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور اپنے نبی علیہ السلام کی بات بھی نہ سنتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا: اٹھو اپنی قوم میں جاؤ اور اپنی زبان میں انہیں پیغام پہنچاؤ۔ پس جب وہ اس کے بیان سے فارغ ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی تھی تو وہ لوگ آپ پر دوڑ کر آ گئے تاکہ وہ آپ کو قتل کر دیں پس آپ بھاگ پڑے اور آپ کے لئے ایک درخت پھٹ گیا (اس میں شگاف ہو گیا) اور آپ اس میں داخل ہو گئے، اور شیطان نے آپ کو پالیا پس اس نے آپ کے کپڑے کا پلو پکڑ لیا اور انہیں وہ دکھا دیا، تو انہوں نے اس درخت کے درمیان میں آری رکھ دی اور اسے چیر ڈالا یہاں تک کہ انہوں نے درخت کو اور اس کے وسط میں آپ کو بھی کاٹ ڈالا۔ اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے انہیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا وصال اپنی طبعی موت سے ہوا، انہیں قتل نہیں کیا گیا اور جنہیں قتل کیا گیا وہ حضرت شعیا علیہ السلام تھے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے قول باری تعالیٰ: بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَٰلَ الدِّيَارِ میں کہا ہے: وہ موصل کے اہل نینوی میں سے سخاریب بادشاہ بابل تھا (1)۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو ابن اسحاق نے کہا ہے۔ فاللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ عمالقہ تھے اور وہ کافر تھے، یہ حسن نے کہا ہے۔ اور جَاسُوْا کا معنی ہے: انہوں نے فساد برپا کیا اور قتال کیا اور اسی طرح حاسوا، ھاسوا اور داسوا بھی ہیں؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے، اور یہی قتبی کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے حاسوا حاء مہملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو زید نے کہا ہے: الحوس، الجوس، العَوس اور الھَوس ان تمام کا معنی رات کے وقت گھومنا، چکر لگانا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الجوس تیرے قول جاسوا خلال الدیار کا مصدر ہے، یعنی وہ آبادی میں گھس گئے اور اسے تلاش کیا جو کچھ اس میں تھا جیسا کہ ایک آدمی خبریں تلاش کرتا ہے اور اسی طرح لفظ اجتیاس بھی ہے۔ اور الجَوَسان (واؤ متحرک کے ساتھ) رات کا طوفان یا تباہ کن موت ہوتی ہے اور یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229

اور علامہ طبری نے کہا ہے: وہ گھروں کے درمیان گھومتے رہے اور انہیں تلاش کرنے لگے اور شدت اور سختی کے ساتھ قتل کرنے لگے، پس انہوں نے اہل لغت کے قول کے درمیان تطبیق کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چلے اور آبادی اور گھروں کے درمیان گھومنے لگے۔ اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں قتل کیا ہے۔

اور حضرت حسان کا یہ شعر بھی نقل کیا:

و منا الذی لاقی بسیف محمد فجاس به الأعداء عرض العساکر(1)

اور قطرب نے کہا ہے: وہ اترے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَجُسْنَا دِيَارَهم عَنْوَةً و أُبْنَا بساداتهم مُوثَقِينَا(2)

وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا یعنی یہ وعدہ اس طرح پورا ہونے والا ہے جس کا خلاف ہرگز نہ ہوگا۔

**ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝**

''پھر ہم نے پلٹا دیا تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کو جو دشمن کے خلاف تھی اور ہم نے قوت دی تمہیں مال سے، بیٹوں سے اور بنا دیا تمہیں کثیر التعداد''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ یعنی ہم نے تمہارے حق میں زمانے کی گردش اور رجعت کو پلٹا دیا، اور یہ اس وقت ہوا جب تم نے توبہ کی اور اطاعت اختیار کر لی۔ پھر کہا گیا ہے: یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے جالوت کو قتل کرنے یا کسی اور کو قتل کرنے کے سبب ہوا(3)، یہ اس کے بارے میں اختلاف ہونے کی بنا پر ہے جس نے انہیں قتل کیا۔ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (اور ہم نے مال اور بیٹوں سے تمہیں قوت دی) یہاں تک کہ تم اسی حالت پر لوٹ آئے جس پر پہلے تھے۔ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا اور ہم نے تمہیں تعداد اور مردوں کے اعتبار سے تمہارے دشمن سے زیادہ کر دیا۔ اور نفیر وہ ہے جو اپنے خاندان میں سے کسی مرد کے ساتھ چلے، کہا جاتا ہے نفیر و نافر جیسا کہ قدیر و قادر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ النفیر، نفر کی جمع ہو جیسا کہ کلیب، کلب کی اور معیز، معز کی، اور عبید، عبد کی جمع ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَأَكْرِمْ بقحطانَ من والدٍ و حِمْيَرَ أكرمْ بقومٍ نفيرا(4)

اور اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس پہلے واقعہ کے بعد اتفاق کرنے اور احوال کی اصلاح کرنے کے اعتبار سے زیادہ ہو گئے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اطاعت و فرمانبرداری پر لوٹنے کی جزا اور بدلہ ہے۔

**اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ**

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 230
3۔ ایضاً
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440

لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

''اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی، پس جب آ گیا دوسرا وعدہ (تو اور ظالم ان پر غالب آ گئے) تا کہ غمناک بنا دیں تمہارے چہروں کو اور تا کہ (جبرًا) داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے داخل ہوئے تھے اس میں پہلی مرتبہ تا کہ فنا و برباد کر کے رکھ دیں جس پر قابو پائیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی اگر تم اچھے کام کرو گے تو تمہاری نیکی اور اچھے کام کا نفع تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ای فعلیها۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی تمہیں پر ہو گی، جیسا کہ سلامٌ لك بمعنی سلام علیك ہے (یعنی تجھ پر سلام ہو)۔ کسی شاعر کا قول ہے:

فخر صریعا للیدین و للفم

اس میں بھی لام بمعنی علی ہے (یعنی وہ ہاتھوں اور منہ کے بل پر گرا)۔ اور طبری نے کہا ہے: لام بمعنی الی ہے، یعنی دان اساتم فالیها، یعنی اگر تم برائی کرو گے تو اسی (نفس) کی طرف برائی کی سزا لوٹے گی۔) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزال) اس میں بھی لَهَا بمعنی إلیها ہے (بے شک تیرے رب نے اس کی طرف وحی کی۔) اور کہا گیا ہے: فلها الجزاء و العقاب۔ پس اسی کے لئے جزا اور سزا ہو گی۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: فلها رَبٌّ یغفر الاساءة۔ (پس اس کے لئے رب ہے جو برائی کو معاف فرما سکتا ہے)۔ پھر یہ احتمال ہے کہ یہ خطاب پہلی بار میں بنی اسرائیل کو ہو، یعنی تم نے برے عمل کئے تو تمہیں قتل کرنا، قید کرنا، اور تباہ و برباد کرنا حلال ہو گیا بعد ازاں تم نے اچھے عمل کئے تو بادشاہی، بلندی اور انتظام حال تمہاری طرف لوٹ آئے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہو، یعنی تم نے گناہوں کی وجہ سے سزا کے لئے اپنے اسلاف کا استحقاق پہچان لیا ہے پس تم بھی اسی کی مثل کا انتظار کرو یا یہ اسی وجہ کی بنا پر مشرکین قریش کو خطاب ہو۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب تمہارے فساد پھیلانے کے بارے دوسرا وعدہ آ گیا؛ اور وہ یہ کہ انہوں نے دوسری مرتبہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کر دیا، انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہ نے قتل کیا تھا اس کو لاخت کہا جاتا تھا؛ یہ قتبی نے کہا ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا نام ہیرودس تھا، اسے انہوں نے تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ اور ایک آزبیل نامی عورت نے اسے آپ کے قتل پر ابھارا تھا۔ اور علامہ سدی نے کہا ہے: بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا اور وہ معاملات میں آپ سے مشاورت کرتا تھا، پس بادشاہ نے آپ سے یہ مشورہ طلب کیا کہ وہ اپنی بیوی کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ نے اسے اس سے منع کر دیا اور فرمایا: بلاشبہ وہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، پس اس کی ماں کے دل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے حقد اور عداوت پیدا ہو گئی، پھر اس نے اپنی بیٹی کو باریک

سرخ کپڑے پہنائے اور اسے خوب معطر کیا اور اسے بادشاہ کی طرف بھیج دیا اس حال میں کہ وہ شراب میں مست تھا۔ اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے چھیڑ چھاڑ کرے، اور اگر وہ اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ انکار کر دے یہاں تک کہ وہ اسے وہ کچھ عطا کرے جو وہ اس سے مانگتی ہے، اور جب وہ اسے قبول کر لے تو پھر وہ اس سے مطالبہ کرے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر سونے کی ٹرے میں رکھ کر لایا جائے، پس اس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا سر لے آیا اور سر گفتگو کرتا رہا یہاں تک کہ جب وہ اس کے سامنے رکھا گیا تو وہ کہہ رہا تھا: لا تحل لك، لا تحل لك (یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے) پس جب صبح ہوئی تو ان کا خون ابھی کھول رہا تھا، پس اس نے اس پر مٹی ڈالی تو وہ پھر اس سے زیادہ کھولنے لگا، پس وہ مسلسل اس پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ وہ شہر کی فصیل تک پہنچ گیا اور وہ اس میں بھی کھولتا رہا؛ اسے ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

اور حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسین بن علی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ ان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ مر گیا اور اس نے اپنی بیوی اور ایک بیٹی پیچھے چھوڑی اور اس کی سلطنت کا وارث اس کے بھائی کو بنایا گیا، تو اس نے اپنے بھائی کی بیوی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا، تو اس نے اس بارے میں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے مشاورت کی، اس زمانے میں بادشاہ انبیاء علیہم السلام کے حکم کے مطابق عمل کرتے تھے، تو آپ نے اسے کہا: تو اس سے شادی نہ کر کیونکہ وہ فاحشہ عورت ہے، پس اس عورت کو بتا دیا گیا کہ اس نے اس کا ذکر کیا ہے اور آپ نے اسے اس سے پھیر دیا ہے، تو اس عورت نے پوچھا: یہ کہاں سے ہوا ہے؟ یہاں تک کہ اس تک یہ خبر پہنچ گئی کہ یہ یحییٰ کی جانب سے ہوا ہے، تو اس نے کہا کہ یحییٰ کو ضرور قتل کیا جائے گا یا اسے اس ملک سے نکال دیا جائے گا، پس اس نے اپنی بیٹی کو بلایا اور اس کا خوب بناؤ سنگار کر کے اسے تیار کیا، پھر اسے کہا: تو اپنے چچا کے پاس مجلس کے وقت جا کیونکہ وہ جب تجھے دیکھے گا تو وہ تجھے بلائے گا اور تجھے اپنے حجرہ میں بٹھا لے گا، اور وہ کہے گا: مجھ سے مانگ جو تو چاہتی ہے، کیونکہ جو شے بھی تو مجھ سے مانگے گی وہ میں تجھے عطا کروں گا، پس جب وہ تجھے یہ کہے، تو تو یہ کہنا: مجھے یحییٰ کے سر کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ راوی نے کہا: ان بادشاہوں میں سے جب کوئی سر مجلس کسی شے کے بارے بات کر دیتا پھر اسے پورا نہ کرتا تو اس سے بادشاہی چھین لی جاتی، پس اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کہا: یحییٰ کو قتل کرنے سے بھی اسے موت آئے گی اور اپنی سلطنت سے باہر نکلنے سے بھی اسے موت آئے گی، چنانچہ اس نے اپنے ملک کو اختیار کیا اور آپ کو قتل کر دیا۔ راوی نے بیان کیا: پس اس لڑکی کی ماں کو زمین نے اپنے اندر نگل لیا (یعنی وہ زمین میں دھنس گئی)۔

ابن جدعان نے کہا ہے: میں نے یہ حدیث حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیان کی تو انہوں نے فرمایا: کیا میں تجھے خبر نہ دوں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کیسے قتل کئے گئے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، تو انہوں نے بیان کیا: حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے کو جس وقت قتل کیا گیا تو وہ ان سے بھاگ نکلے اور ان لوگوں نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ آپ ایک موٹے تنے والے درخت کے پاس پہنچ گئے تو اس نے آپ کو اپنی طرف بلایا اور آپ کو اپنے اندر چھپا لیا اور آپ کے کپڑے کا ایک کنارہ (جھالر) باہر رہ گئی ہوائیں اسے اڑانے لگیں، پس وہ بھی چلتے ہوئے اس درخت کے پاس آپہنچے اور انہوں نے اس

درخت کے بعد آپ کا کوئی اثر اور نشان نہ پایا، اور انہوں نے اس کپڑے کے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور پھر آری منگائی اور اس درخت کو کاٹ دیا اور اس کے ساتھ آپ کو بھی کاٹ دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ طبری نے ''التاریخ الکبیر'' میں بیان کیا ہے کہ ابوالسائب نے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں ابومعاویہ نے اعمش سے انہوں نے منہال سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے یحییٰ بن زکریا کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، فرمایا: وہ چیزیں جن سے انہوں نے لوگوں کو منع کیا ان میں بھائی کی بیٹی سے نکاح بھی تھا۔ فرمایا: اور ان کے بادشاہ کے بھائی کی بیٹی تھی جو اسے پسند تھی ..... آگے خبر مذکورہ خبر کے مثل ہی بیان کی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا گیا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، اور جو وہ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اس میں وہ انہیں بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کرتے تھے، اور ان کے بادشاہ کی بھانجی تھی وہ اسے چاہتی تھی، اور وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اس سے شادی کر لے، ہر روز اس کی کوئی حاجت ہوتی تھی تو وہ اسے پورا کر دیتا تھا، پس جب یہ خبر اس کی ماں کو پہنچی کہ انہوں نے بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کیا ہے تو اس نے اسے کہا: جب تو بادشاہ کے پاس جائے اور وہ پوچھے: کیا تیری کوئی حاجت ہے؟ تو تو یہ کہنا: میری حاجت یہ ہے کہ تو یحییٰ بن زکریا کو ذبح کر دے، پس بادشاہ نے اس سے کہا: تو اس کے سوا مجھ سے مانگ! تو اس نے کہا: میں تجھ سے اس کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ پس جب اس نے اس کا انکار کیا تو اس نے ایک ٹب منگایا اور آپ کو بھی بلایا اور آپ کو ذبح کر دیا، پس آپ کے خون کا قطرہ زمین کے چہرے پر ظاہر اور نمایاں ہو گیا پس وہ مسلسل ابلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور ان کے دل میں یہ بات القا کر دی کہ وہ انہیں اسی خون پر قتل کرے یہاں تک کہ یہ خون ساکن ہو جائے، پس اس نے اس پر ان میں سے ستر ہزار افراد قتل کئے، اور ایک روایت میں پچھتر ہزار کا ذکر ہے۔ حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: یہ ہر نبی علیہ السلام کی دیت ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی ہے کہ میں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے بدلے ستر ہزار افراد کو قتل کیا، اور میں تمہارے نواسے کے بدلے ستر ہزار کو قتل کروں گا۔ اور سمیر بن عطیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا ہے: وہ چٹان جو بیت المقدس میں ہے اس پر ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا گیا ان میں سے حضرت یحییٰ بن زکریا بھی ہیں۔ اور زید بن واقد سے روایت ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سر کو اس وقت دیکھا جب انہوں نے مسجد دمشق بنانے کا ارادہ کیا، وہ اس گنبد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے نیچے سے نکلا جو اس محراب کے ساتھ ملتا ہے جو مشرق کی جانب ملتا ہے، اور آپ کا چہرہ اور بال مبارک اپنی اصلی حالت پر تھے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اور قرہ بن خالد نے کہا ہے: حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے سوا آسمان کسی پر نہیں رویا اور اس کی سرخی اس کا رونا ہی ہے۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: تین مقامات میں ابن آدم زیادہ وحشت زدہ ہوتا ہے: ایک پیدا ہونے کے دن پس وہ غم و

اندوہ کے دار کی طرف نکل کر آتا ہے، اور ایک اس رات جو وہ مردوں کے ساتھ گزارتا ہے پس وہ ایسے پڑوسیوں کا پڑوسی بن جاتا ہے جن کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھے، اور ایک اس دن جب اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور وہ اس جگہ حاضر ہوگا جس کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لئے ان تینوں مقامات کے بارے فرمایا: وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (مریم) (اور سلامتی ہو ان پر جس روز وہ پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے) یہ سب مذکورہ تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جسے ان پر دوسری بار بھیجا گیا، پس کہا گیا ہے کہ وہ بخت نصر تھا۔ اور یہ قشیری ابونصر نے کہا ہے، ان کے سوا کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد قتل کیا گیا، اور بخت نصر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے بہت عرصہ پہلے اور اسکندر سے بھی پہلے ہوا ہے اور اسکندر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً تین سو سال کا عرصہ ہے، لیکن دوسری بار سے مراد وہ لی گئی ہے جس وقت انہوں نے حضرت شعیا کو قتل کیا تھا، اس وقت بخت نصر زندہ تھا، پس یہی وہ ہے جس نے انہیں قتل کیا اور بیت المقدس کو خراب اور برباد کیا اور مصر تک ان کا پیچھا کیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے یہ روایت کیا ہے کہ بخت نصر وہ ہے جس نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا جس وقت انہوں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا وہ اہل السیر والاخبار کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا تھا جس وقت انہوں نے حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کیا تھا اور یہ ارمیاء کے عہد میں ہوا تھا۔ انہوں نے بیان کیا: ارمیاء کے عہد اور بخت نصر کے بیت المقدس کو خراب و برباد کرنے سے لے کر حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی ولادت تک درمیان میں چار سو اکسٹھ برس کی مدت ہے، اور یہ کہ وہ بیت المقدس کی تخریب سے لے کر کوسک کے عہد میں اس کی آبادی تک ستر برس کا عرصہ ہے، پھر اس کی آبادی کے بعد سے لے کر بیت المقدس پر اسکندر کے غلبہ تک اٹھاسی برس ہیں، پھر اسکندر کی مملکت کے بعد سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت تک تین سو تریسٹھ سال ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں سے صحیح وہ ہے جو محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا اور انہوں نے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا...... اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا...... تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بابل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ بھیجا اس کو خردوس کہا جاتا تھا۔ پس وہ اہل بابل کے ساتھ ان کی طرف چلا اور ان پر شام کے ساتھ غلبہ پالیا، پھر اس نے اپنے سالار لشکر کو کہا: میں نے اپنے الٰہ کی قسم کھائی ہوئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیت المقدس پر غلبہ دیا تو میں ضرور انہیں قتل کروں گا یہاں تک کہ ان کا خون میرے لشکر کے درمیان سے بہے گا، اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ انہیں قتل کریں یہاں تک کہ وہ ان تک پہنچ جائے، پس وہ سالار لشکر بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اس میں ابلتا ہوا خون دیکھا تو اس نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے بتایا: یہ قربانی کا خون

ہے ہم نے اسے قربان کیا لیکن اسی برس سے یہ ہماری طرف سے قبول نہیں ہوئی۔ اس نے کہا: تم نے میرے سامنے سچ نہیں کہا، پس اس نے ان سرداروں میں سے سات سو ستر افراد کو اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ پرسکون نہ ہوا، [ پھر ان کے بچوں میں سے سات سو بچے لائے گئے اور وہ اس خون پر ذبح کئے گئے لیکن وہ پرسکون نہ ہوا ] پھر اس نے ان کے قیدیوں اور ان کی عورتوں میں سے سات ہزار لانے کا حکم دیا اور اس نے انہیں اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ ٹھنڈا نہ ہوا، تب اس نے کہا: اے بنی اسرائیل! مجھے سچ سچ بتاؤ اس سے پہلے کہ میں تم میں سے کوئی عورت آگ کو پھونک مارنے کے لئے بھی نہ چھوڑوں اور نہ کوئی مرد چھوڑوں مگر اسے قتل کر دوں۔ پس جب انہوں نے مشقت اور تکلیف کو دیکھا تو کہنے لگے: بیشک یہ ہمارے نبی علیہ السلام کا خون ہے وہ ہمیں الله تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بننے والے بہت سے امور سے منع کرتے تھے تو ہم نے انہیں قتل کر دیا، پس یہ انہی کا خون ہے۔ ان کا اسم گرامی حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تھا، انہوں نے کبھی آنکھ جھپکنے کی دیر بھی الله تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی اور نہ معصیت کا قصد کیا، تو اس نے کہا: اب تم نے مجھے سچ بیان کیا ہے، اور وہ سجدہ میں گر گیا پھر اس نے کہا: اب اس کی مثل کا تم سے انتقام لیا جائے گا، اور اس نے دروازے بند کرنے کا حکم دیا اور کہا: خردوس کے لشکر میں سے جو یہاں ہیں تم باہر نکل جاؤ، اور وہ بنی اسرائیل کے لئے خالی ہو گئی اس نے کہا: اے نبی الله! اے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تحقیق میرا اور آپ کا رب جانتا ہے آپ کی وجہ سے آپ کی قوم پر جو آفت اور مصیبت آئی، پس الله تعالیٰ کے حکم سے پرسکون ہو جاؤ اس سے پہلے کہ میں ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑوں۔ پس حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا خون الله عزوجل کے حکم سے ٹھنڈا ہو گیا، اور اس نے ان سے قتل کو اٹھا لیا اور کہا: اے میرے رب! بلاشبہ میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، پس الله تعالیٰ نے رؤس الانبیاء میں سے ایک رأس کی طرف وحی بھیجی۔ بے شک یہ سالار مومن ہے اور بہت سچا ہے۔ پھر اس نے کہا: بے شک الله تعالیٰ کے دشمن خردوس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم میں سے اتنے لوگوں کو قتل کروں کہ تمہارا خون اس کے لشکر کے درمیان سے بہہ کر جائے۔ اور بلاشبہ میں اس کی نافرمانی اور حکم عدولی نہیں کر سکتا، پس اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ خندق کھودیں اور انہیں اپنے مالوں میں سے اونٹ، گھوڑے، خچر، گدھے، گائیں اور بکریاں وغیرہ لانے کا حکم دیا پس انہوں نے انہیں ذبح کیا یہاں تک کہ خون لشکر کی طرف بہہ گیا، اور وہ مقتول جو اس سے پہلے قتل کئے گئے تھے انہیں ان ذبح کئے گئے جانوروں پر پھینک دیا گیا، پھر وہ ان سے بابل کی طرف لوٹ گیا، حالانکہ یہ قریب تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں طویل حدیث مرفوع موجود ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ہم نے اسے (کتاب التذکرہ) میں ابواب فی اخبار المہدی میں مقطوع ذکر کیا ہے، ہم اس میں سے یہاں اتنا ذکر کریں گے جو آیت کے معنی کی وضاحت کر دے گا اور اس کی تفسیر بیان کر دے گا یہاں تک کہ اس کے ساتھ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہو گی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس الله تعالیٰ کے نزدیک انتہائی عظیم، عالیشان اور قدر و مرتبہ کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ان اعلیٰ و ارفع اور بلند مرتبہ گھروں

میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے، چاندی، موتی، یاقوت اور زمرد سے بنایا۔'' اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب اسے بنایا تو اللہ تعالیٰ نے جن ان کے لئے مسخر کر دیئے (ان کے تابع بنا دیئے) پس وہ معادن (کانیں) سے سونا اور چاندی لے آتے تھے، اور وہ آپ کے پاس جواہر، یاقوت اور زمرد لے آتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے جن آپ کے تابع رکھے یہاں تک کہ انہوں نے ان اصناف سے اسے بنا دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: سو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ چیزیں بیت المقدس سے کیسے اٹھالی گئیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور وہ مجوسی (آتش پرست) تھا اور اس کی حکومت سات سو سال تک رہی، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا پس وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا اور اموال اور وہ سب کچھ جو ان اصناف میں سے بیت المقدس میں تھا سب جمع کر لیا اور اسے ایک لاکھ ستر ہزار سامان لادنے والی گاڑیوں پر لاد دیا یہاں تک کہ اسے بابل پہنچا دیا، پس وہ وہیں مقیم رہے۔ بنی اسرائیل سے خدمت لیتے رہے اور سو برس تک ذلت و رسوائی اور سزا و عذاب کے ساتھ ان پر حکومت کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو یہ القا کیا کہ وہ بابل کی زمین میں مجوسیوں کی طرف چلے، اور ان کے قبضے میں بنی اسرائیل میں سے جو ہیں انہیں نجات دلائے، پس وہ بادشاہ ان کی طرف چل پڑا یہاں تک کہ وہ بابل کے علاقے میں داخل ہو گیا اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں جو بنی اسرائیل کے لوگ باقی تھے انہیں چھڑا یا اور وہ زیورات جو بیت المقدس سے وہ لے آئے تھے وہ بھی ان سے لے لئے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسی مقام پر واپس لوٹا دیا جس پر وہ پہلے تھے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اے بنی اسرائیل اگر تم پھر گناہوں اور نافرمانی کی طرف لوٹ گئے تو ہم بھی قید اور قتل و غارت کو تم پر لوٹا دیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (الاسراء: 8) (قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے) اور جب بنی اسرائیل بیت المقدس کی طرف لوٹ کر آئے تو دوبارہ گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو مسلط کر دیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝ پس اس نے ان پر بحر و بر میں حملہ کیا اور انہیں قیدی بنایا انہیں قتل کیا اور ان کے اموال اور ان کی عورتوں کو اٹھا لیا، اور بیت المقدس کے جمیع زیورات بھی اٹھا لئے اور انہیں ایک لاکھ ستر ہزار سامان والی گاڑیوں پر لادا، یہاں تک کہ انہیں کنیسۃ الذھب میں پہنچا دیا۔ پس وہ اب بھی اس میں ہیں حتیٰ کہ حضرت مہدی علیہ السلام اسے اٹھائیں گے اور اسے بیت المقدس کی طرف لوٹا دیں گے، اور ایک ہزار سات سو کشتیوں کو یافا پر لنگر انداز کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے بیت المقدس کی طرف منتقل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کر دے گا''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ یعنی دونوں باریوں میں سے جب دوسرا وعدہ آ گیا۔ اور اِذَا کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام ہے: بعثناھم (تو ہم نے ان پر مسلط کر دیا) اور اس پر دلیل پہلا بَعَثۡنَا ہے۔ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ تا کہ قید اور قتل کے ساتھ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ اور اس غم کا اثر تمہارے چہروں میں ظاہر ہونے لگے۔ پس لِیَسُوْٓءٗا محذوف کے متعلق ہے، یعنی ہم نے ایسے بندے بھیج دیئے (مسلط کر دیئے) تا کہ وہ تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ اور سلوک کریں جو تمہارے چہروں کو سیاہ اور غمزدہ کر دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: الوجوہ سے مراد سرداری ہے یعنی تا کہ وہ انہیں ذلیل و رسوا کر دیں۔ اور کسائی نے لِنَسُوءَ نون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اپنے بارے میں خبر دینے والے کا فعل عظیم الشان ہے، اور یہ کہ اسے قول باری تعالیٰ: وَقَضَیۡنَا اور بَعَثۡنَا، رَدَدۡنَا پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح علی سے مروی ہے۔ اور اس کی تصدیق حضرت ابی کی قرأت لنسوئَنَّ نون اور حرف تاکید کے ساتھ ہوتی ہے (1)۔ ابوبکر، اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور ابن عامر نے لِیَسُوْءَ صیغہ واحد کی بنا پر یاء اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے لیسؤ اللہ وجوھکم (تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دے۔) اور دوسری یہ ہے ..... لیسؤ الوعد وجوھکم (تا کہ وہ وعدہ تمہارے چہروں کو غمزدہ کر دے) اور باقیوں نے لِیَسُوْءٗوْا صیغہ جمع کی بنا پر یا اور ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تا کہ وہ لوگ جو کرخت اور قوت و طاقت والے ہیں تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ وَلِیَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوۡا اور تا کہ وہ (جبراً) مسجد میں داخل ہو جائیں جیسے وہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے تا کہ وہ تباہ و برباد اور ہلاک کر دیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: تا کہ وہ اسے گرا دیں۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فما الناس إلا عاملان فعاملٌ يُتَبِّرُ ما يَبْنِي و آخر رافع (2)

مَا عَلَوۡا یعنی تمہارے شہروں میں سے جس پر وہ غالب آ جائیں۔ تَتۡبِیۡرًا (مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا)

عَسٰی رَبُّكُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَكُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَ جَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ۝

''قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے، اور ہم نے بنا دیا جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ۔''

قولہ تعالیٰ: عَسٰی رَبُّكُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَكُمۡ اور یہ (خبر) ان میں سے ہے جس کے بارے انہیں ان کی کتاب میں خبر دی گئی ہے اور عَسٰی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ وہ ان سے (اس تکلیف اور غم کو) دور فرما دے گا، اور عَسٰی کا لفظ اللہ تعالیٰ سے واجب (اور ثابت) ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اَنۡ یَّرۡحَمَكُمۡ کہ تمہارا رب تم سے اپنا انتقام لینے کے بعد تم پر رحم فرمائے گا، اور پھر اسی طرح ہوا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھا دیا اور ان سے کئی بادشاہ بنائے۔ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: پس وہ دوبارہ (فسق و فجور کی طرف) لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

فرمادیا۔ اور وہ بڑی رذالت اور حقارت کے ساتھ جزیہ دینے لگے؛ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو پہلے حدیث وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: تحقیق بنی اسرائیل پر عذاب اور سختی دوبارہ کفار کے ہاتھوں سے آئی اور ایک بار مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب وہ دوبارہ فسق و فجور کی طرف لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ (کی گرفت) بھی ان پر لوٹ آئی۔ اور اس بنا پر حضرت قتادہ کا قول صحیح لگتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ اور جیل بنادیا ہے۔ یہ الحصر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی حبس (قید کرنا) ہے۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے حَصَرَهُ يَحْصِرُهُ حَصْرًا اس نے اس پر تنگ کردیا اور اس کا احاطہ کرلیا۔ اور الحصير: الضيق البخيل (سخت بخیل) اور الحصیر کا معنی البارية (تراشیدہ) ہے۔ اور الحصیر سے مراد پہلو بھی ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: وہ ہڈی جو اونٹ اور گھوڑے کے پہلو میں ظاہر ہوتی ہے اس سے لے کر عرضاً اوپر کی جانب پہلو کے ختم ہونے تک درمیان میں جو (گوشت) ہے وہ حصیر کہلاتا ہے۔ اور الحصیر سے مراد بادشاہ بھی ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔

لبید نے کہا ہے:

و قَمَاقِمٍ غُلْبِ الرقاب كأنهم جِنّ لدى باب الحَصِير قيام(1)

اس میں الحصیر سے مراد بادشاہ لیا گیا ہے۔

اور روایت کیا جاتا ہے: و مَقَامَةٍ غُلْبِ الرقاب...... یہ اس بنا پر ہے کہ غلب، مقامة سے بدل ہو گویا کہ اس طرح کہا: و رُبَّ غُلْبِ الرقاب۔ اور ابو عبیدہ سے مروی ہے:

لدى طرف الحصير

قیام یعنی نعمان بن منذر کی چٹائی کے کنارے کے پاس۔ اور الحصیر کا معنی قید خانہ بھی ہے (2)، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور علامہ قشیری نے کہا ہے: جس کو بچھایا جاتا ہے وہ حصیر کہلاتی ہے، کیونکہ بنائی کے سبب اس کے بعض حصے بعض کو روکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: أی فراشا و مهادا (یعنی اللہ تعالیٰ نے جہنم کو کافروں کے لئے فرش اور بچھونا بنادیا ہے) (یعنی) یہ اس طرف گئے ہیں کہ حصیر وہ ہے جسے بچھایا جاتا ہے، کیونکہ عرب چھوٹی چٹائی کو حصیر کا نام دیتے ہیں، ثعلبی نے کہا ہے: اور یہ خوبصورت توجیہ ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب راہوں سے سیدھی راہ ہے اور مژدہ سناتا ہے ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

تیار کر دیا ہے ان کے لئے دردناک عذاب"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ جب اللہ تعالیٰ نے معراج کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے جو وعدہ اور فیصلہ کیا اس کا ذکر کیا، اور یہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے، پھر یہ بیان فرمایا کہ وہ کتاب جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی وہ ہدایت پانے کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ کا معنی ہے الطریقة التی هی أسدّ و أعدل و أصوب۔ یعنی یہی وہ راہ ہے جو زیادہ سیدھی، موزوں اور صحیح ہے، پس التی موصوف محذوف کی صفت ہے، یعنی الطریقة التی هی أقوم۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہی وہ حال ہے جو تمام حالات سے زیادہ صحیح اور موزوں ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لانا ہے، اور یہ کلبی اور فراء نے کہا ہے (1)۔ قولہ تعالیٰ: وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اَنَّ لَهُمْ ای بأن لهم (اعمال صالحہ کے سبب) ان کے لئے اَجْرًا كَبِیْرًا (بڑا اجر ہے) یعنی جنت ہے۔ وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی اور انہیں مژدہ سنا رہا ہے کہ ان کے دشمنوں کے لئے عذاب وعقاب ہے۔ اور قرآن کریم اس کی شان اور عظمت وعدہ و وعید ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے وَ یَبْشُرُ مخفف یا کے فتحہ اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ اس کا ذکر بھی پہلے کر دیا گیا ہے۔

وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝

"اور دعا مانگا کرتا ہے انسان برائی کے لئے جیسے دعا مانگا کرتا ہے بھلائی کے لئے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: یہ آدمی کا اپنی ذات اور اپنی اولاد کے خلاف غصے اور تنگی کی حالت میں دعا کرنا ہے ایسی شے کے بارے جس کے قبول ہونے کو وہ پسند نہیں کرتا (2) کہ اے اللہ! اسے ہلاک کر دے وغیرہ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ جیسا کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اس کو عافیت عطا فرمائے، پس اگر اللہ تعالیٰ شر اور برائی کے بارے اس کی دعا اس کے اپنے خلاف قبول کر لے تو وہ ہلاک ہو جائے لیکن وہ اپنے فضل کے ساتھ اس کے لئے اسے قبول نہیں کرتا۔ اس کی نظیر یہ ہے: وَ لَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ (یونس: 11) (اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لئے) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دعا مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ (الانفال) (اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب۔) اور کہا گیا ہے کہ وہ ممنوع چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے جیسا کہ مباح چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے۔

جیسا کہ شاعر ابن جامع نے کہا ہے:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 232 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 441

أطوف بالبیت فیمن یطوف وأرفع من مِئزَرِی المُسبَلِ

میں بیت اللہ کا طواف کرنے والوں میں اس کا طواف کرتا ہوں اور اپنی لٹکی ہوئی چادر اٹھالیتا ہوں۔

وأسجدُ باللیل حتی الصباح وأتلو من المُحکَم المُنَزَّلِ

اور میں رات کے وقت صبح تک عبادت کرتا ہوں اور نازل کی گئی محکم کتاب کی تلاوت کرتا ہوں۔

عسی فارجُ الهَمّ عن یوسف یُسَخِّرلی ربة المَحمِلِ

پس قریب ہی تو یوسف سے غم دور ہونے کا امیدوار رہ، وہ میرے لئے محمل کے مالک کو تابع کردے گا۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ما علی فلان مِحمِل جیسا کہ مَجلِس ہے یہ بمعنی معتمد ہے یعنی (فلان پر اعتماد نہیں) اور محمل، محامل الحاج کا واحد بھی ہے (حاجیوں کو اٹھانے والا ہودج) اور مِحمَل جیسا کہ مِرجل ہے اس کا معنی ہے تلوار کی پٹی۔ اور وَ یَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ سے لفظ اور خط (یعنی پڑھنے اور لکھنے) میں واو حذف کردی گئی ہے لیکن معنی میں یہ حذف نہیں ہوئی کیونکہ یہ محل رفع میں ہے لیکن اس کے سامنے لام ساکن آنے کی وجہ سے اسے حذف کردیا گیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ ۝ (العلق) وَیَمۡحُ اللّٰہُ الۡبَاطِلَ (الشوریٰ: 24) وَسَوۡفَ یُؤۡتِ اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (النساء: 146) یُنَادِ الۡمُنَادِ (ق: 41) فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ ۝ (القمر) (ان میں پہلی دو آیتوں میں واؤ اور آخری تین میں یاء لام ساکنہ کی وجہ سے حذف کردی گئی ہیں)۔ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا یعنی انسان کے مزاج اور طبیعت میں جلد بازی اور تیزی ہے، پس یہ برائی کے سوال میں اسی طرح جلد بازی اور تیزی کرتا ہے جس طرح خیر اور بھلائی مانگنے میں جلدی کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اشارہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے کہ جس وقت وہ روح کے مکمل طور پر اپنے بدن میں داخل ہونے سے پہلے بھی اٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا سر تخلیق فرمایا پس وہ دیکھتے رہے درآنحالیکہ ان کا جسم تخلیق ہوتا رہا، پس جب عصر کا وقت ہوا ان کی ٹانگیں ابھی باقی تھیں ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی تو انہوں نے کہا: اے میرے پروردگار! رات آنے سے پہلے پہلے جلدی کیجئے؛ تو اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب پھونک ان کی ناف تک پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے جسم کی طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ قادر نہ ہو سکے؛ پس اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب روح ان کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا، اور جب ان کے پیٹ میں داخل ہوئی تو کھانے کی چاہت پیدا ہوئی تو روح کے اپنی ٹانگوں کی طرف پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھلوں کی طرف جلدی سے اچھل پڑے، تو اسی وقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) (انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔) اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر بنائی تو جتنا اللہ تعالیٰ نے چھوڑنا چاہا اسے چھوڑ دیا تو ابلیس اس کے اردگرد چکر لگاتا رہا اور

دیکھتا رہا کہ وہ کیا ہے؟ پس جب اس نے آپ کا پیٹ دیکھا تو وہ پہچان گیا کہ یہ ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو اپنے او پر قابو نہیں رکھ سکے گی (1)''۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قیدی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کیا تو وہ رات کے وقت کراہنے لگا، آپ نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: میرے کراہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چمڑے کا تسمہ شدید اور سخت بندھا ہوا ہے، چنانچہ آپ نے اسے بندھے ہوئے تسمے کو تھوڑا ڈھیلا کر دیا پس جب آپ سو گئیں تو وہ بھاگ گیا، تو آپ نے اس کی اطلاع حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ کاٹ دے (2)''۔ پس جب صبح ہوئی تو آپ اس آفت کی توقع کرنے لگیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ وہ میری دعا اس کے خلاف کر دے جو میری اہل میں سے رحمت کا مستحق نہیں ہے کیونکہ میں بھی انسان ہوں غصے میں ہو جاتا ہوں جیسا کہ انسان غصے میں ہو جاتا ہے''۔ اور یہ آیت نازل ہوئی؛ اسے ابونصر قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اے اللہ! بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بشر ہے غضبناک ہوتا ہے جیسے انسان غصے میں ہوتا ہے اور بلاشبہ میں نے تجھ سے ایک عہد لے رکھا ہے اور تو ہرگز میرے ساتھ اس کا خلاف نہیں کرے گا پس جس مومن کو بھی کوئی اذیت پہنچاؤں یا اسے گالی دوں یا اسے کوڑے کے ساتھ ماروں تو تو اسے اس کے لئے کفارہ اور ذریعہ قربت بنا دے۔ اسے اس کے سبب قیامت کے دن اپنا قرب عطا فرمانا (3)'' اور اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔ اور کہا گیا ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا کا معنی ہے کہ وہ جلدی ملنے والی شے (دنیا) کو ترجیح دیتا ہے اگرچہ وہ قلیل ہے دیر سے ملنے والی پر (آخرت پر) اگرچہ وہ عظیم اور زیادہ ہے۔

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ۝

''اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں اور ہم نے مدہم کر دیا رات کی نشانی کو اور بنا دیا دن کی نشانی کو روشن تا کہ (دن کے اجالے میں) تم تلاش کرو رزق اپنے رب سے اور تا کہ تم جان لو سالوں کی تعداد اور حساب کو، اور ہر چیز کو ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ یعنی ہم نے رات اور دن کو اپنی وحدانیت، وجود اور اپنے کمال علم وقدرت پر دو علامتیں اور نشانیاں بنایا۔ اور ان دونوں میں علامت اور نشانی یہ ہے: ان دونوں میں سے ہر ایک کا وہاں سے آنا جسے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، خلق الانسان خلقا لایتمالك، جلد 2، صفحہ 327

2۔ مجمع الزوائد، کتاب علامات النبوة، ما جاء فی دعائه واشتراطه فیه، جلد 8، صفحہ 477، حدیث 13993

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، من لعنه النبی أو سبه او دعا علیه ولیس هو اهلا، جلد 2، صفحہ 324

نہیں جانتا اور اس کی طرف واپس لوٹتا ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور دونوں میں سے ایک کا دوسرے کے مقابلے میں کم اور زیادہ ہونا اور پھر اس کا برعکس ہو جانا، یہ بھی علامت اور نشانی ہے۔ اور اسی طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریک ہونا بھی ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ اور یہ نہیں فرمایا: فمحونا الليل (ہم نے رات کو مٹا دیا) پس جب آیت (نشانی) کی اضافت رات اور دن کی طرف کی تو اس پر دلیل ہے کہ مذکورہ دونوں آیتیں (نشانیاں) ان دونوں کے لیے ہیں نہ کہ یہ دونوں ہیں۔ اور مَحَوْنَا کا معنی ہے ہم نے مٹا دیا۔

اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا تو انہوں نے اپنا پر چاند کے چہرہ پر سے گزارا تو اس کی روشنی مٹ گئی حالانکہ وہ نور روشنی میں سورج کی مثل تھا، اور وہ سیاہی جو چاند میں دکھائی دیتی ہے وہ اسی مٹنے کا اثر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سورج کے ستر جز بنائے اور چاند کے بھی ستر جز بنائے، پھر چاند کے نور سے انہتر جز مٹا دیئے اور انہیں سورج کے نور کے ساتھ رکھ دیا۔ پس سورج کے نور کے ایک سو انتالیس جز بن گئے، اور چاند کا ایک جز باقی رہا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے نور سے دو سورج پیدا کئے، اور پھر وہ کیا جو اس کے علم میں پہلے تھا کہ اس دنیا کے مشارق و مغارب کی مقدار کے برابر اس پر ایک سورج ہو، اور چاند کو سورج سے کم بنایا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے اپنا پر تین بار چاند کے چہرہ پر پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس کی روشنی مدہم پڑ گئی اور اس کا نور باقی رہا، پس وہ سیاہی جو تم چاند میں دیکھتے ہو وہ اس مٹنے کا اثر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اسے سورج ہی باقی رہنے دیتا تو پھر رات اور دن کے درمیان پہچان نہ ہو سکتی۔ پہلے قول کو ثعلبی نے اور دوسروں کو مہدوی نے ذکر کیا ہے اور عنقریب یہ مرفوع روایت بھی آئے گی۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ محو سے مراد وہ سیاہ داغ ہے جو چاند میں دکھائی دیتا ہے، تاکہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے کم ہو جائے اور رات دن سے ممتاز ہو جائے۔ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے دن کے سورج کو آنکھوں کو روشن کرنے والا بنایا۔ ابو عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے: یعنی وہ اس کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اور یہ عربوں کے قول میں سے ہے أبصر النهار جب دن خوب روشن ہو جائے، اور وہ اس حال میں ہو جائے کہ اس کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے اس قول کی طرح ہے خبیث مُخْبِث جب اس کے ساتھی خبثاء ہوں۔ اور رجل مضعف جب اس کی سواری کمزور ہو، پس اسی طرح النهار مبصرا جب اس کے اہل دیکھنے والے ہوں۔ لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ اس سے مراد معاش (اور کاروبار حیات) میں تصرف کرنا ہے۔ اور رات کے وقت آرام اور سکون کا ذکر نہیں کیا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے جو دن کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس: 67) (وہ ہے جس نے بنائی تمہارے لئے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا۔) وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ یعنی اگر وہ اس طرح نہ کرتا تو رات دن سے نہ پہچانی جا سکتی، اور نہ ہی حساب اور تعداد معلوم ہو سکتی۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا یعنی احکام تکلیفی میں سے ہر شے ہم نے تفصیل سے بیان کر

دی ہے، اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: 89) (اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) (نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور اس کی مخلوق میں سے سوائے آدم کے کوئی باقی نہ رہا تو اس نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند پیدا فرمائے اور یہ دونوں دو سورج تھے پس وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھا کہ وہ ان میں سے ایک کو سورج چھوڑے گا پس اس نے اسے اس دنیا کی مثل پیدا کیا جو اس کے مشارق و مغارب کے درمیان ہے اور رہا وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ ایک کو چاند بنا دے گا تو اسے اس نے سورج سے کم تخلیق فرمایا لیکن آسمان کی انتہائی بلندی میں ہونے اور زمین میں بہت دور ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں پس اگر اللہ تعالیٰ سورج اور چاند دونوں کو اسی طرح چھوڑ دیتا جیسے اس نے ان دونوں کو تخلیق فرمایا تو رات کو دن سے نہ پہچانا جا سکتا اور نہ ایک مزدور یہ جان سکتا کہ وہ کب تک کام کرے گا اور نہ روزے دار کو معلوم ہوتا کہ وہ کب تک روزہ رکھے گا اور نہ عورت جان سکتی کہ وہ عدت کیسے گزارنے گی اور نہ نمازوں اور حج کے اوقات معلوم ہو سکتے اور نہ قرض اتارے جا سکتے اور نہ یہ معلوم ہو سکتا کہ کس وقت بیج ڈالنا ہے اور فصل کاشت کرنی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بدنوں کو راحت پہنچانے کے لئے کب آرام کر سکتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف دیکھا اور وہ ان کے ساتھ ان کے اپنے آپ سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے چاند کے چہرے پر اپنا پر تین بار پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس سے روشنی مٹ گئی اور اس میں نور باقی رہ گیا پس اسی کے بارے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ الآیہ''۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝

''اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔ اور ہم نکالیں گے اس کے لئے روز قیامت ایک کتاب جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے حکم ملے گا) پڑھو اپنا دفتر عمل تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کرنے کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ زجاج نے کہا ہے: عنق (گردن) کا ذکر لزوم (لازم ہونا) سے عبارت ہے جیسا کہ گردن کے لئے قلادہ (ہار) کا لازم ہونا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: طٰٓىِٕرَهٗ یعنی اس کا عمل اور جو اس پر خیر و شر میں سے مقدر ہے (1)، اور وہ اسے لازم ہوتا ہے جہاں وہ ہو۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی نیکی اور اس کی برائی اس کے ساتھ ہوگی۔ اس کا عمل اور اس کا رزق (اس کے ساتھ لازم ہے)، اور انہی سے مروی ہے: کوئی بچہ نہیں جو پیدا ہوتا ہے مگر اس کی گردن میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس میں اس کا شقی (بدبخت ہونا) یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 442

سعید (1) (سعادتمند ہونا) لکھا ہوتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ یعنی اس کی شقاوت اور سعادت اور جو کچھ خیرو شر میں سے اس کے لئے لکھا ہوا ہے اور جو اس کے لئے تقدیر میں سے لکھا ہوا ہے (2)۔ (ہم نے وہ اسے لازم کر دیا ہے) یعنی وہ ازل میں تقسیم کے وقت اس کے لئے ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے ارادہ تکلیف (مکلف بنانا) کا ہے، یعنی ہم نے اسے شریعت کو لازم پکڑنے کا پابند بنا دیا ہے۔ اور وہ اس حیثیت سے ہے کہ اگر وہ وہ کام کرنا چاہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس سے باز رہے جس سے اسے روکا گیا ہے تو یہ اس کے لئے ممکن ہے۔ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا یعنی اس کی وہ کتاب جو اس کے گلے میں لٹکی ہوگی (اسے وہ قیامت کے دن اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا) حسن، ابو رجا اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم نے طَیْرَهٗ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور اسی کے مطابق وہ ہے جو خبر میں مروی ہے اَللّٰهُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُكَ وَلَا طَیْرَ اِلَّا طَیْرُكَ وَلَا رَبَّ غَیْرُكَ (اے اللہ! کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے سوائے تیری بھلائی کے اور کوئی نصیب نہیں ہے سوائے تیرے نصیب (عطا کرنے کے) اور تیرے سوا کوئی رب (پروردگار) نہیں ہے۔) حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، ابن محیصن، ابو جعفر، اور یعقوب نے وَیَخْرُجُ یا کے فتحہ اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہوگا ویخرج له الطائر کتابا (اور اس کا نصیب ظاہر ہوگا اس حال میں کہ وہ لکھا ہوگا)۔ پس کتاباً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ویخرج الطائر فیصیر کتاباً (اور اس کا نصیب ظاہر ہوگا پس وہ لکھا ہوا ہو جائے گا)۔ اور یحییٰ بن وثاب نے وَیُخْرِجُ یا کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نکالے گا۔ اور شیبہ اور محمد بن سمیقع نے اور اسی طرح ابو جعفر سے بھی روایت ہے: وَیُخْرَجُ فعل مجہول کی بنا پر یا کے ضمہ اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے: اور اس کے لئے قسمت کا نوشتہ نکالا جائے گا۔ اور باقیوں نے وَنُخْرِجُ نون کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے: بمعنی و نحن نُخْرِجُ (اور ہم نکالیں گے) ابو عمرو نے اس قرأت میں قول باری تعالیٰ: اَلْزَمْنٰهُ سے استدلال کیا ہے۔ اور ابو جعفر، حسن اور ابن عامر نے یُلَقّٰهُ یا کو ضمہ، لام کو فتحہ اور قاف کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، بمعنی یُؤتاہ (وہ اسے دیا جائے گا) اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ای یراہ منشورا (وہ اسے کھلا دیکھے گا) اور فرمایا: مَنْشُوْرًا یعنی نیکی کے سبب بشارت اور خوشخبری میں اور برائی کے سبب زجر و توبیخ میں جلدی کرنے والا۔ ابو السوار عدوی نے کہا ہے: اور یہ آیت پڑھی وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور فرمایا: یہ دونوں کھلے اور لپٹے ہوئے ہیں پس اے انسان! جب تک تو زندہ ہے تو تیرا صحیفہ کھلا ہوا ہے سو تو جو چاہے اس میں لکھوا لے، اور جب تو فوت ہو جائے گا تو اسے لپیٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ جب تجھے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اسے کھولا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ حسن نے کہا ہے: ہر انسان اپنا نامہ عمل پڑھ لے گا چاہے وہ پڑھا ہوا ہو یا نہ پڑھا ہوا ہو (3)۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا (آج کے دن تم خود ہی اپنے محاسبے کے لئے کافی ہو۔) اور بعض صلحاء نے کہا ہے: یہ کتاب ہے، تیری زبان اس کی قلم ہے، اور تیر العاب اس کی سیاہی ہے، اور تیرے اعضاء اس کے کاغذ ہیں اور تو ہے کہ تو اپنے محافظ فرشتوں (کراماً کاتبین)

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 61 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 16 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 18

کو لکھوانے والا ہے نہ اس میں زیادتی اور اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس سے کچھ کم کیا جائے گا، اور جب تو اس سے کسی چیز کا انکار کرے گا تو اس بارے میں تجھ سے ہی تیرے خلاف شاہد اور گواہ ہوں گے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

''جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے اپنے فائدے کے لئے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے، اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو''

قولہ تعالیٰ: مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا یعنی بلاشبہ ہر ایک سے اس کی اپنی ذات کے بارے میں حساب لیا جائے گا کسی دوسرے کے بارے میں نہیں، پس جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو اس کے راہ ہدایت پر چلنے کا ثواب اسی کے لئے ہوگا، اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کے کفر (اور نافرمانی) کی سزا اسی پر ہوگی۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى یہ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس نے اہل مکہ کو کہا تھا: تم میری اتباع کرو اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر کرو اور تمہارا بوجھ مجھ پر ہوگا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی بلاشبہ ولید تمہارے گناہوں کو نہیں اٹھائے گا بلکہ ہر ایک کا گناہ اس کے اپنے اوپر ہوگا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَزَرَ يَزِرُ وِزْرًا و وِزْرَةً معنی ہے اس نے گناہ کیا۔ اور الوزر کا معنی ہے بھاری بھرکم بوجھ اور اس کی جمع أوزار ہے، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (الانعام: 31) یعنی وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ وَ قَدْ وَزَرَ جب وہ اٹھالے فهو وَازِر (تو وہ اٹھانے والا ہوگیا) اور اسی سے بادشاہ کا وزیر وہ ہوتا ہے جو اس کی مملکت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ اور قول میں ھا ضمیر النفس سے کنایہ ہے، یعنی کسی گناہ کرنے والے نفس کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا، یہاں تک کہ والدہ قیامت کے دن اپنے بیٹے کو کہے گی: اے میرے بچے! کیا میری گود تیرے لئے فرش (بچھونا) نہیں رہی، کیا میری چھاتی تیرے لئے باعث سیرابی نہیں رہی، کیا میرا پیٹ تیرے لئے حفاظت کی جگہ نہیں رہا! تو وہ کہے گا: ہاں (کیوں نہیں) اے میری ماں! تو وہ کہے گی: اے میرے بچے! کیونکہ میرے گناہوں نے مجھے بوجھل کر دیا ہے پس تو مجھ سے ان میں سے ایک گناہ اٹھالے۔ تو وہ کہے گا: اے میری ماں! مجھ سے دور ہو جا کیونکہ آج میں اپنے گناہوں کے سبب تجھ سے مشغول ہوں (یعنی میں تیرا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔)

**مسئلہ:** حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے رد میں دلیل اخذ کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کے سبب عذاب دیا جاتا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: بے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 443

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت ببعض بکاء اھلہ، جلد 1، صفحہ 171

شک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس شے نے اس پر ابھارا ہے کہ وہ یہ ہے جسے آپ نے سنا نہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ آیت کے معارض ہے، حالانکہ ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اس معنی کے راوی کثیر ہیں، مثلاً حضرت عمر اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور قیلہ بنت مخرمہ رضی اللہ عنہم۔ اور یہ تمام روایت کے ساتھ یقین رکھنے والے ہیں، ان کے غلطی کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں ہے، اور آیت اور حدیث کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے، کیونکہ حدیث اس معنی پر محمول ہے جب نوحہ میت کی وصیت سے ہو اور اس کا طریقہ ہو، جیسا کہ وہ جاہلیت میں کرتے تھے۔

یہاں تک کہ طرفہ نے کہا ہے:

إذا مِتّ فانعيني بها أنا أهله و شُقِّي علىّ الجيب يا بنت معْبَدِ

اور مزید کسی نے کہا:

إلى الحَول ثمّ اسْمُ السلام عليكما و من يَبْكِ حَوْلا كاملا فقد اعتذر

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت ان میں سے داؤد بھی ہیں وہ ظاہر حدیث کے اعتقاد کی طرف گئے ہیں کہ اسے ان کے نوحہ کے سبب عذاب دیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے انہیں اپنی موت سے پہلے اس (نوحہ) سے روکا نہیں، اور اس نے انہیں اس بارے ادب نہیں سکھایا، لہٰذا اسی تفریط کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا اور اس ذمہ داری کو ترک کرنے کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:6) (تم بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے) نہ کہ کسی دوسرے کے گناہ کے عوض اسے عذاب دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم نے مخلوق کو مہمل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ہم نے رسول بھیجے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ احکام ثابت نہیں ہوتے مگر شریعت کے ساتھ، بخلاف معتزلہ کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عقل قبیح اور حسین اور مباح اور ممنوع قرار دیتی ہے۔ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا کے حکم میں ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی امت کو عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا مگر ان کی طرف رسول اور ڈرانے والے بھیجنے کے بعد۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ دنیا اور آخرت میں عام ہے(1)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا (الملک) (جب بھی اس میں کوئی جتھا جھونکا جائے گا تو اس سے دوزخ کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، وہ کہیں گے: کیوں نہیں، بے شک ہمارے پاس آیا تھا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ جس پر نظر و فکر پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت توحید کے ساتھ ہوئی اور آپ نے دلائل قائم کر کے اپنی اولاد میں اعتقادات پھیلائے جو کہ فطرت کی سلامتی کے ساتھ صانع پر دلالت کرتی ہیں اور عالم میں سے ہر ایک پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کی اتباع کرنا واجب قرار دیتی ہیں، پھر حضرت نوح علیہ السلام کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444

زمانہ میں کفار کے غرق ہونے کے بعد تجدید ہوئی، اور اس آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ان کے بارے میں ہو جن تک کوئی پیغام رسالت نہیں پہنچا، اور وہ زمانہ فترت کے لوگ ہیں جن کے وجود کو بعض اہل علم نے مقدر کیا ہے۔

اور یہ جو روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی طرف، مجانین (پاگل لوگ) اور بچوں کی طرف (رسول) بھیجے گا یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ وہ ہے جس کا تقاضا شریعت کرتی ہے کیونکہ آخرت دار تکلیف نہیں ہے (1)۔ مہدوی نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہل فترت، گونگوں اور بہروں کی طرف رسول بھیجے گا پس وہ انہیں وہ کچھ عطا کرے گا جو وہ چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں انہیں عطا کرے، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی؛ اسے معمر نے ابن طاؤس سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث موقوف ہے، اور عنقریب سورۂ طٰہٰ کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ اہل جزائر جب اسلام کے بارے میں سنیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو جو گزر چکا ہے ان پر اس کی کوئی پابندی نہیں ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور جن تک دعوت نہیں پہنچی تو وہ عقلی اعتبار سے عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

''اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں، پس واجب ہو جاتا ہے ان پر (عذاب کا) فرمان پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہ رسول بھیجنے سے پہلے کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا، اس لئے نہیں کہ یہ اس کی طرف سے قبیح ہو گا اگر وہ ایسا کرے گا، بلکہ یہ اس کی طرف سے وعدہ ہے، اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب وہ اپنے وعدہ کے اس طرح ثابت ہونے کے ساتھ جس طرح اس نے کہا ہے کسی بستی کو ہلاک اور برباد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ وہاں کے رئیسوں کو فسق و فجور اور ظلم و ستم میں لگا دیتا ہے تو پھر ان پر ہلاکت و بربادی کا فرمان حق اور ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے یہ بتا رہا ہے کہ جو کوئی ہلاک ہوا بلاشبہ وہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہلاک ہوا، پس وہی ہے جو اسباب پیدا کرتا ہے اور انہیں اپنے انجام کی طرف لے جاتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کا قول سابق ثابت اور متحقق ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: اَمَّرْنَا ابو عثمان نہدی، ابو رجا، ابو العالیہ، ربیع، مجاہد اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے اَمَّرْنَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے (2)، یعنی ہم نے وہاں کے شریروں کو مسلط کر دیا پس انہوں نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444　2۔ ایضاً

اس میں نافرمانی کی اور فسق و فجور کا ارتکاب کیا، پس جب انہوں نے ایسا کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور ابو عثمان نہدی نے کہا ہے: امّرنا یعنی میم کی تشدید کے ساتھ (اس کا معنی ہے) تو ہم ان پر امراء بنا دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ ان پر غالب اور مسلط ہوتے ہیں؛ اور یہ ابن عزیز نے کہا ہے اور تأمّر علیھم کا معنی ہے تسلط علیھم (وہ ان پر غالب ہو گیا، قابض ہو گیا) اور حسن نے بھی، قتادہ، ابو حیوہ شامی، یعقوب اور خارجہ نے نافع اور حماد سے انہوں نے ابن کثیر اور علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ان دونوں (قراءتوں) کے خلاف پڑھا ہے: آمَرْنا یعنی مد اور تخفیف کے ساتھ، یعنی ہم اس کے جابروں اور رئیسوں کو زیادہ کر دیتے ہیں؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: آمرتہ مد کے ساتھ ہو اور أمرتہ یہ دونوں لغتیں بمعنی کثرتہ (میں نے اسے زیادہ کر دیا) ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے خیر المال مُهرةٌ مامورۃ او سِکّۃ مابورۃ۔

یعنی بہترین مال وہ ہے جس کے بچے اور نسل کثیر ہو(1)۔ اور اسی طرح ابن عزیز نے کہا ہے: آمرنا اور أمرنا دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یعنی اکثرنا (ہم نے زیادہ کر دیا) اور حسن سے بھی اور یحییٰ بن یامر سے اِمِرنا بغیر مد اور میم کے کسرہ کے ساتھ فعِلنا کے وزن پر روایت ہے، اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت قتادہ اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اکثرنا اور اسی طرح ابو زید اور ابو عبید نے بیان کیا ہے، اور کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: کثرت کے معنی میں فقط آمرنا مد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کی اصل أأمرنا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور صحاح میں ہے: اور ابو الحسن نے کہا ہے أمِر مالُه (یعنی میم کے کسرہ کے ساتھ) یعنی اس کا مال زیادہ ہو گیا۔ اور أمِر القوم یعنی قوم بڑھ گئی، زیادہ ہو گئی۔

شاعر نے کہا ہے:

أمِرون لا یرثون سَهْمَ القُعْدُدِ

(وہ کثیر ہیں وہ قلیل الآباء کے حصے کے وارث نہیں ہو سکتے)

اور آمر اللہ مالہ (مد کے ساتھ) (اللہ تعالیٰ نے اس کا مال زیادہ کر دیا)۔ ثعلبی نے کہا ہے: کثیر شی کو أمِرٌ کہا جاتا ہے، اور اس سے فعل آتا ہے: أمِرَ القومُ یأمَرون أمرا جب قوم زیادہ ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب دور جاہلیت میں کوئی قبیلہ زیادہ ہو جاتا تو ہم اس کے لئے کہتے تھے: أمِر أمرُ بنی فلان (بنی فلاں کی تعداد بڑھ گئی)۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

کل بنی حُرّۃٍ مَصیرُهُم قُلٌّ وإن أکثرت من العددِ

إن یُغْبَطُوا یَهْبِطوا وإن أمِرُوا یوما یصیروا للهُلْکِ والنَّکَدِ(2)

تو اس میں أمِرُوا کثرت کے معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہرقل کی حدیث میں ہے اور وہ حدیث صحیح ہے: لقد أمِر أمْرُ ابن ابی کبشہ، لیخافہ ملک بنی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 236

الأصفر، ای کثر (یعنی ابن ابی کبشہ (مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) کی تعداد زیادہ ہوگئی تا کہ بنی اصفر کا حاکم اس سے خوفزدہ ہو جائے۔) اور یہ سب غیر متعدی ہیں اسی لئے کسائی نے اس کا انکار کیا ہے، واللہ اعلم۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے أمِر پڑھا ہے تو وہ بھی ایک لغت ہے، اور أمِر کے متعدی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عَمِر کے مشابہ ہے اس حیثیت سے کہ کثرت کسی شے کو عمارۃ (آبادی) کے زیادہ قریب کرنے والی ہے پس یہ عَمِر کے متعدی ہونے کی طرح متعدی ہوا۔ اور باقیوں نے اَمَرْنَا، الأمر سے بنایا ہے، یعنی ہم نے انہیں اطاعت کے بارے حکم دیا الزام سے برأت کے لئے، خوفزدہ کرنے کے لئے اور وعید سناتے ہوئے۔ فَفَسَقُوْا یعنی وہ ہماری نافرمانی کرتے ہوئے ہماری اطاعت سے نکل گئے۔ فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ پس ان پر وعید (ہلاکت و بربادی) واجب ہوگئی، ثابت ہوگئی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَمَرْنَا یعنی ہم نے انہیں امراء بنا دیا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمیر غیر مأمور یعنی امیر وہ ہے جس پر کوئی امیر نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے اس کے تکبر کرنے والوں کو بھیج دیا۔ ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابی کی قرأت ہے: "ہم نے اس میں بڑے بڑے مجرم بھیج دیئے اور انہوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا" اسے ماوردی نے بیان کیا ہے۔

اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور ہارون نے ابی کی قرأت میں کہا ہے: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں اس کے بڑے بڑے مجرم بھیج دیتے ہیں پس وہ اس میں مکر و فریب کرتے ہیں تو اس پر (عذاب کا) فرمان واجب ہو جاتا ہے۔ واذا أردنا أن نهلك قرية بعثنا فيها أكابر مجرميها فمكروا فيها فحق عليها القول، اور یہ بھی جائز ہے کہ أمَرْنا بمعنی اکثرنا ہو، اور اسی سے خیر المال مهرة مأمورة (1) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مامورۃ مأبورۃ کے تابع ہے، جیسا کہ الغدایا والعشایا ہیں اور جیسا کہ آپ کا یہ قول ہے: ارجعن مأزورات غیر مأجورات (2) (گناہ کرنے والیاں بغیر کسی اجر کے لوٹ جائیں۔) اور اس بنا پر یہ نہیں کہا جاتا: امرهم الله بمعنی کثرهم (اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ کر دیا)، بلکہ یہ کہا جائے گا: آمرہ اور أمرہ (اس نے اسے زیادہ کر دیا) اور ابوعبید اور ابوحاتم نے قرأت عامہ کو اختیار کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: بلاشبہ ہم نے امرنا کو اختیار کیا ہے کیونکہ اُمر، امارت اور کثرت میں سے تینوں معنی اس میں جمع ہیں اور المترف سے مراد خوشحال اور رئیس ہے اور انہیں اُمر کے ساتھ خاص اس لئے کیا ہے کیونکہ ان کے سوا دوسرے لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: فَدَمَّرْنٰهَا یعنی ہم ہلاکت کے سبب اسے جڑ سے اکھیڑ دیتے ہیں۔ تَدْمِيْرًا مصدر کا ذکر ان پر واقع ہونے والے عذاب میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔ اور صحیح میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں ان کی حدیث ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اس حال میں کہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ماجاء فی اتباع النساء الجنائز، صفحہ 144

آپ گھبرائے ہوئے تھے اور آپ کا چہرہ سرخ تھا آپ فرمانے لگے: ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں عربوں کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے اس شر سے جو قریب آچکا ہے آج یاجوج ماجوج کی دیوار سے اتنا سا سوراخ ہو گیا ہے'' (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے حلقہ سا بنایا۔ آپ فرماتی ہیں: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم ہلاک ہو جائیں (2) گے حالانکہ ہم میں صالحین موجود ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں جب خبث (پلیدی) بڑھ جائے گا''۔ اس بارے میں کلام پہلے گزر چکی ہے۔ بے شک گناہ اور معاصی جب ظاہر ہو جائیں اور انہیں تبدیل نہ کیا جائے تو وہ تمام کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ⑰

''اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد، اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر ہے (اور انہیں) خوب دیکھنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ یعنی کتنی قومیں ہیں جنہوں نے کفر کیا اور ان پر ہلاکت و بربادی آئی۔ (اللہ تعالیٰ) کفار مکہ کو ڈرا رہا ہے اور قرن کے بارے میں سورۃ الانعام میں کلام گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا، خَبِيْرًۢا یعنی آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا ہے۔ بَصِيْرًا (اور) ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ⑱ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ⑲

''اور جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں، پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا (اور) ٹھکرایا ہوا ہو گا، اور جو شخص طلبگار رہتا ہے آخرت کا اور جدوجہد کرتا ہے اس کے لئے پوری طرح درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہو، پس یہ وہ (خوش نصیب ہیں) جنکی کوشش مقبول ہو گی۔''

قولہ تعالیٰ: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ مراد دنیا ہے، اور مراد الدار العاجلة (یعنی جو لوگ طلبگار ہیں صرف دار دنیا کے)، تو اس میں منعوت کو نعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یعنی ہم اس میں سے اسے عطا نہیں کرتے مگر جو ہم چاہتے ہیں پھر ہم اس کے عمل کے مطابق اس کا مواخذہ کریں گے، اور اس کا انجام جہنم میں داخل ہونا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب، جلد 2، صفحہ 1046	2۔ ایضاً

مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھگایا ہوا اور دور کیا ہوا ہوگا اور یہ فاسق منافقوں کی صفت ہے، اور ان ریاکاری اور دکھاوا کرنے والوں کی جو اندر کینہ چھپا کر ظاہرداری کرتے ہیں، وہ اسلام اور طاعت کا لبادہ اوڑھتے ہیں تاکہ وہ جلدی ملنے والی دنیا کے منافع اور فوائد وغیرہ کو حاصل کریں، پس آخرت میں ان سے وہ عمل قبول نہیں کیا جائے گا اور دنیا میں انہیں صرف وہ دیا جائے گا جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور سورۂ ہود میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ آیات ان آیات مطلقہ کو مقید کر رہی ہے، پس تو اس میں غور کر لے۔ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ یعنی اور جو دار آخرت کے طلبگار ہیں۔ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا یعنی اس نے طاعات و عبادات میں سے جو عمل کئے وہ آخرت کے لئے کئے۔ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ کیونکہ طاعات و عبادات قبول نہیں کی جاتیں مگر مومن سے۔ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا پس ان کی سعی و کوشش مقبول ہوگی مردود نہیں ہوگی۔ اور کہا گیا ہے: مضاعفًا یعنی ان کے لئے نیکیوں کو دس گنا تک اور ستر گنا تک، اور سات سو گنا تک، (بلکہ) کثیر گنا تک بڑھا دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تحقیق انہیں کہا گیا: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر ہزار ہزار نیکی کا بدلہ اور جزا دیتا ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر دو لاکھ گنا تک نیکیوں کا ثواب اور جزا عطا فرماتا ہے۔"

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ۝۲۰
اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا ۝۲۱
لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ۝۲۲

"ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے، اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو! کیسے بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل و کرم کے سب سے اعلیٰ ہے۔ نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تم بیٹھ رہو گے اس حال میں کہ تمہاری مذمت کی جائے گی اور بے یار و مددگار ہو جاؤ گے۔"

قولہ تعالیٰ: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ تو یہ جان لے کہ وہ مومنوں اور کافروں سبھی کو رزق دیتا ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا یعنی آپ کے رب کی عطا کسی کے لئے ممنوع اور بند نہیں ہے: محظور یہ حَظَرَ يَحۡظُرُ حَظۡرًا و حِظَارًا سے ماخوذ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ دیکھو! ہم نے رزق اور عمل میں بعض کو بعض پر کیسے فضیلت دی، پس ان میں سے تنگ دست بھی ہیں اور خوشحال و دولتمند بھی (اسی طرح عمل کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں اور کچھ اعلیٰ۔) وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا یعنی مومنوں کے لئے آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل و کرم کے سب سے اعلیٰ ہے اور وہ کافر تو اگرچہ دنیا میں اسے ایک بار وسعت دی گئی، اور مومن پر ایک بار تنگی آئی لیکن آخرت ان کے اعمال کے اعتبار سے صرف ایک بار تقسیم کی جائے گی، پس جس سے کوئی شے ایک بار فوت ہو گئی تو پھر وہ اسے اس میں نہیں پا سکے گا۔ اور قول باری تعالیٰ: لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ

کی امت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب انسان کو ہے (کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ)۔ فَتَقْعُدَ ورنہ تم باقی رہو گے۔ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا اس حال میں کہ نہ تمہارا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی دوست۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا ﴿۲۳﴾ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ﴿۲۴﴾

''اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر بڑھاپے کو پہنچ جائے تیری زندگی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں تو انہیں اف تک مت کہو اور انہیں مت جھڑکو، اور جب ان سے بات کرو تو بڑی تعظیم سے بات کرو۔ اور جھکا دو ان کے لئے تواضع و انکسار کے پر رحمت (و محبت) سے اور عرض کرو: اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے (بڑی محبت و پیار سے) مجھے پالا تھا جب میں بچہ تھا۔''

اس میں سولہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قَضٰى اس کا معنی ہے اَمَرَ (تیرے رب نے حکم دیا)، الزم (اس نے لازم کیا) اور اَوْجَبَ (اس نے واجب کیا) حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یہ قضا حکم نہیں ہے بلکہ یہ قضا امر ہے۔ اور مصحف حضرت ابن مسعود میں ووَصّٰى ہے اور یہی آپ کے اصحاب کی قرأت ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: بلاشبہ یہ ووَصّٰى ربك ہے پس دو واؤں میں سے ایک کو قاف سے بدل دیا اور اسے وَ قَضٰى رَبُّكَ پڑھا گیا کیونکہ اگر یہ قضا (حکم) ہوتا تو پھر کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حکم عدولی نہ کرتا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ایک قوم پر مصحف لکھتے وقت تصحیف ہوتی جس وقت واؤ صاد کیساتھ ملی وصی بقضی (یعنی وصی کو قضی سے بدل دیا) ابو حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضحاک کے قول کی مثل ہی ذکر کیا ہے۔ اور میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر دلیل موجود ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ (الشوریٰ: 13) (اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف) پھر ابو حاتم نے انکار کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہو۔ اور کہا: اگر ہم یہ کہیں تو پھر زنادقہ ہمارے مصحف کے بارے میں طعن کریں گے۔ پھر ہمارے علمائے متکلمین وغیرہ نے کہا ہے: لفظ قضا لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پس قضا بمعنی امر ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ یعنی تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اسی کی۔ اور قضا بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے؛ جیسے قول باری تعالیٰ ہے: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (فصلت: 12) یعنی اس نے انہیں دو دنوں میں تخلیق فرمایا۔

اور قضا بمعنی حکم (فیصلہ کرنا) ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ:72) یعنی تو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرتا ہے۔ اور قضا بمعنی الفراغ (فارغ ہونا) ہے؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ (یوسف) (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ یعنی وہ اس سے فارغ ہوا۔ اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ:200) (پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان) ل باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ:10) (پھر جب پوری ہو چکے نماز)۔

اور قضا بمعنی ارادہ بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (غافر) (جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے) اور قضا بمعنی عہد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ (القصص:44) (اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف (حکم بھیجا)، تو جب قضا ان معانی کا احتمال رکھتا ہے تو پھر اس قول کا اطلاق جائز نہیں ہے کہ معاصی اللہ تعالیٰ کی قضا سے ہوتی ہیں، کیونکہ اگر اس سے امر مراد لیا جائے تو پھر اس کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان (معاصی) کے بارے میں حکم نہیں دیا، کیونکہ وہ الفحشاء (برائیوں) کے بارے حکم نہیں دیتا۔ اور زکریا بن سلام نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا بے شک اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے، تو اس آدمی نے کہا: (کیا) اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے؟ تو حضرت حسن نے فرمایا حالانکہ آپ بڑے فصیح تھے: ماقضی اللہ ذالك یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے حکم نہیں دیا۔ اور پھر یہ آیت پڑھی: وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنی توحید کے بارے حکم ارشاد فرمایا، اور والدین کے ساتھ نیکی کرنے کو اس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے، جیسا کہ آپ نے ان دونوں کا شکر ادا کرنے کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے اور فرمایا ہے: وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اور فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ (لقمان) (کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخرکار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نماز اپنے وقت پر ادا کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا'' (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا اس نماز کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ووصینا الانسان بوالدیہ، جلد 2، صفحہ 882

بعد افضل ترین عمل ہے جو اسلام کے ارکان میں سے سب سے عظیم رکن ہے۔ اور اسے اس ثُمّ کے ساتھ مرتب کیا جو ترتیب اور مہلت کا فائدہ دیتا ہے۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''الصلواۃ علی وقتھا'' قال ثم ایّ؟ قال ''ثم برّ الوالدین'' قال ثم ای؟ قال ''الجھاد فی سبیل اللہ''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ گالی گلوچ کرتے ہوئے تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور نہ ان کی نافرمانی کرے، کیونکہ بلا اختلاف یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اور اس کے بارے سنت ثابتہ (صحیحہ) موجود ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک کبیرہ گناہوں میں سے کسی آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا ہے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! ؟ کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''۔ ایک آدمی کسی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور ایک آدمی دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے۔'' (انّ من الکبائر شتم الرجل والدیہ قالوا: یا رسول اللہ، و ھل یَشْتُمُ الرجل والدیہ؟ قال نعم، یسبّ الرجل أبا الرجل فیَسُبّ أباہ و یَسُبُّ أُمّہ فیسبّ امّہ) (1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ عقوق الوالدین (والدین کی نافرمانی) ان کی جائز اغراض میں ان کی مخالفت کرنا ہے، جیسا کہ ان کے ساتھ نیکی کرنے کا معنی ان کی اغراض میں ان کے ساتھ موافقت کرنا ہے۔ اس بنا پر جب وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اپنی اولاد کو کسی کام کے بارے حکم دیں تو اس بارے میں ان کی اطاعت کرنا واجب ہے، جب وہ امر معصیت اور گناہ کا نہ ہو، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مامور بہ مباح کے قبیلے سے ہو، اسی طرح حکم ہے جب وہ مندوب کے قبیل سے ہو۔ اور بعض لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مباح کے بارے ان دونوں کا حکم دینا اولاد کے حق میں وہ اسے مندوب بنا دیتا ہے اور ان دونوں کا مندوب کے بارے حکم دینا اس کے مندوب ہونے میں مزید تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے عقد میں ایک عورت تھی میں اسے پسند کرتا تھا، اور میرے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اسے ناپسند کرتے تھے پس انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں تو میں نے انکار کر دیا، پھر میں نے یہ واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے عبداللہ ابن عمر! تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے (2)''۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: لوگوں میں سے کون میرے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر و اکبرھا، جلد 1، صفحہ 64

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، ما جاء فی الرجل یسألہ ابوہ أن یطلق امرأتہ، جلد 1، صفحہ 142، ایضاً، حدیث 1110، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلہ و الادب، بر الوالدین و انھما أحق بہ، جلد 2، صفحہ 312

آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: اس کے بعد کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تیرا باپ ہے''۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کی محبت اور اس پر شفقت باپ کی محبت کی تین مثل ہونی چاہئے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ماں کا ذکر تین بار فرمایا اور باپ کا ذکر صرف چوتھی بار فرمایا۔ اور جب اس معنی کو جوڑا جائے تو اس کے کئی شواہد مل جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حمل کی صعوبت اور اسے وضع کرنے کی تکلیف، اور دودھ پلانے اور تربیت کرنے کی صعوبت (ایسی چیزیں ہیں) جن کے ساتھ باپ کے سوا ماں منفرد ہوتی ہے، پس یہی وہ تین منازل ہیں جن سے باپ علیحدہ اور خالی ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان سے ایک آدمی نے کہا: میرا باپ سوڈان میں ہے، اور اس نے میری طرف لکھا ہے کہ میں اس کے پاس آؤں، اور میری ماں مجھے اس سے منع کر رہی ہے، تو آپ نے اسے فرمایا: تو اپنے باپ کی اطاعت کر، اور اپنی ماں کی نافرمانی نہ کر۔

پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس پر دلیل ہے کہ ان کے نزدیک دونوں کے ساتھ نیکی کرنا اور احسان کرنا برابر ہے۔ تحقیق حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے اسے ماں کی اطاعت و پیروی کرنے کا حکم دیا اور یہ گمان کیا کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے دو ثلث ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی ہیں اور یہی اس۔ کے خلاف حجت ہے جس نے اختلاف کیا ہے۔ اور محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الرعایہ'' میں یہ بیان کیا ہے کہ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی اور باپ کے لئے ایک چوتھائی ہے؛ اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقتضا کی بنا پر ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنا اس کے ساتھ مختص نہیں ہے کہ وہ دونوں مسلمان ہوں، بلکہ اگر وہ کافر بھی ہوں تب بھی وہ ان سے نیکی کرے گا اور حسن سلوک سے پیش آئے گا جب ان کے لئے کوئی معاہدہ اور امان ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ (الممتحنۃ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میری ماں آئی اور وہ مشرکہ تھی قریش کے عہد اور ان کی مدت میں جب کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے معاہدہ کیا تھا (وہ) اپنے باپ کے ساتھ آئی، تو میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے استفسار کیا اور عرض کی: بے شک میری ماں آئی ہے اور وہ رغبت رکھتی ہے کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں تو اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر (1)''۔ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم ﷺ کے عہد (2) میں میری ماں رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی تو میں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اس سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' ابن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، صلۃ المرأۃ امہا ولہا زوج، جلد 2، صفحہ 884 2۔ ایضاً، کتاب الأدب، صلۃ لوالد المشرک، جلد 2، صفحہ 884

عیینہ نے کہا ہے: پس اللہ عزوجل نے انہی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ہے: لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ (الممتحنہ: 8)

پہلی روایت معلق ہے اور دوسری مسند ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ان دونوں کے ساتھ احسان اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ جب جہاد متعین (فرض عین) نہ ہو تو وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہ جائے۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس تو ان دونوں (کی خدمت) میں رہ اور جہاد کر (1)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اور غیر صحیح میں الفاظ یہ ہیں اس نے کہا: جی ہاں، میں نے انہیں روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جا اور انہیں ہنسا جیسا کہ تو نے انہیں رلایا ہے (2)''۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا اپنے والدین کے ساتھ ان کے بستر پر سونا کہ وہ تیرے ساتھ ہنسی مزاح کریں اور تیرے ساتھ دل بہلائیں یہ تیرے لئے میرے ساتھ جہاد پر جانے سے افضل ہے۔'' اسے ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کے الفاظ ''کتاب برالوالدین'' میں یہ ہیں ہمیں ابونعیم نے خبر دی اور سفیان نے ہمیں عطاء بن سائب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے خبر دی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ وہ آپ کی ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہے، اور اس نے اپنے والدین کو روتے ہوئے چھوڑا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان کی طرف لوٹ جا اور تو انہیں اسی طرح ہنسا جیسے تو نے انہیں رلایا ہے۔'' ابن منذر نے کہا ہے: اس حدیث میں والدین کی اجازت کے بغیر نکلنے سے منع کیا گیا ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، اور جب (حاکم وقت کی جانب سے) جہاد کے لئے اعلان عام ہو جائے تو پھر تمام پر نکلنا واجب ہے۔

اور یہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل بین اور واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش الامراء بھیجا...... اور حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب، اور حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کا قصہ بیان کیا اور یہ کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے اعلان کیا کہ نماز تیار ہے (الصلوٰۃ جامعۃ)، پس لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! نکلو اور اپنے بھائیوں کی مدد کرو اور کوئی پیچھے نہ رہے۔'' پس لوگ شدید گرمی میں پیدل چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نکلے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: اخرجوا فأمدوا اخوانکم اس پر دلیل ہے کہ جہاد سے پیچھے رہنے کا عذر اس وقت تک ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُم

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والأدب، تقدیم بر الوالدین، جلد 2، صفحہ 313

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب الرجل یغزو الخ، حدیث نمبر 2771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب الرجل یغزو ولہ ابوان، صفحہ 205

فانفروا(1) (پس جب تم سے مدد طلب کی جائے تو مدد کیا کرو)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام احادیث اس پر دلیل ہیں کہ فرائض اور مستحبات جب جمع ہو جائیں تو پھر ان میں سے اہم کو مقدم کیا جائے۔ یہ بحث مکمل طور پر محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''الرعایہ'' میں بیان کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ مشرک والدین کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی اجازت کے ساتھ نکلا جائے گا جب کہ جہاد فروض کفایہ میں سے ہے، تو امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: دادے بھی باپ ہیں اور دادیاں بھی مائیں ہیں پس آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوگا اور میں کوئی دلیل نہیں جانتا جو ان کے علاوہ بھائیوں اور دیگر تمام رشتہ داروں میں سے کسی کے لئے یہ حکم ثابت کرتی ہو۔ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ بہنوں کے بارے میں کوشش اور دوڑ دھوپ کرنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل گمان کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کی تکمیل میں سے ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے، پس صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک بہترین نیکی آدمی کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر لے(2)''۔ (یعنی باپ فوت ہو جائے) حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ نے روایت ذکر کی ہے اور یہ بدری صحابی تھے۔ فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انصار میں سے ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے والدین کے فوت ہونے کے بعد نیکی اور احسان میں سے کوئی شے باقی ہے جس کے ساتھ میں ان دونوں کے ساتھ نیکی اور احسان کر سکوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''، ان پر نماز جنازہ پڑھنا، ان کیلئے استغفار کرنا، ان کے بعد ان کے وعدہ کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کی تکریم کرنا اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا جن کے ساتھ تیرا تعلق صرف انہیں کی جانب سے ہو پس یہی وہ امور ہیں جو تجھ پر باقی ہیں۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کی طرف ان کے ساتھ نیکی اور وفا کرتے ہوئے تحائف بھیجا کرتے تھے حالانکہ آپ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقہ حیات ہیں، تو پھر والدین کے بارے تیرا کیا خیال ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ قولہ تعالیٰ: اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا یہاں بڑھاپے کی حالت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جس میں وہ دونوں آدمی کے احسان اور نیکی کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی حالت اور کیفیت تبدیل ہو چکی ہوتی ہے، پس اس حالت میں ان دونوں کے احوال کا لحاظ رکھنا (اور ان کی

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، المبایعۃ بعد فتح المکۃ علی الاسلام والجہاد، جلد 2، صفحہ 130

2۔ ایضاً، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما، جلد 2، صفحہ 314

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی بر الوالدین، حدیث 4476، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیکھ بھال کرنا) اس سے زیادہ لازم قرار دی ہے جتنی اس سے پہلے لازم کی ہے، کیونکہ وہ اس حالت میں اس پر بھاری ہو گئے ہیں پس وہ بڑھاپے میں اس شے کے ملنے کے محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں جس کا وہ اپنے بچپن اور صغر سنی میں محتاج تھا کہ وہ اس سے وہ برتاؤ کریں، پس یہی وجہ ہے کہ ذکر کے ساتھ اسی حالت کو خاص کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ طویل مدت تک آدمی کا ٹھہرے رہنا عادۃً آدمی کے لئے بوجھل اور گراں ہو جاتا ہے اور اکتاہٹ حاصل ہو جاتی ہے اور تنگی بڑھ جاتی ہے پس اس کا غصہ اپنے والدین پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی رگیں ان کے لئے پھولنے لگتی ہیں، اور بیٹا ہونے کے ناطے سے اس کا جرأت کرنا اور دیانت کا کم ہونا ان دونوں پر گراں گزرتا ہے، اور کم سے کم مکروہ اور ناپسندیدہ وہ رویہ ہے جو تنگی اور پریشانی سے اس کی سانس کے مضطرب اور متردد ہونے کے سبب ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی گفتگو اور قول کرے جو عزت و کرامت کے ساتھ متصف ہو، اور وہ ہر عیب سے محفوظ و مامون ہو پس ارشاد فرمایا: **فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا**۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے والدین میں سے ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا'' اور بخاری نے ''کتاب برالوالدین'' میں بیان کیا ہے، مسدد نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) بشر بن مفضل نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) عبدالرحمن بن اسحاق نے ابو سعید مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو اپنے پاس بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا، اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس پر رمضان المبارک کا مہینہ آیا پھر وہ اس سے پہلے گزر گیا کہ اس کی مغفرت کی جائے (2)''۔

ابن ابی اویس نے ہمیں بیان کیا ہے کہ میرے بھائی نے سلیمان بن بلال سے، انہوں نے محمد بن ہلال سے، انہوں نے سعد بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سالمی سے اور انہوں نے اپنے باپ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''منبر لاؤ'' پس جب آپ باہر تشریف لائے تو منبر پر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا: ''امین'' پھر دوسرے زینہ پر چڑھے تو فرمایا: ''امین'' پھر تیسرے زینہ پر بلند ہوئے تو فرمایا: ''آمین''، پس جب آپ فارغ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لائے تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحقیق آج ہم نے آپ سے وہ شے سنی ہے جو پہلے ہم آپ سے نہیں سنتے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے اسے سنا ہے''؟ ہم نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک حضرت جبرائیل علیہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما، جلد 2، صفحہ 314

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ماجاء فی جامع الدعوات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد 2، صفحہ 671

السلام پیش ہوئے اور کہا: وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہو جس نے رمضان المبارک کو پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی تو میں نے کہا آمین۔ اور جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو انہوں نے کہا وہ دور ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا اور اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو میں نے کہا: آمین۔ اور جب میں تیسرے زینے پر بلند ہوا تو انہوں نے کہا وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہوا جس نے اپنے پاس اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا تو میں نے کہا: آمین (1)"۔

ابو نعیم نے ہمیں بیان کیا ہے (انہوں نے کہا) ہمیں سلمہ بن وردان نے بیان کیا ہے میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر ایک سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"۔ پھر دوسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین" پھر تیسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تو آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے آمین کس پر کہی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے کہا: اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود پاک نہ پڑھے تو میں نے کہا: آمین، اور اس کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو پایا اور وہ جنت میں داخل نہ ہوا تو میں نے کہا: آمین (2)" الحدیث۔ پس سعادت مند وہ ہے جو ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی فرصت کو غنیمت جانتا ہے تاکہ وہ ان کی موت کے سبب اس سے فوت نہ ہو جائے کہ پھر وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہو۔ اور شقی (بدبخت) وہ ہے جس نے ان کی نافرمانی کی، بالخصوص وہ جس تک ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کا حکم پہنچا ہوا ہو۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ یعنی تم انہیں اتنا بھی نہ کہو جس میں معمولی سا بھی زچ کرنا ہو۔ ابو رجا عطاردی نے کہا ہے: الاُف سے مراد وہ کلام ہے جو فحش، ردی اور خفی ہو۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے جب تو انہیں بڑھاپے کی حالت میں اس بول و براز میں دیکھے جو انہوں نے طفولیت کی حالت میں دیکھا تو تو انہیں گندہ خیال نہ کر (اور ان سے گھن نہ کر) کہ تو کہے: اف۔ اور آیت اس سے عام ہے۔ اور اف اور تف سے مراد ناخنوں کی میل کچیل ہے۔ اور ہر وہ شے جو بے چین اور تنگ کرتی ہے اور ثقیل سمجھی جاتی ہے اس کے لئے اُف کہا جاتا ہے۔ ازہری نے کہا: التُّفف سے حقیر شے بھی مراد ہے۔ اور اُفٍّ کو منون اور مجرور پڑھا گیا ہے، جیسا کہ اُصوات (آوازیں) کو جر دی جاتی ہے اور انہیں تنوین کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جب آپ کہتے ہیں: صَہٍ اور مَہٍ۔ اور اس میں دس لغات ہیں: اُفَّ، اُفُّ، اُفِّ، اُفًّا، اُفٍّ، اُفٌّ، اُفَّۃ، اِف لک (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) اُفْ (ہمزہ اور فا کے سکون کے ساتھ) اور اُفًا (یعنی فاء کی تخفیف کے ساتھ)۔

اور حدیث میں ہے: "پس آپ نے اپنے کپڑے کی ایک طرف اپنی ناک پر رکھی پھر کہا: اُف اُف" ابوبکر نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس شے کی بو اور گندگی محسوس کرنا جسے سونگھے۔ اور بعض نے کہا ہے: اف کا معنی ہے کسی کو حقیر اور قلیل جاننا، یہ

---

1۔ الترغیب والترہیب، ترہیب من دعا الانسان علی نفسہ وولدہ وخادمہ ومالہ، جلد 2، صفحہ 504، حدیث 2495

2۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 41، حدیث 43848

الاُفف سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی قلیل ہونا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے تیرا کسی ایسی شے کو پھونک مارنا جو ریت اور مٹی وغیرہ سے تجھ پر گرتی ہے، اور اس جگہ کے لئے جس سے تو کوئی شے دور کرنے اور ہٹانے کا قصد کرے تا کہ تو وہاں بیٹھ سکے، پس ہر ثقیل (اور ناپسندیدہ) شے کے لئے یہ کلمہ کہا گیا ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: الاُف سے مراد ناخنوں میں پائی جانے والی میل کچیل ہے اور التف سے مراد ناخنوں کے کٹے ہوئے ریزے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اُف کا معنی بد بو ہے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: الاُف سے مراد کان کی میل ہے، اور التف سے مراد ناخنوں کی میل ہے، پس اس کا استعمال کثیر ہے یہاں تک کہ اسے ہر اس شے میں ذکر کیا گیا ہے جس کے ساتھ کسی کو اذیت دی جاتی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ عقوق (نافرمانی) میں سے کوئی شے اُف سے بھی ادنیٰ اور گھٹیا پاتا تو یقیناً وہ اس کا ذکر کرتا پس نیکی اور احسان کرنے والا جو عمل کرنا چاہے کرے وہ ہرگز جہنم میں داخل نہ ہوگا)۔ اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جو چاہے عمل کرے وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا" ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک والدین کے لئے اس کا اُف کہنا سب سے گھٹیا اور ادنیٰ لفظ ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو کفران نعمت اور ناشکری کے طور پر چھوڑا ہے، اور تربیت کا انکار کیا ہے، اور اس وصیت کو رد کیا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمائی۔ اور اُف وہ کلمہ ہے جو ہر چھوڑی ہوئی شے کے لئے کہا گیا ہے؛ اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: **اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (الانبیاء: 67) (تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا) یعنی تم کو اور تمہارے ساتھ ان بتوں کو چھوڑنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَا تَنْهَرْهُمَا**، النہر کا معنی جھڑکنا اور غصے کا اظہار کرنا ہے۔ **وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا** یعنی تو ان سے بڑی لطافت اور نرمی کے ساتھ گفتگو کرے۔ مثلاً: یا اَبتاہ و یا اُماہ (اے ابا، اے اماں) بغیر اس کے کہ ان کا نام پکارے یا ان کی کوئی کنیت پکارے؛ یہ عطا نے کہا ہے۔ اور ابو البداح تجیبی نے کہا ہے: میں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو کہا قرآن کریم میں والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کے بارے جو کچھ ہے اسے میں جانتا ہوں سوائے اس قول باری تعالیٰ کے: **وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا** یہ قول کریم کیا ہے؟ تو حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلطی کرنے والے غلام کا اپنے آقا کو درشت اور سخت کلمات کہنا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ قولہ تعالیٰ: **وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ** یہ والدین کے ساتھ شفقت و رحمت کرنے سے استعارہ ہے اور ان کے لئے عجز و انکساری اور تذلل کا اظہار کرنا ہے جیسا کہ رعایا امیر کے لئے اور غلام اپنے آقاؤں کے لئے تذلل اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، جیسا کہ اسی طرف حضرت سعید بن مسیب نے اشارہ کیا ہے، اور پروں کو جھکانے اور انہیں کھڑا کرنے کو بیان کیا جیسا کہ پرندے کے پر جس وقت وہ اپنے بچوں کے لئے اپنے پر کھڑے کر لیتا ہے۔ اور الذل سے مراد نرمی کرنا ہے۔ اور جمہور کی قرأت ذال کے ضمہ کے ساتھ ہے، یہ **ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا وَ ذِلَّةً وَ مَذَلَّةً فَهُوَ ذَالٌّ وَ ذَلِيْلٌ** سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ بن زبیر نے الذِّل ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے،

اور یہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: دابۃ ذلول بینۃ الذِّل۔ اور جانوروں میں ذِل سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس کو مطیع بنانا آسان ہو مشکل نہ ہو، پس اس آیت کے حکم سے چاہئے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے والدین کے ساتھ انتہائی اچھی عجز وانکساری میں رکھے، اپنے اقوال، حرکات وسکنات اور اپنے دیکھنے میں، اور وہ ان کی طرف اپنی تیز نگاہ سے نہ دیکھے کیونکہ وہ غصے والے کی نظر ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین موجود نہ تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿﴾ (الشعراء) میں الذُّل کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہاں حق کی عظمت اور اس کی تاکید کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنَ الرَّحْمَةِ میں مِنَ بیان جنس کے لئے ہے، یعنی بے شک یہ جھکنا ایسی رحمت اور شفقت سے ہو جو نفس (دل) میں راحت وسکون پہنچانے والی ہو، نہ کہ وہ کام لینے کے اعتبار سے ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ انتہا غایت کے لئے ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے آباء پر رحم کرنے اور ان کے لئے دعا مانگنے کا حکم ارشاد فرمایا، اور یہ کہ تو ان کے ساتھ رحم کا سلوک کر جیسے انہوں نے تجھ پر رحم اور شفقت کی اور تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کر جیسے انہوں نے تیرے ساتھ نرمی کی، جب وہ تیرے والی اور محافظ تھے اس حال میں کہ تو صغیر تھا، جاہل اور محتاج تھا پس انہوں نے تجھے اپنی ذاتوں پر ترجیح دی، وہ اپنی راتیں جاگتے رہے، وہ خود بھوکے رہے اور تجھے خوب پیٹ بھر کر کھلایا، وہ خود ننگے رہے اور تجھے لباس پہنایا، پس تو انہیں جزا اور بدلہ نہ دے مگر (اس وقت) کہ جب وہ بڑھاپے کے سبب اس حد کو پہنچ جائیں جس میں تو عہد طفولیت میں تھا۔ اور تو ان کا والی ومددگار ہو جیسا کہ وہ تیرے والی اور مددگار رہے، اور اس وقت ان کے لئے ترجیح وتقدم کی فضیلت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بیٹا والد کو جزا اور بدلہ نہیں دے سکتا مگر یہ کہ وہ اسے کسی کی ملکیت میں پائے اور پھر اسے خرید لے اور اسے آزاد کر دے (1)''۔ اس حدیث کے بارے میں بحث سورۂ مریم میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا رَبَّيٰنِيْ تربیت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے تاکہ بندے کو والدین کی شفقت اور تربیت کے دوران ان کی مشکلات اور مشقت یاد آئے، پس یہ اس میں ان کے ساتھ شفقت اور نرمی ومہربانی کا سلوک کرنے میں اضافہ کا باعث ہوگا، اور یہ سب مومن والدین کے بارے میں ہے۔ اور قرآن کریم نے مشرک مرنے والوں کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ وہ انتہائی قریبی ہوں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ منسوخ ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿﴾ (التوبہ)

پس جب مسلمان کے والدین ذمی ہوں تو وہ ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے، مگر کفر پر ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے رحم کی دعا نہ کرے، کیونکہ یہ اکیلا حکم مذکورہ آیت کے ساتھ منسوخ

1۔ صحیح مسلم، کتاب العتق، باب فضل العتق الوالد، جلد 1، صفحہ 495

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نسخ کا محل نہیں ہے، پس یہ تو مشرک والدین کے لئے دنیوی رحمت کے بارے دعا ہے جب تک وہ زندہ رہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا اس آیت کا عموم اسی کے ساتھ خاص ہے، نہ کہ آخرت کی رحمت کے ساتھ، بالخصوص جب یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کیا، تو ان کی ماں نے اپنے آپ کو ننگے بدن سخت گرمی (دھوپ) میں ڈال دیا، اس کا ذکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: مناسب ہے وہ مرجائے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مسلمان والدین کے لئے دعا کرنے کے بارے خاص ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کا عموم اسی طرح ہے جیسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ آدمی جس نے شام اس حال میں کی کہ وہ اپنے والدین کو راضی کرنے والا ہو اور صبح کی شام کی اور صبح کی، تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہیں اگر چہ وہ ایک سے داخل ہوگا پھر ایک سے، اور جس نے شام اور صبح کی اس حال میں کہ وہ اپنے والدین کو ناراض کرنے والا ہو اور اس نے شام اور صبح اسی طرح کی تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے ہیں۔ اگر چہ وہ ایک میں داخل ہوگا اور پھر ایک میں۔'' تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو، اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو، اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو۔'' اور ہم نے اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے شک میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کو کہا: ''تو اپنے باپ کو میرے پاس لے آ''۔ پس اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: بے شک اللہ عزوجل آپ کو سلام فرما رہا ہے اور آپ کو فرما رہا ہے کہ جب وہ بوڑھا شیخ آپ کے پاس آئے تو اس سے اس شے کے بارے پوچھنا جو اس نے اپنے دل میں کہی اور اس کے کانوں نے اسے نہیں سنا۔'' پس جب وہ بوڑھا شیخ آیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تیرے بیٹے کو کیا ہوا ہے وہ تیری شکایت کر رہا ہے کیا تو اس کا مال لینا چاہتا ہے؟ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے پوچھئے کیا میں اسے اس کی پھوپھیوں یا اس کی خالاؤں میں سے کسی ایک یا اپنی ذات کے سوا کسی پر خرچ کرتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خاموش رہ، تو ہمیں اس سے رہنے دے، تو مجھے اس شے کے بارے بتا جو تو نے اپنے دل میں کہی تیرے کانوں نے اسے نہیں سنا؟ تو اس بوڑھے شیخ نے کہا: قسم بخدا! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہمارے یقین میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے، تحقیق میں نے اپنے دل میں کوئی چیز کہی جسے میرے کانوں نے نہیں سنا۔ آپ نے فرمایا: ''تم کہو اور میں سن رہا ہوں'' اس نے کہا میں نے کہا:

غَذَوتُكَ مولودا و مُنْتُكَ يافِعا تُعَلّ بما أجْني عليك و تُنْهَلُ
إذا ليلةٌ ضافَتْكَ بالسُّقم لم أبِتْ لسُقْمك إلاساهرا أتململُ
كأني أنا المطروق دونك بالذي طُرِقتَ به دوني فعيْني تَهْمُلُ

تخاف الرّدی نفسی علیك و إنها | لتعلم أن الموت وقتٌ مؤجّل
فلما بلغتَ السِّنّ والغایةَ التی | إلیها مَدَی ما کنتُ فیك أؤَمِّلُ
جعلتَ جزائی غِلظةً و فظاظةً | کأنك أنت المُنعِم المُتفضِّلُ
فلیتك إذ لم ترْعَ حقّ أبوّتی | فعلتَ کما الجار المُصاقِب یفعلُ
فأولیتنی حقّ الجِوار ولم تکن | علیّ بمال دون مالك تبخَلُ

راوی نے کہا: پس اس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کے گریبان کو پکڑا اور فرمایا: انت و مالك لأبیك(1) (تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے)۔ طبرانی نے کہا ہے: نخعی یہ حدیث ابن منکدر سے اس طرح مکمل اور اشعار کے ساتھ سوائے اس سند کے روایت نہیں کرتے اور عبید اللہ بن خلصہ اس کے ساتھ منفرد ہیں۔ واللہ اعلم۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

''تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک کردار ہو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ بکثرت توبہ کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ والدین کے ساتھ رحم و مہربانی کرنے اور ان پر شفقت کرنے کے اعتقاد میں سے تمہارے دلوں میں ہے یا اس کے علاوہ نافرمانی یا محض ریاکاری کے لئے ظاہراً ان سے نیکی اور احسان کرنے میں سے (جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)، اور ابن جبیر نے کہا ہے: مراد وہ جلد بازی ہے جو تیزی میں ہو جاتی ہے(2)، جیسا کہ بغیر ارادہ کے تیزی سے کوئی کام ہو جانا اور پھسل جانا، یہ آدمی سے اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے، اور اس سے کسی تکلیف کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ یعنی اگر تم والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی نیت میں سچے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی جلد بازی کو معاف فرما دیتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا یہ اصلاح اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت کی طرف بار بار لوٹنے اور رجوع کرنے کی شرط کے ساتھ مغفرت اور بخشش کا وعدہ ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ وہ بندہ ہے جو توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا اور پھر گناہ کرتا ہے(3)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''الاواب'' ''الحفیظ الذی اذا ذکر خطایا، استغفر منها'' (وہ توبہ کی حفاظت کرنے والا کہ جب وہ اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے تو ان سے استغفار کرتا ہے۔) اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: اواب سے مراد وہ لوگ ہیں جو تنہائی اور خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں پھر اللہ عزوجل سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ اقوال باہم قریب ہیں۔ اور عون عقیلی نے کہا ہے: اوابون وہ ہیں جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں اور صحیح میں ہے: صلاۃ

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 466، حدیث 45471۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب مال الرجل من مال ولدہ، حدیث 2281، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 80 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 239

الاوابین حین ترمض الفصال (1) (اوابین کی نماز اس وقت ہوتی جب اونٹ کے بچوں کے قدم جلیں) اور لفظ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آب یؤوب سے ہے جب وہ رجوع کرلے، لوٹ آئے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

''اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کیا کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکر گزار ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ یعنی رشتہ دار کو اس کا حق اسی طرح دیا کرو جیسے تم والدین کے حق کی رعایت کرتے ہو اور صلہ رحمی کرو، پھر مسکین اور مسافر پر بھی صدقہ کرو۔ اور قول باری تعالیٰ: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کے بارے میں علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے حقوق بیت المال سے دینے کا حکم فرمایا ہے (2)، یعنی غزوہ اور مال غنیمت میں سے ذوالقربیٰ کے حصہ سے (ان کا حق ادا کرو) اور یہ خطاب والیوں یا ان کے قائم مقام حاکموں کو ہوسکتا ہے۔ اور اس آیت میں صلہ رحمی، حاجت کو پورا کرنے، ضرورت کے وقت مال کے ساتھ غمخواری کرنے اور ہر اعتبار سے معاونت کرنے میں سے جو متعین ہیں وہ سب اس میں ملا دیئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُبَذِّرْ یعنی بغیر حق کے مال خرچ کرنے میں فضول خرچی نہ کر۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: تبذیر سے مراد مال کو غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور خیر اور نیکی کے عمل میں تبذیر (فضول خرچی) نہیں ہے۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: التبذیر سے مراد مال کو اس کے حق سے لینا اور اسے غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور یہی اسراف (فضول خرچی) ہے، اور یہ حرام ہے (3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ اور اللہ تعالیٰ کے قول اِخْوَانَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کے تابع ہیں، کیونکہ مبذر (فضول خرچی کرنے والا) فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ شیاطین۔ یا یہ کہ وہ ایسے کام کرتے ہیں جو ان کے نفس ان کے لئے مزین اور آراستہ کردیتے ہیں، یا یہ معنی ہے کہ انہیں کل (قیامت کے دن) جہنم میں ان (شیاطین) کے ساتھ ملا دیا جائے گا؛ یہ تین اقوال ہیں۔

یہاں الاخوان اخ کی جمع ہے جو کہ نسبی بھائی نہ ہو، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) اور قول باری تعالیٰ: وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا یعنی تم شیطان کی متابعت اور فساد میں اس کی مشابہت اختیار کرنے سے بچو۔ اور الشیطان اسم جنس ہے۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اخوانَ الشیطان مفرد پڑھا ہے، اور اسی

---

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 807، حدیث 21506
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203

طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ثابت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نے اپنا مال حاجات وضروریات سے زائد شہوات میں خرچ کیا اور اس نے اسے ختم اور فنا کرنے کے لئے اس طرح پیش کیا تو وہ فضول خرچ ہے۔ اور جس نے اپنے مال کا نفع اپنی شہوات میں خرچ کیا اور اصل مال یا غلام محفوظ رکھا تو وہ فضول خرچ نہیں ہے۔ اور جس نے ایک درہم حرام میں خرچ کیا تو وہ فضول خرچ ہے اور اس پر وہ درہم حرام میں خرچ کرنے پر پابندی لگائی جائے گی، اور اگر اس نے اسے شہوات میں خرچ کیا تو اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی مگر جب اس کے بارے فنا کرنے اور ضائع کرنے کا خوف ہو (1) (تو پھر پابندی لگادی جائے گی۔)

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

''اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے ان سے منہ پھیرنا پڑے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جس کی تمہیں توقع ہے (اس اثنا میں) ان سے بات کرو جو بڑی نرمی سے کرو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس قول کے ساتھ خاص کیا ہے: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اور یہ انتہائی عجیب اور خوبصورت تادیب ہے اور انتہائی عمدہ اور لطیف قول ہے، یعنی آپ ان سے غنی اور قدرت کے ہوتے ہوئے حقیر سمجھنے والوں کے اعراض کی طرح اعراض نہ کریں کہ آپ انہیں محروم کر دیں۔ بلاشبہ کسی عارض آنے والے عجز اور پیش آنے والی رکاوٹ (تنگدستی) کے وقت آپ کا ان سے اعراض کرنا (منہ پھیرنا) جائز ہے، اور آپ اس وقت الله سبحانہ وتعالیٰ سے خوشحالی کا دروازہ کھولنے کی توقع اور امید رکھیں تا کہ آپ اس کے سبب سائل کی دلجوئی اور غمخواری کر سکیں، پس اگر آپ پر ایسی حالت طاری ہو تو اس دوران ان سے بڑی نرمی کے ساتھ بات کرو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کے سبب نزول کے بارے میں ابن زید نے کہا ہے: یہ آیت ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگتے تھے اور آپ انہیں دینے سے انکار فرما دیتے تھے، کیونکہ آپ ان کے بارے یہ جانتے تھے کہ وہ مال فساد وغیرہ پھیلانے میں خرچ کرتے ہیں، پس ان سے اس رغبت کے تحت منہ پھیر لیتے تھے کہ ان کو فساد سے روکنے میں اجر ہے تا کہ آپ ان کے فساد میں ان کے معاون اور مددگار ثابت نہ ہوں (2)۔ اور عطا خراسانی نے قول باری تعالیٰ: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا کے بارے میں کہا ہے: یہ والدین کے ذکر میں نہیں ہے، (بلکہ) مزینہ قبیلے سے کچھ لوگ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے وہ آپ سے سواریوں کا مطالبہ کرنے لگے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں کوئی شے نہیں پاتا جس پر میں تمہیں اٹھاؤں'' (سوار کروں) پس وہ واپس پھرے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں غم کے آنسو بہا رہی تھیں، تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اس میں رحمة سے مراد الفیء (مال فئی) ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لئے دعا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، یعنی ان کے لئے اپنی دعا کے ساتھ ان کا فقر وافلاس ان پر آسان کر دو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لئے ایسی دعا کرو جو ان کے لئے فتح اور اصلاح کو متضمن ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ کا معنی ہے: یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اپنے ہاتھ کے تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں دینے سے منہ پھیریں تو اس اثنا میں ان سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو، یعنی انتہائی حسین اور خوبصورت انداز میں بات کریں اور اپنا عذر بیان فرمادیں، اور ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرمادیں، اور یہ کہیں: جب میں نے وسعت پائی تو میں ضرور دوں گا اور عزت وتکریم بھی کروں گا، کیونکہ مواسات اور غمخواری کا عمل اپنے نفس کی خوشی اور خوشحالی کی حالت میں کیا جاسکتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی چیز کے بارے سوال کیا جاتا اور آپ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رزق آنے کا خاموشی سے انتظار کرتے (کیونکہ آپ) سائل کو رد کرنا ناپسند کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی چیز مانگی جاتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو آپ فرماتے: ''اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔'' پس اس تاویل کی بنا پر رحمۃ سے مراد وہ رزق ہے جس کا انتظار کیا جائے۔ اور یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اور عَنْهُمْ کی ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر آباء، قرابتداروں، مساکین اور مسافروں میں سے پہلے گزر چکا ہے۔ اور قَوْلًا مَّيْسُوْرًا یعنی ایسی بات جو انتہائی نرم، لطیف اور اچھی ہو، یہ مفعول بمعنی فاعل ہے، اور لفظ یُسر سے ماخوذ ہے جیسا کہ میمون ہے، یعنی حسین وجمیل وعدہ، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔

اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اِلّا تکن وَرِقٌ یوما أجود بها     للسائلین فانّی لیّن العُودِ

لایعدم السائلون الخیر من خلقی     إمّانوالی وامّا حسنُ مردودی

تو کہتا ہے: یَسَّرتُ لك كذا جب تو اسے تیار کر دے (تو تو کہے گا میں نے تیرے لئے اس طرح آسانی کر دی)۔

**وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾**

''اور نہ بنالو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کے اردگرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو ورنہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کئے ہوئے درماندہ۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ یہ مجاز ہے اور اس کے ساتھ اس بخیل کو تعبیر کیا گیا ہے جو اپنے دل سے اپنے مال میں سے کوئی شے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتا، پس اس کی مثال اس طوق کے ساتھ بیان کی گئی جو تصرف بالید سے مانع ہوتا ہے۔ اور صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی کہ وہ ایسے دو آدمیوں کی طرح ہیں جن پر لوہے کے دو جبے ہوں اس حال میں کہ ان کے ہاتھ ان کے سینے اور ان کی ہنسلی کی جانب جکڑے ہوئے ہوں پس صدقہ کرنے والا جب بھی کوئی صدقہ دیتا ہے تو وہ (جبہ) اس سے کھل جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے پوروں کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسکے (چلنے کے) اثر (نشان) کو مٹا دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے۔ اور بخیل کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ جب بھی صدقہ کا قصد اور ارادہ کرتا ہے تو وہ (جبہ) اور سکڑ جاتا ہے اور ہر حلقہ اپنی جگہ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: پس میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی انگلیاں اس طرح اپنے گریبان میں ڈال کر یہ بیان کرتے ہوئے دیکھا ہے پس اگر تو آپ کو اسے وسیع (کھلا) کرتے ہوئے دیکھتا اور تو وسیع نہ کرتا(1) (تو تجھے تعجب ہوتا۔)

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ مال کو ختم کرنے کے لئے کھلے ہاتھ کے ساتھ مثال بیان فرمائی، پس اگر ہتھیلی کو بند کر لیا جائے تو جو کچھ اس میں ہوتا ہے وہ اسے روک لیتی ہے، اور اسے بالکل کھول دینا اسے ختم کر دیتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔ یہ سارے کا سارا خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، اور ایسا قرآن کریم میں کثرت سے آیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے سردار ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کے لئے واسطہ ہیں تو پھر آپ کی ذات کے ساتھ ان کو تعبیر کیا گیا ہے اور یہ اس بارے میں عربوں کی عادت جاریہ کے مطابق ہے۔ اور یہ بھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی چیز دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کرتے تھے، اور فاقہ کشی کرتے تھے حتیٰ کہ بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ اور بہت سے صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام اموال خرچ کر دیتے تھے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر کوئی سختی نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں منع کرتے تھے اس لئے کہ ان کا یقین صحیح اور ان کی بصیرت مضبوط اور پختہ تھی۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خرچ کرنے میں افراط سے منع فرمایا ہے، اور اس آدمی کو اپنا سارا مال نکالنے سے منع فرمایا ہے جس کے بارے اپنے ہاتھ سے نکالے گئے مال پر حسرت و درماندگی کا خوف ہو، اور رہا وہ جس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر وثوق ہو اور جو اس نے خرچ کیا ہے اس پر ثواب جزیل کا یقین ہو تو وہ اس آیت کی مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ خطاب صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ خاص ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کو خرچ کرنے کی کیفیت کی تعلیم دی ہے اور آپ کو میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ایک بچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: میری ماں اس اس طرح کا آپ سے سوال کر رہی ہے (یعنی فلاں فلاں چیز مانگ رہی ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج تو ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے۔'' اس نے کہا: پس وہ آپ کو کہتی ہے اپنی قمیص مجھے پہنا دو۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک اتاری اور وہ اسے دے دی اور خود گھر میں ننگے بیٹھ گئے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اذان کہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرنے لگے، اور دل مشغول ہو گئے، تو ان میں سے بعض اندر آئے دیکھا تو آپ ننگے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، مثل المنفق والبخیل، جلد 1، صفحہ 328

بدن (یعنی قمیص کے بغیر) تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ سب خیر اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کے بارے ہے، اور رہا فساد کے لئے خرچ کرنا تو وہ قلیل ہو یا کثیر سب حرام ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت نے ان امور میں ساری دولت خرچ کرنے سے منع کیا ہے جن میں مومنین کی طرف سے پہلے مطالبہ ہوتا ہے، اس لئے کہ جو اس کے بعد آئے وہ اس شے سے محروم نہ رہے یا پھر منفق اپنے اہل وعیال کو محروم نہ کر دے۔ اور اسی طرح کسی حکیم اور دانا کا قول ہے: میں نے کبھی کوئی فضول خرچی نہیں دیکھی مگر یہ کہ وہ اپنے ساتھ کوئی حق ضائع کرنے والی ہوتی ہے۔ اور یہ آیت نفاہت حال سے متعلقہ آیات میں سے ہے پس اس کا حکم نہیں بیان کیا جا سکتا مگر لوگوں میں سے ایک ایک شخص کے اعتبار سے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ابن عرفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے آپ نہ فضول خرچی کریں اور نہ اپنا مال ضائع کریں کہ آپ درماندہ ہو کر اور نفقہ وتصرف سے بالکل کٹ کر باقی رہ جائیں، جیسے تھکا ماندہ اونٹ ہوتا ہے، اور یہ وہ ہے جس کی قوت ختم ہو جائے اور اس کے سبب اس کے لئے اٹھنا، چلنا ممکن نہ رہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۝ (ملک) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام درآنحالیکہ وہ تھکی ماندی ہوگی۔) یعنی آنکھ تھکی اور کٹی ہوگی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی ورنہ تم اپنے کئے پر نادم ہو کر بیٹھ جاؤ گے (1)، پس انہوں نے اسے حسرت سے بنایا ہے، اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ الحسرۃ سے فاعل حسر اور حسران آتا ہے اور محسور نہیں آتا۔ اور الملوم سے مراد وہ ہے جس پر مال ضائع کرنے کی وجہ سے ملامت کی جاتی ہو، یا اسے وہ ملامت کرتا ہے جسے وہ دیتا نہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ۝ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِیَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا ۝

”بے شک آپ کا رب کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) یقیناً وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے خوب آگاہ ہے اور (انہیں) دیکھنے والا ہے۔ اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے، ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی، بلاشبہ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت کے بارے میں سورۃ الانعام میں بحث گزر چکی ہے، والحمد للہ۔ اور الاملاق سے مراد فقر وافلاس اور ملکیت کا نہ ہونا ہے۔ أملق الرجل یعنی اس کے لئے سوائے مَلَقَات کے کچھ باقی نہیں رہا اور ملقات سے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15-16، صفحہ 91

مراد بڑے بڑے ہموار اور چکنے پتھر ہیں۔

ہذلی نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

أُتِيحَ لها أقَيْدِرُ ذو حَشِيف　　　إذا سامَتْ على المَلَقات ساما

ملقات کا واحد ملَقَة ہے۔ اور أُقيدر، اقدر کی تصغیر ہے، مراد چھوٹے قد کا آدمی ہے۔ اور الحشیف من الشیاب سے مراد پرانا کپڑا ہے۔ اور سامت کا معنی مرّت (وہ گزری) ہے۔ اور شمر نے کہا ہے: املق لازم اور متعدی دونوں طرح ہے، أملَقَ جب کوئی محتاج ہو جائے، اور أملق الدّهر ما بيده (زمانے نے اس کے ہاتھ میں جو تھا اسے ختم کر دیا۔)

اوس نے کہا ہے:

وأملق ما عندی خطوب تنَبّلُ

**مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: خطأً** خا کے کسرہ، طا کے سکون اور ہمزہ اور قصر کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور ابن عامر نے **خطأً** خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی ابوجعفر یزید کی قرأت ہے۔ اور یہ دونوں قرأتیں خَطِئَ سے ماخوذ ہیں جب کوئی آدمی جان بوجھ کر گناہ کرے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ فی ذنبه خَطأً جب وہ اس میں گنہگار ہو، اور أخطأ جب کوئی خطا کے راستے پر چلے چاہے بالارادہ چلے یا بغیر ارادہ کے۔ فرمایا: اور خَطِئَ أخطأ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ يخطأ خِطئا جب کوئی خطا اور غلطی کا قصد کرے) جیسا کہ أَثِم يأثم اِثما ہے۔ اور أخطأ جب وہ ارادہ اور قصد نہ کرے، إخطاء و خطأ۔

شاعر نے کہا ہے:

دَعِینی إنما خَطَئِی وَصَوْبِی　　　علیّ وإنّ ما أهلکتُ مالُ

اس میں خَطَئِی بالقصد غلطی کرنے کے معنی میں ہے۔

اور الخطأ اسم الاخطاء کے قائم مقام ہوتا ہے، اور یہ صواب کی ضد ہے اور اس میں دو لغتیں ہیں، ایک قصر اور یہی جید اور عمدہ ہے، اور دوسری مد کے ساتھ اور یہ قلیل ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خَطأً خا کے فتحہ، طا کے سکون اور ہمزہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور ابن کثیر نے اسے خا کے کسرہ، طا کے فتحہ اور ہمزہ کی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں اس قرأت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں پاتا، اسی وجہ سے ابوحاتم نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: یہ خاطأ یخاطئ سے مصدر ہے، اگرچہ ہم خاطأ نہیں پاتے، لیکن ہم نے تخاطأ پالیا ہے، اور یہ خاطأ کا مطاوع ہے، پس اس پر انہوں نے ہماری راہنمائی کی ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

تَخَاطَأَت النَّبلُ احشاءَہ　　　وأَخّرَ يومی فلم أَعْجَلِ(1)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452

اور مهاة (حسن) کے وصف میں کسی دوسرے نے کہا ہے:

تخاطأه القنّاص حتى وجدته　　و خرطومُه في مَنْقَع الماء راسِبُ(1)

اور جوہری نے تخاطأه بمعنی أخطأه کیا ہے۔

اور اوفی بن مطر مازنی نے کہا ہے:

ألا أبلغا خُلّتي جابرا　　بأنّ خليلك لم يُقْتَلِ

تخاطأت النَّبْلُ أحشاءه　　وأخّر يومي فلم يَعْجَلِ

اور حسن نے خطاء خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ کو مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ لغت میں معروف نہیں ہے پس یہ غلط ہے، جائز نہیں ہے۔ اور ابو الفتح نے کہا ہے: الخطأ أخطات سے ہے جیسا کہ عطاء اعطیت سے ہے، اور یہ اسم بمعنی مصدر ہے، اور حسن سے بھی خَطَئی خا کے فتحہ کے ساتھ اور طا کی تنوین کے ساتھ بغیر ہمزہ کے مروی ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝

''اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے، اور بہت ہی برا راستہ ہے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى یہ وَلَا تزنوا کہنے سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے تم بدکاری کے قریب نہ جاؤ۔ اور الزنی کے لفظ میں مد اور قصر دونوں لغتیں ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

كانت فريضة ما تقول كما　　كان الزِّناء فريضةَ الرَّجْم

اور سَبِيْلًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے؛ تقدیر کلام ہے: وساء سبیله سبیلاً (اور اس کا راستہ بہت ہی برا راستہ ہے) یعنی کیونکہ یہ جہنم تک پہنچا دیتا ہے۔ اور زنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور اس میں اور اس کی قبح میں کوئی اختلاف نہیں ہے بالخصوص جب یہ پڑوسی کی بیوی کے ساتھ ہو، اس سے غیر کے بچے کو خادم اور نائب بنانا ہوتا ہے اور اسے ہی بیٹا بنانا ہوتا ہے اور علاوہ ازیں اسے میراث سے حصہ دیا جاتا ہے اور پانیوں کے اختلاط کے سبب نسبوں میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور صحیح میں روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم باب فسطاط پر ایک حاملہ عورت کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: ''شاید وہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے وطی کرے''۔ تو لوگوں نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے قصد کیا ہے کہ میں اس پر ایسی لعنت بھیجوں جو اس کی قبر میں اس کے ساتھ داخل ہو وہ کیسے اسے وارث بنائے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگا وہ کیسے اس سے خدمت لے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگا(2)؟''۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452
2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، تحریم وطی الحامل، جلد 1، صفحہ 465

''اور نہ قتل کرو اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو قتل کیا جائے ناحق تو ہم نے مقتول کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) حق دے دیا ہے پس اسے چاہئے کہ قتل میں اسراف نہ کرے، ضرور اس کی مدد کی جائے گی۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ سورۃ الانعام میں اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۝۳۳۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا اور جو آدمی بغیر ایسے سبب کے قتل کیا گیا جو قتل کو واجب اور ثابت کرتا ہو۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ تو ہم نے اس کے ولی یعنی اس کے خون کے مستحق کو (قصاص کے مطالبہ کا حق دے دیا ہے)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ولی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو، کیونکہ لفظ مذکر کے ساتھ اسے ولایت کے ساتھ مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے قول باری تعالیٰ: فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ میں ذکر کیا ہے کہ یہ ارشاد مطلق لفظ ولی سے عورت کے نکلنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بالخصوص عورتوں کے لئے قصاص میں اس کا کوئی حق نہیں ہے اور اس (عورت) کے معاف کرنے کے بارے میں بھی کوئی روایت نہیں ہے، اور نہ اس کے لئے پورا حق لیتا ہے۔ اور مخالف نے کہا ہے: بے شک یہاں ولی سے مراد وارث ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں)۔

اور مزید فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (الانفال: 72) (اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی نہیں تمہارے لئے ان کی وراثت سے کوئی چیز) اور مزید فرمایا: وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الانفال: 75) (اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، کتاب اللہ کی رو سے)۔ پس یہ تمام وارثوں کے لئے قصاص کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے، اور رہا وہ جو انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لفظ ولی اپنے ظاہر کے اعتبار سے مذکر ہے اور وہ واحد ہے، مفرد ہے، تو گویا وہ اس کی طرح ہے جو جنس کے معنی میں ہوتا ہے اور جنس میں مذکر و مونث سبھی برابر ہوتے ہیں، اور اس کی مکمل بحث مختلف کتب میں ہے (جو دونوں نظریات سے متعلق ہیں۔)

سُلْطٰنًا یعنی ہم نے اسے اس پر ایسے مسلط کر دیا ہے کہ اگر چاہے تو وہ اسے (قاتل کو) قتل کر دے اور اگر چاہے تو اسے معاف کر دے، اور اگر چاہے تو اس سے دیت لے لے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک، اشہب اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے (1)۔ اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: سلطان سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر (حکم) ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سلطان سے مراد اس کا مطالبہ کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، اور ان میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1208

زیادہ واضح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے پھر بلا شبہ اللہ عزوجل کا امر بطور نص واقع نہیں ہوا لہٰذا اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: (کہ اسے) صرف قتل کا حق حاصل ہے۔ اور اشہب نے کہا ہے: اسے اختیار ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اس میں تین اقوال ہیں: مقتول کے قاتل کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا؛ یہ حضرات حسن، ضحاک، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے...... اس کے ولی کے بدلے دو قتل نہیں کئے جائیں گے جیسا کہ عرب اس طرح کرتے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے...... قاتل کا مثلہ نہیں کیا جائے گا؛ یہ طلق بن حبیب نے کہا ہے۔ اور یہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ان میں وہ اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور نے یُسْرِفْ یا کے ساتھ پڑھا ہے(2)، مراد ولی ہے (یعنی وہ اسراف نہ کرے)، اور ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تسرف تا کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہی حضرت حذیفہ کی قرأت ہے۔ اور عطاء بن عبدالکریم نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ (حکم) پہلے قاتل کے لئے ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس کا معنی یہ ہے فلا تسرف ایھا القاتل۔ (اے قاتل! تو اسراف نہ کر) اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے ائمہ کو خطاب کے معنی میں ہے، یعنی تم غیر قاتل کو قتل نہ کرو(3)۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے: فلا تسرفوا فی القتل (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا یعنی بلا شبہ اس کی مدد اور معاونت کی جائے گی، یعنی ولی کی مدد کی جائے گی۔ اور اگر کہا جائے: کتنے ولی ہیں جن کی مدد چھوڑ دی گئی اور وہ اپنے حق تک نہ پہنچ سکے؟ تو ہم کہیں گے: معونت کبھی حجت اور دلیل کے ظاہر ہونے کیساتھ ہوتی ہے اور کبھی اسے مکمل طور پر پانے کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی ان کے مجموعے کے ساتھ ہوتی ہے، پس ان میں سے جو بھی ہو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مدد و نصرت ہی ہے۔ اور ابن کثیر نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بے شک مقتول مدد کیا گیا ہے(4)۔ نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معنی یہ ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کے ولی کے ساتھ اس کی مدد کی ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابی کی قرأت میں ہے فلا تسرفوا فی القتل ان وَلِیَّ المقتولِ کان منصورا (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو بے شک مقتول کے ولی کی مدد کی جائے گی)۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زیادہ بین یا ہے اور وہ ولی کے لئے ہوگی، کیونکہ بلا شبہ یہ کہا جا رہا ہے: وہ اسراف نہ کرے اگر اس کو قتل کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور یہ ولی کے لئے ہی ہے۔ اور تا کے ساتھ ہو تب بھی ولی کے لئے جائز ہوسکتا ہے، مگر اس میں وہ مخاطب کی تحویل کا محتاج ہوگا۔ ضحاک نے کہا ہے: یہ پہلی آیت ہے جو قتل کے بارے میں قرآن کریم میں نازل ہوئی، اور یہ مکی ہے(5)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1209　　2۔ ایضاً　　3۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 95
4۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 97　　5۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 96

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

''اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اس یتیم کے لئے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو بیشک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ اس کے بارے میں کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اس کے بارے کئی مقامات پر کلام گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ہر وہ کام جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جس سے منع کیا ہے پس وہی عہد ہے (1)۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا عنہ، بے شک اس عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ پس کلام میں عنہ محذوف ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ (التحریم) بہ (اور وہی کرتے ہیں جس کے بارے وہ حکم دیئے جاتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک عہد کے بارے عہد توڑنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا: تو نے کیوں توڑا ہے؟ جیسا کہ زندہ درگور کی گئی بچی سے درگور کرنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

''اور پورا پورا ماپو جب تم کسی چیز کو ماپنے لگو اور تولو تو اسے ترازو سے تولو جو بالکل درست ہو، یہی طریقہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ اس کے بارے کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

اور یہ آیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ کیل (ماپ) کرنا بائع کے ذمہ ہے، یہ سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور الْقِسْطَاس (قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) سے مراد میزان (ترازو) ہے اور یہ لغت روم کا لفظ ہے؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القسطاس، ترازو چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: القسطاس سے مراد عدل کرنا ہے، اور آپ فرماتے تھے: یہ لغت رومیہ سے ہے، گویا کہ لوگوں کو کہا گیا ہے: اپنے وزنوں میں عدل کرتے ہوئے وزن کرو (2)۔ اور ابن کثیر، ابو عمرو، نافع، ابن عامر اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں القِسطاس قاف کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں (3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 242　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 445　　3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا یعنی پورا پورا ماپ کرنا اور صحیح صحیح وزن کرنا تیرے رب کے نزدیک بہتر اور زیادہ باعث برکت ہے۔ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔ حسن نے کہا ہے: ہمارے لئے ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی حرام پر قادر نہیں ہوتا پھر وہ اسے چھوڑ دیتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت سے پہلے دنیا میں جلدی ملنے والی نعمت کیساتھ بدل دیتا ہے جو اس کے لئے اس (حرام) سے بہتر ہوتی ہے (1)۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝

''اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْفُ یعنی پیروی نہ کرو اس کی جسے تم جانتے نہیں اور نہ وہ تیرا مقصود اور مراد ہو سکتی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو نہ کہہ میں نے دیکھا ہے حالانکہ تو نے نہیں دیکھا، اور میں نے سنا ہے حالانکہ تو نے نہیں سنا (2)، اور میں جانتا ہوں حالانکہ تو نہیں جانتا؛ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس چیز کے سبب کسی کی مذمت نہ کر جس کے بارے تیرے پاس علم نہیں ہے؛ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جھوٹے آدمی کا شہادت دینا ہے (3)۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ظن اور وہم کی پیروی نہ کر۔ اور یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ اور القفو کا اصل معنی بہتان لگانا اور کسی باطل کی تہمت لگانا ہے اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہم بنو نضر بن کنانہ اپنی ماں کی پیروی نہیں کرتے اور نہ ہم اپنے باپ سے نفی کرتے ہیں (4)''۔ یعنی ہم اپنی ماں کو برا نہیں کہیں گے۔

اور کمیت نے کہا ہے:

فلا أرمي البرئ بغير ذنب ولا أقفو الحواصن إن قُفينا (5)

کہا جاتا ہے: قَفَوْتُه اقفوه اور قُفْتُه اقوفه اور قفيته جب تو کسی کے نشان کی پیروی کرے۔ اور اسی سے القافة ہے کیونکہ وہ ان کے آثار و نشانات قدم کی پیروی کرتا ہے اور ہر شی کے قافیہ سے مراد اس کا آخر ہوتا ہے، اور اسی سے قافية الشعر بھی ہے، کیونکہ وہ شعر کا آخر ہوتا ہے۔ اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی المُقَفِّی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام

1۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 787، حدیث 43113 — 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1211
3۔ ایضاً — 4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 455
5۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 456۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من نفى رجلا من قبيلته، حدیث نمبر 2601، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انبیاء علیہم السلام کے آخر میں تشریف لائے۔ اور اسی سے القائف ہے، یہ وہ ہے جو کسی شبہ کے اثر اور نشان کا پیچھا کرتا ہے (کھرا تلاش کرنے والا)۔ کہا جاتا ہے: قَافَ القائف یَقُوفُ جب وہ ایسا کرے (یعنی کھرا تلاش کرلے) اور آپ کہتے ہیں: قَفَوْتُ الاثر (میں نے نشان کا پیچھا کیا) اس میں فا قاف پر مقدم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شبہ یہ ہے کہ یہ لفظ ان بعض الفاظ میں سے ہو جن میں عرب کھیل اور تفریح کا عمل کرتے رہتے ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں: رَعَمْلِی فی لَعَمْرِی میں ایسا کرتے ہیں۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فرقہ کی جانب سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا ہے: قفا و قاف، جیسا کہ عتاو عات ہے۔ اور منذر بن سعید اس طرف گئے ہیں کہ قفا اور قاف جَبَذ اور جَذَب کی مثل ہے۔

المختصر یہ کہ یہ آیت جھوٹے قول اور تہمت لگانے سے اور ہر اس سے جو جھوٹے اور ردی اقوال میں سے اس کے مشابہ ہو یہ اس سے منع کرتی ہے اور روکتی ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ بعض لوگوں نے تَقُفْ قاف کو ضمہ اور فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جراح (قاضی بصرۃ) نے والفَآد فا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بعض لوگوں کی لغت ہے، اور ابو حاتم وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت قافہ (آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) کے حکم کو متضمن ہے، کیونکہ جب یہ فرمایا: تم اس کی پیروی نہ کرو جس کے بارے تمہیں علم نہ ہو۔ تو یہ اس کے جواز پر دلیل ہے جس کے بارے ہمیں علم ہو، تو ہر وہ چیز جسے انسان جان لے یا اس کے بارے اسے ظن حاصل ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کا حکم لگانا جائز ہے، اور اسی سے ہم نے قرعہ اندازی اور تخمینہ لگانے کے اثبات پر استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ بھی غلبہ ظن کی ایک قسم ہے، اور اسے وسعت علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پس (اعضاء و آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) بیٹے کو باپ کے ساتھ ان دونوں کے درمیان مشابہت پائے جانے کی وجہ سے ملا دیتا ہے، جیسا کہ ایک فقیہ فرع کو اصل کے ساتھ بطریق مشابہت ملا دیتا ہے۔ اور صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی مسرت و فرحت کی کیفیت میں میرے پاس تشریف لائے آپ کے چہرے کے خدوخال چمک رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تو نہیں جانتی (1) کہ ایک اعضاء بدن دیکھ کر پہچان کرنے والے نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا ہے اس حال میں کہ ان دونوں پر ایک چادر تھی وہ اپنے سروں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں ظاہر تھے تو اس (دیکھنے والے) نے کہا ہے: بے شک ان قدموں کا بعض اس کا بعض ہے۔" (یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کا جز ہیں۔) اور حدیث میں مُجَزِّز سے مراد قائف ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام ابو عبداللہ مازری نے کہا ہے: زمانہ جاہلیت میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں جرح قدح ہوتی تھی کیونکہ ان کا رنگ انتہائی زیادہ سیاہ تھا، اور ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ روئی سے زیادہ سفید تھے، اسی طرح اسے ابو داؤد نے احمد بن صالح سے ذکر کیا ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اور احمد کے سوا کسی نے کہا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رنگ انتہائی صاف اور روشن تھا اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ انتہائی شدید سیاہ رنگ کے تھے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، العمل بالحاق والقائف الولد، جلد 1، صفحہ 471

عربی کلب قبیلہ سے تھے، اور پھر آپ کو تیز اور دوری آپہنچی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحزاب میں آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جمہور علماء نے بیٹے میں تنازع اور اختلاف کے وقت قیافہ شناس کی طرف رجوع کرنے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قیافہ شناس کے قول سے بہت خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نہیں تھے کہ آپ کو باطل اور غلط طریقہ سے خوش کیا جا سکے اور نہ آپ اس پر تعجب اور خوشی کا اظہار فرماتے۔ اور امام ابوحنیفہ، اسحاق، ثوری اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح نہیں لیا ہے اور استدلال اس سے کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لعان میں مشابہت کو لغو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قیافہ شناس کے اقوال کو لینے والوں نے اختلاف کیا ہے کہ کیا ان اقوال کو آزاد عورتوں اور لونڈیوں دونوں کی اولاد میں قبول کیا جائے گا یا یہ لونڈیوں کی اولاد کے ساتھ مختص ہے؟ تو اس کے بارے دو قول ہیں: پہلا قول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس روایت میں جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ اور آپ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ صرف لونڈی کی اولاد میں محصور ہے۔ اور صحیح وہ ہے جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے اور وہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ وہ حدیث جو اس باب میں اصل ہے بلاشبہ وہ آزاد عورتوں کے بارے میں واقع ہے، کیونکہ حضرت اسامہ اور ان کے والد رضی اللہ عنہما دونوں آزاد تھے تو اس سبب کو کیسے لغو قرار دیا جا سکتا ہے جس پر حکم کی دلیل کا انحصار ہے اور وہ اس کا باعث بنا ہے؟ یہ علماء اصول کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کیا قیافہ شناسوں میں سے ایک کے قول پر اکتفا کیا جائے گا یا دو کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ شہادت ہے؟ پہلا قول ابن قاسم نے کہا ہے اور یہی خبر کا ظاہر ہے بلکہ اس کی نص ہے۔ اور دوسرا قول امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا یعنی ان میں سے ہر ایک سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے عمل کیا، پس دل سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جس میں اس نے غور و فکر کیا اور اس کا اعتقاد بنایا۔ اور کان اور آنکھ سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے دیکھا اور جو سنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان سے اس کے بارے پوچھے گا جسے اس کے کان، آنکھ اور اس کے دل نے جمع کیا ہوگا اور اس کی نظیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا (1)''۔ پس انسان اپنے اعضاء پر حاکم ہے، تو گویا فرمایا یہ کہ ان تمام کے بارے انسان سے پوچھا جائے گا، تو اس صورت میں مضاف حذف ہوگا لیکن حجت میں پہلا معنی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کی تکذیب اس کے جوارح سے واقع ہوگی، اور یہ ذلت و رسوائی کی انتہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾ (یٰسین) (آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان (بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: شَهِدَ عَلَيْهِمْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، الجمعۃ فی القری والمدن، جلد 1، صفحہ 122

سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ (حم السجدہ) ((اس وقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے)۔ اور انہیں سمع، بصر اور فواد سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان کا ادراک کرنے والے حواس ہیں، اور اس آیت میں انہیں مسئولہ بنایا ہے، اور یہ اس کی حالت ہے جو عقل اور سمجھ رکھتا ہے، پس اسی وجہ سے ان کو ان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے قول باری تعالیٰ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝ (یوسف) میں کہا ہے: بلاشبہ انہوں نے کہا: رَاَيْتُهُمْ میں نے ستاروں میں دیکھا، کیونکہ جب انہیں سجود کے ساتھ متصف کیا اور یہ (سجدہ کرنا) اس کا فعل ہے جو عقل رکھتا ہے تو پھر انہیں کنایۃً ان سے تعبیر کیا جو عقل رکھتے ہیں؛ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور زجاج نے بیان کیا ہے کہ عرب ذوالعقول اور غیر ذوالعقول کو ان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

انہوں نے اور طبری نے یہ شعر بیان کیا ہے:

ذُمَّ المنازل بعد منزلة اللِّوَى والعيش بعد أولئك الأيام (1)

یہ امر ہے ان کے نزدیک اس پر وقف کیا جاتا ہے، اور رہا شعر تو اس میں ایک روایت الاقوام کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۝

"اور نہ چلو زمین میں اکڑتے ہوئے (اس طرح) نہ تم چیر سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کے برابر بلندی میں۔ یہ سب (جن کا ذکر گزرا) ان میں سے ہر بری بات اللہ تعالیٰ کو (سخت) ناپسند ہے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا یہ غرور اور تکبر سے نہی ہے اور تواضع اور انکساری کا حکم ہے۔ المرح کا معنی ہے بہت زیادہ خوشی اور فرحت کا اظہار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی چلنے میں تکبر کا اظہار کرنا (یعنی اکڑ کر چلنا) ہے۔ بعض نے کہا ہے: انسان کا اپنی قدر اور مقام سے تجاوز کر جانا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے مراد چال میں غرور اور خود پسندی کا اظہار کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی کسی نعمت پر اترانا اور اس کا شکر ادا نہ کرنا ہے (2) اور اکڑنا ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے مراد نشاط اور چستی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ تمام اقوال معنوی اعتبار سے قریب قریب ہیں لیکن یہ دو قسموں میں منقسم ہیں: ان میں سے ایک قسم مذموم (قابل مذمت) ہے اور دوسری محمود (قابل تعریف) ہے، پس تکبر کرنا، اترانا، غرور کرنا، اور انسان کا اپنی قدر سے تجاوز کرنا یہ سب مذموم ہے اور فرحت و انبساط اور نشاط و چستی کا اظہار کرنا محمود اور اچھا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک کے ساتھ (یعنی فرحت اور نشاط) اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے، پس صحیح حدیث میں ہے اَللهُ أفرح بتوبة العبد من رجل..... الحدیث (3) (اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت زیادہ خوش ہوتا

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 102 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 244

3۔ مجمع الزوائد، کتاب التوبۃ، باب الحث علی التوبۃ، جلد 10، صفحہ 322، حدیث 17498

ہے)۔ اور سستی شرعاً مذموم ہے اور نشاط اس کی ضد ہے۔ اور کبھی تکبر اور جو چیزیں اس کے معنی میں ہیں محمود اور اچھی ہوتی ہیں، اور وہ یہ کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور ظالموں کے خلاف ہوں۔ ابو حاتم محمد بن حبان نے ابن جابر بن عتیک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غیرت میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض اور ناپسند جانتا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور غرور اور تکبر میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ عزوجل پسند فرماتا ہے اور اس میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض قرار دیتا ہے، پس وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے بارے میں ہو اور وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے معاملہ میں نہ ہو اور وہ رعونت و تکبر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے وہ آدمی کا جنگ کے وقت اور صدقہ دیتے وقت اپنے نفس کے ساتھ اظہار فخر کرنا ہے اور وہ تکبر و غرور جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ باطل اور غلط کاموں میں اس کا غرور اور تکبر کرنا ہے'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے اپنی مصنف وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

اور انہوں نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:

ولا تمش فوق الأرض إلاّ تواضعا فکم تحتها قومٌ هومنك أرفعُ

تو زمین کے اوپر تواضع اور انکساری کے بغیر نہ چل پس اس کے نیچے کتنی قومیں ہیں جو تجھ سے بلند اور ارفع تھیں۔

و إن کنتَ فی عزٍّ و حِرز و مَنْعة فکم مات من قوم هم منك أمنعُ

اور اگر تو عزت، حفاظت اور قوت میں ہے، تو قوم میں سے کتنے مر گئے جو تجھ سے زیادہ محفوظ اور طاقتور تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ انسان کا بغیر حاجت کے محض برتری اور غلبے کے اظہار کے لئے شکار کرنا بھی اس آیت میں داخل ہے، اس میں حیوان کو عذاب دینا اور اسے جاری رکھنا بغیر کسی حاجت اور مقصد کے وہ بھی داخل ہے۔ اور رہا وہ آدمی جو کسی دن اور اس دن کی کسی ساعت میں راحت و سکون حاصل کرتا ہے، اور اس میں وہ اپنے آپ کو اس مقابلے اور راحت میں قوت و طاقت باہم پہنچاتا ہے تاکہ وہ اس کے سبب نیکی اور خیر میں مشغول رہنے کے لئے مدد حاصل کر سکے، مثلاً علم پڑھنا یا نماز پڑھنا وغیرہ، تو یہ اس آیت میں داخل نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَرَحًا جمہور کی قرأت را کے فتحہ کے ساتھ ہے (2)۔ اور اس میں ایک گروہ کی قرأت جسے یعقوب نے بیان کیا ہے وہ اسم فاعل ہونے کی بنا پر را کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور پہلی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ بلاشبہ تیرا یہ قول: جاء زید رکضا تیرے قول جاء زید راکضا کی نسبت زیادہ بلیغ ہے، پس اسی طرح تیرا قول: مَرَحًا بھی ہے۔ اور المرح مصدر ہے لہٰذا اس میں مَرِحًا کہنے کی نسبت مبالغہ زیادہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ یعنی تو ہرگز زمین کے اندر داخل نہیں ہو سکتا کہ تو اسے جان لے جو کچھ اس میں ہے۔ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا یعنی تو ہرگز پہاڑوں کے برابر نہیں ہو سکتا نہ اپنی طوالت و لمبائی کے ساتھ اور نہ

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی الخیلاء فی الحرب، حدیث نمبر 2286، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 456

اپنے فخر و تکبر کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے: خرق الثوب یعنی اس نے کپڑا پھاڑ دیا، اور خرق الارض اس نے زمین کاٹ دی۔ اور الخرق سے مراد زمین کی کشادگی ہے۔ یعنی تو اپنے تکبر اور زمین پر چلنے کے ساتھ زمین کو کشادہ نہیں کر سکتا، یعنی تو اپنی قدرت کے ساتھ اس مقام اور حد تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ تو تو ذلیل اور حقیر بندہ ہے، تو اپنے نیچے اور اپنے اوپر سے ہر طرف سے گھرا ہوا ہے، اور جو گھرا ہوا ہو وہ محصور اور ضعیف ہوتا ہے، پس تیرے لئے تکبر اور رعونت مناسب اور موزوں نہیں ہے۔ اور یہاں خرق الأرض سے مراد زمین کو نقب لگانا، اس کو پھاڑنا ہے نہ کہ اسے مسافت کے ساتھ طے کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ ہرگز اسے کاٹ نہیں سکتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ یہ الخرق سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وسیع صحرا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: فلاں أخرق من فلان، یعنی فلاں سفر، عزت اور قوت کے اعتبار سے فلان سے زیادہ ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ سبا نے اپنے لشکروں کے ساتھ زمین کے شرق و غرب اور اس کے میدانوں اور پہاڑوں کا چکر لگایا اور بڑے بڑے سرداروں کو قتل کیا اور قیدی بنایا...... اور اسی وجہ سے اس کا نام سبا رکھا گیا...... اور مخلوق خدا اس کے قریب ہوگئی پس جب اس نے یہ دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے تین دن الگ اور خلوت میں رہا پھر ان کی طرف نکلا تو کہا: بلاشبہ جو میں نے پایا ہے وہ کوئی بھی نہیں پا سکا میں نے ان نعمتوں کے شکر کے سبب ابتدا کو دیکھ لیا ہے، اور میں نے اس میں سورج سے زیادہ سجود کا اہل کوئی نہیں دیکھا جب وہ طلوع ہوتا ہے، نتیجتاً انہوں نے اسے سجدہ کیا اور یہی سورج کی عبادت اور پرستش کا آغاز ہے، پس یہی غرور، تکبر اور اکڑنے والوں کا انجام ہے۔ نعوذ باللہ من ذالك۔

**مسئلہ نمبر 4۔** قولہ تعالیٰ: کُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا، ذٰلِكَ یہ اشارہ امر و نہی میں سے اس تمام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور ذٰلِكَ واحد، جمع اور مونث و مذکر سبھی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عاصم، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور مسروق رحمہم اللہ تعالیٰ نے سَیِّئُهٗ، سَیِّءُ کو ضمیر کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے (1)، اور اسی لئے فرمایا: مَكْرُوْهًا یہ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور السیِّءُ سے مراد مکروہ (اور ناپسندیدہ) عمل ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جس سے نہ اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور نہ اس کے بارے حکم دیتا ہے۔ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان آیات میں یعنی وَ قَضٰى رَبُّكَ سے لے کر...... تا قولہ ...... كَانَ سَیِّئُهٗ کچھ وہ امور ذکر کئے ہیں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ پس وہ سیئة سے ان تمام کے بارے خبر نہیں دے رہا کہ مامور بہ بھی منھی عنه امور میں داخل ہو جائیں۔ اس قرأت کو ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ذالك كان سیئاته ہے۔ اور یہ اضافت کے لئے ہی ہوتا ہے۔ ابن کثیر، نافع، اور ابو عمرو نے سیئة تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (2) یعنی ہر وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے وہ سیئه (برا) ہے۔ اور اسی بنا پر کلام قول باری تعالیٰ: وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا پر منقطع ہو گئی۔ پھر فرمایا: وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، وَ لَا تَمْشِ، پھر کہا: كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ تنوین کے ساتھ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457　　2۔ ایضاً

تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ سے لے کر اس آیت تک یہ سَيِّئُهٗ ہی ہے اس میں کوئی حسنہ اور نیکی نہیں ہے، پس انہوں نے كُلّا کو صرف منهی عنه کے لئے محیط بنایا ہے نہ کہ کسی اور کے لئے۔ اور قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا۔ سَيِّئُهٗ کی صفت نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے بدل ہے اور تقدیر کلام ہے: كان سيئة و كان مكروها۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مکروها كَانَ کی دوسری خبر ہے اس لئے کہ اسے لفظ کل پر محمول کیا گیا ہے، اور سيئة اس سے پہلے مذکورہ تمام اشیاء میں معنی پر محمول ہے (1)۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: یہ سيئة کی صفت ہے، کیونکہ جب اس کی تانیث مونث غیر حقیقی ہے تو پھر جائز ہے کہ مذکر کیساتھ اس کی صفت لگائی جائے۔ اور ابو علی فارسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک مونث کو جب مذکر بنایا جائے تو پھر یہ چاہئے کہ اس کا مابعد بھی مذکر ہو، اور یہ تساہل اور سستی ہے کہ پہلے وہ فعل ہو جو مونث کی طرف منسوب ہو اور وہ ایسے صیغہ میں ہو جو مذکر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کیا آپ شاعر کا یہ قول نہیں دیکھتے:

فلا مزنة وَدَقَتْ وَدْقَهَا ولا أرضَ أبقل إبقالها (2)

یہ ان کے نزدیک قبیح سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے: أبقل أرض تو یہ قبیح نہیں ہے۔

ابو علی نے کہا ہے: لیکن قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا میں یہ جائز ہے کہ وہ سَيِّئُهٗ سے بدل ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس ضمیر سے حال ہو جو عِنْدَ رَبِّكَ میں ہے اور عِنْدَ رَبِّكَ، سيئة کی صفت کے محل میں ہو (3)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء نے اس آیت سے رقص اور اس میں مشغول ہونے کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ امام ابو الوفاء ابن عقیل نے بیان کیا ہے: رقص سے نہی پر قرآن کریم نے نص بیان کی ہے اور فرمایا: وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اور اکڑنے والے کی مذمت بیان کی ہے۔ اور رقص شدید ترین غرور کرنا اور اترانا ہے۔ کیا ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے نبیذ کو خمر پر قیاس کیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں چستی اور نشہ لانے میں باہم متفق ہیں، تو ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ شعر کی کاٹ اور اس کو ترنم اور سر کے ساتھ کہنے کو آلات موسیقی ستار، بانسری اور طبلے پر ان دونوں کے اجتماع اور اتفاق کے باوجود قیاس نہیں کرتے۔ تو یہ صاحب ریش سے کتنا قبیح ہے اور کیسا لگتا ہے جب وہ بوڑھا ہو، اور وہ اس سر اور کاٹ پر رقص کر رہا ہو اور تالی بجا رہا ہو، اور بالخصوص اس وقت جبکہ عورتوں اور مردوں کی آوازیں ہوں، کیا یہ اس کے لئے اچھا لگتا ہے جس کے سامنے موت، سوال، حشر اور پل صراط ہو، پھر وہ دارین میں سے ایک کی طرف جانے والا ہو، وہ رقص کے ساتھ جانوروں کے اچھلنے کی طرح اچھلتا کودتا ہے، اور عورتوں کے تالی بجانے کی طرح تالی بجاتا ہے۔ قسم بخدا! میں نے اپنی عمر میں کئی مشائخ کو دیکھا ہے کہ تبسم کے سبب ان کا کوئی دانت ظاہر نہیں ہوا چہ جائیکہ ضحک کے سبب ظاہر ہوا اس کے باوجود کہ میرا ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول ہمیشہ رہا۔ اور ابو الفرج علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: بعض مشائخ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مجھ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رقص دو کندھوں کے درمیان حماقت ہے اور یہ لعب کے بغیر زائل نہیں ہوتی اس باب کا مزید بیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 458

سورۃ الکہف وغیرہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

''یہ ہدایات جنہیں بذریعہ وحی آپ کی طرف آپ کے رب نے بھیجا ہے دانائی کی باتوں میں سے ہیں، اور (اے سننے والے!) نہ بنا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تجھے پھینک دیا جائے گا جہنم میں اس حال میں کہ تمہیں ملامت کی جائے گی اور دھکے دیئے جائیں گے۔''

ذٰلِكَ سے اشارہ ان آداب، قصص اور احکام کی طرف ہے جنہیں وہ سابقہ آیات متضمن ہیں جنہیں لے کر حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے، یعنی یہ ان محکم افعال میں سے ہیں جن کا تقاضا اللہ عزوجل کی حکمت اپنے بندوں کے بارے میں کرتی ہے، اور اس نے انہیں ان کے لئے محاسن اخلاق، حکمت، محکم معانی اور افعال فاضلہ کے قوانین میں سے بنایا ہے۔ پھر اپنے قول: وَ لَا تَجْعَلْ کا سابقہ نواہی پر عطف کیا ہے۔ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد ہر وہ انسان ہے جس نے اس آیت کو سنا۔ اور المدحور سے مراد ذلیل و رسوا کیا گیا اور (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) بہت دور ہٹایا گیا ہے۔ اور یہ اس سورت میں گزر چکا ہے۔ اور دعا میں کہا جاتا ہے: اللّٰھم ادحر عنا الشیطان (اے اللہ! شیطان کو ہم سے دور کر دے)۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝

''کیا چن لیا ہے تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لئے اور (اپنے لئے) بنا لیا ہے فرشتوں کو بیٹیاں (صد افسوس!) تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو بہت سخت ہے۔''

یہ آیت ان عربوں کا رد کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (1)، اور ان کے لئے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیاں بھی ہیں، لیکن اس نے ارادہ یہ کیا ہے کہ کیا اس نے اپنے سوا تمہارے لئے بیٹوں کو خالص کیا ہے اور بیٹیوں کو اپنے اور تمہارے درمیان مشترک بنایا ہے۔ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت سخت گناہ ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝

''اور بلاشبہ ہم نے مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے (دلائل توحید کو) اس قرآن میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں، (بایں ہمہ) سوائے نفرت کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا اور بلاشبہ ہم نے بیان کیا۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے بار بار بیان کیا۔ فِيْ هٰذَا

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 105

الْقُرْاٰنِ کہا گیا ہے کہ: فی زائدہ ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: ولقد صرفنا ھذا القرآن (1) (بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو بیان کیا)، مثلاً: اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (الاحقاف:15) ای اصلح ذریتی۔ (میری اولاد کی اصلاح فرما)۔ اور تصریف کا معنی ہے: کسی شی کو ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرنا۔ اور اس تصریف سے مراد بیان اور تکریر (یعنی بار بار کسی چیز کو بیان کرنا) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مغایرت ہے یعنی ہم نے مواعظ ونصائح کے انداز کو بدل بدل کر بیان کیا تا کہ وہ غور وفکر کریں، عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں۔ اور عام قرأت صَرَّفْنَا کثرت کے معنی کی بنا پر تشدید کے ساتھ ہے۔ اور حسن نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ اور قول باری تعالیٰ: فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ اس سے مراد امثال، باعث عبرت قصص، حکمتیں، مواعظ اور احکام واخبار ہیں۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالقاسم حسین کو امام شیخ ابوالطیب کی موجودگی میں یہ کہتے سنا ہے کہ قول باری تعالیٰ: صَرَّفْنَا کے دو معنی ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن مجید کو) ایک نوع پر نہیں رکھا بلکہ وعدہ ووعید، محکم ومتشابہ، امر ونہی، ناسخ ومنسوخ اور اخبار وامثال کے متنوع انداز میں بیان کیا ہے، جیسا کہ ہواؤں کو صبا، دبور، جنوب اور شمال کی متنوع اقسام میں چلاتا ہے، اور افعال کو ماضی، مستقبل، امر، نہی، فعل وفاعل اور مفعول وغیرہ کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نے اسے ایک ہی بار نازل نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ (الاسراء:106) اور اس کا معنی ہے ہم نے کثرت سے جبرئیل علیہ السلام کو آپ کی طرف بھیجا ہے: لِیَذَّكَّرُوْا (الفرقان:50) یحیٰی، اعمش، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ کی قرأت لِیَذْكُرُوْا تخفیف کے ساتھ ہے (3)۔ اور اسی طرح فرقان حمید میں ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا (الفرقان:50) اور باقیوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے اسے اختیار کیا ہے، کیونکہ اس کا معنی لیتذکروا و لیتعظوا (تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں) ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے لِیَذَّكَّرُوْا کو شد دی ہے، انہوں نے اس سے تدبر کرنے اور غور وفکر کرنے کا معنی مراد لیا ہے۔ اور اسی طرح جنہوں نے لِیَذْكُرُوْا پڑھا ہے۔ اور پہلے کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (القصص) (اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں)۔ اور دوسرے کی نظیر وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ (البقرہ:63) ہے۔

وَمَا یَزِیْدُهُمْ یعنی بار بار بیان کرنے اور نصیحت کرنے نے ان میں اضافہ نہیں کیا۔ اِلَّا نُفُوْرًا مگر حق سے دور کرنے اور نظر وفکر سے غفلت برتنے کا، اور یہ اس لئے ہوا کیونکہ انہوں نے قرآن کریم کے بارے یہ اعتقاد رکھا کہ یہ محض حیلہ، سحر، کہانت اور شعر ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝

"آپ فرمائیے: اگر ہوتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا جس طرح یہ کافر کہتے ہیں تو ان خداؤں نے (مل کر)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 458 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تلاش کر لی ہوتی عرش کے مالک (پر غالب آنے کی) کوئی راہ۔ وہ پاک ہے اور وہ بہت برتر و بالا ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ یہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا (الاسراء: 29) اور یہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کا رد ہے۔ كَمَا يَقُوْلُوْنَ ابن کثیر اور حفص نے يَقُوْلُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تقولون خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اِذًا لَّابْتَغَوْا یعنی ان الٰہوں نے تلاش کر لی ہوتی۔ اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنے اور جنگ کرنے کا مطالبہ کرتے جیسا کہ دنیا کے بادشاہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب انہوں نے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی راہ تلاش کر لی ہوتی (2) تاکہ وہ اس کی بادشاہی کو زائل اور ختم کر سکیں، کیونکہ وہ اس کے شریک ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب ان خداؤں نے صاحب عرش کے پاس قرب کی راہ تلاش کر لی ہوتی، اور اس کی نزدیکی تلاش کر چکے ہوتے کیونکہ وہ اس کے سوا ہیں، اور قوم یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ وہ بت انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیتے ہیں، پس جب انہوں نے بتوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے محتاج ہیں تو پھر یہ باطل ہو گیا کہ وہ الٰہ ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی ہر اس شے سے پاکی، عظمت اور بزرگی بیان کی ہے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔ اور تسبیح کا معنی تنزیہ (پاکی بیان کرنا) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

''پاکی بیان کرتے ہیں اس کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے، اور (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ اس میں آسمانوں اور زمین کی طرف ذوی العقول کی ضمیر لوٹ رہی ہے، اس لئے کہ ان کی طرف عاقل کا فعل منسوب کیا گیا ہے اور وہ تسبیح کرنا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ مَنْ فِيْهِنَّ میں مراد فرشتے، انسان اور جنات ہیں، پھر اس کے بعد تمام اشیاء کو اپنے اس قول میں شامل کیا: وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور اس عموم میں اختلاف ہے، کیا یہ مخصص ہے یا نہیں؟ تو ایک فرقہ اور جماعت نے کہا ہے: یہ عام مخصوص نہیں ہے اور اس سے مراد تسبیح الدلالۃ ہے۔ اور ہر پیدا ہونے والی اور بنائی جانے والی شے اس کی ذات پر یہ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور قادر بھی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ تسبیح حقیقی ہے، اور علی العموم ہر شے ایسی تسبیح بیان کرتی ہے جسے انسان نہ سن سکتا ہے اور نہ اسے سمجھ سکتا ہے، اور اگر مراد وہ ہو جو پہلے فریق نے کہا ہے کہ مراد صنعت کا اثر اور دلالت ہے تو یقیناً یہ ایسا امر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 106

ہے جو سمجھا جاسکتا ہے، اور آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ یہ تسبیح سمجھی نہیں جاسکتی (1)۔ اور انہیں جواب یہ دیا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: لَا تَفْقَهُوْنَ سے مراد وہ کفار ہیں جو غور و خوض کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں پس وہ اشیاء میں الله سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: مِّنْ شَیْءٍ میں عموم ہے لیکن اس کا معنی ہر زندہ اور نامی (بڑھنے والا) کے ساتھ خاص ہے، اور یہ جمادات کو شامل نہیں، اسی سے عکرمہ کا قول ہے: درخت تسبیح بیان کرتے ہیں اور ستون تسبیح بیان نہیں کرتے (2)۔ یزید رقاشی نے حسن کو کہا اور یہ دونوں کھانے پر تھے اس حال میں کہ دستر خوان سامنے بچھا ہوا تھا: اے ابا سعید! کیا یہ دستر خوان بھی تسبیح بیان کرتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ ایک بار تسبیح بیان کرتا ہے؛ مراد یہ ہے کہ درخت اپنے پھلدار ہونے اور اپنے اعتدال کے زمانے میں تسبیح بیان کرتا ہے، لیکن اب یہ عمدہ خوشبودار دستر خوان بن چکا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کے لئے اس سنت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جارہا ہے اور کسی بڑے گناہ میں انہیں عذاب نہیں دیا جارہا ہے، ان میں سے ایک چغلخوری کرتا تھا اور رہا دوسرا! تو وہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تر ٹہنی منگائی اور اس کے دو حصے کر دیئے، پھر ایک حصہ ایک قبر پر گاڑ دیا اور دوسرا دوسری قبر پر گاڑ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''ان سے عذاب ہلکا کر دیا جائے گا جب تک یہ خشک نہیں ہوں گے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: مالم ییبسا (4) (جب تک یہ خشک نہ ہوئے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں حصے جب تک تر رہیں گے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہیں گے، اور جب خشک ہو جائیں گے تو جماد ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

اور مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف ایک پر اور نصف دوسری پر رکھ دی اور فرمایا: ''ان دونوں پر عذاب ہلکا اور نرم کر دیا جائے گا جب تک ان دونوں میں ان کی تری میں سے کوئی شے رہی۔'' (لعله أن يهون عليهما العذاب ما دام فيها من بلولتهما شئ) ہمارے علماء نے کہا ہے: اسی سے قبروں پر درخت لگانا اور قرآن کریم پڑھنا مستفاد ہوتا ہے، جب درختوں کے سبب ان سے تخفیف کر دی جاتی ہے تو پھر ایک مومن آدمی کے قرآن کریم پڑھنے سے کیسے نہیں ہوگی۔ ہم نے اس کا مفصل اور شافی بیان ''کتاب التذکرہ'' میں کیا ہے، اور یہ بھی کہ میت کو جو ثواب ہدیہ اور تحفہ بھیجا جاتا ہے وہ اس تک پہنچ جاتا ہے۔ والحمد لله على ذالك۔ اور دوسری تاویل کی بنا پر اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے مطابق ہر شے چاہے جماد ہو یا غیر جماد وہ تسبیح بیان کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل اور اس قول کے لئے کتاب اللہ سے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا جاتا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۝ (ص) (یاد فرماؤ ہمارے بندے داؤد کو جو بڑا طاقتور تھا۔ وہ (ہماری طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے فرمانبردار بنا دیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت۔) اور قول باری تعالیٰ: وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (البقرہ: 74) (اور کئی ایسے بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1980

ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ (مریم) (پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے، کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔)

اور ابن مبارک نے (اپنی دقائق) میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں مسعر نے عبداللہ بن واصل سے انہوں نے عوف بن عبداللہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو کہتا ہے: اے فلاں! کیا تیرے پاس سے آج کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ پس اگر وہ کہے: ہاں، تو اس کے سبب اسے انتہائی مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ الآیہ (مریم) (اور کفار کہتے ہیں: بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا)۔ فرمایا: کیا تم انہیں دیکھ رہے ہو وہ جھوٹ سن سکتے ہیں اور خیر اور نیکی کی بات نہیں سن سکتے۔ اور اسی بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: کوئی صبح اور شام نہیں مگر زمین کے ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں: اے میرے پڑوسی! کیا آج تیرے پاس سے کوئی ایسا بندہ گزرا ہے جس نے تجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھی ہو یا اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا ہو؟ تو ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں: نہیں اور بعض کہتے ہیں: ہاں، پس جب وہ ہاں کہے تو وہ اس کے سبب اسے اپنے سے افضل دیکھتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مؤذن کی آواز جن و انس، شجر و حجر، مٹی کا ڈھیلا یا اور کوئی شے نہیں سنتی مگر وہ قیامت کے دن اس کے لئے شہادت اور گواہی دیں گے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تحقیق ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے حالانکہ وہ کھایا جارہا ہوتا تھا۔ اور اس روایت کے علاوہ دوسری روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں کھانا کھارہے تھے اور ہم اس کی تسبیح سن رہے تھے (2)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھ پر سلام کیا کرتا تھا بلاشبہ میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (3)''۔ کہا گیا ہے کہ وہ حجر اسود ہے۔ واللہ اعلم۔ اس بارے میں بہت سی اخبار ہیں اور ہم ان میں سے بہت سی روایات پر اللمع اللؤلؤیۃ فی شرح العشرنیات النبویہ للفاداری رحمہ اللہ تعالیٰ میں آگاہ ہوئے ہیں۔ اور اسی بارے میں جذع (یعنی کھجور کے تنا) والی روایت بھی مشہور ہے۔ جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ اور جب یہ ایک جماد میں ثابت ہے تو پھر دیگر جمادات میں بھی اس کا پایا جانا جائز ہے، اور اس میں سے کوئی شے بھی محال نہیں ہے، پس اس عموم کی بنا پر ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ اسی طرح حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ ان تمام چیزوں کو بھی عام اور شامل ہے۔ اور

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الصوت بالنداء من حدیث ابن سعید خدری، جلد 1، صفحہ 85

ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ جامع ترمذی، باب البرکۃ فی الماء، حدیث نمبر 3566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و تسلیم الحجر علیہ قبل النبوۃ، جلد 2، صفحہ 245

انہوں نے انہیں اخبار سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جمادات کی تسبیح یہ ہے کہ وہ اپنی طرف دیکھنے والے کو یہ کہنے کی دعوت دیتی ہیں: سبحان اللہ! کیونکہ ان میں ادراک نہیں ہوتا۔

اور شاعر کا قول بھی ہے:

تُلْقِی بتسبیحة من حیث ما انصرفت و تَستقِر حَشَا الرائی بِتَرْعَادِ(1)

یعنی جو انہیں دیکھتا ہے وہ کہتا ہے: سبحان خالقها (انہیں تخلیق فرمانے والے کی ذات پاک ہے)۔

پس صحیح یہ ہے کہ تمام چیزیں تسبیح بیان کرتی ہیں کیونکہ اخبار و روایات اس پر دلالت کرتی ہیں، اور اگر وہ تسبیح تسبیح الدلالۃ ہی ہو تو پھر داؤد کی تخصیص کون سی ہے؟ بلاشبہ وہ تسبیح مقال ہے اللہ تعالیٰ کے ان میں حیات اور زندگی پیدا کرنے کے ساتھ اور تسبیح کے ساتھ بولنے کی قوت عطا کرنے کے ساتھ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور سنت اس پر نص ہے جس پر ہر شے کے تسبیح بیان کرنے میں سے قرآن کریم کا ظاہر دلالت کرتا ہے پس اس کے ساتھ کلام کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ حسن، ابو عمر، یعقوب، حفص، حمزہ، کسائی اور خلف نے تفقھون فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے تا کے ساتھ قرأت کی ہے۔ باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور ابو عبید نے اسے ہی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: فعل اور تانیث کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا بے شک وہ دنیا میں اپنے بندوں کے گناہوں سے حلم کا اظہار کرنے والا ہے۔ غَفُوْرًا اور آخرت میں مومنوں کو بخشنے والا ہے۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

''اور (اے محبوب!) جب آپ پڑھتے ہیں قرآن کو تو ہم (حائل) کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے۔''

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب سورہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (لہب: 1) نازل ہوئی تو کانی ام جمیل بنت حرب آئی وہ بڑے جوش اور غصے میں تھے اور اس کے ہاتھ میں پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی: مُذَمَّمًا عَصَيْنَا (ہم نے مذمم کی نافرمانی کی) وَ اَمْرَهٗ اَبَيْنَا (ہم نے اس کے حکم کا انکار کیا) وَ دِيْنَهٗ قَلَيْنَا (اور ہم نے اس کے دین کو ناپسند کیا)۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے، پس جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ آ رہی ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ آپ کو دیکھ لے گی! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انها لن ترانی (2) (بے شک وہ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گی) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم پڑھا اور اس کے ساتھ محفوظ رہے جیسے آپ نے فرمایا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا پس وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 245

2۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

رکی اور اس نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا اور کہنے لگی: اے ابا بکر! مجھے خبر دی گئی ہے کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے! تو آپ نے فرمایا: نہیں اس گھر کے رب کی قسم انہوں نے تیری ہجو نہیں کی۔ آپ فرماتے ہیں: پس وہ واپس مڑی تو یہ کہہ رہی تھی: تحقیق قریش جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔

اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: جب تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝ (لہب) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حضور نبی کریم ﷺ کی طرف آئی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کاش آپ اس سے دور ہٹ جائیں تاکہ وہ آپ کو کوئی ایسا کلمہ نہ سنا دے جو آپ کو اذیت اور تکلیف پہنچائے، کیونکہ یہ فحش بکنے والی عورت ہے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انه سيحال بيني و بينها(1) (بلاشبہ میرے درمیان اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جائے گا) پس وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابا بکر! تیرے ساتھی نے میری ہجو بیان کی ہے! تو آپ نے فرمایا: قسم بخدا! نہ وہ شعر بناتے ہیں اور نہ شعر کہتے ہیں۔ تو اس نے کہا: بلاشبہ آپ تو ان کی تصدیق کرتے ہیں، پھر وہ وہیں سے واپس لوٹ گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا اس نے آپ کو نہیں دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان حائل ہو کر فرشتے نے مجھے مسلسل ڈھانپے رکھا یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔'' (لا۔ مازال ملك بيني و بينها يسترني حتى ذهبت) اور حضرت کعب نے اس آیت کے تحت کہا ہے: حضور نبی کریم ﷺ تین آیات کے ساتھ مشرکین کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے: ایک آیت وہ ہے جو سورہ انعام میں ہے: وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (الانعام: 25) (ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورۂ نحل میں ہے: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ (النحل: 108) (یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورۃ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً الآیہ۔ (الجاثیہ: 23) (ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنا لیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ۔) حضور نبی کریم ﷺ جب یہ آیات پڑھ لیتے تھے تو مشرکین سے اوجھل ہو جاتے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے ان کے بارے اہل شام میں سے ایک آدمی کو بتایا، پس وہ روم آ گیا اور وہیں طویل عرصہ تک قیام پذیر رہا، پھر وہاں سے بھاگ نکلا تو وہ لوگ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہی آیات پڑھ لیں تو وہ اس طرح ہو گئے کہ راستے میں اس کے ساتھ ہونے کے باوجود اسے دیکھ نہ سکتے تھے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی ہے جسے وہ حضرت کعب سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس کے بارے اہل الری میں سے ایک آدمی کو بتایا اور وہ دیلم میں قید ہو گیا کافی عرصہ وہاں ٹھہرا رہا پھر وہاں سے

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

بھاگ نکلا تو وہ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہ آیات پڑھ لیں۔ یہاں تک کہ ان کے کپڑے اس کے کپڑوں کے ساتھ مس ہونے لگے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم ان آیات میں سورۂ یٰسین کی ابتدا سے لے کر فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ تک کا اضافہ کرتے ہیں، کیونکہ سیرت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آپ کے بستر پر آرام فرمانے کا تذکرہ موجود ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ایک مشت مٹی اپنے ہاتھ میں اٹھائی، اور اللہ عزوجل نے ان کی آنکھوں پر آپ کو دیکھنے سے پردہ ڈال دیا۔ پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکے، اور آپ نے وہ مٹی ان کے سروں پر پھینک دی اور آپ سورۂ یٰسین کی یہ آیت پڑھتے رہے: يٰسٓ ۝ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات سے فارغ ہو گئے، اور ان میں سے کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کے سر پر مٹی نہ پڑی ہو، پھر آپ اس طرف چلے گئے جہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علاقے اندلس میں اعمال قرطبہ میں حصن منثور کے ساتھ اسی طرح کا واقعہ مجھے پیش آیا، وہ یہ کہ میں دشمن کے سامنے سے بھاگ گیا اور میں اس سے ایک طرف پیچھے ہٹ گیا، پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو گھڑسوار میری تلاش میں نکل پڑے اور میں زمین کی کھلی فضا میں بیٹھا ہوا تھا اور کوئی چیز مجھے ان سے چھپانے اور ڈھانپنے والی نہ تھی، اور میں سورۂ یٰسین شروع سے اور علاوہ ازیں قرآن کریم کی آیات پڑھنے لگا، تو وہ دونوں مجھ سے آگے گزر گئے پھر اسی جگہ سے واپس لوٹے تو ان میں سے ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا یہ تو دِيْبَلَه یعنی شیطان (جن) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور وہ مجھے نہ دیکھ سکے، والحمد للہ حمدا کثیرا علی ذالك۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ پردہ (مستور) ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہر ہے یہاں تک کہ نہ وہ اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس میں موجود حکمت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی یہ کہ ان کے آپ کی قرأت سے اعراض کرنے اور آپ سے تغافل برتنے کے سبب یہ اس طرح ہے کہ آپ کے درمیان اور اس کے درمیان آپ کو نہ دیکھنے کے بارے میں حجاب اور پردہ ہے گویا ان کے دلوں پر پردہ سا پڑ گیا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچاتے تھے جب آپ قرآن کریم پڑھتے تھے، اور وہ ابو جہل، ابوسفیان، نضر بن حارث، ابولہب کی بیوی ام جمیل، اور حویطب تھے، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم پڑھنے کے وقت ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا، چھپا دیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتے تھے اور آپ کو دیکھتے نہ تھے؛ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہی پہلے قول کا بعینہ معنی ہے، اور

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 29

یہی آیت میں اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: مَّسْتُوْرًا اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے..... کہ حجاب تم سے چھپا ہوا ہے تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اور دوسرا یہ ہے..... کہ حجاب تم سے اپنے ورا کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہے اور اس صورت میں مستور بمعنی ساتر ہوگا (1)۔

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶

''اور ہم ڈال دیتے ہیں ان کے دلوں پر پردہ تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کردیتے ہیں) اور جب آپ ذکر کرتے ہیں صرف اپنے رب کا قرآن میں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً، اَكِنَّة، كِنَان کی جمع ہے، اور اس سے مراد ہر وہ شے ہے (2) جو کسی شے کو ڈھانپ لے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ یعنی تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں، یا اس کے سمجھنے کو ناپسند کریں، یعنی اس میں اوامر ونواہی اور حکم ومعانی میں سے جو کچھ ہے اسے سمجھنا (انہیں ناپسند ہو) یہ قدر یہ کا رد ہے۔

وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا اور ان کے کانوں میں بہرہ پن اور گرانی پیدا کردیتے ہیں۔ اس کلام میں اضمار ہے یعنی أن یسمعوہ (کہ وہ اسے سن سکیں)۔ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ یعنی آپ کہیں: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس حال میں کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہوں۔ اور ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ نے کہا ہے: کوئی شے نہیں ہے جو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قول سے بڑھ کر شیطان کو دل سے بھگانے والی ہو، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا اور علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہنا ہے۔ اس کا ذکر پہلے بسم اللہ شریف کی بحث میں گزر چکا ہے۔ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا کہا گیا ہے: اس سے مشرکین مراد لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیاطین مراد ہیں۔ اور نُفُوْرًا یہ نافر کی جمع ہے، جیسا کہ شهود، شاهد کی جمع ہے، اور قعود، قاعد کی جمع ہے۔ اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو جو فعل کے الفاظ کے سوا ہے، جبکہ قول باری تعالیٰ: وَلَّوْا بمعنی نفروا ہو اور اس کا معنی یہ ہو نفروا نفورًا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۴۷

''ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کے لئے یہ سنتے ہیں اسے جب یہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کر رہے مگر ایک ایسے آدمی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 460 2۔ ایضاً

کی جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ بِهٖۤ میں باز ائدہ ہے مراد ہے یستمعونه (یعنی ہم اس کے بارے خوب جانتے ہیں جس کے لئے یہ اسے سنتے ہیں) اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنتے تھے پھر نفرت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ ساحر (جادوگر) ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اس کے بارے خبر دی ہے؛ یہ حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے۔ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى یعنی (ہم خوب جانتے ہیں) جب وہ آپ کے معاملے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ان کی سرگوشیاں ان کا یہ قول ہوتا تھا: بے شک یہ مجنون ہے، بے شک یہ ساحر ہے، اور بے شک یہ پہلے لوگوں کے افسانے لاتا ہے(1)، اور اس طرح کی اور باتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب عتبہ نے معززین قریش کو کھانے پر بلایا جو اس نے ان کے لئے تیار کیا، پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور کہنے لگے: یہ جادوگر اور مجنون ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ کھانے کا اہتمام کریں اور مشرکین میں سے اشراف قریش کو اس کی دعوت دیں، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعوت کا اہتمام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں توحید کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: "کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یقیناً عرب تمہارا مطیع ہو جائے گا اور اہل عجم تمہارا دین قبول کر لیں گے۔" لیکن انہوں نے انکار کر دیا، وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنتے تھے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے تھے: یہ تو جادوگر ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: النجوی اسم مصدر ہے، یعنی اذهم ذونجوی (جب وہ سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں) اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اس سے مراد ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور ان جیسے دیگر لوگ ہیں۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (کہ تم پیروی نہیں کر رہے مگر ایسے آدمی کی) جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ تحقیق سحر (جادو) نے اسے خراب کر دیا ہے اور اس پر اس کا معاملہ خلط ملط ہو چکا ہے، وہ یہ اس لئے کہتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بھاگ جائیں (نفرت کرنے لگیں)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مَّسْحُوْرًا اس کا معنی ہے دھوکا دیا ہوا مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ (المومنون) یعنی کہاں سے تمہیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: مَّسْحُوْرًا اس کا معنی ہے کہ ان کے تابع ایک جن ہے، لہٰذا وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہیں، پس وہ تمہاری ہی مثل ہیں اور وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ اور عرب بزدل آدمی کے لئے کہتے ہیں: قد انتفخ سحره (وہ تو بزدل اور ڈرپوک نکلا)۔ آدمی وغیرہ میں سے جو بھی کھائے یا پیئے اسے مسحور اور مُسَحَّر کہا جاتا ہے۔ لبید نے کہا ہے:

فإن تسألينا فيم نحن فإننا عصافير من هذا الأنام المُسَحَّرِ(2)

اور امرء القیس نے کہا ہے:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 247 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461

أرانا موضعین لأمر غیب وَ نُسحَر بالطعام و بالشراب(1)

یعنی ہم کھانا کھلائے جاتے ہیں اور بار بار پلائے جاتے ہیں۔

اور حدیث طیبہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کون ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے میرے مقابلے میں فخر کرسکتی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سینے کے ساتھ لگے ہوئے وصال فرمایا(2)۔

**اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾**

"دیکھئے (یہ گستاخ) کس طرح آپ کے لئے مثالیں بیان کرتے ہیں پس (اس گستاخی کے باعث) وہ گمراہ ہو گئے اب وہ سیدھے راستہ پر چل نہیں سکتے۔"

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ یہ ان کے عمل اور کارستانی پر اظہار تعجب کیا ہے کہ وہ کبھی کہتے ہیں: یہ جادوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ مجنون ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ شاعر ہے۔ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا پس وہ لوگوں کو آپ سے روکنے کا حیلہ کر کے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حق سے گمراہ ہو گئے ہیں پس اب وہ ہدایت کی طرف لے جانے والے راستے کو نہیں پا سکتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ (گمراہی سے) نکلنے کی راہ نہیں پا سکتے کیونکہ ان کے قول میں ان کا کلام متناقض ہے، یعنی وہ کبھی مجنون، کبھی ساحر اور کبھی شاعر کہتے ہیں۔

**وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٤٩﴾**

"اور انہوں نے (از راہ انکار) کہا کہ جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا از سر نو پیدا کر کے۔"

قولہ تعالیٰ: ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ یعنی انہوں نے یہ کہا اس حال میں کہ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے جب انہوں نے قرآن کریم سنا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا حکم سنا کہ اگر یہ جادو کیا ہوا اور دھوکا دیا ہوا نہ ہوتا تو یہ اس طرح نہ کہتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الرفات کا معنی غبار ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی تراب (مٹی) ہے(3)۔ اور الرفات ہر وہ شے جو ریزہ ریزہ ہو جائے اور ہر وہ شے جو بوسیدہ اور پرانی ہو جائے، جیسا کہ فُتَات، حُطام اور رُضاض (تینوں کا معنی ٹوٹی ہوئی چیز کے ٹکڑے اور چورا ہے۔) یہ ابو عبیدہ، کسائی، فراء اور اخفش سے منقول ہے، اسی سے تو کہتا ہے: رُفِتَ الشیٔ رَفْتًا، یعنی چیز کو توڑ دیا گیا فہو مرفوت (پس وہ ٹوٹی ہوئی ہے) اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا، اَئِنَّا استفہام ہے اور اس سے مراد جحد اور انکار ہے۔ اور خَلْقًا منصوب ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، یعنی بعثا جدیدا (نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھانا، تو یہ مفعول مطلق ہے۔) اور یہ ان کی طرف سے حد درجے کا انکار ہے۔

**قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿٥٠﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ**

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 462

مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝

''فرمائیے (یقیناً ایسا ہی ہوگا) خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ۔ یا کوئی ایسی مخلوق بن جاؤ جس کا از سر نو پیدا کرنا تمہارے خیال میں بہت مشکل ہے، وہ کہیں گے: ہمیں دوبارہ کون (زندہ کر کے) لوٹائے گا؟ فرمائیے: وہی جس نے پیدا فرمایا تمہیں پہلی مرتبہ، پس وہ حیرت سے آپ کی طرف (دیکھ کر) سروں کو جنبش دیں گے اور پوچھیں گے: ایسا کب ہوگا؟ آپ بتائیے: شاید اس کا وقت قریب ہی ہو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیے (اگرچہ) تم عاجز کرنے کی جہت سے تم شدت اور قوت میں پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ (تب بھی ایسا ہی ہوگا۔) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر تمہیں اس پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہڈیاں اور گوشت پیدا کرے گا تو تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ اگر تم قدرت رکھتے ہو(1)۔ اور علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ تم اگر پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے جب اس نے تمہارا ارادہ کر لیا، مگر یہ کلام امر کے محل میں ہے، کیونکہ الزام میں یہ زیادہ بلیغ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو وہ یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھائے گا جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اور وہ یقیناً تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا(2)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم جو چاہو ہو جاؤ تم عنقریب دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے کیونکہ وہ یہ استطاعت اور طاقت نہیں رکھتے کہ وہ پتھر ہو جائیں۔ اور بلاشبہ اس کا معنی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے خالق کے بارے اقرار کر لیا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا تو انہیں کہا گیا کہ یہ سمجھ لو کہ تم جو چاہو ہو جاؤ، پس اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو بھی تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے جس طرح پہلی بار پیدا کئے گئے۔ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہ بڑے عظیم ہیں(3)۔ اور یہی معنی حضرت قتادہ کے قول کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: تم جو چاہو ہو جاؤ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں موت دے گا اور پھر تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابن جبیر، مجاہد نے بھی، عکرمہ، ابو صالح، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: مراد موت ہے، کیونکہ ابن آدم (انسان) کے خیال میں اس سے بڑی اور کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ امیہ بن ابی صلت نے کہا ہے:

و للموت خلق في النفوس فظيع(4) (لوگوں کے خیال میں موت خوفناک مخلوق ہے۔)

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: بے شک تم اگر پتھر یا لوہے سے پیدا کئے جاتے یا تم موت ہوتے تو میں ضرور تمہیں موت دوں گا اور یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا، کیونکہ وہ قدرت جس کے ساتھ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی کے ساتھ تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا۔ اور یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا: فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور حدیث میں ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 113 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 248 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کہ "قیامت کے دن چتکبرے مینڈھے کی صورت میں موت کو لایا جائے گا اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بعث (دوبارہ زندہ کیا جانا) ہے، کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہی سب سے بڑی شے ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ فَطَرَكُمْ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بنایا۔ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ یعنی وہ بطور استہزا اپنے سروں کو حرکت دیتے ہیں؛ کہا جاتا ہے: نَغَض رأسه يَنْغَضُ ويَنْغِضُ نَغْضاً و نُغُوضاً، یعنی اس کے سر نے حرکت کی۔ اور أنغض رأسه یعنی اس نے اپنے سر کو ہلایا، حرکت دی، اس طرح جیسا کہ کوئی کسی شے سے تعجب کرنے والا کرتا ہے۔ اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ۔

راجز کا قول ہے: أنغض نحوی رأسه وأقنعا(1) (اس نے میری طرف اپنے سر کو ہلایا اور اسے اوپر اٹھالیا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: نَغَضَ فلان رأسه (یعنی فلاں نے اپنے سر کو حرکت دی) یہ متعدی اور غیر متعدی دونوں طرح آتا ہے، اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: نغضت سنه یعنی اس کا دانت ہل گیا اور اکھڑ گیا۔ راجز نے کہا ہے:

ونغضت من هرم أسنانها(2)

(بڑھاپے کے سبب اس کے دانت ہل گئے) اور دوسرے نے کہا ہے:

لما رأتنی انغضت لی الرأسا(3)

(جب اس نے مجھے دیکھا تو میرے لئے اپنا سر ہلادیا)۔

اور ایک اور نے کہا ہے:

لا ماء فی المقراة إن لم تنهض　　بمسد فوق المحال النغض

المحال اور المحالة سے مراد وہ بڑی چرخی ہے جس کے ساتھ اونٹوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ یعنی وہ کہتے ہیں کہ دوبارہ زندہ کیا جانا، لوٹانا اور وہ وقت کب ہوگا۔ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا یعنی آپ فرمائیے وہ قریب ہے، کیونکہ عسیٰ واجب کے معنی میں ہے؛ اس کی نظیر یہ ہے: وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ (الاحزاب) (اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ (الشوریٰ) (شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور ہر وہ شے جو آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

"اس دن کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ بلائے گا سو تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے اور یہ گمان کر رہے ہو گے کہ تم نہیں ٹھہرے (دنیا میں) مگر تھوڑا عرصہ۔"

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ، الدعا سے مراد میدان حشر کی طرف ایسے کلام کے ساتھ بلانا اور ندا دینا ہے جسے تمام مخلوق سنے گی، اس میں اللہ تعالیٰ انہیں (قبروں سے) نکلنے کے بارے ندا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 462　2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 116　3۔ ایضاً

سے مراد ایسی چیخ ہے جسے وہ سب سنیں گے، پس وہی ان کو قیامت کی زمین میں جمع ہونے کی دعوت ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک قیامت کے دن تمہیں اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں سے بلایا جائے گا اس لئے اپنے نام خوبصورت رکھو (1)''۔ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ یعنی اس کے حمد کے مستحق ہونے کے سبب (تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے) اور ابو سہل نے کہا ہے: مراد الحمدللہ کہنا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے

فإني بحمد الله لاثوب فاجر لبستُ، ولا من غدرة أتقنع (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ہے: تم جواب دو گے اس حال میں کہ تم اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر رہے ہو گے (3)۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے اور وہ کہہ رہے ہوں گے سبحانك وبحمدك، لیکن اس دن کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: بِحَمْدِهٖ سے مراد بامرہ (یعنی اس کے حکم سے) ہے، یعنی تم اقرار کرو گے کہ وہی تمہارا خالق ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کی معرفت اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کی قدرت کے ساتھ۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کے تمہیں بلانے کے ساتھ۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے، کیونکہ صور میں پھونکنا ان کے قبروں سے نکلنے کا سبب ہوگا اور بالحقیقت یہ حق کی دعوت و پکار کے ساتھ مخلوق کا باہر نکلنا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ پس وہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوں گے سبحانك اللّٰھم وبحمدك۔ فرمایا: پس قیامت کا دن وہ دن ہے جس کا آغاز بھی حمد سے ہوگا اور اسی کے ساتھ اختتام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ اور اس کے آخر کے بارے میں فرمایا: وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ (الزمر) (اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ اور کہا جائے گا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے۔)

وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا یعنی دو نفخوں کے درمیان (تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ) اور یہ اس لئے ہوگا کہ دو نفخوں کے درمیان ان سے عذاب روک دیا جائے گا جنہیں پہلے عذاب دیا جا رہا تھا، اور وہ عرصہ چالیس برس ہوگا پس وہ سو جائیں گے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: 52) (کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خواب گاہ سے؟) اور یہ کفار کے لئے خاص ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قیامت کے دن سے پہلے کافروں کو ہلکی سی نیند آئے گی وہ اس میں نیند کا ذائقہ ہی پائیں گے، تو اچانک اہل قبور کے لئے چیخ ماری جائے گی تو وہ خوفزدہ، گھبرائے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ دنیا ان کی نگاہوں میں حقیر اور قلیل ہو جائے گی جس وقت وہ قیامت کے دن کو دیکھیں گے۔ حسن نے کہا ہے: وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا آخرت میں اپنے طویل ٹھہرنے کی وجہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، جلد 2، صفحہ 320۔ ایضاً، باب فی تغییر الأسماء، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249

4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

سے تم گمان کرو گے کہ دنیا میں تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ (1)۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝۵۳

''اور آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں، بے شک شیطان فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان، یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اس کے اعراب اور ترکیب کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے عرب (2) میں سے ایک آدمی کو خوب سب و شتم کیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا، قریب تھا کہ فتنہ بھڑک اٹھتا تو اس بارے میں الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اسے ثعلبی، ماوردی، ابن عطیہ اور واحدی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے کہا: یارسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ان کے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرمائیے تحقیق ان کی اذیت رسانی ہمارے لئے بڑھ گئی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے ابھی تک قتال کے بارے حکم نہیں دیا گیا ہے''۔ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ حکم دیجئے میرے ان بندوں کو جنہوں نے اعتراف کیا کہ میں ان کا خالق ہوں اور وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں کلمہ توحید میں سے اور اقرار نبوت میں سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور حکم دیجئے میرے ایمان والے بندوں کو جب وہ توحید کے بارے میں کفار سے جھگڑا کریں، مباحثہ کریں، تو وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت ہی عمدہ ہوں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: 108) (اور تم نہ برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں الله کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی برا بھلا کہنے لگیں الله کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔) اور حسن نے کہا ہے کہ وہ کافر کو کہے جب وہ زیادتی کرے: الله تعالیٰ تجھے ہدایت دے! الله تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے! اور یہ انہیں جہاد کے بارے حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں حکم دیجئے کہ وہ اس چیز کے بارے حکم دیں جس کے بارے الله تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ اس سے منع کریں جس سے الله تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، اس معنی کی بنا پر آیت مومن اور کافر کے بارے میں عام ہوگی، یعنی آپ تمام کو حکم دیجئے۔ والله اعلم۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: الله تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو ان امور کے بارے میں حکم دیا ہے جو ان کے درمیان خاص ہیں، حسن ادب کے ساتھ اور قول کی نرمی کے ساتھ، پر جھکانے کے ساتھ اور شیطان کے فسادات کو پرے پھینکنے کے ساتھ، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے الله کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ (3)''۔ یہ احسن قول ہے، یہ آیت محکم ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، تحریم التحاسد و التباغض، جلد 2، صفحہ 315

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ بے شک شیطان ان کے درمیان فساد اور عداوت و گمراہی پھیلانا چاہتا ہے۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ یوسف میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے نزغ بیننا شیطان نے ہمارے درمیان فساد برپا کیا؛ یزیدی نے یہ کہا ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: النزغ کا معنی ہے الاغراء برانگیختہ کرنا، ابھارنا۔ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا بے شک شیطان انسان کا شدید عداوت کے سبب کھلا دشمن ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ''ایک قوم بیٹھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے پس شیطان آیا تا کہ ان کی مجلس کو ختم کر دے تو ملائکہ نے اسے روک دیا تو وہ ایک قوم کے پاس آیا جو قریب ہی بیٹھے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کر رہے تھے پس اس نے انہیں آپس میں اکسایا تو وہ آپس میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے تو ان ذکر کرنے والوں نے کہا: ہمارے ساتھ اٹھو ہم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیں، پس وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی مجلس ختم کر دی اور اس سے شیطان خوش ہو گیا، پس یہ اس کی عداوت اور دشمنی میں سے ہے''۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝۵۴

''تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے، اگر چاہے تو تم پر رحم (و کرم) فرمادے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے، اور نہیں بھیجا ہم نے ان کو ان کا ذمہ دار بنا کر (تا کہ ان کے کفر کے لئے آپ جوابدہ ہوں)''۔

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ یہ خطاب مشرکین کو ہے، اور اس کا معنی ہے: اگر وہ چاہے تو تمہیں اسلام کی توفیق عطا فرمادے اور تم پر رحم و کرم فرما دے، یا تمہیں شک پر موت دے دے اور تمہیں سزا اور عذاب میں مبتلا کر دے؛ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔ اور أعلم بمعنی علیم (خوب جاننے والا) ہے، جیسا کہ ان کا قول: اللہ اکبر میں اکبر بمعنی کبیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مومنین کے لئے ہے، یعنی اگر وہ چاہے تو تم پر رحم و کرم فرمائے اس طرح کہ وہ کفار مکہ سے تمہیں محفوظ رکھے، یا اگر وہ چاہے تو وہ تمہیں ان کو تم پر مسلط کر کے سزا دے؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا یعنی ہم نے آپ کو انہیں کفر سے روکنے کے بارے میں ذمہ دار نہیں بنایا اور نہ ہم نے ان کے ایمان کو آپ کے سپرد کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے آپ کو ان کا کفیل نہیں بنایا کہ آپ کو ان کے بدلے پکڑ لیا جائے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے:

ذکرت أبا أرْوَی فبتّ کأنّنی — بردّ الأمور الماضیات وکیل(1)

اس میں وکیل بمعنی کفیل ہے۔

وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

''اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور بے شک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر اور ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور۔''

قولہ تعالیٰ: وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اس قول وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ کے بعد اس کا اعادہ کیا تاکہ وہ یہ واضح کر دے کہ وہی ان کا خالق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق، اشکال، احوال اور مال میں مختلف بنایا ہے؛ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک: 14) (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے)۔ اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اسے ان کے اس حال کے بارے خوب علم ہے۔ اس بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا زبور وہ کتاب ہے جس میں حلال و حرام میں سے کوئی نہیں ہے، اور نہ اس میں حدود و فرائض ہیں، بلکہ وہ تو فقط دعا اور تحمید و تمجید ہے، یعنی جس طرح ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی ہے پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیئے جانے کا انکار نہ کرو اور یہ یہودیوں کے جھگڑے اور اختلاف کے بارے میں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

''(انہیں) کہیے اب بلاؤ ان کو جنہیں تم گمان کیا کرتے تھے (کہ یہ خدا ہیں) اللہ تعالیٰ کے سوا، وہ تو قدرت نہیں رکھتے کہ تکلیف دور کر سکیں تم سے اور نہ ہی وہ (اسے) بدل سکتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ جب قریش کو قحط میں مبتلا کیا گیا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی تم ان کو بلاؤ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہو اور یہ گمان کرتے ہو کہ وہ خدا ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: یعنی ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر (کو بلاؤ) (1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ یعنی جنوں کو بلاؤ (2)۔ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ یعنی وہ قحط جو سات سال تک ان پر مسلط رہا (وہ اس تکلیف کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے)، یہ مقاتل کے قول کے مطابق ہے۔ وَ لَا تَحْوِيْلًا اور نہ ہی وہ اسے فقر سے غنیٰ (خوشحالی) کی طرف اور بیماری سے صحت کی طرف بدل سکتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

''وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں، وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کون سا بندہ (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ قریب ہے اور امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور ڈرتے رہتے ہیں اس کے عذاب سے بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔''

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 30 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے۔ الَّذِيْنَ، اُولٰٓئِكَ کی صفت ہے۔ اور صلہ کی ضمیر محذوف ہے، یدعونھم یعنی وہ جنہیں پکارا جاتا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ خبر ہے یا یہ حال ہوگا، اور الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ خبر ہے، ای یدعون الیہ عبادا [أو عبادہ] إلى عبادتہ۔ (وہ اس کی طرف اس کے بندوں کو اس کی عبادت کے لئے پکارتے ہیں)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تدعون صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خبر کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ یا کے ساتھ ہے۔ اور صحیح مسلم میں کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ کے بارے کہا ہے: جنوں کے ایک گروہ نے اسلام قبول کر لیا حالانکہ ان کی عبادت کی جاتی تھی، پس وہ جو ان کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت اور پرستش پر باقی رہے حالانکہ جنوں کا ایک گروہ اسلام لا چکا تھا (1)۔ اور ایک روایت میں انہوں نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے نازل ہوئی وہ جنوں کے گروہ کی عبادت کرتے تھے پس جنوں سے تعلق رکھنے والے تو اسلام لے آئے اور وہ انسان جو ان کی عبادت کرتے تھے وہ یہ شعور نہیں رکھتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی (2): اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ، اور انہی سے یہ روایت بھی ہے کہ وہ ملائکہ ہیں عرب قبائل ان کی پرستش کرتے تھے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب اور نزدیکی کا ذریعہ تلاش کر رہے ہیں، اور جنت کی طلب میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور زاری کر رہے ہیں، اور یہی وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کر دیا کہ ان کے معبود اپنے رب سے قرب اور نزدیکی تلاش کر رہے ہیں۔ اور رَبِّهِمُ میں ھا اور میم عبادت کرنے والوں کی طرف یا معبودوں کی طرف یا ان تمام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اور رہا يَدْعُوْنَ تو اس کی ضمیر عبادت کرنے والوں کی طرف ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کی ضمیر معبودوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ، يَبْتَغُوْنَ میں موجود ضمیر سے بدل ہو، اور اس کا معنی یہ ہو تلاش کرنا چاہئے کہ کون سا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے؟ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اس سے کسی کو کوئی امان نہیں، پس چاہئے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے خوف کیا جائے۔ اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: امید اور خوف انسان پر دو زمانے ہیں، پس جب یہ دونوں برابر ہوں اس کے احوال صحیح اور درست ہوتے ہیں، اور اگر ان میں سے ایک ترجیح پا جائے تو دوسرا باطل ہو جاتا ہے (3)۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

''اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے برباد کر دیں گے روز قیامت سے پہلے یا اسے سخت عذاب دیں گے، یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، فی قولہ تعالیٰ اولئك الذين يدعون، جلد 2، صفحہ 422　　2۔ ایضاً

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252

فیصلہ کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر اسے خراب اور برباد کر دیں گے۔ قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡهَا عَذَابًا شَدِیۡدًا مقاتل نے کہا ہے: اگر اس بستی کے رہنے والے نیک اور صالح لوگ ہیں تو موت کے ساتھ اس بستی کو ختم کر دیں گے، اور اگر وہ بدکار اور نافرمان ہیں تو پھر عذاب کے ساتھ اسے برباد کر دیں گے (1)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان فرما دیتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اور اگر وہ ظالموں کی بستی میں سے ہو۔ اور اسے یہ قول باری تعالیٰ تقویت دیتا ہے: وَ مَا كُنَّا مُهۡلِكِی الۡقُرٰۤی اِلَّا وَ اَهۡلُهَا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ (القصص) (اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہیں۔) یعنی مشرکوں کو ڈرنا چاہئے، کیونکہ کافروں کی کوئی بستی نہیں ہے مگر اس میں عنقریب عذاب آئے گا۔ كَانَ ذٰلِكَ فِی الۡكِتٰبِ یعنی یہ فیصلہ کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہے۔ مَسۡطُوۡرًا لکھا ہوا۔ اور السطر اس کا معنی لکھنا ہے اور یہ اصل میں مصدر ہے۔ اور السَّطَرُ طا متحرکہ کے ساتھ ہو تو بھی اسی طرح ہے۔

جریر نے کہا ہے:

من شاء بايعته ما لی وخُلْعَتَهُ ما تُكْمِلِ التَّيْمُ فی ديوانهم سَطَرَا

الخُلعة خا کے ضمہ کے ساتھ اس کا معنی مال کا اختیار ہے۔ اور السَّطَرَ کی جمع أسطار ہے، جیسے سبب کی جمع اسباب ہے، پھر اس کی جمع الجمع اساطیر ہے۔ اور السطر کی جمع أسطر اور سطور ہے، جیسے أفلس اور فلوس ہیں۔ اور یہاں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا ؕ وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۵۹﴾

"اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم بھیجیں (کفار کی تجویز کردہ) نشانیاں مگر اس بات نے کہ جھٹلایا تھا ان نشانیوں کو پہلوں نے (اور وہ فوراً تباہ کر دیئے گئے تھے) اور ہم نے دی تھی قوم ثمود کو ایک اونٹنی جو روشن نشانی تھی پس انہوں نے زیادتی کی اس پر، اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر لوگوں کو (عذاب سے) خوفزدہ کرنے کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ اس کلام میں حذف ہے، اور تقدیر کلام ہے: وما منعنا أن نرسل بالآيات التی اقترحوها إلا أن يكذبوا بها فيهلكوا كما فعل بمن كان قبلهم (اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم وہ نشانیاں بھیجیں جن کو کفار نے تجویز کیا مگر اس بات نے کہ وہ انہیں جھٹلائیں اور ہلاک کر دیئے جائیں جیسا کہ ان کے ساتھ کیا گیا جو ان سے پہلے تھے۔) اس کا یہ معنی قتادہ اور ابن جریج وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کفار قریش سے عذاب کو مؤخر کر دیا کیونکہ اس کے علم میں تھا کہ ان میں وہ بھی ہیں جو ایمان لائیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں جو مومنوں کو جنم

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 124

دیں گے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام وغیرہ میں گزر چکا ہے کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے صفا کو سونے میں بدل دے اور پہاڑ ان سے دور ہٹا دیئے جائیں، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اگر آپ چاہیں تو وہی ہو جائے جو آپ کی قوم نے مانگا ہے لیکن اگر وہ ایمان نہ لائے تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو ان کے بارے انتظار کرلیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں، بلکہ میں ان کے بارے انتظار کروں گا۔“ اور پہلا اَنْ محل نصب میں ہے اس لئے کہ منع ان پر واقع ہوا، اور دوسرا اَنْ محل رفع میں ہے۔ اور بِالْاٰیٰتِ میں باء زائدہ ہے۔ اور مجاز کلام یہ ہے: و ما منعنا إرسال الآیات إلا تکذیب الأولین۔ (اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر پہلوں کے جھٹلانے نے) اور اللہ تعالیٰ کو کسی شے سے روکا نہیں جاسکتا، پس یہ اس معنی میں اظہار مبالغہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، تو گویا اسے اس سے روک دیا گیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی جو کچھ اس نے ان کے ساتھ کیا جنہوں نے نشانیوں کا مطالبہ کیا اور وہ ان کے ساتھ ایمان نہ لائے، پس فرمایا: وَ اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے قوم ثمود کو ایسی نشانی عطا فرمائی جو حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر انتہائی واضح اور روشن دلیل تھی، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ فَظَلَمُوْا بِهَا یعنی انہوں نے اسے جھٹلانے کے ساتھ زیادتی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تسلیم نہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے پس اللہ تعالیٰ نے عذاب کے ساتھ انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا اس میں پانچ قول ہیں: (۱) وہ نصائح اور معجزات جو ڈرانے والے دلائل میں سے جھٹلانے والوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ہاتھوں پر ظاہر فرمائے۔ (۲) کہ یہ گنہگاروں کو ڈرانے کے لئے انتقام کی علامات اور نشانیاں ہیں۔ (۳) یہ احوال کو بچپن سے جوانی کی طرف پھر بڑھاپے کی طرف اور پھر شیخوخت کی طرف پھیرنا اور بدلنا ہے، تاکہ تو اپنے احوال کے بدلنے سے عبرت حاصل کرے اور اپنے انجام سے ڈرنے لگے؛ اور یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے(1)۔ (۴) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ (۵) اس سے مراد جلدی اور تیزی سے آنے والی موت ہے) یہ قول حسن نے کہا ہے(2)۔

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا ۠﴿۶۰﴾

”اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا آپ کو کہ بے شک آپ کے پروردگار نے گھیرے میں لے لیا ہے لوگوں کو، اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے نیز (آزمائش بنایا) اس درخت کو جس پر لعنت بھیجی گئی ہے قرآن میں، اور ہم انہیں (نافرمانی کے انجام سے) ڈراتے رہتے ہیں پس نہ بڑھایا اس ڈرانے نے انہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں الناس سے مراد اہل مکہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 126

ہیں، اور اس کے انہیں گھیرنے سے مراد اس کا انہیں ہلاک کرنا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں ہلاک کر دے گا۔ اور اس کو ماضی کے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا اس کے تحقق اور وقوع کے یقینی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور وہ ہلاک کرنا جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ ہے جو کچھ یوم بدر اور یوم فتح کو ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَحَاطَ بِالنَّاسِ کا معنی ہے، یعنی اس کی قدرت نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے، پس وہ اس کے قبضے میں ہیں اور وہ اس کی مشیت سے نکلنے پر قدرت نہیں رکھتے؛ یہ حضرت مجاہد اور ابن ابی نجیح نے کہا ہے(1)۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے اس کے علم نے لوگوں کو گھیرا ہوا ہے(2)۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں سے آپ کی حفاظت اور نگہبانی فرمائے گا کہ وہ آپ کو قتل کریں یہاں تک کہ آپ اپنے رب کا پیغام پہنچادیں، یعنی ہم نے آپ کو ان پر نگران اور محافظ بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ آپ پر تبلیغ کرنے اور پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے، پس آپ اپنی محبت اور کوشش کے ساتھ تبلیغ کریں کیونکہ ہم آپ کو ان سے بچائیں گے اور ہم آپ کی حفاظت کریں گے، پس آپ ان سے نہ ڈریں اور وہ کام کریں تبلیغ رسالت میں سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے، پس ہماری قدرت تمام کو محیط اور گھیرے ہوئے ہے؛ اس کا یہ معنی حضرت حسن، عروہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے(3)۔ قولہ تعالیٰ:

وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ جب یہ بیان کیا کہ قرآن کریم کی آیات کو نازل کرنا ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کو متضمن ہے تو اس کے ساتھ آیۃ الاسراء کا ذکر ملا دیا، اور وہ آیت اس سورت کے آغاز میں مذکور ہے۔ صحیح بخاری اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کے تحت فرمایا: یہ آنکھ کے ساتھ دیکھا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات دکھایا گیا جس رات آپ کو بیت المقدس کی طرف لے جایا گیا۔ فرمایا: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ یہ زقوم (تھور) کا درخت ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(4): یہ حدیث صحیح ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مثل ہی حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ، حسن، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، ضحاک، ابن ابی نجیح اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور فتنہ سے مراد قوم کا مرتد ہونا ہے جو اسلام لا چکے تھے (اور اس وقت مرتد ہو گئے) جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبر دی کہ انہیں معراج پر لے جایا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حالت نیند کی رؤیت ہے۔ اور یہ آیت اس قول کے فاسد ہونے کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس لئے کہ حالت خواب میں دیکھنے میں کوئی فتنہ نہیں ہے، اور کوئی بھی نہیں ہے جو اس کا انکار کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں جس رؤیا کا ذکر ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیبیہ کے سال میں یہ دیکھنا ہے کہ آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے، لیکن آپ کو واپس لوٹا دیا گیا پس مسلمان اس وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی، پس جب آئندہ سال آیا تو آپ اس میں داخل ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ (الفتح: 27) (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ) اس تاویل میں ضعف ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور وہ نظارہ آپ نے مدینہ طیبہ میں دیکھا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 253 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، من سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 141

تھا۔ اور تیسری روایت میں آپ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بنی مروان کو دیکھا کہ وہ آپ کے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کود رہے ہیں، تو آپ کو یہ بہت برا لگا تو کہا گیا: بلاشبہ یہ دنیا ہے جو انہیں عطا کی گئی ہے، پس آپ سے فکر دور کر دی گئی، اور آپ کا مکہ مکرمہ میں کوئی منبر نہ تھا لیکن یہ جائز ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں مدینہ منورہ والے منبر کا نظارہ دیکھا ہو۔ اور یہ تیسری تاویل حضرت سہل بن سعد نے بھی بیان کی ہے۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہی نظارہ وہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی امیہ کو اپنے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کودتے دیکھا، تو آپ اس سے غمزدہ ہو گئے، اور اس دن سے آپ کھل کر ہنسے نہیں یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا، پس یہ آیت اس کی خبر دینے کے لئے نازل ہوئی کہ ان کی بادشاہی اور ان کے غالب آنے کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے فتنہ (آزمائش) اور امتحان بنا دے گا(1)۔ اور امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کے بارے میں اپنے خطبہ میں یہ پڑھا: وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ۞ (الانبیاء) (اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تاویل محل نظر ہے۔ اور اس رؤیا میں حضرت عثمان، حضرت عمر بن عبدالعزیز، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم داخل نہیں ہیں۔ قولہ تعالیٰ: وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی ما جعلنا الرؤیا ألتی أریناك والشجرة الملعونة فی القرآن إلا فتنة للناس۔ (ہم اس نظارہ کو جو ہم نے آپ کو دکھایا اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے نہیں بنایا مگر لوگوں کے لئے آزمائش) اور اس کا فتنہ یہ تھا کہ انہیں جب اس کے ساتھ خوفزدہ کیا گیا تو ابو جہل نے استہزا کیا: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں تمہیں ایسی آگ سے ڈرا رہے ہیں جو پتھروں کو جلاتی ہے، پھر یہ گمان کرتے ہیں کہ درختوں کو اگاتی ہے حالانکہ آگ درختوں کو کھاتی ہے، اور ہم زقوم کو نہیں پہچانتے مگر یہ کہ وہ کھجور اور مکھن ہے، پھر ابو جہل نے اپنی لونڈی کو حکم دیا پس وہ کھجور اور مکھن لے آئی اور اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا: تزقموا زقوم کھاؤ(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ قول کہ ہم زقوم کو نہیں جانتے مگر کھجور اور مکھن، کہنے والا ابن زبعری ہے جس وقت اس نے کہا: كثر الله من الزقوم فی دار کم (اللہ تعالیٰ تمہارے گھر میں زقوم زیادہ کرے)، کیونکہ لغت یمن میں اس سے مراد مکھن اور کھجور ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے اس طرح کہا ہو۔ پس بعض ضعیف اور کمزور لوگ اس قول کی وجہ سے بھی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گئے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی ہے کہ بے شک واقعہ معراج اور زقوم کے درخت کے ذکر کو آزمائش اور امتحان بنا دیا گیا ہے تاکہ وہ کافر ہو جائے جس پر کفر سبقت لے گیا ہے اور وہ تصدیق کر لے جس کے لئے ایمان سبقت لے گیا ہے۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر ہے وہ انکار کر دے اور جو مومن ہے وہ تصدیق کر دے۔) جیسا کہ روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معراج کی صبح کہا گیا: بے شک آپ کا ساتھی کہہ رہا ہے کہ وہ گزشتہ رات بیت المقدس میں سے ہو آیا ہے! تو آپ نے فرمایا: ان کان قال ذالك فقد صدق اگر آپ نے یہ فرمایا ہے تو یقیناً سچ فرمایا ہے۔ تو آپ کو کہا گیا: کیا آپ ان کی تصدیق کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ آپ ان سے سنیں؟ تو انہوں نے فرمایا: تمہاری عقلیں کہاں ہیں؟ میں آسمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468 2۔ ایضاً

کی خبر کے بارے ان کی تصدیق کرتا ہوں، تو میں بیت المقدس کی خبر کے بارے کیسے ان کی تصدیق نہیں کروں گا، حالانکہ آسمان اس سے بہت زیادہ دور ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خبر ابن اسحاق نے ذکر کی ہے، اور انہوں نے بیان کیا ہے: فرمایا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کے بارے میں جو حدیث مجھ تک پہنچی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ دیگر اہل علم اور حضرت ام ہانی بنت ابی طالب سے مروی ہے، جو کچھ اس حدیث میں جمع ہے، ہر کوئی ان بعض امور کو بیان کرتا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ اسراء کے وقت بیان کئے گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسراء میں اور جو کچھ اس بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس میں آزمائش، امتحان اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطنت سے متعلقہ امور میں سے کئی امور ہیں، اس میں صاحب عقل لوگوں کے لئے سامان عبرت ہے، اور ان کے لئے ہدایت، رحمت اور ثبات ہے جو ایمان لائے اور تصدیق کی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ امر تو یقینی ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی جیسے چاہی اور جہاں تک چاہی تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وہ نشانیاں دکھائے جن کا اس نے ارادہ کیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے امر، اس کی عظیم سلطنت اور اس کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کا معائنہ اور مشاہدہ کیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس روایت میں جو ان سے مجھ تک پہنچی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس براق لایا گیا...... اور یہ وہ جانور ہے جس پر آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو اٹھایا جاتا رہا وہ اپنا قدم اپنی حد نگاہ پر رکھتا ہے ...... پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سوار کیا گیا، پھر اس کا صاحب (لانے والا) اسے لے کر نکلا آپ آسمان و زمین میں موجود علامات اور آیات دیکھتے رہے، یہاں تک کہ آپ بیت المقدس تک پہنچ گئے، تو اس میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء میں دیکھا وہ آپ کے لئے جمع کئے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس تین برتن لائے گئے: ایک برتن میں دودھ تھا، ایک برتن میں شراب تھی، اور ایک برتن میں پانی تھا۔ انہوں نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سو میں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جس وقت وہ مجھ پر پیش کئے گئے کہ اگر انہوں نے پانی لیا تو غرق ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی غرق ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے شراب پکڑی تو گمراہ ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی گمراہ ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے دودھ لیا تو خود بھی ہدایت پا جائیں گے اور ان کی امت بھی ہدایت پا جائے گی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس میں نے دودھ والا برتن پکڑا اور پی لیا تو جبرائیل امین نے مجھے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی راہنمائی کر دی گئی اور آپ کی امت کی بھی راہنمائی کر دی گئی۔''

ابن اسحاق نے کہا ہے: میں نے حسن سے حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجرے میں سو رہا تھا میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468

مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا پھر وہ دوسری بار میرے پاس آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا۔ پھر وہ تیسری بار میری طرف آئے اور اپنے قدموں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا اور انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور میں ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور وہ مسجد کے دروازے کی طرف نکل گئے وہاں سفید رنگ کا جانور تھا جو (قد میں) خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کی رانوں پر دو پر تھے وہ انہیں اپنی ٹانگوں پر مارتا تھا اور اپنا قدم اپنی انتہائے نگاہ پر رکھتا تھا پس انہوں نے مجھے اس پر سوار کر دیا پھر میرے ساتھ نکل پڑے پھر نہ وہ مجھ سے الگ ہوئے اور نہ میں ان سے الگ ہوا۔" ابن اسحاق نے بیان کیا ہے اور مجھے حضرت قتادہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا، مجھے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب میں اس کے قریب ہوا کہ میں اس پر سوار ہوں تو وہ اچھلنے اور بدکنے لگا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کی کلغی والی جگہ پر رکھا اور فرمایا: اے براق! کیا تو اس سے حیا نہیں کرتا جو تو کر رہا ہے؟ قسم بخدا! حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو ان سے زیادہ معزز و مکرم ہو، فرمایا: پس اسے حیاء آ گئی یہاں تک کہ پسینہ بہنے لگا پھر وہ پرسکون ٹھہر گیا اور میں اس پر سوار ہو گیا۔''

حسن نے اپنی حدیث میں کہا ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے اور ان کے ساتھ جبرائیل امین بھی چلتے رہے یہاں تک کہ آپ بیت المقدس پہنچ گئے، پس وہاں آپ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء علیہم السلام میں پایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی امامت کرائی اور انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس دو برتن لائے گئے: ان میں سے ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا، فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ کا برتن پکڑ لیا اور اس سے پی لیا اور شراب کا برتن چھوڑ دیا۔ راوی نے کہا: تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا: آپ کی راہنمائی فطرت کی طرف کر دی گئی اور آپ کی امت کو ہدایت دے دی گئی اور تم پر شراب حرام کر دی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ کی طرف واپس لوٹ کر آئے، پس جب صبح کی اور قریش کی ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں واقعہ کی خبر دی، تو اکثر لوگوں نے کہا: قسم بخدا! یہ معاملہ تو بین اور واضح ہے؟ قسم بخدا! بے شک ایک قافلہ مکہ سے شام کی طرف مسلسل ایک مہینہ چلتا ہے ایک مہینہ جاتے ہوئے اور ایک مہینہ واپس آتے ہوئے، اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں ایک رات میں جاتے ہیں اور مکہ کی طرف واپس بھی لوٹ آتے ہیں! راوی نے بیان کیا: پس بہت سے وہ لوگ مرتد ہو گئے جو ابھی اسلام لائے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف گئے: اے ابا بکر! کیا تجھے اپنے ساتھی کے بارے خبر ہے؟ اس کا خیال ہے کہ وہ اس رات بیت المقدس آیا، اور اس میں نماز پڑھی اور واپس مکہ لوٹ آیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک تم ان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہو، تو انہوں نے کہا: نہیں، بلکہ وہ وہاں مسجد میں بیٹھے لوگوں سے بیان کر رہا ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! اگر انہوں نے یہ کہا ہے تو یقیناً وہ سچ ہے اس میں سے کون سی شے تمہیں تعجب میں ڈال رہی ہے؟ قسم بخدا! بلاشبہ وہ مجھے خبر دیتے ہیں کہ یہ خبر آسمان سے زمین کی طرف رات یا دن کی ایک ساعت میں آتی ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، تو یہ

اس سے بہت بعید اور دور ہے جس سے تم تعجب کر رہے ہو۔ پھر آپ آئے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے اور عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ، کیا آپ نے انہیں یہ بیان کیا ہے کہ آپ اس رات بیت المقدس تشریف لے گئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' آپ نے عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ آپ اس کے بارے مجھے بیان فرمائیے، کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے پس حسن نے بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے میرے لئے اٹھایا گیا یہاں تک کہ میں اسے دیکھنے لگا۔'' اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کی ہیئت بیان فرمانے لگے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جب بھی آپ اس میں سے کوئی شے بیان فرماتے تو یہ کہتے: صدقت، أشهد أنك رسول الله (آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔) راوی نے بیان کیا: یہاں تک کہ جب بات مکمل ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: وأنت یا ابابکر الصدیق (اے ابا بکر تو تو صدیق ہے) پس اس دن آپ نے آپ کا نام صدیق رکھ دیا۔ حسن نے بیان کیا ہے: اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے یہ آیت نازل فرمائی جو اس وجہ سے اسلام سے مرتد ہو گئے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۔(1)

پس یہ رسول اللہ ﷺ کے واقعہ اسراء کے بارے حسن کی حدیث ہے اور کچھ اس میں حضرت قتادہ کی حدیث سے بھی داخل ہے، اور ان سے باقی واقعہ معراج کا ذکر کتب میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ درخت بنو امیہ ہیں، اور یہ کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حکم کو شہر بدر کر دیا۔ یہ قول ضعیف اور من گھڑت ہے اور یہ سورت مکی ہے، اور یہ تاویل بعید ہے، مگر اس صورت میں کہ یہ آیت مدنی ہو، لیکن یہ ثابت نہیں۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مروان کو کہا تھا: اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ پر لعنت کی ہے اور تو اس کی صلب میں تھا پس تو بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت کا بعض اور جز ہے۔ پھر فرمایا: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ اور قرآن میں اس درخت پر لعنت جائز نہیں، لیکن (اس طرح کہ) اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت کی ہے اور وہ اسے کھانے والے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: والشجرة الملعونة فی القرآن آکلوها۔ (اور وہ درخت جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ اسے کھانے والے ہیں۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عربوں کے اس قول کی بنا پر ہو کہ وہ ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ کھانے کے لئے کہتے ہیں: ملعون (اس پر لعنت کی گئی ہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الشجرة الملعونه سے مراد وہی درخت ہے جو درختوں پر لپٹ جاتا ہے اور انہیں مار دیتا ہے (یعنی خشک کر دیتا ہے) مراد الکشوث ہے(2) (یعنی ایک قسم کی گھاس ہے جو کانٹوں اور درختوں پر لپٹی ہوتی ہے نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ اس کے پتے ہوتے ہیں۔ المنجد) وَنُخَوِّفُهُمْ اور ہم انہیں زقوم (تھور) کے ساتھ ڈراتے ہیں۔ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اور یہ ڈرانا سوائے کفر کے ان میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 34-33	2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 132

خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے کہا: کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس نے کہا: مجھے بتا یہ (آدم) جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے (اس کی وجہ کیا ہے)؟ اگر تو مجھے مہلت دے روز قیامت تک تو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ شیطان کے انسان کا دشمن ہونے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پس کلام کو ذکر آدم کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس کا معنی ہے: ان مشرکین کی سرکشی اور اپنے رب کے بارے میں ان کی رعونت کے ساتھ ابلیس کے قصہ کو یاد کرو جس وقت اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، اور وہ کہا جو کہا، اور وہ وہ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں دی ہے: فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا یعنی کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے بحث سورۃ البقرہ اور الانعام میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ قَالَ اَرَءَيْتَكَ یعنی یہ ابلیس نے کہا۔ اور اس میں کاف خطاب کی تاکید کے لئے ہے۔ (اس نے کہا: مجھے بتا) هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ یعنی یہ آدم ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔ اس نے آگ کے جوہر کو کیچڑ اور مٹی کے جوہر سے بہتر دیکھا اور اسے یہ علم نہ ہوا کہ جواہر متماثل اور برابر ہیں۔ یہ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ھذا، أرأیت کے سبب منصوب ہے۔ اور الذی اس کی صفت ہے۔ اور الا کہا: ایسا اسم ہے جو ہر اس شے کو جامع ہے جس کی تعریف کی جا رہی ہو۔ اور کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے: أخبرنی عن ھذا الذی فضلتہ علیّ (مجھے اس کے بارے خبر دے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے)، تو نے اسے کیوں فضیلت دی ہے حالانکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے؟ سامع کو علم ہونے کی وجہ سے کلام کو حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر حذف کی کوئی حاجت نہیں، یعنی مجھے بتا تو سہی کیا تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی ہے میں ضرور اس کے ساتھ اس اس طرح کروں گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق لَاَحْتَنِكَنَّ کا معنی ہے: میں ان پر غالب آ جاؤں گا۔ اور یہ فراء نے بھی کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں ضرور انہیں جمع کر لوں گا۔ ابن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں گمراہ کروں گا۔ اور اس کا معنی قریب قریب ہے، یعنی میں اس کی اولاد کو بھٹکانے اور گمراہ کرنے کے سبب جڑ سے اکھیڑ دوں گا، اور ضرور انہیں ہلاک و برباد کر دوں گا۔ اور عربوں سے مروی ہے: احْتَنَكَ الجراد الزرع جب ٹڈی دل (مکڑی) ساری کھیتی کو تباہ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں ضرور چلاؤں گا جہاں میں چاہوں گا اور میں انہیں ادھر ہی کھینچوں گا جہاں کا میں نے ارادہ کیا۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: حنکت الفرس أحنِکہ وأحنُکہ حنکا جب تو گھوڑے کے منہ میں رسی ڈال لے اور اسی طرح احتنکہ بھی ہے اور پہلا قول اس کے قریب ہے، کیونکہ وہ کھیتی پر تباہی و بربادی لاتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أشكوا إليك سنَةً قد أجحفت جهدا إلى جهدٍ بنا وأضعفت

واحتنكت أموالنا واجتلفت (1)

اس میں احتنك ہلاک اور برباد کرنے کے معنی میں ہی ہے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مراد وہ ہیں جو محفوظ اور بچے ہوئے ہیں، اور وہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) ابلیس نے یہ ظناً کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ (السبا:20) (اور بے شک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان) یا اس نے انسان کی طبع اور مزاج کو جان لیا کہ ان میں شہوت رکھی ہوئی ہے، یا اس نے ملائکہ کے اس قول پر بنیاد رکھی: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (البقرہ:30) (کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں)۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ اس کا ظن اور گمان ہے کیونکہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام میں وسوسہ اندازی کی اور اس نے انہیں پختہ عزم نہ پایا۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جا چلا جا (جو مرضی ہو کر) سو جو تیری پیروی کرے گا ان سے تو بے شک جہنم ہی تم سب کی پوری پوری سزا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ اذْهَبْ یہ امر برائے اہانت (وحقارت) ہے، یعنی تو اپنی پوری کوشش کر لے تحقیق ہم تجھے دیکھ لیں گے۔ فَمَنْ تَبِعَكَ یعنی اولاد آدم میں سے جس نے تیری اطاعت و پیروی کی۔ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا تو بے شک جہنم تم سب کی پوری اور وافر سزا ہے۔ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کہا جاتا ہے: وفرته أفره وفرا (میں نے اسے پورا کر دیا)، اور وفر المالُ بنفسه يفر وفورا فهو وافر (مال خود بخود پورا ہو گیا)، پس یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

"اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ، اور وعدہ نہیں کرتا ان سے شیطان مگر مکر وفریب کا۔"

1۔ تفسیر طبری، جلد 15-16، صفحہ 135

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَفْزِزْ یعنی تو پھسلا اور دور ہٹا اور اس کا اصل معنی القطع (کاٹنا) ہے۔ اور اسی سے ہے تفزّز الثوبُ جب کپڑا کٹ جائے، اور اس کا معنی ہے تو اسے حق سے کاٹ کر (یعنی گمراہ کر کے) اسے پھسلا دے۔ اور استفزّہ الخوفُ یعنی خوف نے اسے ہلکا کر دیا، دور ہٹا دیا اور قعد مُسْتَوْفِزًا یعنی وہ غیر مطمئن بیٹھا۔ وَاسْتَفْزِزْ یہ امر برائے تعجیز (عاجز کرنے کے لئے) ہے، یعنی تو کسی کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا، اور نہ تجھے کسی پر کوئی غلبہ ہو سکتا ہے پس تو جو چاہے کر لے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: بِصَوْتِكَ اور اس کی آواز ہر وہ داعی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی کی طرف بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گیت، بانسری، اور لہو (ولہب) ہے (2)۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بانسری کی آواز مراد ہے (3)۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل کی اولاد کو پہاڑ کی چوٹی پر سکونت دی، اور قابیل کی اولاد کو اس کے نیچے رکھا، اور ان میں حسین و جمیل بیٹیاں تھیں، پس شیطان لعین نے بانسری بجائی اور وہ نیچے اترنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے پس انہوں نے بدکاری کی؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِصَوْتِكَ سے مراد ہے تو اپنے وسوسہ کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ، الاجلاب کا اصل معنی ہے السوق بجلبة من السائق (ہانکنے والے کا کسی چیز کو سختی سے ہانک کر لے آنا)، کہا جاتا ہے: أجلب إجلاباً (وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھا) اور الجَلَب اور الجَلَبة کا معنی آوازیں (شور و شغب) ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: جَلَّبُوْا (یعنی تشدید کے ساتھ) انہوں نے شور مچایا۔ اور جَلَبَ الشئ یجلِبه و یجلُبه جَلَبًا و جَلْبًا (اس نے شے کو ہانکا) اور جلبت الشئ إلى نفسى اور اجتلبته دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور أجلب على العدو إجلاباً یعنی اس نے دشمن پر دھاوا بول دیا (یکبارگی حملہ کر دیا)۔ پس آیت کا معنی یہ ہوا تو ان پر دھاوا بول دے جب بھی تو اس پر اپنے مکر و فریب سے قدرت رکھے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: مراد اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ہر گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بے شک جنوں اور انسانوں میں سے اس کے گھوڑ سوار اور پیدل (دستے) ہیں، پس جو بھی گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں قتال کرتا ہے تو وہی ابلیس کے گھوڑ سوار اور پیدل دستے ہیں (4)، اور حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر وہ گھوڑا جو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں چلا، اور ہر وہ پاؤں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں چلا، اور ہر وہ مال جو حرام سے حاصل کیا گیا، اور ہر وہ بچہ جو بدکار اور باغی ہو تو وہ شیطان کے لئے ہے۔ اور الرَّجْل راجل کی جمع ہے (پیدل) جیسا کہ صَحْب صاحب کی جمع ہے۔ اور حفص نے وَرَجِلِكَ جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں، کہا جاتا ہے: رَجُل و رَجِل بمعنی راجل (پیدل چلنے والا)۔ اور

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 136
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 137

حضرت عکرمہ اور قتادہ نے ورجالک صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ یعنی تو اپنے آپ کو ان میں شریک بنالے، پس اموال میں اس کی شرکت انہیں الله تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں خرچ کرنا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ شرکت وہ ہے جس کے سبب وہ مالوں کو غیر حلال تک پہنچادیں؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں (3)۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ جانور مراد ہیں جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اور اولاد میں شرکت کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ مرادزنا سے پیدا ہونے والی اولاد ہے؛ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور حضرت عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور انہی سے یہ بھی ہے: مراد وہ ہے جو انہوں نے اپنے بچوں میں سے قتل کئے اور ان میں جرائم پیدا کر دیئے۔ اور اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ان کا عبدالحارث، عبدالعزیٰ، عبداللات اور عبدشمس وغیرہ نام رکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کا اپنے بچوں کو کفر میں رنگنا ہے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں یہودی بنادیا اور انہیں عیسائی بنادیا جیسا کہ عیسائی اپنے بچوں کو اس پانی میں ڈبونے کا عمل کرتے تھے جو ان کے لئے تیار کرتے؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور پانچواں قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب آدمی جماع کرے اور بسم الله نہ پڑھے تو جن (شیطان) اس کے حشفہ کے ساتھ لپٹ جاتا ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، اور اسی کے بارے الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ (الرحمٰن) (جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تم میں مغربین ہیں''۔ میں نے عرض کی: یارسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم مغربون کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ لوگ جن میں جن شریک ہوجاتے ہیں'' (4)۔ اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں روایت کیا ہے۔ ہروی نے کہا ہے: پس جنوں کے انسانوں کے ساتھ بعض امور اور میل جول میں مفاخر ہوتے ہیں پس ان میں سے بعض کی ان میں شادی ہوتی ہے، اور سبا کی ملکہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنوں میں سے تھا۔ اس کا بیان ان شاء الله تعالیٰ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** قولہ تعالیٰ: وَعِدْهُمْ یعنی انہیں جھوٹی امیدیں دلا، اور یہ کہ کوئی قیامت نہیں اور نہ کوئی حساب ہے، اور یہ کہ اگر حساب، جنت اور جہنم ہوئے بھی تو بھی دوسروں کی نسبت تم جنت کے زیادہ مستحق اور اہل ہو۔ اس معنی کو الله تعالیٰ کا یہ ارشاد مزید قوت دیتا ہے: يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا ۝ (النساء) (شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا شیطان مگر فریب کا) یعنی شیطان ان سے صرف باطل وعدہ کرتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وَعِدْهُمْ یعنی تو ان کی مدد و نصرت کا وعدہ کر ہر اس کے خلاف جو ان کے بارے میں برائی کا ارادہ کرے۔ اور یہ امر شیطان کے لئے جھڑک اور سخت وعید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اسے اور اس کی اتباع کرنے والوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 354، حدیث 44900

کو حقیر اور ہلاک سمجھنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس آیت میں وہ بھی ہے جو بانسری، گیت، گانے اور لہو (ولہب) کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور ہر وہ جو شیطان کی آواز یا اس کے فعل سے ہو اور وہ چیز جسے وہ اچھا سمجھتا ہو اس سے بچنا واجب ہے۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں رکھ لیں اور راستے سے اپنی سواری کو پھیر لیا اور یہ کہنے لگے: اے نافع! کیا تو سن رہا ہے؟ تو میں نے کہا: ہاں، پس آپ چلتے رہے یہاں تک کہ میں نے کہا: نہیں، پس اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اپنی سواری کو اپنے راستے پر لوٹا دیا۔ اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے ایک چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو آپ نے بھی اسی طرح کیا(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اس آواز کے حق میں ان کا فعل اور عمل یہ ہے جو اعتدال سے نہیں نکلتی، تو پھر اس زمانے کے باسیوں کے گانے اور ان کی بانسری بجانے کے بارے کیفیت اور حالت کیا ہوگی؟ اس کا مزید بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝۶۵

''جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکتا، اور (اے محبوب!) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مومنین ہیں۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا یعنی تیرا رب قبول کرکے ابلیس سے بچانے کے لئے، اس کے فریب اور اس کے مکر کی برائی سے حفاظت کرنے کے لئے کافی ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۶۶

''تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں تاکہ تم تلاش کرو (بحری سفر کے ذریعہ) اس کا فضل، بے شک وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ، الازجاء کا معنی ''چلانا'' ہے۔ اور اسی سے یہ قول باری تعالیٰ بھی ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا (النور: 43) (کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

یأیها الراکب المُزجی مطیّته سائل بنی أسد ما هذه الصّوْتُ(2)

تو اس میں بھی مزجی چلانے والے کے معنی میں ہے۔

اور ازجاء الفلک کا معنی ہے کشتیوں کو نرم ہوا کے ساتھ چلانا۔ اور الفلک یہاں جمع ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب کراھیۃ الغناء الخ، حدیث نمبر 4278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 256

البحر سے مراد کثیر پانی ہے چاہے وہ میٹھا ہو یا نمکین ہو، اور یہ اسم مشہور معنی پر غالب ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے بندوں پر اس کے فضل و کرم کے بارے واقفیت دلاتی ہے، یعنی تمہارا رب وہ ہے جس نے تم پر اس اس طرح کی نعمتیں فرمائی ہیں پس تم اس کے ساتھ کسی شی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ تم تجارت میں اس کا فضل تلاش کرو۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا۔

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

''اور جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے ہیں وہ (معبود) جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے، پس جب وہ خیر و عافیت سے تمہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے (تو) تم روگردانی کرنے لگتے ہو اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ، والضُّرُّ کا لفظ غرق ہونے اور چلنے سے روکنے کے خوف اور اس کے حالات کے خوفناک ہونے (یعنی) اس کے اضطراب اور اس کے موجیں مارنے وغیرہ سبھی کو شامل ہے۔ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ، ضَلَّ اس کا معنی ضائع ہونا اور مفقود ہونا، اور گم ہونا ہے اور یہ ان کی تحقیر سے عبارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا بطور الٰہ پکارا جاتا ہے۔ اور اس آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ کفار بلاشبہ اپنے بتوں کے بارے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ شفاعت اور سفارش کرنے والے ہیں، اور یہ کہ ان کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے ہر ایک فطرت کے مطابق یہ علم رکھتا ہے جو وہ اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتا کہ ان بڑی بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں میں بتوں کا کوئی عمل اور فعل نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس سے متعلق سمندر کی حالت پر انہیں واقفیت دلائی کہ جہاں حیلے اور وسائل کٹ جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ پس جب وہ تمہیں خلاصی عطا فرما کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو تم روگردانی کرنے لگتے ہو۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے) یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نعمتوں کی ناشکری انسان کی طبع اور مزاج ہے سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ بچا لے۔ پس یہاں انسان بطور جنس کے مذکور ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴿۶۸﴾

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے کہ اللہ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارہ کو یا بھیج دے تم پر اولے برسانے والا بادل پھر اس وقت تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے کوئی کارساز۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ یہ بیان فرمایا کہ وہ خشکی میں بھی انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اگرچہ وہ سمندر سے صحیح سالم بچ جائیں۔ اور الخسف کا معنی ہے زمین کا کسی چیز کے ساتھ دھنس جانا)۔ کہا جاتا ہے: بئر خسیف جب کنوئیں کی اصل اور بنیاد گر جائے۔ اور عین خاسف یعنی آنکھ کی سیاہی سر میں دھنس گئی اور عین من الماء خاسفۃ یعنی چشمے کا

پانی نیچے دھنس گیا۔ اور خسفت الشمس یعنی سورج زمین سے چھپ گیا (سورج کو گرہن لگ گیا)۔ اور ابو عمرو نے کہا ہے: الخسیف وہ کنواں ہے جو پتھروں میں کھودا جاتا ہے اور اس کا پانی کثیر اور زیادہ ہونے کے سبب ختم نہ ہو۔ اور اس کی جمع خُسُف ہے۔ اور جَانِبَ الْبَرِّ سے مراد زمین کا کنارہ ہے۔ اور اس کا نام جانب رکھا ہے کیونکہ وہ دھنسنے کے بعد جانب (کنارہ) ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ سمندر ایک جانب ہے اور خشکی ایک جانب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ساحل سمندر پر تھے، اور اس کا ساحل خشکی کا کنارہ ہے، اور وہ اس میں سمندر کی ہولناکیوں سے پر امن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے ڈرایا جس سے وہ خشکی میں محفوظ تھے جیسا کہ انہیں اس سے ڈرایا جس کا انہیں سمندر میں خوف تھا(1)۔ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (الملک: 17) یعنی یا وہ تم پر شدید آندھی بھیج دے۔ اور یہ وہ ہے جو سنگریزے پھینکتی ہے۔ اور الحصباء سے مراد چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں (سنگریزے)؛ یہ ابو عبیدہ اور قتبی نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ وہ آسمان سے پتھر ان پر برسائے، جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ کیا گیا۔ اور اس بادل کو بھی حاصب کہا جاتا ہے جو اولے برساتا ہے: حاصب اور اس ہوا کو جو مٹی اور سنگریزے کو اٹھا کر لاتی ہے حاصب کہا جاتا ہے اور حَصِبَة بھی۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

جرّت علیها أن خَوَتْ من أهلها	أذيالَها كلُّ عَصُوفٍ حَصِبه

اور فرزدق نے کہا ہے:

مستقبلین شَمَال الشام یضربنا	بحاصب كنَدِيف القطن منثور(2)

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا پھر اس وقت اپنے لئے تم کوئی محافظ اور مددگار نہیں پاؤ گے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾

"کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے سمندر میں دوسری مرتبہ اور بھیجے تم پر سخت آندھی جو کشتیوں کو توڑنے والی ہو پھر غرق کر دے تمہیں بوجہ کفر کے جو تم نے کیا پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا۔"

قولہ تعالیٰ: اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى (کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوسری مرتبہ لے جائے) سمندر میں۔ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ، القاصف، وہ سخت اور تیز ہوا جو اپنی شدت کے ساتھ (ہر شے کو) توڑ دیتی ہے۔ یہ قَصَفَ الشئ یَقْصِفه سے ماخوذ ہے، یعنی اس نے اسے شدت اور سختی کے ساتھ توڑ دیا۔ اور القصف کا معنی توڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصفت الریح السفینة (ہوا نے کشتی کو توڑ دیا) اور ریح قاصف یعنی شدید آندھی۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257	2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 143

اور رعد قاصف، سخت آواز والی گرج۔ کہا جاتا ہے: قصف الرعدُ وغیرُہ قصِیفا (گرج وغیرہ نے سخت آواز نکالی) اور القصف کا معنی ہے درختوں کو توڑنے والی۔ اور التقصف، اس کا معنی ٹوٹنا اور توڑنا ہے۔ اور التقصف کا معنی لہو ولعب بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ (معنی) نیا پایا گیا ہے۔ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ پھر وہ تمہیں تمہارے کفر کے سبب غرق کردے۔ ابن کثیر اور ابوعمرو نے نَخْسِفَ بِكُم، اَوْ نُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، اَنْ نُعِيْدَكُمْ، فَنُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، فَنُغْرِقَكُمْ پانچوں مقامات پر تعظیم کی بنا پر نون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے قول عَلَيْنَا کی وجہ سے (نون کے ساتھ پڑھا ہے) اور باقیوں نے یا کے ساتھ، کیونکہ آیت میں اس سے پہلے اِيَّاهُ ہے۔ اور ابوجعفر، شیبہ، رویس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے فَتُغرِقكم تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ریح (ہوا) کی صفت ہے۔ اور حسن اور قتادہ سے فیغرّقكم یا اور را کی تشدید کے ساتھ منقول ہے۔ اور ابوجعفر نے یہاں اور پورے قرآن میں الریاح پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قاصف وہ ہے جو خشکی میں ہلاک کرنے والی ہو، اور عاصف وہ ہے جو سمندر میں غرق کرنے والی ہو؛ اسے ماوردی نے بیان کیا ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر تم اس پر ہم سے کوئی بدلہ لینے والا نہیں پاؤ گے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: (ثائر) یہ الثار سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ہر انتقام اور بدلہ کا مطالبہ کرنے والے کو تبیع اور تابع کہا جاتا ہے؛ اور اسی سے فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:178) ہے ای مطالبۃ نیکی کا مطالبہ کرنے والا۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

"اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سے چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ الآیہ۔ جب ترہیب اور ڈرانے والی چیزوں میں سے جن کا ذکر کیا سو کیا تو ساتھ ہی ان پر انعام و اکرام کا بھی ذکر کیا۔ كَرَّمْنَا یہ کرم کو مضاعف بنا کر (یعنی عین کلمہ کو مشدد کر کے) پڑھا ہے، یعنی ہم نے انہیں عزت اور شرف وفضل عطا فرمایا۔ یہ وہ عزت ہے جس نے نقصان اور کمی کی نفی کی ہے نہ کہ اس سے مراد مال کی عزت ہے۔ اور اس عزت و کرامت میں انہیں اس ہیئت یعنی سیدھے قد اور حسین صورت پر پیدا کرنا بھی داخل ہے، اور انہیں بر و بحر میں سوار کرنا بھی ان چیزوں سے ہے جو سوائے انسان کے کسی حیوان کے لئے صحیح نہیں کہ وہ اپنے ارادہ، قصد اور تدبیر کے ساتھ سوار ہو سکے۔ اور ان کی تخصیص ان چیزوں کے ساتھ بھی ہے کھانے، پینے اور لباس میں سے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص کیا ہے۔ اور اس میں انسان کی وسعت کی مثل کوئی حیوان وسعت نہیں رکھتا، کیونکہ خاص طور پر وہی مال کماتے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

ہیں نہ کہ دیگر حیوان، اور وہ کپڑے پہنتے ہیں اور طرح طرح کے مرکب کھانے کھاتے ہیں۔ اور ہر حیوان کی غایت یہ ہے کہ وہ کچا گوشت یا غیر مرکب کھانا کھاتا ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے یہ بیان کیا ہے کہ ابن آدم کی وجہ فضیلت یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا ہے اور باقی تمام حیوان منہ سے کھاتے ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ اسے مہدوی اور نحاس نے ذکر کیا ہے اور یہی کلبی اور مقاتل کا قول ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بولنے اور تمیز کی قوت کے ساتھ عزت عطا فرمائی۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سیدھے قد اور اس کے بڑھنے کی فضیلت دی۔ یمان نے کہا ہے: حسن صورت کے ساتھ فضیلت دی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: انہیں اس سے فضیلت دی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے بنایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوں کو داڑھی کے ساتھ اور عورتوں کو مینڈھیوں کے ساتھ فضیلت دی۔ اور محمد بن جریر طبری نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر مسلط کر کے اور تمام مخلوق کو ان کے لئے مسخر کر کے انہیں عزت و تکریم عطا کی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام کرنے اور لکھنے کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فہم و فراست اور تمیز کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور وہ صحیح قول جس پر تعویل کی جا سکتی ہے کہ بلاشبہ انسان کی فضیلت کا سبب عقل ہے جو مکلف بنائے جانے کی اصل اور بنیاد ہے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے اس کا کلام سمجھا جاتا ہے، اور اس کی نعمتوں اور رسل علیہم السلام کی تصدیق تک پہنچا جا سکتا ہے، مگر یہ کہ جب بندے کے لئے تمام مقصود اور مدعیٰ واضح نہ ہوا تو رسول مبعوث کئے گئے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ پس شریعت کی مثال سورج ہے، اور عقل کی مثال آنکھ ہے، پس جب وہ کھلی ہو اور صحیح و تندرست بھی ہو تو وہ سورج کو دیکھ سکتی ہے اور اشیاء کی تفاصیل کا ادراک کر سکتی ہے۔ اور جو اقوال اوپر مذکور ہوئے ہیں ان میں سے بعض بعض سے قوی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض حیوانوں میں ایسے خصائل رکھ دیئے ہیں جن کے ساتھ وہ ابن آدم سے بھی افضل ہیں، مثلاً گھوڑے کا دوڑنا، اس کا سننا اور اس کا دیکھنا، ہاتھی کی قوت، شیر کی شجاعت اور بہادری اور مرغ کی سخاوت، تو بلاشبہ تکریم و تفضل عقل کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت انسانوں اور جنوں پر ملائکہ کو فضیلت دینے کا تقاضا کرتی ہے اس حیثیت سے کہ ان کی اس قول باری تعالیٰ میں استثنا کی گئی ہے: وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء: 172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)) اور یہ آیت سے لازم نہیں آتا، بلکہ اس میں انسانوں اور جنوں کے درمیان فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر وہ چیزیں شمار کرائی ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام حیوانوں سے خاص کیا ہے، اور جن تو بہت زیادہ مفضول ہیں (یعنی ان پر تو بہت زیادہ فضیلت دی گئی ہے۔) اور ملائکہ ان بہت زیادہ مفضول سے خارج ہیں، لہٰذا آیت نے ان کے ذکر کو نہیں چھیڑا، بلکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ملائکہ افضل ہوں، اس کے برعکس کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، اور مساوی ہونے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، المختصر یہ کہ کلام اس مسئلہ میں کسی یقین کی حد تک نہیں پہنچتی۔ تحقیق ایک قوم اس بارے میں کلام کرنے سے دور رہی جیسا کہ وہ بعض انبیاء علیہم السلام کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

کلام کرنے سے دور رہے اور بچے رہے، کیونکہ حدیث میں ہے: "تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان پسند و اختیار کے اعتبار سے موازنہ نہ کرو اور نہ تم مجھے یونس بن متی پر فضیلت دو۔" اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے درمیان بعض کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے نص موجود ہے۔ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس میں ملائکہ اور مومن کی تفضیل کے بارے کلام گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ یعنی ہم نے انہیں لذیذ کھانے اور مشروبات عطا فرمائے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد گھی، شہد، مکھن، کھجور اور حلوا (اور میٹھا پھل وغیرہ) ہیں، اور انسانوں کے سوا دیگر حیوانوں کا جو رزق بنایا وہ تم پر مخفی نہیں ہے مثلاً بھوسہ اور ہڈیاں وغیرہ۔ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا اور ہم نے انہیں بہت سے چوپاؤں، جانوروں، درندوں، پرندوں پر غلبہ اور تسخیر کے ساتھ، ثواب اور جزا، حفظ و تمیز اور صحیح فہم و فراست کے ساتھ فضیلت دی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** یہ آیت اسے رد کرتی ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے آپ کو عمدہ کھانے سے دور رکھو کیونکہ یہ شیطان کو قوی کرتا ہے وہ اس قوت سے رگوں میں دوڑتا ہے۔" اور اس سے بہت سے صوفیاء لذیذ اور عمدہ کھانے ترک کرنے پر استدلال کرتے ہیں، اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم اس کا رد کرتا ہے، اور سنت ثابتہ اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ کئی مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ اور ابو حامد طوسی نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل ایک مدت تک بیری کے پتوں سے خوراک حاصل کرتے رہے، اور دقاق نے تین سال تک بھوسہ کے پتے کھائے۔ اور ابراہیم ابن البنا نے ذکر کیا ہے کہ میں اخمیم سے اسکندریہ تک ذوالنون کے ساتھ رہا، پس جب بھی آپ کی افطاری کا وقت آتا تو میں ایک روٹی اور نمک نکالتا جو میرے پاس تھا، اور میں کہتا: آؤ، تو وہ مجھے کہتے: کیا تیرا نمک کوٹا ہوا ہے؟ میں کہتا: ہاں۔ فرماتے: تو کامیاب نہیں ہوگا، تو میں نے ان کے توشہ دان کی طرف دیکھا تو اس میں تھوڑے سے جو کے ستو تھے وہ ان سے پھانک لیتے تھے۔ اور ابو یزید نے کہا ہے: میں نے چالیس سال تک ان میں سے کوئی شے نہیں کھائی جو بنی آدم کھاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ ان چیزوں میں سے ہے جس پر نفس کو ابھارنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو گندم کے ساتھ عزت و تکریم دی ہے اور اس کے چھلکے کو جانوروں کے لئے بنایا ہے، لہٰذا بھوسہ کھانے میں چوپاؤں کی مزاحمت کرنا صحیح نہیں ہے، اور رہے جو کے ستو تو یہ قولنج کا سبب بنتے ہیں، اور جب انسان جو کی روٹی اور کوٹے ہوئے نمک پر اقتصار کرے تو اس کا مزاج بدل جاتا ہے، کیونکہ جو کی روٹی خشک ٹھنڈی ہے، اور نمک خشک قابض ہے جو دماغ اور بصارت کو نقصان دیتا ہے۔ اور جب نفس اس شے کی طرف مائل ہو جو اس کی اصلاح کرتی ہے اور پھر اسے روک دیا جائے تو اس طرح اسے رد کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کا مقابلہ کیا گیا، پھر یہ بدن میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ پس یہ فعل شرع اور عقل دونوں کے مخالف ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بدن آدمی کی سواری ہے، اور جب اس نے سواری کے ساتھ دوستی کا برتاؤ نہ کیا تو وہ اسے (منزل پر) نہیں پہنچائے گی۔ اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے مکھن، شہد، اور سفید آٹے کی روٹی خریدی، تو انہیں کہا گیا: یہ سب کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب ہم نے پایا تو ہم

مردوں کی طرح کھائیں گے، اور جب ہم نے کچھ نہ پایا تو ہم مردوں کے صبر کرنے کی طرح صبر کریں گے۔ اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ گوشت، انگور، اور فالوذج (آٹے، پانی اور شہد سے تیار کیا ہوا کھانا) کھاتے تھے پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسلاف میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اس میں کچھ سورۃ المائدہ اور الاعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے اور وہ کافی ہے۔ اور پہلا نظریہ دین میں غلو ہے اگر ان کے بارے میں یہ صحیح ہے۔ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید: 27) (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔)

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

''وہ دن جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ، پس وہ شخص جس کو دیا گیا اس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں تو یہ لوگ (خوشی خوشی) پڑھیں گے اپنا نامہ عمل اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ کے بارے میں فرمایا: ''ان میں سے ایک کو بلایا جائے گا اور اس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور اس کا جسم اس کے لئے ساٹھ گز تک پھیلا دیا جائے گا اور اس کا چہرہ روشن کر دیا جائے گا اور اس کے سر پر موتیوں کا تاج رکھا جائے گا جو چمک رہا ہو گا پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف چل کر آئے گا اور وہ دور سے ہی اسے دیکھ لیں گے اور کہنے لگیں گے: اے اللہ! ہمیں بھی اس کی مثل عطا فرما اور ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما یہاں تک کہ وہ ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور کہے گا: تمہیں بشارت (اور مبارک) ہو تم میں سے ہر ایک کے لئے اسی کی مثل ہے فرمایا..... اور رہا کافر! تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا اور اس کا جسم اس کے لئے آدم کی صورت پر ساٹھ گز بڑھا دیا جائے گا اور اسے ایک تاج پہنایا جائے گا پس اس کے ساتھی اسے دیکھیں گے، تو کہیں گے: ہم اللہ تعالیٰ سے اس شر سے پناہ مانگتے ہیں! اے اللہ! تو ہمیں اس طرح کا نہ دینا۔ بیان فرمایا: پس وہ ان کے پاس آئے گا اور وہ کہیں گے: اے اللہ! اسے رسوا اور ذلیل کر، تو وہ کہے گا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں (رحمت سے) دور ہٹا دیا ہے کیونکہ تم میں سے ہر آدمی کے لئے اسی کی مثل ہے(1)''۔ ابوعیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (الجاثیہ) (اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا۔ ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف۔ (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔)

اور کتاب (نامہ عمل) کو امام کا نام دیا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے اعمال کی پہچان کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، قتادہ، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بکتابھم ہے یعنی ان میں سے ہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الاسراء، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس میں اس کے عمل ہوں گے (1))۔ اور اس کی دلیل فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد ان پر نازل کی گئی کتاب ہے (2)، یعنی ہر انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، پس اہل تورات کو تورات کے ساتھ اور اہل قرآن کو قرآن کے ساتھ بلایا جائے گا، اور کہا جائے گا: اے اہل قرآن! تم نے کون سے عمل کئے ہیں، کیا تم نے اس کے اوامر کی پیروی کی ہے، کیا تم نے اس کی نواہی سے اجتناب کیا ہے؟ اور اسی طرح کے سوال کئے جائیں گے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بِنَبِيِّهِمْ ہے (3) (یعنی انہیں اپنے نبی کے ساتھ پکارا جائے گا۔) اور امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اور کہا جائے گا: آؤ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ شیطان کی اتباع کرنے والو!، آجاؤ بتوں کی پیروی کرنے والو!۔ پس اہل حق اٹھیں گے اور وہ اپنے نامۂ عمل اپنے دائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے، اور اہل باطل اٹھیں گے اور وہ اپنے نامۂ عمل اپنے بائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد بامام عصرهم ہے (یعنی انہیں اپنے زمانے کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ایک کو اپنے زمانے کے امام اور اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کے ساتھ بلایا جائے گا'' پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو! آجاؤ، اے موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ! اے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اور اے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ...... پس اہل حق اٹھیں گے اور اپنا نامۂ عمل اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیں گے اور پھر وہ فرمائے گا: اے شیطان کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اے ضلالت و گمراہی کے سرداروں کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ درآنحالیکہ ہر ایک کے لئے ہدایت کا امام بھی ہوگا اور گمراہی کا امام بھی ہوگا (4)''۔ (اسی کے ساتھ اسے بلایا جائے گا)۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأعمالهم ہے (5) (یعنی انہیں ان کے اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا)۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کہا جائے گا: کہاں ہیں تقدیر کے ساتھ راضی ہونے والے؟ کہاں ہیں اس چیز سے صبر کرنے والے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے مذاہب ہیں، پس انہیں ان کے ساتھ پکارا جائے گا جن کی وہ دنیا میں اقتدا کرتے تھے، اے حنفی، اے شافعی، اے معتزلی، اے قدری وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ اس کی اتباع کرتے ہوں خیر میں یا شر میں، حق پر یا باطل پر، اور ابو عبیدہ کے قول کا یہی معنی ہے۔ اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صدقہ دینے والوں کو باب الصدقہ سے اور جہاد کرنے والوں کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا...... الحدیث۔ یہ طویل حدیث ہے۔ ابو سہا نے کہا ہے: کہا جائے گا فلاں نمازی اور روزے دار کہاں ہیں؟ اور اس کا برعکس دف بجانے والے اور چغلخور ہیں۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأمهاتهم ہے (یعنی

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 258 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً

4۔ موسوعۃ اطراف حدیث النبوی الشریف، جلد 6، صفحہ 452 | 5۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 146

انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ پکارا جائے گا) اور امام امد کی جمع ہے۔ حکماء نے کہا ہے: اس میں حکمت کی تین وجہیں ہیں؛ ان میں ایک یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے۔ اور دوسری یہ ہے...... امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے شرف وعظمت کے اظہار کے لئے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے...... تاکہ زنا کی اولاد رسوا نہ ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین وآخرین تمام کو جمع فرمائے گا تو ہر خیانت کرنے والے کے لئے جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں بن فلاں کی خیانت ہے''۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے روایت کیا ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: ھذہ غَدْرۃ فلان بن فلان یہ اس پر دلیل ہے کہ آخرت میں لوگوں کو ان کے اپنے ناموں اور ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، اور یہ روایت اس کا رد کرتی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ انہیں ان کی ماؤں کے ناموں سے بلایا جائے گا کیونکہ اس میں ان کے باپوں کے بارے ستر پوشی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ یہ ان کے قول کو تقویت دیتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ بِاِمَامِهِمْ سے مراد بکتابھم ہے۔ اور اسے یہ قول بھی قوت دیتا ہے: وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ۞ (یٰسین) (اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں)۔ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا، الفتیل وہ ہے جتنی گٹھلی کی ایک طرف یا ایک حصہ ہوتا ہے اور یہ سوۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

## وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۞

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا''۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى یعنی جو دنیا میں نظر وفکر کرنے سے اور حق کو دیکھنے سے اندھا بنا رہے گا۔ فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ تو وہ آخرت کے معاملہ میں بھی اَعْمٰى اندھا ہوگا۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اہل یمن کی ایک جماعت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئی اور انہوں نے اس آیت کے بارے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: اس کے ماقبل کو پڑھو۔ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ...... تا قولہ...... تَفْضِيْلًا۞ (الاسراء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو آدمی ان نعمتوں اور ان آیات اور نشانیوں کے بارے جو اس نے دیکھیں اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت کے بارے میں جسے اس نے دیکھا نہیں اندھا ہی ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جو ان نعمتوں سے اندھا رہا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اس پر دنیا میں فرمائی ہیں تو وہ آخرت کی نعمتوں سے بھی اندھا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آدمی جو اس دنیا میں جس میں مہلت دی گئی ہے اور اس کو وسعت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت میں جس میں کوئی توبہ نہیں اندھا ہی ہوگا۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو آدمی اس دنیا میں کافر اور گمراہ رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا اور گم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 474

کردہ راہ ہوگا(1)۔ اور یہ بھی قول ہے: وہ آدمی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اندھا بنا رہا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اندھا ہی اٹھائے گا؛ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ۝ الآیات۔ (طہ) (اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔) اور مزید فرمایا: وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (الاسراء: 97) (اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام اقوال میں فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى میں اس کا معنی ہے: سخت اندھا ہوگا، کیونکہ وہ دل کا اندھا ہونا ہے، اور آنکھ کے اندھے کے بارے میں اس کی مثل نہیں کہا جاسکتا۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: کیونکہ وہ بھی خلقت کے اعتبار سے ہاتھ اور پاؤں کی طرح ہی ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا ما اعماہ جیسا کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ما ایداہ۔ اخفش نے کہا ہے: اس میں یہ نہیں کہا گیا کیونکہ اس کے حروف تین سے زائد ہیں۔ اور اس کی اصل اعمی ہے۔ اور بعض نحویوں نے ما أعماہ اور ما أعشاہ کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس کا فعل عَمِیَ اور عَشِیَ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ایک بصری شیخ نے مجھے شام میں بتایا کہ اس نے عربوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ما اسود شعرہ۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ما فی المعالی لکم ظل و لا ثمر و فی المخازی لکم أشباح أشیاخ

أما الملوك فأنت الیوم ألأمهم لؤما و أبیضهم سربال طباخ

اور ابوبکر، حمزہ، کسائی اور خلف نے دو حرفوں اعمی اور اعمی میں امالہ کیا ہے اور باقیوں نے ان میں فتح پڑھا ہے۔ اور ابوعمرو نے پہلے میں امالہ کیا ہے اور دوسرے کو فتح دیا ہے۔ وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا یعنی وہ ہدایت کی طرف کوئی راہ نہیں پائے گا۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ۝

''اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔''

حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم طواف کے دوران حجر اسود کا استلام کر رہے تھے، تو قریش نے آپ کو منع کیا اور کہا: ہم تمہیں استلام کی اجازت نہیں دیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے الہوں کے بھی قریب ہو، تو آپ نے اپنے دل میں خیال کیا اور کہا: مجھ پر نہیں ہے کہ میں ان کے قریب ہوں اس کے بعد کہ وہ مجھے استلام حجر کی اجازت دیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔'' پس اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار کیا اور آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، یہ حضرت مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت ثقیف کے وفد کے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 37 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 259

بارے نازل ہوئی، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا مطالبہ کیا جو حق سے دور تھا انہوں نے کہا: ایک سال تک ہمیں اپنے خداؤں سے منافع حاصل کرنے دیں یہاں تک کہ ہم وہ لے لیں جو انہیں ہدایا پیش کئے جاتے ہیں، پس جب ہم اسے لے لیں گے تو ہم انہیں توڑ دیں گے اور ہم اسلام قبول کر لیں گے، اور آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرم قرار دیجئے جیسے مکہ کرمہ کو حرم قرار دیا ہے، تاکہ عرب اپنے اوپر ہماری فضیلت کو جان لیں، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انہیں عطا کرنے کا قصد وارادہ کیا تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اکابرین قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: آپ ان گرنے والے (کمزور لوگوں) کو اور ان غلاموں کو ہم سے دور بھگائیے تاکہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں اور آپ سے کچھ سن سکیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارادہ کر لیا یہاں تک کہ آپ کو اس سے منع کر دیا گیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قریش ایک رات صبح تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلوت اور تنہائی میں رہے اور آپ کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، آپ کی شان بیان کرتے رہے، آپ کو سردار بنانے اور آپ کو اپنے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے، اور کہنے لگے: بلاشبہ آپ جو شے لائے ہیں وہ لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں لا سکتا، اے ہمارے آقا! آپ تو ہمارے سردار ہوئے، وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ان بعض امور میں ان کے قریب ہونے لگے جو وہ چاہتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ رکھ لیا، بچا لیا (2)، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور لَيَفْتِنُوْنَكَ کا معنی ہے وہ آپ کو برگشتہ کرتے ہیں، پھسلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: فتنتُ الرجل من رأيه جب تو کسی آدمی کو اس رائے سے پھسلا دے، پھیر دے جس پر وہ تھا؛ یہ ہروی نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ آپ کو پھراتے ہیں (يزيلونك اور يصرفونك) دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ یعنی قرآن کریم کے حکم سے، کیونکہ انہیں وہ دینے میں جس کا انہوں نے سوال اور مطالبہ کیا ہے اس میں قرآن کریم کے حکم کی مخالفت ہے۔ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ یعنی تاکہ آپ ایسا بہتان تراش کر ہماری طرف منسوب کر دیں جو اس کے خلاف ہو جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اور وہ ثقیف کا یہ قول ہے کہ آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرام قرار دیجئے جیسے آپ نے مکہ مکرمہ کو حرام قرار دیا ہے، (یعنی) اس کے درختوں کو، اس کے پرندوں کو، اور اس کے وحشی جانوروں کو، اور اگر عرب آپ سے پوچھیں: آپ نے انہیں کیوں خاص کیا؟ تو آپ یہ فرمائیے: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے مجھے حکم دیا ہے، تاکہ وہ آپ کے لئے عذر ہو جائے۔ وَ اِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی اگر آپ وہ کریں جو وہ چاہتے ہیں تو وہ آپ کو گہرا دوست بنا لیں گے، یعنی وہ آپ سے محبت کریں گے اور آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے؛ (خلیل) الخُلّة (خا کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ آپ ان کے ساتھ موافقت کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی وہ آپ کو فقیر اور محتاج بنا دیں گے۔ یہ الخَلّة (خا کے فتحہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد فقر ہے کیونکہ آپ ان کے حاجت مند اور محتاج ہو جائیں گے۔

وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260-259

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 150

الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ۔ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ یعنی اگر ہم نے آپ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا اور ہم نے آپ کو ان کی موافقت سے نہ بچایا ہوتا۔ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ تو آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ شَيْـًٔا قَلِيْلًا یعنی تھوڑا اور کچھ نہ کچھ۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عرض کی: اَللّٰھُمَّ لَا تَكِلْنِی اِلٰی نفسی طرفة عین (1) (اے اللہ! تو مجھے آنکھ جھپکنے کی دیر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔) اور کہا گیا ہے: خطاب کا ظاہر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس کا باطن ثقیف کے بارے خبر دے رہا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: وان کادوا لیرکنونك، یعنی قریب تھا کہ وہ آپ کے بارے یہ خبر دیتے کہ آپ ان کے قول کی طرف مائل ہو گئے ہیں، پس ان کے فعل کو مجازاً اور وسعۃً آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے: كدت تقتل نفسك (قریب ہے تو اپنے آپ کو قتل کر دے)، یعنی قریب ہے لوگ تجھے اس سبب سے قتل کر دیں جو تو نے فعل کیا ہے، اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی طرف سے ان کی طرف مائل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں بنا، بلکہ اس کا معنی ہے: اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو آپ یقیناً ان کی موافقت کی طرف مائل ہو جاتے، لیکن آپ پر مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کا فضل رہا سو آپ نے ایسا نہ کیا؛ یہ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، لیکن یہ امت کی تعریف ہے تاکہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی شرائع میں سے کسی شی میں مشرکین کی طرف مائل نہ ہو۔

اور قولہ تعالیٰ: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ یعنی (بفرض محال) اگر آپ مائل ہوتے تو آپ کو دنیا میں دنیا کے عذاب کی دو مثل اور آخرت میں موت کے عذاب کی دو مثل چکھاتے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور یہ انتہائی وعید ہے۔ اور جب بھی رتبہ اور درجہ اعلیٰ اور بلند ہو تو مخالفت کی صورت میں عذاب بھی اتنا بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔)

اور ضعف الشی سے مراد دو مرتبہ اس کی مثل ہونا ہے (دوگنا)، اور کبھی ضعف کا معنی حصہ بھی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ ضِعْفٌ (الاعراف: 38) یعنی ہر ایک کے لئے ایک حصہ ہے، یہ معنی سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 475　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260

''اور انہوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ پریشان و مضطرب کردیں آپ کو اس علاقہ سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ۔''

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدنی ہے، جیسا کہ سورت کے آغاز میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں قیام فرما ہونے کے ساتھ حسد کیا اور کہا: بے شک انبیاء علیہم السلام شام بھیجے گئے ہیں، پس اگر آپ نبی ہیں تو آپ بھی وہاں چلے جائیں، کیونکہ اگر آپ نے اس کی طرف خروج کیا تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں راسخ ہوگئی کیونکہ آپ ان کے اسلام لانے کو پسند کرتے تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ سے ایک مرحلہ (منزل) تک سفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور عبد الرحمن بن غنم نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے آپ صرف شام کا ارادہ رکھتے تھے، پس جب آپ تبوک اترے تو یہ ارشاد وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ سورت کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوا، اور آپ کو واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ کے آپ کو نکالنے کے ارادہ کے بارے نازل ہوئی، اور اگر انہوں نے آپ کو نکال دیا تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم ارشاد فرمایا تو آپ وہاں سے نکل آئے، یہ قول اصح ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور اس لئے بھی کہ اس آیت کا ماقبل اہل مکہ کے بارے خبر ہے، اور یہ یہودیوں کا ذکر جاری نہیں۔

اور قولہ تعالیٰ مِنَ الْاَرْضِ سے مراد مکہ مکرمہ کی زمین ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ (یوسف:80) (سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو۔) اس میں مراد ارض مصر ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ (محمد:13) (اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں نے) آپ کو نکال دیا) اس میں قریہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا معنی ہے: اس کے باسیوں نے آپ کو نکالنے کا ارادہ کیا، اسی وجہ سے اضافت اس کی طرف کی اور فرمایا اَخْرَجَتْكَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تمام کفار نے یہ قصد کیا کہ وہ آپ پر غلبہ پا کر آپ کو حقارت اور رسوائی کے ساتھ سرزمین عرب سے نکال دیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی (اور آپ کو روک لیا) اور اگر وہ آپ کو عرب میں زمین سے نکال دیتے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی، اور یہی معنی اس قول باری تعالیٰ کا ہے: وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ)۔ حضرت عطا ابن ابی رباح نے لَا يَلْبَثُوْنَ کو با مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خِلٰفَكَ حضرت نافع، ابن کثیر، ابوبکر، اور ابو عمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس کا معنی ہے بعدك (یعنی آپ کے بعد وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے مگر تھوڑا عرصہ)۔ اور ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے خلافك پڑھا ہے(1) اور ابو حاتم نے اسے اختیار کیا ہے، اور انہوں نے اس قول پر قیاس کیا ہے: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (التوبہ: 81) (خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 476

والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر الله کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد۔ اور اس کا معنی بھی بعدك ہے۔
جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

عَفَت الديار خلافهم فكأنما بسط الشَّواطِبُ بينهن حَصِيرا(1)

اس میں خلافهم، بعدهم (ان کے بعد) کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

ماوردی میں بسط البواسط ہے۔ کہا جاتا ہے: شطبت المرأة الجريد جب عورت ٹہنیاں چیرے تا کہ ان سے چٹائیاں بنائے۔ ابوعبید نے کہا ہے: پھر چیرنے والی اسے صاف کی ہوئی ٹہنیوں میں پھینک دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ خِلفَكَ بمعنی بعدك (آپ کے بعد) ہے۔ اور خِلَفَكَ بمعنی مخالفتك (آپ کی مخالفت میں) ہے؛ اسے ابن الانباری نے ذکر کیا ہے۔ اِلَّا قَلِيْلًا اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے..... کہ اس مدت سے مراد وہ ہے جتنی مدت وہ آپ کو نکالنے کے بعد سے لے کر بدر کے دن اپنے قتل ہونے تک وہاں ٹھہرے رہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہاں مراد قریش ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے..... کہ اس کے درمیان اور بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کے جلاوطن ہونے کے درمیان جو مدت ہے وہ مراد ہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ مراد یہودی ہیں (2)۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝

"(یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر اور آپ نہیں پائیں گے ہمارے اس دستور میں کوئی ردوبدل۔"

قولہ تعالیٰ: سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا یعنی یہ عذاب دیئے جائیں گے جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا، پس یعذبون کو مضمر کر کے سُنَّةَ کو نصب دی گئی ہے، پس جب جر دینے والا حرف (کاف، کسنة میں) ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا، یہ فراء نے کہا ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس معنی کی وجہ سے منصوب ہے سننا سنة من قد أرسلنا (ہم نے ان کے لئے دستور بنا رکھا ہے جنہیں ہم نے بھیجا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کاف کے حذف کی تقدیر پر منصوب ہے؛ تقدیر کلام ہوگی: لا يلبثون خلفك إلا قليلا كسنة من قد أرسلنا (وہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا)، پس اس تقدیر پر وقف اِلَّا قَلِيْلًا پر نہیں کیا جائے گا اور پہلے اور دوسرے قول کے مطابق وقف کیا جائے گا۔ قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا اس میں وقف اچھا ہے۔ وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا یعنی اس دستور اور وعدے میں کوئی خلاف اور ردوبدل نہیں ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝

"نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک (نیز ادا کیجئے) نماز صبح، بلاشبہ نماز صبح کا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 261 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 262-261 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477

مشاہدہ کیا جاتا ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قولہ تعالیٰ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ جب مشرکین کے مکروفریب کو ذکر کر چکے تو ساتھ ہی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے اور نماز کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا، اور اس میں دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت کی طلب موجود ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ۙ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ كُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ﴿۹۸﴾ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے تھے سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جائیے سجدہ کرنے والوں سے) اور اقامۃ الصلوۃ کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ اور باجماع مفسرین یہ آیت فرض نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے دلوك کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد آسمان کے درمیان سے سورج کا ڈھل جانا، زوال پذیر ہو جانا ہے؛ یہ حضرت عمر، آپ کے صاحبزادے، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے سوا علماء تابعین وغیرہ کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ دلوك سے مراد سورج کا غروب ہونا ہے؛ یہ حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ ماوردی نے کہا ہے(1): جنہوں نے دلوك کو سورج کے غروب ہونے کا نام قرار دیا ہے وہ اس لئے ہے کیونکہ انسان سورج کے غروب ہونے کی حالت میں اس کے بالکل ظاہر اور بین ہونے کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ رگڑتا ہے، اور جنہوں نے اسے سورج کے زوال کا نام دیا ہے تو وہ اس لئے کیونکہ وہ سورج کی شعاؤں کی شدت اور تیزی کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو رگڑتا ہے(2)۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: سورج کے دلوك کا معنی اس کا غروب ہونا ہے۔ اور دلكت براحِ کا معنی ہے سورج غروب ہو گیا۔ جیسا کہ قطرب نے کہا ہے:

هذا مُقامُ قدمي رَباحِ　　ذَبَّبَ حتى دَلكتْ براحِ (3)

اس میں براح (با کے فتحہ کے ساتھ) حذام، قطام اور رقاش کے وزن پر ہے اور یہ سورج کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور فراء نے اسے (با کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور یہ راحۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہتھیلی ہے، یعنی وہ غائب ہو گئی حالانکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی ہتھیلی اپنی بھنوؤں پر رکھ لی۔

اور اسی سے عجاج کا قول بھی ہے:

والشمس قد كادت تكون دَنَفًا　　أدفعها بالراح كي تَزَحْلَفَا(4)

ابن الاعرابی نے کہا ہے: الزُّحلوفة سے مراد ملائم کرنے کی جگہ ہے، (یعنی ڈھلوان کی جگہ)، کیونکہ وہ اس میں لڑھکتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1219
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477
4۔ ایضاً

اور پھسلتے ہیں۔ مزید کہا: الزّحلفة دحرجة کی طرح ہے اور الدفع کی طرح، (یعنی لڑھکنا اور دھکا دینا)، کہا جاتا ہے: زحلفتُه فتزحَلَف (میں نے اسے دھکا دیا پس وہ پھسل گیا، لڑھک گیا۔) اور کہا جاتا ہے: دَلَکتْ الشَّمْسُ جب سورج غروب ہو جائے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

مصابیح لیست باللواتی تقودها نجومٌ ولا بالآفلات الدوالِك(1)

ابن عطیہ نے کہا ہے: دلوک کا لغوی معنی مائل ہونا، جھکنا اور ڈھلنا ہے پس دلوک کی ابتدا سورج کا زوال پذیر ہونا ہے اور اس کی انتہا اس کا غروب ہونا ہے۔ اور زوال کے وقت سے لے کر غروب ہونے تک کے وقت کو دلوک کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ ڈھلنے اور جھکنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس الله تعالیٰ نے ان نمازوں کا ذکر کیا ہے جو دلوک کی حالت اور اس کے قریب ہوتی ہیں، پس اس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں داخل ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کی نماز غسق اللیل میں داخل ہو(2)۔ اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر غروب آفتاب تک پھیلا ہوتا ہے، کیونکہ الله سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے واجب ہونے کو دلوک پر معلق کیا ہے، اور یہ سارے کا سارا دلوک ہی ہے، اور یہ امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما الله تعالیٰ نے تفصیل میں کہا ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما الله تعالیٰ نے حالت ضرورت میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے(3)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ دلوك الشمس سے مراد سورج کا ڈھلنا ہے، اور غسق اللیل سے مرادرات کا جمع ہونا اور اس کا تاریک ہونا ہے(4)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: الغسق سے مرادرات کی سیاہی ہے۔

جیسا کہ ابن قیس رقیات نے کہا ہے:

إن هذا الليل قد غَسَقَا واشتكيْتُ الهَمّ والأرَقَا(5)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: غسق اللیل سے مراد شفق کا غروب ہونا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مرادرات کی تاریکی کا آنا ہے۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

ظلّت تجود يداها وهي لاهية حتى إذا جنح الإظلام والغسق

کہا جاتا ہے: غسق اللیل غسوقًا۔ اور الغَسَق یہ اسم سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور کلمہ کی اصل السیلان سے ہے۔ (یعنی اس کا معنی بہنا ہے)۔ کہا جاتا ہے: غسقت العین جب چشمہ بہہ پڑے، تَغْسِق۔ اور غَسَقَ الجرح غَسَقَانًا، یعنی زخم سے زرد پانی بہنے لگا۔ اور اغسق المؤذن یعنی مؤذن نے مغرب کو رات آنے تک مؤخر کر دیا۔ اور فراء نے بیان کیا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1221

4۔ مؤطا امام مالک، باب وقوت الصلوٰۃ، ما جاء فی دلوك الشمس، صفحہ 7 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263

غسق اللیل و أغسق ، ظلم و أظلم ، دجا و أدجی ، غبس و أغبس ، غبش و أغبش (ان تمام میں رات کے آنے اور اس کے تاریک ہونے کا معنی پایا جاتا ہے)۔ اور ربیع بن خثیم بادل کے دن اپنے مؤذن کو فرماتے ہیں: أغسق أغسق۔ وہ کہتے: مغرب کو مؤخر کر دیہاں تک کہ رات کی تاریکی چھا جائے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے مغرب کے آخری وقت میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے: اس کا وقت ایک ہی وقت ہے اور اس کا وقت نہیں ہے مگر اس وقت جب سورج غروب ہو جاتا ہے، اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی امامت میں بالکل بین اور واضح ہے، کیونکہ آپ نے یہ نماز دو دن ایک ہی وقت میں پڑھائی اور وہ غروب آفتاب کا وقت تھا، اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے اصحاب کے نزدیک ظاہر مذہب ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور آپ سے مشہور بھی ہے، اور اسی طرح ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے: پس جب شفق غائب ہو جائے تو مغرب کا وقت نکل جاتا ہے اور عشاء کا وقت داخل ہو جاتا ہے (1)۔ اور اسی طرح ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، حسن بن حی، احمد، اسحاق، ابو ثور، اور داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، کیونکہ غروب سے لے کر شفق تک کا وقت سارے کا سارا غسق ہے۔ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت کے بارے سوال کرنے والے کو دوسرے دن مغرب کی نماز پڑھائی اور اسے موخر کیا یہاں تک کہ وہ شفق غروب ہونے کے قریب تھی (2)؛ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث امامت جبرائیل علیہ السلام کی اخبار سے اولیٰ ہے، کیونکہ یہ حدیث متاخر ہے کیونکہ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا اور جبرائیل علیہ السلام نے امامت مکہ مکرمہ میں کرائی، اور آپ کے فعل اور امر میں سے متاخر اولیٰ ہے، کیونکہ وہ اپنے ماقبل کے لئے ناسخ ہے۔ اور ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے مشہور ہے، اور آپ کا وہ قول جو آپ کی موطا میں ہے آپ نے وہ طویل عمر تک پڑھایا اور اپنی زندگی میں اسے املاء کروایا۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ وہ احکام جو اسماء سے متعلق ہوتے ہیں کیا وہ ان کے اوائل سے متعلق ہوتے ہیں یا ان کے آخر سے یا پھر حکم ان تمام سے متعلق ہوتا ہے؟ تو نظر وفکر میں اقویٰ یہی ہے کہ حکم کا تعلق ان کے اوائل سے ہوتا ہے تاکہ اس کا ذکر لغو نہ ہو جائے پس جب حکم ان کے اوائل سے مربوط ہو جائے تو پھر اس کے بعد اس کا تعلق تمام کے ساتھ آخر تک جاری رہے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس قول میں وسعت ہے وہ راجح ہے۔ تحقیق امام حافظ ابو محمد عبدالغنی بن سعید نے اجلح بن عبداللہ کندی کی حدیث بیان کی ہے، انہوں نے ابوزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسے نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے سورج غروب ہونے کے قریب نکلے اور آپ نے مغرب کی نماز ادا نہ فرمائی یہاں تک کہ آپ مقام سرف پر آ گئے۔ اور وہ نو میل سفر ہے۔ اور رہا نسخ کے بارے قول تو وہ بین اور واضح نہیں ہے اگرچہ تاریخ معلوم ہے، کیونکہ ان روایات میں تطبیق اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مغرب کے وقت کے بارے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی احادیث کو افضلیت پر محمول کیا جائے گا، اسی وجہ سے امت نے سورج غروب ہونے کے

1۔ موطا امام مالک، صفحہ 8
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اوقات صلوٰۃ الخمسہ، جلد 1، صفحہ 223

وقت اس میں تعجیل کرنے اور اسے فوراً ادا کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہم مسلمانوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے جماعت والی مسجد میں غروب آفتاب کے وقت سے مغرب کی اقامت کو موخر کیا ہو۔ اور وسعت والی احادیث جواز کے وقت کو ظاہر کرتی ہیں، پس اس طرح تعارض ختم ہو جاتا ہے اور ان کو جمع کرنا صحیح ہوتا ہے، اور باتفاق اصولیین یہ ترجیح سے اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں دو دلیلوں میں سے ہر ایک پر عمل کرنا ثابت ہوتا ہے اور ترجیح یا نسخ کے قول میں ایک کو ساقط کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اس میں قرآنَ دو وجہوں سے منصوب ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ الصلوٰۃ پر معطوف ہو، اس کا معنی ہوگا: أقم قرآن الفجر یعنی صبح کی نماز قائم کرنا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ اغراء کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فعلیك بقرآن الفجر (تجھ پر صبح کی نماز لازم ہے)؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ خاص کر اس نماز کو قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے دوسری نمازوں کو نہیں، کیونکہ قرآن ان سے عظمت و شان والا ہے، جبکہ صبح کی نماز کی قرأت طویل اور بالجہر ہے جیسا کہ یہ مشہور بھی ہے اور لکھی ہوئی بھی؛ یہ بھی زجاج سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صبح کی نماز میں قرأت کو طویل کرنے کے مستحب ہونے پر اہل مدینہ کا پختہ عمل ہے اتنی مقدار تک جو پیچھے کھڑے ہونے والوں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو۔ وہ اس میں طوال مفصل پڑھتے ہیں، اور ظہر اور جمعہ کی نمازوں کو بھی اس میں اس کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور مغرب کی نماز میں قرأت میں تخفیف کرتے ہیں اور عصر اور عشاء میں متوسط قرأت کرتے ہیں۔ اور عصر کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اس میں بھی مغرب کی طرح تخفیف کی جائے گی۔ اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ان نمازوں میں قرأت طویل کرنا جن میں مختصر قرأت پر استقرار ہے، اور ان نمازوں میں قرآت مختصر کرنا جن میں طویل قرأت کرنے پر عمل ہے، جیسا کہ فجر کی نماز میں معوذتین پڑھنا (1) جیسا کہ اسے نسائی نے روایت کیا ہے...... اور مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف، مرسلات اور طور کی قرأت کرنا، پس اس پر عمل متروک ہے اور اس وجہ سے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قرأت طویل کرنے سے منع کیا تھا جس وقت آپ نے اپنی قوم کو عشاء کی نماز کی امامت کرائی اور اس میں سورۃ البقرہ پڑھی، اسے صحیح نے روایت کیا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ آپ نے ائمہ کو تخفیف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ فرمایا: ''اے لوگو! بے شک تم میں سے بھگانے والے بھی ہیں پس تم میں سے جو کوئی لوگوں کی امامت کرائے تو اسے چاہئے کہ وہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، مریض بھی ہوتے ہیں اور درد والے بیمار بھی، اور ضعیف اور کمزور بھی ہوتے ہیں اور صاحب حاجت بھی (2)''۔ اور فرمایا: ''پس جب تم میں سے کوئی اکیلے نماز پڑھے تو وہ جتنی چاہے لمبی اور طویل پڑھے (3)۔'' یہ سب صحیح حدیث میں لکھا ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ یہ اس پر دلیل ہے کہ کوئی نماز بغیر قرأت کے نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 151

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، اذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء، جلد 1، صفحہ 98 — 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 97، مفہوم

نماز کو قرآن کا نام دیا ہے۔ علماء نے نماز میں قرأت کے بارے اختلاف کیا ہے پس جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ امام کے لئے اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ نماز کے بڑے حصے میں اس کی قرأت واجب ہے، اور یہ اسحاق کا قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی ہے کہ ایک رکعت میں اس کی قرأت واجب ہے؛ یہ مغیرہ اور سحنون نے کہا ہے۔ اور ان سے یہ بھی ہے کہ نماز میں سے کسی شے میں قرأت واجب نہیں ہوتی۔ اور یہ آپ سے انتہائی شاذ روایات میں سے ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرأت نصف نماز میں واجب ہوتی ہے، اور اسی طرف امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ بھی گئے ہیں۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اور ایوب سے بھی روایت ہے کہ امام پر، اکیلے نماز پڑھنے والے پر اور مقتدی پر ہر حال میں قرأت واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے، مکمل بحث سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: کَانَ مَشْهُوْدًا ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا کے بارے میں فرمایا: ''اس نماز میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں (1)''۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسے علی بن مسہر نے اعمش سے انہوں نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماعت کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کی فضیلت اکیلے آدی کی نماز پر پچیس درجے ہے اور صبح کی نماز میں رات کے ملائکہ اور دن کے ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں (2)''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (3) اسی وجہ سے اس نماز کو جلدی (صبح سویرے) پڑھا جاتا ہے، پس جس نے یہ نماز سویرے نہ پڑھی تو اس کی نماز میں ملائکہ کے دو گروہوں میں سے صرف ایک گروہ حاضر ہوگا۔ اور اس معنی کی بناء پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا افضل ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اندھیرے اور روشنی کو جمع کرنا (یعنی ان کے درمیان پڑھنا) افضل ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر روشن کر کے پڑھنا اندھیرے میں پڑھنے سے افضل ہے اور یہ اس کے مخالف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تغلیس پر مداومت اختیار کرتے تھے، اور یہ بھی کہ اس میں رات کے ملائکہ کی حاضری کو بھی فوت کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ بعض علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے اس پر استدلال کیا ہے: ''اس میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں (4)''۔ کہ صبح کی نماز نہ رات کی نماز میں سے ہے اور نہ دن کی نماز میں سے۔

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، فضل صلوٰۃ الفجر فی الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 90　3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عصر کی نماز بھی نہ رات کی نماز میں سے ہو اور نہ دن کی نماز میں سے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں: ''تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں، پس وہ عصر کی نماز میں اور فجر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں (1)''۔ الحدیث۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ عصر کی نماز دن میں سے ہے پس اسی طرح فجر کی نماز رات کی نماز میں سے ہوگی اور یہ اس طرح نہیں ہے، بلاشبہ یہ عصر کی نماز کی طرح دن کی نمازوں میں سے ہی ہے اور اس کی دلیل روزہ اور قسم وغیرہ ہے، اور یہ بالکل واضح ہے۔

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝

''اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کے لئے یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الَّيْلِ یہ مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ اور فَتَهَجَّدْ میں فا مضمر کلام پر عطف کے لئے ہے ای قُم فتھجد (یعنی اٹھو اور نماز تہجد ادا کرو) بِهٖ یعنی تلاوت قرآن کریم کے ساتھ۔ اور التھجد ھجود سے ہے اور یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: ھجد بمعنی نام (وہ سو گیا) اور ھجد بمعنی سھر (وہ جاگ گیا)، تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

ألا زارَتْ و أهلُ مِنى هجود — وليت خيالها بمِنًى يعود

اور دوسرا کہتا ہے:

ألَا طرقتنا والرفاق هجود — فباتت بِعَلّات النوال تجود (2)

مراد نیام (سونا) ہے۔ اور ھجد اور تھجد دونوں ہم معنی ہیں۔ اور ھجدتہ أی أنمتہ (میں نے اسے سلا دیا)، اور ھجدتہ ای أیقظتہ (میں نے اسے جگا دیا) اور التھجد سے مراد سونے کے بعد جاگنا ہے، اور پھر یہ نماز کا نام ہو گیا ہے، کیونکہ آدمی اس نماز کے لئے نیند سے بیدار ہوتا ہے، پس تھجد کا معنی نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس کا یہ معنی اسود، علقمہ اور عبد الرحمن بن اسود رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق قاضی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حجاج بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ جب اس نے ساری رات قیام کیا تو اس نے تہجد ادا کر لیے! بلاشبہ تہجد وہ نماز ہے جو نیند کے بعد ہو''۔ پھر فرمایا: ''وہ نماز

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ الفجر و العصر و المحافظۃ علیھا، جلد 1، صفحہ 227

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478

ہے جو نیند کے بعد ہو''۔ پھر فرمایا: ''وہ ہے جو سونے کے بعد ہو''۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی نماز ہوتی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الهجود کا معنی النوم (سونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: تهجد الرجل جب آدمی نیند سے بیدار ہو، اور القی الهجود وهو النوم وہ اپنی نیند پھینک دے، دور کر دے۔ اور وہ آدمی جو نماز کے لئے اٹھا اسے متهجد کا نام دیا جائے گا؛ کیونکہ متهجد وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے اپنی نیند کو دور پھینک دیتا ہے۔ اور یہ فعل تحوّب (گناہ سے بچنا)، تحرّج (گناہ سے بچنا) تاثم، تحنّث (گناہ سے نفرت کرنا، اسے چھوڑ دینا) تقذّر اور تنجس (نجاست اور پلیدی سے بچنا) کے قائم مقام ہے جب آدمی انہیں اپنے آپ سے دور کر دے، پھینک دے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (الواقعہ)

اس کا معنی ہے تندمون (کئے پر پشیمان ہونا)، یعنی تم اپنے آپ سے فکاہت پھینک دو گے، دور کر دو گے اور اس سے مراد نفوس کا انتہائی فرحت و سرور میں ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فكه جب آدمی بہت زیادہ خوش اور ہنسنے والا ہو۔ اور آیت میں اس کا معنی ہے: ووقتا من الليل أسهرته في صلاة و قراءة (اور رات میں کچھ وقت ہو جو اس کو نماز و قرأت کے لئے بیدار کرے)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قولہ تعالیٰ: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ آپ کے لئے اعزاز ہے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور علماء نے حضور نبی مکرم ﷺ کی امت کو چھوڑ کر خاص طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرنے میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ ﷺ پر فرض تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ زائد فریضہ ہے اس فریضہ سے جو امت پر لازم کیا گیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل میں دو اعتبار سے بعد ہے: ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ فرض کو نفل کا نام دیا گیا ہے، اور یہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''پانچ نمازیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هن خمس و هن خمسون لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (یہ پانچ ہیں (دراصل) یہ پچاس ہیں میرے نزدیک قول تبدیل نہیں کیا جائے گا)۔ اور یہ نص ہے، تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پر پانچ سے کوئی زائد نماز فرض ہوئی، یہ وہ ہے جو صحیح نہیں ہو سکتا، اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: ''تین چیزیں ہیں جو مجھ پر فرض ہیں اور میری امت کے لئے نفل ہیں رات کا قیام، وتر، اور مسواک کرنا (2)''۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ کے لئے بھی نفل ہے اور ابتدا میں یہ تمام پر واجب تھی، پھر وجوب منسوخ ہو گیا اور رات کا قیام فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا، اس کا مفصل بیان سورۃ المزمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس بنا پر نفل کے بارے امر ندب کے معنی میں ہوگا اور خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہو رہا ہے کیونکہ آپ کی مغفرت فرما دی گئی ہے (یعنی آپ معصوم ہیں) پس آپ وہ نفل ادا کریں گے جو آپ پر واجب نہیں ہیں تو وہ آپ کے لئے درجات میں اضافہ اور بلندی کا باعث ہوں گے اور آپ کے علاوہ امت کا نفل ادا کرنا فرائض میں واقع ہونے والے خلل کا تدارک

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478، مفہوم

2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 406، حدیث 19540، بتغیر یسیر

اور کفارہ ہوتے ہیں؛ اس کا یہ معنی حضرت مجاہد وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عطیہ ہے، کیونکہ کوئی بندہ سعادت میں سے عبادت کی توفیق سے افضل کوئی عطا نہیں پائے گا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قولہ تعالیٰ: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا مقام محمود کے بارے میں چار مختلف قول ہیں۔

(۱) اور یہی زیادہ صحیح ہے ...... کہ یہ قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کا مقام ہے؛ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور صحیح بخاری میں (1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک لوگ قیامت کے دن گروہ گروہ ہو جائیں گے اور ہر امت اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع کرے گی اور یہ کہے گی: اے فلاں! تو شفاعت کر، یہاں تک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شفاعت انتہا کو پہنچ جائے گی، پس اس دن اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمائے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ ہمیں حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہو گا لوگ آپس میں بعض بعض سے اضطراب کا اظہار کریں گے اور پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے: اپنی اولاد کی شفاعت کیجئے، تو آپ فرمائیں گے: میں یہ نہیں کر سکتا، لیکن تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو آپ بھی فرمائیں گے: میں نہیں کر سکتا، البتہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور وہ بھی کہیں گے: نہیں میں شفاعت نہیں کر سکتا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ کیونکہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ بھی فرمائیں گے: میں اس کے لئے تیار نہیں البتہ تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ چنانچہ وہ میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا: میں اس لئے تیار ہوں (2)''۔ آگے حدیث ذکر کی۔ اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کے بارے فرمایا جب اس کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ (مقام) شفاعت ہے (3)''۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جب یہ ثابت ہو گیا کہ مقام محمود ہی اس شفاعت کا امر ہے جسے انبیاء علیہم السلام ایک دوسرے کے ذمہ لگائیں گے، یہاں تک کہ یہ امر ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک انتہا کو پہنچ جائے گا۔ پس آپ اہل موقف کی یہ شفاعت کریں گے تا کہ ان کا حساب جلدی میں ہو جائے اور وہ اپنے موقف (ٹھہرنے کا محل، میدان حشر) کے ہول اور خوف سے راحت اور سکون پالیں، اور یہ شفاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، اور اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں (4)''۔ نقاش نے کہا ہے (5): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین شفاعتیں ہیں:

---

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 2۔ صحیح مسلم، اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار، جلد 1، صفحہ 110

3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3062، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 434، حدیث 32040 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479

شفاعت عامہ، جنت کی طرف سبقت لے جانے کی شفاعت، اور اہل کبائر کی شفاعت۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مشہور یہ ہے کہ یہ صرف دو شفاعتیں ہیں: شفاعت عامہ، جہنم سے گنہگاروں کو نکالنے کی شفاعت اور یہ دوسری شفاعت وہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام دور نہیں ہٹائیں گے اور نہ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالیں گے بلکہ وہ شفاعت کریں گے اور علماء بھی شفاعت کریں گے۔ اور قاضی ابو الفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں پانچ ہیں! شفاعت عامہ، دوسری بغیر حساب کے قوم کو جنت میں داخل کرنے کے بارے، تیسری آپ کی امت کے موحدین کی ایک جماعت جنہوں نے اپنے گناہوں کے سبب جہنم واجب کر لی ہوگی پس ان کے بارے میں ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ جس کے بارے چاہے گا کہ وہ شفاعت کریں اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور یہی وہ شفاعت ہے جس کا مبتدع خوارج اور معتزلہ نے انکار کیا ہے، اور انہوں نے اس کا انکار اپنے فاسد اصولوں کی بنا پر کیا ہے، اور وہ استحقاق عقلی ہے جس پر کسی کو حسین اور قبیح قرار دینے کا دارومدار ہے اور چوتھی ان گنہگاروں کے بارے میں ہے جو جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور ان کے مومن بھائیوں کی شفاعت سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پانچویں شفاعت جنت میں اہل جنت کے درجات میں زیادتی اور ان کی بلندی کے بارے ہوگی۔ اور یہ وہ شفاعت ہے جس کا معتزلہ انکار نہیں کرتے اور نہ وہ حشر اول کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5۔** حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: سلف صالحین کا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی التجا کرنا اور ان کا اس میں رغبت رکھنا خبر مشہور اور مستفیض سے ثابت اور معلوم ہے، لہٰذا اس بنا پر اس کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جس نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے میرا یہ دعا کرنا مکروہ ہے کہ وہ تجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت عطا فرمائے، کیونکہ یہ تو فقط گنہگاروں کے لئے ہوگی، اس لئے کہ یہ حساب میں تخفیف اور درجات اور مراتب میں زیادتی اور بلندی کے لئے بھی ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر ہر عقلمند کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے اور وہ معافی کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے سبب سرکش اور حدود سے تجاوز کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں وہ ہلاک ہونے والوں میں سے نہ ہو جائے، اور مذکورہ قول کرنے والے کے قول سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ مغفرت اور رحمت کی دعا ہی نہ مانگے کیونکہ یہ بھی گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور یہ سب اس کے خلاف ہے جو کچھ سلف وخلف کی دعا سے معلوم ہوا ہے؛ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے اذان سن کر یہ دعا پڑھی اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَائِمَۃِ آتِ مُحَمَّدًا ...... صلی اللہ علیہ وسلم ...... الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت حلال ہوگئی (1)''۔

دوسرا قول یہ ہے...... کہ مقام محمود سے مراد اللہ تعالیٰ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے دن لواء الحمد عطا کرنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول اور پہلے قول کے درمیان کوئی منافرت نہیں ہے، کیونکہ لواء الحمد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست

---

1۔ صحیح بخاری، الدعاء عند النداء، جلد 2، صفحہ 686

مبارک میں ہوگا اور آپ شفاعت کریں گے۔ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں فخر سے نہیں کہہ رہا اور میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اور اس پر مجھے فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سوا کوئی نبی نہ ہوگا مگر وہ میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا(1)"۔ الحدیث۔

تیسرا قول یہ ہے ...... اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے، اس میں سے حضرت مجاہد بھی ہیں، اس جماعت نے یہ کہا ہے کہ مقام محمود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ساتھ اپنی کرسی پر بٹھائے گا اور اس بارے میں انہوں نے ایک حدیث بھی روایت کی ہے۔ اور علامہ طبری نے اس کے جواز کو ایک قول کی زیادتی سے تقویت دی ہے۔ اور وہ نہیں نکل سکتا مگر معنی میں حیلہ اور انتہائی نرمی برتنے کے ساتھ، اور اس میں حقیقت سے بہت بعد اور دوری ہے۔ اور اس کے باوجود روایت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے معنی میں تاویل ہوگی(2)۔ اور نقاش نے ابوداؤد سجستانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے اس حدیث کا انکار کیا تو وہ ہمارے نزدیک متہم ہوگا، اہل علم اس کے بارے مسلسل بیان کرتے رہے ہیں، جس نے اس کی تاویل کی بنا پر اس کے جواز کا انکار کیا ہے(3)۔ ابو عمر نے کہا ہے: حضرت مجاہد اگرچہ ائمہ میں سے ایک ہیں آپ قرآن کریم کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ آپ کے دو قول ہیں جو اہل علم کے نزدیک چھوڑ دیئے گئے ہیں: ان میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسرا اس قول باری تعالیٰ کی تاویل میں ہے: وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ (القیامۃ) فرمایا: وہ ثواب کا انتظار کرے گا، یہ نظر (یعنی رب کریم کو دیکھنے) سے نہیں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن شہاب نے حدیث التنزیل کے باب میں اسے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے بھی اس آیت میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر بٹھائے گا(4)۔ اور یہ تاویل محال نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام اشیاء اور عرش کو پیدا کرنے سے پہلے اپنی ذات کے ساتھ قائم اور موجود تھا، پھر اس نے بغیر حاجت اشیاء کو تخلیق فرمایا مگر اسے ان کی حاجت اور ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے لئے ایسا کیا، اور اس لئے تاکہ اس کا وجود، اس کی توحید، کمال قدرت اور تمام افعال محکمہ کے بارے اس کا علم معلوم ہو جائے، اور اس نے اپنے لئے عرش تخلیق فرمایا اور اپنی قدرت اور شان کے مطابق اس پر قرار پذیر ہوا بغیر اس کے کہ اللہ کریم نے اس کو مس کیا ہو، یا عرش اس کے لئے مکان بنا ہو۔ کہا گیا ہے: وہ اب بھی اسی صفت پر ہے جس پر وہ زمان و مکان کو پیدا کرنے سے پہلے تھا؛ پس اس بناء پر جواز میں یہ قول کرنا برابر ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرش یا زمین پر بٹھایا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر قرار پذیر ہونا انتقال، زوال، احوال کا تبدیل ہونا مثلاً اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ اور وہ حالت جو عرش کو مشغول کر دے، کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے عرش پر بلا کیف متمکن ہوا

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، ما جاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 202
ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3073، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں خبر دی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش پر بٹھانا نہ تو آپ کے لئے صفت ربوبیت کو ثابت کرتا ہے اور نہ آپ کو صفت عبودیت سے نکالنے کا سبب ہے، بلکہ یہ تو آپ کے مقام ومحل کو بلند کرنا اور آپ کو اپنی مخلوق پر شرف وعزت عطا کرنا ہے۔ اور رہا اخبار میں آپ کا قول مَعَهٗ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ (الاعراف: 126) (بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے) اور رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (التحریم: 11) (اے میرے رب! بنا دے میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں۔) اور وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (العنکبوت: 69) (اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے) اور اسی طرح کے دیگر ارشادات۔ یہ تمام بلند رتبہ، اور درجہ کی طرف عائد ہیں نہ کہ مکان کی طرف۔

چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کا اپنی شفاعت کے ساتھ جہنم سے انہیں نکالنا ہے جو نکلیں گے؛ یہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ واللہ الموفق۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ رات کے قیام کے مقام محمود کا سبب ہونے کے بارے میں علماء کے دو مختلف قول ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے ..... کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فعل میں سے جسے چاہے اپنے فضل کا سبب بنا دیتا ہے چاہے تو اس میں وجہ حکمت کی پہچان نہ کرائے، یا وجہ حکمت کی معرفت عطا کر دے۔

دوسرا قول یہ ہے ..... کہ رات کے وقت قیام کرنے میں لوگوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت اختیار کرنا اور اس کی مناجات کرنا ہے، پس اس نے رات کے قیام میں اپنے ساتھ خلوت نشینی اور اپنی مناجات عطا فرمادی ہے اور یہی مقام محمود ہے اور اس میں مخلوق اپنے درجات کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت پاتی ہے اور مخلوق میں درجہ کے اعتبار سے سب سے اشرف واعلیٰ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، کیونکہ آپ کو وہ کچھ عطا کیا جاتا ہے جو کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا اور آپ اس وقت شفاعت کریں گے جب کوئی شفاعت نہیں کرے گا۔

اور عَسٰى کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب اور ثابت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور مَقَامًا ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی بمعنی فی مقام أو إلی مقام۔ اور طبری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقام محمود یہ وہی مقام ہے جس میں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا(1)''۔ پس مقام وہ جگہ ہے جس میں انسان امور عظیمہ سرانجام دینے کے لئے کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ وہ مقامات جو بادشاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۝

''اور دعا مانگا کیجئے کہ اے میرے رب! جہاں کہیں تو مجھے لے جائے سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو۔''

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے موت عطا فرما سچائی کی موت، اور مجھے قیامت کے دن اٹھا سچائی کے ساتھ، تا کہ یہ الله تعالیٰ کے اس قول سے متصل ہو جائے: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا گویا جب آپ کے ساتھ اس کا وعدہ فرمایا تو آپ کو حکم دیا کہ دعا مانگا کریں تا کہ آپ کے لئے وعدہ پورا کر دیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے ان امور میں داخل فرما دے جن کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے مجھے نکال لے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الله تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی تعلیم دی کہ آپ حالت نماز اور دیگر اوقات میں مشرکین کے درمیان سے نکالے جانے اور پر امن جگہ میں پہنچائے جانے کی دعا مانگا کیجئے، پس الله تعالیٰ نے آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالا اور آپ کو مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔ اس معنی کو ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے پھر آپ کو ہجرت کا حکم دیا گیا پس یہ آیت نازل ہوئی (1): وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ آپ کا مکہ مکرمہ سے نکلنا اور فتح کے دن حالت امن میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونا ہے۔ ابو سہل نے کہا ہے: جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو منافقین نے کہا تھا: لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون: 8) (تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو)۔ تو اس ارشاد میں مراد عزت کے ساتھ داخل کرنا اور مدد و نصرت کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف نکالنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے اس امر میں سچائی کے ساتھ داخل فرما دے جس کے ساتھ تو نے مجھے عزت و تکریم عطا فرمائی ہے (اور وہ) نبوت ہے، اور مجھے اس سے سچائی کے ساتھ نکال لے جب تو مجھے موت عطا فرمائے)، اس کا یہ معنی حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے۔ اور المُدخل اور المُخرج (میم کے ضمہ کے ساتھ) یہ بمعنی ادخال (داخل کرنا) اور اخراج (نکالنا) ہیں، جیسا کہ الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (المومنون: 29) (اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر۔) یعنی یہ بمعنی انزال ہے میں اس جگہ میں ایسی شے نہ دیکھوں جو میں ناپسند کرتا ہوں اور یہی قرأت عامہ ہے۔ حسن، ابو العالیہ، اور نصر بن عاصم رحمہم الله تعالیٰ نے مَدخل اور مَخرج دونوں میموں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی دخول اور خروج ہیں (یعنی داخل ہونا اور نکلنا)، پس پہلا رباعی ہے اور یہ ثلاثی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مجھے موت کے وقت سچائی کے ساتھ قبر میں داخل فرما اور دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت سچائی کے ساتھ وہاں سے نکال۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے سچائی کے ساتھ لے جا جہاں کہیں تو مجھے لے جائے اور سچائی کے ساتھ وہاں سے لے آ، یعنی تو مجھے ان سے نہ بنا جو من وجہ داخل ہوتے ہیں اور من وجہ خارج ہوتے ہیں، کیونکہ دو چہروں والا تیرے نزدیک وجیہ اور پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ہر اس کے بارے میں عام ہے جو امور میں پائے جاتے ہیں اور سفروں اور اعمال میں سے جن کا قصد کیا جاتا ہے، اور موت و حیات میں تقدیر کے جس تصرف کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ پس یہ ایک دعا ہے، اور اس کا معنی ہے: اے میرے رب! تمام امور میں میرے داخل ہونے اور ان سے نکلنے کے بارے میری اصلاح فرما۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا شعبی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور عکرمہ نے کہا ہے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا سے مراد حجۃ ثابتہ ہے۔ اور حسن اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد عزت، مدد و نصرت اور تمام دینوں پر آپ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا کہ وہ فارس اور روم وغیرہ کی سلطنتیں ان سے چھین لے گا اور اسے آپ کے حوالے کر دے گا۔

**وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾**

''اور آپ (اعلان) فرما دیجئے: آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل، بے شک باطل تھا ہی مٹنے والا۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام بخاری اور ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ کی چھڑی سے انہیں کچوکے دینے لگے...... اور کبھی فرمایا: بِعُوْدٍ (لکڑی سے مراد چھڑی ہی ہے)...... اور ساتھ فرماتے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل بے شک باطل مٹنے والا ہی تھا) حق آ گیا ہے اور باطل کبھی نہیں آئے گا(1)''۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی طرح مسلم کی حدیث میں نُصُبًا ہے۔ اور ایک روایت میں صنما ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس عدد کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دن میں ایک بت کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے اور ان کے بڑے (اور سردار) کو دو دنوں کے ساتھ خاص کرتے تھے۔ (یعنی اس کی پرستش دو دن کرتے تھے) اور آپ کا قول: **فجعل يطعنها بعود في يده**(2) کہا جاتا ہے: بے شک وہ کچ کے ساتھ مضبوط اور پختہ کھڑے کئے گئے تھے اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں سے کسی بت کے چہرے پر چھڑی لگاتے تو وہ گدی کے بل پیچھے گر جاتا یا گدی پر مارتے تو وہ اپنے چہرے کے بل گر پڑتا۔ اور آپ فرما رہے تھے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اسے ابو عمر اور قاضی عیاض نے بیان کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: کوئی بت باقی نہیں بچا مگر وہ اپنے منہ کے بل گر گیا، پھر آپ نے ان کے بارے حکم دیا تو وہ توڑ دیئے گئے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں مشرکین کے بتوں اور دیگر تمام بتوں کو توڑنے پر دلیل ہے جب ان پر غلبہ پا لیا جائے۔ اور اس میں معنوی طور پر باطل کے تمام آلات کو توڑنا داخل ہے، اور ہر وہ شے جو صرف اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کے لئے استعمال ہو مثلاً آلات موسیقی جیسے ستار، سارنگی اور وہ مزامیر جن کا سوائے لہو و لعب اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کرنے کے اور کوئی مقصد اور معنی نہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اصنام کے معنی میں وہ صورتیں بھی ہیں جو مٹی، لکڑی اور ان کے مشابہ چیزوں سے بنائی جاتی ہیں، اور ہر وہ شے جسے لوگ بناتے ہیں اور ان میں سوائے اس لہو کے جس سے منع کیا گیا ہے اور کوئی منفعت نہ ہو۔ ان میں سے کسی شے کو بیچنا جائز نہیں سوائے ان بتوں کے جو سونے، چاندی، لوہے اور تانبے وغیرہ سے بنائے گئے ہوں،

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3063، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 686

جب انہیں موجودہ حالت سے تبدیل کر دیا جائے اور وہ پگھلا ہوا ٹکڑا یا کٹا ہوا ٹکڑا بن جائے تو پھر اس کو بیچنا اور اس کے عوض کوئی شے خریدنا جائز ہے۔ مہلب نے کہا ہے: باطل آلات میں سے جو توڑ دیئے جائیں اور انہیں توڑنے کے بعد روک کر محفوظ رکھنے میں منفعت اور فوائد ہوں تو پھر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا ان کا مالک ہی زیادہ حقدار ہے، مگر یہ کہ امام وقت مالی سزا دینے اور اس میں مزید سختی اور شدت کے لئے انہیں آگ کے ساتھ جلانا مناسب سمجھتا ہو، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے جلانے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں کو جلانے کا ارادہ فرمایا جو نماز با جماعت سے پیچھے رہتے تھے (1)۔ اور یہی مالی سزا میں اصل اور بنیاد ہے، اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس اونٹنی کے بارے میں جس پر اس کی مالکہ نے لعنت کی ہو: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ اس پر لعنت کی گئی ہے (2)''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مالکہ کو ادب سکھانے کے لئے اس سے اس کی ملکیت ختم کر دی، اور یہ اس کے لئے اس قول کی سزا ہے جو اس نے اس کے خلاف کہا اس کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پکارا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دودھ کو جو پانی کے ساتھ ملایا گیا، اس کے مالک پر بہا دیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں سے ذکر کیا ہے اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ''قسم بخدا! حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے اور ضرور صلیب کو توڑ دیں گے، اور خنزیر کو یقیناً قتل کریں گے اور ضرور جزیہ لگائیں گے اور یقیناً نوجوان اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی اور انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی جائے گی'' (3) الحدیث۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور اسی باب سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پردے کو پھاڑنا بھی ہے جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، اور یہ بھی تصویروں اور آلات ملاہی کو فاسد اور خراب و برباد کرنے پر دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اور یہ سب ان کو بنانے سے روکتا ہے اور ان کے مالک پر انہیں تبدیل کرنے کو واجب قرار دیتا ہے۔ بے شک یہ صورتیں بنانے والوں کو (اور ان کے مالکوں کو) قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان کو کہا جائے گا: انہیں زندہ کرو جنہیں تم نے بنایا ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے، اور عنقریب اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: **وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ** یعنی اسلام آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے، یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد جہاد ہے۔ **وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ** کہا گیا ہے: باطل سے مراد شرک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد شیطان ہے: یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور درست یہ ہے کہ لفظ میں ممکنہ حد تک تعمیم ہے، پس تفسیر یہ ہوگی کہ شریعت آ گئی تمام احکام کے ساتھ جن کو وہ متضمن ہے۔ **وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ** اور باطل باطل ہو گیا۔ اور اسی سے زهوق النفس بھی ہے یعنی اس کا باطل ہونا۔ کہا جاتا ہے: زهقت نفسه تَزهَق زهوقا، وأزهقتها (اس کا نفس باطل ہو گیا، اور میں نے اسے باطل کر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، وجوب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 89، مفہوم

2۔ سنن طبرانی الکبیر، جلد 18، صفحہ 190، حدیث 452

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، نزول عیسیٰ بن مریم، جلد 1، صفحہ 87

دیا)۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یعنی اس کے لئے بقا نہیں ہے، اور حق وہ ہے جو ثابت ہوتا ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝۸۲

''اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ نُنَزِّلُ جمہور نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے وَيُنْزِلُ یا اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے مروزی نے حفص سے روایت کیا ہے۔ اور مِنَ ابتدا غایت کے لئے ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ بیان جنس کیلئے ہو، گویا کہ یہ فرمایا: و نُنَزِّلُ ما فيه شِفاءٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ (اور ہم قرآن میں وہ نازل کرتے ہیں جو شفا ہے۔) اور حدیث میں ہے: ''جس نے قرآن کریم سے شفا طلب نہ کی تو اللہ تعالیٰ اسے شفا نہیں دے گا(1)''۔ اور بعض متاولین نے مِنَ کے تبعیضیہ ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ یہ اس سے محفوظ ہے کہ اسے یہ لازم آئے کہ اس کے بعض میں شفا نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسے یہ لازم نہیں آتا، بلکہ یہ صحیح ہے کہ مِنَ اس اعتبار سے تبعیض کے لئے ہو کہ اس کے نازل کرنے کو فقط بعض قرار دیا گیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: و نُنَزِّلُ من القرآن شيئًا شِفَاء (اور ہم قرآن میں سے کچھ چیزیں باعث شفا نازل کرتے ہیں)، نہ کہ اس تمام میں شفا ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے اس کے شفا ہونے میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دلوں کے لئے ان سے جہالت دور کرنے، شک اور ریب کا ازالہ کرنے، اور معجزات اور وہ امور جو اللہ تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں انہیں سمجھنے کے لئے جہالت کے مرض سے دل کے پردے کھولنے کے اعتبار سے باعث شفا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ظاہری بیماریوں کے لئے دم اور تعوذ کے سبب باعث شفا ہے۔ تحقیق ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تیس سواروں کے ایک سریہ میں بھیجا آپ نے بیان کیا: پس ہم عرب کی ایک قوم کے پاس اترے اور ہم نے ان سے پوچھا (کیا) وہ ہماری مہمان نوازی کریں گے؟ تو انہوں نے انکار کر دیا، فرمایا: پھر قبیلے کے سردار کو ڈس لیا گیا، پس وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے: تم میں کوئی ہے جو بچھو کا دم کرتا ہو؟ اور ابن قتہ کی روایت میں ہے: بے شک بادشاہ مر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے کہا: ہاں میں ہوں، لیکن میں دم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم ہمیں کچھ دو، تو انہوں نے کہا: ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے۔ آپ نے فرمایا: پس میں نے اس پر سات مرتبہ(3) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ اور سلیمان بن قتہ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس اسے افاقہ ہو گیا اور صحت یاب ہو گیا۔ تو اس نے ہماری طرف ضیافت کا کھانا بھی بھیجا اور بکریاں بھی ہماری طرف بھیجیں، پس ہم نے کھانا کھا لیا اور میرے ساتھیوں نے بکریوں میں سے

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 9، حدیث 28106 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 480 3۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 63، حدیث 243

کوئی کھانے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو گئے اور آپ کو میں نے ساری خبر گوش گزار کر دی تو آپ نے فرمایا: "تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے۔" میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، یہ ایسی شے ہے جو میرے دل میں القا کر دی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کلوا و أطعمونا من الغنم(1) (تم خود بھی کھاؤ اور بکریوں میں سے ہمیں بھی کھلاؤ)۔ انہوں نے اسے کتاب السنن میں نقل کیا ہے۔ اور (کتاب المدبح) میں سری بن یحییٰ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے حسن سے، اور انہوں نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے حکم سے برص، جنون، جذام، پیٹ چلنے، سل (پھیپھڑے کی بیماری، لاغری)، بخار اور سانس کی بیماری سے نفع اور فائدہ ہوتا ہے کہ تو زعفران یا سرخ مٹی (گیرو) کے ساتھ یہ کلمات لکھے أعوذ بکلمات اللہ التامۃ و أسمائہ کلھا عامۃ من شر السامۃ و العامۃ و من شر العین اللامۃ و من شر حاسد اذا حسد و من أبی فروۃ و ما ولد۔ اسی طرح کہا، اور من شر أبی قترۃ نہیں کہا۔ العین اللامۃ سے مراد نظر بد کا لگنا ہے۔ تو کہتا ہے: میں اس کی پناہ مانگتا ہوں ہر زہریلے کیڑے سے اور نظر بد سے۔ اور رہا آپ کا یہ قول: أعیذہ من حادثات اللمۃ تو کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد حوادثات زمانہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شدت اور سختی ہے۔ اور السامۃ کا معنی الخاصہ ہے۔ کہا جاتا ہے: کیف السامۃ و العامۃ (خاص و عام کیسے ہیں) اور السامۃ سے مراد زہر بھی ہے۔ اور من فروۃ و ما ولد۔ اور فرمایا: تنتیس ملائکہ اپنے رب کریم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: ہماری زمین میں درد اور بیماری ہے تو رب کریم نے فرمایا: اپنی زمین سے کچھ مٹی لے لو اور اپنی پیشانیوں پر مل لو۔ یا فرمایا: تمہاری پیشانیوں کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دم ہے، وہ کامیاب نہیں ہوگا جس نے اسے ہمیشہ چھپائے رکھا یا اس پر کوئی ہدیہ وغیرہ لیا۔" پھر فاتحۃ الکتاب (الحمد شریف) سورۃ البقرہ کی پہلی چار آیات، اور وہ آیت جس میں ہواؤں کے چلنے کا ذکر ہے، آیۃ الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیتیں، سورۃ البقرہ کی آخری آیات لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ سے لے کر اس کے آخر تک، سورہ آل عمران کی پہلی دس آیتیں اور اس کے آخر سے دس آیتیں، سورۃ النساء کی پہلی آیت، سورۃ المائدہ کی پہلی آیت، سورۃ الانعام کی پہلی آیت، سورۃ الاعراف کی پہلی آیت، اور وہ آیت جو سورۃ الاعراف میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ آیت کے آخر تک؛ اور وہ آیت جو سورۂ یونس میں ہے اس جگہ سے قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ اور وہ آیت جو سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ اور سورۃ الصافات کی پہلی دس آیات، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اور معوذتین لکھیں۔ یہ پاک صاف برتن میں لکھی جائیں گی پھر انہیں پاک پانی کے ساتھ تین بار دھویا جائے گا پھر اس سے تین بار درد والی جگہ پر لگائے پھر اس سے اس طرح وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے اور وہ نماز کے لئے وضو کرنے سے پہلے اس سے وضو کرے، یہاں تک کہ اس سے وضو کرنے سے پہلے پاکیزگی اور طہارت کی حالت پر

1۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 64، حدیث 246

ہو پھر وہ اپنے سر، اپنے سینے اور اپنی پیٹھ پر پانی انڈیلے اور اس کے ساتھ استنجانہ کرے پھر وہ دو رکعتیں (نفل نماز) پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے شفا کی دعا مانگے، اسی طرح تین دن تک عمل کرے، اتنی مقدار جتنا ہر روز لکھا جا سکتا ہو۔ اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: و من شئہ ابی قِترۃ و ما ولد۔ اور فرمایا: ''پس اپنی پیشانیوں پر مل لو۔'' اور کوئی شک نہ کیا جائے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس مرض میں آپ کا وصال ہوا اس میں معوذات پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکتے تھے اور جب یہ ثقیل ہو گیا (یعنی بیماری بڑھ گئی) تو میں یہ پڑھ کر آپ پر پھونکتی تھی اور میں آپ کا اپنا دست مبارک برکت کے لئے پھیرتی تھی۔ پس میں (مراد عروہ بن زبیر ہیں) نے زہری سے پوچھا آپ کیسے پھونکتے تھے؟ تو انہوں نے بیان کیا: آپ اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے تھے پھر انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے تھے (1)۔ اور مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تکلیف ہوتی تو آپ اپنے اوپر معوذتین پڑھتے اور تھوکتے یا پھونک مارتے (2)۔ ابوبکر بن الانباری نے کہا ہے: علمائے لغت نے کہا ہے کہ نفث سے مراد ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک نہ ہو۔ اور تفل کا معنی ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک بھی ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فإن يَبْرأ فلم أنفِث عليه　　وإن يُفْقد فحقَّ له الفقُود

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

و مِنْ جَوْف ماءٍ عَرْمَض الحَولِ فوقه　　متى يَحْسُ منه مائحُ القوم يَتْفَل

اس سے مراد تھوک کے ساتھ پھونک مارنا ہے۔ اور النفث کے بارے علماء نے جو کہا ہے اس کا بیان سورۃ الفلق میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے: یہ ایسی حدیث ہے جس کی مثل سے دین میں حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کے ناقلین میں وہ ہیں جو معروف نہیں۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو پھر بھی یا غلط ہے یا منسوخ ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ الفاتحہ کے بارے فرمایا: ''تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے (3)؟'' اور جب معوذتین کے ساتھ دم کرنا جائز ہے اور یہ دونوں قرآن کریم کی سورتیں ہیں تو پھر سارا قرآن کریم جواز میں ان دونوں کی مثل ہے کیونکہ سارے کا سارا قرآن ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری امت کی شفا تین چیزوں میں ہے، کتاب اللہ کی آیت میں، یا شہد چاٹنے میں، یا اچھی طرح پچھ لگوانے میں (4)''۔ اور رجا الغنوی نے کہا ہے: جس نے قرآن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقران والمعوذات، جلد 2، صفحہ 854

2۔ موطا امام مالک، التعوذ والرقیۃ من المرض، صفحہ 720

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقرآن والمعوذات، جلد 3، صفحہ 854

4۔ ایضاً، الشفاء فی ثلاث، جلد 2، صفحہ 848، مفہوم

کے ساتھ شفا طلب نہ کی تو اس کے لئے شفا نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے نُشْرَہ کے بارے اختلاف کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے یا قرآن کریم میں سے کوئی شے لکھے پھر اسے پانی کے ساتھ دھوئے پھر اسے مریض پر ملے یا اسے پلائے، تو حضرت سعید بن مسیب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ آپ کو کہا گیا: وہ آدمی جسے اپنی بیوی سے لے لیا جاتا ہے (یعنی اس پر کوئی جادو، منتر کر دیا جاتا ہے) تو کیا وہ اس سے کھولا جائے گا اور اسے کوئی دم تعویذ کیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں، اور جو چیز نفع دیتی ہے اسے اس سے منع نہ کیا جائے۔ اور حضرت مجاہد کی یہ رائے نہیں کہ تو قرآن کریم کی آیات لکھے پھر انہیں دھوئے اور پھر اسے گھبراہٹ والے آدمی کو پلایا جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک برتن میں پانی پر معوذتین پڑھتی تھیں پھر آپ حکم دیتی تھیں کہ اسے مریض پر انڈیل دیا جائے۔ مازری ابو عبداللہ نے کہا ہے: اہل تعزیم (دم کرنے والے) کے نزدیک نشرہ (دم، تعویذ) امر معروف ہے، اور اسے یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ اپنے صاحب کی گرہ کھول دیتا ہے (بیماری ختم کر دیتا ہے۔) حسن اور ابراہیم نخعی نے اس سے منع کیا ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی مصیبت اور بلا آپہنچے، گویا کہ آپ اس طرف گئے ہیں کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ قرآن کو مٹایا گیا ہے اور اس کا اپنے پیچھے کسی آزمائش اور مصیبت تک پہنچانا اس سے زیادہ قریب ہے کہ یہ شفا کا فائدہ دے۔ اور حسن نے کہا ہے: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ شیطان کے عمل میں سے ہے (1)''۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ آثار لینہ ہیں اور ان کے لئے کئی وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک یہ اس معنی پر محمول ہیں کہ جب یہ اس سے باہر ہو جو کچھ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے ہے، اور معروف علاج سے باہر ہو۔ اور نشرہ طب کی جنس سے ہے پس یہ ایک چیز کا دھوون ہے جو اس کے لئے بہتر ہے، پس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی طرح ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دم کرنے میں کوئی حرج نہیں جب اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو اور تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کو نفع پہنچانے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ (دم) کرے (2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے نشرہ کے بارے مرفوع نص ذکر کی ہے اور یہ کہ وہ نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ سے پس چاہئے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس تحریر کو مریضوں کے گلے میں تبرک کے لئے لٹکانے میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے ہوں جبکہ اسے لٹکانے والا اس کے لٹکانے کے ساتھ نظر کا دفاع کرنے سے نڈھال

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب النشرۃ، جلد 2 صفحہ 184۔ ایضاً، باب فی النشرۃ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطب، استحباب الرقی بالعین، جلد 2، صفحہ 224-223

اور عاجز نہ ہو۔ اور یہی اس کا معنی ہے قبل أن ینزل بہ شئ من العین (یعنی نظر سے کوئی تکلیف اور مصیبت آنے سے پہلے)۔ اور اسی قول پر اہل علم کی ایک جماعت بھی ہے، ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ صحت مند جانوروں یا انسانوں کے گلوں میں نظر لگنے کے خوف سے کوئی چیز لٹکائی جائے، اور ہر وہ چیز جو مصیبت آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی کتاب میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے شفا اور کشادگی کی امید رکھتے ہوئے لٹکائی جاتی ہے، تو وہ اس مباح دم کی مثل ہے نظر وغیرہ کی صورت میں جس کا مباح ہونا سنت سے ثابت ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو حالت نیند میں خوف آئے تو اسے چاہئے کہ وہ یہ کہے: أعوذ بكلمات الله التامة من غضبه و سوء عقابه و من شر الشياطين وأن يَحْضُرُون (1)۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے ان بچوں کو یہ سکھاتے تھے جو ادراک رکھتے تھے، اور جو ادراک نہ رکھتے تھے آپ ان کلمات کو لکھتے اور ان کے گلے میں لٹکا دیتے۔ اور اگر کہا جائے: تحقیق روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (2)''۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی ام ولد کے (گلے) میں ایک بندھا ہوا تعویذ دیکھا تو آپ نے اسے انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچا اور اسے توڑ دیا اور فرمایا: بے شک آل ابن مسعود اس شرک سے مستغنی ہے، پھر فرمایا: بے شک تعویذ، دم اور التِّوَلہ یہ سب شرک ہیں۔ پوچھا گیا: یہ التِّوَلہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ جس کے ساتھ عورت اپنے خاوند کی محبوب ہو جائے (3)۔ اور عقبہ بن عامر جہنی سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے تعویذ لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کو مکمل نہ کرے گا اور جس نے وَدَعہ (منکا) لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اطمینان عطا نہیں کرے گا (4)''۔

خلیل بن احمد نے کہا ہے: کلام عرب میں تمیمہ سے مراد قلادہ ہے، اور اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ نظر یا مصائب کی انواع میں سے کسی کے خوف سے قلائد میں سے جو گلوں میں لٹکایا جائے تو گویا حدیث میں معنی یہ ہوا کہ جو کوئی اس تکلیف کے ڈر سے گلے میں لٹکاتا ہے جس کے نازل ہونے کی امید ہو یا یہ کہ وہ مصیبت نہ آئے اس کے آنے سے پہلے لٹکاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی صحت و عافیت کو مکمل نہ کرے۔ اور جس نے کوئی منکا وغیرہ لٹکایا...... اور یہ معنی میں اس کی مثل ہے...... پس اللہ تعالیٰ اسے اطمینان نہ دے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے برکت عطا نہ کریگا جس میں اس کے لئے عافیت ہو۔ واللہ اعلم۔ اور یہ سب اس سے ڈرانا ہے جو اہل جاہلیت تعویذات اور قلائد لٹکانے کا عمل کرتے تھے، اور یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ انہیں بچاتے ہیں اور ان سے آزمائش اور مصائب کو پھیر دیتے ہیں، حالانکہ انہیں اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا، وہی عافیت عطا فرمانے والا ہے اور وہی مبتلا کرنے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس عمل سے منع فرمایا جو دور

1۔ جامع ترمذی، ابواب الدعوات، جلد 2، صفحہ 191۔ ایضاً، باب ماجاء فی جامع الدعوات الخ، حدیث 3451، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابی داؤد، باب کیف الرقی، حدیث نمبر 3395۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی كراهية التعليق، حدیث 1998، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7505
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 240، حدیث 7501۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی تعليق التمائم، حدیث نمبر 3385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاہلیت میں وہ کرتے تھے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ جو آزمائش اور مصیبت آنے کے بعد لٹکایا گیا وہ تمائم (تعویذات) میں سے نہیں ہے، حالانکہ بعض اہل علم نے ہر حال میں آزمائش آنے سے پہلے اور اس کے بعد تعویذ لٹکانے کو مکروہ قرار دیا ہے، ناپسند کیا ہے۔ پہلا قول اثر و نظر میں زیادہ صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ آپ نے قرآن کے سوا ان چیزوں کو لٹکانا ناپسند کیا جو قیافہ شناسوں اور کاہنوں سے لی گئی ہوں، کیونکہ قرآن سے شفا طلب کرنا چاہئے اسے لٹکایا گیا یا نہ لٹکایا گیا ہو وہ شرک نہیں ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (1)''۔ تو جس نے قرآن گلے میں لٹکا لیا تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کا والی بن جائے اور وہ اسے کسی غیر کے حوالے نہیں کرے گا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رغبت رکھی گئی ہے اور قرآن سے شفا طلب کرنے میں اسی پر توکل کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے تعویذ کے متعلق پوچھا گیا: کیا یہ لٹکایا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ بانس کی لکڑی یا کپڑے کے ٹکڑے میں محفوظ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ اس بنا پر ہے کہ لکھا ہوا قرآن ہو۔ اور حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ وہ کوئی حرج نہیں جانتے کہ آدمی کتاب اللہ میں سے کوئی شے گلے میں لٹکائے بشرطیکہ وہ جماع اور بول و براز کے وقت اسے اتار دے۔ ابو جعفر محمد بن علی نے بچوں کو تعویذ پہنانے کے بارے رخصت دی ہے۔ اور ابن سیرین قرآن میں سے کسی شے کے بارے کوئی حرج نہ دیکھتے کہ انسان اسے لٹکائے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قولہ تعالیٰ: **وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** یعنی غموں اور تکلیفوں کو دور کرنے والی ہے، عیوب کو پاک کرنے والی ہے اور گناہوں کو مٹانے والی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب کی فضیلت بھی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لئے اس کے عوض ایک نیکی ہے اور وہ ایک نیکی دس نیکیوں کی مثل ہے میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ حرف ہے بلکہ الف علیحدہ حرف ہے، لام علیحدہ حرف ہے اور میم علیحدہ حرف ہے۔'' ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے (2)۔ اور یہ پہلے گزر چکی ہے۔ **وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا** اور یہ ظالموں کے لئے ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے فقط خسارہ کو ہی بڑھاتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جس نے بھی قرآن کے ساتھ مجالست اختیار کی تو وہ اس سے زیادتی یا کمی (نقصان) کے ساتھ ہی اٹھا، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: **وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** الآیہ اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى** (فصلت: 44) (آپ فرمائیے: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے)۔ اور یہ بھی

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن، جلد 2، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا گیا ہے کہ یہ فرائض واحکام میں باعث شفا ہے، کیونکہ اس میں ان کی وضاحت اور بیان ہے۔

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

''اور جب ہم کوئی انعام فرماتے ہیں انسان پر تو (بجائے شکر کے) وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے اور جب پہنچتی ہے اسے کوئی تکلیف تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن میں قرآن کریم خسارہ اور نقصان بڑھا دیتا ہے ان کا طریقہ اور عمل یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے سے اعراض کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور نَاٰ بِجَانِبِهٖ کا معنی ہے وہ تکبر کرتا ہے اور دور ہوتا ہے۔ اور ناء اسی سے مقلوب ہے اور اس کا معنی ہے: وہ اللہ عزوجل کے حقوق قائم کرنے سے دور رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے: نأی الشئ یعنی شے دور ہوگئی۔ اور نأیته اور نایت عنه دونوں کا معنی بَعُدتُ (میں اس سے دور ہوا) ہے۔ اور أنأیته فانتأ، یعنی میں نے اسے دور کیا اور وہ دور ہو گیا۔ اور تناءَوْا کا معنی تباعدوا (وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے) اور المنتأی بہت دور جگہ۔

النابغہ نے کہا ہے:

فإنّك كالليل الذی هو مُدرِکی وإن خِلتُ أن المنتأی عنك واسعُ

ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت میں ناء باع کی مثل پڑھا ہے، یعنی ہمزہ کو موخر کیا ہے، اور یہ نأی میں قلب کے طریقہ پر ہے، جیسے کہا جاتا ہے: راء و رأی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ النوء سے ماخوذ ہے اس کا معنی اٹھنا اور قیام کرنا ہے۔ اور کبھی واقع ہونے اور بیٹھنے کے لئے بھی نوء کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اور وَنِہی نون کے فتحہ اور ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ بھی یہ پڑھا گیا ہے۔ اور عام قرأت نأی، رأی کے وزن پر ہے۔ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا یعنی جب اسے فقر و افلاس، بیماری یا محتاجی کی شدت کی وجہ سے کوئی تکلیف اور پریشانی لاحق ہو تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر یقین اور اعتماد نہیں رکھتا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص عمل پیرا ہے اپنی فطرت کے مطابق، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے۔''

قول تعالیٰ: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ہر شخص اپنی جہت پر عمل پیرا ہے، اور یہ ضحاک نے بھی کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ہر شخص اپنی طبیعت پر عمل پیرا ہے۔ اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص علیحدہ طور پر عمل پیرا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ہر شخص اپنے دین پر عمل پیرا ہے۔ حسن اور قتادہ نے کہا ہے(1): ہر شخص اپنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 481، مفہوم

نیت پر عمل پیرا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: ہر شخص اپنی فطرت پر عمل پیرا ہے۔ فراء نے کہا ہے: ہر شخص اپنے اس طریقہ اور مذہب پر عمل پیرا ہے جس پر اس کی فطرت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ فرما دیجئے ہر شخص اس پر عمل پیرا ہے جو اس کے نزدیک اس کے اعتقاد کے زیادہ مشابہ اور صواب وصحیح کے زیادہ قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ الشکل سے ماخوذ ہے؛ کہا جاتا ہے: لست علی شکلی ولا شاکلتی (تو میری شکل اور مزاج پر نہیں ہے)۔

شاعر نے کہا ہے:

کل امرئ یشبهه فعله ما یفعل المرء فهو أهله

پس شکل سے مراد مثل، نظیر، اور ضرب (قسم) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ۝ (ص) (اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب)۔ اور الشِکل (شین کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی ہیئت ہے۔ کہا جاتا ہے: جاریة حسنة الشِکل (ایسی لونڈی جو ہیئت اور شکل کے اعتبار سے خوبصورت ہو۔) یہ تمام اقوال باہم متقارب ہیں۔ اور اس کا معنی ہے کہ ہر کوئی اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس پر اس کی وہ اصل اور اخلاق مترتب ہوتے ہیں جن سے وہ مرکب ہے، اور یہ کافر کی مذمت اور مومن کی مدح ہے۔ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت دونوں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی مومن اور کافر اور جو کچھ ان میں سے ہر ایک سے حاصل ہوتا ہے (اس کے بارے تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر گامزن ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی کون زیادہ تیزی سے قبول ہونے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کون دین کے اعتبار سے زیادہ حسین ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کے بارے میں باہم مذاکرہ اور گفتگو کی، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے زیادہ امید افزا اور احسن قول کوئی نہیں دیکھا: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کیونکہ بندے کی فطرت نہیں ہوتی مگر عصیان اور گناہ اور رب کریم کی فطرت نہیں مگر غفران اور بخشش۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا پس میں نے اس میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی امید افزا اور احسن قول نہیں دیکھا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ (غافر) (حا۔ میم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل وکرم فرمانے والا ہے)۔

اس میں گناہوں کی مغفرت کو توبہ کی قبولیت پر مقدم کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ مومنوں کے لئے ہے۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک سارا قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے سارا قرآن اوّل سے لے

کر آخر تک پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ کوئی حسین اور امید افزا آیت نہیں دیکھی: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ (الزمر) (آپ فرمائیے: اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو، بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس قول باری تعالیٰ سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ (الانعام) (وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لئے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔)

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

''یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق، (انہیں) بتائیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا۔''

امام بخاری، امام مسلم اور ترمذی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ایک کھیت میں تھا درآنحالیکہ آپ کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ وہاں سے یہودی گزرے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: تم ان سے روح کے بارے سوال کرو، تو آپ نے فرمایا: کون سی چیز تمہیں اس پر اکسا رہی ہے؟ اور ان میں سے بعض نے کہا: وہ تمہیں کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ نہیں کریں گے جسے تم ناپسند کرتے ہو، تو انہوں نے کہا: پس تم ان سے سوال کرو۔ چنانچہ انہوں نے آپ سے روح کے بارے سوال کر دیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکے رہے اور ان پر کوئی جواب نہ لوٹایا، تو میں جان گیا کہ آپ کی طرف وحی کی جائے گی، پس میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تو جب وحی نازل ہوئی فرمایا: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا یہ الفاظ بخاری کے ہیں (1)۔ اور مسلم میں ہے: پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا۔ اور اس میں: وما أوتوا ہے۔ تحقیق لوگوں نے اس روح کے بارے اختلاف کیا ہے جس کے بارے سوال کیا گیا کہ وہ کون سی روح ہے؟ تو کہا گیا ہے: وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے چھپاتے تھے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ قرآن ہے، اس کا بیان سورۂ شوریٰ کے آخر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں ہر زبان میں ستر ہزار لغات ہیں، وہ ان تمام لغات کے ساتھ اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 686۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ تخلیق فرماتا ہے جو یوم قیامت تک ملائکہ کے ساتھ اڑتا رہے گا (1)، اسے علامہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (2): میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ابوزکریا نے ابواسحاق سے خبر دی ہے کہ ہمیں ابوالحسن طرائفی نے خبر دی ہے کہ ہمیں عثمان بن سعید نے بتایا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن صالح نے معاویہ بن صالح سے انہوں نے علی بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے میں بتایا کہ آپ فرماتے ہیں: روح سے مراد فرشتہ ہے (3)۔ اور یہ اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ بن صالح سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا مجھے ابو ہران (ھا کے کسرہ کے ساتھ) یزید بن سمرہ نے اس سے بیان کیا جس نے اسے حضرت س بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ آپ نے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں ...... الحدیث۔ مذکورہ الفاظ اور معنی میں ہے۔

اور حضرت عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: روح ایک فرشتہ ہے جس کے گیارہ ہزار پر اور ایک ہزار منہ ہیں، وہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہے گا؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور آپ ہی سے روایت ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں اور وہ کھانا بھی کھاتے ہیں؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور خطابی نے کہا ہے، اور بعض نے کہا ہے: یہ (روح) فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اور خلقت کے اعتبار سے ان کی نسبت عظیم صفت سے متصف ہے۔ اور اکثر اہل تاویل کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس روح کے بارے سوال کیا جس کے سبب جسم میں زندگی ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اہل نظر و فکر نے کہا ہے: بے شک انہوں نے آپ سے روح کی کیفیت اور بدن انسانی میں اس کے چلنے کے بارے پوچھا، اور اس کے بارے کہ وہ کیسے بدن کے ساتھ مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے اتصال کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ ایسی شے ہے جسے اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ابوصالح نے کہا ہے کہ روح ایک مخلوق ہے جیسا کہ بنی آدم ہے اور وہ بنی آدم میں سے نہیں ہیں، اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کا ابہام روح کے مخلوق ہونے پر دلیل ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ایک اُمر عظیم اور شان کبیر ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے اور اس کی تفصیل چھوڑ دی ہے، تاکہ انسان بالیقین جان لے کہ وہ اپنے نفس کی حقیقت جاننے سے عاجز ہے اس کے باوجود کہ اسے اس کے وجود کا علم ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات کی معرفت میں اس طرح ہے تو وہ حق کی حقیقت کا ادراک کرنے سے بدرجہ اولیٰ عاجز ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ مخلوق کی معرفت کے ادراک سے عقل کو عاجز قرار دینا اس کا مجاور ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنے خالق کے ادراک سے زیادہ عاجز ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا اس کے بارے اختلاف ہے جسے اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ پس

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482　3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

ایک فرقہ نے کہا ہے: مراد فقط سوال کرنے والے ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: ان سے مراد سارے کے سارے یہودی ہیں (1)۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت وَ مَاۤ اُوْتُوا ہے (2) اور آپ نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد سارا عالم ہے (3)۔ اور یہی صحیح ہے۔ اور اسی کے مطابق جمہور کی قرأت وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ ہے۔ تحقیق یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: کیسے ہمیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تورات عطا کی گئی ہے اور وہ سراپا حکمت ہے، اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ کیا تو وہ مغلوب ہو گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض احادیث میں اپنے اس قول کے ساتھ نص بیان کی: کُلًّا یعنی وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ سے مراد جمیع عالم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ کو کہا: ہم مراد لئے گئے ہیں یا آپ کی قوم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کُلًّا۔ اور اس معنی میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ (لقمان: 27) (اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں۔)

اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح کے متعلق سوال کرنے والے قریش تھے، یہودیوں نے ان کو کہا: تم ان سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے پوچھو، پس اگر یہ تمہیں دو کے بارے خبر دے دیں اور ایک سے رک جائیں تو پھر یہ نبی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے آگاہ کر دیا جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اور روح کے بارے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ یعنی روح وہ امر ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اسے مہدوی وغیرہ مفسرین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو سلب کر لیتے وہ وحی جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پاتے جو آپ کے لئے اس کے متعلق ہماری بارگاہ میں وکالت کرتا۔ سوائے اپنے رب کی رحمت کے (کہ وہ ہمہ وقت آپ کے شامل حال ہے) یقیناً اس کا فضل (وکرم) آپ پر بہت بڑا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ مراد قرآن کریم ہے، یعنی جس طرح ہم اسے نازل کرنے پر قادر ہیں اسی طرح ہم اسے سلب کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں یہاں تک کہ مخلوق اسے بھول جائے اور یہ آیت اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾ یعنی اگر میں چاہوں کہ میں اس قلیل اور تھوڑے علم کو سلب کر لوں تو میں اس پر قادر ہوں۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا پھر آپ کوئی ایسا مددگار نہ پاتے جو اسے آپ پر لوٹا سکتا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لیکن ہم اسے نہیں چاہیں گے (اور یہ) آپ کے رب کی رحمت ہے؛ پس یہ استثناء پہلے سے نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مگر یہ کہ آپ کا رب آپ پر رحم فرمائے اور وہ اسے سلب نہ کرے۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا (یقیناً اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کا فضل و کرم آپ پر بہت بڑا ہے ) جبکہ اس نے آپ کو اولاد آدم کا سردار بنایا ہے، اور آپ کو مقام محمود اور یہ کتاب عزیز عطا فرمائی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اپنے دین میں سے جو چیز تم سب سے پہلے گم کرو گے وہ امانت ہے، اور آخر میں جو چیز تم سے مفقود ہوگی وہ نماز ہے، اور یہ قرآن گویا تم سے چھین لیا جائے گا، تم ایک دن صبح کرو گے اور تمہارے پاس اس سے کوئی شے نہ ہوگی۔ تو ایک آدمی نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! یہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ ہم نے اسے اپنے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں لکھ رکھا ہے، ہم اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں اور ہمارے بیٹے اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیں گے اور یہ یوم قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ تو آپ نے فرمایا: ایک رات میں وہ کوئی ایسی چیز بھیجے گا جس کے ساتھ وہ مصاحف اور دلوں میں جو کچھ ہے وہ سب لے جائے گا، اور لوگ چوپاؤں کی مثل صبح کریں گے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ الآیہ۔ اس کو ابوبکر بن ابی شیبہ نے اس معنی کے ساتھ بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: ہمیں ابوالاحوص نے عبدالعزیز بن رفیع سے انہوں نے شداد بن معقل سے بیان کیا کہ انہوں نے بیان کیا، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک یہ قرآن کریم جو تمہارے درمیان ہے عنقریب تم سے چھین لیا جائے گا، سلب کر لیا جائے گا۔ انہوں ( شداد بن معقل ) نے بیان کیا: میں نے کہا: یہ ہم سے کیسے چھین لیا جائے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں ثابت اور محفوظ کر رکھا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ایک ہی رات میں اس پر کوئی ایسی چیز چلائے گا اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اسے چھین لے گا، سلب کر لے گا، اور جو کچھ مصاحف میں ہے اسے مٹا دے گا اور لوگ اس حال میں صبح کریں گے کہ وہ اس سے خالی اور محروم ہو چکے ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اور یہ اسناد صحیح ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ قرآن کریم ادھر لوٹ جائے گا جہاں سے نازل ہوا، اور اس کی بھنبھناہٹ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تجھے کیا ہوا ہے؟ تو وہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھ سے نکلا تھا اور تیری ہی طرف لوٹ آیا ہوں، میں تلاوت کیا جاتا رہا لیکن میرے مطابق عمل نہ کیا گیا، مجھے پڑھا جاتا رہا اور میرے ساتھ عمل نہ کیا گیا۔

میں ( مفسر ) کہتا ہوں: تحقیق اس معنی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسلام مٹ جائے گا جیسے کپڑے کے نقش و نگار مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ معلوم نہیں ہوگا کہ روزہ کیا ہے اور نہ ہی نماز، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے کوئی علم ہوگا پس ایک ہی رات میں کتاب اللہ پر کوئی چیز چلائی جائے گی تو زمین میں کوئی آیت باقی نہ رہے گی اور لوگوں کے کچھ گروہ باقی رہ جائیں گے، بوڑھے مرد اور عورتیں کہیں گے، ہم نے اپنے آباء واجداد کو اس کلمہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر پایا تھا۔ اور وہ یہ نہیں جانتے تھے نماز کیا ہے اور نہ وہ روزے، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے جانتے تھے''۔

صلہ ( بن زفر عبسی ) نے انہیں کہا! انہیں لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کوئی فائدہ نہیں دے گا! درآنحالیکہ وہ یہ نہیں جانتے ہوں گے

نماز کیا ہے اور روزہ، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے بھی نہیں جانتے ہوں گے، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان سے منہ پھیر لیا، پھر انہوں نے یہی بات تین بار دہرائی، اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہر بار اس سے اعراض کرتے رہے۔ پھر آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے صلہ! یہ انہیں آتش جہنم سے نجات دلا دے گا اور آپ نے یہی جملہ (تنجیهم من النار)(1) تین بار فرمایا۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ آپ اپنے سر مبارک کو درد کی وجہ سے لپیٹے ہوئے تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ''اے لوگو! کیا یہ تحریریں اور کتابیں جو تم لکھ رہے ہو کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سوا کوئی کتاب ہے؟ قریب ہے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی وجہ سے ناراض ہو جائے پس وہ کوئی ورق (کاغذ) نہیں چھوڑے گا اور نہ کوئی دل مگر اس سے سلب کر لے گا''۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو اس وقت مومن مرد اور مومن عورتوں کا حال کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے لئے اس کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اس کے دل میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ باقی رکھے گا۔'' اسے ثعلبی اور غزنوی وغیرہما نے تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

''(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار۔''

یعنی ظہیر کا معنی معاون و مددگار ہے، جس طرح شعراء شعر کے بیت میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور وہ اسے قائم کرتے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کی مثل کہہ دیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا۔ قرآن کے اعجاز کے بارے میں بحث کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ اور لَا يَاْتُوْنَ، لَئِنِ میں موجود قسم کا جواب ہے اور شرط کے ارادہ پر اسے جزم دی جاسکتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

لئن كان ما حُدِّثتِه اليوم صادقا ... أقم في نهار القيظ للشمس بادِيا

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

''اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تاکہ وہ ہدایت پائیں) پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ یعنی ہم نے اس میں ہر مثال کے ساتھ قول کی توجیہ بیان

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، ذهاب القران والعلم، جلد 1، صفحہ 303۔ ایضاً، باب ذهاب القرآن والعلم، حدیث 4038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جس کے ساتھ اعتبار اور نظر وفکر واجب ہوتی ہے، مثلاً آیات، عبرتیں، ترغیب وترہیب، اوامر ونواہی، پہلے لوگوں کے قصص اور واقعات، جنت ودوزخ اور قیامت وغیرہ۔ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا اور ان سے مراد اہل مکہ ہیں، ان کے لئے حق واضح کر دیا اور ان کے لئے (اسے) کھول دیا اور انہیں مہلت دی یہاں تک کہ ان کے لئے ظاہر ہو گیا کہ یہ حق ہے، لیکن انہوں نے حق واضح اور ظاہر ہونے کے وقت سوائے کفر کے (ہر شے کا) انکار کر دیا۔ مہدوی نے کہا ہے: ان کے اس قول میں قدریہ کے لئے کوئی حجت نہیں ہے۔ اَبٰی (اس نے انکار کیا) کا لفظ نہیں بولا جاتا مگر اس کے لئے جو اسے کرنے سے انکار کرے جس پر وہ قادر ہو، کیونکہ کافر اگرچہ ایمان لانے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس سے اعراض کرنے اور اپنے دل پر اس کے مہر لگائے جانے کے سبب قادر نہیں ہے، لیکن وہ وسعت اور مہلت کے وقت میں تو حق کی طلب اور باطل سے اسے ممتاز کرنے پر قادر ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝۹۲ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳

"اور کفار نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کر دیں ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ، یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کے لئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ جاری کر دیں ندیاں جو اس باغ میں (ہر طرف) بہہ رہی ہوں، یا آپ گرا دیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے، ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں، یا (تعمیر) ہو جائے آپ کے لئے ایک گھر سونے کا، یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں، بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں، آپ (ان سب خرافات کے جواب میں اتنا) فرما دیں کہ میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے میں کون ہوں مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۔"

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا یہ آیت رؤساء قریش کے بارے میں نازل ہوئی مثلاً عتبہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان اور نضر بن حارث، ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف اور ابوالبختری، اور ولید بن مغیرہ وغیرہم۔ اور وہ اس طرح کہ جب وہ قرآن کریم کا معارض لانے سے عاجز آ گئے اور وہ اس کے معجزہ ہونے پر بھی راضی نہ ہوئے، تو ابن اسحاق وغیرہ کے بیان کے مطابق وہ کعبہ معظمہ کے پاس غروب آفتاب کے بعد اکٹھے ہوئے، پھر ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلو اور ان سے گفتگو کرو، مباحثہ کرو یہاں تک کہ تمہیں اس بارے میں الزام سے بری کر دیا جائے، پس انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کی قوم کے اشراف آپ کے لئے جمع ہیں تاکہ وہ

آپ کے ساتھ گفتگو کریں لہٰذا آپ ان کے پاس تشریف لایئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے درآنحالیکہ آپ گمان کر رہے تھے کہ جس بارے میں آپ نے ان کے ساتھ گفتگو کی ہے اس بارے میں ان کے لئے کوئی چیز ظاہر ہو گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حریص تھے آپ ان کی رشد و ہدایت کو پسند کرتے تھے اور ان کی سرکشی اور رعونت آپ پر گراں گزرتی تھی، یہاں تک کہ آپ ان کے پاس بیٹھ گئے تو انہوں نے آپ کو کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف پیغام بھیجا ہے تاکہ ہم آپ سے گفتگو کریں، اور بلاشبہ قسم بخدا! ہم پورے عرب میں کسی آدمی کو نہیں جانتے جس نے اپنی قوم میں اس طرح مداخلت کی ہو جیسے آپ نے اپنی قوم میں مداخلت کی ہے، تحقیق آپ نے آباء واجداد کو گالیاں دی ہیں، دین میں عیب اور نقص بیان کیا ہے، الٰہوں کو برا کہا ہے، جوانوں کو بے وقوف اور احمق قرار دیا ہے اور اجتماعیت کو تقسیم کر دیا ہے، نتیجتاً کوئی قبیح امر باقی نہیں مگر وہ ہمارے اور آپ کے درمیان ظاہر ہوا، یا اسی طرح کی کئی باتیں انہوں نے آپ سے کہیں، پس اگر آپ نے یہ بات اس لئے کی ہے کہ آپ اس کے بدلے مال چاہتے ہیں تو ہم آپ کے لئے اپنے اموال اکٹھے کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ ہم سے زیادہ مالدار ہو جائیں گے، اور اگر آپ اس سے شرف و سرداری کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں، اور اگر آپ اس سے بادشاہی اور حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم تسلیم کرتے ہیں، اور اگر یہ آپ سے کسی جن کی اتباع کی وجہ سے ہو رہا ہے جسے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ پر غالب ہے تو ہم کثرت سے اپنے اموال آپ کے علاج کے لئے خرچ کرتے ہیں تاکہ ہم آپ کو اس سے برأت دلا سکیں یا آپ کو معذور قرار دے سکیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں جو تم کہہ رہے ہو جو کچھ میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں وہ اس لئے نہیں لایا کہ تم سے اموال کا مطالبہ کروں اور اس لئے کہ تم میں سردار بن جاؤں اور نہ اس لئے کہ تم پر حاکم بن جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس نے مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہو جاؤں، چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیئے ہیں اور میں نے تمہیں نصیحت کر دی ہے پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو وہی دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے باعث سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (رد کر دو) تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' أو کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو چیزیں ہم نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں اگر آپ ان میں سے کوئی شے بھی قبول نہیں کرتے تو پھر آپ جان لیجئے کہ لوگوں میں سے کوئی نہیں جس کا شہر ہم سے زیادہ تنگ ہو، نہ کوئی ایسا ہے جس کے پاس ہم سے زیادہ پانی کی کمی اور قلت ہو اور نہ کوئی ایسا ہے جو ہم سے زیادہ زندگی کو سخت، تلخ اور تکلیف دہ گزارنے والا ہو، پس آپ اپنے اس رب سے التجا کیجئے جس نے آپ کو اس کے ساتھ بھیجا جس کے ساتھ آپ کو مبعوث فرمایا کہ وہ ہم سے ان پہاڑوں کو دور ہٹا لے جنہوں نے ہم پر ماحول تنگ کر رکھا ہے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے شہر کو کھول دے، وسیع کر دے اور ان میں ہمارے لئے شام کی نہروں کی طرح نہریں جاری کر دے، اور ہمارے وہ آباء جو گزر چکے ہیں انہیں ہمارے لئے زندہ کر دے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے لئے قصی

بن کلاب کو زندہ کر دے، کیونکہ وہ سچے شیخ تھے اور ہم ان سے اس کے بارے پوچھیں گے جو آپ کہتے ہیں: کیا وہ حق ہے یا باطل ہے؟ اور اگر انہوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ نے وہ کیا جو ہم نے آپ سے کہا ہے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور ہم اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں گے، اور یہ کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسے آپ کہتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں اس کے ساتھ تمہاری طرف نہیں بھیجا گیا بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری طرف وہ لایا ہوں جس کے ساتھ اس نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اور میں نے تم تک وہ پیغام پہنچا دیا ہے جس کے ساتھ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں پس اگر تم اسے قبول کر لو تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (یعنی رد کر دو) تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' انہوں نے کہا: اور اگر تم یہ ہمارے لئے نہیں کرتے تو اپنے آپ کو ہی لے لیجئے! اپنے رب سے التجا کیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجے جو آپ کی اس بارے میں تصدیق کرتا ہو جو آپ کہتے ہیں اور ہمیں آپ سے واپس لوٹا دے، اور یہ سوال کیجئے کہ وہ آپ کے لئے باغات، محلات اور سونے، چاندی کے خزانے بنا دے اور وہ ان کے سبب آپ کو اس سے غنی کر دے جو ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ چاہتے ہیں؟ کیونکہ آپ بازاروں میں جاتے ہیں اور اسی طرح معاش، کاروبار تلاش کرتے ہیں جیسے ہم اسے تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم آپ کے رب کی طرف سے آپ کی فضیلت اور آپ کا مرتبہ جان لیں اگر آپ رسول ہیں جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں یہ کرنے والا نہیں اور نہ میں وہ ہوں جو اپنے رب سے یہ سوال کرے اور نہ میں تمہاری طرف اس کے ساتھ بھیجا گیا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے..... أو کما قال ..... پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہاری سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر واپس لوٹا دو تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کے لیے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے''۔ انہوں نے کہا: پس وہ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے جیسا کہ آپ کا گمان ہے کہ آپ کا رب اگر چاہے تو وہ یہ کر سکتا ہے، کیونکہ ہم ہرگز آپ کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے مگر تب کہ آپ ایسا کریں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرنا چاہے تو کر لے۔'' انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کا رب جانتا نہیں کہ ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور ہم آپ سے اس بارے سوال کریں گے جو ہم نے آپ سے سوالات کئے ہیں اور ہم آپ سے وہ مطالبہ کریں گے جو اب ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ پہلے ہی آپ کی طرف توجہ فرماتا اور آپ کو اس کے بارے آگاہ کر دیتا ہے جس کے ساتھ آپ ہمیں لوٹا سکتے ہیں اور وہ آپ کو اس کے بارے خبر دے دیتا جو کچھ وہ اس بارے ہمارے ساتھ کرنے والا ہے جب ہم آپ سے وہ قبول نہ کریں جو آپ ہمارے پاس لائے ہیں؟ بے شک ہمیں تو یہ خبر پہنچی ہے کہ یمامہ کا ایک آدمی آپ کو یہ سکھلاتا ہے اس کو رحمٰن کہا جاتا ہے، اور ہم قسم بخدا! رحمٰن کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، تحقیق ہم آپ کے بارے میں معذور ہیں۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قسم بخدا! ہم آپ کو اور جو کچھ ہماری طرف سے آپ کو پہنچا ہے اسے نہیں چھوڑیں گے یہاں تک کہ ہم آپ کو ہلاک کر دیں

گے یا آپ ہمیں ہلاک کردیں گے۔ اوران میں سے کسی کہنے والے نے کہا: ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور بعض نے کہا: ہم آپ کے ساتھ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے بارے میں کوئی ضامن لے آئیں۔ پس جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہا، تو آپ ان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بھی کھڑا ہو گیا، اور یہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا تھا، اور وہ عاتکہ بنت عبدالمطلب تھیں، تو اس نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی قوم نے آپ پر وہ کچھ پیش کیا جو انہوں نے پیش کیا اور آپ نے اسے ان سے قبول نہ فرمایا، پھر انہوں نے آپ سے اپنے بارے میں چند امور کے بارے سوال کیا تاکہ وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں جیسا کہ تم کہتے ہو اور وہ تمہاری تصدیق کریں اور تمہاری اتباع کریں لیکن تم نے وہ نہیں کیا، پھر انہوں نے تم سے یہ سوال کیا کہ اپنے آپ کے لئے ایسی چیزیں لے لیں جن کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر آپ کی فضیلت اور مرتبہ ظاہر ہو جائے لیکن آپ نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر انہوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ انہیں جس عذاب وغیرہ سے ڈرا رہے ہیں اس میں سے کوئی چیز ان پر فوراً اور جلدی لے آئیں، آپ نے یہ بھی نہیں کیا...... یا جس طرح کی باتیں اس نے آپ سے کیں...... پس قسم بخدا! میں آپ کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ آپ آسمان کی طرف ایک سیڑھی بنائیں، پھر اس میں چڑھیں اور میں دیکھتا رہوں یہاں تک کہ آپ اس (آسمان) تک پہنچ جائیں پھر آپ وہاں سے اپنے ساتھ تحریری عہد نامہ لائیں اس کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو آپ کی شہادت دیں کہ آپ اسی طرح ہیں جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ اور قسم بخدا! اگر آپ ایسا کرلیں تو میں گمان نہیں کرتا کہ میں آپ کی تصدیق کروں گا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منہ پھیر کر چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غمزدہ ہو کر اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ آئے آپ کو اس پر شدید افسوس تھا کہ آپ اسے نہ پا سکے جو آپ اپنی قوم سے اس وقت طمع اور امید رکھتے تھے جس وقت انہوں نے آپ کو بلایا، اور اس وجہ سے کہ آپ نے انہیں اس سے بہت دور ہوتے ہوئے دیکھا؛ یہ تمام الفاظ ابن اسحاق کے ہیں۔

اور واحدی نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا**، ینبوعا کا معنی چشمہ ہے(1)؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ یفعول کے وزن پر ہے، اور نبع ینبع سے ماخوذ ہے۔ اور ائمہ نے **تفجر الانھار** کے مشدد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: پہلا بھی اسی کی مثل ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: پہلا اس کی مثل نہیں ہے، کیونکہ پہلے کے بعد ینبوع ہے اور وہ واحد ہے، اور دوسرے کے بعد الأنھار ہے اور یہ جمع ہے؛ اسی طرح حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ینبوع کا معنی پانی کا چشمہ ہے، اور اس کی جمع ینابیع ہے۔ اور حضرت قتادہ نے او یکون لک جنۃ پڑھا ہے۔ **خِلٰلَهَا** یعنی اس کے درمیان۔ **اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ** یہ قرأت عامہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے او یسقط السماء پڑھا ہے یعنی فعل کی نسبت آسمان کی طرف کی ہے۔ **كِسَفًا** اس کا معنی قطعہ یعنی ٹکڑا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے(2)۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 184
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 273

الکِسَف (سین کے فتحہ کے ساتھ) کِسفة کی جمع ہے، اور حضرت نافع، ابن عامر، اور عاصم کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے کِسفاً (سین کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: جنہوں نے کِسفاً من السماء پڑھا ہے، انہوں نے اسے واحد بنایا ہے، اور جنہوں نے اسے کِسَفًا پڑھا ہے انہوں نے اسے جمع بنایا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے سین کو ساکن قرار دیا ہے اس میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ کِسفة کی جمع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ مصدر ہو، اور کسفت الشئ جب تو کسی شی کو ڈھانپ لے سے ماخوذ ہو، تو گویا انہوں نے یہ کہا: تو ایسا ٹکڑا ہم پر گرا جو ہمیں گھیرنے اور ڈھانپنے والا ہو۔

اور جوہری نے کہا ہے: الکِسفة اس کا معنی ہے کسی شے کا ایک ٹکڑا، کہا جاتا ہے: أعطنی کسفة من ثوبلث (اپنے کپڑے سے ایک ٹکڑا مجھے دے دو) اور اس کی جمع کِسف اور کسف ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الکِسف اور الکِسفة یہ واحد ہیں۔ اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِیْلًا یعنی آپ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو اس طرح سامنے لے آئیں کہ انہیں دیکھا جا سکے؛ یہ حضرت قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے۔ اور حضرت ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ قَبِیْلًا کا معنی کفیل (ضامن) ہے۔

حضرت مقاتل نے کہا: اس کا معنی شہیداً (گواہ، شاہد) ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قبیلة کی جمع ہے، یعنی آپ ملائکہ کی اصناف درآنحالیکہ وہ قبیلہ قبیلہ ہیں انہیں لے آئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ضامن ہیں یعنی وہ ہمیں آپ کے اسے لانے کی ضمانت دیں۔ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ یعنی یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو جائے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور اس کا اصل معنی زینت ہے اور المُزَخرَف کا معنی مزیَّن (جس کو آراستہ کیا جائے) ہے۔ اور زخارف الماء سے مراد اس کے راستے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: میں نہیں جانتا تھا زخرف کیا ہے یہاں تک کہ میں نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں دیکھا بیتٌ مِنَ ذَهَبٍ (3) (سونے کا گھر) یعنی ہم اس فقر کی حالت میں جو ہم دیکھ رہے ہیں آپ کی اتباع اور پیروی نہیں کریں گے۔ اَوْ تَرْقٰى فِی السَّمَآءِ یا آپ آسمان میں چڑھیں؛ کہا جاتا ہے: رَقِیتُ فی السُّلَم اَرْقَیٰ رَقْیًا وَ رُقِیًا جب تو سیڑھی پر چڑھے۔ اور ارتقیت بھی اسی کی مثل ہے۔ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ یعنی آپ کے چڑھنے کی وجہ سے ہم ایمان نہیں لائیں گے، اور یہ مصدر ہے، جیسے مضی یمضی مُضِیا، اور ھوی یھوی ھُوِیًا ہیں اسی طرح رقی یرقی رُقِیًا ہے۔ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ یعنی یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم میں سے ہر آدمی کی طرف ایک کتاب (تحریر) اتار لائیں جسے ہم پڑھ سکتے ہوں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ یُرِیْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں۔)

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ اہل مکہ اور شام نے قال سبحان ربی پڑھا ہے یعنی قال کا فاعل حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی کہ وہ کسی شے سے عاجز ہو اور اس سے کہ اس پر کوئی کام پیش کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سارے کا سارا کلام ان کے کفر اور ان کی خواہشات میں افراط کے سبب اظہار تعجب کے لئے ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ امر کی بنا پر قُلْ پڑھا ہے: یعنی آپ انہیں فرما دیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم۔ هَلْ كُنْتُ یعنی میں نہیں ہوں اِلَّا

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 186، بمفہوم 2۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 187 3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 188

بَشَرًا رَّسُوْلًا مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۔ میں اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں میں سے جو انسان کی قدرت میں نہیں ہیں جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، کیا تم نے انسانوں میں سے کسی کے بارے سنا ہے کہ وہ یہ نشانیاں اور آیات لایا ہو؟ اور بعض ملحدوں نے کہا ہے: یہ ایسا جواب نہیں ہے جس پر قناعت کی جائے، اور انہوں نے غلط کہا ہے، کیونکہ آپ نے انہیں جواب یہ دیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ میں ایک آدمی ہوں میں ان میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا جو تم نے مجھ سے مطالبات کئے ہیں، اور نہ میرے لئے یہ ہے کہ میں اپنے رب پر انہیں ڈال دوں (یعنی ان کا اپنے رب سے مطالبہ کروں)، کیونکہ مجھ سے پہلے انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی امتوں کے پاس ان تمام میں سے کوئی شے نہیں لائے جو مطالبات اور خواہشات وہ لوگ رکھتے تھے اور میرا طریقہ بھی انہیں کا طریقہ ہے، اور وہ انہیں آیات وعلامات پر اقتصار کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان علامات میں سے عطا فرمائیں جو ان کی نبوت کی صحت پر دلیل تھیں، پس جب وہ (انبیاء علیہم السلام) ان پر حجت قائم کر دیں تو پھر ان کی قوم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان کے سوا اور کی خواہش اور مطالبہ کریں، اور اگر اللہ تعالیٰ پر واجب ہو کہ وہ انہیں ان تمام علامات کے ساتھ بھیجے جن کی وہ خواہش اور مطالبہ کرتے ہیں تو پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ رسولوں میں سے وہ بھیجے جنہیں وہ اختیار اور پسند کریں گے، اور ہر آدمی کے لئے یہ کہنا لازم ہو جائے گا کہ میں ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ اس کے خلاف نشانی لائی جائے جس کا مطالبہ میرے سوا دوسرے نے کیا ہے۔ اور یہ اس طرف لوٹ جائے گا کہ تدبیر لوگوں کے پاس ہے، (حالانکہ) بلاشبہ تدبیر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤی اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۴

”اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب آئی ان کے پاس ہدایت مگر اس چیز نے کہ انہوں نے کہا کہ کیا بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو رسول بنا کر؟ (ایسا نہیں ہوسکتا)۔“

قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤی یعنی جب اللہ تعالیٰ کے پاس سے اس کی طرف بلانے کے لئے رسل علیہم السلام اور کتابیں آگئیں (تو لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا) اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے اپنی جہالت کے سبب کہا۔ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا رسول انسانوں میں سے ہو، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی فرط عناد اور سرکشی کو بیان کیا کیونکہ انہوں نے کہا: آپ ہماری مثل ہیں پس آپ کی اطاعت اور پیروی ہم پر لازم نہیں، اور وہ معجزہ سے غافل ہو گئے، پس پہلا اَنْ حرف جر کے ساتھ ساقط ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور دوسرا اَنْ منع کی وجہ سے محل رفع میں ہے (تقدیر کلام اس طرح ہے) وما منع الناس من اَنْ یؤمنوا اِذ جآء ھم الھدی اِلا قولھم اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝۹۵

''فرمایئے: اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر''۔

الله تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ فرشتے کو فرشتوں کی طرف بھیجا جا سکتا ہے، کیونکہ اگر وہ آدمیوں کی طرف فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا تو وہ اسے اس ہیئت پر دیکھنے کی قدرت نہ رکھتے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے، اور بلاشبہ اس نے انبیاء علیہم السلام کو اس پر قدرت دے رکھی ہے اور ان میں وہ چیز پیدا فرما رکھی ہے جس کے ساتھ وہ قدرت رکھتے ہیں، تاکہ یہ ان کے لئے نشانی اور معجزہ ہو جائے۔ اور اس آیت کی نظیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے، اور وہ الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۞ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (الانعام) (اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہو گیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں اور اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتے کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں)) اس کے بارے پہلے بحث گزر چکی ہے۔

## قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ۞

''فرمایئے: کافی ہے الله تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان، بے شک وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جاننے والا ہے اور ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

روایت ہے کہ کفار قریش نے جس وقت یہ قول سنا: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تو انہوں نے کہا: پس کون آپ کی شہادت دے گا کہ آپ الله تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا۔

## وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ۞

''اور جسے الله تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو آپ نہیں پائیں گے ان (گمراہوں) کے لئے کوئی مددگار اس کے سوا اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو بڑھا دیں گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ یعنی اگر الله تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تو وہ یقیناً ہدایت یافتہ ہو جائیں۔ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ یعنی (جنہیں الله تعالیٰ گمراہ کر دے) انہیں کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے ..... کہ اس سے مراد انہیں تیزی اور

جلدی کے ساتھ جہنم کی طرف لے جانا ہے، جیسا کہ عربوں کا قول ہے: قدِم القوم علی وُجُوهِهِمْ (یہ تب بولتے ہیں) جب وہ تیزی سے چل کر آئیں۔ اور دوسرا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں قیامت کے دن چہروں کے بل جہنم کی طرف گھسیٹا جائے گا جیسا کہ دنیا میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے جس کو انتہائی زیادہ ذلیل ورسوا کرنا اور عذاب دینا مقصود ہو۔ اور یہی معنی صحیح ہے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، وہ لوگ جنہیں منہ کے بل اٹھایا جائے گا، کیا کافر کو اس کے منہ کے بل اٹھایا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہ ذات جس نے اسے دو پاؤں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ قیامت کے دن اسے منہ کے بل چلا دے۔'' جس وقت یہ خبر حضرت قتادہ تک پہنچی تو انہوں نے کہا: کیوں نہیں ہمیں اپنے رب کی عزت کی قسم! (وہ اس پر قادر ہے)۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے(1) اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(2): یعنی وہ اندھے ہوں گے اس چیز سے جو انہیں خوش کرسکتی ہے، کوئی حجت اور دلیل بیان کرنے سے گونگے ہوں گے، اور اس شے سے بہرے ہوں گے جو انہیں نفع دے سکتی ہے؛ اس قول کی بناء پر ان کے حواس اپنی اس حالت پر باقی رہیں گے جس پر وہ پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہیں اسی صفت اور کیفیت پر اٹھایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے(3)، تا کہ اس سے ان کے عذاب میں اضافہ ہو، پھر ان کے لئے وہ جہنم میں پیدا کردیئے جائیں گے، پس وہ دیکھنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔) اور گفتگو بھی کرنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ (الفرقان) (تو پکاریں گے وہاں موت کو۔) اور سننے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ (الفرقان) (تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا)۔ اور مقاتل بن سلیمان نے کہا ہے: جب ان کو کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ)۔ تو وہ اندھے ہوجائیں گے دیکھ نہیں سکیں گے، بہرے ہوجائیں گے کچھ سنیں گے نہیں (4)، گونگے ہوجائیں گے کچھ سمجھ نہیں سکیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اندھے ہوجائیں گے جس وقت وہ جہنم میں داخل ہوں گے اس کی سیاہی کی شدت کی وجہ سے، اور ان کا بولنا ختم ہوجائے گا جس وقت انہیں کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) اور زفیر اور شہیق ان کے سننے کی قوت ختم کردے گی اور پھر وہ کوئی شے نہ سن سکیں گے۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام جہنم ہے۔ كُلَّمَا خَبَتْ جب بھی آگ ساکن (سرد) ہونے لگے گی (5)؛ یہ حضرت ضحاک وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آگ بجھنے لگے گی۔ کہا جاتا ہے: خبت النار تخبو خبواً أی طفئت (آگ بجھ گئی)، واخبیتها أنا (اور میں نے اسے بجھا دیا) زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 701
2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 193
3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 531
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 275
5۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 195

بڑھا دیں گے) یعنی وہ آگ شعلے مارنے لگے گی۔ اور اس کے شعلوں کا ساکن ہونا، کم ہونا ان کی اذیت اور درد میں کمی کے بغیر ہوگا اور اس سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آگ سرد ہونے کے قریب ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ (النحل: 98) (اور جب تو قرآن کریم پڑھنے کا ارادہ کرے)، (تو اسی طرح جب وہ آگ سرد ہونے کا ارادہ کرے گی تو اسے اور بڑھا دیا جائے گا)۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝

"یہ سزا ہے ان کی کیونکہ انہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے از سر نو پیدا کر کے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ پیدا فرما دے ان کی مثل اور اس نے مقرر فرما دی ہے ان کے لئے ایک میعاد جس میں ذرا شک نہیں، پس انکار کر دیا ظالموں نے (اللہ کی قدرت کا) سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔"

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا یعنی وہ عذاب ان کے کفر کی جزا ہے۔ وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا (کیا جب ہم ہڈیاں اور) مٹی ہو جائیں گے۔ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا پس انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے (زندہ کئے جانے) کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا اور فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، ای أولم یروا أنّ اللہ الذی خلق السموات والأرض، و جعل لهم أجلا لا ریب فیه قادر علی أن یخلق مثلهم (کیا انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور اس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر فرما دی ہے جس میں ذرا شک نہیں وہ ان کی مثل پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔) اور الأجل سے مراد دنیا میں ان کے قیام کی مدت اور پھر ان کی موت ہے، اور یہ وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا یعنی مشرکوں نے انکار کر دیا (اللہ تعالیٰ کی قدرت کا) سوائے اس مدت اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنے کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ مقررہ مدت وہی اٹھائے جانے کا وقت ہے، اور اس میں شک نہیں کیا جانا چاہئے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَ كَانَ

الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾

''فرمایئے: اگر تم مالک ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے تو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں، واقعی انسان بڑا تنگدل ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ یعنی اگر تم رزق کے خزانوں کے مالک ہوتے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر تم نعمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے، اور یہ اعم ہے۔ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ تو تم بخل کے سبب ضرور ہاتھ روک لیتے، اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ (الاسراء) یہاں تک کہ ہم معیشت میں خوشحال اور وسیع ہو جائیں، یعنی اگر تم خوشحال ہو بھی جاؤ تب بھی ضرور بخل کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر مخلوق میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک بن جائے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سخاوت کرنے کی طرح ان کے ساتھ سخاوت نہ کرے؛ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے...... کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے اپنے خرچ اور اپنی منفعت کے حصول کے لیے ہاتھ روک لے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ اسے فقر و افلاس کا خوف ہو اور ختم ہونے کا ڈر لاحق ہو جائے (لہٰذا وہ ہاتھ روک لے)۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں ان دونوں حالتوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اور اس آیت میں انفاق بمعنی فقر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(1)۔ اور اہل لغت نے انفق، أصرم، أعدم اور اقتر سبھی کو مال کم ہونے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ اور واقعی انسان بخیل اور تنگ دل ہے۔ کہا جاتا ہے: قَتَرعلی عیالہ یَقْتَرُ و یَقْتُرُ قَتْرًا و قُتُوْرًا جب آدمی اہل وعیال پر نفقہ (خرچہ) تنگ کردے (تو مذکورہ جملہ کہا جاتا ہے)، اور اسی طرح التقتیر اور الاقتار ہیں، اور یہ تینوں لغات ہیں۔ اور اس آیت کے بارے میں دو مختلف قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صرف مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے ...... کہ یہ عام ہے، اور یہ جمہور کا قول ہے؛ اور اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

''اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو نو روشن نشانیاں آپ خود پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب موسیٰ آئے تھے ان کے پاس، پس فرعون نے آپ کو کہا: اے موسیٰ! میں تمہارے متعلق خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ان آیات میں اختلاف ہے، پس یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتاب کی آیات کے معنی میں ہیں، جیسا کہ ترمذی اور نسائی نے صفوان بن عسال مرادی سے روایت کیا ہے کہ دو یہودی تھے ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ہمارے ساتھ چلو اس نبی کے پاس ہم اس سے کچھ سوال کرتے ہیں، تو اس نے کہا: تو اسے نبی نہ کہہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 196 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 276

کیونکہ اگر اس نے ہمیں سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ بہت زیادہ خوش ہو جائے گا)، پس وہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ زنا کرو، حق کے سوا کسی ایسے نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، اور کسی بری الذمہ آدمی کو حاکم کی طرف لے کر نہ چلو کہ وہ اسے قتل کر دے، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن عورت پر تہمت اور بہتان نہ لگاؤ اور میدان جہاد میں لشکر سے نہ بھاگو...... شعبہ کو شک ہے...... اے گروہ یہود! تم پر خاص طور پر یہ لازم ہے کہ ہفتہ کے دن حد سے تجاوز نہ کرو۔'' پس ان دونوں نے آپ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسے دیئے اور کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔ فرمایا: ''کون سی چیز تم دونوں کو روک رہی ہے کہ تم اسلام لے آؤ۔'' ان دونوں نے کہا: بے شک حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں مسلسل نبی رہے اور بلاشبہ ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اسلام لے آئے تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیات سے مراد معجزات اور دلائل ہیں۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا ہے: نو نشانیاں یہ ہیں عصا مبارک، حضرت موسیٰ علیہ السلام، لسان، سمندر، طوفان، مکڑی، قمل (جوئیں) مینڈک اور خون؛ یہ مفصل علامات اور نشانیاں ہیں (2)۔ حسن اور شعبی نے کہا ہے: پانچ سورۃ الاعراف میں مذکور ہیں، یعنی طوفان اور جو اس پر معطوف ہے، ید بیضاء، عصا، قحط سالی اور پھلوں میں نقصان اور کمی۔ اور اسی طرح حسن سے مروی ہے، مگر یہ قحط سالی اور پھلوں میں کمی کو ایک بناتے ہیں (3)، اور نویں علامت عصا مبارک کا پھینکی جانے والی رسیوں کو (جھوٹ کے سانپ) جلدی سے نگل جانے کو قرار دیتے ہیں، اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، مگر یہ کہ انہوں نے قحط سالی اور پھلوں میں نقصان کی جگہ سمندر اور پہاڑ کو رکھا ہے۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے: یہ وہی پانچ ہیں جو سورۃ الاعراف میں ہیں اور سمندر، عصا، پتھر، اور ان کے مالوں کو مٹا دینا۔ ان آیات کی مکمل شرح پہلے گزر چکی ہے والحمد للہ۔

فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان سے پوچھئے جب موسیٰ علیہ السلام ان نشانیوں اور علامات کے ساتھ ان کے پاس آئے، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اور یہ سوال برائے استفہام ہے تاکہ یہودی اس کی صحت کو جان لیں جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا یعنی آپ تو اپنے افعال کی ندرت اور غرابت کے ساتھ جادو کرنے والے ہیں، یہ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا ہے۔ پس اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے، جیسے تو کہتا ہے: ھذا مشئوم و میمون، ای شائم ویامِن (یہ نحوست ڈالنے والا، اور یہ مبارک بنانے والا ہے)، (یعنی اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مخدوعا (جس کو دھوکہ دیا گیا ہو۔) اور

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب فی قبلۃ الید والرجل، حدیث 2657، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 197		3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 277

یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی مغلوباً ہے (جس پر غلبہ پالیا گیا ہو)؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابونہیک سے روایت ہے کہ ان دونوں نے اسے: فَسَالَ بَنِی اسرائیل خبر کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے اور ان کا راستہ چھوڑ دے اور وہ انہیں آپ کے ساتھ بھیج دے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

"کلیم نے جواباً فرمایا: (اے فرعون!) تو خوب جانتا ہے کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے یہ بصیرت افروز ہیں۔ اور اے فرعون! میں تیرے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ یعنی اے فرعون! تو ان نو نشانیوں کو خوب جانتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہی نازل کیا ہے۔ اس میں انزل بمعنی أوجد (ایجاد کرنا) ہے۔ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ یعنی یہ ایسی دلالات ہیں جن سے اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اور قرأت عامہ عَلِمْتَ تا کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ خطاب فرعون کو ہے۔ اور کسائی نے تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور فرمایا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کے دشمن نے نہیں جانا لیکن موسیٰ علیہ السلام وہ ہیں جنہیں اس کا علم ہوا، پس یہ خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ لَقَدْ عَلِمْتَ ہے، اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (النمل: 14) (1) (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا۔) اور فرعون کی نسبت عناد اور سرکشی کی طرف کی۔ اور ابوعبید نے کہا ہے: اس سے جو معنی لیا گیا ہے ہمارے نزدیک اس میں تا کا فتحہ ہے، اور وہی اصح ہے اس معنی کی وجہ سے جس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استدلال کیا ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے قول علمت انا کے ساتھ استدلال نہیں کرتے، اور آپ تو دعوت دینے والے رسول ہیں، اس تمام کے باوجود اگر یہ قرأت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہوتی تو یقیناً حجت ہوتی، لیکن یہ آپ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ تو کلثوم مرادی سے مروی ہے اور وہ مجہول ہے اس کی کوئی پہچان نہیں ہے، اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے کسائی کے بغیر اس طرح پڑھا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان معجزات کے بارے جاننے کی نسبت فرعون کی طرف کی ہے) کیونکہ فرعون اس مقدار کو جانتا تھا جس کا کرنا جادوگروں کے لئے ممکن تھا، اور اس کی مثل جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا کسی جادوگر کے لئے ممکن نہیں، اور یہ کہ کوئی اس کے کرنے پر قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جو اجسام بناتا ہے اور آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایک سرد اور ٹھنڈے دن میں داخل ہوئے اور وہ اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھا، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201

اپنا عصا مبارک ڈال دیا تو وہ اژدھا بن گیا، پس فرعون نے گھر کی دونوں اطراف کو اس کے جبڑوں کے درمیان دیکھا، تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اپنی چادر میں داخل ہو گیا۔ [الفُقم ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی جبڑا ہے، اور حدیث میں ہے من حفظ ما بين فقميه (1) (یعنی جس نے اس کی حفاظت کی جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (مراد زبان ہے)] وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۝ یہاں ظن بمعنی تحقیق ہے۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت اور خسران (نقصان اٹھانا) بھی ہے۔

کمیت نے کہا ہے:

ورأتْ قُضاعة فى الأيا مِن رأیٰ مثبورٍ و ثابر

ای مخسور و خاسر (یعنی جس کو خسارہ دیا گیا اور نقصان اٹھانے والا) یعنی یمن کی طرف اپنی نسبت کرنے میں (خسارے میں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ملعون (جس پر لعنت کی گئی ہو) ہے۔ اسے منہال نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اَبان بن تغلب نے کہا ہے۔

اور یہ شعر بھی کہا ہے:

يا قومنا لا تَرُوموا حَرْبَنَا سَفَهًا اِنَّ السَّفاه وإن البَغْيَ مثبورُ

اس میں مثبور بمعنی ملعون ہے۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: کہ مَثْبُوْرًا سے مراد ناقص العقل ہے۔ اور مامون نے ایک آدمی کو دیکھا اور اس کو کہا: اے مثبور! تو اس سے اس بارے پوچھا گیا، اس نے جواب دیا: رشید نے کہا ہے کہ منصور نے ایک آدمی کو کہا: مثبور، تو میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو اس نے کہا: مجھے میمون بن مہران نے بیان کیا ہے۔۔۔ اور اس نے اس کا ذکر کیا۔ اور حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اس کا معنی ''ہلاک کیا گیا'' ہے (3)۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت ہے، کہا جاتا ہے: ثبر الله العدو ثبورًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس کو خیر سے روک دیا جائے۔ اہل لغت نے بیان کیا ہے: ما ثبرك عن كذا یعنی تجھے اس سے کس نے منع کیا ہے۔ اور ثبره الله ثبره [ويُثبِرہ یہ دونوں لغتیں ہیں]۔

ابن الزبعری نے کہا ہے:

اذ أجارِی الشيطان فی سَنَن الغَیِّ و من مال مَيْلَه مثبور (4)

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا بمعنی مسحوراً (جس پر جادو کر دیا گیا ہو) ہے۔ اختلاف الفاظ کے ساتھ اس کی مثل جو کسی نے کہا یہ اس کا جواب ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا اس کا معنی مخبول ہے (5) جس کی کوئی عقل نہ ہو۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا۝ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا۝

---

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 399، حدیث 8063	2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 202	3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201	5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 489

''پس اس نے ارادہ کر لیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھاڑ کر پھینک دے، سو ہم نے غرق کر دیا اسے اور اس کے سارے ساتھیوں کو، اور ہم نے حکم دیا فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سر زمین میں پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ تو ہم لے آئیں گے تمہیں سمیٹ کر''۔

قولہ تعالیٰ: فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی فرعون نے ارادہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو مصر کی زمین سے نکال دے یا قتل کر کے یا وہاں سے دور نکال کر، تو الله تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا۔ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور ہم نے حکم دیا اسے غرق کرنے کے بعد۔ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ بنی اسرائیل کو کہ تم شام اور مصر کی زمین میں آباد ہو جاؤ۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب قیامت کا وعدہ آئے گا۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا تو ہم تمہیں تمہاری قبروں سے لے آئیں گے اس حال میں کہ ہر جگہ سے اکٹھے ہو گے، تحقیق مومن کافر کے ساتھ مل جائے گا اور ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے قبیلہ اور اپنے محلہ کی طرف مائل نہ ہو گا۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): ہم مختلف جہتوں سے تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ دونوں معنی ایک ہی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: اللفیف سے مراد لوگوں کا متفرق قبائل سے اکٹھا اور جمع ہونا ہے؛ کہا جاتا ہے: جاء القوم بلفّهم و لفیفهم، یعنی قوم مل جل کر آئی۔ اور قول باری تعالیٰ: جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا یعنی ہم تمہیں اکٹھا کر کے اور ملا جلا کر لے آئیں گے۔ اور طعام لفیف جب کھانا دو یا زیادہ جنسوں سے ملا جلا اور مخلوط ہو۔ اور فلان لفیف فلان یعنی فلاں فلاں کا دوست ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: اللفیف جمع ہے اور اس کی واحد نہیں ہے، اور یہ جمیع کی مثل ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ انہیں قبروں سے اٹھاتے وقت منتشر مکڑیوں کی طرح نکالا جائے گا، درآنحالیکہ وہ اس طرح ملے جلے ہوں گے کہ ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کا وقت آ جائے گا۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝

''اور حق کے ساتھ ہی ہم نے اسے اتارا ہے اور حق کے ساتھ ہی وہ اترا ہے، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر (رحمت الٰہی کا) مژدہ سنانے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا''

قولہ تعالیٰ: وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ یہ آیت سابقہ معجزات اور قرآن کے ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ اور ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ میں تکرار کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے پہلے کا معنی ہو، ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارنے کو واجب کیا ہے۔ اور دوسرے کا معنی ہو: اور یہ نازل ہوا اور اس میں حق ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: خرج بثیابه (فلاں اپنے کپڑوں کے ساتھ نکلا) یعنی و علیه ثیابه (اور اس پر اس کے کپڑے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے وَ بِالْحَقِّ میں با بمعنی مع ہے یعنی حق کے ساتھ، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: رکب الامیر بسیفه ای مع سیفه (حاکم اپنی تلوار سمیت سوار ہوا) وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ای بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا، جیسا کہ تو کہتا ہے: نزلت بزید (میں زید کے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 278

پاس اترا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو و بالحق قدرنا أن ینزل (حق کے ساتھ ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ نازل ہو)، اور اسی طرح نزل بھی ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿١٠٦﴾

''اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ سیبویہ کا مذہب ہے کہ قُرْاٰنًا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر ظاہر فعل کر رہا ہے۔ اور جمہور لوگوں نے فَرَقْنٰهُ را کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے ہم نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے، اور ہم نے اس میں حق اور باطل کے درمیان فرق کیا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے اسے مفصل بیان کیا ہے(1)۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت قتادہ، ابو رجاء، اور شعبی رضی اللہ عنہم نے فَرَّقْنٰهُ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے(2)، یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا نہ کہ یکبارگی، مگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں فرقناہ علیك ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم کتنی مدت میں نازل ہوا، پس کہا گیا ہے کہ پچیس برس میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیئس برس میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بیس برس میں نازل ہوا۔ اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اختلاف کی وجہ سے ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ آسمان دنیا کی جانب سارا ایک ہی بار نازل ہوا۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

عَلٰى مُكْثٍ یعنی طویل مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ قرآن ترتیب وار نازل ہوتا رہا یعنی ہم نے اسے ایک ایک آیت کر کے اور ایک ایک سورت کر کے نازل کیا۔ اور رہا پہلا قول تو اس کے مطابق عَلٰى مُكْثٍ کا معنی ہوگا تلاوت اور ترتیل میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں؛ یہ حضرت مجاہد، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ پس قاری کو چاہئے کہ وہ قرأت میں اس کا حق ادا کرے اس طرح کہ وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور حسن آواز کے ساتھ بغیر تلحین اور ایسی سر اور ترنم کے جو زیادتی یا کمی کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو تبدیل کر دے کیونکہ یہ حرام ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے، جہاں تک ممکن ہو وہ اسے حسین اور عمدہ بنائے۔ اور قراء نے ابن محیصن کے بغیر مُكث میں میم کے ضمہ پر اجماع کیا ہے اور ابن محیصن نے میم پر فتحہ پڑھا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مَكْث و مُكث اور مِكث؛ یہ تینوں لغات ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عَلٰى مُكْثٍ یعنی خوب تثبت اور ٹھہراؤ کے ساتھ۔ قولہ تعالیٰ: وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا یہ مصدر کے ساتھ سابقہ معنی میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرتا ہے، یعنی ہم نے اسے یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، اگر وہ تمام فرائض کو ایک ہی وقت میں لے لیتے تو وہ یقیناً متنفر ہو جاتے اور بھاگ جاتے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 205 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 490

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

''آپ (کفار کو) کہیے: خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ، بے شک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے جب اسے پڑھا جاتا ہے ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا یعنی قرآن کریم کے ساتھ تم ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لئے بطور تبکیت اور تہدید ہے نہ کہ بطور تخییر ہے (یعنی یہ انہیں ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار نہیں دیا جا رہا بلکہ انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔) اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ بے شک وہ لوگ جنہیں قرآن کریم کے نازل ہونے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے علم دیا گیا ہے، اور وہ اہل کتاب ایمان لانے والے ہیں؛ یہ ابن جریج وغیرہ کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ کا معنی ہے جب ان کی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب قرآن کریم ان پر پڑھا جاتا ہے۔ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا اور کہا گیا ہے: یہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ایک قوم ہے انہوں نے دین کو مضبوطی سے تھامے رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ان میں سے زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل ہیں۔ اور اس معنی کی بنا پر مراد وہ نہیں جنہیں کتاب دی گئی بلکہ مراد وہ ہیں جنہیں علم دین عطا کیا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جنہیں علم عطا فرمایا گیا وہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ یہود کے کچھ لوگ تھے (1)، اور قول باری تعالیٰ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے یہی ظاہر ہے۔ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ جب وہ اسے سنتے جو قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے اور کہتے: سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ اپنی کتاب اور اس قرآن کی تلاوت کرتے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے تو وہ خشوع کرتے، سجدے کرتے اور تسبیح بیان کرتے، اور کہتے: یہ وہی ہے جو تورات میں مذکور ہے، اور یہی اس کی صفت اور انداز ہے، اور لامحالہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ واقع اور پورا ہونے والا ہے، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں (2)، اور قَبْلِهٖۤ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے جیسا کہ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ میں ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ضمیریں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہیں، اور نئے سرے سے قرآن کریم کا ذکر اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ (3)

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

''اور کہتے ہیں: (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے ہمارا رب، بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔''

یہ سجود میں تسبیح کے جواز پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 280 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 491

رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے یہ کہتے تھے: سبحانك اللّٰهم [ ربنا ] و بحمدك اللّٰهم اغفرلی (1) (تیری ذات پاک ہے اے اللہ [اے ہمارے رب] اور حمد تیرے ہی لئے ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما۔)

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

''اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ وزاری کرتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے (خضوع و) خشوع کو بڑھا دیتا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ یہ ان کی صفت کے بیان میں مبالغہ اور ان کی مدح ہے۔ اور ہر وہ آدمی جس کی پہچان علم کے ساتھ ہے اور اس نے اس سے کچھ حاصل کیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس مرتبہ پر فائز ہو، اور وہ قرآن کریم کے سماع کے وقت خشوع، تواضع اور عاجزی کا اظہار کرے۔ اور مسند دارمی ابو محمد میں تیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جسے علم عطا کیا گیا جس نے اسے نہ رلایا تو زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ اسے علم عطا نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی صفت یہ بیان فرمائی ہے، پھر یہی آیت تلاوت کی۔ اسے علامہ طبری نے بھی ذکر کیا ہے (2)۔ اور الاذقان، ذقن کی جمع ہے، اور یہ دو جبڑوں کو مجتمع ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: الاذقان یہ ڈاڑھی سے عبارت ہے (3)، یعنی وہ اسے سجدہ کی حالت میں زمین پر رکھ دیتے ہیں، اور یہ حد درجہ تواضع ہے۔ اور اس میں لام بمعنی علی ہے؛ آپ کہتے ہیں: سقط لِفیه ای علی فیه (وہ منہ کے بل گرا)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا یعنی وہ مونہوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں (4) اور اذقان (ٹھوڑیوں) کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ٹھوڑی انسان کے منہ سے قریب ترشے ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ٹھوڑی پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں ذقن سے مراد الوجه (چہرہ) ہے، اور کبھی ایک شے کو اپنے مجاور (پڑوس والی شے) سے اور کل کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: خرّ لوجهه ساجدا (وہ اپنے چہرے کے بل سجدے میں گر گیا) اگرچہ اس نے اپنے رخساروں اور اپنی آنکھوں پر سجدہ نہیں کیا۔ کیا تو اس قول کی طرف نہیں دیکھتا۔)

فخرّ صَرِيعا لليدين و لِلفَم

تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے منہ اور ہاتھوں کے بل گر پڑا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: يَبْكُوْنَ حالت نماز میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے جائز ہونے پر دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی معصیت پر رونے کے جواز پر دلیل ہے، اور یہ کہ یہ نہ نماز کو توڑتا ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابن مبارک نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ثابت بنانی سے انہوں نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، مایقول فی الرکوع والسجود، جلد 1، صفحہ 192
2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 209
3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 208
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 208-207

پڑھ رہے تھے اور رونے کے سبب آپ کے پیٹ میں اس طرح کھولنے کی آواز آ رہی تھی جیسے ہانڈی کے کھولنے کی آواز آتی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں ہے: رونے کے سبب آپ کے سینے میں اس طرح کی آواز تھی جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ کراہنے کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کراہنا مریض کی نماز کو نہیں توڑتا، اور آپ نے صحت مند آدمی کے لئے کراہنا مکروہ قرار دیا ہے؛ اور یہی ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن الحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: کھانسنا، کراہنا اور پھونک مارنا نماز کو نہیں توڑتا۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسے توڑ دیتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس کے حروف ہوں جو سنے اور سمجھے جا سکتے ہوں تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اگر اس کا کراہنا اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہو تو نماز نہیں ٹوٹے گی، اور اگر درد کی وجہ سے ہو تو نماز کو توڑ دیتا ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی نماز ان تمام صورتوں میں مکمل ہے؛ کیونکہ کوئی مریض اور ضعیف آدمی کراہنے سے خالی نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قولہ تعالیٰ: وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا خشوع کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور مزید آگے آئے گی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝110

"آپ فرمائیے: یا اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام (ہی) اچھے ہیں اور نہ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اسے اور تلاش کرو ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ۔"

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ یا رحمٰن پکارتے ہوئے سنا تو کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تو ایک الٰہ کو پکارنے کا حکم دیتے ہیں اور خود دو کو پکارتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور مکحول نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات تہجد کی نماز پڑھی اور اپنی دعا میں یہ کہا: یا رحمٰن یا رحیم (2) اور مشرکین میں سے ایک آدمی نے اسے سن لیا۔ اور یمامہ کا ایک آدمی تھا جس کا نام رحمٰن تھا، تو اس سننے والے نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یمامہ کے رحمٰن کو پکار رہے ہیں؟ پس یہ آیت یہ بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی کہ یہ دونوں اسم ایک مسمی کے ہیں، پس اگر تم نے اسے یا اللہ کے ساتھ پکارا تو وہ بھی ذات ہے اور اگر تم نے اسے یا رحمٰن کے ساتھ پکارا تو بھی وہی ذات مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تحریر کے شروع میں لکھتے تھے: باسمك اللھم؛ پھر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (النمل) تب رسول اللہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، البکاء فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 130۔ ایضاً، باب البکاء فی الصلوٰۃ، حدیث 769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

ﷺ نے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا تو مشرکوں نے کہا: اس رحیم کو تو ہم پہچانتے ہیں تو یہ رحمن کون ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا: کیا ہے ہمیں کہ ہم قرآن کریم میں ایک اسم نہیں سنتے حالانکہ وہ تورات میں کثیر ہے۔ اوران کی مراد رحمن ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور طلحہ بن مصرف نے اَیًّا مَنۡ تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی قرأت کی ہے، یعنی اسماء جو افضل اوصاف اور اشرف معانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور اسماء کا حسین ہونا شرع کی تحسین کی طرف متوجہ کرتا ہے، کیونکہ یہ آیت مطلق ہے اور اس پر نص ہے۔ اور اس کی طرف منسوب ہونا شریف اور خوبصورت معانی کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ توقیف کے ساتھ ہے قرآن کریم یا حدیث یا اجماع کی توقیف کے بغیر محض نظر وفکر سے اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم وضع کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنٰی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی'' میں بیان کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس کے سبب نزول میں پانچ مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک وہ قول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا کے بارے بیان کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں روپوش تھے، اور جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تو بلند آواز سے قرآن کریم پڑھتے، اور جب مشرکین نے اسے سنا تو انہوں نے قرآن کریم، جس نے اسے نازل کیا اور جو اسے لے کر آیا تمام کے لئے غلیظ الفاظ استعمال کئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ (اور بلند آواز سے نماز نہ پڑھو) کہ مشرک آپ کی قرأت سنیں۔ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا اور نہ اپنے اصحاب سے اسے چھپاؤ، یعنی آپ انہیں قرآن سنائیں اور بہت زیادہ آواز بلند نہ کریں۔ وَابۡتَغِ بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا فرمایا: آپ بلند آواز اور بالکل آہستہ آواز کے درمیان پڑھیے (1)، اسے امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ اور المخافتۃ کا معنی آواز کو پست کرنا اور ساکن ہونا ہے) میت جب ٹھنڈی ہو جائے تو کہا جاتا ہے: خفت (وہ ساکن ہو گیا)۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لم يبق إلا نَفَس خافت　و　مُقْلَةٌ إنسانها باهت
رَثَّ لها الشامت مما بها　يا وَيْحَ مَنْ يَرْثِي له الشامت

(۲) دوسرا وہ قول ہے جو امام مسلم نے ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا کے بارے میں نقل کیا ہے ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دعا کے بارے میں نازل فرمائی ہے (2)۔

(۳) ابن سیرین نے کہا ہے: اعرابی لوگ اپنے تشہد بلند آواز سے پڑھتے تھے تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر یہ آیت تشہد کو مخفی پڑھنے کو متضمن ہوگی، حالانکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تشہد کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 183۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، التوسط فی القراءۃ فی الصلوٰۃ الجہریۃ، جلد 1، صفحہ 183　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

مخفی پڑھنا سنت سے ثابت ہے؛ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۴) یہ بھی حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آہستہ آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے، تو اس بارے میں دونوں سے پوچھا گیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: بلاشبہ میں اپنے رب کی مناجات کرتا ہوں، اور وہ میری حاجت کو خوب جانتا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شیطان کو بھگاتا ہوں اور سونے والوں کو بیدار کرتا ہوں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تھوڑا سا آواز کو بلند کرلو، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تم تھوڑا سا اپنی آواز کو پست کرلو؛ اسے طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے(1)۔

(۵) یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے آپ دن کی نماز میں بلند آواز سے قرأت نہ کریں، اور رات کی نماز میں آہستہ آواز سے قرأت نہ کریں(2)؛ اسے یحییٰ بن سلام اور زہراوی نے ذکر کیا ہے۔ پس یہ آیت نوافل اور فرائض میں قرأت بالجہر اور قرأت بالسر کے احکام کو متضمن ہے، پس رہے نوافل تو نمازی کو رات اور دن کے وقت آہستہ اور بلند آواز سے قرأت کرنے میں اختیار دیا گیا ہے، اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ دونوں امر اکٹھے کر لیتے تھے۔ اور جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو رات اور دن کے وقت قرأت کے بارے میں ان کا حکم معلوم ہے۔

(۶) حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تو اپنی نماز میں دکھاوا نہ کر کہ اعلانیہ میں تو انہیں خوب اچھا کرے اور سری نمازوں میں بھی تو انہیں خراب نہ کرے(3) (یعنی سری اور جہری دونوں قسم کی نمازوں میں بغیر کسی ریاکاری کے خشوع وخضوع قائم رہے اور قرأت خوب اچھی رہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز نہ پڑھ اور نہ لوگوں کے خوف سے اسے چھوڑ۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ نے یہاں قرأت کو صلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جیسا کہ اپنے اس ارشاد میں نماز (صلوٰۃ) کو قرأت کے ساتھ تعبیر کیا ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء) کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ نماز قرأت، رکوع اور سجود پر مشتمل ہوتی ہے پس یہ قرأت من جملہ اس کے اجزاء میں سے ہے، اور جملہ کو جز سے تعبیر کرنا اور جز کو جملہ سے تعبیر کرنا مجازاً یہ عربوں کی عادت ہے اور یہ کثیر ہے، اور اسی معنی میں صحیح حدیث بھی ہے: قسمتُ الصلواۃ بینی و بین عبدی(4) یعنی قرأت فاتحہ کو میں نے اپنے درمیان اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝

''اور آپ فرمائیے: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا اور نہیں ہے جس کا کوئی

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 214	2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492	3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، وجوب القراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، جلد 1، صفحہ 170

شریک حکومت وفرمانروائی میں اور نہیں ہے اس کا کوئی مددگار درماندگی میں اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجہ کی بڑائی۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا یہ آیت یہود و نصاریٰ اور عربوں کے مختلف اقوال کا رد کر رہی ہے(1): کہ حضرت عزیر، حضرت عیسیٰ اور ملائکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذریت اور اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ایسے اقوال سے پاک اور برتر ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ چونکہ وہ واحد و یکتا ہے لہٰذا اس کی حکومت اور اس کی عبادت میں کوئی شریک نہیں۔ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس نے کسی کو حلیف نہیں بنایا اور نہ کسی کی مدد چاہی ہے، یعنی اس کا کوئی مددگار نہیں جو اسے درماندگی سے پناہ دیتا ہو کہ وہ اس کا دفاع کرنے والا ہو۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہود و نصاریٰ میں سے اس کا کوئی ولی اور مددگار نہیں کیونکہ وہ لوگوں میں سے ذلیل ترین ہیں(2)، (گویا) یہ ان کے اس قول کا رد ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) (ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔) اور حسن بن فضل نے کہا ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ یعنی وہ (کمزور) اور درماندہ نہیں کہ وہ کسی ولی اور مددگار کا محتاج ہو اور نہ اس کی عزت و کبریائی کے لئے کوئی ناصر اور معاون ہے۔ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا یعنی مکمل طور پر اس کی عظمت و بڑائی بیان کرو۔ اور کہا جاتا ہے: عرب کلام میں تعظیم و اجلال کے معنی میں بلیغ ترین الفاظ اللہ اکبر ہیں، یعنی اس کا وصف اس سے بیان کرو کہ وہ ہر شی سے بڑا اور عظیم ہے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

رأیتُ اللہ اکبر کل شیٔ　　محاولۃ و أکثرھم جنودا

میں نے یقین کیا کہ اللہ تعالیٰ از روئے قصد وارادہ کے ہر شے سے بڑا اور عظیم ہے اور از روئے لشکر کے سب سے زیادہ اور کثیر ہے۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر(3) اور یہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بندے کا اللہ اکبر کہنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور یہی آیت تورات کا خاتمہ ہے۔ مطرف نے عبداللہ بن کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا تورات کا آغاز سورۃ الانعام کے آغاز (یعنی پہلی آیت) سے ہے اور اس کا اختتام اس سورت کے خاتمہ کے ساتھ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ عزت اور غلبے والی آیت ہے؛ اسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدالمطلب میں سے جب کوئی بچہ فصیح بولنے لگتا تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 293-292　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 282

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الیدین إذا قام من الرکعتین، جلد 1، صفحہ 102

آپ اسے یہ آیت سکھا دیتے تھے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ الآیہ۔ اور عبدالحمید بن واصل نے کہا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے لئے زمین اور پہاڑوں کی مثل اجر لکھ دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فرماتا ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ (مریم) (قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو حکم ارشاد فرمایا جس نے آپ سے قرض کے بارے شکایت کی کہ وہ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ آخر سورۃ تک پڑھے اور پھر تین بار یہ کہے۔ توکلتُ علی الحی الذی لا یموت (1)۔

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 2، صفحہ 287

# سورة الکہف

آیاتہا ۱۱۰ ۱۸ سورۃ الکہف مکیۃ ۶۹ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمام مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ اور ایک جماعت سے مروی ہے کہ یہ سورت ابتدا سے لے کر قول باری تعالیٰ جُرُزًا ۝ تک مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، لیکن پہلا قول اصح ہے۔ اور اس کی فضیلت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جس نے یہ سورت پڑھی اسے زمین و آسمان کے درمیان نور عطا کیا جائے گا اور اس کے سبب اسے قبر کے فتنہ سے بچالیا جائے گا (1)۔ اور اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نے بیان کیا ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تمہاری ایسی سورت پر راہنمائی نہ کروں جسے ستر ہزار فرشتوں نے منزل تک پہنچایا اور اس کی عظمتوں نے زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیا (اور) اس کی تلاوت کرنے والے کے لئے بھی اسی کی مثل ہے۔" صحابہ کرام نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ سورت اصحاب الکہف ہے جس نے جمعہ کے دن اسے پڑھا تو دوسرے جمعہ تک اور مزید تین دنوں تک اس کی مغفرت کر دی جائے گی اور اسے ایسا نور عطا کیا جائے گا جو آسمان تک پہنچے گا اور فتنہ دجال سے اسے بچالیا جائے گا۔" اسے ثعلبی نے اور مہدوی نے بھی اسی معنی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور مسند دارمی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے جمعہ کی رات سورۃ الکہف پڑھی تو اس نے اپنے درمیان اور بیت عتیق کے درمیان ایک نور روشن کرلیا (2)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے سورۃ الکہف کے شروع سے دس آیات یاد کرلیں اسے دجال سے بچالیا جائے گا۔" اور ایک روایت میں ہے "سورۂ کہف کے آخر سے" اور مسلم میں نواس بن سمعان کی حدیث بھی ہے "جو کوئی دجال کو پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔" اور اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ کہا ہے: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے سورۃ الکہف کی دس آیات یاد پڑھیں فتنہ دجال اسے ضرر اور نقصان نہیں دے گا (4)"۔ اور جس نے ساری سورت پڑھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔

---

1۔ الجواہر الحسان، جلد 2، صفحہ 286

2۔ السنن الکبری، للبیہقی، کتاب الجمعہ، مایؤمر بہ فی لیلۃ الجمعہ، جلد 3، صفحہ 249

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل للقرآن، فضل سورۃ الکہف، جلد 1، صفحہ 271

4۔ ایضاً، کتاب الفتن، ذکر دجال، جلد 2، صفحہ 401

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا لِّيُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِيۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَيُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۞ مّٰكِثِيۡنَ فِيۡهِ اَبَدًا ۞

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی، (اور معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے تا کہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بے شک ان کے لئے بہت عمدہ جزا ہے۔ وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد''۔

قولہ تعالیٰ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہود کے علماء کی طرف بھیجا اور انہوں نے ان دونوں کو کہا: تم ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں پوچھو ان کے پاس جا کر آپ کی کیفیت اور حالت بیان کرو اور آپ کے قول کے بارے انہیں اطلاع کرو، کیونکہ ان کے پاس پہلے کتاب ہے اور ان کے پاس انبیاء علیہم السلام کے بارے وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، پس وہ دونوں نکلے یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچ گئے، اور انہوں نے یہودیوں کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے پوچھا، اور ان کے سامنے آپ کے معاملہ کو بیان کیا، اور آپ کے بعض اقوال کے بارے انہیں مطلع کیا، اور انہوں نے انہیں کہا: بلاشبہ تم اہل تورات ہو ہم تمہارے پاس آئے ہیں تا کہ تم ہمیں ہمارے اس صاحب کے بارے میں کچھ آگاہ کرو۔ تو یہودی علماء نے انہیں کہا: تم ان سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھو ہم تمہیں ان کے بارے بتاتے ہیں پس اگر انہوں نے تمہیں ان کے بارے خبر دے دی تو پھر وہ نبی مرسل ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ جھوٹ گھڑنے والا آدمی ہے، پھر تم اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، تم ان سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھو جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں، ان کا معاملہ کیا تھا؟ کیونکہ ان کا واقعہ بہت عجیب بات ہے۔ اور پھر تم اس سے اس گھومنے اور چکر لگانے والے آدمی کے بارے میں پوچھو جو زمین کے مشارق و مغارب تک پہنچا، اس کی خبر کیا ہے؟ اور پھر تم اس سے روح کے بارے سوال کرو، وہ کیا ہے؟ پس جب وہ تمہیں ان کے بارے بتا دے تو تم اس کی اتباع کرو کیونکہ وہ نبی ہے، اور اگر وہ نہ بتائے تو وہ محض جھوٹا آدمی ہے پھر تم اس کے بارے میں جو چاہو کرو۔ پس نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط دونوں قریش کے پاس مکہ مکرمہ آ گئے اور آ کر بتایا: اے گروہ قریش! تحقیق ہم تمہارے پاس ایسی چیز لائے ہیں جو تمہارے درمیان اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان فرق اور جدائی کر دے گی ...... تحقیق ہمیں یہودی علماء نے حکم دیا ہے کہ ہم ان سے چند چیزوں کے بارے سوال کریں جن کے بارے انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے، پس اگر وہ تمہیں ان کے بارے خبر دے دیں تو وہ نبی ہیں، اور اگر نہ دیں تو وہ جھوٹا آدمی ہے، اور تم

اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: اے محمد! ﷺ ہمیں ان جوانوں کے بارے میں بتائیے جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں۔ تحقیق ان کا قصہ بڑا عجیب ہے، اور اس آدمی کے بارے بتائیے جو چکر کاٹتا رہا یہاں تک کہ زمین کے مشارق و مغارب تک جا پہنچا، اور ہمیں روح کے بارے بتائیے وہ کیا ہے؟

راوی کا بیان ہے: پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ''جو کچھ تم نے پوچھا ہے میں اس کے بارے کل تمہیں بتاؤں گا'' اور آپ نے ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس وہ آپ سے واپس چلے گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ اس بارے میں پندرہ راتوں تک ٹھہرے رہے، انتظار کرتے رہے جو وہ گمان کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کی طرف کوئی وحی نہ بھیجی اور نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، یہاں تک کہ اہل مکہ لوگوں کو بھڑکانے کے لئے بری خبریں اڑانے لگے اور کہنے لگے: محمد (ﷺ) نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا، اور آج پندرہ راتیں گزر چکی ہیں، اور ہم نے صبح اس حال میں کی ہے کہ انہوں نے ہمیں ان چیزوں کے بارے کوئی خبر نہیں دی جن کے بارے ہم نے ان سے سوال کیا تھا، یہاں تک کہ وحی کے رکنے نے رسول اللہ ﷺ کو بھی غمزدہ کر دیا، اور آپ پر اس کے بارے اہل مکہ کی گفتگو گراں گزرنے لگی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے سورۂ اصحاب کہف لے کر حاضر ہوئے اس میں آپ ﷺ کو ان پر غمزدہ ہونے کی وجہ سے عتاب بھی کیا گیا، اور اس کے بارے آپ کو خبر بھی دی گئی جو انہوں نے آپ سے جوانوں، گھومنے والے آدمی (1)، اور روح کے بارے پوچھا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: میرے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو فرمایا: اے جبرائیل! تو مجھ سے رک گیا یہاں تک کہ برا گمان کیا جانے لگا''۔ تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو عرض کی: وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ (مریم) (اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔) پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی حمد اور اپنے رسول ﷺ کی نبوت کے ذکر کے ساتھ سورت کا آغاز کیا، کیونکہ انہوں نے اسی سے متعلق آپ کا انکار کیا تھا پس ارشاد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے (محبوب) بندے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر کتاب نازل فرمائی، بلاشبہ آپ ﷺ میری طرف سے رسول ہیں، یعنی یہ اس کی تحقیق ہے جو انہوں نے آپ سے آپ کی نبوت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا (اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی) یعنی معتدل ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ تاکہ ڈرائے دنیا میں اس جلدی آنے والی سزا سے اور آخرت میں عذاب الیم سے، یعنی (وہ سزا اور گرفت) آپ کے اس رب کی طرف سے ہوتی ہے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا۔ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّا كِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ یعنی وہ دار الخلد (ہمیشہ رہنے والا گھر) ہے وہ اس میں نہیں مریں گے، وہ لوگ جنہوں نے اس بارے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 221-220

آپ کی تصدیق کی جو آپ لے کر آئے ان امور میں سے جن کے سبب غیروں نے آپ کو جھٹلایا، اور انہوں نے اعمال میں سے ان پر عمل کیا جن کے بارے آپ نے انہیں حکم دیا۔

وَّ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یعنی قریش کو ان کے اس قول سے ڈرایا: بے شک ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآىِٕهِمْ (نہ انہیں اللہ کی (ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو) جنہوں نے اپنے فراق اور جدائی کو اور اپنے دین کے عیب اور نقص کو بڑا کر دیا۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (کتنی بڑی ہے وہ بات جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے)۔ مراد ان کا یہ قول ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ تو کیا آپ (فرطِ غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے افسوس کرتے ہوئے)۔ یعنی اپنے آپ کو ان پر اس وقت غمزدہ کرتے ہوئے جب وہ چیز حاصل نہ ہو جس کی وہ آپ سے امید رکھتے ہیں (آپ اپنی جان کو ضائع کر دیں گے) ایسا ہرگز نہ کریں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: بَاخِعٌ نَّفْسَكَ یعنی کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے؟ (مُهْلِك نفسك) یہ ابو عبیدہ نے مجھ سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

أَلَا أَيُّهٰذَا الباخِعُ الوَجْدُ نفسه ... بشيءٍ نَحَتْه عن يَدَيْه المَقَادِرُ(1)

اور اس کی جمع باخعون اور بَخَعة ہے۔ اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے اور عرب کہتے ہیں: قد بَخَعْتُ له نُصْحِي و نفسی، یعنی میں نے اس کے لئے پوری کوشش کی۔ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کون ہے جس نے میرے حکم کی اتباع کی ہے اور میری اطاعت کرتے ہوئے عمل کیا ہے۔ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد۔) یعنی زمین، اور بے شک جو کچھ اس پر ہے وہ فنا ہونے والا اور ختم ہو جانے والا ہے، اور بلاشبہ لوٹنا میری طرف ہی ہے اور میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دوں گا، پس آپ پریشان نہ ہوں اور نہ وہ آپ کو غمزدہ کرے جو آپ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الصعید سے مراد سطح زمین ہے، اور اس کی جمع صُعُد ہے۔

ذوالرمہ چھوٹے ہرن کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

كأنه بالضُحَا ترمي الصعيدَ به ... دبّابةٌ في عِظام الرأس خُرْطوم

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الصعید کا معنی الطریق (راستہ) بھی ہے، تحقیق حدیث میں آیا ہے: اياكم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 284

والقعود علی الصُّعُدات(1) (راستوں پر بیٹھنے سے بچو) اور الجزر سے مراد وہ زمین ہے جو کوئی شے نہ اگاتی ہو، اور اس کی جمع أجراز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: سَنَةٌ جُرُزٌ اور سِنُون أجراز اور یہ وہ سال ہوتے ہیں جن میں کوئی بارش نہ ہو۔ اور ان میں قحط سالی، خشکی اور سختی ہو۔

ذوالرمہ نے اونٹ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

طَوَی النحز والإجراز ما فی بطونها فما بقیت إلا الضلوع الجراشع

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر الله تعالیٰ نے ان نوجوانوں کی خبر کے بیان کی طرف توجہ فرمائی جن کے بارے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ پس ارشاد فرمایا: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں۔) یعنی تحقیق میری وہ نشانیاں جو میں نے اپنے بندوں میں رکھی ہیں وہ میری ان حجتوں اور دلائل میں سے ہیں جو اس سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ کتاب اور تحریر ہے جو ان کی خبر کے بارے لکھی گئی اور اس کی جمع رُقُم ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

و مُسْتَقَرّ المصحف المُرَقَّمِ

(لکھا ہوا مصحف رکھنے کی جگہ) اور یہ شعر بحر رجز کے قصیدہ میں سے ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۝ ((یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی: اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔ پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔) پھر فرمایا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ (اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک) یعنی سچی خبر بیان کرتے ہیں۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ (بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا: ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔) یعنی انہوں نے میرے ساتھ شرک نہیں کیا جیسا کہ تم نے میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے تمہیں علم نہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الشطط کا معنی غلو کرنا اور حق سے تجاوز کرنا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الادب، الجلوس علی الصعید، جلد 8، صفحہ 119، حدیث 12935

جیسا کہ اعشیٰ ] بنی ] قیس بن ثعلبہ نے کہا ہے:

أتنتهون ولا يَنْهى ذَوِى شَطِط كالطعن يذهبُ فيه الزَّيتُ والفُتُلُ

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ (یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ایسی حجت جو کامل اور بلیغ ہو۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۞ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۞ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِیْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ (ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔ اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔ اور جو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے۔ اور وہ (سورہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں۔) ابن ھشام نے کہا ہے: تزاور کا معنی تمیل مائل ہونا (ایک طرف ہونا) اور یہ الزور سے ماخوذ ہے۔

اور ابوالزحف کلیبی نے شہر کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

جَدْب المُنَدَّى عن هَوانا أَزْوَرُ يُنْضِى المطايا خِمْسُه العَشَنْزَرُ

اور یہ دونوں بیت اس کے اُرجوزہ میں ہیں۔ اور تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وہ اپنی بائیں جانب سے ان کے پاس سے گزر جاتا ہے اور انہیں چھوڑ دیتا ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

إلى ظُعُن يَقْرِضن أقواز مشرِف شمالا و عن أيمانهن الفوارس

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الفجوۃ سے مراد کشادہ جگہ ہے۔ اور اس کی جمع الفجاء ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ألبسْتَ قومك مَخْزاة و منقصةً حتّى أبيحُوا و حَلُّوا فَجْوَةَ الدار

ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ ((سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔)

یعنی یہ ان پر حجت اور دلیل ہے اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کے امور میں سے اسے پہچانا جنہوں نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ سے ان کے بارے پوچھیں (کہ) ان کے بارے خبر کی تحقیق آپ کی نبوت کی صداقت کی علامت ہے۔ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا ۞ وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ

وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ((حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو تو نہیں پائے گا اس سے کوئی مددگار (اور) راہنما، اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دلہیز پر۔) ابن ہشام نے کہا ہے: الوصید کا معنی دروازہ ہے۔

عبسی نے کہا ہے اور اس کا نام عبد بن وہب ہے:

بأرضِ فلاةٍ لا يُسَدُّ وصِيدها علىَّ و معروفي بها غير منكرِ

اور یہ شعر اس کے اشعار میں ہے۔ اور الوصید کا معنی فناء بھی ہے، (یعنی صحن، گھر کے سامنے کھلی جگہ) اور اس کی جمع وصائد، وُصُد اور وُصْدَان ہے۔ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو...... کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر) یعنی جو ان میں سے اہل سلطنت اور حکمران تھے۔ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔) سَيَقُوْلُوْنَ (کچھ کہیں گے) یعنی وہ یہودی علماء جنہوں نے انہیں ان کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا۔ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۣ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ (کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمایئے: (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں)۔ یعنی تم ان کے بارے میں اختلاف نہ کرو۔ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا (بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے۔ اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔) کیونکہ انہیں ان کے بارے کوئی علم نہیں ہے۔ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝ (ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل، مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے۔ اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے۔ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ) یعنی کسی چیز کے متعلق ہرگز نہ کہنا جس کے بارے وہ آپ سے پوچھیں جیسے تم نے اس بارے میں کہا کہ میں تمہیں کل خبر دوں گا، اور ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور کہیئے۔ اور اپنے

رب کا ذکر کیجئے جب آپ بھول جائیں اور کہیئے: قریب ہے میرا رب اس خبر کے بارے میری راہنمائی فرمادے جس کے بارے تم نے مجھ سے پوچھا ہے ہدایت کی راہ، کیونکہ آپ نہیں جانتے جو کچھ میں اس بارے میں کرنے والا ہوں۔ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال)۔ یعنی عنقریب وہ یہ کہیں گے۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ٘ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (آپ فرمایئے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست، اور نہیں وہ شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو) یعنی اس پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہیں جس کے بارے انہوں نے آپ سے پوچھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصحاب کہف کی خبر کے بارے یہ سیرت میں واقع ہے جسے ہم نے ترتیب کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ اور ذوالقرنین کا واقعہ آگے آرہا ہے، پھر ہم سورت کے آغاز کی طرف لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں: تحقیق اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور اخفش، کسائی، فراء، ابوعبید اور جمہور متأولین نے یہ خیال کیا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں تقدیم و تاخیر ہے، اور اس کا معنی یہ ہے: الحمد لله الذی أنزل علی عبده الکتاب قیما ولم یجعل له عوجا۔ (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے محبوب بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی درآنحالیکہ یہ (معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی) اور قَیِّمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: کلام بغیر تقدیم و تاخیر کے اپنے سیاق پر ہے، اور اس کا معنی ہے: ولم یجعل له عوجا ولکن جعلناه قیما (اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی لیکن ہم نے اسے درست کرنے والا بنایا۔)

اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں حسن ہے (وہ یہ) کہ قَیِّمًا کا معنی مستقیم ہے، یعنی یہ کتاب سیدھی اور صحیح حکمت کو بیان کرنے والی ہے اس میں کوئی خطا نہیں، نہ اس میں فساد ہے اور نہ کوئی تناقض ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا درست قرار دینے والی ہے سابقہ کتابوں کو (کیونکہ یہ) ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا یعنی یہ ہمیشہ دلائل کے ساتھ درست قرار دینے والی ہے۔ عِوَجًا مفعول بہ ہے۔ اور العِوج (عین کے کسرہ کے ساتھ) یعنی دین، رائے، حکم، اور طریق (انداز) میں پائی جانے والی کجی کو کہا جاتا ہے۔ اور عین کے فتحہ کے ساتھ اجسام مثلاً لکڑی اور دیوار وغیرہ میں پائی جانے والی کجی اور ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور قرآن کریم میں کوئی عوج یعنی عیب نہیں ہے، یعنی اس میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء) (اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی اسے مخلوق نہیں بنایا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ میں روایت کیا گیا ہے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (الزمر: 28) آپ نے

فرمایا: غیر مخلوق۔ اور مقاتل نے کہا ہے: عِوَجًا کا معنی اختلاف ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أدوم بودّي للصديق تكُرما ولا خير فيمن كان في الودّ أعْوَجَا

لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا یعنی تا کہ محمد ﷺ یا قرآن کریم ڈرائے سخت گرفت سے۔ اور اس میں اضمار ہے، یعنی تا کہ (آپ یا قرآن کریم) کافروں کو اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرائے۔ اور یہ شدید عذاب کبھی دنیا میں ہوتا ہے اور کبھی آخرت میں ہوتا ہے۔ مِّنْ لَّدُنْهُ یعنی من عندہ۔ (اس کی جانب سے ہے) ابوبکر نے عاصم من لدنہ کو دال کے اسکان اور اسے ضمہ کے ساتھ اشمام کرنے اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ہا کو یا کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور باقیوں نے لَدُنْهُ دال کے ضمہ، نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور لَدُنْ میں تین لغات ہیں: لَدُنْ، لَدَى اور لَدُ اور کہا ہے: مِن لَدُلِحْيَيْهِ الى مُنْحُورہ

المُنْحُور لغوی طور پر المَنْحَر (نتھنے) کے معنی میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ، ای بأن لھم (اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے بدلے ان کے لئے ہوگی اَجْرًا حَسَنًا (بہت عمدہ جزا) اور وہ جنت ہے۔ مَّاكِثِيْنَ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ فِيْهِ اَبَدًا یعنی اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اگر تو بشارت دینے کو بیان پر محمول کرے تو پھر اَنَّ میں با کی ضرورت نہیں۔ اور اُجر حسن سے مراد وہ عظیم ثواب ہے جو جنت تک پہنچا دے گا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

''اور تا کہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ نہ انہیں اللہ (کی ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو، کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے، وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔''

قولہ تعالیٰ: وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے کہا: حضرت عزیز اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور عیسائیوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور قریش نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ سورت کے آغاز میں ڈرانے کا ذکر عام ہے، اور یہ ان کے بارے میں خاص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، مِنْ صلہ ہے، یعنی انہیں اس قول کے بارے کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ مقلد ہیں اور انہوں نے بغیر دلیل کے یہ کہہ دیا ہے: وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ اور نہ ان کے اسلاف کو (کوئی علم ہے)۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً، كَلِمَةً بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی ازروئے قول کے وہ بات بہت بڑی ہے۔ حسن، مجاہد، یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے كَلِمَة (1) کو رفع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

کے ساتھ پڑھا ہے؛ أی عظمت کلمۃٌ۔ (وہ بات بہت بڑی ہے) مراد ان کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا بنالیا ہے۔ اور اس قرأت کی بنا پر اضمار کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے: کبر الشئ جب کوئی شے عظیم ہو جائے۔ اور کبر الرجل جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے۔ تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے) یہ صفت کے محل میں ہے۔ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

''تو کیا آپ (فرطِ غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ، بَاخِعٌ اس کا معنی ہے ہلاک کرنے والا اور قتل کرنے والا اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اٰثَارِهِمْ یہ أثر کی جمع ہے، اور کہا جاتا ہے: إثر (پیچھے) اور اس کا معنی ہے آپ سے ان کے اعراض کرنے اور ان کے پیٹھ پھیرنے کے پیچھے (کیا آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے)۔ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے۔ اَسَفًا یعنی ان کے کفر پر افسوس اور غصہ کرتے ہوئے اور یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

''بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا، ما اور زِيْنَةً یہ دونوں مفعول ہیں۔ اور الزِّينَة سے مراد ہر وہ شی ہے جو سطح زمین پر ہے، پس یہ عام ہے، کیونکہ ہر شی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ آپ نے زینۃ سے مراد رجال (مرد) لئے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زینت سے مراد خلفاء اور امراء ہیں (1)۔ اور ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا کے بارے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: علماء زمین کی زینت ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس سے نعمتیں، لباس، پھل، سبزیاں، پانی اور اسی طرح کی اور چیزیں جو اس میں زینت کا باعث ہیں وہ مراد لی ہیں، اور اس میں سے پہاڑ اور ہر وہ شے جس میں زینت نہیں مثلاً سانپ اور بچھو وغیرہ یہ داخل نہیں ہیں۔ اور عموم کے بارے قول کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے، اور یہ کہ ہر وہ شے جو زمین پر ہے وہ اس میں اپنی خلقت، صنعت، اور اپنی پختگی کے اعتبار سے زینت ہے۔ اور آیت تسلی اور اطمینان دلانے کے لئے بیان کی گئی ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ دنیا اور اہل دنیا کے لئے غمزدہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

پریشان نہ ہوں کیونکہ ہم نے اسے دنیا والوں کے لئے امتحان اور آزمائش بنا دیا ہے، پس ان میں سے کچھ تدبر اور غور وفکر کر کے ایمان لے آئیں گے، اور ان میں سے کچھ کفر بھی کریں گے، پھر قیامت کے دن (وہ سب) ان کے سامنے ہوگا پس ان کا کفر اور انکار آپ پر گراں اور شاق نہ گزرے کیونکہ ہم انہیں ان کے کئے کی سزا اور بدلہ دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کا معنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ''بے شک دنیا سرسبز وشریں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں خلیفہ اور نائب بنانے والا ہے پس وہ دیکھتا ہے تم کیسے عمل کرتے ہو (1)؟'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک زیادہ خوف دلانے والی وہ شے جس کے بارے میں تم پر خوف اور اندیشہ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا کی رونق وخوشحالی (زهرة الدنيا) کو ظاہر کر دے گا۔'' پوچھا: زهرة الدنيا کیا ہے؟ فرمایا: ''دنیا کی برکتیں (2)'' ان دونوں روایتوں کو امام مسلم وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا اپنے ذائقہ میں بڑی لذیذ اور شیریں ہے اور اپنے دکھائی دینے میں بڑی عمدہ اور خوش کرنے والی ہے گویا یہ اس پھل کی طرح ہے جو بڑا میٹھا اور شیریں ہو اور دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہو، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ از روئے عمل کے حسین کون ہے؟ یعنی کون اس میں زیادہ زهد اختیار کرنے والا اور اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے اور بندوں کے لئے اس چیز سے بغض رکھنے اور اسے ناپسند کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے مزین اور آراستہ کیا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس بارے میں بندے کی مدد اور معاونت فرمائے''۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کہتے تھے جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے: اے اللہ! بے شک ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر اس کی کہ ہم اس سے فرحت وسرور حاصل کریں جسے تو نے ہمارے لئے آراستہ اور مزین فرمایا ہے، اے اللہ! بلاشبہ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میں اسے اس کے حق میں خرچ کروں۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ اسے اس کے حق میں خرچ کرنے پر آپ کی مدد فرمائے۔ اور یہی معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ہے: ''پس جس نے اسے طیب نفس کے ساتھ پالیا اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی اور جس نے اسے نفس کی حرص اور طمع کے ساتھ لیا تو وہ اس کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا (3)''۔ اور اسی طرح دنیا کو کثرت سے اکٹھا کرنے والا ہے کہ وہ اس پر قناعت نہیں کرتا جو اسے دنیا میں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کا ارادہ اسے جمع کرنے کا ہوتا ہے، اور یہ چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ فتنہ اور آزمائش اس کے ساتھ لاحق ہو جاتے ہیں اور محفوظ اور سلامت نہ ہونا غالب ہوتا ہے، تحقیق کامیاب اور فلاح پانے والا وہ ہے جس نے اسلام قبول کیا گزارے کے لائق روزی حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا کیا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے والد محترم قول باری تعالیٰ: اَحْسَنُ عَمَلًا کے بارے میں کہتے تھے: احسن عمل ایمان کے ساتھ حق کو پکڑنا اور

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والتوبة، فی قصة اصحاب النار الثلاثة، جلد 2، صفحہ 353

ایضاً، ابن ماجہ، باب فتنة النساء، حدیث نمبر 3989، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، التحذیر من الاغترار بزینة الدنیا، جلد 1، صفحہ 336

3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم اسلام آباد

حق میں خرچ کرنا ہے، فرائض کو ادا کرنا ہے اور محارم سے اجتناب کرنا ہے مندوبات کو کثرت سے کرنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اچھا ہے، اپنے الفاظ میں مختصر ہے اور اپنے معنی میں بلیغ ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک لفظ میں جمع فرما دیا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کو اس وقت ارشاد فرمایا جب انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے بارے میں مجھے ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ میں آپ کے بعد اس کے بارے کسی سے سوال نہ کروں؟...... اور ایک روایت میں: غیرك (آپ کے سوا) کے الفاظ ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنتُ باللہ ثم أستقم (1)۔ کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس پر استقامت اختیار کر لے: اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی ہے ان میں سے دنیا میں زیادہ زاہد کون ہے؟ اور اسی طرح ابوعصام عسقلانی نے کہا ہے: اَحْسَنُ عَمَلًا کون اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے؟ اور زہد کے بارے میں علماء کی عبارات مختلف ہیں، پس ایک قوم نے کہا ہے: امید (اور خواہش) کو کم کرنا اور یہ خشک اور سخت کھانا کھانے اور گدڑی پہننے سے حاصل نہیں ہوتا؛ یہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور سچ کہا ہے کہ بے شک وہ جس کی امید اور آرزو کم ہو جائے وہ عمدہ اور اعلیٰ کھانوں کو تلاش نہیں کرتا۔ اور نہ وہ قسم قسم کے عمدہ لباس پہنتا ہے، وہ دنیا سے وہ کچھ لے لیتا ہے جو اسے میسر آئے، اور وہ اس میں سے اتنی چیز پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے معاملات حیات کو جاری رکھ سکتی ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد محمدة (حمد) کو ناپسند کرنا اور ثنا (تعریف) کو پسند کرنا ہے۔ اور یہی قول امام اوزاعی اور ان کے پیروکاروں کا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: دنیا کو مکمل طور پر چھوڑ دینا زہد ہے۔ کیا اس نے اس کے چھوڑنے کو پسند کیا ہے یا ناپسند؟ اور یہی فضیل کا قول ہے۔ اور بشر بن حارث نے کہا ہے: دنیا کی محبت سے مراد لوگوں کی ملاقات کو پسند کرنا ہے، اور دنیا میں زہد اور بے رغبتی کا اظہار کرنے سے مراد لوگوں کی ملاقات سے دور رہنا ہے، اور حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی منقول ہے: دنیا میں زہد کی علامت لوگوں سے دور رہنا ہے اور ان سے احتراز برتنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی زاہد زاہد نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ دنیا کو چھوڑنا اس کے نزدیک اسے لینے سے زیادہ پسندیدہ ہو؛ یہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: زہد یہ ہے کہ تو دنیا میں اپنے دل سے رغبت نہ رکھے؛ یہ ابن مبارک نے کہا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: زہد سے مراد موت کو پسند کرنا ہے۔ اور پہلا قول معنوی اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے پس وہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

## وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۟

''اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد''

اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابوسہل نے کہا ہے: ایسی زمین جس میں نباتات اور سبزہ نہ ہو، گویا کہ اس کا سبزہ کاٹ دیا گیا ہو۔ اور الجرز کا معنی قطع کرنا، کاٹ دینا ہے اور اس سے سنة جُرُز (وہ سال جس میں بارش نہ ہو اور قحط سالی ہو) ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جامع اوصاف الاسلام، جلد 1، صفحہ 48

راجز نے کہا ہے:

قد جرّ فتهن السّنونُ الأجْراز

(قحط والے سالوں نے انہیں ختم کردیا)

اور الأرض الجُرُز وہ زمین ہے جس میں نباتات نہ ہو اور نہ اس میں آبادی وغیرہ میں سے کوئی شے ہو، گویا کہ اسے مکمل طور پر کاٹ دیا گیا ہو اور زائل کر دیا گیا ہو۔ مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس دن زمین ہموار ہوگی اس میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں الجرز سے مراد وہ زمین ہے جس میں سبزہ نہ ہو۔ کسائی نے کہا ہے: جُرِزَت الأرضُ تَجْرَزُ اور جرزها القوم يَجْرُزونها جب وہ زمین میں اگنے والی ہر شے سبزہ اور کھیتی وغیرہ کھا جائیں تو یہ کہا جاتا ہے پس وہ زمین مجروزۃ اور جُرُز کہلاتی ہے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

''کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں''۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ جب أَمْ مذکور ہو اور اس سے پہلے ہمزہ استفہام نہ ہو تو وہ بمعنی بل اور ہمزہ استفہام کے ہوتا ہے، اور وہ ام منقطعہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ أَمْ کا عطف استفہام کے اس معنی پر ہے جو لعلك میں پایا جا رہا ہے، یا یہ ہمزہ استفہام انکاری کے معنی میں ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے خیال پر پختہ کرنا ہے کہ اصحاب کہف تعجب خیز تھے، اس معنی میں کہ وہ واقعہ اتنا بڑا اور عظیم نہیں ہے جتنا سوال کرنے والے کافروں نے آپ پر اسے بڑا قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری نشانیاں ان کے قصہ کی نسبت بڑی، عظیم، اور عام ہیں، یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن اسحاق رضی اللہ عنہم کا ہے (1)۔ اور خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، کیونکہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھا جو گم ہوئے تھے، اور ذی القرنین اور روح کے بارے پوچھا اور اللہ تعالیٰ نے وحی مؤخر فرما دی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وحی نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا تم نے گمان کیا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں؟ یعنی وہ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں، بلکہ ہماری نشانیوں میں سے ایسی ہیں جو ان کے واقعہ اور خبر سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنا ان کے واقعہ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے غیب میں سے جس پر آپ کو اطلاع دی ہے وہ زیادہ تعجب خیز ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سفر معراج میں آپ کی شان اس سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ماوردی نے کہا ہے (2): کلام کا معنی نفی ہے، یعنی آپ یہ خیال نہ کرتے اگر ہم خبر نہ دیتے۔ ابو سہل نے کہا ہے: استفہام برائے تقریر ہے، یعنی آپ یہ خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ تعجب خیز ہیں۔ اور الکہف سے مراد پہاڑ میں کھلا سوراخ ہے اور جو وسیع اور کھلا نہ ہو تو وہ غار کہلاتا ہے۔ نقاش نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الکہف سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 286، مفہوم

پہاڑ ہے اور یہ لغت میں مشہور نہیں (1)۔

لوگوں نے الرقیم کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن میں موجود ہر شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے سوائے چار کے، یعنی غِسلین، حنان، الاوّاہ اور الرقیم۔ حضرت مرہ سے رقیم کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کعب کا خیال ہے کہ یہ وہ گاؤں ہے جس سے وہ اصحاب نکلے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وادی ہے۔ اور حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ چٹان ہے جو اس غار پر تھی (2)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الرقیم وہ کتاب ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہم پر غالب کر دیا، لیکن اس کے واقعہ کی ہمارے سامنے وضاحت نہ کی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ تحریر ہے جو تانبے کی تختی میں لکھی ہوئی تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تانبے کی ایک تختی میں قوم کفار نے ان نوجوانوں کا واقعہ لکھا تھا جو ان سے بھاگے تھے اور انہوں نے اسے ان کی تاریخ بنا دیا، انہوں نے ان کے گم ہونے کا وقت ذکر کیا، ان کی تعداد ذکر کی کہ وہ کتنے تھے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ اور اسی طرح فراء نے کہا ہے، انہوں نے بیان کیا ہے: رقیم تانبے کی ایک تختی ہے جس میں انکے اسماء، ان کے نسب، ان کا دین اور جس سے وہ بھاگے تھے سب لکھا ہوا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی قوم تھے جو واقعات اور حوادثات کی تاریخ لکھتے تھے، اور یہ مملکت کی فضیلت ہے اور یہ مفید کام ہے۔ اور یہ اقوال الرقیم سے ماخوذ ہیں اور اسی سے ''کتاب مرقوم'' (لکھی ہوئی کتاب) ہے۔ اور اسی سے الأرقم (زہریلے سانپ) وہ اپنے اوپر سیاہ و سفید نشانات اور لکیروں کی وجہ سے کہلاتا ہے۔ اور اسی سے رقمہ الوادی ہے، یعنی وہ جگہ جہاں پانی چلے اور وہ اس میں اکٹھا ہو جائے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ متناقض نہیں، کیونکہ پہلا قول انہوں نے حضرت کعب سے سنا ہے، اور دوسرے قول میں یہ جائز ہے کہ انہوں نے اس کے بعد رقیم کو پہچان لیا ہو۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اصحاب کہف کا ذکر کیا اور فرمایا: بے شک یہ چند نوجوان تھے جو گم ہو گئے، مفقود ہو گئے تو ان کے گھر والوں نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ انہیں نہ پا سکے تو انہوں نے اسے بادشاہ وقت کے پاس پیش کر دیا تو اس نے کہا: یقیناً ان کی کوئی خبر ہوگی، اور اس نے تانبے کی ایک تختی منگائی اور اس میں ان کے نام لکھ لئے اور اسے اپنے خزانہ (ریکارڈ) میں رکھ دیا، پس وہی تختی ہی رقیم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ کے گھر میں دو مومن تھے پس ان دونوں نے ان نوجوانوں کی حالت، ان کے اسماء، اور ان کے انساب تانبے کی تختی میں لکھے اور پھر اسے تانبے کے ایک تابوت میں رکھ دیا اور اسے عمارت میں رکھ دیا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: الرقیم لکھی ہوئی کتاب ہے جو ان کے پاس تھی اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں سے وہ شریعت تھی جس پر وہ عمل پیرا تھے اور اسے تھامے ہوئے تھے۔ اور نقاش نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کے دراہم ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک اور شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497 2۔ ایضاً

کتاب ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: الرقیم دوات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ الرقیم سونے کی وہ تختی ہے جو اس دیوار کے نیچے تھی جسے حضرت خضر علیہ السلام نے سیدھا کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم سے مراد وہ غار والے ہیں جن پر وہ بند ہو گئی تھی، پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنے اصلح عمل کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں معروف خبر ہے جسے صحیحین نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرف امام بخاری بھی مائل ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بارے تو خبر دی ہے، اور اصحاب رقیم کے بارے کسی شے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم روم کا ایک شہر ہے اس میں ایک غار ہے اس میں اکیس آدمی داخل ہوئے گویا وہ اصحاب کہف کی ہیئت پر سو گئے، پس اس قول کی بنا پر وہ دوسرے جوان تھے جن کو وہی کچھ پیش آیا جو اصحاب کہف کو پیش آیا۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم فلسطین کے قریب ایک وادی ہے اور اس میں ایک وسیع غار ہے، اور یہ رقمۃ الوادی سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد پانی جمع ہونے کی جگہ ہے؛ کہا جاتا ہے: علیك بالرقمة و دع الضِفَة (جہاں پانی جمع ہے اس کو لازم پکڑو اور کنارہ کو چھوڑو) اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شام میں ایک غار ہے جیسا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے اور اس میں مردے ہیں، اس کے پڑوس والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں اور وہاں مسجد اور عمارت بنی ہوئی ہے اور اس عمارت کو الرقیم کہا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ کتا بھی ہے۔ اور اندلس میں غرناطہ کی طرف اس کے قریب ایک گاؤں ہے اس کا نام گوشہ ہے اس میں ایک غار میں مردے ہیں اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ (ہڈیوں والا) ایک کتا بھی ہے، اور ان میں سے اکثر کا گوشت اتر چکا ہے اور بعض آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، حالانکہ کئی صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم نے ان کی شان اور حالت جاننے کے بارے کوئی آثار نہیں پائے۔ اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اصحاب کہف ہیں، میں ان کے پاس داخل ہوا اور میں نے ان کے پاس ۵۰۴ھ لکھا ہوا دیکھا اور وہ اسی حالت میں تھے، اور وہاں ایک مسجد ہے، اور ان کے قریب ایک رومی عمارت ہے اس کا نام الرقیم ہے، گویا وہ ایک پرانا اور بوسیدہ محل ہے اس کی بعض دیواریں باقی ہیں، اور وہ زمین کے ایک جنگل میں ایک کھنڈر سا ہے، اور غرناطہ کے اوپر کی جانب جو کہ قبلہ کے ساتھ ملتی ہے پرانے رومی شہر کے آثار ہیں اس کو مدینہ دقیوس کہا جاتا ہے، ہم نے اس کے آثار میں عجیب و غریب قبریں اور اس طرح کی چیزیں دیکھی ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو اندلس میں ان کے متعلق دیکھنے کا ذکر کیا گیا ہے بلاشبہ وہ ان کے سوا ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے حق میں فرماتا ہے: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ⑱ (الکہف) (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں دیکھنے کا ارادہ کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے منع کیا ہے جو تم سے بہتر ہے (2)؛ عنقریب قصہ کے آخر میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 2، صفحہ 293

كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا کے بارے میں کہا ہے: وہ تعجب خیز ہیں (هم عَجَبٌ)۔ اسی طرح ابن جریج نے ان سے روایت کیا ہے، آپ اس طرف جا رہے ہیں کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا انکار نہیں ہے کہ آپ کے نزدیک وہ تعجب خیز ہیں۔ اور ابن نجیح نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری آیات سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے(1)۔

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩

''(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ روایت ہے کہ شہر دقیوس کے اشراف کی اولاد میں سے ایک قوم اور جماعت تھی اس شہر کا حاکم کافر تھا، [اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دقلیوس تھا] اور اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دقنیوس تھا۔ اور روایت ہے کہ انہیں پگھلائے ہوئے سونے کا طوق اور کنگن پہنائے گئے تھے، وہ رومیوں میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی اتباع اور پیروی کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جس کو دقیانوس کہا جاتا ہے اس نے روم کے شہروں میں سے ایک شہر پر غلبہ پالیا، قبضہ کر لیا اس کو افسوس کہا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ طرسوس ہے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد ہوا ہے چنانچہ اس نے بتوں کی پرستش کا حکم دیا اور اس شہر کے باسیوں کو بتوں کی پوجا کی دعوت دی، اور وہاں سات نوجوان تھے جو چھپ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، پس ان کی خبر بادشاہ کے پاس پہنچا دی گئی اور انہیں اس کا خوف لاحق ہوا تو وہ رات کے وقت بھاگ نکلے، اور ان کا گزر ایک چرواہے کے پاس سے ہوا اس کے ساتھ کتا تھا پس اس نے بھی ان کی اتباع کی اور انہوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ پس بادشاہ ان کے پیچھے غار کے منہ تک پہنچ گیا، پس اس نے ان کے اندر داخل ہونے کے نشانات تو پائے لیکن باہر نکلنے کا کوئی نشان نہ پایا، پس وہ اندر (تلاش کے لئے) داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور انہیں کوئی شے نظر نہ آئی، تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر غار کا دروازہ بند کر دو یہاں تک کہ وہ اندر ہی بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ وہ جوان ایک ایسے بادشاہ کے دین میں تھے جو بتوں کی پوجا کرتا تھا اور ان کے لئے جانور ذبح کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتا تھا، اور اس بارے میں اہل شہر اس کی پیروی کرتے تھے، اور ان جوانوں کو بعض حواریوں کی جانب سے کچھ علم ہوا تھا...... جیسا کہ نقاش نے ذکر کیا ہے، یا ان سے پہلی امتوں کے مومنین کی طرف سے...... پس وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 228-227

اور انہوں نے اپنی بصیرت کے ساتھ لوگوں کے افعال کی قباحت کو دیکھ لیا، پس انہوں نے اپنے آپ کو دین اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ لازم کر لیا، اس کا پابند بنا لیا؛ پس ان کا معاملہ بادشاہ کے پاس پیش کیا گیا، اور اس کو بتایا گیا کہ یہ جوان تیرے دین سے الگ ہو گئے ہیں اور یہ تیرے معبودوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، پس بادشاہ نے انہیں اپنی مجلس میں حاضر کیا اور انہیں اپنے دین کی پیروی کرنے اور اپنے الہوں کے لئے ذبح کرنے کا حکم دیا، اور علیحدہ ہونے کی صورت میں انہیں قتل کی دھمکی دی، تو انہوں نے اسے کہا جیسا کہ روایت کیا گیا ہے: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۝ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (الکہف)

اور روایت ہے کہ انہوں نے اس کلام کی طرح کہا نہ کہ یہ کلام کیا، تو بادشاہ نے انہیں کہا: بلاشبہ تم نوجوان ہو، ناتجربہ کار اور جاہل ہو، تمہاری عقل سمجھ نہیں ہے، اور میں تمہارے بارے میں کوئی جلدی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ میں مہلت دیتا ہوں تم اپنے گھروں کو چلے جاؤ اور اپنے نظریہ میں تدبر کرو، خوب غور و فکر کرو اور میرے حکم کی طرف لوٹ آؤ (میرے دین کی طرف رجوع کرلو) اور اس نے اس بارے میں انہیں معین وقت دے دیا، پھر وہ اس مدت کے دوران سفر پر چلا گیا اور ان نوجوانوں نے اپنے دین سمیت بھاگنے کا مشورہ کیا، اور ان میں سے ایک نے انہیں کہا: بے شک میں فلاں پہاڑ میں ایک غار پہچانتا ہوں، میرا باپ اس میں اپنے ریوڑ لے جاتا تھا پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس میں جائیں اور وہاں چھپ جائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کوئی راستہ کھول دے، پس روایت ہے کہ ہاکی اور گیند کھیلتے ہوئے نکلے، اور وہ اسے اپنے راستے کی طرف لڑھکاتے چلے گئے تاکہ لوگ ان کے بارے محسوس نہ کریں۔ اور روایت ہے کہ ان پر غلبہ پا لیا گیا تھا پس ان کا ایک میلہ آ گیا وہ اس کی طرف نکلے اور وہ بھی تمام لوگوں میں سوار ہو کر گئے، پھر وہ ہاکی اور گیند کے ساتھ کھیلنے میں لگ گئے یہاں تک کہ وہ ان سے الگ ہو گئے۔ اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ ان کے معاملے کا آغاز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر کی طرف آیا وہ اس میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا پس اس نے اپنے آپ کو ایک حمام والے کے پاس اجرت پر دے دیا اور اس میں کام کرتا رہا، اور حمام کے مالک نے اس کے کاموں میں بہت بڑی برکت دیکھی، پس اس نے اپنا سارا کام اس کے سپرد کر دیا، اور اس آدمی کو اہل شہر میں سے چند نوجوانوں نے پہچان لیا۔ پس اس نے انہیں اللہ تعالیٰ کی پہچان کرائی اور وہ اس کے ساتھ ایمان لے آئے اور اس کے دین پر اس کی اتباع و پیروی کرنے لگے، اور ان کی اس کے ساتھ ملاقات اور میل جول مشہور ہو گیا پس ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو ساتھ لے کر اس حمام کی طرف آیا اور اس نے اس کے ساتھ خلوت کا ارادہ کیا تو اس حواری نے اسے منع کیا اور وہ باز آ گیا، پھر دوسری مرتبہ وہ آیا تو اس نے اسے منع کیا لیکن اس نے اسے گالی گلوچ دیں، اور اس نے حمام میں بدکاری کے ساتھ داخل ہونے کا اپنا عزم پورا کیا، پس وہ داخل ہو گیا اور وہ دونوں اکٹھے اس میں مر گئے اور اس حواری اور اس کے ساتھیوں پر ان دونوں کے قتل کی تہمت لگائی گئی، نتیجتاً وہ سارے کے سارے بھاگ گئے یہاں تک کہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ ان کے نکلنے کے بارے علاوہ ازیں بھی کئی اقوال کہے گئے

ہیں۔ اور رہا کتا! تو اس کے بارے روایت ہے کہ ان کا یہ شکاری کتا تھا، اور یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے اپنے راستے میں ایک چرواہے کو پایا اس کا کتا بھی تھا پس چرواہے نے ان کی رائے پر ان کی اتباع اور پیروی کی اور کتا بھی ان کے ساتھ چلا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور کتے کا نام حمران تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطمیر تھا (1)۔

اور رہے اہل کہف کے اسماء تو وہ عجمی تھے، اور ان کی معرفت کی سند انتہائی کمزور اور ضعیف ہے۔ اور وہ جو علامہ طبری نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے: مکسلمینا یہ ان میں سے بڑا تھا اور ان کی طرف سے بات کرتا تھا، محسیملنینا، یملیخا اور یہ وہ ہے جو چاندی لے کر شہر گیا تھا جس وقت وہ اپنی نیند سے اٹھے، مرطوس، کشوطوش، دینموس، یطونس اور بیرونس۔ مقاتل نے کہا ہے: کتا مکسلمینا کا تھا، اور یہ ان میں سے عمر کے لحاظ سے بڑا اور بکریوں کا مالک تھا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت دین کے لئے فرار اختیار کرنے اور گھر والوں، اولاد، رشتہ داروں، دوستوں، اوطان اور اموال کے چھوڑنے کے بارے صریح ہے جبکہ فتنہ کا خوف ہو اور آدمی کو مشقت اور تکلیف میں سے پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین کی خاطر اپنے شہر سے ہجرت فرما ہوئے، اور اسی طرح آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور غار میں جا کر بیٹھ گئے جیسا کہ سورۃ النحل میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ براۃ میں اس پر نص بیان کی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور انہوں نے اپنے اوطان سے ہجرت کی اور اپنی زمین، اپنے گھر، اہل خانہ، اولاد، اپنے رشتہ دار اور اپنے بھائی سب دین کی سلامتی کی امید پر اور کافروں کے فتنہ سے نجات پانے کی خاطر چھوڑ دیئے۔ اور پہاڑوں میں سکونت اختیار کی، غاروں میں داخل ہوئے، مخلوق سے علیحدگی اختیار کی اور خالق کے ساتھ انفرادی طور پر خلوت میں رشتہ جوڑا۔ اور ظالم سے راہ فرار اختیار کرنے کا جواز تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اور اولیاء کی سنت اور ان کا طریقہ ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہائی کو فضیلت دی ہے، اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسے فضیلت دی ہے بالخصوص جس وقت فتنے اور لوگوں کے درمیان فساد ظاہر ہو رہا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی کتاب میں نص بیان کی ہے اور فرمایا ہے: فَأْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ۔ علماء نے کہا ہے: لوگوں سے جدائی اور علیحدگی کبھی پہاڑوں اور گھاٹیوں میں ہوتی ہے، اور کبھی سواحل اور سرحدوں کے قریب اور کبھی گھروں میں ہوتی ہے، تحقیق حدیث میں ہے: ''جب فتنہ برپا ہو تو اپنے رہنے کی جگہ کو مخفی رکھو اور اپنی زبان کو روک لو'' (2)۔ اور یہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اور علماء کی ایک جماعت نے عزلت اور تنہائی کو شر اور برائی سے علیحدگی قرار دیا ہے (اس طرح) کہ تو شر پھیلانے والوں سے اپنے دل اور اپنے عمل کے ساتھ علیحدہ اور جدا رہے اگرچہ تو ان کے درمیان رہ رہا ہو۔ اور ابن المبارک نے عزلت کی تفسیر میں کہا ہے کہ تو قوم کے ساتھ ہو پس جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مستغرق ہوں تو تو بھی ان کے ساتھ ذکر میں لگ جا، اور اگر وہ اس کے سوا کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں تو تو خاموش رہ۔ اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور ان کی اذیت اور تکلیف رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے افضل ہے جو ان کے ساتھ میل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 499
2۔ سنن ابی داؤد، باب الأمر والنهی، حدیث نمبر 3780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جول نہیں رکھتا اور ان کی اذیت رسانی پر صبر نہیں کرتا'' (1)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مومنوں کے رہنے کی جگہیں ان کے گھر کتنے اچھے ہیں (2)''۔ یہ حسن وغیرہ کی مرسل روایات میں سے ہے۔ اور حضرت عقبہ بن عامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم نجات کس میں ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عقبہ! اپنی زبان کو اپنے پاس روک کر رکھ، چاہیے کہ تیرا گھر تیرے لئے وسیع ہو اور تو اپنے گناہ اور خطا پر رویا کر (3)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا مسلمان آدمی کا بہترین مال ریوڑ ہوگا وہ ان کے پیچھے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور بارش کی جگہوں کی طرف جائے گا اور اپنے دین کو فتنوں سے بچالے گا (4)''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

اور علی بن سعد نے حسن بن واقد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب ۱۸۰ھ ہوگا تو میری امت کے لئے (شہروں سے) دور پہاڑوں کی چوٹیوں میں خلوت گزینی اور رہبانیت اختیار کرنا حلال ہو گا (5)''۔ اور علی بن سعد ہی عبداللہ بن مبارک سے انہوں نے مبارک بن فضالہ سے اور انہوں نے حضرت حسن سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا اس میں کسی دیندار کا دین سلامت نہیں رہے گا سوائے اس کے جو اپنا دین لے کر ایک بلند جگہ سے دوسری بلند جگہ کی طرف یا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف چلا گیا، فرار ہو گیا۔ پس جب ایسا ہوا تو معیشت نہیں پائی جائے گی مگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کے ساتھ۔ پس جب ایسا ہوا تو (شہروں سے) دور بھاگنا حلال ہوگا (6)''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم دور بھاگنا کیسے حلال ہوگا حالانکہ آپ تو ہمیں ترویج اور اشاعت کا حکم دیتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ایسا ہوگا تو آدمی کا فساد اور اس کی بربادی اس کے والدین کے سامنے ہوگی اور اگر اس کے والدین نہ ہوئے تو اس کی ہلاکت اس کی بیوی کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی بیوی نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت اس کی اولاد کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی اولاد نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سامنے ہوگی۔'' انہوں نے عرض کی: یہ کیسے ہوگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فرمایا: وہ اسے معیشت کی تنگی کی عار دلائیں گے اور اسے ایسی چیز کا مکلف اور پابند بنائیں گے جس کی اس میں طاقت نہ ہوگی تو اس وقت اپنے آپ کو ایسی جگہوں میں لے آئے گا جہاں وہ ہلاک ہو جائے گا (7)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: لوگوں کے احوال اس باب میں مختلف ہوتے ہیں، پس کتنے لوگ ہوتے ہیں جن میں پہاڑوں کی غاروں اور کھوؤں میں سکونت اختیار کرنے کی قوت اور طاقت ہوتی ہے، اور یہ احوال میں سے سب سے ارفع اور اعلیٰ ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آپ کی نبوت کے آغاز اور شروع میں پسند فرمایا، اور اس پر جوانوں کے

---

1۔ جامع ترمذی، باب فی صفۃ أوانی الحوض، حدیث نمبر 2431۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب الصبر علی البلاء، حدیث 4021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الصبر علی البلاء، صفحہ 301

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، ماجاء فی حفظ اللسان، جلد 2، صفحہ 63۔ ایضاً، حدیث نمبر 2330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، من الدین الفرار من الفتن، جلد 1، صفحہ 7

5۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 5، صفحہ 448-447، حدیث 8697 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

بارے خبر دیتے ہوئے اپنی کتاب میں نص بیان فرمائی ہے، اور ارشاد فرمایا: وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ (اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اب پناہ لو غار میں۔) اور کئی لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے گھر میں عزلت اور علیحدگی اختیار کرنا زیادہ آسان اور سہل ہوتا ہے، اہل بدر میں سے کتنے لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اپنے گھروں کو لازم پکڑ لیا اور پھر وہ اپنی قبروں کی طرف جانے سے پہلے اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔ اور کچھ لوگ ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں اور ان میں اتنی قوت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے بھی ہیں اور ان کی اذیت رسانی پر صبر بھی کرتے ہیں۔ پس وہ بظاہر ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطن میں ان کے مخالف ہوتے ہیں۔ اور ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ وہیب بن الورد نے ہمیں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: بے شک لوگ اس میں واقع ہو گئے ہیں جس میں وہ واقع ہو گئے ہیں! اور میں نے اپنے دل میں خیال کیا ہے کہ میں ان سے نہیں ملوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو ایسا نہ کر۔ بلاشبہ تیرے لئے لوگوں سے کوئی چارہ نہیں ہے، اور نہ ہی ان کا تجھ سے کوئی چارہ ہے، تیری ان کے ساتھ حاجات وضروریات ہیں، اور ان کی تجھ سے حاجات ہیں، لیکن تو ان میں اس طرح رہ کہ تو سننے سے بہرہ ہو، دیکھنے سے اندھا ہو، اور بولنے کے اعتبار سے ساکن اور خاموش ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہر جگہ جس میں آدمی لوگوں سے دور ہوتا ہے وہ پہاڑوں اور گھاٹیوں کے معنی میں ہے، مثلاً مساجد میں اعتکاف کرنا، ساحلوں کو رہائش اور ذکر کے لئے لازم پکڑنا، اور لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے گھروں میں بیٹھ رہنا وغیرہ۔ اور احادیث میں گھاٹیوں، پہاڑوں، اور ریوڑ کے پیچھے جانے کا جو ذکر آیا ہے...... واللہ اعلم ...... وہ اس لئے ہی ہے کہ یہ اغلباً وہ جگہیں ہیں جن میں خلوت اور علیحدگی اختیار کی جاتی ہے، پس ہر وہ جگہ جو لوگوں سے دور رکھتی ہے تو وہ اس معنی میں داخل ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ واللہ الموفق وبه العصمة۔

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تیرا رب اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چراتا ہے، نماز کے لئے اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: دیکھو میرے بندے کی طرف وہ اذان کہہ رہا ہے، اور نماز قائم کر رہا ہے، وہ مجھ سے ڈرتا ہے تحقیق میں نے اپنے بندے کو بخش دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر لیا(1)''۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قولہ تعالیٰ: وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا جب وہ اس سے بھاگ نکلے جو انہیں تلاش کر رہا تھا تو وہ دعا میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لی اور عرض کی: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی جناب سے مغفرت اور رزق عطا فرما۔ وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا اور ہمیں ہدایت کی توفیق عطا فرما۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہمیں سلامتی کے ساتھ غار سے نکلنے کی راہ عطا فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمارے اس کام میں درست (سمت) عطا فرما۔ اور اسی معنی کے مطابق جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی پریشان کن اور غمزدہ کر دینے والا

1۔ سنن نسائی، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 108۔ ایضاً، سنن ابی داود، باب الاذان فی السفر، حدیث نمبر 1017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امر پیش آتا، تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہوتے اور (اللہ کریم کی بارگاہ میں دعا کرتے۔)

فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًاۙ۝۱۱

''پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔''

یہ ان پر اللہ تعالیٰ کے نیند مسلط کر دینے سے عبارت ہے۔ اور یہ قرآن کریم کی ان فصیح آیات میں سے ہے جن کی مثل لانے سے قاصر ہونے کے بارے میں عربوں نے اقرار کیا۔ زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم نے انہیں اس سے روک دیا کہ وہ کوئی آواز سنیں، کیونکہ سونے والا جب کوئی سنتا ہے تو وہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے ان کے کان نیند کے ساتھ بند کر دیئے، یعنی ہم نے ان کے کان بند کر دیئے اس سے کہ ان تک آوازیں پہنچیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ یعنی ہم نے ان کی دعا قبول کر لی، اور ان سے ان کی قوم کا شر پھیر دیا اور ہم نے انہیں سلا دیا۔ اور یہ تمام معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے ضرب الامیر علی ید الرعیۃ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ انہیں فساد اور بگاڑ سے روک دے، اور ضرب السید علی ید عبدہ المأذون لہ فی التجارۃ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ اسے تصرف سے روک دے۔

اسود بن یعفر نے کہا ہے اور وہ اندھا تھا:

و من الحوادث لا أبالك أننی ضُرِبتُ علیّ الأرضُ بالأسدادِ

اور رہی کانوں کی ذکر کے ساتھ تخصیص تو یہ وہ عضو ہے جس کے ساتھ نیند میں بہت بڑا فساد اور خرابی لازم آتی ہے۔ اور اکثر اوقات سونے والے کی نیند اس کے کان کی جہت سے ہی ختم ہوتی ہے، اور نیند مستحکم اور پختہ نہیں ہوتی مگر اسی کی جس کا آواز کو سننا معطل اور بند ہو جائے۔ اور نیند میں کانوں کے ذکر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ذاك رجل بال الشیطان فی أذنہ (1) (وہ آدمی ہے جس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا) اسے صحیح نے نقل کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے طویل نیند سونے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا ہے، جو رات کو نہیں اٹھتا۔ اور عَدَدًا یہ سنین کی صفت اور نعت ہے (2)، یعنی سال گنے ہوئے ہیں۔ اور اس سے مقصود کثرت کو بیان کرنا ہے، کیونکہ قلیل تو عدد کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ وہ مصروف ہے۔ اور العَدُّ مصدر ہے، اور العدد معدود کا اسم ہے جیسا کہ النفض اور الخَبَط ہیں۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: عَدَدًا مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ پھر ایک قوم نے کہا ہے: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سالوں کی تعداد بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا۝ (الکہف) (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال۔)

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا۝۱۲

1۔ صحیح بخاری، کتاب التهجد، إذا نام لم یصل بال الشیطان فی أذنہ، جلد 1، صفحہ 153

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

''پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ پھر ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا۔ اور جس آدمی کو نیند سے اٹھایا یا بیدار کیا جائے تو اسے مبعوث کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے اٹھنے اور تصرف کرنے سے روک دیا گیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی، لِنَعْلَمَ یہ اس شے کے وجود اور مشاہدہ کی طرف نکلنے سے عبارت ہے؛ اور یہ عرب کلام کے طریقہ پر ہے، یعنی تا کہ ہم جان لیں وہ موجود ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے۔ اور زہری نے لیعلم یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الحزبان کا معنی دو فریق ہیں۔ اور آیت سے یہ ظاہر ہے کہ ایک گروہ ان نوجوانوں کا ہے جنہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ تھوڑا سا ٹھہرے ہیں۔ اور دوسرا فریق ان شہر والوں کا ہے جن کے عہد میں ان جوانوں کو بیدار کیا گیا، اس وقت ان کے پاس جوانوں کے معاملے کی تاریخ تھی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ کافروں کے دو گروہ ہیں، جنہوں نے اصحاب کہف کی مدت میں اختلاف کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں مومنین کے گروہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جن کا آیت کے الفاظ کے ساتھ کوئی ربط نہیں۔ اور اَحْصٰی فعل ماضی ہے۔ اور اَمَدًا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(1)؛ یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی دو گروہوں میں سے کون سے گروہ نے ان کے ٹھہرنے کی انتہائی مدت شمار کی ہے، اور الامد کا معنی غایت اور انتہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اَمَدًا اس کا معنی عددًا (گننا) ہے، اور یہ تفسیر قریبی معنی کے اعتبار سے ہے(2)۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اَمَدًا، لَبِثُوْا کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قابل توجہ نہیں ہے(3)۔ اور رہا وہ جس نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے تو اس نے اسے اس اختلال اور خرابی کے ساتھ ملا دیا ہے کہ اَفعل کا صیغہ فعل رباعی سے نہیں آتا مگر شاذ صورت میں، اور اَحْصٰی فعل رباعی ہے۔ اور اس کے لئے یہ کہہ کر استدلال کیا جاتا ہے: بے شک رباعی میں اَفعل کا صیغہ کثیر ہوتا ہے، جیسے تیرا یہ قول: ما أعطاہ للمال و آتاہ للخیر (اس نے اسے مال نہیں دیا اور اسے خیر اور بھلائی دی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حوض کی صفت میں فرمایا: ماؤہ أبیض من اللبن(4) (اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہوگا)۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: فھو لما سواھا أضیع(5) (پس وہ اس کے ماسوا کو زیادہ ضائع کرنے والا ہے)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ۝۱۳

''(اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک، بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا''۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، ذکر الحوض، صفحہ 328 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

قولہ تعالیٰ: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ جب قول باری تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى نوجوانوں کے ٹھہرے رہنے کی مدت میں واقع ہونے والے اختلاف کا تقاضا کرتا ہے، اس کے پیچھے یہ خبر بیان کی کہ اللہ عزوجل ان کے بارے اس حق کو جانتا ہے جو امر واقع ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ یعنی وہ جوان اور نئی عمر کے لوگ ہیں ان کے لئے جوانی کا حکم تھا اس وقت جب وہ بلاواسطہ ایمان لائے، اسی طرح اہل زبان نے کہا ہے: الفتوۃ (سخاوت) اصل ایمان ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الفُتوۃ کا معنی سخاوت کرنا، اذیت کو روکنا اور شکایت کو ترک کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الفُتوۃ کا معنی محارم سے اجتناب کرنا اور مکارم اور فیاضی میں جلدی کرنا۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال کہے گئے ہیں۔

اور یہ قول بہت اچھا ہے؛ کیونکہ یہ ان تمام معانی کو جامع ہے جو الفتوۃ کے ضمن میں کہے گئے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَزِدْنٰهُمْ هُدًى یعنی ہم نے ان کے لئے عمل صالح آسان کر دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے، لوگوں سے دوری اختیار کرنے، اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کے سبب۔ اور یہی ایمان پر زیادتی ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ کریم نے چرواہے کے کتے کے ساتھ ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا جس وقت انہوں نے اسے بھگایا اور اس خوف سے اسے پتھر مارے کہ وہ ان پر بھونکے گا اور ان کے بارے آگاہ کر دے گا، پس کتے نے دعا مانگنے والے کی طرح اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قوت گویائی عطا فرما دی، تو اس نے کہا: اے قوم! تم مجھے کیوں بھگاتے ہو؟ تم مجھ پر کیوں پتھر پھینکتے ہو؟ تم مجھے کیوں مارتے ہو؟ قسم بخدا! تحقیق میں نے اللہ تعالیٰ کو تمہارے اسے پہچاننے سے چالیس سال پہلے پہچان لیا تھا، پس اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝

''اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یہ پختہ عزم اور قوت صبر سے عبارت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے کفار کے سامنے کہہ دیا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا اور جب گھبراہٹ اور سانس کا ٹوٹنا، کمزور ہو جانا تناسب کے اعتبار سے کھلنے کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے تو پھر سانس کی مضبوطی اور قوت ارادی کی شدت کا ربط (باندھنے) کے مشابہ ہونا زیادہ حسین ہے، اور اسی سے کہا جاتا ہے: فلان رابط الجاش، جب گھبراہٹ اور جنگ وغیرہ کے وقت اس کا سانس متفرق نہ ہو۔ اور اسی سے الربط علی قلب ام موسیٰ بھی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ بھی ہے: وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ (الانفال) (اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدموں کو)۔ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا یہ تین معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کافر بادشاہ کے سامنے ان کے کھڑے ہونے کا وصف اور بیان ہو...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں دل کو مضبوط کرنے کی حاجت اور ضرورت تھی جہاں انہوں نے اس کے دین کی مخالفت کی، اور الله تعالیٰ کی ذات کی خاطر اس کے خوف اور ڈر کو چھوڑ دیا۔ اور اس میں دوسرا معنی یہ ہے جو کہا گیا ہے: بے شک وہ اس شہر کے اشراف کے بچے تھے، پس وہ نکلے اور اس شہر سے باہر بغیر کسی وعدہ کے اکٹھے ہوئے، تو ان میں سے عمر کے اعتبار سے جو بڑا تھا اس نے کہا: بلاشبہ میں اپنے دل میں یہ پا رہا ہوں کہ میرا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، تو انہوں نے کہا: ہم بھی اپنے نفسوں میں اسی طرح پاتے ہیں۔ پس وہ سارے کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا یعنی اگر ہم اس کے سوا کسی الٰہ کو پکاریں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ ظلم اور محال ہے۔ اور تیسرا معنی یہ ہے کہ ان کے پورے عزم کے ساتھ الله تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے اٹھ کر راہ فرار اختیار کرنے اور لوگوں کو چھوڑ دینے کو قیام (کھڑا ہونے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قام فلان إلى أمر كذا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب آدمی انتہائی کوشش کے ساتھ کسی کام کے لئے پرعزم ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: قیام اور قوم میں صوفیہ نے اس قول کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تعلق صحیح نہیں ہے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے الله تعالیٰ کی ہدایت پر اس کا ذکر کیا، اور انہوں نے الله تعالیٰ کی اس دولت اور انعام و فضل کا شکر ادا کیا جو اس نے ان پر فرمایا، پھر انہوں نے لوگوں سے تعلق توڑ کر اپنے رب کی طرف اپنے چہروں کو موڑنے کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اپنی قوم سے خوفزدہ تھے، اور انبیاء و رسل علیہم الصلوات والتسلیمات اور اولیاء و فضلاء میں یہی الله تعالیٰ کی سنت ہے۔ یہ زمین پر پاؤں مارنے اور آستینوں کے ساتھ رقص کرنے سے کہاں حاصل ہوتا ہے اور بالخصوص اس زمانے میں بے ریش بچوں اور عورتوں کی حسین اور خوبصورت آوازیں سننے کے وقت (جو کیفیت ہوتی ہے)۔ قسم بخدا! ان دونوں کے درمیان اتنا بعد ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ پھر یہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حرام ہے، اس کا بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء الله تعالیٰ۔ اور سورۂ سبحان میں قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (الاسراء: 37) کے تحت گزر چکا ہے۔ جو کافی ہے۔

اور امام ابو الطرسوی نے اس وقت کہا جب ان سے صوفیہ کے مذہب کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رہا رقص اور وجد کرنا سب سے پہلے سامری کے ساتھیوں نے اس کا آغاز کیا، جب اس نے ان کے لئے بچھڑے کا جسم بنایا اور وہ ڈکارنے لگا تو وہ کھڑے ہوئے اور اس کے ارد گرد رقص کرنے لگے اور مل کر وجد کرنے لگے، پس یہ کفار کا دین ہے اور بچھڑے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 501

کی پرستش کرنے والوں کا دین ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

''یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو، ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہماری قوم ہے، یعنی یہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہر کے لوگ ہیں، بتوں کی عبادت کرتے ہیں بغیر حجت کے محض تقلید کرتے ہوئے۔ لَوْلَا یعنی هلاّ (کیوں نہیں) یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ یعنی اپنے بتوں کی عبادت کرنے پر کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عَلَیْهِمْ یہ ضمیر ان کے الہوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی وہ بتوں کے الہ ہونے پر کوئی دلیل کیوں نہیں قائم کرتے، پس ان کا قول: لَوْلَا یہ تخصیص یعنی تعجیز ہے، اور جب ان کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر واجب نہیں کہ ان کے دعویٰ کی طرف توجہ کی جائے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

''اور جب تم الگ ہو گئے ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے تو غار میں پناہ لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے سردار تملیخا کا قول ہے؛ جیسا کہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور غزنوی نے کہا ہے: ان کا رئیس مکسلمینا تھا، اس نے ان کو یہ کہا، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے ہو اور تم ان سے الگ ہو گئے ہو جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ پھر استثنا کی اور کہا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بے شک تم اس (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کو نہ چھوڑو، پس یہ استثنا منقطع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ بے شک وہ لوگ جن سے اصحاب کہف فرار ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے، اور نہ انہیں اس کے بارے کوئی علم تھا اور وہ صرف بتوں کی خدائی کے بارے اعتقاد رکھتے تھے۔ اور اگر ہم فرض کرلیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے تھے جیسا کہ عرب کرتے ہیں لیکن وہ اپنے بتوں کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہراتے تھے تو پھر استثنا متصل ہوگا، کیونکہ جدائی ہر اس کے حق میں واقع ہوئی جس کی کفار عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): یہ اس کی تفسیر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس پر وہ دلالت کرتا ہے جو ابونعیم الحافظ نے عطا خراسانی سے قول باری تعالیٰ: وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ کے تحت ذکر کیا ہے انہوں نے کہا ہے: یہ اس قوم کے جوان تھے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر معبودان باطلہ کی بھی عبادت کرتے تھے پس وہ جوان ان معبودوں کی عبادت سے الگ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے الگ نہ ہوئے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اس بنا پر جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اِلَّا بمعنی غیر ہوگا، اور قول باری تعالیٰ: وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ میں مَا محل نصب میں ہوگا اور اس کا عطف اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ کی ضمیر پر ہوگا۔ اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہوگی کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: جب ہم کفار سے جدا اور الگ ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے منفرد ہو گئے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم غار کو پناہ گاہ بنالیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، کیونکہ وہ ہمارے لئے اپنی رحمت پھیلا دے گا، اور اسے ہمارے اوپر بکھیر دے گا اور ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں آسانی مہیا فرما دے گا۔ اور یہ سب کی سب دنیا کے اعتبار سے دعا ہے۔ اور انہیں اپنی آخرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور یقین تھا۔ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اصحاب کہف تلواریں صیقل اور تیز کرتے تھے اور اس غار کا نام حیوم تھا۔ مِرۡفَقًا اسے میم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جاتی ہے۔ اس طرح مِرفق الانسان اور مَرفق الانسان ہے (آدمی کی کہنی) اور ان میں سے بعض المرفق میم کے فتحہ اور فا کے کسرہ کے ساتھ اس کو امر سے بناتے ہیں اور المرفق من الانسان کہا گیا ہے کہ اگر میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ ظرف مکان ہے جیسا کہ مسجد اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

وَتَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَاِذَا غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُهُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمۡ فِىۡ فَجۡوَةٍ مِّنۡهُ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے، اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں، (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو تو نہیں پائے گا اس کے لئے کوئی مددگار (اور) رہنما۔ اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

(کبھی) بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر، اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ یعنی اے مخاطب! تو سورج کو دیکھے گا کہ وہ اپنے طلوع کے وقت ان کی غار سے جھک کر اور ہٹ کر گزرتا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: بلاشبہ اگر تو انہیں دیکھے تو یقیناً تو انہیں اسی طرح دیکھے نہ یہ کہ مخاطب نے انہیں فی الحقیقت دیکھا۔ اور تَّزٰوَرُ کا معنی دور ہٹ جانا اور مائل ہونا، جھک جانا ہے، یہ الازورار سے ماخوذ ہے۔ اور الزّوَر کا معنی جھکنا ہے۔ اور الأزور فی العین نظر سے ایک طرف ہٹ جانے والا، اور غیر عین میں بھی یہ استعمال ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابن ابی ربیعہ نے کہا ہے:

وَ جَنْبِي خِيفَةَ القومِ أَزْوَرُ　　(میرا پہلو قوم کے خوف سے ایک طرف جھک گیا ہے)۔

اور عنترہ کے قول کے لفظ ہیں:

فازور من وقع القَنَا بلبَانه(1)　　(وہ اپنے سینے کے بل گر پڑے جسے نیزہ لگا)

اور غزوہ موتہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی چارپائی کو حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی چارپائی سے دور ہٹا ہوا (ایک طرف پڑا ہوا) دیکھا۔ ان رسول اللہ ﷺ رأی فی سریر عبداللہ بن رواحہ ازورارا عن سریر جعفر و زید بن حارثہ (2)۔ اہل حرمین اور ابو عمر نے تَزَّاوَرُ تا کو زاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے، اور یہ اصل میں تتزاور ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور کسائی نے تَزَاوَرُ زا کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے تَزْوَرُّ، تحمر کی مثل پڑھا ہے۔ اور فراء نے تزوارّ، تحمارّ کی مثل بیان کیا ہے، تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ جمہور نے اسے تا کے ساتھ تترکھم کے معنی میں پڑھا ہے (اور جب وہ غروب ہوتا ہے تو وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے)؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بمعنی تدعھم (4) (وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے) نحاس نے کہا ہے: یہی معنی لغت میں معروف ہے، بصریوں نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: قرضہ یقرضہ جب وہ اسے ترک کر دے اور اس کا معنی ہے کہ اس کی عزت و تکریم کے لئے انہیں دھوپ بالکل نہیں پہنچتی، اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، یعنی سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کی غار سے دائیں جانب ہٹ جاتا ہے، اور جب غروب ہوتا ہے تو غار کے بائیں جانب سے ہو کر ان سے گزر جاتا ہے، پس انہیں دھوپ نہیں لگتی نہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور نہ دن کے آخری حصہ میں اور ان کی غار سرزمین روم میں بنات نعش (قطب شمالی کے قریب سات ستارے) کے سامنے تھی۔ پس سورج طلوع و غروب اور چلتے وقت ان سے ہٹ جاتا تھا ان تک نہ پہنچتا تھا کہ انہیں اپنی گرمی اور حرارت سے اذیت پہنچائے، ان کے رنگوں کو متغیر کرے اور ان کے کپڑوں کو بوسیدہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ان کی غار کے لئے ایک پردہ جنوب کی جانب سے تھا اور ایک پردہ دبور (پچھوائی ہوا) کی جہت سے تھا اور وہ اس کے کونے میں تھے۔ اور زجاج اس طرف گئے ہیں کہ سورج کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 503　3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 245　4۔ ایضاً

طرف سے ایک نشانی ہے، نہ یہ کہ غار کا دروازہ اس جانب تھا جو یہ ثابت کرتی ہے (1)۔ اور ایک گروہ نے یقرضھم یا کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ القرض سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی قطع کرنا، کاٹنا ہے، یعنی غار اپنے سائے کے ساتھ سورج کی روشنی سے انہیں بچاتی ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ یعنی جب وہ ڈوبتا ہے تو اس کی تھوڑی سی دھوپ انہیں لگتی ہے، یہ قُراضة الذهب والفضة (سونے اور چاندی کے ریزے) سے ماخوذ ہے، یعنی سورج اپنی تھوڑی سی شعائیں انہیں پہنچاتا ہے۔ اور انہوں نے کہا: شام کے وقت دھوپ کے ان کو مس کرنے اور پہنچنے میں ان کے بدنوں کی اصلاح تھی۔ المختصر اس میں آیت اور علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی غار میں پناہ دی جس کی کیفیت اور حالت یہ تھی نہ کہ کسی دوسری غار میں جس میں بڑے دنوں میں سورج کی شعائیں پڑنے سے وہ اذیت اور تکلیف محسوس کرتے۔ اور اس پر یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سورج کا ان سے پھرنا، ایک طرف ہٹنا بادلوں کے سایہ کرنے یا کسی دوسرے سبب سے ہو، اور مقصود ان تک کسی بلا اور مصیبت کے راہ پانے، بدنوں اور رنگوں کے متغیر اور تبدیل ہونے، اور گرمی یا سردی کے ساتھ اذیت پہنچنے سے انہیں بچانے اور ان کی حفاظت کرنے کا بیان ہے۔ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ اور وہ غار کی ایک کشادہ جگہ میں سو رہے ہیں۔ اور الفجوة کا معنی وسیع اور کھلی جگہ ہے، اور اس کی جمع فجوات اور فِجَاء ہے، جیسا کہ رَكْوَة کی جمع رِکاء اور رکوات ہے۔

اور شاعر نے بھی کہا ہے:

و نحن ملأنا كل واد و فجوة رجالا و خيلا غير ميل ولا عزل

یعنی وہ ایسی جگہ تھے جہاں انہیں بادِ نسیم لگتی تھی۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم ہے، اور یہ معنی زجاج کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، پس اسی طرح انہیں دیکھنے والا بیدار گمان کر سکتا ہے (3)۔ اور کہا گیا ہے: تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا کثرت سے ان کے کروٹ بدلنے کے سبب (تو انہیں بیدار خیال کرے گا) جیسا کہ بیدار آدمی اپنے بستر پر پہلو بدلتا ہے۔ اور اَيْقَاظًا، يقظ اور يقظان کی جمع ہے، اور اس سے مراد بیدار ہونے والا ہے وَّهُمْ رُقُوْدٌ (حالانکہ وہ سو رہے ہیں) اور یہ ان کے اس قول کی طرح ہے: وهم ركوع و سجود و قعود (درآنحالیکہ وہ رکوع، سجود اور قعدہ میں تھے۔) پس مصدر کے ساتھ جمع کی صفت بیان کی گئی۔ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تاکہ زمین ان کے گوشت کو نہ کھائے (4)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر سال میں دو بار ان کی کروٹ بدلی جاتی رہی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ ہر سال میں ایک بار۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہر سات سال میں ایک بار کروٹ بدلی جاتی تھی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ آخری نو سالوں میں ان کی کروٹ بدلی گئی، اور رہے تین سو سال تو ان میں کروٹ نہیں بدلی گئی (5)۔ اور مفسرین کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ کروٹ بدلنا اللہ تعالیٰ کے فعل میں سے ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ مقرر ہو، اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا رہی ہو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 503 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 504 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ حضرت عمرو بن دینار نے کہا ہے: بے شک اس میں سے جو بچھو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی کو ضرر اور نقصان نہ پہنچائے تو (چاہیے کہ) وہ اپنی رات یا دن کے وقت یہ کہے: صلی اللہ علی نوح۔ اور بے شک جو کتے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کتا اسے نقصان نہ پہنچائے جو اس پر حملہ آور ہو تو (چاہیے کہ) وہ یہ کہے: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ حقیقتاً کتا تھا، اور وہ ان میں سے کسی ایک کے شکار یا کھیتی کی حفاظت یا اس کے ریوڑ کے لئے تھا؛ جیسا کہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے رنگ میں بہت سا اختلاف کیا گیا ہے، اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے: جو رنگ بھی تو ذکر کر دے وہی صحیح ہے، یہاں تک کہ کہا گیا ہے: وہ پتھر کے رنگ کا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آسمان کے رنگ کا تھا۔ اور اس کے نام میں بھی اختلاف کیا گیا ہے، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کا نام ریان تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قطمیر تھا۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشیر تھا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: بسیط تھا، حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: صہبیا تھا، حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطفیر تھا؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ان کے وقت میں کتا رکھنا جائز تھا، جیسا کہ ہمارے نزدیک آج ہماری شریعت میں جائز ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: وہ رات کے وقت بھاگ کر نکلے اور وہ سات آدمی تھے وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا پس اس نے بھی ان کے دین میں ان کی اتباع کی۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: وہ ایک کتے کے پاس سے گزرے اور وہ انہیں بھونکنے لگا تو انہوں نے اسے بھگایا وہ پھر لوٹ آیا تو انہوں نے اسے بار بار بھگایا، تو کتا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ دعا مانگنے والے کی طرح آسمان کی طرف اٹھا دیئے، اور بول پڑا، اس نے کہا: تم مجھ سے نہ ڈرو! بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں پس تم سو جاؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ (لاتخافوا منی! أنا احب احباء الله تعالى فناموا حتى أحرسكم)

**مسئلہ نمبر 2**۔ صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کتا رکھا سوائے شکاری کتے کے یا جانوروں کی حفاظت والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے دو قیراط کم ہو جائیں گے (1)''۔ اور صحیح میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی کتا رکھا سوائے جانوروں کی حفاظت یا شکار یا کھیتی کی نگرانی والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے ایک قیراط کم کر دیا جائے گا۔'' زہری نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو ہریرہ پر رحم فرمائے! وہ کھیت کے مالک تھے (2)، تحقیق شکار، کھیتی، اور جانوروں کی حفاظت کے لئے کتا رکھنے پر سنت ثابتہ دلالت کرتی ہے۔ اور جس نے اس کے سوا کسی منفعت کے لئے کتا رکھا انہوں نے اس کے اجر میں کمی رکھ دی ہے؛ یہ یا تو کتے کے مسلمانوں کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 21 2۔ ایضاً

ڈرانے اور ان پر بھونکنے کے سبب ان کو پریشانی اور تشویش میں مبتلا کرنے کی وجہ سے ہے یا ملائکہ کو گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی وجہ سے یا پھر اس کی نجاست کی وجہ سے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے یا اس نہی کی وجہ سے ہے جو بغیر کسی منفعت کے اسے رکھنے کے بارے ہے۔ واللہ اعلم۔ اور آپ نے دو روایتوں میں سے ایک میں دو قیراط اور دوسری میں ایک قیراط ذکر کیا ہے۔ اور اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ کتوں کی دو قسموں کے بارے میں ہو ان میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ اذیت رساں ہو، جیسا کہ وہ سیاہ (کتا) جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کر دینے کا حکم دیا اور اسے استثنا میں داخل نہیں کیا جس وقت ان کے قتل سے منع فرمایا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے؛ اسے صحیح نے نقل کیا ہے اور فرمایا: ''تم پر دو نقطوں والے سخت سیاہ جانور کو (قتل کرنا) لازم ہے کیونکہ وہ شیطان ہے (1)''۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جگہوں کے اختلاف کی وجہ سے ہو، پس جو اسے مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں روکے رکھے گا اس کے دو قیراط کم ہوں گے اور ان کے سوا دوسرے شہروں میں ایک قیراط کم ہوگا۔ اور رہیں وہ صورتیں جن میں اسے رکھنا مباح ہے تو ان میں کچھ کم نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ گھوڑا اور بلی وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اور جانوروں کے لئے کتا رکھنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مباح ہے وہ وہ ہے جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، نہ کہ وہ ہے جو گھروں میں چوروں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کھیتی کا کتا وہ ہے جو رات یا دن کے وقت وحشی جانوروں سے اس کی حفاظت کرتا ہے نہ کہ چوروں سے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں نے جانوروں اور کھیتی کی چوروں سے حفاظت کے لئے بھی کتا رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں کتوں کے احکام پہلے گزر چکے ہیں جو کافی ہیں، والحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن عطیہ نے بیان کیا ہے: میرے باپ رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا انہوں نے کہا میں نے ۴۶۹ھ میں جامع مصر میں ابوالفضل جوہری کو منبر پر وعظ کرتے ہوئے سنا: بے شک جس نے اہل خیر سے محبت کی اس نے ان کی برکت کو پا لیا، ایک کتے نے اہل فضل سے محبت کی اور ان کی سنگت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی محکم کتاب میں ذکر فرمایا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب کتوں میں سے بعض نے صلحاء و اولیاء کے ساتھ ملنے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کے سبب اتنا بلند درجہ پا لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب جل وعلا میں اس کی خبر دی ہے تو ان موحد مومنین کے بارے تیرا کیا خیال ہے جو اولیاء اور صالحین سے ملتے اور ان سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس میں درجہ کمال سے قاصر رہنے والے مومنین اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بہترین آل سے محبت کرنے والوں کے لئے تسلی اور انس (کا پیغام) ہے۔

صحیح نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو مسجد کے دروازے کے پاس ہمیں ایک آدمی ملا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کب آئے گی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟'' راوی نے کہا: تو گویا وہ آدمی ساکن سا ہو گیا، پھر عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اس کے لئے کوئی زیادہ نمازیں، روزے اور صدقہ وغیرہ تیار نہیں کیا، لیکن میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 20
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: فأنت مع من أحببت (پس تو اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تو محبت کرتا ہے)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اسلام کے بعد حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد سے زیادہ کبھی کسی سے خوش نہیں ہوئے: فأنت مع من أحببت۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں تو میں امید رکھتا ہوں کہ میرا انجام ان کے ساتھ ہوگا اگرچہ میں نے ان کے اعمال کی مثل عمل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس سے استدلال کیا ہے یہ مسلمانوں میں سے ہر ذی روح کو شامل ہے، پس اسی لئے ہماری حرص اور طمع اس کے ساتھ متعلق ہے اگرچہ ہم کوتاہی کرنے والے اور کمزور ہیں، اور ہم رحمٰن کی رحمت کے امیدوار ہیں اگرچہ ہم اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ایک کتے نے ایک قوم سے محبت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان کے ساتھ کیا! تو ہمارے ساتھ اس کا کیسا سلوک ہوگا جبکہ ہمارے پاس ایمان کا معاہدہ اور کلمہ اسلام، اور حضور نبی مکرم ﷺ کی محبت بھی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

(الاسراء) (اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت)۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ حقیقی کتا نہ تھا، بلکہ وہ ان میں سے ایک تھا (یعنی اصحاب کہف میں سے) وہ ان کی حفاظت کی خاطر غار کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تھا، جیسا کہ جوزاء کے پیچھے آنے والے ستارے کو کلب کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ وہاں انسانوں میں سے کتے کی مثل تھا اور اس کو کہا جاتا ہے: کلب الجبار۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): پس اسے اس حیوان کا نام دے دیا گیا ہے جو اس جگہ کو لازم پکڑنے والا ہے، لیکن اس قول کو بازوؤں کے پھیلا دینے کا ذکر کمزور کرتا ہے کیونکہ عرف میں یہ حقیقی کتے کی صفت میں ہے۔ اور اس سے حضور نبی مکرم ﷺ کا ارشاد بھی ہے: ولا يبسط أحدكم ذراعيه انبساط الكلب(2) (تم میں سے کوئی اپنے بازو کتے کے پھیلانے کی طرح نہ پھیلائے)۔ ابو عمر مطرز نے کتاب الیواقیت میں بیان کیا ہے کہ اسے وكالبهم باسط ذراعيه بالوصيد پڑھا گیا ہے۔ پس اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ کالب سے مراد وہ آدمی ہو جیسا کہ روایت کیا گیا ہے، جب اس نے بازو پھیلا دیئے اور زمین کے ساتھ چمٹ گیا اس کے ساتھ ساتھ چہرے کو اٹھائے رکھا اطلاع پانے کے لئے اور یہی حالت اس مشکوک کی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو چھپانے والا ہوتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کالب سے مراد کلب(3) (کتا) ہو اور جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہ نے وكالبهم پڑھا اور مراد کتے کا مالک لیا۔

قولہ تعالیٰ: بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ اسم فاعل عمل کر رہا ہے اور یہ ماضی کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ حکایت حال ہے۔ کتے کے فعل کے بارے خبر دینا مقصود نہیں ہے۔ اور الذراع سے مراد کہنی کی طرف سے لے کر درمیانی انگلی کے کنارے تک کا حصہ اور

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، الاعتدال فی السجود، جلد 1، صفحہ 193
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

مقدار ہے۔ پھر کہا گیا ہے: اس نے طویل مدت کے لئے اپنا بازو پھیلائے رکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتا سو گیا، اور وہ بھی علامات میں سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آنکھیں کھول کر سویا رہا۔ اور الوصید سے مراد فناء (صحن) ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر نے کہا ہے۔ مراد غار کا صحن ہے، اور اس کی جمع وصائد اور وُصُد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الوصید سے مراد دروازہ ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (1)۔

اور شعر بھی ہے:

بأرض فضاءٍ لا يُسَدّ وصِيدُها علیّ و معروفی بها غير منكر (2)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الوصید سے مراد دروازے کی دہلیز ہے، اور الباب الموصد سے مراد بند دروازہ ہے۔ اور أوصدت الباب و آصدته کا معنی ہے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور الوصید سے مراد ایسی بوٹیاں بھی ہیں جن کی جڑیں باہم قریب قریب ہوں، پس یہ لفظ مشترک ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ جمہور نے واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اعمش اور یحییٰ بن وثاب نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا یعنی اگر تو ان پر جھانک کر دیکھے تو تو یقیناً ان سے بھاگ آئے۔ وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا یعنی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رعب سے گھیر رکھا ہے اور ہیبت اور خوف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی جگہ کی وحشت کی وجہ سے (تو بھاگ آئے) گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی جگہ میں پناہ دی ہے جو بظاہر وحشت ناک ہے تا کہ لوگ وہاں سے دور بھاگیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لوگوں کو ان سے رعب کے ساتھ روک دیا گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی ان کے قریب جانے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے فرار ان کے بالوں اور ان کے ناخنوں کے بڑھنے اور لمبا ہونے کی وجہ سے تھا؛ اسے مہدوی، نحاس، زجاج اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بعید از حقیقت ہے (3)، کیونکہ وہ جب بیدار ہوئے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کے بال اور ان کے ناخن اپنی حالت پر تھے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناخنوں اور اپنے بالوں کی طرف دیکھنے سے پہلے یہ کہا ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان کے معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ان کی اسی حالت پر حفاظت فرمائی جس پر وہ سوئے تھے تا کہ وہ ان کے لئے اور ان میں دوسروں کے لئے علامت اور نشانی ہو جائے۔ پس نہ ان کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہوئے اور نہ ان کی کوئی حالت تبدیل ہوئی، اور شہر کی طرف اٹھ کر جانے والے نے زمین اور عمارتوں کے نشانات کے سوا کسی چیز کا انکار نہیں کیا (اور نہ اس پر تعجب کیا) اور اگر اس کی ذات میں کوئی ایسی حالت ہوتی جس کا وہ انکار کرتا (اور اسے عجیب سمجھتا) تو یقیناً یہ اس پر زیادہ اہم تھا (4)۔ نافع، ابن کثیر، حضرت ابن عباس اور اہل مکہ و مدینہ نے مُلِّئْتَ مِنْهُمْ مبالغہ و مضاعف کی بنا پر لام کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ملئت ثم ملئت (تجھے بھر دیا جائے پھر تجھے بھر دیا جائے) اور

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 292
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505-504

باقیوں نے لملئت تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور لغت میں تخفیف زیادہ مشہور ہے۔

اور مخبل سعدی کے قول میں بھی تثقیل (تشدید) آئی ہے۔

واذ فَتَکَ النُّعمان بالناس مُحْرِمًا فمُلِئَ من کعب بن عوف سلاسله(1)

اور جمہور نے رُعْبًا عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوجعفر نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور فِرَارًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور رُعْبًا مفعول ثانی یا تمییز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(2)۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۗ قَالَ قَآىٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۗ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۗ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝١٩ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝٢٠

''اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں، کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو۔ بعض نے کہا: ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو، پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ پاکیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے، اسے چاہئے کہ خوش خلقی سے کام لے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ، البعث سے مراد سکون سے حرکت دینا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: جیسا کہ ہم نے ان کے کان سننے سے بند کر دیئے، اور ہم نے ان کے لئے نور ہدایت میں اضافہ کیا، اور ہم نے ان کی کروٹیں بدلیں (اسی طرح) ہم نے انہیں ان کی نیند سے بیدار بھی کر دیا، درآنحالیکہ وہ اپنے کپڑوں اور دیگر احوال میں اپنی پہلی حالت پر ہی تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

و فِتْيَانِ صِدْقٍ قد بَعَثْتُ بِسُحْرَةٍ فقاموا جميعا بين عاثٍ و نَشْوانِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 505

یعنی میں نے بیدار کر دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: لِيَتَسَآءَلُوْا میں لام صیر ورت ہے اور یہی لام عاقبت ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبۃ ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) (تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے)۔ پس اس کا بیدار ہونا باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے کے لئے نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ اور وہ یہ کہ وہ صبح کے وقت اس میں داخل ہوئے اور دن کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بیدار کر دیا، تو ان کے رئیس تملیخا یا مکسلمینا نے کہا: مدت کے بارے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: ان کا سکہ موسم ربیع میں پیدا ہونے والے اونٹ کے پاؤں کی مثل تھا، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے، اور ابن کثیر، نافع، ابن عامر، کسائی اور حفص نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے بِوَرِقِكُمْ را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابو بکر نے عاصم سے بوَرْقكم را کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، انہوں نے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور زجاج نے بِوِرْقِكُمْ واؤ کو کسرہ اور را کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ وہ اس حال میں بیدار ہوئے کہ انہیں بھوک لگی ہوئی تھی، اور جسے (شہر کی طرف) بھیجا گیا تھا وہ تملیخا تھا، اور یہی ان میں (عمر کے اعتبار سے) چھوٹا تھا، جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور وہ شہر افسوس تھا۔ اور کہا جاتا ہے: کہ وہ طرسوس تھا، زمانہ جاہلیت میں اس کا نام اُفسوس تھا اور جب اسلام آیا تو انہوں نے اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ان کے پاس دراہم تھے ان پر اس بادشاہ کی تصویر تھی جو ان کے زمانے میں تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ذبیحہ کو حلال قرار دے، کیونکہ ان کے شہر والے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ان میں ایک قوم تھی جو اپنا ایمان چھپا کر رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے عام مجوسی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَزْكٰى طَعَامًا یعنی جس میں برکت زیادہ ہو۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ اتنی مقدار میں خریدے جسے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ دو یا تین آدمیوں کا کھانا ہے تا کہ وہ ان پر اطلاع نہ کر سکے، پھر جب اسے پکایا جائے تو وہ جماعت کو کافی ہو جائے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ کھانا چاول تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ کشمش تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ وہ کھجوریں تھیں۔ فاللہ اعلم۔

اور کہا گیا ہے کہ اَزْكٰى بمعنی اطیب (زیادہ پاکیزہ) ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی ارخص (سستا) ہے۔ فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ پس چاہئے کہ وہ تمہارے لئے خوراک لے آئے۔ وَلْيَتَلَطَّفْ اور چاہئے کہ وہ شہر میں داخل ہونے اور کھانا خریدنے میں خوش خلقی سے پیش آئے۔

وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا یعنی وہ قطعاً تمہارے بارے میں کسی کو خبر نہ ہونے دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر اس پر غلبہ پا لیا جائے (یعنی اگر اسے پکڑ لیا جائے) تو وہ اپنے بھائیوں کو اس آزمائش میں واقع نہ کرے جس میں وہ خود واقع ہوا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505

إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی پتھر ہے، اور یہ خبیث ترین اور انتہائی قبیح قتل کی صورت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمہیں سب وشتم، گالی گلوچ دیں گے؛ اور یہ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے (یعنی وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے)، کیونکہ وہ ان کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا جیسا کہ ان کے واقعہ میں گزر چکا ہے۔ اور رجم جیسا کہ گزر چکا ہے یہ ایک سزا ہے جو لوگوں کے دین (اور رائے) کے خلاف تھی، جب کہ یہ اس دین کے ماننے والے تمام لوگوں کے لئے مناسب تھی اس حیثیت سے کہ وہ اس میں شریک تھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ سکہ دے کر اس کو بھیجنے میں وکالت اور اس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ تحقیق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس وکیل بنا کر بھیجا اور اس میں فی الجملہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور وکالت جاہلیت اور اسلام میں معروف ہے، کیا آپ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہوں نے امیہ بن خلف کو کیسے مکہ مکرمہ میں اپنے اہل خانہ اور اپنے رشتہ داروں کے لئے وکیل مقرر کیا، یعنی وہ ان کی حفاظت کرے گا۔ اور امیہ مشرک تھا، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امیہ کے لئے اس کا انتظام کیا جو مدینہ طیبہ میں اس کے رشتہ داروں کی اسی طرح حفاظت کرے گا اور یہ اس کے عمل کی جزا اور بدلہ ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں رحمن کو نہیں پہچانتا! میری طرف اپنا وہ نام لکھو جو جاہلیت میں تھا، چنانچہ میں نے عبد عمرو لکھا...... اور آگے حدیث ذکر کی۔ اصمعی نے کہا ہے: صاغیۃ الرجل سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس کے پاس آتے ہیں اور یہ صغا يَصْغُوْ اور يَصْغَى سے ماخوذ ہے۔ جب وہ مائل ہو، اور ہر وہ جو کسی شے کی طرف مائل ہو یا اس کے ساتھ ہو (تو اسی کے لئے کہا جائے گا) صغا الیہ و أصغی، یہ کتاب الافعال سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وکالت عقد نیابت ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حاجت اور ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی ہے اور اس میں مصلحت رکھ دی ہے، کیونکہ ہر ایک اپنے امور سرانجام دینے پر قادر نہیں ہوتا مگر دوسرے کی معاونت کے ساتھ یا راحت اور سہولت دینے کے ساتھ پس وہ اسے اپنا نائب بنا لیتا ہے جو اسے راحت وسکون پہنچا سکتا ہے۔

تحقیق ہمارے علماء نے اس کے صحیح ہونے پر کتاب اللہ کی کئی آیات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے ایک یہ آیت ہے، اور قول باری تعالیٰ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا (التوبہ: 60) اور اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا (یوسف: 93) (لے جاؤ میرا یہ پیراہن) ہیں۔ اور رہی سنت! تو وہ کثیر احادیث ہیں۔ ان میں سے عروہ البارقی کی حدیث ہے، اور وہ سورۃ الانعام کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ میں نے خیبر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی: میں خیبر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تو میرے وکیل کے پاس پہنچے تو اس سے پندرہ وسق لے لینا اور اگر وہ تجھ سے کوئی نشانی طلب کرے تو اپنا ہاتھ اس کے گلے پر رکھنا" (2)۔ اسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، إذا وکل المسلم حربیاً فی دار الحرب، جلد 1، صفحہ 308

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب فی الوکالۃ، جلد 2، صفحہ 155

ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، اور اس کے جواز کے بارے اجماع امت ہونا ہی کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ہر اس حق میں وکالت جائز ہے جس میں نیابت جائز ہوتی ہے، پس اگر غاصب نے کسی کو وکیل بنایا تو یہ جائز نہیں، حالانکہ وہ وکیل ہے، کیونکہ ہر وہ کام جسے کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اس میں نیابت جائز نہیں ہوتی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس آیت میں ایک عمدہ نکتہ ہے کہ وکالت بچاؤ کے ساتھ ساتھ خوف بھی ہے کہ کوئی انہیں اس کے بارے احساس دلاتا ہے جو انہیں اپنی جانوں پر خوف نہیں ہے۔ اور صاحب عذر کیلئے کسی کو وکیل بنانے کا جواز تو متفق علیہ ہے اور رہا وہ جس کو کوئی عذر نہیں تو جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: گویا سحنون نے اسے اسد بن فرات سے لیا ہے اور اس نے اپنے ایام قضا میں اس کا فیصلہ کیا، اور شاید وہ ظلم و جبر کرنے والوں کے ساتھ ایسا کرتے تھے، ان سے انصاف لینے کے لئے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے، اور یہی حق ہے؛ کیونکہ وکالت تو معاونت اور مدد کرنا ہے اور یہ اہل باطل کے لئے نہیں ہو سکتی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا ہے، پس جہاں تک اہل دین اور اہل فضل کا تعلق ہے تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ وکیل بنائیں اگرچہ وہ حاضر اور صحتمند ہوں۔ اور وکالت کے جواز کے صحیح ہونے پر دلیل وہ شاہد صحیح ہے جسے صحیحین وغیرہما نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ ایک سال کا اونٹ تھا پس وہ آیا اور اس کا تقاضا کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے عطا کرو"۔ پس انہوں نے اس کے لئے ایک سال کا اونٹ تلاش کیا لیکن انہوں نے نہ پایا مگر وہ جس کی عمر اس سے زیادہ تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے دے دو"۔ تو اس نے کہا: آپ نے میرا حق پورا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کا حق پورا کر دے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بے شک تم میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جو تم میں سے قضا کے اعتبار سے اچھا اور حسین ہو (1)"۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ پس یہ صحیح حدیث صحیح البدن حاضر آدمی کے وکیل بنانے کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ آپ کی طرف سے اس عمر کا اونٹ دے دیں جو آپ پر لازم ہے اور یہ آپ کی طرف سے ان کو اس پر وکیل بنانا ہی ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مریض تھے نہ مسافر۔ اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون کے ان دونوں کے بارے میں اس قول کو رد کرتی ہے کہ صحیح البدن حاضر آدمی کے لئے اپنے خصم کی رضا کے بغیر کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں ہے اور یہ حدیث ان دونوں کے قول کے خلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شرکت کے جواز کو متضمن ہے کیونکہ وہ سکہ ان تمام کا تھا۔ اور وکالت کے جواز کو بھی متضمن ہے کیونکہ انہوں نے اسے بھیجا جسے انہوں نے خریدنے کے لئے وکیل بنایا اور یہ ساتھیوں کے کھانے اور ان کا ایک ساتھ اپنے کھانے کو ملانے اور جمع کرنے کو متضمن ہے، اگرچہ ان میں سے بعض دوسروں سے زیادہ کھانا کھائیں؛ اور اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ:220) (اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اسی لئے ہمارے اصحاب نے مسکین کے بارے میں کہا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، وکالۃ الشاھد والغائب جائزۃ، جلد 1، صفحہ 309

ہے اس پر صدقہ کیا جاتا ہے پھر وہ اسے غنی کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے، بلاشبہ یہ جائز ہے۔ اور انہوں نے مضارب کے بارے میں کہا ہے جو اپنا کھانا دوسرے کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے: بے شک یہ جائز ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وکیل بنایا جس نے آپ کے لئے قربانی کا جانور خریدا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے وہ انفرادی طور پر دیا ہو تو پھر اس میں اشتراک نہیں ہوگا۔ اور اس مسئلہ میں تعویل نہیں کی جاسکتی مگر دو حدیثوں کی بنا پر: ان میں سے ایک یہ ہے ...... کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک قوم کے پاس سے گزرے۔ وہ کھجوریں کھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اقتران اور ملنے سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ آدمی اپنے بھائی سے اجازت طلب کرے (1)۔ اور دوسری یہ ہے ...... ابو عبیدہ کی جیش الخبط کے بارے میں حدیث ہے۔ اور یہ ظہور میں پہلی سی کم ہے، کیونکہ اس میں احتمال ہوسکتا ہے کہ ابو عبیدہ انہیں اس خوراک میں سے حاجت اور ضرورت کے مطابق دیتا ہو اور وہ انہیں اس پر جمع نہ کرتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ: 220) اور قول باری تعالیٰ ہے: لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: 61) (نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ۔) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا ۚۤ اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْهِمْ بُنْیَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا ۝۲۱

"اور بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تاکہ وہ جان لیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلاشبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کر دو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے، کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا! ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ یعنی ہم نے ان پر اطلاع کر دی اور ہم نے ان پر ظاہر کر دیا۔ اور اَعْثَرَ یہ عَثَرَ سے ہمزہ کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ اور عثار کا اصل معنی تو پاؤں کا پھسلنا ہے۔ لِیَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یعنی تاکہ وہ امت مسلمہ جان لے جن کے عہد میں اصحاب کہف کو بیدار کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ دقیانوس فوت ہوگیا اور صدیاں گزر گئیں اور اس علاقے کا بادشاہ ایک صالح اور نیک آدمی بنا، اور وہاں کے باسیوں کا حشر اور قبروں سے جسموں کے اٹھائے جانے کے بارے اختلاف ہوگیا، اور بعض لوگ اس میں شک کرنے لگے اور انہوں نے اسے بعید از حقیقت سمجھا اور کہنے لگے: بے شک ارواح کو اٹھایا جائے گا اور جسم کو تو زمین کھا جائے گی۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: روح اور جسم دونوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا؛ پس یہ اس بادشاہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، النھی عن قران التمر، صفحہ 247

پر گراں گزرا اور وہ حیران رہنے لگا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان کے لئے اس معاملہ کی وضاحت کیسے کرے، یہاں تک کہ ٹاٹ پہن لیا اور وہ ریت پر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حجت و بیان کے لئے تضرع اور زاری کرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف پر آگاہ کر دیا، پس کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر کی طرف بھیجا کہ وہ ان کیلئے وہاں سے کھانا لے آئے تو اس شخص کو اجنبی سمجھا گیا اور بہت طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے اس کے دراہم پر بھی اظہار تعجب کیا گیا، اور اسے بادشاہ کے پاس اٹھا کر لے جایا گیا اور وہ صالح آدمی تھا تحقیق وہ بھی ایمان لے آیا تھا اور جو اس کے ساتھ تھے وہ بھی ایمان لے آئے تھے۔ پس جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو کہا: شاید یہ ان جوانوں میں سے ہے جو بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں نکلے تھے، تحقیق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا ہوں کہ وہ مجھے وہ دکھائے۔ پھر اس نے جوان سے پوچھا تو اس نے اسے اس کی خبر دی، پس بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور اس نے کہا: شاید اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نشانی بھیج دی ہے، پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے ساتھ غار کی طرف چلیں، چنانچہ وہ شہر والوں سمیت ان کی طرف سوار ہو کر گیا، اور جب غار کے قریب پہنچے تو تملیخا نے کہا: میں ان پر داخل ہوتا ہوں تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائیں چنانچہ وہ اندر ان کے پاس گیا اور صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور یہ کہ یہ امت امت اسلام ہے، پس روایت ہے کہ انہیں اس سے از حد خوشی ہوئی، اور وہ بادشاہ کی طرف باہر آئے اور انہوں نے اس کی عزت و تکریم کی اور وہ ان کی تعظیم بجالا یا پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے۔ اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے انہیں یہ بتایا تو اس وقت وہ حقیقی موت کے ساتھ فوت ہو گئے، جیسا کہ اس کا بیان آرہا ہے۔ اور جنہیں جسموں کے اٹھائے جانے میں شک تھا انہیں اس کا یقین حاصل ہو گیا۔ پس اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ کا یہی معنی ہے یعنی تاکہ بادشاہ اور اس کی رعایا جان لے کہ قیامت حق ہے اور دوبارہ زندہ کیا جانا (یعنی بعث) بھی حق ہے۔ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ بلاشبہ انہوں نے اس ایک سے ان کی خبر پر استدلال کیا اور وہ ان پر داخل ہونے سے ڈر گئے تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر (بطور یادگار) ایک عمارت تعمیر کر دو؛ اور جوان جوانوں کے دین پر تھے انہوں نے کہا: ان پر مسجد بنا دو۔ اور روایت ہے کہ ایک کافر گروہ نے کہا: ہم ان پر اپنی عبادتگاہ یا مہمان خانہ بنا لیتے ہیں، تو مسلمانوں نے انہیں روک دیا اور کہا: ہم ان پر ضرور مسجد بنائیں گے۔ اور روایت ہے کہ بعض لوگ ان پر غار کو بند کرنے کے لئے گئے اور انہوں نے انہیں اس میں اس حال میں چھوڑا کہ وہ غائب کر دیئے گئے ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت لوگوں پر ان کے اثر اور نشان کو اوجھل کر دیا اور انہیں ان سے چھپا دیا، پس اسی لئے بادشاہ نے عمارت بنانے کے لئے کہا تاکہ وہ ان کی نشانی ہو جائے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں سونے کے صندوق میں دفن کرے تو حالت خواب میں ان سے کوئی آنے والا اس کے پاس آیا اور کہا: تو نے ہمیں سونے کے صندوق میں دفن کرنے کا ارادہ کیا ہے پس تو اس طرح نہ کر، کیونکہ ہم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹ رہے ہیں پس تو ہمیں چھوڑ دے۔

یہاں کئی ممنوع اور جائز مسائل پیدا ہوتے ہیں، پس قبروں پر مساجد بنانا اور ان میں نماز پڑھنا اور ان پر کوئی عمارت بنانا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 507

اور علاوہ ازیں وہ جنہیں سنت کی نہی متضمن ہے وہ ممنوع ہیں اور جائز نہیں ہیں، جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبور کی زیارت کرنے والیوں پر اور ان پر مساجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے (1)۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک کنیسہ (گرجا گھر) کا ذکر کیا۔ انہوں نے اسے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک یہ وہ لوگ ہیں جن میں کوئی صالح آدمی ہوتا اور وہ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی تصویریں لگا دیتے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے (2)'' یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور علماء کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بنائیں۔ اور ائمہ نے ابو مرثد غنوی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم قبروں کی طرف (متوجہ ہو کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو (3)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں، یعنی تم انہیں قبلہ نہ بناؤ کہ تم ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا ہے، کیونکہ یہ قبر والوں کی عبادت تک پہنچا دیتا ہے جیسا کہ بتوں کی پرستش کا سبب یہی بنا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثل سے ڈرایا، اور اس تک پہنچانے والے ذرائع کو بند کر دیا۔ اور فرمایا: ''اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہوگا جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی قبروں کو مساجد بنایا (4)''۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ان دونوں نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی آتی تو آپ اپنا جبہ اپنے چہرے پر ڈال لیتے اور جب اس کے سبب گرمی اور حدت محسوس کرنے لگتے تو اسے اپنے چہرے سے اتار دیتے ایسے معاملہ میں اسی طرح ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنا لیا ہے (5)''۔ تو آپ اس سے ڈرا رہے ہیں جو کچھ انہوں نے کیا۔

اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے کہ قبر پر چونا کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے (6)۔ اور اسے ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کو چونا کرنے، ان پر کچھ لکھنے، ان پر عمارت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، ما جاء فی کراھیۃ ان یتخذ وا القبر مسجدا، جلد 1، صفحہ 43
ایضاً، حدیث نمبر 294۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب زیارۃ النساء، حدیث نمبر 2817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النھی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

3۔ ایضاً، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312 4۔ موطا امام مالک، فی قصر الصلوٰۃ، صفحہ 159

5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النھی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

6۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312

بنانے اور انہیں روندنے سے منع فرمایا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اور صحیح نے ابوالہیاج اسدی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تجھے اس پر آگاہ نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آگاہ کیا: خبردار سنو کوئی بت نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹادے اور کوئی بلند قبر نہ چھوڑ مگر تو اسے ہموار کردے...... اور ایک روایت میں ہے...... اور کوئی تصویر نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹادے (2)۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا ظاہر تو اس پر دال ہے کہ آپ نے قبروں کو کوہان کی مثل بنانے اور ان کو بلند کرنے سے منع کیا ہے اور یہ کہ وہ (زمین کے ساتھ) چپکی ہوئی ہوں۔ اور بعض اہل علم نے یہی کہا ہے۔ اور جمہور نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ بلندی جسے زائل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہ ہے جو کوہان کی مثل سے زیادہ ہو، اور قبر کے لئے اتنی بلندی باقی رہے گی جس سے اسے پہچانا جاسکتا ہو اور اس کا احترام کیا جائے، اور یہی ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور اور آپ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کی قبروں کی کیفیت اور حالت ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں اسے ذکر کیا ہے...... اور اسی طرح ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر بھی ہے، جیسا کہ اسے دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور رہی زمانہ جاہلیت کی طرز پر بنائی جانے والی کثیر عمارتوں کی بلندی جو ان کی تفخیم شان اور تعظیم کے لئے ہوتی ہے تو اسے گرادیا جائے گا اور زائل کردیا جائے گا، کیونکہ اس میں آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل میں دنیوی زینت کا استعمال ہے، اور ان کے ساتھ تشبیہ اور موافقت ہے جو قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں، اور ان معانی کے اعتبار سے اور نہی کے ظاہر کے اعتبار سے یہ کہا جانا چاہئے کہ یہ حرام ہے۔ اور قبر میں کوہان کی شکل میں اس کی بلندی ایک بالشت کی مقدار ہے، یہ سنام البعیر (اونٹ کی کوہان) سے ماخوذ ہے۔ اور اس پر پانی چھڑکا جائے گا تاکہ ہوا کے ساتھ وہ اڑ نہ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو گارے کے ساتھ لیپ دینے میں کوئی حرج نہیں (3)۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو چونا نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے گارے کے ساتھ لیپ کیا جائے گا اور نہ اس پر کوئی عمارت بنائی جائے گی کہ وہ گر پڑے۔ اور پتھر رکھنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ وہ علامت بن جائیں، کیونکہ اسے ابوبکر الاثرم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں مسدد نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں نوح بن دراج نے ابان بن تغلب سے اور انہوں نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کرتی تھیں اور آپ نے اسے پتھر کی نشانی اور علامت لگا رکھی تھی؛ اسے ابوعمر نے ذکر کیا ہے (4)۔

اور رہے وہ امور جو جائز ہیں...... پس تابوت میں دفن کرنا جائز ہے بالخصوص جب (قبر) نرم زمین میں ہو اور روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام پتھر کے تابوت میں دفن ہوئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ ان کے لئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تحصیص القبور والکتابۃ علیھا، جلد 1، صفحہ 125۔ ایضاً، حدیث 972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی تسویۃ القبر، حدیث 2801، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تحصیص القبور، جلد 1، صفحہ 125

4۔ التمہید، جلد 3، صفحہ 233-234

شیشے کا تابوت بنایا جائے اور پھر انہیں کنوئیں میں ڈال دیا جائے اس خوف سے کہ کہیں ان کی عبادت (نہ) کی جائے، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک اسی طرح باقی رہے، اور پھر ایک بڑھیا نے اس پر آپ کی راہنمائی کی تو انہوں نے آپ کو اٹھایا اور انہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کے حظیرہ میں دفن کر دیا۔ اور صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے اس مرض میں کہا جس میں ان کا وصال ہوا کہ تم میرے لئے لحد بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں کھڑی کر کے لگانا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا گیا (1)۔ اللحد: یہ ہے کہ زمین میں گڑھا کھودا جاتا ہے پھر اس گڑھے میں قبلہ کی جانب سے دوسری قبر کھودی جاتی ہے اگر زمین سخت ہو تو اس میں میت کو داخل کر دیا جاتا ہے اور اسے کچی اینٹوں کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ہمارے نزدیک شق سے افضل ہے، کیونکہ یہی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پسند فرمایا۔ اور اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سنت لحد بنانا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شق ہے۔ اور لحد میں پکی اینٹیں لگانا مکروہ ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی پتھر کی ایک قسم ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ پکی اینٹیں تو عمارت کو پختہ کرنے کے لئے ہیں، اور قبر اور جو کچھ اس میں ہے وہ آزمائش کے لئے ہے لہٰذا اس میں پختگی مناسب نہیں ہے اور اسی بنا پر پتھر اور پکی اینٹ کو برابر قرار دیا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پکی اینٹ میں آگ کا اثر ہوتا ہے، پس وہ بطور فال مکروہ ہے، اور اسی بناء پر پتھر اور پکی اینٹ کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کچی اینٹیں اور کانے لگانا مستحب ہے جیسا کہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کانوں کا ایک گٹھا لگایا گیا۔ اور شیخ امام ابوبکر محمد بن فضل حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ان کے شہروں میں زمین کے نرم ہونے کی وجہ سے تابوت بنانے کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: اگر لوہے کا تابوت بنایا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ چاہئے کہ اس میں مٹی بچھائی جائے اور اوپر والا وہ حصہ جو میت کے ساتھ ملتا ہے اسے مٹی کے ساتھ لیپ کر دیا جائے۔ اور میت کی دائیں اور بائیں جانب پر ہلکی سے کچی اینٹیں رکھ دی جائیں تا کہ وہ لحد کے قائم مقام ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں چادر رکھی گئی، کیونکہ مدینہ طیبہ کی زمین شور یلی ہے۔ شقران نے کہا ہے: قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچے قبر شریف میں چادر رکھی گئی۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: شقران کی حدیث حسن [صحیح] اور غریب ہے (2)۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۗ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ۙ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی الدعاء للمیت، جلد 1، صفحہ 311

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، ما جاء فی الثوب الواحد یلقی تحت المیت فی القبر، جلد 1، صفحہ 124

’’کچھ کہیں گے: اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کروان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے، اور نہ دریافت کروان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔‘‘

قولہ تعالیٰ: سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، سَيَقُوْلُوْنَ میں ضمیر سے مراد اہل تورات اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر ہیں۔ اور انہوں نے اصحاب کہف کی تعداد میں یہ اختلاف کیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد نصاریٰ ہیں، کیونکہ ان کی ایک جماعت نجران سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور آپ نے اصحاب کہف کا ذکر چلا دیا تو یعقوبیہ نے کہا: وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور نسطوریہ نے کہا: وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ اور مسلمانوں نے کہا: وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان یہودیوں کے بارے خبر دی جارہی ہے جنہوں نے مشرکین کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور قول باری تعالیٰ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واو نحویوں کے طریقہ پر واو عطف ہے جو ان کی تعداد کے بارے اخبار کے آخر میں داخل ہے؛ تاکہ ان کا معاملہ جدا اور الگ ہو جائے، اور یہ اس پر دلالت کرے کہ یہ اس کی غایت ہے جو اس بارے میں کہا گیا ہے، اور اگر یہ ساقط بھی ہو جائے تو بھی کلام صحیح ہے۔ اور ایک فرقہ نے کہا ہے ان میں سے ابن خالویہ بھی ہیں: یہ واو ثمانیہ ہے۔ ثعلبی نے ابو بکر بن عیاش سے بیان کیا ہے کہ قریش ان کی تعداد بیان کرتے وقت کہتے تھے: ستة سبعة و ثمانية (چھ، سات اور آٹھ) پس وہ آٹھ کے عدد میں واؤ داخل کرتے تھے (1)۔ اور قفال نے بھی اسی طرح کہا ہے، پس انہوں نے کہا ہے: بے شک ایک قوم نے کہا ہے کہ عربوں کے نزدیک عدد کی انتہا سات پر ہو جاتی ہے، اور جب اس سے زیادہ کی ضرورت پیش آئے تو واؤ ذکر کر کے دوسری خبر نئے سرے سے لائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (التوبہ: 112) پھر فرمایا وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ (التوبہ: 112) اور اس پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ جب جہنم کے دروازوں کا ذکر کیا تو بغیر واؤ کے فرمایا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) اور جب جنت کا ذکر کیا تو فرمایا: وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی اسے واؤ کے ساتھ ذکر کیا۔ مزید فرمایا: خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ (التحریم: 5) پھر فرمایا: وَّاَبْكَارًا پس سات ان کے نزدیک آخری عدد ہے جیسا کہ اب ہمارے نزدیک دس آخری عدد ہے۔ علامہ قشیری ابو نصر نے کہا ہے: اس کلام کی مثل لانا تحکم (یعنی مرضی کا فیصلہ) ہے، ان کے نزدیک سات کہاں آخری عدد ہے پھر یہ (کلیہ) اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر: 23) اور اس میں آٹھواں اسم واؤ کے ساتھ مذکور نہیں۔ اور ان میں سے ایک قوم نے کہا ہے جو اس طرف گئے ہیں کہ ان کی تعداد سات تھی کہ قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

تعالیٰ: سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ میں واؤ ذکر کی گئی ہے تا کہ وہ اس پر آگاہ کرے کہ یہ عدد ہی حق اور صحیح ہے، اور یہ کہ یہ ان دوسرے اعداد سے جدا اور الگ کرنے والی ہے جو اس کے بارے میں اہل کتاب نے کہے ہیں، اسی لئے پہلے دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ (یہ بن دیکھے تخمینے ہیں) اور تیسرے جملے میں اسے ذکر نہیں کیا اور اس میں کسی شے سے کوئی قدح اور اعتراض نہیں، تو گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور الرجم سے مراد قول بالظن (یعنی محض وہم وگمان اور اندازے سے بات کرنا) ہے، ہر وہ شے جس کے لئے اندازہ اور تخمینہ لگایا جاتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے: رَجَمَ فیه و مرجوم و مُرَجَّمٌ۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

وما الحرب إلّا ما علمتم و ذُقْتُمْ　　　وما هو عنها بالحديث المُرَجَّم

میں (مفسر) کہتا ہوں: ماوردی اور غزنوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریج اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ آٹھ تھے، اور ان دونوں نے قول باری تعالیٰ: وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ کو صاحب کلبهم قرار دیا ہے(1) (یعنی آٹھواں کتے کا مالک تھا) اور یہ اس میں سے ہے جو واؤ کے بارے میں نحویوں کے طریقہ کو تقویت دیتا ہے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے انہوں نے کہا۔ اور قشیری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: رَّابِعُهُمْ اور سَادِسُهُمْ میں واؤ ذکر نہیں کی، اور اگر اس کے برعکس بھی ہو تو یقیناً وہ جائز ہے، پس اس جیسی واؤ میں حکمت اور علت تلاش کرنا ایک ایسا تکلف ہے جو حقیقت سے دور ہے، اور یہ اسی قول کی طرح دوسرے مقام پر ہے: وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ (الحجر) اور ایک اور مقام پر ہے: اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰى (الشعراء) (یعنی ایک آیت میں واؤ مذکور ہے اور دوسری میں نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیں، بعد ازاں اس کی خبر دی کہ انسانوں میں سے اسے جاننے والے چند لوگ ہیں اور اس سے مراد اہل کتاب کا گروہ ہے؛ یہ حضرت عطا کے قول میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ان چند آدمیوں میں سے میں بھی ہوں، وہ سات آدمی تھے اور ان میں آٹھواں ان کا کتا تھا(2)، پھر آپ نے ان سات کے ناموں سمیت ذکر کیا۔ اور رہا کتا تو اس کا نام قطمیر کلب انمر ہے، جو قلطی سے بڑا اور کردی سے چھوٹا تھا۔ اور محمد بن سعید بن مسیب نے کہا ہے: وہ چینی کتا تھا۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ زبیری تھا۔ اور بیان کیا کہ نیشاپور میں کوئی محدث باقی نہیں رہا مگر اس نے یہ حدیث مجھ سے لکھی ہے سوائے اس کے جو اس پر قادر نہ ہو سکا۔ فرمایا: اسے ابو عمرو حیری نے مجھ سے لکھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اصحاب کہف کے بارے میں آپ جھگڑا اور بحث نہ کریں مگر اس کے ساتھ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کر دی ہے، اور وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المراء الظاهر کا معنی یہ ہے کہ آپ کہیں: ایسا نہیں ہے جیسے تم کہتے ہو، اور اسی طرح کی گفتگو، اور اس میں مقدر امر پر آپ استدلال نہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 297　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

کریں۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کسی کے لئے بیان نہیں فرمائی پس اسی لئے فرمایا اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اسے جانے دو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وتلك شكاةٌ ظاهرٌ عنك عارُها (وہ عیب ہے اس کی عار تجھ سے ظاہر ہے)

اس آیت میں کسی کے لئے مباح نہیں ہے کہ وہ شک کرے، لیکن قول باری تعالیٰ: اِلَّا مِرَآءً یہ استعارہ ہے اس حیثیت سے کہ اہل کتاب اس میں شک کرتے ہیں۔ اور آپ کے ان کی طرف رجوع کرنے کو مِرَآءً کا نام دیا گیا ہے پھر اسے ظاہر کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے، پس یہ مراد حقیقی سے جو کہ مذموم ہے جدا ہو گیا۔ اور قول باری تعالیٰ فِيْهِمْ میں ضمیر اصحاب کہف کی طرف لوٹ رہی ہے اور قول باری تعالیٰ: مِّنْهُمْ میں ضمیر معارض اہل کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ میں مراد فی عدتھم (پس آپ ان کی تعداد میں شک نہ کریں)؛ اور لفظ عدۃ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ظاہر قول اس پر دلالت کرتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے ان کے بارے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوال سے منع کر دیا۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی چیز کو جاننے کے لئے اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ممنوع ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

”ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل، مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ۔“

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت عتاب فرمایا جب کفار نے آپ سے روح، نوجوانوں اور ذوالقرنین کے بارے سوال کیا تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے سوالات کے جوابات کے بارے کل تمہیں آگاہ کروں گا اور آپ نے اس میں ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس پندرہ دن تک آپ سے وحی رک گئی یہاں تک کہ آپ پر یہ شاق اور گراں گزرا اور کفار بھی آپ کے بارے باتیں کر کے آپ کو پریشان کرنے لگے، پس اس اضطراب اور پریشانی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ سورت نازل فرمائی۔ اور اس آیت میں آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ کسی کام کے بارے یہ نہ کہا کریں کہ میں کل اس اس طرح کر دوں گا، مگر یہ کہ آپ اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کریں تاکہ آپ خبر کے حکم کو ثابت کرنے والے نہ ہوں، کیونکہ جب کوئی یہ کہے: میں یہ ضرور کروں گا اور پھر وہ نہ کرے تو وہ جھوٹا ہوتا ہے، اور جب وہ یہ کہے میں ضرور اس طرح کروں گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ مخبر عنہ کو ثابت کرنے کے حکم سے نکل گیا۔ پس قول

باری تعالیٰ: لِشَایْءٍ میں لام قائم مقام فی کے ہے یا گویا کہ یہ کہا لأجل شئ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): اس آیت میں لوگوں نے قسم میں ان شاء اللہ کہنے کے بارے گفتگو کی ہے، حالانکہ یہ آیت قسم کے بارے نہیں ہے بلکہ یہ قسم کے سوا عام کلام میں ان شاء اللہ کہنے کے بیان میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس کلام میں حذف ہے ظاہر اس کا تقاضا کرتا ہے اور ایجاز (اختصار) اسے حسین بنا رہا ہے، تقدیر کلام یہ ہے: الا ان تقول اِلَّا أن یَشَآءَ الله یا إلا أن تقول إن شاء الله۔ پس اس کا معنی یہ ہے: مگر یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ذکر کریں۔ پس اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس قول سے نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جسے ابن عطیہ نے اختیار اور پسند کیا ہے وہی کسائی، فراء، اور اخفش کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الا بمشیئة الله۔ پس جب کوئی انسان کہے أنا أفعل هذا إن شاء الله تو اس کا معنی ہوتا ہے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ یہ کام کروں گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(2): اور ایک جماعت نے کہا ہے: اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ یہ قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَقُوْلَنَّ سے استثنا ہے۔ انہوں نے کہا: اس قول کو علامہ طبری نے بیان کیا ہے اور اس کا رد بھی کیا گیا ہے، اور یہ فساد میں سے ہے اس حیثیت سے یہ لازم ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ اور استثناء فی الیمین اور اس کے حکم کے بارے بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ اس میں ایک مسئلہ ہے، اور وہ ہے نسیان کے بعد ذکر کا امر اور مامور بہ کے ذکر میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا، محمد الکوفی مفسر نے کہا ہے: بے شک یہ اپنے الفاظ کے ساتھ ان میں سے ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے کہ ہر وہ انہیں کہے جو ان شاء اللہ نہ کہے، اور بلاشبہ یہ ان شاء اللہ بھول جانے کا کفارہ ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: یہ دعا ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے نہ کہ یہ تخصیص ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کا قول وہ ان شاء اللہ ہے جسے قسم کے وقت وہ بھول گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ بھول گیا پھر اسے یاد آ گیا اگرچہ سال بعد تو وہ حانث نہیں ہوا اگر وہ قسم اٹھانے والا تھا(4)، اور یہی حضرت مجاہد کا قول ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے اسے ابو العالیہ سے قول باری تعالیٰ: وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ کے تحت بیان کیا ہے۔ فرمایا: وہ ان شاء اللہ کہہ دے جب اسے یاد آ جائے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (وہ کہہ دے) جب تک وہ مجلس ذکر میں ہو(5)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دو سال (بعد تک کہہ سکتا ہے)؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: پس اسے گناہ سے خلاصی پانے کے لئے ان شاء اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے تدارک پر محمول کیا جائے گا۔ اور رہا وہ ان شاء اللہ کہنا جو حکماً مفید ہو تو وہ صرف متصل کہنا ہی صحیح ہوتا ہے۔ سدی نے کہا ہے: مراد ہر وہ نماز ہے جسے آدمی بھول جائے جب وہ اسے یاد آ جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ استثنا کرتا کہ تو

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 509　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509-508　3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509
4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

نہ بھولے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا ذکر کرو جب تک تم اسے بھول نہ جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے: جب تو کسی شے کو بھول جائے تو تو اس کا ذکر کر وہ تجھے اس کی یاد دلا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اس کا ذکر کر جب تو اس کے غیر کو بھول جائے یا تو اپنے آپ کو بھول جائے، پس وہی ذکر کی حقیقت ہے۔ اور اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اور اصح قول کے مطابق یہ استفتاح کلام (آغاز کلام) ہے، اور استثناء فی الیمین میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، اور یہ اس کے بعد آپ کی تمام امت کو عام ہے، کیونکہ یہ ایسا حکم ہے جو اپنے کثرت سے واقع ہونے کے سبب لوگوں میں متردد رہتا ہے۔ واللہ الموفق۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝

''اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے خبر ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں وَ قَالُوْا لبثوا ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بیشک بنی اسرائیل نے اس مدت میں اختلاف کیا جو مدت ان پر ان کے اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی مدت تک گزر چکی تھی، پس ان میں سے بعض نے کہا: بے شک وہ تین سو نو سال تک ٹھہرے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ یہ مدت ان کے سوئے رہنے کی ہے، اور وہ جو اس کے بعد ہے وہ آدمی کے لئے مجہول ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اس کا علم اس کی طرف لوٹا دے۔ (یعنی یہ کہ اس مدت کے بارے رب کریم بہتر جانتا ہے)۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اس بنا پر قول باری تعالیٰ میں پہلا لَبِثُوْا غار میں سونے کی مدت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور دوسرے لَبِثُوْا سے مراد اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی مدت تک کا بیان ہے، یا اس وقت تک جب تک وہ بوسیدہ ہو کر معدوم نہیں ہوئے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نزول قرآن کے وقت تک۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ان کے فوت ہونے کی مدت تک۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک جب فرمایا وَازْدَادُوْا تِسْعًا لوگوں کو معلوم نہ ہوا کہ یہ نو ساعتیں ہیں یا دن ہیں یا جمعے ہیں یا مہینے ہیں یا نو سال ہیں۔ اور بنی اسرائیل نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس نو کے بارے میں علم اپنی طرف لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا، پس یہ اس بنا پر مبہم ہے۔ اور ظاہر کلام عرب کے مطابق جو اس سے سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سال ہیں۔ اور ان کے معاملے میں سے ظاہر یہ ہے کہ وہ کھڑے ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تھوڑا بعد غار میں داخل ہوئے درآنحالیکہ حواریوں میں سے ابھی کچھ باقی تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: التسع سے نو راتیں اور نو ساعتیں نہیں سمجھی جاسکتیں اس لئے کہ اس سے پہلے سنین (سالوں) کا ذکر ہے، جیسا کہ تو کہتا ہے: عندی مائة درهم و خمسة (میرے پاس ایک سو درہم اور پانچ ہیں) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک سو پانچ درہم (یعنی پانچ سے مراد بھی درہم ہی ہیں)۔ اور ابو علی نے کہا ہے: وَازْدَادُوْا تِسْعًا یعنی ازدادوا لبث تسع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510

(انہوں نے ٹھہرنے میں نو زیادہ کیے) پس یہ (لبث) حذف کر دیا گیا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: جب آیت: وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ نازل ہوئی تو انہوں نے کہا: یہ تین سو سال ہیں یا مہینے ہیں یا جمعے ہیں (مراد ہفتے ہیں) یا دن ہیں تب الله تعالیٰ نے سِنِیْنَ نازل فرمایا(1) (یعنی یہ تین سو سال ہیں)۔ نقاش نے بیان کیا ہے: اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ دنوں کے حساب سے تین سو شمسی سال ٹھہرے رہے، کیونکہ جب یہاں عربی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی جا رہی ہے اور تسعًا (نو) کا ذکر کیا گیا ہے، تو آپ کے نزدیک سنین سے بھی قمری سال ہی سمجھے گئے اور یہ زیادتی وہ ہے(2) جو دو حسابوں (شمسی اور قمری سالوں) کے درمیان واقع ہے، اسی طرح غزنوی نے ذکر کیا ہے، یعنی شمسی سال اور قمری سال کے اختلاف کے سبب، کیونکہ ہر تینتیس سال اور ایک سال کے ثلث میں ایک سال کا فرق بنتا ہے پس تین سو سال میں نو سال کا فرق ہو جائے گا۔

اور جمہور نے ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ، مائۃ کو تنوین کے ساتھ اور سنین کو نصب کے ساتھ تقدیم و تاخیر کی بنا پر پڑھا ہے، ای سنین ثلثمائۃ پس صفت کو موصوف پر مقدم کیا گیا، تو اس بنا پر سِنِیْنَ بدل یا عطف بیان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تفسیر اور تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور سِنِیْنَ، سنۃ کے محل میں ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے، اور تنوین کو ترک کر دیا ہے، گویا انہوں نے سنین کو بمنزلہ سنۃ کے بنایا کیونکہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہ وہ اعداد ہیں جو مشہور روایت کے مطابق آحاد کی طرف مضاف ہوتے ہیں، جیسے ثلثمائۃ رجلٍ و ثوبٍ اور کبھی جمع کی طرف بھی مضاف ہوتے ہیں۔ اور مصحف عبدالله میں ثلثمائۃ سنۃ ہے(3)۔ اور ضحاک نے ثلثمائۃ سنون واؤ کے ساتھ قرآت کی ہے۔ اور ابو عمرو نے اس کے خلاف تَسْعًا کو تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(4)۔ اور فراء، کسائی اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ولبثوا فی کھفھم سنین ثلثمائۃ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝۲۶

"آپ فرمائیے: الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔"

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہا گیا ہے: الله تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اس مدت کے بارے میں جو ان کی موت کے بعد سے لے کر ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہونے تک ہے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی بنا پر ہے یا ان کے فوت ہونے تک کی مدت مراد ہے، یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یا بوسیدہ ہو کر ان کے متغیر ہونے کے وقت تک کی مدت مراد ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مدت کے بارے میں الله تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ غار میں ٹھہرے رہے۔ اور یہ وہ مدت ہے جس کا ذکر الله تعالیٰ نے یہود کی جانب سے کیا ہے اگرچہ انہوں نے زیادہ یا کم ذکر کی،

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 267 | 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510 | 3۔ ایضاً | 4۔ ایضاً

یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے سوا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا علم دیا ہے، اس کے بارے کوئی نہیں جانتا، لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کا علم غیب ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ یعنی وہ کتنا دیکھنے والا اور کتنا سننے والا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ سے زیادہ نہ کوئی دیکھنے والا ہے اور نہ سننے والا ہے۔ یہ ادراک سے متعلقہ عبارات ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اَبْصِرْ بِهٖ کا معنی ہو یعنی آپ دیکھیں اس کی وحی کے ساتھ اور اس کی راہنمائی کے ساتھ جو اس نے آپ کی طرف فرمائی اور آپ کو دلائل اور حجتیں عطا فرمائیں اور امور کے حقائق سے آپ کو آگاہ کیا، اور اسی کے ساتھ عالم کو سنائیں، تو اس صورت میں یہ دونوں امر کے صیغے ہوں گے نہ کہ یہ صیغہ تعجب ہوں گے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں دکھائیں اور انہیں وہ سنائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ یعنی اصحاب کہف کے لئے کوئی ولی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ان کی حفاظت کا ولی اور نگران ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ لَهُمْ کی ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمعصر کفار کی طرف لوٹ رہی ہو، اور اس کا معنی ہو: ان کے ٹھہرنے کی مدت میں ان اختلاف کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ولی نہیں جو ان کے معاملے کی تدبیر کرسکتا ہو، پس وہ اس سے زیادہ عالم کیسے ہوسکتے ہیں، یا اس کے انہیں سکھائے بغیر وہ اسے کیسے جان سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا اسے یا اور کاف کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر کے معنی پر ہے۔ اور ابن عامر، حسن، ابو رجا، قتادہ اور حجدری رحمہم اللہ تعالیٰ نے ولا تشرك تا کے ساتھ اور کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، اور اس کا قول ولا تشرك کا اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ پر عطف ہوگا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے یشرك یا اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب نے کہا ہے: میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

**مسئلہ**: اصحاب کہف کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ فوت ہوگئے اور فناہ ہوگئے، یا وہ سوئے پڑے ہیں اور ان کے جسم محفوظ ہیں، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنے کسی غزوہ میں لوگوں کے ساتھ اصحاب کہف کی جگہ اور ان کے پہاڑ کے پاس سے گزرے، تو لوگ آپ کی معیت میں اس کی طرف چل کر گئے تو انہوں نے وہاں ہڈیاں پائیں تو انہوں نے کہا: یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا: وہ تو ایسی قوم ہے جو طویل مدت سے فناہ اور معدوم ہوگئے ہیں، پس یہ بات ایک راہب نے سنی تو اس نے کہا: میں عربوں میں سے کسی کے بارے میں یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اسے جانتا ہو، تو اس کو بتایا گیا کہ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں۔ اور ایک گروہ نے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ضرور حج کریں گے اور ان کے ساتھ اصحاب کہف ہوں گے کیونکہ انہوں نے ابھی تک حج ادا نہیں کیا۔'' اسے ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ کہ آپ حج یا عمرہ کرنے کے لئے روحاء سے گزریں گے یا اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ان (دونوں) کو جمع کر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511

دے گا۔ پس اللہ تعالیٰ اصحاب کہف اور رقیم کو آپ کا حواری بنا دے گا، پس وہ حج کرتے ہوئے گزریں گے کیونکہ نہ انہوں نے حج کیا ہے اور نہ وہ فوت ہوئے ہیں اور ہم نے یہ روایت مکمل طور پر کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے۔ پس اس بنا پر تو وہ سوئے پڑے ہیں اور یوم قیامت تک نہیں مریں گے، بلکہ قیامت سے تھوڑا پہلے انہیں موت آئے گی۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝

''اور پڑھ سنایئے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے، کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا، اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کہا گیا ہے: یہ اصحاب کہف کے تمام قصہ کے بارے ہے، یعنی آپ قرآن کریم کی اتباع اور پیروی کریں پس اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے خلاف ہو سکتا ہے جو اس نے اصحاب کہف کے واقعہ کے بارے خبر دی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے جن کلمات کے ساتھ گنہگاروں اور اس کی کتاب کی مخالفت کرنے والوں کو وعید سنائی ہے (1) انہیں کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ اور آپ ہرگز نہیں پائیں گے مِنْ دُوْنِهٖ اس کے سوا (کوئی پناہ گاہ) اگر آپ نے قرآن کریم کی اتباع اور پیروی نہ کی اور آپ نے اس کی مخالفت کی۔ مُلْتَحَدًا یعنی پناہ گاہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے مائل ہونے کی جگہ۔ اور اس کی اصل المیل (مائل ہونا، جھکنا) ہے؛ اور یہ لجأت إلیہ سے ہے یعنی میں اس کی طرف مائل ہوا۔ (میں نے اس کے پاس پناہ لی۔) قشیری ابو نصر عبد الرحیم نے کہا ہے: یہ اصحاب کہف کے قصہ کا آخر ہے، جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روم کی طرف غزوۃ المضیق پر گئے اور آپ کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے پس وہ اس غار کے پاس جا کر رکے جس میں اصحاب کہف تھے، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ہمارے لئے انہیں ظاہر کر دیا جائے تو ہم انہیں دیکھ لیں، ان کی زیارت کر لیں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے روک دیا ہے جو آپ سے بہتر اور افضل ہے، اور ارشاد فرمایا: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) تو انہوں نے کہا: میں باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ میں ان کے بارے جان لوں اور اس کام کے لئے انہوں نے ایک جماعت بھیجی، پس جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ہوا بھیج دی تو اس نے انہیں باہر نکال دیا (2)، اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ وہ آپ کو ان کی زیارت کرائے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ آپ انہیں دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے بلکہ آپ اپنے اخیار صحابہ کرام میں سے چار کو ان کی طرف بھیجئے تاکہ وہ آپ کی رسالت کا پیغام ان تک پہنچائیں اور انہیں ایمان کی دعوت دیں: تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''میں انہیں کیسے بھیج سکتا ہوں؟'' تو انہوں نے کہا: آپ اپنی چادر بچھائیں اور اس کی اطراف میں سے ایک طرف

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 269
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 293، مفہوم

پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو، دوسری طرف پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور اس کی تیسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور چوتھی طرف پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیں، پھر اس نرم ہوا کو بلائیے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کی گئی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے حکم دے رہا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت اور پیروی کرے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ہوا انہیں اٹھا کر غار کے دروازے تک لے گئی، پس انہوں نے اس کا ایک پتھر اکھیڑ دیا تو کتے نے ان پر حملہ کر دیا لیکن جب اس نے انہیں دیکھا تو وہ اپنا سر اور اپنی دم ہلانے لگا اور ان کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا کہ داخل ہو جاؤ چنانچہ وہ غار میں داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو اللہ تعالیٰ نے ان جوانوں کی طرف ان کی ارواح کو لوٹایا اور وہ تمام کے تمام کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو انہوں نے ان کو کہا: اے جوانوں کے گروہ! بے شک نبی محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو سلام فرماتے ہیں اور انہوں نے کہا: اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی سلام ہو جب تک زمین وآسمان قائم ہیں، اور تم پر بھی اس کے عوض جو تم نے پیغام پہنچایا ہے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین قبول کر لیا اور وہ اسلام لے آئے، پھر انہوں نے کہا: ہماری طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام پیش کرنا، انہوں نے اپنے بستر لے لئے اور آخر زمانہ میں امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اپنی نیند میں ہو گئے۔ پس کہا جاتا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام انہیں سلام فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کر دے گا (بیدار کر دے گا) پھر وہ اپنی نیند کی طرف لوٹ جائیں گے اور پھر وہ قیامت قائم ہونے تک نہیں اٹھیں گے، پس حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ان کے متعلق تھا، پھر ہوا انہیں لوٹا لائی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے انہیں کیسے پایا ہے؟'' تو انہوں نے آپ کو پوری خبر سے آگاہ کیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: ''اے اللہ! میرے درمیان اور میرے اصحاب اور میرے سسرال کے درمیان تفریق نہ کرنا اور اسے بخش دے جس نے مجھ سے محبت کی اور میرے اہل بیت، میرے خواص اور میرے اصحاب کے ساتھ محبت کی (1)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اصحاب کہف حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے غار میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے بارے خبر دی پھر انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے درمیان زمانہ فترت میں اٹھایا گیا، بیدار کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات میں ان کا ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے بارے سوال کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد غار میں داخل ہوئے، پس ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھیئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام طلب گار ہیں اس کی رضا

1۔ عرائس المجالس، صفحہ 431

کے اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے، کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت، اور نہ پیروی کیجئے اس (بدنصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام: 52) (اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام) یہ سورۃ الانعام میں ہے اور اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مولفۃ قلوب آئے، یعنی عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس اور انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اگر آپ صدر مجلس میں تشریف رکھیں اور آپ ہم سے انہیں اور ان کے جبوں کی بو کو دور کریں..... مراد حضرت سلمان، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما اور مسلمان فقراء ہیں، وہ اون کے جبے پہنے ہوئے تھے اور ان پر ان کے سوا کچھ نہ تھا..... تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے ہیں اور آپ سے گفتگو کرتے ہیں اور آپ سے کچھ لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آگ سے ڈرا رہا ہے اور اس کی دھمکی دے رہا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تلاش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ جب آپ نے انہیں مسجد کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پایا تو کہا: ''سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے موت نہیں دی یہاں تک کہ مجھے حکم فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اپنی امت کے ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھوں، تمہارے ساتھ ہی جینا ہے اور تمہارے ساتھ ہی مرنا ہے۔''

(الحمد لله الذی لم یمتنی حتی أمرنی أن أصبر نفسی مع رجال من امتی، معکم المحیا و معکم الممات)(1)

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور نصر بن عاصم، مالک بن دینار، اور ابو عبدالرحمن نے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام: 52) پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ عام لوگوں میں واؤ کے ساتھ ہے۔ اور ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: یہ ان کے حیاۃ اور صلاۃ واو کے ساتھ لکھنے سے لازم نہیں آتا، اور نہ قریب قریب عرب الغدوۃ کہتے ہیں کیونکہ یہ معروف ہے۔ اور حسن سے روایت ہے وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ یعنی آپ کی آنکھیں ان کے سوا کی طرف تجاوز نہ کریں جو کہ دنیا کے بیٹے ہیں اور اس کی زینت کے طلبگار ہیں، اسے یزیدی نے بیان کیا ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کی آنکھیں انہیں حقیر نہ جانیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلان تنبو عنه العین یعنی فلاں کو حقیر جانتے ہوئے، آنکھ اس سے دور ہوگئی۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 272
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 302، بمفہوم

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی کیا آپ ان سرداروں کے ساتھ بیٹھنے کو زینت بخشیں گے جنہوں نے آپ کو اپنی مجلس سے فقراء کو دور ہٹانے کی تجویز دی ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کرنے سے منع کر دیا، تو یہ اس قول سے زیادہ نہیں ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرک سے محفوظ اور بچا کر رکھا ہے۔ اور تُرِيْدُ فعل مضارع حال کے محل میں ہے، یعنی آپ کی آنکھیں تجاوز نہ کریں درآنحالیکہ آپ ارادہ رکھتے ہوں۔ (لا تعد عيناك مريدا)۔

جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

فقلتُ له لا تبكِ عَيْنُك إنّما نحاول مُلْكا أو نموتَ فنُعْذَرا

اور بعض نے کہا ہے کہ اصل کلام یہ ہے: لا تعد عينيك عنهم (یعنی آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں) کیونکہ تعد بذات خود متعدی ہے۔ آپ کو کہا گیا ہے: وہ جس کے سبب رفع عینین کی آیت نازل ہوئی وہ دونوں میں معنی نصب کی طرف راجع ہے، کیونکہ لا تعد عيناك عنهم قائم مقام لا تنصرف عيناك عنهم کے ہے، تو لا تنصرفُ عيناك عنهم کا معنی ہے لا تنصرف عينيك عنهم، یعنی آپ کی آنکھیں ان سے نہ پھریں کا معنی ہے آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں؛ پس فعل کی نسبت عینین (آنکھوں) کی طرف کی گئی ہے اور یہ فی الحقیقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف توجہ کی گئی ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ (التوبہ: 55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال)۔ تو اس میں الاعجاب کی نسبت اموال کی طرف کی گئی ہے، اور اس کا معنی ہے: لا تعجبك يا محمد أموالهم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا مال آپ کو تعجب میں نہ ڈالے) اور آپ کے لئے مزید وضاحت زجاج کا قول کرتا ہے: بے شک اس کا معنی ہے آپ اپنی نگاہیں ان سے ان کے غیر کی طرف نہ پھیریں جو کہ صاحب حیثیت و زینت ہیں۔ (لا تصرف بصرك عنهم إلى غيرهم من ذوي الهيئات والزينة)

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جویبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ یہ ارشاد امیہ بن خلف جمحی کے بارے نازل ہوا، وہ اس لئے کہ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک ایسے امر کی دعوت دی جسے آپ نے ناپسند کیا اور وہ یہ کہ آپ فقراء کو اپنے آپ سے دور کر دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنے قریب کریں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا یعنی آپ اس کی پیروی نہ کریں جس کے دل پر ہم نے مہر لگا دی ہے اس سے کہ وہ توحید قبول کرے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے) یعنی شرک کرتا ہے(1)۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا اس تفریط سے ہے جس کا معنی تقصیر (کمی کرنا، کوتاہی کرنا) ہے اور ایمان ترک کرنے کے سبب عجز کو مقدم کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ افراط اور حد سے تجاوز کرنے سے ہے، اور اس قوم نے کہا تھا: ہم مضر کے

1۔ اسباب نزول، صفحہ 216، قدیمی کتب خانہ کراچی

اشراف اور سردار ہیں اگر ہم اسلام لے آئے تو بہت سے لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔ اور انہوں نے تکبر اور قول میں افراط اور زیادتی کے سبب یہ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا سے مراد شر میں واقع ہونا ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: فرط منه أمر یعنی معاملہ اس سے بڑھ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ کا معنی ہے ہم نے اسے غافل پایا، جیسا کہ تو کہتا ہے: لقیت فلانا فأحمدته، یعنی میں نے اسے محمود (قابل تعریف) پایا۔ اور عمرو بن معدیکرب نے بنی حارث بن کعب کو کہا: قسم بخدا! ہم نے تم سے مانگا اور تمہیں بخیل نہ پایا، اور ہم نے تمہارے ساتھ قتال کیا اور ہم نے تمہیں بزدل نہ پایا، اور ہم نے تمہیں جوش دلایا اور تمہیں خاموش نہ پایا (واللہ لقد سألناکم فما أبخلناکم و قاتلناکم فما أجبناکم و ھاجیناکم فما أفحمناکم یعنی ما وجدناکم بخلاء ولا جبناء ولا مُفحَمین) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن حصن فزاری کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، اور اسے نحاس نے حضرت سفیان ثوری سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۲۹

''اور فرمایئے: حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے، بے شک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لئے آگ، گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار نے۔ اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے چہروں کو یہ مشروب بڑا ناگوار ہے، اور یہ قرارگاہ بڑی تکلیف دہ ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اس میں اَلْحَقُّ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، ای قل ھو الحق۔ (فرمایئے وہ حق ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور اس کی خبر قول باری تعالیٰ مِنْ رَّبِّكُمْ ہے۔ اور آیت کا معنی ہے: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمایئے ان لوگوں کو جن کے دلوں کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے: اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے ہی حق ہے اور اسی کے پاس توفیق عطا کرنا اور رسوا کرنا ہے، اسی کے دست قدرت میں ہدایت دینا اور گمراہ کرنا ہے، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ ایمان لے آتا ہے اور وہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ کافر ہو جاتا ہے، اس میں سے میرے پاس کوئی شے نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ حق عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے اگرچہ وہ ضعیف اور کمزور ہو، اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے اگرچہ وہ طاقتور اور غنی ہو، اور میں تمہاری خواہش اور پسند پر مومنین کو نہیں بھگا سکتا (انہیں اپنے سے دور نہیں ہٹا سکتا) لہٰذا اگر تم چاہو تو ایمان قبول کرلو اور اگر چاہو تو کافر رہو۔ اور یہ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی اختیار دینا اور رخصت دینا نہیں، بلکہ یہ تو وعید اور جھڑک ہے، یعنی اگر تم نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے، اور اگر تم ایمان لے آئے تو تمہارے لئے جنت ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّآ اَعْتَدْنَا یعنی ہم نے تیار کر رکھی ہے۔ لِلظّٰلِمِیْنَ یعنی کفر کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کے لئے نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا علامہ جوہری نے کہا ہے: السُّرَادِقُ السرادقات کی واحد ہے وہ جو گھر کے صحن میں پھیلائے جاتے ہیں (خیمے، ٹینٹ) اور ہر وہ گھر جو روئی سے بنایا جائے وہی سرادق کہلاتا ہے۔

جیسا کہ رؤبہ نے کہا ہے:

یا حَکَمَ بنَ المنذر بن الجارُود سُرادِقُ المجد علیك مَمْدُوْدُ

کہا جاتا ہے: بیت مُسَرْدَقٌ۔ اور سلامہ بن جندل اَبرویز کا ذکر کرتا ہے اور اسے نعمان بن منذر نے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روند کر قتل کر دیا تھا۔

هو المُدْخِل النعمانَ بیتاً سماؤہ صُدُوْرُ الفیول بعد بَیْتٍ مُسَرْدَقٍ

ابن اعرابی نے کہا ہے: سُرَادِقُهَا اس (آگ) کی فصیل۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (1): آگ کی دیوار۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آگ سے ایک گردن سی نکلے گی اور وہ کفار کو باڑ کی طرح گھیر لے گی (2)۔ قتبی نے کہا ہے: السرادق سے مراد وہ رکاوٹ اور باڑ ہے جو خیمے کے ارد گرد لگائی جاتی ہے، اور یہی ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے دن کافروں کو گھیر لے گا (3)، اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المرسلات میں کیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ فرماتا ہے: اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ (المرسلات) (چلو اس سایہ کی طرف جو تین شاخوں والا ہے) اور ارشاد گرامی ہے: وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ (الواقعہ) (اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے)، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ سمندر ہے جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور یعلی بن امیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: البحر وہ جہنم ہے..... پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی..... نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا پھر فرمایا: قسم بخدا! میں اس میں کبھی داخل نہیں ہوں گا جب تک میں زندہ رہا اور نہ اس سے کوئی قطرہ مجھے پہنچے گا۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جہنم کے سرادق چار مضبوط اور موٹی دیواریں ہیں ہر دیوار چالیس برس کی مسافت کی ہے (4)'' اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے، اور کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح، غریب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وضاحت اس پر دلالت کرتی ہے کہ سرادق سے مراد وہ دھواں یا آگ، اور وہ دیواریں ہیں جن کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے جو کفار پر غالب آ جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المهل سے مراد گاڑھا پانی ہے جیسا کہ تیل کی تلچھٹ ہوتی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد پیپ اور خون ہے۔ حضرت

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 513 2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 564 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 303

4۔ جامع ترمذی، ابواب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ شراب اہل النار، جلد 2، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 2508، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کالے رنگ کا پانی ہے، بلاشبہ جہنم (تاریک) اور سیاہ ہے، اس کا پانی سیاہ ہے، اس کے درخت سیاہ ہیں اور اس کے باسی بھی سیاہ ہوں گے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: زمین کے جواہر میں سے ہر وہ شے جسے پگھلا دیا جائے مثلاً لوہا، سیسہ، تانبہ اور قذویر (ایک دھات) اور وہ ابلنے کے سبب کھول رہی ہو، تو وہی مہل ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: مراد وہ ہے جس کی گرمائش اور حرارت انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور کہا ہے کہ المھل تارکول کی ایک قسم ہے، کہا جاتا ہے: مَھلت البعیر فھو ممھول (میں نے اونٹ پر تارکول ملا تو وہ تارکول والا ہو گیا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زہر ہے۔ اور ان تمام اقوال میں معنی قریب قریب ہے۔ اور ترمذی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: کَالْمُهْلِ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے پس جب کوئی اسے اپنے چہرے کے قریب کرے گا تو اس کے چہرے کی چمک اور رونق ختم ہو جائے گی (1)''۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: اس حدیث کو ہم صرف رشدین بن سعد کی حدیث سے پہچانتے ہیں اور رشدین اپنی قوت حفظ کے اعتبار سے متکلم فیہ راوی ہے۔ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ (ابراہیم) (پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا۔) کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اسے اس کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اسے ناپسند کرے گا پس جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو یہ اس کے چہرے کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال بالوں سمیت ادھڑ جائے گی اور جب وہ اسے پیئے گا تو یہ اس کی آنتوں کو کاٹ دے گا یہاں تک کہ اس کی دبر سے نکل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾ (محمد) (اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو)۔ مزید فرماتا ہے: وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور اس پر کہ یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح اہل لغت نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ صحاح میں ہے المھل سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: المھل سے مراد پگھلایا ہوا سیسہ ہے۔ اور ابو عمرو نے کہا ہے: المھل سے مراد تیل کی تلچھٹ ہے۔ اور المھل سے مراد پیپ بھی ہے، اور حضرت ابو بکر کی حدیث میں ہے: تم مجھے میرے انہی دو کپڑوں میں دفن کرنا کیونکہ یہ دونوں مہل اور مٹی کے لئے ہیں۔ اور مُرْتَفَقًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (3): اس کا معنی ہے مجتمعا (جمع کیا ہوا)، گویا آپ مرافقت کے معنی کی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد منزل (ٹھکانا) ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اس کا معنی قرارگاہ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مھادًا (بچھونا) ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: مراد مجلس (بیٹھنے کی جگہ) ہے۔ اور یہ تمام معنی باہم متقارب ہیں، اور اس کی اصل المتکا (وہ شے جس سے ٹیک لگائی جائے) ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: ارتفقت

1۔ جامع ترمذی، ابواب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ شرب اہل النار، جلد 2، صفحہ 82

2۔ ایضاً۔ ایضاً، باب صفۃ شراب اہل النار، حدیث نمبر 2504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 514

یعنی میں نے کہنی پر ٹیک لگائی۔

شاعر نے کہا ہے:

قالت له وارتفقتْ ألاَفتَى یسوق بالقوم غزالاتِ الضُحا

اور کہا جاتا ہے: ارتفق الرجل جب آدمی اپنی کہنی پر سوئے اسے نیند نہیں آتی۔

ابوذویب ہذلی نے کہا ہے:

نامَ الخلیّ و بِتُّ اللیل مُرْتَفِقا کأن عَیْنِی فیھا الصَّاب مَذْبُوحُ(1)

اور الصاب سے مراد کڑوے درخت کا نچوڑ اور جوس ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لئے ہیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہو گا تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں مرصع پلنگوں پر کتنا اچھا ہے یہ اجر، اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ۔''

جب اللہ تعالیٰ نے اس ذلت و رسوائی کا ذکر کیا جو اس نے کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے تو پھر اس اجر و ثواب کا بھی ذکر کیا جو اس نے مومنوں کے لئے تیار کیا ہے۔ اور اس کلام میں اضمار ہے؛ یعنی لا نضیع أجر من أحسن منهم عملا، فأما من أحسن عملا من غیر المؤمنین فعمله محبط۔ (ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو ان میں سے اچھا کام کرتا ہے اور رہا وہ جو مومنوں کے سوا کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا عمل ضائع اور رائیگاں چلا جاتا ہے۔) اور عَمَلًا تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر تو چاہے تو اس پر اَحسن کو واقع کر کے اسے نصب دے دے۔ اور کہا گیا ہے کہ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا کلام معترض ہے، اور خبر قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ ہے۔ اور جَنّٰتُ عَدْنٍ جنت کے درمیان میں ہے اور باقی تمام جنات اس کے اردگرد ہیں۔ اور اس کی وسعت کے سبب اسے لفظ جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا ہر حصہ اور ٹکڑا جنت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: العدن کا معنی اقامت اختیار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمکان

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

جب وہ اس جگہ اقامت اختیار کر لے۔ اور عَدَنْتَ البلد میں نے شہر کو وطن بنالیا۔ عَدَنَتِ الإبِلُ بمکان کذا یعنی اونٹ نے اسے لازم پکڑ لیا پس وہ مسلسل وہاں رہا۔ اور اسی سے جَنّٰتُ عَدۡنٍ یعنی جنات اقامة ہے۔ اور اسی سے معدن (دال کے کسرہ کے ساتھ) نام رکھا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس میں موسم گرما اور موسم سرما میں مقیم ہوتے ہیں۔ اور ہر شے کا مرکز اس کا معدن ہوتا ہے۔ اور العادن وہ اونٹنی ہے جو چراگاہ میں مقیم ہو اور عدن شہر بھی ہے؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ کئی مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ اس میں اساوِر سِوار کی جمع ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک تین کنگن پہنے ہوگا: ایک سونے کا ہوگا، ایک چاندی کا ہوگا، اور ایک موتیوں کا ہوگا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، یہاں فرمایا: مِنۡ ذَہَبٍ سونے کا اور سورۃ الحج اور فاطر میں فرمایا: مِنۡ فِضَّةٍ (چاندی کا) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، میں نے اپنے خلیل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو (کا پانی) پہنچتا ہے (2)''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور فراء نے بیان کیا ہے: یحلون یہ یا کے فتحہ، حا کے سکون، اور لام کے فتحہ خفیفہ کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے: حَلِیَت المرأۃ تَحۡلیٰ فھی حالیة جب عورت زیور پہن لے۔ اور حَلِیَ الشیءُ بعینی یَحۡلیٰ (چیز میری آنکھوں میں بھلی معلوم ہوئی)؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور السّوار سے مراد عورت کے کنگن ہیں۔ اور اس کی جمع أسورۃ اور الجمع أساورۃ ہے۔ اور فَلَوۡ لَاۤ اُلۡقِیَ عَلَیۡہِ اَسۡوِرَۃٌ مِّنۡ ذَہَبٍ (الزخرف: 53) بھی پڑھا گیا ہے اور کبھی جمع أساور آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور عزیز نے کہا ہے: أساور أسورۃ کی جمع ہے، اور أسورۃ سِوار اور سُوار کی جمع ہے، اور یہ سونے کا وہ زیور ہے جو بازوؤں میں پہنا جاتا ہے، اور اگر یہ چاندی کا ہو تو پھر یہ قُلۡب کہلاتا ہے اور اس کی جمع قِلَبَة ہے، اور اگر یہ سینگ یا ہاتھی دانت وغیرہ کا بنا ہوا ہو تو پھر یہ مَسَکَة کہلاتا ہے اور اس کی جمع مَسَك ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور قطرب نے الأساور کی واحد میں أسوار ذکر کیا ہے، اور قطرب شذوذ بیان کرنے والے ہیں، یعقوب وغیرہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اور اسے ذکر نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق صحاح میں ہے اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: اس کی واحد اِسوار ہے۔ اور مفسرین نے کہا ہے: جب بادشاہ دنیا میں کنگن اور تاج پہنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل جنت کے لئے بنا دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ، السندس سے مراد باریک اور کمزور ریشم ہے۔ اس کا واحد سندسة ہے؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور الاستبرق سے مراد موٹا ریشم ہے، یہ عکرمہ سے منقول ہے۔ اور یہ ریشم ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

تراهن یلبسن المشاعر مَرّة　　واستبرقُ الدیباج طورًا لباسُها (3)

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 565　2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، فضل اسباغ الوضوء علی المکارہ، جلد 1، صفحہ 127

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

پس استبرق سے مراد الدیباج (ریشم) ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: وہ جو سونے کی تاروں کے ساتھ بنا گیا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: یہ لفظ فارسی سے معرب ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اس کی تصغیر اُبَیْرِق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ البریق سے باب استفعال ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں لغتوں کے ساتھ موافقت رکھتا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو لغت عرب میں نہ ہو۔ جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور خاص طور پر سبز لباس کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نگاہوں کے موافق ہوتا ہے، کیونکہ سفید نظر کو بکھیر دیتا ہے، متفرق کر دیتا ہے اور درد پہنچاتا ہے۔ اور سیاہ رنگ کی مذمت کی گئی ہے، اور سبز رنگ سفید اور سیاہ کے درمیان درمیان ہوتا ہے، اور یہ شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نسائی نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے جب کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں جنت کے کپڑوں کے بارے میں بتایئے، کیا وہ مخلوق ہے جسے پیدا کیا جائے گا یا بنا ہوا ہے جسے بنا جائے گا؟ تو بعض لوگ ہنس پڑے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فرمایا: ''تم اس جاہل سے کیوں ہنس رہے ہو جو عالم (جاننے والے) سے سوال کر رہا ہے؟'' پس آپ تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے کپڑوں کے بارے سوال کرنے والا کہاں ہے؟'' تو اس نے عرض کی: یہ ہوں میں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؛ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ ان سے جنت کا پھل کٹ جائے گا''۔ آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو درمیان سے خالی ہوگا اس کے درمیان ایک درخت ہے جو حلے اگاتا ہے اور آدمی ایک انگلی کے ساتھ یا فرمایا اپنی دو انگلیوں کے ساتھ ستر حلے پکڑ سکے گا درآنحالیکہ وہ موتیوں اور مرجان کے ساتھ آراستہ ہوں گے، یہ یحییٰ بن سلام نے اپنی تفسیر میں اور ابن مبارک نے اپنی رقائق میں ذکر کیا ہے۔ اور ہم نے اس کی اسناد کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے۔ اور حدیث میں مذکور ہے کہ ان میں سے ہر پر ایک حلہ ہوگا اس کے دو منہ ہوں گے ہر منہ کا ایک رنگ ہوگا، وہ دونوں آواز کے ساتھ گفتگو کریں گے جسے سننے والا انتہائی مستحسن قرار دیگا، دونوں چہروں میں سے ایک دوسرے کو کہے گا: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور تو اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں اور تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ، الأرائك، أريكة کی جمع ہے۔ اور ان سے مراد وہ پلنگ ہیں جو حجلہ عروسی میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ قالینیں ہیں جو حجلہ عروسی میں بچھی ہوتی ہیں، یہ زجاج نے کہا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ سونے کا پلنگ ہے، اور اسے حجلہ عروسی میں یاقوت اور موتیوں کے ساتھ مرصع اور آراستہ کیا جاتا ہے، الأريكة (ایک پلنگ) اتنا ہوگا جتنا صنعاء سے ایلہ تک کا سفر ہے اور جتنی عدن سے لے کر جابیہ تک کی مسافت ہے۔ اور متکئین کی اصل مُوتَکئین ہے، اور اسی طرح اتکأ اصل میں اوتکأ ہے، اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

التُّکَاۃ کی اصل وُکَاۃ ہے، اور اسی سے التوکاٗ کسی شے پر سہارا اور ٹیک لگانا، پس واؤ کو تا سے بدلا گیا اور پھر ادغام کر دیا گیا۔ اور رجل وُکَاۃٌ بہت زیادہ ٹیک لگانے والا آدمی نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا یعنی جنات کتنا اچھا اجر اور کتنی اچھی آرامگاہ ہے، اور یہ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا کا عکس ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور اگر یہ نِعْمَتْ ہوتا تو بھی جائز ہوتا کیونکہ یہ جنت کا نام ہے۔ اور اسی بنا پر وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میدان عرفات میں اپنی ناقہ عضباء پر کھڑے تھے تو اس نے عرض کی: بلاشبہ میں مسلمان آدمی ہوں سو آپ مجھے اس آیت کے بارے آگاہ فرمائیے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیہ (البقرہ: 227) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان سے دور نہیں ہے اور نہ وہ تجھ سے دور ہیں وہ یہ چاروں یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں پس تو اپنی قوم کو یہ بتا کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)، اور نحاس نے اسے کتاب ''معانی القرآن'' میں مسند بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمیں ابو عبداللہ احمد بن علی بن سہل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن حمید نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں یحییٰ بن ضریس نے زہیر بن معاویہ سے انہوں نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: ایک اعرابی کھڑا ہوا، اور اسے مکمل ذکر کیا۔ اور سہیلی نے اسے ''کتاب الاعلام'' میں مسند بیان کیا ہے۔ اور ہم نے ان تمام کو بالاجازۃ روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

**وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾**

''اور بیان فرمائیے ان کے لئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیئے تھے ان دونوں میں سے ایک کو دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنا دی ان دونوں کے اردگرد کھجور (کے درختوں) کی اور اگا دی ان دونوں کے درمیان کھیتی۔ یہ دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کر دیں ان کے درمیان نہریں۔ اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے، تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں۔''

قولہ تعالیٰ: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ یہ مثال ہے اس آدمی کے لئے جو دنیا کے ساتھ عزت حاصل کرتا ہے اور مومنین کے ساتھ بیٹھنا ناپسند کرتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ کے ساتھ متصل ہے۔ اور ان دونوں آدمیوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

کے نام اور ان کی تعیین میں اختلاف ہے، پس کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اہل مکہ میں سے دو مخزومی بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان میں سے ایک مومن تھا اور وہ حضرت ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم تھے۔ ام سلمہ کے خاوند نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا تھا۔ اور دوسرا کافر تھا اور وہ اسود بن عبدالاسد تھا(1)، ان دونوں بھائیوں کا ذکر سورہ الصافات میں اس قول باری تعالیٰ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝ (الصافات) کے تحت کیا گیا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کو چار ہزار دینار وراثت میں ملے تھے، پس ان میں سے ایک نے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا اور اس نے اپنے بھائی سے کسی شے کا مطالبہ کیا تو پھر اس نے کہا جو کہا............: اسے ثعلبی اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والے تمام لوگوں اور کفر کرنے والے تمام لوگوں کی مثال ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ عیینہ بن حصن اور اس کے ساتھیوں کی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مثال کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے وہ دونوں بھائی تھے ان میں سے ایک مومن تھا اور اس کا نام یہوذا تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ہے۔ اور حضرت مقاتل نے کہا ہے: اس کا نام تملیخا تھا، اور دوسرا کافر تھا(2) اور اس کا نام قرطوش تھا۔ اور یہی وہ دونوں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح محمد بن حسن مقری نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ان دونوں میں سے جو نیک اور اچھا تھا اس کا نام تملیخا، اور دوسرے کا نام قرطوش تھا، اور یہ دونوں شریک تھے پھر انہوں نے مال تقسیم کر لیا تو ہر ایک کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے، پس ان میں سے مومن نے ایک ہزار کے غلام خریدے اور انہیں آزاد کر دیا، اور دوسرے ہزار کے عوض کپڑے خریدے اور ننگوں کو پہنا دیئے، اور تیسرے ہزار کے عوض طعام خریدا اور بھوکوں کو کھلا دیا، اور مساجد بھی بنائیں اور نیکی اور خیر کا عمل کیا۔ اور رہا دوسرا تو اس نے اپنے مال کے عوض خوشحال اور مالدار عورتوں سے نکاح کیا اور چوپائے اور گائیں وغیرہ خریدیں اور ان سے ان کے بچے حاصل کئے تو اس طرح ان میں اس کے لئے خوب اضافہ ہو گیا، اور باقی ماندہ مال کے ساتھ اس نے تجارت کی اور اس سے نفع حاصل کیا یہاں تک کہ مال و دولت میں اپنے ہمعصروں سے سبقت لے گیا۔ اور پہلے آدمی کو کوئی حاجت پیش آ گئی، تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی باغ میں خدمت کے لئے خدمت پر دے دے کہ وہ اس کی خدمت کرتا رہے گا۔ تو اس نے کہا: اگر میں اپنے شریک اور اپنے ساتھی کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ مجھے اپنے کسی باغ میں خدمت کے لئے اجرت پر رکھ لے تو مجھے امید ہے کہ وہ میرے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو گا، چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو موٹے پردوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے وہ اس تک نہ پہنچ سکا، لیکن جب وہ اس پر داخل ہوا از راہ اسے پہچانا اور اپنی حاجت اور ضرورت کا اس کے سامنے ذکر کیا تو اس نے اسے کہا: کیا میں نے تجھے مال نصف نصف کر کے دے نہیں دیا تھا، تو تو نے اپنے مال کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا: میں نے اس کے عوض اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ خرید لیا ہے جو اس سے بہتر اور اچھا ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 566 2۔ ایضاً

اس نے کہا: کیا تو یقینی تصدیق کرنے والوں میں سے ہے، میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے اور میں تجھے تو فقط احمق اور بے وقوف دیکھ رہا ہوں، اور میرے پاس تیری سفاہت اور بے وقوفی کی جزا سوائے محرومی اور پشیمانی کے اور کچھ نہیں، کیا تو دیکھتا نہیں جو کام میں نے اپنے مال کے ساتھ کیا یہاں تک کہ میں اس خوشحالی اور دولتمندی تک پہنچ گیا ہوں جو تو دیکھ رہا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ میں نے کمایا اور تو نے بے قوفی کی تو میرے پاس سے نکل جا۔ پھر اس غنا اور دولتمندی کے قصہ میں سے وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے کہ اس کے پھل کا احاطہ کیا اور اسے بالکل تباہ کر دیا اس عذاب کے ساتھ جو آسمان سے اس پر بھیجا گیا۔ اور ثعلبی نے یہ قصہ دوسرے لفظوں میں ذکر کیا ہے، اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں قریب قریب ہیں۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: وہ دونوں شریک تھے اور ان کے آٹھ ہزار دینار تھے۔ اور کہا گیا ہے: وہ دونوں اپنے باپ کی طرف سے اس کے وارث بنے تھے اور وہ دونوں بھائی تھے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا، تو ان میں سے ایک نے ایک ہزار کے بدلے زمین خرید لی، تو اس کے ساتھی نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں زمین خریدتا ہوں پس اس نے وہ صدقہ کر دیئے، پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا تو اس نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں، پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک عورت کے ساتھ شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کئے، تو اس نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض ایک عورت سے شادی کی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار کے عوض جنت کی عورتوں کا رشتہ طلب کرتا ہوں، اور پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک ہزار دینار کے بدلے خدام اور ساز و سامان خریدا ہے، اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت کا ساز و سامان اور خادم خریدتا ہوں، چنانچہ ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ پھر اسے کوئی شدید حاجت پیش آ گئی تو اس نے کہا: شاید میرا ساتھی میرے ساتھ نیکی کرے گا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو اس نے کہا: تیرے مال کو کیا ہوا ہے؟ تو اس نے اسے سارے واقعہ کی خبر دی تو اس نے کہا: بلاشبہ تو تصدیق کرنے والوں میں سے ہے اس بات کے بارے، قسم بخدا! میں تجھے کوئی شے نہ دوں گا۔ پھر اس نے اسے کہا: تو آسمان والے خدا کی عبادت کرتا ہے، اور میں صرف بت کی پرستش کرتا ہوں، تو اس کے ساتھی نے کہا: قسم بخدا! میں یقیناً اسے نصیحت کروں گا، پس اس نے وعظ و نصیحت کی، اور اسے یاد دلایا اور اسے خوفزدہ کیا۔ تو اس نے کہا: ہمارے ساتھ چل ہم مچھلی کا شکار کریں گے۔ پس جس نے زیادہ پکڑ لیں تو وہ حق پر ہوگا، تو اس نے اسے کہا: اے میرے بھائی! بے شک دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت حقیر ہے اس سے کہ وہ اسے نیکی اور احسان کرنے والے کے لئے اجر و ثواب بنائے یا کافر کے لئے سزا۔ اس نے کہا: تو میں اس کے ساتھ نکلنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ابتلا میں ڈال دیا، پس کافر اپنا جال پھینکتا ہے اور ساتھ اپنے بت کا نام لیتا ہے۔ تو اس میں اچھلتی کودتی مچھلیاں آ جاتی ہیں، اور مومن اپنا جال پھینکتا ہے اور اس پر وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے تو اس کے لئے اس میں کوئی شے نہیں آتی، تو اس نے اس کو کہا: تو دیکھ رہا ہے! میں دنیا میں اپنے حصہ، مرتبہ اور افرادی قوت کے اعتبار سے تجھ سے زیادہ ہوں، اسی طرح

میں آخرت میں بھی تجھ سے افضل ہوں گا۔ اگر جو تو کہہ رہا ہے تیرے خیال کے مطابق وہ حق ہے، پس وہ فرشتہ جوان دونوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا اس نے شور مچایا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اسے پکڑ لے اور اسے جنتوں کی طرف لے جائے اور اس میں اسے مومن کے مراتب اور گھر دکھائے پس جب اس نے دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا ہے تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نقصان نہیں دے گا جو کچھ اس نے دنیا میں پالیا ہے اس کے بعد کہ اس کا انجام اور ٹھکانہ یہ ہے، اور اس نے اسے جہنم میں کافر کی منازل بھی دکھائیں تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نفع نہیں دے گا جو کچھ دنیا میں اسے حاصل ہوا ہے اس کے بعد کہ اس کا ٹھکانہ یہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مومن کو موت دے دی اور کافر کو اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا، پس جب مومن نے جنت میں اقامت اور ٹھکانا حاصل کر لیا اور وہ کچھ دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا تھا تو وہ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ بس فرمایا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ الآیہ۔ (الصافات) (کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا وہ (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں سے ہے۔) تو ایک ندا دینے والے نے ندا دی: اے اہل جنت! کیا تم جھانک رہے ہو پس وہ جہنم کی طرف جھانکا اور اسے سواء الجحیم میں دیکھ لیا، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا الآیہ (اور بیان فرمایئے ان کے لئے مثال)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دو بھائیوں کا حال اس سورت میں بیان کیا، اور آخرت میں دو کا حال سورۃ الصافات میں اپنے اس قول میں بیان کیا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ ...... تا قولہ ...... لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ (الصافات) ابن عطیہ نے کہا ہے(1): اور ابراہیم بن قاسم الکاتب نے اپنی کتاب فی عجائب البلاد میں ذکر کیا ہے کہ بحیرۂ تِنیس یہ دو باغ تھے، اور یہ دو بھائیوں کے تھے تو ان میں سے ایک نے اپنا حصہ دوسرے کو بیچ دیا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اسے خرچ کر دیا یہاں تک کہ دوسرے نے اسے عار دلائی، اور ان دونوں کے درمیان گفتگو چلتی رہی تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں اسے غرق اور تباہ کر دیا، اور وہی اس آیت سے مراد لیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے: بے شک یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے بیان فرمائی ہے، یہ کسی سابقہ حالت کی خبر نہیں ہے، اور اسے زجر و توبیخ اور ڈراوا بنایا ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، لیکن سیاق آیت اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ یعنی ہم نے ان دونوں کو اطراف سے کھجور کے درختوں کے ساتھ گھیر دیا ہے اور الحِفاف کا معنی طرف اور جانب ہے، اور اس کی جمع اَحِفّة ہے؛ اور کہا جاتا ہے: حفَّ القوم بفلان یَحُفُّوْنَ حَفًّا، یعنی انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اور اسی سے حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (الزمر: 75) (حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد) ہے۔ وَجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا یعنی ہم نے انگوروں کے اردگرد کھجور کے درخت اگا دیئے، اور انگوروں کے درمیان میں کھیتی اگا دی۔ كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ یعنی دونوں باغوں میں سے ہر ایک اٰتَتْ اُكُلَهَا مکمل پھل لایا، اسی لئے آتتا نہیں کہا۔ اور لفظ کِلْتا اور کِلا میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 515

اختلاف ہے کیا یہ مفرد ہیں یا تثنیہ؟ پس اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ مفرد ہیں، کیونکہ کِلا اور کِلتا دونوں تثنیہ کی تاکید کے لئے ہیں جیسا کہ جمع میں تاکید کے لئے کُلٌّ ہے اور یہ اسم مفرد ہے تثنیہ نہیں ہے، پس جب اس کے بعد اسم ظاہر ہو تو حالت رفعی، نصبی اور جری میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے۔ تو کہتا ہے: رأیت کِلا الرجلین و جاء نی کِلا الرجلین اور مررتُ بِکلا الرجلین اور جب اس کے ساتھ ضمیر متصل ہو تو حالت نصبی اور جری میں الف کو یا سے بدل دیا جاتا ہے، جیسے تو کہتا ہے: رأیت کِلَیْھما اور مررت بِکلیھما، جیسے تو علیھما کہتا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ اسم تثنیہ ہے، اور یہ کُلّ سے ماخوذ ہے پس لام کو مخفف کیا گیا اور الف تثنیہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اسی طرح کلتا مونث کے لئے آتا ہے، اور یہ دونوں استعمال نہیں ہوتے مگر مضاف ہو کر اور واحد کے ساتھ کلام نہیں کی جاتی، اور اگر اس کے ساتھ کلام کی جائے تو کہا جائے گا: کِلٌ و کِلْت اور کِلان و کِلتان۔

اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے:

فی کِلْتِ رجْلیھا سُلامی واحدَۃٌ کِلتاھما مَقْرونۃٌ بزائدہ

اس میں شاعر نے اس کے دو پاؤں میں سے ایک کا ارادہ کیا ہے پس اسے مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اہل بصرہ کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اگر یہ تثنیہ ہوتا تو پھر یہ واجب تھا کہ اس کا الف حالت نصبی اور جری میں اسم ظاہر کے ساتھ یا ہو جاتا، اور اس لئے بھی کہ کِلا کا معنی کُلٌّ کے معنی کے خلاف ہے کیونکہ کُلٌّ احاطہ کے لئے آتا ہے اور کِلا مخصوص شے پر دلالت کرتا ہے، اور رہا یہ شاعر تو اس نے ضرورت شعری کے تحت الف کو حذف کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے، اور جو چیز ضرورت کے تحت ہوتی ہے اس کو حجت بنانا جائز نہیں ہوتا، پس یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اسم مفرد ہے جیسا کہ کِمعی مگر اسے وضع کیا گیا ہے کہ یہ تثنیہ پر دلالت کرے، جیسا کہ ان کا قول نَحْنُ اسم مفرد ہے لیکن دو اور اس سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے۔

اس پر جریر کا قول دلالت کرتا ہے:

کِلا یومَیْ أمَامَۃَ یومُ صَدّ وإن لم نأتھا إلّا لِمامَا

پس کِلا سے مفرد یوم کی خبر دی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول: آتت کے ساتھ مفرد کی خبر دی ہے اور اگر تثنیہ ہوتا تو کہتا آتتا، ویوماً اور کِلْتَا کے الف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ پس سیبویہ نے کہا ہے: کِلْتَا کا الف تانیث کے لئے ہے اور تا فعل کے لام کلمہ کا بدل ہے اور وہ واو ہے اور یہ اصل میں کِلوا ہے، بے شک واؤ کو تا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ تا میں تانیث کی علامت ہے، اور کِلتا میں الف مضمر کے ساتھ ملنے سے یا ہو جاتا ہے پس وہ تانیث کی علامت سے نکل جاتا ہے، پس واؤ کو تا سے بدلنے میں تانیث کے لئے تاکید ہو گئی، اور ابو عمرو الجرمی نے کہا ہے: اس میں تا ملحق ہے اور الف لام الفعل ہے، اور ان کے نزدیک اس کی تقدیر فِعْتَلْ ہے، اگر معاملہ اس طرح ہو جیسے انہوں نے گمان کیا ہے تو پھر وہ اس کی نسبت میں کِلْتَوِیٌ کہتے، اور جب انہوں نے کِلَوِیٌّ کہا اور تا کو ساقط کر دیا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے اسے اس تا کے قائم مقام قرار دیا ہے جو اُخت میں ہے جب تو اس کی طرف نسبت کرتا ہے تو کہتا ہے اَخَوِیٌ، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اور نحویوں نے قرآن کے علاوہ میں معنی پر محمول کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے کہ تو کہے: کلتا

الجنتین آتتا أکلھما، کیونکہ معنی مختار کلتا ھما آتتا ہے۔ اور فراء نے کلتا الجنتین آتی أکلہ کہنا بھی جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس کا معنی کل الجنتین (دو باغوں میں سے ہر ایک) ہے۔ اور کہا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں کل الجنتین آتی أکلہ ہے۔ (دو باغوں میں سے ہر ایک اپنا پھل لایا) اس بنا پر فراء کے نزدیک اس کا معنی ہے: کل شئ من الجنتین آتی أکلہ۔ (دو باغوں میں سے ہر شے اپنا پھل لائی) اور الأکُل (ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ) سے مراد کھجور کے درخت اور دیگر درختوں کا پھل ہے۔ اور ہر وہ شے جو کھائی جاتی ہے وہی اُکل ہے، اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: اُکُلُهَا دَآئِمٌ (جنت کے پھل دائمی ہیں) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا یعنی اس سے کوئی چیز کم نہیں ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا یعنی ہم نے دونوں باغوں کے درمیان کو شق کیا اور نہر جاری کر دی وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ابو جعفر، شیبہ، عاصم، یعقوب اور ابن ابی اسحاق نے ثَمَرٌ ثا اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الثمرۃ، الثمر اور الثمرات کی واحد ہے، اور الثمر کی جمع ثمار ہے جیسا کہ جبل کی جمع جبال ہے۔ فراء نے کہا ہے: ثمار کی جمع ثُمُر ہے؛ جیسا کہ کتاب کی جمع کتب ہے، اور الثمر کی جمع أثمار ہے مثلاً عنق کی جمع اعناق ہے۔ اور الثمر سے مراد المال الثمر (نفع بخش مال) بھی ہے اس میں میم مخفف اور مثقل دونوں طرح ہے۔ اور ابو عمرو نے کان لہ ثُمْر ثا کو ضمہ اور میم کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کی تفسیر انواع المال (طرح طرح کا مال) کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد سونا، چاندی اور دیگر اموال ہیں، سورہ الانعام میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

اور نحاس نے ذکر کیا ہے: احمد بن شعیب نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عمران بن بکار نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں ابراہیم بن علاء زبیری نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں شعیب بن اسحاق نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا [ہمیں خبر دی ہے] ہارون نے انہوں نے کہا مجھے اَبان نے ثعلب سے انہوں نے اعمش سے بیان کیا ہے کہ حجاج نے کہا ہے: اگر تو کسی کو دیکھے کان لہ ثُمُر پڑھتے ہوئے سنے تو تو اس کی زبان کاٹ دے، تو میں نے اعمش کو کہا: کیا تو اسے پکڑ سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ولا نُعْمَۃَ عَیْن (اور آنکھ جیسی کوئی نعمت نہیں ہے) اور وہ ثُمُر پڑھتے تھے اور اسے الثمر کی جمع بناتے تھے۔ نحاس نے کہا ہے: پس اس قول کی بنا پر تقدیر یہ ہے کہ یہ ثمرۃ کی جمع ثمار ہے، اور پھر ثمار کی جمع ثُمُر ہے، اور عربی میں یہی احسن ہے مگر پہلا قول زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیونکہ قول باری تعالیٰ: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اس کا پھل ہے۔ قولہ تعالیٰ: فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ یعنی وہ اس کے ساتھ کلام میں سوال و جواب کرنے لگا۔ (بحث و مباحثہ کرنے لگا) اور المحاورۃ بمعنی المجاوبۃ (ایک دوسرے کو جواب دینا) ہے اور التحاور بمعنی التجاوب (باہم گفتگو کرنا) ہے، اور کہا جاتا ہے: کلمتہ فما أحار إلیّ جوابا، و ما رجع إلیّ حَوِیرا ولا حَوِیرۃ ولا مَحُورۃ و لا حوارًا؛ یعنی میں نے اس کے ساتھ کلام کی اور اس نے کوئی جواب نہ لوٹایا۔ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا، النفر سے مراد وہ جماعت ہے جو دس سے کم ہو۔ اور یہاں اس سے مراد

اتباع کرنے والے، خدام اور بچے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿35﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿36﴾

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ (یہ سرسبز و شاداب) باغ کبھی برباد ہوگا۔ اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی۔ اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ کہا گیا ہے: اس نے اپنے مومن بھائی کا ہاتھ پکڑا اور اسے باغ میں گھمانے لگا اور اسے وہ دکھانے لگا۔ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ درآنحالیکہ وہ اپنے کفر کے سبب اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، اور یہ جملہ حال کے محل میں ہے۔ اور جس نے اپنے آپ کو کفر کے سبب جہنم میں ڈال دیا تو وہ اپنے ساتھ ظلم کرنے والا ہی ہے۔ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا یعنی اس نے دار (باغ) کے فناہ ہونے کا انکار کیا۔ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً یعنی میں خیال نہیں کرتا کہ کبھی بعث یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا بھی ہوگا۔ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ یعنی اگر دوبارہ زندہ کیا گیا تو جس طرح اس نے مجھے دنیا میں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو وہ مجھے میری عزت افزائی کے لئے اس سے افضل اور بہتر نعمتیں عطا فرمائے گا؛ اور قول باری تعالیٰ: لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا کا یہی معنی ہے۔ اس نے یہ اس وقت کہا جب اس کے بھائی نے اسے حشر و نشر پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحف میں منهما ہے۔ اور اہل بصرہ و کوفہ کے مصاحف میں منها واحد ہونے کی بنا پر ہے، لیکن تثنیہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ ضمیر جنتین کے قریب تر ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿37﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿38﴾

''اس کے ساتھی نے اسے بحث مباحثہ کے درمیان کہا: کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا۔ لیکن میں، (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ یعنی اس کے ساتھی یہوذا یا تملیخا نے کہا: یہ اس کے نام میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے اسے نصیحت کی اور اس کے لئے وضاحت کی کہ ان چیزوں میں سے جن کا اس نے اعتراف کیا ہوا ہے یہ وہ ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ یہ اعادہ کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ اور سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے تجھے معتدل قد و قامت والا، معتدل مخلوق، اور صحیح الاعضاء مرد بنایا ہے۔ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ اسی طرح اسے ابوعبدالرحمن سلمی اور ابوالعالیہ نے پڑھا ہے اور کسائی سے روایت کیا گیا ہے لکن هو الله معنی

لکن الامر ھو اللہ ربی (لیکن معاملہ یہ ہے وہ اللہ ہی میرا رب ہے۔) پس لکن کا اسم اس میں مضمر ہے۔ اور باقیوں نے لکنا الف کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر عبارت ہے لکن اللہ ھو ربی أنا، (لیکن اللہ وہی میرا رب ہے) تو اس میں أنا سے کثرت استعمال اور تخفیف کے لئے ہمزہ حذف کر دیا گیا اور دونوں نونوں میں سے ایک کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ اور أنا کے الف کو حالت وصل میں حذف کر دیا گیا اور حالت وقف میں ثابت رکھا گیا۔ اور نحاس نے کہا ہے: کسائی، فراء اور مازنی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اصل میں لکن أنا ہے پس ہمزہ کی حرکت لکن کی نون کو دے دی گئی اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا اور نون کو نون میں ادغام کر دیا گیا پس وقف اس پر ہے لکنا اور یہ الف حرکت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: اصل میں لکن أنا ہے، پس الف کو حذف کر دیا گیا اور دونونیں مل گئیں اس لئے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا گیا۔

اور کسائی نے ہمیں یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

لَهِنَّكِ من عَبْسِيَّة لَوَسِيْمَةٌ  على هَنَوَاتٍ كاذب من يقولها

ارادہ یہ کیا: للہ اِنك [لوسیمة]، پس للہ سے دو لاموں میں سے ایک کو ساقط کر دیا اور انك سے الف کو حذف کر دیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے اور اس نے اسے اصل کے مطابق ذکر کیا ہے:

وترميننى بالطَّرْف اى أنت مذنب  و تَقْلِيْنَنى لكنَّ اِيَّاكِ لا أَقْلِى

ای لکن أنا۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے: لکنا ھو اللہ ربی اور گمان کیا ہے کہ یہ لحن (غلطی) ہے، یعنی درج کلام میں الف کو ثابت رکھنا۔

زجاج نے کہا ہے: درج کلام میں لکنا ھو اللہ ربی میں الف کو ثابت رکھنا جید اور عمدہ ہے، کیونکہ کبھی أنا سے الف کو حذف کر دیا جاتا ہے پس وہ اسے بطور عوض لائے ہیں۔ فرمایا: اور حضرت ابی کی قرأت میں لکن أنا ھو اللہ ربی ہے۔ اور ابن عامر اور مسیلی نے نافع اور رویس سے اور انہوں نے یعقوب سے لکنا حالت وقف اور حالت وصل دونوں میں اثبات الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور شاعر کا قول ہے:

أنا سيف العشيرة فاعرفونى  حُمَيْدًا قد تَذَرَّيْتُ السِّناما

اور اعشیٰ نے کہا ہے:

فكيف أنا و انتحال القوافى  بعد المشيب كفى ذاك عارا

اور حالت وقف میں الف کو ثابت رکھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ، هُوَ ضمیر قصہ اور شان اور امر ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (الانبیاء: 97) اور قول باری تعالیٰ ہے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (الاخلاص) (ان میں ھی اور ھو ضمیر قصہ و شان ہیں) وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا اس کا مفہوم اس پر دلیل ہے کہ دوسرا

بھائی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا اور کسی اور کی عبادت کرتا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس سے یہ ارادہ کیا ہو کہ میں غنا اور فقر کو نہیں دیکھتا مگر اسی کی طرف سے، اور میں یہ جانتا ہوں کہ اگر وہ کسی دنیا دار کی دنیا کو سلب کرنا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے اور وہی ہے جس نے مجھے فقر و افلاس دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ تیرے دوبارہ زندہ کئے جانے کے انکار کا انجام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت نہیں رکھتا، اور یہ رب سبحانہ وتعالیٰ کو عاجز قرار دیتا ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو عاجز قرار دیا تو اس نے اسے مخلوق کے مشابہ قرار دیا، تو یہی شرک کرنا ہے۔

وَ لَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

''اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا: ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں) اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں، پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرما دے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب۔ تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان، یا یوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پا سکے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تو دل کے ساتھ (باغ میں داخل ہوتے وقت یہ الفاظ کہتا: مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)، اور یہ مومن کی جانب سے کافر کو جھڑک بھی ہے اور نصیحت بھی اور اس کے اس قول کا رد بھی ہے کہ جب اس نے کہا: مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا (میں یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی برباد بھی ہوگا) اور ''ما'' محل رفع میں ہے۔ تقدیر کلام ہے: ھذہ الجنۃ ہی ما شاء اللہ (یہ باغ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے) اور زجاج اور فراء نے کہا ہے: الأمر ما شاء اللہ، یا ھو ما شاء اللہ، یعنی امر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جواب مضمر ہے، یعنی ما شاء اللہ کان، و ما لا یشاء لا یکون۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور وہ جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔) لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تیرے پاس جو مال بھی جمع ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت سے ہے نہ کہ تیری قدرت اور تیری قوت سے، اور اگر وہ چاہے تو اس سے برکت کھینچ لے تو پھر یہ جمع نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اشہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت یہ کہے...... اور ابن وہب نے کہا ہے: مجھے حفص بن میسرہ نے کہا ہے: میں نے وہب بن منبہ کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کیا میں تیری ایک ایسے کلمہ پر راہنمائی نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے،...... یا فرمایا: جو جنت کے خزانوں میں سے ایک

خزانہ ہے۔'' میں نے عرض کی: کیوں نہیں ہاں یارسول اللہ! ﷺ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ جب کوئی آدمی یہ کہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے نے اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لی ہے اور وہ تابعدار ہو گیا ہے (1)''۔ اسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ فرمایا: ''اے ابا موسیٰ! یا اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے......'' میں نے عرض کی: وہ کیا ہے یارسول اللہ! ﷺ؟ تو آپ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ (2)۔ اور آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: ''کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے یا جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے'' میں نے عرض کی: کیوں نہیں (ضرور بتائیے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم (3) اور روایت ہے کہ جو کوئی اپنے گھر میں داخل ہوا یا اس سے باہر نکلا اور اس نے یہ کہا: بسم اللہ ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ تو شیاطین اس سے اس کے سامنے سے بھاگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر برکتیں نازل فرماتا ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: جب آدمی اپنے گھر سے باہر نکلے تو کہے باسم اللہ تو فرشتہ کہتا ہے تیری راہنمائی کر دی گئی، اور جب کہے ماشاء اللہ، تو فرشتہ کہتا ہے تجھے بے نیاز کر دیا گیا، اور وہ کہے: لا قوۃ الا باللہ تو فرشتہ کہتا ہے: تو بچا لیا گیا، اسے ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کہا جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ بسم اللہ توکلت علی اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو اسے کہا جاتا ہے: تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا اور اس سے شیطان دور ہو جاتا ہے (4)''۔ یہ حدیث غریب ہے میں اسے اس سند کے سوا نہیں جانتا۔ اسے ابوداؤد نے بھی ذکر کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے ...... پس اس کے لئے فرمایا: ''تیری راہنمائی کر دی گئی، تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا (5)''۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے گھر کے دروازے سے یا اپنے دار (حویلی) کے دروازے سے باہر نکلتا ہے تو اس کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ مقرر ہیں پس جب وہ کہے باسم اللہ وہ دونوں کہتے ہیں تیری راہنمائی کر دی گئی اور جب وہ کہے: لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بچا لیا گیا اور جب وہ کہے: توکلت علی اللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بے نیاز کر دیا گیا فرمایا پس اس کے دو ساتھی اس سے ملاقات کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: تم اس آدمی سے کیا ارادہ رکھتے ہو حالانکہ اسے ہدایت دے دی گئی ہے اور اسے بچا لیا گیا ہے اور اس کو بے نیاز کر دیا گیا ہے (6)''۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

2۔ صحیح مسلم، کتاب الدعوات، استحباب حفض الصوت، جلد 2، صفحہ 346	3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

4۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، مایقول اذا خرج من بیتہ، جلد 2، صفحہ 180

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، مایقول اذا دخل فی بیتہ، جلد 2، صفحہ 339

6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، مایدعو الرجل اذا خرج من بیتہ، صفحہ 285

اور حاکم ابوعبداللہ نے علوم الحدیث میں کہا ہے، محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے پوچھا گیا: ''جنت اور دوزخ نے باہم جھگڑا کیا تو اس یعنی جنت نے کہا مجھ میں ضعفاء داخل ہوں گے (1)'' تو یہ ضعیف کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ہے جو اپنے آپ کو دن میں بیس مرتبہ یا پچیس مرتبہ لا حول ولا قوۃ کے ساتھ بری کرآتا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی شے کو دیکھے اور وہ اسے اچھی اور خوبصورت لگے تو وہ کہے مَاشَآءَاللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو اسے نظر نقصان نہیں پہنچائے گی۔'' اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی نہیں ہے جس نے ماشاء اللہ کہا تو پھر کوئی شے بھی اسے پہنچی مگر وہ اس کے ساتھ راضی ہوگا۔

اور روایت ہے کہ جس نے چار (قول) کہے وہ چار سے محفوظ رہے گا: جس نے یہ کہا وہ نظر بد سے محفوظ ہو گیا۔ اور جس نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۝ (آل عمران) وہ شیطان کے مکر سے محفوظ ہو گیا، اور جس نے کہا وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (غافر: 44) وہ لوگوں کے مکر سے محفوظ رہے گا۔ اور جس نے کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝ (الانبیاء) تو وہ غم سے محفوظ رہے گا۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا، اِنْ شرطیہ ہے تَرَنِ اسی کے سبب مجزوم ہے اور جواب شرط فَعَسٰى رَبِّيْۤ ہے اور اَنَا بطور فاصل ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اور نون اور یا ئ تاکید کے لئے ہو۔ اور عیسیٰ بن عمر نے: ان ترنِ انا اقلُّ منک رفع کے ساتھ پڑھا ہے؛ وہ اَنَا کو مبتدا بنا رہے ہیں اور اَقَلُّ اس کی خبر ہے اور پھر مکمل جملہ دوسرے مفعول کے محل میں ہے، اور مفعول اول نون اور یا ہیں، مگر یہ کہ یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کرتا ہے، اور اس کو ثابت رکھنا جید اور بلیغ ہے اور یہی اصل ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت اسم ہے۔ اور فَعَسٰى بمعنی لعلّ ہے۔ ای فلعلّ ربی۔ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ شاید میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے کوئی بہتر چیز آخرت میں عطا فرمادے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں (اس سے بہتر عطا فرمادے)۔ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا اور وہ تیرے باغ پر بھیج دے حُسْبَانًا آسمان سے عذاب، اس کا واحد حُسْبانة ہے؛ یہ اخفش، قتبی اور ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: الحسبانة کا معنی بادل ہے، اور الحسبانة کا معنی تکیہ ہے اور الحسبانة کا معنی صاعقة (بجلی کی کڑک) ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الحُسبان (ضمہ کے ساتھ ہو) تو اس کا معنی عذاب ہے۔ اور ابوزیاد الکلابی نے کہا ہے: أصاب الأرض حسبان یعنی زمین پر مکڑی غالب آ گئی۔ اور الحسبان کا معنی حساب بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۝ (رحمن) اور یہاں حسبان کی یہی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: الحسبان، الحساب سے ہے، یعنی وہ اس پر حساب کا عذاب بھیج دے، اور یہ اس کا حساب ہے جو کچھ تیرے ہاتھوں نے کمایا (اعمال کئے)، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہے۔ اور الحسبان سے مراد چھوٹے تیر بھی ہیں جو ایک ہی بار میں پھینکے جاتے ہیں اور یہ اکاسرہ کے تیروں میں سے تھے۔

اور المرامی من السماء سے مراد عذاب ہے۔ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا یعنی ایسی سفید زمین ہو جائے جس میں نہ کوئی سبزہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء احتجاج الجنة، جلد 2، صفحہ 80

اگتا ہے اور نہ اس پر قدم ثابت رہتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ نقصان دہ زمین ہو جائے اس کے بعد کہ یہ ایک باغ تھا اور نفع بخش زمین تھی؛ اور زَلَقًا، صعید کے وصف کی تاکید کے لئے ہے، یعنی اس کی چکناہٹ کی وجہ سے اس سے پاؤں پھسلتے ہوں۔ کہا جاتا ہے: مکان زَلَق یعنی پھسلنی جگہ، اور یہ اصل میں مصدر ہے تیرے اس قول کا زلِقت رجله تزْلَق زلَقا، وأزْلقها غیرہ (کسی غیر نے اسے پھسلا دیا) اور الزلق کا معنی عجزالدابة (جانور کا پچھلا حصہ) بھی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

كأنها حَقْباءُ بَلْقاء الزَّلَق

اور المَزْلَقَة والمُزْلَقَة: مراد وہ جگہ ہے جس پر پاؤں ثابت نہ رہتے ہوں (یعنی نہ جمتے ہوں بلکہ پھسل جاتے ہوں) اور اسی طرح الزّلّاقة بھی ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی الحَلْق (مونڈنا) ہے، زَلَق رأسه يَزْلِقُهُ زلقا اس نے اس کا سر مونڈ دیا؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی المحلوق (مونڈا ہوا) ہے، جیسا کہ النَّقْض اور النَّقَض ہے۔ اور مراد یہ نہیں ہے کہ مونڈی ہوئی ہو جائے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی سبزہ باقی نہیں رہے گا جیسا کہ سر جب اسے مونڈ دیا جائے تو اس پر کوئی بال باقی نہیں رہتا؛ یہ قشیری نے کہا ہے: اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا یعنی یہ غائرًا ذاهبًا کے معنی میں ہے۔ یا اس کا پانی بہت نیچے چلا جائے، تو یہ پانی نہ دینے والی زمین ہو جائے گی اس کے بعد کہ یہ پانی دینے والی زمین تھی۔ اور الغور مصدر ہے اسے اسم کی جگہ رکھا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل صَومٌ و فطرٌ و عدلٌ و رِضا و فضلٌ و زَوْرٌ و نساءٌ نَوْحٌ (یہ تمام مصدر اسم کی جگہ مذکور ہیں) اس میں مذکر و مونث اور تثنیہ و جمع سب برابر ہوتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

تظَلّ جيادہ نَوْحًا عليه　　　مقلّدة أعنّتها صُفُونا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

هرِيقِي من دموعهما سجاما　　　ضُباع و جاوبي نوحا قياما

یعنی اس میں نوحا بمعنی نائحات ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أو يصبح ماؤها ذا غور (اس کا پانی نیچے اترنے والا ہو جائے) پس اس سے مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: ماءٌ غَوْرٌ۔ وقد غار الماء يغور غورا و غُؤورا، یعنی پانی زمین میں نیچے چلا گیا، اور واؤ کے مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ بھی جائز ہے۔ اور غارت عينه تَغُور غَوْرًا و غُؤورا، یعنی اس کی آنکھیں سر میں دھنس گئیں۔ اور غارت تغار بھی اس میں لغت ہے۔ اور کسی شاعر کا قول ہے:

أغارت عينُه أم لم تَغارَا

(اس کی آنکھ دھنسے یا نہ دھنسے) اور غارت الشمس تغور غيارا، یعنی سورج غروب ہو گیا۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 518

ابوذ ؤیب نے کہا ہے:

هل الدهر إلا ليلة و نهارُها ... وإلاطلوعُ الشمس ثم غيارُها

فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا یعنی تو ہرگز نیچے اترے ہوئے پانی کو واپس لانے کی استطاعت نہیں رکھے گا اور کسی حیلہ کے ساتھ اس پر قادر نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس تو ہرگز اس کے بدلے کسی اور کی طلب کی استطاعت نہیں رکھے گا۔ اور اس بات پر اس کے بھائی کا مناظرہ اور اس کا ڈرانا ختم ہو گیا۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہو گیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گر پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اس میں اسم مالم یسم فاعلہ مضمر ہے، اور وہ مصدر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں اسم مجرور محل رفع میں ہو۔ اور اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ کا معنی ہے اس کا سارے کا سارا مال ہلاک کر دیا گیا۔ اور یہ وہ پہلی چیز ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے بھائی کے ڈراوے کو ثابت کر دیا اور حقیقت بنا دیا۔ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ یعنی کافر ندامت کے سبب اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارنے لگا کیونکہ یہ فعل نادم سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی ملکیت الٹ پلٹ کرتا ہے اور جو کچھ اس نے خرچ کیا ہے اس کا عوض اور بدلہ اس میں نہیں دیکھتا، اور یہ اس اعتبار سے ہے کیونکہ ملک کو لفظ ید سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے قول میں سے ہے: فی یدہ مال، یعنی اس کی ملک میں مال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول: فَاَصْبَحَ اس پر دلیل ہے کہ یہ ہلاک کرنے کا عمل رات کے وقت ہوا؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ (القلم) (پس چکر لگا گیا اس باغ پر ایک چکر لگانے والا آپ کے رب کی طرف سے درآنحالیکہ وہ سوئے ہوئے تھے چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) اور کہا جاتا ہے: أنفقتُ فی هذه الدار كذا و أنفقتُ عَلَيْهَا (میں نے اس گھر میں اتنا خرچ کیا اور میں نے اس پر اتنا خرچ کیا) وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یعنی وہ خالی ہے تحقیق وہ بعض بعض پر گر گیا ہے) یہ خَوَتِ النجوم تخوی خيًا أمحلَتْ سے ماخوذ ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب وہ گر جائے اور کسی بھی سبزے پر بارش نہ برسائے۔ اور أخوتْ بھی اسی کی مثل ہے۔ اور خَوَت الدار خواء أقوَت (گھر گر گیا اور اپنے مکینوں سے خالی ہو گیا)، اور اسی طرح ہے جب وہ گر جائے) اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا (النمل: 52) (پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث)۔ اور کہا جاتا ہے: ساقطة (گرنے والا)، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فهی خاوية علی عرد شها یعنی وہ اپنی چھت پر گرنے والا ہے، پس اسے پھل اور اصل کی تباہی اور بربادی کے درمیان جمع کیا گیا ہے، اور یہ بہت شدید اور بڑی آفتوں میں سے ہے، درآنحالیکہ یہ اس کے ظلم اور

نافرمانی کے مقابلہ میں ہے۔ وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا یعنی اے کاش! میں نے ان نعمتوں کو پہچانا ہوتا جو الله تعالیٰ نے مجھ پر فرمائی ہیں، اور میں نے یہ پہچانا ہوتا کہ یہ الله تعالیٰ کی قدرت سے ہیں اور میں اس کے ساتھ کفر نہ کرتا۔ اور یہ اس کی طرف سے اس وقت ندامت کا اظہار ہے جس وقت ندامت اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتی تھی۔

**وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾**

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی الله تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فِئَةٌ یہ تَكُنْ کا اسم ہے اور لَّهٗ اس کی خبر ہے۔ يَّنْصُرُوْنَهٗ یہ صفت کے محل میں ہے، ای فئۃ ناصرۃ (مدد کرنے والی جماعت)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ يَّنْصُرُوْنَهٗ خبر ہو۔ اور پہلی وجہ سیبویہ کے نزدیک اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ لَّهٗ مقدم ہے۔ اور ابو العباس ان کی مخالفت کرتے ہیں، اور الله عزوجل کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں: وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿﴾ (الاخلاص) اور سیبویہ نے دوسری وجہ کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور يَّنْصُرُوْنَهٗ، فِئَةٌ کے معنی کی وجہ سے (جمع کا صیغہ) ہے، کیونکہ اس کا معنی اقوام ہے، اور اگر لفظ کی بنا پر ہوتا تو فرماتا ولم تكن له فئة تنصره؛ یعنی ایسا گروہ اور ایسی جماعت جس کے پاس وہ پناہ لے سکتا ہو (وہ نہیں رہی) وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا یعنی اور نہ وہ روکنے والا تھا؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور نہ وہ اس کا بدل لوٹانے والا ہے جو اس سے ضائع ہو گیا ہے (جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے) اور الفئۃ کا مادہ اشتقاق سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور اس میں ھا اس یا کے عوض ہے جو اس کے درمیان سے کم ہوئی، اس کی اصل فِيئٌ ہے جیسا کہ فِيعٌ ہے کیونکہ یہ فا سے ہے، اور اس کی جمع فِئون اور فئات آتی ہے، جیسے شِيات، لِدات اور مئات وغیرہ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہیں جو الله تعالیٰ کے عذاب سے اس کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کے خدام اور اولاد میں سے وہ اس سے مفقود اور گم ہو گئے جن کے سبب وہ فخر کرتا تھا۔

**هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾**

''یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار الله سچے کے لئے ہے، وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ اس میں قول باری تعالیٰ هُنَالِكَ ظرف ہے اور اس کے عامل میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس میں عامل: وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ ہے اور کان ھنالك نہیں ہے؛ ای ما نُصر ولا انتصر ھنالك یعنی جب اسے عذاب پہنچے گا تو نہ اس کی مدد کی جائے گی اور نہ وہ وہاں بدلہ لینے کے قابل ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ: مُنْتَصِرًا ﴿﴾ پر کلام مکمل ہو گئی ہے اور هُنَالِكَ میں عامل الْوَلَايَةُ ہے، اور اس کی تقدیر تقدیم و تاخیر پر ہے: الولاية لله الحق ھنالك، یعنی قیامت میں سارا اختیار الله سچے کے لئے ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے الْحَقُّ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ الْوَلَايَةُ کی صفت ہے۔ اہل مدینہ اور حمزہ نے الحقِّ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ لفظ الله کی صفت ہے، اور تقدیر

کلام ہے: للہ ذی الحق (اس اللہ کے لئے جو صاحب حق ہے۔) زجاج نے کہا ہے: الحقّ کو مصدر اور تاکید کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے: جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا لك حقًّا۔ اور اعمش، حمزہ، اور الکسائی نے لِولایۃ کو واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ رِضاعۃ اور رَضاعۃ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الولایۃ فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ موالاۃ (محبت اور دوستی) سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ: 257) (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا۔) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (محمد: 11) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔) اور کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر اس کا معنی سلطنت، قدرت اور امارت ہے، جیسے قول باری تعالیٰ ہے: وَالْاَمْرُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ (الانفطار) یعنی اس دن اللہ تعالیٰ کی ہی بادشاہی اور حکم ہوگا، یعنی اس کا امر کسی اور کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا، ہر وقت میں بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن قیامت کے دن سارے دعوے اور توہمات ختم ہو جائیں گے۔ اور ابوعبید نے کہا ہے: بلاشبہ یہ لفظ خالق کے لئے واؤ کے فتحہ کیساتھ ہے۔ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ مخلوق کے لئے ہے۔

هُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا یعنی دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی اسے بہترین اجر وثواب عطا فرمانے والا ہے جو اس کے ساتھ ایمان لایا، اور وہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہوگا جس سے امید رکھی جا سکتی ہو، لیکن اس انداز میں جاہلوں کے ظن کا ارادہ کیا ہے، یعنی ھو خیر مَن یُرجی (وہی سب سے بہتر ہے جس سے امید رکھی جا سکتی ہے۔ وَّ خَیْرٌ عُقْبًا عاصم، اعمش، حمزہ اور یحییٰ نے عُقْبًا قاف کو ساکن پڑھا ہے، باقیوں نے اسے مضموم پڑھا ہے، اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہے، یعنی اس کے ہاتھ میں بہترین انجام ہے اس کے لئے جس نے اس سے امید رکھی اور اس کے ساتھ ایمان لایا۔ کہا جاتا ہے: عاقبۃ أمر فلان و عقباہ و عُقُبُہ، یعنی یہ فلاں کے معاملے کا انجام اور آخر ہے۔

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

”بیان فرمایئے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہو کر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی آپ ان تکبر کرنے والوں کے لئے جو آپ سے فقراء مومنین کو اپنے آپ سے دور ہٹانے کی درخواست کرتے ہیں دنیوی زندگی کی ایک مثال بیان فرمایئے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تشبیہ دی ہے۔ كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ کہ یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا ہے یعنی پانی کے ساتھ۔ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی اس پانی سے زمین کی انگوریاں گنجان ہو کر اگتی ہیں، یہاں تک کہ زمین ہموار ہو جاتی ہے، برابر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ انگوریاں بعض بعض کے ساتھ مل جاتی ہیں جس وقت اس پر پانی برستا ہے، کیونکہ نباتات گنجان ہو جاتی ہیں اور بارش کے سبب بڑھ جاتی ہیں، زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ معنی سورۃ یونس میں واضح طور پر گزر چکا

ہے۔ اور حکماء نے کہا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ پانی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا، اسی طرح دنیا بھی ایک کے پاس باقی نہیں رہتی، اور اسی لئے پانی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اسی طرح دنیا کی حالت بھی ہے، اور اس لئے بھی کہ یہ پانی باقی نہیں رہتا اور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح دنیا بھی فناہ ہو جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ پانی کے بارے میں کوئی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اس میں داخل ہو اور وہ اس سے تر نہ ہو اسی طرح دنیا بھی ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو اوہ اس کے فتنہ و آزمائش اور اس کی آفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور اس لئے کہ پانی جب خاص مقدار میں ہو تو وہ نفع پہنچاتا ہے اور نباتات اگاتا ہے، اور جب اس حد سے تجاوز کر جائے تو وہ نقصان دہ اور مہلک ہوتا ہے، اسی طرح دنیا بھی ہے کہ اس کی کفایت بھر مقدار نفع بخش ہوتی ہے اور اس کی فالتو مقدار نقصان پہنچاتی ہے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب لوگوں میں سے ہو جاؤں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کو چھوڑ دے اور اسے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح قرار دے (اور اس سے تھوڑی سی مقدار لے لے) کیونکہ اس کی قلیل مقدار کافی ہوتی ہے اور اس کی کثیر مقدار سرکش بنا دیتی ہے۔'' اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت ہے: ''تحقیق وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسلام قبول کیا اور اسے کفایت بھر رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا فرمایا(1)''۔ **فَاَصۡبَحَ** یعنی وہ انگوریاں ہو جاتی ہیں **هَشِيْمًا** خشک ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی گھاس، یعنی اس سے پانی کٹ جانے کے سبب، پس اسے اختصار کے لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے، اور الهشم کا معنی ہے خشک چیز کا توڑ دینا۔ اور الهشيم سے مراد خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہے، اور وہ بوسیدہ درخت جسے ایندھن اکٹھا کرنے والا جیسے چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ اور اس سے ان کا یہ قول بھی ہے: **ما فلانٌ إلا هشيمة كَرْمٍ**، جبکہ وہ خوب فیاض اور سخی ہو۔ اور رجلٌ هشيم: کمزور بدن والا آدمی۔ اور **تَهَشَّمَ عليه فلان** جب وہ اس پر مہربان ہو اور إهتشم مافی ضرع الناقة جب آدمی ناقہ کو دوہ لے۔ اور کہا جاتا ہے: **هَشَمَ الثَّرِيْدَ** اس نے ثرید تیار کیا اور اسی سے ہاشم بن عبد مناف کا نام رکھا گیا اور ان کا نام عمرو تھا۔

اور اسی بارے میں عبد اللہ بن زبعری کہتا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيدَ لقومه و رجالُ مكّةَ مُسْنِتُون عجافُ

اور اس کا سبب یہ ہوا کہ قریش کو قحط نے آلیا اور اس نے ان کے اموال ہلاک و برباد کر دیئے پس ہاشم شام کی طرف گئے اور وہاں بہت سی روٹیوں کا حکم دیا پس وہ آپ کے لئے پکا دی گئیں، تو انہوں نے انہیں بوروں میں بند کر کے اونٹوں پر لاد دیا یہاں تک کہ آپ مکہ پہنچ گئے، اور آپ نے ان روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے بنا دیا اور ثرید بنایا، آپ نے انہی اونٹوں کو ذبح کیا، پھر پکانے والوں کو حکم دیا اور انہوں نے وہ گوشت پکایا، پھر ہانڈیوں کو بڑے بڑے پیالوں میں انڈیل دیا اور اہل مکہ کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا، اور یہ اس قحط کے بعد جو ان پر مسلط ہوا پہلی بخشش اور عطا تھی، پس اسی وجہ سے آپ کا نام ہاشم پڑ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 337

گیا۔ تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ یعنی ہوائیں اسے اڑا لے جاتی ہیں، بکھیر دیتی ہیں؛ یہ ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے: وہ اسے اڑا لے جاتی ہیں۔ ابن کیسان نے کہا ہے: وہ اسے لے جاتی ہیں اور لے آتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ اسے پھراتی اور گھماتی ہیں؛ یہ تمام معانی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے تُذْرِيهِ الرِّيحُ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں تُذْرِيهِ یہ کہا جاتا ہے: ذَرَتْه الريح تَذْرُوْهُ ذَرْوًا اور تَذْرِيه ذَرْيًا اور أذرته تُذْرِيه إذْرَاءً، جب ہوا اسے اڑا لے جائے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے: أذريت الرجل عن فرسه یعنی میں نے آدمی کو اس کے گھوڑے سے الٹ دیا۔

اور سیبویہ اور فراء نے یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

فقلتُ له صَوِّبْ ولا تجهدَنَّهُ فَيُذرِك من أُخرَى القَطاةِ فَتَزْلَقِ

قولہ تعالیٰ: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا۝ یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے، فناء کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اور اس کی ذات ہر کمزوری اور نقص سے پاک ہے۔

## اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا۝

''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب و زینت ہیں، اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا اس میں زینتا بھی جائز ہے اور یہ تثنیہ اور مفرد (دونوں حالتوں) میں مبتدا کی خبر ہے۔ اور بلاشبہ مال اور فرزند دنیوی زندگی کی زینت ہیں، کیونکہ مال میں حسن و خوبصورتی اور منافع ہیں، اور بیٹوں میں قوت اور دفاع ہے، تو اس طرح یہ دونوں دنیوی زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ صفت کا قرینہ مال اور فرزندوں کے لئے ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: المال و البنون زينة هذه الحياة المحتقرة فلا تتبعوها نفوسكم (یعنی مال اور فرزند اس حقیر زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں پس تم اپنے آپ کو اس کا تابع نہ بناؤ۔) اور یہ عیینہ بن حصن اور اس جیسے دیگر لوگوں کا رد ہے جب انہوں نے دولت اور ظاہری شرف پر فخر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ یہ جو دنیوی زندگی کے لئے زینت ہے تو یہ ایسا غرور (اور فخر) ہے جو گزر جائے گا، ختم ہو جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، جیسا کہ خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہوتی ہے کہ ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے، بلاشبہ جو شے باقی رہتی ہے وہ زاد قبر اور آخرت کی تیاری ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مال کے ساتھ اپنا دل نہ لگا کیونکہ یہ ختم ہو جانے والے سائے (کی طرح) ہے، اور نہ عورتوں کے ساتھ دل لگا، کیونکہ یہ آج تیرے ساتھ ہیں اور کل کسی دوسرے کے ساتھ ہیں، اور نہ سلطان کے ساتھ کیونکہ وہ آج تیرا ہے اور کل کسی اور کا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول کافی ہے: اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال:28) (بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں۔) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) (بے شک تمہاری

کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں، پس ہوشیار رہو ان سے۔)

قولہ تعالیٰ: وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ مراد طاعات کا وہ عمل ہے جو حضرت سلمان، حضرت صہیب اور دیگر مسلمان فقراء رضی اللہ عنہم کر رہے ہیں۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے افضل ہے۔ وَّ خَيْرٌ اَمَلًا یعنی از روئے امید کے صاحب مال اور فرزندوں سے افضل ہیں نہ کہ عمل صالح سے، اور دنیوی زیب و زینت میں خیر اور بھلائی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے محل میں ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن اچھا ٹھکانا ہو گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ فی الحقیقت اس سے بہتر ہیں جسے جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کے گمان میں بہتر ہے۔

اور وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے؛ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، ابو میسرہ، اور عمرو بن شرحبیل نے کہا ہے: ان سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آدمی کے قول و فعل میں سے ہر عمل صالح ہے جو آخرت کے لئے باقی رہے گا۔ اور یہ ابن زید نے بھی کہا ہے اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ ہر وہ عمل جس کا ثواب باقی رہے جائز ہے کہ اس کے لئے یہ کہا جائے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کھیتی دو قسم کی ہے پس دنیا کی کھیتی مال اور فرزند ہیں اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں، تحقیق اللہ تعالیٰ انہیں اقوام کے لئے جمع فرما دے گا۔ اور جمہور نے کہا ہے: ان سے مراد وہ کلمات ہیں (1) جن کی فضیلت حدیث طیبہ میں مروی ہے: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اسے امام مالک نے اپنی موطا میں عمارہ بن صیاد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ان کو الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ان سے مراد بندے کا یہ کہنا ہے: اللہ اکبر و سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ ولا حَوْلَ وَلَا قوۃ الا باللہ، اسے نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کی کثرت کرو' عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں۔ فرمایا: "تکبیر کہنا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا، سبحان اللہ کہنا اور الحمد للہ او ر لا حول ولا قوۃ اِلَّا باللہ، اسے ابو محمد عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح قرار دیا ہے۔

اور حضرت قتادہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹہنی پکڑی اور اسے جھنجھوڑا یہاں تک کہ اس کے پتے گر گئے اور فرمایا: "بے شک جب مسلمان یہ کہتا ہے سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں جیسا کہ یہ پتے گر گئے ہیں اے ابا الدرداء! انہیں اپنے پاس محفوظ کر لو۔ اس سے پہلے کہ تیرے اور ان کے درمیان کوئی حائل ہو، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں اور عمدہ اور خالص کلام میں سے ہیں اور یہ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں"۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اور اسے ابن ماجہ نے اسی معنی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (2)، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تجھ پر سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ وَاللہ اکبر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 520	2۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، صفحہ 279۔ ایضاً، حدیث نمبر 3802، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھنا لازم ہے کیونکہ یہ گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جس طرح درخت اپنے پتے گرا دیتا ہے۔ اور ترمذی نے اسے اعمش کی حدیث سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خشک پتوں والے درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اسے چھڑی ماری تو پتے گرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر آدمی کے گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جیسے اس درخت کے پتے گر رہے ہیں (1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، اور ہم اعمش کا سماع حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نہیں جانتے، مگر یہ کہ انہوں نے انہیں دیکھا ہے اور انہوں نے ان کی طرف دیکھا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں شب معراج حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا تو انہوں نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں یہ خبر دینا کہ جنت کی مٹی بڑی پاکیزہ اور زرخیز ہے، پانی بڑا عمدہ اور میٹھا ہے اور یہ کہ وہ بڑی ہموار اور نرم ہے اور اس کے پودے اور درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)، اسے ماوردی نے اسی معنی میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں ہے ..... تو میں نے کہا: جنت کے درخت اور پودے کیا ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ (3)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اور وہ پودے لگا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا ہریرۃ! (رضی اللہ عنہ) تم کیا لگا رہے ہو؟'' تو میں نے کہا: پودے لگا رہا ہوں، فرمایا: کیا میں تمہاری راہنمائی ایسے پودوں پر نہ کروں جو ان سے بہتر ہیں، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہر ایک کے بدلے تیرے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔'' تحقیق کہا گیا ہے: بے شک باقیات صالحات ہی نیتیں اور عزم و ارادے ہیں، کیونکہ انہی کے ساتھ اعمال قبول کئے جاتے ہیں اور بلند ہوتے ہیں؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: کہ ان سے مراد بیٹیاں ہیں، آیت کا اول حصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا پھر فرمایا: وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ یعنی صالح اور نیک بیٹیاں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے آباء کیلئے بہترین اجر و ثواب ہیں، اور بہتر ہیں آخرت میں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے اس آدمی کے لئے جس نے ان کے ساتھ احسان اور نیکی کی، اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: میرے پاس ایک مسکین عورت آئی ..... الحدیث، تحقیق ہم نے اسے سورۃ النحل میں قول باری تعالیٰ: یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ الآیہ (النحل: 59) میں بیان کیا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''تحقیق میں نے اپنی امت سے ایک آدمی دیکھا اسے جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا تو اس کی بیٹیاں اس کے ساتھ چمٹ گئیں اور چیخ و پکار کرنے لگیں اور کہنے لگیں: اے ہمارے رب! بلاشبہ یہ دنیا میں ہمارے ساتھ احسان اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 192۔ ایضاً، باب جامع الدعوات، حدیث نمبر 3456، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل التسبیح، حدیث نمبر 3384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 279-278

نیکی کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے وسیلہ سے اس پر رحم فرما دیا''(1)۔ اور حضرت قتادہ نے قول باری تعالیٰ: فَأَرَدْنَآ أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَوٰةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا (کہف) (پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو) کے تحت کہا ہے: ان کو اس کے بدلے بیٹی عطا فرمائی اور اس سے نبی علیہ السلام نے شادی کی اور اس نے بارہ بچوں کو جنم دیا اور وہ تمام انبیاء ہوئے۔

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾

''اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹا دیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً بعض نحویوں نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے والباقیات الصالحات خیر عند ربك یوم نسیر الجبال۔ نحاس نے کہا ہے: یہ واؤ کی وجہ سے غلط ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور اس دن کو یاد کرو جب ہم پہاڑوں کو ہٹا دیں گے، یعنی ہم انہیں سطح زمین سے اپنی جگہوں سے زائل کر دیں گے، اور ہم انہیں چلائیں گے جیسا کہ ہم بادلوں کو چلاتے ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل: 88) (حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال) پھر وہ ٹوٹ جائیں گے اور زمین کی طرف لوٹ آئیں گے، جیسا کہ فرمایا: وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (الواقعہ) (اور ٹوٹ پھوٹ کر پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے پھر غبار بن کر بکھر جائیں گے) ابن کثیر، حسن، ابو عمرو اور ابن عامر نے وَيَوْمَ تُسَيَّرُ تا کو ضمہ اور یا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الْجِبَالُ کو فعل مجہول کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ ابن محیصن اور مجاہد نے ویوم تَسیر الجبال تا کو فتحہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور یہ سَارَ سے ہے۔ اور الجبال مرفوع ہے۔ ابو عمرو کی قرأت کی دلیل وَ إِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (التکویر) ہے۔ اور ابن محیصن کی قرأت کی دلیل وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (الطور) ہے۔ اور ابو عبید نے پہلی قرأت کو نسیر یعنی نون کے ساتھ کو اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّحَشَرْنٰهُمْ اور بَارِزَةً کا معنی ظاهرة ہے، (یعنی) اس پر پہاڑوں، درختوں اور عمارتوں میں سے ایسی کوئی شے نہ ہوگی جو اسے ڈھانپے ہوئے ہو، یعنی اس کے درخت جڑ سے اکھیڑ دیئے جائیں گے، اس کے پہاڑ بھی اکھیڑ دیئے جائیں گے، اور اس کی عمارتیں گرا دی جائیں گی، پس یہی اس کا ظاہر ہونا اور کھلا میدان بننا ہے۔ اہل تفسیر نے یہی قول کہا ہے۔ اور کہا گیا ہے: وَ تَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً یعنی زمین میں جو مخفی خزانے اور مردے ہیں وہ سب ظاہر ہو جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ أَلْقَتْ مَا فِيهَا وَ تَخَلَّتْ (الانشقاق) (اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہو جائے گی۔) اور فرمایا: وَ أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (الزلزال) (اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو) اور یہ قول حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وَّحَشَرْنٰهُمْ اور ہم انہیں موقف کی طرف جمع کر کے لے جائیں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے۔ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا یعنی ہم ان میں سے کسی کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے۔ کہا جاتا ہے: غادرتُ کذا یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔

عنترہ نے کہا ہے:

غَادَرْتُه مُتَعَفِّرًا اَوصالُه والقومُ بين مُجَرَّحٍ و مُجَدَّلِ

یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور المغادرۃ کا معنی ترک کرنا اور چھوڑنا ہے، اور اسی سے الغَدر ہے، کیونکہ اس کا معنی وفا کو ترک کرنا ہے۔ اور پانی کے تالاب کو غدیر کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ پانی اس میں جاتا ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے غدائر المرأۃ (عورتوں کی گندھی ہوئی چوٹی) ہے کیونکہ وہ اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ فرما رہا ہے: ہم ان کے نیکوں، فاجروں، جنوں اور انسانوں سبھی کو جمع کریں گے۔

وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ؗ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝

"اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے، (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار، ہاں تم تو یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لئے وعدہ کا وقت۔"

قولہ تعالیٰ: وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا، صَفًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ پیش کئے جائیں گے درآنحالیکہ وہ یکے بعد دیگرے صفیں باندھے ہوں گے جیسا کہ نماز میں صفیں باندھی جاتی ہیں، ہر امت اور ہر گروہ صف بنائے ہوئے ہوگا نہ کہ وہ سارے ایک صف میں ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام (صف باندھے ہوئے) ہوں گے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (طٰہٰ: 64) ای جمیعا (پھر آؤ پرے باندھے ہوئے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوں گے۔ اور حافظ ابو القاسم عبدالرحمن بن مندہ نے کتاب التوحید میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ایسی بلند آواز سے ندا دے گا جو کہ خوفناک ہوگی: اے میرے بندو! میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں ارحم الراحمین ہوں اور أحکم الحاکمین ہوں اور بہت تیزی سے حساب لینے والا ہوں۔ اے میرے بندو! تم پر آج کے دن کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم اور حزن ہوگا اپنی دلیل اور حجت پیش کرو اور سہولت اور آسانی کے ساتھ جواب دو کیونکہ تم سے باز پرس کی جائے گی اور محاسبہ کیا جائے گا۔ اے میرے ملائکہ! میرے بندوں کو حساب کے لئے ان کے پاؤں کے پوروں کی اطراف پر صفوں میں کھڑا کر دو۔"

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث اس آیت کی تفسیر میں انتہائی واضح اور بین ہے، اور مفسرین میں سے اکثر نے اس کا ذکر نہیں کیا، تحقیق ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں لکھا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ والحمدللہ۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ یعنی ان کو کہا جائے گا: آج تم ہمارے پاس ننگے پاؤں اور ننگے بدن آ گئے ہو، نہ تمہارے پاس مال ہے اور نہ اولاد۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آج تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آ گئے ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم تمہیں اسی طرح اٹھائیں گے جیسے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ بَلْ زَعَمْتُمْ یہ خطاب منکرین بعث کو ہے، یعنی تم دنیا میں یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تم ہرگز نہیں اٹھائے جاؤ گے اور یہ کہ ہم تمہارے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کے وعدہ کا وقت مقرر نہیں کریں گے۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''قیامت کے دن لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھائے جائیں گے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''اے عائشہ! اس دن امر اس سے کہیں زیادہ شدید اور سخت ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں (1)''۔ غُرْلًا کا معنی ہے غیر مختون۔ اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

''اور رکھ دیا جائے گا (ان کے سامنے) نامۂ عمل پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے: صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کر لیا ہے۔ اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کئے تھے اپنے سامنے اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔''

قولہ تعالیٰ: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ، الْكِتٰبُ یہ اسم جنس ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد نامۂ اعمال ہیں جو بندوں کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد حساب کو رکھنا ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، پس حساب کو کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ان کے لکھے ہوئے اعمال پر ان کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اور پہلا قول اظہر ہے؛ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ہمیں حکم یا ابوالحکم نے خبر دی ہے...... یہ نعیم کو شک ہے...... اسماعیل بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے اس نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب کو کہا: تجھ پر افسوس ہے اے کعب! آخرت کی حدیث میں سے کوئی ہمیں بیان کیجئے، انہوں نے کہا: ہاں یا امیر المومنین! جب قیامت کا دن ہوگا لوح محفوظ کو بلند کیا جائے گا تو مخلوق میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اپنے عمل کی طرف دیکھ لے گا ...... بیان فرمایا...... پھر وہ صحائف لائے جائیں گے جن میں بندوں کے اعمال ہیں اور وہ عرش کے ارد گرد بکھر جائیں گے، اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفۃ الجنۃ، باب فناء الدنیا و بیان الحشر، جلد 2، صفحہ 384

اس کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا۔ اسدی نے کہا ہے: صغیرہ سے مراد وہ ہیں جو شرک سے کم ہیں، اور کبیرہ سے مراد شرک ہے، مگر اس نے ان سب کا شمار کرلیا ہے.... حضرت کعب نے بیان کیا: پھر مومن کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اس میں دیکھے گا پس ان کی نیکیاں تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گی اور وہ اپنے گناہ پڑھنے لگے گا تا کہ وہ یہ نہ کہے کہ میری اتنی نیکیاں تھیں اور وہ ذکر نہیں کی گئیں سو اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اسے اس کے سارے اعمال دکھادے یہاں تک کہ جب وہ اسے ناقص اور کم سمجھنے لگے گا جو کتاب میں ہوگا تو اس تمام کے آخر میں وہ پائے گا کہ اس کی مغفرت کردی گئی ہے، اسے بخش دیا گیا ہے اور یہ کہ تو اہل جنت میں سے ہے، پس اس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے گا اور کہے گا: هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ (الحاقہ) (لو پڑھو میرا نامۂ عمل مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) پھر کافر کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پھر اسے لپیٹ دیا جائے گا اور اسے اس کی پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا اور اس کی گردن کو موڑ دیا جائے گا، پس اسی کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ (الانشقاق) (اور جس (بدنصیب) کو اس کا نامۂ عمل پس پشت دیا گیا۔) پس وہ اپنے نامہ عمل میں دیکھنے لگے پس اس کی برائیاں اور گناہ تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گے اور وہ اپنی نیکیوں میں دیکھے گا تا کہ وہ یہ نہ کہے کہ میں اسے گناہوں کا بدلہ دے رہا ہوں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ جب یہ آیت پڑھتے تو کہتے تھے: اے کاش! تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کبائر سے پہلے صغائر کے بارے چیخ و پکار کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صغیرہ سے مراد تبسم کرنا ہے، اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے، یعنی جب یہ اللہ عزوجل کی معصیت و نافرمانی کے عمل میں ہو؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ صغیرہ سے مراد ضحک (ہنسنا) ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ (ہنسنا) صغیرہ ہو جب وہ معصیت میں نہ ہو، کیونکہ معصیت کے سبب ہنسنا اس کے ساتھ رضا کا اظہار کرنا ہے اور معصیت کے ساتھ راضی ہونا بھی معصیت ہے، اور اسی بنا پر وہ کبیرہ ہو جاتا ہے، پس ان میں جمع اور تطبیق کی وجہ یہی ہوسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ یا پھر ضحک کو تبسم پر محمول کیا جائے گا اس روایت میں جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (النمل: 19) (تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے اس کی اس بات سے) اور حضرت سعید بن ... ہے: بے شک صغائر سے مراد چھوٹے گناہ کرنا اور گناہ کے قریب ہونا ہے مثلاً چھونا اور بوسہ لینا وغیرہ، اور کبیرہ سے ... اد گناہ میں واقع ہونا اور بدکاری کا ارتکاب کرنا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: قوم نے احصاء کی شکایت کی ہے، اور کسی نے ظلم کی شکایت نہیں کی، پس تم گناہوں کو حقیر سمجھنے سے بچو کیونکہ یہ اپنے کرنے والے پر جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس کا بیان بھی گزر چکا ہے۔ اور اَحْصٰىهَا کا معنی ہے اس نے انہیں شمار کرلیا ہے اور ان کا احاطہ کرلیا ہے؛ اور وسعت کے طور پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 49-48

احصاء کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا یعنی اس دن وہ تمام اعمال کو اپنے سامنے حاضر پا لیں گے جو انہوں نے کئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان اعمال کی جزا کو اپنے سامنے پالیں گے جو انہوں نے کئے وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو کسی دوسرے کے جرم کے بدلے نہیں پکڑے گا، اور نہ اس کے بدلے کسی کو پکڑے گا جو عمل اس نے نہیں کیا؛ یہ ضحاک نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ کسی طاعت و فرمانبرداری کرنے والے کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی گنہگار کی سزا میں اضافہ کرے گا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

”اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ قوم جن سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔ (اے اولاد آدم!) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں ایک سوال ہے، کہا جاتا ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ کا کیا معنی ہے؟ تو اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے...... اور یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا اس کے بارے اس نے فسق کا ارتکاب کیا پس اس نے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا، تو اس میں فسق کا سبب اس کے رب کا حکم ہوا، جیسے تو کہتا ہے: أطعمته عن جوع (میں نے بھوک کی وجہ سے اسے کھانا کھلایا۔) اور دوسرا قول ہے...... اور یہ محمد بن قطرب کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے: پس وہ اپنے رب کے حکم کو رد کرنے کے سبب فاسق ہو گیا۔ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو زجر و توبیخ کی طرز پر اپنے اس قول سے فرمایا: اے اولاد آدم! کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے، یعنی وہ تمہارے دشمن ہیں۔ پس یہ (عدو) اسم جنس ہے۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بدلے شیطان کی عبادت کرنا بہت برا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے بدلے شیطان بہت برا ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ابلیس کی اولاد اس کی صلب سے ہے؟ پس حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ سے کسی آدمی نے پوچھا: کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ تو میں نے کہا: بے شک وہ عُرس (اگا ہوا) ہے میں نے دیکھا نہیں ہے، پھر مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آ گیا: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ تو میں نے جان لیا کہ اولاد نہیں ہوتی مگر بیوی سے تب میں نے اسے کہہ دیا ہاں (اس کی بیوی ہے) اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (1): بے شک ابلیس نے اپنی شرمگاہ اپنی ہی شرمگاہ میں داخل کی تو اس نے پانچ انڈے دیئے، پس یہی اس کی اولاد کی اصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 575

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی دائیں ران میں ذکر پیدا کیا ہے اور بائیں ران میں فرج پیدا کی ہے، پس وہ اس کے ساتھ اس میں وطی کرتا ہے، اور ہر روز اس کے دس انڈے نکلتے ہیں، اور ہر انڈے سے ستر شیطان اور شیطانہ خارج ہوتے ہیں، پس وہ نکلتا ہے اور اڑ جاتا ہے، اور اپنے باپ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے عظیم اور بڑا وہ ہے جو اولاد آدم میں فتنہ برپا کرنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی ذریت، (بلکہ) اس کی ذریت شیاطین میں سے اس کے معاون و مددگار ہیں۔ قشیری ابونصر نے کہا ہے: خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ابلیس کی اتباع کرنے والے اس کی ذریت ہے، اور یہ کہ وہ اولاد آدم میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ اس کے دشمن ہیں، اور ہمارے نزدیک وہ کیفیت ثابت نہیں جس کیفیت میں اس سے توالد کا سلسلہ ہوتا ہے اور ابلیس سے اس کی ذریت پیدا ہوتی ہے، پس صحیح روایت کے مطابق اس بارے میں حکم متوقف فیہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں جو صحیح روایت سے ثابت ہے وہ ہے جسے حمیدی نے جمع بین الصحیحین میں امام ابوبکر رقانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں ابومحمد عبدالغنی بن سعید الحافظ سے عاصم کی روایت سے مسنداً ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ابوعثمان سے اور انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو بازار میں سب سے اوّل داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو وہیں شیطان انڈے اور بچے دیتا ہے۔''

اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کی اپنی صلب سے ہے، واللہ اعلم۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): قول باری تعالیٰ وَذُرِّيَّتَهٗ میں ظاہر لفظ شیاطین میں سے وسوسہ اندازی کرنے والوں کا تقاضا کرتا ہے، جو برائی کا ارتکاب کرتے ہیں اور باطل پر ابھارتے اور برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ابلیس کی ذریت شیاطین ہیں، اور انہیں زَلَنْبُور بازاروں والا شمار کرتا ہے، وہ زمین و آسمان کے درمیان ہر بازار میں اپنا جھنڈا گاڑھ دیتا ہے، اور وہ اس جھنڈا کو سب سے پہلے دکان کھولنے والے اور سب سے آخر بند کرنے والے کی دکان پر لگاتا ہے۔ اور ثَبَر صاحب المصائب ہے، وہ چہروں پر مارنے اور گریبان چاک کرنے کا، اور ہلاکت اور جنگ کو پکارنے کا حکم دیتا ہے اور أعور زانیوں کے دروازوں والا ہے اور مسوط خبریں دینے والا ہے، وہ انہیں لے کر آتا ہے اور انہیں لوگوں کے مونہوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ ان کی کوئی اصل نہیں پاتے۔ اور داسم وہ ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوا اور سلام نہ کہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر نہ کرے تو وہ اسے سامان میں سے وہ دکھا دیتا ہے جو اٹھایا نہیں گیا اور وہ جس کی جگہ صاف اور اچھی نہیں بنائی گئی، اور جب آدمی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہ کرے تو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اعمش نے کہا ہے: میں بسا اوقات گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے سلام کیا، تو میں نے لوٹا دیکھا اور میں نے کہا: اسے اٹھا لو! اور میں ان سے جھگڑ پڑا، پھر مجھے یاد آتا ہے تو میں کہتا ہوں: داسم داسم! أعوذ باللہ منہ (یعنی میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں) ثعلبی وغیرہ نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے یہ زائد بھی ذکر کیا ہے: اور الابیض یہ وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ کہف، جلد 3، صفحہ 522

وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور صخرا یہ وہ ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اچک لی تھی۔ اور الولھان یہ صاحب الطہارۃ ہے جو اس میں وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اور اقیس وہ ہے جو صاحب صلاۃ ہے یہ اس (نماز) میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اور مُرّہ یہ صاحب المز امیر ہے اور یہ اسی سے کنایہ ہوتا ہے۔ اور الھفاف یہ صحراؤں میں ہوتا ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ اور ان میں سے الغیلان بھی ہے۔ ابو مطیع مکحول بن فضل نسفی نے کتاب اللؤلؤیات میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ الھفاف صاحب الشراب ہے، اور لقوس انگیخت دینے والا ہے۔ اور الاعور سلطان کے دروازوں والا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ دارانی نے کہا ہے: بے شک ابلیس کا ایک شیطان ہے اس کو متقاضی کہا جاتا ہے، وہ ابن آدم سے تقاضا کرتا ہے اور اسے عمل کے بارے خبر دیتا ہے جو اس کا عمل بیس برس سے مخفی تھا، پس وہ اسے اعلانیہ کرنے لگتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت اور جو اس کی ہم جنس روایات ہیں ان کے بارے کوئی صحیح سند نہیں آئی، نقاش نے اس بحث کو طویل کیا ہے اور ایسی حکایات بیان کی ہیں جو صحت سے بہت دور ہیں، اس بارے میں میری نظر سے کوئی صحیح روایت نہیں گزری سوائے اس کے جو مسلم میں ہے (1) کہ نماز کے لئے ایک شیطان ہے وہ خنزب کہلاتا ہے۔ اور ترمذی نے ذکر کیا ہے کہ وضو کے لئے ایک شیطان ہے (2) اس کا نام الولھان ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہی نام کے بارے میں وہ تعیین جو ذکر کی گئی ہے تو وہ صحیح ہے اور رہی یہ بات کہ اس کے متبعین، معاونین اور لشکر ہیں تو اس بارے یہ مقطوع ہے، حالانکہ ہم نے اس بارے میں صحیح حدیث ذکر کی ہے کہ اس کی اولاد اس کی صلب سے ہے، جیسا کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک شیطان آدمی کی شکل بنالیتا ہے اور قوم کے پاس آجاتا ہے اور ان سے جھوٹی گفتگو کرتا ہے پس وہ متفرق ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے: میں نے ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے سنا میں اس کے چہرے کو تو پہچانتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا اس کا نام کیا ہے۔ مسند بزار میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو استطاعت رکھے تو سب سے پہلے بازار میں داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو کیونکہ وہ شیطان کا معرکہ ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنا جھنڈا نصب کرتا ہے۔'' اور مسند امام احمد بن حنبل میں ہے انہوں نے کہا، ہمیں عبداللہ بن مبارک نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں سفیان نے عطا بن سائب سے انہوں نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے اور انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ابلیس صبح کرتا ہے وہ اپنا لشکر پھیلا دیتا ہے اور کہتا ہے: جس نے کسی مسلمان کو گمراہ کیا میں اسے تاج پہناؤں گا۔ راوی نے بیان کیا پس ایک کہنے والا اسے آکر کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، وہ کہتا ہے: قریب ہے کہ وہ شادی کرلے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے نافرمانی کی، اس نے کہا:

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من الشیطان، جلد 2، صفحہ 224

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ماجاء کراھیۃ الاسراف، جلد 1، صفحہ 9

قریب ہے کہ وہ نیکی کرنے لگے۔ راوی کہتا ہے: پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے شراب پی لی، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے زنا کر لیا، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے قتل کر دیا، تو وہ کہتا ہے تو تو ہے! اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکر بھیجتا ہے پس رتبہ کے اعتبار سے ان میں سے اس کے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو فتنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو پس ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اس اس طرح کیا، تو وہ کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا فرمایا: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اسے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میں نے اس کے درمیان اور اس کے گھر والوں کے درمیان تفریق پیدا کر دی، جدائی ڈال دی پس وہ اسے قریب کرتا ہے یا کہا: پس وہ اس سے چمٹ جاتا ہے اور کہتا ہے: تو بہت اچھا ہے۔'' اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ امام ابو محمد عبدالمعطی کو اسکندریہ کی سرحد کے پاس یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ایک شیطان ہے اس کو بیضاوی کہا جاتا ہے وہ لگا تار روزے رکھنے والے فقراء کے پاس مثالی شکل میں آتا ہے اور جب ان میں بھوک شدید ہو جائے اور ان کے دماغوں کو نقصان اور تکلیف دینے لگے تو ان کے لئے ایک روشنی اور نور ظاہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ ان کے گھروں کو بھر دیتا ہے تو وہ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ پہنچ گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہوتا جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور اس کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے آج مورخہ ۸ ستمبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۷ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ بروز پیر بوقت دو بجے دن تفسیر قرطبی دسویں جز (پانچویں جلد) کا ترجمہ اپنے اختتام کو پہنچا میں رب کریم کی بارگاہ میں سراپا التجا ہوں کہ وہ اسے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ جلیلہ سے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور نفع عمیم کا باعث بنائے۔

امین بجاہ نبیہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین الی یوم الدین۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، تحریش الشیطان، جلد 2، صفحہ 376

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

# ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کی زیرنگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر دُرِّ منثور 6 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

# ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کی زیرنگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

# ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کتابِ رشد و ہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور و سرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

# تفسیر احکام القرآن 7 جلد

مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

آیات احکام کا مفصل لغوی و تفسیری حل، امہاتِ کتبِ تفسیر کی روشنی میں مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

یہ تفسیر طلباء، علماء، وکلاء، ججز اور عوام و خواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد ششم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام:

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور- کراچی ○ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد ششم) |
| مفسر | امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين والعاقبة للمتقين

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت مدد لی) جب خود انہیں پیدا کیا اور میں نہیں بنایا کرتا گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو۔ اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کرتے تھے، تو وہ انہیں پکاریں گے، پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ۔ اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی کوئی جگہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ بعض علماء نے فرمایا: ھم ضمیر کا مرجع ابلیس اور اس کی ذریت ہے یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور خود ان کی تخلیق میں ان سے مشورہ نہیں لیا تھا بلکہ میں نے اپنے ارادہ کے مطابق انہیں تخلیق کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: میں نے ابلیس اور اس کی ذریت سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں مشورہ نہیں لیا اور نہ ان مشرکوں کی ذوات کی تخلیق میں ان سے مشورہ لیا تھا۔ تو پھر انہوں نے میرے سوا ان کو دوست کیسے بنالیا؟ بعض علماء نے فرمایا: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ میں ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں اور تمام لوگ ہیں۔ پس آیت کے ضمن میں نجومیوں، اہل طبائع، اطباء اور ان کے علاوہ لوگوں کا رد ہے جو ان اشیاء سے اندازے لگاتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو سنا وہ کہتے تھے میں نے فقیہ ابو عبد اللہ محمد بن معاذ مہدوی کو مہدیہ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبد الحق صقلی کو یہ قول کرتے ہوئے سنا وہ اس آیت میں یہ تفسیر کرتے تھے کہ یہ آیت ان طوائف کا رد کرنے والی ہے (1)۔ یہ بعض اصولیین نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں کہتا ہوں: آیت سے اولاً مقصود ابلیس اور اس کی اولاد ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ طوائف کا رد ثابت ہوتا ہے اور ان لوگوں کا رد ثابت ہے جو کاہن اور جنوں کی تعظیم کرنے والے ہیں، جب وہ کہتے ہیں: أعوذ بعزیز هذا الوادی میں اس وادی کے غالب کی پناہ چاہتا ہوں کیونکہ یہ تمام گروہ ابلیس اور اس کی ذریت سے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 523

ہیں۔ انہوں نے ان سب کو گمراہ کیا ہے۔ الْمُضِلِّيْنَ سے یہی مراد ہیں۔ اور یہ تمام مذکورہ گروہ ان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ثعلبی نے کہا: بعض اہل علم نے کہا: مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نجومیوں کا رد ہے کیونکہ انہوں نے کہا: افلاک زمین میں پیدا کیے جاتے ہیں، اور بعض میں بعض پیدا کیے جاتے ہیں اور الْاَرْضِ کا قول اصحاب ہندسہ کا رد ہے کیونکہ انہوں نے کہا: زمین کروی ہے اور افلاک اس کے نیچے چلتے ہیں، لوگ اس کے نیچے اور اس کے اوپر ہیں۔ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ طبائعین کا رد ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ طبائع نفوس میں اثر کرتی ہیں۔ ابوجعفر نے ''ما أشهدناهم'' پڑھا ہے یعنی تعظیم کے لیے نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کی دلیل وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ ہے یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں نہ ان سے مدد لی ہے اور نہ میں نے ان سے مشورہ کیا: وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ یعنی شیاطین۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمُضِلِّيْنَ سے مراد کفار ہیں۔ عضداً مددگار۔ کہا جاتا ہے أعتضدتُ فلاناً تو اس سے مدد طلب کرے اور قوت حاصل کرے۔ اس میں اصل عضد الید ہے، یعنی باز، پھر یہ مدد کے لیے استعمال کیا گیا کیونکہ ہاتھ کا قوام عضد (کہنی سے اوپر والا حصہ) کہا جاتا ہے: عَضَدَہ وعَاضَدَہ علی کذا۔ جب کوئی کسی کی مدد کرے اور اسے تقویت دے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ (القصص: 35) یعنی ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیری مدد کریں گے۔ لفظ عضد، المثل کی جہت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ مذمت اور توبیخ میں زیادتی کے لیے مضلین کا خاص ذکر کیا۔ ابوجعفر جحدری نے وما کنت تاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تو گمراہوں کو اپنا دست و بازو بنانے والا نہیں۔ عَضُدًا میں آٹھ وجوہ ہیں۔ عَضُد عین کے فتحہ اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ، یہ جمہور کی قرأت ہے، اور یہ افصح وجہ ہے۔ عَضْدًا عین کے فتحہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یہ بنی تمیم کی لغت ہے، عُضُدًا عین اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ، یہ ابو عمرو اور حسن کی قرأت ہے۔ عُضَدًا عین کے ضمہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ عکرمہ کی قرأت ہے۔ عِضَدًا عین کے کسرہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ الضحاک کی قرأت ہے۔ عَضَدًا عین اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ عیسیٰ بن عمر کی قرأت ہے۔ ہارون القاری نے عَضِد عین کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ اور آٹھویں لغت عِضْدًا عین کے کسرہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یہ ان کی لغت ہے جو کِتْف اور فِخْذٌ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ۔ يَوْمَ سے پہلے أذکر و افعل محذوف ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک، یعنی بلاؤ انہیں جنہیں تم میرا شریک ٹھہراتے تھے، تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں، یہ بت پرستوں کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ حمزہ، یحییٰ، عیسیٰ بن عمر نے فنقول، نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ آگے شُرَكَآءِيَ فرمایا ہے۔ شرکائنا نہیں فرمایا۔ فَدَعَوْهُمْ پس مشرک اپنے بتوں کو پکاریں گے فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ تو وہ انہیں مدد کے لیے کوئی جواب نہیں دیں گے، اور نہ ان سے کسی عذاب کو روکیں گے۔ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا حضرت انس بن مالک نے فرمایا(1): موبق جہنم میں پیپ اور خون کی ایک

---

1۔ البحر الوجیز، جلد 5، صفحہ 523

وادی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم مومنوں اور کفار کے درمیان آڑ بنائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: بتوں اور ان کے عبادت کرنے والوں کے درمیان آڑ بنائیں گے جیسے فرمایا: فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ۔

ابن اعرابی نے کہا: ہر وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان آڑ ہو وہ موبق ہے۔ ابن وہب نے مجاہد سے موبقا کے تحت روایت کیا ہے کہ جہنم میں ایک وادی ہے جسے موبق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نوف البکالی نے کہا، مگر اس نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے اور مومنین کے درمیان آڑ بنادی جائے گی۔ عکرمہ نے کہا: یہ جہنم میں ایک نہر ہے جو آگ کے ساتھ بہتی ہے اس کے کناروں پر کالے خچروں کی مانند سانپ ہیں۔ جب وہ سانپ انہیں ڈسنے کے لیے جھپٹیں گے تو وہ آگ میں گھس کر پناہ لیں گے۔ زید بن درہم نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: مَّوْبِقًا جہنم میں پیپ اور خون کی ایک وادی ہے(1)۔ ضحاک اور عطا نے کہا: جہنم میں ایک ہلاکت کی جگہ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: أوبقته ذنوبه إيباقا۔ گناہوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہلاکت کی جگہ۔ جوہری نے کہا: وبق يبق وبوقا اس کا معنی ہے ہلاک ہونا۔ الموبق، الموعد کی مثل ہے۔ وعد يعد سے مفعِلٌ کے وزن پر ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا اس میں ایک اور لغت بھی ہے: وبق يوبق وبقا اور اس میں ایک تیسری لغت بھی ہے: وبق يبق ماضی اور مضارع دونوں کا عین کلمہ مکسور ہے۔ اوبقه، اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ زہیر نے کہا:

مَنْ يَشْتَرِي حسنَ الثَّناءِ بمالِه  يَصُنْ عِرَضَه من كل شَنْعَاءَ مُوبِقُ

فراء نے کہا: ان کا باہم ملنا آخرت میں ان کے لیے ہلاکت بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ اصل میں رأی ہے یاء متحرک تھی جس کا ماقبل مفتوح تھا تو اسے الف سے بدلا، اسی وجہ سے کوفیوں کا خیال ہے کہ رأی کو یا کے ساتھ لکھا جائے۔ بعض بصریوں نے بھی ان کی متابعت کی ہے، لیکن ماہر بصری علماء نے جن میں محمد بن یزید بھی ہے وہ الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے کہا، میں نے محمد بن یزید کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مضیٰ، رمیٰ اور تمام یائی حروف کو صرف الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ یاء والے اور خط میں واو والے حروف میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ لفظ میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اگر یا والے حروف کو یاء کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا تو واؤ والے حروف کو واو کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا حالانکہ وہ خود ہی اپنے کلیہ کو توڑتے ہیں۔ رمی کو یاء کے ساتھ اور رماہ کو الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر علت یہ ہوتی کہ یہ یاء والے حروف سے ہے تو بھی رماہ کو یاء کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا پھر وہ ضحا لکھتے ہیں، جو ضحوۃ کی جمع ہے اور کُسا لکھتے ہیں، جو کسوۃ کی جمع ہے یہ دونوں واوی سے ہیں یاء سے لکھے گئے ہیں یہ وہ چیز ہے جو اصل پر ثابت نہیں ہوتی۔

فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا۔ یہاں ظن بمعنی یقین اور علم ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فَقلتُ لهم ظُنُّوا بِأَلْفَيْ مُدَجَّجٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 523

یعنی انہوں نے یقین کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہوں نے یقین کیا کہ وہ گرنے والے ہیں اس میں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ آگ کو دور سے دیکھیں گے تو خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔ اور انہوں نے گمان کیا وہ بھی انہیں پکڑ لے گی۔ حدیث میں ہے "کافر جہنم کو دیکھے گا اور گمان کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ چسپاں ہونے والی ہے، حالانکہ وہ چالیس سال کی مسافت پر ہو گی" (1)۔ مواقعہ کا معنی ہے کسی شے کے ساتھ سختی کے ساتھ وابستہ ہو جانا۔ علقمہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فَظَنُّوا اَنَّهُمْ مُلَافُوْهَا پڑھا ہے یعنی وہ اس میں جمع ہونے والے ہیں۔ اللَّفَفُ کا معنی جمع کرنا ہے۔ وَ لَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا یعنی وہ نجات کی کوئی جگہ نہ پائیں گے کیونکہ وہ ہر جانب سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہو گی۔ قتبی نے کہا: کوئی پھرنے کی جگہ نہ پائیں گے جس کی طرف وہ پھر جائیں بعض نے فرمایا: کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے جس کی طرف پناہ لیں۔ ان تمام الفاظ کا مفہوم ایک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے بت اور مورتیاں آگ کو مشرکوں سے پھیرنے کی جگہ نہ پائیں گی۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَ مَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

"اور بیشک ہم نے طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آ گئی ان کے پاس ہدایت کی روشنی اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس اگلوں کا دستور یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب، اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے، اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کی آڑ لیکر تاکہ وہ ہٹا دیں اس سے حق کو اور بنا لیا ہے انہوں نے میری آیتوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے، ایک مذاق۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کی ان سے اور فراموش کر دیا اس نے ان

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 15-16، صفحہ 307

(اعمال بدکو) جو آگے بھیجے تھے اس کے دونوں ہاتھوں نے ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحم والا ہے، اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے کیے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا (وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ۔ اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کر دیا ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ**۔ یہ دو احتمال رکھتا ہے: ایک وہ جو ان کے لیے عبرت ناک واقعات اور گزشتہ اقوام کے تذکرے ذکر فرمائے۔ دوسرا احتمال یہ کہ اس نے ان کے لیے اپنی ربوبیت کے دلائل واضح فرمائے۔ یہ پہلے سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ پہلی صورت میں یہ زجر و توبیخ ہو گا اور دوسری صورت میں بیان ہو گا۔ **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا**۔ **جَدَلًا** سے مراد جھگڑنا ہے۔ اس سے مراد نضر بن حارث ہے اور اس کا قرآن کے بارے میں جھگڑنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ابی بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے کافر ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ اس کی دلیل کہ انسان سے مراد کافر ہے، یہ ارشاد ہے: **وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ**۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز کفار میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: جو میں نے تیری طرف بھیجا تھا تو نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ کہے گا: یارب! میں تجھ پر ایمان لایا، تیرے رسولوں کی تصدیق کی اور تیری کتاب کے مطابق عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: یہ تیرا صحیفہ ہے اس میں تو اس میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ شخص کہے گا: یارب! جو کچھ اس صحیفہ میں ہے میں اسے قبول نہیں کرتا، اسے کہا جائے گا: یہ تیرے کندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ وہ کہے گا: میں انہیں بھی قبول نہیں کرتا، وہ کہے گا: یارب! میں انہیں کیسے قبول کروں یہ میرے پاس سے اور میری طرف سے نہیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یہ لوح محفوظ اس کی شہادت دیتی ہے۔ وہ شخص کہے گا: یارب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی تھی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیوں نہیں۔ وہ عرض کرے گا: یارب! میں قبول نہیں کروں گا مگر جو مجھ پر میرے نفس سے گواہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں ابھی تجھ پر تیرے نفس سے لاتا ہوں، وہ غور کرے گا: کون میرے نفس سے مجھ پر گواہی دے گا؟ پس اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی پھر اس کے اعضاء اس کے شرک کے متعلق بولیں گے پھر اس کے اور کلام کے درمیان کچھ حائل نہیں کیا جائے گا پس وہ آگ میں داخل ہو گا؟ اس کا بعض بعض کو لعنت کرے گا۔ وہ اپنے اعضاء کو کہے گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے، میں تمہاری طرف سے جھگڑ رہا تھا۔ اس کے اعضاء اس سے کہیں گے: اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے، اللہ تعالیٰ سے بات چھپائی جاتی ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ایسی چیزوں کو بیان کر رہا ہے: **وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا**''۔ اس حدیث کے ہم معنی امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات کے وقت ان کا اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فرمایا: کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں جب وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ جاتے ہیں (1)۔ نبی پاک ﷺ واپس پلٹے جب میں نے یہ کہا۔ پھر میں نے آپ کو سنا جبکہ آپ واپس جارہے تھے، تو اپنی ران پر ہاتھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے: وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا "۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ۔ الْهُدَىٰ سے مراد قرآن، اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ۔ یعنی ہماری انہیں ہلاک کرنے کی سنت ہے، یعنی انہیں ایمان لانے سے نہیں روکا مگر میرے فیصلہ نے جوان پر تھا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اگر میں ان پر ایمان کا فیصلہ کرتا تو وہ ایمان لے آتے۔ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ یعنی نیست و نابود کرنے والے عذاب کی سنت جو پہلے لوگوں کے متعلق تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں ایمان لانے سے نہیں روکا مگر اس چیز کی طلب نے کہ ان پر بھی پہلے لوگوں کی سنت آئے پھر اس طلب کو حذف کیا گیا۔ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ سے مراد عذاب کو دیکھنا ہے مشرکوں نے اسی چیز کو طلب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا: "اللهم ان کان هذا هو الحق من عندك"۔

أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا۔ قُبُلًا پر نصب حال کی بنا پر ہے، اس کا معنی ہے عیاناً یعنی سامنے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد بدر کے دن کی تلوار ہے (2)۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد فجأۃ، اچانک ہے۔ ابوجعفر، عاصم، اعمش، حمزہ، یحییٰ اور کسائی نے قُبُلًا دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور انہوں نے عذاب کی ساری اقسام مراد لی ہیں۔ یہ قبیل کی جمع ہے جیسے سبیل کی جمع سُبُل ہے۔ فراء کا مذہب یہ ہے کہ قبلا، قُبیل کی جمع ہے اور اس سے مراد متفرق عذاب ہے جو یکے بعد دیگرے آتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کا عیانا معنی بھی ہوسکتا ہے۔ اعرج نے کہا: اس کی قرأت قُبُلًا ہے جس کا معنی جمیعًا ہے۔ ابوعمرو نے کہا: اس کی قرأت قِبَلًا ہے اس کا معنی عیانًا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ۔ یعنی ایمان والوں کو جنت کی بشارت دینے والے۔ وَمُنْذِرِينَ۔ کافروں کو عذاب سے ڈرانے والے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ المقتسمین کے بارے نازل ہوئی جو نبی پاک ﷺ سے جھگڑتے تھے، وہ کہتے: جادوگر ہے، مجنون ہے، شاعر ہے۔ کبھی کہتے: کاہن ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ لِيُدْحِضُوا۔ کا معنی ہے زائل کرنا، باطل کرنا، الدحض اصل معنی پھسلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دحضت رجله یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ تدحض دحضا۔ دحضت الشمس عن کبد السماء، یعنی سورج ڈھل گیا۔ دحضت محبته دحوضا۔ یعنی اس کی محبت باطل ہوگئی۔ أدحضها الله۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باطل کردیا۔ الادحاض کا معنی پھسلنا ہے۔ پل صراط کی تعریف میں ہے جہنم پر ایک پل بنایا جائے گا، شفاعت کا اذن دیا جائے گا۔ انبیاء کرام کہیں گے: سلم سلم اے اللہ سلامتی عطا فرما۔ پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ پل کیا ہے۔ فرمایا: دحض مزلقة۔ وہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، الحث علی صلوٰۃ اللیل، جلد 1، صفحہ 265

2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 578

پھسلن ہے جس میں پاؤں پھسل جائیں گے۔ طرفہ نے کہا:

أيا منذِرٍ رُمتَ الوفاءَ فهِبته		وحِدْتَ كما حادَ البَعيرُ عن الدَّحْضِ

وَاتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ آیات سے مراد قرآن ہے۔ وَمَآ اُنْذِرُوْا، یعنی جو انہیں وعید سنائی گئی۔ هُزُوًا مزاق۔ ما مصدریہ ہے یعنی الانذار۔ بعض نے فرمایا: ما موصولہ ہے، یعنی انہوں نے قرآن اور جس وعید سے انہیں ڈرایا گیا اسے مزاق بنایا۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مکھن اور کھجور کے بارے میں ابوجہل کا قول ہے، اس نے کہا تھا: یہ زقوم ہے۔ بعض نے فرمایا: ان کا قرآن کے متعلق یہ کہنا ہے کہ یہ جادو ہے، خیالات ہیں اور پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ اور انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ یہ نہیں مگر تمہاری مثل بشر اور انہوں نے کہا: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ (الزخرف) مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا۔ (البقرہ: 26)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا یعنی کوئی اس سے اپنے نفس پر زیادہ ظلم کرنے والا نہیں جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی گئی پھر اس نے ان سے نصیحت حاصل کرنے میں کوتاہی کی اور ان کو قبول کرنے سے اعراض کیا۔ وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ اپنے کفر اور گناہوں کو چھوڑ دیا اور اس سے توبہ نہ کی، یہاں نسیان کا معنی ترک کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اسے بھول گیا جو اس نے اپنے لیے آگے بھیجا اور جو اس نے عذاب حاصل کیا۔ ان دونوں اقوال کا معنی قریب قریب ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا یعنی ان کے کفر کے سبب ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے اور کانوں میں گرانی پیدا کر دی، یعنی ہم نے روک دیا ایمان کو کہ ان کے دلوں اور کانوں میں داخل ہو۔ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى۔ ھدی سے مراد ایمان ہے، یعنی اگر آپ انہیں ایمان کی طرف بلائیں: فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا وہ پھر بھی ہدایت نہ پائیں گے۔ یہ آیت معین لوگوں کے متعلق نازل ہوئی۔ قدریہ کے قول کا اس سے رد ہوتا ہے۔ اس کا معنی سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ یعنی وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے، یہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے کفار اس میں داخل نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: 48)۔ ذُو الرَّحْمَةِ۔ اس میں چار تاویلات ہیں۔ 1۔ ذو العفو۔ معافی دینے والا۔ 2۔ ذو الثواب۔ ثواب دینے والا۔ ان دونوں تاویلات پر اہل ایمان کے ساتھ مختص ہوگا کفار داخل نہ ہوں گے۔ 3۔ ذو النعمة۔ نعمتیں عطا فرمانے والا۔ 4۔ ذو الهدى۔ ہدایت دینے والا۔ ان دونوں تاویلات کی بنا پر یہ اہل ایمان اور کفار دونوں کو شامل ہوگا، کیونکہ وہ دنیا میں کافر پر بھی انعام فرماتا ہے جس طرح مومن پر انعام فرماتا ہے۔ اس نے اپنی ہدایت کو کافر کے لیے واضح کیا جس طرح اس نے اپنی ہدایت کو مومن کے لیے واضح کیا مگر اس سے مومن نے ہدایت پائی اور کافر محروم رہا (1)۔ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا یعنی اگر کفر اور گناہوں کی وجہ سے مواخذہ کرتا تو انہیں جلدی عذاب دیتا لیکن وہ مہلت دیتا ہے۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ۔ یعنی مدت مقرر ہے اس تک انہیں

1۔ النکت والعیون، جلد 3 صفحہ 320

ڈھیل دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (انعام: 67) لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ الخ (الرعد) جب وہ وقت آجائے گا تو عذاب ان سے موخر نہ ہوگا خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا۔ مَوْىِٕلًا سے مراد پناہ گاہ ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن زید کا قول ہے، یہ جوہری نے ''الصحاح'' میں حکایت کیا ہے (1)۔ وال یئل والا و ؤولا بروزن فعول، اس کا معنی ہے پناہ لینا۔ واءل بروزن فَاعَل، اس کا معنی ہے نجات طلب کرنا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے محرزا۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے ولیا (دوست)، ابوعبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے نجات کی جگہ۔ بعض نے فرمایا: محیصا (پناہ گاہ)، سب کا معنی ایک ہے۔ عرب کہتے ہیں: لا وألت نفسہ۔ یعنی اس کا نفس نجات نہ پائے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

لا وَأَلَتْ نفسُك خَلَّيْتَها لعامِرِيَيْنِ ولم تُكلَمِ

اور الاعشیٰ نے کہا:

وقد أخالِسُ ربَّ البيتِ غَفْلَتَهُ وقد يُحَاذِرُ مِنِّي ثم مايَئِلُ (2)

یعنی نجات نہیں پاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ۔ تِلْكَ محل رفع میں مبتدا ہے۔ الْقُرٰۤى نعت یا بدل ہے۔ اَهْلَكْنٰهُمْ خبر کے مقام پر ہے، معنی پر محمول ہے کیونکہ الْقُرٰۤى سے مراد اهل القریٰ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تِلْكَ محل نصب میں ہو، ان علماء کے قول پر جو کہتے ہیں: زیداً ضربتہ یعنی وہ بستیاں جن کی خبریں ہم نے آپ پر بیان کی ہیں جیسے قوم عاد، ثمود، مدین، لوط کی بستیاں ہم نے انہیں ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کیا اور کفر کیا۔ وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا یعنی ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے اس سے تجاوز نہیں ہوگا۔ مهلك، یہ أهلكوا سے مشتق ہے۔ عاصم نے مهلكهم میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ اس صورت میں هلك کا مصدر ہوگا۔ کسائی اور فراء نے مهلكهم لام کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی نے کہا یہ میرے نزدیک بہتر ہے کیونکہ یہ هلك سے ہے۔ زجاج نے کہا: مهلك اسم ظرف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے لوقت مهلكهم جیسے کہا جاتا ہے: اتت الناقة على مضربها یعنی اونٹنی حاملہ ہونے کے وقت پر آئی۔

**وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝۶۰**

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ پہنچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں (چلتے چلتے) گزار دوں گا مدت دراز''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ۔ جمہور علماء اور اہل تاریخ کا قول یہ ہے کہ

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 311
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 526

اس موسیٰ سے حضرت موسیٰ بن عمران مراد ہیں۔ جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ قرآن میں ان کے علاوہ کسی موسیٰ کا ذکر نہیں ہے۔ ایک فرقہ نے کہا جن میں نوف بکالی بھی ہے کہ موسیٰ بن عمران نہیں ہے۔ یہ موسیٰ بن منشا بن یوسف بن یعقوب ہے۔ یہ موسیٰ بن عمران سے پہلے نبی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صحیح بخاری میں اس قول کا رد کیا ہے(1)۔ فتاہ سے مراد حضرت یوشع بن نون ہے۔ اس کا ذکر سورۃ المائدہ میں اور سورۂ یوسف کے آخر میں گزر چکا ہے۔ اور جن علماء نے کہا یہ موسیٰ بن منشا ہے ان کے نزدیک فتاہ سے مراد یوشع بن نون نہیں ہے۔ لَآ اَبْرَحُ ''میں ہمیشہ چلتا رہوں گا''، شاعر نے کہا:

وأبرحُ ما أدام اللهُ قومی    بحمد الله مُنْتَطِقًا مُجِیدًا

بعض علماء نے فرمایا: لَآ اَبْرَحُ کا معنی ہے میں تجھ سے جدا نہ ہوں گا حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ، قتادہ نے کہا: یہ فارس اور روم کے دریا ہیں (2)، یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس سے مراد پانی کا وہ بازو ہے جو بحر محیط سے شمالی طرف سے جنوب کی طرف فارس کی زمین میں اذربائیجان کے پیچھے سے نکلتا ہے(3)۔ اس قول کی بناء پر وہ جگہ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ ہوگی جہاں دو دریا ملتے ہیں جو شام کی خشکی سے ملتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قلزم اور اردن کے دریا ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ طنجہ کے قریب مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ ہے، یہ محمد بن کعب نے کہا ہے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے: یہ افریقہ میں ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد ارمینیہ میں الکر اور الرس دو نہریں ہیں۔ بعض اہل علم نے کہا: یہ بحر اندلس اور بحر محیط سے ہے، یہ نقاش نے حکایت کیا ہے۔ یہ زیادہ ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: دریاؤں سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام ہیں۔ یہ ضعیف قول ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا گیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ احادیث سے بالکل واضح ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانی کے دریا تھے۔ اس قصہ کا سبب وہ ہے جو امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں خطبہ دیا، تو ان سے پوچھا گیا: لوگوں میں سے کون بڑا عالم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ انہوں نے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ میرا ایک بندہ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ میں ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایک مچھلی لے لو اور اسے ایک ٹوکرے میں رکھ لو جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ وہاں ہوگا(4)۔ یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم مصر کی زمین پر غالب آئی تو آپ نے اپنی قوم کو مصر میں اتارا جب وہ پوری طرح وہاں گھروں میں آباد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایام اللہ یاد کرنے کا حکم دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ نے جو ان پر نعمت و خیر فرمائی تھی وہ انہیں یاد دلائی کہ اس نے فرعونیوں سے انہیں نجات دلائی اور ان کے دشمن کو ہلاک کیا اور انہیں مصر کی زمین میں خلیفہ بنایا پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے

1۔ صحیح بخاری، سورۃ براءۃ، باب واذ قال موسی لفتٰہ، جلد 2، صفحہ 687
2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 313
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 527
4۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 580

نبی سے کلام فرمائی اور اسے اپنی ذات کے لیے منتخب فرمایا اور اس نے مجھ پر محبت ڈالی اور تمہیں وہ سب کچھ عطا فرمایا جو تم نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا، اور تمہیں اپنے زمانہ کی افضل قوم بنایا، اس نے تمہیں ذلت کے بعد عزت بخشی، فقر کے بعد غنا عطا فرمائی، تم جاہل تھے اس کے بعد تمہیں تورات بخشی، بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کہا: ہم جان چکے ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں کیا سطح زمین پر تم سے زیادہ کوئی عالم ہے؟ اے اللہ کے نبی! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: نہیں! اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا جب انہوں نے علم کی نسبت اللہ کی طرف نہ کی پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جبرئیل امین کو بھیجا (اور یہ پیغام دیا) کہ اے موسیٰ! تجھے کیا معلوم کہ میں کہاں علم رکھتا ہوں؟ ہاں میرا ایک بندہ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ میں تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث میں ہے ھو أعلم منك وہ تم سے زیادہ علم والا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مفصل واقعات کے احکام اور معین حادثات کے حکم کے جاننے کے اعتبار سے تم سے زیادہ علم والا ہے نہ کہ مطلقاً۔ اس کی دلیل حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہنا ہے کہ تو ایسے علم پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے سکھایا ہے جسے میں نہیں جانتا اور میں ایسے علم پر ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھایا ہے جسے تو نہیں جانتا۔ اس بنا پر ہر ایک پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ اپنے علم کے اعتبار سے دوسرے سے زیادہ علم والا تھا جو دوسرا نہیں جانتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد سنا تو ان کے فاضل نفس میں شوق پیدا ہوا اور ان کی بلند ہمت میں جذبہ ابھرا تاکہ وہ علم حاصل کریں جو وہ نہیں جانتے اور ان کی ملاقات کا شوق ہوا جس کے متعلق کہا گیا کہ وہ تجھ سے زیادہ علم والا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عزم کیا اور پوچھا کہ اس تک کیسے پہنچا جائے تو انہیں ہر حال پر چلنے کا حکم ملا، انہیں کہا گیا کہ تم اپنے ساتھ ایک نمکین مچھلی ایک زنبیل میں اٹھالو جہاں وہ زندہ ہو جائے اور تم سے گم ہو جائے وہاں اس کا راستہ ہے۔ آپ اپنے نوجوان کو ساتھ لے کر پوری کوشش سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ میں چلتا رہوں گا حتیٰ کہ میں مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ تک پہنچ جاؤں گا۔ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۔ حاء اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ اس سے مراد زمانہ ہے اس کی جمع احقاب ہے۔ اور یہ اسی سال کا زمانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ زمانہ ہے اور جمع أحقاب ہے، اور الحقبة حاء کے کسرہ کے ساتھ الحِقَب کا واحد ہے، اس سے مراد سال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ عالم کو علم کی زیادتی کی خاطر سفر کرنا چاہیے اور اس پر خادم اور ساتھی سے مدد لینی چاہیے فضلاء اور علماء کی ملاقات حاصل کرنی چاہیے اگرچہ اس کا سفر بہت دور بھی ہو، یہ سلف صالحین کی عادت تھی۔ اسی وجہ سے سفر کرنے والوں نے علم کا وافر حصہ پایا اور اس کوشش پر کامیابی حاصل کی ان کے قدم علوم میں راسخ ہو گئے، اور ان کے لیے اجر، فضل کی ساری اقسام صحیح ہیں۔ امام بخاری نے فرمایا: حضرت جابر بن عبداللہ نے عبداللہ بن انیس کی طرف ایک حدیث کی خاطر ایک مہینہ کا سفر کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ۔ اس کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: 1۔ وہ نوجوان آپ کی خدمت کرتا تھا، عرب کلام میں الفتی نوجوان کو کہتے ہیں، اکثر خدمت کرنے والے نوجوان ہوتے ہیں، اس لیے خادم کو حسن ادب کی جہت سے فتی کہا جاتا ہے۔ شریعت نے ایسے لفظ کو پسند فرمایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا

یقل أحد کم عبدی ولا أمتی ولیقل فتای وفتاتی (1) ''تم میں سے کوئی عبدی اور امتی نہ کہے بلکہ فتای اور فتاتی کہے''۔ یہ تواضع کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اس بحث کا ذکر سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔ ایت میں الفتی سے مراد خادم ہے اور وہ یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام تھے۔ کہا جاتا ہے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کو فتی موسیٰ اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ آپ سے چمٹے رہتے تھے تاکہ حضرت موسی علیہ السلام سے علم حاصل کریں، اگرچہ وہ آزاد تھے، یہ پہلا معنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ وہ فتی (غلام) کے قائم مقام تھے اس لیے انہیں فتی موسیٰ کہا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ (یوسف: 62) اور فرمایا: تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف: 30) ابن عربی نے کہا: قرآن کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ غلام تھے۔ اور حدیث میں ہے وہ یوشع بن نون تھا اور تفسیر میں ہے وہ آپ کا بھانجا تھا۔ ان اقوال میں کوئی بات قطعی نہیں اس لیے توقف میں سلامتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا: الحقب اسی سال ہیں۔ مجاہد نے کہا: ستر سال ہیں (2)۔ قتادہ نے کہا: ایک زمانہ ہے۔ نحاس نے کہا: اہل لغت جس کو جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ الحقب اور الحقبۃ غیر محدود مبہم زمانہ ہے، جیسا کہ رهطا اور قوما مبہم غیر محدود ہیں۔ اور اس کی جمع أحقاب ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ۝ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ٘ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۝ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ٘ وَ مَاۤ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَ اتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۝ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝

''پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی مچھلی کو تو بنالیا اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی طرح۔ پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا: لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیشک ہمیں برداشت کرنا پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت۔ اس کے ساتھی نے کہا: اے کلیم! آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم (ستانے کے لیے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں، بڑے تعجب کی بات ہے۔ آپ نے فرمایا: یہی تو وہ ہے جس کی جستجو کر رہے تھے، پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے جسے ہم نے عطا فرمائی

1۔ صحیح مسلم، حسنہ الصلاۃ، جلد 2، صفحہ 238 2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 314

تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا۔ بَيْنِهِمَا کی ضمیر بحرین کے لیے ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے۔ السراب کا معنی ہے گزرگاہ، سرنگ، یہ بھی مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: پانی تھم گیا اور وہ سرنگ کی طرح ہو گیا۔ جمہور مفسرین نے کہا: مچھلی اپنے چلنے کی جگہ میں پانی میں موجود تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے پیچھے پیچھے چلے حتیٰ کہ اس کے ذریعے دریا میں ایک جزیرہ کے راستہ پر پہنچے۔ اس میں حضرت خضر علیہ السلام کو پایا۔ ظاہر روایات اور کتاب کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ملاقات دریا کے ساحل پر ہوئی تھی۔ نَسِيَا حُوتَهُمَا نسیان تو صرف نوجوان کو ہوا تھا لیکن یہاں دونوں کی طرف نسیان کی نسبت کی گئی ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ منظر بتانا بھول گیا تھا جو اس نے مچھلی کی حالت سے دیکھا تھا تو صحبت کی وجہ سے ان دونوں کی طرف نسیان کو منسوب کیا گیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمٰن: 22) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ (انعام: 130)۔ حالانکہ رسل صرف انسانوں سے تھے جنوں سے نہیں تھے مگر مصاحبت کی وجہ سے ان کو بھی خطاب میں جمع کیا گیا۔ بخاری میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان سے کہا: میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا مگر یہ کہ تو مجھے بتا جہاں تجھ سے مچھلی جدا ہوئی تھی، فرمایا: میں نے تجھے کوئی بڑی تکلیف نہیں دی (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فتا سے مراد یوشع بن نون ہے یہ سعید بن مسیب سے نام مروی نہیں ہے۔ فرمایا: جب وہ تر مٹی پر چٹان کے سایہ میں تھا تو مچھلی تڑپی حضرت موسیٰ علیہ السلام سوئے ہوئے تھے، نوجوان نے کہا: میں آپ کو جگاتا نہیں ہوں حتیٰ کہ جب آپ بیدار ہوں گے تو بتا دوں گا، تو وہ جب بیدار ہوئے تو وہ بتانا بھول گیا مچھلی تڑپی اور دریا میں داخل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پانی کا بہاؤ روک لیا حتیٰ کہ گویا اس کا نشان (سوراخ) پتھر میں ہے، مجھے عمرو نے کہا: اس طرح گویا اس کا اثر (سوراخ) پتھر میں ہے۔ انہوں نے اپنے انگوٹھے اور ساتھ والی دو انگلیوں سے حلقہ بنایا۔ ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے پانی کا بہاؤ روک لیا اور وہ اس پر طاق کی طرح ہو گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو ان کا ساتھی انہیں مچھلی کے متعلق بتانے کے بارے میں بھول گیا۔ وہ بقیہ دن اور رات چلتے رہے حتیٰ کہ جب دوسرا دن تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان سے کہا: ہمارا صبح کا کھانا لے آ ہمیں اس سفر میں مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکن نہ ہوئی حتیٰ کہ اس مکان سے تجاوز کر گئے جس کا اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے نوجوان نے کہا: کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم ستانے کے لیے چٹان کے پاس گئے تو میں مچھلی بھول گیا اور مجھے وہ فراموش نہیں کرائی مگر شیطان نے کہ اس کا ذکر کروں۔ بعض علماء نے فرمایا: بھولنا دونوں کی طرف سے تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسِيَا۔ نسیان کی دونوں کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ ابتدا میں مچھلی کا اٹھانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھا کیونکہ انہیں مچھلی اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا جب وہ دونوں چلے تو پھر مچھلی اٹھانے والا نوجوان تھا حتیٰ کہ چٹان کے پاس اُترے۔

1۔ صحیح بخاری، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 688

فَلَمَّا جَاوَزَا یعنی جب مچھلی چھوڑ کر آگے گزر گئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبح کے کھانے کا سوال کیا تو نوجوان نے نسیان کی نسبت اپنی طرف کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ کے پاس ان کے بھولنے کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد چٹان ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نسیان میں شریک تھے کیونکہ نسیان کا مطلب تاخیر ہے اسی وجہ سے عرب کسی دعا میں کہتے ہیں: إنشاء الله في أجلك۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر لمبی کرے۔ جب وہ چٹان سے گزر گئے تو مچھلی اٹھانے میں تاخیر ہوگئی ان میں سے کسی نے وہ نہ اٹھائی، پس ان دونوں کی طرف نسبت جائز ہے کیونکہ وہ دونوں گزر گئے اور مچھلی چھوڑ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتِنَا غَدَآءَنَا۔ اس میں ایک مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں زادراہ ساتھ لینا، یہ جاہل صوفیاء پر رد ہے جو بیابانوں اور میدان میں بغیر زادراہ کے جاتے ہیں یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور اہل زمین میں سے اس کے کلیم تھے۔ انہوں نے اپنے رب کی معرفت اور اللہ تعالیٰ پر توکل کے باوجود زادراہ ساتھ لیا۔ صحیح بخاری میں ہے(1)۔ یمن کے کچھ لوگ حج کرتے تھے اور زادراہ ساتھ نہیں لے جاتے تھے، اور کہتے تھے: ہم توکل کرنے والے ہیں۔ پھر جب حرم میں پہنچتے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے وَتَزَوَّدُوۡا کا ارشاد نازل فرمایا، یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زادراہ میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ زنبیل میں نمکین مچھلی تھی، صبح وشام وہ اس سے کھاتے تھے جب وہ دریا کے ساحل پر چٹان تک پہنچ گئے تو نوجوان نے ٹوکری کو رکھ دیا، مچھلی پر دریا کے چھینٹے پڑے تو اس نے ٹوکری میں حرکت کی، ٹوکری الٹی ہوگئی اور مچھلی سرنگ بنا کر چلی گئی۔ نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ مچھلی حضرت خضر علیہ السلام کی جگہ کی دلیل تھی کیونکہ حدیث میں ارشاد ہوا تھا: اپنے ساتھ ایک ٹوکری میں مچھلی اٹھاؤ جہاں وہ تم سے گم ہو جائے وہ وہاں ہوگا۔ اس بنا پر مچھلی کے علاوہ کوئی زادراہ ہوگا۔ یہ ہمارے شیخ ابو العباس نے ذکر کیا ہے اور اس کو اختیار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(2): میرے باپ نے کہا میں نے ابوالفضل جوہری کو اپنے وعظ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجات کے لیے گئے تو وہ چالیس دن رہے اور انہیں کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی جب وہ انسانوں کی طرف چلے تو انہیں دن کے وقت بھوک محسوس ہوئی۔ نَصَبًا کا معنی تھکن ہے۔ النصب کا معنی تھکن اور مشقت ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے یہاں مراد بھوک ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ جو انسان کو تکلیف اور مرض ہو تو اس کا بتانا جائز ہے، یہ مقام رضا کے منافی نہیں ہے اور نہ قضا کو تسلیم کرنے کے منافی ہے، لیکن یہ اس صورت میں جائز ہے جب اکتاہٹ اور ناراضگی کی بناء پر نہ ہو۔ وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ اَنۡ اَذۡكُرَهٗ ان اور فعل مصدر کی تاویل میں ہیں۔ یہ اَنۡسٰنِيۡهُ کی ضمیر سے بدل اشتمال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یہ اسم ضمیر سے ظاہر بدل ہے، یعنی ما أنساني ذكره إلا الشيطان۔ اور حضرت عبداللہ کے مصحف میں وما أنسانيه أن أذكره إلا الشيطان ہے۔ یہ یوشع نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول پر عذر پیش کرنے کے لیے کہا جو انہوں نے کہا تھا کہ میں تجھ سے بات نہیں کروں گا مگر یہ کہ تم مجھے بتاؤ جہاں تجھ سے مچھلی جدا ہوگئی تھی، میں نے تجھے کوئی بڑی تکلیف نہیں دی۔ اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، تزودوا فإن خير الزاد التقوى، جلد 1، صفحہ 206
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 529

قول کی وجہ سے یوشع نے معذرت خواہانہ کلام کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوشع نے کہا ہو یعنی مچھلی نے اپنا راستہ بنا لیا لوگوں کے لیے تعجب والی بات ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خبر کی تکمیل سے ہے، پھر تعجب کو علیحدہ اپنی طرف سے بیان کیا ہو کہ اس امر پر تعجب ہے۔ تعجب اس لیے ہے کہ مچھلی مر چکی تھی اور اس کی بائیں جانب کھائی گئی تھی پھر اس کے بعد زندہ ہو گئی تھی۔ ابو الشجاع نے کہا: طبری کی کتاب میں، میں نے اس کو دیکھا، اُتِيتُ بِهٖ (اسے لایا گیا)۔ وہ مچھلی کی ایک طرف تھی اور ایک آنکھ تھی اور دوسری طرف میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اس کو دیکھا جس جانب کچھ نہیں تھا۔ اس پر باریک پردہ تھا جس کے نیچے کوئی کانٹا نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ اس نے مچھلی کے دریا میں راستہ بنانے پر تعجب کیا یا مچھلی کے متعلق خبر دی کہ اس نے لوگوں کے تعجب کے لیے راستہ بنایا۔ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ وہ مچھلی زندہ ہو گئی تھی کیونکہ اسے اس چشمہ کا پانی لگا تھا جسے عین الحیاۃ کہا جاتا ہے، وہ پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ ''التفسیر'' میں ہے کہ علامت یہ تھی کہ مچھلی زندہ ہو گئی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام سفر سے تھک کر چٹان کے پاس ستانے کے لیے گئے تو اس کے قریب آبِ حیات تھا وہ پانی مچھلی کو لگا تو وہ زندہ ہو گئی (1)۔ ترمذی نے اپنی حدیث میں کہا سفیان نے کہا لوگوں کا خیال ہے کہ اس چٹان کے پاس آبِ حیات کا چشمہ تھا وہ کسی چیز کو نہیں لگتا مگر وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ فرمایا: اس مچھلی سے کھایا گیا تھا، جب اس پر پانی کے قطرے پڑے تو وہ زندہ ہو گئی۔ صاحب کتاب العروس نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آبِ حیات سے وضو کیا تو آپ کی داڑھی سے ایک قطرہ مچھلی پر گرا تو وہ زندہ ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان کو مچھلی اور اس کے گم ہونے کے متعلق بتایا کہ وہ جگہ تو تھی جس کو طلب کر رہے تھے وہ شخص جس کے لیے ہم آئے ہیں وہ وہاں ہے۔ پھر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے آئے تاکہ راستہ بھول نہ جائیں۔ بخاری میں ہے (2): ان دونوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دریا کے درمیان سبز جائے نماز پہ کپڑا لپیٹ کر سویا ہوا پایا انہوں نے چادر کی ایک طرف قدموں کے نیچے اور ایک طرف سر کے نیچے کی ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر سلام کیا تو انہوں نے اپنے چہرہ سے کپڑا اٹھایا اور کہا: یہ تمہاری زمین کا سلام ہے؟ تو کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں موسیٰ ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: حضرت موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے پوچھا: کیا کام ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ثعلبی نے کتاب (العرائس) میں کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور یوشع نے حضرت خضر علیہ السلام کو پانی کی سطح پر سبز جائے نماز پر سویا ہوا پایا وہ سبز کپڑا اوڑھے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الکہف، حدیث نمبر 3074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 689

السلام نے ان پر سلام کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور کہا: یہ ہماری زمین کا سلام کہاں ہے؟ پھر اپنا سر اٹھایا اور سیدھے بیٹھ گئے اور کہا: اے بنی اسرائیل کے نبی! وعلیک السلام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: تجھے میرے متعلق کیسے خبر ہوئی ہے؟ اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ میں بنی اسرائیل کا نبی ہوں؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: جس نے آپ کو میرے متعلق بتایا ہے اور میری طرف جس نے تمہاری راہنمائی کی ہے۔ پھر کہا: اے موسیٰ! تجھے تو بنی اسرائیل میں مشغولیت تھی۔ حضرت موسیٰ نے کہا: میرے رب نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں آپ کی پیروی کروں اور آپ سے وہ علم سیکھوں جو آپ کو اس نے سکھایا ہے۔ پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ایک پرندہ آیا اور اس نے اپنی چونچ میں پانی اٹھایا۔ آگے حدیث ذکر کی جیسا کہ آگے آرہی ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ۔ العبد سے مراد جمہور کے قول پر حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اور احادیث کا مقتضا بھی یہی ہے۔ انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے جن کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی حضرت خضر نہیں تھے بلکہ کوئی دوسرا عالم تھا، یہ قول قشیری نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا: ایک قوم نے کہا: وہ عبد صالح تھا۔ صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کو خضر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو ان کے اردگرد کا علاقہ سرسبز ہو جاتا تھا۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (2) فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خضر علیہ السلام کو خضر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سفید زمین پر بیٹھتے تھے تو وہ اس کے نیچے سبز ہو کر لہلہانے لگتی تھی''۔ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ حدیث میں الفروۃ کا لفظ آیا ہے جس کا معنی سطح [illegible] خطابی وغیرہ کا قول ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ عبد صالح تھے نبی نہیں تھے۔ آیت ان کی نبوت کی گواہی دیتی ہے کیونکہ ان کے افعال کے راز وحی سے معلوم ہو سکتے ہیں، کیونکہ انسان نہ سیکھتا ہے اور نہ ہی اتباع کرتا ہے مگر اس کی جو اس سے بلند مرتبہ ہوتا ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ نبی سے بلند مرتبہ وجو نبی نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ان سے علم باطن حاصل کریں جو اسے حاصل ہے۔ پہلا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا اس آیت میں رحمت سے مراد نبوت ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نعمت ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝ یعنی ہم نے اسے اپنی جناب سے علم غیب سکھایا۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کا علم، علم معرفت تھا جو ان کی طرف وحی کیا گیا تھا، ان کے افعال کو احکام کے ظواہر کا رنگ نہیں دیا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم، علم احکام اور حکم فتویٰ لوگوں کے ظاہر اقوال اور افعال سے متعلق تھا (3)۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 689

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 144۔ ایضاً، حدیث نمبر 3076، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 529

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

''کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا: میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ اس بندے نے کہا: (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جن کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ آپ نے کہا: آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نافرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔ اس بندے نے کہا: اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھئے نہیں یہاں تک کہ میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ یہ سوال ایک ملاطف کا سوال ہے اور مخاطب حسن ادب میں مبالغہ کرتے ہوئے اپنے مقام سے اتر کر سوال کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کیا تمہارے لیے ایسا اتفاق ہوگا اور آپ پر آسانی ہوگی؟ یہ اس طرح ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کیا تو مجھے دکھا سکتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کیسے وضو کرتے تھے'' (1)۔ بعض تاویلات پر یہ آئے گا اسی طرح یہ ارشاد ہے: هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (المائدہ: 112) اس کا بیان سورہ مائدہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ شاگرد، اُستاد کے تابع ہوتا ہے اگرچہ مراتب مختلف ہوں، اس سے یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام سے سیکھنے میں دلیل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل تھے، کبھی فاضل کو اس بات کا علم نہیں ہوتا جس کا مفضول کو علم ہوتا ہے، فضیلت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ فضیلت دیتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اگر ولی تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے افضل ہوں گے، کیونکہ وہ نبی تھے اور نبی، ولی سے افضل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ نبی تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسالت کے ساتھ فضیلت دی گئی تھی۔ واللہ اعلم۔ رُشْدًا یہ تُعَلِّمَنِ کا دوسرا مفعول ہے۔ قَالَ، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا یعنی اے موسیٰ! آپ میرے علم کو دیکھ کر صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے کیونکہ ظواہر جو آپ کا علم ہے وہ اس علم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا (2)۔ آپ جس کو خطا دیکھیں گے اس پر کیسے صبر کریں گے؟ اور اس میں حکمت کی وجہ تم پر منکشف نہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 16431

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 350

ہوگی تو آپ کیسے ضبط کر سکیں گے؟ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا کا یہی معنی ہے۔ انبیاء کرام کسی منکر پر خاموش نہیں رہتے اور نہ ان کے لیے خاموش ہونا جائز ہوتا ہے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: آپ اپنی عادت اور حکم کی بنا پر خاموش نہیں رہ سکیں گے۔ خُبْرًا کی نصب تمیز کی بنا پر ہے جو فاعل سے منقول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مصدر کی بنا پر ہے جو معنی میں متصل ہے۔ کیونکہ لَمْ تُحِطْ کا معنی ہے لم تخبرہ گویا فرمایا: لم تخبرہ خبرًا، اسی کی طرف مجاہد نے اشارہ کیا ہے۔ خبیر بالأمور وہ ہوتا ہے جو امور کے بواطن کو جانتا ہو اور امور میں سے جن سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا یعنی میں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو صبر کروں گا۔ وَّ لَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ استثنا میں اختلاف ہے کیا یہ وَّ لَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا کے قول کو شامل ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کو شامل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (احزاب: 35) بعض علماء نے فرمایا: صبر میں استثنا کی تو صبر کیا اور وَّ لَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا میں استثنا نہیں کی، اس لیے اعتراض کیا اور سوال کیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں استثناء نہیں تھی کیونکہ صبر مستقبل کا امر ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا حالت ہوگی اور معصیت کی نفی کا عزم کیا گیا تھا وہ فی الحال حاصل تھی، پس اس میں استثنا عزم کے منافی ہے۔ ان کے درمیان اس طرح فرق کرنا ممکن ہے کہ صبر ہمارے لیے مکتسب نہیں ہے بخلاف معصیت کے کرنے اور اس کے ترک کرنے کے، کیونکہ یہ تمام ہمارے لیے مکتسب ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا یعنی حتیٰ کہ میں خود تمہارے لیے اس کی تفسیر بیان کروں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے سنگت کے آداب سکھائے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر کرتے تو عجیب چیزوں کو دیکھ لیتے، لیکن انہوں نے اعتراض کیا پس فراق اور اعراض متعین ہو گیا۔

فَانْطَلَقَا ٝ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝

”پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شگاف کر دیا، موسیٰ بول اٹھے: کیا تم نے اس لیے شگاف کیا ہے کہ اس کی سواریوں کو ڈبو دو یقیناً تم نے بہت عجیب کام کیا ہے۔ اس بندے نے کہا کیا: میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری سنگت پر صبر کر سکیں۔ آپ نے (عذر خواہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے اور نہ سختی کرو مجھ پر میرے اس معاملہ میں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْطَلَقَا ٝ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں ہے(1): وہ دونوں دریا کے ساحل پر چلے ایک کشتی گزری تو انہوں نے سوار کرنے کے لیے ان سے بات کی کشتی والے حضرت خضر کو جان گئے تو انہوں نے بغیر کرائے کے سوار کرلیا جب کشتی میں دونوں سوار ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اچانک دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ نکالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان لوگوں نے ہمیں بغیر کرائے کے سوار کیا اور آپ نے ان کی کشتی کو شگاف کردیا تاکہ اس کے سواروں کو ہلاک کردیں، آپ نے برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کرسکے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ مجھ پر گرفت نہ فرمائیں میری بھول کی وجہ سے اور نہ مجھ پر میرے اس معاملہ میں سختی کریں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا سوال بھولنے کی وجہ سے تھا'' فرمایا: ایک چڑیا آئی وہ کشتی کے کنارے پر بیٹھی اور دریا سے ایک چونچ بھری، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میرا علم اور تیرا علم، علم الٰہی سے کمی نہیں کرتا مگر جتنا کہ اس دریا سے اس چڑیا نے کمی کی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حرف السفینۃ سے مراد اس کی طرف ہے ہر چیز کا حرف اس کا طرف ہوتا ہے(2)، اسی سے حرف الجبل ہے پہاڑ کی چوٹی۔ اور یہاں علم بمعنی معلوم ہے جیسے فرمایا: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (بقرہ:255) یعنی معلوماتہ۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام نے تمثیل بیان کی کہ میری معلومات اور تمہاری معلومات کا اللہ تعالیٰ کے علم پر کوئی اثر نہیں جیسا کہ چڑیا نے اس دریا سے جو پانی لیا اس کی اس دریا کے پانی سے کوئی نسبت نہیں۔ دریا سے مثال بیان فرمائی، کیونکہ یہ اکثر ہمارے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور یہاں نقص (کمی) کے لفظ کا اطلاق مجازاً ہے اس سے تمثیل اور سمجھانا مقصود ہے کیونکہ اللہ کے علم میں کوئی نقص نہیں ہے اور اس کی معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا معنی امام بخاری نے واضح کیا ہے فرمایا: اللہ کی قسم! میرا علم اور تیرا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے نہیں ہے مگر جس طرح اس پرندے نے اپنی چونچ میں اس دریا سے پانی لیا ہے۔ تفسیر میں ابوالعالیہ سے مروی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی نے نہ دیکھا جب آپ نے کشتی کو شگاف کیا تھا وہ ایسے بندے تھے کہ اسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی مگر جس کو اللہ دکھانا چاہتا تھا۔ اگر قوم انہیں دیکھتی تو وہ اسے کشتی کو شگاف لگانے سے منع کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اہل سفینہ جزیرہ کی طرف نکلے اور حضرت خضر علیہ السلام پیچھے موجود تھے تو انہوں نے کشتی کو شگاف کردیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو پھاڑا تو موسیٰ علیہ السلام ایک طرف ہوگئے اور دل میں سوچا کہ میں اس شخص کی سنگت نہیں کروں گا، میں بنی اسرائیل میں کتاب اللہ کی صبح وشام تلاوت کرتا ہوں اور وہ میری اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں بتاؤں جو تم دل میں سوچ رہے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: تم ایسا ایسا خیال کر رہے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے، یہ ثعلبی نے کتاب (العرائس) میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** کشتی کے شگاف کرنے میں دلیل ہے کہ ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم کے مال میں کمی کردے جب

1۔ صحیح بخاری، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 1، صفحہ 482　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 531

وہ اس میں بھلائی اور اصلاح دیکھے مثلاً اس کے مکان پر کسی ظالم کا خوف دیکھے تو اس کے بعض حصہ کو خراب کردے۔ امام ابو یوسف نے کہا: ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم کے بعض مال کے عوض بعض مال کے لیے سلطان سے معاملات کرے۔ حمزہ اور کسائی نے (لیغرق) یاء کے ساتھ اور اَهْلَهَا کو یغرق کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ اور جمہور کی قرأت پر لِتُغْرِقَ میں لام مآل کے لیے ہوگا جیسے لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص: 8) میں لام عاقبت و مآل کے لیے ہے اور حمزہ کی قرأت پر لام کَیْ ہے، لتغرقنی نہیں فرمایا کیونکہ ان پر فی الحال دوسرے لوگوں پر شفقت غالب تھی اور ان کے حق کی رعایت کا خیال تھا۔ اِمْرًا کا معنی عجیب ہے، یہ قتبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی منکر ہے، مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الامر سے مراد بہت بڑی مصیبت ہے اور دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

قد لَقِيَ الأَقْرانُ مِنِّي نُكْرا دَاهِيَةً دَهْيَاءَ إِدًّا إِمْرًا

اخفش نے کہا: کہا جاتا ہے اَمِرَ أَمْرُهُ یا مَرَامِرًا جب شدت پیدا ہو جائے اسم الاِمر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ اس کے معنی میں دو قول ہیں، (i) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: یہ کلام کی معاریض سے ہے☆ (ii) دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے تھے تو معذرت کی، اس میں دلیل ہے کہ نسیان مواخذہ کا مقتضی نہیں ہے، یہ تکلیف کے تحت داخل نہیں اس کے ساتھ طلاق وغیرہ کے احکام متعلق نہیں ہوتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اگر دوسری مرتبہ بھی بھول جائے تو معذرت کرے۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝

''پھر وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ ملے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا، موسیٰ (غضبناک ہو کر) کہنے لگے: مار ڈالا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلے کے بغیر، بیشک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔ اس نے کہا: کیا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے کہا: اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ بخاری میں ہے یعلیٰ نے کہا سعید نے فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے پائے جو کھیل رہے تھے انہوں نے ایک کافر لڑکا پکڑا اور اسے لٹا دیا پھر اسے چھری سے ذبح کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے ایک معصوم جان کو مار ڈالا ہے بغیر کسی نفس کے بدلے کے یعنی اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔

---

☆ معاریض من الکلام سے مراد ہوتی ہے توریہ کلام کرنا۔ کسی اور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلام کرنا۔ توریہ میں لفظ کا بعیدی معنی پیش نظر ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم اور ترمذی میں ہے(1): پھر دونوں کشتی سے نکلے جب وہ ساحل پر چل رہے تھے تو اچانک حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکا دیکھا جو دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس کے سر کو پکڑا اور تن سے جدا کر دیا اور اسے قتل کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: کیا آپ نے معصوم جان کو مار ڈالا ہے بغیر کسی نفس کے بدلے کے، آپ نے بہت عجیب کام کیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا تجھے کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ فرمایا: یہ جملہ پہلے سے زیادہ سخت تھا، فرمایا: اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے بارے میں پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔ اور تفسیر میں ہے حضرت خضر علیہ السلام بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل رہے تھے، آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک لڑکے کو پکڑا ان لڑکوں میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا، پھر ایک پتھر لیا اور اس کے ساتھ اس کا سر کچل دیا اور اسے قتل کر دیا۔ ابو العالیہ نے کہا: اسے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا اگر لوگ حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھتے تو اسکے اور بچے کے درمیان حائل ہو جاتے۔

میں کہتا ہوں: ان تینوں احوال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ یہ احتمال ہے کہ پہلے پتھر کے ساتھ سر کو کچلا ہو پھر اسے لٹا کر ذبح کیا ہو پھر اس کا سر تن سے جدا کر دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ حقیقت حال بہتر جانتا ہے۔ اور تیرے لیے وہ کافی ہے جو صحیح حدیث میں آیا ہے۔ جمہور علماء نے زاکیۃ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کوفیوں اور ابن عامر نے زکیۃ بغیر الف کے یاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معنی ایک ہے، یہ کسائی نے کہا ہے، اور ثعلب نے کہا: الزکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غُلٰمًا علماء کا غلام کے بارے میں اختلاف ہے، کیا وہ بالغ تھا یا نہیں؟ کلبی نے کہا: وہ بالغ تھا وہ دو شہروں کے درمیان ڈاکہ ڈالتا تھا اس کا باپ ان دو شہروں میں ایک شہر کے عظماء میں سے تھا اور اس کی ماں دوسرے شہر کے عظماء میں سے تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پکڑا اور اسے گرا دیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ کلبی نے کہا: غلام کا نام شمعون تھا۔ ضحاک نے کہا: حیسون تھا۔ وہب نے کہا: اس کے باپ کا نام سلاس اور اس کی ماں کا نام رُحمی تھا۔ سہیلی نے اس کے باپ کا نام زیر اور اس کی ماں کا نام سہوی حکایت کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: وہ بالغ نہ تھا، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: زاکیۃ جس نے گناہ نہ کیا تھا، غلام کا لفظ بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ مردوں میں غلام اسے کہا جاتا ہے جو بالغ نہ ہو، اس کے مقابل عورتوں میں جاریۃ (لڑکی) ہوتی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل کیا کیونکہ آپ نے اپنے علم باطنی سے جان لیا تھا کہ وہ کافر ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے(2)، اگر وہ بالغ ہو جاتا تو وہ اپنے والدین کو کفر پر مجبور کرتا، چھوٹے بچے کو قتل کرنا محال نہیں جب اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہو، اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔ ہر چاہت پر قادر ہے اور کتاب (العرائس) میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةً

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 143 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 144

الآیة تو حضرت خضر علیہ السلام غضبناک ہو گئے اور اس کے کندھے کو الگ کیا اس کا گوشت اس سے اتار دیا اس کے کندھے کی ہڈی پر لکھا ہوا تھا: کافر لا یومن من باللہ ابدا۔ ''کافر ہے کبھی اللہ پر ایمان نہیں لائے گا'' پہلے قول والے علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ عرب نوجوان پر غلام کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ لیلی الاخلیلیہ کا قول ہے:

شَفَاها من الدّاءِ العُضَالِ الذِی بِها　　غلامٌ إذا هَزّ القَنَاةَ سقاها

صفوان نے حضرت حسان کو کہا تھا:

تَلَقَّ ذُبَابَ السَّیفِ عَنِّی فَإنَّنِی　　غلامٌ إذا هُو جِیتُ لَستُ بشاعِرِ

خبر میں ہے: یہ غلام (لڑکا) زمین میں فساد پھیلاتا تھا اور اپنے والدین کے سامنے قسم اٹھاتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے اور اس کے والدین اس کی قسم پر قسم اٹھاتے تھے اور اس کی اس شخص سے حفاظت کرتے تھے جو اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ علماء نے کہا: بِغَیْرِ نَفْسٍ کا قول اس بات کا مقتضی ہے کہ اگر وہ کسی نفس کے بدلے میں قتل ہوتا تو کوئی حرج نہ ہوتی۔ یہ غلام کے بڑا ہونے پر دلیل ہے۔ اگر وہ بالغ نہ ہوتا تو اسے کسی نفس کے بدلے قتل کرنا بھی واجب نہ ہوتا، اس کا قتل کرنا جائز تھا کیونکہ وہ بالغ اور گنہگار تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ نوجوان تھا ڈاکہ ڈالتا تھا۔ ابن جبیر کا خیال ہے کہ وہ مکلف ہونے کی عمر کو پہنچ چکا تھا کیونکہ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت اسی کا تقاضا کرتی ہے: وأما الغلام فکان کافرا وکان أبواہ مؤمنین۔ کفر اور ایمان مکلفین کی صفات سے ہیں غیر مکلف پر کفر کا اطلاق نہیں کیا جاتا مگر والدین کی تبع میں اور اس غلام کے والدین مومن تھے، جس کی دلیل نص قرانی ہے اور اس پر کافر کے اسم کا اطلاق بلوغت کی وجہ سے ہی تھا، پس اس کا کافر ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ الغلام، الاغتلام سے ہے جس کا معنی بہت زیادہ شہوت والا ہونا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نُّكْرًا علماء کا اختلاف ہے کہ نُّكْرًا البغ ہے یا إمرًا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ قتل واضح ہے اور کشتی والوں کے ڈوبنے کا انتظار تھا پس نُّكْرًا زیادہ بلیغ ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ ایک شخص کا قتل ہے اور وہ پوری جماعت کا قتل ہے۔ پس امرًا زیادہ بلیغ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک دونوں میں مختلف معانی ہیں۔ امراً۔ ایک بہت بڑی ہولنا کی ظاہر کر رہا ہے جو متوقع ہے اور نُّكْرًا۔ فساد میں واضح ہے کیونکہ ظاہراً ایک ناپسندیدہ کام واقع ہو چکا ہے۔ اور یہ واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ یہ شرط ہے اور وہ لازم ہے۔ مسلمانوں کے معاملات ان کی شرائط کے مطابق ہوتے ہیں اور جو شرائط پوری کرنے کی زیادہ حقدار ہیں وہ وہ ہیں جن کو انبیاء لازم کرتے ہیں اور جو انبیاء کے لیے لازم کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا پہلی مرتبہ کچھ ہو جائے تو مطلقاً عذر خواہی کے قیام پر دلیل ہے اور دوسری مرتبہ قطعی طور پر حجت کے قیام پر دلیل ہے، یہ ابن عربی نے کہا: ابن عطیہ نے کہا ہو سکتا ہے (1) کہ قصہ احکام میں مدتوں کی اصل ہو اور وہ مدت تین دن ہے اور تین دن ہی سے احکام مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تُصٰحِبْنِیْ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 532

جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے، یعنی آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ اعرج نے تصحبَنّی تاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تصحَبْنی بھی پڑھا گیا ہے۔ یعقوب نے تُصحِبنی تاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، سہل نے اس کو ابوعمرو سے روایت کیا ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے تو مجھے نہ چھوڑ کہ میں تیری سنگت اختیار کروں۔

قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا تو میری سنگت چھوڑنے پر معذوری پر پہنچ جائے گا۔ جمہور علماء نے من لدنی دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، مگر نافع اور عاصم نے نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اصل میں لدن ہے اس کے ساتھ یاء متکلم متصل ہوئی جو غلامی اور فرسی میں ہوتی ہے یاء کے ماقبل کو کسرہ دیا گیا جس طرح غلامی اور فرسی میں دیا گیا۔ ابوبکر عاصم سے لَدْنِي لام کے فتحہ اور دال کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عاصم سے لُدْنِي لام کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ ابن مجاہد نے کہا: یہ غلط ہے۔ ابوعلی نے کہا: یہ تغلیط روایت کی جہت سے ہونے کے مشابہ ہے رہا عربیت کے قیاس کی بنا پر تو یہ صحیح ہے۔ جمہور نے عذراً پڑھا ہے۔ عیسیٰ نے عذراً ذال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ دانی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت اُبی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ''عُذُرِی'' راء کے کسرہ اور اس کے بعد یاء کے ساتھ روایت کیا ہے۔

**مسئلہ:** طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے (1) فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لیے دعا کرتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے ایک روایت میں فرمایا: ''رحمة الله علينا وعلى موسى'' اگر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ صبر کرتے تو عجیب چیزیں دیکھتے، لیکن انہوں نے کہا: ''فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا۔ اور صحیح مسلم میں ہے (2) نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحمة الله علينا وعلى موسى اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی نہ کرتے تو عجیب باتیں دیکھتے لیکن انہیں اپنے ساتھی کی طرف سے عار نے آلیا اگر وہ صبر کرتے تو عجیب چیزیں دیکھتے''۔ فرمایا: جب آپ کسی نبی کا ذکر کرتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے، آپ فرماتے: ''رحمة الله علينا وعلى اخي كذا''۔ اور بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے (3) فرمایا: ''يرحم الله موسى لوددنا أنه صبرحتى يقص علينا من امرهما''۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ہماری خواہش تھی کہ آپ صبر کرتے تا کہ ہم پر ان کے معاملات بیان کیے جاتے۔

مسلم کی حدیث میں ذمامة کا لفظ آیا ہے، یہ المذمّة (ذال کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ) کے معنی میں ہے جس کا معنی ہے حرمت کے ترک پر عار اور رقت محسوس کرنا۔ کہا جاتا ہے: أخذتني منك مَذَمّة ومَذِمّة وذمامة۔ گویا وہ مخالفت کے تکرار سے شرم محسوس کرنے لگے اور انکار کی تغلیظ کی جو ان سے صادر ہوئی اس پر رقت محسوس کرنے لگے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 332 2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 271

3۔ صحیح بخاری، خضر مع موسیٰ، جلد 1، صفحہ 483

''پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس سے تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا ان کی میزبانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ اس نے کہا: (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے، میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ صحیح مسلم میں حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ''لئام'' کا لفظ روایت کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام مجالس میں گھومتے تھے اور ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے میزبانی کرنے سے انکار کیا، پھر ان دونوں نے ایک جھکی ہوئی دیوار دیکھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے درست کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم اس قوم کے پاس آئے انہوں نے نہ ہماری میزبانی کی اور نہ کھانا کھلایا، اگر آپ چاہتے تو اس پر محنت ہی طلب کر لیتے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: یہ تمہاری اور میری جدائی کا وقت ہے، میں تجھے ان باتوں کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے میری خواہش تھی کہ آپ صبر کرتے حتیٰ کہ ہم پر ان کے واقعات واخبار ذکر کی جاتیں'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس گاؤں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ اَیْلَةَ (ایلہ) تھا: یہ قتادہ کا قول ہے، اسی طرح محمد بن سیرین نے کہا ہے: یہ بخیل ترین لوگوں کا گاؤں تھا اور آسمان سے یعنی اس کی رحمت سے بہت دور تھا۔ بعض نے کہا: یہ انطاکیہ کا گاؤں تھا۔ بعض نے کہا: اندلس کا جزیرہ تھا؛ یہ حضرت ابو ہریرہ وغیرہ سے مروی ہے۔ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ سبز جزیرہ تھا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ باجروان تھا یہ آذربائیجان کے قریب ہے۔ سہیلی نے حکایت کیا ہے فرمایا: یہ برقة ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ روم کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات تھا، اسے ناصرہ کہا جاتا تھا: اس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں۔ یہ سب اس اختلاف کی بنا پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کس علاقہ میں ہوا؟ حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں کی بکریوں کو پانی پلایا تھا تو اس وقت انہیں کھانے کی زیادہ ضرورت تھی بنسبت اس وقت کے جب حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ دیہات میں آئے تھے، اس وقت تو انہوں نے خوراک طلب نہیں کی تھی بلکہ پہلے بکریوں کو پانی پلایا تھا اور یہاں خوراک کا سوال کیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مدین کے سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے تھے اور یہاں حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ان کی اتباع میں تھے۔ میں کہتا ہوں: اس معنی کی بنا پر آیت کی ابتدا میں اپنے نوجوان کو بھی کہا تھا: اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِیْنَا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 269

مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھوک کا اظہار کیا اپنے ساتھی یوشع کی رعایت کرتے ہوئے۔ واللہ اعلم۔
بعض علماء نے فرمایا: جب یہ سفر تادیب تھا تو انہیں مشقت میں مبتلا کیا گیا اور وہ سفر، سفر ہجرت تھا تو ان کی خوراک کے ذریعے مدد اور نصرت کے سپرد کیے گئے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس آیت میں خوراک کے سوال کرنے پر دلیل ہے، اگر کوئی شخص بھوکا ہو تو اسے وہ چیز طلب کرنی چاہیے جو اس کی بھوک کو ختم کردے، جبکہ جہال صوفیاء اس کے مخالف ہیں۔ الاستطعام کا معنی کھانا طلب کرنا ہے، یہاں مراد ضیافت کا سوال ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَاَبَوۡا اَنۡ یُّضَیِّفُوۡهُمَا۔ اسی وجہ سے اس گاؤں والے مذمت کے مستحق ٹھہرے اور کمینگی اور بخل کی طرف منسوب کیے گئے جیسا کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا ہے۔ قتادہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: بدترین وہ گاؤں ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہیں کی جاتی اور مسافر کا حق نہیں پہنچایا جاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیافت ان پر واجب تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان سے اس کا مطالبہ کیا جو ضیافت میں سے واجب تھا۔ انبیاء کی حالت اور فضلاء و اولیاء کے منصب کے یہی لائق ہے۔ ضیافت کے بارے میں قول سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ حریری ☆ کو معاف کرے جس نے اس آیت میں مناسب گفتگو نہیں کی، اس سے اس میں لغزش ہوئی ہے، اس نے اس آیت سے اصرار سے سوال کرنے پر استدلال کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر یہ عیب نہیں ہے اور اس پر کوئی نقص نہیں ہے، اس نے کہا:

وإن رُدِدْتَ فما في الرَّدِ مَنْقَصَةٌ    عليك وَرُدَّ موسٰى قبلُ والخَضِرُ

میں کہتا ہوں: یہ دین کے ساتھ مزاح ہے اور انبیاء کرام کے احترام میں کوتاہی ہے، یہ ادبی لغزش ہے اور نامناسب قول ہے۔ اللہ تعالیٰ سلف صالحین پر رحم فرمائے، انہوں نے ہر ذی عقل کو وصیت کرنے میں مبالغہ کیا ہے، انہوں نے کہا: جب تو کسی چیز سے کھیلنے والا ہو تو دین سے کھیل سے اجتناب کر۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جِدَارًا۔ الجدار والجدر دونوں کا ایک معنی ہے، حدیث شریف میں "حتی یبلغ الماء الجدر" (1)۔ حتیٰ کہ پانی کھیت کی وٹوں تک پہنچ جائے۔ مکان جَدِیۡرٌ بُنی حوالیه جدار۔ بہتر مکان وہ ہے جس کے اردگرد دیوار بنائی گئی ہو، اصل معنی اٹھانا ہے۔ أجدرت الشجرہ، درخت نکل آیا، اسی سے الجدری ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّنۡقَضَّ گرنے کے قریب تھی، یہ مجاز ہے اس کی تفسیر حدیث میں (مائل) کے قول سے کی گئی ہے، اس میں دلیل ہے کہ قرآن میں مجاز موجود ہے، یہی جمہور کا مذہب ہے۔ وہ تمام افعال جن کا حق یہ ہے کہ وہ زندہ ناطق کے لیے ہوں جب وہ جمادات اور چوپاؤں کی طرف منسوب ہوں تو وہ مجاز ہوگا یعنی اگر ان کی جگہ انسان ہوتا تو وہ اس فعل کے مناسب ہوتا۔ کلام عرب میں مجاز کثیر ہے، اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، شرب الاعلیٰ قبل الاسفل، جلد 1، صفحہ 318

☆ ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بصری۔

أَتَنْتَهون ولا يَنْهَى ذَوِى شَطَط كالطعنِ يذهبُ فيه الزَّيتُ والفُتُلُ

اعشیٰ نے نہی کو الطعن کی طرف منسوب کیا ہے۔

اور ایک شاعر نے کہا:

يُرِيدُ الرمحُ صدر أَبِي بَرَاءٍ ويرغبُ عن دماء بني عقيل(1)

اس میں فعل یرید کی نسبت الرمح (نیزہ) کی طرف ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إنْ دهرًا يلُفُّ شَمْلِي بجُمْلٍ لَزمَانٌ يَهُمّ بالإحسان

ایک اور شاعر نے کہا:

في مهمة فُلِقت به هاماتها فَلَقَ الفُؤس إذا أردن نُصُولًا

یہ عربوں کے قول: نَصَل السیفُ سے مشتق ہے جب وہ نشانہ پر لگ جائے تلواروں کے ان کے سروں پر واقع ہونے پر زمین میں ہتھوڑے کے واقع ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ ہتھوڑا زمین میں واقع ہوتا ہے تو جلدی نکلتا نہیں۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

لَو أَنَّ اللُّؤمَ يُنسبُ كان عَبْدًا قبيحَ الوجهِ أَعْوَرَ مِنْ ثَقِيفِ

عنترہ نے کہا:

فأزور من وَقْعِ القَنَا بِلَبَانِهِ وَشَكَا اِلَى بِعَبْرَةٍ وَتَحَمْحُمِ

اس معنی کی تفسیر اس قول سے بھی ہوتی ہے:

لوكان يدري ما المُحاورة إشتكى

اس مفہوم میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، اسی سے لوگوں کا قول ہے: إن داري تنظر إلى دار فلان۔ دیکھنے کی نسبت دار کی طرف کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے۔ اشتكت النار إلى ربها(2)۔ شکایت کی نسبت آگ کی طرف کی گئی ہے، ایک قوم نے قرآن میں مجاز سے منع کیا ہے، ان میں ابو اسحاق اسفرائینی، ابو بکر محمد بن داؤد اصبہانی وغیرہما ہیں، کیونکہ اللہ کا کلام اور اس کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو حقیقت پر محمول کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ وہ حق بیان کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، نیز ان علماء نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہا: اگر اللہ تعالیٰ مجاز سے ہمیں خطاب فرماتا ہے تو اسے متجوز کہنا بھی لازم آئے گا۔ اور حقیقت سے مجاز کی طرف عدول، حقیقت سے عجز کا تقاضا کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کرنا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 533

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، استحباب الابراد بالظہر، جلد 1، صفحہ 224

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ۝ (الفرقان)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ۝ (المعارج)

اور حدیث شریف میں ہے: ''اشتکت النار إلی ربھا''۔ آگ نے اپنے رب کی بارگاہ میں شکایت کی۔ اور حدیث میں ہے: ''واحتجت النار والجنۃ''۔ دوزخ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ اور اس کی مثل سب حقیقت ہیں اور ان کا خالق وہ ہے جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت بخشی۔

صحیح مسلم میں ہے (1) حضرت انس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''انسان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اس کی ران کو کہا جائے گا تو بول پس اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال کے بارے میں بولیں گی تا کہ اللہ اس کا عذر زائل کردے یہ وہ منافق ہے اور یہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا''۔ اور یہ آخرت میں ہوگا، اور رہا دنیا میں تو ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (2) کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ درندے، انسانوں سے کلام کریں گے اور حتیٰ کہ انسان سے اس کے کوڑے کا پھندا اور اس کی جوتی کا تسمہ بات کرے گا اور اس کی ران اسے وہ سب کچھ بتائے گی جو اس کے گھر والوں نے اس کے بعد کیا''۔ ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے، یہ حدیث حسن غریب ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَقَامَهٗ بعض علماء نے فرمایا: پہلے دیوار کو گرایا پھر اسے بنایا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اگر تو چاہتا تو اس پر اجرت ہی لے لیتا، کیونکہ یہ ایسا فعل تھا جو اجر کا مستحق تھا۔ ابو بکر انباری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے ابو بکر سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے پڑھا: ''فوجدا فیھا جدارا یرید أن ینقض فھدمه ثم قعد یبنیه''۔ ابو بکر نے کہا: اس حدیث کی اگر سند صحیح ہے تو یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قرآن کی تفسیر کے قائم مقام ہوگی۔ بعض ناقلین نے تفسیر کی جگہ میں قرآن کو داخل کردیا کہ یہ قرآن ہے، مصحف عثمان سے کمی ہوئی ہے، جیسا کہ بعض طعن کرنے والوں نے کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے دیوار کو مس کیا اور اسے سیدھا کیا تو وہ سیدھی ہوگئی، یہ قول صحیح ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے افعال کے زیادہ مناسب ہے بلکہ اولیاء کی شان کے بھی زیادہ مناسب ہے۔ بعض اخبار میں ہے: اس دیوار کی اونچائی اس صدی کے تیس ذراع کے برابر تھی اور طول پانچ سو ہاتھ کے برابر تھا، تو سیدھی کھڑی ہوگئی؛ یہ ثعلبی نے کتاب العرائس میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس پر اجر ہی لے لیتے، یعنی کھانا لے لیتے جسے ہم کھاتے اس میں اولیاء کی کرامات پر دلیل ہے۔ اسی طرح واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام کے احوال میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب خارق العادات امور ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم انہیں ولی تسلیم کریں، نبی

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ماجاء کلام السباع، جلد 2، صفحہ 41۔ ایضاً، حدیث نمبر 2107، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تسلیم نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے انہیں تکلیف اور احکام کی وحی کی جاتی تھی جس طرح انبیاء کو وحی کی جاتی ہے مگر وہ رسول نہیں تھے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 8۔** انسان پر واجب ہے کہ جھکی ہوئی دیوار کے نیچے نہ بیٹھے جس کے گرنے کا اندیشہ ہو بلکہ وہاں سے گزرے تو جلدی چلے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: ''جب تم میں سے کوئی بلند جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے گزرے تو اسے جلدی چلنا چاہیے'' ☆۔ ابوعبیدہ قاسم بن سلام نے کہا: ابوعبیدہ کہتے تھے: الطربال کا لفظ عجمیوں کی بلڈنگ کے مشابہ ہے جیسے گرجا گھر اور بلند عمارت، جریر نے کہا:

اَلْوَی بِهَا شَذْبُ العروقِ مُشَذَّب فَكَاَنَّمَا وَكَنَتْ علی طِرْبالِ

کہا جاتا ہے: وَكَنَ يَكِنُ جب کوئی بیٹھے۔ صحاح میں ہے: الطربال دیوار کا بلند ٹکڑا، پہاڑ کی جھکی ہوئی بڑی چٹان۔ طرابیل الشام۔ شام کے گرجے۔ کہا جاتا ہے: طَرْبَلَ بَوْلَه جب اوپر کی طرف لمبا کرے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** کرامات اولیاء ثابت ہیں جیسا کہ اخبار ثابتہ اور آیات متواترہ دلالت کرتی ہیں۔ اس کا انکار نہیں کرتا مگر بدعتی، ہٹ دھرم یا فاسق منحرف، قرآن کی آیات مریم علیہا السلام کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ان کے پاس گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں ہوتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے کھجور کے درخت کو حکم دیا وہ بالکل خشک تھا تو وہ پھلدار ہو گیا۔ حضرت مریم نبیہ نہیں تھیں، اس پر اختلاف ہے۔ اور کرامات پر دلیل حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر کشتی کا پھٹنا، غلام کا قتل کرنا اور دیوار کو کھڑا کرنا سب کرامات ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں کہ انہیں نبی کہا جائے کیونکہ نبوت کا ثابت کرنا اخبار احاد کے ساتھ جائز نہیں خصوصاً بغیر کسی احتمال کے اجماع امت سے تواتر کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ: ''لانبی بعدی'' (1)۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خاتم النبیین۔ حضرت خضر علیہ اور حضرت الیاس علیہما السلام اس کرامت کے ساتھ باقی ہیں، پس ان دونوں کا غیر نبی ہونا واجب ہے، کیونکہ اگر وہ نبی ہوتے تو ہمارے نبی کے بعد نبی کا ہونا واجب ہوتا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریف لائیں گے اس پر دلیل قائم ہے۔ میں کہتا ہوں: جمہور کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں یعنی ابتداً آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 10۔** لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا ولی جانتا ہے کہ وہ ولی ہے یا نہیں جانتا؟ علماء کے دو قول ہیں: 1۔ قول یہ ہے کہ ولی کے لیے یہ جاننا جائز نہیں اور جو اس کے ہاتھوں پر ظاہر ہو وہ اسے خفیہ تدبیر کی آنکھ سے ملاحظہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے یہ خفیہ تدبیر اور استدراج ہو۔ سری سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: اگر ایک شخص باغ میں داخل ہو اور اس سے درخت کے اوپر سے ایک پرندہ فصیح زبان میں کلام کرے: اے اللہ کے ولی! تجھ پر سلام ہو، پھر وہ اس سے یہ خوف نہ کرے کہ یہ خفیہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ما ذکر عن بنی اسرائیل، جلد 1، صفحہ 491

☆ ابوعبید نے اسے غریب الحدیث میں ذکر کیا ہے جلد 2، صفحہ 18

تدبیر ہوگی تو وہ خفیہ تدبیر میں مبتلا کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اگر یہ جان لے گا کہ وہ ولی ہے تو اس سے خوف زائل ہو جائے گا اور اسے امن حاصل ہوگا اور ولی کی شرط میں سے ہے کہ اسے ہمیشہ امید ہو کہ اس پر فرشتے نازل ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا (حم السجدہ:30)، ولی وہ ہوتا ہے جس کا خاتمہ سعادت پر ہو اور عواقب پوشیدہ ہوتے ہیں کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کیسا ہوگا؟ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إنما الأعمال بالخواتیم'' (1)۔ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لیے یہ جاننا جائز ہے کہ وہ ولی ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاننا جائز ہے کہ وہ ولی ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کوئی دوسرا جان لے کہ وہ ولی ہے تو اس کے لیے خود جاننا بھی جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرہ مبشرہ صحابہ کو اہل جنت میں ہونے کی خوشخبری دی پھر بھی ان کا خوف زائل نہ ہوا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ تعظیم کرنے والے تھے اور انہیں خوف زیادہ تھا، اگر عشرہ مبشرہ صحابہ کے لیے جائز ہے کہ وہ خوف سے نہیں نکلے تو دوسروں کے لیے بھی جائز ہے۔ شبلی کہتے تھے: میں اس جانب سے امان میں ہوں۔ جب شبلی فوت ہوئے اور دفن کر دیے گئے تو دیلم ☆ اسی دن دجلہ عبور کر آئے اور بغداد پر غالب آ گئے۔ لوگ کہتے تھے: دو مصیبتیں آ گئیں: شبلی کی موت اور دیلم کا عبور کرنا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں بھی احتمال ہے کہ یہ بھی استدراج ہو، اگر یہ استدراج ہو جب یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں تو معجزات کا ابطال ہے تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں کرامات کا ابطال ہے اور بلعام کے ہاتھوں پر کرامات کا ظہور اور پھر اس کے بعد اس کا دین سے خروج کیونکہ آیت میں ہے: فَانْسَلَخَ مِنْهَا، تو آیت میں یہ نہیں ہے کہ وہ ولی تھا پھر اس سے ولایت چلی گئی نیز کرامات کے طور پر جو ظاہر ہوا ہے وہ اخبار احاد ہیں جن سے علم ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہے کہ کرامت کی شرط میں سے اس کا چھپانا ہے اور معجزہ کی شرط میں سے اس کا اظہار کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: کرامت وہ ہوتی ہے جو بغیر دعویٰ کے ظاہر ہوتی ہے اور معجزہ انبیاء کے دعویٰ کے وقت ظاہر ہوتا ہے ان سے دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس کے بعد معجزہ وہ ظاہر کرتا ہے، کتاب کے مقدمہ میں معجزہ کی شرائط گزر چکی ہیں۔ الحمد للہ وحدہ لا شریک لہ۔

ایسی احادیث جو کرامت کے ثبوت پر وارد ہیں ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو امام بخاری نے نقل فرمائی ہے (2)، حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دس آدمیوں کا ایک گروہ بطور جاسوس بھیجا اور ان کا امیر عاصم بن ثابت انصاری کو بنایا تھا۔ یہ عاصم بن عمر بن خطاب کے دادا تھے ☆ پس وہ چلے حتیٰ کہ جب ھدأۃ مقام پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے درمیان ہے تو ان کا ذکر ہذیل کے ایک قبیلہ سے کیا گیا جنہیں بنو لحیان کہا جاتا تھا، انہوں نے اپنے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، جلد 2، صفحہ 961 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، هل يستأسر الرجل، جلد 1، صفحہ 427

☆ یہ ایک قبیلہ ہے ان کے علاقہ کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا۔

☆ قسطلانی نے ارشاد الساری جلد 5 صفحہ 163 میں کہا: مصعب زہری نے کہا یہ عاصم کے ماموں تھے۔

دوسو کے قریب تیرانداز تیار کیے وہ ان کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے چلے حتی کہ انہوں نے ان کے کھانے کی جگہ پر کھجوریں پائیں جو مدینہ طیبہ سے لے آئے تھے، وہ کہنے لگے: یہ تو مدینہ کی کھجوریں ہیں وہ ان کے قدموں کے نشانات پر چلے جب عاصم اور اس کے ساتھیوں نے انہیں دیکھا تو وہ ایک بلند جگہ پر چڑھ گئے اور بنولحیان نے ان کا احاطہ کرلیا، انہوں نے انہیں کہا: تم اُتر آؤ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو ہم تمہیں عہد اور وعدہ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ عاصم جو اس گروہ کا سردار تھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں تو آج کافر کے ذمہ میں نہیں اتروں گا اور دُعا کی: اے اللہ اپنے نبی مکرم ﷺ کو ہماری خبر پہنچادے۔ بنولحیان نے تیر مارے اور عاصم اور چھ مزید لوگوں کو قتل کردیا۔ تین مسلمان، ان کے عہد و میثاق پر نیچے اتر آئے تھے وہ خبیب انصاری، ابن دثنہ اور ایک شخص تھا جب وہ ان پر غالب آگئے تو انہوں نے اپنی کمانوں کی رسیاں کھولیں اور انہیں ان سے باندھ دیا تیسرے شخص نے کہا: یہ پہلا غدر ہے، اللہ کی قسم! میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا میرے لیے ان مقتولوں کا اُسوہ ہے۔ بنولحیان نے اسے کھینچا اور اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایسا نہ کیا انہوں نے اسے بھی قتل کردیا وہ خبیب اور ابن دثنہ کو لے کر چلے حتیٰ کہ انہوں نے جنگ بدر کے بعد مکہ میں انہیں فروخت کردیا۔ بنوحارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف نے خبیب کو خریدا، خبیب وہ شخص تھا جس نے حارث بن عامر کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا۔ حضرت خبیب ان کے پاس قیدی بن کر رہے۔ عبیداللہ بن عیاض نے بتایا کہ بنت حارث نے انہیں بتایا کہ جب وہ (بنولحیان) جمع ہوئے تھے تو خبیب نے استرا مانگا جس کے ساتھ وہ اپنے بال صاف کرے تو اس عورت نے اسے استرادے دیا، پھر وہ کہتی ہے: میں غافل تھی تو میرا بچہ اس کے پاس چلا گیا تو اس نے اسے پکڑ لیا وہ عورت کہتی ہے میں نے خبیب کو دیکھا کہ وہ اس بچے کو اپنی ران پر بٹھائے ہوئے ہے اور استرا اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس عورت نے کہا: میں گھبرا گئی۔ خبیب میری گھبراہٹ میرے چہرے سے پہچان گئے حضرت خبیب نے کہا کیا: تو خوف کر رہی ہے کہ میں اسے قتل کردوں گا؟ میں ایسا نہیں کروں گا، اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے خبیب سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا اللہ کی قسم! میں نے ایک دن اسے ہاتھوں میں انگور لے کر کھاتے ہوئے دیکھا حالانکہ وہ لوہے کی زنجیروں کے ساتھ باندھا ہوا تھا اور مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا، وہ کہتی تھی: یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے خبیب کو دیا تھا جب وہ خبیب کو حرم سے باہر لے کر گئے تاکہ اسے حرم سے نکالیں تو خبیب نے اسے کہا: مجھے چھوڑ دو میں دو رکعتیں ادا کرلوں پھر حضرت خبیب نے دو رکعتیں ادا کیں پھر فرمایا: اگر تم یہ گمان نہ کرتے کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں تو میں رکعتوں کو لمبا کرتا پھر فرمایا: اے اللہ! ان کو جڑ سے ختم کردے اور انہیں جدا جدا کر کے قتل کردے اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ پھر کہا:

وَلستُ اُبالِي حِين اُقْتَلُ مُسْلِما　　علی اَيِّ شِقٍّ كان لِلّٰه مَصْرَعِی

وذلك فی ذاتِ الاِلٰهِ واِنْ يَشَاْ　　يُبارِكْ علی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

مجھے کوئی پروا نہیں جب میں مسلمان ہو کر قتل کیا جاؤں گا جس طرف بھی اللہ کی رضا کے لیے میرا گرنا ہوگا یہ ذات الٰہی کے لیے ہے اگر وہ چاہے گا تو اکھڑے ہوئے اعضاء میں بھی برکت ڈال دے گا۔

بنوحارث نے حضرت خبیب کو قتل کر دیا، خبیب وہ شخص تھا جس نے ہر مسلمان کے لیے دو رکعت سنت چھوڑیں جو باندھ کر قتل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم کی دُعا قبول فرمائی تھی جب وہ شہید ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو ان کی شہادت کی خبر پہنچادی۔

کفار قریش کو جب خبر پہنچی کہ حضرت عاصم قتل ہو گئے ہیں تو انہوں نے کچھ لوگوں کو بھیجا تا کہ وہ عاصم کے جسم سے کچھ کاٹ کر لے آئیں تا کہ وہ اسے پہچان لیں۔ حضرت عاصم نے بدر کی جنگ میں ان کے ایک سردار کو قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم کی حفاظت کے لیے بھڑوں کو بھیج دیا جنہوں نے ان کی طرف آنے والے افراد سے حضرت عاصم کی حفاظت کی وہ ان کا گوشت کاٹنے پر قادر نہ ہوئے (1)۔

ابن اسحاق نے اس واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عاصم بن ثابت جب شہید ہو گئے تو ہذیل نے ارادہ کیا کہ ان کا سر کاٹ لیں تا کہ اسے سلافہ بنت سعد کے ہاں فروخت کریں اس نے نذر مانی تھی جب حضرت عاصم نے اس کے بیٹوں کو جنگ احد میں قتل کیا تھا کہ اگر وہ اس کے سر پر قادر ہوئی تو اس کی کھوپڑی میں شراب پیئے گی تو بھڑوں نے حضرت عاصم کی حفاظت کی، جب بھڑیں حائل ہو گئیں تو انہوں نے کہا: اسے چھوڑ دو حتیٰ کہ شام ہو جائے تو شام کے وقت بھڑیں چلی جائیں گی پھر ہم اس کو کاٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے وادی کو حکم دیا تو اس نے حضرت عاصم کو اٹھالیا اور وہ غائب ہو گئے۔ حضرت عاصم نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ کسی مشرک کو نہ چھوئیں گے اور نہ کوئی مشرک انہیں چھوئے گا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی وفات کے بعد محفوظ فرمایا اس سے جس سے وہ زندگی میں بچتے رہے۔

عمرو بن امیہ ضمری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تنہا بطور جاسوس بھیجا فرمایا میں خبیب کی سولی کے پاس آیا میں اس پر چڑھا میں دیکھنے والوں سے ڈر رہا تھا، میں نے خبیب کو سولی سے کھولا تو وہ زمین پر گرے پھر میں اترا پھر میں تھوڑا سا دور ہوا پھر میں متوجہ ہوا تو زمین نے اسے نگل لیا تھا۔ ایک روایت میں یہ زیادتی ہے کہ آج تک خبیب کی قبر کا ہم سے ذکر نہیں کیا گیا، یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 11۔ یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہیں کہ ولی کے لیے مال اور جائیداد ہو جس کے ساتھ وہ اپنی ذات اور عیال کی حفاظت کرے۔ صحابہ کرام کی ذوات میں تیرے لیے اسوہ کافی ہے کہ ان کی ولایت وفضیلت کے باوجود ان کے اموال تھے اور وہ دوسروں پر حجت تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (2) فرمایا: ''ایک شخص صحرا میں تھا اس نے بادل میں ایک آواز سنی فلاں کے باغ کو پانی پلا، وہ بادل چلا اور پتھریلے ٹیلے میں اپنا پانی برسایا وہاں جو پانی کا نالا تھا وہ پانی سے بھر گیا وہ شخص اس پانی کے پیچھے پیچھے چلا تو کیا دیکھا ایک آدمی کسی کے ساتھ پانی کو پھیر رہا ہے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: فلاں، وہ نام ذکر کیا جو اس نے بادل کے اندر سے سنا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، هل يستاسر الرجل، جلد 1، صفحہ 427

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد، فضل الانفاق على المساكين و ابن السبيل، جلد 2، صفحہ 411

کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی تھی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو پانی پلا، اس نے تیرا نام لیا تھا، تو اس میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا جب تو کہتا ہے (تو سن) میں اس باغ کی کل پیداوار کو دیکھتا ہوں پھر اس سے ایک تہائی صدقہ کرتا ہوں ایک تہائی میں اور میرا عیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اس میں پھر کاشت کرتا ہوں"۔ ایک روایت میں ہے: "اس کا ایک تہائی مسکین، سائلین اور مسافروں کے لیے رکھتا ہوں" (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "لاتتخذوا الضیعة فترکنوا إلی الدنیا" (تم جائیداد نہ بناؤ ورنہ دنیا کی طرف جھک جاؤ گے) کے منافی نہیں ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے (2)، اور فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ یہ حدیث اس پر محمول ہے جو کثرت مال کی خاطر جائیداد بناتا ہے یا جائیداد سے لطف اندوز ہونے کے لیے جائیداد اکٹھی کرتا ہے لیکن وہ شخص جو بطور معیشت جائیداد بناتا ہے تاکہ اس کے ساتھ اپنے دین اور اپنے عیال کی حفاظت کرے تو اس نیت سے جائیداد بنانا افضل عمل ہے اور یہ افضل مال ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بہتر مال نیک شخص کے لیے ہے" (3)۔ کرامات اولیاء بہت سے لوگوں نے کثرت سے ذکر کی ہیں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا اس میں اجارہ کے جواز کی صحت پر دلیل ہے یہ انبیاء اور اولیاء کی سنت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ القصص میں ان شاء اللہ آئے گا۔ جمہور علماء نے لَتَّخَذْتَ اور ابوعمرو نے لَتَخِذْتَ پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود، حسن اور قتادہ کی یہی قرأت ہے یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور الأخذ سے مشتق ہے جیسے تیسرا قول ہے: تبع واتبع تقی واتقی۔ بعض قراء نے ذال کو تاء میں ادغام کیا ہے اور بعض نے مدغم نہیں کیا ہے۔ حضرت ابی ابن کعب کی حدیث میں ہے: لوشئت لأوتیت أجرًا (4)۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی جہت سے سوال صادر ہوا تھا نہ کہ بطور اعتراض تھا۔ اس وقت حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو کہا: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ کا تکرار اور بیننا سے عدول تاکید کی خاطر ہے۔ سیبویہ نے کہا، کہا جاتا ہے: أخزی الله الکاذب منی و منك یعنی منا یعنی ہم میں سے جھوٹے کو اللہ رسوا کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول کشتی اور غلام کے بارے میں اللہ کے لیے تھا اور دیوار کے بارے میں قول اپنی ذات کے لیے دنیا کی چیز طلب کرنے کے لیے تھا، پس یہی جدائی کا سبب بنا۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ دیوار سو ہاتھ اونچی تھی۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا کسی چیز کی تاویل کا مطلب ہے اس کا انجام یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ سے کہا: میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے کیوں کیا ہے؟ ان آیات کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حجت ہیں نہ کہ ان کے لیے تعجب ہیں، یہ اس طرح ہے کہ جب کشتی کے پھاڑنے پر انکار کیا تو آواز دی گئی: اے موسیٰ! یہ تیری تدبیر کہاں تھی جب تو تابوت میں تھا اور تجھے دریا میں ڈالا گیا تھا، پھر

---

1۔ جامع ترمذی، ہم الدنیا، جلد 2، صفحہ 56
2۔ جامع ترمذی کتاب الزهد، باب ما جاء فی ہم الدنیا وحبھا، حدیث 2250
3۔ مسند امام احمد بن حنبل حدیث نمبر 17763
4۔ صحیح بخاری تفسیر سورۂ کہف، اذ قال موسیٰ لفتاہ، جلد 2، صفحہ 688

جب لڑکے کے مسئلہ پر انکار کیا تو ارشاد ہوا: یہ تیرا انکار کہاں تھا تو نے جب قبطی کو مارا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، جب دیوار کے کھڑے کرنے پر انکار کیا تو آواز دی گئی: یہ کہاں تھا جب تو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں کے لیے کنوئیں کا پتھر بغیر اجرت کے اٹھا رہا تھا۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

''وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں، سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی۔ اور وہ جو لڑکا تھا (تو اس کی حقیقت یہ ہے) کہ اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کر دے گا انہیں سرکشی پر۔ پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب ایسا بیٹا جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔ باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے انکا خزانہ (دفن) تھا اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا، پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی، اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ جو علماء کہتے ہیں فقیر سے مسکین بہتر حال میں ہوتا ہے انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، اس کا معنی سورۂ براءۃ میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ لوگ تاجر تھے لیکن چونکہ وہ مسافر تھے وہ دریا کے اوپر تھے ان کے پاس مال کم تھا اور تکلیف کو دور کرنے کی حالت میں کمزور تھے تو انہیں مساکین کہا گیا کیونکہ وہ ایسی حالت میں تھے کہ اس کے سبب ان پر شفقت کی گئی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کسی غنی شخص کے بارے میں کہتا ہے جو کسی تکلیف اور مصیبت میں واقع ہوا ہے: مسکین ہے۔ کعب وغیرہ نے کہا: یہ مساکین دس بھائی تھے جن کو کشتی باپ کی طرف سے میراث میں ملی تھی پانچ ان میں سے اپاہج تھے اور پانچ دریا میں ملاحی کا کام کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: وہ سات تھے ان میں سے ہر ایک کو ایسی تکلیف تھی جو دوسرے کو نہیں تھی۔ نقاش نے ان کے اسماء ذکر کیے ہیں ان میں سے جو کام کرنے والے تھے ان میں ایک جزام کی مرض میں مبتلا تھا، دوسرا کانا تھا، تیسرا لنگڑا تھا، چوتھے کو خصیوں کی

تکلیف تھی، پانچواں بخار میں ہمیشہ رہتا تھا وہ سب سے چھوٹا تھا۔ پانچ وہ تھے جو کام بالکل نہیں کر سکتے تھے وہ اندھا، بہرہ، گونگا، اپاہج اور مجنون تھا۔ اور وہ جس دریا میں کام کرتے تھے وہ فارس اور روم کے درمیان تھا، یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ایک فرقہ نے لمساکین، سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ کشتی کے ملاح تھے کیونکہ مساک وہ ہوتا ہے جو کشتی کا نچلا حصہ روکتا ہے اور پوری خدمت اس کے روکنے کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے تمام کو مساکین کہا گیا۔ ایک جماعت نے کہا: المساکین سے مراد کھالوں کا دباغت کرتا ہے اس کا واحد مسلک ہے۔ اظہر قرأت مساکین ہے جمع مسکین ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کشتی ضعیف اور کمزور لوگوں کے لیے تھی ان پر شفقت کرنا مناسب تھا، واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا میں نے اسے عیب دار کرنا چاہا۔ کہا جاتا ہے: عبت الشئ فعاب، میں نے اسے عیب دار کیا تو وہ عیب دار ہوگئی۔ فهو معیب وعائب، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے صحیحة پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان بن عفان نے صالحة پڑھا ہے اور وراء اس کی اصل بمعنی خلف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: وہ پیچھے تھا اور ملاحوں نے اس بادشاہ کی طرف لوٹنا تھا۔ اکثر علماء نے کہا: یہاں وراء کا معنی امام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر کی قرأت اس کی تائید کرتی ہے۔ وَكَانَ اَمَامَهُمْ مَلِكٌ یَاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ صَحِیْحَةٍ غَصْبًا۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک وَرَآءَهُمْ اپنے معنی میں ہے یہ اس طرح ہے کہ ان الفاظ میں زمانہ کی رعایت رکھی جاتی ہے پس جو حادثہ مقدم موجود ہے وہ پہلے ہے اور جو اسکے بعد آئے گا وہ وراء (پیچھے) ہے۔ یہ بادی النظر میں جو ظاہر ہوتا ہے اس کے خلاف ہے ان الفاظ میں ان کے مقامات پر غور کر جہاں یہ وارد ہیں تو تو ان کو عام پائے گا۔ اس آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کا عمل اور ان کی کوشش اس کے بعد اس بادشاہ کا غصب ہے اور جنہوں نے أمامهم پڑھا ہے انہوں نے جگہ کے اعتبار سے کہا ہے، یعنی وہ گویا ایک شہر کی طرف جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''الصلاة أمامك'' (1) (نماز آگے پڑھیں گے) یہاں بھی مکان کا ارادہ کیا ہے۔ اس وقت میں ان کا ہونا زمانہ کے اعتبار سے نماز سے پہلے تھا۔ اس گفتگو میں غور کر یہ تجھے ان الفاظ کے استعمال کی پریشانی سے راحت دے گی۔ طبری کی کتاب میں قتادہ کا قول: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ کے تحت واقع ہوا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی أمامهم ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کیا مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ۔ یعنی ان کے آگے جہنم ہے۔ یہ قول درست نہیں ہے غیر فصیح قول ہے جس سے حسن بن ابی حسن نے اختلاف کیا ہے، یہ زجاج کا قول ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس امام نے جو اختیار کیا ہے اس سے پہلے ابن عرفہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ ہروی نے کہا: ابن عرفہ نے کہا کہنے والا کہتا ہے: من وراءه کیسے کہا ہے؟ وہ اس کے آگے تھی، ابو عبیدہ اور ابو علی قطرب نے کہا: یہ لفظ اضداد میں سے ہے وراء، قدام کے معنی میں ہے یہ غیر محصل ہے کیونکہ أمام، وراء کی ضد کی ہے یہ اماکن اور اوقات میں استعمال کی صلاحیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الجمع بین الصلاتین بالمزدلفة، جلد 1، صفحہ 227

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 535

رکھتا ہے جیسے تیرا قول ہے: إذا وعدنی وعدًا فی رجب لرمضان۔ پھر وہ کہے: ومن وراءك شعبان، تو جائز ہے، اگرچہ وہ اس سے آگے ہے کیونکہ وہ وعدہ کے وقت اس کو پیچھے کرتا ہے۔ قشیری نے بھی اس قول کی طرف اشارہ کیا ہے، فرمایا: یہ اوقات کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ آدمی کو امامك نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ تیرے پیچھے ہے۔ فراء نے کہا: دوسرے علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اس قوم کو بادشاہ کی خبر نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو خبر دی حتیٰ کہ انہوں نے کشتی کو عیب لگا دیا؛ یہ زجاج نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے کہا: امام کی جگہ میں وراء کے استعمال میں اہل عربیہ کے تین اقوال ہیں: ا۔ اس کا استعمال ہر حال میں جائز ہے اور ہر مکان میں جائز ہے یہ اضداد میں سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ۔ یعنی أمامهم جهنم، شاعر نے کہا:

أترجو بَنُو مَروانَ سَمْعِي وطاعتي وقومي تميمٌ والفَلَاةُ وَرَائِيا

یہاں بھی وراء، امام کے معنی میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وراء، امام کی جگہ میں مواقیت اور زمانہ میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ انسان اس سے گزر جاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے ہوتا ہے اور اسکے علاوہ جائز نہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ان اجسام میں استعمال ہوتا ہے جن کا سامنا ہوتا ہے جیسے دو متقابل پتھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کے پیچھے ہے، اور اس کے علاوہ میں جائز نہیں، یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے (1)۔

اس بادشاہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: ہُدَد بن بُدَد تھا بعض نے کہا: جلندی تھا، یہ سہیلی کا قول ہے۔ امام بخاری نے اس غصب کرنے والے بادشاہ کا ذکر کیا ہے فرمایا: وہ ہدد بن بدد تھا اور مقتول لڑکا، اس کا نام جیسور تھا ہم نے ''الجامع'' میں یزید مروزی کی روایت سے اسی طرح مقید کیا ہے اور اس روایت کے علاوہ میں حیسور (حاء کے ساتھ) ہے اور میرے پاس کتاب کے حاشیہ میں تیسری روایت ہے وہ حیسون ہے۔ وہ بادشاہ ہر اچھی کشتی غصب کر لیتا تھا اسی وجہ سے حضرت خضر علیہ السلام نے اسے عیب لگا دیا اور اس میں شگاف کر دیا، اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ مصلحت کے لیے کوئی عمل کرنا جائز ہے جب مصالح ثابت ہوں اور کل مال کی بعض مال کے افساد کے ساتھ اصلاح کرنا جائز ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں کشتی کو شگاف لگانے کی حکمت اس طرح بیان کی گئی ہے: جب وہ آئے گا جو اس کو قبضہ میں کرنا چاہتا ہو تو وہ اسے پھٹا ہوا پائے گا تو وہ اس سے آگے نکل جائے گا، پھر یہ لکڑی کے ساتھ اس کی اصلاح کرلیں گے (2)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تکالیف میں صبر کرنا چاہیے بہت سی ناپسندیدہ چیزوں میں فوائد ہوتے ہیں، اس ارشاد: وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ: 216) کا یہی معنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ صحیح حدیث میں ہے: ''اس پر کافر ہونے کی مہر لگائی گئی تھی'' (3)۔ یہ اس کی تائید کرتا ہے کہ وہ بالغ نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس کے متعلق خبر ہو جبکہ وہ بالغ ہو، یہ مفہوم پہلے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 6
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضائل خضر علیہ السلام، جلد 2، صفحہ 271
3۔ جامع ترمذی، تفسیر سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 144

گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت خضر علیہ السلام کے کلام سے ہے۔ سیاق کلام بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے یعنی ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر مجبور کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے لیے اس جہت پر نفوس کے قتل میں اجتہاد کو مباح کر دیا تھا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام نے بیان کیا۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے جان لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے جان لیا۔ یہ اس طرح ہے جس طرح علم کو خوف سے تعبیر کیا جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقرہ: 229)۔

حکایت ہے کہ حضرت ابی نے فَعَلِم ربك پڑھا ہے۔ بعض نے فرمایا: خشیت بمعنی کراہت ہے۔ کہا جاتا ہے: فرقت بینهما خشیة أن یقتلا۔ یعنی لڑکے کی کراہت کی وجہ سے میں نے ان کے درمیان جدائی کر دی۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک اس تاویل کی توجیہ میں اظہر یہ ہے اگرچہ لفظ اس کی تائید نہیں کرتے کہ یہ استعارہ ہے یعنی مخلوق اور مخاطبین کے گمان پر اگر وہ اس کی حالت کو جان لیں انہیں والدین کو مجبور کرنے کا اندیشہ واقع ہو۔ حضرت ابن مسعود نے فخاف ربك پڑھا ہے یہ استعارہ میں واضح ہے اس کی نظیر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعل اور عسیٰ کا ذکر ہے۔ تمام ایسے حروف اور صیغے جن میں ترجی، توقع، خوف اور خشیت ہے وہ تمہارے اعتبار سے ہیں اے مخاطبو! يُّرْهِقَهُمَا کا معنی ہے وہ انہیں مجبور کرے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت انہیں اس کی اتباع پر ڈالے گی پس وہ گمراہ ہو جائیں گے۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا جمہور علماء نے باء کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عاصم نے باء کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے بیٹا عطا فرمائے گا۔ خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً۔ جو دین اور صلاح کے اعتبار سے اس سے بہتر ہو، کہا جاتا ہے: بدّل و أبدل جیسے مهّل و أمهل، نزّل و أنزل کہا جاتا ہے۔ وَّاَقْرَبَ رُحْمًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، شاعر نے کہا:

وكيف بظلم جارية ومنها اللِّينُ والرُّحُمُ

باقی قراء نے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے؛ اسی سے رؤبۃ بن عجاج کا قول ہے:

يامُنْزِلَ الرُّحْمِ على إدْرِيسَا ومُنْزِلَ اللَّعنِ على إبْلِيسَا(1)

ابوعمرو سے اختلاف مروی ہے۔ رحما معطوف ہے۔ زکاۃ پر اس کا معنی رحمۃ ہے کہا جاتا ہے: رَحِمه رَحمةً و رُحْمًا، اس کا الف تانیث کے لیے ہے اس کا مذکر رُحم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رحما بمعنی الرّحِم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وأوصل رُحْمًا پڑھا ہے یعنی رَحِمًا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ازکی منه بھی پڑھا ہے۔ ابن جبیر اور ابن جریج سے مروی ہے کہ ان والدین کو لڑکی بدلہ میں دی گئی۔ کلبی نے کہا: اس لڑکی سے ایک نبی نے نکاح کیا تھا پھر اس سے نبی پیدا ہوا تھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 536

اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ایک امت کو ہدایت دی تھی۔ قتادہ نے کہا: اس نے بارہ انبیاء کو جنم دیا تھا۔ ابن جریج سے مروی ہے کہ اس لڑکے کی ماں اس دن ایک مسلمان بچے کے ساتھ حاملہ تھی جس دن وہ قتل ہوا تھا اور مقتول لڑکا کافر تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس نے بچی جنم دی جس نے پھر نبی کو جنم دیا۔ ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بدلے میں بچی دی جس نے ستر انبیاء کو جنم دیا، اور یہ جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے روایت کر کے کہا ہے: ہمارے علماء نے کہا یہ بعید ہے، انبیاء کی کثرت صرف بنی اسرائیل میں معروف ہے اور یہ عورت بنی اسرائیل میں نہ تھی۔ اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ اولاد کے مفقود ہونے کے ساتھ مصائب آسان ہوتے ہیں اگرچہ اولاد جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے اور جو قضاء الٰہی کو تسلیم کرتا ہے اس کا انجام ید بیضا سے بھی روشن ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا: جب وہ بچہ پیدا ہوا تھا تو اس کے والدین خوش ہوئے تھے اور جب وہ قتل ہوا تھا تو پریشان ہوئے تھے۔ اگر وہ لڑکا باقی رہتا تو اس میں ان کی ہلاکت تھی، پس ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مومن کے حق میں کبھی ناپسندیدہ امر کا فیصلہ بہتر ہوتا ہے بنسبت اس کے جو وہ اس کے لیے اس کی پسند کا فیصلہ فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ۔ (1) یہ لڑکے دونوں چھوٹے تھے کیونکہ یتیم کے ساتھ ان کی صفت بیان کی گی ہے۔

ان کے نام اُصرام اور صریم تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لا یُتم بعد بلوغ "بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہے"۔ یہی ظاہر ہے۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ ان پر شفقت کی بناء پر بعد از بلوغ یتیم کا لفظ بولا گیا ہو اگرچہ وہ یتیم نہ تھے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ لوگوں میں یتیم وہ ہوتا ہے جس کا باپ فوت ہو جائے اور حیوانوں میں وہ ہوتا ہے جس کی ماں مرجائے۔ فِي الْمَدِيْنَةِ میں دلیل ہے کہ دیہات کو بھی مدینہ کہا جاتا ہے، اسی سے حدیث ہے أمرتُ بقرية تاكلُ القرىٰ (3) اور ہجرت کی حدیث میں ہے۔ لمن انت۔ تو اس شخص نے کہا: من أهل المدينه۔ یعنی مکہ سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا، كَنْزٌ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، عکرمہ اور قتادہ نے کہا: وہ بہت بڑا مال تھا، یہ کنز کے اسم سے ظاہر ہے کیونکہ لغت میں مال مجموع کو کنز کہا جاتا ہے؛ اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ علم تھا جو مدفون صحیفوں میں تھا (4)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے فرمایا: وہ سونے کی تختی تھی جس پر یہ لکھا ہوا تھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مجھے تعجب ہے اس شخص کے لیے جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے پریشان ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو رزق پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے تھکتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے خوش ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو حساب پر ایمان رکھتا ہے پھر کیسے غافل ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو اس کو جانتا ہے اور اس کے اپنے اہل کے ساتھ تبدیل ہونے کو بھی جانتا ہے پھر اس کے لیے مطمئن ہوتا ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 537
2۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء متی ینقطع الیتم، حدیث 2489
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، ما جاء متی ینقطع الیتم، جلد 2، صفحہ 41
4۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 9

عکرمہ اور عمر مولی غفرہ سے اسی طرح مروی ہے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا سیاق کلام اور لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا قریبی والد تھا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ان کا ساتواں دادا تھا؛ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ دسواں دادا تھا اس کی وجہ سے ان کی حفاظت کی گئی اگرچہ وہ صلاح کے ساتھ مشہور نہ تھا، اسے کاشح کہا جاتا تھا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ان کی والدہ کا نام دینا تھا؛ یہ نقاش نے ذکر کیا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صالح شخص کی اپنی بھی حفاظت فرماتا ہے اور اس کی اولاد کی بھی حفاظت فرماتا ہے، اگرچہ وہ اس سے بہت دور کا رشتہ رکھتے ہوں۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ صالح آدمی کی سات پشتوں تک حفاظت کرتا ہے، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ (الاعراف)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔ یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے (2) ان کے بارے میں اختلاف گزر چکا ہے۔ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ یعنی تفسیر۔ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ایک جماعت نے تستطع پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے تسطع پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہم مصحف کے خط میں اسی طرح پڑھتے تھے۔ یہاں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نوجوان کا ذکر نہ آیت کی ابتدا میں ہوا نہ آخر میں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نوجوان کا ذکر نہیں سنا گیا حالانکہ وہ ان کے ساتھ تھا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نوجوان نے پانی پیا تھا پس وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اسے عالم نے پکڑا اور اس پر کشتی کو چسپاں کر دیا پھر اس دریا میں چھوڑ دیا وہ اس کے ساتھ قیامت تک دریا میں گھومتی رہے گی یہ اس لیے ہوا کہ اسے پانی پینا نہیں تھا، لیکن اس نے اس سے پانی پی لیا تھا۔ قشیری نے کہا: اگر یہ ثابت ہو تو پھر نوجوان یوشع بن نون نہ ہو کیونکہ یوشع بن نون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہے تھے اور ان کے خلیفہ تھے۔ اظہر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان کو واپس بھیج دیا تھا جب ان کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے شیخ امام ابو العباس نے کہا: یہ احتمال ہے کہ متبوع کے ذکر کی وجہ سے تابع کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان لڑکوں کے خزانہ کو نکالنے کے واقعہ کو اللہ کی طرف کیسے منسوب کیا جبکہ انہوں نے کشتی کو شگاف لگانے کے بارے میں کہا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا عیب کی نسبت اپنی طرف کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیوار میں ارادہ کو اللہ کی طرف منسوب کیا کیونکہ ایک لمبے زمانہ میں ایک نیا امر تھا اور غیوب میں سے ایک غیب تھا، پس اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہی بہتر تھا، اگرچہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ ارادہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ یہ کام تمام خیر تھا تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ اور کشتی کے عیب کو ادب کی رعایت کرتے ہوئے اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ یہ عیب کا لفظ تھا پس انہوں نے ادب کا خیال کرتے ہوئے ارادہ کو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی طرف منسوب کیا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 537
2۔ ایضاً

کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا: وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (الشعراء) پہلے اور بعد میں فعل کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور اپنی طرف مرض کی نسبت کی کیونکہ اس میں نقص اور مصیبت کا معنی ہے، پس اللہ تعالیٰ کی طرف صرف وہی الفاظ منسوب کیے جاتے ہیں جو مستحسن ہوں۔ یہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران: 26) خیر پر اکتفا فرمایا اور شر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا اگرچہ خیر و شر، نقصان اور نفع اس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہی ہر شی سے آگاہ ہے، اس پر اس حدیث سے اعتراض نہیں کیا جاسکتا جس میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو تو نے میری عیادت نہیں کی، میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو تو نے مجھے کھلایا نہیں تھا، میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا تھا'' (1)۔ یہ خطاب میں تنزل اور عتاب میں تلطف ہے۔ اس کا مقصد ذی الجلال کی فضیلت کی پہچان ہے، اور ان پر اعمال کے ثواب کی مقادیر کی معرفت ہے؛ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کو شایان ہے کہ اپنے لیے جو چاہے بیان کرے اور ہمیں صرف اسی کی اجازت ہے جس میں اوصاف جمیلہ کا ذکر ہو اور افعال شریفہ کا بیان ہو۔ اللہ تعالیٰ نقائص اور آفات سے بلند و بالا ہے۔ لڑکے کے بارے میں فرمایا: فَاَرَدْنَآ قتل کی نسبت اپنی طرف کی اور تبدیلی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی، افضل کمال خلق اور کمال عقل ہے۔ سورۂ انعام میں اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے شیخ ابو العباس نے فرمایا: زنادقہ باطنیہ قوم سلوک طریق کا نظریہ رکھتے ہیں جس سے احکام شرعیہ لازم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ احکام شرعیہ عامہ جو ہیں ان کے ساتھ حکم اغبیاء اور عوام پر لگایا جاتا ہے۔ رہے اولیاء اور اہل خصوص وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان سے وہی مراد ہوتا ہے جو ان کے دلوں میں واقع ہوتا ہے۔ اور ان پر اس کے ساتھ حکم لگایا جاتا ہے جو ان کے خواطر پر غالب آتا ہے، انہوں نے کہا: یہ اس لیے ہے کہ ان کے دل کدورتوں سے صاف ہوتے ہیں اور ان کے دل اغیار سے خالی ہوتے ہیں، اور ان کے لیے علوم الٰہیہ روشن ہوتے ہیں اور حقائق ربانیہ واضح ہوتے ہیں، وہ اسرار کائنات پر واقف ہوتے ہیں اور جزئیات کے احکام جانتے ہیں اس لیے وہ احکام شرعیہ کلیہ سے مستغنی ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے لیے اتفاق ہوا وہ علوم جو ان کے لیے روشن تھے ان کی وجہ سے وہ ان علوم سے مستغنی ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تھے اور یہ لوگ یہ حدیث اپنے اس نظریہ پر نقل کرتے ہیں ''اپنے دل سے فتویٰ پوچھ اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دیں''۔ ہمارے شیخ نے فرمایا: یہ قول زندقہ اور کفر ہے، اس کے قائل کو قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ معلوم شرائع کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت جاری فرمائی اور اپنی حکمت نافذ فرمائی ہے کہ اس کے احکام معلوم نہیں ہوتے ہیں مگر ان رسولوں کے واسطہ سے جو اس کے اور مخلوق کے درمیان سفیر ہوتے ہیں وہ اس کے پیغام اس کی طرف پہنچاتے ہیں اور وہ اس کی شریعت اور احکام بیان کرتے ہیں، اسی وجہ سے اس نے انہیں چنا ہے اور اس کے ساتھ انہیں خاص کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب عیادۃ المریض، جلد 2، صفحہ 318

اللهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ ۝ (الحج)

اور فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام: 124) اور فرمایا: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (البقرہ: 213) اس کے علاوہ بھی آیات ہیں۔

بہر حال علم یقینی اور قطعی یقین اور سلف وخلف کا اس بات پر اجماع حاصل ہے کہ احکام الٰہیہ کی معرفت کا کوئی راستہ نہیں جو اس کے امر اور نہی پر مشتمل ہیں۔ اور ان میں سے کسی حکم کی پہچان نہیں ہوسکتی مگر رسولوں کی جہت سے۔ پس جو کہتا ہے کہ کوئی دوسرا طریقہ ہے جس سے امر ونہی کی پہچان بغیر رسولوں کے ہوتی ہے رسولوں کی جس میں ضرورت نہیں تو وہ کافر ہے، اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کے ساتھ سوال وجواب کی ضرورت ہے۔ پھر یہ تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے انبیاء کا اثبات ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ رسول اس کا بیان یہ ہے کہ جو کہتا ہے کہ وہ اپنے دل سے احکام لیتا ہے جو اس کے دل میں واقع ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا وہ اس کے مقتضا کے مطابق عمل کرے گا وہ اس کیفیت کے ساتھ کتاب وسنت کا محتاج نہیں تو اس نے خاص اپنے لیے نبوت ثابت کی کیونکہ یہ اس طرح ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: کہ ''روح القدس نے میرے دل میں پھونکا'' ☆۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جمہور لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا وصال ہوگیا ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا: وہ زندہ ہیں کیونکہ آپ نے آب حیات کے چشمہ سے پانی پیا تھا۔ وہ زمین میں باقی ہیں اور وہ بیت اللہ کا حج کرتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس مفہوم میں نقاش نے بڑی لمبی کلام کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں بہت سی چیزیں حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہیں۔ یہ تمام روایات کسی بنیاد پر مبنی نہیں۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے اور حج کرتے تو ملت اسلامیہ میں ان کا ظہور ہوتا۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کی تفاصیل کو جاننے والا ہے اس کے علاوہ کوئی رب نہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام کے وصال پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے: أرأیتم لیلتکم هذه فإنه لا یبقی ممن هو الیوم علی ظهر الأرض أحد (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ امام بخاری کا مسلک ہے، قاضی ابو بکر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ صحیح قول دوسرا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں جیسا کہ ہم ذکر کریں گے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخر میں ایک رات عشاء کی نماز پڑھائی جب سلام پھیرا تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''تم اپنی اس رات کے بارے میں بتاؤ کہ اس سے سو سال کے آغاز پر جو سطح زمین پر ہے ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا'' (2)۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر لوگ غلط تبصرے کرنے لگے، سو سال کے بارے میں مختلف باتیں کرنے لگے جو وہ کرتے تھے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آج سطح زمین پر ہے اس میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا'' (3)۔ اس سے مراد یہ تھا کہ یہ قرن ختم ہوجائے گی۔ اس حدیث کو حضرت جابر بن عبد اللہ نے بھی روایت کیا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، السمر فی العلم، جلد 1، صفحہ 22
2۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 194، حدیث نمبر 38344
3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310
☆ شرح السنہ بغوی۔ 4110

فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک مہینہ پہلے یہ کہتے ہوئے سنا: ''تم مجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہو، اس کا علم اللہ کے پاس ہے اور میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں! سطح زمین پر کوئی نفس رہنے والا نہیں ہوگا جس پر سو سال گزرے گا'' دوسری روایت میں ہے سالم نے کہا: ہم نے ذکر کیا کہ جو اس دن پیدا ہو چکا ہے۔ ایک روایت میں ہے آج کوئی نفس ایسا نہیں جس پر سو سال آئے گا، اور وہ اس وقت زندہ ہوگا۔ عبدالرحمٰن صاحب السقایۃ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: عمر کم ہوگی۔ حضرت ابو سعید خدری سے اس حدیث کی طرح مروی ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: اس حدیث کے ضمن میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے ایک مہینہ پہلے خبر دی تھی کہ بنی آدم میں سے جو بھی موجود ہے اس کی عمر سو سال پر ختم ہو جائے گی کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من نفس منفوسۃ (1)۔ یہ لفظ ملائکہ اور جن کو شامل نہیں کیونکہ ان سے صحیح نہیں کہ وہ اس طرح ہیں اور نہ حیوان غیر عاقل شامل ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ممن ھو علی ظھر الأرض أحد (2)۔ یہ اصل وضع کے اعتبار سے ذوی العقول کے لیے بولا جاتا ہے پس تعین ہو گیا کہ مراد بنی آدم ہیں۔ حضرت ابن عمر نے اس معنی کو بیان کیا ہے فرمایا: اس سے مراد صدی کا ختم ہونا ہے۔ اس شخص کے لیے کوئی حجت نہیں جو اس شخص کے قول کے بطلان پر حجت پکڑتا ہے جو کہتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں کیونکہ ما من نفس منفوسۃ (3) میں عموم ہے چونکہ عموم اگرچہ استغراق کی تاکید کرتا ہے، لیکن اس میں نص نہیں ہوتا بلکہ وہ تخصیص کے قابل ہوتا ہے۔ پس یہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شامل نہیں ہے، کیونکہ وہ فوت ہوئے ہیں نہ قتل ہوئے ہیں، نص قرآنی کے ساتھ ان کا زندہ ہونا ثابت ہے، اور یہ عموم دجال کو بھی شامل نہیں حالانکہ وہ بھی زندہ تھا، اس کی دلیل حدیث الجساسہ ہے۔ اسی طرح یہ عموم حضرت خضر علیہ السلام کو بھی شامل نہیں۔ وہ لوگوں کو نظر نہیں آتے اور نہ ان کو نظر آتے ہیں جن لوگوں میں وہ جاتے ہیں تاکہ ان کے دل میں ایک دوسرے سے خطاب کے وقت خطرہ پیدا نہ ہو، اس عموم کی مثل ان کو شامل نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصحاب کہف زندہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حج کرتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نوجوان جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔ ابو اسحاق ثعلبی نے (العرائس) میں ذکر کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں ان کو لمبی عمر دی گئی ہے، آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ محمد بن متوکل نے ضمرہ بن ربیعہ عن ابن شوذب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام فارس کی اولاد سے تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل سے تھے، وہ ہر سال حج کے موقع پر آپس میں ملاقات کرتے ہیں۔ عمرو بن دینار سے مروی ہے فرمایا: حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام زمین پر زندہ رہیں گے جب تک قرآن زمین پر موجود ہے، جب قرآن اٹھا لیا جائے گا وہ بھی فوت ہو جائیں گے۔ ہمارے شیخ امام ابو محمد عبدالمعطی بن محمد بن عبدالمعطی لخمی نے قشیری کے رسالہ کی شرح میں بہت سے نیک مردوں اور عورتوں کی حکایات ذکر کی ہیں کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی جس کے مجموعہ سے ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں نیز نقاش اور ثعلبی وغیرہ نے بھی یہ ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے ''دجال شوریلی زمین پر پہنچے گا جو مدینہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 310　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

کے قریب ہوگی اس وقت اس کی طرف ایک شخص نکلے گا جو لوگوں سے بہتر ہوگا''۔ اس حدیث کے آخر میں ہے ابو اسحاق نے کہا: یعنی انّ ھذا الرجل ھو الخضر (1) (وہ شخص حضرت خضر ہوگا) ابن ابی الدنیا نے ''الھواتف'' میں ایک سند کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملے اور انہوں نے آپ کو یہ دعا سکھائی اور اس میں اس شخص کے لیے بہت بڑے ثواب، مغفرت اور رحمت کا ذکر کیا ہے جو ہر نماز کے بعد اس کو پڑھتے گا وہ دعا یہ ہے: یامن لا یشغلہ سمع عن سمع، ویامن لا تغلطہ المسائل، ویامن لا یتبرم من إلحاح الملحین، أذقنی برد عفوك، وحلاوۃ مغفرتك (اے وہ ذات جس کو ایک آواز کا سننا دوسری آواز کے سننے سے غافل نہیں کرتا، اے وہ ذات مسائل جس سے غلطی نہیں کراتے، اے وہ ذات جو اصرار سے مانگنے والوں کے اصرار سے اکتاتی نہیں! تو مجھے اپنے عفو کی ٹھنڈک اور اپنی مغفرت کی حلاوت عطا فرما) انہوں نے حضرت عمر سے بھی بعینہ یہی دعا ذکر کی ہے جو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کی جو انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے سنی ہے، اسی طرح انہوں نے حضرت الیاس علیہ السلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہونا بھی ذکر کیا ہے۔ جب حضرت الیاس علیہ السلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک باقی ہونا جائز ہے تو حضرت خضر علیہ السلام کا باقی ہونا بھی جائز ہے۔ ابن ابی الدنیا نے ذکر کیا ہے کہ حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال بیت اللہ کے پاس ملتے ہیں اور جدائی کے وقت کہتے ہیں: ما شاء اللہ ما شاء اللہ، لا یصرف السوء إلا اللہ، ما شاء اللہ ما شاء اللہ ما یکون من نعمۃ فمن اللہ ما شاء اللہ ما شاء اللہ توکلت علی اللہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل (جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے برائی اور تکلیف کو اللہ کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا، جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے۔ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے۔ میں اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے) رہی حضرت الیاس علیہ السلام کی خبر تو وہ سورۃ الصافات میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو عمر بن عبد البر نے کتاب ''التمہید'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور کپڑے کے ساتھ آپ کو لپیٹا گیا تھا تو گھر کے ایک کونے سے ہاتف غیبی نے آواز دی لوگ اس کی آواز سنتے تھے اور اس شخصیت کو نہیں دیکھتے تھے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ السلام علیکم أهل البیت۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ۔ إنّ فی اللہ خلفا من كلّ هالك وعوضا من كلّ تالف، عزاء من كلّ مصيبة. فبالله فثقوا. وإياه فارجوا. فإنّ المصاب من حُرِم الثواب (اے اہل بیت! تم پر سلام ہو، ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر جانے والے کا خلیفہ ہے اور تلف ہونے والے کا عوض ہے، ہر مصیبت سے تسلی ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اور اس سے امید رکھو، مصیبت زدہ وہ ہے جو ثواب سے محروم کیا گیا) صحابہ کرام خیال کرتے تھے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں علی الأرض میں الف، لام عہد کے لیے ہے جنس کے لیے نہیں ہے، اس سے مراد عرب کی زمین ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا آمیں تصرف تھا اور اس کی طرف لوٹنا تھا نہ کہ یاجوج و ماجوج کی زمین اور نہ ہند و سندھ کے دور دراز علاقے جس کا نام بھی نہیں سنا گیا اور نہ اس کا علم ہوا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، صفۃ الدجال، جلد 2، صفحہ 402

اور دجال کے بارے میں جواب نہیں۔

علامہ سہیلی نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کے نام کے بارے میں بڑا واضح اختلاف ہے۔ ابن منبہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: ایلیا بن ملکان بن فالغ بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح۔ بعض علماء نے کہا: وہ ابن عامیل بن سامجین ابن اُریا بن علقما بن عیصو بن اسحاق ہے، ان کا باپ ملیکا تھا اور ماں بنت فارس اس کا نام الھا تھا انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو ایک غار میں جنم دیا تھا وہاں ایک بکری تھی جو انہیں ہر روز دودھ پلاتی تھی وہ اس شہر کے ایک آدمی کی بکریوں میں سے تھی، اس شخص نے حضرت خضر علیہ السلام کو پکڑ لیا اور آپ کی پرورش کی جب جوان ہو گئے تو ملک جو حضرت خضر کا باپ ہے نے ایک کاتب بلایا اور اہل معرفت ونبالت کو جمع کیا تا کہ وہ صحیفے لکھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ جو کاتبوں میں اس کے سامنے آیا اس کا بیٹا خضر تھا، وہ اسے نہیں جانتا تھا، جب اس نے بہت اچھا لکھا تو اس نے اس کے بارے میں خوب چھان بین کی کی اسے پتا چلا کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو اس نے اس کو اپنی قربت بخشی اور لوگوں کے امور کا والی بنا دیا پھر حضرت خضر علیہ السلام بادشاہ سے بھاگ گئے۔ ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر بہت طویل ہے، حتی کہ وہ آب حیات کے چشمہ پر پہنچے اور اس کا پانی پیا پس وہ دجال کے نکلنے تک زندہ رہیں گے اور وہ شخص جس کو دجال قتل کرے گا اور پھر اسے کاٹ دے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا وہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا اور یہ صحیح نہیں ہے۔ امام بخاری اور اہل حدیث کی ایک جماعت نے کہا جن میں سے ہمارے شیخ ابو بکر بن عربی رحمہ اللہ بھی ہیں کہ وہ سو سال ختم ہونے سے پہلے وصال کر گئے، اس کی وجہ یہ حدیث ہے: الی رأس مائۃ عام لا یبقی علی ھذہ الأرض فمن ھو علیھا أحد سو سال کے آغاز تک جو بھی اس زمین پر ہے ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے، یعنی جو زندہ تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلام فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: ہم نے اس حدیث کا ذکر کیا اور اس پر کلام کی اور ہم نے حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اب تک کے لیے بیان کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہونے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: مجھے وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: تو مسکرانے والا ہو جا اور ہنسنے والا نہ ہو، لجاجت چھوڑ دے اور بغیر حاجت کے نہ چل۔ خطا کاروں پر ان کی خطاؤں کی وجہ سے عیب نہ لگا اور اے ابن عمران اپنی خطا پر رو۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۭ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ا۟لْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق، فرمایئے: میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال۔ ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا ساز و سامان، پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر، یہاں تک کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں اور اس نے وہاں ایک قوم پائی، ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ذوالقرنین نے کہا: جس نے ظلم (کفر و فسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لوٹا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اسے عذاب دے گا بڑا ہی سخت عذاب۔ اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اس کے لیے اچھا معاوضہ ہے اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجالانے کا جو آسان ہوں گے۔ پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستہ پر، یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوعِ آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی ہم نے ان کے لیے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ، بات یونہی ہے، اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ ابن اسحاق نے کہا: ذی القرنین کی خبر میں سے یہ ہے کہ انہیں وہ عطا کیا گیا جو کسی دوسرے کو عطا نہیں کیا گیا اس کے لیے اسباب اتنے کشادہ ہوئے کہ وہ زمین کے مشارق و مغارب کے شہروں تک پہنچا۔ وہ کسی زمین پر پہنچا تو اس پر غالب آ گیا حتی کہ وہ مشرق و مغرب کے اس مقام پر پہنچا کہ جس کے بعد مخلوق نہیں ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے اس شخص نے بتایا جو عجمیوں سے حکایات روایت کرتا ہے کہ وہ ذی القرنین کے بارے میں متواتر یہ علم رکھتے ہیں کہ وہ اہل مصر میں سے ایک شخص تھا جس کا نام مرزبان بن مردبۃ یونانی تھا وہ یونان بن یافث بن نوح کی اولاد سے تھا۔ ابن ہشام نے کہا: اس کا نام اسکندر تھا، یہ وہی ہے جس نے اسکندریہ بنایا پس اس کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ ابن اسحاق نے کہا مجھے ثور بن یزید نے خالد بن معدان کلاعی سے روایت کر کے بتایا۔ خالد ایک شخص تھا جس نے لوگوں کو پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ بادشاہ تھا جس نے زمین کو نیچے سے چھوا اسباب کے ساتھ'' (1)۔ خالد نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یا ذالقرنین کہتے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 23

ہوئے سنا تو حضرت عمر نے کہا: اللھم غفراً أما رضیتم أن تسموا باسماء الانبیاء حتی تسمیتم بأسماء الملائکة (اے اللہ معاف فرما کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم انبیاء کے اسماء کے ساتھ نام رکھو حتی کہ تم نے ملائکہ کے اسماء کے ساتھ نام رکھ لیے) ابن اسحاق نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے وہ کون تھا کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ نہیں فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر کے قول کی مثل مروی ہے انہوں نے ایک شخص کو سنا جو دوسرے شخص کو آواز دے رہا تھا: اے ذوالقرنین! حضرت علی نے فرمایا: کیا تمہارے لیے کافی نہ تھا کہ تم نے انبیاء کرام کے نام کے ساتھ نام رکھے حتی کہ تم نے ملائکہ کے نام کے ساتھ نام رکھ لیے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ صالح بادشاہ بندہ تھا، اللہ تعالیٰ کا مخلص تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ نبی تھے جو مبعوث کیے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے زمین کی فتح عطا فرمائی۔ دارقطنی نے کتاب الاخبار میں ذکر کیا ہے کہ ایک فرشتہ ہے جس کو رباقیل کہا جاتا ہے وہ ذی القرنین پر اترتا تھا یہ وہ فرشتہ ہے جو قیامت کے روز زمین کو لپیٹے گا اور اسے کم کرے گا۔ تمام لوگوں کے اقدام اس زمین پر واقع ہوں گے جیسا کہ بعض اہل علم نے ذکر کیا۔ سہیلی نے کہا: یہ وہ فرشتہ تھا جو ذی القرنین پر مقرر کیا گیا تھا جس نے زمین کے مشارق و مغارب کو طے کیا تھا جیسا کہ خالد بن سنان کا واقعہ ہے کہ ان کے لیے آگ کو مسخر کیا گیا تھا آگ پر متعین فرشتے کی حالت میں مشاکلت تھی وہ فرشتہ مالک ہے علیہ السلام وعلی جمیع الملائکة اجمعین۔ ابن ابی خیثمہ نے کتاب البدء میں خالد بن سنان کا ذکر کیا ہے اور اس کی نبوت کا ذکر کیا ہے۔ خازن النار مالک فرشتہ کو اس پر مقرر کیا گیا تھا (یعنی اس کے ذریعے اس کی تائید کی جاتی تھی) اس کی نبوت کی علامتوں میں سے یہ تھا کہ ایک آگ کو نار الحدثان کہا جاتا تھا وہ لوگوں پر ایک غار سے نکلتی تھی اور لوگوں کو جلا دیتی تھی لوگ اس کو دور نہیں کر سکتے تھے، خالد بن سنان نے اس کو لوٹایا تو وہ پھر کبھی نہ نکلی۔

ذی القرنین کے نام میں اور اس سبب میں بہت زیادہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا رہا اس کا نام تو بعض نے کہا: وہ اسکندر بادشاہ یونانی مقدونی ہے، کبھی قاف مشدد کہا جاتا ہے، المقدونی کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام ہرمس ہے۔ بعض نے کہا اس کا نام ہردیس ہے۔ ابن ہشام نے کہا: وہ صعب بن ذی یزن حمیری ہے جو وائل بن حمیر کی اولاد سے تھا، ابن اسحاق کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ رومی ہے۔ طبری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ ذی القرنین روم کا ایک نوجوان تھا (1)۔ اس حدیث کی سند انتہائی کمزور ہے؛ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ سہیلی نے کہا: علم الاخبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو شخص تھے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ شخص تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فیصلہ کیا تھا جب وہ بئر السبع کے بارے میں شام میں فیصلہ اس کے پاس لے گئے تھے۔ دوسرا شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ افریدون تھا جس نے عہد ابراہیم میں بیوراسب بن اروند اسب سرکش بادشاہ کو قتل کیا تھا یا اس سے پہلے کچھ زمانہ تھا۔ رہا اس سبب میں اختلاف جس کی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ تو بعض نے کہا: اس کے بالوں کی دو مینڈھیاں تھیں ان کی وجہ سے ذوالقرنین کہا جاتا ہے؛ یہ ثعلبی

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 24

وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ الضفائر، سر کے بالوں کی مینڈھیوں کو کہتے ہیں، شاعر نے کہا:

فَلَثَمْتُ فَاهَا آخِذًا بِقُرُونِهَا شُرْبَ النَّزِيفِ بِبَرْدِ مَاءِ الْحَشْرَجِ

بعض علماء نے فرمایا: اس نے اپنی بادشاہی کے آغاز میں خواب دیکھا کہ وہ سورج کے دونوں قرن پر قابض ہے(1) اس نے یہ خواب بیان کیا تو اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ وہ ہر اس جگہ پر غالب آئے گا جس پر سورج طلوع ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسے یہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ مغرب و مشرق تک پہنچا گویا اس نے دنیا کے دونوں کناروں کو جمع کر لیا۔ ایک جماعت نے کہا: جب وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ پہنچا تو اس کے دیکھنے کے ساتھ سورج کے قرون ظاہر ہوئے اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ سورج کے ساتھ شیطان کے قرن (سینگ) دیکھے۔ وہب بن منبہ نے کہا اس کے عمامہ کے نیچے دو سینگ تھے۔ ابن الکواء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذی القرنین کے متعلق پوچھا کہ وہ نبی تھے یا بادشاہ؟ حضرت علی نے فرمایا: نہ نبی تھا نہ بادشاہ، وہ اللہ کا نیک بندہ تھا اس نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف بلایا تھا تو انہوں نے اس کا سر زخمی کر دیا پھر انہوں نے دعوت دی تو لوگوں نے سر کی دوسری طرف بھی زخمی کر دی اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ کے بارے میں بھی اختلاف ہے، ایک قوم نے کہا: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تھے ایک قوم نے کہا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد فترت کے زمانہ میں تھے۔ بعض نے کہا: وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے زمانہ میں تھے اور حضرت خضر علیہ السلام ان کا بڑا جھنڈا اٹھانے والے تھے۔ اس نے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اسے اقتدار بخشا اور سلطنت بخشی اور بادشاہوں نے اس کی اطاعت کی، روایت ہے کہ تمام دنیا کے چار بادشاہ تھے(2)، دو مومن تھے دو کافر تھے، مومن حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام اور اسکندر تھے اور کافر نمرود اور بخت نصر تھے اور پانچواں اس امت سے مالک ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (التوبہ:33) اور وہ مہدی علیہ السلام ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا ان کو ذوالقرنین اس لیے کہا جاتا تھا کیونکہ وہ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے کریم الطرفین تھا (یعنی اس کے والدین کے خاندان اعلیٰ حسب و نسب والے تھے) بعض علماء نے فرمایا: اس کے وقت میں لوگوں کی دو نسلیں گزریں جبکہ وہ زندہ تھا اس لیے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس لیے یہ نام تھا کہ وہ جب لڑتا تھا تو ہاتھوں اور رکابوں دونوں سے لڑتا تھا۔ بعض نے فرمایا: اس لیے کہ اسے علم ظاہر اور علم باطن دیا گیا تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ ظلمت و نور میں داخل ہوا تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ فارس و روم کا بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لیے بادل کو مسخر کیا گیا تھا اور اس کے لیے اسباب پھیلائے گئے تھے اور اس کے لیے نور کشادہ کیا گیا تھا اس پر رات اور دن برابر تھا۔ حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے کچھ لوگوں کو کہا جنہوں نے آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا تھا فرمایا: "ابتدا میں وہ رومیوں میں سے ایک جوان تھا، پھر اسے بادشاہی عطا کی گئی وہ چلا حتی کہ وہ مصر کی زمین پر آیا وہاں اس نے ایک شہر بنایا جسے اسکندریہ کہا جاتا

1۔ البحر الوجیز، جلد 3، صفحہ 538 2۔ ایضاً

ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس کے پاس ایک فرشتہ آیا وہ اسے اوپر لے گیا اس نے اسے کہا: اپنے نیچے دیکھ، اس نے کہا: میں صرف اپنا شہر دیکھتا ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتا۔ اس فرشتے نے اسے کہا: یہ ساری زمین ہے اور اس کے ارد گرد جو تو سیاہی دیکھ رہا ہے یہ سمندر ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تجھے زمین دکھائے اس نے تیرے لیے اس میں بادشاہی قائم کی ہے پس تو اس میں چل اور جاہل کو تعلیم دے اور عالم کو پختہ کر" (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہر چیز کا علم عطا فرمایا جس کام کا ارادہ کرتے علم اس کا سبب بنتا۔ حسن نے کہا: جہاں کا ارادہ کرتے وہاں پہنچنا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہر وہ چیز بخشی جس کے ساتھ مخلوق کو ضرورت ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ہر وہ چیز بخشی جس کے ساتھ بادشاہ مدد حاصل کرتے ہیں، شہروں کی فتح، دشمنوں پر غلبہ وغیرہ۔ السبب کا اصل معنی رسی ہے پھر استعارۃً ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا گیا جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جاتا ہے۔ فَاَتْبَعَ سَبَبًا۔ ابن عامر، عاصم، حمزہ اور کسائی نے فاتبع ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور ابو عمرو نے فاتبع سببا ہمزہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جو اسباب اسے دیے گئے تھے اس کو استعمال کیا۔ اخفش نے کہا: تبعتہ و أتبعتہ ایک معنی میں ہیں جیسے ردفتہ اور أردفتہ ایک معنی میں ہیں، اسی سے یہ ارشاد بھی ہے: اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ (الصافات)

اسی سے کلام میں الاتباع ہے جیسے حَسَنٌ بَسَنٌ اور قبیح شَقِيح۔ ابو عبیدہ نے اہل کوفہ کی قرات کو پسند کیا فرمایا: کیونکہ یہ سیر (چلنے) سے ہے۔ ابو عبیدہ اور اصمعی نے حکایت کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: تبعہ و اتبعہ جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اس کو پہنچ نہ پائے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا: اس کی مثل ہے: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ (الشعراء)

نحاس نے کہا: یہ تفریق ہے اگرچہ اس کو اصمعی نے بیان کیا ہے مگر بغیر علت اور دلیل کے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ (الشعراء) حدیث میں نہیں ہے کہ وہ ان کو ملے تھے۔ حدیث میں ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی دریا سے نکل گئے اور فرعون اور اس کے ساتھی دریا میں داخل ہوئے تو دریا ان کے اوپر مل گیا۔ اس میں حق یہ ہے کہ تبع، أتبع اور اتبع سب لغات ہم معنی ہیں، یہ السیر کے معنی میں ہیں۔ اس کے ساتھ لاحق ہونا ہے اور لاحق نہ ہونا دونوں جائز ہیں۔ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ ابن عاصم، حمزہ اور کسائی نے حامیة پڑھا ہے، جس کا معنی ہے گرم اور باقی قراء نے حمئة پڑھا ہے، جس کا معنی ہے سیاہ مٹی۔ تو کہتا ہے: حمأت البئر حمأ (میم کی تسکین کے ساتھ) تو اس کا معنی ہے کنویں کی مٹی زیادہ ہوگئی اور حامیة بھی جائز ہے۔ اور یہ الحماۃ سے ہوگا ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور یاء سے بدلا گیا ہوگا۔ دونوں قراتوں کو کبھی جمع کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ مٹی گرم تھی اور سیاہی والی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے کہا (2): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کی طرف دیکھا جب وہ غروب ہو رہا تھا فرمایا: نار اللہ الحامیہ لولا یزَعُها من أمر اللہ لأحرقت ما علی الأرض (اللہ تعالیٰ کی گرم آگ ہے، اگر اسے اللہ کا امر نہ روکتا تو یہ جو کچھ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 368
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 539

زمین پر ہے اسے جلا دیتی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابی نے مجھے یہ اسی طرح پڑھایا جس طرح انہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا۔ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ (1)۔ اور حضرت معاویہ نے کہا: یہ حامیة ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: میں امیر المومنین کے ساتھ تھا پس انہوں نے کعب کو اپنا حکم بنایا انہوں نے کہا: اے کعب! تم یہ تورات میں کیسے پاتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں اسے پاتا ہوں کہ یہ سیاہ چشمے میں غروب ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی موافقت کی۔ شاعر نے کہا: وہ تبع الیمانی ہے۔

قد كان ذوالقرنين قبلي مسلمًا ملكًا تدين له الملوكُ وتسجدُ(2)

بلغ المغاربَ والمشارق يبتغي أسبابَ أمرٍ من حكيم مُرْشِدِ

فرأى مغيبَ الشمسِ عند غروبها في عين ذِي خُلُب وثَأْطٍ حَرْمَدِ

الخلب سے مراد مٹی ہے۔ الثأط سے مراد سیاہ مٹی ہے۔ الحرمد سے مراد بھی سیاہ ہے۔ قفال نے کہا: بعض علماء نے فرمایا اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ سورج کے مغرب و مشرق تک پہنچا حتی کہ اس نے اس کے جرم کو چھوا کیونکہ وہ آسمان کے ساتھ زمین کے اردگرد گھومتا ہے بغیر اس کے کہ وہ زمین سے ملے، یہ اس سے بہت بڑا ہے کہ وہ زمین کے چشموں میں سے کسی چشمہ میں داخل ہو بلکہ یہ زمین سے کئی گنا بڑا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مغرب کی جہت کی آخری آبادی اور مشرق کی جہت کی آخری آبادی۔ پس اسے آنکھ سے ایسے نظر آیا کہ وہ سیاہ چشمہ میں داخل ہو رہا ہے جیسے ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ زمین میں داخل ہو رہا ہے، اسی وجہ سے فرمایا: وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝

اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ ان پر طلوع ہوتا تھا تو وہ انہیں چھوتا تھا اور ان سے ملا ہوتا تھا بلکہ یہ مراد ہے کہ پہلے ان پر طلوع ہوتا تھا۔ قشیری نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ چشمہ سمندر سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ سورج اس کے پیچھے یا اس کے ساتھ یا اس کے پاس غروب ہوتا ہو، پس صفت کے حرف کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا یعنی اس چشمہ کے پاس یا چشمہ کی انتہا کے پاس۔ یہ اہل جابرس تھے انہیں سریانی زبان میں جرجیسا کہا جاتا ہے، اس چشمہ پر قوم ثمود کی نسل سے کچھ لوگ موجود تھے یہ ان کے باقی ماندہ لوگ تھے جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ سہیلی نے ذکر کیا ہے: وہب بن منبہ نے کہا ذوالقرنین روم کی بوڑھیوں میں سے ایک بوڑھی کا بیٹا تھا جس کی ذوالقرنین کے علاوہ کوئی اولاد نہ تھی، اس کا نام اسکندر تھا جب وہ بالغ ہوا تو وہ نیک بندہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ذوالقرنین! میں تجھے زمین کی امتوں کی طرف بھیجنے والا ہوں، ان امتوں کی زبانیں مختلف ہیں وہ ساری زمین کی امتیں ہیں اور وہ کئی اقسام پر ہیں۔ دو امتیں ہیں جس کے درمیان ساری زمین کا طول ہے۔ دو امتیں ایسی ہیں جن کے درمیان ساری زمین کا عرض ہے اور کچھ امتیں زمین کے وسط میں ہیں ان میں سے جن، انس اور یاجوج و ماجوج ہیں اور وہ دو امتیں جن کے درمیان زمین کا طول ہے ان میں سے ایک امت سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ اور

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الکہف، حدیث 2858

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 539

دوسری امت سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے پاس ہے اسے منسک کہا جاتا ہے۔ اور وہ دو امتیں جن کے درمیان زمین کا عرض ہے ان میں سے ایک زمین کے دائیں قطر میں ہے اسے ہاویل کہا جاتا ہے اور دوسری امت زمین کے بائیں قطر میں ہے اسے تاویل کہا جاتا ہے۔ ذوالقرنین نے کہا: اے اللہ! تو نے مجھے ایک عظیم کام کی طرف بلایا ہے جس پر صرف تو ہی قادر ہے، تو مجھے ان امتوں کے بارے بتا کہ میں کس قوت کے ساتھ ان پر زیادتی کروں اور کس صبر کے ساتھ میں انہیں برداشت کروں اور کس زبان کے ساتھ میں ان سے کلام کروں، میں کیسے ان کی زبان سمجھوں گا جب کہ میرے پاس قوت نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تجھ پر بوجھ ڈال رہا ہوں اس کے ساتھ میں تجھے کامیاب کروں گا تیرا سینہ تیرے لیے کھول دوں گا تو ہر چیز کو سنے گا اور تیرے لیے تیرے فہم کو پختہ کروں گا تو ہر چیز کو سمجھ لے گا اور تجھ میں ہیبت دوں گا کوئی چیز تجھے نہیں ڈرائے گی اور میں تیرے لیے نور اور ظلمت مسخر کروں گا، پس وہ تیرے لشکروں میں سے لشکر ہوں گے، نور تیرے آگے سے راہنمائی کرے گا اور پیچھے سے تاریکی تیری حفاظت کرے گی۔ جب اسے یہ کہا گیا تو وہ اپنے متبعین کو ساتھ لیکر چلا پس پہلے وہ اس امت کی طرف چلا جو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس تھی کیونکہ وہ قریب ترین امت تھی اور وہ ناسک امت تھی وہ اتنے زیادہ تھے کہ ان کو شمار نہیں کر سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ اور ایسی قوت تھی کہ اس کی طاقت نہیں رکھتا مگر اللہ اور ان کی مختلف زبانیں تھیں اور مختلف خواہشات۔ تو ظلمت کے ساتھ ان پر حملہ کیا ان کے اردگرد تاریکی کے تین لشکر لگائے جنہوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا حتیٰ کہ تاریکی نے انہیں ایک مکان میں جمع کر دیا پھر وہ ان پر نور کے ساتھ داخل ہوا پھر انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ بعض ان میں سے ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کیا، پھر منکرین پر ظلمت کو داخل کیا جس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا حتی کہ وہ ان کے مونہوں، ناکوں، آنکھوں اور گھروں میں داخل ہوگئی اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیا پس وہ حیران ہو گئے اور گھومنے لگے اور ہلاکت کا خوف کرنے لگے۔ پس وہ ایک آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر ایمان لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان سے تاریکی ختم کر دی اور انہیں سختی سے پکڑ لیا اور وہ دعوت الٰہیہ میں داخل ہو گئے۔

پس انہوں نے اہل مغرب سے ایک لشکر بنایا اور انہیں ایک لشکر بنایا پھر وہ ان کی قیادت کرتا ہوا چلا تاریکی ان کے پیچھے چلتی تھی اور پیچھے سے حفاظت کرتی تھی، نور آگے سے قیادت کرتا تھا اور راہنمائی کرتا تھا پھر وہ چلا زمین کی دائیں جانب کی طرف وہ اس امت کا ارادہ کرتا تھا جو زمین کی دائیں جانب تھی اور وہ امت ہاویل تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ، دل، عقل اور فکر کو مسخر کر دیا تھا وہ جب بھی کوئی کام کرتا تھا تو غلطی نہیں کرتا تھا جب وہ کسی حوض یا دریا پر آتے تھے تو چھوٹی چھوٹی تختیوں سے جوتیوں کی مثل کشتیاں بناتا پھر انہیں ایک ساعت میں منظم کر دیتا پھر جتنے لوگ ساتھ ہوتے ان میں سوار کر دیتا جب وہ دریاؤں اور انہار کو طے کر لیتا تو ان کشتیوں کو توڑ دیتا اور ہر شخص کو ایک تختہ دے دیتا پس وہ ان کو اٹھانے پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرتا، پس وہ ہاویل تک پہنچا اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا جس طرح اس نے ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا وہ ایمان لے آئے پھر ان سے فارغ ہوا تو لشکر زمین کی دوسری طرف چلا حتی کہ منسک امت تک پہنچا جو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے پاس تھی پھر اس نے اس میں بھی عمل کیا اور ان سے اسی طرح لشکر تیار کیا جس طرح پہلی امت میں کیا تھا۔ پھر وہ زمین کی

بائیں جانب کی طرف پلٹنا وہ تاویل قوم کا ارادہ کرتا تھا یہ وہ امت تھی جو ہاویل کے مقابل تھی ان کے درمیان زمین کا عرض تھا۔ اس نے اس میں بھی ایسا ہی کیا جیسے پہلی قوم میں کیا تھا۔ پھر ان امتوں کی طرف پلٹا جو زمین کے وسط میں تھیں یعنی جن، انس اور یاجوج و ماجوج جب وہ راستہ میں تھا جو مشرقی جانب ترکوں کے اختتام سے ملی ہوئی جگہ ہے تو اسے انسانوں کے ایک نیک گروہ نے کہا: اے ذوالقرنین! ان دو پہاڑوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو بے شمار ہے ان میں انسان سے مشابہت نہیں ہے وہ جانوروں کے مشابہ ہیں، گھاس کھاتے ہیں اور جانوروں اور وحشیوں کو اس طرح چیرتے پھاڑتے ہیں جس طرح درندے چیرتے پھاڑتے ہیں وہ زمین کے حشرات سانپ، بچھو، چھپکلی اور ہر ذی روح کو کھاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو سال میں اتنی بڑھتی ہو جتنا کہ وہ بڑھتے ہیں۔ اگر وقت زیادہ گزر گیا تو وہ زمین کو بھر دیں گے اور لوگوں کو زمین سے نکال دیں گے کیا ہم آپ کے لیے خراج مقرر کریں، اس بناء پر تو ہمارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دے، پھر حدیث مکمل ذکر کی۔ آئندہ یاجوج و ماجوج اور ترک کا ذکر آئے گا کہ وہ ان کی ایک قوم ہے اور وہ بیان کفایت کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ۔ قشیری ابو نصر نے کہا: اگر وہ نبی تھا تو یہ وحی تھی، اگر وہ نبی نہیں تھا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تھا۔ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۝ ابراہیم بن سری نے کہا: ان دو چیزوں میں اسے اختیار دیا گیا تھا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا، فرمایا: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ (المائدہ: 42) ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان دو حکموں میں اختیار دیا ہے۔ نحاس نے کہا: علی بن سلیمان نے اس کا قول رد کیا ہے کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا اور اس کے ساتھ اس کو خطاب کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے رب کو کیسے کہتا تھا: ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ؟ اور کیسے کہتا تھا: فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ؟ وہ نون یعنی جمع کے صیغہ کے ساتھ کیسے اس سے مخاطب ہوتا تھا؟ فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے کہ قلنا یا محمد قالوا یا ذالقرنین۔ ابو جعفر نے کہا: یہ ابو الحسن نے کہا ہے اور اس سے کوئی چیز لازم نہیں آتی۔ رہا یہ قول: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے نبی کی زبان پر اسے خطاب کیا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے اس طرح فرمایا ہو جس طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) رہا یہ اشکال: فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ تو اس کی تقدیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ کے قول میں قتل کرنے اور اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا میں ان کو باقی رکھنے کے درمیان اختیار دیا تو انہوں نے اس قوم سے کہا: اَمَّا مَنْ ظَلَمَ۔ یعنی جو تم میں سے کفر پر قائم رہا فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ہم اسے قتل کے ساتھ عذاب دیں گے۔ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ۔ پھر قیامت کے دن اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا۔ تو وہ اسے جہنم میں سخت عذاب دے گا۔ فَاَمَّا مَنْ تَابَ (القصص: 67) اور جو کفر سے توبہ کرے گا وَ عَمِلَ صَالِحًا اور نیک عمل کرے گا۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: ''ان'' اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۔ میں محل نصب میں ہے اگر تو اسے رفع دے تو بھی درست ہے تو بمعنی اما هو ہوگا جیسا کہ شاعر نے کہا:

فسیرا فاما حاجة تقضیانها واما مقیلٌ صالح وصدیق

فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى - اہل مدینہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرأت فله جزاء الحسنیٰ۔ مبتدا کی بناء پر رفع کے ساتھ ہے استقرار کے ساتھ ہے اور الحسنیٰ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے اور تنوین اضافت کی وجہ سے حذف کی گئی ہے یعنی اس کے لیے آخر میں اللہ کی بارگاہ میں جزاء الحسنیٰ ہے اور وہ جنت ہے، جزاء کو جنت کی طرف مضاف کیا۔ جیسے فرمایا: حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ (الواقعہ) اور فرمایا: وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ (یوسف: 109) اور یہ بھی احتمال ہے کہ الحسنیٰ سے مراد اعمال صالح ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزاء، ذی القرنین کی طرف سے ہو یعنی میں اسے عطا کروں گا اور اس پر مہربانی کروں گا اور یہ بھی جائز ہے کہ التقاء ساکنین کی وجہ سے تنوین حذف کی گئی ہو اور الحسنیٰ بدل کی بناء پر محل رفع میں ہو یہ بصریوں کے نزدیک ہے اور کوفیوں کے نزدیک ترجمہ کی بنا پر ہے۔ ابن ابی اسحاق کی قرأت اس بناء پر ہے۔ فله جزاء الحسنیٰ منصوب اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فله الحسنیٰ جزاء۔ الفراء نے کہا: جزاء تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: مصدر کی بنا پر منصوب ہے۔ الزجاج نے کہا یہ مصدر حال کی جگہ میں ہے یعنی مجزیا بها جزاءً۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مسروق نے فله جزاء الحسنیٰ منصوب بغیر تنوین کے پڑھا ہے؛ یہ ابوحاتم کے نزدیک ہے۔ اور تنوین کا حذف التقاء ساکنین کی وجہ سے ہے جیسے فله جزاء الحسنیٰ رفع میں ایک وجہ کے اعتبار سے۔ نحاس نے کہا: دوسروں کے نزدیک یہ خطا ہے کیونکہ یہ التقاء ساکنین کی وجہ سے تنوین کے حذف کی جگہ نہیں ہے اس کی تقدیر ہوگی: فله الثواب جزاء الحسنیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ اس کا معنی گزر چکا ہے کہ اتبع اور اتّبع کا معنی ایک ہے یعنی وہ راستے اور منزل کی طرف چلا۔ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ مجاہد اور ابن محیصن نے میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، کہا جاتا ہے: طَلَعَتِ الشَّمْسُ والكواكبُ طُلُوعًا و مَطْلِعًا، المطلَع والمطلِع۔ طلوع ہونے کی جگہ؛ یہ جوہری کا قول ہے اس کا معنی ہے وہ ایسی قوم کی جگہ پہنچا کہ ان کے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کوئی شخص نہیں تھا۔ سورج کے پیچھے بہت زیادہ مسافت سے طلوع ہوتا تھا یعنی معنی ہے اس قول کا بھی: وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ۔ ان کے بارے میں اختلاف ہے، وہب بن منبہ سے وہی مروی ہے جو پہلے گزر چکا ہے: یہ ایک امت ہے جسے منسک کہا جاتا ہے یہ ناسک کے مقابل تھی؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کو زنج کہا جاتا ہے (1)۔ کلبی نے کہا: یہ تارس، ہاویل اور منسک میں جو ننگے پاؤں اور برہنہ جسم رہتے تھے اور حق کا نور دیکھنے سے اندھے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اہل جابلق ہیں یہ قوم عاد کے مومنین کی نسل سے تھے جو حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ سریانی زبان میں انہیں مرقیسا کہا جاتا ہے۔ اور جو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس تھے وہ اہل جابرس ہیں ان دوشہروں میں سے ہر ایک شہر کے دس ہزار دروازے تھے ہر دو دروازوں کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ تھا اور جابلق کے پیچھے امتیں ہیں وہ تافیل اور تارس ہیں، وہ یاجوج و ماجوج کے پڑوس میں ہیں۔ اہل جابرس اور جابلق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ شب معراج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں دعوت

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 20

دی تو انہوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی، یہ سہیلی نے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: میں نے یہ تمام ایک طویل حدیث سے اختصار کیا ہے جس کو مقاتل بن حیان نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ طبری نے مسنداً مقاتل سے روایت کی ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ یعنی ایسا حجاب جس کے ساتھ وہ سورج کے طلوع ہونے کے وقت چھپتے۔ قتادہ نے کہا: ان کے اور سورج کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا وہ ایسی جگہ میں تھے جہاں کوئی عمارت ٹھہرتی نہیں تھی وہ سرنگوں میں رہتے تھے حتیٰ کہ جب سورج ڈھل جاتا تھا تو وہ اپنے مال، مویشی اور کھیتوں کی طرف لوٹتے تھے یعنی وہ سورج سے نہ کسی پہاڑ کی غار میں چھپ سکتے تھے اور نہ کسی گھر میں چھپ سکتے تھے۔ امیہ نے کہا: میں نے کچھ لوگوں کو سمرقند میں پایا ہے جو ان لوگوں کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ بعض نے کہا: میں چین کی طرف چلا تو مجھے کہا گیا تیرے اور ان کے درمیان ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے، میں نے ایک شخص کو اجرت پر لیا تا کہ وہ مجھے وہ قوم دکھائے حتیٰ کہ میں نے صبح ان کے پاس کی، میں نے دیکھا کہ ان کا ایک شخص اپنا ایک کان نیچے بچھاتا تھا اور دوسرا کان اوپر لپیٹ لیتا تھا۔ میرا ساتھی ان سے اچھی طرح کلام کرتا تھا ہم نے ان کے ساتھ رات گزاری، انہوں نے پوچھا: تم کیسے آئے ہو؟ ہم نے کہا: ہم اس لیے آئے ہیں تا کہ دیکھیں کہ سورج کیسے طلوع ہوتا ہے؟ ہم اسی اثنا میں تھے کہ ہم نے گھنٹی کی ہیبت کی آواز سنی تو میں مدہوش ہو گیا پھر مجھے افاقہ ہوا تو وہ مجھے تیل کی مالش کر رہے تھے۔ جب پانی پر سورج طلوع ہوا تو وہ پانی پر زیتون کے تیل کی ہیبت کی طرح تھا، جب آسمان کی طرف پر تھا تو خیمہ کی مانند تھا جب مزید بلند ہوا تو انہوں نے مجھے ایک سرنگ میں داخل کیا، جب سورج بلند ہوا اور ان کے سروں سے ڈھل گیا تو وہ مچھلیوں کے شکار کے لیے نکلے وہ مچھلیوں کو سورج کے سامنے کرتے تھے تو وہ پک جاتی تھیں۔ ابن جریج نے کہا: ایک دفعہ ان کے پاس ایک لشکر آیا تو انہوں نے لشکر والوں کو کہا: سورج کے طلوع ہونے کے وقت تم یہاں نہ ہونا۔ انہوں نے کہا: ہم سورج کے طلوع ہونے تک یہاں ٹھہریں گے۔ انہوں نے کہا: یہ ہڈیاں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ ایک لشکر کی ہڈیاں ہیں جن پر سورج طلوع ہوا تھا پس وہ مر گئے تھے۔ فرمایا: وہ زمین میں پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ حسن نے کہا: ان کی زمین ایسی تھی کہ نہ کوئی پہاڑ تھا اور نہ درخت اور ان کی زمین عمارت کو برداشت نہیں کرتی تھی جب ان پر سورج طلوع ہوتا تو وہ پانی میں اتر جاتے تھے جب سورج بلند ہو جاتا تو وہ نکل آتے تھے اور وہ جانوروں کی طرح چرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام اقوال اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہاں کوئی شہر نہیں تھا۔ بعض اوقات ان میں سے کوئی نہر میں داخل ہوتا بعض سرنگ میں داخل ہوتے۔ حسن اور قتادہ کے قول میں کوئی تضاد نہیں۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، زیر آیت ہذہ

رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿٩٨﴾

''پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے تھے (ان کی) کوئی بات۔ انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج و ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقے میں تو کیا ہم مقرر کر دیں آپ کے لیے کچھ خراج تاکہ آپ بنا دیں ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار۔ وہ بولا: وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسمانی مشقت سے۔ میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ۔ تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں (چنانچہ کام شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب ہموار کر دیا گیا وہ خلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا تو اس نے حکم دیا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا تو اس نے کہا: لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا کہ میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں۔ سو (یاجوج و ماجوج) بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی) اور جب آجائے گا تیرے رب کا وعدہ تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ (پختہ) سچا ہوا کرتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ یہ ارمینہ اور آذربیجان کی طرف سے دو پہاڑ ہیں۔ عطا خراسانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: بَيْنَ السَّدَّيْنِ۔ سے مراد ارمینہ اور اذربیجان کے پہاڑ ہیں(1)۔ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا۔ یعنی ان پہاڑوں کے پیچھے قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ ایسی قوم پائی جو نہیں سمجھ سکتی تھی (ان کی) کوئی بات۔ حمزہ اور کسائی نے يُفْقِهُوْنَ کو یاء کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ اَفقہ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے ظاہر کرنا یعنی وہ دوسروں کو کلام نہیں سمجھا سکتے تھے۔ اور باقی قراء نے یاء اور قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ نہیں جانتے تھے۔ دونوں قراتیں صحیح ہیں وہ غیر کی بات سمجھتے تھے اور نہ غیر کو سمجھاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ۔ یعنی ایک صالح قوم نے اسے کہا: اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اخفش نے کہا: یأجوج ہمزہ کے ساتھ ہے اور دونوں الفوں کو اصل سے بنایا ہے انہوں نے کہا: یاجوج کا وزن یفعول ہے اور ماجوج کا وزن مفعول ہے گویا یہ أجیج النار سے مشتق ہیں۔ اور جو مہموز نہیں بناتے وہ دونوں الفوں کو زائد بناتے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 22

ہیں وہ کہتے ہیں: یاجوج یججٔ سے ہے اور ماجوج مججٔ سے ہے اور یہ دونوں غیر منصرف ہیں۔ روبہ نے کہا:

لوأن یاجوجَ وماجوجَ مَعَا وَعادَ عادٌ واستجاشوا تُبَعَا

یہ جوہری نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دونوں غیر منصرف ہیں کیونکہ دونوں اسم عجمی ہیں جیسے طالوت اور جالوت، غیر مشتق ہیں ان کے غیر منصرف ہونے کے اسباب عجمہ اور تعریف اور تانیث ہیں اور ایک جماعت نے کہا: یہ اجّ اور اَجّج سے مشتق ہو کر معرب ہیں۔ ان کے غیر منصرف ہونے کی علتیں تعریف اور تانیث ہیں۔ ابوعلی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں عربی لفظ ہوں جس نے ہمزہ سے یأجوج پڑھا ہے یہ اس کے نزدیک یربوع کی طرح یفعول کے وزن پر ہو جیسے تیرا قول ہے: اججت النار، اسی سے الاجیج ہے، یعنی روشن کی گئی آگ اسی سے ملح اُجاج ہے۔ اور جس نے ہمزہ سے نہیں پڑھا ممکن ہے اس نے ہمزہ میں تخفیف کر کے اسے الف سے بدل دیا ہو جیسے راس ہے۔ رہا یاجوج یہ اَجّ سے مفعول کے وزن پر ہے دونوں کلمے اشتقاق میں ایک اصل سے ہیں اور جس نے ہمزہ سے نہیں پڑھا جائز ہے کہ اس نے ہمزہ میں تخفیف کی ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مَجّ سے فاعول کے وزن پر ہو اور تانیث اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے گویا یہ قبیلہ کا اسم ہے ان کے فساد میں اختلاف ہے۔ سعید بن عبدالعزیز نے کہا: ان کا (فساد برپا کرنا یہ تھا کہ وہ) بنی آدم کو کھاتے تھے۔ ایک جماعت نے کا ان کا افساد متوقع ہے یعنی وہ فساد کریں، پس انہوں ان سے بچاؤ کی وجہ کو تلاش کیا۔ ایک جماعت نے کہا: ان کا افساد ظلم، زیادتی، قتل اور وہ تمام شر انگیزیاں ہیں جو انسانیت میں معروف ہیں۔ واللہ اعلم۔ یاجوج، ماجوج کی صفات، ان کے خروج کے بارے میں اخبار وارد ہیں۔ وہ یافث کی اولاد سے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے ہوئے، سام، حام اور یافث، پھر سام سے عرب، فارس اور روم پیدا ہوئے اور ان میں خیر ہے۔ یافث سے یاجوج، ماجوج، ترک اور صقالبۃ پیدا ہوئے اور ان میں خیر نہیں ہے۔ اور حام سے قبط، بربر اور سودان پیدا ہوئے''۔ کعب احبار نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو احتلام ہوا ان کا پانی مٹی سے ملا تو انہوں نے افسوس کیا پس اس پانی سے یاجوج ماجوج پیدا کیے گئے۔ یہ باپ کی طرف سے ہمارے ساتھ متصل ہیں اور ماں کی طرف سے متصل نہیں اس میں نظر ہے کیونکہ انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم وسلامہ کو احتلام نہیں ہوتا۔ یہ یافث کی اولاد سے ہیں؛ اسی طرح مقاتل وغیرہ نے کہا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''ان کا کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا حتی کہ اس کی پشت سے ہزار افراد پیدا ہو چکے ہوتے ہیں یعنی یاجوج وماجوج''۔ حضرت ابوسعید نے کہا: یاجوج وماجوج کے علاوہ یہ پچیس قبائل ہیں ان میں سے اور یاجوج وماجوج میں سے کوئی شخص فوت نہیں ہوتا حتی کہ اس کی پشت سے ہزار آدمی پیدا ہو چکے ہوتے ہیں؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاجوج وماجوج کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاجوج اور ماجوج دو امتیں ہیں ہر امت چار لاکھ امت ہے ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان میں سے کوئی شخص نہیں مرتا حتی کہ اسکے اس کی صلب سے ہزار افراد پیدا ہو چکے ہوتے ہیں، تمام کے تمام ہتھیار اٹھا چکے ہوتے ہیں''۔ عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے ان کی صفت بیان فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''وہ تین قسمیں ہیں ان میں سے ہر صنوبر کے درخت کی مثل ہے، ایک درخت شام میں ہے اس درخت کی لمبائی ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس کا عرض اور طول برابر ہے جیسے ہاتھ ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کان کو لحاف بناتے ہیں وہ کسی ہاتھی، وحشی اور خنزیر سے گزرتے ہیں تو اسے کھا جاتے ہیں اور جو ان میں سے مر جاتا ہے اسے بھی کھا جاتے ہیں ان کا مقدمہ شام میں ہوگا اور ان کا ساقہ خراسان میں ہوگا۔ وہ مشرق کی نہریں اور بحیرہ طبریہ کو پی جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور بیت المقدس سے روک لے گا'' (1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے ایک قسم لمبائی میں ایک بالشت ہے ان کے پنجے ہیں اور درندوں جیسی کچلیاں ہیں، کبوتر کی طرح بلاتے ہیں، جانوروں کی طرح جفتی کرتے ہیں اور بھیڑیوں کی طرح غراتے ہیں اور ان کے بال انہیں گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں اور ان کے بڑے بڑے کان ہیں۔ ایک وبرہ ہے جس میں وہ سردیاں گزارتے ہیں اور دوسرا جلدہ ہے جس میں وہ گرمیاں گزارتے ہیں وہ دیوار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ وہ سوراخ کرنے کے قریب پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر اسے پہلے کی طرح بھر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں گے: کل ان شاء اللہ ہم اس کا سوراخ مکمل کریں گے اور باہر نکل آئیں گے، لوگ اپنے قلعوں میں پناہ لیں گے وہ آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے وہ تیر ان کی طرف خون میں لت پت لوٹایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ انہیں اس کیڑے سے ہلاک کرے گا جو ان کی گردنوں میں نکلے گا؛ یہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ''یاجوج ایک امت ہے اس کے چار سو امیر ہیں اور اسی طرح ماجوج ہے ان کا کوئی فرد نہیں مرتا حتیٰ کہ وہ اپنی اولاد سے ہزار شہسوار دیکھ لیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے (2) جیسے ابن ماجہ نے سنن میں تخریج کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاجوج و ماجوج ہر روز دیوار کو کھودتے ہیں جب وہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو ان کے اوپر جو مسلط ہوتا ہے وہ کہتا ہے: اب واپس چلے جاؤ باقی کل کھودنا تو اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط کر کے بھر دیتا ہے حتیٰ کہ جب ان کی مدت پوری ہوگی اور اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں پر بھیجنے کا ارادہ کرے گا تو وہ دیوار کو کھودیں گے حتیٰ کہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ کہے گا: اب واپس چلے جاؤ پھر کل ان شاء اللہ تم اسے کھودو گے پس وہ ان شاء اللہ کہیں گے تو پھر وہ لوٹ کر اس کی طرف آئیں گے تو وہ اسی طرح ہوگی جس طرح وہ چھوڑ کر گئے ہوں گے وہ پھر اسے کھودیں گے اور لوگوں پر نکل آئیں گے وہ سارا پانی نکالیں گے لوگ اپنے قلعوں میں اپنا بچاؤ کریں گے پھر وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو ان پر خون لوٹے گا''۔ الذی احفظ۔

پس وہ کہیں گے: ہم اہل زمین پر غالب آگئے اور ہم اہل آسمان پر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر ایک کیڑا مسلط فرمائے گا جو ان کی گدیوں میں پیدا ہوگا پس اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ذریعے قتل کر دے گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! زمین کے کیڑے یاجوج و ماجوج کا گوشت کھانے کی وجہ سے موٹے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 597
2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2195

ہو جائیں گے اور خوب خون سے بھر جائیں گے"(1)۔ جوہری نے کہا: شَكِرَتِ النَّاقَةُ تَشْكَرُ شكرًا فهي شَكِرَةٌ واشكر الضرعُ امتلاءً لبناً۔ یعنی اونٹنی کی کھیری دودھ سے بھر گئی۔ وہب بن منبہ نے کہا: ان کو ذوالقرنین نے دیکھا ان میں سے ایک کے قد کی لمبائی ہم میں سے درمیانے قد والے شخص کے نصف کے برابر تھی۔ ان کے ناخنوں کی جگہ پنجے تھے۔ اور ان کی درندوں کی طرح داڑھیں اور کچلیاں اور اونٹوں کی طرح ان کے جبڑے تھے وہ بالوں والے تھے ان پر اتنے بال تھے کہ وہ انہیں چھپا دیتے تھے، ہر ایک کے بڑے بڑے کان تھے۔ ایک کان کو لحاف بناتے اور دوسرے کان کو بچھونا بناتے تھے۔ ان میں ہر ایک کی عمر معلوم نہیں ان میں سے کوئی نہیں مرتا حتیٰ کہ اس کی پشت سے ہزار مرد پیدا ہو جاتے تھے۔ اگر وہ مذکر ہوتا تھا اور اس کے رحم سے ہزار مؤنث پیدا ہو جاتے تھے اگر وہ مونث ہوتی۔ سدی اور ضحاک نے کہا: ترک، یاجوج و ماجوج سے ایک جماعت ہے جو ان سے نکلی ہے تبدیل ہو چکی ہے۔ ذوالقرنین آیا تو اس نے دیوار تعمیر کی پس وہ دیوار کی دوسرے جانب ہیں۔ سدی نے کہا: وہ دیوار اکیس قبائل پر بنائی گئی ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ دیوار سے باہر رہ گیا اور وہ ترک ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: جب یہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکوں کی اسی طرح صفت بیان کی جس طرح یاجوج و ماجوج کی بیان کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ مسلمان ترکوں سے لڑیں گے وہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے ایسی ڈھالوں کی طرح ہیں جن پر تہہ در تہہ کھالیں چڑھائی گئی ہوں، وہ بالوں کا لباس پہنیں گے اور بالوں میں چلیں گے"(2)۔ ایک روایت میں ہے "وہ بالوں کے جوتے بنائیں گے"۔ اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کثرت تعداد اور ان کی شوکت کی حدت جان لی تو فرمایا: "ترکوں کو چھوڑے رکھو جس وقت تک وہ تمہیں چھوڑے رہیں (3) ان سے اس وقت اتنی استیں نکلیں جن کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور مسلمانوں سے انہیں صرف اللہ تعالیٰ نے ہی روکا حتی کہ گویا وہ یاجوج و ماجوج ہیں یا ان کا مقدمہ ہیں"۔ ابوداؤد نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت سے کچھ لوگ کھلی ہموار جگہ پر اتریں گے جو نہر کے پاس ہے وہ اس جگہ کو بصرہ کہیں گے اور اس نہر کو دجلہ کہا جاتا ہوگا اس کے اوپر ایک پل ہوگا اس کے رہنے والے زیادہ ہوں گے اور وہ مہاجرین کے شہروں سے ہوگا"۔ ابن یحییٰ نے کہا: ابو معمر نے کہا: یہ آخر زمانہ میں ہوگا۔ بنو قنطورا جوڑے ہوئے مونہوں والے، چھوٹی آنکھوں والے آئیں گے حتیٰ کہ وہ نہر کے کنارے اتریں گے پھر وہ لوگ تین فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک فرقہ گائیوں کی دم پکڑے گا اور بریت کو اختیار کرے گا اور وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک گروہ اپنے نفسوں کو اختیار کرے گا اور وہ کفر کریں گے اور ایک فرقہ اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے رکھے گا اور وہ ان سے لڑیں گے اور وہ شہداء ہیں۔ بنو قنطورا سے مراد ترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قنطوراء ایک لونڈی کا نام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی اس سے آپ کی اولاد ہوئی تو ان کی

1۔ تفسیر ابن کثیر، صفحہ 2193۔ ابن ماجہ، باب ومن سورۃ الکہف، حدیث 4069۔ جامع ترمذی باب فتنۃ الدجال، حدیث نمبر 3078
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 235۔ سنن ابی داؤد، باب فی قتال الترک، 3749
3۔ سنن ابی داؤد، باب فی النہی عن تہییج الترک والحبشۃ، حدیث نمبر 3748

نسل سے تُرک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا۔ یہ استفہام حسن ادب کے اعتبار سے ہے۔ خراجًا کا معنی ہے کچھ مال، خراجاً بھی پڑھا گیا ہے۔ الخرج، الخراج سے خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: أدِخَرْج رأسك وخراج مدینتك۔ ازہری نے کہا: الخراج کا اطلاق ٹیکس پر ہوتا ہے اور مال فئ پر بھی ہوتا ہے اور جزیہ پر بھی ہوتا ہے اور غلہ پر بھی ہوتا ہے اور الخراج اس کو کہا جاتا ہے جو اموال میں سے فرضی حصہ نکالا جاتا ہے اور الخراج مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ یعنی ردم (دیوار)، ردم اس کو کہتے ہیں جس کا بعض، بعض پر جوڑا گیا ہوحتیٰ کہ وہ مل جائے۔ ثوب مردم وہ کپڑا جو جوڑا گیا ہو؛ ہروی کا یہ قول ہے، کہا جاتا ہے: ردمت الثلمة اردمها ردماً۔ میں سوراخ بند کر دیا۔ الردم اسم ہے اس کا معنی دیوار بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: الردم، السد سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ السد ہر وہ چیز ہوتی ہے جس کے ساتھ روکا جائے اور الردم کا معنی ہے کسی چیز کو کسی چیز پر رکھنا خواہ پتھر ہو، مٹی ہو یا کوئی اور چیز ہوحتیٰ کہ اس کے ساتھ مضبوط پردہ بن جائے گا اسی سے ردم ثوبہ۔ جب اس پر مزید کپڑے لگائے جائیں بعض بعض پر جڑے ہوئے ہوں۔ اسی سے عنترہ کا قول ہے:

هل غادر الشعراء من متردمِ

یعنی ایسا قول جس کا بعض بعض پر مرکب کیا گیا ہو۔ اور سَدًّا سین پر فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: سین کے ضمہ کے ساتھ اسم ہے اور فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ کسائی نے کہا: ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔ عکرمہ، ابوعمرو بن العلاء اور ابوعبیدہ نے کہا: جو اللہ کی تخلیق سے ہو اس میں کوئی کسی عمل سے شریک نہ ہو تو وہ ضمہ کے ساتھ ہے اور جو بشر کے عمل سے ہو وہ فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس قول والوں کو سدًّا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے اور اس سے پہلے بین السدین ضمہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے؛ یہ حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابوحاتم نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابوعبیدة کے قول کا برعکس مروی ہے، ابن ابی اسحاق نے کہا: جس کو تیری آنکھیں دیکھیں وہ سُدّ (ضمہ کے ساتھ) ہے اور جس کو آنکھیں نہ دیکھیں وہ سَدّ (سین کے فتحہ کے ساتھ) ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں جیل خانے بنانا اور فسادیوں کو ان میں قید کرنا اور انہیں تصرف سے روک دینا جائز ہے اور ان فسادیوں کو اپنے حال پر نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ ان کو سزا دی جائے گی یا ان سے ضامن لیے جائیں گے اور انہیں چھوڑ دیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ یہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کو کہا: جو اللہ تعالیٰ نے مجھے قدرت اور ملک عطا فرمایا وہ تمہارے خراج اور مال سے بہتر ہے لیکن تم بدنی قوت سے میری مدد کرو، یعنی مردوں کے ساتھ اور بدنی عمل کے

ساتھ اور اس آلہ کے ساتھ میری مدد کرو جس کے ساتھ میں وہ دیوار تیار کروں۔ اس کلام میں ذی القرنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہے کیونکہ اگر لوگ خراج جمع کرتے تو کوئی اس کی مدد نہ کرتا اور وہ دیوار کی تعمیر اس کے سپرد کر دیتے اور ان کا اپنے جسموں سے مدد کرنا اس عمل کو جلدی مکمل کرکے اور خوبصورت بنانے کا باعث تھا اور جو انہوں نے اس کے لیے ذکر کیا وہ خراج سے زیادہ تھا۔ ابن کثیر۔ نے مامکننی، دونونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مامکنّی فیہ ربی پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اس آیت میں دلیل ہے کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ اپنی رعیت کی حفاظت کرے اور ان کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی سرحدوں کی اصلاح کرے، ان کے مال سے جو ان پر لازم کیے گئے ہیں اور ان حقوق سے جو اس کے ذریعے ان کے خزانہ میں جمع ہیں حتیٰ کہ اگر حقوق اس خزانہ کو ختم بھی کر دیں اور ضروریات اسے صفر تک پہنچا دیں تو ان کے اموال سے جبراً ٹیکس لیا جائے گا اور بادشاہ پر ضروری ہے کہ وہ رعیت کے بارے میں عمدہ اور بہتر انداز میں غور و فکر کرے۔ یہ تین شروط کے ساتھ ہے (i) وہ کسی چیز کے ساتھ اپنے آپ کو ترجیح نہ دے (ii) پہلے اس مال سے حاجت مندوں پر خرچ کرے اور ان کی مدد کرے (iii) ہر ایک کو اس کی قدر و منزلت کے مطابق عطا کرے۔ اس کے بعد اگر مال ختم ہو جائے اور خزانہ خالی ہو جائے اور حوادثات ظاہر ہوں تو بادشاہ لوگوں کو اموال کے خرچ کرنے سے پہلے اپنے جسموں کو پیش کرنے کے لیے کہے اگر جسمانی طاقت سے کام نہ چلے تو پھر تدبیر کے تصرف و تقدیر پر ان سے اموال لیے جائیں گے۔ جب ذوالقرنین پر ان لوگوں نے مال پیش کیا تا کہ وہ ان سے یاجوج و ماجوج کی زیادتی کو رد کرے تو اس نے کہا: مجھے مال کی ضرورت نہیں مجھے تمہاری افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ فَاَعِيْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ یعنی میرے ساتھ تم جسمانی خدمت بجالاؤ۔ اموال میرے پاس ہیں اور جسمانی قوت تمہارے پاس ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان کے مال مفید نہیں کیونکہ ان کے اموال کو اجرت کے طور پر لے گا تو جس کام کی ضرورت ہے وہ اس سے کم ہیں، پھر ان پر اجر لوٹنے گا، پس بدنی خدمت خود اپنی طرف سے پیش کرنا بہتر ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ کسی سے کام لینا حلال نہیں مگر ضرورت کے لیے جو لاحق ہوتی ہے اس سے وہ مال جبراً لیا جائے گا خفیۃً نہیں اور مال وہ عدل کے ساتھ خرچ کرے گا، ترجیحات کے اعتبار سے نہیں، جماعت کی رائے سے خرچ کرے گا نہ کہ اپنی مرضی سے۔ اللہ تعالیٰ درست سمت کی توفیق دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ تم مجھے لوہے کی چادریں دو اس نے انہیں آلات نقل کرنے کا حکم دیا یہ تمام اس عطیہ کا طلب کرنا ہے جو ہبہ کے معنی میں نہیں ہے یہ لینے کے لیے استدعا ہے کیونکہ اس نے ان سے خراج نہ لینے کے قول پر مرتب کیا ہے۔ پس صرف مناولت کی صورت ہی باقی رہ جاتی ہے اور بدنی اعمال کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ زبر الحدید۔ لوہے کے ٹکڑے۔ اس کلمہ کی اصل اجتماع ہے اس سے زبرۃ الاسد ہے۔ شیر کے کندھے کے جمع شدہ بالوں کو کہتے ہیں۔ زبرتُ الکتابَ، یعنی میں نے کتاب کو لکھا اور اس کے حروف کو جمع کیا، ابو بکر اور مفضل نے ردما ایتونی پڑھا ہے۔ یہ الاتیان سے ہے جس کا معنی ہے آنا، یعنی میرے پاس لوہے کی چادریں لے آؤ۔ جب حرف جر ساقط ہو تو فعل کو نصب دیا گیا جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ

حرف جر کو حذف کیا گیا اور فعل کو نصب دی گئی۔ جمہور نے زبر۔ (فاء کے فتحہ) کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن نے اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمام زبرة کی جمع ہے اس سے مراد لوہے کا بڑا ٹکڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى، یعنی جب دیوار کھڑی ہوگئی، دیوار کے لفظ کو حذف کر دیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ پہاڑ کی دونوں طرفیں ہیں۔ اس کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ یہ آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہیں؛ یہ زہری کا قول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کیونکہ وہ دوسری طرف سے اعراض کیے ہوئے ہے۔ یہ الصدوف سے مشتق ہے، شاعر نے کہا:

کِلَا الصَّدَفَیْنِ یَنْفُذُہٗ سَنَاھَا　تَوَقَّدُ مِثْلَ مِصْبَاحِ الظَّلَامِ

بلند عمارت کو بھی الصدف کہتے ہیں۔ صدف کو پہاڑ کی طرف سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''جب جھکی ہوئی بلند منزل سے گزرتے تو تیز چلتے'' (1)۔ ابوعبیدہ نے کہا: الصدف اور الھدف، ہر بلند عمارت کو کہتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: الصدفان سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو آمنے سامنے ہوتے ہیں (2)۔ ان کو صدفان کہتے ہیں کیونکہ ہر ایک دوسرے کے سامنے ہوتا ہے۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے الصدفین یعنی صاد کے فتحہ اور شد کے ساتھ اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قرأت حضرت عمر بن خطاب اور عمر بن عبدالعزیز کی ہے؛ یہ ابوعبیدہ کی مختار قرأت ہے اور یہ مشہور لغت ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر اور ابوعمرو نے الصدفین صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا۔ عاصم نے ابوبکر کی روایت میں الصدفین یعنی صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسے الجُرُف اور الجُرْف۔ یہ تخفیف ہے، ابن ماجشون نے صاد کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ نے بین الصدفین، صاد کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تمام کا معنی ایک ہے دو پہاڑ جو مقابل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ انْفُخُوْا۔ یعنی دھونکنیوں کے ساتھ لوہے کے ٹکڑوں پر پھونکو۔ وہ انہیں لوہے کے ٹکڑے اور پتھر کے ٹکڑوں کو رکھنے کا حکم دیتا تھا پھر ان پر ایندھن اور کوئلہ رکھا جاتا تھا اور دھونکنیوں کے ذریعے آگ جلائی جاتی تھی حتیٰ کہ وہ لوہا گرم ہو جاتا تھا۔ لوہے کو جب گرم کیا جاتا تو وہ آگ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا۔ سے یہی مراد ہے پھر پگھلا ہوا تانبا، رصاص یا لوہا لایا جاتا تھا (قطر میں اختلاف کی بناء پر) اسے ان لوہے کی گرم تہہ در تہہ رکھی ہوئی چادروں پر ڈالا جاتا تھا جب وہ جڑ جاتا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتا تھا تو پھر دوسری چادر ڈالی جاتی تھی یہاں تک کہ عمل مکمل ہوا اور مضبوط پہاڑ سا بن گیا۔ قتادہ نے کہا: وہ یمنی چادر کی طرح تھا ایک لائن زرد اور ایک لائن سرخ تھی۔ روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے یاجوج و ماجوج کی دیوار دیکھی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے کیسی دیکھی ہے؟'' اس نے کہا: میں نے وہ یمنی دھاری دار چادر کی طرح دیکھی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے واقعی دیکھی ہے'' (3)۔ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا۔ کا معنی ہے جب وہ آگ کی

1۔ غریب الحدیث، جلد 1، صفحہ 77　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 543

3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ذکر یاجوج ماجوج، جلد 1، صفحہ 472

طرح ہو گیا۔ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا۔ کا معنی ہے تم مجھے قطر (تانبا) دو میں اس پر انڈیلوں۔ اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور جس نے اُتونی پڑھا ان کے نزدیک اس کا معنی ہے تم آؤ میں اس پر تانبا ڈالوں۔ القطر اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلا ہوا تانبا ہے اس کی اصل القطر ہے کیونکہ جب وہ پگھلایا جاتا ہے تو اس طرح اس کے قطرے گرتے ہیں جیسے پانی کے قطرے گرتے ہیں۔ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد پگھلا ہوا لوہا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: ان میں سے ابن الانباری بھی ہے کہ قطر سے مراد پگھلا ہوا تانبا ہے۔ یہ قطر یقطر قطراً سے مشتق ہے۔ اسی سے ہے وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (سبا: 12) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔ یعنی یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ نہ سکے کیونکہ وہ چکنی اور پہاڑ جتنی بلند تھی کہ پہاڑ بلند تھا اس کو عبور کرنے کا قصد نہیں کیا جاتا تھا اس دیوار کی بلندی دو سو ہاتھ تھی اور چوڑائی پچاس ہاتھ تھی۔ روایت ہے کہ اس کا طول دو پہاڑوں کی طرفوں کے درمیان تھا (یعنی) سو فرسخ اور عرض پچاس فرسخ؛ وہب بن منبہ نے یہی کہا ہے۔ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔ اس کے عرض اور مضبوطی کی وجہ سے یاجوج و ماجوج سوراخ نہ کر سکے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''آج یاجوج و ماجوج کی دیوار سے اس کی مثل کھل گیا ہے''۔ وہب بن منبہ نے اپنے ہاتھ سے نوے کا عقد بنایا۔ ایک روایت میں ہے: انہوں نے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی سے حلقہ بنایا۔۔۔۔ الخ۔ یحییٰ بن سلام نے سعد بن ابی عروبہ سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے ابو رافع سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاجوج و ماجوج ہر روز دیوار کو پھاڑتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچتے ہیں تو ان کا نگران کہتا ہے: اب لوٹ جاؤ باقی تم کل پھاڑو گے۔ پس اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط کر کے لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ جب ان کی مدت پوری ہو گی اور اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں پر بھیجنے کا ارادہ فرمائے گا تو وہ دیوار کو کھودیں گے حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب ہوں گے تو ان کا نگران انہیں کہے گا: ان شاء اللہ کل تم اسے پھاڑو گے۔ وہ دوسرے دن اس کی طرف آئیں گے تو وہ اسے اسی ہیئت میں پائیں گے جس ہیئت میں چھوڑ کر گئے ہوں گے، پس وہ اسے پھاڑ دیں گے اور لوگوں پر نکل آئیں گے'' (1) (الحدیث)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْطَاعُوْٓا طاء کی تخفیف کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لغت استطاعوا کے معنی میں ہے۔ بعض نے فرمایا: بلکہ یہ استطاعوا ہی تھا عربوں کے کلام میں کثرت سے موجود ہے حتیٰ کہ بعض نے اس سے تاء حذف کر دی اور انہوں نے کہا: اسطاعوا۔ اور بعض نے طاء حذف کر دی اور کہا: استاع یستیع بمعنی استطاع یستطیع یہ مشہور لغت ہے۔ صرف حمزہ نے اسے فما اسطاعوا یعنی طاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے گویا اس نے استطاعوا کا ارادہ کیا پھر تاء کو طاء میں ادغام کر دیا ہے اور اسے مشدد کر دیا۔ یہ ضعیف قرأت ہے۔ ابو علی نے کہا: یہ جائز نہیں ہے۔ اعمش نے فما استطاعوا ان یظهروه و ما استطاعوا له نقبا۔ پڑھا ہے دونوں جگہ تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ اس کا قائل ذوالقرنین ہے هذا کے ساتھ اس دیوار کی طرف اور اس

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 544-543

پر قوت اور یاجوج وماجوج کے ضرر کو دفع کرنے میں اس سے انتفاع کی طرف اشارہ کیا۔ ابن ابی عبلہ نے هذه رحمة من ربی پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ۔ یعنی قیامت کا دن آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب یاجوج وماجوج کے خروج کا دن آئے گا جَعَلَهٗ دَكَّآءَ تو اسے زمین کے برابر کردے گا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا (الفجر) ابن عرفہ نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ اس طرح برابر کردی جائے گی کہ اس میں کوئی ٹیلہ نہ ہوگا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَعَلَهٗ دَكَّآءَ۔ ایسی اونٹنی جس کی کوہان ختم ہوگئی ہو۔ قتبی نے کہا: اس دیوار کو زمین کے برابر بنادے گا۔ کلبی نے کہا: اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے گا۔ شاعر نے کہا:

هل غیر غادٍ دكّ غاراً فانهدم

ازہری نے کہا: کہا جاتا ہے: دککته یعنی دققته۔ ریزہ ریزہ کرنا۔ جس نے دكاء پڑھا ہے اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ پہاڑ کو برابر زمین بنادے گا اس سے مراد وہ ٹیلہ ہے جو پہاڑ کی اونچائی کو نہ پہنچتا ہو۔ اس کی جمع دکاوات ہے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دکاء مد کے ساتھ پڑھا ہے اور الناقة الدکاء (بے کوہان اونٹنی) کے ساتھ تشبیہ کی بناء پر۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: جعله فی مثل دكاء۔ اس تقدیر کی بناء پر حذف ضروری ہے کیونکہ السد مذکر ہے اس کی صفت دکاء نہیں ہوسکتی اور جنہوں نے دکا پڑھا ہے تو یہ دك یدك کا مصدر ہوگا جب کوئی چیز گرادی جائے اور چور کردی جائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جعل بمعنی خلق ہو اور دکاً پر نصب حال کی بنا پر ہو، اسی طرح جنہوں نے مد کے ساتھ پڑھا ہے اس کی نصب کے دو احتمال ہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم واگزار کردیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تند موجوں کی طرح) دوسروں میں گھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کردیں گے۔ اور ہم ظاہر کردیں گے جہنم کو اس دن کفار کے لیے بالکل عیاں۔ وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے میری یاد سے اور جو (کلمہ حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو میرے بغیر اپنا حمائیتی؟ (یہ ناممکن ہے) بیشک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لیے۔ فرمایئے: (اے لوگو) کیا مطلع کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آراستگی میں کھو کر رہ گئی اور یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں، یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال تو ہم ان (کے اعمال تولنے) کے لیے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے۔ یہ ہے ان کی جزاء جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا۔ یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔ وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) نہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔ (اے حبیب!) آپ فرمایئے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لیے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور روشنائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم نہ ہوں گے)۔ (اے پیکر رعنائی وزیبائی) آپ فرمایئے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے، پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ**۔ **تَرَكْنَا** میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یعنی ہم جن وانس کو قیامت کے روز واگزار کردیں گے وہ (تند موجوں کی طرح) ایک دوسروں میں گھس جائیں گے۔ بعض نے کہا: ہم یاجوج وماجوج کو واگزار کردیں گے۔ **يَوْمَئِذٍ** اس دیوار کے کمال کے وقت وہ ایک دوسرے میں گھس جائیں گے۔ ان کے لیے موج کا استعارہ حیرت سے عبارت ہے اور ان کے تردد سے عبارت ہے جیسے غم اور خوف کی وجہ سے نڈھال لوگ ہوتے ہیں انہیں دریا کی موج سے تشبیہ دی ہے جس کی موجیں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم یاجوج وماجوج کو دیوار کے کھلنے کے دن دنیا میں دریا کی موجوں کی طرح کردیں گے کثرت کی وجہ سے خلط ملط ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ تین اقوال ہیں ان میں سے اظہر دوسرا قول ہے اور زیادہ بعید آخری قول ہے۔ پہلا قول حسن ہے کیونکہ

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ کے ارشاد کی تاویل میں قیامت کا ذکر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ یہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ یعنی قیامت کے میدان میں جن وانس کو ہم جمع کریں گے۔ وَّ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ یعنی ان کے لیے ہم جہنم کو ظاہر کریں گے۔ یَوْمَىٕذٍ لِّلْكٰفِرِیْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِیْنَ كَانَتْ اَعْیُنُهُمْ اسم موصول کافرین کی صفت کی بناء پر محل جر میں ہے۔ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِیْ وہ اس آنکھ کی طرح ہیں جو ڈھانپی گئی ہے وہ اللہ کے دلائل (توحید) کو دیکھتی ہی نہیں۔ وَ كَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کی طاقت نہیں رکھتے وہ بہرے شخص کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا۔ حسب کا معنی ہے گمان کیا۔ حضرت علی، عکرمہ، مجاہد اور ابن محیصن نے أفحسب سین کے سکون اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی انہیں کافی ہے۔ اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ملائکہ اور حضرت عزیر علیہ السلام۔ مِنْ دُوْنِیْۤ اَوْلِیَآءَ میں انہیں سزا نہیں دوں گا۔ کلام میں حذف ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے کیا انہوں نے گمان کیا ہے کہ انہیں یہ نفع دے گا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآىٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ الآیۃ۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ لوگوں میں سے جو عمل کرتا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ہے وہ اچھائی کرنے والا ہے حالانکہ اس کی محنت رائیگاں ہو چکی ہوتی ہے اور جو چیز اس کی محنت کے ضیاع کا باعث بنتی ہے وہ اس کے عقیدہ کی خرابی ہے یا ریاکاری ہے اور یہاں کفر مراد ہے۔ امام بخاری نے مصعب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے اپنے باپ سے پوچھا: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ سے مراد حروریہ (خوارج) ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں وہ یہود ونصاریٰ ہیں کیونکہ یہود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اور نصاریٰ جنت کا انکار کرتے ہیں، انہوں نے کہا: اس میں کھانا، پینا نہیں ہے اور حروریہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پختہ عہد کرنے کے بعد عہد کو توڑا۔ حضرت سعد انہیں فاسقین کہتے تھے۔ آیت میں توبیخ ہے یعنی ان کفار کو کہو جو میرے علاوہ کی عبادت کرتے ہیں ان کی سعی اور ان کی امنگیں کل قیامت کے روز سب خائب وخاسر ہوں گی۔ پس یہی لوگ اعمال کے اعتبار سے گھاٹے میں ہیں۔ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ یعنی میرے سوا کی عبادت میں گمان رکھتے ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا: وہ حروراء کے خوارج ہیں۔ مرۃ نے کہا: وہ راہب ہیں جو صوامع میں رہتے ہیں۔ روایت ہے کہ ابن الکواء نے الاخسرین اعمالا کے متعلق ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: اس سے مراد تو اور تیرے ساتھی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ان تمام اقوال کو اس کے بعد والا قول کمزور کر دیتا ہے وہ یہ ہے: اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآىٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ اور ان گروہوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ، اس کی ملاقات، بعث اور نشور کا انکار نہیں کرتا۔ یہ مشرکین مکہ کی صفت ہے جو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ حضرت علی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس آیت سے اپنا حصہ لیا۔ اعمالا پر نصب تمیز کی بناء پر ہے۔ حبطت۔ جمہور کی قرأت باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما نے باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۝ جمہور کی قرأت نقیم نون عظمت کے ساتھ ہے۔ مجاہد نے یاء غائب کے ساتھ پڑھا یعنی اللہ قائم فرمائے گا۔ عبید بن عمیر نے فلا یقوم پڑھا ہے اسے وزن پڑھنا لازم ہے اسی طرح مجاہد نے، فلا یقوم لھم یوم القیامۃ وزن پڑھا ہے۔ عبید بن عمیر نے کہا: قیامت کے روز ایک بہت لمبے تڑنگے، زیادہ کھانے پینے والے کو لایا جائے گا اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے برابر بھی وزن نہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: ایسا قول رائے سے تو نہیں کہا جاتا۔ اس کا معنی بخاری و مسلم کی صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے (2)، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز ایک بڑے موٹے شخص کو لایا جائے گا اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا۔ اگر چاہو تو یہ پڑھ لو، فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ثواب نہ ہوگا اور ان کے اعمال کے مقابل عذاب ہوگا، ان کی کوئی نیکی نہ ہوگی کہ قیامت کے میزانوں میں اس کا وزن کیا جائے۔ اور جس کی کوئی نیکی نہ ہوگی وہ آگ میں ہوگا۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: تہامہ پہاڑ کی طرح اعمال کے ساتھ لایا جائے گا لیکن ان کا کچھ وزن نہ ہوگا۔ بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ مجاز اور استعارہ مراد ہو گویا فرمایا: ہمارے نزدیک اس دن ان کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث میں فقہ یہ ہے کہ اس موٹاپے کی مذمت کی گئی ہے جو تکلفاً حاصل کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے لیے کھانے پینے کا تکلف کرنا ہوگا اور مکارم سے دوری ہوگی، بلکہ یہ دلیل ہے کہ کفایت کی قدر سے زائد کھانا حرام ہے جس کے ساتھ ترفہ اور موٹاپا مطلوب ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شخص موٹا دینی پیشوا ہے'' (3)۔ عمران بن حصین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے ساتھ متصل ہوں گے''۔ عمران نے کہا: میں نہیں جانتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین زمانوں کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: ''تمہارے بعد ایک قوم ہوگی جو گواہی دیں گے جبکہ ان سے گواہی طلب نہیں کی جائے گی، وہ خیانت کریں گے اور امین نہ ہوں گے، نذریں مانیں گے اور نذر پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا''۔ یہ مذمت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ موٹاپا جو حاصل کیا جاتا ہے وہ کثرت سے کھانے اور حرص کرنے، آرام اور امن سے رہنے اور نفس کو شہوات پر چھوڑنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس وہ اپنے نفس کی عبادت کرنے والا ہے، اپنے رب کی عبادت کرنے والا نہیں اور جس کی یہ حالت ہو وہ حرام میں واقع ہوتا ہے اور ہر وہ گوشت جو حرام سے پیدا ہوتا ہے آگ اس کی زیادہ مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیادہ کھانے کی وجہ سے کفار کی مذمت کی ہے فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۝ (محمد)

جب ایک مومن ان کے مشابہ ہوگا اور ہر حال اور زمانہ میں ان جیسے تنعم سے لطف اندوز ہوگا تو اس کے ایمان کی حقیقت کہاں ہوگی اور وہ اسلام کے وظائف کو کیسے قائم کرے گا؟ جو زیادہ کھاتا پیتا ہے اس کی حرص اور لالچ زیادہ ہوتی ہے۔ رات کو

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 545	2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قل ھل ابنئکم، جلد 2، صفحہ 690

3۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ما جاء فی القرن الثالث، جلد 2، صفحہ 45

سستی اور نیند زیادہ ہوتی ہے، پس اس کا دن لالچ میں گردش کرتے ہوئے اور رات سوتے ہوئے گزرتی ہے۔ یہ مفہوم سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اس میں میزان کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔ اس کے دو پلڑے ہیں جن میں اعمال کے صحائف کا وزن کیا جائے گا، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب صحابہ حضرت ابن مسعود کی پنڈلی کی باریکی کو دیکھ کر ہنستے تھے جب کہ وہ کھجور پر چڑھ رہے تھے: ''تم پنڈلی کی وجہ سے ہنس رہے ہو تمام اہل زمین کے عمل کے ساتھ اس کا وزن کیا جائے گا''۔ یہ دلیل ہے کہ اشخاص کا وزن کیا جائے گا؛ غزنوی نے اس کو ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ۔ ذالك مشار الیہ وزن کا ترک ہے۔ ذالك مبتدا ہے اور جزاءھم خبر ہے۔ جھنم، متبدا سے بدل ہے جو ذالك ہے۔ اور بما کفروا میں ما مصدر یہ ہے اور الھزء کا معنی مزاح کرنا اور ہلکا سمجھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ قتادہ نے کہا: فردوس جنت کا بلند، عمدہ، اعلیٰ، افضل اور ارفع مقام ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی نے کہا: فردوس جنت کی ناف ہے۔ کعب نے کہا: جنتوں میں سے ایک جنت ہے جو جنۃ الفردوس سے بھی اعلیٰ ہے، اس میں وہ لوگ ہوں گے جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (1) فرمایا: ''نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جو اللہ پر ایمان لایا، نماز قائم کی، رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے خواہ اس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ہو یا اس زمین میں بیٹھا رہا ہو جس میں پیدا ہوا تھا''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو اس کی خوشخبری دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں ایک سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔ اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ اور بلند درجہ ہے''۔ میرا خیال ہے فرمایا: ''اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں''۔ مجاہد نے کہا: فردوس، رومی زبان میں باغ کو کہتے ہے۔ فراء نے کہا: یہ عربی لفظ ہے۔ فردوس جنت میں ایک باغیچہ ہے۔ فردوس یمامہ کے قریب ایک باغ کا نام ہے۔ اس کی جمع فرادیس ہے۔ امیہ بن ابی الصلت ثقفی نے کہا:

كانت منازلهم إذ ذاك ظاهرةً فيها الفَراديس والفُومانُ والبصَلُ

الفرادیس شام کا ایک علاقہ ہے۔ کرم مفردس کا مطلب ہے انگور کی بیلیں جو چھپر کی طرح پھیلی ہوئی ہوں۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ یعنی وہ اس جنت سے کسی اور طرف پھرنا نہیں چاہتے۔ الحول بمعنی التحویل ہے یہ ابوعلی نے کہا۔ زجاج نے کہا، حال من مکانہ حولا، جیسے کہا جاتا ہے: عظم عظماً۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الحیلہ سے مشتق ہو یعنی، لایحتالون منزلاً غیرھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ، نفد الشئی کا

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، درجات المجاھدین فی سبیل اللہ، جلد 1، صفحہ 391

معنی ہے جب مکمل اور فارغ ہو جائے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ اگر ہم سمندر پر عدد یا وزن کے اعتبار سے زیادتی کر دیں۔ مصحف ابی میں مداداً ہے اسی طرح مجاہد، ابن محیصن اور حمید نے پڑھا ہے۔ مدداً کی نصب تمیز یا حال کی بناء پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاسراء) تو یہود نے کہا: ہمیں تورات دی گئی ہے اور جس کو تورات دی گئی تو اسے خیر کثیر دیا گیا (تو ہم افضل ہوئے پھر ہم آپ کی پیروی کیسے کریں) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ ۔۔۔ الآیۃ۔ بعض علماء نے کہا: یہود نے کہا: آپ کو حکمت دی گئی ہے اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا پھر آپ کہتے ہیں: مجھے روح کا علم نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ فرمائیں اگر مجھے قرآن دیا گیا ہے اور تمہیں تورات دی گئی ہے تو تورات اللہ کے کلمات کی نسبت سے کم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ۔ سے مراد مواعظ ربی ہے یعنی میرے رب کے مواعظ۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد وہ قدیم کلام ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اگرچہ وہ ایک ہے اس کو لفظ جمع سے تعبیر کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں فرائد کلمات موجود ہیں اور فرائد کلمات کے قائم مقام ہے۔ پس عظمت شان کے اظہار کے لیے جمع کے صیغہ سے تعبیر کرنا جائز ہے۔ اعمش نے کہا:

دوجۃٌ نقیّ اللون صافٍ یزینُهٗ مع الجیدِ لَبَّاتٌ لها ومَعاصِمُ

اس شعر میں لبہ کو لبات سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن میں ہے: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ (حم السجدہ: 31) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (الحجر: 9) وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ (الحجر: 23)۔ اسی طرح فرمایا: ان ابراهیم كان امۃ۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ایک امت کے قائم مقام تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ عبارات اور دلالات ختم نہ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے معانی کے مفہومات پر دلالت کرتی ہیں۔ سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کے کلمات کے لیے تو سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ اس جنت کی صفات ختم ہوں جو دار الثواب ہے۔ عکرمہ نے کہا: سمندر ختم ہو جائے گا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والے کے ثواب کے ختم ہونے سے پہلے۔ اس آیت کی مثال یہ آیت ہے: وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ ۔۔۔۔ الآیۃ (لقمان: 27)

حمزہ اور کسائی نے قبل أن ینفد یاء کے ساتھ پڑھا ہے فعل کے تقدم کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ یعنی میں نہیں جانتا مگر جو اللہ تعالیٰ مجھے سکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم شمار سے وراء ہے مجھے تو حکم ہے کہ میں تمہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پہنچاؤں۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔ جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت جندب بن زہیر عامر کے بارے میں نازل ہوئی اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کے لیے عمل کرتا ہوں اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتا ہوں مگر جب اس پر (لوگوں کی) آگاہی پائی جاتی ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اسے قبول نہیں فرماتا جس میں کسی اور کو

شریک کیا گیا ہو''(1) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ طاؤس نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ میں اللہ کے راستہ میں جہاد کو پسند کرتا ہوں اور میں یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ میرا مکان و مرتبہ دیکھا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد نے کہا: ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ صدقہ کرتا ہوں اور صلہ رحمی کرتا ہوں اور میں یہ کام نہیں کرتا مگر اللہ کے لیے۔ پھر میری طرف سے اس کام کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس پر تعجب کیا جاتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے۔ نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے اور کوئی کلام نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا** ۔(2)

میں کہتا ہوں یہ آیت تمام اعمال کو شامل ہے سورۂ ہود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث ان تین شخصوں کے بارے گزر چکی ہے جن کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا۔ اور سورۃ النساء میں ریاکاری پر کلام گزر چکی ہے اور ہم نے وہاں بہت سے واقعات ذکر کیے ہیں جن میں کفایت ہے ماوردی نے کہا: تمام علماء تفسیر نے کہا: **وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا** کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اعمال کسی کو نہ دکھائے (یعنی ریاکاری نہ کرے) ترمذی حکیم رحمۃ اللہ علیہ نے نوادر الاصول میں روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں عبدالواحد بن زید نے عبادہ بن نُسی سے روایت کر کے بتایا فرمایا: میں شداد بن اوس کے پاس اس کی جائے نماز میں آیا تو وہ رو رہے تھے میں نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن تم کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں نے ایک دن نبی پاک ﷺ سے ایک دن ایک حدیث سنی تھی؟ میں نے نبی پاک ﷺ کے چہرے پر پریشانی دیکھی تھی۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''شرک اور خفیہ شہوت''(3)۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ آپ کے بعد آپ کی امت شرک کرے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے شداد! لوگ سورج، چاند، پتھر، ریت کی پوجا تو نہیں کریں گے لیکن وہ اپنے اعمال میں ریاکاری کریں گے''۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ ریاکاری شرک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ میں نے پوچھا: حضور! شہوت خفیہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی صبح کے وقت روزے سے ہوگا پھر اس کے لیے دنیا کی شہوات ظاہر ہوں گی تو وہ روزہ افطار کر دے گا''۔ عبدالواحد نے کہا: میں حسن سے ملا تو میں نے پوچھا: اے ابوسعید! مجھے ریاکاری کے بارے بتا کیا وہ شرک ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ کیا تو یہ آیت نہیں پڑھتا: **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ**۔۔۔ الخ۔ اسماعیل بن اسحاق نے روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا تو انہوں نے کہا: ہمیں معتمر بن سلیمان نے بتایا انہوں نے لیث سے انہوں نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے فرمایا: عبادہ بن صامت اور شداد بن اوس اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا: ہم اس امت پر شرک اور شہوت خفیہ کا خوف کرتے ہیں۔ شہوت خفیہ عورتوں کی طرف سے ہے۔ انہوں نے کہا: ہم نے نبی پاک ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے ''جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوا کرتے ہوئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، جلد 2، صفحہ 596 2۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 308

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 110-109

روزہ رکھا اس نے شرک کیا'' پھر یہ آیت تلاوت کی: فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔۔ الآیۃ (1)۔

میں کہتا ہوں: شہوت خفیہ کی تفسیر اس کے خلاف بھی آئی ہے وہ ہم نے سورۃ النساء میں ذکر کر دی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: حسن سے اخلاص اور ریاکاری کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اخلاص میں سے یہ ہے کہ تو اپنی نیکیوں کو چھپانا پسند کرے اور اپنی برائیوں کو پسند نہ کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ تجھ پر تیری نیکیاں ظاہر کر دے تو تو کہے: (اے رب کریم!) یہ تیرا فضل اور احسان ہے یہ نیکیاں میرا فعل نہیں (بلکہ یہ کرم ہے) اور تو اس ارشاد کو یاد کر لے: فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔ الآیۃ۔ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوا۔۔۔ الآیۃ (المومنون: 60) یعنی جنہیں اخلاص دیا گیا ہے وہ ڈرتے ہیں کہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور رہی ریاکاری تو وہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنے نفس کے عمل کا حصہ طلب کرے۔ پوچھا گیا کیسے ہوگا؟ فرمایا: ''جس نے اپنے اور اللہ تعالیٰ اور دار آخرت کے سوا کسی کو اپنے کسی عمل کے ساتھ طلب کیا تو وہ ریاکاری ہے''۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ریاکاری انسان کو لوگوں کے استہزا تک پہنچاتی ہے جیسا کہ حکایت ہے کہ طاہر بن حسین نے ابوعبداللہ مروزی سے کہا: تم اے عبداللہ! کب سے عراق میں ہو؟ اس نے کہا: میں بیس سال سے عراق میں ہوں اور میں تیس سال سے روزہ رکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا: اے ابوعبداللہ! ہم نے تجھ سے ایک سوال پوچھا آپ نے ہمیں دو مسئلے بتا دیے۔ اصمعی نے حکایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز پڑھی اور بڑی لمبی نماز پڑھی اور اس کے قریب ایک قوم تھی انہوں نے کہا: کیا خوب تیری نماز تھی۔ اس نے کہا: اس کے ساتھ میں روزے سے بھی ہوں۔ اشعث بن قیس کا قول ہے کہ اس نے نماز پڑھی اور بہت تخفیف کی ان سے کہا گیا: تو نے بہت تخفیف کی ہے۔ اس نے کہا: اس میں ریاکاری ملی ہوئی نہیں، اپنے نفس سے ریاکاری کی نفی کرنے کے ساتھ ان کی تنقیص سے بچ گیا۔ سورۃ النساء میں ریاکاری کی دواء اور علاج لقمان کے قول سے گزر چکا ہے کہ وہ عمل کو چھپانا ہے۔ ترمذی حکیم نے [illegible] ردی فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا میرے باپ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حمانی نے خبر دی فرمایا ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے لیث سے روایت کیا انہوں نے شیخ سے انہوں نے معقل بن یسار سے روایت کیا فرمایا: حضرت ابوبکر نے کہا اور انہوں نے اس کے ساتھ نبی پاک ﷺ پر گواہی دی فرمایا: نبی پاک ﷺ نے شرک کا ذکر کیا فرمایا: ''شرک تم میں چیونٹی کے رینگنے سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (2)، میں تجھے ایک وظیفہ سکھاتا ہوں جب تو وہ کرے گا تو چھوٹا، بڑا شرک تجھ سے دور ہو جائے گا۔ تو کہہ: اللّٰهم إني أعوذ بك أن أشرك بك وأنا أعلم وأستغفرك لما لا أعلم (3)'' ''اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں کہ میں غیر دانستہ شرک کروں''۔ تین بار کہے۔ عمر بن قیس کندی نے کہا: میں نے حضرت معاویہ کو سنا انہوں نے منبر پر یہ آیت تلاوت کی، فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔ پھر کہا: یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور حضرت عمر نے کہا (4): نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے وحی کی گئی ہے کہ جو فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔۔۔ الخ۔ پڑھے گا اس کے لیے ایک

---

1۔ مستدرک للحاکم، جلد 4، صفحہ 329
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، الریا والسمعۃ، جلد 1، صفحہ 320
3۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 385
4۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 371

نور بلند کیا جائے گا جو عدن سے مکہ تک فاصلہ جتنا ہوگا اس کو ملائکہ نے پُر کر رکھا ہوگا جو اس بندے کے لیے دعا کرتے ہوں گے اور اس کے لیے استغفار کرتے ہوں گے۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا(1): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے سورۂ کہف کا اول و آخر پڑھا اس کے لیے سر سے قدموں تک نور ہوگا اور جو پوری سورت پڑھے اس کے لیے زمین سے لیکر آسمان تک نور ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ایک شخص نے ان سے کہا: میں رات کے وقت اٹھنے کا دل میں عزم کرتا ہوں لیکن مجھ پر نیند غالب آ جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تو رات کے کسی وقت اٹھنا چاہے تو بستر پر سوتے وقت یہ آیت پڑھا کر۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ۔۔۔۔ الخ۔ تو اللہ تعالیٰ تجھے بیدار کر دے گا جب تو اٹھنا چاہے گا۔ یہ فضائل ثعلبی نے ذکر کیے۔ پس مسند داری میں ہے ابو محمد نے کہا: ہمیں محمد بن کثیر نے بتایا انہوں نے اوزاعی سے انہوں نے عبدہ سے انہوں نے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سورۂ کہف کا آخر تلاوت کیا وہ رات کو جس وقت اٹھنا چاہے گا اٹھ پڑے گا۔ عبدہ نے کہا: ہم نے اس کا تجربہ کیا تو ہم نے اسی طرح پایا۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ طرطوشی اکبر کہتے تھے زمانے تم سے ہم عصروں سے لڑتے ہوئے اور بھائیوں سے تعلق جوڑتے ہوئے نہ گزر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بیان کو اس قول پر ختم کر دیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝

---

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 367

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# تفسیر سورۂ مریم

(ایاتها ۹۸) (۱۹ سورۃ مریم مکیۃ ۴۴) (رکوعاتها ۶)

یہ بالا جماع مکی سورت ہے اور اس کی 98 آیات ہیں۔

جب جنگ بدر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں کفار کے سرداروں کو قتل کر دیا تو کفار قریش نے کہا: تمہارا بدلہ حبشہ کی زمین میں ہے۔ نجاشی کی طرف جاؤ اور اس کی طرف اپنے دو صاحب رائے اور بھیجو شاید وہ تمہیں قریش کے وہ آدمی دے دے جو اس کے پاس ہیں۔ پھر تم اپنے بدر کے مقتولوں کے بدلے میں انہیں قتل کر دینا۔ کفار قریش نے عمرو بن عاص اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ کو بھیجا۔ نبی پاک ﷺ نے جب ان کے آدمی بھیجنے کے متعلق سنا تو آپ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا اور اسے نجاشی کے لیے خط لکھ کر دیا۔ عمرو بن امیہ نجاشی کے پاس آیا اور اس نے نبی پاک ﷺ کا خط پڑھا پھر جعفر بن ابی طالب اور مہاجرین کو بلایا اس نے راہبوں اور علماء کو بلایا اور انہیں جمع کیا پھر جعفر کو ان پر قرآن پڑھنے کو کہا تو انہوں نے سورۂ مریم، کٓھٰیٰعٓصٓ پڑھی اور لوگ اٹھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان لوگوں کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ (المائدہ) تلاوت کی۔ یہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے۔ سیرت میں نجاشی نے کہا: کیا تمہارے پاس وہ کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ لائے ہیں؟ حضرت جعفر نے کہا: ہاں۔ نجاشی نے آپ کو کہا: وہ مجھ پر پڑھو۔ تو انہوں نے کٓھٰیٰعٓصٓ پڑھا تو وہ رونے لگا حتی کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ اس کے علماء بھی رونے لگے حتی کہ ان کی داڑھیاں بھی تر ہو گئیں۔ جب انہوں نے وہ کلام سنا جو ان پر تلاوت کیا گیا تھا۔ نجاشی نے کہا: یہ وہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لیکر آئے تھے۔ یہ ایک مشکاۃ سے نکلے ہیں۔ نجاشی بادشاہ نے عمرو بن عاص اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ کو کہا: تم دونوں چلے جاؤ اللہ کی قسم! یہ لوگ میں کبھی بھی تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ پھر مکمل خبر ذکر کی۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّاۤ

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى
يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ
لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ
الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ
وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ۝ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ
وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

”کاف، ہا، یا، عین، ص۔ یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔ عرض کی: اے میرے رب! میری حالت یہ ہے کہ کمزور و بوسیدہ ہو گئیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہو گیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اے میرے رب! اور میں نامراد رہا ہوں۔ اور میں ڈرتا ہوں (اپنے دینی) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں) اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔ جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا اور بنا دے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا)۔ اے زکریا! ہم مژدہ دیتے ہیں تجھے ایک بچے (کی ولادت) کا اس کا نام یحییٰ ہو گا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی ہم نام اس سے پہلے۔ زکریا نے عرض کی: میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں لڑکا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو؟ فرمایا: یونہی ہو گا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبرسنی میں بچہ دینا میرے لیے آسان بات ہے اور (دیکھو) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ زکریا نے عرض کی: اے میرے رب! ٹھہرا دو میرے لیے کوئی علامت۔ جواب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کر سکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہو گا۔ پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح و شام۔ اے یحییٰ! پکڑ تو کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرما دی ان کو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور نفس کی پاکیزگی اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔ اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جابر اور سرکش نہ تھے۔ اور سلامتی ہو ان پر جس روز وہ پیدا ہوئے اور جس روز انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کٓھٰیٰعٓصٓ۔ حروف مقطعات پر کلام پہلے سورتوں کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کاف۔ کافی سے، ھا۔ ھادی ہے، یا۔ حکیم سے اور عین۔ علیم سے اور صاد۔ صادق سے ہے؛ یہ ابن العزیز نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے لیے کافی ہے اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے۔ اس کا ہاتھ سب کے ہاتھوں پر ہے (یعنی سب پر غالب ہے) ان کو جاننے والا ہے اپنے وعدہ میں سچا ہے۔ یہ قول ثعلبی نے کلبی، سدی، مجاہد اور ضحاک سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے یہ بھی کہا ہے کہ الکاف، کریم، کبیر اور کافی سے۔ ھا، ھادی سے ہے۔ یا رحیم سے ہے۔ عین علیم اور عظیم سے ہے۔ صاد صادق سے ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح دعا مانگتے تھے: یا کٓھٰیٰعٓصٓ اغفرلی؛ یہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ سدی نے کہا: یہ وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سوال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور جب اس کے ذریعے دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ قرآن کے اسماء میں سے اسم ہے؛ یہ عبد الرزاق نے معمر سے اور انہوں نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سورت کا نام ہے۔ قشیری کا اختیار یہی ہے (1) کہ حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ کٓھٰیٰعٓصٓ پر کلام کا تمام ہے۔ گویا یہ سورت کے نام کے متعلق بتایا گیا ہے جیسے تو کہتا ہے: فلاں کتاب (طہارت) یا باب فلاں (وضو) پھر تو مقصد میں شروع ہوتا ہے۔ ابوجعفر نے ان حروف کو علیحدہ علیحدہ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے وصل کیا ہے۔ ابو عمرو نے ھا میں امالہ کیا اور یاء کو فتح کے ساتھ پڑھا۔ ابن عامر اور حمزہ نے اس کے برعکس پڑھا ہے اور ان دونوں کو کسائی، ابوبکر اور خلف نے امالہ کیا ہے۔ اہل مدینہ، نافع وغیرہ نے ان دو لفظوں کے درمیان پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خارجہ سے مروی ہے کہ حسن کاف کو ضمہ دیتے تھے اور اس کے علاوہ سے حکایت ہے کہ انہوں نے ھا کو ضمہ دیا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے حکایت کیا ہے کہ وہ یاء کو ضمہ دیتے تھے۔ ابو حاتم نے کہا: کاف کو ضمہ دینا اور ھا اور یا کو ضمہ دینا جائز نہیں۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ کی قرأت سب سے بہتر ہے اور ھا اور یا میں امالہ جائز ہے اور حسن کی قرأت جماعت قراء پر مشکل ہے حتی کہ انہوں نے کہا: یہ جائز نہیں ہے، ان علماء میں سے ابو حاتم بھی ہیں اس کے بارے میں ہارون القاری نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حسن رفع کو اشمام کرتے تھے، اس کا معنی ہے وہ اشارہ کرتے تھے جیسا کہ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: الصلوۃ و الزکاۃ یومی الی الواو۔ یعنی الصلوۃ اور الزکاۃ کے لفظ واؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور صاد کے ہجے سے دال کو نافع، ابن کثیر، عاصم، اور یعقوب نے ظاہر کیا ہے؛ یہی ابو عبیدہ کا اختیار ہے اور باقی قراء نے اسے ادغام کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ ذکر کے رفع میں تین اقوال ہیں۔ فراء نے کہا: یہ کٓھٰیٰعٓصٓ کی وجہ سے مرفوع ہے۔ زجاج نے کہا: یہ محال ہے کیونکہ کٓھٰیٰعٓصٓ اس میں سے نہیں ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 54

نے ہمیں حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق خبر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت زکریا علیہ السلام اور انہیں جو بشارت دی اس کے متعلق خبر دی اور کٓھٰیٰعٓصٓ ان کے قصہ سے نہیں ہے۔ اخفش نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے فیما یقص علیکم ذکر رحمۃ ربك۔ اور بعض علماء نے فرمایا: حسن نے ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ پڑھا ہے، یعنی ھذا المتلو من القرآن ذکر رحمۃ ربك۔ اور ذکِّرْ امر کا صیغہ پڑھا گیا ہے۔ اور رحمۃ لکھا جاتا ہے اور ھاء کے ساتھ اس پر وقف کیا جاتا ہے اسی طرح ہر اسم جو اس کی مثل ہوتا ہے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں نحویوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس میں انہوں نے یہ علت بیان کی ہے کہ یہ ھا اسماء کی تانیث کے لیے ہے تاکہ ان کے اور افعال کے درمیان فرق ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَبْدَهٗ۔ اخفش نے کہا: یہ رحمۃ کی وجہ سے منصوب ہے اور زکریا اس سے بدل ہے جیسے تو کہتا ہے: ھذا ذکر ضرب زید عمراً عمراً ضرب کی وجہ سے منصوب ہے اسی طرح عبدہ، رحمۃ کی وجہ سے منصوب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تقدیم و تاخیر پر ہے اس کا معنی ہے ذکر ربك عبدہ زکریا، برحمۃ۔ پس عبدہ، ذکر کی وجہ سے منصوب ہے، زجاج اور فراء نے یہ ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے عبدہ زکریا رفع کے ساتھ پڑھا ہے یہ ابوالعالیہ کی قرأت ہے۔ یحییٰ بن یعمر نے ذکر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی پر کہ ھذا القرآن ذکر رحمۃ عبدہ زکریا۔ زکریا کے بارے میں قرات اور لغات سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (الاعراف) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ندا کا معنی دُعا اور رغبت ہے یعنی انہوں محراب میں اس کے ساتھ اپنے رب سے مناجات کی، اس کی دلیل یہ اشارہ ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (آل عمران: 39) یہ ظاہر ہوا کہ ان کی نماز میں ہی دعا کی قبولیت ہوئی جیسا کہ انہوں نے نماز کے اندر دعا کی ان کی دعا کو مخفی کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اپنی قوم سے اس دعا کو مخفی کیا تاکہ بڑھاپے میں بچے کے سوال پر انہیں ملامت نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ یہ دنیوی امر تھا اگر اس کی دعا قبول کی گئی تو وہ اپنا مقصود پالیں گے اگر قبول نہ ہوگی تو اس کے متعلق کسی کو علم نہ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس دعا میں خلوص کا مظاہرہ کر رہے تھے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مطلع نہ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ خفیہ اعمال افضل ہوتے ہیں اور ریاکاری سے پاک ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے دعا کو مخفی کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: خفیا۔ کا مطلب ہے رات کی تاریکی میں اپنی قوم سے چھپا کر دعا کی یہ تمام احتمال موجود ہیں لیکن پہلا قول اظہر ہے۔

سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے کہ دعا میں اخفا مستحب ہے اور یہ آیت اس میں نص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی اس پر تعریف فرمائی ہے۔ اسماعیل نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں مسدد نے بتایا فرمایا ہمیں یحییٰ بن سعید نے بتایا انہوں نے اسامہ بن زید سے روایت کیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اور یہ ابن ابی کبشہ سے انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے (1) فرمایا: ان خیر الذکر الخفی و خیر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 85

الرزق مایکفی۔ بہتر ذکر خفی ہے اور بہتر رزق وہ ہے جو کفایت کرے۔ یہ عام ہے۔ یونس بن عبیدہ نے کہا: حضرت حسن کا نظریہ یہ ہے کہ امام دعا مانگے اور مقتدی بغیر بلند آواز کے آمین کہیں اور یونس نے تلاوت کی: اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے دعا آہستہ کی اور امام شافعی نے اس میں جہر کیا۔ اور دعا میں جہر افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہراً دعا فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ۔ وَهُنَ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کمزور ہونا۔ کہا جاتا ہے: وَهَنَ یَهِنُ وَهْناً فهو واهنٌ کمزور ہونا۔ ابوزید نے کہا: وَهَنَ یَهِنُ اَو وَهِن یَوْهَنُ بھی کہا جاتا ہے۔ الْعَظْمُ کا ذکر کیا کیونکہ یہ بدن کا عمود ہے اس کے ساتھ جسم کا قوام ہے۔ یہ اس کی بنا (ڈھانچہ) کی اصل ہے جب ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں تو جسم کی تمام قوتیں کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ جسم میں ہڈی ہی سخت اور مضبوط ہوتی ہے جب ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں تو دوسرا جسم بدرجہ اولیٰ کمزور ہو جاتا ہے۔ عظم واحد ذکر فرمایا کیونکہ واحد جنسیت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے یہ قصد فرمایا کہ یہ وہ جنس ہے جو عمود اور قوام کا باعث ہے اور جسم جس سے مرکب ہوتا ہے اس میں سخت ترین یہ ہے اس کو بھی کمزوری لاحق ہو چکی ہے۔ اگر جمع ذکر کی جاتی تو دوسرے مفہوم کا ارادہ ہوتا اور وہ یہ ہے کہ اس سے بعض ہڈیاں کمزور نہیں ہوئیں لیکن اکثر کمزور ہوئی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا۔ ابوعمرو نے سین کو شین میں ادغام کیا ہے۔ یہ عرب کلام میں خوبصورت ترین استعارہ ہے۔ الاشتعال کا معنی ہے آگ کی شعاع کا بکھرنا، اس کے ساتھ سر میں بڑھاپے کے پھیلنے کو تشبیہ دی گئی ہے، یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا: میں کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اشتعال کو بالوں کے پیدا ہونے کی جگہ کی طرف منسوب کیا اور وہ سر ہے۔ راس (سر) کو مضاف نہیں کیا کیونکہ مخاطب کو علم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا سر مراد ہے۔ شَیْبًا اس کی نصب میں دو وجوہ ہیں۔ (۱) یہ مصدر ہے کیونکہ اشتعل کا معنی ہے شاب۔ یہ اخفش کا قول ہے اور زجاج نے کہا: یہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش کا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہ فعل سے مشتق ہے پس مصدر بنانا اولیٰ ہے۔ الشیب کا معنی ہے سفید اور سیاہ بالوں کا ملنا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: انسان کے لیے مستحب ہے کہ اپنی دعا میں ان انعامات کو یاد کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر کیے ہیں اور ایسی چیزوں کا ذکر کرے جو خضوع کے مناسب ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ خضوع کا اظہار ہے اور وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا۝ دعا قبول کرنے میں فضل کرنے کی عادات کا اظہار ہے یعنی تجھ سے دعا مانگنے میں کبھی شقی نہیں ہوا، یعنی جب بھی میں نے تجھ سے دعا مانگی تو میں دعا میں محروم نہیں رہا، یعنی تو نے مجھے دعا کی قبولیت کا عادی بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے: شقی بکذا یعنی اس میں تھک گیا اور مقصود حاصل نہ ہوا۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ محتاج نے اس سے سوال کیا اور کہا: میں وہ ہوں تو نے فلاں وقت میں اس سے احسان کیا تو اس نے کہا: خوش آمدید اسے جو ہمارے ذریعے ہم تک پہنچا اور پھر اس کی حاجت پوری کر دی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ حضرت عثمان بن عفان، محمد بن علی اور علی بن حسین اور یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہم نے خَفَّت خا کے فتحہ اور فا کی شد اور تا کے کسرہ کے ساتھ اور اَلْمَوَالِیْ کو یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ خفت کی وجہ سے یہ محل رفع میں ہے۔ اس کا معنی ہے میرے رشتہ دار موت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اور باقی قراء نے خفت خاء کے کسرہ، فا کے سکون اور تا کے ضمہ اور موالی کے یا کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ خفت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ الْمَوَالِیَ سے یہاں مراد قریبی رشتہ دار ہیں۔ اور چچا کے بیٹے اور وہ عصبات ہیں جو نسب میں ان سے ملتے تھے۔ عرب چچا کے بیٹوں کو بھی الْمَوَالِیَ کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

مَهْلاً بَنِی عَمِّنَا مَهْلاً مَوَالِینَا　　لا تَنْبُشُوا بَیْنَنَا ما کان مَدْفُونَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ نے کہا: حضرت زکریا علیہ السلام کو اندیشہ ہوا کہ قریبی رشتہ دار وارث بنیں گے اور باپ اور بیٹے کے علاوہ وہ لوگ وارث بنیں گے۔ ایک جماعت نے کہا: آپ کے رشتہ دار دین کے لیے سستی کرنے والے تھے تو آپ کو اپنی موت سے دین کے ضیاع کا خوف ہوا، پس آپ نے ایسا ولی طلب کیا جو ان کے بعد دین کو قائم رکھے؛ یہ قول زجاج نے حکایت کیا ہے۔ اس قول کی بنا پر ہے کہ آپ نے مال کے وارث کا سوال نہیں کیا کیونکہ انبیاء میراث نہیں چھوڑتے۔ یہ قول آیت کی تاویل میں سے دونوں قول میں سے صحیح ہے، کیونکہ انہوں نے علم، نبوت کی وراثت کا ارادہ فرمایا تھا مال کی وراثت کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم انبیاء کا گروہ میراث نہیں چھوڑتے جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے'' (1)۔ ابوداؤد کی کتاب میں ہے ''علماء انبیاء کے ورثاء ہیں، انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے اور وہ علم کا وارث بناتے ہیں'' (2)۔ اس کی مزید وضاحت یرثنی کے قول کے تحت آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ حدیث مسند تفسیر میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ (النمل: 16) اور حضرت زکریا کے قول کو یوں تعبیر فرمایا: فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ۔ اور اس میں عموم کی تخصیص ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام کے مال کے وارث نہ بنے تھے۔ اپنے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا اور اس سے حکمت و علم کے وارث ہوئے تھے، اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام آل یعقوب سے وارث ہوئے تھے۔ رافضیوں کے علاوہ مفسرین نے اس قرآنی آیت کی تفسیر میں یہی کہا ہے مگر حسن بصری سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یَّرِثُنِیْ مال کا وارث بنے۔ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ نبوت و حکمت کا وارث بنے۔ ہر وہ قول جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مخالف ہو وہ مردود، مہجور ہے؛ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: مفسرین میں اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مال کی وراثت کا ارادہ کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 995　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 996۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، حدیث 2606

کے قول: ''ہم انبیاء کا گروہ میراث نہیں چھوڑتے'' (1)۔ احتمال رکھتا ہے کہ آپ نے اس سے عموم مراد نہ لیا ہو بلکہ اس سے مراد غالب امر ہو۔ یہ مقام غور ہے۔ اظہر اور مناسب حضرت زکریا علیہ السلام کے لیے یہ ہے کہ انہوں نے وراثت علم اور دین مراد لی ہے۔ اس صورت میں وراثت، مستعارہ ہوگی کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب انہوں نے ولی طلب کیا ہے تو انہوں نے بچے کو خاص نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی امنگ کو کامل طور پر پورا فرمایا۔ ابوصالح وغیرہ نے کہا: مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ سے مراد علم اور نبوت کی میراث ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ وَّرَآءِیْ ابن کثیر نے اسے مد اور ہمزہ اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان سے مقصور اور یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی مروی ہے، جیسے عصای اور باقی قراء نے ہمزہ، مد اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور قراء خفت کی قرأت پر ہیں جیسے بِنتٌ، مگر جو ہم نے عثمان سے ذکر کیا ہے یہ بہت شاذ قرأت ہے حتی کہ بعض علماء نے فرمایا: وہ جائز ہی نہیں ہے۔ فرمایا: وہ کیسے یہ کہتے ہوں گے: خَفَّت الموالی من بعدی؟ یعنی میرے وصال کے بعد، حالانکہ وہ زندہ تھے۔ نحاس نے کہا: اس کی تاویل ہو سکتی ہے کہ مِنْ وَّرَآءِیْ سے مراد من بعد موتی نہ ہو لیکن من ورائی فی ذالك الوقت ہو۔ یہ تاویل بھی بعید ہے اور دلیل کی محتاج ہے کہ وہ اس وقت کم تھے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کثرت کی خبر دی ہے جب انہوں نے کہا: اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران: 44)

ابن عطیہ نے کہا: مِنْ وَّرَآءِیْ کا مطلب ہے اس زمانہ میں میرے بعد (2) اور یہ بھی وراء ہے جیسا کہ سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا آپ کی بیوی ایشاع بنت فاقوذ ابن قبیل تھی۔ یہ حنہ بنت فاقوذ کی بہن تھی؛ یہ طبری کا قول ہے۔ حنہ یہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ قتبی نے کہا: حضرت زکریا کی بیوی ایشاع بنت عمران تھی۔ اس قول کی بنا پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے ہوں گے اور دوسرے قول کی بنا حضرت پر عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی خالہ کے بیٹے ہوں اور حدیث اسراء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فلقیت ابنی الخالة یحییٰ وعیسیٰ میں خالہ کے بیٹوں یحییٰ اور عیسیٰ سے ملا۔ یہ قول پہلے قول کا شاہد ہے۔ واللہ اعلم۔

العاقر اس عورت کو کہتے ہیں جو عمر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے بچے جنم نہیں دیتی اس کا ذکر آل عمران میں ہو چکا ہے اور عورتوں میں عاقر اس کو بھی کہتے ہیں جو عمر کے زیادہ ہونے کے باوجود بھی بچے جنم نہیں دیتی اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا (الشوریٰ: 50)

اسی طرح مردوں میں سے بھی العاقر ہوتا ہے شاعر کا قول ہے:

لبئس الفتی إن كنتُ أعورَ عاقراً　　جبانا فما عُذْرِی لَدَی كُلِّ مَحْضَرِ

---

1۔ سنن ابی داود، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 58-57۔ ایضاً 3157۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر 218

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 5

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ یہ سوال اور دعا ہے بیٹے کے لیے، صراحۃً دعا نہیں کی کیونکہ انہیں اپنی حالت بھی معلوم تھی اور عورت کے بارے بھی علم تھا۔ قتادہ نے کہا: ان کے لیے یہ امر جاری ہوا جبکہ عمر ستر سال سے زائد تھی۔ مقاتل نے کہا: پچھتر (75) سال تھی یہ زیادہ مناسب ہے۔ حضرت زکریا کا غالب گمان تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا بچہ پیدا نہ ہوگا اسی وجہ سے کہا: وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ انہوں نے بچہ طلب کیا(1) پھر اس بات کی قبولیت طلب کی کہ وہ زندہ رہے حتیٰ کہ وہ وارث بنے، اس بات سے حفاظت کے لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے کے بارے میں دُعا قبول ہو لیکن پھر وہ ختم ہو جائے اور اس سے غرض پوری نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے فرمایا: حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کے لیے دعا کی تا کہ ان کے دین کا غلبہ ہو اور ان کی نبوت کا احیا ہو اور ان کے اجر میں اضافہ ہو دنیا کی خاطر دعا نہیں کی تھی۔ رب کریم نے انہیں قبولیت کا عادی بنا دیا تھا اسی وجہ سے انہوں نے کہا: لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ یہ ایک اچھا وسیلہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر نعمت کے وسیلہ سے سفارش طلب کی اور اس کے فضل کا، اس کے فضل کے وسیلہ سے سوال کیا۔

روایت ہے کہ حاتم طائی جو بہت سخی تھا اسے ایک شخص ملا اور اس نے اس سے سوال کیا۔ حاتم نے اسے کہا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں وہ ہوں جس پر تو نے پہلے سال احسان کیا تھا۔ حاتم نے کہا: خوش آمدید جس نے ہماری بارگاہ میں ہمیں ہی شفیع بنایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے بغیر اذن کے خارق للعادت امر کا کیسے سوال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے انبیاء کے زمانوں میں جائز تھا اور قرآن حکیم میں اس مفہوم کی وضاحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آل عمران)

جب خارق للعادت امر کو دیکھا تو دُعا کی قبولیت میں ان کی امید مزید مستحکم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (آل عمران:38)

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ آیت بچے کے لیے دعا کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اموال اور اولاد کی آفات سے ڈرایا ہے اور ان کے مفاسد پر تنبیہ کی ہے فرمایا: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن: 15) اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) اس کا جواب یہ ہے کہ بچے کے لیے دعا کرنا کتاب وسنت سے ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ پھر حضرت زکریا علیہ السلام نے بری اولاد سے بچاؤ کیا۔ عرض کی: ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (آل عمران:38) اور کہا: وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔

جب بچہ ان صفات کا حامل ہو تو دنیا وآخرت میں والدین کے لیے نفع بخش ہوتا ہے اور وہ عداوت اور فتنہ کی حد سے نکل جاتا ہے اور مسرت ونعمت کا باعث ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم انس کے لیے دعا فرمائی: اللّٰهم اكثر ماله

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 5

وولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ۔ (1) اے اللہ! اس کے مال اور اولاد میں کثرت فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں برکت دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی تا کہ اس کثرت سے بچایا جائے جو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بندے کو اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں اپنی اولاد کی ہدایت اور دنیا و آخرت میں اس کی نجات کی دعا کرنی چاہیے تا کہ انبیاء علیہم السلام اور فضلاء و اولیاء کی اقتدا ہو جائے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَّرِثُنِیْ اہل حرمین، حسن، عاصم اور حمزہ نے یرثنی اور یرث دونوں کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یحییٰ بن یعمر، ابو عمرو اور یحییٰ بن وثاب، اعمش اور کسائی نے دونوں کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں وھب کا جواب نہیں ہیں، جیسا کہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے: ان تھبہ یرثنہ ویرث۔ معنی کے اعتبار سے پہلا قول زیادہ درست ہے کیونکہ انہوں نے موصوف وارث طلب کیا تھا یعنی تو مجھے ایسا ولی عطا فرما جو اس حالت اور صفت پر ہو کیونکہ ان میں بعض اولیاء وارث نہیں ہوتے۔ فرمایا: ھب لی الذی یکون وراثی۔ یعنی مجھے عطا فرما جو میرے پیچھے رہنے والا ہو؛ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے اور جزم کی قراءت کا رد کیا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے اگر تو مجھے عطا فرمائے تو تو اسے وارث بھی بنا وہ کیسے اللہ تعالیٰ کو اس کے متعلق خبر دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اس سے بہتر جانتا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ مشہور حجت ہے کیونکہ نحویوں کے نزدیک جواب امر میں شرط اور جزا کا معنی ہوتا ہے تو کہتا ہے: اطع اللہ ید خلک الجنۃ۔ یعنی ان تطعہ ید خلک الجنۃ۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے جنت میں داخل کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ نحاس نے کہا: یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کے معنی کے متعلق علماء کے تین جواب ہیں: بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نبوت کی وراثت ہے۔ بعض نے فرمایا: حکمت کی وراثت ہے۔ بعض نے فرمایا: مال کی وراثت ہے۔ رہا ان کا قول کہ نبوت کی وراثت ہے یہ محال ہے کیونکہ نبوت میں میراث نہیں چلتی۔ اگر اس میں میراث ہوتی تو کہنے والا کہتا: لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں جبکہ وہ نبی مرسل ہے۔ اور علم و حکمت کی میراث کا قول عمدہ ہے۔ حدیث میں ہے: العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علماء، انبیاء کے وارث ہیں۔ اور رہا مال کی وراثت کا قول تو یہ بھی ممتنع نہیں اگرچہ ایک جماعت نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لانورث ماترکنا صدقۃ۔ ہم میراث نہیں چھوڑتے جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ اس میں کوئی حجت نہیں کیونکہ ایک اپنے متعلق جمع کی اخبار کے ساتھ خبر دے رہا ہے کبھی اس کی اس معنی کے ساتھ تاویل کی جاتی ہے۔ لانورث الذی ترکنا صدقۃ۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز پیچھے نہیں چھوڑی جو آپ کی طرف سے بطور میراث ہوتی اور یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی میں آپ کے لیے اس قول: وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41) سے مباح فرمایا تھا کیونکہ لِلّٰهِ کا مطلب ہے سبیل اللہ۔ اور سبیل اللہ میں سے وہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحت میں تھا جب تک آپ ظاہری حیات میں تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض روایات میں ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول اللہ تبارک و تعالیٰ وصل علیھم، جلد 2، صفحہ 938

انا معاشر الانبیاء لانورث ماترکنا صدقۃ۔ اس میں دو تاویلیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ما بمعنی الذی ہے اور دوسرا یہ کہ جس کی یہ حالت ہو وہ میراث نہیں چھوڑتا۔ لانورث ماترکنا صدقۃ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے اور یہ اکثر علماء اور جمہور علماء کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میراث نہیں چھوڑی اور جو چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی میراث جاری نہیں ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ شان بخشی کہ آپ کا سارا مال صدقہ بنادیا آپ کی فضیلت میں زیادتی کے لیے جیسا کہ نکاح میں، بعض چیز آپ کے لیے مباح کی گئی ہیں جبکہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے حرام ہیں؛ یہ قول بعض اہل بصرہ کا ہے ان میں سے ایک ابن علیہ ہے اور باقی تمام علماء اسلام کا پہلا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یعقوب اسرائیل ہے۔ حضرت زکریا کی شادی مریم بنت عمران کی بہن سے ہوئی تھی اور اس کا نسب حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھی اور وہ یہودا بن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام ہارون کی اولاد سے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ، لاوی بن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ اور نبوت یعقوب بن اسحاق کی اولاد میں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں یعقوب سے مراد یعقوب بن ماتان ہے جو عمران بن ماتان کا بھائی تھا اور عمران حضرت مریم کا والد تھا۔ یہ دونوں حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی نسل سے دونوں بھائی تھے، کیونکہ یعقوب اور عمران، ماتان کے بیٹے تھے اور بنو ماتان بنی اسرائیل کے رؤسا تھے؛ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: آل یعقوب آپ کے ماموں تھے اور وہ یعقوب بن ماتان تھے اور ان میں بادشاہت تھی اور حضرت زکریا علیہ السلام حضرت ہارون بن عمران کی اولاد سے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے۔ قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یرحم اللہ تعالیٰ زکریا ماکان علیہ من ورثتہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام پر رحم فرمایا اس وجہ سے جو ان پر ان کے ورثاء کی طرف سے تھا۔ یعقوب غیر منصرف ہے کیونکہ عجمہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا۝ یعنی جس کے اخلاق اور افعال میں پسندیدگی ہو۔ بعض نے فرمایا: جو تیری قضاء وقدرت پر راضی ہو۔ بعض نے فرمایا: جو ایسا نیک ہو جس سے تو خوش ہو۔ ابو صالح نے کہا: اسے ایسا نبی بنا جیسے تو نے اس کے باپ کو نبی بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰزَكَرِيَّاۤ اس کلام میں حذف ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پھر فرمایا: يٰزَكَرِيَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسۡمُهٗ يَحۡيٰى یہ بشارت (1) تین چیزوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ (۱) ایک دعا کی قبولیت اور یہ ایک کرامت وعزت ہے۔ (۲) اسے بچہ عطا کرنا اور وہ قوۃ ہے۔ (۳) اس نام کے ساتھ ان کا منفرد ہونا۔ سورۂ آل عمران میں یحییٰ نام رکھنے کا معنی گزر چکا ہے۔ مقاتل نے کہا: ان کا نام یحییٰ رکھا کیونکہ وہ بوڑھے باپ اور بوڑھی ماں کے درمیان زندہ ہوئے۔ اس میں نظر ہے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ ان کی بیوی بانجھ تھی بچے جنم نہیں دیتی تھی واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 356

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۝ ہم نے یحییٰ سے پہلے کسی کا یہ نام نہیں رکھا(1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ ابن اسلم اور سدی کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا کہ کسی کے والدین کو یہ نام رکھنے کی توفیق نہیں دی؛ یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ سَمِيًّا اس کا معنی مثل اور نظیر ہے۔ یہ گویا السماماۃ اور السمو سے مشتق ہے۔ اس میں بعد ہے کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ پر انہیں فضیلت نہیں ہے مگر یہ کہ کسی خاص صفت میں فضیلت دی گئی ہو جیسے سرداری اور عورتوں سے اجتناب وغیرہ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے بانجھ عورتوں نے اس کی مثل بچہ جنم نہیں دیا(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قبل (پہلے) کی شرط لگائی کیونکہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے افضل پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اچھے ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ عرب اچھے نام رکھنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ عار اور شرم دلانے سے زیادہ پاک ہوتے ہیں حتیٰ کہ شاعر نے کہا:

سُنْخُ الأسامِي مُسْبِلِي أُزُرٍ　　حُمْرٍ تَمَسُّ الأرضَ بالهُدُبِ

رؤبہ نے نسابہ بکری کو کہا جبکہ اس نے اس کا نسب پوچھا تھا: أنا ابن العجاج۔ میں ابن العجاج ہوں۔ تو اس نے کہا: قَصَّرْتَ وعَرَّفْتَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ۔ یہ انکار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تعجب کی بنا پر ہے کہ وہ بانجھ عورت اور بوڑھے آدمی سے بچہ پیدا کرے گا۔ بعض علماء نے اس کے علاوہ بھی اقوال کہے ہیں جن کا بیان سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ یعنی بڑھاپے، خشکی کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں ان کی مثل العسی ہے۔ اصمعی نے کہا: عسا الشیٔ یعسو عسوا وعساء کا معنی ہے خشک ہونا اور سخت ہونا۔ وقد عسا الشیخ یعسو عُسِیا۔ اس کا معنی ہے پیٹھ پھیرنا حد سے بڑھنا جیسے عتا ہے۔ کہا جاتا ہے: عتا الشیخ یعتو عُتیا وعِتیا۔ اس کا معنی ہے وہ حد سے بڑھ گیا، پیٹھ پھیر گیا۔ عتوت یافلان تعتو عتواً وعِتیا۔ اس کی اصل عتو ہے کیونکہ یہ واوی ہے پھر واو کو یاء سے بدلا گیا ہے کیونکہ وہ اس سے زیادہ خفیف ہے اور تمام آیات یاء پر ختم ہو رہی ہیں اور جنہوں نے عِتیا کہا ہے انہوں نے کسرہ اور یاء کے ساتھ ضمہ کو ناپسند کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

انما يُعْذَرُ الوليد ولايُعْ　　ذَرُ مَنْ كان في الزَّمانِ عِتِيًّا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عُسیا پڑھا ہے۔ اسی طرح ابی کے مصحف میں ہے۔ یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور حفص نے عتیا عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح جثیا اور صلیا ہیں۔ جہاں بھی آئے ہیں۔ حفص نے بُکیا، کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح باقی قراء نے تمام میں ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: عتیا قسیا کے معنی میں ہے، کہا جاتا ہے: ملک عاتٍ جب بادشاہ سخت دل ہو۔

1۔ تفسیر طبری، ج 16-15، صفحہ 60　　2۔ ایضاً، ج 16-15، صفحہ 59

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ یعنی فرشتے نے حضرت زکریا علیہ السلام سے یہ کہا۔ لن محل رفع میں ہے یعنی الامر کذالك، یعنی معاملہ ایسا ہی ہے جیسا تجھے کہا گیا ہے۔ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے مجھ پر اس کی تخلیق آسان ہے۔ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ یعنی یحییٰ سے پہلے میں نے تجھے پیدا کیا تھا؛ یہ اہل مدینہ، بصرہ اور عاصم کی قرأت ہے۔ تمام کوفیوں نے وقد خلقناك پڑھا ہے۔ نا جمع تعظیم کے لیے ہے۔ پہلی قرأت کلام کے زیادہ مناسب ہے۔

وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ نے تجھے جس طرح عدم کے بعد پیدا کیا جبکہ تو موجود نہ تھا، وہ یحییٰ کی تخلیق اور ایجاد پر بھی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً۔ ملائکہ کے بشارت دینے کے بعد اور وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا کے قول کے بعد طمانیت میں زیادتی کے لیے نشانی طلب کی یعنی میرے لیے کوئی نشانی بنا کر نعمت کو مکمل کر۔ یہ نشانی نعمت وکرامت کی زیادتی ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے نشانی طلب کی جو اس بات پر دلالت کرے کہ بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے شیطان کی طرف سے نہیں ہے کیونکہ ابلیس نے ان کو وہم میں ڈالا تھا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ سدی کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ اس قول میں نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ملائکہ نے انہیں آواز دی جیسا کہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ اس کا بیان بھی آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ یعنی اپنی عبادت گاہ سے ان کی طرف جھانکا ہے۔ محراب بلند جگہ اور معزز مجلس ہوتی ہے۔ لوگ عبادت گاہیں زمین سے اونچی بناتے تھے۔ اس کی دلیل حضرت داؤد علیہ السلام کی محراب ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ لوگوں کا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ الحرب سے مشتق ہے گویا اس میں ہمیشہ رہنے والا شیطان اور شہوات سے جنگ کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الحرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) سے مشتق ہے گویا عبادت خانہ میں رہنے والا تھکن اور مشقت اٹھاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت دلیل ہے کہ امام کا مقتدیوں سے بلند ہونا ان کے نزدیک مشروع تھا۔ اس مسئلہ میں فقہاء الامصار کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل وغیرہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے منبر والے واقعہ سے دلیل پکڑی ہے۔ امام مالک نے زیادہ اونچا ہونے سے منع کیا ہے، تھوڑا اونچا ہونے سے نہیں منع کیا۔ اور ان کے اصحاب نے منع کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ امام پر تکبر کا اندیشہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے اس میں بہتر وہ ہے جو ابوداؤد نے ہمام سے روایت کیا ہے(1) کہ حذیفہ نے مدائن میں لوگوں کی امامت دکان پر کرائی تو ابومسعود نے ان کی قمیص سے پکڑ کر انہیں کھینچا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ لوگوں کو اس طرح کرنے سے روکا گیا ہے؟ حذیفہ نے کہا: ہاں۔ مجھے اس وقت یاد آیا جب تو نے مجھے کھینچا۔ اور عدی بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ حضرت عمار بن یاسر کے ساتھ مدائن میں تھا۔ نماز کے لیے تکبیر کہی گئی تو عمار بن یاسر آگے بڑھے اور دکان پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے جبکہ لوگ نیچے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الامام یکون مکان ارفع من مکان القوم، جلد 1، صفحہ 88

تھے۔ حضرت حذیفہ آگے بڑھے اور ان کے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ حضرت عمار ان کے پیچھے پیچھے چلتے آئے حتیٰ کہ حضرت حذیفہ نے انہیں اتار لیا۔ جب عمار نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت حذیفہ نے انہیں کہا: کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا: ''جب کوئی شخص قوم کی امامت کرائے تو ان کی جگہ سے بلند جگہ پر کھڑے نہ ہو(1)'' یا اسی جیسے کلمات فرمائے۔ حضرت عمار نے کہا: اسی وجہ سے میں تمہارے پیچھے پیچھے چلتا آیا جب تو نے میرے ہاتھوں کو پکڑا۔

میں کہتا ہوں: ان تینوں صحابہ نے بلند جگہ پر کھڑے ہونے کے بارے میں نہی کی خبر دی ہے۔ اور کسی نے حدیث منبر سے حجت نہیں پکڑی، تو یہ دلیل ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اور اس کے نسخ پر دلیل یہ ہے کہ اس میں عمل زائد ہے اور وہ منبر سے اترنا اور چڑھنا ہے پس یہ منسوخ ہے۔ جس طرح نماز میں کلام اور سلام منسوخ ہیں۔ یہ اولیٰ ہے اس سے ہمارے اصحاب نے دلیل پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ تکبر سے محفوظ تھے، نیز بہت سے آئمہ ایسے ہوتے ہیں جن میں کبر نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض نے یہ علت بیان کی ہے کہ منبر کی بلندی تھوڑی تھی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا** کلبی، قتادہ اور ابن منبہ نے کہا: اس نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے(2)۔ قتبی نے کہا: اس نے اشارہ کیا۔ مجاہد نے کہا: اس نے زمین پر لکھا۔ عکرمہ نے کہا: کتاب میں کئی کتب۔ کلام عرب میں وحی کا مطلب لکھنا ہے۔ اسی سے ذوالرمۃ کا قول ہے:

سوى الأربع الدُّهم اللواتي كأنها    بَقِيَّةُ وَحْيٍ في بطونِ الصحائِف

عنترہ نے کہا ہے:

كوَحيِ صحائفَ من عهد كسرى    فأهداها لِأعجم طِمْطِيِّ

ان دونوں اشعار میں وحی بمعنی کتابت استعمال ہوئی ہے۔

**بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا** دونوں ظرف ہیں۔ فراء نے کہا: العشی مؤنث ہے اور اس کی تذکیر جائز ہے جب تو اسے مبہم کرے۔ اس نے کہا: کبھی العشی، عشیۃ کی جمع ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ سورۂ آل عمران میں اشارہ میں حکم گزر چکا ہے۔ ہمارے علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کوئی کہے: میں فلاں سے کلام نہیں کروں گا، پھر اس کی طرف تحریر لکھ دے یا کوئی پیغام رساں بھیج دے۔ امام مالک نے فرمایا: ایسا کرنے سے وہ حانث ہو جائے گا مگر یہ کہ اس نے بالمشافہ گفتگو کرنے کی نیت کی ہو۔ پھر رجوع کیا اور فرمایا: تحریر میں نیت نہ ہوگی اور وہ حانث ہو جائے گا مگر یہ کہ خط پہنچنے سے پہلے واپس لے لے۔ ابن القاسم نے کہا: جب وہ اس تحریر کو پڑھے گا تو حانث ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر قسم اٹھانے والا محلوف علیہ (جس کے متعلق قسم اٹھائی گئی تھی) کی تحریر پڑھے تو بھی یہی حکم ہے۔ اشہب نے کہا: جب قسم اٹھانے والا اسے پڑھے گا تو حانث (قسم توڑنے والا) نہ ہوگا۔ یہ واضح ہے کیونکہ اس نے کلام

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الامام یکون مکان ارفع من مکان القوم، جلد 1، صفحہ 88

2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 64

نہیں کی اور نہ کلام سے ابتدا کی مگر یہ کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ وہ اس کی کلام کا معنی نہیں جانے گا تو اس صورت میں حانث ہو جائے گا۔ ابن القاسم کا قول اس پر محمول ہوگا اگر قسم اٹھائے کہ وہ ضرور اس سے کلام کرے گا پھر تو وہ اپنی قسم کو پورا نہیں کر سکے گا حتیٰ کہ بالمشافہ گفتگو کرے۔ ابن الماجشون نے کہا: اگر یہ قسم اٹھائے کہ اگر اس نے جانا تو وہ اسے سکھائے گا یا اسے خبر دے گا پھر اس نے اسے لکھ کر بھیج دیا یا کوئی پیغام رسان بھیج دیا تو وہ قسم پوری کرنے والا ہوگا۔ اور اگر دونوں نے اسے سکھایا تو قسم پوری کرنے والا نہیں ہوگا حتیٰ کہ وہ اسے سکھائے کیونکہ ان دونوں کا علم مختلف ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مالک، امام شافعی اور کوفیوں کا اتفاق ہے گونگا جب اپنے ہاتھ سے طلاق لکھے گا تو طلاق لازم ہو جائے گی۔ کوفیوں نے کہا: مگر کوئی شخص کئی دن بہرہ کیا گیا ہو پھر اس نے طلاق لکھی تو اس سے کوئی چیز جائز نہ ہوگی۔ طحاوی نے کہا: گونگا، عارضی بہرے پن کے مخالف ہے جیسا کہ مرض کی وجہ سے ایک دن جماع سے عارضی عاجز شخص کا حکم جماع سے ہمیشہ مایوس شخص کے حکم کے مخالف ہے، جیسا کہ جدائی میں عورت کے خیار کے باب میں مجنون کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ** اس کلام میں حذف ہے معنی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا بچہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مولود (یحییٰ) کو کہا: **یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ**۔ یہ اختصار ہے جس پر کلام دلالت کر رہی ہے۔ **الْكِتٰبَ** سے مراد تورات ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ **بِقُوَّةٍ** سے مراد کوشش اور اجتہاد ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے اس کا علم حاصل کرنا، اس کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اور یہ عمل کرنا ہے اس کے اوامر کا التزام ہے اور نواہی سے رکنا ہے؛ یہ زید بن اسلم کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا** بعض علماء نے فرمایا: **الْحُكْمَ** سے مراد احکام اور ان کی معرفت۔ ہے۔ معمر نے روایت کیا ہے کہ بچوں نے یحییٰ سے کہا: ہمارے ساتھ چلو ہم کھیلیں گے۔ انہوں نے کہا: میں کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: **وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا**۔ قتادہ نے کہا: آپ اس وقت دو یا تین سال کے تھے۔ مقاتل نے کہا: آپ تین سال کے تھے۔ صبیا پر نصب حال کی بنا پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے بالغ ہونے سے پہلے قرآن پڑھا وہ وہ ہے جسے بچپن میں حکم عطا کیا گیا(2)۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عمر کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: "قیامت کے روز آدم علیہ السلام کا ہر بیٹا آئے گا اور اس پر گناہ ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے"۔ قتادہ نے کہا: حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی چھوٹی اور بڑی نافرمانی نہیں کی (3)۔ اور نہ آپ کو کسی عورت کا خیال آیا۔ مجاہد نے کہا: حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کھانا، گھاس تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے لیے گزرگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ وسیداً وحصوراً کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا**، **حَنَانًا**، کا عطف الحکم پر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ الحنان کیا ہے (4)۔ جمہور مفسرین نے کہا: الحنان کا مطلب شفقت، الرحمة اور

---

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 65
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 7
3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 8
4۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 67

المحبۃ ہے اور یہ نفس کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ نحاس نے کہا: الحنان کے معنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول مروی ہیں (۱) فرمایا: اللہ تعالیٰ کا رحمت کے ساتھ ان پر مہربانی فرمانا (۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو اس نے لوگوں پر رحمت فرمائی حتی کہ انہیں کفر و شرک سے نکالا (1)۔ اس کی اصل حنین الناقة على ولدها یعنی اونٹنی کا اپنے بچے پر انتہائی مہربان ہونا، کہا جاتا ہے: حنانك وحنانيك بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں لغتیں ہیں اور معنی ایک ہے۔ بعض نے فرمایا: حنانيك، الحنان کا تثنیہ ہے ابوعبیدہ نے کہا: عرب کہتے ہیں: حنانك يارب وحنانيك يارب، دونوں کا معنی ایک ہے، مراد رحمت ہے۔ امرء القیس نے کہا:

وَيَمْنَعُهَا بَنُو شَمَجَى بن جَرْمٍ مَعِيزَ هُمُ حَنَانَكَ ذا الحَنَانِ

اور طرفہ نے کہا:

أبا مُنْذِرٍ أفْنَيْتَ فاستَبْقِ بَعْضَنا حَنَانَيْكَ بعضُ الشَّرِّ أهْوَنُ مِنْ بَعْضِ

زمخشری نے کہا: حنانا، اپنے والدین وغیرہما کے لیے رحمت و مہربانی اور شفقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ سیبویہ نے یہ شعر کہا:

فقالتْ حَنَانٌ ما أَتَى بك ها هُنا أذُو نَسَبٍ أم أنتَ بالحَيِّ عارِفُ

ابن الاعرابی نے کہا: الحنان، اللہ تعالیٰ کی صفت ہے نون مشدد کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الرحیم ہے اور نون مخفف ہو تو اس کا معنی مہربانی کرنا اور رحمت ہے۔ الحنان کا معنی رزق اور برکت بھی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: عرب کلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بڑے امر کو بھی کہتے ہیں اسی سے زید بن عمرو بن نفیل کا قول حدیث بلال میں ہے: اللہ کی قسم! اگر تم اس غلام کو قتل کر دو گے تو میں اس پر رحم کروں گا۔ اس خبر کو ہروی نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: حدیث بلال میں ہے ورقہ بن نوفل حضرت بلال کے پاس سے گزرے جبکہ انہیں عذاب دیا جا رہا تھا تو ورقہ نے کہا: واللہ لئن قتلتم لأتخذنه حناناً۔ ہروی نے کہا: اس کا معنی ہے میں اس پر مہربانی کروں گا اور اس پر رحم کروں گا کیونکہ یہ اہل جنت سے ہے۔

میں کہتا ہوں: الحنان کا معنی العطف ہے۔ اسی طرح مجاہد نے کہا: اور حناناً ہمارا اس کی طرف مائل ہونا یا اس کا مخلوق کی طرف کرم فرمانا ہے۔ حطیہ نے کہا:

تَحَنَّنْ علىَّ هَدَاكَ المليكُ فإنّ لكلِّ مقامٍ مَقَالا

عکرمہ نے کہا: اس کا معنی محبت ہے۔ حنة الرجل امرأته، کہا جاتا ہے، دونوں کی آپس میں محبت کی وجہ سے۔ شاعر نے کہا:

فقالت حَنَانٌ ماأتَى بك ههنا أذُو نَسَبٍ أمْ أنتَ بالحَيِّ عارِفُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَزَكٰوةً، الزکاۃ کا معنی تطہیر، برکت اور خیر اور نیکی میں زیادتی کرنا ہے، یعنی ہم نے اسے لوگوں کے لیے برکت والا بنا دیا ہے، وہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم نے اس کی تعریف کے ساتھ اس کا تزکیہ کیا ہے، جس طرح گواہ کسی انسان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ پس بعض علماء نے فرمایا: زَكٰوةً کا مطلب ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 7

کے والدین پر اس کو صدقہ کیا؛ یہ ابن قتیبہ کا قول ہے۔ وَ كَانَ تَقِيًّا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت کرنے والا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کوئی خطا کی اور نہ کبھی انہیں ایسا خیال آیا۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ، البر بمعنی البار ہے۔ نیکی کو فروغ دینے والا۔ جَبَّارًا، متکبر۔ یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نرمی اور تواضع کے اوصاف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ طبری وغیرہ نے کہا(1): اس کا معنی ہے امان۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک اظہر یہ ہے کہ یہ متعارف سلام ہے(2)۔ یہ امان سے زیادہ اشرف ومعزز مقام ہے کیونکہ امان کو ان کے لیے ان سے عصیان کی نفی سے بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ کم درجہ ہے اور شرف اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سلام بھیجا اور اسے ایسے موقع پر زندہ رکھا جہاں انسان حد درجہ ضعیف وکمزور اور حاجت میں ہوتا ہے اور حیلہ کم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قوت کی طرف محتاج ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے ہم نے اس کا معنی سورۂ سبحان میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے بیان میں سفیان بن عیینہ سے ذکر کیا ہے۔ طبری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام آپس میں ملے وہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کریں آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر سلام بھیجا ہے اور میں نے اپنے اوپر خود سلام بھیجا ہے۔ بعض علماء نے سلام کرنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا مسئلہ نکالا ہے فرمایا: انہوں نے اپنے اوپر سلام کرنے میں اور اللہ کی بارگاہ میں اپنی قدر ومنزلت میں راہنمائی کی ہے، جو منزلت ثابت ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ثابت کیا۔ اور قرآن حکیم میں سلام کیے جانے سے زیادہ بلند مرتبہ حکایت کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ہر ایک کی ایک وجہ ہے(3)۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ
دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ
بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا
زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾
فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ
يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ
جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 69 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 8 3۔ ایضاً

جَنِیًّا ۝ فَكُلِیۡ وَ اشۡرَبِیۡ وَ قَرِّیۡ عَیۡنًا ۚ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوۡلِیۡۤ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا ۝۲۶

''اور (اے حبیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہوگئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔ پس بنالیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرائیل کو پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں۔ مریم بولیں: میں پناہ مانگتی ہوں رحمن کی تجھ سے اگر تو پرہیزگار ہے۔ جبرئیل نے کہا: میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ مریم (حیرت سے) بولیں (اے بندہ خدا) کیونکر ہوسکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے اور نہ میں بدچلن ہوں۔ جبرئیل نے کہا: یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا: یوں بچہ دینا میرے لیے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنالیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لیے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پس وہ حاملہ ہوگئیں اس (بچہ) سے پھر وہ گئیں اسے (شکم میں) لیے کسی دور جگہ۔ پس لے آیا انہیں دردِ زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس (بصد حسرت ویاس) کہنے لگیں: کاش! میں مرگئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کردی گئی ہوتی۔ پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے: (اے مریم!) غمزدہ نہ ہو جاری کردی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی۔ اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں (میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے رحمن کے لیے (خاموشی کی) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذۡكُرۡ فِی الۡكِتٰبِ مَرۡیَمَ یہ قصہ کی ابتدا ہے اس کا پہلے واقعہ سے تعلق نہیں اور خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، یعنی دور ہوگئی۔ النبذ کا معنی پھینکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ (آل عمران: 187) مِنۡ اَهۡلِهَا، یعنی ان سے جو آپ کے ساتھ تھے۔ اذ، مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ اوقات اس پر مشتمل ہوتے ہیں جو ان میں ہوتا ہے۔ الانتباذ کا معنی جدا ہونا اور علیحدہ ہونا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت مریم کیوں جدا ہوئیں؟ سدی نے کہا: وہ علیحدہ ہوئیں تا کہ حیض اور نفاس سے پاک ہو جائیں۔ دوسرے علماء نے کہا: تا کہ اللہ کی عبادت کریں۔ یہ قول عمدہ ہے۔ حضرت مریم عبادت خانہ کی خدمت اور اس میں عبادت کرنے پر وقف تھیں اسی لیے وہ لوگوں سے جدا ہوئیں اور مشرقی جانب محراب میں داخل ہوئیں تا کہ خلوت میں عبادت کریں تو ان کے پاس جبرئیل آئے۔ مَكَانًا شَرۡقِیًّا، مشرقی جانب کی جگہ۔ الشرق راء کے سکون کے ساتھ اس مکان کو کہتے ہیں جس میں سورج کی دھوپ پڑتی ہے۔ الشرق راء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد سورج ہوتا ہے۔ مشرقی مکان کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ مشرقی جہت کی تعظیم کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ انوار طلوع ہوتے تھے۔ اور جہات شرقیہ ہر چیز سے افضل تھیں؛ یہ طبری نے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں (1) کہ نصاریٰ نے مشرق کو کیوں قبلہ بنایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۞ پس انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی جگہ کی جہت کو قبلہ بنالیا وہ کہتے تھے: اگر زمین کی کوئی جہت مشرق سے بہتر ہوتی تو حضرت مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس جہت میں جنم دیتیں۔

علماء کا حضرت مریم کی نبوت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس ارسال اور فرشتے سے گفتگو کی وجہ سے نبیہ تھیں۔ بعض نے فرمایا: نبیہ نہیں تھیں انسان کی مثال نے ان سے کلام کیا تھا اور ان کا فرشتے کو دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے جبرئیل کو دحیہ کلبی کی صفت میں دیکھا گیا تھا جب انہوں نے ایمان اور اسلام کے بارے میں سوال کیا تھا۔ پہلا قول اظہر ہے اس مفہوم پر کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا بعض علماء نے فرمایا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو اجساد سے پہلے پیدا فرمایا تھا اور حضرت عیسیٰ کا جسم جو حضرت مریم کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا تھا اس میں روح پھونکی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ روح کو اللہ کی طرف تخصیص اور کرامت کے لیے مضاف کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ جبرئیل علیہ السلام تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَمَثَّلَ لَهَا، یعنی فرشتہ مریم کے لیے انسانی شکل میں آیا۔ بَشَرًا، تفسیر یا حال ہے۔ سَوِيًّا، متوازا خلقت والا، چونکہ حضرت مریم، جبریل کو اصلی شکل میں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس لیے انسانی شکل میں آئے۔ جب حضرت مریم نے انسانی شکل میں ایک خوبصورت انسان دیکھا جس نے آپ پر قائم پردہ کو ہٹایا (اور اندر آ گیا) تھا تو آپ نے خیال کیا کہ یہ کوئی برائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ قَالَتْ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۞ یعنی میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ بکالی نے کہا: جبرئیل امین رحمن کے ذکر سے گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ ثعلبی نے کہا: وہ نیک شخص تھا تو حضرت مریم نے تعجب کی بنا پر پناہ مانگی۔ بعض نے فرمایا: تقی فعیل بمعنی مفعول ہے، یعنی تو ان لوگوں سے ہے جن سے بچا جاتا ہے۔ بخاری میں ہے ابووائل نے کہا: مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ متقی عقلمند ہوتا ہے جب انہوں نے کہا: اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا بعض نے فرمایا: تقی اس وقت میں معروف فاجر شخص کا نام ہے، یہ وہب بن منبہ کا قول ہے، مکی وغیرہ نے اس حکایت کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے اندازہ سے قول کیا گیا ہے (2)۔ جبرئیل نے حضرت مریم سے کہا: اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۞ عطا کرنے کی نسبت جبریل نے اپنی طرف کی کیونکہ اس عطیہ کی آگاہی جبریل کی طرف سے تھی۔ ورش نے نافع سے روایت کر کے لیھب لک پڑھا ہے۔ اس مفہوم پر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تاکہ وہ تجھے عطا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: لاهب اپنے معنی پر معمول ہے یعنی فرمایا میں نے اسے بھیجا تاکہ میں تجھے عطا کروں۔ اور أهب بغیر ہمزہ کے ہو تو احتمال رکھتا ہے کہ یہ بمعنی مہموز ہو پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہو جب حضرت مریم نے اس کے قول سے یہ سنا تو استفہام کے طریق پر کہا: قَالَتْ اَنّٰى

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 71　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 9

یَكُونُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ یعنی مجھ سے کسی کا نکاح نہیں ہوا، وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا۝ میں زانیہ نہیں ہوں۔ یہ آپ نے بطور تاکید ذکر کیا کیونکہ، لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ کا قول حلال اور حرام کو شامل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت مریم نے اللہ کی قدرت سے کسی چیز کو بعید نہیں سمجھا لیکن انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ بچہ کیسے پیدا کیا؟ یہ مستقبل میں خاوند کی طرف سے پیدا ہوگا یا اللہ تعالیٰ ابتداً اسے پیدا فرمائے گا؟ روایت ہے کہ جبرئیل نے جب حضرت مریم سے یہ بات کی تو آپ نے آپ کی قمیص کے گریبان میں اور آستین میں پھونک ماردی؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جبرئیل نے قمیص کی کشادہ جگہ کو اپنی انگلیوں سے پکڑا اور اس میں پھونک ماردی۔ پس حضرت مریم اسی وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوگئیں۔ طبری نے کہا: نصاریٰ نے کہا حضرت مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں تو ان کی عمر تیرہ سال تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے جانے تک بتیس سال اور کچھ دن باقی رہے اور حضرت مریم ان کے اٹھائے جانے کے بعد چھ سال باقی رہیں۔ حضرت مریم کی کل عمر پچاس سال سے کچھ زائد تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِنَجْعَلَهٗۤ یہ محذوف کے متعلق ہے یعنی نخلقه لنجعله، ہم اسے تخلیق کریں گے تاکہ اسے اپنی عجیب قدرت کی نشانی بنادیں۔ رَحْمَةً اور اس کے لیے رحمت بنادیں جوان پر ایمان لائے۔ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا۝ لوح محفوظ میں یہ مقدار اور مسطور ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا۝ یعنی وہ حمل کے ساتھ دور کے مکان میں جدا ہوگئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وادی کے دور کنارے پر یہ بیت لحم کی وادی ہے (1)۔ اس کے اور ایلیاء کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے وہ اس لیے دور چلی گئی تھیں کہ قوم انہیں عار دلائے گی کہ بغیر خاوند کے بچہ جنم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوا تھا پس وہ حاملہ ہوئی تھیں اور اسی وقت جنم دیا تھا، یہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حمل کے بعد پھینکنے کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ قول کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ، اجاءها کا معنی ہے اس نے اسے مجبور کرلیا (2)۔ جاء کو ہمزہ کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء به وأجاءه إلى موضع كذا، جیسے کہا جاتا ہے: ذهب به وأذهبه، شبیل، اور رویت نے عاصم سے فَاَجَآءَهَا مفاجات سے مشتق کرکے پڑھا ہے۔ زہیر نے کہا:

وجَارٍ سَارَ معتمداً إلينا　اَجَاءَتْهُ المخَافَةُ والرَّجَاءُ

جمہور علماء نے الْمَخَاضُ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے کہ انہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الْمَخَاضُ سے مراد دردزہ ہے۔ فخضت المرأة تمخض مَخاضا ومِخاضاً۔ ناقة ماخض، ایسی اونٹنی جس کے بچے کی پیدائش قریب ہو۔ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ، گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ساتھ سہارا لے اور اس سے متعلق ہو جیسے حاملہ عورت درد کی شدت کی وجہ سے کسی چیز کو پکڑتی ہے۔ الجذع، کھجور کے خشک تنا کو کہتے ہیں جو صحرا میں ہو اور اس پر پتے نہ ہوں اور نہ ٹہنی ہو اسی وجہ سے الی النخلة نہیں فرمایا۔ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا حضرت مریم نے دین کی جہت سے دو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 10　2۔ ایضاً

وجوہ کی بنا پر موت کی تمنا کی۔ ا۔ انہیں خوف ہوا کہ اس کے متعلق ان کے دین میں شر کا گمان کیا جائے گا اور عار دلائی جائے گی اور یہ چیز اسے فتنہ میں ڈال دے گی۔ ۲۔ تا کہ قوم ان کے سبب بہتان اور زنا کی طرف نسبت کرنے میں مبتلا نہ ہو کیونکہ یہ چیز مہلک ہے اس حد پر موت کی تمنا جائز ہے۔ یہ معنی سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: میں نے سنا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک شخص کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا نکل جا اے وہ جس کی الله تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے تو آپ اس وجہ سے پریشان ہوئیں۔ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ کلام عرب میں النسی کا معنی وہ حقیر شی ہے جس کی شان یہ ہو کہ وہ بھلائی جائے اور اس کے گم ہونے سے پریشانی نہ ہو جیسے کیل اور رسی جو مسافر کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ عربوں سے حکایت ہے کہ وہ جب ایک منزل سے کوچ کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو کہتے تھے: احفظوا أنساء کم۔ النساء، نسی کی جمع ہے اس سے مراد وہ حقیر چیز ہے جس سے غفلت کی جائے اور بھلائی جائے۔ اسی سے کیت کا قول ہے:

أتجعلُنا جِسْراً لكلب قُضاعةٌ ولسْتُ بِنِسْيٍ فی مَعَدٍّ ولا دَخْلِ

فراء نے کہا: النسی سے مراد وہ چیتھڑے ہیں جو عورت حیض کے خون سے ملوث کر کے پھینک دیتی ہے۔ نسیا نون کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الحَجراور الحِجر، الوَتراور الوِتر، محمد بن کعب قرظی نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسئاً، اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نوف بکالی نے نسئاً نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے نساء الله تعالى فی أجله سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے الله نے اس کی عمر میں تاخیر فرمائی۔ یہ ابوالفتح اور دانی نے محمد بن کعب سے حکایت کیا ہے۔ بکر بن حبیب نے نسّا، سین کی شد اور نون کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ طبری نے حضرت مریم کے قصص میں حکایت کیا ہے کہ جب حضرت مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں تو ان کی بہن حضرت یحییٰ کے ساتھ حاملہ ہوئیں۔ حضرت یحییٰ کی والدہ ان کی زیارت کے لیے آئی تو حضرت مریم نے اسے کہا: کیا تجھے معلوم ہے کہ میں حاملہ ہو گئی ہوں۔ آپ کی بہن نے کہا: میں محسوس کرتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ روایت ہے کہ اس نے اپنے جنین (پیٹ کا بچہ) کو محسوس کیا کہ وہ حضرت مریم کے بطن کی طرف اپنا سر جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا: اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔ مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ (آل عمران) ان کے قصص میں طبری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم بنی اسرائیل کے ایک شخص کے ساتھ بھاگ گئی تھیں اسے یوسف نجار کہا جاتا تھا وہ بھی حضرت مریم کے ساتھ مسجد کی خدمت کرتا تھا (1)۔ انہوں نے اس میں بڑی طویل گفتگو کی ہے۔ کلبی نے کہا: یوسف کو کہا گیا کہ مریم زنا کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہے (نعوذ باالله من ذالك القول) ابھی فرشتہ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو جبرئیل امین یوسف کے پاس آئے اور کہا: یہ روح القدس سے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام واقعات ضعیف ہیں۔ یہ قرآنی واقعہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم حاملہ ہوئیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 10

اور وہ عورتوں کے عرف پر حاملہ رہیں۔ روایات ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں کہ انہوں نے آٹھ ماہ کے بعد بچہ جنم دیا؛ یہ عکرمہ کا قول ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آٹھ ماہ کا بچہ زندہ نہیں رہتا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے نوماہ کے بعد بچہ جنم دیا، بعض نے کہا: چھ ماہ بعد جنم دیا۔ جو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ اصح اور اظہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ**، یہ میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مَنْ سے مراد جبرئیل ہے (1) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کلام نہ کی حتی کہ حضرت مریم اسے قوم کے پاس لے آئیں یہ علقمہ، ضحاک اور قتادہ کا قول ہے۔ اس میں حضرت مریم کے لیے نشانی اور علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے خارق للعادت امور میں کوئی مقصد عظیم ہوتا ہے۔ **اَلَّا تَحْزَنِيْ**، یہ ندا کی تفسیر ہے اور اَنْ مفسرہ بمعنی ای ہے معنی ہے کہ بچے کے جنم سے پریشان نہ ہو۔ **قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا** ﴿۲۴﴾ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ السری مردوں میں سے اسے کہتے ہیں جو عظیم خصال کا حامل ہو اور سردار ہو۔ حسن نے فرمایا: اللہ کی قسم! مردوں میں سے السری تھا یعنی سردار تھا۔ کہا جاتا ہے: سَرِیَ فلان علی فلان۔

جمہور علماء نے کہا: یہ اس نالی کی طرف اشارہ ہے جو کھجور کے تنا کے قریب تھی (2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: السری سے مراد نہر ہے جس کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے لیے اسے جاری فرما دیا۔ النهر کو سریا کہتے ہیں گویا اس کا پانی اس میں چلتا ہے جیسا شاعر نے کہا:

سَلْمٌ تَرَى الدَّالِيَ منه أَزْوَرَا　　إذا يَعُبُّ فى السَّرِيِّ هَرْهَرَا

لبید نے کہا:

فتَوَسَّطا عُرْضَ السَّرِيِّ وصَدَّعا　　مَسْجُورَةً مُتَجَاوِرًا قُلَّامُها

بعض علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم کو ندا دی حضرت مریم کے دل کی تسکین کے لیے یہ معجزہ اور نشانی تھی۔ پہلا قول اظہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے اسے فناداها ملك من تحتها، پڑھا ہے۔ علماء نے فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام اس جگہ سے پست جگہ پر تھے جس پر حضرت مریم موجود تھیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا** ﴿۲۵﴾ **فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا** اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَهُزِّيْٓ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو خشک کھجور کے تنا کو حرکت دینے کا حکم دیا تاکہ مردہ تنا کے احیا میں دوسری نشانی دیکھ لیں۔ بِجِذْعِ میں باء زائدہ موکدہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: خذ بالزمام وأعط بيدك۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ** (الحج: 15) یعنی فليمدد سبباً۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کھجور کے تنا پر جو تر کھجوریں ہیں انہیں اپنی طرف جھکاؤ۔ تُسٰقِطْ اصل میں تتساقط ہے تاء کو سین میں ادغام کیا گیا ہے۔ حمزہ نے تساقط پڑھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 11
2۔ تفسیر ثعلبی، جلد 2، صفحہ 324

ہے یعنی تخفیف کے ساتھ انہوں نے تا کو حذف کر دیا ہے جس کو دوسروں نے ادغام کیا ہے۔ عاصم نے حفص کی روایت میں تساقط تاء کے ضمہ کے ساتھ تخفیف اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں تا کے اظہار کے ساتھ تتساقط بھی پڑھا گیا ہے۔ یساقط یا اور تا کے ادغام کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ تسقط اور یسقط، تَسْقُطُ ویَسْقط تا کے ساتھ نخلة کی وجہ سے اور یا کے ساتھ جذع کی وجہ سے نو قراتیں ہیں ان کو زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ رُطَبًا، اس کو نصب هُزِّيْٓ کی وجہ سے ہے یعنی جب تو تنے کو حرکت دے گی تو اس کی حرکت سے تر کھجوروں کو حرکت دے گی۔ بہر حال رُطَبًا کی نصب میں قرأت کے معانی کے اعتبار سے اختلاف ہے کبھی فعل کو الجذع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور کبھی الهزء کی طرف، کبھی النخلة کی طرف اور جَنِيًّا اس کا معنی ہے جو پک چکی ہیں اور چننے کے قابل ہو چکی ہیں یہ جنیت الثمرۃ سے مشتق ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے تساقط علیك رطباً جنیا برنیا پڑھا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ مجاہد نے کہا: رُطَبًا جَنِيًّا وہ عجوہ کھجور تھی۔ حضرت عباس بن فضل نے کہا: میں نے ابو عمرو بن العلاء سے رطبا جنیا، کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور چننے والوں کے ہاتھوں سے دور نہیں ہوئی تھی یہ صحیح قول ہے۔ فراء نے کہا: الجنی والمجنی کا معنی ایک ہے؛ اس کا نظریہ یہ ہے کہ قتیل اور مقتول، جریح اور مجروح کی طرح ہے۔ فراء کے علاوہ علماء نے کہا: الجنی وہ کھجوریں جو ایک درخت سے کاٹی گئی ہوں اور اس مکان سے لی گئی ہو جہاں وہ پیدا ہوئیں بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

وطیب ثمارٍ فی ریاضٍ اَرِیضۃٍ　　واغصان اشجارٍ جَناها علی قُرْبِ

الجنی سے مراد وہ ہے جو چنی جاتی ہیں یعنی جو کاٹی جاتی ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: وہ تنا بالکل خشک تھا جب حضرت مریم نے اسے حرکت دی تو آپ نے تنے کے اوپر دیکھا وہاں سبز پتے ظاہر ہو چکے تھے پھر اس کے گابھے کو دیکھا جو ان ٹہنیوں اور پتوں سے نکل چکا تھا پھر سبز کھجوریں بنیں پھر آدھی پکی کچی کھجوریں بنیں پھر سرخ ہوئیں پھر پک گئیں پھر چھوارے کی شکل میں بن گئیں، اور یہ سب کچھ آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کھجوریں آپ کے سامنے گرتیں اور اس میں کوئی پھٹتی نہیں تھی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ رزق اگرچہ حتمی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے کوشش کو مقرر فرمایا ہے کیونکہ اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو تنے کو حرکت دینے کا حکم دیا تا کہ وہ نشانی دیکھ لے اور نشانی تب ہوتی جبکہ وہ اس کے حرکت دینے کے بغیر ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ رزق میں محنت کی تکلیف دینا، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں میں سنت ہے یہ توکل کے منافی نہیں بخلاف جاہل صوفیاء کے جو کہتے ہیں کہ محنت کرنا توکل کے خلاف ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے پہلے حضرت مریم کے پاس رزق بغیر تکسب و محنت کے آتا تھا جیسا کہ ارشاد فرمایا: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا جب حضرت مریم نے بچہ جنم دیا تو انہیں تنے کو حرکت دینے کا حکم دیا گیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: جب حضرت مریم کا دل فارغ تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تکسب سے فارغ کر دیا تھا جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا اور ان کا دل اس کی محبت سے معلق ہوا اور اس کی بات اور اس کے امر کے ساتھ ان کا باطن مشغول ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مریم کو کسب کی طرف متوجہ کر دیا اور اسے

عادت کی طرف لوٹا دیا کہ وہ اسباب کے ذریعے رزق دیتا ہے۔ طبری نے ابن زید سے حکایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا: لَا تَحْزَنِيْ تو پریشان نہ ہو۔ حضرت مریم نے کہا: میں کیسے فکرمند نہ ہوں جبکہ تو میرے ساتھ ہے؟ نہ میں خاوند والی ہوں نہ مملوکہ ہوں لوگوں کے سامنے میرا عذر کیا ہوگا؟ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا: میں کلام کر کے تمہاری طرف سے جواب دوں گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ربیع بن خثیم نے کہا: اس آیت کی وجہ سے میرے نزدیک بچہ جنم دینے والی عورتوں کے لیے کھجوروں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک بچہ جنم دینے والی عورتوں کے لیے کوئی اور چیز افضل ہوتی تو اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو وہی کھلاتا۔ اسی وجہ سے علماء نے فرمایا: اس وقت سے نفاس والی عورتوں کے لیے چھواروں کی عادت ہے اسی طرح گھٹی بھی کھجور سے دی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب بچہ جنم دینا مشکل ہو تو کھجور سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں اور مریض کے لیے شہد سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے کہا: امام مالک نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رُطَبًا جَنِيًّا، الجنی اس کھجور کو کہتے ہیں جو بغیر نقش اور فساد کے پکی ہوئی ہو۔ النقش یہ ہے کہ آدھی پکی آدھی کچی کھجور کو نیچے سے کانٹے مارنا تاکہ جلدی پک جائے۔ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ وقت سے پہلے کسی چیز کو جلدی تیار کرنا ہے ایسا کرنا کسی کے لیے مناسب نہیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو بیع کے لیے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا نہ اس کو پکانے کے لیے یہ جائز ہوگا۔ اس پر گفتگو سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ طلحہ بن سلیمان سے جنیا اتباع کے طور پر جیم کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے یعنی ہم نے نہر اور کھجور میں دو فائدے رکھے ہیں، ایک کھانا، پینا اور دوسرا دل کی تسلی کیونکہ یہ دونوں معجزے ہیں۔ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا، کا یہی مفہوم ہے یعنی کھجوروں سے کھاؤ، نہر سے پانی پیو اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ قَرِّيْ قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ جمہور کی قرات ہے۔ طبری نے قری کو قاف کے کسرہ کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ یہ محبد کی لغت ہے کہا جاتا ہے کہ قرعینا یقر ویقِر قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ أقر الله عينه فقرت، اللہ نے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا تو وہ ٹھنڈی ہوگئیں۔ یہ القر اور القرة سے ماخوذ ہے۔ دونوں کا معنی ٹھنڈا ہونا ہے۔ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں۔ ایک جماعت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: ہر آنسو گرم ہوتا ہے۔ أقر الله عينه کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ محبوب کے دیدار کے ساتھ تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے تاکہ وہ ٹھنڈی ہو اور سکون پائے۔ فلان قرة عيني یعنی فلان کے قرب سے میرے نفس کو سکون ملتا ہے۔ شیبانی نے کہا: قَرِّيْ عَيْنًا اس کا معنی ہے تو سوجا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو کھانے، پینے اور سونے پر ابھارا۔ ابوعمرو نے کہ: أقر الله عينه کا مطلب ہے اللہ نے اسے سُلا یا اور اس کے جاگنے کو ختم کر دیا۔ عَيْنًا پر نصب تمیز کے اعتبار سے ہے جیسے تیرا قول ہے: طب نفسا، حقیقت میں فعل آنکھ کے لیے تھا پھر اسے آنکھ والے کی طرف نقل کر دیا اور جو حقیقت میں فاعل تھا اسے تفسیر کی بنا پر نصب دی گئی مثلاً طب نفساً۔ تفقأت شحماً و تصببت عرقاً۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا تَرَيِنَّ اصل میں ترأیین تھا ہمزہ کو حذف کیا گیا جس طرح ترى سے ہمزہ حذف کیا گیا ہے۔ پھر اس کا فتحہ راء کی طرف نقل کیا گیا ہے تو یہ تریین بن گیا پھر پہلی یاء کو الف سے بدلا کیونکہ وہ متحرک ہے او راس کا ماقبل مفتوح ہے۔ پھر دو ساکن الف اور یاء تانیث جمع ہوئے تو التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا گیا تو ترین ہوا پھر جزم کی علامت کے طور پر نون کو حذف کیا گیا کیونکہ اِن حرف شرط اور ماصلة ہے۔ پس ترى رہ گیا۔ پھر نون ثقیلہ داخل ہوا تو التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء تانیث کو کسرہ دیا کیونکہ نون ثقیلہ دو نونوں کے قائم مقام ہوتا ہے اور پہلا نون ساکن ہے پس یہ ترین بن گیا۔ اس طریقہ پر ابن درید کا قول ہے:

أماترى رأسِي حَاكَى لونَهُ

اور الافوہ کا قول ہے:

إما تَرَيْ رأسي أَزْرَى به

اور یہاں ما کے توطئہ کے لیے نون داخل ہوا ہے جس طرح اس کے دخول کے لیے لام قسم بطور توطئہ داخل کیا جاتا ہے۔

طلحہ، ابو جعفر اور شیبہ نے ترین یاء کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ تخفیف سے پڑھا ہے۔ ابوالفتح نے کہا: یہ شاذ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ یہ جواب شرط ہے اور اس میں اضمار ہے یعنی تیرے بچے کے متعلق کوئی سوال کرے تو تو یہ کہہ کہ میں نے خاموشی کے روزے کی نذر مانی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک کا قول ہے (1)۔ حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں انی نذرتُ للرحمن صوماً صمتاً ہے۔ حضرت انس سے یہ بھی مروی ہے اور حضرت انس سے وصمتا واؤ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ لفظوں کا اختلاف دلالت کرتا ہے کہ ایک تفسیر کے لیے ذکر کیا گیا ہے نہ کہ قرأت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جب اس کے ساتھ واؤ ہو تو ممکن ہے کہ یہ روزے کے علاوہ ہو۔ محدثین اور لغات کے رواۃ سے جو روایات مروی ہیں وہ متفق ہیں کہ روزے سے مراد خاموشی ہے کیونکہ الصوم کا مطلب بھی امساک (رکنا) ہے اور الصمت کا معنی کلام سے روکنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصوم سے مراد روزہ ہی ہے اور ان لوگوں پر روزے کے دن خاموشی بھی لازم ہوتی تھی مگر اشارہ کے ساتھ کلام جائز تھا اس بنا پر حضرت انس کی قرأت وصمتاً واؤ کے ساتھ ہوگی۔ الصمت (خاموشی) ان کے نزدیک روزے میں نذر کے ساتھ لازم تھی جیسا کہ کسی نے ہم میں سے بیت اللہ کی طرف چلنے کی نذر مانی تو یہ حج یا عمرہ کے ساتھ احرام کا بھی مقتضی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کی زبان پر حضرت مریم کو حکم دیا یا ان کے بیٹے کی زبان پر انہیں حکم دیا جیسا کہ اختلاف گزر چکا ہے کہ انسان سے مخاطب ہونے سے رک جانا اور اپنے بیٹے کی طرف سوال کرنے والے کو پھیر دینا تا کہ وہ اس کی خجالت کو دور کرے۔ معجزہ ظاہر ہو اور حضرت مریم کا عذر قبول ہو۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت مریم کے لیے یہ الفاظ کہنا مباح کیا گیا تھا جو آیت کے اندر موجود ہیں؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا مطلب ہے تو اشارہ سے یہ کہہ نہ کہ کلام سے۔ زمخشری نے کہا: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ (سفیہ)

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 88

بیوقوف پر خاموش ہونا واجب ہے اور لوگوں میں سے ذلیل ترین وہ بیوقوف ہے جو بیوقوف کو نہ سمجھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نے نذر کے ساتھ یہ التزام کیا کہ وہ آدمیوں میں سے کسی سے بات نہیں کرے گا تو یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ قربت ہو اور نذر کے ساتھ لازم ہوئی ہو اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ ہماری شرع میں جائز نہیں کیونکہ اس میں نفس کی تعذیب اور تنگی ہے جیسے کوئی نذر مانے کہ وہ دھوپ میں کھڑا ہوگا۔ اس بنا پر خاموشی کی نذر اس شریعت میں تھی ہماری شریعت میں نہیں۔ یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے جس نے خاموشی کی نذر مانی تھی؛ حضرت ابن مسعود نے اسے کلام کرنے کا حکم دیا تھا اور ابو اسرائیل کی حدیث کی وجہ سے یہی صحیح ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ ابن زید اور سدی نے کہا: پہلے لوگوں کے نزدیک صیام (روزہ) رکھنے اور کلام کرنے سے رکنا تھا۔

میں کہتا ہوں: ہماری سنت سے ہے کہ ہم بھی روزے کی حالت میں قبیح کلام سے رک جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو وہ نہ بری بات کرے اور نہ جہالت کا کام کرے، اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو اسے اتنا کہنا چاہیے میں روزہ رکھے ہوئے ہوں'' (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو جھوٹی بات اور جھوٹ پر عمل کو نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں'' (2)۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ﴿۲۸﴾

''اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا: اے مریم! تو نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدچلن تھی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت مریم معجزات دیکھ کر مطمئن ہوگئیں اور انہیں یقین کامل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ان کا معذور ہونا ظاہر فرمائے گا تو اس مکان سے بچے کو اٹھا کر لے آئیں جس میں پہلے چلی گئی تھیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب سورج نکلا تھا تو آپ ان کے پاس سے چلی گئی تھیں اور ظہر کے وقت ان کے پاس واپس آئیں اور ساتھ بچہ بھی اٹھائے ہوئے تھیں۔ یہ حمل اور اس کی ولادت دن کی تین ساعتوں میں ہوئی تھی۔ کلبی نے کہا: آپ نے بچے کو وہاں جنم دیا جہاں کی قوم کو خبر نہ تھی، آپ نفاس کے چالیس دن ٹھہری رہیں پھر بچے کو اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں جب لوگوں نے آپ کو دیکھا اور آپ کے ساتھ بچے کو دیکھا تو وہ پریشان ہوئے اور ان کے گھر والے نیک لوگ تھے تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾ تو نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ بڑا کام جیسے کوئی ایسی چیز لانے والا جو اس نے خود گھڑی ہوتی ہے۔ مجاہد نے کہا: فَرِیًّا کا معنی عظیم ہے (3)۔ سعید بن سعدۃ نے کہا: ایسا کام جو گھڑا ہوا اور بناوٹی ہو، کہا جاتا ہے: فریت وافریت، دونوں کا معنی ایک ہے۔ زنا کا بچہ گھڑی ہوئی اور بناوٹی چیز کی طرح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، حفظ اللسان، جلد 1، صفحہ 363

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، من لم یدع قول الزور والعمل بہ، جلد 1، صفحہ 255

3۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 91

نے فرمایا: وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ (الممتحنہ:12)

یعنی بچے کو خاوند سے لاحق کرنے کا قصد کرنا جو اس خاوند سے نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: فلان یفری الفری، یعنی وہ ایسا کام کرتا ہے جو انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ ابوعبیدہ نے کہا: الفری، عجیب اور نادر چیز کو کہتے ہیں؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ فرمایا: فریا کا معنی ہے عجیب، الفری کا معنی کاٹنا بھی ہے گویا جو کام عادت کو ختم کرتا ہے یا عجیب اور نادر ہونے کی وجہ سے قول کو کاٹتا ہے۔ قطرب نے کہا: الفری نئے کام کو کہتے ہیں یعنی تو نے ایک نیا کام کیا ہے پہلے تو تو نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ابوحیوہ نے شیئا فریا، پڑھا ہے (یعنی راء کے سکون کے ساتھ) سدی اور وہب بن منبہ نے کہا: جب حضرت مریم بچہ اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں تو بنو اسرائیل میں یہ بات مشہور ہو گئی ان کے مرد اور عورتیں جمع ہوئے ایک عورت نے آپ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی اس طرف کو خشک کر دیا پس وہ اسے اسی طرح اٹھائے رہی۔ ایک اور شخص نے کہا: یہ تو زنا کارہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے گونگا کر دیا تو لوگ آپ کو مارنے سے رک گئے اور کوئی اذیت ناک کلمہ کہنے سے باز آ گئے اور وہ بڑے نرم انداز میں آہستہ سے یہ کہنے لگے: یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا۔ الراجز نے کہا:

قد أَطْعَمْتِنِي دَقَلًا حَوْلِيًّا مُسَوَّسًا مُدَوِّدًا حَجْرِيًّا

وكنتِ تفرِين بهِ الفرِيًّا(1)

یعنی تو اس کو بڑا سمجھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ اس اخوت کے معنی میں اختلاف ہے اور یہ ہارون کون ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی ہے، مراد یہ ہے کہ جس کو ہم عبادت میں ہارون کی مثل گمان کرتے تھے وہ ایسا فعل کرتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس بنا پر حضرت مریم حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کی اولاد سے تھی۔ پس اخوت کے ذریعے ان کی طرف منسوب کی گئی کیونکہ ان کی اولاد سے تھی جیسے تیمی کو کہا جاتا ہے: یا اخا تیم اور عربی کو کہا جاتا ہے: یا اخا العرب۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت مریم کا ایک باپ کی طرف سے بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا کیونکہ یہ نام بنی اسرائیل میں کثرت سے تھا لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کے نام کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے لیے ہارون نام رکھتے تھے اور بنی اسرائیل میں وہ ایک مثالی شخص تھا۔ بعض علماء نے کہا: ہارون یہ ایک اس زمانہ کا نیک صالح شخص تھا جس دن ان کا وصال ہوا اس کے جنازہ میں چالیس ہزار افراد آئے۔ تمام کا نام ہارون تھا۔ قتادہ نے کہا: اس زمانہ میں بنی اسرائیل میں ایک عابد شخص تھا جو صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھا اسے ہارون کہا جاتا تھا(2)۔ پس لوگوں نے حضرت مریم کو اس اخوت کی طرف منسوب کیا کیونکہ اس سے پہلے وہ ہارون کے طریقہ پر تھی کیونکہ وہ عبادت گاہ کی خدمت پر وقف تھی یعنی اے نیک صالحہ عورت! تیری شان کے لائق یہ عمل نہیں تھا۔ کعب احبار نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں کہا: حضرت مریم، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کی بہن نہیں تھی۔ حضرت عائشہ نے اسے کہا: تو نے غلط کہا ہے۔ کعب نے کہا: اے ام المومنین اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے تو آپ سب سے سچی خبر دینے والے ہیں ورنہ میں ان کے

1۔ تفسیر طبری، جز16، صفحہ 91

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

درمیان چھ سو سال کی مدت پاتا ہوں۔ فرمایا: یہ سن کر حضرت عائشہ خاموش ہو گئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے(1) فرمایا: جب میں نجران آیا تو لوگوں نے مجھ سے پوچھا انہوں نے کہا: تم پڑھتے ہو یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے۔ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے اس کے متعلق پوچھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ اپنے انبیاء اور گزرے ہوئے صالحین کے ناموں کے ساتھ نام رکھتے تھے"۔ غیر صحیح میں بعض طرق میں آیا ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مغیرہ سے کہا: تمہارا ساتھی گمان کرتا ہے کہ مریم، ہارون کی بہن ہے حالانکہ ان کے درمیان چھ سو سال کی مدت ہے۔ مغیرہ نے کہا: میں نہیں جانتا جو میں کہوں۔ آگے حدیث ذکر کی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک اسم، دوسرے اسم کے موافق ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے اسماء کے ساتھ نام رکھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں: حدیث صحیح دلالت کرتی ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور ہارون کے درمیان لمبا زمانہ تھا۔ زمخشری نے کہا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے درمیان ہزار سال یا اس سے زائد سالوں کا زمانہ تھا۔ پس یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت مریم، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی بہن تھی۔ اگر یہ صحیح ہو تو اس طرح ہو گا جیسا کہ سدی نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے قبیلہ کے شخص کو: یا اخا فلان، اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: إن أخا صُداء قد أذّن فمن أذّن فهو يُقيم (2)، صدائی نے آذان دی ہے۔ پس جو آذان دے وہی تکبیر کہے اور یہ پہلا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ایک جماعت نے کہا: اس زمانہ میں ایک فاجر شخص تھا اس کا نام ہارون تھا(3) پس انہوں نے عار دلانے اور زجر و توبیخ کرنے کی جہت سے اس کی طرف نسب کی ہے؛ طبری نے اس کا ذکر کیا ہے اور قائل کا نام ذکر نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں: غزنوی نے یہ سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ وہ فاسق شخص تھا اور فجور میں مثال تھا۔ پس اس کی طرف نسبت کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا باپ اور تیری والدہ اس فعل کے اہل نہ تھے تو نے یہ کیسے کیا؟ یہ تعریض ہے جو تصریح کے قائم مقام ہے۔ یہ ہمارے نزدیک حد کو ثابت کرتی ہے۔ مزید بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آخری قول کو حدیث صحیح رد کرتی ہے وہ نص صریح ہے پس کسی کے لیے کلام کی گنجائش نہیں اور اس پر کوئی غبار نہیں ہے۔ والحمد للہ۔ عمر بن لجا التیمی نے مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ پڑھا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۗ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝٢٩ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ
اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝٣٠ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ
وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝٣١ وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۠ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝٣٢ وَ السَّلٰمُ
عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝٣٣

"اس پر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے: ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن) بچہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 207
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، فی الرجل یؤذن و یقیم، جلد 1، صفحہ 76
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

ہے (اچانک) بچہ بول پڑا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھے خدمت گزار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت۔ اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اُٹھایا جائے گا زندہ کر کے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ حضرت مریم کو ترک کلام کا جو حکم دیا گیا تھا۔ آپ نے اسے لازم پکڑا۔ اس آیت میں وارد نہیں ہے کہ آپ نے اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا بول کر کہا تھا بلکہ یہ وارد ہے کہ آپ نے اشارہ فرمایا۔ پس یہ ان علماء کے قول کو تقویت دیتا ہے کہ (قول) کا جو امر آپ کو دیا گیا تھا اس سے مراد اشارہ ہے۔ روایت ہے کہ جب آپ نے بچے کی طرف اشارہ کیا تو لوگوں نے کہا: اس کا ہمارے ساتھ استخفاف اس کے زنا سے بھی ہم پر زیادہ سخت ہے۔ پھر انہوں نے تقریر و ثبوت کی جہت سے کہا: كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝، (1) اس آیت میں كَانَ سے مراد ماضی نہیں کیونکہ جو بھی مہد میں ہوتا ہے وہ بچہ ہی ہوتا ہے بلکہ یہ الآن (اب) کے معنی میں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: کان یہاں لغو ہے؛ جیسے شاعر نے کہا:

و جِیرانٍ لنا کانوا کِرامِ

بعض علماء نے فرمایا: کان یہاں وجود اور حدوث کے معنی میں ہے جیسے ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ (البقرہ: 280) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن انباری نے کہا: اسے زائدہ کہنا جائز نہیں کیونکہ صبیا کو اس نے نصب دی ہے اور کان بمعنی حدث ہونا تو کہتا ہے: وکان الحر، یعنی اس صورت میں صرف اسم ذکر ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مَنْ جزا کے معنی میں ہے یعنی شرطیہ ہے اور کان بمعنی یکن ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: من یکن فی المھد صبیا فکیف نکلمہ (جو پنگھوڑے میں کمسن بچہ ہے ہم اس سے کیسے بات کریں) جیسے تو کہتا ہے: کیف أعطی من کان لایقبل عطیۃ۔ میں اسے کیسے عطا کروں جو عطیہ قبول ہی نہیں کرتا یعنی: من یکن لایقبل کبھی ماضی، جزا میں مستقبل کے معنی میں ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الفرقان: 10) اس آیت میں اِنْ شَآءَ جَعَلَ کا معنی ان یشا یجعل ہے اور تو کہتا ہے: من کان إلی منہ إحسان کان إلیہ منی مثلہ، یعنی من یکن منہ إلی احسان یکن إلیہ منی مثلہ۔ جس کا مجھ پر احسان ہوگا اس پر میری طرف سے اس کی مثل احسان ہوگا۔ المھد بعض علماء نے فرمایا: وہ چار پائی پنگھوڑے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہاں المھد سے مراد ماں کی گود ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں کمسنی کی وجہ سے پنگھوڑے میں سونا جس کا معمول ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی باتیں سنیں تو آپ نے اپنی آرام گاہ میں لیٹے ہوئے کہا: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ الخ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 14

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے جب انہوں نے لوگوں کی باتیں سنیں تو دودھ پینا چھوڑ دیا اوران کی طرف متوجہ ہوئے اور بائیں طرف پر سہارا لیا اوران کی طرف اپنی دائیں سبابہ انگلی سے اشارہ کیا اور فرمایا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ سب سے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کے عبد ہونے کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا تا کہ ان لوگوں کا رد ہوجائے جو آپ کے بعد آپ کی شان میں غلو کرنے والے تھے۔ الکتاب سے مراد انجیل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بچپن کی حالت میں آپ کو کتاب عطا فرمائی تھی اوراس کا فہم اور علم بھی بخشا تھا اوراس وقت انہیں نبوت عطا فرمائی تھی جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے تھے۔ وہ اس وقت روزہ بھی رکھتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے۔ یہ انتہائی ضعیف قول ہے جیسا کہ ہم اس کے بعد مسئلہ میں بیان کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے ازل میں مجھے کتاب اور نبوت دینے کا حکم دیا تھا اگرچہ کتاب فی الحال نازل نہیں ہوئی تھی؛ یہ اصح قول ہے۔

وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا، برکت والا بنایا۔ دین میں نفع دینے والا، اس کی طرف بلانے والا، اوراس کی معرفت کی تعلیم دینے والا بنایا۔ تستری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ مجھے نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے منع کرنے والا اور گمراہوں کو راہ ہدایت دینے والا، مظلوم کی مدد کرنے والا اور مجبور کی معاونت کرنے والا بنایا۔ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ یعنی جب میں مکلف ہوں تو نماز اور زکوٰۃ ادا کروں جب میرے لیے ان کی ادائیگی ممکن ہو۔ یہ آخری صحیح قول کے مطابق ہے۔ مَا دُمْتُ حَیًّا، مَاظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے یعنی دوام حیاتی (جب تک میری زندگی ہے) وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ، فرمایا اور بوالدی نہیں فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کی طرف سے تھی۔

وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا اوراس نے مجھے جابر و متکبر نہیں بنایا جو غصہ میں آکر قتل کرتا ہے اور مارتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جبار وہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر کسی کا حق نہیں دیکھتا۔ شَقِیًّا خیر سے محروم، اس نے اس کا معنی نافرمان کیا ہے، بعض نے رب کا نافرمان معنی کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس نے مجھے اپنے حکم کا تارک نہیں بنایا کہ میں بدبخت ہوں جس طرح ابلیس اللہ کے حکم کو ترک کر کے بدبخت ہوا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے تحت فرمایا: یہ اہل القدر پر کتنی سخت ہے(1)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی خبر دی جو فیصلہ ہو چکا ہے اور جو ان کی وصال تک ہونے والا ہے۔ اس آیت کے قصص میں ابن زید سے روایت ہے کہ انہوں نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام سنا تو انہیں یقین ہو گیا۔ اور انہوں نے کہا: یہ کسی امر عظیم کی وجہ سے ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے طفولیت میں کلام کی تھی۔ یہ اس آیت سے ثابت ہے لیکن پھر بچوں کی حالت پر لوٹ گئے تھے حتی کہ انسانی عادت کے مطابق بچوں کی طرح بڑھے۔ آپ کا بولنا اپنی والدہ کی برأت کے لیے تھا نہ کہ وہ اس حالت میں یہ شعور رکھتے تھے وہ اس طرح بولے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعضاء انسانی کو قوت گویائی بخشے گا یہ منقول نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ بولتے رہے۔ اور نہ وہ نماز پڑھتے تھے جب وہ ایک دن یا ایک مہینہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 15

تھے۔ اگر وہ اس بچپن میں متواتر بولتے رہتے اور تسبیح و نصیحت اور نماز پڑھتے رہتے تو یہ چیز پوشیدہ نہ ہوتی۔ یہ تمام چیزیں پہلے قول کے فساد پر دلیل ہیں اور قائل کی جہالت پر صریح ہیں اور یہ بھی دلیل ہے کہ آپ پنگھوڑے میں بولے تھے، جبکہ یہود و نصاریٰ کا قول اس کے مخالف ہے۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ نماز، روزہ، والدین کی خدمت گزاری پہلی امتوں پر بھی واجب تھیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کا حکم ثابت رہا اور آپ کی شریعت میں یہ حکم منسوخ نہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی متواضع تھے درختوں کے پتے کھاتے تھے اور بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتے تھے اور مٹی پر بیٹھتے تھے اور جہاں رات ہو جاتی وہیں رہ جاتے تھے۔ آپ کا کوئی خاص مسکن نہ تھا۔ صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وسلم۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ کوفیوں نے کہا: گونگے کا قذف اور لعان صحیح نہیں ہے اس کی مثل شعبی سے بھی مروی ہے۔ امام اوزاعی، امام احمد اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ ان علماء کے نزدیک قذف صریح زنا کے لفظ سے صحیح ہے اور اس کے معنی سے۔ اور گونگے سے ضرورۃً قذف صحیح نہیں ہے، پس وہ قاذف نہ ہوگا۔ اشارہ کے ساتھ زنا، حلال اور شبہ وطی سے ممتاز نہیں ہوتا۔ نیز یہ علماء کہتے ہیں: لعان ہمارے نزدیک شہادت ہیں اور گونگے کی شہادت بالا جماع مقبول نہیں ہے۔ ابن القصار نے کہا: ان علماء کا یہ قول ہے کہ قذف صرف صریح زنا سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ تمام زبانوں کے اعتبار سے باطل ہے سوائے عربی زبان کے۔ اسی طرح گونگے کا اشارہ ہے اور انہوں نے جو اجماع ذکر کیا ہے کہ گونگے کی شہادت کے عدم قبولیت پر اجماع ہے یہ بھی غلط ہے۔ امام مالک کی نص موجود ہے کہ ان کے اشارہ کو سمجھا جاتا ہو تو اس کی شہادت مقبول ہے اس کا اشارہ لفظ کے ساتھ شہادت دینے کے قائم مقام ہوگا۔ رہا یہ کہ لفظ پر قدرت ہو تو پھر لفظ کے ساتھ ہی شہادت واقع ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: مخالفین گونگے کی طلاق، بیع اور باقی تمام احکام لازم کرتے ہیں، پس قذف بھی اس کی مثل ہونا چاہیے۔ مہلب نے کہا: بہت سے فقہی ابواب میں اشارہ کلام سے قوی ہوتا ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت أنا والساعة کھاتین، میں اور قیامت ان دو انگلوں کی طرح قریب قریب مبعوث کیے گئے ہیں۔ ہم ان دو انگلیوں کے درمیان جو قرب ہے اسے وسطی انگلی کی سبابہ پر زیادتی کی مقدار سے جانتے ہیں۔ دانشوروں کا اجماع ہے کہ عیان (مشاہدہ) خبر سے اقویٰ ہوتا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ اشارہ بعض مواقع پر کلام سے قوی ہوتا ہے۔

**وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ**، اللہ کی طرف سے مجھ پر سلام ہو۔ زجاج نے کہا: اس سے پہلے سلام کا لفظ الف، لام کے بغیر ذکر کیا گیا تھا پس دوبارہ الف، لام کے ساتھ ذکر کرنا بہتر تھا۔ **یَوْمَ وُلِدْتُّ** یعنی دنیا میں۔ بعض نے فرمایا: شیطان کے وسوسہ سے۔ یہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ **وَیَوْمَ اَمُوْتُ** یعنی قبر میں۔ **وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا** یعنی آخرت میں، کیونکہ آپ کے تین احوال تھے: دنیا میں زندہ رہنا، قبر میں مردہ ہونا، آخرت میں اٹھنا۔ تو آپ نے تمام حالات میں سلامتی بھیجی؛ یہ کلبی کے قول کا معنی ہے پھر آپ کا کلام پنگھوڑے میں ختم ہو گیا حتی کہ اس عمر کو پہنچے جس میں عام بچے بولتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک عورت نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر زمانہ میں مُردوں کو زندہ کرتے ہیں (1)، اندھوں اور برص کے

---

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 97

مریضوں کو درست کرتے ہیں تو اس نے کہا: مبارک ہو اس بطن کو جس نے تجھے اٹھائے رکھا اور مبارک ہو اس سینے کو جس نے تجھے دودھ پلایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا: مبارک ہو اسے جس نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور اس کی پیروی کی جو کتاب اللہ میں تھا اور کتاب اللہ پر عمل کیا۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهُ ۚ إِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ وَإِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلٰلٍ مُبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ ۘ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

”یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لیے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے پس ہلاکت ہے کفار کے لیے اس دن کی حاضری سے جس دن آئیں گے ہمارے پاس لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں۔ اور اے نبی کریم! آپ ڈرایئے انہیں حسرت وندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔ یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ یعنی یہ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ عیسیٰ ابن مریم ہے پس اسی طرح تم اس پر اعتقاد رکھو نہ اس طرح کہو جس طرح یہود کہتے ہیں کیونکہ وہ درست نہیں ہے وہ کہتے ہیں: یہ یوسف نجار کا بیٹا ہے اور اس طرح بھی تم نہ کہو جس طرح نصاریٰ نے کہا: وہ الہ ہے اور الہ کا بیٹا ہے۔ قَوْلَ الْحَقِّ کسائی نے کہا: یہ عیسیٰ کی نعت ہے یعنی ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ حضرت عیسیٰ کو قول الحق کہا گیا جس طرح انہیں کلمۃ اللہ کہا گیا (1)۔ الحق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس کا معنی ہے ھو قول الحق۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ھذا الکلام قول الحق، حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام قول حق ہے، باطل نہیں ہے، قول کو الحق کی طرف اس طرح مضاف کیا گیا ہے جس طرح اس آیت میں ہے: وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾ (الاحقاف) یعنی الوعد الصدق، اور فرمایا: وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (یوسف: 109) یعنی الدار الآخرۃ، یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 509

ہے۔ عاصم اور عبداللہ بن عامر نے قول الحق حال کی بنا پر منصوب پڑھا ہے، یعنی أقول قولاً حقا، ذالك میں اشارہ کا معنی اس میں عامل ہے۔ زجاج نے کہا: یہ مصدر ہے یعنی أقول قول الحق، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: مدح کی بنا پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: اغرا کی بنا پر منصوب ہے۔ عبداللہ نے قالُ الحق پڑھا ہے۔ حسن نے قُولُ الحقِ، قاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح سورۂ انعام میں قوله الحق کو پڑھا ہے۔ القَول، القَالُ، القُولُ تمام کا ایک معنی ہے جیسے الرَّهَبُ الرُّهَبُ کا معنی ایک ہے۔ الذی، عیسیٰ کی صفت ہے۔ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ، شک کرتے ہیں یعنی عیسیٰ بن مریم جس میں یہ شک کرتے ہیں۔ سچا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: يَمْتَرُوْنَ کا معنی اختلاف کرتے ہیں۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ کے متعلق بتایا کہ بنواسرائیل جمع ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے میں سے چار افراد نکالے ہر قوم نے اپنا عالم نکالا پس وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اختلاف کرنے لگے جب وہ اٹھائے گئے۔ ایک نے کہا: وہ اللہ تھا وہ زمین پر اُترا، اسے زندہ کیا جسے زندہ کیا اور اسے موت دی جسے موت دی پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا۔ یہ گروہ یعقوبیہ تھا۔ دوسرے تینوں نے کہا: تم نے جھوٹ کہا ہے پھر ان میں سے دو نے تیسرے شخص سے کہا: تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے بات کر، اس نے کہا: وہ اللہ کا بیٹا ہے؛ یہ گروہ نسطوریہ ہے۔ پھر دوسروں نے کہا: تو نے غلط کہا ہے، پھر دو میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: تو بات کر، اس نے کہا: تین میں سے تیسرا تھا، اللہ الٰہ ہے، عیسیٰ بھی الٰہ ہے اور اس کی والدہ بھی الٰہ ہے؛ یہ گروہ اسرائیلیہ ہے جو نصاریٰ کے ملوک ہیں۔ چوتھے نے کہا: تو نے غلط کہا ہے بلکہ وہ الٰہ کا بندہ اور اس کا رسول، اس کی روح، اس کا کلمہ ہے؛ یہ مسلمان ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک کے متبعین ہیں جیسا کہ انہوں نے فرمایا: وہ آپس میں لڑے تو مسلمانوں پر غلبہ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ (آل عمران: 21) سے یہی مراد ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں (1) جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ، انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور وہ کئی گروہ بن گئے۔ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ کا یہی معنی ہے۔ ابوعبدالرحمن سلمی کی قرات تمترون (تاء کے ساتھ ہے) حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت مریم کے چچا کا بیٹا حضرت مریم اور ان کے بیٹے کو لیکر مصر کی طرف چلا گیا اور وہ اس میں بارہ سال رہے حتیٰ کہ وہ بادشاہ مر گیا جس سے وہ خوف کرتے تھے؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: مصر کی تاریخ میں واقع ہے جو میں نے دیکھی ہے اور انجیل میں بھی آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیت لحم میں ہوئی تھی اور اس وقت هیرودس بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف نجار کو خواب میں وحی فرمائی اور اسے فرمایا: اُٹھ اور اس بچے اور اس کی والدہ کو لیکر مصر کی طرف چلا جا اور وہاں رہ حتیٰ کہ میں تجھے کہوں کیونکہ هیرودس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تلاش کرنے کا پختہ ارادہ کیا ہوا تھا تاکہ اسے ہلاک کر دے پس یوسف خواب سے بیدار ہوا اور اپنے رب کے حکم کی پیروی کی انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور مریم ان کی والدہ کو ساتھ لیا اور مصر میں آ گیا مصر آتے وقت وہ بلسان کے کنویں پر اترا جو قاہرہ کی زمین میں تھا۔

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 100

حضرت مریم نے اس کنویں پر کپڑے دھوئے بلسان ایسی جگہ ہے جہاں کوئی چیز نہیں اگتی سوائے اس جگہ کے (جہاں حضرت مریم نے کپڑے دھوئے تھے) اسی جگہ سے وہ تیل نکلتا ہے جو اس زیتون سے ملایا جاتا ہے جس کا نصاریٰ قصد کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے مصریوں میں اس تیل کی ایک بوتل کی بہت بڑی قیمت ہے۔ یہ تیل نصاریٰ کے بادشاہوں ملک قسطنطنیہ، ملک صقلیہ، ملک حبشہ، ملک النوبہ، ملک الفرنجہ اور دوسرے بادشاہوں کو جب مصر کے بادشاہ ہدیہ بھیجتے ہیں تو ان کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ہر تحفہ سے زیادہ یہ تحفہ محبوب ہوتا ہے۔ اس سفر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اشمونین اور فسقام (جواب المحرقۃ کے نام سے معروف ہے) کے شہروں میں گئے۔ اسی وجہ سے اب بھی نصاریٰ ان شہروں کی تعظیم کرتے ہیں اور عید الفصح میں ہر جگہ سے ان شہروں کی طرف آتے ہیں کیونکہ یہ انتہا ہے مصر کی زمین کی جہاں مسیح علیہ السلام پہنچے تھے اور یہاں سے شام کی طرف لوٹے تھے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ یعنی الله کے لیے زیبا نہیں۔ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ مِنْ کلام کے لیے صلہ ہے یعنی ان یتخذ ولداً۔ اَنْ، کَانَ کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی کسی کو بیٹا بنانا اسکی صفت سے نہیں۔ پھر الله تعالیٰ نے ان کی بات سے اپنی ذات کو منزہ و مبرا فرمایا (سبحانہٗ) وہ کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہے۔ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۝ اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ، اہل مدینہ، ابن کثیر اور ابوعمرو نے اَنَّ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اہل کوفہ نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ نئی کلام ہے۔ اس پر دلیل ابی کی قرأت ہے كُنْ فَیَكُوْنُ۝ اِنَّ اللّٰهَ یعنی بغیر واو کے اور انہوں نے قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ پر عطف کیا ہے۔ اور ہمزہ کے فتحہ کی صورت میں کئی اقوال ہیں۔ خلیل اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے ولان الله ربی و ربکم اور اسی طرح وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (الجن:18) ان دونوں نحویوں کے نزدیک اَنَّ محل نصب میں ہے۔ اور فراء نے لام کے حذف کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی جائز قرار دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے بھی محل جر میں ہونا جائز قرار دیا ہے کہ یہ اس مفہوم میں ہو وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا و بان الله ربی و ربکم، اور کسائی نے محل رفع میں ہونا بھی جائز قرار دیا ہے کہ یہ اس معنی میں ہوگا والامر ان الله ربی و ربکم، اس میں پانچواں قول بھی ہے۔ ابوعبیدہ نے حکایت کیا ہے کہ ابوعمرو بن العلاء نے یہ کہا ہے کہ یہ اس معنی میں ہوگا وقضیٰ ان الله ربی و ربکم اور یہ امراً پر عطف ہے جو اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا کے قول سے ہے۔ معنی یہ ہوگا اذا قضیٰ امراً و قضیٰ أن الله۔ اس تقدیر پر اور تیسری تقدیر پر ان کے ساتھ ابتدا جائز نہ ہوگی اور باقی وجوہ پر ان کے ساتھ ابتدا جائز ہوگا۔

فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۝ یعنی دین مستقیم جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ، مِنْ زائدہ ہے یعنی اختلف الأحزاب بینھم، قتادہ نے کہا: یعنی جو ان کے درمیان اختلاف تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اہل کتاب کے فرقوں میں اختلاف تھا۔ یہود قدح کرتے اور جادو کا الزام لگاتے۔ نصاریٰ میں سے نسطور یہ کہتے: وہ الله کا بیٹا ہے۔ ملکانیہ نے کہا: تین میں سے تیسرا ہے۔ یعقوبیہ نے کہا: وہ الله ہے۔ نصاریٰ نے افراط اور غلو کیا اور یہود نے تفریط اور کوتاہی کی۔ یہ بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: الْاَحْزَابُ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گروہ در گروہ آئے تھے اور مشرکین میں سے جنہوں نے آپ کو جھٹلایا تھا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ⊙، مَّشْهَدِ سے مراد قیامت کے دن کی حاضری ہے۔ مشھد بمعنی مصدر ہے۔ الشھود کا معنی الحضور ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الحضور لھم کے معنی میں ہو اور ظرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ اس دن میں حاضری کا وقوع ہے جیسے کہا جاتا ہے: ویل لفلان من قتال یوم کذا، یعنی من حضورہ ذالك الیوم۔ بعض علماء نے فرمایا: المشھد سے مراد وہ جگہ ہے جہاں لوگ حاضر ہوں گے جیسے محشر وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہلاکت ہے کافروں کے لیے اس مشہد میں حاضر ہونے کی وجہ سے جس میں وہ مشورہ کے لیے جمع ہوئے پھر الله تعالیٰ کا انکار کرنے پر اتفاق کیا اور اس قول پر اجماع کیا کہ الله تین میں سے تیسرا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا، ابو العباس نے کہا: عرب یہ صیغے تعجب کی جگہ استعمال کرتے ہیں تو کہتا ہے: أسمع بزید و أبصر بزید زید کتنا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نبی کو ان پر متعجب کیا۔ کلبی نے کہا: کوئی ان سے زیادہ قیامت کے دن سننے اور دیکھنے والا نہ ہوگا جب الله تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا: ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ (المائدہ: 16) بعض علماء نے فرمایا: أَسْمِعْ کا معنی ہے اس دن وہ الله تعالیٰ کی کتنی زیادہ اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ⊙ یعنی دنیا میں ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔ اس سے زیادہ کھلی گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی اپنے جیسے شخص کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے وہ خدا ہے جبکہ اسے رحم نے اٹھایا، اس نے کھایا، پیا، حدث کیا اور محتاج ہوا۔ اسی گمراہی کی بنا پر فرمایا: وہ بہرہ اور اندھا ہے لیکن آخرت میں دیکھے گا اور سنے گا جب عذاب کو دیکھے گا لیکن اس وقت کا سننا اور دیکھنا مفید نہ ہوگا۔ یہ مفہوم قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ، حضرت عبد الله بن مسعود سے مروی ہے فرمایا: جو بھی دوزخ میں داخل ہوگا اس کے لیے جنت میں بھی گھر ہوگا پس وہ اس پر حسرت و افسوس کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت حسرت کرے گا جب نامہ اعمال اسے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ، یعنی حساب مکمل ہو جائے گا۔ اہل جنت، جنت میں اور اہل نار آگ میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے(1) فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوں گے تو قیامت کے روز موت کو لایا جائے گا گویا وہ چتکبرا مینڈھا ہے، پس اسے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ کہا جائے گا: اے اہل جنت! کیا تم اسے جانتے ہو؟ پس وہ اپنی گردنیں لمبی کر کے دیکھیں گے اور وہ کہیں گے: ہاں یہ موت ہے“۔ فرمایا: ”پھر کہا جائے گا: اے دوزخیو! کیا تم اسے جانتے ہو وہ گردنیں لمبی کر کے دیکھیں گے اور کہیں گے: ہاں یہ موت ہے“۔ فرمایا: ”پھر اسے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے گا تو وہ ذبح کر دی جائے گی پھر کہا جائے گا: اے جنتیو! تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے اب موت نہیں ہے اور (کہا جائے گا) اے دوزخیو! تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے اب موت نہیں ہے“۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی: وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⊙ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابن عمر

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، ماجاء فی خلود اهل الجنۃ و اهل النار، جلد 2، صفحہ 99

سے، ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے ترمذی نے حضرت ابوسعید سے مرفوع روایت کی ہے(1) اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ہم نے یہ اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے اور وہاں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ ان احادیث اور آیات کی وجہ سے کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ہم نے ان کے قول کا رد کیا ہے جو کہتے ہیں کہ غضب کی صفت ختم ہو جائے گی۔ ابلیس اور پیروکار کفار جیسے فرعون، ھامان، قارون اور ان کے مشابہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا یعنی ہم زمین کے رہنے والوں کو موت دیں گے اور ہم اس کے وارث ہوں گے۔ وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ۠ قیامت کے روز ہم ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دیں گے۔ یہ مفہوم سورۃ الحجر وغیرہا میں گزر چکا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۝ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا۝ وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۝

''اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست باز نبی تھا۔ جب انہوں نے کہا: اپنے باپ سے کہ اے میرے باپ! تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ تجھے فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اے میرے باپ! بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لیے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ اے باپ! شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدائے) رحمٰن کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔ باپ نے کہا: کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ۔ ابراہیم نے (جواب میں) کہا: سلام ہو تم پر میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے، بیشک وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے۔ اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد باب صفۃ النار، حدیث نمبر 4317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔ پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔ اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں) اور ہم نے ان کے لیے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ یعنی وہ کتاب جو آپ پر نازل کی گئی اس میں حضرت ابراہیم کے واقعہ کا ذکر کریں۔ الصدیق کا معنی سورۂ نساء میں گزر چکا ہے اور الصدق کا اشتقاق سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ آیت کا معنی ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں حضرت ابراہیم کے مکالمہ کا ذکر ان پر پڑھیے یہ جان چکے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے ہیں وہ حنیف مسلم تھے اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل نہیں بناتے تھے یہ کیوں اللہ کے مدمقابل بناتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (البقرہ:130)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ، ابیہ سے مراد آزر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ يٰۤاَبَتِ، سورۂ یوسف میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ لِمَ تَعْبُدُ کس وجہ سے آپ عبادت کرتے ہیں۔ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ تجھے کچھ فائدہ دیتے ہیں۔ اس سے مراد بت ہیں۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ یعنی اللہ کی معرفت اور یقین اور جو موت کے بعد ہونا ہے اور جس نے غیر اللہ کی عبادت کی اسے عذاب دیا جائے گا۔ فَاتَّبِعْنِيْۤ اس کی اتباع کرو جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ میں تمہاری دین مستقیم کی طرف راہنمائی کروں گا جس میں نجات ہے۔ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ وہ جو تمہیں کفر کا حکم دیتا ہے اس کی طاعت نہ کرو جس نے کسی معصیت میں شیطان کی اطاعت کی اس نے اس کی عبادت کی۔ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ کان صلة (زائدہ) ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: کان بمعنی صار ہے۔ بعض نے فرمایا: حال کے معنی میں ہے یعنی ھو للرحمن، عصیا اور عاص دونوں کا ایک معنی ہے؛ یہ کسائی کا قول ہے۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ اگر تو اس عقیدہ پر مر گیا جس پر تو اب ہے تو میں جانتا ہوں کہ رحمن کی طرف سے تجھے عذاب ملے گا۔ اور اخاف بمعنی اعلم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اپنے معنی میں ہو معنی یہ ہو کہ مجھے ڈر ہے کہ تو کفر پر مرے گا پھر تجھے عذاب ہوگا۔ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ آگ میں ساتھی ہوگا۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ کیا تو ان بتوں کو چھوڑ کر دوسرے کسی خدا کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ، حسین نے کہا: اس کا معنی ہے میں تجھے پتھروں سے ماروں گا۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد ہے میں تجھے گالی دوں گا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا مطلب ہے میں تجھے سزا دوں گا۔ بعض نے کہا: اس کا معنی ہے میں تیرا معاملہ ظاہر کر دوں گا۔ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عزت بچا کر مجھ سے الگ ہو جا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طرف سے تجھے کوئی فساد پہنچے، طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس مفہوم پر مَلِيًّا، ابراہیم سے حال ہوگا۔ حسن اور مجاہد نے کہا: مَلِيًّا کا معنی ہے لمبا زمانہ (1)؛ اسی سے المہلہل کا قول ہے:

---

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 108

فتصدعت صُمُّ الجبال لموته وبكت عليه لرملات مليا

اس شعر میں ملیا سے مراد لمبا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ، حضرت ابراہیم نے جواب تندی اور ترشی میں نہیں دیا کیونکہ انہیں اس کے کفر پر اسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ جمہور علماء نے کہا ہے کہ یہاں سلام سے مراد مسالمہ ہے یعنی متارکہ (چھوڑنا) ہے سلام نہیں ہے۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے آپ کو امن ہے۔ اس بنا پر کافر کو پہلے سلام نہیں کیا جائے گا۔ نقاش نے کہا: یہ حلیم کا سفیہ سے خطاب ہے جیسے فرمایا: وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان) بعض علماء نے اسے سلام کے معنی میں فرمایا، یہ جدائی کا سلام ہے اور کافر کو سلام کرنے اور اس کو پہلے سلام کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن عیینہ سے پوچھا گیا: کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنہ) اور فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (الممتحنہ) اور حضرت ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا: سَلٰمٌ عَلَيْكَ۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے وہی ظاہر ہوتا ہے جو سفیان بن عیینہ نے کہا ہے اور اس باب میں دو صحیح احادیث ہیں۔ حضرت ابوہریرہ نے نبی پاک ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: ''یہود اور نصاریٰ کو پہلے سلام نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی کو راستہ میں ملو تو اسے تنگی کی طرف مجبور کرو'' (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ گدھے پر سوار ہوئے جس پر پالان تھا جس کے نیچے فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور آپ نے پیچھے حضرت اسامہ بن زید کو سوار کیا ہوا تھا۔ آپ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کی بنی الحرث بن الخزرج میں عیادت کے لیے جا رہے تھے، یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے حتی کہ آپ ایک ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان، مشرکین، بت پرست اور یہودی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں (رئیس المنافقین) عبداللہ بن ابی بن سلول بھی تھا اور مجلس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جب مجلس پر گدھے کا غبار پڑا تو عبداللہ بن ابی نے اپنی ناک اپنی چادر سے ڈھانپ لی اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر سلام کیا (الحدیث) پہلی حدیث ابتداءً غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کو ظاہر کر رہی ہے کیونکہ سلام کرنا عزت دینا ہے اور کافر اس کا اہل نہیں اور دوسری حدیث ابتداءً سلام کرنے کو جائز ظاہر کر رہی ہے۔ طبری نے کہا: حضرت اسامہ کی مروی، حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے معارض نہیں ہے کیونکہ ہر ایک دوسری کے خلاف نہیں ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث کا مخرج عموم ہے اور حضرت اُسامہ کی حدیث بیان کرتی ہے کہ اس کا معنی خصوص ہے۔ نخعی نے کہا: جب تجھے یہودی یا نصرانی سے حاجت ہو تو اسے پہلے سلام کر، اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث (کہ انہیں پہلے سلام نہ کرو (2)) اس صورت میں ہے جب کوئی ایسا سبب نہ ہو جو سلام کرنے کا موجب ہو مثلاً کوئی فیصلہ کراتا ہو، کوئی اور حاجت ہو جو تمہیں ان کی طرف سے لاحق ہو یا سنگت کا حق ہو یا پڑوس کا حق ہو یا سفر کا حق ہو۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، نهي عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام، جلد 2، صفحہ 214

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، التسليم في المجلس فيه اخلاط من المسلمين والمشركين، جلد 2، صفحہ 924

طبری نے کہا: سلف سے مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کرتے تھے۔ حضرت ابن مسعود نے ایک کسان کو سلام کیا جو راستے میں آپ کے ساتھ تھا۔ حضرت علقمہ نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا: اے ابا عبدالرحمٰن! کیا اہل کتاب کو پہلے سلام کرنا مکروہ نہیں ہے؟ حضرت عبداللہ نے فرمایا: ہاں، لیکن حق صحبت وسنگت کی وجہ سے مکروہ نہیں ہے۔ حضرت ابوامامہ جب اپنے گھر کی طرف لوٹتے تو مسلمان، نصرانی، چھوٹے بڑے جس کے پاس سے گزرتے اسے سلام کرتے۔ اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو فرمایا: ہمیں سلام افشاء کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ امام اوزاعی سے اس مسلمان کے بارے پوچھا گیا جو کسی کافر کے پاس سے گزرتا ہے اور پھر اسے سلام کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا: اگر تو سلام کرے تو تجھ سے پہلے نیک لوگوں نے سلام کیا ہے اگر تو سلام نہ کرے تو تجھ سے پہلے نیک لوگوں نے سلام کو ترک کیا ہے۔ حسن بصری سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب تو کسی ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان اور کفار ہوں تو انہیں سلام کر۔

میں کہتا ہوں: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ سلام جس کا معنی تحیۃ ہے یہ اس امت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ (1) السلام یہ اہل جنت کا سلام ہے“ الحدیث۔ اس حدیث کو حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے ان کی سند کے ساتھ سورہ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ کے معنی پر کلام گزر چکی ہے اور سلام پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کے نکرہ ہونے کے باوجود اسے مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ نکرہ مخصوصہ، حکم میں معرفہ کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۞ ، الحفی جو نیکی کرنے اور مہربانی کرنے میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ کہا جاتا ہے: حفی بہ وتحفی، اس کا معنی ہے اس نے اس سے نیکی اور مہربانی کی۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: حفی بی حفاوۃ وحفوۃ، فراء نے کہا: اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا، یعنی وہ عالم اور باریک بین ہے وہ میری دُعا قبول فرماتا ہے جب میں اس سے دعا مانگتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَعْتَزِلُكُمْ، العزلہ کا معنی جدائی ہے، سورۃ الکہف میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا۞ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اہل اور اولاد عطا کرے جن سے وہ تقویت حاصل کرے تاکہ وہ اپنی قوم سے جدائی کی وجہ سے وحشت میں مبتلا نہ ہوں اسی وجہ سے فرمایا: فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ہم نے اسے بیٹے کی نعمت بخش کر اس کی وحشت کو دور کیا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَسٰۤى، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندہ قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ معرفت پر باقی رہے یا مستقبل میں باقی رہے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ باپ کے لیے ہدایت کی دعا ہے اور عسیٰ، سے شک کیا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا اس کے حق میں دعا قبول کی جائے گی یا نہیں؟ پہلا قول اظہر ہے اور فرمایا: وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۞ یعنی ہم نے ان کی خوب تعریف کی کیونکہ تمام ملتیں ان انبیاء کرام کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہیں اور لسان، مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

1۔ نوادر الاصول، جلد 2، صفحہ 185

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ٘ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝ وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا۝

''اور ذکر فرمایئے کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ (اللہ کے) چنے ہوئے تھے اور رسول و نبی تھے۔ اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے اور ہم نے انہیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لیے۔ اور ہم نے بخشا انہیں اپنی (خاص) رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى یعنی قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ان پر پڑھو۔ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا اپنی عبادت میں خلوص رکھتا تھا، ریاکار نہ تھا۔ اہل کوفہ نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے چن لیا اور چنا ہوا بنا دیا۔ وَ نَادَيْنٰهُ ہم نے جمعہ کی رات اس سے کلام کی۔ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب، پہاڑ کے پہلو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں طرف درخت تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کی طرف آرہے تھے؛ یہ طبری وغیرہ نے کہا ہے۔ کیونکہ پہاڑوں کا دایاں، بایاں نہیں ہوتا (1)۔ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۝، نَجِيًّا پر نصب حال کی بناء پر ہے، یعنی ہم نے بغیر وحی کے اس سے کلام کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے اسے قدر و منزلت کے اعتبار سے اتنا قرب بخشا کہ ہم نے اس سے کلام کی۔ وکیع اور قبیصہ نے سفیان سے انہوں نے عطاء بن سائب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۝ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہیں قریب کیا حتی کہ انہوں نے قلموں کے چلنے کی آواز سنی (2)۔ وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا۝ یہ اس وقت ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ۝ هٰرُوْنَ اَخِي۝ (طٰہٰ)

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ٘ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ٘ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۝

''اور ذکر کیجئے کتاب میں اسماعیل کو بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے اور رسول (اور) نبی تھے۔ اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس اسماعیل سے مراد اسماعیل بن حزقیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا تھا تو انہوں نے ان کے سر کی جلد اتار لی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کو عذاب دینے میں اختیار دیا تھا تو انہوں نے عفو طلب کیا اور اللہ تعالیٰ کے ثواب پر راضی ہوئے اور ان کا معاملہ، معاف کرنے یا عذاب دینے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ اسماعیل ذبیح ابو العرب ابن ابراہیم ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذبیح حضرت اسحاق تھے۔ پہلا قول اظہر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 110 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 20

ہے (☆)۔ اور مزید بحث سورۃ الصافات میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وعد الصدق کے ساتھ شرف وعزت بخشنے کے لیے خاص کیا ہے اگر چہ یہ صفت دوسرے انبیاء کرام میں بھی موجود تھی جیسے حلیم، اواہ اور الصدیق، لقب کے طور پر دیے گئے ہیں نیز وہ ان خصائل سے مشہور تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وعدہ کی سچائی محمود صفت ہے اور یہ انبیاء اور مرسلین کے اخلاق سے ہے۔ اس کی ضد وعدہ خلافی ہے اور مذموم ہے یہ فاسقین اور منافقین کے اخلاق سے ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کی اور وعدہ کی سچائی کی صفت سے موصوف فرمایا۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صفت اس لیے بخشی گئی کہ انہوں نے اپنے نفس پر ذبح کے وقت صبر کا وعدہ کیا تو انہوں نے صبر کیا حتی کہ فدیہ دیا گیا۔ یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: ذبیح اسماعیل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے ایک شخص سے کسی جگہ ملاقات کا وعدہ کیا حضرت اسماعیل آئے اور اس جگہ اس شخص کا ایک دن اور ایک رات انتظار کرتے رہے جب دوسرا دن تھا وہ شخص آیا تو آپ نے اسے فرمایا: میں کل سے تیرے انتظار میں یہاں ہوں۔ بعض نے فرمایا: آپ تین دن انتظار میں رہے (1) اس کی مثل ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت سے پہلے واقعہ آیا ہے۔ یہ واقعہ نقاش نے ذکر کیا ہے اور ترمذی وغیرہ (2) نے عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے بعثت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بیع کی تو آپ کے لیے کچھ باقی رہ گیا میں نے وعدہ کیا کہ میں وہ مال اسی جگہ لے آؤں گا پھر میں بھول گیا پھر مجھے تین دن کے بعد یاد آیا، میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے جوان! تو نے مجھے بہت تکلف دی ہے میں تین دن سے یہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں''۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ یزید رقاشی نے کہا: حضرت اسماعیل نے بائیس دن اس شخص کا انتظار کیا تھا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن السلام کی کتاب میں ہے کہ آپ نے ایک سال انتظار کیا تھا۔ زمخشری نے یہ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنے ساتھی سے وعدہ کیا ''اس جگہ وہ اس کا انتظار کریں گے'' تو آپ نے پورا سال انتظار کیا اور قشیری نے یہ ذکر کیا ہے کہ ایک سال آپ اپنی جگہ پر رہے حتی کہ جبرئیل امین آپ کے پاس آئے اور کہا کہ وہ تاجر جس نے آپ سے بیٹھنے کا سوال کیا تھا حتی کہ واپس آجائے وہ شیطان تھا آپ نہ بیٹھیے اور اس کے لیے کوئی عزت نہیں۔ یہ بعید ہے اور صحیح نہیں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جو بھی وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ یہ صحیح قول ہے اور آیت کا ظاہر بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس باب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: العدۃ دین (3) (وعدہ کرنا دین ہے) اور اثر میں مومن کا وعدہ واجب ہے یعنی مومنین کے اخلاق میں وعدہ پورا کرنا واجب ہے ہم نے کہا: یہ بطور فرض واجب نہیں کیونکہ علماء کا اس

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 21 2۔ سنن ابی داؤد، باب فی العدۃ، حدیث نمبر 4344، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الھبۃ، إذ وھب الھبۃ أو وعد ثم، جلد 1، صفحہ 354

☆ حضرت مفسر کے قول میں بظاہر تعارض ہے یہاں اسے ظاہر قرار دے رہے ہیں جب کہ بعد میں دوسرے قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔

پر اجماع ہے جو ابو عمر نے حکایت کیا ہے کہ جس نے مال کا وعدہ کیا جو موجود تھا تو وہ دوسرے قرض خواہوں کے ساتھ اس کو حساب سے لے گا اسی وجہ سے ہم نے کہا: وعدہ پورا کرنا مروّت اور اچھی بات ہے اس کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ عرب وعدہ پورا کرنے پر مدح کرتے ہیں اور وعدہ شکنی پر مذمت کرتے ہیں۔ اسی طرح تمام امتوں میں تھا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مَتَى ما يقلْ حُرٌّ لصاحبِ حاجةٍ نَعَمْ يقضِها والحرُّ لِلواىِ ضامن

"آزاد آدمی جب اپنے کسی حاجت مند ساتھی سے ہاں کہتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور آزاد آدمی وعدے کا ضامن ہوتا ہے"۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وفا کرنے والا شکر اور تعریف کا مستحق ہے جبکہ عہد شکنی کرنے والا مذمت کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ سچ کرنے والے اور نذر پوری کرنے والے کی تعریف فرمائی تو اس کے لیے یہی مدح وثنا کافی ہے جبکہ اس کے مخالف کے لیے مذمت ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** امام مالک نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کو ہبہ کرنے کا سوال کرے اور وہ اسے ہاں کہے پھر اس کے لیے ایسا نہ کرنا ظاہر ہو تو میرے خیال میں اس پر کچھ لازم نہیں۔ امام مالک نے کہا: اگر یہ صورت اگر قرض کی ادائیگی میں ہو پھر وہ اس سے کہے کہ اس کی طرف سے قرض ادا کر دے اس نے کہا: ٹھیک ہے اور وہاں اور بہت سے افراد ہوں جو اس پر گواہی دیں تو اس پر چیز لازم ہوگی جب اس پر دو آدمی گواہی دیں۔ امام ابو حنیفہ اور اس کے اصحاب اور امام اوزاعی، امام شافعی اور تمام فقہاء نے کہا: وعدہ کرنے سے کوئی چیز لازم نہیں کیونکہ یہ منافع ہیں عاریہ چیز میں اس کا قبضہ نہیں ہوا کیونکہ وہ طاری ہے اور غیر عاریہ میں جو اشخاص اور اعیان ہیں جو ہبہ کیے جاتے ہیں ان پر قبضہ نہ ہو تو مالک کو ان میں رجوع کا حق ہوتا ہے۔ امام بخاری میں ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، ابن اشوع نے وعدہ کی وجہ سے فیصلہ کیا یہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں نے اسحاق بن ابراہیم کو دیکھا وہ ابن اشوع کی حدیث سے حجت پکڑتے تھے (1)۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝ بعض علماء نے فرمایا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جرہم قبیلہ کی طرف مبعوث کیا گیا اور تمام نبی جب وعدہ کرتے تھے تو اسے سچا کر دکھاتے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خصوصی اس صفت کے ساتھ ذکر کرنا ان کو شرف بخشنے کے لیے ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ، حسن نے فرمایا: اہل سے مراد ان کی امت ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں اس طرح تھا۔ وکان یامر اھلہ جُرھم وولدہ بالصلوۃ والزکاۃ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا یعنی پسندیدہ پاکیزہ اور صالح تھے۔ کسائی اور فراء نے کہا: جنہوں نے مرضی کہا انہوں نے رضیت کی بنا پر کہا۔ کسائی اور فراء نے کہا: اہل حجاز مرضو کہتے ہیں، نیز ان نحویوں نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ رضوان، رضیان کہتے ہیں۔ پس

1۔ صحیح بخاری کتاب الشہادات، باب من امر انجاز الوعد

رضوان، مرضو کی بنا پر ہے۔ بصری علماء صرف رضوان اور ربوان کہنا جائز قرار دیتے ہیں۔ ابوجعفر نحاس نے کہا میں نے ابو اسحاق زجاج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ لکھنے میں غلطی کرتے ہیں اور ربا کو یاء کے ساتھ لکھتے ہیں، پھر اس سے بڑی شدید غلطی یہ کرتے ہیں کہ ربیان کہتے ہیں اور یہ صرف ربوان اور رضوان جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیۡۤ اَمْوَالِ النَّاسِ (روم:39)

وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ٘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّاۗۙ۝ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا۝

''اور ذکر فرمائیے کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز تھے (اور) نبی تھے۔ اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ٘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا۝ حضرت ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا اور کپڑے سینے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے کا آغاز بھی آپ سے ہوا۔ علم نجوم اور حساب اور ستاروں کے چلنے میں غور و فکر بھی آپ سے شروع ہوا۔ اور ادریس کو ادریس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کتاب اللہ کا کثرت سے درس دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تیس صحیفے نازل کیے جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے۔ زمخشری نے کہا: بعض علماء نے کہا: ادریس کو، ادریس کتاب اللہ کا کثرت سے درس دینے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ درس سے افعیل کے وزن پر ہوتا تو اس میں غیر منصرف ہونے کا صرف ایک سبب ہوتا اور وہ علمیت ہے اور اس کا غیر منصرف ہونا اس کے عجمہ ہونے پر دلیل ہے اسی وجہ سے ابلیس عجمی ہے یہ ابلاس سے مشتق نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے اور اسی طرح یعقوب، العقب سے نہیں ہے اور اسرائیل، اسرال سے نہیں ہے جیسا کہ ابن السکیت نے گمان کیا ہے۔ جو تحقیق نہیں کرتا اور علوم میں مہارت حاصل نہیں کرتا اس سے اس قسم کی اغلاط کثرت سے ہوتی ہیں اور یہ جائز ہے کہ ادریس کا معنی اس لغت میں اس مفہوم کے قریب ہو اور راوی نے الدرس سے مشتق خیال کر لیا ہے۔ ثعلبی اور غزنوی وغیرہما نے کہا: یہ حضرت نوح کے دادا تھے اور یہ خطا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے اسی طرح سیرت میں واقع ہے حضرت نوح علیہ السلام بن لامک بن متوشلخ بن اخنوخ یہ ادریس نبی علیہ السلام ہیں جیسا کہ گمان کرتے ہیں واللہ اعلم۔ اور یہ پہلے شخص تھے جس کو بنی آدم سے نبوت دی گئی تھی اور قلم کے ساتھ سب سے پہلے انہوں نے لکھا اس کا شجرہ نسب یہ ہے۔ ادریس بن برد بن مہلائیل بن قینان بن یانش بن شیث بن آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا۝ حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوسعید وغیرہما نے کہا(1): مَكَانًا عَلِیًّا سے مراد چوتھا آسمان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی مروی ہے اور کعب احبار نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد چھٹا آسمان ہے(2)۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: بخاری میں شریک بن عبداللہ بن ابی نمر سے مروی ہے فرمایا میں نے حضرت انس کو یہ فرماتے ہوئے سنا: وہ

---

1۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3082، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 113

رات جس میں نبی پاک ﷺ کو کعبہ کی مسجد سے سیر کرائی گئی۔ اس حدیث میں ہے ''ہر آسمان میں انبیاء تھے''۔ آپ نے نام بیان کیے ان میں حضرت ادریس علیہ السلام کا دوسرے آسمان میں ہونے کا ذکر کیا۔ یہ وہم ہے صحیح یہ ہے کہ چوتھے آسمان پر تھے۔ اسی طرح ثابت بنانی نے حضرت انس بن مالک سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے؛ یہ مسلم نے صحیح میں ذکر کیا ہے۔ حضرت مالک بن صعصعہ نے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں ادریس علیہ السلام کے پاس چوتھے آسمان میں آیا'' (1)۔ یہ بھی مسلم نے نقل کیا ہے حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند کرنے کا سبب وہ ہے جو حضرت ابن عباس اور کعب وغیرہ نے کہا ہے: ایک دن وہ کسی کام کے لیے چلے تو انہیں سورج کی گرمی لگی تو انہوں نے کہا: یارب! میں ایک دن چلا ہوں (تو یہ حالت ہے) جو ایک دن میں پانچ سو سال اس کو اٹھائے گا اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اللہ اس سے اس کا بوجھ ہلکا کر دے یعنی سورج کے فلک پر متعین فرشتہ۔ حضرت ادریس نے کہا: اے اللہ! اس سے اس کا بوجھ ہلکا کر دے اور اس سے اس کی گرمی اٹھالے۔ جب فرشتے نے صبح کی تو اس نے سورج کی خفت اور ایسا سایہ پایا جو وہ جانتا نہیں تھا۔ اس فرشتہ نے عرض کی: یارب! تو نے مجھے سورج کے اٹھانے کے لیے پیدا کیا تھا پھر یہ کیا فیصلہ فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے ادریس نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میں تجھ سے اس کے بوجھ اور اس کی گرمی میں تخفیف کر دوں تو میں نے اس کی دعا قبول کی ہے۔ اس فرشتے نے عرض کی: یارب! مجھے اور اسے جمع کر دے، میرے اور اس کے درمیان دوستی بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو اجازت دی حتیٰ کہ وہ حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آیا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے اس سے پوچھا اور کہا: مجھے خبر دی گئی ہے کہ تو ملائکہ میں سے معزز فرشتہ ہے اور ملک الموت کے ہاں تیری دوسروں کی نسبت سے زیادہ عزت ہے، تم میری اس کے پاس سفارش کرو تا کہ وہ میری عمر میں ڈھیل دے دے تا کہ اللہ کا شکر اور عبادت زیادہ کروں۔ فرشتے نے کہا: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو ڈھیل نہیں دیتا جب اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ حضرت ادریس نے فرشتے سے کہا: مجھے یہ معلوم ہے لیکن یہ میرے نفس کے لیے اچھا ہوگا۔ پھر سورج کے فرشتے نے حضرت ادریس کو اپنے پَر کے اوپر اٹھایا اور آسمان کی طرف بلند کیا اور انہیں سورج کے مطلع کے پاس اُتارا پھر فرشتے نے ملک الموت سے کہا: بنی آدم سے میرا ایک دوست ہے اس نے تیری بارگاہ میں میری سفارش پیش کی ہے کہ تو اس کی عمر میں ڈھیل دے۔ ملک الموت نے کہا: یہ میرے بس میں نہیں اگر تو پسند کرتا ہے کہ وہ جان لے کہ وہ کب فوت ہوگا تو میں اسے یہ بتا دیتا ہوں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے یہی بتادو۔ پھر ملک الموت نے اپنے دیوان میں دیکھا تو فرمایا: تو مجھ سے ایسے انسان کے بارے سوال کر رہا ہے میں اسے نہیں دیکھتا کہ وہ کبھی فوت ہوگا فرشتے نے کہا: وہ کیسے؟ ملک الموت نے کہا: میں نے اس کی موت کو نہیں پایا مگر سورج کے طلوع ہونے کے پاس۔ فرمایا: میں تیرے پاس آیا ہوں جبکہ ادریس کو میں اسی جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا: تم جاؤ میں تجھے نہیں دیکھتا مگر یہ کہ تو اسے فوت شدہ پائے گا۔ اللہ کی قسم! ادریس علیہ السلام کی عمر سے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ وہ فرشتہ واپس آیا تو حضرت ادریس علیہ السلام کو فوت شدہ پایا۔ سدی نے کہا: ایک دن حضرت ادریس علیہ السلام سوئے ہوئے تھے تو انہیں سورج کی گرمی بڑی

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 114

شدید لگی وہ اٹھے تو وہ اس کی وجہ سے تکلیف میں تھے۔ عرض کی: اے اللہ! سورج کے فرشتے سے سورج کی گرمی میں تخفیف کر اور اس کی اس کے بوجھ پر مدد فرما کیونکہ وہ گرم آگ برداشت کرتا ہے سورج کے فرشتے نے صبح کی تو اس کے لیے نور کی ایک کرسی لگائی گئی تھی اور اس کے پاس ستر ہزار فرشتے دائیں طرف اور ستر ہزار فرشتے بائیں طرف اس کی خدمت کرتے تھے اور اس کا حکم اور عمل بجالاتے تھے۔ سورج کے فرشتے نے کہا: یارب! یہ میرے لیے کہاں سے آیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیرے لیے بنی آدم میں سے ایک نے دعا کی ہے جسے ادریس کہا جاتا ہے۔ پھر کعب کی حدیث کی طرح ذکر کیا ہے فرمایا: سورج کے فرشتے نے حضرت ادریس سے کہا: تیری کیا حاجت ہے؟ حضرت ادریس نے کہا: میری خواہش ہے کہ میں جنت کو دیکھوں۔ فرمایا: اس فرشتے نے آپ کو اپنے پروں پر اٹھایا پھر اڑ گیا جب وہ چوتھے آسمان میں تھا تو اس کی ملاقات ملک الموت سے ہوئی وہ آسمان میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ سورج کے فرشتے نے ملک الموت پر سلام کیا اور کہا: اے ادریس یہ ملک الموت ہے پس تو اس پر سلام کر۔ ملک الموت نے کہا: سبحان اللہ! تو اسے یہاں کس لیے لایا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اسے اس لیے بلند کیا ہے تاکہ اسے جنت دکھاؤں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں۔ میں نے کہا: یارب! ادریس چوتھے آسمان پر کیسے ہوگا؟ پس میں چوتھے آسمان پر اُترا تو وہ تمہارے ساتھ تھے پس اس کی روح قبض کی اور جنت کی طرف اسے بلند کیا۔ ملائکہ نے آپ کے جسم کو چوتھے آسمان میں دفن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا یہی مفہوم ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز عبادت میں سے اس کی مثل بلند ہوتا تھا جتنا کہ اہل زمین کے لیے اس زمانہ میں بلند ہوتا تھا۔ ملائکہ نے اس پر تعجب کیا اور ملک الموت کو آپ کی ملاقات کا شوق ہوا۔ ملک الموت نے آپ کی زیارت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو اجازت مرحمت فرمائی۔ ملک الموت انسانی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام دن کو روزہ رکھتے تھے جب افطار کا وقت ہوتا تھا تو ملک الموت کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ کھانے سے انکار کرتا تھا یہ اس کے ساتھ تین دن کیا پھر ادریس نے عجیب سمجھا اور اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ فرمایا: میں ملک الموت ہوں۔ میں نے اپنے رب سے اجازت طلب کی تھی کہ میں آپ سے ملوں تو اس نے مجھے اجازت دی۔ حضرت ادریس نے کہا: مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ حضرت ملک الموت نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: تو میری روح قبض کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو وحی فرمائی کہ اس کی روح قبض کر لے۔ ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی۔ ایک لمحہ بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے حضرت ادریس سے کہا: تیری روح قبض کرنے میں کیا فائدہ ہوا؟ فرمایا: تاکہ میں موت کی تکلیف چکھ لوں اور میں اس کے لیے زیادہ استعداد حاصل کروں۔ پھر حضرت ادریس نے ملک الموت سے کہا: مجھے تجھ سے ایک اور کام ہے۔ ملک الموت نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا تو مجھے آسمان کی طرف بلند کر تاکہ میں جنت اور دوزخ کو دیکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو اذن دیا کہ اسے آسمانوں کی طرف لے جائے۔ حضرت ادریس نے آگ دیکھی تو غشی طاری ہوگئی جب افاقہ ہوا تو کہا: مجھے جنت دکھاؤ۔ وہ اسے جنت میں لے گئے پھر حضرت ادریس سے ملک الموت نے کہا: جنت سے باہر نکلو تاکہ میں تجھے اپنی جگہ پر لوٹا دوں تو حضرت ادریس نے ایک درخت کو پکڑ لیا اور کہا: میں جنت سے نہیں

نکلوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ کے لیے ایک فرشتہ بھیجا جس نے فیصلہ کرنا تھا اس فرشتے نے حضرت ادریس سے پوچھا: تم جنت سے کیوں نہیں نکلتے؟ حضرت ادریس نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: 185) (ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے) اور میں موت کا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا تم میں سے ہر ایک نے دوزخ پر وارد ہونا ہے۔ اور میں اس پر وارد ہو چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ (الحجر) وہ اس (جنت) سے نکلنے والے نہیں؟ پھر میں اس سے کیسے نکلوں؟ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے فرمایا: میرے اذن سے وہ جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی باہر نکلیں گے، پس حضرت ادریس علیہ السلام جنت میں زندہ ہیں اور وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ سے یہی مراد ہے۔ النحاس نے کہا: ادریس کا قول: وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس کو یہ سکھایا ہو پھر اس کو قرآن میں نازل کیا ہو۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت ادریس جنت میں کبھی کھاتے پیتے ہیں اور کبھی ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۙ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ ۫ وَ مِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۝

"یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم کی اولاد سے تھے اور بعض ان کی اولاد جن کو ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور بعض ابراہیم اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا، جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں تو وہ گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زار و قطار) روتے ہوئے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ سے مراد صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ سے مراد حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور (اسرائیل) کی ذریت سے مراد حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ حضرت ادریس اور حضرت نوح کو حضرت آدم علیہ السلام سے قرب کا شرف تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حضرت نوح علیہ السلام سے قرب کا شرف تھا اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کو حضرت ابراہیم سے قرب کا شرف تھا۔ وَ مِمَّنْ هَدَيْنَا، یعنی جن کو ہم نے اسلام کی طرف ہدایت دی۔ وَاجْتَبَيْنَا اور ہم نے ایمان کے لیے چن لیا۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ، شبل بن عباد کمی نے یتلی مذکر کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی ہے۔ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۝ ان کا وصف بیان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع کا اظہار کرنے والے ہیں اور اس کی بارگاہ میں رونے

والے ہیں۔ یہ الفاظ سورۂ سبحان میں گزر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے: بکی یبکی بکاء وبکی وبُکیا۔ مگر خلیل نے کہا: جب تھوڑا رونا ہوتو وہ حزن کی مثل ہے یعنی اس کے ساتھ آواز نہ ہو جیسے شاعر نے کہا:

بکت عینی وحُقَّ لھا بکاھا — ومایغنی البکاءُ ولا العَوِیلُ

اور سُجَّدًا، پر نصب حال کی وجہ سے ہے اور بُکِیًّا اس پر معطوف ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ رحمٰن کی آیات کا دلوں پر اثر ہے۔ حسن نے کہا: اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ﴿۵۸﴾ یعنی نماز میں جب ان پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ اصم نے کہا: اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ سے مراد وہ کتب ہیں جو اس کی توحید اور اس کی محبتوں کو متضمن ہیں اور وہ ان کی تلاوت کے وقت سجدہ کرتے تھے اور ان کے ذکر کے وقت روتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد خاص قرآن ہے اور وہ اس کی تلاوت کے وقت سجدہ کرتے تھے اور روتے تھے۔ الکیا نے کہا: اس آیت میں حضرت ابن عباس کے قول سے اس شخص کے قول کی دلیل ہے جو کہتا ہے کہ قرآن وہ ہے جو تمام انبیاء پر پڑھا جاتا تھا لیکن اگر اس طرح ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے انزال کے ساتھ مختص نہ ہوتے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابوبکر رازی نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ قاری اور سننے والے پر قرآن کے سجدے واجب ہیں۔ الکیا نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ یہ وصف تو اللہ تعالیٰ کی تمام آیات کو شامل ہے اور سجود کو بکاء (رونے) کے ساتھ ملایا گیا ہے اور اس سے انبیاء کا طریقہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی آیات کی تعظیم کرتے تھے۔ اس میں مخصوص آیت پڑھتے وقت سجدہ کے وجوب پر کوئی دلالت نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء نے فرمایا: جو سجدہ کی آیت پڑھے وہ آیات کے مطابق اس سجدہ میں دعا مانگے مثلاً اگر سورۂ السجدہ، الم تنزیل آیت سجدہ پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللھم أجعلنی من الساجدین لوجھك المسبحین بحمدك وأعوذبك أن أکون من المستکبرین عن أمرك۔ اے اللہ! مجھے اپنی رضا کے لیے سجدہ کرنے والوں، اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کرنے والوں سے بنادے اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے حکم سے تکبر کرنے والوں سے ہو جاؤں۔ اور اگر سورۂ سبحان کی آیت سجدہ پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللھم أجعلنی من الباکین إلیك الخاشعین لك۔ اے اللہ! مجھے اپنی بارگاہ میں رونے والوں اور خشوع کرنے والوں سے بنادے۔ اگر یہ آیت پڑھے تو یہ دعا مانگے: اللھم أجعلنی من عبادك المنعم علیھم المھدین الساجدین لكَ الباکین عند تلاوۃ آیاتك۔ اے اللہ! مجھے اپنے انعام یافتہ، ہدایت یافتہ اور اپنی بارگاہ میں سجدہ کرنے والے لوگوں سے (اور) آیات کی تلاوت کے وقت رونے والوں سے بنادے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

''پس جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی سو وہ دوچار ہوں گے اپنی نافرمانی (کی سزا) سے، مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے غیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز سلامت رہو کی دعائیہ صدا اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام۔ یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندں سے (صرف) اس کو جو متقی ہوگا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اس سے مراد بری اولاد ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہمیں حجاج نے بیان کیا انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ قیامت کے قیام کے وقت ہوگا اور اس امت کے نیک لوگوں کے چلے جانے کے وقت ہوگا، لوگ گلیوں میں زنا کریں گے۔ خلف کے متعلق کلام سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ۔ حضرت عبداللہ اور حسن نے أضاعوا الصلوات، پڑھا ہے یہ مذمت ہے۔ اور نص ہے کہ نماز کا ضائع کرنا ان کبائر میں سے ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا: جس نے نماز کو ضائع کیا وہ اسکے علاوہ احکام شرع کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ اس آیت سے کون مراد ہیں؟ مجاہد نے کہا: نصاریٰ مراد ہیں، جو یہود کے بعد آئے۔ محمد بن کعب قرظی اور مجاہد اور عطا نے کہا: اس سے مراد آخر زمانہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے آنے والے لوگ ہیں (1) یعنی اس امت سے ہوں جن کی یہ صفت ہوگی، نصاریٰ مراد نہیں ہیں۔ اور علماء کا نماز کو ضائع کرنے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ قرظی نے کہا: اس سے مراد نماز کا انکار کرنا ہے۔ قاسم بن مخیمرہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: اس کو وقت پر ادا نہ کرنا اور اس کے حقوق کو قائم نہ کرنا ہے۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ جب نماز وقت پر ادا نہ کی جائے اور آداب و حقوق سے خالی ہو تو وہ صحیح نہیں ہوتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو فرمایا جس نے نماز پڑھی اور آیا اور آپ کو سلام پیش کیا: ''واپس جا اور نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی'' (2) یہ تین مرتبہ فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو فرمایا جس نے نماز میں کوتاہی کی تھی: تو کتنے عرصہ سے یہ نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا: چالیس سال سے۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا: تو نے نماز نہیں پڑھی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 22

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، وجوب قرأۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، جلد 1، صفحہ 170

اگر تو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے مر گیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر نہیں مرے گا، پھر فرمایا: انسان کو نماز مختصر پڑھنی چاہیے مکمل پڑھے اور اچھے انداز میں پڑھے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے اور یہ لفظ نسائی کے ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ نماز جائز نہیں ہوتی جس میں انسان سیدھا نہیں ہوتا یعنی رکوع اور سجود میں پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا ہے (1)۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اہل علم صحابہ اور تابعین کا اس پر عمل ہے ان کا نظریہ ہے کہ آدمی رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو سیدھا کرے۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: جو اپنی پیٹھ رکوع اور سجود میں سیدھی نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ نماز منافق کی نماز ہے سورج کو تاڑتے ہوئے بیٹھا رہتا ہے حتی کہ جب سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے اور چار ٹھونگیں مارتا ہے وہ نماز میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر تھوڑا (2)'' یہ مذمت ہے اس شخص کی جو ایسا کرتا ہے۔ فروہ بن خالد بن سنان نے کہا: ایک دفعہ ضحاک کے ساتھیوں نے نماز عصر میں امیر کا بہت دیر تک انتظار کیا حتی کہ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ ضحاک نے اس وقت یہ آیت پڑھی پھر فرمایا: اللہ کی قسم! نماز کو ترک کرنا میرے نزدیک اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ بہر حال اس باب میں حتمی قول یہ ہے کہ جو نماز کا مکمل وضو نہیں کرتا اور رکوع و سجود صحیح نہیں کرتا وہ نماز کی حفاظت کرنے والا نہیں اور جس نے نماز کی حفاظت نہیں کی اس نے اسے ضائع کر دیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ دوسرے احکام شرع کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔ حسن نے کہا: نماز کے ضیاع سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے مساجد کو معطل کر دیا اور اپنے دنیا کے کاموں اور اسباب میں مشغول ہو گئے۔ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ یعنی لذات اور معاصی کی پیروی کی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ترمذی اور ابو داؤد نے انس بن حکیم ضبی سے روایت کیا ہے (3) کہ وہ مدینہ طیبہ آئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملے انہوں نے کہا: اے نوجوان! کیا میں تجھے ایسی حدیث بیان نہ کروں شاید اللہ تعالیٰ تجھے اس سے نفع دے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں (ضرور بتائیے) فرمایا: قیامت کے روز لوگوں کے اعمال میں سے جس کا پہلے محاسبہ ہوگا وہ نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا حالانکہ وہ زیادہ جانتا ہے: میرے بندے کی نماز دیکھو اس نے اس کو مکمل کیا یا کوتاہی کی اگر وہ نماز مکمل ہوگی تو اس کے لیے مکمل لکھی جائے گی، اگر اس میں کچھ کمی ہوگی تو ارشاد ہوگا: دیکھو کیا میرے بندے کے نوافل ہیں، اگر اس کے نوافل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندے کے لیے اس کے نوافل سے اس کے فرائض کو مکمل کر دو پھر اس پر دوسرے اعمال کا مؤاخذہ ہوگا۔ یونس نے کہا: میرا گمان ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے؛ یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں (4) فرمایا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں حماد نے بیان

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 124۔ ایضاً حدیث نمبر 729۔ سنن ترمذی حدیث نمبر 245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، استحباب التبکیر بالعصر، جلد 1، صفحہ 225

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، قول النبی کل صلوٰۃ لایتم صاحبها، جلد 1، صفحہ 126

4۔ سنن ابی داؤد باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 733۔ ابن ماجہ، باب ما جاء فی اول ما یحاسب به العبد، حدیث نمبر 1414، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا انہوں نے تمیم داری سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مفہوم روایت کیا ہے پھر فرمایا: ''زکوٰۃ بھی اس کی مثل ہے(1) پھر اس کے مطابق اعمال کا مواخذہ ہوگا''۔ اس حدیث کو نسائی نے ہمام سے انہوں نے حسن سے انہوں نے حریث بن قبیصہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''قیامت کے روز بندے کا جس چیز کے متعلق محاسبہ کیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اگر نماز درست ہوگی تو وہ شخص کامیاب وکامران ہو جائے گا اگر نماز کا معاملہ خراب ہوگا تو وہ خائب وخاسر ہوگا''۔ ہمام نے کہا: میں نہیں جانتا یہ قتادہ کے کلام سے ہے یا روایت سے ہے، اگر اس کے فرائض میں سے کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو کیا میرے بندے کے لیے کوئی نفل ہے پھر فرائض کی کمی نفل سے پوری کی جائے گی پھر تمام اعمال اس کے مطابق ہوں گے۔ ابو العوام نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے یہ قتادہ سے انہوں نے حسن سے انہوں نے ابو رافع سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز بندے کا سب سے پہلے جس چیز کا محاسبہ ہوگا وہ اس کی نماز ہے اگر وہ مکمل پائی جائے گی تو وہ مکمل لکھی جائے گی، اگر اس میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو کیا تم اس کے لیے نفل پاتے ہو فرائض نماز میں سے جو کمی ہوگی اس کے نفل سے مکمل کی جائے گی پھر تمام اعمال اس کے مطابق جاری ہوں گے(2)۔ نسائی نے کہا ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں نضر بن شمیل نے بتایا فرمایا ہمیں حماد بن سلمہ نے خبر دی انہوں نے ازرق بن قیس سے انہوں نے یحییٰ بن یعمر سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''قیامت کے روز سب سے پہلے بندے کے جس عمل کا محاسبہ کیا جائے گا وہ اس کی نماز ہے اگر نماز درست ہوگی تو وہ شخص کامیاب وکامران ہو جائے گا اگر نماز کا معاملہ خراب ہو گیا تو وہ خائب وخاسر ہوگا''(3)۔ ورنہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے کے بارے میں دیکھو کیا اس کے نفل ہیں اگر نفل ہوئے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے فرائض کی کمی کو پورا کر دو۔ ابو عمر بن عبد البر نے کتاب التمہید میں فرمایا: نوافل سے فرائض کا مکمل کرنا اس کے لیے ہوگا جو فرض کو بھول گیا ہوگا اور اسے ادا نہ کیا ہوگا یا اس کا رکوع وسجود بہتر ادا نہ کیا ہوگا اور اسے اس کی قدر معلوم نہ ہوگی لیکن جس نے نماز کو جان بوجھ کر ترک کیا ہوگا یا پہلے بھولا ہوگا پھر اسے یاد آیا ہوگا لیکن جان بوجھ کر پھر ادا نہ کیا ہوگا اور فرض کی ادائیگی کو چھوڑ کر نوافل میں مشغول ہوا ہوگا جبکہ فرض اسے یاد بھی ہوگا تو اس کے لیے نوافل سے فرض کو مکمل نہیں جائے گا۔ اس کے بارے میں شامیین کی حدیث سے ایک منکر حدیث مروی ہے جس کو محمد بن حمیر نے عمرو بن قیس سکونی سے انہوں نے عبد اللہ بن قرط سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں رکوع وسجود مکمل نہ کیا، اس میں اس کی تسبیحات زیادہ کہی گئیں حتی کہ نماز مکمل کی جائے گی۔ ابو عمر نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ نہیں ہے مگر اسی طریق سے اور یہ قوی نہیں اور اگر یہ صحیح ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ نماز سے باہر ہو گیا اس نے اپنے خیال میں نماز کو مکمل کیا جبکہ حکم میں مکمل نہ تھی۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، قول الی کل صلوٰۃ لایتم صاحبھا، جلد 1، صفحہ 126۔ ایضاً حدیث نمبر 733، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، المحاسبۃ علی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82　　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 81

میں کہتا ہوں: انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ فرض اور نفل اچھے طریقے سے ادا کرے تا کہ اس کے لیے نفل ہوں جو اس کے فرض سے زائد ہوں اور وہ اپنے رب کا ان کے ذریعے قرب حاصل کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں'' (1) (الحدیث) رہا یہ کہ جب اس کے لیے نفل ہوگا اس کے ساتھ فرض کو پورا کیا جائے گا تو اس کا حکم معنی میں فرض کا حکم ہوگا اور جو فرائض اچھی طرح نہیں پڑھتا وہ نفل بھی اچھی طرح نہیں پڑھے گا یقیناً لوگوں سے نوافل میں زیادہ نقصان اور خلل ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور اس میں وہ سستی کرتے ہیں حتی کہ گویا اس کو کچھ شمار نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ پایا جاتا ہے اس کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے اس کے نفل اسی طرح ہوا کرتے ہیں بلکہ فرض کو بھی مرغ کے دانہ چگنے کی طرح ادا کرتا ہے کیونکہ حدیث کی معرفت نہیں ہوتی پھر جہال کی کیا حالت ہوگی جو کچھ جانتے بھی نہیں؟ علماء نے فرمایا: رکوع و سجود جائز نہیں ہوتا اور رکوع کے بعد وقوف جائز نہیں ہوتا اور دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز نہیں ہوتا حتی کہ اعتدال کے ساتھ رکوع کرے، وقوف کرے، سجدہ کرے اور بیٹھے۔ یہ اثر میں صحیح ہے اسی طرح جمہور اور اہل نظر کا نظریہ ہے؛ یہ ابن وہب اور ابو مصعب کی امام مالک سے روایت ہے؛ یہ معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہو تو ایسے نوافل کے ساتھ فرض کی کمی کو کیسے پورا کیا جائے گا بلکہ یہ تمام غیر صحیح اور غیر مقبول ہیں کیونکہ یہ غیر مطلوب طریقہ پر واقع ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس ارشاد کے تحت مروی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے پختہ مکان بنائے، قابل دید سواری پر سوار ہوا اور مشہور اور شہرت والا لباس پہنا۔

میں کہتا ہوں: الشَّهَوٰتِ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کے موافق ہوتی ہیں انسان ان کی خواہش کرتا ہے اور وہ اس کے مناسب ہوتی ہیں اور انسان ان سے نہیں بچتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جنت کو تکالیف کے ساتھ گھیرا گیا ہے اور دوزخ کو شہوات کے ساتھ گھیرا گیا ہے (2)'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے وہ اس کا جزء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ ابن زید نے کہا: غیا سے مراد شر یا گمراہی یا خسارہ ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

فمن يلق خيرا يحمد الناس أمره　　ومن يغو لا يعدم على الغي لائما

حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے (3)۔ اہل لغت کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: فسوف يلقون هذا الغي۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ (الفرقان) اظہر یہ ہے کہ الغی وادی کا نام ہے، اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ گمراہ لوگ اس کی طرف جائیں گے۔ کعب نے کہا: آخر زمانہ میں ایک قوم ظاہر ہو گی ان کے ہاتھوں میں گائے کے دموں کی طرح کوڑے ہوں گے پھر یہ تلاوت کیا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ یعنی وہ جہنم میں ہلاکت و گمراہی پائیں گے، ان سے یہی مروی ہے کہ غی جہنم میں ایک وادی ہے جہنم کی سب سے گہری وادی ہے اور انتہائی

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، التواضع، جلد 2، صفحہ 923

2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، حجبت النار بالشهوات، جلد 2، صفحہ 960

3۔ تفسیر طبری، جز 15-16، صفحہ 117

گرم وادی ہے اس میں ایک کنواں ہے جس کو البہیم کہا جاتا ہے، جب جہنم بجھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتا ہے پس جہنم اس کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غی جہنم میں ایک وادی ہے اور جہنم کی دوسری وادیاں اس کی گرمی سے پناہ مانگتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس وادی کو اس زانی کے لیے تیار کیا ہے جو زنا پر اصرار کرتا ہے اور اس شرابی کے لیے تیار کیا ہے جو ہمیشہ شراب پیتا ہے اور جھوٹ کی گواہی دینے والوں کے لیے تیار کیا ہے اور اس عورت کے لیے تیار کیا ہے جس نے اپنے خاوند پر ایسے بچے کو داخل کیا جو اس سے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنۡ تَابَ، یعنی نماز کے ضائع کرنے اور شہوات کی پیروی کرنے سے جس نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف لوٹ آیا۔ وَ اٰمَنَ، اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ ابوجعفر، شیبہ، ابن کثیر، ابن محیصن، ابوعمرو، یعقوب اور ابوبکر نے يَدۡخُلُوۡنَ خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَ لَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـئًا۝ ان کے اعمال صالحہ میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی مگر ان کے لیے ہر نیکی کے بدلے دس سے لیکر سات سو تک نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جَنّٰتِ عَدۡنِ یہ الجنۃ سے بدل ہے اس لیے منصوب ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: جَنّٰتِ عَدۡنِ متبدا کی حیثیت سے مرفوع بھی جائز ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اگر خط (کتابت) نہ ہوتا تو یہ جنۃ عدن ہوتا کیونکہ اس سے پہلے یدخلو الجنۃ ہے۔ الَّتِىۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ، یعنی جس نے رحمٰن کی عبادت کی اور غیب میں کیے گئے عہد کی حفاظت کی۔ بعض نے فرمایا: جنت پر ایمان لائے جبکہ انہوں نے اسے دیکھا نہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا۝ مَاۡتِيًّا۔ الاتیان سے مفعول کا صیغہ ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھ تک پہنچتی ہے تو اس تک پہنچتا ہے تو کہتا ہے: اَتَتۡ علیّ ستون سنة وأتیت علی ستین سنةً۔ مجھ پر ساٹھ سال آئے اور میں ساٹھ سال پر آیا۔ وصل إلیّ من فلان خیر وصلت منه الی خیر۔ مجھے فلاں کی طرف سے خیر پہنچی اور اس کی طرف سے خیر کو پہنچا، دونوں کا ایک معنی ہے۔ قتبی نے کہا: مَاۡتِيًّا بمعنی آتٍ ہے یہ مفعول بمعنی فاعل ہے اور ماتیا مہموز ہے کیونکہ یہ اتی یاتی سے آیا ہے اور جنہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی اس نے اس کو الف بنایا ہے۔ طبری نے کہا: الوعد سے یہاں الموعد مراد ہے اور وہ جنت ہے یعنی جنت میں اس کے اولیاء آئیں گے۔ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا۔ اور جنت میں لغوبات نہیں سنیں گے۔ اللغو کا معنی باطل اور فحش کلام ہے اور فضول، بے مقصد بات ہے، اسی سے حدیث ہے: "جب تو اپنے ساتھی کو جمعہ کے دن کہے: انصت (خاموش) جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغوبات کی" (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں یہ لغیت ہے (جبکہ پہلی حدیث میں لغوت ہے معنی دونوں کا ایک ہے واوی اور یائی ہونے میں فرق ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا:

وربِّ أسرابِ حجیجٍ کُظَّمٍ　عن اللغا ورفثِ التکلُّمِ

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللغو ہر وہ بات ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو یعنی جنتیوں کی جنت میں کلام الحمد للہ اور سبحان اللہ ہوگی۔ اِلَّا سَلٰمًا۔ لیکن وہ سلاما سنیں گے، یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی وہ ایک دوسرے کو سلام کریں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، الانصات یوم الجمعة والامام یخطب، جلد 1، صفحہ 127، 128

گے اور فرشتے کا ان پر سلام ہوگا؛ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے۔ سلام خیر کا جامع اسم ہے اس کا معنی ہے وہ اس میں نہیں سنیں گے مگر جو وہ پسند کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾ یعنی ان کے لیے صبح و شام ان کی خواہش کے مطابق کھانے اور مشروبات ہوں گے یعنی ان دونوں وقتوں کی مقدار میں کیونکہ وہاں جنت میں نہ صبح ہوگی نہ شام جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا: 12) یعنی مہینہ کی مقدار۔ یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جریج وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل جنت کے احوال کا اعتدال بتایا ہے۔ اور عربوں کے نزدیک خوشگوار کھانا اور مشروب صبح و شام کا ہے۔ یحییٰ بن ابی کثیر اور قتادہ نے کہا: عربوں میں سے جس کو صبح و شام کھانا میسر ہوتا وہ الناعم (نعمت والا) شمار ہوتا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جنت میں ان کا رزق منقطع نہ ہوگا جیسا کہ فرمایا: لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوعَةٍ ﴿۳۳﴾ (الواقعہ) جیسے تو کہتا ہے: أنا أصبح وأمسی فی ذکرك، یعنی میں ہمیشہ تیرا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بُكْرَةً سے مراد ان کے لذات سے مشغول ہونے سے پہلے کا وقت ہو اور العشی سے مراد ان کے لذات سے فارغ ہونے کے بعد کا وقت ہے، کیونکہ ان اوقات کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے لیے فترات (وقفہ) حائل ہوتے ہیں۔ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے۔ زبیر بن بکار نے اسماعیل بن ابی اُیس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت مالک بن انس نے فرمایا: مومنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوگا، اور پھر یہ تلاوت کی: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو روزوں میں صبح کے کھانے کے عوض سحر کا کھانا دیا تا کہ اپنے رب کی عبادت پر قوت حاصل کریں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لیے ذکر فرمایا کیونکہ غدا (صبح کا کھانا) کی صفت و ہیئت، شام کے کھانے کی صفت اور ہیئت سے مختلف ہوتی ہے اور یہ صرف بادشاہ ہی جانتے ہیں، اسی طرح جنت میں صبح کا کھانا، شام کے کھانے سے مختلف ہوگا انہیں مختلف قسم کی نعمتیں دی جائیں گی تا کہ تنعم اور رشک میں اضافہ ہو۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ابان عن الحسن وابی قلابہ کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنت میں رات ہے؟ آپ نے فرمایا: تجھے اس کے متعلق سوال کرنے پر کس چیز نے ابھارا ہے؟ اس شخص نے کہا: میں نے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے کتاب میں ذکر کیا ہے: وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾ میں نے سوچا بکرہ اور عشیا کے درمیان رات ہوگی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں کوئی رات نہیں''۔ جنت میں صرف نور اور روشنی ہے صبح شام پر لوٹے گی اور نمازوں کے اوقات میں جس میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحائف آئیں گے اور فرشتے انہیں سلام کریں گے یہ اس آیت کے مفہوم کا بیان ہے۔ ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے(1)۔ علماء نے فرمایا: جنت میں رات ہے، نہ دن ہے جنتی ہمیشہ نور میں ہوں گے وہ رات کی مقدار پردوں کے لٹکانے سے جانیں گے اور دروازوں کے بند ہونے سے پہچانیں گے اور دن کی مقدار پردوں کے اٹھنے اور دروازوں کے کھلنے سے پہچانیں گے؛ یہ ابو الفرج جوزی اور مہدوی وغیرہما نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي یہ جنت جس میں رہنے والوں کے

1۔ کتاب التذکرہ، صفحہ 505-504

احوال ہم نے بیان کیے۔ نُوۡرِثُ تخفیف کے ساتھ ہے۔ یعقوب نے نورث واو کے فتحہ اور راء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ بہتر تخفیف ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ (فاطر: 32)

مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو مجھ سے ڈرا اور میری اطاعت کا عمل کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: نورث من کان تقیا من عبادنا۔ ہم اپنے بندوں میں متقین کو وارث بنائیں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝

"اور (جبریل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت پر، کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے"۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے کہا: "کیا چیز تجھے اس سے مانع ہے کہ تو ہماری اس سے زیادہ ملاقات کرے جتنی کہ تو (پہلے) کرتا ہے" (1)۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ۔ یہ حدیث حسن غریب ہے اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے ہمیں خلاد بن یحییٰ نے بتایا ہمیں عمرو بن ذر نے بتایا انہوں نے کہا میں نے اپنے باپ کو یہ بات کرتے ہوئے سنا انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے کہا: "تمہیں اس سے زیادہ ہماری ملاقات سے کیا مانع ہے (2)؟" تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ فرمایا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب تھا۔ مجاہد نے کہا: فرشتے (جبریل) نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آنے سے دیر لگادی پھر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تجھے کس چیز نے دیر کرادی ہے؟ جبریل نے کہا: ہم تمہارے پاس کیسے آئیں جبکہ تم اپنے ناخن نہیں کاٹتے اور اپنی مونچھیں نہیں کاٹتے اور اپنی انگلیوں کے جوڑوں کے درمیان کی جگہ کو صاف نہیں کرتے اور مسواک نہیں کرتے۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت اس پر نازل ہوئی۔ مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ جبریل نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں دیر لگادی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے اصحاب کہف، ذی القرنین اور روح کے بارے میں سوال کیا تھا آپ نہیں جانتے تھے کہ انہیں کیا جواب دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امید تھی کہ جبریل ان کے سوال کا جواب لائیں گے، عکرمہ نے کہا: چالیس دن بعد آپ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً حدیث نمبر 3083، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۂ مریم، ما نتنزل الا بامر ربك، جلد 2، صفحہ 691

کے پاس جبریل آئے۔ مجاہد نے کہا: بارہ راتوں کے بعد آئے۔ بعض نے کہا: پندرہ دنوں کے بعد آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے بہت تاخیر کردی حتی کہ میرا گمان صحیح نہ رہا اور مجھے تیرا بہت اشتیاق ہوا''۔ جبریل نے کہا: مجھے آپ (کی ملاقات) کا شوق تھا لیکن میں عبد مامور (حکم کا بندہ) ہوں جب مجھے بھیجا جاتا ہے تو حاضر ہوتا ہوں اور جب مجھے روکا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ اور یہ نازل فرمایا: وَالضُّحٰى ۙ وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى ۞ (والضحیٰ) یہ ثعلبی، واحدی اور قشیری وغیرہم نے ذکر کیا ہے(1)۔ بعض نے فرمایا: یہ اہل جنت کی طرف سے خبر دی ہے کہ وہ جنت میں داخلہ کے وقت یہ کہیں گے: ہم ان جنتیوں میں نہیں اترے مگر اپنے رب کے حکم سے۔ اس صورت میں آیت کا ماقبل سے تعلق ہوگا۔ اور جو پہلے ہم نے اقوال ذکر کیے ہیں ان کی بنا پر بعض علماء نے فرمایا: اس کا ماقبل سے تعلق نہیں ہے۔ قرآن سورتوں میں ہے پھر سورتیں جملوں پر مشتمل ہیں ہر جملہ دوسرے جملہ سے جدا ہوتا ہے۔ وَ مَا نَتَنَزَّلُ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! تم کہو: وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ یہ دو احتمال رکھتا ہے۔

ا۔ جب ہمیں حکم ہوتا ہے تو ہم آپ پر اترتے ہیں۔ ۲۔ جب تمہارا رب حکم دیتا ہے تو ہم آپ پر اترتے ہیں۔ پہلی صورت پر امر، نزول کی طرف متوجہ ہوگا اور دوسری صورت پر تنزیل کی طرف متوجہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهٗ، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا یعنی جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اللہ کو علم ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو ان کے درمیان ہے سب کا اس کو علم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جریج نے فرمایا: اس کا معنی ہے جو کچھ دنیا کے معاملات سے ہمارے سامنے گزر چکا ہے جو بعد میں ہوگا اور آخرت کے امر سے ہے، اس کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔ وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد برزخ ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا: لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا، سے مراد امر آخرت ہے اور خَلْفَنَا سے مراد جو گزر چکا ہے۔ وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد دو نفخوں کے درمیان جو ہمارے اور ان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ اخفش نے کہا: مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ہے جو ہم سے پہلے تخلیق ہو چکا تھا۔ وَ مَا خَلْفَنَا جو کچھ ہمارے مرنے کے بعد ہوگا۔ وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ جو کچھ ہماری تخلیق سے لے کر ہمارے مرنے تک ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد ثواب، عقاب اور امور آخرت ہیں اور وَ مَا خَلْفَنَا سے مراد دنیا میں جو ہمارے اعمال میں سے ہو چکے۔ وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ وہ اس وقت سے قیامت تک ہوگا۔ اور پانچواں احتمال یہ بھی ہے کہ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد آسمان ہے وَ مَا خَلْفَنَا سے مراد زمین ہے۔ وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد وہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا سے مراد دنیا سے زمین تک ہے اور وَ مَا خَلْفَنَا سے مراد آسمان ہیں۔ یہ پہلے قول کا برعکس ہے اور وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ سے مراد ہوا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے اور دوسرا قشیری نے ذکر کیا ہے۔ زمخشری نے کہا: بعض علماء نے فرمایا جو ہماری عمروں سے گزر چکا ہے اور وہ حال جس میں ہم ہیں اور مابین ذینلک نہیں فرمایا۔ کیونکہ مابین سے مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کے درمیان جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 310

بَیْنَ ذٰلِكَ (البقرہ: 68) یعنی جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کے درمیان۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا ۝ یعنی آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ان کا خالق ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا خالق ہے اور ان کا مالک ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا مالک ہے جس طرح زمانہ کی تدبیر اس کے سپرد ہے اسی طرح اعیان کی تدبیر بھی اس کے سپرد ہے۔ فَاعْبُدْهُ، اس لیے اسی کی عبادت کر۔ اس میں دلیل ہے کہ خلق کے اکتسابات (کوششیں) اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اہل حق کا قول ہے اور یہی تو حق ہے کیونکہ اس جگہ رب کو اس کے معانی پر محمول کرنا ممکن نہیں مگر مالک کے معنی پر۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ آسمان اور زمین کا مالک ہے تو اس میں مخلوق کا اکتساب بھی داخل ہے اور اس کی عبادت واجب ہے۔ جب ثابت ہوا کہ وہ علی الاطلاق مالک ہے اور عبادت کی حقیقت حد درجہ عاجزی کے ساتھ طاعت ہے تو مالک و معبود کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ یعنی ثابت قدم رہو اس کی طاعت پر اور وحی کی تاخیر سے پریشان نہ ہوں بلکہ اس میں مشغول رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اصطبر کی اصل اصتبر ہے، تا اور صاد کو ان کے اختلاف کی وجہ سے جمع کرنا ثقیل تھا تو تا کو طا سے بدل دیا گیا جیسے تو کہتا ہے: اصطام، یہ الصوم سے ہے۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تو اس کے لیے کوئی بیٹا یا اس کی کوئی مثال جانتا ہے یا کوئی شبیہ جانتا ہے جو اس کے نام الرحمٰن کی مثل نام کا مستحق ہو (1)۔ یہ مجاہد نے کہا ہے: یہ المساماۃ سے مشتق ہے۔ اسرائیل نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: کیا تو کسی کو جانتا ہے جس کو الرحمٰن کہا جاتا ہو؟ نحاس نے کہا: یہ عظیم سند سے جو میں جانتا ہوں جو اس حرف میں مروی ہے یہ صحیح قول ہے۔ الرحمٰن صرف اللہ تعالیٰ کو ہی کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بسم اللہ کی بحث میں وضاحت ہو چکا ہے۔ الحمد للہ۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا کے تحت سمیا کا معنی مثلا روایت کیا ہے۔ ابن مسیب نے اس کا معنی عدلا روایت کیا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا: اس کا مطلب ہے کیا تو کوئی ایسا جانتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کہا جاتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے؟ ھل بمعنی لا ہے یعنی تو نہیں جانتا۔ واللہ اعلم۔

وَیَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا ۝ اَوَلَا یَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْـًٔا ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّیٰطِیْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِیًّا ۝ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِیْعَةٍ اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا ۝ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِیًّا ۝ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝

1۔ تفسیر طبری، جز 15، صفحہ 123

''اور انسان (ازراہ انکار) کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ سو (اے محبوب!) تیرے رب کی قسم ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے اردگرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ پھر ہم (چن چن کر) الگ کریں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو جو (خداوند) رحمٰن کے سخت نافرمان تھے۔ پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپائے جانے کے۔ اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ انسان سے مراد یہاں ابی بن خلف ہے اس نے پرانی ہڈیاں پائیں پھر انہیں اپنے ہاتھ سے مسل دیا اور کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہے کہ ہم مرنے کے بعد اٹھائے جائیں گے؛ یہ کلبی کا قول ہے، یہ واحدی، ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور مہدوی نے کہا: یہ ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ لَسَوْفَ میں لام تاکید کے لیے ہے گویا اسے کہا گیا: جب تو مرے گا تو یقیناً زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اس نے کہا: کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا؟ یہ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ پس لام اس کے جواب میں آیا جیسا کہ پہلے قول میں تھا اگر یہ ابتدائی کلام ہوتی تو اس پر لام داخل نہ ہوتا کیونکہ یہ تاکید اور ایجاب کے لیے ہوتا ہے وہ دوبارہ اٹھنے کا منکر تھا۔ ابن ذکوان نے: اذا مامت پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے استفہام کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ اس کا ہمزہ میں اصول ہے۔ حسن اور ابوحیوہ نے لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا پڑھا ہے۔ یہ اس نے استہزا کیا تھا کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے پر یقین نہیں کرتا تھا اور یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ یعنی کیا یہ کہنے والے کو یاد نہیں؟ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ یعنی اس کے سوال اور اس کے اس قول سے پہلے ہم نے اسے پیدا کیا۔ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿۶۷﴾، جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا، اعادہ ابتدا کی طرح ہوتا ہے پس تناقض نہیں۔ عاصم کے سوا اہل کوفہ، اہل مکہ، ابوعمرو اور ابوجعفر نے اولایذکر پڑھا ہے۔ شیبہ، نافع اور عاصم نے اَوَلَا يَذْكُرُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ بہتر تشدید ہے اس کی اصل یتذکر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۹﴾ (الزمر) اور اس قسم کے دوسرے ارشادات ہیں۔ اور ابی کی قرأت میں اولایتذکر ہے؛ یہ قرأت تفسیر کی بنا پر ہے کیونکہ مصحف کے خط کے مخالف ہے۔ یتذکر کا معنی یتفکر ہے اور یذکر کا معنی یتنبہ اور یعلم ہے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ حجت قائم کرنے کے بعد اپنی قسم اٹھائی کہ وہ ضرور قبور سے نکل کر محشر کی طرف جمع ہوں گے جس طرح کہ مومنین کو جمع کیا جائے گا۔ وَالشَّيٰطِيْنَ۔ یعنی شیاطین جو ان کے ساتھ ہیں ان کو بھی ہم جمع کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑ کر لایا جائے گا جس طرح فرمایا: اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) زمخشری نے کہا: والشیاطین میں واو عطف کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور بمعنی مع بھی ہو

سکتی ہے یہ بمعنی مع زیادہ مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں ان کے ان شیاطین ساتھیوں کے ساتھ جمع کیا جائے گا جنہوں نے انہیں اغوا اور گمراہ کیا ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوگا۔ اگر تو کہے: یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب انسان سے مراد خاص کافر ہی ہوں اگر انسان سے مراد عام انسان ہوں تو پھر انہیں شیاطین کے ساتھ کیسے جمع کیا جائے گا؟ میں کہوں گا: جب سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو ان میں سے کافر شیاطین کے ساتھ جکڑے ہوں گے وہ شیاطین کے ساتھ جمع کیے جائیں گے جس طرح ان کو کفار کے ساتھ جمع کیا جائے گا۔ اگر تم کہو کہ حشر میں بدبختوں سے سعادت مندوں کو الگ کیوں نہیں کیا گیا ہوگا جس طرح جزا میں وہ ان سے الگ کیے جائیں گے؟ میں کہوں گا: محشر میں ان کے درمیان جدائی نہ ہوگی وہ حاضر کیے جائیں گے جہاں وہ جہنم کے اردگرد گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے اور ان کے ساتھ انہیں آگ میں وارد کیا جائے گا تا کہ وہ سعادت مندوں کے احوال دیکھ لیں اللہ تعالیٰ نے جنہیں نجات دی اور انہیں خلاصی بخشی تا کہ کفار کو شک زیادہ ہو اور اولیاء اللہ کی سعادت اور ان پر سعادت مندوں کی خوشی سے انہیں تکلیف زیادہ ہو۔ اگر تو کہے کہ گھٹنوں کے بل انہیں لانے کا کیا مطلب ہے؟ تو میں کہوں گا: جب انسان سے مراد خاص انسان (کافر) ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ انہیں محشر سے جہنم کے کنارے کی طرف مجبور کر کے لے جایا جائے گا ان کی وہی حالت ہوگی جو ان کی موقف میں ہوگی وہ گھٹنوں کے بل چلیں گے قدموں پر نہیں چلیں گے یہ اس طرح ہے کہ اہل موقف کی حثو (گھٹنے کے بل چلنا) کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً (الجاثیہ: 28) ہر شخص مواقف میں گفتگو اور نقل ہونے کی مخصوص حالت میں ہوگا کچھ لوگ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے کیونکہ اس میں غیر اطمینانی اور پریشانی ہے۔ الجثا کا اطلاق طمانینت کے خلاف پر ہوگا یا انہیں ایسی شدت اور سختی لاحق ہوگی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہ ہو سکیں گے اور گھٹنوں کے بل چلیں گے۔ اور اگر انسان سے مراد عام انسان ہو تو معنی یہ ہوگا کہ وہ جہنم کے کنارے پر پہنچنے کے وقت گھٹنوں کے بل گر جائیں گے، اس پر بنا پر جثیا، حال مقدرہ ہوگا جیسا کہ وہ موقف میں گھٹنوں کے بل تھے کیونکہ یہ حساب کے لیے کھڑے ہونے کے توابع سے ثواب اور عقاب تک پہنچنے سے پہلے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ: لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا یعنی وہ اپنے گھٹنوں پر ہوں گے کہ وہ قیام پر قادر نہ ہوں گے۔ حَوْلَ جَهَنَّمَ اس میں یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد جہنم کا داخل ہو جیسے تو کہتا ہے: جلس القوم حول البیت، قوم گھر کے اندر بیٹھی اس کے اردگرد طواف کرتے ہوئے۔ اور حَوْلَ جَهَنَّمَ یہ بھی جائز ہے کہ یہ دخول کے بعد ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ دخول سے پہلے ہو۔ جِثِيًّا جمع ہے جاثٍ کی، کہا جاتا ہے: جثا علی رکبتیه، یجثو دیجثی جثوا وجُثیا، مصدر دونوں میں فعول کے وزن پر ہے۔ اجثاہ غیرہ، قوم جثی، جیسے جلس، جلوسا اور قوم جلوس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جثیا کا مطلب جماعات ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے جمعاً جمعاً (اکٹھا اکٹھا) اس تاویل پر یہ جُثوۃ جَثوۃ اور جِثوۃ تینوں لغات ہیں۔ یہ جمع شدہ پتھروں اور جمع شدہ مٹی کو کہتے ہیں، شرابی لوگ علیحدہ ہوں گی، زانی علیحدہ ہوں گے اسی طرح سارے مجرم علیحدہ ہوں گے۔ طرفہ نے کہا:

تَرَى جُثْوَتين من تُرابٍ عليهما صفائحُ صُمٌّ من صفيحٍ مُنَضَّدِ

حسن اور ضحاک نے کہا: گھٹنوں کے بل کھڑا ہونا۔ اس تاویل پر یہ جاثٍ کی جمع ہوگی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہوگا یعنی ان کے لیے مکمل بیٹھنا ممکن نہ ہوگا۔ بعض نے فرمایا: آپس میں جھگڑنے کی وجہ سے گھٹنوں کے بل ہوں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝ (الزمر)

کمیت نے کہا ہے:

ثم تركوا سراتهم جثيا وهم دون السراة مقرنينا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ، یعنی ہم ہر امت اور ہر اہل دین سے نکالیں گے۔ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝ نحاس نے کہا: یہ آیت ترکیب کے اعتبار سے بہت مشکل ہے کیونکہ تمام قراء ایھم کو رفع کے ساتھ پڑھتے ہیں سوائے ہارون قاری اعور کے۔ سیبویہ نے اس سے اَيُّهُمْ پر نصب دی ہے کیونکہ اس پر لَنَنْزِعَنَّ کو واقع کیا ہے۔ ابواسحق نے کہا: اَيُّهُمْ کے رفع میں تین اقوال ہیں۔ خلیل بن احمد نے کہا: یہ سیبویہ نے اس سے حکایت کیا ہے کہ یہ حکایت پر مرفوع ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ثم لننزعن من كل شيعة الذي يقال من أجل عتوه أيهم أشد على الرحمن عتيا۔ اور خلیل نے بطور دلیل یہ شعر پیش کیا ہے:

ولقد أبيت من الفتاة بمنزلٍ فأبيتُ لا حرج ولا محروم

یعنی فابيت بمنزلة الذي يقال له لا هو حرج ولا محروم۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: میں نے ابواسحاق کو دیکھا وہ اس قول کو پسند کرتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے فرمایا: کیونکہ یہ اہل تفسیر کے قول کا معنی ہے اور یہ کہا ہے کہ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ کا معنی یہ ہے ثم لننزعن من كل فرقة الأعتى فالأعتى۔ یعنی ہم ہر فرقہ سے جو زیادہ نافرمان ہوگا اسے نکالیں گے پھر جو اس کے بعد نافرمان ہوگا اسے نکالیں گے گو جو سب سے زیادہ نافرمان ہوگا اسے عذاب دیا جائے گا پھر جو اس سے متصل ہوگا۔ یہ اس آیت کے معنی میں ابواسحاق کے کلام کی نص ہے۔ یونس نے کہا: لَنَنْزِعَنَّ ان افعال کے قائم مقام ہے جو ملغی ہوتے ہیں اور اَيُّهُمْ کا رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے۔ مہدی نے کہا: وہ فعل جو لننزعن ہے یونس کے نزدیک معلق ہے ابوعلی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ ایھم اشد کی جگہ میں عمل کر رہا ہے ملغی نہیں ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک لننزعن کی مثل فعل معلق نہیں ہوتا افعال شک اور وہ افعال جن کا وقوع محقق نہیں ہوتا وہ معلق ہوتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: ایھم مبنی برضمہ ہے کیونکہ حذف میں اس نے اپنے اخوات کی مخالفت کی ہے کیونکہ اگر تو کہے: رأيت الذي أفضل ومن أفضل تو یہ قبیح ہوگا حتی کہ تو کہے: من هو أفضل، أيهم میں حذف جائز ہے۔ ابوجعفر نے کہا: میں کسی نحوی کو نہیں جانتا مگر اس نے اس میں سیبویہ کو غلط کہا ہے میں نے ابواسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ سیبویہ کی کتاب میں میرے لیے کوئی غلطی ظاہر نہیں ہوئی مگر دو جگہوں پر ان میں سے ایک یہ ہے فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ سیبویہ نے ایا کو اعراب دیا ہے جبکہ یہ مفرد ہے کیونکہ یہ مضاف ہوتا ہے وہ اسے کیسے مبنی بناتا ہے جبکہ یہ مضاف ہوتا ہے؟ ابواسحاق نے ذکر نہیں کیا مگر یہی تین اقوال۔ ابوعلی نے کہا: سیبویہ کے مذہب پر مبنی ہونا واجب ہے کیونکہ جس وجہ سے یہ پہچانا جاتا ہے وہ اس سے حذف کیا گیا ہے اور وہ ضمیر ہے حالانکہ اس کی احتیاج ہے جیسا

کہ: من قبل و من بعد میں وہ چیز حذف کی گئی ہے جسکے ساتھ پہچانے جاتے ہیں کیونکہ صلہ موصول کی وضاحت کرتا ہے اور اسے خاص کرتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: اس میں ان مذکورہ تین اقوال کے علاوہ چار اقوال ہیں۔ کسائی نے کہا: لننزعن کا معنی ایھم پر واقع نہیں کہ اسے نصب دیتا ہے۔ مہدوی نے یہ زائد کہا ہے کہ اس کے نزدیک فعل، من کل شیعۃ کے محل پر واقع ہے۔ ایھم اشد جملہ مستانفہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے ایھم مرفوع ہے اور سیبویہ الواجب میں من کی زیادتی کے قائل نہیں۔ فراء نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ندا کے ذریعے نکالیں گے اور لننزعن کا معنی پر واقع ہے جیسے تو کہتا ہے: لبست من الثیاب واکلت من الطعام اور لننزعن ہے ہم پکاریں گے۔ مہدوی نے کہا: نادی فعل معلق ہوتا ہے جب اس کے بعد جملہ ہوتا ہے جیسا کہ ظننت ہے۔ پس یہ معنی میں عمل کرتا ہے اور لفظ میں عمل نہیں کرتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: ابوبکر بن شقیر نے حکایت کیا ہے کہ بعض کوفیوں نے کہا: ایھم میں شرط و جزا کا معنی ہے اس لیے ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا، معنی یہ ہے پھر ہم ہر ایک فرقہ سے نکالیں گے اگر تم گروہ بنو یا نہ بنو جیسے تو کہتا ہے: ضربت القوم أیھم غضب، معنی یہ ہے کہ اگر وہ غصہ میں ہوں یا نہ ہوں میں قوم کو ماروں گا۔ ابوجعفر نے کہا: یہ چھ اقوال ہیں۔ میں نے علی بن سلیمان کو محمد بن یزید سے یہ حکایت کرتے ہوئے سنا کہ ایھم، شیعۃ کے متعلق ہے وہ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے معنی یہ ہے پھر ہم ان لوگوں سے نکالیں گے جنہوں نے آپس میں تعاون کیا اور دیکھا کہ کون رحمٰن کا سخت نافرمان ہے؟ یہ حسن کا قول ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے کہ التشایع کا معنی تعاون کرنا ہے۔ اور عتیا کو نصب بیان کی وجہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۝ یعنی وہ آگ میں داخل ہونے کے زیادہ حقدار ہیں۔ کہا جاتا ہے: صَلَى يَصْلَى صُلِيا، جیسے مضی یمضی مُضِیا جب کوئی چلا جائے۔ ھوی یھوی ھُویا۔ جوہری نے کہا: کہا جاتا ہے صلیت الرجل نارا جب تو کسی کو آگ میں جھونک دے، گویا تو اسے جلانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں: اصلیتہ الف کے ساتھ وصلیتہ تصلیۃ بھی آتا ہے۔ ویُصَلّٰی سَعِیرًا بھی پڑھا گیا ہے۔ اور جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ عربوں کے اس قول سے ہوگا: صَلِیَ فلان بالنار لام کے کسرہ کے ساتھ۔ یصلی صُلِیاً اس کا معنی ہے جل جانا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا۔ عجاج نے کہا:

واللهِ لولا النارُ أن نصلاها

اسی طرح کہا جاتا ہے: صلی بالامر جب گرمی اور شدت سخت ہو جائے۔ طہوی نے کہا:

وَلَا تَبْلَى بَسَالَتُهُمْ وإنْ هُمْ صَلُوا بالحرب حِينًا بعد حِينِ

وآصطلیت بالنار و تصلیت بھا

ابوزبید نے کہا:

وقد تَصَلَّيْتُ حَرَّ حَرْبِهِمُ كما تَصَلَّى الْمَقْرُوْرُ من قَرَسِ

فلانٌ لا يُصْطَلَى بنارہ کہا جاتا ہے جب کوئی بہادر شخص ہو اور اس کا مقابلہ نہ کیا جاتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ یہ قسم ہے اور رواؤ قسم کو متضمن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے۔ لایموت لأحدٍ من المسلمین ثلاثة من الولد فتمسه النار إلا تحلّة القسم۔ جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں اسے آگ نہیں چھوئے گی مگر قسم پوری ہونے کی مقدار۔ زہری نے کہا: گویا یہ آیت مراد لے رہے ہیں وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔ یہ ابوداؤ طیالسی نے ذکر کیا ہے اور حدیث میں الاتحلّة القسم کا قول تفسیر مسند میں نکلتا ہے، کیونکہ اس حدیث میں جو قسم مذکور ہے اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا، بعض علماء نے فرمایا: القسم سے مراد یہ ارشاد ہے: وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ (الذاریات) پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور مفہوم قریب ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الورود کے متعلق علماء کا اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: اس سے مراد دخول ہے(1)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے فرمایا میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''الورود سے مراد دخول ہے کوئی نیکوکار اور فاجر باقی نہیں ہوگا مگر وہ دوزخ میں داخل ہوگا مومنین پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ ابوعمر نے کتاب ''التمہید'' میں اپنی سند کے ساتھ یہ ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، خالد بن معدان، ابن جریج وغیرہم کا یہی قول ہے۔ یونس نے حسین سے روایت کیا ہے کہ وہ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا پڑھتے تو الورود کی تفسیر الدخول سے بیان کرتے۔ بعض راویوں سے اس میں غلطی ہوئی اور انہوں نے الورود، الدخول کے الفاظ کو قرآن کے ساتھ لاحق کر دیا ہے۔ مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اس سے اپنے اعمال کے ساتھ نکلیں گے پہلے لوگ بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے نکلیں گے پھر (بعد والے) ہوا کی طرح نکلیں گے پھر (بعد والے) گھوڑے کی تیز رفتاری سے نکلیں گے پھر (بعد والے) اس مسافر کی تیزی سے نکلیں گے جو اپنی سواری کو تیز چلانے والا ہوتا ہے پھر اس شخص کی طرح جو تیز چلتا ہے''(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں نافع بن ازرق خارجی سے فرمایا: رہا میں اور تو، تو ضرور ہم وارد ہوں گے۔ رہا میں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات دے گا اور رہا تو تو میں گمان نہیں کرتا کہ وہ تجھے نکالے گا تیرے جھٹلانے کی وجہ سے۔ اکثر علماء ڈرتے ہیں کیونکہ دوزخ پر ورود تو یقینی ہے لیکن اس سے نکلنا مجہول ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ (التذکرہ) میں بیان کر دیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الورود سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابن مسعود اور کعب احبار اور سدی سے مروی ہے۔ سدی نے اس کو حضرت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، فضل من مات ولد فاحتسب، جلد 2، صفحہ 145

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً، حدیث نمبر 3084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن مسعود سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حسن کا بھی یہی قول ہے فرمایا: الورود سے مراد الدخول نہیں ہے تو کہتا ہے: وردت البصرة ولم أدخل۔ میں بصرہ پر وارد ہوا اور داخل نہیں ہوا۔ فرمایا: الورود سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: حسن کے مذہب پر اہل لغت کی ایک قوم نے بنیاد رکھی ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے حجت پکڑی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء)

یہ علماء فرماتے ہیں: وہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ دوزخ سے دور کرنے کی ضمانت دے گا۔ اور وہ ثم کو ثاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور پہلے مقالہ والوں نے ان کے خلاف یہ حجت پکڑی ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ کا معنی ہے دوزخ میں عذاب سے دور کرنا اور جلانے سے دور کرنا، جو اس میں داخل ہوگا وہ اسے محسوس نہیں کرے گا اور کوئی تکلیف نہیں پائے گا وہ حقیقت میں دوزخ سے دور کیا گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ ثم کو ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: ثم دخول کے بعد نجات پر دلالت کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں ہے ''جہنم پر ایک پل لگایا جائے گا اور شفاعت کا در کھلے گا لوگ کہیں گے: سلم سلم سلامتی عطا فرما، سلامتی عطا فرما'' (1)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ پل کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ ایک پھسلن ہے اس میں اچک لینے والے اور نوک دار مڑے ہوئے کنڈے ہیں۔ ان میں سہ شاخے کانٹے ہیں اس کو سعدان کہا جاتا ہے۔ مومنین آنکھ جھپکنے کی طرح گزریں گے اور بجلی کی طرح اور ہوا کی طرح اور پرندوں کی طرح اور عمدہ گھوڑوں کی طرح اور اونٹوں کی طرح کچھ نجات پانے والے سلامتی پانے والے ہوں گے۔ اور کچھ کو خراشیں آئیں گی اور چھوڑ دیے جائیں گے اور کچھ جہنم میں دھکیل دیے جائیں گے''۔

اس سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو فرماتے ہیں کہ پل صراط سے گزر وہ ورود ہے جس کو یہ آیت اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے نہ کہ دوزخ میں داخل ہونا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ ورود سے مراد جھانکنا، اطلاع اور قرب ہے۔ وہ حساب کی طرح حاضر ہوں گے اور وہ جہنم کے قریب ہوگی پس وہ اس کی طرف حساب کی حالت میں دیکھیں گے پھر اللہ تعالیٰ انہیں اس سے نجات دے گا جو انہوں نے دیکھا پھر انہیں جنت کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ وَنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ ظالموں کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ (القصص: 23) یعنی پانی پر جھانکا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ پانی میں داخل ہوا۔ زہیر نے کہا:

فَلَمَّا وَرَدْنَ الماء زُرْقًا جِمَامُهُ    وضَعْنَ عِصِیَّ الحاضِرِ المُتَخَیِّم

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آگ میں اہل بدر اور اہل حدیبیہ میں سے کوئی داخل نہ ہوگا'' (2)۔ فرماتی ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا قول کہاں جائے گا؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خاموش، ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝ '' اس حدیث کو امام

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 131
2۔ ایضاً، جز 16، 15-16، صفحہ 130

مسلم نے حضرت ام مبشر سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں: میں نے نبی پاک ﷺ کو حضرت حفصہ سے یہ فرماتے سنا (الحدیث) زجاج نے اس قول کو اس ارشاد کی وجہ سے ترجیح دی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى (الانبیاء:101) مجاہد نے کہا: مومنین کے آگ پر وارد ہونے سے مراد بخار ہے جو مومن کو دنیا میں لاحق ہوتا ہے یہی آگ سے مومن کا حصہ ہے وہ دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی پاک ﷺ نے ایک مریض کی عیادت کی جس کو بخار تھا نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''تمہیں بشارت ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ (بخار) میری آگ ہے جو میں اپنے بندہ مومن پر مسلط کرتا ہوں تا کہ یہ آگ سے اس کا حصہ ہو جائے''۔ ابو عمر نے اسے مسند ذکر کیا ہے فرمایا عبد الوارث بن سفیان نے ہمیں بیان کیا فرمایا ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن اسماعیل صائغ نے بیان کیا فرمایا ہمیں ابو اُسامہ نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبد الرحمٰن بن یزید بن جابر نے بیان کیا انہوں نے اسماعیل بن عبید اللہ سے انہوں نے ابو صالح اشعری سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے مریض کی عیادت کی پھر یہ حدیث مذکور ذکر کی اور حدیث میں ہے ''بخار، مومن کا آگ سے حصہ ہے'' (1)۔ اور ایک جماعت نے کہا: الورود سے مراد قبر میں دوزخ کو دیکھنا ہے پھر کامیاب شخص کو اللہ تعالیٰ نجات دیتا ہے اور جس کی تقدیر میں اس میں داخل ہونا لکھا ہوگا وہ اس میں داخل ہوگا پھر اس سے شفاعت کے ذریعے یا اس کے علاوہ اللہ کی رحمت سے نکلے گا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے کہ ''جب تم میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے'' (الحدیث) وکیع نے شعبہ سے انہوں نے عبد اللہ بن سائب سے انہوں نے ایک شخص سے اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی تفسیر میں فرمایا: یہ خطاب کفار کو ہے۔ ان سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ وان منهم پڑھتے تھے وہ ان آیات پر اس کو لوٹاتے تھے جن میں کفار کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ اسی طرح عکرمہ اور ایک جماعت نے پڑھا ہے، اس قرأت پر کوئی جھگڑا نہیں۔ ایک فرقہ نے کہا: منکم سے مراد کافر ہیں معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد ﷺ ان سے کہو: یہ تاویل آسان ہے اور کاف ضمیر منکم میں لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ میں ھا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس کاف کا ھاء کی طرف لوٹانا ناپسندیدہ نہیں یہ اس ارشاد میں بھی معروف ہے۔ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿٢٢﴾ (الدہر) اس آیت میں كَانَ لَكُمْ سے مراد کان لهم ہے۔ کاف ضمیر ھاء کی طرف راجع ہے۔ اکثر علماء نے فرمایا: مخاطب تمام عالم ہے اور تمام کا ورود ضروری ہے اس پر ورود میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق علماء کے اقوال بیان کر دیے ہیں۔ ورود کا ظاہر معنی دخول ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: فتمسّهُ النار۔ المسیس کا معنی لغت میں چھونا ہے۔ مگر وہ آگ مومنین پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی اور وہ اس سے سلامتی کے ساتھ نجات پائیں گے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ماجاء تبريد الحمى، جلد 2، صفحہ 29-28۔ ایضاً، حدیث نمبر 2014، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب الحمى، حدیث نمبر 3460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالد بن معدان نے کہا: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو وہ دیکھیں گے کیا ہمارے رب نے کہا نہیں تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے؟ انہیں کہا جائے گا: تم اس میں وارد ہوئے تھے پس تم نے اسے راکھ پایا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول مختلف اقوال کا جامع ہے اگر کوئی اس میں وارد ہوا اور اسے آگ اپنے شعلے سے اذیت نہ دے تو وہ اس سے دور کیا گیا اور اس سے بچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم سے نجات عطا فرمائے، ان لوگوں سے کرے جو اس پر وارد ہوں تو سلامتی کے ساتھ داخل ہوں اور اسے غنیمت کے ساتھ نکالے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا انبیاء آگ میں داخل ہوں گے؟ ہم کہیں گے: ہم یہ مطلق نہیں کرتے بلکہ ہم کہتے ہیں: ساری مخلوق دوزخ پر وارد ہو گی جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے نافرمان اپنے جرائم کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گے، اولیاء اور سعادت مند ان مجرموں کی شفاعت کے لیے داخل ہوں گے پس ان دونوں دخولوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ ابن انباری نے مصحف عثمان اور قرأت عامہ سے حجت پکڑتے ہوئے کہا: لغت میں جائز ہے کہ غائب سے مخاطب اور مخاطب سے غائب کی طرف التفات ہوتا رہتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (دہر) پہلے غائب کی ضمیریں تھیں پھر مخاطب کی ضمیریں ذکر فرمائیں؛ یہ مفہوم سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں الاتَحِلَّة القسم یہ مستثنیٰ منقطع کا بھی احتمال رکھتا ہے لیکن تَحِلَّة القسم یہ کلام عرب میں معروف ہے یعنی اسے آگ بالکل نہ چھوئے گی۔ یہاں کلام مکمل ہوئی پھر نئی کلام فرمائی اَلاتَحِلَّةَ القسم یعنی لکن تَحِلَّة القسم (قسم پوری قسم کرنے کے لیے ضروری ہے) جو کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا اور وہ پل صراط سے گزرنا ہو یا آگ کو دیکھنا یا سلامتی کے ساتھ داخل ہونا ہو پس اس میں کوئی مسیس نہ ہوگا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم میں سے جن کے تین بچے فوت ہو جائیں گے پھر وہ ان پر ثواب کی امید رکھے گا تو وہ اس کے لیے دوزخ سے ڈھال ہوں گے'' (1)۔ الجنة کا معنی ڈھال اور پردہ ہے۔ اور جو آگ سے بچایا گیا اور اس سے چھپایا گیا اس کو بالکل آگ نہ چھوئے گی اگر آگ اسے چھوتی تو وہ بچایا گیا نہ ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** یہ حدیث پہلی حدیث کی تفسیر ہے کیونکہ اس میں الحسبة کا ذکر ہے اسی وجہ سے امام مالک نے اپنے اثر کے ساتھ اس کو مفسر فرمایا ہے۔ اس دوسری حدیث کو اس نے مقید کیا ہے جو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا: من مات له ثلاثة من الولد لم يبلغوا الحِنث كان له حجابا من النار أو دخل الجنة (2)۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لم يبلغوا الحنث، اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس عمر کو نہ پہنچے ہوں کہ ان پر گناہ لازم ہوتا ہو۔ یہ دلیل ہے کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں ہوں گے، واللہ اعلم۔ کیونکہ رحمت جب ان کے آباء پر نازل ہوئی تو یہ محال ہے کہ جن کی وجہ سے دوسروں پر رحم کیا گیا ہو وہ خود مرحوم نہ ہوں۔ اس

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 218

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، ، أقسموا بالله جهد ايمانهم، جلد 2، صفحہ 985

پر علماء کا اجماع ہے کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں ہیں، اس میں مخالفت نہیں کی مگر جبریہ فرقہ نے انہوں نے اس کو مشیت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ یہ ان کا اجماع کی وجہ سے مردود قول ہے جن کی مخالفت جائز نہیں اور نہ ان کی مثل پر غلطی جائز ہے نیز ثقہ عادل لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخبار آحاد روایت کی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول: الشقی من شقی فی بطن أمه والسعید من سعد فی بطن أمه وأن الملك ینزل فیکتب أجله وعمله ورزقه (1)۔ بدبخت وہ ہے جو اپنی ماں کے بطن میں بدبخت تھا اور سعید وہ ہے جو اپنی ماں کے بطن میں سعید تھا فرشتہ نازل ہوتا ہے وہ اس کی عمر اس کا عمل اور اس کا رزق لکھتا ہے۔ یہ حدیث مخصوص ہے مسلمانوں کے بچوں میں سے جو اکتساب سے پہلے مرجائے گا وہ وہ ہوگا جو اپنی ماں کے بطن میں سعید تھا اور وہ بدبخت نہیں تھا اس کی دلیل احادیث اور اجماع ہے، اسی طرح حضرت عائشہ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اس کے لیے رہنے والے بھی پیدا کیے جبکہ وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے''۔ یہ اجماع اور آثار کی وجہ سے ضعیف اور مردود ہے۔ طلحہ بن یحییٰ جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہے وہ ضعیف ہے قابل حجت نہیں۔ اس حدیث کے ساتھ وہ منفرد ہے اس لیے قبول نہیں۔ شعبہ عن معاویہ بن قرہ بن ایاس مزنی عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کا چھوٹا بچہ فوت ہوگیا وہ اس پر بہت افسردہ ہوا اسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تجھے یہ خوشی نہیں کہ تو جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے آئے تو تو اسے پائے کہ وہ تیرے لیے دروازہ کھولتا ہے'' (2)۔ یہ حدیث ثابت صحیح ہے ان احادیث کے معنی کے ساتھ جو ہم نے ذکر کی ہیں نیز جمہور کا اجماع بھی ہے۔ یہ صحیح حدیث یحییٰ کی حدیث کے معارض ہے اور اسے دور کرتی ہے۔ ابو عمر نے کہا: میرے نزدیک اس حدیث میں اور اس کے مشابہ آثار میں وجہ یہ ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جس نے فرائض کی آدیگی کی محافظت کی، کبائر سے اجتناب کیا، مصیبت پر صبر کیا اور ثواب کی امید رکھی۔ خطاب اس زمانہ میں ایسی قوم کو تھا جن کا غالب اسی پر تھا وہ صحابہ کرام تھے۔ نقاش نے بعض علماء سے ذکر کیا ہے کہ: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا قول منسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء) جس کو آگ نے نہیں چھوا وہی آگ سے دور کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے ''قیامت کے روز آگ مومن کو کہے گی: ''اے مومن! گزر جا تیرا نور میرے شعلہ کو بجھا رہا ہے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۝، الحتم کا معنی ہے فیصلہ کو واجب کرنا یعنی یہ حتمی تھا۔ مَّقْضِیًّا اللہ تعالیٰ نے یہ تم پر فیصلہ فرمادیا تھا۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: یہ قسم واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا، یعنی ہم متقین کو نکالیں گے، وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝ یہ آیت دلیل ہے کہ ورود سے مراد دخول ہے کیونکہ ندخل الظالمین نہیں فرمایا۔ اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ مذہب یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اگرچہ دوزخ میں داخل ہوگا اسے اس کی بداعمالیوں کی مقدار سزا ملے گی پھر وہ نجات پائے گا۔ فرقہ مرجئہ نے کہا: وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، فضل مکن له ولد فاحتسب، جلد 1، صفحہ 167

2۔ التمہید جلد 6، صفحہ 349۔351۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 24132

3۔ تفسیر طبری

بھی داخل نہ ہوگا۔ وعیدیہ نے کہا: گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اس کا بیان کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ عاصم جحدری، معاویہ بن مرۃ نے ثم ننجی تخفیف کے ساتھ انجی سے پڑھا ہے؛ یہ حمید، یعقوب اور کسائی کی قرأت ہے اور باقی قراء نے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے ثمہ پڑھا ہے، یعنی وہاں، ثم ظرف ہے مگر یہ مبنی ہے کیونکہ غیر محصل ہے پس یہ مبنی ہوگا جیسے ذاہنی ہے اور ھاء یہ بھی جائز ہے کہ یہ حرکت کے بیان کے لیے ہو پس اسے وصل میں حذف کیا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بقعہ کی تانیث کے لیے ہو پس وصل میں تاء ثابت ہوگی۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا ۙ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا ۝ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْیًا ۝ قُلْ مَنْ كَانَ فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ۬ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۝

”اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے (تو) کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے؟ اور (ان احمقوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز و سامان اور ظاہری سج دھج میں (ان سے) بہتر تھیں۔ آپ فرمایئے: جو گمراہی میں (مگن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ، یعنی ان کفار پر جب ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جن کا ذکر ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا ۝ میں گزر چکا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا: وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۝ جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو دنیا کی وجہ سے عزت والے بنتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں کیا ہے اگر ہم باطل پر ہوئے ہم مال کے اعتبار سے زیادہ ہیں، نفری کے اعتبار سے معزز ہیں؟ ان کا مقصود کمزور لوگوں پر شبہ کو زائل کرنا اور ان کو وہم دلانا تھا کہ جس کا مال زیادہ ہوتا ہے یہ دلیل ہے کہ وہ اپنے دین میں حق پر ہے، گویا انہوں نے کفار میں کوئی فقیر نہیں دیکھا اور مسلمانوں میں کوئی غنی نہیں دیکھا۔ اور یہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو دنیا سے دھوکا کھانے اور کثرت سے اس کی طرف میلان سے دور رکھتا ہے۔ بَیِّنٰتٍ، کا معنی جن کے الفاظ میں ترتیل ہے اور معانی میں تلخیص ہے، مقاصد کو بیان کرنے والی ہیں۔ محکمات ہیں یا متشابہات ہیں محکمات کی وجہ سے ان کا بیان ان کے پیچھے موجود ہے یا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا فعلاً بیان کیا ہے، ان کے ظاہر میں اعجاز ہے ان کے ساتھ چیلنج کیا گیا ہے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا یا یہ حجتیں اور براہین ہیں یہ حال مؤکدہ ہے جیسے اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا (البقرہ: 91) کیونکہ آیات ہمیشہ واضح ہوتی ہیں اور حجتیں ہوتی ہیں۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس سے مراد قریش کے مشرک ہیں نضر بن حرث اور اس کے ساتھی، لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فقراء صحابہ ہیں ان کی حالت بوسیدہ تھی ان کی زندگیوں میں خشونت تھی اور ان کے لباس پھٹے پرانے ہوتے تھے مشرک لوگ اپنے بالوں کو کنگھی کرتے تھے، اپنے سروں پر تیل لگاتے تھے اور عمدہ لباس پہنتے تھے انہوں نے مومنین سے کہا: اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا، ابن کثیر، ابن محیصن، حمید اور شبل بن عباد نے مقاما میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قیام کی جگہ، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الاقامۃ کے معنی میں مصدر میمی ہو اور باقی قراء نے مقاماً کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی منزل اور مسکن۔ بعض علماء نے فرمایا: مقام سے مراد وہ جگہ ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے امور طے کیے جاتے ہیں یعنی دونوں فریقوں میں سے زیادہ جاہ و حشمت اور مددگاروں والا کون ہے؟ اَحْسَنُ نَدِيًّا، (1) ندیا سے مراد مجلس ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد منظر ہے لغت میں مجلس کو النادی کہتے ہیں اسی سے دار الندوہ ہے کیونکہ مشرکین اس میں اپنے امور کا مشورہ کرتے تھے۔ ناداہ کا مطلب ہے مجلس میں اس نے اسے بٹھایا۔ شاعر نے کہا: أنادي به آل الوليد وجعفر الندي فعیل کے وزن پر قوم کے بیٹھنے کی جگہ اور گفتگو کی جگہ اسی طرح الندوہ، النادی، المنتدی، المتندی ہے اگر قوم بکھر جائے تو وہ ندی نہیں ہے؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ، قرن سے مراد امت اور جماعت ہے، هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا زیادہ مال و متاع مراد ہے۔ شاعر نے کہا:

وفَرْعٍ يزينُ المتْنَ أسودَ فاحِمٍ　　أثيثٍ كقِنْوِ النَّخْلَةِ المُتَعَثْكِلِ

الاثاث سے مراد گھر کا ساز و سامان ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اثاث جو بچھایا جاتا ہے۔ الحرثی جو پہنا جاتا ہے۔ حسن بن علی طوسی نے یہ شعر کہا ہے:

تقادیم العهد من أم الوليد بنا　　دهراً دصار أثاث البيت خُرْثِيًا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اثاث سے مراد ہیئت ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد کپڑے ہیں، وَّ رِءْيًا خوبصورت منظر، اس میں پانچ قراتیں ہیں: اہل مدینہ نے وریا بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اہل کوفہ نے ورئیا ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب نے حکایت کیا ہے کہ طلحہ نے وریا ایک یاء مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سفیان نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: هم احسن اثاثا وزیا یعنی زاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ چار قراتیں ہیں۔ ابو اسحاق نے کہا: هم احسن اثاثا وریئا یعنی یا کے بعد ہمزہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: اہل مدینہ کی قرأت اس میں بہتر ہے اور اس میں دو تقریریں ہیں۔ (۱) یہ رایت سے مشتق ہو پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہو اور اسکو یاء سے بدل دیا گیا ہو اور پھر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا ہو۔ یہ بہتر ہے تاکہ آیات کے سرے متفق ہو جائیں کیونکہ وہ غیر مہموز

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 134

ہیں اس بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الرئی کا مطلب منظر ہے بس معنی یہ ہے هم احسن اثاثا ولباسا اور دوسری تقریر یہ ہے کہ أن جلودهم مرتویه من النعمة ان کی کھالیں نعمتوں سے سیراب تھیں۔ پس اس بنا پر ہمزہ جائز نہیں اور ورش کی روایت میں نافع اور ابن ذکوان نے ابن عامر سے ریئا ہمزہ کے ساتھ پہلی وجہ پر ہوگا؛ یہ اہل کوفہ اور ابو عمرو کی قرأت ہے یہ اصل پر رأیت سے مشتق ہوگا۔ طلحہ بن مصرف کی قرأت و ریا ایک یاء مخففہ کے ساتھ میں، اس کو غلط خیال کرتا ہوں۔ بعض نحویوں کا خیال ہے کہ اس کی اصل ہمزہ ہے پھر ہمزہ کو یا سے تبدیل کیا گیا پھر ایک یاء کو حذف کیا گیا۔ مہدوی نے کہا: ریئا ہونا بھی جائز ہے یا کو تبدیل کیا گیا تو وہ ریا ہو گیا۔ پھر ہمزہ کی حرکت یا کی طرف نقل کی گئی اور اسے حذف کیا گیا، بعض نے وریا قلب کی بنا پر پڑھا ہے۔ یہ پانچویں قرأت ہے۔ سیبویہ نے راء بمعنی رأی حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: جس نے اس کو ہمزہ دیا ہے اس نے اسے رایت سے مشتق کیا ہے اور اس سے مراد منظر ہے جس کو آنکھ اچھی حالت اور خوبصورت لباس میں دیکھتی ہے۔ ابو عبیدہ نے محمد بن نمیر ثقفی نے کہا:

أشاقتك الظعائن یوم بانوا بذی الرِّئی الجمیلِ من الأثاث

اور جنہوں نے اس کو ہمزہ نہیں دیا یا تو وہ ہمزہ کی تخفیف کی بنا پر ہے یا وہ رَوِیت ألوانهم وجلودهم ریا سے مشتق ہوگا، جس کا معنی ہے ان کے رنگ اور کھالیں بھری ہوئی اور خوبصورت تھیں۔ رہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب اور سعید بن جبیر اور اعسم مکی اور یزید بربری کی قرأت وزیا، زاء کے ساتھ اس کا معنی بھی ہیئت اور خوبصورت ہے۔ یہ جائز ہے کہ یہ زویت سے مشتق ہو یعنی جمع کی گئی اس کی اصل رویا ہوگی واو کو یاء سے بدلا گیا ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: زویت لی الأرض(1) زمین میرے لیے لپیٹ دی گئی یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی چیز بھی فائدہ نہ دے گی۔ یہ لوگ جتنا چاہیں زندگی گزاریں پس انہیں موت اور عذاب کی طرف لوٹنا ہے اگرچہ وہ کتنی لمبی عمر پائیں یا جلدی پہنچنے والا عذاب مراد ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی معرفت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ، یہاں ضلالت سے مراد کفر ہے۔ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا یعنی اس کی جہالت اور کفر کی سرکشی میں اسے چھوڑے رکھتا ہے۔ صیغہ امر کا ہے لیکن اس کا معنی خبر ہے یعنی جو گمراہی میں ہوگا اللہ تعالیٰ اسے ڈھیل دے گا حتی کہ اس کا غرور بڑھتا جائے پس وہ اس کے عقاب کو مزید سخت کر دے گا اس کی مثال یہ ہے: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران: 178) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (الانعام) اس کی مثالیں بہت سی ہیں یعنی جتنا چاہے زندہ رہے اپنی عمر میں اپنے لیے وسعت کرے۔ اس کا انجام موت اور عقاب ہی ہوگا۔ یہ شدید وعید اور دھمکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ دعا ہے جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ تو کہتا ہے: من سرق مالی فلیقطع الله تعالی ییده، جو میرا مال چوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا ہاتھ کاٹے۔ یہ چور کے خلاف بددعا ہے یہ جواب شرط ہے اس بنا پر فلیمدد خبر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ، راؤ، فرمایا کیونکہ لفظ مَنْ واحد اور جمع کی صلاحیت رکھتا ہے اور اذا

1۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن باب ما یکون من الفتن، حدیث نمبر 3941، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ماضی کے ساتھ بھی مستقبل کا معنی دیتا ہے، یعنی حتی کہ وہ دیکھ لیں گے جو ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ العذاب سے یہاں مراد ان کے خلاف مومنین کی مدد کر کے عذاب دینا ہے پس وہ تلوار اور قیدی بنا کر انہیں عذاب دیں گے یا قیامت قائم ہوگی پس اور وہ آگ کی طرف جائیں گے۔ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا اس وقت حقائق منکشف ہوں گے۔ یہ ان کے قول: اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ۔۔۔ الخ کا رد ہے۔

**وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝**

''اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو، اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہی کا انجام اچھا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى اللہ تعالیٰ مومنین کو ہدایت پر ثابت قدم رکھتا ہے اور ان کی نصرت میں اضافہ کرتا ہے اور ایسی آیات نازل فرماتا ہے جو یقین میں زیادتی کا سبب ہوتی ہیں یہ ان کی جزا کے لیے ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور ناسخ و منسوخ کی تصدیق کی وجہ سے ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے جس کا دوسرے لوگ انکار کرتے ہیں؛ یہ معنی کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔ ایک تیسرا احتمال بھی ہے وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا یعنی ہدایت یافتہ لوگوں کی جنت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ مفہوم پہلے مفہوم کے قریب ہی ہے۔ اعمال کی زیادتی اور ایمان و ہدایت کی زیادتی کا مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ اس پر گفتگو سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا ثوابا سے مراد جزا ہے۔ وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا آخرت میں بہتر انجام ہوگا اس سے جس کے ساتھ دنیا میں کفار فخر کرتے تھے۔ المراد مصدر ہے جیسے الرد ہے، یعنی نیکیاں کرنے والے پر بہتر ثواب لوٹایا جائے گا، کہا جاتا ہے: هذا ردّ عليك یعنی میں تجھے نفع دوں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: خَيْرٌ مَّرَدًّا یعنی بہتر مرجع، ہر ایک اپنے اس عمال کی طرف لوٹایا جائے گا جو اس نے عمل کیا۔

**اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝**

''کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد (اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہو گیا ہے غیب پر یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ، ہرگز ایسا نہیں، ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے اور لمبا کر دیں گے اس کے لیے عذاب کو خوب لمبا کرنا۔ اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال و اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا، آئمہ حدیث نے یہ الفاظ مسلم شریف کے ہیں، حضرت خباب سے

روایت کیا ہے(1) فرمایا: میرا عاص بن وائل پر قرض تھا میں اس سے وہ قرض طلب کرنے کے لیے آیا، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے قرض ادا نہیں کروں گا حتی کہ تو محمد (ﷺ) کا انکار کرے۔ حضرت خباب نے فرمایا: میں حضرت محمد ﷺ کا انکار نہیں کروں گا حتی کہ تو مر جائے پھر اٹھایا جائے۔ عاص نے کہا میں مرنے کے بعد اٹھایا جاؤں گا؟ تو پھر میں اس وقت تجھے قرضہ ادا کروں گا جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف لوٹوں گا۔ وکیع نے کہا: اعمش نے اسی طرح کہا ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوۡتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا۝ ---- وَ یَاۡتِیۡنَا فَرۡدًا۝۔ ایک روایت میں ہے میں زمانہ جاہلیت میں کاریگر تھا میں نے عاص بن وائل کے لیے کام کیا تو میں نے اس سے رقم کا مطالبہ کیا۔ بخاری نے اس کو نقل کیا ہے۔ کلبی اور مقاتل نے کہا: حضرت خباب کاریگر تھا اس نے عاص کے لیے کوئی زیور بنایا پھر اس سے اجرت کا مطالبہ کیا۔ عاص نے کہا: آج میرے پاس وہ نہیں ہے جو میں تجھے ادا کروں۔ حضرت خباب نے کہا: میں تجھے نہیں چھوڑوں گا حتی کہ تو مجھے میرا قرض ادا کرے۔ عاص نے کہا: اے خباب! تجھے کیا ہوا؟ تو ایسا تو نہیں تھا تو تو بہت اچھے طریقہ سے مطالبہ کرتا تھا۔ حضرت خباب نے کہا: پہلے میں تیرے دین پر تھا آج میں دین اسلام پر ہوں تیرے دین کو چھوڑنے والا ہوں۔ اس نے کہا: کیا تم ہی نہیں کہتے کہ جنت میں سونا، چاندی اور ریشم ہے؟ حضرت خباب نے کہا: کیوں نہیں۔ عاص نے کہا: تو مجھے مہلت دے میں تجھے جنت میں ادا کروں گا۔ اس نے استہزاءً یہ کہا۔ اللہ کی قسم! تو اور تیرے ساتھی جنت کے مجھ سے زیادہ حقدار نہ ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا، یعنی عاص بن وائل۔ اَطَّلَعَ الۡغَیۡبَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا اس نے لوح محفوظ میں دیکھا ہے؟ مجاہد نے کہا: کیا اس نے غیب جان لیا ہے حتی کہ وہ جانتا ہے کہ کیا وہ جنت میں ہے یا نہیں۔ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا۝ قتادہ اور ثوری نے کہا: یعنی اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی عمل صالح کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَهۡدًا سے مراد توحید ہے۔ بعض نے فرمایا: وعدہ ہے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس سے عہد کیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ کَلَّا یہ اس پر رد ہے یعنی ایسا کچھ بھی نہیں ہے نہ وہ غیب پر مطلع ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لیا ہے۔ کَلَّا پر کلام مکمل ہوئی۔ حسن نے کہا: یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ وہ صحاح میں موجود ہے۔ حمزہ اور کسائی نے وَّ وَلَدًا واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی لوگوں نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضمہ اور فتحہ میں دو وجہ سے اختلاف کیا گیا ہے: (۱) یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ کہا جاتا ہے: وَلَدٌ، وُلْدٌ جیسے کہا جاتا ہے: عَدَمٌ وعُدْمٌ حرث بن حلزہ نے کہا:

ولقد رأیتُ معاشراً　قد ثمّروا مالاً وولدا(2)

دوسرے نے کہا:

فلیتَ فلانًا کان فی بطن اُمِّہ　ولیت فلانا کان وُلْدَ حمارِ(3)

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی سورۃ مریم، جلد 2، صفحہ 145
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 130
3۔ ایضاً

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قیس ولد کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں اور فتحہ کے ساتھ واحد بناتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاعت وعبادت پر جنت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کا مزاح کرتے ہوئے اس نے یہ کہا، یہ کلبی کا قول ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں ان چیزوں کا ارادہ کیا؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) اگر میں اپنے آباء کے دین پر اور اپنے خداؤں کی عبادت پر قائم رہا تو مجھے مال اور اولاد دی جائے گی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اگر میں باطل پر رہوتا تو مجھے مال اور اولاد نہ دی جاتی۔

میں کہتا ہوں: کلبی کا قول ظاہر احادیث کے زیادہ مناسب ہے بلکہ احادیث کی نص اس پر دلیل ہے۔ مسروق نے کہا: میں نے حضرت خباب بن ارت کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں عاص بن وائل کے پاس آیا تا کہ اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کروں اس نے کہا: میں تجھے قرض نہیں دوں گا حتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے۔ میں نے کہا: نہیں، حتی کہ تو مر جائے اور پھر اٹھایا جائے۔ عاص نے کہا: میں مروں گا پھر اٹھایا جاؤں گا؟ میں نے کہا: ہاں۔ عاص نے کہا: میرے لیے وہاں مال اور اولاد ہوگی تو میں تجھے قرضہ ادا کر دوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اس کا الف، الف استفہام ہے کیونکہ اس کے بعد أم آیا ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ اس کی اصل أاطلع ہے۔ پھر دوسرے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ الف وصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ الف کے بعد مد کو کیوں نہیں لائے اور کہتے: آطلع جس طرح کہا: آٰللّٰهُ خَيْرٌ (النمل: 59) ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ (الانعام: 143) تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں اصل أالله، أالذ کرین ہے پس دوسرے الف کو مد سے بدلا تا کہ استفہام اور خبر کے درمیان فرق ہو جائے اگر الله خير بغیر مد کے کہتے تو استفہام خبر کے ساتھ ملتبس ہو جاتا اور اطلع میں اس مد کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ الف استفہام میں مفتوح ہے اور خبر کا الف مکسور ہے، اسی وجہ سے تو استفہام میں کہتا ہے: أطلع؟ أفترى؟ أستغفرت؟۔ الف کے فتحہ کے ساتھ اور خبر میں تو کہتا ہے: اِطلع، اِفترى، اِصطفى اِستغفرت لهم۔ یہ تمام ہمزہ مکسورہ کے ساتھ ہیں پس انہوں نے فتحہ اور کسرہ کے درمیان فرق کیا ہے اور دوسرے فرق کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّا قرآن کے نصف اوّل میں کلا کا ذکر نہیں ہے۔ نصف ثانی میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کے دو معانی ہیں۔ ایک اس کا معنی ہے حقاً اور دوسرا اس کا معنی ہے نہیں۔ جب یہ حقا کے معنی میں ہو تو اس کے ماقبل پر وقف جائز ہے پھر کلا سے آغاز ہوگا اور جب یہ لا کے معنی میں ہوگا تو کلا پر وقف جائز ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس کا معنی ہے نہیں معاملہ اس طرح نہیں ہے اور عھداً پر وقف کرنا اور کلا سے آغاز کرنا بھی جائز ہے یعنی كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا (المومنون: 100) اس میں کلا پر اور ترکت پر وقف جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۚ قَالَ كَلَّا (الشعراء) اس میں وقف کلا پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے نہیں یعنی معاملہ اس طرح نہیں جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو۔ فاذهبا تم دونوں جاؤ۔ اس میں حق کے معنی

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورة مریم، حدیث نمبر 3086، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں ہونے کی جگہ نہیں۔ فراء نے کہا: کلا، سوف کے قائم مقام ہے کیونکہ یہ صلہ ہے اور یہ حرف رد ہے گویا نعم (ہاں) اور لا (نہیں) ہے اگر تو اسے مابعد کے لیے صلہ بنائے تو اس پر وقف نہیں کرے گا جیسے تیرا قول ہے: کلا و رب الکعبہ، کلا پر وقف نہیں کرے گا کیونکہ یہ ای و رب الکعبہ کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ (المدثر) پس کلا پر وقف قبیح ہے کیونکہ یہ الیمین کا صلہ ہے۔ ابوجعفر محمد بن سعدان کلا میں فراء کے قول کی طرح فرماتے تھے۔ اخفش نے کہا: کلا کا معنی جھڑکنا اور روکنا ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: میں نے ابوالعباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا پورے قرآن میں کلا پر وقف نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ جواب ہے اور اس کا فائدہ مابعد میں واقع ہوتا ہے۔ پہلا قول اہل تفسیر کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ یعنی ہم اس کے قول کو اس پر محفوظ کر لیں گے اور آخرت میں اس کی وجہ سے اسے سزا دیں گے۔ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ ہم اس کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے۔ وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ اور ہم نے جو اسے دنیا میں مال اور اولاد عطا کی ہے وہ ہم چھین لیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم اسے ہلاک کرنے کے بعد مال اور اولاد کے وارث بن جائیں گے۔ بعض نے فرمایا: ہم اسے اس خواہش سے آخرت میں محروم کر دیں گے جو وہ مال اور اولاد کی رکھتا ہے اور ہم اس کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو دیں گے۔ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝ وہ ہماری بارگاہ میں متفرد آئے گا نہ اس کے لیے مال ہوگا، نہ اولاد اور نہ خاندان جو اس کی مدد کرتا ہوگا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

''اور انہوں نے بنا لیے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لیے مددگار بنیں۔ ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہو جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ اس سے مراد مشرکین ہیں۔ عِزًّا اس کا معنی ہے مددگار اور محافظ، یعنی اولاد، العز موسلا دھار بارش کو بھی کہتے ہیں؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ کلام کا ظاہر یہ ہے کہ عِزًّا ان بتوں کی طرف راجع ہے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے۔ اور اس کو واحد ذکر فرمایا کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی تاکہ وہ اس کے ساتھ عزت پائیں اور ان کے ذریعے اللہ کے عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا، معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا بلکہ وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے یعنی وہ انکار کریں گے کہ انہوں نے بندوں کی عبادت کی تھی یا وہ بت مشرکوں کی عبادت کا انکار کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ ۫ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝ (القصص) اور یہ بت جمادات ہیں عبادت کا علم نہیں رکھتے۔

وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝، ضدا کا معنی ہے انکی خصومت و تکذیب میں ان کے خلاف مددگار رہوں گے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ان کے دشمن ہوں گے۔ ابن زید نے کہا: وہ ان پر مصیبت ہوں گے پس ان کے معبودوں کو جمع کیا جائے گا اور ان کو عقل دی جائے گی اور وہ بولیں گے اور کہیں گے: یا رب! ان کو عذاب دے جنہوں نے تجھے چھوڑ کر ہماری عبادت کی۔

کلاّ یہاں یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ لا کے معنی میں ہو اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ حقاً کے معنی میں ہو۔ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ ابونہیک نے، کلاً سیکفرون یعنی تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اوران سے اس کے ساتھ کاف کا ضمہ اور فتحہ بھی مروی ہے۔ مہدوی نے کہا: کلاّ زجر وتنبیہ ہے اور یہ پہلی کلام کے رد کے لیے ہوتا ہے اور کبھی مابعد کی تحقیق اور اس پر تنبیہ کے لیے واقع ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ (العلق) اس معنی پر وقف نہیں کیا جاتا اور پہلے معنی پر اس پر وقف کیا جاتا ہے اگر اس میں دو معانی کی صلاحیت ہو تو اس پر وقف اور ابتدا جائز ہوتی ہے۔ اور جنہوں نے کلا کو تنوین دی ہے اور کاف کو فتحہ بھی دیا ہے تو وہ کلّ کا مصدر ہے اور اس کو نصب فعل مضمر کی وجہ سے ہے معنی یہ ہے: کل ھذا الرأی والإعتقاد کلاً یعنی ان مورتیوں کو معبود بنانے کا اعتقاد اور نظریہ ہرگز درست نہیں تا کہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ پس اس مفہوم پر غزا اور کلاً پر وقف ہوگا؛ اسی طرح جماعت کی قرأت میں ہے کیونکہ یہ ماقبل کے رد اور مابعد کی تحقیق کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جنہوں نے تنوین کے ساتھ کاف کا ضمہ روایت کیا ہے وہ بھی فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے۔ گویا فرمایا: سیکفرون، كَلًّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ، یعنی اپنے بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے۔

میں کہتا ہوں: کلاّ میں چار معانی حاصل ہوتے ہیں: (۱) تحقیق یعنی یہ حقا کے معنی میں ہوتا ہے۔ (۲) نفی، (۳) تنبیہ، (۴) قسم کا صلہ۔ صرف پہلی صورت میں اس پر وقف ہوگا۔ کسائی نے کہا: لا صرف نفی کرتا ہے اور کلاّ ایک چیز کی نفی کرتا ہے اور ایک چیز کو ثابت کرتا ہے جب کہا جاتا ہے: اکلت تمراً تو تو کہتا ہے: کلا إنی أکلت عسلا لا تمراً میں نے شہد کھایا، کھجور نہیں کھائی۔ اس کلمہ میں ماقبل کی نفی ہے اور مابعد کی تحقیق ہے۔ الضد کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے العدو اور الرسول واحد اور جمع استعمال ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الضد مصدر کی جگہ واقع ہے یعنی وہ ان کے علاوہ معاون ہوں گے اسی وجہ سے جمع نہیں ذکر کیا گیا، یہ چونکہ لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا کے مقابلہ میں ہے اور العز مصدر ہے پس اسی طرح اس کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔ پھر علماء نے فرمایا: یہ آیت بتوں کے بچاریوں کے متعلق ہے اور بتوں کو شعور والوں کے قائم مقام رکھا گیا ہے جیسے کہ کفار کا نظریہ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کے بارے ہے جو مسیح علیہ السلام یا ملائکہ یا جن یا شیاطین کی عبادت کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۙ۝۸۳ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۚ۝۸۴ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۙ۝۸۵ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۘ۝۸۶ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۘ۝۸۷

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلط کر دیا ہے شیطانوں کو کفار پر وہ انہیں (اسلام کے خلاف) ہروقت اُکساتے رہتے ہیں۔ پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزول عذاب کے لیے) ہم گن رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح۔ وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے حضور میں (معزز ومکرم مہمان بنا کر) اور

اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح۔ انہیں کوئی اختیار نہ ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ہم نے شیطانوں کو ان پر اغوا کرنے کے لیے مسلط کر دیا ہے یہ اس وقت ہوا جب ابلیس سے کہا تھا: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (بنی اسرائیل: 64)

بعض نے فرمایا: اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا کا معنی ہے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أرسلت البعير میں نے اونٹ کو چھوڑ دیا ہے یعنی ہم نے شیطانوں اور ان کو چھوڑ دیا ہے ہم ان کی شیطانوں کی بات قبول کرنے سے حفاظت نہیں کرتے۔ زجاج نے اَرْسَلْنَا کا معنی قیضنا (ہم نے مسلط کر دیا) کیا ہے۔ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے وہ انہیں طاعت کی جگہ معصیت اور نافرمانی پر اکساتے ہیں۔ ان سے مروی ہے تعزیھم اغراء بالشئ وہ انہیں شر پر ابھارتے ہیں اس میں جاری رہو اس میں جاری رہو، حتیٰ کہ وہ انہیں آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ پہلا معنی ثعلبی نے اور دوسرا ماوردی نے حکایت کیا۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ ضحاک نے کہا: تغویھم اغواءً، وہ انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: ابھارتے ہیں۔ اس کا اصل معنی حرکت کرنا اور ابھرنا ہے؛ اسی سے خبر مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قام إلى الصلاة ولجوفه أزيز كأزيز المرجل من البكاء (1) جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ کے اندر سے رونے کی وجہ سے ابلنے کی آواز آئی جیسے ہانڈی ابلتی ہے۔ جب ہانڈی ابل رہی ہو تو کہتے ہیں: ائتزت القدر ائتزازاً۔۔۔ الأزّ، کا معنی اُبھارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا یعنی وہ انہیں گناہوں پر اکساتے ہیں۔ الأزّ کا معنی الإختلاط بھی ہے قد أززت الشیٔ اؤزه ازاً میں نے بعض کو بعض سے ملا دیا، یہ جوہری کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْهِمْ یعنی ان کے لیے جلدی عذاب طلب نہ کرو، اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ان کے ایام، راتیں، مہینے، سال عذاب کے پہنچنے تک شمار کر رہے ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم ان کے سانس گن رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم دنیا میں ان کے سانس گن رہے ہیں جس طرح ہم ان کے سال گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ہم ان کے قدم گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ہم ان کی لذات گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: لحات گن رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: آپ ان کے لیے جلدی نہ کریں ہم ان کو مہلت دے رہے ہیں تاکہ یہ گناہ زیادہ کر لیں۔ روایت ہے کہ مامون نے یہ سورت پڑھی اس آیت پر گزرا تو اس نے ابن سماک کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑے، اس کے پاس فقہاء کی جماعت بیٹھی تھی اس نے کہا: جب سانس گنے جا رہے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مدد نہیں ہے اور کتنے جلدی وہ ختم ہونے والے ہیں۔ اسی مفہوم میں شاعر نے کہا:

حیاتُك انفاسٌ تُعدُّ فکلّما مَضَى نَفَسٌ منك انتقصت به جُزْءا
يميتك ما يحييك فى كل ليلة ويَحْدُوك حَادٍ ما يريد به الهُزءا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، البکاء فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 130، ایضاً حدیث نمبر 769، روایت بالمعنی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا جاتا ہے: انسان ایک دن اور رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے بارہ ہزار سانس دن میں اور بارہ ہزار رات میں لیتا ہے۔ یہ شمار ہو چکے ہیں ان کی تعداد معلوم ہے، ان کے لیے کوئی لمبائی و مدد نہیں ہے اور یہ کتنے جلدی ختم ہونے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا۝ اس کلام میں حذف ہے یعنی رحمٰن کی جنت کی طرف اور اس کے دار کرامت کی طرف متقین کو لے جائیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيَهْدِينِ۝ (الصافات)

اسی طرح حدیث میں ہے: من كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله، (1) جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ الوفد اسم ہے وافدین کا، جیسا کہا جاتا ہے: صوم فطر و زور، یہ وافد کی جمع ہے جیسے رکب و راکب، صحب و صاحب یہ وفد یفد وفداً و وفودا و وفادة سے مشتق ہے جب کوئی فتح یا کسی خطیر امر کی صورت میں بادشاہ کی طرف جائے۔ جوہری نے کہا: وفد فلان على الأمير کہا جاتا ہے یعنی وہ پیغام رساں بن کر آیا، فهو وافدٌ اس کی جمع وفدٌ ہے جیسے صاحب کی جمع صحبٌ ہے وفد کی جمع وفاد اور وفود ہے اور اسم الوفادة ہے: أوفدته أنا إلى الأمير یعنی میں نے اسے امیر کی طرف بھیجا۔ اور تفسیر میں ہے وفداً یعنی وہ اپنی طاعتوں کی سواریوں پر سوار ہو کر حاضر ہوں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ عام طور پر آنے والا سفیر سوار ہوتا ہے۔ الوفد سے مراد سوار ہیں۔ اس کو مفرد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ ابن جریج نے کہا: وفداً على النجائب سواری پر سوار ہو کر آئیں گے۔ عمرو بن قیس ملائی نے کہا: مومن جب اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل حسین صورت اور پاکیزہ خوشبو کی صورت میں اس کا استقبال کرے گا، وہ کہے گا: کیا تو مجھے جانتا ہے۔ مومن کہے گا: نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے تیری خوشبو بہت اچھی بنائی اور تیری صورت حسین بنائی ہے۔ وہ کہے گا: میں دنیا میں اسی طرح تھا میں تیرا نیک عمل ہوں، دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہو، پھر یہ آیت تلاوت کی: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اور کافر کا عمل اس کا استقبال کرے گا وہ انتہائی قبیح صورت اور بدبودار ہوگا، وہ کہے گا: تو مجھے جانتا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے تیری شکل قبیح بنائی ہے اور بُو بڑی کریہہ ہے۔ وہ کہے گا: میں دنیا میں اسی طرح تھا۔ میں تیرا بُرا عمل ہوں کبھی دنیا میں تو مجھ پر سوار تھا آج میں تجھ پر سوار ہوں گا پھر یہ آیت تلاوت کی: وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَى ظُهُورِهِمْ (الانعام: 31) یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح نہیں، یہ ابن عربی نے سراج المریدین میں کہا ہے اور اس حدیث کو ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو گھوڑے پر سوار ہونا پسند کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوگا جو نہ لید کرے گا اور نہ پیشاب کرے گا، اس کی لگام سرخ یاقوت اور سبز زبرجد اور سفید موتیوں سے ہوگی اور اسکی زین سندس اور استبرق (ریشم) کی ہوگی اور جو اونٹ پر سوار ہونا پسند کرتا ہوگا وہ اونٹ پر سوار ہو کر جائے گا جو نہ مینگنیاں کرتا ہوگا اور نہ پیشاب کرتا ہوگا اس کی مہار یاقوت اور زبرجد سے ہوگی اور جو کشتی پر سوار ہونا پسند کرتا ہوگا وہ زبرجد اور یاقوت کی کشتی پر سوار ہوگا وہ غرق ہونے سے امن میں ہوں گے اور پریشانیوں سے امن میں ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت علی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، نیۃ فی الایمان، جلد 2، صفحہ 910

رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بادشاہ اور ان کے وفود دیکھے ہیں اور میں نے ہر وفد سوار دیکھا ہے پس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جانے والے کیسے ہوں گے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ نہ اپنے قدموں پر چلائے جائیں گے اور نہ انہیں ہانکا جائے گا بلکہ انہیں جنت کی اونٹنیوں میں سے دی جائیں گی جن کی مثل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوگی ان کے پالان سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہوں گی اور ان پر سوار ہوں گے حتیٰ کہ وہ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے''(1)۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ثعلبی کے الفاظ اس خبر میں زیادہ واضح ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بادشاہ اور ان کے وفد دیکھے ہیں میں نے کوئی وفد نہیں دیکھا مگر وہ سوار تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹنا ہوگا تو فرشتے مومنین سے ایسی سفید اونٹنیوں کے ساتھ ملیں گے جن کے پالان اور نکیلیں سونے کی ہوں گی ہر سواری پر ایک حلہ ہوگا دنیا جس کے مساوی نہ ہوگی، ہر مومن ایک لباس پہنے گا پھر ان کے ساتھ ان کی سواریاں چلیں گی پھر وہ اونٹنیاں انہیں لیکر چلیں گی حتیٰ کہ وہ انہیں جنت تک پہنچا دیں گی۔ پھر انہیں فرشتے ملیں گے اور کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۝ (الزمر)

میں کہتا ہوں: یہ خبر نص ہے کہ وہ نہ سوار ہوں گے اور نہ لباس پہنیں گے مگر موقف سے۔ اور جب قبور سے باہر نکلیں گے پیدل چلتے ہوں گے ننگے پاؤں اور ننگے بدن ہوں گے اور غیر مختون ہوں گے، اسی حالت میں موقف کی طرف جائیں گے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نصیحت کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں جمع کیے جاؤ گے جبکہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن اور غیر مختون ہو گے''۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے تخریج کیا ہے۔ یہ مکمل سورۃ المومون میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اسی مفہوم کی حضرت عبداللہ بن انیس کی حدیث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ دونوں حالتیں سعداء کی ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مخصوص ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: وفدا یعنی اونٹوں پر سوار ہو کر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ سوار ہوں گے انہیں جنت کی اونٹنیاں دی جائیں گے ان پر سونے کے کجاوے ہوں گے اور ان کی زینیں اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہوں گی پس ان پر سوار کر کے انہیں جمع کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ پیدل جمع نہ کیے جائیں گے بلکہ وہ اونٹنیوں پر سوار ہوں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے ان کی زینیں یواقیت کی ہوں گی اگر وہ ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی اور جب وہ انہیں حرکت دیں گے تو وہ اڑ پڑیں گی۔

بعض علماء نے فرمایا: وہ جو پسند کریں گے اس پر سوار ہو کر آئیں گے اونٹ یا گھوڑے یا کشتیاں جیسا کہ پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وفدا کیونکہ وفود کی شان عربوں کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ وہ بشارات کے ساتھ آتے ہیں، وہ انعامات کا انتظار کرتے ہیں پس متقین عطا اور ثواب کا انتظار کریں گے۔ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا، السوق کا معنی ہے چلنے پر ابھارنا، وردا کا معنی ہے پیاسے؛ یہ حضرت ابن عباس

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 466-465

رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ اخفش، فراء اور ابن اعرابی نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ برہنہ پا ہوں گے اور پیدل ہوں گے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ گروہوں کی شکل میں ہوں گے۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ پیدل اور پیاسے ہوں گے جیسے اونٹ پانی پر وارد ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: جاء ورد بنی فلاں (فلاں قبیلہ کے اونٹ پانی پر آئے) اور قشیری نے کہا: وردا کا قول پیاس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی عام طور پر پیاس کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور تفسیر میں ہے اس کا معنی ہے وہ پیدل ہوں گے پیاسے ہوں گے تاکہ ان کی گردنیں پیاس کی وجہ سے کٹ جائیں۔ جب مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا تو متقین کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: وردا اس کا معنی ہے الورود جیسے تیرا قول ہے: جئتك اکراما لك یعنی لاکرامك، اس کا معنی ہے نسوقهم لورود النار ہم انہیں آگ پر وارد کرنے کے لیے ہانکیں گے۔

میں کہتا ہوں: ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔ انہیں پیاسے، برہنہ پا پیدل گروہوں کی شکل میں ہانکا جائے گا۔ ابن عرفہ نے کہا: الورود سے مراد وہ قوم ہے جو پانی پر وارد ہوتی ہے۔ پیاسوں کو وردا کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ پانی پر ورود طلب کرتے ہیں جیسے تو کہتا ہے: قوم صوم یعنی روزے دار لوگ۔ قوم زور زیارت کرنے والے لوگ۔ یہ مصدر کے لفظ پر اسم ہے اس کا واحد وارد ہے۔ الورد اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے خواہ وہ پرندے ہوں یا اونٹ ہوں۔ الورد اس پانی کو بھی کہتے ہیں جس کے لیے ورود ہوتا ہے اور یہ کسی چیز سے کسی چیز کے ساتھ اشارہ کرنے کے باب سے ہے۔ الورد قرآن کے جز کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: قرأت وردی، الورد بخار کے دن کو کہتے ہیں جب وہ کسی کو مخصوص وقت پر ہوتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ شاعر نے کہا وہ کنویں کا وصف بیان کرتا ہے:

یَطْموا اذا الوِرْدُ علیه التَکَّا (یعنی وہ لوگ جو پانی پر وارد ہوتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ، یعنی یہ کفار کسی کے لیے شفاعت کے مالک نہیں۔ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ اس سے مراد مسلمان ہیں جو شفاعت کے مالک ہوں گے۔ یہ کسی چیز کا استثناء غیر جنس سے ہے یعنی لیکن وہ جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لیا ہے وہ شفاعت کریں گے۔ مَنْ اس بنا پر محل نصب میں ہے۔ بعض نے فرمایا: یملکون کی واو سے بدل کی بنا پر محل رفع میں ہے یعنی کوئی اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کا مالک نہیں ہوگا مگر جس نے اللہ کی بارگاہ میں عہد لیا وہ مالک ہوگا اس بنا پر استثنا متصل ہوگا اور نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ میں الْمُجْرِمِيْنَ سے کفار اور نافرمان سب مراد ہیں۔ پھر خبر دی کہ وہ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے مگر گنہگار مومنین وہ شفاعت کے مالک ہوں گے کہ ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں شفاعت کرتا رہوں گا حتی کہ میں کہوں گا: یارب! میری شفاعت ان کے حق میں قبول فرما جنہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تمہارے لیے نہیں بلکہ یہ میرے لیے ہے''(1)۔ مسلم نے اس حدیث کا مفہوم نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ اخبار متفق ہیں کہ اہل علم اور اہل فضل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، ادنی اهل الجنة منزلة فیها، جلد 1، صفحہ 110

شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ پہلے قول پر کلام ہے، وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ سے متصل ہوگی۔ قیامت کے روز بتوں کے پجاریوں کی شفاعت کسی کے حق میں قبول نہ ہوگی اور نہ بتوں کی شفاعت کسی کے لیے ہوگی اور نہ وہ کسی کی شفاعت کا اختیار رکھتے ہوں گے یعنی شفاعت انہیں فائدہ نہ دے گی جیسا کہ فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝ (المدثر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم متقین اور مجرمین کو جمع کریں گے کوئی شفاعت کا اختیار نہ رکھتا ہوگا مگر جس نے خداوند رحمٰن سے عہد لیا ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کو شفاعت کا اذن دیا ہوگا جیسے فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ: 255) اور یہ وہ عہد ہے جس کے بارے فرمایا: اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ یہ لفظ ایمان اور ان اعمال صالحہ کا جامع ہے جن کے ذریعے انسان شفاعت کے مفہوم پر پہنچتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: العهد سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ مقاتل اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی شفاعت نہیں کرے گا مگر جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور اپنی ہر قوت و طاقت سے براءت کر کے اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت پر بھروسہ کیا وہ امید نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ سے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ سے یہ کہتے ہوئے سنا: ''کیا تم میں سے کوئی عاجز ہے کہ وہ ہر صبح و شام اللہ کی بارگاہ سے عہد کرے'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے فرمایا: ''وہ ہر صبح و شام کہے: اللّهم فاطر السموات والأرض عالم الغيب والشهادة إني أعهد إليك في هذه الحياة الدنيا بأني أشهد أن لا اله إلا أنت وحدك لا شريك لك وأن محمدا عبدك ورسولك فلا تكلني إلى نفسي فإنك إن تكلني إلى نفسي تباعدني من الخير وتقربني من الشر وأني لا أثق إلا برحمتك فاجعل لي عندك عهدا توفينيه يوم القيامة إنك لا تخلف الميعاد۔

جب آدمی یہ کہے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر مہر لگا دے گا اور اسے عرش کے نیچے رکھ دے گا جب قیامت کا دن ہوگا تو ندا دینے والا ندا دے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جن کے لیے اللہ کی بارگاہ میں عہد ہے؟ پس وہ کھڑا ہوگا اور جنت میں داخل ہوگا (1)۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝

''اور کفار کہتے ہیں: بنا لیا رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ (اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے، کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا بیٹا ہے۔ اور نہیں جائز رحمٰن کے لیے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند۔ کوئی ایسی چیز

1۔ تفسیر کشاف، زیر آیت ہذہ

نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح۔ وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ یعنی یہود و نصاریٰ اور جنہوں نے کہا: ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یحییٰ، اعمش، حمزہ، کسائی، عاصم اور خلف نے وُلْدًا واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ چار مقامات پر ایسا ہی پڑھا ہے۔ اس سورہ میں لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾ یہ گزر چکا ہے اور یہ ارشاد: اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اور سورہ نوح میں ماله وولده، سورۂ نوح میں ابن کثیر، مجاہد، حمید، ابوعمرو اور یعقوب نے ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے تمام جگہ واو اور لام میں فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے العَرب والعُرْب، العَجَم والعُجْم۔ شاعر نے کہا:

ولقد رأیت معاشرا قد ثَمَّرُوا مالًا وَوُلْدًا

دوسرے شاعر نے کہا:

ولیتَ فلانا کان فی بطنِ اُمّهِ ولیت فلانا کان وُلْد حمار

اس کے مفہوم میں نابغہ نے کہا:

مَهْلًا فداءً لکَ الأقوامُ کلُّهم وما اُثَمِّر من مالٍ ومن وَلَدِ

پس اس نے فتحہ دیا۔ قیس جمع میں واو پر ضمہ اور مفرد میں واو پر فتحہ دیتے ہیں۔ جوہری نے کہا: الوَلد کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع ہوتا ہے اسی طرح الولد ضمہ کے ساتھ ہے۔ بنی اسد کی امثال سے وُلْدُكِ من دَمّٰى عَقِبَيكِ اور کبھی الوَلد کی جمع الوُلد ہوتا ہے جیسے اُسُد جمع ہے اَسَد کی اور الوِلد واؤ کے کسرہ کے ساتھ الوُلد میں ایک لغت ہے۔ نحاس نے کہا: ابوعبید نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس نے کہا: الوَلد اہل کے لیے ہوتا ہے اور الولد تمام کے لیے ہوتا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: یہ قول مردود ہے، اہل لغت میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ الوَلد اور الوُلد دونوں آدمی کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ وَلَد اکلام عرب میں اکثر ہوتا ہے؛ جیسے شاعر نے کہا:

مَهْلًا فداء لَکَ الأقوامُ کلُّهم وما اُثَمِّر مِنْ مالٍ ومن وَلَدِ

ابوجعفر نے کہا: میں نے محمد بن ولید کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے وُلْد کا وَلَد کی جمع ہونا جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: وَثَنٌ وَوُثْن۔ اَسَد واُسْدٌ۔ ولد اور وُلد کا ہم معنی ہونا بھی جائز ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عجم وعُجم، عَرب وعُربٌ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾، ادّا کا مطلب ہے سخت ممنوع اور قبیح چیز، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد وغیر ہما سے مروی ہے۔ جوہری نے کہا: الاِدّ، الادۃ الداھیۃ والامر العظیم۔ اس کا معنی ہے ہولناک اور سخت ترین امر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا اسی طرح الآدّ، مثل فاعل ہے اور الادۃ کی جمع اِدَدٌ، ہے اَدَّت فلانا داھیۃٌ تَؤُدُّہ اَدًّا، فلاں کو سخت شدت نے آلیا۔ الاد کا معنی غلبہ اور قوت بھی ہے۔ زجاج نے کہا:

نَضَوْنَ عَنِّی شِدَّۃً وَأَدًّا مِن بَعْدِ مَا کُنْتُ صُمُلًّا جَلدًا

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے کہا: اَدًّا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جب کوئی انتہائی ناپسندیدہ کام کرے۔ راجز نے کہا:

قد لقی الأقران مِنِّی نُکْرًا داھِیَۃً دھیاء إِدًّا إِمْرًا(1)

نحاس کے علاوہ سے مروی ہے ثعلبی نے کہا: اس میں تین لغات ہیں۔ اِدًّا ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، یہ قرأت عامۃ ہے۔ أَدًّا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، یہ سلمی کی قرات ہے۔ اور آدٌّ مثل مادٌّ یہ بعض عربوں کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو العالیہ سے بھی مروی ہے گویا یہ الثقل کے معنی سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: أدہ الحمل یؤدہ أدًّا، بوجھ نے اسے بوجھل کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یہاں اور سورۃ الشوریٰ میں قرأت عامہ تاء کے ساتھ ہے۔ نافع، یحییٰ اور کسائی کی قرأت یکاد یاء کے ساتھ ہے کیونکہ فعل مقدم ہے۔ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ، یعنی اس سے پھٹ جائیں۔ نافع، ابن کثیر اور حفص وغیرہم نے یا کے بعد تا اور طا کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں بھی اور سورۃ الشوریٰ میں التفطر سے مشتق کیا ہے۔ حمزہ اور ابن عامر نے سورۃ الشوریٰ میں ان کی موافقت کی ہے اور یہاں الإنفطار سے مشتق ینفطرن پڑھا ہے اسی طرح ابوعمرو، ابوبکر اور مفضل نے دونوں سورتوں میں انفطار سے مشتق پڑھا ہے؛ اور یہی ابوعبید کا اختیار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ (الانفطار) السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (المزمل:18) اور اللہ کا ارشاد ہے: وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ یعنی زمین پھٹ جائے گی۔ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے ھدما یعنی سخت آواز کے ساتھ پہاڑ گریں گے۔ حدیث شریف میں ہے: اللّٰھم إنی أعوذبك من الھد والھدۃ، اے اللہ! میں ھد اور الھدۃ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ شمر نے کہا: احمد بن غیاث مروزی نے کہا: الھد کا معنی گرنا ہے اور الھدۃ کا معنی زمین میں دھنسنا ہے۔ اللیث نے کہا: الھد سے مراد سخت گرنا ہے جیسے دیوار یکبارگی گرتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ھدنی الأمر وھد رکنی، یعنی اس نے مجھے توڑ دیا اور مجھ پر بہت اثر کیا؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ھدّ البناء یھدہ ھدًّا یعنی اس نے دیوار کو توڑ دیا ہلا دیا۔ ھدتہ المصیبۃ، مصیبت نے اسے کمزور کر دیا، انھدّ الجبل پہاڑ ٹوٹ گیا۔ اصمعی نے کہا: الھدّ کمزور آدمی۔ جب کوئی شخص کسی کو دھمکی دیتا ہے تو کہتا ہے: إنی لغیرھد یعنی میں کمزور آدمی نہیں ہوں۔ ابن اعرابی نے کہا: الھدّ مردوں میں سے سخی آدمی۔ رہا بزدل کمزور آدمی تو اسے الھِدّ (ھاء کے کسرہ کے ساتھ) کہتے ہیں؛ شاعر نے کہا:

لَیْسُوا بِھِدِّین فی الحُرُوب إذا تُعْقَدُ فوقَ الحَرَاقِفِ النُّطُقُ

الھدّ اس آواز کو کہتے ہیں جب دیوار گرتی ہے تو کہتا ہے: ھَدَّ یَھِدُّ ھَدِیدًا۔ الھاد اس آواز کو کہتے ہیں جس کو اہل ساحل سنتے ہیں جو دریا کی طرف سے آتی ہے اس کی زمین میں آواز ہوتی ہے۔ اسی سے بعض اوقات زلزلہ آتا ہے۔ دویۃ اس کی آواز۔ نحاس نے کہا: ھدًّا مصدر ہے کیونکہ تخر کا معنی تھد ہے۔ دوسروں نے کہا: یہ حال ہے اور مھدودۃ کے معنی میں ہے۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا، اَنْ فراء کے نزدیک محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے لأن دعوا اور من أن دعوا، حرف جر کو حذف

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 149

کر کے نصب دی گئی ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: یہ محل جر میں ہے اور حرف جر مقدر ہے۔ ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں مسعر نے بتایا انہوں نے واصل سے انہوں نے عون بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے: اے فلاں! کیا آج تیرے پاس سے کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے۔ اگر وہ ہاں کہتا ہے تو اسے اس سے خوشی ہوتی ہے پھر حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی۔ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ فرمایا: کیا تو ان پہاڑوں کو دیکھتا ہے کہ یہ جھوٹ کو سنتے ہیں اور خیر کو نہیں سنتے؟ فرمایا: مجھے عوف نے بتایا انہوں نے غالب بن عجرد سے روایت کیا انہوں نے کہا مجھے شام کے شخص نے منیٰ کی مسجد میں بتایا اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا کیا اور جو کچھ اس میں درخت ہیں انہیں پیدا کیا زمین میں کوئی درخت ایسا نہ تھا بنو آدم جس کے پاس آتے مگر وہ اس درخت سے منفعت پاتے ان کے لیے اس سے منفعت ہوتی زمین اور درخت اسی طرح تھے حتی کہ بنی آدم کے کافروں نے یہ بڑا بول بولا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا، جب انہوں نے یہ کہا، تو زمین کانپ گئی اور درختوں کے کانٹے نکل آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پہاڑ اور تمام درخت کانپ گئے دریا، ان میں رہنے والی مچھلیاں کانپ گئیں اس وجہ سے مچھلیوں میں کانٹے ہو گئے اور درختوں میں کانٹے ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا: اور حضرت کعب نے فرمایا آسمان، زمین، پہاڑ اور تمام مخلوق گھبرا گئی مگر جن وانس نہ ڈرے، قریب تھا کہ آسمان اور زمین زائل ہو جائے۔ فرشتے غصہ میں آئے اور جہنم بھڑک اٹھی اور درختوں کے کانٹے نکل آئے۔ زمین خشک اور بنجر ہو گئی جب لوگوں نے کہا: اتخذ اللہ ولداً، محمد بن کعب نے فرمایا: قریب تھا کہ اللہ کے دشمن ہم پر قیامت برپا کر دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾، اور ابن عربی نے کہا(1): کعب نے سچ کہا کہ یہ قول ہی بہت بڑا ہے اس کے متعلق قضاء وقدر ہو چکی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کافر کا کفر کم مرتبہ نہیں کرتا اور کسی مومن کا ایمان اسے بلند نہیں کرتا اور اس کی ملک میں مومن کا ایمان اضافہ نہیں کرتا اسی طرح اس کی ملک سے کسی اعتبار سے کمی نہیں کرتا تو زبانوں پر ایسے کلمات جاری ہی نہ ہوتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قدوس، حکیم، حلیم ہے اس کے بعد وہ کافروں کے کسی قول کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے بیٹے کی نفی کی کیونکہ بیٹا ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ میں بیان کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق یہ نہیں اس کے ساتھ اس کا یہ وصف بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے حق میں یہ جائز ہے کیونکہ بیٹا ہمیشہ والد سے ہوتا ہے پھر اس کا بھی والد اور اصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فی رأس خَلْقَاء من عَنْقَاء مُشْرِفَةٍ ما ينبغی دونها سَهْلٌ ولا جَبَلٌ(2)

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾، اِنْ نافیہ بمعنی ما ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں کوئی ایسا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1253
2۔ تفسیر طبری، جز 17، صفحہ 151

نہیں ہے مگر وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے لیے عبودیت کا اقرار کرنے والا ہو گا اور اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری کرنے والا ہو گا جیسا کہ فرمایا: وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿ (النمل) یعنی تمام اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے آئیں گے ساری مخلوق اس کے غلام ہیں پھر اس مخلوق میں سے کون اس کا بیٹا ہو گا؟ اللہ تعالیٰ بلند و بالا ہے اس سے جو یہ کہتے ہیں اور جو کچھ یہ منکر بیان کرتے ہیں، اٰتِی لکھنے میں یاء کے ساتھ ہے اصل تنوین ہے۔ پس یہ استخفافاً حذف کی گئی ہے اور مضاف کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بیٹا والد کے لیے مملوک نہ ہو گا بخلاف اس شخص کے جو کہتا ہے کہ وہ اسے خریدے گا اور مالک ہو جائے گا اور وہ اُس پر آزاد نہ ہو گا مگر جب وہ خود اسے آزاد کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ہونے اور ملک ہونے میں منافات ظاہر فرمائی ہے جب باپ بیٹے کا کسی اعتبار سے مالک ہو گا تو وہ اس پر آزاد ہو جائے گا اس دلیل کی وجہ اس آیت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ولدیت اور عبدیت کو تقابل کی دو طرفوں میں رکھا ہے ایک کی نفی سے دوسری کا اثبات ہو گا اگر دونوں جمع ہوتیں تو اس کے قول کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا جس کے ساتھ احتجاج واقع ہوتا۔ صحیح حدیث میں ہے ''کوئی بیٹا اپنے والد کا حق ادا نہیں کر سکتا مگر وہ اسے مملوک پائے پھر اسے خریدے اور اسے آزاد کر دے'' (1)۔ جب باپ اپنے بیٹے کا مالک نہیں ہوتا حالانکہ باپ کو بیٹے پر ایک مرتبہ حاصل ہے تو بیٹا بدرجہ اولیٰ باپ کا مالک نہ ہو گا کیونکہ وہ مرتبہ میں اس سے کم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اسحاق بن راہویہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من اعتق شرکاً لہ فی عبد، سے استدلال کیا ہے اس سے مراد مذکر غلام ہیں عورتیں نہیں ہیں۔ پس اس پر مکمل نہ ہو گا جس نے مؤنث میں سے اپنا حصہ آزاد کیا۔ یہ جمہور علماء سلف کے نظریہ کے خلاف ہے کیونکہ جمہور نے مذکر اور مونث میں فرق نہیں کیا ہے کیونکہ عبد کے لفظ سے جنس مراد ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿ یہ ارشاد مذکر، مونث تمام غلاموں کو شامل ہے۔ اور اسحاق نے دلیل پکڑی ہے کہ عبدۃ مونث حکایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے اسے یہ جائز نہیں تھا اور اس نے مجھے برا کہا حالانکہ یہ اس کو جائز نہ تھا اور رہا اس کا میری تکذیب کرنا تو اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا جس طرح پہلے کیا تھا جبکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا مجھ پر اس کے اعادہ سے آسان نہیں تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے حالانکہ میں یکتا ہوں، بے نیاز ہوں نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور نہ وہ جنم دیا گیا ہے۔ اور نہ میرا کوئی ہمسر ہے''۔ (2) سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے اس جیسی جگہ میں اس کا اعادہ بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ یعنی ان کی تعداد کا اسے علم ہے۔ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا یہ تاکید کے لیے ہے یعنی اس پر ان میں سے کوئی مخفی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے اسماء میں المحصی بھی ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے جس کو ترمذی

---

1۔ مسند احمد، حدیث نمبر 7143　2۔ مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان الفصل الاول

نے نقل کیا ہے اس فعل کا اشتقاق بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: اسماء الٰہیہ میں سے المحصی بھی ہے اور یہ مختص ہے کہ کثرت اسے غافل نہیں کرتی جیسے نور کی روشنی اور ہوا کا تیز چلنا اور پتوں کا گرنا وغیرہ وہ ہر پتے میں حرکات کے اجزاء کو اس وقت جانتا ہے پھر وہ کیسے نہیں جانتا جبکہ اس نے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾ (الملک)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر میں ہے کہ: لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا کا معنی یہ ہے کہ وہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی عبودیت کا اقرار کریں اور اس کے لیے ربوبیت کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ یعنی تنہا آئے گا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور نہ اس کے ساتھ مال ہوگا تا کہ وہ اس سے نفع حاصل کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾ (الشعراء) پس اسے کوئی چیز نفع نہ دے گی مگر جو اس نے عمل آگے بھیجا ہوگا اور فرمایا: كُلُّهُمْ اٰتِیْهِ، یہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے اور معنی کے اعتبار سے آتوہ ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں اشارہ ہے کہ تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے کہ تم اپنی اولادوں کو غلام بناؤ حالانکہ وہ سب غلام ہیں تو پھر تم اس کے لیے وہ کیسے پسند کرتے ہو جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے؟ ان کی اس کی مثل میں رد فرمایا کہ وہ اپنے لیے بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے اور وہ کہتے ہیں: فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے اور انہوں نے کہا: مورتیاں اللہ کی بیٹیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (الانعام: 136)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے پیدا فرمادے گا خدائے مہربان ان کے لیے (دلوں میں) محبت''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، یعنی جنہوں نے تصدیق کی۔ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ یعنی اپنے بندوں کے دلوں میں محبت پیدا فرمادے گا جیسا کہ امام ترمذی نے حضرت سعد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر''۔ فرمایا: ''پھر آسمان میں ندا دیتا ہے پھر اس کے لیے محبت کو اہل زمین میں اُتارتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے: سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ ''اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ناپسند فرماتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پھر آسمان میں منادی کر دی جاتی ہے پھر اس کے لیے نفرت زمین میں اتاری جاتی ہے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ امام بخاری اور امام مسلم نے اس کا مفہوم ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں روایت کی ہے اور نوادر الاصول میں بھی مروی ہے، ابو بکر بن سابق اموی نے ہمیں بیان فرمایا انہوں نے کہا ہمیں ابو مالک جنبی نے بیان کیا انہوں نے جو یبر سے انہوں نے ضحاک سے انہوں نے حضرت

1۔ جامع ترمذی، سورۂ مریم، جلد 2، صفحہ 145۔ ایضاً، حدیث نمبر 3085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مومن کے لیے محبت، ملاحت اور الفت نیک لوگوں کے سینوں میں اور ملائکہ مقربین میں پیدا فرماتا ہے پھر یہ آیت پڑھی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۝ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے علی تم یہ کہو: اللهم اجعل لی عندك عهداً واجعل لی فی قلوب المومنین مودة (1) (اے اللہ! میرے لیے اپنی بارگاہ سے عہد بنادے اور میرے لیے مومنین کے دلوں میں محبت ڈال دے) تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ثعلبی نے ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بندوں کے دلوں میں محبت ڈال دی ہے انہیں کوئی مومن نہیں ملتا مگر وہ اس کی عزت کرتا تھا اور کوئی مشرک و منافق نہیں ملتا تھا مگر وہ ان کی تعظیم کرتا تھا۔ حرم بن حیان کہتے تھے: جب کوئی شخص اللہ کی بارگاہ میں سچے دل سے آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں کو اس کی طرف متوجہ کردیتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کی محبت و رحمت اسے عطا فرماتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے لیے مومنین کے دلوں میں اور فرشتوں میں محبت ڈال دے گا۔

میں کہتا ہوں: جب وہ دنیا میں محبوب تھا تو آخرت میں بھی محبوب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ صرف مومن متقی سے محبت فرماتا ہے اور وہ پسند نہیں فرماتا مگر خالص متقی کو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی ان نیک لوگوں سے کرے۔ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر پس جبریل بھی اس سے محبت کرتا ہے پھر وہ آسمان میں منادی کرتا ہے اور کہتا ہے: اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے پس تم اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں'' (2)۔ فرمایا: ''پھر اس کی قبولیت زمین میں رکھی جاتی ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بغض کرتا ہے تو وہ جبریل کو بلاتا ہے اور کہتا ہے: میں فلاں بندے کو ناپسند کرتا ہوں تو بھی اسے ناپسند کر'' فرمایا'' پھر جبریل اسے ناپسند کرتا ہے۔ پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو بھی اسے ناپسند کر'' ۔ فرمایا: ''وہ اسے ناپسند کرتے ہیں پھر اس کی نفرت زمین میں رکھی جاتی ہے''۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۝

''صرف اس لیے ہم نے آسان کردیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اُتار کر آپ مژدہ سنائیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ڈرائیں اس کے ذریعے اس قوم کو جو بڑی جھگڑالو ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ یعنی ہم نے آپ کی عربی زبان میں قرآن کو بیان کیا اور ہم نے اسے غور و فکر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، کلام الرب مع جبرائیل ونداء اللہ و ملائکة، جلد 2، صفحہ 115

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، إذا أحب الله عبداً أحبه إلى عباده، جلد 2، صفحہ 231

کرنے والے پر آسان بنا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم نے اسے تجھ پر عرب کی زبان میں نازل کیا تا کہ ان پر اس کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ یعنی اس کے ساتھ آپ مومنین کو بشارت دیں۔ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾، اللد جمع ہے الالد کی سخت جھگڑالو آدمی؛ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الدّ الخصام۔ شاعر نے کہا:

أبيت نجيا للهمومِ كأنني　　أخاصم أقواماً ذوی جدلٍ لدا

ابوعبیدہ نے کہا: الالد اسے کہتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا دعویٰ کرتا ہو۔ حسن نے کہا: اللد حق سننے سے بہرا شخص۔ ربیع نے کہا: دلوں کے کان جن کے بہرے ہوں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مجاز ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: باطل میں جھگڑنے والے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جھگڑے میں سختی کرنے والے۔ بعض نے فرمایا: ظالم وہ ہوتا ہے جو سیدھا نہیں ہوتا۔ سب مفہوم ایک جیسے ہیں۔ یہ لوگ خاص کیے گئے ہیں انذار کے لیے جس کے پاس عناد نہیں ہوتا اس کا مطیع ہونا آسان ہوتا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

''اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے ہو ان میں کسی کو یا سنتے ہوں ان کی کوئی آہٹ''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ قرن سے مراد امت ہے اور جماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو ڈرا رہا ہے۔ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ احد محل نصب میں ہے یعنی هل ترىٰ منهم أحداً و تجد کیا ان میں سے کسی کو آپ دیکھتے ہیں۔ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا یا ان کے لیے کوئی آواز سنتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے یعنی وہ مر چکے ہیں اور اپنے اعمال پر اجر حاصل کر چکے ہیں۔ بعض نے فرمایا: الرکز وہ آواز یا حرکت جو سمجھی نہ جا سکے یہ یزیدی اور ابوعبیدہ کا قول ہے جیسے رکز الکتیبۃ لشکر کی آہٹ۔ ابوعبیدہ نے لبید کا شعر بطور استشہاد لکھا ہے:

وَتَوَجَّسَتْ رِكْزَ الأنيس فراعها　　عن ظَهر غيبٍ والأنيس سَقَامُها

بعض نے فرمایا: اس سے مراد مخفی آواز ہے، اس سے رکز الرمح بولا جاتا ہے جب نیزے کی ایک طرف زمین میں غیب ہو جائے۔ طرفہ نے کہا:

وَصَادِقَتَا سَمْعِ التَّوَجُّسِ للسُّرَى　　لِرِكْزٍ خَفِيٍّ أو لِصَوْتٍ مُنَدَّدِ

اور ذوالرمۃ ایک بیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاری اور کتوں کی آواز سنتا ہے:

إذا توجّس رِكْزًا مقفِرٌ نَدِسٌ　　بِنبأةِ الصوتِ مافی سمعه كذب

یعنی اس کے سننے میں جھوٹ نہیں یعنی وہ سننے میں سچا ہے۔ الندس ماہر کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نَدِس و نَدُس جیسے کہا جاتا ہے: حَذِرٌ و حَذُرٌ، و يَقِظٌ يَقُظٌ، النبأة، آہستہ آواز۔ اسی طرح الرکز ہے اور الرکاز اس مال کو کہتے ہیں جو دفن کیا گیا ہو؛ واللہ اعلم بالصواب۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 154

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# سورۂ طٰہٰ

آیاتها ۱۳۵ | ۲۰ سورۃ طٰہٰ مکیۃ ۴۵ | رکوعاتها ۸

سورۂ طہٰ تمام علماء کے نزدیک مکی ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ دارقطنی اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا(1) فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لٹکائے ہوئے نکلے تو انہیں بتایا گیا کہ تمہارا بہنوئی اور تمہاری بہن دین چھوڑ چکے ہیں۔ عمران کے پاس آئے ان کے پاس ایک مہاجر شخص تھا☆ جس کو خباب کہا جاتا تھا وہ سورۂ طہٰ تلاوت کررہے تھے۔ عمر نے کہا: وہ کتاب مجھے دو جو تمہارے پاس ہے تاکہ میں اسے پڑھوں۔ عمر کتابیں پڑھتے تھے۔ عمر کو ان کی بہن نے کہا: تو ناپاک ہے اور اس قرآن کو صرف پاک ہی چھو سکتے ہیں تم اٹھو غسل کرو یا وضو کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور وضو کیا قرآن حکیم کو پکڑا اور پڑھا طہٰ۔ یہ ابن اسحاق نے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ عمر اپنی تلوار لٹکائے ہوئے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے انہیں نعیم بن عبد اللہ ملے، اس نے پوچھا: اے عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر نے کہا: میں محمد کا ارادہ کر کے جارہا ہوں جس نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے اور جس نے قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور قریش کے دانشوروں کو بیوقوف بنایا ہے اور ان کے دین پر عیب لگایا ہے اور ان کے معبودوں کو برا کہا ہے۔ پس میں اسے قتل کروں گا۔ نعیم نے اسے کہا: اللہ کی قسم! اے عمر تجھے تیرے نفس نے دھوکا دیا ہے کیا تجھے بنی عبد مناف زمین پر چلتا رہنے دیں گے جبکہ تو محمد کو قتل کر چکا ہوگا، کیا تو اپنے گھر والوں کی طرف نہیں جاتا تاکہ ان کا معاملہ سیدھا کرے؟ عمر نے پوچھا: میرے گھر والے؟ اس نے کہا: تیرا بہنوئی اور تیرے چچا کا بیٹا سعید بن زید اور تیری بہن فاطمہ بنت خطاب، اللہ کی قسم! دونوں اسلام قبول کر چکے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے پیروکار ہو چکے ہیں تجھے لازم ہے کہ ان کی خبر لو۔ عمر اپنے بہنوئی اور بہن کی طرف لوٹا ان کے پاس حضرت خباب بن ارت بھی تھے ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طہٰ تھی وہ ان دونوں کو پڑھا رہے تھے جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آمد محسوس کی تو حضرت خباب ان کی کوٹھری میں چھپ گئے یا کسی کمرے میں غائب ہو گئے۔ حضرت فاطمہ بنت خطاب نے صحیفہ پکڑا اور اپنی ران کے نیچے کر لیا۔ عمر نے حضرت خباب کی قرأت کو سن لیا جو ان دونوں کو پڑھا رہے تھے جب وہ گھر کے قریب ہوئے تھے جب داخل ہوئے تو پوچھا: جو میں نے مخفی آواز سنی ہے وہ کیسی تھی؟ سعید اور ان کی زوجہ نے کہا: تو نے کچھ نہیں سنا۔ عمر نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی شروع کر دی ہے عمر نے اپنے بہنوئی سعید بن زید کو پکڑ لیا۔ حضرت فاطمہ بنت خطاب اٹھی تاکہ اپنے خاوند کو عمر سے بچائیں عمر نے اسے بھی مار کر زخمی کر دیا۔ جب عمر نے ایسا کیا تو عمر کو اس کی بہن اور بہنوئی نے کہا: ہاں، ہم اسلام لا چکے ہیں اور

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، نہی عن المحدث عن مس القرآن، جلد 1، صفحہ 123

☆ جنہوں نے بعد میں ہجرت کی۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں جو تیرے جی میں آئے کر۔ جب عمر نے اپنی بہن کا خون دیکھا تو اپنے کیے پر شرمندہ ہوا اور پریشان ہوا اس نے اپنی بہن سے کہا: مجھے وہ صحیفہ دے جس کو پڑھتا ہوا میں نے تجھے سنا ہے میں دیکھوں کہ وہ کیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں عمر کاتب تھا جب اس نے یہ کہا تو اس کی بہن نے کہا: ہمیں تیرا خوف ہے کہ تو اس کی بحرمتی کرے گا۔ عمر نے کہا: تم خوف نہ کھاؤ، عمر نے اپنے خداؤں کی قسم اٹھائی کہ وہ صحیفہ واپس کر دے گا جب وہ پڑھ لے گا۔ جب عمر نے یہ کہا تو اس کو عمر کے اسلام لانے کی امید ہوگئی، بہن نے عمر سے کہا: اے میرے بھائی! تو اپنے شرک کی بنا پر نجس ہے اور اسے صرف پاک ہی چھوسکتا ہے۔ عمر اٹھا اور غسل کیا۔ بہن نے وہ صحیفہ عمر کو دے دیا اس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ عمر نے اسے پڑھا اور بے ساختہ کہا: یہ کلام کتنا عمدہ اور خوبصورت ہے اور کتنا معزز ہے! جب حضرت خباب نے یہ سنا تو باہر نکل آئے اور کہا: اے عمر! اللہ کی قسم! میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ تجھے اپنے نبی کی دعا کے ساتھ خاص کر دے گا میں نے کل نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا مانگتے سنا ہے: اللهم أيدّ الاسلام بأبي الحكم بن هشام أو بعمر بن الخطاب (اے اللہ! ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ساتھ اسلام کی تائید اور قوت فرما) اللہ، اللہ اے عمر! اس وقت عمر نے کہا: اے خباب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر میری راہنمائی کرو تا کہ میں ان کے پاس جا کر اسلام قبول کرلوں۔

**مسئلہ**: دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسین آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے پڑھی، جب ملائکہ نے قرآن سنا تو کہا: مبارک ہو اس امت کو جس پر یہ قرآن نازل ہوگا اور مبارک ہو ان سینوں کو جو اسے یاد رکھیں گے، مبارک ہو ان زبانوں کو جو اس کی تلاوت کریں گی''۔ ابن فورک نے کہا: اللہ تعالیٰ کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرشتوں میں سے جن کو اپنا کلام سمجھایا، سنایا اور ظاہر کیا۔ عرب کہتے ہیں: قرأت الشئ جب تو اس میں غور و فکر کرے اور عرب کہتے ہیں: ما قرأت هذه الناقة في رحمها سلى قط، یعنی اس اونٹنی کے رحم میں کبھی بچہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس بنا پر کلام آسان ہوگا۔ قرات سے مراد عبارات کا سمجھنا اور سنانا ہے جس کو تخلیق فرمایا اور لکھوانا ہے جس کو بیان فرمایا ہے۔ ہمارے قول: قرأنا كلام الله کا یہی مفہوم ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل: 20) اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل: 20) کا یہی معنی ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے بعض نے کہا کہ قرء کا معنی ہے تکلم بہ اور یہ مجاز ہے جیسے ان کا قول ہے: ذقت هذا القول ذواقا، اس کا معنی ہے میں نے اس کو آزمایا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (النحل) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے ساتھ آزمایا۔ اس کو ذواق کہا گیا۔ خوف حقیقت میں چکھا نہیں جاتا کیونکہ ذوق حقیقت میں منہ کے ساتھ ہوتا ہے، دوسرے جوارح سے نہیں ہوتا۔ ابن فورک نے کہا: جو ہم نے پہلے کہا وہ اس خبر کی تاویل میں اصح ہے کیونکہ اللہ کا کلام ازلی ہے، قدیم ہے، جملہ حوادث سے پہلے ہے۔ اس نے اپنی مخلوق میں سے جس کو جس وقت چاہا سنایا اور سمجھایا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے کلام کا عین مدت اور زمانہ کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ

خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ﴿۴﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ﴿۶﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ﴿۸﴾

”طا۔ ھا۔ نہیں اُتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔ بلکہ یہ نصیحت ہے اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔ یہ اُتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا، اُسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ اور تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور بھیدوں کو بھی۔ الله (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اس کے لیے بڑے خوبصورت نام ہیں“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: طٰهٰ ﴿۱﴾ اس کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت سیدنا ابوبکر رضی الله عنہ نے کہا: یہ اسرار میں سے ہے؛ غزنوی نے یہ ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی الله عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے یارجل (اے شخص) یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: عکل قبیلہ کی معروف لغت ہے۔ بعض نے فرمایا: عک قبیلہ کی لغت ہے۔ کلبی نے کہا: اگر عک قبیلہ کے کسی شخص کو یارجل کہے گا تو جواب نہیں دے گا حتی کہ توطہ کہے۔ طبری نے اس کے متعلق ایک شعر لکھا ہے:

دعوت بطٰهَ فی القتال فلم یُجِبْ    فخفتُ علیه أن یکون مُوَائِلا (1)

اس شعر میں موئلا کی جگہ مزایلا بھی مروی ہے۔ عبدالله بن عمرو نے کہا: عک قبیلہ کی لغت میں اس کا معنی ہے یاحبیبی، اے میرے حبیب!۔ یہ قول غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ قطرب نے کہا: یہ طی قبیلہ کی لغت ہے۔ یزید بن مہلہل نے کہا:

إنّ السَّفاهةَ طٰهَ من شمائلکم    لابارك الله فی القوم المَلَاعِین

اسی طرح حسن نے کہا کہ طہ کا معنی یارجل ہے؛ یہی عکرمہ کا قول ہے۔ سریانی زبان میں بھی اسی طرح ہے؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی الله عنہما اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ نبطی زبان میں اس کا معنی یارجل ہے، یہ سدی، سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباس رضی الله عنہما کا قول ہے۔

إن السفاهة طه من خلاتقکم    لاقدس الله أرواح الملاعین(2)

عکرمہ نے بھی یہ کہا ہے کہ حبشی زبان میں یارجل کی طرح ہے؛ یہ قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگرچہ دوسری لغات میں بھی یہ لفظ ہے لیکن یہ عربی لغت سے بھی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یہ عک، طی اور عکل میں یمنی لغت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الله تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور قسم ہے۔ اس کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے؛ یہ بھی حضرت ابن

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 158    2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 392

عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے جس طرح کہ محمد نام بھی اس نے رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میرے رب کی بارگاہ میں دس اسماء ہیں'' ان میں طٰہٰ اور یٰسین کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سورت کا نام ہے اور اس کے لیے چابی ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کلام سے اختصار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کے علم کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حروف مقطعات ہیں ہر لفظ ایک خاص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: طا سے مراد شجرہ طوبیٰ ہے اور ھا سے مراد النار الھاویۃ ہے۔ عرب کسی چیز کو اس کے جز سے تعبیر کر دیتے ہیں گویا جنت اور دوزخ کی قسم اٹھائی۔ سعید بن جبیر نے کہا: طا اللہ تعالیٰ کے اسم طاہر اور طلب کا اعادہ ہے اور ھا اللہ تعالیٰ کے اسم ھادی کا آغاز ہے۔ بعض نے فرمایا: طا سے مراد ہے اے امت کی شفاعت کے حریص! ھا سے ھادی الخلق الی اللہ کا معنی مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: طا طہارت سے ہے اور ھا ہدایت سے ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: یاطاھرًا من الذنوب یاھادی الخلق إلی علام الغیوب (اے گناہوں سے مبرا! اے مخلوق کی علام الغیوب کی طرف راہنمائی کرنے والے) بعض نے فرمایا: طا سے مراد طبل جنگ ہے اور ھا سے مراد ان کی ہیبت ہے جو کافروں کے دلوں میں ڈالی جاتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے: سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران: 181) اور فرمایا: وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (الاحزاب: 26) بعض نے فرمایا: طا سے مراد اہل جنت کا جنت میں خوش ہونا ہے اور ھا سے مراد یہ ہے کہ دوزخی دوزخ میں ذلیل ہوں گے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ طٰه کا معنی ہے مبارک ہے اس کو جس نے ہدایت پائی یہ مجاہد اور محمد بن حنفیہ کا قول ہے۔ ساتواں قول یہ ہے کہ طٰه سے مراد طاء الأرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشقت برداشت کرتے تھے حتیٰ کہ پاؤں مبارک سوج جاتے تھے اور پاؤں متورم ہو جاتے تھے اور اپنے قدموں کے درمیان آرام کرنے کی احتیاج محسوس ہوتی تو آپ کو کہا گیا: طاء الارض یعنی آپ تھکیں نہیں کہ آپ کو آرام کی حاجت ہو، یہ انباری نے حکایت کیا ہے۔ قاضی عیاض نے ''الشفاء'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ربیع بن انس نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے طٰه نازل فرمایا۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر دوسرا پاؤں بھی رکھو۔ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی، زمخشری نے کہا: حسن سے مروی ہے طٰه اور اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ الوطاء سے امر کا صیغہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد میں ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے تھے تو آپ کو حکم دیا گیا کہ دونوں پاؤں اکھٹے زمین پر رکھو یہ اصل میں طأتھا ہمزہ کو ہ سے بدل دیا گیا جیسا کہ یطأمیں الف سے بدل دیا گیا۔ یہ اس کے بارے میں ہے جس نے کہا: لاھناك المرتع پھر اس پر یہ امر بنایا گیا اور ھاء سکت کے لیے ہے۔ مجاہد نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رات کے وقت قیام کے لمبا ہونے کی وجہ سے نماز میں اپنے سینوں میں رسیاں باندھتے تھے پھر فرضی نماز کے ساتھ اس کو منسوخ کر دیا گیا، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ کلبی نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں وحی نازل ہوئی تو آپ نے عبادت میں بہت زیادہ کوشش کی اور عبادت میں شدت کی اور ساری رات قیام فرماتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے نفس پر تخفیف کرنے کا حکم دیا پھر آپ نماز بھی پڑھتے تھے اور آرام بھی

کرتے تھے۔ پھر اس آیت نے رات کے قیام کو منسوخ کر دیا اس آیت کے بعد آپ نوافل بھی پڑھتے تھے اور سوتے بھی تھے۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کفار قریش کہتے: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اس لیے نازل ہوا ہے تا کہ آپ کو مشقت میں ڈالے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ یعنی ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ تھکیں، جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس بناء پر طه اصل میں طاھا ہوگا یعنی طا الأرض ضمیر کا مرجع الارض ہوگا یعنی اپنی نمازوں میں اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھو۔ ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور وہ الف ساکن ہوگا۔ ایک جماعت نے طَهْ پڑھا ہے۔ اس کی اصل طَأْ ہے اس کا معنی طأ الأرض ہے۔ ہمزہ کو حذف کیا گیا اور ھاء السکت داخل کی گئی۔ زر بن جیش نے کہا: ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعود پر طَهَ پڑھا تو حضرت عبد اللہ نے اسے فرمایا: طِهِ ہے۔ فرمایا: اے ابو عبد الرحمٰن! کیا یہ حکم نہیں دیا گیا کہ زمین کو اپنے دونوں پاؤں کے ساتھ روندو۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: طِهِ، مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھایا تھا۔ ابو عمر، ابو اسحاق نے ھا کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور طا کو فتحہ دیا ہے۔ ابو بکر، حمزہ، کسائی اور اعمش نے دونوں میں امالہ کیا ہے۔ ابو جعفر، شیبہ اور نافع نے دونوں کو دونوں لفظوں کے بین بین پڑھا ہے۔ ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور باقی قراء نے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ تمام لغات صحیح اور فصیح ہیں۔ نحاس نے کہا: اکثر اہل عرب کے نزدیک دو وجوہ کی بنا پر امالہ کی کوئی وجہ نہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے یہاں نہ یا ہے اور نہ کسرہ تا کہ امالہ ہوتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ طا ان حروف میں سے ہے جو امالہ کے مانع ہیں۔ یہ دونوں علتیں واضح ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ یہ مانُزِلَ علیك القرآن لتشقی بھی پڑھا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: بعض نحویوں نے کہا یہ لام نفی ہے۔ بعض نے کہا: لام جحود ہے۔ ابو جعفر نے کہا: میں نے ابو الحسن بن کیسان کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لام جارہ ہے اس کا معنی ہے: ما انزلنا علیك القرآن للشقاء، الشقاء مد اور قصر کے ساتھ ہے یہ واوی ہے، الشقاء کا لغوی معنی تھکن اور مشقت ہے یعنی آپ کی مشقت کے لیے تو ہم نے آپ پر قرآن نازل نہیں کیا۔ شاعر نے کہا:

ذوالعقل یشقی فی النعیم بعقله    وأخو الجهالة فی الشقاوة ینعم

پس لِتَشْقٰٓى کا معنی ہے تا کہ آپ تھکیں ان پر فرط تاسف کی بنا پر کہ وہ ایمان لے آئیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ (الکہف: 6)

یعنی آپ کے ذمہ صرف تبلیغ کرنا اور نصیحت کرنا ہے اور ان کا ایمان لانا آپ پر فرض نہیں کیا گیا اس کے بعد کہ آپ نے رسالت اور موعظہ حسنہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ روایت ہے کہ ابو جہل (لعنۃ اللہ علیہ) اور نضر بن حارث نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ شقی ہیں کیونکہ آپ نے اپنے آباء کا دین ترک کر دیا ہے پس اس کا رد کیا گیا ہے کہ دین اسلام اور یہ قرآن تو ہر کامیابی کا زینہ ہے اور ہر سعادت کے حصول کا سبب ہے اور جس نظریہ پر کفار ہیں وہ نری شقاوت ہے۔ مذکورہ اقوال کی بنا پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نوافل پڑھتے تھے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے تھے۔ جبریل نے کہا: حضور! اپنے نفس

پر شفقت کریں بیشک اس کا بھی آپ پر حق ہے یعنی ہم نے آپ پر قرآن نازل نہیں کیا تا کہ آپ کا نفس عبادت میں تھک جائے اور تکلیف و مشقت میں آپ اسے مبتلا کریں آپ کو تو آسان شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ تشقیٰ سے بدل ہے یعنی ما انزلناہ إلا تذکرۃ اور نحاس نے کہا: یہ وجہ بہت بعید ہے۔ ابو علی نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ تذکرۃ، شقاء نہیں ہے۔ یہ مصدر کی بناء پر منصوب ہے یعنی أنزلناہ لتذکر بہ تذکرۃ یا مفعولہ لاجلہ کی بنا پر منصوب ہے یعنی مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ۝ ما أنزلناہ إلا للتذکرۃ۔ حسین بن فضل نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی ما أنزلنا علیك القرآن إلا تذکرۃ لمن یخشیٰ ولئلا تشقی اور تنزیلا مصدر ہے یعنی نزلناہ تنزیلاً، بعض نے فرمایا: یہ تذکرۃ کے قول سے بدل ہے۔ ابو حیوہ شامی نے تنزیل مرفوع پڑھا ہے۔ اس معنی کی بناء پر ھذا تنزیلٌ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝، العلاء سے مراد بلند و بالا ہے یہ العلیا کی جمع ہے جیسے کبریٰ و صغریٰ، کُبَر، صُغَر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں اپنی عظمت و جبروت اور جلال کی خبر دی ہے۔ پھر فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اس پر مدح کی بنا پر نصب جائز ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: بدل کی بنا پر جر ہے۔ سعید بن مسعدہ نے کہا: رفع ھو الرحمٰن کے معنی کی بنا پر ہے۔ نحاس نے کہا: رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور اس کی خبر لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ہے۔ پس استویٰ پر وقف نہ ہوگا اور خلق میں جو ضمیر مضمر ہے اس سے بدل کی بنا پر مرفوع ہو تو اس صورت میں استویٰ پر وقف جائز ہوگا اسی طرح جب مبتدا محذوف کی خبر کی بنا پر مرفوع ہوگا تو العلاء پر وقف نہ ہوگا۔ الإستویٰ کے معنی پر گفتگو سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ شیخ ابو الحسن وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بغیر حد و کیف کے اپنے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ مخلوق کا استوا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیدا کیا جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اور جو کچھ قیامت کے بعد ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝، تَحْتَ الثَّرٰى سے مراد یہ ہے کہ اس چٹان کے نیچے جو کچھ ہے جس کے نیچے والی چیزوں کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ محمد بن کعب نے کہا: اس سے مراد ساتویں زمین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی پانی پر ہے اور اس مچھلی کی دونوں طرفیں سر اور دُم عرش کے نیچے ملتی ہیں اور سمندر سبز چٹان پر ہے اور آسمان کا سبزہ اس وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس کے متعلق ارشاد ہے: فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ (لقمان: 16) اور وہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے اور وہ بیل الثریٰ پر ہے۔ اور ثریٰ کے نیچے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا☆۔ وہب بن منبہ نے کہا: سطح زمین پر سات سمندر ہیں اور زمینیں سات ہیں اور ہر دو زمینوں کے درمیان ایک سمندر ہے اور نیچے والا سمندر جہنم کے کنارے سے ملا ہوا ہے۔ اگر سمندر کی بڑائی،

☆ علامہ سید محمود آلوسی رقم طراز ہیں میرے نزدیک اس قسم کی روایات کا موضوع ہونا اقوی ہے۔ ابن قیم نے المنار المنیف جلد 1 صفحہ 78 میں لکھا ہے اس قسم کی فضول مرویات کے نقل کرنے والوں پر تعجب ہوتا ہے۔

پانی کی کثرت اور اس کی ٹھنڈک نہ ہوتی تو جہنم ہر اس چیز کو جلا دیتی جو کچھ اس کے اوپر ہے۔ فرمایا: جہنم ہوا کے متن پر ہے اور ہوا کا متن تاریکی کے پردے پر ہے اس کی موٹائی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ حجاب الثریٰ پر ہے اور الثریٰ تک خلائق کے علم کی انتہا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: السر اسے کہتے ہیں جو انسان آہستہ طور پر بیان کرتا ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جو انسان دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اسے دوسرے کے سامنے بیان نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ السر سے مراد دل کی بات ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جسے تیرا نفس بیان کرتا ہے جو ابھی موجود نہیں ہے جبکہ وہ بعد میں ہوگا اور تو اسے جانتا ہے تو اپنے نفس سے آج بیان کرتا ہے اور کل کے متعلق جو بیان کرتا ہے اسے تو نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو تو آج آہستہ سے سوچتا ہے اور جو تو کل سوچے گا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رازوں اور بھیدوں کو جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: السر سے مراد وہ ہے جو ابن آدم اپنے دل میں آہستہ سے کہتا ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جو ابن آدم پر مخفی ہوتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے لیکن انسان اسے نہیں جانتا۔ اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ماضی اور مستقبل کے بارے میں برابر ہے اس کے علم میں تمام مخلوق ایک نفس کی طرح ہے۔ قتادہ وغیرہ نے کہا: السر سے مراد وہ ہے جو انسان اپنے نفس میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اخفی وہ ہوتا ہے جو نہ ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ ابن زید نے کہا: السر سے مراد خلائق کے راز ہیں اور اخفی سے مراد اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ طبری نے اس کا انکار کیا ہے (1) فرمایا: اخفی وہ ہے جو انسان کے راز میں نہیں ہے وہ آئندہ اس کے نفس میں آئے گا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ اللہ اسم جلالت پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی وجہ سے ہے یا يَعْلَمُ میں جو ضمیر ہے اس سے بدل کی بنا پر ہے۔ اس نے اپنی توحید خود بیان فرمائی ہے یہ اس طرح ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف دعوت دی تو انہیں یہ گراں گزری۔ ابو جہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے سنا تو اس نے ولید بن مغیرہ کو کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تو اللہ کے ساتھ دوسرے خدا کو پکارنے سے منع کرتا ہے اور خود وہ اللہ تعالیٰ اور الرحمٰن کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اور یہ نازل فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل: 110) اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کے اسماء کثیر ہیں۔ پھر فرمایا: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ سورۃ الاعراف میں اسماء حسنیٰ پر تنبیہ گزر چکی ہے۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 162

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ۝١٣ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝١٤ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝١٥ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝١٦

''اور (اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی۔ جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا: تم (ذرا یہاں) ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لیے اس سے کوئی چنگاری یا مجھے مل جائے آگ کے پاس کوئی راہ دکھانیوالا۔ پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی: اے موسیٰ! بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں پس تو اُتار دے اپنے جوتے بیشک تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔ اور میں نے پسند کرلیا ہے تجھے (رسالت کے لیے) سوخوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے۔ یقیناً میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا پس تو میری عبادت کیا کر اور ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لیے۔ بیشک وہ گھڑی (قیامت) آنے والی ہے میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تا کہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو اس کام کا جس کے لیے وہ کوشاں ہے۔ پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اہل معانی نے کہا: یہ استفہام اثبات و ایجاد ہے اس کا معنی ہے أليس قد أتاك؟ کیا تیرے پاس نہیں آئی موسیٰ کے واقعہ کی اطلاع؟ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے قد أتاك (آچکی ہے تیرے پاس)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے ابھی تک موسیٰ کے واقعہ کی اطلاع نہیں آئی۔ پھر اس کے متعلق خود خبر دی۔ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا: یہ اس وقت ہوا جب آپ کی خدمت کرنے کی مدت پوری ہوئی اور آپ اپنی اہلیہ کو لے کر چلے۔ آپ مدین سے مصر کی طرف آرہے تھے اور آپ راستہ بھول گئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک غیور شخص تھے رات کے وقت لوگوں کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت غیرت کی وجہ سے جدا ہو جاتے تھے تا کہ لوگ آپ کی زوجہ کو نہ دیکھیں پس آپ ساتھیوں سے جدا ہو کر راستہ بھول گئے؛ کیونکہ علم الٰہی میں ایسا فیصلہ ہو چکا تھا رات تاریک تھی۔ مقاتل نے کہا: جمعہ کی رات تھی سردیوں کا موسم تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ کی طرف واپس جانے کی اجازت طلب کی تو انہیں اجازت دی گئی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر والوں اور اپنی بکریوں کے ساتھ چل پڑے۔ ٹھنڈی رات میں راستہ میں آپ کا بچہ پیدا ہوا جبکہ آپ راستہ سے ہٹ چکے تھے اور ان کی بکریاں بھی بکھر چکی تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ جلائی لیکن آگ نہ جلی پس آپ نے راستہ کی بائیں جانب دور سے آگ دیکھی تو آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا: تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب آپ آگ کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے عناب کے درخت میں آگ دیکھی اس روشنی کی

خوبصورتی سے تعجب کرتے ہوئے آپ ٹھہر گئے اس درخت کے سبزہ کی شدت اتنی تھی کہ آگ کی گرمی کی شدت اس درخت کی سبزی کے حسن کو تبدیل نہ کر سکے اور درخت کے پانی کی کثرت اور سبزہ کی شادابی نے آگ کی روشنی کے حسن کو تبدیل نہیں کیا تھا؛ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کو دیکھا، جیسا کہ روایت میں ہے: ''یہ علیق (وہ گھاس جو درخت پر لپٹتی ہے اور اس کا پھل شہتوت کی طرح ہوتا ہے) کا درخت تھا آپ نے اس کا قصد کیا تو وہ آپ سے پیچھے ہو گیا پس آپ لوٹ آئے اور اپنے اندر خوف محسوس کیا پھر وہ درخت قریب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس درخت سے کلام فرمائی''۔ ماوردی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک آگ تھی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور تھا(1)۔ حمزہ نے لاهله امکثوا، هاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح سورۃ القصص میں پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ اس کی لغت پر ہے جس نے کہا: مررت بھُویا رجل، وہ اصل پر لایا یہ جائز ہے مگر حمزہ نے دونوں جگہ اس کی اصل کی مخالفت کی۔ امکثوا فرمایا اقیموا، نہیں فرمایا کیونکہ اقامہ تدوام کا تقاضا کرتا ہے، المکث ایسا نہیں ہے۔ آنست کا معنی ہے ابصرت؛ یہ ابن اعرابی کا قول ہے؛ اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (النساء: 6)

آنست الصوت میں نے آواز کو سنا۔ القبس آگ کا شعلہ، اسی طرح المقباس ہے۔ کہا جاتا ہے: قبست منه ناراً، واقتبست منه علماً، یعنی میں نے اس سے استفادہ کیا۔ یزیدی نے کہا: اقبست الرجل علما وقبسته ناراً میں نے اس سے علم حاصل کیا اور میں نے اس سے آگ حاصل کی۔ اگر تو اس کے لیے آگ طلب کرے تو تو کہے گا: اقبسته کسائی نے کہا: اقبسته ناراً وعلماً برابر ہے۔ قبسته دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ هُدًى سے مراد هادیا (راہنما) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا جب آپ اس آگ کے پاس آئے نُوْدِیَ تو درخت سے آواز دی گئی جیسا کہ سورۃ القصص میں ہے یعنی اس کی جہت سے آواز آئی جیسا کہ آگے آئے گا۔ یٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے انہوں نے نبی پاک ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی اس دن موسیٰ علیہ السلام پر صوف کا کمبل تھا صوف (اون) کا جبہ تھا اور صوف کی ٹوپی تھی اور صوف کی شلوار تھی اور آپ کے جوتے مردار گدھے کے چمڑے کے تھے''(2)۔ ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صرف حمید الاعرج کے طریق سے جانتے ہیں۔ حمید یہ علی کوفی کا بیٹا ہے۔ اور یہ منکر الحدیث ہے اور حمید بن قیس الاعرج المکی جو مجاہد کا ساتھی ہے وہ ثقہ ہے۔ الکمة، چھوٹی ٹوپی کو کہتے ہیں۔ عام قراء نے انی کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ أی نودی فقیل له یاموسیٰ انی؛ ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ابو عمرو، ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے انی نداء کے اعمال کی وجہ سے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جوتے اتارنے کے حکم کا سبب کیا تھا۔ الخلع کا معنی ہے اُتارنا۔ النعل اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین سے پاؤں کو بچانے کے لیے بنائی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 395
2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی لبس الصوف، حدیث نمبر 1656، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جوتے اتارنے کا حکم اس لیے دیا کیونکہ وہ ناپاک تھے، غیر مذبوح جلد سے بنے ہوئے تھے؛ یہ کعب، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس لیے یہ حکم دیا تاکہ مقدس وادی کی برکت کو حاصل کریں اور آپ کے قدم وادی کی مٹی کو مس کریں؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حسن اور ابن جریج کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ کی بارگاہ میں تواضع اور خشوع کا اظہار کرنے کے لیے جوتے اُتارنے کا حکم دیا اسی طرح سلف صالحین کرتے ہیں جب وہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس جگہ کی تعظیم کرنے کے لیے یہ حکم دیا جیسا کہ حرم کی تعظیم کے لیے جوتوں کے ساتھ داخل نہیں ہوا جاتا عرف یہ ہے کہ بادشاہوں کی بارگاہ میں حاضری کے وقت جوتے اُتارے جاتے ہیں اور انسان حد درجہ تواضع کا اظہار کرتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی وجہ سے یہ حکم دیا گیا اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ وہ مردار کے چمڑے سے بنے ہوئے تھے یا کسی اور چیز سے بنے ہوئے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ میں سوار نہیں ہوتے تھے وہ اس مٹی کا احترام کرتے تھے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اقدس موجود تھا اس معنی (تعظیم) کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بشیر بن خصاصیہ کو فرمایا تھا جبکہ وہ جوتوں کے ساتھ قبور کے درمیان چل رہے تھے: ''جب تو ایسی جگہ پر ہو تو اپنے جوتے اتار دے'' (1)۔ حضرت بشیر فرماتے ہیں: میں نے جوتے اتار دیے۔ پانچواں قول یہ ہے: یہ اہل، اولاد سے دل کو فارغ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ کبھی اہل کو نعل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خواب کی تعبیر میں یہ اس طرح ہے جو خواب دیکھے کہ وہ جوتے پہنے والا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نور اور ہدایت کی بساط بچھائی تھی تو رب العالمین کی بساط کو جوتوں کے ساتھ روندنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اُتارنے کا حکم دیا گیا ہو۔ یہ ان پر پہلا فرض تھا جیسا کہ سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا: قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۞ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۞ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۞ (المدثر) حقیقی مراد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ خبر میں ہے: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوتے اتارے اور انہیں وادی کے پیچھے پھینک دیا''۔ ابو الاحوص نے کہا: حضرت عبد اللہ، حضرت ابو موسیٰ سے ان کے گھر میں ملے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت ابو موسیٰ نے تکبیر کہی اور حضرت ابو موسیٰ نے حضرت عبد اللہ سے کہا: آگے بڑھو (اور امامت کراؤ) حضرت عبد اللہ نے کہا: تم آگے بڑھو تم اپنے گھر میں ہو۔ تو حضرت ابو موسیٰ آگے بڑھے اور اپنے جوڑے اتار دیے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: کیا تم وادی مقدس میں ہو (کہ تم نے جوتے اُتار دیے ہیں) صحیح مسلم میں سعید بن یزید سے مروی ہے فرمایا: میں نے حضرت انس سے کہا: کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نعلین میں نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا: ہاں (2)۔ اس حدیث کو امام نسائی نے حضرت عبد اللہ بن سائب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنے جوڑے اپنی بائیں طرف رکھ دیے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو سعید کی حدیث سے

---

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 167

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جواز الصلوٰۃ فی النعلین، جلد 1، صفحہ 208

سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ باب الصلوٰۃ فی النعل، حدیث نمبر 553، سنی کے اعتبار سے، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی جب کہ آپ نے اپنے جوڑے اتار دیے تھے اور انہیں اپنی بائیں جانب رکھا تھا جب لوگوں نے یہ دیکھا تو اپنے جوتے اتار دیے، جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل فرمائی تو فرمایا: ''تمہیں کس چیز نے جوتے پھینکنے پر اُبھارا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے جوتے اتار دیے ہیں تو ہم نے اپنے جوتے اتار دیے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل میرے پاس آئے اور مجھے بتایا کہ ان میں غلاظت لگی ہوئی ہے'' فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو اسے دیکھنا چاہیے جب اپنے جوتے میں کوئی غلاظت وغیرہ دیکھے تو اسے صاف کر دینا چاہیے اور پھر ان میں نماز پڑھنی چاہیے'' (1)۔ ابو محمد عبدالحق نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے کہ یہ حدیث دونوں قسم کی احادیث کو جمع کرتی ہے اور ان کے درمیان تعارض کو اٹھا دیتی ہے۔ علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز نعلین میں جائز ہے جب وہ ہر قسم کی غلاظت سے پاک ہوں حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: جوتوں میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: 31) کا یہی مفہوم ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابراہیم نخعی نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جو جوتے اتارتے ہیں: میں خواہش کرتا ہوں کہ کوئی محتاج آئے اور ان کو اٹھا کر لے جائے۔

**مسئلہ نمبر3**۔ اگر تو جوتوں کو اتارے تو اپنے قدموں کے درمیان اتار کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ اپنے قدموں کے درمیان جوتے اُتارے'' (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مقبری سے کہا: اپنے جوتے اپنے قدموں کے درمیان اُتار دے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کو اذیت نہ دے۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوتے بائیں جانب اتارے کیونکہ آپ امام تھے۔ جب تو امام ہو یا اکیلا ہو تو ایسا کر لے اگر تو چاہے اور اگر تو صف میں مقتدی ہو تو اپنے جوتوں کے ساتھ اپنی بائیں طرف والوں کو اذیت نہ دے اور نہ انہیں اپنے سامنے رکھ تا کہ وہ تجھے اپنی طرف مشغول رکھیں گے لیکن اپنے قدموں کے آگے رکھ۔ جبیر بن مطعم سے مروی ہے فرمایا: انسان کا اپنے قدموں کے درمیان جوتے رکھنا بدعت ہے۔

**مسئلہ نمبر4**۔ اگر جوتوں میں ایسی نجاست لگی ہوئی ہو جس کی ناپاکی پر علماء کا اجماع ہے جیسے خون اور غلاظت مثلاً بنی آدم کا پیشاب وغیرہ تو انہیں پانی کے ساتھ دھونا ہی پاک کرے گا؛ یہ امام شافعی اور اکثر علماء کی رائے ہے۔ اگر نجاست ایسی ہو جس میں اختلاف ہے جیسے جانوروں کا پیشاب اور تر گوبر تو اس میں اختلاف ہے کہ جوتے اور موزے کو مٹی پر رگڑنا اسے پاک کر دے گا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک دو قول ہیں: امام اوزاعی اور ابو ثور نے بغیر کسی تفصیل کے اسے مٹی پر رگڑنے کو جائز قرار دیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جب وہ خشک ہو تو اسے کھرچ دینا اور رگڑ دینا بھی زائل کر دے گا اور جب وہ تر ہو گی تو اسے دھونا ہی زائل کرے گا سوائے پیشاب کے۔ ان کے نزدیک اس میں دھونا ہی ضروری ہو گا۔ امام شافعی نے فرمایا: ان میں سے کسی چیز کو پاک نہیں کرے گا مگر پانی۔ صحیح قول اس کا ہے جس نے کہا ہے: رگڑنا جوتے اور موزے کو پاک کر دے گا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الصلوٰۃ فی النعال، جلد 1، صفحہ 95

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، المصلی اذا خلع نعلیہ أین یضعھما، جلد 1، صفحہ 96

کیونکہ حضرت ابو سعید کی حدیث ہے کہ اگر نعل اور خف مردار کی جلد سے بنے ہوئے ہوں اگر وہ غیر مدبوغ ہوگی تو وہ بالاتفاق نجس (ناپاک) ہے سوائے اس قول کے جس کی طرف زہری کا رجحان ہے اور لیث کا خیال ہے جیسا کہ سورۃ النحل میں گزر چکا ہے۔ اور نجاست کے زائل کرنے کا قول سورۂ برأت میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ ، الْمُقَدَّسِ سے مراد مطہر ہے، القدس کا معنی طہارت ہے۔ الأرض المقدسہ سے مراد پاک زمین ہے۔ اس کو مقدس اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں سے کافروں کو نکال دیا تھا اور مومنین کو آباد کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات کو بعض پر فضیلت دی ہے جس طرح کہ بعض اوقات کو بعض پر فضیلت دی ہے اسی طرح بعض حیوانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے کہ جسے چاہے فضیلت دے دے۔ اس بنا پر کافروں کے نکالنے اور مومنین کے ٹھہرانے کی وجہ سے مقدس ہونے کا اعتبار نہ ہوگا دوسری وجہ بھی اس میں شریک ہے۔ طُوًى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہ سے مروی ہے کہ یہ وادی کا نام ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: یہ عمیق گہری، گول وادی ہے جیسے کوئی لپٹی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ عکرمہ نے اسے طوی پڑھا ہے باقی قراء نے طُوًى پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: طوی شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ طا کو کسرہ اور ضمہ دیا جاتا ہے۔ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جنہوں نے اسے منصرف بنایا ہے انہوں نے اسے وادی کا اسم اور اسے نکرہ بنایا ہے اور جنہوں نے اسے غیر منصرف بنایا ہے انہوں نے اسے بلدہ اور بقعہ بنایا ہے اور اسے معرفہ بنایا ہے۔ بعض نے فرمایا: طُوی، طِویً کی مثل ہے۔ لپٹی ہوئی چیز، انہوں نے الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ کے بارے میں کہا: وہ دو مرتبہ پاک کی گئی۔ حسن نے کہا: اس میں دو مرتبہ برکت اور تقدیس رکھی گئی۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کو طوی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وادی کو رات کے وقت طے کیا تھا۔ یہ مصدر ہے اس میں وہ عامل ہے جو اس کے لفظ سے نہیں گویا یوں کہا: إنك بالوادی المقدس الذی طویتہ طوی، یعنی آپ نے اپنے چلنے کے ساتھ اس کو طے کیا۔ حسن نے کہا اس کو دو مرتبہ پاک کیا گیا۔ یہ طویتہ طوی سے مصدر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ یعنی میں نے تجھے رسالت کے لیے چن لیا۔ اہل مدینہ ابو عمرو، عاصم اور کسائی نے وأنا اخترتك پڑھا ہے اور حمزہ نے انا اخترناك پڑھا ہے، دونوں کا معنی ایک ہے لیکن یہاں أنا اخترتك دو اعتبار سے اولیٰ ہے ایک یہ کہ خط کے اعتبار سے یہ مناسب ہے، دوسرا یہ کہ نسق کلام کے اعتبار سے یہ اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، اس نسق کے اعتبار سے متکلم کا صیغہ آئے گا؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اس میں ایک مسئلہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): مجھے میرے والد صاحب نے بتایا فرمایا میں نے ابو الفضل جوہری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا: فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى تو آپ پتھر پر ٹھہر گئے اور ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگائی اور اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور اپنی ٹھوڑی اپنے سینے پر رکھی اور ٹھہر کر

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 170
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 39

سننے لگے اور آپ کا لباس اون کا تھا۔

میں کہتا ہوں: حسن استماع واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مدح فرمائی فرمایا: اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ (الزمر: 18)

اور اس وصف کے خلاف کی مذمت کی ہے فرمایا: نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ (بنی اسرائیل: 47)

حضور عقل کے ساتھ کلام کو سننے کے لیے خاموش رہنے والے کی مدد فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ادب سکھانے کے لیے اس کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: وَ اِذَا قُرِیَٔ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ وَ اَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝ (الاعراف) اور یہاں فرمایا: فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی ۝ کیونکہ اس طرح اللہ کی طرف سے سمجھ ملتی ہے۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے فرمایا: سننے کے آداب میں سے یہ ہے کہ اعضاء میں سکون ہو آنکھیں جھکی ہوئی ہوں اور توجہ سے سننا اور عقل کا حاضر ہونا اور عمل کرنے کا عزم کرنا۔ وہ استماع جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے جوارح کو روکے کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہو کہ اس کا دل اس سے غافل ہو جائے جسے وہ سن رہا ہے اور اپنی نگاہ کو جھکا کر رکھے اور دل کو کسی نظر آنے والی چیز سے غافل نہ کرے اور اپنے عمل کو حاضر رکھے اور جو سن رہا ہے اس کے سوا کسی چیز کو دل میں نہ لائے۔ سمجھنے کا عزم کرے اور جو سمجھے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کرے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: علم کا آغاز غور سے سننا ہے، پھر سمجھنا پھر یاد کرنا ہے، پھر عمل کرنا اور پھر آگے پھیلانا ہے جب انسان کتاب اللہ اور نبی کریم ﷺ کی سنت کو سچی نیت سے اس طرح سنتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور اس کے لیے اس کے دل میں نور پیدا کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ۝ اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لِذِکۡرِیۡ کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ تو مجھے نماز میں ذکر کرے یا مراد ہے کہ میں اس نماز کی وجہ سے علیین میں مدح کے ساتھ تیرا ذکر کروں۔ اس بنا پر مصدر فاعل یا مفعول کی طرف مضاف ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے توحید کے بعد نماز پر استقامت اختیار کر۔ یہ نماز کی قدر کی عظمت پر تنبیہ ہے کیونکہ نماز اللہ کی بارگاہ میں تضرع ہے اور اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس بنا پر نماز ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ذکر کا نام دیا ہے جب تو بھول جائے پھر تجھے یاد آئے تو نماز پڑھ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: فلیصلها اذا ذکرها تو نماز پڑھ جب تجھے یاد آئے یعنی بھولنے کی وجہ سے نماز کو ساقط نہ کر۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے نماز یاد آئے تو اسے ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ'' ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے حجاج بن حجاج کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ پہلا حجاج وہ ہے جس سے یزید بن زریع نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں قتادہ نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک ﷺ سے اس شخص کے بارے

پوچھا گیا جو نماز کے وقت میں سویا رہا اور اس سے غافل ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس نماز کو ادا کرے جب اسے یاد آئے'' (1)۔ ابراہیم بن طہمان نے حجاج سے روایت کرنے میں اس کی متابعت کی ہے، اسی طرح ہمام بن یحییٰ نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا فرمایا: جو نماز بھول جائے تو اس کا وقت وہ ہے جب اسے یاد آئے'' (2)۔ پس فلیصلھا إذا ذکرھا کا قول دلیل ہے کہ سو جانے والے اور غافل پر قضا واجب ہے خواہ نمازیں (جو قضاء ہوئیں) زیادہ ہوں یا کم ہوں۔ یہ عام علماء کا مذہب ہے اور ایک شاذ قول غیر معتد بہ اس کے مخالف بھی حکایت کیا گیا ہے کیونکہ یہ حدیث کی نص کے مخالف ہے وہ یہ ہے کہ بعض علماء سے مروی ہے کہ پانچ نمازوں سے زائد ہو جائیں تو قضاء لازم نہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور اوقات معینہ پر نص موجود ہے فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل: 78) اس کے علاوہ بھی نصوص موجود ہیں اور جس نے دن کی نماز کو رات کے وقت ادا کیا یا رات کی نماز کو دن کے وقت ادا کیا تو اس کا فعل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہ ہوگا اور نہ اسے اس فعل پر ثواب ملے گا بلکہ وہ گنہگار ہوگا۔ اس تعریف پر جو نماز فوت ہو جائے اس کی قضا واجب نہیں اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہ ہوتا: من نام عن صلاۃ أو نسیھا فلیصلھا اذا ذکرھا تو کوئی شخص اپنی اس نماز سے نفع حاصل کرنے والا نہ ہوتا جو غیر وقت میں ادا کی جاتی اس اعتبار سے وہ قضا ہوگی ادا نہ ہوگی کیونکہ قضا نئے حکم کے ساتھ ہے نہ کہ پہلے امر کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کر دیا اس کے متعلق جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ اس پر قضا کرنا واجب ہے اگرچہ وہ گنہگار ہوگا مگر داؤد کا قول اس کے مخالف ہے۔ ابو عبدالرحمن اشعری شافعی نے داؤد کی موافقت کی ہے اس سے یہ قول ابن القصار نے حکایت کیا ہے اور جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے، بھولنے والے اور سونے والے کے درمیان فرق گناہ کا نہ ہونا ہے جان بوجھ کر ترک کرنے والا گنہگار ہوگا لیکن تمام قضا کریں گے۔ اور جمہور علماء کے قول کی حجت یہ ارشاد ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ: 43) اس میں کوئی تفریق نہیں وہ وقت میں ہو یا وقت کے بعد ہو یہ امر کا صیغہ ہے جو وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس طرح سونے والے اور بھولنے والے کی قضا کا امر ثابت ہے لیکن وہ گنہگار ہوگا پس جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے لیے نماز کا قضا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من نام عن صلاۃ أو نسیھا اس میں نسیان بمعنی ترک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ (التوبہ: 67) نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ (الحشر: 19)

خواہ یہ نسیان ذہول سے ہو یا بغیر ذہول کے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بھولنے سے پاک ہے اس لیے اس کا معنی ہے اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (البقرہ: 106) اس آیت میں بھی ننسھا کا معنی نترکھا ہے اسی طرح ذکر نسیان اور اس کے علاوہ صورت کے بعد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی، جس نے مجھے اپنے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، قضاء الفائتہ، جلد 1، صفحہ 241۔ ابن ماجہ، باب من نام عن الصلاۃ او نسیھا، حدیث نمبر 686، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، وقت الصلوٰۃ المنسیۃ، جلد 1، صفحہ 423

دل میں یاد کیا میں نے اسے یاد کیا۔ اللہ تعالیٰ نسیان سے پاک ہے اس لیے اس کا یاد کرنا نسیان کے بعد نہیں ہوتا اس کا معنی ہے علمت، پس اذا ذکرھا کا معنی ہوگا جب وہ اسے جان لے۔ نیز انسان کا وہ قرض جو وقت کے متعلق ہوتا ہے پھر وہ وقت آجاتا ہے تو اس کے وجوب کے بعد اس کی قضا ساقط نہیں ہوتی (جب وہ ادا نہ کرلے) اور ابرا (بری کرنا) ہی ان کو ساقط کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے قرض میں بھی یہی ہوگا کہ ان میں ابرا صحیح نہیں ہوگا اور ان کی قضا ساقط نہ ہوگی مگر اس کے اذن سے۔ نیز جہاں تک ہمارا تعلق ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا ایک روزہ ترک کردے اور جان بوجھ کر بغیر عذر کے ترک کردے تو اس کی قضا واجب ہے، اسی طرح نماز کی قضا بھی واجب ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام مالک سے مروی ہے: جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کبھی اسے قضا نہیں کر سکے گا۔ یہ اشارہ ہے کہ گذشتہ نماز کا اعادہ نہیں کر سکے گا یا یہ بطور سختی کلام فرمائی ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے جان بوجھ کر رمضان کا روزہ افطار کیا پوری زندگی کے روزے بھی اس کا کفارہ نہ ہوں گے اگرچہ وہ روزہ رکھ بھی لے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادا کے قائم مقام قضا کے ذریعے حکم کو پورا کرنا اور توبہ بھی کرنا ضروری ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے گا کرے گا۔ ابوالمطوس نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس نے ایک دن رمضان کا روزہ جان بوجھ کر ترک کیا پوری زندگی کے روزے اس کو پورا نہیں کریں گے، اگرچہ وہ اسے رکھ بھی لے''(1)۔ یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس کا معنی تغلیظ ہو (اگر یہ حدیث صحیح ہو) یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابوداؤد نے اس کو تخریج کیا ہے۔ احادیث صحیح میں کفارہ کا ذکر موجود ہے اور بعض میں اس دن کی قضا کا ذکر ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: من نام عن صلاۃ أو نسیھا (2)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ (3) کے عموم کی تخصیص کرتا ہے اور یہاں رفع سے مراد گناہ کا اٹھنا ہے نہ کہ فرض کا اٹھنا یہ اس قول سے نہیں ہے۔ عن الصبی حتی یحتلم بچے مکلف نہیں ہے حتی کہ بالغ ہوجائے۔ اگرچہ یہ دونوں حکم ایک حدیث میں آئے ہیں پس اس اصل پر آگاہی حاصل کر۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس معنی میں علماء کا اختلاف ہے جسے فوت شدہ نماز یاد آئے جبکہ وہ نماز کے آخری وقت میں ہو یا وہ نماز میں ہو۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جسے نماز یاد آئے جبکہ دوسری نماز کا وقت ہو چکا ہو تو پہلے وہ نماز پڑھے جو وہ بھول گیا تھا۔ قضا شدہ نمازیں پانچ ہوں یا اس سے کم ہوں اگرچہ اس نماز کا وقت فوت بھی ہوجائے اور اگر پانچ نمازوں سے زیادہ ہوں تو پہلے وقتی نماز کو پڑھے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری اور لیث کا مذہب بھی یہی ہے مگر امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں: ہمارے نزدیک ایک دن اور ایک رات کی نمازوں میں ترتیب واجب ہے جب فوت شدہ نماز اور وقتی نماز کے لیے وقت میں

---

1۔ ترمذی، باب ماجاء فی الافطار متعمد، حدیث نمبر 655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، الحث علی ذکر اللہ تعالیٰ، جلد 2 صفحہ 341

3۔ ابوداؤد، باب فی المجنون یسرق او یصیبہ الاحد، حدیث نمبر 3822، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسعت ہو اور اگر وقتی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے وقتی نماز ادا کرے اور اگر پانچ نمازوں سے زیادہ نمازیں قضا ہو جائیں تو ان کے نزدیک ترتیب واجب نہیں ہوتی۔ ثوری سے ترتیب کا وجوب مروی ہے انہوں نے قلیل اور کثیر میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یہ امام شافعی کے مذہب کا حاصل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: فوت شدہ کو پہلے پڑھے جب تک وقتی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو اگر وہ ایسا نہ کرے اور وقتی نماز پہلے پڑھ لے تو بھی انہوں نے جائز قرار دیا ہے۔ اثرم نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک ساٹھ سال کی نمازوں اور اس سے زائد نمازوں میں بھی ترتیب واجب ہے انہوں نے فرمایا: کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ نماز پڑھے جبکہ اسے اس سے پہلے والی فوت شدہ نماز یاد ہو کیونکہ یہ نماز اس پر فاسد ہوگی۔ دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنی فوت شدہ نماز کو یاد کر لے جبکہ وہ نماز میں ہو تو اس سے آغاز کرے جس میں وہ مشغول تھا جب اس سے فارغ ہو جائے تو وہ نماز پڑھے جو بھول گیا تھا''۔ اس کی سند میں عمر بن ابی عمر مجہول ہے۔ میں کہتا ہوں: اگر یہ صحیح ہوتی تو امام شافعی کے قول کے لیے حجت ہوتی کہ وقتی نماز کو پہلے پڑھے۔ صحیح وہ ہے جو اہل صحیح نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنگ خندق کے دن کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی حتی کہ سورج غرب ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے بھی نماز عصر نہیں پڑھی ہے''۔ پھر ہم بطحان کے مقام پر اُترے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور ہم نے بھی وضو کیا۔ پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے غروب ہونے کے بعد عصر کی نماز پڑھی پھر مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ نص ہے کہ پہلے فوت شدہ نماز پڑھے پھر وقتی نماز پڑھے، خصوصاً مغرب کی نماز اس کا وقت تنگ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک مشہور مذہب میں اس کا وقت ممتد نہیں ہوتا۔ امام شافعی کے نزدیک بھی یہی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی نے ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ مشرکین نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خندق کے روز چار نمازوں سے مشغول کیا حتی کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا۔ حضرت بلال اٹھے اور آذان دی پھر اقامت کہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عصر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور مغرب کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عشاء کی نماز پڑھی (1)۔ اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ جس کی بہت سی نمازیں فوت ہو جائیں وہ اسی ترتیب سے قضا کرے جس طرح فوت ہوئی تھیں جب اسی ایک وقت میں یاد آ جائیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے جب فوت شدہ نماز اس وقت یاد آ جائے جبکہ وقتی نماز کا وقت تنگ ہو۔ علماء کے تین اقوال ہیں۔ (۱) پہلے فوت شدہ نماز ادا کرے اگرچہ وقتی نماز کا وقت نکل بھی جائے، یہ امام مالک، لیث اور زہری وغیرہم کا قول ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ (۲) پہلے وقتی نماز پڑھے یہ حسن، شافعی اور اصحاب الحدیث کے فقہاء، محاسبی، ابن وہب مالکی کا قول ہے۔ (۳) اسے اختیار ہے جو چاہے پہلے پڑھ لے؛ یہ اشہب کا قول ہے۔ پہلی وجہ نماز کی کثرت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زیادہ نمازیں ہوں تو وقتی نماز کو پہلے پڑھے؛ یہ قاضی

1۔ ترمذی، کتاب الصلاۃ باب ما جاء فی الرجل تفوتہ الصلاۃ، حدیث نمبر 164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عیاض کا قول ہے۔ اور تھوڑی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک سے مروی ہے کہ وہ پانچ اور اس سے کم ہیں۔ بعض نے فرمایا: چار اور اس سے کم ہیں۔ یہ حضرت جابر کی حدیث کی وجہ سے ہے اور چھ کے کثیر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ رہا وہ شخص جس کو نماز یاد آ جائے جبکہ وہ نماز میں ہو اگر وہ امام کے پیچھے ہو تو جو ترتیب کے وجوب کا قول کرتے ہیں اور جو وجوب ترتیب کا قول نہیں کرتے سب کے نزدیک یہ ہے کہ وہ امام کے ساتھ نماز جاری رکھے حتی کہ اپنی نماز مکمل کر لے۔ اس میں اصل وہ حدیث ہے جو امام مالک اور دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے فرمایا: جو تم میں سے کوئی نماز بھول جائے اور اسے یاد نہ آئے مگر جب وہ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ امام کے ساتھ نماز پڑھے جب اس نماز سے فارغ ہو تو وہ نماز پڑھے جو وہ بھول چکا تھا پھر دوبارہ وہ نماز پڑھے جو اس نے امام کے ساتھ پڑھی تھی۔ دارقطنی کا لفظ ہے۔ موسیٰ بن ہارون نے کہا ہمیں ابو ابراہیم ترجمانی نے بیان کیا فرمایا ہمیں سعید نے یہ حدیث بیان کی اور انہوں نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا اور مرفوع روایت میں ان کا وہم ہے۔ اگر انہوں نے اس کے رفع سے رجوع کر لیا ہے تو اس نے صواب کی موافقت کی ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل نے کہا: پہلے فوت شدہ نماز پڑھے پھر وہ نماز پڑھے جو امام کے ساتھ پڑھی مگر یہ کہ ان دونوں نمازوں کے درمیان پانچ نمازوں سے زیادہ ہوں جیسا کہ کوفیوں سے پہلے روایت کیا گیا ہے۔ یہ امام مالک کے مدنی اصحاب کا مذہب ہے۔ خرقی نے امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے فرمایا: جسے فوت شدہ نماز یاد آئے جبکہ وہ دوسری نماز میں ہو تو وہ اسے مکمل کر لے اور پھر یاد آنے والی نماز قضا کر لے اور پھر اس کا اعادہ کرے جس میں پہلے تھا جبکہ وقت میں وسعت ہو اگر اسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو اور وہ نماز میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ اس کا اعادہ نہیں کرے گا تو اس کی وہ نماز جائز ہو جائے گی تو پھر وہ قضا نماز ادا کرے۔ امام مالک نے فرمایا: جس کو نماز یاد آئے جبکہ وہ نماز میں ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکا ہو تو دو رکعتوں پر سلام پھیر دے۔ اگر وہ امام ہو تو اس کی اور مقتدیوں کی نماز باطل ہو جائے گی؛ یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے لیکن امام مالک کے اصحاب میں سے اہل نظر کا نظریہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ ان کا قول اس شخص کے بارے میں جسے نماز میں فوت شدہ نماز یاد آئی جبکہ وہ ایک رکعت پڑھ چکا تھا تو اس کے ساتھ دوسری رکعت ملا لے اور سلام پھیر دے وہ نماز نفل ہو جائے گی فاسد نہ ہو گی۔ اگر وہ نماز ٹوٹ جاتی اور باطل ہو جاتی تو اسے دوسری رکعت ملانے کا حکم نہ دیا جاتا جیسا کہ اگر ایک رکعت میں حدث لاحق ہو جائے تو دوسری رکعت اس کے ساتھ نہیں ملائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام مسلم نے ابو قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا حدیث المیضاۃ طویل ذکر کی اس میں فرمایا: أما لکم فی أسوۃ، کیا تمہارے لیے میری ذات میں اسوہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا: ''سونے کی صورت میں تفریط (کوتاہی) نہیں ہے کوتاہی تو اس پر ہے جس نے نماز نہ پڑھی حتی کہ دوسری نماز کا وقت آ گیا جس نے ایسا کیا وہ نماز پڑھے جب بیدار ہو جب دوسرا دن ہو جائے تو اس کو اس کے وقت میں ادا کرے''۔ اس حدیث کو دارقطنی نے ذکر کیا ہے اسی طرح مسلم کے الفاظ کے برابر ہے۔ پس اس کا ظاہر دو مرتبہ اعادہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی یاد کے وقت اور آنے والے وقت میں اس کی مثل نماز کی ادائیگی کے وقت۔ اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ابوداؤد نے عمران بن حصین کی حدیث سے

نقل کی ہے اور انہوں نے واقعہ ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں ہے: ''تم میں سے جو دوسرے دن صبح کی نماز کو پائے تو وہ اس کے ساتھ اس کی مثل ادا کرے'' (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے ایک مرتبہ اعادہ کیا جائے گا کیونکہ دارقطنی نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک غزوہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چلے جب سحری کا وقت تھا تو ہم نے پڑاؤ کیا ہم بیدار نہ ہوئے حتی کہ سورج کی دھوپ نے ہمیں بیدار کیا ہم میں ایک شخص گھبرا کر اٹھا جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو ہمیں وہاں سے چلنے کا حکم دیا پھر ہم چلتے رہے حتی کہ سورج بلند ہو گیا لوگوں نے قضاء حاجت کی پھر حضرت بلال کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اذان دینے کا حکم دیا انہوں نے اذان دی پھر ہم نے دو رکعتیں ادا کیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال کو اقامت کہنے کا حکم دیا پھر ہم نے صبح کی نماز پڑھی ہم نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! کیا ہم کل ان دو رکعتوں کو ان کے وقت میں ادا نہیں کریں گے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ تمہیں ربا (سود) سے منع کرتا ہے اور تم سے وہ (سود) قبول کرے گا۔ خطابی نے کہا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے وجوبی طور پر یہ کہا ہو مناسب یہی ہے کہ یہ امر استحباب کے لیے ہوتا کہ قضا میں وقت کی فضیلت کا خیال رکھا جائے۔ صحیح یہ ہے کہ اس پر عمل متروک ہے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ تمہیں سود سے منع کرتا ہے تم سے وہ قبول کرے گا'' (2)۔ صحاح کے طرق جو عمران بن حصین کی حدیث کے ہیں ان میں اس زیادتی میں سے کچھ بھی نہیں ہے مگر جو ابوقتادہ کی حدیث سے ذکر کیا گیا ہے وہ محتمل ہے جیسا کہ ہم نے اس کو بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے (احکام القرآن) میں ذکر کیا ہے کہ سلف میں سے ایسے بھی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: من نسی صلاۃ فلیصلها إذا ذکرها لا کفارۃ لها إلا ذالك، کی مخالفت کی ہے انہوں نے کہا: اس کے وقت کی مثل تک صبر کرے پھر نماز پڑھے اور جب صبح کی نماز فوت ہو جائے تو اسے دوسرے دن صبح ادا کرے، یہ شاذ قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝ یہ مشکل آیت ہے۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے اکاد اخفیہا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے ظاہر کرنا۔ لِتُجْزٰى جزا کے لیے اظہار کرنا۔ اس کو ابوعبید نے کسائی سے روایت کیا ہے انہوں نے محمد بن سہل سے انہوں نے ورقاء بن ایاس سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس حدیث کا اس طریق کے علاوہ کوئی طریق نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں روایت کیا ہے: حدثنی ابی حدثنا محمد بن الجهم الفراء حدثنا الکسائی، ح حدثنا عبدالله بن ناجیه حدثنا یوسف حدثنا یحییٰ الحمانی حدثنا محمد بن سهل، نحاس نے کہا: اس سند سے عمدہ وہ ہے جو یحییٰ القطان نے ثوری سے انہوں نے سائب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: أكاد أُخفیها ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن جبیر کی قرأت، أخفیها ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مذکورہ سند کے ساتھ ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: فراء نے

1۔ ابوداؤد، باب فی من نام عن الصلاۃ او نسیها، حدیث نمبر 372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم السنن جلد 1، صفحہ 139

کہا اس کا معنی ہے اظہرھا یہ خفیت الشیٔ أخفیه سے مشتق ہے جب تو اس کو ظاہر کر دے۔ فراء نے بطور دلیل امرء القیس کا یہ شعر پڑھا ہے:

فإن تدفنوا الدّاءَ لانَخفِهِ وإنْ تَبعَثوا الحربَ لانَقعُد

شاعر کی لانخفه سے مراد لانظهره (ہم ظاہر نہیں کریں گے) ہے بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اخفیھا ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے اس کا معنی ہے اظہرھا کیونکہ کہا جاتا ہے: خفیت الشی و اخفیته جب اسے ظاہر کر دے۔ فاخفیته اضداد کے حروف میں سے ہے پوشیدہ کرنا اور ظاہر کرنا دونوں معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: خفیت و أخفیت دونوں کا ایک معنی ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے یہ ابوالخطاب سے اس نے روایت کیا ہے یہ اہل لغت کے رؤساء میں سے ایک تھا اس کے صدق میں شک نہیں کیا جاتا۔ سیبویہ نے اس سے روایت کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

وإن تكتموا الداءَ لانُخفِهِ وإنْ تَبعثوا الحربَ لانَقعُد

اسی طرح ابوعبیدہ نے ابوالخطاب سے نون کے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امرءالقیس نے کہا:

خَفَاهنّ من أنفاقِهِنّ كأنّما خفاهنّ وَدْقٌ عن عَشِيّ مُجَلِّبِ

خفاهنّ کا معنی اظهرهن ہے۔ عشی مجلب کی جگہ من سحاب مرکب بھی مروی ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: ایک دوسری تفسیر بھی کی گئی ہے۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ، اکاد پر کلام ختم ہوئی اور اس کے بعد کلام مضمر ہے أکاد أتی بها اور ابتدا اُخۡفِيۡهَا لِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍ سے ہے ضابی برجمی نے کہا:

هَمَمْتُ ولم أفعلْ وكِدتُ وليتَنِي تَركتُ على عثمانَ تَبكِي حَلائِلُهْ

اس سے مراد وکدت أفعل ہے کدت کے ساتھ فعل مضمر ہے جیسے قرآن میں اس کے ساتھ فعل مضمر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ نحاس نے اختیار کیا ہے اور اس سے پہلے قول کو صحیح نہیں سمجھا اس نے کہا: کہا جاتا ہے: خفی الشیٔ یخفیه جب وہ ظاہر کرے۔ اور اس نے یہ بھی حکایت کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أخفاه جب وہ کسی چیز کو ظاہر کرے اور یہ معروف نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا جب اس پر اخفیھا کا معنی بیان کرنا مشکل ہوا تو اس نے اس قول کی طرف عدول کیا اور کہا: اس کا معنی وأخفیها کے معنی کی طرح ہے۔ نحاس نے کہا: یہ اظهرها کے معنی پر نہیں ہے، خصوصاً اخفیھا شاذ قرأت ہے پس قرأت صحیحہ کو شاذ قرأت کی طرف کیسے پھیرا جاتا ہے؟ مضمر کے معانی اولیٰ ہیں۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی: ان الساعة آتیه اکاد آتی بها، آتیه پر آتی بها دلالت کرتا ہے پھر فرمایا: اخفیها سے نئی کلام ہے۔ یہ معنی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کو مخفی رکھا اور الساعة جس میں انسان مرتا ہے اس کو بھی مخفی رکھا تاکہ انسان اچھے اعمال کرتا رہے اس سے اس معاملہ کو مخفی رکھا تاکہ وہ توبہ کو مؤخر نہ کرے۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر لتجزی میں جو لام ہے وہ أخفیها کے متعلق ہوگا۔ ابوعلی نے کہا: یہ سلب کے باب سے

ہے۔ اضداد کے باب سے نہیں ہے۔ اخفیھا کا معنی ہے اس سے خفا کو زائل کیا اور وہ اس کا ڈھانپنا ہے، جیسے خفاء الأخفیه اس سے مراد چادریں ہیں اور اس کا واحد خِفاء خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جس کو اوپر لپیٹا جائے۔ (چادر) اور جب اس سے پردہ زائل کردیا تو وہ ظاہر ہوگئی یہ عربوں کے اس قول سے ہے: أشکیته میں نے اس کی تکلیف دور کی۔ أعدیته میں نے اس کی جانب سے مدد طلب کرنے کو قبول کیا اور اسے اس کے اعادہ کا موقع نہ دیا۔ ابو حاتم نے اخفش سے حکایت کیا ہے کہ کاد زائدہ مؤکدہ ہے۔ اور فرمایا: اس کی مثال اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا (النور: 40) ہے، کیونکہ وہ ظلمات جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے ان میں سے بعض ناظر اور منظور الیہ کے درمیان حائل ہوجاتی ہیں؛ یہ معنی ابن جبیر سے مروی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: إن الساعة آتیه أخفیها کل نفس بما تسعیٰ، شاعر نے کہا:

سریعٌ إلی الهیجاءِ شاكٍ سِلاحُهٗ فما إنْ یَكادُ قِرْنُهٗ یَتَنَفَّسُ

شاعر نے فما یتنفّس کا معنی مراد لیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

وألاَّ ألوم النفسَ فیما أصابنی وألَّا أكاد بالذی نِلتُ أنْجَحُ

اس کا معنی ہے ألا أنجح بالذی نلته، پس أکاد کلام کی توکید کے لیے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: أكاد أخفیها کا معنی ہے میں اس کو قریب کروں گا، کیونکہ جب تو کہتا ہے: کاد زیدٌ یقوم یہ دونوں صورتوں میں جائز ہے، خواہ زید کھڑا ہو یا کھڑا نہ ہو۔ اس پر دلیل یہ ہے اس نے اس کو مخفی کیا اس جواب پر اس کے علاوہ کی دلالت کی وجہ سے۔ لغوی علماء نے کہا: كدت أفعل کا معنی عربوں کے نزدیک یہ ہے کہ میں فعل کے قریب تھا اور میں نے وہ فعل کیا نہیں اور ماكدت افعل کا معنی ہے میں نے تاخیر کے بعد وہ کام کیا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ۠ (البقرہ) اس کا مطلب ہے انہوں نے تاخیر کے بعد یہ کام کیا کیونکہ ان پر گائے کا پانا مشکل ہوگیا تھا۔ کبھی ماكدت أفعل کا معنی ہوتا ہے مافعلت ولاقاربت جب کلام کو أكاد کے ساتھ موکد کیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: أكاد أخفیها کا معنی ہے میں اس کو چھپانا چاہتا ہوں۔ انباری نے کہا: اس کی دلیل یہ شعر ہے:

كادتْ وكِدتُ وتِلكَ خیرُ إرادةٍ لوعَادَ من لَهْوِ الصَّبابة مامَضَیٰ

اس کا معنی ہے أرادت وأردت، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین نے کہا جیسا کہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی ہے اکاد اخفیها من نفسی اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں تھا اور حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح تھا: أكاد اخفیها من نفسی فكیف یعلمها مخلوق۔ اور بعض قراءتوں میں ہے فكیف أظهرها لكم یہ اس پر محمول ہے جو عربوں کی عادت ہے کہ جب کوئی کسی چیز کو چھپانے میں مبالغہ کرے تو کہتا ہے: كدت أخفیه من نفسی اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے؛ یہ معنی قطرب وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

أیامَ تَصحبنی هند وأخبرُها ما أكتم النفسَ من حَاجی وأسْرارِی

پس وہ کیسے اسے اس کی خبر دیتا ہے جو اس نے اپنے نفس سے چھپایا ہوا ہے۔

اسی باب سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رجل تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فأخفاها حتی لاتعلم شماله ماتنفق یمینه، وہ

شخص جو صدقہ کرے اور اتنا خفیہ طریقہ سے کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو جو اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے أكاد أخفيها من نفسي، (1) اس محذوف پر کلام میں کوئی دلیل نہیں ہے اور ایسا محذوف جس پر دلیل نہ ہو وہ مطروح ہے اور جنہوں نے یہ معنی بیان کیا ہے انہوں نے حضرت ابی بن کعب کے مصحف کی عبارت کی وجہ سے یہ کہا اس میں ہے أكاد أخفيها من نفسي اور بعض مصاحف میں ہے أكاد أُخفيها من نفسي فكيف أظهركم عليها۔

میں کہتا ہوں بعض علماء نے کہا: جنہوں نے أكاد أخفيها من نفسي کہا ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اخفا میری طرف سے تھا کسی غیر کی طرف سے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے أكاد اخفيها من نفسي اور طلحہ بن عمرو نے عطا سے یہ روایت کیا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کیا ہے فرمایا: میں اس پر کسی کو ظاہر نہیں کروں گا۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا: قد أخفاها یہ اس بنا پر ہے کہ کاد زائدہ ہے یعنی قیامت آنے والی ہے جس کو میں نے پوشیدہ رکھا ہے اور پوشیدہ رکھنے کا فائدہ تخویف (ڈرانا) اور تہویل (ہولناکی بیان کرنا) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لِتُجْزٰی کا تعلق وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ سے ہے۔ پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے؛ یعنی أقم الصلاة لتذكرني۔

لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ﴿۱۵﴾، یعنی بسعيها اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا، والله اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: لتجزی، آتية کے متعلق ہے یعنی ان الساعة آتية لتجزی، فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا یعنی اس پر ایمان لانے سے اور اس کی تصدیق کرنے سے تجھے نہ پھیرے۔ مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی، فتردی کا معنی فتهلك ہے یہ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰی ﴿۱۷﴾ قَالَ هِیَ عَصَایَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَ لِیَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴿۱۸﴾

"اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! عرض کی: (میرے رب) یہ میرا عصا ہے، میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لیے اور میرے لیے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ، بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰی ﴿۱۳﴾ (غور سے سنو جو وحی کیا گیا ہے) اور نبی کی ذات میں ایک معجزہ کا ہونا ضروری ہے جس کے ساتھ وہ اپنی نبوت کی صحت کو جان لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا میں اور اپنی ذات میں معجزہ کی صورت دکھائی۔ یہ بھی جائز ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے درخت میں معجزہ دکھایا تھا وہ ان کی ذات کے لیے کافی ہو پھر ہاتھ اور عصا زیادہ تاکید کے لیے ہوں اور بطور دلیل اپنی قوم کو یہ پیش کیے ہوں۔ مَا تِلْكَ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 9665

میں جو ما ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا: یہ اسم ناقص ہے بیمینک کے ساتھ ملایا گیا ہے، یعنی ما التی بیمینك؛ فراء نے یہی کہا ہے سوال کا مقصود امر کا ثبوت ہے تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہیں یہ میرا عصا ہے تا کہ حجت اعتراف کے بعد ان پر ثابت ہو جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ازل سے جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابن جوہری نے کہا: بعض آثار میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا کہ انہوں نے عصا کی نسبت اپنی طرف کر دی تو انہیں کہا گیا اپنا عصا ڈالو تا کہ اس سے تم تعجب دیکھ لو اور تم جان لو کہ تمہاری اس پر ملکیت نہیں ہے اور تمہاری طرف منسوب نہیں ہے۔ ابن ابی اسحاق نے عصیّ پڑھا ہے۔ یہ لغت ہذیل کی بنا پر ہے اس کی مثل یا بشریٰ اور محیٰ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ حسن نے عصای التقاء ساکنین کی وجہ سے یا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل حمزہ کی قرأت ہے۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيِّ (ابراہیم: 22) ابن ابی اسحاق نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ایک سوال کے بہت سے جواب دیے جا سکتے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا: وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى۞ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چار چیزیں ذکر کیں۔ عصا کی نسبت اپنی طرف کی، حق تو یہ تھا کہ صرف عصا کہتے۔ التوکو (سہارا لینا) الھش (پتے جھاڑنا) اور مارب اخریٰ (دوسرے فائدے) کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے بڑے بڑے اور عمدہ فوائد کا ذکر فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سمندر کے پانی کے بارے پوچھا گیا فرمایا: ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے'' (1)۔ ایک عورت نے چھوٹے بچے کے متعلق پوچھا جب وہ آپ کے پاس لے آئی تھی اس نے پوچھا (حضور!) کیا اس پر حج ہے؟ فرمایا ''ہاں اور تیرے لیے اجر ہے''۔ اس کی مثالیں حدیث میں کثرت سے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا یعنی چلنے اور ٹھہرنے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں۔ اسی سے الاتکاء ہے۔ وَ اَهُشُّ بِهَا اور أهِش بھی ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے یہ نخعی کی قرأت ہے یعنی میں اس کے ساتھ پتے جھاڑتا ہوں یعنی درختوں کی ٹہنیوں کو مارتا ہوں تا کہ اس کے پتے گریں تا کہ میری بکریوں پر ان کا کھانا آسان ہو جائے۔ راجز نے کہا:

أَهُشُّ بالعَصَا على أغْنَامِي من ناعِمِ الأَرَاكِ والبَشَامِ

کہا جاتا ہے: هَشّ على غنمه يَهُشّ۔ ھاء کے ضمہ کے ساتھ۔ هَشّ إلى الرجل يَهَشُّ، ھاء کے فتحہ کے ساتھ۔ اسی طرح هَشّ يَهَشُّ وهَشِشْتُ انا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: هَشِشْتُ يوماً فقبلت وأنا صائم (2)۔ شمر نے کہا: اس کا معنی ہے میں خوش ہوا اور شوق پورا کیا۔ فرمایا: هاش بمعنی هش بھی جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

فكبّرَ للرُّؤيا وهَاشَ فؤادُهُ وبشَّرَ نفسًا كان قبل يَلُومُها

یعنی اس کا دل خوش ہوا۔ هش کا لغوی معنی رخاوۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل هشّ وزوج هشّ۔ عکرمہ نے اسے أهسُّ پڑھا ہے، یعنی سین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان دونوں لغتوں کا ایک معنی ہے۔ بعض نے فرمایا: ان دونوں کا

---

1۔ موطا امام مالک، الطهور للوضوء کتاب الطهارة
2۔ ابوداؤد، باب القبلة لصائم، حدیث نمبر 2037

معنی مختلف ہے۔ الھش کا معنی درختوں کے پتے جھاڑنا ہے اور الھس کا معنی بکریوں کو جھڑکنا ہے، یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ عکرمہ سے أھس یعنی سین کے ساتھ مروی ہے، یعنی میں اس کے ساتھ بکریوں کو زجر کرتا ہوں۔ الھس کا معنی بکریوں کو جھڑکنا ہے۔

**مسئلہ نمبر4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۞ ، مَاٰرِبُ سے مراد ضروریات ہیں۔ اس کا واحد مأربة اور مأرَبة اور مأرِبة ہے۔ اور اخریٰ واحد کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ مآرب جماعت کے معنی میں ہے، لیکن تواتع میں واضح طریقہ یہ ہے کہ غیر ذوی العقول کی جمع مفرد ہو اور اس کے لیے بھی کنایہ ہو کیونکہ وہ واحد مونث کے قائم مقام ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف: 180) اور ارشاد ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ (سباء: 10) یہ سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر5**۔ ایک قوم نے عصا کے منافع کو شمار کیا ہے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں فرمایا: جب میں کنویں پر پہنچتا ہوں اور اس کی رسی چھوٹی ہوتی ہے تو اس کو عصا کے ساتھ باندھ دیتا ہوں جب مجھے سورج کی گرمی لگتی ہے تو اسے زمین میں گاڑ دیتا ہوں اور اس پر کوئی چیز ڈال دیتا ہوں جو مجھ پر سایہ کرتی ہے۔ جب مجھے زمین کے کیڑے مکوڑوں کا خوف ہوتا ہے تو میں انہیں عصا کے ساتھ مار دیتا ہوں اور جب چلتا ہوں تو اسے کندھے پر رکھ لیتا ہوں اور اس پر اپنی کمان، ترکش اور جھولا لٹکا دیتا ہوں اور اس کے ذریعے بکریوں سے درندوں کو دور کرتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے میمون بن مہران نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عصا رکھنا انبیاء کی سنت ہے اور مومن کی علامت ہے۔ حسن بصری نے کہا اس میں چھ خصائل ہیں۔ (ا) انبیاء کی سنت ہے۔ صلحاء کی زینت ہے۔ دشمنوں کی خاطر یہ ہتھیار ہے۔ کمزوروں کے لیے مدد کا باعث ہے۔ منافقین کے لیے غم کا باعث ہے اور طاعات میں زیادتی کا باعث ہے۔ کہا جاتا ہے: جب مومن کے ساتھ عصا ہوتا ہے تو اس سے شیطان بھاگتا ہے اور اس سے منافق اور فاجر ڈرتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اس کے قبلہ (کی طرف سترہ) ہوتا ہے اور جب مومن کمزور ہوتا ہے تو یہ اس کے لیے قوت کا سبب ہوتا ہے۔ حجاج ایک اعرابی کو ملا اور پوچھا: تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا عصا ہے، اسے میں نماز کے لیے زمین میں گاڑھتا ہوں، میں اسے اپنے دشمنوں کے لیے تیار رکھتا ہوں، اس کے ساتھ اپنے جانور ہانکتا ہوں، سفر میں اس کے ساتھ قوت حاصل کرتا ہوں، چلتے وقت اس پر سہارا لیتا ہوں تاکہ لمبے قدموں سے چلوں اور اس کے ساتھ نہر عبور کرتا ہو، یہ مجھے ٹھوکر لگنے سے محفوظ رکھتا ہے، اس پر کپڑے ڈالتا ہوں جو مجھے گرمی سے بچاتا ہے اور ٹھنڈک سے بچاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس چیز کو قریب کرتا ہوں جو مجھ سے دور ہوتی ہے۔ یہ میرے دسترخوان کا محمل ہے اور میرے دوسرے سامان کو لٹکانے کا ذریعہ ہے۔ لڑائی کے وقت اس کے ساتھ لڑائی کرتا ہوں، اس کے ساتھ دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہوں، اس کے ساتھ کتوں کے کاٹنے سے بچتا ہوں، ہم عصروں کے مقابلہ کے لیے تیر اور تلوار کا کام دیتا ہے، یہ میرے باپ کا ورثہ ہے اور یہ میں اپنے بیٹے کو ورثہ میں دوں گا، اس کے ساتھ اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی لاتعداد منافع ہیں۔

میں کہتا ہوں: عصا کے منافع کثیر ہیں۔ بعض مقامات میں شرعی اعتبار سے اس کا دخل ہوتا ہے مثلاً صحراء میں قبلہ بنایا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی کھونٹی تھی جس کو گاڑھا جاتا تھا اور آپ ﷺ اس کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ جب عید کے دن آپ نکلتے تھے تو کھونٹی گاڑھنے کا حکم دیتے تھے وہ آپ کے سامنے گاڑھی جاتی تھی اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ صحیح میں ثابت ہے۔ الحربة، العنزة، النيزك، والالة یہ تمام ایک مسمی کھونٹی کے نام ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ایک کھونٹی تھی جس کے ساتھ آپ حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے تھے جب اس کو بوسہ دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ یہ بھی صحیح میں ثابت ہے۔ موطا میں سائب بن یزید سے مروی ہے فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعتیں پڑھائیں قاری سو سو آیات والی سورتیں پڑھتا تھا حتی کہ ہم قیام کے لمبا ہونے کی وجہ سے اپنے عصا پر سہارا لیتے تھے اور ہم مسجد سے صبح کے طلوع ہونے سے کچھ پہلے واپس گھر آتے تھے۔ صحیحین میں ہے: نبی کریم ﷺ کی کھونٹی تھی، اس پر اجماع ہے کہ خطیب تلوار یا عصا پر سہارا لے کر خطبہ دے۔ عصا کا ثبوت اصل کریم اور معدن شریف سے ہے۔ اس کا انکار صرف جاہل ہی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عصا میں بہت سے معجزات جمع فرمائے تھے۔ اس کی وجہ سے معاندین جادوگر بھی آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خطبہ دینے، وعظ و نصیحت کرنے اور نماز کی طوالت کے لیے عصا بنایا تھا۔ حضرت ابن مسعود نے نبی کریم ﷺ کے عصا اور کھونٹی بردار تھے اور وہ چھڑی پکڑ کر خطبہ دیتے تھے۔ پس عصا کے شرف پر یہ فضیلت کافی ہے۔ خلفاء، کبراء، خطباء کا عمل اسی پر ہے۔ فصحاء عرب کی عادت بھی عصا اور کھونٹی پکڑنا اور کلام کرتے وقت اس پر سہارا لینا ہے۔ محافل اور خطبوں میں بھی وہ اس پر سہارا لیتے تھے۔ شعوبیہ فرقہ خطباء عرب پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ کھونٹی پکڑتے ہیں اور اس کے ساتھ معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شعوبیہ فرقہ عربوں سے بغض کرتا ہے اور عجمیوں کو فضیلت دیتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: عطاء بن سائب کھونٹی ہاتھ میں پکڑتے تھے اور اس سے مدد حاصل کرتے تھے۔ امام مالک نے فرمایا: آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ جوانی کی مثل نہیں ہوتا۔ آدمی اٹھتے وقت اس سے قوت حاصل کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں ایک شاعر نے کہا:

قد كنتُ أمشي على رجلين معتمدًا　　فصرتُ أمشي على أخرى من الخشبِ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لوگ عصا لے کر نکلتے ہیں جب بارش آتی ہے اور ان پر سہارا لیتے ہیں حتی کہ نوجوان بھی اپنے اپنے عصا لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اپنے ہم مجلسوں میں عصا لیتے تھے تاکہ اس کے سہارے کھڑے ہوں۔ عصا کے منافع میں سے یہ بھی ہے کہ اصلاح کی خاطر آدمی اپنی بیویوں کو مارتا ہے اس کے ساتھ اپنی اور اپنے گھر والوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ابوجہم وہ تو اپنے کندھے سے عصا رکھتا ہی نہیں ہے''۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے اہل سے لاٹھی نہ اٹھا اللہ کی ذات کے بارے میں انہیں ڈرا'' (1)۔ حضرت عبادہ بن

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 22075

صامت سے امام نسائی نے اس کو روایت کیا ہے۔ اس مفہوم سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے ''تو اپنے عصا کو وہاں لٹکا جہاں سے تیرے گھر والے اسے دیکھ سکیں''(1)۔ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اس کے فوائد میں سے ہے کہ اس دنیا سے منتقل ہونے پر تنبیہ ہے جیسا کہ کسی زاہد شخص سے کہا گیا: تجھے کیا ہے کہ تو عصا پر چلتا ہے جبکہ تو نہ بوڑھا ہے اور نہ مریض ہے؟ اس نے کہا: میں جانتا ہوں میں مسافر ہوں یہ دنیا فانی ہے اور عصا سفر کا آلہ ہے۔ بعض شعراء نے کہا:

حملتُ العصا لا الضّعف أوجب حملَها علیّ ولا أنّی تحنّیتُ من کِبَرْ

ولکنّنی ألزمتُ نفسی حَمْلَها لأعلمها أنّ المقیمَ علی سَفَرْ

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾

''حکم ہوا: ڈال دے اسے زمین پر اے موسیٰ۔ تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (ادھر اُدھر) دوڑنے لگا۔ حکم ہوا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو ہم لوٹا دیں گے اسے اپنی حالت پر۔ اور (حکم ملا) دبا لو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے یہ نکلے گا جب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے تمہیں دیا) ہے، تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے حصول اور اس کی تکلیف برداشت کرنے کی تدریب کر لیں تو عصا ڈالنے کا حکم دیا۔ فَاَلْقٰىهَا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوصاف اور اغراض تبدیل کر ڈالے وہ عصا دو شاخوں والا ہے تو اس کی وہ دو شاخیں اس کا منہ بن گئیں اور وہ سانپ بن گیا جو دوڑ رہا تھا اور پتھروں کو نگل رہا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھا تو تعجب سے دیکھا اور وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (النمل:10) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو۔ یہ اس لیے فرمایا کیونکہ انہوں نے اپنے دل میں بتقاضائے بشریت خوف محسوس کیا۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے جبے کی آستین کے ساتھ پکڑا تو انہیں اس طرح پکڑنے سے منع کیا گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے ہاتھ سے پکڑا تو وہ عصا بن گیا جس طرح کہ پہلے تھا۔ یہ اس کی پہلی حالت تھی۔ اس نشانی کو ان کے لیے اس لیے ظاہر فرمایا تا کہ آپ اس سے خوفزدہ نہ ہوں جب اسے آپ فرعون کے پاس زمین پر ڈالیں۔ کہا جاتا ہے کہ عصا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چلتا تھا اور باتیں کرتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر سامان لٹکاتے تھے اور رات کے وقت اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتی تھی اور جب آپ پانی نکالنا چاہتے تھے تو وہ شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتی تھیں اور جب آپ کو پھل کھانے کا شوق ہوتا تو اسے زمین پر گاڑھ دیتے تھے اور اس پر پھل لگ جاتا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ڈنڈا جنت کے آس

1۔ مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر 17963

کے درخت کا تھا۔ بعض نے فرمایا: اسے جبریل لے کر آئے تھے۔ بعض نے فرمایا: کوئی اور فرشتہ لے کر آیا تھا۔ بعض نے فرمایا: حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا اس گھر سے ایک چھڑی لے لو تو وہ چھڑی آپ کے ہاتھ میں عصا بن گئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا عصا جنت سے آپ کے ساتھ اُترا تھا؛ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ۞ نحاس نے کہا: حیۃ بھی جائز ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت فإذا زید جالس و جالساً۔ حیہ پر وقف ھا کے ساتھ ہے۔ السعی کا معنی جلدی اور پھرتی سے چلنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ عصا بڑا سانپ بن گیا تھا وہ پتھروں اور درختوں کو نگل لیتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو ہر چیز کو نگل رہا ہے تو وہ اس سے خوفزدہ ہوئے اور اس سے دور ہوئے۔ بعض سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے اس لیے خوفزدہ ہوئے کیونکہ آپ کو معلوم تھا جو اس ڈنڈے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے برداشت کیا تھا۔ بعض نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَخَفۡ (ڈرو نہیں) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف ختم ہو گیا اور دل مطمئن ہو گیا۔ آپ نے اس کے منہ میں اپنا ہاتھ داخل کیا اور اس کے جبڑوں سے پکڑ لیا۔ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے سنا ہے۔ تقدیر عبارت الی سیرتہا ہے جیسے اخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ (الاعراف:155) (میں حرف جر کو حذف کیا گیا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ، غیر قرآن میں ضُمّ میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ جائز ہے، کیونکہ التقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ اور فتحہ عمدہ ہے کیونکہ وہ خفیف ہے اور کسرہ اصل کی بنا پر ہے اور ضمہ اتباع کی بنا ہے۔ یدٌ اصل میں یدیٌ فعل کے وزن پر ہے اس پر دلیل جمع ایدٍ ہے اور تصغیر یُدَیّۃ ہے۔ الجناح سے مراد بازو ہے؛ مجاہد نے یہ کہا ہے اور فرمایا: الی بمعنی تحت ہے۔ قطرب نے کہا: جناحك سے مراد الی جیبك ہے۔ اسی سے زاجز کا قول ہے:

أضمُّهُ للصدر والجَناح

بعض نے فرمایا: الی جنبك کو الی جناحك سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ جناح کے محل میں مائل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب الی عندك ہے۔ مقاتل نے کہا: الی بمعنی مع ہے یعنی مع جناحك، تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ یعنی بغیر برص کے چھانے والے نور کے ساتھ نکلے گا، دن اور رات کو سورج اور چاند کی طرح چمکے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یعنی وہ اس طرح چمکدار تھا کہ آپ کی رنگت کے مخالف تھا۔ بَيۡضَآءَ حال کی بنا پر منصوب ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں دو الف تانیث ہیں، یہ اس سے زائل نہیں ہوتے گویا ان دونوں کا لزوم دوسری علت ہے نکرہ میں غیر منصرف ہے۔ یہ دونوں الف ھاء کے مخالف ہیں کیونکہ ھا اسم سے جدا ہوتی ہے۔ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ، مِنۡ، بیضا کے متعلق ہے جیسے تو کہتا ہے: أبيضت من غير سوئٍ، اٰيَةً اُخۡرٰى، یعنی عصا کے معجزہ کے علاوہ یہ معجزہ ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کرتہ جبہ سے اپنا ہاتھ نکالا تو اس کی سورج کی شعاع کی طرح روشنی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اور آیۃ، بیضاء سے بدل کی بنا پر منصوب ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول حسن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے تجھے دوسرا معجزہ دیا یا دوسرا معجزہ دیں گے کیونکہ فرمایا: تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ یہ دلیل ہے کہ آپ کے پاس دوسرا معجزہ آیا۔ لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى، کبریٰ سے

مراد بڑا ہے۔ حق یہ تھا کہ الکبیرہ ہوتا لیکن الکبریٰ فرمایا تا کہ آیات کے قافیے مل جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اضمار ہے اس کا معنی ہے، لنریك من آیاتنا الآیة الکبری یعنی ہم تجھے اپنی آیات میں سے بڑی نشانی دکھائیں گے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ید موسیٰ اکبر آیاتہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ اللہ کی بڑی آیات میں سے تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۳﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ﴿۳۵﴾

"(اب) جائیے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے۔ آپ نے دعا مانگی: اے میرے پروردگار! کشادہ فرمادے میرے لیے میرا سینہ اور آسان فرمادے میرے لیے میرا یہ (کٹھن) کام اور کھول دے گرہ میری زبان کی تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات۔ اور مقرر فرما میرا وزیر خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ مضبوط فرما دے اس سے میری کمر۔ اور شریک کردے اسے میری (اس) مہم میں، تا کہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں۔ بیشک تو ہمارے (ظاہر و باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید سے مانوس کر دیا اور اسے معجزات دکھادیے جو ان کے رسول ہونے پر دلیل تھے تو انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا کہ اسے دعوت دیں۔ طَغٰى کا معنی ہے اس نے نافرمانی کی، تکبر کیا، کفر کیا، جبر کیا اور حد سے بڑھا۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ رسالت کی تبلیغ کے لیے اعانت طلب کی۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتادیا تھا کہ اس نے فرعون کے دل پر مہر لگادی ہے وہ ایمان نہیں لائے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: یارب! تو مجھے کیسے حکم دیتا ہے کہ میں اس کے پاس جاؤں جبکہ تو نے اس کے دل پر مہر لگادی ہے؟ تو ہوا کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ آیا اور کہا: اے موسیٰ! اس کی طرف چلو جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ یعنی میرا سینہ کشادہ فرما اور ایمان اور نبوت سے منور کردے۔ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ اور فرعون کو تبلیغ کرنے کا جو تو نے مجھے حکم دیا ہے اسے میرے لیے آسان فرما۔ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ عقدہ سے مراد وہ گرہ ہے جو اس انگارے کی وجہ سے بن گئی تھی جو آپ نے بچپن میں منہ میں ڈال لیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی زبان میں لکنت تھی یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن فرعون کی گود میں تھے تو آپ نے فرعون کو طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ کر اسے نوچا۔ فرعون نے آسیہ سے کہا: یہ میرا دشمن ہے۔ ذبح کرنے والوں کو بلا۔ آسیہ نے کہا: ٹھہر جا، یہ معصوم بچہ ہے چیزوں میں تفریق بھی نہیں کر

سکتا۔ پھر آسیہ دو تھال لے آئی ایک میں اس نے انگارے رکھے اور دوسرے میں جواہر رکھے۔ حضرت جبریل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور اسے آگ پر رکھ دیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انگارہ اُٹھایا اور اسے اپنے منہ میں زبان پر رکھ دیا اس کی وجہ سے آپ تتلاتے تھے۔

روایت ہے کہ آپ کا ہاتھ جل گیا تھا۔ فرعون نے اس کے علاج کی کوشش کی تھی لیکن وہ ٹھیک نہ ہوا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی تو اس نے کہا: تو مجھے کونسے رب کی طرف بلاتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اس رَب کی طرف جس نے میرے ہاتھ کو ٹھیک کیا تھا جبکہ تو اس کے علاج سے عاجز ہو گیا تھا۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ آپ کا ہاتھ اس لیے ٹھیک نہ ہوا تھا تا کہ آپ کا ہاتھ فرعون کے ساتھ ایک پلیٹ میں داخل نہ ہو اور ان کے درمیان اکٹھا کھانے کی حرمت منعقدر ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کا وہ تتلاپن ختم ہو گیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: زائل ہو گیا تھا اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى بعض نے فرمایا: یہ تتلاپن قائم رہا تھا، اس کی دلیل فرعون کا یہ قول ہے: وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝ (الزخرف) اور آپ نے یہ دعا نہیں کی: أحلل کل لسانی، یہ دلیل ہے کہ آگ کو چھونے کی وجہ سے گرہ ان کی زبان میں تھی۔ بعض نے فرمایا: کلیۃً یہ تکلیف زائل ہو گئی تھی، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ، فرعون نے کہا: وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝ کیونکہ تربیت کے دوران آپ کی گرہ کا اسے علم تھا اور اس تکلیف کے دور ہونے کا اس کے پاس ثبوت نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو فرعون وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝ نہ کہتا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فصیح زبان سے کلام کی ہوتی؛ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ گرہ اپنے رب سے مناجات کرتے وقت پڑی تھی حتیٰ کہ آپ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے سے کلام نہیں کر سکتے تھے۔ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ تا کہ وہ اسے جان لیں جو میں کہوں اور اسے سمجھ لیں۔ کلام عرب میں الفقه کا معنی فہم (سمجھنا) ہے۔ اعرابی نے عیسیٰ بن عمر کو کہا: شهدت علیك بالفقه؛ اسی سے ہے فَقِهَ الرجل (بکسر عین کلمہ) فلان لایفقه ولا ینقه، أفقهتك الشئ۔ پھر علم شریعت کے لیے خاص ہوا۔ شریعت کا جاننے والا فقیہ ہوتا ہے۔ فَقُهَ (عین کلمہ کے ضم کے ساتھ) فقاهة وفقهه الله جب اللہ تعالیٰ کسی کو سمجھ عطا فرمائے اور وہ سمجھ جائے۔ فاقهتهٗ جب تو نے علم میں بحث کی۔ یہ جوہری کا قول ہے، الوزیر، المؤازر، جیسے الأكیل المواكل ہے کیونکہ وہ سلطان سے اس کا بوجھ اُتار دیتا ہے۔

کتاب النسائی میں ہے قاسم بن محمد سے مروی ہے میں نے اپنی پھوپھو کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تم میں سے کسی منصب پر فائز کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا تو اس کے لیے نیک وزیر بنا دیتا ہے اگر وہ بھولتا ہے تو وہ وزیر اسے یاد دلاتا ہے اگر اسے بات یاد ہوتی ہے تو اس کی معاونت کرتا ہے''(1)۔ اسی مفہوم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا اور کوئی خلیفہ نہیں بنایا مگر اس کے دو مشیر ہوتے ہیں ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اسے نیکی پر ابھارتا ہے اور ایک مشیر اسے شر کا حکم دیتا ہے اور شر پر برانگیختہ کرتا ہے۔ محفوظ وہی ہے جسے اللہ

1۔ ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی اتخاذ الوزیر، حدیث نمبر 2543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے محفوظ کر لیا"۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ اس کا وزیر بنا دے مگر انہوں نے یہ ارادہ نہ کیا کہ وہ وزارت پر مقصور ہوتا کہ وہ نبوت میں اس کا شریک نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بغیر سوال کے اس کا وزیر بنانا جائز ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے متعین فرمایا اور کہا: ھارون، ھارون پر نصب وزیراً سے بدل کی بنا پر ہے یا یہ اِجْعَلْ کی وجہ سے منصوب ہے یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اجعل لی ھارون اخی وزیراً۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک سال بڑے تھے بعض نے کہا: تین سال بڑے تھے۔

**اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۟** یعنی میری پیٹھ کو مضبوط کر دے۔ الازر کا معنی ازار باندھنے کی جگہ ہے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ میرا نفس مضبوط ہو جائے۔ الازر کا معنی قوت ہے۔ آزرہ کا معنی ہے اس نے اسے قوت بخشی۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ** (الفتح: 29) ابو طالب نے کہا:

أليس أبونا هاشمٌ شدَّ أزرَهُ وأوصى بنيه بالطِّعانِ وبالضَّربِ

بعض نے کہا: الازر کا معنی مدد ہے، یعنی وہ مدد بنا دے جس کے ساتھ میرا معاملہ سیدھا ہو۔ شاعر نے کہا:

شَدَدتُ به أزرِي وأيقنتُ أنَّهُ أخو الفقر مَن ضاقت عليه مذاهبُه

حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہما السلام سے زیادہ پر گوشت تھے اور زیادہ قد آور تھے اور ان کا جسم زیادہ سفید تھا اور زیادہ فصیح تھے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال پہلے وصال فرما گئے تھے۔ حضرت ہارون کے چہرے میں علامت تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناک کی بینی پر علامت تھی اور زبان کی ایک طرف پر علامت تھی نہ آپ سے پہلے کسی کی یہ علامت تھی اور نہ آپ کے بعد کسی کی ایسی علامت ہوگی۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی زبان میں گرہ کا سبب تھی؛ واللہ اعلم۔

**وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ۟** یعنی نبوت اور تبلیغ رسالت میں اسے شریک کر دے۔ مفسرین نے فرمایا: حضرت ہارون علیہ السلام مصر میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کے پاس آنے کا حکم دیا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کریں تو ایک منزل پر ان کی ملاقات ہوئی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے اس کے متعلق بتایا جو ان کی طرف وحی کی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا ہے میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ تجھے میرے ساتھ رسول بنا دے۔ عام قراء نے أخی اشدد ہمزہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور أشرکہ کو دعا کی بنا پر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی أَشْدِد یا رب أزری و أشرِکہ معی فی أمری۔ ابن عامر، یحییٰ بن حرث، ابو حیوہ، حسن اور عبد اللہ بن ابی اسحاق نے اشدد کو ہمزہ قطعی کے ساتھ اور أشرکہ کو ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں ایسا کروں گا اور میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو مضبوط کروں گا۔ اور اسے یا رب میں اپنے معاملہ میں شریک کروں گا۔ نحاس نے کہا: دونوں فعل اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا کے قول کی وجہ سے محل جزم میں ہیں۔ یہ قرأت شاذ اور بعید ہے کیونکہ اس کی مثل کا جواب شرط اور جزا کے معنی میں ہوتا ہے۔ پھر معنی ہوگا اگر تو میرے لیے میرے خاندان سے وزیر بنائے گا تو میں اس کے ذریعے مضبوط ہوں گا اور میں اسے اپنے معاملہ میں شریک کروں گا۔ اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا امر نبوت اور رسالت تھی۔ یہ آپ کی طرف نہ تھا کہ آپ اس کے متعلق خبر دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کو ان کے ساتھ نبوت میں شریک کریں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے اخی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم تیرے لیے کثرت سے نماز پڑھیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تسبیح باللسان مراد ہو یعنی ہم تیری ہر اس چیز سے پاکیزگی بیان کرتے ہیں جو تیری شان جلال کے موافق و مطابق نہ ہو، كَثِيْرًا مصدر محذوف کی صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وقت کی صفت ہو۔ اور ادغام عمدہ ہے۔ نذ کرک کثیراً بھی اسی طرح ہے اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا، خطابی نے کہا: البصیر بمعنی المبصر ہے۔ البصیر وہ عالم جو مخفی امور کو جاننے والا ہو معنی ہے ہمیں جاننے والا۔ اور ہمارے بچپن میں ہمیں نعمتیں بہم پہنچانے والا۔ پس تو نے پہلے بھی ہم پر احسان کیا پس اب بھی ہم پر احسان فرما اے ہمارے رب!

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَاۤ
اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ
بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى
عَيْنِىْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِىْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ
كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ فَلَبِثْتَ
سِنِيْنَ فِىْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾ وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ﴿٤١﴾
اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِىْ وَ لَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ ﴿٤٢﴾

''جواب ملا: منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ۔ اور ہم نے احسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی، جب ہم نے وہ بات الہام کی تمہاری ماں کو جو الہام ہی کیے جانے کے قابل تھی۔ یہ کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر پھر پکڑے گا وہ شخص جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے اور (اے موسیٰ!) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تا کہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے) اور (اس تدبیر کا منشا یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے۔ یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے): کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف تا کہ (آپ کو دیکھ کر) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور غمناک نہ ہو اور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم واندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا پھر تم ٹھہرے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر

تم آ گئے ایک مقررہ وعدہ پر اے موسیٰ۔ اور میں نے مخصوص کر لیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لیے۔ اب جایئے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی ۞ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شرح صدر اور معاملہ کی تیسیر کا سوال کیا تو جواباً اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور انہیں ان کی طلب اور مرغوب چیز عطا فرمادی۔ سؤل سے مراد طلب ہے یہ فُعل بمعنی مفعول ہے، خبز بمعنی مخبوز اور اکل بمعنی ماکول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤی ۞ یعنی اس سے پہلے بھی تم پر ہم نے احسان فرمایا۔ اور وہ احسان دشمنوں کے شر سے آپ کی حفاظت ہے اور یہ ذبح کے وقت تھا؛ واللہ اعلم۔ المن کا مطلب احسان کرنا اور مہربانی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤی ۞ بعض علماء نے فرمایا: اوحینا کا معنی ہے ہم نے الہام کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ کی والدہ کو خواب میں وحی کی گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح وحی کی گئی جس طرح انبیاء کو وحی کی گئی تھی۔ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ، مقاتل نے کہا: مومن آل فرعون سے تھا جس نے تابوت بنایا تھا اور اسے تیار کیا تھا اس کا نام حزقیل تھا۔ اور تابوت جمیز کی لکڑی کا تھا۔ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ یعنی اسے دریا میں پھینک دے یعنی دریائے نیل میں ڈال دے۔ فَلْیُلْقِهِ، فراء نے کہا: فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ امر کا صیغہ ہے اور اس میں مجازات کا معنی ہے یعنی اقذفیه یلقه الیم، اسی طرح یہ ارشاد ہے: اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَ لْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ (العنکبوت:12)

یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ یعنی فرعون۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں چمڑے کے ٹکڑے لگا دیے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ اس تابوت کو تارکول لگا دی اور اس کی درازیں بند کر دیں پھر اسے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریائے نیل سے ایک نہر فرعون کے گھر میں جاتی تھی اللہ تعالیٰ نے اس تابوت کو فرعون کے گھر کی طرف اس نہر میں چلایا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس تابوت میں دھنی ہوئی روئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں رکھا اور اس کو تارکول لگا دی اور سیسہ پھیر دیا پھر اسے دریا میں ڈال دیا۔ اس دریا سے ایک بڑی نہر فرعون کے باغ کو جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ تالاب کے اوپر بیٹھا تھا کہ اچانک تابوت نظر آیا اس نے تابوت نکالنے کا حکم دیا تو تابوت نکال دیا گیا جب اسے کھولا گیا تو اس میں بچہ تھا جو انتہائی خوبصورت تھا، دشمن خدا اس بچے سے شدید محبت کرنے لگا اور وہ اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتا تھا۔ قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ دریا نے اسے ساحل پر ڈال دیا تھا۔ فرعون نے وہ تابوت ساحل پر دیکھا تھا اور اس نے اسے اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دریا نے ساحل کی اس جگہ پر ڈالا ہو جہاں فرعون کی نہر کا منہ ہو پھر اس نہر کے ذریعے تالاب میں پہنچا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعون کی بیٹی نے اس بچے کو پایا اس بچی کو برص کا مرض تھا جب اس نے تابوت کھولا تو اسے شفا مل گئی۔ روایت ہے کہ جب انہوں نے وہ تابوت اٹھایا اور اس کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اس پر قادر نہ ہوئے انہوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی تو وہ بھی عاجز آ گئے۔ آسیہ قریب ہوئی اور اس نے تابوت میں نور دیکھا اس نے کوشش کی تو اس نے کھول لیا اس میں ایک بچہ تھا جس کی آنکھوں کے درمیان کی جگہ روشن

تھی اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے انگوٹھے سے دودھ چوس رہے تھے وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرنے لگے۔ فرعون کی بیٹی کو برص کا مرض تھا۔ اطباء نے اسے کہا تھا کہ یہ ٹھیک نہ ہوگی مگر دریا کی طرف سے۔ دریا میں ایک انسان کے مشابہ ایک چیز پائی جاتی ہے۔ اس کا علاج اس کا لعاب ہے اس لڑکی نے اپنی برص پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لعاب ملا تو وہ ٹھیک ہوگئی۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اس لڑکی نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرہ کو دیکھا تو صحت یاب ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو فرعون کی بیوی کی پڑوسن نے پایا تھا جب فرعون نے اس کو دیکھا تو اس نے تمام لوگوں سے اسے خوبصورت پایا۔ فرعون اس سے محبت کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت فرمائی اور ساری مخلوق کا محبوب بنا دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے پرتو حسن ان پر ڈال دیا تھا جو دیکھ لیتا صبر نہیں کر سکتا تھا۔ قتادہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں ملاحت تھی جو دیکھتا محبت و عشق کرنے لگتا تھا۔ عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے تجھ میں میں نے ملاحت و حسن رکھ دیا جو تجھے دیکھے گا تجھ سے محبت کرے گا۔ طبری نے کہا: اس کا مطلب ہے میں نے تجھ پر اپنی رحمت ڈال دی۔ ابن زید نے کہا: اس کا مطلب ہے میں نے تجھے ایسا بنا دیا کہ جو تجھے دیکھے گا تجھ سے محبت کرے گا حتیٰ کہ فرعون نے بھی تجھ سے محبت کی اور میں نے اس کے شر سے تجھے بچا لیا۔ آسیہ بنت مزاحم نے تجھ سے محبت کی اور تجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَیْنِیْ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ یہ میرے سامنے ہوا اس طرح کہ تجھے تابوت میں رکھا گیا اور پھر تابوت کو دریا میں ڈالا گیا اور پھر فرعون کی بیوی کی لونڈی نے تجھے اٹھایا اور انہوں نے تابوت کو کھولنے کا ارادہ کیا تا کہ جو کچھ اس میں ہے اسے دیکھیں، ان میں سے ایک نے کہا: تم اسے مت کھولو حتیٰ کہ تمہاری سردار آجائے وہ اس کے زیادہ لائق ہے تا کہ وہ تم پر تہمت نہ لگائے کہ تم نے اس میں جو کچھ پایا وہ تم نے اپنے لیے اٹھا لیا ہے۔ فرعون کی بیوی پانی نہیں پیتی تھی حتیٰ کہ وہ لونڈیاں اسے پلاتی تھیں وہ تابوت کو بند کر کے اپنی مالکن آسیہ کے پاس لے گئیں جب اس نے اس تابوت کو کھولا تو اس میں ایک ایسا بچہ دیکھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس پر محبت ڈال دی گئی اس نے وہ بچہ اٹھا لیا اور اسے فرعون کے پاس لے گئی اور اسے کہا: یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ فرعون نے اسے کہا: ہاں۔ تیری تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے نہیں۔ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر فرعون کہتا کہ ہاں وہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو وہ ایمان لے آتا اور تصدیق کرتا''۔ آسیہ نے کہا: یہ مجھے ہبہ کر دے اور اسے قتل نہ کر۔ فرعون نے وہ اسے ہبہ کر دیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَیْنِیْ کا مطلب ہے تو میرے سامنے پروان چڑھے اور غذا دیا جائے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ لغت میں معروف ہے، کہا جاتا ہے: صنعت الفرس و امنعته جب تو گھوڑے کی اچھی دیکھ بھال کرے۔ اس کا معنی ہے وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَیْنِیْ میں نے یہ کیا۔ بعض نے فرمایا: اللام مابعد کلام اِذْ تَمْشِیْۤ اُخْتُكَ کے متعلق ہے اور تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اذ، لِتُصْنَعَ کی ظرف ہے۔ بعض نے فرمایا: وَ لِتُصْنَعَ میں واؤ زائدہ ہے۔ ابن

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

القعقاع نے کہا: وَلْتُصْنَعَ امر کی بنا پر لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس کا ظاہر مخاطب ہے اور مامور غائب ہے۔ ابونہیک نے ولتصنع، تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے تا کہ آپ کا حرکت کرنا اور تصرف کرنا میری مشیت سے ہو اور میرے سامنے ہو؛ یہ مہدوی نے قول ذکر کیا ہے۔ اِذْ تَمْشِیْۤ اُخْتُكَ، اِذْ تَمْشِیْۤ میں عامل القیت یا تصنع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اِذْ اَوْحَیْنَاۤ سے بدل ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام مریم تھا۔ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ یَّكْفُلُهٗ یہ اس طرح ہوا کہ وہ اس کی خبر کی تلاش میں نکلی فرعون نے اپنی بیوی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہبہ کر دیا تو اس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دودھ پلانے والیاں طلب کیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی عورت کا دودھ نہیں پیتے تھے حتی کہ ان کی بہن آ گئی اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا اور اپنی گود میں لیا اور پستان منہ میں دیا تو دودھ پینے لگ گئے اور وہ خوش ہو گئے۔ فرعون کے گھر والوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا: تو ہمارے پاس ٹھہرے گی؟ اس نے کہا: میرا دودھ نہیں ہے لیکن میں تمہیں ایسے گھر کے متعلق آگاہ کرتی ہوں جو اس کی کفالت کرے گا اور وہ لوگ اس کے لیے نہایت مخلص ہوں گے۔ انہوں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ اس نے کہا: میری والدہ۔ انہوں نے پوچھا: کیا اس کا دودھ ہے؟ اس نے کہا میرے بھائی ہارون کا دودھ۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک سال بڑے تھے۔ بعض نے کہا: تین سال۔ بعض نے کہا: چار سال بڑے تھے۔ یہ اس لیے ہو کہ فرعون نے بنی اسرائیل پر رحم کیا اور چار سال ان کے بچوں کو قتل کرنا چھوڑ دیا تھا اسی دوران حضرت ہارون پیدا ہوئے تھے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰ کی والدہ آئی تو انہوں نے ان کا دودھ قبول کر لیا۔ اسی کی طرف الله تعالیٰ کا یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے: فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ، حضرت ابی کے مصحف میں فردد ناك ہے۔ عبد المجید نے ابن عامر سے روایت کیا ہے کی تقر عینها قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ جوہری نے کہا: وقررت به عینا وقررت به قرة وقرورا فیهما، رجل قریر العین، وقد قرت عینه، تَقِر و تَقَر یہ گرم ہونے کی نقیض ہے۔ اقر الله عینه یعنی الله تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا حتی کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوئی۔ پس اپنے سے اوپر والے کو مت دیکھو۔ کہا جاتا ہے: حتی تبرد ولا تسخن حتی کہ ٹھنڈا ہو گیا اور گرم نہ رہا۔ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور پریشانی کے آنسو گرم ہوتے ہیں۔ یہ مفہوم سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ وَلَا تَحْزَنَ یعنی اپنے مفقود ہونے پر پریشان نہ ہو۔ وَقَتَلْتَ نَفْسًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس کو آپ نے قتل کیا وہ قبطی کافر تھا۔ کعب نے کہا: وہ اس وقت بارہ سال کا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے: "اس کا قتل کرنا خطا تھا" جیسا کہ آگے آئے گا۔ فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ یعنی ہم نے تجھے خوف، قتل اور حبس سے امن دیا۔ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا یعنی ہم نے تجھے آزمایا حتی کہ آپ رسالت کے لیے تیار ہو گئے۔ قتادہ نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم نے تمہیں آزمائش میں ڈالا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے تجھے خالص کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم نے رسالت سے پہلے کئی چیزوں کے ساتھ آزمایا۔ اس سال والدہ نے انہیں بطن میں اٹھایا جس سال میں فرعون بچوں کو قتل کرتا تھا۔ پھر انہیں دریا میں ڈالنا، پھر اپنی والدہ کے علاوہ کسی عورت کا دودھ پینے سے روک دینا پھر فرعون کی داڑھی پکڑ کر کھینچنا، پھر موتی کے بدلے انگارے کو پکڑنا، پھر فرعون کے قتل سے نجات دینا، پھر قبطی کو قتل کرنا، پھر خائف ہو کر نکل جانا پھر بکریاں چرانا تا کہ مخلوق کی

رعایت کرنے کی مشق کرلیں۔ کہا جاتا ہے: بکری کا ایک بچہ بھاگ گیا تو آپ دن کا اکثر حصہ اس کے پیچھے لگے رہے اس نے آپ کو تھکا دیا پھر اسے پکڑا تو اسے بوسہ دیا اور اپنے سینے سے لگایا اور کہا: تو نے مجھے بھی تھکا دیا اور خود بھی تھک گیا اور آپ اس پر ناراض نہ ہوئے۔ وہب بن منبہ نے کہا: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کلیم بنایا۔ سورۂ نساء میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ آپ نے لمبی مدت دس سال پوری کی۔ وہب نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت شعیب کے پاس اٹھائیس سال رہے ان میں سے دس سال ان کی بیوی صفورا بنت شعیب کا مہر تھا۔ اور اٹھارہ سال آپ ویسے حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس ٹھہرے یہاں کہ ان کے ہاں ان کی اولاد ہوگئی۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور عبدالرحمن نے کہا: اس کا مطلب ہے نبوت و رسالت کے لیے موافق ہو گئے، کیونکہ انبیاء کرام چالیس سال کی عمر میں مبعوث کیے جاتے ہیں۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا: عَلٰى قَدَرٍ کا معنی ہے وعدہ پر۔ محمد بن کعب نے کہا: پھر تو اس مقدار پر ہو گیا جو تیری لیے مقدر کی گئی تھی کہ تو اس میں آئے۔ مفہوم دونوں اقوال کا ایک ہی ہے، یعنی آپ اس وقت آئے جس میں ہم نے تجھے بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ شاعر نے کہا تھا:

نال الخلافة أو كانت له قَدَراً  كما أَتَى ربَّه موسىٰ على قَدَر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے اپنی وحی اور رسالت کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔ بعض نے فرمایا: اِصْطَنَعْتُكَ کا معنی ہے میں نے تجھے پیدا کیا۔ یہ الصنعة سے ماخوذ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں نے تجھے قوت دی اور علم سکھایا تاکہ آپ میرا حکم اور میری نہی میرے بندوں تک پہنچائیں۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد نو آیات ہیں جو آپ پر نازل کی گئیں۔ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: امر رسالت میں کمزور نہ ہونا؛ اور یہ قتادہ کا بھی قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے سست نہ ہونا۔ شاعر نے کہا:

فما وَنَى محمدٌ مُذان غَفَرْ  له الإلهُ مامَضَى وما غَبر

الونی کا مطلب کمزوری اور سستی ہے اور تھک جانا اور عاجز آجانا ہے۔ اس آیت میں یہ سب معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

امرء القیس نے کہا:

مِسَحّ إذا ماالسابحاتُ على الونَى  أَثَرن غُبَاراً بالكَدِيدِ المركَّلِ

کہا جاتا ہے: ونیت فی الأمر ونی و ونیا جس کا معنی ہے کمزور ہونا، فأنا وانٍ وناقةٌ وانية (کمزور اونٹنی) أونيتها أنا میں نے اونٹنی کو تھکا دیا اور کمزور کر دیا۔ فلان لاینی کذا یعنی فلاں ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ابان نے آیت کے معنی کی تفسیر بیان کی ہے اور طرفہ کے قول سے استشہاد کیا ہے:

كان القُدُورَ الراسياتِ أَمَامَهُمْ  قِبابٌ بَنَوْها لاتَنِي أبداً تَغْلِي

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: لاتبطئا (سست نہ ہونا) حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے: ولاتهنافی

ذکری یعنی میری حمد بیان کرنے، میری بزرگی بیان کرنے اور میرے پیغام کو پہنچانے میں کوتاہی و سستی نہ کرنا۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۞

"آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے۔ اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْهَبَآ، آیت کے آغاز میں فرمایا: اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ اور یہاں فرمایا: اِذْهَبَآ۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کو دعوت پہنچانے کا حکم دیا پہلے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علیحدہ خطاب فرمایا ان کو شرف بخشنے کے لیے پھر تاکید کے لیے مکرر فرمایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے واضح کیا کہ ایک کا جانا کافی نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: پہلا تمام لوگوں کی طرف جانے کا حکم تھا اور دوسرا حکم فرعون کی طرف جانے کا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز کی دلیل ہے۔ اور اس شخص سے نرمی سے بات ہونی چاہیے جو قوت و مرتبہ والا ہو اور اس کے لیے عصمت ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا اور فرمایا: لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۞ جب حضرت موسیٰ کلیم اور حضرت ہارون علیہما السلام کی یہ حالت ہے تو ہماری کیا کیفیت ہوگی، ہم اس کیفیت سے تبلیغ کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس وقت امر و نہی کا فریضہ مرغوب انداز میں ہوگا اور مطلوب حاصل ہوگا۔ یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ لَّيِّنًا کے قول میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا جس میں کلبی اور عکرمہ بھی ہیں کہ اس کا معنی ہے اس کو کنیت سے بلاؤ؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: فرعون کی کنیت ابوالعباس تھی۔ بعض نے فرمایا: ابوالولید تھی۔ بعض نے فرمایا: ابومرۃ تھی، اس قول کی بنا پر کافر سے کنایۃً بات کرنا جائز ہے جب کہ وہ وجیہ اور شرف والا ہو اور اسکے اسلام قبول کرنے کی امید ہو۔ اور یہ جائز ہے جبکہ اس کے اسلام قبول کرنے کی امید نہ بھی ہو کیونکہ طمع اور امید اس عمل کو ثابت نہیں کرتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تمہارے پاس کسی قوم کا کریم (معزز) شخص آئے تو اس کا احترام کرو" (1)۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس کے اسلام قبول کرنے کی امید ہو۔ اور اس کے اکرام میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی کنیت ذکر کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ سے کہا: انزل اباوھب، اے ابووہب! نیچے اترو۔ حضرت سعد کو عبداللہ بن ابی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: الم تسمع ما یقولہ أبوحباب، ابوحباب، عبداللہ بن ابی کی کنیت ہے۔ اسرائیلیات میں مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سال فرعون کے دروازے پر کھڑے رہے انہوں نے کوئی پیغام رساں نہ پایا جو ان کی کلام فرعون تک پہنچاتا حتی کہ خود فرعون باہر نکلا تو پھر یہ سارا واقعہ پیش آیا۔ یہ بعد میں آنے

1۔ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ، حدیث نمبر 3701، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والے کے لیے تسلی ہے جن کا معاملہ ظالموں کے ساتھ ہو تمہارا رب ہدایت یافتہ لوگوں کو زیادہ جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا: تو ایمان لے آ اس پر جو میں لے کر آیا ہوں اور تو رب العالمین کی عبادت کر، اس پر کہ تیرے لیے ایسی جوانی ہوگی جو موت تک بوڑھا نہیں کرے گی اور ایسی ملکیت پر جو تجھ سے موت تک چھینی نہیں جائے گی۔ اور تیرے عمر میں چار سو سال اضافہ ہو جائے گا اور جب تو مرے گا تو جنت میں داخل ہوگا۔ یہ قول لین ہے، حضرت ابن مسعود نے فرمایا: القول اللین سے مراد یہ ارشاد ہے: فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ (النازعات) بعض نے فرمایا: قول لین سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ہے: اے فرعون! ہم تیرے پروردگار، تمام جہانوں کے پروردگار کے پیغام رساں ہیں۔ آپ نے اس کا یہ نام لیا کیونکہ باقی اسماء میں سے یہ نام اسے زیادہ پسند تھا جس طرح ہمارے ہاں الملک (بادشاہ) کو نام دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: القول اللین سے مراد وہ قول ہے جس میں خشونت نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یلین لیناً، شئی لی ولین مخفف ہے اور اس کی جمع الیناء ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نرم لہجہ میں بات کرنے کا حکم دیا گیا تو جو ان سے کم مرتبہ ہیں ان کے لیے بدرجہ اولیٰ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خطاب میں اس معاملہ کی اقتدا کرے اور کلام میں نرمی کا مظاہرہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ:83) اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ اس کا معنی ہے تمہاری امید اور تمہاری رجا پر۔ اس میں توقع جہت بشر کی طرف راجع ہے؛ بڑے بڑے نحوی علماء اور سیبویہ وغیرہ نے یہ کہا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ مفہوم گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: لعل لفظ طمع اور ترجی ہے، پس اس کے ساتھ علقمندوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: لعل یہاں استفہام کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فانظر هل یتذکر، یعنی دیکھ کیا وہ نصیحت حاصل کرتا ہے۔ بعض نے کہا: یہ کئی کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا شاید وہ نصیحت حاصل کرے اور ڈرنے لگے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض نے کہا: لعل اور عسیٰ تمام قرآن میں اس معنی کے لیے آئے ہیں جو واقع ہو چکا ہو۔ فرعون نے اس وقت نصیحت حاصل کی جب وہ غرق ہونے لگا اور اس وقت ڈرا اور کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ (یونس) لیکن اس وقت کے ایمان نے اسے نفع نہیں دیا؛ یہ ابو بکر وراق وغیرہ کا قول ہے۔ یحییٰ بن معاذ نے اس آیت میں فرمایا: یہ تیری اس پر مہربانی ہے جو کہتا ہے: میں الٰہ ہوں، پھر اس پر تیری کتنی بندہ نوازی ہوگی جو کہتا ہے: تو الٰہ ہے۔ بعض نے فرمایا: فرعون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی طرف مائل ہوا جب آپ نے اسے دعوت دی اور اپنی بیوی سے مشورہ کیا وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی اور ایمان لانے کا مشورہ دیا پھر اس نے ہامان سے مشورہ کیا تو اس نے کہا: تو ایسا نہ کر تو بادشاہ ہونے کے بعد غلام بن جائے گا، تو رب ہونے کے بعد مربوب ہو جائے گا اور اسے کہا: میں تجھے جوانی کی طرف لوٹاؤں گا۔ اس نے اس کی داڑھی میں سیاہ خضاب لگایا اور یہ پہلا شخص تھا جس نے سیاہ خضاب لگایا تھا۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝

''دونوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکشی سے پیش آئے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ ضحاک نے کہا: یفرط کا معنی تجاوز کرنا ہے۔ نحاس نے کہا: یفرط علینا منه امرٌ ہمیں اندیشہ ہے کہ اس کی طرف سے ہم پر تجاوز ہوگا۔ فراء نے کہا: اس کی طرف سے امر جلدی ہوگا۔ فراء نے کہا: افرط کا معنی اسرع (جلدی کرنا) ہے اور فرمایا: فرط کا معنی چھوڑ دینا ہے اور جمہور کی قرأت یفرط یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے ہمیں سزا دینے میں وہ جلدی کرے گا۔ کہا جاتا ہے: فرط منی امرٌ جلدی ہوا۔ اسی سے الفارط فی الماء ہے، وہ شخص جو پانی تک لوگوں سے پہلے پہنچ جاتا ہے یعنی وہ ہمیں گناہ میں سبقت لے جانے والے کے عذاب کی طرح عذاب دے گا؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے یفرط یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں ابن محیصن بھی ہے۔ مہدوی نے کہا: شاید یہ بھی ایک لغت ہو ان سے یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس کا معنی ہے اسے ہم پر جلدی کرنے پر ابھارنے والا ابھارے گا۔ ایک گروہ نے یفرط یاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ اور ابن محیصن نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ ہمیں اذیت دینے میں زیادتی کرے گا۔ راجز نے کہا:

قد أفرط العِلجُ علينا وعجل

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝

''ارشاد ہوا: ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بتقاضائے بشریت اپنے نفسوں پر خوف لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمایا کہ فرعون ان تک اور ان کی قوم تک نہیں پہنچے گا۔ یہ آیت اس کے قول کا رد کرتی ہے جو کہتا ہے: وہ نہیں ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انبیاء و اولیاء میں سنت ہے کہ انہیں دشمنوں کا خوف ہوتا ہے حالانکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر وثوق اور یقین ہوتا ہے۔ بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا جب عامر بن عبداللہ کے متعلق خبر دینے والے کو کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شام کے راستے پر پانی پر اترا ہے اور ان کے درمیان اور پانی کے درمیان ایک شیر حائل ہو گیا ہے۔ عامر پانی کی طرف آیا اور اس سے اپنی حاجت پوری کی۔ عامر کو کہا گیا: کیا تو نے اپنے اندر خطرہ محسوس کیا؟ تو عامر نے کہا: میرے پیٹ میں نیزے لگیں تو میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ میں اس کے سوا کسی چیز سے ڈرتا ہوں، جبکہ وہ بھی بتقاضائے بشریت ڈرے تھے جو عامر سے بہتر تھے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان سے ایک شخص نے کہا تھا: اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ فَخَرَجَ

مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (القصص) اور فرمایا: فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ (القصص) اور جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکی تو فرمایا: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۔

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھودی تاکہ مسلمان اوران کے اموال محفوظ ہو جائیں جبکہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور وثوق میں ایسے مقام پر فائز تھے جس پر کبھی کوئی پہنچا ہی نہیں پھر آپ کے صحابہ کرام جن سے کوئی ناواقف نہیں کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ایک مرتبہ حبشہ کی طرف گئے اور پھر مدینہ طیبہ کی طرف گئے کیونکہ انہیں مشرکین مکہ سے اپنی جانوں کا خطرہ تھا اور اس لیے چلے گئے تھے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ انہیں عذاب دے کر انہیں دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔ اسماء بنت عمیس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا جب انہوں نے اسے کہا تھا: ہم تم سے ہجرت میں سبقت لے گئے ہیں اس لیے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ اسماء نے کہا: اے عمر! تو نے غلط کہا ہے ہرگز نہیں اللہ کی قسم! تم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے وہ تمہارے بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے، تمہارے جاہلوں کو وعظ کرتے تھے اور ہم دوروالی زمین میں تھے جس میں دین اسلام سے نفرت کی جاتی تھی یعنی ہم حبشہ میں تھے اور یہ سب کچھ ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے برداشت کیا۔ اللہ کی قسم! میں نہ کھانا کھاؤں گی اور نہ پانی پیوؤں گی حتی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عرض کرلوں جو تو نے کہا ہے، ہم اذیت دیئے جاتے تھے اور ہم ڈرتے تھے۔ یہ طویل حدیث ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: اپنی ذات کے متعلق خبر دینے والا جھوٹا ہے سوائے ان باتوں کے جو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے اندر پیدا کر دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے کہ وہ تکلیف دینے والی، اذیت دینے والی اور تلف کرنے والی چیزوں سے ڈرتا ہے۔ علماء نے فرمایا: درندے سے بڑا ضرر نہیں ہے جو انسان پر جنگل میں حملہ کرنے والا ہے اور اس کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے لیے تلوار، نیزہ، تیر وغیرہ بھی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ یعنی فرعون کے خلاف میں تمہاری مدد اور نصرت کروں گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: الامیر مع فلاں جب امیر اس کی حفاظت کرنے والا ہو۔ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ یہ اس ادراک سے عبارت ہے جس کے ساتھ کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی۔ اللہ رب العالمین کی ذات بڑی بابرکت ہے۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

''پس (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ: ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے، ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے، اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ بیشک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئے گا جو جھٹلاتا ہے (کلام الٰہی کو) اور روگردانی کرتا ہے۔ فرعون نے پوچھا: موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ فرمایا: ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی راہنمائی کی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ اس کلام میں حذف ہے معنی یہ ہے کہ وہ فرعون کے پاس آئے اور اسے یہ کہا: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ یعنی ان کو چھوڑ دے۔ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ محنت ومشقت اور کام میں تھکانے کے ساتھ۔ بنو اسرائیل فرعون کے پاس سخت عذاب میں تھے وہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں سے خدمت لیتا تھا۔ اور مٹی اور اینٹیں بنانے اور شہر تعمیر کرنے کی تکلیف مالا یطاق دیتا تھا۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت سے مراد عصا اور ہاتھ ہے۔ بعض نے فرمایا: فرعون نے پوچھا وہ نشانی کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں داخل کیا پھر اسے سفید نکالا اس کی سورج کی شعاع کی طرح شعاع تھی اس ہاتھ کا نور سورج کے نور پر غالب آ گیا۔ اور اس سے اس نے تعجب کیا اور عصا کا معجزہ نہیں دکھایا مگر میلہ کے دن۔ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ زجاج نے کہا: جس نے ہدایت کی اتباع کی وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچ گیا۔ اور فرمایا: یہ سلام نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ملاقات کی ابتدا نہیں ہے اور خطاب نہیں ہے۔ فراء نے کہا: وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اور لمن اتبع الهدى برابر نہیں۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ یعنی دنیا میں ہلاکت و بربادی اور آخرت میں جہنم میں ہمیشہ رہنا۔ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ اس پر ہے جس نے انبیاء کرام کو جھٹلایا۔ تَوَلّٰى اور ایمان سے اعراض کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت موحدین کے لیے امید افزا ہے کیونکہ انہوں نے نہ جھٹلایا اور نہ اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰى ۝ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا حضرت ہارون علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا تاکہ آیات کے سرے مل جائیں۔ بعض نے فرمایا: ذکر کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا کیونکہ وہ رسالت اور کلام اور معجزہ والے تھے۔ بعض نے فرمایا: دونوں نے پیغام پہنچایا اگرچہ حضرت ہارون علیہ السلام خاموش تھے، کیونکہ کلام کے وقت ایک شخص بات کرتا ہے۔ جب ایک کلام ختم کرتا ہے تو دوسرا اس کی تائید کرتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے۔ پس اس بنا میں ہمارے لیے ایک علمی فائدہ ہے کہ دو شخصوں کو کوئی کام سپرد کیا جائے اور پھر ایک ادا کر دے جبکہ دوسرا وہاں موجود ہو اس وقت وہ اس سے مستغنی ہو تو وہ کام دونوں کا ادا کرنا شمار ہوگا اور دونوں عوض اور بدل کے مستحق ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اور پھر فرمایا: اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ اور فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ دونوں کو جانے اور بات کرنے کا حکم دیا۔ پھر فَمَنْ رَّبُّكُمَا کے قول سے خطاب نے ہمیں بتایا کہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے۔ قَالَ، حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ یعنی وہ اپنی صفات کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔اس کا کوئی اسم علم نہیں حتی کہ کہا جائے کہ وہ فلاں ہے بلکہ وہ عالم کا خالق ہے اس نے ہر مخلوق کو اپنی ہیئت اور صورت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اگر خطاب دونوں کے ساتھ ہوتا تو کلام یوں ہوتی: قالا ربنا اور خلقه، اعطی کا مفعول اوّل ہے یعنی اس نے ہر مخلوق کو ہر وہ چیز دی جس کے وہ محتاج تھے اور جس کی انہیں ضرورت تھی یا یہ مفعول ثانی ہے یعنی اس نے ہر چیز کو اس کی وہ صورت اور شکل دی جو اس منفعت کے مطابق تھی جو اس کے متعلق تھی جیسا کہ ضحاک کا قول ہے جو آگے آ رہا ہے۔ ثُمَّ هَدٰى، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر اور سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے اس نے ہر چیز کو اس کی جنس سے اس کا جوڑا دیا پھر اس کی نکاح کرنے، کھانے پینے اور رہنے کی طرف راہنمائی کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پھر اس کی الفت، اجتماع اور مناکحت کی طرف راہنمائی کی۔ حسن اور قتادہ نے کہا: ہر چیز کو اس کی اصلاح دی اور جو اس کے لیے مناسب تھا اس کی طرف راہنمائی کی۔ مجاہد نے کہا: اس نے ہر چیز کو صورت دی اور انسان کی صورت، حیوانوں کی تخلیق پر نہیں بنائی اور نہ حیوانوں کی تخلیق انسانوں کی تخلیق پر بنائی لیکن اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ایک مخصوص انداز ے سے بنایا۔شاعر نے کہا:

وله في كلِّ شئ خِلْقَةُ وكذاك الله ماشاء فَعَلْ

یعنی جس صورت پر تخلیق کرنا چاہا کر دیا؛ یہ عطیہ اور مقاتل کا قول ہے۔ضحاک نے کہا: اس نے ہر چیز کو اس منفعت کے ساتھ پیدا کیا جو اس کے متعلق تھی اور اس کے مطابق تھی یعنی ہاتھ کو پکڑنے کے لیے، پاؤں کو چلنے کے لیے، زبان کو بولنے کے لیے، آنکھ کو دیکھنے کے لیے، کان کو سننے کے لیے پیدا کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر چیز کو علم یا صنعت الہام کی۔ فراء نے کہا: مرد کو عورت کے لیے تخلیق کیا اور ہر مذکر کے لیے اس کے موافق مونث پیدا کی۔ ہر مذکر کو عورت کے لیے راہنمائی کی اس تقدیر پر مطلب ہوگا: أعطى كلّ شئ مثل خلقه ہر چیز کو اس کی تخلیق کی مثل عطا کی۔

میں کہتا ہوں: یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا معنی ہے۔ آیت کریمہ عام ہے۔ زائدہ نے اعمش سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ یعنی لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ ابن ابی اسحق کی قرأت ہے۔ اور نصیر نے کسائی وغیرہ سے یہ روایت کیا ہے یعنی بنی آدم کو ہر چیز عطا کی وہ اس نے پیدا کی جس کے وہ محتاج تھے۔ دونوں قرأتیں معنی میں متفق ہیں۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝

''اس نے کہا: (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا۔ فرمایا: ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَمَا بَالُ، البال سے مراد حالت ہے یعنی کیا حال ہوا اور کیا شان ہوئی، تو

بتایا کہ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، یعنی یہ علم غیب سے ہے جس کے متعلق تو نے سوال کیا ہے۔ اور یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا ہے اس کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور میں نہیں ہوں مگر تیری مثل بندہ، میں نہیں جانتا مگر جس کے متعلق مجھے وہ علام الغیوب خبر دے، گزشتہ قوموں کے احوال کا علم اللہ کی بارگاہ میں لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے پہلی قوموں کا کیا حال ہوا جنہوں نے توحید و رسالت کا اقرار نہیں کیا یعنی ان کا کیا حال ہوا جو گزر گئے اور انہوں نے تیرے رب کے علاوہ معبودوں کی عبادت کی۔ بعض نے فرمایا: اس نے پہلی قوموں کے اعمال کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں شمار کیے گئے ہیں اور اس کے پاس کتاب میں محفوظ ہیں، یعنی وہ اعمال لکھے ہوئے ہیں وہ انہیں عذاب اور جزا دے گا۔ یہاں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ کتاب ہے جو ملائکہ کے پاس ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت اور اس کی مثل دوسری آیات جو گزر چکی ہیں اور جو آگے آئیں گی علوم کو مدون کرنے اور ان کو لکھنے پر دلالت کرتی ہیں تاکہ علوم بھول نہ جائیں کیونکہ کبھی حفظ کو غلطی اور نسیان جیسی آفات لاحق ہو جاتی ہیں اور کبھی انسان اسے یاد نہیں رکھتا جو وہ سنتا ہے تاکہ وہ اسے مقید کرے تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔ ہم نے قتادہ سے متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا ہم تیرے جیسے لوگوں سے جو سنیں اسے لکھ لیں؟ اس نے کہا: تمہیں لکھنے سے کیا مانع ہے جبکہ اللہ تعالیٰ جو لطیف و خبیر ہے اس نے خود خبر دی ہے کہ وہ لکھتا ہے فرمایا: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا فیصلہ فرمایا تو کتاب میں اپنے اوپر لکھا اور وہ اس کے پاس رکھا ہوا ہے کہ میری رحمت، میرے غضب پر غالب ہے''۔ خطیب ابو بکر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک انصاری شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتا تھا وہ حدیث غور سے سنتا تھا اور وہ اسے پسند کرتا تھا اور اسے یاد نہیں کر سکتا تھا اس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت کی عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ سے حدیث سنتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگتی ہے لیکن میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے مدد طلب کرو'' (1) اور آپ نے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔ یہ نص ہے اور علم کے لکھنے اور اس کی تدوین کے جواز پر جمہور صحابہ اور تابعین کا جواز بنے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شاہ کے لیے وہ خطبہ لکھنے کا حکم دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقعہ پر دیا تھا۔ ابو شاہ یمن کا ایک شخص تھا اس نے وہ خطبہ لکھ کر دینے کا سوال کیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''علم کو لکھنے کے ساتھ قید کرو'' (2)۔ معاویہ بن قرہ نے کہا: جو علم لکھتا نہیں اس کا علم، علم شمار نہیں ہوتا۔

بعض علماء علم کو لکھنے سے منع کرتے ہیں۔ ابو نضرہ نے روایت کیا ہے فرمایا: ابو سعید سے پوچھا گیا: کیا ہم تمہاری یہ حدیث لکھیں۔ اس نے کہا: اس کو قرآن نہ بناؤ لیکن یاد کرو جس طرح ہم نے یاد کیا ہے۔ اور جو نہیں لکھتے تھے ان میں شعبی، یونس بن عبید اور خالد حذاء ہیں۔ خالد نے کہا: میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی سوائے ایک حدیث کے جب وہ میں نے یاد کر لی تو وہ

1۔ ترمذی، باب ما جاء فی الرخصۃ فیہ، حدیث نمبر 2590، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ خطیب تقیید العلم، صفحہ 109

میں نے مٹادی۔ ان علماء میں ابن عون اور زہری بھی ہیں۔ بعض لکھتے تھے جب یاد کر لیتے تھے تو اسے مٹا دیتے تھے ان میں سے محمد بن سیرین اور عاصم بن ضمرہ ہیں۔ ہشام بن حسان نے کہا: میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی سوائے حدیث الاعماق کے جب میں نے وہ یاد کر لی تو میں نے اسے مٹا دیا۔

میں کہتا ہوں: ہم نے خالد حذاء سے اس کی مثل ذکر کیا ہے۔ حدیث اعماق کو مسلم نے کتاب کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ ''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ روی اعماق یا دابق میں اتریں گے''۔ اس کو کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے۔ بعض علماء پہلے حدیث یاد کرتے تھے پھر اسے لکھتے تھے ان میں اعمش، عبداللہ بن ادریس اور ہشیم وغیرہم ہیں۔ یہ حفظ پر احتیاط ہے۔ بہر حال لکھنا بہتر ہے۔ اس کے متعلق آیات اور احادیث وارد ہیں اور یہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور بڑے بڑے تابعین سے مروی ہے جیسے حسن، عطا، طاؤس، عروہ بن زبیر اور ان کے بعد والے اہل علم سے بھی یہ مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (الاعراف: 145) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ (الانبیاء) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (الاعراف: 156) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝ (القمر) اور فرمایا: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ان کے علاوہ بھی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ نیز علم کتابت کے ذریعے محفوظ ہوتا ہے، پھر مقابلہ، تکرار، تحفظ، تعہد، مذاکرہ، سوال، ناقلین سے جستجو کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جن علماء نے ابتدائی دور میں لکھنے کو ناپسند کیا تھا وہ عہد کے قرب کی وجہ سے تھا اور اسناد کے قرب کی وجہ سے تھا تا کہ کاتب لکھنے پر اعتماد نہ کرے اور سلسلہ سند اور حفظ اور عمل کو چھوڑ دے اب جبکہ زمانہ بہت دور ہو گیا ہے اسناد غیر متقارب ہیں، طرق مختلف ہو گئے ہیں، نقل کرنے والے متشابہ ہو گئے ہیں، نسیان کی آفت لاحق ہو چکی ہے، وہم سے بھی امن نہیں ہے پس لکھنے کے ساتھ علم کو مقید کرنا اولیٰ اور بہتر ہے اور اس کے وجوب پر دلیل زیادہ قوی ہے۔ اگر کوئی حضرت ابوسعید کی حدیث سے حجت پکڑے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ سے نہ لکھو، جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے''(1)۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متقدم ہے اور کتابت کے امر کے ساتھ منسوخ ہے۔ ابوشاہ کے لیے لکھنے کی اباحت کے ساتھ منسوخ ہے نیز یہ اس لیے فرمایا تھا تا کہ قرآن کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ مل جائے جو قرآن سے نہ ہو۔ اسی طرح حضرت ابوسعید سے بھی مروی ہے: ہم نے خواہش کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لکھنے کی اجازت دیں تو آپ نے ان کار دکیا، اگر یہ محفوظ ہے تو یہ ہجرت سے پہلے کی ہے جب کہ قرآن کو چھوڑ کر حدیث سے مشغول ہونے کا اندیشہ تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابوبکر خطیب نے کہا: مناسب ہے کہ حدیث کالی سیاہی سے لکھی جائے پھر حبر (روشنائی) خاص ہے مداد (سیاہی) نہیں کیونکہ سواد شوخ رنگ ہے اور حبرا سے کافی زمانہ باقی رکھتی ہے۔ سیاہی صاحب علم لوگوں کا آلہ ہے اور اہل

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11085، 11158

معرفت کا ہتھیار ہے۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ذکر کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا کہ مجھے امام شافعی نے دیکھا کہ میں ان کی مجلس میں تھا اور میری قمیص پر سیاہی لگی ہوئی تھی اور میں اسے چھپا رہا تھا۔ امام شافعی نے فرمایا: تو اسے کیوں چھپا رہا ہے؟ کپڑے پر سیاہی مروءت سے ہے کیونکہ اس کی صورت آنکھوں میں سیاہی ہے اور بصائر میں سفیدی ہے۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا: صاحب حدیث کے کپڑے میں سیاہی اس طرح ہے جیسے دلہن کے لباس پر خوشبو ہوتی ہے۔ ابوعبداللہ بلوی نے یہی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

مِدادَ المَحَابر طِیبُ الرجال　　وطِیب النّساء من الزّعفرانْ

فهذا یَلیق بأثواب ذا　　و هذا یلیقُ بثوب الحَصَانْ(1)

ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سلیمان جیسا کہ حکایت کیا گیا ہے نے اپنے کپڑوں پر زردی کا اثر دیکھا اس نے دوات سے کچھ سیاہی لی اور اس پر اسے مل دیا پھر فرمایا: ہمارے لیے سیاہ زعفران سے زیادہ خوبصورت ہے؛ اور شعر کہا:

إنّما الزّعفرانُ عِطرُ العَذَارَی　　ومدادُ الدّوِیّ عِطرُ الرّجالِ

**مسئلہ نمبر 4**۔ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ اس کے مفہوم میں علماء کے پانچ اقوال ہیں:

(۱) یہ نئی کلام ہے اور ان دونوں صفتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی گئی ہے اور کلام فِیْ کِتٰبٍ میں مکمل ہو چکی ہے؛ اسی طرح زجاج نے کہا ہے۔ اور لَا یَضِلُّ کا معنی ہے وہ ہلاک نہیں ہوتا یہ اس قول سے ہے، ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (السجدۃ: 10) کیا جب ہم زمین میں ہلاک ہو جائیں گے۔ وَ لَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ وہ کوئی چیز بھولتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہلاکت اور نسیان سے تنزیہہ بیان کی گئی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لَا یَضِلُّ کا معنی ہے وہ خطا نہیں کرتا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یعنی وہ تدبیر میں خطا نہیں کرتا جس کو اس نے مہلت دی وہ بھی اس نے کسی حکمت کے تحت مہلت دی اور جس کو جلدی پکڑ لیا تو یہ بھی اس کی حکمت کا تقاضا تھا۔ تیسرا قول یہ ہے لَا یَضِلُّ وہ غائب نہیں ہوتا؛ ابن الاعرابی نے کہا: الضلال کی اصل الغیبوبۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: ضلّ الناسی جب کسی سے کسی چیز کا یاد کرنا غائب ہو جائے۔ فرمایا: اس جملہ کا معنی ہے میرے رب سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے یہ بھی زجاج نے کہا اور نحاس نے کہا: یہ معنی میں اس کے مشابہ ہے، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ کتاب کا محتاج نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا علم اور معرفت اس سے غائب نہیں ہوتی اور جو وہ علم رکھتا ہے اسے بھولتا نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول ابن الاعرابی کے قول کے مفہوم کی طرف راجع ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ کتاب کی صفت ہے یعنی وہ کتاب اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہونے والی۔ وَ لَا یَنْسَی یعنی وہ بھولنے والا نہیں۔ یہ دونوں کتاب کی صفت ہیں۔ اس بنا پر کلام متصل ہوگی اور کتاب پر وقف نہ ہوگا۔ عرب کہتے ہیں: ضلّنی الشی جب کوئی چیز نہ پائے۔ أضللته أنا جب میں ایسی جگہ کسی چیز کو چھوڑ دوں کہ پھر میں اسے نہ پاؤں۔ حسن، قتادہ، عیسیٰ بن عمر، ابن محیصن، عاصم

1۔ النطیب، لی الجامع لاخلاق الراوی، جلد 1، صفحہ 386

جحدری اور ابن کثیر نے جو شبل نے اس سے روایت کیا ہے۔ لایضل، یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا رب نہ اسے ضائع کرے گا اور نہ اسے بھولے گا۔ ابن عرفہ نے کہا: عربوں کے نزدیک الضلالہ کا معنی ٹیڑھے راستہ پر چلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل عن الطریق وأضلّ الشی جب کسی چیز کو ضائع کردے اسی سے ہے جنہوں نے لایُضل ربی پڑھا ہے جس کا معنی ہے وہ ضائع نہیں کرے گا؛ یہ عربوں کا مذہب ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝۵۳ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝۵۴ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵

”وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور بنا دیے تمہارے فائدے کے لیے اس میں راستے اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے (شکم زمین سے) جوڑے گوناں گوں نباتات کے۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ، بیشک اس میں (ہماری قدرت وحکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لیے۔ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور (روز حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا، الَّذِیْ، ربی کی نعت کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یعنی لایضل ربی الذی جعل، اور یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِیْ مبتدا محذوف کی خبر ہو یعنی ھو الذی اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو کوفیوں نے یہاں اور سورۃ الزخرف میں مَهْدًا میم کے فتحہ اور ھاء کے اسکان کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مھادا پڑھا ہے۔ ابوعبید اور ابوحاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶ (النباء) کی قرأت پر قراء کا اتفاق ہے۔ نحاس نے کہا: جمع اولیٰ ہے کیونکہ مھد المصدر ہے اور یہ مصدر کی جگہ نہیں بنتی مگر حذف کی تقدیر پر، یعنی ذات مھد۔ مہدوی نے کہا: جس نے مھدا پڑھا ہے جائز ہے۔ کہ یہ مصدر ہو جیسے الفرش یعنی مھد لکم الأرض مھدا اور یہ بھی جائز ہے کہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہو یعنی ذات مھد اور جنہوں نے مھادا پڑھا ہے جائز ہے کہ الفرش کی طرح مفرد ہو اور جائز ہے کہ یہ مھد کی جمع ہو اسماء کے استعمال کی طرح استعمال کیا گیا ہو اور پھر جمع مکسر بنائی گئی ہو اور مھادا کا معنی فراشا اور قرارا ہے جس پر وہ ٹھہرتے ہیں۔ وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا یعنی طرقا اس کی مثال یہ آیت ہے، وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝۱۹ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰ (نوح)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰ (الزخرف)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا آخر ہے۔ پھر فرمایا: فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ بعض نے فرمایا: یہ تمام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ کا مطلب ہے ہم نے کھیتی باڑی اور محنت کے ذریعے نکالا، کیونکہ آسمان سے نازل ہونے والا پانی نباتات کے خروج کا سبب ہے۔ اَزْوَاجًا

کا معنی اقسام ہے، یعنی مختلف قسموں اور رنگوں میں کئی نباتات نکالیں۔ اخفش نے کہا: تقدیر یہ ہے ازواجاً شتی من نباتٍ، فرمایا: کبھی نباتات کی نعت بنانا بھی جائز ہے اور شتی یہ شت الشیٔ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے جدا جدا ہونا۔ کہا جاتا ہے: أمرشت متفرق امر، شت الأمرشتا وشتاتا متفرق ہونا۔ اشتتَّ کا بھی یہی معنی ہے اسی طرح التشتت ہے، شتته، تشتیتا اس نے اس کو متفرق کر دیا۔ أشت بی قومی یعنی میرے معاملہ کو متفرق کر دیا۔ الشتیت کا معنی ہے المتفرق۔ رؤبۃ نے اونٹوں کا وصف بیان کیا ہے:

جَاءَتْ مَعًا واطَّرَقتْ شَتِيتَا　　هي تُثِيرُ السَّاطِعَ السِّخْتِيتَا

ثَغْرٌ شتیتٌ یعنی کھلا۔ قوم شتّی وأشیاء شتّی تو کہتا ہے: جاءوا اشتاتاً، وہ متفرق طور پر آئے۔ اس کا واحد ہے، یہ جوہری کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ امر اباحت کے لیے ہے۔ وَارْعَوْا یہ رعت الماشیة الکلاء رعاها صاحبها رعایةً سے مشتق ہے یعنی مالک نے جانور کو چرایا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى، اولی النھی سے مراد عقلمند لوگ ہیں۔ اس کا واحد نھیة ہے۔ ان کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی رائے تک رو کے جاتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ وہ اپنے نفس کو قبائح سے روکتے ہیں۔ یہ تمام کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے خلاف حجت پیش کرتا ہے کہ صانع موجود ہے جبکہ فرعون نے کہا تھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ اور بیان کیا کہ صانع پر اس کے افعال سے دلیل پکڑی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کیونکہ انہیں زمین سے پیدا کیا گیا تھا۔ ابو اسحاق زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: ہر نطفہ مٹی سے تیار کیا جاتا ہے اس پر قرآن کا ظاہر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس پر اس کی قبر کی مٹی سے مٹی ڈالی جاتی ہے''۔ ابو نعیم الحافظ نے ابن سیرین کے باب میں روایت کی ہے اور فرمایا: یہ حدیث غریب ہے حدیث عون سے، ہم نے اس کو نہیں لکھا مگر ابو عاصم نبیل کی حدیث سے۔ یہ اہل بصرہ سے ثقہ اور عظیم لوگوں میں سے ہے۔ یہ مفہوم سورۃ الانعام میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے واضح طور پر گزر چکا ہے۔ عطا خراسانی نے کہا: جب رحم میں نطفہ واقع ہوتا ہے تو رحم پر متعین فرشتہ جاتا ہے اور اس مکان سے مٹی لیتا ہے جہاں اس نے دفن ہونا ہوتا ہے اور پھر اس نطفہ پر ڈالتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس نطفہ اور مٹی سے اس کو تخلیق فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ حضرت براء کی حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مومن کی روح جب نکلتی ہے تو ملائکہ اسے اوپر لے جاتے ہیں وہ فرشتوں کے جس گروہ سے اس کو گزارتے ہیں وہ کہتے ہیں: یہ کس کی پاکیزہ روح ہے؟ وہ فرشتے کہتے ہیں: فلاں بن فلاں، وہ اس کا خوبصورت نام لیتے ہیں جس کے ساتھ دنیا میں لوگ اسے پکارتے تھے۔ پس وہ اس کے لیے آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں تو دروازہ کھول دیا جاتا ہے پھر ہر آسمان سے مقربین فرشتے اسے اوپر والے آسمان تک الوداع کہتے ہیں حتی کہ وہ فرشتے اسے ساتویں آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے علیین میں

کتاب لکھواور اسے زمین کی طرف لوٹادو میں نے انہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اس میں میں انہیں لوٹاؤں گا اور دوبارہ انہیں اس سے نکالوں گا پھر اس کی روح اس کے جسم کی طرف لوٹادی جاتی ہے"(1) اور حدیث ذکر کی۔ ہم نے یہ حدیث مکمل اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ یعنی موت کے بعد تمہیں لوٹائیں گے۔ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ بعث اور حساب کے لیے زمین سے تمہیں نکالیں گے۔ تَارَةً أُخْرَى یہ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ کی طرف راجع ہے۔ نُعِيدُكُمْ کی طرف راجع نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: اشتريت ناقة ودارا وناقة اخرى مطلب یہ ہے کہ زمین سے ہم نے تمہیں نکالا اور موت کے بعد زمین سے ایک بار پھر نکالیں گے۔

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

''اور ہم نے دکھلادیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کردیا۔ کہنے لگا: موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کی طاقت سے۔ سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی پس (اب) مقرر کرو ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھرے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو۔ آپ نے فرمایا: (تمہارا چیلنج منظور ہے) جس کا دن تمہارے لیے مقرر کرتا ہوں اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہوجائیں۔ پھر فرعون واپس مڑا اور اکٹھا کیا اپنے فریب کاروں کو پھر خود آیا۔ فرمایا ان فرعونیوں کو موسیٰ نے: کم بختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹادے گا کسی عذاب سے اور (اس کا یہ اٹل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افتراء بازی کرتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا، یعنی وہ معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: وہ آیات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی تھیں۔ فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿٥٦﴾ یعنی ایمان نہ لایا۔ یہ دلیل ہے کہ اس نے عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کفر کیا کیونکہ اس نے آیات (معجزات) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے سنائے نہ تھے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے، وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (النمل: 14)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ وہ آیات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 18534

کر آئے اور اس نے انہیں دیکھا تو کہنے لگا: یہ جادو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اس لیے آیا ہے تا کہ لوگوں کو وہم میں ڈالے تو ایسی نشانی لے آیا جو تیری اتباع اور تجھ پر ایمان لانے کا موجب ہے تا کہ تو ہماری زمین پر اور ہم پر غالب آ جائے۔ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ ہم اس کی مثل کے ساتھ تیرا مقابلہ کریں گے جو تو لے کر آیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ جو تو لے کر آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا، مَوْعِدًا مصدر ہے یعنی وعداً۔ بعض نے فرمایا: الموعد وعدہ کی جگہ کا اسم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (الحجر) پس الموعد سے یہاں مکان مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: وعدہ کے زمانہ کا اسم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ (ہود: 81) مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک دن متعین کرو یا مخصوص جگہ کا تعین کرو۔ قشیری نے کہا: اظہر یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اسی وجہ سے فرمایا: لَّا نُخْلِفُهٗ یعنی ہم اس وعدہ سے نہیں پھریں گے۔ الاخلاف کا مطلب ہے کسی سے کام کا وعدہ کرنا اور پھر اسے پورا نہ کرنا۔ جوہری نے کہا: المیعاد کا مطلب الموعدۃ، الوقت اور الموضع ہے، اسی طرح الموعد ہے۔ ابوجعفر ابن قعقاع، شیبہ اور اعرج نے لانخلفہ، اجعل جواب کی وجہ سے جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے تو انہوں نے موعد کی صفت بنایا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: موعوداً غیر مخلف۔

مَكَانًا سُوًى ۝ ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے سُوًى سین کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے عُداً وعِداً طُوًى و طِوًى۔ ابوعبید اور ابوحاتم نے سین کے کسرہ کے ساتھ اختیار کیا ہے کیونکہ یہ لغت عالیہ فصیحہ ہے۔ نحاس نے کہا: کسرہ زیادہ معروف ومشہور ہے۔ تمام نے واؤ کو تنوین دی ہے۔ حسن سے مروی ہے اور ان سے سین کے ضمہ اور بغیر تنوین کے پڑھنے میں اختلاف مروی ہے۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ مکان برابر ہو؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: ایسا ہموار مکان جس میں وہ سب کچھ واضح نظر آئے جو ہم بیان کریں، یہ ابن زید کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی نصف بیان کیا ہے۔ مجاہد نے منصف بیان کیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ سے اس کا معنی عدلاً بیننا وبینك بھی مروی ہے۔ نحاس نے کہا: اہل تفسیر نے سویٰ کا معنی نصف اور عدل بیان کیا ہے؛ یہ حسن قول ہے۔ سیبویہ نے کہا: کہا جاتا ہے: سِوی وسُوی، یعنی عدل (مساوی) یعنی اسی جگہ جو دونوں اطراف کا نصف بنتی ہو۔ اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: جلس فی سواء الدار، وہ گھر کے وسط میں بیٹھا۔ اور ہر چیز کا وسط اس کا نصف ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ: 143) کی تفسیر میں عدلاً مروی ہے (1)۔ زہیر نے کہا:

أَرُونَا خُطَّةً لَاضَيْمَ فِيهَا يُسَوِّي بَيْنَنَا فِيهَا السَّوَاءُ

ابوعبیدہ اور قتبی نے کہا: دونوں فریقوں کے درمیان کی جگہ۔ ابوعبیدہ نے موسیٰ بن جابر حنفی کے لیے یہ شعر کہا:

وَإِنَّ أَبَانَا كَانَ حَلَّ بِبَلْدَةٍ سِوًى بَيْنَ قَيْسٍ قَيْسِ عَيْلَانَ وَالْفِزْرِ

الفزر سے مراد سعد بن زید مناۃ بن تمیم ہے۔ اخفش نے کہا: سوی جب بمعنی غیر یا بمعنی عدل ہو تو اس میں تین لغات

1۔ ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2886

ہوتی ہیں۔ اگر سین کو ضمہ دیا جائے یا کسرہ دیا جائے تو دونوں صورتوں میں قصر کے ساتھ ہوگا اگر سین کو فتحہ دیا جائے تو مد کے ساتھ پڑھا جائے گا تو کہتا ہے: مکان سوی وسوی وسواء یعنی دونوں فریقوں کی درمیانی جگہ۔ موسیٰ بن جابر نے کہا:

وجدنا أبانا كان حلّ ببلدة

بعض نے فرمایا: مکاناً سُوی سے مراد ہموار جگہ ہے۔ اس قول والے نے یہ شعر پڑھا ہے:

لو تمنّتْ حَبِيبَتِي ماعَدَتْنِي وتمنّيتُ ماعدوتُ سِواها

اور تو کہتا ہے: مررت برجل سواك وسُواك وسوائك یعنی غیرك (تیرے سوا) دونوں اس امر میں برابر ہیں۔ اگر تو چاہے تو سواء ان کہے اور جمع کے لیے سواء اور ھم اسواء وھم سواسة جیسے ثمانية بغیر قیاس کے آتا ہے۔ مَكَانًا پر نصب جعل کے مفعول ثانی کی وجہ سے ہے۔ موعد کی وجہ سے اس کو نصب دینا درست نہیں کیونکہ وہ مفعول ہے یا ظرف ہے کیونکہ الموعد سے وصف بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ اسماء جو افعال کے عمل کی طرح عمل کرتے ہیں جب ان کا وصف ذکر کیا جائے یا تصغیر بنائی جائے تو ان کا عمل کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ شبہ فعل سے نکل گئے ہیں اور اس کو اس پر محمول کرنا بہتر نہیں کہ ظرف مفعول ثانی کی جگہ واقع ہوئی ہے، کیونکہ موعد کے بعد جب ظرف واقع ہو تو عرب ظروف کے ساتھ مصادر کے قائم مقام نہیں کرتے بلکہ وہ اس میں وسعت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ (ہود: 81) مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ۔ یوم الزینة کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ عید کا دن تھا اس میں وہ زینت اختیار کرتے تھے اور جمع ہوتے تھے؛ یہ قتادہ اور سدی وغیرہما کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعد بن جبیر نے فرمایا: یہ عاشوراء کا دن تھا۔ سعید بن مسیب نے کہا: بازار کا دن مراد ہے جس میں وہ زیب وزینت کرتے تھے؛ یہ بھی قتادہ کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ ہفتہ کا دن ہے۔ بعض نے کہا: نیروز کا دن ہے؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ وہ دن ہے جس میں خلیج ٹوٹتی تھی یہ اس لیے کہ اس میں وہ باہر نکلتے تھے اور سیر وسیاحت کرتے تھے۔ اس وقت نیل کی طرف سے مصر کے شہر امن میں ہوتے تھے۔ حسن، اعمش، عیسیٰ ثقفی، سلمی اور ہبیرہ نے حفص سے یومَ الزینة پڑھنا روایت کیا ہے۔ یوم الزینة نصب کے ساتھ ہے۔ ابو عمرو سے روایت کیا گیا ہے کہ زینت کے دن میں ہمارے وعدہ کو پورا ہونا ہے۔ باقی قراء نے مبتدا کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى یعنی لوگوں کا جمع ہونا چاشت کے وقت ہوگا۔ انْ، ان لوگوں کی قرات پر محل رفع ہوگا جنہوں نے یوم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَنْ يُّحْشَرَ کا عطف رفع کی قرأت کو تقویت دیتا ہے، کیونکہ اَن ظرف نہیں ہوتا اگرچہ مصدر صریح ظرف ہوتا ہے، جیسے مقدم الحاج کیونکہ جنہوں نے کہا: آتيك مقدم الحاج اس نے آتيك أن يقدم الحاج نہیں کہا۔ نحاس نے کہا: اس سے بہتر یہ ہے کہ الزینة پر عطف کی بناء پر محل جر میں ہو۔ الضحی مونث ہے عرب بغیر ھا کے اس کی تصغیر کرتے ہیں تا کہ اس کی تصغیر ضحوة کی تصغیر کے مشابہ نہ ہو جائے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ضحوة النهار، سورج کے طلوع ہونے کے بعد کا وقت ہے پھر اس کے بعد الضحا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب سورج چمکتا ہے۔ مقصود ہے مونث اور مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اور جنہوں نے اس کو مونث بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ ضحوة

کی جمع ہے اور جنہوں نے اسے مذکر بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ فُعَلُ کے وزن پر اسم ہے جیسے صُرَد اور نُغَر یہ سحر کی طرح ظرف غیر متمکن اسم ہے۔ تو کہتا ہے: لقیتہ ضحاً وضُحا۔ تو، ضحا سے مراد پورا دن لے گا تو اس کو مؤنث نہیں بنائے گا۔ پھر اس کے بعد الضحاء کو ممدود مذکر ذکر کیا ہے۔ اور یہ سورج کا اچھی طرح بلند ہونے کا وقت ہے۔ الضحاء کو خاص کیا ہے کیونکہ یہ دن کا آغاز ہوگا۔ اگر معاملہ ان کے درمیان ہو تو دن میں وسعت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور جحدری وغیرہما سے مروی ہے: وَ اَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا۔ بعض قراء سے مروی ہے: وان تحشر الناس، اس کا معنی ہوگا اے فرعون! تو لوگوں کو جمع کرے گا۔ جحدری سے مروی ہے: وان نحشر نون کے ساتھ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اس دن کا وعدہ کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے دین کا ظہور ہو اور کافر نامراد ہو اور اس پر عام باطل بھاگ جائے۔ اور پھر مجمع میں باطل کی رسوائی ہو تا کہ حق میں رغبت کرنے والے کی رغبت میں تقویت ہو اور باطل گروہ عاجز آجائے اور اس امر کو ہر دیہات اور شہروں میں بیان کرنے والے زیادہ ہوں اور تمام لوگوں میں حق پھیل جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ، کید سے مراد حیلہ اور جادو ہے مراد جادوگروں کو جمع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بہتر جادوگر تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ رسیاں اور لاٹھیاں تھیں۔ بعض نے کہا: وہ چار سو تھے۔ بعض نے کہا: وہ بارہ ہزار تھے۔ بعض نے کہا: وہ چودہ ہزار تھے۔ ابن المنکدر نے کہا: وہ اسی ہزار تھے۔ بعض نے کہا: وہ ایک رئیس کے ماتحت تھے جس کو شمعون کہا جاتا تھا۔ بعض نے کہا: اس کا نام یوحنا تھا اس کے ساتھ بارہ نقیب تھے ہر نقیب کے ساتھ بیس عریف (رہبر) تھے اور ہر عریف کے ساتھ ہزار جادوگر تھے۔ بعض نے کہا: وہ تین لاکھ جادوگر فیوم سے تھے تین لاکھ صعید سے تھے اور تین لاکھ ریف سے تھے وہ کل نو لاکھ تھے اور ان کا رئیس اندھا تھا۔ ثُمَّ اَتٰى ۝ یعنی وقت مقررہ پر آیا۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور جادوگروں سے کہا: وَيْلَكُمْ یہ ان پر ہلاکت کی بددعا ہے۔ یہ بمعنی مصدر ہے ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ منصوب ہے بمعنی الزمهم الله ويلاً الله ان پر ہلاکت کو لازم کرے۔ فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ندا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا (یٰسین: 52)

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا یعنی تم اس پر جھوٹ مت گھڑو اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور معجزت کو جادو نہ کہو۔ فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ورنہ وہ تمہیں ہلاک کر کے نیست و نابود کر دے گا۔ کہا جاتا ہے: سحت، أسحت دونوں کا معنی ایک ہے اس کی اصل بالوں کو مونڈ دینا ہے۔ کوفیوں نے فیسحتکم، أسحت سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے سحت سے مشتق کر کے فیسحتکم پڑھا ہے۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور پہلی بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور نصب نہی کے جواب کی بنا پر ہے۔

فرزدق نے کہا:

عَضُّ زمانٍ یابنَ مَرْوانَ لم یَدَعْ    من المالِ اِلَّا مُسْحَتًا او مُجَلَّفُ

زمخشری نے کہا: یہ وہ بیت ہے ہمیشہ قافلہ علماء اس کے اعراب کے درست کرنے میں گھٹنے رگڑتا رہا۔

وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا ہے جس کی اس نے اجازت

نہیں دی وہ رحمت اور ثواب سے خسارے میں ہے۔

فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَیْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

''پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے: بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹا دیں تمہاری (تہذیب وثقافت کے) مثالی طریقوں کو۔ پس یکجا کرلو اپنی حیلہ سازیوں کو پھر آؤ پرے باندھے ہوئے اور کامیاب ہوگا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ یعنی جادوگروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ چھپ چھپ کر مشورہ کرنے لگے۔ قَالُوْۤا انہوں نے کہا: اگر وہ جو لے کر آئے ہیں جادو ہوگا تو ہم غالب آجائیں گے اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام ہوگا تو اس کا امر غالب آجائے گا یہ انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے یہ سرگوشی کی تھی اگر وہ ہم پر غالب آگیا تو ہم اس کی اتباع کریں گے، یہ کلبی کا قول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نیکوکاروں کا معاملہ ہی بالآخر غالب آتا ہے۔ بعض نے کہا: ان کا سرگوشی کرنا یہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: وَیْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا تو انہوں نے کہا: یہ جادوگر کا قول نہیں ہے۔ النجویٰ سرگوشی کرنا یہ اسم اور مصدر ہوتا ہے۔ سورۃ النساء میں اس کا بیان آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ ابوعمرو نے انّ ھذین لساحران پڑھا ہے۔ حضرت عثمان، حضرت عائشہ وغیرہما رضی اللہ عنہم صحابہ سے یہ مروی ہے۔ اسی طرح حسن، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی وغیرہم نے بھی پڑھا ہے۔ قراء میں سے عیسیٰ بن عمر، عاصم جحدری نے اسی طرح پڑھا ہے جیسا کہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ یہ قرأت اعراب کے موافق ہے اور مصحف کے مخالف ہے۔ زہری، خلیل بن احمد، مفضل، ابان، ابن محیصن، ابن کثیر اور عاصم نے ایک روایت میں پڑھا ہے: حفص نے بھی اِن ھذان ان کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر ھذان کی نون کو شد سے پڑھتے تھے۔ یہ قرأت مصحف کی مخالفت سے سلامت ہے اور اعراب کے فساد سے سلامت ہے۔ اس کا معنی ہے ماھذان اِلا ساحران۔ مدنی اور کوفی قراء نے انّ ھذان، انّ کو شد کے ساتھ اور لساحران پڑھا ہے۔ انہوں نے مصحف کی موافقت کی اور اعراب کی مخالفت کی۔ نحاس نے کہا: یہ تین قرأتیں ہیں۔ ائمہ کی ایک جماعت نے ان کو روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے اِنْ ھذان اِلا ساحران پڑھا ہے۔ کسائی نے حضرت عبداللہ کی قرأت میں ان ھذان ساحران بغیر لام کے کہا ہے۔ فراء نے حضرت ابی کی قرأت میں اِن ذان اِلا ساحران کہا ہے۔ یہ مزید تین قرأتیں ہیں۔ یہ تفسیر پر محمول ہوں گی ان کے ساتھ قرآن کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: اہل مدینہ اور کوفہ کی قرأت میں، مہدوی نے اپنی تفسیر میں اور ان کے علاوہ علماء نے ان کے کلام کے بعض کو بعض میں داخل کر دیا اور ایک قوم نے اس میں خطا کی حتیٰ کہ ابو عمر نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں کہ میں ان ھذان

پڑھوں، عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ان سے لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (النساء:162) کے متعلق پوچھا گیا پھر المقیمین اور سورہ مائدہ میں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِــُٔوْنَ (المائدہ:69) کے متعلق پوچھا اور اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ کے متعلق پوچھا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے میرے بھانجے! یہ کاتب کی خطا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: مصحف میں غلطی ہے۔ عرب اپنی زبان کے ساتھ اس کو ٹھیک کرلیں گے ☆۔ حضرت ابان ابن عثمان نے کہا: میں نے یہ آیت اپنے باپ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سامنے تلاوت کی تو انہوں نے فرمایا یہ لحن اور خطا ہے۔ کسی نے ان سے کہا: کیا تم لوگ اسے تبدیل نہیں کرو گے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کو چھوڑو کیونکہ یہ نہ حلال کو حرام کرتا ہے اور نہ حرام کو حلال کرتا ہے۔ پہلا قول چھ اقوال میں سے ہے یہ بنی حرب بن کعب، زبیر بن خثعم کی لغت ہے اور کنانہ بن زید تثنیہ کا رفع، نصب اور حرف الف کے ساتھ پڑھتے ہیں کہتے ہیں۔ جاء الزیدان، رأیت الزیدان، مررت بالزیدان، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ (یونس:16) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے بنی اسد کے ایک شخص کا شعر پڑھا اور کہا: میں نے اس سے افصح نہیں دیکھا:

فَأطرقَ إطراقَ الشُّجَاعِ لو يَرَىٰ مَساغاً لِنَابَاهُ الشُّجَاعُ لَصَمَّمَا

اور وہ کہتے ہیں: کسرت یداہ و رکبت علاہ بمعنی یدیہ وعلیہ، ان کے شاعر نے کہا:

تَزَوَّدَمِنا بين أُذْنَاه ضَرْبَةً دعته إلى هابِي التُّرابِ عَقِيم

محل استدلال ''بین اذناہ'' ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

إنَّ أَبَاهَا وَأَبَا أباهَا قد بَلَغَا في المجْدِ غايتاها

یعنی إن أبا أبيها وغايتيها۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ قول ان تمام اقوال سے عمدہ ہے جن پر آیت کو محمول کیا گیا ہے جب کہ یہ لغت معروف ہے اس کو اس نے حکایت کیا ہے جن کے علم اور امانت کو پسند کیا گیا ہے۔ ان میں سے ابوزید انصاری ہے وہ کہتا ہے: جب سیبویہ کہے: حدثنی من أثق بہ تو اس سے مراد میری ذات ہوتی ہے۔ ابو الخطاب اخفش یہ لغت کے ائمہ کا سردار ہے، کسائی اور فراء تمام کہتے ہیں کہ یہ بنی حرث بن کعب کی لغت ہے۔ ابو عبیدہ نے ابو الخطاب سے حکایت کیا ہے کہ یہ بنی کنانہ کی لغت ہے۔ مہدوی نے کہا: ان کے علاوہ نے حکایت کیا ہے کہ یہ خثعم قبیلہ کی لغت ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جو کچھ سیبویہ کے قول میں کہا گیا اس میں سے واضح ہے جان لے کہ جب تو واحد کا تثنیہ بنائے گا تو تو اس پر دو چیزیں زائد کرے گا ایک یہ کہ حرف مد اور لین اور وہ اعراب کا حرف ہے۔ ابو جعفر نے کہا: سیبویہ کا قول کہ وہ اعراب کا حرف ہے یہ ثابت کرتا ہے کہ اصل تبدیل نہیں ہوتی۔ پس ان ھذان اپنی اصل پر آیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ (المجادلہ:19) استحاذ نہیں فرمایا یہ اس طرح اس لیے آیا ہے تا کہ اصل پر دلالت کرے اسی

☆ اس قسم کے اقوال کا جلیل القدر صحابہ کرام کی طرف منسوب ہونا محل نظر ہے جن جلیل القدر صحابہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ لغت میں مہارت تامہ رکھتے تھے حضرت مفسر نے کئی مقامات پر اس پر گفتگو کی ہے اور ایسی روایات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا امام قشیری نے فرمایا ایسا مسلک اپنانا باطل ہے۔

طرح ان هذان جو اس لغت کا انکار کرے اس کے انکار میں غور نہیں کیا جائے گا کیونکہ آئمہ نحو نے اس کو روایت کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں انّ بمعنی نعم (ہاں) ہے جیسا کہ کسائی نے عاصم سے روایت کیا ہے، فرمایا: عرب انّ بمعنی نعم ذکر کرتے ہیں۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ انّ بمعنی اجل بھی آتا ہے۔ اس قول کا نظریہ محمد بن یزید اور اسماعیل بن اسحاق قاضی کا ہے۔ نحاس نے کہا میں نے ابو اسحاق زجاج اور علی بن سلیمان کو یہ قول کرتے ہوئے سنا۔ ابو اسحاق نحاس نے اس پر تعجب کیا۔ علی بن سلیمان نے ہمیں بیان کیا اور انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن احمد بن عبدالسلام نیشاپوری نے ہمیں بیان کیا پھر میں عبداللہ بن احمد سے ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے عمیر بن متوکل نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن موسیٰ نوفلی نے بتایا جو حرث بن عبداللہ کی اولاد سے تھے فرمایا ہمیں عمر بن جمی کوفی نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے علی سے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے باپ حضرت علی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں شمار ہی نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ منبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: إن الحمدُ للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ پھر فرماتے: میں تمام قریش سے زیادہ فصیح ہوں اور میرے بعد ابان بن سعید بن عاص افصح ہوگا۔ ابو محمد خفاف نے کہا: عمیر نے کہا اس کا اعراب اہل لغت کے نزدیک إن الحمد للہ نصب کے ساتھ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ کیا نعم الحمد للہ۔ یہ اس طرح ہے کہ عرب اپنے خطبات نعم کے معنی استعمال کر کے آغاز کرتے تھے۔ شاعر نے نعم کے معنی میں اس کو استعمال کیا ہے:

قالوا غَدَرْتَ فقلتُ إنّ و رُبَّمَا نَالَ العُلَا وَشَفَى الغَلِيلَ الغادِرُ

محل استدلال انّ و ربما ہے۔ عبداللہ بن قیس نے کہا:

بَكَرَ العواذِلُ فی الصِّبا حِ يَلُمْنَنِي و أَلُومُهُنَّهْ
ويَقُلْنَ شَيْبٌ قد عَلَا كَ وقد كَبِرْتَ فقلتُ إِنَّهْ

محل استدلال ''انه'' ہے۔ اس بناء پر إِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ میں انّ بمعنی نعم جائز ہے۔ اور اس پر نصب نہیں دی۔ نحاس نے کہا: داؤد بن ہشیم نے شعر پڑھا اور ثعلب نے مجھے یہ شعر سنایا:

ليت شعری هل للمحبِّ شفاء من جَوَى حبهن إنّ اللقاءُ

محل استدلال ''ان اللقاء'' ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول عمدہ ہے مگر اس میں کچھ کمزوری ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: نعم زید خارج یہاں اللام واقع نہیں ہوتا اگرچہ نحویوں نے اس کے بارے کلام کی ہے اور انہوں نے کہا: اللام سے تقدیم کی نیت کی گئی ہے، جیسے کہا جاتا ہے:

خالِی لأنتَ ومَنْ جريرٌ خالُه يَنَلِ العَلاءَ ويُكْرِمِ الأخوالا

ایک اور شاعر نے کہا:

أُمُّ الحُلَيْسِ لَعَجوزٌ شَهْرَبَهْ تَرْضَى من الشَّاةِ بعظمِ الرَّقَبَهْ

یعنی لغانی ولام الحلیس؛ زجاج نے کہا: مطلب یہ ہے کہ آیت میں معنی یہ ہے إن هذان لهما ساحران پھر مبتدا کو حذف کیا گیا۔ مہدوی نے کہا: ابوعلی اور ابوالفتح جنی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابوالفتح نے کہا: هما حذف نہیں کیا جاتا مگر معروف ہونے کے بعد۔ جب معروف ہو تو اس کی معرفت کی وجہ سے لام کے ساتھ تاکید ذکر نہیں کی جاتی اور یہ قبیح ہے کہ مؤکَد کو حذف کیا جائے اور مؤکِد کو باقی رکھا جائے۔

تیسرا قول بھی فراء کا ہے کہتے ہیں: الف ستون ہے فعل کا لام کلمہ نہیں ہے میں نے اس پر نون زیادہ کیا ہے اور میں نے اس پر تبدیلی نہیں کی جیسے تو کہتا ہے: الذی پھر تو اس پر نون زیادہ کرتا ہے اور تو کہتا ہے: جاءنی الذین عندك و رأیت الذین عندك و مررت بالذین عندك۔

چوتھا قول یہ ہے جو بعض کوفیوں نے کہا ہے انہوں نے کہا: هذان میں الف یفعلان میں الف کے مشابہ ہے پس تبدیل نہیں ہوا۔

پانچواں قول ابواسحاق کا ہے انہوں نے کہا: قد ماء نحوی کہتے ہیں یہاں هاء مضمرہ ہے معنی یہ ہے انه هذان لساحران۔ ابن انباری نے کہا: هاء مضمرہ ہے جو منصوب ہے اور هذان، انّ کی خبر ہے اور ساحران کو رفع هما مضمر کی وجہ سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے انه هذان لهما ساحران۔ اس جواب والوں کے نزدیک اثبت یہ ہے کہ هاء ان کا اسم ہو اور هذان مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔

چھٹا قول یہ ہے ابوجعفر نحاس نے کہا: میں نے ابوالحسن بن کیسان سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا اگر تو چاہے تو میں تجھے نحویوں کے جواب کے ساتھ جواب دوں اگر تو چاہے تو میں تجھے اپنے قول کے ساتھ جواب دوں۔ میں نے کہا: اپنے قول کے ساتھ جواب دو، انہوں نے کہا: اسماعیل بن اسحاق نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا: میرے نزدیک قول یہ ہے کہ جب کہا جاتا ہے: هذا محل رفع، نصب اور جر میں ایک حالت پر ہوتا ہے اور تثنیہ میں واجب ہے کہ اس کا واحد تبدیل نہ ہو تثنیہ واحد کے قائم مقام ہو اور فرمایا: کیا اچھا ہوتا کہ تجھے پہلے کسی نے یہ قول کیا ہوتا تاکہ اس سے مانوس ہوا جاتا۔ ابن کیسان نے کہا: میں نے اسے کہا قاضی نے کہا ہے حتی کہ اس کو پسند کیا گیا ہے تو انہوں نے تبسم فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی ﴿۶۳﴾ یہ فرعون کے جادوگروں کو کہا یعنی ان دونوں حضرات کی غرض تمہارے اس دین کو خراب کرنا ہے جس پر تم ہو جیسا کہ فرعون نے کہا: اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ (غافر) کہا جاتا ہے: فلان حسن الطریقه یعنی فلاں عمدہ مذہب والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: طریقة القوم سے مراد فضل القول ہے۔ یہ وہ ہے کہ مناسب ہے کہ وہ اس کے طریقوں پر چلیں اور اس کی اقتدا کریں معنی یہ ہے کہ وہ تمہارے سرداروں اور تمہارے رؤوسا کو مائل کرتے ہوئے لے جائیں یا معنی ہو کہ وہ بنی اسرائیل کو لے جائیں ان سے مراد اماثل ہیں اگرچہ وہ تمہارے نوکر تھے، کیونکہ ان کا شجرہ نسب انبیاء کی طرف لوٹتا تھا یا یہ معنی کہ وہ یذهبا باهل طریقتکم یعنی اہل مضاف محذوف ہے۔ المثلی یہ الامثل کی تانیث ہے، جیسے کہا جاتا

ہے: الافضل والفضلی، طریقۃ کو لفظ کی بنا پر مونث ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس سے مراد مرد ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ تانیث، جماعت کے معنی کی بنا پر ہو۔ کسائی نے کہا: بِطَرِيْقَتِكُمُ سے مراد تمہاری سنت اور تمہارا چال چلن ہے۔ الْمُثْلٰى ۞ لغت ہے جیسے تیرا قول ہے: امرأۃ کبریٰ، عرب کہتے ہیں: فلان علی الطریقة المثلی، یعنی وہ ہدایت مستقیم پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ الاجماع کا معنی کسی چیز کا پختہ عزم کرنا ہے تو کہتا ہے: أجمعت الخروج یعنی تو نے نکل جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ تمام علماء کی قرأت فأجمعوا ہے سوائے ابوعمرو کے انہوں نے فاجمعوا ہمزہ وصلی کے ساتھ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۞ سے حجت پکڑی ہے۔ نحاس نے کہا: میرے لیے محمد بن یزید سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: ابوعمرو پر واجب ہے کہ وہ اپنی اس قرأت کے خلاف پڑھیں اور وہ وہ قراءت ہے جس پر اکثر لوگوں کا اتفاق ہے۔ فرمایا: انہوں نے فجمع سے حجت پکڑی ہے یہ تو ثابت ہے پس اس کے بعد فاجمعوا ہونا بعید ہے۔ اور اس کے بعد اجمعوا ہونا قریب ہے، یعنی عزم کرو اور سنجیدگی اختیار کرو۔ جو کچھ پہلے گزر چکا ہے واجب ہے کہ یہ اس کے معنی کے خلاف ہو۔ کہا جاتا ہے: امر مجمع و مجمع علیه۔ اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ابوعمرو کی قرات فاجمعوا صحیح ہے، یعنی اجمعوا کل کید لکم وکل حیلة فضموہ مع أخیه۔ یہ قول ابواسحاق کا ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہمزہ قطعی اور میم کے کسرہ کی قرأت کی دو وجہیں ہیں۔ (۱) بمعنی الجمع تو کہتا ہے: أجمعت الشیٔ وجمعتهٗ دونوں ہم معنی ہیں۔ صحاح میں ہے: أجمعت الشیٔ تو نے کسی چیز کو جمع کر دیا۔ ابوذویب اپنے گدھوں کی تعریف کرتا ہے:

فكأنها بالجزعِ بَيْنَ نُبَايِعٍ وأولاتِ ذی العَرْجاءِ نَهْبٌ مُجمَعُ

اس شعر میں مجمع بمعنی مجموع ہے۔ اور اس کا دوسرا معنی عزم اور احکام ہے، شاعر نے کہا:

ياليت شِعرِی والمُنَی لاتَنفعُ هل أغدُوَن یوماً وأمرِی مُجمَعُ

اس شعر میں مجمع بمعنی محکم ہے۔ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا مقاتل اور کلبی نے صفاً کا معنی جمیعاً کیا ہے۔ بعض نے صفوفاً کہا ہے تاکہ تمہاری ہیبت شدید ہو۔ صفاً ابوعبیدہ کے قول پر اس لیے منصوب ہے کہ اس پر فعل واقع ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے: أتیت الصف بمعنی میں مسجد میں آیا۔ ابوعبیدہ کے نزدیک اس کا مطلب ہے تم ایسی جگہ پر آؤ جہاں عید کے دن جمع ہوتے ہو۔ بعض فصحاء عرب سے حکایت ہے: ماقدرت أن آتی الصف (مجھے مسجد میں آنے کی قدرت نہ ہوئی) زجاج نے کہا: یہ معنی بھی جائز ہے پھر تم آؤ جبکہ لوگ صفوں میں ہوں۔ اس صورت میں صفاً مصدر حال واقع ہو رہا ہوگا اسی وجہ سے اس کی جمع نہیں بنائی گئی۔ ثم إیتوا صفا بھی پڑھا گیا ہے۔ میم کے کسرہ اور یاء کے ساتھ۔ اور جس نے ہمزہ کو ترک کیا تو اس نے ہمزہ سے الف بنا دیا۔ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۞، یعنی غالب آیا۔ یہ تمام گفتگو جادوگروں نے ایک دوسرے کے ساتھ کی۔ بعض نے کہا: یہ فرعون نے جادوگروں سے کہا تھا۔

**قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۞ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۞ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً**

مُوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ
اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰى ۝ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا
قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ
لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ
لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ٘ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝

''جادوگر بولے: اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہی ہو جائیں پہلے پھینکنے والے۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم ہی پہلے پھینکو، پھر کیا تھا یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا: (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نگل جائے گا جو انہوں نے کاریگری کی ہے، انہوں نے جو کاریگری کی ہے وہ فقط جادوگر کا فریب ہے اور نہیں فلاح پاتا جادوگر جہاں بھی جائے۔ پس گرا دیئے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے، انہوں نے (برملا) کہہ دیا: (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر۔ فرعون (کو یارائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کا فن) تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر اور تم خوب جان لو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیرپا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اس سے مراد جادوگر ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی۔ اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ یعنی تم اپنا عصا پھینکو گے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جادوگروں نے ادب کا مظاہرہ کیا یہی ان کا ادب واحترام ان کے ایمان کا سبب بنا۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ کلام میں حذف ہے یعنی فالقوا (انہوں نے ڈالا) حذف ہے اس پر معنی دلالت کر رہا ہے۔ حسن نے عصیھم کو عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون قاری نے کہا: بنی تمیم کی لغت عُصیھم ہے۔ حسن اس کے مطابق پڑھتے تھے۔ باقی قراء نے صاد کے کسرہ کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح دُلِیّ و دِلِیّ اور قُسِیّ و قِسِیّ ہے۔

یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو حیوہ، ابن ذکوان اور روح نے یعقوب سے روایت کر کے تُخَیَّلُ تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے ضمیر عصی اور الحبال کی طرف لوٹائی ہے چونکہ وہ مونث ہیں اس لیے مونث کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ انہوں نے لاٹھیوں کو پارہ کے ساتھ لت پت کیا ہوا تھا۔ جب انہیں سورج کی دھوپ لگی تو وہ

حرکت کرنے لگیں۔ کلبی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خیال کیا کہ زمین سانپوں والی ہے وہ اس کے بطن میں دوڑ رہے ہیں اور تخییل بمعنی تتخیل بھی پڑھا ہے۔ اس کا طریق بھی تخیل والا طریق ہے۔ اور جنہوں نے یخیل یاء کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس کا مرجع الکید کو بنایا ہے۔ نخیل نون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ آزمائش اور محنت کے لیے خیال پیدا کرنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا فاعل اَنَّهَا تَسْعٰى ہے اور ان محل رفع میں ہے یعنی یخیل الیه سعیها۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ ان محل نصب میں ہے یعنی بأنها پھر با کو حذف کیا گیا۔ پہلی صورت میں معنی ہوگا ان کے جادو اور مکر کی وجہ سے انہیں اشتباہ ہوگیا حتی کہ انہوں نے گمان کیا وہ دوڑ رہی ہیں۔ زجاج نے کہا: جس نے تا کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے انّ کو محل نصب میں بنایا یعنی تخیل الیه ذات سعی انہیں دوڑنے والی چیز معلوم ہوئی۔ فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ تخیل میں جو ضمیر ہے اس پر انّ بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو، جو ضمیر الحبال اور العصی کی طرف لوٹ رہی ہے، اس صورت میں بدل اشتمال ہوگا۔ تسعی بمعنی تمشی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾، او جس بمعنی أضمر ہے دل میں محسوس کیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی پاتا ہے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی محسوس کرتا ہے، یعنی سانپوں سے کچھ خوف محسوس کیا یہ وہی ہے جو طبع بشری کو خوف لاحق ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ آپ کے عصا پھینکنے سے پہلے لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ بعض نے کہا: آپ کو خوف ہوا جب عصا ڈالنے کی وحی میں تاخیر ہوئی کہ لوگ اس سے پہلے جدا ہو جائیں گے اور فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بعض اہل الحقائق نے کہا: اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جادوگروں سے ملے اور آپ نے انہیں فرمایا: (کمبختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹادے گا کسی عذاب سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام متوجہ ہوئے تو جبریل آپ کی دائیں طرف کھڑے تھے تو جبریل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! اللہ کے دوستوں کے ساتھ نرمی کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے جبریل! یہ جادوگر ہیں بڑا جادو لے کر آئے ہیں تا کہ معجزہ کو باطل کریں اور فرعون کے دین کی مدد کریں اور اللہ کے دین کا رد کریں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے نرمی کرو، جبریل نے کہا: یہ اس وقت سے لے کر عصر تک تمہارے پاس ہیں عصر کے بعد یہ جنت میں ہوں گے جب جبریل نے یہ کہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف محسوس ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطرہ لاحق ہوا کہ میرے بارے میں اللہ کا جو علم ہے اس کا مجھے علم نہیں شاید میں اب ایک حالت میں ہوں اور اللہ تعالیٰ کا علم میرے بارے میں اس حالت کے خلاف ہو جیسا کہ یہ لوگ تھے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خوف کو جان لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ یعنی تم ہی دنیا میں ان پر غالب ہوگے اور جنت میں بلند درجات پر ہو گے۔ اس نبوت واصطفا کے مقام کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا۔ خیفة کی اصل خِوْفة ہے۔ خا کے کسرہ کی وجہ سے واؤ یا سے بدل گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا یہ نہیں فرمایا کہ اپنا عصا ڈالو، یہ جائز ہے انکی رسیوں کی

حقارت کے لیے ہو یعنی ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی پروانہ کرو۔ تم وہ ایک چھوٹی سی لکڑی ڈالو جو تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ ایک ان تمام کو نگل جائے گی، وہ چھوٹی سی لکڑی ان تمام بڑی لکڑیوں کو کھا جائے گی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ان کی تعظیم کے لیے ہو یعنی ان بڑے بڑے جسموں والی لکڑیوں کی پروانہ کرو کیونکہ جو چیز تمہارے ہاتھ میں ہے وہ ان تمام سے بڑی ہے۔ یہ کثرت کے باوجود اس کے سامنے کم ہیں۔ پس آپ اسے ڈالیں اللہ کے اذن سے تمام کو نگل جائے گا اور مٹا دے گا۔ تَلْقَفْ جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے گویا فرمایا: اگر تو اسے پھینکے گا تو وہ انہیں نگل جائے گا۔ سلمی اور حفص نے تلقف لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ لقف یلقف لقفاً سے مشتق ہے۔ ابن ذکوان، ابوحیوہ شامی، یحییٰ بن حرث نے تلقف تا کے حذف اور فاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ بایں معنی کہ فانها تتلقف۔ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ بعض نے کہا: عصا کے لیے ہے۔ اللقف کا معنی تیزی سے پکڑ لینا ہے۔ کہا جاتا ہے: لقفت الشیٔ، قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ لقفه لقفا، تلقفته، یعنی جلدی کے ساتھ اس نے اسے پکڑ لیا۔ یعقوب سے مروی ہے کہا جاتا ہے: رجل لقف ثقف، یعنی چالاک اور دانشمند آدمی۔ اللقف حرکت کے ساتھ دیوار کا گرنا۔ لقد لقف الحوض لقفاً یعنی نیچے سے کھل گیا۔ تلقف وتلقم وتلهم تمام کا معنی ایک ہی ہے؛ یہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ لقمت اللقمة لقماً وتلقمتها اس کا معنی ہے لقمہ کو آسانی سے نگل لیا۔ اسی طرح لهمه (ہاء کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی نگل جانا ہے۔ مَا صَنَعُوْا یعنی جو انہوں نے کیا اسی طرح اِنَّمَا صَنَعُوْا یعنی إن الذی صنعوہ، کید رفع کے ساتھ ہے (سحر) سین کے کسرہ اور حاء کے سکون کے ساتھ۔ یہ عصام کے سوا کوفیوں کی قرأت ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ کید، السحر کی طرف مضاف ہو، اتباع کی بنا پر حذف کی تقدیر کے بغیر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام میں حذف ہو یعنی کید ذی سحر، باقی قراء نے کیدَ، نصب کے ساتھ اس پر صنع کے وقوع کے ساتھ۔ ما کافہ ہے۔ ساحر میں اضافت کی وجہ سے ضمیر مضمر نہ ہوگی۔ الکید اس قرأت پر حقیقت میں ساحر کے لیے مضاف ہے سحر کے لیے نہیں۔ ان کا فتحہ جائز ہے اس معنی پر لانّ ماصنعوا کید ساحر کہ جو انہوں نے کیا وہ جادوگر کا مکر وفریب ہے۔ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى یعنی زمین کی کسی جہت سے آئے جادوگر کامیاب نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا: جہاں حیلہ کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ساحر کا حکم اور سحر کا معنی گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا، جب انہوں نے عصا میں عظیم امر اور خارق لاعادت امر دیکھا تو وہ سجدہ میں گر گئے اس عصا نے رسیوں اور لاٹھیوں کے ذریعے جو مکر وفریب کیا تھا سب کو نگل لیا۔ وہ بوجھ جو رسیوں اور لاٹھیوں کا تھا تین سو اونٹ کا تھا، پھر ایک عصا رہ گیا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ رسیاں اور لاٹھیاں کہاں ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یہ مفہوم اور عصا کا مسئلہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ، له بمعنی به ہے۔ کہا جاتا ہے: آمن له وآمن به، اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (العنکبوت: 26) اور سورۃ الاعراف آیت 123 میں ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ، فرعون کی طرف سے جادوگروں پر انکار ہے یعنی تم نے تجاوز کیا اور تم نے وہ کیا جس کا میں نے حکم نہیں دیا ہے۔ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ یعنی تعلیم میں جو تمہارا رئیس ہے۔ وہ تم پر غالب آ گیا کیونکہ وہ

جادوگری میں تم سے زیادہ ماہر تھا۔ فرعون نے اپنے اس قول سے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں میں اشتباہ پیدا کر دے تا کہ لوگ ان کی اتباع نہ کریں اور ان کی طرح لوگ بھی ایمان نہ لے آئیں ورنہ فرعون جان چکا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کچھ نہیں سیکھا ہے بلکہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے اور ان کی ولادت ہونے سے پہلے جادو جانتے تھے۔ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ، یعنی علی جذوع النخل، سوید بن ابی کاہل نے کہا:

هُمْ صَلَبُوا العبدیّ فی جذع نخلةٍ ... فلا عَطَستْ شیبانُ إلّا بأجْدَعا

پس ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور سولی پر چڑھائے گئے حتی کہ وہ وصال کر گئے۔ پس اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ ابن محیصن نے یہاں اور سورۃ الاعراف میں فلاقطعن ولاصلبنکم کو الف کے فتحہ کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قطع اور صلب سے مشتق کیا ہے۔ وَلَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰی ۝ یعنی میں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رب؟۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ۝ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۝ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ۝ وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی ۝

''انہوں نے کہا: (اے فرعون!) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر دے (ہمیں ذرا پروا نہیں) تو صرف اس (فانی) دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔ یقیناً ہم ایمان لائیں گے اپنے رب پر تا کہ وہ بخش دے ہمارے لیے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا تھا یعنی فن سحر اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ بیشک جو شخص بارگاہ الٰہی میں مجرم بن کر آئے تو اس کے لیے جہنم (کا شعلہ زار) ہے نہ وہ مر ہی سکے گا اس میں اور نہ وہ زندہ ہوگا۔ اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الٰہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کیے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لیے بلند درجات ہیں، یعنی سدا بہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزا ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا جادوگروں نے کہا: لَنْ نُّؤْثِرَكَ ہم تجھے اختیار نہیں کریں گے۔ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: البینات سے مراد یقین اور علم ہے۔ عکرمہ وغیرہ نے کہا: جب انہوں نے سجدہ کیا تو سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی جنت میں منازل دکھائیں اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے۔ فَاقْضِ مَاۤ

اَنْتَ قَاضٍ تقدیر عبارت اس طرح ہے، ما انت قاضیه اور یہاں ما جو فعل کو ملاتا ہے مصدر کے قائم مقام نہیں ہے کیونکہ وہ افعال کو ملاتا ہے اور یہ مبتدا اور خبر کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تو کر لے جو تو کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو فیصلہ کر جو تو کرنے والا ہے یعنی ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ یا کو قاضی سے حذف کیا گیا ہے کیونکہ یا ساکن ہے اور دوسرا تنوین کا سکون ہے۔ سیبویہ نے وقف میں یا کے اثبات کو اختیار کیا ہے، کیونکہ اس صورت میں التقاء ساکنین کی علت زائل ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۷۲﴾ تیرا امر صرف اس دنیاوی زندگی پر نافذ ہوگا۔ یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے مطلب یہ ہے تو اس دنیا کے مال و متاع میں فیصلہ کرتا ہے یا اس دنیا کے وقت میں فیصلہ کرتا ہے پس مفعول کا حذف مقدر ہے۔ پس یہ تقدیر عبارت بھی جائز ہے انما تقضی أمور هذه الحیاة الدنیا اس صورت میں نصب بھی مفعول کی نصب کی طرح ہوگی اور ما، اِنَّ کے عمل کو روکنے والا ہے۔ فراء نے رفع کو جائز قرار دیا ہے اس بنا پر کہ ما معنی الذی ہو اور تَقْضِیْ سے ضمیر کو حذف کیا گیا ہو اور هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا کو رفع دیا جائے۔ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا یعنی ہم اللہ وحدہ لاشریک پر اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا اس سے مراد وہ شرک ہے جس پر پہلے وہ تھے۔

وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ما محل نصب میں ہے اور الخطایا پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا کوئی محل نہیں ہے اور یا نافیہ ہے یعنی لیغفر لنا خطایانا من السحر وما اکرهتنا علیه۔ نحاس نے کہا: پہلا قول اولیٰ ہے۔ مہدوی نے کہا: اس میں بُعد ہے کیونکہ ان کا قول ہے: انّ لنا لاجرا ان کُنّا نحن الغالبین، یہ مکرهین (مجبور) کا قول نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اکراہ کی صورت میں گناہ نہیں ہوتا اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ بچپن میں انہیں جادو سیکھنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ حسن نے کہا: وہ چھوٹے بچوں کو جادو سکھاتے تھے پھر بعد میں خود اس پر اپنی مرضی سے عمل کرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور خبر مضمر ہو۔ تقدیر عبارت یہ ہو: وما اکرهتنا علیه من السحر موضوعٌ عنا اور من ساحر اس قول پر اور پہلے قول کی بنا پر اکرهتنا کے متعلق ہوگا۔ اور ما کو نافیہ بنانے کی صورت میں خطایانا کے متعلق ہوگا۔ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی یعنی اس کا ثواب بہتر ہے اور دیرپا ہے، مضاف کو حذف کیا گیا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمارے لیے تجھ سے بہتر ہے اور وہ جو ہمیں عذاب دے گا تیرے عذاب دینے کی نسبت زیادہ دیرپا ہے۔ یہ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰی کا جواب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے لیے بہتر ہے اگر ہم اس کی اطاعت کریں اور ہم اس کی نافرمانی کریں تو وہ تجھ سے زیادہ ہمیں عذاب دینے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا بعض علماء نے فرمایا: یہ ان جادوگروں کا قول ہے جب وہ ایمان لائے تھے۔ بعض نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا آغاز ہے۔ اور انه، کی ضمیر کا مرجع الامر اور الشان ہے۔ اور انّ من یات بھی جائز ہے:

إنّ من يَدخلِ الكنيسةَ يوماً يلْقَ فيها جآذِراً وظِباءَ

اس میں مراد انه من یدخل ہے یعنی ان الأمر هذا مجرم دوزخ میں داخل ہوگا اور مومن جنت میں داخل ہوگا۔ مجرم سے

تبعه و أتبعه، لحقه اور الحقة کا ایک معنی ہے ملنا اور بِجُنُوْدِهٖ حال واقع ہو رہا ہے گویا فرمایا: فاتبعهم سائقاً جنوده یعنی اپنے لشکر کو چلاتے ہوئے ان کا پیچھا کیا۔ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ، یعنی سمندر کی موجیں لاحق ہوئیں جنہوں نے انہیں غرق کر دیا۔ تعظیم اور امر کی معرفت کی وجہ سے فعل کو مکرر ذکر کیا۔ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى یعنی رشد سے فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور خیر اور نجات کی طرف ان کی راہنمائی نہیں کی، کیونکہ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس سے بچ نہیں سکیں گے کیونکہ ان کے آگے سمندر ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر عصا مارا تو اس میں بارہ راستے بن گئے اور راستوں سے پانی پہاڑوں کی مثل رک گیا اور سورہ شعراء میں ہے: فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ (الشعراء) یعنی بہت بڑا پہاڑ۔ ہر قبیلہ نے راستہ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پانی کے پہاڑوں کو حکم دیا کہ وہ جال کی طرح ہو جائیں تو وہ جالوں کی طرح ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی کلام سنتے تھے۔ یہ عظیم معجزات میں سے تھا اور بڑی نشانیوں میں سے تھا۔ جب فرعون آیا اور سمندر میں راستے دیکھے اور پانی کو ٹھہرا ہوا دیکھا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا: اس کی ہیبت کی وجہ سے سمندر پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ پس فرعون اور اس کے ساتھی داخل ہو گئے تو سمندر ان پر مل گیا۔ بعض علماء نے کہا: وَ مَا هَدٰى اس کے ان کو گمراہ کرنے کی تاکید کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: یہ فرعون کے قول: مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ (غافر) کا جواب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کی تکذیب کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وَ مَا هَدٰى یعنی اس نے اپنے آپ کو راہ ہدایت نہ دکھائی بلکہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو ہلاک کر دیا۔

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

”اے بنی اسرائیل! (دیکھو) ہم نے بچا لیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اُتارا تم پر من وسلویٰ۔ کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ اترے گا تم پر میرا عذاب، اور وہ (بدنصیب) اترتا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے۔ اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بعد ازاں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی تو یہ فرمایا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ، جَانِبَ پر نصب، واعدنا کے مفعول ثانی کی بنا پر ہے اور اسے ظرف کی بنا پر نصب دینا بہتر نہیں کیونکہ یہ ظرف مکاں محض غیر مبہم ہے اور افعال اور مصادر ظروف مکاں

کی طرف بغیر حروف جر کے متعدی ہوتے ہیں جبکہ وہ ظروف مُبہم ہوں۔ مکی نے کہا: یہ اصل ہے اس میں اختلاف نہیں ہے۔ آیت کی تقدیر یہ ہے: وواعدناکم اتیان جانب الطور، پھر مضاف کو حذف کیا گیا۔ نحاس نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ نکلنے کا حکم دیں تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے تمہاری موجودگی میں کلام کریں اور تم بھی اس کلام کو سن لو۔ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کے غرق ہونے کے بعد طور کی جانب آنے کا وعدہ لیا تا کہ انہیں تورات عطا کریں پس وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھا لیکن خطاب انہیں کیا گیا کیونکہ وعدہ ان کے لیے تھا۔ ابوعمرو نے ووعدناکم بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابوعبید نے بھی اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھا اور المواعدۃ صرف دو افراد کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الایمن کو نصب دی گئی ہے کیونکہ یہ جانب کی صفت ہے اور پہاڑ کے لیے کوئی دایاں بایاں نہیں ہوتا جب کہا جاتا ہے: خذ عن یمین الجبل تو اس کا معنی ہوتا ہے تم اپنی دائیں جانب پر پہاڑ کو پکڑو۔ اس وقت پہاڑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب پر تھا جب وہ وہاں آئے تھے۔ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى یعنی تیہ کے صحرا میں ہم نے تم پر من وسلویٰ اُتارا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ یعنی لذیذ رزق سے۔ بعض نے کہا: طیب سے مراد حلال رزق ہے جبکہ آدمی کا اس میں کوئی دخل نہیں ورنہ اس میں شبہ داخل ہوجاتا۔ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ یعنی خوشحالی اور عافیت تمہیں نافرمانی پر نہ اُبھارے، کیونکہ الطغیان کا معنی ہوتا ہے ناجائز چیز کی طرف تجاوز کرنا۔ بعض نے کہا: اس کا معنی ہے نعمت کا انکار نہ کرو اور نعمتوں کے شکر کو نہ بھولو اور منعم کے شکر کو نہ بھولو جس نے تم پر انعام کیا۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے بدلے دوسری چیزیں طلب نہ کرو جیسا کہ فرمایا: اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ (البقرہ: 61) بعض نے کہا: ایک دن اور ایک رات سے زائد کے لیے اس میں سے ذخیرہ نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو وہ ذخیرہ کریں ان میں کیڑے پیدا کر دیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی کسی کھانے میں کیڑا پیدا نہ ہوتا۔ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ یعنی تم پر میرا غضب لازم ہوگا اور غضب اترے گا یہ فا کے ساتھ جواب نہی میں منصوب ہے نہی سے مراد وَ لَا تَطْغَوْا ہے۔ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى، اعمش، یحییٰ بن وثاب اور کسائی نے فیحل میں حاء کے ضمہ کے ساتھ اور من یحلل میں پہلے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دو لغتیں ہیں۔ ابوعبیدہ وغیرہ نے حکایت کیا ہے: حَلَّ يَحِلُّ کہا جاتا ہے: جب واجب ہو اور حل یَحُلُّ کہا جاتا ہے جب اترے۔ اسی طرح فراء نے کہا: الحلول سے یحل حاء کے ضمہ کے ساتھ وقوع کے معنی میں ہوتا ہے اور یحل حاء کے کسرہ کے ساتھ وجوب کے معنی میں ہوتا ہے دونوں معانی متقارب ہیں لیکن کسرہ اولیٰ ہے کیونکہ قراء کا وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞ (الزمر) پر اجماع ہے۔ غضب اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عقاب، انتقام اور عذاب ہے۔ فَقَدْ هَوٰى زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ہلاک ہوا یعنی وہ ہاویہ کی طرف چلا۔ ہاویہ سے مراد دوزخ کی گہرائی ہے۔ یہ ھوی یھوی ھویا سے ہے جس کا معنی ہے اوپر سے نیچے کی طرف گرنا۔ ھوی فلان یعنی فلاں مر گیا۔ ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں

ثعلبہ بن مسلم نے بیان کیا انہوں نے ایوب بن بشر سے انہوں نے شفی اصبحی سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جہنم میں ایک پہاڑ ہے اسے صعود کہا جاتا ہے، کافر اس پر چڑھنے سے پہلے چالیس سال چلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ (مدثر) جہنم میں ایک محل ہے جس کو ھویٰ کہا جاتا ہے کافر کو اس کے اوپر سے پھینکا جائے گا پس وہ اس کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال گرتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ حدیث ذکر فرمائی جو ہم نے ''التذکرہ'' کتاب میں ذکر کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ یعنی جس نے شرک سے توبہ کی۔ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ یعنی ایمان پر قائم رہا حتی کہ ایمان پر ہی وصال ہوا، یہ سفیان ثوری اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ایمان میں شک نہ ہوا، یہ ماوردی اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے کہ جو سنت و جماعت پر قائم رہا، یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت انس نے کہا: اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے پکڑا، یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے اور یہ ماوردی نے حضرت ربیع بن انس سے روایت کیا ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ درست عمل کیا، یہ حضرت ابن زید کا قول ہے۔ حضرت ابن زید سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے علم حاصل کیا تاکہ ہدایت پائے کہ کیسے عمل کرے؟ پہلا قول مہدوی نے ذکر کیا اور دوسرا قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی، مقاتل اور کلبی نے کہا: اس نے جان لیا کہ اس کے لیے ثواب اور عقاب ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ آٹھواں قول ثُمَّ اهْتَدٰى پھر اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت میں ہدایت پائی؛ یہ ثابت بنانی کا قول ہے۔ پہلا قول تمام اقوال سے احسن ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تمام اقوال کا مرجع وہی ہے۔ وکیع نے سفیان سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں سنتے ہیں وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ یعنی جس نے شرک سے توبہ کی اٰمَنَ یعنی شرک کے بعد ایمان لایا وَ عَمِلَ صَالِحًا نماز پڑھی اور روزہ رکھا ثُمَّ اهْتَدٰى پھر اسی پر فوت ہوا۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ۬ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

''اور کس وجہ سے تم جلدی آ گئے اپنی قوم سے اے موسیٰ! عرض کی: وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی

تیری بارگاہ میں اس لیے حاضر ہوا ہوں میرے رب کہ تو راضی ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے۔ (یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر، فرمایا: اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ تو کیا طویل مدت گزر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لیے تم نے توڑ ڈالا میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ۔ کہنے لگے: نہیں توڑا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لاد دیئے گئے تھے بوجھ قوم (فرعون) کے زیورات سے سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصہ کے زیور) پھینک دیئے۔ پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے کہا: (اے فرزندان یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے۔ کیا ان احمقوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ تجھے کس چیز نے ابھارا کہ تم اپنی قوم سے پہلے آ گئے؟ بعض علماء نے فرمایا: قوم سے مراد تمام بنی اسرائیل ہیں اس وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: حضرت ہارون کو بنی اسرائیل پر خلیفہ بنایا تھا اور خود ستر آدمیوں کے ہمراہ چل رہے تھے اور آپ کی طرف متوجہ تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ میرے قریب میری واپسی کے منتظر ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے پیچھے بنی اسرائیل کو لانے کا حکم دیا اور ان سے ملنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: قوم سے مراد وہ ستر افراد ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے منتخب فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور کے قریب تھے تو کلام الٰہی کے سننے کے شوق میں سبقت لے گئے۔ بعض نے کہا: جب طور سینا کی طرف چلے تو اپنے رب کا اشتیاق ہوا اور شوق الٰہی میں مسافت لمبی ہو گئی اور معاملہ انتہائی تنگ ہو گیا حتیٰ کہ آپ نے اپنی قمیص پھاڑ دی پھر آپ صبر نہ کر سکے حتیٰ کہ قوم کو پیچھے چھوڑ گئے اور اکیلے چلے گئے جب اپنے مقام پر کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام حیرانگی کے عالم میں کوئی جواب نہ دے سکے چونکہ سچے شوق سے استقبال کیا تھا تو جواب سے اعراض کیا اور کنایۃً کہا: هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِيْ۔ ما کے کلمہ کے ساتھ جلدی آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے پیچھے آنے کی خبر دی پھر عرض کی: وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ شوق کے ذکر سے کنایہ فرمایا اور رضا کی طلب کی طرف کلام کو پھیرا۔ عبد الرزاق نے معمر سے انہوں نے قتادہ سے وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ کے تحت روایت کیا کہ تیرا شوق مجھے جلدی لے آیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب اپنے بستر پر آتی تھیں تو کہتی تھیں: مجید (عزت والے) کو لے آؤ پس پر قرآن کریم لایا جاتا وہ اسے اپنے سینے سے لگاتیں اور اس سے تسلی لیتی ہوئے سو جاتی تھیں، سفیان نے مسعر سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ جب بارش ہوتی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے

اتار دیتے تھے تا کہ جسم پر بارش لگے اور فرماتے تھے: انہ حدیث عهد بربی (1) (یہ میرے رب کا قریبی عہد ہے) یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور آپ کے بعد والوں کی طرف سے شوق و محبت کی وجہ سے تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے جو مروی ہے اس میں فرمایا: ''میری ملاقات کا شوق نیکوکاروں کے لیے طویل ہوا اور میں ان کی ملاقات کا شوق رکھتا ہوں'' (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن پھر فرمایا: مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ، تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحمت ہے اس قول سے انہیں عزت بخشنا اور ان کے دل کو تسلی دینا اور ان پر شفقت کرنا مقصود تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کو جواب دیتے ہوئے کہا: هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ۔ ابو حاتم نے کہا: عیسیٰ نے کہا بنو تمیم کہتے ہیں: هم اولی یعنی مقصورہ مرسلہ پڑھتے ہیں اور اہل حجاز اولاء مد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فراء نے: هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ حکایت کیا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس کی کوئی وجہ نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ اسی طرح ہے جس طرح زجاج نے کہا ہے کیونکہ یہ ان اسماء سے نہیں جو مضاف ہوتے ہیں تا کہ یہ ھدٰی کی طرح ہو، یہ دو جہتوں میں سے ایک سے خالی نہیں یا یہ اسم مبہم ہوگا تو اس کی اضافت محال ہے یا یہ الذین کے معنی میں ہوگا تو یہ بھی مضاف نہیں ہوتا کیونکہ اس کے بعد صلہ ہوتا ہے اور اس سے یہ معرفہ بن جاتا ہے۔ ابن ابی اسحاق، نصر، رویس نے یعقوب سے روایت کیا ہے: علی اِثری، ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ یہ بمعنی اثر ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ یعنی میں نے اس جگہ کی طرف جلدی کی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا تا کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کہا جاتا ہے: رَجلٌ عَجِلٌ وعَجُلٌ وعَجُولٌ وعَجْلَانُ بیّن العَجَلة اور سستی کی ضد عجلة ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر استدلال کریں۔ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ۝ سامری نے انہیں گمراہی کی طرف بلایا یا سامری ان کی گمراہی کا سبب تھا۔ بعض نے فرمایا: فتناھم کا مطلب ہے ہم نے انہیں فتنہ میں ڈالا یعنی ہم نے ان کے بچھڑے کی عبادت کو مزین کر دیا۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (الاعراف: 155) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سامری اس قوم سے تھا جو گائے کی پوجا کرتے تھے پس وہ مصر میں آیا تو وہ بظاہر بنی اسرائیل کے دین میں داخل ہو گیا اور اس کے دل میں گائے کی عبادت کا عقیدہ موجود تھا۔ بعض علماء نے کہا: وہ قبطی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پڑوسی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور آپ کے ساتھ نکلا تھا۔ بعض نے کہا: وہ بنی اسرائیل کے عظماء میں سے ایک عظیم شخص تھا اس قبیلہ سے تھا جو سامرہ کے نام سے مشہور تھا وہ شام میں معروف تھا۔ سعید بن جبیر نے کہا: وہ اہل کرمان سے تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا سورۃ الاعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جب وہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں گے تو انہیں جنت ملے گی اور ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر تورات میں اپنا کلام سنائے گا تا کہ وہ اس پر عمل کریں جو کچھ تورات میں موجود ہے اور وہ اپنے عمل کے ثواب کے مستحق ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان سے نصرت و کامیابی کا وعدہ فرمایا تھا۔ بعض نے کہا: یہ

1۔ مسند احمد، حدیث نمبر 12365
2۔ فردوس دیلمی، حدیث نمبر 8067

وعدہ تھا، وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ، اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو بھول گئے۔ کہا جاتا ہے: زمانہ کے لمبا ہو جانے کی وجہ سے چیز بھول جاتی ہے۔ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، یحل کا معنی یجب اور ینزل (ثابت ہونا اور اترنا) ہے الغضب سے مراد عقوبت ونقمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تم ایسا فعل کرو جو تم پر اللہ کے غضب کے نزول کا سبب ہو کیونکہ کوئی شخص اللہ کا غضب طلب نہیں کرتا بلکہ وہ ایسا فعل کرتا ہے جو غضب کا سبب ہوتا ہے۔ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ تم نے میرے عہد کو توڑا کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں گے حتی کہ وہ طور سے ہو کر ان کے پاس واپس آجائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے پیچھے رہنے کا ان سے وعدہ لیا تھا پس وہ ٹھہرے رہے۔ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا، بملکنا میم کے فتحہ کے ساتھ ہے یہ نافع، عاصم اور عیسیٰ بن عمر کی قرأت ہے۔ مجاہد اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے بطاقتنا (اپنی طاقت سے) ابن زید نے کہا: اس کا مطلب ہے ہمیں اپنے نفسوں پر ضبط نہ تھا ہم مجبور تھے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے بملکنا میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو عبید اور ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ لغت عالیہ ہے۔ یہ ملکت الشیٔ أملکه ملکا کا مصدر ہے۔ اور مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے اور مفعول محذوف ہے گویا فرمایا: بملکنا الصواب بل اخطأنا، یہ ان کی طرف سے خطا کا اعتراف ہے۔ حمزہ، کسائی نے بملکنا میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی بسلطاننا ہمارے پاس ملک نہ تھا پس ہم نے تیرے وعدہ کی خلاف ورزی کی پھر کہا گیا کہ قالوا عام ہے اور مراد خاص ہے یعنی ان لوگوں نے کہا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور سے لوٹنے تک اطاعت پر ثابت رہے تھے۔ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا یہ بارہ ہزار تھے اور تمام بنی اسرائیل چھ لاکھ تھے۔ وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ حاء کے ضمہ اور میم کے مکسورہ مشددہ کے ساتھ۔ نافع، ابن کثیر، حفص اور رویس نے اس طرح پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حروف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ انہوں نے خود قوم کے زیورات اُٹھائے تھے اور انہوں نے یہ مجبوراً نہیں اٹھائے تھے۔ اَوْزَارًا یعنی بوجھ، مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ یعنی ان کے زیوروں سے وہ انہوں نے عاریۃً لیے تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے کا ارادہ کیا تھا اور قوم والوں کو یہ وہم دلایا کہ وہ اپنی عید یا ولیمہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ زیورات تھے جو انہوں نے آل فرعون سے لیے تھے جب دریا نے انہیں ساحل پر پھینک دیا تھا ان کو اوزار اس لیے کہا کیونکہ وہ گناہ کا سبب تھے یعنی ان کے لیے ان کا اٹھانا جائز نہیں تھا اور نہ ان کے لیے غنائم حلال تھے اور لغت میں اوزار کا معنی بوجھ بھی ہے۔

فَقَذَفْنٰهَا ہم پر ان زیورات کا اٹھانا بوجھ بن گیا تھا جو ہمارے ساتھ تھے تو ہم نے انہیں آگ میں ڈال دیا تا کہ وہ پگھل جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے سامری کی طرف انہیں پھینک دیا تا کہ آپ واپس آئیں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔ قتادہ نے کہا: سامری نے انہیں کہا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس نہ پہنچے کہ وہ تم سے اس وجہ سے رک گئے ہیں کیونکہ تمہارے پاس زیورات ہیں، پس انہوں نے زیورات کو جمع کیا اور سامری کو دے دیئے اس نے انہیں آگ میں پھینک دیا اور پھر اس سے ان کے لیے ایک بچھڑا بنایا پھر اس پر جبریل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے جو مٹی اٹھائی تھی

وہ اس پر ڈال دی جب اس نے وہ مٹی ڈالی تو وہ بچھڑے کا جسم بن گیا جو ڈکارتا تھا۔ الخوار گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب وہ زیور آگ میں ڈالے گئے تو سامری آیا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کیا میں ڈالوں جو میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ گمان کر رہا تھا کہ وہ زیورات میں سے ہے جو دوسرے لے کر آئے ہیں۔ پس اس نے اس میں مٹی ڈالی اور کہا: بچھڑا بن جا جس کے لیے ڈکارنے کی آواز ہو جیسا کہ فرمایا کہ یہ فتنہ اور آزمائش کے لیے تھا۔ پس وہ ایک مرتبہ ڈکارا تھا پھر اس کی مثل نہیں ڈکارا تھا (1)۔ بعض نے کہا: اس کی آواز ہوا کی وجہ سے تھی کیونکہ اس میں سوراخ بنائے گئے تھے جب اس کے اندر ہوا داخل ہوتی تو اس میں آواز پیدا ہوتی۔ حقیقۃ اس میں زندگی نہیں تھی؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ پہلے قول کی بنا پر وہ بچھڑا گوشت اور خون کا تھا؛ یہ حسن، قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ حماد نے سماک سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت ہارون سامری کے پاس سے گزرے وہ بچھڑا بنا رہا تھا حضرت ہارون نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ نفع دے گا نقصان نہیں دے گا۔ حضرت ہارون نے دُعا کی: یا اللہ! اسے وہ عطا کر جو یہ تجھ سے آپ کے بارے سوال کرے تو سامری نے یہ دعا کی: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ گائے کی طرح آواز نکالے۔ وہ جب ڈکارتا تھا تو لوگ سجدہ میں گر جاتے تھے اور اس کا ڈکارنا حضرت ہارون کی دعا کے سبب تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اس طرح ڈکارتا تھا جس طرح زندہ بچھڑا ڈکارتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! اس سامری نے ان کے لیے ایک جسم والا بچھڑا نکالا ہے جس کے لیے ڈکارنا ہے اور وہ اس نے ان کے زیورات سے بنایا ہے یہ جسم اور ڈکارنا کس نے بنایا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیری عزت، تیرے جلال، تیرے ارتفاع، تیرے علو اور تیری سلطنت کی قسم! تیرے سوا کسی نے ان کے حق میں گمراہی کو مقدر نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے حکیم الحکماء! تو نے سچ کہا ہے۔ یہ تمام سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى سامری اور اس کے ساتھیوں نے یہ کہا وہ تشبیہ کے عقیدہ کی طرف مائل تھے کیونکہ انہوں نے کہا: اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف: 138) ہمارے لیے ایسا الٰہ بنا جس طرح ان کے لیے الٰہ ہیں۔ فَنَسِيَ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام گم ہو گئے۔ وہ اپنے رب کو تلاش کرنے کے لیے گئے تو وہ اس کا مقام نہ جان سکے اور راستہ جو رب کی طرف جانے والا تھا اسے بھول گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے وہاں چھوڑا اور اسے تلاش کرنے کے لیے نکلے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے الٰہ کو یہاں چھوڑا۔ اسرائیل نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: اس کا مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے لیے یہ ذکر کرنا بھول گئے کہ یہ خدا ہے۔ بعض نے کہا: خطاب سامری کے متعلق خبر ہے یعنی سامری نے اس ایمان کو چھوڑا جس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے حکم دیا تھا۔ پس وہ گمراہ ہو گیا؛ یہ ابن الاعرابی کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: اَفَلَا يَرَوْنَ یعنی وہ اس میں غور و فکر نہیں کرتے کہ وہ ان کی طرف بات کو نہیں لوٹاتا یعنی ان سے

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

کلام نہیں کرتا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ دوبارہ آواز نہیں نکالتا۔ وَّلَا یَمْلِکُ لَہُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ اور وہ ان کے نقصان اور نفع کا مالک نہیں پھر وہ کیسے خدا ہوسکتا ہے۔ اور وہ ذات جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام عبادت کرتے ہیں وہ نقصان بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، بدلہ بھی دیتا ہے، عطا بھی کرتا ہے اور منع بھی کرتا ہے۔ اَلَّا یَرْجِعُ اس کی تقدیر یہ ہے کہ: انہ لایرجع اسی وجہ سے فعل مرفوع ہے ان کو مخففہ بنایا گیا اور ضمیر کو حذف کیا گیا۔ رویت، علم اور ظن میں یہی اختیار ہے۔ شاعر نے کہا:

فی فتیۃٍ من سیوف الهند قد علموا أنْ هالكٌ كلُّ من يَحْفَى وينْتَعِلُ

فلو كنتَ ضَبِّيًا عرفتَ قَرابَتِي ولكنَّ زنجيٌّ عظيمُ المشافِرِ

یعنی لکنک تھا۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَہُمْ ہٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِہٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾ قَالَ یٰہٰرُوْنُ مَا مَنَعَکَ اِذْ رَاَیْتَہُمْ ضَلُّوْۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ﴿۹۳﴾

"اور بیشک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم! تم فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلا شبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔ قوم نے کہا: ہم تو اسی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام) موسیٰ نے (آکر غصہ سے) کہا: اے ہارون! کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا، تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا کیا تو نے بھی میرے حکم کی عدولی کی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ قَالَ لَہُمْ ہٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے پہلے حضرت ہارون نے انہیں کہا: یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِہٖ اس کے ذریعے تم آزمائش میں ڈالے گئے ہو اور تم اسی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہو۔ بہ کی ضمیر کا مرجع بچھڑا ہے۔ وَ اِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحْمٰنُ بیشک تمہارا رب رحمٰن ہے، بچھڑا نہیں۔ فَاتَّبِعُوْنِیْ اس کی عبادت کرنے میں میری اتباع کرو۔ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ اور میرے حکم کی اطاعت کرو نہ کہ سامری کے حکم کی۔ یا یہ مطلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف چلنے میں میری اتباع کرو اور بچھڑے کو چھوڑو، لیکن انہوں نے نافرمانی کی۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ یعنی ہم بچھڑے کی عبادت پر جمے رہیں گے۔ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بچھڑے کی عبادت کریں گے۔ حضرت ہارون نے ان بارہ ہزار کو علیحدہ کر لیا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور شور و غل سنا وہ لوگ اس بچھڑے کے ارد گرد ناچتے تھے۔ آپ نے اپنے ستر ساتھیوں سے کہا: یہ فتنہ کی آواز ہے۔ جب حضرت ہارون کو دیکھا تو

دائیں ہاتھ سے غصہ کی حالت میں ان کے سر کے بال پکڑ لیے اور بائیں ہاتھ سے داڑھی کے بال پکڑ لیے (1) اور کہا: قَالَ یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا کہا اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکا جب تو نے انہیں دیکھا کہ گمراہ ہو گئے ہیں حق کے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور کفر کیا ہے۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ کہ تم میرے پیچھے آ جاتے۔ لا زائدہ ہے یعنی تم میرے امر اور میری وصیت کی پیروی کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ان پر انکار کرنے سے اور میری اتباع سے تجھے کونسی بات مانع تھی۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے تم نے ان سے جنگ کیوں نہیں کی جبکہ تجھے معلوم تھا کہ اگر میں ان کے درمیان ہوتا تو میں ان کے کفر پر ان سے جنگ کرتا۔ بعض علماء نے کہا: جب یہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے تو تجھے مجھ سے ملنے سے کیا چیز مانع تھی۔ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ اس سے مراد یہ ہے کہ تیرے ان کے درمیان ٹھہرنا جبکہ یہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے تیری طرف سے میری نافرمانی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے تو ان سے جدا کیوں نہیں ہوا تاکہ تیرا ان سے جدا ہونا ان کو زجر و توبیخ کے لیے ہوتا اور اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ کا معنی بعض علماء نے فرمایا: امری سے مراد جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سے حکایت تھا۔ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (الاعراف) جب حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ ٹھہرے رہے اور انہیں روکنے میں مبالغہ نہ کیا اور ان پر انکار نہ کیا تو عصیان اور مخالفت امر کی نسبت ان کی طرف کر دی۔

**مسئلہ**: یہ امر بالمعروف اور نہی المنکر میں اصل ہے، اس کو تبدیل کرنا اور برائی کرنے والوں سے جدا ہو جانا ان کے درمیان ٹھہرنے والا خصوصاً جبکہ وہ راضی ہو تو اس کا حکم ان کے حکم کی طرح ہوگا۔ یہ مفہوم سورۂ آل عمران، النساء، مائدہ، الانعام، الاعراف اور الانفال میں گزر چکا ہے۔ امام ابوبکر طرطوشی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ہمارے سردار فقیہ مذہب صوفیاء میں کیا کہتے ہیں؟ ایک جماعت جمع ہوتی ہے وہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں پھر وہ ڈھول بجاتے ہیں، بعض رقص کرنے لگتے ہیں اور وجد میں آ جاتے ہیں حتی کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں کیا ان کے ساتھ حاضر ہونا جائز ہے یا نہیں؟ فتویٰ عنایت فرما کر اجر حاصل کریں۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ یہ اشعار ہیں جو صوفیاء پڑھتے ہیں:

یا شیخُ کُفَّ عن الذُّنوبْ　قبلَ　التَّفرُّق　والزَّلَلْ
واعمَلْ　لنفسكَ　صالحاً　مادام　ينفعك　العَمَلْ
أمّا　الشبابُ　فقد　مَضَى　ومَشِيبُ　رأسكَ　قد　نَزَلْ

جواب یہ ہے کہ صوفیاء کا مذہب باطل، جہالت اور گمراہی ہے۔ اسلام تو صرف کتاب اللہ اور رسول اللہ کی سنت کا نام ہے۔ رہا رقص اور وجد تو یہ سب سے پہلے سامری کے ساتھیوں نے کیا تھا جب اس نے ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ بنایا تھا اور اس میں سے آواز نکلتی تھی وہ اس کے ارد گرد رقص کرتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ یہ کفار کا دین ہے اور بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کا دین ہے اور رہا ڈھول بجانا تو یہ زنادقہ نے سب سے پہلے ایجاد کیا تھا تاکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو کتاب

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذہ

اللہ سے دور کریں۔ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھتے تھے تو وقار و تعظیم کی یہ کیفیت ہوتی تھی گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں (1) پس سلطان اور اس کے قائم مقام لوگوں کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو مساجد میں حاضر ہونے سے روکیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ان کے ساتھ حاضر ہونا جائز نہیں اور وہ باطل پر ان کی معاونت نہ کرے؛ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہم ائمۃ المسلمین کا مذہب ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿٩٤﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِۦ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَوٰةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّن تُخْلَفَهُۥ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰٓ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَّنُحَرِّقَنَّهُۥ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُۥ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ إِنَّمَآ إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

''ہارون نے کہا: اے میرے ماں جائے (بھائی) نہ پکڑو میری داڑھی کو اور نہ میرے سر (کے بالوں) کو، میں نے اس خوف سے (ان پر سختی نہ کی) کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے پھوٹ ڈال دی بنی اسرائیل کے درمیان اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ آپ نے پوچھا: اے سامری! (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی؛ اس نے کہا: میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی پس میں نے مٹھی بھر لی رسول کی سواری کے نشان قدم کی خاک سے پھر اسے ڈال دیا (اس ڈھانچہ میں) اور اس طرح آراستہ کر دی میری لیے میرے نفس نے یہ بات۔ آپ نے (غصہ سے) فرمایا: جا چلا جا پس تیرے لیے اس زندگی میں تو یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے اور بیشک تیرے لیے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور (ذرا) دیکھ اپنے اس خدا کی طرف جس پر تو جم کر بیٹھا رہا (اس کا کیا حشر ہوتا ہے) ہم اسے جلا ڈالیں گے پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو۔ تمہارا معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں گھیر رکھا ہے اس نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: دائیں ہاتھ سے سر کے بال پکڑے اور بائیں ہاتھ سے داڑھی کو پکڑا کیونکہ اللہ کی رضا کے لیے غیرت ان پر غالب آچکی تھی یعنی ایسا نہ کرو کہ لوگ خیال کریں گے کہ یہ آپ کی طرف سے استخفاف اور سزا ہے۔ بعض علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بغیر استخفاف اور عقوبت کے کیا تھا جیسا کہ انسان اپنی داڑھی کو پکڑ لیتا ہے۔ یہ واقعہ سورۂ اعراف میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی

1۔ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرجل یتداوی، حدیث نمبر 3357، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مراد کو بہتر جانتا ہے۔

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ میں نکلوں گا اور انہیں چھوڑ جاؤں گا حالانکہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا میں ان کے ساتھ نکلوں اگر میں خود نکلتا تو قوم میری اتباع نہ کرتی اور قوم بچھڑے کے ساتھ پیچھے رہتی۔ بعض اوقات معاملہ خونریزی تک جا پہنچتا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں انہیں جھڑکوں گا تو جنگ واقع ہوگی اور پھر آپ مجھے ملامت کریں گے۔ یہ حضرت ہارون کا جواب ہے حضرت موسیٰ علیہما السلام کو جب انہوں نے کہا تھا: اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ سورۃ الاعراف میں ہے: اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ (الاعراف:150)

کیونکہ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ اس مفہوم پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ اس کا معنی ہے تو نے ان کی حفاظت کے بارے میں میری وصیت پر عمل نہیں کیا کیونکہ آپ نے مجھے ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا تھا یہ مقاتل کا قول ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: میرے عہد اور میرے آنے کا انتظار نہیں کیا پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: فَمَا خَطْبُكَ یٰسَامِرِیُّ اے سامری! تیری غرض کیا تھی کس چیز نے تجھے اس پر ابھارا ہے؟ قتادہ نے کہا: سامری بنی اسرائیل میں ایک عظیم شخص تھا اس کا تعلق اس قبیلہ سے تھا جسے سامرہ کہا جاتا ہے، لیکن اس اللہ کے دشمن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سمندر پار کرنے کے بعد منافقت کی۔ جب بنی اسرائیل عمالقہ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ اپنے بتوں پر بیٹھے تھے تو بنی اسرائیل نے کہا: اے حضرت موسیٰ! ہمارے لیے ایک خدا بنا دو جیسا کہ ان کے خدا ہیں پس سامری نے موقع کو غنیمت جانا اور اس نے جان لیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کی طرف مائل ہیں تو اس نے بچھڑا بنا دیا۔ پس سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیتے ہوئے کہا: بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِهٖ میں نے ایسی چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی تھی یعنی میں نے وہ چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی میں نے جبریل کو حیاۃ کے گھوڑے پر دیکھا پس میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس کے نشان قدم سے ایک مٹھی بھر لوں پس میں نے اس کو کسی چیز پر نہیں ڈالا مگر اس کے لیے روح، گوشت اور خون بن گیا جب انہوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ ان کے لیے خدا بنا دیں تو میرے نفس نے میرے لیے یہ آراستہ کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب جبریل اترے تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف لے جائیں تو سامری نے لوگوں کے درمیان سے اسے دیکھا اور گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر لی۔ بعض نے کہا: سامری نے کہا: میں نے جبریل کو گھوڑے پر دیکھا وہ حد نظر پر قدم رکھتا تھا پس میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس کے نشان سے مٹھی بھر لوں۔ پس میں نے کسی چیز پر اسے نہیں ڈالا مگر اس کے لیے روح اور خون بن گیا۔ بعض نے کہا: اس نے جبریل کو نر گھوڑے پر نزول کے دن دیکھا۔ فرعون کا گھوڑا دریا میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ کہا جاتا ہے: سامری کی ماں نے سامری کی پیدائش کے دن اسے ایک غار میں رکھا اس خوف سے کہ کہیں فرعون اسے قتل نہ کر دے۔ پس حضرت جبریل امین اس کے پاس آئے اور سامری کی ہتھیلی کو سامری کے منہ میں رکھ دیا پس وہ شہد اور دودھ اس سے پیتا رہا۔ حضرت جبریل اس کے پاس آتے جاتے تھے تو سامری نے اسے اس وقت سے پہچان لیا تھا۔ یہ معنی سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام سنا جہاں انہوں نے موم سیم ڈھانچے بنائے تھے ایک ڈھانچہ بیل کا تھا اور دوسرا گھوڑے کا تھا۔ پھر دونوں کو دریائے نیل میں ڈال دیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کو تلاش کرنے کے لیے ایسا کیا تھا وہ پتھر کے تابوت میں دریائے نیل میں تھے تو بیل اس تابوت کو اپنے سینگ پر اٹھا لایا۔ پس سامری نے وہ کلام پڑھی جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سنی تھی پس سامری نے وہ مٹھی بھر مٹی بچھڑے کے پیٹ میں ڈالی تو وہ ڈکارنے لگا۔ حمزہ، کسائی، اعمش اور خلف نے بما لم تبصروا پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ خبر کی بناء پر پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن مسعود، الحسن اور قتادہ نے فقبصت قبصة صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے قاف کے ضمہ کے ساتھ قبصة سے پڑھا ہے، یعنی صاد بغیر نقطہ کے۔ باقی قراء نے قبضت قبضة ضاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ القبض پوری ہتھیلی کو کہتے ہیں اور القبص انگلیوں کے اطراف کو کہتے ہیں ان کی طرح الخضم والقضم ہے القبضة قاف کے ضمہ کے ساتھ مقبوض مقدار کو کہتے ہیں؛ مہدوی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ جوہری نے قبصة فا کے ضمہ اور صاد کے ساتھ ذکر نہیں۔ انہوں نے القبضة قاف کے ضمہ اور ضاد کے ساتھ کیا ہے جو تو مٹھی میں پکڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے: أعطاه قبضة من سويق أو تمر یعنی میں نے اسے مٹھی بھر ستو یا کھجور دی۔ کبھی قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور فرمایا: القبص قاف کے کسرہ اور صاد کے ساتھ اس کا معنی ہے لوگوں کی کثیر تعداد۔ کمیت نے کہا:

لكم مسجدا الله المزوران والحصى  لكم قِبْصُه من بين أثرى وأقترى

فَنَبَذْتُهَا یعنی میں نے اسے بچھڑے میں ڈالا۔ وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ میرے لیے میرے نفس نے اسی طرح آراستہ کر دیا؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: حدثني نفسي میرے نفس نے بیان کیا۔ دونوں قریب المعنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَاذْهَبْ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہمارے درمیان سے چلا جا۔ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ زندگی بھر تو یہی کہتا رہے گا کہ مجھے کوئی نہ چھوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنی قوم سے نکال دیا۔ اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ نہ ملیں اور نہ اس کے قریب جائیں اور نہ اس سے کلام کریں۔ یہ اس کے لیے بطور سزا تھا۔ شاعر نے کہا:

تَمِيمٌ كرهط السامري وقوله  ألا لا يريدُ السامري مِساسا

حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سامری کی سزا یہ بنائی کہ لوگوں کو وہ نہ چھوئے اور نہ لوگ اسے چھوئیں، یہ اس کے لیے اور جو اس میں سے قیامت تک ہوگا سب کے لیے سزا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس پر محنت سخت کر دی کہ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ کسی کو نہ چھوئے اور کسی کے لیے اس کو چھونا ممکن نہ تھا۔ یہ اس کے لیے دنیا میں سزا تھی۔ کہا جاتا ہے: وہ وسواس میں مبتلا کیا گیا۔ وسواس کی اصل اس وقت سے ہے۔ قتادہ نے کہا: ان کے بقیہ لوگ آج بھی ہیں جو کہتے ہیں: لا مساس اگر کوئی دوسرا ان میں سے کسی کو چھولے تو دونوں اسی وقت بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسے قتل نہ کر دیہ سخی ہے۔ کہا جاتا ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا: فَاذْهَبْ فَإِنَّ

لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ تو وہ بھاگ گیا پس وہ جنگلوں میں درندوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا وہ لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں پاتا تھا جو اسے چھوتا حتی کہ وہ اس کہنے والے کی طرح ہو گیا جو ہر وقت کہتا: لَا مِسَاسَ کیونکہ وہ لوگوں سے دور تھا اور لوگ اس سے دور تھے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

حَمَّالُ رایاتٍ بها قَنَعاسا	حتی تقولَ الأَزْدُ لامسابسَا

یہ اہل بدعت، نافرمانوں کو نکالنے اور دور کرنے کی اصل ہے اور ان سے اختلاط نہ کرنے کی اصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالک اور پیچھے رہ جانے والے صحابہ کے متعلق ایسا کیا تھا۔ جو شخص حرم میں پناہ لے اور اس پر قتل ہو تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے قتل نہیں کیا جائے لیکن اس کے ساتھ معاملہ نہیں کیا جائے نہ بیع کی جائے گی۔ یہ اس کو حرم سے نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔ اس قبیل سے زنا کی حد میں جلاوطن کرنا ہے۔ یہ تمام مسائل اپنے اپنے مقام پر گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ وحدہ۔

ہارون القاری نے کہا: عرب کی لغت میں لَا مِسَاسَ سین کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ نحویوں نے اس میں کلام کی ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ مبنی بر کسرہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: اضرب الرجل۔ ابو اسحاق نے کہا: لَا مِسَاسَ نفی ہے سین کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ تانیث کی علامت ہے تو کہتا ہے: فعلتِ یاامرأۃ۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا میں نے محمد بن یزید کو یہ کہتے ہوئے سنا: جب کسی اسم میں تین علتیں ہوں تو اس کا مبنی ہونا واجب ہے جس میں دو علتیں ہو تو اس کا غیر منصرف ہونا واجب ہے کیونکہ حرف کے ترک کے بعد مبنی ہونا ہی باقی رہتا ہے۔ پس مساس اور دراك میں تین جہات سے علت ہے۔ ایک یہ کہ یہ معدول ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ مونث ہے۔ تیسرا یہ کہ یہ معرفہ ہے۔ جب اس میں بنا واجب ہے اور سین سے پہلے الف ساکن ہے تو التقاء ساکنین کی وجہ سے سین کو کسرہ دیا گیا جیسے تو کہتا ہے: اضرب الرجل۔ میں نے ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ اس قول کی طرف جانا خطا ہے۔ اور ابو اسحاق نے ابو عباس کو الزام دیا ہے کہ جب کسی عورت کا نام فرعون رکھا جائے اسے بھی مبنی ہونا چاہیے جبکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ جوہری نے الصحاح میں کہا: رہا عربوں کا قول: لَا مِسَاسَ یہ فطامِ کی مثل ہے یہ مبنی بر کسرہ ہے کیونکہ یہ مصدر سے معدول ہے اور وہ المس ہے۔ ابو حیوہ نے لامساس پڑھا ہے۔ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ یعنی قیامت کے دن۔ الموعد مصدر ہے یعنی تیرے لیے عذاب کا وعدہ ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تخلفہ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے دو معانی ہیں (۱) تو اس کے پاس آئے گا اور تو اسے وعدہ خلافی کرنے والا نہ پائے گا، جیسے تو کہتا ہے: احمدتہ میں نے اسے محمود پایا۔ (۲) دوسرا معنی تہدید کی بنا پر ہے یعنی تیرے لیے ضروری ہے کہ تو اس کی طرف جائے۔ باقی قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے کیے ہوئے وعدہ میں وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ یعنی تو اس پر قائم ہے۔ عاکفًا، ملازمًا۔ اس کی اصل ظللت ہے۔ شاعر نے کہا:

خَلَا أنَّ العِتاقَ من المطايا	أَحَسْنَ بهٖ فهنّ إليه شُوسُ

یعنی أحسَنتَ اسی طرح اعمش نے اصل پر دو لاموں کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ظلت ظاء کے کسرہ کے ساتھ ہے کہا جاتا ہے: ظللت أفعل کذا إذا فعلته نہارا و ظَلت و ظِلت جب کوئی دن کے وقت کام کرے اور جنہوں نے ظَلت کہا پہلا لام تخفیفاً حذف کر دیا ہے اور جنہوں نے ظِلت کہا اس نے لام کی حرکت ظا کو دے دی۔ لَنُحَرِّقَنَّهٗ نون کے فتحہ اور راء کے ضمہ اور تخفیف کے ساتھ۔ یہ حرقت الشیٔ أحرقه حرقا کسی چیز کو ایک دوسرے سے بالکل مل دینا، پیش دینا: اسی سے عربوں کا قول ہے: حَرَقَ نابه يحرِقه یعنی اس نے اسے پیس ڈالا حتی کہ اس کی آواز سنی گئی۔ اس قرأت کا معنی ہے ہم انہیں آری کیا اور کوٹ دیا۔ المبرد کوٹنے کا آلہ۔ اور پہلی دو قرأتوں کا معنی ہے آگ کے ساتھ اس طرح خون بہا جس طرح عام بچھڑے کو ذبح کرنے سے خون بہتا ہے۔ پھر ہتھوڑے کے ساتھ اس کی ہڈیوں کو توڑا اور پھر جلا دیا۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں لنذبحنه ثم لنحرقنه ہے گوشت اور خون جب جل جاتے ہیں تو راکھ بن جاتے ہیں پھر اسے دریا میں بکھیرنا ممکن ہوتا ہے۔ رہا سونا تو وہ راکھ نہیں بنتا۔ بعض علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے جس کے ساتھ سونا راکھ بن جاتا ہے۔ یہ ان کی آیات میں سے تھا۔ لَنَنْسِفَنَّهٗ کا معنی ہے ہم اسے اڑا دیں گے۔ ابو رجاء نے لننسفنہ سین ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ النسف کا معنی ہے کسی چیز کو جھاڑنا تا کہ ہوا اس کو اڑا لے جائے۔ اس کو التذریة کہتے ہیں۔ المنسف جس کے ساتھ دانے صاف کیے جاتے ہیں، وہ چیز جس کا آگے والا حصہ اٹھا ہوا ہو۔ النسافة جو اس سے نیچے گرے۔ کہا جاتا ہے: اعزل النُسافة وکل من الخالص چھان کو دور کر اور خالص کو کھا۔ کہا جاتا ہے: اتانا فلان کان لحیتہ منسفٌ ہمارے پاس فلاں آیا گویا اس کی داڑھی چھاننی ہے۔ ابو نصر نے یہ حکایت کیا ہے: المنسفة اس آلہ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی عمارت اکھیڑی جاتی ہے۔ نسفت البناء نسفاً میں نے عمارت کو اکھیڑ دیا، نسف البعیر الکلاء ینسفہ سین کے کسرہ کے ساتھ۔ جب اونٹ گھاس کو جڑ سے اکھیڑ دے۔ انتسفت الشیٔ کا معنی ہے میں نے چیز کو اکھیڑ دیا ہے یہ ابوزید سے مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا یعنی بچھڑا معبود نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو وسیع ہے وہ ہر فعل اپنے علم سے کرتا ہے۔ علمًا پر نصب تفسیر کی بناء پر ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے وسّع کل شئ علماء پڑھا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۟ۖ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۟ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۟ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۟ۖ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۟ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۟

''یوں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے خبریں ان لوگوں کی جو پہلے گزر چکے اور ہم نے مرحمت فرمایا ہے آپ کو اپنی

جناب سے ایک پند نامہ۔ جو شخص روگردانی کرے گا اس سے وہ اٹھائے گا قیامت کے دن ایک بوجھ، یہ لوگ ہمیشہ اس بوجھ تلے دبے رہیں گے اور بہت تکلیف دہ ہوگا ان کے لیے روز قیامت یہ بوجھ۔ جس روز پھونکا جائے گا صور میں اور ہم جمع کریں گے مجرموں کو اس دن اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی، چپکے چپکے آپس میں کہیں گے کہ نہیں رہے تم دنیا میں مگر صرف دس دن۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جبکہ ان میں سب سے زیادہ زیرک کہے گا کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر صرف ایک دن"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ کاف محل نصب میں ہے یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی کما قصصنا علیك خبر موسیٰ جس طرح ہم نے آپ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر بیان کی اسی طرح ہم سابقہ واقعات کو بیان کریں گے تا کہ آپ کے لیے باعث تسلی ہوں اور آپ کی صداقت پر دلیل ہوں۔ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ قرآن کو ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں نصیحت ہے اور الرسول کو بھی ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ ذکر (نصیحت) اس پر اتاری جاتی ہے۔ بعض علماء نے کہا: اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا یعنی ذکر سے مراد شرف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ (الزخرف: 44) یعنی تیرے اسم کے ساتھ شرف اور عزت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ یعنی جس نے قرآن سے اعرض کیا اور قرآن پر ایمان نہ لایا اور جو احکام اس میں ہیں ان پر عمل نہ کیا۔ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ وزراً سے مراد بڑا گناہ اور بڑا بوجھ ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ، وہ اس بوجھ تلے ہمیشہ رہیں گے یعنی اس جزا میں اور اس کی جزا جہنم ہے۔ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ برا ہے وہ بوجھ جو وہ قیامت کے روز اٹھائیں گے۔ داؤد بن رفیع نے فانه یُحمل پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ یہ اکثر کی قرأت ہے۔ ینفخ یاء کے ضمہ کے ساتھ فعل مجہول کی بناء پر۔ ابوعمر، ابن ابی اسحاق نے معروف کا صیغہ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے ونحشر سے استدلال کیا ہے۔ ابن ہرمز سے ینفخ یاء کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے، یعنی اسرافیل پھونکے گا۔ سورۂ انعام میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ اور کتاب التذکرہ میں بھی اس کی بحث ہے۔ طلحہ بن مصرف نے ویحشر یاء کے ضمہ کے ساتھ اور المجرمون کو حالت رفعی میں پڑھا ہے۔ یہ مصحف کے خلاف ہے۔ اور باقی قراء نے ونحشر المجرمین پڑھا ہے۔ المجرمین سے مراد مشرک ہیں۔ زُرْقًا، یہ المجرمین سے حال ہے۔ الزرق سیاہی کا متضاد ہے۔ عرب نیلی آنکھوں کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے نیلا ہونے اور چہروں کے سیاہ ہونے کی وجہ سے ان کی خلقت ناپسندیدہ ہوگی۔ کلبی اور فراء نے زرقاً کا معنی اندھا بیان کیا ہے۔ ازہری نے کہا: پیاسے ان کی شدت پیاس کی وجہ سے آنکھیں نیلی ہوں گی؛ یہ زجاج کا قول ہے، انہوں نے کہا: پیاس کی وجہ سے آنکھیں نیلی ہو جاتی ہیں اور سیاہی بدل جاتی ہے۔ بعض نے کہا: یہ جھوٹی امید ہے جب اس کے پیچھے خسارہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے: طویل انتظار کی وجہ سے میری آنکھیں سفید ہوگئیں۔ پانچواں قول یہ ہے کہ شدت خوف سے ان کی آنکھیں کھلی کھلی ہوں گی۔ شاعر نے کہا:

لقد زرقت عیناك یابن مُكَعْبَرٍ کما كُلُّ ضَبِّيٍّ من اللؤم أَزْرَقُ

کہا جاتا ہے: رجل ازرق العین، المرأۃ زرقاء بینۃ الزرق، اسم الزرقۃ زرقت عینہ۔ راء کے کسرہ کے ساتھ ازرقت عینہ ازرقاقاً وازراقت عینۃ ازریقاقاً، سعید بن جبیر نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا کے متعلق پوچھا گیا اور دوسری جگہ فرمایا: وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا (الاسراء: 97) فرمایا: قیامت کے دن کے لیے مختلف حالات ہوں گے ایک حالت میں ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی اور ایک حالت میں اندھے ہوں گے۔

یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ، الخفت کی اصل لغت میں سکون ہے پھر اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو اپنی آواز کو پست کرتا ہے اور خفیہ بات کرتا ہے۔ آیت کا مطلب ہے وہ سرگوشی کرتے ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے یعنی وہ حشر کے میدان میں ایک دوسرے سے رازداری سے چپکے چپکے بات کریں گے۔ اِنْ لَّبِثْتُمْ یعنی دنیا میں نہیں ٹھہرے۔ بعض نے کہا قبور میں نہیں ٹھہرے۔ اِلَّا عَشْرًا مراد دس راتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دو نفخوں کے درمیان کا عرصہ ہے اور وہ چالیس سال ہے اس مدت میں کفار سے عذاب بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اُٹھا لیا جائے گا تو وہ اس مدت کو کم خیال کریں گے یا قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی شدت کی وجہ سے دنیا میں رہنے کی مدت کو کم خیال کریں گے اور ان میں سے جو زیادہ دانشمند اور سیانا ہوگا اور علم والا ہوگا اسے یوں محسوس ہوگا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر ایک دن یعنی دنیا میں ان کا قیام ایک دن تھا؛ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: الا مثل یوم بعض علماء نے فرمایا: وہ قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھ کر وہ دنیا کی نعمتوں کو بھول جائیں گے حتی کہ وہ انہیں ایک دن کی طرح دیکھیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک دن سے مراد نفخوں کے درمیان ٹھہرنا ہے۔ یا قبور میں ٹھہرنا مراد ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ عشرا اور یوما، لبثم کی وجہ سے منصوب ہیں۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَیَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾
لَّا تَرٰى فِیْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ یَوْمَىِٕذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ
وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ یَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ
وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

''اور وہ آپ سے پہاڑوں کے انجام کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمائیے: میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا، پس بنا چھوڑے گا اس پہاڑی علاقہ کو کھلا ہموار میدان، نہ نظر آئے گا تجھے اس میں کوئی موڑ اور نہ کوئی ٹیلا۔ اس روز سب لوگ پیروی کریں گے پکارنے والے کی کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم سی آہٹ۔ اس دن نہیں نفع دے گی کوئی سفارش سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمن نے اجازت دی اور پسند فرمایا ہو اس

کے قول کو۔ وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور ان کے گزرے ہوئے واقعات کو اور لوگ نہیں احاطہ کر سکتے اس کا اپنے علم سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ یعنی لوگ قیامت کے دن پہاڑوں کی حالت کے متعلق پوچھتے ہیں فَقُلْ یہاں فا کے ساتھ آیا ہے ہر سوال جو قرآن میں آیا ہے اس کے جواب میں قل بغیر فاء کے آیا ہے سوائے اس ایک مقام کے، کیونکہ اس کا معنی ہے اگر وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کریں تو آپ کہیں۔ تو کلام کے ضمن میں شرط کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ لوگ پہاڑوں کے متعلق سوال کریں گے پس سوال سے پہلے انہیں جواب دیا۔ یہ سوالات جو پہلے گزر چکے ہیں لوگوں نے ان کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو سوال کے بعد جواب دیا اسی وجہ سے جواب بغیر فاء کے آیا اور یہ سوال ابھی تک انہوں نے پوچھا نہیں تھا۔ يَنْسِفُهَا وہ اسے اڑاتا ہے۔ نَسْفًا ابن اعرابی وغیرہ نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ اسے جڑ سے اکھیڑے گا پھر اسے ریت کی طرح پیس ڈالے گا۔ اور پھر اسے دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح کر دے گا جنہیں ہوائیں ادھر اُدھر اڑائیں گی۔ اور فرمایا: العھن رنگی ہوئی اون کو کہتے ہیں۔ پھر بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔ فَيَذَرُهَا یعنی انہیں چٹیل میدان بنا دے گا۔ قَاعًا صَفْصَفًا، القاع اس زمین کو کہتے ہیں جو چٹیل ہو پس کوئی چیز نہ اگتی ہو؛ یہ ابن اعرابی کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ہموار زمین کو القاع کہتے ہیں۔ اس کی جمع اقوع واقواع وقیعان آتی ہے واو بعد کسرہ کے یاء ہوگی۔ فراء نے کہا: القاع سے مراد وہ زمین ہے جس میں پانی جمع ہوتا ہو اور الصفصف سے مراد وہ زمین ہے جس پر کوئی گھاس وغیرہ نہ ہو۔ کلبی نے کہا: وہ زمین جس پر کوئی گھاس نہ ہو۔ بعض نے کہا: ہموار زمین گویا برابری میں ایک صف کی طرح ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ القاع اور الصفصف کا ایک معنی ہے۔ القاع کھلی زمین الصفصف ہموار چٹیل زمین۔ سیبویہ نے یہ شعر بطور استشہاد پڑھا ہے:

وكَمْ دُوْنَ بينكَ من صَفْصَفٍ ودَكْدَاكِ رَمْلٍ واعْقَادِهَا

قَاعًا کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ لَّا تَرٰى محل نعت میں ہے۔ فِيْهَا عِوَجًا ابن الاعرابی نے کہا: العوج راستے میں ٹیڑھا پن ہونا۔ الامت سے مراد ٹیلا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: الامت سے مراد چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہیں۔ ہموار زمین جس میں نشیب و فراز نہ ہو۔ تو کہتا ہے: امتلاء فما به امتٌ وملأت القربة ملئا لا امت فيه یعنی اس میں ڈھیلا پن نہیں۔ لغت میں الامت سے مراد بلند جگہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عوجاً کا معنی میلاً ہے۔ فرمایا: الامت تسمہ کی مثل اثر، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ عوجاً سے مراد وادی ہے اور امتاً سے مراد ٹیلا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ العوج سے مراد پستی ہے اور الامت سے مراد بلند جگہ ہے۔ قتادہ نے کہا: عوجاً سے مراد پھٹن ہے اور امتا سے مراد ٹیلا ہے۔ یمان نے کہا: الامت سے مراد زمین میں دراڑیں ہیں۔ بعض نے کہا: الامت ہموار زمین میں سے یا پہاڑ میں سے نئی جگہ کا سخت ہونا اور کسی جگہ کا نرم ہونا؛ یہ صولی نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس آیت کے ساتھ مکوڑیوں کا دم کیا جاتا ہے جس کو ہمارے ہاں البراریق کہتے ہیں۔ اس کا واحد بروقة

ہے یہ جسم پر ظاہر ہوتی ہیں خصوصاً ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہیں جو کی تین لکڑیاں لے لو ہر لکڑی کی طرف میں گرہ ہو ہر گرہ کو ان مکوڑیوں کے اوپر سے گزارو اور ایک مرتبہ یہ آیت پڑھو پھر ان لکڑیوں کو کسی تر جگہ میں دفن کر دو وہ لکڑیاں جیسے ختم ہوں گی وہ مکوڑیاں بھی ختم ہوتی جائیں گی اور کوئی اثر بھی باقی نہ رہے گا۔ میں نے یہ اپنے اوپر بھی تجربہ کیا ہے اور دوسروں پر بھی میں نے اس کو نفع مند پایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ**، داعی سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں جب وہ صور میں پھونکیں گے۔ **لَا عِوَجَ لَهٗ** وہ ان کے پکارنے سے انحراف و اعراض نہیں کریں گے بلکہ اس کی طرف جلدی کریں گے اور اس سے ادھر ادھر نہ ہوں گے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **لَا عِوَجَ لَهٗ** یعنی اس کی پکار میں کوئی کجی نہ ہوگی۔ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ پکارنے والے کی پوری اتباع کریں گے اس میں کجی نہ ہوگی۔ مصدر مضمر ہے معنی یہ ہے کہ وہ محشر کے لیے پکارنے والے کی آواز کی اتباع کریں گے۔ اس کی مثل یہ آیت ہے: **وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ**۝ (ق) آگے آئے گا **وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ** آواز پست اور خاموش ہو جائیں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: جب حضرت زبیر کی خبر آئی تو مدینہ طیبہ کی دیواریں اور پہاڑ پست ہو گئے۔ اور ہیبت کی وجہ سے ہر زبان ساکت ہوگی۔ **لِلرَّحْمٰنِ** رحمٰن کی وجہ سے **فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا**۝، الهمس پست آواز کو کہتے ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے الحس الخفی پست آواز، حسن اور ابن جریج نے کہا: قدموں کی آہٹ کو الھمس کہتے ہیں۔ وہ آواز جو محشر کی طرف جاتے وقت قدموں کے ایک دوسرے پر لگنے کی وجہ سے پیدا ہوگی۔ زجاج کا قول ہے وهُنَّ يَمْشِينَ بِنا هَمِيسًا۔ اونٹوں کے چلنے کی آواز۔ شیر کو الھموس کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ تاریکی میں آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ رؤبہ کا شعر ہے:

لَيثٌ يَدُقُّ الأسدَ الهَمُوسَا    والأَقْهَبَينِ الفيلَ والجَامُوسَ

همس الطعام طعام کو چبانا۔ فوہ منضم ملا ہوا منہ۔ راجز نے کہا:

لقد رأيتُ عجبًا مُذْ أَمْسَا    عجائزًا مثلَ السَعَالِي خَمْسَا

يأكُلْنَ ما أصنع هَمْسًا هَمْسًا

بعض علماء نے فرمایا: الھمس کا معنی ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینا ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے فلا ینطقون الا ھمساً پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی قریب قریب ہے یعنی ان کی آواز، کلام اور قدموں کی آواز نہیں سنی جائے گی۔ (ھ، م، س) کی بناء کا اصل معنی خفاء ہے جیسا بھی اس میں تصرف ہو اسی سے حروف مہموسہ ہیں۔ یہ دس حروف ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے (حثه شخص فسکت) ان کو حروف مہموسہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ مخرج میں اعتماد کمزور ہوتا ہے حتی کہ اس کے ساتھ سانس جاری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ**، مَنْ محل نصب میں ہے پہلے سے استثناء خارج کی بنا پر یعنی لا تنفع الشفاعة احداً الا شفاعة من اذن له الرحمن یعنی کسی کو شفاعت نفع نہ دے گی مگر اس کی شفاعت جس کو رحمٰن اذن شفاعت فرمائے گا۔ **وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا** یعنی اللہ تعالیٰ جس کی شفاعت پر راضی ہوگا۔ بعض نے فرمایا:

اس کا مطلب ہے شفاعت اسے نفع دے گی جسے رحمٰن شفاعت کرنے کی اجازت دے گا اور اس کے لیے ایسا قول ہوگا جو پسندیدہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قول سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ یعنی قیامت کے امر سے وَ مَا خَلْفَهُمْ امر دنیا ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جانتا ہے جس ثواب اور عقاب کی طرف لوٹیں گے۔ وَ مَا خَلْفَهُمْ جو انہوں نے دنیا میں پیچھے چھوڑا پھر بعض نے فرمایا: یہ آیت تمام لوگوں کو شامل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے داعی کی اتباع کی۔ والحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ بہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، یعنی کوئی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا، کیونکہ احاطہ حد کا شعور دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے پاک ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع علم ہے یعنی کوئی اس علم کا احاطہ نہیں کرتا جس کو اللہ جانتا ہے۔ طبری نے کہا: اَيْدِيْهِمْ اور خَلْفَهُمْ اور يُحِيْطُوْنَ میں ضمائر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ اللہ زیادہ جانتا ہے۔ جو فرشتوں کی عبادت کرتا ہے وہ نہیں جانتے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔

**وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾**

"اور (فرط نیاز سے) جھک جائیں گے سب (لوگوں کے) چہرے حی و قیوم کے سامنے اور نامراد ہوا جس نے لادا اپنے (سر) پر ظلم (کا بار گراں)۔ اور جو شخص کرتا ہے نیک اعمال اور وہ ایمان دار بھی ہو تو اسے اندیشہ نہ ہوگا کسی ظلم کا یا حق تلفی کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ یعنی چہرے جھک جائیں گے؛ یہ ابن الاعرابی وغیرہ کا قول ہے۔ اسی سے قیدی کو عان کہا جاتا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

ملیكٌ على عرش السّماءِ مُهَيمِنٌ    لعزّتِهِ تَعْنُو الوجوهُ وتَسجدُ

اور شاعر نے کہا:

وعَنَاله    وَجْهِي    وخَلْقِي    كلُّه    فى الساجدين لوجهه مَشْكُوْرًا

جوہری نے کہا: عنا یعنو جھک گیا اور مطیع ہوا۔ اور دوسرے نے اسے جھکا دیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ کہا جاتا ہے: عنا فیهم فلان اسیراً یعنی فلاں ان میں قیدی ہو کر رہا۔ عناه غیرہ تعنیة کا معنی ہے اس نے اس کو روک لیا۔ العانی قیدی کو کہتے ہیں۔ وقوم عناة ونسوة عوان وعنت به امور نزلت قیدی قوم، قیدی عورتیں۔ اس کے ذریعے امور آسان ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عنت کا معنی ہے جھک گئے۔ مجاہد نے کہا: عنت کا معنی ہے خشعت۔ ذل اور خشوع میں فرق ہے اگرچہ قریب المعنی ہیں۔ ذل کا مطلب ہے ذلیل النفس ہونا۔ الخشوع کا مطلب ہے صاحب طاعت کے لیے مطیع ہونا۔ کلبی نے کہا: عنت کا معنی ہے عملت کام کیا۔ عطیہ عوفی نے کہا: اس کا معنی ہے تسلیم کرنا۔ طلق بن حبیب نے کہا: اس کا مطلب ہے زمین پر سجدہ میں پیشانی اور ناک کو رکھنا۔ نحاس نے کہا: عنت الوجوہ

کے دو معانی ہیں ایک یہ کہ آخرت میں چہرے جھکے ہوں گے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ فرمایا اس سے مراد رکوع و سجود کرنا اور عنت کا معنی لغت میں قہر اور غلبہ ہے۔ اسی سے ہے: فتحت البلاد عنوۃ۔ شاعر نے کہا:

فما أخذوها عَنْوَةً عن مودة　　ولكنْ بضربِ المَشْرَفِيِّ استقالها

بعض علماء نے فرمایا: یہ العناء سے مشتق ہے جس کا معنی تھکنا ہے لوگوں کی جگہ چہروں کا ذکر فرمایا۔ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ، القیوم میں تین تاویلات ہیں۔ وہ مخلوق کی تدبیر کو قائم کرتا ہے۔ ہر نفس نے جو کچھ کیا اس پر وہ قائم ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے نہ وہ زائل ہوگا نہ ہلاک ہوگا۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا یعنی جس نے شرک کو اٹھایا وہ خسارے میں گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں من تبعیض کے لیے ہے یعنی شیئا من الصالحٰت۔ بعض نے کہا: جنس کے لیے ہے۔ فَلَا يَخَفُ ابن کثیر، مجاہد، ابن محیصن نے یخف، من یعمل کے جواب کی حیثیت سے جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یخاف پڑھا ہے۔ خبر کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے، یعنی فھو لایخاف یافانہ لایخاف، ظُلْمًا اس کی طاعت کے ثواب میں کمی نہ ہوگی اور اس کی سیئات میں اس پر اضافہ کیا جائے گے۔ وَلَا هَضْمًا اس کے حق میں کمی کر کے حق تلفی نہیں کی جائے، یعنی میں نے اس کے حق کو گرا دیا اور اسے چھوڑ دیا۔ ھذا یھضم الطعام یعنی وہ کھانے کے بوجھ کو کم کرتا ہے۔ امرأۃ ضیم الکشح ایسی عورت جس کا پیٹ پتلا ہو۔ ماوردی نے کہا: ظلم اور ھضم کے درمیان فرق یہ ہے کہ ظلم کا معنی تمام حق سے روکنا ہے اور الھضم بعض حق سے محروم کرنا ہے۔ الھضم بھی ظلم ہے۔ ایک اعتبار سے فرق ہے۔ متوکل لیثی نے کہا:

إنَّ الأذلّةَ واللئامَ لَمَعشَرٌ　　مَوْلَاهُم المتهضَّم والمظلومُ

جوہری نے کہا: رجل ھضیم و مھتضم یعنی مظلوم آدمی، تہضمہ یعنی اس نے اس پر ظلم کیا۔ اھتضمتہ جب کوئی کسی پر ظلم کرے اور اس کے حق کو توڑ دے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

''اور اسی طرح ہم نے اتارا اس کتاب کو قرآن عربی میں اور طرح طرح سے بیان کیں اس میں گناہوں کی سزائیں تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں یا پیدا کر دے یہ قرآن ان کے دلوں میں یہ سمجھ۔ پس اعلیٰ وارفع ہے اللہ تعالیٰ جو سچا بادشاہ ہے اور نہ عجلت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ کی طرف اس کی وحی اور دعا مانگا کیجئے میرے رب (اور) زیادہ کر میرے علم کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ یعنی جس طرح ہم نے آپ کے لیے اس سورت میں بیان کیا فکذالک جعلناہ قرآنا

عربیا یعنی لغت عرب میں بنایا۔ وَ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ ہم نے تخویف، تہدید، ثواب اور عقاب بیان کیا۔ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یعنی وہ اللہ سے ڈریں اور گناہوں سے اجتناب کریں اور اس کے عذاب سے بچنے والے ہو جائیں۔ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا، ذکر سے مراد نصیحت ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد احتیاط اور تقویٰ ہے۔ بعض نے فرمایا: ذِكْرًا سے مراد شرف ہے۔ یہاں ذکر بمعنی شرف ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف: 44) بعض نے فرمایا: تا کہ وہ اس عذاب سے نصیحت حاصل کریں جس کی انہیں وعید سنائی گئی ہے۔ حسن نے اونحدث نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان سے ثاء کے رفع اور جزم کے ساتھ مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ جب بندوں کو اپنی عظیم نعمت کا تعارف کرانا اور قرآن کے نازل کرنے کے متعلق بتایا تو اولاد اور ند (مدمقابل) سے اپنی ذات کو پاک فرمایا۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ یعنی اللہ بلند و بالا ہے۔ الْمَلِكُ الْحَقُّ حق والا ہے۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتایا کہ کیسے قرآن کو حاصل کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریل کے ساتھ جلدی کرتے تھے اور جبریل کے وحی سے فارغ ہونے سے پہلے اسے پڑھتے تھے یہ آپ کا وحی کی حفاظت پر شوق تھا اور قرآن کے بھولنے کے خوف کی وجہ سے تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے منع فرمایا اور وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ نازل فرمایا۔ یہ اس قول کی طرح ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ (القیامۃ) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: اس کا مطلب ہے آپ اس کو پوری طرح ہمارے واضح کرنے سے پہلے تلاوت نہ کریں۔ بعض نے فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ کا معنی ہے اس کے انزال کا سوال نہ کر اس سے پہلے کہ آپ کے پاس وحی آجائے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان کی تاویل کے بیان سے پہلے لوگوں پر نہ پڑھیں۔ حسن نے کہا: یہ ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنی بیوی کو طمانچہ مارا اور وہ عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں قصاص کا مطالبہ لے کر آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے قصاص کا فیصلہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ (النساء: 34) اسی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا کہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کا حکم فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار کیا(1)۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے من قبل ان نقضی نون کے ساتھ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور وحیہٗ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

## وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۞

''ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ اعمش نے اس سے مختلف پڑھا ہے۔ فنسی یا کے اسکان کے ساتھ۔ اس کے دو معانی ہیں۔ چھوڑ دینا یعنی امر اور عہد کو ترک کر دیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے، اکثر مفسرین کا قول ہے اسی سے یہ

1۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 145

قول ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ:67) دوسرا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں سہو اور نسیان سے ہے۔ انسان سے اس نے عہد لیا اور وہ بھول گیا۔ ابن زید نے کہا: جو اس سے عہد لیا تھا وہ بھول گیا اگر اس کے لیے عزم ہوتا۔ تو اپنے دشمن ابلیس کی اطاعت نہ کرتا اس قول کی بنا پر یہ احتمال ہے کہ اس وقت میں حضرت آدم علیہ السلام کا بھول پر مؤاخذہ کیا گیا تھا اگر چہ اب ہم سے بھول کو معاف کیا گیا ہے۔ مِنْ قَبْلُ یعنی درخت سے کھانے سے پہلے کیونکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے یعنی بنی آدم کا شیطان کی اطاعت کرنا امر قدیم ہے، یعنی اگر انہوں نے عہد کو توڑا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے ہم سے عہد لیا تو وہ بھول گئے؛ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔ اسی طرح طبری نے بیان کیا ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کفار میری آیات سے اعراض کرتے ہیں اور میرے رسولوں کی مخالفت کرتے ہیں اور ابلیس کی اطاعت کرتے ہیں پہلے ان کے باپ حضرت آدم نے بھی ایسا کیا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تاویل ضعیف ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا منکرین کفار کی مثل ہونا درست نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے تاویل کی وجہ سے معصیت ہوئی تھی۔ اس قول میں نبی کی گستاخی اور نقص ہے آیت میں ظاہر یا تو یہ ہے کہ ایک واقعہ کی ابتدا ہے اس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے یا اس کا ماقبل سے تعلق ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد لیا تھا کہ وہ قرآن کو پڑھنے میں جلدی نہ کریں تو آپ کے لیے آپ سے پہلے ایک نبی کی مثال بیان کی گئی جس کے ساتھ عہد کیا گیا تھا پس وہ بھول گیا تو انہیں عتاب کیا گیا تاکہ تحذیر سخت ہو جائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد میں مبالغہ ہو جائے۔ یہاں عہد بمعنی وصیت ہے اور نسی بمعنی ترک (چھوڑ دینا) ہے یہاں نسیان کا معنی ممکن نہیں کیونکہ بھولنے والے کو سزا نہیں دی جاتی۔ العزم کا معنی ہے کسی بھی چیز میں اپنے اعتقاد پر قائم رہنا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ درخت ممنوعہ سے نہیں کھائیں گے لیکن جب ابلیس نے آپ کو وسوسہ ڈالا تو آپ کا قصد وارادہ موجود نہ تھا اور حضرت آدم علیہ السلام سے جو عہد لیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اس درخت سے نہیں کھائیں گے اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ابلیس آپ کا دشمن ہے۔ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے فرمایا: ہم نے اسے درخت کے کھانے سے صبر کرنے والا نہ پایا اور حکم کے التزام پر مواظبت کرنے والا نہ پایا۔ نحاس نے کہا: اسی طرح لغت میں ہے کہا جاتا ہے: لفلان عزم یعنی گناہوں سے محفوظ ہونے پر صبر اور ثبات ہے حتی کہ وہ ان سے محفوظ ہے اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:35)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطیہ عوفی سے مروی ہے کہ جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے والا نہ پایا یعنی جس چیز سے اسے منع کیا گیا تھا اس کی حفاظت نہ کی حتی کہ بھول گئے۔ استدلال کے ترک کی وجہ سے اس کا علم نہ رہا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اگر آپ یہ درخت کھائیں گے تو ہمیشہ جنت میں رہیں گے یعنی اس نے اس درخت کو متعین کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی بات نہ مانی پھر اس نے اس درخت کی مثل کی طرف بلایا جو نہی کے عموم میں داخل تھا، حضرت آدم علیہ السلام پر واجب تھا کہ وہ اس پر استدلال کرتے اور ایسا نہ کرتے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ نہی میں داخل نہیں ہے پس آپ نے تاویل کی بنا پر کھالیا۔ وہ بھول والا شمار نہیں ہوتا جو جانتا ہو کہ یہ معصیت

ہے۔ ابن زید نے کہا: عزماً کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے امر کی محافظت کرنا۔ ضحاک نے کہا: امر کی عزیمت۔ ابن کیسان نے کہا: اصرار کرنا، گناہ کی طرف لوٹنے کو پوشیدہ نہ رکھنا۔ قشیری نے کہا: پہلا قول کلام کی تاویل کے زیادہ قریب ہے۔ اسی وجہ سے ایک قوم نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے نہ تھے اور کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا معظم نے کہا: تمام رسل اولوالعزم تھے۔ حدیث میں ہے: ''کوئی نبی نہیں تھا مگر اس نے خطا کی، خطا کا خیال گزرا سوائے یحییٰ بن زکریا کے'' (1)۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام اپنی خطا کے سبب اولی العزم سے نکل جاتے تو حضرت یحییٰ کے سوا تمام انبیاء نکل جاتے۔ ابو امامہ نے کہا: اگر بنی آدم کے حلم کو جمع کیا جائے جب سے اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور قیامت تک (جتنی پیدا ہوگی) سب کے حلم کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں حضرت آدم کے حلم کو رکھا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کا حلم بھاری ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا (سوائے ابلیس کے) اس نے (حکم بجا لانے سے) انکار کیا۔ اور ہم نے فرمادیا: اے آدم! بیشک یہ تیرا دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ بیشک تمہارے لیے یہ ہے کہ تمہیں نہ بھوک لگے گی یہاں اور نہ تم ننگے ہو گے، اور تمہیں نہ پیاس لگے گی یہاں اور نہ دھوپ ستائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾، سورۂ بقرہ میں اس پر تفصیلاً گفتگو گزر چکی ہے۔ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا یہ نہی ہے مطلب یہ اس کی بات نہ ماننا ورنہ تمہارے جنت سے خروج کا سبب بن جائے گا۔ فَتَشْقٰى یعنی آپ اور آپ کی بیوی دونوں علت کے برابر ہونے میں ایک ہیں۔ فتشقیا نہیں فرمایا کیونکہ معنی معروف ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام مخاطب ہیں اور وہی مقصود ہیں نیز حضرت آدم علیہ السلام حضرت حواء کے لیے محنت کرنے والے تھے اور اس کے لیے کمانے والے تھے تو شقا میں وہ خاص کیے گئے۔ بعض نے فرمایا: اخراج دونوں پر واقع ہوگا اور شقا صرف حضرت آدم پر ہوگا۔ اس سے مراد شقاوۃ البدن ہے۔ بدن کا تھکنا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ بعد میں فرمایا: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰى یعنی جنت میں نہ تجھے بھوک لگے گی نہ تم ننگے ہو گے۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰى آپ اس میں نہ پیاسے ہوں گے نہ دھوپ لگے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آگاہ کیا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے جنت میں ہوگا لباس، طعام، شراب، مسکن اور اگر آپ نے وصیت ضائع کر دی اور دشمن کی اطاعت کی تو وہ تمہیں جنت سے نکال دے گا اور آپ تھکاوٹ اور اذیت برداشت کریں گے یعنی آپ بھوکے ننگے ہوں گے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2294

اور پیاسے ہوں گے اور تجھے دھوپ بھی لگے گی تم زمین کی طرف لوٹائے جاؤ گے جب جنت سے نکالے جاؤ گے۔ شقاء کے ذکر میں حضرت آدم کو خاص فرمایا: فتشقیان نہیں فرمایا، اس میں تعلیم دی کہ بیوی کا نفقہ خاوند پر ہے پس اس دن سے عورتوں کا نفقہ مردوں پر ہے۔ جب حضرت حواء کا نفقہ حضرت آدم علیہ السلام پر تھا تو اسی طرح زوجیت کے حق کی وجہ سے حواء کی بیٹیوں کا نفقہ حضرت آدم کے بیٹوں پر ہوگا۔ اس آیت میں ہمیں بتایا کہ وہ نفقہ جو عورت کے لیے خاوند پر واجب ہوتا ہے وہ چار چیزیں ہیں۔ طعام، مشروب، لباس اور مسکن۔ جب مرد عورت کو یہ چار چیز مہیا کرے تو وہ اس کے نفقہ سے عہدہ برا دسمجھا جائے گا۔ اگر اس کے بعد اس پر کوئی مہربانی کرتا ہے تو وہ ماجور ہوگا یہ چار چیزیں تو عورت کے لیے ضروری ہیں کیونکہ اس کے ساتھ زندگی کا قیام ہے۔ حسن نے فتشقی سے مراد دنیا کی تکلیف ہے۔ ابن آدم نہیں دیکھا جاتا مگر تھکا ہوا۔ فراء نے کہا: وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سرخ اونٹ اتارا گیا وہ اس پر کھیتی باڑی کرتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے۔ یہ وہ شقا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا گیا تو یہ پہلی شقا تھی۔ حضرت جبریل نے حضرت آدم علیہ السلام پر جنت سے دانے اتارے تھے اور کہا تھا: اے آدم! اس کو کاشت کرو اور زراعت کر پھر حضرت آدم علیہ السلام نے کھیتی باڑی کی فصل کو پھر کاٹا، پھر اسے گاھا پھر صاف کیا پھر اسے پیسا پھر گوندھا پھر روٹی پکائی، پھر تھکن کے بعد کھایا پھر ان کے ہاتھ سے روٹی گر گئی حتی کہ وہ پہاڑ کے نیچے چلی گئی حضرت آدم علیہ السلام اس کے پیچھے چلتے گئے حتی کہ تھک گئے اور پیشانی پر پسینہ آگیا اور کہا: اے آدم! تیرا رزق تھکاوٹ اور مشقت کے ساتھ ہوگا اور تیری اولاد کا رزق بھی دنیا میں تیرے بعد اسی طرح ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا ھا ضمیر سے مراد جنت ہے۔ لاتظمأ کا معنی ہے پیاسا نہ ہوگا۔ الظمأ سے مراد پیاس ہے۔ وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ تم سورج کے سامنے نہ آؤ گے کہ تمہیں اس کی گرمی لگے کیونکہ جنت میں سورج نہیں ہے۔ وہ لمبے لمبے سائے ہیں جس طرح فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت ہوتا ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا: جنت کا دن اسی طرح ہے اور نماز فجر پڑھنے والوں کے لیے وقت کی طرف اشارہ کیا۔ ابو زید نے کہا: ضحا الطریق یضحو ضُحوا اس کا مطلب ہے راستہ ظاہر ہوگیا۔ وضَحِیت وضحیت ضَحاً (پسینہ آیا) ضَحِیت للشمس ضَحاء (ممدود) کا مطلب ہے ظاہر ہوا۔ ضحیت حاء کے فتحہ کے ساتھ۔ دونوں لغتوں میں اضحی مضارع کا صیغہ آتا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

رَأَتْ رَجُلاً أَيْمَا إذا الشمسُ عَارَضَتْ فَيَضْحىٰ وأماّ بالعَشِيِّ فَيَخْصَرُ

حدیث میں ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سائے میں ایک شخص کو دیکھا تو آپ نے اسے فرمایا: جس کے لیے احرام باندھا ہے اس کی خاطر دھوپ میں آ۔ اسی طرح محدثین نے أضحِ ہمزہ کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ أضحیت سے مشتق ذکر کیا ہے، کیونکہ آپ نے اسے دھوپ میں آنے کا حکم دیا ہے اسی سے یہ ارشاد ہے: وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى اور بطور

استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

ضَحِيتُ له كَنَى أَستظلَّ بظلّهِ إذا الظلُّ أضْحى فى القيامة قَالِصَا

ابوعمرو اور کوفیوں نے سوائے عاصم کے ابوبکر کی روایت میں وانك ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ الا تجوع پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ اور مرفوع ہونا بھی جائز ہے اس وقت موضع پر عطف ہوگا معنی یہ ہے کہ لك أنك لاتظمأفيها۔ باقی علماء نے استئناء کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یا ان لك پر عطف کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

''پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اس نے کہا: اے آدم! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو۔ سو (اس کے پھسلانے سے) دونوں نے کھالیا اس درخت سے تو (فوراً) برہنہ ہوگئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ چپکانے لگ گئے اپنے (جسم) پر جنت (کے درختوں) کے پتے اور حکم عدولی ہوگئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا۔ پھر (اپنے قرب کے لیے) چن لیا انہیں اپنے رب نے اور (عفو ورحمت سے) توجہ فرمائی ان پر اور ہدایت بخشی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ قَالَ یعنی شیطان نے کہا: يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى یہ کلام بالمشافہ پر دلیل ہے۔ شیطان جنت میں سانپ کے منہ میں داخل ہوا تھا جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور درخت کے تعیین کی بحث بھی گزر چکی ہے۔ اور علماء کے جو اقوال ہیں وہ بھی گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ۔ یہ بھی سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ فراء نے کہا: طفقا کا عربی میں معنی ہے متوجہ ہوئے۔ فرمایا: بعض علماء نے کہا: وہ انجیر کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَعَصٰۤى سورۂ بقرہ میں انبیاء کے ذنوب کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ہمارے بعض متاخرین علماء نے فرمایا: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض سے ذنب کے وقوع کی خبر دی اور ذنوب کو ان کی طرف منسوب کیا اور انہیں اس پر عتاب بھی کیا اور خود انبیاء کرام نے اپنے بارے میں اس کی خبر بھی دی، وہ اس پر پریشان بھی ہوئے ان سے توبہ واستغفار بھی کیا یہ تمام چیزیں بہت سے مقامات پر موجود ہیں۔ یہ امور جو ان سے واقع ہوئے جہت عذر پر ہیں اور جہت خطا اور نسیان پر ہیں یا کسی تاویل کی بنا پر ہیں جو اس کی داعی تھی یہ کام غیر کی نسبت سے نیکیاں تھے اور ان کے حق میں سیئات تھے کیونکہ ان کے مناصب ومراتب بہت بلند تھے اور ان کی اقدار بہت بلند تھیں ایک کام پر وزیر کا مواخذہ ہوتا ہے

اور کو توال کو بدلہ دیا جاتا ہے اسی وجہ سے وہ قیامت کے موقف میں خوف کھائیں گے حالانکہ انہیں امن و امان اور سلامتی کا عمل ہے۔ فرمایا: یہی حق ہے کیا خوب کہا ہے حضرت جنید نے: حسنات الأبرا سیئات المقربین ابرار کی نیکیاں مقربین کی سیئات شمار ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام سے ذنوب کے وقوع پر اگرچہ نصوص قائم ہیں لیکن ان کے مناصب و مراتب میں اس سے کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ ان کے رتبہ میں قدح کا باعث ہیں بلکہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی تلافی فرمائی اور انہیں مقام اجتبا دعطا فرمایا، ہدایت کا راستہ دکھایا، ان کی مدح کی، ان کا تزکیہ کیا، انہیں مقام اصطفاء سے نوازا۔ صلوات اللہ علیہم و سلامہ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے فرمایا: آج ہم میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے ایسی بات کریں مگر یہ کہ جب انکا ذکر کریں تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے تحت کلام کریں۔ اپنی طرف سے ان کی شان میں کچھ کہنا قطعاً جائز نہیں۔ ہمارے جو قریبی آباء گزرے ہیں جو ہماری مثل ہیں ان کے بارے ہتک آمیز یا تنقیص شان والا جملہ کہنا درست نہیں تو اپنے عظیم المرتبہ نبی مکرم و مقدم باپ کے بارے میں ایسا کلام کیسے جائز ہوگا جن کا اللہ تعالیٰ نے خود عذر بیان کیا ہے اور ان کی توبہ قبول فرمائی ہے اور ان کی بخشش فرمائی ہے۔

میں کہتا ہوں: جب یہ مخلوق کے بارے میں جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں خبر دینا، ہاتھ، انگلی، پہلو، نزول وغیرہ کا بھی ذکر بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ ابتداً اپنی طرف سے کچھ کہنا جائز نہیں ہے مگر کتاب اللہ کی قرابت اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ذکر کرنا جائز ہے۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں کوئی ایسا وصف بیان کیا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ (المائدہ: 64) پس اس نے اپنے ہاتھ سے گردن کی طرف اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح سمع و بصر کی طرف اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے ساتھ تشبیہ دی ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آئمہ نے یہ حدیث روایت کی ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے آدم! تو ہمارا باپ ہے تو نے ہمیں نامراد کیا اور تو نے ہمیں جنت سے نکالا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا اے حضرت موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے کلام سے مشرف کرنے کے لیے چنا اور تیرے لیے اپنے ہاتھ سے خط کھینچا۔ اے موسیٰ! کیا تو مجھے ایسے امر پر ملامت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے مجھ پر مقدر کر دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے'' (2)۔ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ مہلب نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے کا مطلب یہ حجت کے ذریعے غالب آگئے۔ لیث بن سعد نے کہا: اس واقعہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حجت صحیح تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خطا کو معاف کیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے زیبا نہیں تھا کہ وہ انہیں اس خطا کی وجہ سے عار دلاتے جس کو

1۔ التمہید، جلد 7، صفحہ 145
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7387

اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا۔'' اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا تو وہ موسیٰ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا کی اور اس میں ہر چیز کا علم ہے اور تو نے اس میں پایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر معصیت کو مقدر کیا ہے اور یہ بھی کہ اس سے توبہ کو مقدر کیا ہے پس اس نے اس وجہ سے مجھ سے ملامت کو ساقط کر دیا کیا تو مجھے ملامت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مجھے ملامت نہیں کرتا''۔ اس کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص پر حجت قائم کی تھی جس نے کہا تھا: عثمان جنگ اُحد میں بھاگ گئے تھے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس کا کوئی گناہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا فرمایا: وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ (آل عمران: 155) بعض نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام آب (باپ) تھے۔ ان کو ان کی نیکی کی وجہ سے عار دلانا جائز نہیں۔ اگر کسی دوسرے کو اس کے ساتھ عار دلانا جائز بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے بارے میں فرمایا: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان: 15) اسی وجہ سے حضرت ابراہیم کو ان کے اب یعنی چچا نے کہا تھا جو کافر تھا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (مریم)

جب ایک کافر کو نازیبا کلمہ کہنا جائز نہیں تو پھر وہ باپ جو نبی بھی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مقام انبیاء پر فائز فرمایا ہے ان کی توبہ قبول کی ہے اور راہ ہدایت دی ہے۔ (اس کی شان میں نازیبا کلمہ کہنا کیسے جائز ہوگا)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جس نے کوئی خطا کی اور اس کو مغفرت کا مژدہ نہیں ملا تو علماء کا اجماع ہے کہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کی حجت کی طرح حجت نہیں پکڑنی چاہیے کہ وہ کہے: تو مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے قتل کیا ہے یا زنا کیا یا چوری کی جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ مقدر کیا تھا۔ اور امت کا اجماع ہے کہ نیکی کرنے والے کی نیکی کی تعریف کی جائے اور برائی کرنے والے کو برائی پر ملامت کی جائے اور اس کے گناہوں کو شمار کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَغَوٰی اس کا معنی ہے اس نے اپنی زندگی کو خراب کر دیا؛ یہ نقاش نے حکایت کیا ہے اور قشیری نے اس کو پسند کیا ہے میں نے اپنے شیخ استاذ المقری ابو جعفر قرطبی کو یہ کہتے ہوئے سنا: فَغَوٰی دنیا کی طرف اترنے کے ساتھ اپنی زندگی کو خراب کر دیا۔ الغیّ کا معنی فساد ہے۔ یہ اچھی تاویل ہے اور جنہوں نے غویٰ کا معنی ضل کیا ہے۔ ان کی تاویل سے یہ تاویل اولیٰ ہے۔ ضل معنی کرنے والوں نے اسے الغیّ سے مشتق کیا ہے جس کا معنی رشد کی ضد ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اپنے رشد کی جگہ سے ناواقف رہا، یعنی آپ کو معلوم نہ ہوا کہ یہ درخت بھی ان درختوں سے ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ الغیّ کا معنی الجہل ہے۔ بعض سے مروی ہے: فَغَوٰی کا معنی ہے کثرت اکل سے بدہضمی ہوئی۔ زمخشری نے کہا: یہ ان کی لغت پر صحیح ہے جو یاء ماقبل مکسور کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ فنِیَ اور بقِیَ میں فنیٰ اور بقیٰ کہتے ہیں یہ بنو طے کی لغت ہے۔ یہ تفسیر خبیث ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ قشیری ابو نصر نے کہا: ایک قوم نے کہا: کہا جاتا ہے عصیٰ آدم وغویٰ عاصٍ اور غاوٍ نہیں کہا جاتا جیسا کہ جو ایک مرتبہ کپڑا سیے تو کہا جاتا ہے: خاط (اس نے سیا) اسے خیاط نہیں کہا جاتا جب تک بار بار خیاطت کا عمل نہ کرے۔ بعض نے کہا: سردار کے لیے اپنے غلام کو معصیت کے وقت کہنا جائز ہوتا ہے غیر کے لیے اسے وہ کہنا جائز نہیں ہوتا۔

یہ تکلف ہے اور جو انبیاء کرام کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یا تو صغائر ہیں یا ترک اولیٰ ہے یا نبوت سے پہلے کے اعمال ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔ امام ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام سے یہ کام نبوت سے پہلے ہوا تھا اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى، اجتباء اور هدایت، عصیان کے بعد تھے۔ جب یہ نبوت سے پہلے تھا تو ان پر ایک وجہ سے ذنوب بھی جائز ہیں کیونکہ نبوت سے پہلے ہم پر ان کی تصدیق میں کوئی حکم نہیں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا جبکہ وہ پیغام کی ادائیگی میں مامون تھے اور معصوم تھے تو پہلے ذنوب نے انہیں کوئی نقصان نہ دیا۔ یہ عمدہ بحث ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝

''حکم ملا: دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو وہ نہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہو گا۔ اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لیے زندگی (کا جامہ) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! کیوں اٹھایا ہے تو نے مجھے نابینا کر کے میں تو (پہلے بالکل) بینا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری آیتیں سو تو نے انہیں بھلا دیا اسی طرح آج تجھے فراموش کر دیا جائے گا۔ اور یونہی ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا اپنے رب کی آیتوں پر، اور (سن لو) آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا حضرت آدم و ابلیس کو خطاب فرمایا۔ مِنْهَا جنت سے۔ ابلیس کو فرمایا: اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (الاعراف: 18) شاید اسے جنت سے آسمان کی کسی جگہ پر نکلنے کا حکم دیا پھر اسے زمین کی طرف اتارا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ یہ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یعنی تو سانپ اور ابلیس کا دشمن ہو گا اور وہ تیرے دشمن ہوں گے۔ یہ دلیل ہے کہ اهبطا آدم وحواء کو خطاب نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے۔ حضرت آدم کا اترنا حضرت حواء کے اُترنے کے ضمن میں ہے۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى رشد اور سچی بات مراد ہے سورۂ بقرہ میں یہ بھی گزر چکا ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ یعنی جس نے رسل اور کتب کی پیروی کی۔ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ضمانت دی ہے جو قرآن پڑھے گا اور اس کے احکام پر عمل کرے وہ دنیا میں گمراہ نہ ہو گا اور آخرت

میں بد بخت نہ ہوگا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس میں موجود احکام کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت دے گا اور قیامت کے روز بُرے حساب سے اسے بچالے گا پھر یہ آیت پڑھی: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ یعنی میرے دین سے میری کتاب کی تلاوت سے اور اس کے احکام پر عمل سے اعراض کیا۔ بعض نے فرمایا: ذِكْرِيْ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اتارے گئے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ذکر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں کیونکہ آپ کی طرف سے نصیحت ہے۔ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا تنگ زندگی۔ کہا جاتا ہے: منزل ضنك وعیش ضنك اس میں واحد، تثنیہ، مذکر، مونث جمع برابر ہے۔ عنترہ نے کہا:

إنْ يُلحقوا أكْرُرْ وإنْ يَستلحمُوا أَشْدُدْ وإنْ يُلفَوْا بضَنْكٍ أنزِلِ

شاعر نے کہا:

إن المنيةَ لو تُمثَّل مُثِّلت مثلي إذا نَزلُوا بضَنكِ المنزِلِ

اور ضنكي بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ تسلیم، قناعت، اس پر توکل اور اس کی تقسیم پر راضی ہونا عطا کیا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے سخاوت و سہولت کے ساتھ خرچ کرتا ہے وہ بلند زندگی گزارتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل: 97) جو شخص دین سے اعراض کرتا ہے اس پر حرص غالب آ جاتی ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ دنیا کی زیادتی کا لالچ کرتا رہتا ہے اس پر بخل کو مسلط کیا جاتا ہے جو اس کو خرچ کرنے سے روکتا ہے پس اس کی زندگی تنگ ہوتی ہے اور اس کا حال تاریک ہوتا ہے، جیسا کہ بعض نے فرمایا: اپنے رب کے ذکر سے اعراض نہیں کرتا مگر جس پر وقت تاریک ہوتا ہے اور رزق کے بارے میں پریشان ہوتا ہے اس کی زندگی تنگ ہوتی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ضَنْكًا سے مراد حرام کمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد کانٹے اور جھاڑی اور زقوم کا درخت ہے۔ چوتھا قول یہ ہے جو کہ صحیح ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر ہے۔ ابو سعید خدری اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کا یہ قول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً اس قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب التذکرہ میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کافر پر اس کی قبر تنگ ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں۔ یہ **معيشة ضنكا** ہے۔

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى بعض علماء نے فرمایا: ایک حال میں اندھا ہوگا اور ایک حال میں بینا ہوگا۔ سورۂ سبحان کے آخر میں یہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ حجت پیش کرنے سے اندھا ہوگا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ خیر کی جہات سے اندھا ہوگا کسی خیر کی طرف ہدایت نہ پائے گا۔ بعض نے فرمایا: اپنے آپ سے عذاب دور کرنے کے حیلہ سے اندھا ہوگا جیسے وہ اندھا بے بس ہوتا ہے جسے کچھ نظر نہیں آتا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى یعنی کس گناہ کی وجہ سے مجھے اندھا ہونے کی سزا دی؟ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا دنیا میں میں بینا تھا۔ گویا اس کا گمان ہوگا کہ اس کا کوئی گناہ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مجھے حجت سے کیوں اندھا کر کے اٹھایا حالانکہ میں دنیا میں حجت کو جاننے والا تھا۔ قشیری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ کافر کے لیے دنیا میں

کوئی حجت نہیں۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا یعنی الله تعالیٰ اسے فرمائے گا: ہماری وحدانیت اور قدرت پر ہماری نشانیاں تیرے پاس آئیں۔ فَنَسِيْتَهَا تو نے انہیں چھوڑ دیا اور تو نے ان کی طرف نہیں دیکھا اور تو نے ان سے اعراض کیا۔ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى تو عذاب میں آج چھوڑا گیا ہے مراد جہنم ہے۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ جس طرح ہم نے قرآن سے اعراض کرنے والے اور مصنوعات میں غور وفکر نہ کرنے والے اور معصیت میں حد سے تجاوز کرنے والے کو جزا دی، وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ اپنے رب کی آیات کی تصدیق نہیں کی۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ آخرت کا عذاب معیشت ضنک اور عذاب قبر سے زیادہ خوفناک ہے۔ وَ اَبْقٰى دائمی عذاب ہے کیونکہ وہ ختم نہیں ہوگا۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

”کیا (یہ بات) انہیں راہ راست نہ دکھا سکی کہ کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے (بداعمالیوں کے باعث) ان سے پہلے برباد کر دیا چلتے پھرتے ہیں یہ لوگ جن کے (اجڑے ہوئے) مکانوں میں اس میں (ہماری قدرت) کی نشانیاں ہیں دانش مندوں کے لیے۔ اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لیے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔ پس (اے حبیب!) صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانیوالی) باتوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں اس کی پاکی بیان کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ آپ خوش رہیں“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ اس سے مراد اہل مکہ ہیں یعنی کیا ان کے لیے ان کی خبر واضح نہیں ہوئی جن کو ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ یہ ان کے مکانوں کے درمیان چلتے ہیں جب طلب معاش میں تجارت کے لیے سفر کرتے ہیں اور گزشتہ قوموں کے شہروں کو دیکھتے ہیں اور چھتوں کے بل گری پڑی بستیوں کو دیکھتے ہیں یعنی کیا وہ نہیں ڈرتے اس عذاب سے کہ ان پر بھی ویسا عذاب اترے جو ان سے پہلے کفار پر اترا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسلمی وغیرہما نے نهد لهم نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ زیادہ واضح ہے۔ يهد یاء کے ساتھ فاعل کی وجہ سے مشکل ہے۔ کوفیوں نے کہا: کم فاعل ہے۔ نحاس نے کہا: یہ خطا ہے کیونکہ کم استفہامیہ میں اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے جن کو ہم نے ہلاک کیا ان کی ہلاکت کا امر ان کے لیے واضح نہیں ہوا۔ يهد کی حقیقت ہدایت پر دلالت کرتی ہے اور فاعل الهدیٰ ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: افلم يهد الهدیٰ لهم۔ زجاج نے کہا: کم محل نصب میں ہے اور اس کا ناصب أهلكنا ہے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی تیرے رب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر عذاب لازم ہو جاتا۔ قتادہ کا قول ہے: اللزام کا مطلب ملازمت ہے یعنی انہیں عذاب لازم ہوتا۔ کان کا اسم مضمر ہے۔ زجاج نے فرمایا: وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ۝۱۲۹ ، اس کا عطف کلمہ پر ہے۔ قتادہ نے کہا: مراد قیامت ہے۔ یہ قتبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ان کا بدر کے دن تک مؤخر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ان کی باتوں پر صبر کا حکم دیا ہے۔ وہ کبھی کہتے: جادوگر ہے، کبھی کہتے: کاہن ہے، کبھی کہتے: کذاب ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ ان کی پرواہ نہ کریں کیونکہ ان کے لیے عذاب کا وقت مقرر ہے وہ نہ مقدم ہوگا نہ مؤخر ہوگا۔ پھر بعض نے فرمایا: یہ آیت، آیت قتال سے منسوخ ہے بعض نے فرمایا: منسوخ نہیں ہے کیونکہ آیت قتال کے بعد کفار کو جڑ سے ختم نہیں کیا گیا بلکہ ان میں بڑے بڑے بچ بھی گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ پانچ نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد صبح کی نماز ہے۔ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا سے مراد عصر کی نماز ہے۔ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مراد عشاء کی نماز ہے۔ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ سے مراد مغرب اور ظہر کی نماز ہے کیونکہ ظہر دن کے پہلے حصہ کے آخر میں، دوسرے حصہ کی ابتدا میں ہوتی ہے یہ دن کی دونوں طرفوں میں ہے۔ تیسری طرف سورج کا غروب ہے اور وہ مغرب کا وقت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ زوال ان میں حد فاصل ہے ہر حصہ کی دو طرفیں ہیں زوال کے وقت دو طرفیں ہیں۔ پہلے حصہ سے آخری حصہ اور دوسرے حصہ سے پہلا حصہ۔ طرفین کی جگہ اطراف ذکر فرمایا جیسا کہ فرمایا: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) اس کی طرف ابن فورک نے المشکل میں اشارہ کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النہار جنس کے لیے ہے ہر دن کی ایک طرف ہے اور وہ جمع کے معنی میں ہے کیونکہ وہ ہر دن کی طرف راجع ہے۔ اٰنَآئِ الَّيْلِ رات کی گھڑیاں۔ الاناء کا واحد اِنْیٌ، اِنًی و اَنًی۔ ایک فرقہ نے کہا: اس آیت سے مراد نفلی نماز ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝۱۳۰ ، تا کے فتحہ کے ساتھ تاکہ آپ کو ان پسندیدہ اعمال پر ثواب دیا جائے۔ کسائی اور ابوبکر نے عاصم سے روایت کر کے ترضیٰ تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تجھے وہ عطا کیا جائے جو تجھے خوش کرے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۳۱ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝۱۳۲

”اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھیے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب وزینت ہے دنیوی زندگی کی (اور انہیں اس لیے دی ہیں) تاکہ ہم آزمائیں انہیں ان سے اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اور حکم دیجیے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہیے اس پر، نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو، اور اچھا انجام

پرہیزگاری کا ہی ہوتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اس کا معنی سورۃ الحجر میں گزر چکا ہے۔ ازوجاً، متعنا کا مفعول ہے۔ زهرة حال کی بنا پر منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: زهرة، متعنا کے معنی کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس کا معنی ہے، جعلنالهم الحیاة الدنیا زهرةً یا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور وہ جعلنا فعل ہے یعنی جلعنا لهم زهرة الحیاة الدنیا۔ زجاج سے بھی یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بہ کی ضمیر کے مقام سے بدل ہے جیسے کہ تو کہتا ہے: مررت به اخاك۔ فراء نے حال کی بنا پر منصوب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں عامل متعنا ہے۔ فرمایا: تو کہتا ہے: مررت به المسکین اور اس کی تقدیر یہ ہے، متعنا هم به زهرة فی الحیاة الدنیا وزینة فیها اور صنع اللہ کی طرح مصدر کی بنا پر منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ اسی طرح وعد اللہ ہے۔ اس ترکیب میں نظر ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حال کی بنا پر نصب ہو۔ اور تنوین کے سکون اور الحیاة کے لام کی سکون کی وجہ سے حذف ہو جیسے: وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسین: 40) پڑھا ہے۔ نہار پر نصب سابق کی وجہ سے اس تقدیر پر کہ اس کے سکون اور لام کے سکون کی وجہ سے تنوین حذف ہے۔ اور الحیاة ما سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ولا تمدن عینیك الی الحیاة الدنیا زهرةً یعنی فی حال زهرتها اور زهرة کو ما سے بدل بنانا اچھا نہیں کیونکہ لنفتنهم، متعنا کے متعلق ہے اور زهرة الحیاة الدنیا سے مراد نباتات کے ساتھ اس کی زینت ہے۔ الزهرة هاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کلیاں ہیں۔ اور الزهرة زاء کے ضمہ اور هاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ستارہ ہے اور بنو زہرہ هاء کے سکون کے ساتھ ہے؛ یہ ابن عزیز کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے زهرة ها کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جیسے نهر اور نهَرَ اور کہا جاتا ہے: سراج زاهر یعنی اس کے لیے چمک ہے۔ زهر الاشجار۔ درختوں کے رنگ جو چمکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازهر اللون تھے، یعنی چمکدار رنگ والے تھے۔ ہر روشن چیز ہے یعنی زہرا ہے اور یہ خوبصورت ترین رنگ ہے۔ لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ یعنی ہم انہیں آزمائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم اس کو ان کے لیے فتنہ بنا دیں گے۔ آیت کا معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی چمک کو آپ کافی اہمیت نہ دیں کیونکہ اس کے لیے کوئی بقاء نہیں ہے۔ وَ لَا تَمُدَّنَّ یہ لاتنظرن سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ جو نظر کو لمبا کرتا ہے اسے اس پر حرص ابھارتی ہے جو اس کے ساتھ متصل ہے اور جو صرف دیکھتا ہے کبھی اس کے ساتھ حرص متصل نہیں ہوتی۔

**مسئلہ**: بعض لوگوں نے کہا: اس آیت کے نزول کا سبب وہ روایت ہے جو حضرت ابو رافع نے روایت کی ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے انہوں نے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک یہودی کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ اسے کہنا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک مہمان آیا ہے اور ہمارے پاس اس کی خوراک کے لیے کچھ نہیں ہے تو مجھے اتنا آٹا بیچ دے'' یا فرمایا: ''رجب کے چاند تک ادھار دے دے''۔ یہودی نے کہا: نہیں مگر رہن کے ساتھ دوں گا۔ حضرت ابو رافع نے کہا: میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ کر آیا تو میں نے آپ کو اس کی بات بتائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں آسمان میں امین ہوں، زمین میں امین ہوں اگر وہ مجھے ادھار دے یا بیچ دے تو میں

اسے ادا کر دوں گا تو میری اس کے پاس یہ زرہ لے جا'' (اور رہن رکھ دے) تو اللہ نے اپنے محبوب کو دنیا کے نہ ہونے پر تسلی دینے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ سبب ہونے پر اعتراض ہے کیونکہ یہ سورۂ مکی ہے اور یہ واقعہ مدنی ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخر میں پیش آیا کیونکہ آپ کا وصال ہوا تو اس واقعہ کی وجہ سے آپ کی زرہ ابھی اس یہودی کے پاس رہن تھی (1)۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کا ماقبل کے ساتھ اتصال ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں سے عبرت حاصل نہ کرنے پر کفار کو زجر و توبیخ فرمائی پھر انہیں موجل عذاب کی دھمکی دی پھر اپنے نبی کو ان کی حیثیت کو حقارت سے دیکھنے کا حکم دیا اور ان کی اذیت ناک باتوں پر صبر کرنے کا حکم دیا اور ان کے اموال سے اعراض کرنے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے منہ پھیرنے کا حکم دیا کیونکہ یہ تمام چیزیں ان سے ختم ہونے والی ہیں، رسوائی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح جو روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی المصطلق کے اونٹوں کے پاس سے گزرے تو موٹاپے کی وجہ سے ان کے دودھ اور مینگنیاں ان کی رانوں پر خشک ہو چکی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کپڑے سے پردہ کر لیا اور آگے گزر گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی، وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى یعنی صبر پر اور دنیا کی طرف کم توجہ پر اللہ تعالیٰ کا ثواب اولیٰ ہے کیونکہ وہ ثواب باقی رہنے والا ہے اور دنیا فنا ہونے والی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس رزق سے مراد وہ شہر اور اموال غنیمت ہیں جو اللہ تعالیٰ مومنین کو فتح کی صورت میں عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں کہ وہ نماز پر دوام اور ملازمت اختیار کریں۔ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور اس کے عموم میں تمام امت داخل ہے اور آپ کے اہل بیت بالخصوص داخل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد ہر صبح حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے گھر جاتے تھے اور کہتے تھے: الصلوۃ (2) (یعنی نماز کے لیے انہیں جگاتے تھے اور نماز کا حکم دیتے تھے) روایت ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب سلاطین کی اخبار میں کوئی چیز دیکھتے تھے تو فوراً اپنے گھر میں داخل ہو جاتے تھے اور یہ پڑھتے تھے: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ پھر نماز کے لیے اس طرح ندا دیتے تھے: الصلوۃ یرحمکم اللہ اور نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں کو نماز تہجد کے لیے جگاتے تھے اور خود نماز پڑھتے تھے اور اس آیت پر عمل کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا یعنی ہم تجھ سے سوال نہیں کرتے کہ تو اپنے آپ کو اور انہیں رزق دو اور رزق کے سبب نماز سے غافل ہو جاؤ بلکہ تمہارے اور ان کے رزق کے ہم کفیل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب گھر میں ہوتے تو نماز کا حکم دینے میں سختی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

---

1۔ ترمذی، باب ما جاء فی الرخصة فی الشراء، حدیث نمبر 1136، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب و من سورة احزاب، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۞ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ (الذاریات)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۞ یعنی اہل تقویٰ کے لیے جنت ہے، یعنی اچھا انجام۔ کبھی تقویٰ اختیار نہ کرنے والوں کے لیے انجام ہوتا ہے لیکن وہ مذموم ہوتا ہے، یہ معدوم کی طرح ہوتا ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۞ وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ۞ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ۞

''اور کفار کہتے ہیں کہ (یہ نبی) کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب کے پاس سے (ان سے پوچھو) کیا نہیں آ گیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی نازل شدہ کتابوں میں ہے۔ اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس سے پہلے تو کہتے: اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیتوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوئے (اے حبیب!) آپ انہیں فرمایئے ہر شخص (انجام کا) منتظر ہے سو تم بھی انتظار کرو تم عنقریب جان لو گے کون ہیں سیدھی راہ (پر چلنے) والے اور کون ہدایت یافتہ ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ یہ کفار مکہ نے کہا: یعنی ہمارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کوئی ایسی نشانی نہیں لے آیا جو علم ضروری کو ثابت کرتی یا کوئی ایسی آیت جو ظاہر ہوتی جیسے ثمود کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصایا کیوں نہ ایسی نشانیاں لے آیا جو ہم تجویز کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے انبیاء لے کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۞ صحف اولیٰ سے مراد تورات، انجیل اور پہلی کتب ہیں۔ یہ بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ جو کچھ ان میں ہے ان کی آپ نے خبر دی۔ الصحف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا ان کے پاس وہ نشانی نہیں آئی جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے جس کو انہوں نے سابقہ کتب میں بشارت کے طور پر پایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا ان کے پاس سابقہ امتوں کے کفار کو ہمارا ہلاک کرنا پہنچ نہیں چکا جو آیات تجویز کرتے تھے کونسی چیز انہیں امن دینے والی ہے کہ ان کے پاس اگر آیات آئیں تو ان کا حال ان کفار کی حالت جیسا نہ ہوگا۔ ابو جعفر، شیبہ، نافع، ابو عمرو، یعقوب، ابن اسحاق اور حفص نے أولم تاتھم تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ بینة مونث ہے باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے فعل کے مقدم ہونے کی وجہ سے۔ نیز بینة سے مراد بیان اور برہان ہے پس انہوں نے اس کو معنی کی طرف لوٹایا۔ ابو عبید اور حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے: اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةٌ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى اور کہا: بَيِّنَةٌ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى اس بنا پر جائز ہے۔ نحاس نے کہا: جب تو بینة کو تنوین دے اور رفع دے گا تو ما

کو اس سے بدل بنائے گا اور جب تو اسے نصب دے گا تو حال کی بنا پر ہوگا مطلب یہ ہوگا: اولم یاتھم مانی الصحف الاولی مبیناً کیا نہیں آچکا جو پہلے صحیفوں میں ہے جبکہ وہ بیان کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ یعنی محمد ﷺ کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پہلے۔ لَقَالُوْا قیامت کے روز کہیں گے۔ رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا یعنی کیوں نہ ہماری طرف رسول بھیجا۔ فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی، اس کو نُذَلّ ونُخزٰی مجہول کے صیغے بھی پڑھے گئے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''زمانہ فترہ میں ہلاک ہونے والے، پاگل کہے گا میرے پاس نہ کتاب آئی اور نہ رسول آیا پھر یہ تلاوت کی۔ وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا...الخ، اور پاگل کہے گا: اے میرے پروردگار! تو نے میرے لیے عقل ہی نہیں بنائی جس کے ساتھ میں خیر و شر کو سمجھتا اور مولود (بچہ) کہے گا: اے میرے رب! میں نے عمل کا زمانہ پایا ہی نہیں۔ پس ان کے لیے آگ بلند کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا: اس میں اترو اور داخل ہو جاؤ''۔ فرمایا: ''جو علم الٰہی میں سعید ہوگا اگر وہ عمل کو پاتا وہ اس میں داخل ہو جائے گا اور جو علم الٰہی میں شقی ہوگا اگر وہ عمل کو پاتا وہ رک جائے گا''۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی پھر اگر میرے رسول تیرے پاس آتے تو تم کیسے اتباع کرتے''(1)۔ حضرت ابوسعید سے موقوف بھی مروی ہے۔ اس میں نظر ہے۔ ہم نے اس کو کتاب التذکرہ میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو کہتے ہیں کہ بچے اور دوسرے لوگ آخرت میں آزمائے جائیں گے۔ فَنَتَّبِعَ کو نصب تخصیص کے جواب کے ساتھ ہے۔ اٰیٰتِكَ سے مراد وہ آیات ہیں جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے تھے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ عذاب میں ذلیل ہونے سے پہلے۔ وَنَخْزٰی اور جہنم میں رسوا ہونے سے پہلے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ دنیا میں عذاب میں ذلیل ہونے سے پہلے۔ وَنَخْزٰی آخرت میں اس کے عذاب میں رسوا ہونے سے پہلے۔ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ اے محمد! ﷺ انہیں فرمایئے ہر ایک منتظر ہے یعنی مومنین اور کفار گردش زمانہ کے منتظر ہیں۔ اور ہر شخص اس کا منتظر ہے کہ کامیابی کس کے لیے ہوتی ہے؟

فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾، اس سے مراد دین مستقیم اور ہدایت ہے مطلب یہ ہے کہ تم نصرت کے ساتھ جان لو گے کہ کون دین حق کی طرف جانے والا ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: تم قیامت کے روز جان لو گے کون جنت کے راستہ کا ہدایت یافتہ تھا؟ اس میں وعید، تخویف اور تہدید کی ایک صورت ہے اس کے ساتھ سورت کا اختتام کیا۔ فسوف تعلمون بھی پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابورافع نے کہا: میں نے نبی پاک ﷺ سے اس کو یاد کیا تھا؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ من زجاج کے نزدیک محل رفع میں ہے اور فراء نے کہا: محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے، جیسے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ: 220) ابواسحاق نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا اور من یہاں استفہامیہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے معنی یہ ہے تم سیدھے راستہ والوں کو جان لو گے ہم یا تم؟ نحاس

---

1۔ التمہید ابن عبدالبر، جلد 18، صفحہ 127، ابن عبدالبر آخر میں کہتے ہیں ان روایات کی اسناد ضعیف ہیں۔

نے کہا: فراء اس مفہوم کی طرف گئے ہیں من اصحاب الصراط السوی من لم یضل یعنی کون سیدھے راستے والے ہیں جو گمراہ نہیں ہوئے اور مَنِ اهْتَدٰی جو گمراہ ہوا پھر ہدایت پائی۔ یحییٰ بن یعمر، عاصم جحدری نے فسیعلمون من أصحاب الصراط السوّی پڑھا ہے، یعنی واو کی تشدید کے ساتھ اور اس کے بعد الف تانیث فُعلی کے وزن پر بغیر ہمزہ کے۔ الصراط کی تانیث شاذ اور قلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ (الفاتحہ) اس آیت میں اور دوسری کئی آیات میں صراط مذکر آیا ہے۔ ابو حاتم نے اس کا رد کیا ہے فرمایا: اگر یہ السوء سے ہے تو السوءی کہنا واجب ہے اگر یہ السواء سے ہو تو السِّیا سین کے کسرہ کے ساتھ، اس کی اصل السِّویا ہے۔ زمخشری نے کہا: السَّواءِ بمعنی وسط اور عدل یا المستوی پڑھا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: یحییٰ بن یعمر اور جحدری کی قرأت کا جواز یہ ہے کہ اصل السوءی ہو اور ساکن مانع نہیں گویا ہمزہ کو ضمہ سے بدلا گیا پھر ضمہ کو واو سے بدلا گیا جس طرح واو کو الف سے بدلا جاتا ہے جب اس کا ماقبل فتحہ ہو۔ والحمد للہ وحدہٗ۔

# سورۃ الانبیاء

آیاتہا ۱۱۲ | ۲۱ سورۃ الانبیاء مکیۃ ۷۳ | رکوعاتہا ۷

تمام علماء کے نزدیک یہ مکی سورت ہے اس کی ایک سو بارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۞ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۞ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۞

''قریب آ گیا ہے لوگوں کے لیے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ نہیں آتی ان کے پاس کوئی (تازہ) نصیحت ان کے رب کی طرف سے مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں مگن ہوتے ہیں، غافل ہوتے ہیں ان کے دل اور (آپ کے خلاف) سرگوشیاں کرتے ہیں ظالم (وہ کہتے ہیں) کیا ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند تو کیا تم پیروی کرنے لگے ہو جادو کی حالانکہ تم دیکھ رہے ہو (کہ یہ تمہاری طرح بشر ہے)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: سورۃ الکہف، مریم، طٰہٰ اور انبیاء پہلی سورتوں میں سے ہیں اور یہ میری پہلی یاد کی ہوئی سورتیں ہیں یعنی پہلے پہل یہ سورتیں حاصل کیں اور قرآن کو یاد کیا جیسے پرانا مال ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھا وہ دیوار بنا تا تھا اس سورت کے نزول کے دن اس کے پاس سے ایک اور شخص گزرا جو دیوار بنا رہا تھا اس نے پوچھا آج قرآن میں سے کیا نازل ہوا ہے؟ دوسرے نے کہا: یہ نازل ہوا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۞، تو اس شخص نے اپنے ہاتھ سے اپنی عمارت کو توڑ دیا اور کہا: اللہ کی قسم! میں کبھی تعمیر نہیں کروں گا جبکہ حساب کا وقت قریب آ گیا ہے (1)۔ اِقْتَرَبَ یعنی وہ وقت قریب آ گیا ہے جس میں لوگوں کے اعمال کا حساب ہوگا۔ لِلنَّاسِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد مشرکین ہیں اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۞ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۞ بعض علماء نے فرمایا: الناس عام ہے اگرچہ اس وقت اس کا مشار الیہ کفار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 73

قریش تھے۔ اس پر بعد والی آیات دلالت کرتی ہیں جس کو قیامت کے قرب کا علم ہوگیا اس کی امیدیں مختصر ہوگئیں اور توبہ کے ساتھ اس کا نفس پاک رہا۔ اور وہ دنیا کی طرف مائل نہ ہوا گویا جو موجود تھا جب وہ چلا گیا تو وہ تھا ہی نہیں۔ ہر آنے والا امر قریب ہے۔ موت لامحالہ آنے والی ہے۔ اور ہر انسان کی موت اس کے لیے قیامت کا قیام ہے اور قیامت قریب ہے۔ گزشتہ زمانہ کی نسبت سے جو زمانہ باقی ہے وہ گزرے ہوئے زمانہ سے کم ہے۔ ضحاک نے کہا: اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ کا معنی ہے عذابھم یعنی کفار مکہ کے عذاب کا وقت قریب آ گیا ہے کیونکہ انہوں نے عذاب کے وعدہ کی تکذیب کرتے ہوئے اسے دیر سے آنے والا سمجھا۔ ان کا قتل بدر کے دن تھا۔ نحاس نے کہا: کلام میں اقترب حسابھم للناس جائز نہیں تاکہ مظہر پر مضمر مقدم نہ ہو اور اس کے ساتھ تاخیر کی نیت کرنا بھی جائز نہیں۔

**وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ** ۝ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ غیر قرآن میں حال کی بنا پر نصب بھی جائز ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں: (۱) **وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ** یعنی دنیا کی طرف متوجہ ہیں آخرت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ (۲) حساب کے لیے تیار ہونے سے غافل ہیں اور اس سے غافل ہیں جو حضرت محمد ﷺ لے آئے ہیں۔ یہ واو سیبویہ کے نزدیک اذ کے معنی میں ہے اس کو نحوی واو حالیہ کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يَغْشَىٰ طَآئِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ** (آل عمران: 154)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ**، محدث ذکر کی صفت ہے۔ کسائی اور فراء نے محدثاً بھی جائز قرار دیا ہے، بمعنی مایاتیھم محدثاً نصب حال کی بنا پر ہے کیونکہ اگر تو مِنْ کو حذف کرے گا تو ذکر کو رفع دے گا یعنی **مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ** مراد نزول ہے اور جبرائیل کا حضرت محمد ﷺ پر تلاوت کرنا ہے، کیونکہ قرآن کی سورت کے بعد سورت اور آیت کے بعد آیت نازل ہوتی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک وقت کے بعد دوسرے وقت میں اسے نازل کرتا تھا نہ کہ قرآن مخلوق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الذکر سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ نبی پاک ﷺ انہیں نصیحت کرتے تھے اور وعظ کرتے تھے۔ اور فرمایا: **مِّن رَّبِّهِم** کیونکہ نبی کریم ﷺ صرف وحی کے ساتھ بولتے تھے پس نبی پاک ﷺ نے وعظ فرمایا اور آپ کا ڈرانا ذکر تھا اور وہ محدث تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ** ۝ (الغاشیہ) کہا جاتا ہے: فلان فی مجلس الذکر۔ یعنی وعظ کی مجلس میں ہے۔ بعض نے کہا: ذکر سے مراد نبی پاک ﷺ کی ذات گرامی ہے یہ حسین بن فضل کا قول ہے اور دلیل کلام کا سیاق ہے۔ **هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** اگر ذکر سے مراد قرآن ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا: **هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ** ۝ (الانعام) اس تاویل کی دلیل یہ بھی ہے: **يَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ** ۝ **وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ** ۝ (القلم) ان دونوں آیتوں میں مراد محمد ﷺ کی ذات ہے۔ فرمایا: **قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُولًا** (الطلاق) **إِلَّا اسْتَمَعُوهُ** یعنی محمد ﷺ کو سنتے ہیں یا محمد ﷺ سے قرآن سنتے ہیں یا آپ کی امت سے قرآن سنتے ہیں۔ **وَهُمْ يَلْعَبُونَ** واو حالیہ ہے اس پر دلیل **لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ** ہے یلعبون کا معنی یلھون ہے بعض نے فرمایا: یشتغلون ہے اگر تاویل کو لہو پر محمول کیا جائے تو جس کے ساتھ وہ لہو کرتے تھے اس کے دو احتمال ہیں۔ (۱) اپنی لذات کے

ساتھ۔ (۲) جوان پر تلاوت کیا جاتا تھا اس کے سماع کے ساتھ۔ اگر اس کی تاویل کو الشغل پر محمول کیا جائے تو جس کے ساتھ وہ مشغول ہوتے تھے اس کے دو احتمال ہیں۔ (۱) دنیا کے ساتھ مشغول ہوتے تھے کیونکہ وہ لہو ولعب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (محمد: 36) دنیوی زندگی لعب ولہو ہے۔ (۲) وہ اس پر اعتراض کرنے کے ساتھ مشغول ہوتے تھے۔ حسن نے کہا: جب ان کے لیے نیا ذکر آتا تو وہ اس میں غور وفکر نہ کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ قرآن کو استہزاء کرتے ہوئے سنتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ یعنی ان کے دل غافل ہوتے ہیں ذکر الٰہی سے اعراض کیے ہوئے ہوتے ہیں غور وتامل نہیں کرتے یہ عربوں کے قول لهیت عن ذکر الشیٔ سے مشتق ہے۔ جب تو کسی چیز کو ترک کر دے اور اس سے اعراض کرے۔ اَلْهَی لهیًا ولِهیَانًا، لَاهِیَةً۔ نعت ہے اسم سے مقدم ہے اور نعت کا حق یہ ہوتا ہے کہ تمام اعراب میں موصوف کے تابع ہو جب نعت اسم سے پہلے آجاتی ہے تو منصوب ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خاشعة ابصارهم۔ وَ دَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا (الدہر: 14) لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ۔ شاعر نے کہا:

لِعَزَّةَ مُوحِشًا طَلَلُ یَلُوحُ كَاَنَّهُ خَلَلُ

مراد طلل موحش ہے۔ کسائی اور فراء نے لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ رفع کے ساتھ بھی جائز قرار دیا ہے، بمعنی قلوبهم لاهیة۔ ان کے علاوہ علماء نے خبر کے بعد ہونے کی بنا پر رفع جائز قرار دیا ہے۔ اور مبتدا مضمر کی بنا پر رفع کو جائز قرار دیا ہے۔ کسائی نے کہا: یہ معنی بھی جائز ہے الا استمعوه لاهیة قلوبهم مگر وہ اسے سنتے ہیں جبکہ ان کے دل غافل ہوتے ہیں۔ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی ۖ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وہ آپس میں اس کی تکذیب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہیں پھر بیان فرمایا کہ وہ کون ہیں فرمایا: الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا جنہوں نے شرک کیا۔ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، اَسَرُّوا کی واو سے بدل ہے جو الناس کی طرف راجع ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس قول کی بنا پر النجویٰ پر وقف جائز نہیں۔ مبرد نے کہا: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان الذین فی الدار انطلقوا بنو عبد الله۔ بنو بدل ہے انطلقوا کی واو سے۔ بعض نے فرمایا: مذمت کی بنا پر مرفوع ہے یعنی هم الذین ظلموا بعض نے فرمایا: قول کے حذف کی بنا پر مرفوع ہے۔ تقدیر یوں ہے: یقول الذین ظلموا قول کو حذف کیا گیا جیسے: اَلْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۚ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ (الرعد) اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اس جواب کی صحت پر دلیل اس کے بعد والی کلام هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ اعنی مضمر کی بنا پر منصوب ہے اعنی الذین ظلموا۔ فراء نے اس کا مجرور ہونا بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس معنی کی بناء پر اقترب للناس الذین ظلموا حسابهم اس ترکیب کی بنا پر النجویٰ پر وقف جائز نہ ہوگا اور اس سے پہلے تین صورتوں میں وقف جائز ہوگا۔ یہ پانچ اقوال ہیں۔ اخفش نے، اکلونی البراغیث کہنے والوں کی لغت پر رفع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ (المائدہ: 71) اسی طرح شاعر نے کہا:

بك نال النِّضالُ دون المساعی فاهتدَیْنَ النِّبالُ للأغراض

ایک اور نے کہا:

وَلٰکِن دِیَافِیٌّ اَبُوهُ وَاُمُّهٗ　بِحَوْرَانَ یَعْصِرْنَ السَّلِیْطَ اَقَارِبُهٗ

کسائی نے کہا: اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اس کا مجاز یہ ہے: والذین ظلموا اسروا النجوی۔ ابوعبیدہ نے کہا: اسروا یہاں اضداد میں سے ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی کلام کو مخفی کیا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے کلام کو ظاہر کیا ہو اور اعلانیہ کہا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ انہوں نے آپس میں سرگوشی کی۔ کہنے لگے: یہ ذکر جو رسول ہے یا یہ جو تم کو بلاتا ہے نہیں ہے مگر تمہاری مثل بشر، وہ تم سے کسی چیز میں ممتاز نہیں ہے وہ کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا ہے جیسا تم کرتے ہو اور انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ان کی طرف بشر کے علاوہ بھیجنا جائز ہی نہیں ہے تاکہ وہ اس کی بات کو سمجھ سکیں اور وہ انہیں تعلیم دے۔ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ یعنی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں وہ جادو ہے پھر تم کیوں اس کے پاس آتے ہو اور اس کی پیروی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرگوشیوں پر اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا۔ السحر لغت میں ہر بناوٹی چیز کو سحر کہتے ہیں جس کی حقیقت واضح نہ ہو۔ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۝ بعض علماء نے اس کا معنی کیا ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ وہ تمہاری مثل انسان ہے۔ وانتم تعقلون اس کی مثال ہے کیونکہ عقل اشیاء کو دیکھنا ہے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی ہے کیا تم جادو کو قبول کرتے ہو جبکہ تم جانتے ہو کہ یہ جادو ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا تم باطل کی طرف لوٹتے ہو جبکہ تم حق کو پہچانتے ہو۔ کلام کے معنی میں توبیخ ہے۔

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ۝

"(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: میرا رب جانتا ہے جو بات کہی جاتی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہر بات سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں: بلکہ یہ پریشان خواب ہیں (نہیں) بلکہ اس نے خود گھڑا ہے اسے (نہیں) بلکہ وہ شاعر ہے (اگر وہ سچا نبی ہے) تو لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جس طرح بھیجے گئے تھے پہلے انبیاء۔ نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی بستی جسے ہم نے تباہ کیا تھا تو کیا اب یہ لوگ ایمان نہیں لے آئیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمان اور زمین میں جو بات کہی جاتی ہے اس پر مخفی نہیں ہوتی۔ اہل کوفہ کے مصاحف میں قال رب یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میرا رب قول کو جانتا ہے یعنی وہ جانتا ہے جو تم سرگوشیاں کرتے ہو۔ بعض علماء نے کہا: پہلی قرأت قُلْ رَبِّيْ اولیٰ ہے کیونکہ انہوں نے اپنی بات کو چھپایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے نبی پر ظاہر کر دیا اور اسے کہنے کو کہا۔ نحاس نے کہا: دونوں قرأتیں صحیح ہیں اور یہ دو آیتوں کے قائم مقام ہیں ان میں فائدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ، زجاج نے کہا: انہوں نے کہا جو آپ لائے ہیں وہ پریشان خواب ہیں۔ اور دوسرے علماء نے کہا: انہوں نے کہا وہ ملی جلی باتیں ہیں جیسے پریشان خواب ہوتے ہیں، یعنی ڈراؤنی چیزیں جو آپ خواب میں دیکھتے ہیں؛ یہ معانی مجاہد اور قتادہ نے بیان کیے ہیں، اسی طرح شاعر کا قول ہے:

كضِغْث حُلْم غُرّ منه حالِمُهْ

قتبی نے کہا: اس سے مراد جھوٹے خواب ہیں؛ شاعر کا قول ہے:

أحاديثُ طسْم أو سرابٌ بفدفدٍ　　ترقرقُ للسّاري وأضغاثُ حالم

یزیدی نے کہا: الاضغاث اس خواب کو کہتے ہیں جس کی کوئی تعبیر نہ ہو؛ یہ مفہوم سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ معاملہ اس طرح کا نہیں ہے جس طرح انہوں نے کہا ہے تو وہ اس بات کو چھوڑ کر کہنے لگے: بَلِ افْتَرٰىهُ بلکہ انہوں نے خود گھڑا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر کہنے لگے: بَلْ هُوَ شَاعِرٌ بلکہ نہیں وہ تو شاعر ہے یعنی وہ متحیر ہیں کسی ایک بات پر ٹھہرتے نہیں، کبھی کہا: جادو ہے، کبھی کہا: یہ پریشان خواب ہیں، کبھی کہا: یہ خود گھڑا ہے۔ ایک فریق نے کہا: یہ شاعر ہے۔ الافتراء کا معنی گھڑنا ہے۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۝ ، یعنی تم بھی اسی طرح کوئی نشانی لاؤ جیسی پہلے رسول لائے تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام عصا وغیرہ معجزات لائے تھے اور جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی۔ اور وہ جانتے تھے کہ قرآن جادو نہیں ہے اور نہ خواب ہے لیکن انہوں نے کہا: مناسب ہے کہ وہ ایسی نشانی لے آئیں جو تم تجویز کرو جبکہ ایک آیت دیکھنے کے بعد ان کے لیے تجویز نہ تھی نیز وہ آیت پر ایمان نہیں لائے تھے یہ اس کی جنس سے تھی جس کو وہ لوگوں سے زیادہ جانتے تھے اور اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی تو پھر وہ کسی دوسری نشانی پر کیسے ایمان لے آئیں گے؟ اگر وہ مادرزاد اندھے کو بینا کر دے اور کوڑھی کے مریض کو درست کر دے تو کہیں گے: یہ باب الطب سے ہے یہ ہماری شان نہیں کہ ان کی ہر بات کو پورا کرتے رہیں۔ ان کا سوال ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنا پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی نشانیاں دکھائی تھیں جن میں کفایت ہے اور اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو جو وہ سوال کرتے ہم انہیں عطا فرماتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ (الانفال)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے اور فرعون کی قوم ہے۔ اَهْلَكْنٰهَا یعنی ہمارے علم میں ان کی ہلاکت تھی۔ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ۝ وہ تصدیق کرتے ہیں یعنی وہ آیات پر ایمان نہ لائے تو انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا گیا اگر یہ بھی آیات دیکھ لیں گے جو یہ تجویز کرتے ہیں پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے عقاب کو مؤخر کیا کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کی صلبوں میں ایمان والے ہیں اور مِّنْ قَرْيَةٍ میں من زائدہ ہے جیسے اس ارشاد میں زائدہ ہے، فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ۝ (الحاقہ)

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اور نہیں رسول بنا کر بھیجا ہم نے (اے حبیب!) آپ سے پہلے مگر مردوں کو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف پس (اے منکرو!) پوچھو اہل علم سے اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے۔ اور نہیں بنائے ہم نے انبیاء کے (ایسے) جسم کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے تھے۔ پھر ہم نے سچا کر دکھایا انہیں (جو) وعدہ (ہم نے ان سے کیا تھا) پس ہم نے نجات دی انہیں اور ان لوگوں کو جن کو ہم نے (بچانا) چاہا اور ہم نے ہلاک کر دیا حد سے بڑھنے والوں کو۔ بیشک ہم نے اُتاری تمہاری طرف کتاب جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے، کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ یہ ان پر رد ہے جو انہوں نے کہا تھا: هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اپنے نبی کو تسلی دی یعنی ہم نے آپ سے پہلے رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر مردوں کو۔ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اس سے مراد اہل تورات اور انجیل ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے؛ یہ سفیان کا قول ہے۔ اس کو اہل ذکر کہا ہے کیونکہ وہ انبیاء کی خبروں کا ذکر کرتے تھے جن کو عرب نہیں جانتے تھے کفار قریش حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو اہل کتاب کی طرف لوٹاتے تھے۔ ابن زید نے کہا: الذکر سے مراد قرآن ہے، یعنی اہل قرآن میں سے جاننے والے مومنین سے پوچھ۔ جابر جعفی نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اہل ذکر ہیں۔ تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ رسل، بشر ہی تھے معنی یہ ہے انکار کے ساتھ اور اپنے قول کہ مناسب ہے کہ رسول ملائکہ سے ہو سے آغاز نہ کرو بلکہ تم مومنین سے مناظرہ کرو تاکہ وہ تمہیں بیان کریں کہ انسانوں سے رسول ہونا جائز ہے۔ فرشتے کو رجلا نہیں کہا جاتا کیونکہ رجل کا لفظ اس پر واقع ہوتا ہے جس کی لفظ سے ضد ہو جیسے تو کہتا ہے: رجل وامرأة۔ رجل وصبی، اِلَّا رِجَالًا کا قول کہ بنی آدم سے مرد تھے۔ حفص اور کسائی نے نُوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ پڑھا ہے۔

**مسئلہ:** علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عام لوگوں پر لازم ہے کہ وہ علماء کی تقلید کریں اور فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ سے علماء مراد ہیں۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ نابینا شخص اس کی تقلید کرے جس پر وثوق ہو قبلہ کی تمیز کرنے میں جب اس پر قبلہ تلاش کرنا مشکل ہو جائے۔ اسی طرح وہ شخص جس کو علم نہیں تو وہ علماء کی تقلید کرے۔ اسی طرح علماء کا اختلاف نہیں ہے کہ عام لوگوں کو فتویٰ دینا جائز نہیں کیونکہ وہ ان معانی سے ناواقف ہوتے ہیں جن سے حرمت وحلت جائز ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ھم ضمیر کا مرجع انبیاء ہیں یعنی ہم نے آپ سے پہلے ایسے رسل نہیں بنائے جو بشری طبائع سے خارج ہوں اور وہ کھانے، پینے کے محتاج نہ ہوں۔ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝ وہ فوت نہ ہوں گے۔ یہ ان کے قول کا جواب ہے: هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اور ان کے اس قول کا جواب ہے جو انہوں نے کہا: مَالِ

هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ (الفرقان: 7)۔ جَسَدًا، اسم جنس ہے اسی لیے اجساد نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اجساداً نہیں فرمایا کیونکہ وماجعلنا کل واحدٍ منھم جسد اًمراد لیا ہے۔ الجسد بدن کو کہتے ہیں؛ اسی سے ہے تجسّد جس طرح تو جسم سے تجسّم کہتا ہے۔ الجسد، زعفران اور اس جیسے رنگ کو بھی کہتے ہیں، خون کو بھی کہتے ہیں؛ نابغہ نے کہا:

وما هُرِيقَ على الأنصاب من جَسَدِ

کلبی نے کہا: الجسد سے مراد وہ جسد والا ہے جس میں روح ہو، کھاتا پیتا ہو، اس قول کی بنا پر جو کھاتا پیتا نہ ہو وہ جسم ہوگا۔ مجاہد نے کہا: جسد سے مراد وہ ہے جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو اس قول کی بنا پر جو کھاتا پیتا ہو وہ نفس ہوگا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ ھم ضمیر کا مرجع انبیاء ہیں یعنی ہم نے ان کو نجات دینے، ان کی مدد کرنے اور ان کو جھٹلانے والوں کو ہلاک کرنے کا وعدہ سچا کیا۔ وَ مَنْ نَّشَآءُ یعنی جنہوں نے انبیاء کی تصدیق کی۔ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۞ ہم نے مشرکوں کو ہلاک کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا یعنی قرآن ہم نے تمہاری طرف نازل کیا۔ فِيْهِ ذِكْرُكُمْ متبدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ جملہ محل نصب میں ہے کیونکہ کتاب کی نعت ہے۔ یہاں ذکر سے مراد شرف ہے یعنی تمہارے لیے قرآن میں شرف ہے جیسے: وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف: 44) پھر اس استفہام کے ذریعے انہیں متنبہ کیا جن کا معنی توقیف ہے فرمایا: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ بعض علماء نے فرمایا: فِيْهِ ذِكْرُكُمْ کا مطلب ہے تمہارے دین کے امر کا ذکر ہے تمہاری شریعت کے اس میں احکام ہیں اور اس میں ثواب اور عقاب کا ذکر ہے جس کی طرف تم نے لوٹنا ہے کیا تم غور نہیں کرتے ان چیزوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ مجاہد نے کہا: فِيْهِ ذِكْرُكُمْ کا مطلب ہے اس میں تمہاری بات ہے۔ بعض نے فرمایا: تمہارے مکارم اخلاق کا ذکر ہے تمہارے اعمال کے محاسن کا ذکر ہے۔ سہل بن عبد اللہ نے کہا: اس میں وہ عمل ہے جس میں تمہاری زندگی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ہم معنی ہیں۔ پہلا قول عام ہے کیونکہ یہ سراپا شرف ہے یہ کتاب ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شرف ہے کیونکہ یہ آپ کا معجزہ ہے، یہ ہمارے لیے شرف ہے اگر ہم اس کے احکام کے مطابق عمل کریں اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: القرآن حجة لك اوعليك۔ قرآن تیرے لیے حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۞ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۞ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۞ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۞ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۞

''اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں ( کیونکہ ) وہ ظالم تھیں اور ہم نے پیدا فرما دی ان ( کی بربادی ) کے بعد ایک دوسری قوم۔ پس جب انہوں نے محسوس کیا ہمارا عذاب تو فوراً انہوں نے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اب مت بھاگو اور واپس لوٹو ان آسائشوں کی طرف جو تمہیں دی گئی تھیں اور (لوٹو) اپنے مکانوں کی طرف تا کہ تم سے باز پرس کی جائے۔ کہنے لگے: وائے شومئے قسمت! ہم ہی ظالم تھے۔ پس یونہی شور و پکار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے کھیت (اور) بجھے ہوئے (انگاروں) کی طرح کر دیا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً قریۃ سے مراد وہ شہر ہیں جو یمن میں تھے۔ اہل تفسیر اور مؤخرین نے کہا: اس سے مراد اہل حضور ہیں۔ یہ قوم وہ تھی جن کی طرف ایک نبی کو مبعوث کیا گیا تھا جس کا نام شعیب بن ذی مہدم تھا اور اس شعیب نبی کی قبر یمن میں ایک پہاڑ کے پاس ہے جس کو ضنن کہا جاتا ہے اس میں کثیر نمک ہے۔ یہ شعیب صاحب مدین نہیں ہیں کیونکہ حضور کا قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدت سے پہلے کا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدت سے دو سو سال بعد ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے نبی کو قتل کیا تھا اور اصحاب الرس نے اسی تاریخ میں اپنے نبی کو قتل کیا تھا ان کا نام حنظلہ بن صفوان تھا۔ حضور شہر حجاز کی زمین شام کی طرف میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارمیاء کی طرف وحی کی کہ بخت نصر کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ میں نے اسے عرب کی زمین پر تسلط بخشا ہے اور میں تیرے ذریعے ان سے انتقام لینے والا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارمیاں کی طرف وحی کی کہ معد بن عدنان کو براق پر سوار کر کے عراق کی زمین کی طرف بھیج تا کہ اسے ان کے ساتھ عذاب اور مصیبت نہ پہنچے کیونکہ میں اس کی صلب سے نبی آخر الزماں کو نکالنے والا ہوں جس کا نام محمد ہے۔ معد کو ارمیا نے سوار کیا جبکہ وہ بارہ سال کا تھا۔ معد، بنی اسرائیل کے ساتھ رہا یہاں تک کہ وہ بڑا ہوا اور ایک عورت سے نکاح کیا جس کا نام عانۃ تھا۔ پھر بخت نصر لشکروں کو لے کر گیا اور عربوں کے لیے کمین گاہیں بنائیں یہ پہلا شخص تھا جس نے کمین گاہیں بنائی تھیں۔ پھر اس نے اہل حضور پر کئی حملے کیے انہیں قتل کیا اور بعض کو قیدی بنایا اور آبادیوں کو خراب کیا اس نے حضور شہر کا نام و نشان مٹا دیا پھر وہ السواد کی طرف لوٹا۔ كَمْ، قَصَمْنَا کی وجہ سے منصوب ہے۔ القصم کا معنی توڑ پھوڑ کرنا ہے، کہا جاتا ہے: قصمت ظهر فلان۔ فلاں کی پیٹھ میں نے توڑ دی۔ انقصمت سنة اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ یہاں القصم کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ الفصم (فاء) کسی چیز میں ایسی پھٹن جو واضح نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

كأنه دُمْلُجٌ من فِضَةٍ نَبَهٌ  فی مَلْعَبٍ من عَذَارَیَ الحيّ مَفْصُومُ

اسی سے حدیث ہے: فيفصم عنه وإن جبينه ليتفصد عرقاً (1) جب آپ سے وحی ختم ہوئی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ نکلتا تھا۔

كَانَتْ ظَالِمَةً یعنی اس شہر والے کافر تھے۔ الظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے مقام پر نہ رکھنا۔ انہوں نے کفر کو ایمان کی جگہ رکھا۔ وَّ اَنْشَاْنَا یعنی ہم نے ان کو ہلاک کرنے کے بعد قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ دوسری قوم کو پیدا کیا۔ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا۔ کہا جاتا ہے: أحسست منه ضعفاً۔ میں نے اس سے کمزوری محسوس کی۔ اخفش نے کہا: اَحَسُّوْا کا معنی ہے خافوا وتوقعوا خوف کھایا اور توقع کی۔ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ یعنی وہ بھاگ رہے تھے۔ الرکض کا

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 26198۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث عائشہ 2

معنی ہے تیزی سے دوڑنا۔ الرکض کا معنی ہے پاؤں کو حرکت دینا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ (ص: 42) رکضت الفرس برجلی یعنی میں نے گھوڑے کو دوڑنے پر ابھارا۔ پھر یہ کثرت سے استعمال ہونے لگا حتی کہ بعض نے کہا: رکض الفرس جب گھوڑا دوڑتا۔ یہ اصل نہیں ہے درست یہ ہے کہ رُکض الفرس ہو گھوڑا دوڑایا گیا۔ فھو مرکوض۔ لَا تَرْكُضُوْا یعنی نہ بھاگو۔

وَارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ یعنی تم ان نعمتوں کی طرف لوٹو جو تمہارے تکبر و غرور کا سبب تھیں۔ المترف جس پر انعام کیا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے: اترف علی فلان یعنی معیشت میں اسے خوشحالی دی گئی ہے۔ إنما اترفهم الله عزوجل۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشحالی دی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المومنون: 33) ہم نے دنیوی زندگی میں انہیں خوشحالی دی۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ تا کہ تم سے دنیا کی کسی چیز کا سوال کیا جائے: یہ ان سے استہزاء کیا گیا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ کس وجہ سے تمہیں یہ سزا دی گئی پھر تم اس کے متعلق خبر دو؟ بعض نے فرمایا: لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ تا کہ تم سے ایمان لانے کا سوال کیا جائے جیسا کہ تم پر عذاب کے نزول سے پہلے یہ سوال کیا گیا تھا ان کو یہ استہزاء، تقریع اور توبیخ کے لیے کہا جائے گا۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ جب ملائکہ نے انہیں کہا: بھاگو مت اور کہا: انبیاء کا بدلہ ہے۔ انہوں نے کلام کرتے ہوئے کوئی شخص نہ دیکھا (جبکہ یہ آواز آرہی تھی) تو وہ جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے دشمن کو مسلط کر دیا ہے کیونکہ انہوں نے انبیاء کو قتل کیا ہے جو ان کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ اس وقت ان لوگوں نے کہا: يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ انہوں نے ظالم ہونے کا اعتراف اس وقت کیا جب ان کا اعتراف نفع بخش نہ تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ وہ ہمیشہ یہ کہتے رہے: يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ شومیٔ قسمت! ہم ہی ظالم تھے۔ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا تلواروں کے ساتھ انہیں اس طرح کاٹ دیا جس طرح کھیتی درانتی کے ساتھ کاٹی جاتی ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ حسن نے کہا: عذاب کے ساتھ ہم نے انہیں کاٹ دیا۔ خٰمِدِيْنَ ۝ مردہ تھے۔ الخمود کا معنی ہے آگ کی طرح بجھ جانا۔ زندگی کے بجھ جانے کو آگ کے بجھ جانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسے کہا جاتا ہے جو مر جاتا ہے: قد طفئ آگ کے بجھ جانے کیساتھ تشبیہ دیا گیا ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے دل لگی کرتے ہوئے۔ اگر ہمیں یہی منظور ہوتا کہ ہم (اس کائنات کو) کھیل تماشا بنائیں تو ہم بنا لیتے اسے خود بخود (ہمیں کون روک سکتا تھا) مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے کچل دیتا ہے اور وہ یکایک نا پید ہو جاتا ہے اور (اے باطل پرستو!) تمہارے لیے ہلاکت ہے ان (نازیبا) باتوں کے باعث جو تم بیان کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو

کچھ ان کے اندر ہے اسے عبث اور باطل نہیں بنایا بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ ان کا خالق اور قادر ہے جس کے امر کی پیروی لازم ہے وہ مجرم اور نیک کام کرنے والے کو بدلہ دے گا یعنی ہم نے آسمان اور زمین کو پیدا اس لیے نہیں کیا کہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم کریں اور انکار کریں اور جو انہیں حکم دیا گیا ہے اس کی مخالفت کریں پھر مرجائیں اور انہیں جزا نہ دی جائے اور وہ دنیا میں نیکی کا حکم نہ دیں اور بری چیز سے منع نہ کریں۔ یہ لعب ہے جس سے حکیم کی نفی کی گئی ہے اور اس کی ضد حکمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا جب ایک قوم نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا، اللھو سے مراد یمنی لغت میں عورت ہے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ عقبہ بن ابی جسرہ نے کہا: طاؤس، عطا اور مجاہد ان سے لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا کے متعلق پوچھنے کے لیے آئے تو انہوں نے فرمایا: اللھو سے مراد زوجہ ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللھو سے مراد بچے ہیں؛ حسن کا یہ بھی قول ہے۔ جوہری نے کہا: اللھو جماع سے کنایہ ہے۔

میں کہتا ہوں امرء القیس کا قول ہے:

أَلَا زَعِمَتْ بَسْبَاسَةُ الیومَ أَنَّنِی کَبِرْتُ وأَلَّا یُحْسِنَ اللَّهْوَ أَمثالِی

جماع کو لہو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دل کو غافل کرنے کا عمل ہے، جیسے شاعر نے کہا:

فیهِنَّ مَلْهیً للصدیقِ ومَنْظَرُ

جوہری نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا سے مراد عورت ہے۔ کہا جاتا ہے: ولداً یعنی بچہ۔ لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ یعنی ہم اپنی طرف سے نہ کہ تمہاری طرف سے۔ ابن جریج نے کہا: اہل سماء کی طرف سے نہ اہل زمین کی طرف سے۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ بت اللہ کی بیٹیاں ہیں یعنی تمہارا گھڑا ہوا بت ہماری اولاد کیسے ہو سکتا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا: یہ آیت نصاریٰ کا رد ہے۔ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ۝ قتادہ، مقاتل، ابن جریج اور حسن نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ایسا کرنے والے نہیں جیسے: اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ۝ (فاطر) یعنی تو نہیں ہے مگر ڈرانے والا۔ اِنْ نفی کے معنی میں ہے۔ لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ پر کلام مکمل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: یہ شرط کے معنی پر ہے یعنی اگر ہم ایسا کرنے والے ہوتے لیکن ہم ایسا کرنے والے نہیں کیونکہ ہمارے لیے اولاد ہونا محال ہے کیونکہ اگر یہ ہوتا تو ہم جنت، دوزخ، موت، بعث، حساب پیدا نہ کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اگر ہم کسی کو متبنیٰ بناتے تو ہم ملائکہ میں سے بناتے۔ اس کی طرف ایک قوم کا رجحان ہے کیونکہ ارادہ متبنیٰ کے ساتھ متعلق ہے رہا اولاد بنانا تو یہ محال ہے۔ ارادہ مستحیل کے متعلق نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ، القذف کا معنی ہے پھینکنا، یعنی ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں۔ فَیَدْمَغُهٗ تو وہ اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ الدمغ سر کے زخم کو کہتے ہیں۔ یہاں الحق سے مراد قرآن ہے اور باطل سے مراد شیطان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: باطل وہ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے علاوہ صفات کرتے تھے۔ (مثلاً یہ کہ) اس کا بیٹا تو ان کی اللہ تعالیٰ نے تکذیب کی۔ بعض نے فرمایا: الحق سے مراد حجت ہے۔ باطل سے مراد ان کے شبہات ہیں۔ بعض نے فرمایا:

الحق سے مراد مواعظ ہیں۔ باطل سے مراد معاصی ہیں۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔قرآن حجت اور مواعظ کو متضمن ہے۔
فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ یعنی باطل ہلاک ہونے والا ہے اور تلف ہونے والا ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ یعنی تمہارے لیے آخرت میں عذاب ہے کیونکہ تم نے رب کے لیے ایسی صفات بیان کیں جو اس کی شان کے لائق نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْوَيْلُ جہنم میں ایک وادی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مِمَّا تَصِفُوْنَ۝ جو وہ جھوٹ بولتے ہیں؛ یہ قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔ اس کی مثال: سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ (الانعام:139) یعنی اس کے جھوٹ کی انہیں جزا دے گا۔ بعض نے فرمایا: وہ اللہ کی ایسی صفات بیان کرتے ہیں جو محال ہیں، مثلاً ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے۔

وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ۝ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ۝

''اور اس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو (فرشتے) اس کے نزدیک ہیں وہ ذرا سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہ ہی وہ تھکتے ہیں۔ وہ (اس کی) پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات، دن اور وہ اکتاتے نہیں۔ کیا بنا لیے ہیں انہوں نے خدا (اہل) زمین سے جو مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہر چیز اس کی ملک اور تخلیق ہے پھر جو اس کا عبد اور خلق ہے اس کا خیر ہونا کیسے جائز ہے۔ وَ مَنْ عِنْدَهٗ یعنی وہ ملائکہ جن کا تم ذکر کرتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ وہ سرکشی نہیں کرتے اس کی اطاعت سے۔ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ۝ نہ وہ تھکتے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ یہ الحسیر سے ماخوذ ہے وہ اونٹ جو تھکنے کی وجہ سے جدا ہو جائے۔ کہا جاتا ہے: حسر البعیر یحسر حسورا اونٹ تھک گیا۔ استحسر اور تحسر ہم مثل ہیں حسرته أنا حسرا کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ أحسرته ایضا فهو حسیر ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اکتاتے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ عار نہیں سمجھتے۔ ابو زید نے کہا: وہ تھکتے نہیں۔ بعض نے فرمایا: وہ کمزور نہیں ہوتے؛ یہ ابن اعرابی نے ذکر کیا ہے۔ تمام کا مفہوم ایک ہی ہے۔ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ یعنی وہ ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ لَا يَفْتُرُوْنَ یعنی وہ کمزور نہیں پڑتے اور اکتاتے نہیں انہیں تسبیح و تقدیس الہام کی جاتی ہے جس طرح نفس الہام کیے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن حرث نے کہا: میں نے کعب سے پوچھا میں نے کہا: کیا کبھی تسبیح سے ان کا اعراض بھی ہوتا ہے؟ کسی اور چیز میں بھی مشغول ہوتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے کہا: بنی عبد المطلب سے ہوں۔ تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور کہا: اے میرے بھتیجے! کیا سانس سے کبھی تجھے کوئی چیز غافل کرتی ہے؟ تسبیح ان کے لیے سانس کی طرح ہے۔ اس آیت سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ ملائکہ، بنی آدم سے افضل ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ۝ مفضل نے کہا: اس استفہام سے مقصود انکار

ہے یعنی انہوں نے اہل زمین سے ایسے خدا نہیں بنائے جو زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: أَمْ بمعنی هل ہے یعنی کیا ان مشرکوں نے اہل زمین سے ایسے خدا بنالیے ہیں جو مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ أَمْ یہاں بل کے معنی میں نہ ہوگا کیونکہ یہ ان کے لیے مردوں کو پیدا کرنے کا موجب ہے مگر یہ کہ أَمْ کو استفہام کے ساتھ مقدر کیا جائے۔ پس أَمْ منقطعہ ہوگا، پس یہ معنی صحیح ہوگا؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ بعض نے کہا: أَمْ معنی پر معطوف ہے یعنی کیا ہم نے زمین اور آسمان کو کھیل بنایا یا یہ جو انہوں نے ہماری طرف منسوب کیا ہے ان کے لیے کوئی شبہ کا مقام ہے یا کیا جو اہل زمین سے خدا بنائے ہیں مردوں کو زندہ کرتے ہیں کیا انہیں کوئی شبہ ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۠ ۝ پھر معاتبہ کے ساتھ اس پر عطف کیا ہے۔ ان دونوں تاویلوں پر أَمْ متصلہ ہوگا۔ جمہور نے یُنْشِرُوْنَ یا کے ضمہ اور شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ أنشر الله الميت، فنشر سے مشتق ہے یعنی الله تعالیٰ نے اسے زندہ کیا تو وہ زندہ ہوگیا۔ حسن نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ زندہ ہوتے ہیں اور مرتے نہیں۔

لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

”اگر ہوتے زمین و آسمان میں کوئی اور خدا سوائے الله تعالیٰ کے تو یہ دونوں برباد ہو جاتے پس پاک ہے الله تعالیٰ جو عرش کا رب ہے ان تمام نازیبا باتوں سے جو وہ کرتے ہیں۔ نہیں پرسش کی جاسکتی اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے اور ان (تمام سے) باز پرس ہوگی۔ کیا انہوں نے بنالیے ہیں الله تعالیٰ کے سوا اور معبود، (اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمائیے: پیش کرو اپنی دلیل یہ قرآن جو نصیحت ہے میرے ساتھ والوں کے لیے اور دوسری کتب جو نصیحت ہیں میرے پیشرووں کے لیے (سب موجود ہیں ان کا کوئی حوالہ دو) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے اس لیے وہ (اس سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا الله تعالیٰ کے سوا آسمانوں اور زمین میں اور معبود ہوتے تو یہ دونوں برباد ہو جاتے۔ کسائی اور سیبویہ نے کہا: الا بمعنی غیر ہے جب الا بمعنی غیر ہوتا ہے تو اس کے بعد والے اسم کو غیر کے اعراب کے ساتھ اعراب دیا جاتا ہے، جیسا شاعر کا قول ہے:

وكلُّ أخٍ مفارِقُهٗ أخوهٗ لَعَمْرُ أبيكَ إلّا الفَرْقَدان

سیبویہ نے حکایت کیا ہے: لوكان معنا رجل إلّا زيد لهلكنا۔ فراء نے کہا: یہاں الا بمعنی سوی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر الله کے سوا خدا ہوتے تو ان کے رہنے والے تباہ ہو جاتے۔ دوسرے علماء نے کہا: اگر ان میں دو خدا ہوتے تو تدبیر خراب ہو جاتی کیونکہ اگر ایک ایک چیز کا ارادہ کرتا اور دوسرا دوسری چیز کا ارادہ کرتا تو ایک ضرور عاجز آتا۔ بعض علماء نے فرمایا: لَفَسَدَتَا

کا معنی ہے دونوں خراب ہو جاتے اور شرکاء کے درمیان واقع کے اختلاف کے ساتھ تنازع کے وقوع کی وجہ سے ان میں جو کچھ ہے ہلاک ہو جاتے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ اپنی پاکیزگی بیان فرمائی اور بندوں کو حکم دیا کہ اس کی شریک یا بیٹے سے پاکیزگی بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ یہ قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوق اس سے اس کے فیصلہ کے متعلق نہیں پوچھ سکتی جو وہ اپنی مخلوق کے بارے میں فرماتا ہے لیکن وہ مخلوق سے ان کے اعمال کے بارے پوچھے گا کیونکہ وہ اس کے بندے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ کل جن سے ان کے اعمال کے متعلق مواخذہ ہوگا جیسے مسیح اور ملائکہ تو وہ خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے افعال کا مواخذہ نہ ہوگا جبکہ لوگوں کا مواخذہ ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے کہا: اے امیر المومنین! کیا ہمارا رب پسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے؟ حضرت علی نے فرمایا: کیا ہمارے رب کی جبراً نافرمانی کی جائے گی؟ اس شخص نے کہا: آپ بتائیں اگر اس نے مجھے ہدایت سے روکا اور مجھے ہلاکت دی تو کیا اس نے مجھ سے احسان کیا یا برا کیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو وہ تجھے تیرے حق سے منع کرے گا تو تیرے ساتھ اچھا نہیں کرے گا اور اگر اپنا فضل تجھ سے روک لے گا تو وہ اس کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝، (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان سے کلام فرمائی اور ان پر تورات نازل کی تو انہوں نے عرض کی: اے اللہ! تو عظیم رب ہے اگر تو چاہے کہ تیری اطاعت کی جائے تو تیری اطاعت کی جائے گی، اگر تو چاہے کہ تیری نافرمانی کی جائے تو تیری نافرمانی کی جائے گی تو پسند کرتا ہے کہ تیری اطاعت کی جائے جبکہ اس میں تیری نافرمانی نہیں کی جاتی ہے۔ یارب! یہ کیسے ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: جو میں کرتا ہوں اس پر مجھ سے باز پرس نہیں کی جا سکتی اور لوگوں سے باز پرس کی جائے گی (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنانے میں توبیخ میں مبالغہ کے لیے تعجب کا اعادہ کیا، یعنی ان کی صفت انشاء واحیاء میں ایسی ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ پس ام بمعنی هل ہوگا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ تم اس پر دلیل لاؤ۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا احتجاج معقول کی حیثیت سے ہے کیونکہ فرمایا: هُمْ يُنْشِرُوْنَ وہ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ یہ تو بہت دور ہے۔ اور دوسرا احتجاج منقول کے ساتھ ہے یعنی اس جہت سے دلیل لاؤ کونسی کتاب میں یہ نازل ہوا ہے؟ قرآن میں یا دوسری کتب میں جو دوسرے انبیاء پر اتریں؟۔ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ قرآن میں توحید کے اخلاص کا ذکر ہے۔ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ تورات اور انجیل میں اور جو کتابیں نازل ہوئیں سب میں توحید کے اخلاص کا ذکر ہے۔ دیکھو کیا منزل شدہ کتب میں سے کسی کتاب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی کو خدا بنانے کا حکم دیا ہے؟ شرائع جو توحید کے متعلق ہیں مختلف نہیں ہیں۔ صرف اوامر و نواہی میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ قرآن کی طرف اشارہ ہے۔ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ جو

---

1۔ التمہید، ابن عبد البر، جلد 6، صفحہ 65،64　2۔ طبرانی، الکبیر، 10606

حلال اور حرام میں سے ان کو لازم ہوا یہ میرے ساتھیوں کے لیے ہے۔ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ مجھ سے پہلی امتوں کے لیے نصیحت ہے جو ایمان کے ساتھ نجات پا گئے اور شرک کر کے ہلاک ہو گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ یعنی ایمان پر ثواب اور کفر پر عقاب جو ان کے لیے ہے۔ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ پہلی امتوں کے ساتھ جو دنیا میں کیا گیا اور جو آخرت میں ان کے ساتھ کیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کلام کا معنی وعید اور تہدید ہے یعنی جو چاہو تم کرو، عنقریب پردہ اٹھ جائے گا۔ ابو حاتم نے حکایت کیا ہے کہ یحییٰ بن یعمر اور طلحہ بن مصرف نے هٰذَا ذِكْرٌ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرٌ مَنْ قَبْلِيْ پڑھا ہے تنوین کے ساتھ اور میم کے کسرہ کے ساتھ۔ ابو حاتم نے کہا: اس کی کوئی وجہ نہیں۔ ابو اسحاق زجاج نے اس قرات کے بارے میں کہا: اس کا معنی ہے یہ نصیحت ہے اس میں سے جو میری طرف نازل کیا گیا اور اس میں سے جو میرے پاس ہے اور جو مجھ سے پہلے تھا۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو میں لے کر آیا ہوں یہ وہی ہے جو مجھ سے پہلے انبیاء لے کر آئے تھے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ ابن محیصن اور حسن نے الحقُ پڑھا ہے بمعنی هو الحق۔ اور هذا هو الحق۔ اس بنا پر لَا يَعْلَمُوْنَ پر وقف ہوگا اور نصب کی قرأت کی صورت میں اس پر وقف نہ ہوگا۔ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ یعنی وہ حق سے منہ پھیرے ہوئے ہیں اور وہ حق قرآن ہے پس وہ توحید کی حجت میں غور و فکر ہی نہیں کرتے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝٢٥

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے پس میری عبادت کیا کرو“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ حفص، حمزہ اور کسائی نے نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ نون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ پہلے اَرْسَلْنَا آیا ہے۔ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ہم نے سب کو کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عقلی دلائل شاہد ہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور تمام انبیاء سے نقل بھی موجود ہے۔ دلیل کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں عقلی یا نقلی۔ قتادہ نے کہا: ہر نبی توحید کے پیغام کے ساتھ بھیجا گیا جبکہ تورات، انجیل اور قرآن میں شرائع مختلف تھے یہ تمام اخلاص اور توحید پر مشتمل ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝٢٦ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝٢٧ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝٢٨ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝٢٩

”وہ کہتے ہیں: بنالیا ہے رحمن نے (اپنے لیے) بیٹا سبحان اللہ (یہ کیونکر ہوسکتا ہے) وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں۔ نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو

کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا ہے۔ اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ (اس کی بے نیازی کے باعث) اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی، یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ یہ خزاعہ قبیلہ کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے کہا: فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور وہ اس امید سے ان کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ان کی سفارش کریں گے۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: یہودیوں نے کہا معمر نے اپنی روایت میں کہا لوگوں میں سے ایک طائفہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے جنوں سے رشتہ جوڑا اور ملائکہ جنوں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وہ اس سے پاک ہے۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بلکہ ملائکہ تو اس کے معزز بندے ہیں ایسا نہیں جیسا کہ کفار نے کہا ہے۔ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ کو زجاج کے نزدیک منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اس معنی پر بل اتخذ عبادا مکرمین، الولد کا لفظ یہاں جمع کے لیے ہے کبھی واحد اور جمع کے لیے ولد استعمال ہوتا ہے یہ بھی جائز ہے کہ الولد کا لفظ جنس کے لیے ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے: لفلان مال، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ یعنی وہ نہیں کہتے حتی کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اور وہ نہیں بولتے مگر جس کے ساتھ بولنے کا اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے۔ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وہ اس کی طاعت و اوامر کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ یعنی وہ اسے بھی جانتا ہے جو انہوں نے عمل پہلے کیا اور اسے بھی جانتا ہے جو یہ کر رہے ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ کا معنی ہے جو آخرت میں ہوگا۔ وَ مَا خَلْفَهُمْ جو دنیا میں تھا؛ پہلا قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے، دوسرا قشیری نے ذکر کیا ہے۔

وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دینے والے ہیں۔ مجاہد نے کہا: ہر وہ شخص مراد ہے جس سے اللہ راضی ہوگا۔ ملائکہ قیامت کے روز شفاعت کریں گے جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے اور دنیا میں بھی فرشتے مومنین کے لیے اور اہل زمین کے لیے استغفار کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کی نص موجود ہے: وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ فرشتے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے ڈرتے رہتے ہیں وہ اس کے عذاب سے امن میں نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ قتادہ اور ضحاک وغیرہما نے کہا: اس آیت سے مراد ابلیس ہے جس نے شرکت کا دعویٰ کیا تھا اس نے اپنی عبادت کی طرف بلایا جبکہ وہ ملائکہ میں سے تھا۔ اس کے علاوہ ملائکہ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں خدا ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تمام ملائکہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو ایسا کہے گا نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے۔ یہ دلیل ہے کہ اگرچہ وہ عصمت کے ساتھ عزت دیے گئے ہیں پھر بھی وہ عبادت کرتے ہیں وہ عبادت پر مجبور نہیں ہیں جیسا کہ بعض جہلاء کا خیال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اہل آسمان سے افضل ہیں۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ یعنی جس طرح اس کو ہم نے آگ کے ساتھ جزا دی اسی طرح ہم ان ظالموں کو جزا دیں گے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کے لیے الوہیت اور عبادت کا قول وضع کرتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا

مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ۖ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ۠ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَّ هُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝

"کیا کبھی غور نہیں کیا کفر وانکار کرنے والوں نے کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز، کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے۔ اور ہم نے بنا دیئے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے ان کے ساتھ اور بنادیں ہم نے ان پہاڑوں میں کشادہ راہیں تا کہ وہ (اپنی منزل مقصود کا) راستہ پاسکیں۔ اور ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت سے) محفوظ ہے اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے روگردانی کیے ہوئے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا لیل ونہار کو اور مہر و ماہ کو سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اکثر کی قرأت أولم یرو، واؤ کے ساتھ ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصن، حمید، شبل بن عباد نے الم یر، بغیر واو کے پڑھا ہے اسی طرح مکہ کے مصحف میں ہے، اَوَ لَمْ یَرَ بمعنی یعلم ہے۔ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا، کَانَتَا یہ دو قسمیں ہیں جیسے عرب کہتے ہیں: هما لقاحان اسودان جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا (فاطر: 41) ابو اسحاق نے کہا: السماوات کو لفظ سماء سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ السماوات ایک سماء تھے۔ اسی طرح الارضون ہے۔ رتقا فرمایا رتقین نہیں فرمایا کیونکہ یہ مصدر ہے، معنی یہ ہے کانتا ذواتی رتق۔ حسن نے رتقا تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے کہا: یہ درست ہے یہ ایک لغت ہے۔ الرتق کا معنی سد (بند) ہے اور یہ الفتق (پھٹنا) کی ضد ہے۔ رَتَقْتُ الْفَتْقَ اَرْتُقُهٗ فارتق میں نے پھٹن کو ملایا تو وہ جڑ گئی۔ اسی سے الرتقاء ہے وہ عورت جس کی فرج ملی ہوئی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن، عطا، ضحاک اور قتادہ نے فرمایا: یہ ایک چیز تھے، ملے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے ہوا کے ذریعے ان کے درمیان فاصلہ کیا، اسی طرح کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا یہ ایک دوسرے کے اوپر تھے پھر اس کے وسط میں ہوا پیدا کی تو ہوا کے ذریعے ان کو جدا جدا کر دیا اور آسمان سات بنائے زمینیں بھی سات بنائیں؛ یہ قتبی نے عیون الاخبار میں اسماعیل بن ابی خالد سے اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا الخ کے تحت حکایت کیا ہے فرمایا: آسمان ایک مخلوق تھی اور زمین ایک مخلوق تھی پھر ایک آسمان سے سات آسمان بنائے اور اس ایک زمین سے سات زمینیں بنائیں۔ اوپر والی زمین بنائی تو اس کے رہائشی جن وانس بنائے اس میں نہریں نکالیں اور اس میں پھل اگائے اس میں دریا بنائے اور اس کو رعاء نام دیا اس کا عرض پانچ سو سال ہے پھر دوسری زمین کو تخلیق کیا تو اس کا عرض اور موٹائی بھی پہلی زمین کی طرح تھا اس میں کئی قومیں بنائیں، ان کے منہ کتوں کے مونہوں کی طرح

ہیں، ہاتھ انسانوں کی طرح ہیں، کان گائیوں کے کانوں کی طرح ہیں، ان کے بال بکریوں کے بالوں کی طرح ہیں۔ جب قیامت قریب آئے گی تو زمین انہیں یاجوج و ماجوج پر پھینک دے گی اس زمین کا نام الدکماء ہے۔ پھر تیسری زمین کو پیدا کیا اس کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اس سے ہوا زمین کی طرف آتی ہے۔ چوتھی زمین میں تاریکی اور ان بچھوؤں کو پیدا کیا جو دوزخیوں کے لیے ہیں وہ کالے خچروں کی طرح ہیں ان کے دم گھوڑوں کے دموں کی مثل لمبے ہیں وہ ایک دوسرے کو کھاتے ہیں پس وہ بنی آدم پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ پھر اللہ نے پانچویں زمین کو پیدا فرمایا جو موٹائی اور طول و عرض میں پہلی کی مثل ہے اس میں زنجیریں، بیڑیاں اور قیود ہیں جو دوزخیوں کے لیے ہیں۔ پھر چھٹی زمین کو پیدا فرمایا اس کا نام ماد ہے اس میں کالے پتھر ہیں اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی تیار کی گئی۔ قیامت کے روز ان پتھروں کو نکالا جائے گا ان میں سے ہر پتھر بڑے پہاڑ کی مانند ہوگا یہ کبریت سے کفار کے گلے میں لٹکائے جائیں گے پھر وہ بھڑکائے جائیں گے حتی کہ وہ ان کے چہروں اور ہاتھوں کو جلا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (البقرہ: 24) پھر اللہ تعالیٰ نے ساتویں زمین کو پیدا کیا اس کا نام عربیۃ ہے اس میں جہنم ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں ایک کا نام سجین ہے اور دوسرے کا نام الفلق ہے، سجین کھلا ہوا ہے کفار کا نامہ اعمال اس تک پہنچتا ہے، اس پر اصحاب مائدہ اور قوم فرعون پیش کیے جاتے ہیں۔ رہا الفلق دروازہ تو وہ بند ہے قیامت تک نہیں کھولا جائے گا۔ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ سات زمینیں ہیں ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الطلاق کے آخر میں آئے گا۔ تیسرا قول عکرمہ، عطیہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے جو مہدوی نے ذکر کیا ہے کہ آسمان ملے ہوئے تھے بارش نہیں برساتے تھے اور زمین ملی ہوئی تھی اس پر کچھ نہیں اگتا تھا۔ پس آسمان کو بارش کے ساتھ پھاڑا اور زمین کو نبات کے ساتھ کھولا اس کی مثال یہ آیت ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ (الطارق) اس قول کو طبری نے اختیار کیا ہے کیونکہ اس کے بعد ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۔

میں کہتا ہوں: اس کے ساتھ از روئے مشاہدہ اور معاینہ کے اعتبار سے واقع ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے متعلق دوسری آیات میں خبر دی تاکہ اس کے کمال قدرت اور جزا پر دلالت کرے۔ شاعر نے کہا:

یَهُونُ علیهم إذا یَغضبو　نَ سخطُ العداۃ وإرغامُها
ورَتْقُ الفُتوق وفَتْقُ الرَّتو　قِ ونَقْضُ الأُمورِ وإبرامُها

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اس میں تین تاویلات ہیں: (۱) ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا، یہ قتادہ کا قول ہے۔ (۲) ہر چیز کی زندگی کی حفاظت پانی کے ذریعے کی۔ (۳) صلب کے پانی سے ہر زندہ چیز کو بنایا، یہ قطرب کا قول ہے(1)۔ وَجَعَلْنَا بمعنی خلقنا ہے۔ ابو حاتم بستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خوش ہوتا ہے، میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی

1۔ النکت والعیون، جلد 3، صفحہ 444

ہیں مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے۔ فرمایا: ''ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے''۔ ابو حاتم نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول: انبئنی عن کل شئی (مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے) اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی صحت پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے''۔ اگرچہ مخلوق نہ تھی۔ یہ آسمانوں اور زمین کے رتق ہونے کے علاوہ یہ دوسری حجت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الکل یذکر بمعنی البعض ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل: 23) اور ارشاد ہے: تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ (الاحقاف: 25) الصحیح عموم ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کل شی خلق من الماء ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۝ یعنی کیا وہ جو مشاہدہ کرتے ہیں اس کی وجہ سے تصدیق نہیں کرتے یہ سب کچھ خود بخود تو نہیں ہوا بلکہ کسی بنانے والے کے بنانے سے ہوا اور کسی مدبر کی تدبیر سے سب کچھ ہوا اور اس مکون کا حادث ہونا جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ یعنی ثابت وقائم پہاڑ۔ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ یعنی تاکہ ان کے ساتھ لرزتی نہ رہے اور حرکت نہ کرتی رہے تاکہ اس پر قرار مکمل ہو؛ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا: معنی ہے کراہیۃ۔ اَنْ تَمِيْدَ یعنی حرکت کرنے کی کراہیت کی وجہ سے۔ المید کا معنی حرکت کرنا اور گردش کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: ماد راسہ یعنی اس کا سر چکرایا اس پر تفصیلی گفتگو سورۃ النحل میں گزر چکی ہے۔ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا یعنی ان پہاڑوں میں راستے بنائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے الفجاج راستے۔ الفج دو پہاڑوں کے درمیان کھلا راستہ۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم نے زمین میں راستے بنائے، یہ طبری کا اختیار ہے کیونکہ فرمایا: لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۝ زمین میں چلنے کی طرف ہدایت پائیں۔ سُبُلًا، الفجاج کی تفسیر ہے کیونکہ الفج کبھی نافذ راستہ کو کہتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ بعض نے فرمایا: تاکہ ان کے ذریعے اپنے دین کی طرف راہنمائی حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا یعنی گرنے اور زمین پر سقوط سے محفوظ کیا، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (الحج: 65) بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ستاروں کے ذریعے، شیطانوں سے اس کو محفوظ کیا؛ یہ فراء کا قول ہے اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۝ (الحجر: 17) بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ بنایا اور اس سے محفوظ کیا کہ کوئی حیلہ کے ساتھ اس تک پہنچ سکے۔ بعض نے فرمایا: ایسا محفوظ بنایا کہ ستون کا محتاج نہیں۔ مجاہد نے محفوظ کا معنی مرفوعاً (بلند کیا گیا) بیان کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: شرک اور معاصی سے محفوظ کیا۔ وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ۝ یعنی کفار اس کی نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: نشانیوں سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ آیات کی اضافت آسمان کی طرف کی کیونکہ وہ نشانیاں آسمان میں بنائی گئی ہیں۔ جبکہ کئی مقامات پر آیات کی نسبت اپنی طرف بھی کی کیونکہ وہی انکا فاعل حقیقی ہے۔ فرمایا: مشرکین آسمانوں میں اور ان کی نشانیوں میں، رات اور دن میں، شمس وقمر میں، آسمانوں کے افلاک میں، ان کی ہواؤں میں اور ان کے بادلوں میں اور ان میں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں ان میں غور وفکر کرنے سے غافل ہیں اگر وہ غور وفکر کرتے تو جان لیتے کہ ان کا

کوئی صانع ہے، قادر ہے اور وہ واحد ہے۔ اس کا شریک ہونا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ انہیں ایک اور نعمت یاد دلائی ان کے لیے رات بنائی تاکہ اس میں آرام کریں، دن بنایا تاکہ اس میں اپنی معاش کے لیے تصرف کریں۔ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ سورج کو دن کی نشانی بنایا اور چاند کو رات کی نشانی بنایا تاکہ مہینے، سال اور حساب معلوم ہو جیسا کہ سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ كُلٌّ یعنی سورج، چاند، ستارے، کواکب، لیل ونہار میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝ تیزی کے ساتھ چلتے ہیں جیسے پانی میں تیرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور وہ اصدق القائلین ہے: وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا۝ (النازعات) وہ گھوڑا جو لمبا پاؤں رکھتا ہے دوڑنے میں اسے سابح کہتے ہیں۔ یسبحن اور لا تسبح نہیں فرمایا۔ سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ جب ان کے متعلق ذوی العقول کے فعل کے ساتھ خبر دی تو طاعت میں بھی انہیں ذوی العقول کے قائم مقام رکھا۔ ان کے متعلق واو اور نون کے ساتھ خبر دی۔ اسی طرح فراء نے کہا۔ یہ مفہوم سورۂ یوسف میں میں گزر چکا ہے۔ کسائی نے کہا: يَّسْبَحُوْنَ فرمایا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ۝ (القمر) منتصرون نہیں فرمایا۔ بعض نے کہا: چلنا فلک کے لیے ہے۔ پس اس کی طرف نسبت کر دی گئی۔ اصح یہ ہے کہ سیارہ فلک میں چلتا ہے۔ آسمانوں کے علاوہ سات افلاک ہیں۔ اور وہ آسمان فرشتوں کی جولانگاہ ہیں اور ملکوت کے اسباب ہیں اور چاند نچلے فلک میں ہے اور پھر عطارد، پھر زہرہ، پھر سورج، پھر مریخ پھر مشتری پھر زحل ہے اور آٹھواں بروج کا فلک اور نواں الفلك الاعظم ہے۔ فلک، نجوم کے افلاک کا واحد ہے۔ ابوعمرو نے کہا: اس کی جمع فُعُل پر جائز ہے جیسے أَسد و أُسُد، خَشب و خُشُب، فلک کا اصل معنی گردش کرنا ہے۔ اسی سے فلكة المغزل چرخے کا پرتہ جو گھومتا ہے؛ اسی سے کہا جاتا ہے: فلك ثدي المرأة تفليكاً عورت کے پستان کا گول ہونا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: تركت فرسي كأنه يدور في فلك، (1) میں نے گھوڑے کو چھوڑا گویا وہ فلک میں گردش کر رہا ہے۔ اس کی گردش کی وجہ سے آسمان کے فلک کے ساتھ تشبیہ دی جس پر ستارے گھومتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: الافلاك ستاروں، سورج اور چاند کی گزرگاہیں ہیں۔ فرمایا: آسمان اور زمین کے درمیان ہیں۔ قتادہ نے کہا: الفلك آسمان میں گروش ہے۔ آسمان کے ثبوت کے ساتھ ستاروں کے ساتھ گھومتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فلک، چکی کے قطب کی طرح ہے۔ ضحاک نے کہا: فلک سے مراد ان کا گزرنا اور تیزی سے چلنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فلک ایک موج ہے جو روک دی گئی ہے، اس میں چاند اور سورج کی گزرگاہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۝۳۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝۳۵

''اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لیے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا تو اگر آپ انتقال فرما جائیں تو کیا یہ لوگ (یہاں) ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ہر نفس موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے، اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے اور (آخر کار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے''۔

1۔ غریب الحدیث، ابوعبید، جلد 4، صفحہ 96

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ دنیا میں ہمیشہ باقی رہنا۔ کفار نے کہا: ہم محمد ﷺ پر گردش زمانہ کا انتظار کرتے ہیں۔ مشرکین آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ شاعر ہے ہم ان پر گردش زمانہ (موت) کا انتظار کرتے ہیں شاید یہ فوت ہو جائے گا جیسا کہ بنی فلاں کا شاعر فوت ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ سے پہلے انبیاء کا وصال ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خود حفاظت کرتا ہے اسی طرح ہم آپ کے دین اور شریعت کی حفاظت کریں گے۔ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۞ أفهم یعنی کیا وہ ہمیشہ رہیں گے؛ شاعر نے کہا:

رَفَوْنِي وقالوا يا خُوَيلِدُ لاتُرَعْ    فقلتُ وأنكرتُ الوجوهَ هُمُ هُمُ

یعنی أهُم۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ فراء نے کہا: یہ فاء کے ساتھ آیا ہے تاکہ شرط پر دلالت کرے یہ ان کے قول: سَيَمُوتُ (وہ فوت ہو جائے گا) کا جواب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاء کے ساتھ لایا گیا کیونکہ اس کی تقدیر یوں ہے: أفهم الخالدون إن مت۔ فراء نے کہا: فاء کا حذف اور اس کا اضمار دونوں جائز ہیں، کیونکہ ھم میں اعراب ظاہر نہیں ہوتا، یعنی إن مت فهم يموتون ایضاً اگر آپ کا انتقال ہو گا تو یہ بھی مریں گے۔ پس آپ کے وصال پر خوشی نہیں کرنی چاہیے۔ مِتُّ اور مُتُّ، میم کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً، فِتْنَةً غیر لفظ پر مصدر ہے یعنی ہم شدت، رخوت، حلال اور حرام کے ساتھ تمہیں آزمائیں گے پھر دیکھیں گے تم کیسے شکر و صبر کرتے ہو؟ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ اعمال کی جزا کے لیے ہماری طرف لوٹنا ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۞

''اور جب دیکھتے ہیں آپ کو وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے تو آپ سے بس تمسخر کرنے لگتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ صاحب ہیں جو (برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں تمہارے خداؤں کا حالانکہ وہ (کفار) رحمٰن کے ذکر سے خود (یکسر) انکاری ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اس آیت میں ان نافیہ ہے۔ الھزء کا معنی مزاق کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ استہزاء کرنے والے وہی ہیں جن کا ذکر سورۃ الحجر میں اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۞ (الحجر) کے تحت گزر چکا ہے۔ وہ اس کو مبعوث سمجھتے تھے جو ان کے بتوں کے الٰہ ہونے کا انکار کرتا تھا اور خود رحمٰن کی الوہیت کا انکار کرتے تھے۔ یہ انتہائی جہالت ہے۔ اَهٰذَا الَّذِيْ یعنی وہ کہتے ہیں: کیا یہ ہے وہ؟ قول کو مضمر کیا گیا ہے اور وہ اذا کا جواب ہے۔ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا، اِذَا اور اس کے جواب کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ یعنی برائی اور عیب کے ساتھ تمہارے خداؤں کا ذکر کرتا ہے؛ عنترہ کا قول ہے:

لا تَذْكُرِي مُهْرِي وما أطعمتُه    فيكون جلدُكِ مثلَ جِلد الأجربِ

یعنی میرے مہر کو عیب نہ لگا۔

وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ یعنی وہ قرآن کا انکار کرتے ہیں۔ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۞ دوسرا هُمْ ان کے کفر کی تاکید ہے، یعنی وہ ہی انکار کرنے والے ہیں۔ ان کے وصف کفر میں مبالغہ کیا۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۞ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۞

''انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے میں عنقریب تمہیں (خود ہی) اپنی نشانیاں دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو۔ اور وہ کہتے ہیں: کب پورا ہوگا یہ (قیامت کا) وعدہ؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔ کاش! جانتے کفار (اس وقت کو) جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ (کے شعلوں) کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی، بلکہ وہ آئے گی ان کے پاس ناگہانی سو انہیں بدحواس کردے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ یعنی عجلت پر مرکب کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں تیزی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم: 54) یعنی انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے کہا جاتا ہے: خُلِقَ الانسانُ مِنَ الشَّرِّ یعنی شریر پیدا کیا گیا ہے۔ جب کسی کے وصف شر میں مبالغہ کرنا ہو تو اس طرح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: أنت ذهاب و مجیٔ یعنی تو آنے، جانے والا ہے، یعنی انسان کی طبع میں عجلت رکھی گئی ہے۔ بہت سی اشیاء کے لیے جلدی کرتا ہے اگرچہ وہ اس کے لیے مضر بھی ہوں پھر بعض علماء نے فرمایا: انسان سے حضرت مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ سعید بن جبیر اور سدی نے کہا: جب روح حضرت آدم علیہ السلام کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے جنت کے پھلوں کو دیکھا جب روح پیٹ میں داخل ہوئی تو کھانے کا شوق کیا، ٹانگوں میں روح کے پہنچنے سے پہلے جنت کے پھلوں کی طرف جلدی کی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سے یہی مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن آخری وقت میں پیدا کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سر کو زندہ کیا تو انہوں نے جلدی کی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اس میں روح کے پھونکنے کی تکمیل طلب کی؛ یہ کلبی اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ ابوعبیدہ اور بہت سے اہل معانی نے کہا: حمیر قبیلہ کی لغت میں العجل مٹی کو کہتے ہیں اور بطور استشہاد یہ شعر پڑھا:

والنخلُ يَنبتُ بين الماءِ والعَجَلِ

بعض علماء نے فرمایا: انسان سے مراد تمام انسان ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نضر بن حرث بن علقمہ بن کلدہ بن عبدالدار ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر میں ہے جو حقیر مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی آیات اور

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے استہزاء مناسب نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مقلوب ہے یعنی خلق العجل من الإنسان: یہ ابوعبیدہ کا مذہب ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول ایسا ہے کہ کتاب اللہ میں اس کے ساتھ جواب دینا مناسب نہیں کیونکہ قلب اشعار میں اضطراری طور پر واقع ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

کان الزِّنَا فَرِيضةَ الرَّجْم

زنا (رجم کا فریضہ ہے) اس کی مثال یہ آیت ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ یہ سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ۝ یہ پہلے کی تائید کرتا ہے۔ طبع انسان میں عجلت ہے اس کی ایسی تخلیق کی گئی ہے کہ یہ برداشت نہیں کرتا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ اور آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ محمود انجام ہے جو اپنے محبوب کے لیے بنایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آیات سے مراد وہ عذاب ہے جو انہوں نے طلب کیا تھا اور انہوں نے استعجال کا ارادہ کیا تھا انہوں نے کہا: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہر چیز کے لیے ایک مقرر وقت ہوتا ہے یہ نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور انہوں نے جب کہا: اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ (الانفال: 32) (اگر یہ حق ہے) اخفش سعید نے کہا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ اس کا معنی ہے اس کو کہا گیا: کن (ہو جا) فکان (تو وہ ہو گیا) فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ اس قول کی بناء پر کہ جو کسی چیز کو کن کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔ وہ بات جس کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں اس کا اظہار کرنا اس کو عاجز نہیں کرتا۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یعنی اس کا وعدہ کیا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: اللہ رجاء نا بمعنی مرجونا۔ بعض نے فرمایا: الوعید یہاں بمعنی وعید ہے یعنی جس عذاب کا وہ ہم سے وعدہ کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد قیامت ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ اے مومنین کے گروہ! اگر تم سچے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہاں علم بمعنی معرفت ہے جو مفعول ثانی کا تقاضا نہیں کرتا جیسے: لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال: 60) اور لو کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر وہ اس وقت کو جان لیتے جس میں وہ اپنے چہروں سے اور اپنی پیٹھوں سے آگ کے شعلوں کو نہ روک سکیں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی اگر وہ اسکو جان لیتے تو وعید کے لیے جلدی نہ کرتے۔ زجاج نے کہا: اگر وہ جان لیتے تو وعدہ کی سچائی کو جان لیتے۔ بعض نے فرمایا: اگر وہ اسے جان لیتے تو وہ کفر پر قائم نہ رہتے اور ایمان لے آتے۔ کسائی نے کہا: یہ قیامت کے وقوع کے تحقق پر تنبیہ ہے، یعنی اگر وہ علم یقین سے جان لیتے تو جان لیتے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس پر دلیل بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً ہے یعنی قیامت ان کے پاس آئے گی۔ بغتۃ سے مراد قیامت ہے۔ بعض نے کہا: عقوبت ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ آگ ہے جس سے بچاؤ کے کسی حیلہ پر قادر نہ ہوں گے۔ فَتَبْهَتُهُمْ جوہری نے کہا: بهته بهتا اس کا معنی اچانک پکڑ لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ۔ فراء نے کہا: اس کا معنی ہے وہ انہیں حیران وششدر کر دے گی۔ کہا جاتا ہے: بهته يبهته جب کوئی کسی چیز کے سامنے آئے اور وہ اسے حیران کر دے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ان کے پاس اچانک آئے گی۔ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وہ اپنی پیٹھوں سے اسے دور نہیں کر سکیں گے۔ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۝ انہیں توبہ کرنے اور عذر پیش کرنے کی مہلت نہیں دی جائے گی۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''پس نازل ہوا ان لوگوں پر جو تمسخر کیا کرتے تھے ان میں سے وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور تعزیت کے لیے ہے۔ فرمایا: اگر انہوں نے آپ کا مذاق اڑایا ہے تو آپ سے پہلے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا پس آپ صبر کا مظاہرہ کریں جس طرح انہوں نے صبر کیا تھا۔ پھر نصرت کا وعدہ فرمایا۔ فَحَاقَ گھیر لیا۔ بِالَّذِيْنَ جنہوں نے کفر کیا اور مذاق اڑایا۔ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ یعنی ان کے استہزاء کی جزا نے۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

''آپ پوچھیے: (اے منکرو!) کون ہے جو نگہبانی کرسکتا ہے تمہاری رات بھر اور دن بھر خدائے رحمٰن سے (اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے) مگر (ان سے کیا پوچھنا) یہ تو اپنے رب کے ذکر سے ہی روگرداں ہیں۔ کیا ان کے اور خدا ہیں جو بچا سکتے ہیں انہیں (عذاب سے) ہمارے سوا وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہو گی۔ بلکہ ہم نے (عیش و آرام کا) سامان دیا انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو حتیٰ کہ (اسی عیش و آرام میں) ان پر لمبا عرصہ گزر گیا (اور وہ سرکش ہو گئے) کیا وہ ملاحظہ نہیں کر رہے ہے کہ ہم زمین (کی وسعتوں) کو گھٹائے چلے جا رہے ہیں اس کی (چاروں) سمتوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ، يَكْلَؤُ کا معنی حفاظت کرنا اور نگرانی کرنا۔ الکلاء کا معنی حفاظت کرنا ہے۔ کلاہ اللہ کلاءۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی۔ کہا جاتا ہے: اذهب فی کلاءۃ اللہ و اکتلاتُ منهم یعنی حفاظت کی۔

شاعر نے کہا::

إنّ سليمى وَاللهُ يَكلؤها ضنَّت بشئ ما كان يَرزؤُها

دوسرے شاعر نے کہا:

أَنَخْتُ بَعِيرِي وَاكْتَلَأْتُ بَعَيْنِيه

کسائی نے اور فراء نے حکایت کیا ہے: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ لام کے فتحہ اور واو کے سکون کے ساتھ۔ ان دونوں نے مَنْ یکلا کم کو دونوں صورتوں میں ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ اور معروف ہمزہ کی تحقیق ہے یہ اکثر کی قراءت ہے اور

رہا یکلا کم دو اعتبار سے خطا ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔(۱) ہمزہ کا بدل شعر میں ہوتا ہے۔(۲) دونوں ماضی میں کلیتہ کہتے ہیں۔ معنی بدل جاتا ہے کیونکہ کلیتہ کا معنی ہے أوجعت کلیتہ میں نے اسے گردے میں تکلیف پہنچائی اور جو کسی کو کہتا ہے: کلاك الله تو وہ اسے بدُ عا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے گردے کی تکلیف پہنچائے۔ پھر کہا گیا ہے کہ لفظ کا مخرج، استفہام کا مخرج ہے اس سے مراد نفی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی: قل لاحافظ لکم تمہارا کوئی محافظ نہیں۔ بِالَّيْلِ جب تم سوتے ہو۔ وَالنَّهَارِ جب تم اٹھتے ہو اور اپنے امور میں تصرف کرتے ہو۔ مِنَ الرَّحْمٰنِ یعنی رحمٰن کے عذاب سے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ (ہود:63) یعنی اللہ کے عذاب سے۔ یہ خطاب ان میں سے اسے ہے جو صانع کا اعتراف کرتا ہے۔ یعنی جب تم اقرار کرتے ہو کہ وہ خالق ہے تو پھر وہ اس عذاب کے اُتارنے پر بھی قادر ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ بعض نے کہا: مواعظ ہیں۔ بعض نے کہا: معرفت ہے۔ مُّعْرِضُوْنَ غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ، اَمْ لَهُمْ کا معنی ألهم ہے۔ میم صلہ (زائدہ) ہے۔ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا، یعنی من عذابنا ہمارے عذاب سے۔ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ یعنی یہ کفار جو کہتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کریں گے جو اپنی مدد نہیں کر سکتے وہ ان کی مدد کیسے کریں گے؟ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یصحبون کا معنی یمنعون یعنی وہ ہم سے بچائے نہیں جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا معنی یجارون بھی مروی ہے یعنی وہ پناہ نہیں دیے جائیں گے؛ یہ طبری کا مختار ہے۔ عرب کہتے ہیں: انالك جار و صاحب من فلان؛ شاعر نے کہا:

يُنادِي بأعلى صوتِه متعوِّذًا ليُصحَبَ منها والرِّماحُ دَوَانِي

معمر نے ابن ابی نجیح سے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: ینصرون یعنی وہ حفاظت نہیں کیے جائیں گے۔ قتادہ نے کہا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو انکا ساتھی نہیں بنائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد اہل مکہ ہیں یعنی ہم نے ان کے لیے اور ان کے آباء کے لیے اپنی نعمتوں کو پھیلایا۔ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ اور ان نعمتوں میں عرصہ دراز گزر گیا انہوں نے سمجھا کہ یہ نعمتیں ان سے زائل نہیں ہوں گی پس وہ فریب میں مبتلا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حجج کی تدبیر سے اعراض کیا۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ایک علاقہ کے بعد دوسرے علاقہ پر غلبہ اور ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کی فتح تمہیں عطا کر کے زمین کو سمیٹ رہے ہیں؛ یہ اس کا معنی حسن وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: قتل اور قیدی بنا کر؛ یہ معنی کلبی نے بیان کیا ہے۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے اس پر تفصیلی کلام سورۃ الرعد میں گزر چکی ہے۔ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝ یعنی ان کی اطراف کو سمیٹنے کے بعد کفار مکہ ہی کیا غالب ہیں بلکہ آپ ان پر غالب ہیں اور آپ کو ان پر فتح نصیب ہوگی۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ۝ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝

''آپ فرمائیے: میں تمہیں ڈراتا ہوں صرف وحی سے اور نہیں سنا کرتے بہرے پکارنے کو جب انہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرایا جاتا ہے۔ اور اگر (صرف) چھو جائے انہیں ایک جھونکا تیرے رب کے عذاب کا تو (سارا نشہ دور ہو جائے) یوں کہنے لگیں: صد حیف! بیشک ہم ہی ظالم تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ یعنی میں تمہیں قرآن کے ذریعے ڈراتا ہوں۔ وَ لَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ یعنی اللہ تعالیٰ جن کے دل کو بہرہ کر دیتا ہے اور جن کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے وہ آیات کو سمجھنے اور حق کو سننے سے اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔ ابو عبدالرحمن سلمی اور محمد بن سمیقع نے يَسْمَعُ یاء مضمومہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ الصم کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں سناتا۔ ابن عامر اور سلمی، ابو حیوہ اور یحییٰ بن حرث نے لا تسمع تاء مضمومہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ اور الصم کو منصوب پڑھا ہے۔ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ بہروں کو آواز نہیں سناتے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اس قرات کو بعض اہل لغت نے رد کیا ہے اور کہا: پھر یہ کہنا واجب تھا اذا ماتنذرھم۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے کیونکہ معنی معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نفحہ سے مراد طرف ہے۔ قتادہ نے کہا: عقوبت ہے۔ ابن کیسان نے کہا: تھوڑی اور ادنیٰ شی مراد ہے یہ نفح المسك سے ماخوذ ہے۔ شاعر نے کہا:

وعَمْرة من سَرَواتِ النِّساء تَنفَحُ بالمسكِ أَرْدَانُها

ابن جریج نے کہا: اس سے مراد حصہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: نفح فلان لفلان من عطائه جب کوئی کسی کو مال کا ایک حصہ عطا کرے۔ شاعر نے کہا:

لَمَا أَتَيتك أَرجو فَضْل نَائِلِكُمْ نَفَحْتنی نَفْحةً طابتْ لها العَرَبُ

یعنی اس کا نفس خوش ہوا۔ لغت میں النفحہ کا معنی دفعة یسیرة ہے یعنی اگر انہیں عذاب کا ایک جھونکا بھی چھو لے۔ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝ یعنی ہم ہی حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔ وہ اس وقت اعتراف کریں گے جب ان کا اعتراف نفع بخش نہ ہوگا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۝

''اور ہم رکھ دیں گے صحیح تولنے والے ترازو قیامت کے دن پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا، الْمَوَازِيْنَ جمع ہے میزان کی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر مکلف کے لیے ایک میزان ہوگا جس کے ذریعے اس کے اعمال کا وزن کیا جائے گا پس نیکیوں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور برائیوں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ بعض نے فرمایا: یہ

بھی جائز ہے کہ وہاں ایک عامل کے لیے بہت سے میزان ہوں ان میں سے ہر میزان کے ساتھ اس کے اعمال کی ایک قسم کا وزن کیا جائے گا جیسا کہ شاعر نے کہا:

مَلِكٌ تقومُ الحادثاتُ لعَدْلِه فلكلِّ حادثةٍ لها ميزانُ

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک میزان ہو اسے جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو۔ الکائی حافظ ابوالقاسم نے اپنی سنن میں حضرت انس سے روایت کیا ہے اور حضرت انس نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے کہ ''ایک فرشتہ میزان پر مقرر ہوگا۔ ابن آدم کو لایا جائے گا تو اسے میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان روکا جائے گا اگر اس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا تو وہ فرشتہ بلند آواز سے ندا دے گا جسے ساری مخلوق سن لے گی: سعد فلان سعادۃ لایشقی بعدھا أبدا فلاں ایسی سعادت سے مشرف ہوا کہ اس کے بعد کبھی بد بخت نہ ہوگا اور اگر اس کا نیکیوں والا پلڑا ہلکا ہوا تو فرشتہ ندا دے گا فلاں ایسی شقاوت کے ساتھ شقی ہوا کہ اس کے بعد کبھی سعادت مند نہ ہوگا'' (1)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ''قیامت کے روز صاحب میزان جبریل ہوگا''۔ بعض علماء نے فرمایا: میزان کے دو پلڑے ہوں گے دھاگے ہوں گے ایک اس کی زبان ہوگی اور ترازو کا عمود ہوگا۔ ان کی وجہ سے میزان کو جمع ذکر کیا گیا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک نے کہا: میزان کا ذکر ایک مثال ہے وہاں کوئی میزان نہ ہوگا مراد عدل ہے اور جس پر اخبار وارد ہیں اور جو سواد اعظم کا نظریہ ہے وہ پہلا قول ہے۔ اس کا بیان سورہ اعراف اور سورۃ کہف میں گزر چکا ہے۔ ہم نے کتاب التذکرہ میں تفصیلاً اس پر گفتگو کی ہے۔ القسط کا معنی عدل ہے یعنی وہ کمی اور ظلم نہ ہوگا جس طرح دنیا کے وزن میں ہوتا ہے۔ القسط موازین کی صفت ہے مفرد اس لیے ہے کیونکہ یہ مصدر ہے کہا جاتا ہے: میزان قسط، میزانان قسط، موازین قسط، جیسے رجال عدل و رضاً۔ ایک جماعت نے القصط پڑھا ہے۔ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی اہل قیامت کے لیے۔ بعض نے فرمایا: فی یوم القیامۃ قیامت کے دن میں۔ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا محسن کے احسان میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور کسی مجرم کے جرم میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ نافع، شیبہ اور ابوجعفر نے مثقال حبۃ یہاں رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۃ لقمان میں اس معنی پر کہ اگر واقع ہو یا حاضر ہو۔ پس اس صورت میں کان تامہ ہوگا اور خبر کا محتاج نہیں ہے۔ باقی قراء نے مثقال کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس معنی پر کہ ان کان العمل أو ذالك الشئ مثقال۔ مثقال الشی اس کی مثل کا میزان۔ اَتَيْنَا بِهَا الف مقصورہ جمہور کی قرأت ہے یعنی ہم انہیں حاضر کریں گے اور ہم انہیں جزا دینے کے لیے یا سزا دینے کے لیے لے آئیں گے۔ ھا ضمیر سے مراد حبۃ ہے۔ اگر بہ ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: مثقال الحبۃ، حبۃ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: اَتَيْنَا بِهَا مجاہد اور عکرمہ نے آتینا مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے جازینا بھا ہم اس کے ساتھ انہیں جزا دیں گے۔ کہا جاتا ہے: آتی یواتی مؤاتاۃ۔ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ خیر و شر میں سے جو انہوں نے آگے بھیجا اس پر جزا دینے والے۔ بعض علماء نے فرمایا: حٰسِبِيْنَ یعنی کوئی ہم سے زیادہ جلدی حساب لینے والا نہیں۔ الحساب کا معنی شمار کرنا ہے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ ایک

1۔ الحلیۃ ابونعیم، جلد 6، صفحہ 174

شخص نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھا اور عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ میرے غلام ہیں جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں اور مجھ سے خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں، میں انہیں گالیاں دیتا ہوں اور انہیں سزا دیتا ہوں میں ان میں سے کیسا ہوں؟ فرمایا: ''جو وہ خیانت کرتے ہیں، نافرمانی کرتے ہیں اور تجھ سے جھوٹ بولتے ہیں اب سب کا ان سے محاسبہ ہوگا اور تیرا انہیں سزا دینا اگر تو ان کے جرم کے مطابق ہے تو یہ برابر ہوگا نہ تیرے حق میں ہوگا نہ تیرے خلاف ہوگا اور اگر تیری سزا ان کے جرم سے کم ہوگی تو تیرے لیے فضل ہوگا اگر تیری سزا ان کے جرم سے زیادہ ہوگی تو زیادتی کا تجھ سے بدلہ لیا جائے گا''۔ فرمایا: وہ شخص پیچھے ہٹا اور زور زور سے رونے لگا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو کتاب اللہ پڑھتا ہے۔ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا۔ اس شخص نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے لیے اور ان کے لیے ان کو جدا کرنے سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھتا میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ تمام آزاد ہیں (1)۔ یہ حدیث غریب ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٠﴾

''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ھارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لیے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے نیز وہ قیامت سے بھی ترساں رہتے ہیں۔ اور یہ قرآن نصیحت ہے بڑی بابرکت ہم نے (ہی) اسے اُتارا ہے تو کیا تم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ نے الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً حال کی بناء بغیر واو کے پڑھا ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ واو حذف کرنا اور نہ کرنا ایک جیسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ࣙالْكَوَاكِبِ ۙ وَ حِفْظًا (الصافات: 6) یعنی حفظاً اس قول کا زجاج نے رد کیا ہے انہوں نے فرمایا: واو ایک معنی کے لیے ہوتی ہے پس اسے زیادہ نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد تورات ہے کیونکہ ان میں حرام اور حلال کے درمیان فرق ہے۔ فرمایا: وَ ضِيَآءً، فیہ ھدی ونورٌ کی مثل ہے۔ ابن زید نے کہا: فرقان سے مراد دشمنوں پر مدد ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ (الانفال: 41) یعنی بدر کے دن۔ ثعلبی نے کہا: یہ قول ظاہر آیت کے زیادہ مشابہ ہے، الضیاء میں واو کے دخول کی وجہ سے۔ پس آیت کا معنی یہ ہوگا ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو نصرت اور تورات عطا کی جو روشنی اور نصیحت ہے۔ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ یعنی غائبین کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا بلکہ انہوں نے نظر و استدلال کے ذریعے پہچانا کہ ان کے لیے رب ہے جو قادر ہے اعمال پر جزا دے گا وہ اپنے دل میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور خلوتوں میں بھی خشیت ظاہر رہتی

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الانبیاء، حدیث نمبر 3089، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے جہاں وہ لوگوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ تو بہ سے پہلے قیام قیامت سے۔ مُشْفِقُوْنَ۝ ڈرتے رہتے ہیں۔ وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اس سے مراد قرآن ہے۔ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ اے معشر عرب مُنْكِرُوْنَ۝ تم انکار کرتے ہو کہ قرآن معجزہ ہے اس کی مثل لانے پر تم قادر نہیں ہو۔ فراء نے کہا: وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ بمعنی انزلنا مبارکاً ہے، ہم نے اسے برکت والا نازل کیا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝ۚ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۝ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ۝ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝

"اور یقیناً ہم نے مرحمت فرمائی تھی ابراہیم کو ان کی دانائی اس سے پہلے اور ہم ان کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو جب آپ نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو۔ وہ بولے: پایا ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو کہ وہ ان کے پجاری تھے۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ مبتلا رہے ہو تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں۔ انہوں نے پوچھا: کیا تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا (صرف) دل لگی کر رہے ہو؟ آپ نے فرمایا: (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا فرمایا ہے اور میں اس (صداقت) پر گواہی دینے والوں سے ہوں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ فراء نے کہا: ہم نے ابراہیم کو اپنی ہدایت عطا کی، مِنْ قَبْلُ نبوت سے پہلے یعنی ہم نے اسے غور وفکر کرنے کی توفیق بخشی جب اس پر رات تاریک ہوئی تو انہوں نے چاند، سورج اور ستارے کو دیکھا۔ بعض نے فرمایا: مِنْ قَبْلُ سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون سے پہلے۔ نبوت پر دانشمندی۔ پہلا قول اکثر مفسرین کا ہے جس طرح یحییٰ کو فرمایا: وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۝ (مریم) قرطبی نے کہا: رُشْدَهٗ سے مراد اس کی اصلاح ہے۔ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝ یعنی ہم جانتے تھے کہ وہ رشد کے عطا کرنے کے اہل تھے اور نبوت کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ بعض علماء نے فرمایا: یعنی تو یاد کر جب اس نے اپنے باپ کو کہا۔ پس کلام وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ پر مکمل ہوگی۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم جانتے تھے جب انہوں نے کہا۔ اس مفہوم پر کلام متصل ہوگی اور عالمین پر وقف نہ ہوگا لِاَبِيْهِ سے مراد آزر ہے۔ قَوْمِهٖ نمرود اور اس کے پیروکار۔ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ اس سے مراد مورتیاں ہیں۔ التَّمَاثِيْلُ ہر اس شی کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مشابہ بنائی گئی ہو۔ کہا جاتا ہے: مثلت الشئ بالشئ میں نے ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہت دی۔ اس مثل کا اسم تماثل ہے۔ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۝ یعنی تم ان کی عبادت پر قائم

ہو۔ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ ہم اپنے اسلام کی تقلید میں ان کی عبادت کرتے ہیں۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ ان کی عبادت کی وجہ سے گمراہی میں ہیں، کیونکہ یہ جمادات ہیں جو نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان اور نہ کچھ جانتے ہیں۔ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ یعنی کیا تو حق کو لانے والا ہے اپنی بات میں؟ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ یا تو مزاح کرنے والا ہے۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ میں مزاح کرنے والا نہیں ہوں بلکہ تمہارا پروردگار اور تمہاری تدبیر کو قائم کرنے والا آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ جس نے انہیں پیدا کیا۔ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ میں گواہ ہوں کہ وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ شاھد حکم کو بیان کرتا ہے؛ اسی سے ہے شَهِدَ اللّٰهُ (آل عمران:18) الله نے بیان کیا معنی یہ ہے کہ میں جو کہتا ہوں دلیل ہے، بیان کرتا ہوں۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور بخدا! میں بندوبست کروں گا تمہارے بتوں کا جب تم چلے جاؤ گے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ پس آپ نے انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالا مگر ان کے بڑے کو کچھ نہ کہا تاکہ وہ لوگ (اس افتاد کے بارے میں) اس کی طرف رجوع کریں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بتایا کہ حضرت ابراہیم نے زبانی حجت پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے بتوں کو توڑا آپ کو الله تعالیٰ کی ذات پر وثوق تھا اور دین کے دفاع میں تکلیف برداشت کرنے پر نفس مطمئن تھا۔ تَاللّٰهِ میں تاء الله تعالیٰ کے اسم کے ساتھ قسم اٹھانے میں مختص ہے واؤ ہر ظاہر اسم کے ساتھ مختص ہے اور باء ظاہر و ضمیر کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

تاللہ یَبْقَی علی الأیام ذوحِیَدٍ بِمُشْمَخِرٍ به الظَّیَانُ و الآسُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الله کی حرمت کی قسم! میں تمہارے بتوں کا بندوبست کروں گا۔ میں ان کے ساتھ ضرور مکر کروں گا۔ الکید کا معنی مکر ہے۔ کادہ یکیدہ کیداً و مکیدۃ اسی طرح المکایدۃ ہے جنگ کو کید کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: غزا فلان فلاں نے جنگ کی لیکن لڑائی کو نہ پایا۔ ہر وہ چیز جس کا تو برا ارادہ کرے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: أنت تکیدہ۔ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ یعنی تمہارے چلے جانے کے بعد۔ ان کی ہر سال عید ہوتی تھی جس میں وہ جمع ہوتے تھے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: اگر تو ہمارے ساتھ ہماری عید کی طرف نکلے تو تو ہمارے دین کو پسند کرے گا؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا۔ حضرت ابراہیم نے دل میں کہا: تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ میں تمہارے بتوں کا بندوبست کروں گا۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم سے چھپا کر کہا تھا اس کو صرف ایک آدمی نے سنا تھا اور اسی نے آپ کا یہ راز افشا کیا تھا۔ ایک کی خبر کو جمع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جب دوسرے لوگ اس کی خبر پر راضی ہوں، جیسے اس آیت میں ہے: يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ

الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون: 8) بعض علماء نے فرمایا: یہ آپ نے قوم کے نکلنے کے بعد کہا تھا۔ اور ان میں سے صرف وہ کمزور لوگ باقی تھے جنہوں نے آپ کی بات کو سنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے ان سے پیچھے رہنے کا حیلہ کیا فرمایا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ (الصافات) یعنی میں حرکت کرنے میں کمزور ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ الجذ و الجذاذ جو توڑا گیا ہو۔ ضمہ، کسرہ سے افصح ہے؛ یہ جوہری کا قول ہے۔ کسائی نے کہا: سونے کے پتھروں کو جذاذ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسائی، اعمش اور ابن محیصن نے جذاذ جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جذیذ کی جمع ہے۔ ریزہ ریزہ جیسے خفیف کی جمع خفاف اور ظریف کی جمع ظراف آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

جَذَّذ الأصنام فی مِحْرابِها ذاك فی الله العلیّ المقتدر

باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبید اور ابوحاتم نے اس کو اختیار کیا ہے جیسے الحُطام اور الرُّفات وغیرہ یہ جذاذۃ کی جمع ہے یہ وہ کید ہے جس کی آپ نے قسم اٹھائی تھی کہ آپ ضرور ایسا کریں گے۔ فرمایا: فَجَعَلَهُمْ کیونکہ قوم کا اپنے بتوں کے بارے الہ (خدا) ہونے کا عقیدہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابونہیک اور ابوالسمال نے جذاذ جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے فتح اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں، جیسے الحَصاد اور الحِصاد۔ ابوحاتم نے کہا: فتحہ، کسرہ اور ضمہ ہم معنی ہیں؛ یہ قطرب نے حکایت کیا ہے۔ اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ جسم میں بڑا خدا۔ حضرت ابراہیم نے بڑے بت کو نہیں توڑا تھا۔ سدی اور مجاہد نے کہا: آپ نے بڑے بت کو چھوڑ دیا اور اس ہتھوڑے کو اس کی گردن میں لٹکا دیا جس کے ساتھ دوسرے بتوں کو توڑا تھا تا کہ اس کے ذریعے ان پر حجت قائم کریں۔ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ شاید حضرت ابراہیم اور اس کے دین کی طرف يَرْجِعُوْنَ ۝ لوٹیں جب ان پر حجت قائم ہو جائے۔ بعض نے کہا: اِلَيْهِ کی ضمیر کا مرجع بڑا بت ہے۔ يَرْجِعُوْنَ ان کے توڑنے میں۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝

"وہ بولے: کس نے یہ حال کیا ہے ہمارے بتوں کا بیشک وہ ظالموں میں سے ہے۔ (چند آدمیوں نے کہا) ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ کہنے لگے: تو پھر (پکڑ کر) لاؤ اسے سب لوگوں کے روبرو شاید وہ اس کے متعلق کوئی شہادت دیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ جب وہ اپنے میلے سے لوٹ کر آئے اور ان کے بتوں کا جو حشر ہو چکا تھا اسے دیکھا تو بحث و انکار کی جہت سے یہ کہا: مَنْ فَعَلَ۔۔۔ الخ بعض نے فرمایا: مَنْ استفہامیہ نہیں بلکہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ہے یعنی ایسا کرنے والا ظالم ہے۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ ارشاد ہے: سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ یہ مَنْ فَعَلَ هٰذَا کا جواب ہے۔ قَالُوْا میں ضمیر ان کمزور لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حضرت ابراہیم کی بات سنی تھی یا وہ ایک شخص ہے جس نے آپ کا جملہ سنا تھا۔ يَذْكُرُهُمْ کا معنی ہے وہ انہیں عیب لگاتا ہے اور انہیں برا بھلا کہتا ہے۔ شاید اس نے یہ کیا ہو۔ ابراہیم پر رفع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ زجاج نے کہا: يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ۝

کے معنی پر مرفوع ہے اس صورت میں مبتدا محذوف کی خبر ہوگا اور جملہ محکیہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ ندا کی بنا پر مرفوع ہو اور ضمہ مبنی ہونے کی بنا پر ہو اور نائب الفاعل کے قائم مقام ہو۔ اور بعض نے کہا: اس کو رفع نائب الفاعل کی بنا پر ہے اس بنا پر ابراہیم مخصوص شخص پر دلالت کرنے والا نہ بنایا جائے بلکہ اس کے ساتھ بولنا اس لفظ کی بنا پر دلالت کرنے کے لیے ہو یعنی اس کے لیے یہ قول اور یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: زید فعل کے وزن پر ہے یا زید تین حرف ہیں۔ اور یہ کسی وجہ سے شخص پر دلالت نہیں کرتا بلکہ تو نے اس کے بولنے کے ساتھ لفظ کے نفس پر دلالت کی ہے۔ اس طریقہ پر تو کہتا ہے: میں نے ابراہیم بولا۔ اور یہ مفعول صحیح ہوگا تو نے اسے قول اور کلام کے قائم مقام رکھا اس کے بعد فعل کو مجہول بنانے میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ رفع میں ابن عطیہ کا اختیار ہے۔ استاذ ابوالحجاج اشبیلی اعلم نے کہا: یہ اہمال کی بنا پر رفع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: جب اس نے رفع کی وجوہ دیکھیں تو گویا وہ معنی واضح نہیں کرتیں جن کا انہوں نے قصد کیا ہے تو انہوں نے بغیر کسی چیز کے اس کو رفع دیا جیسا کہ عوامل سے خالی ہونے کی وجہ سے مبتدا کو رفع دیا جاتا ہے۔ الفتی کا معنی نوجوان ہے اور الفتاۃ کا معنی جوان لڑکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر نوجوان (1) پھر یہ آیت پڑھی: سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ۔

اس میں ایک مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ جب نمرود اور اس کے حواریوں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بغیر دلیل کے حضرت ابراہیم کو پکڑنا ناپسند کیا انہوں نے کہا: اسے لوگوں کے سامنے لے آؤ تاکہ اسے دیکھیں۔ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ تاکہ وہ اس کے خلاف گواہی دیں جو اس نے کہا ہے، تاکہ اس پر حجت قائم ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ تاکہ اس کی سزا کا مشاہدہ کریں تاکہ اس کے بعد اس جیسا کوئی اقدام نہ کرے یا یہ مطلب ہے کہ تاکہ لوگ گواہی دیں کہ انہوں نے یہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ سزا کا مستحق ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں دلیل ہے کہ کسی سے صرف کسی کے دعویٰ کی بنا پر مواخذہ نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ ہماری شریعت میں بھی یہی عمل ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

**قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝**

''(ابراہیم پکڑ کر لائے گئے تو) لوگوں نے پوچھا: اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔ فرمایا: بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہوگی ان سے پوچھو اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** جب سماع عام نہ تھا اور شہادت ثابت نہ تھی تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا:

1۔ تفسیر ابن کثیر اس آیت کے تحت

کیا انہوں نے یہ کیا ہے یا نہیں؟ اس کلام میں حذف ہے یعنی ابراہیم آئے جب انہیں لایا گیا تو انہوں نے پوچھا: کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے ان پر حجت قائم کرنے کے لیے یہ کہا: بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا یہ دھوکا اور غضب ہے کہ اس کی اور اس کے ساتھ چھوٹے بتوں کی عبادت کی جائے پھر اس نے ان کے ساتھ یہ کیا ہوا گر یہ بولتے ہیں تو ان سے پوچھو۔ بڑے بت کے فعل کو دوسروں کے بولنے کے ساتھ معلق کیا ہے انہیں ان کے بدعقیدہ پر تنبیہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے گویا فرمایا: بلکہ یہ اس بڑے نے کیا ہے اگر یہ بولتے ہیں۔ اس تاویل پر کلام میں تقدیم ہے۔ فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۞ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ بلکہ بڑے نے کیا ہوگا اگر یہ بولتے ہیں یہ بیان کیا کہ جو بولتے نہیں ہیں اور کچھ جانتے بھی نہیں ہیں وہ عبادت کے مستحق نہیں ہیں۔ اس کا یہ قول تعریض تھا اور معاریض ⁂ جھوٹ سے بچنے کے لیے ہوتی ہیں یعنی ان سے پوچھیے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو وہ سچے ہیں اگر یہ نہیں بولتے تو وہ ایسا کرنے والا نہیں۔ اس کلام کے ضمن میں اعتراف ہے کہ وہ ایسا کرنے والا ہے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ انہوں نے اپنے نفس پر اس کو شمار کیا۔ پس یہ دلیل ہے کہ آپ نے یہ کلام تعریض کی حیثیت سے ذکر کی ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے اللہ کو چھوڑ کر انہیں معبود بناتے تھے جیسا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اب سے کہا تھا: يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ (مریم: 42) حضرت ابراہیم نے فرمایا: بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا تا کہ وہ اپنی زبان سے اعتراف کریں کہ یہ بولتے نہیں یہ نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان دیتے ہیں۔ پس پھر انہیں آپ کہیں کہ تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو اور ان پر حجت قائم ہو جائے۔ اسی وجہ سے امت کے نزدیک خصم کے ساتھ باطل کا فرض کرنا جائز ہے تا کہ خصم خود ہی حق کی طرف لوٹ آئے کیونکہ یہ چیز حجت کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور شبہ کو ختم کرنے والی ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے اپنی قوم سے کہا: هٰذَا رَبِّيْ (الانعام: 77) هذه اختي، اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۞ (الصافات) بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا، ابن سمیقع نے بَلْ فَعَلَّهٗ لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ شاید ایسا کرنے والا ان کا بڑا ہو۔ کسائی نے کہا: بَلْ فَعَلَهٗ پر وقف ہوگا یعنی اس نے کیا جس نے کیا پھر كَبِيْرُهُمْ هٰذَا سے نئی کلام ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ان کے بڑے نے ایسا کیا ہے اس کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ یہ خبر کے لفظ کے ساتھ الزام ہے یعنی جو ان کی عبادت کا اعتقاد رکھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان کے لیے فعل کا بھی اثبات کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز تمہیں لازم ہے اس کے اعتبار سے تو ان کے بڑے نے یہ عمل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بخاری، مسلم اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت ابراہیم نے کبھی (بظاہر) بھی جھوٹ نہیں بولا مگر (بظاہر) تین مواقع پر۔ آپ نے کہا: اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۞ (الصافات) اور حضرت سارہ کے متعلق کہا یہ میری بہن ہے اور فرمایا: بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ'' (1) یہ ترمذی کے الفاظ ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں واقعہ معراج میں ہے فرمایا: ''ستارے کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: هٰذَا رَبِّيْ (الانعام: 77) اس بنا پر کذبات کی تعداد چار ہوگی لیکن نبی

1۔ ترمذی، باب ومن سورۃ الانبیاء، حدیث 3090، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

⁂ اشارۃً بات کرنا

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی کی فرمایا: ''ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر بظاہر تین مواقع پر دو مواقع پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تھا۔ فرمایا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ (الصافات) اور بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ اور ایک سارہ کے بارے میں تھا''۔ یہ الفاظ مسلم کی حدیث کے ہیں۔ ستارے کے بارے میں جو کہا تھا: هٰذَا رَبِّیْ (الانعام: 77) یہ بھی کذب میں داخل ہے لیکن اس کو کذب شمار نہیں کیا کیونکہ آپ نے یہ بچپن میں کیا تھا جب کہ آپ مکلف نہ تھے یا آپ نے توبیخ وانکار کی بنا پر ان سے سوالیہ انداز میں یہ کہا اور ہمزہ استفہام حذف کیا گیا یا اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے کہا۔ اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ جو متغیر ہوتا ہے وہ رب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ تمام وجوہ سورۃ الانعام میں واضح طور پر گزر چکی ہیں۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 3۔** قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اس حدیث میں ایک عظیم نکتہ ہے جو پیٹھ کو توڑ دیتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت ابراہیم نے جھوٹ نہیں بولا مگر بظاہر تین صورتوں میں دو ایسی صورتیں تھیں جن سے انہوں نے اپنے دین کا دفاع کیا وہ یہ تھیں آپ نے فرمایا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ (الصافات) اور فرمایا: بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ'' اور ھذہ اختی (سارہ میری بہن ہے) کو ذات الٰہی میں شمار نہیں کیا اگرچہ انہیں آپ نے مجبور ہونے کی صورت میں جابر بادشاہ کے پاس بھیجا تھا لیکن اس میں چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی فراش کی حفاظت اور اپنے گھر والوں کی حمایت کا کچھ حصہ تھا تو اسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے نہیں بنایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف وہ عمل ہوتا ہے جو خالصۃً اللہ کی رضا کے لیے ہو اور دنیا کے ثواب سے پاک ہو اور وہ معاریض (ایسی کلام جس کو سننے والا اور مفہوم میں سمجھے اور متکلم کا ارادہ کچھ اور ہو) جو نفس کی طرف لوٹتی ہیں جب وہ خالص دین کے لیے ہوں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (الزمر: 3) یہ اگر ہماری طرف سے صادر ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں لیکن حضرت ابراہیم کا مقام بلند اسی بات کا مقتضی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** ہمارے علماء نے فرمایا: کذب (جھوٹ) کا مطلب ہے کسی چیز کے بارے میں ایسی خبر دینا جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو۔ ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول تعریض اور توریہ تھا۔ معاریض، حسنات اور حجج اور دلالات جائز ہوتی ہیں لیکن مرتبہ کی کمی میں موثر ہوتی ہیں اور محمود مرتبہ سے کم کر دیتی ہیں اور ان کا قائل ان سے حیا کرتا ہے جیسا کہ حدیث شفاعت میں وارد ہے انبیاء کرام ایسی باتوں سے ڈرتے ہیں جن سے دوسرے لوگ نہیں ڈرتے (1)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ ذات جو نبوت اور خلت کے مرتبہ پر فائز ہے وہ حق کو واضح کرے اور امر کا صراحۃ بیان کرے جیسا بھی ہو لیکن انہیں رخصت دی گئی تھی تو انہوں نے رخصت کو قبول کر لیا تھا پس ان کے قصہ میں یہی ہوا تھا اسی وجہ سے حدیث شفاعت میں ہے: انما اتخذت خلیلاً من وراءَ وراءَ، وراء مبنی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جیسے خمسة عشر ہے اور جس طرح عرب کہتے ہیں: جاری بیت بیت اور مسلم کے بعض نسخوں میں من وراءُ مِن وراءُ، من کے اعادہ کے ساتھ ہے اس صورت میں مبنی برفتحہ جائز نہیں ان میں سے ایک مبنی برضمہ ہوگا کیونکہ مقطوع الاضافہ ہے اور مضاف کی نیت کی گئی ہے جیسے: قبل وبعد میں ہوتا ہے اور اگر مضاف کی نیت نہ ہو تو معرب ہوتا ہے اور منون ہوتا ہے لیکن وراء غیر منصرف

1۔ مسند امام محمد، حدیث نمبر 12153

ہے کیونکہ اس کی الف تانیث کے لیے ہے کیونکہ عرب اس کی تصغیر میں وُرَیئۃ کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: یہ شاذ ہے اس بنا پر من کے موجود ہونے کے ساتھ ہی دونوں میں فتحہ صحیح ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ میں خلیل تھا جو دوسروں سے پیچھے تھا۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ خلت اپنے کمال کے ساتھ صحیح نہیں ہے مگر اس کے لیے جس کے لیے اس دن مقام محمود پر فائز ہونا صحیح ہوگا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

"(لاجواب ہوکر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے پھر بولے بلاشبہ تم ہی زیاں کار ستمگار ہو۔ پھر وہ اوندھے ہوکر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے اور کہنے لگے: تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں۔ آپ نے فرمایا: (نادانو!) کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان (بے بس بتوں) کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح لوٹے جس طرح وہ شخص رجوع کرتا ہے جس کے پاس دلیل باقی نہیں رہتی اور اپنے مقابل کی حجت کی صحت کو سمجھ لیتا ہے۔ پس انہوں نے کہا: تم ہی ظالم ہو یعنی ایسی مورتیوں کی عبادت کر کے تم ظلم کرتے ہو جو ایک لفظ بول نہیں سکتی ہیں۔ اور ایک لمحہ کے لیے اپنے آپ کی مالک نہیں ہیں۔ وہ اپنے عبادت گزاروں کو کیسے نفع دیں گے اور ان سے تکلیف کو کیسے دور کریں گی جو اپنے سر سے ہتھوڑے کے وار کو دور نہ کیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ یعنی وہ اپنی جہالت اور عناد کی طرف لوٹ گئے انہوں نے کہا: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ تو حضرت ابراہیم نے ان کے بکواسات کو توڑتے ہوئے اور ان کی غلط باتوں کا قلع قمع کرتے ہوئے کہا: اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ، تف ہے تمہارے لیے۔ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ بعض علماء نے فرمایا: ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ کا معنی ہے حضرت ابراہیم کے سامنے شرمندگی اور خجالت کی وجہ سے انہوں نے سر جھکا دیے۔ اس میں نظر ہے کیونکہ اگر یہ معنی ہوتا تو عبارت یوں ہوتی نکسوا رؤسھم کاف کے فتحہ کے ساتھ بلکہ یہاں کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے تو اس کا مطلب ہے وہ اپنے پہلے امر کی طرف لوٹ گئے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کو شقاوت نے گھیر لیا اور وہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

''(سب یک زبان ہوکر) بولے جلا ڈالو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (جب آپ کو آتش کدہ میں پھینکا گیا تو) ہم نے حکم دیا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا ابراہیم کے لیے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالُوْا حَرِّقُوْهُ جب اس کی حجت اور دلیل ختم ہوگئی تو انہیں گناہ کی غیرت نے آلیا۔ وہ ظلم، غلبہ کے طریقہ کی طرف لوٹے اور کہا: اسے جلا دو۔ روایت ہے کہ یہ بات کرنے والا فارس کے بدوؤں میں سے تھا اور اکراد قبیلہ سے تھا؛ یہ ابن عمر، مجاہد اور ابن جریج کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے: اس کا نام ہیزر تھا، اسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں غرق کر دیا اور قیامت تک وہ نیچے چلا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بادشاہ نمرود نے یہ کہا تھا: اُنْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ یعنی ابراہیم کو جلا کر اپنے خداؤں کی مدد کرو کیونکہ ابراہیم انہیں گالیاں دیتا ہے اور ان پر عیب لگاتا ہے۔ خبر میں آیا ہے کہ نمرود نے ایک محل بنایا تھا جس کا طول اسی ہاتھ تھا اور عرض چالیس ہاتھ تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: انہوں نے ایک مہینہ لکڑیاں جمع کیں پھر انہیں جلایا وہ اچھی طرح جل گئیں اور شعلے نکلنے لگے حتی کہ پرندہ قریب سے گزرتا تو اس کی تپش کی شدت سے جل جاتا تھا۔ پھر انہوں نے ابراہیم کو باندھ دیا اور انہیں منجنیق میں رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن ابلیس نے ان کے لیے منجنیق بنائی۔ آسمان، زمین اور ان میں رہنے والے فرشتوں اور ساری مخلوق نے ایک آواز دی سوا جنوں اور انسانوں کے: اے ہمارے رب! صرف ابراہیم ہی زمین میں تیری عبادت کرتا ہے اسے تیری وجہ سے جلایا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنے کی اجازت دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی چیز سے وہ مدد مانگتا ہے یا کسی کو وہ بلاتا ہے تو وہ اس کی مدد کرے میں نے اسے اجازت دی ہے اور اگر وہ میرے علاوہ کسی کو نہ پکارے اور میں اس کو جانتا ہوں اور میں اس کا والی ہوں پس جب انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکنے کا ارادہ کیا تو پانی کے فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت ہوا میں تھے۔ انہوں نے کہا: اے ابرہیم! اگر تو چاہے تو ہم آگ کو پانی کے ساتھ بجھا دیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پانی کے فرشتوں کو کہا مجھے تمہاری حاجت نہیں ہے۔ پھر ہوا کا فرشتہ آیا اس نے کہا: اگر آپ چاہیں تو میں آگ کو اڑا دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: نہیں۔ پھر آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا: اے اللہ! تو آسمان میں ایک ہے اور میں زمین میں ایک ہوں، میرے سوا کوئی تیری عبادت نہیں کرتا میرے لیے اللہ کافی ہے اور اللہ بہتر کارساز ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب انہوں نے آگ میں پھینکنے کے لیے باندھا تو آپ نے کہا: لا الٰہ إلا أنت سبحانك رب العالمین لك الحمد ولك الملك لا شریك لك'' پھر فرمایا: ''انہوں نے آپ کو ایک جوڑے کپڑے میں رکھ کر پھینکا۔ آپ کو جبریل امین ملے اور کہا: اے ابراہیم! آپ کو کوئی حاجت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: أما إلیك فلا تجھ سے تو نہیں۔ جبریل نے کہا: اپنے رب سے سوال کرو۔ آپ نے فرمایا: میرے سوال کی نسبت میرے متعلق اس کا علم مجھے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور وہ سب سے زیادہ سچا ہے: يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آگ میں ایسی ٹھنڈک پیدا کی جس نے اس کی گرمی کو دور کر دیا پس وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سلامتی والی ہوگئی۔ ابو العالیہ نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا نہ کہتے تو اس کی ٹھنڈک اس کی گرمی

سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور اگر عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ نہ فرماتے تو ہمیشہ اس کی ٹھنڈک باقی رہتی۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنت سے ایک قالین اتارا اور اسے جحیم میں بھیجا اور اللہ تعالیٰ نے جبریل، میکائیل، ٹھنڈک کا فرشتہ اور سلامتی کا فرشتہ اتارا۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر بَرْدًا کے بعد سَلٰمًا نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی ٹھنڈک کی وجہ سے فوت ہو جاتے اور اس دن ہر آگ بجھ گئی تھی۔ ہر آگ نے سمجھا کہ اسے ارشاد ہوا ہے۔ سدی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے درخت کی ہر ٹہنی کو حکم دیا کہ وہ اپنے درخت کی طرف لوٹ جائے اور پھل پھینکے۔ حضرت کعب اور قتادہ نے کہا: حضرت ابراہیم کو آگ نے نہیں جلایا تھا مگر آپ کی رسی کو جلا دیا تھا جس سے آپ باندھے ہوئے تھے۔ آپ سات دن آگ میں رہے اور کوئی آدمی آگ کے قریب نہیں جا سکتا تھا پھر وہ آئے تو حضرت ابراہیم کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ منہال بن عمرو نے کہا: جب حضرت ابراہیم نے کہا میں اتنا کبھی انعام یافتہ نہ ہوا جتنا کہ میں ان ایام میں تھا جن میں میں آگ میں تھا۔ کعب، قتادہ اور زہری نے کہا: ہر جانور آگ کو بجھانے والا تھا سوائے چھپکلی کے یہ آگ کو پھونکے مارتی تھی اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو فویسقہ کہا(1)۔ شعیب حمانی نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی عمر سولہ برس تھی۔ ابن جریج نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلا کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی عمر چھبیس برس تھی۔ پہلا قول ثعلبی نے اور دوسرا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ کلبی نے کہا: زمین کی ہر آگ بجھ گئی تھی اور کوئی گوشت بھونا نہیں گیا تھا۔ نمرود نے اپنے محل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ ایک فرشتہ آپ سے الفت کا اظہار کر رہا تھا۔ کہنے لگا: تیرا رب کتنا اچھا رب ہے میں اس کے لیے چار ہزار گائے قربان کروں گا اور وہ اس سے رک گیا۔

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَۚ۝ وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ۝ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ۝ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ۝

"انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو نا کام بنا دیا۔ اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط کو اس سرزمین کی طرف (ہجرت کا حکم دیا) جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کے لیے۔ اور ہم نے عطا فرمایا انہیں اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا) پوتا اور سب کو ہم نے صالح بنا دیا۔ اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لیے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ وہ نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا نمرود اور اس کے ساتھیوں نے حضرت ابراہیم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا۔

---

1۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 2، صفحہ 25۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ۝ پس ہم نے انہیں اعمال میں گھاٹا پانے والے بنادیا اور ہم نے ان کے مکر کو ان پر لوٹا دیا یہ ہم نے ان پر اپنی مخلوق میں سے کمزور ترین مخلوق کو ان پر مسلط کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان پر مچھر کو مسلط کیا۔ نمرود باقی رہا حتی کہ اس نے اپنے ساتھیوں اور گھوڑوں کی ہڈیاں دیکھیں۔ وہ ان کے گوشت کھاتے اور ان کے خون پیتے اور ایک مچھر اس کے ناک میں داخل ہو گیا وہ اسے کھاتے کھاتے اس کے دماغ تک پہنچ گیا اور جو نمرود کے نزدیک معزز شخص تھا وہ اس کے سر پر لوہے کا گرز مارتا تھا وہ اسی کیفیت میں چار سو سال رہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ۝ الارض سے مراد شام کی زمین ہے پہلے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط عراق میں تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت لوط کے چچا تھے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور شام کی زمین کو برکت والی زمین کہا گیا کیونکہ اس کی شادابی اس کے پھل اور اس کی نہریں کثیر ہیں، نیز وہ انبیاء کی آرام گاہ ہے برکت کا مطلب خیر کا ثبوت ہے۔ اسی سے ہے: برکت البعیر جب اونٹ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ اس سے مراد مکہ ہے۔ بعض نے کہا: بیت المقدس ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے اکثر انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ یہ بھی کثیر شادابی والی ہے اور بڑھوتری والی ہے اس کا پانی میٹھا ہے اور اور پانی اسی سے بکھرتا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: ہر میٹھا پانی آسمان سے اس چٹان پر اترتا ہے جو بیت المقدس میں ہے پھر زمین میں وہ پانی بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح کعب اخبار سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: الارض المبارکہ سے مراد مصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَیَعْقُوْبَ نَافِلَةً، نافلہ کا معنی زیادہ ہے۔ اسحاق کے لیے آپ نے دعا مانگی تھی اور یعقوب بغیر دعا کے عطا فرمایا تھا، پس یہ نافلہ ہو گا یعنی جو مانگا تھا اس سے زائد تھا کیونکہ آپ نے دعا مانگی: رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ (الصافات) پوتے کو نافلۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ والد پر زیادتی ہوتا ہے۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ۝ یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب میں سے ہر ایک کو صالح اللہ کی طاعت کے مطابق عمل کرنے والا بنایا اور انہیں صالح بنایا ان کے لیے طاعت اور صلاح کو تخلیق کر کے اور طاعت پر قدرت تخلیق کر کے صالحیت کو متحقق فرمایا۔ پھر بندہ جو کوشش کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا یعنی ہم نے انہیں سردار بنایا ہے خیر اور اعمال صالحہ میں ان کی اقتدا کی جاتی ہے۔ امرنا کا معنی ہے جو ہم نے ان پر وحی کی، امر، نہی نازل کیا اس کے مطابق راہنمائی کرتے ہیں گویا فرمایا: وہ ہماری کتاب کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں مخلوق کی راہنمائی کرنے کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہمارے دین کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے وہ اس کی وجہ سے توحید کی طرف بلاتے ہیں۔

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ ہم نے انہیں وحی کی کہ وہ طاعت کو بجالائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَ لُوۡطًا اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا وَّ نَجَّیۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡیَةِ الَّتِیۡ کَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِیۡنَ ﴿ۙ۷۴﴾ وَ اَدۡخَلۡنٰهُ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۷۵﴾

''اور لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا اور نجات دی اسے اس گاؤں سے جس کے باشندے بہت رزیل کام کیا کرتے تھے بیشک وہ لوگ بڑے نابکار (اور) نافرمان تھے۔ اور ہم نے اسے داخل کرلیا ہے (حریم) رحمت میں بیشک وہ نیکوکاروں میں سے تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لُوۡطًا اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا لوطاً فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر بعد والا فعل دلالت کر رہا ہے۔ یعنی و آتینا لوطاً آتیناہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اصل میں اذکر لوطاً ہے۔ الحکم سے مراد نبوت ہے۔ العلم سے مراد امر دین کی معرفت ہے اور وہ علم ہے جس کے ذریعے جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: علماً سے مراد فہم ہے۔ مفہوم تمام اقوال کا ایک ہی ہے۔ وَ نَجَّیۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡیَةِ الَّتِیۡ کَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ قریۃ سے مراد سدوم کا شہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ سات شہر ہیں۔ چھ شہروں کو حضرت جبریل نے الٹ دیا تھا اور ایک شہر کو حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے عیال کی وجہ سے باقی چھوڑا تھا۔ یہ بہت سے شہر تھے جن میں پھل تھے یہ فلسطین کے ضلع سے شراۃ پہاڑ کی حد تک تھے۔ اس میں بحر حجاز کی حد تک بہت سے شہر تھے۔ وہ خبائث جو وہ کرتے تھے ان کے متعلق دو قول ہیں: (۱) لواطت کا عمل جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ (۲) بآواز بلند ہوا خارج کرنا وہ اپنی مجالس میں ہوا خارج کرتے تھے۔ بعض نے کہا: بآواز بلند ہوا خارج کرنا اور کنکریاں پھینکنا۔

اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِیۡنَ ﴿۷۴﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنے والے تھے۔ الفسوق کا معنی نکلنا ہے۔ وَ اَدۡخَلۡنٰهُ فِیۡ رَحۡمَتِنَا رحمت سے مراد نبوت ہے۔ بعض نے کہا: اسلام ہے۔ بعض نے کہا: جنت ہے۔ بعض نے کہا: اپنی قوم سے نجات ہے۔

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿ۚ۷۶﴾ وَ نَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۷۷﴾

''اور یاد کرو نوح (علیہ السلام) کو جب انہوں نے (ہمیں) پکارا پیش ازیں تو ہم نے قبول فرمایا ان کی دعا کو اور بچایا انہیں اور ان کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے۔ اور ہم نے حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا بیشک وہ بڑے نابکار لوگ تھے، پس ہم نے غرق کر دیا ان سب کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ نوح سے پہلے اذکر فعل محذوف ہے نَادٰی کا معنی ہے پکارا۔ مِنۡ قَبۡلُ ابراہیم اور لفظ سے پہلے ان کی دعا یہ تھی: رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ (نوح) اور جب انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو آپ نے کہا: اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ ﴿۱۰﴾ (القمر) فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۶﴾،

الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ سے مراد غرق ہونا اور الْكَرْبِ کا معنی شدید غم بھی ہے۔ اَهْلَهٗ سے مراد ان میں سے جو ایمان لانے والے ہیں۔ وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ابوعبیدہ نے کہا: من بمعنی علی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم نے انتقام لیا اس قوم سے جو ہماری آیتوں کو جھٹلانے والی تھی۔ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ان میں سے چھوٹے، بڑے کو غرق کر دیا۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۟ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۟

''اور یاد کرو داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں ایک قوم کی بکریاں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم اور ہم نے فرمانبردار بنا دیا داؤد کا پہاڑوں اور پرندوں کو وہ سب ان کے ساتھ مل کر تسبیح کیا کرتے اور (یہ شان) ہم دینے والے تھے''۔

ان آیات میں چھبیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ یعنی ان دونوں کو یاد کرو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے۔ اِذْ يَحْكُمٰنِ سے مراد اکٹھا فیصلہ کرنا مراد نہیں ہے اگرچہ دونوں کو ایک صیغہ کے ساتھ جمع کیا ہے کیونکہ ایک حکم پر دو حکم جائز نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا فیصلہ علیحدہ تھا۔ حضرت سلیمان اللہ تعالیٰ کے سمجھانے کی وجہ سے فیصلہ کو سمجھنے والے تھے۔ فِي الْحَرْثِ اس میں دو قول ہیں: بعض نے کہا: وہ کھیتی تھی؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے کہا: وہ انگوروں کی بیلیں تھیں جن پر انگور لگ چکے تھے؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور شریح کا قول ہے۔ الحرث کا لفظ دونوں کے لیے بولا جاتا ہے اور کھیتی میں استعارہ سے بعید ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ یعنی اس کھیتی میں رات کے وقت بکریاں چر گئیں۔ النفش کا معنی ہے رات کے وقت چرنا کہا جاتا ہے: نَفَشَتْ باللیل وهَمَلَتْ بالنهار رات کے وقت چر گئیں اور دن کے وقت چر گئیں۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بغیر چرواہے کے چر جائیں اور اَنْفَشَها صَاحِبُها اور ابلٌ نفاش بولا جاتا ہے، مالک نے انہیں چرایا اور چرنے والے اونٹ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں ہے: الحبة في الجنة مثل كرش البعير يبيت نافشاً، یعنی بعیر رائی کے رات گزارتا ہے؛ یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ ابن سیدہ نے کہا: الهمل بکریوں کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ یہ اونٹوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ یہ دلیل ہے کہ جمع کا کم از کم فرد دو ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد فیصلہ کرنے والے اور تیسرا المحکوم علیہ ہے۔ اسی وجہ سے لِحُكْمِهِمْ فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ہم نے سلیمان کو قضیہ سمجھا دیا۔ صرف ضمیر ذکر فرمایا کیونکہ پہلی کلام فیصلہ پر دلیل ہے۔ حضرت سلیمان کے فیصلہ کو ان کے باپ کے فیصلہ پر فضیلت اس لیے ہے کیونکہ آپ نے ہر شخص کی اپنے مال پر ملکیت محفوظ رکھی ہے اور ہر ایک کا نفس اس پر خوش تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا تھا کہ بکریاں کھیتی والے کو دے دی جائیں۔ ایک فرقہ نے کہا: آپ نے کہا تھا بکریاں کھیتی والے کو اور کھیتی بکریوں والے کو دی جائیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ایک قول کے مطابق آپ نے خیال کیا کہ بکریاں کھیتی کا بدل ہیں جو خراب ہوئی ہے دوسرے قول کے مطابق آپ نے خیال کیا کہ بکریاں کھیت اور غلہ کے مقابل ہیں۔ جب دونوں جھگڑنے والے حضرت سلیمان کے پاس سے گزرے تو وہ اس دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے جھگڑنے والے نکلتے تھے۔ وہ حضرت داؤد علیہ السلام پر دوسرے دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا: اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام نے کیسے فیصلہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ نے بکریوں کا فیصلہ کھیت والے کے لیے کر دیا ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا: شاید فیصلہ اس کے علاوہ ہے تم دونوں میرے ساتھ واپس چلو۔ حضرت سلیمان اپنے باپ کے پاس آئے اور عرض کی: اے اللہ کے نبی! آپ نے ایسا فیصلہ فرمایا ہے اور میں ایک فیصلہ کی صورت دیکھتا ہوں جو تمام کے لیے بہتر ہے۔ آپ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ حضرت سلیمان نے کہا: بکریاں کھیت والے کو دینی چاہیں وہ ان کے دودھ، گھی اور اون سے نفع حاصل کرے اور کھیت بکریوں والے کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے جب کھیتی آئندہ سال اسی حالت پر آ جائے جس حالت پر رات بکریوں نے چرا تھا تو ہر ایک وا اپنا مال واپس کر دیا جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے بیٹے! تجھے توفیق بخشی گئی ہے اللہ تعالیٰ تیرے فہم کو ہمیشہ رکھے تو آپ نے حضرت سلیمان کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، مجاہد وغیرہما نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے(1)۔ کلبی نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے بکریوں اور ان انگوروں کی قیمت جن کو بکریوں نے خراب کیا تھا دونوں کی قیمت برابر تھی پس آپ نے بکریاں کھیت والے کو دے دیں۔ نحاس نے اسی طرح کہا ہے۔ فرمایا: بکریوں کا فیصلہ کھیت والے کے لیے کر دیا کیونکہ بکریوں کی قیمت اس کھیت کی قیمت کے قریب تھی۔ رہا حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ تو کہا گیا ہے کہ جو بکریوں سے کھیت والے نے نفع اٹھایا اس کی قیمت اور بکریوں نے جو کھیت خراب کیا تھا اس کی قیمت بھی برابر تھی۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ایک قوم نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس واقعہ میں خطا نہیں کی تھی بلکہ انہیں بھی حکم اور علم عطا کیا گیا تھا انہوں نے فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ کو حضرت سلیمان کی فضیلت پر محمول کیا ہے اور ان کی فضیلت حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔ والد کو بیٹے کی فضیلت زیادہ خوش کرتی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام اس واقعہ میں مطلوب فیصلہ نہ پا سکے اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ کی مدح فرمائی ہے کہ ان کے لیے حکم اور علم تھا تو یہ دوسرے واقعات کی طرف راجع ہے۔ رہا یہ کہ اس فیصلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام صحیح فیصلہ پر پہنچے اور حضرت داؤد علیہ السلام صحیح فیصلہ پر نہ پہنچے اور انبیاء سے غلطی اور خطا کا وجود مانع نہیں جس طرح

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

دوسروں سے اس کا وجود مانع نہیں لیکن انبیاء کرام غلطی اور خطا پر قائم نہیں رہتے اور دوسرے برقرار رہتے ہیں (1)۔ جب ولید نے دمشق کا کنیسہ (عیسائیوں کا عبادت خانہ) گرایا تو روم کے بادشاہ نے اس کی طرف خط لکھا کہ تو نے وہ کنیسہ گرادیا ہے جس کو تیرے باپ نے دیکھا تھا تو چھوڑ دیا تھا اگر تو نے صحیح کیا ہے تو تیرے باپ نے غلطی کی تھی اگر تیرے باپ نے درست کیا تھا تو تو نے غلطی کی ہے۔ ولید نے اسے جواب دیا: وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ﴿﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ایک قوم نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں نبی تھے اس وحی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے جو ان کی طرف بھیجی جاتی تھی پس حضرت داؤد علیہ السلام نے وحی کے مطابق فیصلہ کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی وحی کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کو منسوخ کر دیا۔ اس بنا پر فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ اس وحی کے ساتھ ہوگا جس نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف کی گئی وحی کو منسوخ کر دیا اور حضرت سلیمان کو یہ حضرت داؤد علیہ السلام تک پہنچانے کا حکم دیا اسی لیے فرمایا: وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا یہ ایک جماعت کا قول ہے ان میں سے ابن فورک بھی ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: ان دونوں کا فیصلہ اجتہاد کی بنا پر تھا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا انبیاء کے اجتہاد کے جواز پر اختلاف ہے ایک قوم نے اس سے منع کیا ہے اور محققین نے انبیاء کے اجتہاد کے جواز کا قول کیا ہے۔ اس میں کوئی استحالہ عقلیہ نہیں کیونکہ یہ دلیل شرعی ہے پس انبیاء کا اس سے استدلال کرنا کوئی محال نہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: جب تیرے گمان پر اس طرح غالب آجائے تو اپنے غالب گمان پر فیصلہ کر دے وہ میرا فیصلہ ہے اور وہ امت کو پہنچا دے یہ عقلاً غیر محال ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اجتہاد اس وقت دلیل ہوتا ہے جب نص موجود نہ ہو اور ان سے نص معدوم نہیں ہوتی، ہم کہیں گے: جب فرشتہ وحی لے کر نازل نہ ہوا تو نص نہ پائی گئی تو وہ بھی بحث میں نصوص کے معانی میں دوسرے مجتہدین کی طرح ہو گئے۔ انبیاء کرام اور دوسرے مجتہدین کے درمیان فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام خطا اور غلطی سے اور اجتہاد میں کوتاہی سے معصوم ہوتے ہیں جبکہ دوسرے مجتہدین غلطی اور خطا سے معصوم نہیں ہوتے جیسا کہ جمہور علماء کا خیال ہے کہ تمام انبیاء اپنے اجتہاد میں غلطی اور خطا سے معصوم ہوتے ہیں اور ابو علی بن ابی ہریرہ ☆ جو اصحاب شافعی میں سے تھے ان کا خیال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء سے خطا میں جواز میں سے خارج تھے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی ایسا نہیں جو آپ کی غلطی کا تدارک کرے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو غلطی سے محفوظ فرمایا اور دوسرے انبیاء کے بعد چونکہ انبیاء مبعوث ہوتے رہے جو ان کی غلطی کا تدارک کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تمام انبیاء میں عام ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیاء خطا کے جواز میں برابر ہیں مگر انبیاء کرام خطا پر باقی نہیں رہتے پس بعد والے انبیاء کرام کا استدراک کا اعتبار نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک عورت نے عدت کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تو جہاں چاہے عدت گزار'' پھر اسے فرمایا: ''تو اپنے گھر میں ٹھہری

1۔ النکت والعیون، جلد 3، صفحہ 457

☆ الحسن بن حسین بغدادی قاضی وفات 345ھ

رہ حتیٰ کہ تیری عدت پوری ہو جائے'' (1)۔ ایک شخص نے آپ سے کہا: بتایئے اگر مجھے باندھ کر قتل کیا جائے جبکہ میں ثواب کی امید رکھتا ہوں تو کیا مجھے جنت سے کوئی چیز رد کرے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ پھر اسے بلایا اور کہا: ''سوائے قرض کے مجھے اسی طرح جبریل نے خبر دی ہے'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ حسن نے کہا: اگر یہ آیت نہ ہوتی تو تو دیکھتا کہ فیصلہ کرنے والے ہلاک ہو گئے ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی صواب کی وجہ سے تعریف فرمائی اور حضرت داؤد علیہ السلام کا اجتہاد کی وجہ سے عذر قبول کیا۔ مجتہدین جو فروع میں اختلاف کرتے ہیں اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق ایک طرف میں ہوتا ہے اس نے ادلہ قائم کی ہیں اور مجتہدین کو ان کے متعلق بحث کرنے اور ان میں غور و فکر کرنے پر ابھارا ہے۔ پس جس نے مسئلہ میں صحیح سمت کو پالیا وہ علی الاطلاق مصیب ہے اور اس کے لیے دو اجر ہیں ایک اجتہاد میں اجر اور ایک درست سمت پانے میں اجر اور جس نے درست سمت کو نہیں پایا وہ اپنے اجتہاد میں مصیب ہے اور اس اعتبار سے مخطی ہے کہ اس نے حقیقت کو نہیں پایا اس کے لیے اجر ہے اور وہ معذور نہیں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مطلوب جہت کو پالیا وہ وہی تھی جو انہیں سمجھائی گئی تھی۔ ایک فرقہ نے کہا: عالم جو اجتہاد میں غلطی کرتا ہے اس پر خطا میں گناہ نہیں ہوتا اگرچہ غیر معذور ہوتا ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: حق ایک طرف میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر دلائل قائم نہیں کیے ہوتے بلکہ معاملہ مجتہدین کی نظر کے سپرد کیا گیا ہے جو صحیح سمت کو پہنچے گا وہ مصیب ہوگا اور جو غلطی کھا جائے گا وہ بھی معذور و ماجور ہوگا۔ صحیح سمت کو پانے کا اس نے ہمیں مکلف نہیں بنایا بلکہ ہمیں صرف اجتہاد کرنے کا مکلف کیا گیا ہے۔ جمہور اہل سنت نے کہا اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے محفوظ ہے کہ فروعی مسائل میں حق دونوں طرفوں میں ہوتا ہے ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے اور مطلوب وہ ہوتا ہے جو اس کے گمان میں افضل ہوتا ہے۔ ہر مجتہد کی نظر اس کے گمان میں افضل کی طرف پہنچی ہوتی ہے اس مقالہ پر دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین بہت سے مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف ثابت کرتے رہے اور ان میں سے کسی نے بھی اپنے قول پر عمل کرنے کو لازم نہیں کیا۔ اسی سے امام مالک کا قول ہے کہ آپ نے منصور ابی جعفر کو موطا پر مجبوراً عمل کرانے سے روکا۔ جب کوئی عالم کسی معاملہ میں حلت کا قول کرے تو وہ اس میں حق ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عالم کے ساتھ مختص ہے اور جو اس عالم کے قول پر عمل کرنے والے ہیں اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے۔ علماء نے فرمایا: حضرت سلیمان نے اگرچہ فیصلہ کو سمجھا اور وہ ارجح تھا لیکن پہلا بھی خطا نہیں تھا۔ اس بنا پر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: اذا اجتهد العالم فاخطأ کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ اس نے افضل میں خطا کی (3)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ مسلم وغیرہ نے حضرت عمرو بن عاص سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر صحیح جہت کو پالے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور فیصلہ کرے اور اجتہاد

---

1۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق فی المتوفی عنها تنتقل، حدیث 1957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 22542

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 92،91

کرے پھر غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ امام مسلم کی کتاب میں حدیث کے لفظ اس طرح ہیں: اذا حکم فاجتھد،(1) اجتہاد سے پہلے حکم کا ذکر کیا جبکہ معاملہ برعکس ہے فیصلہ پر اجتہاد مقدم ہوتا ہے پس بالا جماع اجتہاد سے پہلے فیصلہ جائز نہیں۔ حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب فیصلہ کرنے کا ارادہ کرے جیسا کہ فرمایا: فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ (النحل: 98) تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا جب واقعہ میں اجتہاد کرنے کا ارادہ کرے۔ یہ اصولیوں کے قول کی صحت کو مفید ہے۔ مجتہد پر واقعہ کے وقوع کے وقت نئے سرے سے غور و فکر کرنا واجب ہے وہ اپنے پہلے اجتہاد پر اعتماد نہ کرے کیونکہ ممکن ہے کہ دوبارہ غور و فکر کرنے کے وقت پہلے اجتہاد کے خلاف ظاہر ہو جائے مگر یہ کہ وہ اپنے اجتہاد کے ارکان کو یاد کرنے والا ہو اس کی طرف مائل ہو اور دوسری نشانی میں نئے غور و فکر کا محتاج نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس حاکم کے لیے اجر ہوتا ہے جو خطا کر جائے جبکہ وہ اجتہاد، سنن اور قیاس کو جاننے والا ہو اور گزشتہ لوگوں کے فیصلوں کو جاننے والا ہو کیونکہ اس کا اجتہاد کرنا عبادت ہے خطا پر اجر نہیں دیا جائیگا بلکہ اس سے صرف گناہ ساقط ہو گا۔ اور وہ شخص جو اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ متکلف ہوگا حکم میں خطا کی صورت میں معذور نہ ہوگا بلکہ اس پر بڑے گناہ کا خوف ہے۔ اس پر دلیل دوسری حدیث ہے، ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے: القضاۃ ثلاثۃ(2) (الحدیث) ابن منذر نے کہا: صواب کی طلب میں اس کے اجتہاد پر اسے اجر دیا جائے گا نہ کہ خطا پر اجر دیا جائے گا اس کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ، حسن نے کہا: حضرت سلیمان کی تعریف کی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مذمت نہیں کی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ ابوالتمام مالکی نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ مجتہدین کے اقوال میں سے ایک میں حق ہوگا، تمام مختلف اقاویل میں حق نہیں ہوگا، اکثر فقہاء نے یہی کہا ہے۔ ابن قاسم نے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے امام مالک سے صحابہ کے اختلاف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مخطی و مصیب (یعنی خطا کرنے والا یا درست جہت کو پہنچنے والا) ہوگا۔ تمام اقوال میں حق نہیں یہ قول امام مالک سے مشہور ہے، محمد بن حسین کا بھی یہی نظریہ ہے جنہوں نے یہ کہا ہے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے حجت پکڑی ہے انہوں نے کہا: یہ نص ہے کہ مجتہدین اور فیصلہ کرنے والوں میں خطا کرنے والے اور صحیح سمت پہنچنے والے ہیں انہوں نے کہا: یہ قول کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے یہ قول اس مسئلہ تک پہنچاتا ہے کہ کوئی چیز حلال، حرام ہو جائے واجب، مستحب ہو جائے۔ پہلے قول والوں نے حضرت ابن عمر کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا: جنگ احزاب سے واپسی کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ندا دی: ''خبردار! کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں (اس سفر میں) لوگوں کو نماز کے وقت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہوا تو بعض نے بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ دوسرے صحابہ نے کہا: ہم نماز نہیں پڑھیں گے مگر جہاں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اگرچہ وقت

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 17774

2۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی القاضی یخطئ، حدیث 3102۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب الحاکم یجتہد، حدیث 2305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فوت بھی ہو جائے''۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کسی فریق پر سختی نہ فرمائی انہوں نے کہا: اگر ایک فریق خطا کرنے والا ہوتا تو نبی مکرم ﷺ اسے معین فرماتے۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے شاید خطا کرنے والوں کی تعیین اس لیے نہ فرمائی ہو کیونکہ وہ گنہگار نہیں تھے بلکہ ماجور تھے۔ پس کسی کی تعیین نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم۔ اجتہاد کا مسئلہ طویل اور بہت سی جہتوں کو رکھتا ہے یہ چیدہ چیدہ گفتگو کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اس آیت سے ایک اور فصل بھی متعلق ہے وہ یہ ہے کہ حاکم اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کے بعد دوسرے اجتہاد کی طرف رجوع کرے جو پہلے اجتہاد سے ارجح ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایسا کیا تھا اس کے متعلق ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ عبدالملک اور مطرف نے (الواضحہ) میں کہا ہے یہ اس کے لیے جائز ہے جب تک وہ اپنی ولایت میں ہو۔ جب دوسری ولایت ہو تو اس کے لیے جائز نہیں وہ دوسرے قضاۃ کی طرح ہوگا؛ یہ المدونہ میں امام مالک کے قول کا ظاہر ہے۔ سحنون نے کہا: قاضی کا اپنے اجتہاد والے قول سے دوسرے قول کی طرف رجوع کرنا جس کو وہ صائب دیکھتا ہے جائز نہیں، یہ ابن عبدالحکم کا قول ہے۔ ان دونوں نے فرمایا: جو اس کے نزدیک قوی ہے اس کے ساتھ نیا فیصلہ صادر کرے۔ سحنون نے کہا: مگر یہ کہ اس وقت اس کو قوی قول بھول جائے یا اسے وہم ہو تو پھر اس نے اس کے علاوہ کے ساتھ فیصلہ کر دیا ہو تو اس کے لیے اس فیصلہ کو توڑنا جائز ہے۔ اگر اس نے اس حکم کے ساتھ فیصلہ کیا جو اس وقت اس کے نزدیک قوی تھا پھر اس کے بعد اس کے نزدیک کوئی دوسرا فیصلہ قوی ہو گیا تو پہلے فیصلہ کو توڑنا جائز نہیں؛ یہ سحنون نے اپنے بیٹے کی کتاب میں کہا ہے۔ اشہب نے ابن المواز کی کتاب میں کہا: اگر اس کا رجوع مال میں اصوب کی طرف ہے تو اسے پہلے فیصلہ کو توڑنا جائز ہے اگر فیصلہ طلاق یا نکاح یا آزادی کا تھا تو اسے پہلے فیصلہ کو توڑنا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: قاضی کا اپنے فیصلہ سے رجوع کرنا اولیٰ ہے جب اس کے لیے واضح ہو جائے کہ حق دوسرے قول میں ہے جبکہ وہ اپنی ولایت میں ہو۔ حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ کو جو خط لکھا تھا اس میں اسی طرح ہے اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ہم نے سورۃ الاعراف میں اس کا ذکر کیا ہے اور تفصیلی نہیں ہے۔ یہ امام مالک کے قول کے ظاہر کے لیے حجت ہے اور علماء کا اختلاف نہیں ہے کہ قاضی نے جب تجوزاً اور اہل علم کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ مردود ہوگا اگرچہ وہ اجتہاد کے ساتھ کیا ہو اور قاضی کا دوسرے قاضی کے حکم کو توڑنا جائز نہیں کیونکہ احکام کو توڑنے کی جہت سے اور حلال کو حرام سے تبدیل کرنے، قوانین اسلام ضبط نہ کرنے کی صورت پیش آجائے گی۔ علماء میں سے کسی نے دوسرے کے فیصلہ کو توڑنے کا قول نہیں کیا وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اس کے لیے ظاہر ہو۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ بعض علماء نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے ابھی حکم نافذ نہیں کیا تھا اور ان کے لیے وہ ظاہر ہوا جو دوسرے نے کہا تھا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: وہ فیصلہ نہیں تھا بلکہ فتویٰ تھا۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو روایت کیا ہے اس کی بھی اسی طرح تاویل کی جاتی ہے انہوں نے فرمایا: دو عورتیں تھیں اور ان کے ساتھ اپنا اپنا بیٹا تھا ایک بھیڑیا آیا اور ایک کا بیٹا لے گیا جس کا بیٹا بھیڑیا لے گیا تھا اس نے اپنی ساتھی

عورت سے کہا: بھیڑیا تمہارا بچہ لے گیا ہے۔ دوسری نے کہا: تیرا بیٹا لے گیا ہے۔ فیصلہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے گئیں حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ بڑی عورت کے حق میں کر دیا وہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے پاس آئیں اور انہیں اپنا مسئلہ بتایا حضرت سلیمان نے فرمایا: میرے پاس چھری لے آؤ میں اس بچہ کو تمہارے درمیان دو ٹکڑے کر دیتا ہوں چھوٹی عورت نے کہا: ایسا نہ کرو اللہ تجھ پر رحم فرمائے یہ اس کا بیٹا ہے(1)۔ تو حضرت سلیمان نے فیصلہ چھوٹی عورت کے حق میں کر دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اس سے پہلے السکین (چھری) کا لفظ کبھی نہیں سنا تھا ہم چھری کو المدیة کہتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے نقل کیا ہے اور رہا یہ قول کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف سے فتویٰ تھا ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ یہ واضح کرتا ہے کہ ہر ایک نے فیصلہ دیا تھا اسی طرح حدیث میں فقضیٰ به الکبریٰ آپ نے بڑی کے لیے اس کا فیصلہ کیا۔ یہ قضاء کے انفاذ اور انجاز پر دلیل ہے اور جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی شریعت میں بڑی کے لیے فیصلہ ہوتا تھا اس حیثیت سے کہ وہ بڑی ہے۔ یہ قول بہت بعید ہے کیونکہ بڑا ہونا چھوٹا ہونا دعاوی میں مطرود ہوتا ہے جیسے لمبا ہونا، چھوٹا ہونا، کالا ہونا اور سفید ہونا کسی چیز کا اعتبار نہیں ہوتا یہ دونوں جھگڑنے والوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کا موجب نہیں حتی کہ اس کے حق میں فیصلہ کیا جائے یا اس وجہ سے اس کے خلاف فیصلہ کیا جائے۔ شرائع سے جو بات سمجھی جاتی ہے یہ قطعی ہے یہ کہنا چاہیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سبب سے بڑی کے لیے فیصلہ کیا جس کی وجہ سے ان کے نزدیک بڑی کا قول راجح تھا۔ حدیث میں اس کی تعیین کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کی حاجت نہیں تھی ممکن ہے بچہ اس کے قبضہ میں ہو اور دوسری کا دلیل قائم کرنے سے عاجز ہونا آپ کے نزدیک ثابت ہو گیا ہو پس آپ نے موجود صورت کو برقرار رکھتے ہوئے فیصلہ کر دیا ہو۔ اس حدیث کی تاویل میں جو کہا گیا ہے سب سے بہتر یہی قول ہے یہ وہ فیصلہ ہے جس کے لیے ان دعاوی شرعیہ کا قاعدہ تائید کرتا ہے جو شرائع کے اختلاف کو دور کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام نے سبب شرعی کے ساتھ فیصلہ کیا تھا تو پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ان کے فیصلہ کو توڑنا کیسے جائز تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے باپ کے فیصلہ کو توڑنے سے تعرض نہیں کیا انہوں نے تو ایک لطیف حیلہ کیا جس کی وجہ سے ان کے لیے چھوٹی کی سچائی ظاہر ہوئی۔ وہ حیلہ یہ تھا کہ جب آپ نے فرمایا: چھری لے آؤ میں اسے تمہارے درمیان دو ٹکڑے کر دوں تو چھوٹی نے کہا: ایسا نہ کرو، تو آپ کے لیے چھوٹی میں شفقت کا قرینہ ظاہر ہوا اور بڑی میں یہ نہیں تھا اس کے ساتھ ساتھ دوسرے قرائن بھی آپ کو مل گئے جن کی بنا پر آپ نے اس کے لیے فیصلہ کر دیا شاید آپ ان لوگوں میں سے ہوں جن کے لیے اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنا جائز قرار دیا گیا ہو۔ نسائی نے اس حدیث کا یہ عنوان باندھا ہے حکم الحاکم بعلمه (حاکم کا اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنا اور یہ بھی عنوان باندھا ہے) السعة للحاکم أن يقول للشئ الذی لا یفعل افعل یستبین الحق اور یہ عنوان بھی باندھا ہے نقض الحاکم لا یحکم به غیرہ فمن ھو مثله أو أجل منه شاید بڑی عورت نے اعتراف کر لیا ہو بچہ چھوٹی کا ہے جب حضرت سلیمان کا اس نے دو ٹکڑے کرنے میں عزم اور یقین دیکھا

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 8280

ہو پس حضرت سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ چھوٹی کے لیے کر دیا یہ اس طرح ہوگا جس طرح حاکم قسم کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ جب وہ قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوتا ہے تو وہ شخص آجاتا ہے جو منکر سے ایسی بات نکالتا ہے جو اس کے اقرار کو واجب کرتی ہے پس وہ اس کے خلاف ان کے اقرار کے ساتھ قسم سے پہلے اور قسم کے بعد فیصلہ کر دیتا ہے یہ پہلے حکم کے توڑنے کے باب سے نہیں ہوگا بلکہ یہ اسباب کے تبدیل ہونے کے مطابق احکام کے تبدیل ہونے کے باب سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ انبیاء کے لیے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہے۔ یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ حکام کے لیے ان حیلوں کا استعمال جائز ہے جن کے ذریعے حقوق ظاہر کیے جاتے ہیں اور یہ ذکاوت و فطانت اور قوت سے ہوتا ہے اور مخلوق کے احوال کی مہارت سے ہوتا ہے۔ اور کبھی اہل تقویٰ کے لیے فراست دینیہ ہوتی ہے اور نوری علامات ہوتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اس میں یہ کہنے والے کے لیے حجت ہے کہ ماں کی طرف اس کو لاحق کیا جائے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب نہیں ہے اور نہ یہ اس مسئلہ کو ذکر کرنے کا مقام ہے۔ بہرحال حضرت سلیمان کا اس واقعہ میں ایسا فیصلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح بیان فرمائی: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ کھیتی کے بارے میں قول اور ہماری شریعت میں اس واقعہ کا حکم گزر چکا ہے کہ باغوں والے اور کھیتوں والے دن کے وقت اپنے باغات کی حفاظت کریں گے پھر مثل چیزوں میں ضمانت مثلی چیزوں کے ساتھ ہوگی اور ذوالقیم میں قیمت کے ساتھ ہوگی۔ اس مسئلہ میں اصل ہماری شریعت میں وہ فیصلہ ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، جو حضرت براء بن عازب کی اونٹنی کے بارے میں تھا جس کو امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے حرام بن سعد بن محیصہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت براء کی اونٹنی ایک شخص کے باغ میں داخل ہوگئی اور اس نے اس کو خراب کر دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ "باغ والوں پر دن کے وقت ان کی حفاظت کرنا ہے مویشی جو رات کے وقت کھیت خراب کر دیں تو ان کے مالکوں پر اس کی ضمانت ہوگی" (1)۔ اسی طرح تمام رواۃ نے مرسلاً روایت کی ہے اسی طرح ابن شہاب کے شاگردوں نے ابن شہاب سے روایت کی ہے مگر ابن عیینہ نے زہری سے انہوں نے سعید اور حرام بن سعد بن محیصہ سے روایت کیا ہے کہ اونٹنی الخ انہوں نے اس کی مثل حدیث بیان کی۔ اس حدیث کو ابن ابی ذئب نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت براء کی اونٹنی ایک قوم کے باغ میں داخل ہوگئی۔ امام مالک کی حدیث کی مثل بیان کی مگر انہوں نے حرام بن سعید بن محیصہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ ابو عمر نے کہا ابن ابی ذئب نے کچھ بھی نہیں کہا مگر انہوں نے اس کی سند کو خراب کر دیا۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حرام بن محیصہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق کا کوئی متابع نہیں ہے اور عن ابیہ کے قول پر بعض علماء نے انکار کیا ہے۔ ابن جریج نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے بتایا کہ اونٹنی ایک قوم کے باغ میں داخل ہوگئی اور اس نے اسے خراب کر دیا۔ پس ابن شہاب کی حدیث کو حضرت ابوامامہ سے روایت کیا ہے اور حضرت

---

1۔ ابوداؤد، باب المواشی الخ، حدیث 3099۔ ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب الحکم فی ما افسدت المواشی، حدیث 2322، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

براء کے لیے اونٹنی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ حدیث ابن شہاب عن ابن محیصہ سے روایت ہو اور سعید بن مسیب نے روایت کی ہو اور حضرت ابو امامہ سے مروی ہے اور جس سے چاہا روایت کیا اور جو لوگ موجود تھے انہوں نے انہیں بیان کیا اور تمام ثقہ ہیں۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے یہ حدیث مشہور ہے ائمہ حدیث نے اسے مرسل بنایا ہے اور ثقات نے اس کو بیان کیا ہے۔ فقہاء حجاز نے اس کو استعمال کیا ہے اور قبولیت کے ساتھ لیا ہے۔ اور مدینہ طیبہ میں اس پر عمل جاری ہوا ہے۔ تیرے لیے اہل مدینہ اور اہل حجاز کا اس حدیث کو استعمال کرنا کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ مالک اور جمہور ائمہ نے حدیث براء کو لیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور کوفیوں کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ جانور جب کھیتی کو خراب کر دیں خواہ دن ہو یا رات ہو تو جانور والے پر کچھ لازم نہ ہوگا اور ان ائمہ نے اس کے فساد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "جانور کا زخمی کرنا رائیگاں ہے" (یعنی اس کی ضمانت نہ ہوگی جانور جس کو زخمی کر دے گا) کے عموم میں داخل کیا ہے۔ اور جانوروں کے تمام اعمال کو ان کے زخمی کرنے پر قیاس کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے پہلے کسی نے یہ قول نہیں کیا ہے۔ العجماء والی حدیث میں نہ ان کی حجت ہے اور نہ ان کے متبعین کے لیے حجت ہے اور حدیث براء کے لیے نہ ناسخ ہے اور نہ اس کی معارض ہے کیونکہ نسخ کی شروط نہیں پائی جاتیں اور تعارض وہاں ہوتا ہے جب ایک کے استعمال سے دوسری کی نفی لازم آتی ہو اور العجماء جرحھا جبار (جانور کا زخمی کرنا رائیگاں ہے) میں عموم متفق علیہ ہے پھر اس سے کھیتی اور باغ کو حدیث البراء کے ذریعے خاص کیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث میں یہ آیا العجماء جرحھا جبار نھارا لا لیلاً وفی الزرع والحوائط والحراث پھر بھی یہ قول محال نہ تھا پھر یہ کہنا کیسے جائز ہے کہ یہ متعارض ہے؟ یہ عموم اور خصوص کے باب سے ہے جیسا کہ یہ اصول میں مذکور ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اگر کہا جائے کہ رات اور دن کے درمیان تفریق کرنے میں کیا حکمت ہے؟ لیث بن سعد نے کہا: رات اور دن کے وقت مویشی اگر نقصان کر جائیں تو مویشیوں والے ضامن ہوں گے ہر اس مال کے جس کو وہ خراب کر دیں گے لیکن مویشی کی قیمت سے زیادہ ضمانت نہ ہوگی؟ ہم نے کہا: ان کے درمیان فرق واضح ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ مویشیوں والوں کو دن کے وقت مویشیوں کو چرانے کے لیے چھوڑنا ہوتا ہے ان کے نزدیک اغلب یہ ہے کہ جس کے پاس کھیتی ہو وہ دن کے وقت اس کا خیال کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے پس دن کے وقت کھیتی کی حفاظت کھیت والوں پر رکھی کیونکہ یہ معاش میں تصرف کا وقت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ (النبا) اور جب رات ہوتی ہے تو ہر چیز اپنی جگہ اور مسکن کی طرف لوٹ جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ (القصص: 72) اور فرمایا: وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا (الانعام: 86)

رات کے وقت مویشیوں والے اپنے مویشی اپنی جگہ پر لوٹاتے ہیں تا کہ ان کی حفاظت کریں جب مویشی والا اس کو گھر لوٹانے میں کوتاہی کرے گا یا رات کے وقت اس کو اچھی طرح باندھنے میں کوتاہی کرے گا حتی کہ وہ کسی چیز کو تلف کر دے گا تو مالک پر ضمانت ہوگی پس حکم آسان طریقہ پر جاری ہوگا اس میں دونوں فریقوں کے لیے آسانی ہے اور دونوں فریقوں کے

لیے سہولت ہے اور دونوں کے اموال کے لیے زیادہ حفاظت ہے۔ صاحب نظر کے لیے مسئلہ واضح ہے لیکن جو آنکھوں سے محروم ہے اس کے لیے نہیں رہے۔ لیث کا قول کہ جانور کی قیمت سے زیادہ ضمانت نہ ہوگی۔ ابوعمر نے کہا: میں نہیں جانتا کہ لیث بن سعد نے یہ قول کہاں سے لیا ہے مگر یہ کہ جرم کرنے والے غلام پر اسے قیاس کیا ہو تو اس کی قیمت سے زیادہ نہیں دیا جاتا اور جنایت کی صورت میں اس کے مالک پر اس کی قیمت سے زیادہ لازم نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ضعیف ہے اسی طرح التمہید میں کہا اور الاستذکار میں فرمایا انہوں نے العجماء جرحها جبار کی مخالفت کی اور ناقۃ البراء والی حدیث کی مخالفت کی ان سے پہلے بھی چند علماء کا یہ قول ہے جن میں سے عطا بھی ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے کہا کھیتی میں جانور اگر رات یا دن کے وقت پڑ جائے تو کیا حکم ہے تو انہوں نے کہا: مالک اس کی چٹی دے گا۔ میں نے کہا: خواہ اس پر اسے روکنا ہو یا نہ ہو۔ عطا نے کہا: ہاں وہ ہر صورت میں چٹی دے گا۔ میں نے کہا: کیا چٹی دے گا؟ عطا نے کہا: جو گدھے، جانور اور ماشیہ نے کھایا اس کی چٹی دے گا۔ معمر نے ابن شبرمہ سے روایت کیا ہے: کھیتی جس حالت میں تھی اس کی دراہم کے اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما سے غیر صحیح طرق سے مروی ہے کہ رب الماشیہ (جانور کا مالک) ہر صورت میں ضامن ہوگا خواہ رات ہو یا دن ہو۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ امام مالک نے فرمایا: کھیتی جس کو رات کے وقت مویشیوں نے خراب کیا اس کی رجا اور خوف پر قیمت لگائی جائے گی۔ فرمایا: وہ باغات جن کی حفاظت کی جاتی ہے اور جن کی حفاظت نہیں کی جاتی ہے اور جن سے روکا جاتا ہے اور جن سے روکا نہیں جاتا برابر ہے۔ ہر صورت میں مویشیوں کے مالکوں کو ضمانت دینی ہوگی جب رات کے وقت ان کے مویشی نقصان کریں گے خواہ وہ نقصان کہاں تک پہنچ جائے اگرچہ وہ مویشیوں کی قیمت سے زائد بھی ہو۔ فرمایا: جب ایک جانور رات کے وقت کھل جائے اور وہ کسی سوئے ہوئے آدمی کو لتاڑ دے تو اس کا مالک کسی چیز کا ضامن نہ ہوگا یہ حکم باغ، زرع اور حرث میں ہے ابن عبدالحکم نے امام مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ ابن القاسم نے کہا: رات کے وقت جانور جو نقصان کرے گا وہ اس جانور کے مالک کے مال میں ہوگا اگرچہ وہ نقصان اس جانور کی قیمت سے کئی گنا زیادہ بھی ہو کیونکہ جنایت اس کی طرف سے ہے جب اس نے جانور کو صحیح نہیں باندھا۔ جانور، غلام کی طرح نہیں ہے؛ یہ سحنون اور اصبغ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ کھیتی کے اگنے یا نہ اگنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا جیسا کہ چھوٹے بچے کی عمر میں کیا جاتا ہے: عیسیٰ نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے کہ اس کی قیمت لگائی جائے گی جبکہ وہ اتنی ہو چکی ہو کہ اس کی بیع حلال ہو۔ اشہب اور ابن نافع نے المجموعۃ میں کہا: اگرچہ اس کی منفعت ظاہر نہ بھی ہوئی ہو۔ ابن عربی نے کہا: پہلا قول قوی ہے کیونکہ یہ اس کی صفت ہے پس اس کی قیمت لگائی جائے گی جس طرح ہر تلف شدہ مال کی اس کی صفت پر قیمت لگائی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اگر اس کے لیے کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا جس کی کھیتی خراب ہوئی ہے حتی کہ اس کی کھیتی پھر اُگ آئی اور اس کی کمی پوری ہوگئی اگر تو اس میں اس سے پہلے چرنے کی یا کوئی اور منفعت تھی تو اس منفعت کا ضامن ہوگا اگر اس میں کوئی منفعت نہ تھی تو کوئی ضمانت نہ ہوگی۔ اصبغ نے کہا: وہ ضامن ہوگا کیونکہ تلف ہونا متحقق ہو چکا ہے اور پھر کھیتی کا تیار ہونا اس کی

طرف سے نہیں ہے۔ پس اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ ابن سحنون کی کتاب میں واقع ہے کہ یہ حدیث ان شہروں کے بارے میں ہے جو چار دیواری کے ساتھ گھیرے گئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ شہر جن کی کھیتیاں متصل ہوتی ہیں اور ان کے اردگرد باڑ وغیرہ نہیں ہوتی اور باغات بھی اسی طرح کھلے ہوتے ہیں تو بکریوں والے اس کے ضامن ہوں گے جو وہ خراب کریں گے خواہ وہ رات ہو یا دن ہو گویا ان کا خیال ہے کہ ایسے شہروں میں حیوانوں کو کھلا چھوڑنا ضرور خرابی کا باعث ہوگا؛ یہ لیث کے قول کی طرف میلان ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اصبغ نے مدینہ میں کہا: مویشیوں والوں کے لیے دیہاتوں کی طرف بغیر چرواہوں کے نکالنا جائز نہیں۔ علماء نے اس بنا پر کہا کہ کوئی جگہ کھیت کے ٹکڑے یا چراگاہ کے ٹکڑے سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر کھیت کا ٹکڑا ہو تو جانور اس میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جس کی حاجت ہوگی اس کے مالکوں پر اس کی حفاظت لازم ہے اور جو وہ خراب کرے گا اس کا مالک ضامن ہوگا خواہ دن ہو یا رات ہو اور اگر چراگاہ کا ٹکڑا ہو تو کھیت والے کو اپنی حفاظت خود کرنی ہے، مویشیوں والوں پر کچھ نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ مویشیوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کھلے پھرتے ہیں ایک وہ جو باڑوں میں بند کیے جاتے ہیں۔ امام مالک نے ان کی یہی تقسیم کی ہے۔ وہ جو کھیتوں اور پھلوں کے عادی ہوتے ہیں تو امام مالک نے فرمایا: انہیں ایسے شہروں میں نکالا اور بیچا جائے گا جہاں کھیت نہیں ہوتے اور ابن القاسم نے الکتاب وغیرہ میں اس کو روایت کیا ہے۔ ابن حبیب نے کہا: اگرچہ اس کا مالک اسے ناپسند بھی کرے۔ اسی طرح امام مالک نے اس جانور کے بارے میں کہا ہے جو کھیتی کو خراب کرنے کا عادی ہو اسے نکالا جائے گا اور بیچا جائے گا۔ رہے وہ جانور جس سے حفاظت کی جاسکتی ہے تو اس کے مالک کو اسے نکالنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اصبغ نے کہا: شہد کی مکھی، کبوتر، مرغی، جانور کی طرح ہے ان کے رکھنے سے اس کے مالک کو منع نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ نقصان کرتی بھی ہوں۔ دیہات والوں پر کھیتوں کی حفاظت کرنا ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: یہ روایت ضعیف ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی جو ایسی چیز رکھنے کا ارادہ کرے گا جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اور وہ دوسروں کو نقصان نہیں پہنچاتی تو اسے رکھنے کی اجازت دی جائے گی لیکن جس چیز سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ دوسروں کے نقصان کا باعث ہے تو پھر اسے اجازت نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لاضرر ولاضرار نہ نقصان اٹھایا جائے گا اور نہ نقصان پہنچایا جائے گا۔ یہ نقصان پہنچانے والے جانور ہیں۔ ابن القاسم کی روایت ہے کہ ان کے مالکوں پر تاوان نہیں ہے مگر یہ کہ وہ انہیں خود نقصان کرنے کے لیے بڑھائیں۔ ابن عربی نے کہا: ان پر تاوان ہوگا تقدم سے پہلے بھی جب وہ نقصان کرنے والے ہوں۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ عبد الرزاق نے معمر سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ ان کی بکری جولاہے کی تانی میں داخل ہوگئی (اس نے اس کے دھاگے توڑ دیے) تو وہ جھگڑا قاضی شریح کے پاس لے آئے۔ شعبی نے کہا: اس کو دیکھو وہ ان سے سوال کریں گے کہ وہ دن کے وقت واقع ہوئی یا رات کے وقت داخل ہوئی پس قاضی شریح نے ایسا ہی

کیا پھر کہا: اگر رات کو ایسا ہوا ہے تو بکری کا مالک ضامن ہوگا اور اگر دن کے وقت ایسا ہوا ہے تو ضامن نہ ہوگا پھر شریح نے یہ آیت پڑھی: اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ فرمایا: النفش کا معنی رات کو چرنا ہے اور الھمل کا معنی دن کو چرنا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس باب سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: العجماء جرحها جبار جانور کا زخمی کرنا رائیگان ہے یعنی اس کا تاوان نہیں ہوگا۔ ابن شہاب نے کہا: الجبار کا معنی رائیگان ہونا ہے۔ العجماء سے مراد جانور ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ اکیلا جانور نقصان کردے تو اس میں کچھ نہیں ہے یہ مجمع علیہ ہے اور اگر اس کے ساتھ مہار پکڑنے والا ہو یا پیچھے سے ہانکنے والا ہو یا اس پر سوار ہو پھر مالک نے اسے کسی چیز کو روندنے کے لیے ابھارا اور اس نے کسی چیز کو تلف کردیا تو تلف کرنے والے کا حکم اس پر لاگو ہوگا اگر اس نے ایسی جنایت کردی جس میں قصاص ہے اور اس کا اس پر چڑھانا عمداً تھا تو اس میں قصاص ہوگا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ جانور آلہ (قتل) کی طرح ہے اگر بلا ارادہ ایسا ہوا ہے تو اس میں عاقلہ پر دیت ہوگی اور مال کے تلف کرنے کی صورت میں مجرم کے مال میں چٹی ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ علماء کا اس کے بارے اختلاف ہے جس کو جانور نے پاؤں یا دم کے ساتھ نقصان پہنچایا۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی اس کے مالک پر ضمانت نہیں لگاتے جبکہ امام شافعی، ابن ابی لیلی اور ابن شبرمہ اس پر ضمانت لگاتے ہیں۔ نقصان کرنے والے جانور جمہور کے نزدیک دوسرے جانوروں کی طرح ہیں۔ امام مالک اور بعض ان کے اصحاب اس کو ضمانت لگاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ سفیان بن حسین نے زہری سے انہوں نے سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”پاؤں سے جانور جنایت کرے تو رائیگاں ہے“ (1)۔ دارقطنی نے کہا: سفیان بن حسین کے علاوہ کسی نے اس کو روایت نہیں کیا اور اس کا کوئی متابع بھی نہیں۔ زہری سے روایت کرنے میں حفاظ حدیث نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان میں سے امام مالک، ابن عیینہ، یونس، معمر، ابن جریج، زبیدی، عقیل، لیث بن سعد وغیرہم ہیں، تمام زہری سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا: العجماء جبار والبئر جبار والمعدن جبار، جانور کسی کو نقصان پہنچادے تو وہ رائیگاں ہے، کنویں میں کوئی گر کر مرجائے تو رائیگاں ہے، کان میں کوئی مرجائے تو رائیگاں ہے۔ ان تمام نے (پاؤں سے جانور نقصان پہنچائے تو رائیگاں ہے) کو ذکر نہیں کیا اور یہی درست ہے اسی طرح اس کو ابو صالح سمان، عبدالرحمن اعرج، محمد بن سیرین، محمد بن زیاد وغیرہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بھی الرجل جبار کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہی محفوظ ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ البئر جبار اس کی جگہ النار جبار بھی مروی ہے۔ دارقطنی نے کہا ہمیں حمزہ بن قاسم ہاشمی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حنبل بن اسحاق نے بتایا انہوں نے کہا میں نے ابو عبداللہ احمد بن حنبل کو عبدالرزاق کی حدیث میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث والنار جبار کچھ نہیں ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ ہمیں مخلد نے بتایا انہوں

1۔ ابوداؤد، باب فی الدابۃ تنفخ برجلہا، حدیث 3976

نے کہا ہمیں ابو اسحاق ابراہیم بن معانی نے بتایا فرمایا میں نے احمد بن حنبل کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اہل یمن النار کو النیر لکھتے ہیں اور اس کی مثل البیر لکھتے ہیں۔ عبدالرزاق نے النار جبار کی تلقین کی (1)۔ رمادی نے کہا: عبدالرزاق نے کہا معمر نے کہا: میرا خیال ہے یہ وہم ہے۔ ابو عمر نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے معمر کی حدیث جو انہوں نے ہمام بن منبہ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: النار جبار، یحییٰ بن معین نے کہا: اس کی اصل البئر جبار تھا معمر نے اس میں تصحیف کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: ابن معین نے اپنے اس قول پر دلیل پیش نہیں کی۔ ثقات کی حدیث کو اس طرح رد نہیں کیا جاتا۔ وکیع نے عبدالعزیز بن حصین سے انہوں نے یحییٰ بن یحییٰ غسانی سے ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے کھیت کے تنکے جلائے تو آگ کی ایک چنگاری اڑی اور اس نے پڑوسی کے کھیت کا کچھ حصہ جلا دیا۔ فرمایا: انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے مجھے لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: العجماء جبار، اور میرا خیال ہے ان النار جبار اور العجماء کی جگہ السائمۃ جبار بھی مروی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ میں یہ وارد ہے اور ہر معنی کے لیے لفظ صحیح مذکور ہے۔ شرح حدیث میں اور کتب فقہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ**، وہب نے کہا داؤد علیہ السلام پہاڑوں کے پاس تسبیح کرتے ہوئے گزرتے تو پہاڑ انہیں تسبیح کے ساتھ جواب دیتے۔ اسی طرح پرندے بھی آپ کے ساتھ تسبیح کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب حضرت داؤد علیہ السلام کمزوری محسوس کرتے تو پہاڑوں کو حکم دیتے تو وہ تسبیح کرتے حتی کہ آپ کا اشتیاق بڑھ جاتا اسی وجہ سے فرمایا: **وَّسَخَّرْنَا** یعنی ہم نے انہیں ایسا بنا دیا کہ وہ ان کی اطاعت کرتے جب وہ انہیں تسبیح کرنے کا حکم کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہاڑوں کا آپ کے ساتھ چلنا ان کا تسبیح کرنا ہے۔ التسبیح، السباحۃ سے ماخوذ ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: **یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ** (سبا:10) قتادہ نے کہا: یسبحن کا مطلب ہے وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھتے جب آپ نماز پڑھتے۔ التسبیح سے مراد نماز ہے۔ یہ تمام احتمال ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا کیونکہ پہاڑ عقل نہیں رکھتے۔ پس ان کا تسبیح کرنا، اللہ تعالیٰ کی عاجز اور محدث کی صفات سے پاکیزگی بیان کرنے پر دلالت ہے۔

**وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝**

''اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے تاکہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے تو کیا تم (اس احسان کا) شکر یہ ادا کرنے والے ہو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ** یعنی لوہے کو داؤد کے لیے نرم کر کے زرہ بنانے کا ہنر سکھایا۔ عربوں کے نزدیک لبوس ہر ہتھیار کو کہتے ہیں خواہ وہ زرہ ہو یا جوشن (زرہ) ہو یا تلوار ہو یا نیزہ ہو۔ ہزلی نیزے کی تعریف کرتا ہے:

1۔ ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب الجبار، حدیث 2665۔ ابوداؤد، باب فی النار تعدی، حدیث 3978 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَمَعِي لَبُوسٌ لِلبَئِيسِ كَأَنَّهُ رَوْقٌ بِجَبْهَةِ ذِي نِعَاجٍ مُجْفِلِ

اللبوس ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہنی جاتی ہے، ابن سکیت نے کہا:

اِلْبَسْ لِكُلِّ حَالَةٍ لَبُوسَهَا إِمَّا نَعِيمَهَا إِمَّا بُوسَهَا

اللہ تعالیٰ نے یہاں لبوس سے زرہ کا ارادہ کیا ہے۔ یہ لبوس بمعنی ملبوس ہے جیسے رکوب اور حلوب بمعنی مفعول استعمال ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا: سب سے پہلے زرہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بنائی۔ پہلے سیدھی ہوتی تھیں سب سے پہلے آپ نے اس کے حلقے بنائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِتُحْصِنَكُمْ تاکہ تمہیں بچائے۔ مِّنۢ بَأْسِكُمْ تمہاری جنگ سے۔ بعض علماء نے فرمایا: بَأْسِكُمْ سے مراد تلوار، تیر اور نیزہ ہے یعنی تمہاری جنگ کے آلات سے۔ مضاف حذف کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مِّنۢ بَأْسِكُمْ سے مراد من سلاحکم (تمہارے ہتھیاروں سے) ہے۔ ضحاک نے کہا: من حرب اعداءکم تمہارے دشمن کی جنگ سے۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ حسن، ابوجعفر، ابن عامر، حفص اور روح نے لتحصنکم کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضمیر کو الصنعۃ کی طرف لوٹاتے ہوئے۔ بعض نے کہا: اللبوس اور المنعۃ کی طرف ضمیر راجع ہے جس کا مطلب زرہیں ہیں۔ شیبہ، ابوبکر مفضل، رویس، ابن ابی اسحاق نے، لنحصنکم نون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ پیچھے ہے وَعَلَّمْنٰهُ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے فعل کو لبوس کے لیے بنایا ہے یا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ تمہیں بچائے گا۔ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ۞ کیا تم زرہ کی نعمت کو آسان کرنے پر شکر کرتے ہو۔ بعض نے فرمایا: ھل انتم شاکرون کیا تم میرے رسول کی اطاعت کر کے شکر کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اسباب اور صنائع کے استعمال میں اصل ہے، یہ صاحب العقول لوگوں کا قول ہے۔ یہ ان جہلاء اور اغنیاء کا قول نہیں جو کہتے ہیں: یہ ضعفاء کے لیے شروع کی گئی۔ سبب کا بنانا اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق میں سنت ہے۔ پس جس نے سبب میں طعن کیا اس نے کتاب وسنت میں طعن کیا اور اس کو ضعف اور عدم احسان کی طرف منسوب کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ زرہیں بناتے تھے اور اسی طرح وہ کھجور کے پتوں سے چیزیں بناتے تھے، وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام لکڑی کا کام کرتے تھے۔ حضرت لقمان درزی تھے۔ حضرت طالوت کھالوں کی دباغت کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: پانی بھرتے تھے۔ ہنر انسان کے نفس کو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روکتا ہے اور ان کے نفس سے ضرر اور تکلیف کو دور کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے ''اللہ تعالیٰ اس مومن سے محبت کرتا ہے جو کوئی پیشہ اختیار کیے ہوئے ہو، عاجزی کرنے والا ہو، لوگوں سے سوال نہ کرنے والا ہو، اصرار سے سوال کرنے والے سے بغض رکھتا ہو'' (1)۔ اس کا مزید بیان سورۃ الفرقان میں آئے گا۔ کچھ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ اس میں کفایت ہے۔ واللہ اعلم۔

---

1۔ طبرانی، الکبیر، 10442

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝

''اور ہم نے سلیمان کے لیے تند و تیز ہوا کو فرمانبردار بنادیا چلتی تھی وہ ہوا ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنادیا تھا اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے۔ اور ہم نے مسخر کردیئے شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرتے ان کے لیے اور کیا کرتے طرح طرح کے اور کام اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً یعنی ہم نے سلیمان کے لیے تند و تیز ہوا کو فرمانبردار بنادیا۔ کہا جاتا ہے: عصفت الریح ہوا تیز ہوگئی، ریح عاصف و عصوف تند و تیز ہوا۔ بنی اسد کی لغت میں أعصفت الریح فھی معصف و معصفة استعمال ہوتا ہے۔ العصف بھوسے کو کہتے ہیں اور اس کے ساتھ تیز ہوا کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ وہ بھوسے کو تیزی سے اڑاتی ہے۔ عبد الرحمن اعرج، سلمی اور ابوبکر نے ولسلیمان الریح یعنی حا کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور ماقبل سے قطع کرنے کی بنا پر معنی یہ ہے کہ سلیمان کے لیے ہوا کو فرمانبردار کرنا۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔

تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا، الْاَرْضِ سے مراد شام کا علاقہ ہے۔ روایت ہے کہ ہوا حضرت سلیمان اور آپ کے ساتھیوں کو وہاں لے جاتی جہاں آپ کا ارادہ ہوتا تھا پھر آپ کو شام کی طرف لوٹا دیتی۔ وہب نے کہا: حضرت سلیمان بن داؤد جب اپنی مجلس کی طرف نکلتے تو پرندے آپ پر رک جاتے اور جن و انس آپ کے لیے کھڑے رہتے حتیٰ کہ آپ اپنے تخت پر بیٹھ جاتے۔ آپ جنگجو تھے۔ جنگ سے کبھی نہیں بیٹھتے تھے۔ جب آپ جہاد کا ارادہ کرتے تو آپ تخت کو بچھانے کا حکم دیتے، تخت بچھایا جاتا اور اس پر لوگوں کو سوار کیا جاتا جانور اور آلات حرب بھی سوار کیے جاتے پھر آپ تیز ہوا کو حکم دیتے تو وہ اس تخت کو اٹھا لیتی پھر آپ نرم ہوا کو حکم دیتے تو وہ صبح اور شام کے وقت ایک ایک مہینہ کی مسافت سے چلتی۔ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ (ص) کا یہی معنی ہے۔ الرخاء کا معنی نرم ہے۔ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ یعنی یہ سب کچھ ہم نے کیا جبکہ ہم اس کی تدبیر کو جاننے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ یعنی ہم نے ان کے لیے مسخر کردیا انہیں جو غوطہ لگاتے تھے یعنی پانی کے نیچے جاتے تھے اور سمندر سے حضرت سلیمان کی خاطر جواہر نکالتے تھے۔ الغوص کا معنی ہے پانی کا نیچے اترنا۔ غاص فی الماء پانی کے نیچے گیا اور الھاجم علی الشئ کسی چیز پر حملہ کرنے والے کو غائص کہتے ہیں۔ الغواص جو موتیوں پر سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اس کے فعل کو غیاصة کہتے ہیں۔

وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ یعنی غواص کے عمل کے علاوہ عمل کرتے تھے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے مراد محاریب، تماثیل وغیرہ کے کام ہیں جن میں آپ جنوں کو لگائے رکھتے تھے۔ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ ان کے اعمال کی نگرانی کرنے والے تھے۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے اعمال کو خراب کرنے سے پہلے ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔ بعض نے کہا: اس میں بنی آدم میں سے کسی پر حملہ کرنے سے ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی

ہے کہ ہم ان کے بھاگنے اور انکار کرنے سے حفاظت کرنے والے تھے یا یہ کہ ہم نے ان کی حفاظت کی کہ کہیں اس کے امر سے نکل نہ جائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمام، چونا، بال گرانے والی چیزیں، شیشے اور صابون جنوں کے استخراج سے ہے۔

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِیْنَ ۝

''اور یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو کہ مجھے پہنچی ہے سخت تکلیف اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے حال زار پر بھی رحم فرما) تو ہم نے قبول فرمالی اس کی فریاد اور ہم نے دور فرمادی جو تکلیف انہیں پہنچ رہی تھی اور ہم نے عطا کیے اسے اس کے گھر والے نیز اتنے اور ان کے ساتھ اپنی رحمت خاص سے اور یہ نصیحت ہے عبادت گزاروں کے لیے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ یعنی یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ میرے بدن میں اور میرے مال اور اہل میں مجھے تکلیف پہنچی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایوب کو ایوب اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام روم کے ایک مالدار آدمی تھے۔ انتہائی نیکوکار اور متقی تھے۔ مسکینوں پر بہت رحم فرماتے تھے۔ یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کرتے تھے۔ مہمان کی عزت کرتے تھے۔ مسافر کو مال پہنچاتے تھے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کرنے والے تھے۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ ایک جابر شخص کے پاس گئے پس انہوں نے اسے ایک کام کے لیے مخاطب کیا حضرت ایوب اس کے لیے نرمی سے بات کر رہے تھے اپنی کھیتی کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ نے مال اور اہل لے کر اور جسم میں تکلیف دے کر انہیں آزمائش میں ڈال دیا آپ کے جسم سے گوشت گر گیا تھا اور جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے حتیٰ کہ شہر والوں نے آپ کو شہر سے باہر نکال دیا آپ کی بیوی آپ کی خدمت کرتی تھی۔ حسن نے کہا: آپ نو سال چھ ماہ اسی کیفیت میں رہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی تکلیف دور کرنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ۝ (ص) اس پانی میں تمہاری شفا ہے میں نے تجھے تیرے اہل، مال اور اولاد بھی واپس کر دیے اور ان کی مثل ان کے ساتھ اور بھی عطا کیے۔ مزید تفصیل سورۂ (ص) میں آئے گی۔ اور جو کچھ مفسرین نے لکھا ہے کہ شیطان کو آپ پر تسلط دیا گیا تھا اور مفسرین کا رد بھی انشاء اللہ آئے گا۔ حضرت ایوب کے قول: مَسَّنِیَ الضُّرُّ میں پندرہ اقوال ہیں۔ (۱) آپ نماز پڑھنے کے لیے اٹھے تو آپ نہ اٹھ سکے تو آپ نے عرض کی: مَسَّنِیَ الضُّرُّ یہ آپ نے اپنی حالت کو بیان کرنے کے لیے کہا۔ مصیبت کی وجہ سے شکوئی نہیں۔ حضرت انس نے اس کو مرفوع ذکر کیا ہے۔ (۲) یہ عجز کا اقرار ہے یہ صبر کے منافی نہیں۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان پر یہ جاری فرمایا تا کہ آپ کے بعد آنے والے اہل بلا کے لیے حجت ہو جائے، وہ مصیبت میں یہ اظہار کر سکیں۔ (۴) یہ آپ کی زبان پر جاری فرمایا یہ لازم

کرنے کے لیے کہ انسان تکلیف برداشت کرنے میں ضعیف اور کمزور ہے۔ (۵) چالیس دن آپ سے وحی کا سلسلہ منقطع رہا آپ اپنے رب کے چھوڑنے سے خوفزدہ ہوئے اور عرض کی: مَسَّنِيَ الضُّرُّ؛ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے۔ (۶) آپ کے تلامذہ آپ سے وحی اور دین کی باتیں لکھتے تھے جب آپ کی تکلیف اس انتہا کو پہنچی تو انہوں نے اس کو مٹانا شروع کر دیا اور انہوں نے کہا: اللہ کی بارگاہ میں ان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ پس آپ نے وحی کے ضائع ہونے اور لوگوں کے ہاتھوں سے دین کے چلے جانے کی تکلیف محسوس کی۔ اس کی سند صحیح نہیں۔ واللہ اعلم؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ (۷) کیڑا آپ کے جسم سے گرا تو آپ نے اسے پکڑا اور اسے اپنے جسم پر اپنی جگہ پر رکھ دیا اس نے آپ کو کاٹا تو آپ نے چیختے ہوئے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ تو کہا گیا: کیا تو ہم پر صبر کرتا ہے؟ ابن عربی نے کہا: یہ بہت بعید قول ہے نیز اس کے لیے نقل صحیح کی بھی ضرورت ہے اور اس کے وجود کا کوئی راستہ نہیں۔ (۸) کیڑے آپ کو کھاتے رہے تو آپ صبر کرتے رہے حتیٰ کہ ایک کیڑے نے دل پر حملہ کیا اور دوسرے نے زبان پر حملہ کیا تو آپ نے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ تاکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے محروم نہ ہو جاؤں۔ ابن عربی نے کہا: یہ عمدہ قول ہے اگر اس کی سند ہو جبکہ دعویٰ لمبا چوڑا نہیں ہے۔ (۹) اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو مصیبت میں گرفتار کرنے کی جہت کو مخفی رکھا کیا یہ تادیب تھی یا تعذیب، یا تخصیص تھی یا تمحیص یا ذخر تھا یا طہر تھا۔ آپ نے عرض کی: مَسَّنِيَ الضُّرُّ یعنی تکلیف میں مبتلا کرنے کی جہت میں اشکال کی تکلیف مراد ہے۔ ابن عربی نے کہا یہ غلو ہے اس کی ضرورت نہیں۔ (۱۰) حضرت ایوب علیہ السلام سے کہا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو۔ آپ نے کہا: میں ستر سال نعمتوں میں رہا اور سات سال مصیبت میں گرفتار رہا ہوں اس وقت میں اس سے سوال کروں آپ نے اتنا عرض کیا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ ابن عربی نے کہا: یہ ممکن ہے لیکن آپ کی مدت اقامت کے بارے میں کوئی خبر صحیح نہیں ہے۔ اور نہ آپ کے واقعہ میں کوئی حدیث صحیح ہے۔ (۱۱) آپ کی بیوی کو شیطان نے کہا: تو میرے لیے سجدہ کر تو اس قول نے آپ کو تکلیف پہنچائی۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ میری بیوی کا ایمان ضائع ہو جائے گا اور وہ ہلاک ہو جائے گی۔ اور آپ بغیر کسی کفیل کے رہ جائیں گے۔ (۱۲) جب آپ پر آزمائش ظاہر ہوئی تو آپ کی قوم نے کہا: اس کا ہمارے ساتھ ہونا ہمیں تکلیف دیتا ہے پس اسے ہم سے دور کرنا چاہیے۔ آپ کی بیوی آپ کو شہر سے باہر نکال کر لے گئی لوگ جب آپ کو دیکھتے تو دیکھ کر بری فال پکڑتے پھر انہوں نے کہا: اسے اتنا دور ہونا چاہیے کہ ہم اسے دیکھ نہ سکیں۔ پھر آپ شہر سے بہت دور چلے گئے۔ آپ کی بیوی آپ کی دیکھ بھال کرتی اور آپ کی طرف کھانا لے جاتی۔ لوگوں نے کہا: یہ عورت اس کے پاس جاتی ہے پھر ہمارے پاس آتی ہے کہیں ایسا نہ ہو اس کے سبب اس کی تکلیف ہماری طرف لوٹ آئے۔ لوگوں نے بیوی کو حضرت ایوب علیہ السلام سے روکنے کا ارادہ کیا تو آپ نے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ۔ (۱۳) عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا: حضرت ایوب کے دو بھائی تھے وہ آپ کے پاس آئے اور دور کھڑے ہو گئے آپ کی بدبو کی وجہ سے وہ آپ کے قریب نہیں آ سکتے تھے ایک نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ ایوب میں کوئی خیر دیکھتا تو اس تکلیف میں مبتلا نہ کرتا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس سے زیادہ تکلیف دہ کلمہ نہ سنا اس وقت آپ نے عرض کی: مَسَّنِيَ الضُّرُّ پھر آپ نے یہ دعا کی: اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی سیر ہو کر رات نہیں گذاری میں بھوکے کے مکان کو جانتا ہوں پس تو میری تصدیق فرما۔ آسمان سے

ایک ندا دینے والے نے ندا دی میرے بندے نے سچ کہا۔ وہ دونوں بھائی سجدہ میں گر گئے۔ (۱۴) مَسَّنِیَ الضُّرُّ کا معنی ہے دشمن خوش ہو رہے ہیں، اسی وجہ سے آپ سے پوچھا گیا: تمہاری تکلیف میں کونسی چیز آپ پر شدید تھی؟ فرمایا: دشمنوں کا خوش ہونا۔ ابن عربی نے کہا: یہ ممکن ہے کیونکہ کلیم سے ان کے بھائی نے اس وجہ سے عافیت کا سوال کیا تو آپ نے کہا: اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ (الاعراف: 150) (۱۵) آپ کی بیوی کی مینڈھیاں تھیں جب وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتی تھی تو اس نے اپنی مینڈھیاں کاٹیں اور انہیں خوراک کے بدلے بیچ ڈالا اور خوراک حضرت ایوب کے پاس لے آئی۔ حضرت ایوب تصرف اور حرکت کرنے کے لیے اپنی بیوی کی مینڈھیوں سے سہارا لیتے تھے۔ جب انہیں نہ پایا اور حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو حرکت نہ کر سکے اس وقت عرض کی: مَسَّنِیَ الضُّرُّ بعض علماء نے کہا: جب آپ کی بیوی نے اپنی مینڈھیوں کے بدلے خوراک خریدی تو ابلیس لعنۃ اللہ علیہ حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں آیا اور کہا تیری بیوی نے بدکاری کی ہے اور وہ پکڑی گئی ہے اور اس کے بال مونڈ دیئے گئے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم اٹھائی کہ وہ اسے کوڑے ماریں گے تو عورت کے دل پر محبت، حضرت ایوب کے دل پر محبت سے زیادہ سخت تھی۔

میں کہتا ہوں: (۱۶) سولہواں قول وہ ہے جو ابن المبارک نے ذکر کیا ہے، ہمیں یونس بن یزید نے بتایا انہوں نے عقیل سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کی آزمائش کا ذکر کیا اس میں ہے کہ ''آپ کا ایک بھائی آپ کے ساتھ لازم رہا اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! مجھے تیرے معاملہ نے تعجب میں ڈالا میں اس کا ذکر تیرے بھائی اور تیری ساتھی سے کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اہل اور مال کے تلف کرنے اور جسم میں بیماری پیدا کرنے کے ساتھ اٹھارہ سال سے آزمایا ہے حتی کہ تو اس کیفیت میں پہنچ گیا جو تو دیکھ رہا ہے کیا وہ تجھ پر رحم نہیں کرتا کہ وہ تجھ سے تکلیف دور کر دے۔ تو نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جو میرے خیال کے مطابق کسی نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا: میں نہیں جانتا جو وہ کہتے ہیں مگر میرا رب جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرتا ہوں وہ گمان کرتے ہیں اور ہر ایک اللہ کی قسم اٹھاتا ہے یا ایک جماعت سے گزرتا ہوں جو گمان کرتے ہیں پھر میں اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتا ہوں پھر میں ان کی قسموں کا کفارہ دیتا ہوں اس ارادہ سے کہ کوئی گنہگار نہ ہو جو اس نے ذکر کیا ہے۔ اور کوئی اسے ذکر نہ کرے مگر حق کے ساتھ پس حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا: مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ آپ کی دعا بڑی طویل تھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا پیش کی اس تکلیف کی وجہ سے جو آپ کو پہنچی ہوئی تھی آپ اس تکلیف پر صبر کرنے والے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھی۔ (۱۷) سترواں قول یہ ہے جو میں نے سنا ہے اور میں اس پر واقف نہیں ہوں: ایک کیڑا آپ کے جسم سے گرا تو آپ نے اسے تلاش کیا تا کہ اسے اپنی جگہ لوٹا دیں تو وہ آپ کو نہ ملا آپ نے عرض کی: مَسَّنِیَ الضُّرُّ جب آپ کو اس کیڑے کی تکلیف کا اجر نہ ملا آپ چاہتے تھے کہ عافیت کے وقت پورا اجر ملتا رہے۔ یہ عمدہ قول ہے مگر سند کا محتاج ہے۔ علماء نے فرمایا: مَسَّنِیَ الضُّرُّ یہ بطور گھبراہٹ نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں

فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (ص: 44) ہم نے ایوب کو صبر کرنے والا پایا بلکہ یہ آپ کی طرف سے یہ دعا تھی۔ الجزع وہ شکوئی ہے جو مخلوق کی طرف ہو۔ اللہ کی بارگاہ میں عرض شکوئی نہیں ہوتا۔ دعا، رضا کے منافی نہیں ہے۔ ثعلبی نے کہا: میں نے اپنے استاذ ابو القاسم بن حبیب کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں سلطان کے دربار میں فقہاء اور ادباء کی مجلس میں حاضر تھا مجھ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا اس پر اجماع کے بعد کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا قول شکایت تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (ص: 44) ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔ میں نے کہا: یہ شکایت نہیں تھی یہ دعا تھی۔ اس کا بیان فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ہے دعا کے بعد قبولیت ہوتی ہے نہ کہ شکایت کے بعد قبولیت ہوتی ہے۔ علماء نے اس جواب کو اچھا سمجھا اور اس سے خوش ہوئے۔ جنید سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: سوال کے فاقہ کا اظہار کیا تھا تاکہ اس پر نوال کے کرم کے ساتھ احسان کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام سے کہا گیا ہم نے تجھے جنت میں تیرے اہل عطا کیے اگر تو چاہے تو ہم تیرے لیے انہیں جنت میں رہنے دیں اور اگر تو چاہے تو ہم انہیں دنیا میں تجھے عطا کر دیں۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت ایوب کے لیے جنت میں چھوڑ دیا اور دنیا میں ان کی مثل انہیں عطا فرمائے۔ نحاس نے کہا: ان دونوں سے اس کی سند صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے۔ ضحاک نے کہا: حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا حضرت ایوب علیہ السلام کے اہل، بیوی کے سوا سب فوت ہو گئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آنکھ جھپکنے سے کم وقت میں انہیں زندہ کر دیا اور ان کی مثل ان کے ساتھ عطا فرمائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ کے بیٹے فوت ہو گئے تھے پس آپ کی خاطر انہیں زندہ کیا گیا اور ان کی مثل ان کے ساتھ اور پیدا ہوئے؛ یہ قتادہ، کعب احبار اور کلبی وغیرہم کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کی اولاد فوت ہو گئی اور وہ سات مرد تھے اور سات عورتیں تھیں۔ جب آپ کو صحت دی گئی تو وہ آپ کے لیے اٹھائے گئے اور آپ کی بیوی نے سات بیٹے اور سات بیٹیاں جنم دیں۔ ثعلبی نے کہا: یہ قول ظاہر آیت کے زیادہ مناسب ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ بطور آزمائش اپنی مدت عمر سے پہلے فوت ہو گئے تھے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ الخ، (البقرہ: 243) کے واقعہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور وہ ستر افراد جن کو کڑک نے آلیا تھا اور وہ مر گئے تھے پھر وہ زندہ کیے گئے یہ اس لیے ہوا کہ وہ اپنی مدت عمر سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔ یہاں بھی اسی طرح ہوا۔ مجاہد اور عکرمہ کے قول پر معنی یہ ہوگا ہم نے اسے اجرت میں اس کے اہل عطا فرمائے اور دنیا میں ان کی مثل ان کے ساتھ۔ اور خبر میں ہے اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو آپ کی طرف بھیجا جب آپ نے زمین پر پاؤں مارا تھا اور گرم پانی کا چشمہ ظاہر ہوا تھا حضرت جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور اسے جھاڑا تو آپ کے کیڑے سارے گر گئے۔ اور آپ پانی میں داخل ہوئے تو گوشت پیدا ہو گیا اور آپ اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے اہل اور ان کی مثل ان کے ساتھ اور عطا فرما دیئے۔ اور ایک

بادل آپ کے گھر کی بنیادوں کی مقدار ظاہر ہوا اور وہ تین دن اور تین راتیں سونے کی مکڑیاں برساتا رہا۔ حضرت جبریل نے آپ کو کہا: کیا آپ سیر ہو گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے فضل سے کون سیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے ازمائش سے پہلے اور آزمائش کے بعد تیری صبر کے ساتھ تعریف کی ہے اگر میں نے خود تیرے ہر بال کے نیچے صبر نہ رکھا ہوتا تو تو صبر نہ کرتا۔ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا یہ سب کچھ ہم نے اپنی رحمت کی بنا پر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم نے اسے آزمایا تا کہ کل اس کا ثواب زیادہ ہو۔ وَ ذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ ۞ عبادت گزاروں کے لیے نصیحت ہے کیونکہ جب وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش اس پر ان کا صبر اور محنت کو یاد کریں گے جبکہ وہ اپنے زمانہ کے سب لوگوں سے افضل تھے تو وہ بھی دنیا کی تکالیف پر اپنے نفسوں کو صبر کا عادی بنائیں گے جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا تھا۔ پس یہ ان کے لیے ہمیشہ عبادت کرنے اور تکلیف برداشت کرنے پر تنبیہ ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کتنی مدت آزمائش میں رہے اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آزمائش کی مدت سات سال اور سات مہینے اور سات دن اور سات راتیں تھیں۔ وہب نے کہا: تیس سال تھی۔ حسن نے کہا: سات سال اور چھ مہینے تھی۔

میں کہتا ہوں: ان میں سے اصح اٹھارہ سال ہے۔ ابن شہاب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے اور ابن المبارک نے اس کو ذکر کیا ہے۔

وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِدۡرِيۡسَ وَ ذَا الۡكِفۡلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۞ وَ اَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۞

''اور یاد کرو اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو یہ سب صابروں کے گروہ سے تھے۔ اور ہم نے داخل فرمایا انہیں اپنی خاص رحمت میں یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِدۡرِيۡسَ ادریس، اخنوح تھے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ ذَا الۡكِفۡلِ یعنی اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو۔ ترمذی الحکیم نے نوادر الاصول میں حضرت ابن عمر کی حدیث نقل کی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس کو ذوالکفل کہا جاتا تھا وہ کسی گناہ سے بچتا نہیں تھا اس نے ایک عورت کا پیچھا کیا اس سے بدکاری کرنے کے لیے اسے سات دینار دیے جب وہ اس کے قریب بیٹھا تو وہ کانپنے لگی اور رونے لگی ذوالکفل نے کہا: تو کیوں رو رہی ہے؟ اس نے کہا: اس عمل کی وجہ سے۔ اللہ کی قسم! میں نے کبھی ایسا گناہ نہیں کیا۔ ذوالکفل نے کہا: کیا میں نے تجھے مجبور کیا ہے؟ اس عورت نے کہا: نہیں لیکن مجھے حاجت نے مجبور کیا ہے۔ ذوالکفل نے کہا: تو چلی جا وہ رقم بھی تیری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں اس کے بعد کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا پھر وہ رات کو فوت ہو گیا لوگوں نے اس کے دروازے پر یہ لکھا ہوا پایا: ان اللہ قد غفر لذی الکفل اللہ تعالیٰ نے ذوالکفل کی بخشش کر دی ہے۔ اس کو ابو عیسیٰ ترمذی نے بھی تخریج کیا ہے۔ اس کے لفظ حضرت ابن عمر سے مروی ہیں فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث بیان کرتے ہوئے سنا: ''اگر میں نے اس کو نہ سنا مگر ایک یا دو مرتبہ حتی کہ سات مرتبہ کو شمار کیا۔ تو میں اسے بیان نہ کرتا لیکن میں نے

اس سے زیادہ مرتبہ سنا ہے۔ میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ’’ذوالکفل بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جو کسی گناہ سے نہیں بچتا تھا جس کو وہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک عورت اس کے پیچھے آئی اس نے اسے ساٹھ دینار دیے اس شرط پر کہ وہ اس کے ساتھ وطی کرے گا جب وہ اس کے قریب بیٹھا تو وہ کانپنے لگی اور رونے لگی۔ ذوالکفل نے پوچھا: تو کیوں رو رہی ہے؟ کیا میں نے تجھے مجبور کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں لیکن، یہ ایسا گناہ ہے جو میں نے کبھی نہیں کیا ہے اور مجھے اس پر حاجت نے ابھارا ہے۔ ذوالکفل نے کہا: تو ایسا کرتی ہے اور میں نے ایسا نہیں کیا تو چلی جا اور پیسے بھی تیرے ہیں۔ ذوالکفل نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس کے بعد کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا وہ اسی رات فوت ہو گیا۔ صبح اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا: اللہ تعالیٰ نے ذوالکفل کو بخش دیا ہے‘‘۔ فرمایا: یہ حدیث حسن ہے(1)۔ بعض نے کہا: الیسع جب وہ بوڑھا ہو گیا تو کہا: اگر میں لوگوں پر کسی کو خلیفہ بناؤں حتی کہ میں دیکھوں کہ وہ کیسے عمل کرتا ہے آپ نے فرمایا: تین دن کی کون مجھے ضمانت دے گا دن کو روزہ رکھے، رات کو قیام کرے اور فیصلہ کرتے وقت غصہ میں نہ آئے۔ عیص کی اولاد میں سے ایک شخص نے کہا: میں۔ آپ نے اسے رد کر دیا۔ پھر دوسرے دن بھی اسی طرح فرمایا تو اسی شخص نے کہا: میں۔ آپ نے اسے خلیفہ بنایا۔ پس اس نے وعدہ وفا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی اور اس کا نام ذوالکفل رکھا کیونکہ اس نے ایک امر کی ضمانت دی تھی، یہ حضرت ابوموسیٰ، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ عمر بن عبدالرحمن بن حرث نے کہا: حضرت ابوموسیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ’’ذوالکفل نبی نہیں تھا لیکن وہ عبد صالح تھا اپنی موت کے وقت ایک نیک شخص کے عمل کی ضمانت لی تھی۔ وہ ہر روز اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے سو رکعت نماز پڑھتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی تعریف فرمائی‘‘(2)۔ کعب نے کہا: بنی اسرائیل میں ایک کافر بادشاہ تھا اس کے شہر سے ایک نیک شخص گزرا تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! اگر میں اس شہر سے نکلوں گا تو اس بادشاہ پر اسلام پیش کروں گا۔ اس نے اس بادشاہ پر اسلام پیش کیا اس بادشاہ نے پوچھا: میری کیا جزا ہو گی؟ اس نے کہا: جنت۔ اور اس کے لیے جنت کی صفت بیان کی۔ بادشاہ نے کہا: مجھے اس کی کون ضمانت دے گا؟ اس شخص نے کہا: میں۔ پس وہ بادشاہ اسلام لایا اور اپنی مملکت سے علیحدہ ہو گیا اور اپنے رب کی طاعت کی طرف متوجہ ہوا حتی کہ وہ فوت ہو گیا۔ وہ دفن کیا گیا صبح ہوئی تو لوگوں نے اس کا ہاتھ قبر سے باہر دیکھا اس کے ہاتھ میں سبز رقعہ تھا جس میں سفید نور کے ساتھ یہ لکھا ہوا تھا: ان اللہ قد غفرلی و ادخلنی الجنۃ و وفی عن کفالۃ فلان۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور مجھے جنت میں داخل کیا ہے اور فلاں کی کفالت کو پورا کیا ہے۔ لوگ اس شخص کی طرف دوڑ کر گئے تاکہ وہ ان پر ایمان کا عہد لے اور ان کے لیے کفیل بن جائے، جس طرح بادشاہ کے لیے کفیل بنا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا وہ تمام لوگ ایمان لے آئے اور اس کا نام ذوالکفل رکھا گیا۔ بعض نے کہا: وہ پاکدامن شخص تھا ہر انسان کا کفیل بن جاتا تھا جو کسی مصیبت یا تہمت یا مطالبہ میں گرفتار ہوتا تھا پس اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں گرفتار شخص کو نجات دیتا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: ذوالکفل نام اس لیے تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل وسعی کی کفالت دی تھی باوجود اس کے کہ اس کے زمانہ کے دوسرے انبیاء کی بنسبت اس کا عمل کمزور تھا۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ نبی نہیں تھا۔ حسن نے کہا:

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2420

2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 2، صفحہ 27

حضرت الیاس سے پہلے وہ نبی تھا۔ بعض نے کہا کہ یہ حضرت زکریا علیہ السلام تھے انہوں نے حضرت مریم کی کفالت کی تھی۔

**كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ** یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم، طاعت کے قیام اور گناہوں سے اجتناب پر صبر کرنے والے تھے۔ **وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا** ہم نے انہیں جنت میں داخل کیا۔

**وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُــْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾**

''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیا غضبناک ہو کر اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر گرفت نہیں کریں گے پھر اس نے پکارا (تہہ در تہہ) اندھیروں میں کہ کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاک ہے تو بیشک میں ہی قصور واروں سے ہوں۔ پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرمایا اور نجات بخش دی انہیں غم (واندوہ) سے اور یونہی ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ ذَا النُّوْنِ** اس سے پہلے اذکر فعل محذوف ہے یعنی ذوالنون کو یاد کرو۔ یہ یونس بن متی کا لقب ہے کیونکہ مچھلی نے آپ کو نگل لیا تھا۔ النون سے مراد مچھلی ہے۔ حضرت عثمان کی حدیث میں ہے کہ انہوں ایک ملیح بچہ دیکھا تو فرمایا: اس کی ٹھوڑی پر سیاہ نشان لگا دو تا کہ اسے نظر نہ لگے۔ ثعلب نے ابن اعرابی سے روایت کیا ہے۔ کہ النونۃ گڑھا ہوتا ہے جو چھوٹے بچے کی ٹھوڑی میں ہوتا ہے۔ **اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا** حسن، شعبی اور سعید بن جبیر نے کہا: اپنے رب کے لیے ناراض ہو کر گیا۔ اس مفہوم کو طبری اور قتبی نے اختیار کیا ہے۔ مہدوی نے اس کو مستحسن سمجھا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نحاس نے کہا: جو لوگ لغت کو نہیں جانتے انہوں نے اس کا انکار کیا ہے حالانکہ یہ صحیح قول ہے۔ معنی یہ ہے کہ اپنے رب کی خاطر ناراض ہوا جیسے تو کہتا ہے: غضبت لك یعنی تمہاری وجہ سے ناراض ہوا۔ مومن اللہ تعالیٰ کے لیے ناراض ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اسی وجہ سے فرمایا تھا: اشترطی لهم الولاء (ان کے لیے ولاء کی شرط منظور کرلو) قتبی نے اس قول کی تائید میں مبالغہ کیا ہے۔ حدیث میں حضرت یونس کے وصف میں ہے'' آپ کا سینہ تنگ تھا جب آپ نے نبوت کا بوجھ اٹھایا تو اس کے نیچے آپ کا سینہ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا جس طرح موسم ربیع میں پیدا ہونے والا اونٹ کا بچہ بھاری بوجھ کے نیچے ٹوٹ جاتا ہے''۔ پس حضرت یونس علیہ السلام بھاگے ہوئے غلام کی طرح چل پڑے (1)۔ یہ آپ کا غصہ کرنا صغیرہ تھا آپ اللہ تعالیٰ پر ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ناراض ہوئے تھے جب ان کی قوم سے عذاب اٹھایا گیا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اپنے رب سے بھاگا یعنی اپنے رب کے حکم سے بھاگا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم سے عذاب اٹھانے کے بعد ان کی طرف لوٹ

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

آنے کا حکم دیا، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کو ایک معلوم وقت میں عذاب کے نزول کی دھمکی دے چکے تھے پس اس وقت آپ ان سے نکل گئے۔ ان کی قوم پر عذاب آیا تو وہ گڑگڑانے لگے۔ پس ان سے عذاب اٹھالیا گیا اور حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی توبہ کا علم نہ تھا، اسی وجہ سے وہ غضبناک ہو کر نکلے تھے۔ اس کے حق میں تھا کہ وہ نہ جاتے مگر اجازت کے ساتھ۔ حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کی طرف جانے کا حکم دیا تو آپ نے مہلت کا سوال کیا تا کہ تیاری کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جلدی کرنے کو کہا حتی کہ انہوں نے جوتا لینے کو کہا تا کہ اسے پہن لیں لیکن مہلت نہ دی گئی۔ آپ کو کہا گیا: حکم اس سے جلدی کا ہے۔ آپ کے خلق میں تنگی تھی آپ اپنے رب پر ناراض ہو کر نکلے۔ یہ ایک قول ہے لیکن نحاس کا قول عمدہ ہے یعنی اپنے رب کی خاطر غضبناک ہو کر نکلے یعنی اپنی قوم پر ناراض ہوئے کیونکہ ان کی قوم نے کفر کیا تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ اپنی قوم سے ناراض ہوئے جب ان پر ان کا امر طویل ہو گیا اور ان کی سرکشی طویل ہو گئی تو آپ اپنے نفس پر ناراض ہو کر نکلے ان کی اذیت پر صبر نہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا تھا اور دعا کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان کا ذنب یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نکلے تھے۔ یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک سے مروی ہے حضرت یونس علیہ السلام جوان تھے اور انہوں نے نبوت کا بوجھ نہیں اٹھایا تھا اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا: وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (القلم: 48) (تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ) ضحاک سے مروی ہے (1) کہ وہ اپنی قوم پر غضبناک تھے انہوں نے کفر کیا تو ان پر ناراض ہونا واجب تھا ہر ایک پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس پر ناراض ہو جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ ایک جماعت نے کہا جن میں اخفش بھی ہے: وہ اس بادشاہ پر ناراض ہو کر نکلے تھے جو ان کی قوم پر مقرر تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شعیا نبی اور وہ بادشاہ جو اس وقت موجود تھا جس کا نام حزقیا تھا انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو نینوی کے بادشاہ کی طرف بھیجیں اس نے بنی اسرائیل سے جنگ کی تھی اور ان میں سے اکثر کو قیدی بنالیا تھا تا کہ نینوی کے بادشاہ سے حضرت یونس علیہ السلام بات کریں تا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیج دے۔ اس وقت انبیاء کی طرف وحی کی جاتی تھی اور سیاسی امور بادشاہ کے پاس ہوتے تھے جس کو وہ انبیاء منتخب کرتے تھے پس وہ بادشاہ اپنے نبی کی وحی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا نبی کو وحی فرمائی کہ حزقیا بادشاہ کو کہو کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوت والا امین خبر دینے والا چنے اور اسے اہل نینوی کی طرف بھیجیں اور وہ انہیں حکم دے کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں۔ میں ان کے بادشاہوں اور جابروں کے دل میں ان کو علیحدہ کرنے کا حکم ڈال دوں گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے شعیا کو کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے نکالنے کا حکم دیا ہے؟ شعیا نے کہا: نہیں۔ پوچھا: کیا اس نے تجھ سے تیرا نام لیا ہے؟ شعیا نے کہا: نہیں۔ فرمایا: وہ انبیاء امین اور قوت والے تھے۔ پس انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام پر نکلنے کے لیے اصرار کیا تو حضرت یونس علیہ السلام اس نبی اور بادشا پر اور اپنی قوم پر ناراض ہو کر نکلے۔ آپ بحر روم پر آئے پھر آپ کو مچھلی کے منہ میں چلے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ آپ کو مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی آزمائش میں ڈالا گیا کیونکہ آپ نے شعیا نبی کے حکم کو ترک کیا تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 96

مُلِيمٌ⊙ (الصافات) ملیم اسے کہتے ہیں جو ایسا فعل کرے جس پر ملامت کی جاتی ہو۔ آپ نے جو فعل کیا وہ یا صغیرہ تھا یا ترک اولیٰ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ جب نکلے تھے تو آپ اس وقت نبی نہ تھے لیکن آپ کو بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے نینویٰ کی طرف جانے کو کہا تا کہ آپ انہیں شعیا کی طرف بلائیں تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی امر سے جانے کو ناپسند کیا پس آپ بادشاہ پر ناراض ہو کر نکلے۔ جب آپ نے مچھلی کے پیٹ میں نجات پائی تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قوم کی طرف بھیجا آپ نے انہیں بلایا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ قشیری نے کہا: اظہر یہ ہے کہ یہ غضبناک ہونا اللہ تعالیٰ کے ارسال کے بعد تھا اور قوم پر عذاب کے اٹھائے جانے کے بعد آپ نے ان سے عذاب کے اٹھائے جانے کو پسند نہ کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ سب سے بہتر ہے جو اس کے متعلق کہا گیا ہے جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ الصافات میں اس کا بیان آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ کی قوم کے اخلاق میں سے تھا کہ جس کے متعلق انہیں جھوٹ بولنے کا پتہ چل جاتا اسے قتل کر دیتے تھے۔ پس آپ کو قتل ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو آپ ناراض ہوئے۔ آپ نکل پڑے حتیٰ کہ آپ ایک کشتی میں سوار ہوئے وہ کشتی ٹھہر گئی اور چلتی نہیں تھی کشتی والوں نے کہا: کیا تم میں سے کوئی بھاگنے والا ہے؟ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: وہ میں ہوں، پھر واقعہ ہوا جو ہوا۔ آپ کو گناہ صغیرہ سے پاک کرنے کے لیے مچھلی کے پیٹ میں مبتلا کیا گیا جیسا کہ اہل احد کے بارے میں فرمایا: حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ۔۔۔ ولیمحص اللہ الذین آمنوا۔ انبیاء کے گناہ بخشے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان پر تمحیص جاری ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں دوبارہ ایسا کرنے سے زجر ہوتی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ آپ اپنے رب پر اور اپنی قوم پر ناراض نہیں ہوئے تھے۔ یہ عربوں کے قول غضب سے مشتق ہے جب کوئی ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔ فاعل کبھی ایک فاعل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے قوم کو عذاب کا وعدہ دیا اور آپ ان سے نکل گئے تو انہوں نے توبہ کر لی اور ان سے عذاب اٹھا لیا گیا۔ جب آپ واپس آئے تو آپ کو معلوم ہوا کہ وہ تو ہلاک نہیں ہوئے آپ نے اس کو ناپسند کیا اور آپ بھاگ نکلے۔ یہ شعر اس مفہوم میں بطور دلیل پڑھا جاتا ہے۔

وأغضب أن تُهجى تميم بدارم

یہاں أغضب بمعنی آنف ناپسند کرنا ہے۔ اس قول میں نظر ہے کیونکہ اس قول والے کو کہا جاتا ہے کہ یہ مغاضبت اگرچہ انفت کی وجہ سے تھی۔ الانفۃ (نفرت، ناپسندیدگی) کو غضب بھی لاحق ہوتا ہے وہ غضب تو ہے اگرچہ جس پر ہو قلیل بھی ہو آپ تو کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب پر اور اپنی قوم پر ناراض نہیں ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ابلیس نے آپ کو پھسلایا اور آپ کے گمان میں اس کا امکان واقع ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں سزا دینے پر قادر نہ ہوگا۔ یہ قول مردود اور قابل توجہ نہیں ہے کیونکہ یہ کفر ہے۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے مہدوی نے ان سے حکایت کیا ہے اور ثعلبی نے حسن سے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ [illegible] سعید بن جبیر اور کثیر علماء نے کہا: اس کا معنی ہے کہ اس نے گمان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر تنگی نہیں کرے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہے: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الرعد: 26) یعنی اللہ تعالیٰ جس کے

لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ فرماتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ فرماتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول سعید اور حسن کے قول کے مشابہ ہے۔ قَدَرَ، قُدِرَ، قَتَرَ اور قُتِرَ ہم معنی ہیں یعنی تنگ کیا گیا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس کو ماوردی اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ القدر سے مشتق ہے جس کا معنی قضا اور فیصلہ ہے، یعنی آپ نے گمان کیا کہ ہم آپ پر عقوبت کا فیصلہ نہیں کریں گے؛ یہ قتادہ، مجاہد اور فراء کا قول ہے۔ یہ القدر سے ماخوذ ہے جس کا معنی فیصلہ ہے نہ کہ قدرت واستطاعت سے ماخوذ ہے۔ ابو العباس احمد بن یحییٰ ثعلب سے مروی ہے انہوں نے فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کے متعلق فرمایا: یہ تقدیر سے ہے نہ کہ القدرۃ سے۔ کہا جاتا ہے: قدر اللہ لك الخير يقدره قدراً اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے خیر کو مقدر کیا۔ ثعلب نے بطور استشہاد یہ اشعار پڑھے:

فلیست عشیّات اللِّوَی برواجع لنا أبداً ماأورق السَّلَم النَّضُرُ

ولا عائد ذالك الزمان الذی مضی تبارك ما تقدِر یقعُ ولك الشکرُ

ما تقدر بمعنی ما تقدرہ وتقضی ہے ان دو تاویلوں پر علماء کا نظریہ ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز اور زہری نے فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نُّقَدِّرَ عَلَيْهِ نون کے ضمہ اور دال کی شد کے ساتھ تقدیر سے پڑھا ہے۔ یہ قرأت ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ عبید بن عمیر، قتادہ اور اعرج نے اَنْ لَّنْ يُّقَدَّرَ عَلَيْهِ یاء کے ضمہ اور دال کی شد کے ساتھ فعل مجہول پڑھا ہے۔ یعقوب عبد اللہ بن ابی اسحاق، حسن، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یقدر علیه یاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ تخفیفاً مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ حسن سے بھی فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ، مروی ہے باقی قراء نے نقدر نون کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام کے نزدیک بمعنی تقدیر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں تاویلیں ایسی ہیں جن کو علماء نے اس شخص کے قول میں بھی استعمال کیا ہے جس نے کبھی کوئی خیر کا عمل نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا: جب وہ مرجائے تو اسے جلا دینا فواللہ لئن قدر اللہ علیّ (اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر سزا کا فیصلہ کیا) پہلی تاویل کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اگر مجھ پر تنگی فرمائی اور میرے محاسبہ میں مبالغہ کیا اور مجھے میرے گناہوں پر جزا دی تو ایسا ہوگا پھر اس نے افراط خوف کی وجہ سے گھر والوں کو جلانے کا حکم دیا۔ دوسری تاویل پر معنی یہ ہوگا اگر اللہ تعالیٰ تقدیر اور فیصلہ میں ہر مجرم کو اس کے جرم کی سزا دینے کا معاملہ طے کر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنے گناہوں اور جرموں کی ایسی سزا دے گا جو میرے سوا تمام جہانوں میں سے کسی کو بھی نہیں دے گا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے موطا وغیرہ میں نقل کیا ہے۔ وہ شخص مومن، موحد تھا۔ بعض احادیث میں ہے ''اس نے سوائے توحید کے کوئی خیر کا عمل نہیں کیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے کہا: من خشیتك یا رب!، اے میرے رب! تیری خشیت کی وجہ سے ایسا کیا تھا اور خشیت مومن مصدق میں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: 28) بعض علماء نے فرمایا: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کا معنی استفہام ہے اس کی تقدیر أفظنّ ہے۔ الف استفہام اختصاراً حذف کیا گیا ہے۔ یہ سلیمان ابو المعتمر کا قول ہے۔ قاضی منذر بن سعید نے حکایت کیا ہے

کہ بعض نے اُقْطِن الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ علماء کا الظُّلُمٰتِ کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ ایک جماعت نے کہا: جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ بھی ہیں کہ اس سے مراد رات کی تاریکی، سمندر کی تاریکی اور مچھلی کی تاریکی ہے۔ ابن ابی الدنیا نے کہا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے اسرائیل سے انہوں نے ابواسحاق سے انہوں نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا ہمیں حضرت عبداللہ بن مسعود نے بیت المال میں بتایا کہ جب حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ انہیں زمین کی تہہ کی طرف لے گئی تو حضرت یونس علیہ السلام نے کنکریوں کی تسبیح سنی۔ تو آپ نے ان تاریکیوں میں پکارا۔ وہ تین تاریکیاں تھیں مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، رات کی تاریکی اور سمندر کی تاریکی: اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۔ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ۝ (الصافات: 145)

جیسے اس چوزے کی ہیئت ہوتی ہے جس پر بال نہ ہوں۔ ایک جماعت نے کہا جن میں سالم بن ابی الجعد بھی ہیں کہ تاریکیوں سے مراد سمندر کی تاریکی۔ اس مچھلی کی تاریکی جس نے پہلی مچھلی کو نگلا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ پہلی مچھلی کے پیٹ کی تاریکی کو الظلمات سے تعبیر کیا گیا ہو جیسا کہ فرمایا: فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ (یوسف: 10) چونکہ ہر جہت میں تاریکی تھی تو اس کا جمع ذکر کرنا جائز ہے۔ ماوردی نے ذکر کیا ہے: یہ بھی احتمال ہے کہ خطا کی ظلمت، شدت کی ظلمت اور تنہائی کی ظلمت کو الظُّلُمٰتِ سے تعبیر کیا گیا ہو۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کی طرف وحی فرمائی یونس کے ایک بال کو بھی اذیت نہ دینا۔ میں نے تیرے پیٹ کو اس کی قید بنایا ہے میں نے اسے تیری خوراک نہیں بنایا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں سجدہ کیا جب سمندر کی گہرائی میں مچھلیوں کی تسبیح سنی۔ ابن ابی الدنیا نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عباس بن یزید عبدی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسحاق بن ادریس نے بتایا کہ انہوں نے کہا ہمیں جعفر بن سلیمان نے بتایا انہوں نے عوف سے انہوں نے سعید بن ابی حسن سے روایت کیا ہے فرمایا: جب مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا تو انہوں نے گمان کیا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں پس انہوں نے اپنی ٹانگوں کو لمبا کیا جبکہ وہ فوت نہیں ہوئے تھے۔ آپ اپنی عادت کے مطابق نماز کے لیے کھڑے ہوئے آپ نے اپنی دعا میں کہا: میں نے تیرے لیے ایسی جگہ کو مسجد بنایا جس کو کسی نے مسجد نہیں بنایا۔ ابوالمعالی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا تفضلونی علی یونس بن متی (1) اس کا معنی ہے میں جب سدرۃ المنتہیٰ میں تھا میں اللہ تعالیٰ کے قریب ان سے زیادہ نہ تھا جبکہ وہ مچھلی کے پیٹ میں سمندر کی گہرائی میں تھے۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جہت میں نہیں۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ اور سورۂ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ آپ نے قوم کے ساتھ رہنے کو ترک کیا تھا اور ان پر صبر نہیں کیا تھا وہ ظلم مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: بغیر اجازت

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2167

کے نکلنا مراد ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقوبت نہیں تھی کیونکہ انبیاء کرام کو عقاب نہیں کیا جاتا یہ تمحیص (پاک وصاف کرنا) تھا کبھی کبھی اسے ادب سکھایا جاتا ہے جو عقاب کا مستحق نہیں ہوتا جیسے بچے ہوتے ہیں؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے میں نے اپنی قوم پر عذاب کی دعا کر کے قصور کیا حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے بددعا کی تو ان کا مواخذہ نہ ہوا۔ واسطی نے کہا: اس کا معنی ہے اپنے رب کی ظلم سے پاکیزگی بیان کی اور استحقاق واعتراف کی بناء پر ظلم کی نسبت اپنی طرف کی، اسی کی مثل حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کا قول ہے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (الاعراف: 23) جب انہوں نے اپنے آپ کو اپنے منصب پر نہ رکھا تو وہ زمین میں اتارے گئے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ابوداؤد نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''حضرت یونس علیہ السلام کی مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا تھی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ جس مسلمان نے اس دعا کے ساتھ کسی مسئلہ میں دعا مانگی تو وہ قبول کی گئی'' (1)۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اس کو حضرت سعد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ خبر میں ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی شرط ہے اس شخص کے لیے جو اس سے دعا مانگے تو وہ اس کی دعا قبول فرمائے گا جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی تھی اور اسے نجات دے گا جس طرح انہیں نجات دی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ آپ نے ظلم کا اعتراف کیا پس یہ اشارہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ نُـۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ یعنی جو عمل ان سے ہوا اس کی وجہ سے جس پریشانی میں ہوتے ہیں اس سے انہیں ہم خلاصی دیتے ہیں وہ یہ ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ (الصافات) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے حضرت یونس علیہ السلام کی حفاظت ہے۔ اس کے حق تعبد کی رعایت کی اور جو انہوں نے طاعت میں سے پہلے کیا تھا اس کے حق کی حفاظت فرمائی۔ استاذ ابو اسحاق نے فرمایا: حضرت یونس علیہ السلام تھوڑے دن مچھلی کے ساتھ رہے تو قیامت تک انہیں ذوالنون کہا جائے گا تو تیرا اس بندے کے متعلق کیا گمان ہے جس نے ستر سال عبادت کی، اس کے نزدیک یہ رائیگاں جائے گی یہ تو گمان ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مِنَ الْغَمِّ یعنی مچھلی کے پیٹ سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ نُـۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ اکثر کی قرأت دو نونوں کے ساتھ ہے۔ یہ أنجى ینجى سے مشتق ہے۔ ابن عامر نے نجى ایک نون اور جیم مشدد اور یاء کے سکون کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور مصدر کا اضمار کیا ہے یعنی کذلک نجى النجاء المومنین۔ جیسے تو کہتا ہے: ضرب زیداً بمعنی ضرب الضرب زیداً اور بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

ولو ولدت قُفَيْرَةُ جرو كلب لسُبّ بذلك الجروِ الكلابا

تو شاعر نے لسب السب بذالك الجرو کا ارادہ کیا ہے یا کوان کی لغت کے مطابق ساکن کیا گیا ہے جو یا کو حرکت دیئے بغیر کہتے ہیں بقی و رضی۔

حسن نے: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (البقرہ: 278) پڑھا کیونکہ یاء قبل مکسور کو حرکت دینے سے ثقل پیدا ہوتا ہے اور

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید، حدیث 3427

یہ اشعار پڑھے ہیں:

خَمَّرَ الشَّیبُ لِمَّتِی تَخْمِیرا وَحَدَا بِی إلی القُبورِ البعیرا

لیتَ شِعری إذا القیامةُ قامتْ ودُعِی بالحسابِ أینَ المصیرا

یاء کو دعی میں ساکن کیا گیا کیونکہ اس کو حرکت دینے اور اس کے ماقبل کسرہ سے ثقل پیدا ہوتا ہے۔ حدا کا فاعل المشیب ہے یعنی وحد المشیب البعیر لیت شعری المصیر أین ھو؛ یہ تاویل فراء، ابوعبید اور ثعلب نے کی ہے۔ اس قرأت کو درست کرنے کے لیے ابوحاتم اور زجاج نے غلطی کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ غلطی ہے کیونکہ نائب الفاعل کو نصب دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے: نُجّی المؤمنون جیسے کہا جاتا ہے: کُرِّم الصالحون اور ضُرِبَ زیدٌ بمعنی ضُرِبَ الضربُ زیدٌ کہنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ضُرِبَ الضرب پر دلالت کرتا ہے اور اس قسم کے اشعار سے کتاب اللہ پر حجت قائم کرنا جائز نہیں۔ ابوعبید کا ایک اور قول بھی ہے۔ قتیبی نے کہا ہے: وہ یہ ہے کہ نون کو جیم میں مدغم کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول نحویوں میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ نون کا مخرج جیم کے مخرج سے دور ہے اس لیے ادغام نہیں ہوگا۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ (الانعام: 160) میں مجاء بالحسنة جائز نہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے جو بات علی بن سلیمان سے سنی ہے اس سے بہتر کوئی بات نہیں سنی۔ انہوں نے کہا: اصل میں ننجی تھا ایک نون کو حذف کیا گیا کیونکہ دونون جمع ہوئے ہیں جیسا کہ ایک تاء کو حذف کیا جاتا ہے جب دونوں جمع ہو جاتی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا (الشوریٰ: 14) اصل میں لا تتفرقوا تھا محمد بن السمیقع اور ابوالعالیہ نے وَ كَذٰلِكَ نُجِي الْمُؤْمِنِيْنَ پڑھا ہے یعنی نجی اللہ المومنین۔ یہ عمدہ ہے۔

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۞ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۞

''اور یاد کرو زکریا کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو کہ اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔ تو ہم نے اس کی دعا کو قبول فرمالیا اور اسے یحییٰ (جیسا فرزند) عطا فرمایا اور ہم نے تندرست کر دیا ان کی خاطر ان کی اہلیہ کو، بیشک وہ بہت تیز رو تھے نیکیاں کرنے میں اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے اور ہمارے سامنے بڑا عجز و نیاز کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ یعنی زکریا کو یاد کرو۔ ان کا ذکر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا یعنی اکیلا اور بغیر بیٹے کے نہ چھوڑ۔ وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۞ یعنی تو ہر مرنے والے کے بعد جو باقی رہنے والے ہیں ان سے بہتر ہے۔ فرمایا: وَ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۞ کیونکہ پہلے یہ شی گزر چکا ہے، یعنی میں جانتا ہوں تو اپنے دین کو ضائع نہیں کرے گا، لیکن یہ امر دین کی حفاظت کی فضیلت میری نسل سے منقطع نہ کر، جیسا کہ پہلے سورۂ مریم میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ یعنی ہم نے اس کی دعا قبول کی۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى ان کا ذکر تفصیلاً گزر چکا ہے۔ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ قتادہ، سعید بن جبیر اور اکثر مفسرین نے کہا: ان کی بیوی بانجھ تھی تو اسے بچے جنم دینے والی بنا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: وہ تند خو تھی اور زبان دراز تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح فرمائی اور اسے اچھے اخلاق والا بنا دیا۔

میں کہتا ہوں: دونوں مفہوم جمع بھی ہو سکتے ہیں اسے حسن اخلاق بھی دے دیا ہو اور بچے جننے والی بھی بنا دیا ہو۔ انھم، ھم ضمیر سے مراد وہ انبیاء کرام ہیں جن کا اس سورت میں نام لیا گیا ہے۔ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع حضرت زکریا، ان کی زوجہ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وہ ہماری بارگاہ میں پناہ لیتے ہیں اور سختی اور خوشحالی میں ہمیں پکارتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ عبادت کے وقت ہمیں پکارتے ہیں جبکہ وہ امید اور خوف کی حالت میں ہوتے ہیں کیونکہ رغبت اور رہبت ایک دوسرے کو متلازم ہیں۔ بعض نے فرمایا: الرغب کا مطلب ہے آسمان کی طرف ہتھیلیوں کے باطن کو بلند کرنا اور الرھب کا مطلب ہے ان کی پیٹھوں کو آسمان کی طرف بلند کرنا؛ یہ خصیف کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی تلخیص یہ ہے کہ ہر دعا مانگنے والا انسان اپنے ہاتھوں سے مدد طلب کرتا ہے۔ پس رغبت اس حیثیت سے کہ وہ طلب ہے۔ تو ہتھیلی کے باطن کو مطلوب منہ کی طرف متوجہ کرنا بہتر ہے کیونکہ وہ عطا کرنے کی جگہ ہے یا اس کے ذریعے انسان مالک ہوتا ہے۔ اور الرھب اس حیثیت سے کہ تکلیف کو دور کرنا ہے تو اس کے ساتھ اس کو پھینکنا اچھا ہوتا ہے اور جانے کی طرف اشارہ کرنا ہے اور ہاتھ جھاڑ کر اسے بچانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ترمذی نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے تو انہیں نیچے نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے تھے (1)۔ ہاتھوں کو بلند کرنے کے متعلق اختلاف سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ یہ حدیث اور دوسری احادیث وہاں ہم نے ذکر کی ہیں ہاتھوں کو بلند کرنے کے قول پر پھر اس کی صفت اور کہاں تک اٹھانے ہیں اس میں اختلاف ہے۔ بعض پسند کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینے کے برابر اٹھاتے ہوئے پھیلائیں اور ان کا باطن اس کے چہرے کی طرف ہو۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ہتھیلیوں کے باطن کے ساتھ دعا مانگتے تھے اور حضرت انس سے اس کی مثل مروی ہے۔ یہ جامع ترمذی کی حدیث کا ظاہر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن کے ساتھ اس سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پیٹھوں کے ساتھ سوال نہ کرو اور انہیں اپنے چہروں پر پھیرو''۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن زبیر سے چہرے تک بلند کرنا مروی ہے انہوں نے حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفہ

---

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی رفع الایدی عند الدعاء، حدیث 3308

میں ٹھہرے تو آپ نے دعا مانگنی شروع کی آپ نے اپنی ہتھیلیوں کی پشت کو اس سمت کیا جو چہرے کی طرف تھی اور انہیں اپنے سینہ سے بلند کیا اور کندھوں سے نیچے کیا(1)۔ بعض نے فرمایا: حتیٰ کہ چہرے کے برابر کیا اور ان کی پشتیں چہرہ کی سمت تھیں۔ ابوجعفر طبری نے کہا: یہ کہنا صحیح ہے کہ تمام آثار جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں متفق اور متحد ہیں اور یہ تمام صورتیں نبی کریم ﷺ سے مروی ہوں دعا کے احوال اختلاف کی وجہ سے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک انگلی کے ساتھ اشارہ کرے تو وہ اخلاص ہے اور جب اپنے ہاتھوں کو سینہ کے برابر کرے تو وہ دعا ہے۔ جب انہیں اتنا بلند کرے کہ سر سے اوپر لے جائے اور ان کا ظاہر چہرے کی طرف ہو تو یہ ابتہال (گڑگڑانا) ہے۔ طبری نے کہا: قتادہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو اپنی ہتھیلیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ دعا مانگتے ہوئے دیکھا(2)۔

**رَغَبًا وَّ رَهَبًا** مصدر کی بنا پر منصوب ہیں یعنی یرغبون رغباً ویرھبون رھباً یا مفعول لاجلہ کی بنا پر منصوب ہیں یعنی للرغب والرھب یا حال کی بنا پر منصوب ہیں۔ طلحہ بن مصرف نے یدعونا ایک نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمش نے راء کے ضمہ اور غین کے سکون اور ھا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جیسے: السقم اور البخل اور العدم اور الضر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابن وثاب اور اعمش نے رغباً و رھباً را پر فتحہ اور غین اور ھا میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے نَهْرٌ اور نَهَرٌ، صَخْرٌ اور صَخَرٌ یہ قرأت ابوعمرو سے مروی ہے۔ **وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ** تواضع کرنے والے اور عاجزی کرنے والے۔

## وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

''اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح سے اور ہم نے بنا دیا اسے اور اس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کی) نشانی سارے جہان والوں کے لیے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا** یعنی مریم کو یاد کرو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو۔ حضرت مریم کا ذکر کیا حالانکہ وہ انبیاء میں سے نہیں تھی اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر مکمل ہوا اسی وجہ سے فرمایا: **وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** ﴿۹۱﴾ آیتیں نہیں فرمایا کیونکہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان دونوں کے امر، واقعہ اور شان کو تمام جہانوں کے لیے نشانی بنایا۔ زجاج نے کہا: دونوں میں نشانی ایک تھی کیونکہ حضرت مریم نے انہیں بغیر باپ کے جنم دیا تھا۔ سیبویہ کے مذہب پر تقدیر یہ ہے: وجعلناھا آیۃ للعالمین وجعلنا ابنھا آیۃ للعالمین پھر حذف کیا گیا۔ اور فراء کے مذہب پر تقدیر یہ ہوگی: وجعلناھا آیۃ للعالمین وابنھا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ** (التوبہ: 62) بعض علماء نے فرمایا: ان کی آیات میں سے یہ تھا کہ حضرت مریم پہلی عورت تھیں جو عبادت خانہ میں نذر کے طور پر قبول کی گئی تھیں۔ یہ بھی نشانی سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو اپنی جناب سے رزق دیا تھا اور بندوں میں سے کسی بندے کے ہاتھ پر ان کا رزق جاری نہیں فرمایا تھا۔ بعض نے فرمایا: حضرت مریم نے پستان نہیں چوسا تھا۔ احصنت برائی سے محفوظ رہیں۔ بعض نے فرمایا فرج سے مراد قمیص کی فرج ہے یعنی ان کے کپڑے کے ساتھ کبھی کوئی مشکوک چیز معلق نہ ہوئی آپ پاکیزہ لباس تھیں۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11093، 11806　　2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

قمیص کی فروج چار ہوتی ہیں۔ دو آستینیں۔ اعلیٰ اور اسفل۔ سہیلی نے کہا: تیرا خیال کسی دوسری چیز کی طرف نہ جائے کیونکہ یہ لطیف کنایہ ہے کیونکہ قرآن معنی کے اعتبار سے پاکیزہ ہے اور لفظ کے اعتبار سے موزوں ہے اس میں لطیف اشارہ اور خوبصورت عبارت ہے جو جائے کہ کسی جاہل کا وہم اس کی طرف جائے، خصوصاً روح قدس کا پھونکنا، قدوس کے حکم سے تھا۔ قدس کی نسبت قدوس کی طرف کی اور جھوٹے گمان سے مقدسہ ومطہرہ کو پاک فرمایا۔

فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا یعنی ہم نے جبریل کو حکم دیا اور انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری پھر اس پھونک سے ہم نے مریم کے بیٹے مسیح کو پیدا کیا۔ سورۂ مریم اور سورۃ النساء میں یہ گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ آیۃ اس سے مراد علامت اور مخلوق کے لیے عجیب بات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا علم اور جس میں ہم چاہتے ہیں اپنی قدرت کے نفوذ پر دلالت ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝

"(اے ان انبیاء کو ماننے والو!) یہی (توحید) تمہارا دین ہے جو ایک دین ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس میری بندگی کیا کرو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً جب انبیاء کرام کا ذکر فرمایا تو فرمایا: یہ تمام توحید پر جمع تھے۔ یہاں امۃ سے مراد دین ہے اور وہ اسلام ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہما کا قول ہے۔ رہے مشرک تو انہوں نے تمام انبیاء کی مخالفت کی۔ وَأَنَا رَبُّكُمْ یعنی صرف میں ہی تمہارا پروردگار ہوں۔ فَاعْبُدُونِ صرف میری عبادت کرو۔ عیسیٰ بن عمر اور ابن ابی اسحاق نے إن هذه أمتكم واحدة پڑھا ہے۔ اور یہ حسن نے ابوعمرو سے روایت کیا ہے۔ باقی قراء نے امۃ واحدۃ پڑھا ہے۔ اس پر نصب قطع کی بنا پر ہے کہ کلام مکمل کرنے کے بعد نکرہ آیا ہے۔ فراء کا قول ہے نحاس نے کہا: امۃ پر نصب حال کی بنا پر ہے یعنی حق پر جمع ہونے کی حالت پر یعنی یہ امت ایک امت رہی اور تم توحید پر جمع رہے اور جب تم جدا جدا ہو گئے اور اختلاف کیا تو جو حق کی مخالفت کرنے والا تھا وہ دین حق کے اہل میں سے نہ رہا جیسے تو کہتا ہے: فلان صدیق عفیفاً یعنی جب تک وہ پاک تھا میرا دوست تھا جب عفت میں مخالف ہوا تو میرا دوست نہ تھا۔ رہا رفع تو یہ امتکم سے بدل ہونے کی بنا پر یا مبتدا کے اضمار کی بنا پر ہو گا یعنی إن هذه أمتكم هذه أمة واحدة یا یہ دوسری خبر ہو گی اور اگر تو هذه سے بدل کی بنا پر امتکم کو نصب دے تو بھی جائز ہے اور امۃ واحدۃ ان کی خبر ہو گی۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ۝ فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ۝

"مگر لوگوں نے پارہ پارہ کر ڈالا اپنے دین کو آپس میں (آخر کار) سب ہماری طرف ہی لوٹنے والے ہیں۔ پس جو شخص کرتا رہا کوئی نیک کام بشرطیکہ وہ مومن ہو تو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا اس کی کوشش کو اور ہم اس کے

لیے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ یعنی دین میں تقسیم ہو گئے؛ یہ مفہوم کلبی نے بیان کیا ہے۔ اخفش نے کہا: دین میں انہوں نے اختلاف کیا مراد مشرک ہیں۔ انہوں نے چونکہ حق کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو خدا بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔ ازہری نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ اپنے معاملہ میں پارہ پارہ ہو گئے۔ امرھم پر نصب فی کے حذف کے ساتھ ہے۔ اس مفہوم پر تقطع فعل لازم ہوگا اور پہلے مفہوم پر متعدی ہوگا۔ اور مراد تمام مخلوق ہے یعنی انہوں نے اپنے اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا اور اسے آپس میں تقسیم کرلیا کوئی موحد تھا کوئی یہودی تھا کوئی نصرانی تھا۔ کچھ نے بادشاہ کی عبادت کی، بعض نے بتوں کی عبادت۔ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ یعنی سب نے ہمارے حکم کی طرف لوٹ کر آنا ہے پس ہم انہیں جزا دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ، من، بعضیہ ہے جنس کے لیے نہیں ہے کیونکہ کسی مکلف کو یہ طاقت نہیں کہ وہ تمام طاعات فرض، نفل کو ادا کرے۔ معنی یہ ہے جو بھی کوئی طاعت کرے گا خواہ وہ فرض ہو یا نفل جبکہ وہ موحد مسلم ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جبکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والا ہو۔ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ اس کے عمل کا انکار نہیں یعنی اس کی جزا کو ضائع نہیں کیا جائے گا اور اس کی جزا کو چھپایا نہیں جائے گا۔ کفر کی ضد ایمان ہے اور کفر کا معنی نعمت کی ناشکری کرنا بھی ہے یہ شکر کی ضد ہوگا۔ وقد کفرہ کفوراً و کفراناً۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں: فلا کفر لسعیہ ہے وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ اس کے عمل کو ہم لکھنے والے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (آل عمران: 195) یعنی سب محفوظ ہوگا تاکہ اس کی جزا دی جائے۔

وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۹۷﴾

''اور ناممکن ہے اس بستی کے لیے جس کو ہم نے برباد کر دیا کہ اس کے باشندے لوٹ کر آئیں۔ یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے (تب معلوم ہوگا کہ) قریب آگیا ہے سچا وعدہ تو اس وقت تاڑنے لگ جائیں گی نظریں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا (کہیں گے) صد حیف! ہم تو غافل رہے اس امر سے بلکہ ہم تو ظالم تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حضرت زید بن ثابت اور اہل مدینہ کی قرأت وَحَرَامٌ ہے، یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا اختیار ہے۔ اہل کوفہ کی قرأت وحِرْمٌ ہے یہ حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے حِلٌّ وحَلَالٌ اور حضرت ابن عباس اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے وحَرِمَ حا اور میم کے فتحہ اور را کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور ابو العالیہ سے وحَرُمَ را کے ضمہ

اور حا اور میم کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَحَرَمَ، وحَرِمَ وحُرِمَ بھی مروی ہے۔ عکرمہ سے بھی وحَرِمٌ مروی ہے۔ قتادہ اور مطر وراق سے وَحَرْمٌ مروی ہے یہ نو قرائتیں ہیں۔ سلمی نے علی قریة أھلکتھا پڑھا ہے۔ لَا يَرْجِعُوْنَ میں جو (لا) ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ صلہ (زائدہ) ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ یہی ابو عبید کا اختیار ہے یعنی اس بستی پر ہلاکت کے بعد لوٹنا ناممکن ہے جس کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ بعض نے فرمایا: یہ صلہ نہیں ہے یہ ثابتة ہے۔ اس صورت میں حرام بمعنی واجب ہوگا یعنی اس دیہات پر واجب ہے جیسے خنساء نے کہا تھا:

وَاِنَّ حَرَامًا لَا أَرَى الدَّهْرَ بَاكِيًا　　عَلَى شَجْوِهِ اِلَّابَكَيْتُ علی صَخْرٖ

وہ اپنے بھائی کے بارے میں یہ کہہ رہی ہے اس قول پر لا ثابتہ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ آیت مشکل ہے اور سب سے بہتر جو کہا گیا ہے وہ وہ ہے جو ابن عیینہ، ابن علیہ، ھشیم، ابن ادریس، محمد بن فضیل، سلیمان بن حیان اور معلی نے داود بن ابی ہند سے اور انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے۔ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ فرمایا واجب ہے کہ وہ نہیں لوٹیں گے فرمایا: وہ توبہ نہیں کریں گے۔ ابو جعفر نے کہا: اس کا اشتقاق لغت میں بڑا واضح ہے اس کی شرح یہ ہے کہ حرام الشیٔ کا معنی ہے اس چیز سے منع کیا گیا ہے اور روکا گیا ہے جیسا کہ أحل کا معنی ہے مباح کیا گیا اور اس سے روکا نہیں گیا جب حراما اور حرام بمعنی واجب ہوگا تو اس کا معنی ہوگا اس سے نکلنا تنگ کیا گیا ہے اور منع کیا گیا ہے یہ ممنوع کے باب سے ہوگا۔ رہا ابو عبید کا قول کہ لا زائدہ ہے اس کو ایک جماعت نے رد کیا ہے کیونکہ ایسے مقامات پر لا زائدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی صورت میں جہاں اشکال ہو اگر یہ زائدہ ہوتا تو یہ تاویل بعید بھی ہوتی کیونکہ اگر یہ مراد ہے وحَرَامٌ علی قریة أھلکناھا أن یرجعوا إلی الدین تو یہ ایسی چیز ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں اگر توبہ کا ارادہ کیا ہے تو توبہ تو حرام نہیں کی گئی۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں اضمار ہے یعنی حرام علی قریة حکمنا باستئصالھا او بالختم علی قلوبھا أن یتقبل منھم عمل لأنھم لا یرجعون أی لا یتوبون یعنی اس بستی پر حرام ہے جس کے تباہ کرنے کا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے یا ان کے دلوں پر مہر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے ان سے کوئی عمل قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ توبہ نہیں کریں گے۔ زجاج اور بوعلی کا قول ہے اور لا غیر زائدہ ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا معنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ اس میں قول گزر چکا ہے۔ کلام میں حذف ہے یعنی جب یاجوج و ماجوج کا بند کھل جائے گا جیسے: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں مضاف محذوف ہے۔ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ ہر بلندی سے اتریں گے یعنی کثرت کی وجہ سے ہر طرف سے بھاگتے ہوئے اتریں گے۔ الحدب زمین کی بلند جگہ کو کہتے ہیں اس کی جمع الحداب ہے یہ حدبة الظھر (کبڑی پیٹھ) سے ماخوذ ہے۔ عنترہ نے کہا:

فلما رعشت یدای ولا أزدھانی　　تواترھم إلیّ من الحداب

بعض نے فرمایا: ینسلون کا معنی ہے وہ نکلیں گے؛ اسی سے شاعر کا قول ہے:

فَسُلِّي ثِيَابِي من ثِيَابِكَ تَنْسُلِ

بعض نے کہا: اس کا معنی ہے تیز چلتے ہیں؛ اسی سے نابغہ کا قول ہے:

عَسَلَانَ الذئبِ أَمْسَى قَارِبًا　　بَرَدَ اللَّيلُ عليهِ فَنَسَلُ

کہا جاتا ہے: عَسَلَ الذئبُ يَعْسِلُ عَسَلاً وعَسَلاناً بھیڑیے کا تیز چلنا۔ حدیث میں ہے: كذب عليك العسل (1) یعنی تجھ پر تیز چلنا ہے۔ زجاج نے کہا: النَّسَلان کا معنی ہے بھیڑ کا تیز چلنا۔ کہا جاتا ہے: نسل فلان في العدو وينسِلُ (کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) نَسْلاً ونُسولا ونَسَلاناً اس کا معنی ہے تیز چلنا۔ پھر کہا گیا ہے کہ جو ہر بلندی سے اتریں گے وہ یاجوج وماجوج ہیں یہی اظہر قول ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض نے کہا تمام لوگ مراد ہیں۔ وہ موقف کی زمین کی طرف چلیں گے اور ہر اونچی جگہ سے جلدی جلدی آ رہے ہوں گے۔ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ، شواذ قراتوں میں پڑھا گیا ہے۔ یہ اس قول سے لیا گیا ہے۔ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ (یٰسین) اسی قرأت کو مہدوی نے ابن مسعود سے اور ثعلبی نے مجاہد اور ابوالصہباء سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ، الْوَعْدُ الْحَقُّ سے مراد قیامت ہے۔ فراء، کسائی وغیرہ نے کہا ہے کہ واؤ زائدہ مقحمہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب یاجوج وماجوج کا بند کھل جائے گا قیامت قریب آجائے گی۔ اقْتَرَبَ، اذا کا جواب ہے۔ فراء نے یہ شعر اس پر کہا ہے:

فَلَمَّا أَجَزْنَا سَاحَةَ الحَيِّ وانْتَحَى

یعنی اس میں بھی واؤ زائدہ ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ (الصافات) نَادَيْنٰهُ سے پہلے واؤ زائدہ ہے۔ کسائی نے اذا کا جواب فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ ہونا بھی جائز قرار دیا ہے اس صورت میں اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ اس فعل پر معطوف ہوگا جو شرط ہے۔ بصریوں نے کہا: جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: قالوا یاویلنا؛ یہ زجاج کا قول ہے اور یہ عمدہ قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: 3) اس کا معنی ہے قالوا ما نعبدھم قول کا حذف کثیر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ، ھی ضمیر ابصار کے لیے ہے اور ابصار بعد میں اس کی تفسیر کے طور پر مذکور ہے گویا یوں فرمایا: فاذا ابصار الذین کفروا شخصت عند مجیئ الوعد؛ شاعر نے کہا:

لَعَمْرُ أبيها لاتقول ظَعِينَتِي　　أَلَا فَرَّعَنِّي مالكُ بن أَبِي كعب

شاعر نے پہلے ھا ضمیر ذکر کی ہے پھر ظعینتی کو ظاہر ذکر کیا۔ فراء نے کہا: ھی عماد ہے جیسے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ (الحج: 46) ہے۔ بعض نے فرمایا: ھی پر کلام مکمل ہوگی۔ تقدیر اس طرح ہے فاذا ھی یعنی قیامت ظاہر واقعہ ہوگی یعنی ان کے قریب سے گویا وہ آنے والی ہے حاضر ہے پھر نئی کلام کا آغاز کیا۔ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہ مبتدا پر خبر کو مقدم کیا گیا ہے یعنی کفار کی آنکھیں قیامت کے دن پھٹی پھٹی ہوں گی۔ قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے آنکھیں نہیں جھپکیں گی وہ کہیں گے:

1۔ غریب الحدیث خطابی، جلد 2، صفحہ 370

ہائے افسوس! ہم اپنی معصیت کی وجہ سے ظالم تھے ہم نے عبادت کو اپنے مقام پر نہ رکھا۔

اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝

''(اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سب جہنم کا ایندھن ہوں گے اور اس میں داخل ہونے والے ہو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک ایسی آیت ہے کہ لوگ اس کے متعلق مجھ سے نہیں پوچھتے، معلوم نہیں وہ اس کا عرفان رکھتے ہیں اس لیے اس کے متعلق نہیں پوچھتے یا اس سے غافل ہیں اس لیے نہیں پوچھتے؟ پوچھا گیا: وہ کونسی آیت ہے؟ آپ نے فرمایا: اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ۔۔۔ الخ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش پر بڑی شاق گزری کہنے لگے: اس نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے۔ لوگ ابن الزبعری کے پاس آئے اور اس کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگا: اگر میں وہاں ہوتا تو میں اس کو جواب دیتا۔ لوگوں نے کہا: تو اسے کیا کہتا؟ کہنے لگا: میں اسے کہتا حضرت مسیح علیہ السلام کی نصاریٰ عبادت کرتے ہیں، یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں کیا وہ دونوں بھی جہنم کا ایندھن ہوں گے؟ قریش اس کی بات سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے خیال کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزاع کیا گیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) اور لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا (الزخرف: 57) ابن العزیر کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ آیت آگے آرہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ اصل قول میں عموم کی اصل ہے اور عموم کے لیے مخصوص صیغے ہیں جبکہ بعض اس کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: عموم پر دلالت کرنے کے لیے کوئی صیغہ وضع نہیں کیا گیا۔ یہ قول باطل ہے کیونکہ یہ آیت اور دوسری آیات اس کی دلیل ہیں۔ عبداللہ بن الزبعری نے ما سے زمانہ جاہلیت کے تمام معبود سمجھے اور قریش جو فصحاء عرب اور بلغاء لسان تھے انہوں نے بھی اس کی موافقت کی اگر یہ ما عموم کے لیے نہ ہوتا تو اس سے استثناء کرنا صحیح نہ ہوتا حالانکہ یہ پایا گیا ہے۔ پس یہ عموم کے لیے ہے اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ عام قرأت حصب یعنی صاد کے ساتھ ہے مفہوم یہ ہے کہ اے کفار کے گروہ! تم اور جن بتوں کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ جہنم کا ایندھن ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ نے کہا: خطبھا حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حطب جھنم یعنی طاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضب ضاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: اس سے مراد الحصب ہے۔ فرمایا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ الحضب اہل یمن کی لغت میں الحطب کے معنی میں ہے۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ آگ بھڑکائی جائے اور جس کے ساتھ تو آگ جلائے وہ

حضب کہلاتی ہے؛ یہ جوہری نے ذکر کیا ہے۔ الموقد کا معنی محضب (چولھا) ابوعبیدہ نے حصب جھنم کے بارے میں فرمایا: ہر وہ چیز جو آگ میں ڈالے اس کے لیے حصبتھا بہ بولا جاتا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کافر لوگ اور وہ بت جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس آیت کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (البقرہ: 24) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الحجارۃ سے مراد کبریت کا پتھر ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ آگ، بتوں پر عذاب اور عقاب نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے تو کوئی جرم نہیں کیا بلکہ یہ ان کے عبادت گزاروں کے لیے عذاب ہوگی۔ یہ پہلا مقام حسرت ہوگا پھر انہیں آگ پر جمع کیا جائے گا اور ان کی آگ ہر آگ سے سخت ہوگی۔ پھر اس آگ کے ساتھ مشرکوں کو عذاب دیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان پتھروں (بتوں) کو جلایا جائے گا اور پھر مشرکوں کے عذاب میں زیادتی کے لیے انہیں ان بتوں کے ساتھ ملایا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں آگ میں ڈالا جائے گا تا کہ ان کی عبادت پر سرزنش ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔ یہ خطاب مشرکوں کو ہے جو بتوں کے پجاری ہیں یعنی تم اپنے بتوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو گے۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ خطاب بتوں کے لیے اور ان کے عبادت گزاروں کے لیے ہو کیونکہ اگرچہ جمادات تھے لیکن کبھی آدمیوں کی ضمیروں کے ساتھ ان کے متعلق خبر دی جاتی ہے۔ علماء نے فرمایا: حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور ملائکہ علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ ما غیر آدمیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اگر آدمیوں کا ارادہ ہوتا تو من کہا جاتا۔ زجاج نے کہا چونکہ اس آیت کا مخاطب مشرکین مکہ ہیں دوسرے نہیں۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ هُمْ فِیْهَا لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"(سوچو!) اگر یہ خدا ہوتے تو نہ داخل ہوتے جہنم میں اور جھوٹے خدا اور ان کے پجاری سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ جہنم میں (شدت عذاب سے) چیخیں گے اور اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا یعنی اگر یہ بت خدا ہوتے تو ان کے عبادت گزار آگ میں نہ جاتے۔ بعض علماء نے کہا: عبادت گزار اور معبود جہنم میں داخل نہ ہوتے اسی لیے فرمایا: كُلٌّ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ کفار و شیاطین میں سے جو آگ میں داخل ہوں گے ان کے لیے چیخ و پکار ہوگی۔ رہے بت تو ان میں اختلاف ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کرے گا اور انہیں عذاب دے گا تا کہ ان کے لیے چیخ و پکار ہو یا انہیں زندہ نہیں کرے گا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں۔ الزفیر مغموم نفس کی وہ آواز جو دل سے نکلتی ہے۔ یہ سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ وَّ هُمْ فِیْهَا لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے اس کا معنی ہے اس میں وہ کچھ نہیں سنیں گے کیونکہ وہ بہرے ہوں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا (الاسراء: 97)

اشیاء کے سننے میں راحت وانس ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کفار کو آگ میں اس سے محروم کرے گا۔ بعض نے فرمایا: اس کا

مطلب ہے وہ ایسی بات نہیں سنیں گے جو انہیں خوش کرے گی بلکہ وہ ان فرشتوں کی آواز سنیں گے جو انہیں عذاب دینے پر مسلط ہوں گے۔ بعض نے فرمایا: جب انہیں کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ (المومنون) تو وہ بہرے اور گنگے ہو جائیں گے جیسا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جب وہ لوگ جنہوں نے ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے وہ باقی رہ جائیں گے تو وہ آگ کے تابوتوں میں ڈالے جائیں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے تابوتوں میں رکھا جائے گا جس میں آگ کے کیل لگے ہوں گے اور وہ کچھ نہیں سن سکیں گے اور ان میں سے کوئی نہیں دیکھ سکے گا کہ آگ میں ان کے علاوہ بھی کسی کو عذاب دیا جا رہا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

''بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے۔ نہ غم ناک کرے گی انہیں وہ بڑی گھبراہٹ اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے (انہیں بتائیں گے) یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى الحسنیٰ سے مراد جنت ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا، ھا ضمیر سے مراد آگ ہے۔ مُبْعَدُوْنَ ۝ کلام کا معنی استثناء ہے اسی وجہ سے بعض اہل علم نے کہا: ان یہاں بمعنی الا ہے اور قرآن میں اس کے علاوہ ایسا کہیں نہیں۔ محمد بن حاطب نے کہا میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ آیت منبر پر پڑھتے سنا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى انہوں نے فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) ان میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا یعنی وہ آگ کی آہٹ اور اس کے شعلوں کی حرکت نہ سنیں گے۔ الحسیس اور الحس کا معنی حرکت ہے۔ ابن جریج نے عطا سے روایت کیا ہے فرمایا ابو راشد حروری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تو مجنون ہے پھر یہ ارشاد کہاں ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ (مریم) اور یہ گزشتہ لوگوں کی دعا تھی: اے اللہ! مجھے آگ سے سلامتی کے ساتھ نکال اور مجھے جنت میں کامیاب فرما۔ ابو عثمان نہدی نے کہا: پل صراط پر سانپ ہوں گے جو دوزخیوں کو کاٹیں گے اور وہ کہیں گے: حَس حَس۔ بعض علماء نے فرمایا: جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہونگے تو وہ دوزخیوں کی آہٹ نہیں سنیں گے اور اس سے پہلے سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ وہ ہمیشہ رہیں گے جبکہ وہ ان نعمتوں میں ہوں گے جو ان کے نفس چاہیں گے اور آنکھوں کو لذت دیں گے۔ فرمایا: وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْۤ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حم السجدہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ابو جعفر اور ابن محیصن نے يُحزنهم یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے

ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنہ لغت قریش ہے اور أحزنہ لغت تمیم ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ الفزع الاکبر سے مراد قیامت کے دن کی ہولناکیاں ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حسن نے کہا: یہ وہ وقت ہے جس میں بندوں کو آگ کی طرف جانے کا حکم دیا جائے گا۔ ابن جریج اور سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: یہ وہ وقت ہے جب آگ کو ان کے اوپر بند کر دیا جائے گا اور موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔ ذوالنون مصری نے کہا: یہ قطعیت اور فراق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''تین افراد قیامت کے دن معنبر کستوری کے ٹیلوں پر ہوں گے انہیں بڑی گھبراہٹ پریشان نہیں کرے گی۔ ایک وہ شخص جس نے ثواب کی نیت سے قوم کی امامت کرائی جبکہ وہ اس سے راضی ہوں۔ دوسرا وہ شخص جس نے ثواب کی نیت سے قوم کے لیے اذان دی۔ تیسرا وہ شخص جو دنیا میں غلامی میں مبتلا کیا گیا اور اپنے رب کی طاعت سے بھی غافل نہ ہوا'' (1)۔ ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے کہا: میں ایک شخص کے پاس سے گزرا جو اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ غلام نے میری طرف چھڑانے کا اشارہ کیا میں نے اس کے مالک سے بات کی تو اس نے اسے معاف کر دیا۔ میں حضرت ابو سعید خدری سے ملا، میں نے اسے یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا: اے میرے بھتیجے! جس نے کسی پریشان حال کی مدد کی اللہ تعالیٰ بڑی پریشانی والے دن اسے آگ سے آزاد کرے گا۔ یہ میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی فرشتے جنت کے دروازوں پر ان کا استقبال کریں گے اور انہیں مبارک باد پیش کریں گے اور انہیں کہیں گے: هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ بعض علماء نے فرمایا: قبور سے نکلنے کے وقت رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے هٰذَا یَوْمُكُمْ یعنی ویقولون لھم یہ وہ انہیں کہیں گے اس کو حذف کیا گیا ہے۔ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ جس میں عزت و کرامت ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ۝

''(یاد کرو) جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جیسے لپیٹ دیئے جاتے ہیں طومار میں کاغذات، جیسے ہم نے آغاز کیا تھا ابتدائے آفرینش کا اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے یہ وعدہ (پورا کرنا) ہم پر لازم ہے یقیناً ہم (ایسا) کرنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ ابو جعفر بن قعقاع، شیبہ بن نصاح، اعرج اور زہری نے تطوی تا مضمومہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ السماء کو نائب الفاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ مجاہد نے یطوی پڑھا ہے۔ اس معنی پر کہ یطوی اللہ السماء۔ اللہ آسمان کو لپیٹ دے گا باقی قراء نے نطوی نون کے ساتھ پڑھا ہے پر یہ عظمت کی دلیل ہے اور یوم پر نصب ہ ضمیر محذوف سے بدل ہونے کے اعتبار سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ يَوْمَ نَطْوِي

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی کلام الحور العین، حدیث 2490

السَّمَآءَ یا نعید کی وجہ سے منصوب ہوگا تو کَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ یا لایحزنهم کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی لایحزنهم الفزع الاکبر فی الیوم الذی نطوی فیه السماء یا اذکر کے اضمار کے ساتھ منصوب ہے۔ السماء سے مراد جنس ہے اس کی دلیل یہ ہے وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (الزمر: 67)

كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: صحیفہ کو اس پر لپیٹ دینا جو کچھ اس میں ہو۔ لام بمعنی علی ہو گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام ہے(1)۔ یہ بھی قوی نہیں کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب معروف تھے ان میں سے یہ کسی کا نام نہیں اور نہ آپ کے اصحاب میں سے کسی کا نام السّجل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر اور سدی نے کہا: السجل اس فرشتے کا نام ہے جو بنی آدم کے رجسٹر لپیٹتا ہے، جب وہ اس کی طرف بلند کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: وہ تیسرے آسمان میں ہے۔ اس کی طرف بندوں کے اعمال بلند کیے جاتے ہیں۔ کندھوں پر موجود الحفظة فرشتے ہر جمعرات اور سوموار کو اس کو پیش کرتے ہیں اس کے مددگاروں میں سے ہاروت وماروت ہیں۔ السجل، اشام کو بھی کہتے ہیں یہ السجالة سے مشتق ہے جس کا معنی کتابت ہے اس کی اصل السجل سے ہے یعنی ڈول۔ تو کہتا ہے: ساجلت الرجل جب تو نے ڈول نکال دیا پھر مکاتبت اور مراجعت کو مساجلة کہا گیا۔ سجل الحاکم تسجيلاً۔ فصل بن عباس بن عتبة بن ابی لہب نے کہا:

مَنْ يُسَاجِلْنِي يُسَاجِلْ ماجدا يملاء الدَّلْوَ إلى عَقْدِ الكَرَب

پھر اس اسم کی بنا فِعِلّ بنائی گئی ہے جیسے حِمِرّ وطِمِرّ وبلیّ۔ ابوزرعہ بن عمرو بن جریر نے كطي السُّجُلّ سین اور جیم کے ضمہ کے ساتھ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمش اور طلحہ نے كطي السجل سین کے فتح اور جیم کے سکون اور لام کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: معنی ایک ہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور للكتاب کے قول پر کلام مکمل ہے۔ اس آیت میں الطی دو معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ الدرج جو النشر کی ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (الزمر: 67) دوسرا معنی چھپانا اور مٹانا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے نشان مٹائے گا اور اس کے ستاروں کی روشنی کو ختم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ (التکویر) وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝ (التکویر) للكتاب پر کلام مکمل ہوئی۔ اعمش، حفص، حمزہ، کسائی، یحییٰ اور خلف نے للكتاب جمع پڑھا ہے۔ پھر کلام کا آغاز ہوا فرمایا: كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ یعنی ہم انہیں جمع کریں گے جبکہ وہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن اور غیر مختون ہوں گے جس طرح وہ ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیے گئے تھے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگ جمع ہو جائیں گے جبکہ وہ برہنہ بدن، غیر مختون ہوں گے قیامت کے روز سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا پھر یہ آیت پڑھی: كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ''۔ اس کو امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موعظت کے لیے کھڑے ہوئے فرمایا: ''اے لوگو!

1۔ ابوداؤد، باب فی اتخاذ الکاتب، حدیث 2546

تم اللہ کی بارگاہ میں جمع کیے جاؤ گے جبکہ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون ہو گے پھر یہ آیت پڑھی: كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ خبردار! سب سے پہلے قیامت کے روز ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا'' (1)۔ ہم نے اس باب کے تحت التذکرہ کتاب میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ سفیان ثوری نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے ابوالزعراء سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے پانی بھیجتا ہے جیسے مردوں کی منی ہوتی ہے پس اس سے لوگوں کے گوشت اور جسم پیدا ہوتے ہیں اسی طرح گیلی مٹی سے اور چیزیں پیدا ہوتی ہیں پھر یہ آیت پڑھی: كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم ہر چیز کو ہلاک کر دیں گے اور ہم ہر چیز کو فنا کر دیں گے جس طرح ابتدا میں تھا۔ اس بناء پر کلام يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ کے قول سے متصل ہوگی، یعنی ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے پھر اسے ہلاکت وفنا کی طرف لوٹا دیں گے پس کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم آسمان کو فنا کریں گے پھر انہیں دوبارہ لپیٹنے اور زوال کے بعد لوٹائیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم: 48)

پہلا قول اصح ہے اور اس کی مثال یہ قول ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 94)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الکہف: 48) وعداً مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی وعدنا وعداً۔ علینا ہم پر اس کا پورا کرنا اور وفا کرنا ہے یعنی دوبارہ اٹھانا اور اعادہ کرنا ہے۔ کلام میں حذف ہے پھر: اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ کے ساتھ مؤکد کیا۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے جو ہم چاہتے ہیں اس پر قادر ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے جو ہم نے تم سے وعدہ کیا اسے پورا کرنے والے ہیں، جس طرح فرمایا: كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ (المزمل) بعض نے کہا: کان جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کی خبر دینے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: صلہ ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝

''اور بیشک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں پند وموعظت کے (بیان کے) بعد کہ بلاشبہ زمین کے وارث تو میرے نیک بندے ہوں گے۔ یقیناً اس قرآن میں کفایت ہے اس قوم کی (فلاح دارین) کے لیے جو عبادت گزار ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ، الزبور اور الکتاب ایک چیز ہے اسی وجہ سے تورات اور انجیل کو زبور کہنا جائز ہے۔ زبرت کا معنی ہے کتبت اس کی جمع زُبُر ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: الزبور سے مراد تورات، انجیل اور قرآن ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ جو آسمان میں ہے۔ اَنَّ الْاَرْضَ سے مراد جنت کی زمین ہے۔ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ یہ سفیان نے اعمش سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: الزبور سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور ہے۔ الذِّكْرِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات ہے۔ مجاہد اور ابن زید نے کہا: الزبور سے مراد انبیاء کرام کی کتب ہیں۔ الذِّكْرِ

1۔ مسند امام احمد، 1913، 2096

سے مراد ام الکتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس آسمان میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الزبور سے مراد وہ کتب ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء کرام پر اتارا۔ الذکر سے مراد وہ تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی۔ حمزہ نے فِي الزَّبُوْرِ راء کے ضمہ کے ساتھ زبر کی جمع کے طور پر پڑھا ہے۔ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ بہتر قول جو اس کی تفسیر میں مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد جنت کی زمین ہے جیسا کہ سعید بن جبیر نے کہا کہ دنیا میں زمین کے وارث نیک لوگ بھی ہوتے ہیں اور دوسرے ظالم وجابر بھی ہوتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہما کا قول ہے۔ مجاہد اور ابوالعالیہ نے کہا: اس تاویل کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ (الزمر: 74)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد ارض مقدسہ ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ کافر امتوں کی زمین ہے جس کی امت محمد یہ فتوحات کے ساتھ وارث بنی۔ بعض نے کہا: اس سے مراد بنو اسرائیل ہیں اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (الاعراف: 137)

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ عباد الصالحین سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔ حمزہ نے عبادی الصالحون یاء کی تسکین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا اس سورت میں جو وعظ وتنبیہ گزری ہے۔ بعض علماء نے کہا: یعنی جو قرآن میں ہے: لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ وہ کفایت کرنے والا ہے عبادت گزار قوم کے لیے۔ حضرت ابو ہریرہ اور سفیان ثوری نے کہا: اس سے مراد پانچ نمازیں ادا کرنے والے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عابدین سے مراد اطاعت کرنے والے ہیں۔ العابد جو اطاعت وانکساری کرنے والا ہو۔ قشیری نے کہا: کوئی بعید نہیں کہ اس میں ہر عاقل داخل ہو کیونکہ فطرت کی حیثیت سے وہ خالق کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔ وہ اگر قرآن میں غور وفکر کرے اور اس پر عمل کرے تو وہ اسے جنت تک پہنچائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ امتی ہیں جو پانچوں نمازیں پڑھتے ہیں اور رمضان کے مہینہ کے روزے رکھتے ہیں؛ یہ بعینہٖ پہلا قول ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لیے۔ فرمادیجئے کہ میرے پاس تو صرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا (وہی ہے جو) ایک خدا ہے پس کیا تم اسلام لانے کے لیے تیار ہو، اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ فرمادیجئے کہ میں نے آگاہ کر دیا ہے تمہیں پوری طرح اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں پس جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی وہ سعادت مند ہوا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لایا اسے وہ عذاب لاحق نہیں ہوا جو پہلی امتوں کو (نافرمانی کی وجہ سے) خسف اور غرق لاحق ہوا۔ ابن زید نے کہا: العالمین سے خاص مومنین مراد ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا جائز نہیں۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ کیا تم اللہ تعالیٰ کی توحید کی اطاعت کرنے والے ہو یعنی اسلام قبول کرلو، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ) یعنی تم باز آجاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ اسلام سے اعراض کریں۔ فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ یعنی میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری جنگ ہے ہماری کوئی صلح نہیں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (الانفال: 58) یعنی انہیں آگاہ کرو کہ تو نے عہد توڑ دیا ہے یعنی تم اور وہ برابر ہو کسی ایک فریق کا دوسرے فریق کے لیے لازم عہد نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے میں نے تمہیں بتایا کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس کے علم میں برابر ہیں میں نے ایسا نہیں کیا کہ کسی کے سامنے کوئی چیز ظاہر کی ہو اور دوسروں سے چھپائی ہو۔ وَاِنْ اَدْرِيْٓ، انْ نافیہ ہے بمعنی ما یعنی ما ادری۔ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ یعنی قیامت کی مدت کوئی نہیں جانتا نہ کوئی نبی مرسل جانتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میں تمہیں جنگ کے متعلق آگاہ کرتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کہ مجھے کب تم سے جنگ کرنے کی اجازت دی جائے گی؟

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ۝ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۝ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۝

''بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم (اپنے دل میں) چھپاتے ہو۔ اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو۔ آپ نے عرض کی: میرے رب! فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ اور (اے کفار!) ہمارا رب وہ ہے جو رحمٰن ہے اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ۝ یعنی شرک میں سے جو تم بلند آواز سے کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہے وہ اس پر جزا دے گا۔ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ شاید مہلت دینا، فِتْنَةٌ لَّكُمْ تمہارے لیے امتحان ہو تا کہ وہ دیکھے تمہارا عمل کیسا ہے جبکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ بعض علماء نے فرمایا: مدت کے ختم

ہونے تک۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنی امیہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ لوگوں پر غالب ہیں۔ حکم آپ کے پاس نکلا تو بنی امیہ کو اس کی خبر دی۔ بنو امیہ نے حکم کو کہا کہ تو آپ سے پوچھ یہ کب ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝ ۔ وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ۝ ، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو فرمایا: آپ انہیں یہ کہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ سورت کا اختتام اس طرح فرمایا کہ اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم فرمادیا کہ اپنا امر اللہ تعالیٰ کو تفویض کرو اور اس کی بارگاہ سے کشادگی کی توقع رکھو، یعنی میرے درمیان اور ان جھٹلانے والوں کے درمیان فیصلہ کر اور ان کے خلاف میری مدد فرما۔ سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: انبیاء کرام کہتے تھے: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (الاعراف: 89) نبی کریم ﷺ کو یہ کہنے کا حکم دیا: رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ یعنی اس وقت آپ یہ کہتے تھے جب دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تھا حالانکہ آپ کو یقین کامل تھا کہ آپ حق پر ہیں اور دشمن باطل پر ہے: رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ اے میرے پروردگار حق کے ساتھ فیصلہ فرما۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہاں صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: رب احکم بحکمك الحق اور رب محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ ندا مضاف ہے۔ ابوجعفر بن قعقاع اور ابن محیصن نے قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ با کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ نحویوں کے نزدیک غلط ہے۔ ان کے نزدیک رجل اقبل کہنا جائز نہیں حتی کہ تم کہو: یا رجل اقبل یا اس کے مشابہ کہو۔ ضحاک، طلحہ اور یعقوب نے قال رب احکم بالحق ہمزہ قطعی کے ساتھ اور کاف مفتوحہ اور میم مضمومہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی حضرت محمد ﷺ نے عرض کی اے میرے رب! تو ہر حاکم سے زیادہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ جحدری نے قل رب احکم پڑھا ہے، یعنی تمام امور کو حق کے ساتھ پختہ کرنے والا ہے۔

وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝ جو تم کفر اور تکذیب میں سے بیان کرتے ہو۔ مفضل اور سلمی نے علی مایصفون یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ واللہ اعلم۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# سورۂ حج

(آیاتہا ۷۸) (۲۲ سورۃ الحج مدنیۃ ۱۰۳) (رکوعاتہا ۱۰)

یہ سورت مکی ہے، سوائے تین آیات کے، هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ سے لیکر تین مکمل آیات تک؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ چار آیات ہیں۔ عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ تک ضحاک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی قول ہے کہ یہ مدنی سورت ہے، یہ قتادہ کا قول ہے سوائے چار آیات کے۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ سے لیکر عَذَابُ یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ تک یہ آیات مکی ہیں۔ نقاش نے مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی آیات کو دس شمار کیا ہے۔ جمہور نے کہا: یہ سورت ملی جلی ہے کیونکہ اس کی بعض آیات مکی ہیں اور اس کی بعض آیات مدنی ہیں؛ یہ قول اصح ہے کیونکہ آیات اسی کا تقاضا کرتی ہیں کیونکہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ مکی ہے۔ اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مدنی ہے۔ غزنوی نے کہا یہ عجیب سورتوں میں سے ہے یہ رات اور دن میں، سفر اور حضر میں، مکہ اور مدینہ میں، صلح و جنگ میں نازل ہوئی اس میں ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی ہے۔ محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ بھی ہیں تعداد مختلف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی فضیلت میں وہ روایت آئی ہے جو ترمذی، ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے فرمایا میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سورۂ حج کو فضیلت دی گئی ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔ اور جس نے ان کا سجدہ نہیں کیا اس نے اسے نہیں پڑھا'' (1)۔ یہ ترمذی کے الفاظ کا ترجمہ ہے اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔

اہل علم کا اس میں اختلاف ہے حضرت عمر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: سورۂ حج کو فضیلت دی گئی ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ ابن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس میں ایک سجدہ ہے؛ یہ سفیان ثوری کا قول ہے اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن ثعلبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو میں نے سورۂ حج میں دو سجدے کرتے دیکھا۔ میں نے پوچھا: صبح کی نماز میں؟ فرمایا: صبح کی نماز میں۔

## یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ۝

''اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار (کی ناراضگی) سے بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے''۔

امام ترمذی نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ سے لے کر وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیۡدٌ ۝ تک آیات نازل ہوئیں تو آپ سفر میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟''

1۔ ابوداؤد، حدیث 1194

صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''یہ وہ دن ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا آگ کا حصہ نکالو۔ حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے: آگ کا حصہ کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: نو سو ننانوے (999) آگ کی طرف جائیں گے اور ایک جنت کی طرف جائے گا''۔ مسلمان رونے لگ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمدہ اعمال کے قریب قریب اعمال کرو اور سیدھے اعمال کرو نبوت کبھی نہیں تھی مگر اس سے پہلے زمانہ جاہلیت تھا''۔ فرمایا: ''پہلے تعداد زمانہ جاہلیت سے پوری کی جائے گی اگر مکمل ہو جائے گی تو فبہا ورنہ منافقین سے مکمل کی جائے گی۔ تمہاری اور دوسری امتوں کی مثال اس طرح ہوگی جیسے جانور کے بازوں پر اٹھی ہوئی جگہ ہوتی ہے یا اونٹ کے پہلو میں کوئی علامت ہوتی ہے'' پھر فرمایا: ''میں امید کرتا ہوں تم اہل جنت کا نصف ہو گے''۔ صحابہ کرام نے تکبیر بلند کی۔ راوی فرماتے ہیں: میں نہیں جانتا آپ نے 2\3 کا ذکر کیا یا نہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ یہ حسن عن عمران بن حصین سے دوسرے طریق سے روایت کی گئی ہے۔ اس میں ہے: لوگ مایوس ہو گئے حتی کہ انہوں نے اظہار مسرت نہ کیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: ''اچھے اعمال کرو اور خوش ہو جاؤ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم دو ایسی خلقتوں کے ساتھ ہو جو کسی کے ساتھ نہیں ہوتیں مگر اس کو زیادہ کر دیتی ہیں۔ یاجوج و ماجوج اور بنی آدم میں سے ابلیس کی اولاد میں سے جو مر چکے ہیں''۔ پس قوم سے پریشانی دور ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھے اعمال کرو اور خوش ہو جاؤ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم ان لوگوں میں نہیں ہو گے مگر اونٹ کے پہلو پر ایک نشان کی طرح یا جانور کے بازو میں ابھری ہوئی جگہ کی طرح'' فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم! وہ عرض کریں گے: لبیک و سعدیك والخیر فی یدیك اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آگ کا حصہ نکال۔ حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے: آگ کا حصہ کتنا ہے؟ فرمایا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے (999)۔ فرمایا: یہ وہ وقت ہے چھوٹا بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشہ میں مدہوش دیکھے گا وہ نشہ میں مدہوش نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔ فرمایا: لوگوں پر یہ بات بڑی سخت ہوئی۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں وہ ایک شخص کون ہوگا؟ فرمایا: ''تم خوش ہو جاؤ یاجوج و ماجوج میں سے ہزار ہوں گے اور تم میں سے ایک شخص ہوگا'' آگے حضرت عمران بن حصین کی حدیث کی طرح حدیث بیان کی۔ ابو جعفر نحاس نے ذکر کیا ہے فرمایا: ہمیں احمد بن محمد بن نافع نے بتایا فرمایا ہمیں سلمہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں عبدالرزاق نے بتایا فرمایا ہمیں معمر نے بتایا انہوں نے قتادہ سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ سے لیکر وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝ تک آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو آپ سفر میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے اس آیت کو پڑھا حتی کہ صحابہ کرام آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو یہ کونسا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا: اے آدم! اٹھو اور دوزخ کا حصہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے (999)

1۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الحج، حدیث 3093

آگ کی طرف نکالو اور ایک جنت میں ہوگا''۔ مسلمانوں نے اس پر نعرہ تکبیر بلند کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سیدھے راستہ پر چلو اور صحت کے قریب قریب والے اعمال کرو اور خوش ہو جاؤ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم ان لوگوں میں نہیں ہوگے مگر اس علامت (نشانی) کی طرح جو اونٹ کے پہلو میں ہوتی ہے یا گدھے کے بازو میں اٹھی ہوئی جگہ ہوتی ہے اور تمہارے ساتھ دو خلقتیں ایسی ہیں جو کسی چیز کے ساتھ نہیں ہوتیں مگر وہ اس میں اضافہ کرتی ہیں۔ یاجوج و ماجوج اور جن وانس میں سے کافر لوگ جو ہلاک ہو چکے ہیں'' (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اس ندا سے مراد مکلف لوگ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر کو چھوڑنے اور اس کے نواہی سے آگے بڑھنے سے ڈرو۔ الاتقاء سے مراد مکروہ چیز سے بچنا ہے، اس پر گفتگو سورۂ بقرہ میں تفصیلاً گزر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی سزا سے بچنے کے لیے اس کی طاعت کا احترام کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝، الزلزلة کا معنی ہے شدید حرکت کرنا اسی سے ہے وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ (البقرہ: 214) اس کلمہ کا اصل معنی ہے کسی کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور حرکت کرنا۔ زلزل اللہ قدمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے پاؤں کو حرکت دی۔ یہ لفظ کسی چیز سے ڈرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد معروف زلزلہ ہے جو قیامت کی ان شرائط میں سے ہے جو قیامت سے پہلے دنیا میں ہوں گی؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ زلزلہ پندرہ رمضان کو آئے گا اس کے بعد سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝

''جس روز تم اس (کی ہولناکیوں) کو دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی ہر دودھ پلانے والی (ماں) اس (لخت جگر) سے جس کو اس نے دودھ پلایا اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے وہ نشہ میں مست ہوں حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہوں گے بلکہ عذاب الٰہی سخت ہوگا (وہ اس کی ہیبت سے حواس باختہ ہو نگے)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تَرَوْنَهَا، ھا ضمیر کا مرجع جمہور کے نزدیک الزلزلة ہے۔ اس کی تائید یہ ارشاد الٰہی بھی کرتا ہے: تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا، رضاع اور حمل دنیا میں ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: لزلزلة قیامت کے دن آئے گا اور ان علماء نے حضرت عمران بن حصین کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی ہے۔ اس حدیث میں ہے: ''کیا تم جانتے ہو وہ دن کون سا ہے''۔ اور حضرت ابو سعید کی حدیث جو امام مسلم نے روایت کی ہے اس کا سیاق بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَذْهَلُ کا معنی ہے مشغول ہو جانا؛ یہ قطرب کا قول ہے:

ضَرْبًا يُزِيلُ الهامَ عن مَقِيلِهِ ويُذْهِلُ الخَلِيلَ عن خَلِيلِهِ

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

بعض نے فرمایا: اس کا معنی بولنا ہے۔ بعض نے کہا: غافل ہوجانا ہے۔ بعض نے کہا: بھول جانا ہے۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ عَمَّآ اَرْضَعَتْ مبرد نے کہا: اس میں ما مصدریہ ہے یعنی وہ دودھ پلانے سے بھول جائے گی۔ فرمایا: یہ دلیل ہے کہ یہ زلزلہ دنیا میں ہوگا کیونکہ دوبارہ اٹھنے کے بعد تو نہ حمل ہوگا اور نہ دودھ پلانا ہوگا۔ مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو حاملہ مرجائے گی وہ حاملہ ہی اٹھائی جائے گی پس وہ ہولناکی کی وجہ سے اپنا حمل گرادے گی اور جو دودھ پلاتے ہوئے مرجائے گی وہ اسی طرح اٹھائی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَّوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ﴿۱۷﴾ (المزمل) جس دن بچے بوڑھے ہوجائیں گے۔ بعض نے کہا: یہ پہلے صور کو پھونکنے کے وقت ہوگا۔ بعض نے کہا: قیامت کے قیام کے ساتھ ہوگا حتی کہ دوسرے صور کے پھونکنے کے ساتھ لوگ اپنی قبور سے حرکت کریں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت میں زلزلہ سے مراد قیامت کے دن کی ہولناکیوں کو بیان کرنا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا (البقرہ: 214) اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللّٰھم اھزمھم وزلزلھم (1) اے اللہ! ان کفار کو شکست دے اور ان کے پاؤں اکھیڑ دے۔ قیامت کے دن کی ہولناکیوں کو بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ نیک اعمال کے ساتھ لوگ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ زلزلہ کو شئ عظیم کہنا یا تو اس لیے ہے کہ اس کا وقوع یقینی ہے اسی وجہ سے معدوم چیز کو شئ کہنا بھی آسان ہے، کیونکہ یقین، موجودات کے مشابہ ہوتا ہے یا مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے یعنی یہ جب واقع ہوگا تو عظیم شئ ہوگا۔ گویا اب اسم کا اطلاق نہیں کیا بلکہ اس کا معنی ہے جب یہ ہوگا تو عظیم شئ ہوگا اسی کی وجہ سے دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں سے غافل ہوجائیں گے اور لوگ نشہ میں مست نظر آئیں گے جیسا کہ فرمایا: وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى یعنی اس کی ہولناکی کی وجہ سے اور جو انہیں خوف اور گھبراہٹ لاحق ہوگی اس کی وجہ سے نشہ میں مست نظر آئیں گے۔ وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى حالانکہ وہ شراب کے نشہ میں نہیں۔ اہل معانی نے کہا: تو لوگوں کو دیکھے گا گویا کہ وہ نشہ میں مست ہیں۔ اس پر دلیل ابی زرعہ ہرم بن عمرو بن جریر بن عبداللہ کی قرأت وتُری الناس تا کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی تجھے خیال گزرے گا۔ حمزہ اور کسائی نے سکریٰ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ باقیوں نے سکاریٰ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغات ہیں یہ سکران کی جمع ہے جیسے کسلیٰ و کسالیٰ، الزلزلة کا معنی سختی سے حرکت دینا ہے۔ الذھول کا معنی غم، ھم اور تکلیف وغیرہ کے لاحق ہونے کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہوجانا ہے۔ ابن زید نے کہا: عورت اس تکلیف کی وجہ سے اپنے بچے کو چھوڑ دے گی جو اس پر نازل ہوگی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾

''اور بعض ایسے لوگ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کے بغیر اور پیروی کرتے ہیں ہر سرکش شیطان کی۔ جس کے مقدر میں لکھا جاچکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کرکے رہے گا اور راہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 19107

دکھائے گا اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ اس سے مراد نضر بن حارث جو کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرنے پر قادر نہیں جو بوسیدہ ہو چکا ہے اور مٹی بن چکا ہے۔ وَّيَتَّبِعُ اس کے قول میں كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ یعنی ہر سرکش شیطان۔ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ قتادہ اور مجاہد نے کہا: جو شیطان کو دوست بناتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝

''اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو (روز محشر) جی اٹھنے میں تو (ذرا اس امر میں غور کرو کہ) ہم نے ہی پیدا کیا تھا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کے ٹکڑے سے بعض کی تخلیق مکمل ہوتی ہے اور بعض کی نامکمل تاکہ ہم ظاہر فرما دیں تمہارے لیے (اپنی قدرت کا کمال) اور ہم قرار بخشتے ہیں رحموں میں جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں بچہ بنا کر پھر (پرورش کرتے ہیں تمہاری) تاکہ تم پہنچ جاؤ اپنے شباب کو اور تم میں سے کچھ (پہلے) فوت ہو جاتے ہیں اور تم میں سے بعض کو پہنچا دیا جاتا ہے نکمی عمر تک تاکہ وہ کچھ نہ جانے ہر چیز کو جاننے کے بعد، اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو وہ تروتازہ ہو جاتی ہے اور پھولتی ہے اور اگاتی ہے ہر خوشنما جوڑے کو''۔

**مسئلہ نمبر 1**: اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ یہ پہلی دفعہ آغاز کرنے کے ساتھ حجت پکڑی جارہی ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ، یہ توقیف کو متضمن ہے۔ حسن بن ابی حسن نے البعث عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بصریوں کے نزدیک بعث میں یہ لغت بھی ہے اور یہ کوفیوں کے نزدیک تخفیف کے ساتھ بَعَثَ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے میں شک ہے۔ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہارے باپ کو، جو بشر کی اصل ہے، آدم کو پیدا کیا۔ مِّنْ تُرَابٍ مٹی سے ثُمَّ ہم نے ان کی اولاد کو پیدا کیا مِنْ نُّطْفَةٍ منی سے۔ اس کو نطفہ کہا جاتا ہے اس کی قلت کی وجہ سے۔ وہ تھوڑا سا پانی ہے کبھی کثیر پانی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی سے حدیث میں ہے۔ حتی یسیر الراکب بین النطفتین لایخشی جوراً (1) یعنی سوار بحر مشرق اور بحر مغرب کے درمیان چلے گا اور اسے ظلم کا خوف نہ ہوگا۔ النطف کا معنی ٹپکنا ہے۔ نَطَفَ يَنْطِفُ وينطُف ٹپکنا۔

1۔ الفائق زمخشری، جلد 2، صفحہ 442

لیلة نطوفة اس رات کو کہتے ہیں جس میں متواتر بارش برستی رہے۔ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ جامد خون العلق ترجمے ہوئے خون کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: شدید سرخ رنگ کے خون کو کہتے ہیں۔ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مضغة اس تھوڑی مقدار کے گوشت کو کہتے ہیں جو چبایا جاتا ہے، اسی سے حدیث ہے: الاوان فی الجسد مضغة، (1) خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ یہ چار مہینے کی مختلف کیفیات ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: چار ماہ دس دن بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے؛ اسی وجہ سے وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن رکھی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یحییٰ بن زکریاء بن ابی زائدہ نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں داؤد نے بتایا انہوں نے عامر سے انہوں نے علقمہ سے انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نطفہ جب رحم مادر میں قرار پاتا ہے تو ایک فرشتہ اسے اپنی ہتھیلی میں لیتا ہے اور عرض کرتا ہے: یارب! مذکر یا مونث، شقی یا سعادت مند، اس کی مدت اور اثر کیا ہے کس زمین میں مرے گا؟ اسے کہا جاتا ہے: تو ام الکتاب کی طرف جا اس میں تجھے اس نطفہ کا قصہ مل جائے گا۔ وہ فرشتہ ام الکتاب (لوح محفوظ) کی طرف جاتا ہے تو وہاں اس کا قصہ پالیتا ہے پھر وہ نطفہ انسان بنایا جاتا ہے وہ اپنا تقدیر میں لکھا ہوا رزق کھاتا ہے اپنے اثر کو روندتا ہے جب مدت عمر پوری ہوتی ہے تو اس کی روح قبض کی جاتی ہے اور اسے اس مکان میں دفن کیا جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا پھر عامر نے یہ آیت پڑھی: يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔

صحیح میں حضرت انس بن مالک سے روایت مروی ہے انہوں نے حدیث مرفوع ذکر کی ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رحم پر ایک فرشتہ مقرر فرماتا ہے وہ کہتا ہے: اے میرے رب! یہ نطفہ ہے، اے میرے رب! اب یہ علقہ ہے، اے میرے رب! اب یہ مضغہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اسے مکمل تخلیق کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔ فرمایا: فرشتہ کہتا ہے: یارب! مذکر یا مونث، شقی یا سعید، اس کا رزق کیا ہے اس کی عمر کیا ہے؟ پس یہ سب کچھ ماں کے پیٹ میں ہوتے ہوئے لکھا جاتا ہے'' (2)۔ صحیح میں حضرت حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے فرمایا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''جب نطفہ پر بیالیس راتیں گزرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس کی تصویر بناتا ہے اس کے کان، اس کی آنکھیں اس کی جلد، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں بناتا ہے پھر فرشتہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! مذکر یا مونث'' الحدیث۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا ہمیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا آپ سچے بھی ہیں اور آپ سے سچ کہا گیا ہے کہ ''تم میں سے ہر ایک کی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن کے مرحلہ سے ہوتی ہے، پھر چالیس دن وہ جامد خون کی حیثیت سے رہتا ہے پھر چالیس دن گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے پھر ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اسے چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، رزق، عمر، شقی یا سعادت مند ہونا'' (الحدیث) یہ حدیث پہلی احادیث کی تفسیر کرتی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع باب الکسب و طلب الحلال، صفحہ 241، مطبوعہ وزارت تعلیم

2۔ مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 12157

ہے کیونکہ اس میں ہے کہ ''تم میں ہر ایک کی تخلیق کو ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ کی شکل میں جمع کیا جاتا ہے پھر چالیس دن جامد خون کی حیثیت سے رہتا ہے پھر چالیس دن گوشت کی حیثیت سے رہتا ہے پھر فرشتہ بھیجا جاتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے یہ چار ماہ بنتے ہیں اور دس دنوں میں فرشتہ روح پھونکتا ہے اور یہی اس عورت کی عدت ہے جس کا خاوند فوت ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ حدیث کے الفاظ: ان احد کم یجمع خلقه فی بطن امه، یعنی تم میں سے کسی کی تخلیق کو اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر بیان کی۔ اعمش سے پوچھا گیا: ماں کے پیٹ میں جمع کیے جانے کا کیا مطلب ہے انہوں نے کہا ہمیں خیثمہ نے بتایا فرمایا: عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا جب رحم میں نطفہ گرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس سے انسان تخلیق کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ عورت کے جسم میں ہر ناخن اور ہر بال کے نیچے اتر جاتا ہے پھر چالیس دن اسی طرح ٹھہرا رہتا ہے پھر وہ رحم میں خون بن جاتا ہے، یہ اس کا جمع کرنا ہے یہ اس کا جامد خون ہونے کا وقت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ تخلیق کرنے اور تصویر بنانے کی نسبت فرشتے کی طرف مجازی ہے حقیقی نہیں کیونکہ جو کچھ مضغۃ میں تصویر و تشکیل کا فعل صادر ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق و اختراع کے ساتھ تھا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقی خلقت کی نسبت اپنی طرف کی اور تمام مخلوق سے نسبت ختم کر دی فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف: 11) پھر فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ (المومنون) پھر فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (الحج: 5) پھر فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن: 2) پھر فرمایا: وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (المومن: 62) پھر فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین) پھر فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ (العلق)

اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں جو قطعی دلائل ہیں کہ مخلوق میں سے کسی چیز کا خالق رب العالمین کے علاوہ کوئی نہیں ہے اسی طرح کہا جائے گا اس قول میں بھی: ثم یرسل الملك فینفخ فیه الروح پھر فرشتہ بھیجا جاتا ہے اور وہ اس میں روح پھونکتا ہے، یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے روح اور حیات پیدا کرنے کا سبب پھونکتا ہے۔ اسی طرح تمام اسباب عادیہ میں کہا جائے گا کیونکہ سب کچھ اللہ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اصل پر غور کرو اور اس کو مضبوطی سے پکڑو۔ اس میں گمراہ ٹولہ طبعیین وغیرہم کے مذاہب سے نجات ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ روح ایک سو بیس دن کے بعد پھونکی جاتی ہے یہ چار مہینے مکمل ہو جاتے ہیں اور پانچویں کا آغاز ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے احادیث کے ذریعے بیان کیا جھگڑے کے وقت بچے کو لاحق کرنے کے احکام میں جس وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس پر اعتماد ہے اور طلاق والی عورتوں کے نفقات کے وجوب میں بھی اسی مدت پر اعتماد ہے۔ یہ مدت اس لیے رکھی گئی ہے کیونکہ اس مدت میں بچے کی پیٹ میں حرکت یقینی ہو جاتی ہے۔ بعض علماء نے کہا: عورت کی عدت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو چار ماہ دس دن رکھنے میں یہی حکمت ہے پانچویں مہینے میں دخول کے وقت رحم

کی برأت ثابت ہو جاتی ہے جب حمل ظاہر نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ فراء نے کہا: مُّخَلَّقَةٍ سے مراد جس کی تخلیق مکمل ہو اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ سے مراد وہ بچہ جس کی تخلیق مکمل نہ ہو۔ ابن اعرابی نے کہا: مُّخَلَّقَةٍ جس کی خلقت ظاہر ہوگئی اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ جس کی ابھی تصویر نہ بنائی گئی ہو۔ ابن زید نے کہا: مُّخَلَّقَةٍ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے سر، ہاتھ اور ٹانگیں بنا دیں ہوں اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ سے مراد وہ ہے جس کی ابھی کوئی چیز نہ بنی ہو۔ ابن عربی نے کہا: جب ہم اشتقاق کی اصل کی طرف لوٹتے ہیں تو نطفہ، علقہ اور مضغۃ سب مخلقۃ ہیں کیونکہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اگر ہم اس تصویر کی طرف رجوع کرتے ہیں جو خلقۃ کی انتہا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (المومنون: 14) تو پھر اس طرح ہوتا ہے جس طرح ابن زید نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: التخلیق، الخلق سے ہے۔ اس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے۔ پس جس پر بہت اطوار متواتر گزرتے ہیں تو وہ ایک خلق کے بعد دوسری خلق ہوئی جب وہ نطفہ تھا تو بھی مخلوق تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (المومنون: 14) بعض علماء نے فرمایا: مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ یہ مکمل بچہ کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ کچے بچہ کی طرف یعنی کچھ بچے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ جن کو گوشت کے لوتھڑے سے مکمل کرتا ہے اور اس کے لیے تمام اعضاء بناتا ہے، بعض وہ ہوتے ہیں جو ناقص اور غیر تام ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا: مُّخَلَّقَةٍ وہ ہوتا ہے جس کو عورت وقت مکمل کر کے جنم دیتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مُّخَلَّقَةٍ وہ ہوتا ہے جو زندہ ہوتا ہے اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ وہ ہوتا ہے جو وقت سے پہلے گر جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أَفِي غير المخلقة البكاءُ فأينَ الحزم ويحك والحياء

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا اجماع ہے کہ لونڈی جو بچہ جنم دیتی ہے جس کی تخلیق مکمل ہوئی ہے تو وہ ام الولد ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام اوزاعی کے نزدیک مضغۃ کو گرانے سے بھی ام الولد بن جاتی ہے، خواہ اس کی تخلیق مکمل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مضغۃ تھا۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے کہا: اگر اس کے لیے کچھ ظاہر ہو چکا ہو جو بنی آدم کی تخلیق سے ہوتا ہے، مثلاً انگلی یا آنکھ یا اس کے علاوہ کوئی اعضاء تو وہ اس کی ام الولد ہوگی۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ بچہ جب آواز نکالے گا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس نے آواز نہ نکالی تو امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ یہ ابن مسیب، سیرین وغیرہما کا قول ہے۔ مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ وہ ادھورے بچے پر بھی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیتے تھے وہ فرماتے تھے: اس کا نام بھی رکھو، غسل بھی دو، اسے کفن بھی دو اور خوشبو بھی لگاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی وجہ سے تمہارے بڑے اور چھوٹے کو عزت دی ہے اور وہ یہ آیت پڑھتے تھے: فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ۔ ابن عربی نے کہا: شاید مغیرہ بن شعبہ نے السقط سے مراد وہ لیا ہو جس کی خلقت ظاہر ہو چکی ہو۔ پس اس کا نام رکھا جائے گا اور جس کی خلقت ظاہر نہ ہو اس کے لیے کوئی وجود نہیں۔ بعض سلف نے کہا:

جب اس میں روح پھونکی گئی ہو اور اس کے لیے چار مہینے مکمل ہو چکے ہوں تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بچہ چیخے (آواز نکالے) تو وہ وارث ہوگا''، الاستہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ ہر بچہ جو چیخ نکالے یا حرکت کرے یا چھینک مارے یا سانس لے تو اس کو وارث بنایا جائے گا کیونکہ اس میں زندگی کی دلالت ہے۔ سفیان ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی کا یہی نظریہ ہے۔ خطابی نے کہا: اصحاب الرائے کا قول بہتر ہے۔ امام مالک نے کہا: اس کے لیے میراث نہ ہوگی اگرچہ حرکت کرے یا چھینک مارے جب تک کہ وہ آواز نہ نکالے؛ محمد بن سیرین، شعبی، زہری اور قتادہ سے یہی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام مالک نے فرمایا: عورت، مضغۃ یا علقہ یا جس کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ بچہ تھا وہ گرا دے جب اسے پیٹ پر ضرب لگائی جائے تو اس میں غرہ ہے، یعنی غلام یا لونڈی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس میں کوئی چیز نہیں ہے حتی کہ اس کی تخلیق میں سے کوئی چیز واضح نہ ہو جائے۔ امام مالک نے فرمایا: جنین (پیٹ کا بچہ) جب گر جائے اور وہ چیخا نہ ہو تو اس میں غلام یا لونڈی ہے خواہ اس نے حرکت کی ہو یا چھینک ماری ہو ہمیشہ اس میں غلام یا لونڈی ہوگی حتی کہ وہ بلند آواز سے چیخے گا تو اس میں مکمل دیت ہوگی۔ امام شافعی اور تمام فقہاء نے کہا: جب حرکت یا چھینک یا آواز یا اس کے علاوہ کوئی علامت ہو جس سے اس کی زندگی کا یقین ہو تو اس میں دیت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے کہ عورت کی عدت، گرنے والے بچے سے مکمل ہو جائے گی، اس پر حجت پکڑی گئی ہے کہ وہ حمل ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4)

قاضی اسماعیل نے کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے اور اس کے وجود کے خلق ہونے اور اس کے ولد اور حمل ہونے پر دلیل ہے۔ ابن عربی نے کہا: ان احکام میں سے کوئی بھی اس پر مرتب نہ ہوگا حتی کہ وہ تام الخلق ہو۔

میں کہتا ہوں: اشتقاق میں سے جو ہم نے ذکر کیا ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ذکر کیا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کو ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے یہ ہمارے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے نیز علقہ اور مضغۃ کو گرانے والی پر تصدیق کی جاتی ہے کہ وہ حاملہ تھی، اس نے اسے گرادیا جو کچھ اس کے رحم میں قرار پذیر تھا۔ پس یہ ارشاد اس عورت کو بھی شامل ہے۔ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4) حمل والیوں کی مدت (عدت) انکا حمل کو گرانا ہے۔ اس نے نطفہ سے جو بچے کا آغاز ہوا تھا اسے گرادیا جبکہ وہ متجسد تھا مخطط کی طرح اور یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں خالد بن مخلد نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں یزید نے بیان کیا انہوں نے عبدالملک نوفلی سے انہوں نے یزید بن رومان سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سقط (کچا گرنے والا بچہ) میں اسے اپنے آگے بھیجوں یہ مجھے اس شہسوار سے زیادہ پسند ہے جسے میں پیچھے چھوڑ دوں'' (1)۔ اس ارشاد کو حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں سہل بن ابی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی من اصیب بسقط، حدیث 1595

صالح سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ''ہزار شہسواروں سے زیادہ محبوب ہے جن کو میں پیچھے چھوڑوں'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 10** ۔ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ تا کہ ہم تمہاری تخلیق کے اطوار میں تصرف کرنے کے ساتھ اپنے کمال قدرت کو واضح کریں۔ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ، نُقِرُّ اور نُخْرِجُ کو نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ابو حاتم نے ابو یزید سے انہوں نے مفضل سے انہوں نے عاصم سے یہ روایت کیا ہے فرمایا ابو حاتم نے فرمایا: نصب عطف کی بنا پر ہے۔ زجاج نے کہا: نقر پر صرف رفع ہے کیونکہ اس کا یہ معنی نہیں ہم نے یہ کہا تا کہ ٹھہرائیں رحموں میں جو ہم چاہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا تا کہ وہ ان کی رشد و صلاح پر راہنمائی کریں۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ ہم ان کے لیے دوبارہ اٹھانے کا امر واضح کریں پس یہ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہوگا۔ ایک جماعت نے رفع کے ساتھ نقر پڑھا ہے اس کا معنی ہے نحن نُقِرُّ؛ یہ جمہور کی قرأت ہے۔ یقر اور یخرجکم یاء کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور اس پر رفع جائز ہے۔ ابن وثاب نے مَا نِشَآءُ نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَجَلٍ مُّسَمًّى (مقررہ میعاد) ہر جنین کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، بعض پہلے گر جاتے ہیں بعض کی تخلیق مکمل ہوتی ہے اور وہ زندہ پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا: مَا نَشَآءُ، مَنْ نشاء نہیں فرمایا، کیونکہ اس کا مرجع حمل ہے یعنی ہم ارحام میں ٹھہراتے ہیں حمل میں سے اور مضغہ میں سے۔ چونکہ یہ جماد ہیں اس لیے انہیں لفظ ما سے تعبیر فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 11** ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا، یعنی اطفالاً، طفلاً اسم جنس ہے نیز عرب کبھی جمع کو واحد کے اسم سے بیان کرتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

یَلْحَیْنَنِی فی حبها ویَلُمْنَنِی إنّ العواذل لیس لی بأمیر

شاعر نے امراء نہیں کہا۔ مبرد نے کہا: یہ وہ اسم ہے جو مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (النور: 31) طبری نے کہا: اس کو نصب تمیز کی بنا پر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا (النساء: 4)

بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم تم میں سے ہر ایک کو طفل نکالیں گے اور طفل کا اطلاق ماں سے جدا ہونے کے وقت سے بلوغت تک ہوتا ہے۔ ہر وحشی جانور کے بچے کو بھی طفل کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: جاریة طفل و جاریتان طفل و جوار طفل۔ غلام طفل و غلمان طفل اور طفل و طفلة و طفلان و طفلتان و أطفال بھی بولا جاتا ہے۔ طفلات نہیں بولا جاتا۔ أطفلتِ المرأۃ کہا جاتا ہے۔ جب اولا د والی ہو جائے۔ المطفل اس ہرنی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ بچے ہوں۔ یہ وہ ہوتی ہے جس کے ابھی ابھی بچے پیدا ہوئے ہوں۔ اسی طرح اونٹنی کو کہا جاتا ہے اور اس کی جمع مطافل اور مطافیل ہے۔ الطفل طاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو نرم و ملائم کو کہتے ہیں۔ جاریة طفلة ملائم بچی۔ بنان طفل نرم و ملائم پورے۔ وقد طفلَ اللیل بولا جاتا ہے: جب رات کی تاریکی آ جائے۔ الطَّفل عصر کے بعد کے وقت کو کہتے ہیں جب سورج غروب ہونے کے

1۔ معرفۃ علوم الحدیث، صفحہ 186

قریب پہنچ جائے۔ الطّفل بارش کو بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

لِوَھْدٍ جادہ طَفَلُ الثُّرَیا

ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ بعض نے فرمایا: ثم زائدہ ہے جس طرح: حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) میں واؤ زائدہ ہے۔ ثم حروف نسق میں سے ہے جس طرح واؤ حروف نسق میں سے ہے۔ اَشُدَّكُمْ تمہاری عقول کا کمال اور تمہاری قوت کی انتہا۔ اس کا بیان سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ اَرْذَلِ الْعُمُرِ سے مراد گھٹیا اور بیکار عمر ہے۔ اور وہ بڑھاپے کا زمانہ ہے حتی کہ انسان کچھ سمجھتا نہیں؛ اسی وجہ سے فرمایا: لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا، جیسا کہ سورۂ یٰسین میں فرمایا: وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ (یٰسین: 68)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے تھے: اللهم إني أعوذ بك من البخل وأعوذ بك من الجبن وأعوذ بك ان أرد إلى أرذل العمر وأعوذ بك من فتنة الدنيا وعذاب القبر (1)

میں تیری پناہ چاہتا ہوں بخل سے اور تیری ہی پناہ چاہتا ہوں بزدلی سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں ارذل العمر (نکمی عمر) سے اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں دنیا کے فتنہ سے اور عذاب قبر سے۔

اس حدیث کو نسائی نے حضرت سعد سے روایت کیا ہے فرمایا حضرت سعد اپنے بیٹوں کو یہ کلمات اس طرح سکھاتے تھے جس طرح معلم بچوں کو سکھاتا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ النحل میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً۔ دوبارہ زندہ کرنے پر قوی دلیل ذکر کی۔ پہلے فرمایا: فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ تمہیں مٹی سے پیدا کیا تمام کو خطاب فرمایا۔ دوسری دلیل میں فرمایا: وَ تَرَى الْاَرْضَ، ایک فرد کو خطاب فرمایا۔ لفظ، لفظ سے جدا ہو گیا۔ لیکن قیامت کے وقوع کے منکر پر حجت قائم کرنے کے اعتبار سے معنی متصل ہے۔ ھامدۃ خشک زمین جو کچھ نہ اُگائے؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی دارسۃ ہے اور الهمود، الدروس کو کہتے ہیں یعنی پرانی زمین یا پرانا راستہ۔ شاعر نے کہا:

قالت قُتَيلَةُ ما لجسمك شاحِبًا وأرى ثيابك باليات هُمَّدًا

ہروی نے ھامدۃ کا معنی خشک مٹی والی زمین کیا ہے۔ شمر نے کہا کہا جاتا ہے: همد شجر الأرض جب زمین سے درخت ختم ہو جائے اور بوسیدہ ہو جائے۔ همدت أصواتهم جب آوازیں خاموش ہو جائیں۔ همود الأرض اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں نہ حیات ہو نہ کوئی نبات ہو نہ کوئی لکڑی ہو اور نہ اس پر بارش ہو۔ حدیث شریف میں ہے: حتی کاد یھمد من الجوع (2) قریب تھا کہ وہ بھوک سے ہلاک ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے: همد الثوب يهمد جب کپڑا پرانا ہو جائے۔ وھمدت النار تھمد آگ کا بجھ جانا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ، اهتزت کا معنی ہے حرکت کرنا۔ الاهتزاز حرکت کی شدت کو کہتے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1585

2۔ الفائق زمخشری، جلد 2، صفحہ 20

ہیں۔ ھززت الشئ فاھتز میں نے چیز کو حرکت دی تو وہ حرکت کرنے لگی۔ ھزّ الحادی الإبل ھزیزاً فاھتزت، حدی خوان نے اونٹوں کو اپنی حدی خوانی کے ساتھ حرکت دی۔ إھتزالکواکب فی إنقضاضہ۔ ستارے نے ٹوٹنے میں حرکت کی۔ کوکب ھاز، حرکت کرنے والا ستارہ۔ الأرض تھتز بالنبات زمین نباتات کے ساتھ حرکت کرنے لگی کیونکہ نباتات زمین سے نہیں نکلتیں حتی کہ بعض، بعض کو خفی سے ازالہ کے ساتھ زائل کر دیتی ہیں۔ اس کو مجازاً اھتزاز کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: اھتز نباتھا اس کی فصل حرکت کرنے لگی۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ إھتزازہ اس کی حرکت کا شدید ہونا؛ شاعر نے کہا:

تَثَنّٰی إذا قامت وتھتز إن مشت کما اھتز غصن البان فی ورق خُضْر

الاھتزاز فی النبات زمین میں فصل کا لہلہانا۔ وَ رَبَتْ بلند ہوئی اور بڑھی۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے پھول گئی۔ مفہوم ایک ہی ہے اصل مفہوم زیادہ ہونا ہے۔ ربا الشی یربو ربواً جب کوئی چیز زائد ہو جائے۔ اسی سے الربا اور الربوۃ ہے۔ یزید بن قعقاع اور خالد بن الیاس نے وَرَبَأَتْ پڑھا ہے یعنی وہ بلند ہوئی حتی کہ معزز چیز کے قائم مقام ہوگئی۔ جس چیز کی قوم شرف کی وجہ سے حفاظت کرتی ہے۔ فھو رابی و ربیئۃ یہ مبالغہ کی بناء پر ہے۔ امرء القیس نے کہا:

بَعَثْنَا ربیئًا قبل ذاك مُخَمَّلًا کذئب الغضایمشی الضَّراء وَیَتَّقِی

وَ اَنۡۢبَتَتۡ یعنی نکالی۔ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ ہر رنگ سے۔ بَهِيۡجٍ خوبصورت، یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یعنی جو اسے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے۔ البھجۃ کا معنی حسن۔ کہا جاتا ہے: رجل ذو بھجۃ قد بُھج، بھاجۃ وبھجۃ فھو بھیج۔ أبھجنی کا معنی اس کے حسن نے مجھے تعجب میں ڈالا۔ جب زمین کا انبت کے ساتھ وصف بیان کیا گیا تو یہ دلیل ہے کہ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ کا تعلق بھی زمین کے ساتھ ہے، نبات کے ساتھ نہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَـقُّ وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۙ‏ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ ۝

''یہ (رنگا رنگیاں اس کی دلیل ہیں) کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے اور وہی زندہ کرتا ہے مردوں کو اور بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شک نہیں اور اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائے گا ان (مردوں) کو جو قبروں میں ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَـقُّ جب اللہ تعالیٰ نے يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ سے لیکر بَهِيۡجٍ ۝ تک یہ ذکر فرمایا کہ موجودات اللہ کی محتاج ہیں اور ان کی تسخیر اس کے اقتدار و اختیار سے ہے تو بعد میں فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَـقُّ وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۙ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ ۝ تو اس سے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام چیزیں اگرچہ یقیناً موجود ہیں لیکن ان کی حقیقت نہیں ہے کیونکہ وہ مسخر کی گئی ہے اور ان میں تصرف کیا گیا ہے۔ الحق الحقیقی موجود مطلق ہے اور غنی مطلق ہے، ہر ذی وجود کا وجود اس کے وجود کے وجوب سے ہے، اسی وجہ سے سورہ کے آخر میں فرمایا: وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ (الحج: 62) اور الحق وہ

موجود ثابت ہے جس میں تغیر اور زوال نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسکا مطلب ہے وہ اپنے بندوں پر حق والا ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ اپنے افعال میں حق ہے۔ زجاج نے کہا: ذٰلِكَ محل رفع میں ہے یعنی وہ معاملہ جو تم سے بیان کیا گیا ہے۔ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ ذالک منصوب ہو یعنی فعل اللہ ذالک بانہ ھو الحق۔ اللہ نے یہ کیا کیونکہ وہ حق ہے وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰى اس سے پہلے باء حرف جر محذوف ہے یعنی بانہ ہے۔ وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی وہ جو ارادہ کرتا ہے اس پر قادر ہے۔ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اس کا عطف ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ پر لفظ کے اعتبار ہے، معنی کے اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: فعل اللہ ما ذکر بان الساعۃ آتیۃ بلکہ فعل اضمار ضروری ہے جیسے ولیعلموا ان الساعۃ آتیۃ تا کہ وہ جان لیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ لَّا رَیْبَ فِیْهَا اس میں کوئی شک نہیں۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ۝ ثواب وعقاب کے لیے اللہ تعالیٰ قبور میں موجود لوگوں کو اٹھائے گا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ۝ ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ نُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۝

''اور انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے (تکبر سے) گردن مروڑتے ہوئے تا کہ بہکا دے (دوسروں کو بھی) اللہ تعالیٰ کی راہ سے اس کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ہم چکھائیں گے اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب، (اس روز اسے بتایا جائے گا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ۝ یعنی روشن کتاب، حجت کو بیان کرنے والی۔ یہ نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض نے کہا: ابوجہل بن ہشام کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ زیادہ یہ ہے کہ نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ پہلی آیت تھی۔ یہ دونوں آیات ایک فریق کے بارے میں اور تکرار مذمت میں مبالغہ کے لیے ہیں جیسے تو کسی کو مذمت اور توبیخ کرتے ہوئے کہتا ہے: أنت فعلت ھذا، أنت فعلت ھذا تو نے یہ کیا ہے؟ تکرار اس لیے جائز ہے کیونکہ ہر آیت میں زیادتی کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا گویا فرمایا: نضر بن حارث اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے جھگڑتا ہے اور سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے۔ اور نضر بن حارث اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے جھگڑتا ہے اور بغیر ہدایت اور کتاب منیر کے جھگڑتا ہے تا کہ دوسروں کو بھی راہ راست سے بھٹکائے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: زید شتمنی وزید یضربنی یہ تکرار مفید ہے؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: نضر بن حارث کے بارے میں دس سے زائد آیات نازل ہوئیں پہلی آیت سے

مراد اس کا قیامت کا انکار کرنا ہے۔ دوسری سے اس کا نبوت کا انکار کرنا ہے اور قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کا انکار کرنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نضر بن حارث کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا ہے۔ اور من محل رفع میں مبتدا ہے اور اس کی خبر وَمِنَ النَّاسِ ہے۔ ثَانِيَ عِطْفِهٖ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ اس کی دو معانی پر تاویل کی جاتی ہے۔ (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد نضر بن حارث ہے اس نے اپنی گردن کو غرور اور تکبر سے مروڑا۔ اور دوسرا معنی۔ یہ فراء کا قول ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے کہ لوگوں میں سے جو بغیر علم کے اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے ذکر سے اعراض کرتے ہوئے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: کفر کی بنا پر اپنی گردن کو مروڑتے ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کفر کی بنا پر جس کی طرف بلایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہوئے۔ مفہوم تمام اقوال کا ایک ہی ہے۔ اوزاعی نے مخلد بن حسین سے انہوں نے ہشام بن حسان سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول ثَانِيَ عِطْفِهٖ۔ الخ کے بارے میں فرمایا: وہ صاحب بدعت ہے۔ مبرد نے کہا: العطف کا معنی گردن مروڑنا ہے۔ مفضل نے کہا: العطف کا معنی پہلو ہے، اسی سے عربوں کا قول ہے: فلان ينظر في أعطافه یعنی فلاں اپنے پہلوؤں کی طرف دیکھتا ہے۔ عطفا الرجل سے مراد سر سے لیکر سرین تک کا حصہ ہے۔ اسی طرح عطفا كل شئ ہر چیز کی دونوں اطراف۔ کہا جاتا ہے: ثنى فلان عنى عطفه جب کوئی تجھ سے اعراض کرلے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جھگڑے میں حق سے اعراض کرنے والا ہے، کلام میں غور و فکر سے منہ موڑنے والا ہے۔ یہ اس قول کی طرح ہے: وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (لقمان: 7) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ (المنافقون: 5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ (الاسراء: 83) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ (القیامہ) لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے گمراہ کرتا ہے۔ اس کو لیضل یاء کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور لام عاقبت کے لیے ہے، یعنی وہ جھگڑتا ہے تاکہ (بالآخر) گمراہ ہو جائے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) پس وہ ان کے لیے اسی طرح ہوا اس کی مثال یہ ہے: اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا (الروم) لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ یعنی قیامت تک مومنین کی زبانوں پر اس کا ذکر قبیح جاری رہے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ (القلم) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ (لہب) بعض علماء نے فرمایا: یہاں الخزی سے مراد قتل کرنا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن نضر بن حارث کو روک کر قتل کر دیا تھا، جیسا کہ سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔ وَنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ یعنی ہم اسے جہنم کی آگ کا مزہ چکھائیں گے۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ یہ اسے کہا جائے گا جب وہ آگ میں داخل ہوگا: یہ عذاب ہے اس کا جو تیرے ہاتھوں نے کفر اور معاصی سے آگے بھیجا۔ تمام اعضاء کی جگہ ید (ہاتھ) کا ذکر کیا کیونکہ ہاتھ کے ساتھ عمل کرتا ہے اور پکڑتا ہے۔

**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾**

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے، اس شخص نے برباد کر دی اپنی دنیا اور آخرت، یہی تو کھلا ہوا خسارہ ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ، مَنۡ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور تمام اِنۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ پر ہے۔ جمہور کی قرأت پر یہ آیت منافقین کے بارے میں خبر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد شیبہ بن ربیعہ ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ سے پہلے اسلام لایا تھا جب آپ اس کے پاس آئے تو وہ مرتد ہو گیا۔ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: یہود میں سے ایک شخص نے اسلام قبول کیا تو اس کی نظر اور اس کا مال چلا گیا اس نے اسلام سے بری فال پکڑی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: مجھے میری بیعت واپس کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کے بارے ایسا نہیں کہا جاتا''۔ اس نے کہا مجھے اپنے دین میں خیر نہیں پہنچی میری آنکھیں، میرا مال اور میری اولاد بھی چلی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے یہودی! اسلام مردوں کو پگھلا دیتا ہے جس طرح آگ لوہے، چاندی اور سونے کے کھوٹ کو پگھلا دیتی ہے''(1)۔ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ۔ اسرائیل نے ابوحصین سے اس نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ اگر کوئی شخص مدینہ طیبہ آتا تھا اگر اس کی بیوی بچہ جنم دیتی اور اس کی گھوڑیاں بھی بچے جنم دیتیں تو کہتا: یہ صالح دین ہے۔ اگر اس کی بیوی بچہ جنم نہ دیتی اور گھوڑیاں بچے جنم نہ دیتیں تو وہ کہتا: یہ اچھا دین نہیں ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں: یہ ان بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور اسلام قبول کر لیتے اگر وہ خوشحالی پاتے تو اسلام پر قائم رہتے اگر انہیں شدت لاحق ہوتی تو مرتد ہو جاتے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن زید وغیرہ نے کہا: یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ عَلٰى حَرۡفٍ کا معنی ہے علی شك؛ یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت میں کمزوری پر ہے جیسے وہ شخص کمزور ہوتا ہے جو ایک کنارے پر ہوتا ہے جس میں اسے اضطراب ہوتا ہے ہر چیز کی طرف کنارے اور حد کو حرف کہتے ہیں۔ اسی سے حرف الجبل پہاڑ کا اوپر کا حصہ۔ بعض نے کہا: عَلٰى حَرۡفٍ کا مطلب ہے وہ ایک وجہ پر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ خوشحالی میں عبادت کرتا ہے اور پریشانی میں عبادت نہیں کرتا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خوشحالی پر شکر اور تکلیف پر صبر کی بناء پر کرتے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک وجہ پر عبادت کرنے والے ہوتے۔ بعض نے کہا: عَلٰى حَرۡفٍ کا مطلب ہے وہ کسی شرط پر عبادت نہیں کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے غلبہ سے پہلے شیبہ بن ربیعہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میرے لیے آپ اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ مجھے مال، اونٹ، گھوڑے اور اولاد عطا فرمائے حتی کہ میں تجھ پر ایمان لاؤں اور آپ کے دین کی طرف مائل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا ہی رزق عطا کیا جتنی اس کی خواہش تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آزمانے کا ارادہ کیا

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 317

حالانکہ وہ آئندہ کے حالات بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا رزق واپس لے لیا تو وہ اسلام سے مرتد ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ مراد شرط ہے یعنی وہ خوشی کی شرط پر عبادت کرتا ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد وہ منافق ہے جو زبان سے عبادت کرتا ہے اور دل سے عبادت نہیں کرتا۔ پس جو ایسی حالت میں عبادت کرتا ہے وہ کلیۃً اسلام میں داخل نہیں ہوتا۔ اسی بات کو آگے قرآن نے خود بیان فرمایا: فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اگر اسے جسم کی صحت، معیشت میں خوشحالی ملتی ہے تو خوش ہوتا ہے اور دین پر قائم رہتا ہے۔ اگر اسے آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور پھر کفر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ مجاہد، حمید بن قیس، اعرج، زہری، ابن ابی اسحاق اور یعقوب سے بھی مروی ہے: خاسر الدنیا الف کے ساتھ۔ اس کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ اس صورت میں عَلٰى وَجْهِهٖ پر وقف نہ ہوگا۔ دنیا میں اس کے خسارہ کا مطلب یہ ہے کہ غنیمت اور ثنا میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور آخرت میں اس کے لیے کوئی ثواب نہیں ہوگا۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝

''وہ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ ضرر پہنچا سکتا ہے اسے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے اسے، یہی تو انتہائی گمراہی ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی وہ جو کفر کی طرف لوٹتا ہے اس بت کی عبادت کرتا ہے جو نہ نفع دیتا ہے اور نہ نقصان دیتا ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ فراء نے کہا: بعید سے مراد طول ہے۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝

''وہ پوجتا ہے اسے جس کی ضرر رسانی زیادہ قریب ہے اس کی نفع رسانی سے، یہ بہت برا دوست ہے اور بہت برا ساتھی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ یہ ہے وہ جو دین سے منہ موڑ دیتا ہے اس کی عبادت کرتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے یعنی آخرت میں کیونکہ وہ اس کی عبادت کی وجہ سے آگ میں داخل ہوگا جبکہ اس نے اس بت سے کبھی نفع دیکھا ہی نہیں لیکن فرمایا: ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ تو یہ کلام کی ترفیع کے لیے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سبا) بعض علماء نے فرمایا: وہ ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں اس خیال سے کہ وہ ان کے لیے کل سفارش کریں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:18)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:3) فراء، کسائی اور زجاج نے کہا: کلام کا معنی قسم اور تاخیر ہے یعنی وہ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قسم! اس کی جس کا نقصان اس کے نفع سے کم ہے۔ لام غیر مقام میں مقدم ہے اور من، یدعو کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور لام جواب قسم ہے اور ضرہ مبتدا ہے اور اقرب خبر ہے۔ لام کی تاخیر کو نحاس نے

ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا: لام کے لیے ایسا تصرف نہیں ہے جو اس کا موجب ہو کہ اس میں تقدیم ہے اور تاخیر نہیں۔

میں کہتا ہوں: کلام کا حق تقدیم ہے کبھی مؤخر کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

خالِی لأنت ومَن جَرِیرٌ خالُه ینلِ العَلَاء ویُکرِم الأخوالا

یعنی لخالی انت یہ پہلے گزر چکا ہے۔ نحاس نے کہا: ہمیں علی بن سلیمان نے محمد بن یزید سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: کلام میں حذف ہے۔ اس کا معنی ہے وہ عبادت کرتا ہے ایسے معبود کی جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ نحاس نے کہا: میرا خیال ہے یہ قول محمد بن یزید کی طرف غلط منسوب ہے کیونکہ اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ جو لام کے بعد ہے وہ مبتدا ہے پس الہ کو نصب دینا جائز نہیں اور محمد بن یزید کا مذہب میں خیال نہیں کرتا مگر اخفش کا قول ہے۔ اور میرے نزدیک سب سے بہتر قول جو اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یدعو بمعنی یقول ہے اور من مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اس کا معنی ہے یقول لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ الٰهه یعنی وہ اسے اپنا معبود کہتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔

میں کہتا ہوں یہ قول قشیری نے زجاج اور مہدوی نے اخفش سے روایت کیا ہے اور اس کے اعراب کو مکمل کیا ہے۔ فرمایا: یدعو بمعنی یقول ہے اور من مبتدا ہے اور ضرہ دوسرا مبتدا ہے اور اقرب اس کی خبر ہے اور جملہ من کا صلہ ہے اور من کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: یقول لمن ضرہ اقرب من نفعہ الٰھہ اس کی مثال عنترہ کا قول ہے:

یدعون عَنْتَرَ والرِّماحُ کأنها أشطانُ بئرٍ فی لَبانِ الأدهَم

قشیری نے کہا: وہ کافر جو بت کے بارے میں کہتا ہے کہ میرا معبود ہے وہ نہیں کہتا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ کافر اس کو اپنا معبود اور الٰہ کہتا ہے۔ مسلمانوں کے قول میں اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ (الزخرف: 49) یعنی اے ساحر! ان لوگوں کے نزدیک جو تجھے ساحر پکارتے ہیں۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یدعو حال ہو اور اس میں ضمیر محذوف ہو یعنی ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ یدعوہ یعنی اس کے اسے پکارنے کی حالت میں۔ یدعو میں ضمیر مضمر ہے اور اس بنا پر یدعو پر وقف ہوگا اور لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ نئی کلام مرفوع مبتدا ہوگی اور اس کی خبر لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ہوگی یہ اس لیے کیونکہ لام قسم اور تاکید کے لیے ہے۔ اسے کلام کا آغاز بنایا۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ ذالک بمعنی الذی ہو اور اس پر یدعو واقع ہے اس لیے محل نصب میں ہو، یعنی الذی ھو فی الضلال البعید یدعو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰى (طٰہٰ) یعنی ما الذی پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَمَنْ ضَرُّهٗۤ مبتدا ہے اور لَبِئْسَ الْمَوْلٰى مبتدا کی خبر ہے اس بنا پر آیت کی تقدیر اس طرح ہوگی یدعو الذی ھو الضلال البعید مفعول کو مقدم کیا گیا اور وہ الذی ہے جیسے تو کہتا ہے: زیداً یضرب۔ ابوعلی نے اس کو عمدہ خیال کیا ہے۔ زجاج کا خیال ہے کہ نحویوں نے اس قول سے غفلت کی ہے اور یہ شعر پڑھا ہے:

عَدَسْ مالِعِبَّادٍ علیك إمارةٌ نَجَوتِ وهذا تَحْمِلِینَ طَلِیق

هذا بمعنی الذی ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یدعوا اپنے ماقبل پر اس فعل کی تکثیر کی جہت پر مکرر ہو جو دعا ہے اور اس کو متعدی نہیں کیا گیا کیونکہ پہلے متعدی تھا یعنی یدعو من دون الله مالا ینفعه ولا یضرہ یدعو جیسے ضربت زیداً ضربت پھر پہلی یدعو پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے یدعو کو حذف کر دیا گیا۔ فراء نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ لمن ضرہ کلام کے کسرہ کے ساتھ ہو یعنی یدعو الی من ضرہ أقرب من نفعه۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۞ (الزلزال) یہاں بھی لہا بمعنی الیہا، فراء اور قفال نے کہا: لام صلہ ہے یعنی یدعو من ضرہ أقرب من نفعه، یدعو بمعنی یعبد ہے اسی طرح حضرت عبدالله بن مسعود کی قرأت میں ہے لَبِئْسَ الْمَوْلٰى برا مدد گار، وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ، العشیر بمعنی معاشہ صاحب، دوست۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد بت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۞

”بیشک الله تعالیٰ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں، بیشک الله تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جب مشرکین، منافقین اور شیاطین کا ذکر کیا تو مومنوں کی آخرت کا حال بیان کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۞ جسے چاہتا ہے ثواب دیتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ الله تعالیٰ کے سچے وعدہ اور اس کے فضل سے مومنین کے لیے جنت ہے اور اس کے عدل کی بنا پر کافروں کے لیے دوزخ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ الله تعالیٰ کا فضل بندے کے فعل کے ساتھ معلل ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۞

”اور جو شخص یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ الله تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال کر) اسے کاٹ دے پھر دیکھے آیا دور کر دیا اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس میں بہتر قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ الله تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کرے گا تو وہ اس نصرت کو کاٹ دے جو اسے دی گئی ہے۔ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ یعنی اسے حیلہ تلاش کرنا چاہیے جو اسے آسمان کی طرف لے جائے۔ ثُمَّ لْيَقْطَعْ پھر اسے اس نصرت کو کاٹ دینا چاہیے اگر اس کے لیے ممکن ہو۔ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ پھر وہ دیکھے کہ اس کی تدبیر اس کے اس غم و غصہ کو دور کرتی ہے جو اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی وجہ سے ہے۔ اس کلام کا فائدہ یہ

ہے کہ تدبیر اور حیلہ اس کے لیے ممکن نہیں بنا تا کہ وہ ایسا کر سکے تو وہ نصرت کو ختم کرنے تک بھی نہیں پہنچے گا۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یَّنْصُرَهُ اللّٰهُ میں ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر چہ پہلے ذکر نہیں ہے لیکن پوری کلام اس پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ ایمان، اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے اور دین سے پھرنا اس دین سے پھرنا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے ہیں یعنی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کرنے والوں اور کنارے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں سے یہ گمان کرتا ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کریں گے تو اسے ایسا ایسا کرنا چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ ضمیر کا مرجع مَنْ ہے مفہوم یہ ہوگا کہ جو گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے رزق نہیں دے گا اسے چاہیے کہ پھانسی پر لٹک جائے اور اپنے آپ کو قتل کر دے کیونکہ اس زندگی میں کوئی بھلائی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے خالی ہو۔ اس قول کی بنا پر نصرت سے مراد رزق ہوگا۔ عرب کہتے ہیں: من ینصرنی نصرہ اللہ یعنی جو مجھے عطا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے گا؛ اسی سے عربوں کا قول ہے أرض منصورۃ ایسی زمین جس پر بارش ہو؛ فقعسی نے کہا:

وانك لا تعطى أمرأ فوق حقه　　ولا تملك الشق الذی الغيث ناصره

اسی طرح ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ یعنی وہ اسے ہرگز رزق نہیں دے گا؛ ابو عبیدہ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا: ضمیر کا مرجع دین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد نہیں کرے گا۔ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ، السبب سے مراد رسی ہے۔ السبب وہ جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جائے۔ اِلَى السَّمَآءِ گھر کی چھت کی طرف۔ ابن زید نے کہا: السَّمَآءِ سے مراد آسمان معروفہ ہے۔ کوفیوں نے ثُمَّ لْيَقْطَعْ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عربی میں بعید ہے کیونکہ ثم واو اور فاء کی طرح نہیں کیونکہ اس پر وقف کیا جاتا ہے۔ اور یہ علیحدہ ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ کی قرات میں فليقطعه ثم لينظر هل يذهبن كيده مايغيظ۔ بعض علماء نے کہا: ما بمعنی الذی ہے یعنی هل يذهبن كيده الذی يغيظه ضمیر کو تخفیف کی خاطر حذف کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا: ما مصدریہ ہے یعنی هل يذهبن كيده غيظه کیا اس کی تدبیر غصہ کو ختم کر دے گی۔

## وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝

''اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اس کتاب کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ یعنی و کذالك أن اللہ اسی طرح اللہ تعالیٰ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ ہدایت کے وجود کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے معلق کیا گیا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والا ہے، اس کے سوا حقیقۃً کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

## اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـِٕيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

''بیشک اہل ایمان یہودی، ستارہ پرست، عیسائی، آتش پرست اور مشرک ضرور فیصلہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ ان سب (گروہوں) کے درمیان قیامت کے دن بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی جو اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ وَالَّذِیْنَ هَادُوْا اس سے مراد یہود ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملت کی طرف منسوب ہیں۔ الصّٰبِـِٕیْنَ وہ لوگ جو ستاروں کی پوجا کرتے ہیں۔ النَّصٰرٰی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملت کی طرف منسوب ہیں۔ الْمَجُوْسَ آگ کی پوجا کرنے والے، جو کہتے ہیں عالم کی دو اصل ہیں نور اور ظلمت۔ قتادہ نے کہا: ادیان پانچ ہیں۔ چار شیطان کے لیے ہیں اور ایک رحمن کے لیے ہے۔ بعض علماء نے کہا: مجوس اصل میں نجوس ہیں کیونکہ نجاستوں کے استعمال کرنے کو دین کہتے ہیں۔ نون اور میم ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں جیسے الغیم، الغین، الایم، الاین اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا اس سے مراد عرب کے بت پرست ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا کافروں کے لیے آگ ہوگی اور مومنین کے لیے جنت ہوگی۔ بعض نے فرمایا: فیصلہ یہ ہوگا کہ حق والے اور باطل والے کو ضروری معرفت عطا فرمائے گا۔ آج غور و فکر سے حق والا، باطل والے سے جدا ہو جائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ۝ وہ اپنی مخلوق کے اعمال، حرکات اور اقوال کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ پاک ہے وہ ذات اور اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ، اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں جو ان ہے اس کی خبر ہے جیسے تو کہتا ہے: انَّ زیداً أن الخیر عندہ۔ فراء نے کہا: کلام میں ان زیداً أن اخاہ منطلق جائز نہیں اور اس کا خیال ہے کہ آیت میں یہ جائز ہے کیونکہ کلام میں مجازات کا معنی ہے یعنی جو ایمان لایا اور یہود بنا یا نصرانی بنا یا صابی بنا ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ابو اسحاق نے فراء کے اس قول کو رد کیا ہے اور قبیح کہا ہے۔ اس قول کو کہ إن زیداً أن أخاہ منطلق جائز نہیں فرمایا۔ زید اور الذین کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ان مبتدا پر داخل ہوتا ہے۔ پس تو کہتا ہے: إن زیداً ھو منطلق پھر تو ان کو لاتا ہے اور کہتا ہے: إنّ زیداً أنہ منطلق۔

إنّ الخلیفۃ إن اللہ سَرْبَلہ سِربال عِزِّہ تُرْجیٰ الخواتیم

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝۱۸

''کیا تم ملاحظہ نہیں کر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب، مہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے، اور (دیکھو) جس کو ذلیل کر دے اللہ تعالیٰ تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اس رویت سے مراد دل کی رویت ہے یعنی آپ نے اپنے دل اور عقل سے ملاحظہ نہیں کیا۔ السجود کا معنی سورۂ بقرہ میں اور جماد کے سجدہ کرنے کا ذکر سورۃ النحل میں گزر چکا ہے۔ وَالشَّمْسُ، من پر معطوف ہے اسی طرح وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ بھی معطوف ہے پھر فرمایا: وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ یہ اعراب میں مشکل ہے۔ نصب نہیں دیا تاکہ جس میں فعل عامل ہو وہ اس پر معطوف ہو جائے جس میں فعل عامل ہو جیسے: وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (الدہر)

کسائی اور فراء کا خیال ہے کہ اگر نصب دی جاتی تو بہتر ہوتا لیکن رفع اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے بہت سے لوگوں نے سجدہ کرنے کا انکار کیا۔ پس یہ مبتدا، خبر ہوں گے۔ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ کے قول پر کلام مکمل ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ معطوف ہو، اس بنا پر کہ السجود سے مراد ضعف، قوت، صحت، سقم، حسن اور قبیح میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے سامنے تذلل اور انقیاد ہے۔ اس میں ہر چیز داخل ہے اور اس تقدیر پر نصب دینا جائز ہے۔ اھان کثیرا حق علیہ العذاب۔ بعض نے فرمایا: والدواب کے قول پر کلام مکمل ہوئی۔ نئی کلام شروع ہوئی اور فرمایا: وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ بہت سے لوگ جنت میں ہوں گے اور بہت سے لوگوں پر عذاب ثابت ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اس کا معنی ہے کثیر لوگ جنت میں ہوں گے اور بہت سے لوگوں پر عذاب ثابت ہوگا۔ یہ ابن انباری نے ذکر کیا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: آسمانوں میں ستارہ، چاند، سورج نہیں ہے مگر وہ غائب ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہے پھر وہ واپس نہیں لوٹتا حتی کہ اسے اذن دیا جاتا ہے پس وہ اپنے مطلع سے پھر لوٹتا ہے۔ قشیری نے کہا: سورج کے حق میں سجدہ کرنا مسند کی خبر میں وارد ہے او ر یہ حقیقی سجدہ ہے اور اس کی ضرورت سے ہے کہ سجدہ کرنے والے میں عقل اور حیات ہو۔

میں کہتا ہوں: مسند حدیث وہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ امام مسلم نے نقل کی ہے۔ وہ سورہ یٰسین میں وَ الشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (یٰسین: 38) کے تحت آئے گی۔ اور سجود کا معنی سورۂ بقرہ میں لغۃ اور معنی بیان ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ شقاوت اور کفر کے ساتھ ذلیل کرتا ہے اس سے کوئی ذلت کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی توہین کی وہ آگ کی طرف گیا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ ان کو آگ پہنچنے میں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اخفش، کسائی اور فراء نے حکایات کیا ہے۔ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ یعنی اس کے لیے کوئی اکرام نہیں۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ؗ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ۝ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝

"یہ دو فریق ہیں جو جھگڑ رہے ہیں اپنے رب کے بارے میں تو وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا تیار کر دیے گئے ہیں ان کے لیے کپڑے آتش (جہنم) سے انڈیلا جائے گا، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی گل جائے گا اس

کھولتے ہوئے پانی سے جو کچھ ان کے شکموں میں ہے اور ان کی چمڑیاں بھی گل جائیں گی اور ان (کو مارنے) کے لیے گرز ہوں گے لوہے کے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ امام مسلم نے حضرت قیس بن عباد سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے حضرت ابوذر کو قسم اٹھا کر یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ آیت هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے بدر میں ایک دوسرے کو للکارا تھا (مسلمانوں میں سے) حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم اور (کفار میں سے) عتبہ، شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے اور ولید بن عتبہ۔ اس حدیث سے امام مسلم نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ تینوں آیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں اور (چھ افراد کے بارے میں نازل ہوئیں) تین کا تعلق مسلمانوں سے تھا اور تین کا تعلق کافروں سے تھا اور ان کے نام بھی ذکر کیے جس طرح حضرت ابوذر نے ذکر کیے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں پہلا شخص ہوں گا جو قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں جھگڑنے کے لیے گھٹنوں کے بل کھڑا ہوں گا ان کی مراد ان کا اور ان کے ساتھیوں کی مبارزت کا واقعہ ہے۔ اس کو امام بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اس قول کی طرف ہلال بن یساف اور عطاء بن یسار وغیرہما گئے ہیں۔ عکرمہ نے کہا: الخصمان سے مراد جنت اور دوزخ ہیں انہوں نے آپس میں جھگڑا کیا۔ آگ نے کہا: اس نے مجھے سزا کے لیے پیدا کیا اور جنت نے کہا: اس نے مجھے اپنی رحمت کے لیے پیدا کیا۔

میں کہتا ہوں: جنت اور دوزخ کا جھگڑا حضرت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وارد ہے، فرماتے ہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت اور دوزخ کا جھگڑا ہوا تو آگ نے کہا: میرے اندر جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر ضعیف اور کمزور لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو فرمایا: تو میرا عذاب ہے میں جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ عذاب دوں گا اور جنت کو فرمایا: تو میری رحمت ہے میں جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ رحم کروں گا، تم میں سے ہر ایک نے بھرنا ہے"(2)۔ اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فرمایا: کہ وہ اہل کتاب ہیں جنہوں نے مومنین کو کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں اور تم سے پہلے ہمیں کتاب ملی تھی اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے ہیں۔ مومنوں نے کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور ہم تمہارے نبی پر بھی ایمان لائے اور اس پر ایمان لائے جو ان پر کتاب نازل ہوئی۔ اور تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جانتے ہو اور تم نے اسے چھوڑ دیا اور حسد کی وجہ سے تم نے اس کا انکار کیا۔ یہ ان کی خصومت ہے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ پہلا قول اصح ہے جس کو امام بخاری نے حجاج بن منہال سے انہوں نے ہشیم سے انہوں نے ہاشم سے انہوں نے ابومجلز سے انہوں نے قیس بن عباد سے انہوں نے حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی قولہ تعالٰی ھذان خصمان، حدیث نمبر 5412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، باب ما جاء فی احتجاج الجنۃ والنار، حدیث 2484

ابوذر سے روایت کی ہے اور امام مسلم نے عمرو بن زرارہ سے انہوں نے ہشیم بن عباد سے انہوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے فرمایا: یہ آیت ہمارے متعلق اور ہماری بدر کے دن کی مبارزت کے بارے میں نازل ہوئی۔ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ ۔۔ الخ، ابن کثیر نے هٰذٰنِ خَصْمٰنِ میں ھذان کونون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے خصمان کی تفسیر میں کہا کہ یہ دو مختلف دینوں والے تھے۔ ایک گروہ مسلمانوں میں سے تھا اور دوسرا یہود و نصاریٰ میں سے تھا۔ وہ اپنے رب کے دین کے بارے میں جھگڑے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اخْتَصَمُوْا کیونکہ وہ بہت سے تھے۔ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ اختصما فرماتے تو بھی جائز تھا۔ نحاس نے کہا: یہ ایسے شخص کی تاویل ہے جس کے لیے نہ حدیث سے روایت ہے نہ اہل تفسیر سے کوئی نقل ہے، کیونکہ اس آیت کے بارے میں حدیث مشہور ہے اس کو سفیان ثوری وغیرہ نے ابو ہاشم سے انہوں نے ابو مجلز سے انہوں نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابوذر کو قسم اٹھا کر یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ آیت حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب اور عتبہ، شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے اور ولید بن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابو عمرو بن علاء نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں چوتھا قول یہ ہے کہ وہ تمام مومنین تھے اور تمام کافر تھے خواہ ان کا تعلق کسی بھی ملت سے ہو؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حسن، عطاء بن ابی رباح اور عاصم بن ابی النجود اور کلبی کا قول ہے یہ قول اپنے عموم کی وجہ سے تمام کو شامل ہے؛ جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جو ان کے علاوہ تھے۔ بعض نے کہا: یہ دوبارہ اٹھنے اور جزا کے متعلق جھگڑنے کے بارے میں نازل ہوئی جب ایک قوم نے اس کا اقرار کیا اور دوسروں نے اس کا انکار کیا۔ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یعنی وہ فرقے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ سیئے گئے ہیں اور تیار کیے گئے ہیں۔ یہاں آگ کو کپڑوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ یہ ان کا لباس ہو گی جیسے کپڑے ہوتے ہیں اور قُطِّعَتْ کا ارشاد اس کا مطلب ہے ان کے آخرت میں آگ سے کپڑے بنائے جائیں گے۔ لفظ ماضی کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ جو آخرت کی اخبار سے ہے اس کا وعدہ کیا گیا ہے تو واقع محقق کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذقال اللہ یاعیسیٰ بن مریم أأنت قلت للناس۔ یہاں بھی قال بمعنی یقول ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ اب سے ان کے لیے یہ لباس تیار کیے گئے ہوں کہ وہ انہیں پہنیں جب وہ آگ کی طرف جانے لگیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: من نار سے مراد قیامت ہے۔ وہ لباس تانبے سے ہوں گے جس کو پگھلایا گیا ہو گا، یہی مراد ہے جن کا ذکر قِطْرٍ اٰنٍ میں کیا گیا ہے اور گرم چیزوں میں کوئی چیز اس سے زیادہ گرم نہیں ہوتی جب اسے گرم کیا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے آگ ان کا اس طرح احاطہ کرے گی جس طرح کپڑے انسان کا احاطہ کرتے ہیں جب انہیں وہ پہنائی جائے گی۔ پس وہ اس وجہ سے کپڑے کی مانند ہو گی کیونکہ احاطہ کی وجہ سے کپڑوں کی مانند ہو گی جیسے فرمایا: وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا۞ (النبا) یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ۔ الْحَمِیْمُ سے مراد گرم پانی ہے جو جہنم کی آگ پر گرم کیا گیا ہو گا۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا فرمایا: ”گرم پانی ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا تو وہ اندر داخل ہو گا حتی کہ وہ ان کے پیٹ تک پہنچ جائے گا اور جو کچھ ان کے پیٹ میں ہو گا اسے نکال دے گا حتی کہ وہ ان کے قدموں سے نکل جائے گا۔ یہ الصھر ہے پھر اسے اسی طرح لوٹا دیا جائے گا

جس طرح پہلے تھا"(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ یُصْهَرُ کا معنی ہے پگھلانا۔ به ما فی بطونهم، الصهر کا معنی ہے چربی کا پگھلانا۔ الصهارا سے کہتے ہیں جو اس میں پگھل جائے۔ کہا جاتا ہے: صهرت الشئ فانصهر۔ میں نے اس کو پگھلایا تو وہ پگھل گئی۔ فهو صهیر۔ ابن احمر نے کونج کے بچے کی تعریف میں کہا:

تَرْوِی لَقًی أُلْقِیَ فی صَفْصَفٍ تَصهره الشمسُ فما یَنْصَهِرْ

یعنی سورج اسے پگھلاتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔

وَالْجُلُوْدُ ۝ وہ ان کی کھالوں کو پگھلا دے گی یا انہیں بھون ڈالے گی کیونکہ کھالیں پگھلتی نہیں ہیں لیکن ہر چیز کیساتھ وہ ملایا جاتا ہے جو اس کے مناسب ہوتا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: آتیتہ فاطعمنی ثریداً ای واللہ ولبنا قارصاً یعنی اس نے ثرید کھلائی اور کھٹا دودھ پلایا۔ شاعر نے کہا:

عَلَفتها تبناً و مائً بارداً

وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ لوہے کے گرزوں سے انہیں مارا جائے گا اور دھکیلے جائیں گے۔ مقامع کا مفرد مقمعة ہے اور مقمع بھی ہے جیسے المحجن جو ہاتھی کے سر پر چڑھائی جاتی ہے۔ وقد قمعتہ جب تو نے اسے اس کے ساتھ مارا۔ قمعتہ اور اقمعتہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے یعنی میں نے اس پر جبر کیا اور اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔ ابن سکیت نے کہا: أقمعت الرجل عنی اقماعا جو وہ تجھ پر طلوع ہوا اور تو اسے اپنے آپ سے دور کر دے۔ بعض علماء نے فرمایا: المقامع سے مراد گرز ہیں۔ حدیث میں ہے: جہنم کے فرشتوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک گرز ہو گا جس کی دو شاخیں ہوں گی پس وہ ایک ضرب لگائے گا تو وہ ستر ہزار (سال) نیچے چلا جائے گا"(2)۔ بعض نے کہا: مقامع سے مراد آگ کے کوڑے ہیں۔ اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ مضروب کو ذلیل کرتے ہیں۔

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

"جب بھی ارادہ کریں گے اس سے نکلنے کا فرط رنج والم کے باعث تو انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں اور (کہا جائے گا) کہ چکھو جلتی ہوئی آگ کا عذاب"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا، منها میں ھا ضمیر کا مرجع آگ ہے۔ اُعِيْدُوْا فِيْهَا گرز مار مار کر لوٹا دیئے جائیں گے۔ ابوظبیان نے کہا: ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ آگ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے جب وہ ان کے ساتھ جوش مارے گی اور بھڑکے گی تو انہیں آگ کے دروازوں کے اوپر ڈالا جائے گا تو وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے فرشتے گرزوں کے ساتھ انہیں آگ کی طرف لوٹا دیں گے(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: جب ان کا غم زیادہ ہو گا تو وہ بھاگیں گے جو ان میں سے اس کے کنارے تک پہنچے گا تو فرشتے اسے گرزوں کے ساتھ اس میں لوٹا دیں گے۔ اور وہ انہیں

1۔ جامع ترمذی، باب صفة الجهنم، جلد 2، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ الزہد، ابن مبارک، صفحہ 340
3۔ تفسیر طبری، جز 17-18، صفحہ 159

کہیں گے: وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے جیسے الیم اور وجیع بمعنی فاعل ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: الحریق، الاحتراق ہے اسم ہے۔ تحترق الشئ بالنار کا مطلب کسی چیز کا جل جانا۔ اسم الحرقة اور الحریق ہے۔ الذوق سے مراد وہ حاسہ ہے جس کے ساتھ ذائقہ کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں وسعت ہے اس سے مراد ان کا تکلیف پانا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝۲۳

''یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان بھی لے آئے اور عمل بھی نیک کرتے رہے جنتوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے ندیاں انہیں پہنائے جائیں گے جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہوگی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ پہلے ایک خصم کافر کا ذکر کیا تو اب دوسرے خصم مومن کا ذکر ہو رہا ہے۔ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ، من صلہ ہے۔ الأساور جمع ہے أسورة کی اور أسورة کا واحد سوار ہے۔ اس میں تین لغات ہیں۔ سین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ اور اسوار۔ مفسرین نے فرمایا: جب بادشاہ دنیا میں کنگن اور تاج پہنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جنت میں یہ اہل جنت کے لیے بنائے گا۔ ہر جنتی کے ہاتھ میں تین کنگن ہوں گے ایک سونے کا، ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا۔ یہاں اور سورۂ فاطر میں فرمایا: مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا اور سورہ الانسان میں فرمایا: وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ (الانسان: 21) اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرمایا: میں نے اپنے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے'' (1)۔ بعض نے کہا: عورتوں کو سونے کے زیور پہنائے جائیں گے اور مردوں کو چاندی کے زیور پہنائے جائیں گے اس میں نظر ہے قرآن اس کا رد کرتا ہے۔

وَّ لُؤْلُؤًا، نافع، ابن قعقاع، شیبہ، عاصم نے یہاں اور سورۃ الملائکۃ میں لولوا نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی پر یحلون لولوا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ تمام مصاحف میں الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح یعقوب اور جحدری، عیسیٰ بن عمر نے یہاں نصب کے ساتھ اور سورۂ فاطر میں جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ انہوں نے مصحف کی اتباع کرتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ یہاں الف کے ساتھ لکھا گیا ہے اور فاطر میں بغیر الف کے لکھا گیا ہے۔ باقی قراء نے دونوں جگہ مجرور پڑھا ہے۔ ابوبکر سارے قرآن میں اللؤلؤ کو ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔

اللؤلؤ سے مراد وہ ہے جو سمندر میں سیپ کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ قشیری نے کہا: اس سے مراد موتیوں کے ساتھ کنگنوں کو مزین کرنا ہے۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ جنت میں خالص موتیوں سے کنگن بنے ہوئے ہوں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

میں کہتا ہوں: یہ قرآن ظاہر ہے بلکہ قرآن کی نص ہے۔ ابن الانباری نے کہا: جنہوں نے لؤلؤ جر کے ساتھ پڑھا انہوں نے اس پر وقف کیا اور ذھب پر وقف نہیں کیا۔ سجستانی نے کہا: لؤلؤ کی نصب کی وجہ سے مِن ذھب پر وقف کافی ہے کیونکہ اس کا معنی ہے یحلون لؤلؤا۔ ابن الانباری نے کہا: اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے کہا ہے کیونکہ جب ہم اللؤلؤ کو جر دیتے ہیں تو ہم اساور کے لفظ پر اس کا عطف کرتے ہیں گویا ہم یوں کہتے ہیں: یحلون فیھا اساور دلؤلؤا اور یہ نصب میں بھی اپنے مقام کی وجہ سے جر میں ہے پس اسے پہلے سے قطع کرنے کا کوئی معنی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ جو وہ پہنیں گے بستر، لباس اور پردے وغیرہ سب ریشم کے ہوں گے اور یہ دنیا کے ریشم سے کہیں بلند و بالا مرتبہ ہوگا۔ نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا اور جس نے دنیا میں شراب پی وہ آخرت میں شراب (طہور) نہیں پیئے گا اور جس نے سونے اور چاندے کے برتنوں میں پیا وہ آخرت میں سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہیں پیئے گا''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اہل جنت کا لباس اور اہل جنت کی شراب اور اہل جنت کے برتن'' (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تینوں چیزوں میں برابری کی ہے اور آخرت میں یہ چیزیں حرام کی گئی ہیں۔ کیا: جنت میں جب داخل ہو جائیں گے اس وقت یہ چیزیں حرام کی جائیں گی؟ ہم کہیں گے: ہاں جب تک ان سے توبہ نہیں کرے گا آخرت میں ان چیزوں کو حرام کیا جائے گا اگر چہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا کیونکہ اس نے ان چیزوں کے استعمال میں جلدی کی جن کو اللہ تعالیٰ نے اس پر دنیا میں حرام کیا تھا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس وقت حرام ہوں گی جب اسے آگ میں عذاب دیا جائے گا یا موقف میں طویل عرصہ ٹھہرتے وقت۔ رہا وہ وقت جب جنت میں داخل ہوں گے تو اس وقت حرام نہیں ہوں گی کیونکہ جنت کی لذات سے محروم ہونا اس شخص کے لیے جو جنت میں ہے ایک قسم کی سزا اور مؤاخذہ ہے اور جنت سزا کی جگہ نہیں ہے او راس میں کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں ہے، پس ہم کہتے ہیں: جو تم نے ذکر کیا ہے اس کا احتمال ہے اگر ایسی دلیل نہ ہوتی جو اس احتمال کو دور کرتی ہے اور ظاہر حدیث سے اس کا رد ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ ائمہ حدیث نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں شراب پی پھر اس سے توبہ کی تو آخرت میں اس سے محروم کیا جائے گا'' (2)۔ اصل ظاہر سے تمسک ہے حتی کہ کوئی ایسی نص وارد ہو جو اس کو رد کرے بلکہ جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کی صحت پر نص وارد ہے اور وہ ابو داؤد طیالسی کی حدیث ہے جو انہوں نے اپنی مسند میں روایت کی ہے، ہشام نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے قتادہ سے روایت کیا انہوں نے داؤد السراج سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا فرمایا: نبی'' پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں ریشم نہ پہنے گا اگر چہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا اہل جنت ریشم کو پہنیں گے اور وہ نہیں پہنے گا'' (3) یہ صریح نص ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر چہ وہ جنت میں داخل بھی ہوگا اہل

1۔ مسند امام احمد، 251، 11985، 16118
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربة، جلد 2، صفحہ 836
3۔ المستدرک للحاکم، کتاب اللباس، جلد 4، صفحہ 191

جنت اسے پہنچیں گے اور وہ نہیں پہنچے گا'' یہ بالکل واضح بیان ہے اور اگر یہ راوی کے کلام سے ہو جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو بھی وہ بات کو زیادہ جاننے والا اور حال کا زیادہ واقف تھا اس کی مثل اپنی رائے سے نہیں کہا جاتا۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے شراب پی اور توبہ نہ کی'' اور آپ کا ارشاد ''جس نے سونے اور چاندی کے برتن استعمال کیے'' (یہ سب صریح اقوال ہیں) جس طرح وہ اپنے سے بلند درجہ والے کے مقام کی خواہش نہیں کرے گا اور یہ اس کے لیے سزا نہ ہوگی اسی طرح وہ جنت کی شراب، ریشم کی خواہش نہیں کرے گا اور یہ اس کے لیے سزا نہ ہوگی۔ میں نے اس پر تفصیلی بحث کتاب التذکرہ میں ذکر کی ہے۔ اور ہم نے اس میں ذکر کیا ہے کہ جنت کے درخت اور ان کے پھل جنت کے کپڑوں سے نکلیں گے۔ یہ سورۃ الکہف میں ہم نے ذکر کیا ہے۔

وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝

''اور ان کی رہنمائی کی گئی تھی پاکیزہ قول کی طرف اور دکھایا گیا تھا انہیں راستہ اللہ تعالیٰ کا جو تعریف کیا گیا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ اس کی راہنمائی کی گئی تھی پاکیزہ قول کی طرف۔ اس قول سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لا الہ الا اللہ والحمد للہ کے کلمات ہیں۔ بعض نے کہا: اس سے مراد قرآن ہے۔ پھر بعض نے کہا: یہ دنیا میں ہے اور اس کی راہنمائی شہادت کی طرف اور قرآن کی طرف کی گئی ہے۔ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے مراد اس کا دین ہے اور وہ اسلام ہے۔ بعض نے کہا: آخرت میں پاکیزہ قول کی طرف ان کی راہنمائی کی گئی ہے اور الحمد للہ کا قول ہے کیونکہ کل کہیں گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف: 43) الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: 34) جنت کے اندر لغو اور جھوٹ نہ ہوگا جو وہ کہیں گے وہ پاکیزہ قول ہے وہ جنت میں اللہ کے راستہ کی طرف راہنمائی کیے گئے ہیں کیونکہ جنت میں اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت والی کوئی چیز نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: پاکیزہ قول سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی بشارت ہے۔ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ جنت کے راستہ کی طرف ان کی راہنمائی کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور (دوسروں کو) روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور مسجد حرام سے جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لیے (مرکز ہدایت) بنایا ہے یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی، اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ کلام مشرکین مکہ کی طرف کیا جب انہوں نے

صلح حدیبیہ کے سال مسجد حرام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا تھا۔ اس اجتماع سے پہلے آپ کو انکار و روکنا معلوم نہ تھا مگر یہ کہ وہ روکنا مراد لیا جائے جو انہوں نے چند لوگوں کو روکا تھا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آغاز میں تھا۔ الصد کا معنی روکنا یعنی وھم یصدون اس سے مستقبل کا ماضی پر عطف اچھا ہو جائے گا۔ بعض علماء نے کہا واؤ زائدہ ہے اور ویصدون ان کی خبر ہے۔ یہ مقصود معنی کو خراب کرتا ہے۔ والباد کے قول کے پاس خبر محذوف مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: خسروا إذهلكوا اور ویصدون۔ مستقبل کا صیغہ آیا ہے کیونکہ یہ وہ فعل ہے جو وہ ہمیشہ کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَطۡمَىِٕنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ (الرعد: 28) گویا کہ فرمایا: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کی شان یہ ہے کہ وہ روکتے ہیں۔ اگر یوں ارشاد ہوتا: ان الذین کفروا وصدوا تو بھی جائز ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ابو اسحاق سے مروی میری کتاب میں ہے۔ فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ خبر نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ہو۔ ابو جعفر نے کہا: یہ غلط ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں کیا وجہ ہے کیونکہ اِنَّ کی خبر محذوف آئی نیز یہ جواب شرط ہے اگر یہ اِنَّ کی خبر ہو تو شرط بغیر جواب کے باقی ہوگی خصوصاً وہ فعل جو شرط میں سے مستقبل ہے پس اس کے لیے جواب کا ہونا ضروری ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مسجد بھی ہے اور یہی قرآن کا ظاہر ہے کیونکہ اس کے علاوہ ذکر نہیں کیا۔ بعض نے کہا: اس سے مراد پورا حرم ہے کیونکہ مشرکین نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حدیبیہ کے سال حرم سے روکا تھا تو آپ حرم سے باہر اترے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (الفتح: 25) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبۡحٰنَ الَّذِيۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (الاسراء: 1) یہ صحیح ہے لیکن یہاں اس کے ذکر سے مراد وہ ہے جو مقصود ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ یعنی نماز، طواف اور عبادت کے لیے بنایا ہے یہ اس ارشاد کی مانند ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آل عمران: 96)

سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَالۡبَادِ۔ العاکف سے مراد مقیم اور ملازم ہے اور البادی سے مراد دیہاتوں اور صحراؤں والے ہیں اور جو ان کے پاس آتے تھے، یعنی اس کی حرمت کی تعظیم میں اور احکام کی ادئیگی میں مقیم اور باہر سے آنے والا برابر نہیں۔ اہل مکہ، دور سے آنے والے سے زیادہ حقدار نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مساوات سے مراد وہاں کے مکانات اور منازل میں برابری ہے۔ باہر سے آنے والے کی نسبت مقیم زیادہ مستحق نہیں یہ اس بنا پر ہے کہ مسجد حرام سے مراد سارا حرم ہو، یہ مجاہد اور امام مالک کا قول ہے ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت سے مروی ہے (1) کہ مسجد حرام کی طرف آنے والا جہاں جگہ پائے وہاں رہ سکتا ہے اور مکان کے مالک کی مرضی ہے اسے ٹھہرائے یا انکار کرے؛ یہ سفیان وغیرہ کا قول ہے (2)۔ اسی طرح معاملہ صدر اول میں تھا مکانات بغیر دروازوں کے ہوتے تھے حتیٰ کہ کثرت سے چوریاں ہونے لگیں ایک شخص نے مکان کا دروازہ بنایا تو حضرت عمر نے اس پر انکار کیا اور فرمایا: کیا تو بیت اللہ کی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 116 2۔ ایضاً

زیارت کرنے والے پر دروازہ بند کرے گا۔ اس نے کہا: میں نے حاجیوں کے مال کی حفاظت کا ارادہ کیا ہے۔ پس حضرت عمر نے اسے چھوڑ دیا پھر لوگوں نے بھی مکانات کے دروازے بنائے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ وہ حج کے موسم میں مکہ کے گھروں کے دروازے اکھیڑنے کا حکم دیتے تھے حتی کہ جو آتا ان میں داخل ہوتا اور جہاں چاہتا پڑاؤ کرتا اور گھروں میں خیمے لگائے جاتے تھے۔ امام مالک سے مروی ہے کہ مکہ کے گھر مسجد کی طرح نہیں گھر کے مالکوں کے لیے جائز ہے کہ وہ لوگوں کو ان سے روکیں اور اسی پر عمل ہے اور یہی جمہور علماء کا قول ہے (1)۔ یہ اختلاف دو اصل پر مبنی ہے ایک یہ کہ مکہ کے گھر کیا ان کے مالکوں کی ملک ہیں یا تمام لوگوں کے لیے ہیں۔ اس اختلاف کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ کیا مکہ مکرمہ سختی کے ساتھ فتح کیا گیا تھا پھر تو یہ مال غنیمت ہوں گے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم نہیں کیے تھے اور ان کے مالکوں کو وہاں ٹھہرائے رکھا اور ان کے بعد والوں کے لیے انہیں چھوڑ دیا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمین کے ساتھ کیا تھا آپ نے ان کا خراج معاف کر دیا تھا اسی طرح ان کو غلام بھی نہیں بنایا اور ان پر یہ احسان کیا اور دوسرے کفار پر یہ احسان نہیں کیا۔ پس وہ اسی طرح باقی رہیں گے ان کو نہ بیچا جائے گا اور نہ ان کو کرائے پر دیا جائے گا جو کسی جگہ پر پہلے پہنچ گیا وہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا۔ اسی طرح کا قول امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کا ہے۔ یا مکہ مکرمہ صلح کے ساتھ فتح ہوا؛ یہ امام شافعی کا نظریہ ہے پس ان کے دیار ان کے قبضہ میں رہیں گے اور جیسے چاہیں گے وہ اپنی املاک میں تصرف کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے صفوان بن امیہ کا گھر چار ہزار میں خریدا تھا اور اسے قید خانہ بنایا تھا (2)۔ حضرت عمر پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں قید خانہ میں لوگوں کو قید کیا جیسا کہ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آیۃ المحاربین کے تحت گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے کی وجہ سے جیل میں ڈالا۔ طاؤس مکہ میں قید کرنا ناپسند کرتے تھے اور وہ کہتے تھے: یہ مناسب نہیں کہ بیت رحمت میں بیت عذاب ہو۔

میں کہتا ہوں: صحیح وہ ہے جو امام مالک نے کہا، اس پر اخبار ثابتہ کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ مکہ سختی کے ساتھ فتح کیا گیا تھا۔ ابوعبید نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ مکہ مکرمہ کے مشابہ کوئی شہر ہے۔ دارقطنی نے حضرت علقمہ بن نضلۃ سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کا وصال ہو گیا اور مکہ کے مکانوں کو سوائب کہا جاتا تھا جس کو ضرورت ہوتی وہ ان میں رہتا اور جسے ضرورت نہ ہوتی وہ دوسروں کو اس میں ٹھہراتا (3)۔

ایک روایت میں حضرت عثمان کا بھی ذکر ہے۔ حضرت علقمہ بن نضلۃ کنانی سے مروی ہے فرمایا: عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میں مکہ کے گھروں کو السوائب کہا جاتا تھا انہیں بیچا نہیں جاتا تھا جو محتاج ہوتا وہ ان میں رہتا جسے ضرورت نہ ہوتی وہ دوسروں کو ٹھہراتا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرم بنایا ہے اس کے مکانات کو بیچنا حرام ہے اور ان کی ثمن (قیمت) کھانا حرام ہے'' (4)۔ فرمایا: ''جس نے مکہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 116
2۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 57، حدیث 224
3۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب اجر بیوت مکۃ، 3097
4۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 57

مکانات کی اجرت سے کچھ کھایا تو اس نے آگ کو کھایا''۔ دارقطنی نے کہا: امام ابوحنیفہ نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے اور اس میں انہیں وہم ہوا ہے اور اس قول میں بھی وہم ہوا ہے کہ انہوں نے راوی عبیدالله بن ابی یزید ذکر کیا ہے جبکہ وہ ابن ابی زیاد القداح ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف حدیث ہے۔ دارقطنی نے حضرت عبدالله بن عمرو سے مسند ذکر کی ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکہ اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے نہ اس کے مکانات بیچے جائیں گے اور نہ اس کے مکانات اجرت پر دیئے جائیں گے'' (1)۔ ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے عرض کی: یارسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں منیٰ میں آپ کے لیے کوئی کمرہ یا عمارت نہ بنادوں جو آپ کو سورج کی دھوپ سے بچائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں یہ مناخ ہے جو اس کی طرف سبقت لے جائے گا وہی مستحق ہے'' (2)۔ امام شافعی نے اس قول سے استدلال کیا ہے: الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ اس میں دیار کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے اور رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: ''جس نے دروازہ بند کرلیا وہ امن میں ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ امن میں ہے''۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جمہور قراء نے سواء رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مبتدا ہے اور العاکف خبر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: سواء خبر مقدم ہے اور یعنی العاکف فیہ والباد سواء؛ یہ ابوعلی کا قول ہے معنی یہ ہے کہ جس کو ہم نے لوگوں کے لیے قبلہ بنایا اور عبادت گاہ بنایا اس میں مقیم اور صحراء سے آنے والا برابر ہیں۔ حفص نے عاصم سے سواء نصب کے ساتھ روایت کیا ہے؛ یہ اعمش کی قرات ہے۔ یہ بھی دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ جعل کا مفعول ثانی ہے اور اس کی وجہ سے العاکف پر رفع ہو کیونکہ یہ مصدر ہے اس نے اسم فاعل کی طرح عمل کیا کیونکہ یہ مستو کے معنی میں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جعلناہ کی ضمیر سے حال ہے۔ ایک فرقہ نے سواء نصب کے ساتھ اور العاکف اور البادی کو الناس پر عطف کی وجہ سے مجرور پڑھا ہے، تقدیر یوں ہوگی: الذی جعلناہ للناس العاکف والبادی۔ ابن کثیر کی قرأت وقف اور وصل میں یا کے ساتھ ہے۔ ابوعمرو نے بغیر یا کے وقف کیا ہے اور یا کے ساتھ وصل کیا ہے۔ نافع نے وصل اور وقف میں بغیر یا کے پڑھا ہے۔ علماء کا نفس مسجد حرام میں برابری پر اجماع ہے۔ اختلاف مکہ میں ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ یہ شرط ہے اور اس کا جواب نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ہے لغت میں الحاد کا معنی مائل ہونا ہے۔ مگر الله تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ ظلم کے ساتھ مائل ہونا ہی مراد ہے۔ الظلم کے بارے میں اختلاف ہے علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ عطا نے کہا: شرک اور قتل ہے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی کبوتروں کا شکار کرنا ہے اور درخت کاٹنا ہے اور بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہونا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم کہا کرتے تھے کہ حرم میں الحاد یہ ہے کہ انسان کہے: لا والله، وبلی والله، وکلا والله اسی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے دو خیمے تھے ایک حل میں لگا ہوا تھا اور دوسرا حرم میں تھا جب آپ نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 53

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، تحریم مکۃ، جلد 1، صفحہ 276، ایضاً 1726۔ ابن ماجہ، باب النزول بمنی، حدیث 2996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حرم والے خیمہ میں داخل ہو جاتے اور جب کوئی دوسرا کام کرنا ہوتا تو حل والے خیمہ میں داخل ہو جاتے تا کہ حرم کلا واللہ، بلی واللہ کے قول سے محفوظ رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں گناہ کو بہت بڑا کہا ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے بھی دو خیمے تھے ایک حل میں اور دوسرا حرم میں جب آپ اپنے گھر والوں کو عتاب کرنے کا ارادہ کرتے تو انہیں حل میں عتاب کرتے تھے اور جب نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو حرم میں نماز پڑھتے اس کے بارے میں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہم یہ کہتے تھے کہ حرم میں الحاد یہ ہے کہ ہم کہیں: کلا واللہ، بلی واللہ اور گناہ مکہ میں زیادہ ہوتے ہیں جس طرح نیکیاں زیادہ ملتی ہیں، پس ایک معصیت دو معصیتیں بن جاتی ہے۔ ایک تو حکم شرعی کی مخالفت کرنا ہے دوسرا بیت اللہ کی حرمت کو ساقط کرنا ہے۔ اسی طرح حرمت والے مہینے برابر ہیں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت یعلی بن امیہ سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حرم میں کھانے کو ذخیرہ کرنا اس میں الحاد ہے''(1)۔ یہ حضرت عمر بن خطاب کا قول ہے۔ عموم ان تمام چیزوں کو شامل ہے۔(2)

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے جن میں ضحاک اور ابن زید ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کو مکہ میں نیت پر بھی عقاب کیا جائے گا اگرچہ عمل نہ بھی کیا ہو، یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اگر کوئی بیت اللہ میں کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کرے جبکہ وہ عدن اَبْیَن میں ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے یہی مفہوم سورۂ ن والقلم میں واضح طور پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ بالحاد میں باء زائدہ ہے جس طرح تَنۢبُتُ بِالدُّهْنِ (المومنون: 9) میں زائدہ ہے۔ اسی پر شاعر کا قول محمول ہے:

نحن بنو جَعْدَة أصحاب الفَلَج نضرب بالسيف ونرجو بالفَرَج

مراد نرجو الفرج ہے۔ اعشیٰ نے کہا: ضمنت برزق عیالنا أرماحنا مراد رزق ہے باء زائدہ ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

ألم يأتيك والأنباء تَنْمِي بما لاقت لَبُون بني زياد

مراد مالاقت ہے باء زائدہ ہے۔ باء کے زائدہ ہونے کی بہت سی مثالیں ہیں۔ فراء نے کہا: میں نے ایک عرب کو سنا میں نے اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: ارجو بذالك یعنی ارجو ذاك۔

شاعر نے کہا:

بوادٍ يمانٍ يُنبت الشثَّ صدرُه وأسفله بالمَرْخ والشَّبَهان

مراد المرخ ہے باء زائدہ ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے اس کے نزدیک اس کا معنی ہے: ومن يرد فيه الحاداً بظلم۔ کوفیوں نے کہا: باء داخل ہوتی ہے کیونکہ معنی ہے بان یلحد باء ان کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور حذف کی جاتی ہے یہ تقدیر ہونا بھی جائز ہے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ، جلد 1، صفحہ 276۔ ایضاً، حدیث 1727، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 116

ومن یرد الناس فیہ بالحاد یہ الحاد اور ظلم کفر سے لیکر صغائر تک تمام گناہوں کو شامل ہیں۔ اس مکان کی حرمت کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس میں گناہ کی نیت پر بھی سخت وعید سنائی ہے جس نے گناہ کی نیت کی اور گناہ نہ کیا تو اس کا محاسبہ نہ ہوگا مگر مکہ میں؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور اصحاب کی ایک جماعت اور دوسرے لوگوں کا قول ہے ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔

**وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْقَآىِٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾**

''اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم کے لیے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور صاف ستھرا رکھنا میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ، یعنی أذکر اذبوانا، اذ سے پہلے اذکر محذوف ہے۔ کہا جاتا ہے: بوأتہ منزلاً، بوات لہ، جیسے کہا جاتا ہے: مکنتك ومکنت لك، لِاِبْرٰهِیْمَ میں لام تاکید کے لیے صلہ ہے جیسے ارشاد ہے: رَدِفَ لَكُمْ (النمل: 72) یہ فراء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ یعنی ہم نے اسے اس کی بنیاد دکھائی تاکہ وہ اسے تعمیر کریں جبکہ طوفان نے اسے روند دیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو تعمیر کرنے کا حکم فرمایا۔ حضرت ابراہیم اس کی جگہ پر آئے اور اس کے نشانات تلاش کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا چلائی جس نے حضرت آدم علیہ السلام کی بنیاد سے پردہ ہٹا دیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر اس کی بنیاد رکھی جیسا کہ پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: بوانا یہ اس فعل کے قائم مقام ہے جو لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے جعلنا یعنی جعلنا لابراھیم مکان البیت مبوأ۔ شاعر نے کہا:

کم من أخ لی ماجد بوأتہ بیدی لحداً

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَنْ لَّا تُشْرِكْ جمہور علماء کا قول ہے کہ یہ خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہے۔ عکرمہ نے ان لا یشرك یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس قول کے معنی کی نقل پر جو انہیں کہا گیا۔ ابو حاتم نے کہا: اس قرأت کی بنا پر کاف کو نصب ضروری ہے بمعنی لئلا یشرك۔ بعض نے کہا: انْ مخففہ من الثقیلہ ہے۔ بعض نے کہا: انْ مفسرہ ہے۔ بعض نے کہا: انْ زائدہ ہے جیسے فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ (یوسف: 96) آیت میں بیت اللہ کے رہنے والوں میں سے شرک کرنے والوں پر طعن ہے یعنی یہ تمہارے باپ پر اور ان کے بعد والوں پر اور تم پر شرط تھی تم نے اسے وفا نہیں کیا بلکہ تم نے شرک کیا۔ ایک فرقہ نے کہا: اَنْ لَّا تُشْرِكْ میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے آپ کو بیت اللہ کی تطہیر اور حج کے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: یہ خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہے۔ یہ اصح ہے۔ بیت اللہ کی طہارت سے مراد کفر، بدعت، خون اور تمام نجاستوں سے طہارت ہے۔ بعض نے فرمایا: بتوں سے طہارت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ

**مِنَ الْاَوْثَانِ**۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ جرہم اور عمالقہ قبائل کے بیت اللہ کی جگہ اور اس کے اردگرد بت موجود تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے پہلے موجود تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے میرے گھر کو پاک رکھو اس سے کہ اس میں کسی بت کی عبادت کی جائے۔ یہ اس میں توحید کے اظہار کا امر ہے۔ مسجد حرام اور دوسری مساجد کی طہارت وصفائی میں علماء کے جو اقوال ہیں وہ سورۂ برأت میں گزر چکے ہیں۔ القائمون سے مراد نمازی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے ارکان میں سے عظیم ترین ارکان کا ذکر کیا ہے وہ قیام، رکوع اور سجدہ ہیں۔

**وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾**

''اور اعلان عام کردو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پاپیادہ اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہوکر جو آتی ہیں ہر دور دراز راستہ سے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ** جمہور لوگوں نے اذّن ذال کے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن بن ابی حسن اور ابن محیصن نے آذن ذال کی تخفیف اور الف کی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: علی بن جنی نے اس میں تصحیف کی ہے کیونکہ انہوں نے حسن اور ابن محیصن سے حکایت کیا ہے واذن اس بناء پر کہ یہ فعل ماضی ہے اور اس کو اس بنا پر بوأنا پر معطوف کیا ہے۔ الاذان کا معنی آگاہ کرنا ہے۔ یہ پہلے سورۂ برات میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے (1) تو انہیں کہا گیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو آپ نے عرض کی: یارب! میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اعلان کرو پیغام پہنچانا میرا کام ہے۔ حضرت ابراہیم جبل ابی قیس پر چڑھے اور بلند آواز سے کہا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہیں اس گھر کے حج کا حکم فرماتا ہے تاکہ تمہیں اس کے بدلے جنت دے اور تمہیں آگ کے عذاب سے بچائے، پس تم حج کرو۔ جو لوگ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں تھے انہوں نے جواب دیا: لبیك اللّٰھم لبیك۔ جس نے جواب دیا وہ اپنے جواب کی مقدار میں حج کرے گا اگر ایک مرتبہ لبیک کہا ہوگا تو اسے ایک مرتبہ حج کی سعادت ملے گی اور جس نے دو مرتبہ لبیک کہا ہوگا اسے دو مرتبہ حج کی سعادت ملے گی۔ اس پر تلبیہ جاری ہوا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر کا قول ہے (2)۔ ابو طفیل سے مروی ہے فرمایا مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو تلبیہ کی اصل کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں میں حج کا اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تو سارے پہاڑ پست ہو گئے اور تمام شہر بلند ہوگئے آپ نے ان لوگوں میں حج کا اعلان کیا ہر چیز نے آپ کو جواب دیا: لبیك اللھم لبیك، بعض علماء نے فرمایا: خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہے اور السجود کے قول پر کلام مکمل ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا اور فرمایا: **اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ** لوگوں میں حج کا اعلان کرو۔ تیسرا قول یہ ہے کہ **اَنْ لَّا تُشْرِكْ** کے قول میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے؛ یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 117 2۔ ایضاً

اہل نظر کا قول ہے کیونکہ قرآن نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا ہے پس قرآن میں جو بھی خطاب ہے وہ آپ ﷺ کو ہی ہے مگر یہ کہ اس کے علاوہ پر کوئی قطعی دلیل موجود ہو یہاں ایک اور دلیل بھی ہے جو دلالت کرتی ہے کہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور وہ ان لاتشرك بی تا کے ساتھ ہے۔ اس صیغہ سے خطاب اسے کیا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام غائب تھے اس بنا پر مفہوم یہ ہوگا جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین کی اور ہم نے اللہ تعالیٰ کی توحید پر تمہارے لیے دلائل بنادیئے اور اس پر بھی دلائل قائم کر دیئے کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ جمہور علماء نے بالحج حا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی اسحاق نے ہر جگہ حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا اس پوری شریعت کے لیے تھی جس کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ وعدہ فرمایا کہ لوگ پیدل اور سوار ہو کر حج کرنے کے لیے آئیں گے فرمایا: یَاْتُوْكَ تیرے پاس آئیں گے اگرچہ لوگ کعبہ کی طرف آئیں گے۔ یہ اس لیے فرمایا کیونکہ ندا کرنے والے آپ ہی تھے جو کعبہ کی طرف حج کرنے کے لیے آیا تو گویا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا کیونکہ اس نے آپ کی ندا کا جواب دیا۔ اس میں حضرت ابراہیم کو شرف بخشا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: رجالاً جمع ہے راجل کی جیسے تاجر کی جمع تجار ہے۔ صاحب کی جمع صِحاب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رجال، رجُل کی جمع ہے اور الرجُل، راجل کی جمع ہے جیسے تاجر کی جمع تجر اور تجر کی جمع تِجار ہے جیسے صاحب کی جمع صحب اور اس کی جمع صِحاب ہے۔ کبھی جمع میں رُجّال جیم کی شد کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے جیسے کافر کی کُفّار ہے۔ ابن ابی اسحاق (1) اور عکرمہ نے رُجالاً راء کے ضمہ اور جیم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جمع کی بناؤں میں بہت کم ہے یہ مجاہد سے روایت کیا گیا ہے اور مجاہد نے فُعالی کے وزن پر رُجالی پڑھا ہے جیسے کسالی۔ نحاس نے کہا: راجل کی جمع میں پانچ صورتیں ہیں۔ رُجال جیسے رُکاب۔ یہ عکرمہ سے مروی ہے۔ رِجال جیسے قیام۔ رَجْلَةٌ، رَجْلٌ، رجالۃ اور مجاہد سے رُجالاً مروی ہے وہ غیر معروف ہے۔ مناسب غیر منون ہونا ہے جیسے کسالی اور سکاری ہیں۔ اگر اس کو تنوین دی جاتی تو یہ فعال کے وزن پر ہوتا اور فُعَال جمع میں بہت قلیل ہے۔ الرجال کو الرکبان سے مقدم کیا گیا ہے کیونکہ چلنے میں انہیں تھکاوٹ زیادہ ہوتی ہے۔

وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ، ضامر کا معنی ضوامر ہے۔ فراء نے کہا: لفظ کی بناء پر یاتی صیغہ بھی جائز ہے۔ الضامر اس کمزور اونٹ کو کہتے ہیں جس کو سفر نے تھکا دیا ہو۔ کہا جاتا ہے: ضَمُرَ یَضْمُرُ ضمورا۔ اللہ تعالیٰ نے مآل کے اعتبار سے وصف بیان کیا جو مکہ پہنچ کر انہیں لاحق ہوتا ہے۔ کمزور ہونے کا سبب ذکر کیا ہے اور فرمایا: یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ یعنی اس میں سفر کی طوالت نے اثر کیا۔ ضمیر کو اونٹ کی صرف لوٹایا انہیں اعزاز دینے کے لیے کیونکہ مالکوں کے ساتھ حج کا قصد کرتے ہیں جیسے فرمایا: وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝ (العادیات) یہ جہاد والے گھوڑوں کے بارے میں فرمایا انہیں شرف دینے کے لیے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دوڑے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 117

**مسئلہ نمبر 4**۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رجالاً فرمایا ہے کیونکہ اکثر حج کے لیے مرد جاتے ہیں عورتیں کم جاتی ہیں پس رجالاً کا ارشاد یہ اس قول سے ہے: ھذا رجل اور اس میں بعد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ اس سے مراد سوار ہیں۔ اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رجالاً اور ان کے ساتھ آغاز کیا۔ یہ دلیل ہے کہ پیدل حج کرنا، سوار ہو کر حج کرنے سے افضل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں کسی چیز سے پریشان نہیں جو مجھ سے فوت ہوئی مگر یہ کہ میں نے پیدل حج نہیں کیا (1) میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: یَاْتُوْكَ رِجَالًا۔ ابن ابی نجیح نے کہا: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے پیدل حج کیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (2) کے اصحاب نے یاتون: یہ ابن ابی عبلۃ اور ضحاک کی قرأت ہے اور ضمیر لوگوں کے لیے ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ سوار ہونے اور چلنے کے جواز میں اختلاف ہے، ان میں سے افضل میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا خیال ہے کہ سوار ہونا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں اقتدا ہے اور اس میں اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور سواری کی تیاری کے ساتھ حج کے شعائر کی تعظیم بھی ہوتی ہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے کہ پیدل حج کرنا افضل ہے کیونکہ اس میں نفس کی مشقت ہے۔ حضرت ابو سعید کی حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف پیدل حج کیا اور فرمایا: ''اپنی کمروں کو اپنے ازاروں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لو'' (3)۔ اور آپ تھوڑے تیز چلے۔ ابن ماجہ نے اس کو اپنی سنن میں تخریج کیا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام مناسک میں امام مالک کے نزدیک سوار ہونا افضل ہے کیونکہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ بعض علماء نے اس آیت سے بحر کے ذکر کے سقوط سے یہ استدلال کیا ہے کہ بحر کی وجہ سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ امام مالک نے ''الموازیۃ'' میں فرمایا: میں بحر (دریا) کا ذکر نہیں سنتا یہ تانس ہے (4)۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دریا کے ذکر کے سقوط سے فرض کا سقوط ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ سمندر کے ساحل پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی طرف کشتیاں لیکر آئیں۔ پس جو دریا پر سوار ہو کر آئے اس کے لیے بھی مکہ کی طرف پیدل یا سوار ہو کر آنا ضروری ہے پس پہنچنے کی دونوں حالتیں ذکر کی گئی ہیں صرف دریا کی وجہ سے حج کے فرض کا اسقاط ہے اس میں کثرت وقلت نہیں ہے مگر جب کسی شخص کو دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور خوفناک صورت ہو یا کوئی مرض لاحق ہو تو امام مالک، امام شافعی اور جمہور علماء ان اعذار کی وجہ سے وجوب کے سقوط کے قائل ہیں اسے استطاعت حج نہیں ہے (5)۔ ابن عطیہ نے کہا: صاحب الاستظہار نے اس مفہوم میں کلام کی ہے۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ ان اعذار کی وجہ سے وجوب ساقط نہیں ہوتا۔ یہ ضعیف قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی ضعیف ہے اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الفج، کھلا راستہ۔ اس کی جمع فجاج ہے یہ سورۃ الانبیاء میں گزر چکا ہے۔ العمیق کا معنی بعید ہے۔ جماعت کی قرأت (یاتین) ہے اور حضرت عبداللہ کے اصحاب نے یاتون

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 118　2۔ ایضاً
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الحج ماشیا، صفحہ 232　4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 118　5۔ ایضاً

پڑھا ہے یہ سواروں کے اعتبار سے ہے اور یاتین اونٹوں کے اعتبار سے ہے گویا فرمایا: علی ابل ضامرة یاتین۔ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ عمیق کا معنی دور ہے اسی سے ہے بئرٌ عمیقةٌ جو کنواں بہت گہرا ہو اسی سے ہے:

وقاتِم الأعماق خاوِی المخترق

**مسئلہ نمبر 7**۔ علماء کا اختلاف ہے جو بیت اللہ تک پہنچے تو کیا بیت اللہ کو دیکھتے وقت ہاتھ بلند کرے یا نہیں۔ ابوداؤد نے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت جابر بن عبد اللہ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو بیت اللہ کو دیکھتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو بلند کرتا ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: میں نے تو کسی کو ایسا کرتے نہیں دیکھا سوائے یہود کے۔ ہم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا ہم نے ایسا نہیں کیا تھا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات مقامات پر ہاتھ بلند کیے جائیں گے۔ نماز کے آغاز میں، بیت اللہ کے استقبال میں۔ صفا پر، مروۃ پر، دونوں مواقف میں اور دونوں جمروں کے پاس''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو امام ثوری، ابن المبارک، امام احمد اور اسحاق نے لیا ہے اور حضرت جابر کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ مہاجر مکی مجہول راوی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیت اللہ کو دیکھتے وقت ہاتھ بلند کرتے تھے اسی طرح کا عمل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

''(اعلان کیجئے) تا کہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی دنیوی) فائدوں کے لیے اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ پس خود بھی کھاؤ ان سے اور کھلاؤ مصیبت زدہ محتاج کو۔ پھر چاہیے کہ دور کریں اپنی میل کچیل اور پوری کریں اپنی نذریں اور طواف کریں ایسے گھر کا جو بہت قدیم ہے''۔

اس میں تیئس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّيَشْهَدُوْا حج کا اعلان کرو وہ تمہارے پاس پیدل اور سوار ہو کر آئیں گے تا کہ وہ حاضر ہوں۔ الشہود کا معنی حاضر ہونا ہے۔ مَنَافِعَ لَهُمْ منافع سے مراد مناسک ہیں جیسے عرفات اور مزدلفہ میں قیام۔ اور بعض نے فرمایا: اس سے مراد مغفرت ہے۔ بعض نے کہا: تجارت ہے۔ بعض نے کہا: یہ عام ہے یعنی وہ حاضر ہوں دنیا و آخرت کے ان امور کے لیے جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے؛ یہ مجاہد، عطا کا قول ہے اور ابن عربی نے اس کو پسند کیا ہے یہ قول، عبادت، تجارت، مغفرت اور دنیوی و آخروی تمام منفعتوں کو جامع ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ: 198) سے مراد تجارت ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی رفع الیدین اذا رأی البیت، 1594

**مسئلہ نمبر 2۔** وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ، الایام المعلومات اور المعدودات پر سورۂ بقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اللہ کے اسم کے ذکر سے مراد ذبح اور نحر کے وقت بسم اللہ کا ذکر کرنا ہے جیسے تیرا قول ہے: باسم اللہ واللہ اکبر اللھم منك ولك، اور ذبح کے وقت تیرے قول: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ (الانعام:162) کی مثل۔

**مسئلہ نمبر 3۔** دسویں ذی الحج کو ذبح کرنے کے وقت میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: امام کی نماز اور اس کی ذبح کے بعد اس کا وقت ہے مگر یہ کہ وہ اتنی زیادہ تاخیر کرے کہ اقتدا ساقط ہو جائے سو اس سے پہلے ذبح کرنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ نے امام کے نماز سے فارغ ہونے کی رعایت کی ہے ذبح کا خیال نہیں کیا۔ امام شافعی نے نماز کے وقت کے دخول اور دو خطبوں کے ساتھ نماز کے وقوع کی مقدار وقت کا خیال کیا ہے۔ امام شافعی نے وقت کا اعتبار کیا ہے نماز کا نہیں، یہ امام شافعی سے مزنی کی روایت ہے یہی طبری کا قول ہے۔ ربیع نے بویطی سے روایت کیا ہے فرمایا امام شافعی نے فرمایا: کوئی ذبح نہ کرے حتی کہ امام ذبح کرے مگر یہ کہ وہ ایسا ہو کہ ذبح نہ کرتا ہو۔

جب نماز پڑھ لے اور خطبہ سے فارغ ہو جائے تو ذبح کا وقت ہو جاتا ہے۔ یہ مالک کے قول کی طرح ہے۔ امام احمد نے کہا: جب امام واپس آئے تو تو ذبح کر؛ یہ ابراہیم کا قول ہے۔ ان اقوال میں سے اصح امام مالک کا قول ہے کیونکہ حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث ہے فرمایا: ہمیں دسویں ذی الحجہ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں نماز پڑھائی لوگ آگے بڑھے اور جانوروں کو نحر کیا انہوں نے خیال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نحر کر چکے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جو نحر کر چکا ہے وہ دوبارہ نحر کرے اور نحر نہ کرو یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نحر کر لیں (1)۔ اس کو امام مسلم اور امام ترمذی نے تخریج کیا ہے فرمایا: یہ حضرت جابر، حضرت جندب، حضرت انس، حضرت عویمر بن اشقر، حضرت ابن عمر و اور حضرت ابوزید انصاری سے بھی مروی ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے کہ شہر میں قربانی نہ کی جائے یہاں تک کہ امام قربانی کرلے۔ امام ابوحنیفہ نے حضرت براء کی حدیث سے حجت پکڑی ہے اس میں ہے۔ ''جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی مکمل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی سنت کو پالیا'' (2)۔ اس حدیث کو امام مسلم نے بھی تخریج کیا ہے۔ ذبح کو نماز پر معلق کیا ہے اور ذبح کو ذکر نہیں کیا اور حضرت جابر کی حدیث اس کو مقید کرتی ہے۔ اسی طرح حضرت براء کی حدیث ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج ہم سب سے پہلے نماز پڑھیں گے پھر واپس آئیں گے اور نحر کریں گے جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سنت کو پالیا'' (3)۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ نماز سے پہلے ذبح کرے اور وہ شہری آدمی ہو تو وہ قربانی کرنے والا نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا وہ گوشت ہے'' (4)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** رہے دیہاتوں میں رہنے والے اور جن کا امام نہیں ہوتا تو امام مالک کا ان کے متعلق قول یہ ہے کہ وہ امام کے ذبح کے وقت یا قریبی آئمہ کے ذبح کے وقت کی تحری کریں۔ ربیعہ اور عطا نے کہا: جس کا امام نہیں ہے اگر وہ سورج

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضحی، سن الاضحیۃ، جلد 2، صفحہ 155 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 154 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کے طلوع ہونے سے پہلے ذبح کرے گا تو جائز نہ ہوگا اگر سورج کے طلوع ہونے کے بعد ذبح کرے گا تو جائز ہوگا۔ اہل الرائے نے کہا: فجر کے بعد جائز ہے؛ یہی ابن المبارک کا قول ہے۔ اس کو امام ترمذی نے ابن المبارک سے روایت کیا ہے اورانہوں نے اس قول سے استدلال کیا ہے۔ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ نحر کی اضافت یوم کی طرف ہے کیا الیوم کے لفظ کا اطلاق طلوع فجر سے ہوتا ہے یا سورج کے طلوع ہونے سے ہوتا ہے۔ اس میں دو قول ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قربانی کا ذبح کرنا دسویں کے دن فجر کے طلوع ہونے سے پہلے جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ایام النحر کتنے ہیں؟ امام مالک نے فرمایا: تین دن ہیں۔ دسویں کا دن اور اس کے بعد دو دن۔ یہی قول امام ابوحنیفہ، امام ثوری اور امام احمد بن حنبل کا ہے یہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ان سے کوئی اختلاف مروی نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: چار دن ہیں۔ دسویں کا دن اور اس کے بعد تین دن۔ یہی اوزاعی کا قول ہے اور یہی حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے ان کی مثل امام مالک اور امام احمد کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: خاص دسویں کا دن ہے یعنی دس ذی الحجہ کا دن ہے۔ ابن سیرین سے یہ مروی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت جابر بن زید سے مروی ہے کہ ان دونوں نے کہا: شہروں میں ایک دن ہے اور منیٰ میں تین دن ہیں۔ حسن بصری سے اس کے متعلق تین روایات ہیں۔ ایک وہ جو امام مالک کا قول ہے۔ دوسرا وہ جو امام شافعی کا قول ہے ۔تیسرا یہ کہ ذی الحجہ کے آخری دن تک جب محرم کا چاند دیکھے تو اس پر قربانی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ سلیمان بن یسار اور ابو سلمہ بن عبدالرحمن کا قول ہے انہوں نے مرسل حدیث روایت کی ہے جو دارقطنی نے نقل کی ہے۔ الضحایا إلى هلال ذی الحجة(1)، قربانیاں ذی الحجہ کے چاند تک ہوسکتی ہیں۔ یہ حدیث صحیح نہیں۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ یہ جمع قلت ہے لیکن اس میں یقینی تین دن ہیں اور جو تین دنوں کے بعد ہیں وہ غیر یقینی ہیں اس لیے ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ دسویں کا دن قربانی کا دن ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ذی الحجہ کے گزرنے کے بعد قربانی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس میں صرف دو قول صحیح ہیں۔ ایک امام مالک اور کوفیوں کا قول اور دوسرا امام شافعی اور شامیوں کا قول۔ یہ دونوں قول صحابہ کرام سے مروی ہیں ان کے مخالف قول کے ساتھ مشغول ہونے کا کوئی معنی نہیں۔ جو اقوال ان دو قولوں کے مخالف ہیں اس کی سنت میں اور صحابہ کے اقوال میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اور جو ان دو اقوال سے خارج ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ قتادہ سے ایک چھٹا قول بھی مروی ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کا دن دسویں کا دن ہے اور اس کے بعد چھ دن ہیں۔ یہ صحابہ کے قول سے خارج ہے اس کا کوئی معنی نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ راتیں بھی دنوں کے ساتھ داخل ہیں ان میں ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں۔ امام مالک سے مشہور یہ ہے کہ راتیں داخل نہیں اور رات کو ذبح کرنا جائز نہیں یہی جمہور اصحاب اور اصحاب رائے کا موقف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ یہاں ایام کو ذکر کیا اور ایام کا ذکر دلیل ہے کہ ذبح رات کو جائز

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاضحیٰ، جلد 2، صفحہ 30

نہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، ابوثور نے کہا: راتیں دنوں میں داخل ہیں اور اس میں ذبح جائز ہے۔ امام مالک اور اشہب سے اسی طرح مروی ہے اور اشہب کے نزدیک ہدی اور قربانی کے درمیان فرق ہے۔ ہدی رات کو ذبح کرنے کی اجازت دی اور قربانی رات کو ذبح کرنے کی اجازت نہیں دی۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ جو اس نے انہیں دیا اس کو ذبح کرنے پر۔ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، الانعام سے مراد یہاں اونٹ، گائے اور بکری ہیں اور بھیمۃ الانعام سے مراد جانور ہیں یہ اس طرح ہے جیسے: صلاۃ الاولیٰ اور مسجد الجامع ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** فَكُلُوْا مِنْهَا یہ امر کا صیغہ ہے اور جمہور علماء کے نزدیک استحباب کے معنی میں ہے۔ مستحب ہے کہ آدمی اپنی ہدی اور قربانی سے کھائے اور اکثر صدقہ کر دے مگر سارا گوشت صدقہ کرنا اور سارا گوشت خود کھانا بھی جائز ہے۔ ایک طائفہ نے شاذ قول کہا ہے کہ خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا واجب ہے ان کا استدلال اس آیت کے ظاہر سے ہے اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہے کہ ''کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو'' (1)۔ الکیا نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا دلیل ہے کہ سارا گوشت بیچنا جائز نہیں اور سارا گوشت صدقہ کرنا بھی نہیں جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** کفار کے جانوروں سے ان کے مالکوں کے لیے کھانا جائز نہیں۔ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کہ تین جانوروں سے نہ کھائے۔ شکار کی جزا سے، اذیت کے فدیہ سے اور مساکین کی نذر سے۔ اس کے علاوہ سے کھائے جب وہ اپنے مقام پر پہنچ جائے خواہ وہ واجب ہو یا نفل ہو اس پر سلف صالحین کی جماعت اور فقہاء الامصار نے ان کی موافقت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔** اگر ایسے جانور سے کھا لیا جس سے کھانا ممنوع تھا تو کیا جتنا اس نے کھایا ہے اس کی چٹی دے گا یا مکمل ہدی چٹی دے گا؛ ہمارے مذہب میں دو قول ہیں۔ ایک وہ ہے جو ابن الماجشون نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: ابن عربی نے کہا اور وہی حق ہے کہ اس پر کوئی چیز نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر اس نے مساکین کے لیے ہدی کی نذر مانی تھی پھر ہدی کے مقام پر پہنچنے کے بعد اس نے اس میں سے کچھ کھا لیا تو وہ چٹی نہیں دے گا مگر جو انہوں نے کھایا۔ اور مدونہ میں اس کے خلاف مسئلہ ہے کیونکہ نحر واقع ہو چکا ہے اور حد سے تجاوز گوشت میں ہوا ہے۔ پس جو اس نے تجاوز کیا اتنی مقدار اس سے چٹی لی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ یہ نذر کے اخراج پر دلیل ہے خواہ وہ دم ہو یا ہدی ہو یا اس کے علاوہ ہو اور یہ دلیل ہے کہ نذر کی وفا کی وجہ سے خود اس کا اس سے کھانا جائز نہیں۔ اسی طرح شکار کی جزا اور اذیت کے فدیہ کا حکم ہے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ گوشت وغیرہ میں کمی کے بغیر مکمل طور پر ادا کرے۔ اگر اس نے اس میں سے خود کھایا تو اس پر دوسری ہدی ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 11۔** کیا گوشت کی قیمت یا کھانے کی قیمت چٹی دے گا۔ امام محمد کی کتاب میں عبد الملک سے مروی ہے کہ وہ کھانے کی چٹی دے گا۔ پہلا قول اصح ہے کھانا ہدی کے مقابلہ میں ہدی کے نہ پائے جانے کے وقت عبادت ہوتا ہے اور تعدی کا حکم، عبادت کا حکم نہیں ہوتا۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، النہی عن اکل لحم بعد ثلاث فی اول الطعام، جلد 2، صفحہ 158

**مسئلہ نمبر 12**۔ اگر شکاری کی جزا، اذیت کے فدیہ اور مساکین کی نذر کی ہدی میں سے کوئی ہلاک ہو جائے جبکہ ابھی وہ اپنے مقام پر نہ پہنچی ہو تو اس کا مالک اس سے کھا سکتا ہے اور اس سے غنی اور فقراء اور جن کو مالک پسند کرے سب کو کھلا سکتا ہے اور اس کا گوشت کھا سکتا ہے اور اس کے ہار میں سے کوئی چیز فروخت نہیں کرے گا۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا: ہدی جو مضمون ہے جب وہ اپنے محل میں پہنچنے سے پہلے ہلاک ہو جائے تو مالک پر اس کا بدل ہو گا اسی وجہ سے مالک کے لیے اس میں سے خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا جائز ہے۔ جب نفلی ہدی اپنے محل میں پہنچنے سے پہلے ہلاک ہو جائے تو اس سے خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا جائز نہیں کیونکہ اس پر جب اس کا بدل نہیں ہے تو اندیشہ ہے کہ وہ ہدی کے ساتھ ایسا خود کرے اور اس کی ہلاکت کے بغیر اسے ذبح کر ڈالے۔ پس لوگوں پر احتیاط رکھی گئی ہے اسی پر عمل ہے۔ ابوداؤد نے ناجیہ اسلمی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ ایک ہدی بھیجی اور فرمایا: ''اگر اس میں سے کوئی چیز ہلاک ہو جائے تو اسے ذبح کر دینا اور اس کے خون میں اس کی نعل کو رنگ دینا پھر اس کے اور لوگوں کے درمیان راستہ خالی چھوڑ دینا'' (1)۔ اس حدیث کی وجہ سے امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں اور امام احمد، اسحاق، ابوثور اور اصحاب الرائے اور ان کے پیروکاروں نے کہا: نفلی ہدی سے اس کا لے جانے والا کچھ نہ کھائے اور اسے لوگوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دے۔ صحیح مسلم میں ہے: ''اس سے تو اور تیرے رفقاء میں سے کوئی نہ کھائے'' (2)۔ نہی کی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام شافعی نے دوسرے قول میں فرمایا اور ابن المنذر نے بھی اس کو پسند کیا ہے فرمایا: اس کا لے جانے والا نہ کھائے اور اس کے رفقاء میں سے بھی کوئی نہ کھائے۔ ابوعمر نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول کہ ''اس میں سے تو بھی نہ کھائے اور تیرے رفقاء میں سے بھی کوئی نہ کھائے''۔ یہ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے یہ ہشام بن عروہ عن ابیہ عن ناجیہ کی سند سے مروی حدیث میں نہیں ہے اور ہمارے نزدیک یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کی نسبت زیادہ صحیح ہے اور فقہاء کے نزدیک اسی پر عمل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: خلّ بینها وبین الناس (3) میں اس کے رفقاء اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔ امام شافعی اور ابوثور نے کہا: جس ہدی کی اصل واجب ہو اس سے نہ کھائے اور جو ہدی نفلی ہو یا قربانی ہو اسے خود کھائے اور ہدیہ بھی دے، ذخیرہ بھی کرے اور صدقہ بھی کرے۔ تمتع اور قران کی ہدی ان کے نزدیک قربانی ہے۔ امام اوزاعی کا مذہب بھی اسی طرح ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ تمتع کی ہدی اور نفلی ہدی سے کھا سکتا ہے اور جو ان کے علاوہ ہیں جو احرام کے حکم کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں اس میں سے نہ کھائے۔ امام مالک سے حکایت کیا گیا ہے کہ دم الفساد سے نہ کھائے۔ اس قیاس پر دم الجبر سے بھی نہ کھائے جیسے امام شافعی اور اوزاعی کا قول ہے۔ امام مالک نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ شکار کی جزا کو اللہ تعالیٰ نے مساکین کے لیے بنایا ہے۔ ارشاد فرمایا: اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ (المائدہ: 95) اور اذیت کے فدیہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب مناسک الحج، باب الهدی إذا عطب، جلد 1، صفحہ 245۔ سنن ابی داؤد، 1499۔ ابن ماجہ، 3096، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، ما یفعل بالهدی إذا عطب فی الطریق، جلد 1، صفحہ 427

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز الحلق للمحرم، جلد 1، صفحہ 382

میں فرمایا: فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرہ: 196) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ کو فرمایا: ''چھ مساکین کو کھلاؤ ہر مسکین کے لیے دو مد ہوں یا تین دنوں کے روزے رکھو یا ایک بکری ذبح کرو'' اور مساکین کی نذر کی تصریح کی گئی ہے رہے ان کے علاوہ ہدایا تو وہ اپنی اصل پر باقی ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان ہدایا سے کھایا جو وہ لے کر آئے تھے اور ان کے شوربے سے پیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصح روایات کے مطابق قارن تھے۔ اور آپ پر یہ ہدی واجب تھی۔ امام ابوحنیفہ کا قول صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہدایا سے کھانے کی اجازت دی کیونکہ عرب قربانی سے کھانا جائز نہیں سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مخالفت کا حکم دیا پس ضروری ہے جیسے مشروع ہے اور جیسے آپ نے پہنچایا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا جب آپ نے ہدی دی اور احرام باندھا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ فَكُلُوْا مِنْهَا بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد لوگوں کے فعل کا ناسخ ہے کیونکہ وہ قربانیوں کے گوشت اپنے اوپر حرام سمجھتے تھے اور اس سے کھاتے نہیں تھے جیسا کہ ہم نے ہدایا میں کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فَكُلُوْا مِنْهَا کے ارشاد سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: من ضحی فلیأکل من أضحیتہ جس نے قربانی دی وہ اپنی قربانی سے کھائے۔ سے ان کے عمل اور نظریہ کو منسوخ کر دیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی اور ہدی سے کھایا تھا۔ زہری نے کہا: کلیجی میں سے پہلے کھانا سنت ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ تہائی گوشت صدقہ کرنا، تہائی گوشت لوگوں کو کھلانا اور تہائی اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے رکھنا مستحب ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے: ہمارے نزدیک ضحایا میں معلوم اور موصوف قسم نہیں ہے۔ امام مالک نے اپنی حدیث میں فرمایا: مجھے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے خبر پہنچی ہے اور اس پر عمل نہیں ہے اور الصحیح اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بکری قربانی دی، پھر فرمایا: ''اے ثوبان! اس بکری کے گوشت کو صاف کر'' (1)۔ فرمایا: میں اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلاتا رہا حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ یہ اس مقصود میں نص ہے۔ امام شافعی کے اقوال مختلف ہیں کبھی فرمایا: نصف کھائے اور نصف صدقہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ دو شخصوں کا ذکر کیا ہے کبھی فرمایا: ایک تہائی کھائے ایک تہائی ہدیہ دے اور ایک تہائی دوسروں کو کھلائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ یہاں تین آدمیوں کا ذکر ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ مسافر بھی اسی طرح قربانی کرنے کا مخاطب ہے جس طرح مقیم ہے کیونکہ اصل خطاب میں عموم ہے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے اس میں امام ابوحنیفہ اور نخعی نے اس کی مخالفت کی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حدیث ان کے خلاف حجت ہے مسافرین میں سے امام مالک نے منیٰ کے حاجیوں کی استثنا کی ہے۔ وہ ان پر قربانی کا نظریہ نہیں رکھتے یہی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاضحی، باب فی المسافر یضحی، جلد 2، صفحہ 33۔ ایضاً، 2431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نخعی کا قول ہے اور یہی حضرت ابو بکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے کیونکہ حاجی اصل میں ہدی کے ساتھ مخاطب ہے جب وہ قربانی دینے کا ارادہ کرے گا تو اسے ہدی بنائے گا اور لوگوں کا حکم حاجی سے مختلف ہے انہیں قربانی دینے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ اہل منیٰ کے مشابہ ہو جائیں اور انہیں ان کے اجر سے حظ وافر ملے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ گوشت ذخیرہ کرنے کے متعلق چار اقوال ہیں۔ حضرت علی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے مروی ہے ''تین دنوں کے بعد ضحایا کے گوشت سے ذخیرہ نہ کر''۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہوں نے یہ روایت کیا ہے یہ آئندہ آئے گا۔ ایک جماعت نے کہا: ذخیرہ کرنے کی نہی جو مروی ہے وہ منسوخ ہے پس جس وقت تک چاہے ذخیرہ کر سکتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت بریدہ اسلمی کا یہی قول ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس سے مطلقاً کھانا جائز ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اگر لوگوں کو حاجت ہو تو ذخیرہ نہ کرے کیونکہ نہی ایک علت کی وجہ سے تھی فرمایا: ''میں نے تمہیں قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے منع کیا تھا'' (1)۔ جب وہ علت اُٹھ گئی تو موجب کے اٹھ جانے کی وجہ سے پہلا حکم بھی اٹھ گیا نہ کہ یہ منسوخ ہے۔ یہاں ایک اصولی مسئلہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ نسخ کے ساتھ حکم کا اٹھانا اور علت کے ختم ہونے کے ساتھ حکم کو اٹھانے میں فرق ہے۔ نسخ کے ساتھ اٹھائے گئے حکم کے ساتھ کبھی بھی حکم نہیں لگایا جاتا لیکن علت کے ارتفاع کے ساتھ اٹھایا گیا حکم، علت کے لوٹنے کے ساتھ حکم بھی لوٹ آتا ہے۔ پس اب بھی اگر کسی شہر میں قربانی کے دنوں میں محتاج لوگ آجائیں اور اس شہر والوں کے پاس ان کی بھوک مٹانے کی وسعت نہ ہو مگر قربانیوں کا گوشت تو ان پر متعین ہو جائے گا کہ وہ تین دنوں سے زیادہ گوشت کو ذخیرہ نہ کریں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ وہ احادیث جو اس باب میں وارد ہیں منع اور اباحت کے متعلق وہ صحیح اور ثابت ہیں کبھی منع اور اباحت اکٹھے آئے ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ، حضرت سلمہ بن اکوع اور حضرت ابو سعید کی حدیث میں منصوص ہے جن کو صحیح میں روایت کیا گیا ہے۔ صحیح میں ابو عبید مولیٰ بن ازہر سے مروی ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عید کی نماز میں حاضر ہوئے فرمایا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ عید کی نماز پڑھی فرمایا: آپ نے ہمیں خطبہ سے پہلے عید کی نماز پڑھائی پھر لوگوں کو خطاب کیا فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں تین دنوں سے زیادہ اپنی قربانیوں کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے پس تم انہیں تین دنوں سے زیادہ نہ کھاؤ (2)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دنوں سے زیادہ قربانیوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ سالم نے کہا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، تین دنوں سے زیادہ قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ابو داؤد نے حضرت نُبیشہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم نے تمہیں تین دنوں سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا تھا تاکہ تمہارے لیے کشادگی کا باعث ہو۔ اب اللہ تعالیٰ نے (رزق) میں وسعت دے دی ہے اب تم کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور کھانا کھلانے کے ذریعے اجر طلب کرو خبردار! یہ ایام کھانے، پینے اور اللہ تعالیٰ کے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب من النھی عن اکل اللحم، جلد 2، صفحہ 158 2۔ ایضاً

ذکر کے ایام ہیں"(1)۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: اس مسئلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے سب سے بہتر یہ قول ہے تا کہ احادیث متفق ہوں اور ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب اور حضرت عثمان کا قول محصور ہے کیونکہ لوگ انتہائی شدت میں تھے۔ پس انہوں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا جب مسافر لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس پر دلیل یہ حدیث ہے جو ابراہیم بن شریک نے ہمیں بتائی انہوں نے کہا ہمیں احمد نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں لیث نے بتایا انہوں نے کہا مجھے حارث بن یعقوب نے بتایا انہوں نے یزید بن ابی یزید سے روایت کیا انہوں نے اپنی بیوی سے روایت کیا کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قربانیوں کے گوشت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہمارے پاس حضرت علی بن ابی طالب آئے تو ہم نے ان کے سامنے قربانی کا گوشت رکھا انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا حتی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیں انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو فرمایا: "ذی الحجہ سے ذی الحجہ تک کھاؤ"۔ امام شافعی نے فرمایا: جن لوگوں نے تین دن کے بعد ذخیرہ کرنے سے منع کا ذکر کیا ہے انہوں نے رخصت نہیں سنی اور جس نے مطلقا رخصت کا ذکر کیا ہے انہوں نے ذخیرہ کرنے کی نہی نہیں سنی اور جنہوں نے نہی اور رخصت کا ذکر کیا ہے انہوں نے دونوں کو سنا اور دونوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ مزید تفصیلی اختلاف جو قربانی کے وجوب اور مستحب ہونے کے متعلق ہے اس کا ذکر سورۃ الکوثر میں آئے گا۔ اور یہ بھی وضاحت ہوگی کہ یہ ہر ذبح کے لیے ناسخ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ۔ الفقیر صفت ہے البائس کی۔ البائس وہ ہوتا ہے جسے بھوک اور شدت فقر نے آلیا ہے۔ کہا جاتا ہے: بیأس باساً جب کوئی فقیر ہو جائے۔ فھو بائس کبھی اس شخص کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جس پر زمانہ کا کوئی حادثہ آیا ہو اگرچہ وہ فقیر نہ ہو۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لکن البائس سعد بن خوله(2)، لیکن سعد بن خولہ (جسے مکہ میں موت آئی تھی اس) فقیر پر افسوس ہے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ بئیسٌ سخت آدمی کبھی بؤس بیؤس بأساً استعمال ہوتا ہے جب سخت ہو جائے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕیْسٍ (الاعراف: 165) یعنی سخت عذاب سے ہم نے ظالموں کو پکڑ لیا۔ جب قربانی کا گوشت زیادہ صدقہ کیا جائے تو اجر بھی زیادہ ہوگا اور وہ مقدار جس کا کھانا جائز ہے اس میں اختلاف ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بعض نے فرمایا: نصف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فکلوا و اطعموا۔ بعض نے کہا 2\3 حصہ صدقہ کرے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الا فکلوا وادخروا واتجروا (خبردار! کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور کھلانے کے ساتھ اجر طلب کرو) کھانے اور کھلانے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: دونوں واجب نہیں۔ بعض نے کہا: دونوں مستحب ہیں۔ بعض نے کہا: کھانے اور کھلانے کے حکم میں فرق ہے۔ کھانا مستحب ہے اور کھلانا واجب ہے، یہی امام شافعی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ یعنی قربانیوں اور ہدایا کو نحر کرنے کے بعد ماقی حج کے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاضحی، حبس لحوم الاضاحی، جلد 2، صفحہ 33

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، رثاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن خولہ، جلد 1، صفحہ 173

امور ادا کریں جیسے حلق کرانا، رمی جمار کرنا اور میل کچیل دور کرنا۔ ابن عرفہ نے کہا: یعنی وہ اپنے آپ سے اپنی میل دور کریں۔ ازہری نے کہا التفث کا معنی مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا، بغلوں کے بال نوچنا، اور زیر ناف بال صاف کرنا، یہ احرام سے خروج کے وقت ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: عرب کلام میں التفث کا معنی میل اور پراگندگی دور کرنا ہے۔ میں نے زہری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عرب کلام میں التفث کا معنی صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اہل تفسیر کے قول سے معروف ہے۔ حسن نے کہا: اس کا معنی احرام کی میل کو دور کرنا ہے۔ بعض علماء نے کہا: التفث سے مراد تمام مناسک حج ہیں اس کو حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اگر ان دونوں سے روایت صحیح ہے تو یہ حجت ہے کیونکہ انہیں شرف صحبت حاصل ہے اور لغت کا احاطہ بھی رکھتے ہیں فرمایا: یہ لفظ غریب ہے اہل عرب اس میں کوئی شعر نہیں پاتے اور اس کے بارے کوئی خبر نہیں رکھتے ہیں لیکن میں نے التفث کا لغوی معنی تلاش کرنے کی کوشش کی تو میں نے ابوعبیدہ معمر بن المثنی کو دیکھا انہوں نے فرمایا: یہ ناخن کاٹنا اور مونچھیں کاٹنا ہے اور نکاح کے علاوہ محرم پر جو حرام ہے اس کو ختم کرنا ہے۔ فرمایا: اس میں کوئی شعر نہیں آیا جس سے حجت پکڑی جائے۔ صاحب العین نے کہا: التفث کا معنی رمی جمار کرنا، حلق کرانا یا بال چھوٹے کرانا، ذبح کرنا، ناخن کاٹنا، مونچھیں کاٹنا اور زیر ناف بال صاف کرنا ہے۔ زجاج اور فراء نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے انہوں نے یہ علماء کے اقوال سے لیا ہے۔ قطرب نے کہا: تفث الرجل کا معنی ہے جب اس کی میل زیادہ ہو جائے۔ امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

حفُّوا رؤسهم لم يحلِقوا تَفَثًا ولم يَسُلُّوا لهم قَمْلاً وصِئبانا

قطرب نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ التفث میں وہی صحیح ہے یہ لغوی اعتبار سے میل کچیل کو دور کرنا ہے۔ رہی شریعت کی حقیقت تو جب حاجی یا عمرہ کرنے والا اپنی ہدی کو نحر کرتا ہے اور اپنا سر حلق کراتا ہے اور اپنی میل دور کرتا ہے اور پاک صاف ہو جاتا ہے اور عام کپڑے پہن لیتا ہے تو وہ اپنی میل دور کر دیتا ہے اور اپنی نذر پوری کر دیتا ہے اور نذر سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو خود اپنے اوپر لازم کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو قطرب سے حکایت کیا گیا ہے وہ شعر سے ذکر کیا گیا ہے اس کو ماوردی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور اس نے ایک اور شعر بھی لکھا ہے:

قَضوا تَفَثًا ونَحَبًا ثم ساروا إلى نَجْدٍ وما انتظروا عليًا

ثعلبی نے کہا: التفث کا لغوی معنی میل ہے۔ عرب جس شخص کو ناپسند اور گندہ سمجھتے ہیں اس کے لیے استعمال کرتے ہیں ما اتفثك یعنی تو کتنا گندہ ہے۔ امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

ساخين آباطهم لم يقذفوا تفثا وينزعوا عنهُم قَمْلاً وصِئبانا

ماوردی نے کہا بعض صلحاء سے پوچھا گیا کہ شعث المحرم سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ خود گواہی دے کہ تو اپنے نفس کی دیکھ بھال نہیں کرتا اور وہ اطاعت کے لیے اپنی جان قربان کرنے میں تیری سچائی کو جان لے۔

**مسئلہ نمبر 21۔** وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ مطلقاً انہیں نذر پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ کہ وہ معصیت نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ کی معصیت میں نذر کو پورا کرنا نہیں ہے'' (1) اور ارشاد فرمایا: ''جو اللہ کی اطاعت کرنے کی نذر مانے وہ اس کی اطاعت کرے اور جو اس کی نافرمانی کی نذر مانے وہ ادا نہ کرے'' (2)۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۞ اس آیت میں طواف افاضہ کا ذکر ہے جو حج کے واجبات سے ہے۔ طبری نے کہا: مفسرین کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 22۔** حج کے تین طواف ہیں۔ طواف قدوم، طواف افاضہ، طواف وداع۔ اسماعیل بن اسحق نے کہا: طواف قدوم سنت ہے۔ یہ مراہق، مکی اور ہر اس شخص سے ساقط ہوتا ہے جو مکہ سے حج کا احرام باندھتا ہے فرمایا: واجب طواف کسی چیز سے ساقط نہیں ہوتا اور وہ طواف افاضہ ہے نویں ذوالحجہ کے بعد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ فرمایا: یہ طواف کتاب اللہ میں فرض کیا گیا ہے۔ اس طواف کے ساتھ حاجی اپنے احرام سے فارغ ہو جاتا ہے۔ حافظ ابو عمر نے کہا: طواف افاضہ کے بارے میں اسماعیل نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اہل مدینہ کے نزدیک امام مالک کا قول ہے۔ یہ ابن وہب، ابن نافع اور اشہب کی ان سے روایت ہے۔ اور یہی فقہاء اہل حجاز و عراق کا نظریہ ہے۔

ابن القاسم اور ابن عبدالحکم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ طواف قدوم واجب ہے۔ ابن القاسم نے المدونہ سے ذکر کیا ہے۔ اور اسے امام مالک سے بھی روایت کیا ہے کہ طواف واجب مکہ کی طرف آنے والے کا طواف ہے۔ فرمایا: جو مکہ میں دخول کے وقت طواف بھول گیا یا اس سے کوئی چکر بھول گیا یا سعی بھول گیا یا اس کا کوئی چکر بھول گیا حتی کہ وہ اپنے شہر لوٹ آیا پھر یہ ذکر کیا: اگر اس نے بیوی سے مجامعت نہیں کی تو مکہ کی طرف لوٹ آئے اور بیت اللہ کا طواف کرے اور دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے پھر ہدی دے اگر عورت سے مجامعت کر چکا ہو تو لوٹ آئے، طواف کرے اور سعی کرے پھر عمرہ کرے اور ہدی دے۔ یہ بالکل اس شخص کی مانند حکم رکھتا ہے جو طواف افاضہ بھول گیا ہو۔ اس روایت پر دونوں طواف واجب ہیں اور سعی بھی واجب ہے اور رہا طواف صدر جس کو طواف وداع بھی کہا جاتا ہے تو ابن القاسم وغیرہ نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ جو بغیر وضو کے طواف افاضہ کرے وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے اور طواف افاضہ کرے مگر اس کے بعد تطوع (نفل) ہوگا اس مسئلہ پر امام مالک اور ان کے اصحاب کا اجماع ہے۔ ان کے نزدیک واجب فرض طواف کی جگہ نفل طواف جائز ہے، اسی طرح ان کا اجماع ہے کہ جس نے حج میں کوئی نفلی کام کیا اور وہ کام حج میں واجب تھا جبکہ اب اس کا وقت گزر گیا ہے تو اس کا وہ نفلی کام واجب کے طور پر ہو جائے گا نفل کے لیے نہ ہوگا۔ بخلاف نماز کے۔ جب نفل حج میں فرض کے قائم مقام ہو جائے گا تو مکہ میں دخول کا طواف بھی طواف افاضہ کے قائم مقام بدرجہ اولیٰ ہو جائے گا مگر جو طواف دسویں کے دن جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے بعد ہو یا اس کے بعد ہو تو وہ وداع کے لیے ہوگا۔ ابن عبدالحکم کی روایت امام مالک سے اس

1۔ مسند عبدالرزاق، کتاب الایمان والنذر، لا نذر فی معصیۃ اللہ، جلد 8، صفحہ 376

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذر، النذر فی الطاعۃ، جلد 2، صفحہ 991

کے برعکس ہے کیونکہ اس میں ہے کہ دخول مکہ کا طواف جو سعی کے ساتھ ہو وہ طواف افاضہ کے قائم مقام ہو جائے گا اس شخص کے لیے جو اپنے شہر کی طرف ہدی کے ساتھ لوٹ آیا ہو جیسا کہ طواف افاضہ سعی کے ساتھ قائم مقام ہو جاتا ہے اس شخص کے لیے جس نے ہدی کے ساتھ مکہ میں داخل ہوتے وقت طواف قدوم اور سعی نہ کی ہو اور جنہوں نے یہ کہا انہوں نے یہ بھی کہا: طواف دخول کو واجب کیا جائے اور طواف افاضہ کو بھی واجب کیا جائے کیونکہ یہ ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے ہیں نیز امام مالک سے مروی ہے کہ جو ان میں سے ایک طواف بھول جائے وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حاجی پر صرف ایک طواف فرض کیا ہے۔ فرمایا: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ اور آیت کے سیاق میں فرمایا: وَ لْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ اس آیت اور دوسری آیات میں ان کے نزدیک واؤ ترتیب کے لیے نہیں مگر توقیفی ہے۔ طبری نے عمرو بن ابی سلمہ سے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے فرمایا: میں نے زہیر سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ طواف وداع ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ واجب ہے؛ یہ امام شافعی کا پہلا قول ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض والی عورت کو بغیر طواف کے جانے کی رخصت دی اور رخصت نہیں دی جاتی مگر واجب میں۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ علماء کا البیت کی صفت العتیق کی وجہ میں اختلاف ہے مجاہد اور الحسن نے کہا: العتیق کا معنی قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے: سیف عتیق پرانی تلوار۔ قد عتق کا معنی ہے قدم اس قول کی تائید نظر بھی کرتی ہے۔ صحیح میں ہے: انہ اول مسجد وضع فی الارض، (1) یہ پہلی مسجد ہے جو زمین میں بنائی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو عتیق اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آزاد فرمایا ہے کہ کوئی جابر شخص ذلت کے ساتھ اس پر قیامت تک مسلط ہو؛ یہ معنی ابن زبیر اور مجاہد نے بیان فرمایا۔ امام ترمذی میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البیت العتیق (2) اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس پر کوئی جابر غالب نہیں آئے گا"۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً مروی ہے اگر کوئی حجاج بن یوسف کا حوالہ دے کہ اس نے کعبہ پر منجنیق نصب کی تھی اور کعبہ کو توڑا بھی تھا تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفار جابروں سے آزاد کیا کیونکہ اگر وہ سرکشی کرتے ہوئے اور بیت کی حرمت کا اعتقاد نہ رکھتے ہوئے آئیں گے اور کعبہ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرتے ہوئے آئیں گے پس کفار سے اسے محفوظ کیا گیا یہ دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے جبراً پھیر دیا ہے رہے مسلمان جو اس کی حرمت کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ بھی اگرچہ اس سے رک جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی منزلت پر وہ دلالت نہ ہو گی جس کی اس کے دشمنوں کو روکنے میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو نہی اور وعید کے ساتھ روکا ہے اور انہیں مجبوری اور اضطرار کی حالت میں نہیں پھیرا اور قیامت کو ان کے وعدہ کی جگہ بنایا اور قیامت بھی خوفناک اور کڑوی ہے۔ بعض نے کہا: اس کو عتیق اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ جگہ کبھی کسی کی ملکیت نہیں رہی۔ ایک طائفہ نے کہا: اس کو عتیق اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس میں مجرموں کو عذاب سے آزاد فرماتا ہے۔ بعض نے کہا: اس کو عتیق اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے طوفان میں غرق ہونے سے بچایا گیا؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے۔ بعض

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ حج، جلد 2، صفحہ 146

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199

نے کہا: العتیق کا معنی کریم ہے۔ العتق کا معنی کرم ہے۔ طرفہ نے اپنے گھوڑے کا وصف بیان کیا ہے:

مُؤَلَّلتَان تَعْرِف العِتْق فیهما كسا مِعَتَيْ مذعورة وسط رَبْرَبِ

عتق الرقیق۔ غلامی کی ذلت سے نکلنا اور حریت کی عزت کی طرف جانا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ عتیق صفت مدح ہو جو کسی شے کی عمدگی کا تقاضا کرتی ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: حملت علی فرس عتیق۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ نظر اور حدیث صحیح اس کی تائید کرتی ہے۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے زمین سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ کو تخلیق کیا اسی وجہ سے اس کو عتیق کہا گیا۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۗ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝

''ان احکام کو یادرکھو اور جو شخص تعظیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اس کے رب کے ہاں اور حلال کیے گئے تمہارے لیے جانور بجز ان کے جن کی حرمت پڑھی گئی تھی تم پر بس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور بچو جھوٹی بات سے، یکسر مائل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف نہ شریک ٹھہراتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اس کی حالت ایسی ہے گویا وہ گرا ہوا ہے آسمان سے پس اچک لیا ہو اسے کسی پرندے نے یا پھینک دیا ہو اسے ہوا نے کسی دور جگہ میں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ اس میں احتمال ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اور اس کی تقدیر یہ ہو: فرضکم ذالك یا الواجب ذالك اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اس کی تقدیر یہ ہو امتثلوا ذالك؛ زہیر کے قول میں اس کی مثل اشارہ ہے:

هذا وليس كمن يَعْيَا بخُطَّته وَسْطَ النَّدِيّ إذا ما قائل نطقاً

اور یہاں حرمات مقصودہ سے مراد افعال حج ہیں جن کی طرف ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے اس میں جگہوں کی تعظیم بھی داخل ہے؛ یہ ابن زید وغیرہ کا قول ہے۔ یہ کہنا تمام چیزوں کو شامل ہے کہ حرمات سے مراد تمام فرائض اور سنن کی پیروی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ان حرمات میں سے کسی کی تعظیم کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اہانت سے بہتر ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ تعظیم اس خیرات سے بہتر ہے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ خیر کا لفظ تفضیل کے لیے نہیں یہ خیر کا وعدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُحِلَّتۡ لَكُمُ الۡاَنۡعَامُ کہ تم انہیں کھاؤ یہ اونٹ، گائیں اور بکریاں ہیں۔ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ یعنی کتاب میں جن محرمات کا ذکر ہے اور وہ المیتۃ (مردار) اور موقوذہ وغیرہ ہیں۔ یہ حج کے امر کے ساتھ اتصال ہے کیونکہ حج میں ذبح کا حکم ہے پس جن کا ذبح کرنا اور جن کا گوشت کھانا حلال ہے اس کو بیان کیا۔ بعض نے کہا: اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ (المائدہ: 1) مراد ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ، الرِّجۡسَ گندی چیز کو کہتے ہیں۔ الوثن وہ بت جو لکڑی، لوہے، سونے یا چاندی وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں۔ عرب انہیں نصب کرتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ نصاریٰ صلیب نصب کرتے تھے اس کی عبادت کرتے تھے، اور اس کی تعظیم کرتے تھے یہ بھی تمثال کی طرح ہے۔ عدی بن حاتم نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی۔ فرمایا: ''اس بت کو اپنے آپ سے دور کر'' (1) یعنی صلیب کو دور کر۔ اس کی اصل وثن الشی ہے۔ یعنی اپنی جگہ میں اس کو کھڑا کیا۔ صنم کو وثن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نصب کیا جاتا ہے اور ایک جگہ گاڑھا جاتا ہے جہاں سے وہ ہلتا نہیں۔ مراد یہ ہے کہ بتوں کی عبادت سے اجتناب کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن جریج سے مروی ہے اور اس کو رجس کہا ہے کیونکہ یہ عذاب کا سبب ہیں۔ بعض نے کہا: اس کو رجس کہا۔ الرجس کا معنی نجس ہے۔ یہ حکماً نجاست ہے۔ اعیان کا جو ذاتی وصف ہوتا ہے وہ نجاست نہیں ہے۔ یہ وصف شرعی جو ایمان کے احکام سے ہے اور یہ زائل نہیں ہوتا مگر ایمان سے جیسے پانی کے بغیر طہارت جائز نہیں ہوتی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مِنۡ جو مِنَ الۡاَوۡثَانِ کے ارشاد میں ہے، بعض علماء نے کہا: یہ جنس کے بیان کے لیے ہے یہاں صرف بتوں کی غلاظت سے نہی واقع ہوئی ہے اور باقی غلاظتوں سے نہی دوسرے مقام پر بیان ہوئی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ من ابتداء غایت کے لیے ہو گویا انہیں مطلقاً نجاست سے روکا پھر اس مبدء کو ان کے لیے متعین کر دیا جو انہیں لاحق تھا کیونکہ بت کی عبادت ہر فساد اور رجس کی جامع ہے۔ اور جنہوں نے کہا: من تبعیض کے لیے ہے انہوں نے آیت کا معنی الٹ کر دیا اور خراب کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ ۝، الزُّوۡرِ باطل اور جھوٹ کو کہتے ہیں۔ زور کہا جاتا ہے کیونکہ حق سے پھیرا گیا ہوتا ہے، اسی سے ہے: تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ (الکھف: 17) مدینۃ زوراء یعنی مائلۃ ہر وہ چیز جو حق کے علاوہ ہے وہ کذب باطل اور زور ہے۔ حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے فرمایا: عُدِلَتۡ شهادةُ الزور بالشرك بالله (2) بتوں کی عبادت، نہی میں شرک باللہ سے ملائی گئی ہے۔ یہ جملہ آپ نے دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ فرمایا (3)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت جھوٹی گواہی دینے کی وعید کو متضمن ہے۔ حاکم کے لیے مناسب ہے کہ جب اسے جھوٹے گواہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 136　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب القضایا، باب فی شھادۃ الزور، جلد 2، صفحہ 150

3۔ جامع ترمذی کتاب الشہادات، باب ما جاء فی شھادۃ الزور، حدیث 2222۔ ابن ماجہ، کتاب الاحکام باب شھادۃ الزور، حدیث 2362

پر اطلاع ہو جائے تو اسے تعزیر لگائے اور اس کے متعلق لوگوں کو بتائے تا کہ وہ پہچانا جائے اور کسی کو اپنی شہادت سے دھوکا نہ دے۔ اس کی شہادت میں حکم مختلف ہو جاتا ہے جب وہ توبہ کرے۔ اگر وہ پہلے اہل عدالت میں سے تھا عدالت کے ساتھ مشہور تھا اور اسے اچھا سمجھا جاتا تھا تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گا کیونکہ توبہ میں اس حالت تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ وہ پہلے سے زیادہ نیکیاں کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر پہلے وہ اتنا نیکی میں مشہور نہ تھا پھر توبہ کے بعد اس نے عبادت شروع کر دی اور تقویٰ کا پیکر بن گیا تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ان اکبر الکبائر الاشراك بالله وعقوق الوالدین وشهادة الزور وقول الزور (1)، یعنی بڑے سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹی بات کرنا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے آپ آخری جملہ کا تکرار کرتے رہے حتی کہ ہم نے کہا: کاش! آپ خاموش ہو جاتے (2)۔

**مسئلہ نمبر 7۔** حُنَفَآءَ لِلّٰهِ اس کا معنی ہے مستقیم، مسلمان اور حق کی طرف مائل ہونا ہے۔ حنفاء کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ استقامت پر واقع ہوتا ہے اور میل پر بھی واقع ہوتا ہے۔ اور حنفاء پر نصب حال کی بنا پر ہے۔ بعض نے کہا: حنفاء کا معنی حجاجاً ہے یہ تخصیص ایسی ہے جس کے ساتھ کوئی حجت نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ یہ قیامت کے دن اس کی مانند ہوگا جو اپنے لیے نہ نفع کا مالک ہوگا اور نہ اپنے سے ضرر و عذاب کو دور کر سکے گا وہ اس کی مانند ہوگا جو آسمان سے گرا ہو۔ پس وہ اپنے نفس کے دفاع پر قادر نہ ہوگا۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ یعنی پرندوں نے اسے اپنے پنجوں سے کاٹ دیا ہو۔ بعض علماء نے کہا: یہ اس کی حالت اس کی روح کے نکلنے اور فرشتوں کے اس کی روح کو آسمان کی طرف لے جانے کے وقت ہوگی۔ آسمان کا دروازہ کھولا جائے گا پھر اس کی روح کو زمین کی طرف پھینک دیا جائے گا جیسا کہ حضرت براء کی حدیث میں ہے ہم نے اپنی کتاب التذکرہ میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔ السحیق کا معنی بعید ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (الملک) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فسحقاً فسحقاً (3) دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

''حقیقت یہ ہے اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔ تمہارے لیے مویشیوں میں طرح طرح کے فائدے ہیں ایک معین مدت تک پھر ان کے ذبح کرنے کا مقام بیت عتیق کے قریب ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر اکبرھا، جلد 1، صفحہ 64
2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ النساء، 2945
3۔ صحیح بخاری، کتاب الشھادۃ، باب قیل فی شھادۃ الزور، جلد 1، صفحہ 362

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ، اس میں تین وجوہ ہیں۔ بعض نے کہا: مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے تقدیر یوں ہوگی۔ ذالك أمراللہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ محل نصب میں ہو یعنی اتبعوا ذالك۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ، الشعائر جمع ہے شعیرۃ کی۔ ہر وہ چیز جس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی امر ہو جس سے وہ جانا پہچانا جائے اسی سے جنگ میں قوم کا شعار ہوتا ہے، یعنی ان کی ایک علامت ہوتی ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں اسی سے اشعار البدن ہے اونٹ کی دائیں طرف میں نیزہ مارا جاتا ہے تاکہ خون بہہ جائے تو وہ اس کی علامت ہوتی ہے۔ یہ شعیرۃ بمعنی مشعورۃ ہے۔ شعائر اللہ سے مراد اس کے دین کی علامتیں ہیں خصوصاً جو حج کے مناسک کے متعلق ہیں۔ ایک قوم نے کہا: یہاں اس سے مراد اونٹوں کو موٹا کرنا اور اس کے معاملات کا اہتمام کرنا اور ان کو موٹا کرنے میں مبالغہ کرنا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ایک جماعت کا قول ہے (1)۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ ہے بعض اوقات آدمی اونٹ اس لیے خریدتا ہے کہ اس کی مجبوری ہوتی ہے وہ اخلاص پر دلالت نہیں کرتا اور جب جزا کے حصول کے لیے انہیں موٹا کرتا ہے تو اس سے شرع کی تعظیم کا عمل ظاہر ہوتا ہے یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ انھا کی ضمیر اس فعلہ کی طرف لوٹ رہی ہے جسے کلام اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اگر وہ انہ فرمایا تو بھی جائز تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ہا ضمیر شعائر کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی شعائر کی تعظیم۔ مضاف کو حذف کیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے پس ضمیر کنایہ شعائر کی طرف راجع ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ القلوب کو رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس بنا پر کہ تقویٰ مصدر کا فاعل ہے۔ تقویٰ کی نسبت قلوب کی طرف کی گئی ہے کیونکہ تقویٰ کی حقیقت دل میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں فرمایا: التقویٰ ھاھنا (2) اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: تقویٰ یہاں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ یعنی تمہارے لیے اونٹوں میں منافع ہیں سوار ہونا، دودھ حاصل کرنا، نسل بڑھانا، اون حاصل کرنا وغیرہ جب ان کا مالک ان کو بطور ہدی نہ بھیجے۔ جب وہ انہیں بطور ہدی بھیجے تو اس کے لیے مدت متعین ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: جب اونٹ بطور ہدی بھی ہو جائیں تو ضرورت کے وقت ان پر سوار ہونا اور اس کے بچے سے جو دودھ بچے اس کے لیے منافع ہیں۔ صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اونٹ لے جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اس پر سوار ہو جا'' اس نے عرض کی: حضور! یہ بدنہ ہے۔ فرمایا: ''سوار ہو جا''۔ اس نے پھر کہا: حضور! یہ بدنہ ہے۔ فرمایا: ''سوار ہو جا تیرے لیے ہلاکت ہو'' یہ دوسری یا تیسری مرتبہ فرمایا (3)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے اور ہدی پر سوار ہونے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں نے نبی کریم

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 121

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب تحریم ظلم مسلم، جلد 2، صفحہ 317

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7350

ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جب تمہیں ضرورت ہو تو معروف طریقہ پر اس پر سوار ہو حتیٰ کہ تم دوسری سواری پالو''(1)۔
الاجل المسمیٰ سے مراد اس قول کی بنا پر ان کو نحر کرنا ہے۔ یہ عطاء بن ابی رباح کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ بعض علماء نبی کریم ﷺ کے ارشاد: ''تو اس پر سوار ہو جا'' کی وجہ سے بدنہ کی سواری کے وجوب کی طرف گئے ہیں اور جنہوں نے اس ارشاد کے ظاہر کو لیا ہے ان میں امام احمد، اسحاق اور اہل ظاہر ہیں۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ بدنہ پر سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں اور مشہور یہ ہے کہ امام مالک بغیر مجبوری کے اس پر سواری نہیں کرتے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی وجہ سے کیونکہ وہ مقید ہے اور مقید، مطلق پر غالب ہوتا ہے۔ اسی طرح امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے بھی کہا ہے، اور پھر جب ضرورت کی وجہ سے سوار ہو گا تو ضرورت پوری ہونے پر اتر جائے گا؛ یہ اسماعیل قاضی کا قول ہے۔ یہی وہ بات ہے جس پر امام مالک کا مذہب دلالت کرتا ہے۔ یہ اس کے برعکس ہے جو ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس پر اترنا لازم نہیں اور ان کی دلیل نبی کریم ﷺ کا اس کی سواری کو مباح قرار دینا ہے۔ اور سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد: اذا الجئت الیها حتی تجد ظهرا۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے قول کی حجت پر دلالت کرتا ہے؛ اور اسی طرح جو اسماعیل قاضی نے امام مالک کا مذہب بیان کیا ہے اس کی صحت پر دال ہے اور صراحۃً مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آدمی کو فرمایا: ''تو سوار ہو''۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے فرمایا: مباح سوار ہونا بھی اس کی کمی و نقصان کا باعث ہو تو اس پر اس کی قیمت ہے اور اسے صدقہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ یعنی وہ بیت اللہ تک پہنچ جائے اور وہ طواف ہے پس محلها به محرم کے احرام اتارنے سے ماخوذ ہے معنی یہ ہے کہ حج کے تمام شعائر وقوف عرفہ، رمی جمار، سعی، بیت اللہ کے طواف افاضہ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس تاویل پر بیت سے مراد بیت اللہ ہی ہے؛ یہ امام مالک نے مؤطا میں کہا ہے۔ عطا نے کہا: مکہ تک پہنچ جائے۔ امام شافعی نے کہا: حرم تک پہنچ جائے۔ اس بناء پر شعائر سے مراد بدن (اونٹ) ہیں۔ شعائر کے متعلق عموم کے قول ہوتے ہوئے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں اور بیت اللہ کا ذکر خصوصیت کو لغو کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور ہر امت کے لیے ہم نے مقرر فرمائی ہے ایک قربانی تاکہ وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کا اسم (پاک) ان بے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں پس تمہارا خدا خدائے واحد ہے تو اسی کے آگے سر جھکاؤ اور (اے محبوب) مژدہ سنائیے تواضع کرنیوالوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا جب اللہ تعالیٰ نے ذبائح کا ذکر کیا تو بیان فرمایا کہ کوئی امت بھی اس حکم سے خالی نہ تھی۔ امت اس قوم کو کہتے ہیں جو ایک مذہب پر جمع ہو یعنی ہر مومن جماعت کے لیے ہم نے قربانی مقرر

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 14413

فرمائی۔ المنسک کا معنی ذبح کرنا اور خون بہانا ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے: نسلک جب ذبح کرے ینسلک نسکاً، ذبیحہ کو نسیکۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع نُسُک ہے اسی سے ہے اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرہ: 196) النسک کا معنی طاعت بھی ہے۔ ازہری نے اس قول وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا کے تحت فرمایا کہ یہاں یہ نحر کی جگہ پر دلالت کرتا ہے۔ مراد قربانی کی جگہ ہے۔ کہا جاتا: مَنسَک و منسِک یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ عاصم کے سوا کوفیوں نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: کلام عرب میں المنسک خیر و شر کی معتاد جگہ کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: اس سے مراد مناسک حج ہیں کیونکہ لوگ ان کی طرف بار بار لوٹتے ہیں وقوف عرفہ، رمی جمار اور سعی۔ ابن عرفہ نے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا کے متعلق کہا جب کوئی قوم پہلے مسلک پر چلے۔ پہلا قول اظہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ یعنی جو اس نے دیا ہے اسے ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے ساتھ ذبح کرنے کا حکم دیا تاکہ ذبح اس کے لیے ہو کیونکہ اس کا عطا کرنے والا ہے پھر سابقہ امتوں کے متعلق خبر دینے کے لفظ سے حاضرین کی خبر دینے کی طرف رجوع کیا اس کا معنی ہے فرمایا: تم تمام کے لیے ایک خدا ہے اسی طرح ذبیحہ کے امر میں ہے اس کی خاطر ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا اس کا معنی ہے اس کے حق کی خاطر، اس کی وجہ سے اس کے انعام کی بنا پر ایمان لے آؤ اور اسلام قبول کرو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد اطاعت کرنا اور سرنگوں کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۞، المخبت تواضع کرنے والا شخص مراد ہے۔ الخبت کا معنی ہے جو زمین کے نیچے ہے اور یعنی انہیں ثواب اور جزا کی بشارت دو۔ عمرو بن اوس نے کہا: المخبتون وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظلم نہیں کرتے جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو انتقام نہیں لیتے۔ مجاہد نے کہا: سفیان نے ابن جریج سے روایت کیا ہے المخبتون جو اللہ کے حکم پر مطمئن ہوتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞

''وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں ان (مصائب و آلام) پر جو پہنچتے ہیں انہیں اور جو صحیح ادا کرنے والے ہیں نماز کو اور ان چیزوں سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ خرچ کرتے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے ڈرتے ہیں اس کے ذکر کے وقت خوف اور ڈر سے متصف ہوتے ہیں یہ ان کی قوت یقین اور اپنے رب کی طرف توجہ کے سبب ہوتا ہے گویا وہ اس کے سامنے ہیں اور ان کا وصف بیان فرمایا کہ وہ صبر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس پر دوام اختیار کرتے ہیں۔

روایت ہے کہ یہ آیت وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ جمہور نے الصلاۃ کو اضافت کی وجہ سے مجرور پڑھا ہے (1) اور ابو عمرو نے الصلاۃ کو نون کے توہم کی بنا پر منصوب پڑھا ہے (2)۔ اسم کی طوالت کی وجہ سے نون کا حذف تخفیف کے لیے ہے۔ سیبویہ نے یہ دلیل دی ہے: الحافظوا عورۃ العشیرۃ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس قول کی طرح ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (الانفال)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: 23)

یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والوں اور اس کی سطوت وعقوبت سے ڈرنے والوں کی حالت ہے نہ کہ جہال عوام اور بدعتیوں کی جو شور مچاتے ہیں اور گدھوں کے ہینگنے کی طرح ہینگتے ہیں۔ پس جو ایسا واویلا کرتا ہے اور اسے وجد اور خشوع کہا جاتا ہے تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے خوف اور اس کے جلال میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کی حالت کو نہیں پہنچ سکتا اس کے باوجود وعظ کے وقت وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل معرفت کی اس کے ذکر اور قرآن کی تلاوت کے وقت کے احوال کی تعریف کی ہے جو اس کیفیت میں نہیں ہوتا وہ ہدایت اور ان کے راستہ پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ (المائدہ)

یہ ان کے حال کی صفت ہے اور مقال کی حکایت ہے پس جو سنت پر عمل کرنے والا ہے وہ سنت پر عمل کرے اور جو مجانین اور جنون کے احوال کرے تو وہ ان کی بنسبت بری ترین حالت پر ہے جنون فنون ہے۔ صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیے اور سوالوں کی کثرت کی۔ ایک دن آپ نکلے اور منبر پر چڑھے فرمایا: سلونی لا تسألونی عن شئ إلا بینتہ لکم ما دمت فی مقامی ھذا (3)۔ مجھ سے پوچھو تم کسی چیز کے بارے سوال نہیں کرو گے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا جب تک میں اس جگہ پر کھڑا ہوں۔ جب لوگوں نے یہ سنا تو وہ خاموش ہو گئے اور ڈر گئے کہ کوئی امر آچکا ہے۔ حضرت انس نے فرمایا: میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو ہر انسان اپنا سر اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئے رو رہا تھا (الحدیث)۔ اس مسئلہ میں گفتگو سورۂ انفال میں تفصیلاً گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

**وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝**

''اور قربانی کے فربہ جانوروں کو ہم نے بنایا ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تمہارے لیے ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 122　2۔ ایضاً　3۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 263

میں بھلائی ہے پس لو اللہ تعالیٰ کا نام ان پر اس حال میں کہ ان کا ایک پاؤں بندھا ہو اور تین پر کھڑے ہوں پس جب وہ گر پڑیں کسی پہلو پر تو خود بھی کھاؤ اس سے نیز کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو، اس طرح ہم نے فرمانبردار بنادیا ان جانوروں کو تمہارے لیے تا کہ تم (اس احسان کا) شکریہ ادا کرو"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْبُدْنَ ابن اسحاق نے والبُدُن پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اس کا واحد بدنۃ ہے جیسے کہا جاتا ہے: ثمرۃ و ثُمُرو ثُمْرٌ، خشبۃ کی جمع خُشب و خُشْبٌ۔ قرآن حکیم میں ہے وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ (الکہف: 34) ثُمْرٌ بھی پڑھا گیا ہے یہ دو لغات ہیں۔ اس کو بدنۃ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ موٹا ہوتا ہے۔ البدانۃ کا معنی موٹاپا ہے۔ بعض علماء نے کہا یہ اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ بعض نے کہا: البدن، بدن کی جمع ہے باء اور دال کے فتحہ کے ساتھ، کہا جاتا ہے: بدن الرجل دال کے ضمہ کے ساتھ جب آدمی موٹا ہو جائے۔ بدّن جب آدمی بڑی عمر کا ہو جائے۔ حدیث میں ہے: انی بدنت (1) یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بَدُنت مروی ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کے خلاف ہے اس کا معنی ہے گوشت کا زیادہ ہونا۔ کہا جاتا ہے: بدن الرجل بدناً و بدانۃ فھو بادن یعنی موٹا ہونا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ وَالْبُدْنَ کا اطلاق اونٹ کے علاوہ گائے پر ہوتا ہے یا نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عطا اور شافعی نے کہا: گائے پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا: اس کا اطلاق گائے پر ہوتا ہے۔ اختلاف کا فائدہ اس وقت مرتب ہوتا ہے جب کوئی شخص بدنہ کی نذر مانے اور پھر وہ اونٹ نہ پائے اور اونٹ پر قادر نہ ہو اور گائے پر قادر ہو تو کیا گائے اس نذر میں جائز ہوگی یا نہیں؟ امام شافعی اور عطا کے مذہب پر جائز نہ ہوگی اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے مذہب پر جائز ہوگی۔ صحیح مذہب امام شافعی اور عطا کا ہے کیونکہ صحیح حدیث "جمعہ کے دن کے بارے میں جو پہلی گھڑی میں مسجد کی طرف گیا گویا اس نے بدنہ (اونٹ) کی قربانی کی جو دوسری گھڑی میں پہنچا اس نے گویا گائے کی قربانی کی" (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گائے اور اونٹ میں تفریق فرمائی۔ یہ دلیل ہے کہ گائے کو بدنہ نہیں کہا جاتا اور اسی طرح فاذا وجبت جنوبھا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ وصف اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ گائے، بکری کی طرح پہلو کے بل لٹائی جاتی ہے اور ذبح کی جاتی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ ہماری دلیل کہ بدنہ، بدانۃ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے موٹاپا۔ تو موٹاپا دونوں میں پایا جاتا ہے، نیز گائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خون بہانے کے اعتبار سے اونٹ کی طرح ہی ہے قربانی گائے کی ہو تو اس میں سات حصص جائز ہیں جیسے اونٹ میں سات حصص جائز ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ کی حجت ہے۔ امام شافعی نے اس پر ان کی موافقت کی ہے یہ ہمارے مذہب میں نہیں ہے۔ ابن شجرہ نے حکایت کیا ہے۔ بکری کو بھی بدنہ کہا جاتا ہے۔ یہ شاذ قول ہے۔ البدن

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، ما یؤمر بہ الماموم، جلد 1، صفحہ 91

ایضاً، سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب النھی عن ان یسبق الامام بالرکوع والسجود، حدیث نمبر 952

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، فضل الجمعہ، جلد 1، صفحہ 121

سے مراد اونٹ ہیں جو کعبہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں اور الهدی کا لفظ عام ہے اس کا اطلاق اونٹ، گائے اور بکری پر ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ یہ نص ہے کہ یہ شعائر کا بعض ہیں۔ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ اس سے مراد وہ منافع ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ درست عموم ہے یعنی دنیا و آخرت کی خیر۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ یعنی اللہ تعالیٰ کا نام لے کر نحر کرو۔ صَوَآفَّ جن کے پاؤں باندھے گئے ہوں اونٹ کھڑا ہوا نحر کیا جاتا ہے جبکہ اسکا ایک پاؤں باندھا گیا ہوتا ہے۔ اس وصف کی اصل گھوڑے میں ہے۔ کہا جاتا ہے: صفن الفرس فھو صافن جب گھوڑا تین پاؤں پر کھڑا ہو چوتھے پاؤں کا سُم صرف لگائے ہوئے ہو۔ اونٹ کو جب وہ نحر کرنے کا ارادہ کرتے تو اس کا ایک پاؤں باندھ دیتے اور تین پاؤں پر کھڑا ہوتا۔ حسن، اعرج، مجاہد، زید بن اسلم اور حضرت ابوموسیٰ اشعری نے صوافی پڑھا ہے۔ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے وہ اس کے ساتھ ان کو نحر کرتے وقت کسی کو شریک نہیں کرتے۔ حسن سے صواف فاء کے کسرہ اور تنوین کے ساتھ مخففہ مروی ہے(1)۔ یہ پہلے لفظ کے معنی میں ہے لیکن بغیر قیاس کے تخفیفاً یاء حذف کی گئی ہے اور صواف جمہور کی قرات ہے۔ فاء کے فتحہ اور شد کے ساتھ یہ صفت یصف سے مشتق ہے اس کا واحد صافة ہے اور صوافی کا واحد صافية ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ابو جعفر، محمد بن علی نے صوافن نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ صافنة کی جمع ہے اس کا واحد صافن نہیں ہے کیونکہ فاعل کی جمع فواعل کے وزن پر نہیں آتی سوائے مخصوص الفاظ کے جن پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ الفاظ ہیں۔ فارس جمع فوارس، هالك جمع هوالك، خالف جمع خوالف۔ الصافنة وہ اونٹ جس کا ایک پاؤں باندھ کر اوپر کیا گیا ہوتا ہے تا کہ حرکت نہ کرے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝ (ص)

عمرو بن کلثوم نے کہا:

تركنا الخيلَ عاكفةً عليه مقلَّدةً أعنَّتَها صُفُونا

اور مروی ہے:

تظل جيادُه نَوْحًا عليه مقلَّدةً أعنَّتها صفونا

اور ایک شاعر نے کہا:

أَلِفَ الصُّفونَ فما يزال كأنهُ مما يقوم على الثلاث كسيرا

ابو عمرو جرمی نے کہا: الصافن اگلے پاؤں میں ایک رگ ہے جب گھوڑے کو مارا جاتا ہے تو وہ پاؤں اٹھا لیتا ہے۔

اعشیٰ نے کہا:

وكل كميت كجذع السحوق يزمن الفناء اذا ما صفن

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن وہب نے کہا: ابن ابی ذئب نے مجھے بتایا کہ ابن شہاب سے انہوں نے الصواف کے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 122

پوچھا تو انہوں نے کہا: تو اس کو باندھے پھر اس کا وصف بیان کرے۔ حضرت مالک بن انس نے مجھے اسی کی مثل بتایا۔ علماء اس کے استحباب کے قائل ہیں مگر امام ابوحنیفہ اور ثوری ان کو کھڑا کر کے اور بٹھا کر نحر کرنا بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ عطا نے شاذ قول کہا ہے، اس نے مخالفت کی ہے اور بٹھا کر نحر کرنے کو مستحب کہا ہے۔ صحیح قول جمہور کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا اس کا معنی ہے نحر ہونے کے بعد جب وہ گر جائیں۔ اسی سے ہے: وجبت الشمس سورج غروب ہوا۔ صحیح مسلم میں زیاد بن جبیر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک شخص کے پاس آئے وہ اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا (1)۔ آپ نے فرمایا: اس کو کھڑا کرو ایک پاؤں باندھو یہ تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ ابوداؤد نے ابوزبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے اور مجھے عبدالرحمٰن بن سابط نے خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اونٹوں کو اس طرح نحر کرتے تھے کہ ان کا بایاں پاؤں باندھا ہوتا تھا اور تین پاؤں پر کھڑے ہوتے تھے (2)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مالک نے کہا: انسان کمزور ہو یا اسے اونٹ کے بھاگ جانے کا خوف ہو تو میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ باندھ کر نحر کرے۔ بہتر یہ ہے کہ اونٹ کھڑا ہو باندھا ہوا نہ ہو تو نحر کیا جائے مگر ایسا مشکل ہو تو باندھا جائے اور کونچیں نہ اٹھائے مگر یہ کہ اسے کمزوری کا خوف ہو یا اس پر طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے بٹھا کر نحر کرنا افضل ہے بنسبت کونچیں کاٹنے کے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جوانی میں اپنے ہاتھوں میں نیزہ لیتے تھے اور اونٹ کے سینے میں مارتے تھے اور اس کی کہان سے نکالتے تھے جب بوڑھے ہو گئے تھے تو کمزوری کی وجہ سے بٹھا کر نحر کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص نیزہ پکڑتا تھا اور ایک شخص اس کی مہار پکڑتا تھا۔ گائے اور بکری کو لٹا کر ذبح کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ بالاجماع دسویں کے دن فجر سے پہلے نحر کرنا جائز نہیں اور اسی طرح قربانی بھی فجر سے پہلے جائز نہیں جب فجر طلوع ہو تو منیٰ میں نحر کرنا حلال ہو جاتا ہے ان لوگوں پر امام کے نحر کرنے کا انتظار ضروری نہیں بخلاف دوسرے شہروں کے۔ ہر حاجی کے لیے منیٰ نحر کرنے کی جگہ ہے اور ہر عمرہ کرنے والے کیلئے مکہ منحر ہے اگر حاجی مکہ میں نحر کرے اور عمرہ کرنے والا منیٰ میں نحر کرے تو کوئی حرج نہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا جب سورج غروب ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: وجبت الشمس اور جب دیوار گر جاتی ہے تو کہتے ہیں: وجب الحائط۔ قیس بن خطیم نے کہا:

أطاعت بنوعوف أميرا نها هم عن السِّلْم حتى كان أوّل واجبِ

اوس بن حجر نے کہا:

ألم تكسف الشّمسُ والبدرُ وال كواكبُ للجبل الواجب

پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا یعنی جب مردہ ہو کر پہلو کے بل گر پڑیں۔ پہلو کے بل گرنے کو موت

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، استحباب النحر الابل، جلد 1، صفحہ 424

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، کیف تنحر البدن، جلد 1، صفحہ 246

سے کنایہ کیا جیسا کہ: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا کے ارشاد سے ذبح اور نحر سے کنایہ ہے۔ کنایات اکثر مواقع میں تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فتركته جَزَرَ السباعِ يَنُشْنه　ما بين قُلّه رأسه والمِعْصَم

عنترہ نے کہا: وضربت قرنى كبشها فتجدلا یعنی مقتول ہو کر زمین کی طرف گر پڑا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں اور الوجوب للجنب بعد النحر خون کے نکلنے اور روح کے نکلنے کی علامت ہے اور وہ کھانے کا وقت ہے یعنی کھانے کے وقت کے قریب، کیونکہ پہلے اس کی کھال اُتاری جاتی ہے اور ذبیحہ میں سے کچھ کاٹا جاتا ہے پھر پکایا جاتا ہے اور کھال نہیں اتاری جاتی حتی کہ ٹھنڈا ہو جائے کیونکہ اس سے پہلے کھال اتارنا اسے عذاب دینے کے باب سے ہے اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: روح کے نکلنے سے پہلے کھال اتارنے میں جلدی نہ کرو۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِنْهَا امر بمعنی ندب ہے تمام علماء کے نزدیک ہدی کے گوشت سے کچھ کھانا مستحب ہے اس میں اجر اور حکم کی پیروی ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی ہدی سے نہیں کھاتے تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابوالعباس بن شریح نے کہا: خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا مستحب ہے۔ ان میں سے جس پر چاہے اکتفا کر لے۔ امام شافعی نے فرمایا: کھانا مستحب ہے اور دوسروں کو کھلانا واجب ہے اگر تمام گوشت دوسرں کو کھلا دے تو بھی جائز ہے۔ اگر تمام خود کھالے تو جائز نہیں یہ اس صورت میں ہے جب ہدی نفلی ہو اور واجبی ہدی اس سے کھانا جائز نہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ مجاہد، ابراہیم اور طبری نے کہا: اطعموا کا امر اباحت کے لیے ہے۔ الْقَانِعَ سے مراد سائل ہے۔ کہا جاتا ہے: قنع الرجل يقنع قنوعاً جب کوئی سوال کرے ماضی میں نون کے فتحہ کے ساتھ ہے اور مضارع میں کسرہ کے ساتھ ہے۔ يقنع قناعة فهو قنع جب کوئی سوال کرنے سے بچے اور تھوڑی سی چیز کے ساتھ مستغنی ہو جائے اور سوال نہ کرے جیسے: حمد يحمد۔ قناعة وقنعا وقنعاناً: یہ خلیل کا قول ہے۔ پہلے سے شماخ کا قول ہے:

لَمَالُ المرءِ يُصلِحُه فَيُغنِي　مفاقِرَه أعفُ من القُنُوعِ(1)

ابن السلت نے کہا: بعض عربوں نے قنوع بمعنی قناعت ذکر کیا ہے جس کا معنی ہے راضی ہونا، سوال کرنے سے بچنا اور سوال نہ کرنا۔ ابو رجاء سے مروی ہے کہ انہوں نے: اطعموا القنع پڑھا ہے یہ پہلے مفہوم کے مخالف ہے۔ کہا جاتا ہے: قنع الرجل فهو قنعٌ جب کوئی راضی ہو۔ رہا المعتر تو یہ وہ شخص ہوتا ہے جو تیرے اردگرد چکر لگاتا ہے وہ طلب کرتا ہے وہ تیرے پاس ہے خواہ وہ سوال کرے یا خاموش رہے۔ محمد بن کعب قرظی، مجاہد، ابراہیم، کلبی، حسن بن ابی الحسین نے کہا: المعتر جو بغیر سوال کے سامنے آتا ہے۔ زہیر نے کہا:

على مُكْثِريهم رزقُ من يعتريهم　وعند المُقِلّين السماحةُ والبَذْلُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 123

امام مالک نے کہا: جو میں نے بہتر سنا ہے وہ یہ ہے کہ القانع فقیر ہے اور المعتز زائر ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے المعتری پڑھا ہے۔ اس کا معنی بھی المعتر والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اعترہ واعتراہ وعرّہ وعراہ جو کسی کے پاس اس کے لیے تعرض کرے یا طلب کرے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۭ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

''نہیں پہنچتے اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت اور نہ ان کے خون البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور تقویٰ تمہاری طرف سے، یوں اس نے فرمانبردار بنا دیا ہے انہیں تمہارے لیے تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس (نعمت) پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور (اے حبیب!) خوشخبری دیجیے احسان کرنے والوں کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں لوگ اونٹوں کا خون بیت اللہ پر مل دیتے تھے پھر مسلمانوں نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی، النیل باری تعالیٰ کے متعلق نہیں ہوتا لیکن قبولیت کی مجازی تعبیر ہے مطلب یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں نہیں پہنچے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کی طرف بلند نہیں ہوگا۔ ابن عیسیٰ نے کہا: ان کے گوشت اور خون قبول نہیں کرے گا لیکن اس کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے یعنی جو اس کی ذات کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور وہ اس کی طرف بلند ہوتا ہے، وہ اسے سنتا ہے اور اس پر ثواب دیتا ہے؛ اسی سے حدیث ہے: ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے'' (1) اور لن ينال الله وينالہ دونوں جگہ یاء کے ساتھ ہے اور یعقوب سے دونوں جگہ اللحوم کا اعتبار کرتے ہوئے تاء کے ساتھ مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے جانوروں کو ہمارے لیے مطیع بنا کر اور ہمیں ان پر تصرف کی قدرت دے کر ہم پر احسان فرمایا، حالانکہ بدن اور اعضاء کے اعتبار سے ہم سے قوی ہیں اور بڑے ہیں۔ یہ اس لیے ہے تاکہ بندے کو معلوم ہو جائے یہ امور ایسے نہیں جیسے بندے کے لیے ظاہر ہوتے ہیں بلکہ یہ ایسے ہوتے ہیں جیسے وہ غالب وقادر ارادہ فرماتا ہے۔ پس چھوٹا، بڑے پر غالب ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل آیت میں ان جانوروں پر اپنا نام ذکر کرنے کو بیان کیا تھا فرمایا: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اور اب یہاں تکبیر کا ذکر فرمایا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں کو جمع فرماتے تھے جب ہدی کو نحر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے بسم اللہ واللہ اکبر یہ ان کی فقہ سے ہے۔ صحیح میں حضرت انس سے مروی ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو سینگوں والے چتکبرے مینڈھے ذبح کیے (2)، اور فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 2

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، نحر البدن بیدہ، جلد 1، صفحہ 231

کو انہیں ہاتھ سے ذبح کرتے دیکھا اور میں نے دیکھا کہ آپ اپنا قدم ان کے کندھے پر رکھے ہوئے تھے آپ نے بسم اللہ اور تکبیر پڑھی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ابوثور نے کہا: ذبح میں بسم اللہ متعین ہے جس طرح نماز میں تکبیر متعین ہے اور تمام علماء اس کے استحباب پر متفق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کوئی اور اسم ذکر کر دے اور اس سے بسم اللہ کا ارادہ کرے تو بھی جائز ہے اسی طرح اگر صرف الله اکبر کہا یا لا الہ الا اللہ کہا تو بھی جائز ہے؛ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ اگر اس سے بسم اللہ کا ارادہ نہ کیا تو بسم اللہ کی طرف سے جائز نہ ہوگا اور جانور نہیں کھایا جائے؛ یہ امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ ہمارے اصحاب اور دوسرے علماء کے نزدیک ذبح کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود یا آپ کا ذکر مکروہ ہے اور فرماتے ہیں: ذبح کے وقت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ امام شافعی نے ذبح کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو جائز کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جمہور علماء کا خیال ہے کہ قربانی کرنے والے کا اللھم تقبل منی اے اللہ! میری طرف سے قبول فرما۔ کہنا جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ نے مکروہ کہا ہے۔ اور امام صاحب پر حجت حضرت عائشہ کی روایت ہے جس میں ہے پھر کہا: باسم الله اللھم تقبل من محمد و آل محمد و من امۃ محمد (1) پھر اس کو قربان کیا۔ بعض علماء نے نص قرآنی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (البقرہ) کی وجہ سے یہ کہنا مستحب ہے۔ امام مالک نے یہ قول مکروہ کہا ہے: اللھم منک و الیک۔ امام مالک نے فرمایا: یہ بدعت ہے۔ ابن حبیب جو ہمارے علماء میں سے ہیں اور حسن نے اس کو جائز قرار دیا ہے ان دونوں کے قول کی صحت کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے (2) فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبح کے دن دو سینگوں والے خصی چتکبرے مینڈھے ذبح کیے جب انہیں لٹایا تو یہ پڑھا: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا الی قولہ وانا اول المسلمین اللھم منک ولک عن محمد وامۃ باسم اللہ واللہ اکبر پھر ذبح فرمایا۔ شاید امام مالک کو یہ خبر نہ پہنچی ہو یا ان کے نزدیک صحیح نہ ہو یا عمل اس کے مخالف دیکھا ہو اس بنا پر فرمایا یہ بدعت ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ روایت ہے کہ یہ خلفاء اربعہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ اس سے پہلے آیت میں گزرا ہے۔ لفظ کا ظاہر عموم کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر محسن کے بارے میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝

''یقیناً اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے اہل ایمان کی (کفار کے مکروہ فریب سے) بیشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی دھوکا باز احسان فراموش کو''۔

روایت ہے کہ یہ مومنین کے سبب نازل ہوئی جب مکہ میں ان کی کثرت ہوئی تو کفار نے انہیں اذیتیں دیں اور بعض حبشہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، جلد 2، صفحہ 155

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، مایستحب من الضحایا، جلد 2، صفحہ 30۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب اضاحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، 3111

کی طرف ہجرت کر گئے اور بعض مومنین نے ارادہ کیا کہ جس کافر پر غالب آئیں اسے قتل کر دیں اور دھوکہ اور حیلہ سازی کی کوشش کریں تو یہ آیت نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے مدافعت کا وعدہ فرمایا اور خیانت وغدر سے بڑے بلیغ انداز میں منع فرمایا۔ دھوکہ دینے میں شدت سورۃ الانفال میں بھی گزر چکی ہے۔ ''قیامت کے روز دھوکہ دینے والے کے لیے اس کی سرین کے پاس ایک جھنڈا گاڑھا جائے گا جو اس کے دھوکا کی مقدار کا ہوگا'' (1)۔ کہا جائے گا: یہ فلاں کا دھوکہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ مومنین کو ہمیشہ توفیق عطا فرماتا رہے گا حتی کہ ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے گا اور کفار ان کو اپنے دین سے پھیرنے پر قادر نہ ہوں گے اگرچہ اکراہ جاری رہے گا پس اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ رکھے گا حتی کہ وہ دلوں سے مرتد نہ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حجت کے ذریعے مومنین کو بلندی عطا فرمائے گا پھر کسی کافر کا مومن کو قتل کرنا نادر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس مومن کا دفاع اس طرح کرے گا کہ اسے اپنی رحمت میں لے لے گا۔ نافع نے یدافع اور لولا دفاع پڑھا ہے۔ ابوعمرو، ابن کثیر نے یدفع اور ولولا دفع پڑھا ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے یدافع اور لولا دفع اللہ پڑھا ہے۔ یدافع بمعنی یدفع ہے جیسے عاقبت اللص ہے اور عافاہ اللہ ہے مصدر دفعاً ہے۔ زہری نے حکایت کیا ہے کہ دفاعاً، دفع کا مصدر ہے جیسے حسب کا مصدر حساباً ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝۳۹

''اذن دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بیشک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کفار کے گروہوں کو مومنین سے اس طرح دور کرے گا کہ انہیں کفار سے جہاد کرنے کی جازت دے گا اور ان کی مدد کرے گا۔ اس میں اضمار ہے یعنی اجازت دے دی گئی ہے جنگ کی انہیں جو جنگ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پس کلام کو حذف کیا گیا کیونکہ موجودہ کلام محذوف کلام پر دلالت کر رہی ہے۔ ضحاک نے کہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے کفار سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کی کیونکہ کفار نے مکہ میں انہیں اذیتیں دی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ جب ہجرت کی تو یہ آیت نازل ہوئی: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ۔۔۔ الخ، یہ ناسخ ہے ہر اس حکم کے لیے جو قرآن میں اعراض اور ترک اور درگزر کرنے بارے میں آیا ہے یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے کے وقت نازل ہوئی (2)۔ نسائی اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، جلد 2، صفحہ 42

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 124۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الحج، 3095

حضرت ابوبکر نے کہا: انہوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے یہ ضرور ہلاک ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ ۔۔۔ الخ، حضرت ابوبکر نے کہا: مجھے معلوم تھا قتال ضرور ہوگا۔ فرمایا: یہ حدیث حسن ہے بہت سے راویوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے مسلم البطین سے انہوں نے سعید بن جبیر سے مرسلاً روایت کی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اباحت شرع سے ہے جبکہ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے کیونکہ اُذِنَ کا معنی اُبیح ہے یہ لفظ ہر ممنوع چیز کی اباحت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ اور دوسرے مقام پر گزر چکا ہے۔ یہ اذن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی الله نے اجازت دی۔ یقاتلون تا کے کسرہ کے ساتھ ہے، یعنی مشرک ان سے لڑتے ہیں اور وہ مومنین ہیں اسی لیے فرمایا: بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا انہیں اپنے شہروں سے نکال کر ان پر ظلم کیا گیا۔

الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

”وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقتور کی غارتگری سے) منہدم ہو جاتیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو ان (کے دین) کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا اور سب پر غالب ہے“۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ یہ ان کے مظالم میں سے ایک ظلم ہے کہ انہیں اس بات پر اپنے گھروں سے نکالا گیا کہ انہوں نے کہا: ہمارا پروردگار اللہ وحدہ ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ استثنا منقطع ہے یعنی لیکن ان کے ربنا اللہ کہنے کی وجہ سے؛ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو اس سے پہلے با مقدر ہو؛ یہ ابو اسحاق زجاج کا قول ہے۔ اس کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں بغیر حق کے ان کے گھروں سے نکالا گیا مگر یہ کہ انہوں نے کہا: ہمارا پروردگار اللہ ہے یعنی وہ توحید کی وجہ سے نکالے گئے بت پرستوں نے انہیں نکالا۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا، الذین یقاتلون سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے کہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بیعت عقبہ سے پہلے جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور نہ ان کے لیے خون حلال کیے گئے تھے انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے اور اذیت پر صبر کرنے، جاہل

لوگوں سے درگزر کرنے کا دس سال تک حکم دیا گیا تھا تا کہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہو جائے اور وہ وعدہ بھی وفا ہو جائے جو اس نے اپنے فضل سے احسان کرنے کا کیا ہے فرمایا: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (الاسراء) لیکن لوگ سرکشی میں قائم رہے اور واضح برہان سے انہوں نے استدلال نہیں کیا قریش نے ان لوگوں پر ظلم کیا جنہوں نے آپ کی قوم سے آپ کی اتباع کی حتیٰ کہ انہیں دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا کیا اور انہیں اپنے شہروں سے نکال دیا۔ پس بعض لوگ حبشہ چلے گئے، بعض مدینہ چلے گئے، بعض اذیتوں پر صبر کرتے رہے۔ جب قریش نے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی کی اور اس کے حکم کو رد کیا اور اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور جو ایمان لائے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کیا اور اس کی عبادت کی اور اس کے نبی کی تصدیق کی اور اپنے دین کی حفاظت کی انہیں انہوں نے تکالیف پہنچائیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کرنے، دفاع کرنے اور مظلوموں کا انتقام لینے کی اجازت دی اور یہ حکم نازل فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔۔۔۔ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مجبور کے فعل کی نسبت مجبور کرنے والے کی طرف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخراج کی نسبت کفار کی طرف کی ہے کیونکہ کلام ذنب (جرم) اور الزام جرم کے تقدیر کے معنی میں ہے یہ آیت اس آیت کی مثل ہے: اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (التوبہ: 40) ان دونوں آیات میں کلام ایک ہے۔ یہ سورۂ برأت میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اگر اللہ تعالیٰ انبیاء کرام اور مومنین کے لیے دشمنوں اور اہل شرک سے قتال کو مشروع نہ فرماتا تو دیندار جو عبادت کی جگہیں بناتے یہ مشرک انہیں تباہ و برباد کر دیتے لیکن اس نے قتال کو واجب کر کے دفاع کیا تا کہ اہل دین عبادت کے لیے فارغ ہوں۔ پس جہاد پہلی امتوں میں بھی تھا اس کے ساتھ شرائع کی اصلاح ہوئی اور متعبدات جمع ہوئیں گویا فرمایا: قتال کی اجازت دی گئی ہے پس مومنوں کو قتال کرنا چاہیے پھر قتال میں یہ امر قوی ہوا۔ ارشاد فرمایا: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ۔۔۔ الخ، یعنی اگر قتال اور جہاد نہ ہوتا تو ہر امت میں حق پر غلبہ کیا جاتا جو نصاریٰ اور صابئین جہاد کو پسند نہیں کرتے وہ اپنے مذہب کے مخالف ہیں کیونکہ اگر جہاد نہ ہوتا تو دین جس کا دفاع کیا جاتا ہے وہ باقی نہ ہوتا اور یہ جگہیں بھی نہ رہتیں جو ان کی تحریف اور تبدیلی سے پہلے اور اسلام کے ذریعے ان کی ملل کے نسخ سے پہلے بتائی گئی ہیں یہ اسی معنی کے لیے ذکر کیا گیا ہے اگر یہ دفاع نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں کے عبادت خانے گرائے جاتے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عیسائیوں کے گرجے گرائے جاتے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مساجد گرائی جاتیں۔ تَهَدَّمَتْ یہ هدمت البناء سے مشتق ہے یعنی میں نے عمارت کو توڑا تو وہ ٹوٹ گئی۔ ابن عطیہ نے کہا: جو کچھ اس آیت کی تاویل میں کہا گیا ہے اس میں سے یہ درست ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کفار کو تابعین اور ان کے بعد والوں سے نہ روکتا۔ اس میں بھی اگرچہ ایک قوم کا دوسری قوم سے دفاع ہے مگر قتال کا معنی زیادہ مناسب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ مجاہد نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ عادل لوگوں کی شہادت کے ساتھ قوم کے ظلم کو نہ روکتا۔ ایک جماعت نے کہا: والیوں کے عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ

ظالموں کے ظلم کو نہ روکتا۔ حضرت ابوالدرداء نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ مساجد میں رہنے والوں کی وجہ سے ان کا دفاع نہ کرتا تو مسجدوں میں نہ آتے اور جو جہاد کرتے ہیں ان کی وجہ سے دفاع نہ کرتا ان کا جو جہاد نہیں کرتے تو ان پر عذاب آجاتا۔ ایک جماعت نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ فضلاء اور نیکوکاروں کی دُعا سے عذاب کو نہ ٹالتا۔ اس کے علاوہ بھی اس آیت کے معنی کی تفسیر کی گئی ہے۔ یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ لوگوں کا دفاع کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت اپنے ضمن میں یہ مفہوم بھی رکھتی ہے کہ ذمیوں کی عبادت گاہوں، کلیسوں، گرجوں اور آتشکدوں کو گرانا منع ہے، لیکن انہیں یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ ان میں اضافہ کریں اور ان میں وسعت پیدا کریں اوران کی عمارتوں کو بلند کریں اور مسلمانوں کے لیے ان کے گرجوں میں داخل ہونا اور ان میں نماز پڑھنا مناسب نہیں جب وہ کوئی تعمیر کریں تو اس کا توڑنا واجب ہے۔ اور بلاد حرب میں ان کے عبادت خانے اور کلیسے گرائے جائیں گے اور اسلام کے شہروں میں ذمیوں کے جو عبادت خانے ہوں گے انہیں نہیں گرایا جائے گا کیونکہ یہ ان کے گھروں اور اموال کے قائم مقام ہوں گے جس کی حفاظت کا معاہدہ کیا گیا ہے اور انہیں زیادتی کی قدرت نہیں دی جائے گی کیونکہ اس میں کفار کے اسباب کا ظہور ہے اور نئی تعمیر کے لیے مسجد کو گرانا جائز ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی تعمیر دوبارہ کی تھی۔

**مسئلہ نمبر 6۔** لَّهُدِّمَتْ دال کی تخفیف اور تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ صوامع جمع ہے صومعۃ کی اس کا وزن فوعلۃ ہے ایسی عمارت جو بلند ہو اور پر والا حصہ مضبوط ہو۔ کہا جاتا ہے: صمع الثرید ۃ یعنی اس نے اس کا سر اٹھایا اور مضبوط اور تیز کیا۔ رجل اصمع القلب جس کی فطانت تیز ہو۔ الاصمع من الرجال جس کی بات مضبوط ہو۔ بعض نے کہا: وہ شخص جس کے کان چھوٹے ہوں۔ پہلے صومعہ کا لفظ نصاریٰ کے راہبوں اور صابئین کے عبادت گزاروں کے لیے استعمال ہوتا تھا پھر یہ مسلمانوں کے آذان دینے کی جگہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔ البیع جمع ہے بیعۃ کی۔ نصاریٰ کا کنیسہ۔ طبری نے کہا: یہود کے کنائس ہیں پھر انہوں نے مجاہد سے ایسی چیز روایت کر کے داخل کی جو اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ صلوات، زجاج اور حسن نے کہا: یہ یہود کے کنائس ہیں۔ عبرانی زبان میں انہیں صلوتا کہا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: الصلوات سے مراد وہ گھر ہیں جو نصاریٰ صحرائی جگہوں میں بناتے تھے جن میں وہ اپنے سفروں میں عبادت کرتے تھے۔ انہیں صلوتا کہا جاتا تھا۔ پھر یہ عربی بنایا گیا اور صلوات کہا گیا۔ صلوات میں نو قرأتیں ہیں جن کو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ صُلُوات، صِلُوات، صُلُولی بروزن فعولی، صُلُوب باء کے ساتھ جمع صلیب، صلوث ثاء کے ساتھ بروزن فعول۔ صلوات صاد اور لام کے ضمہ کے ساتھ واؤ کے بعد الف ہے۔ صلوثا صاد اور لام کے ضمہ کے ساتھ اور ثاء کے بعد الف مقصورہ۔ صِلویثا صاد کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ اور واؤ مکسورہ جس کے بعد یاء ہے پھر ثاء ہے پھر الف ہے اور نحاس نے ذکر کیا ہے اور عاصم جحدری سے مروی ہے کہ انہوں نے دصلوت پڑھا ہے(1)۔ ضحاک سے مروی ہے کہ انہوں نے وَصَلُوث (ثاء کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اور مجھے معلوم نہیں صاد پر فتحہ پڑھا ہے یا ضمہ پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 125

میں کہتا ہوں: اس طرح کل یہاں بارہ قراءتیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الصلوات سے مراد کنائس ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا: الصائبون کی مساجد ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہ مسلمانوں کی نمازیں ہیں، جب ان کی مساجد میں دشمن داخل ہوتا ہے اور وہ مساجد کو گرا دیتا ہے تو ان میں عبادت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے؛ اسی وجہ سے صلوات کے لیے ھدم کا لفظ استعارۃ استعمال کیا گیا ہے، ان کے تعطل کی وجہ سے یا صلوات کی جگہ مراد ہے پس مضاف کو حذف کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور زجاج کے قول کے مطابق ھدم حقیقۃً ہوگا۔ حسن نے کہا: ھدم الصلوت سے مراد نمازوں کا ترک کرنا ہے۔ قطرب نے کہا: یہ چھوٹے کلیسے ہیں۔ اس کا واحد نہیں ہے۔ خصیف نے کہا: ان اسماء سے مقصود امم کی متعبدات کی تقسیم ہے۔ پس صوامع یہود کے راہبوں کے لیے ہیں اور البیع نصاریٰ کے لیے ہیں۔ الصلوات یہود کے لیے ہیں۔ مساجد مسلمانوں کے لیے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اظہر یہ ہے کہ ان سے متعبدات کے ذکر میں مبالغہ کا قصد کیا گیا ہے۔ یہ اسماء اپنے مسمات میں امتوں میں مشترک ہیں جن کے پاس کتابیں تھیں۔ اس آیت میں مجوس کا ذکر نہیں کیا اور نہ مشرکوں کا ذکر کیا کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں جس کی حمایت ثابت ہو اور اللہ کا ذکر صرف اہل شرائع کے پاس ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ حقیقت میں نظر کرنے سے کلام عرب سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فیھا کی ضمیر کا مرجع مساجد ہیں کیونکہ ضمیر ان کے ساتھ متصل ہے اور اس کو صوامع اور اس کے مابعد کی طرف لوٹانا بھی جائز ہے معنی ہو ان کی شرائع کے وقت اور ان کے حق کو قائم کرنے کے وقت۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر یہ کہا جائے کہ ذمیوں کی مساجد کو مسلمانوں کی مساجد سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ بنا میں مقدم ہیں۔ بعض نے کہا: ان کی مساجد ھدم کے قریب ہیں اور مسلمانوں کی مساجد ذکر کے قریب ہیں جیسا کہ سابق کو مؤخر کیا گیا ہے اس قول میں فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ (فاطر: 32)

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ یعنی جو اللہ کے دین اور اللہ کے نبی کی مدد کرے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ یعنی اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ خطابی نے کہا: القوی بمعنی القادر ہے یہ قوی علی شی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے وہ اس چیز پر قادر ہے۔ عزیز بمعنی جلیل، شریف؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ بعض نے کہا: اتنا محفوظ اور مضبوط جس کا قصد نہ کیا جا سکے۔ ہم نے اپنی کتاب ''الکتاب الاسنی فی شرح الاسماء الحسنیٰ'' میں ان دونوں اسماء کو بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

''وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہے سارے کاموں کا انجام''۔

زجاج نے کہا: اَلَّذِیْنَ محل نصب میں ہے اس کا تعلق من کے ساتھ ہے جو من ینصرہ میں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: محل جر میں ہے انہوں نے اس کا تعلق اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ سے ہے اور اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ سے مراد نبی

پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چار یار ہیں زمین میں ان کے علاوہ کوئی نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد مہاجرین، انصار اور تابعون باحسان ہیں۔ قتادہ نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مراد ہیں۔ عکرمہ نے کہا: وہ پانچ وقت کی نمازیں ادا کرنے والے ہیں۔ حسن اور ابوالعالیہ نے کہا: اس سے مراد یہ امت ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عطا فرمائی تو انہوں نے نماز کو قائم کیا۔ ابن ابی نجیح نے کہا: اس سے مراد والی ہیں۔ ضحاک نے کہا: یہ شرط ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر لگائی جن کو ملک عطا فرماتا ہے؛ یہ عمدہ قول ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سلطان پر اور علماء پر واجب ہے اور لوگوں پر واجب نہیں کہ وہ سلطان کو حکم دیں کیونکہ یہ اس کے لیے لازم ہے اس پر واجب ہے اور لوگ علماء کو حکم نہ دیں کیونکہ حجت ان پر ثابت ہو چکی ہے۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

''اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کیا تعجب ہے) پس جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور عاد و ثمود نے اور قوم ابراہیم نے اور قوم لوط نے اور مدین کے رہنے والوں نے (اپنے اپنے نبیوں کو) اور جھٹلائے گئے موسیٰ بھی تو (کچھ عرصہ) میں نے مہلت دی ان کفار کو (جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑا (خود ہی بتاؤ) کتنا خوفناک تھا میرا عذاب''۔

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے یعنی آپ سے پہلے انبیاء بھی جھٹلائے گئے پس انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیا آپ ان کی اقتدا کریں اور صبر کریں۔ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا رہے بنو اسرائیل تو انہوں نے آپ کو نہ جھٹلایا اسی وجہ سے اس کا ماقبل پر عطف نہیں کیا ورنہ ہوتا وقوم موسیٰ، فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ یعنی سزا کو ان سے مؤخر کیا گیا۔ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ پھر میں نے انہیں سزا دی۔ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ استفہام بمعنی تغییر ہے یعنی دیکھو کیسے میں نے ان نعمتوں کو عذاب اور ہلاک کے ساتھ بدلا تھا جن نعمتوں میں وہ تھے، اسی طرح میں قریش کے مکذبین کے ساتھ کروں گا۔ جوہری نے کہا: النکیر والانکار کا مطلب ہے برائی کو تبدیل کرنا۔ منکر واحد ہے مناکیر کا۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

''پس کتنی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تہہ و بالا کر ڈالا کیونکہ وہ ظالم تھیں تو اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنویں ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں (جو ویران پڑے ہیں)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا یعنی ان بستیوں والوں کو ہلاک کر دیا۔ فَكَاَيِّنْ کے بارے میں کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَهِيَ ظَالِمَةٌ کفر کر کے ظلم کرنے والے تھے۔ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یہ سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۝ زجاج نے کہا: وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ، مِّنْ قَرْيَةٍ پر معطوف ہے یعنی من اهل قرية ومن اهل بئر۔ فراء کا خیال ہے کہ بئر، عروشها پر معطوف ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے نافع بن ابی نعیم سے پوچھا: کیا البئر اور الذئب کو ہمزہ دیا جائے گا؟ تو انہوں نے کہا: اگر عرب ہمزہ دیتے تھے تو تو بھی انہیں ہمزہ دے۔ نافع سے اکثر راویوں نے ہمزہ کے ساتھ روایت کیا ہے مگر ورش کی ان سے بغیر ہمزہ کے روایت ہے۔ اصل ہمزہ ہے۔ معطلة کا معنی متروکة ہے۔ ضحاک نے یہ کہا ہے۔ بعض نے کہا: جو ہلاکت کی وجہ سے اہل سے خالی ہو۔ بعض نے فرمایا: جس کا پانی نیچے چلا گیا ہو۔ بعض نے کہا: جو ڈول اور رسیوں سے خالی ہو۔ مفہوم متقارب ہیں۔ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ قتادہ، ضحاک اور مقاتل نے کہا: بلند طویل محل۔

عدی بن زید نے کہا:

شاده مَرْمَرًا وجَلَّله كِلْ　سًا فللطير فى ذُراهُ وُكور(1)

یعنی اس کو بلند کیا۔ سعید بن جبیر، عطا، عکرمہ اور مجاہد نے کہا: مشید کا معنی ہے جس پر چونے سے پلستر کیا گیا ہو۔ الشید سے مشتق ہے جس کا مطلب چونا ہے۔ راجز نے کہا:

لا تَحْسَبَنِّي وإن كنت أمرأ غَمِرًا　كحية الماء بين الطين والشِّيد

اور امرء القیس نے کہا:

ولا أُطُمًا إلَّا مَشِيدًا بِجَنْدَلِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مشید سے مراد مضبوط ہے۔ کلبی نے یہ کہا ہے یہ مَفِعل بمعنی مفعول ہے جیسے مبيع بمعنی مبيوع ہے۔ جوہری نے کہا: المشید جو چونے سے بنایا گیا ہو۔ الشید شین کے کسرہ کے ساتھ چونا، سیمنٹ وغیرہ میں سے جس کے ساتھ دیوار کی لپائی کی گئی ہو۔ شین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہے۔ تو کہتا ہے: شَادَ يَشِيدُ شيداً، چونا وغیرہ سے پختہ کرنا۔ المشيد تشدید کے ساتھ۔ اس کا معنی ہے طویل۔ کسائی نے کہا: المشید واحد کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ اور المشيد جمع کے لیے ہے جو اس قول سے ہے: فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء: 78) کلام میں اضمار ہے۔ تقدیر یوں ہے: قصر مشيد مثلها معطل۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کنواں اور محل حضر موت میں معروف تھے۔ محل پہاڑ کی چوٹی پر تھا اس تک کسی حال میں پہنچا نہیں جا سکتا تھا اور اس کنویں میں جو کوئی چیز گرتی تھی ہوا اسے ٹھہرنے نہیں دیتی تھی بلکہ اسے نکال دیتی تھی۔ محلوں والے شہروں کے بادشاہ اور کنوؤں والے دیہاتوں کے بادشاہ ہم نے سب کو ہلاک کر دیا۔ ضحاک وغیرہ نے وہ سب کچھ ذکر کیا ہے جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور جو ابوبکر محمد بن حسن مقری وغیرہما نے ذکر کیا ہے کہ البئر، الرس یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 127

یمن کے علاقہ حضر موت میں عدن کے مقام پر تھا یہ اس شہر میں تھا جسے حضوراء کہا جاتا تھا۔ اس پر چار ہزار ایماندار ایک صالح آدمی کے ساتھ اترے تھے اور انہوں نے عذاب سے نجات پائی تھی اور ان کے ساتھ صالح آدمی تھا پھر وہ صالح شخص فوت ہو گیا تو اس جگہ کا نام رکھا گیا کیونکہ صالح آدمی وہ حاضر ہوا اور فوت ہو گیا پس انہوں نے حضوراء بنایا اور اس کنویں پر بیٹھ گئے انہوں نے اپنے اوپر ایک امیر بنایا جن کو علس بن جلاس بن سوید کہا جاتا تھا جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: علس بن جلاس تھا وہ ان میں بڑی اچھی سیرت کا مالک تھا اور عادل تھا انہوں نے اس کا وزیر سنحاریب بن سوادہ کو بنایا وہ کچھ زمانہ ٹھہرے رہے ان کی نسل بڑھتی رہی حتی کہ وہ کثیر ہو گئے۔ اور وہ کنواں شہر والوں اور دیہات والوں کو سیراب کرتا تھا۔ جانور، بکریاں، گائیں سب اس سے پانی پیتے تھے اور کنویں کی بہت سی زمینیں تھیں جو اس کنویں سے منسوب تھیں اور بہت سے لوگ اس پر مقرر تھے اور وہاں مختلف حوض بنے ہوئے تھے۔ ایک سے لوگ پیتے تھے، دوسرے سے جانور پیتے تھے، تیسرے سے گائیں پیتی تھیں، چوتھے سے بکریاں پیتی تھیں۔ صبح و شام نگران پانی پلاتے رہتے تھے اور لوگ آتے جاتے تھے کیونکہ وہاں اور کوئی پانی نہیں تھا۔ جس کو انہوں نے بادشاہ بنایا تھا اس کی عمر لمبی ہوئی جب اس پر موت آئی تو اسے تیل لگایا گیا تا کہ اس کی صورت باقی رہے اور تبدیل نہ ہو۔ وہ اسی طرح کرتے تھے جب بھی ان کا کوئی شخص فوت ہوتا اور ان کے ہاں وہ معزز ہوتا۔ جب وہ فوت ہوا تو لوگوں پر بہت شاق گزرا انہوں نے دیکھا کہ ان کا معاملہ خراب ہو گیا ہے وہ زور زور سے رونے لگے۔ شیطان نے موقع غنیمت جانا تو بادشاہ کے جثہ میں کئی دن داخل رہا اور لوگوں سے کلام کرتا رہا اور کہا: میں مرا نہیں ہوں لیکن میں تم سے غیب ہوا ہوں تا کہ میں تمہارا عمل دیکھوں، تو لوگ بہت خوش ہوئے۔ اس نے خاص لوگوں کو حکم دیا کہ اس کے لیے ایک حجاب بناؤ جو اس کے اور لوگوں کے درمیان ہو اور وہ لوگوں سے اس حجاب کے پیچھے سے کلام کرے گا تا کہ موت اس کی صورت میں نہ پہچانی جائے۔ پس انہوں نے ایک پردے کے پیچھے بت نصب کر دیا جو نہ کھاتا تھا، نہ پیتا تھا اس نے انہیں بتایا کہ وہ کبھی فوت نہیں ہوگا اور وہ ان کا خدا ہے۔ یہ سب کچھ شیطان بولتا تھا انمیں سے اکثر لوگوں نے اس کی تصدیق کی اور بعض نے شک کیا۔ ان میں سے اسے جھٹلانے والے مومن کم تھے، تصدیق کرنے والے زیادہ تھے۔ جب وہ کلام کرتا تو ان کا ناصح زجر و توبیخ کرتا تھا پس وہ اس کی عبادت پر جمع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک نبی بھیجا اس پر خواب میں وحی اترتی تھی، بیداری میں نہیں آتی تھی۔ اس کا نام حضرت حنظلہ بن صفوان تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ صورت صنم کی ہے اس میں روح نہیں اور بادشاہ کے لیے اللہ کا شریک ہونا جائز نہیں اس نے انہیں وعظ و نصیحت کی اور انہیں اپنے رب کی سطوت اور عذاب سے ڈرایا، لیکن انہوں نے اسے تکلیف پہنچائی اور اس کے دشمن بن گئے۔ وہ انہیں وعظ و نصیحت کا اہتمام کرتے تھے اور ہمیشہ انہیں نصیحت کرتے تھے حتی کہ ان بدبختوں نے اسے بازار میں قتل کر ڈالا اور اسے کنویں میں پھینک دیا۔ اس وقت ان پر عذاب آیا۔ انہوں نے رات کو سیر ہو کر کھانا کھایا اور خوب پانی پیا۔ صبح ہوئی تو کنویں کا پانی نیچے جا چکا تھا اور اس کی رسی بیکار ہو چکی تھی وہ سب چیخے اور عورتیں اور بچے چلائے، جانور پیاس کی وجہ سے آوازیں نکالنے لگے حتی کہ موت اور ہلاکت عام ہو گئی اور ان کی زمینوں میں درندے ان کے خلیفے بن گئے ان کی منازل میں لومڑ اور بجو تھے ان کے باغات اور اموال بیکار درخت

بن گئے اور کانٹے دار درخت بن گئے وہاں جنوں کی آواز اور شیروں کی گرج سنائی دیتی تھی۔ نعوذ باللہ من سطواتہ اور ایسے اصرار سے ہم پناہ مانگتے ہیں جو عذاب کا موجب ہو۔ سہیلی نے کہا: پختہ محل یہ وہ محل تھا جسے شداد بن عاد بن ارم نے بنایا تھا۔ زمین پر اس کی مثل پہلے نہیں بنایا تھا جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی حالت بھی اس کے بعد وحشت میں، آبادی کے بعد چٹیل میدان ہونے میں مذکورہ کنویں کی طرح تھی کوئی شخص اس کے قریب نہیں آسکتا تھا کیونکہ اس میں نعمتوں اور خوشحال زندگی، بادشاہ کی رونق اور لوگوں کے انتظام کے بعد جنوں کی آوازیں اور ناپسندیدہ آوازیں سنی گئیں۔ پس وہ ہلاک ہو گئے اور مٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔ بطور موعظہ اور عبرت اور نصیحت اور اس نے معصیت کے نقصان اور مخالفت کے بُرے انجام سے ڈرایا ہے۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اور برے انجام سے پناہ مانگتے ہیں۔ بعض نے کہا: جس نے انہیں ہلاک کیا تھا وہ بخت نصر تھا جیسا کہ سورۂ انبیاء میں: كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ (الانبیاء: 11) کے تحت گزرا ہے۔ کنواں بیکار اور محل خراب ہو گیا۔

**اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝۴۶**

”کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے اور کان ایسے ہو جاتے جن سے نصیحت سن سکتے حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی کفار مکہ ان اجڑی بستیوں کو نہیں دیکھتے ہیں تاکہ نصیحت حاصل کریں اور ڈریں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کہ کہیں ان پر بھی وہ نازل نہ ہو جائے جو ان سے پہلے لوگوں پر نازل ہوا تھا۔ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ سمجھنے کی نسبت قلب کی طرف کی کیونکہ سمجھ کا محل وہی ہے جس طرح سننے کا محل کان ہے۔ بعض علماء نے کہا: سمجھنے کا محل دماغ ہے اور امام ابوحنیفہ سے مروی ہے اور جو ان سے مروی ہے صحیح ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ فراء نے کہا: ہاء عماد ہے یہ بھی جائز ہے کہ فانہ کہا جائے؛ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت ہے۔ معنی ایک ہی ہے مذکر خبر کی بنا پر ہے اور تانیث ابصار یا قصہ کی بنا پر ہے یعنی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں یا فان القصۃ، لا تعمی الابصار آنکھوں کی بصارت تو ان کے لیے ثابت ہے۔ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ بلکہ دل حق کے ادراک اور عبرت حاصل کرنے سے اندھے ہیں۔ قتادہ نے کہا: دیکھنے والی نظر تو کفایت کرنے والی اور منفعت ہے اور نفع بخش نظر دل میں ہے۔ مجاہد نے کہا: ہر آنکھ کے لیے چار آنکھیں ہیں یعنی ہر انسان کے لیے چار آنکھیں ہیں دو آنکھیں دنیا میں اس کے سر میں ہیں اور دو آنکھیں آخرت میں اس کے دل میں ہوں گی جب سر کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور دل کی آنکھیں بینا ہوتی ہیں تو اس کا ظاہری آنکھوں سے اندھا ہونا کچھ نقصان نہیں دیتا اور اگر سر کی آنکھیں دیکھیں اور دل کی آنکھیں اندھی ہوں (1) تو اس کا دیکھنا نفع

1۔ النکت والعیون، ماوردی، جلد 4، صفحہ 32

نہیں دیتا۔ قتادہ اور ابن جبیر نے کہا: یہ آیت حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی کے متعلق نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل نے کہا: جب وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى (الاسراء: 72) نازل ہوئی تو ابن ام مکتوم نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں دنیا میں نابینا ہوں کیا میں آخرت میں بھی نابینا ہوں گا تو یہ آیت فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ۔۔۔ الخ، نازل ہوئی یعنی جو اس دنیا میں اپنے دل سے اسلام سے نابینا رہا وہ آخرت میں دوزخ میں ہوگا۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

''یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے عذاب (یہ تسلی رکھیں) اللہ تعالیٰ خلاف ورزی نہیں کرے گا اپنے وعدہ کی اور بیشک ایک دن تیرے رب کے ہاں ایک ہزار سال کی طرح ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ یہ نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی اور اس نے کہا تھا: فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (الاعراف)

بعض علماء نے کہا: یہ ابوجہل بن ہشام کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے کہا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ (الانفال: 32) وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ یعنی عذاب کے نازل کرنے کا وعدہ جو کیا ہے اس میں خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ زجاج نے کہا: انہوں نے عذاب کو جلدی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ کوئی چیز اس سے فوت نہ ہوگی۔ دنیا میں بدر کے دن ان پر عذاب نازل ہو بھی چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یعنی ان ایام میں سے جن میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا۔ عکرمہ نے کہا: یعنی آخرت کے دنوں میں سے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جب انہوں نے چھوٹے ایام میں عذاب کا مطالبہ کیا ہے تو وہ انہیں بڑے ایام میں عذاب دے گا۔ فراء نے کہا: یہ انہیں آخرت میں طویل عذاب کی وعید سنائی جاری رہی ہے یعنی آخرت میں ان کے عذاب کے دنوں میں سے ہر دن ہزار سال کا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے آخرت میں شدت اور خوف میں ہر دن دنیا کے سال میں سے ہزار سال کی طرح ہوگا۔ اس میں خوف اور شدت ہوگی۔ اسی طرح نعمتوں کے دن کو قیاس کرلو۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے مِّمَّا تَعُدُّوْنَ پڑھا ہے، یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبید نے وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ کے قول کی وجہ سے یعدون کو پسند کیا ہے۔ باقی قراء نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوحاتم نے اس کو اختیار کیا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝

''اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے (کافی عرصہ) ڈھیل دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (بھی جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑ لیا اور میری طرف ہی (سب کو) لوٹنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا باوجود سرکشی کے انہیں میں نے مہلت دی۔ ثُمَّ اَخَذْتُهَا پھر میں نے انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

"(اے حبیب!) آپ فرمائیے: اے لوگو! پس میں تو تمہیں (عذاب الٰہی سے) کھلا ڈرانیوالا ہوں۔ سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے تو ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی بھی۔ اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہرا دیں گے یہی لوگ دوزخی ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ، النَّاسُ سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ، نَذِيْرٌ بمعنی منذر اور مخوف (ڈرانے والا) ہے۔ انذار کا معنی سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ یعنی دینی معاملات میں سے جس کی تمہیں ضرورت ہوتی ہے میں تمہارے لیے اسے بیان کرنے والا ہوں۔ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ سے مراد جنت ہے۔ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا وہ لوگ جو ہماری آیات کو باطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاجزین غلبہ پانے کے لیے جنگ کرنے کے لیے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ فراء نے کہا: اس کا معنی ہے دشمنی کرتے ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: اسلام سے باز رکھنے والے تھے۔ اخفش نے کہا: معاندین مسابقین۔ زجاج نے کہا: یہ گمان کرتے ہوئے کہ وہ ہمیں عاجز کر دیں گے کیونکہ ان کا گمان تھا کہ دوبارہ اٹھنا نہیں ہوگا اور انہوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ ان پر قادر نہ ہوگا؛ یہ قتادہ کا قول ہے اسی طرح ابن کثیر اور ابو عمرو کی قرات معجزین کا معنی ہے انہوں نے الف کے بغیر جیم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آیات پر ایمان لانے میں مومنین کو عاجز کرتے تھے؛ یہ سدی کا قول ہے۔ بعض نے کہا: جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا تھا اسے وہ عجز کی طرف منسوب کرتے تھے جیسے ان کا قول ہے جهلته وفسقته میں نے اسے جہالت اور فسق کی طرف منسوب کیا۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہ کوئی نبی مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک) پس مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جو وہ دخل اندازی کرتا ہے پھر پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَمَنّٰۤى اس کا معنی ہے پڑھا، تلاوت کیا۔ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ اس کی قرأت اور تلاوت میں شیطان ڈالتا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اس طرح پڑھتے تھے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ ولا محدثٍ؛ یہ مسلمہ بن قاسم بن عبداللہ نے ذکر کیا ہے اور اس کو سفیان نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ مسلمہ نے کہا: ہم نے محدثین کو پایا کہ نبوت کو وہ مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت پر کیونکہ وہ بڑے بڑے امور کے متعلق خطرات کی باتیں کرتے تھے اور باطنی حکمت کے ساتھ بولتے تھے پس جو انہوں نے بات کی صحیح کی اور جو انہوں نے کہا: اس میں غلطی سے محفوظ رہے جیسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ساریہ کے واقعہ کو اور دوسرے دلائل عالیہ کو بیان کیا۔

میں کہتا ہوں: اس واقعہ کو ابوبکر انباری نے اپنی کتاب ''الرد'' میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: مجھے میرے باپ نے بتایا انہوں نے کہا مجھے علی بن حرب نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں سفیان بن عیینہ نے بتایا انہوں نے عمرو سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اس طرح پڑھا۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ ولا محدث۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا المحدث وہ ہوتا ہے جسے خواب میں وحی کی جاتی ہے اور انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت دو اعتبار سے مشکل ہے۔

ا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء کرام کچھ تو مرسل ہوتے ہیں اور کچھ ان میں غیر مرسل ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کو نبی کہنا جائز نہیں حتی کہ وہ مرسل ہو۔ اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رسالت کو ثابت کیا اور نبی کا معنی ہے انبأ عن اللہ عزوجل اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی اور انبأ عن اللہ عزوجل کا معنی ہے الارسال، فراء نے کہا: رسول وہ ہوتا ہے جو مخلوق کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ اس کے پاس جبریل کو بھیجا جاتا ہے جسے وہ سامنے دیکھتا ہے۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کی نبوت الہامی ہوتی ہے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اسی طرح قاضی عیاض نے الشفاء میں ذکر کیا ہے۔ صحیح اور جس پر علماء کا جم غفیر ہے وہ یہ ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور ہر نبی رسول نہیں ہوتا انہوں نے حضرت ابوذر کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ اور رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ ہے۔ پہلے ان میں سے حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور دوسری جہت جس میں اشکال ہے وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت کے نزول میں احادیث مروی ہیں جن میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے ایسی چیز جس کے ساتھ کفار نے عوام کو پریشان کیا ان کا یہ قول ہے کہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ وہ کسی چیز سے عاجز نہ ہوں تو پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر عذاب کیوں نہیں لاتے، حالانکہ ہم نے ان کی دشمنی میں مبالغہ کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مناسب ہے کہ ان پر سہو اور غلطی جاری نہ ہو۔ پس رب تعالیٰ نے بیان کیا کہ وہ بشر ہیں اور عذاب لانے والا اللہ تعالیٰ ہے جیسا وہ چاہتا ہے اور بشر پر سہو، نسیان اور غلطی کا امکان جائز ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو پختہ کرتا ہے اور شیطان کی مکاریوں کو مٹاتا ہے۔ لیث نے یونس

سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن بن محارث بن ہشام سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک ﷺ نے یہ آیات پڑھیں: وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۝ (النجم) جب آپ أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ۝ (النجم) پر پہنچے تو بھول گئے اور آپ نے پڑھا: إن شفاعتهم ترتجیٰ آپ کو مشرکین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض تھا ملے، آپ کو سلام کیا اور خوش ہوئے اور کہا: یہ شیطان کی طرف سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ، نحاس نے کہا: یہ حدیث منقطع ہے اس میں ایک بڑا امر ہے۔ اسی طرح قتادہ کی حدیث ہے اس میں یہ زائد ہے وانهن لهن الغرانیق العلا اس سے خوفناک وہ ہے جو واقدی نے کثیر بن زید سے انہوں نے مطلب بن عبداللہ سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: تمام مشرکوں نے سجدہ کیا سوائے ولید بن مغیرہ کے اس نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اپنی پیشانی تک اسے بلند کیا اور اس پر سجدہ کیا وہ ایک بوڑھا شخص تھا اور اسے ابوحیحہ سعید بن عاص کہا جاتا تھا حتیٰ کہ جبریل امین نازل ہوئے اور نبی کریم ﷺ نے اس پر پڑھا تو اس نے کہا: میں تو یہ نہیں لایا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ (الاسراء) نحاس نے کہا: یہ حدیث منکر منقطع ہے خصوصاً حدیث واقدی اور بخاری میں ہے کہ وہ جس نے مٹی کی مٹھی بھری تھی اور پیشانی کی طرف بلند کی تھی وہ امیہ بن خلف تھا۔ حدیث پر نحاس کی مکمل کلام آئے باب کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ وہ حدیث ہے جس میں ھی الغرانیق ہے۔ کتب تفسیر میں واقع ہے اور امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتب میں داخل نہیں کیا اور نہ کسی مشہور علمی مصنف نے اس کو ذکر کیا۔ اہل حدیث کا مذہب یہ تقاضا کرتا ہے کہ شیطان نے کچھ ڈالا۔ وہ اس سب کو اور اس کے علاوہ سب کو متعین نہیں کرتے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شیطان کا القا الفاظ مسموعہ کے ساتھ تھا جن کی وجہ سے فتنہ ہوا۔ پھر لوگوں کا اس القا کی صورت میں اختلاف ہے جو کچھ تفاسیر میں ہے اور جو مشہور قول ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی زبان پر کلام کی۔ اور مجھے میرے باپ نے بتایا کہ وہ مشرق میں علماء و متکلمین کے شیوخ سے ملا۔ جنہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ پر یہ جائز نہیں وہ تبلیغ میں معصوم تھے۔ معاملہ یہ ہے کہ شیطان نے یہ لفظ بولے اور کفار کو اس وقت سنائے جب نبی کریم ﷺ أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ۝ (النجم) اور نبی کریم ﷺ کی آواز سے قریب کیا حتیٰ کہ مشرکین پر معاملہ ملتبس ہو گیا انہوں نے کہا: محمد ﷺ نے یہ پڑھا ہے۔ اسی تاویل کی طرح امام المعالی سے بھی مروی ہے۔ بعض نے کہا: جس نے ڈالا وہ انسانوں کا شیطان تھا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْغَوْا فِيْهِ (فصلت: 26) قتادہ نے کہا: یہ وہ ہے جو اونگھتے ہوئے پڑھا تھا۔ قاضی عیاض نے کتاب الشفاء میں نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلیل ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ آپ ﷺ طریقہ تبلیغ میں معصوم تھے یعنی جس شرعی مسئلہ کی خبر دیتے تھے اس میں قصداً، عمداً، سہواً، غلطاً کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی تھی بخلاف اس کے جس پر آپ تھے (یعنی بتقاضاء شریعت عوارض بشریہ لاحق ہوتے تھے) اللہ تعالیٰ آپ کو عزت دے۔ ہمارے لیے اس کلام میں اس حدیث کے مشکل پر دو ماخذ ہیں۔ ایک اس کی اصل کی توہین میں اور دوسرا اس کے تسلیم پر۔ ماخذ اول یہ ہے کہ تیرے لیے کافی ہے کہ یہ حدیث ایسی ہے جسے اہل الصحۃ میں

سے کسی نے تخریج نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی ثقہ نے کسی سند صحیح سلیم متصل اس کو روایت کیا ہے۔

اس روایت اور اس جیسی دوسری روایت کو مفسرین، مؤرخین اور ہر غریب روایت سے اشتیاق رکھنے والے علماء اور ہر صحیح وسقیم روایت کو لینے والے علماء نے شوق سے روایت کیا ہے (جبکہ محققین نے اس کا رد کیا ہے)۔

ابوبکر بزار نے کہا: یہ حدیث ایسی ہے جسے ہم نہیں جانتے کہ یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی سند سے مروی ہو جس کا ذکر جائز ہو مگر وہ جس کو شعبہ نے ابوبشر سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ میرے خیال کے مطابق حدیث میں شک ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ آگے پورا واقعہ ذکر کیا اور شعبہ سے کسی نے مسند روایت نہیں کیا سوائے امیہ بن خالد کے۔ باقی تمام نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت کی ہے اور یہ عن کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے معروف ہے اور ابوبکر نے بیان کیا ہے کہ کسی ایسے طریق سے معروف نہیں جس کا ذکر اس کے سوا جائز ہو اور اس میں ضعف ہے اس میں شک کے وقوع کے ساتھ اس پر تنبیہ کی گئی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے یہ وہ چیز ہے جس پر کوئی وثوق نہیں اور جس کے ساتھ کوئی حقیقت نہیں۔ رہی کلبی کی حدیث اس سے روایت کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ انتہائی ضعیف اور انتہائی کاذب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ والنجم پڑھی (1) اس وقت مکہ میں تھے آپ نے اس میں سجدہ تلاوت کیا اور مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے سجدہ کیا۔ یہ نقل کے طریق سے اس کی توہین ہے۔

دوسرا ماخذ حدیث کے تسلیم کرنے پر ہے۔ اگر وہ صحیح ہو ہم اس کی صحت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ لیکن بہر حال ائمہ مسلمین نے کئی جوابات دیئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کمزور اور کچھ طاقتور ہیں۔ وہ چیز جو اس کی تاویل میں راجح ہوتی ہے اور غالب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تلاوت کر رہے تھے جس طرح آپ کو حکم تھا۔ آپ اپنی تلاوت میں آیات کا فاصلہ رکھتے تھے جیسا کہ ثقہ راویوں نے آپ سے روایت کیا ہے۔ پس ممکن ہے ان سکتوں میں شیطان نے موقع پایا ہو اور ان کلمات میں سے گھڑ کر اس میں داخل کر دیا ہو اور اس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں اس طرح بیان کیا ہو کہ اس کے قریب والے کفار نے اس کو سن لیا ہو اور انہوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول گمان کیا ہو اور پھر انہوں نے اس کو عام کر دیا ہو۔ اس سے قبل مسلمانوں کے نزدیک یہ اس سورت کو یاد کرنے کی وجہ سے کوئی حرج نہ تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کی مذمت کرتے ہیں اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ سے معروف تھا پس جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوئے تھے وہ اس شہرت، شبہ اور اس فتنہ کے سبب سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ۔

میں کہتا ہوں: یہ تاویل سب سے بہتر ہے۔ سلیمان بن حرب نے کہا: یہاں آیت میں فی بمعنی عند ہے یعنی شیطان نے کفار کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے دوران یہ ڈالا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَبِثْتَ فِيْنَا (الشعراء: 18) اس میں فی بمعنی عند ہے۔ یہ وہ مفہوم ہے جو ابن عطیہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے علماء مشرق سے روایت کیا ہے۔ اسی کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 721

طرف قاضی ابوبکر بن عربی نے اشارہ کیا ہے اور اس سے پہلے کہا: یہ آیت ہماری غرض میں نص ہے اور ہمارے مذہب کی صحت پر دلیل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو منسوب ہے اس کی براءت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس کے رسولوں میں، انبیاء کرام کی سیرت میں اس کی سنت یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام بیان کرتے ہیں تو شیطان اپنی طرف سے ڈالتا ہے جیسا کہ وہ دوسرے گناہ کرتا ہے۔ تو کہتا ہے: ألقیت فی الدار کذا والقیت فی الکیس کذا میں نے گھر میں اسے پھینکا اور میں نے پرس میں اسے پھینکا یہ نص ہے کہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا شیطان نے اس میں زائد کیا نہ کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ کلام کی تھی۔ قاضی عیاض کی کلام کا معنی ذکر کیا اور یہاں تک کہا کہ اس کی ہدایت نہیں دی گئی مگر طبری کو کیونکہ ان کو جلالت قدر اور صفاء فکر اور وسعت علم، ژرف نگاہی عطا کی گئی گویا انہوں نے اس غرض کی طرف اشارہ کیا اور صحیح نشانہ پر تیر لگایا اور ان تمام روایات کو لکھنے کے بعد فرمایا یہ سب باطل ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اگر تیرا رب چاہتا تو کوئی انہیں روایت نہ کرتا نہ کوئی ایک سطر روایت کرتا لیکن وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ ﴿۱۶﴾ (البروج) ہے۔ رہی دوسری تاویلات جو علماء نے بیان کی ہیں کہ شیطان نے آپ کو مجبور کیا حتیٰ کہ آپ نے ایسا کیا یہ محال ہے کیونکہ شیطان کو انسان کا اختیار سلب کرنے کی قدرت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق خبر دیتے ہوئے کہا: وَمَا كَانَ لِىَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِىۡ (ابراہیم: 22) اگر شیطان کو یہ قدرت ہوتی تو بنی آدم میں سے کوئی بھی نہ بچتا جسے طاعت کی قوت ہوتی اور جنہوں نے یہ گمان کیا کہ شیطان کے لیے یہ قوت ہے وہ ثنویہ اور مجوسیہ کا قول ہے کہ خیر اللہ کی طرف سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔ اور جنہوں نے کہا: یہ آپ کی زبان پر سہواً جاری ہوئے، اس نے کہا: کوئی بعید نہیں کہ آپ نے مشرکین سے دو کلمے سنے ہوں اور دونوں آپ کے حافظہ میں ہوں اور قراءت کے وقت سہواً وہ بھی پڑھے گئے ہوں۔ اس بنا پر ان پر سہو جاری ہوگا اور اس پر قائم نہیں رہتے ہوں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے عذر کے لیے اور آپ کو تسلی دینے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی بعض قراءت سے رجوع کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: شیطان کو ابیض کہا جاتا ہے وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل کی صورت میں آیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت میں اس نے یہ الفاظ ڈال دیئے: تلك الغرانیق العلا وان شفاعتهن لترتجی یہ تاویل اگرچہ پہلی تاویل کے مشابہ ہے۔ پس پہلی تاویل پر اعتماد ہوگا کسی دوسری تاویل کی طرف عدول نہیں کیا جائے گا کیونکہ محققین علماء نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اور حدیث کے ضعف کی وجہ سے کسی تاویل کی ضرورت نہیں جو چیز اس کے ضعف اور کمزوری پر دلالت کرتی ہے وہ کتاب اللہ میں سے یہ ارشاد ہے: وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ (الاسراء: 73) یہ دو آیتیں اس خبر کا رد کرتی ہیں جو انہوں نے روایت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قریب تھا کہ وہ آپ کو فتنہ میں ڈالتے حتیٰ کہ آپ کوئی بات اپنی طرف سے کہہ دیتے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ثابت قدم نہ رکھتا تو آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ اس کا مضمون اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی بات اپنی طرف سے کہنے سے بھی محفوظ رکھا اور آپ کو ثابت قدم رکھا حتیٰ کہ آپ تھوڑے سے بھی ان کی

طرف مائل نہ ہوئے۔ پھر زیادہ کیسے مائل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ تو اپنی کمزور باتوں میں یہ روایت کرتے تھے کہ وہ میلان میں زیادہ ہو گئے ہیں اور ان کے بتوں کی مدح میں افترا کی طرف مائل ہوئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا اور میں نے وہ کہا جو اس نے نہیں کہا''۔ یہ آیت کے مفہوم کی ضد ہے۔ یہ حدیث کو ضعیف کر دیتا ہے اگر وہ صحیح بھی ہوتی پھر جب وہ صحیح بھی نہیں ہے تو کیسی حالت ہو گی یہ اس قول کی مثل ہے: وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا یُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ (النساء: 113)

قشیری نے کہا: قریش اور ثقیف نے آپ سے مطالبہ کیا جب آپ ان کے بتوں سے گزر رہے تھے کہ آپ ایک دفعہ ان کی طرف اپنا چہرہ پھیر کر دیکھ لیں اور انہوں نے کہا: اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے تو آپ نے ایسا نہ کیا اور نہ آپ کی یہ شان تھی۔ ابن انباری نے کہا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہ قریب ہوئے نہ مائل ہوئے۔ زجاج نے کہا: یعنی وہ قریب تھے کہ ایسا کرتے ان اور لام تاکید کے لیے داخل ہوئے ہیں۔ بعض نے کہا: تمنی کا معنی حدث ہے نہ کہ تلاوت کرنا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا: الا اذا حدث اس کا مفہوم ہے۔ اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ کا مطلب ہے اس کی بات میں شیطان نے ڈالا۔

فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ یعنی اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا ہے جو شیطان ڈالتا ہے۔ نحاس نے کہا: جو کچھ اس آیت کے بارے کہا گیا ہے اس میں سے یہ بہتر، عمدہ اور بلند و بالا ہے۔ احمد بن محمد بن حنبل نے مصر میں ایک تفسیری نسخہ کے متعلق کہا جس کو علی بن ابی طلحہ نے روایت کیا تھا: کاش کوئی شخص اس کے لیے مصر تک سفر کرے اس میں کثیر معانی کا قصد کرتے ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ بیان کرتے تو شیطان آپ کی بات میں کسی حیلہ سے کوئی بات ڈال دیتا وہ کہتا: اگر آپ اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے کہ وہ آپ کو اپنے حصہ سے زائد دیتا تو مسلمانوں میں وسعت ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فلاح اس کے علاوہ میں ہے تو اسے مٹا دیتا جو شیطان ڈالتا تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ کسائی اور فراء تمام نے تمنی کا معنی حدث نفسہ بیان کیا ہے یہ لغت میں معروف ہے اور ان دونوں نے اس کا معنی تلاوت کرنا بھی کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے اور یہ مجاہد، ضحاک وغیرہما نے کہا ہے۔ ابوالحسن بن مہدی نے کہا: یہ التمنی قرآن اور وحی میں سے کسی چیز میں نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک جب مال سے خالی ہو جاتے تھے اور آپ اپنے اصحاب کی معاشی بدحالی کو دیکھتے تو دل کی وجہ سے اور شیطان کے وسوسہ سے دنیا کی خواہش ہوتی؛ یہ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ بات کرتے تو شیطان آپ کی بات میں ڈالتا؛ یہ طبری کا مختار ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیَجْعَلَ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ فِتْنَةً نفس کی حدیث کو رد کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شیطان کا پھینکنا الفاظ کی وجہ سے تھا جو سنے جاتے تھے جن کے ساتھ فتنہ واقع ہوا۔ نحاس نے کہا اگر حدیث صحیح ہوتی اور اس کی سند متصل ہوتی تو اس میں بات صحیح ہوتی اور سہا کا معنی اسقط ہوتا اور تقدیر کلام اس طرح ہوتی۔

افرایتم اللات والعزیٰ کلام یہاں مکمل ہوئی پھر والغرانیق العلاء کو گرادیا۔ اس سے مراد فرشتے ہیں۔ فان شفاعتھم ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں اور جو فإنھم الغرانیق العلاء مروی ہے۔ اس روایت کے کئی جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ قول محذوف ہے جیسا کہ عرب کئی اشیاء میں ایسا کرتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بغیر حذف کے ہو اور یہ توبیخ ہو کیونکہ اس سے پہلے افرایتم ہے۔ یہ ان پر احتجاج ہوگا اگر یہ نماز میں تھا تو پہلے نماز میں کلام کرنا مباح تھا۔ اس واقعہ میں روایت ہے کہ آپ نے جو پڑھا وہ یہ تھا: افرایتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ، والغرانقۃ العلاء وان شفاعتھن لترتجی؛ یہ معنی مجاہد سے مروی ہے۔ حسن نے کہا: الغرانیق العلاء سے مراد فرشتے ہیں اس کے ساتھ کلبی نے الغرانقۃ کی تفسیر بیان کی ہے کہ یہ فرشتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بت اور ملائکہ، اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے حکایت کیا ہے اور ان پر اس سورت میں اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ (النجم) کے قول کے ساتھ رد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا انکار فرمایا۔ فرشتوں سے شفاعت کی امید صحیح ہے جب مشرکین نے اس کی یہ تاویل کی کہ الذ کہہ سے مراد ان کے خدا ہیں اور ان پر شیطان مسلط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مٹا دیا جو شیطان نے ڈالا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو محکم فرمایا اور ان دو لفظوں کی تلاوت کو اٹھا دیا جن کے ذریعے شیطان نے تلبیس کا راستہ پایا تھا جیسا کہ اس نے قرآن کا کثیر حصہ منسوخ کر دیا اور اس کی تلاوت اٹھا دی۔ قشیری نے کہا: یہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ یعنی اللہ تعالیٰ اسے باطل کرتا ہے جبکہ فرشتوں کی شفاعت باطل نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ جو اس کے نبی کی طرف وحی کیا گیا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ اور اپنی مخلوق میں فیصلہ فرمانے والا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

"(یہ سب اس لیے) تا کہ اللہ تعالیٰ بنا دے جو وسوسہ ڈالتا ہے شیطان ایک آزمائش ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں، اور بیشک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً میں فِتْنَةً کا معنی ہے گمراہی۔ لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد شرک اور نفاق ہے۔ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ان کے دل سخت ہیں اللہ کے حکم کے لیے نرم نہیں ہوتے۔ ثعلبی نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ انبیاء کرام پر سہو، نسیان اور شیطان کے وسوسہ کی وجہ سے یا دل کے مشغول ہونے کی وجہ سے غلطی جائز ہے پھر اسے متنبہ کیا جاتا ہے اور وہ صحیح کی طرف لوٹ آتا ہے۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کے قول کا یہی معنی ہے۔ لیکن غلطی اس کے مطابق ہوتی ہے جیسے ہم غلطی کرتے ہیں۔ اور جو انہوں نے تلك الغرانیق العلاء کا قول آپ کی طرف منسوب کیا وہ نبی کریم ﷺ پر کذب ہے کیونکہ اس میں تو بتوں کی تعظیم ہے اور یہ انبیاء پر جائز نہیں ہے جس طرح یہ جائز نہیں ہے کہ آپ بعض قرآن پڑھیں پھر شعر پڑھنے لگیں اور پھر آپ کہیں کہ میں نے غلطی کی اور میں نے اسے قرآن گمان کیا۔ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ ظالمین سے مراد کفار ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی

دشمنی، نافرمانی اور مخالفت میں ہیں۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''(نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے) کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا کہ کتاب حق ہے آپ کے رب کی طرف سے تاکہ ایمان لائیں اس کے ساتھ اور جھک جائیں اس (کی سچائی) کے آگے ان کے دل اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے ایمان والوں کو راہ راست کی طرف''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اس سے مراد مومنین ہیں۔ بعض نے کہا: اہل کتاب ہیں۔ انہ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ نے آیات قرآنی سے محکم فرمائیں وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تاکہ ان کے دل ایمان لائیں اس کے ساتھ اور جھک جائیں اور سکون پائیں۔ بعض نے فتخبت کا معنی تخلص (خالص ہونا) کیا ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا ابو حیوہ نے واللہ لہاد الذین آمنوا یعنی تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ یعنی وہ انہیں ہدایت پر ثابت قدم رکھتا ہے۔

وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝

''اور ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کفار اس کے بارے میں یہاں تک کہ آجائے ان پر قیامت اچانک یا آجائے ان پر عذاب منحوس دن کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ یعنی قرآن کے بارے میں کافر ہمیشہ شک میں رہیں گے، یہ ابن جریج کا قول ہے۔ بعض نے کہا: دین کے بارے میں شک میں رہیں گے اور وہ صراط مستقیم ہے۔ بعض نے کہا: اس کے بارے میں جو شیطان نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ڈالا اور وہ کہتے ہیں: کیا ہوا ہے اسے کہ پہلے تو بتوں کا ذکر خیر سے کیا ہے اور پھر اس سے پھر گیا ہے۔ ابو عبدالرحمن سلمی نے مرية کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور میم کے کسرہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ، الساعة سے مراد قیامت ہے۔ بَغْتَةً کا معنی ہے اچانک۔ اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝ ضحاک نے کہا: اس دن کا عذاب جس کے لیے رات نہیں ہے اور وہ قیامت کا دن ہے۔ نحاس نے کہا: قیامت کے دن کو عَقِيْمٍ کہا گیا ہے کیونکہ اس کے بعد اس کی مثل دن نہیں آئے گا؛ یہ ضحاک کے قول کا معنی ہے۔ لغت میں عقیم اسے کہتے ہیں جس کی اولاد نہ ہو اور جن والدین کے درمیان بچہ ہو اور ایام متواتر آگے پیچھے ہوں تو بعد والے دنوں کو اولاد کی ہیئت کی طرح بنایا گیا ہے اور وہ دن جس کے بعد دن نہ ہو تو اسے عقیم کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد بدر کے دن کا عذاب ہے۔ اور عقیم کا معنی ہے بڑائی میں اس کی مثل نہیں ہے کیونکہ اس

میں فرشتوں نے جہاد کیا تھا۔ ابن جریج نے کہا: کیونکہ وہ اس دن رات تک نظر نہیں آئے تھے بلکہ وہ شام سے پہلے قتل کیے گئے پس وہ ایسا دن ہوا جس کے لیے رات نہیں ہے اسی طرح ضحاک کے قول کا معنی ہے کہ وہ قیامت کا دن ہے کیونکہ اس کے لیے رات نہیں ہے۔ بعض نے کہا: اس کو عقیم اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں رحمت و رأفت نہیں ہے اور وہ ہر خیر سے خالی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ (الذاریات) یعنی ایسی ہوا جس میں خیر نہ تھی اور نہ وہ بارش لاتی تھی نہ رحمت۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

''حکمرانی اس روز اللہ تعالیٰ کی ہوگی وہی فیصلہ فرمائے گا لوگوں کے درمیان پس جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو وہ نعمت (واحسان) کے باغوں میں (قیام پذیر) ہونگے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو یہ بدنصیب ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ یعنی قیامت کے روز حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگی اس میں نہ کوئی جھگڑنے والا ہوگا نہ دفاع کرنے والا۔ اَلْمُلْكُ کا معنی ہے جس کے لیے امور کی تدبیر ہے۔ اس کے لیے قدرت کا وسیع ہونا پھر اس کا حکم بیان فرمایا۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ یومئذ سے یوم بدر کی طرف اشارہ ہو اس نے اس دن میں کافر کو ہلاک کرنے اور مومن کو سعادت بخشنے کا فیصلہ فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: ''تجھے کیا معلوم اللہ تعالیٰ نے اہل بدر پر کرم کیا اور فرمایا جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا'' (1)۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جن لوگوں نے ہجرت کی راہ خدا میں پھر وہ (جہاد میں) قتل کر دیے گئے یا طبعی طور پر فوت ہوئے تو ضرور عطا فرمائے گا انہیں اللہ تعالیٰ بہترین رزق اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، بڑا بردبار ہے''۔

وہ مہاجرین جو فوت ہو گئے اور شہید ہو گئے تو انہیں دوسرے مردوں پر فضیلت و شرف دینے کے لیے ان کا علیحدہ ذکر کیا۔ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب مدینہ طیبہ میں حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد فوت

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، فضل شھداء بدر، جلد 2، صفحہ 567

ہوئے تو بعض لوگوں نے کہا جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید ہوا وہ اس سے افضل ہے جو طبعی موت مرا تو ان کی برابری بیان کرتے ہوئے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ تمام کو عمدہ رزق دیتا ہے۔ شریعت کا ظاہر یہ ہے کہ شہید افضل ہے۔ بعض اہل علم نے کہا: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں فوت ہونے والا شہید ہے لیکن مقتول نے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے برداشت کیا اس کی وجہ سے اسے فضیلت ہے۔ بعض نے کہا: دونوں برابر ہیں اور اس آیت سے حجت پکڑی ہے اور دوسری حجت اس آیت سے پکڑی ہے: وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء:100) اور تیسری دلیل حضرت ام حرام کی حدیث سے پکڑی ہے وہ اپنی سواری سے گر کر وصال فرما گئی تھیں اور شہید نہیں ہوئی تھیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خوشخبری سنائی تھی کہ ''تو پہلے لوگوں میں سے ہے'' (1) اور چوتھی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بنایا جو حضرت عبداللہ بن عتیک کی حدیث میں ہے فرمایا: ''جو گھر سے اللہ کے راستہ میں ہجرت کرتے ہوئے نکلا پھر وہ اپنی سواری سے گرا اور فوت ہو گیا یا اسے سانپ نے کاٹا وہ مر گیا یا طبعی موت مر گیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو شخص اچانک مر جائے تو وہ انجام کا مستوجب ہوگا'' (2)۔ ابن المبارک نے حضرت فضالہ بن عبید سے روایت کیا ہے اس میں ہے کہ دو آدمیوں میں سے ایک کو جنگ میں منجنیق لگی اور فوت ہو گیا اور دوسرا وہاں فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہ میت کے پاس بیٹھے تھے تو انہیں کہا گیا: تو نے شہید کو چھوڑ دیا ہے جبکہ تم اس کے پاس نہیں بیٹھے کیا وجہ ہے؟ حضرت فضالہ نے کہا: مجھے کوئی پروا نہیں میں کسی ایک کی قبر سے اٹھایا جاؤں پھر یہ آیت تلاوت کی: وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا۔ سلیمان بن عامر نے کہا: حضرت فضالہ زمینوں پر بردس میں امیر بنائے گئے تھے دو شخصوں کے جنازے اٹھائے گئے ایک مقتول (شہید) تھا اور دوسرا ایسے فوت ہوا تھا۔ حضرت فضالہ نے دیکھا کہ لوگ شہید کے جنازہ کے ساتھ اس کی قبر کی طرف میلان کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے لوگو! میں دیکھتا ہوں تم شہید کی طرف میلان کر رہے ہو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! مجھے کوئی پروا نہیں میں ان میں سے کسی کی قبر سے اٹھایا جاؤں تم یہ ارشاد پڑھو: وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا۔ اسی طرح ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا۔ ابن المبارک نے جو ذکر کیا ہے اس کا معنی ہے اور جو کہتے ہیں کہ مقتول کو فضیلت حاصل ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کون سا جہاد افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کا خون بہایا گیا اور جس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹی گئیں'' (3)۔ جب افضل شہید وہ ہے جس کا خون بہایا گیا اور کونچیں کاٹی گئی تو معلوم ہوا کہ جو اس صفت پر نہیں ہے وہ مفضول ہے۔ ابن عامر اور اہل شام نے قتلوا کثرت کی تشدید کے لیے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لید خلنهم مدخلا كريما اس سے باغات مراد ہیں۔ اہل مدینہ کی قرات مَدخلاً میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مراد

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، الترغیب فی الجہاد، صفحہ 480 2۔ مجمع الزوائد، کتاب الجہاد، جلد 5، صفحہ 503

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، القتال فی سبیل اللہ، صفحہ 206

ایضاً، ابوداؤد، ابواب قیام اللیل باب طول القیام، حدیث 1237، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دخولا ہے اور باقی قراء نے ضمہ دیا ہے۔ یہ سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے، ان کو سزا دینے میں بردبار ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝

''ان باتوں کو یاد رکھو اور جس نے بدلا لیا اتنی قدر جتنی تکلیف اسے دی گئی تھی پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائے گا، بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ، ذٰلِكَ محل رفع میں ہے یعنی ذالك الأمر الذی قصصنا علیك وہ معاملہ جو ہم نے آپ پر بیان کیا ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی محرم کی دو راتیں باقی تھیں ان کی مسلمانوں سے ملاقات ہوئی مشرکوں نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شہر حرام میں جنگ کو ناپسند کرتے ہیں اس لیے اب ان پر حملہ کر دو، مسلمانوں نے ان سے سوال کیا تھا کہ وہ شہر حرام میں ان سے جنگ نہ کریں۔ مشرکین نے انکار کیا اور جنگ کرنے کے لیے مسلمانوں پر حملہ کر دیا مسلمان ثابت قدم رہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مشرکین کے خلاف مدد کی اور مسلمانوں کے دلوں میں شہر حرام میں جنگ کی وجہ سے پریشانی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض نے کہا: یہ مشرکوں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے مسلمانوں کا مثلہ کیا تھا پھر جنگ احد میں ان سے لڑائی ہوئی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا پس وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ کا معنی ہے جس نے ظالم کو اتنی جزا دی جتنا اس نے اس پر ظلم کیا تھا۔ پس عوقبت کی جزا کو عوقبت کہا گیا ہے کیونکہ صورت میں فعل برابر ہیں یہ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: 40) کی طرح ہے اور فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ: 194) کی مثل ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ پھر کلام کے ذریعے یا اسے اپنے وطن سے نکال کر مشرکین نے اپنے نبی کو جھٹلایا اور مومنین کو اذیت دی اور انہیں مکہ سے باہر نکالا اور ان کے نکالنے پر غالب آ گئے۔ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ضرور مدد کرے گا کیونکہ کفار نے ان پر زیادتی کی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو معاف فرمایا اور شہر حرام میں ان کے قتال کو بھی معاف فرمایا اور ان پر پردہ ڈالا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝

''اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کے کچھ حصہ) کو رات میں اور اللہ تعالیٰ سب باتیں سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ یعنی جو میں نے تجھ پر مظلوم کی مدد کرنے سے بیان کیا ہے وہ میں ہی ہوں جو رات کو دن میں داخل کرتا ہوں اور کوئی اس پر قادر نہیں جس پر میں قادر ہوں، اس قدرت سے وہ اپنے بندے کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وہ اقوال کو سنتا ہے اور افعال کو دیکھتا ہے اس سے ذرہ برابر کوئی چیز مخفی نہیں ہے

اور چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی وہ جانتا ہے، سنتا اور دیکھتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

''نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بلند (اور) سب سے بڑا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ یعنی وہ حق والا ہے۔ اس کا دین حق ہے اور اس کی عبادت حق ہے اور مومنین اس سے نصرت کے مستحق ہوتے ہیں اس کے حق وعدہ کے حکم سے۔ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ یعنی وہ بت جن کا عبادت میں کوئی استحقاق نہیں ہے۔ نافع، ابن کثیر، ابن عامر اور ابو بکر نے وان ماتدعون تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے اور باقی قراء نے خبر کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۂ لقمان میں بھی یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے۔ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ یعنی اپنی قدرت کی وجہ سے ہر چیز سے بلند ہے۔ اور اشباہ، انداد سے بلند ہے اور ظالم لوگ جو ایسی صفات بیان کرتے ہیں جو اس کے جلال کے مطابق نہیں ہیں وہ ان سے پاک ہے۔ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ عظمت، جلال اور بلند شان سے متصف ہے۔ بعض نے کہا: الْكَبِيْرُ کا مطلب ہے کبریاء والا اور الْكَبِيْرُ کمال ذات سے عبارت ہے یعنی اس کے لیے ہمیشہ سے وجود مطلق ہے وہ اول قدیم ہے آخر باقی ہے جبکہ مخلوق فنا ہو جائے گی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی تو ہو جاتی ہے (خشک) زمین سرسبز و شاداب، بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہر چیز سے باخبر ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال پر دلیل ہے یعنی جو اس پر قادر ہے وہ موت کے بعد حیات کے اعادہ پر قادر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ جب ہم نے اس پر پانی اتارا تو لہلہانے لگی اور بڑی ہوئی۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ فَتُصْبِحُ جواب نہیں ہے تاکہ منصوب ہو؛ یہ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک خبر ہے۔ خلیل نے کہا: اس کا معنی ہے تو بیدار ہو، اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل کیا تو ایسا ایسا ہوا جیسا کہ شاعر نے کہا:

اَلم تسأل الرَّبعَ القواءَ فینطقُ　　　وھل تُخبِرَنْكَ اليومَ بيداءُ سَمْلَقُ

اس کا معنی ہے تو نے اس سے سوال کیا تو وہ بولا۔ بعض علماء نے کہا: استفہام تحقیق ہے یعنی قد رأیت میں پھر تو غور کر کیسے یہ ہو جاتی ہے یا عطف ہے کیونکہ اس کا معنی ہے کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے۔ فراء نے کہا: اَلَمْ تَرَ خبر ہے جیسے تو کلام عرب میں دیکھتا ہے جان تو کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً تو وہ

زمین سرسبز ہوگئی جیسے تو کہتا ہے: مبقلة و مسبعة یعنی سبزیوں والی زمین اور درندوں والی زمین۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ پانی کے نزول کا اثر بوٹیوں پر جلدی ہوتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: اور وہ اس طرح نہ ہوا مگر مکہ اور تہامہ میں (1)۔ اس کا مطلب ہے اس نے فَتُصْبِحُ کے قول سے بارش کی رات کی صبح مراد لی ہے۔ اور ان کا خیال ہے یہ شادابی باقی شہروں میں متاخر ہوتی ہے۔ میں نے یہ بسوس الاقصیٰ میں مشاہدہ کیا کہ قحط کے بعد رات کو بارش نازل ہوئی تو وہ ریتلی زمین جس کو ہوا اڑاتی تھی صبح کے وقت باریک بوٹیوں کے ساتھ سرسبز و شاداب تھی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خَبِیْرٌ بارش کے نہ ہونے کے وقت بندے پر جو مایوسی طاری ہوتی ہے وہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔ لَطِیْفٌ اپنے بندوں کو رزق بخشنے میں بہت لطیف ہے۔ بعض علماء نے کہا: زمین سے نباتات نکالنے میں لطیف ہے اور ان کی حاجت و فاقہ سے باخبر ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶۴﴾

''اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بے پروا اور تعریف کا مستحق ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ تخلیق اور ملکیت کے اعتبار سے سب کچھ اسی کا ہے ہر چیز تدبیر اور پختگی میں اس کی محتاج ہے۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶۴﴾ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں وہ ہر حال میں محمود ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لیے ہر چیز کو جو زمین میں ہے اور کشتی کو بھی کہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے اور اس نے روکا ہوا ہے آسمان کو کہ گر نہ پڑے زمین پر بجز اس کے فرمان کے، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا بتایا کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے جانور، درخت اور نہریں جس کی انہیں ضرورت تھی اسے مسخر کر دیا۔ اَلْفُلْكَ اور کشتی کو اس کے چلنے کی حالت میں تمہارے لیے مسخر کیا، ابو عبد الرحمن اعرج نے والفلك کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور مابعد کو خبر بنایا ہے جبکہ باقی قراء نے مَّا فِی الْاَرْضِ پر عطف کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ یعنی کراهية ان تقع۔ اور کوفیوں نے اس کی تفسیر میں کہا: لئلا تقع آسمان کو اس کا روکنا یہ ہے کہ اس نے اس میں ایک حال کے بعد دوسرے حال میں سکون پیدا کیا ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِهٖ مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کا وقوع ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾ وہ اشیاء جن کو اس نے بندوں کے لیے مسخر کیا ان میں وہ بندوں پر مہربانی کرنے والا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 131

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶

''اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی پھر مارے گا تمہیں پھر زندہ کرے گا تمہیں بیشک انسان بڑا ناشکرا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ یعنی تمہارا نطفہ ہونے کے بعد اس نے تمہیں زندگی دی ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ اور تمہاری عمر پوری ہونے کے وقت وہ تمہیں موت دے گا ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر وہ تمہیں حساب، ثواب اور عقاب کے لیے زندہ کرے گا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝ جب وہ آیات ظاہر ہو چکی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت و وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں پھر بھی انسان منکر بنا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْاِنْسَانَ سے مراد اسود بن عبد الاسد، ابوجہل بن ہشام، عاص بن ہشام اور مشرکین کی ایک جماعت ہے۔ بعض نے کہا: یہ اس لیے فرمایا کیونکہ اکثر انسان نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں جیسے فرمایا: قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ (سبا)

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝۶۷

''ہر امت کے لیے ہم نے مقرر کر دیا ہے عبادت کا طریقہ جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ نہ جھگڑا کریں آپ سے اس معاملہ میں آپ بلاتے رہیئے انہیں اپنے رب کی طرف، (اے محبوب!) آپ بیشک سیدھی راہ پر (گامزن) ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا یعنی ہم نے ہر امت کے لیے شریعت مقرر کی ہے هُمْ نَاسِكُوْهُ وہ اس پر عمل کرنے والے ہیں۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ تمہاری امت کے لیے جو شریعت ہے اس میں کوئی شخص آپ سے جھگڑا نہ کرے۔ ہر زمانہ کی اپنی شریعت تھی۔ ایک فرقہ نے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کفار جو ذبائح کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے اس کے سبب نازل ہوئی اور جو وہ مومنین سے کہتے تھے: تم وہ کھاتے ہو جو تم خود ذبح کرتے ہو اور اسے نہیں کھاتے جس کو اللہ تعالیٰ مارتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ مارتا ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اسے کھاؤ بنسبت اس کے جس کو تم ہی چھریوں سے قتل کرتے ہو۔ تو اس جھگڑا کے سبب یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ مسئلہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ اور مَنْسَكًا کے متعلق علماء کے اقوال ہیں وہ اسی سورت میں گزر چکے ہیں اور هُمْ نَاسِكُوْهُ یہ شعور دیتا ہے کہ منسک مصدر ہے اگر یہ ظرف کا صیغہ ہوتا تو هم ناسکون فیه ہوتا۔ زجاج نے کہا: فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ کا مطلب ہے آپ سے وہ نہ جھگڑیں اس معنی پر اِنْ جٰدَلُوْكَ دلالت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: وہ تو آپ سے جھگڑے تھے پھر کیسے فرمایا کہ وہ آپ سے نہ جھگڑیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے آپ ان سے نہ جھگڑیں۔ یہ آیت قتال کے حکم سے پہلے نازل ہوئی۔ تو کہتا ہے: لا یضاربنك فلان فلا تضاربه أنت پس یہ باب مفاعلہ پر جاری ہوا۔ یہ نہیں کہا جاتا: لایضربنك زیدٌ وأنت ترید لا تضرب زیداً اور ابومجلز نے فلا ینزعنك فی الامر پڑھا ہے یعنی وہ آپ کو ہلکا نہ سمجھے اور وہ دین کے معاملہ میں تجھ پر غالب نہ آئے۔ جماعت کی قرأت المنازعة سے ہے۔ نہی کا لفظ دونوں قرأتوں میں کفار کے لیے ہے اور مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ یعنی آپ انہیں اللہ تعالیٰ

کی توحید، اس کے دین اور اس پر ایمان لانے کی طرف بلائیں۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ آپ دین مستقیم پر ہیں۔ جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔

وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾

"آپ سے جھگڑا کریں تو آپ (صرف اتنا) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو تم کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ، اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ آپ سے جھگڑیں یعنی مشرکین مکہ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ تو کہو: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو یعنی جو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر شب معراج نازل ہوئی جب آپ ساتویں آسمان میں تھے اور جو آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ اگر وہ باطل کے ساتھ تم سے جھگڑیں تو انہیں اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ کے قول کے ساتھ جواب دو یعنی کفر و تکذیب جو تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو جھگڑا کرنے سے اعراض کا حکم فرمایا تاکہ آپ ان کی ہٹ دھرمی سے مشغول ہونے سے محفوظ رہیں۔ ہٹ دھرم شخص کے لیے کوئی جواب نہیں ہوتا۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فیصلہ فرمائے گا۔

**مسئلہ**: اس آیت میں حسن آداب سکھایا جا رہا ہے کہ جو شخص تعصب اور صرف جھگڑا کرنے کے لیے مناظرہ کرتا ہے اسے جواب نہ دیا جائے اور اس سے مناظرہ نہ کیا جائے بلکہ اسے صرف وہی کہا جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت، آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے یعنی مخالفت پر خاموشی اور اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ کے قول پر اکتفا منسوخ ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٧٠﴾

"کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، یہ سب کچھ ایک کتاب میں (لکھا ہوا) ہے، بیشک (بلندی اور پستی کی ہر چیز کو جان لینا) اللہ تعالیٰ پر آسان ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کو یہ معلوم ہے اور آپ کو یقین ہے تو جان لو کہ وہ یہ بھی جانتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ بعض نے کہا: یہ غیر کے لیے استفہام تقریر ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ یعنی جو کچھ اس عالم میں ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ام الکتاب

میں لکھا ہوا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا الله پر آسان ہے۔ بعض نے کہا: اس قلم کا لکھنا جس کو الله تعالیٰ نے قیامت تک ہونے والے امور کے لکھنے کا حکم دیا الله تعالیٰ پر آسان ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝

''اور وہ پوجتے ہیں الله تعالیٰ کے سوا ان کو نہیں اتاری جن کے متعلق الله تعالیٰ نے کوئی سند اور انہیں خود بھی ان کے بارے میں کوئی علم نہیں اور نہیں ہوگا ظلم وستم کرنے والوں کا کوئی مددگار''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَعْبُدُوْنَ اس سے مراد کفار قریش ہیں جو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا۔ سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔ یہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

''اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف صاف تو آپ پہچان لیتے ہیں کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں پر جو پڑھتے ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں۔ آپ فرمایئے (اے چیں بجبیں ہونے والو!) کیا میں آگاہ کردوں تمہیں اس سے بھی تکلیف دہ چیز پر دوزخ کی آگ! وعدہ کیا ہے اس آگ کا الله تعالیٰ نے کفار سے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ آیات سے مراد قرآن ہے۔ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ، المنکر سے مراد غضب اور یبوست ہے۔ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ وہ پکڑتے ہیں۔ السطوة کا معنی شدت سے پکڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: سطابہ یسطو جب کوئی کسی چیز کو پکڑ لے خواہ یہ مارنے کے ساتھ ہو یا گالی گلوچ کے ساتھ ہو۔ اور سطا علیہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یسطون کا معنی ہے وہ ان کی طرف ان کے ساتھ لڑتے ہیں۔ ضحاک نے کہا: وہ انہیں سختی سے ہاتھ سے پکڑتے ہیں۔ تمام معانی ایک جیسے ہیں۔ السطو کی اصل قہر ہے۔ الله تعالیٰ ذوسطوت ہے اور سخت گرفت کرنے والا ہے۔ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ اس قرآن سے جو تم سنتے ہو ناپسندیدہ چیز آگ ہے۔ بعض نے کہا: النار سے پہلے ضمیر ہے یعنی ھو النار وہ آگ ہے۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے کیا میں تمہیں اس سے بھی بری چیز سے آگاہ نہ کروں جو تم سے قرآن پڑھنے والے کو لاحق ہوتی ہے وہ آگ ہے۔ تو یہ ان کے لیے وعید ہوگی جو قرآن پڑھنے والوں کو شدت سے پکڑتے ہیں۔ اور النار میں رفع، نصب اور جر تینوں اعراب جائز ہیں۔ الرفع ھو النار کی تقدیر پر یا ھی النار کی تقدیر پر النصب اعنی کی تقدیر پر یا فعل کے اضمار پر جو دوسرے فعل کی مثل ہے یا

معنی پر محمول کی بنا پر یعنی اعرفکم بشہ من ذلکم النار اور زبر بدل کی بنا پر۔
وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی قیامت میں وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وہ جگہ جس کی طرف وہ جائیں گے وہ آگ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے پس غور سے سنو اسے بیشک جن معبودوں کو تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں اس (معمولی سے) کام کے لیے اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھوڑا سکتے اسے اس مکھی سے، (آہ) کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ، اس کا تعلق وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔۔۔الخ سے ہے فرمایا: ضُرِبَ مَثَلٌ مثال دی گئی ہے کیونکہ ضرب امثال کے ذریعے ان پر اللہ تعالیٰ کی حجتیں، ان کے افہام کے زیادہ قریب تھیں۔ اگر کہا جائے کہ جو مثال دی گئی ہے وہ کہاں ہے تو اس میں دو وجوہ ہیں:

1۔ اخفش نے کہا: یہاں کوئی مثل نہیں مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے مثال دی تم ان کی بات غور سے سنو یعنی کفار نے اللہ تعالیٰ کے لیے مثال بنائی ہے غیر کی عبادت کر کے گویا فرمایا: انہوں نے میری عبادت میں میری شبیہ بنائی ہے اس تشبیہ کی خبر سنو۔

2۔ قتبی کا قول ہے اس کا معنی ہے اے لوگو! جو ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ نحاس نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی اس کی جس کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے۔ اور فرمایا: جو کچھ اس آیت کے بارے کہا گیا ہے اس میں سے یہ قول عمدہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور تمہارے معبود کے لیے ایک شبہ بیان فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تمام کی قرأت تاء کے ساتھ تدعون ہے۔ سلمی، ابو العالیہ اور یعقوب نے خبر کی بنا پر یا کے ساتھ یدعون پڑھا ہے۔ اس سے مراد وہ بت ہیں جن کی وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے اور یہ کعبہ کے اردگرد تھے یہ تین سو ساٹھ بت تھے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد وہ سردار ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے لوگوں کو روکا تھا۔ بعض نے کہا: اس سے مراد شیاطین ہیں جنہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کی معصیت پر ابھارا تھا۔ پہلا قول زیادہ درست ہے۔ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا، الذباب اسم ہے مذکر اور مؤنث کے لیے اور جمع قلت اَذِبَّة اور جمع کثرت ذِبَّان آتی ہے جیسے غراب کی جمع اَغْرِبَة اور غربان آتی ہے اور مکھی کو ذباب اس کی کثرت سے حرکت کرنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: الذباب معروف ہے اس کا واحد ذُبَابَة ہے اور ذِبَّا بِقَنَہ کہو۔ المِذَبَّة جس کے ساتھ مکھی کو دور کیا جاتا ہے: ذباب أسنان الابل اونٹوں کی عمروں کی حد۔ ذباب السیف تلوار کی طرف جو ماری جاتی ہے۔

ذباب العین سے مراد آنکھوں کی پتلی ہے۔ الذبابۃ قرض کا بقیہ حصہ۔ ذبب النہار بولا جاتا ہے۔ جب تھوڑا سا دن باقی ہو۔ التذبذب کا معنی حرکت کرنا ہے۔ الذبابۃ کسی چیز کا حرکت کرنے والا حصہ جو ہوا میں لٹکائی گئی ہوتی ہے۔ الذبذب ذکر کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بار بار حرکت کرتا رہتا ہے۔ حدیث میں ہے: من وقی شر ذبذبۃ یعنی جسے ذبذبہ کے شر سے بچایا گیا۔ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْــٴًـا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ، الاستنقاذ اور الانقاذ کا مطلب ہے چھڑوانا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنے بتوں پر زعفران ملتے تھے۔ پھر وہ خشک ہوتا تھا۔ پس مکھی آتی تھی اور اسے اچک لیتی تھی۔ سدی نے کہا: وہ اپنے بتوں کے لیے کھانا رکھتے تھے اس پر مکھی بیٹھتی تھی اور اسے کھا جاتی تھی۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ بعض علماء نے کہا: الطالب سے مراد وہ بت ہیں اور المطلوب سے مراد مکھی ہے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ بعض نے کہا: الطالب سے مراد بتوں کے پجاری ہیں اور المطلوب سے مراد بت ہے۔ عابد اس بت کی طرف قرب حاصل کرتا تھا۔ اور وہ بت اس کا مطلوب الیہ تھا۔ اور کہا گیا ہے: وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْــٴًـا یہ اس کے الم کی طرف راجع ہے جو ان کے جسموں کو کاٹنے کی صورت میں الم اور تکلیف پیدا ہوتی ہے حتی کہ ان سے صبر اور وقار چھین لیتا ہے۔ یہاں مکھی کی مثال اس کی چار خصوصیات کی وجہ سے دی۔ اس کی ذلت و ضعف اور اس کی گندگی کو طلب کرنے اور اس کی کثرت کی وجہ سے مثال بیان کی ہے۔ جب یہ مکھی جو کمزور ترین حیوان ہے اور حقیر ترین حیوان ہے۔ ان کے معبود اس کی مثل پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اور اس کی اذیت دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر یہ خدا معبود اور ارباب جن کی اطاعت کی جاتی ہو کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ قوی ترین دلیل ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

"نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسے اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور (اور) سب پر غالب ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ، یعنی انہوں نے اللہ کی ایسی تعظیم نہ کی جیسی اس کی عظمت کا حق تھا کیونکہ انہوں نے مورتیوں کو اس کا شریک بنا دیا۔ یہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ۚ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے فرشتوں سے بعض پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی بعض کو رسول بنایا، بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ، سورت کا اختتام اس پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کی تبلیغ کے لیے چن لیا ہے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا کوئی اجنبی امر نہیں۔ بعض نے کہا: ولید بن مغیرہ نے کہا: کیا ہمارے درمیان سے اس پر قرآن نازل ہوا ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا کہ یہ اختیار اللہ تعالیٰ کا

ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ بَصِیۡرٌ ﴿۷۵﴾ وہ دیکھتا ہے اسے جسے وہ اپنی مخلوق میں سے رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ جو انہوں نے آگے بھیجا۔ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ جو انہوں نے پیچھے چھوڑا۔ یہ اس قول کی مثل ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا (یٰسین: 12) جو انہوں نے آگے بھیجے۔ وَ اٰثَارَہُمۡ جو پیچھے چھوڑے۔ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۷۶﴾۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۷۷﴾

''اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور عبادت کرو اپنے پروردگار کی اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو تاکہ تم (دین و دنیا میں) کامیاب ہو جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا، سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ اس سورت کو دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہ دوسرا سجدہ ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ اس سجدہ کو واجبی سجود سے شمار نہیں کرتے کیونکہ رکوع، سجود کے ساتھ متصل ہے اس سے مراد فرضی نماز ہے۔ رکوع اور سجود کو بطور تشریف نماز کے لیے خاص کیا۔ رکوع و سجود کے متعلق وضاحت سے سورۂ بقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ والحمد للہ وحدہٗ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرو۔ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ اور واجبات کے علاوہ بھی نیکی کے افعال کرو۔

وَ جَاہِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ؕ ہُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ وَ مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ ؕ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِیۡ ہٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ؕ ہُوَ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَ نِعۡمَ النَّصِیۡرُ ﴿۷۸﴾

''اور (سرتوڑ) کوششیں کرو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جس طرح کوششیں کرنے کا حق ہے، اس نے چن لیا ہے تمہیں (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لیے) اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی (پیروی کرو) اپنے باپ حضرت ابراہیم کے دین کی اسی نے تمہارا نام مسلم (سر اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ ہو جائے رسول (کریم) گواہ تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر پس (اے دین حق کے علمبردارو!) صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور ادا کرو زکوۃ اور مضبوط پکڑ لو اللہ تعالیٰ (کے دامن رحمت) کو، وہی تمہارا کارساز ہے پس وہ بہتر کارساز ہے اور بہتر مدد فرمانے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَاہِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ، بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد کفار سے جہاد ہے۔ بعض علماء نے

فرمایا: اس سے تمام اوامر کی اطاعت کرنے اور تمام نواہی سے باز رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خواہش نفس کو رد کرنے میں اپنے نفسوں سے جہاد کرو اور شیطان کے وسوسوں کو دور کرنے میں شیطان سے جہاد کرو اور ظالموں کے ظلم کو رد کرنے کے لیے ظالموں سے جہاد کرو اور کافروں کے کفر کو روکنے کے لیے کافروں سے جہاد کرو۔ ابن عطیہ نے کہا: مقاتل نے کہا یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** (التغابن: 16) ہے اسی طرح ھبۃ اللہ نے کہا: **حَقَّ جِهَادِهٖ** اور دوسری آیت میں **حَقَّ تُقٰتِهٖ** (آل عمران: 102) ان اوامر میں استطاعت کی طرف تخفیف کے ساتھ منسوخ ہیں اور نسخ کی تقدیر کی ضرورت نہیں کیونکہ حکم کی ابتدا میں بھی یہی مراد ہے کیونکہ **حَقَّ جِهَادِهٖ** سے حرج اٹھائی گئی ہو۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا بہتر دین آسان دین ہے''(1)۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ وہ چیز ہے جس میں نسخ کا واقع ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ انسان پر واجب ہے جیسا کہ حضرت حیوہ بن شریح نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے''(2)۔ اسی طرح ابو غالب نے حضرت ابوامامہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کونسا جہاد افضل ہے؟ یہ سوال اس نے جمرہ اولیٰ کے پاس کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب نہ دیا پھر دوسرے جمرہ کے پاس یہی سوال کیا تو آپ نے جواب نہ دیا پھر جمرہ عقبہ پر یہی سوال کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سائل کہاں ہے؟'' اس نے کہا: میں حاضر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ظالم حکمران کے سامنے کلمہ عدل کہنا''(3)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هُوَ اجْتَبٰىكُمْ** یعنی اپنے دین کے دفاع اور اپنے امر کے التزام کے لیے اس نے تمہیں چن لیا ہے یہ مجاہد کے امر کی تاکید ہے یعنی تم پر جہاد کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِنْ حَرَجٍ**، یعنی کوئی تنگی نہیں۔ سورۂ انعام میں یہ گزر چکا ہے۔ اس آیت میں بہت سے احکام داخل ہیں یہ وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خاص فرمایا۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: اس امت کو ایسی تین چیزیں عطا کی گئی ہیں جو سوائے نبی کے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے: اذهب فلا حرج عليك تم جاؤ تم پر کوئی تنگی نہیں اور اس امت کو کہا گیا: **وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** نبی اپنی امت پر گواہ ہوتا ہے اور اس امت کو کہا گیا: **وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** نبی کو کہا جائے گا: سَلْ تُعْطَه تم مانگو تمہیں دیا جائے گا۔ اس امت کو کہا گیا: **ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ** (المومن: 60)

**مسئلہ نمبر 2**۔ وہ حرج جو اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ عکرمہ نے کہا: وہ دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کا حلال ہونا اور لونڈیوں کا حلال ہونا ہے۔ بعض نے کہا: نماز قصر اور مسافر کے لیے روزہ افطار کرنا ہے اور اشارہ سے نماز پڑھنا جو رکوع و سجود پر قادر نہ ہو، اندھے لنگڑے، مریض اور نادار شخص سے جہاد کا ساقط کرنا ہے اور ان

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 15936　2۔ جامع ترمذی، کتاب فضل الجہاد، من مات مرابطا، جلد 1، صفحہ 195

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، صفحہ 299۔ ایضاً حدیث 4001، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سختیوں کو ختم کرنا ہے جو بنی اسرائیل پر تھیں ان اشیاء میں سے اکثر کی تفصیل گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری سے مروی ہے کہ فطر، اضحیٰ اور روزے میں چاندوں کی تاخیر و تقدیم ہے۔ جب کوئی جماعت ذی الحجہ کے چاند میں غلطی کر جائے پھر ایک دن عرفہ سے پہلے انہیں آگاہی ہو جائے یا وہ دسویں کے دن پر آگاہ ہو جائیں تو ان کے لیے جائز ہے۔ اس میں اختلاف ہے جو ہم نے موطا کی شرح المقتبس میں بیان کیا ہے اور جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح فطر، اضحیٰ کا مسئلہ ہے جیسا کہ حماد بن زید نے ایوب سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری عید اسی دن ہے جس دن تم افطار کرتے ہو اور تمہاری قربانی کا دن وہ ہے جس میں تم قربانیاں کرتے ہو'' (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ وہ ہیں جو ہم نے ذکر کیے ہیں یعنی جہاد کرو جس میں تمہیں کوئی حرج لاحق نہ ہو۔ ائمہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دسویں کے دن کی چیزوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقدیم و تاخیر کے جواب میں فرمایا: افعل ولا حرج تم کرو کوئی حرج نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے فرمایا: حرج اس سے اٹھائی گئی ہے جو منہاج شریعت پر قائم رہا ہے۔ رہے مال سلب کرنے والے، چور، اصحاب حدود تو ان پر حرج ہے۔ یہ وہ ہے جنہوں نے دین سے مفارقت کر کے حرج کو اپنے اوپر لاگو کیا اور شریعت میں اس سے بڑی حرج نہیں کہ اللہ کے راستہ میں دو شخصوں کے لیے ایک شخص کے ثبوت کا الزام ہے، نیز یقین کی صحت کے ساتھ اور عزم کی عمدگی کے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِلَّةَ اَبِیْكُمْ زجاج نے کہا: اپنے باپ حضرت ابراہیم کے دین کی اتباع کرو۔ فراء نے کہا: کاف کے حذف کی تقدیر پر منصوب ہے گویا فرمایا: كَمِلَّةِ ابیکم۔ بعض علماء نے کہا: اپنے باپ حضرت ابراہیم کے فعل کی طرح خیر کے اعمال کرو فعل کو ملت کے قائم مقام رکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عربوں کے باپ ہیں۔ بعض نے کہا: یہ خطاب تمام مسلمانوں کو ہے اگرچہ تمام آپ کی اولاد سے نہیں ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حرمت مسلمانوں پر اس طرح ہے جس طرح باپ کی حرمت بیٹے پر ہوتی ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ، ابن زید اور حسن نے کہا: ھو ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ تمہارا نام لیا ہے۔ وَ فِیْ هٰذَا اس کے حکم میں کہ جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کی وہ مسلم ہے۔ ابن زید نے کہا: رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ: 128) نحاس نے یہ قول عظماء امت کے قول کے مخالف ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: اس سے پہلی یعنی پہلی کتب میں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، یہ مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔ لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ تمہارے تبلیغ کرنے پر رسول گواہ ہو اور وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ تم لوگوں کے خلاف گواہی دو کہ ان کے رسولوں نے انہیں تبلیغ کی تھی جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ۠ اس پر تفصیلاً گفتگو گزر چکی ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصیام، إذا اخطاء القوم الهلال، جلد 1، صفحہ 318

# سورۃ المومنون

آیاتہا ۱۱۸　۲۳ سورۃ المؤمنون مکیۃ ۷۴　رکوعاتہا ۶

تمام علماء کے نزدیک یہ پوری سورت مکی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝١ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝٢ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝٣ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝٤ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝٥ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝٦ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝٧ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝٨ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝٩ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝١١

''بیشک دونوں جہاں میں بامراد ہو گئے ایمان والے۔ وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔ اور وہ جو بیہودہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں۔ اور وہ جو زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بیشک انہیں ملامت نہ کی جائے۔ اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں۔ نیز وہ (مومن بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں۔ جو وارث بنیں گے فردوس (بریں) کے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بیہقی نے حضرت انس کی حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو تخلیق فرمایا اور اپنے دست قدرت سے اس کے درخت لگائے اور اسے فرمایا تو بول تو اس نے کہا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ''(1) نسائی نے حضرت عبداللہ بن سائب سے روایت کیا ہے فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 136

میں فتح مکہ کے دن نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نعلین اتارے اور انہیں اپنی بائیں جانب رکھا اور سورۃ المومنون سے تلاوت کی جب حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچے تو آپ کو کھانسی آگئی آپ نے وہاں رکوع کر دیا۔ امام مسلم نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ امام ترمذی میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کے منہ مبارک سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسے آواز سنائی دیتی تھی (2)۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی ہم کچھ دیر آپ کے پاس ٹھہرے رہے پھر جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہاتھوں کو بلند کیا اور یہ دعا کی: ''اے اللہ! ہم میں اضافہ کر اور ہم میں کمی نہ کر اور ہمیں خوش رکھ اور ہم سے راضی ہو جا''۔ پھر فرمایا: ''مجھ پر دس آیات نازل ہوئی ہیں جو ان پر عمل پیرا ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ پھر یہ آیات پڑھیں: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، دس آیات تک۔ ابن عربی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ نحاس نے کہا: من اقامھن کا مطلب ہے جس نے ان پر عمل کیا اور جو ان میں احکام ہیں ان کی مخالفت نہ کرے جیسے تو کہتا ہے: فلان یقوم بعملہ فلاں اپنا کام کرتا ہے۔ پھر ان آیات کے بعد وضو اور حج کا فرض نازل ہوا پس وہ بھی ان کے ساتھ داخل ہو گیا۔ طلحہ بن مصرف نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی الف کے ضمہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی ثواب اور خیر میں باقی رکھے گئے۔ الفلاح کا لغوی اور شرعی معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خٰشِعُوْنَ ۝ معتمر نے خالد سے انہوں نے حضرت محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کی جگہ دیکھتے تھے اور ہشیم نے روایت کی ہے کہ مسلمان نماز میں ادھر ادھر متوجہ ہوتے تھے اور ادھر ادھر دیکھتے تھے حتیٰ کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ کا ارشاد نازل ہوا تو وہ اپنی نمازوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے سامنے دیکھنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ میں فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ: 144) کے تحت علماء کے اقوال نمازی کی نماز کی حالت میں دیکھنے کے بارے میں گزر چکے ہیں کہ وہ نماز میں کس جگہ نظر رکھے۔ اسی طرح خشوع کا لغوی معنی وَ اِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ۝ (البقرہ) کے تحت گزر چکا ہے۔ خشوع کا محل دل ہے دل میں خشوع ہوتا ہے تو اس کے خشوع کی وجہ سے تمام اعضاء میں خشوع ہوتا ہے کیونکہ وہ جسم کی سلطنت کا بادشاہ ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ جب کوئی عالم نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ نماز میں کسی چیز کی طرف نظر کرنے اور نفس میں کسی دنیا کی چیز کا خیال لانے سے رحمٰن سے ڈرتا ہے۔ عطا نے کہا: وہ نماز میں اپنے جسم کے کسی حصہ سے نہیں کھیلتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا'' (3)۔ حضرت ابوذر نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو

---

1۔ سنن نسائی، قرأت بعض السورۃ، جلد 1، صفحہ 156
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مومنون، جلد 2، صفحہ 146
3۔ کنز العمال، باب الخشوع، جلد 3، صفحہ 146، حدیث 5691

رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے پس وہ کنکریوں کو حرکت نہ دے"(1)۔ اس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ شاعر نے کہا: غور سے سنو نماز میں ساری خیر و برکت ہے کیونکہ اس میں اعضاء اللہ کے لیے عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہماری شریعت کا نماز پہلا فرض ہے۔ اور آخر میں بھی یہی باقی رہے گا جب دین اٹھالیا جائے گا جو تکبیر کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس سے رحمت الٰہی ملاقات کرتی ہے گویا غلام اپنے آقا کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور نماز میں انسان اپنے رب سے سرگوشی کرنے والا ہوتا ہے۔ مبارک ہو اگر اسے خشوع نصیب ہو۔ ابو عمران جونی نے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا فرمایا کیا تم سورۃ المومنون پڑھتے ہو؟ عرض کی گئی: ہاں۔ فرمایا: وہ پڑھو تو سورۃ المومنون قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ سے لیکر یُحَافِظُوْنَ ۝ تک پڑھی (2)۔ نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پہلے دائیں بائیں دیکھتے تھے لیکن پیٹھ کے پیچھے گردن نہیں پھیرتے تھے (3)۔ حضرت کعب بن مالک نے ایک طویل حدیث میں کہا: میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نماز پڑھتا تھا اور میں چوری چوری آپ کو دیکھتا تھا جب میں اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف دیکھتے تھے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو مجھ سے اعراض فرمالیتے تھے۔ (الحدیث) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب کو نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** خشوع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کہا: یہ نماز کے فرائض سے ہے یا اس کے فضائل اور مکملات سے ہے۔ صحیح پہلا قول ہے اور خشوع کا محل دل ہے یہ پہلا عمل ہے جو لوگوں سے اٹھایا جائے گا یہ حضرت عبادہ بن صامت کا قول ہے۔ اس کو امام ترمذی نے جبیر بن نفیر کے حوالہ سے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (4)۔ نسائی نے جبیر بن حدیث سے، عوف بن مالک اشجعی سے طرق صحیحہ کے ذریعے روایت کیا ہے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: معاویہ بن صالح اہل حدیث کے نزدیک ثقہ ہے۔ ہم کوئی ایسا محدث نہیں جانتے جس نے اس پر کلام کی ہو سوائے یحییٰ بن سعید قطان کے۔

میں کہتا ہوں: معاویہ بن صالح ابو عمرو اور ابو عمر حضرمی حمصی قاضی اندلس بھی کہا جاتا ہے، ابو حاتم رازی سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: صالح الحدیث ہے اس کی حدیث لکھی جاتی ہے اور اس سے حجت پکڑی جاتی ہے۔ اس میں یحییٰ بن معین کا قول مختلف ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی، امام احمد بن حنبل اور ابوزرعہ رازی نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس سے حجت پکڑی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللَّغْوِ اور لِلزَّکٰوۃِ کا معنی گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ضحاک نے کہا: یہاں اللَّغْوِ سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا: تمام گناہ ہیں۔ یہ جامع قول ہے اس میں اس کا قول بھی داخل ہے جس نے کہا:

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، ما جاء فی کراہیۃ مسح الحصیٰ فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 50

2۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، سورۂ مومنون، جلد 2، صفحہ 392

3۔ سنن نسائی، کتاب السہو، الرخصۃ فی الالتفات، جلد 1، صفحہ 178۔ جامع ترمذی، باب ما ذکر فی التفات الصلاۃ، حدیث 536

4۔ ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی ذہاب العلم، حدیث 2577

اللَّغْوِ سے مراد شرک ہے اور اس کا قول بھی داخل ہے جنہوں نے کہا: اس سے مراد غنا ہے جیسا کہ امام مالک بن انس نے حضرت محمد بن منکدر سے روایت کیا ہے جس کا بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ فٰعِلُوْنَ۝ کا معنی ہے ادا کرنے والے۔ یہ فصیح ہے۔ کلام عرب میں اس معنی میں آیا ہے۔ امیہ بن الصلت نے کہا:

المطعمون الطعام فی السنة الأزْ مة و الفاعلون للزّكواتِ

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝ ابن عربی نے کہا: قرآن کے غرائب میں سے ہے کہ یہ دس آیات مردوں اور عورتوں میں عام ہیں جیسے باقی قرآن کے الفاظ ہیں جو احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مردوں اور عورتوں میں عام ہیں لیکن وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝ کا قول اس کے مخاطب صرف مرد ہیں عورتوں کو اس میں خطاب نہیں کیونکہ آگے اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کا قول آیا ہے اور عورتوں کا اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دوسرے دلائل سے ثابت ہے جیسے عموماً اور خصوصاً آیات احصان اور اس کے علاوہ جو دلائل موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر آیت میں یہ ہے کہ عورت کے لیے حلال نہیں کہ اس سے وہ شخص وطی کرے جس کی وہ مالک ہے اسی پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ وہ اس آیت میں داخل نہیں لیکن اگر وہ عورت غلام کو آزاد کر دے تو اس غلام کے لیے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے جس طرح دوسروں کے لیے جائز ہے؛ یہ جمہور کے نزدیک ہے۔ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، شعبی اور نخعی سے مروی ہے کہ اگر وہ اپنے غلام کو آزاد کر دے جب وہ اس کی مالک ہو تو وہ اپنے نکاح پر باقی رہیں گے۔ ابو عمر نے کہا: فقہاء الامصار میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک اس کے مالک ہونے سے ان کے درمیان نکاح باطل ہو جائے گا اور یہ طلاق نہیں ہے؛ یہ نکاح کا فسخ ہے اگر مالک ہونے کے بعد اسے آزاد کر دے تو رجوع نہیں ہو سکتا مگر حدیث نکاح کے ساتھ اگرچہ وہ عدت میں ہی ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ محمد بن عبد الحکم نے کہا میں نے حرملہ بن عبد العزیز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جو استمناء کرتا ہے۔ تو انہوں نے جواباً یہ آیت پڑھی: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝ ...... الْعٰدُوْنَ۝ عرب آلہ تناسل کو عمیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاعر نے کہتا ہے:

إذا حَلَلْتَ بوادٍ لا أنيس به فاجلد عُمَيرة لاداءٌ ولا حَرَجٌ

اہل عراق اس کو الاستمناء کہتے ہیں یہ منی سے باب استفعال ہے۔ امام احمد بن حنبل اپنے تقویٰ و ورع کے باوجود اس کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی حجت یہ ہے کہ یہ بدن سے فضلہ کا اخراج ہے اور حاجت کے وقت یہ جائز ہے اور اس کی اصل پچھنے لگوانا اور خون نکلوانا ہے۔ اکثر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ اپنے ساتھ برائی کرنا ہے یہ وہ معصیت ہے جس کو شیطان نے ایجاد کیا ہے اور لوگوں میں اس کو پھیلا دیا حتی کہ اس پر بات ہونے لگی کاش! یہ نہ کی جاتی اگر اس کے جواز پر دلیل بھی ہوتی تو ایک صاحب مروت اس کی خست کی وجہ سے اس سے اعراض کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ استمناء، لونڈی سے نکاح کرنے سے بہتر ہے۔ ہم کہیں گے: لونڈی سے نکاح کرنا بہتر ہے خواہ کافرہ بھی ہو۔ یہ بعض علماء کے مذہب پر ہے۔

اگر کوئی یہ کہے: تو بھی استمناء کی دلیل ضعیف ہے اور خسیس آدمی کے لیے بھی عار اور شرم کا باعث ہے پھر ایک عظیم آدمی کے لیے کیسے درست ہوگا؟

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ، فراء نے کہا: یعنی وہ عورتیں جو اللہ نے ان کے لیے حلال کی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرتے۔ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ یہ محل جر میں ہے اور اَزْوَاجِهِمْ پر معطوف ہے اور ما مصدریہ ہے یہ زنا استمناء اور نکاح متعہ کی تحریم کا تقاضا کرتی ہے؛ کیونکہ جس عورت سے متعہ کیا گیا ہے وہ زوجات کے قائم مقام نہیں ہے وہ نہ وارث ہوتی ہے نہ اس کی میراث لی جاتی ہے۔ اور اس کا بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جاتا اور نکاح متعہ سے عورت کو طلاق دینے کے ساتھ نکاح سے خارج نہیں کرتا بلکہ اسی مدت کے گزرنے کے ساتھ اسے خارج کرتا ہے جو مدت انہوں نے متعین کی تھی وہ مستاجرہ کی طرح ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اگر ہم کہیں کہ متعہ جائز ہے اور یہ ایک مدت تک زوجہ ہے تو اس پر زوجیت کے اسم کا اطلاق ہوگا اور اگر ہم وہ حق بات کہیں جس پر اجماع امت ہے کہ نکاح متعہ حرام ہے تو وہ اس کی زوجہ نہیں ہے اور وہ اس آیت کے تحت داخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ کیا حد واجب ہوگی اور صریح زنا کی طرح بچہ لاحق نہیں کیا جائے گا یا شبہ کی وجہ سے حد نہیں لگائی جائے گی اور بچہ لاحق کیا جائے گا؟ ہمارے اصحاب کے دو قول ہیں۔ (۱) متعہ کی تحلیل و تحریم کے احوال تھے۔ اسی وجہ سے پہلے مباح تھا پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے زمانہ میں اس کو حرام کیا تھا پھر اسے فتح مکہ کے موقع پر حلال کیا تھا پھر اس کے بعد اس کو حرام کیا تھا۔ یہ ہمارے اصحاب میں سے ابن خویز منداد وغیرہ کا قول ہے۔ ابن عربی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سورۃ النساء میں متعہ پر گفتگو گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۞ جو ایسی عورت سے نکاح کرے جو حلال نہ ہو اسے عادی کہا گیا ہے اور اس کے حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے اس پر حد واجب کی ہے اور لواطت کرنے والا قرآن اور لغت کے اعتبار سے حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۞ (الشعراء) جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے پس ایسے لوگوں پر حد کا قائم کرنا واجب ہے یہ ظاہر ہے اس پر کوئی غبار نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے جبتک وہ جاہل نہ ہو یا تاویل کرنے والا نہ ہو اگرچہ اجماع منعقد ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۞ ...... الخ سے مراد صرف مرد ہیں عورتیں اس میں شامل نہیں۔ معتمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک عورت نے اپنے غلام سے ہم بستری کی اس کا ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تو آپ نے اس عورت سے پوچھا کہ اس عمل پر تجھے کس بات نے ابھارا؟ اس عورت نے کہا: میں خیال کرتی تھی کہ وہ میرا غلام ہے جس طرح مرد کے لیے لونڈی حلال ہوتی ہے یہ میرے لیے حلال ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے اس عورت کو رجم کرنے کا فیصلہ کیا تو صحابہ کرام نے کہا: اس نے کتاب اللہ کی غلط تاویل کی ہے اس پر رجم نہیں ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس کے بعد کبھی تجھے کسی آزاد کے لیے حلال نہیں کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے یہ سزا دی اور حد دور کر دی اور غلام کو آپ نے اس کے

قریب نہ جانے کا حکم دیا۔

ابوبکر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس تھا ایک عورت اپنے خوبصورت غلام کے ساتھ آئی اور کہنے لگی: میں اس کے ساتھ ہم بستر ہوتی ہوں اور میرے چچا کے بیٹے مجھے اس سے منع کرتے ہیں میں بھی تو اس مرد کی طرح ہوں جس کے لیے لونڈی ہوتی ہے تو وہ اس کے ساتھ وطی کرتا ہے۔ پس آپ میرے چچا کے بیٹوں کو مجھ سے باز رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تو نے اس سے پہلے نکاح کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر تیری جہالت نہ ہوتی تو میں تجھے پتھروں کے ساتھ رجم کرتا لیکن تم اسے لے جاؤ اور اس کو فروخت کر دو کسی ایسے شخص سے جو اس غلام کو شہر سے باہر لے جائے۔ وراء بمعنی سویٰ ہے یہ اَبْتَغٰی کا مفعول ہے یعنی جس نے بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے علاوہ کو طلب کیا۔ زجاج نے کہا: اس کے بعد جس نے طلب کیا۔ پس اَبْتَغٰی کا مفعول محذوف ہے اور وراء ظرف ہے۔ اور ذالك اس کے ساتھ ہر مذکور، مذکر اور مؤنث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۝ حد سے تجاوز کرنے والے یہ عدا سے مشتق ہے یعنی حد سے تجاوز کیا۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ جمہور نے لامانا تھم پڑھا ہے جمع کے ساتھ۔ ابن کثیر نے مفرد پڑھا ہے۔ امانت اور عہد دین کے ہر قول اور عمل کو جامع ہے جس کو انسان اٹھاتا ہے۔ یہ لوگوں کی معاشرت، وعدہ وغیرہ کو عام ہے۔ اس کی انتہاء یہ ہے کہ عہد و پیان کی پاسداری اور حفاظت کی جائے۔ امانت عہد سے اعم ہے۔ ہر عہد امانت ہوتا ہے اس میں قول، فعل اور عقیدہ سب شامل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 9۔** جمہور نے صلواتھم پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے صلاتھم پڑھا ہے یہ افراد اسم جنس ہے جو جمع کے معنی میں ہے۔ نماز کی محافظت سے مراد نماز کا قائم کرنا ہے اور اول وقت میں ادائیگی کی کوشش کرنا ہے، اس کے رکوع و سجود کو مکمل کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ان آیات میں جو ذکر کیا گیا ہے اس پر جس نے عمل کیا وہ وارث ہیں یعنی جنت میں دوزخیوں کی منازل کے یہ وارث ہیں۔ حدیث میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم سے مروی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے جنت میں ایک مسکن بنایا ہے اور ایک مسکن دوزخ میں ہے مومنین اپنی منازل کو لے لیں گے اور کفار کی منازل کے وارث ہوں گے اور کفار اپنی دوزخ کی منازل میں ہوں گے'' (1)۔ اس حدیث کا مفہوم ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں ہر ایک کی دو منزلیں ہیں ایک منزل جنت میں اور ایک منزل آگ میں جب کوئی شخص مرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا ہے تو اہل جنت اس کی منزل کے وارث ہوتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ۝'' (2) اس کی سند صحیح ہے یہ بھی احتمال ہے کہ جنت کے حصول کو وراثۃ کہا ہو اس کے حصول کی حیثیت سے جبکہ دوسروں کو وہ نہیں ملی۔ یہ دو وجوہ پر اسم مستعار ہے۔ فردوس جنت کی بلند، اوسط اور افضل جگہ کا نام ہے۔ اس حدیث کو ربیع بنت نضر ام حارثہ سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 137　　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، صفۃ الجنۃ، صفحہ 332

روایت کیا ہے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور صحیح مسلم میں ہے ''جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو وہ جنت وسط اور جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں'' (1)۔ ابو حاتم محمد بن حیان نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فإنه أوسط الجنة، یعنی وہ عرض کے اعتبار سے جنت کے وسط میں ہے اور وہ جنت کا اعلیٰ ہے یعنی بلند ترین جگہ ہے۔ یہ تمام حضرات ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول کی تصحیح کرتے ہیں۔ فردوس جنت کا پہاڑ ہے جس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔ مجاہد کے قول میں یہ رومی لفظ ہے عربی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ فارسی لفظ ہے عربی بنالیا گیا ہے۔ بعض نے کہا: حبشہ کی زبان کا لفظ ہے۔ اگر یہ ثابت ہو تو یہ تمام زبانوں کا لفظ ہوگا۔ ضحاک نے کہا: یہ عربی لفظ ہے اس کا مطلب الکرم ہے۔ عرب کروم (انگور کی بیلیں) کو فرادیس کہتے ہیں۔ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ⑪، جنت کے معنی پر مونث استعمال ہوا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ⑫ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ⑬ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ⑭

''اور بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام پر۔ پھر ہم نے بنادیا نطفہ کو خون کا لوتھڑا پھر ہم نے بنادیا اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی پھر ہم نے پیدا کردیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر ہم نے پہنادیا ان ہڈیوں کو گوشت پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا، پس بڑا بابرکت ہے اللہ تعالیٰ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں؛ یہ قتادہ وغیرہ کا قول ہے کیونکہ وہ مٹی سے بنائے گئے تھے پھر ثُمَّ جَعَلْنٰهُ کی ضمیر کا مرجع ابن آدم ہے اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں لیکن شہرت امر کی وجہ سے یہ صحیح ہے کیونکہ معنی صرف اسی صورت میں صحیح ہوتا ہے اس کی مثال یہ ہے حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ⑳ (ص)

بعض علماء نے فرمایا: سُلٰلَةٍ سے مراد ابن آدم ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا قول ہے اس بناء پر السلالۃ سے مراد صاف پانی یعنی منی ہوگی۔ السلالۃ، السل سے فُعالہ کا وزن ہے۔ اس کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز سے نکالنا۔ کہا جاتا ہے: سَلَلتُ الشعرَ مِنَ العجین میں نے آٹے سے بال نکالا اور نیام سے میں نے تلوار نکالی۔ السیف من الغمد اسی سے شاعر کا قول ہے:

فَسُلّی ثیابی من ثیابك تنسل

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مومنون، جلد 2، صفحہ 147

النطفه کو سلالة بچے کو سليل و سُلالة کہتے ہیں اس سے مراد وہ پانی لیا جاتا ہے جو پیٹھ سے نکالا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فجاءت به عضب الاديم غضنفرا　　سلاله فرج كان غير حصين

اور ایک شاعر نے کہا:

وما هندٌ الا مهرة عربية　　سليلة افراس تجللها بغل

اور مِّنۡ طِيۡنٍ ۝ حضرت آدم علیہ السلام کی اصل مٹی سے ہے۔

میں کہتا ہوں: یعنی خالص مٹی سے ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ انعام کے آغاز میں بیان کیا ہے۔

کلبی نے کہا: السلالہ اس مٹی کو کہتے ہیں جب تو اسے نچوڑے تو وہ تیری انگلیوں کے درمیان سے نکلے اور جو نکلتی ہے اسے السلالہ کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نُطۡفَةً نطفہ، علقہ، مضغۃ اور ان کے متعلق احکام سورۂ حج کے آغاز میں گزر چکے ہیں۔ الحمد للہ علی ذالك۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ خلق آخر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، شعبی، ابو العالیہ، ضحاک اور ابن زید نے کہا: اس کے جماد ہونے کے بعد اس میں روح پھونکنا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس کا دنیا کی طرف نکلنا ہے۔ قتادہ نے ایک جماعت سے روایت کیا ہے کہ بالوں کا اگنا ہے۔ ضحاک نے کہا: دانتوں کا نکلنا اور بالوں کا نکلنا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کے شباب کا کمال ہے؛ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس میں اور دوسری چیزیں نطق، ادراک، حسن گفتگو اور تحصیل المعقولات یعنی مرنے تک جو مراحل آتے ہیں سب کو شامل ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ۝ روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت آغاز سے خَلۡقًا اٰخَرَ تک سنی تو کہا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ۝ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح اتاری گئی ہے(2)۔ مسند طیالسی میں ہے: وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۝ نازل ہوئی جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ۝، تو فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ۝ کے الفاظ نازل ہو گئے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ اس کے قائل معاذ بن جبل تھے۔ روایت ہے کہ اس کے قائل عبد اللہ بن ابی سرح تھے۔ اسی سبب سے وہ مرتد ہوا تھا اس نے کہا جیسا کلام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لاتا ہے اس کی مثل میں بھی لاتا ہوں۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ قَالَ اُوۡحِىَ اِلَىَّ وَلَمۡ يُوۡحَ اِلَيۡهِ شَىۡءٌ وَّمَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (الانعام: 93) اس کا بیان سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ تبارك برکت سے باب تفاعل ہے۔ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ سب بنانے والوں سے پختہ بنانے والا ہے۔ جو کوئی چیز بناتا ہے اس کے لیے خلقه بولا جاتا ہے؛ اسی سے شاعر کا قول ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 138　　2۔ ایضاً

ولانت تفری ماخلقت وبعض من القوم یخلق ثم لایفری

بعض لوگوں نے اس لفظ کی لوگوں سے نفی کی ہے۔ خلق کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ابن جریج نے کہا: فرمایا اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ کیونکہ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تخلیق کرنے کی اجازت دی تھی۔ بعض اس میں مضطرب ہیں۔ الصنع کے معنی میں اس لفظ کی بشر سے نفی نہیں کی جاتی۔ عدم سے ایجاد واختراع کے معنی کے اعتبار سے نفی کی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اس آیت کی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا جب انہوں نے بزرگ صحابہ سے لیلۃ القدر کے بارے پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا: اللہ بہتر جانتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے حضرت ابن عباس! رضی اللہ عنہما تم کیا جانتے ہو؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کیے اور سات زمینیں پیدا کیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سات ادوار سے پیدا کیا اور اس کا رزق سات چیزوں سے بنایا۔ میرا خیال ہے یہ ستائیسویں کی رات میں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تم اس جیسا کلام لانے سے عاجز تھے جو یہ نوجوان لایا ہے جس نے ابھی اپنے سر کی مکمل صلاحیتیں بھی جمع نہیں کیں۔ یہ طویل حدیث مسند ابی شیبہ میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خلق ابن آدم من سبع سے مراد یہ آیت لی ہے اور جعل رزقہ من سبع سے مراد یہ آیت لی ہے۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ (عبس) ان میں سے سات چیزیں ابن آدم کے لیے ہیں۔ اور الاب جانوروں کے لیے ہے۔ القضب اس کو ابن آدم کھاتا ہے۔ اور اس سے عورتیں موٹی ہوتی ہیں یہ ایک قول ہے۔ اور بعض علماء نے کہا: القضب سے مراد سبزیاں ہیں کیونکہ وہ کاٹی جاتی ہیں۔ یہ ابن آدم کا رزق ہیں۔ بعض نے کہا: القضب اور الاب جانوروں کے لیے ہیں۔ باقی چھ ابن آدم کے لیے ہیں اور ساتویں چیز جانور ہیں۔ یہ بھی ابن آدم کا رزق ہیں۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۟ ؕ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۟

''پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو پھر بلا شبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۟ یعنی خلق اور حیات کے بعد تم مرنے والے ہو۔ نحاس نے کہا: اس معنی میں المائتون کہا جاتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد اٹھنے کی خبر دی فرمایا: ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۟ پھر تم قیامت کے روز اٹھائے جاؤ گے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖۗ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۟

''اور بیشک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنا دیئے اور ہم اپنی مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ابوعبیدہ نے کہا: سَبْعَ طَرَآئِقَ سے مراد سات آسمان ہیں اس سے حکایت کیا گیا ہے کہ کہا جاتا ہے: طارقت الشئی کسی چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھنا۔ بعض نے کہا: آسمانوں کے لیے راستے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ عرب ہر وہ چیز جو کسی چیز کے اوپر ہو اسے طریقہ کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: وہ

ملائکہ کے راستے ہیں۔ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے آسمان کی تخلیق سے غافل نہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا: تمام مخلوق سے بے خبر نہیں کہ آسمان ان پر گر پڑیں اور انہیں ہلاک کر دیں۔

میں کہتا ہوں: اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ مخلوق کی مصلحتوں اور حفاظت سے ہم غافل نہیں، یہی الحی القیوم کا معنی ہے۔ جو پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۗ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝

"اور ہم نے اُتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرا لیا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے بالکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو نعمتیں فرمائیں اور جو ان پر احسانات فرمائے ان میں سے ایک یہ آیت بھی ہے اس کے احسانات میں سے بڑا احسان پانی ہے جو انسانی بدن کی زندگی اور حیوان کی نمو کا باعث ہے۔ آسمان سے نازل ہونے والے پانی کی دو قسمیں ہیں۔ یہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا اور جس کے بارے خبر دی کہ اسے اس نے زمین کے اندر رکھا ہے اور اسے انسانوں کے پینے کے لیے خزانہ کیا ہے جس کو لوگ ضرورت کے وقت حاصل کرتے ہیں اور وہ نہروں، چشموں اور کنوؤں کا پانی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے کہ یہاں چار پانیوں کا ارادہ فرمایا ہے۔ سیحان، جیحان نیل اور فرات۔ مجاہد نے کہا: زمین میں کوئی پانی نہیں ہے مگر وہ آسمان سے آیا ہے۔ یہ مطلق نہیں ہے ورنہ کھاری پانی زمین میں ثابت ہے۔ ممکن ہے یہ مجاہد کا قول میٹھے پانی سے مقید ہو۔ لامحالہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پانی رکھا ہے اور آسمان سے بھی پانی اتارا ہے۔ بعض نے کہا: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً میٹھے پانی کی طرف اشارہ ہے اور اس کی اصل سمندر سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے لطف اور حسن تقدیر سے سمندر سے آسمان کی طرف اُٹھاتا ہے حتی کہ وہ اس اٹھائے جانے کے ساتھ میٹھا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے زمین کی طرف اتارتا ہے تاکہ اس سے نفع حاصل کیا جائے اگر معاملہ سمندر کے پانی تک ہوتا تو اس کی ملاحت کی وجہ سے اس سے نفع حاصل نہ کیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِقَدَرٍ، اس مقدار پر جو اصلاح کرنے والی ہے کیونکہ اگر بارش زیادہ ہوتی تو نقصان کرتی اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الحجر) اور ارشاد ہے: وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ یعنی اس خزانہ شدہ پانی کو لے جانے پر بھی قادر ہیں۔ یہ تہدید اور وعید ہے یعنی اس کا نیچے لے جانا ہماری قدرت میں ہے اور لوگ پیاس کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے اور مویشی مر جائیں گے یہ اس قول کی طرح ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝ (الملک)

**مسئلہ نمبر 3**۔ نحاس نے ذکر کیا ہے کہ ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن یونس پر پڑھا گیا انہوں نے جامع بن سوارہ

سے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں سعید بن سابق نے بتایا فرمایا ہمیں مسلمہ بن علی نے بتایا انہوں نے مقاتل بن حیان سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جنت سے زمین کی طرف پانچ نہریں اُتاریں (1)۔ سیحون، یہ ہند کی نہر ہے۔ جیحون، یہ بلخ کی نہر ہے۔ دجلہ اور فرات، یہ عراق کے دریا ہیں۔ نیل مصر کی نہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ سے انہیں اتارا ہے۔ جنت کے درجات میں سے نچلے درجہ سے جبریل کے دونوں پروں پر نکالیں پھر انہیں پہاڑوں میں ودیعت کیا اور زمین میں انکا اجرا فرمایا اور ذرائع معاش میں لوگوں کے لیے ان میں منافع رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ جب یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا تو اللہ تعالیٰ جبریل کو بھیجے گا اور زمین سے قرآن، علم اور پانچوں نہریں وہ اٹھا لے گا پھر وہ انہیں آسمان کی طرف لے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۟ سے یہی مراد ہے۔ جب یہ تمام اشیاء زمین سے اٹھالی جائیں گی تو زمین میں بسنے والے دین ودنیا کی خیر کو مفقود پائیں گے''۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہر پانی جو آسمان سے نازل ہوا خواہ وہ خزانہ شدہ ہے یا خزانہ شدہ نہیں ہے وہ پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے۔ اس سے غسل اور وضو کیا جائے گا جیسا کہ سورۃ الفرقان میں اس کا بیان ہوگا۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِیْهَا فَوَاكِهُ كَثِیْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾

''پھر ہم نے اُگائے تمہارے لیے اس پانی سے باغات کھجوروں اور انگوروں کے تمہارے لیے ان میں بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْشَاْنَا یعنی اس پانی کو ہم نے نباتات کا سبب بنایا اور ہم نے اس کے ذریعے باغات کو وجود بخشا اور ہم نے انہیں پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے النخیل (کھجور) والاعناب (انگور) کا ذکر کیا کیونکہ یہ طائف، مدینہ وغیرہما شہروں کے پھل ہیں؛ یہ طبری کا قول ہے۔ نیز تمام پھلوں سے یہ افضل ہیں تشریف وتنبیہ کے لیے ان کا خصوصی ذکر فرمایا۔ لَكُمْ فِیْهَا تمہارے لیے جنت میں۔ فَوَاكِهُ کھجور اور انگور کے علاوہ۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نخیل اور اعناب کی طرف راجع ہو کیونکہ ان کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ پہلا قول تمام پھلوں کو شامل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جس نے قسم اٹھائی کہ وہ پھل فَوَاكِهُ نہیں کھائے گا۔ ایک روایت میں ہے ہمارے نزدیک، سبز لوبیا اور اس کے مشابہ چیزیں کھانے سے حانث ہو جائے گا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ککڑی، کھیرا اور تر کھانے سے حانث نہیں ہوگا کیونکہ یہ سبزیوں سے ہیں پھلوں سے نہیں ہیں، اسی طرح اخروٹ، بادام اور پستہ کا حکم ہے کیونکہ یہ چیزیں پھلوں سے شمار نہیں ہوتی ہیں۔ اگر سیب، آڑو، کشمش یا امرود کھایا تو حانث ہو جائے گا اسی طرح تربوز کھانے سے حانث ہو جائے گا کیونکہ یہ تمام اشیاء کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بطور پھل کھائی جاتی ہیں۔ پس یہ پھل ہیں۔ اسی طرح یہ اشیاء خشک ہوں تو بھی ان کا

1۔ تاریخ بغداد، جلد 1، صفحہ 57

پھل کا حکم ہے مگر خشک تربوز اس حکم میں نہیں کیونکہ وہ پھلوں میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر انگور یا انار یا کھجور کھائی تو بھی حانث نہ ہوگا۔ صاحبین نے امام صاحب کی اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے وہ فرماتے ہیں: حانث ہوجائے گا کیونکہ یہ اشیاء تو عمدہ پھلوں سے ہیں۔ اور تنعم کے طور پر کھائی جاتی ہیں اور ان کا علیحدہ ذکر ان کے معانی کے کمال کی وجہ سے ہے جیسے ملائکہ سے جبریل ومیکائل کی تخصیص کی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ حجت پکڑی ہے کہ ان اشیاء کا عطف پھلوں پر کیا گیا ہے۔ فرمایا: وَّفَاكِهَةً وَّ اَبًّا۝ (عبس) معطوف، معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے۔ احسان کے مقام پر ایک چیز کو دو نام دینے کا حکمت تقاضا نہیں کرتی۔ انگور اور انار بعض شہروں میں کفایت کرتے ہیں وہاں یہ پھل نہیں ہوں گے کیونکہ جو پھل ہوتا ہے وہ خشک اور تر میں علیحدہ علیحدہ حکم نہیں رکھتا ہے۔ ان اشیاء کا خشک فاکہہ شمار نہیں ہوتا اسی طرح ان کا تر بھی فاکہہ (پھل) شمار نہیں ہوتا۔

**وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ۝**

''نیز پیدا کیا ایک درخت جو اُگتا ہے طور سیناء میں وہ اُگتا ہے تیل لیے ہوئے اور سالن لیے ہوئے کھانیوالوں کے لیے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَشَجَرَةً اس کا عطف جنات پر ہے۔ فراء نے اس پر رفع بھی جائز قرار دیا کیونکہ فعل ظاہر نہیں اس کا معنی ہوگا وثم شجرۃ اس سے مراد زیتون کا درخت ہے۔ اس کو علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ اس کے منافع شام، حجاز اور دوسرے شہروں میں بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کو پانی بھی زیادہ نہیں دینا پڑتا اور اس کی گوڈی وغیرہ بھی کم ہوتی ہے جبکہ دوسرے درختوں کی دیکھ بھال زیادہ ہوتی ہے۔ تَخْرُجُ یہ صفت ہے۔ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ اللہ تعالیٰ نے زیتون کے درخت کو طور سیناء پہاڑ سے نکالا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے۔ طور سیناء شام کی زمین سے ہے۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ طور کلام عرب میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ عربی بنایا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے یہ مصر سے ایلۃ تک پھیلا ہوا ہے۔ سیناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے خوبصورت۔ اس تاویل پر طور کی نعت کی حیثیت سے منون ہوگا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے مبارک (1)۔ معمر نے ایک جماعت سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے شَجَرَةً (درخت)۔ ان کو طور کو تنوین دینا لازم آتا ہے۔ جمہور نے کہا: یہ پہاڑ کا نام ہے جیسے تو کہتا ہے: جبل احد۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: سیناء ایک پتھر ہے پہاڑ کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ مقاتل نے کہا: ہر پہاڑ جو پھلوں کو اٹھاتا ہے وہ سیناء یعنی خوبصورت ہے۔ کوفیوں نے فعلاء کے وزن پر سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فعلاء کلام عرب میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ معرفہ اور نکرہ دونوں صورتوں میں غیر منصرف ہوتا ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف تانیث ہے اور الف تانیث جس میں ہوتی ہے اسکو لازم ہوتی ہے۔ عرب کلام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 139

میں فِعلاء نہیں ہے۔ لیکن جنہوں نے سیناء سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس کا وزن فعلاً بنایا ہے۔ اس میں ہمزہ، حرباء کے ہمزہ کی طرح ہے۔ اس آیت میں غیر منصرف نہیں کیونکہ یہ بقعہ کا اسم ہے۔ اخفش کا خیال ہے کہ یہ عجمی اسم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ جمہور نے تنبُت تاء کے فتحہ اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وہ اُگتا ہے اور اس کے ساتھ تیل ہوتا ہے جیسے تو کہتا ہے: خرج زیدٌ بسلاحه (1)۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تاء کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت پر تقدیر میں اختلاف ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا اس کی تقدیر یہ ہے: تنبت حباها ومعه الدهن پس مفعول محذوف ہے۔ بعض نے کہا: باء زائدہ ہے جیسے: وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ (البقرہ: 195) یہ ابو عبیدہ کا مذہب ہے۔ شاعر نے کہا:

نضرب بالسیف ونرجو بالفرج

ایک اور شاعر نے کہا:

هنّ الحرائر لاربَاتُ أَخمرة سود المحاجر لايقرأن بالسُّوَرِ

اسی طرح ابو علی نے کہا ہے پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: نبت اور انبت ہم معنی ہیں پس معنی اسی طرح ہوگا جو جمہور کی قرأت میں گزرا ہے؛ یہی فراء اور ابو اسحاق کا مذہب ہے، اسی سے زہیر کا قول ہے۔

حتی إذا أنبت البقل

اصمعی، انبت کا انکار کرتا ہے۔ اور زہیر کے اس قصیدہ پر تہمت لگاتا ہے جس میں ہے:

رأيتُ ذوی الحاجاتِ حَوْلَ بیوتهم قَطِينًا بهاحتی إذا أنبت البقل

یعنی نبت زہری، حسن اور اعرج نے تنبت بالدھن تاء کے رفع اور باء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی اور زجاج نے کہا: یہ باء حال کی ہے یعنی تنبت ومعها دهنها اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں تخرج بالدهن (2) یہ با حال کے لیے ہے۔ ابن دستویہ نے کہا: الدھن سے مراد نرم پانی ہے۔ تنبت، الانبات سے ہے۔ ذر بن حبیش نے تنبت تاء کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الدھن باء کے حذف اور اس کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک اور اشہب نے بالدھان پڑھا ہے۔ آیت سے مراد زیتون کی نعمت کو انسان پر شمار کرنا ہے۔ یہ ان نعمتوں کے ارکان سے ہے۔ جن سے استغناء نہیں۔ زیتون کے معنی میں سارے زیتون کے درخت ہیں۔ مختلف علاقوں کے اعتبار سے مختلف اقسام پر جو ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَصِبۡغٍ لِّلۡاٰكِلِيۡنَ۝ یہ جمہور کی قرأت ہے۔ ایک جماعت نے اصباغ جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ عامر بن عبد قیس نے ومتاعاً پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد زیت ہے جس کے ساتھ کھانا بنایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: صِبغٌ وصِباغ جیسے دِبغ ودِباغ، لِبس ولِباس ہر سالن جس کے ساتھ کھانا کھایا جاتا ہے وہ صبغ ہے۔ ہروی وغیرہ نے اس کو حکایت کیا ہے۔ الصبغ کا اصل معنی وہ چیز ہے جس کے ساتھ کپڑے کو رنگا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ سالن کو تشبیہ دی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 140
2۔ ایضاً

گئی ہے کیونکہ روٹی سالن کے ساتھ رنگی جاتی ہے جب روٹی کو سالن میں ڈبویا جاتا ہے۔ مقاتل نے کہا: الادم سے مراد الزیتون اور الدھن سے مراد تیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس درخت میں سالن اور تیل پیدا فرمایا ہے۔ اس بنا پر الصبغ سے مراد زیتون ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ تمام مائعات جن کے ساتھ کھانا کھایا جاتا ہے جیسے زیتون کا تیل، گھی، شہد اور شیرہ، سرکہ وغیرہ جو بھی شوربے والی چیزیں ہوتی ہیں وہ سالن ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے نص قائم فرمائی ہے(1)۔ نعم الادام الخل، بہترین سالن سرکہ ہے۔ اس کو نو صحابہ نے روایت کیا ہے۔ سات مرد اور دو عورتیں ہیں۔ صحیح میں جنہوں نے اس کو روایت کیا ہے وہ یہ ہیں۔ حضرت جابر، حضرت عائشہ، حضرت خارجہ، حضرت عمر، ان کا بیٹا حضرت عبیداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت انس اور حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس میں اختلاف ہے جو چیزیں جامد ہوتی ہیں مثلاً گوشت، کھجور اور زیتون وغیرہ۔ جمہور علماء کہتے ہیں: یہ سب سالن ہیں پس جس نے قسم اٹھائی کہ وہ سالن نہیں کھائے گا پھر اس نے گوشت یا پنیر کھایا تو وہ حانث ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: وہ حانث نہیں ہوگا۔ صاحبین نے اس مسئلہ میں امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے۔ اور البقل (سبزیاں) تمام کے نزدیک سالن نہیں ہے۔ امام شافعی سے کھجور کے متعلق دو قول مروی ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ یہ سالن نہیں کیونکہ ان کا قول التنبیہ میں ہے۔ بعض نے کہا: حانث ہو جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام سالن ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت یوسف بن عبداللہ بن سلام سے روایت کیا ہے(2) فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ نے ایک ٹکڑا جو کی روٹی کا لیا اور اس پر کھجور رکھی اور فرمایا: ''یہ اس کا سالن ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا و آخرت کے سالن کا سردار گوشت ہے۔ اس حدیث کو ابوعمرو نے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے باب الادام کے نام سے عنوان باندھا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر کی ہے۔ الادام، المؤادمة سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے موافقت کرنا یہ اشیاء روٹی کے موافق ہیں۔ پس یہ ادام ہیں۔ حدیث شریف میں ہے ''سالن سے روٹی کھاؤ اگرچہ پانی کے ساتھ ہو''۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ ادام کی حقیقت اجتماع میں اس طرح موافقت ہے کہ فصل کو قبول نہ کرتا ہو جیسے سرکہ، زیتون کا تیل وغیرہ، رہے گوشت اور انڈے وغیرہ یہ روٹی سے موافقت نہیں کرتے بلکہ یہ اس کے مجاور ہوتے ہیں جیسے تربوز، کھجور اور انگور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کھانے میں روٹی کی موافقت کی محتاج ہے وہ ادام ہے، جو اس کی محتاج نہیں بلکہ علیحدہ کھائی جاتی ہے تو وہ سالن نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام ترمذی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''زیتون کا تیل کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ مبارک درخت ہے''(3)۔ یہ حدیث معروف نہیں مگر عبدالرزاق کی

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب الاطعمۃ، ما جاء فی الخل، جلد 2، صفحہ 6

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب الاطعمۃ، ما جاء فی اکل الزیت، جلد 2، صفحہ 7۔ ایضاً، حدیث نمبر 1774

حدیث سے۔ وہ اس میں مضطرب ہے کبھی اس میں وہ عن عمر عن النبی ﷺ ذکر کرتا ہے۔ اور کبھی شک کی بنا پر روایت کرتا ہے اس نے کہا: أحسبه عن عمر عن النبی ﷺ اور کبھی کہا: عن زید بن اسلم عن ابیه عن النبی ﷺ۔ مقاتل نے کہا: الطور کو زیتون کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ زیتون سب سے پہلے اس سے پیدا ہوا۔ بعض نے کہا: زیتون پہلا درخت ہے جو دنیا میں طوفان کے بعد پیدا ہوا۔

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۗ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور بیشک تمہارے لیے جانوروں میں غور وفکر کا مقام ہے، ہم پلاتے ہیں تمہیں اس (دودھ) سے جو ان کے شکموں میں ہے اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے بہت فائدے ہیں اور انہیں (کے گوشت) سے تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے۔ اور ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر، کیا تم (بت پرستی کے انجام سے) نہیں ڈرتے۔ تو کہنے لگے وہ سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا ان کی قوم سے کہ نہیں ہے یہ مگر بشر تمہارے جیسا یہ چاہتا ہے کہ اپنی بزرگی جتلائے تم پر اور اللہ تعالیٰ (رسول بھیجنا) چاہتا تو وہ اُتارتا فرشتوں کو ہم نے نہیں سنی بات (جو نوح کہتا ہے) اپنے پہلے آباء واجداد میں، نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جسے جنون کا مرض ہو گیا ہے سو انتظار کرو اس کے انجام کا کچھ عرصہ۔ آپ نے عرض کی: اے رب! (اب) تو ہی میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ تو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ بناؤ ایک کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق پھر جب آ جائے ہمارا عذاب اور (پانی) ابل پڑے تنور سے تو داخل کر لو اس میں ہر جوڑے سے دو دو اور اپنے گھر والوں کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے ان میں سے، اور گفتگو نہ کرنا میرے ساتھ ان کے متعلق جنہوں نے ظلم کیا وہ تو ضرور غرق کیے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ سورۃ النحل میں ان پر گفتگو ہو چکی ہے۔ سورۂ ہود میں کشتی اور حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور ان کا سمندر پر سوار ہونا کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَلَيْهَا یعنی خشکی میں جانوروں پر۔ وَ عَلَى الْفُلْكِ اور دریا میں کشتی پر۔ تُحْمَلُوْنَ خشکی میں اونٹوں پر سوار کیے جاتے ہو۔ پس ضمیر کا بعض انعام کی طرف لوٹانا جائز ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص پہلے زمانہ میں گائے پر سوار ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سوار سے بولنے کی طاقت عطا فرمائی وہ بولی: میں سواری کے لیے پیدا نہیں کی گئی، میں زمین جوتنے کے لیے پیدا کی گئی ہوں (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے جر (زیر) کے ساتھ اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ الاعراف میں یہ گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ یعنی وہ تمہاری سرداری کرے اور تم پر شرف حاصل کرے اس طرح کہ وہ متبوع ہو جائے اور ہم اس کے تابع ہوں۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً یعنی اگر اللہ چاہتا کہ اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کی جائے تو وہ اپنا رسول فرشتہ کو بناتا۔ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا اس کی دعوت کی مثل ہم نے نہیں سنا۔ بعض نے کہا: ہم نے اس کی مثل بشر نہیں سنا جو اپنے رب کی رسالت کو لایا ہو۔ فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ یعنی گزشتہ امتوں میں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بھذا میں با زائدہ ہے یعنی ہم نے یہ اپنے آباء و اجداد میں ایسا ہونا نہیں سنا پھر بعض کا بعض پر عطف کیا۔ انہوں نے کہا: اِنْ هُوَ یعنی حضرت نوح علیہ السلام نہیں ہے۔ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ مگر ایک ایسا شخص جس کو جنون کا مرض ہے جو یہ نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ یعنی اس کی موت کا انتظار کرو۔ بعض نے فرمایا: حتی کہ اس کا جنون ظاہر ہو جائے۔ فراء نے کہا: یہاں حین سے مراد مقرر وقت نہیں ہے یہ اس قول کی طرح ہے: دعه الی یوم ما اسے کچھ وقت تک چھوڑ دو۔ فرمایا: جب وہ اپنی سرکشی پر بڑھتے رہیں۔ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ یعنی اے میرے رب! جس نے میری اطاعت نہیں کی اور میرا پیغام نہیں سنا اس سے تو انتقام لے۔ فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ یعنی ہم نے آسمان سے پیغام رساں بھیجے۔ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْلُكْ فِيْهَا یعنی اس میں داخل ہو اور اس کے اندر ہو جا۔ کہا جاتا ہے: سلکته فی کذا۔ واسلکته فیه۔ جب تو کسی چیز کو داخل کرے عبد مناف بن ربع ہذلی نے کہا:

حتی إذا أسلکو هم فی قُتائِدۃٍ | شَلًّا کما تَطْرُد الجَمّالُه الشُّرُدا

مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ حفص نے مِنْ كُلٍّ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور حسن نے کہا: حضرت نوح نے کشتی میں سوار نہیں کیا تھا مگر جو بچے جنم دیتی تھی اور انڈے دیتی تھی رہے

---

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7351

پسو اور مکھی اور کیڑے تو ان میں سے کسی چیز کو سوار نہیں کیا تھا یہ مٹی سے نکلے تھے۔ کشتی کے بارے میں قول تفصیلاً گزر چکا ہے۔

فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَی الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۲۸

''پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے ظلم وستم) سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا اسْتَوَیْتَ جب آپ اور جو آپ کے ساتھی ہیں سوار ہو جائیں اس پر فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ تو اللہ کی حمد کرو کہ اس نے تمہیں خلاصی دی۔ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ غرق ہونے سے الحمد للہ کا کلمہ ہر اللہ کے شکر گذار کا کلمہ ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝۲۹

''اور یہ بھی عرض کرنا کہ اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا یہ اکثر کی قرات ہے مُنْزَلًا میم کے ضمہ اور زاء کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ انزال سے مصدر ہے یعنی أنزلنی إنزالا مبارکا۔ زر بن جیش اور ابوبکر نے عاصم اور مفضل سے منزلا میم کے فتحہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے، یعنی ظرف کا صیغہ پڑھا ہے یعنی مجھے مبارک جگہ پر اتار۔ جوہری نے کہا: المنزل میم اور زاء کے فتحہ کے ساتھ النزول کا معنی اترنا ہے۔ تو کہتا ہے: نزلت نزولا و منزلا؛ شاعر نے کہا:

أأنْ ذکرتْ تلك الدارُ مَنْزَلَھا جُمْلُ بکیتَ فدمعُ العین مُنْحدِرٌ سَجْلُ

المنزل کو نصب دی گئی ہے کیونکہ وہ مصدر ہے اَنْزَلَه غیرہ اور اِسْتَنْزَلَه ہم معنی ہیں۔ نَزّلَه تنزیلا۔ التنزیل کا معنی ترتیب دینا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یہ اس وقت تھا جب آپ کشتی سے نکلے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَعَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ (ہود: 48) بعض نے کہا: جب کشتی میں داخل ہوئے تھے۔ اس صورت میں مُّبٰرَكًا کا قول سلامتی اور نجات کے معنی میں ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم دے رہا ہے کہ جب وہ سوار ہوں اور جب وہ اتریں تو یہ کہیں بلکہ جب اپنے گھروں میں داخل ہوں اور سلام کریں تو یہ کہیں۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ وہ جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے: اللھم اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ۝۳۰

''بیشک اس قصہ میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزمانے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ یعنی نوح اور کشتی میں اور کفار کو ہلاک کرنے میں نشانیاں ہیں جو اس کے کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں وہ اپنے انبیاء کرام کی مدد کرتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کرتا ہے۔ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ۝ ہم

ضرور پہلی قوموں کو بھی آزمانے والے تھے یعنی انکی طرف اپنے رسل بھیج کر ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا تھا تا کہ مطیع اور عاصی ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں اور ملائکہ کے لیے ان کی حالت واضح ہو جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم ان کے ساتھ آزمانے والوں کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ معنی سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: ان کن کا معنی قد کنا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣٢﴾

''پھر ہم نے پیدا فرمادی ان کے (غرق ہونے کے) بعد ایک دوسری جماعت۔ پھر ہم نے بھیجا ان میں ایک رسول ان میں سے (اس نے انہیں کہا) کہ عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے سوا، کیا تم (شرک کے انجام سے) نہیں ڈرتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی قوم نوح کی ہلاکت کے بعد قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾ ایک دوسری جماعت پیدا کر دی۔ بعض نے کہا: یہ قوم عاد تھی۔ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یعنی ہم نے ان میں ہود کو بھیجا کیونکہ حضرت نوح کی قوم کے پیچھے قوم عاد ہی آئی تھی۔ بعض نے کہا: وہ قوم ثمود تھی۔ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا یعنی ہم نے ان میں حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے کہا: اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ (الحجر: 83) اور اس کی مثال یہ ہے۔ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) میں کہتا ہوں: جنہیں چنگھاڑ نے آلیا تھا وہ حضرت شعیب کی قوم اصحاب مدین تھے۔ یہ بعید نہیں کہ یہ ہوں اللہ بہتر جانتا ہے۔ منھم ان کے خاندان سے۔ وہ اس کی پیدائش اور پرورش کی جگہ کو جانتے ہیں تا کہ ان کو اس کی بات سے زیادہ سکون ملے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿٣٥﴾

''تو بولے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اور جنہوں نے جھٹلایا تھا قیامت کی حاضری کو اور ہم نے خوشحال بنا دیا تھا انہیں دنیوی زندگی میں (اے لوگو!) نہیں ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند یہ کھاتا ہے وہی خوراک جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اس سے جو تم پیتے ہو۔ اور اگر تم پیروی کرنے لگے اپنے جیسے بشر کی تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں (قبروں سے) نکالا جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الْمَلَاُ۔ الْمَلَاُ سے مراد اشراف، قائدین اور رؤساء ہیں مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ مراد دوبارہ اٹھنا اور حساب ہے۔ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہم نے ان پر دنیا کی نعمتوں میں وسعت کر دی حتی کہ وہ اکڑ گئے اور اپنی خوشحالی کی وجہ سے کہنے لگے: مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ من حذف ہے یعنی مما تشربون منہ۔ یہ بصریوں کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حذف کی احتیاج نہیں ہے، کیونکہ ماجب مصدر یہ ہوتو ضمیر عائد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر تو ما کو بمعنی الذی بنائے گا تو مفعول کو حذف کرے گا من کے اضمار کی پھر بھی ضرورت نہیں۔ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ یعنی تم اپنے بتوں کو چھوڑ کر اور اس کی اتباع کر کے خسارہ میں ہو نگے اسے تم پر کوئی فضلیت نہیں ہے۔ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ یعنی مرنے کے بعد تم قبور سے اٹھائے جاؤ گے۔ پہلا ان محل نصب میں ہے کیونکہ اس پر یعد کم واقع ہے اور دوسرا اناس سے بدل ہے؛ یہ سیبویہ کا مذہب ہے مطلب یہ ہے کہ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم نکالے جاؤ گے جب تم مر جاؤ گے۔ فراء نے کہا: حضرت عبداللہ کی قرات میں یہ تھا أیعدکم إذا متم وکنتم ترابا وعظاما أنکم مخرجون۔ یہ تیرے اس قول کی مانند ہے کہ دوسرا ان تاکید کے لیے مکرر لایا گیا ہے جب کلام لمبی ہو جائے تو اس کا تکرار اچھا ہوتا ہے۔ اخفش نے کہا: اس کا مطلب ہے کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے وہ پھر تمہیں نکالے گا؟ پس دوسرا ان فعل مضمر کی وجہ سے محل رفع میں ہے جیسے تو کہتا ہے: الیوم القتال معنی ہے آج جنگ ہوگی۔ ابو اسحاق نے کہا: ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون۔ بھی جائز ہے کیونکہ أیعدکم کا معنی ہے کیا وہ کہتا ہے کہ تم الخ۔

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝

''یہ بات عقل سے بعید ہے بالکل بعید جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: هَيْهَاتَ یہ بعد کے لیے ہے گویا انہوں نے کہا: جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ بعید ہے، جو یہ دوبارہ اٹھنے کا ذکر کرتے ہیں یہ نہیں ہوگا۔ ابو علی نے کہا: یہ فعل کے قائم مقام ہے یعنی بعد ما توعدون جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ بعید ہے۔ ابن الانباری نے کہا: هَيْهَاتَ میں دس لغات ہیں هيهات لك۔ تاء کے فتحہ کے ساتھ؛ یہ جماعت کی قرات ہے هيهات لك تاء کے کسرہ کے ساتھ؛ ابوجعفر بن قعقاع سے مروی ہے۔ هيهات لك تاء کے کسرہ اور تنوین کے ساتھ عیسی بن عمر سے مروی ہے هيهات لك تاء کے رفع کے ساتھ۔ ثعلبی نے کہا: نصر بن عاصم اور ابو العالیہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور هيهات لك رفع اور تنوین کے ساتھ ابو حیوہ شامی نے اس طرح پڑھا ہے؛ یہ قول بھی ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ هيهات لك نصب اور تنوین کے ساتھ۔ احوص نے کہا:

تَذَكَّرْتَ أَيَّامًا مَضَيْنَ مِنَ الصِّبَا　　وَهَيْهَاتَ هَيْهَاتًا إِلَيْكَ رُجُوعُهَا

اور ساتویں لغت ایہات ایہات ہے۔ فراء نے یہ دلیل دی ہے:

فأيهات أيهاتَ العقيقُ ومن به وأيهات خِلٌّ بالعقيق نواصله (1)

مہدوی نے کہا: عیسی ہمدانی نے هيهات هيهات تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن الانباری نے کہا: عربوں میں سے کچھ ایهان نون کے ساتھ بھی کہتے ہیں ایها بغیر نون کے کہتے ہیں۔ فراء نے یہ شعر پڑھا:

ومن دُونِيَ الأعيان والقِنْعُ كله وكُتْمانُ أيهَا ما اشت وأَبْعَدا

یہ دس لغات ہیں جنہوں نے هيهات تاء کے فتحہ کے ساتھ کہا اس نے اس کو این اور کیف کی مثل بنایا۔ بعض نے کہا: کیونکہ یہ دوادات ہیں جو مرکب ہیں جیسے خمسة عشر، بعلبك اور رام ہرمز اور تو ها کے ساتھ دوسرے پر وقف کرے گا جیسے تو کہتا ہے: خمس عشرة و سبع عشرة۔ فراء نے کہا اس کی نصب تمت اور ربت کی نصب کی طرح ہے۔ الف اور اس سے پہلے فتحہ کی اتباع میں فتح ہونا بھی جائز ہے اور جنہوں نے تا کو کسرہ دیا انہوں نے اسے أمس اور هولاء کی مثل بنایا ہے شاعر نے کہا:

وهيهات هيهات إليك رجوعها

کسائی نے کہا: جنہوں نے کسرہ دیا انہوں نے اس پر ها کے ساتھ وقف کیا وہ کہتا ہے: هيهاه اور جنہوں نے تا کو نصب دی اس نے تا کے ساتھ وقف کیا اگر وہ چاہے تو ها کے ساتھ وقف کرے اور جنہوں نے تا کو ضمہ دیا انہوں نے اس کو منذ، قط اور حیث کی مثل بنایا اور جنہوں نے هيهات تنوین کے ساتھ پڑھا وہ جمع ہے اس کے ساتھ اس نے کثرت کا ارادہ کیا گویا کہا: بعدا بعدا بعض نے کہا: کسرہ دیا گیا اور تنوین دی گئی اصوات کے ساتھ تشبیہ کی بنا پر جیسے عاق وطاق۔ اخفش نے کہا: هيهات میں جمع کا تصور ہونا بھی جائز ہے پس اس میں تا اس جمع کے لیے ہوگی جو تانیث کے لیے ہوتی ہے اور جنہوں نے هيهات پڑھا یہ جائز ہے کہ اس نے اس کو اسم معرب بنایا ہو جس میں بعد کا معنی ہو اور اس نے فعل کے لیے اسم نہ بنایا ہو تا کہ مبنی ہو۔ بعض نے کہا: تا کو تا جمع کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَآ اَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفٰتٍ (البقرہ: 198) فراء نے کہا: میں تا پر وقف کو پسند کرتا ہوں عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو تا کو ہر حال میں جر دیتے ہیں گویا یہ عرفات اور ملکوت اور اس کے مشابہ الفاظ کی طرح ہے۔ مجاہد، عیسی بن عمرو، ابو عمر بن علاء، کسائی اور ابن کثیر هيهاه پر وقف کرتے تھے۔ ابو عمرو سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ هيهات پر تا پر وقف کرتے تھے۔ بقیہ قراء کا بھی یہی نظریہ ہے کیونکہ یہ حرف ہے۔ ابن الانباری نے کہا: جس نے ان دونوں کو ایک حرف بنایا ہے وہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کرتا اور دوسرے پر ها کے ساتھ وقف کیا اور پہلے پر وقف نہیں کیا پس وہ کہتا ہے: هيهات هيهاه جیسے کہتا ہے خمس عشرة جیسا کہ پہلے گزرا ہے اور جنہوں نے ایک کی دوسرے سے علیحدگی کی نیت کی اس نے دونوں میں ها اور تا کے ساتھ وقف کیا کیونکہ ها کی اصل تا ہے۔

اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿۳۷﴾

"نہیں ہے کوئی اور زندگی سوائے ہماری اس دنیوی زندگی کے یہی ہمارا مرنا ہے اور یہی ہمارا جینا ہے اور ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 143

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا، هِيَ ضمیر الدُّنْيَا سے کنایہ ہے، یعنی زندگی نہیں ہے مگر جس میں ہم ہیں اور آخرت کی زندگی جس کا دوبارہ اٹھنے کا وعدہ کیا ہے یہ نہیں ہے نَمُوْتُ وَ نَحْيَا کہا جاتا ہے: انہوں نے نَمُوْتُ وَ نَحْيَا کیسے کہا وہ تو دوبارہ زندہ ہونے کا یقین نہیں رکھتے تھے؟ اس کے کئی جوابات ہیں ایک یہ کہ اس کا معنی ہے ہم نطفہ تھے پھر ہم دنیا میں زندہ ہوئے۔ بعض نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی یہ دنیوی زندگی ہے اس میں ہم جئیں گے اور مریں گے یہ جیسے فرمایا: وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ (آل عمران: 43) سجدہ کر اور رکوع کر اس میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔ بعض علماء نے کہا: نَمُوْتُ یعنی ہمارے آباء مر گئے وَ نَحْيَا اولاد زندہ ہوئی۔ وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ موت کے بعد ہمیں نہیں اٹھایا جائے گا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"وہ نہیں مگر ایسا شخص جس نے بہتان لگایا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اور ہم قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس (پیغمبر) نے کہا: میرے رب! اب تو میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عنقریب ہی یہ لوگ اپنے کیے پر نادم ہو جائیں گے۔ تو آ پکڑا انہیں حقیقی چنگھاڑ نے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا تو برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۔ اس سے مراد وہ رسول لیتے تھے۔ افْتَرٰى اس کا معنی ہے اس نے گھڑا۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ یہ پہلے گزر چکا ہے قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ ما زائدہ مؤکدہ ہے یعنی عن قلیل۔ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ وہ اپنے کفر پر شرمندہ ہوں گے لام۔ لام قسم ہے یعنی واللہ لیصبحن، فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ تفاسیر میں ہے حضرت جبریل نے اس ہوا کے ساتھ ان پر چیخ ماری جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور وہ سب مر گئے۔ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۔ ہلاک ہونے والے سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح تھے۔ غُثَآءً سے مراد وہ پرانے درخت، گھاس اور سرکنڈے ہوتے ہیں جو پرانے ہو جاتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ یعنی ان کے لیے ہلاکت ہے۔ بعض نے کہا: ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے۔ یہ مصدر کی بنا پر منصوب ہے اس کی مثل سقیا لہ اور رعیا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"پھر ہم نے پیدا فرمائیں ان (کی بربادی) کے بعد کئی قومیں۔ آگے نہیں بڑھ سکتی کوئی قوم اپنی مقررہ میعاد سے

اور نہ وہ لوگ پیچھے رہ سکتے ہیں۔ پھر ہم بھیجتے رہے اپنے رسول یکے بعد دیگرے جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو ہلاک کرتے گئے اور ہم نے (ان جابر) قوموں کو افسانے بنا دیا پس خدا کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لاتی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ان کی ہلاکت کے بعد قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اس کلام میں حذف ہے پس انہوں نے اپنے انبیاء کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا من صلہ ہے یعنی کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور پیچھے نہیں رہ سکتی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف) تَتْرَا کا معنی ہے متواتر۔ بعض کو بعض کے پیچھے بھیجا ترغیب و ترہیب کے لیے۔ اصمعی نے کہا: واترت کتبی علیه۔ بعض کو بعض کے پیچھے رکھا مگر ان میں سے ہر دو کے درمیان وقفہ تھا۔ دوسرے علماء نے کہا: بغیر مہلت کے متواتر ہونا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تتری تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (1) کیونکہ یہ مصدر ہے راء کے فتحہ پر تنوین داخل کی گئی جیسے تیرا قول حمدا اور شکرا ہے۔ اس پر وقف اس الف پر ہے جو تنوین کے عوض ہے اور اس کا جعفر کے ساتھ ملحق ہونا بھی جائز ہے پس یہ ارطی اور علقی کی مثل ہوگا جیسے شاعر نے کہا:

یستن فی علقی وفی مُکُور

جب اس وجہ پر وقف ہوگا تو امالہ جائز ہوگا۔ الف ملحقہ پر وقف کی نیت ہوگی۔ ورش نے دونوں لفظوں کے درمیان پڑھا ہے جیسے سکری اور غضبی یہ اسم جمع ہے جیسے شتی اور اسری ہے اسکی اصل وتری ہے یہ المواتر اور التواتر سے ہے واؤ کو تاء سے بدلا گیا ہے جیسے التقوی والتکلان وتجاہ اور اس جیسے الفاظ۔ بعض نے کہا: یہ الوتر سے مشتق ہے جس کا معنی فرد ہے معنی یہ ہوگا ہم نے انہیں فردا فردا بھیجا۔ نحاس نے کہا اس بنا پر تتری پہلی تا کے کسرہ کے ساتھ جائز ہے یہ، مصدر کی بنا پر منصوب ہے، کیونکہ ثُمَّ اَرْسَلْنَا کا معنی ہے اترنا۔ اور یہ اس کا حال بنانا بھی جائز ہے یعنی متواترین کے معنی میں ہوگا۔ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا یعنی ہم بھی متواتر انہیں ہلاک کرتے رہے۔ وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ یہ أحدوثة کی جمع ہے جو بات کی جاتی ہے جیسے اعاجیب جمع ہے اعجوبة کی وہ جس سے تعجب کیا جائے۔ اخفش نے کہا: شر میں کہا جاتا ہے جعلناهم احادیثا اور خیر میں یہ نہیں کہا جاتا ہے: صار فلان حدیثنا یعنی فلان عبرت کا نشان بن گیا جیسے دوسری آیت میں فرمایا فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا: 19) میں کہتا ہوں کہا جاتا ہے: فلان حدیث حسن جب اس کے ذکر کے ساتھ مقید ہو؛ اسی سے ابن درید کا قول ہے۔

انما　المرء　حدیث　بعد　　فکن حدیثا حسنا لمن وعی

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ۝ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 144

عٰبِدُوْنَ ۚ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

''پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ھارون کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی غرور و تکبر کیا اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے۔ تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔ پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی برباد ہونے والوں میں شامل ہو گئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ کا معنی ہے تکبر کرنے والے اور دوسروں پر ظلم کرنے والے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ (القصص: 4) فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا یہ آیت پہلے گزر چکی ہے۔ مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ سمندر میں غرق ہونے کے ساتھ ہلاک ہونے والوں سے ہو گئے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

''بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب تاکہ (ان کی قوم) ہدایت یافتہ ہو جائے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ یعنی تورات، حضرت موسیٰ کا خاص ذکر کیا کیونکہ تورات طور میں ان پر نازل ہوئی تھی اور حضرت ہارون ان کی قوم میں خلیفہ تھے اگر ولقد آتینا ھما فرمایا جاتا تب بھی جائز ہوتا جیسے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (الانبیاء: 48)

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

''اور ہم نے بنا دیا مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کی) نشانی اور انہیں بنایا ایک بلند مقام پر جو رہائش کے قابل تھا اور جہاں چشمے جاری تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً اس پر گفتگو سورۃ الانبیاء میں گزر چکی ہے۔ وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ الربوۃ زمین کی بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں اس سے مراد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول میں فلسطین ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ رملہ کا شہر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن مسیب اور ابن سلام نے فرمایا: اس سے مراد دمشق ہے۔ کعب اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد بیت المقدس ہے۔ کعب نے کہا: یہ وہ زمین ہے جو آسمان کے قریب اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

فكنت هَبِيدا تحت رَمْس بربوة　　تَعاوَرُني رِيحٌ جنوبٌ وشَمْأَلٌ

ابن زید نے کہا: اس سے مراد مصر ہے۔ سالم افطس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ: وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ سے مراد زمین کی بلند جگہ ہے۔ ذَاتِ قَرَارٍ برابر زمین جس پر قرار ہو۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد پھلوں والی زمین ہے پھلوں کی وجہ سے لوگ اس میں رہتے ہیں وَّ مَعِيْنٍ جاری پانی جو چشموں سے ظاہر ہو کہا جاتا ہے: معین و معن جیسے کہا جاتا ہے: رغیف

و رغف؛ یہ علی بن سلیمان کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: یہ چشموں میں جاری پانی ہے اس بنا پر میم زائدہ ہوگی جیسے مبیع میں میم زائدہ ہے اسی طرح اس کے قول پر بھی میم زائدہ ہوگی جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو آنکھ کے ذریعے دیکھا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: کہا جاتا ہے معن الماء جب پانی جاری ہو فھو معین و معیون۔ ابن اعرابی نے کہا: معن الماء یمعن معونا جب پانی جاری ہو اور آسان ہو أَمْعَنَ اور اَمْعَنْتُه و میاہ مُعنان۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿51﴾

''اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بیشک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر پاک اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو وہی حکم دیا جو اس نے مرسلین کو حکم دیا (1) فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿51﴾ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ: 172) پھر ذکر کیا ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے اس کے بال پراگندہ ہیں، جسم غبار آلود ہے، اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے کہتا ہے: یا رب یا رب جب کہ اس کا کھانا حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے اور اس کا لباس بھی حرام ہے اور اسے حرام سے غذا دی گئی ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟''

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام رسل کے قائم مقام رکھا جیسے فرمایا: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (آل عمران: 173) اس آیت میں النَّاسُ سے مراد نعیم بن مسعود ہے۔ زجاج نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے جمع کا صیغہ اس بات پر دلیل ہے کہ تمام رسل کو اسی طرح حکم دیا گیا تھا، یعنی حلال سے کھاؤ۔ طبری نے کہا خطاب حضرت عیسیٰ کو ہے روایت ہے کہ وہ اپنی والدہ کے سوت کاتنے سے کھاتے تھے۔ ان سے مشہور یہ ہے کہ وہ جنگل کی سبزیوں سے کھاتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو خطاب کی وجہ وہی ہے جو ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ذکر کی ہے یعنی انہیں شرف دینے کے لیے۔ بعض نے کہا: اس بات سے ہر نبی کو خطاب کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان کا طریقہ ہے جس پر ان کا ہونا مناسب ہے پس معنی یہ ہوگا ہم نے کہا: اے رسل! کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جیسے تو تاجر کو کہتا ہے: اے تاجرو! سود سے بچو، تو اس کو معنی کے ساتھ خطاب کرتا ہے اس کے ساتھ متصل ہے کہ یہ مقالہ تمام اصناف کی صلاحیت رکھتا ہے انبیاء کرام کو اکٹھا کبھی خطاب نہیں کیا گیا ہر ایک کو اس کے زمانہ میں خطاب کیا گیا۔ فراء نے کہا: یہ اس طرح ہے جیسے ایک شخص کو کہتا ہے، ہمیں اذیت دینے سے رک جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے اکل حلال کے وجوب اور حرام سے اجتناب کے ساتھ خطاب میں انبیاء کرام اور مومنین میں برابری فرمائی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، قبول الصدقۃ من الکسب الطیب، جلد 1، صفحہ 326

اور پھر تمام اس وعید میں شامل ہیں جس کو اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ کا ارشاد اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ الله تعالیٰ درود بھیجے اپنے رسل اور انبیاء پر جب انبیاء کرام کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو پھر باقی لوگوں کے ساتھ کیسا گمان ہے؟ الطیبات اور الرزق کے بارے میں گفتگو کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔ الحمدلله۔ اور حدیث شریف یمد یدیه (1)۔ وہ ہاتھوں کو بلند کرتا ہے۔ دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھوں کو بلند کرنے کی مشروعیت پر دلیل ہے۔ اس میں کلام گزر چکی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فانی یستجاب لذلك (2)۔ اس کی دعا قبول کیسے ہوگی؟ یہ استبعاد کی جہت سے ہے یعنی وہ دعا کی قبولیت کا اہل نہیں لیکن یہ جائز ہے کہ الله تعالیٰ اپنے لطف کرم سے اس کی دعا قبول فرمالے۔

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۵۴﴾

"اور یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں سو تم ڈرا کرو مجھ سے۔ لیکن کاٹ کر بنا دیا انہوں نے اپنی دینی وحدت کو باہمی اختلاف سے پارہ پارہ، ہر گروہ اپنے نظریات پر مسرور ہے۔ پس (اے محبوب!) رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت تک"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ یہ تمہارا دین اور تمہاری ملت ہے پس اسے لازم پکڑو۔ امت سے مراد یہاں دین ہے اس کے محمل پہلے گزر چکے ہیں اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (الزخرف: 23) یعنی علی دین النابغہ نے کہا۔

حلفتُ فلم أترك لنفسك رِيبة وهل يَأثَمَنْ ذُو أُمَّةٍ وهو طائع

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور فتحہ کے ساتھ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے: خلیل نے کہا: یہ محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جر حذف ہے یعنی أنا عالم بأن هذا دینكم الذی أمرتكم أن تومنوا به۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا یہ دین ہے جس کا میں نے حکم دیا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ (3)۔ یہ مضمر فعل کے متعلق ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ واعلموا أن هذه أمتكم۔ یہ سیبویہ کے نزدیک فَاتَّقُوْنِ کے متعلق ہے۔ تقدیر اس طرح ہے فاتقون لأن أمتكم واحدة۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ (الجن) یعنی لأن المساجد لله فلا تدعوا معه غیره۔ اور جس طرح یہ ارشاد ہے: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ (القریش: 1) یعنی فلیعبدوا رب هذا البیت لایلاف قریش۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اس بات کو تقویت دیتی ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ میں خطاب سب کو ہے۔ یہ انکی حاضری کی

1۔ صحیح مسلم، بیان أن اسم الصدقة یقع علی كل نوع من المعروف، جلد 1، صفحہ 326 2۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 146

تقدیر کے اعتبار سے ہے اور جب تو یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ سے مراد صرف محمد ﷺ کو خطاب لے تو اس آیت اور فَتَقَطَّعُوْۤا کا اتصال مشکل ہوتا ہے۔ رہا اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ کا ارشاد اگرچہ یہ انبیاء کرام کو کہا گیا ہے لیکن معنی کے اعتبار سے اس میں امتیں بھی شامل ہیں اس کے بعد فَتَقَطَّعُوْۤا کا اتصال بہتر ہوگا۔ فَتَقَطَّعُوْۤا سے مراد ہوگا کہ امتیں متفرق ہوگئیں انہوں نے ایک دین کو اجتماع کے حکم کے بعد بھی کئی ادیان بناڈالا۔ پھر الله تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک اپنی رائے اور گمراہی پر خوش ہے یہ گمراہی کی انتہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ آیت حضور ﷺ کے ارشاد کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ''خبردار! تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے اور یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی بہتر دوزخ میں ہوں گے اور ایک جنت میں ہوگا اور وہ جماعت ہے''۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے (1) اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ زائد روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا: یا رسول الله! وہ کون سا گروہ ہے؟ فرمایا: ''جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں'' (2) انہوں نے اسے حضرت عبد الله بن عمرو کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ یہ بیان ہے کہ آیت میں اور حدیث میں جس افتراق سے ڈرایا گیا ہے وہ اصول دین اور قواعد دین میں ہے کیونکہ اصول و قواعد پر ملل کا اطلاق کیا ہے اور بیان فرمایا کہ ان ملل میں سے کسی چیز کو پکڑنا☆ دخول نار کا موجب ہے اس قسم کا حکم فروع میں نہیں بیان کیا جاتا، کیونکہ یہ ملل کے متعدد ہونے اور آگ کے عذاب کا موجب نہیں ہوتا۔ الله تعالیٰ فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ: 48) الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُبُرًا یعنی وہ کتب جو انہوں نے خود وضع کیں اور گمراہیاں جو انہوں نے تالیف کیں؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا: انہوں نے کتب کو جدا جدا کیا اور ایک فرقہ نے صحف کی پیروی کی، ایک فرقہ نے تورات کی پیروی کی، ایک فرقہ نے زبور کی اور ایک فرقہ نے انجیل کی پیروی کی تمام نے ان کتب میں تحریف اور تبدیلی کی؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے کہا: ان میں سے ہر فریق نے ایک کتاب کو پکڑا اس پر ایمان لائے اور اس کے علاوہ کتب کا انکار کیا۔ زبر باء کے ضمہ کے ساتھ نافع کی قرأت ہے اس کی جمع زبور ہے اعمش اور ابو عمرو سے زبر باء کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے یہ لوہے کے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑے ہیں جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ (الکہف: 96) كُلُّ حِزْبٍ یعنی ہر فریق اور ہر ملت۔ بِمَا لَدَیْهِمْ یعنی جو دین میں سے ان کے پاس تھا۔ فَرِحُوْنَ اس پر خوش تھے یہ آیت قریش کی مثال ہے حضرت محمد ﷺ کو ان کے بارے میں خطاب فرمایا اس قول کے ساتھ: فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ۔ یعنی ان لوگوں کو چھوڑ دیئے یہ گذشتہ لوگوں کی طرح ہیں ان سے عذاب کی تاخیر پر آپ کا سینہ تنگ نہ ہو۔ ہر چیز کا ایک وقت ہے۔ الغمرۃ لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو تجھے ڈھانپ لے اور تجھ پر غالب آجائے۔ اس کی اصل ڈھانپنا ہے اس میں سے الغمر ہے جس کا معنی کینہ ہے کیونکہ وہ دل کو ڈھانپ دیتا ہے الغمرۃ زیادہ پانی کو بھی کہتے ہیں جو زمین کو ڈھانپ دیتا ہے۔ غمر الرداء وہ جو عطا کے ساتھ لوگوں کو ڈھانپ دیتا ہے شاعر نے کہا:

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب شرح السنۃ، جلد 2، صفحہ 275
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89

☆ ایسے اصول و قواعد کو اپنانا جو ان اصول و قواعد کے خلاف ہوں جن پر دین اسلام کی بنیاد ہے۔

غَمْرُ الرداءِ إذا تبسّم ضاحكا غَلِقتْ لضَحْكتِه رِقابُ المالِ

یہاں مراد حیرت، غفلت اور گمراہی ہے۔ دخل فلان فی غمار الناس یعنی وہ ان کے رش میں داخل ہوا۔ حَتّٰى حِيْنٍ۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے موت تک، یہ دھمکی ہے کوئی متعین وقت نہیں ہے جیسے کہا جاتا ہے: سیاتی لک یوم؛ ایک دن تجھ پر آئے گا۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد (کی کثرت سے)، تو ہم جلدی کر رہے ہیں انہیں بھلائیاں پہنچانے میں (یوں نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال سے) بے خبر ہیں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ ما بمعنی الذی ہے یعنی اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ جو ہم انہیں دنیا میں مال اور اولاد دیتے ہیں وہ ان کے لیے ثواب ہے بلکہ وہ تو استدراج ہے اور ڈھیل ہے یہ بھلائیوں کے پہنچانے میں جلدی نہیں ہے۔ ان کی خبر میں تین اقوال ہیں۔ (۱) خبر محذوف ہے۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے نسارع لهم به فی الخیرات، به کو، حذف کیا گیا(1)۔ ہشام الضریر نے ایک باریک اور دقیق قول کیا ہے۔ انہوں نے کہا: انما هی الخیرات۔ معنی یہ ہوگا سارع لهم فیه۔ پھر ظاہر فرمایا اور فرمایا فِي الْخَيْرٰتِ۔ اس تقدیر پر اس میں حذف نہیں ہے۔ کسائی کا مذہب یہ ہے کہ انما ایک حرف ہے۔ یہ حذف کی تقدیر کا محتاج نہیں وَّ بَنِيْنَ پر وقف جائز ہے اور جنہوں نے کہا کہ انما دو حرف ہیں ان کے نزدیک ایک ضمیر کا ہونا ضروری ہے جو خبر سے ان کے اسم کی طرف لوٹے وَّ بَنِيْنَ پر وقف مکمل نہیں۔ سختیانی نے کہا وَّ بَنِيْنَ پر وقف اچھا نہیں کیونکہ يَحْسَبُوْنَ دو مفعولوں کا محتاج ہے۔ دونوں مفعولوں کی تکمیل فِي الْخَيْرٰتِ میں ہے۔ ابن انباری نے کہا: یہ خطا ہے کیونکہ انّ اپنے اسم اور خبر کی وجہ سے کافی ہے ان کے بعد دوسرا مفعول لانا جائز نہیں۔ ابو عبدالرحمن سلمی اور عبدالرحمن بن ابی بکرہ نے یسارع یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس کا فاعل امدادنا ہے۔ یہ بغیر حذف کے ہونا جائز ہے یعنی یسارع لهم الامداد۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں حذف جائز ہو معنی ہوگا یسارع الله لهم اور یسارع لهم فی الخیرات بھی پڑھا جاتا ہے اس میں تین وجوہ ہیں: ایک حذف کی بناء پر ہے اور یسارع الامداد ہونا بھی جائز ہے یہ بھی جائز ہے کہ لهم نائب الفاعل ہو؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے کہا حر نحوی نے نسرع لهم فی الخیرات پڑھا ہے یہ جماعت کی قرات کا معنی ہے۔ ثعلبی نے کہا: درست جمہور کی قرات ہے کیونکہ پیچھے نمد آیا ہوا ہے۔ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ انہیں شعور نہیں کہ یہ ان کے لیے فتنہ ہے اور استدراج ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 347

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ
قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾

”بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈر رہے ہیں، اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور
وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں بناتے، اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان
کے دل ڈر رہے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ کفار کے ذکر اور ان کو وعید سنانے کے بعد مومنین
کا ذکر کیا جو نیکیوں میں جلدی کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے اس کا ذکر کیا ہے اور ان کی ابلغ
صفات کا ذکر کیا مُّشْفِقُوْنَ وہ ان چیزوں سے ڈرنے والے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ حسن نے کہا: وہ اخلاص کا
مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ ڈرتے ہیں کہ ان کا عمل کہیں غیر مقبول ہو جائے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا
میں نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے متعلق پوچھا: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ حضرت عائشہ نے عرض
کی: کیا وہ شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں (1)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں اے صدیق کی بیٹی! لیکن وہ روزے
رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں جب کہ وہ ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ کہیں ان کے یہ اعمال رد نہ کیے جائیں یہی
وہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں جلدی کرنے والے ہیں“ (2)۔ حسن نے کہا: ہم نے ایسے لوگوں کو پایا کہ انہیں اپنی نیکیوں کے رد
ہونے کا زیادہ خوف ہوتا تھا اس سے زیادہ جتنا کہ تمہیں اپنی برائیوں پر عذاب دیئے جانے کا خوف ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ،
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور نخعی نے وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا۔ الاتیان سے مشتق کر کے مقصور پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: یہ
قرات حضرت عائشہ سے صحیح ہوتی تو جماعت کی قرأت کے خلاف نہ ہوتی کیونکہ عربوں میں سے جو تمام حالات میں ہمزہ میں
الف کو لازم کرتے ہیں جب اسے لکھا جاتا ہے پس سئل الرجل سین کے بعد الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ یستھزؤن۔ زا
اور واؤ کے درمیان الف کے ساتھ ہے اور شئی یا کے بعد الف کے ساتھ ہے۔ پس ان علماء کے نزدیک یا کے بعد الف کے
ساتھ لکھنا ناپسندیدہ نہیں یہ لفظ اس خط کی بنا پر دونوں قراءتوں کا احتمال رکھتا ہے۔ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا۔ ویاتون ما اتوا (3) ان
دونوں تاویلوں کے احتمال کے ساتھ منفرد ہے۔ وہ نظریہ جو جماعت کا ہے، وہ جو زکاۃ، صدقہ دیتے ہیں تو ان کے دل کانپ
رہے ہوتے ہیں اور وہ جو فرشتوں کو اعمال پیش کرتے ہیں تو ڈر رہے ہوتے ہیں۔ مفعول کو اس باب میں حذف کیا گیا ہے
کیونکہ اس کا معنی واضح ہے، جس طرح کہ اس قول میں حذف کیا گیا ہے فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ (یوسف)
یعنی وہ تلوں اور انگور کو نچوڑتے ہیں۔ مفعول کو حذف کیا کیونکہ اس کی تاویل واضح ہے۔ اصل اس قرات پر ہوگی اور قرآن کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ مومنون، جلد 2، صفحہ 147
2۔ ترمذی، باب و من سورۃ المومن، حدیث نمبر 3099، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 348

اصل نسخہ میں موجود ہے یاتون، الف ہمزہ سے بدلا گیا ہے اور الف کو واؤ کی صورت میں لکھا گیا ہے، کیونکہ خفا میں حروف مدہ اور لین برابر ہیں، ابن الانباری نے یہ حکایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات سے معروف والذین یاتون ما اتوا ہے یہ قرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور حضرت عائشہ سے مروی ہے اور اس کا معنی ہے وہ عمل کرتے ہیں جو عمل کرتے ہیں جیسا کہ حدیث میں مروی ہے۔ الوجل کا معنی ڈرنا اور خوف کھانا ہے متقی اور تائب کو انجام کا خوف ہوتا ہے اور ان امور کا خوف ہوتا ہے جو موت کے بعد اس پر طاری ہوں گے۔ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ یہ خاتمہ پر تنبیہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: إنما الأعمال بالخواتیم (1)۔ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے۔ رہا وہ شخص جس سے نیکیاں اور گناہ دونوں سر زد ہوتے ہوں تو انہیں وعید کے نفاذ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اصحاب الخواطر نے کہا: عارف پر طاعت کی وجہ سے کپکپی اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جتنا کہ مخالفت پر کپکپی ہوتی ہے کیونکہ مخالفت کو توبہ مٹا دیتی ہے اور طاعت میں غرض کی تصحیح مطلوب ہوتی ہے ☆ اَنَّهُمْ یعنی لانهم یا من اجل انهم۔۔۔۔ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۔

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

''یہی لوگ جلدی کرتے ہیں بھلائیاں کرنے میں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ۔ خیرات سے مراد نیکیاں ہیں وہ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں تاکہ اعلیٰ درجات اور بالا خانوں کو حاصل کرلیں یہ يُسْرِعُوْنَ بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ نیکیوں کی طرف جلدی کرنے والے ہوتے ہیں يُسٰرِعُوْنَ کا مطلب ہے وہ اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان سے نیکیوں میں سبقت لے جاتا ہے مفعول محذوف ہے۔ زجاج نے کہا: جو جلدی کرتے ہیں وہ اس سے زیادہ جلدی کرتے ہیں (2)۔ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۔ اسمیں جو خوبصورت قول ہے وہ یہ ہے کہ وہ نیکیوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ دلیل ہے کہ نیکیوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنا افضل ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ جو کسی چیز میں بڑھ جائے وہ اس کی طرف سبقت لے جانیوالا ہے اور ہر وہ شخص جو اس سے موخر ہوتا ہے تو اس کا فوت ہونا اس سے سبقت لے جاتا ہے۔ لَهَا۔ میں لام اس قول کی بنا پر الی کے معنی میں ہے، جیسے فرمایا: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾ (الزلزلۃ) یعنی اوحی الیها۔ سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

تَجانَفُ عن جَوّ اليمامة ناقتي    وما قصدت من أهلها لسَوائكا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ کا یہ معنی مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے سعادت مل چکی ہے اس وجہ سے وہ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ نیکیوں کی وجہ سے سبقت لے جانے والے ہیں۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور ہم تکلیف نہیں دیتے کسی شخص کو مگر جتنی اس کی طاقت ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ بولتی ہے

1۔ صحیح بخاری، باب العمل بالخواتیم، جلد 2، صفحہ 978
2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 348
☆ النکت والعیون، جلد 4، صفحہ 59

اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور جو تکلیف مالا یطاق شریعت میں وارد ہے اس تمام کے لیے ناسخ ہے۔ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ سب کا ظاہر قول یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد اعمال کو شمار کرنے والی کتاب ہے جسے ملائکہ اٹھاتے ہیں اس کو اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بندوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں وہ حق کے ساتھ بولتی ہے اس میں تہدید اور ظلم سے مایوس کرنا ہے۔ لفظ النطق کتاب کے لیے جائز ہے اور مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام اس کے احکام کے ساتھ بولتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد لوح محفوظ ہے اس میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے پس وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ بعض نے کہا: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ سے مراد قرآن ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ تمام معانی کا احتمال رکھتا ہے اور پہلا معنی اظہر ہے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

"بلکہ ان کے دل مدہوش ہیں اس (خوفناک حقیقت) سے اور ان کے اعمال مومنوں کے اعمال سے مختلف ہیں۔ یہ (نابکار) ان برے کاموں کو ہی کرنے والے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم پکڑیں گے ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے اس وقت وہ چلائیں گے۔ (ظالمو!) آج نہ چلاؤ تمہاری ہماری طرف سے اب کوئی مدد نہ کی جائے گی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا مجاہد نے کہا: وہ پردے اور غفلت میں ہیں اور قرآن سے اندھے ہو چکے ہیں کہا جاتا ہے: غمرۃ الماء جب پانی ڈھانپ لے۔ نہر غمر ایسی نہر کہ جو اس میں داخل ہو اس کو ڈھانپ دیتی ہے رجلٌ غَمْرٌ یغمرہ آراء الناس۔ ایسا شخص جس کو لوگوں کی آراء ڈھانپ لیں۔ بعض علماء نے کہا غمرۃ کیونکہ وہ چہرے کو ڈھانپ لیتی ہے اسی سے ہے دخل فی غمار النّاس و خمارھم۔ یعنی لوگوں کے مجمع نے اسے ڈھانپ لیا۔ بعض نے کہا: بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ یعنی وہ حیرت اور اندھے پن میں ہیں یعنی اس سے وہ اندھے ہیں جو پہلی آیات میں اعمال خیر بیان کیے گیے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے یا اس کتاب سے اندھے ہیں جو حق بولتی ہے (1)۔ وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ قتادہ اور مجاہد نے کہا: ان کی ایسی خطائیں ہیں کہ ضرور وہ حق کے علاوہ کام کریں گے۔ حسن اور ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے ان کے ردی اعمال ہیں جس روش پر ہیں انہوں نے اس کے علاوہ اعمال نہیں کیے ضرور وہ مومنین کے اعمال کے علاوہ اعمال کریں گے جن کی وجہ سے وہ دوزخ میں داخل ہوں گے ان کے لیے شقاوت مقدر ہو چکی ہے۔ ایک تیسرا احتمال بھی ہے کہ اس نے خالق کا کفر کرنے کے ساتھ مخلوق پر ظلم کیا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 18، صفحہ 46

**مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ**۔ یعنی بدر کے دن جب ہم نے تلوار کے ساتھ ان کے خوشحال لوگوں کو پکڑ لیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: یعنی بھوک سے پکڑ لیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا کی ''اے اللہ! مضر قبیلہ پر سختی فرما۔ اے اللہ! انہیں ایسے قحط میں مبتلا کر دے جیسے یوسف کے زمانہ میں تھا'' (1) پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قحط اور بھوک میں مبتلا کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے ہڈیاں، مردار، کتے اور دھرنگے کھائے، ان کے مال اور عیال ہلاک ہوئے۔ **اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ**۔ وہ چیختے تھے اور مدد طلب کرتے تھے۔ الجؤار کا اصل معنی تضرع کے ساتھ آواز بلند کرنا ہے، جیسے بیل آواز نکالتا ہے۔ اعشی نے گائے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

فطافت ثلاثًا بَيْنَ يوم وليلة     وكان النكير أن تُضِيفَ وتجأرا

جوہری نے کہا: الجؤار، الخوار مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: جأر الثور یجأر یعنی بیل نے آواز نکالی۔ بعض نے عجلاً جسدا له جؤار پڑھا ہے۔ اخفش نے یہ حکایت کیا ہے۔ اور جأر الرجل الی اللہ عزوجل یعنی دعا کے ساتھ تضرع کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ توبہ کے ساتھ چیختے تھے پس ان سے توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

يراوح من صلوات المَلِيك     فطَوْرًا سجودا و طَوْرًا جُؤارا

ابن جریج نے کہا: **حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ** اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدر میں قتل کیے گئے تھے۔ **اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ** اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں تھے۔ پس دونوں قولوں کو جمع کیا گیا۔ یہ عمدہ ہے۔ **لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا**۔ منا سے مراد من عذابنا ہمارے عذاب سے **لَا تُنْصَرُوْنَ**۔ تمہاری حفاظت نہیں کی جائے گی اور تمہاری جزع و فزع تمہیں نفع نہیں دے گی۔ حسن نے کہا: توبہ کی قبولیت کے ساتھ ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ بعض علماء نے کہا: اس نہی کا معنی اخبار ہے یعنی تم اگر تضرع وزاری کرو تو تمہیں نفع نہ دے گی۔

**قَدْ كَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِیْنَ ۖۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾**

''(وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں اور تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جایا کرتے تھے غرور و تکبر کرتے ہوئے (پھر صحن حرم میں) تم داستان سرائی کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **تُتْلٰى عَلَیْكُمْ** تم پر پڑھی جاتی ہیں۔ ضحاک نے کہا قتل کے ساتھ عذاب دینے سے پہلے۔ **تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾** تم پیچھے کی طرف لوٹتے ہو(2)۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی پیچھے ہٹتے ہو۔ اس کی اصل الٹے پاؤں پیچھے ہٹنا ہے، شاعر نے کہا:

زعموا بأنّهم على سُبُل النَّجا     ةِ وإنما نَكْصٌ على الأعقاب

1۔ صحیح بخاری، الدعاء علی المشرکین، جلد 2، صفحہ 942
2۔ احکام القرآن للطبری، جز 18-17، صفحہ 48

یہاں حق سے اعراض سے استعارہ ہے۔ حضرت علی نے علی ادبار کم پڑھا ہے۔ تنکصون کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۚ بِهٖ کی ضمیر سے حال ہے۔ جمہور نے کہا: یہ ضمیر حرم یا مسجد یا البلد کی طرف لوٹ رہی ہے، البلد سے مراد مکہ ہے اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں لیکن معاملہ میں اس کی شہرت کی وجہ سے ضمیر لوٹانا جائز ہے، یعنی وہ کہتے ہیں ہم اہل حرم ہیں پس ہم نہیں ڈرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ اپنے دلوں میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں ان کے لیے مسجد اور حرم کی وجہ سے لوگوں پر زیادہ حقوق ہیں پس وہ اس وجہ سے تکبر کرتے تھے، حق سے تکبر کرنا مراد نہیں۔ ایک جماعت نے کہا: ضمیر کا مرجع قرآن ہے اس حیثیت سے کہ آیات ذکر کی گئی ہیں معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے میری آیات سننا تکبر اور سرکشی کو پیدا کرتا ہے، پس تم اس پر ایمان نہ لاؤ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ نحاس نے کہا: پہلا قول اولی ہے اس کا معنی ہے وہ حرم کی وجہ سے فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم اہل حرم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ، سامرا پر نصب حال کی بنا پر ہے اس کا معنی ہے سمارا۔ وہ جماعت جو رات کو باتیں کرتی ہے۔ یہ السمر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چاند کا سایہ اسی سے سمرۃ اللون ہے۔ وہ کعبہ کے اردگرد چاند کے سایہ میں باتیں کرتے تھے اس کو التحدث کہا گیا۔ ثوری نے کہا: چاند کے سایہ کو السمر کہتے ہیں اسی سے السمرۃ فی اللون ہے رنگ میں گندمی رنگ کہا جاتا ہے۔ اس کو الفخت کہا جاتا ہے اور اسی سے فاختۃ ہے۔ ابو رجاء نے سمارا پڑھا ہے یہ جمع ہے سامر کی جیسا کہ شاعر نے کہا:

الست تری السمار والناس احوالی

قیلہ کی حدیث میں ہے: اذا جاء زوجھا من السامر، جب اس کا خاوند داستان سرائی کرنے والی قوم سے واپس آیا، یہ اسم مفرد بمعنی جمع ہے جیسے الحاضر ہے اس سے مراد وہ قوم ہوتی ہے جو پانی پر اترتی ہے۔ الباقر جمع ہے البقر کی اور الجامل جمع ہے الابل کی مذکر اور مونث دونوں کی جمع یہی ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) یعنی اطفالا کہا جاتا ہے قوم سمر و سمرد سامر اس کا معنی ہے رات کو جاگنا، یہ السمر سے مشتق ہے اس سے مراد چاند کی وہ روشنی ہے جو درختوں پر پڑتی ہے۔ جوہری نے کہا: السامر اور اسی طرح السمار وہ لوگ جو داستان سرائی کرتے ہیں جیسے الحاج کو حجاج کہا جاتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

وسامر طال فیہ اللھو والسمر

گویا اس مکان کو سامر کہا گیا جس میں قصہ خوانی کے لیے جمع ہوا جاتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: سامر واحد ہے اور بمعنی السمار ہے کیونکہ یہ وقت کے لیے وضع کیا گیا ہے جیسے شاعر کا قول ہے۔

مِنْ دُونِهِم إن جئتهم سَمَرًا عَزْفُ القِيَانِ و مَجْلِسٌ غَمَرُ

اور فرمایا: سمرا کیونکہ اس کا معنی ہے اگر تو رات کے وقت ان کے پاس آئے گا جبکہ وہ قصہ خوانی میں مصروف ہوں گے

بنا سمیر رات اور دن کو کہتے ہیں کیونکہ ان میں داستان سرائی ہوتی ہے کہا جاتا ہے: لا افعله ما سمرا بنا سمیرا بدا میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گا، السمیر زمانہ کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور ابناہ سے مراد رات اور دن میں۔ لا افعله السمر والقمر یعنی جب تک لوگ چاندنی رات میں قصہ خوانی کرتے رہیں گے میں ایسا نہیں کروں گا۔ ولا افعله سمیرا اللیالی، شنفری نے کہا:

هنالك لا أرجو حياة تَسُرُّنِي سَمِيرَ الليالي مُبْسَلًا بالجرائر

السمار سین کے فتحہ کے ساتھ پتلا دودھ۔ عرب قصہ خوانی کے لیے بیٹھتے تھے۔ یہ نجوم کے ذریعے اس کی معرفت کو ثابت کیا ہے کیونکہ وہ صحراء میں بیٹھتے تھے اور طلوع اور غروب ہونے والے ستارے دیکھے جاتے تھے۔ قریش کعبہ کے اردگرد مجالس قائم کرتے تھے۔ اور جھوٹی اور کفریہ کہانیاں بیان کرتے تھے، الله تعالیٰ نے اس کی وجہ سے انہیں عیب لگایا۔ تُهْجِرُوْنَ۔ تاء کے ضمہ کے ساتھ، میم کے کسرہ کے ساتھ اَهْجَرَ سے مشتق ہے جب کوئی فحش کلام کرے۔ اور تاء کے نصب کے ساتھ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ هجر المریض سے مشتق ہے جس کا معنی ہے مریض نے ہذیان بکا۔ اس کا معنی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے بری بات کرتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی مُسْتَكْبِرِيْنَ ۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ۝ تو قصہ خوانی مکروہ ہوگئی؛ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی مذمت فرمائی ہے جو طاعت الٰہی کے علاوہ باتیں کرتے ہیں خواہ وہ ہذیاں مین ہو یا کوئی اور مشورہ میں ہو۔ اعمش فرماتے تھے: جب میں شیخ کو دیکھتا ہوں جبکہ اس نے حدیث نہیں لکھی ہوتی تو میں اسے تھپڑ مارتا ہوں کیونکہ وہ شیوخ القمر سے ہے یعنی جو چاندنی راتوں میں جمع ہوتے ہیں خلفاء اور امراء کے زمانہ کو بیان کرتے ہیں ان میں سے کوئی نماز کے لیے اچھی طرح وضو نہیں کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** امام مسلم نے حضرت ابو برزہ سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز کو رات کے تہائی حصہ تک موخر فرماتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونا اور بعد میں باتیں کرنا ناپسند فرماتے تھے (1)۔ علماء نے فرمایا: نماز سے پہلے سونے کی کراہت اس لیے ہے تاکہ پورا وقت کہیں فوت نہ ہو جائے یا افضل وقت ضائع نہ ہو جائے، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو عشاء سے پہلے سو جائے اس کی آنکھ کبھی نہ سوئے۔ یہ تین مرتبہ فرمایا: جن علماء نے عشاء سے پہلے سونے کو مکروہ قرار دیا ہے ان میں حضرت عمر، حضرت عبد الله بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی الله عنہم وغیرہ ہیں۔ یہی امام مالک کا مذہب ہے۔ بعض نے اس کی رخصت دی ان میں سے حضرت علی، حضرت ابو موسیٰ وغیرہم ہیں یہ کوفیوں کا مذہب ہے۔ بعض نے شرط لگائی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک شخص رکھ لے جو اسے نماز کے لیے جگائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے؛ یہی امام طحاوی کا مذہب ہے۔ رہا نماز کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہونا تو یہ اس لئے ہے کیونکہ نماز گناہوں کے لیے کفارہ ہے پس وہ سلامتی پر سوئے گا جب کہ فرشتوں نے اس کے صحیفہ کو عبادت کے ساتھ ختم کیا تھا۔ وہ قصہ کہانی کرتا ہے وہ اپنی طرف سے باتیں کرتا ہے اور اپنا اختتام لغو اور باطل چیز پر کرتا ہے اور یہ مومنین کے فعل سے نہیں ہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہنا رات کے

1۔ صحیح مسلم، استحباب التکبیر بالصبح فی اول وقتها وهو التغلیس، جلد 1، صفحہ 230

آخری حصہ میں نیند کو غالب کرتا ہے۔ اور رات کے آخر میں قیام بھی نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات صبح کی نماز سے بھی رہ جاتا ہے۔
بعض علماء نے کہا: عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہے کیونکہ حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب لوگوں کے چلنے کی آواز تھم جائے تو قصہ خوانی سے پرہیز کرو کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کیا پھیلائے گا تم اپنے دروازے بند کر دو اور مشکیزوں کے منہ باندھ دو اور برتن ڈھانپ دو اور چراغ بجھا دو'' (1)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ لوگوں کو عشاء کے بعد باتیں کرنے پر سزا دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے: رات کے ابتدائی حصہ میں قصہ خوانی کرنا اور رات کے آخری حصہ میں سونا! اپنے اعمال لکھنے والے فرشتوں کو راحت دو حتی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس نے عشاء کے بعد شعر کا ایک مصرعہ پڑھا اس کی صبح تک نماز قبول نہ ہوگی، اس کی حضرت شداد بن اوس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند چلائی ہے۔ بعض علماء نے کہا: عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنے کی کراہت میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو سکون کے لیے بنایا ہے جب آدمی اس میں باتیں کرے گا اور دن کے وقت سوئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ نے دن کو معاش کی تلاش کے لیے بنایا ہے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کی مخالفت کی جو اس نے اس کے وجود پر جاری فرمائی ہے۔ فرمایا: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ۞ (الفرقان)

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ کراہت ایسی باتوں کے ساتھ مختص ہے جو عبادت، اذکار اور علم کی تعلیم کے زمرہ سے نہ ہوں اور اہل علم کی گفتگو اور مصالح کی تعلیم وغیرہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین سے ایسی روایات وارد ہیں جو اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں بلکہ اس کی ندبیت، استحباب پر دلالت کرتی ہیں۔ امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے۔ باب السمر فی الفقہ والخیر بعد العشاء۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ قرۃ بن خالد نے کہا: ہم نے حسن کا انتظار کیا انہوں نے ہمارے پاس آنے سے دیر لگا دی حتی کہ وہ اس وقت آئے جب وہ وہاں سے چلے جاتے تھے پس وہ آئے اور کہا: ہمارے پڑوسیوں نے ہمیں بلایا تھا۔ پھر حضرت انس نے فرمایا: ہم نے ایک رات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کیا حتی کہ جب آدھی رات کا وقت ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں نے نماز پڑھ لی اور تم نماز میں رہے جب تک تم نماز کے منتظر رہے'' (2)۔ حسن نے کہا: قوم خیر میں ہوتی ہے جب تک خیر کے انتظار میں ہوتی ہے۔ فرمایا: باب السمر مع الضیف والاھل۔ اس کے تحت امام بخاری نے ابوبکر بن عبد الرحمن کی حدیث لکھی ہے کہ اصحاب صفہ فقراء تھے۔ الحدیث۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے، نیز سرحدوں کی حفاظت اور رات کے وقت لشکروں کی حفاظت پر ثواب اور اجر عظیم ذکر کیا ہے جو اخبار میں مشہور ہے۔ یہ سب آل عمران کے آخر میں گزر چکا ہے۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۞

''کیا انہوں نے کبھی تدبر نہ کیا قرآن میں؟ یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی آپ کے پہلے آباء اجداد کے پاس''۔

1۔ ابوداؤد، کتاب، ابواب النوم، باب ما جاء فی الدیک والبھائم، حدیث نمبر 4440، روایت بالمعنی

2۔ صحیح بخاری، السمر فی الفقہ والخیر بعد العشاء، جلد 1 صفحہ 84

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ۔ القول سے مراد قرآن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (النساء: 82) قرآن کو قول کہا گیا کیونکہ اس کے ساتھ انہیں خطاب کیا گیا، اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ انہوں نے اس سے اعراض کیا اور اس کا انکار کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ام بمعنی بل ہے یعنی بلکہ ان کے پاس آئی ہے ایسی چیز جس کا ان کے آباء کے لیے عہد نہ تھا اسی وجہ سے انہوں نے اس کا انکار کیا اور اس میں غور وفکر کو ترک کر دیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے یا ان کے پاس عذاب سے امان کا پروانہ آیا ہے یہ وہ چیز ہے جو ان کے پہلے آباء کے پاس نہیں آئی تھی پس انہوں نے عزت والے قرآن کو ترک کر دیا۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

"یا انہوں نے اپنے رسول (مکرم) کو نہ پہچانا تھا اس لیے وہ اس کے منکر تھے"۔

عرب یہ ترکیب توقیف اور تقبیح کے معنی پر استعمال کرتے ہیں عرب کہتے ہیں: الخير أحب اليك ام الشر یعنی میں نے تجھے شر کے بارے میں بتا دیا اس لیے تو اس سے اجتناب کر۔ وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان چکے تھے اور وہ پہچان چکے تھے کہ اہل صدق، امانت سے ہے اور اس کی اتباع میں نجات اور خیر ہے اگر ہٹ دھرمی نہ ہوتی۔ سفیان نے کہا: کیوں نہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان چکے تھے لیکن انہوں نے آپ سے حسد کیا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾

"یا کہتے ہیں کہ اسے سودا کا مرض ہے (یوں نہیں) بلکہ وہ تشریف لایا ان کے پاس حق کے ساتھ اور بہت سے لوگ ان میں سے حق کو ناپسند کرتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ یعنی کیا وہ ایمان کے ترک پر اس سے حجت پکڑتے ہیں کہ اسے سودا کا مرض ہے۔ حقیقت ایسی نہیں کیوں کہ اس سے جنون کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ الحق سے مراد قرآن، توحید حق اور دین حق ہے۔ وَ اَكْثَرُهُمْ یعنی تمام کے تمام۔ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ حسد، تقلید، اور نافرمانی کی وجہ سے حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ؕ

"اور اگر پیروی کرتا حق ان کی خواہشات (نفسانی) کی تو درہم برہم ہو جاتے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے بلکہ ہم ان کے پاس لے آئے ان کی نصیحت تو وہ اپنی نصیحت سے ہی روگردانی کرنے والے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ یہاں الحق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یہ اکثر علماء کا قول ہے ان میں سے مجاہد، ابن جریج اور ابو صالح وغیرہ ہیں (1)۔ عربی میں اس کی تقدیر اس طرح ہے لو اتبع صاحب الحق۔ یہ نحاس کا قول ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 151

بعض نے کہا: یہ مجاز ہے یعنی اگر حق ان کی خواہشات کے موافق ہوتا۔ موافقت کو مجازاً اتباع بنایا یعنی اگر وہ رسولوں کا انکار کرتے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے پھر انہیں سزا نہ دی جاتی اور انہیں اس پر جزا نہ دی جاتی خواہ عجز کی وجہ سے یا جہالت کی وجہ سے تو آسمان و زمین کا نظام خراب ہو جاتا۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے اگر حق وہ ہوتا جو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود بنا لیے جائیں تو ان میں اختلاف پیدا ہوتا۔ بعض ایسی چیز کا ارادہ کرتے جس کا دوسرے ارادہ نہ کرتے تو نظام درہم برہم ہو جاتا اور آسمان اور زمین کا معاملہ خراب ہو جاتا اور جو کچھ ان میں ہے اس میں بھی بگاڑ پیدا ہو جاتا۔ بعض علماء نے کہا: لَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ یعنی الحق اگر لوگوں کی خواہشات کی اتباع کرتا اور اس کی اتباع کرتا جو لوگ چاہتے ہیں تو عالم کا نظام باطل ہو جاتا کیونکہ لوگوں کی شہوات مختلف اور متضاد ہیں حق کا راستہ ہی متبوع ہے اور لوگوں کا راستہ حق کی پیروی ہے۔ بعض علماء نے کہا: الحق سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن ان کی خواہشات کے مطابق نازل ہوتا تو آسمان اور زمین کا نظام گڑبڑ ہو جاتا۔ وَمَنْ فِيْهِنَّ یہ آسمان کے ملائکہ، زمین کے جن و انس کی طرف اشارہ ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: جو ان کے درمیان مخلوق ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود کی قرأت ہے لفسدت السموات والارض وما بینهما کلبی اور حضرت ابن مسعود کی قرأت کی تاویل پر معقول اور غیر معقول سب کے فساد کو شامل ہے۔ قرآن کا ظاہر جمہور کی قرأت میں عقل والوں کے فساد پر محمول ہے کیونکہ جو غیر ذوی العقول ہیں وہ صلاح اور فساد میں ذوی العقول کے تابع ہیں۔ اس بنا پر جو فساد ہوگا وہ آسمان کے فرشتوں کی طرف لوٹے گا کہ انہیں ارباب بنایا گیا حالانکہ مربوب ہیں ان کی عبادت کی گئی حالانکہ وہ عبادت گزار ہیں اور انسانوں کا افساد دو وجوہ پر ہوگا۔ ایک خواہشات نفسانی کی وجہ سے اور یہ مہلک ہے۔ دوسرا غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے اور یہ کفر ہے۔ رہا اس کے علاوہ کا فساد تو وہ بالتبع ہے، کیونکہ ان کی تدبیر ذوی العقول کے ذریعے کی جاتی ہے پس تدبیر کرنیوالوں کا فساد ان پر ہی لوٹے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لے آئے جس میں ان کے لیے شرف اور عزت ہے؛ یہ سدی اور سفیان کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: جس میں ان کے ثواب اور عقاب کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس میں حق کا بیان ہے اور اس کا ذکر ہے امر دین میں سے جس کی انہیں ضرورت ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

”کیا آپ طلب کرتے ہیں ان سے کچھ معاوضہ؟ (آپ کے لیے) تو آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا جو آپ ان کے پاس لائے ہیں کیا آپ ان سے اس پر اجر طلب کرتے ہیں؛ یہ حسن وغیرہ کا قول ہے۔ فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ، حمزہ، کسائی، اعمش اور یحییٰ بن وثاب نے خراجاً الف کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ابن عامر اور ابوحیوہ کے انہوں نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کیا آپ ان سے رزق طلب کرتے ہیں آپ کے رب کا رزق بہتر ہے۔ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ کوئی شخص قادر نہیں کہ وہ اس کے رزق کی مثل رزق دے۔ اور اسکی مثل انعام نہیں دیتا۔ بعض نے کہا: جو اللہ تعالیٰ آپ کو اجر میں سے ادا کرے گا اور اس کی بارگاہ میں دعا، دنیا کے سامان سے بہتر ہے

انہوں نے آپ کو اموال پیش کیے تا کہ قریش کے ایک شخص کی طرح ہو جائیں تو آپ نے اسے قبول نہ کیا؛ یہ حسن نے معنی بیان کیا ہے۔ الخراج اور الخرج کا ایک معنی ہے مگر کلام کا اختلاف احسن ہے یہ الاخفش کا قول ہے اور ابو حاتم نے کہا: میں نے ابو عمرو بن العلاء سے الخراج اور الخرج کا فرق پوچھا تو انہوں نے کہا: خراج وہ ہے جو تم پر لازم ہو اور خرج وہ ہے جو تو اپنی طرف سے خود دے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ الخرج وہ ہوتا ہے جو غلاموں سے وصول کیا جاتا ہے۔ پہلا قول ثعلبی نے اور دوسرا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

## وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝

''اور بیشک آپ تو انہیں بلاتے ہیں سیدھی راہ کی طرف۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ یعنی آپ انہیں دین قیم کی طرف بلاتے ہیں۔ الصراط کا لغوی معنی راستہ ہے۔ دین کو راستہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ جنت تک پہنچاتا ہے پس یہ اس کا راستہ ہے۔ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی وہ دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتے۔ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝ بعض نے کہا: یہ پہلے کی مثل ہے۔ بعض نے کہا: وہ جنت کے راستہ سے منحرف ہونے والے ہیں حتی کہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں۔ نکب عن الطریق ینکب نکوباً (1) کا معنی ہے راستہ سے ہٹ جانا دوسری طرف مائل ہو جانا اس سے ہے: نکبت الریح جب وہ گزرگاہ پر سیدھی نہ چلے۔ شر الریح النکباء سب سے بری ہوا وہ ہے جو الٹی چلنے والی ہو۔

## وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

''اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور دور بھی کر دیں اس مصیبت کو جس میں مبتلا ہیں پھر بھی وہ بڑھتے جائیں گے اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ یعنی اگر ہم انہیں دنیا کی طرف لوٹا دیں اور انہیں دوزخ میں داخل نہ کریں اور ہم پھر انہیں آزمائیں۔ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ سدی نے کہا: وہ اپنی معصیتوں میں بڑھتے جائیں گے۔ يَعْمَهُوْنَ ۝ یعنی وہ سرگرداں رہیں گے۔ ابن جریج نے کہا: وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ یعنی دنیا میں اگر ان پر مہربانی کریں۔ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ اور قحط اور بھوک ان سے دور کر دیں۔ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ تو یہ اپنی گمراہی اور حد سے تجاوز کرنے میں سرکش ہوتے جائیں گے۔ يَعْمَهُوْنَ بدحواس ہوں گے اور متذبذب ہوں گے۔

## وَ لَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَ مَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝

''اور ہم نے پکڑ لیا انہیں عذاب سے پھر بھی وہ نہ جھکے اپنے رب کی بارگاہ میں اور نہ وہ اب گڑگڑا کر (توبہ

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 352

کرتے) ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ، ضحاک نے کہا: عذاب سے مراد بھوک ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد امراض، حاجت اور بھوک ہے۔ بعض نے کہا: قتل اور بھوک ہے۔ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وہ نہ جھکے۔ وَ مَا يَتَضَرَّعُوْنَ جو انہیں تکالیف پہنچتی ہیں ان میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں جھکتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ثمامہ بن آثال کے واقعہ میں نازل ہوئی جب اسے ایک لشکر نے پکڑ لیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کر دیا تو وہ مکہ والوں اور سامان رسد کے درمیان حائل ہو گیا اس نے کہا: اللہ کی قسم! نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گندم کا ایک دانہ بھی یمامہ سے مکہ والو! تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کو قحط اور بھوک میں مبتلا کر دیا حتی کہ انہوں نے مردار، کتے اور العلہز کھائے۔ پوچھا گیا: العلہز کیا ہے؟ فرمایا وہ اون اور اونٹوں کے بال لیتے تھے اسے خون کے ساتھ تر کرتے تھے پھر اسے بھونتے تھے اور اسے کھاتے تھے۔ ابوسفیان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں کیا آپ کہتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیوں نہیں"۔ ابوسفیان نے کہا: آپ نے آباء کو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا اور اولاد کو بھوک کے ساتھ قتل کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ...الخ۔

## حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾

"یہاں تک کہ جب ہم کھول دیں گے ان پر دروازہ سخت عذاب والا وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ عکرمہ نے کہا: یہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اس پر چار لاکھ فرشتے مقرر ہیں ان کے چہرے کالے ہیں، ان کے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں، ان کے دلوں سے رحمت نکالی گئی ہے جب یہ کافر اس دروازے پر پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے ان پر کھول دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ ان کا بدر کے دن تلوار سے قتل کرنا ہے (1)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد قحط ہے جو انہیں پہنچا تھا حتی کہ انہوں نے بھوک کی وجہ سے اون کھائی تھی جیسا کہ پہلے گزر رہا ہے۔ بعض نے کہا: عذاب شدید سے مراد فتح مکہ ہے۔

اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾ وہ مایوس و متحیر ہونگے وہ نہ جانتے ہوں گے کہ کیا کریں جیسے ہر خوشحالی اور خیر سے محروم شخص ہوتا ہے۔ یہ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

## وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

"اور وہ وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل لیکن (ان عظیم نعمتوں پر بھی) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی کثرت اور کمال قدرت

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 353

کی انہیں پہچان کرائی۔ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾ یعنی وہ بہت تھوڑا شکر کرتے ہیں۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ بالکل شکر نہیں کرتے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۹﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا تمہیں زمین (کے اطراف) میں اور (انجام کار) اسی کی جناب میں اکٹھے کیے جاؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ یعنی وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا اور تمہیں پھیلایا اور تمہیں تخلیق کیا۔ وَ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۹﴾ جزاء کے لیے اس کی جناب میں جمع کیے جاؤ گے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ لَہُ اخۡتِلَافُ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۸۰﴾ بَلۡ قَالُوۡا مِثۡلَ مَا قَالَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَ اٰبَآؤُنَا ہٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۵﴾ قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۸۶﴾ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۸۷﴾ قُلۡ مَنۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُوَ یُجِیۡرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیۡہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۸﴾ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ ؕ قُلۡ فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے گردش لیل ونہار، کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھتے۔ بلکہ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو پہلے (کفار) کہا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا: کیا جب ہم مر جائیں گے اور بن جائیں گے خاک اور ہڈیاں تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا۔ بلاشبہ یہ وعدہ کیا گیا ہے ہم سے اور ہمارے باپ دادا کے ساتھ بھی آج سے پہلے (لیکن آج تک پورا نہ ہوا) نہیں ہیں یہ باتیں مگر من گھڑت افسانے پہلے لوگوں کے۔ (اے حبیب!) آپ پوچھیے کس کی ملکیت ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو۔ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ آپ فرمائیے: تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے؟ آپ پوچھیے: وہ کون ہے جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی ملکیت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جاسکتی اس کی مرضی کے خلاف (بتاؤ) اگر تم کچھ علم رکھتے ہو؟ وہ کہیں گے: یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے۔ فرمائیے: پھر کیسے تم دھوکا میں مبتلا ہو جاتے ہو؟''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ہُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ لَہُ اخۡتِلَافُ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ دن اور رات کو اس نے مختلف بنایا جیسے تیرا قول ہے لک الاجر والصلۃ یعنی تجھے اجر دیا جائے گا اور صلہ دیا جائے گا؛ یہ فراء کا قول ہے۔ بعض نے کہا: دن رات کے

اختلاف سے مراد نور وظلمت میں مختلف ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد اس کا تکرار ہے دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے۔ پانچواں احتمال یہ ہے کہ ان میں جو سعادت و شقاوت اور گمراہی و ہدایت گزر چکی ہیں اس کا اختلاف مراد ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ کیا تم اس کی قدرت، ربوبیت اور وحدانیت کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس کی مخلوق سے اس کا شریک ہونا جائز نہیں وہ دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے پھر انہیں ان کے قول کے ساتھ بدلا اور ان کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا اس کی مثل جو پہلے کفار نے کہا۔ انہوں نے کہا: کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا یہ تو متصور نہیں ہو سکتا۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے بھی ہم سے اور ہمارے آباء سے یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس کی کوئی حقیقت نہیں دیکھتے اِنْ هٰذَآ، ان بمعنی ما ہے۔ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قل، اے پیارے حبیب! ان کے جواب میں فرمائیے لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ کس کی ملکیت ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت، وحدانیت، اور لازوال بادشاہی اور اپنی کامل قدرت کی خبر دے رہے ہیں۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو آپ فرمائیے: کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے اور نہیں جانتے کہ جو ابتداءً اس کی تخلیق پر قادر ہے وہ ان کے مرنے کے بعد ان کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ یعنی کیا تم نہیں ڈرتے ہو کہ تم میرے لیے وہ بناتے ہو جو تم اپنے لیے ناپسند کرتے ہو تم کہتے ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں اور تم اپنے لیے بیٹیاں ناپسند کرتے ہو۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ اس سے مراد آسمان اور جو کچھ ان کے اوپر ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور وہ چیزیں مراد ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مجاہد نے کہا: مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کے خزائن۔ ضحاک نے کہا: ہر چیز کی ملک۔ ملکوت مبالغہ کی صفات سے ہے جیسے جبروت اور رہبوت۔ یہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے جسے چاہتا ہے امن دیتا ہے وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اور جسے وہ ڈراتا ہے اسے امن نہیں دیا جاتا۔ بعض نے کہا: یہ دنیا میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس کے ہلاک کرنے اور خوف کا ارادہ فرماتا ہے کوئی روکنے والا اسے روک نہیں سکتا اور جس کی مدد کا اور امن دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کی مدد کوئی روک نہیں سکتا اور اس کے امن کو کوئی روک نہیں سکتا۔ بعض نے کہا: یہ آخرت میں ہوگا یعنی جو ثواب کا مستحق ہے اسے ثواب دینے سے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو عذاب کا مستحق ہے اسے عذاب دینے سے کوئی روکنے والا نہیں۔ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ یعنی تم اس کی طاعت اور توحید سے کیسے پھیرے گئے ہو اور کیسے دھوکا دیے گئے ہو یا کیسے یہ تصور دیا گیا ہے کہ تم ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جو نہ نفع دیتی ہیں اور نہ نقصان دیتی ہیں۔ السحر کا معنی خیال کرنا ہے۔ یہ تمام ان عربوں پر حجت ہے جو صانع کا اقرار کرنے والے ہیں۔ ابو عمرو نے آخری دونوں جگہ سیقولون اللہ پڑھا ہے یہی اہل عراق کی قرأت ہے اور باقی قراء نے للہ پڑھا ہے اور پہلے کے للہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ کا جواب ہے جب لمن میں لام مقدم ہوئی تو جواب میں لوٹائی گئی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام مصاحف میں بغیر الف کے لکھا ہوا ہے اور جنہوں نے

سیقولون اللہ پڑھا تو سوال بغیر لام کے ہے تو جواب بھی اسی طرح آیا اور پہلی صورت میں للہ لام کے ساتھ پڑھا ہے اور سوال میں بھی لام ہے۔ کیونکہ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ کا مطلب ہے قل لمن السموت السبع الخ۔ پس جواب کے ساتھ دیا جب سوال میں لام مقدر کیا گیا اور تیسرے کی علت دوسرے کی علت کی طرح ہے؛ شاعر نے کہا:

إذا قيل من ربّ المزالف والقُرَى　　وربُّ الجياد الجُرْد قلت لخالد

اصل میں لمن المزالف ہے۔ مزالف ان شہروں کو کہتے ہیں جو صحراء اور آبادی کے درمیان ہوتے ہیں۔ یہ آیات کفار سے جھگڑنے اور ان کے خلاف حجت قائم کرنے پر دلیل ہیں۔ یہ مسئلہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ان آیات نے آگاہی بخشی کہ جو خلق اختراع، ایجاد اور ابداع پر ابتداء قادر ہے وہ الوہیت اور عبادت کا مستحق ہے۔

بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۝ۙ عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝۹۲

''حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پہنچا دیا انہیں حق اور وہ یقینا جھوٹے ہیں۔ نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے کسی کو (اپنا) بیٹا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے ورنہ لے جاتا ہر خدا ہر اس چیز کو جو اس نے پیدا کی ہوتی اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے وہ خدا ایک دوسرے پر، پاک ہے اللہ تعالیٰ ان تمام (نازیبا) باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں، وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِالْحَقِّ یعنی ہم نے انہیں سچا قول پہنچا دیا نہ کہ وہ جو کفار کہتے ہیں یعنی شریک کا اثبات اور دوبارہ اٹھنے کی نفی۔ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ وہ جھوٹے ہیں کہ کہتے ہیں: ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ۔ من صلہ ہے وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ۔ من زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے ما اتخذ اللہ ولدا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا جیسا کہ تم نے کہا ہے اور جو اس نے پیدا کیا ہے اس میں اس کے ساتھ کوئی خدا نہیں ہے کلام میں حذف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ اور خدا ہوتے تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ علیحدہ ہوتا۔ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ قوی، ضعیف پر غالب آتا جیسے بادشاہوں کی نفی پر دلالت کرتا ہے وہ بیٹے کی نفی پر بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ بیٹا باپ سے ملک میں جھگڑتا ہے جس طرح شریک جھگڑتا ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۝ بیٹے اور شریک سے وہ پاک ہے۔ عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ وہ عالم الغیب ہے۔ فَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝ وہ شرک سے پاک ہے۔ نافع، ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے عالم رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ھو عالم الغیب نئی کلام ہے۔ باقی قراء نے للہ کی صفت کی بنا پر، مجرور پڑھا ہے۔ رویس نے یعقوب سے روایت کیا ہے جب وصل کیا تو عالم کو جر دی اور جب ابتدا کی تو رفع دیا۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِیَنِّیْ مَا یُوْعَدُوْنَ۝۹۳ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۝

''آپ یہ دعا مانگئے: اے میرے پروردگار! اگر تو ضرور مجھے دکھانا چاہتا ہے وہ (عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو میرے رب (از راہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا''۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا سکھائی یعنی تم کہو: اے میرے پروردگار! اگر تو ضرور مجھے وہ عذاب دکھانا چاہتا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۴﴾ تو ان پر عذاب نازل ہونے کے وقت مجھے ان ظالم قوم سے نہ کرنا بلکہ مجھے ان سے نکال لینا۔ بعض نے کہا: ندا معترض ہے اور اما میں ما زائدہ ہے۔ بعض نے کہا: اما کی اصل ان ما ہے۔ ان شرط ہے اور ما بھی شرط ہے دونوں شرطوں کو تاکید کے لیے جمع فرمایا۔ اور جواب۔ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ہے یعنی جب تو انہیں عذاب دینے کا ارادہ فرمائے تو مجھے ان سے نکال لینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ظالم قوم سے آپ کو نہیں کرے گا جب ان پر عذاب نازل ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دعا اور سوال کا حکم دیا تا کہ آپ کا اجر بڑھے اور آپ ہر وقت اپنے پروردگار کا ذکر کرتے رہیں۔

## وَ اِنَّا عَلٰۤی اَنْ نُّرِیَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

''اور ہم اس بات پر کہ دکھا دیں تجھے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے قادر ہیں''۔

اللہ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ معلوم کے خلاف بھی قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں بھوک اور تلوار کے ساتھ عذاب دکھایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور جو آپ پر ایمان لائے انہیں اس سے بچالیا۔

## اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

''دور کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے برائی کو، ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں وہ بیان کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ درگزر اور مکارم اخلاق کا حکم دیا مکارم اخلاق میں سے جو ان کے درمیان ہیں وہ اس امت میں ہمیشہ محکم اور باقی ہیں اور جو کفار سے صلح اور ترک تعرض اور ان کے امور سے درگزر کا حکم ہے وہ قتال کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ یعنی جو وہ شرک اور تکذیب بیان کرتے ہیں ہم اسے جانتے ہیں یہ تقاضا ہے کہ یہ آیت موادعۃ (صلح) ہے۔ واللہ اعلم۔

## وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

''اور کہیے: میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں میرے رب! اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۹۷﴾۔ الھمزات جمع ہے ھمزۃ کی الھمز کا لغوی معنی ہے دفع کرنا، دور کرنا۔ کہا جاتا ہے: ھمزہ ولمزہ اس نے اسے دور کیا۔ لیث نے کہا الھمز کا معنی ہے پیچھے سے کلام کرنا اور اللمز کا معنی ہے سامنے باتیں کرنا۔ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے، ابن آدم کے سینے میں آہستہ آہستہ وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

ارشاد فرمایا: اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ یعنی (کہیے) میں شیطان کی وسوسہ اندازی سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دور کر دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے آپ شیطان کے وسوسہ اور دخل اندازی سے پناہ مانگتے تھے (1) ابوالہیثم نے کہا: جب آہستہ کلام کرے اور اسے پوشیدہ کرے تو اسے الھمس کہتے ہیں شیر کو ہموس کہتے ہیں کیونکہ وہ اتنا آہستہ چلتا ہے کہ اس کے چلنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو شیطان کی تحریک اور وسوسہ سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ یہ غصہ کا ابھار ہے جس پر انسان ضبط نہیں کر سکتا گویا یہ وہ ہے جو مومنین کو کفار کے ساتھ پہنچتی ہے تاکہ مقابلہ شروع ہو جائے اسی وجہ سے یہ اس آیت کے ساتھ متصل ہے، غصہ کی زیادتی اور شدت شیطان کی طرف سے ہوتی ہے آیت میں اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ سورۂ اعراف کے آخر میں اس کا بیان تفصیلاً گزر چکا ہے۔ اور کتاب کے آغاز میں بھی گذر چکا ہے۔ علی بن حرب بن محمد طائی سے مروی ہے فرمایا ہمیں سفیان نے بتایا انہوں نے ایوب سے انہوں نے محمد بن حبان سے روایت کیا کہ حضرت خالد رات کو جاگتے رہتے تھے انہوں نے اپنی بے خوابی کی شکایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے انہیں ان کلمات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا أعوذ بكلمات الله التامة من غضب الله وعقابه ومن شر عباده ومن همزات الشياطين وان يحضرون (2)۔ ابوداؤد کی کتاب میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمزہ سے مراد الموتۃ ہے ابن ماجہ نے کہا: الموتۃ سے مراد جنون ہے اور جنون سے پناہ مانگنا موکد ہے، حضرت ابی کی قرات میں رب عائذا بك من همزات الشياطين وعائذا بك ان يحضرون ہے یعنی میں پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان میرے امور میں میرے ساتھ ہو، کیونکہ شیطان جب انسان کے پاس حاضر ہوتے ہیں تو وہ طعنہ زنی کے لیے تجاوز کرتے تھے اور جب وہ حاضر نہیں ہوتے تو طعنہ زنی نہیں ہوتی۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''شیطان تم میں سے ہر شخص کے پاس ہر کام میں موجود ہوتا ہے حتی کہ کھانے کے وقت بھی حاضر ہوتا ہے جب کسی کے ہاتھ سے لقمہ گرے تو وہ اس سے مٹی وغیرہ جھاڑے پھر اسے کھالے اور اسے شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ اور جب کھانے سے فارغ ہو تو اپنی انگلیاں چاٹ لے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ کس کھانے میں برکت ہے'' (3)۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''یہاں تک کہ جب آئے گی ان میں سے کسی کو موت تو وہ (بصد حسرت) کہے گا: میرے مالک! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے، شاید میں اچھے کام کروں اس دنیا میں دوبارہ جا کر جسے میں ایک بار چھوڑ آیا ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا یہ ایک (لغو) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3828

2۔ جامع ترمذی، حدثنا محمد بن خاتم، جلد 2، صفحہ 191

3۔ صحیح مسلم، استحباب لعق الاصابع والقصعة واكل اللقمة الساقطة، جلد 2، صفحہ 176

زندہ کیے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ کلام کو پھر مشرکین کی طرف لوٹایا یعنی انہوں نے کہا ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ پھر ان پر حجت قائم کی اور انہیں ہر چیز پر اپنی قدرت یاد دلائی پھر فرمایا: وہ اس پر مصر ہیں حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو اسے اپنی گمراہی کا یقین ہوگا اور وہ ان ملائکہ کو دیکھے گا جو اس کی روح قبض کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ (الانفال:50) قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لوٹنے کی تمنا کرے گا تا کہ اعمال صالحہ کرے جسے وہ چھوڑ آیا ہے۔ کبھی قول دل میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (المجادلۃ:8) اور ارْجِعُوْنِ کا قول، وہ اپنے رب سے مخاطب ہے اس نے ارجعنی نہیں کہا تعظیم کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے ابتدا میں اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کیا ان کے کہنے والے نے کہا: رب۔ پھر فرشتوں سے مخاطب ہوا اور کہا ارجعون الی الدنیا مجھے دنیا کی طرف لوٹا دو؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ بعض نے کہا: ارْجِعُوْنِ تکرار کی جہت سے ہے یعنی ارجعنی ارجعنی ارجعنی۔ مزنی نے اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ (ق:24) کی تفسیر میں کہا: اس کا معنی ہے الق الق۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد مشرک ہیں۔ میں کہتا ہوں: رجوع کا سوال کافر کے ساتھ مختص نہیں مومن بھی رجوع کا سوال کرے گا جیسا کہ سورۂ منافقین کے آخر میں آئے گا، یہ آیت دلیل ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا حتیٰ کہ وہ اضطراری طور پر جان لیتا ہے کہ کیا وہ اولیاء اللہ سے ہے یا اللہ کے دشمنوں سے ہے اگر یہ نہ ہوتا تو مومن لوٹنے کا سوال نہ کرتا پس وہ جان لیتے ہیں موت کے نزول اور اس کا ذائقہ چکھنے سے پہلے لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دینا ہے۔ فِيْمَا تَرَكْتُ جو میں نے طاعات میں سے ضائع کیا اور چھوڑ دیا۔ بعض نے فرمایا: فِيْمَا تَرَكْتُ جو مال میں نے چھوڑا تا کہ میں صدقہ کروں۔ لعل تردد کو متضمن ہے یہ وہ ہے جو لوٹنے کا سوال کرے گا جب کہ اسے عذاب کا یقین ہو چکا ہوگا وہ قطعی طور پر عمل صالح کا قول کرے گا اسے کوئی تردد نہ ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تردد یا تو دنیا کی لوٹنے کی طرف راجع ہے یا توفیق کی طرف راجع ہے یعنی میں عمل صالح کروں گا اگر تو مجھے توفیق عطا فرمائے گا کیونکہ قدرت و توفیق کا وجود قطعی نہیں ہے اگر وہ دنیا کی طرف لوٹا یا بھی گیا۔ کلا یہ کلمہ رد ہے یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوگا جیسا کہ اس نے گمان کیا ہے کہ دنیا کی طرف لوٹنے کی استدعا قبول کی جائے گی بلکہ یہ کلام ہوا میں بکھر جائے گا۔ بعض نے کہا: اگر قبول کر لیا جائے جو وہ طلب کر رہا ہے تو وہ اپنے کہنے کو پورا نہیں کرے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام:28) بعض علماء نے فرمایا۔ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی اس کی خبر میں خلاف نہیں اس نے خبر دی ہے کہ ہرگز کسی نفس کو مہلت نہیں دے گا جب اس پر اس کی موت کا وقت آجائے گا اور اس نے خبر دی کہ یہ کافر ایمان نہیں لائے گا، بعض نے کہا۔ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا موت کے وقت وہ یہ کہے گا لیکن اسے نفع نہیں دے گا۔ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ یعنی ان کے آگے آڑ ہے۔ بعض نے کہا: ان کے پیچھے آڑ ہے یعنی موت اور بعث کے درمیان آڑ ہے؛ یہ

ضحاک، مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ مجاہد سے مروی ہے دنیا و آخرت کے درمیان آڑ ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حجاب ہے۔ سدی نے کہا: مدت ہے۔ قتادہ نے کہا: دنیا کا بقیہ ہے۔ بعض نے کہا: قیامت تک مہلت دینا ہے؛ یہ ابن عیسی نے حکایت کیا ہے۔ کلبی نے کہا: دو صوروں کے درمیان کی مدت ہے۔ ان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہے۔ یہ تمام اقوال قریب قریب ہیں۔ دو چیزوں کے درمیان آڑ کو برزخ کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا البرزخ بین الشیئین دو چیزوں کے درمیان آڑ کو برزخ کہتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے درمیان موت کے وقت سے لے کر دوبارہ اٹھنے تک کا وقفہ برزخ ہے۔ جو فوت ہو گیا وہ برزخ میں داخل ہو گیا۔ ایک شخص نے امام شعبی کی موجودگی میں کہا: اللہ تعالیٰ نے فلاں پر رحم فرمایا وہ اہل آخرت سے ہو گیا۔ شعبی نے کہا: وہ اہل آخرت سے نہیں ہوا بلکہ وہ اہل برزخ سے ہوا ہے۔ دنیا اور آخرت میں سے نہیں ہے یوم کو یبعثون کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ یہ ظرف زماں ہے اضافت سے مراد مصدر ہے۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾

"تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ اس نفخہ سے مراد نفخہ ثانی ہے۔ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ آخرت میں نہیں پوچھیں گے نسب کے بارے میں جیسے دنیا میں پوچھتے ہیں یعنی تو کس قبیلہ سے ہے؟ نہ یہ پوچھیں گے کہ کس نسب سے تعلق رکھتا ہے قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے تعارف نہیں طلب کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ نفخہ اولیٰ میں ہوگا جب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے سب پر غشی طاری ہو جائے گی مگر جسے اللہ چاہے گا (2)۔ ان کے درمیان اس دن کوئی نسب و رشتہ داری نہ رہے گی اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھیں گے پھر اس میں دوسرا صور پھونکا جائے گا جب وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت اور فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿﴾ (الصافات) کے متعلق پوچھا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پہلے نفخہ میں وہ نہیں پوچھیں گے کیونکہ زمین پر کوئی زندہ باقی نہیں رہے گا پس نہ نسب ہوگا نہ سوال ہوگا۔ رہا فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿﴾ تو جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ایک دوسرے کے متعلق پوچھیں گے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اس آیت میں نفخہ ثانی مراد ہے۔ ابو عمر زاذان نے کہا: میں حضرت ابن مسعود کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ اصحاب خیر و برکت مجھ سے ان کی بارگاہ میں سبقت لے گئے ہیں میں نے بلند آواز سے کہا: اے عبداللہ بن مسعود! یہ اس وجہ سے ہے کہ میں عجمی ہوں آپ نے ان کو قریب کیا ہے اور مجھے دور کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: قریب ہو، میں قریب ہوا حتیٰ کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی بیٹھنے والا نہ تھا میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا: بندے یا بندی کا ہاتھ قیامت کے دن پکڑا جائے گا اولین و آخرین کے

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 18، صفحہ 66

2۔ ایضاً، جز 18، صفحہ 67

سروں پر اسے کھڑا کیا جائے گا پھر نداد ینے والا ندا دے گا: یہ فلاں بن فلاں ہے جس کے لیے حق ہو وہ اپنے حق کی طرف آئے عورت خوش ہوگی کہ اس کے لیے حق اس کے باپ پر یا اس کے خاوند پر یا اس کے بھائی پر یا اس کے بیٹے پر پھیرا جائے گا، پھر حضرت ابن مسعود نے یہ پڑھا: فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ۝ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان کے حقوق لاؤ۔ وہ کہیں گے: یارب! دنیا فنا ہوگئی ہے۔ پس میں ان کے حقوق کہاں سے لاؤں؟ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کی نیکیوں سے لو اور ہر انسان کو اس کے مطالبہ کی مقدار دے دو۔ اگر وہ اللہ کا ولی ہوگا ایک رائی کے دانہ کی مقدار نیکیاں ہوں گی تو اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا بڑھا دے گا حتی کہ اس کے ذریعے اسے جنت میں داخل کرے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود نے یہ پڑھا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ (النساء) اگر وہ شقی ہوگا تو فرشتے کہیں گے یارب! اس کی نیکیاں ختم ہوگئی ہیں اور مطالبہ کرنے والے باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: حق طلب کرنے والے کے برے اعمال میں سے لے کر اس کی برائیوں کے ساتھ ملا لو اور اس کے لیے جہنم کا پروانہ لکھ دو(1)۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝

"البتہ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب و کامران ہوں گے۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے"۔

اس پر کلام گزر چکی ہے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ۝ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝

"بری طرح جھلس دے گی ان کے چہروں کو آگ اور وہ اس میں دانت نکالے ہوں گے۔ (اب منہ کیوں بسورتے ہو؟) کیا ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ۔ کہا جاتا ہے: تنفح دونوں کا ایک معنی ہے اسی سے ہے وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ (الانبیاء: 46) مگر تلفح تکلیف کے اعتبار سے زیادہ ہے کہا جاتا ہے: لفحته النار والسموم بحرها یعنی آگ نے اسے جلا دیا اور گرم ہوا نے اپنی گرمی سے جلا دیا۔ لفحته بالسيف لفحة جب کوئی آہستہ سے کسی کو تلوار مارے وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے منہ بسورنے والے۔ اہل لغت نے کہا: یبوست میں دانت نکالنے کو الکلوح کہتے ہیں الکالح جس کے ہونٹ سکڑ گئے ہوں اور دانت باہر نکل آئے ہوں۔ اعشی نے کہا:

ولہ المُقْدَمُ لا مِثْلَ لہ ساعةَ الشِّدْقِ عن النّاب كَلَحْ

1۔ حلیۃ الاولیاء، ابونعیم، جلد 4، صفحہ 202-201

کلح الرجل کلوحا و کلاحا، وماأقبح کلحته۔ اس سے مراد منہ اور اس کے اردگرد کا حصہ سکوڑنا ہے۔ دھر کالح، سخت زمانہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وَهُمْ فِيهَا كٰلِحُوْنَ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے ہونٹ سکڑ گئے ہوں اور اس کی پیپ بہ گئی ہو۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: کیا آپ نے اس سر کی طرف نہیں دیکھا جسے آگ کے ساتھ کنگھی کی جائے گی اور ان کے دانت نکلے ہوئے ہوں گے اور ہونٹ خشک ہو چکے ہوں گے۔ امام ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَهُمْ فِيهَا كٰلِحُوْنَ آگ اسے بھون دے گی اس کا اوپر والا ہونٹ سکڑ جائے گا (1) حتیٰ کہ وہ سر کے درمیان تک پہنچ جائے گا اور نیچے والا ہونٹ اس کی ناف تک پہنچ جائے گا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

"(معذرت کرتے ہوئے) کہیں گے: اے ہمارے رب! غالب آگئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے اے ہمارے مالک! ہمیں نکال اس سے پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے۔ جواب ملے گا: پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات شقوتنا ہے اور عاصم کے سوا کوفیوں نے شقاوتنا پڑھا ہے؛ یہ قرأت حضرت ابن مسعود اور حسن سے مروی ہے۔ کہا جاتا ہے: شقاء و شقا مد اور قصر کے ساتھ اور اس کے معنی میں بہتر قول یہ ہے کہ ہم پر ہماری لذات و خواہشات نفسانی غالب آگئیں۔ لذات اور خواہشات کو شقوۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ شقاوت تک پہنچاتی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (النساء: 10) کیونکہ یہ عمل انہیں آگ کی طرف لے جاتا ہے اس لئے فرمایا وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو ہماری شقاوت تیرے علم میں پہلے تھی اور ام الکتاب میں ہمارے اوپر شقاوت لکھی گئی تھی۔ بعض نے فرمایا: شقاوت سے مراد یہ ہے کہ ہم پر اپنی ذات کے بارے میں حسن ظن اور مخلوق پر سوء ظن کا خیال غالب آگیا۔ وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ہم اپنے فعل میں ہدایت سے گمراہ تھے۔ یہ ان کی طرف سے عذر نہیں بلکہ یہ اقرار ہے۔ اس پر دلیل یہ قول ہے: رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ وہ دنیا کی طرف لوٹنا طلب کریں گے جیسے موت کے وقت انہوں نے دنیا کی طرف لوٹنا طلب کیا تھا۔ فَاِنْ عُدْنَا اگر ہم کفر کی طرف لوٹے فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ تو کفر کی طرف لوٹنے کی وجہ سے ظلم کرنے والے ہوں گے تو انہیں ہزار سال کے بعد جواب دیا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ جہنم میں دور چلے جاؤ جیسے کتے کو کہا جاتا ہے: اخسأ دور چلا جا، خسأت الکلب خساء کا مطلب ہے میں نے کتے کو دھتکارا۔ خسا الکلب بنفسه خسوا۔ کبھی یہ متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ انخسا الکلب بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابن المبارک نے کہا: ہمیں سعید بن ابو عروبہ نے بتایا انہوں نے قتادہ سے روایت کیا انہوں نے ابو ایوب سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن

1۔ جامع ترمذی، صفۃ طعام اہل النار، جلد 2، صفحہ 82۔ ترمذی، حدیث 3100، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمرو بن عاص سے روایت کیا فرمایا: اہل جہنم، مالک جہنم کے فرشتہ کو پکاریں گے وہ انہیں چالیس سال جواب نہیں دے گا پھر ان پر یہ لوٹائے گا کہ تم یہاں ٹھہرنے والے ہو۔ فرمایا: پھر وہ اپنے رب کو پکاریں گے اور کہیں گے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّيْنَ۔ پھر اللہ تعالیٰ ان پر یہ لوٹائے گا۔ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا۔ فرمایا: اللہ کی قسم! اس کے بعد قوم ایک کلمہ بھی نہیں کہہ سکے گی اور جہنم کی آگ میں صرف چیخ و پکار ہی ہوگی۔ ان کی آواز کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کی ابتدائی آواز کو زفیر اور آخری آواز کو شہیق کہتے ہیں۔ اس روایت کو امام ترمذی نے مرفوع حضرت ابوالدرداء کی حدیث کے ہم معنی روایت کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: آگ میں کفار کی آواز گدھے کی آواز کی طرح ہوگی اس کا اول زفیر اور آخر شہیق کہلاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کفار کیلئے کتے کی طرح بھونکنا ہوگا۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: مجھے خبر پہنچی ہے یا مجھے ذکر کیا گیا ہے کہ دوزخی، دوزخ کے فرشتوں سے مدد طلب کریں گے۔ یہ طویل خبر ہے۔ اس کو ابن المبارک نے ذکر کیا ہے مکمل التذکرہ کتاب میں ذکر کی ہے اور اس کے آخر میں ہے پھر پہلے وہ انہیں کوئی جواب نہ دے گا جتنا عرصہ اللہ چاہے گا پھر انہیں ندا دے گا: اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ فرمایا: جب وہ اللہ تعالیٰ کی آواز سنیں گے تو کہیں گے: اب ہمارا پروردگار ہم پر رحم فرمائے گا۔ وہ اس وقت کہیں گے: رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا یعنی ہم پر ہماری کتاب غالب آگئی جو ہم پر لکھی گئی تھی۔ وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ اس وقت ان کی پکار اور دعا ختم ہو جائے گی وہ ایک دوسرے پر کتے کی طرح بھونکیں گے اور پھر جہنم ان پر بند کر دی جائے گی۔

**اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾**

''(تمہیں یاد ہے) ایک گروہ میرے بندوں سے ایسا تھا جو عرض کیا کرتا تھا: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں سو تو بخش دے ہمیں اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا حتی کہ اس مشغلہ نے غافل کر دیا تمہیں میری یاد سے اور تم ان پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ میں نے بدلہ دے دیا انہیں آج ان کے صبر کا (ذرا دیکھو) وہی ہیں مراد کو پانے والے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا مجاہد نے کہا: اس سے مراد حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت صہیب اور فلاں اور فلاں کمزور مسلمان ہیں۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی، مسلمانوں سے مذاق کرتے تھے۔ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا نافع، حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ جن میں ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عمرو نے ان کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے سین کے کسرہ کے ساتھ استہزء کی جہت سے بنایا ہے اور سین کے ضمہ کے ساتھ سخرۃ کی جہت سے بنایا ہے، خلیل، سیبویہ، کسائی اور فراء نے اس تفریق کو نہیں جانا

کسائی نے کہا یہ ہم معنی ہیں جیسے کہا جاتا ہے عُصِیّ دعِصِیّ و لُجّیّ و لِجّیّ۔ ثعلبی نے کسائی اور فراء سے حکایت کیا ہے کہ وہ فرق جو ابوعمرو نے حکایت کیا ہے سین کے کسرہ کے ساتھ استہزا کے معنی میں ہے اور زبان سے مذاق کرنے کے معنی میں ہے اور ضمہ کے ساتھ تسخیر اور بالفعل استعباد کے معنی میں ہے۔ مبرد نے کہا: عربوں سے معانی کے درمیان تفریق لی جاتی ہے رہی تاویل تو اس میں تفریق نہ ہوگی۔ اور سخری میں کسرہ دونوں کیلئے ہے کیونکہ اس جیسے لفظ میں ضمہ ثقیل ہوتا ہے۔ حَتّٰۤی اَنْسَوْکُمْ ذِکْرِیْ حتی کہ تم نے ان سے استہزا کی وجہ سے انہیں میرے ذکر سے مشغول کر دیا۔ وَ کُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ان سے استہزا کرتے ہوئے ہنستے تھے۔ الانساء کو مومنین کی طرف مضاف کیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ان کی مشغولیت کا سبب تھے مومنین سے کفار کے استہزا کی نحوست ان کے دلوں پر کفر کے غلبہ کی طرف متعدی ہوئی۔ اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا تمہاری اذیت پر جو انہوں نے صبر کیا اس پر آج میں انہیں جزا دوں گا اور جو انہوں نے میری طاعت پر صبر کیا۔ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ حمزہ اور کسائی نے ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدح کے طور پر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی لأنهم هم الفائزون۔ اور اس پر جزا کے وقوع کی وجہ سے نصب پڑھنا بھی جائز ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی إنی جزیتهم الیوم الفوز بالجنة، میں کہتا ہوں: یہی مفہوم سورۃ المطففین کے آخر میں فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ﴿﴾ (مطففین) میں دیکھا جائے گا۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے ضعیفوں مساکین کے ساتھ استہزاء نہیں کرنا چاہیے اور انہیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور ان کی وجہ سے لایعنی قول و فعل میں مشغول نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہے۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: (ذرا بتاؤ) کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے؟۔ کہیں گے: ہم ٹھہرے تھے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے۔ ارشاد ہوگا: نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ کاش! تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قبور میں رہنے کے متعلق سوال ہوگا۔ بعض نے کہا: دنیا میں مدت حیات کے بارے میں سوال ہوگا یہ سوال مشرکین کیلئے قیامت کے عرصات میں یا دوزخ میں ہوگا۔ عَدَدَ سِنِیْنَ ﴿﴾ نون کے فتحہ کے ساتھ کہ یہ جمع سالم ہے اور بعض عرب اسے جر دیتے ہیں اور تنوین دیتے ہیں۔ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ عذاب کی شدت انہیں قبور میں ٹھہرنے کی مدت بھلا دے گی۔ بعض نے کہا: چونکہ ان سے دونوں نفخوں کے درمیان عذاب اٹھا لیا جائے گا تو وہ قبور میں عذاب کو بھول جائیں گے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس عذاب میں وہ تھے نفخہ اولی سے نفخہ ثانیہ تک وہ انہیں بھلا دے گا کیونکہ جس کو کسی نبی نے قتل کیا یا کسی نے نبی کو قتل کیا یا نبی کی موجودگی میں قتل کیا گیا تو اس مرنے کے وقت سے لے کر نفخہ اولی یعنی پہلا صور پھونکنے تک عذاب دیا جائے گا پھر ان سے عذاب دور کیا جائے

گا۔ پس وہ پانی کی طرح ہو گا حتی کہ دوسرا صور پھونکا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے دنیا میں ٹھہرنے کی مدت اور قبور میں رہنے کے عرصہ کو کم جانا اور اسے تھوڑا سمجھا اس عذاب کی نسبت جس میں وہ مبتلا تھے۔ فَسۡـَٔلِ الۡعَآدِّيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ حساب لگانے والوں سے پوچھ جو حساب کو جانتے ہیں ہم تو اسے بھول چکے ہیں یا یہ مراد ہے کہ ان فرشتوں سے پوچھ جو دنیا میں ہمارے ساتھ تھے۔ پہلا قول قتادہ کا ہے اور دوسرا قول مجاہد کا ہے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے قل کم لبثتم فی الارض پڑھا ہے یعنی امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ تین معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ (۱) قولوا کم لبثتم تم بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے۔ تو کلام ایک کو حکم دینے کیلئے ذکر کی گئی جب کہ مراد جماعت ہے، کیونکہ یہی معنی مفہوم ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ فرشتے کو حکم ہو کہ ان سے قیامت کے روز دنیا میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں پوچھو یا یہ مراد ہو کہ بتا اے کافر! تم کتنا عرصہ ٹھہرے؟ یہ تیسرا قول ہے۔ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ قال پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا یا فرشتوں نے انہیں کہا: تم کتنا عرصہ ٹھہرے؟ حمزہ اور کسائی نے بھی قل ان لبثتم الا قلیلا پڑھا ہے باقی قراء نے قال خبر کی بنا پر پڑھا ہے جیسا کہ ابتدا میں تفسیر میں ذکر کیا گیا یعنی تم نہیں ٹھہرے زمین میں مگر تھوڑا عرصہ۔ یہ اس لیے کہ ان کا قبور میں ٹھہرنا اگرچہ لمبا تھا لیکن متناہی تھا۔ بعض نے کہا: آگ میں ٹھہرنے کی نسبت یہ عرصہ کم تھا کیونکہ اس کی حد نہیں ہے۔ لَّوۡ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ یعنی کاش! تم اس حقیقت کو جانتے۔

## اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾

"کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہمارے طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں مہمل پیدا کیا ہے جیسے جانور پیدا کیے گئے پس جنکے لیے نہ ثواب ہے اور نہ عقاب یہ اس قول کی مثل ہے۔ اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ (القیامہ) یعنی جانور کی طرح مہمل بغیر فائدہ کے چھوڑ دیا جائے گا۔ ترمذی حکیم ابو عبد اللہ محمد بن علی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو غلام پیدا کیا تا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ پس وہ عبادت پر ثواب دے گا اور عبادت کے ترک پر عذاب دے گا اگر وہ اس کی عبادت کریں گے تو آج اس کے آزاد معزز اور دنیا کی غلامی سے آزاد بندے ہوں گے اور دار السلام میں بادشاہ ہوں گے۔ اگر عبودیت کو ترک کریں گے تو وہ آج بھاگے ہوئے غلام اور گرے ہوئے اور گھٹیا لوگ شمار ہوں گے اور کل آگ کے طبقوں میں قید دشمن ہوں گے۔ عَبَثًا۔ سیبویہ کے نزدیک اور قطرب کے نزدیک حال کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: مصدر کی بنا پر منصوب ہے یا مفعول لہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ وَّ اَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾ پس انہیں ان کے اعمال کی جزا دی جائے گی۔ حمزہ اور کسائی نے ترجعون تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

## فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ‌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ ﴿۱۱۶﴾

"پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے (بے مقصد تخلیق سے) نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عزت والے عرش کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ اللہ تعالیٰ جو مالک حقیقی ہے وہ پاک ہے اولاد، شرکاء اور مد مقابل سے اور کسی

چیز کو بے مقصد اور بے حکمت پیدا کرنے سے کیونکہ وہ حکیم ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ قرآن میں اس کے علاوہ کسی جگہ اس طرح نہیں ہے۔ ابن محیص اور ابن کثیر سے الکریم رفع کے ساتھ مروی ہے اور اسے اللہ کی صفت بنایا ہے۔

وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

''اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے بلاشبہ نہیں کامیاب ہوں گے حق کا انکار کرنے والے۔ اور (اے محبوب!) آپ (یوں) عرض کرو: میرے رب! بخش دے (میری گنہگار امت کو) اور رحم فرما (ہم سب پر) اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ یعنی اسکے لیے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وہ اسے سزا دے گا اور محاسبہ کرے گا۔ انہ ضمیر شان ہے۔ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ حسن اور قتادہ نے لا یفلح فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس نے تکذیب کی اور انکار کیا اس کا جو میں نے بھیجا ہے اور جس نے میری نعمتوں کی ناشکری کی وہ کامیاب نہ ہوگا۔ پھر اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ استغفار کرو تا کہ آپ کی امت آپ کی اقتدا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: استغفار کا حکم آپ کی امت کیلئے ہے۔ ثعلبی نے ابن لہیعہ کی حدیث مسند روایت کی ہے ابن لہیعہ نے عبد اللہ بن ہبیرہ سے انہوں نے حنش بن عبد اللہ صنعانی سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک مصیبت میں مبتلا شخص کے پاس سے گذرے تو انہوں نے اس کے کان میں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا الخ۔ پڑھ دیا تو وہ ٹھیک ہو گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اس کے کان میں کیا پڑھا ہے''۔ حضرت ابن مسعود نے بتایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر کوئی شخص جو یقین رکھتا ہو وہ اسے پہاڑ پر پڑھے تو وہ اپنی جگہ سے زائل ہو جائے''۔

# سورۃ النور

آیاتہا ۶۴ ۲۴ سورۃ النور مدنیۃ ۱۰۲ رکوعاتہا ۹

بالاجماع یہ مدنی سورت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

''یہ (ایک عظیم الشان) سورت ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے اور ہم نے فرض کیا ہے اس (کے احکام) کو اور ہم نے اتاری ہیں اس میں روشن آیتیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو''۔

اس سورت کا مقصود عفت اور پردہ پوشی کے احکام کا ذکر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو لکھا کہ اپنی عورتوں کو سورۃ النور سکھاؤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: عورتوں کو بالا خانوں میں نہ ٹھہراؤ اور نہ انہیں کتابت سکھاؤ اور انہیں سورۃ النور اور سوت کاتنا سکھاؤ(1)۔ وَ فَرَضْنٰهَا را کی تخفیف کے ساتھ پڑھا گیا ہے یعنی ہم نے تم پر اور تمہارے بعد میں آنے والوں پر اس سورت میں موجود احکام فرض کیے ہیں اور راء کی شد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہم نے اس سورت میں مختلف فرائض نازل کیے ہیں۔ ابوعمرو نے فرّضناها تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا اتارا ہے۔ الفرض کا معنی القطع بھی ہے اسی سے فرضة القوس ہے کمان کا حصہ، فرائض میراث کے مقررہ حصص۔ فرض النفقه خرچہ کا حصہ فرضنا یعنی ہم نے اسے علیحدہ واضح طور پر بیان کیا۔ بعض نے کہا: تشدید تکثیر کے لیے ہے یعنی اس میں کثرت سے فرائض ہیں۔ لغت میں سورت بلند مرتبہ کا نام ہے اسی وجہ سے قرآن کی سورت کہا جاتا ہے؛ زہیر نے کہا:

ألم تر ان الله أعطاك سورة ترى كلّ مَلْكٍ دونها يتذبذب(2)

کتاب کے مقدمہ میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ سورة کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر أنزلناها ہے، یہ ابوعبیدہ اور اخفش کا قول ہے۔ زجاج اور فراء اور مبرد نے کہا: سورة مرفوع ہے کیونکہ مبتدا کی خبر ہے(3) کیونکہ یہ نکرہ ہے اور نکرہ کے ساتھ آغاز نہیں کیا جاتا، یعنی هذه سورة۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ سورة مبتدا ہو اور اس کے بعد والا کلام اس کی صفت ہو جس نے اسے نکرہ محضہ کی تعریف سے خارج کر دیا پس اس کے ساتھ ابتداء درست ہے اور اس کی خبر اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ ہوگی۔ سورة نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس کی تقدیر اس طرح ہوگی أنزلنا سورة أنزلناها۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 361 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 70

3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 361

الذئب أخشاه إن مررتُ به    وَحْدِي وأخشى الرياح والمطر

یا فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب ہوگی (1) یعنی اتل سورۃ، فراء نے کہا: یہ ھاء اور الف سے حال ہے۔ اور ضمیر سے حال ہو تو اس کا ذوالحال سے مقدم کرنا جائز ہوتا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

”جو عورت بدکار ہو اور جو مرد بدکار ہو تو لگاؤ ہر ایک کو ان دونوں میں سے سو (سو) درے اور نہ آئے تمہیں ان دونوں پر (ذرا) رحم اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر اور چاہیے کہ مشاہدہ کرے دونوں کی سزا کو اہل ایمان کا ایک گروہ“۔

اس میں بائیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ زنا لغت میں شریعت سے پہلے بھی معروف تھا جیسے سرقہ (چوری) اور قتل کے اسم پہلے موجود تھے۔ زنا کا مطلب ہے مرد کا عورت کی فرج (شرمگاہ) میں بغیر نکاح اور بغیر شبہ نکاح کے عورت کی رضا کے ساتھ جماع کرنا۔ اگر تو چاہے تو یوں بھی کہہ سکتا ہے فرج کا طبعاً مشتہی فرج میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو۔ جب ایسی صورت ہو تو حد واجب ہوتی ہے۔ زنا کی حد اور اس کی حقیقت اور اس کے متعلق علماء کے اقوال گزر چکے ہیں یہ آیت حبس کی آیت اور اذیت والی آیت جو سورۂ نساء میں ہے ان کے لیے بالاتفاق ناسخ ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ یہ آزاد، بالغ، غیر شادی شدہ زنا کرنے والے کی حد ہے۔ اسی طرح آزاد، بالغہ، غیر شادی شدہ عورت کی حد ہے اور سنت سے ایک سال کی جلاوطنی بھی ثابت ہے۔ اس جلاوطنی میں اختلاف ہے اور لونڈیاں اگر زنا کریں گی تو ان پر پچاس درے ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء: 25) یہ لونڈی کے بارے میں ہے۔ اور غلام بھی اسی کے معنی میں ہے۔ رہا آزاد لوگوں میں سے شادی شدہ تو اس پر کوڑے نہیں رجم ہوگا۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ پہلے اسے سو کوڑے مارے جائیں گے پھر اسے رجم کیا جائے گا یہ سب کچھ سورۃ النساء میں تفصیلاً گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جمہور نے اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ عیسیٰ بن عمر ثقفی نے الزانیۃ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ سیبویہ کے نزدیک زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی طرح ہے: زیداً اضرب۔ اور سیبویہ کے نزدیک رفع کی وجہ یہ ہے کہ یہ مبتدا کی خبر ہے تقدیر اس طرح ہوگی فیما یتلی علیکم حکم الزانیۃ والزانی۔ رفع پر علماء کا اجماع ہے اگرچہ سیبویہ کے نزدیک قیاس نصب تھا فراء، مبرد اور زجاج کے نزدیک رفع زیادہ بہتر ہے اور خبر فَاجْلِدُوْا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 160

کے قول میں ہے کیونکہ اس کا معنی ہے الزانیة والزانی مجلودان بحکم الله۔ بدکارہ عورت اور بدکار مرد کو الله کے حکم سے کوڑے لگائے جائیں گے۔ یہ عمدہ قول ہے اور یہ اکثر نحویوں کا قول ہے۔ اگر تو چاہے تو خبر مقدر کرے ینبغی ان یجلدا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے الزان بغیر یاء کے پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** الله تعالیٰ نے مذکر اور مونث کا ذکر کیا حالانکہ الزانی کا لفظ دونوں کی طرف سے کافی تھا۔ بعض علماء نے کہا: دونوں کا ذکر تاکید کے لیے ہے جیسے فرمایا۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (المائدہ:38) یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں کا ذکر اس لیے فرمایا تا کہ کوئی گمان کرنے والا یہ گمان نہ کرے کہ مرد وطی کرنے والا تھا اور عورت محل وطی تھی اس لیے وہ وطی کرنے والی نہیں اس لیے اس پر حد واجب نہ ہوگی تو اس اشکال کو دور کرنے کے لیے دونوں کا ذکر فرمایا۔ یہ اشکال علماء کی ایک جماعت نے وارد کیا ہے جن میں امام شافعی بھی ہیں انہوں نے کہا: رمضان میں عورت پر وطی کی صورت میں کفارہ نہیں ہے کیونکہ ایک شخص نے کہا میں نے رمضان شریف میں دن کے وقت اپنی بیوی سے مجامعت کی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کفر تو کفارہ دے۔ اس کو آپ نے کفارہ کا حکم دیا۔ عورت نہ مجامعت کرنے والی ہے اور نہ وطی کرنے والی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اَلزَّانِيَةُ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں عورتوں کا زنا عام تھا عربوں کی لونڈیوں اور فاحشہ عورتوں کے گھروں پر جھنڈے لگے ہوتے تھے اور وہ سر عام زنا کرتی تھیں۔ بعض علماء نے کہا: چونکہ عورتوں میں زنا زیادہ عار کا باعث ہے یہ اسی کی وجہ سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ بعض نے کہا: عورت میں شہوت زیادہ ہوتی ہے اور اس پر شہوت غالب ہوتی ہے اس کا پہلے ذکر کیا تا کہ وہ شہوت سے رک جائے اگرچہ عورت میں حیاء رکھا گیا ہے لیکن جب وہ زنا کرتی ہے تو اس کا حیاء ختم ہو جاتا ہے نیز عورتوں کی وجہ سے عار زیادہ لاحق ہوتی ہے کیونکہ ان کا موضوع پردہ اور حفاظت ہے اس لیے تغلیظا اور اہتماما ان کا پہلے ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اَلزَّانِيَةُ اور الزَّانِيْ پر الف لام جنس کے لیے ہے۔ یہ عام ہے اور تمام بدکاروں کو شامل ہے۔ اور جنہوں نے رجم کے ساتھ دروں کا قول کیا ہے انہوں نے کہا: سنت میں حکم کی زیادتی آئی ہے پس کوڑوں کے ساتھ رجم بھی ہو گا؛ یہ اسحاق بن راہویہ، حسن بن ابی الحسن کا قول ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شراحہ سے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: یہ غیر شادی شدہ کے ساتھ خاص ہے۔ انہوں نے غلاموں اور لونڈیوں کے خروج کی وجہ سے اس کے غیر عام ہونے پر استدلال کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** الله تعالیٰ نے اس سزا پر نص قائم فرمائی جو بدکاری کرنے والوں پر واجب ہوگی جب ان کے خلاف گواہی قائم ہو جائے گی جیسا کہ آگے آئے گا۔ علماء کا اس قول پر اجماع ہے اور اس میں اختلاف ہے ایک شخص ایک عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں پایا جائے تو اس پر کیا واجب ہے؟ اسحاق بن راہویہ نے کہا: ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگائے جائیں گے؛ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ ان دونوں حضرات سے ثابت نہیں ہے۔ عطا اور سفیان ثوری نے کہا: ان کو ادب سکھایا جائے گا؛ یہی امام مالک اور امام احمد کا قول ہے جیسا کہ ادب میں ان کے مذاہب کی قدر پر

ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جو اس حالت میں پایا جائے اس پر ادب ہے۔ اس میں جو مختار ہے وہ سورہ ہود میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاجْلِدُوْا فاء داخل ہوئی ہے کیونکہ یہ امر کی جگہ ہے اور امر شرط کے لیے مضارع ہے۔ مبرد نے کہا: اس میں جزا کا معنی ہے، یعنی اگر زنا کرنے والا زنا کرے تو اس کے ساتھ ایسا کرو، اسی وجہ سے فا داخل ہوئی اسی طرح وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا (المائدہ:38) ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس امر کے ساتھ مخاطب امام اور اس کا نائب ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: ہر کوڑے اور قطع میں یہ حکم ہے۔ امام مالک نے فرمایا کوڑوں میں ہے، قطع میں یہ حکم نہیں۔ بعض نے کہا: یہ خطاب مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ دین کے مراسم کو قائم کرنا مسلمانوں پر واجب ہے پھر امام ان کے قائم مقام ہوتا ہے کیونکہ حدود کے قائم کرنے پر اجتماع ممکن نہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ علماء کا اجماع ہے کوڑے مارنا دُرّے کے ساتھ واجب ہے اور وہ کوڑا درمیانی صورت میں ہوگا نہ بہت سخت اور نہ بہت زیادہ نرم۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے(1) کہ ایک شخص نے عہد رسالت میں زنا کا اعتراف کیا تو آپ ﷺ نے اس کے لیے ایک کوڑا منگوایا تو آپ کے پاس ٹوٹا ہوا کوڑا لایا گیا آپ نے فرمایا: ''اس سے بہتر ہو'۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو زیادہ تیز تھا۔ آپ نے فرمایا: ''اس سے کم ہو' پھر کوڑا لایا گیا جو درمیانی قسم کا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ مارنے کا حکم دیا۔ ابو عمر نے کہا: مؤطا کے تمام رواۃ نے اس حدیث کو اسی طرح مرسل روایت کیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کے ساتھ متصل سند سے مروی ہے۔ معمر نے یحییٰ بن کثیر سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ سورہ المائدہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قدامہ کو شراب پینے کی وجہ سے مکمل کوڑے سے مارنا گزر چکا ہے، یعنی متوسط کوڑے سے مارا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ زنا میں سزا پانے والے کے کپڑے اتارے جائیں گے یا نہیں؟ امام مالک، امام ابوحنیفہ وغیرہما کا قول ہے کہ اس کے کپڑے اتارے جائیں گے اور عورت پر وہ لباس رہنے دیا جائے گا جو باعث پردہ ہو نہ کہ وہ جو اسے ضرب سے بچائے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: امام کو اختیار ہے چاہے تو اس کے کپڑے اتارے چاہے تو نہ اتارے۔ شعبی اور نخعی نے کہا: اس کے کپڑے نہیں اتارے جائیں گے لیکن اس پر قمیص چھوڑی جائے گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس امت میں کپڑے اتارنا اور لمبا کرنا نہیں ہے؛ یہی ثوری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ علماء کا مردوں اور عورتوں کو ضرب لگانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: مرد اور عورت تمام حدود میں برابر ہیں ان میں کوئی کھڑا نہیں کیا جائے گا اور یہ صرف پیٹھ پر لگائی جائے گی۔ اصحاب الرائے اور امام شافعی کا خیال ہے کہ مرد کو کھڑا کر کے کوڑے لگائے جائیں گے، یہی حضرت علی بن ابی طالب کا قول ہے۔ لیث بن سعد، امام

---

1۔ مؤطا امام مالک، ماجاء فیمن اعترف علی نفسہ بالزنا، صفحہ 286

ابو حنیفہ اور امام شافعی نے کہا: تمام حدود میں اور تعزیر میں لٹائے بغیر کھڑا کر کے کپڑے اتار کر سزا دی جائے گی سوائے حد قذف کے۔ اسے مارا جائے گا جب کہ اس پر کپڑے ہوں گے؛ یہ مہدوی نے التحصیل میں امام مالک سے روایت کیا ہے اس سے پوستین اور جیکٹ وغیرہ اتار لی جائے گی۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر اس کو لٹانے میں صلاح ہو تو اسے لٹایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ ان مواضع میں اختلاف ہے حدود میں انسان کو جہاں مارا جائے گا؟ امام مالک نے کہا: ساری حدود کی سزا پیٹھ پر دی جائے گی اور یہی حکم تعزیر کا بھی ہے (1)۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: چہرے اور شرمگاہ کو بچایا جائے گا اور باقی تمام اعضاء پر مارا جائے گا (2)؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لونڈی کی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا جسے زنا میں کوڑے لگنے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس پر اجماع ہے کہ چہرے، شرمگاہ اور ایسی جگہ پر نہیں مارا جائے گا جس کی وجہ سے مرنے کا اندیشہ ہو، سر پر مارنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور نے کہا: سر کو بچایا جائے گا۔ حضرت عمر نے صبیغ بن عسل کو سر پر مارا اور یہ تعزیر تھی، حد نہیں تھی۔ امام مالک کی حجت میں سے یہ ہے جس پر لوگوں کو انہوں نے پایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "دلیل پیش کرو ورنہ پیٹھ پر حد لگے گی" (3)۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ ایسی ضرب لگانا واجب ہے جو تکلیف تو پہنچائے مگر زخمی نہ کرے نہ عضو کو کاٹے اور مارنے والا اپنا ہاتھ اپنی بغل کے نیچے سے نہ نکالے، یہی جمہور کا قول ہے یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حد کے سلسلہ میں ایک شخص کو لایا گیا آپ نے درمیانہ کوڑا منگوایا اور مارنے والے کو کہا: تو اسے مار لیکن تیری بغل نظر نہ آئے اور ہر عضو کو اس کا حق دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شرابی لایا گیا آپ نے فرمایا: میں تجھے ایسے شخص کے پاس بھیجوں گا جسے تم پر نرمی نہ آئے گی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کو مطیع بن اسود عدوی کی طرف بھیجا اور فرمایا جب تو کل صبح کرے تو اسے حد لگانا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو وہ اسے سخت کوڑے مار رہا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے آدمی کو قتل کر دیا، تو نے اسے کتنی ضربیں لگائی ہیں؟ اس نے کہا: ساٹھ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیس باقی ہیں ان کے بدلے میں اس شدت کو کر دے جو تو نے اسے پہنچائی ہے اور مزید بیس کوڑے نہ لگاؤ۔ اس حدیث سے یہ سمجھ آتا ہے کہ شراب، پینے والے کو سخت کوڑے نہیں مارے جائیں گے۔ حدود میں سخت ضرب کس حد میں ہوگی؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور لیث بن سعد نے کہا: تمام حدود میں ضرب برابر ہے۔ وہ ضرب زخمی کرنے والی نہ ہوگی اور درمیانی ضرب ہوگی؛ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور اس کے اصحاب نے کہا: تعزیر کی ضرب سخت ترین ضرب ہے اور زنا کی ضرب شراب کی ضرب سے سخت ہے اور شراب پینے والے کی ضرب قذف کی ضرب سے سخت ہے (4)۔ ثوری نے کہا: زنا کی ضرب قذف کی ضرب سے سخت ہے اور قذف کی ضرب شراب کی ضرب سے سخت ہے (5)۔ امام

---

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 363	2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، إذا ادعى أو قذف فله ان يلتمس البينة وينطلق لطلب البينة، جلد 1، صفحہ 367

4۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 363	5۔ ایضاً

مالک نے کوڑوں کی تعداد پر توقیف کے ورود سے حجت پکڑی ہے۔ اور حدود میں سے کسی حد میں تخفیف اور تثقیل وارد نہیں ہے اس شخص کے متعلق جس کے لیے تسلیم ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے حجت پکڑی ہے کہ تعزیر میں ضرب، زنا کی ضرب سے شدید ہوگی۔ ثوری نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ زنا میں جب کوڑوں کی تعداد زیادہ ہے تو یہ محال ہے کہ قذف تکلیف میں زیادہ ہو اسی طرح شراب ہے کیونکہ شراب میں حد اجتہاد سے ثابت ہے اور مسائل اجتہاد مسائل توقیف سے زیادہ قوت والے نہیں ہوتے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ وہ حد جو اللہ تعالیٰ نے زنا، شراب اور قذف میں واجب کی ہے مناسب ہے کہ وہ حکام کے سامنے لگائی جائے اور اسے فضلاء اور خیار لوگ قائم کریں جن کو امام منتخب کرے اسی طرح صحابہ کرام کرتے تھے جب ان کے لیے کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ یہ قاعدہ شرعیہ اور قربت تعبدیہ کے ساتھ قائم کی جاتی ہے پس اس کے فعل۔ اس کی مقدار، محل اور حال پر محافظت واجب ہے تا کہ اپنی شروط اور احکام سے کوئی چیز تجاوز نہ کرے کیونکہ مسلم کا خون اور اس کی حرمت بہت زیادہ ہے پس جتنا ممکن ہو سکے اس کی رعایت کرنا واجب ہے۔ صحیح میں حضین بن منذر ابی ساسان سے مروی ہے فرمایا: میں عثمان بن عفان کے پاس موجود تھا، ولید کو لایا گیا اس نے صبح کی دو رکعتیں پڑھائیں پھر کہا: کیا میں تمہیں زیادہ پڑھاؤں۔ ولید کے خلاف دو آدمیوں نے گواہی دی ایک نے گواہی دی کہ اس نے شراب پی تھی، دوسرے نے گواہی دی اس نے اس کو قئی کرتے دیکھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس نے قئی نہیں کی حتی کہ اس نے شراب پی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اٹھو اور اسے کوڑے لگاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے حسن! اٹھو اور اسے کوڑے لگاؤ، حسن نے کہا: یہ کام اس کے سپرد کرو جن کو یہ خلافت اچھی لگتی ہے، گویا حضرت حسن نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عبد اللہ بن جعفر! تم اٹھو اور اس کو کوڑے لگاؤ۔ پس حضرت عبد اللہ بن جعفر نے اسے کوڑے لگائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں شمار کیا(1)۔ سورۃ المائدہ میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اٹھو اور اسے کوڑے لگاؤ۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ نے قذف اور زنا میں کوڑوں کی تعداد پر نص قائم فرمائی ہے اور شراب میں اسی کوڑوں پر تمام صحابہ کی موجودگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے توقیف ثابت ہے۔ پس ان میں حد سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ اس وقت تک ہے جو لوگ شر میں مگن نہ ہوں اور انہیں گناہ میں لذت نہ ہو لیکن جب وہ گناہوں کو عادت بنالیں اور بار بار گناہ کریں حد کو آسان سمجھیں اور وہ برائی سے باز نہ آئیں تو پھر شدت متعین ہو جائے گی اور گناہ کی زیادتی کی وجہ سے حد زیادہ کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان میں ایک نشئی کو لایا گیا تو آپ نے اسے سو کوڑے لگائے، اسی شراب کی حد کے طور پر اور بیس رمضان کی حرمت توڑنے پر پس جنایات کی تغلیظ اور حرمات کی ہتک پر سزائیں مرکب کرنا واجب ہے۔ ایک شخص نے بچے کے ساتھ بدمعاشی کی تو والی نے اسے تین سو کوڑے مارے۔ امام مالک کو جب اس کی خبر پہنچی تو آپ نے اسے تبدیل نہیں کیا پھر اگر امام ہمارے زمانہ میں حرمات کی ہتک اور گناہوں کی بھرمار اور برائیوں پر تعاون اور حدود کی بیع اور

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 1230

قضاۃ کے منصب پر غلاموں کا فائز ہونا دیکھتے تو غم وغصہ کی وجہ سے فوت ہو جاتے اور کسی کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ کرتے۔ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر کارساز ہے۔ میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے شراب کی حد میں زیادتی کی گئی حتی کہ اسی کوڑوں تک پہنچ گئی۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے ہمیں قاضی حسین بن اسماعیل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں یعقوب بن ابراہیم دورقی نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں صفوان بن عیسیٰ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں اسامہ بن زید نے بیان کیا انہوں نے زہری سے روایت کیا انہوں نے کہا مجھے عبدالرحمٰن بن زہر نے بتایا انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو جنگ حنین کے دن دیکھا آپ لوگوں کے درمیان تھے آپ خالد بن ولید کی منزل کے بارے پوچھ رہے تھے پھر نشہ کی حالت میں ایک شخص لایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس موجود لوگوں کو فرمایا: "اسے اس چیز کے ساتھ مارو جو تمہارے پاس ہے" فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اس پر مٹی ڈالی۔ فرمایا: پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نشی کو لایا گیا، فرمایا: اس دن انہوں نے ضربات کو طلب کیا اور اسے چالیس کوڑے لگائے (1)۔ ازہری نے کہا پھر حمید بن عبدالرحمن نے مجھے بتایا انہوں نے ابن وبرہ کلبی سے روایت کیا فرمایا مجھے خالد بن ولید نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا فرمایا: میں ان کے پاس آیا تو ان کے پاس حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم موجود تھے اور وہ ان کے ساتھ مسجد میں سہارا لے کر بیٹھے تھے میں نے کہا: مجھے خالد بن ولید نے آپ کی طرف بھیجا ہے وہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں لوگ شراب پینے میں مبالغہ کر رہے ہیں اور اس کی سزا کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ لوگ تمہارے پاس ہیں ان سے پوچھو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم دیکھتے ہیں جب شرابی شراب پیتا ہے تو ہزیان بکتا ہے اور جب ہزیان بکتا ہے تو تہمت لگاتا ہے اور تہمت لگانے والے پر اسی کوڑے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہی پیغام خالد بن ولید کو پہنچا دو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ فرمایا: حضرت خالد نے اسی کوڑے لگائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کوڑے لگائے۔ فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی کمزور شخص لایا جاتا اور اس سے لغزش ہوئی ہوتی تو اسے چالیس کوڑے لگاتے۔ فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کوڑے اور چالیس کوڑے لگائے۔ اسی مفہوم سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ "اگر چاند موخر ہوتا تو میں تمہارے لیے زیادتی کرتا (2)" جیسے کوئی ناپسند کرنے والا کہتا ہے جب صحابہ کرام صوم وصال رکھنے سے نہ رکے تھے۔ ایک روایت میں ہے: "اگر ہمارے لیے مہینہ لمبا ہوتا تو میں متواتر صوم وصال رکھتا حتیٰ کہ شدت کرنے والے اپنی شدت کو ترک کر دیتے" (3)۔ حامد بن یحییٰ نے سفیان سے انہوں نے مسعر سے انہوں نے عطاء بن ابی مروان سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نجاشی کو شراب پینے کی وجہ سے سو کوڑے لگائے۔ ابو عمر نے اس کو ذکر کیا ہے اور اس کا سبب ذکر نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ۔ محدود پر حد قائم کرنے سے شفقت کی بنا پر نہ رکو، ضرب میں تخفیف نہ کرو تا کہ اسے تکلیف ہی نہ ہو؛ یہ اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے۔ شعبی، نخعی اور سعید بن

1۔ ابوداؤد، کتاب الحدود، باب اذا تتابع فی شرب الخمر، حدیث 3831، 3890، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، النھی عن الوصال، جلد 1، صفحہ 352　3۔ ایضاً

جبیر نے کہا: لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ یعنی ضرب لگانے اور کوڑے لگانے میں تمہیں رحم نہ آئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کسی جگہ حد قائم کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے چالیس راتوں کی بارش سے بہتر ہے پھر یہ آیت پڑھی۔ الرافۃ میں رحمت سے زیادہ نرمی ہے۔ رافۃ الف کے فتحہ کے ساتھ فعلۃ کے وزن پر پڑھا گیا ہے اور رافتعالہ کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ تین لغات ہیں یہ تمام مصادر ہیں زیادہ مشہور پہلا ہے یہ روف سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے نرمی کرنا اور رحم کرنا کہا جاتا ہے: رأفۃ و رآفۃ جیسے کأبۃ و کآبۃ۔ وقد رافت بہ و رؤفت بہ۔ الروف اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے۔ العطوف کا معنی الرجیم ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم میں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ (یوسف:76) یعنی فی حکمہ۔ بعض نے کہا: فی دین اللہ کا مطلب ہے فی طاعۃ اللہ و شرعہ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں حدود کے قائم کرنے کا جو حکم دیا ہے اس میں اس کی شریعت اور اس کی طاعت میں، پھر انہیں تثبیت اور ابھارنے کے معنی پر اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ کے قول سے قائم فرمایا۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کسی شخص کو ابھارتے ہوئے کہتا ہے: اگر تو مرد ہے تو ایسا کر یعنی یہ مردوں کے کام ہیں۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے انہیں تعذیب دینے کے لیے وہ حاضر ہوں جو تادیب کے مستحق ہوں۔ مجاہد نے کہا: ایک آدمی سے لے کر ہزار آدمیوں تک۔ ابن زید نے کہا: چار آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے زنا کی شہادت پر قیاس کیا ہے۔ یہ اس کا ایک باب ہے؛ یہی امام مالک، لیث اور امام شافعی کا قول ہے۔ عکرمہ اور عطا نے کہا: دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے (1)۔ یہ امام مالک کا مشہور قول ہے، پس انہوں نے اس کو شہادت کی جگہ دیکھا۔ زہری نے کہا: تین آدمی ہوں کیونکہ یہ جمع کا کم از کم فرد ہے۔ حسن نے کہا: ایک یا ایک سے زائد ہوں، ان سے مروی ہے کہ دس ہوں۔ ربیع نے کہا: تین سے زائد ہوں۔ مجاہد کی حجت یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ (التوبہ:122) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان طائفتان اگر دو گروہ، یہ دو آدمیوں کے لڑنے کے متعلق نازل ہوئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ ایک کو بھی طائفہ کہا جاتا ہے اور ہزار تک افراد کو طائفہ کہا جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابراہیم کا قول ہے۔ حضرت ابو برزہ اسلمی نے ایک لونڈی کے بارے میں حکم دیا جس نے بدکاری کی تھی اور بچہ جنم دیا تھا انہوں نے اس لونڈی پر کپڑا ڈال دیا تھا اور پھر اپنے بیٹے کو اسے پچاس ایسی ضربیں مارنے کو کہا جو زخمی کرنے والی نہ ہوں اور نہ اتنی ہلکی ہوں کہ تکلیف محسوس نہ ہو اور انہوں نے ایک جماعت کو بلایا پھر یہ آیت پڑھی وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝

**مسئلہ نمبر 21**۔ جماعت کے حضور سے مراد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے کیا اس سے مقصود بدکاروں پر سختی اور موجود لوگوں کو توبیخ ہے؟ یہ محدود کو روکتا ہے اور جو موجود ہوتے ہیں انہیں نصیحت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے جھڑک ہوتی ہے اس کی بات کی تشہیر ہو جاتی ہے اور بعد والے لوگ عبرت حاصل کرتے ہیں یا انکے لیے تو بہ اور رحمت کی دعا کرتے ہیں اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 162

میں علماء کے دو قول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! زنا سے بچو کیونکہ اس میں چھ خصال ہیں تین دنیا میں اور تین آخرت میں وہ جو دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں وہ یہ ہیں، چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے، فقر اور غربت آ جاتی ہے اور عمر کم ہو جاتی ہے۔ اور وہ جو آخرت میں ظاہر ہوں گی یہ ہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوگی، حساب برا ہوگا اور ہمیشہ دوزخ میں جلنا ہوگا''۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر جمعہ میں مجھ پر میری امت کے اعمال دو مرتبہ پیش کیے جاتے ہیں پس زنا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب سخت ہوتا ہے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''جب پندرہ شعبان کی رات ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ میری امت پر کرم کی نظر فرماتا ہے۔ اور ہر اس مومن کو بخش دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا مگر پانچ افراد کی بخشش نہیں ہوتی، جادوگر، کاہن، والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا، اور زنا پر اصرار کرنے والا'' (1)۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ١ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ۝۳

''زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ، نہیں نکاح کرتا اس کے ساتھ مگر زانی یا مشرک اور حرام کر دیا گیا ہے یہ اہل ایمان پر''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت کے معنی میں علماء تفسیر کے چھ اقوال ہیں: (۱) اس آیت کا مقصد زنا کی برائی بیان کرنا اور اس کی خرابی بیان کرنا ہے۔ اور یہ کہ مومنین پر یہ حرام کیا گیا ہے۔ ماقبل سے اس معنی کا اتصال بہت عمدہ ہے۔ لَا یَنْكِحُ سے مراد لا یطاء ہے یعنی وطی نہیں کرتا ہے۔ پس نکاح بمعنی جماع ہوگا مبالغہ کے لیے اور ہر طرف کو لینے کے لیے واقعہ کو دوہرایا پھر مشرک اور مشرکہ کی تقسیم زائد فرمائی اس حیثیت سے کہ گناہ میں شرک زنا سے اعم ہے معنی یہ ہے کہ زانی اپنے زنا کے وقت جماع نہیں کرتا مگر مسلمانوں میں سے زانیہ سے یا جو مشرکات میں سے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آپ کے اصحاب سے مروی ہے کہ اس آیت میں نکاح سے مراد وطی ہے (2)۔ زجاج نے اس کا انکار کیا ہے، فرمایا: کتاب اللہ میں نکاح، تزویج کے معنی میں معروف ہے، اس طرح نہیں ہے جیسا کہ زجاج نے کہا ہے قرآن حکیم میں ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ (البقرہ: 230) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ کہ ''یہاں وطی کے معنی میں ہے''۔ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ طبری نے سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس اور عکرمہ سے ایسی بات روایت کی ہے جو اسی تاویل کی طرف میلان رکھتی ہے، لیکن وہ مکمل نہیں ہے۔ خطابی نے اس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے۔ اس کا معنی وطی ہے یعنی زنا نہیں ہوتا مگر زانیہ کیساتھ یہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ زنا دونوں جہتوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک قول ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب ما جاء فی لیلۃ النصف من شعبان، حدیث 1379، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 162

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابوداؤد اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت مرثد بن ابی مرثد قیدیوں کو مکہ سے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ مکہ میں ایک بدکارہ عورت تھی جس کا نام عناق تھا وہ مرثد کی دوست تھی، حضرت مرثد نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں عناق سے نکاح کرلوں؟ فرمایا: کچھ دیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے پھر یہ آیت نازل ہوئی اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور مجھ پر یہ آیت پڑھی اور فرمایا: ''تو اس سے نکاح نہ کر''۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں اور امام ترمذی کی حدیث اکمل ہے۔ خطابی نے کہا: یہ اس عورت کے ساتھ خاص تھا کیونکہ وہ کافرہ تھی اور زانیہ مسلمہ، اس سے نکاح فسخ نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ مسلمانوں میں سے ایک فرد کے ساتھ خاص تھی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی تھی جس کو ام مہزول کہا جاتا تھا۔ وہ بدکارہ عورتوں میں سے تھی اور اس نے شرط رکھی تھی کہ اس مرد پر وہ خرچ کرے گی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی؛ یہ عمرو بن العاص اور مجاہد کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ آیت اہل صفہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ مہاجر لوگ تھے مدینہ طیبہ میں ان کے مکانات اور خاندان نہ تھے وہ مسجد کے صفہ پر رہتے تھے۔ یہ چار سو افراد تھے دن کے وقت رزق تلاش کرتے تھے اور رات صفہ پر گذارتے تھے۔ مدینہ میں بدکارہ عورتیں تھیں جو اعلانیہ بدکاری کرتی تھیں۔ اور لباس اور خوراک کی ان کے پاس فراوانی ہوتی تھی۔ اہل صفہ نے ان سے نکاح کرنے اور ان کے مکانات میں رہنے اور ان کے طعام اور لباس سے کھانے کا ارادہ کیا تو ان کو اس سے بچانے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ابن ابی صالح کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ یہ قول زجاج وغیرہ نے حسن سے ذکر کیا ہے، حسن نے فرمایا: الزانی سے مراد وہ ہے جسے حد لگائی گئی ہو اور زانیہ سے مراد بھی وہ ہے جس پر حد لگائی گئی ہو یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے، پس جس زانی کو حد لگائی گئی ہو وہ نکاح نہ کرے مگر اس زانیہ سے جسے حد لگائی گئی ہو؛ ابراہیم نخعی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور مصنف ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(1)، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ زانی جس کو حد لگائی گئی ہو وہ نکاح نہ کرے مگر اپنی مثل سے''، روایت ہے کہ ایک زانی جس کو حد لگائی گئی تھی اس نے غیر محدودۃ عورت سے شادی کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان تفریق کر دی۔ ابن عربی نے فرمایا: یہ وہ معنی ہے جو نظر کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے جیسا کہ نقلاً بھی ثابت نہیں ہے، ایسے شخص کا نکاح جس کو حد لگائی گئی ہو کیا وہ محدودۃ عورتوں کے نکاح پر موقوف ہونا صحیح ہے؟ یہ کس اثر سے ہوگا اور شریعت کی کس اصل پر قیاس ہوگا؟ میں کہتا ہوں: یہ قول الکیا نے بعض اصحاب شوافع سے حکایت کیا ہے کہ زانی جب غیر زانیہ سے نکاح کرے گا تو ظاہر آیت کی وجہ سے ان کے درمیان تفریق کی جائے گی۔ الکیا نے کہا: اگر وہ ظاہر پر عمل کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ زانی کے لیے مشرکہ سے بھی نکاح کو جائز قرار دے اور زانیۃ کے لیے مشرک مرد سے نکاح کرنا بھی جائز قرار دے یہ انتہائی بعید ہے، یہ کلیۃً اسلام سے خروج ہے۔ کبھی یہ علماء کہتے ہیں: یہ آیت خاص مشرک میں منسوخ ہے، زانیۃ کے حق میں منسوخ نہیں ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب قولہ الزانی لا ینکح الا زانیۃ، جلد 1، صفحہ 280

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت منسوخ ہے امام مالک نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے فرمایا: اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً اس آیت کو بعد والی آیت وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ نے منسوخ کر دیا ہے؛ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے، فرمایا: أیامى المسلمين میں زانیہ بھی داخل ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ قول اکثر علماء کا ہے، اہل فتویٰ فرماتے ہیں: جس نے کسی عورت سے زنا کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سے نکاح کرے اور دوسرے شخص کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ اس زانیہ سے نکاح کر لے۔ یہ حضرت ابن عمر، حضرت سالم، حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہم، عطاء، طاؤس، امام مالک بن انس کا قول ہے اور یہی قول امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس میں قول اسی طرح ہے جس طرح سعید بن مسیب نے فرمایا، ان شاء اللہ یہ منسوخ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس آیت میں اشراک کا ذکر ان مناحی کو کمزور کرتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک یہ ہے کہ نکاح سے مراد وطی ہوگا جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے یا نکاح سے مراد عقد نکاح ہوگا اگر اس سے مراد وطی ہوگا تو اس کا معنی ہوگا زنا نہ ہوگا مگر زانیہ کے ساتھ، یہ عبارت ہے اس سے کہ وطی، مرد اور عورت دونوں جہتوں سے ہوتی ہے، آیت کی تقدیر اس طرح ہوگی زانیہ کی وطی واقع نہ ہوگی مگر زانی سے یا مشرک سے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ معنی صحیح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر بالغ آدمی بچی سے زنا کرے یا عاقل، مجنونہ سے زنا کرے یا بیدار شخص سوئی ہوئی سے زنا کرے تو مرد کی جہت سے زنا ہوگا پس یہ مرد زانی غیر زانیہ سے نکاح کرے گا۔ پس گذشتہ مسئلہ کی صورت سے یہ خارج ہوگا۔ ہم کہیں گے: یہ ہر جہت سے زنا ہے مگر ایک میں حد ساقط ہے دوسرے میں ثابت ہے۔ اگر نکاح سے مراد عقد نکاح ہو تو اس کا معنی ہوگا زانیہ سے نکاح کرنے والا جس نے زنا کیا اور اس کے ساتھ اس نے دخول کیا جبکہ ابھی تک اس سے اس کا رحم صاف نہیں ہوا، تو وہ زانی کے قائم مقام ہوگا مگر اس پر حد نہ ہوگی کیونکہ اس میں علماء کا اختلاف ہے، مگر جب اس نے اس سے عقد نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول نہیں کیا حتیٰ کہ اس کا رحم صاف ہو جائے تو یہ بالا جماع جائز ہے۔ بعض علماء نے کہا: آیت میں یہ مراد نہیں کہ زانی کبھی نکاح نہ کرے مگر زنا کرنے والی عورت سے کیونکہ اس کا غیر زانیہ سے نکاح کرنا متصور ہوتا ہے لیکن معنی یہ ہے کہ جس نے زانیہ سے نکاح کیا وہ زانی ہے گویا فرمایا: زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر زانی۔ پس کلام میں قلب ہوا، وہ یہ ہے کہ زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر وہ اس کے زنا سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوتا ہے جب وہ خود اس سے زنا کرنے والا ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ زانیہ سے نکاح کرنا صحیح ہے جب کسی مرد کی بیوی زنا کرے تو اس کا نکاح فاسد نہ ہوگا جب مرد زنا کرے تو اس کا اپنی بیوی سے نکاح فاسد نہ ہوگا کیونکہ یہ آیت منسوخ ہے، بعض نے کہا: یہ آیت محکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے سیدنا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت سے زنا کیا تو آپ نے دونوں کو سو سو کوڑے لگائے پھر اسی وقت انہوں نے ایک دوسرے سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دونوں کو ایک سال کے لیے جلا وطن کیا تھا۔ اسی کی مثل حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا آغاز زنا تھا آخر نکاح تھا، اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص کسی باغ سے چوری کرے پھر وہ باغ

والے کے پاس آئے اور اس سے وہ پھل خرید لے تو اس نے جو چوری کیا تھا وہ حرام تھا اور جو خریدا وہ حلال ہے اسی کو امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے اختیار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پانی کی کوئی حرمت نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جب مرد، عورت سے زنا کرے پھر اس کے بعد اس سے نکاح کر لے تو وہ ہمیشہ زنا کرنے والے ہوں گے؛ یہ امام مالک کا مسلک ہے ان کا خیال ہے کہ وہ اس سے نکاح نہ کرے یہاں تک کہ اس کا رحم اس فاسد پانی سے صاف ہو جائے، کیونکہ نکاح کی حرمت ہے اور اس کی حرمت سے یہ ہے کہ زنا کے پانی پر اسے نہ انڈیلا جائے تا کہ حلال، حرام مل نہ جائیں، ذلیل پانی اور عزت والا پانی مل نہ جائیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن خویز منداد نے کہا: جو اعلانیہ زنا یا دوسرے برے کاموں میں معروف ہو پھر وہ کسی معزز گھرانے کی عورت سے نکاح کرے اور وہ انہیں دھوکا دے تو انہیں اختیار ہے چاہیں تو اس کے ساتھ رہیں چاہیں تو اس سے جدائی کر لیں۔ یہ عیوب میں سے کسی عیب کی طرح ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے حجت پکڑی ہے کہ ''ایسا زانی جس کو کوڑے لگائے گئے ہوں وہ نکاح نہ کرے مگر اپنی مثل سے'' (1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: کوڑے لگائے گئے کا ذکر کیا کیونکہ وہ فسق کے ساتھ مشہور ہے یہ وہ ہے جس کے درمیان میں دوسرے کے درمیان تفریق کرنا واجب ہے اور جو فسق میں مشہور نہ ہو تو جدائی نہ کی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ متقدمین کی ایک قوم نے کہا: یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔ ان علماء کے نزدیک جس نے زنا کیا اس کا اور اس کی بیوی کا نکاح فاسد ہو جائے گا جب عورت زنا کرے گی تو اس کا اور اس کے خاوند کا نکاح فاسد ہو جائے گا، ان علماء میں سے بعض نے کہا: زنا سے نکاح فاسد نہ ہوگا لیکن مرد کو حکم دیا جائے گا کہ وہ عورت کو طلاق دے جب اس عورت نے زنا کیا ہو۔ اگر وہ اسے اپنے پاس رکھے گا تو گناہگار ہوگا اور زانیہ کے ساتھ اور زانی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں بلکہ اگر توبہ ظاہر ہو جائے تو اس وقت نکاح جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ ان بدکاروں کا نکاح مومنین پر حرام کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان بدکاروں کے نکاح کو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر حرام قرار دیا ہے۔ ان عورتوں میں سے مشہور عناق تھی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ نے زنا کو کتاب اللہ میں حرام کیا ہے۔ جب مرد زنا کرے گا تو اس پر حد ہوگی۔ یہ امام مالک، امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: ''وہ مسلمان شخص جو دارالحرب میں امان کے ساتھ رہ رہا ہو اور وہ وہاں زنا کرے'' پھر دارالاسلام میں نکل آئے تو اس پر حد نہ ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: دارالحرب اور دارالاسلام برابر ہیں جو بھی زنا کرے گا اس پر حد ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ

1۔ سنن ابی داؤد، باب قولہ الزانی لا ینکح الا زانیۃ، جلد 1، صفحہ 280

جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں پاکدامن عورتوں پر پھر وہ نہ پیش کر سکیں چار گواہ تو لگاؤ ان (تہمت لگانے والوں) کو اسی درے اور نہ قبول کرنا ان کی گواہی ہمیشہ کے لیے اور وہی لوگ فاسق ہیں، مگر (ان میں سے) وہ لوگ جو توبہ کر لیں ایسا بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

اس میں چھبیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ آیت تہمت لگانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی سعید بن جبیر نے کہا: اس کا سبب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت تھی (1)۔ بعض نے کہا: یہ عام تہمت لگانے والوں کے سبب نازل ہوئی نہ کہ مخصوص واقعہ میں۔ ابن المنذر نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخبار میں کوئی ایسی خبر نہیں پاتے جو صراحۃً قذف پر دلالت کرتی ہو۔ اور ظاہر کتاب اللہ اس سے مستغنی ہے۔ جو اس قذف پر دلالت کرتی ہو جس کی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے اہل علم کا اس پر اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ یعنی جو زبان درازی کرتے ہیں اس کے لیے رمی کا اسم عاریۃً لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ زبان کے ساتھ اذیت ہے۔ نابغہ نے کہا:

جرح اللسان کجرح الید زبان کے زخم ہاتھ کے زخم کی طرح ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

رمانِي بأمرٍ كنتُ منه ووالدي بريئا من أجلِ الطَّوِيّ رمانِي

اس کو قذف کہا جاتا ہے اسی سے حدیث پاک ہے ''ابن امیہ نے ایک عورت پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائی'' (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ نے آیت میں عورتوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ وہ اہم ہیں اور ان پر برائی کی تہمت لگانا زیادہ قبیح ہے اور نفوس کو زیادہ زخمی کرنے والا ہے۔ اور مردوں پر تہمت لگانا بھی معنی اور اجماع امت کی وجہ سے حکم میں داخل ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے اس نے خنزیر کے گوشت کی تحریم پر نص قائم فرمائی اور اس میں اس کی چربی اور بھر بھری ہڈی بھی شامل ہے۔ یہ معنی اور اجماع کی وجہ سے ہے۔ زہراوی نے حکایت کیا ہے اس کا معنی: الانفس المحصنات ہے۔ اور یہ اپنے لفظ کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کو شامل ہے، اس پر دلیل وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النساء: 24) کا قول ہے۔ ایک قوم نے کہا: المحصنات سے مراد فروج، شرمگاہیں ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (الانبیاء: 91) اس میں مردوں اور عورتوں کی شرمگاہیں داخل ہیں۔ بعض نے کہا: اجنبیہ عورت کا ذکر کیا گیا، جب اس پر تہمت لگائی جائے تاکہ اس پر مرد کا اپنی عورت پر تہمت لگانے کا عطف کیا جائے۔ واللہ اعلم۔ جمہور نے المحصنات سے مراد یہاں پاکدامن عورتیں لی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 164

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 12450

ہیں۔ سورۃ النساء میں الاحصان کا ذکر اور اس کے مراتب گزر چکے ہیں۔ والحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ علماء کے نزدیک قذف کی نو 9 شرائط ہیں دو شرطیں تہمت لگانے والے میں ہیں۔ (۱) عقل، (۲) بلوغت، کیونکہ مکلف ہونے کی یہ دو اصل ہیں جو عقل مند نہ ہو اور جو بالغ نہ ہو وہ مکلف نہیں ہوتے اور دو شرطیں اس میں ہیں جس کے ساتھ تہمت لگائی گئی ہے وہ یہ کہ وہ ایسی وطی کی تہمت لگائے جس میں حد لازم آتی ہو اور وہ لواطت ہے یا بچے کی باپ سے نفی پائی جائے اور پانچ شرائط اس میں ہیں جس پر تہمت لگائی گئی ہے، عقل، بلوغت، اسلام، حریت، اور اس برائی سے پاک ہونا جس کی تہمت لگائی گئی ہے خواہ وہ دوسری برائیوں سے پاک ہو یا نہ ہو۔ ہم نے اس کے بارے میں جس پر تہمت لگائی گئی ہو عقل اور بلوغت کی شرط رکھی ہے جس طرح ہم نے قاذف میں یہ شرطیں ذکر کی ہیں۔ اگر یہ دونوں احصان کے معانی سے نہیں ہیں کیونکہ حد اس اذیت کو دور کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے جو اس پر داخل ہوتی ہے جس پر تہمت لگائی جاتی ہے اور عقل اور بلوغت کے نہ ہونے پر کوئی ضرر نہیں ہے کیونکہ ایسے شخص کو نہ لوطی کہا جاتا ہے نہ زانی کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء کا اتفاق ہے کہ جب صراحۃً زنا کا ذکر کرے تو یہ قذف اور تہمت ہوگی اور حد کا موجب ہوگی۔ اگر وہ تعریض کرے اور صراحۃً زنا کا ذکر نہ کرے تو امام مالک نے فرمایا: وہ قذف، تہمت ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا: وہ قذف نہ ہوگا حتی کہ وہ خود کہے کہ میں نے قذف کا ارادہ کیا تھا۔ امام مالک کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قذف میں حد اس لیے رکھی گئی ہے تا کہ وہ عار دور ہو جو تہمت لگانے والا، متہم شخص پر لگاتا ہے جب تعریض کے ساتھ عار حاصل ہو تو واجب ہے کہ وہ قذف ہو جیسے صریح تہمت لگانے میں حد ہوتی ہے، اور فہم پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق خبر دیتے ہوئے کہا: اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ۝ (ہود) یعنی قوم نے آپ کو سفیہ اور گمراہ کہا۔ انہوں نے برا کہنے کے لیے تعریض کی ایسی کلام کے ساتھ جس کا ظاہر مدح ہے۔ یہ ایک تاویل ہے جیسا کہ سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابوجہل کے بارے میں فرمایا۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ۝ (الدخان) اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق حکایت کیا ہے: يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۝ (مریم) لوگوں نے حضرت مریم کے باپ کی تعریف کی اور ان کی والدہ سے بدکاری کی نفی کی اور حضرت مریم کے لیے تعریض کی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّبِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا۝ (النساء) اور ان کا کفر معروف تھا وہ بہتان عظیم ہے جس کے لیے انہوں نے تعریض کی یعنی نہ تیرا باپ برا تھا، نہ تیری والدہ بدکارہ تھی یعنی تو ان دونوں کے برعکس ہے جبکہ تو یہ بچہ لائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝ (سبا) اس لفظ سے سمجھا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کفار ہدایت یافتہ نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہدایت یافتہ ہیں پس اس تعریض سے وہی سمجھا گیا جو اس کی تصریح سے سمجھا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حطیہ کو قید کیا تھا جب اس نے کہا تھا:

دَعِ المکارِمَ لا ترحل لبُغیتھا　　واقعد فإنک أنت الطاعِم الکاسِی

کیونکہ حطیہ نے اس شعر میں عورتوں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی کہ انہیں کھلایا پلایا جاتا ہے اور لباس دیا جاتا ہے، جب اس

نے نجاشی کا قول سنا:

قبیلته لا یغدرون بذمة ولا یظلمون الناس حبة خردلِ

اس نے کہا: کاش خطاب بھی اسی طرح ہوتا۔ شاعر نے قبیلہ کے ضعف کو بیان کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس شخص پر حد نہیں ہے جو کسی اہل کتاب میں سے کسی مرد یا عورت پر تہمت لگائے۔ زہری، سعید بن مسیب اور ابن ابی لیلی نے کہا: اس پر حد ہوگی جب کہ اہل کتاب کا بیٹا مسلمان ہو۔ اس میں تیسرا قول یہ ہے کہ جب کوئی نصرانی عورت پر تہمت لگائے جو مسلمان کی بیوی ہو تو اسے کوڑوں کی حد لگائی جائے گی۔ ابن المنذر نے کہا: بڑے بڑے علماء پہلے قول کے قائل ہیں میں نے کسی عالم کو نہیں پایا جو اس کے مخالف ہو۔ جب کوئی نصرانی آدمی، آزاد مسلمان پر تہمت لگائے تو اس پر وہی حد ہوگی جو مسلمان کی حد ہوگی یعنی اسی کوڑے اس کے بارے میں اختلاف میں نہیں جانتا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ غلام کو چالیس کوڑے مارے جائیں گے جب وہ کسی آزاد پر تہمت لگائے گا کیونکہ غلامی کی وجہ سے اس کی حد نصف ہو جاتی ہے جیسے زنا کی حد اس کی نصف ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عبد العزیز اور قبیصہ بن ذؤیب سے مروی ہے کہ غلام کو بھی اسی کوڑے مارے جائیں گے۔ ابو بکر بن محمد نے غلام کو اسی کوڑے مارے تھے جس نے آزاد پر تہمت لگائی تھی؛ یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔ جمہور علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے حجت پکڑی ہے: فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء:25) اور دوسرے علماء نے کہا: ہم نے یہاں سمجھا کہ زنا کی حد اللہ کے لیے ہے اور بعض اوقات اس کے حق میں تخفیف ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کم ہوتی ہیں اور اس پر حد سخت ہوتی ہے جس پر نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور رہی حد قذف تو یہ آدمی کا حق ہے یہ واجب ہوتی ہے اس پر جو کسی کی عزت کو تار تار کرتا ہے۔ اور جنایت غلامی اور حریت کی وجہ سے مختلف نہیں ہوتی۔ بعض اوقات کہتے ہیں: اگر ان کی سزا مختلف ہوتی تو ذکر کیا جاتا جس طرح زنا میں ذکر کیا گیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اکثر علماء کا نظریہ پہلا قول ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء کا اجماع ہے کہ آزاد جب غلام پر تہمت لگائے گا تو اس کی وجہ سے آزاد کو حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ ان کے مراتب مختلف ہیں نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے اپنی لونڈی پر زنا کی تہمت لگائی قیامت کے روز اس پر حد لگائی جائے گی مگر یہ کہ وہ اسی طرح ہو جس طرح آقا نے کہا ہے" (1)۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے تخریج کیا ہے۔ بعض طرق میں ہے: "جس نے اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائی پھر زنا ثابت نہ ہوا تو اس پر قیامت کے روز اسی کوڑے حد لگائی جائے گی"۔ یہ دارقطنی نے ذکر کی ہے۔ علماء نے فرمایا: آخرت میں اس لیے حد ہوگی کیونکہ اس وقت ملکیت اٹھ چکی ہوگی اور شریف، وضیع، آزاد، غلام برابر ہو چکے ہوں گے اور کسی کو کوئی فضلیت نہ ہوگی مگر تقویٰ کی بنا پر جب

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود والدیۃ، جلد 2، صفحہ 91

ایسا ہوگا تو حدود وحرمت میں سب لوگ برابر ہوں گے ہر شخص سے دوسرے کا بدلہ لیا جائے گا مگر یہ کہ مظلوم، ظالم کو معاف کر دے۔ دنیا میں ہم پلہ نہیں ہیں تا کہ مالکوں پر ان سے بدلہ لینے میں ذلت داخل نہ ہو اور ان کے لیے مرتبہ میں حرمت و فضل صحیح نہیں ہے ورنہ تسخیر کا فائدہ باطل ہوگا اور حلیم و علیم کی حکمت بھی ختم ہو جائے گی۔ لا الہ الا ھو۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ امام مالک اور امام شافعی نے بتایا: جس نے کسی کو غلام سمجھ کر اس پر تہمت لگائی جبکہ وہ آزاد تھا تو اس پر حد ہوگی؛ یہ حسن بصری کا قول ہے اور ابن المنذر کا مختار قول ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے ام الولد پر تہمت لگائی اسے حد لگائی جائے گی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہی امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس پر حد ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے کسی کو کہا: اے رانوں میں وطی کرنے والا! ابن القاسم نے کہا: اس پر حد ہوگی کیونکہ یہ تعریض ہے۔ اشہب نے کہا: اس میں حد نہیں ہے کیونکہ یہ ایسے فعل کی طرف نسبت ہے جو بالاجماع زنا شمار نہیں کیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جب ایسی چھوٹی بچی پر زنا کی تہمت لگائی بلوغت سے پہلے جس کے ساتھ زنا ممکن ہے تو امام مالک کے نزدیک یہ بھی قذف ہوگا۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ابوثور نے کہا: یہ قذف نہیں ہے کیونکہ اس پر حد نہیں ہے اسے تعزیر لگائی جائے گی (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ مسئلہ کئی احتمال رکھتا ہے۔ اور کئی شکلیں رکھتا ہے۔ امام مالک نے مقذوف کی عزت کی حفاظت طلب کی ہے اور دوسرے علماء نے قاذف کی پیٹھ کی حفاظت کا خیال کیا ہے اور مقذوف کی حمایت اولی ہے کیونکہ تہمت لگانے والے نے اس کا پردہ چاک کیا ہے اپنی زبان سے تو اس پر تہمت لگانے والے کو کوڑے لگائے جائیں گے اسی طرح بچے پر تہمت لگانے والا جو دس سال کو پہنچ چکا ہے، تو تہمت لگانے والے کو حد لگائی جائے گی۔ اسحق نے کہا: جب ایسے غلام پر تہمت لگائے جس کی مثل وطی کر سکتا ہے تو اس پر حد ہوگی اور بچی جب نو سال سے تجاوز کر جائے تو یہی حکم ہے۔ ابن المنذر نے کہا: جس نے نابالغ پر زنا کی تہمت لگائی اسے حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ یہ جھوٹ ہے لیکن اذیت پر تعزیر لگائی جائے گی۔ ابوعبید نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ایک عورت آئی اس نے ذکر کیا کہ اس کا خاوند اس کی لونڈی سے وطی کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو سچی ہے تو ہم اسے رجم کریں گے اگر تو جھوٹی ہے تو ہم تجھے کوڑے لگائیں گے۔ اس عورت نے کہا: مجھے اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا دو میرا اندر غصہ سے ابل رہا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو اپنی بیوی کی لونڈی سے وطی کرے اس پر حد ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ جب اس پر کوئی تہمت لگائے تو اس کے تہمت لگانے والے پر حد ہے کیا تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول سنا نہیں: اگر تو جھوٹی ہے تو ہم تجھے کوڑے لگائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایسا کرنے والا اپنے فعل اور قول سے جاہل نہ ہو اگر وہ جاہل ہوگا اور وہ شبہ کا دعوی کرنے والا ہوگا تو ان تمام صورتوں میں اس سے حد دور کی جائے گی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ کوئی شخص حاکم کی موجودگی میں کسی پر تہمت لگائے اور جس پر تہمت لگائی گئی، حاضر نہ ہو تو قاذف، تہمت لگانے والے پر کچھ نہیں ہوگا حتی کہ وہ آئے اور حد کا مطالبہ کرے کیونکہ معلوم نہیں

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 365

یہ سچا ہو گیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے کوئی تعریض نہیں کیا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حاکم کے پاس جب کسی شخص پر تہمت لگائی جائے پھر مقذوف آئے اور اپنا حق طلب کرے تو حاکم اس کی بات سن کر تہمت لگانے والے کو حد لگائے گا کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو جھوٹی ہوگی تو ہم تجھے کوڑے لگائیں گے، کیونکہ یہ انسانوں کے حقوق سے ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں اختلاف ہے کہ یہ حقوق اللہ سے ہے یا آدمیوں کے حقوق سے ہے یہ آگے آئے گا۔ ابو عبید نے کہا: اصمعی نے کہا شعبۃ نے مجھ سے غیری نَغِرہ کا مفہوم پوچھا تو میں نے اسے کہا: یہ نَغَرالقِدْرِ سے مشتق ہے۔ ہانڈی کا ابلنا۔ اسی سے ہے۔ نغرت تنغر نغرت تنغر جب وہ ابلنے لگے اس کا معنی ہے اس کا اندر غیرت اور غصہ کی وجہ سے ابل رہا ہے۔ رأیت فلانا یتنغر علی فلان یعنی اس کا اندر فلاں پر غصہ کی وجہ سے ابل رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے کسی پر تہمت لگائی تو اس پر دو حدیں لگائی جائیں گی؛ یہ مسروق کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ اسے ایک حد لگائی جائے گی کیونکہ اللہ کا ارشاد عام ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ان کا شرف محدود کی حد میں زیادتی کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ مرتبہ کا شرف حدود میں مؤثر نہیں ہوتا اور مرتبہ کی کمی کرنے میں مؤثر نہیں ہوتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جنہوں نے تہمت لگائی ان پر کلام آگے آئے گی کیا قتل کیا جائے گا یا نہیں؟

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ چار گواہ صرف زنا میں ضروری ہیں باقی حقوق میں چار گواہ نہیں ہیں، یہ حکم بندوں پر رحمت اور ان کی پردہ پوشی کے لیے ہے۔ یہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ گواہوں کی گواہی کی ادائیگی کے لیے امام مالک کے نزدیک ایک مجلس ہونا شرط ہے۔ اگر مجالس جدا ہوئیں تو شہادت نہ ہوگی۔ عبد الملک نے کہا: گواہی گواہوں سے قبول کی جائے گی خواہ وہ اکٹھے ہوں یا جدا جدا آئیں۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ گواہوں کا اجتماع تعبدی ہے؛ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ اور عبد الملک کا نظریہ یہ ہے کہ مقصود شہادت کی ادائیگی ہے اور اس کا جمع ہونا ہے اور وہ حاصل ہو چکا ہے؛ یہ عثمان بتی، ابو ثور کا قول ہے اور ابن المنذر کا مختار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ ان آیات میں اکٹھا آنے یا متفرق طور پر آنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اگر شہادت مکمل ہو گئی مگر ان کی تعدیل نہیں کی گئی تو حسن بصری اور شعبی کا خیال ہے کہ نہ گواہوں پر حد ہوگی اور نہ اس پر جس کے خلاف گواہی دی گئی ہے؛ یہی قول امام احمد، امام نعمان اور امام محمد بن حسن کا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جب اس پر چار گواہ گواہی دیں کہ اس نے زنا کیا ہے اگر ان گواہوں میں سے کوئی اس پر ناراضگی کی وجہ سے گواہی دے رہا ہو یا کوئی غلام ہو تو سب کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ سفیان ثوری، احمد اور اسحاق نے کہا: چار گواہوں میں دو اندھے ہوں اور وہ کسی عورت پر زنا کی گواہی دیں تو سب کو سزا ملے گی۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اگر گواہوں میں سے ایک اپنی گواہی سے رجوع کر لے جبکہ جس پر زنا کی گواہی دی گئی تھی اسے رجم ہو چکا ہو تو ایک طائفہ نے کہا: وہ چوتھائی دیت کا ضامن ہوگا اور دوسرے گواہوں پر کچھ نہ ہوگا، اسی طرح قتادہ، حماد، عکرمہ، ابو

ہاشم، امام مالک، امام احمد اور اصحاب الرائے کا نظریہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تا کہ اسے قتل کیا جائے تو اس کے اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو بدلے میں اسے بھی قتل کر دیں اگر چاہیں تو اسے معاف کر دیں اور اس سے چوتھائی دیت وصول کر لیں اور اس پر حد ہوگی۔ حسن بصری نے کہا: اسے قتل کیا جائے گا اور دوسرے گواہوں پر دیت کا 3/4 حصہ ہوگا۔ ابن سیرین نے کہا: جب وہ کہے میں نے خطا کی اور میں نے کسی اور کا ارادہ کیا تھا، تو اس پر پوری دیت ہوگی۔ اگر وہ کہے: میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تو اسے قتل کیا جائے گا؛ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ حد قذف کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ حقوق اللہ سے ہے یا حقوق العباد سے ہے یا اس میں ان دونوں کا شائبہ ہے۔ پہلا امام ابوحنیفہ کا قول ہے اور دوسرا امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے، تیسرا قول بعض متاخرین کا ہے۔ اختلاف کا ثمرہ اس وقت مرتب ہوگا کہ اگر وہ اللہ کا حق ہے اور امام تک معاملہ پہنچ جائے تو وہ اس پر حد قائم کرے اگرچہ مقذوف مطالبہ نہ بھی کرے اور قاذف کی توبہ اللہ اور اس کے درمیان نفع بخش ہوگی۔ اس میں حد غلامی کی وجہ سے نصف ہو جائے گی جیسے زنا میں ہوتی ہے۔ اگر یہ آدمی کا حق ہو تو امام حد کو قائم نہیں کرے گا مگر مقذوف کے مطالبہ کے ساتھ اور مقذوف کے معاف کرنے کے ساتھ معاف ہو جائے گا اور قاذف کو توبہ نفع نہیں دے گی یہاں تک کہ مقذوف اسے معاف کر دے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ جمہور کی قرات اربعہ کی الشہداء کی طرف اضافت کے ساتھ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسلم بن یسار اور حضرت ابوزرعۃ بن عمرو بن جریر نے اربعۃ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ شھداء میں چار وجوہ ہیں یہ اربعۃ کی صفت کی بنا پر مجرور ہوگا یا بدل ہوگا اور اس کا نکرہ سے حال یا تمیز ہونا بھی جائز ہے۔ حال اور تمیز کے قول میں نظر ہے کیونکہ حال نکرہ سے ہے اور تمیز جمع ہے۔ اور سیبویہ کا خیال ہے یہ عدد کی تنوین ہے اور اس کی اضافت ترک کی گئی ہے اور یہ شعر میں جائز ہے۔ ابوالفتح عثمان بن جنی نے اس قرات کو اچھا کہا ہے اور جمہور کی قرات پر اس کو بہتر سمجھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ شھداء محل نصب میں ہو اس معنی میں ثم لم یحضروا اربعۃ شھداء۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ چار گواہوں کی گواہی کا حکم یہ ہے کہ انہوں نے وہ اس طرح دیکھا ہو جس طرح سرمچو سرمہ دانی میں ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں نص حدیث میں گذر چکا ہے اور وہ ایک جیسی گواہی ہو؛ یہ مالک کے قول پر ہے۔ اگر چار گواہوں میں سے ایک بھی ادھر ادھر ہو گیا تو تین کو کوڑے لگائے جائیں گے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ کے معاملہ میں کیا تھا۔ ان کے خلاف ابوبکرہ نفیع بن حارث اور ان کے بھائی نافع نے زنا کی گواہی دی تھی۔ زہراوی نے کہا: عبداللہ بن حارث اور ان کا ماں کی طرف سے بھائی زیاد جو حضرت معاویہ کے ساتھ لاحق کیا گیا تھا شبل بن معبد بجلی، چاروں گواہ شہادت دینے کیلئے آئے تو زیاد نے توقف کیا اور گواہی نہ دی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ تین گواہوں کو کوڑے لگائے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاجْلِدُوْهُمْ، الجلد کا معنی ہے مارنا، المجالدة و المضاربة کوڑے مارنے کیلئے استعمال ہوتے ہیں، پھر الجلد کا لفظ تلوار وغیرہ سے مارنے کیلئے بھی استعمال ہوا؛ اسی سے قیس بن خطیم کا قول ہے:

أجالدهم يوم الحديقة حاسرًا كأن يَدِي بالسيف مِخراق لاعِبِ

ثَمٰنِیْنَ مصدر کی بنا پر منصوب ہے جلدۃ تمیز ہے۔ وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا یہ ان کی مدت عمر کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر ان پر حکم لگایا کہ وہ فاسق ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہیں۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا استثنا کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ بدل کی بنا پر محل جر میں ہو معنی یہ ہو کہ ان کی کبھی شہادت قبول نہ کرو مگر جو قذف کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، یہ آیت قاذف، تہمت لگانے والا کے بارے میں تین احکام اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے، اس کو کوڑے لگنا، اس کی شہادت کا ہمیشہ رد ہونا اور اس کا فاسق ہونا استثناء کوڑوں کے بارے میں تو بالاجماع عامل نہیں ہے مگر جو شعبی سے مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور فسق میں بالاجماع عامل ہے اور شہادت کے رد میں اس کے عامل ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ شریح قاضی، ابراہیم نخعی، حسن بصری، سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: استثنا اس کی شہادت کے لوٹانے میں عامل نہیں ہے اور اس کا فسق اللہ تعالیٰ کے نزدیک زائل ہو جائے گا اور رہی قاذف کی شہادت تو وہ کبھی قبول نہیں ہوگی خواہ وہ توبہ کرے اور اپنے نفس کو جھٹلا بھی دے کسی صورت میں بھی اس کی گواہی قبول نہ ہوگی۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: شہادت لوٹانے میں عامل ہے۔ جب قاذف توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ اس کی شہادت کا رد ہونا فسق کی علت کی وجہ سے تھا جب توبہ سے فسق زائل ہو گیا تو حد سے پہلے اور حد کے بعد مطلقاً اس کی شہادت قبول ہوگی؛ یہ عام فقہاء کا قول ہے۔ پھر اس کی توبہ کی صورت میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب اور شعبی وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ نہیں ہو گی مگر یہ کہ وہ اس قذف میں اپنے آپ کو جھوٹا کہے جس میں اس کو حد لگائی گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تھا آپ نے مغیرہ کے خلاف گواہی دینے والوں کو کہا تھا جس نے اپنے آپ کو جھوٹا کہا اس کی شہادت مستقبل میں قبول ہوگی اور جس نے ایسا نہیں کیا اس کی شہادت کو جائز قرار نہیں دوں گا۔ ابوبکرہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا پس اس کی شہادت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ یہ قول نحاس نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے۔ ایک فرقہ نے کہا جن میں امام مالک بھی ہیں کہ اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے اور اپنی حالت کو درست کرے اگرچہ تکذیب کے ساتھ اپنے قول سے رجوع نہ بھی کرے اس قذف پر اس کی ندامت۔ اور اس سے استغفار اور پھر ایسا نہ کرنے پر عزم کافی ہے۔

یہ ابن جریر کا قول ہے۔ شعبی سے مروی ہے انہوں نے کہا: استثنا تینوں احکام سے ہے جب وہ توبہ کرے اور اس کی توبہ ظاہر ہو تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی اور اس کی شہادت قبول ہوگی اور اس سے تفسیق زائل ہو جائے گی کیونکہ وہ اب پسندیدہ گواہوں سے ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82)

**مسئلہ نمبر 22**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ قاذف کی شہادت کب ساقط ہوگی؟ ابن الماجشون نے کہا: نفس قذف کے ساتھ۔ ابن القاسم، اشہب اور سحنون نے کہا: اس کی شہادت ساقط نہ ہوگی حتیٰ کہ اسے کوڑے لگ جائیں اگر معافی یا کسی اور وجہ سے اسے کوڑے نہ لگائے گئے تو اس کی شہادت رد نہ ہوگی۔ شیخ ابوالحسن لخمی نے کہا: اس کی شہادت عمر کی مدت میں موقوف ہوتی ہے اس قول کو ترجیح دی ہے جب توبہ قذف میں اپنے آپ کو جھٹلانے کے ساتھ ہو ورنہ کونسا رجوع اس کے عدل کے لیے

ہے اگر وہ تہمت لگائے اور اسے حد لگائی گئی ہو اور اپنی عدالت پر باقی ہو۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ علماء کا اختلاف ہے کہ توبہ کے بعد شہادت کے جواز پر کسی چیز میں شہادت جائز نہ ہوگی۔ امام مالک نے فرمایا: ہر چیز میں مطلقاً شہادت جائز ہے، اسی طرح اس میں بھی جس چیز میں حد لگائی گئی ہو (1)۔ اس کو نافع اور ابن عبد الحکم نے مالک سے روایت کیا ہے؛ یہ ابن کنانہ کا قول ہے۔ وقار نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس کی شہادت اس مسئلہ میں خاص طور پر قبول نہیں ہوگی جس میں اسے حد لگائی گئی تھی اس کے علاوہ معاملات میں اس کی گواہی قبول ہوگی؛ یہ مطرف اور ماجشون کا قول ہے۔ عتبی نے اصبغ اور سحنون سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ سحنون نے کہا: جس کو کسی چیز میں حد لگائی گئی ہو تو اس کی مثل میں اس کی شہادت جائز نہ ہوگی۔ مطرف اور ابن الماجشون نے کہا: جس کو قذف یا زنا میں حد لگائی گئی ہو تو زنا، قذف، لعان میں سے کسی چیز میں گواہی قبول نہ ہوگی اگرچہ وہ عادل بھی ہو۔ ان دونوں حضرات نے یہ امام مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ جب کئی معطوفہ جملوں کے بعد استثناء آئے تو وہ امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک تمام جملوں کی طرف لوٹے گی۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے بڑے اصحاب کے نزدیک جو قریب ترین جملہ ہوگا استثنا اس کی طرف لوٹے گی اور وہ فسق ہے۔ اس لیے اس کی شہادت ہمیشہ قبول نہ ہوگی کیونکہ استثنا صرف فسق کی طرف راجع ہے نہ کہ شہادت کی قبولیت کی طرف راجع ہے۔

اس اصل میں اختلاف کے دو سبب ہیں۔ (1) معطوفہ جملے عطف کی وجہ سے ایک جملہ کے حکم میں ہیں یا یہ جملہ اپنے حکم میں مستقل ہے اور حرف عطف صرف محسن ہے مشرک (شریک کرنے والا) نہیں یہ جملوں کے عطف میں صحیح ہے کیونکہ مختلف جملوں کا ایک دوسرے پر عطف صحیح ہے جیسا کہ نحو میں معروف ہے۔

دوسرا سبب۔ استثنا سابقہ جملوں کی طرف لوٹنے میں شرط کے مشابہ ہے کیونکہ شرط فقہاء کے نزدیک تمام کی طرف لوٹتی ہے یا استثنا شرط کے مشابہ نہیں ہے کیونکہ لغت میں یہ قیاس کے باب سے ہے۔ اور اصل فقہ میں یہ فاسد ہے اصل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک محتمل ہے اور ترجیح نہیں ہے۔ پس جو قاضی نے وقف کا قول کیا ہے وہ متعین ہوگیا ہے۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کتاب اللہ میں دونوں امر موجود ہیں۔ آیۃ المحاربۃ میں ضمیر بالاتفاق تمام کی طرف راجع ہے اور مومن کو خطاً قتل کرنے کی آیت میں استثنا کا رد بالاتفاق آخری جملہ کی طرف ہے۔ آیت قذف دونوں وجوہ کا احتمال رکھتی ہے پس بغیر شک کے وقف متعین ہو جاتا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ کلی اصولی نظر ہے اور فقہی جزئی نظر کے اعتبار سے امام مالک اور امام شافعی کا قول راجح ہے وہ اس طرح کہ استثنا فسق اور شہادت کی قبولیت کی نہی کی طرف راجع ہے مگر ان کے درمیان ایک خبر کے ساتھ فرق کیا گیا ہے جس کا تسلیم کرنا واجب ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ توبہ کفر کو مٹا دیتی ہے پس جو اس سے کم ہوگا اس کو بدرجہ اولیٰ مٹا دے گی۔ واللہ اعلم۔ ابو عبید نے کہا: استثنا تمام سابقہ جملوں کی طرف راجع ہے۔ انہوں نے کہا: جس نے زنا کی طرف نسبت کی ہے وہ زنا کے مرتکب سے بڑا جرم کرنے والا نہیں، پھر جب زانی توبہ کرے تو اس کی شہادت قبول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 165

ہوتی ہے کیونکہ "گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا" (1)۔ جب اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے تو بندوں کو اس کی توبہ بدرجہ اولیٰ قبول ہونی چاہیے جبکہ اس استثنا کی مثل قرآن میں کئی جگہ موجود ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا (المائدہ) اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ استثنا تمام جملوں کی طرف راجع ہے۔ زجاج نے کہا قاذف، کافر سے سخت مجرم نہیں۔ پس اس کا حق یہ ہے کہ جب وہ توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اس کی شہادت قبول کی جائے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَبَدًا اس کا مطلب ہے جب تک وہ تہمت لگانے والا ہے جیسے کہا جاتا ہے: لاتقبل شهادة الكافر ابدا اس کا مطلب ہے جب تک وہ کافر ہے۔ شعبی نے اس مسئلہ میں مخالفت کرنے والے کو کہا: اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور تم اس کی شہادت قبول نہیں کرتے۔

بعض اصولیین کے نزدیک استثنا آخری جملہ کی طرف راجع ہے اور وہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ہے۔ یہ تعلیل ہے مستقل جملہ نہیں یعنی ان کے فسق کی وجہ سے ان کی شہادت قبول نہ کرو جب فسق زائل ہو جائے تو پھر ان کی شہادت قبول کیوں نہیں کی جائے گی؟ پھر تہمت لگانے والے کا توبہ کرنا اپنے نفس کو جھٹلانا ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ پر تہمت لگانے والوں کو صحابہ کی موجودگی میں کہا تھا۔ حالانکہ وہ واقعہ بصرہ سے حجاز تک اور دوسرے علاقوں تک پھیل چکا تھا۔ اگر آیت کی وہ تاویل ہوتی جو کوفیوں نے کی ہے تو صحابہ کرام سے اس کا علم غائب نہ ہوتا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہہ دیتے کہ تہمت لگانے والے کی توبہ ہمیشہ قبول نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کتاب اللہ کی تاویل کی تحریف کے فیصلہ پر وہ خاموش رہیں ورنہ ان کا قول ساقط ہو جاتا۔ واللہ المستعان۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ قشیری نے کہا: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب تہمت لگانے والے کو کوڑے نہ لگائے گئے ہوں مثلاً قاذف سے مطالبہ حد کرنے سے پہلے مقذوف مر جائے یا وہ مقدمہ سلطان تک نہ لے جائے یا مقذوف اسے معاف کر دے تو پھر اس کی شہادت قبول ہو گی کیونکہ خصم کے نزدیک بھی اس مسئلہ میں شہادت کی قبولیت سے نہی کوڑوں پر معطوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا امام شافعی نے اس مقام پر کہا: یہ حد لگنے سے پہلے حد لگنے کے وقت سے زیادہ برا ہے کیونکہ حدود تو کفارہ ہیں پھر اس کی کیسے شہادت رد کی جائے گی جو دو حالتوں میں سے بہتر حالت میں ہے نہ کہ گھٹیا حالت میں ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح کہا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں اور ابن ماجشون سے پہلے روایت ہو چکا ہے کہ قذف کے ساتھ ہی اس کی شہادت رد ہو جائے گی؛ یہ لیث، اوزاعی اور شافعی کا قول ہے۔ اس کی گواہی رد کر دی جائے گی اگرچہ اسے حد نہ بھی لگی ہو کیونکہ تہمت لگانے کے ساتھ ہی وہ فاسق ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ گناہ کبیرہ ہے پس اس کی شہادت قبول نہ ہو گی حتی کہ اس کی

1۔ سنن ابن ماجہ، ذکر التوبۃ، جلد 2، صفحہ 323۔ ایضاً، حدیث 4239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

برأت صحیح ہو جائے وہ اس طرح کہ جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ زنا کا اقرار کرے یا اس کے خلاف بینہ قائم ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 26۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَصْلَحُوْا یعنی توبہ کا اظہار کرے۔ بعض نے کہا: عمل کی اصلاح کرے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ جب وہ توبہ کریں اور ان کی توبہ قبول ہو۔

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ۝ وَ الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۝ وَ یَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ۝ وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَیْهَاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۝ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِیْمٌ۝

''اور وہ (خاوند) جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر اور نہ ہوں ان کے پاس کوئی گواہ بجز اپنے تو ان کی شہادت کا یہ طریقہ ہے کہ وہ خاوند چار مرتبہ گواہی دے کہ بخدا وہ (یہ تہمت لگانے میں) سچا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہے۔ اور ٹل سکتی ہے اس عورت سے حد کہ وہ گواہی دے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہ وہ (خاوند) جھوٹا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہو اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں تیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ، اَنْفُسُهُمْ بدل کی بنا پر مرفوع ہے اور استثنا اور یکن کی خبر کی بنا پر نصب بھی جائز ہے۔ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ کوفیوں کی قرأت مبتدا اور خبر کی بنا پر رفع کے ساتھ ہے یعنی ان میں سے ایک کی شہادت جس کی وجہ سے اس سے حد قذف زائل ہوگی وہ چار شہادتیں ہیں۔ اہل مدینہ اور ابو عمرو نے اربع کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے(1)، کیونکہ فشهادة کا معنی أن یشهد ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فعلیهم أن یشهد أحدهم أربع شهادات یا یہ تقدیر ہوگی: فالأمر أن یشهد أحدهم أربع شهادات دوسری صورت میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ شہادت کی وجہ سے منصوب ہے۔ الخامسة مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر ان اور اس کا صلہ ہے اور ان مخففہ کا معنی مثقلہ کے معنی کی طرح ہے کیونکہ اس کا معنی ہے انه۔ ابو عبد الرحمن، طلحہ اور عاصم نے حفص کی روایت میں الخامسة نصب کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی وتشهد الشهادة الخامسة اور باقی قراء نے ابتدا کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور خبر اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ہے یعنی الشهادة الخامسة قوله لعنة الله علیه۔

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 18 صفحہ 100

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کے نزول کا سبب وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ بدکاری کرنے کی تہمت لگائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دلیل پیش کرو ورنہ پیٹھ پر حد قذف ہوگی'' (1)۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہم میں سے کوئی کسی کو اپنی بیوی پر دیکھے تو وہ دلیل تلاش کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی فرماتے رہے ''دلیل پیش کرو ورنہ تیری پیٹھ پر حد ہوگی''۔ ہلال نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! میں سچا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے معاملہ میں ایسی چیز نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ کو حد سے بری کرے گی تو یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ آپ نے لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ تک تلاوت کی۔ بعض علماء نے فرمایا جب سابقہ آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ نازل ہوئی اس کا ظاہر ازواج (خاوندوں) اور دوسروں کو شامل تھا۔ حضرت سعد بن معاذ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر میں بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پاؤں تو میں اسے چھوڑے رکھوں حتیٰ کہ میں چار گواہ لے آؤں۔ اللہ کی قسم! میں اسے تلوار کی دھار سے ماروں گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم سعد کی غیرت پر تعجب کر رہے ہو میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے'' (2)۔ حضرت سعد کے الفاظ میں روایات مختلف ہیں مفہوم ایک جیسا ہے۔ پھر اس کے بعد ہلال بن امیہ واقفی آئے اس نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء بلوی کے ساتھ بدکاری کی تہمت لگائی جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حد قذف لگانے کا عزم کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہلال اور اس کی بیوی کو مسجد میں جمع کیا اور انہوں نے لعان کیا۔ پانچویں مرتبہ قسم اٹھانے سے عورت ہچکچائی جب اسے نصیحت کی گئی اور کہا گیا کہ اس مرتبہ کی گواہی فیصلہ کن ہوگی۔ پھر کہنے لگی: میں ہمیشہ کے لیے اپنی قوم کو رسوا نہیں کرتی پس اس نے لعان مکمل کر دیا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے درمیان جدائی کر دی اس نے ایک بچہ جنم دیا جو مٹیالے اونٹ کی طرح تھا، اس صفت پر جو ناپسندیدہ تھی پھر اس کے بعد وہ بچہ مصر کا امیر بنا جبکہ وہ اپنا باپ نہیں جانتا تھا۔ عویمر عجلانی آیا تھا اس نے بھی اپنی بیوی پر تہمت لگائی تھی اور لعان کیا تھا۔ مشہور یہ ہے کہ حضرت ہلال کا واقعہ پہلے تھا اور وہی آیت کے نزول کا سبب تھا۔ بعض نے کہا: عویمر بن اشقر کا واقعہ پہلے تھا۔ یہ حدیث مشہور ہے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔ ابوعبداللہ بن ابی صفرہ نے کہا: صحیح یہ ہے کہ اپنی بیوی پر تہمت لگانے والا عویمر تھا اور ہلال بن امیہ غلطی ہے۔ طبری نے کہا: حدیث میں ہلال بن امیہ کا قول منکر ہے کیونکہ تہمت لگانے والا عویمر بن زید بن الجد بن عجلانی تھا وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ احد میں شریک ہوا تھا اس نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ بدکاری کرنے کی تہمت لگائی تھی۔ سحماء اس کی والدہ تھی۔ بعض نے کہا: اس کو سحماء اس کے کالے ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اور وہ ابن عبدہ بن الجد بن عجلانی مورخین اور اہل الاخبار نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض علماء نے کہا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کے دن خطبہ میں یہ آیات پڑھیں: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ تو عاصم بن عدی انصاری نے کہا: اللہ مجھے آپ پر قربان کرے۔ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو اپنی بیوی کے پیٹ پر پائے پھر اس نے بات کی اور جو مسئلہ جاری ہوا تھا اس کے متعلق خبر دی اسے

1۔ صحیح بخاری، اذا ادعی او قذف فلہ ان یلتمس البینۃ، جلد 1، صفحہ 367

2۔ صحیح مسلم، کتاب اللعان، جلد 1، صفحہ 491

اسی (80) کوڑے لگائے جائیں گے اور مسلمان اس کو فاسق کہیں گے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اس وقت ہم میں سے کسی کے لیے چار گواہ لانا کیسے ممکن ہے۔ اور وہ چار گواہ تلاش کرنے کے لیے جائے گا تو وہ مرد اپنی خواہش پوری کر چکا ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عاصم بن عدی! اسی طرح حکم نازل ہوا ہے''۔ عاصم یہ حکم سنتے ہوئے اور اطاعت کرتے ہوئے باہر نکلا۔ اسے ہلال بن امیہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ) پڑھتے ہوئے ملا۔ عاصم نے پوچھا کیا ہوا۔ اس نے کہا: بہت برا ہوا ہے۔ میں نے شریک بن سحماء کو اپنی بیوی خولہ کے پیٹ پر اس کے ساتھ زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ خولہ عاصم بن عدی کی بیٹی تھی۔ اس طریق میں اسی طرح ہے کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ شریک کو پایا تھا وہ ہلال بن امیہ تھا۔ صحیح اس کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کلبی نے کہا: اظہر یہ ہے کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ شریک کو پایا تھا وہ عویمر عجلانی تھا کیونکہ کثرت سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عویمر اور اس کی بیوی میں لعان کرایا تھا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ زانی شریک بن عبدہ تھا اس کی ماں سحماء تھی۔ عویمر اور خولہ بنت قیس اور شریک عاصم کے چچا کی اولاد تھے۔ یہ واقعہ شعبان 9ھ میں ہوا تھا جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینہ لوٹے تھے؛ یہ طبری کا قول ہے۔ اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر تھا عویمر عجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان ہوا تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس ہوئے تھے۔ عویمر نے اس کے حمل کا انکار کیا تھا جو اس کے پیٹ میں تھا۔ عویمر نے کہا: یہ ابن سحماء کا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عویمر کو فرمایا: ''اپنی بیوی کو لے آؤ تمہارے متعلق قرآن نازل ہوا ہے'' (1)۔ پس ان کے درمیان عصر کے بعد ایک قالین پر منبر کے پاس لعان ہوا تھا۔ اس کے طریق میں سے واقدی عن ضحاک بن عثمان عن عمران بن ابی انیس بھی ہے فرمایا: میں نے عبداللہ بن جعفر کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ آگے پورا واقعہ بیان کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ یہ ہر تہمت لگانے والے میں عام ہے۔ خواہ وہ کہے: تو نے زنا کیا ہے یا کہے: اے زانیہ! یا کہے: میں نے اسے زنا کرتے ہوئے دیکھا یا کہے: یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ یہ آیت تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اگر وہ خاوند چار گواہ نہ لائے تو لعان واجب ہوگا؛ یہ جمہور علماء اور عام فقہاء اور اہل حدیث کی جماعت کا نظریہ ہے۔ امام مالک سے اس کی مثل مروی ہے۔ امام مالک فرماتے تھے: لعان نہیں ہوگا مگر یہ کہ خاوند کہے میں نے تجھے زنا کرتے ہوئے دیکھا یا اس کے حمل کی نفی کرے یا اس کے بچہ کی نفی کرے۔ ابوالزناد، یحییٰ بن سعید اور البتی کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ لعان تہمت لگانے سے واجب نہ ہوگا۔ یہ زنا کرتے ہوئے دیکھنے یا استبرا کے دعویٰ کے ساتھ حمل کی نفی کرے۔ یہ امام مالک کے نزدیک مشہور ہے یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ کا قول عام ہے۔ ابن عربی نے کہا: قرآن کا ظاہر بغیر دیکھنے کے صرف تہمت لگانے سے لعان کے ایجاب کے لیے کافی ہے۔ پس قرآن کے ظاہر پر اعتماد کرو خصوصاً جبکہ حدیث صحیح میں بھی ہے۔ بتاؤ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ اور اپنی بیوی کو لے آ'' (2)۔ آپ نے اسے دیکھنے کے ذکر کرنے کا مکلف نہیں کیا اور علماء کا اجماع ہے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 277
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللعان، جلد 1، صفحہ 488

کہ اندھا جب اپنی بیوی پر تہمت لگائے گا تو لعان ہوگا اگر دیکھنا لعان کے لیے شرط ہوتا تو اندھا لعان نہ کرتا؛ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ ابن قصار نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اندھے کا لعان صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کہے: میں نے مرد کی فرج کو عورت کی فرج میں چھوا۔ امام مالک اور اس کے متبعین کی حجت ابوداؤد کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے فرمایا: ہلال بن امیہ آیا یہ ان تین افراد میں سے ہے جن کی توبہ قبول کی گئی تھی وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس آیا اس نے اپنے گھر والوں کے پاس ایک شخص دیکھا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا پھر اسے کچھ نہ کہا حتی کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے گھر والوں کے پاس عشاء کے وقت آیا میں نے ان کے پاس ایک شخص کو پایا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا (1)۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کو پسند نہ فرمایا اور اس پر سختی کی تو یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ الخ (2)، یہ نص ہے کہ وہ لعان جس کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا تھا وہ دیکھنے کی صورت میں تھا۔ پس اس سے تجاوز کرنا درست نہیں جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی اور دیکھنے کا ذکر نہیں کیا تو اسے حد لگائی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جب حمل کی نفی کرے تو لعان ہوگا کیونکہ یہ دیکھنے سے اقویٰ ہے اس کے بعد وطی کے نہ کرنے اور استبرا کا ذکر ضروری ہے۔ ہمارے علماء کا استبرا کے بارے میں اختلاف ہے۔ مغیرہ اور ایک قول میں امام مالک نے کہا: اس میں ایک حیض کافی ہے۔ امام مالک نے یہ بھی کہا کہ وہ نفی نہ کرے مگر تین حیض کے ساتھ (3)۔ صحیح پہلا قول ہے رحم کی برأت تو ایک حیض سے بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ لونڈی کے استبرا میں ہے اور ہم نے عدت میں تین حیضوں کی رعایت رکھی ہے دوسرے حکم کی وجہ سے جس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ طلاق میں آئے گا۔ لخمی نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا: استبرا کے ساتھ بچے کی نفی نہیں کی جائے گی کیونکہ حیض حمل میں بھی آتا ہے؛ یہی اشہب نے ابن المواز کی کتاب میں کہا ہے۔ یہی قول مغیرہ کا ہے اور انہوں نے کہا: بچے کی نفی نہیں کی جائے گی (4) مگر پانچ سال کے ساتھ کیونکہ یہ اکثر مدت حمل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** ہمارے نزدیک لعان میاں، بیوی کے درمیان ہوگا خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام ہوں، مومن ہوں یا کافر ہوں، فاسق ہوں یا عادل ہوں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ آزاد آدمی اور اس کی لونڈی کے درمیان اور ام ولد کے درمیان لعان نہیں ہے۔ بعض علماء نے کہا: لونڈی کے بچے کی نفی نہ ہوگی مگر ایک قسم کے ساتھ بخلاف لعان کے۔ بعض علماء نے کہا: جب ام ولد کے بچے کی نفی کرے گا تو لعان ہوگا۔ پہلا قول امام مالک کا مذہب ہے اور وہی صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: لعان صحیح نہیں ہے مگر دو آزاد مسلمان میاں بیوی کے درمیان کیونکہ لعان امام ابوحنیفہ کے نزدیک شہادت ہے۔ ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک قسم ہے اور ہر وہ شخص جس کی قسم صحیح ہے اس کا قذف اور لعان بھی صحیح ہے اور علماء کا اتفاق ہے

1۔ اسباب النزول، صفحہ 164
2۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی اللعان، حدیث 1923
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 164
4۔ ایضاً

کہ میاں بیوی کے لیے مکلف ہونا ضروری ہے اور عویمر کے قول ''کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے'' یہ دلیل ہے کہ لعان میاں، بیوی کے درمیان ہوگا کیونکہ کسی مرد سے مرد کو اور عورت کو عورت سے خاص نہیں کیا اور لعان کی آیت اس جواب پر نازل ہوئی فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ کسی خاوند کو خاص نہیں کیا فرمایا: یہی امام مالک اور اہل مدینہ کا مذہب ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق، ابوعبید اور ابوثور کا قول ہے اور لعان نکاح کے فسخ کا موجب ہے پس یہ طلاق کے مشابہ ہے اور جس کی طلاق جائز ہے اس کا لعان بھی جائز ہے۔ لعان قسمیں ہیں شہادت نہیں ہیں۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے جو سب کہنے والوں سے سچا ہے: لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا (المائدہ: 107) یعنی ایماننا اور الله تعالیٰ نے فرمایا: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (المنافقون) پھر فرمایا: اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (المجادلہ: 16) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر قسمیں نہ ہوتیں تو میرے لیے اور اس کے لیے، اور معاملہ ہوتا'' (1) اور رہے وہ دلائل جن سے امام ابوحنیفہ اور ثوری نے حجت پکڑی ہے وہ قوی نہیں ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے جو عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انہوں نے اس کے دادا حضرت عبدالله بن عمرو سے روایت کی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار افراد ایسے ہیں جن کے درمیان لعان نہیں ہے آزاد اور لونڈی کے درمیان لعان نہیں ہے، آزاد عورت اور غلام خاوند کے درمیان لعان نہیں ہے، مسلمان مرد اور یہودی عورت کے درمیان لعان نہیں ہے، مسلمان مرد اور نصرانی عورت کے درمیان لعان نہیں ہے''۔ اس حدیث کو دارقطنی نے کئی طرق سے روایت کیا ہے اور تمام کے تمام ضعیف ہیں۔ اوزاعی اور ابن جریج سے مروی ہے وہ دونوں امام ہیں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے یہ قول مروی ہے اور انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں کیا ہے اور نظر کی حجت سے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ جب خاوندوں کی جملہ شہداء (گواہ) سے استثناء کی گئی ہے، ارشاد فرمایا: وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ تو واجب ہے کہ لعان نہ کیا جائے مگر جس کی شہادت جائز ہو اگر یہ قسم ہوتی تو رد نہ کی جاتی اور ان کی تردید میں حکمت تعداد میں اس کو زنا میں شہود کے قائم مقام کرنا ہے۔ ہم کہتے ہیں: یہ قسامت کی یمین کے ساتھ باطل ہے اس کا تکرار کیا جاتا ہے۔ اور بالاجماع وہ شہادت نہیں ہے اور اس کے تکرار میں حکمت فروج اور خونوں میں تغلیظ ہے۔ ابن عربی نے کہا: قول فیصل یہ ہے کہ یہ قسمیں ہیں شہادت نہیں کیونکہ خاوند اپنے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات میں اور اپنے آپ کو عذاب سے بچانے کے لیے قسمیں اٹھاتا ہے اور کسی کے لیے یہ کیسے جائز ہوگا کہ وہ شریعت میں دعویٰ کرے کہ گواہ اپنے لیے ایسی گواہی دے گا جو غیر پر کوئی حکم ثابت کر دے گی۔ یہ اصل میں بعید ہے اور نظر میں معدوم ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** گونگے کے لعان کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: وہ لعان کرے گا کیونکہ اس کی طلاق، ظہار اور ایلاء صحیح ہے جب اس کے اشارہ سے سمجھا جائے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: وہ لعان نہیں کرے گا کیونکہ وہ اہل شہادت میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ زبان سے دی جاتی ہے، پس لعان نہیں ہوگا اور ہمارے لیے اس پر حد لگانا ممکن نہیں ہے۔ یہ مفہوم سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ اور دلیل بھی بیان ہو چکی ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب فی اللعان، جلد 1، صفحہ 307۔ ایضاً، حدیث 1923، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 7**۔ ابن عربی نے کہا: امام ابوحنیفہ آیت کے عموم کا اعتبار کرتے ہیں اس لیے فرمایا: جب کوئی مرد اپنی بیوی پر اس سے شادی کرنے سے پہلے تہمت زنا لگائے تو وہ لعان کرے گا۔ اور وہ یہ بھول گئے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ اس نے محصنة پر تہمت لگائی ہے، زوجہ پر تہمت نہیں لگائی ہے۔ لعان اس قذف (تہمت) میں ہوتا ہے جس میں نسب لاحق ہو اور یہ ایسا قذف ہے جس میں نسب لاحق نہیں ہوتا۔ پس لعان کو ثابت نہیں کرے گا جیسے اگر وہ کسی اجنبیة پر تہمت لگاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جب طلاق کے بعد عورت پر خاوند تہمت لگائے تو وہ دیکھے اگر وہاں نسب ہے جس کی وہ نفی کرنا چاہتا ہے یا کوئی حمل ہے جس سے براءت چاہتا ہے تو لعان ہوگا ورنہ لعان نہیں ہوگا۔ عثمان البتی نے کہا: کسی حال میں لعان نہ ہوگا کیونکہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: دونوں صورتوں میں لعان نہ ہوگا کیونکہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ یہ اس مسئلہ کے خلاف ہو جاتا ہے جب زوجیت میں لانے سے پہلے تہمت لگاتا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے بلکہ یہ اولیٰ ہے کیونکہ نکاح ہو چکا ہے اور وہ نسب سے نفی کرنا چاہتا ہے اور اس بچے سے برأت چاہتا ہے جو اسے لاحق کیا جاتا تھا۔ پس لعان ضروری ہے جب وہاں ایسا حمل نہ ہو جس کی امید ہو اور نہ نسب ہو جس کے تعلق کا خوف ہو۔ لعان کا کوئی فائدہ نہیں پس لعان کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ یہ مطلق قذف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ کے عموم کے تحت داخل ہے۔ پس اس پر حد ہوگی اور جو البتی نے کہا اس کے فساد کے ظہور کی وجہ سے وہ باطل ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ عدت کے ختم ہونے کے بعد میاں، بیوی میں لعان نہ ہوگا مگر ایک مسئلہ میں وہ یہ ہے کہ مرد غائب ہو اور عورت بچہ جنم دے اس کے غائب ہونے کی حالت میں جبکہ اسے معلوم نہ ہو کہ اس نے بچہ جنم دیا ہے۔ پس وہ اسے طلاق دیتا ہے پھر اس کی طلاق کی عدت گزر جاتی ہے بعد میں وہ آتا ہے اور اس بچہ کی نفی کرتا ہے تو اس کے لیے اس عورت سے عدت کے بعد لعان کرنا جائز ہے اسی طرح اگر وہ عورت کی وفات کے بعد آیا اور بچے کی نفی کی تو وہ اپنے لیے لعان کرے گا جبکہ وہ عدت کی مدت کے بعد مر چکی ہے اور وہ مرد اس کا وارث بنے گا کیونکہ وہ ان کے درمیان فرقت کے وقوع سے پہلے فوت ہو گئی تھی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ جب حمل کی نفی کرے اور وہ اس کی شرط کے ساتھ واقع ہو تو وضع حمل سے پہلے لعان کرے گا؛ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: وضع حمل کے بعد لعان کرے گا کیونکہ ممکن ہے کہ پیٹ میں ہوا ہو یا کوئی بیماری ہو اور ہماری دلیل نص صریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع سے پہلے لعان کرایا اور فرمایا: ''اگر وہ ایسا ایسا بچہ جنم دے گی تو وہ اپنے باپ کا ہوگا اور اگر ایسا ایسا بچہ جنم دے گی تو وہ فلاں کا ہوگا'' (1) تو اس عورت نے ناپسندیدہ صفت پر بچہ جنم دیا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اگر مرد اپنی بیوی پر دبر میں وطی کی تہمت لگائے تو لعان کرے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: لعان نہیں کرے گا۔ ان کی بنیاد ان کی اصل پر ہے کہ لواطت سے حد ثابت نہیں ہوتی۔ یہ فاسد ہے کیونکہ تہمت لگانا ایک فساد ہے اور یہ اس ارشاد کے عموم کے تحت داخل ہے: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ یہ مسئلہ سورۃ الاعراف اور سورۃ المومنون میں گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، من اظہر الفاحشة والتلطخ والتهمة بغير بينة، جلد 2، صفحہ 1013

**مسئلہ نمبر 12**۔ ابن العربی نے کہا: اس شخص کے عجیب مسئلہ میں سے یہ ہے کہ جب کوئی اپنی بیوی اور بیوی کی ماں پر زنا کی تہمت لگائے اگر اسے ماں کی وجہ سے حد لگائی جائے گی تو بیٹی کی حد ساقط ہو جائے گی اگر بیٹی کی وجہ سے لعان ہوگا تو ماں کی وجہ سے حد ساقط نہ ہوگی۔ اس کی کوئی وجہ نہیں۔ میں نے اس میں ان کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جو حکایت کی گئی ہو۔ یہ بالکل باطل ہے کیونکہ آیت کے عموم کو ماں کی حد کی وجہ سے بیٹی میں خاص کیا ہے اور وہ زوجہ ہے۔ اس میں نہ کوئی اثر ہے اور نہ اصل ہے جس پر اس نے قیاس کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب اپنی بیوی پر تہمت لگائے پھر وہ لعان سے پہلے زنا کر لے تو نہ حد ہوگی اور نہ لعان ہوگا۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ ثوری اور مزنی نے کہا: قاذف سے حد ساقط نہ ہوگی اور تہمت لگائے جانے کے بعد مقذوف کا زنا اس کی متقدم حصانت میں قدح کا باعث نہیں ہے اور وہ اسے نہیں اٹھائے گا کیونکہ حصانت اور عفت کا اعتبار حالت قذف میں ہے نہ کہ اس کے بعد ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان پر قذف لگائے پھر مقذوف مرتد ہو جائے قذف کے بعد اور قاذف کو حد لگانے سے پہلے تو اس سے حد ساقط نہ ہوگی۔ نیز حدود تمام وجوب کے وقت معتبر ہوتی ہیں نہ کہ حدود کے قائم کرنے کے وقت معتبر ہوتی ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ لعان اور حد کے حصول سے پہلے ایک معنیٰ ظاہر ہو چکا ہے اگر وہ ابتدا میں موجود ہوتا تو لعان کی صحت اور حد کے وجوب کے مانع ہوتا۔ اسی طرح جب دوسرے میں طاری ہو جیسے دو گواہ گواہی دیں جن کا ظاہر عدالت ہو اور حاکم نے ان کی شہادت کے ساتھ فیصلہ نہیں دیا حتی کہ زنا کرے یا شراب پینے کے ساتھ ان کا فسق ظاہر ہو جائے تو حاکم کے لیے جائز نہیں کہ ان کی اس شہادت کے ساتھ فیصلہ دے۔ اسی طرح عفت و احصان کا حکم ظاہر کے طریق سے ہوگا قطع اور یقین کی حیثیت سے نہ ہوگا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کی پیٹھ محفوظ ہے'' (1)۔ قاذف کو حد نہیں لگے گی مگر دلیل قطعی کے ساتھ۔ وباللہ التوفیق۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی جبکہ وہ اتنی عمر میں بڑی ہے کہ اسے حمل نہیں ہوتا تو لعان ہوگا اور وہ حد کو دور کرنے کے لیے لعان کرے گا اور یہ عذاب کو دور کرنے کے لیے لعان کرے گی۔ اگر وہ بالکل چھوٹی ہو جس کو حمل نہیں ہو سکتا تو لعان ہوگا مرد حد کو دور کرنے کے لیے لعان کرے گا اور وہ لعان نہیں کرے گی کیونکہ اگر اقرار کرے تب بھی اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا۔ ابن الماجشون نے کہا: اس قاذف پر حد نہیں ہے جو نابالغ پر تہمت لگائے (2)۔ لخمی نے کہا: اس بنا پر چھوٹی بچی کے خاوند پر لعان نہیں ہے جو حاملہ نہیں ہو سکتی۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ جب کسی عورت پر چار گواہ زنا کی گواہی دیں ایک ان میں سے اس کا خاوند ہو۔ خاوند لعان کرے گا اور باقی تین کو حد لگے گی؛ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ انہیں حد نہیں لگائی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب خاوند اور تین اور شخص ابتداءً شہادت دیں تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی اور عورت کو حد لگائے جائے گی۔ ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جس نے محصن پر تہمت لگائی اور چار گواہ نہ لایا

---

1۔ صحیح بخاری، ظهر المومن حمی الا فی حد أو فی حق، جلد 2، صفحہ 1003

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 167

تو اس کو حد لگائی جائے گی اس کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ تہمت لگانے والے کے علاوہ چار گواہ لائے اور خاوند اپنی بیوی پر تہمت لگانے والا ہے۔ پس وہ اس سے خارج ہو گیا کہ وہ گواہوں میں سے ایک ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر** 16۔ جب عورت کا حمل ظاہر ہوا پھر خاوند نے اس کی نفی کو ترک کر دیا تو سکوت کے بعد اس کو نفی کرنے کا حق نہیں۔ شریح اور مجاہد نے کہا: اس کو ہمیشہ نفی کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ خطا ہے کیونکہ علم کے بعد اس کا سکوت رضا ہے جیسے اگر پہلے اقرار کرے پھر نفی کرے تو اس کی نفی قبول نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر** 17۔ اگر اس نے نفی کو موخر کیا یہاں تک کہ اس نے وضع حمل کر لیا اور اس نے کہا: ہو سکتا ہے ہوا ہو یا وہ اسے گرا دے تو قذف سے میں راحت پاؤں گا۔ کیا اس کے وضع حمل کے کچھ عرصہ بعد نفی کر سکتا ہے جب وہ اس عرصہ سے تجاوز کرے گا تو اسے نفی کا اختیار نہ ہوگا۔ اس میں اختلاف ہے، ہم کہتے ہیں: جب اس کو سکوت میں کوئی عذر نہ ہو حتی کہ تین دن گزر گئے اور وہ اس پر راضی تھا تو اب اس کے لیے نفی کرنا جائز نہیں؛ یہ امام شافعی کا قول ہے نیز انہوں نے فرمایا: جب اس کے لیے نفی کرنا ممکن تھا جیسا کہ عادت جاری ہے حاکم کی طرف اس کے لیے نفی ممکن تھی پھر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے بعد اس کے لیے نفی کرنا جائز نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: میں مدت کا اعتبار نہیں کرتا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا: اس میں چالیس دن معتبر ہوں گے یعنی مدت نفاس۔ ابن القصار نے کہا: ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ اپنے بچے کی نفی کرنا اس پر حرام کیا گیا ہے۔ اور بچے کا لاحق کرنا اس پر حرام نہیں کیا گیا پس اس پر وسعت کرنا ضروری ہے تاکہ غور و فکر کر لے۔ کیا اس کے لیے نفی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ہم نے حد کو تین دن بتایا ہے کیونکہ یہ کثرت کی ابتدائی حد ہے اور قلت کی حد کا آخر ہے تین دن مدت رکھی ہے کیونکہ اس کے ساتھ مصراۃ (جس کا دودھ روکا گیا ہو) حال معلوم کیا جاتا ہے۔ پس یہاں بھی یہی ہونا چاہیے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ان کا اعتبار، مدت ولادت اور رضاع کے اعتبار سے اولیٰ نہیں ہے کیونکہ شریعت میں ان کی کوئی شہادت نہیں ہے جبکہ ہم نے شریعت میں مصرات کی مدت سے شاہد ذکر کر دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 18۔ ابن القصار نے کہا: جب عورت اپنے خاوند یا کسی اجنبی شخص کو کہے: یازانیہ ھاء کے ساتھ اور اسی طرح اجنبی، اجنبی کو کہے تو اس میں اپنے اصحاب کی نص نہیں دیکھتا لیکن میرے نزدیک یہ قذف ہوگا اور ایسا کہنے والے پر حد ہوگی اور اس نے ایک حرف زائدہ کیا ہے۔ اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف نے کہا: یہ قذف نہ ہوگا اور علماء کا اتفاق ہے جب کوئی اپنی بیوی کو کہے: یازان تو قذف ہوگا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ مراد میں قذف ہے یہ خطاب ہے جب اس کا معنی سمجھا جائے گا تو اس کا حکم ثابت ہوگا خواہ وہ عجمی لفظ ہو یا عربی لفظ ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اس نے جب عورت کو کہا: زینت (تاء کے فتحہ کے ساتھ) تو قذف ہوگا کیونکہ اس کا معنی اس سے سمجھا جا رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ مونث کو مذکر کے خطاب کے ساتھ مخاطب کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ قَالَ نِسْوَةٌ** (یوسف: 30) تو یازان کا قول مونث کے لیے قذف ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جب مذکر کا فعل مونث لانا جائز نہیں جب وہ اس پر مقدم ہو اور مونث کو اس کے ساتھ خطاب کرنے کی وجہ سے حکم ثابت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ نکاح فاسد میں بھی اپنی بیوی سے لعان کرے گا کیونکہ وہ اس کی فراش ہوگئی تھی اور اس میں نسب لاحق ہوگا؛ پس اس پر لعان بھی جاری ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ جب خاوند لعان کرنے سے انکار کردے تو علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اس پر حد نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اجنبی پر حد رکھی ہے اور خاوند پر لعان۔ جب لعان، اجنبی کی طرف منتقل نہیں ہوتا تو حد بھی خاوند کی طرف منتقل نہ ہوگی اور اسے قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لعان کرے کیونکہ حدود قیاساً مؤخر نہیں کی جاتی ہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور جمہور نے کہا: جب خاوند لعان نہیں کرے گا تو اسے حد لگائی جائے گی کیونکہ اس کے لیے لعان پر برأت تھی جیسے اجنبی کے لیے شہود (گواہ) ہوتے ہیں اگر اجنبی شخص چار گواہ نہ لائے تو اسے حد لگائی جاتی ہے اسی طرح خاوند لعان نہیں کرے گا تو اس کو حد لگائی جائے گی۔ عجلانی کی حدیث میں جو ہے وہ اس پر دلیل ہے اس نے کہا تھا: اگر میں خاموش ہوں گا تو غصہ پر خاموش ہوں گا اگر میں قتل کروں گا تو مجھے قتل کیا جائے گا اور اگر میں بولوں گا تو مجھے کوڑے لگائے جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا خاوند کے لیے گواہوں کے ساتھ لعان ہوگا؟ امام مالک اور امام شافعی نے کہا: وہ لعان کرے گا خواہ اس کے لیے گواہ ہوں یا گواہ نہ ہوں کیونکہ گواہوں کا حد کو دور کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ رہا فراش کا اٹھنا اور بچے کی نفی تو اس میں ضرور لعان ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: لعان خاوند کے لیے ہے جب اس کے لیے اپنی ذات کے علاوہ گواہ نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ لعان میں آغاز اس سے ہوگا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا اور وہ خاوند ہے اس کا فائدہ اس کا حد کو دور کرنا ہے اور اپنے سے نسب کی نفی کرنا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دلیل پیش کرو ورنہ تیری پیٹھ پر حد لگے گی''۔ اگر عورت سے لعان کا آغاز کیا گیا تو جائز نہ ہوگا کیونکہ جو ترتیب اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کا برعکس ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جائز ہوگا۔ یہ درست نہیں کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے جس کی طرف وہ لوٹے اور نہ کوئی ایسا مفہوم ہے جو اسے تقویت دے بلکہ ہمارے لیے معنی ہے کیونکہ عورت جب لعان سے آغاز کرے گی تو وہ اس کی نفی کرے گی جو اس نے ثابت بھی نہیں کیا اور اس کی کوئی وجہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ لعان کی کیفیت یہ ہے کہ حاکم لعان کرنے والے مرد سے کہے کہ تو کہہ: اشھد باللہ میں نے اسے زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور میں نے زانی کی فرج اس کی فرج میں اس طرح دیکھی ہے جس طرح سرمہ دانی میں سرچو اور میں نے اسے دیکھنے کے بعد اس سے وطی نہیں کی۔ اگر چاہے تو تو کہے اس نے زنا کیا ہے اور اس کے زنا کے بعد میں نے اس سے وطی نہیں کی۔ ان دو لفظوں میں سے جو چاہے چار مرتبہ بیان کرے اگر وہ ان قسموں سے یا ان میں سے ایک سے انکار کرے گا تو اسے حد لگائی جائے گی۔ اور جب وہ حمل کی نفی کرے گا تو کہے گا: اشھد باللہ میں نے اس سے استبرا کیا ہے اور اس کے بعد میں نے اس سے وطی نہیں کی تھی اور یہ حمل مجھ سے نہیں ہے اور حمل کی طرف اشارہ کرے اور وہ چار مرتبہ یہ قسم اٹھائے اور ہر قسم میں کہے: میں نے اس کے بارے میں جو کہا ہے اس میں میں سچوں میں سے ہوں پھر پانچویں مرتبہ کہے:

علیٰ لعنۃ اللہ إن کنت من الکاذبین۔ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹے لوگوں سے ہوں۔ اگر چاہے تو یہ کہے: اگر میں جھوٹا ہوں اس میں جو میں نے اس کے بارے میں کہا: جب وہ یہ کہے گا تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی اور اس سے بچے کی نفی ہو جائے گی۔ جب مرد لعان سے فارغ ہو جائے گا تو اس کے بعد عورت کھڑی ہو گی اور چار قسمیں اٹھائے گی وہ اس میں کہے گی: اشہد باللہ وہ جھوٹا ہے یا وہ جو میرے بارے اس نے دعویٰ کیا ہے اور جو میرے بارے اس نے ذکر کیا ہے اس میں جھوٹوں میں سے ہے۔ اگر وہ حاملہ ہو تو کہے: میرا یہ حمل اس سے ہے پھر پانچویں مرتبہ کہے: وعلیٰ غضب اللہ إن کان صادقاً، مجھ پر اللہ کا غضب ہو گا اگر وہ سچا ہے یا کہے: اگر وہ اس قول میں سچوں میں سے ہے اور جس نے قذف کے ساتھ لعان کو واجب کیا وہ ان چار شہادتوں میں سے ہر شہادت میں کہے گا: اشہد باللہ میں اس میں سچوں میں سے ہوں جو میں نے فلانی پر زنا کی تہمت لگائی ہے اور پانچویں مرتبہ کہے گا: علیٰ لعنۃ اللہ إن کنتُ کاذباً فیما رمیتہا بہ من الزنا، یعنی مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اس میں جو میں نے اس پر زنا کی تہمت لگائی ہے اور عورت کہے گی: اشہد باللہ اس نے جو مجھ پر زنا کی تہمت لگائی ہے اس میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے گی: مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ سچا ہے جو اس نے مجھ پر زنا کی تہمت لگائی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: لعان کرنے والا کہے: اشہد باللہ میں سچوں میں سے ہوں اس میں جو میں نے اپنی زوجہ فلانۃ بنت فلاں پر تہمت لگائی ہے اور اگر وہ موجود ہو تو اس کی طرف اشارہ کرے۔ مرد یہ چار مرتبہ کہے: پھر امام اسے وعظ و نصیحت کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اسے یاد دلائے اور کہے: میں ڈرتا ہوں کہ اگر سچا نہیں ہو گا تو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہو گا اور اگر وہ دیکھے کہ وہ پانچویں مرتبہ کہنا چاہتا ہے تو حاکم کسی کو حکم دے کہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھے اور اسے کہے: تیرا یہ قول کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹوں میں سے ہوں، حکم کو ثابت کر دے گا اگر وہ انکار کرے کہ وہ قسم اٹھائے گا تو وہ کہے: مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹوں میں سے ہوں اس میں جو میں نے فلاں پر زنا کی تہمت لگائی ہے۔ انہوں نے ابوداؤد کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لعان کرنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھے پانچویں مرتبہ کہنے سے پہلے اور اسے کہے کہ یہ حکم ثابت کر دے گی (1)۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی عورت پر کسی شخص کے ساتھ بدکاری کی تہمت لگائی اور اس مرد کا نام بھی لے لیا کیا اسے حد لگائی جائے گی یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا: اس پر اس کی بیوی کی وجہ سے لعان ہو گا اور جس شخص پر اس نے تہمت لگائی اس کی وجہ سے خاوند پر حد ہو گی؛ یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کیونکہ اس نے اس پر تہمت لگائی جس کو تہمت لگانے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ امام شافعی نے فرمایا: اس شخص (خاوند) پر حد ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیوی پر تہمت لگانے والے پر صرف ایک حد لگائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ اس میں کوئی تفریق نہیں جس نے متعین شخص کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ عجلانی نے اپنی بیوی پر شریک کے ساتھ بدکاری کی تہمت لگائی تھی اسی طرح ہلال بن امیہ نے کہا تھا تو اسے ایک حد لگائی گئی۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے لیے قرآن کا ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

1۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی اللعان، حدیث 1922، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اجنبی اور بیوی کے قذف میں مطلق حد رکھی ہے پھر بیوی کی حد کو لعان کے ساتھ خلاصی پانے کے ساتھ خاص کیا ہے اور مطلق آیت پر اجنبی باقی ہے۔ عجلانی کو شریک کی وجہ سے اور ہلال کو شریک کی وجہ سے حد نہیں لگائی گئی تھی کیونکہ اس نے حد کا مطالبہ ہی نہیں کیا تھا اور حد قذف مطالبہ کے بعد امام ہی قائم کرے گا اس پر اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 25**۔ جب لعان کرنے والے لعان سے فارغ ہو جائیں تو وہ آپس میں جدا ہو جائیں گے ہر ایک اپنے ساتھی سے جدا ہو کر مسجد کے اس دروازے سے نکلے گا جس سے اس کا ساتھی نہ نکلا ہوگا۔ اگر دونوں ایک دروازہ سے بھی نکلیں تو ان کے لعان کو کوئی نقصان نہ ہوگا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ لعان جامع مسجد میں ہوگا جس میں جمعہ ہوتا ہو، سلطان یا اس کے قائم مقام کی موجودگی میں ہوگا۔ اہل علم کی ایک جماعت نے مستحب قرار دیا ہے کہ لعان جامع مسجد میں عصر کے بعد ہو اور نصرانی عورت اپنے مسلمان خاوند سے لعان اس جگہ کرے گی جس کی وہ تعظیم کرتی ہے جیسے کنیسہ جیسا کہ مسلمان عورت اس جگہ لعان کرتی ہے جس کی وہ تعظیم کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ امام مالک اور اس کے اصحاب نے کہا: لعان مکمل ہونے کے ساتھ لعان کرنے والوں کے درمیان فرقت واقع ہو جائے گی۔ وہ کبھی جمع نہیں ہوں گے اور کبھی ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے اور مرد کے لیے کبھی بھی اس عورت سے رجوع حلال نہیں نئے خاوند سے پہلے بھی اور بعد میں بھی؛ یہ لیث بن سعد، زفر بن ہذیل اور اوزاعی کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن نے کہا: لعان سے فارغ ہونے کے ساتھ فرقت واقع نہ ہوگی حتیٰ کہ حاکم ان کے درمیان تفریق کرے؛ یہ ثوری کا قول ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کرنے والوں کے درمیان تفریق کی اور فرقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لاسبیل لك علیها(1) تیرے لیے اس پر کوئی سبیل نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: جب خاوند شہادت اور لعان کو مکمل کرے گا تو اس کی بیوی کا فراش ہونا زائل ہو جائے گا خواہ عورت لعان کرے یا نہ کرے۔ فرمایا: عورت کا لعان کرنا یہ اپنے آپ سے حد کو دور کرنے کے لیے ہے اور کوئی اس کا مقصد نہیں اور عورت کے فراش کے زوال میں عورت کے لعان کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب خاوند کا لعان بچے کی نفی کرتا ہے اور حد کو اٹھا دیتا ہے تو فراش (عورت کا بستر ہونا) اٹھ جائے گا۔ عثمان البتی کے نزدیک لعان میاں بیوی کی عصمت سے کچھ کمی نہیں کرتا حتیٰ کہ خاوند اسے طلاق دے۔ یہ ایسا قول ہے جو صحابہ میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، نیز البتی کے نزدیک لعان کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ لعان کے بعد طلاق دے۔ اس سے پہلے اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ پس یہ دلیل ہے کہ اس کے نزدیک لعان نے ایک حکم پیدا کر دیا ہے۔ عثمان کے قول کے مطابق جابر بن زید کا قول ہے جو طبری نے ذکر کیا ہے۔ اسے لخمی نے محمد بن ابی صفرہ سے حکایت کیا ہے۔ مشہور مذہب یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان لعان کا مکمل ہونا فرقت ہے۔ اس مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ کتاب اللہ میں یہ نہیں ہے جب مرد لعان کرے یا عورت لعان کرے گی تو فرقت واقع ہو جائے گی اور عویمر کے قول سے حجت پکڑی ہے کہ اگر میں اس کو روکوں تو میں نے اس پر جھوٹ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللعان، جلد 1، صفحہ 490

بولا۔ پس اس نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی انکار نہ کیا اور اسے نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ تو اس کا محتاج نہیں تھا کیونکہ لعان کے ساتھ طلاق ہو چکی تھی۔ امام مالک اور ان کی موافقت کرنے والے علماء کی حجت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: لا سبیل لک علیھا (1)، اب تجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔ یہ اعلام ہے کہ لعان کا مکمل ہونا اس کی گرفت اس سے اٹھا دیتا ہے اور ان کے درمیان جدائی کرنا نئے حکم کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ نافذ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان دوری کو واجب کیا ہے یہی لغت میں لعان ہے۔

**مسئلہ نمبر 27۔** جمہور علماء کا خیال ہے کہ لعان کرنے والے کبھی آپس میں نکاح نہیں کریں گے اگر مرد اپنے آپ کو جھٹلائے گا تو اسے حد لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق کر دیا جائے گا اور عورت کبھی اس مرد کی طرف نہیں لوٹ سکتی یہی سنت ہے جس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں۔ ابن المنذر نے عطا سے روایت کیا ہے کہ لعان کرنے والا لعان کے بعد جب اپنے آپ کو جھٹلائے گا تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ اور عطا نے کہا: وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی لعنت کی وجہ سے جدا ہو گئے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد نے کہا: جب وہ اپنے آپ کو جھٹلائے تو اسے حد لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق کر دیا جائے گا اور وہ دوبارہ اگر چاہے تو وہ منگنی کا پیغام بھیجنے والوں میں سے ہو سکتا ہے؛ یہ سعید بن مسیب، حسن اور سعید بن جبیر اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ کا قول ہے انہوں نے کہا: نکاح حلال ہو کر لوٹ آئے گا جس طرح بچہ بعد میں اس کے ساتھ لاحق کیا گیا کیونکہ اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور جماعت کی حجت یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب تجھے اس پر کوئی گرفت نہیں اور آپ نے یہ نہیں فرمایا مگر یہ کہ تو اپنے آپ کو جھٹلائے۔ ابن اسحاق اور ایک جماعت نے زہری سے روایت کیا ہے فرمایا: سنت یہ قائم ہو چکی ہے کہ جب میاں بیوی لعان کریں گے تو ان کے درمیان جدائی کر دی جائے گی اور وہ کبھی جمع نہ ہوں گے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اسے سعید بن جبیر عن ابی عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں مرفوع روایت کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو کبھی جمع نہ ہوں گے'' (2)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ سے مروی ہے ان دونوں نے فرمایا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ لعان کرنے والے جمع نہ ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہمیشہ کا لفظ بھی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 28۔** لعان کے لیے چار اشیاء ضروری ہیں:

1۔ الفاظ کی تعداد۔ وہ چار شہادتیں ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے۔

2۔ مکان۔ اس کے لیے شہر میں عمدہ اور معزز جگہ کا قصد کیا جائے۔ اگر مکہ میں ہوں تو لعان رکن اور مقام کے پاس ہو۔ اگر مدینہ طیبہ میں ہو تو منبر کے پاس ہو، اگر بیت المقدس میں ہو تو صخرۃ (چٹان) کے پاس ہوں اور دوسرے شہروں میں ہو تو مساجد میں ہو اگر وہ کافر ہوں تو انہیں ایسی جگہ بھیجا جائے گا جس کی وہ تعظیم کرتے ہوں گے۔ اگر وہ میاں بیوی یہودی ہوں تو کنیسہ میں ہوگا اگر مجوسی ہوں تو آگ کے کمرے کے پاس ہوگا، اگر ان کا کوئی دین نہ ہو جیسے بت پرست ہیں تو ان کے درمیان مجلس حکم میں لعان کرنا ہوگا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللعان، جلد 1 صفحہ 490 2۔ ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی اللعان، حدیث 1918، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ وقت۔ یہ عصر کے بعد کا وقت ہے۔

4۔ لوگوں کو جمع کرنا۔ چار یا اس سے زائد لوگ لعان کے وقت موجود ہوں، لوگوں کا جمع کرنا مشروط ہے، زمان اور مکان مستحب ہے۔

**مسئلہ نمبر 29**۔ جس نے کہا: فراق واقع نہیں ہوتا مگر لعان کے مکمل ہونے کے ساتھ اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اگر ایک لعان کے مکمل ہونے سے پہلے مرجائے تو دوسرا اس کا وارث ہوگا اور جس نے کہا: تفریق واقع نہیں ہوتی مگر امام کی تفریق کے ساتھ تو پھر ایک اس سے پہلے مرجائے اور لعان کے مکمل ہونے سے پہلے مرجائے تو دوسرا اس کا وارث ہوگا اور امام شافعی کے قول پر اگر ایک مرجائے عورت کے لعان کرنے سے پہلے تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 30**۔ ابن القصار نے کہا: ہمارے نزدیک لعان کی تفریق فسخ نہیں ہے؛ یہ المدونۃ کا مذہب ہے کیونکہ لعان کی تفریق کا حکم طلاق کی تفریق کا حکم ہے۔ غیر مدخول بہا کو نصف مہر دیا جائے گا اور ابن الجلاب کی مختصر میں ہے ایسی عورت کے لیے کچھ نہیں ہوگا یہ اس بنا پر ہے کہ لعان کی تفریق فسخ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَ الَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِیْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا ۖ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ ﴿۱۵﴾ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷﴾ وَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۰﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ

اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۱ وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۪ۖ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۲۲

''بیشک جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے تم اسے اپنے لیے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لیے، ہر شخص کے لیے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لیے عذاب عظیم ہوگا۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے میں نیک گمان اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے (اگر وہ سچے تھے تو) کیونکر نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو پہنچتا تمہیں اس سخن سازی کی وجہ سے سخت عذاب۔ (جب تم ایک دوسرے سے) نقل کرتے تھے اس (بہتان) کو اپنی زبانوں سے اور کہا کرتے تھے اپنے مونہوں سے ایسی باتیں جس کا تمہیں کوئی علم ہی نہ تھا نیز تم خیال کرتے کہ یہ معمولی بات ہے حالانکہ یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی تھی اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا: ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گفتگو کریں اس کے متعلق۔ اے اللہ! تو پاک ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ نصیحت کرتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا اگر تم ایماندار ہو اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے (اپنی) آیتیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ بیشک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ پھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لاتے ہیں (تو) ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ تعالیٰ (حقیقت کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان (اور) رحیم ہے (تو تم بھی نہ بچ سکتے) اے ایمان والو! نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر اور جو چلتا ہے شیطان کے نقش قدم پر تو وہ حکم دیتا ہے (اپنے پیروؤں کو) بے حیائی کا اور ہر برے کام کا۔ اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ بچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہرگز۔ ہاں اللہ تعالیٰ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور نہ قسم کھائیں جو برگزیدہ ہیں تم میں سے اور خوش حال ہیں اس بات پر کہ وہ نہ دیں گے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو اور چاہیے کہ (یہ لوگ) معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس میں اٹھائیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، عُصْبَةٌ، ان کی خبر ہے۔ اور حال کی

بنا پر اس کو نصب دینا بھی جائز ہے۔ اور خبر لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ہوگی۔ اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو ائمہ حدیث نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں طویل حدیث افک روایت کی ہے یہ خبر صحیح مشہور ہے وہ اتنی مشہور ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ مختصراً آگے آئی گی۔ امام بخاری نے اسے تعلیقاً نقل کیا ہے اور اس کی حدیث اتم ہے۔ فرمایا اسامۃ نے کہا انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اس کو محمد بن کثیر نے انہوں نے اپنے بھائی سلیمان سے حدیث مسروق سے انہوں نے ام رومان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ام رومان نے فرمایا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی تو وہ غش کھا کر گر پڑیں۔ موسیٰ بن اسماعیل سے ابووائل کی حدیث سے مروی ہے فرمایا مجھے مسروق بن اجدع نے بتایا فرمایا مجھے ام رومان نے بتایا ام رومان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ہے فرمایا: میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوئی تھیں اچانک انصار کی ایک عورت داخل ہوئی اور کہا: اللہ تعالیٰ فلاں کے ساتھ ایسا کرے، اللہ تعالیٰ فلاں کے ساتھ ایسا کرے۔ ام رومان نے کہا: یہ کیا ہے؟ اس عورت نے کہا: میں ان میں تھی جس نے بات بیان کی۔ ام رومان نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس انصاری عورت نے واقعہ بیان کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بہتان سنا ہے؟ اس عورت نے کہا: ہاں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: (میرے والد گرامی) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی؟ اس عورت نے کہا: ہاں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غش کھا کر گر پڑیں۔ جب آپ کو افاقہ ہوا تو آپ کو کپکپی کے ساتھ بخار چڑھا ہوا تھا۔ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کپڑے ڈالے اور اسے ڈھانپ دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور پوچھا: اسے کیا ہوا ہے؟'' میں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے کپکپی کے ساتھ بخار ہو گیا ہے۔ فرمایا: ''شاید اس بات کی وجہ سے ہو جو کہی گئی ہے'' (1)۔ ام رومان نے کہا: ہاں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیٹھ گئی اور کہا: اللہ کی قسم! اگر میں قسم اٹھاؤں تو تم میری تصدیق نہیں کرو گے، اگر میں کچھ کہوں تو تم مجھے معذور نہیں سمجھو گے۔ میری اور تمہاری مثال حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں جیسی ہے۔ واللہ المستعان علی ما تصفون۔

فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوٹ گئے اور کوئی بات نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عذر نازل فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گی کسی کی حمد نہیں کروں گی اور نہ آپ کی حمد کروں گی۔ ابوعبداللہ حمیدی نے کہا: بعض بغدادی حفاظ جن سے ہم ملے تھے وہ فرماتے تھے اس حدیث میں اور سال زیادہ واضح ہے اس پر انہوں نے اس سے استدلال کیا کہ ام رومان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں وصال کر گئی تھیں اور مسروق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نہیں کی تھی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں عبیداللہ بن عبداللہ بن ابی ملیکہ کی حدیث ہے اس میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِذْ تَلِقُوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ پڑھتی تھیں اور کہتی تھیں: الولق کا معنی کذب (جھوٹ) ہے۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا معنی دوسروں سے زیادہ جانتی تھیں کیونکہ یہ ان کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ امام بخاری نے کہا: معمر بن راشد نے زہری سے روایت کیا حدیث افک غزوہ مریسیع، میں پیش آئی۔ ابن اسحاق نے کہا: یہ چھٹا سال تھا۔ موسیٰ

1۔ صحیح بخاری، حدیث الافک، جلد 2، صفحہ 597

بن عقبہ نے کہا: چوتھا سال تھا۔ امام بخاری نے معمر عن زہری کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: مجھے ولید بن عبدالملک نے کہا: کیا تجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تہمت لگانے والوں میں تھے؟ انہوں نے کہا میں نے کہا: نہیں لیکن مجھے تیری قوم کے دو افراد ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے مجھے خبر دی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان دونوں کو کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں خاموش تھے۔ ابو بکر اسماعیلی نے اپنی کتاب المخرج علی الصحیح میں ایک دوسرے طریق سے معمر عن زہری کی حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے فرمایا: میں ولید بن عبدالملک کے پاس تھا اس نے کہا: جو اس مسئلہ کو زیادہ اچھالنے والے تھے ان میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے؟ میں نے کہا: نہیں۔

مجھے سعید بن مسیب، عروہ، علقمہ، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ تمام نے کہا میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس مسئلہ کو اچھالنے والوں کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ امام بخاری نے زہری عن عروہ عن عائشہ کی حدیث سے روایت کیا ہے جو اس مسئلہ کو پھیلانے والے تھے ان میں سے عبداللہ بن ابی تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْاِفْكِ، افک کا معنی جھوٹ ہے۔ العصبة تین سے لیکر دس افراد تک کو عصبہ کہتے ہیں۔ ابن عیینہ نے کہا: چالیس آدمیوں کو عصبہ کہتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: یہ دس سے پندرہ افراد ہیں۔ اس کی اصل لغت میں اور کلام عربی میں وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہوں۔ اور الخیر کی حقیقت یہ ہے کہ جس کا نفع اس کے نقصان سے زائد ہو اور الشر جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہو وہ خیر جس میں کوئی شر نہیں ہے وہ جنت ہے اور وہ شر جس میں کوئی خیر نہیں وہ جہنم ہے اور وہ آزمائش جو اولیاء اللہ پر نازل ہوتی ہے وہ خیر ہوتی ہے کیونکہ دنیا میں اس کا ضرر کم ہوتا ہے اور اس کی خیر آخرت میں بہت زیادہ ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے گھر والوں اور صفوان کو آگاہ فرمایا کیونکہ خطاب اس ارشاد میں ان سے ہے: لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، کیونکہ شر کی نسبت سے نفع اور خیر راجح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ غزوہ بنی مصطلق میں نکلے یہی غزوہ مریسیع ہے اور آپ لوٹے جب مدینہ طیبہ کے قریب تھے تو آپ نے رات کو چلنے کا اعلان فرمایا جب کوچ کرنے کا اعلان ہو چکا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھیں اور قضاء حاجت کے لیے چلیں حتی کہ لشکر سے دور چلی گئیں جب فارغ ہوئیں اور اپنی جگہ پر آئیں اور اپنے سینہ پر ہاتھ مارا تو یمن کے موتیوں کا ہار ٹوٹ چکا تھا۔ آپ واپس لوٹیں اور اسے تلاش کیا اس کی تلاش نے آپ کو روک لیا آپ نے ہار پالیا اور واپس آئیں وہاں کسی شخص کو نہ پایا آپ نوجوان تھیں گوشت کم تھا۔ مردوں نے آپ کا ہودج اٹھایا اور انہیں آپ کا نہ ہونا محسوس نہ ہوا جب آپ نے اپنی جگہ پر کسی کو نہ پایا تو آپ اپنی جگہ پر لیٹ گئیں اس امید کے ساتھ کہ آپ کو تلاش کیا جائے گا اور اس کی طرف رجوع کیا جائے گا آپ اپنی جگہ سو گئیں آپ کو بیدار نہ کیا مگر صفوان بن معطل کے قول: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ نے وہ پیچھے رہ جانے والی چیزوں کی حفاظت کے لیے لشکر سے پیچھے تھے۔ بعض نے کہا: آپ ان کے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے سے بیدار ہوئیں۔ وہ اپنی سواری سے اترے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دور کھڑے ہو گئے حتی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹنی پر سوار ہوئیں۔ حضرت صفوان نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور چل پڑے حتی

کہ دوپہر کے وقت انہیں لیکر لشکر میں پہنچ گئے۔ جھوٹے اور بہتان تراش اپنے دھندے میں مشغول ہوگئے۔ اس مسئلہ میں لوگ جس کے پاس جمع ہوتے تھے اور جو اس مسئلہ کے بارے استفسار کرتا تھا اور اس کو پھیلاتا تھا وہ عبداللہ بن ابی بن سلول منافق تھا اس نے صفوان کو دیکھا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے ہے تو اس نے یہ کہا: اللہ کی قسم! نہ وہ اس سے بچی اور نہ وہ اس سے بچا اور کہا: تمہارے نبی کی بیوی نے ایک آدمی کے ساتھ رات گزاری، اور اس بہتان تراشی میں حضرت حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش شامل تھے۔ یہ اس حدیث کا اختصار ہے اور یہ مکمل طور پر امام بخاری اور امام مسلم میں ہے اور صحیح مسلم میں اکمل ہے جب حضرت صفوان کو اس جھوٹ میں حضرت حسان کی بات پہنچی تو وہ آئے اور حضرت حسان کے سر پر تلوار ماری اور کہا:

تَلَقَّ ذُباب السیف عَنِّی فإنّنی غلام إذا هُو جِیت لیس بشاعر

ایک جماعت نے حضرت صفوان کو پکڑا اور اس کا گریبان پکڑ کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان کا زخم رائیگاں کر دیا اس سے کچھ طلب کیا۔ یہ دلیل ہے کہ حسان بھی ان لوگوں میں تھا جو اس بہتان کی تشہیر کرتے تھے۔ یہ حضرت صفوان نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کی غزوات میں مہار پکڑتے تھے کیونکہ آپ بہت بہادر تھے اور خیار صحابہ میں سے تھے۔ بعض نے کہا: آپ عورتوں کے پاس نہیں جاتے تھے؛ یہ ابن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: صفوان کے دو بیٹے تھے۔ اس پر دلیل آپ کی مروی حدیث ہے آپ کی بیوی کے ساتھ آپ کا معاملہ ہوا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے بیٹوں کے بارے میں فرمایا: ''دونوں صفوان کے ساتھ اس طرح مشابہ ہیں جیسے کوا، کوے کے مشابہ ہوتا ہے'' (1)۔ اور حدیث میں آپ کا قول کہ ''اللہ کی قسم! میں نے کبھی کسی عورت کا پردہ نہیں کھولا''، اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے کبھی زنا نہیں کیا۔ غزوہ ارمینیہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں 19ھ کو شہید ہوئے۔ بعض نے کہا: یہ روم کے شہروں میں حضرت معاویہ کے زمانہ میں اٹھاون ہجری میں وصال فرما گئے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ یعنی جس نے جھوٹ بولا۔ اہل افک کا نام نہیں لیا سوائے حسان، مسطح، حمنہ اور عبداللہ کے اور کچھ دوسرے مجہول لوگ؛ یہ عروہ بن زبیر کا قول ہے اس کے متعلق عبدالملک بن مروان نے اس سے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ جتھہ تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مصحف حفصہ میں ہے: عصبة أربعة۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ حمید اعرج اور یعقوب نے کُبرکاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فراء نے کہا: یہ وجہ عمدہ ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں: فلان تولی عُظم کذا و کذا یعنی وہ کام میں بڑا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت حسان جب نابینا ہوگئے تھے شاید وہ بڑا عذاب ہے جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا وہ ان کی آنکھوں کا چلا جانا ہے؛ یہ مسروق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ

1۔ صحیح بخاری، الشباب الخضر، جلد 2، صفحہ 866

تشہیر کرنے والا عبداللہ بن ابی تھا یہ صحیح ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ ابو عمر بن عبدالبر نے حکایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسان کو اس بات سے بری کر دیا تھا۔ کہا تھا اس نے کچھ نہیں کیا۔ حضرت حسان نے اس کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کیا تھا۔ حضرت حسان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں یہ اشعار کہے:

حَصَانٌ رَزَانٌ ما تُزَنُّ بريبَةٍ وتُصبح غَرثَىٰ من لُحوم الغَوافِلِ

وہ پاک دامن ہے صاحب وقار ہے اس کو متہم نہیں کیا جاتا وہ پاک دامن عورتوں کی غیبت سے بھوکی رہتی ہے۔

حلِيلَة خيرِالنّاس دينًا ومَنْصِبًا نَبِيِّ الهُدَىٰ والمكرُمات الفواضل

عَقِيلَةُ حَيٍّ من لُؤَيِّ بن غالب كِرامِ المساعِي مَجْدُها غيرُ زائل

مُهَذَّبَةٌ قد طيّب الله خِيمَها وطهّرها من كل شَيْنٍ وباطل

فإن كانت مابُلِّغْتِ أَنِّي قلتُهُ فلا رفَعْت سَوْطِي إليّ أناملي

فكيف ووُدِّي ما حَيِيتُ ونُصْرتي لِآلِ رسول الله زَيْنِ المحافل

له رُتَبٌ عالٍ على الناس فضلها تقاصَرُ عنها سَوْرَةُ المتطاول

یہ بھی مروی ہے کہ جب حضرت حسان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا وہ پاک دامن اور صاحب وقار ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تو تو اس طرح نہیں ہے، تو تو پاکدامن عورتوں کے بارے میں باتیں کرنے والا ہے۔ یہ تعارض ہے اس طرح ان کو جمع کرنا ممکن ہے کہ حضرت حسان نے نصاً اور تصریحاً کچھ نہیں کہا۔ یہ تعریض اور اشارہ ہے پس اس کو آپ کی طرف منسوب کیا گیا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت حسان نے اس میں زیادہ دخل دیا تھا یا نہیں کیا آپ کو حد لگائی گئی تھی یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیا ہوا تھا؟

**مسئلہ نمبر 6**۔ محمد بن اسحاق وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جھوٹی تہمت میں دو مردوں اور ایک عورت کو حد لگائی تھی وہ مسطح، حسان اور حمنۃ تھے، یہ ترمذی نے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن ابی کو اسی (80) کوڑے لگائے تھے اور اس کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ قشیری نے کہا: جو چیز اخبار میں ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ابن ابی، حسان اور حمنۃ کو سزا ملی تھی رہا مسطح تو اس سے قذف صریح ثابت نہیں ہوا تھا لیکن وہ سنتا تھا اور بغیر صراحت کے اس بات کو پھیلاتا تھا۔ ماوردی وغیرہ نے کہا: اختلاف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ میں ملوث لوگوں کو حد لگائی تھی؟ اس کے متعلق دو قول ہیں ایک یہ کہ کسی کو بھی حد نہیں لگائی گئی تھی کیونکہ حدود اقرار یا دلیل کے ساتھ قائم کی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صرف اخبار کی بنا پر حدود قائم کرنے کا مکلف نہیں بنایا جس طرح منافقین کو قتل کرنے کا مکلف نہیں بنایا تھا جبکہ ان کے کفر کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ فاسد ہے اور بعض قرآن کے مخالف ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا

بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ جو پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر اپنے قول کی سچائی پر چار گواہ نہ لائیں۔ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً تو انہیں اسی درے مارو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل الافک (جھوٹ گھڑنے والوں) عبداللہ بن ابی، مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش کو کوڑے لگائے۔ اس کے متعلق مسلمانوں کے شاعر نے کہا:

لقد ذاق حسّان الذی کان أهلَه وحَمْنَة إذ قالوا هجيراً ومِسْطَحُ

وابنُ سَلُولَ ذاق فی الحَدّ خزية كما خاض فی إفك ومن القول يُفْصِحُ

تعاطَوْا برجم الغيب زَوْجَ نبيّهم وسخطة ذی العرش الكريم فأبرحوا

وآذَوْا رسول الله فيها فَجُلِّلُوا مخازِیَ تبقی عُمِّمُوها وفُضِحوا

فصبت عليهم مُحْصَدات كأنها شآبيب قطرمن ذُری المُزْن تَسْفَحُ

میں کہتا ہوں: علماء کے نزدیک مشہور و معروف اخبار سے یہ ہے کہ حسان، مسطح اور حمنہ کو حد لگائی گئی تھی اور عبداللہ بن ابی کی حد کے متعلق نہیں سنا گیا۔ ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا: جب میرا عذر نازل ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور وہ ذکر کیا اور قرآن تلاوت کیا جب آپ منبر سے اترے تو دو مردوں اور ایک عورت کے بارے حکم دیا انہیں حد لگائی گئی (1) اور ان کے نام بھی لیے۔ حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بن جحش۔ طحاوی کی کتاب میں ہے اسی اسی کوڑے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: عبداللہ بن ابی کو حد نہیں لگائی گئی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے آخرت میں عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اگر اسے دنیا میں حد لگائی جاتی تو یہ آخرت میں اس کے عذاب کے لیے کمی اور تخفیف کا باعث ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کی گواہی دی اور تہمت لگانے والوں کے جھوٹ کو بیان کیا۔ پس حد کا فائدہ حاصل ہو گیا، کیونکہ مقصود قاذف کا اظہار اور مقذوف کی براءت ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ان مسلمانوں کو حد لگائی گئی تاکہ ان سے قذف کی وجہ سے جو گناہ صادر ہوا وہ معاف ہو جائے اور آخرت میں ان پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود کے بارے میں فرمایا: ''یہ اس کے لیے کفارہ ہیں جس پر یہ حدود قائم کی گئیں'' جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث میں ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ عبداللہ بن ابی کو حد اس لیے نہ لگائی گئی ہو تاکہ اس کی قوم کی الفت حاصل کی جائے یا اس کے بیٹے کے احترام کی وجہ سے ہو اور متوقع فتنہ کو بجھانے کے لیے ہو اور اس متوقع فتنہ کا آغاز سعد بن عبادہ اور ان کی قوم سے ظاہر بھی ہوا تھا جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا یہ اللہ تعالیٰ کی

---

1۔ ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی حد القذف، حدیث 3880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ النور، حدیث 3105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب حد القذف، حدیث 2556، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرف سے مومنین کو ان کے گمان کی وجہ سے عتاب ہے جب جھوٹے لوگوں نے کہا جو انہوں نے کہا۔ ابن زید نے کہا:
مومنوں نے گمان کیا کہ مومن اپنی ماں کے بارے ایسا نہیں کہہ سکتا؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔ ولولا بمعنی ھلا ہے۔
بعض نے کہا: اس کا معنی ہے مومن مردوں اور مومن عورتوں کے فضلاء کو اپنے نفسوں پر قیاس کرنا چاہیے تھا۔ اگر ان سے
یہ بعید تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان میں بدرجہ اولیٰ بعید تھا۔ روایت ہے کہ صحیح فکر وہ تھی جو حضرت ابوایوب
انصاری اور ان کی بیوی سے ظاہر ہوئی تھی۔ وہ اس طرح ہے کہ حضرت ابوایوب، اپنی بیوی کے پاس گئے تو بیوی نے پوچھا:
اے ابوایوب! کیا تو نے سنا ہے جو کہا گیا ہے؟ ابوایوب نے کہا: ہاں۔ یہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب! تو ایسا کرے گی اس
نے کہا: نہیں۔ اللہ کی قسم!۔ حضرت ابوایوب نے کہا: اللہ کی قسم! عائشہ تجھ سے افضل ہے۔ ام ایوب نے کہا: ہاں۔ یہ وہ فعل
ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مومنین کو عتاب فرمایا ہے کیونکہ مومنین نے یہ کام نہیں کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَنْفُسِهِمْ، نحاس نے کہا: اس کا معنی ہے باخوانھم اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں
پر واجب فرمایا کہ جب وہ کسی کو سنیں کہ وہ کسی پر تہمت لگا رہا ہے یا اس کی برائی بیان کر رہا ہے جو وہ اس کے متعلق نہیں جانتے
تو وہ اس کا انکار کریں اور اس شخص کو جھٹلائیں جس نے اس کو ترک کیا، اس کو وعید سنائی اور اسے بھی وعید سنائی جس نے اس
بات کو آگے نقل کیا۔

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے علماء نے کہا یہ آیت اصل ہے کہ ایمان کا وہ درجہ جس کو انسان حاصل کرتا ہے اور اصلاح کا وہ
مرتبہ جس پر مومن اترتا ہے اور عفاف کا لباس جس کے ساتھ مسلمان کا پردہ ہوتا ہے وہ کسی محتمل خبر سے زائل نہیں ہوتا اگرچہ وہ
پھیل بھی جائے جبکہ اس کی اصل فاسد یا مجہول ہو۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ یہ جھوٹ گھڑنے والوں کو توبیخ ہے۔
لولا بمعنی ھلا ہے یعنی اپنے اس افترا پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ یہ پہلے حکم پر رد ہے اور سابقہ آیت پر لوٹاتا ہے جو قذف
کے بارے میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ یعنی وہ اللہ
کے حکم میں جھوٹے ہیں کبھی کوئی شخص دلیل پیش کرنے سے عاجز ہوتا ہے حالانکہ وہ قذف میں سچا ہوتا ہے لیکن حکم شرع میں اور
ظاہر امر میں جھوٹا ہے نہ کہ علم الٰہی میں جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حدود کو اسی حکم پر مرتب کیا ہے جو دنیا میں مشروع کیا ہے نہ کہ اس
اپنے علم کے مقتضیٰ پر جو انسان کے ساتھ متعلق ہے، جس پر وہ ہے اپنے علم کے مطابق آخرت میں اس سے برتاؤ کرے گا۔

میں کہتا ہوں: اس مفہوم کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو امام بخاری نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے
انہوں نے فرمایا: اے لوگو! وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اب ہم تمہارے ظاہر اعمال کو لیں گے جس نے ہمارے لیے خیر کو
ظاہر کیا ہم اسے امن دیں گے اور اپنا قرب بخشیں گے ہمارے لیے اس کے باطن سے کوئی سروکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے
باطن کا محاسبہ کرے گا اور جو ہمارے لیے برائی ظاہر کرے گا ہم اسے نہ امن دیں گے اور نہ ہم اس کی تصدیق کریں گے اگرچہ

وہ کہے کہ اس کا باطن اچھا تھا۔ علماء کا اجماع ہے کہ دنیا کے احکام ظاہر پر مبنی ہیں اور دل کے بھید اللہ کے سپرد ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ، سیبویہ کے نزدیک فضل پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور اس کی خبر محذوف ہے عرب اس کو ظاہر نہیں کرتے اور لولا کا جواب حذف ہے کیونکہ اس کے بعد اس کی مثل ذکر کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتو جو کچھ تم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا ہے اس کے سبب دنیا و آخرت میں تمہیں عذاب عظیم لاحق ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب بلیغ ہے لیکن اس نے اپنی رحمت سے دنیا میں متہم پر پردہ فرمایا اور آخرت میں بھی اس پر رحم فرمائے گا جو توبہ کرے گا۔ الافاضۃ کا معنی ہے حدیث (بات) میں پڑنا۔ اس پر عتاب واقع ہوا ہے کہا جاتا ہے: افاض القوم فی الحدیث قوم اس بات میں پڑ گئی۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ محمد بن سمیقع نے تا کے ضمہ، لام کے سکون اور قاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی القاء سے مشتق کیا ہے یہ قرأت واضح ہے اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اذ تتلقونه، التلقی سے مشتق کر کے دو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ قراء سبعہ کے جمہور نے ایک تا اور ذال کے اظہار کے ساتھ بغیر ادغام کے پڑھا ہے۔ یہ بھی التلقی سے مشتق ہے۔ ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے تا میں ذال کو ادغام کر کے پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے ذال کے اظہار اور تا کے تا میں ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ تلقفہ قرأت ہے کیونکہ یہ اجتماع ساکنین کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ فلا تناجوا اور ولا تنابزوا پڑھنے والوں کی قرأت میں ادغام کی طرح نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے الف ساکن ہے اور اس کا حرف لین ہونا وہاں اچھا ہے جو ذال کے سکون کے ساتھ اچھا نہیں۔ ابن یعمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ تمام لوگوں سے زیادہ اس معاملہ کو جانتے تھے اس کو اذ تلقونہ تا کے فتحہ، لام کے کسرہ اور قاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت کا معنی عربوں کے اس قول سے ہے: ولق الرجل یلق ولقاً جب کوئی جھوٹ بولے اور اس پر متواتر جھوٹ بولتا رہے۔ وہ متعدی کو غیر متعدی پر شاہد لائے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک انہوں نے اذ تلقون فیه کا ارادہ کیا ہے۔

حرف جر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کو فعل سے متصل کیا گیا۔ خلیل اور ابوعمرو نے کہا: الولق کا اصل معنی جلدی کرنا ہے کہا جاتا ہے: جاءت الابل تلِق۔ تیز دوڑتے ہوئے آئے۔ شاعر نے کہا:

لما راؤا جیشا علیهم قد طرق　جاؤا بأسراب من الشأم وَلِقْ

إن الحُصَيْنَ زَلِق وزُمَّلِق　جاءت به عَنْس من الشأمِ تَلِقْ

کہا جاتا ہے: رجل ذلق وزملق اس کی مثال ھدبدٌ ہے زمالق وزمّلق۔ میم کی تشدید کے ساتھ وہ شخص جس کو جماع کرنے سے پہلے انزال ہو جاتا ہے۔ راجز نے کہا: انّ الحُصَيْنَ زَلِق وزُمَّلِق۔

الولق کا معنی اخف الطعن بھی ہے ولقه یلقه ولقاً، ولقه بالسیف ولقات۔ یعنی تلوار کے کئی وار کیے۔ یہ لفظ مشترک ہے۔

---

1۔ التمہید، جلد 10، صفحہ 157

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ، افواھکم لفظ مبالغہ، الزام اور تاکید کے لیے ہے۔ تحسبونہ کی ضمیر حدیث، اس میں غور و خوض اور اس کے پھیلانے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ هَيِّنًا۔ تھوڑا گناہ یعنی اس میں تمہیں گناہ لاحق نہ ہوگا۔ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ یہ اللہ کے نزدیک (عظیم) بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی مثل ہے جو دو قبور کے بارے میں ہے۔ إنهما ليعذّبان وما يُعَذّبان في كبير یعنی ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور تمہاری نسبت سے انہیں کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ۝ وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ یہ تمام مومنوں کو عتاب ہے، یعنی تمہیں مناسب تھا کہ تم انکار کرتے، اس کو حکایت کرنے اور نقل کرنے میں ایک دوسرے کی معاونت نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے کہ اس کے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ سے ایسا فعل واقع ہو اور تم اس بات پر بہتان کا فیصلہ کرتے۔ بہتان کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے بارے میں ایسی بات کہنا جو اس میں نہ ہو اور غیبت یہ ہے کہ ایسی بات بیان کی جائے جو اس میں ہو۔ یہی مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں آیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت کی طرف لوٹنے سے نصیحت فرمائی۔ ان مفعول لاجلہ ہے۔ تقدیر کراھیۃ ان ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ یہ توقیف اور تاکید ہے جیسے تو کہتا ہے: تجھے ایسا ایسا کرنا مناسب ہے اگر تو مرد ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں پھر ایسی بات کرو اللہ تمہیں اس سے نصیحت کرتا ہے کیونکہ اس کی مثل نہیں ہوگا مگر اس قول کے مثل جو بعینہٖ مقول عنہ (جس کے بارے میں بات کی گئی ہے) کے بارے کہا گیا ہے یا اس کے بارے میں جو مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مرتبہ میں ہوگا، کیونکہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہے اس لیے ایسا کرنے والے کی طرف سے یہ کفر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ ہشام بن عمار نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا اس کی تادیب کی جائے گی اور جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہا اسے قتل کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ۝ پس جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کی اس نے قرآن کی مخالفت کی۔ ابن عربی نے کہا: اصحاب شافعی نے کہا: جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گالی دی اس کی تادیب کی جائے گی جیسا کہ دوسرے مومنین کے بارے میں ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ یہ قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کفر نہیں ہے یہ اسطرح ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایؤمن من لایامن جارہ بوائقہ (1) وہ مومن نہیں ہوگا جس کا پڑوسی اس کی تخریب کاریوں سے محفوظ نہیں۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گالی دینے والے کا ایمان حقیقۃً سلب

1۔ صحیح بخاری، اثم من لایامن جارہ بوائقہ، جلد 2، صفحہ 889

ہوتا تو لایزنی الزانی حین یزنی و ھو مومن (2)۔ کے قول میں زانی کا ایمان بھی حقیقۃً سلب ہوتا۔ ہم کہتے ہیں: جیسا تم نے گمان کیا ہے ایسا نہیں ہے کیونکہ بہتان تراشوں نے حضرت عائشہ صدیقہ مطہرہ رضی اللہ عنہا پر فاحشۃ ہونے کا بہتان لگایا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت فرمائی۔ پس ہر وہ شخص جو اسے برا کہتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے برأت فرمائی تو وہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے والا ہے وہ کافر ہے۔ یہ امام مالک کے قول کا طریق ہے یہ اہل بصائر کے لیے واضح راستہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ، ان تشیع کا معنی تفشو (پھیلانا) ہے کہا جاتا ہے: شاع الشئ شیوعا و شیعا و شیعاناً و شیعوعۃ، اس کا معنی ظاہر ہونا، بکھر جانا ہے۔ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی پاکدامن مردوں اور عورتوں میں۔ اس لفظ عام سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان ہیں۔ الفاحشۃ ایسا برا فعل جو برائی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ بعض علماء نے کہا: اس آیت میں فاحشۃ سے مراد بری بات ہے۔ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا یعنی عذاب سے مراد حد ہے اور آخرت میں آگ کا عذاب ہے یعنی منافقین کے لیے یہ مخصوص ہے۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ حد مومنین کے لیے کفارہ ہے۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے اگر وہ اصرار کرتے ہوئے بغیر توبہ کے مرے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ یعنی اس گناہ کی بڑائی کی مقدار اور اس پر جزا کو جانتا ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ حضرت ابو الدرداء کی حدیث سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے لوگوں میں سے کسی کی جھگڑے میں مدد کی جبکہ اس کو اس کے متعلق کوئی علم ہی نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں ہوتا ہے حتی کہ وہ اس سے باز آ جائے۔ اور جس شخص نے اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے بارے میں سفارش کی کہ وہ اسے نہ لگے تو اس نے حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی طرف پیش قدمی کی اور اس پر متواتر قیامت تک اللہ کی لعنت ہوگی اور جس نے کسی مسلمان کے بارے ایسا کلمہ پھیلایا جس سے وہ بری ہے اس کا خیال ہے کہ وہ دنیا میں اس کے ساتھ اسے عیب دار کر دے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے اس کی وجہ سے آگ میں ڈالے'' پھر اس کا مصداق کتاب اللہ سے تلاوت کیا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔۔۔۔۔۔ الخ۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یعنی شیطان کے راستہ اور مذہب پر نہ چلو۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف شیطان بلاتا ہے۔ الخطوات کا مفرد خطوۃ ہے۔ یہ وہ فاصلہ ہوتا ہے جو دو قدموں کے درمیان ہوتا ہے۔ الخطوۃ خاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: خطوت خطوۃ اس کی جمع خَطَوات ہے۔ تخطی الینا فلان۔ اسی سے حدیث ہے: انہ رایٔ رجلاً یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ۔ (2) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگ رہا تھا۔

جمہور نے خطوات طاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عاصم اور اعمش نے اسے طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جمہور

1۔ صحیح بخاری، الزنیٰ و شرب الخمر، جلد 2، صفحہ 1001

2۔ ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ، باب ما جاء فی النھی عن تخطی الناس یوم الجمعہ، حدیث 1104، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے ماذکی کو کاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس نے ہدایت نہیں پائی، وہ سلامت نہ ہوا اور اس نے ہدایت کو نہیں پہچانا۔ بعض علماء نے کہا: ماذکی کا مطلب ہے ماصلح اس نے اصلاح نہ کی۔ کہا جاتا ہے: زکا، یذکو زکاء یعنی صلح کرنا۔ حسن اور ابوحیوہ نے اس کو شد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کا تمہارا تزکیہ کرنا اور تطہیر اور ہدایت دینا یہ اس کے فضل سے ہے، تمہارے اعمال کی وجہ سے نہیں ہے۔ کسائی نے کہا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ جملہ معترضہ ہے۔ اور مَا زَکٰی مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا پہلے اور دوسرے لولا کا جواب ہے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ روایات سے مشہور ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بن ابی قحافہ اور مسطح بن اثاثہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت مسطح، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ کی بیٹی کا بیٹا تھا یہ بدری صحابہ میں سے تھا۔ مہاجر بھی تھا اور مساکین میں سے تھا۔ یہ مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب بن عبد مناف تھا۔ بعض نے کہا: اس کا نام عوف تھا اور مسطح اس کا لقب تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے مسکین ہونے اور اس کی قرابت کی وجہ سے اس پر خرچ کرتے تھے (1)۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا واقعہ پیش آیا اور مسطح بھی اس بہتان تراشی میں شامل تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ وہ اس پر خرچ نہیں کریں گے اور اسے کوئی نفع نہیں پہنچائیں گے۔ مسطح، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور معذرت کی۔ میں حسان کی مجالس میں ہوتا تھا میں سنتا تو تھا لیکن کہتا نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسطح سے کہا: تو ہنستا تھا اور اس بات میں تو شریک ہوا۔ پس آپ نے یہ قسم اٹھا دی پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ ضحاک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مومنین کی ایک جماعت نے ان کے منافع کاٹ دیئے تھے جنہوں نے تہمت لگائی تھی اور کہا: ہم ان سے صلہ رحمی کا معاملہ نہیں کریں گے جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کچھ کہا ہے۔ پس تمام کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلا قول اصح ہے مگر آیت قیامت تک تمام لوگوں کو شامل ہے۔ کوئی صاحب فضل اور خوشحال غصہ نہ کرے اور قسم نہ اٹھائے کہ وہ ایسی صفت والے کو کبھی نفع نہیں پہنچائے گا۔ صحیح نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب، اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ سے لیکر دس آیات نازل فرمائیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ مسطح پر قرابت اور فقر کی وجہ سے خرچ کرتے تھے: اللہ کی قسم! میں اس پر کوئی چیز خرچ نہیں کروں گا۔ اس کے بعد جو اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۪ۖ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے کہا: یہ آیت کتاب اللہ میں امید افزا آیت ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔ پھر آپ نے وہ نفقہ مسطح کا جاری کر دیا جو آپ پہلے عطا کرتے تھے اور فرمایا: میں اب کبھی ان سے خرچ نہیں روکوں گا۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ قذف اگرچہ گناہ کبیرہ ہے لیکن اعمال کو ضائع نہیں کرتا اللہ تعالیٰ نے اس بہتان کے بعد پھر حضرت مسطح کا ہجرت اور ایمان کے ساتھ وصف بیان فرمایا ہے۔ یہی حکم تمام کبائر کا ہے اللہ تعالیٰ کے شریک

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 373

ٹھہرانے کے علاوہ کوئی بھی گناہ اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65)

**مسئلہ نمبر 23**۔ اگر کوئی کسی شے پر قسم اٹھائے کہ وہ یہ نہیں کرے گا پھر اس فعل میں بہتری دیکھے تو وہ کر دے اور قسم کا کفارہ دے دے یا پہلے قسم کا کفارہ دے اور پھر وہ کام کرے جیسا کہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ فقہاء کا خیال ہے کہ جو کسی سنت کو نہ کرنے یا کسی مندوب کو نہ کرنے کی قسم اٹھائے اور ہمیشہ انہیں ادا نہ کرے تو یہ امر اس کی شہادت کو مجروح کر دے گا؛ یہ الباجی نے المنتقی میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 24**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ، ولا یاتل کا معنی ہے قسم نہ اٹھائے اس کا وزن یفتعل ہے یہ الیۃ سے مشتق ہے جس کا معنی قسم ہے اسی سے الله تعالیٰ کا فرمان ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ (بقرہ: 226) یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا معنی ہے کمی کرنا۔ یہ الوت من کذا سے مشتق ہے کسی امر میں کوتاہی کرنا۔ اس سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (آل عمران: 118)

**مسئلہ نمبر 25**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ یہ تمثیل اور حجت ہے یعنی جس طرح تم پسند کرتے ہو کہ الله تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے تو اسی طرح تم بھی دوسروں کو معاف کرو جو تم سے کم درجہ ہیں۔ یہی مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من لا یرحم لا یرحم (1) (جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا) کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26**۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت کتاب الله میں امید افزا ہے کیونکہ اس لفظ کے ساتھ الله تعالیٰ نے تہمت لگانے والے نافرمانوں پر لطف فرمایا ہے۔ بعض علماء نے کہا: کتاب الله میں امید افزا آیت ہے: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۝ (الاحزاب) الله تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۝ (الشوریٰ) اس آیت میں فضل کبیر کی شرح فرمائی ہے اور اس کے ساتھ مومنین کو بشارت دی ہے اور امید افزا آیات سے یہ بھی ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ (الزمر: 53) اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ (الشوریٰ: 19) بعض نے کہا: یہ آیت امید افزا ہے۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۝ (الضحیٰ) یہ اس لیے ہے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک امتی کے دوزخ میں رہنے سے راضی نہ ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 27**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ يُّؤْتُوْٓا۔ یعنی الا یوتوا، لا کو حذف کیا گیا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلت یمین الله أبرح قاعداً

زجاج نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابو عبیدہ کے قول پر لا کے اضمار کی ضرورت نہیں۔ ولیعفوا یہ عفا الریح سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ہوا کا اثر مٹا دینا، یعنی گناہ معاف کر دینا اور مٹا دینا جس طرح ہوا اثر مٹا دیتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ

---

1۔ صحیح بخاری، رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ، جلد 2، صفحہ 887

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾

''جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاکدامن عورتوں پر جو انجان ہیں، ایمان والیاں ہیں ان پر پھٹکار ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے''۔

اس کے بارے میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الْمُحْصَنٰتِ یہ لفظ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ پاکدامن مردوں پر تہمت لگانے کا حکم ہے۔ یہ قیاس اور استدلال سے ہے ہم نے سورت کے آغاز میں اس کو بیان کیا ہے۔ الحمد للہ۔ اس آیت سے جو مراد ہیں ان میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے بارے میں ہے (2)۔ ایک قوم نے کہا: یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور تمام ازواج مطہرات کے بارے میں ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک وغیرہما کا قول ہے تو یہ انہیں نفع نہیں دے گی۔ اور جنہوں نے دوسری محصنات (پاکدامن) عورتوں پر تہمت لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے توبہ رکھی ہے کیونکہ فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور ازواج مطہرات کے اوپر تہمت لگانے والوں کے لیے توبہ نہیں ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ بعض نے کہا: یہ اس شخص کے لیے وعدہ ہے جو قذف پر اصرار کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا۔ بعض نے کہا: یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے نازل ہوئی مگر اب اس سے ہر وہ مراد ہے جو اس صفت سے متصف ہے۔ بعض نے کہا: جو بھی تہمت لگانے والا ہے خواہ جس پر تہمت لگائی گئی ہے مذکر ہو یا مونث ہو۔ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی۔ ان الذین یرمون الانفس المحصنات۔ اس میں مذکر اور مؤنث داخل ہیں؛ یہ نحاس نے اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا: مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ جو عورت ہجرت کرتی تو وہ کہتے یہ بدکاری کے لیے نکلی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ علماء نے فرمایا: اگر اس آیت سے مراد تہمت لگانے والے مومنین ہیں تو لعنت سے مراد دور کرنا، حد لگانا اور مومنین کو ان سے وحشت دلانا اور ان سے قطع تعلق کرانا ہے اور ان کا عدالت کے رتبہ سے زائل ہونا ہے اور مسلمانوں کی زبانوں پر اچھی تعریف سے دور ہونا مراد ہے۔ اور جنہوں نے کہا: یہ خاص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو یہ سختیاں عبد اللہ بن ابی اور اس جیسے افراد میں مرتب ہوتی ہے۔ اور جنہوں نے کہا: یہ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو وہ دور کیے جائیں گے اور ان کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہوگا۔ اور جس نے اسلام قبول کیا تو اسلام پہلے سارے گناہ ختم کر دیتا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس آیت کی تاویل میں خوبصورت قول یہ ہے کہ یہ تمام تہمت لگانے والوں کو شامل ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تقدیر یوں ہوگی: ان الذین یرمون الانفس المحصنات۔ اس میں مذکر اور مؤنث شامل ہیں اسی طرح الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ میں بھی سب شامل ہیں مگر مؤنث پر مذکر کو غلبہ دیا گیا ہے۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 373

"وہ یاد کریں اس دن کو جب گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے"۔

عام قرأت تاء کے ساتھ ہے۔ ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور خلف نے یشھد یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے بھی اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ جار مجرور، اسم اور فعل کے درمیان حائل ہیں معنی یہ ہے اس دن کو یاد کریں جب بعض کی زبانیں بعض پر گواہی دیں گی ان اعمال پر جو وہ قذف اور بہتان میں کرتے تھے۔ بعض علماء نے کہا: اس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی اس کے ساتھ جو انہوں نے کلام کی تھی۔ وَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ دنیا میں جو اعمال کیے ہوں گے ان کے متعلق ان کے اعضاء بولیں گے۔

يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝

"اس روز پورا پورا دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ جس کے وہ حقدار ہیں اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یعنی ان کا حساب اور جزا اللہ تعالیٰ انہیں پوری پوری دے گا۔ مجاہد نے یومئذ یوفیھم اللہ دینھم الحقُ یعنی حق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ وہ اللہ کی صفت ہے۔ ابو عبید نے کہا: اگر لوگوں کے خلاف کی کراہت نہ ہوتی تو بہتر رفع تھا کیونکہ یہ (اللہ) کی صفت ہے اور حضرت ابی کی قرأت کی موافقت بھی ہے۔ یہ اس لیے کہ جریر بن حازم نے کہا: میں نے حضرت ابی کے مصحف میں دیکھا، يَوْمَىِٕذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ۔ نحاس نے کہا: ابو عبید سے یہ کلام غیر پسندیدہ ہے کیونکہ اس نے اس سے حجت پکڑی ہے جو سواد اعظم کے مخالف ہے۔ اس میں کوئی حجت نہیں کیونکہ اگر یہ صحیح ہوتا کہ یہ مصحف ابی میں اس طرح ہے تو یومئذ یوفیھم اللہ الحق دینھم۔ کی قرأت جائز ہوتی۔ دینھم، الحق سے بدل ہوتا اور عام قراء کی قرأت پر دینھم الحق کے لیے صفت ہے یہ معنی بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجرموں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ انہیں حق کے ساتھ جزا دے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ هَلْ نُجٰزِیْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝ (سبا) کیونکہ کافر اور مجرم کو اللہ تعالیٰ کا جزا دینا حق اور عدل کے ساتھ ہے اور محسن کو اللہ تعالیٰ کا جزا دینا احسان اور فضل کے ساتھ ہے۔ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ہم نے ان دونوں اسماء کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے اور خصوصاً الکتاب الاسنیٰ میں کیا ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

"ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لیے اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ مبرا ہیں ان (تہمتوں) سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں ان کے لیے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے"۔

ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے عورتوں میں سے خبیث عورتیں (1)، مردوں میں سے خبیث مردوں کے لیے ہیں اسی طرح خبیث مرد، خبیث عورتوں کے لیے ہیں۔ اسی طرح پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں۔ مجاہد نے ابن جبیر، عطا اور اکثر مفسرین نے کہا: اس کا معنی ہے خبیث کلمات، خبیث مردوں کے لیے ہیں اسی طرح خبیث لوگ، خبیث باتوں کے لیے ہیں اسی طرح پاکیزہ کلمات پاکیزہ لوگوں کے ہیں اور پاکیزہ لوگ پاکیزہ باتوں کے لیے ہیں۔ نحاس نے کہا: معانی القرآن کی کتاب میں کہا: یہ قول اس آیت میں احسن ہے اس قول کی صحت پر دلیل أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ۔ کا ارشاد ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صفوان رضی اللہ عنہما مبرا ہیں جو خبیث مرد اور خبیث عورتیں کہتی ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ آیت اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً پر مبنی ہے۔ الخبیثات سے مراد بدکار عورتیں ہیں اور الطیبات سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں۔ اسی طرح الطیبون اور الطیبات ہے؛ اس قول کو بھی نحاس نے اختیار کیا ہے یہی ابن زید کے قول کا معنی ہے۔ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ یعنی جنس مراد ہے۔ بعض نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان مراد ہیں پھر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے جیسا کہ فرمایا: فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ (النساء: 11) یہاں مراد اخوان ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ مبرءون یعنی جوان پر تہمت لگائی گئی ہے اس سے مبرا ہیں۔ بعض اہل تحقیق نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک شیر خوار بچے کی زبان سے آپ کی برأت کی جو پنگھوڑے میں تھا اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی گئی تو ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے برأت کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کے ذریعے آپ کی برأت کی۔ پس اللہ تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کے لیے کسی بچے اور نبی کی براءت کے ساتھ راضی نہ ہوا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے بہتان اور تہمت سے آپ کی براءت فرمائی۔

علی بن زید بن جدعان سے مروی ہے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے نو چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو کسی عورت کو عطا نہیں کی گئیں۔ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے ساتھ نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تو جبریل میری صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحن میں اترے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے شادی کی تو میں باکرہ تھی میرے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی باکرہ عورت سے نکاح نہیں کیا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا، آپ کی قبر مبارک میرے حجرے میں بنائی گئی، فرشتے میرے حجرے کو گھیرے رہتے ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی دوسرے اہل بیت کے پاس ہوتے تو وہ لوگ آپ سے وحی کے دوران جدا ہو جاتے تھے اور اگر آپ پر وحی نازل ہوتی اور میں آپ کے ساتھ لحاف میں ہوتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اپنے جسم سے جدا نہیں فرماتے تھے، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اور صدیق کی بیٹی ہوں، میرا عذر آسمان سے نازل ہوا، میں پاکیزہ پیدا کی گئی اور پاکیزہ کے پاس رہی، مجھ سے مغفرت اور رزق کریم کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ۠ فرمایا: اس سے مراد جنت ہے (2)۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 187 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 374

اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

''اے ایمان والوں نہ داخل ہوا کرو (دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک تم اجازت نہ لے لو اور سلام نہ کرلو ان گھروں میں رہنے والوں پر، یہی بہتر ہے تمہارے لیے شاید تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا ابن آدم جس کو الله تعالیٰ نے کرامت وفضیلت سے نوازا اسے منازل کے ساتھ خاص فرمایا اور انہیں گھروں میں آنکھوں سے اوجھل کر دیا اور علیحدگی میں انہیں لطف اندوز ہونے کا مالک بنایا اور مخلوق پر پابندی لگادی کہ باہر سے انہیں جھانکیں یا مالکوں کی اجازت کے بغیر ان گھروں میں داخل ہوں انہیں پردے کے آداب سکھائے تاکہ کوئی کسی پوشیدہ چیز پر مطلع نہ ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی قوم کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر جھانکا تو ان کے لیے حلال ہے کہ وہ اس کی آنکھ پھوڑ دیں'' (1)۔ اس کی تاویل میں اختلاف ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے اگر وہ آنکھ پھوڑ دے گا تو اس پر ضامن ہوگا اور یہ خبر منسوخ ہے اور یہ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا (النحل: 126) کے نزول سے پہلے کی ہے یہ بھی احتمال ہے کہ یہ بطور وعید ہو حتمی طور پر نہ ہو۔ خبر جب کتاب الله کے مخالف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر میں ایک کلام فرماتے تھے جبکہ مراد کوئی دوسری چیز ہوتی تھی جیسا کہ حدیث میں ہے عباس بن مرداس نے جب آپ کی مدح کی تو آپ نے حضرت بلال کو فرمایا: ''اٹھو اور اس کی زبان کاٹ دو''۔ اس سے مراد یہ تھا کہ اس کو کوئی چیز دے دو، حقیقۃً اس کی زبان کاٹنا مراد نہیں تھا۔ اسی طرح یہاں بھی احتمال ہے کہ آنکھ پھوڑنے کا ذکر ہو اور مراد اس کے ساتھ ایسا عمل کرنا ہو تاکہ اس کے بعد وہ کسی دوسرے کے گھر میں نہ دیکھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر کوئی ضمان اور قصاص نہیں ہے حضرت انس کی حدیث کی وجہ سے۔ ان شاء الله یہ صحیح ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ آیت کا شان نزول وہ ہے جو طبرانی وغیرہ نے عدی بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری عورت نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے گھر میں کبھی ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس حالت میں کوئی دیکھے نہ والد اور نہ بیٹا۔ پھر کبھی باپ آجاتا ہے وہ مجھ پر داخل ہوتا ہے کبھی کوئی اور میرے اہل خانہ سے میرے پاس آجاتا ہے جبکہ میں اس حالت میں ہوتی ہوں تو پھر میں کیا کروں۔ تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم بتایئے وہ سرائیں اور رہائش گاہیں جو شام کے راستہ پر ہیں ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہوتا تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الله تعالیٰ نے کسی غیر کے گھر میں دخول کی حرمت کی ایک غایت بیان کی ہے اور وہ استیناس ہے اور اس سے مراد اجازت طلب کرنا ہے۔ ابن وہب نے کہا: امام مالک نے کہا ہمارے خیال میں استیناس سے مراد استیذان

1۔ صحیح مسلم، باب تحریم النظر، جلد 2، صفحہ 212

(اجازت طلب کرنا) ہے۔ حضرت ابی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر کی قرأت میں اسی طرح ہے: حتی
تستأذنوا و تسلموا علی اھلھا۔ بعض علماء نے فرمایا: تستانسوا کا معنی ہے کوئی عمل کرو اس کے لیے جو گھر میں ہے تا کہ
آپ کی آمد محسوس ہو جائے۔ مجاہد نے کہا: کھانسے اور عمل کرے جو ممکن ہو اور اتنی مقدار ٹھہر جائے کہ جس سے اس کی آمد معلوم
ہو جائے پھر اس کے بعد داخل ہو۔ طبری نے کہا: اس کا یہی معنی ہے اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا
(النساء: 6) یعنی تم جان لو۔ شاعر نے کہا:

آنَسَتْ بَبْأَة وأفزعها القنَّ ا ص عصراً وقد دنا الإمساء

میں کہتا ہوں: سنن ابن ماجہ میں ہے ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں عبدالرحیم بن سلیمان نے بتایا
انہوں نے واصل بن سائب سے روایت کیا انہوں نے ابوسورہ سے روایت کیا ہے انہوں نے ابوایوب انصاری سے روایت
کیا فرمایا: ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ سلام (تو ہم سمجھتے ہیں) یہ استیناس کیا ہے؟ فرمایا: ''آدمی تسبیح، تکبیر، تحمید
کے ساتھ بولے یا کھانسے اور گھر والوں کو (اپنی آمد سے) آگاہ کرے''(1)۔

میں کہتا ہوں: نص ہے کہ استیناس، استیذان کے علاوہ ہے جیسا کہ مجاہد اور ان کے ہم نوا علماء نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے بعض لوگوں نے کہا: سعید بن جبیر سے مروی ہے حتی
تستانسوا کاتب کی طرف وہم یا خطا ہے۔ یہ حتی تستاذنوا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت صحیح نہیں
ہے کیونکہ تمام مصاحف اسلام میں حتی تستانسوا ثابت و موجود ہے۔ حضرت عثمان کے زمانہ سے اسی پر اجماع صحیح ہے
اس کے خلاف جائز نہیں۔ کاتب پر خطا اور وہم کا اطلاق ایسے لفظ میں جس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے ایسا قول ہے جو حضرت
ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ
حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝ (فصلت)
اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی
ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حتی تسلموا علی اھلھا و تسأنسوا۔ یہ قول ابوحاتم نے حکایت کیا ہے۔
حضرت ابن عطیہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے اس قول کی جو چیز نفی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ تستانسوا معنی میں
ثابت ہے کلام عرب میں اس کی وجہ واضح ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اَستانِسُ یا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اجازت چاہتا ہوں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ
حدیث مشہور ہے یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انس طلب کیا پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسی
صورت میں اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے غلط کہہ سکتے ہیں؟
میں کہتا ہوں: ہم نے حضرت ابوایوب کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ استئناس سلام سے پہلے ہوتا ہے۔ آیت اپنے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب الاستیذان، صفحہ 271۔ ایضاً، حدیث نمبر 3696، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

باب پر ہے اس میں کوئی تقدیم وتاخیر نہیں ہے جب داخل ہو تو سلام کرے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ تین مرتبہ اجازت طلب کرنا سنت ہے تین مرتبہ سے زیادہ اجازت طلب نہ کرے (یعنی گھنٹی چوتھی مرتبہ نہ دے اور دروازہ چوتھی مرتبہ نہ کھٹکھٹائے)۔ ابن وہب نے کہا: امام مالک نے فرمایا اجازت طلب کرنا تین مرتبہ ہے۔ میں پسند نہیں کرتا کہ وہ اس سے زیادہ مرتبہ اجازت طلب کرے مگر وہ سمجھے کہ ابھی تک انہیں سنائی نہیں دیا۔ میں زیادہ مرتبہ اجازت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا جب اسے یقین ہو کہ (گھر والوں کو) سنائی نہیں دیا۔ استیذان (اجازت طلب) کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کہے: السلام علیکم! کیا میں داخل ہو سکتا ہوں اگر اسے اجازت دی جائے تو داخل ہو جائے اگر اسے واپس جانے کا حکم ہو تو واپس چلا جائے اگر سکوت کیا گیا ہو تو تین مرتبہ اجازت طلب کرے پھر تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد واپس چلا جائے۔ ہم نے کہا: اجازت طلب کرنا تین بار ہے اس پر زیادتی نہیں کی جائے گی کیونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے جس پر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عمل کیا تھا اس کی گواہی حضرت ابوموسیٰ کے لیے حضرت ابوسعید الخدری نے دی تھی پھر ابی بن کعب نے دی تھی یہ مشہور حدیث ہے جس کو الصحیح نے نقل کیا ہے اور یہ نص صریح ہے کیونکہ اس میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے پاس آنے سے تجھے کیا مانع تھا؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا: میں آیا میں نے تمہارے دروازے پر تین مرتبہ سلام کیا مجھ پر جواب نہ آیا تو میں واپس چلا گیا کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے پھر اسے اجازت نہ دی جائے تو وہ واپس چلا جائے'' (1)۔ رہا وہ جو ہم نے استیذان کی صورت ذکر کی ہے اسے ابوداؤد نے ربعی سے روایت کیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے اس نے پوچھا: میں داخل ہو جاؤں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خادم کو فرمایا: ''تم اس کی طرف جاؤ اور اسے اجازت طلب کرنا سکھاؤ'' (2)۔ تو خادم نے اسے کہا: تم کہو: السلام علیکم! کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ اس شخص نے یہ سنا تو کہا: السلام علیکم! کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اجازت دی تو وہ داخل ہو گیا (3)۔ اس کو طبری نے ذکر کیا ہے اور کہا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی لونڈی کو کہا اس کو روضہ کہا جاتا تھا۔ اس کو کہو کہ یہ کہے السلام علیکم! کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک دن گرمی نے اذیت دی تو وہ ایک قریشی عورت کے خیمہ پر آئے اور کہا: السلام علیکم! کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ اس عورت نے کہا: سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ پھر آپ نے سوال لوٹایا تو اس نے یہی جواب دیا پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس عورت سے کہا: تو کہہ داخل ہو جا۔ اس عورت نے یہ کہا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما داخل ہو گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رک گئے جب اس نے سلامتی کے ساتھ داخل ہو جا کہا تھا کیونکہ لفظ میں احتمال تھا کہ اس کی مراد یہ ہو کہ تم سلام کے ساتھ داخل ہو شخصیت کے ساتھ داخل نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اجازت طلب کرنا تین مرتبہ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں سے غالب یہ ہے جب تین مرتبہ تکرار کیا جائے تو سنا اور سمجھا جاتا ہے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی کلمہ سے کلام فرماتے

---

1۔ صحیح بخاری، التسلیم والاستیذان ثلاثاً، جلد 2، صفحہ 923 2۔ جامع ترمذی، ماجاء فی أن الاستیذان ثلاثاً، جلد 2، صفحہ 94

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب النوم، باب کیف الاستئذان، حدیث 4508، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو اسے تین مرتبہ دہراتے تا کہ اسے سمجھا جائے۔ جب آپ کسی قوم پر سلام کرتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ جب یہ غالب مقدار پوری ہو جائے اور پھر بھی جواب نہ آئے تو اس کا مطلب ہے گھر کا مالک اجازت دینے کا ارادہ نہیں رکھتا یا شاید جواب سے کوئی عذر مانع ہے جس کو قطع کرنا ممکن نہیں۔ پس اجازت طلب کرنے والے کو واپس چلا جانا چاہیے، کیونکہ اس پر زیادتی گھر کے مالک کو پریشان کرے گی۔ بعض اوقات اصرار اذیت دیتا ہے حتی کہ جس کام میں مشغول ہوتا ہے وہ منقطع ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو ایوب کو فرمایا جب آپ ﷺ نے اجازت طلب کی تو وہ جلدی سے باہر آ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''شاید ہم نے تجھ پر جلدی کی ہے'' (الحدیث) (1)۔ عقیل نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے فرمایا: رہا تین مرتبہ سلام کہنا سنت تو اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی پاک ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا: ''السلام علیکم!'' (2) گھر والوں نے جواب نہ دیا پھر نبی پاک ﷺ نے کہا: ''السلام علیکم!'' پھر انہوں نے جواب نہ دیا تو نبی پاک ﷺ واپس لوٹ آئے۔ جب حضرت سعد نے پھر سلام کی آواز نہ پائی تو وہ جان گئے کہ نبی پاک ﷺ واپس تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت سعد آپ ﷺ کے پیچھے نکلے اور آپ کو ملے اور عرض کی: وعلیکم السلام! یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ کا سلام سن لیا تھا۔ نبی پاک ﷺ حضرت سعد کے ساتھ واپس تشریف لائے اور حضرت سعد کے گھر میں داخل ہوئے (3)۔ ابن شہاب نے کہا: آپ کی طرف سے تین مرتبہ سلام فرمایا گیا ہے۔ اس کو ولید بن مسلم نے اوزاعی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے یحییٰ بن کثیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے محمد بن عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارہ نے بتایا انہوں نے قیس بن سعد سے روایت فرمایا نبی پاک ﷺ حضرت معاذ کے گھر تشریف لائے اور کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ!'' انہوں نے کہا: حضرت سعد نے آہستہ سے جواب دیا۔ قیس نے کہا میں نے کہا: کیا آپ ﷺ کو اجازت نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا: ''چھوڑو تا کہ آپ کثرت سے ہم پر سلام فرمائیں'' (الحدیث)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اس میں یہ نہیں ہے کہ ابن شہاب نے کہا تین مرتبہ سلام کرنا آپ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ابوداؤد نے کہا: عمر بن عبدالواحد اور ابن سماعہ نے اوزاعی سے مرسلاً روایت کیا ہے ان دونوں حضرات نے قیس بن سعد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اجازت طلب کرنا، اس پر لوگوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: کیونکہ لوگوں نے اب دروازے بنا لیے ہیں اور ان کو کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک ﷺ جب کسی قوم کے دروازے پر آتے تو دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ دروازے کی دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے: ''السلام علیکم، السلام علیکم'' (4)۔ یہ اس لیے تھا کیونکہ اس وقت دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 30
2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی افشاء السلام، جلد 2، صفحہ 94
3۔ ابوداؤد، باب کیف الاستئذان، حدیث 4511، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابی داؤد، کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستئذان، جلد 2، صفحہ 349

**مسئلہ نمبر 8**۔ اگر دروازہ بند ہوتا تو آنے والا جہاں چاہے کھڑا ہو اور اجازت طلب کرے اگر چاہے تو دروازہ کھٹکھٹائے کیونکہ یہ حضرت ابوموسیٰ نے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک باغ میں مدینہ طیبہ میں کنویں کے منڈیر پر تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنویں میں اپنی ٹانگیں لمبی کردیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کہا: ''اسے اجازت دو اور جنت کی بشارت بھی دو'' (1)۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن ابی الزناد نے اس کو روایت کیا ہے۔ صالح بن کیسان، یونس بن یزید نے ان کی متابعت کی ہے۔ ان تمام نے اس کو ابوالزناد سے انہوں نے ابوسلمہ سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن نافع سے انہوں نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔ محمد بن عمرو لیثی نے ان کی مخالفت کی ہے انہوں نے ابوالزناد سے انہوں نے ابوسلمہ سے انہوں نے نافع بن عبدالحارث سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی طرح روایت کی ہے۔ پہلی سند صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ کھٹکھٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ آہستہ سے کھٹکھٹایا جائے حتیٰ کہ سن لیا جائے۔ سختی سے نہ کھٹکھٹائے۔ حضرت انس بن مالک نے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے ناخنوں سے کھٹکھٹائے جاتے تھے؛ یہ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے اپنی جامع میں روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ بخاری و امام مسلم وغیرہما نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2) فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''کون ہے؟'' میں نے کہا: میں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں میں''۔ گویا آپ نے ''میں'' کہنا ناپسند کیا (3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لیے یہ ناپسند فرمایا تھا کیونکہ میں کے لفظ سے تعریف حاصل نہیں ہوتی اس میں حکم یہ ہے کہ اپنا نام ذکر کرے جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ نے کیا تھا، کیونکہ نام کے ذکر کرنے میں سوال اور جواب کی کلفت ساقط ہوجاتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بالاخانہ میں تشریف فرما تھے عرض کی: السلام علیك یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! السلام علیکم أید خل عمر (4) (کیا عمر داخل ہوسکتا ہے؟) صحیح مسلم میں ہے حضرت ابوموسیٰ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: السلام علیکم۔ یہ ابوموسیٰ ہے۔ السلام علیکم۔ یہ اشعری ہے (الحدیث)۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ خطیب نے اپنی جامع میں علی بن عاصم واسطی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں بصرہ میں آیا تو شعبہ کے گھر آیا میں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا انہوں نے پوچھا: کون؟ میں نے کہا: میں۔ انہوں نے کہا: اے شخص! میرا تو کوئی ایسا دوست نہیں جس کو ''میں'' کہا جاتا ہو۔ پھر وہ میری طرف نکلے اور کہا: مجھے محمد بن منکدر نے بتایا انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا فرمایا: میں کسی کام کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ میں نے ان کا دروزاہ کھٹکھٹایا انہوں نے پوچھا: کون؟ میں نے کہا: میں۔ انہوں نے کہا: ''میں میں'' (5)۔ گویا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اس قول کو ناپسند فرمایا۔

---

1۔ صحیح بخاری، الفتنۃ التی تموج کموج البحر، جلد 2، صفحہ 1051
2۔ ایضاً، اذا قال من ذا فقال أنا، جلد 2، صفحہ 923
3۔ سنن ابی داؤد، دق الباب عند الاستیذان، جلد 2، صفحہ 349
4۔ ابوداؤد، باب فی الرجل یفارق الرجل ثم یلقاہ، حدیث 4525
5۔ سنن ابی داؤد، دق الباب عند الاستیذان، جلد 2، صفحہ 349

عمر بن شیبہ سے روایت ہے انہوں نے کہا ہمیں محمد بن سلام نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا: میں نے عمرو بن عبید کا دروازہ کھٹکھٹایا انہوں نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا: میں۔ انہوں نے کہا: غیب تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ خطیب نے کہا: میں نے علی بن محسن قاضی کو بعض شیوخ سے یہ حکایت کرتے ہوئے سنا کہ جب ان کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا وہ پوچھتے: کون؟ دروازے پر کھڑا شخص کہتا میں تو شیخ صاحب فرماتے: انا (میں) ھَمّ دق۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ ہر قوم کا استیذان میں اپنا عرف ہے جیسا کہ ابو بکر خطیب نے مسنداً ابو عبد الملک مولی ام مسکین بنت عاصم بن عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے میری مالکن نے حضرت ابو ہریرہ کے پاس بھیجا وہ میرے ساتھ آئے جب دروازے پر کھڑے ہوئے تو فرمایا: اندر ایم؟ میری مالکن نے کہا: اندرون۔ انہوں نے عنوان باندھا ہے۔ ''باب الاستیذان بالفارسیۃ'' (عجمی زبان میں اجازت طلب کرنا) احمد بن صالح سے روایت کیا گیا ہے فرمایا: دراوردی اہل اصبہان سے تھے وہ مدینہ طیبہ آئے تو جو شخص ان کے پاس آنے کا ارادہ کرتا اسے کہتے اندرون۔ اہل مدینہ نے اس کا لقب دراوردی رکھا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ ابو داؤد نے حضرت کلدۃ بن حنبل سے روایت کیا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہ نے اسے بارگاہ رسالت میں دودھ، ہرن کا بچہ اور ضغابیس (ایک قسم کی بوٹی ہے جو سرکہ اور تیل میں پکا کر کھائی جاتی ہے) دے کر بھیجا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ کی بالائی طرف میں تھے۔ میں حاضر ہوا اور میں نے سلام نہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تو واپس جا اور کہہ السلام علیکم''۔ یہ حضرت صفوان بن امیہ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے (1)۔ ابو زبیر نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جو سلام سے آغاز نہ کرے اسے اجازت نہ دو''۔ ابن جریج نے ذکر کیا ہے کہ عطا نے مجھے بتایا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: جب کوئی شخص کہے: کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ اور سلام نہ کرے تو تم کہو: نہیں حتی کہ تو چابی لے آئے۔ میں نے پوچھا: چابی سے مراد السلام علیکم ہے؟ فرمایا: ہاں۔ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے جو کچھ گھر میں تھا اسے دیکھا پھر کہا: السلام علیکم کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ حضرت حذیفہ نے کہا: اپنی آنکھوں کے ساتھ تو تو داخل ہو چکا ہے اور سرین کے ساتھ داخل نہیں ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اس مسئلہ میں یہ بھی ہے جو ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص کا دوسرے شخص کی طرف اپنا پیغام رساں بھیجنا اس کی طرف سے اجازت ہے'' (2) یعنی اس نے اسے بلا بھیجا تو اس نے اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد اس کی وضاحت کرتا ہے: ''جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے اور وہ پیغام رساں کے ساتھ آئے تو یہ اس کے لیے اجازت ہے''۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔

---

1۔ ابوداؤد، کتاب ابواب النوم کیف الاستئذان، حدیث 4507۔

ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی التسلیم قبل الاستئذان، حدیث 2634

2۔ سنن ابی داؤد، فی الرجل یدعی أیکون ذالک أذنہ، جلد 2، صفحہ 349

**مسئلہ نمبر 15**۔ جب نظر پر نظر پڑھ جائے تو سلام متعین ہو جاتا ہے اندر والے کا تجھے دیکھنا تیرے داخل ہونے کے لیے اذن نہ ہوگا جب تک تو سلام کا حق ادا نہ کرے گا کیونکہ تو اس پر وارد ہونے والا ہے۔ تو کہے گا: کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ وہ اگر تجھے اجازت دے تو فبہا ورنہ تو واپس لوٹ آئے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ یہ تمام احکام اس گھر کے بارے میں ہیں جو تمہارا نہیں ہے۔ رہا تمہارا اپنا گھر تو اگر اس میں تمہارے اہل ہیں تو پھر ان سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں مگر تو ان پر سلام کر جب بھی تو داخل ہو۔ قتادہ نے کہا: جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں پر سلام کر وہ سب سے زیادہ حق دار ہیں (1) جنہیں تو سلام کرتا ہے اگر اس گھر میں تیرے ساتھ تیری والدہ یا تیری ہمشیرہ ہے تو علماء فرماتے ہیں: پہلے تو کھانسی کر اور زمین پر زور سے پاؤں مارتا کہ وہ تیری آمد کے متعلق آگاہ ہو جائیں کیونکہ تیرے اور تیرے اہل کے درمیان تو کوئی حشمت نہیں لیکن والدہ اور ہمشیرہ کبھی ایسی حالت میں ہوتی ہیں جس میں تو انہیں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ابن القاسم نے کہا: امام مالک نے فرمایا: آدمی اپنی والدہ اور اپنی ہمشیرہ سے اجازت طلب کرے جب وہ ان کے پاس جانے کا ارادہ کرے۔ عطا بن یسار نے روایت کیا ہے ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کیا میں اپنی والدہ سے بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ اس شخص نے عرض کی: حضور! میں اس کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اجازت طلب کر''۔ تین مرتبہ یہی سوال و جواب ہوا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو اسے برہنہ حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تو اس سے اجازت طلب کر''۔ یہ طبری نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اگر اپنے گھر میں داخل ہو جس میں اور کوئی نہیں رہتا تو ہمارے علماء نے کہا: وہ کہے: السلام علینا من ربنا التحیات الطیبات المبارکات للہ السلام۔ اس کو ابن وہب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ قتادہ نے کہا: جب تو ایسے مکان میں داخل ہو جہاں کوئی نہیں ہے تو تو کہہ: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین۔ اس کا تجھے حکم دیا گیا ہے فرمایا: ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ فرشتے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: صحیح سلام اور استیذان کا ترک ہے۔ واللہ اعلم۔ میں کہتا ہوں: قتادہ کا قول بہتر ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸

''پھر اگر نہ پاؤ ان گھروں میں کسی کو (جو تمہیں اجازت دے) تو نہ داخل ہو ان میں یہاں تک کہ اجازت دی جائے تمہیں اور اگر کہا جائے تمہیں کہ واپس چلے جاؤ یہ (طرز معاشرت) بہت پاکیزہ ہے تمہارے لیے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

1۔ ترمذی، باب ماجاء فی التسلیم اذا دخل بیتہ، حدیث 2622

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا۔ فِيۡهَاۤ میں ضمیر کا مرجع دوسروں کے گھر ہیں۔ طبری نے مجاہد سے حکایت کیا ہے انہوں نے کہا: فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا کا معنی یہ ہے کہ تمہارا ان کے گھروں میں سامان نہ ہو۔ طبری نے اس تاویل کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح یہ انتہائی ضعف میں ہے گویا مجاہد کا خیال ہے کہ وہ گھر جن میں کوئی رہنے والا نہیں تو ان میں بغیر اجازت کے داخل ہوسکتا ہے جب داخل ہونے والے کا اس میں سامان ہو۔ انہوں نے المتاع کے لفظ سے متاع البیت مراد لیا ہے۔ جو کالین اور کپڑے وغیرہ ہیں یہ سب ضعیف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ماقبل آیت سے اور احادیث سے منسلک ہے۔ تقدیر یوں ہے: یایھا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا فان اذن لکم فادخلوا والا فارجعوا۔ یعنی اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ گھروں میں داخل نہ ہو حتی کہ تم اجازت طلب کرلو اور سلام کرلو اگر تمہیں اجازت دی جائے تو داخل ہوجاؤ ورنہ واپس چلے جاؤ جیسا کہ حضرت سعد کے ساتھ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور حضرت ابو موسیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا۔ اگر تم ان میں کسی کو نہ بتاؤ جو تمہیں اجازت دے تو تم ان میں داخل نہ ہو حتی کہ تم اجازت پالو۔ طبری نے قتادہ سے سند کے ساتھ روایت کیا فرمایا ایک مہاجر نے کہا: میں ساری عمر اس آیت پر عمل کو تلاش کرتا رہا میں نے نہیں پایا کہ میں کسی دوست سے اجازت طلب کروں اور وہ مجھے کہے: لوٹ جاؤ پھر میں لوٹ جاؤں جبکہ میں خوش ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُوَ اَزۡكٰى لَكُمۡ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ خواہ دروازہ بند ہو یا کھلا ہو کیونکہ شرع نے دخول کی تحریم کے ساتھ اس کو بند کردیا ہے حتی کہ اس کے مالک کی اجازت اسے کھول دے بلکہ اس پر واجب ہے کہ دروازے پر آئے اور اجازت کا اس طریقہ پر ارادہ کرے جس سے گھر پر مطلع نہ ہو نہ آنے میں اور نہ لوٹنے میں گھر پر آگاہی ہو۔ ہمارے علماء نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس نے اپنی آنکھوں کو گھر کے صحن سے بھرا اس نے فسق کا ارتکاب کیا۔ صحیح نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کی دراز سے جھانکا جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کنگھی تھی جس کے ساتھ آپ سر کو کنگھی کر رہے تھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''اگر میں جانتا کہ تو دیکھ رہا ہے تو میں تیری آنکھوں میں اس کے ساتھ مارتا۔ اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کی وجہ سے اذن کو مقرر کیا ہے''(1)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تجھ پر بغیر اجازت کے جھانکے پھر تو کنکری کے ساتھ اس کو مارے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کوئی گرفت نہیں ہوگی''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت شرط ہے تو یہ چھوٹے اور بڑے کی طرف سے ہوگا۔ حضرت انس بن مالک بلوغت سے پہلے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے تھے، اسی طرح صحابہ کرام اپنے بچوں اور لڑکوں کے ساتھ کرتے تھے اس کا مزید بیان سورت کے آخر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ۞ گھروں کی جاسوسی کرنے والوں کے لیے اور

1۔ جامع ترمذی، من اطلع فی دار قوم بغیر اذنھم، جلد 2، صفحہ 95

گناہوں اور غیر حلال چیزوں کو دیکھنے کے لیے غفلت کی حالت میں دخول کے طلب کرنے والوں کے لیے وعید ہے اور ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو ممنوع چیز پر واقع ہوتے ہیں۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

”کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم داخل ہو ایسے گھروں میں جن میں کوئی آباد نہیں جن میں تمہارا سامان رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو“۔

اس میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ روایت ہے کہ جب آیت استیذان نازل ہوئی تو بعض لوگ اس میں زیادہ تکلف کرنے لگے وہ کسی کھنڈر یا کسی خالی مقام پر آتے تو سلام کرتے اور اجازت طلب کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے گھر میں اجازت طلب کرنا اٹھا دیا جہاں کوئی رہنے والا نہ ہو کیونکہ استیذ ان کی علت یہ ہے کہ حرمات نہ کھلیں تو جہاں کوئی رہنے والا ہی نہیں تو علت ہی نہ پائی گئی اور حکم بھی زائل ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ان گھروں سے مراد کیا ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت محمد بن حنفیہ، قتادہ اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد ہوٹل ہیں جو راستوں پر ہوتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: ان میں رہتا کوئی نہیں بلکہ یہ ہر مسافر کے آرام کے لیے وقف ہوتے ہیں ان میں ان کا متاع ہوتا ہے یعنی ان کی منفعت سے لطف اندوز ہونا۔ حضرت محمد بن حنفیہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد مکہ کے گھر ہیں۔ اس کو امام مالک کا قول بیان کرتا ہے۔ یہ اس قول کی بنا پر ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ہیں لوگ سب ان میں شریک ہیں کیونکہ مکہ سختی کے ذریعے فتح کیا گیا تھا۔ ابن زید اور شعبی نے کہا: سبزیوں کی دکانیں ہیں (1)۔ امام ثعلبی نے کہا: وہ لوگ اپنی اشیاء لے کر آتے تھے اور ان مکانوں میں رکھتے تھے اور لوگوں کو کہتے تھے: ادھر آؤ، ادھر آؤ۔ عطا نے کہا: اس سے مراد وہ کھنڈرات ہیں جہاں لوگ پیشاب پاخانہ کے لیے جاتے ہیں اس میں متاع ہے۔ جابر بن زید نے کہا: یہاں متاع سے مراد سامان نہیں ہے اس کے علاوہ حاجت ہے خواہ وہ منزل ہو جہاں لوگ دن یا رات کے وقت ٹھہرتے ہوں یا ایسی کھنڈر جگہ جہاں لوگ قضاء حاجت کے لیے داخل ہوتے ہوں یا ایسا گھر جس کو دیکھا جاتا ہو یہ متاع ہے دنیا کی ہر منفعت متاع ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ عمدہ شرح ہے ائمہ مسلمین کے امام کے قول سے اور یہ لغت کے موافق ہے۔ کلام عرب میں متاع کا معنی منفعت ہے اسی سے ہے: امتع اللہ بك۔ اللہ تعالیٰ تجھے منفعت دے۔ اسی سے ہے فَمَتِّعُوْهُنَّ (الاحزاب: 49)

میں کہتا ہوں: قاضی ابو بکر بن عربی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ اور جنہوں نے متاع کی تفسیر بغیر تغیر کے انتفاع سے کی ہے تو انہوں مفصل کو ڈھانپ دیا اور قول فیصل کو لے آئے اور یہ بیان کیا کہ ان میں داخل ہونے والا وہ ہے جس کے لیے انتفاع میں سے کچھ ہو۔ پس طالب علم مدارس میں داخل ہوتا ہے، رہنے والا ہوٹلوں اور سراؤں میں داخل ہوتا ہے اور گاہک

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 191

سامان خریدنے کے لیے دکان میں داخل ہوتا ہے، پیشاب کرنے والا حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہوتا ہے ہر ایک اپنے کام کے لیے آتا ہے۔ رہا ابن زید اور شعبی کا قول تو وہ بھی ایک قول ہے وہ یہ کہ سبزیوں کے مکانات لوگوں کے اموال کی وجہ سے ممنوع ہوتے ہیں ہر داخل ہونے والے کے لیے بالا جماع مباح نہیں ہوتے اور ان میں داخل نہیں ہو سکتا مگر جسے ان کا مالک اجازت دے بلکہ ان کے ارباب لوگوں کو دور کرنے کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

"آپ حکم دیجیے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی یہ (طریقہ) بہت پاکیزہ ہے ان کے لیے، بیشک اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کاموں پر جو وہ کیا کرتے ہیں"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ اللہ تعالیٰ نے پردے کے ساتھ نظر کے امر کو ملایا۔ کہا جاتا ہے: غض بصرہ یغضہ غضاً۔ شاعر نے کہا:

أَغُضُّ طرفی مابَدَتْ لِی جارتِی حتی یُوَارِیَ جارتِی مأواھا

اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہیں کیا جس سے نظر کو بچانا ہے اور فرج کی حفاظت کرنی ہے لیکن یہ معلوم و معروف ہیں اس سے مراد محرم ہے مخلل نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں سعید بن ابی حسن نے حسن کو کہا: عجمیوں کی عورتیں اپنے سینے اور اپنے سر کھلے رکھتی ہیں (1)؟ تو آپ نے فرمایا: تو اپنی نظر کو پھیر لے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ۔ قتادہ نے کہا: یعنی ان کے لیے جو حلال نہیں اس سے آنکھیں نیچے رکھیں اور اس سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ۔ یعنی خیانت کرنے والی نظروں سے اور ممنوعہ چیزوں کے ذریعے دیکھنے سے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں من زائدہ ہے جیسے اس ارشاد میں من زائدہ ہے۔ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝۴۷ (الحاقہ) بعض نے کہا: یہ من تبعیضیہ ہے کیونکہ کچھ دیکھنا مباح ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: الغض کا معنی نقصان ہے کہا جاتا ہے: غض فلان من فلان، یعنی اس سے کمی کر دی۔ آنکھوں کو جب عمل سے روک دیا گیا ہو تو وہ نیچی کی گئی ہے اور اس میں کمی کی گئی ہے پس من الغض کے متعلق ہو گیا نہ تبعیض کے لیے ہو گا اور نہ زائدہ ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آنکھ، دل کی طرف بہت بڑا دروازہ ہے اور حواس کے طرق کو اس کی طرف بہت زیادہ پہنچاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی بنا پر سقوط بہت زیادہ ہوتا ہے اس سے بچنا بہت ضروری ہے اور تمام محرمات سے آنکھ کا جھکانا واجب ہے اور ہر اس چیز سے آنکھوں کو نیچا کرنا ضروری ہے جس سے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 191

"راستوں پر بیٹھنے سے بچو" (1)، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان مجالس پر بیٹھنا ہماری مجبوری ہے ہم یہاں آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تمہیں ضروری ہے تو راستے کا حق ادا کرو" (2)۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا: "آنکھ کا جھکانا، اذیت سے رکنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا" (3)۔ اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے۔ اس کو بخاری و مسلم نے تخریج کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "غیر محرم کی طرف متواتر نہ دیکھو پہلی نظر معاف ہے، دوسری نظر تجھے معاف نہیں" (4)۔ اوزاعی نے روایت کیا ہے فرمایا مجھے ہارون بن رئاب نے بیان کیا کہ غزوان اور حضرت ابوموسیٰ اشعری دونوں کسی جنگ میں تھے ایک عورت کا ستر کھل گیا تو غزوان نے اس کی طرف دیکھا پھر اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی آنکھ پر زور سے طمانچہ مارا حتی کہ آنکھ سوج گئی اور کہا: تو ایسی چیز کی طرف دیکھتی ہے جو تجھے نقصان دیتی ہے نفع نہیں دیتی ہے۔ پھر غزوان، حضرت ابوموسیٰ سے ملے اور ان سے ان کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: تو نے اپنی آنکھ پر ظلم کیا ہے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور استغفار کرو کیونکہ پہلی نظر دیکھنا اس کے لیے جائز تھا اور اس کے بعد ممنوع تھا۔ اوزاعی نے کہا: غزوان نے اپنے نفس پر ضبط کیا اور کبھی نہ ہنسے حتی کہ وصال ہو گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ سے مروی ہے فرمایا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک اٹھنے والی نظر کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی آنکھ پھیرنے کا حکم دیا۔ یہ اس کے قول کو تقویت دیتی ہے جو کہتے ہیں کہ من تبعیض ہے کیونکہ پہلی نظر پر کنٹرول نہیں ہوتا وہ خطاب تکلیف میں داخل نہیں کیونکہ اس کا وقوع قصداً نہیں ہوتا اور نہ اس میں انسان کا کسب ہوتا ہے نہ اس کے روکنے کا مکلف ہوتا ہے پس اس لیے تبعیض واجب ہے۔ یہ فرج کے بارے میں نہیں فرمایا کیونکہ اس پر ضبط نہیں ہوتا۔ شعبی نے اپنی بیٹی یا اپنی ماں یا اپنی بہن کو متواتر دیکھنے کو مکروہ کہا ہے۔ ان کا زمانہ ہمارے اس زمانہ سے بہتر تھا اور کسی محرمہ عورت کی طرف بار بار شہوت کی نظر سے دیکھنا حرام ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ یعنی اپنی شرمگاہوں کو اس سے چھپاؤ جس کا دیکھنا حلال نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہے زنا سے بچاؤ۔ اس قول کی بناء پر من فروجهم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ صحیح یہ ہے کہ تمام مفہوم مراد ہیں۔ لفظ عام ہے۔ بہز بن حکیم بن معاویہ قشیری نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا فرمایا: میں نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنی شرمگاہوں میں سے کس کو چھپائیں اور کس کو کھلا چھوڑیں؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو مگر اپنی زوجہ اور کنیز اس سے مستثنیٰ ہیں" (5)۔ اس شخص نے پوچھا: ایک مرد دوسرے مرد کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "اگر تو طاقت رکھتا ہے کہ شرمگاہ کو کوئی نہ دیکھے تو ایسا ضرور کر" (6)۔ میں نے عرض کی: کبھی انسان تنہا ہوتا ہے۔ فرمایا: "اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ اس سے حیاء کیا جائے"۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی پاک

---

1۔ صحیح بخاری، أفنية الدور والجلوس فيها والجلوس على الصعدات، جلد 1، صفحہ 333 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب ما يؤمر به من رد البصر، حدیث 1837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع الترمذی، ما جاء فی حفظ العورة، جلد 2، صفحہ 103 6۔ ایضاً

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ اپنی حالت کا ذکر کیا اور فرمایا: نہ میں نے آپ کی شرمگاہ دیکھی اور نہ آپ نے میری شرمگاہ دیکھی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت کی وجہ سے علماء نے بغیر ازار کے حمام میں داخل ہونے کو حرام قرار دیا ہے حالانکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو انسان خرچ کرتا ہے اس میں سے بہتر وہ درہم ہے جو وہ خلوت میں حمام کے لیے دیتا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ حمام میں داخل ہوئے جبکہ وہ جحفہ میں محرم تھے۔ پس مردوں کے لیے حمام میں ازار کے ساتھ داخل ہونا جائز ہے اسی طرح عورتوں کے لیے ضرورت کے لیے داخل ہونا جائز ہے جیسے حیض ونفاس سے غسل کے لیے یا ایسی مرض کے لیے جو عورتوں کو لاحق ہوتی ہیں عورتوں کے لیے افضل اور اولیٰ یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنے گھروں میں غسل کریں۔ احمد بن منیع نے روایت کیا ہے انہوں نے کہا حسن بن موسیٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابن لہیعہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں زبان نے بتایا انہوں نے حضرت سہل بن معاذ سے روایت کیا انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ام درداء سے روایت کیا کہ انہوں نے حضرت ام درداء کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ملے جبکہ میں حمام سے نکلی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "ام الدرداء کہاں سے آرہی ہے" (1) انہوں نے کہا: حمام سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو عورت اپنے گھر کے علاوہ کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے وہ اپنے اور رحمٰن کے درمیان ہر پردے کو پھاڑنے والی ہوتی ہے"۔ ابو بکر بزار نے طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس گھر سے بچو جس کو حمام کہا جاتا ہے" صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ میل کو صاف کرتا ہے۔ فرمایا: "پھر پردہ کرو"۔ ابو محمد عبدالحق نے کہا: یہ اس باب میں سند کے اعتبار سے اصح حدیث ہے لوگ اس کو طاؤس سے مرسل روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد نے جو اس بارے میں حظر واباحت سے روایت کیا ہے اسانید کے ضعیف ہونے کی وجہ سے کوئی چیز صحیح نہیں ہے، اسی طرح جو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس زمانہ میں حمام میں داخل ہونا اہل فضل اور اہل دین پر حرام ہے کیونکہ لوگوں پر جہالت کا غلبہ ہے اور لوگ اسے سہل سمجھنے لگے ہیں جب وہ حمام کے درمیان میں ہوتے ہیں تو اپنے ازار پھینک دیتے ہیں حتی کہ ہر ایک خوش شکل بزرگ آدمی حمام کے وسط میں کھڑا نظر آتا ہے اس کے باہر والا حصہ اس کی شرمگاہ کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اسے اپنی رانوں کے درمیان سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اور کوئی بھی اسے منع نہیں کرتا یہ معاملہ مردوں میں ہے عورتوں کی کیا حالت ہوگی خصوصاً مصری شہروں میں کیونکہ ان کے حمام تو ان پاکیزہ عورتوں سے خالی ہوتے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے چھپتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر وہ حمام میں ستر کے ساتھ داخل ہو تو دس شرائط کے ساتھ داخل ہو۔

1- وہ صرف علاج کی نیت سے، پسینہ سے طہارت حاصل کرنے کی نیت سے۔

1۔ مسند احمد بن حنبل، حدیث اُم الدرداء، جلد 6، صفحہ 362

2- خلوت اور لوگوں کے کم ہونے کے وقت داخل ہو۔

3- اپنی شرمگاہ کو موٹے کپڑے سے ڈھانپے۔

4- اس کی نظر زمین کی طرف ہو یا سامنے والی دیوار کی طرف ہو تا کہ کسی ممنوع چیز پر نظر نہ پڑے۔

5- کسی برائی کو دیکھے تو نرمی سے منع کرے وہ کہے: پردہ کرو اللہ تجھ پر پردہ ڈالے۔

6- اگر کوئی شخص اس کے جسم کو مل رہا ہو تو اسے شرمگاہ پر قدرت نہ دے مرد کی شرمگاہ ناف سے گھٹنے تک ہے ہاں بیوی یا کنیزہ ہو تو ان سے ستر کی صفائی کرا سکتا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ران شرمگاہ ہے یا نہیں۔

7- اجرت معلومہ جو شرط کے ساتھ معلوم ہو یا لوگوں کی عادت کے ساتھ معلوم ہو اس کی ادیگی کے ساتھ داخل ہو۔

8- ضرورت کی مقدار پانی انڈیلے۔

9- اگر وہ تنہا حمام میں داخل ہونے پر قادر نہ ہو تو اس قوم کے ساتھ اتفاق کرے جو اپنے ادیان کی حفاظت کرتے ہیں اپنے کپڑے پر۔

10- جہنم کو یاد کرے اگر یہ سب کچھ ممکن نہ تو اسے پردہ کرنا چاہیے اور آنکھوں کو نیچا رکھنے میں کوشش کرے۔

امام ترمذی ابو عبد اللہ نے نوادر الاصول میں طاؤس عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس مکان سے بچو جس کو حمام کہا جاتا ہے" عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ میل کو دور کرتا ہے اور آگ یاد دلاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم ضرور ایسا کرنے والے ہو تو ستر ڈھانپ کر داخل ہو"(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بہتر گھر جس میں مسلمان مرد داخل ہوتا ہے وہ حمام ہے۔ یہ اس لیے کیونکہ وہ جب اس میں داخل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہے اور آگ سے پناہ مانگتا ہے اور برا گھر وہ ہے جس میں مرد داخل ہوتا ہے وہ بیت العروس ہے کیونکہ وہ اسے دنیا کی رغبت دیتا ہے اور اسے آخرت بھلا دیتا ہے"۔ ابو عبد اللہ نے کہا: یہ اہل غفلت کے لیے ہے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس کے ساتھ جو اس میں ہے اہل غفلت کی تذکیر کا سبب بنایا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے اپنی آخرت کو یاد کریں۔ رہے اہل یقین تو آخرت ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے، نہ انہیں حمام اچھا لگتا ہے اور نہ بیت عروس انہیں اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا و مافیہا بہت حقیر ہے حتی کہ دنیا کی تمام نعمتیں ان کی آنکھوں میں ایک بڑے دستر خوان بکھرے ہوئے کھانے کی طرح ہیں اور دنیا کی تمام تکالیف ان کی آنکھوں میں اس قتل کی مانند ہیں جس کے ساتھ اس مجرم یا گنہگار کو سزا دی جاتی ہے جو اہل دنیا کی تمام عقوبات میں سے قتل یا سولی چڑھانے کا مستحق ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ یعنی نظروں کو نیچا کرنا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنا دین میں پاکیزہ ہے اور انسانوں کی میل کچیل سے بہت دور ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ اللہ تعالیٰ جاننے والا بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۞ یہ دھمکی اور وعید ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، ماجاء علی المجالس فی الطریق، جلد 2، صفحہ 97

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۱

''اور آپ حکم دیجیے ایماندار عورتوں کو کہ وہ نیچی رکھا کریں اپنی نگاہیں اور حفاظت کیا کریں اپنی عصمتوں کی اور نہ ظاہر کیا کریں اپنی آرائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے اور ڈالے رہیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں میں اور نہ ظاہر ہونے دیں اپنی آرائشوں کو مگر اپنے شوہروں کے لیے یا اپنے باپوں کے لیے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لیے یا اپنے بیٹوں کے لیے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے لیے یا اپنے بھائیوں کے لیے یا اپنے بھتیجوں کے لیے اور اپنے بھانجوں کے لیے یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر یا اپنی باندیوں پر یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہش مند نہ ہوں یا ان بچوں پر جو (ابھی تک) آگاہ نہیں عورتوں کی شرم والی چیزوں پر اور نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) تا کہ معلوم ہو جائے وہ بناؤ سنگار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو! تا کہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ''۔

اس میں تئیس (23) مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یہاں اللہ تعالیٰ نے تاکید کے طریق پر عورتوں کو خطاب کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ کا قول کافی تھا کیونکہ وہ عام ہے مومنین میں سے مذکر و مونث سب کو شامل ہے جیسا کہ ہر خطاب جو قرآن میں عام ہے۔ یَغْضُضْنَ میں تضعیف ظاہر ہے جبکہ یَغُضُّوْا میں ظاہر نہیں ہے کیونکہ فعل کا لام کلمہ دوسرے میں ساکن ہے اور پہلے میں متحرک ہے یہ دونوں فعل امر کے جواب کی وجہ سے محل جزم میں ہیں۔ فرج کے ذکر سے پہلے غض بصر کا ذکر فرمایا کیونکہ نظر دل کے لیے جاسوس ہے جیسا کہ بخار موت کے لیے جاسوس ہے یہ مفہوم ایک شاعر نے بیان کیا ہے:

ألم تر أنّ العين للقلب رائد فما تألف العينان فالقلب آلف

آنکھ دل کی جاسوس ہے آنکھیں جس کو پسند کرتی ہے دل بھی اس سے الفت کرتا ہے۔ حدیث میں ہے: ''نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے جس نے اپنی نظر کو نیچا کیا اللہ تعالیٰ دل میں اسے مٹھاس عطا فرماتا ہے''(1)۔

1۔ المعجم الکبیر، جلد 10، صفحہ 173، حدیث 10362

مجاہد نے کہا: جب عورت آتی ہے تو شیطان اس کے سر پر ہوتا ہے وہ اسے خوبصورت بناتا ہے اس کے لیے جو اسے دیکھتا ہے جب وہ واپس جاتی ہے تو وہ اس کے پچھلے حصہ پر بیٹھا ہوتا ہے وہ اسے مزین کرتا ہے اس کے لیے جو اسے دیکھتا ہے۔ خالد بن ابی عمران سے مروی ہے: متواتر نظر سے نہ دیکھو بعض اوقات بندہ دیکھتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کا دل فاسد ہوتا ہے جس طرح چمڑا خراب ہوتا ہے تو اس سے نفع نہیں اٹھایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو غیر حلال چیزوں سے نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے پس مرد کے لیے اجنبی عورت کی طرف دیکھنا جائز نہیں اور عورت کے لیے مرد کو دیکھنا جائز نہیں کیونکہ عورت کا مرد سے وہ تعلق ہے جو مرد کا عورت سے تعلق ہے۔ عورت کا مرد سے وہی قصد ہے جو مرد کا عورت سے قصد ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا کا حصہ لکھا ہے تو وہ ضرور اسے پائے گا آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے'' (الحدیث) (1)۔

زہری نے ان عورتوں کو دیکھنے کے بارے فرمایا جن کو حیض نہیں آتا: ایسی عورتوں کو دیکھنا جائز نہیں جن کو دیکھنے کی طرف نظر شوق کرتی ہو اگرچہ وہ چھوٹی بھی ہوں۔ عطا نے ان لونڈیوں کی طرف دیکھنا بھی مکروہ قرار دیا ہے جو مکہ میں بیچی جاتی ہیں مگر وہ خریدنے کا ارادہ کرتا ہے تو دیکھ سکتا ہے۔ صحیحین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فضل کا چہرہ خثعمیہ عورت سے پھیر دیا تھا جب وہ سوال کر رہی تھی۔ حضرت فضل اس کو دیکھ رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غیرت ایمان سے ہے اور مذاء نفاق سے ہے'' (2)۔ مذاء یہ ہے کہ کوئی مردوں اور عورتوں کو جمع کرے پھر انہیں چھوڑے وہ ایک دوسرے سے دل لگی کرتے رہیں۔ یہ المذی سے مشتق ہے۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب مردوں کو عورتوں کی طرف بھیج دینا۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے: مذیت الفرس گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دینا۔ ہر نر کو مذی آتی ہے اور ہر عورت کو قذی آتی ہے۔ جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے اپنی زینت کو ظاہر کرنا حلال نہیں مگر جس کے لیے وہ حلال ہے یا جس پر وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے وہ امن میں ہوتا ہے کہ اس کی طبع ان کی طرف متحرک ہو کیونکہ اسے ان سے مایوسی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ترمذی نے نبہان مولی ام سلمہ سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اور حضرت میمونہ کو فرمایا جب ان کے پاس حضرت ابن ام مکتوم تھا ''اس سے پردہ کرو'' انہوں نے عرض کی: حضور! یہ تو نابینا ہے۔ فرمایا: ''کیا تم بھی نابینا ہو کیا تم اسے نہیں دیکھتی ہو'' (3)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اہل نقل کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت ام سلمہ سے روایت کرنے والا راوی آپ کا غلام نبہان ہے اور اس کی حدیث سے حجت نہیں پکڑی جاتی اور اس کی صحت کی تقدیر پر یہ ازواج مطہرات پر ان کی حرمت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سختی اور تغلیظ ہو گی جس طرح حجاب کے مسئلہ میں

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، قدر علی بنی آدم حظہ من الزنا وغیرہ، جلد 2، صفحہ 336

2۔ مجمع الزوائد، کتاب النکاح، باب الغیرۃ، جلد 4، صفحہ 600، حدیث 7725

3۔ جامع ترمذی، کتاب الادب، ماجاء فی احتجاب النساء من الرجال، جلد 2، صفحہ 102۔

ایضاً سنن ابی داؤد، باب فی قولہ عزوجل وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن، حدیث 3085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان پر سختی فرمائی تھی جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ ائمہ نے اشارہ کیا ہے اور صحیح ثابت حدیث کا معنی باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فاطمہ بنت قیس کو ام شریک کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا پھر فرمایا: ''وہ ایسی عورت ہے جس کے پاس میرے صحابہ آتے ہیں تو ابن ام مکتوم کے گھر عدت گزار کیونکہ وہ نابینا شخص ہے تو اپنے کپڑے اتارے گی تو وہ تجھے نہیں دیکھے گا'' (1)۔ ہم کہیں گے: بعض علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ مرد کا وہ حصہ دیکھ سکتی ہے جو مرد کے لیے عورت کا دیکھنا جائز نہیں ہے جیسے سر اور کان، لیکن شرمگاہ دیکھنی جائز نہیں اس بنا پر یہ الله تعالیٰ کے ارشاد: وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ کے عموم کے لیے مخصص ہوگی اور من تبعیض کے لیے ہوگا جیسے اس سے پہلی آیت میں تھا۔ ابن عربی نے کہا: نبی پاک ﷺ نے ام شریک کے گھر سے حضرت ابن ام مکتوم کے گھر کی طرف منتقل ہونے کو کہا کیونکہ ام شریک کے گھر کی نسبت اس میں اس کی بقا کے لیے بہتر تھا، کیونکہ ام شریک کے پاس کثرت سے لوگ آتے جاتے تھے تو اسے بھی دیکھنے والے زیادہ ہوتے اور حضرت ابن ام مکتوم کے گھر میں اسے کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ حضرت ابن مکتوم سے اپنی آنکھ کو روکنا اس کے لیے زیادہ بہتر تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الله تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں مگر دیکھنے والوں سے جن کی آیت میں استثناء فرمائی۔ علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ظاہر زینت سے مراد کپڑے ہیں (2)۔ ابن جبیر نے چہرے کا بھی اضافہ کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے بھی اور عطا اور اوزاعی نے چہرہ، ہتھیلیاں اور لباس فرمایا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور حضرت مسور بن مخرمۃ نے کہا: ظاہر زینت سے مراد سرمہ، کنگن اور نصف ذراع تک خضاب (مہندی) بالیاں اور انگوٹھی ہے (4)۔ یہ چیزیں ظاہر کرنا مباح ہے ہر اس شخص کے سامنے جو اس کے پاس آئے۔ طبری نے قتادہ سے نصف ذراع کے معنی میں نبی کریم ﷺ سے حدیث روایت کی ہے (5) اور دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے فرمایا: ''جو عورت الله تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کے لیے ظاہر کرنا حلال نہیں مگر اپنا چہرہ اور یہاں تک اپنے ہاتھ (نصف ذراع سے پکڑ کر اشارہ کیا)'' ابن عطیہ نے کہا: میرے لیے آیت کے الفاظ کا حکم ظاہر ہوا ہے کہ عورت کو زینت ظاہر نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اپنے آپ سے ہر زینت چھپانے کی کوشش کرنے کا حکم دیا گیا ہے (6) جس کو ظاہر کرنے کی استثناء واقع ہوئی ہے وہ ضرورت کے حکم کے ساتھ ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے یا اصلاح شان وغیرہ کے لیے ظاہر کرنا ہوتا ہے پس ماظھر اس بنا پر وہ ہوگا جس کی عورتوں میں ضرورت ہے اور وہ معاف ہے۔

میں نے کہا: یہ عمدہ قول ہے مگر عادۃً اور عبادۃً جب چہرہ اور ہاتھ ظاہر کیے جاتے ہیں اور یہ نماز اور حج میں ظاہر ہوتے ہیں تو بہتر ہے کہ استثناء ان دونوں کی طرف راجع ہو اس پر دلیل ابوداؤد کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، المطلقة البائن لا نفقة لها، جلد 1، صفحہ 483
2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 377
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 178
6۔ ایضاً

ابی بکر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جبکہ اس پر باریک کپڑے تھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے چہرہ مبارک پھیر لیا اور اسے فرمایا: ''اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کا دیکھا جانا درست نہیں مگر یہ حصہ'' (1) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے اور اپنی ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا(2)۔ یہ احتیاط کی جانب سے اقویٰ ہے اور اس میں لوگوں کے فساد کی بھی رعایت ہے پس عورت اپنی زینت ظاہر نہ کرے مگر چہرے اور ہاتھوں میں سے جو ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشنے والا ہے اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ ابن خویز منداد جو ہمارے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: جب عورت خوبصورت ہو اور اس کے چہرے اور ہتھیلیوں سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو وہ ان اعضاء کو بھی ڈھانپ لے۔ اگر وہ بوڑھی ہو یا بدصورت ہو تو اس کے لیے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ زینت کی دو قسمیں ہیں: ایک خلقی ہے اور دوسری کسبی ہے۔ خلقی زینت اس کا خوبصورت چہرہ ہے وہ زینت کی اصل ہے، خلقت کا جمال ہے اور حیوانیت کا معنی ہے کیونکہ اس میں منافع اور علوم کے راستے ہیں اور کسبی زینت سے مراد بناؤ سنگھار ہے جو عورت اپنی تخلیق کو خوبصورت بنانے کے لیے کرتی ہے جیسے لباس، زیورات، سرمہ اور خضاب اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ (الاعراف: 31) شاعر نے کہا:

يأخُذْن زينتهنّ أحسنَ ماترَىٰ        وإذا عَطِلن فهنّ خير عواطل

**مسئلہ نمبر 5**۔ زینت کا ظاہر اور باطن ہے؛ جو ظاہر ہے وہ محارم اور اجانب ہر ایک کے لیے ظاہر کرنا مباح ہے۔ ہم نے علماء کے اقوال اس پر ذکر کر دیے ہیں اور جو باطنی زینت ہے اس کا ظاہر کرنا حلال نہیں مگر ان کے لیے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نام لیا ہے یا جو ان کے قائم مقام ہیں۔ کنگن کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ زینت ظاہرہ سے ہے کیونکہ یہ ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: یہ باطنی زینت سے ہے کیونکہ یہ ہتھیلیوں سے خارج ہے یہ بازوؤں پر ہوتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: خضاب زینت باطنی سے ہے جب یہ قدموں میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ جمہور نے لام کے سکون کے ساتھ پڑھا(3) ہے جو لام امر کے لیے ہے۔ ابو عمرو نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اصل پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لام امر کی اصل کسرہ ہے اور اس کے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کا سکون عضد اور فخذْ کے سکون کی طرح ہے۔ اور یضربن امر کی وجہ سے محل جزم میں ہے مگر یہ سیبویہ کے نزدیک ماضی کی اتباع کی وجہ سے ایک حالت پر مبنی کیا گیا ہے۔ اس آیت کا سبب یہ ہے کہ عورتیں اس زمانہ میں جب اپنے سر چادروں کے ساتھ ڈھانپتی تھی تو ان کے پلو پیٹھ پر لٹکا دیتی تھیں۔ نقاش نے کہا: جیسے نبطی لوگ کرتے ہیں پس سینہ، گردن اور کان ڈھانپے ہوئے نہیں ہوتے تھے(4) تو اللہ

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، فیما تبدی المرأۃ من زینتھا، جلد 2، صفحہ 211

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحمام باب فیما تبدی المرأۃ من زینتھا، حدیث 3580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 178        4۔ ایضاً

تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اپنی چادریں اپنے سینوں پر ڈالیں۔ اس کی ہیئت یہ ہے کہ عورت اپنی چادر اپنے گریبان پر ڈالے تا کہ اس کا سینہ ڈھک جائے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے جب وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑ دیں اور ان کے ساتھ اپنے سینوں کو ڈھانپا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا آئی جوان کی بھتیجی تھی اور ان کے بھائی عبد الرحمٰن کی بیٹی تھی اس نے ایسا باریک دوپٹہ کیا ہوا تھا کہ اس سے اس کی گردن وغیرہ نظر آ رہی تھی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس دوپٹہ کو پھاڑ دیا اور فرمایا: ایسا موٹا کپڑا ہونا چاہیے جو چھپا دے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ الخمر، خمار کی جمع ہے وہ چادر جس کے ساتھ عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے اسی سے ہے: أخمرت المرأة وتخمرت وهي حسنة الخمرة (عورت نے دوپٹہ اوڑھا) الجیوب جیب کی جمع ہے اس سے مراد قمیص کا گلہ ہے یہ جوب سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ مشہور قراءت جیوبھن جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ بعض کوفیوں نے یاء کی وجہ سے جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) جیسا کہ ان کی قراءت بیوت اور شیوخ میں ہے۔ قدیم نحوی اس قراءت کو جائز قرار نہیں دیتے وہ کہتے ہیں: بیت اور بیوت جیسے فلس اور فلوس ہے۔ زجاج نے کہا: ضمہ کو کسرہ سے بدلنا جائز ہے اور جو حمزہ سے ضمہ اور کسرہ کو جمع کرنا مروی ہے وہ محال ہے کیونکہ اس کا تلفظ نہیں کر سکتا مگر نا جائز کی طرف اشارہ کرنے پر۔ مقاتل نے کہا: عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ سے مراد علی صدورھن اپنے سینوں پر یعنی اپنے گلوں کے اوپر۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ گریبان کپڑے میں سینے کی جگہ ہوتا ہے اسی طرح سلف صالحین کے کپڑوں میں گریبان سینوں پر ہوتے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں اندلس اور مصری دیار میں عورتوں، مردوں اور بچوں وغیرہ کے لیے عورتیں گریبان بناتی ہیں۔ امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے (باب جیب القمیص عند الصدر وغیرہ) قمیص کا گریبان سینے کے پاس ہونا اور امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال ان دو شخصوں کی ہے جن کے اوپر لوہے کے دو جبے ہیں وہ اپنا ہاتھ اپنے سینوں کی طرف بڑھاتے ہیں'' (2)۔ یہ حدیث مکمل پہلے گزر چکی ہے اس میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گریبان کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اگر تو (بخیل) کو دیکھے کہ وہ اس جبے کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ نہیں کھلتا۔ یہ بیان کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جیب (گریبان) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ پر تھی اگر وہ گریبان آپ کے کندھے پر ہوتا تو آپ کے ہاتھ سینے کی طرف نہ بڑھتے یہ عمدہ استدلال ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ۔ بعل سے مراد کلام عرب میں شوہر اور آقا ہے اور اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حدیث جبریل میں ارشاد ہے: إذا ولدت الأمة بعلها (3) یعنی جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ کثرت

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 178

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، جلد 2، صفحہ 862

3۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 9501

فتوحات کی وجہ سے یہ کثرت غلامی کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا لونڈیوں کی طرف سے اولاد آئے گی اور ہر ام ولد اپنے بیٹے کی وجہ سے آزاد ہو جائے گی۔ تو گویا وہ اس کا وہ آقا ہوگا جس نے آزادی کے ذریعے اس پر احسان کیا ہے کیونکہ لونڈی کو اس کے سبب آزادی حاصل ہوگی؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ارشاد ہے: أعتقها ولدها (1) یعنی اس کے بیٹے نے اس کو آزاد کیا ہے۔ نیز آپ نے آزادی کو اس بچے کی طرف منسوب کیا۔ اور یہ اس حدیث کی عمدہ ترین تاویلات ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

خاوند اور آقا بیوی اور لونڈی کی زینت دیکھ سکتا ہے اور اکثر زینت کو دیکھ سکتا ہے کیونکہ اس کا پورا بدن اس کے لیے لذت حاصل کرنے اور دیکھنے کے لیے حلال ہے اسی معنی کی بنا پر بعولة کا پہلے ذکر فرمایا کیونکہ ان کی ان کے اکثر حصہ پر اطلاع واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ (المومنون)

**مسئلہ نمبر 10**۔ مرد کا عورت کی فرج کی طرف دیکھنے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے اس میں دو قول ہیں۔ جائز ہے کیونکہ جب اس کے لیے اس سے تلذذ جائز ہے تو دیکھنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔ بعض علماء نے کہا: جائز نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جب انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی حالت کا ذکر کیا: میں نے آپ کی شرمگاہ نہیں دیکھی اور آپ نے میری شرمگاہ نہیں دیکھی۔ پہلا قول اصح ہے اور یہ حدیث ادب پر محمول ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے اصبغ جو ہمارے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: مرد کے لیے اپنی زبان سے اسے چاٹنا بھی جائز ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: خاوند اور آقا کے لیے عورت کے تمام بدن اور فرج خارج کو دیکھنا جائز ہے۔ فرج کے باطن کو دیکھنا جائز نہیں اسی طرح عورت کے لیے اپنے خاوند کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز ہے اور لونڈی کے لیے اپنے آقا کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فرج کی طرف دیکھنا اندھے پن کو پیدا کرتا ہے''۔ بعض علماء نے کہا: جو شرمگاہ کو دیکھتا ہے ان کے درمیان اندھا بچہ پیدا ہوتا ہے؛ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جب اللہ تعالیٰ نے ازواج کا ذکر کیا تو پھر ان کا ذکر کیا پھر محارم کا ذکر کیا اور زینت کے ظاہر کرنے میں ان کے درمیان برابری رکھی لیکن ان کے مراتب بشر کے نفوس کے مطابق مختلف ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ باپ اور بھائی کا عورت پر کشف، اس کے خاوند کے بیٹے کے کشف سے زیادہ احتیاط کا متقاضی ہے اور جو ان کے لیے ظاہر ہونا ہے اس کے مراتب بھی مختلف ہیں باپ کے لیے جو حصہ ظاہر کرنا جائز ہوتا ہے وہ خاوند کے بیٹے کے لیے ظاہر کرنا جائز نہیں ہوتا، قاضی اسماعیل نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ امہات المومنین کو نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا انہیں دیکھنا حلال تھا۔ اسماعیل نے کہا: میرا خیال ہے کہ حضرت حسن و حسین کا نظریہ یہ تھا (2) کہ خاوندوں نے بیٹوں کا

1۔ ابن ماجہ، باب امہات الاولاد، 2506، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 179

ذکر اس آیت میں نہیں جو نبی کریم ﷺ کی ازواج کے بارے میں ہے وہ یہ آیت ہے، لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيٓ اٰبَآىِٕهِنَّ (الاحزاب: 55) اور سورۃ النور میں فرمایا: وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت مراد لی ہے اور حسن وحسین نے دوسری آیت مراد لی ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اس سے مراد خاوندوں کی مذکر اولاد ہے اور اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے اگرچہ بچے بھی ہوں خواہ وہ مذکر ہوں یا مؤنث ہوں جیسے بیٹوں کے بیٹے اور بیٹیوں کے بیٹے، اسی طرح خاوندوں اور دادوں کے آباء اگرچہ بہت اوپر کے ہوں مذکر کی جہت سے آباء کے آباء اور ماؤں کے آباء۔ اسی طرح ان کے بیٹے اگرچہ بہت نیچے کے ہوں اسی طرح بیٹیوں کے بیٹے اگرچہ وہ بہت نیچے کی ہوں اس میں بیٹوں کی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد برابر ہیں۔ اسی طرح ان کی بہنیں خواہ آباء اور امہات کی طرف سے ہوں یا ایک صنف کی طرف سے ہوں، اسی طرح بھائیوں کے بیٹے اور بہنوں کے بیٹے اگرچہ بہت نیچے کے ہوں خواہ مذکر سے ہوں یا مونث سے ہوں جیسے بہنوں کے بیٹوں کے بیٹے اور بہنوں کی بیٹیوں کے بیٹے یہ وہ تمام رشتے ہیں جن سے نکاح حرام ہے کیونکہ یہ ولادت میں سے ہیں اور یہ محارم ہیں۔ یہ مسئلہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور جمہور کا خیال ہے کہ چچا، ماموں دیکھنے کے جواز میں دوسرے محارم کی طرح ہیں ان کے لیے وہ حصہ دیکھنا جائز ہے جو دوسرے محارم کے لیے دیکھنا جائز ہے۔ آیت میں رضاع (دودھ والے رشتوں کا) ذکر نہیں یہ بھی نسب کی طرح ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ثعلبی اور عکرمہ کے نزدیک چچا اور ماموں محارم میں سے نہیں ہیں۔ عکرمہ نے کہا: ان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ اپنے بیٹوں کے تابع ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ یعنی مسلمان عورتیں اس میں مومن لونڈیاں بھی داخل ہیں اور اس سے ذمیوں وغیرہ میں سے مشرکوں کی عورتیں خارج ہو جاتی ہیں۔ کسی مومنہ عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ مشرکہ عورت کے سامنے کھولے مگر یہ کہ وہ اس کی کنیز (لونڈی) ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ابن جریج، عبادہ بن نسی اور ہشام القاری ناپسند کرتے تھے کہ نصرانی عورت، مسلمان عورت کو بوسہ دے یا اس کی شرمگاہ کو دیکھے وہ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ سے یہ نکالتے تھے۔ عبادہ بن نسی نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو عبیدہ بن جراح کو لکھا کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ ذمیوں کی عورتیں حمامات میں مسلمان عورتوں کے ساتھ داخل ہوتی ہیں انہیں اس سے منع کرو اور ان کے درمیان پردہ کرو(1)، کیونکہ ذمیہ عورت مسلمہ عورت کا ظاہر ہونے والا حصہ نہیں دیکھ سکتی۔ فرمایا: اس وقت حضرت ابو عبیدہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: عورت بغیر عذر کے حمام میں داخل ہوتی ہے وہ صرف اپنا چہرہ سفید کرنا چاہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس دن اس کا چہرہ سیاہ کر دے گا جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں کہ اسے یہودیہ یا نصرانیہ دیکھے تا کہ وہ اس کا وصف اپنے خاوند سے بیان نہ کرے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے اگر کافرہ مسلمان کی لونڈی ہو تو اس کا اپنی مالکن کو دیکھنا جائز ہے اور اس کے علاوہ نہیں کیونکہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ولایت ختم ہو چکی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 179

ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 14۔** اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ آیت کا ظاہر غلاموں اور مسلمانوں اور کتابیہ لونڈیوں کو شامل ہے یہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے؛ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مذہب کا ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: غلاموں کا اپنی مالکن کے بالوں کو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں (1)۔ اشہب نے کہا: امام مالک سے پوچھا گیا: کیا عورت اپنا دوپٹہ خصی آدمی کے سامنے اتار دے؟ انہوں نے کہا: ہاں خواہ وہ اس کا غلام ہو یا غیر کا غلام ہو۔ رہا آزاد خصی تو اس کے سامنے نہ اتارے اگر وہ بڑا آدمی ہو اور کم عقل ہو نہ اس کی کوئی ہیئت ہو نہ منظر تو وہ اس عورت کے بال دیکھ سکتا ہے۔ اشہب نے کہا: امام مالک نے فرمایا اس میں گنجائش نہیں کہ بیٹے یا بیوی کی لونڈی، باپ یا خاوند کے پاس ہاتھ میں داخل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ کم عقل گھٹیا غلام اپنی مالکن کے بالوں کو دیکھ سکتا ہے اور اس میں خاوند کے غلام کے لیے یہ پسند نہیں کرتا۔ سعید بن مسیب نے فرمایا: یہ آیت، اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اس سے مراد لونڈیاں ہیں (2) اس سے مراد غلام نہیں ہیں اور شعبی ناپسند کرتے تھے کہ مملوک اپنی مالکن کے بالوں کو دیکھے؛ یہ مجاہد اور عطا کا قول ہے۔ ابوداؤد نے اس سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے پاس ایک غلام لے آئے اور انہیں وہ ہبہ کر دیا (3) اور فرمایا: فاطمہ پر ایک کپڑا تھا جب اس کے ساتھ اپنے سر کو ڈھانپتی تھی تو پاؤں تک نہیں پہنچتا تھا اور جب پاؤں ڈھانپتی تھیں تو سر تک نہیں پہنچتا تھا جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ پریشانی دیکھی تو فرمایا: ''تجھ پر کوئی حرج نہیں ہے یہ تیرا باپ اور تیرا غلام ہے''۔

**مسئلہ نمبر 15۔** اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ یعنی جن کو حاجت نہیں۔ الاربة کا معنی ہے حاجت۔ کہا جاتا ہے: أربت كذا ارب أرباء والارب ولاِرْبَة والمارب اس کا معنیٰ حاجت ہے جمع مآرب ہے یعنی حوائج اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ (طٰہٰ) میرے لیے اس میں دوسری بھی حاجتیں ہیں یہ پہلے گزر چکا ہے۔ طرفہ نے کہا:

إذا المرء قال الجهل والحوب والخنا تقدّم يوماثم ضاعت مآربه

لوگوں کا اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے قول میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد احمق ہیں جن کو عورتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض نے کہا: اس سے مراد ابلہ ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جو قوم کے پیچھے جاتا ہے اور اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے، ان کے ساتھ نرمی کرتا ہے وہ ایسا کمزور ہوتا ہے جو عورتوں کی پروا نہیں کرتا اور ان کا شوق نہیں رکھتا۔ بعض نے کہا: اس سے مراد نامرد ہے۔ بعض نے کہا: خصی ہے۔ بعض نے کہا: مخنث ہے۔ بعض نے کہا: انتہائی بوڑھا شخص ہے۔ بعض نے کہا: وہ بچہ ہے جو بالغ نہیں ہوتا۔ یہ اختلاف ایسا ہے کہ تمام معانی قریب ہیں اور جو نہ سمجھ رکھتا ہو اور ایسی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 179 2۔ تفسیر کشاف، جلد 3، صفحہ 232

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، فی العبد ینتظر الی شعر مولاته، جلد 2، صفحہ 211

ہمت نہ رکھتا ہو جس کے ساتھ وہ عورتوں کے معاملات کی طرف متوجہ ہو یہ سب کو جامع ہے اس صف پر ہیت خنثہ تھا جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا جب اس کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے محاسن بیان کرتے ہوئے سنا وہ عورت غیلان کی بیٹی بادیہ تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا(1)۔ امام مسلم، ابوداؤد، امام مالک وغیرہم نے اس کی حدیث نقل کی ہے۔ ہشام بن عروہ نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے ابو عمر نے کہا: عبد الملک بن حبیب نے حبیب کاتب امام مالک نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے امام مالک سے پوچھا: سفیان نے ابنۃ غیلان کی حدیث میں زیادتی کی ہے کہ وہ مخنث جس کو ہیت کہا جاتا ہے اور آپ کی کتاب میں ہیت نہیں ہے؟ امام مالک نے کہا: سچ کہا انہوں نے اسی طرح کہا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے الحمی کی جگہ جلا وطن کر دیا یہ مسجد سے بائیں جانب ذی الحلیفہ کی جگہ ہے۔ حبیب نے کہا میں نے امام مالک سے کہا سفیان نے اپنی حدیث میں کہا ہے: جب وہ بیٹھتی ہے تو ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتی ہے جب بولتی ہے تو گاتی ہے۔ امام مالک نے کہا: صحیح کہا وہ اسی طرح تھی۔ ابو عمر نے کہا: حبیب کاتب امام مالک نے کہا جو کچھ سفیان سے ذکر کیا ہے انہوں نے حدیث میں فرمایا یعنی ہشام بن عروہ کی حدیث میں فرمایا: اس خنثیٰ کو ہیت کہا جاتا ہے پس غیر معروف ہے کسی ایک راوی کے ہاں جو ہشام سے روایت کرتے ہیں نہ کہ ابن عیینہ اور نہ کسی اور سے نسق حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ مخنث کو ہیت کہا جاتا ہے یہ انہوں نے حدیث کو مکمل کرنے کے بعد ابن جریج سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ان کا قول سفیان سے مروی ہے کہ وہ حدیث میں کہتے تھے جب وہ بیٹھتی تھی تو ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتی تھی اور جب بولتی تھی تو گاتی تھی۔ یہ وہ ہے جو نہ سفیان نے کہا ہے اور نہ کسی اور نے ہشام بن عروہ کی حدیث میں یہ لفظ نہیں پایا جاتا مگر واقدی کی روایت سے۔ تعجب ہے کہ وہ سفیان سے حکایت کرتا ہے اور وہ امام مالک سے حکایت کرتا ہے کہ وہ اسی طرح ہے تو یہ روایت امام مالک سے ہو گئی۔ اور امام مالک سے حبیب کے علاوہ کسی نے اس کو روایت نہیں کیا اور نہ سفیان سے اس کے علاوہ کسی نے روایت کیا ہے؛ واللہ اعلم۔ حبیب امام مالک کا کاتب ہے متروک الحدیث ہے اور تمام کے نزدیک ضعیف ہے اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی اور جو وہ بیان کرے اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا۔ واقدی اور کلبی نے ذکر کیا ہے کہ ہیت المخنث نے عبد اللہ بن امیہ مخزومی کو کہا وہ حضرت ام سلمہ کے باپ کی طرف سے بھائی تھا اور اس کی والدہ عاتکہ تھی جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھی اس مخنث نے حضرت عبد اللہ کو کہا جبکہ وہ اپنی بہن ام سلمہ کے گھر میں تھے جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات سن رہے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں طائف کی فتح دے بادیہ بنت غیلان بن سلمۃ ثقفی کو لازم پکڑ وہ اتنی موٹی ہے کہ چار سلوٹوں کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ سلوٹوں کے ساتھ واپس جاتی ہے نیز اس کے ہونٹ گلابی ہیں اگر وہ بیٹھتی ہے تو ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتی ہے اگر وہ بات کرتی ہے تو گانا گاتی ہے اس کی ٹانگوں کے درمیان الٹے برتن کی طرح ہے یہ ایسے ہے جیسے قیس بن خطیم نے کہا:

تَغْتَرِقُ الطَّرْفَ وهى لاهِيَةٌ　　كانما شَفَّ وَجْهَها نُزُفُ

بين شُكُول النساء خِلْقَتُها　　قَصْدٌ فلا جَبْلَةٌ ولا قَضَفُ

---

1۔ ابوداؤد، کتاب الحمام، باب فی العبد ینظر الی شعر مولاتہ، حدیث 3583

تنام عن كُبْرِشأنها فإذا قامَتْ رُوَيْدًا تكاد تَنْقَصِفُ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مخنث کو فرمایا: ''اے اللہ کے دشمن! تو نے اس کو گہری نظر سے دیکھا'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حمی کی طرف منتقل کر دیا فرمایا جب طائف فتح ہوا تو عبد الرحمٰن بن عوف نے بادیۃ بنت غیلان سے نکاح کیا تھا اس سے بریہہ پیدا ہوئی تھی۔ کلبی کے قول میں ہیت ہمیشہ وہاں ہی رہا حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اس کی واپسی کی ان سے بات کی گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے واپس کرنے سے انکار کیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ان کے پاس اس کے متعلق بات کی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انکار کر دیا پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں بات کی گئی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ بوڑھا اور کمزور اور محتاج ہو گیا تو حضرت عثمان نے اسے ہر جمعہ آنے کی اور سوال کرنے کی اجازت دی۔ وہ ایسا کرتا تھا پھر واپس اپنی جگہ لوٹ جاتا تھا فرمایا ہیت، عبد اللہ بن ابی امیہ مخزومی کا غلام تھا وہ خوبصورت تھا اسی وجہ سے اس نے خنثیٰ بننا قبول کیا۔ ابو عمر نے کہا: کہا جاتا ہے بادیۃ یاء کے ساتھ اور بادنقطون کے ساتھ۔ درست یاء کے ساتھ ہے؛ یہ اکثر کا قول ہے۔ اسی طرح زہری نے یاء کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ تابعین کی صفت غیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے کیونکہ تابعین کی ذوات مقصود نہیں ہیں پس یہ لفظ نکرہ کی طرح ہو گیا۔ اور غیر کا لفظ نکرہ محضہ نہیں ہے پس اس کا معرفہ کی صفت بننا جائز ہے اگر تو چاہے تو کہہ سکتا ہے یہ بدل ہے اس میں اسی طرح کا قول ہے جیسا کہ: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ:6) میں ہے۔ عاصم، ابن عامر نے غیر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے پس یہ استثناء ہوگا؛ یعنی وہ اپنی زینت ظاہر کریں تابعین کے لیے مگر جو شہوت والے ہیں ان کے سامنے نہیں، یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو یعنی جو ان کے پیچھے آتے ہیں جبکہ وہ ان سے عاجز ہیں؛ یہ ابو حاتم کا قول ہے اور ذوالحال التابعین میں جو ذکر میں سے ہے وہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوِ الطِّفْلِ اسم جنس بمعنی جمع ہے اس پر دلیل اس کی نعت الذین ہے حضرت حفصہ کے مصحف میں اوالاطفال جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: طفل وہ ہوتا ہے جو قریب البلوغ نہ ہو۔

يَظْهَرُوْا اس کا معنی ہے وہ وطی پر مطلع نہ ہوں یعنی اپنے چھوٹا ہونے کی وجہ سے جماع کے لیے ان کی شرمگاہوں سے آگاہ نہ ہوں۔ بعض نے کہا: وہ عورتوں تک پہنچنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ کہا جاتا ہے: ظهرت على كذا یعنی میں نے اس کو جان لیا۔ و ظهرت على كذا میں اس پر غالب آ گیا۔ جمہور نے عورات کو واو کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ واو پر حرکت ثقیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے واؤ کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے جیسے جفنة و جفنات۔ فراء نے حکایت کیا ہے کہ یہ واؤ کے فتحہ کے ساتھ قیس کی لغت ہے۔ نحاس نے کہا: یہی قیاس ہے کیونکہ یہ نعت نہیں ہے جیسے تو کہتا ہے: جفنة و جفنات مگر عورات میں اور اس جیسے الفاظ میں سکون بہتر ہے کیونکہ واؤ جب متحرک ہوتی ہے اور اس کا ماقبل متحرک ہوتا ہے تو وہ الف سے بدل جاتی ہے اگر یہ کہا جائے تو معنی ہی ختم ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ علماء کا اختلاف ہے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا جسم کے پردہ کے وجوب کے بارے میں دو قول

ہیں۔(1) لازم نہیں ہے کیونکہ اس کا مکلف نہیں بنایا گیا اور یہی قول صحیح ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لازم ہے کیونکہ کبھی اس پر شہوت آتی ہے اور کبھی اسے شہوت آتی ہے اگر قریب البلوغ ہو تو پردہ کے وجوب میں بالغ کے حکم میں ہے۔ اس کی مثل وہ بوڑھا ہے جس کی شہوت ختم ہو چکی ہو۔ بچے کے بارے میں بھی دو قول ہیں صحیح حرمت کی بقا ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر19**۔ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ شرمگاہ مرد اور عورت کی پردہ کی جگہیں ہیں عورت کا پورا جسم پوشیدہ رکھنا ضروری ہے سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ان کے متعلق بھی اختلاف ہے اکثر علماء کہتے ہیں کہ ناف سے لے کر گھٹنے تک مرد کا ستر ہے اس کا دیکھنا جائز نہیں۔ یہ سورۂ اعراف میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر20**۔ اصحاب الرائے نے کہا: عورت اپنے غلام کے ساتھ ہو تو ناف سے لے کر گھٹنے تک اس کا ستر ہے گویا انہوں نے اسے مرد گمان کیا ہے پھر لذت کی خاوندوں اور غلاموں کے لیے اجازت دی ہے پھر زینت کی بارہ شخصوں سے استثناء فرمائی ہے ان میں سے غلام بھی ہے پس ہمیں اس میں کوئی تبدیلی کی گنجائش نہیں یہ نظر فاسد ہے اور اجتہاد درست نہیں ہے۔ بعض علماء نے اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کی تاویل لونڈیوں سے کی ہے، غلاموں سے نہیں۔ ان میں سعید بن مسیب بھی ہیں وہ اسے پہلے غلاموں پر محمول کرتے ہیں پھر عورتوں سے لاحق کرتے ہیں۔ یہ بہت بعید ہے۔ ابن عربی نے کہا: بعض علماء نے فرمایا اس کی تقدیر اس طرح ہے او ما ملکت ایمانهن من غیر اولی الاربة او التابعین غیر اولی الاربة من الرجال؛ یہ مہدوی نے حکایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر21**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ یعنی جب عورت چلے تو اپنا پاؤں زمین پر نہ مارے تاکہ اپنی پازیب کی آواز سنائے۔ زینت کی آواز سنانا، زینت کے ظاہر کرنے کی طرح ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ مقصود پردہ کرنا ہے۔ طبری نے معتمر سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے(1) فرمایا: حضرمی کا خیال ہے کہ ایک عورت نے چاندی کی دو پازیبیں بنائیں اور موتی خریدے پھر انہیں اپنی پنڈلی پر باندھا وہ لوگوں کے سامنے چلی تو اس نے زمین پر پاؤں مارا پازیب اس موتی پر لگی تو آواز پیدا ہوئی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس زینت کا سننا شہوت کو زینت کے ظاہر کرنے سے زیادہ ابھارتا ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر22**۔ عورتوں میں سے جس نے اپنے زیورات سے خوشی کی وجہ سے ایسا کیا تو وہ مکروہ ہے اور جس نے تبرج اور مردوں کے سامنے آنے کے لیے ایسا کیا تو وہ حرام مذموم ہے۔ اسی طرح مردوں میں سے جس نے اپنے جوتے کو مارا اگر تو اس نے تکبر کی بنا پر ایسا کیا تو وہ حرام ہے کیونکہ تکبر اور عجب گناہ کبیرہ ہے اگر اس نے تبرجاً ایسا کیا تو جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر23**۔ مکی نے کہا: کتاب اللہ میں اس سے زیادہ ضمائر والی اور کوئی آیت نہیں اس میں مومنات کے لیے پچیس ضمائر جمع ہے کچھ مجرور ہیں اور کچھ مرفوع ہیں(3)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ اس میں دو مسئلے ہیں:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 180 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُوْبُوْٓا یہ امر کا صیغہ ہے اس میں امت کا اختلاف نہیں کہ توبہ کرنا واجب ہے اور یہ فرض متعین ہے اس پر کلام سورۃ النساء وغیرہا میں گزر چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں سہو اور کوتاہی ہو ہی جاتی ہے کسی حال میں توبہ کو ترک نہ کرو۔

(۲) جمہور نے ایۃ کو ھاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ھاء نفس کلمہ سے ہے پس اس میں منادیٰ کا اعراب ہوگا۔ ابوعلی نے اس کو انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا: اسم کی دوسری یا یہ ای سے ہے۔ پس مناسب ہے کہ اسم کا آخر مضموم ہو اگر ھاء کا ضمہ یہاں جائز ہو نا کلمہ کے ساتھ اتصال کی وجہ سے ہو تو اللھم میں میم پر ضمہ جائز ہو جاتا کلمہ سے اس کے اتصال کی وجہ سے صحیح یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک قراءت ثابت ہے تو لغت میں صحت کا اعتقاد ہوتا ہے کیونکہ قرآن حجت ہے۔ فراء نے کہا:

یائیه القلبُ اللّجوجُ النفس    أفق عن البيض الحسان اللعس

اللعس ہونٹوں کے رنگ کو کہتے ہیں جب وہ تھوڑے سیاہی مائل ہو جائیں یہ اچھے لگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: شفة لعساء، فتية ونسوة لعس۔ بعض ایۃ وقف کرتے ہیں۔ بعض الف کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔ ایسا کیونکہ وصل میں اس کے حذف کی علت اس کا سکون اور لام کا سکون ہے جب وقف ہوگا تو عظمت ختم ہو جائے گی۔ پس الف لوٹے گا جیسے یاء لوٹتی ہے جب غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ (المائدہ: 1) کے قول سے مُحِلِّي پر وقف کیا گیا۔ یہ وہ اختلاف ہے جو ہم نے یایه الساحر اور ایه الثقلان میں ذکر کیا ہے۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۳۲

"اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے اور جو نیک ہیں تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے اگر وہ تنگ دست ہوں (تو فکر نہ کرو) غنی کر دے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہمہ دان ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ خطاب ستر اور اصلاح میں داخل ہے یعنی جن کا نکاح نہیں ہے ان کا نکاح کرو کیونکہ یہ پاک دامنی کا راستہ ہے یہاں خطاب اولیاء کو ہے۔ بعض نے کہا: خاوندوں کو ہے۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ اگر ازواج مراد ہوں تو وانکحوا بغیر ہمزہ کے ہوتا اور الف وصل کے لیے ہوتا۔ اس میں دلیل ہے کہ عورت کے لیے بغیر ولی کے نکاح کرنا جائز نہیں ہے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب ثیبہ یا باکرہ اپنا نکاح بغیر ولی کے کرے اور وہ اس کا کفو ہو تو جائز ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس پر بحث ہو چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا: مومن کے حالات کے مختلف ہونے کے ساتھ حکم مختلف ہوتا ہے گناہ کا اندیشہ ہو، صبر کرنا ممکن نہ ہو، صبر پر قوت ہو، گناہ کا اندیشہ نہ ہو، سب صورتوں میں حکم مختلف

ہے۔ جب دین یا دنیا یا دونوں میں ہلاکت کا خوف ہو تو نکاح ضروری ہے۔ اگر کسی چیز کا خوف نہ ہو، حالت مطلقہ ہو تو امام شافعی نے فرمایا: نکاح مباح ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: نکاح مستحب ہے(1)۔ امام شافعی نے اس سے تعلق جوڑا ہے کہ یہ لذت کا پورا کرنا ہے اور لذت کا پورا کرنا مباح ہے جیسے کھانا اور پینا ہے۔ ہمارے علماء نے اس کا تعلق حدیث سے جوڑا ہے ''جس نے میری سنت سے انحراف کیا وہ میرے راستہ پر نہیں ہے''(2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْاَیَامٰی مِنْكُمْ وہ مرد اور عورتیں جن کی بیویاں اور خاوند نہ ہوں انہیں ایامیٰ کہتے ہیں۔ اس کا واحد ایم ہے۔ ابو عمر نے کہا: ایامیٰ خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ ہو؛ یہ ابو عمر و اور کسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: تأیمت المرأة جب وہ بغیر شادی کے ٹھہری رہی۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں ہے ''میں اور وہ عورت جس کے رخسار سیاہ ہو گئے وہ اپنے چھوٹے بچوں پر (خاوند کے مرنے کے بعد) بغیر شادی کے ٹھہری رہی حتیٰ کہ وہ بالغ ہو گئے یا اللہ تعالیٰ نے انہیں فضل سے غنی کر دیا تو اس طرح جنت میں ہوں گے جس طرح یہ دو انگلیاں ہیں(3)۔ شاعر نے کہا:

فإن تنكحي أنكح وإن تتأيمي وإن كنتُ أفتى منكم أتأيَّمُ(4)

کہا جاتا ہے: أَيِّم بيّن الأيمة وقد امتُ هي، أمت انا، شاعر نے کہا:

لقد إمْتُ حتى لامَني كلُّ صاحب رجاءَ بسَلْمَى أن تَئِيم كما إمْتُ

ابو عبید نے کہا: رجل ایم و امرأة أيم، اکثر یہ عورتوں میں استعمال ہوتا ہے یہ مردوں میں مستعار کی طرح ہے۔ امیہ بن صلت نے کہا:

لِلّٰه دَرُّ بنِي عَلِ يّ أيِّمٍ منهم وناكحُ

ایک قوم نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ الخ۔ کے حکم کی ناسخ ہے۔ ہم نے اس کو سورت کے آغاز میں بیان کر دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ سے مقصود آزاد عورتیں اور مرد ہیں پھر غلاموں کا حکم بیان فرمایا۔ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ حسن نے والصالحین من عبید کم پڑھا ہے۔ عبید جمع کا اسم ہے۔ فراء نے کہا: اباء کم پر نصب بھی جائز ہے انہوں نے اس کا عطف الصالحین پر کیا ہے، یعنی مذکر، مونث اور صلاح سے مراد ایمان ہے۔ بعض نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کی شادی میں رغبت ہونی چاہیے جب وہ نیک ہوں پس اس کی شادی کرنا جائز ہے لیکن اس میں ترغیب نہیں ہے اور نہ استحباب ہے جیسا کہ فرمایا: فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا پھر کتابت جائز ہے اگر چہ غلام میں خیر معلوم نہ بھی ہو لیکن خطاب ترغیب اور استحباب کے لیے وارد ہوا ہے اور کتابت مستحب ہے جس میں خیر ہو۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ سردار کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو نکاح

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 100
2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 449
3۔ ابوداؤد، باب فی فضل من عال یتیما، 4482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 97

پر مجبور کرے؛ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ وغیرہما کا قول ہے۔ اور جب نقصان اور ضرر ہو تو امام مالک نے فرمایا: جائز نہیں، اسی طرح کا قول امام شافعی سے بھی مروی ہے پھر فرمایا: آقا کے لیے جائز نہیں کہ غلام کو نکاح پر مجبور کرے۔ نخعی نے کہا: لوگ غلاموں کو نکاح پر مجبور کرتے تھے اور ان پر دروازے بند کر دیتے تھے۔ اصحاب الشافعی نے دلیل پکڑی اور کہا: غلام مکلف ہے اسے نکاح پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ مکلف بنانا دلیل ہے کہ غلام آدمیت کی جہت سے کامل ہے اور اس کے ساتھ مملوکیت متعلق ہے کہ اس میں مالک کا ملک رقبۃ اور ملک منفعت کا حصہ ہوتا ہے بخلاف لونڈی کے اس میں سردار کے لیے مملوکیت کا حق اس کے بضعہ میں ہوتا ہے تا کہ وہ اس کو حاصل کرے۔ رہا غلام کا بضع تو اس میں مالک کا کوئی حصہ نہیں اسی وجہ سے مالکن اپنے غلام کے لیے مباح نہیں ہوتی یہ اہل خراسان اور اہل عراق کا اعتماد ہے ان کا نظریہ طلاق کی بنا پر بھی ہے کیونکہ غلام عقد ملک کی وجہ سے اس کا مالک ہوتا ہے۔ ہمارے علماء کا اس میں نکتہ عظیمہ یہ ہے کہ غلام کی مالکیت کو آقا کی مالکیت نے گھیر رکھا ہے اور اسی وجہ سے آقا کی اجازت کے بغیر بالا جماع غلام شادی نہیں کر سکتا ہے۔ نکاح اور اس کا باب مصالح میں سے ہے اور غلام کی مصلحت، سردار کے سپرد ہے وہ اسے دیکھتا ہے اور غلام کے لیے اسے قائم رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ پھر کلام کا رخ آزادوں کی طرف کر دیا یعنی مرد اور عورت کے فقر کی وجہ سے نکاح کرنے سے مت روکو۔ اگر وہ فقراء ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نکاح کرنے والوں سے غنا کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے اور گناہوں سے بچنے کے لیے نکاح کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نکاح میں غنا کو تلاش کرو اور پھر یہ آیت تلاوت کی (1)۔ حضرت عمر نے فرمایا: مجھے اس سے تعجب ہوتا ہے جو نکاح میں غنا کو طلب نہیں کرتا (2) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ یہ مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین افراد ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر حق ہے (3)۔ (۱) مجاہد جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتا ہے۔ (۲) پاک دامنی کے ارادہ سے نکاح کرنے والا۔ (۳) مکاتب جو زر کتابت ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہے'' (4)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم دیکھتے ہیں نکاح کرنے والا غنی نہیں ہوتا تو ہم کہیں گے: یہ لازم نہیں کہ غنا میں دوام ہو بلکہ ایک لحہ کے لیے بھی غنی ہو جائے تو وعدہ سچا ہو جائے گا۔ بعض نے کہا: غنا سے مراد نفس کا غنا ہے۔ صحیح میں ہے ''غنا سامان کی کثرت سے نہیں بلکہ غنا نفس کی غنا ہے'' (5)۔ بعض نے فرمایا: یہ ایسا وعدہ نہیں جس میں خلف واقع نہ ہو بلکہ اس کا مطلب ہے مال آنے جانے والی چیز ہے۔ پس غنا کی امید رکھو۔ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 379 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 180

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب العتق، باب المکاتب، جلد 1، صفحہ 184

4۔ ترمذی، کتاب الجهاد، باب ما جاء فی المجاهد والناکح والمکاتب، حدیث 1579

5۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد، ما جاء ان الغنی غنی النفس، جلد 2، صفحہ 60

ہے اگر اللہ چاہے گا تو وہ انہیں اپنے فضل سے غنی فرما دے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: 41) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ (الرعد: 26) بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اگر وہ نکاح کی طرف محتاج ہوں گے تو اللہ تعالیٰ حلال نکاح کے ساتھ انہیں غنی کر دے گا تا کہ وہ زنا سے بچ جائیں۔

**مسئلہ نمبر 7۔** یہ آیت فقیر کے نکاح کرنے پر دلیل ہے وہ یہ نہ کہے کہ میں شادی کیسے کروں میرے پاس تو مال ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کا نکاح جس نے اپنا نفس آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا تھا ایسے شخص سے کر دیا تھا جس کے پاس صرف ایک چادر تھی اور تنگ دستی کی وجہ سے عورت کو نکاح فسخ کرانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے پاس تنگ دستی پر داخل ہو چکی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ خوشحالی کے دور میں اس پر داخل ہو تو پھر وہ معسر نکلا یا اس کے بعد اسے تنگی لاحق ہوئی کیونکہ بھوک پر صبر نہیں ہے؛ یہ ہمارے علماء کا قول ہے۔ نقاش نے کہا: یہ آیت ان لوگوں پر حجت ہے جنہوں نے کہا: قاضی میاں بیوی کے درمیان تفریق کر دے (1) جب خاوند فقیر ہو نفقہ دینے پر قدرت نہ رکھتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُغْنِهِمُ اللّٰهُ یہ ضعیف جھگڑا ہے۔ اس آیت میں نفقہ سے عاجز کے بارے میں کوئی حکم نہیں ہے یہ وعدہ ہے غنا کا اس کے لیے جو فقیر ہو کر شادی کرے۔ رہا وہ شخص جو خوشحالی کی حالت میں نکاح کرتا ہے اور پھر خرچ دینے سے عاجز ہو گیا تو ان کے درمیان تفریق کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ (النساء: 130) اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیوں کی ہر حال میں لوٹنے کی امید ہوتی ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۳ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۳۴

"اور چاہیے کہ پاک دامن بنے رہیں وہ لوگ جو نہیں پاتے شادی کرنے کی قدرت یہاں تک کہ غنی کر دے انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور جو مکاتب بننا چاہیں تمہارے غلاموں سے تو مکاتب بنا لو انہیں اگر تم جانو ان میں سے کوئی بھلائی اور (زر مکاتبت ادا کرنے میں) مدد کرو ان کی اللہ تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے اور نہ مجبور کرو اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تا کہ تم حاصل کرو (اس بدکاری سے) دنیوی زندگی کا کچھ سامان اور جو (کمینہ خصلت) مجبور کرتا ہے انہیں (عصمت فروشی پر) تو بیشک اللہ تعالیٰ ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 180

کے مجبور کیے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانے والا ہے۔ اور ہم نے اُتاری ہیں تمہاری طرف روشن آیتیں نیز (ہم نے اتارے ہیں) بعض حالات ان لوگوں کے جو گزر چکے ہیں تم سے پہلے نیز (اتاری ہے) نصیحت پرہیز گاروں کے لیے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ یہ اسے خطاب ہے جو اپنے نفس کا خود مالک ہے نہ کہ اسے جس کی زمام دوسرے کے ہاتھ میں ہو کیونکہ وہ اسے اپنی مرضی سے چلاتا ہے جیسے مجور علیہ ہوتا ہے؛ یہ ایک قول ہے۔ اور جیسے لونڈی اور غلام علماء کے دوسرے قول کے مطابق۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ استعفف کا وزن استفعل ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے پاکدامن ہونا طلب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہر اس شخص کو پاکدامن رہنے کا حکم دیا ہے جو نکاح نہیں کر سکتا اور کسی وجہ سے نکاح کو نہیں پاتا پھر جب نکاح کے موانع میں سے اغلب مال کا نہ ہونا ہے تو اپنے فضل سے غنی کرنے کا وعدہ فرمایا وہ اسے عطا فرمائے گا جس کے ساتھ وہ نکاح کرے گا یا وہ ایسی عورت پائے گا جو تھوڑے مہر پر راضی ہو جائے گی یا اس سے عورتوں کی خواہش زائل ہو جائے گی۔ نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمی ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والا۔ وہ نکاح کرنے والا جو پاکدامنی کا ارادہ کرتا ہے؛ اور مکاتب جو زر کتابت کی ادئیگی کا ارادہ کرتا ہے''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا یعنی نکاح کی طاقت نہیں رکھتے مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں نکاح سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ عورت سے نکاح کرتا ہے مثلاً مہر اور نفقہ وغیرہ جیسے لحاف اسم ہے اس کا جس کو لپیٹا جاتا ہے۔ لباس اسم ہے جو پہنا جاتا ہے۔ اس مفہوم پر آیت میں حذف نہ ہوگا؛ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ انہوں نے اس کو اس قول پر محمول کیا ہے: حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ جسے پاک دامن رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہ شخص ہے جو وہ مال نہیں رکھتا جس کے ساتھ نکاح کرے۔ اس قول میں جن کو پاکدامن رہنے کا حکم دیا گیا ہے ان کی تخصیص ہے اور یہ ضعیف قول ہے بلکہ پاکدامن رہنے کا حکم ہر اس شخص کی طرف متوجہ ہے جس پر نکاح کرنا مشکل ہو خواہ کوئی بھی وجہ ہو جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جس کے نفس کو نکاح کا شوق ہو اگر وہ طاقت رکھتا ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا مستحب ہے اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کو پاکدامن رہنا چاہیے اگر ممکن ہو اگرچہ روزے کے ساتھ ہو کیونکہ روزہ شہوت کو ختم کرتا ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے: ''اور جس کو نکاح کا شوق نہ ہو تو اس کے لیے عبادت الٰہی کے لیے خلوت اختیار کرنا بہتر ہے''۔ حدیث میں ہے ''تم میں بہتر وہ خفیف آدمی ہے جس کے اہل اور اولاد نہ ہو''۔ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو لونڈیوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عفت اور نکاح کے درمیان کوئی درجہ نہیں

بنایا۔ یہ دلیل ہے کہ ان کے علاوہ صورت حرام ہے اس میں ملک یمین داخل نہیں کیونکہ وہ دوسری نص سے مباح ہے وہ یہ ارشاد ہے: مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اس میں زیادتی آئی ہے پس استمناء اپنی تحریم پر باقی ہے یہ امام احمد پر رد ہے اسی طرح نکاح متعہ اپنے نسخ کی وجہ سے اس سے خارج ہوگا۔ سورۃ المومنون کے آغاز میں یہ مفہوم گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ۔ الذین محل رفع میں ہے۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک فعل کے اضمار پر محل نصب میں ہے کیونکہ اس کے بعد امر ہے پہلے جب غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر گزرا تو اس کے ساتھ یہ ملایا کہ غلام اگر کتابت طلب کرے تو اس کو مکاتب بنانا مستحب ہے۔ بعض اوقات الکتابۃ سے مراد مستقل ہونا، کمانا اور شادی کرنا ہوتا ہے جب وہ ارادہ کرے یہ اس کے لیے زیادہ پاکدامنی کا باعث ہوگا۔ بعض نے کہا: یہ آیت حویطب بن عبد العزی کے غلام کے بارے نازل ہوئی جس کو صبیح کہا جاتا تھا۔ بعض نے کہا: صبیح کہا جاتا تھا اس نے اپنے آقا سے کہا کہ مجھے مکاتب بنادے تو اس نے انکار کردیا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حویطب نے اسے سو دینار پر مکاتب بنادیا اس نے اسے بیس دینار ہبہ کردیے باقی اس غلام نے ادا کردیا وہ جنگ جس میں شہید ہوا تھا۔ قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے اور نقاش نے اس کو حکایت کیا ہے۔ مکی نے کہا: یہ صبیح قبطی، حاطب بن ابی بلتعۃ کا غلام تھا (1)۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کو حکم دیا کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنادیں جب مملوک کتابت کا مطالبہ کرے اور مالک اس میں خیر دیکھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الْكِتٰبَ اور المکاتبۃ برابر ہیں۔ باب مفاعلہ دو شخصوں کے درمیان عمل کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس میں سردار اور غلام کا عقد ہوتا ہے کہا جاتا ہے: كَاتَبَ يُكَاتِبُ كِتَاباً و مكاتبة جیسے کہا جاتا ہے: قَاتَلَ قِتَالاً و مقاتلۃ آیت میں الکتاب مصدر ہے جیسے قتال، جلاد اور دفاع مصدر ہیں۔ بعض علماء نے کہا: کتاب سے مراد یہاں وہ کتاب معروف ہے جس میں کوئی چیز لکھی ہوئی ہوتی ہے یہ اس لیے کیونکہ مطلب یہ ہے کہ وہ آزادی طلب کرتے تھے جس کے ساتھ کتاب لکھی جاتی تھی اور انہیں دی جاتی تھی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ شرع میں مکاتبت کا معنی ہے، مالک اپنے غلام کو مخصوص مال کی ادائیگی پر مکاتب بناتا ہے جب وہ قسط وار رقم ادا کردے گا تو وہ آزاد ہوگا۔ اس کی دو حالتیں ہیں۔ غلام مطالبہ کرنے اور آقا اس کو قبول کرلے یہ آیت کا مطلق ہے اور اس کا ظاہر ہے۔ غلام مطالبہ کرے اور مالک انکار کردے اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول عکرمہ، عطا، مسروق، عمرو بن دینار، ضحاک بن مزاحم اور اہل ظاہر کی ایک جماعت کا ہے کہ سردار پر غلام کو مکاتب بنانا واجب ہے اور علماء امصار نے فرمایا: واجب نہیں ہے۔ جنہوں نے واجب کہا انہوں نے مطلق امر سے واجب کہا ہے۔ امر کا صیغہ مطلق وجوب کے لیے ہوتا ہے حتیٰ کہ دلیل اس کے علاوہ پر آجائے؛ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ طبری نے اس کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 181

پسند کیا ہے۔ داؤد نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ سیرین ابا محمد بن سیرین نے حضرت انس سے کتابت کے متعلق سوال کیا وہ حضرت انس کے غلام تھے حضرت انس نے انہیں مکاتب بنانے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر نے حضرت انس پر دُرّہ اٹھایا اور یہ تلاوت کی: فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا حضرت انس نے ابن سیرین کو مکاتب بنا دیا۔ داؤد نے کہا: حضرت عمر کی یہ شان نہیں کہ وہ حضرت انس پر ایک مباح پر درہ اٹھاتے جس کا نہ کرنا ان کے لیے جائز تھا۔ اور جمہور علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اس پر اجماع منعقد ہے کہ اگر وہ اسے غیر سے بیچنے کا مطالبہ کرے تو اس پر بیچنا لازم نہیں ہے اور اسے اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا اگرچہ اس کو دوگنا قیمت دی جائے۔ اسی طرح اگر غلام مالک سے کہے کہ مجھے آزاد کر دے یا مجھے مدبر بنا دے یا میری شادی کر دے تو بالا جماع مالک پر ایسا کرنا لازم نہیں، اسی طرح مکاتبت بھی لازم نہیں کیونکہ وہ بھی معاوضہ ہے اور بغیر رضا کے صحیح نہیں۔ اور رہا ان کا قول کہ امر مطلق وجوب کا تقاضا کرتا ہے صحیح ہے لیکن جب ایسے قرینہ سے خالی ہو جو اسے وجوب سے پھیرنے کا تقاضا کرتا ہے اور یہاں اس میں خیر جاننے کی شرط کے ساتھ اس کو معلق کیا گیا ہے۔ پس وجوب ایک امر باطن پر معلق ہے وہ آقا کا اس میں خیر جاننا ہے۔ جب غلام کہے: مجھے مکاتب بنا دو۔ آقا کہے: میں تجھ میں خیر نہیں جانتا۔ یہ امر باطن ہے تو اس میں مالک کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس پر اعتماد کیا جائے گا۔ یہ اس باب میں قوی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** علماء کا خَيْرًا کے قول میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: اس سے مراد مال ہے(1)۔ مجاہد نے کہا: مال اور ادا ہے۔ حسن اور نخعی نے کہا: دین اور امانت ہے۔ امام مالک نے کہا: میں نے بعض اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سے مراد کمانے اور کتابت ادا کرنے کی قوت ہے۔ لیث سے اسی طرح مروی ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔ عبیدہ سلمانی نے کہا: نماز کا قائم کرنا اور اعمال صالحہ ہیں۔ طحاوی نے کہا: جنہوں نے کہا اس سے مراد مال ہے ان کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ غلام کا مال اس کے آقا کا مال ہوتا ہے پس غلام کے لیے مال کیسے ہوگا؟ ہمارے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ تم ان میں دین اور صدق جان لو اور تم جان لو کہ وہ تمہارے ساتھ اس بنا پر معاملہ کریں گے کہ وہ وفا کرنے کے مکلف ہیں جو ان پر کتابت اور معاملہ میں سچائی لازم ہوگی۔ پس تم انہیں مکاتب بنا دو۔ ابو عمر نے کہا: جس نے یہ کہا کہ خیر سے مراد یہاں مال ہے اس نے ان علمتم فیھم مالاً کہنے سے انکار کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: میں نے اس میں خیر، صلاح اور امانت جان لی، علمت فیہ المال نہیں کہا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا ہے: علمت عندہ المال۔

میں کہتا ہوں: بریرہ کی حدیث ان کا رد کرتی ہے جنہوں نے کہا: الخیر سے مراد مال ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** جس شخص کے پاس کوئی پیشہ نہیں اس کی کتابت کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما غلام کو مکاتب بنانا پسند کرتے تھے جب اس کے لیے کوئی پیشہ نہ ہو وہ کہتے: کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں لوگوں کی میل کھاؤں۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے حکیم بن حزام نے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عمیر بن سعد کی طرف خط لکھا: اما بعد! تجھ سے پہلے سلمان اپنے غلاموں کو لوگوں کے سوال کرنے پر مکاتب بناتے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 99

تھے۔ اوزاعی، امام احمد اور اسحاق نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے انہیں رخصت دی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابن التیاح ان کے موذن نے ان سے پوچھا: کیا میں مکاتب بن جاؤں جبکہ میرے پاس مال نہیں ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں پھر لوگوں کو ابھارا کہ مجھ پر صدقہ کریں لوگوں نے مجھے میرے زر مکاتبت سے زیادہ دیا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا: اس مال کو غلام آزاد کرانے پر خرچ کردے۔ امام مالک سے اس کی کراہیت مروی ہے۔ وہ لونڈی جس کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے مکاتب بنا مکروہ ہے کیونکہ یہ چیز اس کو فساد کی طرف لے جائے گی۔ سنت میں حجت ہے اس کی مخالفت میں حجت نہیں ہے۔ آئمہ حدیث نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث روایت کی ہے فرمایا: بریرہ (لونڈی) میرے پاس آئی اور کہا میرے مالکوں نے مجھے نو (9) اوقیہ چاندی پر مکاتبہ بنا دیا ہے اور یہ میں نے نو سال میں ادا کرنی ہے ہر سال ایک اوقیہ چاندی دینی ہے آپ اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیں (الحدیث) یہ دلیل ہے کہ آقا اپنے غلام کو مکاتب بنا سکتا ہے جبکہ غلام کے پاس کچھ بھی نہ ہو کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس یہ خبر دینے کے لیے آئی کہ اس نے مکاتبت طے کی ہے اور اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مدد کا سوال کیا یہ اس نے اس وقت سوال کیا تھا جب اس نے کوئی چیز ادا نہیں کی تھی۔ ابن شہاب نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ بریرہ زر کتابت کے سلسلہ میں مدد کرنے کے لیے آئی جبکہ ابھی تک اس نے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا اس کو بخاری اور ابوداؤد نے تخریج کیا ہے (1)۔ اس میں لونڈی کو مکاتبہ بنانے کے جواز پر دلیل ہے یہ نہ تو کام کرنے والی تھی نہ کوئی ہنر رکھتی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی مال تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ کیا اس کو کمانے کی طاقت ہے یا کوئی متواتر کام کرتی ہے یا اس کے پاس مال ہے؟ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور سوال کرتے تاکہ اس پر حکم واقع ہوتا کیونکہ آپ مبیّن اور معلم بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ جنہوں نے خیر کی تفسیر مال سے کی ہے وہ عمدہ تاویل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد کمانے کی قوت ہے ساتھ ساتھ امین بھی ہو۔

**مسئلہ نمبر 6۔** کتابت کبھی قلیل مال کے ساتھ اور کبھی کثیر مال کے ساتھ ہوتی ہے اور یہ رقم قسط وار ادا کی جائے گی کیونکہ بریرہ کی حدیث ہے اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے اگر اس نے ہزار درہم پر مکاتب بنایا اور قسطوں کا ذکر نہیں کیا تو اس کی محنت کی مقدار قسط ہوگی اگرچہ مالک اسے پسند نہ بھی کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: مدت کا ذکر ضروری ہے کم از کم تین اقساط ہیں۔ اس میں اختلاف ہے جب ایک قسط پر کتابت واقع ہوا کثر اہل علم اس کو ایک قسط پر جائز قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ایک قسط پر جائز نہیں اور اسی وقت ادا کرنے پر بھی جائز نہیں یہ اس طرح آزادی ہوگی گویا اس نے کہا: جب تو اتنا اتنا ادا کرے تو تو آزاد ہے۔ اور کتابت نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب کتابت حالی (فوراً رقم دینی ہو) ہو تو علماء کا کتابت میں اختلاف ہے ہمارے علماء کا دوسرے علماء کی طرح اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ کتابت مؤجل (مؤخر) ہے جیسا کہ حدیث بریرہ میں وارد ہے۔ جب اس نے اپنے مالکوں سے نو اوقیہ پر مکاتبت طے کی ہر سال ایک اوقیہ دینا تھا اسی طرح

1۔ ابوداؤد، باب فی بیع المکاتب اذا فسخت الکتابۃ، حدیث 3428

صحابہ کرام نے کہا: اسی وجہ سے اس کو کتابت کہا جاتا ہے کیونکہ اس کو لکھا جاتا ہے اور اس پر گواہ بنایا جاتا ہے اسم اور اثر جمع ہو گئے معنی بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ مال اگر موقع پر ادا کرنا ہو جبکہ مال، غلام کے پاس ہو تو وہ مال مقاطعہ ہوگا اور یہ عقد مقاطعہ ہوگی عقد کتابت نہ ہوگی۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب فوری مال پر مکاتبت کرے گا تو وہ مال پر آزاد ہوگا کتابت نہ ہو گی۔ ہمارے اصحاب میں سے دوسروں نے کتابت حالی کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو قطاعہ کا نام دیا ہے۔ یہی قیاس ہے کیونکہ اس میں مدت، غلام کو کمانے میں وسعت دینا ہے کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا اگر وہ قسط وقت سے پہلے لے آئے تو مالک پر واجب ہے کہ وہ رقم وصول کرے اور مکاتب کو جلدی آزاد کردے اور کتابت حالیہ جائز ہے؛ یہ کوفیوں نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: کتابت حالی میں امام مالک سے کوئی نص وارد نہیں ہے بلکہ اصحاب کہتے ہیں یہ جائز ہے اور اس کو قطاعہ کا نام دیتے ہیں۔ رہا امام شافعی کا قول کہ کم از کم تین قسطوں پر جائز ہے صحیح نہیں ہے اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ کہنا بھی جائز ہوتا کہ پانچ قسطوں سے کم پر جائز نہیں کیونکہ کم از کم اقساط جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بریرہ کے بارے میں تھیں وہ پانچ تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا علم تھا اور آپ نے اس کا فیصلہ سنایا پس یہ اولی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کتابت میں مدد طلب کرنے کے لیے آئی اس پر پانچ اواق چاندی تھے۔ پانچ سال میں ادا کرنی تھی اسی طرح لیث نے یونس سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ بریرہ پر پانچ اوقیہ تھے اور پانچ سال میں ادا کرنے تھے۔ ابو اسامہ نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا: بریرہ آئی تو اس نے کہا میں نے نو اواق چاندی پر مالکوں سے مکاتبت کی ہے (الحدیث) دونوں روایات کے ظاہر میں تعارض ہے مگر ہشام کی حدیث اتصال کی وجہ سے اولیٰ ہے اور یونس کی حدیث میں انقطاع ہے کیونکہ امام بخاری نے کہا لیث نے کہا مجھے یونس نے بتایا نیز ہشام نے اپنے باپ اور دادا کی حدیث میں جو ثابت کیا ہے دوسروں سے بھی ثابت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 7۔** مکاتب غلام ہوتا ہے جب تک اس پر مال کتابت میں سے کچھ ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مکاتب غلام ہے جب تک اس کی مکاتبت میں سے ایک درہم بھی باقی ہے'' (1) اس حدیث کو ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کی ہے ان سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس غلام نے سو دینار زر مکاتبت مقرر کیا دس دینار کے سوا سب ادا کر دیا تو بھی وہ غلام ہے'' (2)۔ یہ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ ثوری، احمد، اسحاق، ابو الثور، داؤد اور طبری کا یہی قول ہے۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کئی وجوہ سے مروی ہے۔ حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اس میں ان میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا یہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہی ابن مسیب، قاسم، سالم اور عطا کا قول

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، باب فی المکاتب یؤدی بعض کتابتہ، جلد 2، صفحہ 191

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 192۔ سنن ابی داؤد، حدیث 3426، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ امام مالک نے کہا: جن کو ہم نے اپنے شہر میں پایا وہ یہی کہتے ہیں اس میں دوسرا قول بھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ نصف ادا کرلے گا تو وہ مقروض ہوگا؛ یہ نخعی کا قول ہے یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان سے سنداً مروی ہے کہ مکاتب غلام ہے جب تک ایک درہم بھی اس پر باقی ہے بہتر ہے ان سے مروی اس قول سے کہ جب نصف ادا کردے گا تو اس پر غلامی نہ ہوگی یہ ابو عمر کا قول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ جو اس نے ادا کردیا اتنی مقدار آزاد ہوگیا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ آدمی اس میں سے پہلی قسط جو ادا کرتا ہے اس سے اس میں آزادی جاری ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر وہ تہائی کتابت ادا کردے تو وہ آزاد مقروض ہے یہی شریح کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اگر کتابت دو سو دینار ہو اور غلام کی قیمت بھی دو سو دینار ہو پھر غلام نے اپنی قیمت سے سو دینار ادا کردیئے جو اس کی قیمت ہے تو آزاد ہوگا؛ یہ نخعی کا بھی قول ہے۔ ساتواں قول یہ ہے جب 4/3 اور 4/1 باقی ہو تو وہ مقروض ہے وہ کبھی غلام نہیں رہے گا؛ یہ عطاء بن ابی رباح کا قول ہے۔ ابن جریج نے ان سے روایت کیا ہے بعض سلف سے حکایت ہے کہ وہ کتابت کی عقد سے ہی آزاد ہے وہ کتابت کے ساتھ مقروض ہے وہ غلامی کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا اس قول کا رد حدیث بریرہ کرتی ہے جو صحت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے اس میں واضح دلیل ہے کہ مکاتب غلام ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو بریرہ بیچی نہ جاتی اگر اس میں آزادی کی کوئی چیز ہوتی تو بیع جائز نہ ہوتی کیونکہ اس سنت پر اتفاق ہے کہ آزاد کو بیچا نہیں جائے گا اسی طرح حضرت سلمان اور حضرت جویریہ کی کتابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب پر غلامی کا حکم لگایا حتی کہ انہوں نے کتابت ادا کردی؛ یہ جمہور کی حجت ہے کہ مکاتب غلام ہے جب تک اس پر کچھ بھی باقی ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے مکاتب کے بارے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تو اسے رجم کرے گا اگر وہ زنا کرے یا اس کی شہادت کو جائز قرار دے گا اگر وہ شہادت دے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں۔ زید نے کہا: وہ غلام ہے جب تک اس پر کوئی چیز باقی ہے۔ نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکاتب سے اتنا حصہ آزاد ہوجاتا ہے جتنی مقدار وہ زر مکاتب ادا کرتا ہے اور اس پر حد قائم کی جائے گی اتنی مقدار جتنا وہ ادا کرچکا ہے اور جتنا اس سے آزاد ہوا ہے اتنی مقدار وارث ہوگا'' (1)۔ اس کی سند صحیح ہے یہ اس کے لیے حجت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے نبہان مکاتب ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے ام سلمہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہمیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کا مکاتب ہو اور اس کے پاس وہ ہو جو وہ اسے ادا کرسکے تو اس سے پردہ کرنا چاہیے'' (2)۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے مگر اس میں احتمال ہے کہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے ساتھ ہو ان کے حق میں ورع اور احتیاط کو لیا ہو جیسے سودہ کو

1۔ سنن نسائی، کتاب العتق، دیۃ المکاتب، جلد 2، صفحہ 247

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب العتق، المکاتب، جلد 1، صفحہ 184۔ ایضاً حدیث 3427، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرمایا تھا: ''اس سے پردہ کرو''(1)۔ حالانکہ اس کے بھائی ہونے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ کو فرمایا: ''کیا تم بھی نابینا ہو کیا تم اسے نہیں دیکھتی ہو یعنی ابن ام مکتوم کو''(2)۔ حالانکہ فاطمہ بنت قیس کو فرمایا تھا: تو ابن ام مکتوم کے پاس عدت گزار۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ علماء کا اجماع ہے کہ مکاتب پر جب ایک قسط یا دو قسطیں یا تمام قسطوں کی ادائیگی کا وقت آ جائے پھر مالک اس سے قسط کا مطالبہ نہ کرے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دے تو کتابت فسخ نہ ہوگی جب تک وہ اس حال پر باقی رہیں گے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ امام مالک نے فرمایا: غلام کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو عاجز ظاہر کرے جبکہ اس کے پاس ظاہر مال ہو اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کے لیے اپنے آپ کو عاجز ظاہر کرنا جائز ہے اس کے لیے اپنے آپ کو عاجز بنانا جائز نہیں جبکہ وہ اقساط کی ادائیگی پر طاقت رکھتا ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کے لیے اپنے آپ عاجز بنانا جائز ہے خواہ اس کے لیے مال معلوم ہو یا زر کتابت پر طاقت ہو یا یہ معلوم نہ ہو جب وہ کہے گا: میں عاجز آ گیا ہوں (قسط ادا کرنے سے) تو کتابت باطل ہو جائے گی۔ امام مالک نے فرمایا: جب مکاتب عاجز ہو جائے گا تو جو اقساط مالک اس سے پہلے وصول کر چکا ہوگا وہ بھی مالک کے لیے حلال ہو جائیں گی خواہ وہ غلام کی محنت سے تھیں یا اس پر صدقہ کی گئی تھیں اور جو مال اسے اپنی گردن آزاد کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور وہ اس نے کتابت میں نہ لگایا تو جنھوں نے وہ مال دیا تھا وہ اپنا واپس لے سکتے ہیں خواہ کسی نے اسے خود دیا ہو اور مکاتب نے اسے معاف کرایا ہو۔ اگر لوگوں نے اس کی بطور صدقہ مدد کی تھی گردن چھڑانے کی غرض سے نہیں دیا تھا۔ اگر وہ غلام قسط ادا کرنے سے عاجز آ گیا تو وہ صدقہ کا مال آقا کے لیے حلال ہوگا اگرچہ اس کے ساتھ اس کی آزادی مکمل ہوئی ہو اور اس سے کچھ مال بچ بھی جاتا ہو۔ اگر وہ آزادی کی غرض سے تھا تو وہ انھیں حصص کے ساتھ واپس کرے گا یا وہ اس کو معاف کریں گے؛ یہ امام مالک کا مذہب ہے جو ابن قاسم نے ذکر کیا ہے۔ اکثر اہل علم نے کہا: اگر وہ مال جس پر مالک نے زر کتابت میں سے قبضہ کر لیا اور جو مال اس کے عاجز آنے کے بعد بچ گیا صدقہ وغیرہ میں سے تو وہ مالک کے لیے ہوگا اور اس کے لئے یہ تمام مال لینا جائز ہے۔ یہ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام احمد بن حنبل کا قول ہے اور ایک روایت شریح سے بھی یہی مروی ہے۔ ثوری نے کہا: جو اس نے اس کو دیا ہے آقا اسے گردن چھڑانے میں خرچ کرے؛ یہ مسروق اور نخعی کا قول ہے اور ایک روایت شریح سے یہ بھی ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جو مالک نے اس سے قبضہ کیا ہے وہ اس کا ہے اور عاجز آنے کے بعد جو اس کے قبضہ میں بچا ہوا ہے وہ غلام کا اپنا ہے مالک کے لیے نہیں ہے؛ یہ ان علماء کا قول ہے جو کہتے ہیں غلام مالک ہوتا ہے۔ اسحاق نے کہا: جو اسے کتابت کی حالت میں عطا کیا گیا وہ جنہوں نے دیا تھا ان پر لوٹایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ حدیث بریرہ اپنے طرق اور الفاظ کے اختلاف کے باوجود اس بات کو متضمن ہے کہ

1۔ صحیح بخاری، مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ زمن الفتح، جلد 2، صفحہ 616

2۔ جامع ترمذی، ابواب الادب، ما جاء فی احتجاب النساء من الرجال، جلد 2، صفحہ 101

اسمیں بیع کتابت کا معاملہ طے ہونے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ اس سبب سے مکاتب کی بیع میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ امام بخاری نے ایک عنوان ذکر کیا ہے (باب بیع المکاتب اذا رضی) اور آزادی کے لیے اس کی بیع کا جواز ہے جب مکاتب بیع پر راضی ہو اگر چہ عاجز نہ بھی ہو۔ ابن المنذر اور دراوردی کا یہ نظریہ ہے اور ابو عمر عبد البر نے اس کو پسند کیا ہے یہی ابن شہاب، ابوالزناد اور ربیعہ کا قول ہے مگر انہوں نے کہا: اس کا بیع پر راضی ہونا اس کا عاجز آنا ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: مکاتب کا بیچنا جائز نہیں ہے جب تک وہ مکاتب ہے حتیٰ کہ وہ عاجز آجائے اور اس کی کتابت کی بیع جائز نہیں ہے؛ یہ مصر میں امام شافعی کا قول تھا اور عراق میں فرماتے تھے اس کی بیع جائز ہے اور کتابت کی بیع جائز نہیں ہے۔ امام مالک نے کتابت کی بیع کو جائز قرار دیا جب وہ کتابت ادا کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا ورنہ وہ کتابت کے خریدنے والے کے لیے غلام ہو گا۔ امام ابوحنیفہ نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ اسمیں دھوکا ہے۔ امام شافعی کا قول منع اور اجازت میں مختلف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: مکاتب کی بیع جائز ہے جبتک وہ کتابت میں ہے اگر وہ کتابت ادا کر دے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور اس کی ولاء اس کے لئے ہوگی جس نے اسے خریدا تھا اگر وہ عاجز آ گیا تو وہ خریدنے والے کا غلام ہو گا۔ امام نخعی، عطاء، لیث، احمد اور ابوثور کا یہی قول ہے امام اوزاعی نے کہا: مکاتب کو نہیں بیچا جائے گا مگر آزاد کرنے کے لیے۔ اس کے عاجز آنے سے پہلے اس کو بیچنا مکروہ ہے۔ یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: حدیث بریرہ میں مکاتب کی بیع کی اجازت ہے جب وہ بیع پر راضی ہو اور وہ قسط ادا کرنے سے عاجز نہ ہو جس کو ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے جبکہ ان علماء کا قول مختلف ہے جو کہتے ہیں کہ مکاتب کی بیع جائز نہیں ہے مگر عجز کی صورت میں کیونکہ بریرہ نے ذکر نہیں کیا کہ وہ قسط ادا کرنے سے عاجز ہے اور نہ اس نے بتایا کہ اس پر قسط ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو عاجز ہے یا کیا تجھ پر قسط ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے یا نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خریدنے کی اجازت نہ دیتے مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ عاجز ہے اگرچہ ایک قسط کی ادائیگی سے عاجز ہوتی جس کی ادائیگی کا وقت آ چکا تھا۔ زہری کی حدیث میں ہے اس نے زر کتابت سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا اور میں اس باب میں بریرہ کی اس حدیث سے اصح کوئی حجت نہیں جانتا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی چیز مروی نہیں ہے جو اس کے معارض ہو اور نہ کوئی خبر مروی ہے جو اس کے عجز پر دال ہو۔ اور علماء نے مکاتب کی بیع سے منع کیا ہے انہوں نے کئی امور سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے کہا: مذکورہ کتابت ابھی منعقد نہیں ہوئی تھی اور حضرت بریرہ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنے مالکوں سے کتابت کی ہے اس کا مطلب ہے میں نے مکاتب بنانے کا ان سے سودا طے کیا ہے انہوں نے اس کی قیمت، مدت مقدر کی ہے اور ابھی تک عقد نہیں ہے۔ احادیث کا ظاہر اس کے خلاف ہے جب اس کا سیاق غور سے پڑھا جائے۔ علماء نے کہا: بریرہ ادائیگی سے عاجز تھی اور اس نے اپنے مالکوں سے کتابت کے فسخ کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اس وقت بیع صحیح ہوتی ہے مگر یہ ان علماء کے قول کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ مکاتب کے عاجز ثابت ہونے کے لئے حاکم کی ضرورت نہیں جب غلام اور آقا اس پر متفق ہو جائیں کیونکہ حق ان سے تجاوز نہیں کرتا؛ یہ معروف مذہب ہے۔ سحنون نے کہا: سلطان کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے خوف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق کے ترک پر متفق ہو جائیں اس کی صحت پر دلیل ہے کہ وہ

عاجز ہوگئی تھی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ ان سے اپنی کتابت کے سلسلہ میں مدد طلب کرنے کے لیے آئی تھی اور ابھی اس نے اپنی کتابت سے کچھ ادا نہیں کیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے کہا: تو اپنے مالکوں کی طرف لوٹ جا اگر وہ پسند کریں کہ میں تیری کتابت ادا کر دوں تو میں ایسا کر دوں گی۔ اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ تمام کتابت یا بعض کتابت کا اس پر استحقاق ہو چکا تھا کیونکہ حقوق ادا نہیں کیے جاتے مگر جس کا مطالبہ ثابت ہو۔ واللہ اعلم۔ یہ تاویلات ان کی اپنی بیاری کے زیادہ مشابہ ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: میں اس شخص کے لیے حجت نہیں جانتا جو کہتا ہے کہ مکاتب کی بیع جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کہے: شاید بریرہ عاجز آ گئی تھی۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ مکاتب کے مالک کے لیے اس کا بیچنا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**: مکاتب جب کتابت ادا کر دے تو وہ آزاد ہو جائے گا اور وہ مالک سے آزادی کی ابتدا کی طرف محتاج نہ ہوگا۔ اسی طرح اس کی اولاد جو اس کی لونڈی سے کتابت کے دوران پیدا ہوئی وہ بھی اس کے آزاد ہونے کے ساتھ آزاد ہوں گے اور اس کے غلام ہونے کے ساتھ غلام ہوں گے کیونکہ انسان کی اولاد اس کی لونڈی سے اس کے مقام کی وجہ سے آزاد تصور کی جائے گی اسی طرح مکاتبہ کی اولاد کا تصور ہوگا۔ اگر کتابت سے پہلے ان کی اولاد ہو تو وہ کتابت میں داخل نہ ہوگی مگر شرط کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ یہ مالکوں کو حکم ہے کہ وہ کتابت کے مال میں ان کی مدد کریں یا تو خود اپنی طرف سے کچھ ادا کر دیں یا زر کتابت کے مال سے کچھ انہیں معاف کر دیں امام مالک نے فرمایا: مکاتب سے آخری قسط میں سے ساقط کیا جائے گا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پینتیس ہزار ۳۵۰۰۰ میں سے پانچ ہزار معاف کیے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چوتھائی کتابت ساقط کرنے کو اچھا سمجھا ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن بن ابی حسن نے تہائی معاف کرنے کو مستحسن کہا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا دسواں حصہ معاف کرے۔ ابن جبیر نے کہا: کچھ معاف کر دے۔ انہوں نے اس کی حد متعین نہیں کی؛ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ثوری نے اس کو مستحسن کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: کچھ معاف کرے کم از کم چیز جس پر کچھ چیز ہونے کا اطلاق ہوتا ہو۔ اس پر مالک کو مجبور کیا جائے گا اور حاکم اس کے ساتھ ورثاء پر حکم لگائے گا اگر سردار مر جائے گا۔ امام مالک نے اس امر کو استحباب پر محمول کیا ہے اور کم کرنے کی مقدار کی حد متعین نہیں فرمائی۔ امام شافعی نے وَّاٰتُوْهُمْ کے قول میں مطلق امر سے حجت پکڑی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل: 90) اور جو آیات اس کی مثل ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اس سے پہلے یہ اسماعیل بن اسحاق قاضی نے ذکر کیا ہے۔ امام شافعی نے عطا کرنے کو واجب کہا ہے اور کتابت واجب نہیں ہے۔ پس امام شافعی نے اصل کو غیر واجب اور فرع کو واجب کہا ہے۔ اس کی مثال نہیں ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نکاح کی طرح ہوگا یہ واجب نہیں اور جب یہ منعقد ہو جائے تو اس کے احکام واجب ہوتے ہیں ان میں سے متعہ ہے ہم کہتے ہیں: ہمارے نزدیک متعہ واجب نہیں ہے۔ حضرت عثمان بن عفان نے اپنے غلام کو

مکاتب بنایا اور قسم اٹھائی کہ زر کتابت میں کچھ بھی معاف نہیں کریں گے۔ یہ ایک طویل حدیث میں ہے۔

میں کہتا ہوں: حسن اور نخعی اور بریدہ نے کہا وَاٰتُوْهُمْ کا خطاب تمام لوگوں کو ہے کہ وہ مکاتب لوگوں پر صدقہ کریں اور ان کی گردنیں آزاد کرانے میں ان کی مدد کریں۔ زید بن اسلم نے کہا: یہ خطاب والیوں کو ہے کہ وہ صدقہ کے مال سے ان کا حصہ انہیں ادا کریں (1)۔ یہ وہ قول ہے جس کوفی الرقاب کا قول اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے ان دو اقوال کی بنا پر مالک کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مکاتب سے اس کی کتابت سے کوئی چیز ساقط کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کتابت کی اقساط سے کوئی چیز ساقط کرنے کا ارادہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ان سے اتنا مال ساقط کر دو۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جب ہم نے کہا کہ مخاطب مالک ہیں تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خیال کیا کہ یہ سقوط پہلی قسط سے ہوگا خیر کی طرف جلدی کرنے کے لیے کیونکہ ممکن ہے کہ آخری قسط کو نہ پائے۔ امام مالک وغیرہ نے کہا: سقوط آخری قسط سے ہو اس کی علت یہ ہے کہ جب وہ پہلی قسط سے ساقط کرے گا تو بعض اوقات غلام عاجز آ جاتا ہے تو وہ اور اس کا مال سب مالک کی طرف لوٹ جائے گا اور اس کا ساقط کرنا بھی اس کی طرف لوٹ جائے گا جبکہ یہ صدقہ کے مشابہ ہے؛ یہ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے مجاہد نے کہا: وہ اس کے لئے ہر قسط سے کچھ چھوڑ دے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک اقوی یہ ہے کہ وہ آخر میں ساقط کرے کیونکہ ہمیشہ ساقط کرنا قرضوں کے آخر میں ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ کتابت کی عقد کی صفت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس کا طریقہ یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کو کہے میں نے تجھے اتنے اتنے مال پر مکاتب بنایا اتنی اتنی قسط ہوگی جب تو یہ ادا کر دے گا تو تو آزاد ہوگا یا اسے کہے تو مجھے ہزار دس قسطوں میں ادا کر دے تو تو آزاد ہے۔ غلام کہے: مجھے قبول ہے۔ اس طرح کے الفاظ کہے جب وہ اسے ادا کر دے گا تو آزاد ہوگا۔ اسی طرح اگر غلام نے کہا: مجھے مکاتب بنا دے اور سردار کہے: میں نے ایسا کر دیا یا کہے: میں نے مکاتب بنا دیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ لازم نہیں ہے کیونکہ قرآن کے الفاظ اس کا تقاضا نہیں کرتے اور حال اس کی گواہی نہیں دیتا اگر وہ اس کا ذکر کرے تو اچھا ہے اگر وہ اس کو ترک کر دے تو معلوم ہے اس کی احتیاج نہیں ہے۔ اس باب کے مسائل اور فروع کثیر ہیں ہم نے اس کے اصول سے تمام ذکر کر دیے ہیں جو ان پر اکتفا کرے اس کے لیے کافی ہے۔ واللہ الموفق للهداية۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ مکاتب کی میراث کے بارے میں علماء کے مختلف تین اقوال ہیں۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ مکاتب جب مر جائے اور وہ اپنی کتابت سے زائد مال چھوڑ جائے اور اس کے وہ بچے موجود ہوں جو کتابت کے عرصہ میں پیدا ہوئے ہوں یا ان پر اس نے مکاتبت کی ہو تو کتابت ادا کرنے کے بعد وہ باقی مال کے وارث ہوں گے کیونکہ بچوں کا حکم اس کے حکم کی طرح ہے۔ اور اگر اس نے مال نہ چھوڑا ہو تو باقی کتابت کے لیے وہ کوشش کریں گے اور وہ آزاد نہ ہوں گے مگر اس کی آزادی کے ساتھ۔ اگر ان کی طرف سے وہ ادا کرے جس نے ان کی طرف رجوع کرنا تھا، کیونکہ وہ اس پر آزاد ہو

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 182

ں گے تو وہ بدرجہ اولیٰ اس کی میراث کے مستحق ہوں گے کیونکہ وہ تمام حالات میں اس کے مساوی ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اپنے مال سے تمام زر کتابت ادا کرے اور اسے اس طرح کر دے گو یا وہ آزاد مرا ہے اور اس کی تمام اولاد اس کی وارث بن جائے خواہ وہ اولاد جو اس کی موت سے پہلے آزاد تھی اور ان پر اس نے مکاتبت کی تھی یا اس کی کتابت کے دوران پیدا ہوئے تھے کیونکہ وہ حریت میں تمام برابر ہو گئے تھے جب ان کی طرف سے ان کی کتابت ادا ہو گئی؛ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور تابعین میں سے عطا، حسن، طاؤس اور ابراہیم سے مروی ہے۔ یہی کوفہ کے فقہاء، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب حسن بن صالح بن حی کا قول ہے۔ اسحاق کا نظریہ بھی یہی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مکاتب جب تمام کتابت ادا کرنے سے پہلے مر جائے تو وہ غلام کی حیثیت سے مرے گا جو مال پیچھے چھوڑے گا وہ اس کے مالک کے لیے ہوگا اس کی اولاد میں سے کوئی وارث نہ ہوگا نہ آزاد اولاد، نہ وہ جو کتابت کے دوران اس کے ساتھ تھے، کیونکہ جب وہ تمام زر کتابت ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو وہ غلام ہو کر مرا اور اس کا مال اس کے مالک کا ہے اس کے مرنے کے بعد اس کا آزاد ہونا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے مرنے کے بعد اس کا آزاد ہونا محال ہے اور اس کی وہ اولاد جن پر اس نے مکاتبت لی یا جو اس کی کتابت کے دوران پیدا ہوئے باقی کتابت میں انہیں محنت کرنا ہوگی اور ان سے اس کے حصہ کی مقدار ساقط ہوگا۔ جب وہ ادا کر دیں گے تو وہ آزاد ہو جائیں گے وہ اسمیں اپنے باپ کے تابع ہوں گے۔ اگر وہ زر کتابت ادا نہیں کریں گے تو وہ غلام ہوں گے؛ یہ امام شافعی کا قول ہے، یہی امام احمد بن حنبل کا قول ہے یہی حضرت عمر بن خطاب، حضرت زید بن ثابت، عمر بن عبد العزیز، زہری اور قتادہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (1) کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی کے بارے نازل ہوئی اس کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام معاذہ تھا اور دوسری کا نام مسیکہ تھا وہ انہیں زنا پر مجبور کرتا تھا اور انہیں اجرت طلب کرنے اور بچہ حاصل کرنے پر تکلیف دیتا تھا ان دونوں لونڈیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو عبد اللہ بن ابی اور منافقین میں جو ایسا کرتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ معاذہ یہ اس خولہ نامی عورت کی ماں تھی جس نے بارگاہ رسالت میں اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑا کیا تھا صحیح مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن ابی کی لونڈی جسکا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ انہیں زنا پر مجبور کرتا تھا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا یہ الفتیات کی طرف راجع ہے۔ یہ اس طرح ہے لونڈی جب تحصن (پاکدامنی) کا ارادہ کرے تو اس وقت مالک کے لیے مجبور کرنا ممکن ہوتا ہے اور اسے مجبور کرنے سے اسے منع کرنا ممکن ہوتا ہے جب لونڈی خود ہی اس گناہ سے بچنے کا ارادہ نہ رکھتی ہو تو آقا کو یہ کہنا ممکن بھی نہیں کہ تو اسے زنا پر مجبور نہ کر، کیونکہ اکراہ (مجبور کرنا) متصور نہیں ہوتا جبکہ وہ زنا کا ارادہ کرنے والی ہو، یہ سرداروں اور لونڈیوں کو امر

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 381

ہے جبکہ ان کی یہ حالت ہو اس مفہوم کی طرف ابن عربی نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی طرف سے بدکاری سے بچنے کے ارادہ کا ذکر کیا ہے کیونکہ مالک کی طرف سے اسے اکراہ (مجبور کرنا) اسی حالت میں متصور ہوتا ہے۔ جب وہ زنا میں پہلے بھی رغبت رکھتی ہو تو اکراہ متصور نہیں ہوسکتا پس علماء نے فرمایا: اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا، الایامی کی طرف راجع ہے۔ زجاج اور حسن بن فضل نے کہا: کلام میں تقدیم وتاخیر ہے (1) یعنی ایامی اور اپنے نیک لوگوں کا نکاح کردو بعض نے فرمایا: اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی شرط ملغہ ہے۔ اس طرح کے اقوال کمزور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یہ مال جو لونڈی فرج کے ذریعے کماتی ہے اور وہ بچہ جو غلام بنایا جائے اور بیچا جائے۔ بعض نے کہا: زانی، مزنی بہا کی اولاد کو سو اونٹ فدیہ دیتا تھا، پھر وہ مالک کو سو اونٹ پیش کرتا تھا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یُّكْرِهْهُّنَّ جو انھیں مجبور کرتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ ان کے لیے اللہ تعالیٰ غفور ہے (رحیم) اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، جابر بن عبد اللہ اور ابن جبیر نے لھن غفود پڑھا ہے۔ اکراہ (مجبور کرنا) پر کلام سورۃ النحل میں گذر چکی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مومنین پر اپنے انعام شمار کیے جو اس نے ان پر روشن آیات میں سے نازل کیا ان میں گزشتہ قوموں کی مثالیں ہیں تا کہ جن برے کاموں میں وہ واقع ہوئے تھے یہ اس سے پرہیز کریں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۟ۙ ﴿۳۵﴾

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو اسمیں چراغ ہو، وہ چراغ شیشہ کے (ایک فانوس) میں ہو، وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہے جو روشن کیا گیا ہے برکت والے زیتون کے درخت سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے قریب ہے اس کا تیل روشن ہوجائے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے، (یہ) نور ہی نور ہے، پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے، اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ طرح طرح کی مثالیں لوگوں (کی ہدایت) کے لیے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کلام عرب میں نور ان روشنیوں کو کہتے ہیں جو آنکھ کے ذریعے دیکھی جاتی ہیں مجاز اً دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی چمکنا بھی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: کلام له نور اس کا چمکنے والا کلام ہے۔ اسی سے الکتاب المنیر (روشن کتاب) ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

نَسب كأنّ عليه من شمس الضحا نورا ومِن فَلَقِ الصباح عمودا (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 201

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 183

لوگ کہتے ہیں: فلان نور البلد و شمس العصر و قمرہ فلاں شہر کا نور ہے زمانہ کا سورج اور چاند ہے۔

شاعر نے کہا: فإنك شمس والملوك كواكبُ۔

ایک شاعر نے کہا:

هَلّا خصصت من البلاد بمقصد قمر القبائل خالد بن يزيد

ایک اور شاعر نے کہا:

إذا سار عبدالله من مَرْوَ ليلة فقد سار منها نورها و جمالها

یہ کہنا بھی جائز ہے اس کا معنی ہو اللہ کا نور ہے۔ یہ مدح کی جہت سے ہو کیونکہ اس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور تمام اشیاء کا نور اس سے ہے اس سے تمام اشیاء کی ابتدا ہے اور اسی سے ان کا صدور ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے وہ ان روشنیوں میں سے نہیں ہے جو آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں وہ پاک ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں اس کی شان اس سے بلند اور بڑی ہے۔ ہشام جوالقی اور مجسمیہ گروہ نے کہا: وہ نور ہے دوسرے انوار کی طرح نہیں، وہ جسم ہے دوسرے اجسام کی طرح نہیں یہ تمام اللہ تعالیٰ پر عقلاً اور نقلاً محال ہے جیسا کہ علم الکلام میں معروف ہے پھر ان کا قول متناقض ہے کیونکہ ان کا قول جسم یا نور ہے اس پر اس کی حقیقت کے ساتھ ایک حکم ہے اور انکا قول: دوسرے نوروں کی طرح نہیں دوسرے اجسام کی طرح نہیں۔ اس چیز کی نفی ہے جس کو انہوں نے جسمیت اور نور میں سے ثابت کیا تھا یہ تناقض ہے اور اس کی تحقیق علم الکلام میں ہے جو انہیں اس میں ظاہر نظر آیا انہوں نے اس کی اتباع کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب آپ نماز تہجد کے لیے اٹھتے تو یہ کہتے: اللهم لك الحمد، أنت نور السموت والأرض (1)۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے نور دیکھا'' (2) اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں۔ علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے، اس کے ساتھ اور اس کی قدرت سے اشیاء کی روشنی چمکی اور ان کے امور قائم ہوئے اور مصنوعات بنیں۔ یہ کلام ذہن کی تقریب پر مبنی ہے جیسے کہا جاتا ہے: الملك نور اهل البلد یعنی شہر والوں کے معاملات کا قیام اور ان کی صلاح بادشاہ کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے امور سیدھے راستے پر چلاتے ہیں۔ یہ الملک کے لفظ میں مجاز ہے یہ اللہ تعالیٰ کی صفت میں حقیقت محضہ ہے کیونکہ اس نے موجودات کو پیدا کیا عقل کو نور اور ہدایت دینے والا بنایا کیونکہ موجود کا ظہور اس کے ساتھ حاصل ہوا جس طرح روشنی کے ساتھ دیکھی جانے والی چیزوں کا ظہور حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بابرکت ہے اس کے علاوہ کوئی رب نہیں ہے؛ یہ معنی مجاہد اور زہری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے اسی طرح ضحاک اور قرظی نے کہا ہے جیسے لوگ کہتے ہیں: فلاں غیاثنا یعنی وہ ہماری مدد کرنے والا ہے فلان زادی فلاں میرے ساز و سامان تیار کرنے والا ہے؛ جریر نے کہا:

وأنت لنا نور وغَيْث وعصمه ونَبْتٌ لمن يرجو نَدَاك ورِيقُ

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دعائہ باللیل، جلد 1، صفحہ 262 2۔ ایضاً، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 99

یعنی ذو درق۔ مجاہد نے کہا: آسمانوں اور زمین میں امور کی تدبیر فرمانے والا ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حسن اور ابو العالیہ نے کہا: وہ سورج، چاند اور ستاروں سے آسمانوں کو مزین کرنے والا ہے (1) اور زمین کو انبیاء، علماء اور مومنین کے ساتھ مزین کرنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت انس نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کا ہادی ہے (2)۔ پہلا معنی اعم ہے اور تاویل کے ساتھ زیادہ اصح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُ نُوْرِهٖ یعنی اس کے دلائل کی صفت جو وہ بندہ مومن کے دل میں ڈالتا ہے۔ دلائل کو نور کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو نور کہا ہے فرمایا: اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۞ (النساء) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نور فرمایا: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۞ (المائدہ) یہ اس وجہ سے فرمایا کیونکہ کتاب ہدایت دیتی ہے اور بیان کرتی ہے اسی طرح رسول کی بھی یہی مثال ہوتی ہے اللہ کی طرف اضافت کی وجہ یہ ہے کہ وہ دلالت کو ثابت کرنے والا ہے اور بیان کرنے والا ہے اور اسے وضع کرنے والا ہے یہ آیت دوسرے معانی کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ اس میں مثال کے ہر جز کا مقابلہ ممثل بہ کے ہر جز کے ساتھ نہیں بلکہ اس میں جملہ کی جملہ کے ساتھ تشبیہ واقع ہوئی ہے کیونکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہدایت، ہر مخلوق کی صنعت کو اس کا پختہ کرنا اور ان تمام پر اس کے پھیلے ہوئے دلائل ہیں جیسے اس نور سے ہے جس کو تم اس صفت پر بناتے ہو جو اس نور کی صفات میں ابلغ ترین صفت پر ہے جو لوگوں کے سامنے ہے۔ بس وضوح اور روشنی میں اللہ کے نور کی مثال اسطرح ہے جس پر تمہاری انتہا ہے اے انسانو! المشكاة۔ دیوار میں بنے ہوئے طاق کو کہتے ہیں جو آر پار نہیں ہوتا؛ یہ ابن جبیر اور جمہور مفسرین کا قول ہے۔ یہ روشنی کو جمع کرتا ہے اس میں چراغ دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ روشنی دیتا ہے اس کی اصل وہ برتن ہے جس میں کوئی چیز رکھی جاتی ہے مشکاۃ چمڑے کا برتن جیسے ڈول، اس میں پانی ٹھنڈا ہوتا ہے یہ مِفعلة کے وزن پر ہے جیسے مقراۃ و مصفاۃ۔ شاعر نے کہا:

كأن عَيْنَيه مِشكاتان في حجر قِيضا اقتياضا بأطراف المناقير

بعض علماء نے کہا: مشکاۃ قندیل کا ستون جس میں وٹ ہوتی ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد قندیل ہے (3)۔ فرمایا: فِیْ زُجَاجَةٍ کیونکہ وہ شفاف جسم ہے چراغ، فانوس میں زیادہ روشن ہوتا ہے۔ اَلْمِصْبَاحُ آگ کے ساتھ وٹ: كانها كوكب دری، روشنی کرنے اور چمک میں ستارے کی مانند ہے۔ اس میں دو معانی کا احتمال ہے، وہ چراغ کے ساتھ اس طرح ہے یا اپنی صفائی اور اپنے جوہر کی عمدگی کی وجہ سے اس طرح ہے۔ یہ تاویل نور پر تعاون میں زیادہ بلیغ ہے۔ ضحاک نے کہا: الكوكب الدری سے مراد زہرہ ستارہ ہے (4)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ یعنی درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور درخت کو مبارک کہا گیا ہے کیونکہ زیتون نما (برہوتری) کے اعتبار سے پھلوں میں سے بڑا ہے۔ اسی طرح انار ہے۔ مشاہدہ اس کا تقاضا کرتا ہے ابو طالب نے مسافر بن ابی عمرو بن امیۃ بن عبد شمس کے مرثیہ میں کہا:

ليتَ شِعرِي مسافرَ بن أبي عمرو وليتٌ يقولها المحزونُ

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 202 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 203 4۔ تفسیر ثعلبی، جلد 4، صفحہ 189

بورك الميت الغريب كما بو رك نبعُ الرمان والزيتونُ(1)

بعض نے کہا: ان کی برکت کی وجہ سے ان کو مبارک کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ٹہنیاں نیچے سے اوپر تک پتے نکالتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زیتون میں بہت سے منافع ہیں۔ اس سے چراغ جلایا جاتا ہے، یہ بطور سالن استعمال ہوتا ہے، بطور تیل استعمال ہوتا ہے، اس کے ساتھ دباغت کی جاتی ہے، اس کے ساتھ لکڑیوں کو آگ لگائی جاتی ہے، اس میں کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس میں منفعت ہے حتی کہ اس کی راکھ کے ساتھ ریشم کو صاف کیا جاتا ہے۔ یہ پہلا درخت ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور طوفان نوح کے بعد سب سے پہلے اگنے والا یہی درخت ہے۔ انبیاء کی منازل اور ارض مقدسہ میں اگتا ہے۔ اس کے لیے ستر انبیاء کرام نے برکت کی دعا کی۔ ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اللهم بارك في الزيت والزيتون یہ دو مرتبہ عرض کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لاشرقية ولا غربية اس قول میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، قتادہ وغیرہم نے فرمایا: شرقية، جس کو سورج کی دھوپ پڑتی ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے(2)۔ اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس وقت اسے سورج کی دھوپ نہیں لگتی، کیونکہ اس کے لیے پردہ ہوتا ہے۔ اور غربیہ، اس کے برعکس ہے یعنی وہ صحراء میں درخت ہے زمین پر ظاہر ہے سورج کی دھوپ سے کوئی چیز اسے نہیں چھپاتی وہ تیل کے لیے عمدہ ہوتا ہے نہ خالصۃ شرق کے لیے ہے کہ اسے شرقیہ کہا جائے اور نہ غرب کے لیے ہے کہ اسے غربیہ کہا جائے بلکہ وہ شرقیہ غربیہ ہے۔ طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ وہ ایک بہت بڑے صحن میں درخت ہے اس کو اس گھر نے گھیرا ہوا ہے۔ وہ شرق کی جہت سے نہ منکشف ہوتا ہے اور نہ غرب کی جہت سے منکشف ہوتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے درست نہیں ہے کیونکہ وہ پھل جو اسطرح ہوتا ہے اس کی اطراف خراب ہوتی ہیں یہ کائنات میں مشاہدہ ہے۔ حسن نے کہا: یہ دنیا کے درختوں میں سے نہیں ہے(3) یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کے لیے قائم فرمائی ہے کیونکہ اگر یہ دنیا میں ہوتا تو یا یہ شرقیہ ہوتا یا غربیہ ہوتا۔ ثعلبی نے کہا: قرآن نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ یہ دنیا کا درخت ہے، کیونکہ شام کے درخت نہ شرقی ہیں نہ غربی ہیں شام کے درخت افضل درخت ہیں یہ ارض مبارکہ ہے اور شرقیۃ، زیتونۃ کی نعت ہے اور لاصفت اور موصوف کے درمیان حائل نہیں ہوتا ولا غربية، اس پر ولا غربية کا عطف کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ یہ اس کے حسن صفائی اور جودت میں مبالغہ ہے نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ، مشکاۃ میں چراغ کی روشنی جمع ہے زجاجہ (شیشہ) تک وہ روشنی پہنچتی ہے اور تیل کی روشنی تک پہنچتی ہے پس اسی وجہ سے وہ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ہو گیا ہے۔ یہ انوار مشکاۃ (طاق) میں جمع ہوئے تو وہ انتہائی خوبصورت نور ہو گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے براہین واضح ہیں۔ یہ دلیل کے بعد دلیل ہے اور تنبیہ کے بعد تنبیہ ہے جیسے رسولوں کو مبعوث فرمایا، کتب کو نازل فرمایا اور نصیحتیں فرمائیں جن میں عقل سلیم رکھنے والے کے لیے تکرار ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف اسے ہدایت دیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سعادت بخشتا ہے اپنے بندوں پر ضرب الامثال کی صورت میں اپنے فضل کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 184 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 185 3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 205

ذکر فرمایا تا کہ انہیں عبرت نصیب ہو اور ایسی نظر ملے جو انہیں ایمان تک پہنچانے والی ہو۔ عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ اور ابو عبدالرحمن سلمی نے اللہ نور نون کے فتحہ اور واو کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ نورہ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ کعب احبار اور ابن جبیر نے کہا: اس کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی مثل نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1)۔ ابن انباری نے کہا: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پر وقف حسن ہے پھر کلام کا آغاز ہو رہا ہے مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ یعنی نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال۔ حضرت ابی بن کعب اور ابن جبیر نے بھی اور ضحاک نے کہا: اس کا مرجع مومنین ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں مثل نور المومنین ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ ان کی قراءت میں مثل نور المومن ہے روایت ہے کہ اس میں مثل نور من امن بہ ہے۔ حسن نے کہا: اس کا مرجع قرآن اور ایمان ہے۔ مکی نے کہا: ان اقوال کی بناء پر (الارض) پر وقف ہوگا ابن عطیہ نے کہا: ان اقوال کی بنا پر ضمیر کا مرجع ایسا ہوگا جس کا پہلے ذکر نہیں ہے۔ اس میں مثال کے ہر جز کا مقابلہ مثل بہ کے جز سے ہوگا۔ پس جنہوں نے کہا کہ مثل بہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ کعب حبر کا قول ہے۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشکاۃ ہوں گے یا آپ کا سینہ مشکاۃ ہوگا اور مصباح سے مراد نبوت اور اس سے متصل اچھا عمل اور ہدایت ہے۔ الزجاجة سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب (دل) ہے الشجرة المباركة سے وحی اور ملائکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام آپ کی طرف لاتے تھے اور اس کا سبب جو اس سے متصل ہوتا۔ الزیت سے مراد وہ حجج و براہین ہیں وحی جن کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہوتی تھی اور جنہوں نے کہا: مثل بہ مومن ہے۔ ان کے نزدیک چراغ سے مراد ایمان اور علم ہے۔ زجاج سے مراد اس کا دل ہے۔ زیت سے مراد حجتیں اور حکمت ہے جن کو وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ حضرت ابی نے کہا: وہ مومن لوگوں میں بہتر حالت میں چلتا ہے جس طرح زندہ مردوں کی قبور میں چلتا ہے اور جنہوں نے کہا: مثل بہ قرآن اور ایمان ہے تو تقدیر کلام اسطرح ہوگی مثل نورہ الذی ھو الایمان فی صدر المؤمن فی قلبه کمشکاۃ یعنی اس نور کی مثال جو ایمان ہے جو بندہ مومن کے سینہ میں ہے اس کے دل میں ہے جو طاق کی طرح ہے۔ اس میں پہلی دونوں تشبیہوں کی طرح تشبیہ نہیں ہے کیونکہ مشکاۃ ایمان کا مقابل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جسے ثعلبی، ماوردی اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ معنی گذر چکا ہے اس قول کی بنا پر (الارض) پر وقف نہ ہوگا۔ مہدوی نے کہا: ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے تقدیر اس طرح ہوگی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین والوں کو ہدایت دینے والا ہے۔ اس نے جو مسلمانوں کے قلوب میں ہدایت ڈالی اس کی مثال مشکاۃ کی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اسی طرح حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے۔ حسن نے کہا: ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کو مثل نورہ فی قلب المومن کمشکاۃ پڑھتے تھے۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا: ان کے علاوہ کسی نے قرآن میں اسطرح نہیں پڑھا ہے۔ اور تاویل میں ان کی موافقت کی ہے کہ یہ بندہ مومن کے دل میں اس کا نور ہے۔ اس کی تصدیق دوسری آیت میں ہے فرمایا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر:22) اور پہلے مفسرین نے اس کی اس طرح علت بیان کی ہے کہ ضمیر کو اللہ کے لیے بنانا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 183

کے نور کی کوئی حد نہیں ہے۔ ابو عمر ورا اور دی نے کسائی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مشکاۃ کے الف میں اور اس سے پہلے کاف میں امالہ کیا ہے۔ نصر بن عاصم نے زجاجۃ کو زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح الزجاجۃ کو بھی زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابن عامر اور حفص نے عاصم سے دری دال کے ضمہ اور ی کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قراءت کی دو وجہیں ہیں یا تو کوکب، الدر کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کی سفیدی اور صفائی کی وجہ سے یا اس کی اصل دریء مہموز ہے۔ فعیل یہ الدرء سے مشتق ہے جسکا معنی دور کرنا ہے۔ پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی وہ بڑے بڑے ستارے جن کے اسماء معروف نہیں ہیں ان کو الدراری (بغیر ہمزہ کے) کہا جاتا ہے۔ حمزہ اور ابوبکر نے عاصم سے دریء ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے یہ فعیل کے وزن پر الدرء سے مشتق ہے اس معنی میں کہ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں۔ کسائی اور ابو عمر نے دریء دال کے کسرہ اور ہمزہ کے ساتھ الدرء سے مشتق کر کے پڑھا ہے جسکا معنی دور کرنا ہے جیسے السکیر اور الفسیق۔ سیبویہ نے کہا: ابو عبیدہ نے ابو عمر اور کسائی کی قرات کو انتہائی ضعیف قرار دیا کیونکہ انہوں نے اس کو درات سے مشتق کیا ہے جسکا مطلب ہے دور کرنا یعنی ستارہ ایک افق سے دوسرے افق کی طرف چلتا ہے۔ جب یہ تاویل ہو تو کلام میں کوئی فائدہ نہیں رہتا اور اس ستارے کی بہت سے ستاروں پر کوئی فضیلت نہیں رہتی۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ یہ نہیں کہا جاتا جاءنی انسان من بنی آدم۔ ابو عمرو اور کسائی جیسے علماء کو ایسی دور از فکر تاویل نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ان کی تاویل اس کے مطابق ہے جو محمد بن یزید سے مروی ہے کہ ان کا معنی یہ ہے کہ ستارا نور کو دور کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: اندرء الحریق یعنی اندفع آگ سے دور رہ۔ یہ تاویل میں قرات کے لیے صحیح ہے۔ سعید بن مسعدہ نے حکایت کیا ہے کہا جاتا ہے درء الکوکب بضوءہ جب اس کی روشنی لمبی اور بلند ہو۔ جوہری نے الصحاح میں فرمایا: درء علینا فلان یدرء دروء یعنی اچانک طلوع ہوا۔ اسی سے کوکب دری بروزن فعیل ہے جیسے سکیر اور خمیر۔ اس کے زیادہ روشن ہونے اور چمکنے کی وجہ سے ہے۔ قد درا الکوکب دروء۔ ابو عمر بن علاء نے کہا: میں نے سعد بن بکر کے ایک شخص سے پوچھا جو ذات عرق سے تھا میں نے کہا: اس بڑے ستارے کو تم کیا کہتے ہو۔ فرمایا: الدری۔ وہ لوگوں میں سے بلیغ تھا۔ نحاس نے کہا: حمزہ کی قرات اہل لغت کے قول کے مطابق غلط ہے بالکل جائز نہیں ہے کہ عرب کلام میں کوئی اسم فُعّیل کے وزن پر نہیں ہے۔ ابو عبید نے اس پر اعتراض کیا اور حمزہ کی طرف سے حجت پیش کی کہ یہ فعیل کا وزن نہیں بلکہ یہ فعول کے وزن پر ہے جیسے سبوح واو سے یاء کو بدلا گیا ہے جیسے کہتے ہیں عُتی۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ اعتراض اور احتجاج بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ بالکل جائز نہیں ہے اگر وہ جائز ہوتا جو انہوں نے کہا ہے تو سبوح میں سبیح کہا جاتا۔ یہ کسی نے بھی نہیں کہا ہے۔ عتی اس سے نہیں ہے ان کے درمیان فرق واضح ہے کیونکہ عتی دو جہتوں سے خالی نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ یہ عات کی جمع ہو۔ اس میں بدل لازم ہوگا کیونکہ جمع تغییر کے باب سے ہے اور واو اسماء میں طرف کلمہ میں نہیں ہوتی جبکہ اس سے پہلے ضمہ ہو۔ جب اس سے پہلے ساکن تھا اور ساکن سے پہلے ضمہ تھا اور ساکن مضبوط آڑ نہیں ہے تو ضمہ کو کسرہ سے تبدیل کیا گیا اور واو کو یاء سے بدلا گیا۔ اور اگر عتی واحد ہو تو واو کے ساتھ اولی ہے اور اس کا قلب جائز ہے کیونکہ طرف کلمہ میں ہے۔ اور فعول میں واو طرف کلمہ میں نہیں پس اس کا قلب جائز نہیں۔ جوہری اور ابو عبید نے کہا: اگر تو دال کو ضمہ دے اور تو کہے دری تو

یہ الدر کی طرف منسوب ہوگا فعلیٌ کے وزن پر ہوگا اور مہموز نہ ہوگا کیونکہ عرب کلام میں فعیل نہیں ہے۔ قراء میں سے جنہوں نے اس کو ہمزہ دیا ہے انہوں نے فعول کا ارادہ کیا ہے جیسے سبوح ہے پھر کثرت سے ضموں کی وجہ سے ثقل پیدا ہو گیا تو بعض کو کسرہ کی طرف لوٹا دیا۔ اخفش نے بعض سے حکایت کیا ہے دری یہ دراتہ سے مشتق ہے اس کو ہمزہ دیا ہے اور اسے فعیل کے وزن پر پہلے حرف کو فتحہ دیا ہے۔ فرمایا: یہ اس کی چمک کی وجہ سے ہے۔ ثعلبی نے کہا: سعید بن مسیب اور ابو رجاء نے دری دال کے فتحہ کے ساتھ مہموز پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ خطا ہے کیونکہ کلام میں فعیل بھی نہیں ہے اگر ان سے یہ صحیح ہو تو وہ دونوں حجت ہیں۔ یوقد شیبہ، نافع، ایوب، سلام ابن عامر، اہل شام اور حفص نے یوقد یاء مضمومہ کے ساتھ، قاف کی تخفیف اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، سلمی، ابو جعفر، ابو عمرو بن علاء بصری نے توقد تمام حروف مفتوحہ کے ساتھ اور قاف کی شد کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو حاتم اور ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ دونوں قراءتیں قریب قریب ہیں کیونکہ دونوں مصباح کے لیے ہیں۔ یہ وصف کے مناسب ہیں کیونکہ وہ روشن کرتا ہے اور روشن ہوتا ہے۔ الزجاجۃ اس کے لیے برتن ہے اور توقد ماضی توقد، یتوقد، یتوقد سے ہے۔ اور یوقد فعل مضارع اوقد، یوقد سے ہے۔ نصر بن عاصم نے توقد پڑھا ہے اس کی قرات پر اصل تتوقد ہے ایک تاء کو حذف کیا گیا کیونکہ دوسری اس پر دلالت کرتی ہے کوفیوں نے توقد تاء کے ساتھ پڑھا ہے الزجاجۃ کی طرف ضمیر لوٹائی ہے یہ دونوں قراءتیں الزجاجۃ کی تانیث کی بنا پر ہیں، مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ مونث فعل نار کی تانیث کی وجہ سے ہے۔ ابو عبید نے کہا: صرف یہی قراءت معروف ہے۔ ابو حاتم نے حکایت کیا ہے کہ سدی نے ابو مالک سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے لم یمسسہ نار یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: تذکیر اس بنا پر ہے کہ یہ مؤنث غیر حقیقی ہے۔ ان کے نزدیک مؤنث کے استعمال کا یہی طریقہ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: المشکاۃ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جوف (پیٹ) ہے اور الزجاجۃ سے مراد قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور المصباح سے مراد وہی نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں رکھا ہے۔ وہ روشن کیا جاتا ہے شجرۃ مبارکۃ سے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل ابراہیم سے ہے وہ آپ کا شجرہ (درخت) ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں نور رکھا جس طرح حضرت ابراہیم کے قلب میں نور رکھا۔ محمد بن کعب نے کہا: المشکاۃ سے مراد حضرت ابراہیم ہیں۔ الزجاجۃ سے مراد حضرت اسماعیل ہیں اور المصباح سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مصباح رکھا جیسا کہ آپ کا نام سراج رکھا۔ فرمایا: وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب) يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ شجرہ مبارکہ سے مراد حضرت آدم ہیں ان کی نسل میں برکت ڈالی گئی اور آپ سے انبیاء و اولیاء کثرت سے ہوئے۔ بعض علماء نے فرمایا: شجرۃ مبارکۃ سے مراد حضرت ابراہیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک فرمایا کیونکہ اکثر انبیاء کرام آپ کی صلب سے تھے لاشرقیۃ ولا غربیۃ یعنی ابراہیم نہ یہودی تھے یہ نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن لوگوں کے لیے وحی الٰہی آنے سے پہلے بھی روشن تھے۔ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ نبی کی نسل سے نبی۔ ضحاک نے کہا:

مشکاۃ سے مراد عبد المطلب ہیں (1)، الزجاجۃ سے مراد حضرت عبد الله ہیں اور المصباح سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے دل میں تھے آپ حضرت ابراہیم سے نبوت کے وارث بنے۔ من شجرۃ تقوی رضوان کا درخت اور ہدایت وایمان ایک درخت ہے جس کی اصل نبوت ہے اور اس کی فرع مروت ہے، اس کی ٹہنیاں تنزیل ہیں اور اس کے پتے تاویل ہیں اور اس کے خدمت گذار جبریل ومیکائیل ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن عربی نے کہا غریب امر یہ ہے کہ بعض فقہاء نے کہا یہ الله تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عبد المطلب اور ان کے بیٹے حضرت عبد الله کی مثال دی ہے۔ المشکاۃ سے مراد حبشہ کی زبان میں طاق ہے عبد المطلب کو مشکاۃ سے تشبیہ دی گئی جس میں قندیل ہے اور الزجاجۃ ہے اور حضرت عبد الله کو قندیل سے تشبیہ دی گئی اور وہ الزجاجۃ ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مصباح کی مانند تھے یعنی ان کی اصلاب میں گویا وہ روشن ستارہ ہے اور وہ مشتری ہے۔ یُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ یعنی نبوت کی میراث حضرت ابراہیم سے ہے وہ مبارک درخت ہیں، یعنی حنیفیۃ لاشرقیۃ ولاغربیۃ لا یہودیۃ ولانصرانیۃ۔ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ فرمایا: قریب تھا حضرت ابراہیم وحی کے ساتھ کلام کرتے وحی آنے سے پہلے، نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ حضرت ابراہیم پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ قاضی نے کہا: یہ تمام ظاہر سے عدول ہے اور تمثیل میں ممتنع نہیں ہوتا کہ آدمی اس میں وسعت دے۔ میں کہتا ہوں: سوائے پہلے قول کے تمام اقوال کا آیت سے ربط نہیں ہے۔ یہ الله تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال دی ہے اور الله تعالیٰ کے نور کی مثال دینا ممکن بھی نہیں ہے یہ مخلوق کو تنبیہ کرنے کے لیے تھا مگر بعض مخلوق کے ساتھ کیونکہ مخلوق اپنے قصور کی وجہ سے کسی بات کو نہیں سمجھتی مگر اپنی ذات کے ذریعے اور اپنی ذات سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو الله تعالیٰ کو کوئی بھی نہ پہچانتا مگر الله وحدہ؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ الله تعالیٰ کے نور اور ہدایت کی مثال ہے جو بندہ مومن کے دل میں ہوتی ہے قریب ہے بندہ مومن ہدایت کے مطابق عمل کرے علم آنے سے پہلے، جب معرفت آنے سے پہلے حضرت ابراہیم نے کہا: هٰذَا رَبِّیْ (الانعام: 77) یہ آپ نے کسی کے خبر دینے سے پہلے کہا تھا کہ اب کوئی رب ہے جب الله تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ وہ اس کا رب ہے تو ہدایت میں اضافہ ہوگیا اور فرمایا: قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (البقرہ) اور جنہوں نے کہا: یہ بندہ مومن کے دل میں قرآن کی مثال ہے۔ فرمایا: جس طرح یہ چراغ روشن کیا جاتا ہے اور وہ کم نہیں ہوتا اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے اور کم نہیں ہوتا المصباح سے مراد قرآن ہے۔ الزجاجۃ سے مراد مومن کا دل ہے اور المشکاۃ سے مراد اس کی زبان اور اس کا فہم ہے۔ شجرہ مبارکہ سے مراد شجرۃ الوحی ہے۔ یَكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ قریب ہے کہ قرآن کے دلائل واضح ہو جائیں اگرچہ نہ بھی پڑھے جائیں۔ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ یعنی قرآن الله تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لیے نور ہے باوجود اس کے کہ نزول قرآن سے پہلے اعلام ودلائل ان کے لیے قائم فرمادیے تھے پس ان کے نور میں مزید اضافہ ہوگیا پھر بتایا کہ یہ نور عزیز ہے اسے کوئی حاصل نہیں کرسکتا مگر جس کی ہدایت کا الله تعالیٰ ارادہ فرمائے۔ فرمایا: یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ یعنی الله تعالیٰ اشیاء کو افہام

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 384

کے قریب کرنے کے لیے بیان فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ وہ ہدایت یافتہ اور گمراہ سب کو جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کا نور آسمان کے نیچے کیسے پایا جاتا ہے(1)؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال دی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

''ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے کہ بلند کیے جائیں اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان گھروں میں صبح و شام وہ (جوان) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یاد الٰہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے گھبرا جائیں گے جس میں دل اور آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی تاکہ جزادے انہیں اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی اور اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے انہیں اپنے فضل سے اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب''۔

ان میں انیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ، بیوت کی باء کو ضمہ اور کسرہ دیا جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور فی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مصباح کے متعلق ہے۔ بعض نے کہا: یسبح کے متعلق ہے۔ اس تاویل پر علیم پر وقف ہوگا۔ ابن انباری نے کہا: میں نے ابو العباس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ مصباح، الزجاجة اور الکوکب سے حال ہے گویا فرمایا: وھی بیوت۔ ترمذی حکیم محمد بن علی نے کہا: فی بیوت منفصل ہے گویا فرمایا: اللہ فی بیوت أذن اللہ أن ترفع، اللہ ان گھروں میں ہے اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے۔ اسی وجہ سے اخبار وارد ہیں کہ جو مسجد میں بیٹھا تو وہ اپنے رب سے ہم مجلس ہوا۔ اسی طرح تورات سے حکایت کیا گیا ہے کہ مومن جب مسجد کی طرف چلتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری زیارت کی اور مجھ پر اس کی مہمان نوازی ہے اور میں جنت سے کم مہمان نوازی پر اس کے لیے راضی نہ ہوں گا۔ ابن انباری نے کہا اگر فی کو یسبح کے متعلق کیا جائے یا رجال کو رفع دینے والی ہو تو وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ کے قول پر وقف بہتر ہے۔ رمانی نے کہا: یہ یوقد کے متعلق ہے اور اس بناء پر علیم پر وقف نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ کیا وجہ ہے جب بیوت، یوقد کے متعلق ہوں مصباح اور مشکاۃ واحد ہیں اور بیوت جمع ہے اور ایک مشکاۃ ہی ایک گھر میں ہوگا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اس متلون خطاب سے ہے جس کا واحد سے آغاز ہے اور جمع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 106

کے ساتھ اختتام ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق: 1) اور اس قسم کی دوسری مثالیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ بیوت میں سے ہر بیت کی طرف راجع ہے۔ بعض نے کہا: یہ اس قول کی مانند ہے وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا (نوح: 16) حالانکہ چاند ایک آسمان میں ہے۔ علماء کے یہاں بیوت کے متعلق پانچ اقوال ہیں: پہلا قول: اس سے مراد مساجد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ خاص ہیں اور یہ اہل آسمان کے لیے اسطرح چمکتی ہیں جس طرح ستارے اہل زمین کے لیے چمکتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور حسن کا قول ہے

دوسرا قول: یہ بیت المقدس کے بیوت ہیں، یہ بھی حسن سے مروی ہے۔ تیسرا قول: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیوت مراد ہیں، یہ بھی مجاہد سے مروی ہے۔ چوتھا قول: یہ تمام بیوت ہیں؛ یہ عکرمہ کا قول ہے اور یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ اس قول کو تقویت دیتا ہے کہ اس سے مراد مساجد ہیں۔ پانچواں قول:۔ اس سے مراد وہ چار مساجد ہیں جنہیں انبیاء نے تعمیر کیا ہے کعبہ، بیت اریحا، مسجد نبوی، مسجد قبا؛ یہ ابن بریدہ کا قول ہے؛ یہ پہلے سورۃ براءت میں گذر چکا ہے۔ میں کہتا ہوں: اظہر قول پہلا قول ہے کیونکہ حضرت انس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرے اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے وہ میرے اصحاب سے محبت کرے جو میرے اصحاب سے محبت کرتا ہے وہ قرآن سے محبت کرے جو قرآن سے محبت کرتا ہے وہ مساجد سے محبت کرے یہ اللہ تعالیٰ کے فناء اور بناء ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلند کرنے کا حکم دیا ہے اور ان میں برکت رکھی ہے اور ان کے اہل کی برکت محفوظ ہے ان کے اہل محفوظ ہیں وہ اپنی نماز میں ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی ضروریات پوری کرتا ہے وہ اپنی مساجد میں ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے پیچھے ان کی حفاظت فرماتا ہے''۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ اذن کا معنی حکم دینا اور فیصلہ کرنا ہے اذن کی حقیقت علم اور قدرت دینا ہے بغیر کسی رکاوٹ کے اگر اس کے ساتھ امر اور نفاذ متصل ہو تو یہ اقویٰ ہوتا ہے۔ ترفع کا معنی ہے بنائے گئے اور بلند کئے گئے؛ یہ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (البقرہ: 127)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے مال سے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا'' (1)۔ اس معنی میں بہت سی احادیث ہیں جو مساجد کے بنانے پر برانگیختہ کرتی ہیں حسن بصری وغیرہ نے کہا: ترفع کا معنی یہ ہے ان کی تعظیم کرنا اور ان کی شان بلند کرنا، غلاظتوں اور انجاس سے پاک کرنا۔ حدیث میں ہے ''مسجد نجاست کی وجہ سے اسطرح سمٹ جاتی ہے جس طرح چمڑا آگ کی وجہ سے سکڑ جاتا ہے''۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مسجد سے کسی غلاظت اور آلودگی کو دور کیا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم گھروں میں مساجد بنائیں اور انہیں صاف ستھرا رکھیں اور خوشبو لگائیں (2)۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد، من بنی للہ مسجداً، جلد 1، صفحہ 54۔ ایضاً، حدیث نمبر 728، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، تطهیر المساجد، جلد 1، صفحہ 55۔ ایضاً، حدیث نمبر 449، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 3۔** جب ہم کہتے ہیں کہ مساجد کی بنیان سے مراد کیا انہیں مزین کرنا ہے؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ ایک قوم نے اس کو مکروہ کہا ہے اور دوسروں نے اس کو مباح قرار دیا ہے۔ حماد بن سلمہ نے ایوب سے انہوں نے ابوقلابہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا اور قتادہ نے بھی حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ لوگ مساجد کے سبب فخر کریں گے'' (1)۔ اس حدیث کو ابوداود نے نقل کیا ہے اور صحیح بخاری میں ہے حضرت انس نے فرمایا: مساجد پر فخر کریں گے پھر انہیں آباد بہت کم کریں گے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم انہیں مزین کرو گے جیسے یہود و نصاریٰ نے اپنی عبادت گاہیں مزین کی تھیں۔ اور حکیم ابوعبداللہ ترمذی نے نوادر الاصول میں حضرت ابودرداء کی حدیث روایت کی ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم اپنی مساجد کو مزین کرو گے اور تم اپنے مصاحف کو زیور پہناؤ گے تو تم پر ہلاکت ہوگی''۔ اور جن علماء نے مساجد کی تزیین اور خوبصورتی کو مباح قرار دیا ہے انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اس میں مساجد کی تعظیم ہے اور اللہ تعالیٰ نے مساجد کی تعظیم کا اس ارشاد: فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ میں حکم دیا ہے ترفع کا معنی تعظیم کرنا ہے۔ حضرت عثمان سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد نبوی کی تعمیر دیار کی لکڑی سے کی اور اسے خوبصورت بنایا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: مساجد میں سونے کے پانی سے نقش و نگار بنائے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد نبوی میں نقش و نگار بنوائے اور اس کی عمارت اور تزیین میں مبالغہ کیا یہ ان کی خلافت سے پہلے ولایت کے زمانہ میں ہوا تھا اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبد الملک نے دمشق کی مسجد کی تعمیر میں اور تزیین میں شام کے خراج سے تین گنا مال خرچ کیا اور روایت ہے کہ حضرت سلمان بن داود علیہ السلام نے بیت المقدس کی مسجد بنائی اور اس کی تزیین میں مبالغہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** مساجد کو بدبودار چیزوں اور بُرے اعمال وغیرہ سے بھی بچانا اور محفوظ رکھنا چاہیے جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔ یہ بھی مساجد کی تعظیم سے ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے صحیح مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ تبوک کے موقع پر فرمایا: ''جس نے اس درخت یعنی اس سے کھایا وہ مساجد میں نہ آئے (3)'' اور حضرت جابر بن عبداللہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس سبزی لہسن سے کھایا'' اور کبھی فرمایا: ''جس نے پیاز، تھوم اور بدبودار سبزی سے کھایا ہماری مسجد کے قریب نہ آئے ملائکہ کو ان چیزوں سے تکلیف محسوس ہوتی ہے جن سے بنو آدم کو تکلیف محسوس ہوتی ہے''۔ حضرت عمر بن خطاب نے اپنے خطبہ میں فرمایا: ''اے لوگو! تم دو درخت کھاتے ہو میں انہیں نہیں دیکھتا مگر خبیث وہ پیاز اور تھوم ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا جب آپ مسجد میں کسی شخص سے پیاز اور تھوم کی بدبو محسوس کرتے تو اسے حکم دیتے کہ تو بقیع کی طرف نکل جا۔ اور جو ان کو کھائے تو پکا کر ان کی بدبو کو ختم کر دے۔ اس کو مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ علماء نے فرمایا:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 54۔ ایضاً، حدیث 730، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، الحدث فی المسجد، جلد 1، صفحہ 64

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، النہی عن اکل الثوم، جلد 1، صفحہ 209

مسجد سے اس کو نکالنے کی علت اس کی اذیت تھی تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے مسجد میں اس کے پڑوسیوں کو تکلیف ہو مثلاً کوئی چرب زبان ہو، نادان ہو یا اس سے بدبو آتی ہو اور اس کے برے پیشے کی وجہ سے بدبو اس سے جدا نہ ہوتی ہو یا کوئی ایسی موذی مرض ہو جیسے جذام وغیرہ اور ہر وہ چیز جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو تو اہل مسجد کو اس شخص کو مسجد سے نکالنا جائز ہے جب اس میں یہ علت موجود ہو حتی کہ اس سے وہ علت زائل ہو جائے اسی طرح ایسا شخص لوگوں کے مجمع سے پرہیز کرے جو نماز وغیرہ کے لیے ہو جیسے علم، ولیمہ اور اس جیسی دوسری مجالس جو تھوم وغیرہ کھاتا ہے یا ایسی چیز کھاتا ہے جس کی بدبو ہوتی ہے اور لوگوں کو اذیت دیتی ہے، اسی وجہ سے پیاز تھوم اور الکراث (بدبودار سبزی) کو جمع فرمایا اور بتایا کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: میں نے اپنے شیخ ابو عمر احمد بن عبد الملک بن ہشام کو دیکھا کہ انہوں نے اس شخص کے بارے فتوی دیا جس کے پڑوسیوں نے اس کی شکایت کی اور انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ انہیں مسجد میں اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے اذیت دیتا ہے اس کے بارے میں مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اسے مسجد سے نکالنے کا فتوی دیا اور مسجد سے دور کرنے کا فتوی دیا اور ان کے ساتھ نماز میں حاضر نہ ہونے کا فتوی دیا۔ کیونکہ اس جنون کے ہوتے ہوئے اس سے سلامتی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک دن شیخ صاحب سے اس فتوی کی دلیل پوچھی اور ان سے دوبارہ پوچھا تو انہوں نے حدیث سے ثوم (لہسن) سے استدلال کیا اور فرمایا: میرے نزدیک یہ لہسن کھانے والے سے زیادہ اذیت کا موجب ہے اور ایسے شخص کو مسجد میں جماعت کے ساتھ حاضر ہونے سے منع کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں: آثار مرسلہ میں ہے کہ ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بدبو سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ اس بنا پر جو جھوٹ بولتا ہو اور باطل کلام کرتا ہو اسے مسجد سے نکالا جائے گا کیونکہ اذیت دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ تمام مساجد برابر ہیں اس کی وجہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بارے میں وارد ہوئی کیونکہ اس میں جبریل امین آتے تھے نیز حضرت جابر کی حدیث میں ہے: فلا یقربن مسجدنا (1) ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ حکم میں صفت ذکر کی اور وہ مسجد ہونا ہے حکم میں صفت کا ذکر تعلیل ہوتا ہے۔ ثعلبی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ دنیا کی مساجد لائے گا گویا وہ سفید اونٹنیاں ہیں ان کی ٹانگیں عنبر کی، گردنیں زعفران کی، سر کستوری کے ان کی مہاریں سبز زبرجد کی۔ ان کے مؤذن ان کے نگران ہوں گے جو ان کو آگے سے پکڑ کر چلا رہے ہوں گے اور ان کے ائمہ انہیں پیچھے سے ہانک رہے ہوں گے اور ان کو آباد کرنے والے ان کے ساتھ متعلق ہوں گے وہ قیامت کے عرصات سے تیز بجلی کی طرح گزریں گی اہل موقف کہیں گے: یہ ملائکہ مقربین ہیں اور مرسل انبیاء ہیں۔ ارشاد ہوگا: نہ یہ فرشتے ہیں اور نہ یہ انبیاء ہیں لیکن یہ اہل مسجد ہیں اور نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے ہیں''۔ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (التوبہ: 18) اللہ کی مساجد کو وہ تعمیر کرتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ یہ ہر مسجد کو عام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی شخص کو مسجد میں آنے جانے کا عادی دیکھو (2) تو اس کے

1۔ صحیح مسلم، نہی اکل الثوم، جلد 1، صفحہ 209 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 135

لیے ایمان کی گواہی دو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ '' یہ پہلے گذر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** مسجد کو بیع وشرا اور دوسری مشغولیتوں سے بچایا جائے گا کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو فرمایا جو اپنے سرخ اونٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا: ''تو اسے کبھی نہ پائے (1)۔ مساجد اس کام کے لیے بنائی گئی ہیں جس کے لیے بنائی گئی ہیں'' یعنی اللہ کے ذکر کے لیے، اس حدیث کو امام مسلم نے سلیمان بن بریدہ عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تو ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا: کس نے میرا سرخ اونٹ پایا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے کبھی نہ پائے مساجد اس کے لیے بنائی گئی ہیں جس کے لیے بنائی گئی ہیں'' (2)۔ یہ دلیل ہے کہ نماز، اذکار، قرات قرآن کے علاوہ مسجد میں کوئی عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح تفسیر سے حضرت انس کی حدیث میں آیا ہے فرمایا: ہم مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اچانک ایک اعرابی آیا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا صحابہ کرام نے کہا: رک جا، رک جا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے پیشاب کو نہ روکو اسے چھوڑ دو'' (3)۔ صحابہ کرام نے اسے چھوڑ دیا حتی کہ اس نے پیشاب کر لیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا: ''یہ مساجد پیشاب اور غلاظت کے لیے نہیں ہیں یہ اللہ کے ذکر، نماز اور قرآن کی تلاوت کے لیے بنائی گئی ہیں'' (4)۔ یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فرمایا۔ پھر ایک شخص کو حکم دیا تو وہ پانی کا ایک ڈول لے آیا وہ اس پیشاب کی جگہ پر انڈیل دیا۔ اس کو امام مسلم نے تخریج کیا ہے اور کتاب اللہ سے اس پر یہ قول حق دلالت کرتا ہے: وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ بن حکم سلمی کو فرمایا: ''یہ مساجد لوگوں کے کلام جیسی چیز کے مناسب نہیں یہ تسبیح، تکبیر اور قرآن کی قرات کے لیے بنائی گئی ہیں'' (5)۔ یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلم نے طویل حدیث اپنی صحیح میں نقل کی ہے تیرے لیے وہ کافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی تو فرمایا: یہ کیا آواز ہے کیا تو جانتا ہے تو کہاں (کھڑا) ہے؟ خلف اپنی جگہ سے اٹھے مسجد میں بیٹھے تھے ان کا غلام ان کے پاس کوئی چیز پوچھنے آیا تو خلف اپنی جگہ سے اٹھے مسجد سے باہر آئے پھر اس کے سوال کا جواب دیا۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: میں نے اتنے عرصہ سے مسجد میں دنیا کی کلام نہیں کی۔ پس آج بھی میں نے بات کرنا ناپسند کیا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** ترمذی نے عمر بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے، اس میں خرید وفروخت کرنے اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے لوگوں کے حلقہ بنانے سے منع فرمایا (6)، امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حضرت بریدہ، حضرت جابر اور حضرت انس سے بھی مروی ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث حسن ہے۔ محمد بن اسماعیل نے کہا: میں نے محمد اور اسحاق کو دیکھا اور انہوں نے ان کے علاوہ علماء کا بھی ذکر کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، النهی عن نشد الضالة فی المسجد، جلد 1، صفحہ 210 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، وجوب غسل البول وغیرہ من النجاسات إذا حصلت فی المسجد، جلد 1، صفحہ 138 4۔ ایضاً

5۔ ایضاً، کتاب المساجد، تحریم الکلام فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 203

6۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی کراهیة البیع والشراء، حدیث نمبر 296

کہ وہ عمرو بن شعیب کی حدیث سے حجت پکڑتے تھے۔ اہل علم کے ایک طائفہ نے مسجد میں خرید وفروخت کو مکروہ کہا ہے؛ احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم ایک قوم کے پاس آئے وہ مسجد میں خرید وفروخت کر رہے تھے۔ آپ نے اپنی چادر کا چھوٹا بنالیا اور انہیں مارنے لگے اور فرمایا: اے سانپوں کی اولاد! تم نے اللہ کے گھروں کو بازار بنالیا ہے، یہ تو آخرت کا بازار ہے۔ میں کہتا ہوں: ہمارے بعض علماء نے مسجد میں بچوں کو پڑھنا بھی مکروہ کہا ہے انہوں نے کہا: یہ بیع (خرید وفروخت) کے باب سے ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب تعلیم اجرت کے ساتھ ہو اگر بغیر اجرت کے ہو تو دوسری وجہ سے ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ بچے غلاظتوں اور گندگیوں سے نہیں بچتے۔ یہ چیز مسجد کی نظافت کو قائم نہیں رکھتی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدوں کو صاف، ستھرا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی مساجد سے بچوں اور پاگلوں کو دور کرو اور اپنی تلواروں کا سونتنا، حدود قائم کرنا، اپنی آوازوں کو بلند کرنا، جھگڑا کرنا مساجد سے دور رکھو اور جمعہ کے دن ان میں خوشبو کی دھونی لگاؤ اور طہارت خانے ان کے دروازوں پر (باہر) بناؤ'' (1)۔ اس کی سند میں علاء بن کثیر دمشقی ہے جو بنی امیہ کا غلام ہے وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابو احمد بن عدی حرانی حافظ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ ابو احمد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی حدیث سے بھی یہ حدیث ذکر کی ہے فرمایا: میں نے عصر کی نماز امیر المومنین حضرت عثمان کے ساتھ پڑھی انہوں نے مسجد کے کونے میں ایک درزی دیکھا آپ نے اسے مسجد سے نکالنے کا حکم دیا آپ سے عرض کی گئی: اے امیر المومنین! یہ مسجد کی صفائی کرتا ہے، دروازے بند کرتا ہے اور کبھی کبھی پانی چھڑکتا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ''کہ اپنی مساجد سے اپنے کاریگروں کو دور رکھو''۔ یہ حدیث غیر محفوظ ہے اس کی سند میں محمد بن مجیب ثقفی ہے وہ ذاہب الحدیث ہے۔ میں کہتا ہوں: اس معنی میں جو حدیث بھی وارد ہے اگر چہ اس کی سند لین ہے وہ معنی صحیح ہے۔ اور اس کی صحت پر دلیل وہ ہے جو پہلے ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض تابعین اہل علم سے مسجد میں خرید وفروخت کی اجازت مروی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں اشعار پڑھنے کی رخصت بھی کئی احادیث میں مروی ہے۔ میں کہتا ہوں: رہا مسجد میں اشعار پڑھنا تو اس میں اختلاف ہے، کچھ مطلقاً منع کرنے والے ہیں کچھ مطلقاً جائز قرار دینے والے ہیں لیکن بہتر تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ شعر کو دیکھا جائے گا اگر وہ اللہ تعالیٰ کی ثنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف یا اللہ اور اس کے رسول کے دفاع کے مفہوم پر مبنی ہے جیسے حضرت حسان کے اشعار تھے یا ان اشعار میں کوئی وعظ ونصیحت ہو دنیا سے عدم دلچسپی اور اس سے کم حاصل کرنے کا ذکر ہو تو وہ اشعار مساجد اور دوسری جگہ پر پڑھنا اچھا ہے جیسے:

طَوِّفِي يا نفسُ كي أقصد فردا صمدا وذريني لست أبغي غير ربي أحدا

فهو أنسي وجليسي ودعِ الناس فما إن تجدى من دونه ملتحدا

اور جو اشعار ایسے نہ ہوں وہ جائز نہیں کیونکہ اکثر اشعار فواحش، جھوٹ، باطل کی تزیین سے خالی نہیں ہوتے اگر سلامت بھی ہوں تو کم از کم لغو اور ھذر ضرور ہوتا ہے مساجد اس سے پاک ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد، ما یکرہ فی المساجد، جلد 1، صفحہ 55

اَنْ تُرْفَعَ، کبھی مسجد میں شعر پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے قائل کا قول ہے:

كَفحل العَذاب الفَرْدِ يضربه النَّدى تَعَلَّى النَّدَى فى متنه و تَحدّرا

ایک اور شاعر نے کہا:

إذا سقط السماء بأرض قوم رَعَيناه وان كانوا غِضابًا

اس قسم کے اشعار اگرچہ ان میں حمد وثنا نہیں ہے لیکن جائز ہیں کیونکہ یہ فواحش اور جھوٹ سے خالی ہیں۔ مزید جائز اشعار کا ذکر سورۃ الشعراء میں آئے گا جس میں عقلمند کے لیے کفایت ہے۔ دارقطنی نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ کے پاس شعر کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''یہ کلام ہے اس کا اچھا اچھا ہے اور اس کا قبیح، قبیح ہے'' (1) اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاص اور حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اس کو سنن میں ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: امام شافعی کے اصحاب یہ کلام امام شافعی سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں امام شافعی کے علاوہ اس کے ساتھ کسی نے کلام نہیں کی۔ گویا وہ ان احادیث پر آگاہ نہ تھے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 8۔** رہا مسجد میں آواز کو بلند کرنا تو اگر آواز بلند کرنے والے کی کوئی مصلحت ہو تو اس کو اس کے ارادہ کے خلاف بددعا دی جائے گی اس کی وجہ حضرت بریدہ کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے اور حدیث ابوہریرہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی شخص کو مسجد میں اپنی گمشدہ چیز تلاش کرتے ہوئے سنے تو وہ اسے کہے: اللہ تعالیٰ وہ تجھ پر نہ لوٹائے، کیونکہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں ہیں'' (2)۔ یہی امام مالک اور ایک جماعت کا نظریہ ہے حتیٰ کہ انہوں نے مسجد میں آواز بلند کرنے کو مکروہ کہا ہے خواہ علم وغیرہ کے لیے ہو۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور محمد بن مسلمہ مالکی نے خصومت اور علم کے لیے مسجد میں آواز بلند کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ لوگوں کی مجبوری ہے۔ یہ ظاہر حدیث کے مخالف ہے اور ان کا یہ کہنا کہ یہ لوگوں کی مجبوری ہے یہ درست نہیں ہے، بلکہ دو وجوہ کی بنا پر ان کے لیے بچنا ممکن ہے، (۱) مسجد میں وقار اور حرمت کو لازم پکڑنا ضروری ہے، دل سے اس کا احترام کرنا اور اس کی نقیض سے بچنا۔ (۲) اگر کوئی مجبوری ہو تو ان امور کے لیے علیحدہ جگہ بنالینی چاہیے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا آپ نے ایک رحبۃ بنایا تھا جس کو البطیحاء کہا جاتا تھا جو کلام کرنے یا شعر پڑھنے کا ارادہ کرے یعنی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں تو وہ اس رحبۃ کی طرف نکل جائے۔ یہ دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں اشعار پڑھنا ناپسند کرتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے مسجد سے باہر ایک رحبۃ (تھلا) بنایا تھا۔

**مسئلہ نمبر 9۔** جس مرد یا عورت کو خواہ وہ مسافر یا جس کا گھر ہی نہ ہو تو ضرورت کی بنا پر مسجد میں سونا جائز ہے ابوقلابہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے عکل قبیلہ کا ایک گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا تو وہ صفہ میں رہتے تھے۔

1۔ سنن دارقطنی، خبر الواحد یوجب العمل، جلد 2، صفحہ 155

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد، النھی من انشاد الضوال فی المسجد، جلد 1، صفحہ 56

حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر نے کہا: اصحاب صفہ فقراء تھے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں سوتے تھے وہ نوجوان، کنوارے تھے ان کے گھر والے نہیں تھے۔ امام بخاری کے لفظ ہیں اور انہوں نے ایک عنوان باندھا ہے مسجد میں عورت کا سونا۔ اور اس کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے جو اس کالی عورت کے بارے میں ہے جس پر اس کے مالکوں نے ہار چوری کرنے کی تہمت لگائی تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اس کا خیمہ یا جھونپڑی مسجد میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عطاء بن ابی رباح کے رات گزانے کی جگہ چالیس سال مسجد ہی رہی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام مسلم نے ابوحمید سے یا ابو اسید سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ یہ پڑھے (1) اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك۔ اور جب باہر نکلے تو وہ یہ پڑھے: اللّٰھم انی أسئلك من فضلك'' ابوداؤد نے بھی اس کو اسی طرح تخریج کیا ہے مگر انہوں نے یہ زائد نقل کیا ہے کہ ''جب مسجد میں داخل ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام اور درود پڑھے (2) پھر کہے: اللھم افتح لی۔۔۔ الخ'' ابن ماجہ نے حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ کہتے: باسم اللہ والسّلام علی رسول اللہ اللّٰھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك اور جب باہر نکلتے تو یہ کہتے: باسم اللہ والسّلام علی رسول اللہ اللّٰھم اغفرلی ذنوبی و افتح لی ابواب رحمتك (3) (اور جب باہر نکلتے تو یہ کہتے، باسم اللہ والصّلوۃ علی رسول اللہ اللّٰھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك وفضلك) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے (4) اور یہ کہے: اللھم افتح لی ابواب رحمتك اور جب مسجد سے باہر نکلے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کرے اور کہے: اللھم اعصمنی من الشیطان الرجیم، ابوداود نے حیوہ بن شریح سے روایت کیا ہے فرمایا میں عقبہ بن مسلم سے ملا تو اس نے مجھے کہا مجھے خبر پہنچی ہے کہ تو نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ ''جب آدمی مسجد میں داخل ہو تو یہ کہے (5) اعوذ باللہ العظیم وبوجھہ الکریم و سلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم، تو عقبہ بن مسلم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: جب آدمی یہ کہتا ہے تو شیطان کہتا ہے: وہ مجھ سے آج سارا دن محفوظ ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ مسلم نے ابوقتادہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے'' (6) اور ان سے یہ بھی مروی ہے فرمایا: ''میں مسجد میں داخل ہوا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ فرمایا میں بیٹھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنے سے کونسی چیز مانع تھی (7)، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے دیکھا کہ آپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، تو میں بھی

1۔ صحیح مسلم، مایقول اذا دخل المسجد، جلد 1، صفحہ 248

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد، الدعاء عند دخول المسجد، جلد 1، صفحہ 56　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، مایقول رجل عند دخولہ المسجد، جلد 1، صفحہ 67

6۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا، جلد 1، صفحہ 248　7۔ ایضاً

بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ نہ بیٹھے حتی کہ دو رکعت نماز پڑھ لے"۔ علماء نے فرمایا: مسجد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک فضلیت بنائی جس کی وجہ سے وہ دوسرے گھروں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ نہ بیٹھے حتی کہ نماز پڑھ لے۔ عام علماء کا خیال یہ ہے کہ رکوع کا امر استحباب اور ترغیب کے لیے ہے۔ داؤد اور اس کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ یہ قول باطل ہے اگر اس طرح ہوتا جیسا انہوں نے کہا ہے تو پھر بے وضو آدمی کا مسجد میں داخل ہونا حرام ہوتا حتی کہ وہ وضو کر لیتا میری معلومات کے مطابق اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابراہیم بن یزید نے اوزاعی سے انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے انہوں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ نہ بیٹھے حتی کہ دو رکعتیں ادا کرے اور جب تم میں سے کوئی اپنے گھر میں داخل ہو تو وہ نہ بیٹھے حتی کہ دو رکعتیں ادا کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں اس کی دو رکعتوں کو خیر بنا دے گا"۔ یہ حدیث تو مسجد اور گھر کے درمیان برابری کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے وقت نماز پڑھنے کا ذکر ایسی زیادتی ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے؛ یہ امام بخاری نے فرمایا ہے اس میں قتادہ کی حدیث صحیح ہے جو امام مسلم کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہے اور یہ ابراہیم میں نہیں جانتا کہ سوائے سعد بن عبد الحمید کے کسی نے ان سے روایت کیا ہو۔ اور میں ان کی صرف یہی ایک حدیث جانتا ہوں؛ یہ ابو محمد عبدالحق کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ سعید بن زبان نے روایت کیا ہے فرمایا مجھے میرے باپ نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے انہوں ابوہند سے روایت کیا فرمایا: تمیم داری شام سے مدینہ طیبہ کی طرف قنادیل، زیتون کا تیل اور عمدہ بٹی ہوئی رسیاں اٹھا کر لے آئے۔ وہ مدینہ طیبہ پہنچے تو اتفاق سے جمعہ کی رات تھی آپ نے اپنے غلام ابوالبزاء کو حکم دیا کہ انہیں جلا دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد کی طرف نکلے تو وہ ان قندیلوں کی وجہ سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "یہ کس نے کیا ہے؟" (1) لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! تمیم داری نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا: "تو نے اسلام کو روشن کیا اللہ تعالیٰ تجھ پر دنیا و آخرت کو منور فرمائے اگر میری بیٹی ہوتی تو میں تیرا اس سے نکاح کر دیتا" حضرت نوفل بن حارث نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری بیٹی ہے جس کو مغیرہ بنت نوفل کہا جاتا ہے آپ اس کے ساتھ اپنا ارادہ پورا کر لیں تمیم کا نکاح میری بیٹی سے کر دیں۔ حدیث کا راوی سعید کا باپ زبان ہے یہ زاء کے فتحہ اور باء کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ سعید کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے اور وہ ابوعثمان سعید بن زبان بن قائد بن زبان بن ابی ھند ہے، ابوھند بنی بیاضہ کا غلام تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پچھنے لگاتا تھا۔ اور حدیث میں المُقُط کا لفظ آیا ہے یہ القاط کی جمع ہے اس کا معنی رسی ہے گویا یہ القماط سے مقلوب ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا: سب سے پہلے مسجد میں جس نے قنادیل روشن کیں وہ تمیم داری تھے (2)۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے مسجد میں چراغ جلایا جبتک روشنی رہتی ہے فرشتے اور حاملین عرش اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور اس کے لیے استغفار کرتے ہیں مسجد کے غبار کو صاف کرنا

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الصلوٰۃ، متابعۃ الامام، جلد 2، صفحہ 227، حدیث 2406
2۔ ابن ماجہ، باب تطہیر المساجد و تطییبہا، 751

آہو چشم موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کا مہر ہے"۔ علماء نے فرمایا: مستحب ہے کہ اس گھر کو قنادیل لٹکا کر اور اس میں شمعیں جلا کر منور کیا جائے جسمیں قرآن پڑھا جاتا ہو اور رمضان کے مہینہ میں مسجد کی روشنیوں میں اضافہ کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ، علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ تسبیح کرنے والوں کا وصف بیان کر رہا ہے ان سے کون مراد ہیں؟ بعض علماء نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے امر کو ہر وقت نگاہ میں رکھنے والے اللہ کی رضا طلب کرنے والے ہیں جنہیں نماز سے اور اللہ کے ذکر سے امور دنیا میں سے کوئی چیز مشغول نہیں کرتی، بہت سے صحابہ کرام نے کہا: یہ آیت ان بازار میں کاروبار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی جب نماز کی آذان کی آواز سنتے تھے تو ہر کام چھوڑ دیتے تھے اور مسجد کی طرف جلدی کرتے تھے۔ سالم بن عبد اللہ نے بازار والوں کو دیکھا وہ نماز کی طرف آرہے تھے آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جنکا اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد سے ارادہ فرمایا: لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، عبد اللہ بن عامر، عاصم نے ابو بکر کی روایت میں اور حسن نے یسبح له فیها مجہول کا صیغہ پڑھا ہے (1)۔ نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، ابو عمرو، اور حمزہ یسبح باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے تھے اسی طرح ابو عمرو نے عاصم سے روایت کیا ہے اور جنہوں نے یسبح مجہول کا صیغہ پڑھا ہے وہ دو معانی کی بنا پر ہے ایک یہ کہ رجال کا رفع فعل مضمر کے ساتھ ہے جس پر ظاہر فعل دلالت کرتا ہے معنی یہ ہوگا یسبحه رجال۔ اس بنا پر الاصال پر وقف ہوگا سیبویہ نے اس کی مثال ذکر کی ہے:

لِیُبْكَ یَزِیدُ ضَارِعٌ لخصومة　د　مُخْتَبِطٌ مما تُطِیحُ الطَّوَائِحُ

اس کا مطلب ہے یبکیه ضارع اس بنا پر تو کہتا ہے: ضرب زید عمرو اس بنا پر کہ ضربه عمرو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رجال کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے۔ اس کی خبر، فِیْ بُیُوْتٍ ہے یعنی فی بیوت أذن الله أن ترفع رجال اور یسبح، ترفع کی ضمیر سے حال ہے گویا فرمایا: أن ترفع مسبحا له فیها اور اس تقدیر پر الاصال پر وقف نہ ہوگا۔ اور جنہوں نے یسبح معروف کا صیغہ پڑھا ہے انہوں نے الاصال پر وقف نہیں کیا کیونکہ یسبح، رجال کے لیے فعل ہے اور فعل فاعل کے لیے مجبور ہوتا ہے اس میں اضمار نہیں ہے، الغدو الاصال پر سورۂ اعراف کے آخر میں کلام گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا اس کا معنی ہے نماز پڑھتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: قرآن میں تسبیح کا لفظ صلاۃ کے لیے آیا ہے اور اس پر دلیل بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ کا ارشاد ہے یعنی صبح اور شام۔ اکثر مفسرین نے اس سے فرضی نماز مراد لی ہے یعنی الغدو سے مراد صبح کی نماز ہے اور الأصال سے مراد ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں کیونکہ الاصال کا اسم ان تمام نمازوں کو جمع کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ ابو داؤد نے حضرت ابو امامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص فرضی نماز کے لیے گھر سے باوضو نکلا اس کا اجر احرام باندھنے والے حاجی کے اجر کی طرح ہے اور جو چاشت کی نماز کے لیے نکلا اور اسے کھڑا نہیں کیا مگر چاشت کی نماز نے تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کی طرح ہے اور نماز کے پیچھے نماز پڑھنا (جن کے

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 386

درمیان لغو نہ ہو) علیین میں مکتوب ہے''۔ اور حضرت بریدہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''تاریکیوں میں مساجد کی طرف چل کر جانے والوں کو قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت دو'' (1)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جو مسجد کی طرف صبح گیا یا شام کو گیا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمان نوازی کرتا ہے جب بھی صبح جاتا ہے یا شام کو جاتا ہے (2)۔ اور غیر صحیح میں ہے تو وہ اس کی عزت و کرامت میں کوشش کرتا ہے؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے (3) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے گھر میں طہارت حاصل کی پھر اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر کی طرف چلا تاکہ اللہ کے فرائض میں سے ایک فریضہ ادا کرے تو اس کے ایک قدم سے اس کا گناہ گرتا ہے اور دوسرے قدم سے اس کا درجہ بلند ہوتا ہے''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اس کی گھر کی نماز اور بازار کی نماز پر بیس سے زائد درجہ ثواب زیادہ رکھتا ہے (4) یہ اس لیے ہے کہ ان میں سے کوئی جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد میں آتا ہے اور اسے صرف نماز ہی ادھر لے کر آتی ہے وہ صرف نماز کا ہی ارادہ کرتا ہے پس جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے تو وہ نماز میں ہوتا ہے جب تک اسے نماز روکے ہوئے ہوتی ہے اور فرشتے تم میں سے اس شخص کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی اس جگہ بیٹھا رہتا ہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہوتی ہے فرشتے کہتے ہیں: اللّٰھم أرحمه اللّٰھم اغفرله اللّٰھم تب علیه ''اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی مغفرت کر، اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما، یہ فرشتے کہتے رہتے ہیں جب تک بے وضو نہیں ہوتا'' ایک روایت میں ہے پوچھا: حدث سے کیا مراد ہے (5)؟ فرمایا: ''آہستہ سے ہوا خارج کرنا یا بلند آواز سے ہوا خارج کرنا''۔ حکیم بن زریق نے کہا: سعید بن مسیب سے پوچھا گیا کیا نماز جنازہ میں حاضر ہونا تمہارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے یا مسجد میں بیٹھنا؟ انہوں نے فرمایا: جو نماز جنازہ پڑھتا ہے اس کے لیے ایک قیراط ثواب ہے اور جو اس کے دفن ہونے تک ساتھ رہتا ہے اس کے لیے دو قیراط ثواب ہے اور مسجد میں بیٹھنا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے کیونکہ ملائکہ کہتے ہیں: اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما۔ حکم بن عمیر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا میں مہمان کی طرح ہو جاؤ مساجد کو گھر بناؤ اپنے دلوں کو رقت و نرمی کا عادی بناؤ، تفکر اور رونا زیادہ کرو تمہاری خواہشات تم پر مختلف نہ ہوں تم وہ بناتے ہو جس میں تم نے رہنا نہیں ہے اور تم وہ جمع کرتے ہو جو تم کھاتے نہیں ہو اور تم وہ امیدیں رکھتے ہو جو تم پاتے نہیں ہو''۔ حضرت ابو درداء نے اپنے بیٹے کو فرمایا: مسجد تیرا گھر ہونا چاہیے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ''مساجد متقین کے گھر ہیں اور مسجد جس کا گھر ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت و راحت اور پل صراط سے گزرنے کا ضامن ہو جاتا ہے'' ابو صادق ازدی نے شعیب حجاب کی طرف لکھا کہ مساجد

1۔ سنن ابن ماجہ، الدعاء عند دخول المسجد، جلد 1، صفحہ 57۔ ایضاً، ابوداؤد، باب ما جاء فی المشی الی الصلاۃ فی الظلام، حدیث 474

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، فضل الجلوس فی مسجد بعد الصبح، جلد 1، صفحہ 235

3۔ ایضاً، فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ، جلد 1، صفحہ 235 — 4۔ ایضاً — 5۔ ایضاً

کو لازم پکڑو کیونکہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ یہ انبیاء کی مجالس تھیں۔ ابو ادریس خولانی نے کہا: مساجد نیک اور معزز لوگوں کی مجالس ہیں۔ مالک بن دینار نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ الله تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندوں کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر میں مساجد کو آباد کرنے والوں، قرآن پڑھنے والوں اور اسلام کے بیٹوں کو دیکھتا ہوں تو میرا غضب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''آخر زمانہ میں کچھ لوگ ہوں گے وہ مساجد میں آئیں گے وہ ان میں حلقے بنا کر بیٹھیں گے ان کا ذکر دنیا اور اس کی محبت ہوگی پس تم ان کے ساتھ مت بیٹھو الله کو ان کی کوئی ضرورت نہیں''۔ ابن مسیب نے کہا: جو مسجد میں بیٹھتا ہے وہ اپنے رب کا جلیس ہوتا ہے پس اسے اچھی بات کہنی چاہیے۔ مساجد کی تعظیم اور ان کی حرمت سے اتنا گزر چکا ہے جسمیں کفایت ہے۔ بعض علماء نے مسجد کی تعظیم میں پندرہ خصلتوں کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا: مسجد کی حرمت سے ہے کہ داخل ہوتے وقت سلام کرے اگر لوگ مسجد میں بیٹھے ہوں، اگر مسجد میں کوئی نہ ہو تو کہے: السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین اور بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے اس میں خرید و فروخت نہ کرے، اس میں تیر اور تلوار نہ سونتے، اس میں گم شدہ چیز تلاش نہ کرے اور لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور جگہ کے لیے جھگڑا نہ کرے، صف میں کسی پر تنگی نہ کرے، کسی نمازی کے سامنے سے نہ گزرے، نہ مسجد میں تھوکے نہ ناک صاف کرے اور بلغم نہ ڈالے، اپنی انگلیوں کے چٹخارے نہ نکالے، اپنے جسم کے ساتھ نہ کھیلے، مسجد کو نجاسات، بچوں اور مجنونوں سے پاک رکھے، اس میں حدود قائم نہ کرے، کثرت سے الله کا ذکر کرے ذکر الٰہی سے کبھی غافل نہ ہو۔ جس نے یہ خصال پورے کیے تو اس نے مسجد کا حق ادا کر دیا اور مسجد اس کے لیے شیطان رجیم سے محفوظ قلعہ بن جائے گی۔ خبر میں ہے ''مسجد، لوگوں کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھالی گئی مسجد نے لوگوں کی شکایت کی تھی کیونکہ لوگ اس میں دنیا کی باتیں کر رہے تھے'' دار قطنی نے عامر شعبی سے روایت کیا ہے فرمایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرب قیامت سے یہ ہے کہ چاند سامنے نظر آئے گا تو کہا جائے گا: یہ تو دو راتوں کا ہے اور مساجد کو راستے بنایا جائے گا اور اچانک موت ظاہر ہوگی''۔ اس کو عبد الکبیر بن معافی نے شریک سے انہوں نے عباس بن ذریح سے انہوں نے شعبی سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے شعبی سے مرسلا روایت کی ہے۔ والله اعلم۔ ابو حاتم نے کہا: عبد الکبیر بن معافی ثقہ ہے اور ابدال میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ اور امام بخاری میں حضرت ابو موسیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جو ہماری مساجد اور ہمارے بازار سے تیروں کے ساتھ گزرے تو وہ ان کے بھالوں سے پکڑے تاکہ کسی مسلمان کو زخمی نہ کر دے'' (1) امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کرنا ہے'' (2)۔ حضرت ابو ذر سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کیے گئے تو میں نے ان کے اچھے اعمال میں سے راستے سے اذیت دینے والی چیز کا ہٹانا ہے اور ان کے برے اعمال سے مسجد میں رینٹ ڈالنا ہے جس کو دفن نہ کیا گیا ہو'' (3)۔ ابو داؤد نے فرج

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المرور فی المسجد، جلد 1، صفحہ 64

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، النہی عن بصاق فی المسجد فی الصلوٰۃ وغیرھا، جلد 1، صفحہ 207

3۔ ایضاً

بن فضالہ سے انہوں نے ابو سعد خمیری سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے واثلہ بن اسقع کو مسجد دمشق میں دیکھا انہوں نے چٹائی پر تھوکا پھر پاؤں سے اسے صاف کر دیا۔ ان سے پوچھا گیا: آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔ فرج بن فضالہ ضعیف ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں چٹائیاں نہیں تھیں۔ صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر تھوکتے تھے اور اپنے بائیں جوتے سے صاف کر دیتے تھے۔ شاید واثلہ نے اس کا اردہ کیا ہو اور چٹائی کو اس پر محمول کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رِجَالٌ خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرنا دلیل ہے کہ عورتوں کا مساجد میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ ان میں نہ جمعہ ہے اور نہ جماعت ہے۔ ان کی نماز ان کے گھروں میں افضل ہے۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''عورت کی اپنے گھر میں نماز اس کی حجرے کی نماز سے افضل ہے اور اپنے کمرے میں نماز گھر کے صحن کی نماز سے افضل ہے''(1)۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا تُلْهِيهِمْ انہیں مشغول نہیں کرتی، تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ خصوصی طور پر تجارت کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ انسان کو نماز سے بہت زیادہ غافل کرنیوالی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کہ بیع کا ذکر دوبارہ کیوں کیا جب کہ تجارت، بیع کو بھی شامل تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تجارۃ سے مراد شرا (خریدنا) ہے کیونکہ آگے بیع آیا ہوا ہے اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعۃ: 11) یہ واقدی کا قول ہے کلبی نے کہا: التجار سے مراد باہر سے اشیاء لانے والے مسافر ہیں اور الباعۃ سے مراد مقامی بیچنے والے ہیں۔ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ عطا نے کہا: اس سے مراد نماز میں حاضر ہونا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور فرمایا: اس سے مراد فرض نماز ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے مراد آذان ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام نے ذکر کیا ہے، بعض نے کہا: اس سے مراد اسماء حسنیٰ ہیں یعنی وہ اس کی وحدانیت اور بزرگی بیان کرتے ہیں۔ یہ آیت بازار میں تجارت کرنے والوں کے متعلق نازل ہوئی؛ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سالم نے کہا: حضرت عبداللہ بن عمر بازار سے گزر رہے تھے لوگ اپنی دوکانیں بند کر رہے تھے اور جماعت میں حاضری کے لیے اٹھے تھے آپ نے فرمایا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ ان کے متعلق نازل ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے ''یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں سفر کرتے ہیں اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرتے ہیں'' بعض علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو آدمی تھے ایک بیع کرتا تھا جب وہ آذان سنتا تھا تو اسے اٹھاتا نہیں تھا اور دوسرا شخص لوہار تھا وہ تجارت کے لیے تلواریں بناتا تھا جب وہ آذان سنتا اور اس کا ہتھوڑا، آئرن پر ہوتا تھا تو وہ اسے وہاں ہی رہنے دیتا تھا۔ اگر وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوتا تھا تو اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیتا تھا یہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے اور جو ان کی اقتدا کرنے والے ہیں ان کی ثنا کرتے ہوئے نازل کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِقَامِ الصَّلٰوةِ یہ دلیل ہے کہ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد نماز نہیں ہے ورنہ تکرار

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی خروج النساء الی المسجد، جلد 1، صفحہ 84۔ ایضاً، حدیث 483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اقام الصلوۃ، اقامۃ اصل میں مصدر اقواما تھا واؤ کی حرکت نقل کر کے قاف کو دی گئی پھر واؤ کو الف سے بدلا گیا دو الف اکٹھے ہوئے تو ایک کو حذف کیا گیا اور ھاء کو ثابت کیا تا کہ حذف ہوتے ہوتے لفظ ختم بھی نہ ہو جائے۔ جب مضاف کیا گیا تو مضاف کو ھاء کے قائم مقام رکھا گیا پس اس کا حذف جائز ہوا اگر مضاف نہ ہو تو ھاء کا حذف کرنا جائز نہیں کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تو کہتا ہے: وعد عدۃ و وزن زنۃ ھاء کا حذف جائز نہیں کیونکہ تو نے واؤ حذف کر دی ہے کیونکہ اصل میں ودعۃ اور وزنۃ تھا، جب مضاف کیا گیا تو ھاء حذف کی گئی۔ فراء نے یہ شعر لکھا ہے:

إِنِ الخَلِيطَ أَجَدُّوا البَيْنَ فَانْجَرَدُوا و أخلفوك عِدَالأَمرِ الذى وَعَدوا(1)

مراد عدۃ ہے۔ ھاء کو حذف کیا گیا جب مضاف کیا۔ حضرت انس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز دنیا کی مساجد کو لایا جائے گا گویا سفید عمدہ اونٹنیاں ہیں جن کے پاؤں عنبر کے ہیں، گردنیں زعفران کی ہیں، ان کے سر کستوری سے ہیں، ان کی مہاریں سبز زبرجد سے اور ان کے نگران اور ان میں آذان دینے والے ان کی قیادت کر رہے ہوں گے، ان کے ائمہ ان کو پیچھے سے چلا رہے ہوں گے، ان کو آباد کرنے والے ان سے چمٹے ہوئے ہوں گے وہ قیامت کے عرصات سے تیز رفتار بجلی کی طرح گذریں گے اہل موقف کہیں گے: یہ مقرب فرشتے ہیں یا مرسل انبیاء ہیں۔ ارشاد ہوگا: نہ یہ مقرب فرشتے ہیں نہ انبیاء ہیں لیکن یہ اہل مساجد ہیں اور امت محمد ﷺ سے نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں'' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا اسلام میں سے کچھ باقی نہ رہے گا سوائے اسلام کے نام کے اور قرآن میں سے کچھ باقی نہ رہے گا سوائے اس کے خط کے۔ لوگ مساجد کو تعمیر کریں گے اور یہ اللہ کے ذکر سے خالی ہوں گی اس زمانے کے برے ترین لوگ علماء ہوں گے ان سے فتنہ نکلے گا اور ان کی طرف لوٹے گا یعنی وہ جانتے ہوں گے اور جو واجبات ہوں گے ان پر عمل نہیں کرتے ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے؛ یہ حسن کا قول ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں زکوٰۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اخلاص ہے (2) کیونکہ ہر مومن کا مال نہیں ہوتا۔ يَخَافُوْنَ يَوْمًا یعنی قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔ تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ یعنی روز حشر ہولناکی اور دہشت سے گھبرا جائیں گے۔ التقلب کا معنی ہے پھرنا اور اس سے مراد کفار کے دل اور ان کی آنکھیں ہیں دل اپنی جگہ سے نکل کر گلوں تک آ جائیں گے۔ پھر یہ اپنی جگہوں پر واپس نہیں جائیں گے۔ بعض علماء نے کہا: دل نجات کی امید اور ہلاکت کے خوف کے درمیان گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ اور آنکھیں پھٹی پھٹی دیکھ رہی ہوں گی کہ کس طرف سے انہیں ان کے اعمال نامے دیئے جائیں گے اور کس طرف سے انہیں پکڑا جائے گا؟ بعض علماء نے کہا: شک کرنے والوں کے دل اس شک سے پھر جائیں گے جس میں پہلے تھے اسی طرح ان کی آنکھیں یقین کو دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ یہ اس قول کی مثل ہے: فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۞ (ق:22) جس کو وہ دنیا میں گمراہی دیکھتا تھا اب اسے ہدایت دیکھے گا

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 17، صفحہ 176 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 186

مگر آخرت میں انہیں یہ فائدہ نہ دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے دل جہنم کے انگاروں پر پھریں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوم تقلب وجوھھم فی النار، وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ (الانعام:110) اور جنہوں نے کہا کہ آگ کے شعلوں پر ان کے دل پھریں گے۔ بعض نے کہا: آگ کے شعلے ایک مرتبہ انہیں جھلسادیں گے اور پھر انہیں پکادیں گے۔ بعض نے کہا: دل مضطرب ہوں گے آنکھیں قیامت کی ہولناکیوں کو ادھر ادھر دیکھ رہی ہوں گی۔ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا نیکیوں پر جزا کا ذکر فرمایا اور برائیوں پر جزا کا ذکر نہیں فرمایا اگرچہ برائیوں پر بھی سزا ہوگی۔ اس کی دو حکمتیں ہیں: ایک یہ کہ یہ ترغیب ہے پس رغبت کے ذکر پر اکتفا کیا۔ دوسری یہ کہ یہ اس قوم کی صفت ہے جن کے گناہ کبیرہ نہ ہوں گے۔ اور ان کے صغیرہ گناہ معاف ہوں گے۔ وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ یہ دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو دس گنا کر دے گا۔ دوسرا یہ کہ جزا کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے گا۔ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ وہ اپنی عطا کا حساب کتاب نہیں رکھتا کیونکہ اس کی عطا کی کوئی نہایت بھی نہیں ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے قبا کی مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ جو مسجد بنائے گا وہ کامران ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اے ابن رواحہ! ہاں، اے ابن رواحہ''(1)۔ عبد اللہ نے عرض کی: اس نے اللہ کے لیے رات نہ گذاری ہو مگر سجدہ کرتے ہوئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اے ابن رواحہ''۔ فرمایا: ''سجع (جملوں کی بناوٹ ردیف، کافیے ملانا) سے رک جاؤ بندے کو طاقت لسان سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں دی گئی'' یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۞

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیاسا کہ وہ پانی ہے حتی کہ جب (پینے کے لیے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا اور پاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب تو پورا دیا اس نے اس کا حساب اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ پہلے مومن کی مثال دی تو اب کافر کی مثال دی۔ مقاتل نے کہا: یہ شیبۃ بن ربیعہ بن عبد شمس کے بارے میں نازل ہوئی وہ دین کی تلاش میں رہبانیت اختیار کر چکا تھا، جب رسول اللہ ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو اس نے کفر کیا۔ ابو سہل نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ ضحاک نے کہا: یہ کافر کے اعمال خیر میں نازل ہوئی جیسے صلہ رحمی، پڑوسیوں کو نفع پہنچانا وغیرہ۔ السراب جو گرمی کی شدت میں دوپہر کے وقت صحرا میں پانی کی طرح نظر آتی ہے مگر وہ زمین سے بلند ہوتا ہے حتی کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان ہو جاتا ہے سراب کو سراب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ پانی کی طرح چلتا ہے کہا جاتا ہے: سرب الفحل یعنی نر زمین میں چلا۔ اس کو الال بھی کہا جاتا ہے یہ خشکی اور گرمی میں ہوتا ہے پیاسا اس سے دھوکا کھاتا ہے؛ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 108

فکنت کمُفرِیقِ الذی ی سِقَائه     لِرَقْرَاقِ آلٍ فوقَ رابیَۃِ صَلْدِ

اور دوسرے نے کہا:

فلما کففنا الحرب کانت عهودهم     کلمح سراب بالفلا متالق (1)

امرا القیس نے کہا:

أَلَمْ أُنْضِ المَطِیّ بِکلِّ خَرْقٍ     أَمَقِّ الطُّولِ لَمَّاعِ السَّراب

القیعة، القاع کی جمع ہے جیسے حیرة، حار کی جمع ہے؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: قیعة وقاع واحد ہیں یہ نحاس نے حکایت کیا ہے۔ القاع زمین کا پھیلا ہوا حصہ جس میں کوئی بوٹی نہ ہو اس میں سراب ہوتا ہے یعنی چٹیل میدان القاع کا اصل معنی وہ پست جگہ ہے جس میں پانی ٹھہر جاتا ہے اور اس کی جمع قیعان ہے۔ جوہری نے کہا: القاع، ہموار زمین ہے۔ اس کی جمع اقوع، اقواع اور قیعان ہے ماقبل کسرہ کی وجہ سے واؤ، یا سے بدل گئی۔ القیعة، القاع کی مثل ہے یہ بھی واؤ سے ہے بعض نے کہا یہ جمع ہے، یحسبه الظمان، الظمآن سے مراد پیاسا ہے ماء یعنی سراب کو پانی گمان کرتا ہے، حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا یعنی جو اس نے اندازہ لگایا تھا اس نے اسے ایسی زمین میں پایا جس میں پانی نہیں ہوتا وہ ہلاک ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے، وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ۔ وہ الله تعالیٰ کو تاڑ میں پائے گا فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ اپنے عمل کی جزا۔ امرا القیس نے کہا:

فَوَلّٰی مُدْبِرًا یَهْوِی حَثِیثًا     وأَیْقَنَ أَنَّه لاقَی الحِسَابا

بعض علماء نے فرمایا وہ اپنے عمل کی جزا کے ساتھ الله کا وعدہ پائے گا۔ بعض نے کہا: وہ اپنے حشر کے وقت الله کا امر پائے گا۔ یہ تمام معانی متقارب ہیں۔ بقعات بھی پڑھا گیا ہے۔ مہدوی نے کہا: عین کے فتحہ کی وجہ سے الف اشباع کا ہونا بھی جائز ہے اور عزة وعزهاة ہونا بھی جائز ہے یہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو عورتوں کے قریب نہیں جاتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ قیعة کی جمع ہو۔ اس بنا پر وصل اور وقف میں تا ہوگی۔ نافع، ابن جعفر اور شیبة سے الظمان بغیر ہمزہ کے مروی ہے ان دونوں سے ہمزہ مشہور ہے کہا جاتا ہے: ظمی یظمأ ظمأ فهو ظمآن اگر تو ہمزہ میں تخفیف کرلے تو تو کہے گا: ظمان اور الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا مبتدا ہے۔ اَعْمَالُهُمْ مبتدا ثانی ہے۔ كَسَرَابٍ سے کاف خبر ہے اور پھر جملہ، الَّذِیْنَ کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ اَعْمَالُهُمْ۔ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا سے بدل ہو۔ یعنی اعمال الذین کفروا کسراب پھر مضاف کو حذف کیا گیا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

''یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 109

اس کے اوپر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل (تہ در تہ) اندھیرے میں ایک دوسرے کے اوپر جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لیے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لیے کہیں نور نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ، اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ایک اور مثال دی یعنی ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں یا تاریکیوں کی طرح ہیں۔ زجاج نے کہا اگر تو چاہے تو سراب سے تشبیہ دے اگر چاہے تو ظلمات سے تشبیہ دے (1)۔ او، اباحت کے لیے ہے جیسا کہ اَوْ كَصَيِّبٍ (البقرہ:19) میں گزر چکا ہے۔ جرجانی نے کہا: پہلی آیت کفار کے اعمال کے ذکر میں ہے اور دوسری ان کے کفر کے ذکر میں ہے ان کے اعمال پر کفر کو عطف کیا کیونکہ کفر بھی ان کے اعمال سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (المائدہ:16) یعنی اللہ تعالیٰ انہیں کفر سے ایمان کی طرف نکالتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: اَوْ كَظُلُمٰتٍ، او کذی الظلمات اور ذی مضاف کے حذف پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ۔ ضمیر کا مرجع محذوف ہے؛ قشیری نے کہا۔ زجاج کے نزدیک تمثیل کفار کے اعمال کے لیے واقع ہوئی ہے۔ ابوعلی کے نزدیک کافر کے لیے واقع ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں فرمایا: یہ کافر کے دل کی مثال ہے۔ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللجۃ کی طرف منسوب ہے۔ اس سے ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من رکب البحر اذا التج فقد برئت منہ الذمۃ۔ (2) جو سمندری سفر پر گیا جب وہ موجیں مار رہا تھا تو اس سے ذمہ بری ہے۔ التج الامر کا معنی ہے بڑا ہونا، خلط ملط ہونا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَسِبَتْهُ لُجَّةً (النمل:44) یعنی جو بہت گہرا ہو۔ لججت السفینۃ یعنی کشتی گہرائی میں چلی گئی۔ اللجۃ لام کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی گہرائی ہے اور اللجۃ لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی لوگوں کی آوازیں ہیں۔ کہتا ہے: سمعت لجۃ الناس میں نے لوگوں کی آوازیں سنیں۔ ابوالنجم نے کہا: فی لجۃ امسك فلانا عن فلان، التجت الأصوات۔ آوازیں خلط ملط ہوئیں اور شور وغل بڑھا۔ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ اس گہرے سمندر پر ایک موج بلند ہے۔ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ یعنی موج کے اوپر موج ہے اس دوسری موج پر بادل ہے پس موج کا خوف، ہوا کا خوف اور بادل کا خوف جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے یغشاہ موج من بعدہ موج یعنی ایک موج دوسری موج کے پیچھے آتی ہے حتیٰ کہ گویا وہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں یہ زیادہ خوفناک ہوتی ہے جب موجیں متواتر ہوں اور قریب قریب ہوں اور اس موج کے اوپر بادل ہے یہ دو وجوہ سے خوف کے لیے عظیم ہے، ایک یہ کہ اس نے ان ستاروں کو ڈھانپ دیا جن سے راستہ کی ہدایت و راہنمائی حاصل کی جاتی ہے دوسرا یہ کہ ہوا جو بادل کے ساتھ چلتی ہے اور بارش جو اس سے اترتی ہے۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ۔ ابن محیصن اور بزی نے ابن کثیر سے سحاب ظلمات اضافت اور جر کے ساتھ روایت کیا ہے۔ قنبل نے سحاب تنوین کے ساتھ پڑھا ہے ظلمات جر اور تنوین کے ساتھ۔ باقی قراء نے رفع اور تنوین کے ساتھ۔ مہدوی نے کہا: جس نے من فوقہ سحاب ظلمات اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بادل ان

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 388

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 271

تاریکیوں کے وقت بلند ہوتا ہے پس اسے ان کی طرف مضاف کیا گیا جیسے کہا جاتا ہے: سحاب رحمۃ جب بارش کے وقت بلند ہوتا ہے اور جنہوں نے سحاب ظلمات پڑھا ہے تو ظلمات کی جر پہلے ظلمات کی تاکید یا اس سے بدل کی بنا پر ہے اور سحاب مبتدا ہے اور من فوقہ خبر ہے اور جنہوں نے سحاب ظلمات پڑھا تو ظلمات مبتدا محذوف کی خبر ہوگی تقدیر یوں ہوگی ھی ظلمات او ھذہ ظلمات۔ ابن انباری نے کہا: مِنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مکمل نہیں کیونکہ من فوقہ سحاب موج کا صلہ ہے اور من فوقہ سحاب پر وقف حسن ہے۔ پھر۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ یہ نئی کلام ہے اس معنی پر بھی ظلمات بعضھا فوق بعض۔ اہل مکہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ظلمات پڑھا ہے اس معنی پر او کظلمات ظلمات بعضھا فوق بعض اس مذہب کی بناء پر السحاب پر وقف حسن نہ ہوگا بعض نے کہا: ان تاریکیوں سے مراد بادل کی تاریکی، موج کی تاریکی، رات کی تاریکی اور سمندر کی تاریکی ہے۔ پس جو ان تاریکیوں میں ہوتا ہے اسے کچھ نظر نہیں آتا اور نہ ستارہ نظر آتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الظلمات سے مراد سختیاں ہیں یعنی ایک دوسرے کے اوپر سختیاں ہیں۔ بعض نے کہا: الظلمات سے مراد کافر کے اعمال ہیں اور البحر اللجی سے مراد کافر کا دل ہے اور مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ سے مراد جہالت، شک اور حیرت ہے جو کافر کے دل پر چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور السحاب سے مراد رین، ختم اور مہر ہے جو اس کے دل پر لگی ہوئی ہے؛ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے یعنی وہ اپنے دل سے نور ایمان کو نہیں دیکھتا جیسے سمندر میں تاریکیوں والا جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو وہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: کافر، پانچ قسم کی تاریکیوں میں گھومتا رہتا ہے اس کی کلام تاریکی ہے، اس کا عمل تاریکی ہے، اس کا مدخل تاریکی ہے، اس کا مخرج تاریکی ہے اور قیامت کے روز آگ میں تاریکیوں کی طرف جائے گا۔ اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ یعنی دیکھنے والا جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے۔ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا تو وہ ظلمات کی شدت کی وجہ سے اسے دکھائی نہیں دیتا۔ زجاج اور ابوعبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے لم یرو لم یکد؛ یہی حسن کے قول کا معنی ہے اور لَمْ یَكَدْ کا معنی ہے اسے دیکھنے کی امید ہی نہ تھی۔ فراء نے کہا: کاد صلہ ہے یعنی اس نے اسے نہیں دیکھا جیسے تو کہتا ہے: ما کدت اعرفہ۔ مبرد نے کہا: اس کا مطلب ہے اس نے اسے نہیں دیکھا (1) مگر کوشش کے بعد جیسے تو کہتا ہے: ما کدت أراك من الظلمۃ۔ یعنی میں تاریکی کی وجہ سے تجھے دیکھ نہ پایا جبکہ اس نے اسے مایوسی اور مشکل کے بعد دیکھ لیا۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے دیکھنے کے قریب ہوا اور دیکھا نہیں جیسے کہا جاتا ہے: کاد العروس یکون امیرا، قریب تھا کہ دولہا امیر بن جاتا۔ کاد النعام یطیر قریب تھا شتر مرغ اڑنے لگے۔ کاد المنتعل یکون راکبا قریب تھا پیدل چلنے والا سوار ہو جاتا۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں سے صحیح قول وہ ہے جس کا معنی ہے رؤیت قریب نہ ہوئی جب اس کی رؤیت قریب نہ ہوئی پس اس نے اسے قریب وبعید سے نہیں دیکھا۔ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لیے نور نہیں بناتا اس پر معاملات تاریک ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اللہ تعالیٰ جس کے لیے دین نہیں بناتا اس کے لیے کوئی دین نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے جس کے لیے نور نہیں بنایا جس کے ساتھ وہ قیامت کے روز چلے گا وہ جنت کی طرف ہدایت نہیں پائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 288

ہے: وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (الحدید:28) زجاج نے کہا: یہ دنیا میں ہے مطلب یہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت نہیں دی وہ ہدایت یافتہ نہ ہوا۔ مقاتل بن سلیمان نے کہا: یہ آیت عتبة بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی وہ زمانہ جاہلیت میں دین تلاش کرتا تھا اور ٹاٹ کا لباس پہنتا تھا پھر اسلام میں کفر کیا۔ ماوردی نے کہا: یہ شیبة بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی وہ جاہلیت میں راہب بنا ہوا تھا اون کا لباس پہنتا تھا اور دین طلب کرتا تھا پھر اسلام میں کفر کیا۔ میں کہتا ہوں: یہ دونوں کفر میں تھے بعید نہیں کہ یہ دونوں اور ان کے علاوہ لوگ آیت میں مراد ہوں۔ بعض علماء نے کہا: یہ عبداللہ بن جحش کے بارے میں نازل ہوئی وہ مسلمان ہوا تھا۔ پھر حبشہ کی زمین کی طرف ہجرت کی تھی پھر اسلام قبول کرنے کے بعد نصرانی بن گیا تھا۔ ثعلبی نے ذکر کیا ہے حضرت انس نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے نور سے پیدا کیا اور ابوبکر کو میرے نور سے پیدا کیا۔ عمر اور عائشہ کو ابوبکر کے نور سے پیدا کیا اور میری امت کے مومنین کو عمر کے نور سے پیدا کیا اور میری امت کی مومنات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نور سے پیدا کیا جو مجھ سے محبت نہیں کرتا اور ابوبکر، عمر اور عائشہ سے محبت کرتا ہے تو اس کے لیے نور نہیں ہے'' تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۞۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۞ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۞

''کیا تم غور نہیں کرتے کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی تسبیح بیان کرتے ہیں سارے آسمانوں والے اور زمین والے اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور اپنی تسبیح اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے بادشاہی ہے سارے آسمانوں کی اور ساری زمین کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ جب آیات کی وضاحت ذکر کی تو حجت و دلائل میں اضافہ کیا اور بیان فرمایا کہ اس کی مصنوعات اپنی تبدیلی کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ ان کا کوئی صانع (بنانے والا) ہے، کمال پر قادر ہے اس کے لیے رسولوں کو بھیجنا ہے اس نے انہیں بھیجا اور معجزات کے ساتھ ان کی تائید فرمائی اور انہوں نے جنت و دوزخ کی خبر دی۔ اَلَمْ تَرَ میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس کا معنی الم تعلم ہے اور مراد تمام لوگ ہیں۔ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ، مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد فرشتے ہیں، وَ الْاَرْضِ جن و انس، وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: صلاۃ انسان کے لیے ہے اور تسبیح دوسری مخلوق کے لیے ہے۔ سفیان نے کہا: پرندوں کے لیے ایسی نماز ہے جس میں رکوع و سجود نہیں ہے(1)۔ بعض نے کہا: پرندوں کا پر مارنا نماز ہے اور ان کی آوازیں تسبیح ہیں؛ یہ نقاش نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 112

حکایت کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہاں تسبیح سے مراد مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا اثر نظر آتا ہے۔ صافات کا معنی ہے ہوا میں اپنے پر پھیلائے ہوئے۔ ایک جماعت نے الطیر کو من پر عطف کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ زجاج نے کہا: والطیر بمعنی مع الطیر بھی جائز ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: قمت وزیدا بمعنی مع زید۔ فرمایا: یہ رفع سے عمدہ ہے، فرمایا: اگر تو کہے قمت أنا و زید تو رفع بہتر ہوگا اور نصب جائز ہوگی۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ یہ مفہوم بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی صلاۃ اور تسبیح جانتا ہے یعنی وہ نمازی کی نماز اور تسبیح کرنے والے کی تسبیح کو جانتا ہے اس لیے فرمایا: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ یعنی اس پر ان کی طاعت اور تسبیح مخفی نہیں ہے۔ اس جہت سے بصریوں اور کوفیوں کے نزدیک فعل کے اضمار کے ساتھ کل پر نصب جائز ہے جس فعل کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے ہر نماز پڑھنے والا اپنی نماز کو جانتا ہے اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے جس کا اسے مکلف کیا گیا ہے، بعض لوگوں نے کل قد عُلِمَ صلاتہ و تسبیحة یعنی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ بعض نحویوں نے ذکر کیا ہے کہ بعض نے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ پڑھا ہے۔ یہ تقدیر ہونا بھی جائز ہے کل قد علمه الله صلاته و تسبیحه تمام کو اللہ تعالیٰ نے اس کی صلاۃ اور تسبیح سکھائی، پس تعلیم سے مراد سمجھانا ہو گا اور مراد خصوص ہے کیونکہ لوگوں میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کو سکھاتے نہیں ہیں۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ ہر استدلال کرنے والے نے اس سے استدلال کیا۔ استدلال کو تعلیم سے تعبیر کیا گیا؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔ یہاں صلاۃ بمعنی تسبیح ہے تاکید کے لیے تکرار کیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى (الانبیاء: 3) الصلاۃ کو تسبیح کہا جاتا ہے؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ یہ کئی مقام پر پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

”کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو پھر جوڑتا ہے اس کے (بکھرے ٹکڑوں) کو پھر اسے تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو، کہ نکلتی ہے اس کے درمیان سے اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے پس نقصان پہنچاتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور پھیر دیتا ہے اس کو جس سے چاہتا ہے، قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک لے جائے آنکھوں کی بینائی کو، بدلی کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ رات اور دن کی، بیشک اس میں عبرت ہے آنکھوں والوں کے لیے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ایک اور حجت ذکر فرمائی یعنی کہا: آپ نے اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ يُزْجِيْ سَحَابًا وہ جہاں چاہتا ہے بادل کو لے جاتا ہے۔ الریح تزجی السحاب ہوا بادل کو چلاتی ہے۔

والبقرة تزجی ولدها گائے اپنے بچے کو چلاتی ہے اسی سے ہے زجا الخراج یزجو زجاء جب خراج لینا آسان ہو(1)۔ نابغہ نے کہا:

إنّی أتیتك من أهلی ومن وطنی أزجی حُشاشَةَ نفسٍ مابها رمَقُ

اور اس نے یہ بھی کہا:

أسرَتْ علیه من الجَوْزَاءِ سارِیَةٌ تُزجی الشَّمَالُ علیه جامدَ البَرَدِ

ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیۡنَهٗ اس کو پیدا کرنے کے بعد اسے جمع کرتا ہے تا کہ وہ مضبوط ہو جائے، مل جائے اور کثیف ہو جائے۔ التالیف میں اصل ہمزہ ہے تو کہتا ہے: تالف اور اس کو یولف واؤ کے ساتھ تخفیفاً پڑھا گیا ہے۔ السحاب واحد ہے لیکن اس کا معنی جمع ہے اسی وجہ سے فرمایا: یُنۡشِئُ السَّحَابَ (الرعد: 12) اور بین دو چیزوں یا زیادہ چیزوں کے درمیان واقع ہوتا ہے پس یہاں بینهٗ کیسے جائز ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بینهٗ یہاں سحاب کی جماعت کے لیے ہے جیسے تو کہتا ہے: الشجر جلست بینهٗ کیونکہ وہ جمع ہے اور لفظ کے اعتبار سے ضمیر واحد ذکر کی؛ یہ معنی فراء نے بیان کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ السحاب واحد ہے اور بینهٗ کہنا جائز ہے کیونکہ وہ بہت سے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جیسے شاعر نے کہا: بین الدخول وحومل۔ دخول پر بین داخل کیا ہے حالانکہ وہ واحد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت سے مقامات پر مشتمل ہے جیسے تو کہتا ہے: مازلت أدور بین الكوفة۔ میں کوفہ میں گھومتا رہا کیونکہ کوفہ بہت سے مکانات ہیں؛ یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ اصمعی کا خیال ہے کہ یہ جائز نہیں ہے اور وہ روایت کرتا تھا بین الدخول وحومل۔ ثُمَّ یَجۡعَلُهٗ رُكَامًا۔ تہہ در تہہ کر دیتا ہے، بعض کو بعض سے جوڑ دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنۡ یَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ (الطور) الركم کا معنی ہے کسی چیز کا جمع کرنا اسی سے کہا جاتا ہے: ركم الشئي يركمه ركما جب وہ کسی چیز کو جمع کر دے اور بعض کو بعض پر ڈال دے۔ ارتكم الشئي وتراكم جب جمع ہو جائے الركمة جمع شدہ مٹی الركام ریت کا ٹیلہ اسی طرح بادل وغیرہ مرتكم الطریق راستہ فَتَرَى الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ۔ الودق کے بارے دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد بجلی ہے؛ یہ ابو الاشہب عقیلی کا قول ہے؛ اسی سے شاعر کا قول ہے:

أثرنا عجاجة و جرجن منها خروج الوَدْق من خَلَل السحاب (2)

دوسرا معنی ہے بارش؛ یہ جمہور کا قول ہے؛ اسی سے شاعر کا قول ہے:

فلا مُزْنة ودَقَت ودْقَها ولا أرضَ أبْقَلَ إبقالَها (3)

امراء القیس نے کہا:

فد معهما وَدْقٌ و سَحٌّ ودِیمَةٌ وسَكْبٌ وتَو كَافٌ و تَنْهَمِلانِ

کہا جاتا ہے: وَدَقَت السحابة فهي وادقة ووَدَقَ المطر يَدِق وَدْقًا اس کا مطلب ہے بارش برسی ودقت الیه میں اس

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 112 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 113 3۔ احکام القرآن للطبری، جز 17، صفحہ 183

کے قریب ہوا۔ ضرب المثل ہے ودق البعیر الی الماء۔ اونٹ پانی کے قریب ہوا۔ یہ مثال اس شخص کے لیے دی جاتی ہے جو کسی چیز کے حرص کی وجہ سے اس کے لیے جھک جاتا ہے۔ اسم ظرف مودق۔ ودقت به ودقا کا معنی ہے میں نے اس سے انس حاصل کیا جس جانور کے سم ہوں جب وہ نر کا ارادہ کرے نر کو چاہے۔ ودقت تدق ودقا او دقت واستودقت۔ اتان (گدھی) ودوق و فرس ودوق ودیق بھی اور وادق بھی استعمال ہوتا ہے الودیقة گرمی کی شدت کو کہتے ہیں خلال، خلل کی جمع ہے جیسے جبل کی جمع جبال ہے اس سے مراد سوراخ اور بادل سے بارش کے نکلنے کی جگہ ہے۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ کعب نے کہا: بادل بارش کی چھانی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو پانی آسمان سے اکٹھا اترتا اور جس جگہ پر گزرتا اسے خراب کر دیتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور ابوالعالیہ نے کہا: من خلله یعنی مفرد پڑھا ہے۔ تو کہتا ہے: کنت فی خلال القوم یعنی میں ان کے درمیان تھا۔ وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آسمان میں برف کے پہاڑ پیدا کیے وہ ان سے اولے نازل فرماتا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی ینزل من جبال البرد بردا برف کے پہاڑوں سے برف نازل کرتا ہے۔ مفعول محذوف ہے۔ اسی طرح کا قول فراء کا ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے من جبال برد ان کے نزدیک جبال ہی برد (برف) ہیں۔ برد محل جر میں ہے اس قول کی بنا پر معنی ہوگا من جبال برد فیھا یعنی جبال کی تنوین کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آسمان میں پہاڑ پیدا فرمائے جن میں برف ہے تقدیر اس طرح ہوگی وینزل من السماء من جبال فیھا برد۔ اور من صلہ ہے، بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ آسمان سے پہاڑوں کی مقدار یا پہاڑوں کی مثل برف نازل کرنے کی ابتدا ہے۔ اور دوسرا من تبعیض کے لیے ہے کیونکہ برف، پہاڑوں کا بعض ہے اور تیسرا من جنس کے بیان کے لیے ہے کیونکہ ان پہاڑوں کی جنس برف سے ہے۔ اخفش نے کہا الجبال اور برد سے پہلے من دونوں جگہ زائدہ ہے (1) اور الجبال اور البرد محل نصب میں ہیں یعنی ینزل من السماء بردا یکون کالجبال آسمان سے برف نازل کرتا ہے جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ پس اس کا پہنچانا عذاب ہے اس کا اسے پھیر لینا نعمت ہے۔ یہ سورۂ بقرہ اور سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے اور جو کڑک کی آواز سن کر تین مرتبہ کہتا ہے: سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکة من خیفته تو اس کڑک سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس سے بچ جاتا ہے۔ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یعنی بادل میں جو بجلی ہے اس کی چمک۔ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ اپنی شدت کی چمک اور روشنی کی وجہ سے آنکھوں کو لے جائے شاخ نے کہا:

وما كادت إذا رفعتْ سَناها　　لِيُبْصِر ضوْءها إلّا البَصِيرُ (2)

امراء القیس نے کہا:

يضيئى سَناه أو مصابيحُ راهبٍ　　أهان السَّلِيط فى الذُّبال المُفَتَّلِ (3)

السنا مقصود ہے بجلی کی چمک۔ السنا ایک بوٹی ہے جس سے دوا کی جاتی ہے۔ السناء ممدود بھی ہے اسی طرح طلحہ بن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 190　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 113　　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 114

مصرف نے سناء، روشنی اور صفائی کی شدت میں مبالغہ کے اظہار کے لیے مد کے ساتھ پڑھا ہے اس پر شرف کے اسم کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ مبرد نے کہا: السنا مقصود ہے اس کا معنی چمک ہے۔ جب یہ شرف اور حسب کے معنی میں ہو تو ممدود ہوتا ہے ان دونوں کی اصل ایک ہی ہے اور وہ چمکنا ہے۔ طلحہ بن مصرف نے البرقة بجلی کی مقدار البرقة اسم مرة۔ جحدری اور ابن القعقاع نے کہا: یُذْهِبُ بِالْاَبْصَارِ میں باء صلہ زائدہ ہے۔ باقی قراء نے یذهب الابصار یاء اور ھا کے فتحہ کیساتھ پڑھا ہے۔ باء الصاق کے لیے ہے البرق بادل کے گھنا ہونے کی دلیل ہے اور بارش کی تیزی کی بشارت ہے اور بجلی کے نزول سے ڈرانے والی ہے۔ یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ بعض علماء نے کہا: ان کی تقلیب سے یہ مراد ہے کہ ایک کے بعد دوسرے کو لاتا ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان میں کمی اور زیادتی کرتا ہے۔ بعض نے کہا: کبھی دن کو بادل کی تاریکی سے بدل دیتا ہے کبھی سورج کی روشنی سے چمکا دیتا ہے اسی طرح کبھی رات کو بادل سے تاریک کر دیتا ہے اور کبھی چاند کی روشنی سے روشن کر دیتا ہے؛ یہ نقاش کا قول ہے۔ بعض نے کہا: ان کی تقلیب سے مراد ان میں خیر و شر، نفع و ضرر کا جو اختلاف ہوتا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ یعنی لیل و نہار کی تبدیلی میں سے جو ہم نے ذکر کیا ہے بارش کے احوال اور گرمی و سردی کے احوال سے جو ذکر کیا ہے۔ لَعِبْرَةً عبرت ہے۔ لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔ میری مخلوق میں سے صاحب بصیرت لوگوں کے لیے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰى رِجْلَیْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴۶﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے تو ان میں کچھ تو رینگتے ہیں پیٹ کے بل اور ان میں سے بعض چلتے ہیں دو ٹانگوں پر اور ان میں سے بعض چلتے ہیں چار ٹانگوں پر، پیدا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو (حق کو) صاف صاف بیان کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا ہے دونوں قراءتوں میں معنی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو خبریں دی ہیں۔ پس اس میں یہ کہنا مناسب نہیں کہ ایک قرات دوسری قرات سے اصح ہے۔ بعض علماء نے کہا: خلق مخصوص چیز کے لیے ہے اور خالق عموم پر بولا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الْخَالِقُ الْبَارِئُ (الحشر: 24) اور خصوص میں فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (الانعام: 1) اسی طرح هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (الاعراف: 189) پس الله خلق كل دابة من ماء ہونا ضروری ہے۔ الدابة حیوان میں سے جو سطح زمین پر چلتا ہے کہا جاتا ہے: دب یدب فهو داب۔ اس میں ھاء مبالغہ کے لیے ہے۔ یہ سورۂ بقرہ

میں گزر چکا ہے۔ من ماء۔ اس میں جن اور ملائکہ داخل نہیں کیونکہ ہم انہیں نہیں دیکھتے اور نہ یہ ثابت ہے کہ وہ پانی سے پیدا کیے گئے ہیں بلکہ صحیح میں ہے کہ ''ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں''۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مفسرین نے کہا: من ماء سے مراد من نطفۃ یعنی نطفہ سے پیدا کیا ہے(1) کہ ہر انسان کی تخلیق میں پانی ہے جس طرح آدم کو پانی اور مٹی سے پیدا فرمایا اس بناء پر نبی کریم ﷺ نے اس شیخ سے فرمایا تھا جس نے غزوہ بدر میں پوچھا تھا: تم کس سے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تھا: نحن من ماء ہم پانی سے ہیں۔ الحدیث۔ ایک قوم نے کہا: جن و فرشتوں کی استثنا نہیں ہے بلکہ ہر حیوان پانی سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے پیدا کی گئی ہے، ہوا پانی سے پیدا کی گئی ہے کیونکہ عالم کی سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ پانی تھا پھر اس سے ہر چیز بنائی۔ میں کہتا ہوں: اس کی صحت پر یہ قول دلالت کرتا ہے: **فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ**۔ پیٹ کے بل چلنا سانپوں اور مچھلیوں کے لیے ہے اور اسی طرح دوسرے کیڑوں کے لیے ہے اور دو ٹانگوں پر چلنا انسان اور پرندوں کے لیے ہے اور چار ٹانگوں پر چلنا حیوان کے لیے ہے۔ مصحف ابی میں ہے و منھم من یمشی علی اکثر۔ اس زیادتی کے ساتھ تمام حیوان شامل ہو گئے جیسے سرطان اور خشاش وغیرہ، لیکن ان الفاظ کو اجماع نے ثابت نہیں کیا۔ لیکن نقاش نے کہا: چار ٹانگوں پر چلنے والوں کے ذکر پر اکتفا کیا(2) اور اس سے زیادہ پر چلنے والوں کے ذکر سے استغنا کیا کیونکہ تمام حیوانوں کا اعتماد چار ٹانگوں پر ہوتا ہے یہ اس کے چلنے کا سہارا ہوتی ہیں اور بعض حیوانوں میں ٹانگوں کی کثرت اس کی خلقت میں زیادتی ہے وہ حیوان ان تمام ٹانگوں پر چلنے کا محتاج نہیں ہوتا۔ ابن عطیہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ کثیر ٹانگیں اس کے چلنے میں حرکت کرتی ہیں (3)۔ بعض نے کہا: کتاب میں چار سے زیادہ پر چلنے کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ چار سے زیادہ پر چلنا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اضمار ہے و منھم من یمشی علی اکثر من اربع جیسا کہ حضرت ابی کے مصحف میں ہے، واللہ اعلم۔ دابۃ کا لفظ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول کو شامل ہے اور ذوی العقول کو غلبہ دیا کیونکہ جو غیر ذوی العقول کے ساتھ ہو جمع ہوتا ہے کیونکہ ذوی العقول مخاطب اور مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے فرمایا **مِنْهُمْ**۔ اور فرمایا **مَّنْ يَّمْشِيْ**۔ اور اس اختلاف کے ساتھ صانع کے ثبوت کی طرف اشارہ کیا۔ اگر تمام کا صانع مختار نہ ہوتا تو وہ مختلف نہ ہوتے بلکہ وہ ایک جنس سے ہوتے یہ اس قول کی طرح ہے۔ **يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ** (الرعد: 4) **يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ**۔ جو ارادہ کرتا ہے اس پر قادر ہے۔ **لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝** اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

**وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝**

''وہ کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور (اس کے) رسول پر اور ہم فرمانبردار ہیں پھر منہ پھیر لیتا ہے ایک فریق ان سے (ایمان و اطاعت کے) اس دعویٰ کے بعد اور یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں''۔

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 391	2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 191	3۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ زبان سے کہتے ہیں: ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے لیکن ان کا یہ کہنا اخلاص اور یقین کے بغیر ہوتا ہے۔ وَ اَطَعْنَا۔ وہ کہتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔

وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

''جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں سے روگردانی کرنے لگتی ہے۔ اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہو تو (بھاگے) چلے آتے ہیں اس کی طرف تسلیم کرتے ہوئے۔ کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے یا وہ (اسلام کے متعلق) شک میں مبتلا ہیں یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ ظلم کرے گا اللہ تعالیٰ ان پر اور اس کا رسول بلکہ (درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ طبری وغیرہ نے کہا: ایک منافق آدمی جس کا نام بشر تھا اس کے اور ایک یہودی کے درمیان زمین کا جھگڑا تھا یہودی نے اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے بلایا۔ منافق چونکہ حق پر نہ تھا اس نے آپ کے پاس آنے سے انکار کیا اور اس نے کہا: نعوذ باللہ محمد ﷺ ہم پر ظلم کرتا ہے ہم کعب بن اشرف (یہودی) کو اپنا حاکم بناتے ہیں تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مغیرہ بن وائل جو بنی امیہ سے تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان پانی اور زمین کا جھگڑا تھا۔ مغیرہ نے انکار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے جائیں، مغیرہ نے کہا: وہ مجھ سے بغض کرتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لیحکم مفرد صیغہ ذکر فرمایا۔ لیحکما تثنیہ کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا کیونکہ اس سے مراد رسول مکرم ﷺ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور کلام کے آغاز کے لیے تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اطاعت کرتے ہوئے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ آپ ﷺ حق کے ساتھ فیصلہ فرماتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اَذْعَنَ فلانٌ لحکم فلان يُذْعِن اذعانا تسلیم کرنا نقاش نے کہا: مذعنین کا مطلب ہے خضوع کا اظہار کرتے ہوئے (1)۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے جلدی کرتے ہوئے۔ اخفش اور ابن اعرابی نے کہا: اقرار کرتے ہوئے۔ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد شک وشبہ ہے۔ اَمِ ارْتَابُوْۤا۔ کیا انہیں آپ کی نبوت اور عدل میں شک پڑ گیا ہے، اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ یا انہیں خوف ہے کہ فیصلہ میں اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے۔ استفہام کے لفظ سے کلام ذکر کی کیونکہ یہ توبیخ میں سخت ہے اور مذمت میں ابلغ ہے جیسے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 115

جریر نے مدح میں کہا:

أَلستم خیر من رکب المطایا  وأنْدَیٰ العالمین بُطُونَ راحِ (1)

بَلْ أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ وہ معاند اور کافر ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے اعراض کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ فیصلہ کرنے کا اختیار مسلمانوں کے لیے ہوگا جب معاہد اور مسلم کے درمیان فیصلہ ہو۔ اس میں ذمیوں کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اگر جھگڑا ذمیوں کے درمیان ہو تو پھر ان کا قاضی ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں ذمی اسلام کے قاضی کے پاس آئیں تو اس کی مرضی ہے چاہے تو فیصلہ کر دے چاہے تو اعراض کر لے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں گزرا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ آیت دلیل ہے کہ کوئی شخص کسی کو کسی جھگڑے میں تصفیہ کے لیے کسی قاضی کی طرف بلائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ضرور اس قاضی کے پاس جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی سخت مذمت کی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بلایا جائے تاکہ آپ اس کے اور اس کے خصم کے درمیان فیصلہ کریں اور وہ انکار کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ، ابن خویز منداد نے کہا: جس کو قاضی کی عدالت میں بلایا جائے اسے جانا واجب ہے جب کہ اسے معلوم نہ ہو کہ قاضی فاسق ہے یا مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان عداوت ہے۔ زہراوی نے حسن بن ابی الحسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے خصم کو کسی مسلمان حاکم کی طرف بلایا اور وہ نہ آیا تو وہ ظالم ہے اور اسے حق نہیں ہے'' (2) یہ بھی ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے۔ رہا یہ قول کہ وہ ظالم ہے، یہ کلام صحیح ہے اور رہا یہ قول کہ اس کا حق نہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ وہ غیر حق پر ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۭ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝

''ایمانداروں کی بات تو صرف اتنی ہے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ فرمائیں ان کے درمیان تو وہ کہتے ہیں ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں بامراد ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ یعنی مومنین کو جب کتاب اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کی طرف بلایا جاتا ہے۔ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا تو وہ کہتے ہیں ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار کی اطاعت کی خبر دے رہا ہے اگرچہ فیصلہ ان کے خلاف بھی ہوتا تو وہ یہی کہتے تھے۔ وہ منافق اگر ایماندار ہوتے تو کہتے: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا قول پر نصب کان کی خبر کی بنا پر ہے اور اس کا اسم ان یقولوا ہے جیسے یہ ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (آل عمران: 147) بعض علما نے کہا: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور کان کلام میں صلہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا۝

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 392
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 116

(مریم) ابن القعقاع نے لیحکم بینھم پڑھا ہے یعنی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب نے انما قول کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

''جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ڈرتا رہتا ہے اللہ سے اور بچتا رہتا ہے اس (کی نافرمانی) سے تو یہی لوگ کامیاب ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرتا ہے۔ حفص نے ویتقه کو جزم کی نیت پر قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ شاعر نے کہا:

ومن يَتَّقِ فإنَّ الله معه	ورِزْقُ الله مُؤتابٌ وغادِي

باقی قراء نے قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کی جزم اس کے آخر کے حذف کے ساتھ ہے۔ ابو عمرو اور ابو بکر نے ھا کو ساکن کیا ہے یعقوب اور قالون نے نافع سے اور بستی نے ابو عمرو اور حفص سے کسرہ میں اختلاس روایت کیا ہے باقی قراء نے ھا کے کسرہ کو اشباع کیا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ حضرت اسلم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک روز مسجد میں کھڑے تھے روم کا ایک دہقان ان کے پاس کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا: انا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: میں نے اللہ کے لیے اسلام قبول کر لیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا اس کا کوئی سبب ہے؟ اس نے کہا: ہاں میں نے تورات، زبور، انجیل اور بہت سی انبیاء کرام کی کتابیں پڑھیں میں نے ایک قیدی کو قرآن کی ایک آیت پڑھتے ہوئے سنا جس میں سابقہ کتب کی ہر چیز جمع تھی، تو میں نے جان لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے پس میں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے کہا: یہ آیت ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائض میں اللہ کی۔ وَرَسُوْلَهٗ۔ اور سنن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وَيَخْشَ اللّٰهَ۔ اور گزشتہ عمر کی غلطیوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ وَيَتَّقْهِ اور آئندہ عمر میں گناہوں سے بچتا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کامیاب وہ ہے جو آگ سے نجات پا گیا اور جنت میں داخل ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے جوامع الکلم کی شان دی گئی ہے'' (2)۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی بڑے زور سے کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ (گھروں سے بھی) نکل جائیں گے فرمائیے: قسمیں نہ کھاؤ تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ پھر منافقین کے ذکر کی طرف رجوع کیا جب اللہ تعالیٰ نے حکم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 119

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 200

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آنے پر ان کی کراہت بیان کی تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اللہ کی قسم! اگر آپ ہمیں اپنے گھروں، عورتوں اور اپنے اموال کو چھوڑ کر نکل جانے کا حکم دیں تو ہم نکل جائیں گے، اگر آپ ہمیں جہاد کا حکم دیں تو ہم آپ کے ساتھ نکلیں گے نئے حکم میں اور آپ کی اطاعت کریں گے۔ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ یعنی پوری طاقت سے قسمیں اٹھائیں۔ مقاتل نے کہا: جس نے اللہ کی قسم اٹھائی اس نے قسم میں زور لگایا۔ اس کا ذکر سورہ انعام میں گزر چکا ہے۔ جهد مصدر کی بنا پر منصوب ہے اس کی تقدیر اقساما بلیغا ہے۔ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا بیان کلام مکمل ہوا، طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ معروف طاعت تمہارے لیے تمہاری قسموں سے بہتر ہے یا یہ معنی کہ تمہاری طرف سے طاعت معروفۃ ہونی چاہیے اور دل کے اخلاص کے ساتھ قول معروف ہونا چاہیے قسم کی ضرورت نہیں۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے میں نے تمہاری طاعت جان لی ہے یہ کذب اور تکذیب ہے یعنی تمہاری طرف سے معروف جھوٹ ہے اخلاص نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ تعالیٰ تمہاری زبان سے اطاعت اور عمل سے مخالفت کو جانتا ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

"آپ فرمائیے: اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول مکرم کی پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذمہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا ہے اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا اور اگر تم اطاعت کرو گے اس کی تو ہدایت پا جاؤ گے اور نہیں ہے (ہمارے) رسول کے ذمہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ نفاق کو چھوڑ کر اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا یہ اصل میں تتولوا تھا ایک تا کو حذف کیا گیا اس پر دلیل اس کے بعد علیکم کا لفظ ہے وہاں غائب کی ضمیر علیھم ذکر نہیں کی۔ فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ اس پر پیغام پہنچانا لازم کیا گیا ہے۔ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ اور تم پر ان کی اطاعت لازم کی گئی ہے۔ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ الْبَلٰغُ سے مراد تبلیغ پیغام پہنچانا ہے۔ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ واضح۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

"وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے اور مستحکم کر دے گا ان کے لیے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لیے اور وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف کو امن سے، وہ میری

عبادت کرتے ہیں کسی کو میرا شریک نہیں بناتے، اور جس نے ناشکری کی اس کے بعد وہی لوگ نافرمان ہیں''۔

یہ آیت سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ امام مالک کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا سبب یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام نے دشمن کے سخت مقابلہ کی شکایت کی اور جو انہیں اپنے نفسوں پر خوف تھا اس کا ذکر کیا اور وہ اپنے ہتھیار رکھتے نہیں تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابوالعالیہ نے کہا: وحی کے بعد دس سال مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام خوفزدہ ہو کر رہے۔ اللہ تعالیٰ سے سراً اور جہراً دعا کرتے تھے۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا وہ ڈرتے ہوئے صبح کرتے تھے اور شام کو ہتھیاروں میں ہوتے تھے۔ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہم پر کوئی ایسا دن نہیں آئے گا جس میں ہم امن سے ہوں گے اور ہتھیار اتار دیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تھوڑا سا وقت گزرے گا حتی کہ تم میں سے ایک شخص بڑے مجمع میں گوٹھ مار کر بیٹھے گا اور اس پر ہتھیار نہ ہوگا'' (1) تو یہ آیت نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جزیرہ عرب پر غالب کیا تو انہوں نے ہتھیار اتار دیے اور امن میں ہو گئے۔ نحاس نے کہا: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ وعدہ پورا کیا۔ ضحاک نے نقاش کی کتاب میں کہا کہ یہ آیت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی خلافت کو متضمن ہے (2) کیونکہ وہ اہل ایمان تھے اور اعمال صالحہ کرنے والے تھے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی'' اس قول کی طرف ابن عربی نے ''احکام'' میں اشارہ کیا ہے اور اس قول کو پسند کیا ہے۔ فرمایا: ہمارے علماء نے فرمایا یہ آیت خلفاء اربعہ کی خلافت کی دلیل ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیفہ بنایا اور ان کی امانت پر راضی ہوا۔ وہ لوگ اس دین پر تھے جو اس نے ان کے لیے پسند کیا تھا، کیونکہ آج تک فضیلت میں کوئی شخص ان سے آگے نہیں بڑھا خلافت ان کے لیے قائم ہوئی انہوں نے مسلمانوں کو صحیح سمت چلایا اور دین کا پورا دفاع کیا۔ اور ان میں یہ وعدہ پورا ہوا۔ اگر ان میں یہ وعدہ پورا نہیں ہوا اور ان میں نافذ نہیں اور ان پر وارد نہیں ہوا تو پھر کن لوگوں میں پورا ہوگا؟ آج تک ان کے بعد ان کی مثل نہیں آیا اور نہ بعد میں کوئی ایسا ہوگا رضی اللہ عنہم؛ یہ قول قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے غلام سفینہ نے روایت کی ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی پھر ملوکیت ہوگی'' (3)۔ سفینہ نے کہا: اے سعید! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت دو سال، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دس سال، حضرت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چھ سال شمار کر۔ ایک قوم نے کہا: یہ وعدہ تمام امت کو ہے کہ وہ کلمہ اسلام کے تحت ساری زمین کے مالک ہوں گے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زویت لی الأرض فرأیت مشارقها و مغاربها و سیبلغ ملك أمتی ما زوی لی منها (4)۔ میرے لیے زمین سمیٹ دی گئی میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھا اور

---

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 171

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 193

3۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، ما جاء فی الخلفاء، جلد 2، صفحہ 45

4۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعة، جلد 2، صفحہ 390

میری امت کی بادشاہی وہاں تک پہنچے گی جہاں تک میرے لیے زمین سمیٹی گئی ہے؛ اس قول کو ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں پسند کیا ہے، فرمایا: آیت میں صحیح یہ ہے کہ یہ جمہور کی خلافت کے بارے میں ہے اور ان کا استخلاف یہ ہے کہ وہ انہیں شہروں کا مالک بنائے گا اور انہیں ان کے ماتحت کر دے گا جیسا کہ شام، عراق، خراسان اور مغرب میں ہوا۔ ابن عربی نے کہا: ہم نے انہیں کہا یہ نبوت، خلافت، اقامۃ دعوت اور عموم شریعت میں عام وعدہ ہے۔ یہ وعدہ ہر ایک میں اس کی قدر اور اس کی حالت کے اعتبار سے نافذ ہو گا حتیٰ کہ مفتیوں، قاضیوں اور ائمہ میں یہ وعدہ پورا ہو گا خلافت کے لیے کوئی محل نہیں جس میں یہ وعدہ نافذ ہو مگر وہ جو خلفاء گزر چکے ہیں پھر انہوں نے بطور اعتراض و انفعال اس کا معنی ذکر کیا۔ اگر کہا جائے کہ یہ امر صحیح نہیں ہے سوائے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے، رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ دھوکے سے قتل کیے گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جھگڑا ہوا تھا۔ ہم کہیں گے: امن کے ضمن میں موت سے سلامتی نہیں خواہ وہ کسی وجہ سے ہو۔ رہے حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ان کا جنگ میں اترنا امن کو ختم کرنا نہیں تھا اور نہ امن کی شرط سے جنگ کا نہ ہونا ہے بلکہ امن کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا خود مالک ہو نہ کہ جس طرح مکہ میں صحابہ کرام تھے۔ پھر اپنی کلام کے آخر میں فرمایا: حقیقت حال یہ ہے کہ وہ پہلے مجبور و مقہور تھے پھر غالب ہو گئے پہلے وہ مطلوب تھے پھر طالب بن گئے یہ امن اور عزت کی انتہا و کمال ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ حالت خلفاء اربعہ کے ساتھ خاص نہیں ہے تاکہ آیت کے عموم سے ان کو خاص کیا جائے بلکہ اس میں تمام مہاجرین وغیرہ شامل ہیں کیا آپ نے ملاحظہ کیا کہ قریش نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ احد وغیرہ میں لڑائی کی خصوصاً جنگ خندق میں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام کے متعلق خبر دی: اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (الاحزاب) پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کو لوٹا دیا اور انہوں نے خیر نہ پائی۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے امن دیا انہیں قریش کی زمینوں، گھروں اور اموال کا وارث بنایا۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ کے ارشاد سے یہی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد بنی اسرائیل ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مصر میں جابروں کو ہلاک کر دیا تھا اور بنی اسرائیل کو ان کی زمینوں اور گھروں کا وارث بنا دیا تھا۔ فرمایا: وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا (الاعراف: 137) اسی طرح صحابہ کرام پہلے کمزور اور ڈرنے والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں امن دیا اور انہیں قرار بخشا اور انہیں مالک بنایا۔ پس صحیح یہ ہے کہ آیت کریمہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت کو شامل ہے کوئی مخصوص لوگ مراد نہیں ہیں کیونکہ تخصیص تو کسی ایسی خبر سے ہوتی ہے جو واجب التسلیم ہو۔ اور اصل یہ ہے کہ عموم پر عمل کیا جائے اور صحابہ کرام کا خوف، امن میں تبدیل ہوا وہ اس طرح کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو کہا: کیا ہم پر ایسا دن بھی آئے گا کہ ہم امن میں ہوں گے اور ہتھیار اتار دیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تھوڑے عرصہ بعد تم میں سے ایک شخص ایک بڑے مجمع میں گوٹھ مار کر بیٹھے گا جبکہ اس پر کوئی ہتھیار نہ ہو گا'' (1) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اس امر (اسلام) کو مکمل فرمائے گا (2) حتیٰ کہ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 171
2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام، جلد 1، صفحہ 510

سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا اسے اللہ تعالیٰ کے خوف کے سوا کوئی خوف نہ ہوگا اور اپنی بکریوں پر بھیڑیے کے خوف کے سوا کوئی خوف نہ ہوگا لیکن تم جلدی کر رہے ہو"۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں تخریج کیا ہے۔ پس اسی طرح ہوا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔ یہ آیت نبوت کا معجزہ ہے کیونکہ یہ مستقبل کی خبر تھی تو ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ اس میں دو قول ہیں۔ (۱) ارض سے مراد مکہ مکرمہ کی زمین ہے کیونکہ مہاجرین نے اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کیا تھا۔ تو ان سے وعدہ کیا گیا جس طرح بنو اسرائیل سے وعدہ کیا گیا تھا؛ یہ معنی نقاش نے بیان کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عرب و عجم کے شہر ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہی صحیح ہے کیونکہ مکہ کی زمین مہاجرین پر رہنے کے لیے حرام کی گئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لیکن مسکین سعد بن خولہ" (1) چونکہ ان کا وصال ہجرت کے بعد مکہ میں ہو گیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ اور صحیح میں یہ بھی فرمایا: "مناسک حج ادا کرنے کے بعد مہاجر تین دن ٹھہر سکتا ہے" (2)۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ میں لام مضمر قسم کا جواب ہے کیونکہ وعدہ قول ہے۔ اس کا مجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا اور انہیں زمین کا مالک اور اس میں رہنے والا بنا دے گا۔ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی بنی اسرائیل۔ اللہ تعالیٰ نے مصر اور شام کے جبابرہ کو ہلاک کر دیا اور مسلمانوں کو ان کی زمینوں اور گھروں کا وارث بنا دیا۔ اکثر کی قرات كما استخلف۔ تاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے کیونکہ وعدہ اور لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ کا قول اس کی دلیل ہے۔ عیسیٰ بن عمر، ابو بکر اور مفضل عاصم سے استخلف تاء کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ فعل مجہول روایت کیا ہے۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ اور وہ دین اسلام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ: 3) یہ پہلے گزر چکا ہے، سلیم بن عامر نے مقداد بن اسود سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: "سطح زمین پر پتھر اور مٹی کا کوئی گھر نہیں ہے (3) مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمہ اسلام کو عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلت والے کی ذلت کے ساتھ اس میں داخل کرے گا۔ رہے وہ جن کی عزت کے ساتھ اسلام داخل ہوگا تو انہیں اللہ تعالیٰ عزت والا بنا دے گا اور جن کی ذلت کے ساتھ اسلام داخل ہوگا تو وہ اس کی اطاعت کریں گے"۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے یہ اس کی حجت ہے جس نے کہا: ارض سے مراد عرب و عجم کے شہر ہیں اور یہ دوسرا قول ہے جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ ابن محیصن، ابن کثیر، یعقوب اور ابو بکر نے تخفیف کے ساتھ ابدل سے مشتق کر کے پڑھا ہے؛ یہ حسن کی قرات ہے اور ابو حاتم کا مختار ہے باقی قراء نے تشدید کر کے ساتھ بدل سے مشتق کر کے پڑھا ہے؛ یہ ابو عبید کا مختار ہے کیونکہ قرآن میں یہ اکثر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لاتبديل لكلمات الله۔ اور فرمایا: وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً (النحل: 101) اس قسم کی دوسری مثالیں موجود ہیں۔ یہ دونوں لغات ہیں۔ نحاس نے کہا: محمد بن جہم نے فراء سے

---

1۔ صحیح بخاری، باب بنیان الکعبہ، جلد 1، صفحہ 560

2۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، ماجاء أن مكث المهاجر بعد الصدر ثلاثاً، جلد 1، صفحہ 114

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 4

روایت کیا ہے فرمایا: عاصم اور اعمش نے ولیبدلنھم پڑھا ہے یہ عاصم سے روایت غلط ہے جب کہ اس کے بعد اس نے اس سے بڑی غلطی ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تمام لوگوں سے تخفیف حکایت کی ہے۔ نحاس نے کہا احمد بن یحییٰ نے کہا: تثقیل اور تخفیف میں فرق ہے۔ کہا جاتا ہے: بدلتہ یعنی میں نے اس میں تبدیلی کی ابدلتہ میں نے اس کو زائل کر دیا اور اس کے غیر کو بنا دیا۔ نحاس نے کہا یہ قول صحیح ہے جیسے تو کہتا ہے أبدل لی ھذا الدرھم۔ یعنی یہ زائل کر دو اور مجھے اس کی جگہ اور دے دو۔ تو کہتا ہے: بدّلت بعدنا یعنی میں نے تبدیل کر دیا۔ لیکن یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ اور جو اس نے ذکر کیا وہ اکثر ہے؛ یہ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے سورۂ ابراہیم میں سنت سے دلیل ذکر کی کہ بدل کا معنی ہے عین چیز کو زائل کرنا۔ وہاں غور کرو۔ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا (القلم: 32) تخفیف اور تثقیل کیساتھ پڑھا گیا ہے۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ یہ حال واقع ہو رہا ہے یعنی اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی حالت میں ان کی تعریف کی بنا پر اس کوئی کلام بنانا بھی جائز ہے۔ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا۔ اس میں چار اقوال ہیں۔ (۱) وہ میرے علاوہ کسی خدا کی عبادت نہیں کرتے؛ یہ نقاش نے حکایت کیا ہے۔ (۲) میری عبادت میں ریاکاری نہیں کرتے۔ (۳) میرے علاوہ سے محبت نہیں کرتے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ ان نعمتوں کے بعد یہاں کفر سے مراد کفران نعمت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اللہ تعالیٰ کا انکار ذکر کرنے والا اس انعام کے بعد اور پہلے فاسق ہے۔

**وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝**

''صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوۃ اور اطاعت کرو رسول (پاک) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

یہ آیت پہلے گزر چکی ہے۔ عبادت کے امر کا تاکید کے لیے اعادہ فرمایا۔

**لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝**

''یہ خیال ہرگز نہ کیجئے کہ کفار عاجز کرنے والے ہیں (ہمیں) زمین میں اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے اور نصرت کا وعدہ ہے۔ اکثر لوگوں کی قرات تحسبن مخاطب کا صیغہ ہے، ابن عامر، حمزہ اور ابو حیوہ نے یحسبن یاء کے ساتھ پڑھا ہے (1) یعنی کافر یہ خیال نہ کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو زمین میں عاجز کرنے والے ہیں، کیونکہ الحساب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ فراء اور ابو علی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو (2) یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ گمان نہ کریں کہ کفار ہمیں زمین میں عاجز کرنے والے ہیں۔ پس الذین مفعول اول اور معجزین مفعول ثانی ہوگا۔ پہلے قول کی بنا پر الذین کفروا فاعل ہے، انفسھم مفعول اول ہے جو محذوف ہے معجزین مفعول ثانی ہے۔ نحاس نے کہا: میں اہل عرب میں سے کوئی ایسا

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 394 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 193

نہیں جانتا خواہ وہ بصری ہو یا کوفی اس نے حمزہ کی قرات کو غلط کہا ہے۔ بعض نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ اس میں لیحسبن کا ایک مفعول آیا ہے۔ یہ کہنے والوں میں ابو حاتم بھی ہے۔ فراء نے کہا: یہ ضعیف ہے اور اس کے باوجود جائز قرار دیا ہے اس بناء پر کہ پہلا مفعول حذف کیا گیا ہے۔ ہم اسے بیان کر چکے ہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو اس قرات میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ الذین کفروا محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے وہ کافر جنہوں نے کفر کیا وہ گمان نہ کریں کہ وہ ہمیں زمین میں عاجز کرنے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ فراء اور ابو علی کے قول کے موافق ہے مگر وہاں فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس قول میں فاعل کافر ہے معجزین کا معنی فائتین ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ لوٹنے کی جگہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڞ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﭚ

''اے ایمان والو! اذن طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے تم میں سے تین مرتبہ نماز فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو دوپہر کو اور نماز عشاء کے بعد یہ تین پردے کے وقت ہیں تمہارے لیے نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج ہے ان اوقات کے علاوہ، کثرت سے آنا جانا رہتا ہے تمہارا ایک دوسرے کے پاس، یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے (اپنے) احکام اور اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت خاص ہے اور اس سے پہلے والی عام ہے کیونکہ فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ ۔۔۔ الخ۔ اور یہاں خاص فرمایا: لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ اس میں بعض اجازت طلب کرنے والوں کو خاص فرمایا، اسی طرح آیت کریمہ تمام اوقات کو شامل ہے۔ اس آیت میں بعض اوقات کو خاص کیا ان اوقات میں نہ غلام داخل ہو نہ لونڈی خواہ خدمت گذار ہو یا اس کے علاوہ ہو مگر اجازت کے بعد۔ مقاتل نے کہا: یہ اسماء بنت مرشد کے بارے میں نازل ہوئی (1)، ان کے پاس ان کا بڑا لڑکا آیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ بعض نے کہا: اس کے نزول کا سبب مدلج کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر داخل ہونا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ لِيَسْتَاْذِنْكُمُ کے بارے میں علماء کے مختلف چھ اقوال ہیں: پہلا یہ کہ یہ منسوخ ہے؛ یہ ابن مسیب اور

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 395

ابن جبیر کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مستحب ہے واجب نہیں؛ یہ ابوقلابہ کا قول ہے فرمایا: انہیں یہ حکم دیا گیا ہے ان کی خاطر، تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عورتیں ہیں؛ یہ ابوعبدالرحمن سلمی کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ مردوں کے متعلق ہے عورتوں کے لیے نہیں یہ چوتھا قول ہے (1)۔ پانچواں قول یہ ہے کہ یہ واجب تھا جب لوگوں کے دروازے اور کنڈے نہیں تھے (2)؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ یہ حکم مردوں، عورتوں پر ثابت اور محکم ہے؛ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے ان میں قاسم، جابر بن زید، شعبی ہے اور سلمی کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ الذین عرب کلام میں عورتوں کے لیے نہیں ہوتا۔ عورتوں کے لیے اللاتی اور اللواتی استعمال ہوتا ہے۔ اہل نظر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو مستحسن کہا ہے، کیونکہ الذین کلام عرب میں مردوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ یہ جائز ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہوں اور یہ دلیل کے ساتھ واقع ہوتا ہے اور کلام اپنے ظاہر پر ہے مگر اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم ہے۔ رہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول تو ابوداؤد نے عبید اللہ بن ابی یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ آیت جس کے ساتھ اکثر لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا وہ آیت استیذان ہے میں اپنی لونڈی کو حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھ پر آتے ہوئے اجازت طلب کرے۔ ابوداؤد نے کہا: اسی طرح عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یامر بہ روایت کیا ہے۔ عکرمہ نے روایت کیا ہے کہ اہل عراق کے ایک گروہ نے کہا: اے حضرت ابن عباس! رضی اللہ عنہما آپ اس آیت کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جس میں ہمیں ایک حکم دیا گیا ہے اور کسی نے بھی اس پر عمل نہیں کیا پھر یہ آیت پڑھی، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَ لَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ۔ ابوداؤد نے کہا: قعنبی نے عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ تک پڑھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومنین پر حلیم و رحیم ہے وہ پردے کو پسند کرتا ہے لوگوں کے گھروں کے لیے پردے اور چادریں نہیں ہوتی تھیں بعض اوقات خادم، بیٹا یا یتیم بچی داخل ہو جاتی تھی جبکہ مرد اپنے اہل کے ساتھ ہوتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پردوں کے وقت میں اجازت طلب کرنے کا حکم دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے پردے اور مال عطا فرمایا تو میں نے کسی کو اس پر عمل کرتے نہیں دیکھا (3)۔ میں کہتا ہوں: یہ عمدہ متن ہے یہ سعید اور ابن جبیر کے قول کو رد کرتا ہے کیونکہ اس میں آیت کے نسخ پر دلیل نہیں ہے لیکن یہ اپنے حال پر تھی پھر زائل ہو گئی اگر پھر پہلے جیسی حالت ہو جائے تو اس کا حکم قائم ہو گا جس طرح پہلے تھا، بلکہ آج بھی اس آیت کا حکم دیہاتوں اور صحراؤں میں مسلمانوں کے گھروں کے بارے میں ثابت ہے۔ وکیع نے سفیان سے انہوں نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ ۔۔۔ الخ کی آیت منسوخ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 395 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 194

3۔ سنن ابی داؤد، باب الاستئذان فی العورات الثلاث، حدیث 4518

**مسئلہ نمبر 3**۔ بعض اہل علم نے کہا: تین مرتبہ اجازت طلب کرنا اس ارشاد سے ماخوذ ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ فرمایا: اس ارشاد سے مراد تین مرتبہ ہے۔ فرمایا: قرآن غلاموں اور بچوں کے بارے میں نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت تمام کے بارے وارد ہوئی۔ ابن عبد البر نے کہا: جو کچھ ان علماء نے کہا ہے اگرچہ اس کی وجہ ہو سکتی ہے لیکن یہ علماء سے معروف نہیں ہے اس آیت کی تفسیر میں جس میں جھگڑا کیا گیا ہے۔ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ سے جمہور علماء نے تین اوقات مراد لیے ہیں اور اس قول کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے بندوں کو ادب سکھایا ہے کہ غلام جن کی کوئی پروا نہیں کی جاتی اور بچے جو ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے مگر وہ ستر عورت کے مفہوم کو سمجھتے ہوں تو وہ ان تین اوقات میں اپنے گھر والوں کے پاس اجازت لے کر جائیں۔ عام طور پر ان تین اوقات میں لوگ ستر عورت کا اہتمام نہیں کرتے اور کپڑے اتارے ہوئے ہوتے ہیں۔ فجر سے پہلے کا وقت نیند کی انتہا کا وقت ہے۔ نیند کے کپڑوں سے نکلنا اور دن کے کپڑے پہننے کا وقت ہے اور دوپہر کا وقت بھی کپڑے اتارنے کا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت میں دن خوب روشن ہوتا ہے اس کی شعاعیں بلند ہوتی ہے اور گرمی سخت ہوتی ہے اور عشاء کی نماز کے بعد سونے کے لیے کپڑے اتارے جاتے ہیں پس ان اوقات میں ستر عورت غالب ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری غلام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جس کو مدلج کہا جاتا تھا(1) تا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا لائے غلام آیا تو وہ سوئے ہوئے تھے اور دروازہ بند تھا غلام نے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر آواز دی اور اندر داخل ہو گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے اور بیٹھ گئے آپ کا ستر کھلا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے بیٹوں، ہماری عورتوں اور ہمارے خدام کو ان اوقات میں ہمارے پاس آنے سے منع کر دے مگر وہ اجازت سے اندر آئیں، پھر حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ آپ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر گئے۔ یہ آیت مکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ تمہارے آزاد لوگوں میں سے جو بالغ نہیں ہوئے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا وہ فرماتے تھے: لیستاذنکم الذین لم یبلغوا الحلم مما ملکت ایمانکم۔ تقدیم و تاخیر پر ہے۔ آیت لونڈیوں کے متعلق ہے۔ جمہور نے الحلم کو لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن بن ابی الحسن نے ضمہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو اس کو مستحسن سمجھتے تھے۔ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ظرف کی بنا پر منصوب ہے کیونکہ انہیں تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کا حکم نہیں دیا گیا انہیں تین اوقات میں اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ثلاث میں ظرفیت واضح ہے۔ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہر وقت میں تین مرتبہ اجازت طلب کرنا واجب نہیں۔ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ جمہور قراء

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 395

نے ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ، ثلاث کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے عاصم سے ثلاث نصب کے ساتھ پڑھا۔ انہوں نے ثلاث مرات کے قول میں ظرف سے بدل بنایا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: نصب ضعیف مردود ہے۔ فراء نے کہا: میرے نزدیک رفع محبوب ہے۔ فرمایا: میں نے رفع کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے یہ خصال تین ستر کے اوقات ہیں۔ کسائی کے نزدیک رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور ان کے نزدیک اس کی خبر مابعد کلام ہے اور عائد کے متعلق کچھ نہیں کہا اور مبتدا کے بارے میں نصا کہا ہے۔ فرمایا: العورات سے مراد وہ اوقات ہیں جن میں پردہ کھلا ہوتا ہے مگر انہوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور نصب میں دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ ثلاث مرات پر لوٹایا گیا ہے، اسی وجہ سے فراء نے اس کو بعید جانا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا یہ معنی ہے لیستاذنکم اوقات ثلاث عورات مضاف حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا۔ عورات جمع ہے عورۃ کی اور صحیح میں اس کا باب فعلات (عین کے فتحہ کے ساتھ) پر آتا ہے جیسے جفنۃ اور جفنات۔ وغیرہ اور معتل میں عین کو ساکن کیا گیا ہے جیسے بیضۃ سے بیضات کیونکہ فتحہ اس کے اعلال کا داعی ہے اسی وجہ سے فتحہ نہیں دیا گیا رہا شاعر کا قول:

أبو بَيَضاتٍ رائحٌ مُتَأوِّبٌ　　رَفِيقٌ بمسحِ المُنْكِبَيْنِ سَبُوحُ

تو یہ شاذ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ان اوقات کے بعد بغیر اجازت ان کے داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ تم معمول کے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔ طَوّٰفُوْنَ بمعنی ھم طوافون۔ فراء نے کہا: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے انما ھم خدمکم وطوافون علیکم۔ فراء نے اس پر نصب یعنی طوافین پڑھنا جائز کہا ہے کیونکہ نکرہ ہے اور علیکم میں مضمر معرفہ ہے۔ بصریوں نے علیکم اور بعضکم کی ضمیروں سے حال بنانا جائز قرار نہیں دیا کیونکہ عامل مختلف ہیں۔ اور مررت بزید و نزلت علی عمرو عاقلین۔ دونوں کی لغت کی بنا پر جائز نہیں۔ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ کا معنی ہے وہ تم پر آتے جاتے ہیں اور تم ان پر آتے جاتے ہو، اسی سے بلی کے بارے میں حدیث ہے: إنما ھی من الطوافین علیکم أو الطوافات۔ (1) تین پردے کے اوقات میں ان کے داخلہ کو منع فرمایا کیونکہ عورت کا حقیقی معنی ہے پردہ وہ چیز جس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو اسی سے یہ ارشاد ہے: ان بیوتنا عورۃ ہمارے گھر داخل ہونے کے لیے آسان ہیں پس اذن کی موجب علت کو بیان کیا وہ ہے بے پردگی کی حالت میں خلوت، پس اس کی پیروی کرنا متعین ہو گیا اور نسخ کا قول ختم ہو گیا۔ پھر جناح کو رفع دیا گیا ہے اس قول کے ساتھ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی بعض بعض پر چکر لگاتے ہیں۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ کاف محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات بیان فرماتا ہے جو اس کی متعبدات پر دلالت کرتی ہیں ایسا بیان جیسا کہ اس نے تمہارے لیے ان اشیاء کو بیان کیا ہے، یعنی کاف بمعنی مثل ہے اور بیانا مصدر کی صفت ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب سور الھرۃ، حدیث نمبر 68

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ عشاء کی نماز مراد ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "اعراب تم پر تمہاری نماز کے نام پر غالب نہ آجائیں خبردار وہ عشاء ہے وہ دیر سے اونٹوں کا دودھ دوہتے" (1) ایک روایت میں ہے "اللہ کی کتاب میں اس کا نام عشاء ہے وہ تاخیر سے دودھ دوہتے ہیں اس لیے عشاء کی نماز کو عتمہ کہتے ہیں" (2)۔ بخاری میں حضرت ابو برزہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز کو موخر فرماتے تھے۔ حضرت انس نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز کو موخر کرتے تھے، یہ مغرب کی نماز پر دلالت کرتا ہے اور صحیح میں ہے۔ فصلاها مغرب اور عشاء کے درمیان عصر کی نماز پڑھی۔ اور مؤطا وغیرہ میں ہے۔ ولو یعلمون ما فی العتمۃ والصبح لاتوھما ولو حبوا۔ اگر وہ عشاء اور صبح کی نماز کا ثواب جانتے تو وہ ان نمازوں کو پڑھنے کے لیے آتے اگرچہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑتا۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم عشاء اور صبح کی نماز کی طرح پڑھتے تھے اور تمہاری نماز کے بعد کچھ عشاء کو موخر کرتے تھے اور نماز میں تخفیف فرماتے تھے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ اخبار متعارض ہیں۔ تاریخ سے معلوم نہیں کہ مقدم، موخر کونسی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مغرب کی نماز کو عشاء کی نماز کہنے سے اور عشاء کی نماز کو عتمہ کہنے سے منع کرنا ثابت ہے۔ حدیث کے الفاظ کو صحابہ کرام کے اقوال بھی رد نہیں کر سکتے چہ جائے کہ کسی اور کا قول۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے جس نے کہا: صلاۃ العتمہ وہ گنہگار ہے۔ ابن القاسم نے کہا: امام مالک نے کہا وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام صلاۃ العشاء رکھا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی نام کو پسند کرتے تھے جو اللہ نے رکھا۔ انسان اپنے اہل اور اولاد کو اس کی تعلیم دے اور عتمہ نہیں کہا جاتا مگر اس کے خطاب کے وقت جو سمجھتا ہے۔ حضرت حسان نے کہا:

وکانت　لایزال　بها　أنیس　　خلالَ　مُروجِها　نَعَمٌ　وَشاءُ

فدَعْ　هذا　ولکن　مَنْ　لِطَیْفٍ　　یؤَرِّقنی　إذا　ذهب　العشاء

بعض علماء نے فرمایا: یہ نہی اس لیے ہے کہ بدوؤں کی اتباع میں عشاء کو عتمہ کہا جائے تاکہ اس کا وہ نام بدل نہ جائے جو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام کتاب اللہ میں رکھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ گویا جو اولیٰ ہے اس کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے نہی کی گئی ہے یہ تحریم کی جہت سے نہیں ہے اور نہ اس مفہوم میں کہ عشاء کو عتمہ کہنا جائز بھی نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عتمہ کا اطلاق اس پر ثابت ہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اس کو عتمہ کہنا مباح قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا: اس نام سے منع کیا گیا ہے یہ عبادت دینیہ ہے اس پر اس نام کا اطلاق نہ کیا جائے جو ایک دنیوی فعل کا اسم ہے وہ ہے اس وقت میں دودھ دوہنا اور اس کو عتمہ کہتے تھے۔ اس کی دلیل یہ قول ہے انھا تُعتم بحلاب الابل (3)۔ اس وقت اونٹوں کا دودھ دوہا جاتا ہے اس وجہ سے وہ اس نماز کو عتمہ کہتے تھے۔

---

1۔ صحیح مسلم، وقت العشاء و تاخیرها، جلد 1، صفحہ 229　　2۔ ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، وقت عشاء و تاخیرها، جلد 1 صفحہ 229

**مسئلہ نمبر 8**۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے ہمیں عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بیان کیا انہوں نے عمارہ بن غزیہ سے انہوں نے حضرت انس بن مالک سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''جس نے چالیس راتیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جبکہ اس کی عشاء کی نماز سے پہلی رکعت فوت نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے بدلے آگ سے آزادی لکھ دیتا ہے'' (1) اور صحیح مسلم میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے فجر کی نماز (بھی) جماعت کے ساتھ پڑھی گویا اس نے ساری رات قیام کیا'' (2)۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں سبیع یا تبیع سے انہوں نے کعب سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد چار رکعتیں ادا کیں ان کے رکوع و سجود کو مکمل کیا اور وہ جانتا ہو جو ان رکعتوں میں پڑھتا ہے تو وہ چار رکعتیں اس کے لیے لیلۃ القدر کے قائم مقام ہوں گی۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جب پہنچ جائیں تمہارے بچے حد بلوغ کو تو وہ بھی اذن طلب کیا کریں جس طرح اذن طلب کیا کرتے ہیں وہ لوگ (جن کا ذکر) پہلے ہوا، یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کو اور اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے''۔

حسن نے اَلْحُلْمَ میں ضمہ کے ثقل کی وجہ سے اسے حذف کر دیا ہے۔ مذکورہ تین اوقات میں بچوں کو اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اوقات میں بغیر اجازت آنا مباح کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا کہ بچے جب بالغ ہو جائیں تو وہ اجازت طلب کرنے میں ہر وقت مردوں کے حکم میں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام کا بیان ہے اس کے حلال اور حرام کی وضاحت ہے۔ فرمایا فَلْيَسْتَاْذِنُوْا یہ نہیں فرمایا فلیستاذنوکم جب کہ پہلی آیت میں فرمایا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ کیونکہ بچے مخاطب اور مکلف نہیں ہیں۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے کہا۔ وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اجازت طلب کریں جب وہ بالغ ہو جائیں، خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام ہوں۔ ابواسحاق فزاری نے کہا: میں نے اوزاعی کو کہا بچے کی کیا حد ہے جس میں وہ اجازت طلب کرے؟ انہوں نے کہا: چار سال۔ فرمایا: کسی عورت پر داخل نہ ہو حتی کہ اجازت طلب کر لے؛ یہ زہری کا قول ہے۔ یعنی آدمی اپنی لونڈی پر اجازت طلب کرے اسی معنی میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب المساجد، صلوٰۃ العشاء والفجر فی جماعۃ، جلد 1، صفحہ 58۔ ایضاً، حدیث 789، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، فضل صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 232

ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اور بوڑھی خانہ نشین عورتیں جنہیں آرزو نہ ہو نکاح کی تو ان پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ رکھ دیں اپنے بالائی کپڑے بشرطیکہ وہ نہ ظاہر کرنے والی ہوں (اپنی) آرائش اور ان کا اس سے بھی اجتناب کرنا ان کے لیے بہتر ہے، اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ۔ القواعد کا واحد قاعد بغیر تاء کے ہے تا کہ اس کا حذف دلالت کرے کہ وہ کبر (بڑھاپے) کی وجہ سے بیٹھ گئی ہے جیسے کہا جاتا ہے: امراۃ حامل تاء کا حذف دلالت کرتا ہے کہ وہ حمل اٹھائے ہوئے ہے۔ شاعر نے کہا:

فلو أنّ ما في بطنه بين نِسْوَةٍ حَبِلْنَ وإن كنّ القوعد عُقّرا(1)

اس کے علاوہ صورت میں کہا: قاعدۃ فی بیتھا وہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔ حاملۃ علی ظھرھا اپنی پیٹھ پر بچہ اٹھانے والی ہے۔ اَلْقَوَاعِدُ عمارت کی بنیادوں کو بھی کہتے ہیں اس کا واحد قاعدۃ تاء کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَلْقَوَاعِدُ۔ وہ بوڑھی عورتیں جو تصرف سے بیٹھ جاتی اور بچہ جنم دینے اور حیض سے بیٹھ جاتی ہیں؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ ربیعہ نے فرمایا: وہ عورتیں جن کو تو دیکھے تو اس کے بڑھاپے کیوجہ سے تو اسے ناپسند کرے۔ ابوعبیدہ نے کہا: جو بچہ جنم نہیں دیتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات عورت بچے جنم نہیں دیتی لیکن اس سے متمتع ہوا جاتا ہے؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ القواعد کو چادر نہ کرنے میں خاص کیا ہے، کیونکہ نفس ان سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ مردوں کو ایسی عورتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی پس ایسی عورتوں کے لیے اوپر والی چادر اوڑھنا مباح کیا گیا ہے جب کہ دوسری جوان عورتوں کے لیے مباح نہیں (بلکہ فرض ہے) ان سے تحفظ کی تکلیف دور کی گئی ہے جو انہیں تھکانے والی ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان یضعن من ثیابھن، من کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ثیاب سے مراد جلباب پردے والی بڑی چادر ہے۔ حضرت ابن مسعود سے من جلابیبھن مروی ہے (2)۔ عرب کہتے ہیں: امرۃ واضع اس عورت کو کہتے ہیں جو بوڑھی ہو اور اپنا دوپٹہ اتار دیا ہو۔ ایک جماعت نے کہا: وہ بوڑھی عورت جو نکاح سے مایوس ہو چکی ہو اگر اس کے بال ظاہر ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں اس بنا پر اس کے لیے دوپٹہ اتار دینا جائز ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ پردہ کرنے میں جوان عورت کی طرح ہے اور بوڑھی عورت وہ چادر نہیں کرے گی جو قمیص اور دوپٹہ کے اوپر ہوتی ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود اور ابن جبیر وغیرہما کا قول ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 121 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 195

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ۔ اپنی زینت کو ظاہر کرنے والی نہ ہوں تاکہ ا کی طرف دیکھا جائے کیونکہ انتہائی قبیح اور حق سے دور بات ہے۔ التبرج کا معنی آنکھوں کے لیے ظاہر ہونا اور کھلنا اسی سے بروج مشیدہ اور بروج السماء والاسوار ہے یعنی ایسے ایسے محلات جن کے سامنے پردہ نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا: اے ام المومنین! آپ خضاب، رنگ، تعویز، بالیاں، پازیب، سونے کی انگوٹھی، باریک کپڑوں کے متعلق کیا کہتی ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تمہارا قصہ ایک عورت کے قصہ کی طرح ہے اللہ تعالیٰ نے زینت کو حلال کیا ہے لیکن زینت ایسے شخص کے سامنے ظاہر کرنے والیاں نہ ہوں جس کے لیے ان کو دیکھنا حلال نہ ہو لیکن یہ کہ وہ تمہیں دیکھیں حرام طریقہ پر۔ عطا نے کہا: یہ اپنے گھروں میں اجازت ہے جب گھر سے باہر نکلیں تو ان کے لیے چادریں اتارنا جائز نہیں اس بنا پر غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ کا مطلب ہوگا وہ اپنے گھروں سے نکلنے والی نہ ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا لازم آئے گا کہ جب گھر میں ہو تو بھی قمیص کے اوپر چادر لینا ضروری ہے۔ یہ بعید ہے مگر جب اس پر کوئی اجنبی شخص داخل ہو تو پھر گھر میں بھی چادر اوڑھے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ تمام عورتوں کا کپڑے اتارنے سے بچنا اور ان کا ان چیزوں کا اہتمام کرنا جو نوجوان عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ ان کے لیے افضل ہے۔ حضرت ابن مسعود نے وان یتعففن بغیر سین کے پڑھا ہے۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: التبرج سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے دو کپڑے پہنیں جو اتنے باریک ہوں کہ ان کا جسم ظاہر ہو۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو اقسام آگ والوں سے ہیں میں نے ان کو ابھی نہیں دیکھا(1)۔ ایک وہ قوم جن کے پاس گائے کی دموں کی طرح کوڑے ہیں جن کیساتھ لوگوں کو مارتے ہیں اور وہ عورتیں جو پہنے ہوئے ہوں گی (لیکن) برہنہ ہوں گی (لباس کے باریک ہونے کی وجہ سے) مائل کرنے والی ہوں گی اور مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر بختی اونٹوں کی کہانوں کی طرح ہوں گے جو مائل ہونے والی ہوتی ہیں۔ وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی اگرچہ اس کی خوشبو اتنی مسافت سے پائی جاتی ہے''۔ ابن عربی نے کہا: پہلے فرمایا وہ پہننے والیاں ہیں لیکن ان کے لباس اتنے باریک ہیں کہ ان کے محاسن ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے فرمایا: وہ برہنہ ہیں اور یہ حرام ہے۔ میں کہتا ہوں: اس معنی میں علماء کی دو تاویلوں میں سے یہ ایک تاویل ہے اور دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں لیکن تقویٰ کے لباس سے برہنہ ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: 26) شاعر نے کہا:

إذا المرء لم يلبس ثيابا من التُّقَى تقلّب عُرْيَانًا وإن كان كاسِيا

وخيرُ لباس المرء طاعَة ربّه ولا خيرَ فيمن كان لِله عاصِيا

جب انسان تقویٰ کا لباس زیب تن نہ کرے تو وہ برہنہ ہوتا ہے اگرچہ وہ لباس پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ انسان کا بہتر لباس اس کے رب کی اطاعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں سویا ہوا تھا(2)، میں نے خواب میں لوگوں کو دیکھا وہ مجھ پر پیش کیے گئے اور ان پر

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 205
2۔ صحیح مسلم، من فضائل عمر رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 274

قیصیں تھیں کچھ سینوں تک پہنچتی تھیں کچھ اس سے لمبی یا کم تھیں، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ گزرے ان پر قمیص اتنی لمبی تھی کہ وہ گھسیٹ رہے تھے"۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی۔ فرمایا: "دین"، نبی کریم ﷺ کا قمیص کی تعبیر دین سے کرنا اس قول سے ماخوذ ہے: وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: 26) عرب فضل اور عفاف کو لباس سے کنایہ کرتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا: ثیاب بنی عوف طهاری نقیة۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اللہ تعالیٰ تیری قمیص کو پرانا کرے گا اگر وہ تجھ سے ارادہ کریں کہ تو اسے اتار دے تو تو اسے نہ اتارنا"۔ یہاں خلافت کو قمیص سے تعبیر فرمایا یہ خوبصورت استعارہ معروفہ ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ تاویل بہتر ہے۔ یہ اس زمانہ میں عورتوں کے مناسب ہے خصوصاً جوان عورتیں وہ زیب وزینت کرتی ہیں اور زیب وزینت ظاہر کرتے ہوئے باہر نکلتی ہیں پس وہ لباس پہنے ہوئے ہیں، حقیقۃً، ظاہراً اور باطناً تقویٰ سے برہنہ بلکہ ان کا مقصود بھی یہ ہوتا ہے کہ لوگ انہیں دیکھیں۔ یہ مشاہدہ ہے اگر ان کے پاس تقویٰ نام کی کوئی چیز ہوتی تو وہ ایسا کبھی نہ کرتیں اور کوئی نہ جانتا جو کچھ وہاں ہے۔ اس تاویل کو مزید تقویت اس قول سے ملتی ہے کہ ان کے سر بختی اونٹوں کی کہانوں کی طرح ہیں۔ بختی اونٹ بڑے بڑے جسموں والے اونٹ ہوتے ہیں۔ اور ان کی کہانیں بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ اس کے سر کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ اپنے سروں کے درمیان اپنے بالوں کے جوڑے کو بلند کرتی ہیں۔ یہ بھی مشاہد و معلوم ہے اور ان کی طرف دیکھنے والا ملوم (ملامت کیا گیا) ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں پر عورتوں سے زیادہ نقصان دہ ہو" (1)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

"نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جن گھروں کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ، پھر جب تم داخل ہو گھروں میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الادب، ماجاء فی تحذیر فتنة النساء، جلد 2، صفحہ 102

سلامتی کی دعا دو اپنوں کو وہ دعا جو الله تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت (اور) پاکیزہ ہے، یونہی کھول کر بیان کرتا ہے الله تعالیٰ تمہارے لیے (اپنے) احکام کہ تم سمجھ لو"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ اس آیت کی تفسیر میں علماء کے مختلف آٹھ اقوال ہیں اور ان میں قریب ترین تین ہیں کیا یہ منسوخ ہے یا ناسخ ہے یا محکم ہے؟ (1) یہ وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ سے لے کر آخر تک منسوخ ہے؛ یہ عبدالرحمن بن زید کا قول ہے۔ فرمایا: یہ چیز ختم ہو چکی ہے، ابتدائے اسلام میں تھی جب کہ ان کے دروازے بند نہیں ہوتے تھے اور ان کے دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ بعض اوقات کوئی شخص آتا تھا وہ گھر میں داخل ہوتا تھا جب کہ وہ بھوکا ہوتا تھا اور گھر میں کوئی شخص نہیں ہوتا تھا الله تعالیٰ نے اس کے لیے اس گھر سے کھانا جائز قرار دیا تھا پھر گھروں کے دروازے بن گئے تو اب کسی کے لیے ان کو کھولنا جائز نہیں پس یہ حکم ختم ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی شخص کسی کا جانور نہ دوہے مگر اس کی اجازت سے" (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت ناسخ ہے؛ یہ ایک جماعت کا قول ہے۔ حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: جب الله تعالیٰ نے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء: 29) نازل فرمایا تو مسلمانوں نے کہا: الله تعالیٰ نے ہمیں اپنے مال باطل ذریعہ سے کھانے سے منع فرمایا ہے اور طعام، اموال سے افضل ہے (2) پس ہم میں سے کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کے پاس کھانا کھائے، پس لوگ اس سے باز آ گئے۔ الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ فرمایا: ایک آدمی اپنا سامان دوسرے شخص کے سپرد کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں: علی بن ابی طلحہ یہ بنی ہاشم کا غلام ہے شام میں سکونت اختیار کی ابوالحسن اس کی کنیت تھی اور ابومحمد بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے باپ کا نام ابوطلحہ سالم تھا تفسیر میں اس پر کلام کی گئی ہے۔ بعض نے کہا: اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دیکھا بھی نہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے؛ یہ بھی مقتدر اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے ان میں سعید بن مسیب، عبیدالله بن عبدالله بن عتبہ بن مسعود ہیں اور زہری نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا: مسلمان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے تھے اور اپنی چابیاں اپنے اپاہج لوگوں کو دے دیتے تھے اور کہتے تھے: اگر تمہیں ضرورت پڑے تو تم کھا لینا۔ وہ کہتے تھے: انہوں نے ہمارے لیے خوشی سے اس کھانے کو حلال نہیں کیا تو الله تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ ۔۔۔ الخ۔ نحاس نے کہا: حدیث میں یوعبون کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی وہ تمام کے تمام جنگ میں نکلتے تھے کہا جاتا ہے: اوعب بنی فلان لبنی فلان جب وہ تمام کے تمام ان کے پاس آ جائیں۔ ابن السکیت نے کہا: کہا جاتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللقطۃ، لاتحلب ماشیۃ احد بغیر اذن، جلد 1، صفحہ 329

2۔ زادالمسیر، جلد 3، صفحہ 397

ہے اوعب بنوں فلان جلاء یعنی شہر میں ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ جاء الفرس برکض وعیب یعنی پوری طاقت سے دوڑ کر آیا۔ حدیث میں ہے، فی الانف اذا استوعب جدعه الدیة(1) ناک پوری کٹ جائے تو اس میں پوری دیت ہے۔ استیعاب الشئی کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینا۔ کہا جاتا ہے: بیت وعیب جب گھر کھلا ہو جو کچھ اس میں ہے وہ اس کو گھیر لے۔ الضمنی سے مراد اپاہج لوگ ہیں ان کا واحد ضمن ہے جیسے زمن ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول بہتر ہے اس سے جو کچھ اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کیونکہ اس میں صحابہ اور تابعین سے تعین مروی ہے کہ آیت معین چیز میں نازل ہوئی ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ کلام منظم ہے کیونکہ اپاہج لوگ جہاد میں شریک نہیں ہوتے تھے اور مجاہدین کے اموال ان کے ہاتھوں میں ہوتے تھے لیکن اَوْ مَامَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اس کا تقاضا کرتا ہے ورنہ یہ قول بہت بعید تھا، لیکن یہ کہنا بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نابینا سے اس کام کے کرنے کی حرج اٹھا دی جس میں نظر ہونا شرط ہے اور لنگڑے سے اس کام کی تکلیف دور کر دی جس میں چلنا شرط تھا اور ان افعال کا کرنا لنگڑے پن کے ہوتے ہوئے مشکل تھا۔ اور مریض سے حرج اٹھا دی جس کو ساقط کرنے میں مرض موءثر تھی جیسے روزہ اور نماز کی شرط اور اس کے ارکان اور جہاد اور اس جیسے اعمال اس کے بعد واضح اور مفید تفسیر ہے۔ شریعت اور عقل اس کی تائید کرتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے فرمایا: آیت کا ظاہر اور امر شریعت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں سے حرج اٹھائی گئی ہے جس کو کوئی عذر لاحق ہے اور ان کی نیت اس میں کامل طور پر کرنے کی تھی اور ان کا عذر ان سے ناقص کام کا تقاضا کرتا ہے۔ پس ان سے حرج اٹھائی گئی ہے، ور جو علماء نے اس حرج کے بارے میں کہا ہے وہ یہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن زید نے کہا: یہ جنگ میں حرج ہے(2) یعنی جنگ میں پیچھے رہ جانے میں کوئی حرج نہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ یہ پہلے کلام سے جدا ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: پوری آیت کھانوں کے بارے میں ہے۔ فرمایا: عرب اور جو مدینہ طیبہ میں رہتے تھے بعثت سے پہلے معذور لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ بعض تو نفرت کرتے ہوئے ایسا کرتے تھے کیونکہ نابینا ہاتھ کو کھانے میں گھماتا رہتا ہے اور لنگڑے کے پاس غرور کی وجہ سے نہیں بیٹھتے تھے اور مریض کی بدبو اور بیماری کی وجہ سے اس کے پاس نہیں بیٹھتے تھے یہ زمانہ جاہلیت کے اخلاق تھے اور یہ تکبر تھا تو یہ آیت یہ اعلان کرتے ہوئے نازل ہوئی اور بعض لوگ غیر معذور سے بچنے کے لیے ایسا کرتے تھے کیونکہ وہ کھانے میں صحیح لوگوں سے درجہ میں کم ہوتے تھے کیونکہ نابینے کو دکھائی نہیں دیتا اور لنگڑا مزاحمت سے عاجز ہوتا ہے اور مریض کمزور ہوتا ہے تو ان کے ساتھ کھانے کی اباحت میں آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے زہروی کی کتاب میں فرمایا: عذر والے لوگ اپنے عذر کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے بچتے تھے تو یہ آیت ان کے لیے اباحت کا اظہار کرتے ہوئے نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: آدمی جب کسی معذور کو اپنے گھر لے جاتا تھا اور اپنے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں پاتا تھا تو وہ اسے اپنے قرابت داروں کے گھر لے جاتا تھا پس عذر والے لوگ اس سے بچتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، عقل الاصابع، جلد 2، صفحہ 251　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 195

**مسئلہ نمبر 3۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ یہاں سے کلام کا آغاز ہو رہا ہے یعنی اے لوگو! تم پر کوئی حرج نہیں جو مخاطب اور غیر مخاطب جمع تھے تو مخاطب کو غلبہ دیا تا کہ کلام کا نظم باقی رہے۔ قرابت داروں کے گھروں کا ذکر کیا اور بیٹوں کے گھروں کا ذکر نہیں کیا۔ مفسرین نے فرمایا: یہ فی بیوتکم میں داخل ہیں کیونکہ بیٹے کا گھر باپ کا گھر ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: بعض علماء نے اس قول کی مخالفت کی ہے اور فرمایا: یہ کتاب اللہ پر حکم لگانا ہے بلکہ ظاہر میں اولی یہ ہے کہ بیٹا ان کے مخالف نہ ہو۔ اور انت ومالك لابيك(1)۔ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے کی روایت سے بھی حجت قوی نہیں ہوتی کیونکہ یہ حدیث بہت کمزور ہے اگر یہ صحیح بھی ہوتی تو اس میں حجت نہیں تھی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس مخاطب کا مال اس کے باپ کا ہے یعنی مالك لك۔ تیرا مال تیرا ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان میراث کا جاری ہونا اس کو قطع کر دیتا ہے۔ حکیم ترمذی نے کہا: وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ۔ گویا فرمایا تمہارے وہ مکان جن میں تمہارے گھر والے اور تمہاری اولاد رہتی ہے۔ پس یہاں اہل اور بیٹے کے لیے ایک چیز ہے اس شخص نے جس کا مسکن ہے اہل اور اولاد کو فائدہ پہنچایا۔ پس اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کے ساتھ خوراک کھائے یا بیوی اور بچے کے لیے وہاں ان کی ملکیت سے کوئی چیز ہو پس اس پر اس میں کوئی حرج نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ بعض علماء نے فرمایا: ان کے گھروں سے کھانا تب جائز ہے جب وہ اسے اجازت دیں۔ بعض علماء نے کہا: وہ اسے اجازت دیں یا نہ دیں اس کے لیے کھانا جائز ہے کیونکہ قرابت جو ان کے درمیان ہے یہ ان کی طرف سے اذن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قرابت میں ایک مہربانی ہے اس مہربانی اور شفقت کی وجہ سے نفوس کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ ان کی کوئی چیز کھا لے جب انہیں اس کے کھانے کے متعلق معلوم ہوگا تو وہ خوش ہوں گے۔ ابن عربی نے بغیر اجازت نسب کی وجہ سے کھانا ہمارے لیے مباح قرار دیا ہے جب کہ کھانا معمول کے مطابق ہو۔ جب کھانا مخصوص ہو اور محفوظ کیا گیا ہو تو پھر کھانا جائز نہیں اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ ذخیرہ کریں اور نہ ایسی چیز کی طرف تجاوز کریں جو کھانے والی نہ ہو اگرچہ وہ غیر محفوظ ہو مگر ان کی اجازت سے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ یعنی جو تم نے خزانہ کیا اور تمہارے قبضہ میں ہے۔ اور اس کو عظیم سمجھتا ہے انسان جس کا وہ اپنے گھر میں مالک ہوتا ہے اور اس کے قبضہ میں ہوتا ہے؛ یہ ضحاک، قتادہ اور مجاہد کی تاویل ہے اور جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت میں وکلاء، غلام اور مزدور سب داخل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انسان کا وکیل اس کے مال کی حفاظت کرتا ہے، خازن اس کے مال کی حفاظت کرتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ معمولی سی چیز کھا لے۔ ابن عربی نے کہا: خازن کے لیے جائز ہے کہ وہ جس کو خزانہ کرتا ہے اس سے کچھ کھائے۔ اس پر اجماع ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب اس کے لیے اجرت نہ ہو لیکن جب اس کے لیے اجرت ہو تو اس پر کھانا حرام ہے۔ سعید بن جبیر نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، حدیث نمبر 3063، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ملکتم میم کے ضمہ، لام کے کسرہ اور شد کے ساتھ پڑھا ہے اور مفاتیحہ تاء اور حاء کے درمیان یاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ مفتاح کی جمع ہے یہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ قتادہ نے مفاتحہ مفرد پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت حارث بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لیے نکلا اور مالک بن زید اس کے گھر والوں کی نگرانی پر تھا جب وہ واپس آیا تو اس نے مالک کو بڑی مشقت میں پایا۔ اس کی حالت پوچھی تو اس نے کہا: میں نے تیری اجازت کے بغیر تیرے مال سے کھانے سے اجتناب کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ صَدِیْقِكُمْ۔ صدیق جمع کے معنی میں ہے اس طرح العدو ہے جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ (الشعراء: 77) وہ میرے دشمن ہیں۔ جریر نے کہا:

دَعَوْن الهوى ثم ارْتَمَيْنَ قلوبنا بأسهم أعداء وهن صديقُ (1)

الصدیق وہ ہوتا ہے جو اپنی محبت میں تجھ سے سچ بولتا ہے اور تو اپنی محبت میں اس سے سچ بولتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ (الاحزاب: 53) کے ارشاد کے ساتھ اور فان لم تجدوا فیها احدا فلا تدخلوها کے قول کے ساتھ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: لایحل مال امرء مسلم الا بطیبة نفس منه (2)۔ کے ساتھ منسوخ ہے۔ بعض نے کہا: یہ محکم ہے۔ یہ اصح ہے۔ محمد بن ثور نے معمر سے روایت کیا ہے فرمایا: میں قتادہ کے گھر داخل ہوا تو میں نے اس میں کھجوریں دیکھیں میں نے انہیں کھانا شروع کر دیا انہوں نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: میں نے تیرے گھر میں کھجوریں دیکھیں تو میں نے کھانا شروع کر دیا۔ فرمایا: تو نے اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ صَدِیْقِكُمْ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے قتادہ سے۔ اَوْ صَدِیْقِكُمْ کے تحت فرمایا: جب تو اپنے دوست کے گھر اس کے حکم کے بغیر داخل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ معمر نے کہا میں نے قتادہ سے کہا: کیا میں اس گھڑے سے پی لوں؟ انہوں نے فرمایا: تو میرا دوست ہے پھر یہ اجازت کیسی ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوطلحہ کے باغ بیرحاء میں داخل ہوتے تھے اور ان کی اجازت کے بغیر اس کا میٹھا پانی پیتے تھے جیسا کہ علماء نے فرمایا ہے۔ علماء نے فرمایا: پانی اپنے مالکوں کی ملکیت میں ہوتا ہے جب دوست کے پانی سے بغیر اجازت پینا جائز ہے تو اس کے پھلوں اور طعام سے کھانا بھی جائز ہے، جب اسے معلوم ہو کہ اس کا دوست اس سے خوشی محسوس کرے گا کیونکہ اس کے ساتھ اس کی بات چیت ہوتی ہے نیز اس میں مشقت بھی کم ہے یا ان کے درمیان محبت ہے۔ اسی مفہوم میں ام حرام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا کھلانا ہے جب وہ ان کے پاس سوتے تھے کیونکہ اغلب یہ ہے کہ جو کچھ گھر میں ہوتا ہے وہ مرد کا ہوتا ہے۔ اور اس کی بیوی کا ہاتھ اس میں عاریۃً ہوتا ہے۔ یہ تمام اسی صورت میں ہے جب تک وہ کپڑے میں باندھ کر نہ لے جائے اور اس سے اپنے مال کو بچانے کا ارادہ نہ ہو اور وہ مال معمولی حیثیت کا ہو۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دوست کو خالص قرابت داروں کے ساتھ ملایا ہے کیونکہ مودت کا قرب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 124

2۔ مجمع الزوائد، کتاب البیوع، القصب و حرمة مال مسلم، جلد 4، صفحہ 305

بہت زیادہ ملنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقاش کی کتاب میں دوست، قرابت سے زیادہ موکد ہے (1)۔ آپ جہنمیوں کا استغاثہ ملاحظہ نہیں کرتے فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ (الشعراء) میں کہتا ہوں: اس وجہ سے ہمارے نزدیک دوست کی دوست کے لیے شہادت جائز نہیں جس طرح رشتہ دار کی رشتہ دار کے لیے شہادت (گواہی) جائز نہیں۔ اس کا بیان اور اس کی علت سورۃ النساء میں گزر چکی ہے اور ضرب المثل ہے أیھم أحب الیك أخوك أم صدیقك قال أخي إذا کان صدیقي۔ تجھے کون زیادہ محبوب ہے اپنا بھائی یا دوست۔ اس نے کہا: میرا بھائی جب وہ میرا دوست ہو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا بعض علماء نے کہا: یہ بنی لیث بن بکر کے بارے میں نازل ہوئی یہ بنی کنانہ سے ایک قبیلہ ہے ان میں سے کوئی شخص تنہا کھانا نہیں کھاتا تھا اور وہ کئی دن تک بھوکا رہتا تھا حتی کہ وہ کوئی ایسا شخص پالیتا جو اس کے ساتھ کھانا کھاتا؛ اسی سے کسی کا قول ہے:

إذا ما صنعتِ الزاد فالتمسي له أكِيلًا فإنّي لستُ آكله وَحْدِي (2)

ابن عطیہ نے کہا: یہ سیرت انہیں حضرت ابراہیم سے میراثاً ملی تھی۔ حضرت ابراہیم تنہا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور بعض عرب ایسے تھے کہ جب ان کا مہمان ہوتا تو وہ میزبان مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا تو آیت کریمہ کھانے کی سنت کو بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی اور یہ سیرت عرب میں سے جو اس کے مخالف تھا اس کو یہ ختم کرنے والی ہے اور عربوں کے نزدیک تنہا کھانا جو حرام تھا اس کو مباح کرنے والی ہے اس کے ذریعے اخلاق کریمانہ کا قصد کیا ہے اور اس کو لازم کرنے میں مبالغہ کیا ہے کھانے والے کو حاضر کرنا اچھی بات ہے کہ تنہا کھانا بھی حرام نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا، جمیعا پر نصب حال کی بناء پر ہے۔ اَشْتَاتًا شت کی جمع ہے۔ الشت بمعنی التفرق (جدا جدا ہونا) ہے کہا جاتا ہے: شت القوم یعنی قوم جدا جدا ہوئی۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے۔ لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج والنھد والاجتماع۔ اس باب سے مقصود بقول ہمارے علماء اکٹھا کھانا کھانا مباح ہے اگرچہ کھانے میں احوال مختلف ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے پس یہ ان گروہوں میں سنت ہے جو اجتماعی کھانے، دعوت ولیمہ اور سفر میں کھانا ختم ہونے کی صورت میں کھانے کی طرف بلائے جاتے ہیں اور جس کی چابیوں کا تو امین یا دوستی کی وجہ سے مالک ہو تو تیرے لیے رشتہ دار یا دوست کے ساتھ مل کر کھانا اور تنہا کھانا جائز ہے۔ النھد سے مراد وہ مال یا کھانا ہوتا ہے جس کو احباب خرچ کرنے کے لیے جمع کرتے ہیں پھر اسے آپس میں خرچ کرتے ہیں تو کہتے ہیں: تناھدوا انہوں نے خوراک کو جمع کیا پھر اکٹھا خرچ کیا۔ صاحب العین سے مروی ہے ابن درید نے کہا: اسی سے کہا جاتا ہے تناھد القوم الشی بینھم، ہروی نے کہا: حسن کی حدیث میں ہے۔ أخرجوا نھدکم فإنه أعظم للبرکۃ وأحسن لأخلاقکم۔ اپنا اپنا مال یا کھانا نکالو اور جمع کرو کیونکہ اس میں بہت برکت ہوتی ہے اور تمہارے اخلاق کے لیے اچھا ہے۔ النھد جو سفر میں برابر خرچہ تقسیم کرنے کے وقت احباب نکالتے ہیں اور جمع کرتے ہیں عرب کہتے ہیں:

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 5
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 196

ھات نھدك۔ نون کے کسرہ کے ساتھ اپنا کھانا لے آؤ۔ مہلب نے کہا: وہ جمع شدہ کھانا کھانے والوں کے لیے اس لئے نہیں رکھا جاتا کہ وہ برابر کھائیں بلکہ ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق کھاتا ہے اور کوئی شخص زیادہ بھی کھاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایسا نہ کرنا تقویٰ کے زیادہ مناسب ہے اگر ایک جماعت ہر روز کسی ایک کے کھانے پر جمع ہوتی ہے تو یہ النھد سے افضل ہے کیونکہ وہ کھانا نہیں نکالتے مگر اسلیے تا کہ ان میں سے ہر ایک اس کے مال سے پہنچے پھر یہ معلوم نہیں ہوتا شاید اس نے اپنے مال سے کم کھایا ہو اور دوسروں نے اس کے مال سے زیادہ کھایا ہو۔ جب وہ ایک دن ایک کے کھانے پر جمع ہوں گے اور دوسرے دن دوسرے کے کھانے پر جمع ہوں گے اور اس میں شرط بھی نہ ہوگی تو وہ مہمان ہو جائیں گے اور مہمان خوشی سے کھاتا ہے جو اسے پیش کیا جاتا ہے۔ ایوب سختیانی نے کہا: النھد یہ تھا کہ لوگ سفر میں ہوتے تھے بعض منزل پر پہلے پہنچ جاتے تھے وہ جانور ذبح کرتے تھے، کھانا تیار کرتے تھے، پھر وہ اگلی منزل پر پہلے پہنچ جاتا تھا اور وہ اسی طرح کھانا تیار کرتا تھا تو لوگوں نے کہا: یہ جو کچھ کرتا ہے ہم بھی اس کی طرح کرنا پسند کرتے ہیں آؤ ہم ایسا کام کریں جس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ ہو تو انہوں نے نہد (مال جمع کرنا) کا پروگرام بنایا۔ نیک لوگ جب مال جمع کرتے تھے جو ان میں سے مالدار ہوتا تھا وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ دینے کی کوشش کرتا تھا اگر دوسرے اس سے راضی نہ ہوتے تھے تو وہ پوشیدہ ایسا کر دیتا تھا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۱ مفسرین کا بیوت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابراہیم نخعی اور حسن نے کہا: اس سے مراد مساجد ہیں (1) مطلب یہ ہے کہ مساجد میں جو تمہاری صنف سے بیٹھے ہیں انہیں سلام کرو اگر مساجد میں کوئی نہ ہوں تو آدمی کو یوں کہنا چاہیے: السلام علی رسول اللہ۔ بعض نے کہا السلام علیکم کہنا چاہیے اور اس سے فرشتوں کا ارادہ کرے، پھر کہے: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں معمر نے خبر دی انہوں نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس ارشاد کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: جب تم مسجد میں داخل ہو تو السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہو۔ بعض نے کہا: البیوت سے مراد رہنے والے گھر ہیں، یعنی اپنے او پر سلام کرو یہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور عطاء بن ابی رباح کا بھی یہی قول ہے وہ اگر ایسے گھروں میں داخل ہو جہاں کوئی نہ ہو تو انسان اپنے اوپر سلام کرے یوں کہے: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین۔ ابن عربی نے کہا: بیوت میں عموم کا قول صحیح ہے تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اس عموم کے تحت ہر گھر داخل ہے خواہ وہ غیر کا ہو یا اپنا ہو، جب غیر کے گھر میں داخل ہو تو سلام کرے جیسا حدیث میں وارد ہے۔ فرمایا السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین (2) کہے۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب گھر خالی ہو۔ اگر اس کے گھر میں اس کے اہل، خدام وغیرہ ہوں تو السلام علیکم کہے۔ اگر مسجد میں داخل ہو تو السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے خالی گھر میں یہی کہنے کی ترغیب دی ہے۔ ابن عربی نے کہا: مختار یہ ہے کہ گھر خالی ہو تو سلام

1۔ تفسیر ثعلبی، جلد 4، صفحہ 199　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 126

لازم نہیں ہے۔ اگر سلام فرشتوں پر مقصود ہو تو فرشتے ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں، لیکن تو گھر میں داخل ہو تو تیرے لیے الله کا ذکر کرنا مستحب ہے تو اس طرح کہے: ماشاء الله لا قوۃ الا بالله۔ یہ سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔ قشیری نے کہا۔ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا میں زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہر گھر میں داخل ہونے کے وقت عام ہے۔ اگر اس میں کوئی مسلمان رہتا ہو تو یوں کہے: السلام علیکم و علینا و علی عباد الله الصالحین۔ اگر گھر میں غیر مسلم ہو تو یوں کہے: السلام علی من اتبع الھدی یا السلام علینا و علی عباد الله الصالحین۔ ابن خویز منداد نے کہا: مجھے ابو العباس اصم نے لکھا کہ ہمیں محمد بن عبد الله بن عبد الحکم نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابن وہب نے بتایا فرمایا ہمیں جعفر بن میسرہ نے بتایا انہوں نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم گھروں میں داخل ہو تو ان کے رہنے والوں پر سلام کرو اور الله کے نام کا ذکر کرو کیونکہ جب کوئی گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کرتا ہے اور کھانے پر الله کا نام ذکر کرتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: یہاں نہ تمہارے لیے رات گذارنے کی جگہ ہے اور نہ شام کا کھانا ہے۔ اور جب کوئی سلام نہیں کرتا جب داخل ہوتا ہے اور کھانے پر الله کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: تم نے رات گذارنے کی جگہ اور کھانے کو پالیا''۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث کا معنی حضرت جابر کی حدیث سے ثابت ہے جو امام مسلم نے تخریج کی ہے۔ اور ابو داؤد نے امام مالک اشجعی سے روایت کی ہے فرمایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہو تو کہے اللھم انی أسألك خیرا لولج و خیر الخروج بإسم الله ولجنا و بإسم الله خرجنا و علی الله ربنا توکلنا (1)۔ پھر اپنے گھر والوں پر سلام کرے''۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَحِیَّةً۔ یہ مصدر ہے کیونکہ فسلموا کا معنی ہے فحیوا۔ برکت کے ساتھ اس کا وصف بیان فرمایا کیونکہ اس میں دعا ہے اور جس پر سلام کیا گیا ہے اس کی محبت حاصل کرنا ہے اور الطیب کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا کیونکہ اس کو سننے والا خوشی محسوس کرتا ہے۔ کذلك میں کاف تشبیہ ہے اور ذالك اسم اشارہ ہے اور یہ ان سنن کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح تمہارے لیے ان اشیاء میں تمہارے دین کی سنت بیان کی گئی ہے وہ تمہارے لیے وہ تمام چیزیں بیان کرتا ہے جس کی تمہیں تمہارے دین میں حاجت ہوتی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۶۲

''پس سچے مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں الله تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر جب ہوتے ہیں آپ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے لیے تو (وہاں سے) چلے نہیں جاتے جب تک کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں، بلاشبہ وہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، ما یقول الرجل اذا دخل بیتہ، جلد 2، صفحہ 339

لوگ جو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ پس وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لیے تو اجازت دیجیے ان میں سے جسے آپ چاہیں اور مغفرت طلب کیجیے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے، بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اس آیت میں انحصر کے لیے ہے، معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانیوالے کا ایمان مکمل نہیں ہوتا مگر جب وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بغیر عناد کے سننے والا ہو اس طرح کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو مکمل کرنے کا ارادہ کرتا ہو وہ اس ارادہ کے وقت اس کے زوال کے ساتھ اس کے فساد کا ارادہ کرتا ہو اللہ تعالیٰ نے سورت کے آغاز میں بیان فرمایا کہ اس نے آیات بینات نازل کیں۔ اور نزول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ اور سورت کا اختتام آپ کی متابعت کرنے کے موکد حکم کے ساتھ کیا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم، قرآن کے حکم کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امر جامع سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ ہے جس کے لیے امام کو لوگوں کے جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس میں مصلحت کا پھیلاؤ ہوتا ہے، مثلاً دین میں سنت کو قائم کرنا، ان کے اجتماع کے ساتھ دشمن کو ڈرانا اور ضرر پر مشتمل ہو تو اس کے مشورہ کے لیے لوگوں کو جمع کرے۔ امام وہ ہوتا ہے جس کے اذن کا انتظار کیا جاتا ہے وہ امارت کا امام ہے۔ کوئی شخص کسی عذر کی وجہ سے نہ جائے مگر اس کی اجازت سے جب کوئی شخص اس کے اذن سے جائے گا تو اس سے سوء ظن دور ہو جائے گا۔ مکحول اور زہری نے کہا: جمعہ، امر جامع سے ہے(1)۔ نماز کے امام سے اجازت لینی چاہیے جب ریاست کا امیر اس کو امامت کے لیے مقدم کرے جب اجازت طلب کرنے والا اجازت طلب کرنا چاہے۔ ابن سیرین نے کہا: لوگ اجازت طلب کرتے تھے جب امام منبر پر ہوتا تھا۔ جب یہ زیادہ عمل ہوا تو زیاد نے کہا: جو اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھے وہ بغیر اجازت کے چلا جائے۔ یہ مدینہ طیبہ میں تھا حتی کہ سہل بن ابی صالح کو جمعہ کے دن نکسیر آئی تو انہوں نے امام سے اجازت طلب کی۔ آیت کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ ریاست کے امیر سے اجازت لی جائے جو احکام نبوت کی تکمیل کراتا ہے کیونکہ اسے بعض اوقات دینی امور میں سے کسی امر کے لیے کسی شخص کو روکنا ہوتا ہے، رہا صرف نماز کا امام اس کے لیے یہ نہیں ہے کیونکہ وہ دین کے اجزاء میں ایک جزء پر وکیل ہے اس شخص کا جو نبوت کے احکامات کی تکمیل و تعمیل کراتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ آیت خندق کے کھودنے کے وقت نازل ہوئی جب قریش آئے تھے اور ان کا قائد ابوسفیان تھا۔ غطفان قبیلہ کے لوگ آئے تھے اور ان کا قائد عیینہ بن حصن تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھودنے کا حکم دیا۔ یہ شوال سنہ ۵ ہجری میں واقعہ پیش آیا تھا۔ منافق لوگ کام کرنے سے آہستہ آہستہ کھسک جاتے تھے اور جھوٹے عذر پیش کرتے تھے۔ اشہب اور ابن عبدالملک نے امام مالک سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی طرح محمد بن اسحاق نے کہا۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 197

مقاتل نے کہا: یہ حضرت عمر کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے غزوہ تبوک میں نبی کریم ﷺ سے لوٹنے کی اجازت طلب کی (1) تو آپ ﷺ نے اس کو اجازت دے دی۔ اور فرمایا: تو جا اللہ کی قسم! تو منافق نہیں ہے۔ یہ آپ منافقین کو سنانا چاہتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت عمر نے عمرہ کے لیے اجازت طلب کی آپ ﷺ نے جب انہیں اجازت دی تو فرمایا: ''اے ابوحفص! اپنی نیک دعاؤں میں ہمیں نہ بھولنا'' (2)۔ میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے کیونکہ وہ تمام اقوال کو شامل ہے۔ ابن عربی نے آیت کے نزول میں اس کو پسند کیا ہے جو ہم نے امام مالک اور اسحاق سے ذکر کیا ہے اور یہ کہ یہ جنگ میں خاص ہے۔ فرمایا: اس کو دو امر واضح کرتے ہیں ایک یہ کہ دوسری آیت میں ہے۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا اور منافقین کھسک جاتے تھے اور جماعت سے بھاگ جاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام کو حکم دیا کہ ان میں سے کوئی بھی نہ نکلے حتی کہ رسول اللہ ﷺ اسے اجازت دیں۔ اس سے اس کا ایمان ظاہر ہوگا۔ دوسرا یہ ارشاد: لَمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ یعنی حدث میں اجازت طلب کرنا جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو۔ اور امام کے لیے حدث کی صورت میں منع کرنے اور باقی رکھنے کا کوئی اختیار نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ یہ ارشاد بیان کرتا ہے کہ یہ جنگ کے ساتھ خاص ہے۔ میں کہتا ہوں: عموم کا قول اولی اصح، احسن اور اعلی ہے۔ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ نبی کریم ﷺ کو اختیار تھا اگر چاہیں تو اجازت دیں چاہیں تو منع کر دیں قتادہ نے کہا: فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ ارشاد ہے۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ: 43) اور اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ یعنی جماعت کے خروج کی وجہ سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں اگر آپ ان میں عذر دیکھیں۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''نہ بنالو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے انہیں جو کھسک جاتے ہیں تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لے کر پس ڈرنا چاہیے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا انہیں دردناک عذاب نہ آلے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا یعنی دور سے آواز دینا: اے ابوالقاسم! بلکہ رسول مکرم کی تعظیم کرو جیسا کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (الحجرات: 3)

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 127

2۔ سنن ابن ماجہ، ابواب المناسك، فضل دعاء الحجاج، جلد 1، صفحہ 213

سنن ابی داؤد، کتاب ابواب قیام اللیل، باب الدعاء، حدیث نمبر 1280

سعید بن جبیر اور مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے تم کہو: یارسول اللہ! اور نرم اور عزت آمیز ملائم لہجہ میں کہو، گستاخانہ انداز میں: یا محمد! نہ کہو۔ قتادہ نے کہا: انہیں حکم دیا کہ رسول کریم کی عزت واحترام کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض کر کے اپنے خلاف دعا کا موجب نہ ہو کیونکہ آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا۔ التسلل اور الإسلال کا معنی ہے نکلنا لواذا، الملاوذة سے مشتق ہے کسی چیز کی آڑ لینا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ منافق لوگ نماز جمعہ سے ایک دوسرے کی آڑ لے کر کھسک جاتے تھے۔ لِوَاذًا حال کی جگہ میں مصدر ہے یعنی ملاوذین، یعنی ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہیں۔ یہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپنے کے لیے کرتے تھے، کیونکہ منافقین پر جمعہ کے دن اور خطبہ میں حاضری سے بھاری کوئی اور چیز نہیں تھی؛ یہ نقاش نے حکایت کیا ہے۔ اس پر گفتگو گزر چکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جہاد سے ایک دوسرے کی آڑ لے کر لوٹ جاتے تھے۔ حسن نے کہا: لواذا جہاد سے فرار ہوتے ہوئے؛ اسی سے حضرت حسان کا قول ہے:

وقریشٌ تجول منا لِوَاذا     لم تحافظ وخَفّ منها الحُلُومُ (1)

واؤ صحیح ہے کیونکہ لاذ میں واؤ متحرک ہے کہا جاتا ہے: لاذ یلاوذ ملاوذة، ولواذا اور لاذ یلوذ لواذا ولیاذا۔ یہاں واؤ کسرہ کے بعد یاء سے بدل گئی ہے کیونکہ لاذ میں تعلیل ہو چکی ہے۔ جب فاعل کا مصدر ہو تو تعلیل نہیں کی جائے گی، کیونکہ فاعل میں تعلیل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اس آیت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت سے ڈرایا ہے۔ اور اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے ارشاد سے نافرمانی پر سزا کی پیروی کرنا واجب ہے۔ فتنة سے مراد یہاں قتل ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ عطاء نے کہا: اس سے مراد زلزلے اور ہولناکیاں ہیں۔ جعفر بن محمد نے کہا: ظالم بادشاہ ہے جو ان پر مسلط کیا جاتا ہے بعض نے کہا فتنة سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی نحوست کی وجہ سے دلوں پر مہر لگا دینا ہے۔ امرہ میں ضمیر کا مرجع بعض علماء کے نزدیک امر اللہ ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ بعض نے کہا: امر رسول ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے، يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اعراض کرتے ہیں۔ ابو عبیدہ اور اخفش نے کہا: عن، اس جگہ زائدہ ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: زائدہ نہیں ہے اس کا معنی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد مخالفت کرتے ہیں جیسے شاعر نے کہا: لم تَنْتَطِق عن تَفَضُّلِ۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف: 50) یعنی بعد امر ربہ۔ اور ان یحذر کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اکثر نحویوں کے نزدیک حذر زیدا جائز نہیں اور ان میں یہ جائز ہے کیونکہ حروف جارہ اس کے ساتھ حذف ہوتے ہیں۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 129

''سن لو! بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ خوب جانتا ہے جس حالت پر تم ہو اور اس دن جب وہ لوٹائے جائیں گے اس (کی بارگاہ) کی طرف تو وہ انہیں آگاہ کرے گا جو انہوں نے کیا تھا اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی تخلیق اور ملک سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وہ تمہیں اس پر جزاء دے گا اور یہاں یعلم بمعنی علم ہے۔ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ پہلے خطاب کے صیغے ذکر فرمائے اب خبر کی طرف رجوع فرمایا اس کو خطاب التلوین کہا جاتا ہے۔ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ان کے اعمال کے متعلق انہیں خبر دے گا اور انہیں ان کی جزا دے گا۔ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۠ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال اور احوال کو خوب جاننے والا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين۔ سورۃ النور کی تفسیر قرطبی کا ترجمہ 3 جولائی بروز جمعرات 2008ء صبح آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر ختم ہوا۔ اے میرے کریم رب! آسمان و زمین کے خالق و مالک اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما اور اسے دنیا و آخرت کی سعادتوں کے حصول کا باعث بنا۔ میرے والدین، میرے مشائخ، میرے اساتذہ کرام، طلباء، میرے اہل بیت سب کی بخشش کا سبب بنا۔

بجاہ سیدنا محمد المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ اجمعین۔

سید محمد اقبال شاہ عفی عنہ

# حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

## ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کتابِ رشد و ہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور و سرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

# تفسیر احکام القرآن 7 جلد

مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

آیات احکام کا مفصل لغوی و تفسیری حل، امہاتِ کتبِ تفسیر کی روشنی میں مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

یہ تفسیر طلباء، علماء، وکلاء، ججز اور عوام و خواص کے لئے قیمتی سرمایہ

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

**کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

## ☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

**﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾**

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد ہفتم

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۵ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد ہفتم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی<br>مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی<br>من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ<br>ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

# ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 32630411-021-32212011۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

## سورۃ فاطر

# سورۃ الفرقان

اٰیاتھا ۷۸ | ۲۵ سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ مَکِّیَّۃٌ ۴۲ | رکوعاتھا ٦

جمہور علماء کے نزدیک یہ تمام سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: اس کی تین آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ یہ ہیں وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ضحاک نے کہا: یہ سورت مدنی ہے اور اس میں کئی آیات ہیں۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔

اس سورت کا مقصود قرآن کی عظمت کا بیان، کفار جو نبوت میں طعن کرتے ہیں ان کا ذکر، ان کے مقالات اور جہالتوں کا رد ہے، ان کی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے وہ کہتے ہیں: قرآن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گھڑا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل نہیں کیا گیا۔ نعوذ باللہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ۝

”بڑی خیر (و برکت) والا ہے وہ جس نے اتارا ہے الفرقان، اپنے (محبوب) بندہ پر تاکہ وہ بن جائے سارے جہان والوں کو (غضب الٰہی سے) ڈرانے والا، وہ جس کے لیے حکومت ہے آسمانوں اور زمین کی اور نہیں بنایا ہے اس نے کسی کو بیٹا اور نہیں اس کا کوئی شریک سلطنت میں اور اس نے پیدا فرمایا ہے ہر چیز کو، پس اس نے مقرر کیا ہے ہر چیز کا ایک اندازہ۔ اور بنا رکھے ہیں انہوں نے خدائے برحق کو چھوڑ کر ایسے خدا جو پیدا نہیں کر سکتے کسی چیز کو اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں اور نہیں قدرت رکھتے اپنے آپ کو نقصان (سے بچانے) کی اور نہ نفع پہنچانے کی اور نہیں طاقت رکھتے کسی کو مارنے کی اور نہ زندہ کرنے کی اور نہ مرنے کے بعد جلانے کی“۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ، تَبٰرَكَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: عربی لغت میں تَبٰرَكَ اور تقدس ایک ہی ہیں دونوں لفظ عظمت کے لیے بولے جاتے ہیں۔ زجاج نے کہا: تبارک یہ برکت سے تفاعل کا وزن ہے۔ کہا: برکت کا معنی ہے ہر خیر والے کی جانب سے کثرت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تبارك کا معنی ہے بلند ہونا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تعالی عطاء ہ، اس کی عطا زیادہ اور کثیر ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس کا انعام دائمی ہے اور ثابت ہے۔ نحاس نے کہا: لغت اور اشتقاق میں یہ ان سب سے اولیٰ ہے، یہ برك الشیء سے مشتق ہے، جب وہ ثابت ہو، اسی سے برك الجمل والطیر علی الماء ہے یعنی وہ ثابت رہا۔ جہاں تک پہلے قول کا تعلق ہے وہ غلط ہے کیونکہ تقدیس میں طہارت کا تصور ہوتا ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ تو کہا جاتا ہے تبارك الله، یہ نہیں کہا جاتا: الله متبارك، اور نہ ہی یہ کہا جاتا ہے: الله مبارك کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات امور توقیفی ہیں (☆) وہی اسماء وصفات ذکر کی جاسکتی ہیں جن کے بارے میں کوئی نص ہو۔ طرماح نے کہا:

تبارکتَ لا معطٍ لشیءٍ منعتَه    ولیس لما اعطیتَ یا ربِّ مانعُ

”تو بڑی ہی برکتوں والا ہے جس شے کو تو روک لے وہ کوئی عطا کرنے والا نہیں اور جو تو عطا کرے اے میرے رب! اسے کوئی روکنے والا نہیں“۔

ایک اور نے کہا: تبارکتَ ما تقدِرْ یقع ولکَ الشکر تو بڑی ہی برکتوں والا ہے تو جو اندازہ لگاتا ہے وہ واقع ہو جاتا ہے اور تیرے لیے شکر ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں مبارك ذکر کیا ہے اور ہم نے بھی اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے، اگر اس پر اجماع واقع ہو کہ یہ اسم استعمال نہ کیا جائے تو اجماع کی وجہ سے اسے تسلیم کیا جائے گا اگر اس میں اختلاف واقع ہو تو بہت سے اسماء ایسے ہیں جن کو اسم شمار کرنے میں اختلاف ہے جس طرح دھر وغیرہ۔ ہم نے وہاں اس پر متنبہ کر دیا ہے۔ الحمدللہ۔

الْفُرْقَانَ سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہر نازل شدہ کتاب کا نام ہے جس طرح فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (الانبیاء: 48) اس کا نام فرقان رکھنے کی دو وجہیں ہیں: (۱) اس نے حق اور باطل، مومن اور کافر میں تفریق کر دی ہے (۲) جو حلال و حرام کے احکام مشروع کیے گئے ہیں ان کی اس میں وضاحت ہے، نقاش نے اس کی وضاحت کی ہے۔ عَلٰى عَبْدِهٖ اس سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا، یکون کا اسم مضمر ہے جو ہو ضمیر ہے وہ عَبْدِهٖ کی طرف لوٹ رہی ہے یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ اس سے زیادہ قریب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ضمیر الْفُرْقَانَ کی طرف لوٹے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے علی عبادہ قراءت کی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: انذر جب وہ ڈرائے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ النذیر جو ہلاکت سے خبردار کرنے والا ہو۔ جوہری نے کہا: نذیر کا معنی منذر ہے اور نذیر کا معنی انذار بھی ہے۔ العالمین سے مراد یہاں انسان اور جن ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کو ان دونوں کی طرف بھیجا گیا تھا اور آپ ﷺ ان دونوں کے لیے نذیر تھے۔ اور آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپ ﷺ کے علاوہ

☆ قرآن اور حدیث میں جیسے ذکر آیا ہے قیاس اور اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

کسی کی رسالت عام نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد تمام انسانوں کے لیے رسول تھے کیونکہ آپ کے ذریعے مخلوق کا آغاز ہوا۔

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کو بیان فرمایا وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا اللہ تعالیٰ نے اپنی پاکی بیان کی ان چیزوں سے، جو مشرکوں نے کہا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ان چیزوں سے بھی پاکی بیان کی، جو یہودیوں نے کہا: حضرت عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالا ہے اور اس سے پاکی بیان کی، جو نصاریٰ نے کہا: حضرت مسیح اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے ماوراء ہے۔

وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ جس طرح بت پرستوں نے کہا: وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ بات اس طرح نہیں جس طرح مجوسیوں اور بت پرستوں نے کہا: شیطان اور ظالم بعض اشیاء کو پیدا کرتے ہیں۔ اور نہ ہی بات اس طرح ہے جس طرح کوئی یہ کہتا ہے: مخلوق کو ایجاد کی قدرت حاصل ہے، آیت اس سب کا رد کرتی ہے۔ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا مخلوقات میں سے جس چیز کو بھی پیدا کیا اپنی حکمت کے ساتھ اس کا اندازہ لگایا، جس کا بھی ارادہ کیا سہو اور غفلت سے پیدا نہیں کیا۔ مقادیر اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر قیامت اور قیامت کے بعد تک جاری ہیں وہی خالق اور مقدر ہے پس اسی کی عبادت کرو۔

وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً مشرکوں نے جو کچھ کہا اس کا ذکر تعجب کے انداز میں کیا کہ انہوں نے کئی معبود بنا لیے، ساتھ ہی ساتھ اپنی وحدانیت اور قدرت پر دلیل کو ظاہر کیا۔ لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا یہ معبودان باطلہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے۔ وَّہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ جب کہ انہیں بنایا جاتا ہے۔ جب مشرکوں نے اعتقاد کیا کہ یہ بت نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کو اس طرح تعبیر کیا جس طرح ذوی العقول کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَلَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا نہ وہ تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اور نہ نفع لا سکتے ہیں، مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس بات پر قادر نہیں کہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں یا نفع پہنچائیں اور نہ ہی انہیں، جو ان کی عبادت کرتے ہیں کیونکہ یہ جمادات ہیں۔

وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا نہ وہ کسی کو موت دیتے ہیں اور نہ ہی کسی کو زندہ کرتے ہیں۔ نشور سے مراد موت کے بعد زندگی دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کیا تو وہ زندہ ہو گئے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

حتی یقول الناس مما رأوا یا عجبا للمیت الناشر

یہاں تک کہ لوگوں نے جو دیکھا اس کی وجہ سے کہہ اٹھیں: اس میت پر تعجب جو دوبارہ زندہ ہونے والا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۨافۡتَرٰىہُ وَ اَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا ۚ﴿۴﴾ وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ﴿۵﴾ قُلۡ اَنۡزَلَہُ الَّذِیۡ یَعۡلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝

''اور کہنے لگے کفار کہ نہیں یہ (قرآن) مگر محض بہتان جو گھڑ لیا ہے اس نے اور مدد کی ہے اس کی اس معاملہ میں ایک دوسری قوم نے، سو یہ (کہہ کر) انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے اور سفید جھوٹ بولا ہے۔ اور کفار نے کہا: یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اس شخص نے لکھوا لیا ہے انہیں، پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تا کہ ازبر ہو جائیں) آپ فرمایئے: اتارا ہے اس کو اس (خدا) نے جو جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے بارے رازوں کو، واقعی وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا مراد مشرکین قریش ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے یہ بات کرنے والا نضر بن حارث تھا اور اس طرح قرآن میں جہاں بھی اساطیر کا ذکر ہے اس کا کہنے والا بھی یہی تھا (1)۔ محمد بن اسحاق نے کہا: وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیا کرتا تھا۔ اِنْ هٰذَآ اسم اشارہ سے مراد قرآن حکیم ہے اِلَّآ اِفْكُ اِۨفْتَرٰىهُ یعنی جھوٹ ہے جو خود انہوں نے گھڑا ہے۔ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ مراد یہودی ہیں، یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ سے مراد ابو فکیہ جو بنی حضری کا غلام تھا، عداس اور جبر ہے، یہ تینوں اہل کتاب تھے۔ سورۂ نحل میں ان کا ذکر گزر چکا ہے۔ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا انہوں نے ظلم کیا، ظلم سے پہلے باء حرف محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے فقد اتوا ظلما انہوں نے ظلم کیا۔ وَّزُوْرًا۝ وَ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ زجاج نے کہا: اساطیر کا واحد اسطورہ ہے جس طرح احدوثہ کی جمع احادیث آتی ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اساطیر، یہ اسطار کی جمع ہے جس طرح اقوال کی جمع اقاویل آتی ہے۔ اكْتَتَبَهَا اسے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لکھا ہے فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ یہ اس پر پڑھا جاتا ہے۔ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا صبح و شام، یہاں تک کہ یہ یاد ہو جاتا ہے۔ تُمْلٰى اصل میں تملل ہے، ایک جنس کے دو حرف ہونے کی وجہ سے دوسرے لام کو یاء سے بدل دیا جس طرح تقضی البازی اصل میں تقضض تھا اسی طرح دوسرے افعال میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے: اس قرآن کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو سر کو جانتا ہے وہ عالم الغیب ہے اسے کسی معلم کی کوئی ضرورت نہیں۔ السِّرَّ کا ذکر کیا جہر کا ذکر نہیں، کیونکہ جو ذات سر کو جانتی ہے وہ جہر کو بدرجہ اولیٰ جانتی ہے۔ اگر قرآن اہل کتاب وغیرہ سے اخذ کیا گیا ہوتا تو ان پر زائد نہ ہوتا جب کہ یہ ایسے فنون لایا ہے جو ان سے خارج ہیں یہ ان سے ماخوذ نہیں۔ اگر یہ ان سے ماخوذ ہوتا تو مشرک بھی اس پر قادر ہوتے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قادر ہوئے، انہوں نے اس کے ساتھ معارضہ کیوں نہ کیا تو ہر طرح سے ان کا اعتراض باطل ہو گیا۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وہ اپنے اولیاء کے گناہ بخشنے والا اور ان پر رحم فرمانے والا ہے۔

## وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۝ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ

1۔ المحرر الوجیز

قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۸

''اور کفار بولے: کیا ہوا ہے اس رسول کو کھانا کھاتا ہے اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا (ایسا کیوں نہ ہوا) کہ اتارا جاتا اس کی طرف خزانہ یا (کم ازکم) اس کا ایک باغ ہی ہوتا، کھایا کرتا اس (کی آمدنی) سے، اور ان ظالموں نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر ایک ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے''۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَقَالُوْا ان کے طعنوں میں سے ایک اور چیز کا ذکر کیا۔ قَالُوْا میں ضمیر قریش کے لیے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشہور ملاقات ہوئی۔ سورۂ اسراء میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ابن اسحاق نے سیرت میں اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے سردار عتبہ بن ربیعہ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے اور عرض کیا: اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) اگر تو سرداری کو پسند کرتا ہے تو ہم تجھے اپنے اوپر حاکم بنا دیتے ہیں، اگر تو مال سے محبت کرتا ہے تو ہم اپنے اموال میں سے آپ کے لیے مال جمع کیے دیتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا تو وہ حجت بازی کی طرف لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا: کیا وجہ ہے تو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں ٹھہرتا ہے (1) جب کہ تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، انہوں نے کھانا کھانے پر عار دلائی کیونکہ انہوں نے یہ اندازہ کیا تھا کہ رسول تو فرشتہ ہوتا ہے، بازار میں چلنے پر عار دلائی جب انہوں نے کسریٰ، قیصر اور جابر بادشاہوں کو دیکھا کہ وہ تو بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں ان سے ملتے جلتے انہیں بعض چیزوں کا حکم دیتے اور انہیں بعض چیزوں سے منع کرتے۔ انہوں نے کہا: یہ خواہش رکھتا ہے کہ ہمارا بادشاہ بن جائے تو پھر بادشاہوں کے طریقے کی کیوں مخالفت کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ جواب دیا، اور اپنے نبی پر اسے نازل کیا: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ آپ غم نہ کریں اور غمگین نہ ہوں، یہ ایسا عیب ہے جس کی عار آپ سے دور کر دی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ تجارت اور طلب معاش کے لیے بازاروں میں جانا مباح ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ضرورت کے لیے اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کی دعوت یاد کرانے کے لیے داخل ہوتے۔ اور اپنی ذات کو قبائل پر پیش کرتے ممکن ہے اللہ تعالیٰ انہیں حق کی طرف پھیر دے۔ بخاری شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بیان کی گئی ہے: ''نہ ترش رو اور نہ سخت دل اور نہ ہی بازار میں شور و شغب کرنے والے''۔ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکی ہے۔ بازار کا ذکر کئی روایات میں مذکور ہے جس کا ذکر اہل صحیح نے کیا ہے۔ صحابہ کرام کی تجارت تو معروف ہے خصوصاً مہاجرین کی تجارت تو مشہور ہے جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے مہاجر بھائیوں کو بازاروں میں خرید و فروخت مشغول رکھتی، اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے، اس سورت میں اس مسئلہ پر مزید گفتگو ہوگی۔

1۔ المحرر الوجیز

لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ، لَوْلَآ، ھلا کے معنی میں ہے، فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا یہ جواب استفہام ہے اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ یہ محل رفع میں ہے معنی ہے ھلا یلقی یعنی کیوں نہیں ان کی طرف بھیجا گیا خزانہ؟ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا یا ان کے لیے کوئی باغ کیوں نہیں جس سے وہ کھاتے يَّاْكُلُ یاء کے ساتھ ہے مدنیوں، ابوعمرو اور عاصم نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے باقی کوفہ کے قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں قرائتیں اچھی ہیں جو صحیح معنی دیتی ہیں اگرچہ یاء کے ساتھ قراءت زیادہ واضح ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکیلے ذکر پہلے گزر چکا ہے تو آپ کی طرف ضمیر لوٹانا زیادہ واضح ہے۔

وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا اس کی تفسیر سورۃ الاسراء میں گزر چکی ہے۔ یہ بات کرنے والا ابن زبعری تھا جس کا ذکر ماوردی نے کیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝

''ملاحظہ تو کیجئے کیسے بیان کرتے ہیں آپ کے متعلق طرح طرح کی مثالیں سو وہ (اس بے ادبی کے باعث) گمراہ ہو گئے پس وہ راہ نہیں پا سکتے۔ بڑی خیر (و برکت) والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو بنا دے آپ کے لیے بہتر اس سے (یعنی ایسے) باغات رواں ہوں جن کے نیچے نہریں اور بنا دے آپ کے لیے بڑے بڑے محلات''۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ امثال بیان کیں تا کہ وہ آپ کو جھٹلانے تک پہنچ سکیں۔ فَضَلُّوْا وہ حق کے راستہ اور جس کا انہوں نے ارادہ کیا اس تک پہنچنے سے گمراہ ہو گئے۔ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا انہوں نے جو کچھ آپ کے متعلق کہا اس کی صحت تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ یہ کلام شرط و جزا ہے۔ جَعَلَ لَكَ میں ادغام نہیں کیا کیونکہ دونوں کلمے منفصل ہیں دو ہم مثل حروف کے اجتماع سے ادغام جائز ہوتا ہے۔ وَ يَجْعَلْ لَّكَ محل جزم میں ہے اس کا عطف جَعَلَ کے محل پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو جب کہ ماقبل سے اس کو قطع کر دیا گیا ہو، اہل شام نے اسی طرح قراءت کی ہے، عاصم سے بھی اسی طرح مروی ہے وَ يَجْعَلُ لَّكَ مرفوع ہے یعنی و سیجعل لك فی الآخرۃ قصورا وہ تیرے لیے آخرت میں محلات بنا دے۔ مجاہد نے کہا: قریش پتھر کے بنے گھر کو قصر کہتے خواہ کیسا ہوتا۔ لغت میں قصر کا معنی روکنا ہے، محل کو قصر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس میں جو ہوتا ہے اس تک پہنچنے سے روک دیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عرب مٹی کے گھروں کو قصر کہتے اور اون اور جانوروں کے بالوں سے بنے گھر کو بیت کہتے، قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ سفیان نے حبیب بن ابی ثابت انہوں نے خیثمہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں تو ہم آپ کو دنیا کے خزانے اور ان کی چابیاں دے دیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی کو نہیں دیئے گئے اور نہ آپ کے بعد کسی کو دیئے جائیں گے اور یہ آخرت میں آپ کے اجر میں کوئی کمی کرنے والے نہ ہوں گے اور اگر آپ چاہیں تو ہم اسے آخرت میں آپ کے لیے جمع کر دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: ''یہ آخرت میں میرے لیے جمع کر دیئے جائیں'' تو اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝ (1) یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ آیت جنتوں کے خازن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک لائے۔ حدیث میں ہے: رضوان جب نازل ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کیا پھر کہا: اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم رب العزت تجھے سلام فرماتا ہے یہ ڈبیہ ہے۔ وہ نور کی ایک ڈبیہ تھی جو چمک رہی تھی۔ آپ کا رب آپ کو فرماتا ہے: یہ دنیا کے خزانوں کی چابیاں ہیں جب کہ آخرت میں مچھر کے پر کے برابر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں کمی نہیں کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کے ارادہ سے حضرت جبرئیل امین کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیل امین نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا مقصد تواضع اختیار کرنے کا مشورہ دینا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے رضوان! مجھے اس کی ضرورت نہیں فقر مجھے زیادہ محبوب ہے اور مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں صابر و شکر گزار بندہ بنوں''۔ رضوان نے عرض کی: آپ نے صحیح فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۫ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا ۝ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیْرًا ۝ وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِیْرًا ۝

''بلکہ یہ تو جھٹلاتے ہیں قیامت کو، اور ہم نے تیار کر رکھی ہے ان کے لیے جو جھٹلاتے ہیں قیامت کو بھڑکتی ہوئی آگ۔ جب یہ آگ دیکھے گی انہیں دور سے تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا۔ اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے زنجیروں میں جکڑ کر تو پکاریں گے وہاں موت کو (کہا جائے گا بدبختو!) نہ مانگو آج ایک موت بلکہ مانگو بہت سی موتیں''۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ اس ساعت سے مراد یوم قیامت ہے۔ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا، سعیر سے مراد جہنم ہے جو ان پر جوش مار رہی ہوگی۔ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ وہ پانچ سو سال کی مسافت سے انہیں دیکھے گی۔ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیْرًا ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب جہنم انہیں دیکھے گی تو وہ اس کی آواز سنیں گے جو آواز اس کے ان پر حد درجہ غصے ہونے کی ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جب جہنم کے خازن انہیں دیکھیں گے تو وہ لوگ ان خازنوں کے غصے ہونے کی آواز سنیں گے جو ان کو عذاب دینے کے حریص ہوں گے، پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ جہنم کی دو آنکھوں کے درمیان اپنا ٹھکانہ بنالے''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کی دو آنکھیں بھی ہیں؟ فرمایا: ''کیا تم اللہ تعالیٰ کو ارشاد فرماتے ہوئے نہیں سنتے: اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیْرًا۔ (2) جہنم کی آگ میں سے ایک گردن ظاہر ہوگی جس کی دو آنکھیں ہوں گی اور ایک زبان ہوگی جو بولے گی، وہ کہے گی: جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو معبود بنایا اس کا معاملہ میرے سپرد کر دیا گیا ہے، تو وہ ان لوگوں کو اس پرندے سے زیادہ دیکھے گی جو تل کے دانہ کو دیکھتا ہے اور اسے اٹھا لیتا ہے''۔ ایک روایت میں ہے: ''آگ سے ایک گردن نکلے گی وہ

1۔ تفسیر طبری
2۔ ایضاً

کفار کو یوں اچک لے گی جس طرح پرندہ تل کے دانے کو اٹھا لیتا ہے''۔ رزین نے اسے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور ابن عربی نے اسے اپنی قبس میں صحیح قرار دیا ہے اور کہا: وہ گردن مخلوق سے انہیں یوں الگ کر لے گی جس طرح پرندہ مٹی سے تل کے دانے کو الگ کر لیتا ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز آگ (جہنم) سے ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھتی ہوں گی، دو کان ہوں گے جو سنتے ہوں گے، ایک زبان ہوگی جو گفتگو کرے گی وہ کہے گی: تین قسم کے افراد میرے سپرد کیے گئے ہیں: (۱) ہر عناد رکھنے والا جابر (۲) ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کے معبود ہونے کا دعویٰ کیا (۳) تصویریں بنانے والے''۔

اس باب میں حضرت ابو سعید کی ایک روایت ہے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ کلبی نے کہا: انہوں نے ایسا غصہ سنا جیسا انسان کا غصہ ہوتا ہے اور ایسی آواز سنی جیسی آواز گدھے کی ہوتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے انہوں نے اس کی چنگھاڑ کو سنا اور اس کے غصہ کو جانا۔ قطرب نے کہا: تغیظ کو سنا نہیں جاتا بلکہ اسے دیکھا جاتا ہے، اس کا معنی ہے انہوں نے اس کے غصہ کو دیکھا اور اس کی چنگھاڑ کو سنا، جس طرح شاعر کا قول ہے:

ورأيتُ زوجَكِ فی الوَغَی متقلِّدًا سیفًا و رُمْحًا

میں نے جنگ میں تیرے خاوند کو دیکھا جو تلوار کو قلادہ بنائے اور نیزہ اٹھائے ہوئے تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لھا، فیھا کے معنی میں ہے یعنی اس میں عذاب دیئے گئے لوگوں کے غصہ اور چیخ و پکار کو سنیں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّشَهِيقٌ ۝ (ہود) فی اور لام قریب قریب ہیں۔ تو کہتا ہے: أفعلُ هذا فی اللہ و للہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ عمل کرتا ہوں، دونوں جملوں کا معنی ایک ہے۔

وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ قتادہ نے کہا: ہمارے لیے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عبداللہ کہا کرتے تھے: جہنم کافر پر یوں تنگ کی جائے گی جس طرح لوہا نیزے کے سرے پر تنگ کیا جاتا ہے، ابن مبارک نے اسے دقائق میں ذکر کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے، ثعلبی اور قشیری نے ان سے یہ بیان کیا ہے، ماوردی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی ہے۔ مُّقَرَّنِيْنَ کا معنی ہے جکڑے ہوئے؛ یہ ابو صالح کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے ہاتھ ان کی گردنوں کے ساتھ طوق میں جکڑ دیئے جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں شیاطین کے ساتھ ملا دیا جائے گا یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کے شیطان کے ساتھ ملا دیا جائے گا؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ سورۂ ابراہیم میں یہ گزر چکا ہے، عمرو بن کلثوم نے کہا:

فآبوا بالنھاب وبالسبایا وابنا بالملوك مقرنین

وہ غنیمتوں اور قیدیوں کے ساتھ لوٹے جب کہ ہم لوٹے ایسے بادشاہوں کے ساتھ جن کو جکڑا گیا تھا۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ثبور کا معنی ہلاکت ہے؛ یہ ضحاک نے کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ثبورا کا معنی ویل

ہے۔(1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''سب سے پہلے جو یہ کلمہ کہے گا وہ ابلیس ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے آگ کا حلہ پہنایا جائے گا، اس حلہ کو اس کے آبروؤں پر رکھا جائے گا، اس کے پیچھے سے اسے ہانکا جائے گا اس کی اولاد اس کے پیچھے ہوگی وہ کہہ رہا ہوگا: ہائے ہلاکت''۔ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے اسے نصب دی گئی ہے، تقدیر کلام یہ ہے: ثبرنا ثبورا: یہ زجاج کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مفعول بہ ہے۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا کیونکہ تمہاری ہلاکت اس سے زیادہ ہے کہ تم ایک دفعہ ہلاکت پکارو۔ ثبورا کہا، کیونکہ یہ مصدر ہے جو قلیل اور کثیر کے لیے واقع ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس کی جمع نہیں بنائی جاتی، یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ضربتہ ضربا کثیرا و قعد قعودا طویلا یہ آیات ابن خطل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۝ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔــوْلًا ۝

''ان سے پوچھیے: (ذرا بتاؤ) یہ بھڑکتی ہوئی آگ بہتر ہے یا دائمی جنت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے، ہوگی یہ جنت ان کے اعمال کا صلہ اور (ان کی زندگی کا) انجام''۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اگر یہ کہا جائے: کس طرح یہ کہا: اَذٰلِكَ خَيْرٌ جب کہ آگ میں تو کوئی خیر نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سیبویہ نے عربوں سے یہ حکایت بیان کی ہے الشقاء أحب إليك أم السعادة بدبختی تجھے زیادہ محبوب ہے یا سعادت، جب کہ یہ تو معلوم ہے کہ سعادت ہی اسے زیادہ محبوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ افعل منك کے باب میں سے نہیں بلکہ یہ تو تیرے اس قول کی طرح ہے: عندہ خیر، نحاس نے کہا: یہ اچھا قول ہے جس طرح فرمایا: فشرکما لخیرکما الفداء تم میں سے برا تم میں سے اچھے پر فدا ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس لیے فرمایا، کیونکہ جنت اور دوزخ منازل کے باب میں داخل ہیں یہ اس لیے فرمایا کیونکہ دونوں منزلوں میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَاۗءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ کی طرف پھیرا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا کی طرف لوٹایا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے کفار! یہ تمہارے علم اور تمہارے اعتقاد کے اعتبار سے فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے جب وہ جہنمیوں کا سا عمل کرتے ہیں تو وہ اس طرح ہو گئے گویا وہ کہتے ہیں: بے شک آگ میں بھلائی ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔــوْلًا اس کے لیے وہ نعمتیں ہیں جو وہ چاہیں گے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس وعدہ کا سوال کیا۔ انہوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! تو ہمیں وہ عطا کر جو تو نے اپنے رسولوں کی زبانوں پر ہم سے وعدہ کیا ہے؛ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتے ان کے لیے جنت کا سوال کریں گے، اس کی دلیل

1۔ تفسیر طبری

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﹰالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ (غافر: 8) یہ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا کا معنی ہے واجب، اگر چہ اس کا سوال نہ کیا جائے جس طرح قرض ہوا کرتا ہے؛ عربوں سے یہ حکایت بیان کی گئی ہے: لا عطینك ألفا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا کا معنی ہے یہ تیرے لیے ثابت ہے تو اس کا سوال کر۔ زید بن اسلم نے کہا: انہوں نے دنیا میں جنت کا سوال کیا اور دعا کے ذریعے اس میں رغبت کی تو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کو عطا فرمایا جو انہوں نے سوال کیا تھا اور جو انہوں نے مطالبہ کیا تھا وہ دے دیا، یہ تعبیر پہلے قول کی طرف راجح ہے۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ یَنْۢبَغِیْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِیْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ مَنْ یَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِیْرًا ﴿۱۹﴾

''اور جس روز (محشر میں) اللہ انہیں اکٹھا کرے گا اور ان (باطل خداؤں) کو جنہیں یہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا تو اللہ پوچھے گا (ان معبودوں سے) کیا تم نے گمراہ کیا میرے ان بندوں کو یا وہ خود ہی سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے، وہ کہیں گے تو پاک ہے ہر عیب سے، ہمیں یہ بات زیبا نہ تھی کہ ہم بناتے تیرے سوا کسی غیر کو دوست لیکن تو نے آرام و آسائش عطا کی انہیں اور ان کے آباء کو یہاں تک کہ انہوں نے بھلا دیا تیری یاد کو اور (یوں) وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ (اے کفار!) تمہارے معبودوں نے تمہیں جھٹلا دیا جو تم کہتے ہو پس اب نہ تم اپنے سے عذاب کو پھیر سکتے ہو اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی، اور جس نے ظلم کیا تم میں سے تو ہم چکھائیں گے اسے عذاب بڑا''۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ ابن محیصن، حمید، ابن کثیر، حفص، یعقوب اور ابو عمرو نے دوری کی روایت میں یَحْشُرُهُمْ یاء کے ساتھ قراءت کی ہے، ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ کلام کے شروع میں ہے كَانَ عَلٰى رَبِّكَ اور اس کے آخر میں ہے ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰۤؤُلَآءِ باقی قراء نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس سے مراد فرشتے، انسان، جن، حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں جن کی لوگ عبادت کرتے تھے، یہ مجاہد اور ابن جریج کا قول ہے۔ ضحاک اور عکرمہ نے کہا: مراد بت ہیں۔ فَیَقُوْلُ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے: یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ابن عامر اور ابو حیوہ نے تعظیم کے لیے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ یہ استفہام ہے اور کفار کو توبیخ کی جا رہی ہے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ جو معبود تھے انہوں نے کہا: سُبْحٰنَكَ تو ہر عیب سے پاک ہے۔ مَا كَانَ یَنْۢبَغِیْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِیَآءَ اگر یہ سوال کیا جائے: اگر وہ بت جن کی عبادت کی جاتی ہے انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا تو وہ بات کس

طرح کریں گے جب کہ وہ تو جمادات میں سے ہیں؟ اسے جواب دیا جائے گا: اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح قوت گویائی دے گا جس طرح ہاتھوں اور پاؤں کو قوت گویائی دے گا۔ حضرت حسن بصری اور ابو جعفر نے اسے أن نتخذ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے نحویوں نے اس قراءت میں گفتگو کی ہے۔ ابو عمرو بن علاء اور عیسیٰ بن عمر نے کہا: نتخذ پڑھنا جائز نہیں۔ ابو عمرو نے کہا: اگر یہ نتخذ ہوتا تو دوسرا من حذف کر دیا جاتا تو تو یہ پڑھتا نتخذ من دونك اولیاء؛ ابو عبیدہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ نتخذ جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے من دو دفعہ ذکر کیا ہے اگر کلام اس طرح ہوتا جس طرح اس نے قراءت کی ہے تو یوں ارشاد ہوتا، اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِیَآءَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دوسرا من زائد ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عمرو جیسا جلیل القدر آدمی جو کہتا ہے اس کو مستحسن سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ دلیل لایا ہے، اس نے جو کہا اس کی وضاحت یہ ہے کہ کہا: میں نے کسی آدمی کو دوست نہیں بنایا۔ یہ کسی معین فرد کے لیے تو جائز ہے۔ پھر کہا جائے گا: میں نے کسی کو بھی دوست نہیں بنایا تو یہ عام نفی ہوگی۔ تیسرا قول: ولیا؛ یہ ماقبل کے تابع ہے تو اس میں من داخل کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ رسولوں کے وصال کے بعد تو نے انہیں دنیا میں صحت، غنا اور طویل عمر کے ساتھ لطف اندوز کیا۔

حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ یہاں تک کہ انہوں نے تیرے ذکر کو ترک کیا اور تکبر و جہالت کی وجہ سے تیرے ساتھ شرک کیا تو انہوں نے ہماری عبادت کی جب کہ ہم نے انہیں اس بات کا حکم نہیں دیا تھا۔ ذکر کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) فرقان جو رسولوں پر نازل کیا گیا، انہوں نے اس پر عمل کو ترک کر دیا، یہ ابن زید کا قول ہے (۲) جو ان پر احسان کیا گیا اس پر شکر اور ان پر انعام۔

وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا بے شک وہ ہلاک ہونے والے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ بوار سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہلاکت ہے، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ اہل حمص پر جھانکے فرمایا: اے اہل حمص! اس بھائی کی طرف آؤ جو تمہارا مخلص ہے۔ جب وہ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم حیاء کیوں نہیں کرتے تم ایسے گھر بناتے ہو جن میں رہتے نہیں، ایسا مال جمع کرتے ہو جس کو کھاتے نہیں اور ایسی امیدیں رکھتے ہو جس کو پاتے نہیں تم سے قبل جو لوگ ہو گزرے ہیں انہوں نے مضبوط گھر بنائے، غلام جمع کیے، دور کی امیدیں رکھیں ان کی جمعیتیں ہلاک ہو گئیں، ان کی آرزویں کھوٹی ہو گئیں اور ان کے گھر قبریں بن گئے۔ بورا کا معنی ہلاک ہونا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے: ان کے گھر برباد ہو گئے یعنی خالی ہو گئے، ان میں کوئی چیز باقی نہ بچی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: بورا کا معنی ہے ان میں کوئی خیر نہیں۔ یہ بوار الأرض سے مشتق ہے اس کا معنی ہے کھیتی سے اس کو معطل کر دینا تو اس زمین پر کوئی خیر نہ رہی۔ شہر بن حوشب نے کہا: بوار کا معنی فاسد ہونا اور کساد بازاری کا شکار ہونا ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: بارت السلعة جب سامان میں خرید و فروخت نہ رہے۔ اس معنی میں ایک حدیث طیبہ ہے: نعوذ باللہ من بوار الایم ہم بے خاوند عورت کے نہ پوچھے جانے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یہ اسم مصدر ہے جس طرح زور، اس میں واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مونث برابر ہیں، ابن زبعری نے کہا:

یا رسول الملیك أن لسانی　راتق ما فَتَقتُ إذ أنا بور

إذ أباری الشیطان فی سنن الغی　ومن مَالَ میله مثبور

اے بادشاہ کے رسول! جو میں نے کہا ہے میری زبان ان چاکوں کو رفو کر رہی ہے جو میں نے کیے، میں ہلاک ہونے والا ہوں، کیوں کہ میں سرکشی کے معاملات میں شیطان کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا، جو انسان اس کے میلان جیسا میلان رکھتا ہے وہ ہلاک ہونے والا ہے۔

بعض نے کہا: واحد بائر ہے اور جمع بور ہے جس طرح کہا جاتا ہے عائذ کی جمع عوذ، ھائد کی جمع ھود۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بورا کا معنی ہے حق سے اندھا۔

فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا جب معبود براءت کا اظہار کریں گے: جو تم کہتے تھے اس میں انہوں نے تمہاری تکذیب کر دی ہے یعنی تم جو یہ کہتے تھے: یہ معبود ہیں۔ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ یعنی یہ معبود نہ تو تم سے عذاب کو پھیر سکتے ہیں اور نہ ہی تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب معبودوں نے انہیں جھٹلایا تو یہ کچھ طاقت نہیں رکھیں گے۔ صَرْفًا یعنی عذاب کو دور کرنے اور لَا نَصْرًا اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

ابن زید نے کہا: معنی ہے اے مومنو! ان کفار نے اس کا انکار کر دیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر بِمَا تَقُولُونَ کا معنی ہوگا جو تم حق کہتے ہو۔ ابو عبید نے کہا: معنی ہے جو تم کہتے ہو اس کو انہوں نے جھٹلا دیا وہ تمہیں اس حق سے پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت دی ہے اور انہوں نے جو تمہیں جھٹلایا ہے اس کی وجہ سے جو عذاب ان پر نازل ہوگا اس بارے میں اپنی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ عام قراءت بِمَا تَقُولُونَ تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ ہے ہم نے اس کے معنی کی وضاحت کر دی ہے۔ فراء نے کہا: یہ قراءت کی جاتی ہے فقد کذبوکم بما یقولون یعنی مجرد کا صیغہ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور یہ خطاب شرک اپنانے والوں کو ہوگا جس نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو معنی ہوگا: فما یستطیع الشرکاء شرکاء طاقت نہیں رکھیں گے۔

وَمَنْ يَظْلِمْ مِنْكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم میں سے جو شرک کرے پھر اس شرک پر مر جائے نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ہم آخرت میں اسے سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (الاسراء) آیت میں کبیر کا معنی شدید ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝

''اور نہیں بھیجے ہم نے آپ سے پہلے رسول مگر وہ سب کھانا کھایا کرتے اور چلا پھرا کرتے بازاروں میں، اور ہم نے بنا دیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش، کیا تم (اس آزمائش میں) صبر کرو گے؟ اور آپ کا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ یہ مشرکوں کے جواب میں نازل ہوئی جب انہوں نے کہا:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاقہ کی عار دلائی اور کہا: مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہوئے تو یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ حضرت جبرئیل امین نے عرض کی: السلام علیک یا رسول اللہ! اللہ جو تیرا رب ہے وہ تجھے سلام فرماتا ہے اور تجھے فرماتا ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ یعنی وہ بھی دنیا میں معاش تلاش کیا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ جب خبر پر لام آ گیا تو اِنّ میں کسرہ ہی ہوگا، اگر خبر پر لام نہ ہوتا تب بھی ان کے ہمزہ میں کسرہ کے سوا کوئی چیز جائز نہ ہوتی کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے، یہ تمام نحویوں کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: مگر علی بن سلیمان نے محمد بن زید سے یہ قول نقل کیا ہے اِن کے ہمزہ میں فتحہ بھی جائز ہے اگرچہ خبر پر لام ہو۔ میں اسے اس سے وہم گمان کرتا ہوں۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: کلام میں حذف ہے اس کا معنی ہے وما أرسلنا قبلك رسلا إلا إنهم ليأكلون الطعام پھر رسلا کو حذف کر دیا کیونکہ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں رسلا پر دلالت موجود ہے۔ زجاج کے نزدیک موصوف محذوف ہے اس کے نزدیک موصول کا حذف اور صلہ کو باقی رکھنا جائز نہیں، جس طرح فراء نے کہا۔ فراء نے کہا: محذوف من ہے معنی ہوگا إلا من إنهم ليأكلون الطعام اور اسے اس فرمان کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (الصافات) اور اس فرمان کے ساتھ تشبیہ دی ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) تقدیر کلام یہ ہوگی ما منکم إلا من هو واردها، یہ کسائی کا بھی قول ہے۔ عرب کہتے ہیں: ما بعث إليك من الناس إلا من انه يعطيك میں نے تیری طرف لوگوں میں سے کسی کو نہیں بھیجا مگر اسے جو تجھے عطا کرتا ہے۔ تیرا یہ قول: انه ليعطيك، من کا صلہ ہے۔ زجاج نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ من موصولہ کا حذف جائز نہیں ہوتا۔ اہل معانی نے کہا: معنی ہے وما أرسلنا قبلك من المرسلين إلا قيل إنهم ليأكلون ہم نے آپ سے قبل رسولوں کو نہیں بھیجا مگر یہ کہا گیا کہ وہ کھانا کھاتے ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (فصلت: 43) ابن انباری نے کہا: إلا کے ان بعد کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور واؤ مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی الا وانهم۔ ایک فرقہ اسی طرف گیا ہے کہ ليأكلون الطعام حدث سے کنایہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اپنے معنی میں بلیغ ہے، اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ (المائدہ: 75)

وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ جمہور نے يمشون یاء کے فتحہ، میم کے سکون اور شین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عوف اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے یاء کے ضمہ، میم کے فتحہ اور شین کی شد مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے معنی ہوگا انہیں بازار میں چلنے کی دعوت دی جاتی ہے اور برانگیختہ کیا جاتا ہے۔ ابو عبدالرحمن سلمی نے اسے یاء کے ضمہ، میم کے فتحہ اور شین مشددہ مضمومہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ يمشون کے معنی میں ہے۔

شاعر نے کہا:

أُمشي باعطان المباءة وأبتغي قلائص منها صعبة ورکوب

اس شعر میں مشی، مشی کے معنی میں ہے۔

کعب بن زہیر نے کہا:

منه تظل سباع الجو ضامرة ولا تمشي بواديه الاراجيل

اس شعر میں بھی تُمشي، تمشي کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** یہ آیت اسباب کو حاصل کرنے، تجارت، صنعت وغیرہ کے ذریعے طلب معاش میں اصل ہے، یہ معنی کئی مقام پر گزر چکا ہے، لیکن ہم یہاں ان میں سے وہ چیزیں ذکر کریں گے جو کفایت کر جائیں گی۔ ہم کہتے ہیں: میرے سامنے اس زمانے کے ایک شیخ نے جری کلام کرتے ہوئے یہ کہا: انبیاء علیہم السلام کو اس لیے مبعوث کیا گیا تا کہ ضعفاء کے لیے اسباب کی سنتیں قائم کریں۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا: یہ قول جاہلوں، غبیوں اور بے وقوف چرواہوں سے صادر ہو سکتا ہے یا اس آدمی سے صادر ہو سکتا ہے جو کتاب اور اعلیٰ سنت پر طعن کرنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اصفیاء، رسل اور انبیاء کے اسباب اور حرفوں کے بارے میں خبر دی ہے، اس کا ارشاد ہے اور اس کا قول حق ہے: وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80) ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ علماء نے کہا: وہ تجارت کرتے ہیں اور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جَعَلَ رِزْقِيْ تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي میرا رزق نیزے کے سائے میں رکھ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (الانفال: 69) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارت کرتے، حرفہ اختیار کرتے اور اپنے اموال میں محنت مزدوری کرتے، اور کفار میں سے جو ان کی مخالفت کرتے ان کے ساتھ جنگ کرتے۔ کیا تم انہیں کمزور خیال کرتے ہو؟ اللہ کی قسم! وہ اقویاء تھے ان کے پیچھے صالح خلف ہیں جو ان کی اقتدا کرنے والے ہیں، ان کا اس میں طریقہ ہدایت دینے اور ہدایت لینے کا ہے۔ اس نے کہا: انہوں نے اس چیز کو اپنایا کیونکہ وہ اقتداء کے ائمہ تھے تو انہوں نے ضعفاء کے حق میں خود انہیں اپنایا جہاں تک اپنی ذات کے حق میں ہے تو یہ نہیں، اس کی وضاحت اصحاب صفہ میں موجود ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ اس طرح ہوتا تو ان پر اور ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب ہوتا کہ اس کی وضاحت کریں جس طرح قرآن میں ثابت ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى (البقرہ: 159) یہ بینات وہدی میں سے ہے، جہاں تک اصحاب صفہ کا تعلق ہے وہ تنگ حالی کے وقت اسلام کے مہمان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کبھی صدقہ کا مال آتا تو آپ اس صدقہ میں انہیں خاص کرتے، جب کوئی ہدیہ آتا تو ان کے ساتھ بیٹھ کر اس ہدیہ کو تناول فرماتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایندھن لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے لیے پانی لاتے۔ امام بخاری اور دوسرے علماء نے ان کے یہی اوصاف ذکر کیے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے ان پر شہروں کو کھول دیا اور علاقے فتح کر دیے تو انہیں امیر بنا دیا گیا اور اسباب کا حکم دیا گیا۔ پھر یہ قول اس

بات پر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کمزور تھے کیونکہ فرشتوں کے ذریعے ان کی تائید کی گئی اور انہیں ثابت قدم کیا گیا، اگر وہ قوی ہوتے تو انہیں فرشتوں کی تائید کی ضرورت نہ ہوتی جب کہ ان کی تائید کامیابی کے اسباب میں سے ایک سبب تھا۔ ہم ایسے قول اور ایسی گفتگو جو اس تاویل کی طرف لے جائے، سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں بلکہ اسباب اور وسائط سے فائدہ اٹھانا اللہ کا حکم اور طریقہ ہے اور اس کے رسول کا حکم اور طریقہ ہے یہی حق مبین ہے اور صراط مستقیم ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا فرمان حق: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (الانفال: 60) ضعفاء پر محدود رہے گا اور تمام خطابات اسی طرح ہوں گے۔ قرآن حکیم میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب فرمایا: اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء: 63) اللہ تعالیٰ عصا مارے بغیر بھی سمندر کو پھاڑ سکتا تھا، اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کو خطاب ہے: وَ هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (مریم: 25) جب کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ حکم دینے کے بغیر بھی کھجوریں گرانے پر قادر تھا، اس میں حضرت مریم کو کھجور کا تنا ہلانے اور اس مشقت کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس سب کے باوجود ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ کوئی ایسا آدمی ہو جس پر مہربانی کی جاتی ہو، اس کی مدد کی جاتی ہو، اس کی دعا قبول کی جاتی ہو یا خاص طور پر اسے کرامت سے نوازا جاتا ہو یا کسی اور وجہ سے ایسا ہو اس وجہ سے قواعد کلیہ اور امور جمیلہ کو ختم نہیں کیا جائے گا۔ ایسی بات کہنے سے دور ہو جا، دور ہو جا، ایسی بات نہ کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ۝ (الذاریات) ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا اور اس کے رسول کریم نے سچ فرمایا۔ علماء تاویل کے اجماع کے مطابق یہاں رزق سے مراد بارش ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (غافر: 13) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ۝ (ق) یہ مشاہدہ نہیں کیا گیا کہ مخلوق پر آسمان سے روٹیوں کے طبق اور گوشت کے پیالے نازل ہوں بلکہ اس کے وجود میں اسباب اصل ہیں اسی معنی میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اطلبوا الرزق فی خبایا الأرض مراد ہے تم زمین میں ہل چلانے، اسے کھودنے (گوڈی کرنے) اور درخت لگانے کے ذریعے رزق تلاش کرو، بعض اوقات کسی شی کا نام انجام اور عاقبت کے اعتبار سے رکھا جاتا ہے بارش کو رزق کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ بارش کے ذریعے رزق حاصل ہوتا ہے، کلام عرب میں یہ مشہور ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لان یاخذ أحدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیرله من أن یسأل احدا أعطاه أو منعه تم میں سے کوئی اپنی رسی لے اور اپنی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے تو یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے چاہے وہ اسے دے یا اس کا سوال رد کر دے، یہ حکم اس کے بارے میں بھی ہے جو بغیر مشقت کے کام ہو جاتا ہے خواہ وہ گھاس ہو یا لکڑیاں ہوں۔

اگر کسی کے لیے پہاڑوں میں رہنا مقدر کر دیا جائے جب کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہو تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ وہ ان چیزوں کے لیے نکلے جو ٹیلے اور پہاڑوں کی چوٹیاں اگاتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان سے ایسی چیزیں حاصل کرے جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کر سکے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا یہی معنی ہے: لو أنکم کنتم توکلون علی اللہ حق توکله لرزقتم کما ترزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق

ہے تو تمہیں بھی اس طرح رزق دیا جائے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے تم خالی پیٹ صبح نکلو گے اور بھرے پیٹ شام کو واپس لوٹو گے۔ اس کا صبح جانا اور شام کو لوٹنا یہی سبب ہے، اس آدمی پر بہت زیادہ تعجب ہے جو اسباب سے لاتعلقی اور یقینی توکل کا دعویٰ کرتا ہے وہ راستہ کی پگڈنڈیوں پر جا بیٹھتا ہے صراط مستقیم اور واضح راستہ کو چھوڑ دیتا ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ثابت ہے کہ اہل یمن حج کیا کرتے تھے اور زاد راہ نہ لیتے اور وہ کہتے: ہم توکل کرتے ہیں، جب وہ آتے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا: **وَتَزَوَّدُوْا** (البقرہ: 197) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے بارے میں یہ منقول نہیں کہ وہ زادِراہ کے بغیر سفر پر نکلے ہوں جب کہ وہ یقینی طور پر توکل کرنے والے تھے۔ توکل کا معنی یہ ہے دل کا رب العالمین پر یہ اعتماد ہو کہ وہ اس کے بکھرے امر کو جمع کر دے گا اور اس کی ضرورت پوری فرما دے گا پھر وہ امر کی بنا پر اسباب کو کام میں لائے، یہی حق ہے۔ ایک آدمی نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا، عرض کی: میں توکل کے قدم پر حج کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فرمایا: تنہا نکلو۔ اس نے کہا: نہیں مگر لوگوں کے ساتھ۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: پھر تو تو ان کی تھیلیوں پر توکل کرنے والا ہوگا۔ ہم نے اسے کتاب قمع الحرص بالزھد والقناعة ورد ذل السوال بالکسب والصناعة میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احب البلاد الی اللہ مساجدھا وأبغض البلاد الی اللہ أسواقھا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے محبوب جگہیں مساجد ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے ناپسندیدہ جگہیں بازار ہیں۔ بزار نے حضرت سلیمان فارسی سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تو طاقت رکھے تو تو پہلا شخص نہ ہو جو بازار میں داخل ہوتا ہے اور تو آخری شخص نہ ہو جو اس سے نکلتا ہے کیونکہ یہ شیطان کا معرکہ ہے وہاں ہی اس کے جھنڈے گاڑے جاتے ہیں''۔ ابوبکر برقانی نے مسند طریقہ سے ابومحمد عبدالغنی بن سعید حافظ سے (عاصم کی روایت سے) وہ ابوعثمان نہدی سے وہ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو بازار میں داخل ہونے والا پہلا شخص نہ ہو اور اس سے نکلنے والا آخری شخص نہ ہو، یہاں شیطان نے انڈے دیئے اور بچے نکالے''۔ ان احادیث میں ایسے دلائل ہیں جو بازاروں میں داخل ہونے کی کراہت پر دال ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں جس میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوتا ہے؛ ہمارے علماء نے اسی طرح کہا ہے۔ جب بازاروں میں باطل بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور منکرات عام ہو گئے ہیں ارباب فضل اور دین کے امور میں جن کی اقتدا کی جاتی ہے ان کے لیے بازار میں داخل ہونا مکروہ ہے تاکہ انہیں ایسی جگہوں سے دور رکھا جائے جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے۔ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ بازار میں جانے کے ساتھ آزمائے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ خیال لائے کہ وہ شیطان کے محل اور اس کے لشکروں کی جگہ میں داخل ہو چکا ہے اور یہ خیال لائے کہ اگر وہ ٹھہرا رہا تو ہلاک ہو جائے گا جس کی حالت یہ ہو تو وہ صرف ضرورت تک وہیں رہے اور اس کے برے انجام سے بچے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بازار کو معرکہ سے تشبیہ دینا بہت اچھی تشبیہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ معرکہ قتال کی

جگہ ہے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بڑے بڑے جوانمرد معرکہ آرا ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو پچھاڑتے ہیں۔ بازار، اس میں شیطان کے فعل، شیطان ان بازار والوں سے جو حصہ پاتا ہے اس طریقہ پر کہ بازار والوں کے مکر، دھوکہ، بیوع فاسدہ میں تساہل، جھوٹ، جھوٹی قسموں پر ابھارنے، آوازوں کے خلط ملط ہونے اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں ان سب کو جنگ کے معرکہ اور اس میں جن کو پچھاڑا جاتا ہے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** ابن عربی نے کہا: کھانا کھانا یہ مخلوق کی ضرورت ہے اس میں کوئی عار نہیں اور نہ اس میں کوئی عیب ہے، جہاں تک بازاروں کا تعلق ہے تو میں نے اہل علم کے مشائخ سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں: وہ کتابوں اور اسلحہ کے بازار کے علاوہ میں داخل نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ضرورت کے وقت ہر بازار میں داخل ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی چیز نہ کھائے کیونکہ یہ عمل مروت کو ختم کرتا ہے اور حشمت کو گرا دیتا ہے۔ احادیث موضوعہ (1) میں ہے: بازار میں کھانا کمینگی ہے۔

میں کہتا ہوں: اہل علم مشائخ نے جو کہا ہے وہ کتنا اچھا ہے کیونکہ اس میں عورتوں کو دیکھنے اور ان کے ساتھ مخالطت سے بچاؤ ہوتا ہے کیونکہ ان بازاروں میں انہیں حاجت نہیں ہوتی جہاں تک کتابوں اور اسلحہ کے بازاروں کے علاوہ بازار ہیں وہ عورتوں سے بھرے ہوتے ہیں اور حیاء کی کمی ان پر غالب آ چکی ہے، یہاں تک کہ عورتوں کو اپنی زینتوں میں عیاں دیکھا جاتا ہے ہمارے زمانہ میں یہ برائی عام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ہم اس کی پناہ مانگتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7۔** ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن زید سے روایت نقل کی ہے وہ عمرو بن دینار قہرمان آل زبیر سے وہ سالم سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جو آدمی ان بازاروں میں سے کسی بازار میں داخل ہوا اس نے لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی و یمیت وھو حی لا یموت بیدہ الخیر وھو علی کل شیء قدیر پڑھا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے اور دس لاکھ برائیاں مٹا دیتا ہے اور جنت میں اس کے لیے محل بنا دیتا ہے۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور آخر میں کچھ اضافہ کیا ہے: اس سے دس لاکھ برائیاں مٹا دیتا ہے اور دس لاکھ درجے بلند کر دیتا ہے اور جنت میں اس کے لیے گھر بنا دیتا ہے۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے۔

ابن عربی نے کہا: یہ اس صورت میں ہوگا جب اس نے اس جگہ اس کے سوا کا قصد نہ کیا ہو کہ وہ طاعت کے ساتھ اس جگہ کو آباد کرے کیونکہ اسے معصیت کے ساتھ آباد کیا جاتا ہے، اسے ذکر کے ساتھ آراستہ کرے کیونکہ غفلت کے ساتھ اسے معطل کر دیا گیا ہے تاکہ وہ جاہلوں کو علم سکھائے اور بھولنے والوں کو یاد دلائے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ بے شک دنیا دار ابتلاء اور دار الامتحان ہے اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ بعض بندوں کو بعض بندوں کے لیے آزمائش بنا دے یہ تمام لوگوں میں ہے وہ مومن ہو یا کافر ہو، صحیح، مریض کے لیے آزمائش ہے، غنی، فقیر کے لیے فتنہ ہے، صابر فقیر، غنی کے لیے فتنہ ہے (2)۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے ساتھی کے

1۔ اس حدیث کو [illegible] سے روایت کیا ہے اور سیوطی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

2۔ المحرر الوجیز

ساتھ آزمایا گیا ہے اس پر لازم ہے کہ اس سے حسد نہ کرے اور اس سے نہ لے مگر وہ جو اسے عطا کرے اور ہر ایک حق پر صابر رہے جس طرح ضحاک نے اَتَصۡبِرُوۡنَ کا معنی کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم حق پر صبر نہیں کرتے''۔ مصیبت زدہ لوگ کہتے ہیں: ہم کو عافیت اور سلامتی کیوں نہیں دی جاتی؟۔ اندھا کہتا ہے: مجھے بینا کیوں نہیں بنایا گیا؟ اسی طرح ہر آفت زدہ آدمی کہتا ہے: رسول جسے نبوت کی کرامت کے ساتھ نوازا گیا ہے یہ اس کے زمانہ کے کفار کے اشراف کے لیے فتنہ ہوتا ہے، اسی طرح علماء اور عادل حکام ہیں۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں غور و فکر نہیں کرتا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ۝ (الزخرف) فتنہ یہ ہے کہ مصیبت زدہ، عافیت والے سے حسد کرے اور عافیت والا مصیبت زدہ کو حقیر جانے، صبر یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے نفس کو روکے، یہ تکبر سے اور وہ دل کی تنگی سے۔ اَتَصۡبِرُوۡنَ اس کا جواب محذوف ہے یعنی ام لا تصبرون یہ جواب کا مقتضی ہے جس طرح مزنی نے کہا: اسے فاقہ نے گھر سے نکالا اس نے مراکب اور مناکب میں ایک خصی کو دیکھا اس کے دل میں خیال آیا تو اس نے ایک آدمی کو آیت پڑھتے ہوئے سنا: اَتَصۡبِرُوۡنَ اس نے کہا: کیوں نہیں اے ہمارے رب! ہم صبر کریں گے اور اجر کی امید رکھیں گے۔ ابن قاسم جو امام مالک کے شاگرد تھے انہوں نے اس آیت کو پڑھا جب انہوں نے اشہب بن عبدالعزیز کو اس کی مملکت میں ان پر گزرتے ہوئے دیکھا پھر اپنے نفس کو اس قول کے ساتھ جواب دیا: سنصبر، ہم صبر کریں گے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''عالم کے لیے جاہل کی ہلاکت ہے، جاہل کے لیے عالم کی ہلاکت ہے، مالک کے لیے مملوک کی ہلاکت ہے، سلطان کے لیے رعیت کی ہلاکت ہے اور رعیت کے لیے سلطان کی ہلاکت ہے ہر ایک دوسرے کے لیے فتنہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: وَ جَعَلۡنَا بَعۡضَكُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَةً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ''، ثعلبی نے اسے مسند ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔

مقاتل نے کہا: یہ آیت ابوجہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عقبہ بن ابی معیط، عتبہ بن ربیعہ اور نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے حضرت ابوذر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمار، حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت سالم جو حضرت ابوحذیفہ کے غلام تھے، حضرت مجع جو حضرت عمر بن خطاب کے غلام تھے اور حضرت جبر جو حضرت حضرمی کے غلام تھے اور ان جیسے اصحاب کو دیکھا تو استہزاء کے انداز میں کہا: کیا ہم اسلام قبول کریں اور ان لوگوں کی مثل ہو جائیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: اَتَصۡبِرُوۡنَ کیا تم یہ سخت حالت اور فقر کو دیکھتے ہوئے اس پر صبر کرتے ہو؟ اَتَصۡبِرُوۡنَ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ان افراد کے ساتھ خاص ہے جو حق پر قائم تھے، گویا کفار کو مہلت اور ان پر رزق کی فراوانی یہ مومنوں کے لیے آزمائش تھی، جب مسلمانوں نے صبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: اِنِّیۡ جَزَيۡتُهُمُ الۡيَوۡمَ بِمَا صَبَرُوۡۤا (المومنون: 111)

**مسئلہ نمبر 9۔** وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيۡرًا ہر انسان کو دیکھنے والا ہے وہ صبر کرے یا جزع و فزع کرے جو ایمان لائے یا ایمان نہ لائے اور جو اپنے قرض کو ادا کرے یا ادا نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَتَصۡبِرُوۡنَ کا معنی ہے تم صبر کرو، جس طرح

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ) یعنی تم رک جاؤ، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۝

''اور کہا ان لوگوں نے جو امید نہیں رکھتے تھے ہم سے ملنے کی کہ کیوں نہ اتارے گئے ہم پر فرشتے یا ہم دیکھ لیتے اپنے رب کو، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اپنے دلوں میں اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی۔ جس روز وہ دیکھیں گے فرشتوں کو تو کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اس روز مجرموں کے لیے اور فرشتے کہیں گے: تمہارے لیے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے''۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وہ ارادہ کرتا ہے وہ دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے نہیں ڈرتے یعنی وہ اس چیز پر ایمان نہیں رکھتے، شاعر نے کہا:

اذا لَسَعَتْه النحلُ لم يَرْجُ لَسْعَها

جب شہد کی مکھیاں اس کو ڈنگ ماریں تو اس کے ڈنگ کا خوف نہیں کرتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَا يَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ پرواہ نہیں کرتے، شاعر نے کہا:

لعمرك ما أرجو إذا كنتُ مسلمًا على أي جنب كان في الله مصرعي

تیری زندگی کی قسم! جب میں مسلمان ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر میری موت کس پہلو پر واقع ہوتی ہے۔

ابن شجرہ نے کہا: وہ امید نہیں رکھتے، شاعر نے کہا:

أترجو أمةٌ قتلتْ حُسينا شفاعة جده يوم الحساب

کیا وہ لوگ جنہوں نے امام عالی مقام کو شہید کیا تھا وہ قیامت کے روز آپ کے نانا کی شفاعت کی امید رکھتے ہیں؟

لَوْلَآ اُنْزِلَ کیوں نہ نازل کیے گئے عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ہم پر فرشتے جو خبر دیتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا یا اپنے رب کو عیاں دیکھتے جو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی خبر دیتا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا۝ (الاسراء) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا۝ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی بات کا سوال کیا جو حقیقت سے بہت بعید تھی، کیونکہ فرشتوں کو نہیں دیکھا جا سکتا مگر موت کے وقت اور نزول عذاب کے وقت۔ اللہ تعالیٰ کا احاطہ آنکھیں نہیں کر سکتیں اللہ تعالیٰ کی ذات آنکھوں کا احاطہ کر سکتی ہے کوئی ایسی آنکھ نہیں جو اسے دیکھے۔ مقاتل نے کہا: عتوا سے مراد ہے زمین میں

غلبہ۔ عتوشدید ترین کفر اور سخت ظلم ہے۔ جب معجزات انہیں کفایت نہیں کرتے تو فرشتے انہیں کیسے کفایت کریں گے جب کہ وہ فرشتوں اور شیاطین کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ ان کے لیے ایک ایسے معجزہ کا ہونا ضروری ہے جو معجزہ وہ آدمی قائم کرے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے۔ اس قوم کو معجزہ کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں جنہوں نے معجزہ دیکھ لیا تھا۔

**یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى یَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ** اس سے یہ ارادہ کیا کہ فرشتوں کو کوئی نہیں دیکھتا مگر موت کے وقت ہی انہیں دیکھتا ہے، وہ مومنوں کو جنت کی بشارت دیتے ہیں، مشرکوں اور کفار کو لوہے کے ہنٹر مارتے ہیں یہاں تک کہ ان کی روحیں نکل آتی ہیں۔

**وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا** یہ ارادہ کیا ہے کہ فرشتے کہتے ہیں: حرام کر دیا گیا ہے کہ جنت میں کوئی داخل ہو مگر یہ کہ جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے، شرعی احکام کو بجالائے، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قیامت کا دن ہے؛ یہ مجاہد اور عطیہ عوفی کا قول ہے۔ عطیہ نے کہا: جب قیامت کا دن ہوگا تو مومن کو خوشخبری دیتے ہوئے ملاقات کی جائے گی۔ جب کافر یہ دیکھے گا تو اس کی تمنا کرے گا تو وہ فرشتے کو نہیں دیکھے گا۔ **یَوْمَ یَرَوْنَ** کو نصب تقدیر کلام کی وجہ سے دی گئی ہے وہ یہ ہے لا بشری یوم یرون الملائکۃ۔

**یَوْمَىِٕذٍ** یہ **یَوْمَ یَرَوْنَ** کی تاکید ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز نہیں کہ **یَوْمَ یَرَوْنَ**، **بُشْرٰى** کی وجہ سے منصوب ہو کیونکہ جو نفی کے حکم میں ہو وہ ماقبل میں عمل نہیں کرتا لیکن اس میں تقدیر یہ ہے کہ معنی ہو جس روز وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو انہیں بشارت سے روک دیا جائے گا۔ **یَوْمَىِٕذٍ** تاکید ہے، اس کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ اس دن کو یاد کرو جس روز وہ فرشتوں کو دیکھیں گے۔ پھر ابتدا کی اور ارشاد فرمایا: **لَا بُشْرٰى یَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا** فرشتے کہیں گے: قطعی حرام ہے یعنی بشارت صرف مومنوں کے لیے ہے، شاعر نے کہا:

**الا اصبحت اسماء حجرا محرما**

یہاں یہ ارادہ کیا ہے، خبردار اسماء قطعی حرام ہوگئی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

حنت إلى النخلة القصوى فقلت لها حجر حرام الا تلك الا هاريس

اس میں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے فرمایا: **وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا** یہ مجرموں کے قول سے ہے اور اس پر وقف ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مَّحْجُوْرًا** یعنی انہیں پناہ دیئے جانے سے روک دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز اسے ان پر روک دیا، پہلا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، فراء نے بھی یہی کہا ہے، یہ ابن انباری نے کہا۔ حضرت حسن بصری اور رجا نے حُجرا پڑھا ہے جب کہ دوسرے علماء نے اسے کسرہ کے ساتھ حجرا پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کفار کے قول میں سے ہے انہوں نے یہ قول اپنی ذاتوں سے کیا، یہ قتادہ نے کہا، جو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کفار کا قول ہے جو انہوں نے

ملائکہ سے کیا۔ یہ پناہ مانگنے کے لیے لفظ استعمال ہوتا ہے یہ دور جاہلیت میں معروف تھا، جب کوئی آدمی کسی ایسے آدمی سے ملتا جس سے وہ خوف محسوس کرتا تو کہتا حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی مجھ سے تعرض کرنا تیرے لیے حرام ہے۔ اس کو نصب اس جملہ کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے دی گئی ہے حجرتُ علیك، حجر اللهُ علیك۔ جس طرح تو کہتا ہے: سقیا و رعیا یعنی مجرم جب فرشتوں کو دیکھیں گے کہ وہ مجرموں کو جہنم میں پھینکتے ہیں تو وہ کہیں گے: نعوذ باللہ منکم ہم تم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں؛ قشیری نے اس کا ذکر کیا، مہدوی نے مجاہد سے یہی معنی نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حِجْرًا مجرموں کا قول ہے مَّحْجُوْرًا یہ ملائکہ کا قول ہے یعنی وہ فرشتوں سے کہیں گے: ہم تم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ تم ہم سے چھیڑ چھاڑ کرو۔ فرشتے کہیں گے: مَّحْجُوْرًا تم کو اس امر سے روک دیا گیا ہے کہ تم اس دن کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ﴿۲۴﴾

”اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے کاموں کی طرف اور انہیں گرد و غبار بنا کر اڑا دیں گے۔ اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانہ ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی“۔

وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ یہ تو قیامت کے عظیم الشان ہونے پر تنبیہ ہے یعنی ہم نے اس دن قصد کیا ان اعمال کی طرف جنہیں مجرم اپنے طور پر اچھے عمل کے طور پر کرتے رہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے قدم فلان الی امر کذا یعنی اس کا قصد کیا۔ مجاہد نے کہا: قدمنا یعنی ہم نے قصد کیا، راجز نے کہا:

وقدم الخوارج الضلال إلى عباد ربهم فقالوا

إن دماء کم لنا حلال

گمراہ خارجیوں نے اپنے رب کے بندوں کا قصد کیا اور کہا: تمہارے خون ہمارے لیے حلال ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد فرشتوں کا آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے کیونکہ فرشتوں کا آنا بھی اس کے حکم سے ہوتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا اس سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا یعنی ہم نے کفر کے ساتھ اسے باطل کر دیا۔ ھباء ہمزہ والے حروف میں سے نہیں، اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہمزہ آیا ہے، اس کی تصغیر ھُبَی ہے، یہ رفع کے محل میں ہے۔ نحویوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں: ھُبَی یہ رفع کے محل میں ہے؛ نحاس نے اسے بیان کیا ہے۔ اس کی واحد ھباۃ ہے جمع اھباء آتی ہے۔ حارث بن حلزہ اونٹنی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

فتری خلفها من الرجع والو قع منینا کانه اهباء

تو اس اونٹنی کے ٹانگوں کے واپس آنے اور پاؤں کے پڑنے پر باریک غبار دیکھے گا گویا وہ ہباء ہے۔

حارث نے حضرت علی شیر خدا سے روایت نقل کی ہے کہ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا سے مراد سورج کی وہ شعاع ہے جو کسی سوراخ

سے داخل ہوتی ہے۔ ازہری نے کہا: هَبَآءً سے مراد وہ چیز ہے جو سورج کی روشنی میں اس سوراخ سے نکلتی ہے جو غبار کے مشابہ ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا یہاں تک کہ وہ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کے قائم مقام ہو گئے جہاں تک هباء المنبث کا تعلق ہے اس سے مراد وہ غبار ہے جسے گھوڑے اپنے سموں کے ساتھ اڑاتے ہیں، منبث کا معنی بکھرا ہوا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: هبوة اور هباء سے مراد باریک مٹی ہے۔ جوہری نے کہا: جب وہ بلند ہو تو کہا جاتا ہے: هبا، یهبو هبوا و أهبیته أنا، هبوة کا معنی غبار ہے۔

موضع هابي التراب ایسی جگہ گویا اس کی مٹی باریکی میں هباء کی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے خشک پتوں میں سے جسے ہوائیں بکھیر دیتی ہیں؛ یہ قتادہ اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا: اس سے مراد بہایا گیا پانی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد راکھ ہے؛ یہ عبید بن یعلی کا قول ہے۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ﴿۲۴﴾

اس کے بارے میں گفتگو قُلْ اَذٰلِكَ خَیْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ نحاس نے کہا: کوفہ کے علماء اس قول کو جائز سمجھتے ہیں: العسل أحلی من الخل یہ قول مردود ہے کیونکہ فلان خیر من فلان کا معنی ہے فلاں فلاں سے خیر میں زیادہ ہے جب کہ سرکہ میں تو کوئی مٹھاس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا جائز نہیں النصرانی خیر من الیهودی کیونکہ دونوں میں کوئی خیر نہیں کہ ان دونوں میں سے ایک خیر میں دوسرے سے بڑھ کر ہو، لیکن یہ کہنا درست ہوگا الیهودی شر من النصرانی، اس معنی میں عربوں کا کلام ہے۔ مُّسْتَقَرًّا اس کو ظرف کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے جب اسے افعل منك سے مقدر نہ مانا جائے۔ معنی ہوگا اس کے لیے مستقر میں خیر ہے جب یہ افعل منك کے باب سے ہو تو مستقرا بیان کے طریقہ پر منصوب ہوگا؛ یہ نحاس اور مہدوی کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا بہترین منزل اور بہترین ٹھکانہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہی مقیل ہے، عرب جسے جانتے پہچانتے ہیں وہ نصف النهار کا قیلولہ ہے۔ اسی معنی میں مرفوع حدیث ہے: إنّ اللہ تبارك و تعالی یفرغ من حساب الخلق في مقدار نصف یوم فیقیل أهل الجنة في الجنة و أهل النار في النار، (1) اللہ تعالیٰ نصف دن کی مقدار میں مخلوقات کے حساب سے فارغ ہو جائے گا تو اہل جنت جنت میں اور اہل جہنم جہنم میں قیلولہ کریں گے؛ مہدوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قیامت کے روز دنیا کا نصف النهار نہیں ہوگا یہاں تک کہ یہ جنت میں اور یہ جہنم میں قیلولہ کریں گے۔ پھر یہ پڑھا: ثم ان مقیلهم لإلی الجحیم۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یہ اسی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس معنی میں وہ روایت ہے قیلوا فان الشیاطین لا تقیل، تم قیلولہ کیا کرو کیونکہ شیطان قیلولہ نہیں کرتا۔ قاسم بن اصبغ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: في یوم کان مقداره خمسین ألف سنة میں نے عرض کی: یہ دن کتنا ہی طویل ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ مومن پر خفیف ہو

1۔ تفسیر طبری

گا یہاں تک دنیا میں وہ جتنے وقت میں فرض نماز پڑھتا تھا اس سے بھی خفیف ہوگا''۔

وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا۝

''اور یاد کرو جس روز پھٹ جائے گا آسمان اور بادل نمودار ہوگا اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ۔ اس دن سچی بادشاہی (خداوند) رحمن کی ہوگی اور دن کافروں کے لیے بڑا مشکل ہوگا''۔

وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ اس دن کو یاد کرو جب آسمان بادلوں کی صورت میں پھٹ جائے گا۔ عاصم، اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور ابو عمرو نے تشقق شین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اصل میں تتشقق تھا پہلی تاء کو تخفیف کے طریقہ پر حذف کر دیا؛ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ باقی قراء نے تشقق شین کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ سورۂ ''ق'' میں بھی اسی طرح ہے۔ بِالْغَمَامِ سے مراد عن الغمام ہے۔ باء اور عن ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں جس طرح تو کہتا ہے: رمیتُ بالقوسِ، رمیتُ عن القوس۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آسمان سفید پتے بادلوں کی صورت میں پھٹ جائے گا جس طرح کہر ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے تیہ کے ریگستان میں ایسا ہی ہوا، آسمان اس بادل کی صورت میں پھٹ جائے گا اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (البقرہ:210)

وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ آسمان سے فرشتے نازل کیے جائیں گے، اللہ تعالیٰ فیصلہ کے لیے ان آٹھ فرشتوں کے جلو میں جلوہ گر ہو گا جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اس طریقہ پر جس پر اس کے آنے کو محمول کیا جا سکتا ہے، نہ اس طریقہ پر جس پر مخلوقات کے آنے کو محمول کیا جاتا ہے جس میں حرکت اور انتقال کی صورت ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آسمان دنیا پھٹے گا تو اس کے مکیں اتریں گے زمین میں جتنے جن و انس ہیں وہ فرشتے ان سے زیادہ ہوں گے پھر دوسرا آسمان پھٹے گا تو اس کے مکین اتریں گے وہ اس سے زیادہ ہوں گے جتنے آسمان دنیا میں تھے، پھر اسی طرح ساتواں آسمان پھٹے گا، پھر مقرب فرشتے اتریں گے اور عرش کو اٹھانے والے فرشتے اتریں گے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا کا یہی معنی ہے یعنی جن و انس کے حساب کے لیے آسمان سے زمین کی طرف فرشتے اتریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آسمان پھٹ جائے گا اس بادل کی صورت میں جو لوگوں اور آسمان کے درمیان میں ہے تو بادل پھٹ جائے سے آسمان کے پھٹ جائے گا۔ جب آسمان پھٹ جائے گا تو اس کا اتصال ختم ہو جائے گا، اسے لپیٹ دیا جائے گا اور فرشتے اس کے علاوہ مکان کی طرف اتریں گے۔

ابن کثیر نے وننزل الملائکۃ نصب کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے نُزِّل الملائکۃ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کی دلیل تَنْزِيْلًا ہے اگر پہلے قول کے مطابق ہوتا تو انزال کہتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نزل اور انزل کا معنی ایک ہی ہے۔ تنزیلا، نزل کی بنا پر آیا ہے۔ عبد الوہاب نے ابو عمرو سے قرأت

نقل کی ہے وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا حضرت ابن مسعود نے وأنزل الملائكة، حضرت ابی بن کعب نے وُنزلت الملائكةُ قراءت کی ہے ان سے وتنزلت الملائكة بھی مروی ہے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ، اَلْمُلْكُ مبتدا ہے اَلْحَقُّ اس کی صفت ہے لِلرَّحْمٰنِ اس کی خبر ہے کیونکہ ایسی ملکیت جو زائل ہو جائے اور ختم ہو جائے وہ ملک نہیں، اس روز مالکوں کی ملکیتیں ختم ہو جائیں گی ان کے دعوے منقطع ہو جائیں گے۔ ہر بادشاہ کی بادشاہت اور حکومت زائل ہو جائے گی صرف حقیقی بادشاہت اللہ تعالیٰ کی رہ جائے گی۔

وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا کافروں پر وہ دن بڑا سخت ہوگا، کیونکہ وہ ہولناکیاں پائیں گے اور انہیں حزن اور ذلت لاحق ہوگی۔ وہ دن مومنوں پر فرض نماز سے بھی خفیف ہوگا جس طرح حدیث میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہ آیت اس پر دال ہے کیونکہ کافروں پر جب مشکل ہے تو وہ مومنوں پر آسان ہوگا۔ اس کا باب یوں ذکر کیا جاتا ہے عَسِرَ يَعْسَرُ عَسْرًا، يَعْسُرُ۔

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝۲۸ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝۲۹

''اور اس روز ظالم (فرط ندامت سے) کاٹے گا اپنے ہاتھوں کو (اور) کہے گا: کاش! میں نے اختیار کیا ہوتا رسول (مکرم) کی معیت میں (نجات کا) راستہ۔ ہائے افسوس! کاش نہ بنایا ہوتا میں نے فلاں کو اپنا دوست۔ واقعی اس نے بہکا دیا مجھے اس قرآن سے اس کے میرے پاس آجانے کے بعد، اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو (مشکل کے وقت) بے یارومددگار چھوڑنے والا ہے''۔

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ماضی عضِضت ہے کسائی نے عضَضت پہلی ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ اہل تفسیر سے یہ وضاحت آئی ہے، مفسرین سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت سعید بن مسیب ہیں کہ یہاں ظالم سے مراد عقبہ بن ابی معیط اور اس کا دوست امیہ بن خلف ہے۔ عقبہ کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، اس نے عرض کی: کیا میں دوسرے کے بغیر قتل کیا جاؤں گا؟ فرمایا: تیرے کفر اور تیری سرکشی کے باعث تجھے قتل کیا جائے گا۔ اس نے عرض کی: بچوں کے لیے کوئی ہے؟ فرمایا: آگ۔ حضرت علی شیر خدا اٹھے اور اسے قتل کر دیا۔ امیہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل کیا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے دلائل میں سے ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کے بارے میں خبر دی تھی تو دونوں کو کفر کی حالت میں قتل کر دیا گیا۔ آیت میں ان دونوں کا نام نہیں لیا گیا کیونکہ فائدہ میں یہ زیادہ بلیغ ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ظالم کا راستہ ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کی معصیت کرتے ہوئے کسی اور کی بات کو قبول کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: عقبہ نے اسلام لانے کا ارادہ کیا، ابی بن خلف نے اسے اس سے منع کیا وہ دونوں گہرے دوست تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو قتل کیا۔ عقبہ غزوۂ بدر کے موقع پر انتقام لینے کے لیے قتل

کیا گیا اور ابی بن خلف غزوۂ احد کے موقع پر دعوت مبارزت میں قتل ہوا، قشیری اور ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پہلا قول نحاس نے ذکر کیا ہے۔

سہیلی نے کہا: وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے وہ امیہ بن خلف جمحی کا دوست تھا یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ وہ ابی بن خلف جمحی کا دوست تھا جو امیہ کا بھائی تھا۔ عقبہ نے ولیمہ کی دعوت کی اس نے قریش کو دعوت دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے میں اس وقت تک شریک ہونے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرے۔ عقبہ نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اس کی دعوت میں قریش کے سرداروں میں سے کوئی نہ آئے۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اور زبان سے شہادتین کو ادا کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے آئے اور اس کا کھانا کھایا۔ اس کے دوست امیہ بن خلف نے عقبہ کو ملامت کی یا ابی بن خلف نے ملامت کی جو اس وقت موجود نہ تھا۔ عقبہ نے کہا: میں نے اس امر کو عظیم خیال کیا کہ میرے کھانے میں قریش کے اشراف میں سے کوئی غیر حاضر ہو۔ اس کے دوست نے اسے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا یہاں تک کہ تو لوٹے، ان کے چہرے پر تھوکے اور ان کی گردن کو روندے اور تو یہ کہے: اللہ کے دشمن نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے دوست نے اسے کہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ۔ ضحاک نے کہا: جب عقبہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر تھوکنا چاہا تو تھوک اس کے اپنے چہرے کی طرف لوٹ آئی اور اس کے چہرے اور اس کے ہونٹوں کو جلا دیا، یہاں تک کہ اس کے چہرے پر نشان چھوڑا اور اس کے رخساروں کو جلا دیا۔ اس کے چہرے پر وہ نشان باقی رہا یہاں تک کہ وہ قتل ہوا۔ عضہ یدیہ یہ غمگین اور شرمندہ کا فعل ہے کیونکہ اس نے اپنے دوست کی اطاعت کی۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا وہ کہے گا: ہائے کاش! میں نے دنیا میں رسول اللہ کی اتباع اپنا کر جنت کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا ہوتا۔

يٰوَيْلَتٰى ہلاکت اور ویل کی بد دعا ہے جو اس نے کافر کی دوستی اختیار کی تھی اور اس کی متابعت کی تھی۔

لَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا فلاں سے مراد امیہ ہے، کنایۃً اس کا ذکر کیا ہے صراحۃً ذکر نہیں کیا تا کہ یہ وعدہ اسی کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ جو بھی ان جیسا عمل کرے ان کو شامل ہو۔ مجاہد اور ابو رجاء نے کہا: ظالم، ہر ظالم میں عام ہے "فلاں" سے مراد شیطان ہے؛ اس قول کے کرنے والے نے مابعد ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝

حضرت حسن بصری نے اسے یا ویلتی پڑھا ہے، سورۂ ہود میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ الخلیل سے مراد صاحب اور صدیق ہے، اس کی وضاحت سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ نادم یہ کہے گا: جس کو میں نے دنیا میں دوست بنایا ہے اس نے مجھے قرآن اور اس پر ایمان لانے سے گمراہ کر دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَنِ الذِّكْرِ سے مراد عن الرسول ہے۔

وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، یہ ظالم کے قول کی حکایت نہیں

اور کلام بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ پر مکمل ہو جائے گی۔ خذل کا معنی اعانت کو ترک کرنا ہے، اسی سے ہے ابلیس نے مشرکوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جب وہ مشرکوں کے سامنے سراقہ بن مالک کی صورت میں ظاہر ہوا جب اس نے فرشتوں کو دیکھا تو ان سے براءت کر دی۔ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ سے روکے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے تو وہ انسان کا شیطان ہے جب عذاب اور آزمائش نازل ہوتی ہے تو اس وقت وہ بے یار و مددگار رہتا ہے، جس نے کہا کتنا اچھا کہا:

أصحبُ خیار النّاس حیث لقیتُهم      خیر الصحابة من یکون عفیفا
والنّاس مثل دراهم میزتُها      فوجدتُ منها فضةً وزیوفا

میں بہترین لوگوں کی سنگت اختیار کرتا ہوں جہاں بھی میں انہیں ملتا ہوں، بہترین دوست وہ ہوتا ہے جو پاک دامن ہو۔ لوگ دراہم کی طرح ہیں جن کی میں نے پرکھ کی تو میں نے ان میں سے کچھ چاندی اور کچھ کھوٹے پائے۔

صحیح میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنما مثل الجلیس الصالح والجلیس السؤ کحامل المسك ونافخ الکیر فحامل المسك إمّا أن یحذیك وإمّا أن تبتاع منه وإمّا أن تجد ریحا طیبة ونافخ الکیر إمّا أن یحرق ثیابك وإمّا أن تجد ریحا خبیثة (1)

صالح دوست اور برے دوست کی مثال خوشبو بیچنے والے اور بھٹی والے کی سی ہے خوشبو بیچنے والا یا تو عطا کر دے گا یا تو اس سے خرید لے گا یا تو عمدہ خوشبو پائے گا اور بھٹی والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا یا تو بدبو پائے گا؛ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے ابوبکر بزار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ہمارے ساتھیوں میں سے کون سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ''جس کا دیدار تمہیں اللہ تعالیٰ یاد دلا دے، اس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کر دے اور اس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلا دے''۔ مالک بن دینار نے کہا: اگر تو نیک لوگوں کے ساتھ پتھر اٹھائے تو یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ تو فجار کے ساتھ حلوہ کھائے اور یہ شعر پڑھا:

وصاحبْ خیارَ النّاس تنج مسلما      وصاحبْ شرارَ النّاس یوما فتندما

اچھے لوگوں کے ساتھ سنگت اختیار کر تو سلامتی کے ساتھ نجات پا جائے گا اور برے لوگوں کے ساتھ سنگت اختیار کر تو کسی روز ضرور شرمندہ ہو گا۔

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا ﴿۳۱﴾

''اور رسول عرض کرے گا: میرے رب! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور (اے حبیب) اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کے دشمن جرائم پیشہ لوگوں سے، اور کافی ہے آپ کا رب (آپ کے لیے) منزل مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب من یؤمر ان یجالس، حدیث 4191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ رسول اللہ، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتے ہیں: اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا کفار نے قرآن حکیم کے بارے میں ناحق بات کی تھی کہ یہ جادو ہے، یہ شعر ہے، یہ مجاہد اور نخعی سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَهْجُوْرًا کا معنی متروک ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ کے ساتھ تسلی دی، جس طرح اے محمد! ہم نے مشرکوں میں سے آپ کے دشمن بنائے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں وہ ابوجہل تھا۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے ان کی قوم کے مشرکوں کو ان کا دشمن بنا دیا، پس میرے حکم پر صبر کیجئے جس طرح انہوں نے صبر کیا، بے شک میں تجھے ہدایت دینے والا ہوں اور جو بھی تیرے ساتھ دشمنی رکھتا ہے اس کے خلاف تیری مدد کرنے والا ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ کا قول: یٰرَبِّ یہ قیامت کے روز ہوگا، یعنی انہوں نے قرآن کو چھوڑا، مجھے چھوڑا اور مجھے جھٹلایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور اپنے مصحف کو لٹکا دیا اس کی دیکھ بھال نہ کی اور اس کو نہ دیکھا وہ مصحف قیامت کے روز اس کے ساتھ چمٹے ہوئے آئے گا۔ وہ عرض کرے گا: اے رب العالمین! تیرے اس بندے نے مجھے نظر انداز کر دیا میرے اور اس کے درمیان فیصلہ فرما''۔ ثعلبی نے اس (1) کو ذکر کیا ہے۔

وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا، هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا حال یا تمیز ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے یعنی تجھے ہدایت سے نوازے گا اور تیری مدد فرمائے گا، تو جو تجھ سے دشمنی کرتا ہے ان کی پرواہ نہ کر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ابوجہل ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہو۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا ۝ وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ۝

''اور کہنے لگے کفار (از راہ اعتراض) کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن یکبارگی، اس طرح اس لیے کیا کہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپ کے دل کو اور اسی لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر کر اسے پڑھا ہے۔ اور نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب اور عمدہ تفسیر (جو اعتراض کو رد کر دے گی)''۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اس کے قائل میں اختلاف کیا گیا ہے اس بارے میں دو قول ہیں: (۱) قریش کے کفار ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (۲) یہودی ہیں جب انہوں نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل ہوتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا: یہ سارے کا سارا کیوں نہیں نازل کیا گیا جس طرح تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ہم نے یہ اس طرح کیا تاکہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو قوی کریں، آپ اسے یاد کریں اور اس کو برداشت کر

1۔ اس روایت کی صحت پر سوال اٹھایا گیا ہے اس کی سند میں ابو ہدبہ راوی ہے جو کذاب ہے۔

لیں، کیونکہ سابقہ کتب ایسے انبیاء پر نازل کی گئیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے جب کہ قرآن نبی امی پر نازل کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے، اس میں سوالات کے جوابات ہیں جو سوالات پوچھے گئے تھے۔ ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا نازل کیا تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد ہو جائے، اس پر عمل کرنے والے کے لیے آسان ہو جب بھی نئی وحی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی قوت میں اضافہ ہو جاتا۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ کہا جائے قرآن حکیم کو ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہ کیا گیا اور کیوں اسے یاد نہیں کرا دیا اگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تھا؟ اس کا جواب دیا جائے گا: اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ تھا کہ وہ ایک لحظہ میں کتاب اور قرآن کی تعلیم دے دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس کے حکم پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، اس کی حکمت ہم بیان کر چکے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: کَذٰلِكَ یہ مشرکوں کے قول میں سے ہے اور ان کے قول کی حکایت ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن تورات، انجیل کی طرح کیوں نہیں یکبارگی نازل کیا گیا تو کَذٰلِكَ پر وقف مکمل ہو جاتا ہے پھر لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ نئی کلام شروع ہوتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وقف جُمْلَةً وَّاحِدَةً پر ہو پھر نئے سرے سے کلام شروع ہو كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ اس کا معنی یہ ہوگا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح اس لیے نازل کیا ہے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو اس کے ساتھ مضبوط کریں۔ ابن انباری نے کہا: پہلی توجیہ زیادہ عمدہ اور زیادہ اچھی ہے۔ دوسرے قول کی تفسیر آئی ہے۔ محمد بن عثمان شیبی، منجاب سے وہ مبشر بن عمارہ سے وہ ابو روق سے وہ ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۝ کی تفسیر روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن حکیم لوح محفوظ سے آسمان میں سفرہ کراما کاتبین پر ایک ہی بار نازل ہوا۔ سفرہ کراما کاتبین نے اسے حضرت جبرئیل امین پر بیس راتوں میں نازل کیا اور حضرت جبرئیل امین بیس (1) سال تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے لاتے رہے۔ کہا: مابعد آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ۝ (الواقعہ) یہاں نجوم سے مراد قرآن کی آیات ہیں وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ۝ (الواقعہ) جب قرآن حکیم ایک ہی بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں کیا گیا تو کافروں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم ایک ہی بار کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ خطاب حضرت محمد مصطفی علیہ التحیۃ والثناء کو ہے وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔

وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اگر ہم قرآن حکیم کو آپ پر ایک ہی دفعہ نازل کرتے پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہی جواب دیتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا لیکن ہم اسے آپ پر روکے رکھتے ہیں جب وہ سوال کرتے ہیں تو آپ جواب دے دیتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ نبوت کی علامات میں سے ہے، کیونکہ وہ کوئی سوال نہیں کرتے مگر انہیں جواب دیا جاتا ہے، یہ ایک نبی سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ان کے دلوں کو ثابت اور پختہ کرنا ہے، اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا۝ اگر وہ تمام

---

1۔ متن کا مترادف بائیس سال سے اوپر بنتا ہے۔ مترجم

فرائض جو اس میں ہیں وہ یکبارگی نازل ہو جاتے تو یہ امر ان پر ثقیل ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ بہتری انہیں الگ الگ نازل کرنے میں ہے کیونکہ انہیں یکے بعد دیگرے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اگر یہ ایک ہی بار نازل ہو جاتا تو تنبیہ کا معنی زائل ہو جاتا جب کہ اس میں ناسخ و منسوخ بھی ہے۔ لوگ ایک وقت تک ایک فرض کی پیروی کرتے اللہ تعالیٰ جس میں ان کی بھلائی دیکھتا پھر اس کے بعد نسخ کا حکم نازل ہو جاتا ہے تو یہ امر محال تھا کہ یہ سب ایک ہی دفعہ نازل ہوتا: اس طرح کرو اور اس طرح نہ کرو۔ نحاس نے کہا: بہتر یہ ہے کہ کلام جُمۡلَةً وَّاحِدَةً پر مکمل ہو جائے کیونکہ جب کَذٰلِكَ پر عطف ہو تو معنی ہو جائے گا تورات، انجیل اور زبور کی طرح جب کہ ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

ضحاک نے کہا: وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا یعنی اچھی تفصیل معنی ہے انہوں نے جن کی مثال دی ہے تفصیل کے اعتبار سے ان سے احسن ہے، سامع کے جاننے کی وجہ سے یہ حذف کیا گیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرک اہل کتاب سے مدد لیتے جب کہ اہل کتاب پر تحریف غالب آ چکی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی لاتے وہ اچھی تفسیر ہوتی اس کی بنسبت، جو چیز ان کے پاس تھی، کیونکہ وہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیتے تھے خالص حق اس حق سے اچھا ہوتا ہے جس میں باطل کی آمیزش ہو، اسی وجہ سے فرمایا: وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ (البقرہ: 42) ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَلَا یَاۡتُوۡنَكَ بِمَثَلٍ ان کے اس قول کی طرح ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتے تھے کہ انہیں بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے اِلَّا جِئۡنٰكَ بِالۡحَقِّ ہم ایسا حق لاتے ہیں جس میں ان کی دلیل کا توڑ ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ کو باپ اور ماں کے بغیر پیدا کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ اِلٰی جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۳۴﴾

"جو لوگ ہانکے جائیں گے اوندھے منہ جہنم کی طرف ان کا بہت برا ٹھکانا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے"۔

اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ اِلٰی جَهَنَّمَ سورۂ اسراء میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا کیونکہ وہ جہنم میں ہیں۔ مقاتل نے کہا: کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں کہا: یہ مخلوق میں سے سب سے برے ہیں، تو یہ آیت نازل ہوئی: وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا دین اور طریقہ کے اعتبار سے گمراہ ہیں۔ معنی یہ بنتا ہے: وہ آپ پر کوئی مثال نہیں لائیں گے مگر ہم مبنی برحق اس کا جواب لائیں گے۔ ان کے خلاف واضح دلائل سے آپ کی مدد کی گئی ہے جب کہ انہیں منہ کے بل ہانکا جائے گا۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡكِتٰبَ وَ جَعَلۡنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ وَزِیۡرًا ﴿ۚۖ۳۵﴾ فَقُلۡنَا اذۡهَبَاۤ اِلَی الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرۡنٰهُمۡ تَدۡمِیۡرًا ﴿ؕ۳۶﴾

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور مقرر کیا ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر پھر

ہم نے حکم دیا دونوں جاؤ اس قوم کی طرف جنہوں نے جھٹلایا ہے ہماری آیتوں کو (وہ گئے تو ان کو ٹھکرا دیا) تو ہم نے ان کو بالکل برباد کر دیا"۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ، کتاب سے مراد تورات ہے وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا سورۂ طٰہٰ میں بحث گزر چکی ہے۔ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ خطاب ان دونوں کو ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اکیلے جانے کا حکم دیا گیا تھا یہ کلام اس طرح ہے جس طرح ارشاد ہے: نَسِیَا حُوْتَهُمَا (الکہف: 61) یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ (الرحمن) حالانکہ یہ ایک سمندر سے نکلتے ہیں یعنی صیغہ تثنیہ کا ذکر کیا گیا ہے اور مراد ایک ہے۔ نحاس نے کہا: یہ ایسی بات ہے جو مناسب نہیں تھی کہ کتاب اللہ پر اس سے جرأت کی جاتی، جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَاۤ اَوْ اَنْ یَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۝ فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (طٰہٰ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ (الرحمن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰیٰتِنَا (المومنون: 45) تمام آیات میں دونوں کو خطاب اور حکم ہے۔ قشیری نے کہا: ایک اور جگہ پر اس کا قول ہے: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (طٰہٰ: 24) یہ اس کے منافی نہیں کیونکہ جب دونوں مامور ہیں تو ہر ایک بھی مامور ہے، یہ کہنا جائز ہے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا پھر جب انہوں نے عرض کی: میرے خاندان میں سے میرا ایک وزیر بنا دے، تو ارشاد ہوا: اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ (طٰہٰ: 43)

اِلَى الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اس سے مراد فرعون، ہامان اور قبطی ہیں۔

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا اس کلام میں اضمار ہے کلام یوں ہے فکذبوهما فدمرناهم تدمیرا یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔

## وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰیَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

"اور قوم نوح کو یاد کرو جب انہوں نے جھٹلایا رسولوں کو تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور بنا دیا انہیں دوسرے لوگوں کے لیے عبرت اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب"۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ لفظ قوم کے منصوب ہونے میں چار قول ہیں: فَدَمَّرْنٰهُمْ، ہم کی ضمیر پر اس کا عطف ہے (۲) اذکر فعل کی وجہ سے نصب ہے (۳) ایسا فعل مضمر ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے تقدیر کلام یہ ہے أغرقنا قوم نوح أغرقناهم (۴) اَغْرَقْنٰهُمْ کی وجہ سے منصوب ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ نحاس نے اسے رد کیا ہے، کہا: أغرقنا ایسا فعل نہیں جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کہ وہ ضمیر اور قوم نوح میں عامل ہو۔

لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ جنس کا ذکر کیا مراد صرف حضرت نوح علیہ السلام ہیں، کیونکہ اس وقت سوائے حضرت نوح کے کوئی ان کی طرف رسول نہیں تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اس لیے مبعوث کیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی طرف دعوت دینے اور اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا ہے اس پر ایمان لانے کی دعوت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے جب انہوں نے حضرت

نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تو اس جھٹلانے میں ان تمام کا جھٹلانا آگیا جو اس کلمہ کے ساتھ مبعوث کیے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے ایک رسول کو جھٹلایا اس نے تمام رسولوں کو جھٹلایا، کیونکہ ایمان لانے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، کیونکہ ہر نبی تمام انبیاء کی تصدیق کرتا ہے جس نے ان میں سے کسی ایک نبی کو جھٹلایا تو اس نے گویا ان تمام کو جھٹلایا جنہوں نے اس کی تصدیق کی تھی۔

**اَغْرَقْنٰهُمْ** طوفان کے ساتھ ہم نے انہیں غرق کر دیا، سورۂ ہود میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ **وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً** اپنی قدرت پر اسے ظاہر علامت بنایا۔ **وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا** قوم نوح میں سے مشرکوں کے لیے آخرت میں ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر ظالم کے بارے میں یہی میرا طریقہ ہے۔

**وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾**

''اور یاد کرو قوم عاد، ثمود اور اصحاب رس کو اور ان کثیر التعداد قوموں کو جو ان کے درمیان گزریں''۔

**وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا** یہ سب **قَوْمَ نُوْحٍ** پر معطوف ہیں جب **قَوْمَ نُوْحٍ** معطوف ہو یا اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ **فَدَمَّرْنٰهُمْ** کی ھم ضمیر پر عطف کی وجہ سے منصوب ہو یا **جَعَلْنٰهُمْ** کی ھم ضمیر پر عطف کی وجہ سے منصوب ہو، یہ نحاس کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے، کیونکہ یہی اس کے قریب تر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہو یعنی اس قوم عاد کو یاد کرو جنہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے بانجھ ہوا کے ساتھ انہیں ہلاک کر دیا اور قوم ثمود کو یاد کرو جنہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تو انہیں زلزلہ کے ساتھ ہلاک کر دیا۔

**وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ** لغت عرب میں رَسّ سے مراد ایسا کنواں ہے جس کی چنائی نہ کی گئی ہو اس کی جمع رساس ہے کہا: تنابلة یحفرون الرساسا یعنی معدنیات کے کنویں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے حضرت کعب سے اصحاب رس کے بارے میں پوچھا، انہوں نے جواب دیا: صاحب یس جس نے کہا تھا: اے میری قوم! رسولوں کی اتباع کرو، اس کی قوم نے اسے قتل کر دیا اور اپنے کنویں میں ڈال دیا جسے رس کہتے انہوں نے اسے رس میں پھینک دیا تھا، مقاتل نے یہی کہا۔ سدی نے کہا: قصہ یس والے اہل انطاکیہ ہیں، رس انطاکیہ میں ایک کنواں تھا جس میں لوگوں نے حبیب نجار کو قتل کیا تھا جو آل یس کا مومن تھا تو وہ لوگ اس کنویں کی طرف منسوب ہو گئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ وہ قوم تھی جو صنوبر کے درخت کی پوجا کرتی تھی ان کے نبی نے ان کے خلاف بددعا کی جو یہودا کی اولاد میں سے تھے وہ درخت خشک ہو گیا لوگوں نے اس نبی کو قتل کر دیا اور اس کنویں میں بند کر دیا سیاہ بادل ان لوگوں پر سایہ فگن ہو گیا اور انہیں جلا دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آذر بائیجان میں ایک قوم تھی جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا ان کے درخت اور کھیتیاں خشک ہو گئیں وہ بھوک اور پیاس سے مر گئے ابن وہب بن منبہ نے کہا وہ کنویں والے تھے وہ اس کے ارد گرد بیٹھا کرتے تھے اور وہ مویشیوں کے مالک تھے وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا اور آپ کو اذیتیں دیں اور اپنے کفر و سرکشی میں حد سے بڑھ گئے۔ اسی اثنا میں کہ وہ اپنے

گھروں میں اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو وہ انہیں اور ان کے گھروں کو بہا کر لے گیا اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں دھنسا دیا اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔ قتادہ نے کہا: اصحاب رس اور اصحاب ایکہ دو امتیں تھیں دونوں کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے آپ کو جھٹلایا اللہ تعالیٰ نے دو مختلف عذابوں میں انہیں مبتلا کیا۔ قتادہ نے کہا: رس ایک دیہات تھا جو یمامہ کے علاقہ میں تھا۔ عکرمہ نے کہا: یہ ایسی قوم تھے جنہوں نے اپنے نبی کو زندہ ایک کنویں میں دفن کر دیا تھا، اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن کعب قرظی سے نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اس راوی سے نقل کی جس نے یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز جنت میں سب سے پہلے ایک حبشی غلام داخل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی اس کی اپنی قوم کی طرف بھیجا اس نبی پر اس سیاہ غلام کے سوا کوئی ایمان نہ لایا بستی والوں نے ایک گڑھا کھودا اور اپنے نبی کو زندہ اس میں پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا۔ وہ سیاہ غلام اپنی پشت پر لکڑیاں کاٹ کر لاتا، انہیں بیچتا، اس سے کھانا اور مشروب خریدتا اس پتھر کو ہٹانے میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا یہاں تک کہ وہ کھانا اس نبی تک لٹکا دیتا اس اثنا میں کہ وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ وہ سو گیا تو اللہ تعالیٰ نے سات سال تک اسے سلائے رکھا پھر وہ نیند سے بیدار ہوا پھر وہ دراز ہو گیا اور بائیں پہلو پر ٹیک لگائی تو اللہ تعالیٰ نے سات سال تک اسے سلائے رکھا پھر وہ اٹھا لکڑیوں کا گٹھا اٹھایا اسے بیچا اور کھانا پانی کنویں کے پاس لایا تو اس نبی کو نہ پایا۔ اس نبی کی قوم کو اللہ نے ایک نشانی دکھائی تو انہوں نے اسے نکالا، اس پر ایمان لائے، اس کی تصدیق کی اور وہ نبی وصال کر گئے'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ سیاہ غلام سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا''۔

اس واقعہ کو مہدوی اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے الفاظ ثعلبی کے ہیں۔ کہا: یہ لوگ اپنے نبی پر ایمان لے آئے تھے تو یہ جائز نہیں کہ یہ لوگ اصحاب الرس ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رس کے بارے میں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں برباد کر دیا مگر یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نبی کے بعد کوئی ایسے افعال کیے ہوں جن کی وجہ سے انہیں برباد کیا گیا ہو۔

کلبی نے کہا: اصحاب رس سے مراد ایسی قوم ہے اللہ تعالیٰ نے جن کی طرف نبی بنا کر بھیجا تو وہ اپنے نبی کو کھا گئے یہ وہ پہلے لوگ ہیں جن کی عورتوں نے ہم جنسی کا عمل کیا؛ ماوردی نے اسی کا ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اصحاب اخدود ہیں جنہوں نے خندقیں کھودیں اور مومنوں کو ان میں جلایا، اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ قوم ثمود کے بقایا لوگ تھے رس وہی کنواں ہے جس کا ذکر سورۂ حج میں وبئر معطلۃ میں ہوا جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ صحاح میں ہے رس ایک کنویں کا نام ہے جو قوم ثمود کے باقی ماندہ افراد کا تھا۔ امام جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے: اصحاب رس ایک قوم ہے جو اپنی عورتوں کے لیے سحق (ہم جنسی) کو پسند کرتے تھے ان کی تمام عورتیں ہم جنس پرست تھیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ مرد مردوں اور عورتیں عورتوں پر اکتفاء کریں گی''۔ یہی سحق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رس بنی اسد کا چشمہ اور کھجوریں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے رس سے مراد پہاڑوں میں تہہ در تہہ برف ہے؛ قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے جو پہلے ذکر کیا ہے وہ معروف ہے

سے مراد ہر وہ گڑھا ہے جسے کھودا جائے جس طرح قبر، کان اور کنواں۔ ابوعبیدہ نے کہا: رس سے مراد ایسا کنواں ہے جس کی چنائی نہ کی گئی ہو۔ اس کی جمع رساس ہے۔ شاعر نے کہا:

وهم سائرون إلى أرضهم فياليتهم يحضرون الرساس

وہ اپنے علاقہ کی طرف جارہے ہیں، کاش! وہ کنویں کھود لیتے۔

زہیر کے قول میں رس وادی کا نام ہے۔

فهن لوادی الرس کالید للفم

وہ وادی رس کے لیے ایسی ہیں جس طرح منہ کے لیے ہاتھ۔

رسستُ رسا میں نے کنواں کھودا۔ رُسّ المیت میت کو قبر میں دفن کیا گیا۔ رس کا معنی لوگوں کے درمیان اصلاح ہے اور اس کا معنی فاسد کرنا بھی ہے۔ قد رسست بینهم میں نے ان کے درمیان صلح کرادی، میں نے ان کے درمیان فساد برپا کردیا، یہ اضداد میں سے ہے۔ اصحاب رس کے بارے میں اس کے علاوہ بھی بات کی گئی ہے جو کچھ ہم نے کہا؛ ثعلبی اور دوسرے علماء نے یہ ذکر کیا ہے۔

وَ قُرُوْنًۢا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور اصحاب رس کے درمیان ایسی ایسی امتیں ہو گزری ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ربیع بن خثیم کے بارے میں مروی ہے کہ وہ بیمار ہوئے تو ان سے عرض کی گئی: کیا آپ دوائی نہیں کریں گے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں حکم دیا ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے اس کا قصد کیا پھر میرے اور میرے نفس کے درمیان جو معاملات تھے ان کے بارے میں غور و فکر کیا تو کیا پاتا ہوں کہ قوم عاد، قوم ثمود، اصحاب رس اور درمیان میں بے شمار قومیں ہیں جو مال جمع کرنے کی زیادہ حریص تھیں ان میں طبیب بھی تھے نہ ان میں کوئی تعریف کرنے والا بچا اور نہ وہ بچا جس کی تعریف کی گئی۔ انہوں نے دوائی کرنے سے انکار کردیا صرف پانچ دن تک وہ زندہ رہے یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

## وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ٘ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ۝۳۹

''حق سمجھانے کے لیے ہم نے بیان کیں ہر ایک کے لیے مثالیں اور ہم نے سب کو نیست و نابود کر دیا''۔

زجاج نے کہا: معنی ہے ہم نے سب کو ڈرایا، ان کے لیے امثال بیان کیں اور ان کے لیے حجت کو واضح کیا۔ ہم نے ان کی باطل امثال ذکر نہیں کیں جس طرح یہ کافر کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: كُلًّا کو نصب، ذکر فعل کی وجہ سے ہے کیونکہ امثال کا ذکر کرنا یہ بھی وعظ و نصیحت ہے؛ مہدوی نے اس کا ذکر کیا۔ معنی ایک ہی ہے۔ ہم نے سب کو عذاب کے ساتھ ہلاک کردیا۔ تبرتُ الشیء میں نے اسے توڑ دیا۔

مورج اور اخفش نے کہا: ہم نے انہیں برباد کردیا، یعنی تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا کا معنی فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ہے تاء اور باء، دال اور میم سے بدلی ہوئی ہے۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝۴۰

''اور کئی بار گزرے ہیں یہ مشرک اس قصبہ کے پاس سے جس پر پتھراؤ کیا گیا تھا بری طرح، کیا (وہاں سے گزرتے ہوئے) وہ اسے دیکھا نہیں کرتے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں دوبارہ جینے کی امید ہی نہیں''۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ واؤ ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں قریۃ سے مراد قوم لوط کی بستی ہے۔ مَطَرَ السَّوْءِ وہ پتھر جو ان پر برسائے گئے۔ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا کیا انہوں نے اپنے سفروں میں نہیں دیکھا تاکہ وہ عبرت حاصل کریں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش شام کی طرف تجارتی سفر میں قوم لوط کے شہروں کے پاس سے گزرتے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ (الصافات) فرمایا: وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الحجر) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ وہ بعث کی تصدیق نہیں کرتے۔ یہ بھی جائز ہے کہ يَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ خوف کرتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنے اصل معنی پر ہو اس کا معنی ہوگا: وہ آخرت کے ثواب کی امید نہیں رکھتے۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝۴۱ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۲

''اور جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں (کہتے ہیں) کہ یہ وہ صاحب ہیں جن کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ قریب تھا کہ یہ شخص ہمیں بہکا دیتا اپنے خداؤں سے اگر ہم ثابت نہ رہے ہوتے ان کی (پوجا) پر، (اے حبیب) یہ جان لیں گے جب (ہمارے) عذاب کو دیکھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا ہے راہ (راست) سے''۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا، اِذَا کا جواب اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ ہے کیونکہ اس کا معنی يَتَّخِذُوْنَكَ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب محذوف ہے وہ قالوا یا یقولون أھذا الذی ہے۔ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا جملہ معترضہ ہے، یہ آیت ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ استہزا کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے: اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ضمیر عائد منصوب ہے تقدیر کلام ہوگی بعثه الله۔ رَسُوْلًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے تقدیر کلام یہ ہے أھذا الذی بعثه الله مرسلا۔ اَهٰذَا مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ الَّذِيْ اس کی خبر ہے رَسُوْلًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ بَعَثَ، الَّذِيْ صلہ ہے لفظ اللہ اسم جلالت بَعَثَ کی وجہ سے مرفوع ہے، یہ بھی جائز ہے کہ رَسُوْلًا مفعول مطلق ہو کیونکہ بَعَثَ کا معنی ارسل ہے تو رَسُوْلًا کا معنی رسالۃ ہوگا، ہمزہ استفہام تقریر کے لیے یا احتقار (حقیر جاننا) کے لیے ہوگا۔

اِنۡ كَادَ لَيُضِلُّنَا انہوں نے کہا: قریب تھا کہ وہ ہمیں پھیر دے۔

عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡلَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَيۡهَا ہم نے اس کی عبادت پر اپنے آپ کو محبوس رکھا۔ وَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ حِيۡنَ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا یعنی کون از روئے دین کے گمراہ ہے وہ یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ غزوۂ بدر کے موقع وہ یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے۔

## اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ﴿۴۳﴾

''کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا اس (احمق) کو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو، کیا آپ اسکے ذمہ دار ہیں''۔

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اپنے نبی کو تعجب کرنے کا حکم دیا کہ وہ اپنے دل سے شرک کو چھپائے ہوئے ہیں، یہ اقرار کرنے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق اور رازق ہے وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں پھر ایسے پتھر کا قصد کرتے ہیں جس کی دلیل کے بغیر عبادت کرتے ہیں۔

کلبی اور دوسرے علماء نے کہا: عربوں میں سے کوئی جب کسی شی سے محبت کرتا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتا، جب اس سے زیادہ خوبصورت چیز کو دیکھتا تو پہلی چیز کو چھوڑ دیتا اور زیادہ خوبصورت چیز کی عبادت کرنے لگتا۔ اس آیت کا یہ معنی بنتا ہے اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ بھواہ حرف جار کو حذف کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ھوی معبود ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے پھر اس آیت کی تلاوت کی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اس نے اپنی خواہش کی اطاعت کی۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: وہ کسی شے سے محبت نہیں کرتا مگر اس کی پیروی کرتا ہے، معنی ایک ہی ہے۔ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا کیا تو اس پر نگہبان اور ضامن ہے یہاں تک کہ تو اسے ایمان کی طرف لوٹاتا ہے اور اس فساد سے نکالتا ہے، یعنی ہدایت اور گمراہی تیری مشیت کے سپرد نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تبلیغ حق کرنا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ پھر ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت منسوخ نہیں، کیونکہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔

## اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ﴿۴۴﴾

''کیا آپ خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا (کچھ) سمجھتے ہیں، نہیں ہیں یہ مگر ڈنگروں کی مانند بلکہ یہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ، انھم نہیں فرمایا کیونکہ ان میں سے ایسے افراد بھی تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان کی مذمت کی ہے۔ یہاں سننے سے ایسا سننا ہے جو قبولیت کا سننا ہے یا جو آپ کہتے ہیں اس میں غور و فکر کرتے ہیں تو وہ اسے سمجھ جاتے ہیں یعنی وہ اس آدمی کی جگہ ہیں جو عقل نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے سنتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جب وہ اس چیز سے نفع حاصل نہیں کرتے جس

کو سنتے ہیں تو گویا انہوں نے سنا ہی نہیں، مراد اہل مکہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: أم اس قسم کے مواقع میں بل کے معنی میں ہوتا ہے اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ وہ کھانے پینے میں چوپاؤں کی طرح ہیں۔ چوپاؤں پر نہ کوئی حساب ہے اور نہ ہی سزا۔ مقاتل نے کہا: چوپائے اپنے رب کو پہچانتے ہیں اپنی چراگاہوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور وہ مالک جو انہیں چارہ کھلاتے ہیں ان کی وہ اطاعت کرتے ہیں یہ نہ اطاعت کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے اس رب کو پہچانتے ہیں جس نے انہیں پیدا کیا اور انہیں رزق دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: چوپائے ان سے افضل اس لیے ہیں کیونکہ چوپائے اگرچہ توحید و نبوت کی صحت کو نہیں سمجھتے تو وہ ان کے بطلان کو بھی نہیں سمجھتے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا ۙ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا ﴿۴۶﴾

''(کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف) کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو، اور اگر چاہتا تو بنا دیتا اسے ٹھہرا ہوا پھر ہم نے بنا دیا آفتاب کو اس پر دلیل، پھر ہم سمیٹے جاتے ہیں سایہ کو اپنی طرف آہستہ آہستہ''۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ یہ جائز ہے کہ رویت سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد علم ہو۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: فجر کے طلوع سے لے کر سورج کے طلوع تک سایہ کو لمبا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد سورج کے غائب ہونے سے اس کے طلوع تک کا وقت ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ اس ساعت سے بڑھ کر کوئی ساعت اچھی نہیں کیونکہ اس میں مسافر اور ہر بیمار راحت پاتا ہے، ان میں مردوزن کی روحیں اور نفوس جسموں کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، اس میں زندوں کے نفوس خوش ہوتے ہیں مغرب کے بعد یہ صفت مفقود ہوتی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: جنت کا دن اس طرح ہوگا۔ صبح کی نماز پڑھنے والوں کی ساعت کی طرف اشارہ کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: ظل پہلے پہر اور فئی پچھلے پہر ہوتا ہے کیونکہ سورج کے ڈھلنے کے بعد وہ لوٹتا ہے۔ اسے فئی کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ مشرق سے مغرب کی جانب پلٹتا ہے۔ شاعر جو حمید بن ثور ہے وہ سرحہ درخت کی صفت بیان کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنی بیوی کا کنایہ کے طور پر ذکر کرتا ہے:

فلا الظل من برد الضحی تستطیعه ولا الفئی من برد العشی تذوق

تو چاشت کے ٹھنڈے سایہ کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ پچھلے پہر کے سایہ کو چکھتا ہے۔

ابن سکیت نے کہا: ظل اسے کہتے ہیں جسے سورج ختم کر دیتا ہے اور فئی اسے کہتے ہیں جو سورج کو ختم کر دیتا ہے۔ ابو عبید نے رؤبہ سے یہ حکایت بیان کی ہے جس پر سورج ہو اور سورج اس سے زائل ہو جائے تو وہ فئی اور ظل ہے جب تک اس پر سورج نہ چمک رہا ہو تو وہ ظل ہوتا ہے۔

وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے دائمی اور ساکن بنا دیتا سورج اس کو ختم نہ کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یوم قیامت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سورج کو طلوع ہونے سے روک دیتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ہم نے سورج کو (اس لیے کہ اس کے آنے کے وقت وہ سایہ کو ختم کر دیتا ہے) اس امر پر دلیل بنا دیا ہے کہ ظل شے اور معنی ہے کیونکہ اشیاء کو اضداد سے پہچانا جاتا ہے اگر سورج نہ ہو تو سایہ کی پہچان نہ ہوتی اگر نور نہ ہوتا تو تاریکی کی پہچان نہ ہوتی۔ دلیل کا لفظ فعیل کے وزن پر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مفعول کے معنی میں ہے جس طرح قتیل، دھین اور خصیب مفعول کے معنی میں ہیں۔ ہم نے سورج کو سایہ پر دلیل بنایا یہاں تک کہ سورج اسے لے گیا یعنی ہم نے اسے اس پر دلیل بنایا، یعنی سورج دلیل یعنی حجت اور برہان ہے وہی ذات ہے جو مشکل کو دور کرتی ہے اور اسے واضح کرتی ہے۔ دلیل کو مونث نہیں بنایا جب کہ یہ الشمس کی صفت ہے کیونکہ یہ اسم کے معنی میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: الشمس برھان والشمس حق۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ، ہ ضمیر سے مراد پھیلا ہوا سایہ ہے۔ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا اس کا قبض کرنا ہم پر آسان ہے ہر امر اللہ تعالیٰ پر آسان ہے سایہ اس فضا میں اتنی دیر ہی رہتا ہے جتنا وقت فجر کے طلوع ہونے سے سورج کے طلوع ہونے تک رہتا ہے جب سورج طلوع ہو جاتا ہے تو سایہ مقبوض ہو جاتا ہے۔ فضا میں اس کے پیچھے سورج کی شعاع ہوتی ہے جو سورج کے غروب ہونے تک زمین اور اشیاء پر چمکتی ہے۔ جب وہ غروب ہو جاتا ہے تو وہاں کوئی سایہ نہیں ہوتا، بے شک وہ دن کے نور کا باقی ماندہ حصہ ہوتا ہے۔ ایک قوم نے کہا: سایہ کا قبض غروب شمس کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ جب تک سورج غروب نہیں ہوتا تو اس میں سایہ باقی رہتا ہے اس کا زوال رات کے آنے اور ظلمت کے داخل ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قبض سورج کے ساتھ واقع ہوتا ہے کیونکہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ سایہ چلا جاتا ہے یہ ابو مالک اور ابراہیم تیمی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اس سے مراد ہے ہم نے سورج کی روشنی کو سایہ کے ساتھ آسانی سے قبضہ میں لے لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: يَّسِيْرًا کا معنی تیز ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: مخفی یعنی جب سورج غائب ہوتا ہے تو سایہ کو مخفی طریقہ سے قبض کر لیا جاتا ہے جب بھی اس میں سے کسی جز کو قبضہ میں لیا جاتا ہے تو اس کی جگہ تاریکی میں سے حصہ رکھ دیا جاتا ہے وہ ایک ہی دفعہ زائل نہیں ہوتا: یہ قتادہ کے قول کا معنی ہے؛ یہی مجاہد کا قول ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

''اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا جس نے رات کو مخلوق کے لیے لباس بنا دیا جو بدن کو ڈھانپنے میں لباس کے قائم مقام ہے۔ طبری نے کہا: رات کی صفت لباس سے کی گئی ہے کیونکہ رات بھی اشیاء کو ڈھانپ لیتی ہے اور چھپا لیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: بعض غافلوں نے یہ گمان کیا کہ جس نے تاریکی میں ننگے نماز پڑھی اس کے لیے وہ

نماز جائز ہوگی کیونکہ رات لباس ہے۔ یہ تو اس امر کو بھی ثابت کرے گی کہ وہ کمرے میں ننگے نماز پڑھ لے جب وہ اپنا دروازہ بند کر لے۔ نماز کی حالت میں پردہ کرنا عبادت ہے یہ نماز کے ساتھ خاص ہے یہ اس لیے نہیں کہ لوگ اسے دیکھیں، اس میں طویل گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا نیند کو راحت بنایا جو تمہارے بدنوں کو راحت پہنچاتی ہے، کیونکہ تم اس وقت کام کاج چھوڑ دیتے ہو۔ سبات کا اصل معنی لمبا ہونا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سبت المراءۃ شعرھا عورت نے اپنی مینڈھیوں کو کھول دیا اور انہیں لمبا کر لیا۔ رجل مسبوت لمبے قد والا آدمی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نیند کو سبات کہتے ہیں کیونکہ نیند لمبے لیٹنے سے ہی ہوتی ہے اور لمبا لیٹنے میں راحت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سبت کا معنی کاٹنا ہے۔ نوم، مصروفیات سے الگ تھلگ ہونا ہے، اسی سے سبت الیہود ہے کیونکہ ہفتہ کے روز وہ کام کاج نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سبت کا معنی مکان میں مقیم ہونا ہے گویا سبات سے مراد سکون اور اس پر ثابت رہنا ہے النوم سبات کا معنی ہوگا کہ یہ اضطراب اور حرکت سے سکون ہے۔ خلیل نے کہا: سبات سے مراد بھاری نیند ہے، یعنی ہم نے تمہاری نیند کو ثقیل بنایا تا کہ راحت مکمل ہو۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا دن کو معاش کے لیے پھیلنے والا بنایا۔ دن احیاء کا سبب بنایا تا کہ تم پھیل سکو۔ اس میں نیند سے بیداری کو نشور کہا یہ اس امر کے مشابہ ہے جس طرح زندہ کرنا مارنے کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صبح کرتے تو کہتے: الحمد للہ الذی أحیانا بعد ما أماتنا والیہ النشور اس اللہ کے لیے تمام تر تعریفیں ہیں جس نے ہمیں موت عطا کرنے کے بعد زندہ کیا اور اس کی بارگاہ میں دوبارہ اٹھایا جانا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾

"اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی"۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** مَآءً طَهُوْرًا جس کے ساتھ طہارت حاصل کی جاتی ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: اس سے مراد ایسا پانی ہے جس کے ساتھ وضو کیا جاتا ہے ہر طهور، طاہر تو ہوتا ہے مگر ہر طاہر، طہور نہیں ہوتا۔ طہور جب طاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اسم ہوتا ہے اسی طرح وضو اور وقود، ضمہ کے ساتھ مصدر ہوتا ہے، لغت میں یہی معروف ہے؛ یہ ابن انباری کا قول ہے۔ یہ واضح کیا کہ آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے وہ فی نفسہ طاہر ہوتا ہے اور غیر کے لیے مطہر (پاک کرنے والا) ہوتا ہے کیونکہ طاہر کی بنسبت طہور میں مبالغہ ہے کیونکہ یہ اسم مبالغہ کا صیغہ ہے یہ مبالغہ کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ پانی طاہر و مطہر ہو؛ جمہور علماء اسی طرف

گئے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طہور، طاہر کے معنی میں ہے؛ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے، آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ (الانسان) سے استدلال کیا ہے جس میں طہور، طاہر کے معنی میں ہے، اسی طرح شاعر کے قول سے استدلال کیا اس میں شاعر نے عورتوں کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا: ریقھن طھور، لعاب کی صفت طہور سے لگائی حالانکہ تھوک پاک کرنے والا نہیں۔ عرب کہتے ہیں: رجل نؤوم، اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ کسی اور کو سلانے والا ہے یہ اس کے اپنے فعل کی طرف راجع ہے۔ ہمارے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے: جنت کی شراب کی صفت طہور سے لگائی گئی ہے کیونکہ وہ گناہوں کی غلاظتوں، خسیس صفات جیسے کینہ اور حسد سے پاک کرنے والی ہے جب وہ یہ مشروب پئیں گے اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کی آلودگیوں اور مذموم اعتقادات کی غلاظتوں سے پاک کردے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سلیم دل کے ساتھ آئیں گے اور سلامتی کی صفات کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اس موقع پر انہیں کہا گیا: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ ﴿۷۳﴾ (الزمر) جب دنیا میں اس کا حکم یہ ہے کہ جب پانی اعضاء پر جاری ہوتا ہے تو آخرت میں بھی اس کی حکمت یہی ہوگی۔

جہاں تک شاعر کے قول کا تعلق ہے ریقھن طھور اس میں مبالغہ کا ارادہ کیا ہے کہ طہور ریقہ کے ساتھ ریق کی صفت لگائی کیونکہ اس میں مٹھاس ہے اور دلوں کے ساتھ اس کا تعلق ہے اور نفوس میں اس کی خوشبو پائی جاتی ہے۔ اس کے چوسنے کے ساتھ محب کی پیاس کو سکون حاصل ہوتا ہے گویا وہ ماء طہور ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ احکام شرعیہ اشعار میں ایسے الفاظ جو مجازی معنی میں استعمال ہوں ان سے اس کا ثبوت نہیں ہوتا، کیونکہ شعراء صدق سے کذب کی طرف تجاوز کر جاتے ہیں اور گفتگو میں اتنی آزادروی اپناتے ہیں، یہاں تک کہ یہ چیز انہیں بدعت و معصیت کی طرف لے جاتی ہے بعض اوقات وہ کفر میں جا پڑتے ہیں کہ انہیں شعور تک نہیں ہوتا۔ کیا تو ان میں سے ایک کے قول کو نہیں دیکھتا؟

ولولم تلامس صفحةُ الأرض رِجلَها	لما كنت أدرِي علةَ للتيمم

اگر سطح زمین اس کے پاؤں سے مس نہ کرتی تو مجھے تیمم کی علت کا علم نہ ہوتا۔

یہ صریح کفر ہے نعوذ باللہ منہ۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ علماء کے کلام کا لب لباب ہے یہ اپنے فن میں بلیغ ترین ہے مگر میں نے عربی لغت کے حوالہ سے غور و فکر کیا تو میں نے اس میں روشن مطلع پایا، وہ یہ ہے کہ فعول کا وزن مبالغہ کا ہے مگر مبالغہ کبھی فعل متعدی میں ہوتا ہے جس طرح شاعر نے کہا:

ضَروبٌ بنصل السيف سُوقَ سِمانِها

وہ تلوار کے پھل سے ان میں سے موٹی اونٹنیوں کی پنڈلیوں پر ضرب لگانے والا ہے۔

بعض اوقات فعل لازم میں یہ آتا ہے جس طرح کہا: نئوم الضحا چاشت کے وقت تک سونے والا۔ پانی کا غیر کو پاکیزگی عطا کرنا، اسے نظافت کے اعتبار سے لیا جائے تو یہ عمل حسن ہے اور طہارت کے اعتبار سے لیا جائے تو یہ امر شرعی ہوگا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا یقبل اللہ صلاۃ بغیر طھور، اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر نماز کو قبول نہیں فرماتا۔ لغت اور شرع کے اعتبار سے علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ طہور کا وصف پانی کے ساتھ خاص ہے یہ تمام مائع چیزوں کی

طرف متعدی نہیں ہوگا جب کہ وہ پاکیزہ ہیں ان کا پانی کے بارے میں یہ حکم محدود کرنا اس امر پر واضح دلیل ہے کہ طھور کا معنی مطھر ہے فعول کا وزن کئی اور مقاصد کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ اس کی تمام وضاحت نہیں اس سے مراد فعل کا آلہ بھی ہوتا ہے فعل مراد نہیں ہوتا جس طرح وقود، سحود کیونکہ ان سے مراد لکڑی اور وہ کھانا ہے جس کے ساتھ سحری کی جاتی ہے، پانی کی صفت طھور سے لگائی گئی ہے اس سے مراد ایسا آلہ ہوگا جس کے ساتھ طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ جب وقود، سحور اور طھور کے فاء کلمہ کو ضمہ دیا جائے تو اس سے مراد فعل ہوگا یعنی یہ مصدری معنی پر دال ہوں گے اور اس کے بارے میں خبر دی جائے گی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''فعول'' کا وزن یہ بھی مبالغہ کا وزن ہے اس سے مراد آلہ ہوگا۔ حنفیہ کے دل میں یہی بات کھٹکی ہے، لیکن مقصد پورا نہ ہوا۔ اس گفتگو کے بعد اس کے مبالغہ کے وزن اور اسم آلہ کے وزن ہونے کے بارے میں وضاحت دلیل پر موقوف ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۝ (الفرقان) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جُعِلَتْ لِي الأرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا میرے لیے زمین مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنادی گئی۔ یہ دونوں دلیلیں مبالغہ اور آلہ کا احتمال رکھتی ہیں۔ اس میں ہمارے علماء کے لیے کوئی حجت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان لیطھرکم بہ اس میں نص ہے کہ اس کا فعل غیر کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وہ پانی جو آسمان سے نازل ہوں یا زمین سے ودیعت کیے گئے ہوں وہ طاہر بھی ہوں گے وہ مطہر بھی ہوں گے خواہ ان کے رنگ مختلف ہوں، ان کے ذائقے مختلف ہوں اور ان کی بو مختلف ہو، یہاں تک کہ ان کے ساتھ کوئی اور چیز ملی ہوئی ہو۔ پانی کے ساتھ ملنے والی چیز کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: ایسی قسم جو پانی کی دونوں صفتوں کے موافق ہو۔ جب وہ چیز پانی کے ساتھ مل جائے تو وہ اس کو تبدیل کردے تو وہ پانی کے کسی وصف کو سلب نہیں کرتی کیونکہ وہ ان دونوں کے موافق ہے، وہ مٹی ہے (۲) وہ چیز پانی کی دو صفتوں میں سے ایک کے موافق ہو، وہ طہارت ہے، جب وہ چیز اس پانی کے ساتھ مل جائے جس میں مخالف ہو اس کو تبدیل کردیتی ہے وہ تطہیر کی صفت ہے جس طرح عرق گلاب اور باقی ماندہ پاکیزہ چیزیں (۳) ایسی چیز جو دونوں صفتوں میں مخالف ہو جب وہ چیز اس پانی کے ساتھ مل جائے تو اسے تبدیل کردے تو اس کی دونوں صفتوں کو سلب کرلیتی ہے کیونکہ وہ ان دونوں کے مخالف ہے وہ ناپاکی ہے۔

**مسئلہ نمبر ۳**۔ امام مالک کے مصری اصحاب اس نقطہ نظر کی طرف گئے ہیں کہ تھوڑے پانی کو تھوڑی نجاست ناپاک کر دیتی ہے اور زیادہ پانی کو اس وقت تک ناپاک نہیں کرتی جب تک اس کے رنگ، ذائقہ اور بو کو بدل نہ دے جب کہ وہ چیز حرام ہو۔ انہوں نے قلیل اور کثیر میں کوئی حد بیان نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوسکے مگر ابن قاسم نے امام مالک سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک جنبی جو ایسے حوض میں غسل کرتا ہے جس سے جانور پانی پیتے ہیں جب کہ اس نے جسم پر لگی ناپاکی کو نہ دھویا ہو تو وہ پانی کو فاسد کردے گا؛ یہ قول ابن قاسم، اشہب، ابن عبد الحکم اور مصر میں ان کے پیروکاروں کا ہے مگر ابن وہب، وہ وہی قول کرتے ہیں جو مدینہ طیبہ کے مالکی علماء کا ہے ان کا قول وہ ہے جو ابو مصعب نے ان سے اور امام مالک سے نقل کیا ہے: پانی میں گری ہوئی نجاست وہ تھوڑی یا زیادہ ہو اسے فاسد نہ کرے گی مگر اس صورت میں کہ اس میں گری ہوئی نجاست ظاہر ہو جائے اور اس سے

ذائقہ، بو اور رنگ بدل جائے۔ احمد بن معدل نے ذکر کیا کہ پانی کے بارے میں یہ قول حضرت مالک بن انس کا ہے اسی طرف اسماعیل بن اسحاق، محمد بن بکیر، ابو الفرج، ابہری اور دوسرے علماء کا میلان ہے جو بغداد سے تعلق رکھتے ہیں؛ یہی قول امام اوزاعی، لیث بن سعد، حسن بن صالح اور داؤد بن علی کا ہے؛ یہی اہل بصرہ کا قول ہے، نظر و فکر کے اعتبار سے یہی صحیح ہے۔

امام ابو حنیفہ نے کہا: جب پانی میں نجاست گر جائے تو پانی کو ناپاک کر دے گی وہ پانی زیادہ ہو یا تھوڑا ہو جب اس میں عموم نجاست محقق ہو جائے۔ ان کے نزدیک اس کے تحقق کی صورت یہ ہے کہ ایک تالاب میں پیشاب کا ایک قطرہ گر جائے اگر تالاب کی ایک جانب دوسری جانب کو حرکت دینے سے متحرک ہو جائے تو تمام تالاب ناپاک ہوگا۔ اگر اس کی دونوں طرفوں میں سے ایک کو حرکت دینے سے دوسری طرف حرکت نہ کرے تو وہ ناپاک نہیں ہوگا۔

مجموعہ میں امام ابو حنیفہ کے مذہب کی مثل ہے۔

امام شافعی نے قلتین والی حدیث سے استدلال کیا ہے(1)، یہ ایسی حدیث ہے جس میں طعن ہے اس کی سند اور متن میں اختلاف ہے، اسے ابو داؤد، ترمذی اور دار قطنی نے نقل کیا ہے آپ نے اپنی کتاب کے آغاز میں اس کا ذکر کیا اور اس کے طرق کو جمع کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: دار قطنی نے اپنی امامت کے بل بوتے پر حدیث قلتین کو صحیح قرار دینے کا قصد کیا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: امام شافعی نے حدیث قلتین کی وجہ سے جو نقطہ نظر اپنایا ہے وہ نظر و فکر کے اعتبار سے کمزور نقطہ نظر ہے، اثر میں ثابت نہیں کیونکہ اہل علم کی ایک جماعت نے اس بارے میں گفتگو کی ہے کیونکہ قلتین کی حقیقت کسی اثر میں بھی کوئی آگاہی نہیں اور نہ ہی اجماع میں کوئی بات ثابت ہے اگر یہ لازمی حد ہوتی تو علماء پر لازم تھا کہ اس سے بحث کرتے اور ضرور اس حد پر آگاہ ہو جاتے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہوتی کیونکہ یہ ان کے دین اور فرض کی اصل ہے اگر یہ ایسا ہوتا تو وہ اسے ضائع نہ کرتے جب کہ انہوں نے اس سے ادنیٰ درجہ کے مسائل پر گفتگو کی ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن منذر نے قلتین کے بارے میں جو اختلاف ذکر کیا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان میں کوئی تعیین و تحدید نہ ہوگی۔ سنن دار قطنی میں حماد بن زید، عاصم بن منذر سے روایت نقل کرتے ہیں: یہ قلال سے مراد بڑے مٹکے ہیں۔ عاصم، قلتین والی حدیث کے ایک راوی ہیں۔ دار قطنی کے قول سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہجر کے مٹکوں کی مثل ہیں کیونکہ انہوں نے اسراء کی حدیث نقل کی ہے کہ حضرت انس بن مالک نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب مجھے سدرۃ المنتہیٰ سے ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا اس کے بیر ہجر کے مٹکوں کی طرح تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے'' اور حدیث ذکر کی۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے بئر بضاعہ کے متعلق حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے استدلال کیا ہے اسے امام نسائی، امام ترمذی، ابو داؤد اور دوسرے علماء نے روایت کیا ہے(2)، یہ بھی حدیث ضعیف ہے، صحت میں اس کا کوئی مقام نہیں

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما ینجس الماء، حدیث نمبر 58-59۔ ابن ماجہ باب مقدار الماء الذی لا ینجس، حدیث نمبر 509، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابو داؤد، باب ما جاء فی بئر بضاعۃ، حدیث 60-61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس لیے اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس مسئلہ میں طوسی اکبر کا موافق ہوں۔ انہوں نے کہا: اس مسئلہ میں سب سے اچھا مذہب امام مالک کا مذہب ہے پانی مطہر ہی رہے گا جب تک اس کا ایک وصف تبدیل نہ ہو جائے کیونکہ اس باب میں کوئی ایسی حدیث نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ اعتماد قرآن کے ظاہر پر کیا جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا یہ اس وقت اس حالت پر رہے گا جب تک اس کی صفات باقی رہیں۔ جب ان میں سے کسی چیز سے متغیر ہو جائے تو وہ اس اسم سے خارج ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کی صفت سے خارج ہو چکا ہے اسی وجہ سے جب امام بخاری نے جو حدیث و فقہ کے امام ہیں اس باب میں کوئی روایت نہ پائی جس پر اعتماد کر سکیں تو فرمایا: باب اذا تغیر وصف الماء اور حدیث صحیح اس باب میں داخل کی ما من أحد یکلم فی سبیل اللہ و اللہ اعلم بمن یکلم فی سبیلہ إلا جاء یوم القیمۃ و جرحہ یثعب و ما اللون لون الدم و الریح ریح المسک (1) اللہ کی راہ میں جس کو بھی زخم لگایا گیا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کسے اس کی راہ میں زخم لگایا جاتا ہے وہ قیامت کے روز آئے گا جب کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہو گا رنگ خون کا ہو گا اور خوشبو کستوری کی ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ خون اپنی حالت پر رہے گا اور اس پر خوشبو کستوری کی ہو گی، خوشبو اسے خون کی صفت سے خارج نہ کرے گی۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء نے ارشاد فرمایا: جب پانی کی بو مردار کی بو سے تبدیل ہو جائے جو اس کی ایک جانب یا ساحل پر پڑا ہے تو یہ اس سے وضو کے مانع نہیں۔ اگر اس کی وجہ سے بو تبدیل ہو چکی ہے جب کہ اسے پانی میں ڈالا گیا تو یہ اس کو ناپاک کرنے کا سبب بن جائے گا کیونکہ وہ آپس میں خلط ملط ہو چکے ہیں پہلی صورت میں تغیر پڑوس کی وجہ سے ہے جس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔

میں کہتا ہوں: اس کے برعکس پر استدلال کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بو کا بدل جانا اسے اصل سے خارج کر دیتا ہے اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ خون، جب اس کی بو خوشبو سے بدل گئی تو وہ ناپاک ہونے سے خارج ہو گیا بلکہ وہ مسک ہو گیا اور مسک (کستوری) بھی بدن کے خون کا بعض ہے۔

اسی طرح پانی ہے جب اس کی بو تبدیل ہو جائے۔ پانی کے بارے میں اسی تاویل کی طرف جمہور گئے ہیں، پہلے قول کی طرف عبدالملک گئے ہیں۔ ابو عمرو نے کہا: انہوں نے حکم بو کی وجہ سے لگایا، رنگ کی وجہ سے حکم نہیں لگایا، حکم اسی کا ہو گا۔ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق اس حدیث سے استدلال کیا ہے، اس سے کوئی ایسا معنی سمجھ میں نہیں آتا جس سے نفس سکون پائے۔ نہ ہی خون میں پانی کا معنی ہے کہ اس پر قیاس کیا جاتا اور نہ اس قسم کی چیزوں میں فقہاء مشغول ہوتے ہیں اور نہ ہی علماء کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کو مشکلات میں ڈالتے رہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی وضاحت کریں، اسی وجہ سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ لوگوں کے سامنے بیان کریں گے، وہ کوئی چیز نہیں چھپائیں گے، پانی تغیر و تبدل سے خالی نہیں وہ نجاست کے ساتھ ہو یا نجاست کے بغیر ہو۔ اگر نجاست کے ساتھ ہو اور اس میں تغیر آ جائے تو علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ نہ طاہر ہو گا اور نہ مطہر ہو گا۔ اور اسی طرح علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جب وہ نجاست کے بغیر متغیر ہو جائے تو وہ اپنے اصل کے مطابق

1۔ صحیح البخاری، باب مایقع من النجاسات فی السمن والماء، حدیث نمبر 230، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاک ہوگا۔ جمہور نے کہا: وہ مطہر نہیں ہوگا ہاں اس صورت میں مطہر (پاک کرنے والا) ہوگا کہ اس کا تغیر مٹی سے ہو جس پر سب علماء کا اتفاق ہے یہی حق ہے اس میں کوئی اشکال نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ التباس ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ایسا پانی جو ٹھہرنے کی وجہ سے متغیر ہو جائے جس طرح ہڑتال یا گچ جس پر پانی بہتا ہو یا کائی اور درخت کے پتوں کی وجہ سے متغیر ہو جائے جو درخت اس پانی پر اگتا ہے اس سے بچنا ممکن نہیں علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ چیز وضو سے مانع نہیں کیونکہ اس سے بچنا اور اس سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ اس کے علاوہ پانی اس سے اولیٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ جوٹھے پانی کے احکام۔ ہمارے علماء نے فرمایا: نصرانی، کفار، ہمیشہ شراب نوشی کرنے والے، مردار کھانے والے جیسے کتے کا جوٹھا مکروہ ہے۔ جس نے ان کے جوٹھے سے وضو کیا تو اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی یہاں تک کہ اسے نجاست کا یقین ہو جائے۔ امام بخاری نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصرانی عورت کے گھر سے وضو کیا۔ سفیان بن عیینہ نے ذکر کیا ہے کہ زید بن اسلم نے اپنے باپ سے روایت نقل کی: جب ہم شام میں تھے تو میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس پانی لایا تو آپ نے اس سے وضو کیا۔ پوچھا: تو یہ پانی کہاں سے لایا تھا؟ میں نے اس سے زیادہ میٹھا اور پاکیزہ پانی نہیں دیکھا۔ میں نے عرض کی: میں یہ پانی ایک نصرانی بوڑھی عورت کے گھر سے لایا ہوں جب آپ نے وضو کرلیا تو آپ اس عورت کے پاس آئے فرمایا: اے بوڑھی عورت! اسلام قبول کرلے تو سلامتی پا جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اس بوڑھی عورت نے اپنے سر سے کپڑا اٹھایا تو اس کا سر ثغامہ بوٹی کی طرح سفید تھا۔ اس عورت نے کہا: بہت ہی بڑھیا، میں اس وقت مرنے والی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

حسن بن اسماعیل، احمد بن ابراہیم بوشنجی سے وہ سفیان سے روایت نقل کرتے ہیں اسے حسین بن اسماعیل نے خلاد بن اسلم سے وہ سفیان سے وہ زید بن اسلم سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے نصرانی عورت کے گھر سے وضو کیا آپ اس کے پاس تشریف لائے، فرمایا: اے بڑھیا! اسلام قبول کرلے، اور پہلی کی مثل حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ جہاں تک کتے کا تعلق ہے جب وہ پانی میں منہ ڈال لے تو اس برتن کو سات دفعہ دھویا جائے گا اس سے وضو نہیں کیا جائے گا اور وہ پانی پاک ہوگا۔ ثوری نے کہا: اس سے وضو کیا جائے گا اور ساتھ ہی تیمم کیا جائے گا؛ یہ عبدالملک بن عبدالعزیز اور محمد بن مسلمہ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: کتا ناپاک ہے اس کی وجہ سے برتن کو دھویا جائے گا کیونکہ وہ ناپاک ہے۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال جاتا تو امام مالک اس برتن کے دھونے میں فرق کرتے کہ کیا کتا وہ ہے جس کا پکڑنا جائز ہے اور جس کا پکڑنا جائز نہیں۔ آپ کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک کتا پاک ہے جب وہ کسی شے میں منہ ڈال جاتا ہے تو وہ اس چیز کو ناپاک نہیں کرتا وہ چیز کھانا ہو یا کوئی اور چیز ہو مگر جب وہ پانی ہو جس میں کتے نے منہ ڈالا ہو تو اس میں مشقت کیونکہ کم ہوتی ہے تو اس کا بہا دینا مستحب ہوتا ہے، دیہاتی اور شہری کتا برابر ہیں۔ برتن کو امر تعبدی کے طور پر سات دفعہ دھویا جائے گا۔ ان کے اصحاب میں سے جو مناظر لوگ ہیں یہی وہ

نقطہ نظر ہے جس پر ان کے اصحاب کا اتفاق ہے۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ عبد الرحمن بن زید بن اسلم اپنے باپ سے وہ عطا سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حوضوں کے بارے میں سوال کیا گیا جو مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کتے اور درندے ان پر وارد ہوتے ہیں۔ فرمایا: ''ان کے لیے وہ کچھ ہے جوان کے پیٹوں نے لے لیا اور ہمارے لیے وہ کچھ ہے جو باقی ہے، وہ مشروب بھی ہے اور پاکیزگی عطا کرنے والا ہے''۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے، یہ کتوں کی طہارت کے بارے میں اور جن چیزوں میں وہ منہ ڈال جاتے ہیں ان کی طہارت کے بارے میں نص ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں کتے آتے جاتے رہتے تھے وہ ان کی وجہ سے پانی وغیرہ نہیں بہاتے تھے (1)۔ حضرت عمرو بن عاص نے جب حوض والے سے یہ پوچھا: کیا تیرے حوض پر درندے آتے رہتے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے حوض والے! ہمیں اس کے بارے میں نہ بتانا، ہم درندوں پر وارد ہوتے ہیں اور وہ ہم پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ امام مالک اور دارقطنی نے اسے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے درندوں اور کتوں کے بارے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جس میں کتا منہ ڈال جائے اس پانی کے بہا دینے کے حکم سے مخالف کے لیے کوئی دلیل نہیں اور نہ اس کی دلیل ہے کہ یہ بہانا نجاست کی وجہ سے ہے، امام مالک نے پانی بہانے کا حکم اس لیے دیا کیونکہ نفس اسے ناپسند کرتا ہے اس وجہ سے بہانے کا حکم نہیں دیا کہ وہ ناپاک ہے کیونکہ غلیظ چیزوں سے بچنا مندوب ہے یا ان پر سختی کرنے کے لیے ہے کیونکہ انہیں گھروں میں رکھنے سے منع کیا گیا تھا، جس طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری نے کہا: جب وہ اس سے باز نہ آئے تو پانی کے معاملہ میں ان پر سختی کی گئی کیونکہ بادیہ میں ان کے پاس پانی بہت ہی کم ہوتا ہے ان پر سختی کی جائے تاکہ وہ کتے رکھنے سے باز آجائیں، جہاں تک برتن کو دھونے کا جو حکم ہے یہ عبادت ہے اس کے ناپاک ہونے کی وجہ سے نہیں جس طرح ہم نے دو دلیلیں ذکر کی ہیں: (۱) دھونے میں عدد داخل ہے (۲) اس میں مٹی کا عمل دخل رکھ دیا گیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''آٹھویں دفعہ اسے مٹی سے ملو''۔ اگر یہ حکم نجاست کی وجہ سے ہوتا تو تعداد اور مٹی کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہوتا جس طرح پیشاب کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی اور بلی جس میں منہ ڈال جائے اس کو پاک قرار دیا ہے، بلی بھی درندہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ وہ چیرتی پھاڑتی ہے اور مردار کھاتی ہے۔ کتا بھی اسی طرح ہے اور درندے بھی اسی طرح ہیں، کیونکہ جب یہ ایک میں نص ہے تو دوسری میں بھی نص ہے۔ یہ قیاس کی اقسام میں سے قوی ترین قسم ہے یہ اس صورت میں ہے جب کوئی دلیل نہ ہو۔ ہم نے اس کی طہارت کے بارے میں نص کا ذکر کیا ہے پس مخالف کا قول ساقط ہو گیا۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 7**۔ وہ جاندار جس میں خون نہ ہو وہ پانی میں مر جائے تو وہ پانی کو کچھ نقصان نہ دے گا اگر اس کی بو کو نہ بدلے۔ اگر وہ بدبودار ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ وضو نہ کرے، اسی طرح پانی کے جانور جن میں بہنے والا خون نہیں ہوتا ان کا

---

1۔ ابوداؤد، باب فی طہور الارض اذا یبست، حدیث نمبر 325، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بھی یہ حکم ہوتا ہے جس طرح مچھلی اور مینڈک، ان چیزوں کے مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا مگر اس صورت میں کہ بو متغیر ہو جائے۔ اگر بو متغیر ہو جائے اور پانی بدبودار ہو جائے تو اس کے ساتھ طہارت حاصل کرنا جائز نہیں ہوتا اور اس سے وضو کرنا بھی جائز نہیں ہوتا۔ امام مالک کے نزدیک یہ ناپاک ہے۔ جس میں بہنے والا خون ہو وہ پانی میں مر جائے اسے نکال لیا جائے اس کا رنگ بو اور ذائقہ نہ بدلا ہو تو وہ طاہر و مطہر رہے گا، خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ ہو؛ یہ مدینہ طیبہ کے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ان میں سے بعض نے اس امر کو مستحب جانا ہے کہ اس پانی سے کچھ ڈول نکال لیے جائیں تاکہ دل کو اطمینان ہو جائے۔ اس میں وہ کسی حد کا تعین نہیں کرتے جس سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈول نکالنے سے پہلے وہ پانی کے استعمال کو مکروہ خیال کرتے ہیں اگر اس سے نہانے یا وضو کرنے کے لیے اس پانی کو استعمال کیا تو یہ جائز ہوگا جب اس کی حالت وہی ہو جو ہم نے ذکر کی ہے۔ امام مالک کے بعض اصحاب کی رائے ہے: جس نے اس پانی سے وضو کیا اگرچہ اس کا پانی متغیر نہ ہوا ہو تو وہ تیمم کرے گا تو وہ احتیاط کے طریقہ پر دونوں طہارتوں کو جمع کرے گا، اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اس پانی سے نماز پڑھ لی تو یہ جائز ہوگا۔

دار قطنی نے محمد بن سیرین سے روایت نقل کی ہے کہ ایک حبشی زمزم کے کنواں میں گر گیا یعنی مر گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بارے میں حکم دیا اسے باہر نکالا گیا اور آپ نے کنویں کا پانی نکالنے کا حکم دیا۔ کہا: وہ چشمہ ان پر غالب آ گیا جو حجر اسود کی جانب سے نکل رہا تھا، اسے قباطی (1) اور معارف (2) سے بند کیا گیا یہاں تک کہ انہوں نے اس پانی کو نکالا، جب وہ ایک دفعہ پانی نکال چکے تو وہ چشمہ ان پر پھوٹ پڑا۔

ابو الطفیل سے روایت مروی ہے کہ ایک بچہ بئر زمزم میں گر پڑا تو اس کا سارا پانی نکالا گیا۔ یہ احتمال موجود ہے کہ پانی متغیر ہو چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

شعبہ نے مغیرہ سے وہ ابراہیم سے روایت نقل کرتے ہیں وہ کہا کرتے تھے: ہر ایسا جانور جس میں بہنے والا خون ہو وہ اگر پانی میں مر جائے تو اس کے ساتھ وضو نہیں کیا جائے گا، لیکن گبریلا، بچھو، مکڑی اور جدجد (جھینگر) جب برتن میں گر جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ شعبہ نے کہا: میرا خیال ہے انہوں نے وزغ (چھپکلی) کا ذکر کیا ہے؛ اسے دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ حسین بن اسماعیل، محمد بن ولید سے وہ محمد بن جعفر سے وہ شعبہ سے روایت نقل کرتے ہیں اور اسی چیز کو ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ جمہور صحابہ، مختلف شہروں کے فقہاء، حجاز اور عراق کے تابعین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس پانی میں بلی منہ ڈال جائے وہ پاک ہے اس کے جوٹھے سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں اس کی دلیل حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے؛ امام مالک اور دوسرے علماء نے اسے نقل کیا ہے (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے برعکس مروی ہے۔ عطاء بن ابی رباح، سعید بن مسیب اور محمد بن سیرین سے مروی ہے انہوں نے اس پانی کو بہانے کا حکم دیا جس میں بلی نے منہ ڈالا ہو اور اس برتن کو دھونے کا حکم دیا۔ حضرت حسن بصری سے بھی اس بارے میں اختلاف مروی ہے۔ یہ احتمال موجود ہے کہ حضرت

1۔ کتان سے بنا ہوا کپڑا جو قبط کی طرف منسوب ہو۔ 2۔ نقش و نگار والی ریشمی چادر

3۔ سنن ابی داؤد، باب سؤر الھرۃ، حدیث نمبر 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حسن بصری نے اس کے منہ میں نجاست دیکھی، تا کہ دونوں روایتیں آپ سے صحیح ہو جائیں۔

امام ترمذی نے جب امام مالک کی حدیث ذکر کی تو کہا: اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے، یہ حدیث حسن صحیح ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ، تابعین اور بعد کے اکثر علماء کا قول ہے، جس طرح امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق وغیرہ۔ انہوں نے بلی کے جوٹھے میں کوئی حرج نہیں دیکھا؛ یہ اس باب میں سب سے اچھی چیز ہے۔ امام مالک نے اس حدیث کو اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے لیا ہے، امام مالک سے بڑھ کر اسے کسی نے مکمل نہیں لیا۔

حافظ ابو عمرو نے کہا: تنازع اور اختلاف کے وقت دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، حضرت ابو قتادہ کی حدیث ثابت ہے کہ حضرت ابو قتادہ نے بلی کے لیے برتن کو جھکایا یہاں تک کہ بلی نے پانی پیا۔ ہر شہر کے فقہاء نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر امام ابو حنیفہ اور ان کے موافق قول کرنے والوں نے اختلاف کیا ہے وہ بلی کے جوٹھے کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ یہ بھی کہا: اگر کسی نے اس کے ساتھ وضو کیا تو یہ جائز ہوگا۔ میں اس آدمی کے لیے کوئی اس سے اچھی دلیل نہیں پاتا جو بلی کے جوٹھے کو مکروہ کہتا ہے کہ اسے حضرت ابو قتادہ کی حدیث نہیں پہنچی، اسے کتے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پہنچی ہے تو اس نے بلی کو بھی اس پر قیاس کر لیا ہو۔ سنت نے دونوں کے درمیان فرق کر دیا ہے کہ برتن دھونے کا حکم امر تعبدی ہے دلیل قائم کرنے میں سنت جس سے جھگڑا کرے وہ اس پر غالب آ جاتی ہے۔ اور جس کی مخالفت کرے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی توفیق دینے والی ہے۔ ان کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے جسے قرہ بن خالد نے محمد بن سیرین سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''جب بلی برتن میں منہ ڈال جائے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے ایک یا دو بار دھویا جائے''۔ قرہ کو شک ہے۔ اس حدیث کو قرہ بن خالد کے سوا کسی نے بھی مرفوع نقل نہیں کیا۔ قرہ ثقہ اور ثبت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ حدیث ہے جسے دار قطنی نے نقل کیا ہے اس کا متن یہ ہے: ''جب کتا پانی میں منہ ڈال جائے تو برتن کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات دفعہ دھویا جائے پہلی دفعہ مٹی سے دھویا جائے، جب بلی منہ ڈال جائے تو ایک یا دو دفعہ دھویا جائے''۔ قرہ کو شک ہوا ہے۔ ابو بکر نے کہا: اسی طرح ابو عاصم نے اسے مرفوع روایت کیا ہے، دوسرے علماء نے قرہ سے کتے کے بارے میں روایت مرفوع اور بلی کے بارے موقوف نقل کی ہے۔

ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلی کے جوٹھے سے برتن کو دھویا جائے گا جس طرح کتے کے جوٹھے سے برتن کو دھویا جائے گا''۔ دار قطنی نے کہا: یہ مرفوع ثابت نہیں محفوظ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے ان سے مختلف روایات منقول ہیں۔ معمر اور ابن جریج نے ابو طاؤس سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ بلی کو کتے کی مثل قرار دیتے تھے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے اس برتن کے بارے میں کہا جس میں بلی منہ ڈال جاتی ہے: اسے سات دفعہ دھو ڈالو؛ یہ دار قطنی نے کہا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب وضو کرنے والے کے اعضاء پاک ہوں تو ماء مستعمل بھی پاک ہوگا مگر امام مالک اور عظیم فقہاء کی

جماعت ایسے پانی کے ساتھ وضو کو ناپسند کرتی تھی۔ امام مالک نے کہا: اس میں کوئی بھلائی نہیں، میں کسی کے لیے پسند نہیں کرتا کہ وہ اس کے ساتھ وضو کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا اور نماز پڑھی پس اس پر نماز کا اعادہ نہیں دیکھتا اور اگلی نماز کے لیے وہ وضو کرے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور دونوں کے اصحاب نے کہا: اگر پہلے وضو نہ ہوا تو ایسے پانی کا استعمال جائز نہیں جس نے اس کے ساتھ وضو کیا وہ دوبارہ وضو کرے کیونکہ یہ مطلق پانی نہیں، جو آدمی صرف یہی پانی پائے وہ پانی پانے والا نہیں۔ اس بارے میں اصبغ بن فرج نے انہیں جیسا قول کیا ہے، یہ اوزاعی کا قول ہے۔ انہوں نے صنابحی کی حدیث سے استدلال کیا ہے عمرو بن عنبسہ کی حدیث کو امام مسلم نے نقل کیا ہے اس کے علاوہ بھی آثار موجود ہیں۔ انہوں نے کہا: پانی سے جب وضو کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ خطائیں نکل جاتی ہیں، اس سے بچنا واجب ہے کیونکہ یہ گناہوں کا پانی ہے۔ ابوعمرو نے کہا: میرے نزدیک اس کی کوئی توجیہ نہیں کیونکہ گناہ پانی کو آلودہ نہیں کرتے کیونکہ نہ ان گناہوں کی ذاتیں ہیں اور نہ ہی اجسام ہیں جو پانی سے ملیں اور اسے فاسد کر دیں۔ خرجت الخطایا مع الماء کا معنی ہے یہ بتایا جائے کہ نماز کے لیے وضو ایسا عمل ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مومن بندوں سے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، یہ اس کی جانب سے رحمت اور فضل و احسان کے طور پر ہوتا ہے۔ ابوثور اور داؤد نے امام مالک کے قول کی مثل قول کیا ہے کہ مستعمل پانی کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ پاک پانی ہے اس کے ساتھ کوئی چیز ملی ہوئی نہیں یہ مطلق پانی ہے۔ اس کے پاکیزہ ہونے پر انہوں نے اجماع امت سے استدلال کیا ہے جب وضو کرنے والے کے اعضاء میں نجاست نہ ہو؛ ابوعبداللہ مروزی محمد بن نصر اس طرف گئے ہیں۔

حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن عمر، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہم، عطاء بن ابی رباح، حضرت حسن بصری، امام نخعی، مکحول اور زہری نے کہا: جو آدمی سر پر مسح کرنا بھول گیا اس نے اپنی ڈاڑھی میں تری پائی اس کے لیے جائز ہے کہ اس تری کے ساتھ اپنے سر کا مسح کر لے۔ ان سب نے مستعمل پانی سے وضو کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

عبدالسلام بن صالح، اسحاق بن سوید سے وہ علاء بن زید سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا ہوا تھا آپ کے جسم کا ایک حصہ ایسا تھا جس تک پانی نہیں پہنچا تھا۔ ہم نے کہا: یا رسول اللہ! یہ وہ حصہ ہے جہاں پانی نہیں پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لمبے بال تھے تو اس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بالوں سے یوں کر دیا اور اس حصہ کو تر کر دیا؛ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ عبدالسلام بن صالح نے کہا، یہ بصری نے کہا: وہ قوی نہیں۔ کئی اور ثقہ لوگ اسے اسحاق سے اور وہ حضرت علاء سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں۔ یہی درست ہے۔

میں کہتا ہوں: ثقہ راوی اسحاق بن سوید عدوی سے وہ علاء بن زید عدوی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا۔ یہ وہ حدیث ہے جسے ہشیم نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: مستعمل پانی کا مسئلہ ایک اور اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ آلہ کے ساتھ جب ایک دفعہ فرض ادا کیا جائے کیا اس کے ساتھ کوئی اور فرض ادا کیا جا سکتا ہے یا ادا نہیں کیا جا سکتا؟ مخالف نے غلام پر قیاس کرتے ہوئے اس کا انکار کیا ہے جب اس نے اس کے ساتھ ایک دفعہ غلام آزاد کرنے کا فرض ادا کر

دیا تو ایک دوسرے فرض کو ادا کرنا صحیح نہ ہوگا، یہ قول باطل ہے، کیونکہ جب اس نے ایک دفعہ غلام آزاد کر دیا تو اس کو تلف کر دیا تو دوسری دفعہ آزادی کے ساتھ فرض کی ادائیگی کا محل باقی نہ رہا۔ اس کی مثل وہ پانی ہے جو اعضاء پر تلف ہو چکا ہے کیونکہ اس کے ساتھ کسی اور فرض کی ادائیگی صحیح نہیں، کیونکہ اس کا عین تلف ہو چکا ہے جس طرح غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں غلام حکماً تلف ہو چکا ہے، یہ نفیس بحث ہے اس پر غور و فکر کرو۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اس پانی میں کوئی فرق نہیں کیا جس میں نجاست گر پڑتی ہے اور جو پانی اس نجاست پر پڑتا ہے وہ پانی کھڑا ہو یا کھڑا نہ ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جو پانی پر غالب آجائے اور اس کے ذائقہ، اس کے رنگ اور بو کو بدل دے''۔ امام شافعی نے ان میں فرق کیا ہے انہوں نے کہا: جب نجاست پانی میں گرے تو وہ پانی کو ناپاک کر دیتی ہے؛ ابن عربی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ کہا: پانی کے احکام کے بارے میں شریعت کے اصول یہ ہیں کہ پانی کا نجاست پر وارد ہونا اس طرح نہیں جس طرح پانی نجاست پر وارد ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ برتن میں داخل نہ کرے یہاں تک کہ اسے تین دفعہ دھوئے کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے''، ہاتھ کو پانی پر وارد ہونے سے منع کیا اور پانی کو ہاتھ پر وارد کرنے کا حکم دیا۔ اس باب میں یہ بہت عمدہ ضابطہ ہے اگر پانی کا ورود نجاست پر نہ ہوتا وہ تھوڑا ہوتا یا زیادہ ہوتا تو وہ نجاست پاک نہ ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بدو کے پیشاب کے بارے میں ارشاد فرمایا جس نے مسجد میں پیشاب کیا تھا ''اس پر پانی کے ڈول بہا دو''۔

ہمارے شیخ ابوالعباس نے کہا: انہوں نے حدیث قلتین سے بھی استدلال کیا ہے، انہوں نے کہا: جب پانی دو مٹکوں سے کم ہو اس میں نجاست گر پڑے تو وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے اگرچہ اس میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ اگر اتنی مقدار یا اس سے کم نجاست پر واقع ہو اور نجاست کے عین کو زائل کر دے تو پانی طہارت پر باقی رہے گا اور نجاست کو زائل کر دے گا۔ نجاست کا پانی پر واقع ہونا یہ صوری فرق ہے اس میں فقہ کا کوئی تعلق نہیں یہ باب امور تعبدیہ سے نہیں بلکہ امور معقولہ میں سے ہیں یہ نجاست کو زائل کرنے اور اس کے احکام سے متعلق ہے، پھر یہ سب ان علماء کی باتیں ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد رد کر دیتا ہے: الماء طهور لا ينجسه شيء إلّا ما غيّر لونه أو طعمه أو ريحه، پانی پاکیزگی عطا کرنے والا ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جب اس کے رنگ، ذائقہ اور بو کو تبدیل کر دے۔

میں کہتا ہوں: یہ ایسی حدیث ہے جسے دارقطنی نے اشد بن سعد ابی الحجاج سے وہ معاویہ بن صالح سے وہ راشد بن سعد سے وہ حضرت ابو امامہ باہلی اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں اس میں رنگ کا ذکر نہیں۔ کہا: اسے رشدین بن سعد کے سوا کسی نے مرفوع نقل نہیں کیا، اس کی سند یہ ہے کہ وہ معاویہ بن صالح سے روایت نقل کرتے ہیں۔ وہ قوی نہیں استدلال میں جو سب سے اچھا ہے وہ وہ روایت ہے جسے ابو امامہ نے ولید بن کثیر سے وہ محمد بن کعب سے وہ عبداللہ بن عبداللہ بن رافع بن خدیج سے وہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ عرض کی

گئی: یا رسول الله! کیا ہم بئر بضاعہ سے وضو کر لیا کریں، یہ ایسا کنواں تھا جس میں حیض آلود کپڑے، مردہ کتوں اور بدبودار چیزوں کو پھینکا جاتا تھا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' (1)۔ اسے ابو داؤد، ترمذی اور دارقطنی نے اس سند سے روایت کیا ہے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن ہے، ابوامامہ نے اس حدیث کو بہت عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بئر بضاعہ کے بارے میں جو حدیث ہے حضرت ابوامامہ سے بہتر کسی نے اس حدیث کو بیان نہیں کیا۔ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ نجاست پانی پر واقع ہو۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طہارت کا حکم دیا ہے اور اس کے مطہر ہونے کا حکم لگایا ہے۔ ابوداؤد نے کہا: میں نے قتیبہ بن سعید سے سنا کہا: میں نے بئر بضاعہ کے قیم (منتظم) سے اس کی گہرائی کے بارے میں سوال کیا میں نے کہا: اس میں زیادہ سے زیادہ کتنا پانی گہرا ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا: انسان کے خصیتین تک پانی پہنچ جاتا ہے۔ میں نے پوچھا: جب وہ کم ہوتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: انسان جتنے حصہ کو ڈھانپتا ہے اس سے نیچے کے حصے تک۔ ابوداؤد نے کہا: میں نے اپنی چادر سے بئر بضاعہ کا اندازہ لگایا میں نے اسے اس کنواں پر لمبا کیا تھا پھر میں نے اسے ماپا تو اس کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ جس نے میرے لیے باغ کا دروازہ کھولا تھا اور مجھے باغ میں داخل کیا تھا میں نے اس سے پوچھا: کیا جتنا یہ کنواں تھا اس میں تبدیلی کی گئی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے اس میں پانی کو دیکھا جس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ہم نے جو ذکر کیا ہے اس پر یہ دلیل ہے، مگر ابن عربی نے کہا: یہ شوریدہ زمین میں تھا اور پانی اس میں کھڑا ہونے سے متغیر ہو گیا۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ وہ پانی جو طاہر (پاک) اور مطہر (پاک کرنے والا) ہوتا ہے جس کے ساتھ وضو کرنا اور نجاستوں کو دھونا جائز ہے وہ خالص صاف پانی ہے یہ بارش کا، دریاؤں، سمندروں، چشموں اور کنوؤں کا پانی ہے اور جسے لوگ ماء مطلق پہچانتے ہیں یہ کسی ایسی چیز کی طرف مضاف نہیں ہوتا جو اس کے ساتھ مل جائے جس طرح الله تعالیٰ نے اسے صاف پیدا کیا زمین کا رنگ اسے کوئی نقصان نہیں دیتا، جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ اس مجموعی صورت میں امام ابوحنیفہ، حضرت عبدالله بن عمرو اور حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہم نے اختلاف کیا ہے، جہاں تک حضرت امام ابوحنیفہ کا تعلق ہے آپ نے حالت سفر میں نبیذ تمر (کھجور کی نبیذ) سے وضو کرنے کی اجازت دی ہے اور ہر مائع سے نجاست زائل کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ جہاں تک تیل اور شوربے کا تعلق ہے ان سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ساتھ ازالہ کرنا جائز نہیں مگر ان کے اصحاب کہتے ہیں جب اس کے ساتھ نجاست زائل ہو جائے تو یہ بھی جائز ہے اسی طرح آگ اور سورج کی شعاع کا مسئلہ ہے یہاں تک کہ مردار کی جلد جب سورج کی تمازت میں خشک ہو جائے تو دباغت کے بغیر وہ پاک ہو جاتی ہے اسی طرح ایسی نجاست جو زمین پر واقع ہو جب وہ سورج کی تمازت سے خشک ہو جائے تو وہ جگہ پاک ہو جائے گی اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہو جائے گا، مگر اس مٹی کے ساتھ تیمم کرنا جائز نہیں ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: جب الله تعالیٰ نے پانی کی صفت بیان کی کہ وہ طہور ہے تو اس کو آسمان سے نازل کرنے پر احسان جتلایا تاکہ اس کے ذریعے ہمیں پاک کرے تو یہ اسی کے ساتھ خاص ہونے پر دال ہے اسی طرح

1۔ سنن ابن ماجہ، باب مقدار الماء الذی لاینجس، حدیث 513۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی بئر بضاعۃ، حدیث 60، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما سے فرمایا جب انہوں نے اس حیض کے خون کے بارے میں پوچھا جو کپڑے کو لگ جاتا ہے: ''اسے لو پھر انگلیوں کے ساتھ اسے کھرچ دو پھر پانی کے ساتھ اسے مل دو''۔ اس لیے پانی کے علاوہ چیز کو پانی کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس میں احسان کا ابطال ہوتا ہے۔ نجاست کوئی محسوس چیز تو نہیں یہاں تک کہ یہ کہا جائے کہ جو بھی اس کو زائل کر دے تو اس کے ساتھ غرض قائم ہو جائے۔ نجاست حکم شرعی ہے شارع نے اس کے لیے پانی کو معین کیا اس لیے غیر کو اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ غیر اس کے معنی میں نہیں کیونکہ اگر یہ اس کے ساتھ لاحق ہو تو اس کو ساقط کر دے جب فرع کا اصل کے ساتھ الحاق اس کے اسقاط میں ہو تو یہ خود ساقط ہو جاتا ہے تاج السنۃ ذوالعز بن المرتضی دبوسی اسے فرخ زنی (زنا کا چوزہ) کا نام دیتے۔

میں کہتا ہوں: نبیذ کے استعمال کے بارے میں جن روایات سے استدلال کیا گیا ہے وہ کمزور احادیث ہیں ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل پر قائم نہیں۔ دارقطنی نے ان کا ذکر کیا، ان کو ضعیف قرار دیا اور اس پر گفتگو کی۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو موقوف روایات مروی ہیں انہیں بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے: ''جو آدمی پانی نہ پائے اس کے لیے نبیذ وضو کا پانی ہے''۔ اس کی سند میں ابن محرز متروک ہے، اسی طرح حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا: نبیذ کے ساتھ وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حجاج اور ابولیلی دونوں ضعیف ہیں۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث بھی ضعیف قرار دی گئی ہے(1) کہا: ابن لہیعہ اس حدیث کو روایت کرنے میں منفرد ہیں وہ حدیث میں کمزور ہے؛ علقمہ بن قیس سے یہ نقل کیا گیا ہے میں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا: تم میں سے کوئی اس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حاضر تھا جس رات آپ کے پاس جنوں کا داعی آیا تھا؟ فرمایا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح سند ہے اس کے راویوں کی عدالت میں کوئی اختلاف نہیں، امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے سوال کیا: ''تیرے مشکیزہ میں کیا ہے؟'' میں نے کہا: نبیذ ہے۔ فرمایا: ''پاکیزہ کھجور اور پاکیزگی عطا کرنے والا پانی''۔ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے وضو کیا۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث ابوزید سے مروی ہے وہ اسے حضرت عبد اللہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔ علماء حدیث کے نزدیک ابوزید مجہول ہے، اس حدیث کے علاوہ ہم اس کی کسی روایت کو نہیں جانتے۔ بعض علماء نے نبیذ سے وضو کرنے کی رائے قائم کی ہے، ان میں سفیان اور دوسرے علماء بھی ہیں۔ بعض علماء نے کہا: نبیذ سے وضو نہیں کیا جائے گا، یہ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کا نقطہ نظر ہے اگر کسی آدمی کو اس قسم کی صورتحال کا سامنا ہو تو وہ نبیذ سے وضو کرے اور تیمم کرے یہ مجھے زیادہ محبوب ہے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: جو آدمی یہ کہتا ہے نبیذ سے وضو نہیں کیا جائے گا اس کا قول کتاب اور سنت کے زیادہ قریب اور زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (النساء:43) یہ مسئلہ اختلافی کتب میں بہت طویل بحث کے ساتھ مذکور ہے انحصار لفظ ماء پر ہے اس کی وضاحت سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب الوضوء بالنبیذ، حدیث نمبر 377، روایت بالمعنی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 12**۔ جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا اور فرمایا: لیطھرکم بہ ایک جماعت نے سمندر کے پانی کے بارے میں توقف کیا ہے کیونکہ یہ منزل من السماء کی صفت پر نہیں یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی کہ وہ سمندر کے پانی سے وضو نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ آگ ہے اور جہنم کا ایک طبق ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم اس آدمی کے لیے بیان کیا جس نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ **ھو الطھور ماء ہ الحل میتتہ**، اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے، امام مالک نے اسے روایت کیا ہے اس کے بارے میں ابو عیسیٰ نے یہ کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کا یہی قول ہے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے وہ سمندر کے پانی میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے سمندر کے پانی سے وضو کو مکروہ قرار دیا ہے، ان میں حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت عبداللہ بن عمر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: وہ آگ ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام ترمذی، ابو عیسیٰ سے امام مالک کی اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو صفوان بن سلیم سے مروی ہے فرمایا: میرے نزدیک وہ حدیث صحیح ہے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: میں نے امام بخاری سے پوچھا ہشیم اس کے بارے میں کہتا۔ ابن ابی برزہ، فرمایا: اسے اس میں وہم ہوا ہے وہ مغیرہ بن ابی بردہ ہے۔ ابو عمر نے کہا: میں نہیں جانتا امام بخاری سے یہ کیا واقع ہوا۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو اسے اپنی صحیح میں نقل کرتے انہوں نے ایسا نہ کیا کیونکہ وہ صحیح میں اسناد پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ حدیث ایسی ہے جس کی مثل اسناد سے وہ استدلال نہیں کرتے۔ وہ میرے نزدیک صحیح ہے کیونکہ علماء نے اسے قبول کیا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔ مجموعی طور پر فقہاء میں سے کسی نے ان سے اختلاف نہیں کیا، انہوں نے اس کے بعض معانی میں اختلاف کیا ہے۔ علماء میں سے جمہور اور فقہاء کے ائمہ میں سے ایک جماعت نے یہ اتفاق کیا ہے کہ سمندر کا پانی پاک ہے اس کے ساتھ وضو جائز ہے مگر جو حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے مروی ہے ان دونوں نے سمندر کے پانی سے وضو کو مکروہ قرار دیا ہے زمانہ کے فقہاء نے ان کی موافقت نہیں کی اور اس باب کی حدیث کی وجہ سے کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ یہ امر تیری رہنمائی اس بات پر کرتا ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک مشہور ہے، ان کا عمل اور ان کا قبول کرنا مشہور ہے، یہ ان کے نزدیک اس اسناد سے اولیٰ ہے جس کی سند ظاہری اعتبار سے صحیح ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اصول اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

ابو عمر نے کہا: صفوان بن سلیم جو حمید بن عبدالرحمن بن عوف زہری کے غلام تھے اور اہل مدینہ کے عبادت گزاروں اور ان میں سے سب سے متقی تھے، عبادت گزار، بہت زیادہ صدقہ و خیرات کرنے والے جو بھی تھوڑا یا زیادہ پاتے صدقہ کر دیتے، بڑے عامل اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرنے والے جنہیں ابو عبداللہ کے نام سے یاد کیا جاتا وہ مدینہ طیبہ میں رہے اس سے نقل مکانی نہ کی اور ایک سو بتیس ہجری میں وہاں ہی فوت ہوئے۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ذکر کیا: میں نے سنا جب کہ آپ سے صفوان بن سلیم کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ فرمایا: وہ ثقہ تھے، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے اور فاضل مسلمانوں میں سے تھے، جہاں تک سعید بن سلمہ کا تعلق ہے جس قدر میرا علم ہے صفوان کے علاوہ کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ اللہ

تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ جس کا یہ حال ہو وہ مجہول ہوتا ہے کسی کے نزدیک بھی حجت نہیں کی۔ جہاں تک مغیرہ بن ابی بردہ کا تعلق ہے موسیٰ بن نصیر نے مغرب میں جو مغازی کیے ان میں، میں نے اس کا ذکر بار ہا کیا ہے موسیٰ بن نصیر اسے گھوڑوں پر عامل بناتا۔ بربر کے علاقہ میں اللہ تعالیٰ نے اسے خشکی اور سمندر میں فتوحات عطا کیں۔ دار قطنی نے امام مالک کے علاوہ ایک اور سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من لم یطھرہ ماء البحر فلا طھرہ اللہ جسے سمندر کا پانی پاک نہ کرے اللہ تعالیٰ اسے پاکیزگی عطا نہ کرے۔ کہا: اس کی سند حسن ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ ابن عربی نے کہا: کچھ لوگوں کا وہم ہے کہ جب پانی جنبی کے غسل سے بچ جائے تو اس سے وضو نہ کیا جائے گا، یہ باطل مذہب ہے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے یہ ثابت ہے انہوں نے کہا: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق زوجیت ادا کیے، میں نے ایک ٹب نما برتن سے غسل کیا اور کچھ پانی بچا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تا کہ اس سے غسل کریں میں نے عرض کی: میں نے اس سے غسل کیا ہے۔ فرمایا: "پانی پر کوئی نجاست نہیں" یا فرمایا "پانی جنبی نہیں ہوتا"۔ ابو عمرو نے کہا: اس باب میں ایسے مرفوع آثار وارد ہوئے ہیں جن میں یہ نہی کی گئی ہے کہ آدمی عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرے۔ بعض نے بعض روایات میں یہ اضافہ کیا ہے "لیکن وہ دونوں اکٹھے چلو بھریں"۔ ایک جماعت کا قول ہے: یہ جائز نہیں کہ مرد عورت کے ساتھ ایک برتن میں چلو بھرے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے وضو کر رہا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مکروہ ہے کہ عورت تنہا ایک برتن سے پانی استعمال کرے پھر اس کے بعد اس کے بچے ہوئے پانی سے مرد وضو کرے۔ ہر ایک نے جو نقطہ نظر اپنایا ہے اس کے بارے میں ایک اثر روایت کیا ہے۔ جمہور علماء اور شہروں کے فقہاء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرے اور عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرے۔ عورت منفرد ہو کر برتن سے پانی لے یا نہ لے۔ اس میں بے شمار آثار ہیں جو صحیح ہیں۔ جس نقطہ نظر کی طرف ہم گئے ہیں کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جب اس میں نجاست کا اثر ظاہر ہو جائے اس لیے ایسے آثار اور اقوال میں مصروف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں جو صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مدد طلب کی جاتی ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بیان کیا کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل جنابت کیا کرتے تھے۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے: میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کیا کرتے تھے جس برتن کو فرق کہا جاتا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی نے ٹب نما برتن سے غسل کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وضو کیا۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں حالت جنابت میں تھی، فرمایا: "پانی جنبی نہیں ہوتا"۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے؛ یہ حضرت سفیان ثوری، امام مالک اور

1۔ سنن الترمذی، باب ماجاء فی وضوء الرجل، حدیث نمبر 57، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام شافعی کا نقطہ نظر ہے(1)۔ دار قطنی نے عمرہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتی ہیں کہا: میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے وضو کیا کرتے تھے جب کہ اس سے قبل بلی نے اس برتن سے پانی پیا تھا۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(2)۔ بنی غفار کے ایک آدمی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے بچے ہوئے پانی کے استعمال سے منع کیا ہے(3) اس باب میں حضرت عبداللہ بن سرجس سے روایت مروی ہے بعض فقہاء نے عورت کے بچے ہوئے پانی کے استعمال کو مکروہ جانا ہے؛ یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے(4)۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ دار قطنی نے زید بن اسلم جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے غلام تھے سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے برتن میں پانی گرم کیا جاتا جس برتن کو قمقمہ کہا جاتا، آپ اس پانی سے غسل کیا کرتے تھے۔ کہا: یہ حدیث صحیح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے جب کہ میں نے دھوپ میں پانی کو گرم کیا تھا۔ فرمایا ''اے حمیراء! ایسا نہ کیا کرو کیونکہ یہ برص کا مرض لگا دیتا ہے''۔ اسے خالد بن اسماعیل مخزومی نے ہشام بن عروہ سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں۔ خالد بن اسماعیل متروک ہے اسے عمرو بن محمد اعشم وہ فلیح سے وہ زہری سے وہ عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں۔ وہ منکر الحدیث ہے کسی اور نے اسے فلیح سے نقل کیا ہے زہری سے صحیح نہیں، یہ دار قطنی نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ ہر وہ برتن جو پاک ہو اس کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے مگر سونے اور چاندی کے برتن سے وضو کرنا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے استعمال سے منع کیا ہے اس کی وجہ عجمیوں اور جابروں کے ساتھ مشابہت ہے ان کی نجاست نہیں ہے۔ جس نے ان دونوں سے وضو کیا وہ ان برتنوں کے استعمال کی وجہ سے گناہگار ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے کسی ایک میں وضو کرنا جائز نہیں۔ پہلا قول زیادہ معروف ہے؛ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ ہر جلد جس کے جانور کو ذبح کیا گیا ہو تو اس کا استعمال وضو اور دوسرے امور کے لیے جائز ہے، امام مالک مردار کی جلد کی دباغت کے بعد اس سے وضو کو مکروہ خیال کرتے تھے، امام مالک کا قول اس بارے میں مختلف ہے سورۂ نحل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ۝۴۹

''تاکہ ہم زندہ کر دیں اس پانی سے کسی غیر آباد شہر کو اور ہم پلائیں یہ پانی اپنی مخلوق سے کثیر التعداد مویشیوں اور انسانوں کو''۔

لِّنُحْیِۦَ بِهٖ، ہ ضمیر سے مراد بارش ہے۔ بَلْدَةً مَّیْتًا وہ بستی خشک سالی اور نباتات کے نہ ہونے کی وجہ سے مردہ ہو چکی ہو۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب الماء لا یجنب، حدیث نمبر 62۔ ابن ماجہ، باب الرخصۃ بفضل وضوء المرأۃ، حدیث نمبر 363، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الوضوء بسؤر الهرۃ، حدیث نمبر 361، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب النهی عن ذلك، حدیث نمبر 366، سنن ابی داؤد، باب النهی عن ذلك، حدیث 75۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 59-58، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 58، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کعب نے کہا: بارش زمین کی روح ہے اللہ تعالیٰ اسے بارش کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ مَّيْتًا فرمایا، ميتة نہیں فرمایا، کیونکہ بلدۃ اور بلد کا معنی ایک ہی ہے، یہ زجاج کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلد سے مراد مکان ہے۔ وَّنُسْقِيَهٗ عام قراءت نون کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، اعمش اور عاصم جو مفضل نے ان دونوں سے قراءت نقل کی ہے وہ نَسْقيه ہے اس میں نون مفتوح ہے۔

مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا بہت زیادہ انسان۔ اناسی کا واحد انسی ہے جس طرح قراقور کی جمع قراقیر اور قراقر ہے، یہ اخفش، مبرد اور فراء کا ایک قول ہے۔ اس کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی واحد انسان ہے پھر نون کو یاء سے بدل دیا تو کہے گا: اناسی، اصل میں یہ اناسین تھا جس طرح سرحان اور سراحین اور بستان کی جمع بساتین ہے انہوں نے یاء کو نون کا عوض قرار دیا، اسی وجہ سے سراحی اور بساتی بھی جائز ہے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ فراء نے کہا: اناسی اس یاء کی تخفیف کے ساتھ جو فعل کے لام اور عین کلمہ کے درمیان ہے جس طرح قراقیر اور قراقر ہے۔ کثیرا فرمایا کثیرین نہیں فرمایا، کیونکہ فعیل سے بعض اوقات کثرت مراد ہوتی ہے جس طرح اس ارشاد میں ہے: وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (النساء)

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

''اور ہم بانٹتے رہتے ہیں بارش کو لوگوں کے درمیان تاکہ وہ غور و فکر کریں، پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے مگر یہ کہ وہ ناشکر گزار بنیں گے''۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ، ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے، سورت کے آغاز میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ کفورا یعنی اس کا انکار کرتے ہوئے اور اسے جھٹلاتے ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ میں ہ ضمیر سے مراد بارش ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کوئی ایسا سال نہیں جو کسی سال کی بنسبت زیادہ بارش والا ہو لیکن اللہ تعالیٰ اسے جہاں چاہتا ہے پھیر دیتا ہے کسی علاقہ کے لوگوں پر بارش زیادہ ہو رہی ہوتی ہے کسی علاقہ میں وہ کم ہو رہی ہوتی ہے۔ تصریف کا یہی معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ اسے وابل، طش، طل اور رہام کی صورت میں پھیر دیا۔ جوہری نے کہا: رہام سے مراد ہلکی بارش ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تصریف سے مراد اس کے ذریعے مختلف منافع دینا ہے جیسے پانی پینا، سیراب کرنا، اس کے ذریعے کاشت کرنا، پاکیزگی حاصل کرنا، باغوں کو سیراب کرنا، غسل کرنا وغیرہ۔

عکرمہ نے کہا: فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا سے مراد ان کا ستاروں کے بارے میں یہ کہنا ہے: فلاں ستارے کی وجہ سے ہمارے اوپر بارش ہوئی۔ نحاس نے کہا: ہم مفسرین میں کوئی اختلاف نہیں پاتے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں کفر سے مراد ان کا یہ کہنا ہے: ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی، اس کی مثل ان کا یہ قول ہے: فعل النجم کذا ستارے نے

ایسا کیا۔ جو آدمی بھی ستارے کی طرف کسی فعل کو منسوب کرے تو وہ کافر ہے۔ حضرت ربیع بن صبیح نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک رات لوگوں پر بارش ہوئی جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس میں لوگ دو حصوں میں بٹ گئے ہیں شکر گزار اور ناشکرے جہاں تک شکر گزار کا تعلق ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے کہ اس نے اسے سیراب کیا اور اس پر بارش کی۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ کہتا ہے: ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی''۔ اس کی صحت پر اتفاق ہے اور سورۂ واقعہ میں ان شاء اللہ یہ روایت آئے گی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی ہے فرمایا: ما من سنة بامطر من اخری ولکن إذا عمل قوم بالمعاصی صرف اللہ ذلك إلی الفیافی والبحار کوئی سال دوسرے سال کی بنسبت زیادہ بارش والا نہیں ہوتا لیکن جب کوئی قوم نافرمانیاں کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس بارش کو دوسروں کی طرف پھیر دیتا ہے جب سب لوگ نافرمانیاں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو جنگلوں اور سمندروں کی طرف پھیر دیتا ہے''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تصریف یہ ہوا کی طرف راجع ہے سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے لیذ کروا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یہ ذکر سے مشتق ہے باقی قراء نے تذکر سے تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کریں اور یہ جان لیں کہ جو اس پر انعام کرے اس کے ساتھ شرک کرنا جائز نہیں تذکر، ذکر کے قریب ہے مگر تذکر کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو دل سے دور ہو تو اسے تذکر میں تکلف کی ضرورت ہوتی ہے۔

**وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ﴿۵۲﴾**

''اور اگر ہم چاہتے تو بھیجتے ہر گاؤں میں ایک ڈرانے والا، پس کافروں کی پیروی نہ کرو اور خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا کرو ان کا (قرآن کی دلیلوں) سے''۔

**وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا** نذیر سے مراد رسول ہے یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک رسول بھیج دیتے جو انہیں ڈرائے جس طرح ہم نے بارش کو تقسیم کیا تا کہ آپ سے نبوت کے بوجھ کم ہو جائیں لیکن ہم نے ایسا نہ کیا بلکہ ہم نے آپ کو سب کے لیے نذیر بنایا تا کہ تیرا درجہ بلند ہو جائے پس اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر بجا لاؤ۔

**فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ** کفار آپ کو اپنے بتوں کی اتباع کی جو دعوت دیتے ہیں اس میں کافروں کی اطاعت نہ کرو۔ **وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ ابن زید نے کہا: مراد اسلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تلوار ہے، یہ قول حقیقت سے بعید ہے، کیونکہ سورت مکی ہے اور قتال کے حکم سے پہلے نازل ہوئی۔ **جِهَادًا كَبِیْرًا** یعنی ایسا جہاد جس میں سستی اور کاہلی کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔

**وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا**

بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو یہ (ایک) بہت شیریں ہے اور یہ (دوسرا) سخت کھاری ہے اور بنادی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان آڑ اور مضبوط رکاوٹ''۔

وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کلام نعم کے ذکر کی طرف راجع ہے مَرَجَ کا معنی تخلیہ، خلط ملط کرنا اور بھیجنا ہے۔ مجاہد نے کہا: دونوں کو بھیجا اور ایک کو دوسرے میں بہایا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ دونوں کو خلط ملط کر دیا پس دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: مرجتُه جب تو اسے خلط ملط کر دے۔ مرج الدین والامر دین اور امر خلط ملط ہو جائے اور مضطرب ہو جائے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِیْۤ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ﴿۵﴾ (ق) اسی معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو فرمان ہے: إذا رأيت الناس مرجت عهودهم وخفت أماناتهم وكانوا هكذا وهكذا (1) جب تو لوگوں کو دیکھے کہ ان کے عہد و پیمان خلط ملط ہو جائیں اور ان کی امانتیں ہلکی ہو جائیں اور وہ اس طرح گڈمڈ ہو جائیں آپ نے انگلیوں کا جال بنایا، میں نے عرض کی: میں اس وقت کیا کروں۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے۔ فرمایا: إلزم بيتك وأملك عليك لسانك وخذ بما تعرف ودع ما تنكر وعليك بخاصة امر نفسك ودع عنك أمر العامة اپنے گھر میں ہی رہو، اپنی زبان کو قابو میں رکھو جسے پہچانتے ہو وہ لے لو اور جس سے تو ناواقف ہے اس کو چھوڑ دو اپنے ذاتی امر کو اپنے او پر لازم کرو اور عام لوگوں کے امور کو ترک کر دو۔ امام نسائی، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔

ازہری نے کہا: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ سے مراد ہے دونوں میں آڑ بنادی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: مرجتُ الدابة۔ جب تو جانور کو چرنے کے لیے چھوڑ دے۔ ثعلب نے کہا: مرج کا معنی جاری کرنا ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کا معنی ہے دونوں کو جاری کیا۔ اخفش نے کہا: ایک قوم کہتی ہے: امرج البحرین یہ مرج کی طرح ہے فعل اور افعل کا باب ایک ہی معنی میں ہے۔

هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ یہ بہت ہی میٹھا ہے وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ اور یہ بہت ہی نمکین اور کڑوا ہے۔ حضرت طلحہ سے یہ مروی ہے کہ اسے وهذا مليح بھی پڑھا گیا ہے یعنی میم پر فتحہ اور لام کے نیچے کسرہ ہے۔ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا یعنی ان دونوں کے درمیان اپنی قدرت سے رکاوٹ بنادی ان میں سے ایک دوسرے پر غالب نہیں آتا، جس طرح سورۂ رحمن میں فرمایا: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ﴿۱۹﴾ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ﴿۲۰﴾ (الرحمن)

وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا مضبوط پردہ ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ اختلاط سے روکتا ہے، برزخ سے مراد رکاوٹ اور حجر سے مراد روکنے والا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد بحر فارس اور بحر روم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے کہا: مراد آسمان اور زمین کا سمندر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ہر سال میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان اس کی قضاء کا پردہ حائل ہے۔ ان پر قطعی حرام ہے کہ یہ اپنی مٹھاس کے ذریعے اس نمکین کو میٹھا کر دے اور اس میٹھے کو نمکین کے ساتھ نمکین کر دے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب الامر والنهی، حدیث نمبر 3739، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا انسان کو پانی (کی بوند) سے اور بنا دیا اسے خاندان والا اور سسرال والا اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا یعنی نطفہ سے انسان کو پیدا کیا۔ فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا، ہ ضمیر سے مراد انسان ہے یعنی انسان کو نسب اور سسرال والا بنا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِنَ الْمَآءِ سے خلقت کی اصل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ زندہ پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ان نعمتوں کا شمار ہے جو اس کے عدم کے بعد اس کے ایجاد کی صورت میں کی گئیں اور اس میں عبرت پر تنبیہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا نسب اور صہر دو ایسے معانی ہیں جو ہر رشتہ کو عام ہیں جو دو آدمیوں کے درمیان موجود ہوتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: نسب سے مراد مذکر اور مونث کے پانی کا شرعی طریقہ سے خلط ملط ہونا ہے۔ اگر وہ ملاپ معصیت کی صورت میں ہو تو وہ مطلق خلق ہوگا وہ محقق نسب نہ ہوگا، اسی وجہ سے زنا سے جنم لینے والی بیٹی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ (النساء:23) کے تحت داخل نہ ہوگی، کیونکہ ہمارے علماء کے دو قولوں میں سے اصح قول کے نزدیک اور دین میں دو قولوں میں سے اصح قول کے نزدیک بیٹی نہیں۔ جب وہ شرعی طور پر نسب نہیں تو وہ شرعی طور پر صہر بھی نہیں تو فعل زنا بنت ام (ماں کی بیٹی) اور ام بنت (بیٹی کی ماں) کو حرام نہ کرے گی جو چیز حلال فعل سے حرام ہوتی ہے وہ حرام فعل سے حرام نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نسب اور صہر کے ساتھ احسان جتلایا ہے ان کی قدر و منزلت کو بلند کیا ہے حلت اور حرمت میں ان دونوں پر احکام کو معلق کیا ہے تو باطل کو ان دونوں کے ساتھ لاحق نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے ہم پلہ قرار دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: کسی بھی مرد کے اپنے زنا سے پیدا ہونے والی بیٹی، اس کی بہن، اور زنا سے جنم لینے والی پوتی سے نکاح میں اختلاف کیا گیا ہے، ایک قوم نے اسے حرام کہا ہے، ان میں حضرت ابن قاسم ہیں؛ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ فقہاء میں سے دوسروں نے اسے جائز قرار دیا ہے ان میں عبد الملک بن ماجشون ہیں؛ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ سورۃ النساء میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ فراء نے کہا: نسب سے مراد ہے جس کے ساتھ نکاح حلال نہ ہو اور صہر سے مراد ہے جس کے ساتھ نکاح حلال ہو، یہ زجاج کا قول ہے، یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ صہر کا اشتقاق صہرت الشیء سے ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے جب تو اسے خلط ملط کر دے دونوں صہروں میں سے ہر ایک اپنے صاحب سے خلط ملط ہو گیا۔ مناکح کو صہر کہتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ لوگ خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صہر سے مراد نکاح کی قرابت ہے زوجہ کی قرابت اختان ہیں اور خاوند کی قرابت سسرال ہیں۔ اصہار کا لفظ ان سب پر واقع ہوتا ہے؛ یہ اصمعی کا قول ہے۔ اختان سے مراد بیوی کا باپ، اس کا بھائی اور اس کا چچا ہے جس طرح اصمعی نے کہا: صہر سے مراد مرد کی بیٹی کا خاوند اس کا بھائی، اس کا والد اور اس کا چچا ہے۔ محمد بن حسن نے ابو سلیمان جوزجانی کی روایت میں کہا: مرد کے اختان سے مراد اس کی بیٹیوں کے

خاوند، اس کی بہنوں کے خاوند، اس کی پھوپھیوں کے خاوند اور اس کی خالاؤں کے خاوند ہیں اسی طرح ہر ذی رحم محرم کے خاوند ہیں اور اصہار سے مراد ان کی بیوی کے ذی رحم محرم رشتہ دار ہیں۔

نحاس نے کہا: بہتر یہ ہے کہ اصہار میں وہ قول کیا جائے جو اصمعی نے کیا ہے اور ان سب سے قبل جو قول کیا گیا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: صہرت الشیء یعنی تو نے اسے خلط ملط کیا۔ میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جاتا ہے۔ اَختان میں وہ قول بہتر ہے جو محمد بن حسین نے کیا ہے یہ دو وجوہ سے بہتر ہے: (۱) حدیث مرفوع ہے محمد بن اسحاق، یزید بن عبداللہ بن قسیط سے وہ محمد بن اسامہ بن زید سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أما أنت یا علی فختنی و أبو ولدی و أنت منی و أنا منك یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ بیٹی کا خاوند ختن ہے دوسری صورت میں یہ ختن کا اشتقاق ''ختنه'' ہے جب وہ اسے کاٹے گویا خاوند اپنے اہل سے کٹ گیا اور اپنی بیوی کو اس کے اہل سے کاٹ دیا۔ ضحاک نے کہا: صہر سے مراد رضاعت (دودھ پینا) کی قرابت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک یہ وہم ہے اس وہم کو حضرت ابن عباس کے قول نے ثابت کیا ہے۔ فرمایا: نسب سے سات چیزیں حرام ہیں اور صہر سے پانچ رشتے حرام ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے: صہر سے سات رشتے حرام ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ (النساء: 23) تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں حرام کر دی گئی ہیں، یہی نسب ہے، پھر صہر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ارادہ کیا ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (النساء: 23) پھر محصنات کا ذکر کیا اس کلام کا محل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صہر سے ان حرمتوں کا ارادہ کیا جو اس کے ساتھ مذکور ہیں اور جو ذکر کیا گیا ان میں سے اکثر کی طرف اشارہ کیا وہ صہر ہے نہ کہ یہ ارادہ کیا کہ رضاع صہر ہے رضاع تو نسب کا ہم پلہ ہے اس کے ساتھ وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کے ساتھ حرام ہو جاتے ہیں کیونکہ اس بارے میں حدیث ماثور موجود ہے۔ جس نے یہ روایت کی کہ صہر سے پانچ رشتے حرام ہوتے ہیں اس نے دونوں آیتوں سے دو بہنوں اور محصنات یعنی خاوندوں والی عورتوں کو خارج کیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے رضاع کو نسب قرار دیا ہے جس طرح پہلے گزرا ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: نسب صہر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ۔ صہر تو وہ ہوتا ہے جس میں ازدواج کا رشتہ ہو۔ ابن عطیہ نے کہا: زہراوی نے ایک قول کی حکایت بیان کی ہے کہ نسب بیٹوں کی جانب سے ہوتا ہے اور صہر بیٹیوں کی جانب سے ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے اس قول کو ذکر کیا ہے اور کہا: مصاہرت دونوں جہتوں سے ہوتی ہے۔ ابن سیرین نے کہا: یہ

آیت نبی کریم ﷺ اور حضرت علی شیر خدا کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت علی کو نسب اور صہر میں جمع کیا۔ ابن عطیہ نے کہا: ان دونوں کا اجتماع قیامت تک حرمت کی تاکید ہے۔

وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا یعنی جس کا ارادہ کرتا ہے اسے پیدا فرما دیتا ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

''اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں انہیں اور نہ نقصان اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہمیشہ شیطان کا مددگار رہتا ہے''۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ جب اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کو بیان کیا اور اپنی کمال قدرت کو بیان کیا تو مشرکین پر تعجب کا اظہار کیا کہ وہ اس ذات کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو نفع اور نقصان پر قادر نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی مذکورہ چیزوں کو پیدا کیا پھر یہ جہلاء اپنی جہالت کی وجہ سے ایسے جمادات کی عبادت کرتے ہیں جو نفع اور نقصان نہیں دیتے۔

وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہاں کافر سے مراد ابوجہل ہے (اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہو) اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ بتوں کی عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے خلاف مدد طلب کرتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: کافر سے مراد ابلیس ہے اس نے اپنے رب کی عداوت کو ظاہر کر دیا ہے۔ مطرف نے کہا: یہاں کافر سے مراد شیطان ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ظہیر سے مراد معاصی پر شیطان کا مددگار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کافر اپنے رب پر آسان اور ذلیل ہے اس کی کوئی قدرت نہیں اور نہ ہی اس کی بارگاہ میں اس کا کوئی وزن ہے۔ عربوں کا قول ہے: ظهرتُ به یعنی تو نے اسے اپنی پشت کے پیچھے کر دیا اور تو اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (ہود: 92) یہاں ظهريا سے مراد هينا (ہلکا) ہے اس معنی میں فرزدق کا قول ہے:

تمیم بن قیس لا تکونن حاجتی     بظهر فلا یعیا عَلَیَّ جوابُها

اے تمیم بن قیس! میری حاجت کو آسان خیال نہ کرنا مجھ پر اس کا جواب مشکل نہیں۔

ابوعبیدہ کے قول کا یہی معنی ہے۔ ظہیر یہ مظہور کے معنی میں ہے یعنی کافروں کا کفر اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرنے والا ہے، کیونکہ اس کا کفر کوئی نقصان نہیں دے سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافر اپنے اس رب جس کی وہ عبادت کرتا ہے جو بت ہے اس پر قوی اور غالب ہے اس کے ساتھ جو چاہتا ہے سلوک کرتا ہے کیونکہ جمادات کو نقصان کے دور کرنے اور نقصان پہنچانے پر کوئی قدرت نہیں ہوتی۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔ فرما دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیر

خواہی) پر کچھ مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے"۔

یعنی جنت کا بشارت دینے والا اور آگ سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ہم نے آپ کو وکیل اور زبردستی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ میں تمہارے پاس قرآن اور وحی جو لے کر آیا ہوں اس پر تم سے اجر کا مطالبہ نہیں کرتا۔ یہاں مِنْ اَجْرٍ میں مِنْ تاکید کے لیے ہے۔ اِلَّا مَنْ میں اِلَّا، لکن کے معنی میں ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے معنی ہے لیکن جو چاہے، یعنی جو چاہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے تو وہ مال خرچ کرے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہو اور مضاف مقدر ہو تقدیر کلام یہ ہوگی الا اجر من شاء، یعنی میرے دین کی اتباع کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ کو اپنائے یہاں تک کہ دنیا اور آخرت کی کرامت کو پائے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚۛ ۝۵۸

"اور (اے مصطفیٰ!) آپ بھروسہ کیجئے ہمیشہ زندہ رہنے والے پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اس کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کیجئے، اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہے"۔

توکل کا معنی سورۂ آل عمران اور اس سورت میں گزر چکا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ تمام امور میں دل کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا اور اسباب تو صرف واسطے ہیں جن کا حکم دیا گیا ہے ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ کفار اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کرتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ تسبیح کا معنی پاکی بیان کرنا ہے، یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَسَبِّحْ کا معنی ہے اس کے لیے نماز پڑھو۔ نماز کو تسبیح کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں پر آگاہ ہے اس لیے انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝۵۹

"جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر وہ متمکن ہوا عرش پر (جیسے اس کی شان ہے) وہ رحمن ہے سو پوچھ اس کے بارے میں کسی واقف حال سے"۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ الَّذِيْ محل جر میں ہے کیونکہ یہ الحی کی صفت ہے بَيْنَهُمَا فرمایا بینھن نہیں فرمایا کیونکہ دو صنف، دو نوع اور دو چیزیں مراد لی ہیں، جس طرح قطامی کا قول ہے:

ألم يَحزُنكِ ان حبال قيس و تغلب قد تباينتا انقطاعا

کیا تجھے غمگین نہیں کرتا کہ قیس اور تغلب کے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

یہاں وحبال تغلب کا ارادہ کیا تو اسے تثنیہ بنایا حبال جمع کا صیغہ ہے کیونکہ دو چیزوں اور دو نوع کا ارادہ کیا۔

اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے اس کے بارے میں سوال کرو۔ یعنی باء، عن کے معنی میں ہے۔ اہل لغت میں سے ایک جماعت نے اس کو بیان کیا ہے کہ باء، عن کے معنی میں ہے، جس طرح فرمایا سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ (المعارج) شاعر نے کہا:

هلا سألت الخيل يابنة مالك ان كنت جاهلة بمالم تعلمی

اے بنت مالک تو نے گھڑسواروں سے کیوں نہ پوچھا اگر تو ناواقف تھی جس کو تو نہیں جانتی۔

علقمہ بن عبدہ نے کہا:

فإن تسألونی بالنساء فإننی خبير بادواء النساء طبيب

اگر تم مجھ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہو بے شک میں عورتوں کی بیماریوں کے بارے میں باخبر اور طبیب ہوں۔

یہ اصل میں عن النساء اور عما لم تعلمی تھا۔ علی بن سلیمان نے اس کا انکار کیا ہے اہل نظر انکار کرتے ہیں کہ باء، عن کے معنی میں ہو، کیونکہ اس صورت میں عربوں کے اقوال کے معانی کا ابطال لازم آتا ہے۔ لو لقيت فلانا للقيك به الاسد یہ اس معنی میں ہے للقيك للقائك أياه الاسد اگر تو فلاں سے ملتا تو تیرے اس کے ساتھ ملاقات کرنے سے شیر تیرے ساتھ ملاقات کرتا معنی ہے تو اس سے سوال کرنے کے ساتھ خبیر سے سوال کرے گا؛ ابن جبیر نے یہی کہا ہے۔ خبیر الله تعالیٰ کی ذات ہے۔ خَبِيۡرًا، سوال مصدر کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

میں کہتا ہوں: زجاج کا قول بہترین توجیہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خبیر سے مراد الله تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہے یعنی الله تعالیٰ کے متعلق کسی باخبر سے سوال کر جو اس کی صفات اور اسماء سے آگاہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کے لیے خبیر سے سوال کر۔ خبیر مضمر ضمیر سے حال ہے۔ مہدوی نے کہا: حال بنانا اچھا نہیں کیونکہ یہ اس امر سے خالی نہ ہوگا کہ یہ سائل یا مسئول سے حال ہو۔ فاعل سے حال بنانا صحیح نہیں کیونکہ خبیر اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ وہ غیر سے سوال کرے۔ یہ مفعول سے حال نہیں ہوگا، کیونکہ مسئول عنہ رحمٰن ہے جو ہمیشہ باخبر ہے حال عموی طور پر تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر اس صورت میں کہ اسے حال موکدہ پر محمول کیا جائے، جس طرح وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا (البقرہ: 91) پس یہ جائز ہے جہاں تک اَلرَّحۡمٰنُ کا تعلق ہے اس کے مرفوع ہونے میں تین وجوہ ہیں: یہ اسۡتَوٰى میں جو مضمر ضمیر ہے اس سے بدل ہے، یہ بھی جائز ہے کہ یہ هو الرحمٰن کے معنی میں ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا کی حیثیت میں مرفوع ہو۔ فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا اس کی خبر ہو اس کو مجرور پڑھنا بھی جائز ہے، معنی ہوگا توکل علی الحی الذی لا یموت الرحمن اس صورت میں یہ الحی کی صفت ہو گی۔ مدح کے طور پر نصب بھی جائز ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ ۚ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ۝ؕ۶۰

"اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ رحمٰن (کے حضور) سجدہ کرو وہ پوچھتے ہیں: رحمٰن کون ہے؟ کیا ہم سجدہ کریں اس کو

جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو اور وہ زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں''۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ، رحمن سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ وہ یہ بات انکار اور تعجب کے طریقہ پر کرتے ہیں، یعنی ہم تو یمامہ کے رحمن کو جانتے ہیں وہ اس سے مراد مسیلمہ کذاب لیتے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے گمان کیا ہے: وہ صفت سے جاہل تھے موصوف سے جاہل نہیں تھے۔ اس پر استدلال وَ مَا الرَّحْمٰنُ سے کیا گیا ہے انہوں نے من الرحمن نہیں کہا۔ ابن حصار نے کہا: گویا انہوں نے دوسری آیت نہیں پڑھی وہ ہے: وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد: 30)

اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا یہ مدینہ طیبہ اور بصرہ کے قراء کی قراءت ہے یعنی اے محمد! کیا ہم اس کو سجدہ کریں جس کے بارے میں تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے یامرنا یاء کے ساتھ قراءت کی ہے فاعل الرحمٰن مراد لیتے، ابو عبید نے یہی تاویل کی ہے، کہا: اگر وہ اقرار کرتے کہ رحمٰن نے انہیں حکم دیا ہے تو وہ کافر نہ ہوتے۔ نحاس نے کہا: یہ واجب نہیں آتا کہ کوفیوں کی قراءت میں یہ بعید تاویل کی جائے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ ان کی یہ تاویل کی جائے انسجد لما یامرنا، ھو ضمیر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس طرح یہ قراءت صحیح ہوگی اگرچہ پہلی قراءت زیادہ واضح اور تناول کے اعتبار سے زیادہ قریبی ہے۔

وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا قائل کے اس قول: اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ نے دین سے ان کی نفرت میں اضافہ کر دیا۔ حضرت سفیان ثوری اس آیت کے بارے میں یہ عرض کرتے: اے میرے اللہ! وہ چیز جس نے تیرے دشمنوں کے نفور میں اضافہ کیا ہے وہ میرے خضوع میں اضافہ کرے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ۝۶۱

''بڑی (خیرو) برکت والا ہے جس نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور بنایا ہے اس میں چراغ (آفتاب) اور چاند چمکتا ہوا''۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا بروج سے مراد منازل ہیں، اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سراج سے مراد سورج ہے، اس کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶ (نوح) عام قراءت سراجاً ہے جو واحد کا صیغہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے سُرُجًا قراءت کی ہے وہ اس سے بڑے روشن ستارے مراد لیتے ہیں۔ پہلی قراءت ابو عبید کے نزدیک اولیٰ ہے، کیونکہ انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ بروج سے مراد ستارے ہیں معنی ستارے اور ستارے ہوگا۔ نحاس نے کہا: ان کے نزدیک تاویل یہ ہے کہ ابان بن تغلب نے کہا: سرج سے مراد بڑے ستارے ہیں۔ ثعلبی نے کہا: جس طرح زہرہ، مشتری، زحل اور سماکین وغیرہ۔

وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا جب وہ طلوع ہو تو زمین کو روشن کرتا ہے۔ عصمہ نے اعمش سے روایت نقل کی ہے وقمرا قاف پر ضمہ اور میم ساکن ہے، یہ شاذ قراءت ہے۔ اگر یہ شاذ قراءت نہ ہوتی تب بھی امام احمد بن حنبل جو اپنے وقت میں امام المسلمین تھے نے کہا: وہ نہ لکھا کرو جو عصمہ قراءتیں نقل کرتا ہے۔ ابو حاتم سجستانی ان قراءتوں کے بیان کرنے کا حریص تھا جسے عصمہ نے

روایت کیا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

''اور وہ وہی ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا اس کے لیے جو چاہتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے یا چاہتا ہے کہ شکرگزار بنے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** خِلْفَةً ابو عبید نے کہا: خلفہ سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو کسی چیز کے بعد ہو۔ رات اور دن میں سے ہر ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ پیٹ کے مرض میں مبتلا لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے: أصابته خلفة یعنی وہ یکے بعد دیگرے اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اسی سے خلفة النبات ہے یہ ایسا پتہ ہے جو موسم سرما میں پہلے پتے کے بعد نکلتا ہے۔ اسی معنی میں زہیر بن ابی سلمیٰ کا قول ہے:

بها العین والآرام یمشین خلفة وہاں نیل گائیں اور ہرن کے بچے یکے بعد دیگرے چلتے ہیں۔

رئم ہرن کے بچے کو کہتے ہیں اس کی جمع آرام ہے۔ وہ کہتا ہے: جب ایک جماعت چلی جاتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔ اسی معنی میں ایک اور شاعر کے اشعار ہیں وہ ایک عورت کی صفت بیان کرتا ہے جو موسم سرما کی منزل سے موسم گرما کی منزل کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

مجاہد نے کہا: خلفة یہ خلاف سے مشتق ہے یہ سفید ہے اور یہ سیاہ ہے، پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ روشنی تاریکی، زیادتی اور کمی میں ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام ایسی ہے جس کا مضاف حذف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی: جعل اللیل والنهار ذوی خلفة اس صورت میں خلفة کا معنی اختلاف ہوگا۔

لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ جو ارادہ کرے کہ وہ غور و فکر کرے تو اسے علم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فضول نہیں بنایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر کرے گا۔ وہ عقل، فکر اور فہم میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر بجالائے گا۔ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے جس سے رات کے وقت کوئی بھلائی فوت ہو جائے تو وہ دن کے وقت اس کو پالے اور جس سے دن کے وقت بھلائی فوت ہو جائے وہ رات کے وقت اسے پالے۔ صحیح یہ ہے ما من امری تکون له صلوة باللیل فغلبه علیها نوم فیصلی مابین طلوع الشمس الی صلاة الظهر الا کتب الله له اجر صلاته و کان نومه علیه صدقة (1) جب آدمی کی رات کے وقت کی کوئی نماز ہو اس پر نیند غالب آ جائے تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر ظہر کی نماز تک نماز پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی نماز کا اجر لکھ دیتا ہے اور اس کی نیند اس کا صدقہ ہوتا ہے۔

امام مسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی اپنا وظیفہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب من نوی القیام فنام، حدیث نمبر 1119، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنے سے سو گیا یا اس میں سے کوئی حصہ پڑھنے سے سو گیا تو اس نے اسے نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان پڑھ لیا تو اس کے حق میں اسے لکھ لیا جاتا ہے گویا اس نے اسے رات کے وقت پڑھ لیا ہو"۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: میں نے شہید اکبر کو کہتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ نے بندے کو زندہ اور عالم پیدا کیا اس کے ساتھ اس کا کمال ہے، اس پر نیند کی آفت، حدث کی ضرورت اور خلقت کا نقصان مسلط کر دیا کیونکہ کمال پہلے خالق کے لیے ہے بندے کے لیے جو ممکن ہے کہ وہ تھوڑا کھانے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت میں جاگنے کے ساتھ نیند کو دور کرے تو وہ ایسا کرے۔ غبن عظیم میں سے یہ ہے کہ انسان ساٹھ سال تک زندہ رہے ساری رات سویا رہے تو اس کی نصف عمر لغو چلی گئی۔ وہ دین کا 1/6 حصہ آرام کرنے کے لیے سوتا ہے تو اس کے دو تہائی چلے جاتے ہیں اور اس کے بیس سال باقی رہ جاتے ہیں یہ امر جہالت اور سفاہت سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان اپنی عمر کا دو تہائی فانی لذت میں گزار دیتا ہے اور وہ اپنی عمر بیدار ہو کر ایسی لذت میں نہیں گزارتا جو باقی رہنے والی ہے اور وہ اس غنی کے پاس ہے جو پورا پورا حق دینے والا ہے جو نہ معدوم ہونے والا ہے اور نہ ہی ظلم کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی فضیلت نہیں رکھتیں کیونکہ جواہر اور اعراض وجود کے اعتبار سے باہم مماثل ہیں۔ تفاضل صفات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کون سا وقت افضل ہے رات یا دن؟ جہاں تک روزے کا تعلق ہے اس کے بارے میں رہنمائی کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: رات کی بڑی شان ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قیام کا حکم دیا فرمایا: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء:79) قُمِ الَّیْلَ (المزمل:2) جس کی وضاحت آگے آئے گی۔ مومنین کی قیام کرنے کی وجہ سے مدح کی، فرمایا: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (السجدہ:16) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: الصدقة تطفئ الخطیئة کما یطفئ الماء النار وصلاة الرجل فی جوف اللیل وفیه ساعة یستجاب فیها الدعاء وفیه ینزل الرب تبارك و تعالى، (1) صدقہ خطا کی آگ کو بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، رات کے وسط میں آدمی کا نماز پڑھنا یہ بھی خطاؤں کو مٹا دیتا ہے اس میں ایک ایسی ساعت ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے اس میں رب تبارک و تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ جس کی وضاحت ان شاء اللہ آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ صرف حمزہ نے یذکر ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ ابن وثاب، طلحہ اور نخعی کی قراءت ہے۔ حضرت ابی کے مصحف میں یتذکر تاء کی زیادتی کے ساتھ ہے۔ باقی قراء نے یذکر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس نے دونوں وقتوں میں سے جو بولا وہ دوسرے وقت میں اسے یاد کرے گا یا وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور تسبیح کو یاد کر لے گا۔

اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا یہ جملہ بولا جاتا ہے شَكَرَ یَشْكُرُ شُكْرًا و شُكُوْرًا جس طرح كَفَرَ یَكْفُرُ كُفْرًا و كُفُوْرًا ہے یہ شکر اسی بنا پر

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، حدیث نمبر 2541۔ سنن ابن ماجہ، باب کف اللسان فی الفتنة، حدیث نمبر 3962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان کی زندگی کا سہارا بنا دیا گویا جب انہوں نے کہا: وَمَا الرَّحْمٰنُ، جواب دیا: رحمٰن وہ ہے جو ان اشیاء پر قادر ہے۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝

''اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر آہستہ آہستہ اور جب گفتگو کرتے ہیں ان سے جاہل تو وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو''۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا جب مشرکوں کی جہالتوں، قرآن اور نبوت کے بارے ان کے طعن کو ذکر کیا تو اپنے مومن بندوں کا ذکر کیا اور ان کی صفات کا ذکر کیا اور انہیں شرف عطا کرنے کے لیے اپنی عبودیت کی طرف منسوب کیا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (الاسراء: 1) اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اس کی عبادت کی، اپنے کان، آنکھ، زبان اور دل کو ان امور میں مصروف رکھا جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو وہ ہی عبودیت کے اسم کا مستحق ہوا، جو اس کے برعکس ہے اسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان شامل ہوگا: اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف: 179) یعنی وہ عبرت حاصل کرنے والا نہیں؛ جس طرح سورۂ اعراف میں پہلے گزر چکا ہے، گویا فرمایا: و عباد الرحمن هم الذین یمشون علی الأرض، هم ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح تیرا قول ہے: زید الامیر یعنی زید هو الامیر۔ الَّذِیْنَ مبتدا محذوف کی خبر ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی خبر سورت کا آخر اُولٰٓىِٕكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا ہے، مبتدا اور خبر کے درمیان ان کے اوصاف اور ان کے متعلقات ہیں، یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ ہو۔ یَمْشُوْنَ سے مراد ان کی زندگی، ان کی زندگی کی مدت اور ان کے تصرفات ہیں۔ ان میں سے بڑی چیز کا ذکر کیا خصوصاً اس میں زمین میں گھومنا پھرنا ہے وہ لوگوں کے ساتھ میل جول اور خلط ملط ہونا ہے۔

هَوْنًا، هون یہ هین کا مصدر ہے جس کا معنی سکینہ اور وقار ہے، تفسیر میں ہے وہ زمین پر حلم کا پیکر اور تواضع اختیار کرتے ہوئے چلتے ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ میانہ روی، آہستگی اور اچھی چال چلن نبوت کے اخلاق میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أیها الناس علیکم بالسکینة فإن البر لیس فی الایضاع، اے لوگو! سکینہ و وقار کو لازم پکڑو ایضاع (چال کا ایک انداز جو خبب کی طرح ہوتا ہے) میں کوئی نیکی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں یہ بیان کیا گیا ہے: انه کان إذا زال زال تقلعا و یخطو تکفا و یمشی هونا ذریع المشیة اذا مشی کانما ینحط من صبب، تقلع سے مراد قوت کے ساتھ پاؤں کو اٹھانا۔ تکفو چلنے میں درمیانی چال کی طرف مائل ہونا۔ هون سے مراد نرمی اور وقار ہے۔ ذریع سے مراد کھلے قدم والے یعنی آپ کی چال اس طرح تھی آپ جلدی سے اپنے قدم کو اٹھاتے، اپنے قدم کو لمبا کرتے مگر متکبر کی چال کی طرح نہ ہوتا، اپنی سمت کو سیدھا رکھتے یہ ہر ایک نرمی سے ہوتا اور جلدی کے بغیر ثابت ہوتا جس طرح کہا: کانما ینحط من صبب گویا آپ بلندی سے پستی کی طرف آ رہے ہیں، یہ قاضی عیاض کا قول ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تکلف کی بجائے فطرتی

طور پر جلدی چلا کرتے تھے۔ زہری نے کہا: تیز چلنا چہرے کی رونق کو ختم کر دیتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: مراد تیز رفتاری ہے کیونکہ یہ وقار میں مخل ہوتا ہے اور بھلائی میانہ روی میں ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: پس میں الله تعالیٰ کے فرمان: الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کی تفسیر کے بارے پوچھتا تھا اور اس میں کوئی شافی جواب نہ پاتا۔ میں نے خواب دیکھا ایک آدمی میرے پاس آیا اس نے مجھے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ قشیری نے کہا: وہ فساد اور نافرمانی کے لیے تگ و دو نہیں کرتے بلکہ وہ الله تعالیٰ کی اطاعت اور مباح امور کے لیے بغیر سستی و کاہلی کے کدوکاوش کرتے ہیں۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ⑱ (لقمان) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ طاعت میں معروف اور تواضع کو اپناتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ حلیم ہیں اگر ان کے ساتھ جہالت کا رویہ اپنایا جائے تو وہ جہالت کا رویہ نہیں اپناتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لوگوں پر تکبر نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: یہ سب قریب قریب معانی ہیں۔ ان سب کو الله تعالیٰ کا عرفان، اس کا خوف، اس کے احکام کی معرفت اور اس کے عذاب اور عقاب کی خشیت جامع ہے، الله تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ہمیں ان لوگوں میں سے بنا دے۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ هَوْنًا کا لفظ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ سے متعلق ہے، اور مشی ہی ھون ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی یہ تاویل کرنا مناسب ہے کہ اس چلنے والے کے اخلاق نرم ہوں اور اس کی چال کے مناسب ہوں۔ قول اسی کی طرف لوٹ جاتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے، جہاں تک صرف چال کی صفت کا تعلق ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ بعض نرمی سے اور ٹھہر ٹھہر کر چلتے ہیں جب کہ وہ مٹیالے رنگ کا بھیڑیا ہوتا ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرتے گویا آپ ڈھلان سے اتر رہے ہیں۔ اس آیت میں آپ ہی مقتدا ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: من مشی منکم فی طمع فلیمش رویدا تم میں سے جو آدمی کسی غرض کے لیے چلے تو وہ آہستہ آہستہ چلے۔ یہاں صرف چال کا ارادہ نہیں کیا۔ کیا تم دیکھتے نہیں باطل پرست اور اپنے آپ کو ظاہری طور پر دین سے آراستہ کرنے والے صرف چال کی صورت کو اپناتے ہیں یہاں تک کہ شاعر نے ان کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

کلھم یمشی رویدا کلھم یطلب صید

ان میں سے ہر ایک ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہے ان میں سے ہر ایک شکار کا طالب ہوتا ہے۔

ابن عربی نے اپنے بارے میں اس کے برعکس کہا:

تواضعتُ فی العلیاء والاصل کابر و حزت قصاب السبق بالھون فی الامر

سکون فلا خبث السریرة اصله وجل سکون الناس من عظم الکبر

وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا نحاس نے کہا: سلام یہ تسلیم سے نہیں بلکہ یہ تسلم سے ہے، عرب کہتے ہیں: سلاما مراد تسلما منک کہتے ہیں یعنی تجھ سے بری۔ دو امور میں سے کسی ایک کی وجہ سے منصوب ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ قَالُوْا کی وجہ سے منصوب ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو یہ سیبویہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: جو میں کہتا ہوں وہ یہ کہ

قَالُوْا یہ سَلٰمًا میں عامل ہے کیونکہ معنی ہے انہوں نے یہ لفظ کہا۔ مجاہد نے کہا: سلاما کا معنی سدادا ہے، یعنی وہ جاہل سے ایسی گفتگو کرتا ہے کہ اسے نرمی کے ساتھ اپنے آپ سے دور کر دیتا ہے۔ اس تاویل کی بنا پر قَالُوْا یہ سَلٰمًا میں عامل ہوگا۔ یہ نحویوں کے طریقہ پر ہے کیونکہ یہ قولا کے معنی میں ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: مخاطب کو یہ چاہیے کہ وہ جاہل کو سلاما کہے، اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی: سلمنا سلاما او تسلیما اس صورت میں نحویوں کے طریقہ پر عامل اسی کا فعل ہوگا۔

**مسئلہ**: یہ آیت، آیت سیف سے پہلے نازل ہوئی، جو کافروں کے ساتھ خاص ہے وہ اس میں سے منسوخ ہے اور مسلمانوں کے بارے میں ادب قیامت تک جاری وساری رہے گا۔ سیبویہ نے اپنی کتاب میں اس آیت کے نسخ کا ذکر کیا ہے اس کے غیر کے نسخ کے بارے میں جو کلام کی گئی ہے اس کے ساتھ یہ بات راجح ہو جاتی ہے کہ مراد سلامتی ہے، سلام کرنا نہیں کیونکہ مومنوں کو کبھی بھی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ کافروں کو سلام کریں۔ یہ آیت مکی ہے اسے آیت سیف نے منسوخ کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: ناسخ اور منسوخ کے بارے میں سیبویہ کا کلام اس آیت کے سوا ہم نہیں جانتے۔ سیبویہ نے کہا: اس روز مسلمانوں کو حکم نہیں دیا گیا کہ وہ مشرکوں کو سلام کریں مگر اس معنی میں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی خیر و شر نہیں ہے۔ مبرد نے کہا: یہ کہنا چاہیے تھا اس وقت مسلمانوں کو حکم نہیں دیا گیا کہ ان کے ساتھ جنگ کریں پھر ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ محمد بن یزید نے کہا: سیبویہ نے اس میں غلطی کی اور عبارت کو غلط معنی پہنایا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس وقت مسلمانوں کو حکم نہیں دیا گیا کہ وہ مشرکوں کو سلام کریں اور نہ ہی انہیں اس سے منع کیا گیا بلکہ انہیں درگزر کرنے اور خوبصورت پیرائے میں پہلو تہی کرنے کا حکم دیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مجالس کے پاس کھڑے ہوتے، انہیں سلام کہتے، ان کے قریب ہوتے اور ان کے ساتھ مداہنت کا رویہ اختیار نہ کرتے لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مومنوں میں سے کوئی بے وقوف تجھ پر زیادتی کرے تو تیرے لیے یہ کہنا جائز ہے: سلام علیك۔

میں کہتا ہوں: یہ سنت کے دلائل کے زیادہ مناسب ہے ہم نے سورۂ مریم میں کفار کو سلام کہنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ذکر کر دیا ہے، اس لیے نسخ کے دعویٰ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ نضر بن شمیل نے ذکر کیا مجھے خلیل نے بیان کیا میں ابو ربیعہ اعرابی کے پاس آیا میرے نزدیک وہ سب سے بڑے عالم تھے وہ چھت پر تھے جب ہم نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے ہمیں سلام کا جواب دیا اور ہمیں فرمایا: استووا ہم حیران کھڑے ہوئے ہم نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے کیا کہا۔ ان کے پہلو میں موجود ایک بدو نے کہا: تمہیں حکم دیا ہے اوپر آ جاؤ۔ خلیل نے کہا: یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ (فصلت: 11) ہم ان کی طرف اوپر گئے۔ فرمایا: کیا تمہیں روٹی جو خمیری نہیں، عمدہ دودھ اور تازہ پانی کی طلب ہے؟ ہم نے جواب دیا: ابھی ابھی ہم اس سے فارغ ہوئے۔ فرمایا: سلاما ہم نے کچھ نہ سمجھا کہ انہوں نے کیا کہا۔ اس بدو نے کہا: آپ نے تمہیں کہا ہے تم چلے جاؤ اس میں کوئی بھلائی نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی شر ہے۔ خلیل نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝

ابن عطیہ نے کہا: میں نے ایک تاریخ میں دیکھا کہ ابراہیم بن مہدی جوان لوگوں میں سے تھا جو حضرت علی شیر خدا کی

طرف میلان رکھتے تھے مامون کے پاس گیا جب کہ ان کے پاس جماعت تھی میں خواب میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھتا ہوں میں انہیں کہتا ہوں آپ کون ہیں؟ وہ خواب میں کہتے ہیں: علی بن ابی طالب۔ میں ان کے ساتھ ایک پل کی طرف آتا ہوں وہ جانتے ہیں وہ اس کے عبور کرنے میں مجھ سے پہل کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: آپ اس امر کا ایک عورت کی وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں جب کہ ہم اس کے آپ کی بنسبت زیادہ حق رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے جواب میں ایسی بلاغت نہیں پائی جیسی بلاغت ان کے بارے میں ذکر کی جاتی ہے۔ مامون نے کہا: انہوں نے تجھے کیا جواب دیا؟ کہا: وہ مجھے سلاما کہتے۔ راوی نے کہا: ابراہیم کو آیت یاد نہیں تھی یا اس وقت اس کے حافظہ سے نکل گئی۔ مامون نے حاضرین کو اس آیت پر متنبہ کیا۔ فرمایا: اے میرے چچا جان اللہ کی قسم! وہ علی بن ابی طالب ہیں آپ نے تجھے بلیغ ترین جواب دیا ہے۔ ابراہیم شرمندہ ہوا اور اسے حیاء آئی وہ خواب یقیناً سچے تھے۔

## وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝

''اور جو رات بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور کھڑے ہوئے''۔

زجاج نے کہا: بَاتَ الرَّجُلُ يَبِيْتُ، جب اسے رات آلے، وہ سوئے یا نہ سوئے۔ زہیر نے کہا:

فبتنا قیاما عند رأس جوادنا یزوالنا عن نفسه و نزاوله

ہم نے اپنے گھوڑے کے پاس رات قیام کرتے ہوئے گزاری وہ اپنے نفس کو چھڑانے کے لیے ہمارے ساتھ کوشش کرتا رہا اور ہم اسے قابو کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

انہوں نے اولیاء کی صفت میں یہ اشعار کہے:

امنع جفونك ان تذوق مناما واذر الدموع علی الخدود سجاما
واعلم بانك میت و محاسَب یامن علی سخط الجلیل اقاما
لله قوم اختلصوا لی حبه فرضی بهم واختصهم خُدّاما
قم اذا جن الظلام علیهم باتوا هنالك سجدا و قیاما
خُمص البطون من التعفف ضمرا لایعرفون سوی الحلال طعاما

اپنی پلکوں کو روکو کہ وہ نیند کا ذائقہ چکھیں، رخساروں پر آنسوؤں کو موسلا دھار برساؤ یہ جان لو کہ تو مرنے والا ہے اور تیرا محاسبہ ہونے والا ہے۔ اے وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے راتوں کو قیام کیا! اللہ کی ایسی قوم ہے جو اس کی محبت میں مخلص ہیں وہ ان سے راضی ہے انہیں خادم کے طور پر خاص کر لیا ہے۔ وہ ایسی قوم ہیں جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو وہ سجدہ و قیام میں رات گزار دیتے ہیں ان کے پیٹ بڑھے ہوئے نہیں وہ حلال کھانے کے سوا کسی کھانے کو نہیں پہچانتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے عشاء کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھیں تو اس نے سجدہ و قیام میں رات گزاری۔ کلبی نے کہا: جس نے مغرب کے بعد دو رکعتیں اور عشاء کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اس نے سجدہ و قیام کرتے

ہوئے رات گزاری۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿﴾

''اور جو (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! دور فرما دے ہم سے عذاب جہنم، بے شک اس کا عذاب بڑا مہلک ہے، بے شک وہ بہت برا ٹھکانہ اور بہت بری جگہ ہے''۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ وہ طاعت کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنے سجدوں اور اپنے قیام میں یہ دعا کرتے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا جہنم کا عذاب لازمی، دائمی اور جدا نہ ہونے والا ہے، اس وجہ سے قرض خواہ کو غریم کہتے ہیں کیونکہ وہ مقروض کو لاحق رہتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان مغرم بکذا، یعنی اسے لازم ہے، اس کے ساتھ سخت محبت کرنے والا ہے۔ کلام عرب میں یہی اس کا معنی ہے جو ابن عربی، ابن عرفہ اور دوسرے علماء نے کہا۔ اعشیٰ نے کہا:

ان يعاقب يكن غراما وان يعط جزيلا فانه لايبالى

اگر وہ عقاب دے تو وہ عقاب لازم رہنے والا ہے اور بڑا اجر دے تو اسے کوئی پرواہ نہیں۔

حضرت حسن بصری نے کہا: سب کو علم ہے کہ ہر غریم، غریم کو چھوڑنے والا ہے مگر جہنم کا غریم چھوڑنے والا نہیں۔ زجاج نے کہا: غرام سخت ترین عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا: غرام سے مراد شر ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد ہلاکت ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔ محمد بن کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے دنیا میں نعمتوں کے ثمن کا مطالبہ کیا تو انہوں نے وہ ادا نہ کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کے ثمن انہیں جہنم میں داخل کرنے کے ساتھ لازم کر دیئے۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا وہ کتنا برا ٹھکانا ہے، وہ یہ بات علم سے کہتے ہیں جب انہوں نے یہ بات علم سے کہی تو وہ اس شے کی عظیم قدر کو پہچاننے والے ہو گئے جس کا ان سے مطالبہ کیا جا رہا تھا، یہ چیز ان کی کامیابی کے قریب ترین ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿﴾

''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی (بلکہ) ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے بین بین اعتدال سے ہوتا ہے''۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس کے متعلق جو یہ کہا گیا وہ کتنا اچھا کہا گیا: جس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت کے بغیر مال خرچ کیا تو وہ اسراف ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طاعت سے رک گیا وہ اقتار ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کیا تو وہ قوام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے ایک لاکھ حق کے راستہ میں خرچ کیا وہ اسراف نہیں اور جس نے ناحق ایک درہم خرچ کیا وہ اسراف ہے جس نے اس میں سے روکا جو اس پر واجب تھا تو وہ اقتار ہے؛ یہ مجاہد، ابن زید اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ عون بن عبد اللہ نے کہا: اسراف یہ ہے

کہ تو کسی اور کا مال خرچ کرے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اور اس جیسی چیزیں آیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے: معصیت میں خرچ کرنے سے شرع نے روک دیا ہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ اسی طرح غیر کے مال پر تعدی کرنا ہے۔ جن لوگوں کی صفت بیان کی جارہی ہے وہ اس سے منزہ تھے۔ اس آیت میں یہ ادب سکھایا جارہا ہے کہ مباحات میں مال کیسے خرچ کرنا ہے؟ اس میں شرع کا ادب یہ ہے کہ انسان افراط سے کام نہ لے یہاں تک کہ کسی اور حق کو ضائع کرے یا عیال کو ضائع کرے وہ اپنے مال کو اس طرح بھی نہ روکے یہاں تک کہ عیال کو بھوکا رکھے اور بخل میں افراط سے کام لے اس میں بہترین میانہ روی ہے عدل وقوام ہر ایک میں اس کے عیال اور حال کے مطابق ہوگا، اسی طرح اس کا صبر، اس کا خرچ پر قوی ہونا اس کی کمائی کے حساب سے ہوگا یا ان خصلتوں کی ضد مراد ہوگی اور امور میں سے بہترین ان کے وسط ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا تمام مال صدقہ کرنے دیا(1) کیونکہ یہ ان کے دین میں قوت اور صبر کے اعتبار سے وسط تھا اور دوسرے افراد کو اس سے منع کردیا۔ ابراہیم نخعی نے کتنی ہی اچھی بات کہی ہے: اس سے مراد وہ شخص ہے نہ عیال کو بھوکا رکھتا ہے اور نہ ہی بے لباس رکھتا ہے اور نہ ہی ایسا نفقہ خرچ کرتا ہے کہ لوگ یہ کہنے لگیں کہ اس نے اسراف سے کام لیا۔

یزید بن ابی حبیب نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو خوبصورتی کے لیے لباس زیب تن نہیں کرتے اور لذت کے لیے کھانا نہیں کھاتے، یزید نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی کہا ہے: وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں وہ لذت کے لیے کھانا نہیں کھاتے تھے اور جمال کے لیے لباس زیب تن نہیں کرتے تھے لیکن وہ کھانے سے یہ ارادہ کرتے تھے کہ بھوک کا سدباب ہو، اور اپنے رب کی عبادت کی قوت حاصل ہو۔ اور لباس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ جو ان کی شرمگاہ کا پردہ کرے اور سردی و گرمی سے انہیں بچائے۔ عبدالملک بن مروان نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا جب اس نے آپ سے اپنی بیٹی فاطمہ کی شادی کی: تیرا خرچہ کیا ہے؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: دو برائیوں کے درمیان نیکی، پھر اس آیت کی تلاوت کی۔

حضرت عمر بن خطاب نے کہا: کسی بندے کے اسراف کے لیے یہی اسراف کافی ہے کہ جس چیز کی وہ خواہش کرے وہ اس کو خرید لے اور اس کو کھالے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسراف یہ ہے کہ تو وہ چیز کھائے جس کی تو خواہش کرے''۔ ابو عبیدہ نے کہا: وہ معروف پر زیادتی نہیں کرتے اور وہ بخل سے کام نہیں لیتے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ لَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ** (الاسراء:29) شاعر نے کہا:

ولا تغل فی شیء من الامر واقتصد کلا طرفی قصد الامور ذمیم

کسی بھی معاملہ میں غلو نہ کرو، میانہ روی اختیار کرو امور کی دونوں طرفیں مذموم ہوتی ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرخصۃ فی ذلک، حدیث نمبر 1429

إذا المرء أعطى نفسه كلّ ما اشتهت ولم ينهها تاقت إلى كل باطل

وساقت إليه الإثم والعار بالذى دعته إليه من حلاوة عاجل

جب انسان اپنے نفس کو ہر وہ چیز عطا کرے جس کی وہ خواہش کرے اور وہ اپنے نفس کو نہ روکے تو وہ ہر باطل چیز کا شوقین ہو جاتا ہے نفس اس کی طرف گناہ اور عار کو لے آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نفس نے اسے جلدی مٹھاس کی دعوت دی تھی۔

حضرت عمر بن الخطاب نے اپنے بیٹے عاصم سے کہا: اے بیٹے! اپنے نصف پیٹ میں کھا تو کپڑے کو نہ پھینک یہاں تک کہ تو اسے بوسیدہ کر دے، تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جا جو اللہ تعالیٰ کے رزق کو اپنے پیٹوں اور پشتوں پر رکھ لیتے ہیں۔ حاتم طائی کا شعر ہے:

إذا أنت قد أعطيت بطنك سؤله وفرجك نالا منتهى الذم اجمعا

جب تو نے اپنے پیٹ اور شرمگاہ کا سوال پورا کر دیا تو دونوں نے اکٹھے ذم کی انتہاء کو پالیا۔

وَلَمْ يَقْتُرُوْا حمزہ، کسائی، اعمش، عاصم اور یحییٰ بن وثاب نے اختلاف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یقتروا یہ یاء کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے؛ یہ اچھی قراءت ہے، یہ قَتَرَ، يَقْتُرُ سے مشتق ہے یہ لازم میں قیاس ہے جس طرح قَعَدَ، يَقْعُدُ۔ ابو عمرو بن علاء اور ابن کثیر نے یاء کے فتحہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ اچھی اور معروف لغت ہے۔ اہل مدینہ، ابن عامر اور ابو بکر نے عاصم سے یاء کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثعلبی نے کہا: تمام لغتیں صحیح ہیں۔ نحاس نے کہا: ابو حاتم نے اہل مدینہ کی اس قراءت سے تعجب کیا ہے کیونکہ اہل مدینہ کی قراءت میں شاذ نہیں۔ یہ کہا جاتا ہے: أَقْتَرَ يُقْتِرُ جب وہ محتاج ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (البقرہ: 236) ابو حاتم نے یہ تاویل کی ہے اسراف کرنے والا جلد محتاج ہو جاتا ہے یہ تاویل حقیقت سے بعید ہے، لیکن ان کی تاویل کہ ابو عمر جرمی نے اصمعی سے حکایت بیان کی ہے جب وہ تنگ دست ہو جائے قتر يقتُرُ و يقتِرُ اور اقتر يُقتِر، اس تاویل کی بنا پر قراءت صحیح ہے اگرچہ یاء کو فتحہ دینا زیادہ صحیح ہے تاول کے اعتبار سے زیادہ قریب اور زیادہ مشہور و معروف ہے۔ ابو عمرو اور دوسرے لوگوں نے قِواما پڑھا ہے یعنی قاف پر زیر ہے مراد عدل ہے۔ حسان بن عبدالرحمن نے کہا: قِواماً ہے یعنی قاف کے نیچے کسرہ ہے۔ قوام جب قاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جس پر امر دوام اختیار کرے اور قرار پذیر ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ قواماً یہ کان کی خبر ہے اس کا اسم مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: کان الإنفاق بين الإسراف والقتر قواما، یہ فراء کا قول ہے۔ اس کا ایک اور قول بھی ہے: بین کو کان کا اسم بنایا ہے اور اسے نصب دی ہے کیونکہ ان الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے محل رفع میں اسے اسی حال پر رکھا۔ نحاس نے کہا: میں اس کی وجہ کو نہیں جانتا، کیونکہ بین کا لفظ جب محل رفع میں ہو تو اسے رفع دیا جاتا ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: بينُ عينيه احمر۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

''اور جو نہیں پوجتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو اور نہیں قتل کرتے اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ بدکاری کرتے ہیں اور جو یہ کام کرے گا تو وہ پائے گا (اس کی) سزا، دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب روز قیامت اور ہمیشہ رہے گا اس میں ذلیل وخوار ہو کر''۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ مومن بندوں کو ان کافروں کی صفات سے خارج کرنا مقصود ہے جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، بچیوں کو زندہ درگور کر کے نفوس کو قتل کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ ظلم، دھوکہ اور غارت گری مچاتے ہیں اور زنا ان کے نزدیک مباح امر ہے۔ علماء معانی میں سے جس نے اس آیت کو ظاہر معنی سے پھیرا اس نے کہا: رحمن نے جن کو اپنی طرف خصوصی طور پر منسوب کیا ہے اور معرفت اور تشریف والی صفات کے ساتھ انہیں موصوف کیا اور ان کا ذکر کیا، تو یہ مناسب نہیں کہ ان سے یہ قبیح امور واقع ہوں یہاں تک کہ ان کی ان سے نفی کے ساتھ مدح کی جائے کیونکہ وہ اس سے اعلیٰ واشرف ہیں۔ فرمایا: وہ خواہش نفس کو الہٰ نہیں بناتے، معاصی کے ساتھ اپنے نفوس کو ذلیل ورسوا نہیں کرتے تو یہی ان کا قتل ہے۔ اِلَّا بِالْحَقِّ مگر صبر کی چھری اور مجاہدہ کی تلوار کے ساتھ۔ وہ ایسی عورتوں کو شہوت سے نہیں دیکھتے جو ان کی محرم نہیں ہوتیں تو یہ بدکاری ہوگا، بلکہ ضرورت کی بنا پر دیکھتے ہیں تو وہ نکاح کی طرح ہو جائے گا۔ ہمارے شیخ ابو العباس نے کہا: یہ عمدہ کلام ہے مگر جانچ کرنے کے وقت یہ احمقانہ کلام ہے، یہ باطل رجحان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اضافت کے اختصاص کے ساتھ شرف عطا کرنا صحیح ہے جب کہ انہوں نے صفات حمیدہ سے اپنے آپ کو آراستہ کیا اور اوصاف ذمیمہ کے نقائص سے خالی ہوئے۔ ان آیات کے شروع میں آراستہ کی جانے والی صفات کا ذکر کیا تا کہ انہیں شرف عطا کیا جائے پھر اس کے بعد ان صفات کا ذکر کیا جن سے انہوں نے اپنے آپ کو خالی کیا تا کہ ان سے ان کے بعد کا ذکر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قائل نے جو یہ دعویٰ کیا کہ یہ امور ظاہر معنی پر نہیں اس کے بطلان پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو امام مسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: ''تو اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرائے جب کہ اس نے تجھے پیدا کیا''۔ عرض کی: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: ''تو اپنی اولاد کو اس وجہ سے قتل کرے کہ وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا''۔ عرض کی: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: ''تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے''۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۝ کلام عرب میں آثاما سے مراد عقاب ہے۔ ابن زید اور قتادہ نے اس آیت میں یہی قراءت کی ہے؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

جزى الله ابن عروة حيث امسى عقوقا والعقوق له آثام

اللہ تعالیٰ ابن عروہ کو جزا دے جب اس نے نافرمانی کرتے ہوئے شام کی جب کہ نافرمانی پر اس کے لیے جزا اور سزا ہے۔ یہاں آثام کا معنی جزا اور عقوبت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو، عکرمہ اور مجاہد نے کہا: آثام جہنم میں ایک وادی ہے اللہ

تعالیٰ نے کافروں کے لیے اسے سزا بنایا ہے، شاعر نے کہا:

لقیت المھالك فی حربنا بعد المھالك تلقی اثاما

ہماری جنگ میں تو نے ہلاکتوں کو پایا ہلاکتوں کے بعد تو سزا پائے گا۔

سدی نے کہا: آثام جہنم میں ایک پہاڑ ہے۔ شاعر نے کہا:

وکان مقامنا ندعو علیھم بابطح ذی المجازله اثام

اس شعر میں آثام کا معنی پہاڑ ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مشرکوں میں سے کچھ لوگوں نے قتل کیے تو بہت زیادہ قتل کیے انہوں نے بدکاری کی تو بہت زیادہ بدکاری کی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: جو بات آپ کرتے ہیں اور جس کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ بہت اچھی ہے، وہ امر ہمیں یہ خبر دیتا ہے کہ ہم نے جو عمل کیا اس پر کفارہ ہے تو یہ آیت نازل ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ (زمر: 53) ایک قول یہ کیا گیا: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا یہ وحشی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا؛ یہ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے، اس کی وضاحت سورہ زمر میں آئے گی۔

اِلَّا بِالْحَقِّ مگر اس حق کی وجہ سے جس کے ساتھ نفوس کو قتل کرنا جائز ہوتا ہے جیسے ایمان کے بعد کفر، شادی کے بعد بدکاری، جس طرح اس کی وضاحت سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

وَلَا یَزْنُوْنَ وہ نکاح اور ملک یمین کے بغیر شرمگاہوں کو حلال نہیں سمجھتے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کفر کے بعد ناحق قتل کرنے سے بڑا گناہ کوئی نہیں اس کے بعد بدکاری ہے اسی وجہ سے جو شادی شدہ ہو اس کے بارے میں زنا کی صورت میں قتل ثابت ہے اگر وہ شادی شدہ نہ ہو تو سب سے زیادہ کوڑے اور سخت کوڑے لازم ہیں۔

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ نافع، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے یضاعف اور یخلد مجزوم پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے یضعف عین کو مشدد اور الف کو حذف کرنے کے ساتھ قراءت کی ہے اور دونوں فعلوں کو مجزوم پڑھا ہے۔ طلحہ بن سلیمان نے نُضعِف نون کے ضمہ اور عین مشددہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ العذاب کو نصب دی اور یخلد کو جزم دی ہے، یہ ابو جعفر اور شیبہ کی قراءت ہے۔ عاصم نے ابو بکر کی روایت میں یضاعف اور یخلد دونوں میں رفع پڑھا ہے یہ آپس میں معطوف، معطوف علیہ ہیں اور جملہ مستانفہ ہیں۔

طلحہ بن سلیمان نے تخلد تاء کے ساتھ پڑھا ہے، خطاب کافر کو ہے۔ ابو عمرو سے ویخلد یاء کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ ابو علی نے کہا: روایت کے اعتبار سے یہ غلط ہے، یضاعف مجزوم ہے یہ یلق سے بدل ہے جو شرط کی جزا ہے۔ سیبویہ نے کہا: عذاب کے کئی گنا ہونے سے مراد عقاب کو پانا ہے۔ شاعر نے کہا:

متی تاتنا تلمم بنا فی دیارنا تجد حطبا جزلا ونارا تاججا

جب تو ہمارے پاس آئے گا تو ہمارے ہاں ہمارے گھروں میں اترے گا تو بہت بڑا ایندھن اور بھڑکتی آگ پائے گا۔
محل استدلال تجد ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا۔

إن علی اللہ ان تبایعا توخذ کرھا او تجیٔ طائعا

اللہ کی قسم! مجھ پر لازم ہے کہ تم بیعت کرو تجھے مجبوری کے عالم میں پکڑ کر لایا جائے یا تو خوشی خوشی آئے۔
محل استدلال توخذ ہے۔

جہاں تک رفع کا تعلق ہے اس میں دو قول ہیں: (۱) ماقبل سے اسے الگ کر دیا جائے (۲) اسے معنی پر محمول کیا جائے، گویا ایک کہنے والا کہتا ہے: آثام سے ملنے کا کیا مطلب ہے؟ اسے کہا جائے گا: اس کے لیے عذاب کئی گنا کر دیا جائے گا۔ مُھَانًا اس کا معنی ہے ذلیل، نا کام، مقصد سے دور اور دھتکارا ہوا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

’’مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے تو یہ وہ لوگ ہیں بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے‘‘۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا علماء میں سے کوئی اختلاف نہیں کرتا کہ استثناء کافر اور زانی میں عامل ہے مسلمانوں میں سے جو قاتل ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے جس طرح اس کی وضاحت سورۃ النساء میں گزر چکی ہے، سورۂ مائدہ میں یہ قول گزر چکا ہے۔ عین میں جو استثناء ہو اس میں تراخی جائز ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ کا قول ہے، وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ نحاس نے کہا: اس کے بارے میں جو اقوال ذکر کیے گئے ہیں ان میں سے سب سے بہترین یہ ہے کہ کافر کی جگہ مومن اور نافرمان کی جگہ مطیع لکھ دیا جاتا ہے۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ شرک کو ایمان سے بدل دیتا ہے؟ حضرت حسن بصری سے اسی کی مثل مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ایک قوم یہ کہتی ہے یہ تبدیلی آخرت میں ہوگی، جب کہ معاملہ اس طرح نہیں یہ تبدیلی دنیا میں ہوگی اللہ تعالیٰ ان کے شرک کو ایمان سے بدل دیتا ہے، شک کو اخلاص سے بدل دیتا ہے اور فجور کو احصان سے بدل دیتا ہے۔ زجاج نے کہا: اس سے مراد یہ نہیں کہ سیئہ کی جگہ حسنہ رکھ دیتا ہے بلکہ سیئہ کی جگہ توبہ رکھ دیتا ہے، اور حسنہ کو توبہ کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ حضرت ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: إن السیئات تبدل الحسنات، برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا جائے گا۔ اس کے ہم معنی روایت حضرت سلمان فارسی، سعید بن جبیر اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آخرت میں اس آدمی کے بارے میں ہوگا جس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب ہو جائیں گی، تو اللہ تعالیٰ برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ حدیث میں ’’ کچھ اقوام تمنا کریں گی کہ ان کی برائیاں زیادہ ہوتیں‘‘۔ عرض کی گئی: وہ کون ہیں؟ فرمایا: ’’جن کی برائیاں اللہ تعالیٰ

نیکیوں سے بدل دے گا''۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے، ثعلبی اور قشیری نے اسے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تبدیل سے مراد بخشش ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو بخش دے گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں نیکیوں میں بدل دے گا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے کرم سے یہ کوئی بعید نہیں کہ جب بندے کی توبہ صحیح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سیئہ کی جگہ حسنہ رکھ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا: ''برائی کے بعد نیکی کرو جو اس برائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ''۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس آدمی کو جانتا ہوں جو جنت میں سب سے آخر میں داخل ہوگا اور اس آدمی کو بھی جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا۔ ایک آدمی کو قیامت کے روز لایا جائے گا، یہ کہا جائے گا: اس پر اس کے چھوٹے گناہ پیش کرو اور بڑے گناہوں کو اس سے اٹھا لو اس پر اس کے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے، اسے کہا جائے گا: تو نے یہ عمل کیا اور تو نے فلاں فلاں دن یہ عمل کیا۔ وہ کہے گا: ہاں۔ وہ انکار کی طاقت نہیں رکھے گا۔ جب کہ وہ بڑے گناہوں کے پیش کرنے سے ڈر رہا ہوگا۔ اسے کہا جائے گا: تیرے لیے ہر برائی کی جگہ نیکی ہے۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں نے کچھ ایسے عمل کیے ہیں جو میں نے یہاں نہیں دیکھے''۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ہنسے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں۔ ابوطویل نے کہا: ''یا رسول اللہ! ایسے آدمی کے بارے میں بتائیے جس نے ہر گناہ کیا ان میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی اس نے چھوٹی بڑی کوئی خواہش نہ چھوڑی مگر اس کو پورا کیا اس کے لیے توبہ ہے؟ فرمایا: ''کیا تم نے اسلام قبول کیا ہے'' اس نے عرض کی: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرمایا: ''ہاں۔ تو نیکیاں کرے گا اور برائیوں کو ترک کرے گا اللہ تعالیٰ سب کو نیکیاں بنا دے گا''۔ عرض کی: اے اللہ کے نبی! میرے دھوکے اور میرے گناہ؟ فرمایا: ''ہاں''۔ اس نے زبان سے یہ نعرہ لگایا: اللہ اکبر! وہ لگاتار یہ کلمات کہتا رہا یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا؛ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ بشر بن عبید نے کہا: جو علم نحو اور لغت عربی سے آگاہ تھا (وہ جانتا ہے) حاجہ سے مراد وہ امر ہے جو حاجی پر لازم ہوتا ہے جب وہ حج کے لیے جا رہے ہوں اور داجہ سے مراد وہ امر ہوتا ہے جو اس پر اس وقت لازم کیا جاتا ہے جب وہ واپس پلٹیں۔

**وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝**

''اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے''۔

یہ جملہ نہیں کہا جاتا: مَنْ قَامَ فَإِنَّهُ يَقُومُ، تو یہ کس طرح فرمایا: وَمَنْ تَابَ فَإِنَّهُ يَتُوبُ؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے اہل مکہ میں سے جو ایمان لایا اور ہجرت کی اس نے نہ قتل کیا تھا اور نہ ہی زنا کیا تھا بلکہ اس نے عمل صالح کیا اور فرائض کو ادا کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرنے والا ہے، یعنی میں نے انہیں ان لوگوں پر مقدم رکھا اور ان پر فضیلت دی جنہوں نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی اور محارم کو حلال جانا۔ قفال نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں ہو جنہوں نے مشرک ہونے کے بعد توبہ کی، اسی وجہ سے فرمایا: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ پھر مسلمانوں میں سے جنہوں نے توبہ کی اس پر اس کا عطف کیا اور اپنی توبہ کے بعد عمل صالح کیا اس کے لیے بھی تائبین کا حکم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے زبان سے توبہ کی اور اپنے فعل کے ساتھ اسے ثابت نہ کیا ایسی توبہ نفع دینے والی نہیں بلکہ جس نے توبہ کی اور صالح عمل کیا اور اعمال صالحہ کے ساتھ توبہ کو ثابت کیا اسی نے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کی، یہی توبۃ النصوح ہے، اسی وجہ سے مصدر کے ساتھ اسے موکد کیا۔ مَتَابًا مصدر ہے اس کا معنی تاکید ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ﴿۱۶۴﴾ (النساء) وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حق سچ کی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ یقینی طور پر قبول فرماتا ہے۔

وَالَّذِيۡنَ لَا يَشۡهَدُوۡنَ الزُّوۡرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

''اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب گزرتے ہیں کسی لغو چیز کے پاس سے تو بڑے باوقار ہو کر گزر جاتے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالَّذِيۡنَ لَا يَشۡهَدُوۡنَ الزُّوۡرَ جو کذب اور باطل کے پاس حاضر نہیں ہوتے اور نہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ زور اس باطل کو کہتے ہیں جسے آراستہ کر کے پیش کیا جائے۔ ان میں سے سب سے عظیم شرک اور شریکوں کی تعظیم بجا لانا ہے، ضحاک، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے: مراد مشرکوں کی عیدیں ہیں۔ عکرمہ نے کہا: مراد لعب (کھیل کود) ہے دور جاہلیت میں اسے زور کہتے۔ مجاہد نے کہا: مراد گانا گانا ہے، یہ حضرت محمد بن حنیفہ کا بھی قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: مراد جھوٹ ہے، مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ علی بن طلحہ اور محمد بن علی نے کہا: معنی ہے وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے، یہ شہادت سے مشتق ہے مشاہدہ سے مشتق نہیں۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ یہ کذب ہے تو یہ صحیح ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک جھوٹ کی طرف راجع ہے۔ جس نے یہ کہا: یہ دور جاہلیت میں کھیل کود تھا اگر اس میں جوا ہو یا جہالت ہو یا ایسا امر ہو جو کفر کی طرف لے جانے والا ہو تو یہ حرام ہو گا، جہاں کا نا گانے کا تعلق ہے تو وہ اس حد تک نہیں پہنچتا۔

میں کہتا ہوں: گانے میں ایسی صورت بھی ہے جس کا سننا حرمت تک جا پہنچتا ہے وہ ان اشعار کی طرح ہیں جن میں حسین صورتوں اور شراب وغیرہ کی صفت بیان کی جاتی ہے جو طبیعتوں میں حرکت پیدا کرتے ہیں اور اسے اعتدال سے نکال دیتے ہیں یا لہو کے بارے میں چھپی محبت کو ابھارتے ہیں، خصوصاً جب ان اشعار کے ساتھ آلات لہو و لعب بھی شامل ہو جائیں۔ جس طرح آج کے دور میں کیا جاتا ہے؛ جس کی وضاحت ہم نے کئی مواقع پر کر دی ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد جھوٹی گواہی ہے، تو یہی دوسرا مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جھوٹے گواہ کو چالیس کوڑے مارتے، اس کے چہرے پر کالک ملتے، اس کے سر کا حلق کراتے اور بازار میں پھراتے۔ اکثر اہل علم نے کہا: اس کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کی جائے گی اگرچہ وہ توبہ کرے اور

اس کا حال اچھا ہو جائے۔ اس کا امر الله کے سپرد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر وہ اعلانیہ جھوٹی شہادت دینے والا نہ ہو اور اس کا حال اچھا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی، جس طرح اس کی وضاحت سورۂ حج میں گزر چکی ہے وہاں اس میں غور و فکر کر لے۔

**وَ اِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا کِرَامًا** لغو کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اس سے مراد ہر وہ قول اور فعل ہے جو پایہ ثقاہت سے گرا ہوا ہو اس میں غنا، لہو اور اس کے قریب قریب کی چیزیں مراد ہیں۔ اس میں مشرکین کے بے وقوفانہ عمل، ان کا مومنوں کو اذیت دینا، عورتوں کا ذکر اور ان جیسے ناپسندیدہ عمل ہیں۔ مجاہد نے کہا: جب انہیں اذیت دی جائے تو وہ درگزر سے کام لیتے ہیں، ان سے مروی ہے: جب وہ نکاح کا ذکر کرتے ہیں تو کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: لغو سے مراد تمام قسم کی نافرمانیاں ہیں (1)؛ یہ جامع قول ہے۔

**کِرَامًا** اس کا معنی ہے وہ اعراض کرتے ہیں ناپسند کرتے ہیں، اس پر راضی نہیں ہوتے، وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتے، یعنی وہ کریم لوگوں کی طرح گزر جاتے ہیں وہ باطل میں داخل نہیں ہوتے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: تکرم فلان عما یشینه، فلاں نے عیب دار چیز سے اپنے آپ کو پاکیزہ رکھا اور اس سے اپنے نفس کو معزز رکھا۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نغمہ کو سنا تو جلدی چلے اور وہاں سے چلے گئے، یہ بات رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو فرمایا: لقد أصبح ابن أم عبدٍ کریما، ابن ام عبد کریم ہو گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

**وَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡهَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا ﴿۷۳﴾**

''اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات سے تو نہیں گر پڑتے ان پر بہرے اور اندھے ہو کر''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ **وَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ** جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ اپنی آخرت کو یاد کرتے ہیں اور وہ غافل نہیں ہوتے یہاں تک کہ وہ اس کے قائم مقام ہو جاتے جو سنتا ہی نہیں۔ **لَمۡ یَخِرُّوۡا** وہاں کوئی خرور نہیں ہوتا، جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: تعد یبکی وہ روتا رہا، اگرچہ وہاں بیٹھنا نہیں ہوتا؛ یہ طبری نے کہا اور اسے پسند کیا۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ بہرے اور اندھے گر پڑتے ہیں، یہ کفار کی صفت ہے اس سے مراد ان کا اعراض کرنا ہے یہ تیرے اس قول کے موافق ہے: تعد فلان یشتمنی، قام فلان یبکی۔ تو نے اس کے ساتھ قعود (بیٹھنے) اور قیام (کھڑے ہونا) کی خبر دینے کا قصد نہیں کیا۔ یہ کلام اور عبارت میں تمہید کے طور پر ذکر کیے جاتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ذکر کو سننے والا سیدھے نیزے والا اور سیدھے امر والا ہوتا ہے جب وہ اعراض کرے اور گمراہ ہو جائے تو یہ خرور ہوتا ہے اس سے مراد نظام اور ترتیب کے بغیر گرنا ہے، اسے تشبیہ دی جاتی ہے اس کے ساتھ جو سجدہ کرتے ہوئے گرتا ہے، لیکن اس کی اصل، ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ان پر الله تعالیٰ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر

1۔ تفسیر طبری

پڑتے ہیں وہ بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ فراء نے کہا: وہ پہلی حالت پر نہیں بیٹھے رہتے گویا انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے کہا: جس نے کسی آدمی کو آیت سجدہ تلاوت کرتے ہوئے سنا وہ اس کے ساتھ سجدہ کرے کیونکہ اس نے الله تعالیٰ کی آیات کو سنا جو اس پر تلاوت کی جا رہی تھیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ صرف قاری پر لازم ہے جہاں تک دوسرے افراد کا تعلق ہے ان پر یہ لازم نہیں مگر صرف ایک مسئلہ میں، وہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب قرآن کی تلاوت کرے اور آیت سجدہ کی تلاوت کرے اگر اس کے پاس کوئی اس لیے بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس کی تلاوت کو سنے تو اس کے ساتھ سجدہ کرے اگر اس نے سماع کو لازم نہیں کیا تھا تو اس پر کوئی سجدہ نہیں۔ یہ بحث سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

"اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں پرہیز گاروں کے لیے پیشوا۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کو بدلا ملے گا (جنت کا) بالا خانہ ان کے صبر کرنے کے باعث اور ان کا استقبال کیا جائے گا وہاں دعا اور سلام سے، وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس میں، بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے۔ آپ فرمایئے: کیا پرواہ ہے تمہاری میرے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو اور تم نے (تو الٹا) جھٹلانا شروع کر دیا تو یہ جھٹلانا تمہارے گلے کا ہار بنا رہے گا"۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ضحاک نے کہا: وہ تیری اطاعت کرتے ہوئے۔ اس آیت میں بچے کی دعا کا جواز ہے، یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ذریۃ واحد اور جمع ہے، واحد کے لیے الله تعالیٰ کا فرمان ہے: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (آل عمران: 38) فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ (مریم) جمع کے لیے یہ آیت ہے: ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا (النساء: 9) سورۂ بقرہ میں اس کا اشتقاق مفصل گزر چکا ہے۔

ابن کثیر، ابن عامر اور حضرت حسن بصری نے وذریاتنا قراءت کی ہے۔ ابوعمرو، حمزہ، کسائی، طلحہ اور عیسیٰ نے ذریتنا قراءت کی ہے۔

قُرَّةَ اَعْيُنٍ مفعول کے طور پر منصوب ہے یعنی ہماری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس سے فرمایا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ اے الله اس کے مال اور اس کی اولاد کو زیادہ کر دے اور اس کے لیے اس میں برکت رکھ دے۔ اس کی وضاحت سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کے لیے اس کے مال اور اس کی اولاد میں برکت رکھی جاتی ہے تو اس کے اہل اور عیال کی وجہ سے اس کی

آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس اس کی بیوی ہو اس بیوی میں اس کی آرزوئیں جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ جمال ہو، عفت ہو اور پاک دامنی ہو یا اس کے پاس اولاد ہو جو طاعت پر دوام اختیار کریں، دین اور دنیا کے امور میں اس کے معاون ہوں۔ وہ کسی اور کی بیوی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کی اولاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کی آنکھ ملاحظہ سے سکون پاتی ہے اس کی آنکھ اس کی طرف ممتد نہیں ہوتی جس کی طرف وہ دیکھتی ہے۔ یہی آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور نفس کا سکون ہے۔ قرۃ کے لفظ کو واحد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر ہے تو کہتا ہے: قرت عینلک قرۃ، قرۃ العین کے بارے میں یہ احتمال موجود ہے کہ وہ قرار سے مشتق ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ قر سے مشتق ہو، یہ زیادہ مشہور ہے۔ قر کا معنی ٹھنڈک ہے کیونکہ عرب گرمی سے اذیت حاصل کرتے اور ٹھنڈک سے راحت حاصل کرتے نیز خوشی کا آنسو ٹھنڈا اور غم کا آنسو گرم ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: اقر اللہ عینلک اللہ تعالیٰ تیری آنکھ کو ٹھنڈا کرے اسخن اللہ عین عدوك اللہ تعالیٰ تیرے دشمن کی آنکھ گرم کرے۔ شاعر نے کہا:

فکم سَخِنَتْ بالأمس عینٌ قریرۃٌ　　وقرّت عیونٌ دمعُھا الیومَ ساکبُ

گزشتہ کل میں کتنی ہی ٹھنڈی آنکھیں گرم ہوئیں اور کتنی ہی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں آج جن کے آنسو بہہ رہے ہیں۔

**وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا**، امام کا معنی مقتدیٰ ہے جو بھلائی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے یہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب داعی متقی ہو یہی داعی کا مقصود ہوتا ہے، موطا امام مالک میں ہے: إنکم أیھا الرھط أئمۃ یقتدی بکم اے جماعت! تم امام ہو تمہاری اقتدا کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دعا میں عرض کیا کرتے تھے: اے اللہ! ہمیں متقین کا امام بنا دے۔ اماما کہا ائمہ نہیں کہا یعنی جمع کا صیغہ ذکر نہیں کیا کیونکہ امام مصدر ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أم القوم فلان اماما جس طرح صیام اور قیام مصدر ہے۔ بعض نے کہا: ائمہ کا ارادہ کیا جس طرح کوئی کہنے والا کہتا ہے: امیرنا ھولاء یہاں امیر سے مراد امراء ہے۔ شاعر نے کہا:

یا عاذلاتی لا تَزِدْنَ مَلامَتِی　　إنّ العواذل لَسْنَ لِی بأمیرِ

اے مجھے ملامت کرنے والیو! مجھے ملامت کرنے میں اضافہ نہ کرو کیونکہ ملامت کرنے والیاں میری امیر نہیں۔

اس شعر میں امیر، امراء کے معنی میں ہے۔ قشیری ابو القاسم صوفیہ کے شیخ کہا کرتے تھے: امامت دعا کے ساتھ ہوتی ہے دعویٰ کے ساتھ نہیں ہوتی یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی جانب سے آسان کرنے اور اس کے احسان کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ جو انسان اپنے لیے اس کا دعویٰ کرے۔ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: انہوں نے ریاست کو طلب نہیں کیا بلکہ وہ دین میں مقتدیٰ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہمیں ہدایت کے ائمہ بنا دے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا** (الانبیاء: 73) مکحول نے کہا: تقویٰ میں ہمیں امام بنا دے متقی ہماری اقتدا کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام قلب سے تعلق رکھتی ہے اس کا مجاز ہے: واجعل المتقین لنا اماما؛ یہ مجاہد کا قول ہے، پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابن عباس اور مکحول کا قول بھی اسی طرف راجع ہے۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ دین میں سرداری طلب کرنا مستحب ہے امام لفظ کے اعتبار سے واحد ہے اور جمع پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جس طرح قیام ہے۔ اخفش نے کہا:

امام، ام کی جمع ہے امر یؤمر سے مشتق ہے یہ فعال کی جمع ہے جس طرح صاحب کی صحاب اور قائم کی جمع قیام ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا، اُولٰٓئِكَ، وعباد الرحمن کی خبر ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے اس بارے میں جو بھی قول کیے گئے ہیں ان میں سے سب سے اچھا قول ہے، مبتدا اور خبر میں جو کچھ ہے وہ ایسے اوصاف ہیں جن سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور جن سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہے وہ گیارہ اوصاف ہیں (۱) تواضع (۲) حلم (۳) تہجد (۴) خوف (۵) اسراف اور اقتار کو ترک کرنا (۶) شرک، زنا اور قتل سے بچنا (۷) توبہ کرنا (۸) جھوٹ سے اجتناب کرنا (۹) زیادتی کرنے والے کو معاف کرنا (۱۰) نصیحتوں کو قبول کرنا (۱۱) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ وزاری کرنا۔

الْغُرْفَةَ بلند درجہ۔ یہ جنت کی منازل میں سے سب سے بلند درجہ ہے اور سب سے افضل درجہ ہے جس طرح بالا خانہ دنیا کے مسکنوں میں سے سب سے اعلیٰ مسکن ہے؛ ابن شجرہ نے یہ بیان کیا ہے۔ ضحاک نے کہا: غرفۃ سے مراد جنت ہے بِمَا صَبَرُوْا اپنے رب کے حکم پر صبر کرنے کے باعث اور اپنے نبی کی طاعت کے باعث۔ محمد بن علی بن حسین نے کہا: انہوں نے دنیا میں فقر و فاقہ پر جو صبر کیا اسی کے باعث۔ ضحاک نے کہا: انہوں نے شہوات پر جو صبر کیا۔

وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا، ابوبکر، مفضل، اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور خلف نے ويَلْقون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، فراء نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں: فلان يُتلقی بالسلام و بالتحية وبالخير وہ بہت کم فلان يُلقی بالسلامة کہتے ہیں باقی قراء نے ويُلقون پڑھا ہے؛ اسے ابوعبید اور ابو حاتم نے پسند کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا۝ (الانسان) ابوجعفر نحاس نے کہا: فراء جس طرف گئے ہیں اور جسے اختیار کیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں اگر یہ یلقون ہو تو لغت عرب میں یہ تحیۃ اور سلام کے لیے ہوتا ہے انہوں نے کہا جس طرح قول کیا جاتا ہے: فلان یتلقی بالسلام و بالخیر اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ عجیب وغریب ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں: یتلقی جب کہ آیت يُلَقَّوْنَ ہے دونوں میں فرق واضح ہے کیونکہ جملہ کہا جاتا ہے: فلان یتلقی بالخیر، باء کا حذف جائز نہیں تو یہ اس کے مشابہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم میں: وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا۝ ہے اسے کسی اور لفظ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ یہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اولیٰ اس کے برعکس ہے جو انہوں نے کہا۔ تحیۃ، اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور سلام ملائکہ کی جانب سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تحیۃ سے مراد دائمی بقا اور ملک عظیم ہے۔ اظہر یہ ہے کہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ (الاحزاب: 44) خٰلِدِيْنَ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ یہ مشکل آیت ہے۔ ملحدہ نے اس سے استدلال کیا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ماعبأت لفلان میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، یعنی اس کا میرے ہاں کوئی وزن اور کوئی قدر نہ تھی۔ یعبأ کی اصل عبأ ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔ شاعر کا قول ہے:

كَاَنَّ بصدرہ وبجانبیہ عَبِيْرًا بَاتَ يَعْبَؤُهُ عَرُوْسُ

وہ بعض کو بعض پر رکھتا ہے، عبا کا معنی بھاری بوجھ ہے اس کی جمع اعباء ہے۔ عبا مصدر ہے ما استفہامیہ ہے زجاج کے کلام کے بیچ میں یہ ظاہر ہوا اور فراء نے اس کی تصریح بیان کی۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ نافیہ ہو کیونکہ جب تو نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ استفہام ہے تو یہ نفی ہے جو استفہام کی جگہ واقع ہوا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن) ابن شجری نے کہا: میرے نزدیک قول کی حقیقت یہ ہے کہ ما محل نصب میں ہے؛ تقدیر کلام یہ ہو گی: أیّ عبٔ یعبأ بکم وہ کیسی پرواہ ہے جو میرا رب تمہارے بارے میں کرے اگر اس کی تمہیں دعوت نہ ہو کہ تم اس کی عبادت کرو، اس قول کی بنا پر مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے؛ یہ فراء کا پسندیدہ قول ہے اس کا فاعل محذوف ہے اور لولا کا جواب محذوف ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں محذوف ہے: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ (الرعد: 31) اس کی تقدیر ہو گی لم یعبأ کم۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات) خطاب تمام لوگوں کو ہے گویا ان میں سے قریش سے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری کیا پرواہ کرے گا اگر تم نے اس کی عبادت نہ کی ہو گی، یہی تو وہ امر ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسان کی پرواہ کرتا ہے۔ ابن زبیر اور دوسروں کی قراءت اس کی تائید کرتی ہے۔

**فَقَدْ كَذَّبْتُمْ** تمام لوگوں کو اس چیز کے ساتھ خطاب ہے جس کی اللہ تعالیٰ پرواہ کرتا ہے پھر قریش سے فرماتا ہے: تم نے جھٹلایا اور تم نے اس کی عبادت نہ کی عنقریب یہی تکذیب دائمی عذاب کا سبب ہو گی۔ نقاش اور دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے اگر مشکلات میں تم اس کی بارگاہ میں مدد طلب نہ کرتے، اس کی وضاحت ہے: فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ (العنکبوت: 65)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے تمہارے گناہ بخشنے کا کیا مسئلہ تھا اور نہ ہی وہ امر جو اس کے نزدیک عظیم تھا: لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ اگر اس کے ساتھ معبودوں اور شرکاء کی عبادت نہ ہوتی۔ اس کی وضاحت اس آیت میں ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ (النساء: 147) یہ ضحاک کا قول ہے۔ ولید بن ابی الولید نے کہا: مجھے اس آیت کے بارے میں یہ تعبیر پہنچی ہے میں نے تمہیں پیدا کیا اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی غرض تھی مگر یہ کہ تم مجھ سے سوال کرو اور میں تمہیں بخش دوں اور تمہیں عطا کروں۔

وہب بن منبہ نے روایت بیان کی ہے کہ تورات میں ہے: اے انسان! میری عزت کی قسم میں نے تجھے پیدا نہیں کیا کہ میں تجھ سے نفع حاصل کروں میں نے تجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ تو مجھ سے نفع حاصل کرے ہر شے کا بدل مجھ سے لے میں ہر چیز سے تیرے لیے بہتر ہوں۔

ابن جنی نے کہا: حضرت ابن زبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں قراءت کی: فقد کذب الکافرون زاہروی اور نحاس نے کہا: یہ حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے اور یہ تفسیر کے اسلوب میں ہے جو كَذَّبْتُمْ میں تاء اور میم کی تفسیر ہے۔ قتبی اور فارسی اس طرف گئے ہیں کہ دعا فاعل کی طرف مضاف ہے اور مفعول محذوف ہے۔ اصل کلام یہ ہے لولا دعاء کم آلھة من دونه، لولا کا جواب محذوف ہے اس صورت میں تقدیر ہو گی: لم یعذبکم۔ لولا دعاء کم آلھة کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (الاعراف: 194)

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ جس امر کی تمہیں دعوت دی گئی اس کو تم نے جھٹلایا، یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کی بنا پر یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو جھٹلایا۔ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا یعنی تمہاری تکذیب تم کو لازم ہو گی۔ معنی ہے عنقریب تکذیب کی جزا ہو گی۔ جس طرح فرمایا: وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (الکہف: 49) انہوں نے جو کچھ کیا اس کی جزا کو حاضر پایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (الانفال) یعنی تم نے جو کفر کیا اس کی جزا چکھو۔ تکذیب کو مضمر کرنا اچھا ہے کیونکہ اس کا فعل پہلے مذکور ہو چکا ہے کیونکہ جب تو فعل کا ذکر کرے گا تو وہ اپنے لفظ کے ساتھ مصدر پر دال ہو گا۔ جس طرح فرمایا: وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (آل عمران: 110) یہاں ایمان محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (زمر: 7) یہاں یرضی کا فاعل الشکر ہے۔ اس کی بے شمار امثلہ ہیں۔ جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں لزام سے مراد وہ ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر ان پر مصیبت نازل ہوئی؛ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، ابو مالک، مجاہد، مقاتل وغیرہ کا قول ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ سے روایت مروی ہے: بطشہ، دخان اور لزام گزر چکا۔ سورۂ دخان میں اس کی مفصل وضاحت آئے گی ان شاء اللہ۔ ایک جماعت نے کہا: عذاب آخرت کی دھمکی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے: لزام سے مراد جھٹلانا ہی ہے۔ یعنی اس سے توبہ کا انہیں موقع نہ دیا جائے گا۔ زہراوی نے اس کا ذکر کیا ہے(1): اس میں یوم بدر اور دوسرے عذاب داخل ہو جاتے ہیں جو ان کو لازم ہوں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا: لزام سے مراد فیصلہ ہے یعنی عنقریب تمہارے اور مومنوں کے درمیان فیصلہ ہو گا۔ جمہور قراء لام کو کسرہ دیتے ہیں، ابو عبیدہ نے صخر کا یہ شعر پڑھا ہے:

فإما يَنْجُوَا من خَسْفِ أرضٍ فقد لَقِيا حُتُوفَهما لِزاما

اگر وہ دونوں زمین کے دھنسنے سے نجات پا گئے ہیں تحقیق ان دونوں نے اپنی موتوں کو فیصلہ کن دیکھا ہے۔

لزاما اور ملازمہ دونوں ایک ہیں۔ طبری نے کہا: لزاما سے مراد ایسا عذاب ہے جو دائمی اور لازم ہے۔ اور ایسی ہلاکت ہے جو فنا کرنے والی ہے جو تم ایک دوسرے کو لاحق کرتے ہو، جس طرح ابو ذویب کا قول ہے:

ففاجأه بعاديةٍ لِزامٍ كما يَتَفَجَّرُ الحوضُ اللَّقِيفُ

اسے اچانک اس قول نے آلیا جو اپنے قدموں پر دوڑتی ہے اور ایک دوسرے کو لاحق کرتی ہے جس طرح وہ حوض بہہ پڑتا ہے جس کے پتھر ٹوٹ جائیں۔ لزام سے مراد جس کا بعض بعض کی پیروی کرے۔ لقیف سے مراد جس کے پتھر ٹوٹ کر گر جائیں۔

نحاس نے کہا: ابو حاتم نے ابو زید سے کہا میں نے قعنب ابو سال کو پڑھتے ہوئے سنا: لَزاما یعنی لام کو فتحہ دیا۔ ابو جعفر نے کہا: یہ لزم کا مصدر ہو گا اور کسرہ اَولیٰ ہے؛ یہ قتال اور مقاتلہ کی مثل ہے جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں لام کے کسرہ پر اجماع کیا ہے: وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ۝ (طہٰ) دوسرے علماء نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز

لزام فتحہ کے ساتھ یہ لزم کا مصدر ہے جس طرح سلم سلاما ہے سلام سلامتی کے معنی میں ہے لزام فتحہ کے ساتھ ہوتو اس کا معنی لزوم ہے اور لزِام کا معنی ملازمت ہے، دونوں قرائتوں میں مصدر، اسم فاعل کی جگہ واقع ہے لِزام، ملازم کی جگہ واقع ہے اور لَزام لازِم کی جگہ واقع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا ( ملک: 30) اس میں غورا، غائر کے معنی میں ہے۔ نحاس نے کہا: یکون کے اسم میں فراء کا قول ہے، کہا: وہ مجہول ہوگا۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ مجہول کی خبر جملہ ہی ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ ( یوسف: 90) جس طرح نحویوں نے کہا: کان زید منطلق کان میں اسم مجہول ہوگا مبتدا اور خبر مجہول کی خبر ہوگی، تقدیر کلام یہ ہوگی کان الحدیث فاما أن یقال کان منطلقا۔ کان میں اسم مجہول ہوگا۔ کسی ایک کو بھی ہم نہیں جانتے جس کے نزدیک یہ جائز ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے، اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے، تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے۔

# سورۃ الشعراء

آیاتہا ۲۲۷ ۲۶ سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ مَکِّیَّۃٌ ۴۷ رکوعاتہا ۱۱

جمہور کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ مقاتل نے کہا: ان میں سے ایک آیت مدنی ہے جس میں شعراء کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۞ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: یہ سورت مکی ہے مگر چار آیات ایسی ہیں جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۞ سے آخر تک ہیں۔ یہ کل دو سو ستائیس آیات ہیں۔ ایک روایت میں دو سو چھبیس آیات ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے ذکر اوّل سے وہ سورت عطا کی گئی جس میں بقرہ کا ذکر ہے، الواح موسیٰ میں سے مجھے سورۃ طٰہٰ اور طسم عطا کی گئیں، قرآن کے فواتح اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے مجھے عطا کی گئیں اور مفصل سورتیں مجھے زائد عطا کی گئیں''۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: ''تورات کی جگہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سات لمبی سورتیں عطا کیں، انجیل کی جگہ مجھے مبین عطا کیں، زبور کی جگہ طواسین عطا کیں حم اور مفصل صورتوں کے ساتھ مجھے فضیلت عطا کی مجھ سے قبل کسی نبی نے ان کی قراءت نہیں کی''۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

طٰسٓمّٓ ۞ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۞ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۞ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ ۞ وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِیْنَ ۞ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَیَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ۞ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۞

''طا۔ سین۔ میم۔ یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی (اے جان عالم) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے۔ اگر ہم چاہیں تو اتاریں ان پر آسمان سے کوئی نشانی پس ہو جائیں ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی اور نہیں آیا کرتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت الرحمن کی جانب سے مگر یہ کہ وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ تو بے شک انہوں نے تکذیب کی سو مل جائے گی انہیں اطلاع اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزاء

کیا کرتے تھے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا زمین کی طرف کہ کتنی کثرت سے ہم نے اگائے ہیں اس میں ہر طرح کے مفید پودے۔ بے شک اس میں (ان کے لیے قدرت الٰہی کی) نشانی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

طٰسٓمٓ ○ اعمش، یحییٰ، ابوبکر، مفضل، حمزہ، کسائی اور خلف نے اس سورت اور اس جیسی سورتوں میں طاء کو امالہ اور اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع، ابوجعفر، شیبہ اور زہری نے دو لفظوں کے درمیان پڑھا ہے؛ ابو عبید اور حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ اشباع کی صورت میں پڑھا ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ تمام فصیح لغتیں ہیں۔ سورۂ طہٰ میں نحاس کا قول اس بارے میں گزر چکا ہے، نحاس نے کہا: مدینہ طیبہ کے قاریوں، ابو عمرو، عاصم اور کسائی نے طٰسٓمٓ نون کو میم میں ادغام کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ فراء نے نون کے اخفاء کے ساتھ کہا اعمش اور حمزہ نے طسین میم، نون کے اظہار کے ساتھ قراءت کی۔ نحاس نے کہا: سیبویہ کے نزدیک نون ساکنہ اور تنوین کی چار قسمیں ہیں حروف حلقیہ کے وقت ان کو واضح کیا جاتا ہے۔ راء، لام، میم، واؤ اور یاء کے وقت ادغام کیا جاتا ہے، یاء کے وقت میم سے قلب کیا جاتا ہے یہ دونوں خیاشیم سے ہیں یعنی دونوں کو واضح نہیں کیا جاتا۔ یہ چار اقسام جن کی وضاحت سیبویہ نے کی ہے یہ قراءت جائز نہیں کیونکہ یہاں حروف حلقیہ نہیں کہ اس کے ساتھ نون کو واضح کیا جائے لیکن اس میں ایک چھوٹی سی توجیہ ہے وہ یہ ہے کہ حروف معجم کا حکم یہ ہے کہ ان پر وقف کیا جائے۔ جب ان پر وقف کیا جائے گا تو نون واضح ہو جائے گی۔ ثعلبی نے کہا: ادغام ابو عبید اور ابو حاتم کا اختیار ہے وہ تمام قرآن پر قیاس کرتے ہیں۔ ان قراء نے تبیین اور تمکین کے لیے اس میں اظہار کیا ہے اور ان علماء نے حروف ضم کی مجاورت کی وجہ سے ادغام کیا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو اسحاق نے اپنی کتاب فیما یجری و فیما لا یجری، میں حکایت بیان کی یہ کہنا جائز ہے: طسین میم نون کو فتحہ اور میم کو ضمہ دیا جائے جس طرح یہ کہا جاتا ہے: ھذا معدی کرب۔ ابو حاتم نے کہا: خالد نے طسین میم قراءت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: طٰسٓمٓ یہ قسم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، مقسم علیہ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ سورت کا نام ہے سورت کا آغاز اچھا ہے۔ ربیع نے کہا: قوم کی مدت کا حساب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عذاب ہے جو ایک قوم پر واقع ہوگا۔ طسم اور طس ایک ہے۔ کہا:

وَفَاؤُكُمَا كَالرَّبْعِ أَشْجَاهُ طَاسِمُهُ　　بِأَنْ تُسْعِدَا وَالدَّمْعُ أَشْفَاهُ سَاجِمُهُ

تم دونوں کی وفا کہ تم رونے کے ساتھ مدد کرو گھر کے ماحول کی طرح ہے اس کے آثار کا مٹانا عاشق کے لیے زیادہ غم دینے والا ہے بہنے والے آنسو اسے زیادہ شفا دینے والے ہیں۔

قرطبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، رفعت اور ملک کی قسم اٹھائی۔ عبداللہ بن محمد بن عقیل نے کہا: طاء سے مراد طور سینا، سین سے مراد اسکندریہ اور میم سے مراد مکہ ہے۔ جعفر بن محمد بن علی نے کہا: طاء سے مراد طوبیٰ کا درخت ہے، سین سے مراد سدرۃ المنتہیٰ ہے اور میم سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طاء، طاہر سے اور سین قدوس سے ہے۔ ایک

قول یہ کیا گیا ہے: سین سمیع سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سلام سے ہے اور میم مجید سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رحیم سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ملک سے ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ طواسیم اور طواسین قرآن میں سورتیں ہیں جن کی جمع غیر قیاسی ہے۔ ابوعبیدہ نے شعر پڑھا:

وبالطواسیم التی قد ثُلِّثت وبالحوامِیم التی قد سُبِّعَتْ

طواسیم تین سورتیں ہیں اور حوامیم جو سات ہیں۔

جوہری نے کہا: صحیح یہ ہے: ذوات کے ساتھ جمع بنائی جائے اور واحد کی طرف مضاف کیا جائے، پس کہا جاتا ہے: ذوات طسم، ذوات حم۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ مبتدا کے مضمر ہونے کے ساتھ اس کو رفع دیا جائے وہ ھذہ ہے، یہ کتاب مبین کی وہ آیات ہیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا کیونکہ تورات اور انجیل میں ان سے قرآن کے نزول کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تلك، ھذہ کے معنی میں ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اپنے نفس کو قتل کرنے والا اور اسے ہلاک کرنے والا ہے۔ سورۂ کہف میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کیونکہ انہوں نے ایمان کو ترک کر دیا۔ فراء نے کہا: ان محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جزا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہمزہ کے نیچے کسرہ ہے کیونکہ یہ جزا ہے متعارف یہی ہے اس میں قول وہی ہے جو ابو اسحاق نے اپنی کتاب جو قرآن کی تفسیر کے متعلق ہے میں کیا ہے: اَنْ محل نصب میں ہے مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے معنی ہے ممکن ہے آپ اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالیں کیونکہ انہوں نے ایمان کو ترک کیا ہے۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً آیۃ سے مراد ظاہر معجزہ اور غالب قدرت ہے۔ تو ان کی معلومات بدیہی ہو جاتیں، لیکن پہلے فیصلہ ہو چکا تھا کہ معارف نظریہ ہوں گے۔ ابوحمزہ ثمالی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اس آیت کی آواز ہے جو رمضان شریف کی نصف کو آسمان سے سنی جاتی ہے، کنواری عورتیں گھروں سے نکل آتی ہیں اور زمین اس کے لیے چیختی ہے۔ یہ قول حقیقت سے بعید ہے، کیونکہ مراد قریش ہیں ان کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ان کی گردنیں ان کے آگے جھکی ہوتی ہیں۔ مجاہد نے کہا: اَعْنَاقُهُمْ سے مراد ان کے بڑے لوگ ہیں۔ نحاس نے کہا: اور لغت میں معروف ہے، یوں کہا جاتا ہے: جاءنی عنق من الناس میرے پاس لوگوں میں سے رؤسا آئے۔ ابوزید اور اخفش نے کہا: اَعْنَاقُهُمْ سے مراد ان کی جماعتیں ہیں؛ یہ جملہ بولا جاتا ہے جاءنی عنق من الناس میرے پاس لوگوں کی جماعت آئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اصحاب اعناق کا ارادہ کیا مضاف کو حذف کیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک آیت نازل کرتا جس کے سامنے وہ عاجزی کا اظہار کرتے تو ان میں سے کوئی بھی اپنی گردن معصیت کی طرف نہ پھیرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت ہمارے اور بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان پر ہماری حکومت ہوگی اور حضرت معاویہ کے بعد ان کی گردنیں ہماری سامنے جھکی ہوں گی؛ اسے

ثعلبی اور غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ خاضعین اور خاضعة یہاں برابر ہیں، یہ عیسیٰ بن عمر نے کہا: اور مبرد نے اسے پسند کیا معنی ہے جب ان کی گردنیں ذلیل ہو گئیں تو وہ بھی ذلیل ہو گئے، گردنوں کے بارے میں خبر ہے۔ کلام عرب میں یہ جائز ہے کہ پہلے کی خبر کو ترک کر دیا جائے اور دوسرے کی خبر دی جائے۔ راجز نے کہا:

طولُ الليالي أسرعتْ في نَقْضِي　　طَوَيْنَ طُولِي و طَوَيْنَ عَرْضِي

اسرعت یہ اللیالی کی خبر ہے اور طول کی خبر کو ترک کر دیا گیا ہے۔ جریر نے کہا:

أرى مَرَّ السنين أَخَذْنَ مِنِّي　　كما أخذَ السِّرارُ من الهلالِ

میں دیکھتا ہوں سالوں کے گزرنے نے مجھ سے حصہ لیا جس طرح سرار ہلال سے حصہ لیتا ہے۔ محل استدلال اخذن ہے۔ یہ جائز ہے کیونکہ مَرَّ اور طول کا لفظ کلام سے حذف ہوتا تو اس کا معنی فاسد نہ ہوتا، اسی طرح فعل کو غیر کی طرف لوٹانا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ کیونکہ اگر اعناق کا لفظ ساقط کر دیا جاتا تو کلام فاسد نہ ہوتی اور باقی ماندہ کلام اس معنی کو ادا کر دیتی یہاں تک کہ ارشاد ہوتا: فظلوا لها خاضعین۔ فراء اور ابو عبیدہ نے اسی پر اعتماد کیا ہے۔ کسائی اس طرف گئے ہیں کہ معنی یہ ہے خاضعیها هم بصریوں اور فراء کے نزدیک یہ خطا ہے اس قسم کا حذف کلام میں واقع نہیں ہوتا، یہ نحاس نے کہا۔

**وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِیْنَ** سورۃ الانبیاء میں بحث گزر چکی ہے۔ **فَقَدْ كَذَّبُوْا** یعنی انہوں نے اعراض کیا اور جو کسی چیز سے اعراض کرتا ہے اور اسے قبول نہیں کرتا تو وہ اس کی تکذیب میں ہوتا ہے۔ **فَسَیَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ** یہ ان کے لیے وعید ہے جو انہوں نے جھٹلایا اور جو انہوں نے استہزاء کی اس کی سزا انہیں ضرور پہنچے گی۔

**اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ** اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور قدرت پر متنبہ کیا اگر وہ اپنے دلوں سے غور کرتے اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو انہیں علم ہو جاتا کہ وہ ہی عبادت کا مستحق ہے کیونکہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ زَوْجٍ سے مراد قسم ہے، یہ فراء نے کہا، كَرِیْمٍ سے مراد حسن شریف ہے۔ لغت میں کرم سے مراد شرف و فضل ہے نخلة كريمة سے مراد ہے ایسا کھجور کا درخت جو اعلیٰ نسل کی ہو اور زیادہ پھل والی ہو۔ رجل کریم سے مراد شریف، فاضل اور درگزر کرنے والا۔ نبتت الارض اور أنبتت الارض دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نکالنے والا اور اگانے والا ہے۔ امام شعبی سے مروی ہے فرمایا: لوگ زمین کی نباتات ہیں ان میں سے جو جنت میں چلا گیا وہ کریم ہے اور جو جہنم کی طرف چلا گیا تو وہ لئیم ہے۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً** زمین میں انبات کا جو ذکر فرمایا اس میں یہ دلالت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔

**وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** ان میں سے اکثر تصدیق کرنے والے نہیں کیونکہ ان کے بارے میں مجھے پہلے سے علم ہے سیبویہ کے قول میں کان زائدہ ہے اس کی تقدیر کلام یہ ہے: وما اكثرهم مومنين۔

**وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** عزیز سے مراد ہے وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے اور اپنے اولیاء پر رحم

فرمانے والا ہے۔

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۙ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ؕ﴿۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۚ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور یاد کرو جب ندا دی آپ کے رب نے موسیٰ کو (اور فرمایا) کہ جاؤ ظالم لوگوں کے پاس یعنی قوم فرعون کے پاس۔ کیا وہ (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے۔ آپ نے عرض کی: میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اور گھٹتا ہے میرا سینہ اور روانی سے نہیں چلتی میری زبان سو (از راہ کرم) وحی بھیج ہارون کی طرف اور (تو جانتا ہے کہ) ان کا میرے ذمہ ایک جرم بھی ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ اللہ نے فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا پس تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں (اور ہر بات) سننے والے ہیں''۔

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى، اِذْ محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہے: واتل علیھم اذ نادی ربك موسی، اس پر یہ کلام وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ دلالت کرتی ہے جو اس کے بعد ہے۔ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں اذکر فعل محذوف ہے جس طرح اس ارشاد میں ہی تصریح ہے وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ (احقاف: 21) وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ (ص: 45) وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْیَمَ (مریم: 19) ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى، کذا و کذا۔ نداء سے مراد یا فلاں کے ساتھ بلانا، یعنی تیرے رب نے فرمایا: یا موسیٰ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ پھر خبر دی کہ ظالم قوم کون ہے؟ فرمایا: قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ قوم فرعون، یہ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ سے بدل ہے۔ اَلَا یَتَّقُوْنَ کا معنی ہے کیا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس شے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ وہ ظالم قوم کے پاس جائیں اور یَتَّقُوْنَ کا قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تقویٰ نہیں رکھتے اور اس پر دال ہے کہ انہیں تقویٰ کا حکم دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے قل لهم الا تتقون، انہیں کہو: کیا تم تقویٰ نہیں رکھتے؟ آیت کریمہ میں یاء کے ساتھ فعل آیا ہے کیونکہ خطاب کے وقت وہ غائب تھے اگر تاء کے ساتھ آئے تب بھی جائز ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قل للذین کفروا ستغلبون فعل مضارع کو یاء اور تاء دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ عبید بن عمیر اور ابو حازم نے الا تتقون دو تاؤں کے ساتھ پڑھا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی: قل لهم الا تتقون۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں ڈرتا ہوں وہ مجھے رسالت و نبوت کے معاملہ میں جھٹلائیں گے۔ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ ان کے جھٹلانے کی وجہ سے میرا سینہ تنگ پڑ جائے گا۔ عام قراءت ویضیق اور ولا ینطلق رفع کے ساتھ ہے یعقوب، عیسیٰ بن عمر اور ابو حیوۃ نے ویضیق اور ولا ینطلق میں نصب کے ساتھ قراءت کی ہے اسے اَن

یکذبون کی طرف لوٹایا ہے یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ میں رفع کے ساتھ قراءت دو وجہوں سے ہوگی (۱) اس وجہ سے کہ یہ ابتدا کلام ہے (۲) یہ انی یضیق صدری ولا ینطلق لسانی کے معنی میں ہے اس کا عطف اِنِّیْۤ اَخَافُ پر ہے۔ فراء نے کہا: اسے نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے؛ یہی چیز اعرج، طلحہ، عیسیٰ بن عمر سے مروی ہے دونوں کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ نحاس نے کہا: مناسب رفع ہی ہے کیونکہ نصب کی صورت میں عطف یُّكَذِّبُوْنِ پر ہے۔ یہ تعبیر بعید از حقیقت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴾ (طٰہٰ) یہ اس پر دال ہے کہ یہ اس طرح ہے معنی ہوگا جس طرح میں پسند کرتا ہوں استدلال میں میری زبان رواں نہ ہوگی۔ آپ کی زبان میں لکنت تھی جس طرح سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ حضرت جبرئیل امین کو وحی دے کر اس کی طرف بھیج اسے بھی میرے ساتھ پیغمبر بنا دے تاکہ وہ میری مدد و حمایت کرے یہاں لیعیننی نہیں فرمایا کیونکہ معنی معلوم تھا۔ سورۂ طٰہٰ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا (طٰہٰ:29) سورۂ قصص میں ہے فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ (34) گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سوال کی اجازت دی گئی تھی ان کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی رسالت کو ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے بلکہ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کا مددگار بنایا جائے۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ جو امر میں مستقل نہ ہو، اسے اپنے بارے میں تقصیر کا خوف ہو تو وہ اپنے مددگار سے مطالبہ کرے اس میں اس پر کوئی ملامت نہ ہوگی۔

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ یہاں ذنب سے مراد قبطی کا قتل ہے اس کا نام ماثور تھا جس طرح سورۂ قصص میں اس کی وضاحت آئے گی، اس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوف ہوا کہ اس الزام کی وجہ سے قبطی آپ کو قتل کر دیں گے؛ یہ آیت اس امر پر دال ہے کہ خوف بعض اوقات انبیاء، فضلاء اور اولیاء کو لاحق ہو جاتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات فاعل حقیقی ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے کسی کو مسلط کر دیتا ہے۔

قَالَ كَلَّا فرمایا: ہرگز نہیں وہ تمہیں کبھی بھی قتل نہ کر سکیں گے۔ اس ظن سے جھڑکنا مقصود ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد و بھروسہ کا حکم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو اور ان سے خوف کو دور کر دو کیونکہ وہ آپ کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے اور نہ اس کی طاقت رکھتے ہیں فَاذْهَبَا تو اور تیرا بھائی جائیں میں نے اسے تیرے ساتھ پیغمبر بنا دیا ہے۔ بِاٰیٰتِنَاۤ ہماری براہین اور معجزات کے ساتھ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ ہماری آیات کے ساتھ۔ اِنَّا مَعَكُمْ مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مُّسْتَمِعُوْنَ جو وہ کہتے ہیں اور جو وہ جواب دیتے ہیں اس کو سننے والے ہیں اس سے ان کے دل کی تقویت مراد لی ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کی حفاظت فرمائے گا، استماع سے مراد توجہ سے بات کو سننا ہے اللہ تعالیٰ کی اس کے ساتھ صفت نہیں لگائی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت سمیع و بصیر سے لگائی ہے، سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿ (طٰہٰ) مَعَكُمْ دونوں کو جمع کے قائم مقام رکھا ہے کیونکہ دو بھی جماعت ہے کہ جمع کا صیغہ ان دونوں اور جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ان سب کے لیے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے(1)۔

1۔ المحرر الوجیز

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ
إِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَّأَنَا مِنَ
الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾

''سو دونوں جاؤ فرعون کے پاس اور اسے کہو ہم فرستادہ ہیں رب العالمین کے (ہم تمہیں کہتے ہیں) کہ بھیج دے ہمارے ساتھ (ہماری قوم) بنی اسرائیل کو۔ فرعون نے (یہ سن کر) کہا: موسیٰ! کیا ہم نے تجھے پالا نہیں تھا اپنے یہاں جب کہ تو بچہ تھا اور بسر کیے تو نے ہمارے پاس اپنی عمر کے کئی سال اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا ہے اور تو بڑا احسان فراموش ہے۔ آپ نے جواب دیا: میں نے ارتکاب کیا تھا اس کا اس وقت جب کہ میں ناواقف تھا تو میں بھاگ گیا تھا تمہارے ہاں سے جب کہ میں تم سے ڈرا پس بخش دیا مجھے میرے رب نے حکم اور بنا دیا مجھے رسولوں سے اور یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے حالانکہ تو نے غلام بنا رکھا ہے بنی اسرائیل کو''۔

**فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** ابوعبیدہ نے کہا: رسول رسالت کے معنی میں ہے اس تعبیر کی بنا پر تقدیر کلام یہ ہوگا انا ذوو رسالة رب العالمین۔ ہذلی نے کہا:

أَلِكْنِي إِليها وَخَيْرُ الرَّسُو لِ أَعْلَمُهُمْ بِنَواحِي الخَبَرْ

مجھے اس کی طرف بھیجو بہترین رسول وہ ہوتا ہے جو خبر کی اطراف کو ان سے سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لقد كَذَبَ الواشون ما بُحْتُ عندهُم بِسِرٍّ ولا أَرسلتُهُم برسولِ

چغل خوروں نے جھوٹ بولا میں نے ان کے ہاں بھید کو ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی کوئی قاصد بھیجا۔

ایک شاعر نے کہا:

أَلا أَبْلِغْ بني عمرو رسولًا بأَنّي عن فُتَاحَتِكُمْ غَنِيُّ

خبردار بنی عمرو کو پیغام پہنچا دو کہ میں تمہارے فیصلہ سے غنی ہوں۔

عباس بن مرداس نے کہا:

أَلَا مَنْ مُبلِغٌ عنّي خُفَافًا رسولًا بيتُ أهلِك مُنتَهاها

خبردار! کون خفاف کو میری طرف سے پیغام پہنچائے گا تیرے اہل کا گھر ہی اس کی انتہاء ہے۔

یہاں بھی رسول رسالت کے معنی میں ہے اسی وجہ سے ضمیر مونث ذکر کی۔ ابوعبید نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ رسول کا لفظ دو اور جمع کے لیے ہو۔ عرب کہتے ہیں: ھذا رسولی و وکیلی، ھذان رسولی و وکیلی، ھولاء رسولی و وکیلی، اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ (الشعراء: 77) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا رسول ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی انہیں آزاد کر دو اور ان کا راستہ نہ روکو تا کہ وہ ہمارے ساتھ فلسطین کی طرف جائیں اور انہیں اپنا غلام نہ بناؤ۔ فرعون نے چار سو سال سے انہیں اپنا غلام بنایا ہوا تھا، اس وقت ان کی تعداد چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ دونوں فرعون کے پاس گئے ایک سال تک اس نے دونوں کو دربار میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ دربان فرعون کے پاس گیا اس نے کہا: یہاں ایک انسان ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ رب العالمین کا رسول ہے۔ فرعون نے کہا: اسے اجازت دو ممکن ہے ہم اس کی وجہ سے ہنس لیں۔ دونوں فرعون کے پاس گئے اور پیغام پہنچایا (1)۔

وہب اور دوسرے علماء نے روایت کی ہے جب دونوں فرعون کے پاس گئے دونوں نے اسے پایا کہ اس نے ببر شیر، شیر اور چیتے وغیرہ نکالے ہوئے تھے وہ ان میں گھوم پھر رہا تھا، ان درندوں کے رکھوالوں کو خوف ہوا کہ وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو پکڑ لیں گے وہ درندوں کی طرف جلدی سے بڑھے اور درندے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف جلدی سے بڑھے وہ ان دونوں کے قدموں کو چاٹنے لگے، اپنی دمبوں کو ہلانے لگے اور اپنے رخساروں کو ان کی رانوں کے ساتھ مس کرنے لگے فرعون اس سے متعجب ہوا، اس نے پوچھا: تم دونوں کون ہو؟ دونوں نے جواب دیا: ہم رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا کیونکہ آپ اس کے گھر میں پروان چڑھے تھے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ فرعون نے احسان جتلانے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ کہا: ہم نے تجھے بچپنے میں پالا اور جن بچوں کو ہم نے قتل کیا تھا ان میں ہم نے تجھے قتل نہیں کیا اور کئی سال تک تو ہمارے پاس رہا، جس کا تو اب دعویٰ کر رہا ہے یہ کب سے واقع ہوا؟ پھر اس قول کے ساتھ قبطی کے قتل کا ذکر کیا۔ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ، فعلۃ جب فاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد ایک دفعہ کا عمل ہے شعبی نے فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فتحہ اولیٰ ہے، کیونکہ یہ عمل ایک دفعہ ہوا اور فاء کے نیچے کسرہ ہو تو اس سے مراد ہیئت اور حالت ہوتی ہے یعنی تو نے وہ فعل کیا جس کو تو پہچانتا ہے تو پھر تو کیسے دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے جب کہ ہم تیرے احوال سے آگاہ ہیں۔ شاعر نے کہا

كَاَنَّ مِشْیَتَهَا مِنْ بَیْتِ جَارَتِهَا　　مَرُّ السَّحَابَةِ لَا رَیْثٌ وَلَا عَجَلُ

گویا اس کی اپنی پڑوسن کے گھر سے چال بادل کے گزرنے کی طرح ہے نہ اس میں سستی ہوتی ہے اور نہ ہی تیزی۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: کان ذلک ایام الرِّدۃ والرَّدۃ۔

---

1۔ تفسیر بغوی (معالم التنزیل)

وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ضحاک نے کہا: قبطی کے قتل کرنے میں تو ناشکروں میں سے تھا کیونکہ وہ ایسا نفس تھا جس کا قتل حلال نہیں تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو میں نے تجھ پر تربیت اور احسان کیا اس کی ناشکری کرنے والا تھا، یہ ابن زید کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: تو میرے الہٰ ہونے کا انکار کرنے والا تھا۔ سدی نے کہا: تو الله تعالیٰ کا انکار کرنے والا تھا کیونکہ تو ہمارے دین میں ہمارے ساتھ تھا جس دن پر تو اب عیب لگا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب قبطی کو قتل کیا اور پھر وہاں سے آپ نکلے اور پھر واپس آئے درمیان میں گیارہ سال کا عرصہ حائل تھا۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ میں نے وہ فعل کیا مراد قبطی کا قتل ہے اس وقت میں ناواقف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات سے کفر کی نفی کی اور یہ بتایا کہ یہ فعل جہالت کی بنا پر تھا۔ مجاہد نے بھی یہی کہا کہ مِنَ الضَّآلِّيْنَ کا معنی ناواقفوں میں سے تھا۔ ابن زید نے کہا: میں اس سے ناواقف تھا کہ گھونسا قتل تک جا پہنچتا ہے۔ حضرت عبدالله کے مصحف میں من الجاهلین کے الفاظ ہیں۔ جو آدمی کسی چیز سے جاہل ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: ضل عنه۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ کا معنی ہے میں بھولنے والوں میں سے تھا، یہ ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں نبوت سے ناواقف تھا کیونکہ الله تعالیٰ کی جانب سے مجھے کوئی چیز نہیں پہنچی تھی اس لیے میں نے جو کہا اس پر مجھے توبیخ نہیں کی جاسکتی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں تربیت نبوت اور لوگوں پر حلم کے منافی نہیں ہوتی اور خطاءً قتل کرنا یا ایسے وقت میں قتل کرنا جب کوئی شرعی حکم نہ ہو یہ نبوت کے منافی نہیں۔

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ میں تمہارے درمیان سے مدین کی طرف نکل گیا جس طرح سورۃ القصص میں ہے فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ (القصص: 21) یہ قتل کے موقع پر ہوا تھا۔ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا حکم سے مراد نبوت ہے؛ یہ سدی وغیرہ سے مروی ہے۔ زجاج نے کہا: مراد تورات کی تعلیم ہے جس میں الله تعالیٰ کا حکم تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد علم اور فہم ہے۔

وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اس کلام کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ سدی، طبری اور فراء نے کہا: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نعمت کا اقرار کیا گویا آپ کہتے ہیں: ہاں! تیری تربیت مجھ پر احسان ہے جب تو نے میرے سوا ہر کسی کو غلام بنالیا اور مجھے چھوڑ دیا لیکن یہ میری رسالت کو ختم نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام انکار کے طریقہ پر ہے یعنی کیا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے کہ تو نے چھوٹی عمر میں میری تربیت کی جب کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے اور انہیں قتل کیا ہے؟ یعنی یہ کوئی انعام نہیں، کیونکہ واجب یہ تھا کہ تو انہیں قتل نہ کرتا اور انہیں غلام نہ بناتا کیونکہ وہ میری قوم تھی تو تو مجھ پر خصوصی احسان کا کیسے ذکر کرتا ہے؟ کہا: یہ معنی قتادہ اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں کلمہ استفہام مقدر ہے، تقدیر کلام یہ ہے: او تلك نعمة۔ یہ اخفش اور فراء کا قول ہے۔ نحاس اور دوسرے علماء نے انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ الف استفہام معنی پیدا دیتا ہے اس کا حذف محال ہے مگر جب کلام میں ام ہو جس طرح شاعر نے کہا:

تَرُوحُ من الحيّ أم تَبْتَكِر، یہاں تروح سے پہلے ہمزہ استفہام مقدر ہے۔

تو قبیلہ سے پچھلے پہر جاتا ہے یا صبح جلدی جاتا ہے۔

اس بارے میں نحویوں کے درمیان کسی اختلاف سے آگاہ نہیں صرف فراء نے جو کلام کی ہے، اس نے کہا: افعال شک میں کلمہ استفہام کا حذف کرنا جائز ہے اور یہ حکایت بیان کی تُرٰی زیدا منطلقا، اس سے مراد أتُرٰی ہے۔ علی بن سلیمان اس بارے میں کہا کرتے تھے: فراء نے اسے الفاظ عام سے لیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: فراء نے کہا جس نے یہ کہا: یہ انکار ہے اس نے کہا اس کا معنی ہے کیا وہ نعمت ہے؟ یہ استفہام کے طریقہ پر ہے جس طرح یہ فرمان ہے: هٰذَا رَبِّيْ (الانعام: 77) اور فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ (الانبیاء)

شاعر نے کہا:

رَفَوْنِي وقالوا يا خُوَيلدُ لا تُرَعْ فقلتُ وأنكرتُ الوجوهَ هُمُ هُمُ

انہوں نے میرے خوف کو دور کیا انہوں نے کہا: اے خویلد! تجھے نہ ڈرایا جائے، میں نے کہا: اور میں وجوہ سے ناواقف تھا کیا یہ وہ ہیں۔

غزنوی نے الف کو ترک کرنے پر بطور دلیل یہ اشعار پڑھے:

لم أنس يوم الرحيل وِقفتَها وجفنها من دموعها شَرِقُ

وقولَها والركابُ واقفةٌ تركتَني هكذا و تَنطلقُ

میں کوچ کے روز اس کے ٹھہراؤ کو نہیں بھول سکتا جب کہ اس کی پلکیں اس کے آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور اس کے قول کو نہیں بھول سکتا جب کہ اونٹ کھڑے تھے تو نے مجھے اس طرح چھوڑ دیا اور تو خود جارہا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں استفہام کے الف کا حذف، ام کے بغیر ایسا امر ہے جو نحاس کے قول کے خلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ کلام تبکیت کے طریقہ پر ہے، تبکیت استفہام اور استفہام کے بغیر ہوتا ہے۔ معنی ہے اگر تو بنی اسرائیل کو قتل نہ کرتا تو میرے والدین میری تربیت کرتے، تو مجھ پر تیرا احسان کہاں سے ہوا تو مجھ پر اسی چیز سے احسان جتلا رہا ہے جو احسان جتلانے کو واجب نہیں کرتا، ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تو مجھ پر کیسے تربیت کا احسان جتلاتا ہے جب کہ تو نے میری قوم کو ذلیل کر دیا ہے؟ جس نے اس کی قوم کو ذلیل کیا وہ ذلیل ہے۔ اَنْ عَبَّدْتَّ یہ محل رفع میں ہے یہ نعمة سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو معنی ہو لأن عبدت بني اسرائيل تو نے انہیں غلام بنا لیا۔ کہا جاتا ہے: عبدته، أعبدته دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ فراء نے یہ قول کیا ہے اور یہ شعر پڑھا:

عَلَامَ يُعبِدُنِي قومي وقد كَثُرت فيهم أباعِرُ ماشاءوا وعِبدانُ

میری قوم کس وجہ سے مجھے غلام بناتی ہے جب کہ ان میں اونٹوں کے بچے اور غلام کثیر تعداد میں ہیں جتنے وہ چاہیں۔

**قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا**

إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ (24) قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ (25) قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ
آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (26) قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ (27) قَالَ
رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ (28) قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ
إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (29) قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ (30)
قَالَ فَأْتِ بِهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (31) فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ (32) وَ
نَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ (33) قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ (34)
يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ (35) قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ
وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ (36) يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ (37) فَجُمِعَ السَّحَرَةُ
لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (38) وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ (39) لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ
السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ (40) فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا
لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ (41) قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (42) قَالَ
لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ (43) فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ
فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ (44) فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ (45)
فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ (46) قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (47) رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ (48)
قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ
تَعْلَمُونَ ۚ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (49)
قَالُوا لَا ضَيْرَ ۖ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ (50) إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا أَن
كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ (51)

''فرعون نے پوچھا: کیا حقیقت ہے رب العالمین کی؟ آپ نے فرمایا: (رب العالمین وہ ہے جو) مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر ہو تم یقین کرنے والے۔ فرعون نے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے کہا: کیا تم سن نہیں رہے؟ آپ نے فرمایا: وہ جو تمہارا بھی مالک ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی فرعون بولا بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو بھیجا گیا ہے تمہاری طرف یہ تو دیوانہ ہے آپ نے (معا) فرمایا: جو مشرق و مغرب کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اس نے (رعب جماتے ہوئے) کہا: (یاد رکھو!) اگر تم نے میرے سوا کسی کو خدا بنایا تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں داخل کر دوں گا۔ فرمایا: اگرچہ میں

لے آؤں تیرے پاس ایک روشن چیز۔ اس نے کہا: پھر پیش کرو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس آپ نے ڈالا اپنا عصا تو اسی وقت وہ صاف اژدہا بن گیا اور آپ نے باہر نکالا اپنا ہاتھ تو یک لخت وہ سفید ہو گیا دیکھنے والے کے لیے (یہ دیکھ کر) فرعون نے اپنے پاس بیٹھنے والے درباریوں سے کہا: واقعی یہ ماہر جادوگر ہے، یہ چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں اپنے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے (اب بتاؤ) تمہاری کیا رائے ہے؟ بولے: مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو اور بھیج دو شہروں میں ہرکارے تا کہ وہ لے آئیں تیرے پاس (ملک کے کونہ کونہ سے) تمام ماہر جادوگر الغرض جمع کر لیے گئے سارے جادوگر مقررہ وقت پر ایک خاص دن اور کہہ دیا گیا لوگوں سے: کیا تم (مقابلہ دیکھنے کے لیے) اکٹھے ہو گے؟ شاید ہم پیروی کرتے رہیں جادوگروں کی اگر وہ (مقابلے میں) غالب آ جائیں جب حاضر ہوئے جادوگر تو انہوں نے فرعون سے پوچھا: کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آ جائیں؟ اس نے کہا: ہاں ضرور ملے گا اور تم اس وقت میرے مقربوں میں شامل کر لیے جاؤ گے۔ موسیٰ نے انہیں فرمایا: پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں (میدان میں) اور (بڑے وثوق سے) کہا: ناموس فرعون کی قسم! ہم ہی یقیناً غالب آئیں گے، پھر پھینکا موسیٰ نے اپنا سونٹا تو وہ یکایک نگلنے لگ گیا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا پس (یہ معجزہ دیکھ کر) گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے انہوں نے (برملا) کہہ دیا: ہم ایمان لائے رب العالمین پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔ فرعون نے (خفت مٹانے کے لیے) کہا: تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں تمہیں مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سحر کا فن سکھایا ہے ابھی (اس سازش کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا پس ضرور کاٹ دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف طرفوں سے اور میں تم سب کو سولی چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا: ہمیں اس کی پرواہ نہیں، ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہمیں یہ امید ہے کہ بخش دے گا ہمارے لیے ہمارا رب ہماری خطائیں کیونکہ ہم (تیری قوم میں سے) پہلے ایمان لانے والے ہیں''۔

**قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ** جب حضرت موسیٰ علیہ السلام دلیل میں فرعون پر غالب آ گئے اور فرعون لعین نے تربیت اور دوسری چیزوں میں کوئی دلیل نہ پائی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معاوضہ کے لیے آپ کے قول **رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے ایسا سوال کیا جو مجہول چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ مکی اور دوسرے علماء نے کہا: جس طرح اجناس کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے ما کے ساتھ سوال کیا۔ مکی نے کہا: ایک اور جگہ من کے ساتھ بھی استفہام واقع ہوا ہے یہ اس کے مشابہ ہے کہ یہاں کئی مواطن ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مخلوقات میں سے ایسی صفات لائے جو اللہ تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں جن میں کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ فرعون نے جنس کے بارے پوچھا جب کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جنس نہیں کیونکہ اجناس حادث ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی جہالت سے آگاہ ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سوال سے صرف نظر کیا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر اسے آگاہ کیا جو سامع پر اس

چیز کو واضح کر رہی تھی کہ فرعون کو اس میں کوئی مشارکت حاصل نہیں۔ فرعون نے کہا: اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ اس نے یہ قول اغرا اور مقالہ کی سفاہت پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کیونکہ قوم کا عقیدہ یہ تھا کہ فرعون ان کا رب ہے اور ان کا معبود ہے اس سے قبل فراعنہ بھی اسی طرح تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید وضاحت فرمائی رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ آپ ایک ایسی دلیل لائے جس کو وہ سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے آباء تھے اور وہ فنا ہو گئے تو کوئی نہ کوئی مغیر ہے وہ اب ہیں جب کہ پہلے نہ تھے تو ضروری ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی ہو فرعون نے استخفاف کے طریقہ پر کہا: اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ یعنی جو میں سوال کرتا ہوں وہ اس کا جواب نہیں دیتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس قول کے ساتھ جواب دیا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ یعنی اس کا ملک تیرے ملک کی طرح نہیں کیونکہ تو ایک ملک کا بادشاہ ہوتا ہے تو دوسرے ملک میں تیرا حکم نہیں چلتا اور وہ مر جاتا ہے جس کے مرنے کو تو پسند نہیں کرتا، جس ذات نے مجھے بھیجا ہے وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے تھے کہ اس کے سوال میں مقصود اس کی معرفت تھی جس کے بارے میں وہ سوال کر رہا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس چیز کے ساتھ جواب دیا جو آپ کی معرفت کا طریقہ تھا۔ جب فرعون دلیل قائم کرنے سے عاجز آ گیا تو وہ بناوٹی غلبہ کی طرف لوٹ آیا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قید کرنے کی دھمکی دی۔ اور اس نے یہ نہ کہا: اس پر کیا دلیل ہے کہ اس اللہ نے تجھے بھیجا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ اعتراف ہوتا کہ وہاں اس کے علاوہ بھی الٰہ ہے۔ قید خانہ میں ڈالنے کی دھمکی میں ضعف ہے جو بات روایت کی جاتی ہے کہ اس کی قید قتل سے بھی سخت تھی جب وہ کسی کو قید خانہ میں ڈالتا اسے قید خانہ سے نہ نکالتا یہاں تک کہ وہ مر جاتا وہ خوفزدہ تھا پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسا امر تھا جس کے باعث فرعون کی دھمکی آپ کو خوفزدہ نہ کر سکی۔ قَالَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر مہربانی کرتے ہوئے اور اس کے ایمان کا طمع کرتے ہوئے کہا: اَوَ لَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ جس کے ساتھ میری صداقت تجھ پر واضح ہو جائے۔ جب فرعون نے یہ سنا تو اسے طمع ہوئی وہ اس کے درمیان معاوضہ کا کوئی محل پائے۔ قَالَ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ سیبویہ کے نزدیک شرط جواب کی محتاج نہیں کیونکہ شرط سے پہلے جو کلام گزر چکی ہے وہ کافی ہے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے عصا پھینکا تو وہ وہ کچھ ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا۔ اس کی وضاحت اور شرح سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔ جب فرعون نے جادوگروں کو ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تو انہوں نے کہا: لَا ضَیْرَ ہمیں دنیا کا عذاب پہنچے گا اس میں ہمارے لیے کوئی ضرر نہیں یعنی تیرا عذاب تو لمحہ بھر کے لیے ہوگا ہم اس پر صبر کر لیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ سے مومن کی حیثیت میں ملاقات کریں گے۔ یہ چیز ان کی بصیرت اور ایمانی قوت پر دال ہے۔ امام مالک نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک فرعون کو اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے اور جادوگر ایک دن میں ایمان لے آئے۔ یہ کہا جاتا ہے: لا ضیر، لا ضور، لا ضر، لا ضرر، لا ضار، ور تمام سب ایک معنی میں ہیں، یہ ہروی کا قول ہے۔ ابو عبیدہ نے یہ شعر پڑھا:

فَإِنَّكَ لَا يَضُورُكَ بَعْدَ حَوْلٍ　أَظَبْيٌ كَانَ أُمَّكَ أَمْ حِمَارُ

سال کے بعد تجھے تکلیف نہ دے گا کیا تیری ماں ہرن تھی یا گدھی۔

محل استدلال لایضورك ہے۔

جوہری نے کہا: ضَارَهُ يَضُورُهُ، يضيره ضَيْرًا وَضُورًا یعنی اسے تکلیف پہنچائی۔ کسائی نے کہا: میں نے ایک کو کہتے ہوئے سنا لاینفعنی ذلك ولا یضورنی یہ چیز نہ مجھے نفع دیتی ہے اور نہ نقصان دیتی ہے۔ تضور سے مراد مارا اور بھوک کے وقت چیخنا اور دوہرا ہونا ہے ضُورَة سے مراد ایسا مرد ہے جو حقیر ہو اور جس کا مرتبہ کم ہو۔

اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ارادہ کیا ہے کہ ہم اپنے رب کریم کی طرف پلٹنے والے ہیں اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ، ان محل نصب میں ہے کیونکہ اصل میں یہ لان تھا۔ فراء نے ہمزہ کے نیچے کسرہ کو جائز قرار دیا ہے کہ یہ مجازات کے طریقہ پر ہو۔ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ کا معنی ہے فرعون کی جانب سے آیت کے ظاہر ہونے کے وقت۔ فراء نے کہا: ہمارے زمانے کے مومنوں میں سے پہلا۔ زجاج نے اس کا انکار کیا۔ کہا: یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ چھ لاکھ ستر ہزار لوگ ایمان لائے یہی وہ قلیل جماعت تھی جس کے بارے میں فرعون نے کہا تھا: اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾

''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی طرف کہ راتوں رات (یہاں سے) میرے بندوں کو لے جاؤ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ پس بھیجے فرعون نے سارے شہروں میں ہرکارے (تاکہ لوگوں کو بتائیں) یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں اور انہوں نے ہمیں سخت برافروختہ کر دیا ہے (تاہم فکر نہ کرو) ہم سب (ان کے متعلق) بہت محتاط ہیں تو ہم نے نکالا انہیں (سرسبز) باغوں اور (بہتے ہوئے) چشموں اور (بھرپور) خزانوں اور شاندار محلات

سے۔ہم نے ایسا ہی کیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان تمام چیزوں کا وارث بنا دیا۔پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت پس جب ایک دوسرے کو دیکھ لیا دونوں گروہوں نے تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے (ہائے) ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے، آپ نے فرمایا: ہرگز نہیں، بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور میری راہنمائی فرمائے گا سو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند اور ہم نے قریب کر دیا وہاں دوسرے فریق کو اور ہم نے بچا لیا (ان تند موجوں سے) موسیٰ اور ان کے سب ہمراہیوں کو پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے فریق کو، اس واقعہ میں (بڑی واضح) نشانی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔اور بے شک (اے حبیب!) آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

**وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ** جب اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے مومن بندوں کو نجات عطا فرماتا ہے جو اس کے اولیاء میں سے تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں اور اس کے رسولوں اور انبیاء کی تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں اور ان کافروں کو ہلاک فرماتا ہے جو اس کے دشمنوں میں سے جھٹلانے والے ہوتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو رات کے وقت نکالے۔انہیں اپنے بندہ ہونے کا نام دیا کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے **اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ** کا معنی ہے فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کرے گی تاکہ تمہیں واپس لے جائیں۔اس کلام کے ضمن میں ان کی تعریف ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں نجات عطا فرماتا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو سحری کے وقت لے کر نکلے شام کی طرف جانے والا راستہ اپنے بائیں ہاتھ رکھا اور سمندر کی طرف منہ کیا بنی اسرائیل کا کوئی شخص آپ کو راستہ چھوڑنے کا کہتا تو آپ فرماتے: اسی طرح مجھے حکم دیا گیا۔جب فرعون نے صبح کی اور اسے علم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چلے گئے ہیں تو وہ ان کے پیچھے چلا۔اس نے مصر کے شہروں کی طرف پیغام بھیجا کہ لشکر اس سے آملیں۔یہ روایت بیان کی گئی کہ وہ پیچھے سے آکر ملا جب کہ اس کے ساتھ ایک لاکھ سیاہ گھوڑوں پر لشکر تھا اس کے علاوہ ہر قسم کی فوج تھی۔یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔اللہ تعالیٰ صحیح جانتا ہے۔

اس آیت سے جو بات لازم آتی ہے اور جو بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی عظیم جمعیت کے ساتھ نکلے اور فرعون نے ان سے کئی گنا لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرعون کے ساتھ ایک ہزار جابر حکمران تھے سب کے سر پر تاج تھا اور ہر ایک گھڑ سوار لشکر کا امیر تھا(1)۔**لَشِرْ ذِمَةٌ** سے مراد لوگوں میں سے ایک طائفہ اور شے کا قطعہ ہے۔ثوب شراذم کپڑے کے ٹکڑے۔ثعلبی نے راجز کے شعر کا ذکر کیا:

جاء الشتاءُ وثیابی أخلاقُ　شَرَاذِمٌ یَضحكُ منها النَّوَّاقُ

موسم سرما آگیا اور میرے کپڑے بوسیدہ ٹکڑے ٹکڑے ہیں ان سے نواق ہنستا ہے۔

---

1۔المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 232

لوگوں میں نواق انہیں کہتے ہیں جو امور کا جائزہ لیتا ہے اور انہیں درست کرتا ہے، یہ صحاح میں کہا ہے۔ لَشِرْذِمَةٌ میں لام تاکید یہ ہے اکثر یہ ان کی خبر پر داخل ہوتا ہے مگر کوفی أن زيدا لسوف يقوم کو جائز نہیں سمجھتے اس کے جائز ہونے پر دلیل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ لام تاکید ہے جو سوف پر داخل ہوا ہے؛ یہ نحاس نے قول کیا ہے۔

وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآىِٕظُوْنَ وہ ہمارے دشمن ہیں کیونکہ وہ ہمارے دین کے مخالف ہیں اور ہمارے وہ اموال لے کر بھاگ جانے والے ہیں جو انہوں نے ہم سے ادھار لیے تھے۔ جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے اس رات ان کے نوجوان مر گئے تھے یہ بحث سورۃ الاعراف اور سورۂ طٰہٰ میں مفصل گزر چکی ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: غاظنی کذا و أغاظنی، غیظ کا معنی غضب ہے اسی سے تغیظ اور اغتیاظ ہے بغیر اجازت کے نکل کر انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا ہے (1)۔

وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ہم سب مجتمع اور مستعد ہیں ہم نے اپنا اسلحہ لے لیا ہے۔ اسے حاذرون بھی پڑھا گیا ہے اس کا معنی بھی حٰذِرُوْنَ ہے یعنی خوف زدہ ہیں۔ جوہری نے کہا: وانا لجمیع حاذرون وحذِرون وحذُرون۔ یعنی ذال کے ضمہ کے ساتھ؛ اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ حاذرون کا معنی ہے ہم تیاری کرنے والے ہیں۔ حذرون کا معنی ہے ڈرنے والے ہیں۔ نحاس نے کہا: حذرون مدینہ طیبہ کے قراء اور ابو عمر کی قراءت ہے اہل کوفہ کی قراءت حاذرون ہے۔ حضرت عبد الله بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے معروف ہے حادرون دال بے نقطہ؛ یہ ابی عباد کی قراءت ہے۔ مہدوی نے یہ ابن ابی عمار سے بیان کی ہے ماوردی اور ثعلبی نے سمیط بن عجلان سے نقل کی ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبیدہ اس طرف گئے ہیں کہ حذرون اور حاذرون کا معنی ایک ہی ہے؛ یہ سیبویہ کا قول ہے اور اس کو جائز قرار دیا هو حذِرٌ زيدا جس طرح کہا جاتا ہے: حاذر زیدا یہ شعر پڑھا:

حَذِرٌ أُمورًا لا تَضِيرُ و آمِنٌ　مالیس مُنْجِيَهُ من الأقدارِ

وہ ایسے امور سے ڈرنے والا ہے جو نقصان نہیں دیتے اور ایسی اقدار سے بے خوف ہے جو نجات دینے والی نہیں۔

ابو عمر جرمی نے گمان کیا کہ یہ جملہ کہنا جائز ہے: هو حذرٌ زیدا یہاں سے من حذف ہے اکثر نحوی حذر اور حاذر میں فرق کرتے ہیں؛ ان میں کسائی، فراء اور محمد بن زید ہے؛ وہ اس طرف گئے ہیں کہ حذر کا معنی فی خلقته الحذر ہے وہ بیدار اور متنبہ ہے جب اس طرح ہے تو وہ متعدی نہیں ہوتا۔ حاذر کا معنی مستعد ہے متقدمین سے یہی تفسیر آئی ہے۔

حضرت عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الله تعالیٰ کے فرمان وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: ہم سب کے پاس اسلحہ ہے اور گھوڑے ہیں۔ یہ بھی وہی معنی ہے جو مقودون کا معنی ہے ان کے پاس اسلحہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ہمارے پاس اسلحہ ہے جب کہ بنی اسرائیل کے پاس اسلحہ نہیں جو انہیں قتال پر برانگیختہ کرے جہاں تک حادرون کا تعلق ہے یہ ان کے قول عین حدرة سے مشتق ہے یعنی چشمہ بھرا ہوا ہے یعنی ہم ان پر غصہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی معنی میں یہ قول ہے:

---

1۔ تفسیر بغوی

وعین لہا حَذْرَۃٌ بَدْرَۃٌ شَقَّتْ مَا فِیہِمَا مِنْ أُخَرْ

اہل لغت نے حکایت بیان کی ہے کہ یہ جملہ کہا جاتا ہے: رجل حادر جب وہ بھرے گوشت والا ہو یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو اسلحہ سے بھرا ہوا۔ مہدوی نے کہا: حادر سے مراد قوی اور شدید ہے۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ مراد مصر کا علاقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نیل کے دونوں کناروں پر اسوامی سے رشید تک باغات تھے اور باغات کے درمیان کھیتیاں تھیں نیل سات خلیجیں (ندیاں) تھیں، خلیج اسکندریہ، خلیج سخا، خلیج دمیاط، خلیج سردوس، خلیج منف، خلیج فیوم، خلیج المنہی (1)۔ یہ سب متصل تھیں ان میں سے کوئی دوسرے سے منقطع نہ تھیں کھتیاں سب خلیجوں کے درمیان تھیں۔ مصر کی تمام زمین سولہ ہاتھ (بلند پانی) سے سیراب ہو جاتی تھی جو انہوں نے بڑے، چھوٹے پلوں اور ندیوں کے ذریعے تدبیر کی تھی اور انہوں نے جو اندازہ لگایا تھا اسی وجہ سے جب نیل کو سولہ ہاتھ پر بند کیا جاتا تو اسے نیل سلطان کا نام دیا جاتا اور اسے ابن ابی رداد کے اندازے پر چھوڑا جاتا یہ حالت آج تک جاری ہے۔ اسے نیل سلطان کا نام اس لیے دیا کیونکہ اس وقت لوگوں پر خراج واجب ہوتا جب نیل کی سطح سترہ ہاتھ ہو جاتی تو مصر کی تمام زمین ایک انگلی بھر سطح سے سیراب ہو جاتی جب نیل کا پانی سترہ ہاتھ پر بند کیا جاتا اور اٹھارویں ہاتھ سے ایک انگلی بلند ہوتا تو خراج میں دس لاکھ دینار کا اضافہ ہو جاتا اور جب وہ اس حد سے نکلتا اور انیس ہاتھ سے بڑھ جاتا تو اس کا خراج دس لاکھ دینار کم ہو جاتا اس کی وجہ یہ ہوتی کہ وہ خراج مصالح، ندیوں، پلوں اور ان کی تعمیر میں خرچ ہو جاتا۔ جہاں تک موجودہ صورتحال کا تعلق ہے تو اکثر زمین سیراب نہیں کی جاتی یہاں تک کہ مصر کے پیمانہ کے مطابق پانی انیسویں ہاتھ کی انگلی برابر پانی بلند ہو۔ جہاں تک صعید اعلیٰ کے علاقے ہیں تو ان کی سیرابی اس وقت تک نہیں ہوتی یہاں تک کہ پانی بائیس ہاتھ نہ ہو جائے۔

میں کہتا ہوں: مصر کی زمین اس وقت سیراب ہوتی ہے جب پانی بیس ہاتھ اور کچھ انگلیاں اوپر ہو جائے، کیونکہ زمین اونچی ہو گئی ہے اور پلوں وغیرہ کی تعمیر کا اہتمام نہیں۔ یہ دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ یہ تعجب اور بڑھ جاتا ہے جب تمام علاقہ میں پانی بہتا ہے یہاں تک کہ مصر کے تمام علاقہ میں سیلاب ہوتا ہے تو شہر پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں جن تک کشتیوں کے ذریعے ہی پہنچا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے: مصر کا نیل تمام دریاؤں کا سردار ہے اللہ تعالیٰ نے مشرق و مغرب میں ہر دریا اس کے لیے مسخر کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نہروں کو مسخر کر دیا ہے جب اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ مصر کے نیل کو جاری کرے تو یہ دریا کو حکم دیتا ہے کہ اس کی مدد کرے تو دریا اپنے پانیوں کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے لیے چشموں کو کھول دیتا ہے جب وہ اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر پانی کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔

قیس بن حجاج نے کہا: جب مصر فتح ہو گیا تو اس کے مکین حضرت عمرو بن عاص کی خدمت میں حاضر ہوئے جب قبطیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 232

کے مہینوں میں سے بونہ داخل ہوا انہوں نے حضرت عمرو بن عاص سے عرض کی: اے امیر! ہمارے اس نیل کی ایک سنت ہے وہ اس کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے ان سے پوچھا: وہ سنت کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: جب اس ماہ کی بارہویں رات گزر جاتی ہے تو ہم ایک دوشیزہ کا قصد کرتے ہیں ہم اس کے والدین کو راضی کرتے ہیں، ہم اسے بہترین زیورات اور بہترین کپڑے پہناتے ہیں پھر ہم اسے اس نیل میں پھینک دیتے ہیں۔ حضرت عمرو نے فرمایا: اسلام میں یہ جائز نہیں اسلام پرانے دور کی رسومات کو مٹانے والا ہے۔ وہ لوگ وہاں رہے نہ نیل زیادہ چلتا نہ کم، ان لوگوں نے جلاوطنی کا ارادہ کر لیا۔ جب حضرت عمرو بن عاص نے یہ دیکھا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور تمام واقعہ سے آگاہ کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا جو کچھ تو نے کہا ہے وہ درست ہے اسلام ماقبل کی رسومات کو ختم کرنے والا ہے اور اب یہ نہیں ہوگا اور خط کے اندر ایک رقعہ بھیجا اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو لکھا میں نے خط کے اندر ایک رقعہ بھیجا ہے جب میرا خط تم تک پہنچے تو اسے نیل میں پھینک دینا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط حضرت عمرو بن عاص کو پہنچا تو انہوں نے وہ رقعہ لیا اور اسے کھولا تو اس میں یہ تحریر تھی: اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کی جانب سے نیل کے نام امابعد! اگر تو اپنی جانب سے چلتا ہے تو نہ چل اگر اللہ تعالیٰ تجھے چلاتا ہے تو ہم اللہ واحد قہار سے سوال کرتے ہیں کہ وہ تمہیں چلائے، کہا: حضرت عمرو بن عاص نے صلیب سے ایک دن پہلے وہ رقعہ نیل میں پھینک دیا جب کہ اہل مصر نے جلاوطنی اور وہاں سے نکل جانے کی تیاری کر لی تھی کیونکہ ان کے مصالح نیل سے ہی وابستہ تھے۔ جب حضرت عمرو بن عاص نے وہ رقعہ نیل میں پھینکا صلیب کے دن ان لوگوں نے صبح کی جب کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں اسے سولہ ہاتھ بڑھا دیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس سال سے اہل مصر سے اس طریقہ کو ختم کر دیا۔ کعب الاحبار نے کہا: چار دریا جنتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے جنہیں دنیا میں جاری فرمایا ہے سیحان، جیحان، نیل اور فرات۔ سیحان جنت میں پانی کا دریا ہے، جیحان جنت میں دودھ کا دریا ہے، نیل جنت میں شہد کا دریا ہے اور فرات جنت میں شراب کا دریا ہے۔ ابن لہیعہ نے کہا: دجلہ جنت میں دودھ کا دریا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سیحان، جیحان، نیل اور فرات تمام جنت کی نہریں ہیں''۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔ حدیث اسراء میں حضرت انس بن مالک، مالک بن صعصعہ جو انہیں کے قوم کے افراد میں سے تھے سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے بیان کیا کہ آپ نے چار دریا دیکھے ان کی اصل سے دو ظاہر دریا نکلتے ہیں اور دو باطنی دریا نکلتے ہیں۔ میں نے عرض کی: اے جبریل! یہ دریا کون سے ہیں؟ فرمایا: جہاں تک دو باطنی دریاؤں کا تعلق ہے تو دو دریا جنت میں ہیں جہاں تک دو ظاہری دریاؤں کا تعلق ہے وہ نیل اور فرات ہیں''۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔

امام بخاری نے شریک کی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: ''پس وہ آسمان دنیا میں دو دریا ہیں جو جاری ہوتے ہیں پوچھا: اے جبریل! یہ کون سے دریا ہیں؟ عرض کی: یہ نیل اور فرات ہے، پھر آپ آسمان میں تشریف لے گئے تو آپ ایک دریا پر تھے جس پر موتیوں اور زبرجد کا محل تھا آپ نے اپنا ہاتھ مارا تو وہ مرکب کستوری تھی۔ پوچھا: اے جبرئیل! یہ

کیا ہے؟ عرض کی: یہ وہی کوثر ہے جو تیرے رب نے تیرے لیے چھپا رکھی ہے"۔ حدیث کو ذکر کیا۔ جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ عیون سے مراد پانی کے چشمے ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد سونے کے چشمے ہیں۔ سورۂ دخان میں ہے کَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿﴾ وَّزُرُوْعٍ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مصر کے آغاز سے لے کر آخر تک دو پہاڑوں کے درمیان کھیتی باڑی کیا کرتے تھے سورۂ دخان میں وکنوز کا لفظ نہیں کنوز یہ کنز کی جمع ہے۔ سورۂ براءۃ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد خزائن ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دفائن ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد انہار ہیں، اس سے اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ چشمے ان پر مشتمل ہوتے ہیں۔

وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور مجاہد نے کہا: مقام کریم سے مراد منبر ہے۔ ہزار منبر ہزار جابر حکمرانوں کے لیے تھے جن پر بیٹھ کر وہ فرعون اور اس کی بادشاہت کی عظمت بیان کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ مراد رؤسا اور امراء کی مجالس ہیں؛ اسے ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے، یہ پہلے قول کے قریب ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد اچھے مسکن ہیں۔ ابن لہیعہ نے کہا: میں نے سنا ہے کہ مقام کریم سے مراد فیوم ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی مجالس میں سے ایک مجلس پر لکھا تھا لا الہ الا اللہ ابراهيم خليل الله اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے اس کا نام کریمہ رکھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد گھوڑوں کے تھان (اصطبل) ہیں کیونکہ زعماء انہیں سامان جنگ اور زینت کے طور پر باندھتے ہیں اس وجہ سے ان کا مقام سب سے معزز جگہ بن گئی؛ ماوردی نے اس کا ذکر کیا۔ اظہر یہ ہے کہ مراد اچھے مسکن ہیں جن کے سبب سے کرامت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لغت میں مقام سے مراد موضع ہے؛ یہ مصدر ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں مقام سے مراد موضع ہے یہ تیرے قول قام یقوم سے ماخوذ ہے اسی طرح مقامات اس کا واحد مقام ہے جس طرح شاعر نے کہا:

وفيهم مَقَاماتٌ حِسانٌ وجوهُهم وأنديةٌ ينتابُها القولُ والفعلُ

ان میں مقامات ہیں ان کے چہرے حسین ہیں اور مجلسیں ہیں جن میں قول اور فعل باری باری ہوتا ہے۔

مقام بھی مصدر ہے یہ قام یقوم کا مصدر ہے مقام ضمہ کے ساتھ اقام سے اسم ظرف ہے اس سے مصدر بھی اسی وزن پر آتا ہے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن جنات، عیون، کنوز اور مقام کریم کا ذکر کیا ہے یہ سب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ورثہ کے طور پر دیا ہے۔ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا: بنی اسرائیل فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد مصر کی طرف لوٹے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں وراثت سے مراد وہ ہے جو بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آل فرعون سے زیورات ادھار لیے تھے۔

میں کہتا ہوں: دونوں امور انہیں حاصل ہوئے، الحمد للہ۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 232

2۔ ایضاً مفہوم

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ فرعون اور اس کی قوم نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا۔ سدی نے کہا: جب سورج روشن ہوا۔ قتادہ نے کہا: جب زمین روشنی سے روشن ہوگئی۔ زجاج نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے شرقت الشمس جب وہ طلوع ہوا اشرقت جب وہ روشن ہو جائے۔ فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے میں کوئی دیری کی اس میں دو قول ہیں (۱) اس رات جوان کے نوجوان فوت ہوئے ان کو دفن کرنے میں مشغول ہو گئے تھے کیونکہ اس رات ان میں وبا پھیلی تھی۔ مُّشْرِقِيْنَ یہ قوم فرعون سے حال ہے (۲) بادل اور تاریکی ان پر سایہ فگن ہو گئی تھی انہوں نے کہا: ابھی رات ہے تاریکی ان سے نہ چھٹی یہاں تک کہ انہوں نے صبح کی۔ ابو عبیدہ نے کہا: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ کا معنی ہے مشرق کی جانب ان کا پیچھا کیا۔ حضرت حسن بصری اور عمرو بن میمون نے کہا: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ تشدید اور الف فاصل کے ساتھ، یعنی مشرق کی جانب، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے شرق و غرب۔ جب وہ مشرق اور مغرب کی طرف چلے۔ کلام کا یہ معنی ہوگا ہم نے مقدر کیا کہ بنی اسرائیل ان کے وارث بنیں تو قوم فرعون نے بنی اسرائیل کا مشرق کی جانب پیچھا کیا تو وہ سب ہلاک ہو گئے اور بنی اسرائیل ان کے ملکوں کے وارث بن گئے۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ دونوں جمعیتیں بالمقابل ہوئیں یہ فریق اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ رویۃ سے تفاعل کا وزن ہے قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ دشمن ہمارے قریب آ گیا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ جماعت کی قرأت لَمُدْرَكُوْنَ ہے یہ ادرك سے مشتق ہے، اسی سے حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (یونس:90) ہے۔ عبید بن عمر، اعرج اور زہری نے کہا: المدرکون دال مشدد ہے یہ ادرك سے مشتق ہے۔ فراء نے کہا: حفر اور احتفر ایک ہی معنی میں ہیں اسی طرح لمدرکون اور لمدّرکون ایک معنی میں ہیں۔ نحاس نے کہا: نحوی جو حذاق ہیں کہتے ہیں وہ اس طرح نہیں ہے۔ مدرَکون کہتے ہیں جن کو پیچھے سے آ کر ملا جائے۔ مدرّکون جن کو ملنے کی کوشش کی جائے، جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے کسبتُ یہ أصبتُ اور ظفرتُ کے معنی میں ہے اکتسبت یہ اجتهدت اور طلعت کے معنی میں ہے، یہ سیبویہ کے قول کا معنی ہے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ جب فرعون اپنے لشکر کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جمعیت کو جا ملا اور ان کے قریب ہو گیا بنی اسرائیل نے مضبوط دشمن اور اپنے سامنے سمندر دیکھا تو ان کے گمانات خراب ہو گئے۔ انہوں نے توبیخ اور جفا کے انداز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے قول کو رد کر دیا، انہیں جھڑکا اور الله تعالیٰ نے ہدایت اور کامیابی کا جو وعدہ کیا تھا وہ انہیں یاد دلایا۔ كَلَّا یعنی وہ تمہیں نہیں پکڑ سکتے۔ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ دشمن کے خلاف مدد کرنے میں میرا رب میرے ساتھ ہے۔ سَيَهْدِيْنِ وہ نجات کے راستہ کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔ جب بنی اسرائیل پر آزمائش عظیم ہو گئی اور انہوں نے ایسے لشکر دیکھے جن کا مقابلہ کرنے کی ان میں طاقت نہ تھی تو الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سمندر پر اپنا عصا مارے اس کی وجہ یہ تھی کہ الله تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ متصل ہو اور جو فعل حضرت موسیٰ علیہ السلام کریں اس کے ساتھ متعلق ہو ورنہ عصا کا مارنا سمندر کو پھاڑنے والا نہیں اور نہ ہی بالذات اس میں مددگار ہے مگر الله تعالیٰ کی قدرت اور اختراع اس کے ساتھ ملی۔ سمندر کا یہ قصہ سورۂ بقرہ میں

گزر چکا ہے۔ جب سمندر پھٹا تو بنی اسرائیل کے قبائل کے برابر اس میں بارہ راستے بن گئے اور پانی بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل میں رک گیا۔ طود سے مراد پہاڑ ہے۔ اسی معنی میں امرء القیس کا قول ہے۔

فبينا المرء في الاحياء طود　　رَماهُ الناس عن كَثَبٍ فمالا

آدمی قبائل میں پہاڑ تھا۔ اسود بن یعفر نے کہا:

حَلوا بأَنْقَرةٍ يَسِيلُ عليهم　　ماءُ الفُراتِ يجئ من أَطْوَادِ

وہ انقرہ میں اترے ان پر فرات کا پانی بہتا جو پہاڑوں سے آتا۔

الطواد یہ طود کی جمع ہے جس کا معنی پہاڑ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کے لیے سمندر میں خشک راستہ بن گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نکل گئے اور فرعون کے ساتھی سارے کے سارے اس میں داخل ہو گئے جس طرح سورۂ یونس میں گزرا ہے تو پانی رواں ہو گیا اور فرعون غرق ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک ساتھی نے کہا: فرعون جونہی غرق ہوا تو اس کو سمندر کے کنارے پھینک دیا گیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے دیکھا۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے تاجروں میں سے دو آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساحل سمندر کی طرف نکلے جب وہ سمندر تک پہنچے دونوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اللہ تعالیٰ نے تجھے کیسے حکم دیا؟ فرمایا: مجھے حکم دیا گیا کہ میں سمندر پر اپنا عصا ماروں تو وہ پھٹ جائے گا۔ دونوں نے عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے جو حکم دیا اس طرح کیجئے اللہ تعالیٰ تجھ سے وعدہ خلافی نہیں فرمائے گا۔ پھر ان دونوں نے تصدیق کی خاطر اپنے آپ کو سمندر میں پھینک دیا سمندر اسی طرح رہا یہاں تک کہ فرعون اور اس کے ساتھی اس میں داخل ہو گئے، پھر وہ سمندر اسی طرح ہو گیا جس طرح وہ تھا سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے، یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا۔ شاعر نے کہا:

وكلُّ يوم مَضَى أو ليلةٍ سَلَفَتْ　　فيها النفوسُ إلى الآجال تَزْدَلِفُ

ہر دن یا رات جو گزر گئے ہیں ان میں نفوس اپنی آجال تک جمع ہوتے رہیں گے۔

ابو عبیدہ نے کہا ازلفنا ہم کو جمع کیا۔ اسی وجہ سے مزدلفہ کی رات کو لیلۃ جمع کہتے ہیں۔ ابو عبداللہ بن حرث، ابی بن کعب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قراءت کی وازْلَقْنَا یعنی یہ قاف کے ساتھ ہے معنی ہے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا(1)۔ اسی سے یہ جملے بولے جاتے ہیں أزلقت الناقة، أزلقت الفرس فهي مزلق۔ جب وہ اپنے بچے کو پھینک دے۔ وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ، آخرین سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر علامت ہے۔

وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کیونکہ قوم فرعون میں سے آل فرعون کے مومن کے علاوہ کوئی ایمان نہیں لایا تھا اس کا نام حزقیل تھا اس کی بیٹی حضرت آسیہ تھی جو فرعون کی بیوی تھی اور اس کی بیٹی مریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی وہ بوڑھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 233

عورت تھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر پر آگاہ کیا تھا اس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو چاند ان پر تاریک ہو گیا۔ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا: یہ کیا ہوا؟ ان کے علماء نے بتایا: جب حضرت یوسف علیہ السلام کی موت کا وقت آیا تو آپ نے ہم سے پختہ وعدہ لیا کہ ہم مصر سے نہ نکلیں یہاں تک کہ ہم آپ کی ہڈیاں یہاں سے اپنے ساتھ منتقل کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم میں سے کون ان کی قبر کو جانتا ہے؟ بتایا بنی اسرائیل کی ایک بوڑھی کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا فرمایا: مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں ایسا نہ کروں گی یہاں تک کہ تو میری بات مانے۔ فرمایا: تیرا حکم و بات کیا ہے؟ اس نے عرض کی: میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں جنت میں تیرے ساتھ رہوں۔ یہ امر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناگوار ہوا۔ آپ سے عرض کی گئی: اس کے فیصلہ کو مان لو۔ اس بوڑھی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر پر ان کی راہنمائی کر دی لوگوں نے اس کی قبر کو کھودا، اس کی ہڈیاں نکالیں جب ان ہڈیوں کو اٹھا لیا تو راستہ یوں ہو گیا جس طرح روشن دن ہوتا ہے۔ ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کی کہ اس کو وعدہ دے دیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لیا وہ عورت بنی اسرائیل کو بحیرہ پر لے آئے۔ اس عورت نے لوگوں کو کہا: یہ پانی خشک کرو، انہوں نے پانی خشک کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں نکال لیں، تو ان کے لیے راستہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ یہ بحث سورۂ یوسف میں گزر چکی ہے۔ ابو بردہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی کے پاس فروکش ہوئے اس نے آپ کی تکریم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کوئی خدمت؟'' اس نے عرض کی: ایک اونٹنی جس پر میں سواری کروں اور ایک بکری جسے میں دوہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو بنی اسرائیل کی بوڑھی کی مثل ہونے سے کیوں عاجز آ گیا؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے عرض کی: بنی اسرائیل کی بوڑھیا کا کیا معاملہ ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بوڑھی عورت کا ذکر کیا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ جنت میں وہ ان کے ساتھ ہو گی (1)۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۞ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۞ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۞ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۞ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۞ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۞ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۞ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۞ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

''آپ بیان فرمائیے ان کے سامنے ابراہیم کا قصہ جب آپ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم تو پوجتے ہیں بتوں کو اور ہم انہی کی پوجا میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں۔ آپ نے پوچھا (بھلا یہ تو بتاؤ) کیا وہ سنتے ہیں تمہاری آواز جب تم انہیں پکارتے ہو یا وہ تمہیں (کچھ) نفع پہنچا سکتے

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 439، دار الکتب العلمیہ

ہیں یا ضرر پہنچا سکتے ہیں؟ انہوں نے (لاجواب ہوکر) کہا: بلکہ ہم نے تو پایا اپنے باپوں کو کہ وہ یونہی کیا کرتے تھے آپ نے فرمایا: کیا تم نے دیکھ لیا ان (کی بے بسی) کو جن کی تم پرستش کیا کرتے ہو تم اور تمہارے گزشتہ آباء واجداد پس وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے''۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ مشرکوں کو ان کی انتہائی جہالت پر آگاہ کیا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعتقاد و دین سے اعراض کرنے والے تھے جب کہ وہ ان کے جد اعلیٰ تھے۔ نَبَاَ کا معنی خبر ہے یعنی اے محمد! ان پر اس کی خبر، اس کی گفتگو اور قوم جن کی عبادت کرتی تھی اس پر عیب لگانے کو بیان کر دیجئے۔ یہ اس لیے فرمایا تا کہ ان پر حجت لازم کر دی جائے۔ جمہور قراء دوسرے ہمزے میں تخفیف کرتے ہیں، یہ بہترین توجیہ ہے، کیونکہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک کلمہ میں دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرتے ہیں جس طرح آدم۔ اگر تو چاہے تو دونوں کو ثابت رکھ اور تو کہے نَبَأَ اِبْرٰهِيْمَ اگر تو چاہے تو دونوں میں تخفیف کرلے تو کہہ لے نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ، اگر چاہے تو پہلے میں تخفیف کر لے۔ وہاں پانچویں توجیہ بھی ہے مگر یہ عربی میں بعید ہے کہ ہمزہ کو ہمزہ میں مدغم کر دیا جائے جس طرح جو آدمی سر بیچتا ہے اسے رأاس کہتے ہیں۔ یہ تعبیر بعید ہے کیونکہ تو دو ہمزوں کو جمع کر رہا ہے گویا وہ ایک کلمہ میں ہیں، فعال کے وزن میں یہ اچھا ہے کیونکہ وہ مدغم میں آتا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ یعنی تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا ان کے بت سونے، چاندی، پیتل، لوہے اور لکڑی کے ہوتے تھے۔

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ہم ان کی عبادت پر قائم رہیں گے مراد وقت معین نہیں بلکہ جس کام میں وہ مصروف تھے اس کی خبر دی جارہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دن کو عبادت کرتے تھے رات کو عبادت نہیں کرتے تھے۔ وہ رات کے وقت ستاروں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ظل یفعل کذا۔ جب وہ دن کو کام کرے۔ بات یفعل کذا۔ جب رات کو کوئی عمل کرے۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اخفش نے کہا: اس میں حذف ہے معنی ہے کیا وہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ یا کیا وہ تمہاری دعا سنتے ہیں؟ یعنی تقدیر کلام یہ ہے هل يسمعون دعاء كم۔ شاعر نے کہا:

القائد الخَيْلَ مَنْكُوبًا دَوابِرُهَا قد أُحْكِمَتْ حَكَمَاتِ القِدِّ والأَبْقَا

کہا اَبق سے مراد کتان (السی کا پودا) ہے یہاں حذف ہے اصل ہے أحكمت حكمات الأبق۔ صحاح میں ہے ابق جب حرکت کے ساتھ ہو تو اس سے مراد قِنَّب (ایک درخت جس کی چھال سے رسی بنائی جاتی ہے)۔ قتادہ سے مروی ہے انہوں نے قراءت کی هَلْ يُسْمِعُونَكُمْ یاء پر ضمہ ہے یعنی کیا وہ تمہیں اپنی آوازیں سناتے ہیں؟

اِذْ تَدْعُوْنَ ۙ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ کیا یہ بت تمہیں نفع پہنچاتے ہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں یا اگر تم نافرمانی کرو تو تمہارے لیے خیر اور شر کے مالک ہیں؟ یہ استفہام حجت ثابت کرنے کے لیے ہے جب وہ تمہیں نفع اور نقصان نہیں دے سکتے تو پھر تمہارا ان کی عبادت کا کیا مقصد ہے؟

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ وہ حجت اور دلیل کے بغیر تقلید کی طرف پھر گئے؛ اس کے بارے میں گفتگو

پہلے گزر چکی ہے۔

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ۔ قَالَ میں ضمیر سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں مَّا سے مراد یہ بت ہیں۔ الْاَقْدَمُوْنَ سے مراد پہلے ہیں۔ عدو واحد کا صیغہ ہے جماعت کا معنی دیتا ہے اسی طرح عورت کے لیے کہا جاتا ہے: ھی عدو اللہ و عدوۃ اللہ۔ فراء نے دونوں کا ذکر کیا ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: جس نے عدوۃ اللہ کہا اور ھاء کو ثابت رکھا تو اس نے کہا یہ معادیۃ کے معنی میں ہے۔ جس نے مونث اور جمع کے لیے عدو کا لفظ ذکر کیا اس نے اسے نسبت کے معنی میں لیا اور جماد کی صفت عداوت سے لگائی معنی ہوگا اگر میں نے ان کی عبادت کی تو یہ قیامت کے روز میرے دشمن ہوں گے، جس طرح فرمایا: كَلَّا ؕ سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ (مریم) فراء نے کہا: یہ مقلوب میں سے ہے اس کا معنی ہوگا میں ان کا دشمن ہوں کیونکہ تو جس سے دشمنی کرے وہ تجھ سے دشمنی کرے گا۔ پھر فرمایا: اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ کلبی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے الا من عند رب العالمین، إلا عابد رب العالمین مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: نحویوں نے کہا یہ اوّل سے مستثنیٰ نہیں۔ ابو اسحاق نے اجازت دی کہ یہ اوّل کلام سے مستثنیٰ ہو اس معنی پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے ساتھ بتوں کی عبادت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر جس کی وہ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے مبرا ہے۔ فراء نے اس کی تاویل صرف اصنام سے کی ہے اس کے نزدیک معنی ہے اگر میں ان کی عبادت کروں تو قیامت کے روز وہ میرے دشمن ہوں گے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ جرجانی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے أفرایتم ما کنتم تعبدون أنتم و آباء کم الأقدمون إلا رب العالمین فإنھم عدولی۔ اور یہ سوی اور دون کے معنی میں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (الدخان: 56) یہاں بھی اِلَّا، دون کے معنی میں ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾

”جس نے مجھے پیدا فرمایا پھر (ہر قدم پر) وہ میری رہنمائی کرتا ہے اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور مجھے پلاتا بھی ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت بخشتا ہے اور وہ جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بخش دے گا میرے لیے میری خطا روز جزا کو“۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ یعنی دین کی طرف میری رہنمائی کرتا ہے۔ وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ یعنی وہ مجھے رزق دیتا ہے هُوَ ضمیر کا دخول اس امر پر تنبیہ ہے کہ اس کے سوا نہ کوئی کھلاتا ہے اور نہ پلاتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: زید ھو الذی فعل کذا یعنی زید کے علاوہ کسی نے ایسا عمل نہیں کیا۔ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ حضرت ابراہیم نے مَرِضْتُ ادب کی رعایت کرتے ہوئے کہا ورنہ مرض اور شفا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اس کی مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم کا قول ہے

وَ مَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ (الکہف:63)

وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ احیاء سے مراد بعث ہے وہ موت کو اسباب کی طرف منسوب کرتے اللہ تعالیٰ نے اس امر کو واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی موت اور زندگی عطا کرتی ہے۔ سب (یھدین اور یشفین) یاء متکلم کے بغیر ہیں کیونکہ آیات کے سروں کا حذف اچھا ہے تا کہ سب متفق ہو جائیں۔ ابن ابی اسحاق نے اپنی جلالت اور لغت عربی میں اپنے مقام کے اعتبار سے سب میں یاء متکلم پڑھی ہے کیونکہ یاء اسم ہے نون علت کی وجہ سے داخل ہوئی۔ اگر یہ سوال کیا جائے یہ تو تمام مخلوق کی صفت ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کیسے ہدایت پر دلیل بنایا ہے اور کسی غیر نے اس سے ہدایت نہ پائی؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے ذکر کیا تا کہ طاعت کے وجوب پر استدلال کریں کیونکہ جو انعام کرے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے تا کہ اس نے جس چیز کو خود پر لازم کیا ہے وہ بھی اس پر لازم ہو جائے۔ یہ صحیح الزامی دلیل ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض اہل اشارات نے پوشیدہ معانی مراد لیے ہیں، جو ہم نے معانی ذکر کیے ہیں ان سے عدول کیا ہے بداہت عقل جس کا انکار کرتی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد ہے۔ کہا: وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ وہ مجھے ایمان کی لذت چکھاتا ہے اور قبول کی حلاوت پلاتا ہے ان کے نزدیک وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ میں دو وجوہ ہیں (۱) جب میں اس کی مخالفت کے ساتھ مریض ہوتا ہوں تو وہ اپنی رحمت کے ساتھ مجھے شفا دیتا ہے (۲) جب میں مخلوق کی سختی کے ساتھ مریض ہوتا ہوں تو مشاہدہ حق کے ساتھ مجھے شفا عطا کرتا ہے۔ امام جعفر بن محمد صادق نے کہا: جب میں گناہوں کے ساتھ مریض ہوتا ہوں تو وہ توبہ کے ساتھ مجھے شفا عطا کرتا ہے (1)۔ انہوں نے وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔ (۱) جو معاصی کے ساتھ موت عطا کرتا ہے طاعات کے ساتھ مجھے زندہ کرتا ہے (۲) خوف کے ساتھ مجھے موت عطا کرتا ہے رجا کے ساتھ مجھے زندہ کرتا ہے (۳) طمع کے ساتھ مجھے موت عطا کرتا ہے اور قناعت کے ساتھ مجھے زندہ کرتا ہے۔ (۴) وہ عدل کے ساتھ موت عطا کرتا ہے اور فضل کے ساتھ مجھے زندہ کرتا ہے (۵) فراق کے ساتھ مجھے موت عطا کرتا ہے اور ملاقات کے ساتھ مجھے زندہ کرتا ہے (۶) جہالت کے ساتھ مجھے موت عطا کرتا ہے اور عقل عطا فرما کر زندہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو آیت کی مراد نہیں۔ یہ مخفی تاویلات اور باطنی امور اس آدمی کے لیے ہیں جو حاذق ہو اور حق کو پہچانتا ہو، جو حق سے اندھا ہو اور حق کو نہ پہچانتا ہو تو اس کے لیے امور باطنہ کی طرف کیسے اشارہ کیا جا سکتا ہے اور ظاہر امور کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ محال ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ الَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـٴَـتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ، اَطْمَعُ کا معنی ہے میں امید کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آپ کے حق میں یقین کے معنی میں ہے اور آپ کے علاوہ تمام مومنوں کے حق میں رجا کے معنی میں ہے۔ حضرت حسن بصری اور ابن ابی اسحاق نے خطایای قراءت کی ہے کہا: یہ ایک خطا نہیں۔ نحاس نے کہا: خطیئة کلام عرب میں خطایا میں معروف ہے۔ علماء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (الملک: 11) میں واحد پر اتفاق کیا ہے اس کا معنی ذنوب ہے۔ اسی طرح وَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 235

أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ:43) اس کا معنی الصلوات ہے اسی طرح خطیئتی ہے یہ خطایا کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مجاہد نے کہا: خطیئة سے آپ کا یہ قول ہے بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا (الانبیاء:63) اور ان کا قول: اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ (الصافات) اور ان کا قول: سارہ ان کی بہن ہے۔ حضرت حسن بصری نے اس کا اضافہ کیا ہے کہ ان کا قول جو ستاروں کے بارے میں ہے ھذا ربی یہ میرا رب ہے، اس کی مفصل وضاحت گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا: انبیاء بشر ہیں یہ جائز ہے کہ ان سے خطا واقع ہو ہاں کبیرہ گناہ جائز نہیں کیونکہ وہ کبیرہ گناہ سے معصوم ہیں۔ يَوْمَ الدِّيْنِ، یوم جزا؛ جہاں بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے اظہار عبودیت ہے اگرچہ آپ کو علم تھا کہ آپ بخشے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتا کیا یہ امر اس کے لیے نافع ہوگا؟ فرمایا: ''اسے نفع نہ دے گا کیونکہ اس نے اس وقت نہیں کہا تھا رب اغفرلی خطیئتی یوم الدین اے میرے رب قیامت کے روز میرے گناہ بخش دینا''(1)۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَ اغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

''اے میرے رب! عطا فرما مجھے علم وعمل (میں کمال) اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ اور بنا دے میرے لیے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں اور بنا دے مجھے ان لوگوں سے جو نعمت والی جنت کے وارث ہیں اور بخش دے میرے باپ کو وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور نہ شرمسار کرنا مجھے جس روز لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلب سلیم''۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ حکم سے مراد تیری، تیری حدود اور تیرے احکام کی معرفت ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔ مقاتل نے کہا: مراد فہم اور علم ہے؛ یہ بھی پہلی تعبیر کی طرف راجع ہے۔ کلبی نے کہا: مراد نبوت اور مخلوق کی طرف رسالت ہے۔ وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ مجھ سے قبل جو انبیاء ہو گزرے ہیں درجہ میں ان کے ساتھ لاحق کر دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بِالصّٰلِحِيْنَ سے مراد اہل جنت ہیں یہ هَبْ لِيْ حُكْمًا کی تاکید ہے۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد تمام امتوں کا اس پر مجتمع ہونا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد اچھی تعریف ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ لِسَانَ صِدْقٍ سے مراد ثناء، ہمیشہ کے لیے اچھا مقام ومرتبہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کیا۔ ہر امت آپ سے تمسک کرتی ہے اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی الکفر لاینفعہ عمل، جلد 1، صفحہ 115، قدیمی کتب خانہ

آپ کی عظمت بیان کرتی ہے وہ اسی دین حنیف پر تھے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے۔ مکی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال کرنا ہے کہ آپ کی اولاد میں آخر زمانہ میں وہ افراد ہوں جو حق کو قائم کریں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں آپ کی دعا قبول کی گئی (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اچھا معنی ہے مگر آیت کا لفظ یہ معنی عطا نہیں کرتا مگر اس صورت میں کہ لفظ پر اپنی مرضی سے حکم لگایا جائے۔ قشیری نے کہا: مراد قیامت تک اچھی دعا ہے کیونکہ ثواب کی زیادتی ہر ایک کے حق میں مطلوب ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے ایسا کر دیا کیونکہ کوئی فرد بھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں درود پیش کرتا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی درود پڑھتا ہے، خصوصاً نمازوں میں درود پڑھتا ہے اور منبروں پر بیٹھ کر بھی درود پڑھا جاتا ہے جو تمام حالات سے افضل اور تمام درجات سے افضل ہے۔ صلاۃ سے مراد رحمت کی دعا ہے لسان سے مراد قول ہے اس کا اصل معنی زبان ہے۔ قتبی نے کہا: لسان کا لفظ قول کی جگہ استعارہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات عرب اس لفظ کو کلمہ کی جگہ کنایہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اعشی نے کہا:

إِنِّی أَتَتْنِی لِسَانٌ لَا أُسَرُّ بِهَا		مِنْ عَلُوٍ لَا عَجَبٌ وَلَا سَخَرُ

جوہری نے کہا: علو کا لفظ واؤ کے ضمہ، فتحہ اور کسرہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے یعنی مجھے اوپر سے خبر پہنچی جس سے میں خوش نہیں ہوتا نہ تعجب ہے اور نہ ہی مذاق ہے۔ أتتنی میں تانیث کلمہ کی وجہ سے ہے۔ اس تک اس کے بھائی منتشر کے قتل کی خبر پہنچی تھی۔ اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک انسان اس کو پسند کرے کہ صالح کی حیثیت سے اس کی تعریف کی جائے اور صالحین کے عمل میں اس کو دیکھا جائے؛ جب وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ (سورہ طٰہٰ: 39) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۝ (مریم) یعنی اپنے بندوں کے دلوں میں محبت اور اچھی تعریف ڈال دے پھر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ اس پر متنبہ فرمایا: وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ کہ جو چیز ذکر جمیل کا وارث بنائے اس کو حاصل کرنا مستحب ہے۔ لیث بن سلیمان نے کہا: اس سے مراد دوسری زندگی ہے۔ یہ کہا گیا:

قد مات قومٌ وهُمْ فی النَّاس أحیاءُ

لوگ مر گئے جب کہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

ابن عربی نے کہا: زید کے شیوخ میں سے محققین نے کہا: اس سے ایسے عمل صالح پر ترغیب ہے جو اچھی تعریف کا باعث ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل منقطع نہیں ہوتے (2)''

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 235

2۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ، جلد 2، صفحہ 41، قدیمی کتب خانہ

ایک روایت میں ہے اسی طرح درخت لگانا اور کھیتی کاشت کرنا ہے اسی طرح وہ شخص جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو جائے تو اس کا عمل قیامت تک لکھا جاتا رہتا ہے؛ ہم نے اس کی وضاحت سورۂ رعد کے آخر میں بیان کی ہے۔ الحمدللہ

**وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ** جنت اور جو جنت کا وارث بنے اس کی دعا ہے، یہ ارشاد ان بعض لوگوں کا رد کرتا ہے جو یہ کہتا ہے: میں جنت کا سوال کرتا ہوں اور نہ جہنم سے بچنے کا سوال کرتا ہوں۔

**وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ** ان کے باپ نے ظاہر میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ایمان لے آئے گا تو آپ نے اس کے حق میں مغفرت کی التجا کی جب یہ واضح ہو گیا کہ اس نے جو کہا اس کو پورا نہ کیا تو اس سے براءت کر لی۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے **الضَّآلِّيْنَ** سے مراد مشرک ہے اور **كَانَ** زائدہ **وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ** یعنی لوگوں کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا یا مجھے قیامت کے روز عذاب نہ دینا۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام باپ کو قیامت کے روز دیکھیں گے جب کہ ان پر غبار ہو گا'' غبرہ ہی قترہ ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے ملیں گے وہ عرض کریں گے: اے میرے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا کہ تو مجھے قیامت کے روز غمگین نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں نے کافروں پر جنت حرام کر دی ہے(1)''۔ امام بخاری ان دونوں روایات کو روایت کرنے میں منفرد ہیں۔

**يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ** یوم، پہلے یوم سے بدل ہے یعنی جس روز مال اور بیٹے کسی کو کوئی نفع نہ دیں گے۔ یہاں **بَنُوْنَ** سے مراد مددگار ہیں کیونکہ جب بیٹا نفع نہیں دیتا تو اور کب نفع دے گا؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بیٹوں کا ذکر کیا کیونکہ حضرت ابراہیم کے والد کا ذکر گزر چکا ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے کچھ نفع نہ دیں گے۔

**اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ** یہ الکافرین سے مستثنیٰ ہے یعنی اس کا مال اور اس کے بیٹے اسے نفع نہ دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ غیر جنس سے استثناء ہے۔ معنی ہو گا لیکن جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آیا تو اسے نفع دے گا۔ قلب کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ جس کا دل سلیم ہو تو اس کے اعضاء بھی سلیم ہو جاتے ہیں اور جب وہ فاسد ہو جائے تو باقی اعضاء بھی فاسد ہو جاتے ہیں؛ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ قلب سلیم کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ شک اور شرک سے پاک ہے جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے کوئی بھی ان سے محفوظ نہیں؛ یہ قتادہ، ابن زید اور اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: قلب سلیم سے مراد صحیح ہے یہ مومن کا دل ہے کیونکہ کافر اور منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** (البقرہ:10) ابو عثمان نیساپوری نے کہا: اس سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے خالی ہو اور سنت پر مطمئن ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ مال اور بیٹوں کی آفت سے محفوظ ہو۔ جنید نے کہا: لغت میں سلیم اسے کہتے ہیں جسے کسی چیز نے ڈسا ہو(2)۔ اس کا معنی ہے وہ ایسا دل ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے ڈسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً، جلد 1، صفحہ 473، وزارت تعلیم

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 235

ہوئے انسان کی طرح ہے۔ ضحاک نے کہا: سلیم سے مراد خالص ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول اپنے عموم کی وجہ سے مختلف اقوال کو جامع ہے یہ اچھا قول ہے یعنی یہ دل اوصاف ذمیمہ سے پاک اور اوصاف جمیلہ سے متصف ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ عروہ سے مروی ہے فرمایا: اے میرے بیٹو! لعنت کرنے والے نہ بنو کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی بھی لعنت نہ کی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (صافات)

محمد بن سیرین نے کہا: قلب سلیم یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور قیامت قائم ہونے والی ہے اور قبروں میں جو بھی ہیں سب کو اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں اقوام داخل ہوں گی ان کے دل پرندوں کے دلوں کی طرح ہوں گے (1)'' اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ ارادہ کیا: وہ ہر گناہ سے خالی ہوں گے یا ہر عیب سے محفوظ ہوں گے، دنیا کے امور کی انہیں کچھ خبر نہ ہوگی، جس طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے: ''اکثر جنتی بلہ ہوں گے'' یہ حدیث صحیح ہے، جو معاصی سے پاک ہوں گے۔ ازہری نے کہا: یہاں بلہ سے مراد وہ ہے جس کو بھلائی پر پیدا کیا گیا وہ شر سے غافل ہو وہ شر کو پہچانتا ہی نہیں۔ قتبی نے کہا: البلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر سینوں کی سلامتی غالب ہو اور انہیں لوگوں کا حسن ظن حاصل ہو۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''اور قریب کر دی جائے گی جنت پرہیزگاروں کے لیے اور ظاہر کر دی جائے گی دوزخ بہکنے والوں کے لیے اور کہا جائے گا انہیں کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم پوجا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کیا وہ تمہاری (کچھ) مدد کر سکتے ہیں یا انتقام لے سکتے ہیں پس اوندھے پھینک دیئے جائیں گے اس میں وہ اور دوسرے گمراہ اور ابلیس کی ساری فوجیں، وہ کہیں گے اس حال میں کہ وہ دوزخ میں باہم جھگڑ رہے ہوں گے خدا کی قسم! ہم کھلی گمراہی میں گرفتار تھے جب ہم تمہیں رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے اور نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر (ان ناکی) مجرموں نے تو

1۔ صحیح مسلم، باب فی صفۃ الجنۃ، جلد 2، صفحہ 380

(آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی اور نہ کوئی غمخوار دوست پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا (دنیا میں) واپس جانا تو ہم اہل ایمان سے ہوتے بے شک اس واقعہ میں (عبرت) کی نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے اور (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ یعنی جنت قریب کردی گئی تا کہ وہ اس میں داخل ہوں۔ زجاج نے کہا: ان کا اس میں داخل ہونا قریب ہو گیا۔ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ اور جہنم ظاہر کردی گئی لِلْغٰوِيْنَ ان کافروں کے لیے ہے جو ہدایت سے گمراہ ہوئے، یعنی جہنم جہنمیوں کے لیے ان کے داخل ہونے سے پہلے ظاہر کردی جائے گی یہاں تک کہ وہ خوف اور حزن محسوس کریں گے جس طرح جنتی خوشی محسوس کریں گے کیونکہ انہیں علم ہوگا کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت اور شریک ہیں۔ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ کیا وہ الله تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لیے تمہاری مدد کریں گے۔ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ یا اپنے لیے انتقام لے سکتے ہیں، یہ سب توبیخ کے طریقہ پر ہے۔ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا انہیں جہنم میں ان کے سروں کے بل گرا دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے بعض کو بعض پر پھینک دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں جمع کیا جائے گا۔ یہ کبکبہ سے ماخوذ ہے جس سے مراد جماعت ہے؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ کواکب الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی اس کا بڑا حصہ ہے۔ گھوڑوں کی جماعت کو کوکب اور کبکبہ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں جمع کیا گیا اور جہنم میں پھینک دیا گیا۔ مجاہد نے کہا: انہیں گڑھے میں پھینکا گیا۔ مقاتل نے کہا: انہیں پھینکا گیا۔ معنی ایک ہی ہے تو کہتا ہے: دھورث الشیء جب تو اسے جمع کرے پھر اسے گڑھے میں پھینک دے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھوید ھور اللقم وہ لقمے کو گھماتا ہے یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب وہ لقمے کو بڑا کرے۔ دعا میں یہ جملہ بولا جاتا ہے: کتب الله عدو المسلمین، اکبہ نہیں کہا جاتا کبکبہ یعنی اسے منہ کے بل گرایا اور اسے الٹ دیا۔ اسی معنی میں الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا اصل کببوا تھا درمیانی باء کو ثقل کی وجہ سے کاف میں بدل دیا کیونکہ تین باء جمع ہو گئے تھے۔ سدی نے کہا: کبکبوا میں ضمیر مشرکین عرب کے لیے ہے: وَالْغَاوُنَ مراد معبود ہیں۔

وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ جو اس کی ذریت میں سے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے اسے بتوں کی عبادت کی دعوت دی تو اس نے اس کی پیروی کی۔ قتادہ، کلبی اور مقاتل نے کہا: الْغَاوُنَ سے مراد شیاطین ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آگ میں پھینکے جائیں گے، وہ لوہے اور تانبے کے ہوں گے تا کہ ان کے ساتھ غیروں کو عذاب دیا جائے۔ قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ وہ اس میں جھگڑ رہے ہوں گے مراد انسان، شیاطین، گمراہ اور معبود باطلہ۔ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ وہ الله تعالیٰ کی قسم اٹھائیں گے ہم خسارہ، ہلاکت اور حق سے واضح حیرت میں تھے جب ہم نے الله تعالیٰ کے ساتھ اور معبود بنا لیے تو ہم نے ان کی عبادت کی جس طرح ان کی عبادت کی جاتی تھی، یہی اس ارشاد کا معنی ہے۔ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی ہم تمہیں عبادت میں رب العالمین کے ساتھ برابر کرنے والے ہیں اب تم نہ ہماری مدد کی طاقت رکھتے ہو اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہو۔ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ مجرموں سے مراد شیاطین ہیں جنہوں نے ہمارے لیے بتوں کو مزین کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد

ہمارے اسلاف ہیں جن کی ہم نے تقلید کی۔ ابوالعالیہ اور عکرمہ نے کہا: مجرمون سے مراد ابلیس اور حضرت آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا جس نے قتل کیا تھا دونوں وہ پہلے افراد ہیں جنہوں نے کفر، قتل اور مختلف قسم کے معاصی کی سنت قائم کی۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ہمارے کوئی شفیع نہیں فرشتوں میں سے، انبیاء میں سے اور مومنوں میں سے۔ وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ اور نہ کوئی مشفق دوست ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: بھلائیوں کو لازم پکڑو کیونکہ وہ دنیا و آخرت کا سامان ہیں کیا تو جہنمیوں کا قول نہیں سنا: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ ۔ زمخشری نے کہا: شافع کی جمع ذکر کی کیونکہ شفاعت کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور صدیق کو واحد ذکر کیا کیونکہ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ انسان جب ظالم کے ظلم کا شکار ہو تو اس کے شہر کی بڑی جماعت اس کی سفارش کے لیے جاتی ہے مقصد اس پر رحم و شفقت کا اظہار ہوتا ہے اگرچہ اکثر کو پہلے اس کی پہچان تک نہ ہو جہاں تک صدیق کا تعلق ہے وہ وہ ہوتا ہے جو تیری محبت میں سچا ہوتا ہے اسے وہ چیز غمگین کرتی ہے جو تجھے غمگین کرتی ہے۔

ایک حکیم سے مروی ہے اس سے صدیق کا معنی پوچھا گیا۔ اس نے کہا: یہ ایسا اسم ہے جس کا کوئی معنی نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ صدیق سے مراد جمع اور قریبی و خاص حمایتی ہو، اسی سے حامة الرجل ہے یعنی اس کے قریبی۔ اس کی اصل حمیم ہے اس سے مراد گرم پانی ہے اسی سے حما اور حمی ہے حامة الرجل سے مراد وہ لوگ ہیں انہیں وہ جلائے جو اسے جلائے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: یحزنهم مایحزنه، یعنی انہیں وہ چیز غمگین کرتی ہے جو اسے غمگین کرتی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: حم الشیء و أحم جب وہ قریب ہو جائے۔ اسی سے حمی ہے کیونکہ یہ موت کے قریب کر دیتا ہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا: قریبی کو حمیم کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ساتھی کے غصہ کی وجہ سے حمیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اسے حمیت سے ماخوذ مانا ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز صدیق کی محبت اور حمیم کی رقت ختم کر دے گا۔ لا صدیقٌ حمیمٌ مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ اس کا عطف مِنْ شَافِعِيْنَ کے محل پر ہے کیونکہ مِنْ شَافِعِيْنَ کا محل رفع ہے۔ صدیق کی جمع اصدقاء، صدقاء اور صداق ہے صُدُق نہیں کہا جاتا تاکہ نعت اور غیر میں فرق کیا جائے۔ کوفیوں نے کہا: اس کی جمع صدقان بھی آتی ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ یہ ایسی جمع ہے جو نعت نہیں۔ جس طرح رغیف کی جمع رغفان آتی ہے۔ انہوں نے صدیق کی جمع اصادق بیان کی ہے۔ افاعل یہ افعل کی جمع ہے جب وہ نعت نہ ہو۔ جس طرح اشجع کی جمع اشاجع آتی ہے۔ صدیق کا لفظ واحد، جمع اور عورت کے لیے بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نَصَبْنَ الهواءَ ثم ارتمین قلوبَنا  بأعيُنِ أعْدَاءٍ وهُنَّ صَدِيق

محل استدلال هن صدیق ہے۔ هن جمع مونث کی ضمیر ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان صدیقی، فلاں میرا خاص دوست ہے۔ مدح کے لیے تصغیر بنائی ہے۔ جس طرح حباب بن منذر کا قول ہے: أنا جُذَيْلُها المحكّك و عُذَيقُها المرَجَّب محل استدلال جذیل اور عذیق ہے۔ جوہری نے اس کو ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: حمیم کی جمع احماء اور أَحِمَّة ہے تضعیف کے لیے افعلاء کے وزن کو مکروہ جانا ہے۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً، ان محل رفع میں ہے اگر ہمارا دنیا کی طرف لوٹنا ہوتا تو ہم ایمان لاتے یہاں تک کہ ہمارے بھی شفیع ہوتے۔ انہوں نے اس وقت تمنا کی جب تمنا کوئی نفع نہیں دے گی۔ انہوں نے یہ بات اس وقت کی جب فرشتوں اور مومنوں نے شفاعت کی۔ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''انسان جنت میں کہے گا جہنم میں فلاں اور اس کے دوست کا کیا معاملہ ہے وہ لگا تار اس کی سفارش کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اس کی سفارش قبول کر لے گا۔ جب وہ نجات پا جائے گا تو مشرک کہیں گے۔ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿ وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ ''

حضرت حسن بصری نے کہا: کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کے ذکر پر جمع نہیں ہوتی جن میں کوئی جنتی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان سب میں اس کی شفاعت قبول کر لیتا ہے اہل ایمان ایک دوسرے کی شفاعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے ہوتے ہیں اور ان کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔ کعب نے کہا: دو آدمی دنیا میں دوست تھے ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے پاس سے گزرے گا جب کہ اسے جہنم کی طرف کھینچا جا رہا ہوگا، اس کا بھائی اسے کہے گا: اللہ کی قسم! میری صرف ایک نیکی رہ گئی ہے جس کے ساتھ میں نجات پا سکتا ہوں تو وہ نیکی لے لے، اے میرے بھائی! میرا خیال ہے تو اس کے ساتھ (جہنم سے) نجات پا جائے گا، پھر میں اور تو اصحاب اعراف میں رہیں گے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں کے بارے میں حکم دے گا تو وہ دونوں جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

''جھٹلایا قوم نوح نے (اللہ کے) رسولوں کو۔ جب کہا انہیں ان کے بھائی نوح نے: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری فرمانبرداری کرو اور میں طلب نہیں کرتا تم

سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے پس تم ڈرو اللہ سے اور میری پیروی کرو۔ انہوں نے کہا: کیا ہم (قوم کے رئیس) ایمان لائیں تجھ پر حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کر رہے ہیں آپ نے فرمایا: مجھے کیا خبر کہ وہ کس نیت سے ایمان لائے ہیں ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے اگر تمہیں (حقیقت کا) شعور ہے اور نہیں ہوں میں دور بھگانے والا (غریب و مسکین) مومنوں کو نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا۔ ان (مغروروں) نے کہا: اے نوح! اگر تم باز نہ آئے (تو یاد رکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔ آپ نے عرض کی: میرے مالک! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے پس تو فیصلہ فرما دے میرے اور ان کے درمیان جو قطعی ہو اور (اپنے عذاب سے) نجات دے مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں اہل ایمان سے، پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو آپ کے ہمراہ اس کشتی میں تھے جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی پھر ہم نے غرق کر دیا اس کے بعد پیچھے رہ جانے والوں کو۔ یقیناً اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر ایمان لانے والے۔ اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ فرمایا جب کہ قوم مذکر ہے کیونکہ مراد ہے كذبت جماعة قوم نوح۔ الْمُرْسَلِيْنَ فرمایا کیونکہ جس نے ایک رسول کو جھٹلایا اس نے تمام رسل کو جھٹلایا کیونکہ ہر رسول تمام رسولوں کی تصدیق کا حکم دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کے نبی ہونے اور ان کے بعد رسولوں کے آنے کی جو خبر دی اس کو جھٹلایا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جنس کا ذکر کیا مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں سورۂ فرقان میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ ان کے جد اعلیٰ کے بیٹے، وہ ان کے نسبی بھائی تھے دینی بھائی نہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مجانست کی اخوت تھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (ابراہیم) سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عربوں کے قول سے ہے یا اخا بنی تمیم وہ ان میں سے ایک فرد مراد لیتے۔ اسی معنی میں حماسہ کا شعر ہے:

لا يَسْألونَ أخاهم حِينَ يَنْدُبُهم ۔۔۔ في النّائباتِ على ماقال بُرْهَانا

ان کا بھائی مصیبتوں میں جب انہیں مدد کے لیے بلاتا ہے تو اس سے کسی دلیل کا سوال نہیں کرتے۔

اَلَا تَتَّقُوْنَ وہ بتوں کی عبادت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہیں جو پیغام حق سنا رہا ہوں اس میں سچا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے درمیان امین ہوں، کیونکہ اس سے قبل وہ آپ کی امانت اور صدق کو جانتے تھے، جس طرح قریش میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو اس کے عقاب سے پردہ بنا دو۔ وَاَطِیْعُوْنِ میں تمہیں ایمان کا جو حکم دیتا ہوں اس میں میری اطاعت کرو۔ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ میرا تم میں کوئی طمع نہیں۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میری جزا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ تاکید کے لیے کلام کو مکرر ذکر کیا۔

**قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ**

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** **قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ** انہوں نے کہا: کیا ہم آپ کے قول کی تصدیق کریں۔ **وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ** واؤ حالیہ ہے اس میں قد ہے تقدیر کلام یہ ہے وقد اتبعك، الارذلون، یہ ارذل کی جمع ہے جمع مکسر اراذل مونث رذلی اس کی جمع رذل ہے۔ نحاس نے کہا: جن نحویوں کو ہم جانتے ہیں ان میں سے کسی کے نزدیک بھی اس میں سے الف لام کا حذف جائز نہیں۔ حضرت ابن مسعود، ضحاک، یعقوب حضرمی اور قراء نے اسے وانما اتباعك الأرذلون پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ اچھی قراءت ہے اس واؤ کے بعد اکثر اسماء آتے ہیں اور افعال قد کے بعد آتے ہیں اتباع یہ تبع اور تبیع کی جمع ہے یہ لفظ واحد اور جمع کے لیے آتا ہے۔ شاعر نے کہا:

له تَبَعٌ قد يعلمُ النّاسُ أنّه    على من يُدانِ صَيِّفٌ ورَبِيعُ

محل استدلال له تبع ہے یعنی اس کے پیروکار ہیں۔

اتباعك پر رفع مبتدا ہونے کی وجہ سے جائز ہے الارذلون خبر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی انومن لك وانما اتباعك الارذلون یہ بھی جائز ہے انومن، لك کی ضمیر پر معطوف ہو تقدیر کلام یہ ہوگی انؤمن لك نحن واتباعك الارذلون فنعد منهم، لك کے ساتھ فصل بہت اچھا ہے، سورۂ ہود میں اراذل کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے ہم یہاں مزید وضاحت کرتے ہیں اور یہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو لوگ ان پر ایمان لائے وہ ان کے بیٹے، گھر کی عورتیں اور ان کے پوتے تھے اس میں اختلاف ہے کہ کیا ان کے ساتھ کوئی اور تھا یا نہیں تھا کوئی بھی صورت ہو وہ سب صالح تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی: **وَّ نَجِّنِیْ وَ مَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ** جو آپ کے ساتھ تھے وہی آپ کے پیروکار تھے کافروں کے قول سے نہ انہیں شین لاحق ہوا اور نہ ہی مذمت لاحق ہوئی بلکہ ارذل ہی ان کی تکذیب کرنے والے تھے۔ سہیلی نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو قول روایت کیا گیا ہے اس سے بہت سے عوام نے دھوکہ کھایا ہے وہ قول یہ ہے: وہ بافندے اور حجام تھے، اگر وہ بافندے تھے جس طرح انہوں نے گمان کیا تو ان کا نبی پر ایمان اور اس کی اتباع انہیں شرف عطا کرنے والا تھا جس طرح حضرت بلال اور حضرت سلمان فارسی اسلام کی طرف سبقت لے جانے سے مشرف ہوئے۔ یہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد بافندے اور حجام نہ تھے اور کافروں کا بافندوں اور حجاموں کے بارے میں اگر وہ ایمان لائے تھے کہ یہ ارزل ہیں اس طرح کی مذمت کو لاحق نہیں کرتا جس طرح آج یہ لفظ مذمت کو لاحق کرتا ہے کیونکہ یہ تو کافروں کے قول کی حکایت ہے مگر اس صورت میں کہ کافروں کی حجت اور ان کے قول کو اصول قرار دیا جائے یہ عظیم جہالت ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے آگاہ کیا ہے کہ صنعتیں دین میں کوئی نقصان دینے والی نہیں۔

**قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** کان زائدہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وما علمی بما یعملون یعنی مجھے ان کے اعمال

کے علم کا مکلف نہیں بنایا گیا مجھے تو اس امر کا مکلف بنایا گیا ہے کہ میں انہیں ایمان کی دعوت دوں اعتبار ایمان کا ہے حرفوں اور صنعتوں کا نہیں۔ گویا انہوں نے کہا: ان کمزور لوگوں نے عزت اور مال کی طمع میں آپ کی اتباع کی۔ فرمایا: میں ان کے امر کے باطن پر واقف نہیں میرے سپرد تو ان کا ظاہر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے گا اور تمہیں گمراہ کرے گا ان کی رہنمائی کرے گا اور تمہیں راہ راست سے بھٹکا دے گا انہیں توفیق دے گا اور تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔

اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ان کے اعمال اور ایمان کا حساب میرے رب کے ذمہ ہے۔ لو کا جواب محذوف ہے اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾، لو کا جواب محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی لو شعرتم إن حسابهم على ربهم لما عبتموهم بصنائعهم عام قراءت تشعرون تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ ہے، کفار کو خطاب ہے یہی ظاہر ہے۔ ابن ابی عبلہ اور محمد بن سمیقع نے لو يشعرون قراءت کی ہے گویا کفار کے بارے میں خبر ہے اور خطاب کو ان سے ترک کیا گیا ہے جس طرح یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ الخ (یونس: 22) یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک آدمی نے سفیان سے پوچھا: جس نے بدکاری کی اور اپنے بچے کو قتل کر دیا جب کہ وہ مسلمان ہے کیا اس کی آگ کا فیصلہ کیا جائے گا؟ فرمایا اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾۔

وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ان کے احوال اور اشغال کی خفت کی وجہ سے میں انہیں دھتکارنے والا نہیں گویا انہوں نے بھی ضعفاء کو دھتکارنے کا مطالبہ کیا جس طرح قریش نے ان سے مطالبہ کیا تھا۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے فقراء کو چھوڑ کر صرف اغنیاء کے لیے مبعوث نہیں کیا۔ میں تو رسول ہوں میں تمہیں پیغام حق سناتا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے جس نے میری اطاعت کی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سعادت مند ہے اگر چہ وہ فقیر ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ اے نوح! اگر تم ہمارے معبودوں کو سب و شتم کرنے اور ہمارے دین میں عیب لگانے سے نہ رکا۔ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ تم کو پتھروں سے رجم کر دیا جائے گا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل نے کہا: تو مقتولوں میں سے ہو جائے گا۔ ثمالی نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی مرجومین کا لفظ آیا ہے اس سے مراد قتل ہے مگر سورۂ مریم میں لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (مریم: 46) میں تجھے سب و شتم کروں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تو سب و شتم کیے جانے والوں میں ہوگا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ اس معنی میں ابو داؤد کا قول ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ اس وقت بات کی جب آپ ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ فتح کا معنی حکم ہے یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ اس سے مراد کشتی ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مشحون سے مراد بھری ہوئی۔ شحن سے مراد کشتی کا لوگوں اور جانوروں سے بھر جانا۔ یہاں فلک مونث نہیں کیونکہ یہاں فلك واحد ہے جمع نہیں۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ بعد اس کے کہ ہم نے نوح اور جو ایمان لائے ان کو نجات دی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ یہ بحث گزر چکی ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ وَ اتَّقُوا الَّذِیْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِیْنَ ۝ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ۝ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝

''جھٹلایا عاد نے (اپنے) رسولوں کو جب فرمایا انہیں ان کے بھائی ہود نے: کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (خدمت) کا کوئی صلہ۔ میرا اجر تو اس پر ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ کیا تم تعمیر کرتے ہو ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بے فائدہ اور اپنی رہائش کے لیے بناتے ہو مضبوط محلات اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑے ظالم و بے درد بن کر گرفت کرتے ہو پس (اب تو) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور ڈرو اس ذات سے جس نے مدد کی ہے تمہاری ان چیزوں سے جن کو تم جانتے ہو (یعنی) اس نے مدد فرمائی ہے تمہاری مویشیوں اور فرزندوں سے اور باغات اور چشموں سے۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آ جائے انہوں نے کہا: یکساں ہے ہمارے لیے خواہ آپ نصیحت کریں یا نہ ہوں آپ نصیحت کرنے والوں سے۔ نہیں ہے یہ (محلات کا شوق) مگر ہمارے اسلاف کا دستور (آپ فکر نہ کریں) ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا اس لیے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، بے شک اس میں بھی (نبوت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے اس میں اکثر لوگ ایمان لانے والے۔ اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ تانیث قبیلہ اور جماعت کے معنی کی وجہ سے ہے۔ وہ مرسلین کو جھٹلاتے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۷﴾ معنی واضح ہے بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ریع سے مراد وہ چیز ہے جو زمین سے بلند ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کا قول ہے: یہ ریعۃ کی جمع ہے کم ریع ارضك تیری زمین کی بلندی کتنی ہے۔ قتادہ نے کہا: ریع سے مراد راستہ ہے؛ یہ ضحاک، کلبی، مقاتل اور سدی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہ قول ہے اس معنی میں مسیب بن علس کا قول ہے۔

فی الآلِ یَخفِضُها ویَرفَعُها ریعٌ یَلُوحُ کأنَّه سَحْلٌ(1)

راستہ کو سفید کپڑے سے تشبیہ دی۔ نحاس نے کہا: لغت میں معروف ہے زمین سے جب کوئی چیز بلند ہو تو اسے ریع کہتے ہیں اور راستہ کو بھی ریع کہتے ہیں۔ اسی معنی میں شاعر کا شعر ہے:

طِراقُ الخَوافِی مشرِق فوقَ رِیعَةٍ نَدَی لیلِهِ فی ریشه یَتَرقرَقُ

عمارہ نے کہا: ریع سے مراد پہاڑ ہے واحد ریعة ہے جمع ریاع آتی ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان کھلا راستہ ہے۔ انہیں سے معنی ثنیة صغیرہ مروی ہے۔ ان سے اس کا معنی منظرہ مروی ہے۔ عکرمہ اور مقاتل نے کہا: جب وہ سفر کرتے تو وہ ستاروں سے رہنمائی لیتے وہ راستوں پر لمبے لمبے نشان بناتے تا کہ ان سے ہدایت حاصل کریں اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان اٰیَةً دلالت کرتا ہے۔ اس سے مراد علامت ہے۔ مجاہد سے مروی ہے ریع سے مراد حمام کی عمارت ہے اس کی دلیل تَعْبَثُوْنَ ہے یعنی تم کہتے ہو یعنی تم ہر بلند جگہ نشانی کے طور پر بناتے ہو جس کے ساتھ تم کھیلتے ہو۔ مراد حمام اور برج بنانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو آدمی راستہ سے گزرتا اس کے ساتھ کھیلتے ہو، یعنی تم بلند جگہ بناتے ہو تا کہ تم راستہ پر جھانکو اور ان سے مذاق کرو۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد عاشروں (ٹیکس لینے والے) کا گزرنے والوں کے اموال سے کھیلنا ہے؛ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن اعرابی نے کہا: ریع سے مراد گرجا ہے اور ریع سے مراد حمام کا برج ہے جو صحراء میں ہوتا ہے۔ ریع سے مراد بلند ٹیلہ ہے۔ ریع میں دو لغتیں ہیں۔ راء کے نیچے کسرہ اور اس پر فتحہ۔ اس کی جمع ارياع ہے؛ ثعلبی نے اس کا ذکر کیا۔

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ، مصانع سے مراد منازل ہیں؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مضبوط قلعے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تَرَكْنا دیارَهُم منهم قِفَارًا وَهَدَّمْنا المصانِعَ وَالْبُرُوجا

ہم نے ان کے گھروں کو چٹیل چھوڑا اور ہم نے مصانع اور برج گرا دیئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مضبوط محلات ہیں؛ یہ مجاہد کا بھی قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: حمام کے برج؛ یہ سدی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: مجاہد سے یہ قول حقیقت سے بعید ہے کیونکہ ان سے پہلے یہ قول گزر چکا ہے اس سے مراد حمام کی عمارت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 238

ہے تو کلام میں تکرار ہوگا۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد زمین کے نیچے پانی کے مآجل (وہ گڑھے جن میں پانی جمع ہو) ہے اسی طرح زجاج نے کہا: اس سے مراد مصانع الماء ہے اس کا واحد مصنعۃ اور مصنع ہے۔ اسی معنی میں لبید کا قول ہے:

بَلِینا و ماتَبْلَی النجومُ الطوالعُ وتبقَی الجبالُ بَعْدَنا والمصَانِعُ

ہم بوسیدہ ہوگئے اور طلوع ہونے والے ستارے بوسیدہ نہیں ہوتے اور ہمارے بعد پہاڑ اور مصانع باقی رہتے ہیں۔

جوہری نے کہا: مصنعہ حوض کی طرح ہوتا ہے اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اسی طرح مصنعہ ہے مصانع کا معنی قلعے بھی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہر عمارت کو مصنع کہتے ہیں؛ مہدوی نے اسے بیان کیا ہے۔ عبدالرزاق نے کہا: ہمارے نزدیک یمن کی لغت میں مصانع سے مراد عادی محلات ہیں۔

**لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ** تاکہ تم ہمیشہ رہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لعل استفہام، توبیخ کے معنی میں ہے یعنی کیا تم ہمیشہ رہو گے۔ جس طرح تیرا قول ہے: لعلك تشتمنی کیا تو مجھے گالیاں دیتا ہے۔ ابن زید سے اس کا معنی مروی ہے۔ فراء نے کہا: تاکہ تم ہمیشہ رہو تم موت میں غوروفکر نہیں کرتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: گویا تم اس میں ہمیشہ اور باقی رہنے والے ہو۔ بعض قراءتوں میں ہے کأنکم تخلدون؛ نحاس نے اس کو ذکر کیا ہے۔ قتادہ نے حکایت بیان کی ہے: بعض قراءتوں میں کأنکم خالدون ہے۔

**وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ** بطش کا معنی سطوت اور سختی سے پکڑنا ہے اس کا باب یوں ذکر کیا جاتا ہے قد بَطَش به یبطش و یبطِش بطشا، باطشه مباطشة، حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: بطش سے مراد تلوار سے قتل کرنا اور ڈنڈے سے مارنا ہے۔ اس کا معنی ہے تم نے یہ عمل ظلم کے طور پر کیا۔ مجاہد نے یہ بھی کہا ہے: اس سے مراد ڈنڈے سے مارنا ہے۔

مالک بن انس نے نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں جو ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ناحق تلوار سے قتل کرنا ہے۔ یہ یحییٰ بن سلام نے حکایت بیان کی ہے۔ کلبی اور حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد غصہ کی وجہ سے قتل کرنا ہے۔ سب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی طرف راجع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عمد اور خطا کے طور پر مواخذہ کرنا جب کہ معافی وغیرہ نہ ہو۔ ابن عربی نے کہا: مالک نے جو کہا اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان کرتا ہے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: **فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ** (القصص: 19) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر نہ تلوار سونتی اور نہ ہی اسے نیزہ مارا آپ نے اسے گھونسا مارا۔ اس کی موت اس کے گھونسے میں ہی واقع ہوگئی۔ بطش ید سے بھی ہوتی ہے کم سے کم حالت گھونسا مارنا اور دھکا دینا ہے اس کے بعد سوط اور عصا سے مارنا ہے اور اس سے بڑھ کر لوہے سے مارنا ہے، سب مذموم ہے مگر جب حق کے ساتھ ہو۔ آیت اس لیے نازل ہوئی تاکہ اس امر کی خبر دے جو سابقہ امتوں میں گزرا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمیں نصیحت ہے کہ ہم اس فعل سے پہلو تہی کریں جس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی اور ان پر اسے ناپسند کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ مذموم اوصاف اس امت کے کثیر افراد میں پائے جاتے ہیں خصوصاً مصری علاقوں میں جب سے ترک ان کے حاکم بنے ہیں وہ ناحق سوط اور عصا سے لوگوں کو مارتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ یہ امر واقع ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دو قسم کے لوگ جہنمی ہیں میں نے ان دونوں کو نہیں دیکھا ایک ایسی قوم جن کے پاس سوط (ڈنڈے) ہوں گے جس طرح گائیوں کی دُمیں ہوتی ہیں جن کے ساتھ وہ لوگوں کو ماریں گے اور ایسی عورتیں جو لباس پہنے ہوں گی، ان کے جسم عیاں ہوں گے، جو خود گمراہ ہوں گی اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گی ان کے سر بختی اونٹوں کی جھکی ہوئی کہانوں کی طرح ہوں گے۔ وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی اس کی خوشبو پائیں گی جب کہ جنت کی خوشبو اتنے اتنے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے'' (1)۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جب تم بیع عینہ (2) کرو، تم بیلوں کی دمیں پکڑ داور کھیتی پر راضی ہو جاؤ اور جہاد کو ترک کر دو تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط کر دے گا وہ اس ذلت کو دور نہیں کرے گا یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ گے''۔

جَبَّارِیْنَ قتل کرنے والے، جبار اسے کہتے ہیں جو ناحق قتل کرنے والا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ (القصص: 19) یہ ہروی نے قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبار سے مراد ایسا شخص ہے جو سرکش اور تسلط جمانے والا ہو۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (ق: 45) جبار سے مراد مسلط ہے۔ شاعر نے کہا:

سَلَبْنَا من الجَبَّار بالسّيف مُلْكَه عَشِيًّا وأطرافُ الرِّمَاحِ شَوَارِعُ

ہم نے پچھلے پہر جبار سے اس کا ملک تلوار سے چھین لیا جب کہ نیزے کی انیاں تنی ہوئی تھیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ان کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اتَّقُوا الَّذِیْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ یعنی بھلائیوں سے تمہاری مدد کی، پھر اس ارشاد: اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِیْنَ ۝ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی، یعنی ان چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کیا اور تم پر ان کے ساتھ فضل و احسان فرمایا وہ ہی ایسی ذات ہے جس کی عبادت کرنا اس کا شکر بجا لانا اور اس کی ناشکری نہ کرنا واجب ہے۔

اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ اگر تم اس کا انکار کرو اور تم اس پر اصرار کرو تو میں تمہارے بارے میں یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَوَ عَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ یہ سب ہمارے لیے برابر ہے نہ ہم تجھ سے یہ بات سنتے ہیں اور نہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو تم کہتے ہو۔ عباس نے ابو عمرو سے اور بشر، کسائی سے روایت نقل کرتے ہیں اوعظت

1۔ صحیح مسلم، باب فی فناء الدنیا وبیان الحشر یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 383

2۔ وہ ثمن معلوم پر کسی کو کوئی چیز ادھار بیچے پھر اس قیمت سے کم قیمت پر نقد اس سے وہ چیز خرید ے۔

میں ظاء تاء میں مدغم ہے۔ یہ قول بعید ہے کیونکہ ظاء حروف مطلقہ میں سے ہے یہ صرف اس میں مدغم ہوتا ہے جو اس کے بہت ہی قریب ہو وہ اس کی مثل ہو یا اس کا ہم مخرج ہو۔

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ، خلقا سے مراد دین ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا۔ فراء نے کہا: پہلے لوگوں کی عادت ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے خَلْقُ الاولین پڑھا ہے باقی نے خُلُقُ پڑھا ہے۔ ہروی نے کہا: الله تعالیٰ کا فرمان اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ کا معنی ہے ان کا اختلاف اور ان کا کذب۔ جس نے خُلُقُ الاولین پڑھا ہے تو اس کا معنی ہے ان کی عادت یہ ہے۔ عرب کہتے ہیں: حدثنا فلاں باحادیث الخلق فلاں نے ہمیں خرافات اور من گھڑت باتیں بتائیں۔ ابن اعرابی نے کہا: خلق کا معنی دین، طبع اور مروت ہے۔ نحاس نے کہا: فراء کے نزدیک خلق الاولین سے مراد پہلوں کی عادت ہے۔ محمد بن ولید نے محمد بن زید سے حکایت بیان کی ہے کہ خلق الاولین کا معنی ہے ان کا مذہب اور ان پر جو امر جاری ہوا۔ ابو جعفر نے کہا: دونوں قول قریب قریب ہیں۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: اکمل المومنین ایماناً احسنهم خلقا، (1) مومنوں میں سے سب سے کامل وہ ہے جو ان میں سے مذہب، عادت اور الله تعالیٰ کی طاعت میں جو ان کا معمول ہوتا ہے اس میں اچھا ہو۔ یہ جائز نہیں جو حسن خلق کا مالک ہو وہ فاجر ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ برے اخلاق والا کامل ایمان والا ہو اگرچہ وہ فاجر نہ ہو۔ ابو جعفر نے کہا: ہمارے سامنے محمد بن یزید سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ خلق الاولین کا معنی ان کا جھٹلانا اور اندازہ لگانا ہے مگر وہ پہلی قراءت کی طرف مائل تھے، کیونکہ اس میں ان کے آباء کی مدح تھی۔ قرآن حکیم میں جو ان کی صفت آئی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے آباء کی مدح کرتے تھے۔ ان کا قول: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (زخرف:23) ابو قلابہ سے مروی ہے انہوں نے خلق خاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یہ خلق کی تخفیف ہے: اسے ابن جبیر نے اصحاب نافع سے اور وہ حضرت نافع سے روایت نقل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خلق الاولین کا معنی ہے پہلوں کا دین۔ اسی معنی میں الله تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النساء: 119) خلق الله سے مراد الله کا دین۔ خلق الاولین پہلے لوگوں کی عادت؛ زندگی پھر موت اور اس کے بعد کوئی اٹھانا نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ چیز یعنی عمارتیں بنانا اور قوت جس کا تو نے انکار کیا ہے نہیں ہے مگر ہمارے پہلوں کی عادت، ہم ان کی اقتدا کرتے ہیں۔

وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ جو ہم کیا کرتے تھے اس پر ہمیں عذاب نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے خلق اجسام الاولین یعنی ہماری پیدائش نہیں ہے مگر پہلوں کی پیدائش کی طرح جو ہم سے قبل پیدا کیے گئے وہ مر گئے اور جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اس میں سے کوئی چیز ان پر نازل نہ ہوئی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ہم نے انہیں ریح صرصر سے ہلاک کر دیا وہ سرکش تھی جس طرح سورۂ حاقہ میں آئے گا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ بعض نے کہا: ان پر تین لاکھ اور چند سو ایمان لائے اور باقی ماندہ ہلاک ہو گئے۔

1۔ جامع ترمذی، باب فی الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها، جلد 1، صفحہ 138۔ ایضاً، حدیث نمبر 1082، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۴۰﴾ اس کی بحث گزر چکی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِیْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖۚ فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾

''جھٹلایا قوم ثمود نے رسولوں کو جب کہا انہیں ان کے بھائی صالح نے کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے میں تمہارے لیے رسول امین ہوں سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے، میری پیروی کرو اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس پر کوئی معاوضہ، میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش وطرب) میں جس میں تم یہاں ہو امن سے، ان باغات میں اور چشموں میں اور (شاداب) کھیتوں میں اور کھجور کے درختوں میں جس کے شگوفے بڑے نرم و نازک ہیں اور تراشتے رہو گے پہاڑوں میں گھر ماہر (سنگتراش) بنتے ہوئے پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میرا اتباع کرو اور نہ پیروی کرو حد سے بڑھنے والوں کے حکم کی جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے۔ جواب ملا (اے صالح!) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے نہیں ہو تم مگر ایک انسان ہماری مانند ورنہ لاؤ کوئی معجزہ اگر تم راست بازوں میں سے ہو۔ فرمایا: یہ ایک اونٹنی ہے ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمہاری باری ہے اور نہ پہنچانا اسے کوئی اذیت ورنہ آئے گا تمہیں بڑے دن کا عذاب۔ ان (بدبختوں) نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر ہو گئے ندامت (و افسوس) کرنے والے۔ پس آلیا انہیں عذاب نے، بے شک اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے اور بے شک آپ کا رب عزیز و رحیم ہے''۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ ذکر کیا۔ وہ قوم ثمود ہے جس طرح پہلے گزرا ہے وہ حجر میں رہا کرتے تھے یہ علاقہ کھجوروں، کھیتوں اور چشموں والا تھا۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ یعنی دنیا میں موت اور عذاب سے امن میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ بڑے معمر لوگ تھے عمارات ان کی عمروں کے ساتھ باقی نہیں رہتی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا (ہود: 61) حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں شرمندہ کیا اور فرمایا: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم دنیا میں موت کے بغیر باقی رہو گے۔

فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ زمخشری نے کہا: اگر تو کہے جَنّٰتٍ کے بعد نَخْلٍ کیوں فرمایا جب کہ جنات کھجور کے درختوں کو پہلے شامل ہوتا ہے جس طرح نعم کا لفظ اونٹوں کو شامل ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت کا لفظ ذکر کرتے ہیں اور وہ کھجور کے درخت مراد لیتے ہیں جس طرح وہ نعم کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے صرف اونٹ ہی مراد لیتے ہیں۔ زہیر نے کہا:

كَأَنَّ عَيْنَيَّ فِي غَرْبَيْ مُقَتَّلَةٍ مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِي جَنَّةً سُحُقَا

گویا میری دونوں آنکھیں سیراب کرنے والی اونٹنی کے بڑے ڈول میں آنسو گرا رہی ہیں جو کھجور کے لمبے لمبے درختوں کو سیراب کر رہی ہے۔ یہاں بھی جنت سے مراد کھجور کا باغ ہے۔ نخلة سحوق سے مراد لمبی کھجوریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس میں دو وجوہ ہیں (۱) پہلے کھجور کے درخت تمام درختوں کے ضمن میں داخل ہوئے بعد میں کھجور کے درختوں کو انفرادی طور پر یہ شامل ہوا اس کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے (۲) جنات سے دوسرے درخت مراد لیے جائیں کیونکہ یہ لفظ ان سب کی صلاحیت رکھتا ہے پھر اس پر نخل کا لفظ معطوف کیا۔ طلعة سے مراد ہے جو کھجور سے پھوٹتا ہے جس طرح تلوار کا پھل ہوتا ہے اس کے اندر گچھے کی شاخیں ہوتی ہیں۔ قنو تنے سے نکلنے والی چیز کو کہتے ہیں جس طرح اس کی موٹی اور باریک شاخیں ہوتی ہیں۔ هضيم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب تک وہ غلاف میں ہوتا ہے وہ لطیف و نرم ہوتا ہے هضيم سے مراد لطیف اور باریک ہے۔ اسی معنی میں امراء القیس کا مصرعہ ہے:

عَلَيَّ هَضِيمَ الْكَشْحِ رَيَّا الْمُخَلْخَلِ

پتلے پہلو پر اس حال میں جو خوبصورت ہے اور پازیب کی جگہ۔

جوہری نے کہا: خوشے کو اس وقت تک هضيم کہا جاتا ہے جب تک وہ اپنے غلاف سے باہر نہ آئے، کیونکہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور عورتوں میں سے هضيم اسے کہتے ہیں جو نرم پہلوؤں والی ہو پتلی کمر والی۔ اسی کی مثل ہروی نے بیان کیا ہے اس نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے جو اپنے غلاف میں ایک دوسرے سے پیوست ہو ابھی وہ ظاہر نہ ہو۔ اس سے رجل هضيم الجنبين ہے جس کے پہلو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں؛ یہ اہل لغت کا قول ہے۔ ماوردی اور دوسرے علماء نے اس بارے میں بارہ قول ذکر کیے ہیں (۱) تر اور نرم کھجور: یہ عکرمہ کا قول ہے (۲) تر کھجوروں میں سے جس کا ایک سرا رنگ بدل چکا ہو: یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: ابو اسحاق نے یزید سے روایت نقل کی ہے اس سے مراد ابن ابی زیاد کوفی اور یزید بن ابی مریم شامی ہے ونخل طلعها هضيم کہا ان میں سے جو پک چکی ہوں اور ان میں سے کچھ کے سرے رنگ بدل چکے ہوں

(۳) اس میں گٹھلی نہ ہو، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے (۴) جو ٹوٹ جاتی ہو جب اسے مس کیا جائے تو ریزہ ریزہ ہو جائے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: جو منہ میں جاتے ہی ریزہ ریزہ ہو جائے (۵) اس سے مراد ہے جو ایک دوسرے پر چڑھنے کی وجہ سے پتلی رہ گئی ہو؛ یہ ضحاک اور مقاتل کا قول ہے (۶) جن میں سے بعض بعض سے چمٹی ہوئی ہوں؛ یہ ابو صخر کا قول ہے (۷) جب وہ الگ الگ اور سبز ہو اس وقت طلع ہوتی ہے؛ یہ بھی ضحاک کا قول ہے (۸) جو صحیح پک چکی ہو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (۹) جو غلاف کے پھٹنے سے پہلے جمع ہو؛ اسے ابن شجرہ نے روایت کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

كَأَنَّ حَمولةً تُجْلَى عليهِ هَضِيمٌ مايُحَسُّ له شُقُوقُ

(۱۰) اس سے مراد نرم ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے (۱۱) اس سے مراد نرم و لطیف ہے جو سب سے پہلے نکلتا ہے وہی طلع نضید ہے؛ یہ ہروی نے کہا ہے (۱۲) یہ برنی ہے؛ یہ ابن اعرابی نے کہا۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے یہ مبارک اور خوشگوار ہے کیونکہ یہ ایسا کھانا ہے جو ہضم ہو جاتا ہے طلع یہ طلوع سے اسم مشتق ہے جس کا معنی ظہور ہے اسی معنی میں سورج، چاند اور نباتات کا طلوع ہے یعنی ظہور ہے۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ، نحت کا معنی چھیلنا ہے نحتَه ينحِته نحتا جب اسے چھیلا نحاتة برادية، مِنْحَت جن کے ساتھ چھیلا جاتا ہے سورہ صفات میں ہے: اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے کیونکہ ان کی عمریں طویل ہوتیں اور مٹی سے جو گھر وہ بناتے تھے وہ گر جاتے تھے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور نافع نے فرهين الف کے بغیر پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فارهين الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبیدہ اور دوسرے علماء کے نزدیک دونوں کا معنی ایک ہے۔ جس طرح عظاما نخرة اور ناخرة کا معنی ایک ہی ہے؛ قطرب نے اس کو بیان کیا ہے۔ فرُه، يفرُه فهو فاره و فرِه يفرَه فهو فرِه و فاره جب وہ چست ہو۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ دونوں کے درمیان ایک جماعت نے فرق بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا: فارهين سے مراد ہے وہ ان کو تراشنے میں ماہر تھے؛ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ابو صالح اور دوسرے علماء سے یہ مروی ہے۔ عبد اللہ بن شداد نے کہا: فارهين کا معنی ہے متجبر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے فرهين کا معنی ہے اترانے والے؛ یہ قول مجاہد نے بھی کیا ہے۔ ان سے شرهين بھی مروی ہے یعنی حد درجہ حریص (1)۔ ضحاک نے کہا: عقلمند۔ قتادہ نے کہا: اپنے اعمال پر خوش ہونے والے؛ یہی قول کلبی نے کیا ان سے ناعمين بھی مروی ہے یعنی نرم و نازک ان سے آمنين بھی مروی ہے، یہی حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے متخیرین، ذخیرہ کرنے والے؛ یہ کلبی اور سدی کا قول ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

إلى فِرَهٍ يماجد كلَّ أمرٍ قصدتُ له لأختبر الطِّباعا

مال ذخیرہ کرنے والے کی طرف جو ہر امر میں بزرگی میں مقابلہ کرتا ہے میں نے اس کا قصد کیا تا کہ طباع کو آزماؤں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی متعجب ہے؛ یہ خصیف نے قول کیا ہے۔ ابن زید نے کہا: قوی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 240

فرہین کا معنی خوش ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ عرب ھاء اور حاء ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: مدھتہ، مدحتہ۔ الفرہ کا معنی خوش ہونے والا پھر فرح کا معنی مرح (متکبر) مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (الاسراء: 37) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿﴾ (القصص)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿﴾ وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد نو افراد ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے رہے اور اصلاح احوال نہ کرتے۔ سدی اور دوسرے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی طرف وحی کی: تیری قوم تیری اونٹنی کی کونچیں کاٹے گی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے افراد سے یہ بات کی۔ انہوں نے کہا: ہم ایسا کام کرنے والے نہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا: اس ماہ میں تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جو اس کی کونچیں کاٹے گا اور تمہاری ہلاکت اس کے ہاتھ پر ہوگی۔ انہوں نے کہا: اس ماہ میں جو بھی بچہ پیدا ہوگا ہم اسے قتل کر دیں گے۔ اس ماہ میں ان کے ہاں نو بچے پیدا ہوئے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو ذبح کر دیا پھر دسویں کے ہاں بچہ پیدا ہوا اس نے اپنا بیٹا ذبح کرنے سے انکار کر دیا اس کے ہاں پہلے بچہ پیدا نہ ہوا تھا دسویں کا بیٹا سرخ رنگ والا اور نیلی آنکھوں والا تھا۔ وہ تیزی سے بڑا ہوا جب وہ بچہ ان نو افراد کے پاس سے گزرتا وہ اس کو دیکھتے تو کہتے، اگر ہمارے بیٹے زندہ ہوتے تو وہ اس کی مثل ہوتے۔ وہ نو افراد حضرت صالح علیہ السلام پر ناراض ہو گئے، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام ہی ان کے بیٹوں کے قتل کا سبب بنے تھے انہوں نے عصبیت کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں اٹھائیں کہ ہم رات کے وقت ان کو اور ان کے اہل کے افراد کو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے کہا: ہم سفر پر نکلتے ہیں لوگ ہمارے سفر پر جانے کو دیکھیں گے تو ہم ایک غار میں چھپ جائیں گے یہاں تک کہ جب رات ہوگی اور حضرت صالح علیہ السلام مسجد کی طرف نکلیں گے تو ہم انہیں قتل کر دیں گے، پھر ہم کہیں گے: ہم اس کے اہل کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے بے شک ہم سچے ہیں۔ وہ ہماری تصدیق کریں گے اور وہ جانتے ہیں کہ ہم سفر پر نکلے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام ان کے ساتھ بستی میں نہیں سوتے تھے وہ اپنی مسجد میں آرام کیا کرتے تھے۔ جب صبح ہوتی تو ان کے پاس آتے اور انہیں نصیحت کرتے جب وہ غار میں داخل ہوئے پھر ارادہ کیا کہ وہ باہر نکلیں تو غار ان پر گر پڑی اور ان سب کو قتل کر دیا وہ لوگ جو اس امر پر مطلع تھے انہوں نے یہ دیکھا وہ بستی میں شور مچانے لگے اے اللہ کے بندو! کیا حضرت صالح ان کے بچوں کے قتل پر راضی نہ ہوئے تھے کہ انہیں بھی قتل کر دیا۔ بستی کے لوگوں نے اونٹنی کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ ابن اسحاق نے کہا: اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں جو سب و شتم کیا اور انہیں عذاب سے ڈرایا تو نو افراد اکٹھے ہوئے۔ جس کی وضاحت سورۂ نمل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ یہ سحر سے مشتق ہے، یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ جس طرح مہدوی نے بیان کیا ہے۔ یعنی تجھ پر جادو کا اثر ہے تو تیری عقل باطل ہو گئی ہے کیونکہ تو ہماری مثل بشر ہے تو تو ہمارے سوا کس طرح رسالت کا دعویٰ کرتا ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تو ان لوگوں میں سے ہے جنہیں بار بار کھلایا پلایا جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کلبی، قتادہ

اور مجاہد کا قول ہے جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے اس تعبیر کی بنا پر وہ سَحْر سے مشتق ہے جو رئہ ہے یعنی تجھے سحر لاحق ہو گیا ہے جو ہماری مثل کھاتا پیتا ہے جس طرح لبید نے کہا:

فإن تسألينا فِيمَ نحن فإننا　　عصافيرُ من هذا الأنام المُسَحَّرِ

اگر تو ہمارے بارے میں سوال کرتی ہے کہ ہم کس حال میں ہیں بے شک ہم چڑیاں ہیں جوان جانداروں سے ہیں جن کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔

امراء القیس نے کہا:

نُسْحَرُ بالطَّعامِ وبالشَّرابِ

ہم کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔

فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ کوئی نشانی لے آئیں اگر آپ سچے ہیں۔ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے کہا اگر آپ سچے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے جو اس پہاڑ سے سرخ اونٹنی نکالے جو دس ماہ کی گابھن ہو وہ بچہ جنے جب کہ ہم دیکھ رہے ہوں، وہ اس پانی پر وارد ہو وہ پانی پیئے اور اگلے روز اتنا ہی دودھ ہمیں دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کر لیا۔ آپ نے فرمایا: هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ یہ اونٹنی ہے پانی میں اس کا حصہ ہے ایک روز تمہاری پانی کی باری ہے اور ایک روز اس کی باری ہے جس روز اونٹنی کے پانی پینے کی باری ہوتی تو وہ سارا پانی پہلے پہر پی جاتی اور دن کے پچھلے پہر انہیں اتنا ہی دودھ دیتی جب ان کی باری ہوتی تو وہ پانی ان کے اپنے لیے، ان کے چوپاؤں کے لیے اور ان کی زمین کے لیے ہوتا۔ جس روز اونٹنی کی باری ہوتی تو اس میں سے کوئی پانی نہ پی سکتے اور جس دن ان کی باری ہوتی اونٹنی اس میں پانی نہ پیتی۔ فراء نے کہا: شرب سے مراد پانی کا حصہ ہے۔ نحاس نے کہا: جہاں تک مصدر کا تعلق ہے تو اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے شرب شَربا وشِربا وشُربا۔ مصدر اکثر مضموم ہوتا ہے کیونکہ مکسورہ اور مفتوحہ کسی اور چیز کے ساتھ شریک ہوتے ہیں تو شِرب پانی کے حصہ کو کہتے ہیں۔ شَرب یہ شارب کی جمع ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فقلتُ للشَّربِ فی دُرْنَا وقد ثَمِلُوا

میں نے درنا (جگہ) میں پینے والوں سے کہا جب کہ وہ مست ہو چکے تھے۔

محل استدلال الشرب ہے۔ مگر ابو عمرو بن علاء اور کسائی شَرب فتحہ کے ساتھ مصدر میں پسند کرتے ہیں۔ اور بعض علماء کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انها ايام اكل و شرب یہ کھانے پینے کے ایام ہیں (1)۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ یہاں تضعیف کا اظہار جائز نہیں کیونکہ یہ دونوں ایک جنس سے متحرک حروف ہیں۔ فَيَاْخُذَكُمْ یہ نہی کا جواب ہے اس میں سے فاء کا حذف جائز نہیں جس میں جزم جائز نہیں جس طرح امر میں ہوتی ہے مگر کسائی سے مروی ہے کہ وہ

1۔ سنن دار قطنی، باب فی الصوم، باب قبلۃ الصائم، جلد 2، صفحہ 187، دار المحاسن

اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

**فَعَقَرُوۡهَا فَاَصۡبَحُوۡا نٰدِمِيۡنَ** جب انہیں عذاب کا یقین ہو گیا تو اس کی کونچیں کاٹنے پر شرمندہ ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں تین دن کی مہلت دی تو ان پر ہر روز علامت ظاہر ہوتی انہوں نے شرمندگی کا اظہار کیا اور عذاب کے معاینہ کے وقت شرمندگی نے انہیں کوئی نفع نہ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا، شرمندگی نے انہیں کوئی نفع نہ دیا کیونکہ انہوں نے توبہ نہ کی بلکہ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو تلاش کیا تاکہ انہیں قتل کریں جب انہوں نے عذاب کو دیکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی ندامت اس بچے کے چھوڑنے پر تھی کیونکہ انہوں نے اس بچے کو دوسروں کے ساتھ قتل نہ کیا تھا۔ یہ قول حقیقت سے بعید ہے۔

**اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً** آخر تک کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: ان لوگوں میں دو ہزار اور آٹھ سو افراد مردوں اور عورتوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ چار ہزار تھے۔ کعب نے کہا: حضرت صالح علیہ السلام کی قوم بارہ ہزار قبیلے تھے اور یہ قبیلہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا قوم عاد ان سے چھ گنا بڑی تھی۔

كَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطِ اۨلۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ لُوۡطٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيۡ لَكُمۡ
رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَاۤ اَسۡـَٔـلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ
اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوۡنَ
مَا خَلَقَ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوۡا لَـئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ
يٰلُوۡطُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُخۡرَجِيۡنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّيۡ لِعَمَلِكُمۡ مِّنَ الۡقَالِيۡنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيۡ وَ
اَهۡلِيۡ مِمَّا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوۡزًا فِى الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ
دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۷۵﴾

''جھٹلایا قوم لوط نے اپنے رسولوں کو۔ جب کہا ان سے ان کے بھائی لوط نے: کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے؟ بے شک میں تمہارا رسول امین ہوں پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو اور میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ، میرا معاوضہ تو اس کے ذمہ ہے جو رب العالمین ہے۔ کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لیے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔ وہ (غصہ سے) کہنے لگے (خاموش!) اے لوط! اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: (سن لو!) میں تمہارے اس (گندے) فعل سے بیزار ہوں۔ میرے مالک! نجات دے مجھے اور میرے اہل و عیال کو اس (کی شامت) سے جو وہ کرتے ہیں۔

سو ہم نے نجات دے دی اسے اور اس کے سب اہل کو سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی پھر ہم نے نام و نشان مٹا دیا دوسروں کا اور ہم نے برسائی ان پر (پتھروں کی) بارش پس بڑی تباہ کن تھی وہ بارش جو برسی ان پر جنہیں ڈرایا گیا (اور وہ باز نہ آئے) بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے اور بلاشبہ (اے محبوب!) آپ کا پروردگار ہی عزیز و رحیم ہے''۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ الْمُرْسَلِيْنَ اس کا معنی اور قصہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں مفصل گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ وہ ان کی دبروں میں اپنی خواہش پوری کیا کرتے تھے وہ یہ عمل اجنبی اور مسافروں کے ساتھ کیا کرتے تھے، جس طرح سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ یعنی عورتوں کی شرمگاہیں چھوڑ دیتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں نکاح کے لیے پیدا کیا۔ ابراہیم بن مہاجر نے کہا: مجاہد نے مجھ سے کہا حضرت عبداللہ اس آیت وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ کو کس طرح پڑھا کرتے تھے۔ میں نے کہا: وتذرون ما أصلح لكم ربكم من أزواجكم۔ کہا مراد شرمگاہ ہے جس طرح ارشاد فرمایا: فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (البقرہ:222) بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ تم اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ہو۔ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ اے لوط! اگر تم اپنی اس بات سے نہ رکے۔ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ یعنی ہمارے ملک اور ہماری بستی سے نکالے جانے والوں میں سے ہو گے۔ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ یعنی لواطت کے عمل سے بغض رکھنے والا ہوں۔ قلی معنی بغض ہے قليته أقليه قلى وقلاء۔ شاعر نے کہا

فلستُ بمقلِي الخلالِ ولا قالِي۔ نہ میں دوستوں کو ناراض کرنے والا ہوں اور نہ ہی بغض رکھنے والا ہوں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

علیكَ السلامُ لا مُلِلتِ قریبةً　　ومَالَكِ عندی إن نأیتِ قَلَاءُ

تجھ پر سلامتی ہو قریب ہو تو تجھ سے کوئی اکتاہٹ نہیں اگر تو دور ہو تو میرے نزدیک کوئی ناراضگی نہیں۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ اے میرے رب! مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے عذاب سے نجات عطا فرما۔ جب آپ ان کے عذاب سے مایوس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ انہیں ان کا عذاب نہ پہنچے۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ان کے اہل میں ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں جس طرح سورۂ ہود میں گزرا ہے اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے غبرت فی عذاب اللہ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں باقی رہی۔ ابو عبیدہ اس طرف گئے ہیں کہ معنی ہے وہ بڑھاپے میں باقی رہنے والوں میں سے ہوئی۔ یعنی وہ باقی رہی یہاں تک کہ بوڑھی ہو گئی۔ نحاس نے کہا: جانے والے کو غابر اور باقی رہنے والے کو بھی غابر کہتے ہیں۔ جس طرح شاعر نے کہا:

لا تَكْسَعِ الشَّوْلَ بأغْبارِهَا　　إنَّكَ لا تَدْرِي مَنِ النَّاتِجُ

تیزی سے خدمت کرنے والے کو بچی کھچی چیز کے ساتھ نہ دھتکار تو نہیں جانتا کہ نتیجہ دینے والا کون ہے۔

اور جس طرح کہا:

فما وَنَیٰ محمدٌ منذ ان غَفَرْ لہ الالٰہُ ما مَضَیٰ وما غَبَرْ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کمزور نہ ہوئے جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے گزشتہ آنے والے اعمال کو معاف کر دیا۔

ما غبر سے مراد ما بقی ہے۔ اغبار سے مراد باقی ماندہ دودھ ہے۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ہم نے انہیں دھنسا کر اور پتھروں کی مار کے ساتھ ہلاک کر دیا۔ مقاتل نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو زمین میں دھنسا دیا اور جو بستی سے باہر تھا اس پر پتھروں کی بارش کی۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا یعنی پتھروں کی بارش کی۔

فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت جبریل امین نے ان کی بستی کو زمین میں دھنسا دیا اور اس کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد پتھروں کی بارش کی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اس میں کوئی مومن نہیں تھا مگر حضرت لوط علیہ السلام کا گھر اور ان کی دو بیٹیاں۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ۖۚ (۱۷۶) اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ (۱۷۷) اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ (۱۷۸) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۚ (۱۷۹) وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ (۱۸۰) اَوْفُوا الْكَیْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ۚ (۱۸۱) وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ۚ (۱۸۲) وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۚ (۱۸۳) وَ اتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ؕ (۱۸۴) قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۙ (۱۸۵) وَ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۚ (۱۸۶) فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ؕ (۱۸۷) قَالَ رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸۸) فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۸۹) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۱۹۰) وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۠ (۱۹۱)

"جھٹلایا اہل ایکہ نے بھی (اپنے) رسولوں کو جب فرمایا انہیں شعیب (علیہ السلام) نے: کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے۔ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں، پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو۔ اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس پر کوئی اجر میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے پورا کیا کرو ناپ اور نہ ہو جاؤ کم ناپنے والوں سے اور وزن کیا کرو صحیح ترازو سے اور نہ کم دیا کرو لوگوں کو ان کی چیز میں اور نہ پھرا کرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور (تم سے) پہلی

مخلوق کو۔ انہوں نے (جھلا کر) کہا: تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے اور نہیں ہو تم مگر ایک بشر ہماری مانند اور ہم تو تمہارے متعلق یہ خیال کر رہے ہیں کہ تم جھوٹوں میں سے ہو (ہم تمہاری بات نہیں مانتے) لو اب گرادو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر تم راست بازوں میں سے ہو۔ آپ نے فرمایا: میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ سو انہوں نے جھٹلایا شعیب کو تو پکڑ لیا انہیں چھتری والے دن کے عذاب نے، بے شک یہ بڑے دن کا عذاب تھا بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے اور یقیناً آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡئَيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ، الایك، سے مراد گھنے کثیر درخت۔ اس کا واحد ایکہ ہے۔ جس نے اصحاب الایکہ قراءت کی تو یہی غیضہ ہے اور جس نے لیکۃ پڑھا ہے تو یہ بستی کا نام ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: بکہ اور مکہ کی مثل ہے؛ یہ جوہری کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: ابو جعفر اور نافع نے كذب اصحاب لَيكة المرسلين قراءت کی۔ اسی طرح سورۂ ص میں قراءت ہے۔ سورۃ الحجر میں قراء نے جر پر اتفاق کیا ہے۔ سورۃ ق میں جو ہے اس میں ضروری ہے کہ مختلف کو متفق علیہ کی طرف پھیر دیا جائے کیونکہ معنی ایک ہی ہے۔ ابو عبید نے جو حکایت بیان کی ہے کہ لیکہ اس بستی کا نام ہے جس میں وہ رہائش پذیر تھے اور ایکہ ان کے ملک کا نام تھا یہ ایسی چیز ہے جو ثابت نہیں۔ اور جس نے یہ قول کیا ہے: وہ بھی معروف نہیں کہ اس کا علم ثابت ہوتا۔ اگر اس کا قائل معروف ہوتا تو بھی اس میں اعتراض کی گنجائش ہوتی کیونکہ تمام علماء جو علماء تفسیر میں سے ہیں یا کلام عرب کے ماہرین ہیں وہ اس کے خلاف ہیں۔

عبد اللہ بن وہب نے جریر بن حازم سے وہ قتادہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام دو قوموں کی طرف مبعوث کیے گئے اپنی قوم اہل مدین کی طرف اور اصحاب ایکہ کی طرف، ایکہ سے مراد گھنے درختوں کا دلدلی جنگل ہے۔ سعید بن قتادہ سے روایت نقل کی ہے: اصحاب ایکہ اہل غیضہ ہے اور اہل شجر ہیں ان کا عام درخت دوم تھا اور یہی مقل کا درخت ہے۔ ابن جبیر نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے: اصحاب ایکہ نکلے یعنی جب انہیں گرمی نے آلیا تو وہ غیضہ اور درختوں کی جگہ چلے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بادل کو بھیجا تو انہوں نے اس کے نیچے سایہ حاصل کیا۔ جب اس کے نیچے آ گئے تو انہیں جلا دیا گیا۔ اگر کوئی اور نہ ہو مگر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایکہ سے مراد درخت ہے۔ ہم اہل علم میں کوئی اختلاف نہیں پاتے سب کا اتفاق ہے کہ ایکہ سے مراد گھنا درخت ہے جہاں تک بعض لوگوں کے استدلال کا تعلق ہے جس نے اس آدمی کی قراءت سے استدلال کیا جس نے دونوں فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے کہ سواد میں لیکہ ہے تو اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اس میں یہ قول کہ اس کی اصل ایکہ ہے پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور اس کی حرکت لام کو دی گئی تو ہمزہ حذف ہو گیا اور وہ الف وصلی سے مستغنی ہو گیا کیونکہ لام کو بعض اوقات حرکت دی جاتی ہے تو وہ کسرہ ہی ہوتی ہے جس طرح تو ہمزہ کی موجودگی میں بالاحمر اور تخفیف کی صورت میں بلحمر کہتا ہے اگر تو چاہے تو تو اس کو اس خط میں لکھ دے جس طرح میں نے پہلی دفعہ اسے لکھا ہے اگر تو چاہے تو حذف کے ساتھ کتابت کرے۔ پھر کسرہ کے بغیر کوئی صورت

جائز نہیں۔

سیبویہ نے کہا: جان لو جو اسم منصرف نہ ہو جب اس پر الف لام داخل ہو یا اسے مضاف کیا جائے تو وہ منصرف ہو جاتا ہے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے اس مسئلہ میں سیبویہ کی مخالفت کی ہو۔ خلیل نے کہا: الایکہ سے مراد ایسا جنگل ہے جو بیری اور پیلو وغیرہ کے درخت اگاتا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ، اخوهم شعیب نہیں فرمایا کیونکہ وہ نسبی طور پر اصحاب ایکہ سے نہ تھے جب مدین کا ذکر کیا تو فرمایا: اَخَاهُمْ شُعَيْبًا (اعراف: 85) فرمایا کیونکہ یہ نسبی طور پر انہیں میں سے تھے۔ ان کے نسب کے بارے میں قول سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم اہل مدین کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور اہل بادیہ جو اصحاب ایکہ ہیں ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ہم نے اس کا ذکر کیا ہے: اَلَا تَتَّقُوْنَ کیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ان رسولوں کا جواب ایک ہی تھا اور ایک ہی صیغہ پر تھا کیونکہ وہ امر بالتقویٰ، طاعت اور عبادت میں اخلاص پر متفق تھے اور رسالت کی تبلیغ پر اجر لینے سے رکنے والے تھے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ کیل اور وزن میں کمی کرنے والے نہ ہو۔ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ یعنی حق دار کا حق ادا کرو۔ سورۃ الاسراء اور دوسری سورتوں میں بحث گزر چکی ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ سورۂ ہود اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ مجاہد نے کہا: جبلۃ سے مراد خلیقہ ہے جبل فلان علی کذا یعنی اسے فلاں پر پیدا کیا گیا۔ فالخُلق جِبِلّة و جبلة و جِبْلة و جُبْلة جَبْلَة۔ نحاس نے اسے قرآن کے معانی میں ذکر کیا ہے۔ والجبلۃ کا عطف کاف اور میم پر ہے۔ ہروی نے کہا: الجِبْلة، الجُبْلة، والجِبلّ، والجُبُل، والجَبْل سب لغتیں ہیں یہ لوگوں میں سے کثیر تعداد والی جمعیتیں ہیں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جِبِلًّا كَثِيْرًا (یٰسین: 62)

نحاس نے کتاب "اعراب القرآن" میں کہا: کہا جاتا ہے جبلۃ دونوں کی جمع جبال آتی ہے۔ باء سے ضمہ اور کسرہ حذف ہو جاتا ہے اسی طرح لام سے شد کو حذف کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے جُبْلة و جُبَل۔ اسی طرح جِبلة و جِبال ہے۔ سب سے ھاء حذف کی جاتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے ان سے اختلاف کے ساتھ پڑھا ہے والجبلۃ الاولین جیم اور باء پر ضمہ ہے شیبہ اور اعرج سے بھی مروی ہے باقیوں نے کسرہ کے ساتھ روایت کی ہے۔ شاعر نے کہا:

والموتُ أعظمُ حادثٍ فیما یمرُّ علی الجِبِلَّة(1)

موت بڑا حادثہ ہوتا ہے جو مخلوق پر گزر جاتا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ جو کھانا کھاتے ہیں اور مشروب پیتے ہیں۔ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ہم یہی گمان کرتے ہیں کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اس میں آپ جھوٹے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 242

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ یعنی آسمان کی جانب اور اس کا ٹکڑا ہم پر گرادیں اور ہم اسے دیکھیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝ (الطور) ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے ارادہ کیا کہ ہم پر عذاب نازل کیا جائے۔ یہ جھٹلانے میں مبالغہ ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: كِسَف یہ کسفہ کی جمع ہے جس طرح سِدر یہ سدرہ کی جمع ہے۔ سلمی اور حفص نے کہا: کسفا یہ کسفہ کی جمع ہے اس سے مراد ٹکڑا اور جانب ہے اس کی تقدیر کِسفا اور کِسف ہے۔ جوہری نے کہا: کسفہ سے مراد شے کا ٹکڑا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اعطنی کسفة من ثوبك اس کی جمع کیسف اور کسف ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: الکسف والکسفة واحد۔ یعنی یہ دونوں ایک ہیں۔ اخفش نے کہا: جس نے کسفا پڑھا اس نے اسے واحد بنایا اور جس نے اسے کِسَفًا پڑھا ہے اس نے اسے جمع بنایا ہے۔ سورۂ اسراء میں یہ بحث گزری ہے۔ ہروی نے کہا: جس نے کسفا واحد پڑھا ہے اس کی جمع اکساف اور کسوف آتی ہے گویا فرمایا: أو نسقط علینا طبقا واحدا یہ كَسَفْتُ الشيء کسفا سے مشتق ہے جب تو اس کو ڈھانپ دے۔

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس میں دھمکی ہے، یعنی مجھ پر تبلیغ حق پہچانا ہے۔ یعنی وہ عذاب جس کا تم مجھ سے سوال کرتے ہو وہ میرے قبضہ میں نہیں اللہ تعالیٰ ہی تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں سخت گرمی نے آلیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بادل ان کی طرف بھیجا وہ بھاگ کر اس بادل کی طرف گئے تاکہ اس سے سایہ حاصل کریں جب وہ سارے اس کے نیچے جمع ہو گئے تو ان پر چیخ ماری گئی تو سب ہلاک ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ نے اس بادل کو ان کے سروں پر کھڑا کر دیا اور اسے گرمی سے بھڑکا دیا یہاں تک کہ وہ راکھ سے مر گئے۔ دنیا میں یہ دن عذاب کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان پر باد سموم بھیجی وہ ایکہ کی طرف نکلے تاکہ وہ اس سے سایہ حاصل کریں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دن پر آگ کی صورت میں بھڑکا دیا تو وہ سب جل گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی اور دوسرے علماء سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ نے ان پر جہنم کا دروازہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر شدید گرمی کو بھیجا جس نے ان کی سانسوں کو گرفت میں لے لیا وہ ان کے گھروں میں داخل ہو گئے انہیں نہ کوئی سایہ نفع دیتا اور نہ ہی پانی۔ گرمی نے ان کو پکا دیا وہ بھاگ کر جنگل کی طرف گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کو بھیجا اس نے ان پر سایہ کر دیا انہوں نے اس کی ٹھنڈک، راحت اور عمدہ خوشبو پائی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بلایا جب وہ سب بادل کے نیچے جمع ہو گئے اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کو بھڑکا دیا زمین میں زلزلہ برپا ہو گیا تو وہ یوں جل گئے جس طرح کڑاہی میں مکڑی جل جاتی ہے تو وہ سارے کے سارے راکھ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بھی یہی مطلب ہے: فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (ہود)

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے سات سال تک ہوا کو روک لیا ان پر گرمی کو مسلط کر دیا یہاں تک کہ اس نے ان کی سانسوں کو اپنی گرفت میں لے لیا سایہ اور پہاڑ نے ان کو کوئی نفع نہ دیا وہ درندوں کے کھوہوں میں داخل ہوئے تاکہ اس سے ٹھنڈک حاصل کریں تو وہ اس کے ظاہر سے اندر زیادہ

شدید گرمی پاتے وہ جنگل کی طرف بھاگے ان پر بادل نے سایہ کرلیا یہی ظلہ تھا انہوں نے اس ٹھنڈک اور بادنسیم کو پایا اس بادل نے ان پر آگ کو برسایا تو وہ جل گئے۔ یزید جریری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر سات دن اور سات راتیں گرمی کو مسلط کیا پھر ان کے لیے دور سے ایک پہاڑ بلند کیا گیا ایک آدمی اس کے پاس آیا وہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے نیچے نہریں، چشمے، درخت اور ٹھنڈا پانی ہے سب اس کے نیچے جمع ہو گئے پہاڑ ان پر آپڑا جب کہ وہ ظالم تھے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دو امتوں کی طرف مبعوث کیا اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب ایکہ کو ظلم سے ہلاک کر دیا جہاں تک اصحاب مدین کا تعلق ہے تو حضرت جبریل امین نے ان پر چیخ ماری تو وہ سب ہلاک ہو گئے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں امتوں میں سے نو سو افراد حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لائے۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

''اور بلاشبہ یہ کتاب رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تا کہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے، یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے اور اس کا (ذکر خیر) پہلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے''۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سورت کے آغاز میں جس کا ذکر ہے اس کی طرف رجوع کیا کہ مشرکین نے قرآن سے اعراض کیا۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ، نزل کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمر نے مخفف پڑھا باقی قراء نے نزل کو مشدد پڑھا ہے بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ منصوب ہے۔ وہ ابو حاتم اور ابوعبید کا پسندیدہ قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ یہ نزل کا مصدر ہے۔ جس نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ کہے یہ مقدر نہیں کیونکہ معنی ہے قرآن رب العالمین کی نازل شدہ ہے جسے جبریل امین نے تیری طرف نازل کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (البقرہ: 97) یعنی وہ تجھ پر اسے تلاوت کرتا ہے اور تیرا دل اسے یاد کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ تیرا دل ثابت رہے۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ تا کہ یہ نہ کہیں جو تو کہتا ہے: ہم اسے نہیں سمجھتے۔ وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ان کے نزول کا ذکر انبیاء کی کتب میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پہلوں کی کتابوں میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ (الاعراف: 157) زُبُر کا معنی کتابیں ہیں واحد زبور ہے جس طرح رسول کی جمع رسل ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اَوَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَ لَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ

الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''کیا نہیں تھی (ان مشرکین مکہ) کے لیے آپ کی سچائی کی یہ دلیل کہ جانتے ہیں آپ کو بنی اسرائیل کے علماء اور اگر ہم اتارتے قرآن کو کسی غیر عربی پر پھر وہ ان کو پڑھ کر سناتا تب وہ ایمان لانے والے نہیں تھے یونہی ہم نے داخل کر دی ہے انکار کی عادت مجرموں کے دلوں میں وہ ایمان نہیں لائیں گے اس پر جب تک دیکھ نہ لیں دردناک عذاب کو سو وہ آئے گا ان پر اچانک اور انہیں اس (کی آمد) کا احساس ہی نہ ہوگا تب (بصد حسرت) کہیں گے: کیا ہمیں مزید مہلت ملے گی؟ کیا وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں''۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مجاہد نے کہا: مراد عبداللہ بن سلام، سلمان اور ان دونوں کے علاوہ جو مسلمان ہوئے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اہل مکہ نے یہودیوں کی طرف پیغام بھیجا جو مدینہ طیبہ میں تھے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان سے سوال کرتے تھے۔ انہوں نے کہا: یہ اس نبی کا زمانہ ہے ہم تورات میں اس کی نعت اور صفت پاتے ہیں (2)۔ لفظ علماء ان سب کی طرف راجع ہے جو ان کی کتابوں کا علم رکھتے وہ یہی گفتگو کرتے جو وہ اسلام لایا نہ لایا اہل کی کتاب کی گواہی مشرکوں کے خلاف دلیل بن گئی کیونکہ وہ دینی امور میں اہل کتاب کی طرف رجوع کرتے کیونکہ ان کا گمان تھا کہ وہ اس کا علم رکھتے ہیں۔ ابن عامر نے اولم تکن لھم آیۃ قراءت کی باقی قراء نے أولم یکن لھم آیۃً نصب کے ساتھ قراءت کی ہے یہ خبر ہے اور یکن کا اسم أن یعلمہ ہے تقدیر کلام یہ ہے أولم یکن لھم علم علماء بنی اسرائیل الذین أسلموا آیۃ واضحۃ پہلی قراءت کی صورت میں کان کا اسم آیۃ ہے خبر أن یعلمہ علماء بنی اسرائیل ہے۔ عاصم جحدری نے قراءت کی أن تعلمہ علماء بنی اسرائیل۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ایسے آدمی پر جو عربی زبان والا نہیں۔ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ لغت عرب کے بغیر ان پر پڑھتا تو وہ ایمان نہ لاتے اور کہتے ہم اسے سمجھے ہی نہیں۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا (فصلت: 44) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر ہم اسے غیر عربی آدمی پر بھیجتے تو تکبر کی وجہ سے وہ ایمان نہ لاتا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل اعجمی واعجم۔ جب وہ فصیح نہ ہو اگرچہ وہ عربی ہو۔ رجل عجمی اگرچہ فصیح ہو اسے اپنے اصل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر فراء نے اجازت دی ہے کہ یہ کہا جائے: رجل عجمی یہ اعجمی کے معنی میں ہے۔ حضرت حسن بصری نے علی بعض الاعجمیین قراءت کی ہے یعنی مشدد پڑھا ہے دو یاء ہیں اسے اسم منسوب بنایا ہے جس نے الأعجمین قراءت کی تو ایک قول یہ کیا گیا: یہ اعجم کی جمع ہے۔ اس میں بعد ہے، کیونکہ وہ اسم جو صفات میں سے ہو جس کی مونث فعلاء کے وزن پر ہو اس کی جمع واؤ اور نون سے نہیں بنائی جاتی اور نہ ہی الف اور تاء سے جمع بنائی جاتی ہے نہ احمرون کہا جاتا ہے اور نہ

1۔ تفسیر طبری 2۔ تفسیر بغوی

حمراوات کہا جاتا ہے۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اصل اعجمین ہے جس طرح جحدری کی قراءت ہے پھر یا نسبت کو حذف کر دیا اور اس کی جمع یاء اور نون سے بنائی جو اس پر دلیل ہے یہ ابوالفتح عثمان بن جنی نے کہا: یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔

**كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ**، ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے یعنی قرآن کا کفر۔ **فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ** ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے ان کے دل میں تکذیب کو داخل کر دیا یہی وہ چیز تھی جس نے انہیں ایمان سے روک دیا: یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔عکرمہ نے کہا: ہ ضمیر سے مراد قسمتی ہے۔معنی قریب قریب ہے۔سورۂ حجر میں یہ بحث گزر چکی ہے۔فراء نے لا یومنون میں جزم کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس پر شرط اور جزا کا معنی موجود ہے۔یہ گمان کیا گیا ہے کہ عربوں کا معمول ہے جب لا کو کی لا کی جگہ رکھا جائے جس طرح یہاں ہے تو بعض اوقات یہ مابعد کو جزم دیتا ہے اور بعض اوقات مابعد کو یہ رفع دیتا ہے تو کہتا ہے: ربطت الفرس لا ینفلت فعل مضارع پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں کیونکہ اس کا معنی ہے اگر میں اس کو نہ باندھتا تو وہ کھسک جاتا اور رفع کیلا ینفلت کے معنی میں ہے۔بنی عقیل کے آدمی کا شعر پڑھا:

وحتى رأينا أحسنَ الفعلِ بيننا مُسَاكَنَةٌ لا يقرِفُ الشَّرَ قارِفُ

لا یقرف مرفوع ہے کیونکہ کی محذوف ہے۔

اور جزم دوسرے کے قول میں ہے:

لطالَما حَلَأْتُماهَا لا تَرِدْ فخلِّيا هما والسِّجالَ تَبْتَرِدْ

محل استدلال تبترد ہے۔

نحاس نے کہا: یومنون میں یہ سب کچھ بصریوں کے نزدیک خطا ہے جازم کے بغیر جزم جائز نہیں۔کوئی ایسی چیز نہیں جو عمل کرے اور جب اسے حذف کیا گیا تو وہ ایسا عمل کرے جو اس کے اس عمل سے اقوی ہو جب کہ وہ موجود ہے۔یہ واضح استدلال ہے۔

**حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً**، **فَيَاْتِيَهُمْ** کا فاعل العذاب ہے۔حضرت حسن بصری نے پڑھا فتاتیهم معنی ہے قیامت ان پر اچانک آجائے گی۔اسے مضمر کیا گیا ہے، کیونکہ العذاب اس پر دلالت کرتا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ الساعۃ کا ذکر قرآن میں کثرت سے واقع ہوا ہے۔ایک آدمی نے حضرت حسن بصری سے کہا جب کہ آپ نے فتاتیهم پڑھا: اے ابا سعید! عذاب ان پر اچانک آجائے گا؟ تو آپ نے اسے جھڑکا، فرمایا: وہ قیامت ہے جو ان پر اچانک آئے گی۔

**وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ** وہ اس کے آنے کا احساس بھی نہ کریں گے۔

**فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ** کیا ہمیں مہلت دی جائے گی وہ وہاں رجوع کا مطالبہ کریں گے تو انہیں کوئی جواب نہ دیا جائے گا۔قشیری نے کہا فیاتیهم اس کا عطف حتی یروا پر نہیں بلکہ یہ لا یومنون کے قول کا جواب نہیں۔جب یہ نفی کا جواب ہے تو اس کو نصب دی اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَيَقُوْلُوْا**۔

**اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا**

يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾ وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرٰى ۛ وَ مَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٠٩﴾

''کیا وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں کیا تم نے کچھ غور کیا اگر ہم لطف اندوز ہونے دیں انہیں چند سال پھر (یہ عرصہ گزرنے کے بعد) آئے ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا تو کیا نفع دیں گے انہیں (اس وقت) وہ (سازوسامان) جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس کے لیے ڈرانے والے (بھیجے گئے) تھے یاددہانی کے لیے اور ہم ظالم نہیں تھے''۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ مقاتل نے کہا: مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! کب تک آپ ہمیں عذاب کی دعوت دیتے رہیں گے اور اس کو لائیں گے نہیں؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ یعنی دنیا میں ہم لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ضحاک اور دوسرے علماء کے نزدیک مراد اہل مکہ ہیں۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ عذاب اور ہلاکت جس کی انہیں دھمکی دی جاتی تھی۔ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ پہلا ما استفہامیہ ہے اس کا معنی تقریر ہے اغنی کی وجہ سے یہ محل نصب میں ہے۔ دوسرا ما محل رفع میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما نافیہ ہو اس کا کوئی محل اعراب نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلا ما نافیہ ہے اور دوسرا ما، اغنی کی وجہ سے محل رفع میں ہو ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ما أغنى عنهم الزمان الذي كانوا يمتعون زہری سے مروی ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز جب صبح کرتے تو اپنی داڑھی کو پکڑ لیتے پھر اسے پڑھتے اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾ پھر روتے اور کہتے:

نهارُك يا مغرورُ سهوٌ و غفلةٌ — وليلُك نومٌ والرَّدى لك لازمُ
فلا أنتَ في الأيقاظ يقظانُ حازمٌ — ولا أنتَ في النُّوَّام ناجٍ فسالمُ
تُسَرُّ بما يَفْنَى و تفرحُ بالمنى — كما سُرَّ باللذات في النوم حالمُ
وتَسعى إلى ما سوف تكرهُ غِبَّهُ — كذلك في الدنيا تَعيشُ البهائمُ

اے دھوکہ میں مبتلا شخص تیرا دن بھول اور غفلت میں ہے اور تیری رات نیند میں ہے ہلاکت تجھے لازم ہے۔ تو بیداری میں بیدار اور محتاط نہیں نہ ہی تو سونے والوں میں نجات پانے والا اور سلامت رہنے والا ہے۔ جو چیز فانی ہے اس سے تو خوش ہوتا ہے اور تو آرزوؤں پر خوش ہوتا ہے جس طرح لذات سے نیند میں خواب دیکھنے والا خوش ہوتا ہے۔ تو اس کی طرف دوڑتا ہے جس کو تو کل ناپسند کرے گا جس طرح دنیا میں چوپائے خوش ہوتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ من زائدہ ہے معنی ہے وما اهلكنا قرية، اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ مگر اس کے لیے رسل تھے۔ ذِكْرٰى کسائی نے کہا: حال ہونے کی حیثیت میں محل نصب میں ہے (1)۔ نحاس نے کہا: یہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں فراء اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 244

ابو اسحاق کا قول ہے کہ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ فراء نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ینذ کرون ذکری۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ کا معنی ہے مگر اس کے لیے نصیحت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ذِكْرٰى میں اعراب واضح نہیں ہوتا کیونکہ اس میں الف مقصورہ ہوتا ہے۔ اسے تنوین کے ساتھ ذکری پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اور اس کا مبتدا مضمر ہو۔ ابو اسحاق نے کہا: ہمارا ڈرنا نصیحت ہے۔ فراء نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ذلك ذکری و تلك ذکری۔ ابن انباری نے کہا: بعض مفسرین نے کہا سورۂ شعراء میں کسی جگہ وقف تام نہیں ہوتا مگر اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ پر وقف تام ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وقف حسن ہے پھر کلام کو شروع کرے۔ ذِكْرٰى کلام یہ بنے گی ھی ذکری یعنی انہیں نصیحت کی جاتی ہے۔ ذِكْرٰى پر وقف عمدہ ہے۔ وَ مَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ یعنی انہیں عذاب دینے میں ہم ظالم نہیں کیونکہ ہم نے ان پر حجت مکمل کر دی ہے اور تمام عذر ختم کر دیے ہیں۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾

''اور نہیں اترے اس قرآن کو لے کر شیاطین اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ انہیں (شیطانوں کو) تو ان کے سننے سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ پس نہ پکارا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو، ورنہ تو ہو جائے گا ان لوگوں میں سے جنہیں عذاب دیا گیا ہے''۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ، ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے بلکہ اسے روح الامین نے نازل کیا ہے۔

وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ جس طرح سورۂ حجر میں بیان کیا گیا ہے انہیں شہاب پھینک مار کر سننے سے روک دیا گیا ہے۔ حضرت حسن بصری اور محمد بن سمیقع اسے وما تنزلت به الشیاطون پڑھا کرتے۔ مہدوی نے کہا: یہ لغت عرب میں جائز نہیں اور خط کے مخالف ہے۔ نحاس نے کہا: یہ تمام نحویوں کے نزدیک غلط ہے۔ میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا، وہ کہتے میں نے محمد بن زید کو کہتے ہوئے سنا: یہ علماء کے نزدیک غلط ہے یہ شبہ کے داخل ہونے کی وجہ سے ہوا جب حضرت حسن بصری نے اس کے آخر میں یاء اور نون دیکھا جب کہ یہ محل رفع میں ہے تو ان پر جمع سالم کے اعتبار سے اشتباہ ہوا تو ان سے غلطی ہوئی۔ حدیث میں ہے ''عالم کی لغزش سے بچو (1)''۔ جب کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ پڑھا وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (البقرہ: 14) اگر یہ محل رفع میں واؤ کے ساتھ ہوتو اضافت کی وجہ سے نون کا حذف واجب ہوتا۔ ثعلبی نے کہا: فراء نے کہا حضرت حسن بصری نے غلطی کی۔ یہ نضر بن شمیل سے ذکر کیا گیا تو کہا: اگر رؤبہ، عجاج اور ان جیسے لوگوں کے قول سے استدلال کرنا جائز ہے تو حضرت حسن بصری اور ان کے اصحاب کے قول سے بھی استدلال کرنا جائز ہے۔ ساتھ ساتھ ہم جانتے ہیں انہوں نے اسے نہیں پڑھا مگر انہوں نے اس بارے میں کوئی روایت سنی ہوگی۔ مورج نے کہا: اگر لفظ شیطان شاط، یشیط سے مشتق ہو تو ان دونوں کی قراءت کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے۔ یونس بن حبیب نے کہا: میں نے ایک اعرابی کو کہتے ہوئے

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الشہادات، باب ماتجوز به شهادة اهل الهواء، جلد 10، صفحہ 211، دار الفکر

سنا: دخلنا بساتین من و رائھا بساتون۔ میں نے کہا: یہ قول حضرت حسن بصری کی قراءت کے کتنے زیادہ مشابہ ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اسے کہو جو اس کا انکار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اگرچہ آپ ایسا نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ معصوم اور چنے ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ آپ کو خطاب کیا گیا اور مقصود اس کا غیر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء) وہ اپنے نسب اور قرابت پر بھروسہ نہ کریں کہ وہ ان امور کو چھوڑ دیں جو ان پر واجب ہیں۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾

''اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ فرما دیں میں بری الذمہ ہوں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے ہو۔ اور بھروسہ کیجئے سب سے غالب ہمیشہ رحم کرنے والے پر جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور (دیکھتا رہتا ہے جب) آپ چکر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں) کا بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ڈرانے میں قریبی رشتہ داروں کو خاص کیا ہے تاکہ تمام قبیلہ اور اجنبی لوگوں کی طمع ختم ہو جائے جب ان کے شرک پر رہتے ہوئے آپ انہیں چھوڑ جائیں۔ قریبی عشیرہ سے مراد قریش ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بنو عبد مناف ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث واقع ہے ''اپنے قریبی رشتہ داروں اور مخلص ساتھیوں کو ڈرائیں'' (1)۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ قرآن تھا جو تلاوت کیا جاتا تھا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا کیونکہ مصحف میں نقل ثابت نہیں اور نہ ہی یہ تواتر سے ثابت ہے اس کے ثبوت پر اشکال لازم آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ پر لازم آتا ہے کہ آپ کسی کو نہ ڈرائیں مگر جو آپ کے عشیرہ میں سے ایمان لائے، کیونکہ مومن ہی وہ لوگ ہیں جو اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اخلاص کی صفت سے متصف ہیں نہ کہ مشرک اس سے متصف ہیں کیونکہ مشرک ان میں سے کسی چیز پہ نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام عشیرہ کو دعوت دی وہ مومن تھا یا کافر تھا۔ آپ نے سب کو ڈرایا اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کو ڈرایا اور جو ان کے بعد آئیں گے ان کو ڈرایا۔ نہ یہ نقلا ثابت ہے اور نہ ہی معنی ثابت ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان من مات علی الکفر فھو فی النار ولا تنالہ شفاعۃ ولا تنفعہ قرابۃ المقربین، جلد 1، صفحہ 114، قدیمی کتب خانہ

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو دعوت دی وہ سب عام و خاص جمع ہو گئے۔ فرمایا: ''اے بنی کعب بن لؤی! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ(1)۔ اے بنی ہاشم! اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنی عبدالمطلب! اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے نفس کو آگ سے بچاؤ۔ میں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں میں اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں سوائے اس کے کہ تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے میں دنیا میں تمہارے ساتھ صلہ رحمی کروں گا اور آخرت میں تمہیں کوئی نفع نہ دوں گا''۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس حدیث اور آیت میں دلیل ہے کہ اسباب میں بعد ہوتے ہوئے انساب کا قرب بندے کو نفع نہ دے گا۔ اس امر کے جواز پر دلیل ہے کہ مومن کافر کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتا ہے اس کی رہنمائی کر سکتا ہے اور اخلاص کا مظاہرہ کر سکتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ان لکم رحما سابلّها ببلالها تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے میں دنیا میں تمہارے ساتھ صلہ رحمی کرتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ (الممتحنہ:8) جس کی وضاحت آگے آئے گی۔

**وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** سورۂ حجر اور سورۂ اسراء میں یہ بحث گزر چکی ہے خفض جناحہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ نرمی کرے۔ **فَاِنۡ عَصَوۡکَ** تیرے امر کی مخالفت کریں۔ **فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ** تم جو میری نافرمانی کرتے ہو میں اس سے بری ہوں کیونکہ ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی امر کا حکم نہیں دیتے مگر اسی امر کا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براءت کا اظہار کر دیں اللہ تعالیٰ اسی سے براءت کا اظہار کر دیتا ہے۔

**وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ** اپنے امر کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں، کیونکہ وہی غالب ہے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ رحیم ہے وہ اپنے دوستوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ عام قراءت وتوکل واؤ کے ساتھ ہے اسی طرح ان کے مصاحف میں ہے۔

نافع اور ابن عامر نے فتوکل فاء کے ساتھ پڑھا ہے(2) اسی طرح مدینہ اور شام کے مصاحف میں ہے۔ **الَّذِیۡ یَرٰىکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ** اکثر مفسرین کے قول کے مطابق: جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو؛ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا یہی قول ہے۔ مجاہد نے کہا: جہاں کہیں ہوں، تو جب کھڑے ہوں(3)۔ **وَ تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ** مجاہد اور قتادہ نے کہا: الساجدین سے مراد نمازیوں میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آباء کی پشتوں میں۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں تک کہ آپ کو نبی کی حیثیت سے نکالا۔ عکرمہ نے کہا: آپ کو قیام کرتے ہوئے رکوع کرتے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان من مات علی الکفر فھو فی النار ولا تنالہ شفاعۃ ولا تنفعہ قرابۃ المقربین، جلد 1، صفحہ 114، قدیمی کتب خانہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 245

3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 246

ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ قول بھی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے آپ نماز میں اپنے دل سے اپنے پیچھے نماز پڑھنے والوں کو دیکھتے ہیں جس طرح آپ اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے والے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ مجاہد سے مروی ہے ماوردی اور ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے والے لوگوں کو اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح اپنے سامنے والوں کو دیکھا کرتے تھے۔ یہ صحیح میں ثابت ہے۔ آیت کی یہ تاویل بعید ہے: اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

''کیا میں بتاؤں تمہیں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں وہ اترتے ہیں ہر جھوٹ گھڑنے والے بدکار پر یہ اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر نرے جھوٹے ہیں''۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۔ تنزل فرمایا کیونکہ اکثر یہ ہوا میں ہوتا ہے اور ہوا میں گزرتا ہے۔ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ سورۂ حجر میں بحث گزر چکی ہے۔ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ یہ شیاطین کی صفت ہے وَ اَكْثَرُهُمْ یہ کاہنوں کی طرف لوٹتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ شیاطین کی طرف راجع ہے۔

وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

''اور جو شعراء ہیں تو ان کی پیروی حق سے بہکے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شعراء ہر وادی میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں اور وہ کہا کرتے تھے ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے بجز ان شعراء کے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم و ستم کیے کہ وہ کس (بھیانک) جگہ لوٹ کر آرہے ہیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ الشُّعَرَآءُ۔ یہ شاعر کی جمع ہے جس طرح جاہل کی جمع جہلاء ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد کفار ہیں ان کی جنوں اور انسانوں میں گمراہ لوگ پیروی کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الْغَاوٗنَ سے مراد حق سے بھٹکے ہوئے ہیں اس میں یہ دلالت موجود ہے کہ شعراء بھی گمراہ ہیں کیونکہ اگر وہ گمراہ نہ ہوتے تو ان کے پیروکار گمراہ نہ ہوتے ہم سورۂ نور میں بیان کر چکے ہیں کہ کن اشعار کو پڑھنا جائز ہے، کن کو پڑھنا مکروہ ہے اور کن کو پڑھنا حرام ہے۔ امام مسلم نے عمرو بن شرید سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا

ہوا تھا پوچھا: ''کیا تیرے پاس امیہ بن صلت کا شعر ہے؟'' میں نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''کچھ کہو''۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔ فرمایا: ''کچھ اور پڑھو''۔ میں نے ایک اور شعر پڑھا۔ فرمایا: ''کچھ اور کہو'' یہاں تک کہ میں نے سو اشعار پڑھے (1)۔

یہی اس سند سے صحیح ہے۔ امام مسلم کے ایک راوی نے یوں روایت کی ہے عمرو بن شرید اپنے باپ سے، اس میں وہم ہے کیونکہ شرید کو ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا ابو شرید کا نام سوید تھا۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ اشعار کو یاد کیا جائے اور ان کو ملحوظ رکھا جائے جب وہ حکمتوں اور مستحسن معانی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہوں۔ وہ معانی شرعی طور پر مستحسن ہوں یا طبعی طور پر مستحسن ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امیہ بن ابی صلت کے اشعار اکثر سنا کرتے تھے کیونکہ وہ حکیم تھا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں دیکھا: ''قریب تھا کہ امیہ بن ابی صلت مسلمان ہو جاتا''۔ رہے وہ اشعار جو اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کی حمد اور اس کی ثنا کو اپنے ضمن میں لیے ہوتے ہیں تو وہ مندوب ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی کہنے والا کا قول ہے:

الحمد لله العلي المنان صار الثريد في رؤس العيدان

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور مدح ہو جس طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے اشعار ہیں۔

مِن قبلها طِبْتَ في الظِلال وفي مستودعٍ حيث يُخْصَفُ الورقُ

ثم هبطت البلاد لا بشرٌ أنت ولا مُضْغةٌ ولا عَلَقُ

پھر تو شہروں کی طرف اترا نہ تو بشر ہے، نہ مضغہ ہے اور نہ ہی علق ہے۔

بل نطفة تركب السَفِينَ وقد ألجَمَ نَسْرًا وأهلَه الغَرَقُ

تنقل من صالبٍ إلى رَحِمٍ إذا مَضَى عَالَمٌ بَدَا طَبَقُ

تو پشت سے رحم کی طرف منتقل ہوتا ہے جب ایک عالم (زمانہ) گزر جاتا ہے تو دوسرا زمانہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: لا يَفْضُضِ اللهُ فاك اللہ تعالیٰ تیرے دانت سلامت رکھے۔ یا شاعر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرے جس طرح حضرت حسان کا قول:

هجوتَ محمدًا فأجبتُ عنه وعند اللهِ في ذلك الجزاءُ

تو نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تو میں نے آپ کی طرف سے جواب دیا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بارے میں جزا ہے۔

یہ وہ اشعار ہیں جن کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں ذکر کیا یہ سیرت میں مکمل ہیں۔ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے۔ جس طرح زید بن اسلم نے روایت کی ہے۔

ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نگہبانی کے لیے نکلے تو آپ نے ایک گھر میں چراغ دیکھا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت اون دھنک رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

على محمدٍ صلاة الأبرار صلى عليه الطَيبون الأخيار

1۔ صحیح مسلم، کتاب الشعر، جلد 2، صفحہ 239

قد كنتَ قوّامًا بُكًا بالأسحارْ　　　يا ليتَ شِعْرى والمنايا أطوارْ

هل يَجمعنى وحبيبى الدارْ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ابرار کا درود ہو آپ کے پاکیزہ اور نیک لوگوں کا درود ہو آپ قیام کرنے والے تھے سحری کے وقت رونے والے تھے کاش میں جانتا جب کہ موتیں پے در پے واقع ہونے والی ہیں۔ کیا دار مجھے اور میرے حبیب کو جمع کرے گا۔ مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ کر رونے لگے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا ذکر اور ان کی مدح کرنا۔ محمد بن سابق نے کتنا اچھا کیا جب کہا:

إنّي رضيتُ عليا للهُدَى عَلَمًا　　　كما رضيتُ عَتيقًا صاحبَ الغارِ

وقد رضيتُ أباحفصٍ و شيعَتُه　　　وما رضيتُ بقتل الشيخِ في الدارِ

كلُّ الصحابة عندى قُدوةٌ عَلَمٌ　　　فهل علىَّ بهذا القول من عارِ

إن كنتَ تعلم أنّي لا أحبُّهُمْ　　　إلّامن اجلك فاعتقى من النّار

میں حضرت علی پر راضی ہوں وہ ہدایت کے نشان ہیں جس طرح میں عتیق پر راضی ہوں جو صاحب غار ہیں ابو حفص اور ان کے حمایتیوں پر راضی ہوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں قتل پر راضی نہیں۔ میرے نزدیک تمام صحابہ مقتدی ہیں۔ کیا ایسے قول کی وجہ سے مجھ پر کوئی شرمندگی ہو سکتی ہے؟ اے میرے رب! اگر تو جانتا ہے کہ میں ان سے صرف تیری وجہ سے محبت کرتا ہوں تو مجھے آگ کے عذاب سے نجات عطا فرما۔

ایک اور نے اشعار کہے اور خوب کہے:

حُبُّ النَّبِي رسول الله مُفْتَرَضٌ　　　وحُبُّ أصحابِه نورٌ ببرهانِ

من كان يعلم أن الله خالقه　　　لا يرمينَّ أبابكرٍ ببهتانِ

ولا أبا حفص الفاروقَ صاحبَه　　　ولا الخليفة عثمان بن عفانِ

أمّا علىٌّ فمشهورٌ فضائلُه　　　والبيت لا يَستوِى إلّا بأركانِ

نبی جو رسول اللہ ہیں ان کی محبت فرض ہے اور آپ کے صحابہ کی محبت نور ہے جس کے ساتھ برہان ہے جو یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق ہے وہ حضرت ابو بکر صدیق پر بہتان نہیں لگائے گا۔ وہ ابو حفص فاروق جو حضور کے صحابی ہیں پر اور نہ خلیفہ عثمان بن عفان پر بہتان لگائے گا۔ جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے تو ان کے فضائل مشہور ہیں اور گھر ارکان کے ساتھ ہی مکمل ہوتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: جہاں تک تشبیہات میں استعارات کا تعلق ہے تو ان اشعار میں اس کی اجازت ہے اگرچہ تو اس میں مستغرق ہو جائے اور معتاد طریقہ سے تجاوز کر جائے۔ اسی وجہ سے وہ فرشتہ جو خوابوں پر مقرر ہے وہ مثالیں بیان کرتا ہے۔

حضرت کعب بن زہیر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی:

بانت سعادُ فقلبى مَتبُولُ　　　مُتَيَّمٌ إثرَها لم يُفْدَ مَكْبُولُ

وما سُعادُ غداۃَ البَیْنِ إذ رَحلُوا　　إلّا أغَنّ غَضیضُ الطَّرفِ مَکحولُ

تَجلُو عَوارِضَ ذِی ظَلْمٍ إذا ابتسمتْ　　کأنّہ مُنْہَلٌ بالرّاحِ مَعْلولُ

سعاد جدا ہوگئی تو میرا دل اس کے پیچھے اس کی محبت کی وجہ سے بیمار، ذلیل اور قید ہے جس کا فدیہ نہیں دیا گیا جب انہوں نے کوچ کیا تو جدائی کی صبح سعاد نہیں تھی مگر گنگنانے والی، آنکھیں جھکی ہوئی جن میں سرمہ لگا ہو جب وہ مسکراتی تو تر چمکدار دانتوں کو ظاہر کرتی گویا وہ ایسا گھاٹ ہے جس سے کوچ کرتے وقت دوسری دفعہ پانی لیا گیا ہو۔

اس قصیدہ میں ہر طرح کے استعارات اور تشبیہات آتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے سنتے اور اس نے ریق (لعاب) کو راح (شراب) سے جو تشبیہ دی اس کو ناپسند نہیں کیا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے:

فَقَدْنا الوحیَ إذ ولّیتَ عنّا　　وودّعَنا من اللہ الکلامُ

سوی ما قد ترکتَ لنا رھینًا　　تَوارَثُہ القَراطیسُ الکرامُ

فقد أورثتَنا میراثَ صدقٍ　　علیک بہ التحیۃ والسلامُ

جب آپ نے ہم سے رخ انور پھیرا تو وحی ہم سے مفقود ہوگئی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کلام نے ہمیں الوداع کیا سوائے اس چیز کے جو آپ نے ہمارے لیے قابل ضمانت چھوڑی جسے معزز صحیفے محفوظ کیے ہوئے ہیں تحقیق آپ نے ہمیں سچائی کی میراث عطا کی اس وجہ سے آپ پر صلوٰۃ و سلام ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سنتے اور حضرت ابو بکر صدیق اسے پڑھتے کیا اس سے بہتر تقلید کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ ابو عمر نے کہا: اہل علم اور اہل دانش میں سے کوئی بھی اچھے شعر کو ناپسند نہیں کرتا کبار صحابہ، اہل علم، مقتدیٰ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں مگر اس نے شعر کہا، اس کو سنا اس میں جو حکمت یا مباح امر تھا اس میں کوئی فحش بات نہ تھی اور نہ ہی کسی مسلم کے لیے اذیت کا تصور تھا اس پر رضامندی کا اظہار کیا۔ جب وہ اس طرح ہو یعنی وہ فحش ہو یا اذیت ہو وہ شعر اور اس جیسی نثر دونوں برابر ہیں۔ اس کا سننا اور اس کا قول کرنا حلال نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا: أصدق کلمۃ أو أشعر کلمۃ قالتھا العرب قول لبید ألا کلُّ شیءٍ ما خلا اللہَ باطلُ (1) سب سے سچا کلام جو عربوں نے کہا وہ لبید کا قول ہے: خبردار اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے۔

امام مسلم نے اسے نقل کیا اور یہ اضافہ کیا "قریب تھا کہ امیہ بن ابی صلت مسلمان ہو جاتا"۔ ابن سیرین سے مروی ہے کہ انہوں نے شعر پڑھا تو پاس بیٹھنے والے لوگوں میں سے ایک نے کہا: اے ابو بکر تیری مثل آدمی شعر کہتا ہے۔ فرمایا: تو ہلاک ہو یا لُکَع۔ شعر بھی ایک کلام ہے قوافی کے علاوہ دوسرے کلاموں کے مخالف نہیں۔ ان میں سے اچھا اچھا ہے قبیح قبیح ہے۔ وہ شعر کا باہم ذکر کیا کرتے تھے۔ کہا میں نے حضرت ابن عمر کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا:

یُحِبُّ الخمرَ من مال النّدامیٰ　　ویکرہُ أن یفارقَہ الفُلوسُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الشعر، جلد 2، صفحہ 239

وہ مجلس کے مال سے شراب پسند کرتا ہے اور یہ ناپسند کرتا ہے کہ عکوس اس سے جدا ہو۔

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود جو مدینہ طیبہ کے دس فقہاء میں ایک، پھر سات شعراء میں سے ایک تھے وہ بہت عمدہ شاعر اور اس میں مقدم تھے۔ زبیر بن بکار جو قاضی تھے ان کی اشعار کے بارے میں کتاب ہے۔ اس کی ایک خوبصورت بیوی تھی جس کا نام عثمہ تھا کسی وجہ سے قاضی اس پر ناراض ہوئے اور اسے طلاق دے دی قاضی کے اپنی بیوی کے بارے میں بے شمار اشعار ہیں ان میں سے یہ بھی ہیں:

تَغلغَل حُبُّ عَثْمَةَ فی فؤادی　　فبادیه مع الخافی یسیرُ

تَغلغَل حیث لم یبلغ شَرابٌ　　ولا حزنٌ ولم یبلغ سرورُ

أکاد إذا ذکرتُ العهد منها　　أطیر لو أن إنسانا یَطیرُ

عثمہ کی محبت میرے دل میں موجزن ہے اس کا ظاہر اس کے باطن کے ساتھ چل رہا ہے۔ وہ وہاں تک نفوذ کر گئی ہے جہاں شراب نہیں پہنچتی نہ جہاں تک حزن ہے اور نہ ہی سرور پہنچا ہے جب میں اس کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتا ہوں تو قریب ہے کہ میں اڑنے لگوں اگر انسان اڑتا۔

ابن شہاب نے کہا: میں نے کہا تو اس فضل وشرف میں ہوتے ہوئے شعر کہتا ہے؟ اس نے جواب دیا: جس کے سینے میں تکلیف ہو جب وہ تھوکتا ہے تو اسے آرام آجاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جہاں تک مذموم شعر کا تعلق ہے تو اس کا سماع حلال نہیں اور اس کا کہنے والا ملامت کیا گیا ہوتا ہے۔ وہ باطل بات کہتا ہے یہاں تک کہ لوگوں میں سے جو سب سے بزدل ہوتا ہے اسے عنترہ پر فضیلت دیتا ہے۔ اور دنیا جہاں کے بخیل کو حاتم پر فضیلت دیتا ہے، وہ بری پر بہتان لگاتا ہے، متقی پر فسق کی تہمت لگاتا ہے۔ ایک کام کسی نے کیا نہیں ہوتا تو وہ افراط سے کام لیتا ہے مقصد نفس کو تسلی دینے کی رغبت رکھنا اور قبول کی تحسین کرنا۔ جس طرح فرزدق سے مروی ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے اس کا قول سنا:

فبِتْنَ بجانبیَّ مُصرَّعاتٍ　　وبِتُّ أَفُضُّ أغلاقَ الختامِ

اس شعر میں عورتوں سے خواہش نفس پوری کرنے کا ذکر ہے۔

سلیمان بن عبد الملک نے کہا: تجھ پر حد واجب ہو چکی۔ فرزدق نے عرض کی: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے مجھ سے حد کو ساقط کر دیا ہے۔ فرمایا: وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ روایت بیان کی گئی ہے کہ نعمان بن عدی بن نضلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا عامل تھا۔ اس نے یہ اشعار کہے:

مَنْ مُبلِغُ الحسناءِ أنّ حلیلَها　　بمَیْسَانَ یُسقَی فی زُجاجٍ و حَنْتَمِ

إذا شئتُ غَنّتنی دَهاقینُ قریةٍ　　ورقّاصةٌ تَجذو علی کلِّ مَنْسِمِ

فإن کنت ندمانی فبالأکبر أسقِنی　　ولا تَسقِنی بالأصغر المتثلِّمِ

لعلَّ أميرَ المؤمنين يَسوءهٗ تَنادُمنا بالْجَوسقِ المتهدِّمِ

ان اشعار میں شراب پینے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی عورتوں کا تذکرہ ہے۔

یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے اسے حاضری کا حکم دیا۔ کہا: الله کی قسم! یہ چیز مجھے پریشان کرتی ہے۔ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! جو کچھ آپ نے کہا اس میں سے میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ تو فضول کلام تھا الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: جہاں تک تیرے عذر کا تعلق ہے اس نے تجھ سے حد کو ساقط کر دیا ہے مگر تو میرا کبھی عامل نہیں بنے گا تو نے کہہ دیا جو کہہ دیا۔ زبیر بن کبیر نے ذکر کیا اور کہا: مصعب بن عثمان نے مجھے خبر دی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ بنے سوائے عمر بن ابی ربیعہ اور احوص کے کسی کو پریشانی نہ تھی آپ نے مدینہ طیبہ کے عامل کو خط لکھا: تو عمر اور احوص کے شر اور خبث کو پہچانتا ہے، جب تیرے پاس میرا یہ خط آئے ان دونوں کو گرفتار کر دو اور دونوں کو میرے پاس بھیج دو جب عامل کے پاس خط پہنچا تو اس نے دونوں کو آپ کے پاس بھجوا دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز، عمر بن ابی ربیعہ کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا:

فلم أر كالتَّجميرِ منْظَرَ ناظرٍ ولا كليالي الحج أَفْلَتْنَ ذَاهَوَى

وكم مالِئٍ عينيه من شيءِ غيرِهِ إذا راح نحو الجمرةِ البيضُ كالدُّمَى

خبردار اگر تو حج کا ارادہ کرتا تو تو کسی اور چیز کی طرف نہ دیکھتا جب ان دنوں میں لوگ تجھ سے چھٹکارا نہیں پاتے تو کب چھٹکارا پاتے ہوں گے پھر اس کو جلا وطن ہو جانے کا حکم دیا۔ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! کیا اس سے بہتر صورت بھی ہے؟ فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: میں الله تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں دوبارہ اس قسم کے اشعار نہیں کہوں گا۔ اور کبھی بھی اشعار میں عورتوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ میں نئے سرے سے توبہ کرتا ہوں۔ پوچھا: تو ایسا کرے گا؟ عرض کی: ہاں۔ اس کی توبہ پر الله تعالیٰ کے نام کا واسطہ دیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ پھر احوص کو بلایا فرمایا:

الله بيني و بين قَيِّمِها يَفِرُّ مِنّي بها وأَتْبَعُ

بلکہ الله اس کے قیم اور تیرے درمیان ہے۔ پھر اس کی جلا وطنی کا حکم دیا۔ اس کے متعلق انصار میں سے چند افراد نے گفتگو کی فرمایا: الله کی قسم! جب تک حکومت میرے پاس ہے میں اس کو واپس نہیں آنے دوں گا، کیونکہ یہ اعلانیہ فاسق ہے۔ یہ مذموم شعر کا حکم ہے اور اس شعر کو کہنے والے کا حکم ہے۔ اس کا سننا اور مسجد وغیرہ میں پڑھنا حلال نہیں، جس طرح قبیح کلام کو نثر کی صورت میں پڑھنا جائز نہیں۔ اسماعیل بن عیاش نے عبدالله بن عون سے وہ محمد بن سیرین سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں حسن الشعر كحسن الكلام و قبيحه كقبيح الكلام۔ اچھا شعر اچھی کلام کی طرح ہے اور قبیح شعر قبیح کلام کی طرح ہے۔ اسے اسماعیل نے عبدالله شامی سے روایت کیا ہے اہل شام سے اس کی حدیث صحیح ہے جو یحییٰ بن معین اور دوسرے علماء نے کہا ہے۔ عبدالله بن عمرو بن عاصم نے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الشعر

بمنزلة الكلام حسنه كحسن الكلام وقبيحه كقبيح الكلام۔(1) شعر کلام کے قائم مقام ہے اچھا شعر اچھی کلام کی طرح اور قبیح شعر قبیح کلام کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے یہاں تک کہ وہ پیٹ کو کھا جائے اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے“۔ صحیح میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا: اس اثنا میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے کہ ایک شاعر شعر کہتے ہوئے سامنے آ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شیطان کو پکڑ لو یا فرمایا: ”شیطان کو قابو کر لو“۔ کسی آدمی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے“(2)۔ ہمارے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ شاعر کے ساتھ اس وقت کیا جب اس کے احوال کو جانا۔ شاید یہ شاعر وہ تھا جس کے بارے میں معروف تھا کہ اس نے شعر کو کمائی کا ذریعہ بنا دیا ہے جب اسے کوئی مال دیا جاتا تو وہ مدح میں افراط سے کام لیتا اور جب اسے مال نہ دیا جاتا تو وہ ہجو اور مذمت میں زیادتی کرتا وہ لوگوں کو ان کے اموال اور عزتوں میں اذیتیں دیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں جس کی یہ حالت ہو تو جتنا مال وہ شعر کے ذریعے کماتا ہے وہ حرام ہے اس قسم کے جو اشعار کہے وہ اس پر حرام ہیں ان کو سننا حلال نہیں بلکہ ان کا انکار واجب ہے جس کو اس کی زبان سے خوف ہو اور اس کے لیے انکار بھی ممکن نہ ہو تو جہاں تک طاقت رکھے وہ اس کے ساتھ نرمی کرے اور جس قدر ممکن ہو اپنا بچاؤ کرے ابتداءً اسے کچھ نہ دے کیونکہ یہ معصیت پر مدد بنتی ہے۔ اگر وہ کوئی صورت پائے تو عزت بچانے کی نیت کرتے ہوئے اسے مال دے، بندے نے عزت بچانے کے لیے جو مال دیا وہ اس کے حق میں صدقہ کے طور پر لکھ دیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں قیح سے مراد وہ مادہ ہے جس میں خون کی آمیزش ہوتی ہے۔ اسی بارے میں یہ کہا جاتا ہے قاء الجرح يقيح و تقيح و قيح۔ "يريه"۔ اصمعی نے کہا: یہ وری سے مشتق ہے یہ رمی کی مثل ہے اس سے مراد ہے ان یدوی جوفه اس سے یہ لفظ ذکر کیا جاتا ہے رجل موری۔ یہ لفظ مشدد ہے مہموز نہیں۔ صحاح میں ہے وری القيح جوفه يريه وريا۔ جب وہ اسے کھا جائے۔ یزیدی نے یہ شعر پڑھا:

قالت له وَرْيًا إذا تَنَحنحا

اس کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ حدیث ان سب میں اچھی ہے: بے شک وہ شخص جس پر شعر کا غلبہ ہو اور اس کا سینہ اس سے بھر جائے اس کے علاوہ اس میں کوئی علم نہ ہو اور نہ ہی ذکر میں سے کوئی چیز ہو۔ اس (شعر) کے ساتھ وہ باطل میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے اور ایسے راستے پر چلتا ہے جس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ جس طرح بہت زیادہ غلطیاں کرتا ہو، پھر گفتگو کرتا ہو، غیبت کرتا ہو اور قبیح قول کرتا ہو جس پر شعر کا غلبہ ہو تو اس کو یہ مذموم اور کمینے اوصاف لازم ہوتے ہیں کیونکہ اولی عادت یہی ہے، یہی وہ معنی ہے جس کی طرف امام بخاری نے اپنی صحیح میں اشارہ کیا ہے جب اس حدیث کا باب یہ ذکر کیا باب ما يكره ان يكون الغالب على الانسان الشعر اس کی تاویل میں یہ قول کیا گیا ہے اس سے وہ اشعار مراد ہیں جن میں نبی

1۔ الادب المفرد للبخاری

2۔ صحیح مسلم، کتاب الشعر، باب تحریم اللعب بالنرد شیر، جلد 2، صفحہ 240

کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے لوگوں کی ہجو کی گئی ہو۔ یہ کوئی چیز نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھوڑی ہجو کی گئی ہو یا زیادہ کی گئی ہو وہ کفر اور مذموم ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کی ہجو وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہو وہ بھی مذموم ہے اس وجہ سے کثیر کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام شافعی نے کہا: شعر کلام کی نوع ہے اچھا شعر اچھی کلام کی طرح اور قبیح شعر قبیح کلام کی طرح ہے یعنی شعر بالذات مکروہ نہیں یہ متعلقات کی وجہ سے مکروہ ہے جب کہ عربوں کے ہاں اس کا بڑا مقام تھا۔ ان میں سے پہلے لوگوں نے کہا:

وجُرْحُ اللسان کجُرْحِ الید　　زبان کا زخم ہاتھ کے زخم کی طرح ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شعر کے بارے میں فرمایا جس میں حضرت حسان نے مشرکوں کو جواب دیا تھا: إنه لأسرع فیهم من رشق النَّبْل۔ یہ شعر ان میں تیر مارنے سے زیادہ تیزی سے اثر کرے گا۔ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابن عباس سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے جب عمرۃ القضاء کا مرحلہ تھا جب کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ آپ کے سامنے چل رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

خَلُّوا بنی الکفّار عن سبیله　　الیومَ نَضرِبْکُمْ علی تنزیله

ضربا یزیلُ الهامَ عن مَقِیله　　ویُذْهِلُ الخلیلَ عن خلیله

اے کفار کی اولاد! آپ کا راستہ خالی کر دو آج ہم قرآن کے حکم کے مطابق تم پر ایسا وار کریں گے جو کھوپڑی کو تن سے جدا کر دے گا اور دوست کو دوست سے غافل کر دے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابن رواحہ! اللہ تعالیٰ کے حرم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے عمر! اس کو چھوڑ دو یہ ان میں تیر کے وار سے زیادہ تیزی سے اثر کرنے والا ہے'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ جتنا میں جانتا ہوں قراء نے الشُّعَرَآءُ کے رفع میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ فعل مضمر کے ساتھ نصب دینا بھی جائز ہے جس کی تفسیر یَتَّبِعُهُمُ فعل بیان کرتا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے اس کے ساتھ قراءت کی ہے۔ ابو عبید نے کہا: ان پر غالب نصب کا پسندیدہ ہوتا ہے اس نے پڑھا وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ (المائدہ: 38) حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ (الهب) سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا (النور: 1) نافع، شیبہ، حسن بصری اور سلمی نے پڑھا یتبعهم یعنی اسے مخفف پڑھا۔ باقی قراء نے یتّبعهم پڑھا ہے۔ ضحاک نے کہا: دو آدمیوں نے باہم ہجو کی ایک انصاری تھا اور ایک مہاجر تھا دونوں نے یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا ہر ایک کے ساتھ اس کی قوم کے بے وقوف بھی تھے تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا (2)۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو آگے اشعار روایت کرتے ہیں۔ علی بن طلحہ نے ان سے روایت نقل کی ہے: مراد وہ کفار ہیں جن کی جنوں اور انسانوں میں سے گمراہ اتباع کرتے ہیں۔ ہم نے اس کا

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی انشاد الشعر، جلد 2، صفحہ 107　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 232

ذکر کیا ہے۔ غضیف نے نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی جو آدمی اسلام میں ہجو کا آغاز کرے اس کی زبان کاٹ دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو ابلیس غم سے چیخا اس کی ذریت اس کے پاس جمع ہوئی اس دن کے بعد تم اس چیز سے مایوس ہو جاؤ کہ تم حضرت محمد ﷺ کی امت میں شرک کا رواج دے سکو گے بلکہ اس مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں شعر کو عام کر دو''۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وہ ہر لغویات میں داخل ہو جاتے ہیں اور حق کے طریقہ کی پیروی نہیں کرتے کیونکہ جو آدمی حق کی اتباع کرے اور اسے علم ہو کہ جو وہ کہے گا وہ اس پر لکھا جائے گا تو وہ حق پر قائم ہو جاتا ہے وہ آوارہ جدھر منہ آئے ادھر نہیں چلا جاتا کہ جو کچھ کہے اس کی پرواہ نہ کرے۔ یہ آیت عبد اللہ بن زبعری، مسافع بن عبد مناف اور امیہ بن ابی صلت کے حق میں نازل ہوئی۔

وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ان میں سے اکثر جھوٹ بولتے ہیں، یعنی وہ اپنی گفتگو کے ذریعے کرم اور خیر پر رہنمائی کرتے ہیں اور وہ کرتے نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ابی عزہ جمحی کے حق میں نازل ہوئی۔ جب اس نے کہا:

أَلَا أَبلغا عَنِّي النبيَّ محمدًا　بأنَّكَ حَقٌّ والمليكُ حميدُ
وَلٰكِنْ إذا ذُكِرتُ بَدْرًا وأهلَهُ　تَأَوَّهَ مِنِّي أعظمٌ و جلودُ

خبردار تم دونوں حضرت محمد ﷺ جو نبی ہیں کو پہنچا دو کہ آپ حق پر ہیں اور مالک حمد کے لائق ہے لیکن جب مجھے بدر اور اس میں قتل ہونے والے لوگ یاد آتے ہیں تو میری ہڈیاں اور جلد اوہ اوہ کرتے ہیں۔

پھر مومنوں کے شعر کو اس حکم سے خارج کیا۔ مومن شعراء یہ ہیں حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، کعب بن مالک اور کعب بن زہیر۔ اسی طرح وہ تمام شعراء جو ان کی طرح سچی بات کرتے۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا یعنی اپنی گفتگو میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے۔ وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا یہ انتقام بھی حق کے ساتھ ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے جو اس کی حدود بیان کیں اگر اس نے اس سے تجاوز کیا تو اس نے باطل طریقہ سے انتقام لیا۔ ابو الحسن مبرد نے کہا: جب سورۃ ''الشعراء'' نازل ہوئی تو حضرت حسان، حضرت کعب بن مالک اور حضرت ابن رواحہ روتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی: اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ وہ برتر ذات جانتی ہے کہ ہم شعراء ہیں؟ فرمایا: ''اس کے بعد والا حصہ پڑھو اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ تم وہ ہو جو اس کا مصداق ہیں وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا تم مشرکوں کو رد کرنے والے تھے''۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بدلہ لو اور حق بات ہی کہو اور آباء اور امہات کا ذکر نہ کرو''۔ حضرت حسان نے ابوسفیان کے بارے میں کہا:

هجوتَ محمدًا فأجبتُ عنه　و عندَ اللهِ في ذاكَ الجزاءُ
فإنَّ أبي و والدَهُ و عِرْضي　لِعِرضِ محمدٍ منكم وِقاءُ
أتشتمه ولستَ له بكفءٍ　فشرُّكما لخيرِكما الفِداءُ

لسانی صارم لا عیبَ فیہِ　　و بحری لا تُکدِّرہ الدِّلاءُ

تو نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی اور میں نے آپ کی طرف سے جواب دیا جب کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جزا ہے۔ میرا والد، میری والدہ اور میری عزت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے سامنے ڈھال ہے کیا تو آپ کو برا بھلا کہتا ہے جب کہ تو آپ کا ہم پلہ نہیں، تم میں سے براتم میں سے اچھے پر قربان، میری زبان تلوار ہے اس میں کوئی عیب نہیں اور میرے سمندر کو ڈول گدلا نہیں کرتے۔

حضرت کعب نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ نے شعر کے بارے میں حکم نازل کیا جس کو آپ جانتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن اپنی جان، تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! گویا تم اپنی زبان سے تیر برسار ہے ہو''۔ حضرت کعب نے کہا:

جاءت سَخِینۃُ(1) کی تُغالبَ ربَّھا　　وَلَیُغْلَبَنَّ　　مُغَالِبُ　　الغَلاَّبِ

قریش آئے تا کہ اپنے رب سے غلبہ میں مقابلہ کریں غلبہ پانے والوں میں سے غالب ہی غالب قرار دیا جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے کعب! اللہ تعالیٰ نے تیرے اس قول پر تیری تعریف کی ہے''۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس آیت وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ کو اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ساتھ منسوخ قرار دیا۔ مہدوی نے کہا: صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اِلَّا الَّذِيْنَ استثناء ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ جو آدمی ظلم کے ساتھ انتقام لے اس کے لیے اس میں دھمکی ہے۔ شریح نے کہا عنقریب ظالم جان لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کیسے خلاصی پائیں گے۔ ظالم عقاب کا انتظار کرتا ہے اور مظلوم نصرت کا انتظار کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھا اَیَّ مُنْفَلَتٍ یَنْفَلِتُون، یعنی یہ لفظ فاء اور تاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ ثعلبی نے اسے ذکر کیا أیّ منقلب ینقلبون کا معنی ہے کس پناہ کی وہ پناہ لیں گے۔ کون سی لوٹنے کی جگہ کی طرف وہ لوٹیں گے کیونکہ ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ سب سے قبیح ٹھکانہ ہے، ان کا لوٹنا عقاب کی طرف ہے اور وہ سب سے بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ منقلب اور مرجع میں فرق یہ ہے کہ منقلب اسے کہتے ہیں کہ جس میں وہ ہو اس کی ضد کی طرف منتقل ہونا۔ مرجع ایک حال جس میں وہ ہے اس سے اس حال کی طرف لوٹ جانا جس پر وہ پہلے تھا ہر مرجع منقلب تو ہے مگر ہر منقلب مرجع نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ أیّ یہ ینقلبون کی وجہ سے منصوب ہے یہ مصدر کے معنی میں ہے یہ سیعلم کی وجہ سے منصوب نہیں کیونکہ ای اور دوسرے کلمات استفہام میں ماقبل عمل نہیں کرتا جو نحویوں نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا، اصل بات یہ ہے کہ استفہام ایک معنی ہے اور اس کا مقابل ایک اور معنی ہے اگر اس میں ماقبل عمل کرے تو بعض معانی بعض میں داخل ہو جائیں۔

1۔ یہ کھانا ہے جو آٹے اور گھی سے بنایا جاتا ہے یہ کھانا گرم ہوتا ہے قریش اس کے شیدائی تھے اس لیے قریش کو وہی نام دیا جو اس کھانے کا تھا۔ مترجم

# سورۃ النمل

(اٰیاتہا ۹۳) (۲۷ سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ ۴۸) (رکوعاتہا ۷)

سب کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ اس کی ترانوے آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی چورانوے آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍۙ ① هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَۙ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۗ ④ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥

''طاسین، یہ آیتیں ہیں قرآن (حکیم) اور روشن کتاب کی (یہ) سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے اہل ایمان کے لیے جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور دیا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے خوبصورت بنا دیئے ان (کی نظروں) میں ان کے اعمال (بد) پس وہ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے بدترین عذاب ہے اور یہی آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے: اور بے شک آپ کو سکھایا جاتا ہے قرآن حکیم بڑے دانا سب کچھ جاننے والے کی جانب سے''۔

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں حروف مقطعات کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ تِلْكَ یہ ھذہ کے معنی میں ہے یعنی یہ سورت قرآن کی آیات اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔ لفظ قرآن معرفہ ذکر کیا اور کتاب مبین نکرہ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا دونوں معرفہ کے حکم میں ہیں: جس طرح تو کہتا ہے: فلان الرجل عاقل و فلان الرجل العاقل۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اس کی دو صفتیں جمع کی گئیں یعنی یہ قرآن ہے اور یہ کتاب ہے کیونکہ یہ کتابت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور قراءت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ان کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ سورۂ حجر میں فرمایا: الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ① (الحجر) کتاب کو معرفہ اور قرآن کو نکرہ ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور کتاب دو اسم ہیں ان میں سے ہر ایک اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اسے معرفہ بنایا جائے اور اسے صفت بنایا جائے اس کی صفت جو

مبین کے ساتھ لگائی گئی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا امر، اپنی نہی، اپنا حلال، اپنا حرام، اپنا وعدہ اور اپنی وعید واضح کیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، هُدًى یہ الکتاب سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی تلك آیات الکتاب هادية و مبشرة، مبتدا ہونے کی حیثیت سے اس میں رفع بھی جائز ہے یعنی هو هدى۔ اگر تو چاہے صرف جار مجرور کے حذف کی بنا پر اس پر رفع پڑھے جیسے فیه هدی۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر لِلْمُؤْمِنِيْنَ ہو۔ پھر ان کی صفت بیان کی اور فرمایا: الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ جو بعث بعد الموت کی تصدیق نہیں کرتے۔ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے اعمال سیہ کو مزین کیا یہاں تک کہ انہوں نے انہیں حسنہ خیال کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال حسنہ کو مزین کیا تو انہوں نے ان پر عمل نہ کیا۔ زجاج نے کہا: ہم نے ان کے کفر پر ان کی جزا بنائی کہ ہم نے ان کے لیے وہ مزین کیا جس میں وہ تھے۔ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ وہ اپنے اعمال خبیثہ میں متردد ہوتے ہیں اور اپنی گمراہی میں متردد ہوتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ابو العالیہ نے کہا: وہ اس میں طوالت اختیار کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: وہ کھیلتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ حیران ہوتے ہیں۔ راجز نے کہا:

أَعْمَى الهُدَى بالحائرين العُمَّهِ

بے بصیرت حیران و ششدر لوگوں پر ہدایت ناپید ہوگئی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اس سے مراد جہنم ہے۔ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ، فِي الْاٰخِرَةِ وضاحت ہے یہ الْاَخْسَرُوْنَ کے متعلق نہیں کیونکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دنیا میں خسارے میں رہے اور آخرت میں نفع کمایا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کفر کے باعث آخرت میں خسارے میں رہے یہ ہر خسارہ پانے والے سے خسارہ میں ہے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ یعنی اسے آپ پر القا کیا جاتا ہے تو آپ اسے پاتے ہیں، اسے سیکھتے ہیں اور اخذ کرتے ہیں مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ، لدن یہ عند کے معنی میں ہے مگر یہ مبنی ہے معرب نہیں کیونکہ یہ متمکن نہیں اس میں کئی لغات ہیں جن کو میں نے سورۂ کہف میں ذکر کیا ہے۔ یہ آیت ان قصوں کی تمہید ہے جن کو بیان کرنے کا قصد و ارادہ کیا۔ اور اس میں حکمتوں کے لطائف اور علم کے دقائق ہیں جن کو بیان کرنے کا قصد کیا۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ۙ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّيْ

لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۣ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

''(یاد فرماؤ) جب کہا موسیٰ نے اپنی زوجہ سے کہ میں نے دیکھی ہے آگ ابھی لے آتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا لے آؤں گا تمہارے پاس (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلگا کر تاکہ تم اسے تاپو پھر جب اس کے پاس پہنچے تو ندا کی گئی کہ بابرکت ہو جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے اور (ہر تشبیہ و تمثیل سے) پاک ہے اللہ جو رب العالمین ہے اے موسیٰ! وہ میں اللہ ہی ہوں عزت والا دانا۔ اور ذرا زمین پر ڈال دو اپنے سونٹے کو اب جو اسے دیکھا تو وہ (اس طرح) لہرا رہا تھا جیسے سانپ ہو، آپ پیٹھ پھیر کر وہاں سے چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (فرمایا) موسیٰ! ڈرو نہیں میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر) نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد تو میں بے شک غفور رحیم ہوں اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا بغیر کسی تکلیف کے (یہ دو معجزے) ان نو معجزات میں سے ہیں جن کے ساتھ آپ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ بے شک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں پس جب آئیں ان کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت افروز بن کر تو انہوں نے کہا: یہ تو جادو ہے کھلا ہوا اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا پس آپ ملاحظہ فرمائیے کیا (ہولناک) انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا''۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ، اذ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور وہ فعل اذ کر ہے گویا اسے اس ارشاد: وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ فرمایا: مراد ہے اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم اس کی حکمت اور اس کے علم کے آثار میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ لیجئے جب انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا یعنی میں نے دور سے اسے دیکھا ہے۔ حرث بن حلزہ نے کہا:

آنَسَتْ نَبْاَةً وَاَفْزَعَهَا الْقُنَّاصُ عَصْرًا وَقَدْ دَنَا الْاِمْسَاءُ

اس نے خفی آواز محسوس کی، عصر کے وقت شکاریوں نے اسے خوفزدہ کیا جب کہ شام قریب آ چکی تھی۔

سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ عاصم، حمزہ اور کسائی نے بِشِهَابٍ قَبَسٍ قراءت کی ہے(1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 249

شہاب تنوین کے ساتھ ہے۔ باقی قراء نے تنوین کے بغیر اضافت کی صورت میں پڑھا ہے۔ مراد آگ کا شعلہ ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ فراء نے تنوین کو ترک کرنے کا گمان کیا ہے کہ یہ ان کے اس قول کے قائم مقام ہے ولدار الآخرۃ و مسجد الجامع اور صلاۃ الاولی شے کو اپنی ہی ذات کی طرف مضاف کیا جب اسماء مختلف ہوئے۔ نحاس نے کہا: شی کو اپنی ہی ذات کی طرف منسوب کرنا بصریوں کے نزدیک محال ہے کیونکہ لغت میں اضافت کا معنی ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ ملانا ہے تو یہ محال ہے کہ ایک چیز کو اپنی ہی ذات کے ساتھ ملایا جائے۔ ایک چیز کو دوسری چیز کی طرف مضاف کیا جاتا ہے تا کہ ملک اور نوع کا معنی واضح ہو جائے تو یہ محال ہے کہ یہ واضح ہو کہ وہ اپنی ذات کا مالک ہے یا وہ اپنی نوع سے ہے۔ و شہاب قبس نوع اور جنس کی اضافت ہے جس طرح تو کہتا ہے: ھذا ثوب خز، خاتم حدید وغیرہ۔ شہاب ہر نور والی چیز کو کہتے ہیں جس طرح ستارہ اور جلائی گئی لکڑی۔ قبس اسے کہتے ہیں جس کو اخذ کیا جائے، جیسے انگارہ وغیرہ۔ معنی ہے روشن جو انگارے میں سے ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا: أقبستُ قبسا؛ اسم قبس ہے جس طرح تو کہتا ہے: قبضت قبضا، اسم قبض ہے۔ جس نے بشہاب قبس پڑھا اس نے قبس کو شہاب سے بدل بنایا ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ اس کی صفت ہے کیونکہ قبس میں یہ جائز ہے کہ اسم ہو صفت نہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ صفت ہو جہاں تک اس کے صفت نہ ہونے کا تعلق ہے تو کیونکہ وہ کہتے ہیں: قبستُه اقبسُه قبسا، قبس کا معنی مقبوس ہے۔ جب وہ صفت ہے تو زیادہ اچھا یہ ہے کہ وہ نعت ہو۔ اس میں اضافت احسن ہوگی جب صفت نہ ہو۔ یہ نوع کی اپنی جنس کی طرف اضافت ہے جس طرح خاتم فضة وغیرہ۔ اگر بیان اور حال کے طریقہ پر قبس کو منصوب پڑھا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ قرآن کے علاوہ میں اسے بشہاب قبسا پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ مفعول مطلق ہو، بیان ہو یا حال ہو۔

**لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ**، طاء کی اصل تاء ہے یہاں اس کو طاء سے بدل دیا گیا، کیونکہ طاء حروف مطبقہ میں سے ہے اور صاد بھی حروف مطبقہ میں سے ہے دونوں کو جمع کرنا اچھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ ٹھنڈک سے بچنے کے لیے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اصطلی یصطلی جب وہ گرمائش حاصل کرے۔ شاعر نے کہا:

النارُ فاكهةُ الشتاءِ فمن يُرِدْ أكلَ الفواكهِ شاتِيًا فليصطلِ

آگ موسم سرما کا پھل ہے جو موسم سرما میں پھل کھانے کا ارادہ کرے تو وہ آگ تاپے۔

زجاج نے کہا: ہر سفید چیز جو نور والی ہو تو وہ شہاب ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: شہاب سے مراد آگ ہے۔ ابو نجم نے کہا:

كانما كان شهابا واقدا أضاء ضوءا ثم صار خامدا

گویا وہ روشن شہاب تھا اس نے روشن کیا پھر وہ بجھ گیا۔

احمد بن یحییٰ نے کہا: شہاب سے مراد ایسی لکڑی ہے جس کی ایک جانب انگارہ ہو اور دوسری جانب آگ نہ ہو۔ نحاس کا قول اس میں اچھا ہے: شہاب سے مراد روشن شعاع ہے اسی سے وہ ستارہ ہے جس کی روشنی آسمان میں پھیلتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فی كفه صَعْدَةٌ مثقفةٌ فيها سِنانٌ كشُعلة القبَسِ

اس کی ہتھیلی میں سیدھا نیزہ ہے اس میں پھل ہے جس طرح قبس کا شعلہ ہوتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ آئے جہاں انہوں نے گمان کیا تھا کہ وہ آگ ہے تو وہ نور تھا؛ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کو دیکھا تو اس کے قریب کھڑے ہو گئے اسے دیکھا کہ وہ درخت کی شاخ سے نکل رہی ہے وہ درخت انتہائی سرسبز ہے جسے علیق کہتے ہیں۔ آگ بڑھتی ہی جاتی ہے اور درخت زیادہ سرسبز و شاداب اور حسین ہوتا جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام متعجب ہوئے اور اس کی طرف اس مٹھے کو جھکایا جوان کے ہاتھ میں تھا تا کہ اس سے اس کو روشن کریں وہ درخت ان کی طرف جھکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے خوفزدہ ہو گئے تو پیچھے ہٹ گئے پھر وہ لگا تار حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طمع کرتا رہا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی طمع کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا کہ یہ مامور ہے وہ اس کے امر کو نہیں جانتے یہاں تک کہ ندا کی گئی: نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا یہ بحث سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ نُوْدِيَ اللہ تعالیٰ نے اسے ندا کی جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ (مریم:52)

اَنْۢ بُوْرِكَ زجاج نے کہا: ان محل نصب میں ہے اصل کلام اس طرح ہے بأنه۔ یہ جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اسے نائب فاعل بنا دیا جائے۔ ابو حاتم نے حکایت بیان کی ہے کہ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس اور مجاہد کی قراءت میں ان بورکت النار و من حولها ہے (1)۔ نحاس نے کہا: اس کی مثل اسناد صحیح میں نہیں پایا جاتا۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ قراءت تفسیر کی بنا پر ہوگی۔ برکت آگ اور جو اس کے اردگرد فرشتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کسائی نے عربوں سے روایت کیا ہے: بارك الله، بارك فيه۔ ثعلبی نے کہا: عرب کہتے ہیں: بارك الله، بارك فيه، بارك عليك، بارك لك۔ اس میں چار لغات ہیں۔ شاعر نے کہا:

فبوركتَ مولودًا و بوركتَ ناشِئًا　وبوركتَ عند الشَّيبِ إذ أنتَ أشيبُ

تو حالت ولادت میں بابرکت تھا جوانی کے عالم میں بابرکت تھا اور تو بڑھاپے کے وقت بابرکت ہے جب تو سب سے بوڑھا ہے۔

طبری نے کہا: بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ، بورك في من في النار نہیں کہا یہ اس کی لغت کے مطابق ہے جو بارك الله کہتا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: بارکه الله، بارك له، بارك عليه اور بارك فيه، سب ایک معنی میں ہیں یعنی جو آگ پر تھا اس پر برکت ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے یا جو آگ کے قریب تھے نہ کہ یہ جو اس کے وسط میں تھے۔ سدی نے کہا: آگ میں ملائکہ تھے تو برکت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اے موسیٰ! تجھ پر برکت ڈالی گئی اور ان فرشتوں میں برکت رکھی گئی جو اس کے اردگرد تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تحیہ اور تکریم تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کی زبانوں پر سلام کیا۔ فرمایا: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ہود:73)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 250

تیسرا قول وہ ہے جو حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر کا ہے۔ جو آگ میں تھا وہ مقدس تھا وہ الله تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس سے مراد اپنی ذات لی جو مقدس دعا کی ہے۔ حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب نے کہا: آگ الله تعالیٰ کا نور ہے الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا کی جب کہ وہ نور میں تھے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عظیم نور دیکھا تو اسے آگ گمان کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ الله تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے آگ سے اپنی آیات اور کلام کے ساتھ ظہور فرمایا نہ کہ وہ کسی حیز میں تحیز فرمانے والا تھا وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (الزخرف: 84) نہ یہ کہ ان دونوں میں تحیز فرماتا ہے لیکن وہ ہر فعل میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کے ذریعے فاعل کا وجود ظاہر ہوتا ہے اس تعبیر کی بنا پر کہا گیا: یعنی جو آگ میں ہے اس کی سلطان اور قدرت میں برکت رکھی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آگ میں جو الله تعالیٰ کا امر ہے اس میں برکت رکھی گئی وہ امر جسے الله تعالیٰ نے علامت بنایا۔

**میں کہتا ہوں:** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی صحت پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”الله تعالیٰ سوتا نہیں اور نہ ہی اس کی شان ہے کہ وہ سوئے وہ میزان کو پست کرتا ہے اور اسے بلند کرتا ہے اس کا حجاب نور ہے اگر وہ حجاب کو ہٹادے تو اس کی ذات کے انوار ہر شے کو جلادیں جہاں تک اس کی نظر پہنچے“۔ پھر ابو عبیدہ نے اس آیت کی تلاوت کی اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اسے امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابو موسیٰ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم پانچ باتیں فرمانے کے لیے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے فرمایا: ”الله تعالیٰ نہیں سوتا اور اس کو زیبا نہیں کہ وہ سوئے وہ میزان کو پست کرتا ہے اور اسے بلند کرتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے پیش کیا جاتا ہے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے پیش کیا جاتا ہے اس کا حجاب نور ہے“ (1)۔ ابوبکر کی روایت میں نار کے الفاظ ہیں ”اگر وہ اس حجاب کو ہٹادے تو اس کی ذات کے انوار ان تمام چیزوں کو جلادیں مخلوقات میں سے جہاں تک اس کی نظر پہنچے“ (2)۔

**ابو عبید نے کہا:** سبحات سے مراد اس کی ذات کا جلال ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: سبحان الله سے مراد اس کی تعظیم اور تنزیہ ہے لو کشفها فرمان کا مطلب ہے اگر حجاب ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹادیا جائے اور اپنی رؤیت کے لیے ان کو ثابت نہ رکھے تو وہ سب جل جائیں اور وہ اس کے دیدار کی طاقت نہ رکھیں۔

ابن جریج نے کہا: آگ حجابوں میں سے ایک حجاب ہے یہ سات حجاب ہیں۔ حجاب العزة، حجاب الملك، حجاب السلطان، حجاب النار، حجاب النور، حجاب الغمام، حجاب الماء۔ اصل بات یہ ہے کہ مخلوق حجاب میں ہے الله تعالیٰ کی ذات کو کوئی چیز حجاب میں نہیں رکھ سکتی۔ آگ نور ہی تھی اسے نار کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اثبات رؤیة المومنین فی الآخرة ربهم سبحانه و تعالیٰ، جلد 1، صفحہ 99

2۔ سنن ابن ماجہ، باب فی ما انکرت الجهمية، حدیث نمبر 191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اسے آگ ہی گمان کیا تھا۔ عرب نور اور نار کو ایک دوسرے کی جگہ رکھتے رہتے ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: آگ اپنی ذات کے اعتبار سے تھی اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام ایک طرف سے اسے سنایا اور اس کی جانب سے اپنی ربوبیت کو اس کے لیے ظاہر کیا یہ اسی طرح ہے جس طرح تورات میں مکتوب ہے جاء الله من سيناء واشرف من ساعير واستعلى من جبال فاران، فمجيئه من سيناء سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سے مبعوث کرنا، اشرافه من ساعير سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سے مبعوث کرنا اور استعلاؤه من فاران سے مراد حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کرنا ہے۔ فاران سے مراد مکہ مکرمہ ہے سورۃ القصص میں اس بارے میں زیادہ وضاحت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام درخت سے آپ کو سنایا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اللہ رب العالمین کے لیے تنزیہ و تقدیس ہے۔ کئی مواقع پر یہ بحث پہلے گزر چکی ہے معنی ہے جو اس کے اردگرد ہیں وہ کہتے ہیں: وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ تو اسے حذف کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام اس وقت کی جب وہ ندا کو سننے سے فارغ ہوئے مقصود اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا اور اس کی پاکی بیان کرنا تھا، یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں سے ہے معنی ہے جس نے اللہ، جو رب العالمین ہے کی پاکی بیان کی اس میں برکت رکھ دی گئی ہے؛ ابن شجرہ نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ہاء ضمیر بنیاد و سہارہ ہے کوفیوں کے قول میں یہ کنایہ نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ امر و شان سے کنایہ ہے۔ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ میں ایسا غالب ہوں کہ جس کی مثل کوئی شے نہیں۔ الْحَكِيْمُ وہ اپنے فعل اور امر میں حکیم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کس نے ندا کی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ یعنی میں ہی تجھے ندا کرنے والا ہوں۔ میں اللہ ہوں۔

وَ اَلْقِ عَصَاكَ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ اس کو چھوڑ دیں تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اس لیے فرمایا تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم ہو جائے کہ ان سے کلام کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے رسول ہیں۔ ہر نبی کے لیے اس کی ذات میں آیت کا ہونا ضروری ہے جس کے ساتھ وہ نبوت کو جان لے۔ آیت میں حذف ہے یعنی اپنا عصا پھینک دے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا اپنے ہاتھ سے پھینک دیا تو وہ حرکت کرتا ہوا سانپ ہو گیا گویا وہ جان ہے، وہ ہلکے چھوٹے سے جسم والا سانپ ہوتا ہے۔ کلبی نے کہا: نہ وہ چھوٹا نہ بڑا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلے اسے چھوٹے سانپ کی شکل میں بدلا گیا جب آپ مانوس ہو گئے تو وہ بڑا ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایک دفعہ وہ چھوٹا سانپ بنا اور ایک دفعہ وہ دوڑتا ہوا سانپ بنا جو مونث تھا ایک دفعہ وہ ثعبان بن گیا، یہ سانپوں میں سے بڑا سانپ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انقلبت ثعبانا تهتز کا معنی ہے گویا وہ جان تھا اس کی جسامت ثعبان جیسی تھی اور پھرتی جان جیسی تھی اور اهتزاز یعنی وہ دوڑتا ہوا سانپ ہے۔ جان کی جمع جنان ہوتی ہے اسی معنی میں ایک حدیث ہے نهى عن قتل الجنان التي في البيوت وہ باریک سانپ جو گھروں میں

ہوتے ہیں ان کے قتل سے منع کیا۔

وَّلّٰى مُدْبِرًا انسان کی عادت کے مطابق خوفزدہ ہو کر پیٹھ پھیر کر مڑا (1)۔ وَّ لَمْ يُعَقِّبْ نہ لوٹے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: متوجہ نہ ہوئے (2)۔ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اے موسیٰ! سانپ اور اس کی تکلیف سے نہ ڈرو (3)۔ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ گفتگو مکمل ہوگئی پھر استثناء منقطع کی صورت میں کلام کی، فرمایا اِلَّا مَنْ ظَلَمَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ محذوف سے مستثنیٰ ہے۔ معنی ہے میری بارگاہ میں مرسلین خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ جو ظالم ہوتے ہیں وہ خوف کھاتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ کیونکہ وہ نہیں ڈرتا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: محذوف سے مستثنیٰ محال ہے کیونکہ یہ ایسی چیز سے مستثنیٰ ہے جو ذکر نہیں کی گئی اگر یہ جائز ہو تو یہ بھی جائز ہے اِنی لا ضرب القوم الا زیدا معنی یہ ہو انی لا اضرب القوم وانما اضرب غیرھم الا زیدا، یہ بیان کی ضد ہے آنے والا ایسا ہے جس کا معنی معروف نہیں۔ فراء نے بھی یہ گمان کیا ہے کہ بعض نحوی الا کو واؤ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں معنی ہوگا ولا من ظلم۔ شاعر نے کہا:

وكلُّ أخٍ مفارقُه أخوهُ لَعَمْرُ أبيكَ إلَّا الفَرْقَدانِ

ہر بھائی کو اس کا بھائی چھوڑنے والا ہے تیرے باپ کی قسم اور فرقدان بھی چھوڑنے والا ہے۔

محل استدلال الا الفرقدانِ ہے۔

نحاس نے کہا: الا کو واؤ کے معنی میں لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور کلام کسی صورت میں جائز نہیں الا کا معنی واؤ کے خلاف ہے، کیونکہ جب تو نے کہا: جاء نی اخوتك الا زیدا تو نے زید کو اس سے نکال دیا جس میں بھائی داخل تھے۔ دونوں کے درمیان کوئی نسبت اور قربت نہیں۔ آیت میں ایک اور قول ہے وہ یہ کہ یہاں استثناء متصل ہو تقدیر کلام ہوگی الا من ظلم من المرسلین باتیان الصغائر التی لا یسلم منها احد سوی ما روی عن یحییٰ بن زکریا علیہ السلام۔ مگر مرسلین میں سے جو صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرے ظلم کرے ایسا صغیرہ جس سے کوئی بھی محفوظ نہیں سوائے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے جن کے بارے یہ روایت کی گئی ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ذکر کیا ہے: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح: 1) مہدوی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ نحاس نے اسے پسند کیا ہے ان میں سے جو لغزش کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم تھا تو اس کی اللہ تعالیٰ نے استثنا کر دی، فرمایا: اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ کیونکہ وہ ڈرتا ہے اگرچہ میں نے اس کی خطا کو معاف کر دیا۔ ضحاک نے کہا: مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام ہیں۔ زمخشری نے کہا: جس طرح کی فروگزاشت حضرت آدم علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو گھونسا رسید کر کے کی۔

اگر کوئی کہنے والا کہے: توبہ اور مغفرت کے بعد خوف کا کیا معنی ہے؟ اس کو کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ کی ذات کو جاننے والوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کے بارے میں ڈرتے ہی رہتے ہیں وہ اس سے امن میں نہیں ہوتے کہ توبہ کی شرطوں میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 251	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

سے کوئی شرط ایسی بھی ہو جس کو وہ بجا نہ لاتے ہوں وہ اس کے بارے میں مطالبہ سے ڈرتے ہیں۔

حضرت حسن بصری اور ابن جریج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میں نے تجھے اپنے نفس کو قتل کرنے سے ڈرایا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انبیاء سے لغزش ہوتی تھی تو ان کو عتاب بھی کیا جاتا تھا(1)۔ ثعلبی، قشیری، ماوردی اور دوسرے علماء نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر استثنا صحیح ہے یعنی مگر انبیاء اور نبیین میں سے جس نے نبوت سے قبل صغیرہ گناہ کا ارتکاب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطی کو قتل کرنے کی وجہ سے ڈرے اور اس عمل سے توبہ کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نبوت کے بعد صغائرہ اور کبائرہ سے معصوم تھے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ قیامت کے روز اس سے اپنے آپ کو خارج کریں گے جس طرح شفاعت والی حدیث میں ہے جب مقرب آدمی سے کوئی لغزش واقع ہو جاتی ہے اگرچہ اس کی وہ خطا بخش دی جائے تب بھی اس کا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ جب تک اثر اور تہمت قائم ہو تو خوف باقی ہوتا ہے یہ عقوبت کا خوف نہیں ہوتا بلکہ عظمت کا خوف ہوتا ہے۔ سلطان کے نزدیک جس پر تہمت لگائی گئی ہو تو وہ تہمت کی وجہ سے دل میں اضطراب پاتا ہے جو اسے اس طرف لے جاتا ہے کہ اس پر اعتماد کی صفائی مقدر ہو رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس فرعون کے بارے میں امر وقوع پذیر ہوا تھا۔ پھر انہوں نے بخشش طلب کی اور اپنی جان پر ظلم کا اقرار کیا پھر آپ کو بخش دیا گیا پھر مغفرت کے بعد کہا: قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۞ (القصص) پھر اگلے روز ایک اور فرعونی سے ان کو آزمایا گیا اور آپ نے ارادہ کیا کہ اسے بھی پکڑیں تو اس ارادہ کے ساتھ ایک اور امر وقوع پذیر ہو گیا۔ اگلے روز ان کو آزمائش میں ڈالا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی یوں حکایت بیان کی ہے: فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۞ (القصص) اقتدار کا کلمہ لن افعل سے عیاں ہے تو ارادہ کی وجہ سے ان پر عتاب کیا گیا جب انہوں نے پکڑنے کا ارادہ کیا اور نہ پکڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اسرائیل کو آپ پر مسلط کر دیا یہاں تک کہ اس نے آپ کے راز کو ظاہر کر دیا کیونکہ جب اسرائیلی نے آپ کو دیکھا کہ پکڑنے کے لیے آپ آستین چڑھا رہے ہیں تو اس نے گمان کیا کہ وہ اس کو پکڑ رہے ہیں، تو اس نے راز ظاہر کر دیا: قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ (القصص: 19) فرعونی بھاگ گیا اور اس نے فرعون کو اس امر کے بارے میں آگاہ کر دیا جو اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں راز ظاہر کر دیا تھا۔ گزشتہ دن کے مقتول کا امر مخفی تھا یہ معلوم نہ تھا کہ کس نے اس کو قتل کیا ہے۔ جب فرعون کو اس کا علم ہو گیا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں آدمی بھیجے تاکہ ان سے قتل کا بدلہ لے۔ سخت تلاشی کی گئی اور تمام چوکوں پر پہرے دار لگا دیے گئے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا عرض کی: قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ (القصص: 20) حضرت موسیٰ علیہ السلام نکلے جس طرح اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف اس حادثہ کی وجہ سے تھا اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا قرب نصیب فرمایا، انہیں عزت دی اور کلام کے ساتھ چن لیا تو باقی ماندہ تہمت نے ان کو گرفت میں لیے رکھا اور پیچھا نہ چھوڑا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 251

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اس بارے میں گفتگو سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ نحاس نے کہا: اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ان میں سے سب سے بہترین یہ قول ہے کہ یہ معجزہ بھی ان نو معجزات میں داخل ہے۔ مہدوی نے کہا: معنی ہے اَلْقِ عَصَاكَ اور وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ یہ دونوں ان نو معجزات میں سے دو معجزات ہیں۔ قشیری نے کہا: معنی ہے جس طرح تو کہتا ہے: خرجتُ فی عشرۃ نفر۔ تو تو بھی ان میں سے ایک ہوتا ہے یعنی تو دس میں سے دسواں نکلا۔ فی، مِن کے معنی میں ہے کیونکہ یہ اس کے قریب ہے جس طرح تو کہتا ہے: خذلی عشرا من الابل فیھا فحلان دونوں فحل ان دس میں ہوتے ہیں۔ اصمعی نے امرء القیس کے قول کے بارے میں کہا:

وهل يَنْعَمَنْ من كان آخرُ عهدِه　　ثلاثين شهرًا فى ثلاثة أحوالِ

محل استدلال فی ثلاثۃ أحوال ہے اس میں فی، من کے معنی میں ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فی، مع کے معنی میں ہے معجزات دس ہیں ان میں سے ایک یہ بیضاء ہے نو نشانیاں یہ ہیں: سمندر کا پھٹنا، عصا، ٹڈی دل، جوئیں، طوفان، خون، مینڈک، قحط سالی، شکل و صورت کا بدل جانا۔ تمام کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ فراء نے کہا: کلام میں اضمار ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے یعنی آپ فرعون اور اس کی قوم کی طرف مبعوث کیے گئے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ الله تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہونے والے ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً واضح اور واشگاف۔ اخفش نے کہا: اسے مَبصرۃ پڑھنا بھی جائز ہے یہ مصدر ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: الولد مَجْبَنة۔

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وہ جھٹلانے میں سابقہ عادت پر قائم و دائم رہے اسی وجہ سے کہا: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا انہیں یقین تھا کہ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے ہے اور یہ جادو نہیں لیکن انہوں نے کفر کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے تکبر کیا۔ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ معاند تھے۔ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا مصدر محذوف کی صفت ہونے کی بنا پر منصوب ہیں، یعنی انہوں نے انکار کیا ان کا انکار ظلم اور اپنے آپ کو بلند سمجھنے کی وجہ سے تھا۔ باء زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی جحدھا، یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔

فَانْظُرْ اے محمد! صلی الله علیک وسلم دیکھو كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ سرکش کافروں کا معاملہ کیسے ہوا! اپنے دل کی نظر سے دیکھ اور اس میں تدبر کر۔ خطاب آپ کو ہے اور مراد غیر ہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝

”اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا داؤد اور سلیمان کو علم اور انہوں نے کہا: سب تعریفیں الله تعالیٰ کے لیے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر اور جانشین بنے سلیمان داؤد کے اور فرمایا: اے لوگو! ہمیں

سکھائی گئی ہے پرندوں کی بولی اور ہمیں عطا کی گئی ہیں ہر قسم کی چیزیں، بے شک یہی وہ نمایاں بزرگی ہے (جو ہمیں مرحمت ہوئی)''۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ عِلْمًا علم سے مراد فہم ہے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دین، حکم وغیرہ کا علم، جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیمیا گری کی صنعت؛ یہ قول شاذ ہے۔ الله تعالیٰ نے دونوں کو نبوت اور زمین میں خلافت عطا فرمائی اور زبور عطا کی۔ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ اس آیت میں علم کے شرف، مقام کی بلندی اور اہل علم کے تقدم پر دلیل ہے۔ الله تعالیٰ کی نعمتوں میں سے علم کی نعمت سب سے عظیم نعمت ہے اور مومن بندوں میں سے جس کو علم عطا کیا گیا اسے خیر کثیر عطا کیا گیا۔ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (الجادلہ: 11) یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

وَ وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ کلبی نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس بچے تھے ان میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام نبوت اور ملک میں ان کے وارث تھے اگر مال کی وراثت ہوتی تو تمام اولاد اس میں برابر ہوتی؛ یہ ابن عربی کا قول ہے کہا: اگر مال کی وراثت ہوتی تو تعداد کے اعتبار سے منقسم ہوتی الله تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان چیزوں کے لیے خاص کیا جو حضرت داؤد علیہ السلام میں حکمت اور نبوت تھی۔ اور ایسے ملک کے ساتھ فضیلت عطا کی گئی جو ان کے لیے مناسب نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے آپ بادشاہ تھے حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے ملک اور نبوت میں ان کے مقام کے وارث بنے یعنی اپنے والد کے فوت ہو جانے کے بعد یہ چیزیں ان کی طرف منتقل ہوئیں تو مجازاً انہیں میراث قرار دیا گیا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فرمایا: العلماء ورثة الانبیاء، علماء انبیاء کے وارث ہیں (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: انا معشر الانبیاء لا نورث سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ یہ انبیاء کا فعل اور ان کی سیرت ہے۔ اگرچہ ان میں ایسے افراد بھی ہوئے جو مال کے وارث ہوئے جس طرح حضرت زکریا، جس طرح مشہور قول ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: ہم مسلمانوں کی جماعت ہیں ہمارا شغل عبادت ہے۔ مراد ہے یہ اکثر کا فعل ہے اسی معنی میں وہ قول ہے جو سیبویہ نے بیان کیا ہے: انا معشر العرب أقری الناس للضیف ہم عرب لوگ مہمان کی سب سے زیادہ ضیافت کرنے والے ہیں۔

میں کہتا ہوں: سورۂ مریم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ صحیح قول پہلا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انا معشر الانبیاء لا نورث یہ عام ہے کوئی چیز دلیل کے بغیر اس میں سے خارج نہ ہوگی۔ مقاتل نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام بڑے ملک والے اور زیادہ فیصلے کرنے والے تھے۔ حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ دوسرے علماء نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہت میں جس مقام پر پہنچے کوئی اور اس مقام پر نہ پہنچا، کیونکہ الله تعالیٰ نے ان کے لیے انسانوں، جنوں، پرندوں اور وحشی جانوروں کو مسخر کر دیا تھا۔ اور ان کو وہ شان عطا فرمائی جو

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الفقه على العبادة، جلد 2، صفحہ 93، وزارت تعلیم

کسی اور کو عطا نہ فرمائی۔ وہ ملک و نبوت میں اپنے باپ کے وارث بنے اور ان کے بعد ان کی شریعت پر قائم رہے۔ ہر نبی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا جو ان میں سے تھا جسے مبعوث کیا گیا یا مبعوث نہیں کیا گیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے تو آپ نے ان کی شریعت کو منسوخ کر دیا۔ ان کے درمیان اور ہجرت کے درمیان تقریباً اٹھارہ سو سال کا عرصہ حائل ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے: ایک ہزار تین سو باسٹھ سال کا عرصہ حائل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے وصال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا عرصہ حائل ہے۔ یہودی اس میں سے تین سو سال کی کمی کرتے وہ پچاس سال سے زائد عرصہ زندہ رہے۔

**وَ قَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ** حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالانے کے انداز میں کہا **عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ** اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل و احسان فرمایا کہ اس نے ہمیں حضرت داؤد علیہ السلام کے علم، نبوت اور زمین میں خلافت کا وارث بنایا کہ ہمیں پرندوں کی آوازوں سے معانی کی تعلیم دی جو ان آوازوں میں معانی پنہاں تھے۔ مقاتل نے آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام ایک روز بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پرندہ طواف کرتے ہوئے گزرا آپ نے اپنے ہم نشینوں سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے مجھے کہا ہے: اے بادشاہ! جسے غلبہ دیا گیا ہے اسے سلام اور بنی اسرائیل کے نبی کو سلام، اللہ تعالیٰ نے تجھے کرامت عطا کی، تجھے تیرے دشمن پر غلبہ دیا میں اپنے بچوں کی طرف جا رہا ہوں پھر میں دوبارہ حاضر ہوں گا۔ وہ عنقریب دوبارہ آئے گا۔ پھر وہ دوبارہ آیا، فرمایا: وہ کہتا ہے: اے غلبہ دیئے گئے بادشاہ! تجھ پر سلام اگر آپ چاہیں تو میں اپنے بچوں کے لیے روزی تلاش کروں یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا پھر تو میرے ساتھ جو چاہے سلوک کرے، اس نے جو کہا تھا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی خبر دی اور اسے اجازت دی اور وہ پرندہ چلا گیا۔

فرقد سخی نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام ایک بلبل کے پاس سے گزرے جو درخت پر بیٹھی ہوئی تھی جو اپنے سر کو حرکت دے رہی تھی اور اپنی دم کو جھکا رہی تھی آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ بلبل کیا کہتا ہے؟ انہوں نے عرض کی: نہیں اے اللہ کے نبی! فرمایا: وہ کہہ رہا ہے میں نے نصف پھل کھایا ہے اور دنیا پر ہلاکت ہے۔ آپ ہدہد کے پاس سے گزرے جو ایک درخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے اس کا کمزور بچہ کھڑا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے فرمایا: اے ہدہد! ڈر۔ اس نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! یہ بچہ ہے اس میں کوئی عقل نہیں میں اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام لوٹے تو اسے پایا کہ وہ ایک بچے کے پھندہ میں ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے پوچھا: ہدہد! یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں نے اسے نہ دیکھا یہاں تک کہ میں اس جال میں گر پڑا۔ فرمایا: تجھ پر افسوس تو زمین کے نیچے پانی دیکھ لیتا ہے کیا تو اس پھندے کو نہیں دیکھ سکتا؟ عرض کی: اے اللہ کے نبی! جب قضا آ جائے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔

حضرت کعب نے کہا: قمری حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے سامنے چیخی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا: کیا

تم جانتے ہو وہ کیا کہتی ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتی ہے مرنے کے لیے جیو اور برباد ہونے کے لیے تعمیر کرو۔ فاختہ چیخی پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا کہتی ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتی ہے کاش یہ مخلوق پیدا نہ کی جائے جب انہیں پیدا کیا گیا ہے تو کاش یہ جانتے یہ کس لیے پیدا کیے گئے؟ ان کے پاس ایک مور نے چیخ ماری پوچھا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتا ہے جس طرح کرو گے ویسا بھرو گے۔ آپ کے پاس ہدہد نے آواز نکالی۔ پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتا ہے جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ آپ کے پاس صرد (ایک پرندہ) نے آواز لگائی پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتا ہے اے گناہگارو! اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل سے منع کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: صرد ہی وہ پرندہ تھا جس نے حضرت آدم علیہ اسلام کو بیت اللہ شریف کی جگہ بتائی تھی۔ یہ وہ پہلا جاندار ہے جس نے روزہ رکھا۔ اسی وجہ سے صرد کو صوام (روزہ رکھنے والا) کہتے ہیں؛ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ طیطوی آپ کے پاس چیخا پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتا ہے ہر زندہ مرنے والا ہے اور ہر نئی چیز بوسیدہ ہونے والی ہے۔ خطافہ (پرندہ) آپ کے پاس چیخی پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتی ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ کہتی ہے بھلائی آگے بھیجو تم اسے پاؤ گے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطافہ کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وحشت کی شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے خطاف کے ساتھ انس عطا کیا اور انہیں گھروں میں رہنا لازم کر دیا یہ بنی آدم سے انس کی وجہ سے جدا نہیں ہوتے فرمایا: اس کے پاس قرآن کی چار آیات ہوتی ہیں لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (الحشر) حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس کبوتری بولی۔ پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا: وہ کہتی ہے سبحان ربی العظیم المھیمن۔ کعب نے کہا: سلیمان نے انہیں بیان کیا کوا کہتا ہے: اللہ عشار پر لعنت کر۔ چیل کہتی ہے: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص:88) اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ کونج کہتی ہے: جو خاموش رہا سلامتی پا گیا۔ ببغاء کہتا ہے: دنیا جس کا مقصود ہے اس کے لیے ہلاکت ہے۔ مینڈک کہتا ہے: سبحان ربی القدوس۔ بازی کہتا ہے: سبحان ربی وبحمدہ، سرطان کہتا ہے: سبحان المذکور بکل لسان فی کل مکان سجان جو ہر زبان سے ہر جگہ ذکر کی جاتی ہے۔

مکحول نے کہا: دراج حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس چیخا۔ پوچھا: کیا تم جانتے ہو وہ کیا کہتا ہے؟ فرمایا: وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) حضرت حسن بصری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مرغ چیختا ہے تو وہ کہتا

ہے: اے غافلو! اللہ کا ذکر کرو"۔

حضرت حسن بن علی بن ابی طالب نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "گدھ جب آواز نکالتی ہے تو وہ کہتی ہے: اے ابن آدم! جتنا عرصہ چاہے زندہ رہ لے آخر کار تیری موت ہے جب عقاب آواز نکالے تو کہتا ہے: لوگوں سے دوری میں راحت ہے۔ جب قنبر آواز نکالے تو کہتا ہے: اے اللہ! آل محمد سے بغض رکھنے والوں پر لعنت فرما۔ جب خطاف آواز نکالے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وہ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ پڑھتا ہے تو اس کے ساتھ اپنے آواز کو لمبا کرتا ہے، جس طرح قاری اپنی آواز کو لمبا کرتا ہے"۔ قتادہ اور شعبی نے کہا: یہ امر پرندوں میں خاص طور پر ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ، چیونٹی پرندہ ہے کیونکہ اس کے پر پائے جاتے ہیں۔ امام شعبی نے کہا: یہ چیونٹی دو پروں والی تھی۔ ایک جماعت نے کہا: یہ تمام حیوانات میں ہوتا ہے۔ پرندوں کا ذکر اس لیے ہوا کیونکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکروں میں ایک لشکر تھا۔ سورج کی تپش سے بچنے کے لیے ان کی ضرورت ہوتی اور کچھ امور کے لیے انہیں بھیجا جاتا۔ ان کی کثرت مداخلت کی وجہ سے پرندوں کا خصوصاً ذکر کیا۔ باقی حیوانات کا امر نادر ہے اور پرندوں کے تردد کی طرح تردد نہیں۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: منطق کا لفظ بعض اوقات ایسی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو کلام کے بغیر سمجھی جائے۔ اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرمائے اسے خوب جانتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: جو آدمی یہ کہے وہ پرندوں کی بولی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا تو یہ عظیم نقصان ہے۔ لوگوں کے لیے ایسا اتفاق ہوا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کا کلام سمجھ جائے جو تکلم نہیں کرتے تھے ان کے لیے نباتات کا قول پیدا کر دیا جاتا۔ ہر جڑی بوٹی اسے کہتی: میں فلاں درخت ہوں میں فلاں چیز سے نفع دیتی ہوں اور فلاں چیز سے نقصان دیتی ہوں، تو تیرا حیوانات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝

"اور فراہم کیے گئے سلیمان کے لیے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے پس وہ نظم و ضبط کے پابند ہیں"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ حشر جمع کیے گئے حشر کا معنی جمع کرنا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝ (الکہف) حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کی مقدار میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: آپ کے لشکروں کی چھاؤنی سو فرسخ ضرب سو فرسخ تھی پچیس فرسخ جنوں کے لیے، پچیس فرسخ انسانوں کے لیے، پچیس فرسخ پرندوں کے لیے اور پچیس فرسخ وحشی جانوروں کے لیے تھی آپ کے ایک ہزار کمرے تھے جو شیشے کے بنے ہوئے تھے جو شیشہ لکڑی پر لگایا گیا تھا ان میں تین سو منکوحہ بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ان کی چھاؤنی میں اختلاف کیا گیا ہے اور لشکر کی مقدار میں شدید اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا ملک عظیم تھا جو روئے زمین کے برابر تھا تمام آبادی ان کی اطاعت گزار تھی۔

**فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ** اس کا معنی ہے ان کے اول کو ان کے آخر کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور انہیں روکا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: ہر صنف کے لیے ان کے رتبہ اور مقام کے اعتبار سے کرسی یا زمین میں سے جگہ مختص تھی جب وہ اس میں چلتے۔ یہ جملہ بولا جاتا

ہے: وزعتہ اوزعہ وزعا۔ یعنی میں نے اس کو روک لیا۔ جنگ میں وازع اسے کہتے ہیں جو صفوں کو منضبط کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو ان صفوں میں آگے نکلتا ہے اس کو روکتا ہے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ کے مقام پر ٹھہرے مراد فتح مکہ ہے تو ابو قحافہ نے اپنی بیٹی سے کہا جب کہ ان کی نظر جاتی رہی تھی: مجھے جبل ابی قبیس پر لے چلو۔ حضرت اسماء نے کہا: میں انہیں جبل ابی قبیس پر لے گئی پوچھا: کیا دیکھتی ہو؟ میں نے کہا: میں ایک مجتمع لشکر دیکھتی ہوں کہا: وہ گھوڑے ہوں گے۔ بیٹی نے کہا: میں لشکر میں ایک آدمی دیکھتی ہوں جو کبھی آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے جاتا ہے۔ کہا: وہ ناظم ہوگا جو لشکر کو منتشر ہونے سے روکے گا۔ تمام واقعہ ذکر کیا۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''شیطان کو یوم عرفہ سے بڑھ کر کسی روز زیادہ بے حیثیت، لاچار، حقیر اور غصے میں نہیں دیکھا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس روز اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بڑے بڑے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کے درگزر کرنے کو دیکھتا ہے مگر جو اس نے یوم بدر کو دیکھا (تو وہ اس روز زیادہ ذلیل ورسوا ہوا)'' عرض کی گئی۔ یارسول اللہ! اس نے کیا دیکھا؟ فرمایا: ''اس نے جبریل امین کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کو منظم کر رہے ہیں''۔ امام مالک نے موطا میں اسے ذکر کیا ہے (1)۔ اسی معنی میں نابغہ کا قول ہے:

على حينَ عاقبتُ المَشيبَ على الصِّبَا　　وقلت أَلَمَّا أَصحُ والشَّيْبُ وازِعُ (2)

جب میں نے بچپنے میں ہی بڑھاپے کو عتاب کیا اور میں نے کہا: کیا جب میں بچپنے کو چھوڑ رہا ہوں جب کہ بڑھاپا منظم کر رہا ہے؟

ایک شاعر نے کہا:

ولما تَلا قَيْنا جرت من جُفوننا　　دموعٌ وَزَعْنا غَرْبَها بالأصابعِ

جب ہم ملے تو ہماری پلکوں سے آنسو بہہ پڑے ہم نے آنسو بہنے کی جگہ کو انگلیوں سے درست کیا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ولا يَزَعُ النفس اللَّجوجَ عن الهوى　　من النّاس إلا وافرُ العقل كامله

لوگوں میں سے کامل عقل والا ہی جھگڑالو نفس کو محبت سے روکتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ توزیع سے مشتق ہے جس کا معنی تفریق ہے۔ القوم اوزاع قوم کئی طائفوں میں بٹی ہوئی ہے۔ قصہ میں ہے شیاطین نے آپ کے لیے ایک قالین بنایا جو ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا تھا ریشم میں سونے کی تاریں تھیں۔ اس پر سونے کی کرسی رکھی جاتی۔ اس کے اردگرد سونے اور چاندی کی دو ہزار کرسیاں رکھی جاتیں۔ انبیاء سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے اور علماء چاندیوں کی کرسیوں پر بیٹھتے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ امام اور حاکم ضابطہ بنائیں جو لوگوں کو روکیں اور ان کو ایک دوسرے

1۔ موطا امام مالک، کتاب فی الحج، باب جامع الحج، صفحہ 457، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 253

سے آگے بڑھنے سے روکیں کیونکہ حکام کے لیے بذات خود یہ فریضہ سرانجام دینا ممکن نہیں ہوتا۔ ابن عون نے کہا: میں نے حضرت حسن کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ وہ اپنی مجلس قضا میں موجود تھے جب آپ نے لوگوں کو دیکھا جو کچھ وہ کر رہے ہیں، فرمایا: اللہ کی قسم! ان لوگوں کو ضابط ہی درست کر سکتے ہیں۔ حضرت حسن نے یہ بھی کہا: لوگوں کے لیے ایک منتظم کا ہونا ضروری ہے یعنی ایسے سلطان کا ہونا ضروری ہے جو انہیں روکے۔ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے ہمیں مالک نے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: امام لوگوں کو اتنا منظم نہیں کرتا جتنا قرآن منظم کرتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا: میں نے مالک سے پوچھا: یہ یزع کیا ہے؟ فرمایا: وہ روکتا ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: قوم اس کلام کی مراد سے جاہل ہے انہوں نے گمان کیا اس کا معنی ہے کہ سلطان کی قدرت و قوت لوگوں کو اس سے زیادہ روکتی ہے جس قدر قرآن کی حدود روکتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ اور اس کی حکمت سے ناواقفیت ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حدود کو مصلحت عامہ کافہ کے لیے وضع کیا جو مخلوق کے امور کو درست رکھتی ہیں نہ ان پر کوئی زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کمی ہو سکتی ہے اس کے سوا کوئی درست نہیں لیکن ظالم ان کی وجہ سے ذلیل ہوئے اور ان سے کوتاہی کی اور جو کچھ کیا نیت کے بغیر کیا۔ فیصلہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہ کیا اور مخلوق ان کی وجہ سے نہ رکی۔ اگر وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتے، نیت کو خالص رکھتے تو امور درست ہو جاتے اور جمہور لوگ درست ہو جاتے۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۸ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۹

"یہاں تک کہ جب وہ گزرے چیونٹیوں کی وادی سے تو ایک چیونٹی کہنے لگی: گھس جاؤ اپنی بلوں میں کہیں کچل کر نہ رکھ دے تمہیں سلیمان اور ان کے لشکر اور انہیں معلوم ہی نہ ہو (کہ تم پر کیا گزر گئی) تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے اس کی اس بات سے اور عرض کرنے لگے: میرے مالک! مجھے توفیق دے تاکہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت (عظمیٰ) کا جو تو نے مجھ پر فرمائی اور میرے والدین پر نیز (مجھے توفیق دے کہ) میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے اور شامل کر لے مجھے اپنی رحمت کے باعث اپنے نیک بندوں میں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قتادہ نے کہا: ہمارے لیے یہ بات ذکر کی گئی کہ یہ شام میں ایک وادی ہے۔ کعب نے کہا: یہ طائف میں ایک وادی ہے۔ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ شعبی نے کہا: چیونٹی کے دو پر تھے وہ پرندوں میں سے تھی اس وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام اس کی بولی سمجھ گئے۔ اگر وہ پرندہ نہ ہوتی تو آپ اس کی بولی کو نہ سمجھتے۔ یہ بحث گزر چکی ہے اور بعد میں بھی آئے گی۔ سلیمان تیمی نے مکہ میں نَمَلَة اور النَّمُل نون کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا

ہے۔ان سے دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھنے کی قراءت بھی منقول ہے۔ نملہ کو نملہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ اکثر حرکت کرتی رہتی ہے اور کم ہی ایک جگہ ٹھہرتی ہے۔ کعب نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام طائف کی وادیوں میں سے وادی سدیر سے گزرے تو آپ وادی نمل پر آئے۔ ایک چیونٹی چل رہی تھی وہ لنگڑاتے ہوئے چل رہی تھی اس کی جسامت اتنی تھی جتنی جسامت بھیڑیے کی ہوتی ہے اس نے ندا کی: یٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ۔

زمخشری نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی آواز تین میلوں سے سن لی۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی جب کہ وہ لنگڑی تھی۔ اس کا نام طافیہ تھا۔ سہیلی نے کہا: علماء نے اس چیونٹی کا نام مکلمہ رکھا ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کلام کی۔ انہوں نے کہا: اس کا نام ''حرمیا'' تھا۔ میں نہیں جانتا کہ نملہ کے لیے کیسے اسم علم تصور کیا جا سکتا ہے جب کہ چیونٹیاں ایک دوسرے کو نام نہیں دیتیں اور نہ ہی انسانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کو کوئی مخصوص نام دیں، کیونکہ انسانوں کے لیے وہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ بنی آدم کی ملک کے تحت واقع ہیں، جس طرح گھوڑے اور کتے وغیرہ جو چیز اس طرح تھی اس کی علیت عربوں کے ہاں موجود تھی۔ اگر تو کہے: علیت اجناس میں موجود تھی جس طرح ثعالہ، اسامہ، جعار، قثام، بجو کے یہ اسماء ہیں۔ اس کی امثلہ بے شمار ہیں۔ چیونٹی کا نام اس قبیل سے نہیں کیونکہ انہوں نے گمان کیا کہ یہ نام تمام چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی کا تھا ثعالہ وغیرہ جنس میں سے ایک کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس جنس سے جس کو بھی تو دیکھے تو وہ ثعالہ ہے اسی طرح اسامہ، ابن آوی، ابن عرس اور اس جیسے اسماء۔ جو کچھ انہوں نے کہا اگر وہ صحیح ہے تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ وہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس بولنے والی چیونٹی کو تورات یا زبور میں یا کسی اور صحیفہ میں نام دیا گیا اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ نام ذکر کیا اور انبیاء حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے اس کا نام جانتے تھے یا بعض انبیاء نام جانتے تھے۔ اس کے بولنے اور اس کے ایمان کی وجہ سے نام میں اسے خاص کیا گیا تو یہ وجہ ہو سکتی ہے۔ ہمارے قول کہ اس کے ایمان کی وجہ سے مراد یہ ہے کہ اس نے دوسری چیونٹی سے کہا: لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ اس کا قول۔ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ مومن کا ہی قول ہو سکتا ہے یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کا عدل، ان کا فضل اور ان کے لشکروں کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ چیونٹی اور اس سے چھوٹی چیز کو بھی ہلاک نہیں کرتے مگر اس صورت میں کہ انہیں احساس ہی نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام کا تبسم اس کے حکم پر اظہار مسرت ہے۔ اسی وجہ سے تبسم کو ضَاحِكًا کے قول سے موکد کیا، کیونکہ بعض اوقات تبسم ضحک اور رضا کے بغیر ہوتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے وہ کہتے ہیں: تبسم تبسم الغضبان، تبسم تبسم المستهزئين۔ ضحاک کا تبسم یہ خوشی سے ہی ہوتا ہے۔ نبی دنیا کے امر سے خوش نہیں ہوتا وہ تو امر آخرت اور امر معین سے خوش ہوتا ہے اس کا قول: وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یہ دین، عدل، رافت کی طرف اشارہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کے بارے میں چیونٹی کا قول: وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ کی مثل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَتُصِیْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ (الفتح: 25) اس امر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے کہ وہ مومن کے خون کو رائیگاں کرنے کا قصد نہیں کرتے۔ مگر فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی ثنا کرنے والی چیونٹی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کی تعریف اللہ تعالیٰ نے

خود فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکروں کو دوسرے انبیاء کے لشکروں پر فضیلت ہے، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء پر فضیلت حاصل ہے۔ شہر بن حوشب نے مَسْكَنَكُمْ سین کے سکون کے ساتھ واحد کا صیغہ پڑھا ہے(1)۔ حضرت ابی کے مصحف میں مساکنکن لا یحطمنکم ہے سلیمان تیمی نے مساکنکم لا یحطمنکن قراءت کی ہے۔ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے تمہیں روند کر تم کو توڑ پھوڑ ہی نہ دیں جب کہ وہ تمہارے بارے میں جانتے بھی نہ ہوں۔ مہدوی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس چیونٹی کو یہ فہم عطا کیا تا کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے معجزہ ہو جائے۔ وہب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ کوئی کسی چیز کا تکلم نہ کرے مگر وہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے کان میں ڈالے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیاطین نے آپ کے ساتھ مکر و دھوکہ کا ارادہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وادی یمن کے علاقہ میں تھی۔ وہ عام چیونٹیوں کی طرح چھوٹی چیونٹی تھی؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ نوف شامی اور شقیق بن سلمہ نے کہا: اس وادی کی چیونٹیاں جسامت میں بھیڑیوں کی طرح تھیں۔ بریدہ اسلمی نے کہا: وہ بھیڑ جتنی تھیں۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا: اگر وہ اس شکل و صورت پر تھی تو اس کی آواز بھی ہوگی۔ چیونٹی کی آواز اس کے چھوٹے جسم کی وجہ سے مفقود ہوتی ہے ورنہ پرندوں اور چوپاؤں میں آوازیں تو ہوتی ہیں یہی ان کی گفتگو ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو میں تسبیح وغیرہ کے معانی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (الاسراء: 44) یہی مقصود ہے۔

لَا یَحْطِمَنَّكُمْ یہ کلبی کے قول کی صحت پر دال ہے اگر وہ بھیڑیوں اور بھیڑوں کی جسامت کی ہوتیں تو وہ روندی نہ جا سکتیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اُدْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ انسانوں سے خطاب کے طریقہ پر کلام آئی ہے کیونکہ جب چیونٹی نے کلام کیا تو اسے انسانوں کے قائم مقام رکھا جس طرح انسان گفتگو کرتے ہیں۔ ابو اسحاق ثعلبی نے کہا: میں نے بعض کتابوں کو دیکھا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹی سے کہا: تو نے چیونٹیوں کو کیوں ڈرایا کیا تو میرے ظلم سے خوف زدہ ہوگئی؟ کیا تو نہیں جانتی کہ میں عادل نبی ہوں؟ تو نے یہ کیوں کہا: یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ چیونٹی نے عرض کی: کیا آپ نے میرے اس قول کو نہیں سنا: وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ جب کہ میں نے نفوس کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ میں نے تو دلوں کے برباد کرنے کا ارادہ کیا اس ڈر سے کہ وہ بھی اس کی تمنا نہ کریں جس طرح کی حکومت آپ کو دی گئی یا دنیا کی وجہ سے وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں یا آپ کی حکومت کو دیکھ کر تسبیح اور ذکر سے غافل ہی نہ ہو جائیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا: تو مجھے نصیحت کر۔ چیونٹی نے کہا: کیا تجھے علم ہے تیرے والد کا نام داؤد کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے عرض کی: کیونکہ انہوں نے اپنے دل کے زخم کی دوا کی۔ کیا تجھے علم ہے تیرا نام سلیمان کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے عرض کی: آپ کو جو کچھ عطا کیا گیا ہے اس پر آپ سینہ کی سلامت کے ساتھ سلیم پہلو والے ہیں اور تیرے لیے مناسب ہے کہ تو اپنے والد کے ساتھ جا ملے۔ پھر اس نے عرض کی: آپ کو علم ہے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے ہوا کو کیوں مسخر کیا؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے عرض کی: اللہ تعالیٰ نے تجھے خبر دی ہے کہ تمام دنیا ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 254

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا متعجب ہوتے ہوئے مسکرائے پھر وہ اپنی قوم کی طرف جلدی چلی گئی۔ اس چیونٹی نے کہا: کیا تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہم اللہ تعالیٰ کے نبی کو ہدیہ دیں۔ انہوں نے کہا: ہم اس کو جو ہدیہ دیں اس کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو صرف ایک بیر ہے۔ اس چیونٹی نے کہا: بہت اچھا ہے وہ میرے پاس لے آؤ وہ بیر اس چیونٹی کے پاس لے آئے اس نے بیر کو اپنے منہ میں اٹھایا وہ اسے کھینچتے ہوئے چلی اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ وہ اسے اٹھالے وہ انسانوں، جنوں، علماء، انبیاء کو چیرتے ہوئے قالین پر آگے بڑھی یہاں تک کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آگری پھر اس بیر کو اپنے منہ سے آپ کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور کہنے لگی:

ألم ترنا نُهدِی إلی الله مَالَهُ　　وإن كان عنه ذا غنی فهو قابلُهُ

ولو كان يُهدَی للجليل بقدره　　لقصر عنه البحرُ يوما وساحلُهُ

ولكننا نُهدی إلی مانُحِبُّه　　فيرضی به عنا ويشكر فاعلُهُ

وما ذاك إلامن كريم فعالُه　　وإلا فما فی ملكنا ما يشاكلُهُ

کیا تو ہمیں نہیں دیکھتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا مال ہدیہ کے طور پر دیتے ہیں اگرچہ وہ اس سے غنی ہے تو وہ اس کو قبول کرنے والا ہے۔ اگر جلیل القدر ہستی کو کوئی چیز اس کی قدر کے مطابق ہدیہ کی جاتی تو سمندر اور اس کا ساحل اس سے قاصر ہوتے لیکن ہم وہ چیز ہدیہ کے طور پیش کرتے ہیں جسے ہم پسند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہم سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کا فاعل شکر گزار ہوتا ہے یہ نہیں ہے مگر جس کے افعال کرامت والے ہیں اور ہمارے ملک میں تو اس کی شایان شان کوئی چیز نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم میں برکت ڈالے۔ وہ اس دعوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے زیادہ شکر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار جانداروں کو قتل کرنے سے منع کیا، ہدہد، صرد، نملہ (چیونٹی)، شہد کی مکھی۔ ابو داؤد نے اسے نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ چیونٹی نے حضرت سلیمان کی تعریف کی اور جو مقدر کیا جا سکتا تھا اس کی خوبصورت ترین انداز میں خبر دی کہ اگر وہ تمہیں روندیں گے تو انہیں شعور نہیں ہوگا۔ وہ ارادہ سے ایسا نہیں کریں گے۔ ظلم کی ان سے نفی کی، اس وجہ سے اس کے قتل اور ہدہد کے قتل کی نہی کی کیونکہ اسی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پانی پر رہنمائی اور بلقیس تک آپ کا پیغام پہنچایا۔ عکرمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہدہد سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے شر کو دور کیا کیونکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والا تھا۔ صرد کو صوام بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے صرد نے روزہ رکھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام شام سے حرم کی طرف نکلے مقصد بیت اللہ کی تعمیر تھی تو سکینہ (بادل) اور صرد آپ کے ساتھ تھا۔ صرد جگہ پر رہنمائی کرتا اور بادل اتنی مقدار پر رہنمائی کرتا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بقعہ مبارکہ میں پہنچے تو بادل بیت اللہ شریف کی جگہ آ کر رک گیا اور ندا کی: اے

ابراہیم! میرے سایہ کے برابر تعمیر کرو۔ سورۃ الاعراف میں مینڈک کو قتل کرنے سے نہی کا سبب اور سورۂ نحل میں شہد کی مکھی کو قتل کرنے سے نہی کا سبب گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

**مسئلہ نمبر 2۔** حضرت حسن بصری نے لا یَحَطِّمنکم اور لا یحِطِّمنکم پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری سے اور ابو رجاء سے یہ بھی مروی ہے لا یُحَطِّمنکم حطم کا معنی توڑ دینا ہے۔ حطمته حطما و تحطم۔ میں نے اسے توڑ دیا اور وہ ٹوٹ گیا۔ تحطیم کا معنی کثرت سے یا شدت سے توڑنا ہے وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ⊙ (النمل) یہ جائز ہے کہ یہ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ سے حال ہو، حال میں عامل یَحْطِمَنَّكُمْ ہے یا یہ النملة سے حال ہے اور عامل قالت ہے۔ اس نے کہا: یہ لشکروں کی غفلت کی حالت میں ہوگا، جس طرح تیرا یہ قول ہے: قمت والناس غافلون یا یہ النمل سے حال ہے اور عامل قالت ہے معنی یہ ہے نمل نہیں سمجھتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ امر حقیقت سے بعید ہے اس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** امام مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک چیونٹی نے انبیاء میں سے ایک نبی کو کاٹا تو اس نبی نے چیونٹی کو بستی کو کھودنے کا حکم دیا تو اسے جلا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نبی کی طرف وحی کی: کیا یہ ایک چیونٹی کے کاٹنے کے باعث ہے تو نے ایک ایسی امت کو ہلاک کر دیا جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کیا کرتی تھی''۔ ایک اور سند میں ہے فهلا نملة واحدة (1)۔ ہمارے علماء نے کہا: ایک قول یہ کیا جاتا ہے اس نبی سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے عرض کی: اے میرے رب! تو اہل قریہ کو ان کی نافرمانیوں کے باعث عذاب دیتا ہے جب کہ ان میں اطاعت گزار بھی ہوتے ہیں، گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پسند کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے وہ دکھا دے جو اس کے پاس اس کی حکمت ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر گرمی کو مسلط کیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک درخت کی پناہ لی آپ اس کے سایہ سے راحت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس درخت کے پاس چیونٹیوں کی بستی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نیند غالب آگئی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نیند کی لذت پائی تو چیونٹی نے ان کو کاٹا اور آپ کو پریشان کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مسلا اور ان سب کو ہلاک کر دیا اور جس درخت کے پاس ان کے مساکن تھے اس درخت کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس میں اسے عبرت و حکمت دکھا دی۔ جب تجھے ایک چیونٹی نے کاٹا تو تو نے کیوں دوسری چیونٹیوں کو سزا دی؟ ارادہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ! سے آگاہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عقوبت عام ہوتی ہے یہ مطیع کے لیے رحمت، طہارت اور برکت ہوتی ہے اور نافرمان کے لیے شر اور انتقام ہوتا ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں جو چیونٹی کے قتل کی کراہت یا امتناع پر دلالت کرے۔ بے شک جو تجھے اذیت دے تو تیرے لیے حلال ہے کہ تو اس سے اپنا دفاع کرے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے مومن سے بڑھ کر کوئی حرمت والا نہیں۔ تیرے لیے مباح ہے کہ تو قتل کرنے یا مارنے کے ساتھ اپنا دفاع کرے۔ تو ان کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کی کیا حیثیت ہے جو تیرے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور تجھے ان پر مسلط کر دیا گیا ہے جب وہ تجھے اذیت دے تو تیرے لیے اس کا قتل مباح ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرها، باب النهی عن قتل النمل، جلد 2، صفحہ 236

ابراہیم سے مروی ہے چیونٹی میں سے جو تجھے اذیت دے تو تو اسے قتل کر۔ یہ قول الا نملة واحدة اسی امر پر دلیل ہے کہ جو اذیت دے اسے اذیت دی جائے اور اسے قتل کیا جائے۔ جب قتل نفع کے لیے ہو یا ضرر کو دور کرنے کے لیے ہو تو علماء کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ نملہ کو مطلق ذکر کیا اور اس نملہ کو خاص نہ کیا جس نے کاٹا تھا کیونکہ مراد قصاص نہیں تھا کیونکہ اگر اس کا ارادہ ہوتا تو فرماتا: الا نملتك التی لدغتك۔ بلکہ نملہ کی جگہ فرمایا: الا نملة، اس کے ساتھ یہ جانی اور بری کو عام ہو گیا، تاکہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے متنبہ فرمائے کہ وہ کس لیے تمام بستی والوں کو عذاب دیتا ہے جب کہ ان میں مطیع و عاصی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس نبی کی شریعت میں حیوانوں کو جلانے کے ساتھ سزا دینا جائز تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صرف جلانے پر عتاب نہیں فرمایا بلکہ کثیر چیونٹیوں کو جلانے پر عتاب فرمایا۔ کیا تو یہ فرمان نہیں دیکھتا: فهلا نملة واحدة یعنی تو نے ایک چیونٹی کو کیوں نہ جلایا۔ یہ ہماری شرع کے خلاف ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کے ساتھ عذاب دینے سے منع کیا ہے۔ فرمایا: لا یعذب بالنار الا الله (1) اسی طرح اس نبی کی شریعت میں چیونٹیوں کو قتل کرنا مباح تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کے قتل پر انہیں عتاب نہ کیا جہاں تک ہماری شریعت کا تعلق ہے تو اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس سے نہی آئی ہے۔ امام مالک نے اسے مکروہ جانا ہے کہ چیونٹی کو قتل کیا جائے مگر اس صورت میں کہ وہ تکلیف دے اور اس کی تکلیف کو اس کو مارنے کے بغیر دور نہ کر سکے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نبی کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے عتاب کیا کیونکہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے ایسی جمعیت سے انتقام لیا جن میں سے ایک نے اسے اذیت دی تھی۔ زیادہ بہتر صبر اور درگزر کرنا تھا۔ لیکن اب نبی کے لیے یہ واقع ہوا کہ یہ نوع انسان کو اذیت دیتی ہے اور بنی آدم کی حرمت حیوانوں میں سے جو ناطق نہیں ان کی حرمت سے بڑھ کر ہے۔ اگر اس کے لیے یہ نظر منفرد ہوتی اور اس کے ساتھ طبعی تشفی شامل نہ ہوتی تو اس کو عتاب نہ کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ لیکن جب طبعی تشفی اس کے ساتھ شامل تھی جس پر سیاق حدیث دلالت کرتا ہے تو اس پر عتاب کیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ أنی ان قرصتك نملة أهلكت أمة من الأمم تسبح (2) اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ یہ تسبیح قول اور نطق کی صورت میں تھی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے نمل کے بارے میں خبر دی کہ اس کی زبان تھی جسے حضرت سلمان علیہ السلام سمجھ گئے تھے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کی بات پر مسکرائے، یہ واضح دلالت ہے کہ چیونٹی گفتگو کرتی ہے لیکن اسے ہر کوئی نہیں سنتا، بلکہ اللہ تعالیٰ جس ولی یا نبی کے لیے بطور خرق عادت ایسی صلاحیت پیدا فرما دیتا ہے۔ ہم اس لیے اس کا انکار نہیں کرتے کہ ہم اسے نہیں سنتے۔ عدم ادراک سے مدرک کا عدم لازم نہیں کرتا۔ پھر انسان اپنے نفس میں قول اور کلام پاتا ہے مگر اس سے وہ کلام اس وقت تک نہیں سنا جاتا مگر جب وہ کلام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کے لیے خرق عادت کے طور پر یہ صلاحیت پیدا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی وہ کلام سنا دی جو انہوں نے آپس میں کی اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا اس کی بھی خبر دے دی۔ جس طرح کتب معجزات میں ہمارے کثیر ائمہ سے منقول ہے۔ اس طرح

1۔ جامع ترمذی فی التفسیر، جلد 1، صفحہ 190 2۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرها، باب النهی عن قتل النمل، جلد 2، صفحہ 236

کثیر اولیاء سے بھی ایسا واقع ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے شرف سے نوازا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں یہی مراد لیا ہے: ان فی امتی محدثین وان عمر منهم میری امت میں محدثین ہیں اور حضرت عمر ان میں سے ہیں (1)۔ سورۂ اسراء میں جمادات کی تسبیح کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے وہ تسبیح زبانی اور قولی ہے یہ دلالت حال کی تسبیح نہیں۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 5۔** فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا ابن سمیقع نے ضحکا پڑھا ہے (2) یہ فعل محذوف کا مصدر ہے جس فعل محذوف پر تبسم دلالت کرتا ہے گویا فرمایا: ضحك ضحكا، یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ سیبویہ کے علاوہ دوسرے علماء کے نزدیک یہ تبسم سے منصوب ہے، کیونکہ یہ ضحك کے معنی میں ہے جس نے ضاحکا پڑھا ہے تو وہ تبسم کے ضمیر سے ہونے کی وجہ سے منصوب ہے معنی ہے ضحک کی مقدار تبسم فرمایا کیونکہ ضحک تبسم کو مستغرق ہوتا ہے۔ اور تبسم، ضحك سے کم درجہ کا ہوتا ہے یہ اس کا آغاز ہوتا ہے یہ کہا جاتا ہے: بسم يبسم بسما فهو باسم وابتسم، تبسم۔ مبسم سے مراد دانت ہیں جس طرح مجلس یہ جلس یجلس سے مشتق ہے رجل جسام، بسام۔ بہت زیادہ ہنسنے والا۔ تبسم ضحک کا آغاز ہے۔ ضحک ابتدا اور انتہا سے عبارت ہے مگر ضحک تبسم پر زیادتی کا تقاضا کرتا ہے۔ جب اس میں اضافہ کرے اور انسان اپنے نفس پر ضبط نہ کر سکے تو اس وقت کہا جاتا ہے: اس نے قہقہہ لگایا، تبسم عموماً انبیاء کا ضحک ہوتا ہے۔ صحیح میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ کو عرض کی گئی: کیا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ فرمایا: ہاں اکثر آپ اپنے مصلیٰ سے نہ اٹھتے جس پر صبح کی نماز ادا فرماتے، یہاں تک کہ سورج طلوع ہوتا جب سورج طلوع ہوتا تو آپ اٹھ کھڑے ہوتے صحابہ باتیں کرتے اور جاہلیت کے معاملات کرتے تو وہ ہنستے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرماتے۔

اس بارے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ مشرکوں میں سے ایک آدمی نے مسلمانوں کو جلا دیا حضرت سعد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیر پھینکیے میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں'' (3)۔ کہا: میں نے اس (مشرک) کے لیے ایسا تیر نکالا جس میں پھل نہیں تھا میں نے اس کے پہلو میں مارا وہ گر گیا تو اس کی شرمگاہ کھل گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے یہاں تک کہ میں نے آپ کی داڑھیں مبارکہ دیکھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر تبسم فرمایا کرتے تھے۔ بعض دوسرے مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبسم سے زیادہ ضحک فرماتے جو تبسم سے بڑھ کر ہوتا اور استغراق سے کم ہوتا جس میں کوا ظاہر ہو جاتا ہے شاذ و نادر طور پر آپ زیادہ تعجب کے موقع پر ضحک فرماتے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہو جاتیں۔

علماء نے ضحک کی کثرت کو مکروہ جانا ہے جس طرح حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا: اے بیٹے! زیادہ ہنسنے سے بچو۔ زیادہ ضحک دل کو مار ڈالتا ہے۔ حضرت ابوذر اور دوسرے علماء سے مرفوع مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں جب حضرت سعد نے اس آدمی کو تیر مارا تھا تو وہ تیر اس کو جا لگا تھا۔ آپ کی خوشی اس کی شرمگاہ کے کھلنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ تیر لگنے کی وجہ سے تھی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عیوب سے مبرا ہیں۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 521
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 254
3۔ صحیح مسلم، باب فی فضل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جلد 2، صفحہ 281

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء کے نزدیک اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام حیوانات کے اذہان اور عقلیں ہیں۔ امام شافعی نے کہا: حمام (کبوتر) تمام پرندوں سے زیادہ عقل والا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: چیونٹی ایسا حیوان ہے جو ذہین ہے قوی ہے بہت زیادہ سونگھنے کی قوت رکھتی ہے، وہ ذخیرہ کرتی ہے، بستیاں بناتی ہیں، دانے کو دو حصوں میں کاٹتی ہے تاکہ وہ نہ اگے، دھنیا کو چار حصوں میں کاٹتی ہیں کیونکہ جب اس کو دو حصوں میں کاٹا جائے تو وہ اگ پڑتا ہے اس نے جو جمع کیا ہوتا ہے وہ سال میں اس کا نصف کھاتی ہے اور باقی بطور سامان محفوظ رکھتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ہمارے نزدیک علوم کے خواص ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جب پیدا کیا تو چیونٹی نے ان کا ادراک کر لیا۔ استاذ ابو مظفر شاہنور اسفرائنی نے کہا: یہ کوئی بعید نہیں کہ بہائم عالم کے حادث ہونے مخلوقات کے حادث ہونے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانیں، لیکن ہم اس سے یہ چیز نہیں سمجھتے اور وہ ہم سے اس چیز کو نہیں سمجھتے۔ مگر ہم ان کی تلاش کرتے ہیں تو وہ ہم سے دور بھاگتے ہیں یہ جنسیت کے حکم کی وجہ سے ہے۔

وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ ان مصدر یہ ہے اَوْزِعْنِیْۤ یہ مجھ میں الہام فرما۔ اس کی اصل وزع ہے گویا عرض کی: مجھے ایسی چیزوں سے روک دے جو ناراضگی کا باعث ہیں۔ محمد بن اسحاق نے کہا: اہل کتاب یہ گمان کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ اوریا کی بیوی تھی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کا امتحان لیا۔ اوریا کے فوت ہونے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے شادی کی تو اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنا اس کی مزید وضاحت سورۂ ص میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ فی، مع کے معنی میں ہے، یہ ابن زید سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اپنے صالح بندوں کے زمرہ میں داخل فرما دے۔

وَ تَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ﳲ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىٕبِیْنَ ۝۲۰ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاۡاَذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۲۱ فَمَكَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ۝۲۲ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ۝۲۳ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ ۝۲۴ اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ یَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝۲۵ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝۲۶ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝۲۷ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَا ذَا یَرْجِعُوْنَ ۝۲۸

''اور آپ نے (ایک روز) پرندوں کا جائزہ لیا تو فرمانے لگے: کیا وجہ ہے کہ مجھے (آج) ہد ہد نظر نہیں آرہا یا وہ

ہے ہی غیر حاضر (اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں ضرور اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا یا اسے لانا پڑے گی میرے پاس کوئی روشن سند پس کچھ زیادہ دیر نہ گزری (کہ وہ آ گیا) اور کہنے لگا: میں ایک ایسی اطلاع لے کر آیا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی اور (وہ یہ کہ) میں لے آیا ہوں آپ کے پاس ملک سبا سے ایک یقینی خبر میں نے پایا ایک عورت کو جوان کی حکمران ہے اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے میں نے پایا ہے اسے اور اس کی قوم کہ وہ سب سجدہ کرتے ہیں سورج کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور آراستہ کر دیئے ہیں ان کے لیے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستہ سے پس وہ ہدایت قبول نہیں کرتے وہ کیوں سجدہ نہ کریں اللہ تعالیٰ کو جو نکالتا ہے پوشیدہ چیزوں کو آسمانوں اور زمین سے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اللہ تعالیٰ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عرش عظیم کا آپ نے فرمایا: ہم پوری تحقیق کریں گے اس بات کی کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیان کرنے والوں سے ہے لے جا میرا یہ مکتوب اور پہنچا دے ان کی طرف پھر ہٹ کر کھڑا ہو جا ان سے اور دیکھ وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں''۔

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ جس سفر میں چیونٹی کا ذکر ہوا اس میں ایک اور چیز کا ذکر کیا جس طرح پہلے گزر را ہے۔ تَفَقَّدَ کا مطلب ہے جو چیز تجھ سے غائب ہو اس کی تلاش کرنا۔ طیر اسم جمع ہے واحد طیر ہے۔ یہاں طیر سے مراد جنس طیر اور جماعت ہے۔ وہ سفر میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس رہتے اور اپنے پروں سے آپ کو سایہ کرتے لوگوں نے پرندوں کی تلاش کی وجہ میں اختلاف کیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ اس اعتبار سے تھا کہ امور مملکت کی بجا آوری اس کا تقاضا کرتی تھی یہ آیت کا ظاہر معنی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: آپ نے پرندوں کو تلاش کیا کیونکہ جب ہدہد غائب ہوا تو سورج کی شعاعیں اس جگہ سے آپ پر پڑھیں۔ پرندے کو طلب کرنے کا سبب یہی چیز تھی تا کہ یہ واضح ہو کہ سورج کی شعاع کہاں سے داخل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: آپ نے ہدہد کو طلب فرمایا کیونکہ آپ کو پانی کی معرفت کی ضرورت پڑی تھی کہ وہ روئے زمین سے کتنا دور ہے، کیونکہ آپ نے ایسے جنگل میں پڑاؤ کیا تھا جہاں پانی نہیں تھا۔ اور ہدہد زمین کے ظاہر اور اس کے باطن کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پانی کی جگہ پر آگاہ کرتا تھا پھر جن تھوڑے سے وقت میں اسے نکال لیتے تھے وہ روئے زمین کو یوں الگ کر لیتے جس طرح بکری سے چمڑا اتارا جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو حضرت ابن سلام سے مروی ہے۔ ابو مجلز نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عبداللہ بن سلام سے فرمایا میں تجھ سے تین مسائل پوچھنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابن سلام نے کہا: تو مجھ سے سوال کرے گا جب کہ تو قرآن پڑھتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ یہ تین دفعہ کہا۔ پوچھا: دوسرے پرندوں کو چھوڑ کر حضرت سلیمان نے ہدہد کا ہی کیوں پوچھا؟ جواب دیا: پانی کی ضرورت تھی آپ اس کی گہرائی کو نہیں جانتے تھے ہدہد دوسرے پرندوں کی بجائے اسے پہچانتا تھا اس لیے آپ نے اسے طلب فرمایا۔ نقاش کی کتاب میں کہا: ہدہد

مہندس تھا۔ روایت بیان کی گئی کہ نافع بن ازرق نے سنا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہدہد کا ذکر کر رہے ہیں تو عرض کی: اے علامہ! رک جائیے ہدہد زمین کے اندر کیسے دیکھ سکتا ہے جب کہ وہ پھندے کو نہیں دیکھ سکتا جب اس میں گرتا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تقدیر آجاتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ مجاہد نے کہا: حضرت ابن عباس سے عرض کی گئی: ہدہد کو پرندوں میں سے کس لیے تلاش کیا گیا؟ فرمایا: حضرت سلیمان علیہ السلام ایسی جگہ اترے جہاں وہ نہیں جانتے تھے کہ پانی کتنا دور ہے ہدہد پانی کے بارے میں آپ کی رہنمائی کرتا تھا۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے پوچھنے کا ارادہ کیا۔ مجاہد نے کہا: میں نے کہا: وہ پانی تک کیسے ہدایت پا سکتا ہے جب کہ اس کے لیے پھندہ لگتا ہے تو وہ اس میں پھنس جاتا ہے؟ فرمایا: جب تقدیر آجاتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس جواب پر قرآن کا عالم ہی قادر ہو سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں: نہیں یہ وہ جواب ہے جو ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیا جو پہلے گزر چکا ہے۔ یہ اشعار کہے گئے:

إذا أراد الله أمرًا بامرئٍ وكان ذا عقلٍ ورأيٍ ونظرْ
وحيلةٍ يعملها في دفع ما يأتي بِه مكروهُ أسبابِ القَدَرْ
غَطّى عليه سمعه و عقلَه وسلّه من ذهنه سلّ الشَّعَرْ
حتى إذا أنفذ فيه حكمه ردّ عليه عقلَه ليعتبرْ

جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کے ساتھ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے جب کہ وہ بڑا عقل مند، اچھی نظر و فکر والا اور بڑے حیلے والا ہوتا ہے اسباب قدر جو مکروہات اس تک لاتے ہیں اس حیلہ کے دن وہ دفاع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی قوت سماعت اور عقل کو ڈھانپ لیتا ہے اور اس کے ذہن سے یوں نکال لیتا ہے جس طرح بال نکال لیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں اپنا قلم نافذ کر چکتا ہے تو اس پر اس کی عقل کو واپس کر دیتا ہے تاکہ عبرت حاصل کرے۔

کلبی نے کہا: آپ کے سفر میں صرف ایک ہی ہدہد تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ امام کو اپنی رعیت کے احوال کی چھان بین اور اس پر نگاہ رکھنی چاہیے ہدہد کو دیکھو وہ چھوٹا سا پرندہ تھا پھر بھی اس کا حال حضرت سلیمان علیہ السلام پر مخفی نہ رہا، تو ملک کی بڑی بڑی چیزیں مخفی رہ سکتی تھیں؟ اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سیرت پر ہی تھے۔ آپ نے فرمایا: اگر فرات کے کنارے ایک میمنہ کو بھیڑیا پکڑ لے تو اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا، تو تیرا ان والیوں کے بارے میں کیا گمان ہے جن کے ہاتھوں سے شہر دشمنوں کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں رعیت ضائع ہوتی ہے اور نگہبان ضائع ہوتے ہیں۔

صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب شام کی طرف نکلے یہاں تک کہ جب وہ سرغ (وادی تبوک کا ایک دیہات) کے مقام پر تھے تو اجناد کے امراء آپ سے ملے ان میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح امین الامۃ اور آپ کے اصحاب بھی تھے انہوں نے عرض کی: شام کے علاقہ میں وباء پھوٹ پڑی ہے ہمارے علماء نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ دورہ بیت المقدس کی فتح کے بعد سن سترہ ہجری میں ہوا تھا جس طرح خلیفہ بن خیاط نے ذکر کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اپنی رعیت اور امراء کے احوال کی چھان بین کیا کرتے تھے۔ قرآن اور سنت اس پر دال ہے اور دونوں نے واضح کیا کہ امام پر اپنی رعیت کے احوال کے حوالہ سے یہ واجب ہے اور یہ فریضہ اسے بنفس نفیس ادا کرنا چاہیے اور اس کے لیے سفر کرنا چاہیے اگر چہ وہ طویل ہو۔ اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے جب انہوں نے کہا:

وهل أفسدَ الدينَ إلّا الملوكُ وأحبارُ سوءٍ و رهبانُها

دین کو بادشاہوں، برے علماء اور برے عبادت گزاروں نے فاسد کیا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ہد ہد کو کیا ہو گیا ہے میں اسے نہیں دیکھتا؟ یہ کلام اس قلب کے قاعدہ سے تعلق رکھتی ہے جس کا معنی معروف نہیں۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: مالی اراک کئیبا یعنی تجھے کیا ہو گیا ہے میں تجھے غمگین دیکھتا ہوں؟ ہد ہد معروف پرندہ ہے ھدھدتہ صوتہ میں نے اس کی آواز نکالی۔ ابن عطیہ نے کہا: کلام کا مقصد یہ تھا کہ ہد ہد غائب ہے لیکن لازم کا ذکر کیا وہ یہ ہے کہ میں اسے نہیں دیکھتا۔ تو لازم پر آگاہی حاصل کرنے کے لیے سوال کیا۔ یہ ایجاز کی ایک قسم ہے۔ مالی میں جو استفہام ہے اس ہمزہ کے قائم مقام ہے ام جس کا محتاج ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرمایا مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اپنے نفس کی حالت کا اعتبار کیا کیونکہ آپ کو علم تھا کہ آپ کو عظیم ملک دیا گیا ہے تمام مخلوق آپ کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ اور آپ پر حق شکر لازم ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ طاعت اختیار کریں اور عدل کو دوام بخشیں۔ جب آپ نے ہد ہد کی نعمت کو مفقود پایا تو خوف ہوا کہ آپ نے حق شکر میں کمی کی ہے۔ اسی وجہ سے وہ نعمت طلب کی گئی ہے تو آپ اسے تلاش کرنے لگے۔ فرمایا: مَالِيَ۔ ابن عربی نے کہا: یہ وہ عمل ہے جو صوفیاء کے شیوخ کرتے ہیں جب وہ اپنی کسی چیز کو گم پاتے ہیں تو وہ اپنے اعمال کی چھان بین کرتے ہیں۔ یہ آداب میں ہے تو ہمارا کیا حال ہوگا کہ ہم فرائض میں بھی کوتاہی کرتے ہیں۔

ابن کثیر، ابن محیصن، عاصم، کسائی، ہشام اور ایوب نے مالی یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ اسی طرح سورۂ یٰسین میں ہے وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (یٰسین: 22) حمزہ اور یعقوب نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ باقی مدینہ طیبہ کے قراء اور ابو عمرو نے سورۂ یٰسین میں یاء کے فتحہ اور یہاں سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: سورۂ نمل میں یہ استفہام ہے اور دوسری جگہ یہ نافیہ ہے۔ ابو حاتم اور ابو عبیدہ نے اسکان کو پسند کیا ہے فقال مالی۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: ایک قوم نے گمان کر[illegible] نے ارادہ کیا کہ وہ ابتدا اور جو ماقبل پر معطوف ہے ان میں فرق کریں۔ یہ کوئی چیز نہیں۔ یہ یاء نفس ہے ع[illegible] میں سے کچھ اسے فتحہ دیتے ہیں اور ان میں سے کچھ اسے ساکن رکھتے ہیں۔ انہوں نے دونوں لغتوں کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ یاء نفس میں فصیح لغت یہ ہے کہ وہ مفتوح ہو کیونکہ وہ اسم ہے اور یہ حرف واحد پر ہے پسندیدہ یہ ہے کہ اس کو ساکن رکھا جائے کہ اسم میں اجحاف ہو۔ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىِٕبِيْنَ ام، بل کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اس میں یہ دلیل ہے کہ حد گناہ کے اعتبار سے ہوگی جسم کے اعتبار سے نہ ہوگی مگر بعض اوقات جس پر حد جاری کی جارہی ہوتی ہے زمانہ اور صفت کے اعتبار سے نرمی کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور ابن جریج سے مروی ہے کہ پرندے کو عذاب دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پر اکھاڑ دیئے جائیں۔ ابن

جریج نے کہا: اس کے تمام پر۔ یزید بن رومان نے کہا: اس کے دونوں پر (1)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کیا تاکہ نافرمانوں پر سختی کی جائے اور سزا دی جائے اس کی صورت یہ ہو کہ اس کی باری اور رتبہ میں کمی کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب ان کے لیے مباح کیا تھا، جس طرح جانوروں اور پرندوں کو کھانے اور دوسرے منافع کے لیے ذبح کرنا مباح قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

نوادر الاصول میں ہے کہا: سلیمان بن حمید ابو ربیع ابادی، عون بن عمارہ سے وہ حسین جعفی سے وہ زبیر بن خریت سے وہ عکرمہ سے روایت نقل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہدہد سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شر کو دور کر دیا کیونکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والا تھا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تعذیب سے مراد اس کو اس کی اضداد کے ساتھ ملا دینا ہے۔ بعض سے یہ بھی مروی ہے: قید خانوں میں سے سب سے سخت اضداد کے ساتھ ملا دینا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں اس پر لازم کروں گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی خدمت کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں اسے پنجرے میں بند کر دوں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پر اکھیڑنے کے بعد اسے دھوپ میں چھوڑ دوں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں اس کو اپنی خدمت سے خارج کر دوں گا۔ بادشاہ اپنی خدمت اور الفت سے محروم کر کے جدائی کے ساتھ لوگوں کو سزا دیتے یہ نون ثقیلہ کے ساتھ موکد ہے۔ یہ اسے ہی لازم ہوتا ہے یا خفیفہ کو بھی لاحق ہوتا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اگر اسے لأعذبنّه عذابًا شديدًا اولأ ذبحنّه پڑھنا جائز ہو تو جائز ہے اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ واضح حجت کے ساتھ۔ لَیَاْتِیَنِّیْ میں لام قسمیہ نہیں کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہدہد کے فعل پر قسم اٹھانے والے نہیں تھے، لیکن جب یہ اس قول کے بعد آیا لَاُعَذِّبَنَّهٗ یہ ان چیزوں میں سے ہے جن میں قسم جائز ہوتی ہے تو اسے اس کے طریقہ پر جاری کیا۔ صرف ابن کثیر نے اسے لیاتیننی دونوں کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فعل کا فاعل ہدہد ہے جمہور قراء کاف کو ضمہ دیتے ہیں صرف عاصم نے اسے فتحہ دیا ہے۔ دونوں قراءتوں میں اس کا معنی اقام ہے۔ سیبویہ نے کہا: مکث یمکث مکوثا جس طرح انہوں نے قعد یقعد قعودا کہا: مکث یہ ظرف کی مثل ہے۔ دوسرے قراء نے کہا: فتحہ اچھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ماکثین۔ یہ مکث سے مشتق ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے مَكَثَ يَمْكُثُ فهو ماكثٌ۔ مَكُثَ یمکث جس طرح عَظُمَ يَعْظُمُ فهو مَكِيثٌ جس طرح عظیم ہے مَكَثَ يَمْكُثُ فهو ماكثٌ جس طرح حَمُضَ يَحْمُضُ فهو حامض۔ مَكَثَ میں جو ضمیر ہے اس میں احتمال ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے لیے ہو معنی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام طلب اور وعید کے بعد تھوڑی دیر رہے یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ہدہد کے لیے ہو؛ یہ اکثر کا قول ہے وہ آگیا فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ یہی چھٹا مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ میں نے وہ امر جانا ہے جس کا آپ کو علم نہیں۔ اس میں اس کا رد ہے جو یہ کہتا ہے کہ انبیاء غیب (3) کو جانتے ہیں۔ فراء نے کہا: احط تاء کو طاء میں ادغام کیا۔ احتُ حکایت بیان کی، طاء کو تاء سے بدلا اور اس میں ادغام کیا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا بتایا جو حضرت سلیمان علیہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 255 2۔ ایضاً 3۔ اس کی توضیح حضرت مفسر مسئلہ نمبر نو میں خود کر رہے ہیں۔

السلام نہیں جانتے تھے اور اس کو عذاب اور ذبح کی جو دھمکی دی گئی اس کو اپنی ذات سے دور کیا۔ جمہور نے سبأ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمر نے سبأ ہمزہ پر فتحہ اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ پہلی تاویل کی صورت میں یہ ایک آدمی کا نام ہے جس کی طرف قوم کی نسبت کی گئی ہے۔ اسی تعبیر پر شاعر کا قول ہے:

الواردون وتیم فی ذُرَی سبأٍ قد عَضّ أعناقَهُمْ جلدُ الجوامِیس (2)

وارد ہونے والے اور تیم سبا کی نسل میں ہیں ان کی گردنوں کو بھینسوں کی جلد نے کاٹا ہے۔

زجاج نے اس کا انکار کیا ہے کہ یہ کسی آدمی کا نام ہو۔ کہا: سبا شہر کا نام ہے جو مآرب کے نام سے معروف تھا جو یمن میں واقع ہے اس کے درمیان اور صنعاء کے درمیان تین دن کی مسافت ہے۔

میں کہتا ہوں: غزنوی کے عیون المعانی میں واقع ہے کہ تین میل کی مسافت ہے۔ قتادہ اور سدی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس بستی کی طرف بارہ انبیاء مبعوث فرمائے۔ اور نابغہ جعدی کا شعر پڑھا:

من سَبَأَ الحاضِرین مَآرِبَ إذْ یَبْنُون من دون سَیْلِهِ العَرِمَا

سبا سے جو مآرب میں رہتے تھے جب وہ سیل عرم کی وجہ سے عمارتیں بناتے تھے۔

کہا: جو اسے تنوین نہیں دیتا اس نے کہا: یہ شہر کا نام ہے۔ جس نے اسے تنوین دی۔ اور یہ قول اکثر کا قول ہے کیونکہ یہ بلد کا نام ہے وہ مذکر ہوگا اس وجہ سے مذکر کا نام دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایک عورت کا نام تھا جس کی وجہ سے شہر کا نام رکھا گیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک آدمی کا نام تھا۔ کتاب الترمذی میں فروہ بن مسیک مرادی کی حدیث سے ثابت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں ان شاء اللہ اس کا ذکر آئے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: زجاج پر یہ حدیث مخفی رہی اس وجہ سے اس نے ٹامک ٹوئیاں کھائیں۔ فراء نے گمان کیا ہے کہ رواسی نے ابو عمرو بن علاء سے سبا کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا: میں نہیں جانتا وہ کیا ہے؟ نحاس نے کہا: فراء نے ابو عمرو پر تاویل کی ہے انہوں نے اسے تنوین سے روک دیا ہے کیونکہ وہ مجہول ہے، کیونکہ جب شے معروف نہ ہو تو وہ منصرف نہیں ہوتی۔ نحاس نے کہا: ابو عمرو اس قسم کا قول کرنے سے جلیل شان والا ہے۔ رواسی نے اس سے جو بیان کیا ہے کہ یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ غیر منصرف اس لیے ہے کیونکہ وہ اسے نہیں پہچانتے تھے انہوں نے کہا: میں اسے نہیں پہچانتا، اگر کسی نحوی سے یہ پوچھا جائے تو وہ کہہ دے، میں اسے نہیں پہچانتا تو اس میں اس کی دلیل نہیں کہ یہ غیر منصرف ہے بلکہ حق اس کے علاوہ ہے ضروری ہے کہ جب وہ اسے نہیں پہچانتا تو اسے تنوین دے کیونکہ اسماء میں اصل ان کا منصرف ہونا ہے۔ شے کو تنوین سے روکا جاتا ہے کسی ایسی علت کی وجہ سے جو اس پر داخل ہوتی ہے۔ اصل یقینی طور پر ثابت ہے تو جو معروف نہ ہو وہ اس کے ساتھ زائل نہیں ہوتا اور نحویوں سے کثیر کلام ذکر کی ہے اس کے آخر میں کہا: سبا کے بارے جو بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اصل میں آدمی کا اسم ہے اگر تو اس کو تنوین دے تو یہ اس لیے کیونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اگر تو اس کو تنوین نہ دے تو تو اسے قبیلہ کا نام قرار دے گا جس طرح ثمود ہے مگر سیبویہ کے نزدیک تنوین اور منصرف ہے اس میں اس کی دلیل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 255 2۔ ایضاً

قطعی ہے کیونکہ جب یہ ایسا اسم ہے جو مذکر اور مونث دونوں طرح آسکتا ہے تو مذکر اَولی ہے کیونکہ یہی اصل اور زیادہ خفیف ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ آیت میں دلیل ہے کہ چھوٹا بڑے سے کہتا ہے متعلم، عالم سے کہتا ہے: عندی ما لیس عندك میرے پاس وہ ہے جو تیرے پاس نہیں ہے۔ جب یہ چیز اس پر واضح ہوگئی اور اس کو اس کا یقین ہوگیا۔ یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں اپنی جلالت شان اور علم کے باوجود اجازت طلب کرنے والے حکم سے آگاہ نہیں تھے۔ تیمم کا علم حضرت عمارہ وغیرہ کے پاس تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس نہیں تھا۔ دونوں صحابہ نے کہا: جنبی تیمم نہیں کرے گا۔ بالغہ عورت کے بارے میں اذن کا حکم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا اور حضرت مسور بن مخرمہ پر مخفی تھا۔ اس کی کثیر امثلہ ہیں اس وجہ سے اس کے ساتھ اس بحث کو طویل نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ جب ہد ہد نے کہا: جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: اس کی کیا خبر ہے؟ اس نے عرض کی: اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ مراد بلقیس بنت شراحیل ہے جو اہل سبا کی ملکہ تھی۔ یہ سوال کیا جاتا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام پر اس کا مکان کیسے مخفی رہا جب کہ آپ کے پڑاؤ اور اس کے شہر کے درمیان فاصلہ بہت تھوڑا تھا؟ یہ صنعاء اور مآرب کے درمیان تین دن یا تین میل کی مسافت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی وجہ سے اسے مخفی رکھا جس طرح حضرت یوسف کا مکان حضرت یعقوب پر مخفی رکھا۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس کے آباء میں سے ایک جن تھا۔ ابن عربی نے کہا: یہ ایسا امر ہے جس کا ملحد انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جن نہ کھاتے ہیں اور نہ ان کے ہاں ولادت ہوتی ہے۔ انہوں نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ ان سب پر لعنت فرمائے۔ یہ صحیح ہے ان کا نکاح عقلاً جائز ہے اگر نقلاً صحیح ثابت ہو جائے تو یہ کتنی اچھی بات ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ جنوں کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا انہوں نے عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی امت کو منع کریں کہ وہ ہڈی، لید اور حُمم (سر کی کھوپڑی، لکڑی کا پیالہ) سے استنجاء نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے ان میں ہمارے لیے رزق بنایا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے "ہر وہ ہڈی جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو وہ تمہارے ہاتھ لگے گی تو اس پر وافر گوشت ہوگا اور ہر لید کا دانہ تمہاری سواریوں کے لیے چارہ ہوگا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ان دونوں کے ساتھ استنجاء نہ کرو کیونکہ یہ تمہارے جن بھائیوں کا کھانا ہے"(1)۔ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے میں نے عرض کی: یہ ہڈی اور لید کا کیا معاملہ ہے؟ فرمایا: "یہ جنوں کا کھانا ہے میرے پاس نصیبین کے جنوں کا وفد آیا وہ کتنے اچھے جن تھے انہوں نے مجھ سے زادِ راہ کا سوال کیا، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ کسی ہڈی اور لید پر نہ گزریں مگر اس پر کھانا پائیں"(2)۔ یہ سب روایات اس میں نص ہیں کہ وہ کھاتے ہیں۔ جہاں تک ان کے نکاح کا تعلق ہے وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (اسراء: 64) کے ضمن میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وہب بن جریر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الجھر بالقرأۃ، جلد 1، صفحہ 184

2۔ صحیح بخاری، کتاب فی بنیان الکعبہ، باب ذکر الجن و قول اللہ تعالیٰ قل اوحی الی انہ، جلد 1، صفحہ 544

بن حازم، خلیل بن احمد سے وہ عثمان بن حاضر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ بلقیس کی ماں جنوں میں سے تھی جسے بلعم بنت شیعان کہا جاتا تھا اس کے بارے میں مزید گفتگو ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنایا ہے فرمایا: لن یُفلح قوم وَلّوا أمرَهم امرأةً وہ قوم فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے امور عورت کے سپرد کردیے(1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ اس امر میں نص ہے کہ عورت خلیفہ نہ ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ محمد بن جریر طبری سے مروی ہے کہ یہ جائز ہے کہ عورت قاضی ہو ان سے یہ قول ثابت نہیں۔ شاید ان سے یہ قول اسی طرح منقول ہے جس طرح امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ وہ ان امور میں فیصلہ کرسکتی ہے جن میں وہ گواہی دے سکتی ہے وہ علی الاطلاق قاضی نہیں بن سکتی اور نہ اس کے لیے یہ لکھا جائے کہ فلانہ حکم پر مقدم ہے اس کا سبیل تحکیم اور قضیہ واحدہ میں نائب بنانا ہے یہی وہ گمان ہے جو امام ابوحنیفہ اور ابن جریر کے بارے میں ہے۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ نے ایک عورت کو بازار کی نگرانی پر مقرر کیا۔ یہ ثابت نہیں تم اس کی طرف متوجہ نہ ہو یہ احادیث میں بدعت جاری کرنے والوں کے وساوس ہیں۔

اس مسئلہ میں قاضی ابوبکر بن طیب مالکی اشعری نے ابوالفرج بن طرار شیخ شافعیہ کے ساتھ مناظرہ کیا ابوالفرج نے کہا: اس امر پر دلیل کہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ فیصلہ کرے وہ یہ ہے احکام سے غرض یہ ہے کہ قاضی ان کو نافذ کرے، اس پر گواہوں کو سنے، جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے یہ عورت کی طرف سے بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح مرد کی جانب سے ممکن ہے۔ قاضی ابوبکر نے اس پر اعتراض کیا اور امامت کبریٰ سے ان کے کلام میں نقض پیش کیا کیونکہ اس سے غرض سرحدوں کی حفاظت ہے امور کی تدبیر ہے، خراج کی وصولی ہے اور اسے مستحقین کی طرف لوٹانا ہے۔ یہ فرائض جس طرح مرد سے واقع ہوتے ہیں عورت سے واقع نہیں ہوتے۔ ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں شیخین کا کلام کوئی چیز نہیں عورت کے لیے مجلس میں آنا ممکن نہیں ہوتا، وہ مردوں سے میل جول نہیں رکھ سکتی اور ہم پلہ، ہم پلہ کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ اگر وہ نوجوان ہوگی تو مرد کا اس کی طرف دیکھنا اور کلام کرنا حرام ہوگا۔ اگر وہ پکی عمر کی ہو مرد اس کے ساتھ اکٹھے نہیں بیٹھ سکتا۔ مردوں کی مجلس ایک ہوتی ہے وہ ان کے ساتھ بھیڑ کرے گی اور وہ ان کی طرف دیکھے گی جو آدمی اس قسم کا تصور رکھے وہ فلاح نہیں پاسکتا اور نہ وہ جو اس قسم کا اعتقاد رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یہ کلام مبالغہ کے طور پر ہے یعنی مملکت جس کی محتاج ہوتی ہے وہ سب مجھے حاصل ہے اوتیت من کل شی فی زمانها شیئا، تو مفعول کو حذف کردیا گیا، کیونکہ کلام اس پر دال ہے، وَ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ عرش سے مراد سریر (تخت) ہے اس کی عظیم سے جو صفت لگائی گئی ہے وہ ہیئت اور سلطان کے رتبہ کے لحاظ سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ سونے کا تخت تھا جس پر وہ بیٹھا کرتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں عرش سے مراد ملک ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا اگر تو کہے: ہدہد نے کیسے بلقیس کے عرش اور اللہ تعالیٰ کے

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ و قیصر، جلد 2، صفحہ 637

عرش میں عظیم کے ساتھ صفت لگا کر برابری کی ہے؟ میں کہوں گا: دونوں وصفوں میں بہت ہی دوری ہے کیونکہ ملکہ بلقیس کے عرش کی عظمت اس مناسبت سے ہے جو اسی جیسے بادشاہ بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عرش کی عظمت ان چیزوں کے اعتبار سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں جیسے آسمان اور زمین۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کے عرش کی لمبائی اسی ہاتھ تھی اور اس کی چوڑائی چالیس ہاتھ تھی اور اونچائی تیس ہاتھ تھی، جس پر موتیوں، سرخ یاقوت اور سبز زبرجد کا تاج تھا۔ قتادہ نے کہا: اس کے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اس پر دیباج (ریشم کی ایک قسم) اور حریر کے پردے تھے، اس کے سات تالے تھے۔ مقاتل نے کہا: وہ اسی ہاتھ لمبا اور اسی ہاتھ چوڑا تھا اس کی اونچائی اسی ہاتھ تھی اس پر جواہرات جڑے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا: عورتیں اس کی خدمت گار تھیں اس کی خدمت کے لیے چھ سو عورتیں تھیں۔ ابن عطیہ نے کہا: آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جو یمن کے شہروں کی ملکہ تھی اس کا عظیم ملک اور عظیم تخت تھا۔ وہ کافر قوم کی ایک کافر عورت تھی (1)۔

**مسئلہ نمبر 12۔** وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امت ان لوگوں میں سے تھی جو سورج کی پوجا کرتے ہیں جس طرح روایت کی گئی ہے وہ زنادقہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مجوسی تھے وہ انوار کی عبادت کیا کرتے تھے۔ نافع سے مروی ہے کہ وقف عرش پر ہوگا۔ مہدوی نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر عظیم مابعد کے متعلق ہوگا اس تعبیر کی بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ تقدیر کلام یوں ہو عظیم ان وجدتھا یعنی عظیم وجودی ایاھا کافرۃ۔ ابن انباری نے کہا: وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ اس پر وقف اچھا ہے عرش پر وقف جائز نہیں اور عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا سے ابتدا جائز نہیں مگر جو فتحہ دے کیونکہ عظیم عرش کی صفت ہے اگر یہ وجدت کے متعلق ہوتو تو کہتا: عظيمة وجدتها یہ ہر اعتبار سے محال ہے۔ ابوبکر محمد بن حسین بن شہریار، ابو عبداللہ حسین بن اسود عجلی سے وہ بعض اہل علم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ عرش پر وقت اور عظیم سے ابتدا اس معنی کی بنا پر ہوگی ان کا سورج اور چاند کی عبادت کرنا عظیم ہے۔ کہا: میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا جو اس مذہب کی تائید کرتا ہے اور اللہ اللہ کرتا ہے کہ اس کا عرش اس سے حقیر اور دقیق تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی صفت عظیم سے لگاتا۔ انباری نے کہا: میرے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے کیونکہ سورج اور چاند کی عبادت کے مضمر ہونے پر کوئی دلیل نہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی صفت عظیم سے لگائے کیونکہ اس نے اسے طول اور عرض میں متناہی حد کو دیکھا۔ عرش کے اعراب پر اس کا جاری ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اس کی نعت ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ یعنی ان میں جو کفر تھا اسے مزین کیا فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ توحید کے راستہ سے انہیں روکا اور اس امر کو واضح کیا کہ جو توحید کا راستہ نہیں وہ ایسا راستہ نہیں جس سے یقینی طور پر نفع حاصل کیا جائے۔ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ وہ اللہ تعالیٰ اور توحید کی طرف ہدایت پانے والے نہیں۔

**مسئلہ نمبر 13۔** اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ ابوعمرو، نافع، عاصم اور حمزہ نے الا یسجدوا للہ، الا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے الا کو شد دی ہے اس کے نزدیک فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ مکمل کلام نہیں کیونکہ معنی ہے شیطان نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 256

ان کے لیے مزین کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں۔ نحاس نے کہا: یہ ان ہے جو لا پر داخل ہوا ہے ان محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: اسے زین نے نصب دی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی زین لھم لئلا یسجدوا۔ کسائی نے کہا: صدھم نے اسے نصب دی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فصدھم الا یسجدوا دونوں صورتوں میں مفعول لہ ہے۔ یزیدی اور علی بن سلیمان نے کہا: ان، اعمالھم سے بدل ہے یہ محل نصب میں ہے۔ ابوعمرو نے کہا: ان محل جر میں ہے جو السبیل سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں عامل لا یھتدون ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فھم لا یھتدون أن یسجدوا ﷲ یعنی وہ نہیں جانتے کہ یہ ان پر واجب تھا۔ اس قول کی بنا پر لا زائدہ ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَامَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (الاعراف: 12) یعنی تجھے کس نے سجدہ کرنے سے منع کیا؟ اس قراءت کی بنا پر یہ سجدہ کی جگہ نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ان کے سجدہ ترک کرنے کی خبر ہے، خواہ وہ تزئین، روکنے اور ہدایت پانے سے رکنے کی صورت میں ہو۔ زہری، کسائی وغیرہما نے پڑھا ألا یسجدوا ﷲ معنی ہے خبردار اے لوگو! تم سجدہ کرو کیونکہ یا حرف ندا کے ساتھ اسماء کو ندا کی جاتی ہے افعال کو ندا نہیں کی جاتی۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا:

یا لعنةُ اللهِ والأقوامِ كلِّهِمُ    والصّالحين على سِمْعَانَ من جَارِ

سیبویہ نے کہا: یا حرف ندا لعنت کے لیے نہیں کیونکہ اگر اس کا منادی لعنة ہوتا تو حرف ندا اس کو نصب دیتا کیونکہ یہ منادی مضاف ہوتا، لیکن اس کی تقدیر کلام یہ ہے یا ھولاء لعنة الله والأقوام علی سمعان۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ اور تمام اقوام کی سمعان پر لعنت ہو۔ بعض علماء نے عربوں سے اپنے سماع کو بیان کیا ہے ألا یا ارحموا ألا اصدقوا۔ وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں خبردار اے قوم! تم رحم کرو تم سچ بولو۔ اس قراءت کی بنا پر اسجدوا امر کی وجہ سے مجزوم ہے اور وقف الا یا پر ہوگا پھر تو نئے سرے سے کلام کرے گا اور تو کہے گا: اسجدوا، کسائی نے کہا: میں شیوخ کو امر کے ارادہ سے تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا تھا عبداللہ کی قراءت میں ہے الا ھل تسجدون ﷲ یعنی تاء اور نون ہے۔ ابی کی قراءت میں الا تسجدون ﷲ یہ دونوں قرائتیں اس کے لیے حجت ہیں جو تخفیف کرتا ہے۔ زجاج نے کہا: تخفیف کی قراءت سجدہ کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے تشدید سجدہ کا تقاضا نہیں کرتی۔ کہا تخفیف بہت اچھی توجیہ ہے مگر اس میں خبر سبا کے امر سے منقطع ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد ان کے ذکر کی طرف رجوع کیا۔ تشدید کے ساتھ قراءت ایسی خبر ہے جس کا بعض بعض کے تابع ہے اس کے وسط میں کوئی انقطاع نہیں اس کی مثل نحاس نے کہا: تخفیف کے ساتھ قراءت بعید ہے کیونکہ کلام جملہ معترضہ بن جائے گی اور تشدید کے ساتھ قراءت متسق ہو جائے گی، نیز جو مسودات ہیں وہ اس قراءت کے علاوہ ہیں کیونکہ اس سے دو الف حذف ہیں۔ اس کی مثل کو ایک الف کے حذف کے ساتھ اختصار کیا جاتا ہے، جس طرح یا عیسی بن مریم۔ ابن انباری نے کہا: اسجدوا کا الف ساقط ہو گیا جس طرح یہ ساقط ہو جاتا ہے ان کے ساتھ جب ظاہر ہو۔ جب یا کا الف ساقط ہو گیا تو اسجدوا کا الف متصل ہو گیا تو وہ گر گیا اس کا سقوط اختصار پر دلالت کرنے والا شمار ہوا اور اس پر ترجیح دینے کے لیے شمار ہوا جو تخفیف کا قائل ہے اور الفاظ کی کمی کا قائل ہے۔ جوہری نے اپنی کتاب کے آخر میں کہا: بعض نے کہا اس جگہ یا یہ تنبیہ کے لیے ہے گویا فرمایا ألا اسجدوا ﷲ جب اس پر یا تنبیہ کے لیے داخل کی گئی تو اسجدوا میں جو الف تھا وہ ساقط ہو گیا کیونکہ یہ الف وصل ہے اور یا میں جو الف تھا وہ

اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف ہوگیا کیونکہ یہ اور سین دونوں ساکن ہیں۔ ذورمہ نے کہا:

أَلَا يَا اسْلَمِي يَا دَارَمَيَّ عَلَى البِلَى ۔۔۔ وَلَا زَالَ مُنْهَلًّا بَجَرْعَائِكِ الْقَطْرُ(1)

محل استدلال اسلمی کا ہمزہ ہے۔

جرجانی نے کہا: یہ کلام معترضہ ہو، ہدہد کی جانب سے ہو، حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہو یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو، یعنی أَلَا يَسْجُدُوا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ (الجاثیہ: 14) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر ہے یعنی بخشش طلب کرو۔ اسی پر مصحف کی کتابت منتظم ہے یعنی یہاں ندا نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: العظیم تک ہدہد کا کلام ہے یہ ابن زید اور ابن اسحاق کا قول ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ تو مخاطب ہی نہیں تو وہ شرع کے معنی میں کیسے گفتگو کرسکتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ہو جب ہدہد نے آپ کو اس قوم کی خبر دی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو یہ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہوگا یہ تامل کے ساتھ ثابت ہے۔ الا میں تشدید کے ساتھ قراءت یہ معنی دیتی ہے کہ کلام ہدہد کا ہے اور تخفیف کی قراءت اس سے مانع ہے۔ تخفیف کی قراءت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کا امر ہے یہ تقاضا اس امر کی وجہ سے ہے جس کو ہم نے بیان کیا ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تو سوال کرے کیا سجدہ تلاوت دونوں قرائتوں میں واجب ہے یا ایک قراءت میں واجب ہے؟ میں کہوں گا: دونوں قرائتوں میں واجب ہے کیونکہ سجدہ کے جتنے بھی مواضع ہیں یا تو ان کا امر ہے یا ان لوگوں کی مدح ہے جو سجدہ کرتے ہیں یا جو اسے ترک کرے اس کی مذمت ہے دونوں قرائتوں میں سے ایک سجدہ کا امر ہے اور دوسری تارک کے لیے مذمت ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں خبر دی کہ وہ سجدہ نہیں کرتے جس طرح سورۂ انشقاق میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سجدہ کیا، جس طرح بخاری اور دوسری کتب میں ثابت ہے۔ اسی طرح سورۂ نمل کا مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ بہتر جانتا ہے۔ زمخشری نے کہا: زجاج نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ تخفیف کی صورت میں سجدہ واجب ہے اور تشدید کی صورت میں واجب نہیں تو اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا۔

الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ خبء السماء سے مراد اس کے قطرات ہیں اور خبء الارض سے مراد اس کے خزانے اور نباتات ہیں۔ قتادہ نے کہا: خبء سے مراد راز ہے۔ نحاس نے کہا: یہ مروی ہے، یعنی جو آسمانوں اور زمین میں غائب ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ دلالت کرتا ہے۔ عکرمہ اور مالک بن دینار نے کہا: الخب باء کے فتحہ کے ساتھ اور ہمزہ کے بغیر ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ تخفیف قیاسی ہے اور جو وقف کی صورت میں ہمزہ کو ترک کر دیتا ہے اس کا ذکر ہے۔ نحاس نے کہا: ابو حاتم نے حکایت بیان کی ہے کہ عکرمہ نے الذی یخرج الخبا پڑھا یعنی ہمزہ کے بغیر الف کے ساتھ اور گمان کیا کہ یہ لغت عرب میں جائز نہیں علت یہ بیان کی کہ اگر ہمزہ میں تخفیف کی جائے تو اس کی حرکت باء کو دی جاتی ہے تو کہا: الخب فی السموات والارض اگر ہمزہ میں تحویل کی جائے تو الخبی باء ساکن اور اس کے بعد یاء ہوگی۔ نحاس نے کہا: پس علی بن سلیمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 256

کو کہتے ہوئے سنا وہ محمد بن یزید سے بیان کرتے ہیں کہ ابو حاتم نحو میں اپنے ساتھیوں سے مرتبہ میں کم تھے وہ ان کے مرتبہ کو لاحق نہیں ہوتے تھے، مگر جب وہ اپنے شہر سے نکلے تو ان سے بڑا عالم نہ پایا گیا۔

سیبویہ نے عربوں سے حکایت بیان کی ہے کہ وہ ہمزہ کو الف سے بدل دیتے ہیں جب اس کا ماقبل ساکن ہو اور وہ خود مفتوح ہو، اسے واؤ سے بدل دیا جاتا ہے۔ جب اس کا ماقبل ساکن ہو اور وہ خود مضموم ہو، اسے یاء سے بدل دیا جاتا ہے جب اس کا ماقبل ساکن ہو اور وہ خود مکسور ہو۔ تو کہتا ہے: هذا الوَثُو، عجبت من الوَثِي، رأيت الوَثَا۔ یہ وَثَبۡتَ یَدَہٗ سے مشتق ہے اس طرح یہ ہے هذا الخَبُو، عجبت من الخَبِي، رأيت الخَبَا۔ یہ اس لیے کیا گیا کیونکہ ہمزہ خفیفہ ہے۔ ہمزہ کو ان حروف سے بدل دیا جاتا ہے۔ سیبویہ نے بنی تمیم اور بنی اسد سے یہ روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں: هذا الخبوُ جب ہمزہ مضموم ہو تو وہ ساکن کو ضمہ دیتے ہیں۔ وہ ہمزہ کو ثابت رکھتے ہیں اور ساکن کو کسرہ دیتے ہیں جب ہمزہ مکسور ہو، جب ہمزہ مفتوح ہو تو ساکن کو فتحہ دیتے ہیں۔ سیبویہ نے یہ حکایت بھی کی ہے وہ کسرہ دیتے ہیں اگرچہ ہمزہ مضموم ہو مگر یہ بنی تمیم سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: الرِّدِی اس نے گمان کیا ہے وہ دال کو ضمہ نہیں دیتے کیونکہ وہ اس ضمہ کو ناپسند کرتے ہیں جس سے قبل کسرہ ہو کیونکہ کلام میں کوئی فُعِل نہیں یہ سب قرائتیں اس لغت پر داخل ہیں جنہیں جماعت نے پڑھا ہے۔ عبداللہ کی قراءت میں الذی یخرج الخبا من السموات ہے من اور فی ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں عرب کہتے ہیں: لا ستخرجن العلم فیکم اس سے وہ منکم مراد لیتے ہیں؛ یہ فراء کا قول ہے۔

**وَيَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ** دونوں میں عام قراءت یاء کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت یہ معنی دیتی ہے کہ کلام ہدہد کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے توحید کی معرفت، اس کی بارگاہ میں سجدہ کے وجوب، وہ سورج کو جو سجدہ کرتے اس کا انکار، اس کی شیطان کی طرف اضافت اور شیطان کا ان کے لیے اس امر کو مزین کرنا ان سب چیزوں کی معرفت کے لیے ہدہد کو خاص کیا۔ جس طرح اس نے دوسرے پرندوں اور حیوانوں کو لطیف معارف کے لیے خاص کیا جہاں تک ترجیح پانے والے عقول رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ جحدری، عیسیٰ بن عمر، حفص اور کسائی نے تخفون اور تعلنون پڑھا ہے یہ تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ ہے۔ یہ قراءت یہ معنی دیتی ہے کہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خطاب ہے۔

**اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ** ابن محیصن نے العظیم پڑھا ہے مرفوع ہے لفظ اَللّٰهُ اسم جلالت کی صفت ہے۔ باقی قراء نے مجرور پڑھا ہے یہ **الۡعَرۡشِ** کی صفت ہے رب کا خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ مخلوقات میں سے عظیم ہے اس کے علاوہ اس کے ضمن میں اور اس کے قبضہ میں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ سَنَنۡظُرُ یہ اس نظر سے مشتق ہے جس کا معنی غور و فکر کرنا ہے۔ اَصَدَقۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ کیا تو اپنی بات میں سچا ہے یا جھوٹا ہے كُنۡتَ یہ انت کے معنی میں ہے کہا: سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ یہ نہیں کہا: سننظر فی امرك کیونکہ جب ہدہد نے علم میں فخر کی تصریح کر دی اَحَطۡتُ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اس قول کے ساتھ تصریح کی سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ كُنۡتَ اس نے جو کہا تھا یہ اس کے لیے کافی ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 15۔** اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ امام پر واجب ہے کہ وہ اپنی رعیت کا عذر قبول کرے اور ان کے باغی عذروں کی وجہ سے ان کے ظاہر احوال میں جو عقوبت واقع ہو رہی تھی اس کو ختم کرے، کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو کوئی سزا نہ دی جب اس نے معذرت پیش کی کیونکہ ہدہد کا صدق عذر بن گیا کیونکہ اس نے اس امر کی خبر دی جو جہاد کا تقاضا کرتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جہاد سے محبت کرتے تھے۔ صحیح میں ہے ''اللہ کی ذات سے بڑھ کر کوئی بھی معذرت سے محبت کرنے والا نہیں اس وجہ سے اس نے کتاب کو نازل کیا اور رسولوں کو بھیجا'' (1)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعمان بن عدی کا عذر قبول کیا اور اسے سزا نہ دی۔ لیکن امام کو حق حاصل ہے کہ وہ خوب چھان بین کرے جب اس کے ساتھ کوئی حکم شرعی بھی متعلق ہو۔ جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کیونکہ جب ہدہد نے آپ کی خدمت میں عرض کی: اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۳﴾ آپ کی طمع نہ بھڑکی اور نہ ملک میں زیادتی کی محبت آپ کو اس طرف لے گئی کہ آپ اس سے تعرض کریں، یہاں تک کہ ہدہد نے کہا: وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جب یہ سنا تو اس وقت غصے میں ہوئے اور جو اس نے خبر دی اس کی تہہ تک پہنچنے کا فیصلہ کیا اور جو امور ابھی تک غیب تھے ان کو حاصل کرنا چاہا۔ فرمایا: سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ اس کی مثل وہ روایت ہے جس کو حضرت مسور بن مخرمہ نے روایت کیا ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے املاص المرأۃ میں مشورہ کیا۔ املاص المرأۃ سے مراد وہ عورت ہے جس کے پیٹ پر ضرب لگائی جاتی ہے تو وہ اپنا نامکمل بچہ پھینک دیتی ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے غلام یا لونڈی کے غرہ (چھوٹا غلام) کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ آدمی لاؤ جو تیرے حق میں گواہی دے۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ان کے حق میں گواہی دی۔ ایک روایت میں ہے: تو یہاں سے نہیں جا سکتا یہاں تک اس سے نکلنے کی کوئی راہ پائے۔ میں نکلا تو میں نے حضرت محمد بن مسلمہ کو پایا میں انہیں لے آیا تو انہوں نے گواہی دی۔ اس کی مثل اجازت طلب کرنے کے حوالے سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 16۔** اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ زجاج نے کہا: اس میں پانچ وجوہ ہیں: فَاَلْقِهِیْ اِلَیْهِمْ لفظ میں یاء ثابت ہے یاء کو حذف کرنے اور کسرہ کو ثابت کرنے کے ساتھ جو یاء کے حذف پر دال ہے۔ فَاَلْقِهُوْ اِلَیْهِمْ ہاء کے ضمہ اور واؤ کو ثابت کرنے کے ساتھ اپنے اصل پر۔ فَاَلْقِهُ اِلَیْهِمْ واؤ کے حذف اور ضمہ کو ثابت کرنے کے ساتھ۔ فالقهْ الیهم پانچویں لغت وہ ہے جسے حمزہ نے ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ۔ نحاس نے کہا: نحویوں کے نزدیک یہ جائز نہیں مگر بعید حیلہ کی صورت میں جائز ہو سکتا ہے وہ وقف کو مقدر کیا جائے۔

میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا: اس علت کی طرف متوجہ نہ ہو، اگر یہ جائز ہوتا، کہ تو وہ وصل کرے اور وقف کی نیت کرے تو اسماء سے اعراب کو حذف کرنا جائز ہوتا۔ اِلَیْهِمْ کہا: ضمیر جمع کی ذکر کی الیھا نہیں کہا کیونکہ کہا: وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ گویا فرمایا: اسے ان کی طرف پھینکو جن کا یہ دین ہے۔ مقصود دین کے امر کا اہتمام ہے اور غیر سے

1۔ صحیح مسلم، باب غیرۃ اللہ تعالیٰ و تحریم الفواحش، کتاب التوبۃ، جلد 2، صفحہ 358

اس کے ساتھ اعراض کرنا ہے، اسی وجہ سے کتاب میں خطاب کی بنیاد جمع کے صیغہ پر رکھی گئی ہے۔ اس آیت کے قصوں میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ہدہد پہنچا اس نے اس ملکہ کے اردگرد دیواروں سے بنا حجاب پایا اس نے اس روشندان کا قصد کیا، بلقیس نے یہ روشن دان اس لیے بنوایا تھا تا کہ سورج کے طلوع ہونے کے وقت روشنی اس سے داخل ہو تا کہ وہ سورج کی عبادت کر سکے۔ وہ اس روشن دان سے داخل ہوا اور خط ملکہ بلقیس پر پھینک دیا وہ اس وقت سوئی ہوئی تھی یہ اس طرح روایت کیا گیا ہے جب وہ بیدار ہوئی تو اس خط کو پایا تو اس خط نے اس کو خوفزدہ کر دیا۔ اس نے گمان کیا کہ کوئی اس کے کمرہ میں داخل ہوا ہے پھر وہ اٹھی تو اس نے وہی حال پایا جس طرح پہلے کا معمول تھا اس نے روشن دان کی طرف دیکھا تا کہ سورج کے معاملہ کا جائزہ لے تو اس نے ہدہد کو دیکھا تو اسے علم ہو گیا۔

وہب اور ابن زید نے کہا: سورج کے مطلع کے سامنے روشن دان تھا جب سورج طلوع ہوتا تو وہ سجدہ کرتی ہدہد نے اپنے پروں کے ساتھ اسے بند کر دیا۔ سورج بلند ہوا اور بلقیس کو اس کا علم نہ ہوا جب سورج کے نظر آنے میں دیر ہو گئی تو وہ دیکھنے لگی ہدہد نے صحیفہ اس کی طرف پھینکا جب اس نے مہر دیکھی تو وہ کانپ اٹھی اور عاجزی کا اظہار کیا کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت، ان کی مہر میں تھی، اس نے خط پڑھا اس نے اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا اور جو کچھ ہونے والا تھا اس کے بارے میں ان سے بات چیت کی۔ مقاتل نے کہا: ہدہد نے خط اپنی چونچ میں اٹھایا وہ اڑا یہاں تک کہ عورت کے سر پر رک گیا اس کے اردگرد اس کے لشکر تھے۔ وہ تھوڑی دیر پھڑ پھڑایا جب کہ لوگ اسے دیکھ رہے تھے عورت نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا تو ہدہد نے خط اس کی گود میں پھینک دیا۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ مشرکوں کو خط بھیجنا، انہیں دعوت پہنچانا اور اسلام کی طرف انہیں دعوت دینا درست ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر اور ہر جابر کی طرف خطوط بھیجے جس طرح آل عمران میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ پھر ایک طرف ہو جانے کا حکم دیا یہ امر حسن ادب کے طور پر تھا تا کہ وہ اس طرح الگ ہو جائے جس طرح بادشاہوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے معنی ہے قریب ہی رہنا تا کہ تو ان کے جواب کو دیکھے، یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: اسے واپس آنے کا حکم دیا، یعنی خط اس پر پھینکنا اور واپس آ جانا (1)۔ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ یہ حکم میں مقدم ہے ثُمَّ تَوَلَّ یہ حکم میں موخر ہے کلام میں اتساق نمایاں ہے، یعنی القہ ثم تول، اس کے درمیان دیکھنا یعنی انتظار کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جان لے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (النباء: 40) جان لو وہ کیا جواب دیتے ہیں اور کیا مشورہ کرتے ہیں؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ وہ آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں؟

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝۲۹ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳۰ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۱

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 257

”(خط پڑھ کر) ملکہ نے کہا: اے سرداران قوم! پہنچایا گیا ہے میری طرف ایک عزت والا خط۔ یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن (اور) رحیم ہے۔ تم مت غرور و تکبر نہ کرو میرے مقابلہ میں اور چلے آؤ میرے پاس فرمانبردار بن کر“۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا** کلام میں حذف ہے مراد ہے فذهب فالقاه إليهم فسمعها وهي تقول یایها الملأ وہ گیا اس نے خط ان پر پھینکا اس نے ملکہ بلقیس کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے قوم کے سردارو! پھر کتاب کی صفت کریم سے لگائی کیونکہ وہ خط ایسی ذات کی جانب سے تھا جو عظیم تھی یہ عظمت ملکہ بلقیس کے نفس میں تھی یا ان سرداروں کے نفوس میں تھی۔ ملکہ بلقیس نے خط کی عظیم سے صفت حضرت سلیمان علیہ السلام کی تکریم کے لیے ذکر کی تھی؛ یہ ابن زید کا قول ہے یا اس نے یہ اشارہ کیا کہ اس پر مہر لگی ہوئی ہے تو خط کی کرامت اس کی مہر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ہر وہ کلام جس کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہ ہو تو وہ دم بریدہ ہوتی ہے“ (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ اس کا آغاز اپنی ذات سے تھا یہ طریقہ جلیل القدر لوگ ہی کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے عبد الملک بن مروان کی طرف خط لکھا جس میں وہ مروان کی بیعت کر رہے تھے۔ من عبد الله لعبد الملك بن مروان امير المومنين، یہ خط عبد اللہ کی جانب سے عبد الملک بن مروان کے لیے ہے جو امیر المومنین ہے میں تیرے لیے سمع و طاعت کا اقرار کرتا ہوں جس قدر میں طاقت رکھوں گا، میرے بیٹوں نے بھی اس بارے میں تیرے لیے اقرار کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے وہم کیا کہ یہ خط آسمان سے آیا ہے کیونکہ خط پہنچانے والا پرندہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کریم کا معنی حسن ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ (الشعراء) یعنی مجلس حسن۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے خط کی یہ صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ اس میں نرم گفتگو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت کی نصیحت تھی اس میں شفقت اور لطف و مہربانی تھی اس میں سب و لعن وغیرہ نہیں تھا۔ نہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جو نفس میں تغیر پیدا کرے نہ وہ درجہ سے گری ہوئی تھی اور نہ ہی اس میں پیچیدگی تھی۔ جس طرح رسولوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے جو اس نے اپنے نبی سے فرمایا: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل: 125) اور اللہ تعالیٰ کے فرمان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ) تمام وجوہ اچھی ہیں اور یہ ان سب سے بہترین ہے یہ روایت بیان کی گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے قبل کسی نے بھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں لکھی۔ عبد اللہ کی قراءت میں ہے وان من سليمان واؤ زائد ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔ كِتٰبٌ** میں **كَرِيْمٌ** کی صفت حد درجہ کا وصف ہے کیا تو اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں دیکھتا انه لقرآن كريم

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب خطبۃ النکاح، حدیث نمبر 1883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اہل زمان کتاب کی صفت، خطیر، اثیر اور مبجل لگاتے ہیں۔ اگر وہ بادشاہ کا خط ہو تو وہ عزیز کہتے ہیں اور غفلت کے طور پر الکریم کو ساقط کر دیا۔ یہ خصلت کے اعتبار سے افضل ہے جہاں تک العزیز کے ساتھ صفت کا معاملہ ہے تو اس کے ساتھ قرآن کی صفت ذکر کی گئی ہے وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ (فصلت: 42) یہ اس کی عزت ہے یہ کسی اور کے لیے نہیں اپنے مکتوبات میں اس سے اجتناب کرو اس کی جگہ العالی کا لفظ رکھو، مقصود ولایت کا حق پورا کرنے کے لیے اور دیانت کا احاطہ کرنے کے لیے ہے، یہ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ متقدمین کا طریقہ تھا جب وہ خط لکھتے تو اپنی ذاتوں سے شروع کرتے۔ من فلان الی فلان۔ اس کے متعلق آثار آئے ہیں۔ ربیع بن انس نے روایت کی ہے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی زیادہ حرمت والا نہیں۔ جب وہ مکتوب لکھتے تو اپنی ذات سے شروع کرتے۔ ابن سیرین نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اہل فارس جب خط لکھتے ہیں تو آغاز اپنے سرداروں سے کرتے ہیں آدمی اپنی ذات سے شروع کرے''۔ ابو اللیث نے اپنی کتاب ''البستان'' میں کہا: اگر اس سے خط کو شروع کیا جس کی طرف خط لکھا جا رہا ہے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ امت کا اسی پر اتفاق ہے انہوں نے یہ طریقہ کسی مصلحت کی وجہ سے اپنایا جو مصلحت انہوں نے اس طریقہ میں دیکھی یا اس سے جو طریقہ تھا وہ منسوخ ہو گیا۔ ہمارے اس زمانے میں اچھا یہ ہے کہ خط مکتوب الیہ سے شروع کیا جائے پھر اپنا ذکر کرے، کیونکہ اپنی ذات سے خط کو شروع کرنا یہ مکتوب الیہ کو حقیر جاننے اور اپنے آپ کو بڑا جاننے پر دال ہے مگر یہ لکھا جائے الی عبد من عبیدہ او غلام من غلمانہ۔ غلاموں میں سے ایک غلام کی طرف۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب انسان پر کوئی خط وارد ہو جس میں سلام وغیرہ ہو تو اس کو جواب دینا چاہیے کیونکہ مکتوب غائب سے اس طرح ہے جس طرح حاضر سے سلام ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس طرح سلام کا جواب دینا واجب ہوتا ہے اسی طرح مکتوب کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ مکتوبات اور رسائل کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے پر علماء کا اتفاق ہے اسی طرح ان کے اختتام پر بھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے پر اتفاق ہے کیونکہ یہ شک سے بعید ہے یہی طریقہ ہے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اسی طرح اثر واقع ہوا ہے۔ جس مکتوب پر مہر نہ ہو وہ اغلف (جس کو نہ سمجھا جائے) ہے۔ حدیث میں ہے کرم الکتب ختمہ مکتوب کی کرامت اس پر مہر ہے۔ ایک ادیب نے کہا جو ابن مقفع ہے: جس نے اپنے بھائی کو خط لکھا اور اس پر مہر نہ لگائی تو اس نے اس کی حقارت بیان کی، کیونکہ مہر لگانا ہی اس کا افتتاح ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ عجمیوں کو خط لکھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یہ وہی خط قبول کرتے ہیں جس پر مہر ہو، آپ نے مہر بنوائی اور اس کے نگینہ پر یہ نقش لکھوایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ گویا میں اس کی چمک اور سفیدی آپ کی ہتھیلی میں دیکھتا ہوں (1)۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب نقش الخاتم، جلد 2، صفحہ 872

**مسئلہ نمبر 6۔** اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ دونوں جگہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور دونوں سے کلام شروع ہو رہا ہے۔ فراء نے دونوں میں ان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ محل رفع میں ہے یہ الکتاب سے بدل ہے اُلقی الیّ انہ من سلیمان یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہو یعنی لانہ من سلیمان ولانہ گویا اس کی کرامت کی علت یہ بیان کی کہ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے اشہب عقیلی اور محمد بن سمیقع نے پڑھا: الا تغلوا غین معجم کے ساتھ، وہب بن منبہ سے مروی ہے یہ غلا یغلو سے مشتق ہے جب وہ حد سے تجاوز کرے اور تکبر کرے۔ یہ جماعت کی قراءت کے معنی کی طرف راجع ہے۔

وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ اطاعت کرنے والے اور ایمان والے بن کر ہمارے پاس آؤ۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝۳۲ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝۳۳ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝۳۴

''ملکہ نے کہا: اے سرداران قوم! مجھے مشورہ دو میرے اس معاملہ میں، میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو۔ وہ کہنے لگے: ہم بڑے طاقت ور اور سخت جنگجو ہیں اور فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے آپ غور کرلیں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں؟ ملکہ نے کہا: اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اسے برباد کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل اور یہی ان کا دستور ہے (اس لیے جنگ کرنا قرین دانشمندی نہیں)''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ، ملأ سے مراد قوم کے اشراف ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کے ساتھ ہزار سردار تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بارہ ہزار سردار تھے، ہر سردار کے ساتھ لاکھ سپاہی تھے۔ قیل سے مراد بڑے بادشاہ کے نیچے چھوٹے بادشاہ تھے اس نے اپنی قوم کے ساتھ حسن ادب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اس معاملہ میں ان سے مشورہ کیا اور انہیں یہ بتایا: یہ اس کا عام معمول ہے اس معاملہ میں جو اسے لاحق ہوتا ہے، اس کا ذکر اس قول میں ہے: مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ تو اس بڑی مصیبت میں کیسے تم سے مشورہ نہ کروں؟ سرداروں نے اسے وہ جواب دیا جس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ انہوں نے اسے اپنی قوت اور طاقت کا بتایا پھر معاملہ کو اس کی رائے کے سپرد کر دیا۔ یہ سب کی جانب سے اچھا مشورہ تھا۔ قتادہ نے کہا: ہمارے سامنے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ اس کے تین سو تیرہ آدمی تھے جو اہل مشورہ تھے ان میں سے ہر ایک دس ہزار افراد پر مشتمل لشکر کا سردار تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں مشورہ کی صحت پر دلیل ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: 159) یا تو آراء سے مدد لی یا اولیاء کی خاطر مدارت تھی اللہ تعالیٰ نے فضلاء کی اس قول کے ساتھ مدح کی وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ: 38) مشاورت یہ قدیمی امر ہے اور جنگی معاملات میں اس کا خاص مقام ہے یہ بلقیس دور جاہلیت کی عورت تھی سورج کی عبادت کیا کرتی تھی۔ قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّىٰ تَشْهَدُونِ تاکہ دشمنوں کے ساتھ برسرپیکار ہونے کے لیے ان کے عزم سے آگاہی حاصل کرے، اور جو ان کے معاملہ کو درست کرے اس میں احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھے اور اپنی اطاعت پر ان کے فیصلہ سے آگاہی حاصل کرے اور یہ جانے کہ اگر وہ اپنی جانیں، اپنے اموال اور اپنے خون اس کے دفاع کے لیے خرچ نہ کریں تو ان میں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ ہوگی۔ اگر ان کا امر، احتیاط اور کدوکاوش کو مجتمع نہ ہو تو یہ ان کی اپنے دشمن کی مدد ہوگی اگر وہ خود امتحان نہ لے جو کچھ ان کے پاس ہے اور ان کے عزم کی قدر کو نہ پہچانے تو وہ بصیرت پر نہ ہوگی۔ بعض اوقات اس کا اپنی رائے سے استبداد اختیار کرنا اس کی طاعت میں کمزوری کو ثابت کرتا اور ان کا امور کی تقدیر میں دخل اندازی بنتی اس نے ان سے جو مشورہ لیا اور ان کی رائے لی تو یہ اس امر میں مددگار ثابت ہوا جس امر کا وہ ارادہ رکھتی تھی وہ ان کی شوکت کی قوت اور ان کی مدافعت کی شدت کا ملاحظہ کرنا تھا کیا آپ ان کے اس قول کو نہیں دیکھتے جو انہوں نے جواب دیا: نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ وَأُولُو بَأْسٍ شَدِيدٍ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے ایک کی قوت یہ تھی کہ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا جب وہ خوب تیز دوڑنے لگتا تو وہ اپنی رانوں کو ملاتا تو وہ اپنی طاقت سے گھوڑے کو دوڑنے سے روک لیتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانْظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ انہوں نے اپنی قوت، طاقت اور شدت کا اظہار کیا، پھر معاملہ کو اس کی رائے کے سپرد کر دیا۔ جب وہ یہ کر چکے تو اس موقع پر اس نے بتایا کہ بادشاہ جب غلبہ پاتے ہیں تو وہ بستیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اس کلام میں اسے اپنی قوم کے بارے میں خوف اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو عظیم جاننے کا تذکرہ ہے۔

وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بلقیس کے قول میں سے ہے جس معنی کا اس نے ارادہ کیا اس کی تائید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں حضرت محمد ﷺ اور آپ کی امت کو آگاہ کرنا ہے (1)۔ وہب نے کہا: جب اس نے ان پر خط پڑھا وہ اللہ تعالیٰ کے نام کو نہ پہچان سکی۔ اس نے کہا: یہ کیا ہے؟ کسی فرد نے بتایا: ہمارا گمان نہیں مگر یہ جنوں میں بڑا جن ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہ ہر اس امر پر قادر ہو جاتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ سرداروں نے اسے خاموش کرا دیا، ایک اور نے کہا: میں انہیں تین عفریتوں میں سے دیکھتا ہوں۔ سرداروں نے اسے بھی خاموش کرا دیا۔ ایک نوجوان نے کہا جس کو علم تھا: اے بادشاہوں کی ملکہ! حضرت سلیمان ایک بادشاہ ہے آسمان کے بادشاہ نے اسے عظیم ملک عطا کیا ہے وہ کوئی کلام نہیں کرتا مگر اس کے شروع میں اپنے الٰہ کا نام لیتا ہے، اللہ یہ آسمان کے بادشاہ کا نام ہے رحمن اور رحیم اس کی صفات ہیں اس موقع پر اس نے کہا: أَفْتُونِي فِي أَمْرِي انہوں نے جواب دیا: نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ ہم قتال میں بڑے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 258

قوی ہیں۔ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ جنگ اور مقابلہ کے وقت بڑی قوت والے ہیں۔ وَّ الْاَمْرُ اِلَیْكِ معاملہ تیرے سپرد ہے۔ انہوں نے اس معاملہ کو اس کی طرف سپرد کر دیا کیونکہ انہیں تجربہ تھا کہ اس کی رائے میں برکت ہے۔ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ تو اس موقع پر اس نے کہا: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً وہ شرفاء کو ذلیل کر دیتے ہیں تاکہ ان کے لیے امور درست ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے قول کی تصدیق کی: وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ۔ ابن انباری نے کہا: وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً پر وقف تام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی تحقیق کے طور پر کہا: وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ اس کی مثل سورۂ اعراف میں ہے: قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۹﴾ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ (الاعراف: 109) فرعون نے کہا: فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ (الاعراف) ابن شجرہ نے کہا: یہ بلقیس کے قول میں سے ہے، وقف وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ پر ہے یعنی جب حضرت سلیمان ہمارے شہروں میں داخل ہوں گے تو اس طرح کریں گے۔

وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف ایک تحفہ پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ یہ اس کا حسن نظر اور حسن تدبیر تھا۔ میں تحفہ بھیج کر اس آدمی کا امتحان لیتی ہوں میں اسے عمدہ اموال عطا کرتی ہوں اور امور مملکت میں نادر و نایاب چیزیں اس پر پیش کرتی ہوں اگر وہ دنیاوی بادشاہ ہوا تو مال اسے خوش کر دے گا اور ہم اس کے ساتھ اسی مناسبت سے معاملہ کر لیں گے اگر وہ نبی ہوا تو مال اسے خوش نہیں کرے گا اور وہ ہمارے اوپر دینی امور کو لازم کرے گا تو ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ ہم اس پر ایمان لے آئیں اور اس کے دین پر اس کی اتباع کریں۔ اس نے حضرت سلیمان کی طرف عظیم تحفہ بھیجا لوگوں نے اس کی تفصیل میں بہت زیادہ گفتگو کی ہے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اس نے سونے کی ایک اینٹ بھیجی تو قاصدوں نے سونے کی دیواریں دیکھیں تو جو تحفہ وہ لائے تھے اس کو انہوں نے حقیر جانا۔ مجاہد نے کہا: ملکہ بلقیس نے اس کی طرف دو سو غلام اور دو سو لونڈیاں بھیجیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس نے بارہ خادمائیں بھیجیں جن کو اس نے غلاموں کا لباس پہنایا اور بارہ غلام بھیجے ان کو اس نے عورتوں کا لباس پہنایا۔ خادموں کے ہاتھوں پر کستوری اور عنبر کے طبق تھے بارہ شریف خاندان کی دوشیزائیں تھیں جو سونے کی اینٹیں اٹھائے ہوئے تھیں دو گھونگے تھے ان میں سے ایک میں چھید تھا اور دوسرے میں چھید نہیں تھا اور چھید ٹیڑھا تھا۔ ایک پیالہ تھا جس میں کوئی چیز نہ تھی ایک عصا تھا حمیر کے بادشاہ جس کے وارث چلے آ رہے تھے۔ اس نے یہ ہدیہ اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ بھیجا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قاصد ایک تھا اس کی صحبت میں پیروکار اور خدام تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس نے اپنی قوم کے اشراف میں سے ایک آدمی بھیجا جس کو منذر بن عمرو کہا جاتا۔ اس کے ساتھ اس نے صاحب الرائے اور دانشمند آدمی کر دیے۔ ہدیہ سو غلام اور سو لونڈیاں تھیں۔ لباس ان کے مختلف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 259، معنا

تھے اس نے غلمان سے کہا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام تم سے گفتگو کریں تو ان کے ساتھ ایسی گفتگو کرو جس میں تانیث ہو اور وہ کلام عورتوں کے کلام کے مشابہ ہو۔ اس نے لونڈیوں سے کہا: ان سے کلام کرو جس میں سختی ہو اور وہ کلام مردوں کے کلام کے مشابہ ہو۔ یہ کہا جاتا ہے: ہدہد آیا اور اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو سب کچھ بتا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خبر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ آپ کی جگہ نو فراسخ تک سونے اور چاندی کی اینٹیں لگا دیں، پھر فرمایا: خشکی اور تری میں کون سا جانور تم سب سے خوبصورت دیکھتے ہو؟ ساتھیوں نے بتایا: اے اللہ کے نبی! ہم نے سمندر میں فلاں فلاں جانور دیکھے جس پر نقطے ہیں اس کے رنگ مختلف ہیں، اس کے پر ہیں، اس کی گردن پر بال ہیں اور پیشانی پر بال ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا تو جانور آ گئے انہیں میدان کے دائیں اور بائیں اور سونے چاندی کی اینٹوں پر باندھ دیا گیا اور ان کے لیے چارہ ڈال دیا پھر آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ اپنی اولادوں کو لے آؤ تو آپ نے انہیں میدان کی دائیں اور بائیں جانب کھڑا کر دیا جو انتہائی خوبصورت جوان تھے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی مجلس میں اپنی کرسی پر بیٹھے آپ کے لیے سونے کی چار ہزار کرسیاں آپ کی دائیں جانب اور اتنی مقدار میں بائیں جانب رکھ دیں۔ ان پر انبیاء اور اولیاء کو بٹھایا۔ شیاطین، جنوں اور انسانوں کو حکم دیا کہ کئی فرسخوں تک کھڑے ہو جائیں، درندوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کو حکم دیا تو انہوں نے کئی فراسخ تک آپ کے دائیں بائیں صفیں بنالیں جب قوم میدان کے قریب ہو گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک کو دیکھا اور جانور دیکھے جس سے حسین ان کی آنکھوں نے نہ دیکھے تھے جو سونے اور چاندی کی اینٹوں پر پیشاب کر رہے تھے تو انہیں اپنے آپ چھوٹے لگے اور ان کے پاس جو ہدایا تھے انہیں پھینک دیا۔

بعض روایات میں ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ حکم دیا کہ میدان کے فرش کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنا دیا جائے تو آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ راستہ میں قالین کے برابر زمین کا حصہ چھوڑ دیا جائے اس پر فرش نہ لگایا جائے جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو انہیں خوف ہوا کہ ان پر تہمت لگائی جائے گی تو ان کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے وہاں پھینک دیا جب انہوں نے شیاطین کو دیکھا تو انہوں نے خوفناک منظر دیکھا تو وہ اس سے گھبرا گئے اور خوفزدہ ہو گئے۔ شیاطین نے انہیں کہا: تم گزر جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں وہ جنوں، انسانوں، چوپائیوں، پرندوں، درندوں اور وحشیوں کی جماعتوں کے پاس سے گزرتے رہے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خندہ پیشانی سے خوبصورت انداز میں دیکھا ملکہ بلقیس نے اپنے قاصد سے کہا تھا: اگر وہ تجھے غضب کی نظر سے دیکھے تو جان لینا کہ وہ بادشاہ ہے اس کا منظر تجھے خوفزدہ نہ کرے بے شک میں اس سے زیادہ غلبہ رکھتی ہوں اگر تو اسے ایسا آدمی دیکھے جو ہشاش بشاش اور شفقت کرنے والا ہے تو جان لینا وہ نبی مرسل ہے اس کی بات کو خوب سمجھنا اور جواب دینا۔ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ ملکہ بلقیس نے سونے کے ایک چھوٹے برتن کا ارادہ کیا جس میں ایک ایسا موتی تھا جس میں سوراخ نہیں کیا گیا تھا اور ایک ایسا گونگا تھا جس میں چھید ٹیڑھا کیا گیا تھا۔ اس نے قاصد کے ہاتھ ایک خط لکھ کر بھی بھیجا تھا اس میں اس نے کہا تھا: اگر تو نبی ہے تو خدام اور خادماؤں میں فرق کرو اور چھوٹے برتن میں جو کچھ ہے اس کے بارے میں خبر دو اور نچلی جانب

سے عصا کا سرا مجھے بتاؤ۔ موتی میں سیدھا چھید کرو اور گونگے میں دھاگا داخل کرو اور پیالے کو ایسے پانی سے بھر دو جو نہ زمین سے تعلق رکھتا ہو اور نہ ہی آسمان سے۔ جب قاصد پہنچا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے کھڑا ہوا تو آپ کو ملکہ کا خط پہنچایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے دیکھا پوچھا: وہ برتن کہاں ہے؟ اسے لایا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے حرکت دی تو اس میں جو کچھ تھا حضرت جبریل امین نے اس کے بارے میں خبر دے دی۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں خبر دے دی۔ قاصد نے عرض کی: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ موتی میں سوراخ کیجئے اور گھونگے میں دھاگہ ڈالیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں اور انسانوں سے فرمایا کہ اس میں سوراخ کیجئے تو وہ عاجز آ گئے آپ نے شیاطین سے فرمایا: تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ انہوں نے عرض کی: آپ دیمک کو پیغام بھیجیں، دیمک آ گئی اس نے اپنے منہ میں ایک بال لیا یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے فرمایا: تیری کوئی حاجت؟ اس نے عرض کی: میرا رزق درخت میں رکھ دیجئے۔ فرمایا: تیرے لیے وہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: کون اس گھونگے میں دھاگا ڈالے گا؟ سفید کیڑے نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ کیڑے نے دھاگا اپنے منہ میں لیا سوراخ میں داخل ہوا یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: تیری کوئی حاجت؟ عرض کی: میرا رزق پھلوں میں رکھ دیجئے۔ فرمایا: وہ تیرے لیے ہے۔ پھر آپ نے خدام اور لونڈیوں میں فرق کیا۔ سدی نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں وضو کا حکم دیا مرد ہاتھ اور پاؤں پر پانی بہانے لگے اور لونڈیاں بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ پر پانی بہانے لگیں اور دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی بہانے لگیں، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس طرح ان کو الگ الگ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لونڈی برتن سے ایک ہاتھ سے پانی لیتی پھر اسے دوسرے میں رکھتی پھر منہ پر ڈالتی جب کہ غلام برتن سے پانی لیتا اور اپنے چہرے پر ڈالتا لونڈی اپنی کلائی کے بطن پر پانی بہاتی اور غلام کلائی کی پشت پر پانی بہاتا۔ لونڈی پانی انڈیلتی اور غلام اپنے ہاتھوں پر پانی تیزی سے بہاتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس طرح ان کے درمیان تمیز کی۔

یعلی بن مسلم نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ ملکہ بلقیس نے دو سو غلام اور لونڈیاں بھیجیں اس نے کہا: اگر نبی ہوئے تو مؤنث سے مذکر کو پہچان لیں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ وضو کرو تو انہوں نے وضو کیا ان میں سے جس نے وضو کیا اور اپنی ہتھیلی سے پہلے اپنی کہنی سے دھونے کا عمل شروع کیا۔ فرمایا: یہ مونث ہے اور جس نے کہنی سے پہلے ہتھیلی سے دھونے کا عمل شروع کیا تو وہ مذکر ہے۔ پھر آپ نے عصا کو ہوا کی طرف اچھالا فرمایا: جو سرا پہلے زمین کی طرف آئے گا وہ اس کی اصل ہوگا۔ آپ نے گھوڑے کے بارے میں حکم دیا کہ اسے دوڑایا جائے یہاں تک کہ اسے پسینہ آ جائے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے پسینہ سے اس پیالہ کو بھر دیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے تحفہ واپس کر دیا۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے: جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدیہ واپس کر دیا اور اس کے قاصدوں نے ان چیزوں کے بارے میں بتایا جن کا مشاہدہ انہوں نے کیا تھا تو ملکہ بلقیس نے اپنی قوم سے کہا: یہ آسمان کا معاملہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** نبی کریم ﷺ ہدیہ قبول کیا کرتے تھے اس پر ثابت رہتے اور صدقہ قبول نہ فرماتے۔ حضرت

سلیمان علیہ السلام اور باقی انبیاء کا بھی یہی معمول تھا۔ ملکہ بلقیس نے ہدیہ کے قبول کرنے اور اس کے رد کرنے کو اپنے ہاں ایک علامت بنایا تھا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہیں یا نبی ہیں کیونکہ آپ نے اپنے خط میں لکھا تھا **اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَ اْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ** اس میں فدیہ قبول نہیں ہوتا اور نہ ہی ہدیہ لیا جاتا ہے یہ اس باب سے متعلق نہیں جس میں یہ ثابت ہو کہ اس میں ہدیہ کو کس طریقہ سے قبول کیا جاتا ہے؟ یہ تو رشوت ہے اور حق کی باطل کے بدلہ میں بیع ہے، یہ ایسی رشوت ہے جو حلال نہیں جہاں تک مطلق ہدیہ کا تعلق ہے جو باہم محبت اور صلہ رحمی کے لیے دیا جاتا ہے یہ بہر کیف جائز ہے جب کہ مشرک کی جانب سے نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اگر مشرک کی جانب سے ہو تو حدیث طیبہ میں ہے ''مجھے مشرکوں کے ہدایا اور عطیات سے روک دیا گیا ہے'' (1)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا جس طرح مالک کی حدیث میں ہے جو ثور بن زید دیلی وغیرہ سے مروی ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے دونوں میں نسخ کا قول کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس میں کوئی ناسخ و منسوخ نہیں۔ اس میں معنی یہ ہے آپ اس کافر کا ہدیہ قبول نہ کرتے جس پر غلبہ کا ارادہ رکھتے ہوں، اس کے ملک کو لینا چاہتے ہوں اور اس کے اسلام میں داخل ہونے کی خواہش کرتے ہوں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہی حالت تھی۔ اس جیسی صورتحال میں آپ کو نہی کی گئی کہ اس کا ہدیہ قبول کیا جائے تاکہ اسے محمول کیا جائے کہ آپ اس سے رک جائیں۔ اس بارے میں علماء کی تاویلات میں سے سب سے اچھی تاویل ہے کیونکہ اس تاویل میں احادیث کی تطبیق ہو جاتی ہے اس کے علاوہ بھی علماء نے تاویل کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہدیہ مستحب ہے یہ محبت کو پیدا کرتا ہے اور دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ امام مالک نے عطا خراسانی سے روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''باہم مصافحہ کیا کرو یہ کینے کو ختم کر دیتا ہے، باہم ہدیہ دیا کرو تمہارے درمیان محبت پیدا ہو جائے گی اور یہ چیز بخل کو ختم کر دے گی (2)''۔ معاویہ بن حکم نے روایت نقل کی ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''باہم ہدیہ دیا کرو کیونکہ یہ محبت میں اضافہ کرتا ہے اور سینے کے کینوں کو دور کرتا ہے'' (3)۔ دار قطنی نے کہا: ابن بکیر اپنے باپ سے وہ مالک سے روایت نقل کرتے ہیں وہ کوئی پسندیدہ شخصیت نہیں تھے نہ یہ روایت امام مالک سے ثابت ہے اور نہ زہری سے ثابت ہے۔ ابن شہاب سے مروی ہے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''باہم ہدیہ دیا کرو ہدیہ کینہ کو ختم کر دیتا ہے''۔ ابن وہب نے کہا: میں نے یونس سے سخیمہ کے بارے میں پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: کینہ۔ اس حدیث کو وقاص عثمان، زہری سے متصل نقل کرتے ہیں جب کہ وہ ضعیف ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ کو قبول فرمایا کرتے تھے اس میں اسوۂ حسنہ موجود ہے اتباع سنت کے ساتھ ساتھ ہدیہ نفس کی

---

1۔ جامع ترمذی، بابُ السیر، باب ماجاء فی قبول ھدایا المشرکین، جلد 1، صفحہ 191

2۔ موطا امام مالک، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی الغضب، صفحہ 706

3۔ جامع ترمذی، باب الولاء والھبۃ، باب ماجاء فی حث النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الھدایۃ، جلد 2، صفحہ 35، (روایت بالمعنیٰ)

آلائشوں کو زائل کرتا ہے ہدیہ دینے والے اور جس کو ہدیہ دیا جائے ان میں باہمی ملاقات اور صحبت کی چاشنی پیدا کرتی ہے جس نے کہا کتنا اچھا کہا:

هدايا الناس بعضهم لبعض تُولّد فی قلوبهمُ الوِصَالَا

وتزرعُ فی الضمير هَوىً ووُدًّا و تُکسِبهُم إذا حضروا جَمالًا

لوگوں کے ایک دوسرے کو ہدایا ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کرتے ہیں۔ وہ ضمیر میں محبت کا بیج بوتے ہیں اور جب وہ حاضر ہوتے ہیں تو انہیں جمال عطا کرتے ہیں۔

إنّ الهدايا لها حظّ إذا وَرَدتْ أحظى من الا بن عند الوالد الحدِبِ

ہدایا جب بیٹے کی جانب سے واقع ہوں تو شفیق باپ کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''تمہارے جلیس ہدیہ میں تمہارے ساتھ شریک ہیں''(1) اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ظاہر معنی پر محمول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کرم اور مروت کی بنا پر ان کے ساتھ شریک ہیں اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ امام ابو یوسف نے کہا: یہ پھلوں وغیرہ میں ہے۔ بعض نے کہا: وہ ہدیہ کی بجائے سرور میں شریک ہیں۔ خبر اصحاب صفہ، گلی والے اور فقراء کے لیے وقف کیے گئے مکانات پر محمول ہے۔ اگر وہ فقہاء میں سے فقیہ ہو تو اس میں اصحاب کی کوئی شرکت نہ ہوگی۔ اگر وہ ان لوگوں کو شریک کرے تو اس کی سخاوت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ یہاں ناظرہ، منتظرہ کے معنی میں ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے وہ اپنے اسلام اور اپنے شرک میں سمجھ دار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہدیہ لوگوں کے ہاں بڑی شان رکھتا ہے۔ بِمَ میں الف ساقط ہوگیا ہے تاکہ ما استفہامیہ اور ما خبریہ میں فرق کیا جائے۔ بعض اوقات اس کا ثابت کرنا بھی جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

علی ما قام يشتمنی لئيمٌ کخنزيرٍ تمرّغ فی رمادِ

کمینہ آدمی مجھے ملامت کرنے لگا جس طرح خنزیر راکھ میں لیٹتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ؗ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الهبة و فضلها التحريض عليها، باب من الهدی له هدية، جلد 2، صفحہ 355، (روایت بالمعنی)

فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝

''سو جب قاصد آپ کے پاس (ہدیہ لے کر) آیا تو آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو (سنو!) جو عطا فرمایا ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بہتر ہے اس سے جو تمہیں دیا ہے بلکہ تم اپنے ہدیہ پر پھولے نہیں سما رہے (گویا کوئی بڑی نادر چیز لائے ہو) تو واپس چلا جا ان کے پاس اور ہم آ رہے ہیں ان کی طرف ایسے لشکر لے کر جس کے مقابلہ کی ان میں تاب نہیں اور ہم یقیناً نکال دیں گے انہیں اس شہر سے ذلیل کر کے اور وہ خوار اور رسوا ہو چکے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا: اے (میرے) درباریو! کون تم سے لے آئے گا میرے پاس اس تخت کو اس سے پہلے کہ وہ آ جائیں میری خدمت میں (فرمانبردار بن کر) عرض کی ایک عفریت نے جنات میں سے (حکم ہو تو) میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اس سے پیش ازیں کہ آپ کھڑے ہوں اپنی جگہ سے اور بے شک میں اس کو اٹھالانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں۔ عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھ جھپکے پھر جب آپ نے اسے دیکھا کہ وہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو فرمانے لگے: یہ میرے رب کا فضل (وکرم) ہے تاکہ وہ آزمائے مجھے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی ہے (اور) کریم بھی''۔

**فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ** قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ہدیہ لایا فرمایا: **اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ** حمزہ، یعقوب اور اعمش نے ایک نون مشددہ اور اس کے بعد یاء ثابتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں پڑھے ہیں؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ قول ہے، کیونکہ تمام مصاحف میں دونون ہیں۔ اسحاق نے نافع سے یہ قراءت نقل کی ہے اَتُمِدُّوْنِ یعنی ایک نون ہے مخففہ ہے بعد میں یاء ہے جو لفظوں میں ہے۔ ابن انباری نے کہا: اس قراءت میں واجب ہے کہ وقف کے وقت یاء کو ثابت رکھا جائے تاکہ مصحف کے ہجوں کے ساتھ موافقت ہو جائے۔ اصل نون مشددہ ہے اس جگہ تشدید میں تخفیف کی گئی ہے جس طرح أشهد أنت عالم میں تخفیف کی گئی ہے اصل انك عالم ہے۔ اسی معنی پر اس نے بنا کی جس نے پڑھا: يشاقون فيهم۔ اتحاجون في الله۔ عربوں نے کہا: الرحال يضربون ويقصدون اصل میں يضربونني ويقصدونني ہے کیونکہ یہ يضربونني اور يقصدنونني کا ادغام ہے۔ شاعر نے کہا:

تَرْهَبِينِ والجِيدُ مِنكِ لِلَيْلَى والحَشَا والبُغَامُ والعَيْنَانِ

اصل میں ترهبيني ہے اس میں تخفیف کی گئی۔ اَتُمِدُّوْنَنِي کا معنی ہے کیا تم میرے مال میں اضافہ کرتے ہو جب کہ تم میرے اموال کا مشاہدہ کر رہے ہو۔

**فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ** اللہ تعالیٰ نے اسلام، ملک اور نبوت کی صورت میں جو کچھ عطا کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو

اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا ہے میں مال کے ساتھ خوش نہیں ہوتا۔ اٰتانی اللہ یاء مفتوحہ ہے۔ جب انہوں نے وقف کیا تو انہوں نے یاء کو حذف کیا۔ جہاں تک یعقوب کا تعلق ہے تو وہ وقف میں ثابت کرتے ہیں اور اجتماع ساکنین کی وجہ سے وصل میں گرا دیتے ہیں۔ باقی قراء دونوں حالوں میں یاء کے بغیر پڑھتے ہیں۔

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ کیونکہ تم فخر کرنے والے اور دنیا میں کثرت مال کا تقاضا کرنے والے ہو۔

اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ حضرت سلیمان نے منذر بن عمرو سے کہا جو وفد کا امیر تھا: ہدیہ کو ان کی طرف واپس لے جاؤ۔ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا لام قسمیہ ہے اور نون ثقیلہ اس کو لازم ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے ابو الحسن بن کیسان کو کہتے ہوئے سنا: یہ لام تاکید ہے اسی طرح اس کے نزدیک لام تین طرح ہیں کوئی اور لام نہیں (۱) لام تاکید (۲) لام امر (۳) لام جار۔ یہ ذہین نحویوں کا قول ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو اس اصل کی طرف پھیرتے ہیں یہ کسی انسان کے لیے اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب اسے عربی زبان میں تجربہ و مہارت ہو۔ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا کا معنی ہے انہیں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ ہا ضمیر سے مراد ان کی زمینیں ہیں۔ اَذِلَّةً وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہا ضمیر سے مراد قریۂ سبا ہے اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا میں گزر چکا ہے اَذِلَّةً کا معنی ہے ان کا ملک اور عزت سلب کر لی جاتی ہے۔ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ جب کہ وہ ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔ یہ صغر سے مشتق ہے جس کا معنی ذلت ہے یعنی اگر وہ اسلام لائیں۔ قاصد واپس ملکہ بلقیس کے پاس گیا اور اسے خبر دی۔ اس نے کہا: میں پہچان گئی ہوں کہ وہ بادشاہ نہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں سے کسی نبی کے ساتھ جنگ کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ اس نے اپنے عرش کے بارے میں حکم دیا تو اسے ایسے سات کمروں میں مقفل کر دیا گیا جو ایک دوسرے کے اندر تھے جس کے ارد گرد سات محلات تھے۔ تمام دروازے بند کر دیئے گئے ان پر پہرے لگا دیئے گئے اور خود بارہ ہزار چھوٹے بادشاہوں کے ساتھ جو یمن کے بادشاہ تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جانے کے لیے سفر شروع کیا ہر بادشاہ کی قیادت میں ایک لاکھ سپاہی تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام بڑے ہیبت والے بادشاہ تھے آپ پہل نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ان سے اس کا سوال کیا جاتا۔ ایک دن آپ نے اپنے قریب غبار دیکھا پوچھا: یہ کیا ہے؟ ساتھیوں نے بتایا: یہ ملکہ بلقیس ہے اے اللہ کے نبی! تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لشکریوں سے فرمایا وہب اور دوسرے علماء نے کہا: آپ نے جنوں سے فرمایا۔

اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ عبداللہ بن شداد نے کہا: ملکہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام سے ایک فرسخ دور تھی جب آپ نے یہ حکم دیا تھا وہ اپنا عرش سبا چھوڑ آئی تھی اور اس پر نگہبان بٹھائے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ملکہ بلقیس نے تحفہ بھیجا تھا تو اس نے اپنے قاصد اپنے لشکروں کی صورت میں بھیجے تھے تا کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو تیاری سے پہلے ہی دھوکہ سے انہیں قتل کر دیا جائے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم ہوا تو اس وقت آپ نے یہ حکم دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرش لانے کا حکم اس

سے قبل دیا تھا جب آپ نے اسے خط لکھا تھا کہ وہ اس کی بارگاہ میں داخل ہوا ابھی خط نہیں بھیجا تھا کہ وہ عرش آ گیا۔ ابن عطیہ نے کہا: آیات کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ گفتگو ہدہد کے آنے اور اس کو لوٹانے اور ہدہد کو خط دے کر بھیجنے کے بعد کی تھی؛ جمہور مفسرین کی یہی رائے ہے۔ عرش منگوانے کے فائدے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے اس کی عظمت اور عمدگی کا ذکر کیا گیا تو آپ نے ارادہ کیا کہ قبل اس کے کہ اسلام اس کے تخت اور قوم کی حفاظت کرے اور ان کے اموال کی حفاظت کرے وہ اس تخت کو لے لیں۔ اسلام کا یہی طریقہ ہے، یہ ابن جریج کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: آپ نے تخت اس لیے منگوایا تھا تا کہ ملکہ بلقیس کو اپنی وہ طاقت دکھائیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو دی گئی نیز اسے نبوت پر دلیل بنائیں کہ وہ لشکر اور جنگ کے بغیر بھی ان کے گھروں کو اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔ اس تاویل کی بنا پر مُسْلِمِيْنَ، مستسلمین کے معنی پر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی عقل کا امتحان لینا چاہا۔ اسی وجہ سے فرمایا: نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ جنوں کو خوف ہوا کہ کہیں حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے شادی ہی نہ کر لیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس کے بطن سے بچہ پیدا نہ ہو جائے تو وہ ہمیشہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل کے خادم اور تابع ہی رہیں گے۔ جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا: ملکہ بلقیس کی عقل میں خلل ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت کی وساطت سے اس کا امتحان لینا چاہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی صداقت کا امتحان لینا چاہا۔ جو اس نے کہا تھا: وَ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝ یہ طبری کا قول ہے۔ قتادہ سے مروی ہے: ہدہد نے جو وصف بیان کیا اس کو دیکھنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے پسند کیا۔ پہلے قول کو اکثر علماء نے تسلیم کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ کیونکہ وہ اگر مسلمان ہو جاتی تو اس کا مال اس پر محفوظ ہو جاتا تو اس کی اجازت کے بغیر اس کو نہ لیا جا سکتا۔ روایت بیان کی گئی ہے: وہ سونے اور چاندی کا بنا ہوا تھا سرخ یاقوت اور جواہرات سے آراستہ تھا وہ سات کمروں کے اندر تھا اس پر سات تالے لگے ہوئے تھے۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ جمہور کی قراءت یہی ہے۔ ابو رجاء اور عیسیٰ ثقفی نے اسے عفریۃ پڑھا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ عفریہ نفریہ کو ناپسند کرتا ہے" (1)۔ نفریہ کا لفظ عفریۃ کی اتباع میں آتا ہے۔ قتادہ نے کہا: بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: شدید کو عفریہ کہتے ہیں جب اس کے ساتھ خبث ہو۔ دھاء عِفر و عِفرِیۃ و عِفرِیت و عُفاریۃ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عفریت کا معنی رئیس ہے۔ ایک فرقہ نے قراءت کی قال عِفْرٌ عین کے نیچے کسرہ ہے؛ ابن عطیہ نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔ نحاس نے کہا: جس نے عفریۃ کہا اس کی جمع عفار ہے جس نے کہا: عفریت، اس کی جمع میں تین صورتیں ہیں۔ اگر چاہے تو کہے: عفاریت اگر چاہے تو کہے: عفار کیونکہ تاء زائدہ ہے، جس طرح کہا جاتا ہے طواغ یہ طاغوت کی جمع ہے اگر چاہے تو تاء کی جگہ یاء لے آئے اور کہے: عفاری۔ شیطانوں میں سے عفریت اسے کہتے ہیں جو طاقتور اور سرکش ہو۔ تاء زائدہ ہے۔ عربوں نے کہا: تعفرت الرجل۔ جب اس نے اذیت پہنچانے والا رویہ

1۔ الفردوس الماثور، جلد 1، صفحہ 153

اپنایا۔ وہب بن منبہ نے کہا: اس عفریت کا نام کودن تھا۔ نحاس نے اس کا ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا نام ذکوان تھا؛ سہیلی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ شعیب صبائی نے کہا: اس کا نام دعوان تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ صخر جنی تھا۔ اسی نام کے بارے میں ذی رمہ کا قول ہے:

كأنه كوكب فى اثر عفرية مُصَوَّبٌ فى سواد الليل مُنْقَضِبُ

گویا وہ عفریہ کے پیچھے ستارہ تھا۔

کسائی نے یہ شعر پڑھا:

إذ قال شيطانُهُمُ العِفريتُ ليس لكم مُلكٌ و لاتثبيتُ

جب ان کی عفریت شیطان نے کہا: تمہارے لیے کوئی ملک اور ثابت قدمی نہیں۔

حضرت ابوہریرہ سے صحیح میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: "گزشتہ رات جنوں میں سے ایک سرکش جن مجھے دھوکہ دینے لگا تا کہ مجھ پر میری نماز کو قطع کر دے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دی تو میں نے اسے شدید دھکا دیا" (1)۔ حدیث ذکر کی۔ بخاری شریف میں تفلت علی البارحة کے الفاظ ہیں جو جعل یفتك کی جگہ ہیں۔ موطا میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رات کے وقت میر کرائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک سرکش جن کو دیکھا جو آگ کے ایک شعلہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طلب میں تھا جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم متوجہ ہوتے تو اسے دیکھ لیتے۔ جبریل امین نے کہا: کیا میں آپ کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہ کلمات پڑھیں تو اس کا شعلہ بجھ جائے تو اس کی ہڈی سے گوشت الگ ہو کر گر جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت جبریل امین نے یہ کلمات بتائے: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْكَرِيْمِ وَ كَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِىْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَشَرِّ مَا يَعْرُجُ وَ شَرِّ مَا ذَرَا فِى الْاَرْضِ وَ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِلَّا طَارِقًا يطرق بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ (2)

میں اللہ کریم اور اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ جن سے کوئی نیک اور فاجر تجاوز نہیں کر سکتا کی پناہ مانگتا ہوں اس شر سے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور اس شر سے جو آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور اس کے شر سے جو زمین میں بوئی جاتی ہے اور اس شر سے جو زمین سے نکلتی ہے رات اور دن کے فتنوں سے، رات اور دن کے وقت آنے والوں سے مگر جو بھلائی لائے اے رحمن۔

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ یعنی اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے جن میں آپ فیصلہ کرتے ہیں۔ وَاِنِّىْ عَلَيْهِ لَقَوِىٌّ اَمِيْنٌ اس کے اٹھانے پر قوی اور اس میں جو کچھ ہے اس پر امین ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بیوی کی شرمگاہ پر امین ہوں؛ مہدوی نے یہ ذکر کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: میں اس سے بھی تیزی کا ارادہ کرتا ہوں۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ ووہبنا لداود سلیمان، جلد 1، صفحہ 487

2۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب مایؤمر بہ من التعوذ عند النوم وغیرہ، صفحہ 722

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ وہ فرد جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ آصف بن برخیا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا، وہ صدیق تھا اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کا حافظ تھا جب اس اسم کے وسیلہ سے سوال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے جب اس اسم کے وسیلہ سے دعا کی جاتی ہے تو وہ قبول فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ اسم اعظم جس کے وسیلہ سے آصف بن برخیا نے دعا کی تھی وہ یاحی یاقیوم تھا''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان کی زبان میں اهیا شراهیا ہے۔ زہری نے کہا: جس کے پاس اسم اعظم تھا اس کی دعا یہ تھی یاإلهنا وإله کل شیء إلها واحدا لا إله إلا أنت إیتنی بعرشها اے ہمارے الٰہ! اے ہر شے کے الٰہ! جو الٰہ واحد ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں میرے پاس اس کا عرش لے آ۔ تو وہ عرش اس کے سامنے تھا۔ مجاہد نے کہا: اس نے دعا کی اور یہ الفاظ کہے: یا إلهه وإله کل شیء یا ذا الجلال والاکرام سہیلی نے کہا: جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ آصف بن برخیا تھا وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے اسم اعظم تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت سلیمان علیہ السلام خود تھے۔ سیاق کلام میں اس قسم کی تاویل صحیح نہیں۔ ایک جماعت نے کہا: وہ حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اس تاویل کی صورت میں خطاب عفریت کو ہوگا جب یہ کہا: اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ گویا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس میں دیری محسوس کی اور اسے تحقیر کے انداز میں کہا اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ یہ قول کرنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں۔ ھٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ۔

میں نے کہا: ابن عطیہ نے جو ذکر کیا ہے نحاس نے وہ معانی القرآن میں کہا: ان شاء اللہ یہ اچھا قول ہے۔ بحر نے کہا: وہ فرشتہ تھا جس کے قبضہ قدرت میں کتاب المقادیر تھی۔ عفریت کے قول کے وقت اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو بھیجا۔ سہیلی نے کہا: محمد بن حسن مقری نے ذکر کیا ہے وہ ضبہ بن اد تھا۔ یہ کسی اعتبار سے بھی درست نہیں کیونکہ ضبہ وہ ابن اد بن طابخہ تھا۔ اس کا نام عمرو بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد تھا۔ معد یہ بخت نصر کے دور میں تھا یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے طویل عرصہ بعد تھا۔ جب معد حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں نہ ہو تو ضبہ بن اد کیسے ہوسکتا ہے جو اس کے پانچ نسلوں بعد تھا؛ جو آدمی غور کرے یہ اس کے لیے واضح ہے۔

ابن لہیعہ نے کہا: وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ ابن زید نے کہا: جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ ایک صالح آدمی تھا جو سمندر کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ میں رہتا تھا وہ اس روز زمین میں سکونت پذیر افراد کو دیکھنے کے لیے نکلا تھا؛ کیا اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے یا کہ نہیں۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پایا اس نے اللہ تعالیٰ کے نام کے وسیلہ سے دعا کی تو عرش لے آیا گیا۔ ساتواں قول ہے: یہ بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا اس کا نام یملیخا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم جانتا تھا؛ قشیری نے اسے ذکر کیا ہے۔ ابن ابی بزہ نے کہا: وہ آدمی جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس کا نام اسطوم تھا وہ بنی اسرائیل میں بڑا عبادت گزار تھا؛ غزنوی نے اسے ذکر کیا ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا: وہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی تھے۔ خبردار لوگ خیال کرتے ہیں ان کے پاس کوئی نام تھا یہ بات اس طرح نہیں۔ بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا جو عالم تھا اللہ تعالیٰ نے اسے علم

اور سمجھ عطا کر رکھی تھی اس نے کہا: اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ فرمایا: لے آ۔ اس نے عرض کی: آپ اللہ کے نبی ہیں اللہ کے نبی کے بیٹے ہیں، اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ اسے لے آئے گا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ اس عرش کو لے آیا۔

آٹھواں قول بھی ہے: وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے، یہ امام نخعی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اس تعبیر کی بنا پر علم الکتاب سے مراد کتب منزلہ کا علم ہے یا لوح محفوظ میں جو ہے اس کا علم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ بلقیس کی طرف مکتوب کا علم۔ ابن عطیہ نے کہا: جس پر جمہور کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جس کا نام آصف بن برخیا تھا۔ روایت بیان کی گئی ہے: انہوں نے دو رکعت نماز ادا کی پھر حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کی: اے اللہ کے نبی! اپنی نظر اٹھایئے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے نظر یمن کی طرف اٹھائی تو تخت کو دیکھا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی نظر واپس نہ کی مگر وہ تخت آپ کے پاس موجود تھا۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد اتنی طویل نظر ہے جس سے آنکھ تھک ہار کر واپس ہو جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اتنا وقت ہے جس میں انسان آنکھ کھولتا ہے پھر پلک جھپکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: افعل کذا فی لحظۃ عین میں یہ کام آنکھ جھپکنے کے وقت میں کر گزرتا ہوں۔ یہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اگر یہ فعل حضرت سلیمان کی جانب سے ہو تو وہ معجزہ ہوتا ہے۔ اگر یہ آصف یا کسی اور ولی کی جانب سے ہوتا ہے تو یہ کرامت ہوگی۔ اور ولی کی کرامت نبی کا معجزہ ہوا کرتا ہے۔ قشیری نے کہا: جس نے یہ کہا: الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے مراد حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں تو اس نے اولیاء کی کرامت کا انکار کیا ہے۔ حضرت سلیمان نے عفریت سے کہا: اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ان کے نزدیک یہ کام عفریت نے نہیں کیا اس لیے نہ یہ معجزات میں سے ہے اور نہ ہی کرامات میں سے ہے کیونکہ جن تو اس قسم کے افعال کرنے پر قادر ہوتے ہیں ایک حال میں دو جگہ ایک جوہر کے متحقق ہونے کے بارے میں واقع ہونے کا قطعی حکم نہیں لگایا جاتا، بلکہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق کی انتہا میں ایک جوہر کو معدوم کر دے پھر دوسری حالت میں اسے لوٹا دے عدم کے بعد، یہی حالت اقصی مغرب میں ہوتی ہے یا درمیانی اماکن کو وہ معدوم فرما دیتا ہے پھر اسے اٹھاتا ہے۔ قشیری نے کہا: وہب نے اسے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے ہوا میں لایا گیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور عرش کے درمیان اتنا فاصلہ تھا جتنا فاصلہ کوفہ اور حیرہ کے درمیان تھا۔ امام مالک نے کہا: وہ تخت یمن میں تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام شام میں تھے۔ تفاسیر میں ہے ملکہ بلقیس کے عرش کی جگہ کو پھاڑا گیا پھر اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے نکالا گیا۔ عبد اللہ بن شداد نے کہا: زمین کے نیچے سے ایک سوراخ سے عرش ظاہر ہوا۔ کیا ہوا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ آپ کے پاس ثابت تھا۔ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ یہ مدد اور قدرت میرے رب کے فضل سے ہے۔ لِیَبْلُوَنِیْۤ اخفش نے کہا: معنی ہے وہ مجھے دیکھے۔ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ دوسرے علماء نے کہا: لِیَبْلُوَنِیْۤ کا معنی ہے لیتعبدنی یہ مجاز ہے، ابتلاء کا اصل معنی آزمانا ہے، یعنی وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کی نعمت کا شکر بجا لاتا ہوں یا میں اس کی

ناشکری کرتا ہوں۔ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ اس کا نفع اس کی ذات کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ شکر، تمام نعمت، اس کے دوام اور مزید نعمت کا تقاضا کرتا ہے شکر موجود نعمت کے لیے قید ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مفقود نعمت کو حاصل کیا جاتا ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ میرا رب شکر سے غنی ہے اور فضل و احسان فرمانے والا ہے۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِیْنَ ۝ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ۝

”آپ نے حکم دیا: شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حقیقت پر آگاہ ہوتی ہے یا یہ ہو جاتی ہے ان لوگوں سے جو حقیقت کو نہیں پہچانتے۔ سو جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ کہنے لگی: یہ تو ہو بہو وہی ہے اور ہمیں اطلاع مل گئی تھی اس واقعہ کی اس سے پہلے اور ہم تو فرمانبردار بن کر حاضر ہوئے ہیں اور روک رکھا تھا اسے (ایمان لانے سے) ان بتوں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتی تھی اللہ تعالیٰ کے بعد، بے شک وہ قوم کفار سے تھی“۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا اس کی ہیئت بدل دو۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا اوپر والا حصہ نیچے کر دو اور نیچے والا حصہ اوپر کر دو۔ ایک قول یہ کیا گیا: کمی بیشی کے ساتھ اس کو تبدیل کر دو۔ فراء اور دوسرے علماء نے کہا: آپ نے اس کی ہیئت بدلنے کا حکم دیا کیونکہ شیاطین نے آپ سے عرض کی تھی: اس کی عقل میں خرابی ہے، تو آپ نے اسے آزمانے کا ارادہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنوں کو خوف ہوا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے شادی کریں گے تو اس کے بطن سے حضرت سلیمان کا بیٹا پیدا ہوگا۔ تو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آل کے لیے ہمیشہ مسخر رہیں گے۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کی: وہ عقل کی کمزوری ہے اس کا پاؤں اس طرح ہے جس طرح گدھے کا پاؤں ہوتا ہے۔ فرمایا: نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا تا کہ ہم اس کی عقل کو پہچان لیں۔ جنوں میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخلص بھی تھے۔ آپ نے پوچھا: میرے لیے اس کے قدم دیکھنا کیسے ممکن ہوگا جب کہ میں اس کو اس کے ننگے کرنے کا سوال بھی نہیں کر سکتا؟ عرض کی: میں اس محل میں پانی چھوڑ دیتا ہوں اور پانی کے اوپر شیشہ لگا دیتا ہوں وہ گمان کرے گی کہ یہ پانی ہے تو وہ اپنے کپڑے کو اوپر اٹھائے گی تو آپ اس کے قدم دیکھ لیں گے۔ یہی وہ صرح ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْ مراد بلقیس ہے قِیْلَ اسے کہا گیا: اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ اس نے اسے اپنے عرش کے ساتھ تشبیہ دی، کیونکہ وہ اسے تالوں میں پیچھے چھوڑ آئی تھی نہ اس نے انکار کیا اور نہ اس کا اقرار کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کی کمال عقل سے آگاہ ہو گئے۔ عکرمہ نے کہا: وہ حکیمہ تھی اس نے کہا: كَاَنَّهٗ هُوَ مقاتل نے کہا: وہ پہچان گئی لیکن اس نے ان پر شبہ ڈالا جس طرح انہوں نے اس پر شبہ ڈالا تھا۔ اگر اسے کہا جاتا: کیا یہ تیرا عرش ہے؟ تو وہ کہتی: ہاں وہی ہے؛ حسن بن مفضل نے یہی قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس کے سامنے یہ ظاہر کریں کہ جن آپ کے سامنے مسخر ہیں اسی طرح شیاطین مسخر ہیں تا کہ وہ جان

جائے کہ یہ نبوت ہے اور وہ ایمان لے آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس کے مقابل ہے جو اس نے لڑکوں اور لڑکیوں کے معاملہ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔

**وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا** ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بلقیس کا قول ہے، تخت کے بارے میں نشانی سے قبل ہی ہمیں یہ علم عطا کر دیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت صحیح ہے۔ **وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ** ہم اس کے امر کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں ہمیں علم عطا کیا گیا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے یہ بات ہم کئی دفعہ کر چکے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ** یعنی ہمیں بلقیس کے آنے سے قبل اس کے اسلام لانے اور مطیع بن کر آنے کا علم عطا کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوم کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** پر وقف اچھا ہے معنی ہے جو وہ سورج اور چاند کی عبادت کرتی تھی اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے روک دیا۔ مَا محل رفع میں ہے۔ نحاس نے کہا: معنی ہے اس کی غیر اللہ کی عبادت اور اس کی ان چیزوں کی عبادت نے اسے روک دیا کہ وہ وہ جانے جس کو ہم جانتے ہیں اور اس سے کہ وہ اسلام لائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مَا محل نصب میں ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وصدھا سلیمان عما کانت تعبد من دون اللہ یعنی بلقیس کے درمیان اور اسلام کے درمیان رکاوٹ بن گئی۔ یہ بھی جائز ہے کہ معنی ہو وصدّھا اللہ، اللہ تعالیٰ نے اسے روک دیا کہ وہ غیر کی عبادت کرے۔ تو عن کو حذف کر دیا گیا اور فعل براہ راست متعدی ہو گیا۔ اس کی مثل واختار موسی قومہ ہے اصل میں من قومہ تھا۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

ونُبِّئْتُ عبدَاللہ بالجوِّ أصبحتْ　　کِراماً موالیها لئیما صمیمُها

یہ گمان کیا کہ اس کے نزدیک معنی ہے نبئت عن عبد اللہ۔

**اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ** سعید بن جبیر نے پڑھا اَنّھا یہ محل نصب میں ہے معنی ہے لِأنّھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ماکا بدل ہو۔ یہ محل رفع میں ہوگا اگر ما، صد کا فاعل ہو۔ اور ہمزہ کے نیچے کسرہ استئناف کے طریقہ پر ہو۔

**قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟**

''اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ پس جب اس نے دیکھا اس (کے بلوریں فرش) کو تو اس نے خیال کیا یہ گہرا پانی ہے اور اس نے کپڑا اٹھالیا اپنی دونوں پنڈلیوں سے آپ نے فرمایا: (یہ پانی نہیں) یہ چمکدار محل ہے بلور کا بنا ہوا (اس کی آنکھیں کھل گئیں) کہنے لگی: اے میرے رب! میں (آج تک) ظلم ڈھاتی رہی اپنی جان پر اور (اب) ایمان لائی ہوں سلیمان کے ساتھ اللہ پر جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے''۔

**قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ** سیبویہ کے نزدیک اس کی تقدیر کلام میں ہے ادخلی الی الصرح، الی حرف جار کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو براہ راست مفعول بہ میں عامل بنایا گیا۔ ابو العباس اس نقطہ نظر میں اس کو غلط قرار دیتا ہے کہا: کیونکہ دخل، مدخول پر دلالت کرتا ہے اس محل کا صحن شیشے کا تھا جس کے نیچے پانی تھا جس میں کشتیاں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام اس لیے کیا تا کہ ملکہ بلقیس کو یہ دکھائے کہ آپ کا ملک اس کے ملک سے بڑھ کر ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ شیشے کا تھا اس کے پیچھے پانی تھا **حَسِبَتْهُ لُجَّةً**، لجۃ کا معنی پانی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صرح کا معنی محل ہے۔ ابو عبیدہ سے مروی ہے جس طرح کہا: تحسب أعلامهن الصروح۔ اس مصرعہ میں الصروح سے مراد محلات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الصرح سے مراد صحن ہے جس طرح کہا جاتا ہے: هذه صرحة الدار وقاعتها دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عبیدہ نے الغریب المصنف میں حکایت بیان کی ہے کہ صرح سے مراد ایسی اونچی عمارت ہے جو زمین سے بلند ہو۔ ممرد کا معنی طویل ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اصل یہ ہے کہ ہر ایسی عمارت جسے ایک ہی دفعہ بنایا گیا ہو اسے صرح کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے: لبن صریح ایسا دودھ جس میں پانی کی آمیزش نہ ہو۔ عربوں کے قول سے ہے صرح بالامر، اسی سے ہی عربی صریح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ عمل اس لیے کیا تا کہ جنوں نے ملکہ بلقیس کے بارے میں جو قول کیا تھا اس کی تحقیق کریں کہ ملکہ بلقیس کی ماں جنوں میں سے تھی اور اس کا پاؤں گدھے کے پاؤں جیسا ہے؛ یہ قول وہب بن منبہ نے کیا ہے۔ جب اس نے گہرے پانی کو دیکھا تو گھبرائی اس نے گمان کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے غرق کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اور اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پانی پر ہے اس نے وہ چیز دیکھی جس نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ اس کے لیے حکم کی طاعت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

**وَ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا** تو لوگوں میں سے سب سے خوبصورت پنڈلی والی تھی۔ جنوں نے جو کچھ کہا تھا اس سے وہ سالم تھی، مگر یہ تھا کہ اس کی پنڈلی پر بال زیادہ تھے۔ جب وہ اس حد تک پہنچی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا جب کہ آپ نے اس سے نظر کو پھیر دیا تھا: **اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ** ممرد سے مراد ہے جس کو رگڑ کر ملائم کر دیا گیا ہو اس سے امرد کا لفظ ہے تمرد الرجل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب لڑکے کے بالغ ہونے کے بعد اس کی داڑھی دیر سے آئے: یہ فراء کا قول ہے اسی سے شجرة مرداء ہے جس کے پتے نہ ہوں۔ رملة مرداء ایسی ریت جو کسی چیز کو نہ اُگائے۔ ممرد کا معنی لمبا بھی ہے قلعہ کو بھی مارد کہتے ہیں۔ ابو صالح نے کہا: کھجور کے درخت کی طرح طویل۔ ابن شجرہ نے کہا: وہ طول وعرض میں وسیع۔ شاعر نے کہا:

غدوتُ صباحا باكرا فوجدتهم　　قبيل الضحا في السَّابريِّ الممَرَّدِ

میں صبح صبح چلا تو میں نے چاشت سے پہلے انہیں کھلی زرہوں میں پایا۔

اس موقع پر ملکہ بلقیس نے سر تسلیم خم کر دیا، اس نے اطاعت کی، وہ اسلام لے آئی اور اس نے اپنی جان پر ظلم کا اقرار کیا۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے قدم دیکھے تو آپ نے شیاطین میں سے ناصح سے پوچھا: میرے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا کہ جسم کو تکلیف دیئے بغیر میں ان بالوں کو اکھیڑ دوں؟ اس نے چونے کے استعمال کے

بارے میں بتایا۔ اس دن سے بال صفا پاؤڈر اور حمامات کا رواج ہے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی اور اسے شام میں ٹھہرایا، یہ ضحاک کا قول ہے۔

سعید بن عبد العزیز نے کتاب النقاش میں فرمایا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی اور اسے ملک یمن کی طرف واپس بھیج دیا۔ آپ ہر ماہ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اس کے پاس آتے، ملکہ بلقیس نے ایک بچہ جنا جس کا نام حضرت سلیمان علیہ السلام نے داؤد رکھا جو آپ کے دور میں ہی فوت ہو گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملکہ بلقیس جہاں بھر کی عورتوں میں سے سب سے خوبصورت پنڈلی والی تھیں وہ جنت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی زوجہ ہوں گی''۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: وہ مجھ سے زیادہ حسین پنڈلیوں والی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو جنت میں اس سے زیادہ خوبصورت پنڈلی والی ہو گی''۔ قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حمامات سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوائے جب ان کی پشت دیوار کے ساتھ لگی تو اس کی گرمی محسوس ہوئی تو کہا: اواہ من عذاب اللہ پھر ملکہ بلقیس سے شدید محبت کی اور ملک یمن پر اسے باقی رکھا جنوں کو حکم دیا تو انہوں نے ملکہ بلقیس کے لیے تین قلعے بنائے لوگوں نے ان جیسے بلند قلعے نہیں دیکھے تھے سلحون، بینون اور عمران۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام ہر ماہ ایک دفعہ اسے ملنے کے لیے آتے اور تین دن اس کے پاس قیام کرتے۔ شعبی نے بیان کیا ہے کہ حمیر کے لوگوں نے مقبرہ ملوک کو کھودا تو انہوں نے اس میں ایک قبر پائی جس میں ایک عورت مدفون تھی جس پر سونے سے بنے حلے (دو چادروں پر مشتمل لباس) تھے۔ اس کے سر کی جانب سنگ مرمر کی ایک تختی تھی جس میں یہ لکھا ہوا تھا:

يأيها الأقوامُ عُوجُوا معا وأربعوا فی مَقْبَرِی العِيسَا

لتعلموا أَنِّی تلك التی قد كنتُ أُدعَى الدهر بَلْقِيسَا

شَيَّدْتُ قصرَ المُلْكِ فی حِمْيَرٍ قَوْمِی وقِدْمًا كان مأنوسا

وكنتُ فی مُلْكی و تدبيره أَرْغِمُ فی الله المَعَاطِيسَا

بَعْلِی سليمانُ النبیُّ الذی قد كان للتوراة دِرِّيسَا

وسُخِّرَ الريحُ له مركبا تهبُّ أحيانا رَوَامِيسَا

مع ابن داؤد النبیِّ الذی قَدَّسه الرحمنُ تَقْدِيسَا

اے اقوام! اکٹھے رہنا اور میرے مقبرہ میں اونٹ باندھنا تاکہ تمہیں علم ہو کہ میں وہ ہوں جسے زمانہ بلقیس کہتا تھا۔ میں نے حمیر ملک کے محل کو مضبوط کیا جب کہ میری قوم قدیم زمانہ سے مانوس تھی۔ میں اپنے ملک اور اس کی تدبیر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ناکوں کو خاک آلود کر دیتی۔ میرے خاوند حضرت سلیمان علیہ السلام تھے جو تورات کو پڑھنے والے تھے۔ ہوا کو ان کے لیے سواری کے طور پر مسخر کر دیا گیا جو بعض اوقات قبروں پر چلتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے کے ساتھ جس کی رحمٰن نے تقدیس بیان کی ہے۔

محمد بن اسحاق اور وہب بن منبہ نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی نہیں کی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے فرمایا: اپنے خاوند کو منتخب کر لے تو ملکہ بلقیس نے کہا: مجھ جیسی عورت نکاح نہیں کرتی میرے لیے ملک ہے جو پہلے سے ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اسلام میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تو اس نے ہمدان کے بادشاہ کو پسند کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کی شادی اس سے کر دی اور اسے یمن کی طرف بھیج دیا۔ اور زوبعہ جو یمن کے جنوں کا امیر تھا اسے حکم دیا کہ وہ اس کی اطاعت کرے تو اس نے اس کے لیے کارخانے بنائے وہ امیر رہا یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا۔ ایک قوم کا خیال ہے اس بارے میں کوئی صحیح خبر نہیں نہ اس بارے میں کہ خود شادی کی اور نہ اس بارے میں کہ آپ نے اس کی شادی کسی سے کی۔ ملکہ بلقیس کا شجرہ نسب یہ تھا بلقیس بنت سرح بن ہداہد بن شراحیل بن ادد بن حدر بن سرح بن حرس بن قیس بن صیفی بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ اس کا دادا ہداہد عظیم بادشاہ تھا اس کے چالیس بیٹے ہوئے جو سب کے سب بادشاہ تھے یمن کا پورا علاقہ اس کی مملکت میں شامل تھا۔ اس کا والد سرح اطراف کے بادشاہوں کو کہتا: تم سب سے کوئی بھی میرے ہم پلہ نہیں، اس نے ان میں شادی کرنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے اس کی شادی جنوں کی ایک عورت سے کر دی جسے ریحانہ بنت سکن کہتے تو اس کی ایک بچی بلقمہ پیدا ہوئی اسے بلقیس کہتے ہیں اس بچی کے علاوہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملکہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جن تھا'' (1)۔ اس کا باپ فوت ہوا تو اس پر قوم نے اختلاف کیا اور دو فرقوں میں بٹ گئی انہوں نے اپنے امور مملکت ایسے آدمی کے سپرد کیے جس کی سیرت بری تھی یہاں تک کہ اس نے اپنی رعیت کی عورتوں سے بدکاری کی، بلقیس کو غیرت نے آلیا اس نے اپنے آپ کو اس بادشاہ پر پیش کیا تو اس حاکم نے بلقیس سے شادی کر لی۔ بلقیس نے اسے شراب پلائی یہاں تک کہ اس کا سر کاٹا اور اپنے گھر کے دروازے پر اسے لٹکا دیا تو لوگوں نے اسے بادشاہ بنا لیا۔ ابوبکر نے کہا: ملکہ بلقیس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو فرمایا: لا یُفلح قوم ولّوا أمرهم إمرأة (2) کوئی ایسی قوم فلاح نہیں پا سکتی جنہوں نے اپنا معاملہ عورت کے سپرد کر دیا۔

ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس کے باپ کے جنی سے شادی کرنے کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک سرکش بادشاہ کا وزیر تھا جو رعیت کی عورتوں کو غصب کر لیتا۔ وزیر غیور تھا اس نے شادی نہ کی ایک دفعہ راستہ میں وہ ایک آدمی سے ملا جسے وہ پہچانتا نہیں تھا اس نے پوچھا: کیا تیری بیوی ہے؟ اس نے جواب دیا: میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے ملک کا بادشاہ مردوں سے ان کی بیویوں کو غصب کر لیتا ہے۔ اس نے کہا: اگر تو میری بیٹی سے شادی کرے تو وہ اسے کبھی بھی غصب نہیں کرے گا۔ وزیر نے کہا: نہیں بلکہ وہ غصب کر لے گا۔ اس نے کہا: ہم جنوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہم پر قادر نہیں ہو سکتا۔ ملکہ بلقیس کے باپ نے اس کی بیٹی سے شادی کر لی تو اس سے اس کی بیٹی بلقیس پیدا ہوئی پھر ماں مر گئی ملکہ بلقیس نے صحراء میں محل بنوایا غلطی سے بلقیس کے والد نے اس کا ذکر کیا۔ بادشاہ تک وہ خبر پہنچی بادشاہ نے اس سے کہا: اے فلاں! تیرے پاس وہ خوبصورت بیٹی

1۔ تفسیر طبری، پارہ نمبر 19، صفحہ 193

2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التي تموج كموج البحر، جلد 2، صفحہ 1050

ہے جب کہ تو اسے میرے پاس نہیں لاتا اور تو عورتوں سے میری محبت کو خوب جانتا ہے پھر اس کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ بلقیس نے بادشاہ کی طرف پیغام بھیجا: میں تیرے سامنے ہوں۔ بادشاہ نے اس کے محل کی طرف جانے کی تیاری کی۔ جب اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہونے کا قصد کیا تو جنوں کی بیٹیاں جو سورج کی طرح روشن تھیں اس کے سامنے آ گئیں انہوں نے بادشاہ سے کہا: تجھے حیا نہیں آتی، ہماری مالکہ تجھے کہتی ہے: کیا تو ان لوگوں کے ساتھ اپنے اہل پر داخل ہوتا ہے تو بادشاہ نے لوگوں کو واپس جانے کی اجازت دے دی اور اکیلا داخل ہو گیا اس کے داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا اور جوتیاں مار مار کر اسے قتل کر دیا اس کا سر کاٹا اور اس کے لشکر کی طرف اسے پھینک دیا، تو لوگوں نے ملکہ بلقیس کو اپنا حکمران بنا لیا۔ وہ اس طرح حکمران رہی یہاں تک کہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی خبر پہنچا دی۔ اس کی وجہ یہ بنی جب حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے کسی پڑاؤ میں اترے ہدہد نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام فروکش ہونے میں مشغول ہو چکے ہیں تو وہ ہدہد آسمان کی طرف بلند ہوا تو اس نے دنیا کا طول و عرض دیکھ لیا اس نے زمین کو شمالاً جنوباً دیکھا اس نے بلقیس کا باغ دیکھا جس میں ہدہد موجود تھا۔ اس ہدہد کا نام عفیر تھا۔ یمن کے عفیر نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے یعفور سے کہا: تو کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں شام سے اپنے مالک حضرت سلیمان بن داؤد کے ساتھ آیا ہوں۔ عفیر یمن نے پوچھا: کون سلیمان؟ اس نے جواب دیا: جنوں، انسانوں، شیاطین، پرندوں، وحشیوں، ہواؤں اور زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے ان کا بادشاہ۔ یعفور نے پوچھا: تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے جواب دیا: ان شہروں کا جن کی بادشاہ ایک عورت ہے اسے بلقیس کہتے ہیں اس کے زیر حکومت بارہ ہزار چھوٹے حکمران ہیں؟ ہر حاکم کے زیر تسلط ایک لاکھ جنگجو ہیں جو عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہیں وہ اس کے ساتھ گیا اور ملکہ بلقیس اور اس کے ملک کو دیکھا اور عصر کے وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف لوٹ آیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز کے وقت اسے پوچھا تھا اور اسے نہ پایا تھا۔ وہ اس وقت پانی پر تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام پر سورج کی شعاع پڑی تو آپ نے پرندوں کے وزیر سے پوچھا: یہ کس کی جگہ ہے؟ عرض کی: اے اللہ کے نبی! یہ ہدہد کی جگہ ہے۔ پوچھا: وہ کہاں چلا گیا ہے؟ اس نے عرض کی: اللہ تعالیٰ تیرے ملک کو سلامت رکھے! میں نہیں جانتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام غصے ہو گئے۔ فرمایا: لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا پھر آپ نے عقاب کو بلایا وہ پرندوں کا سردار اور ان سے قوی تھا۔ عرض کی: اے اللہ کے نبی! کیا ارادہ رکھتے ہو؟ فرمایا: مجھے اسی وقت ہدہد چاہیے۔ عقاب نے اپنے آپ کو آسمان کی طرف بلند کیا یہاں تک کہ ہوا کے ساتھ جا لگا اس نے دنیا کی طرف دیکھا جس طرح تمہارے سامنے ایک پیالہ ہو، کیا دیکھا کہ ہدہد یمن کی جانب سے آ رہا ہے۔ وہ اس کی طرف نیچے آیا، اس میں اپنا پنجہ گاڑھا، ہدہد نے اسے کہا: میں تجھ سے اس اللہ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جس نے تجھے قدرت دی اور مجھ پر قوت عطا کی مگر تو مجھ پر رحم کرے۔ اس نے کہا: تیرے لیے ہلاکت ہو، تیری ماں تجھ پر روئے اللہ کے نبی نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ تجھے عذاب دے گا یا تجھے ذبح کر دے گا۔ پھر وہ اسے لے آیا اس کا گدھوں اور باقی لشکر کے پرندوں نے استقبال کیا۔

سب نے یہی کہا: تیرے لیے ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ کے نبی نے تجھے دھمکی دی ہے۔ ہدہد نے کہا: میں کیا اور میری اوقات کیا ہے کیا آپ نے استثناء نہیں کی تھی؟ پرندوں نے کہا: کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا: اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ پھر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اپنا سر اٹھایا ہدہد نے اپنی دنب اور پروں کو تواضع کی خاطر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: تو اپنی خدمت اور جگہ کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا میں تجھے عذاب دوں گا یا تجھے ذبح کروں گا۔ ہدہد نے آپ سے عرض کی: اے اللہ کے نبی! جس وقت آپ اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اس کو یاد کرو جس طرح میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جلد کانپنے لگی، آپ کانپ گئے اور معاف کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کو ذبح کرنے سے پھیر دیا کیونکہ ہدہد اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والا تھا وہ کھانے کو ان کی طرف لے جاتا اور انہیں کھلاتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا: کس چیز نے تجھے دیری میں ڈال دیا؟ تو ہدہد نے وہی کہا جو اللہ تعالیٰ نے ملکہ بلقیس، اس کے عرش اور اس کی قوم کے بارے میں بتایا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

ماوردی نے کہا: یہ قول کہ بلقیس کی ماں جنی تھی یہ عقول کے لیے عجیب و غریب ہے کیونکہ جنس ایک دوسرے سے مختلف ہیں، طبیعتیں الگ الگ ہیں اور جنسوں میں فرق ہے کیونکہ آدمی جسمانی ہے، جن روحانی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے اور جنوں کو ایسے بھڑکنے والے شعلے سے پیدا کیا ہے جو آگ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تباین کی موجودگی میں امتزاج ممتنع ہوتا ہے اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے تناسل محال ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ عقل اس کو محال قرار نہیں دیتی، ساتھ ہی ساتھ روایت بھی واقع ہوئی ہے جب خلقت کی اصل کی طرف دیکھا جائے تو اس کی اصل پانی ہے جس طرح وضاحت گزر چکی ہے۔ اس میں کوئی بعید نہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (الاسراء: 64) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ (الرحمٰن) اس کی وضاحت سورۃ الرحمٰن میں آئے گی۔

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ میں نے شرک پر قائم رہتے ہوئے اپنی جان پر ظلم کیا۔ ابن شجرہ نے کہا: سفیان نے کہا: وہ گمان اختیار کر کے ظلم کیا جو اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں گمان کیا کیونکہ جب ملکہ بلقیس کو محل میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تو اس نے اسے پانی گمان کیا اور یہ گمان کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اسے غرق کرنا چاہتے ہیں۔ جب اس پر یہ امر واضح ہوا کہ یہ تو شیشے کا ملائم محل ہے تو اس کو علم ہو گیا کہ اس نے یہ گمان کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اِنّ کو کسرہ دیا کیونکہ قول کے بعد اس سے کلام کا آغاز ہوا۔ عربوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے فتحہ دیتے ہیں تو اس میں قول عمل کرتا ہے۔

وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ جب تو مع کو ساکن پڑھے تو یہ حرف ہے جو معنی کے لیے آیا ہے نحویوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ جب تو اس کو فتحہ دے گا تو اس میں دو قول ہیں (۱) یہ ظرف کے معنی میں اسم ہے (۲) حرف جر ہے مبنی بر فتحہ ہے: یہ نحاس نے کہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ

يَخْتَصِمُوْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ۭ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ۝

''بے شک ہم نے رسول بنا کر بھیجا ثمود کی طرف اس کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی تو وہ دو گروہ بن گئے (اور آپس میں) جھگڑنے لگے۔ صالح نے فرمایا: اے میری قوم! کیوں تیزی کرتے ہو برائی کرنے میں نیک کام کرنے سے پہلے تم کیوں نہیں بخشش طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے شاید تم پر رحم کر دیا جائے۔ کہنے لگے: ہم تو براشگون سمجھتے ہیں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو، آپ نے فرمایا: تمہارا براشگون تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے بلکہ تم ایسی قوم ہو جو فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے''۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ اس کا معنی گزر چکا ہے فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ مجاہد نے کہا: یعنی مومن اور کافر۔ کیا خصومت وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (الاعراف) ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا جھگڑا یہ تھا کہ ہر فرقہ نے کہا: ہم حق پر ہیں تم حق پر نہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ مجاہد نے کہا: سیئۃ سے مراد عذاب اور حسنۃ سے مراد رحمت ہے۔ معنی ہے تم اس ایمان میں کیوں تاخیر کرتے ہو جو تمہاری طرف ثواب کھینچ کر لاتا ہے۔ اور کفر کو پہلے لاتے ہو جو عذاب کو لازم کرتا ہے کفار انکار کی زیادتی کی وجہ سے کہتے ہیں: ہمارے اوپر عذاب لے آؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم ایسے کام کیوں کرتے ہو جن کے باعث تم عتاب کے مستحق بنتے ہو اس کا مطلب یہ نہیں تم جلد عذاب کے آنے کی تلاش کرتے ہو۔

لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ تم شرک سے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کیوں نہیں کرتے؟ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ہم نے فال بدلیا۔ شؤم کا معنی نحوست ہے۔ بدفالی سے بڑھ کر کوئی چیز رائے اور تدبیر کو نقصان پہنچانے والی نہیں۔ جو آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ گائے کا ڈکارنا اور کوے کا کائیں کائیں کرنا قضا کو لوٹا سکتا یا مقدور چیز کو دور کر سکتا ہے تو جاہل ہے۔ شاعر نے کہا:

طِيَرَةُ الدهر لا تَرُدُّ قضاءً　فاعذر الدهرَ لا تشبه بلومِ
أيُّ يوم يَخُصُّه بسعود　والمنايا ينزلنا فی كل يومِ
ليس يومٌ إلا وفيه سعودٌ　و نحوسٌ تجری لقومٍ فقومِ

زمانہ کی بدفالی قضا کو لوٹا نہیں سکتی زمانہ سے معذرت کر لے تو اسے ملامت کے ساتھ تشبیہ نہ دے۔ کون سا دن ہے جو اسے سعادت مندی کے ساتھ خاص کرتا ہے جب کہ موتیں ہر دن نازل ہوتی ہیں۔ کوئی دن نہیں ہے مگر اس میں سعادت مندی

ہوتی ہے اور نحوست قوم کے لیے یکے بعد دیگرے واقع ہوتی ہے۔

عرب سب سے زیادہ فال پکڑنے والے تھے جب وہ سفر کا ارادہ کرتے تو پرندے کو اڑاتے جب وہ دائیں جانب اڑتا تو وہ باعث برکت ہوتا اور اگر وہ بائیں جانب اڑتا تو یہ بدبختی کی علامت ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی کی ہے۔ فرمایا: ''پرندوں کو اپنے گھونسلوں میں رہنے دو'' (1)۔ اس کی وضاحت سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ تمہارا شگون تم تک پہنچنے والا ہے۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ تمہارا امتحان لیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہیں تمہارے گناہوں کا عذاب دیا جائے گا۔

وَ كَانَ فِي الۡمَدِيۡنَةِ تِسۡعَةُ رَهۡطٍ يُّفۡسِدُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ وَ لَا يُصۡلِحُوۡنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوۡا تَقَاسَمُوۡا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهۡلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوۡلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدۡنَا مَهۡلِكَ اَهۡلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

''اور اس شہر میں نو شخص تھے جو فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اس علاقہ میں اور اصلاح کی کوئی کوشش نہ کرتے، تو انہوں نے کہا: الله کی قسم کھا کر یہ عہد کر لیں کہ شب خون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے پھر کہہ دیں گے اس کے وارث سے کہ ہم تو (سرے سے) موجود ہی نہ تھے جب انہیں ہلاک کیا گیا اور (یقین کرو) ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں''۔

وَ كَانَ فِي الۡمَدِيۡنَةِ حضرت صالح علیہ السلام کے شہر میں جو مجرم ہے۔ تِسۡعَةُ رَهۡطٍ ان کے اشراف کی اولاد میں سے نو آدمی۔ ضحاک نے کہا: یہ نو افراد اہل مدینہ کے عظماء تھے۔ وہ زمین میں فساد برپا کرتے اور فساد کا حکم دیتے۔ وہ عظیم چٹان کے پاس بیٹھے تو الله تعالیٰ نے اس چٹان کو ان پر الٹ دیا۔ عطا بن ابی رباح نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے وہ دنانیر اور دراہم قرض کے طور پر دیتے یہ زمین میں فساد کی ایک صورت ہے؛ سعید بن مسیب نے یہ کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا فساد یہ تھا وہ لوگوں کی شرمگاہوں کی تاڑ میں رہتے اور خود پر ستر عورت کا اہتمام نہ کرتے۔ اس کے علاوہ کا بھی قول کیا گیا ہے آیت سے جو لازم آتا ہے وہ وہ ہے جو ضحاک وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ قوم کے سرداروں اور غنی لوگوں میں سے تھے۔ وہ سب کے سب اہل کفر اور اہل معاصی تھے۔ ان کے امر کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح احوال کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ رَهۡطٍ جماعت کا نام ہے گویا وہ سردار تھے اور ان میں سے ہر ایک کی لوگ اتباع کیا کرتے تھے رَهۡطٍ کی جمع أرهط اور أراهط ہے۔ شاعر نے کہا:

یا بؤس للحرب التی وضعت أراهط فاستراحوا

ہائے جنگ کی سختی جس نے کئی جماعتوں کو پست کر دیا تو انہوں نے آرام پایا۔

یہ مذکورہ لوگ قدار کے ساتھ تھے جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں؛ ابن عطیہ نے یہ ذکر کیا ہے۔

---

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 25، صفحہ 168، حدیث نمبر 407

میں کہتا ہوں: ان کے اسماء میں اختلاف ہے۔ غزنوی نے کہا: ان کے نام یہ تھے قدار بن سالف، مصدع، اسلم، دسما، ذہیم، ذعما، ذعیم، قتال، صداق۔ ابن اسحاق نے کہا: ان کا سردار قدار بن سالف اور مصدع بن مہرع تھا سات افراد نے ان کی پیروی کی۔ وہ بلع بن میلع، دعیر بن غنم، ذؤاب بن مہرج اور چار افراد ایسے ہیں جن کے نام معروف نہیں۔ زمخشری نے وہب بن منبہ سے ان کے نام نقل کیے ہیں: ہذیل بن عبدرب، غنم بن غنم، رباب بن مہرج، مصدع بن مہرث، عمیر بن کردبہ، عاصم بن مخرمہ، سبیط بن صدقہ، سمعان بن صفی، قدار بن سالف؛ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے میں کوشش کی۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے سرکش لوگ تھے وہ ان کے معززین کے بیٹے تھے۔ سہیلی نے کہا: نقاش نے ان نو افراد کا ذکر کیا جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح احوال نہیں کرتے تھے اور ان کے اسماء ذکر کیے۔ یہ کسی روایت پر منضبط نہیں ہوتے مگر میں اجتہاد اور گمان سے اس کا ذکر کروں لیکن ہم اس کا ذکر کریں گے جن کو ہم نے محمد بن حبیب کی کتاب میں پایا ہے وہ مصدع بن دہر ہے اسے دہم کہا جاتا ہے، قدار بن سالف، ہریم، صواب، ریاب، داب، دعما، ہرما، دعین بن عمیر۔

میں نے کہا: ماوردی نے ان کے اسماء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیے ہیں وہ دعما، دعیم، ہرما، ہریم، داب، صواب، ریاب، مسطح اور قدار ہیں وہ حجر کے علاقہ کے لوگ تھے یہ شام کی سرزمین ہے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ یہ جائز ہے کہ تَقَاسَمُوْا فعل امر پر دلالت کرتا ہو۔ یعنی انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: تم قسم اٹھاؤ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ فعل ماضی ہو اور حال کا معنی دے رہا ہو۔ گویا کہا: متقاسمین باللہ اس تاویل کی دلیل حضرت عبداللہ کی قراءت ہے۔ یفسدون فی الارض ولا یصلحون تقاسموا باللہ اس میں قالو انہیں ہے۔

لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ عام قراءت دونوں میں نون کے ساتھ ہے۔ ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے دونوں میں تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تاء اور لام کو ضمہ دیا ہے۔ یہ خطاب کے طریقہ پر ہے یعنی انہوں نے اس طرح باہم خطاب کیا؛ ابو عبید نے اسے اختیار کیا ہے۔ مجاہد اور حمید نے دونوں جگہ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یاء اور لام کو ضمہ دیا اس صورت میں یہ غائب کا صیغہ ہوگا۔ بیات سے مراد رات کے وقت دشمن پر اچانک حملہ کرنا ہے لِوَلِیِّهٖ سے مراد ہے حضرت صالح علیہ السلام کا خاندان جسے قصاص لینے کا حق ہے۔ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ یعنی ہم تو یہاں موجود ہی نہ تھے ہم نہیں جانتے کہ کس نے اس کو قتل کیا ہے اور کس نے اس کے اہل کو قتل کیا ہے؟ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اس کے قتل کا جو ہم انکار کر رہے ہیں اس میں ہم سچے ہیں۔ مَهْلِكَ کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف کا صیغہ ہو۔ عاصم اور سلمٰی نے میم اور لام کو فتحہ دیا ہے مراد ہلاکت ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ضرب یضرب مضربا یہ ضربا کے معنی میں ہے۔ مفضل اور ابو بکر نے میم کے فتحہ اور لام کے جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو یہ اسم مکان ہوگا جس طرح مجلس بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ (الانعام: 60) یہاں مرجع سے مراد رجوع ہے۔

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۵۰ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۵۱ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

''اور انہوں نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور وہ سمجھ ہی نہ سکے (ہماری تدبیر کو)۔ تم (خود ہی) دیکھ لو کیا (ہولناک) انجام ہوا ان کے مکر کا۔ ہم نے برباد کر کے رکھ دیا انہیں اور ان کی ساری قوم کو پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث۔ بے شک اس میں عبرت ہے اس قوم کے لیے جو (کچھ) جانتی ہے اور ہم نے بچا لیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور (اپنے رب سے) ڈرتے رہتے تھے''۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ان کا مکر وہ تھا جو روایت بیان کی گئی ہے کہ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بتا دیا تھا کہ تین دنوں میں تم پر عذاب آ جائے گا۔ ان نو افراد نے اتفاق کیا اور قسم اٹھائی کہ وہ رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کے گھر جائیں گے اور آپ کو اور آپ کے اہل کو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے کہا: اگر وہ اپنی وعید میں جھوٹا ہے تو جس کا وہ مستحق ہے ہم نے اس پر واقع کر دیا ہے اگر وہ سچا ہے تو ہم نے اسے اپنے سے پہلے عذاب دے دیا اور اپنے نفوس کو شفا دے لی؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس رات فرشتے بھیجے انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کو بھر دیا۔ وہ نو افراد اپنی تلواریں سونتے ہوئے حضرت صالح کے گھر آئے فرشتوں نے انہیں پتھر مار کر ہلاک کر دیا وہ پتھر دیکھتے تھے اور جو پتھر مار رہا ہے اسے نہیں دیکھتے تھے۔ قتادہ نے کہا: وہ تیزی سے حضرت صالح علیہ السلام کی طرف نکلے ان پر ایک فرشتہ مسلط کر دیا گیا جس کے ہاتھ میں چٹان تھی تو اس نے ان سب کو قتل کر دیا۔ سدی نے کہا: وہ ایسی جگہ اترے جو نیچے سے کھوکھلی تھی تو وہ قطعہ زمین ان پر آ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے نیچے ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کے قریب چھپ گئے تو ان پر چٹان آ گری جس نے ان سب کو پیس دیا۔ یہ ان کا مکر تھا اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر یہ تھی کہ ان کو بدلہ دیا۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ چیخ کے ساتھ ان سب کو ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام کی ہلاکت حضرت جبریل امین کی چیخ سے ہوئی۔ ظاہر بات یہ ہے کہ سب کی ہلاکت ایک عذاب سے ہوئی پھر باقی چیخ یا ہدم سے ہلاک ہوئے۔ اعمش، حضرت حسن بصری، ابن ابی اسحاق، عاصم، حمزہ اور کسائی انا پڑھا کرتے تھے۔ ابن انباری نے کہا: اس مذہب کی بنا پر عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ پر وقف اچھا نہیں کیونکہ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ، کان کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ تو اسے محل رفع میں رکھے یہ عاقبہ کی اتباع میں ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ تو اسے محل نصب میں رکھے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ کسائی کے قول کے مطابق یہ محل جر میں ہوگا مراد ہوگا بانا دمرناهم، ولانا دمرناهم اسے نصب دینا اس اعتبار سے بھی جائز ہے کہ تو اسے کیف کے محل کے اعتبار سے نصب دے اس اعتبار سے مَكْرِهِمْ پر عطف کرنا صحیح نہ ہوگا ابن کثیر، نافع اور ابو عمرو نے اسے اِنا دمرناهم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس مذہب کی بنا پر مکرهم پر وقف اچھا نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے کہ تو عاقبہ کو نصب دے کہ کان کی خبر ہے اور انا یہ محل رفع میں ہو اس اعتبار سے یہ کان کا اسم ہو یہ بھی جائز ہے

کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا مضمر ہو مقصد عاقبہ کی وضاحت ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ھی أناد مرناھم۔ ابوحاتم نے کہا: حضرت ابی کی قراءت میں أنا دمرناھم ہے یہ فتحہ کی تصدیق ہے۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا خاویة میں عام قراءت نصب کے ساتھ ہے یہ حال ہے فراء اور نحاس کا نقطہ نظر ہے۔ وہ اپنے اہل سے خالی ہے، برباد ہے وہاں کوئی رہائش رکھنے والا نہیں۔ کسائی اور ابوعبیدہ نے کہا: خَاوِيَةً منصوب ہے ماقبل سے اسے قطع کیا گیا ہے معنی ہوگا فتلك بیوتم الخاویة، جب اس سے الف لام کو الگ کیا گیا تو حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (النحل: 52) عیسی بن عمر، نصر بن عاصم اور جحدری نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ تلك کی خبر ہے۔ بیوتھم یہ تلك کا بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بیوتھم عطف بیان ہو خاویة یہ تلك کی خبر ہو خاویة کا رفع اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، یعنی ھی خاویة یا یہ بیوتھم سے بدل ہو کیونکہ نکرہ کو معرفہ سے بدلا گیا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵۲ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور اس کے عذاب سے خوف کھاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت صالح علیہ السلام پر چار ہزار افراد ایمان لائے۔ باقی کو مقاتل کے قول کے مطابق چنے کے دانے کے برابر پھنسی نکلی وہ پہلے روز سرخ تھی پھر اگلے روز وہ زرد ہوگئی پھر تیسرے روز وہ سیاہ ہوگئی اونٹنی کی کونچیں بدھ کو کاٹی گئیں اور ان کی ہلاکت اتوار کو ہوئی۔ مقاتل نے کہا: وہ پھوڑے خالص زرد رنگ کے ہو گئے۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے ان کے درمیان چیخ ماری تو وہ سب ٹھنڈے ہو گئے۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام اور جو لوگ ان پر ایمان لائے تھے وہ حضر موت کی طرف نکلے جب حضر موت پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو اس کا نام حضر موت ہو گیا۔ ضحاک نے کہا: پھر چار ہزار افراد نے شہر بسایا جسے حاضورا کہا جاتا؛ جس کی وضاحت اصحاب رس میں گزر چکی ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۵۴ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝۵۵ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ
اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝۵۶ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ
اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۵۷ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ
الْمُنْذَرِيْنَ ۝۵۸

''اور یاد کرو لوط کو جب اس نے اپنی قوم کو فرمایا: کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔ کیا تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے (اپنی) بیویوں کو چھوڑ کر بلکہ تم تو بڑے نادان لوگ ہو۔ پس نہیں تھا آپ کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا: نکال دو آل لوط کو اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے

پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ سو ہم نے بچا لیا لوط کو اور ان کے اہل خانہ کو سوائے ان کی بیوی کے ہم نے فیصلہ کر دیا اس کے متعلق وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہوگی۔ اور ہم نے ان پر خوب پتھر برسائے پس تباہ کن پتھراؤ تھا (بارہا) ڈرائے جانے والوں پر"۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ ہم نے لوط علیہ السلام کو بھیجا یا لوط علیہ السلام کو یاد کرو۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ قوم سے مراد اہل سدوم ہیں۔ آپ نے اپنی قوم سے کہا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ، فاحشہ سے مراد ایسا فعل ہے جو قبیح اور شنیع ہو۔ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ جب کہ تم دیکھتے ہو کہ یہ بے حیائی ہے۔ یہ تمہارا سب سے بڑا گناہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم ایک دوسرے کے پاس جاتے ہو جب کہ تم اسے دیکھ رہے ہوتے ہو۔ وہ سرکشی اور تمرد کی وجہ سے پردہ پوشی بھی نہ کرتے تھے۔ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ اس کی قباحت اور شناعت کی زیادتی کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کیا۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ حرمت کے امر یا عقوبت کے امر سے ناواقف ہو۔ خلیل اور سیبویہ نے اَىِٕنَّكُمْ میں دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جہاں تک تحریر کا تعلق ہے تو اس میں قاعدہ یہ ہے کہ تمام صورتوں میں دو الف لکھے جائیں۔ کیونکہ یہ ہمزہ ہے جو کلام کے شروع میں ہے اور اس سے پہلے ہمزہ استفہام کا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ یہ مردوں کی دبر سے پاکیزہ بنتے ہیں۔ وہ یہ بات حضرت لوط علیہ السلام سے استہزاء کے طور پر کہا کرتے تھے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! انہوں نے بغیر کسی عیب کے ان پر عیب لگایا کہ یہ برے اعمال سے پاکیزہ بنتے ہیں۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِیْنَ عاصم نے اسے پڑھا قدرنا یعنی تخفیف کے ساتھ پڑھا معنی ایک ہی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: قدرت الشیء قدْرا و قدَرا و قدّرتہ۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ یہ أنذر سے مشتق ہے اس نے انذار کو قبول نہ کیا۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾
اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾

"فرمایئے: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور سلام ہو اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا (بتاؤ) کیا اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک بناتے ہیں۔ بھلا وہ کون ہے جس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور جس نے

اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی پھر ہم نے اگائے اس پانی سے خوش منظر باغات، تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت، کیا کوئی دوسرا خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہ راست سے پرے ہٹ رہے ہیں بھلا کس نے بنایا ہے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہریں اور بنا دیئے زمین کے لیے (پہاڑوں کے) لنگر اور بنا دی دو سمندروں کے درمیان آڑ، کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں''۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى فراء نے کہا: اہل معانی نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام سے کہا گیا ان کی ہلاکت پر الْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ اس بات میں علماء کی ایک جماعت نے فراء کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، یعنی سابقہ کافر امتوں کی ہلاکت پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو۔ نحاس نے کہا: یہ سب سے بہتر قول ہے۔ کیونکہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس میں جو کچھ ہے سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے سوائے اس کے جس میں معنی غیر کے لیے ہی صحیح ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم کہو: الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى یہاں عباد سے مراد آپ کی امت ہے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی معرفت اور طاعت کے لیے چن لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سفیان نے کہا: اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ان آیات کی تلاوت کریں جو اس کی وحدانیت، ہر شے پر اس کی قدرت اور اس کی حکمت پر براہین ہیں اور آپ آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے جو انبیاء اور چنے ہوئے ہیں ان پر سلام سے کریں اس میں تعلیم حسن ہے اور ادب جمیل پر آگاہی حاصل کرنا ہے دونوں کے ذکر سے برکت حاصل کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور دونوں کے مکان سے آگاہی حاصل کرنا ہے کہ جو سامعین کو القا کیا جا رہا ہے اسے قبول کیا جائے اور اس کی طرف توجہ کی جائے اور اسے ان کے دلوں کے ہاں ایسے مقام پر رکھا جائے جسے سننے والا پسند کرتا ہے۔

علماء، خطباء اور واعظین کا نسل در نسل یہ معمول چلا آ رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود پڑھتے ہیں جب بھی کسی فائدہ بخش علم کا ذکر کرنا ہو، نصیحت کرنی ہو یا خطبہ دینا ہو ان کے شروع میں یہ عمل کیا جاتا ہے۔ بعد کے لوگوں نے ان کی پیروی کی اور اپنی کتب کے اوائل میں یہ چیزیں ذکر کرتے ہیں خواہ وہ فتوحات سے تعلق رکھتی ہوں یا ایسے حادثات کے متعلق ہوں جس کی شان ہو۔

الَّذِيْنَ اصْطَفٰى جس کو اس نے چن لیا اپنی رسالت کے لیے، وہ انبیاء علیہم السلام ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ (الصافات) آٰللّٰهُ خَيْرٌ ابو حاتم نے اسے دو ہمزوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ نحاس نے کہا: ہم کسی کو نہیں جانتے کہ کسی نے اس کی موافقت کی ہو؟ یہ مدہ استفہام اور خبر کے درمیان فرق کرنے کے لیے آتی ہے یہ توقیف کا الف ہے۔ خَيْرٌ یہاں افضل منك کے معنی میں نہیں ہے، یہ شاعر کے اس قول کی مثل ہے:

أتهجوه ولست له بكفء فشركما لخيركما الفداء

کیا تو اس کی ہجو کرتا ہے جب کہ تو اس کا ہم پلہ نہیں پس تم دونوں میں سے برا تم میں سے اچھے پر قربان ہے۔

اس کا معنی ہے تم میں سے جس میں شر ہے وہ اس پر قربان ہے جس میں خیر ہے۔ یہاں من کا معنی لینا جائز نہیں کیونکہ جب تو نے کہا: فلان شر من فلان تو دونوں میں سے ایک میں شر ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے بھلائی اس میں ہے یا اس میں ہے جس کو تم عبادت میں شریک کرتے ہو۔ سیبویہ نے حکایت بیان کی ہے السعادة أحب إليك أم الشقاء، تجھے سعادت محبوب ہے یا بدبختی؛ جب کہ وہ جانتا ہے کہ سعادت اسے زیادہ محبوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اسم تفضیل کے باب سے ہے۔ معنی ہے اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر ہے یا وہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو، یعنی اس کا ثواب بہتر ہے یا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کا عقاب بہتر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں یہ فرمایا وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بتوں کی عبادت میں بہتری ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے اعتقاد کے مطابق خطاب فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لفظ استفہام کا ہے اور اس کا معنی خبریہ ہے۔ ابو عمرو، عاصم اور یعقوب نے اسے پڑھا یشرکون، یاء کے ساتھ تو اس وقت یہ خبر ہوگی۔ باقی قراء نے خطاب کا اعتبار کرتے ہوئے تاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ نبی کریم ﷺ جب یہ آیت پڑھتے تو کہتے: بل الله خیر و أبقى و أجل و أكرم۔

**اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ** ابو حاتم نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے آلهتكم خير ام من خلق السموات والارض یہ بحث پہلے گزر چکی ہے معنی ہے جو ان چیزوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ عبادت بہتر ہے یا اس ذات کی عبادت بہتر ہے جس نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا؟ تو یہ پہلے معنی کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس میں ان کے لیے توبیخ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ان کے معبودوں کے عجز پر تنبیہ ہے۔

**فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ**، حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے اردگرد دیوار ہو۔ بَهْجَةٍ سے مراد خوبصورت منظر ہے۔ فراء نے کہا: حدیقہ سے مراد وہ باغ ہے دیوار جس کی حفاظت کرے اگر دیوار نہ ہو تو اس کو بستان کہتے ہیں۔ وہ حدیقہ نہیں ہے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: حدائق سے مراد کھجور کے درخت ہیں جو خوبصورت منظر والے ہوں۔ بَهْجَةٍ سے مراد زینت اور حسن ہے جو بھی اسے دیکھتا ہے خوش ہو جاتا ہے۔

**مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا**، ما نافیہ ہے اس کا معنی فعل سے انہیں روکنا ہے یعنی بشر کو زیبا نہیں، یہ ان کے لیے تیار نہیں ہوتا، یہ ان کی قدرت کے تحت داخل نہیں کہ وہ اس کے درخت کو اگائیں کیونکہ وہ اس کی مثل سے عاجز ہیں کیونکہ اس سے مراد کسی شے کو عدم سے وجود کی طرف نکالنا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ کسی شے کی تصویر بنانا منع ہے، خواہ اس کی روح ہو یا نہ ہو، یہ مجاہد کا قول ہے اس کی تائید نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی کرتا ہے: قال الله عزوجل و من أظلم ممن ذهب يخلق خلقا كخلقي فليخلقوا ذرة او ليخلقوا حبة او ليخلقوا شعيرة (1)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس آدمی سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو میری تخلیق

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم صورة الحیوان و تحریم اتخاذ ما فیه صورة، جلد 2، صفحہ 202

جیسی تخلیق بناتا ہے پس چاہے وہ ایک چیونٹی کو بنائیں، دانہ بنائیں یا جو بنائیں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' پھر اس حدیث کو ذکر کیا۔ تو یہ ارشاد مذمت، دھمکی اور تقبیح میں ہر اس فرد کو عام ہے جو کہ ایسی شے کی تصویر بناتا ہے جسے اللہ تعالیٰ بنائے اور اس شے کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشابہت اختیار کرے اللہ تعالیٰ جس کی تخلیق میں منفرد ہے۔ یہ کلام واضح ہے۔ جمہور بھی اس طرف گئے ہیں کہ اس چیز کی تصویر بنانا جائز ہے جس میں روح نہ ہو۔ یہ جائز ہے اور اس کے ساتھ روزی کمانا بھی جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شخص سے فرمایا تھا جس نے آپ سے تصویر بنانے کے بارے میں پوچھا تھا: اگر تیرے لیے ان تصویروں کے بنانے کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو درختوں اور ایسی چیز کی تصویریں بناؤ جن میں روح نہیں۔ امام مسلم نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ منع کرنا بہتر ہے اس روایت کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ سورۂ سبا میں اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پھر توبیخ کے طریقہ پر کہا: ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود ہے جو اس امر پر اس کی مدد کرتا ہے؟ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ بلکہ وہ ایسی قوم ہیں جو غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حق اور میانہ روی سے اعراض کرتے ہیں یعنی وہ کفر کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الہ، مع کے ساتھ مرفوع ہے تقدیر کلام یہ ہے أمع اللہ ویلکم إلہ۔ مَّعَ اللّٰهِ پر وقف کرنا اچھا ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا قرار، مستقر کے معنی میں ہے وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا، خلال کا معنی وسط ہے جس طرح ارشاد باری تعالیٰ: فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ (الکہف) وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ اور اس سے مراد پہاڑ ہیں جو زمین کو روکے رکھتے ہیں اور حرمت سے منع کرتے ہیں۔ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا اس کی قدرت سے مانع تاکہ میٹھا، نمکین سے نہ مل جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حاجز کا معنی سلطان ہے، یعنی اپنی قدرت سے سلطان بنا دیا نہ یہ دوسرے کو تبدیل کرتا ہے نہ دوسرا پہلے کو تبدیل کرتا ہے۔ حجز کا معنی روکنا ہے ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ جب یہ ثابت ہے کہ اس پر کوئی غیر قادر نہیں تو وہ ان چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو نفع و نقصان نہیں دیتے؟ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی گویا وہ اللہ تعالیٰ سے جاہل ہیں وہ اسے نہیں جانتے جس کے لیے وحدانیت ثابت ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ
مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ
یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾
اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۶۴﴾

''بھلا کون قبول کرتا ہے ایک بے قرار کی فریاد جب وہ اسے پکارتا ہے اور (کون) دور کرتا ہے تکلیف کو اور

(کس نے) بنایا ہے تمہیں زمین میں (اگلوں کا) خلیفہ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم بہت کم غور و فکر کرتے ہو۔ بھلا کون راہ دکھاتا ہے تمہیں بر و بحر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی (باران) رحمت سے پہلے کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ برتر ہے اللہ تعالیٰ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں۔ بھلا کون ہے جو آغاز کرتا ہے آفرنیش کا پھر دوبارہ پیدا کرے گا اسے اور کون ہے جو رزق دیتا ہے تمہیں آسمان سے اور زمین سے؟ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ فرمایئے: (اے مشرکو!) پیش کرو اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد سخت ضرورت والا ہے۔ سدی نے کہا: جس کے پاس کوئی حیلہ اور قوت نہیں۔ ذوالنون مصری نے کہا: جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا سے تعلقات ختم کر دیئے ہوں۔ ابوجعفر اور ابوعثمان نیشاپوری نے کہا: اس سے مراد مفلس ہے۔ سہیل بن عبد اللہ نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے تو اس کے پاس طاعت سے کوئی وسیلہ نہ ہو جن کو وہ پیش کرے ایک آدمی مالک بن دینار کے پاس آیا اس نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میرے لیے دعا کرنے میں مضطر ہو فرمایا: تو پھر اس سے سوال کر کیونکہ مضطر جب دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

وإنِّي لأدعُو اللهَ والأمرُ ضَيِّقٌ ... عليَّ فما ينفكُّ أن يتفرَّجَا
وربَّ أخٍ سُدَّتْ عليه وُجوهُهُ ... أصابَ لَها لما دعا اللهَ مَخرَجَا

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں جب کہ معاملہ مجھ پر تنگ ہے وہ چھٹنے والا نہیں۔ کتنے ہی بھائی ہیں جن پر راستے بند کر دیئے گئے جب اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس نے مخرج پالیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مسند ابی داؤد طیالسی میں ابوبکرہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور کی دعا کے بارے میں فرمایا: "اے اللہ! تیری رحمت کی میں امید کرتا ہوں مجھے ایک لحہ بھی میرے سپرد نہ فرما اور میرے تمام معاملات کی اصلاح فرما تیرے سوا کوئی معبود نہیں" (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مجبور آدمی جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کرنے کی ضمانت اٹھائی ہے اپنے بارے میں اس امر کی خبر دی ہے اس میں سبب یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں پناہ کی ضرورت اخلاص سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور غیر سے قلبی لگاؤ کے ختم ہونے میں جنم لیتی ہے۔ اخلاص کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا موقع اور شان ہوتی ہے۔ وہ مومن سے پایا جائے یا کافر سے، اطاعت شعار سے ہو یا فاجر سے ہو؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (2): حَتّٰۤی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ ۚ وَ

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ما یقول الرجل اذا اصبح، جلد 2، صفحہ 338

2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 623

جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝ (یونس) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ۝ (العنکبوت) ضرورت اور اخلاص کے وقت انہیں جواب دیا جب کہ اسے علم تھا کہ وہ شرک وکفر کی طرف لوٹ چلیں گے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (العنکبوت: 65) اللہ تعالیٰ مضطر کی دعا کو قبول کرتا ہے جب وہ اضطرار اور اخلاص کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''تین دعائیں قبول ہوتی ہیں ان میں کوئی شک نہیں مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور والد جب اپنے بیٹے کے خلاف دعا کرے''۔ صاحب شہاب نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کے علاقہ کی طرف بھیجا: فرمایا ''مظلوم کی بددعا سے بچو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب نہیں''۔ شہاب کی کتاب میں ہے مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اسے بادل پر سوار کیا جاتا ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''میں تیری ضرور مدد کروں گا اگرچہ کچھ عرصہ بعد''۔ یہ روایت بھی صحیح ہے آجری حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت نقل کرتے ہیں: ''میں اسے واپس نہیں کرتا اگرچہ وہ کافر کے منہ سے نکلے'' (2)۔ مظلوم کی دعا کو قبول کرتا ہے کیونکہ اس کو اپنی ضرورت کے ساتھ اخلاص ہوتا ہے یہ سب کچھ اللہ کے کرم کے تقاضا کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے اخلاص کو قبول کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے اگرچہ کافر ہو اسی طرح اگر وہ اپنے دین میں فاجر ہو فاجر کے فجور اور کافر کے کفر سے اس کے آقا (اللہ) کی مملکت میں کوئی نقص اور ضعف واقع نہیں ہوتا اور مضطر کے لیے جو وہ دعا قبول کرتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہوتا مظلوم کی دعا اس کے ظالم کے خلاف کیسے قبول ہوتی ہے اس کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے چاہے تو اسے مغلوب کر دیتا ہے، اس سے بدلہ لیتا ہے یا اس پر کوئی اور ظالم مسلط کر دیتا ہے جو اس پر ظلم کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا (الانعام: 129) اس کی دعا کے جلد قبول کرنے کو یوں مؤکد کیا۔ تحمل علی الغمام اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو معین فرماتا ہے کہ وہ مظلوم کی دعا کو لیں، اسے بادل پر رکھیں اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہو جائیں آسمان دعاؤں کا قبلہ ہے تاکہ تمام ملائکہ اسے دیکھ لیں۔ اس سے مظلوم کی معاونت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دعا کی قبولیت فرشتوں کی جانب سے اس کی سفارش ہوتی ہے۔ مقصد اس پر رحم کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ظلم سے ڈرانا مقصود ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی، اس کی معصیت اور اس کے امر کی مخالفت ہے جب اس نے اپنے نبی کی زبان سے فرمایا یہ حدیث صحیح مسلم اور دوسری کتب میں ہے۔ یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا (3)، اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کر لیا ہے میں نے اسے تمہارے درمیان حرام کر دیا ہے تم باہم ظلم نہ کیا کرو۔ مظلوم مجبور ہے، مسافر اس کے قریب ہے کیونکہ وہ اپنے اہل اور

---

1۔ الترغیب والترہیب، باب الترھیب من الظلم و دعاء المظلوم، جلد 3، صفحہ 188 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 319

وطن سے الگ تھلگ ہوتا ہے، دوست اور حمایتی سے الگ تھلگ ہوتا ہے اس کی اجنبیت کی وجہ سے اس کا دل کسی مددگار سے سکون نہیں پاتا۔ مولیٰ کی بارگاہ میں اس کی ضرورت سچی ہوتی ہے اور پناہ لینے میں وہ اخلاص کا مظاہرہ کرتا ہے مضطر آدمی جب دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔ اسی طرح والد جب اپنے بیٹے کے بارے میں بددعا کرتا ہے وہ بددعا اس سے صادر نہیں ہوتی جب کہ والد کی اپنی اولاد پر شفقت و مہربانی معلوم و معروف ہے مگر اس وقت وہ بددعا کرتا ہے جب وہ کامل طور پر عاجز ہو جائے اور اس کی ضرورت میں صداقت ہو اور اپنے بیٹے کی طرف سے نیکی سے بالکل مایوس ہو جائے، جب کہ ساتھ ہی ساتھ اس کی طرف سے اذیت ہو پس اس صورت میں اس کی دعا کو جلد قبول کرنا ہی مناسب و موزوں ہے۔

وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ سوء کا معنی تکلیف ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی ظلم ہے۔ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ، خلفاء سے مراد مکین ہیں وہ ایک قوم کو ہلاک فرما دے اور دوسری کو پیدا فرما دے۔ کتاب نقاش میں ہے یعنی وہ تمہاری اولادوں کو تمہارا نائب بناتا ہے۔ کلبی نے کہا: کفار کا نائب بناتا ہے۔ مومن ان کی زمینوں میں جا کر فروکش ہوتے ہیں اور ان کے کفر کے بعد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ یہ توبیخ کے طریقہ پر کہا گویا فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے تم ہلاک ہو۔ اِلٰهٌ یہ مَعَ کے ساتھ مرفوع ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ اضمار کے ساتھ مرفوع ہو تقدیر کلام یہ ہوگی أإلہ مع اللہ یفعل ذلک فتعبدوہ، مَّعَ اللّٰهِ پر وقف اچھا ہے۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ابوعمرو، ہشام اور یعقوب نے یذ کرون یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (النحل) وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝ (یونس) ماقبل اور مابعد کے بارے میں خبر دی۔ ابوحاکم نے اسے اختیار کیا ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے: ویجعلکم خلفاء الارض۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ تمہاری سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے۔ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ جب تم شہروں کی طرف سفر کرتے ہو تو تم رات اور دن میں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا: خشکی کے جنگلوں کو بنایا کہ ان کے راستوں کی کوئی علامت نہیں اور سمندر کی موجیں گویا وہ تاریکیاں ہیں کیونکہ ان میں کوئی علامت نہیں ہوتی جس کی مدد سے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔

وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ، بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ سے مراد بارش سے پہلے۔ اس پر اہل تاویل کا اتفاق ہے ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ جو ایسا کرتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ ان بتوں سے بلند و بالا ہے جن کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہی خالق و رازق ہے۔ پس ان پر اعادہ کو لازم کیا۔ جب وہ ابتدا پر قادر ہے تو بدیہی بات ہے کہ وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے دوبارہ اٹھانا اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے جو پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور دوبارہ اٹھائے گا۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ کوئی دلیل لاؤ کہ واقعی میرا کوئی شریک ہے یا کوئی ایسی دلیل لاؤ جو اس امر کو ثابت کرے کہ ان اشیاء میں سے کسی

شے کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے بھی پیدا کیا ہے۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ اگر تم سچے ہو۔

قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ‌ ؕ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ۞ بَلِ ادّٰرَكَ عِلۡمُهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ‌ ۚ بَلۡ هُمۡ فِىۡ شَكٍّ مِّنۡهَا‌ ۚ بَلۡ هُمۡ مِّنۡهَا عَمُوۡنَ ۞

"آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور وہ (یہ بھی) نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا بلکہ گم ہو گیا ان کا علم آخرت کے متعلق بلکہ وہ تو اس کے بارے میں شک میں ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں"۔

قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ بعض سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب کو مخلوق سے مخفی رکھا کوئی اس پر مطلع (1) نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت کریمہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے برپا ہونے کے بارے میں سوال کیا۔ مَنۡ محل رفع میں ہے معنی ہے کہہ دیجئے: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا۔ کیونکہ لفظ اللہ اسم جلالت مَنۡ کا بدل ہے، یہ زجاج اور فراء کا قول ہے۔ اِلَّا کے مابعد کو رفع دیا کیونکہ اس سے ماقبل کلام منفی ہے جس طرح اس کا قول ہے ما ذهب احد الا ابوك معنی ایک ہی ہے۔ زجاج نے کہا: جس نے اس کو نصب دی ہے اس نے استثناء کے طور پر نصب دی ہے۔ نحاس نے کہا: جو آدمی منجم کی تصدیق کرتا ہے میں نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے سنا کہا: مجھے خوف آتا ہے کہ وہ آیت کی وجہ سے کفر کا ارتکاب کر رہا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بحث سورۃ الانعام میں مفصل گزر چکی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کہ کل کیا ہوگا تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حجاج کے پاس ایک منجم آیا حجاج نے اسے روک لیا پھر کنکریاں لیں اور انہیں گنا پھر پوچھا: میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ منجم نے حساب لگایا پھر کہا: اتنی۔ تو درست جواب دیا پھر اسے روک لیا کنکریاں لیں انہیں شمار نہ کیا پوچھا: میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ اس نے حساب لگایا تو غلطی کی پھر حساب لگایا تو غلطی کی پھر اس نے کہا: اے امیر! میرا گمان ہے تو عدد کو نہیں جانتا۔ حجاج نے کہا: نہیں۔ نجومی نے کہا: تو پھر میں صحیح جواب نہیں دے سکتا۔ اس نے کہا: وجہ کیا ہے؟ نجومی نے کہا: اگر تو انہیں شمار کر لیتا تو یہ غیب کی حد سے نکل جاتا انہیں تو نے شمار نہیں کیا تو یہ غیب ہے قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ یہ بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلۡمُهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ یہ اکثر قراء کی قراءت ہے؛ ان میں عاصم، شیبہ، نافع، یحییٰ بن وثاب، اعمش، حمزہ اور کسائی

1۔ بے شمار غیب کے امور ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے چنے ہوئے بندوں کو آگاہ کیا تو یہ مراد درست ہوگی کہ اس کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

ہے۔ ابو جعفر، ابن کثیر، ابو عمرو اور حمید نے بل اَدْرَكَ قراءت کی ہے یہ ادراک سے مشتق ہے۔ عطا بن یسار، اس کے بھائی سلیمان بن یسار اور اعمش نے اسے بل ادَّرَكَ، ہمزہ کے بغیر اور مشدد پڑھا ہے۔ ابن محیصن نے بل أَادَّرَكَ استفہام کے طریقہ پر قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بلی قراءت کی یعنی یاء کو ثابت رکھا۔ ادارك ہمزہ قطعی ہے دال مشدد ہے اس کے بعد الف ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اسناد اسناد صحیح ہے یہ شعبہ کی حدیث سے ہے جسے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک مرفوع نقل کرتے ہیں۔ ہارون قاری نے روایت نقل کی ہے: ابی کی قراءت بل تدارك علمهم ہے۔ ثعلبی نے حکایت کی ہے ابی کی قراءت میں أم تدارك ہے عرب ام کی جگہ بل اور بل کی جگہ امر کھتے ہیں جب کلام کے شروع میں استفہام ہو۔ جس طرح شاعر کا قول ہے:

فوالله لا أدری أسلمی تغوّلت أم القول أم كل إلى حبيب

یہاں ام کل، بل کل کے معنی میں ہے۔ نحاس نے کہا: پہلی قراءت اور آخری قراءت کا معنی ایک ہی ہے۔ کیونکہ اذراك کا اصل تدارك ہے دال کو تاء میں ادغام کیا اور الف وصل کو لائے۔ اس کے معنی میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے بلکہ ان کا علم آخرت میں مکمل ہو گیا کیونکہ انہوں نے جب ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا تو اس کے متعلق ان کا علم مکمل ہو گیا۔ دوسرا قول یہ ہے معنی ہے آخرت کے بارے میں ان کا علم آج پے در پے ہے۔ انہوں نے کہا: وہ ہو گی اور انہوں نے کہا: نہیں ہو گی۔ اس کی دوسری قراءت میں بھی دو معنی ہیں (۱) اس کا معنی ہے آخرت میں کامل ہو گیا؛ یہ پہلے کی مثل ہے۔ مجاہد نے کہا: آخرت کے بارے میں ان کا علم احاطہ کرنے والا ہے، وہ اسے جانتے ہیں جب وہ اسے دیکھیں گے اس وقت اس کا علم انہیں کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ وہ دنیا میں جھٹلانے والے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ انکار کے طریقہ پر ہے؛ یہ ابو اسحاق کا مذہب ہے۔ اس قول کی صحت پر یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اس کے بعد بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ یعنی ان کا علم آخرت کے علم کا احاطہ کرنے والا نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ ان کا آخرت کے بارے میں علم کم ہو گیا اور غائب ہو گیا ان کا اس میں کوئی علم نہیں۔ تیسری قراءت بل اذرك یہ بل اذارك کے معنی میں ہے۔ بعض اوقات افتعل اور تفاعل ایک ہی معنی میں ہوتے ہیں اس وجہ سے اذدجوا کا لفظ صحیح ہوتا ہے جب وہ تزاوجوا کے معنی میں ہو۔ چوتھی قراءت: اس میں ایک ہی قول ہے: اس میں انکار کا معنی پایا جاتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: أأنا قاتلتك؟ تو معنی ہو گا اس نے ادراک نہ کیا؛ اسی کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت لوٹتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بلی اذارك علمهم فی الآخرة یہ لم یدرك کے معنی میں ہے۔ فراء نے کہا: یہ اچھا قول ہے گویا بعث کے انکار والوں کی طرف استہزاء کو متوجہ کیا۔ جس طرح تیرا ایسے آدمی کے بارے میں قول جس کو تو جھٹلاتا ہے: بلی لعمری قد أدركت السَّلَفَ فأنت تروی مالا أروی کیوں نہیں تو نے اسلاف کو پایا تو روایت کرتا ہے جو میں روایت نہیں کرتا جب کہ تو اس کو جھٹلا رہا ہوتا ہے۔ ساتویں قراءت: بل اذرك ہے لام پر فتحہ ہے فتحہ کی طرف۔ اس لیے عدول کیا ہے کیونکہ یہ خفیف ترین حرکت ہے۔ قطرب سے اس کی مثل قُمِ الَّيْلَ (المزمل: 2) میں مروی ہے، کیونکہ اس میں فتحہ کی طرف عدول کیا گیا ہے۔ اسی طرح وَبِعَ الثوب وغیرہ میں ہے۔ زمخشری نے کتاب

میں کہا: بل أأدَّرَكَ دو ہمزوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے اسی طرح بل آادّرك درمیان میں الف ہے بلی أأدرك، أمْ تَدَارَكَ، أمْ أَدْرَكَ یہ بارہ قراءتیں ہیں۔ پھر قراءتوں کی صورتوں کی علتیں بیان کیں۔ کہا: اگر تو کہے بل أأدرك استفہام کے ساتھ قراءت کی کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا: یہ استفہام انکار کے طریقہ پر ہے ان کے علم کے ادراک کی وجہ سے۔ اسی طرح جس نے پڑھا امر ادرك اور أمر تدارك کیونکہ یہ ام ہے جو بل اور ہمزہ کے معنی میں ہے۔ جس نے پڑھا بلی أأدرك استفہام کے طریقہ پر تو معنی ہوگا کیوں نہیں وہ شعور رکھتے ہیں کہ کب ان کو اٹھایا جائے گا؟ اس کے وقوع کے وقت ان کے علم کا انکار کیا۔ جب اس کے واقع ہونے کے وقت اس کے علم کا انکار کیا تو اس کے وقوع کے وقت کا شعور انہیں حاصل نہ ہوا کیونکہ کسی ہونے والی چیز کے وقت کا علم اس چیز کے ہونے کے علم کے تابع ہے۔ فِی الْاٰخِرَةِ یعنی آخرت کے متعلق۔

**بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا** یعنی دنیا میں اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں: **بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ** بلکہ وہ اس کے بارے میں دل سے اندھے ہیں۔ اس کا واحد عمو ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عم ہے اصل میں عمیون تھا اجتماع ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کیا گیا حرکت کے ثقیل ہونے کی وجہ سے حرکت دینا جائز نہیں۔

**وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۞ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۞**

''اور کفار کہنے لگے: کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا ہمیں (پھر) نکالا جائے گا۔ بے شک قیامت کے آنے کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا اور ہمارے باپ دادا سے بھی اس سے پہلے نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت افسانے''۔

**وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا** یعنی مشرکین مکہ۔ **ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ** نافع یہاں اور سورۂ عنکبوت میں اسی طرح قراءت کیا کرتے تھے۔ ابو عمرو نے دونوں استفہاموں کے ساتھ پڑھا ہے مگر ہمزہ میں تخفیف کی ہے۔ عاصم اور حمزہ نے دو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے مگر دونوں ہمزہ کو ثابت رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ دونوں صورتوں میں جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ سب ایک ہی ہے۔ کسائی، ابن عامر، رویس اور یعقوب نے ائذا دو ہمزوں کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اِننا دو نونوں کے ساتھ اس صورت میں خبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں دو استفہاموں کے ساتھ ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: قراءت ،إذا کنا ترابا و آباؤنا ائنا لمخرجون خط کی موافقت بہت اچھی ہے۔ ابو حاتم نے اس میں اس کے ساتھ معارضہ کیا ہے اور کہا یہ اس کے کلام کا معنی ہے۔ اذا استفہام نہیں آئنا استفہام ہے اس میں ان ہے تو یہ کیسے جائز ہے کہ وہ اس میں عمل کرے جو اس سے قبل استفہام کی حیز میں ہے؟ جب اس میں یہ استفہام ہو تو پھر یہ بہت ہی بعید صورتحال ہوگی جب اس کے بارے میں سوال ہو تو یہ اس وجہ سے مشکل ہوگا جو ہم نے ذکر کیا۔

ابو جعفر نے کہا: میں نے محمد بن ولید کو کہتے ہوئے سنا ہم نے ابو العباس سے قرآن کی آیت میں موجود ایک مشکل کے بارے میں سوال کیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ یُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ**

مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۝ (سبا) کہا اذا میں ینبئکم کا عمل محال ہے، کیونکہ وہ اس وقت انہیں آگاہ کرے گا۔ اگر اس میں ان کا مابعد اس میں عمل کرے تو معنی صحیح ہوگا اور لغت عرب میں غلط ہے کہ ان کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل کرے یہ واضح سوال ہے۔ میری رائے تھی کہ اسے اس سورت میں ذکر کیا جائے جہاں یہ آیت ہے جہاں تک ابو عبید کا تعلق ہے تو وہ نافع کی قراءت کی طرف مائل ہوا ہے اور جنہوں نے دونوں استفہاموں کو جمع کیا ہے ان کا رد کیا ہے اور الله تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران: 144) اور الله تعالیٰ کے فرمان: اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۝ (الانبیاء) سے استدلال کیا ہے؛ یہ ابو عمرو، عاصم، حمزہ، طلحہ اور اعرج کا رد ہے۔ اس سے کوئی چیز لازم نہیں آتی اور آیت میں جو کچھ آیا ہے اس کے مشابہ بھی کوئی چیز نہیں دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ شرط اور اس کا جواب دونوں ایک شے کے قائم مقام ہیں۔ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ کا معنی ہے أفان مِتَّ خلدوا اس کے مثل أزید منطلق ہے یہ نہیں کہا جاتا أزیدا منطلق کیونکہ یہ دونوں ایک چیز کے قائم مقام ہیں آیت اس طرح نہیں کیونکہ دوسرا جملہ مستقل جملہ ہے۔ اس میں استفہام درست ہے اور پہلا جملہ بھی مستقل کلام ہے اس میں بھی استفہام درست ہے۔ جس نے دوسرے سے استفہام کو حذف کیا اور پہلے میں ثابت رکھا تو اس نے پڑھا ائذا کنا ترابا و اباؤنا اننا دوسرے سے اسے حذف کر دیا کیونکہ کلام میں اس پر دلیل ہے جو انکار کے معنی میں ہے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ سورۂ مومنون میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ انبیا تحذیر میں مبالغہ کے لیے بعث کے معاملہ کو قریب کر کے پیش کرتے تھے ہر وہ چیز جو آنے والی ہو وہ قریب ہی ہوا کرتی ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۝ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

”آپ فرمائیے: سیر و سیاحت کرو زمین میں، پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ کیسا ہولناک انجام ہوا مجرموں کا (اے محبوب!) آپ غمزدہ نہ ہوں ان (کے رویہ) پر اور دل تنگ نہ ہوا کریں ان کے مکر و فریب سے۔ اور وہ پوچھتے ہیں کب (پورا ہوگا) یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو“۔

ان کافروں سے کہو: شام، حجاز اور یمن کے علاقوں میں گھومو، پھرو! اپنے دل اور آنکھوں سے دیکھو جو لوگ رسولوں کو جھٹلاتے ہیں ان کا انجام کیسے ہوا۔ اگر کفار مکہ ایمان نہیں لاتے تو غمگین نہ ہوں اور جو وہ کرتے ہیں ان پر تنگ دل نہ ہوں۔ یہ استہزاء کرنے والوں کے حق میں آیت نازل ہوئی جنہوں نے مکہ مکرمہ کے عذاب کے بارے میں قسم اٹھائی تھی۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اسے ضِیق کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ سورۂ نحل کے آخر میں بحث گزر چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں: وہ کون سا وقت ہے جب ہم پر عذاب آئے گا کیونکہ ہم نے جھٹلایا ہے اگر تم سچے ہو؟

قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾

''آپ فرمائیے: قریب ہے کہ تمہارے پیچھے آ گیا ہو اس عذاب کا کچھ حصہ جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔ اور بے شک آپ کا رب بہت فضل (وکرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔ اور یقیناً آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور نہیں کوئی پوشیدہ چیز آسمان اور زمین میں مگر اس کا بیان کتاب مبین میں موجود ہے''۔

قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ تمہارے قریب آ گیا ہے بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ مراد عذاب ہے۔ عذاب قریب آ گیا ہے: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ ردفہ سے مشتق ہے جب وہ اس کی پیروی کرے اور اس کے پیچھے آئے۔ لام داخل ہوا ہے کیونکہ معنی ہے اقترب لهم و دنالکم یا یہ مصدر کے متعلق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے معکم تمہارے ساتھ۔ ابن شجرہ نے کہا: معنی ہے تبعکم اس سے ردف المرأة ہے عورت کا پٹھا کیونکہ یہ اس کا تابع ہوتا ہے۔ اس معنی میں ابوذ ؤیب کا قول ہے:

عاد السوادُ بياضاً فى مفارِقهِ لا مَرحبًا ببياض الشَّيْبِ إذ رَدِفَا

سیاہی اس کی مانگ میں سفیدی کی شکل میں لوٹ آئی بڑھاپے کی سفیدی کو کوئی خوش آمدید نہ ہو جب وہ اسے بعد میں لاحق ہو۔

جوہری نے کہا: وأردفه امره یہ ردفہ میں ایک لغت ہے جس طرح تبعه واتبعه دونوں کا معنی ایک ہے۔ خزیمہ بن مالک نہدی نے کہا:

إذا الجوزاءُ أردفتِ الثُّريَا ظَننتُ بآل فاطمةَ الظُّنونَا

جب جوزاء ستارہ ثریا کو پیچھے سے آ کر ملا تو میں آل فاطمہ کے بارے میں گمانات کا شکار ہو گیا۔

یہاں فاطمہ بنت یذکر بن عنزہ مراد ہے جو قارظین میں سے ایک تھا۔ فراء نے کہا: رَدِفَ لَكُمْ تمہارے قریب ہو گیا۔ اسی وجہ سے کہا: لَكُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ردفه اور ردف له دونوں ایک معنی میں ہیں لام تاکید کے لیے زائد ہے؛ فراء سے بھی یہ قول منقول ہے جس طرح تو کہتا ہے: نقدته، نقدت له، كلته، وزنته، كلت له، وزنت له اس کی مثل دوسرے افعال ہیں۔ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ مراد عذاب ہے جس کی تم جلدی مچاتے ہو یہ یوم بدر کو واقع ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد عذاب قبر ہے۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وہ سزا میں تاخیر کرتا ہے اور رزق میں فراخی پیدا کرتا ہے، اس پر فضل فرمانے والا ہے۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ وہ اس کے فضل اور نعمتوں کا شکر بجا نہیں لاتے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ان کے سینے جس کو چھپائے ہوئے ہیں تیرا رب اسے جانتا ہے

اور جن امور کو وہ ظاہر کرتے ہیں اسے بھی جانتا ہے۔ ابن محیصن اور حمید نے ما تکنُّ پڑھا ہے یہ کننت الشیء سے مشتق ہے جب تو اسے چھپائے۔ قصص میں ہے تقدیر کلام ہے تکن صدورھم علیہ گویا سینوں میں جو چیز پوشیدہ ہے وہ باقی ماندہ جسم کی طرح ہے جس نے تُکِنّ پڑھا جب کہ یہی قراءت معروف ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اکننت الشیئ، جب تو اسے اپنے دل میں چھپائے۔

وَ مَا مِنْ غَآىِٕبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ حضرت حسن بصری نے کہا: یہاں غائبہ سے مراد قیامت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آسمان اور زمین کے عذاب میں سے جو ان سے غائب ہے وہ مراد ہے؛ نقاش نے یہ بیان کیا ہے۔ ابن شجرہ نے کہا: غائبہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق سے پوشیدہ اور غائب رکھا ہے یہ عام ہے۔ غائبہ کے آخر میں ھاء داخل ہے یہ جمع کی طرف اشارہ ہے تو یہ لوگ جسے پوشیدہ رکھتے ہیں یا اس کا اظہار کرتے ہیں وہ کیسے اس پر مخفی ہوگا؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر شے جسے ام الکتاب میں ثبت کیا ہے وہ اسے اجل مؤجل کے لیے نکالتا ہے۔ جس عذاب کی وہ جلدی مچاتے ہیں وہ بھی اجل مضروب ہے وہ وقت نہ پہلے ہو سکتا ہے نہ پیچھے ہو سکتا ہے۔ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا اس کو اس میں ثبت فرما دیا تاکہ ملائکہ میں سے جس کے بارے میں چاہتا ہے اس آگاہ کرے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَ مَاۤ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

”بلاشبہ یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اکثر ان امور (کی حقیقت) کو جن میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں اور بلاشبہ یہ قرآن سراپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے مومنین کے لیے۔ یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان اپنے حکم سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا، سو آپ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر۔ بے شک آپ روشن حق پر ہیں۔ بے شک آپ نہیں سنا سکتے مردوں کو اور نہ آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو اپنی پکار جب وہ بھاگے جا رہے ہوں پیٹھ پھیرے ہوئے۔ اور نہیں آپ ہدایت دینے والے (دل کے) اندھوں کو ان کی گمراہی سے نہیں سناتے آپ بجز ان کے جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیتوں پر پھر وہ فرمانبردار بن جاتے ہیں“۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اس لیے کیونکہ انہوں نے بہت سی اشیاء میں اختلاف کیا یہاں تک کہ انہوں نے ایک دوسرے کو لعن طعن کیا معنی ہے یہ قرآن ان کے لیے ان چیزوں کو بیان فرماتا ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا اگر ان کا اس کے بدلہ میں مواخذہ کیا جائے۔ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں تورات وانجیل میں

سے جن میں انہوں نے تحریف کی اور ان کی کتابوں میں سے جو احکام ساقط ہو گئے وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ قرآن ہدایت اور مومنوں کے لیے رحمت ہے مومنوں کو خاص کیا کیونکہ وہ اس سے انتفاع کرنے والے ہیں۔ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ جن امور میں بنی اسرائیل اختلاف کرتے رہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان میں فیصلہ فرمائے گا۔ وہ حق پرست اور باطل پرست میں فیصلہ فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ان کے درمیان دنیا میں ہی فیصلہ فرمادے گا انہوں نے جو جو تحریف کی اللہ تعالیٰ اسے ظاہر فرمادے گا۔ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ وہ غالب ہے جس کا امر رد نہیں کیا جاسکتا اور اس پر کوئی شے مخفی نہیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اپنا امر اس کے سپرد کر دے اور اسی پر بھروسہ کر کیونکہ وہی تیرا مددگار ہے۔ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِیْنِ تو ظاہر حق پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو صحیح کو جاننا چاہتا ہے اس پر وہ ظاہر کرنے والا ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى موتی سے مراد کفار ہیں کیونکہ انہوں نے تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے وہ مردوں کی طرح ہے ان میں کوئی حس اور عقل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ان کفار کے بارے میں ہے جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ یعنی ایسے کفار کو دعوت نہیں سنا سکتے جو نصیحت قبول کرنے کے اعتبار سے بہروں کی طرح ہیں۔ جب انہیں بھلائی کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو اعراض کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں گویا وہ سنتے ہی نہیں۔ اس کی مثل صم بکم عمی ہے جس طرح بات پہلے گزر چکی ہے۔ ابن محیصن، حمید، ابن کثیر، ابن ابی اسحاق اور عباس نے ابوعمرو سے قراءت نقل کی ہے ولا یسمع یاء اور میم پر فتحہ ہے۔ الصم مرفوع ہونے کے اعتبار سے فاعل ہے۔ باقی قراء تسمع قراءت کرتے ہیں یہ أسمعت کا مضارع ہے اور الصم منصوب ہے۔

**مسئلہ**: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتی کا انکار کیا اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے مردوں کو اپنا کلام سنایا تھا آپ نے اس امر میں قیاس عقلی سے استدلال کیا ہے اور اس آیت پر وقوف کیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما أنتم بأسمع منهم (1) تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس سے یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ بدر کا واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مردوں کی طرف ادراک کی صلاحیت کو لوٹایا ہو جن کی وجہ سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقالہ سنا ہو اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے سننے کی خبر نہ دیتے تو ہم اس ندا کو ان کافروں کے لیے توبیخ کے معنی پر محمول کرتے جو دنیا میں باقی تھے اور مومنوں کے دلوں کی شفا پر محمول کرتے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن محمد نے روح بن عبادہ سے سنا کہا ہم نے سعید بن ابی عروبہ سے انہوں نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس بن مالک نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم بدر کو قریش کے چوبیس سرداروں کے بارے میں حکم دیا تو انہیں بدر کے بے آباد کنوؤں میں سے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا (2)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی قوم پر غلبہ حاصل کرتے تو وہاں تین دن قیام فرماتے جب بدر میں تیسرا دن تھا تو آپ نے سواری کو تیار کرنے کا حکم دیا تو اس پر کجاوا کس دیا گیا پھر آپ چلے اور آپ کے صحابہ آپ کے پیچھے تھے۔ انہوں نے کہا: ہمارا یہ خیال تھا کہ آپ کسی حاجت کے لیے چلے ہیں یہاں تک کہ آپ اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے

---

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 287

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ بدر، جلد 2، صفحہ 566

آپ انہیں ان کے ناموں اور ان کے آباء کے ناموں کے ساتھ پکارنے لگے: ''اے فلاں بن فلاں! اے فلاں بن فلاں! کیا تمہیں یہ بات خوش کرتی ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا ہم نے اسے حق پایا کیا تمہارے رب نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اس کو حق پایا ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ ایسے جسموں سے گفتگو کر رہے ہیں جن میں روحیں نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جو میں انہیں کہہ رہا ہوں تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو''۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سنایا مقصود انہیں شرمندہ کرنا، ان کی حقارت بیان کرنا، ان سے انتقام لینا، حسرت کا اظہار کرنا اور انہیں شرمندہ کرنا تھا۔ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا: عبدہ، ہشام سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے ایک کنویں پر کھڑے ہوئے فرمایا: ''تمہارے رب نے جو وعدہ کیا کیا تم نے اس کو حق پایا ہے؟'' پھر فرمایا: ''آج وہ جان گئے ہوں گے کہ جو میں انہیں کہتا تھا وہ حق ہے''(1)۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کی قراءت کی: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى یہاں تک کہ مکمل آیت پڑھی یہ آیت واقعہ بدر اور قبروں کو سلام کرنے کے معارض (2) ہے۔ اور ان روایات کے بھی معارض ہے جن میں یہ تصریح موجود ہے کہ روحیں بعض اوقات قبروں کے کنارے پر ہوتی ہیں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ میت جوتوں کی کھٹکھٹاہٹ کو سنتی ہے جب لوگ اس سے واپس جاتے ہیں اگر میت نہ سنے تو اس کو سلام نہ کیا جائے یہ امر واضح ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔

وَمَاۤ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ، ضَلٰلَتِهِمْ سے مراد ان کا کفر ہے، یعنی آپ کی قدرت میں نہیں کہ آپ ان کے دلوں میں ہدایت کو تخلیق کریں۔ حمزہ نے اسے وما أنت تھدی العمی عن ضلالتھم پڑھا ہے جس طرح یہ آیت ہے اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ (یونس:43) باقی نے بھادی العمی پڑھا ہے۔ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ سورۂ روم میں اس کی مثل ہے سب نے اس سورت میں بِهٰدِی پر وقف کیا ہے اور روم میں یاء کے بغیر وقف کیا ہے اس میں مصحف کی اتباع کی ہے مگر یعقوب نے دونوں میں یاء پر وقف کیا ہے۔ فراء اور حاتم نے وما انت بھاد العمی پڑھنے کو بھی جائز قرار دیا ہے یہ اصل ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت وما أنتَ تھدی العُمْیَ ہے۔ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا آپ انہیں ہی سناتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف انہیں سناتے ہیں جسے میں نے سعادت کے لیے پیدا کیا ہے وہ توحید میں مخلص ہیں۔

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ بدر، جلد 2، صفحہ 566

2۔ اگر یوں تعبیر کی جائے کہ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں جو اقوال ہیں وہ توجہ طلب ہیں اگر یہاں موتی حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنی میں ہو تو آیت اور آحادیث میں ظاہری تعارض باقی نہ رہے گا اور آیت کا ظاہر بھی مجازی معنی کی تائید کرتا ہے مراد جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں مجاز کا قاعدہ قرآن میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ (مترجم)

كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَ يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِیْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا
جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٨٦﴾

''اور جب ہماری بات کے ان پر پورا ہونے کا وقت آ جائے گا تو ہم نکالیں گے ان کے لیے ایک چوپایہ زمین سے جو ان سے گفتگو کرے گا کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اور جس روز ہم اکٹھا کریں گے ہر امت سے ایک گروہ جو جھٹلایا کرتا تھا ہماری آیتوں کو تو ان کو (اپنی اپنی جگہ پر) روک لیا جائے گا حتی کہ جب وہ آ جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم نے جھٹلایا میری آیتوں کو حالانکہ تم نے اچھی طرح انہیں جانا بھی نہ تھا یا اس کے علاوہ اور کیا تھا جو تم کیا کرتے تھے اور پوری ہو گی (اللہ کی) بات ان پر بوجہ ان کے ظلم کے تو وہ (اس وقت) بولیں گے نہیں، کیا انہوں نے غور نہ کیا کہ ہم نے بنایا ہے رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور بنایا ہے دن کو بینا، بے شک اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ علماء نے وقع قول اور دابۃ میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے ان پر غضب ثابت ہو جائے گا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: ان پر فیصلہ لازم ہو چکا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما نے کہا: جب وہ نیکی کا حکم نہ دیں اور برائی سے نہ روکیں تو ان پر ناراضگی ثابت ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: وقع قول سے مراد علماء کی موت ہے، علم کا ناپید ہونا اور قرآن حکیم کا اٹھ جانا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: قرآن کے اٹھائے جانے سے پہلے قرآن کی تلاوت کثرت سے کرو۔ لوگوں نے عرض کی: یہ مصاحف اٹھا لیے جائیں گے تو لوگوں کے سینوں میں جو کچھ ہے وہ کیسے اٹھا لیا جائے گا؟ ان پر رات گزاری جائے گی تو صبح کے وقت وہ اس سے خالی ہو جائیں گے وہ لا الہ الا اللہ کو بھول جائیں گے۔ وہ دور جاہلیت کی باتوں اور ان کے اشعار میں واقع ہو جائیں گی یہ وہ وقت ہے جب ان پر فیصلہ واقع ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر بزار نے اسے بیان کیا ہے عبداللہ بن یوسف ثقفی، عبدالمجید بن عبدالعزیز سے وہ موسیٰ بن عبیدہ سے وہ صفوان بن سلیمہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں: اس گھر کی زیارت کثرت سے کرو قبل اس کے کہ اس کو اٹھا لیا جائے اور لوگ اس کی جگہ کو بھول جائیں اور قرآن کے اٹھائے جانے سے قبل اس کی تلاوت کثرت سے کیا کرو۔ ساتھیوں نے عرض کی: اے ابا عبدالرحمن! یہ مصاحف تو اٹھا لیے جائیں مگر لوگوں کے سینوں میں جو کچھ ہے وہ کیسے اٹھا لیا جائے گا؟ جواب دیا: وہ صبح کریں گے وہ کہیں گے: ہم ایک کلام کیا کرتے تھے اور ایک قول کیا کرتے تھے پھر دور جاہلیت کے شعر اور اس دور کی باتوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ یہی وہ وقت ہے جب ان پر فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ

(السجدہ:13) وقوع قول سے مراد ان پر عقاب کو لازم کرنا ہے جب وہ لوگ اس حد تک جا پہنچیں گے کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے اور ان کی کوئی مومن اولاد نہ ہو تو اس وقت قیامت برپا ہو جائے گی؛ قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے۔

چھٹا قول یہ ہے: حضرت حفصہ بنت سیرین نے کہا: میں نے ابو العالیہ سے الله تعالیٰ کے فرمان وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: الله تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو وحی کی اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود:36) تو گویا میرے چہرے پر پردہ تھا تو وہ پردہ ہٹا دیا گیا۔ نحاس نے کہا: یہ بہت اچھا جواب ہے کیونکہ لوگوں کا امتحان لیا جاتا ہے اور انہیں مہلت دی جاتی ہے کیونکہ ان میں مومن اور صالح لوگ ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کے بارے میں الله تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ عنقریب ایمان لائیں گے اور توبہ کریں گے اسی لیے انہیں مہلت دی گئی اور ہم کو ان سے جزیہ وصول کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب یہ امر زائل ہو گیا تو ان پر قول ثابت ہو گیا تو وہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح ہو گئے اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود:36)

میں کہتا ہوں: تمام اقوال غور و فکر کی صورت میں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اس پر دلیل آیت کا آخر ہے۔ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ اسے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ان بھی پڑھا گیا ہے یہ بحث عنقریب آئے گی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تین چیزیں ایسی ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی نفس کو اس کا ایمان کوئی نفع نہ دے گا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا یا اس نے ایمان کی حالت میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، دجال کا ظاہر ہونا اور دابۃ الارض کا ظاہر ہونا“ (1)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اس دابہ کی تعیین، اس کی صفت اور یہ کہاں سے ظاہر ہو گا اس میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب ”التذکرہ“ میں کیا ہے ہم یہاں بھی اسے مفصل ذکر کریں گے۔

پہلا قول یہ ہے: اس سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا بچہ ہے۔ اور یہ صحیح ترین قول ہے۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے دابہ کا ذکر کیا فرمایا: ”وہ تین دفعہ زمانے سے نکلے گا وہ دور دراز کے دیہاتی علاقے سے نکلے گا اس کا ذکر قریہ یعنی مکہ مکرمہ تک نہیں پہنچے گا پھر وہ طویل زمانہ تک چھپ جائے گا پھر دوسری دفعہ مکہ مکرمہ سے پہلے سے قریب سے نکلے گا اس کا ذکر دیہاتی علاقوں میں عام ہو جائے گا اور اس کا ذکر مکہ مکرمہ میں داخل ہو جائے گا“ (2)۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”پھر اسی اثنا میں کہ لوگ سب سے بڑی مسجد میں ہوں گے اس کے خیر کی حرمت الله تعالیٰ کے ذمہ ہے الله تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے معزز مسجد مسجد حرام ہے لوگوں کو کسی چیز نے نہ ڈرایا مگر اس چیز نے کہ وہ دابہ حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان بلبلا رہا ہو گا وہ اپنے سر سے مٹی جھاڑ رہا ہو گا۔ لوگ ایک ایک اور جمعیتوں کی صورت میں اس سے بھاگ جائیں گے مومنوں کی ایک جماعت اپنی جگہ میں ٹھہری رہے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الزمن الذی لایقبل فیہ الایمان، جلد 1، صفحہ 88
2۔ درمنثور، جلد 5، صفحہ 219

گی۔ وہ پہچان لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکیں گے وہ ان سے شروع کرے گا وہ ان کے چہروں کو روشن کر دے گا یہاں تک کہ انہیں بنا دے گا گویا وہ روشن ستارہ ہو۔ وہ زمین میں گھومے پھرے گا کوئی طالب اسے نہیں پکڑ سکے گا اور کوئی بھاگنے والا اس سے نجات نہیں پائے گا یہاں تک کہ آدمی نماز پڑھ کر اس سے پناہ چاہے گا۔ وہ دابہ اس کے پاس اس کے پیچھے سے آئے گا وہ دابہ کہے گا: اب تو نماز پڑھتا ہے؟ وہ دابہ اس کے سامنے آئے گا اور اس کے چہرے پر نشان لگائے گا پھر چلا جائے گا۔ لوگ اموال میں شریک ہو جائیں گے اور شہروں میں صلح کریں گے مومن کافر سے پہچان لیا جائے گا یہاں تک کہ مومن کافر سے کہے گا: میرا حق ادا کرو'۔ اس حدیث میں دلیل کا محل کہ وہ اونٹ کا بچہ ہے وہ یہ قول ہے وھی ترغو وہ بلبلائے گا۔ رغاء یہ اونٹ کا ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کیا گیا تو اس کا بچہ بھاگ گیا تھا اس کے لیے ایک پتھر میں سوراخ بن گیا تو وہ اس پتھر کے اندر داخل ہو گیا پھر وہ پتھر اس پر مل گیا وہ بچہ اس پتھر میں ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ پتھر سے نکلے گا۔

روایت بیان کی گئی ہے: وہ ایسا جانور ہے جس کے جسم پر بہت زیادہ بال ہوں گے وہ پایوں والا ہوگا اس کی لمبائی ساٹھ ذراع ہوگی اسے کہا جائے گا: جساسہ؛ یہ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: وہ انسان کی شکل میں ہوگا وہ بادلوں میں ہوگا اور اس کے پائے زمین میں ہوں گے۔ ایک روایت یہ بیان کی گئی: وہ ہر حیوان کی خصوصیات کو جامع ہوگا۔ ماوردی اور ثعلبی نے کہا: اس کا سر بیل کے سر جیسا ہوگا، اس کی آنکھیں خنزیر کی آنکھ جیسی ہوں گی، اس کے کان ہاتھی کے کان جیسے ہوں گے، اس کی گردن شتر مرغ کی گردن جیسی ہوگی، اس کا سینہ شیر کے سینہ جیسا ہوگا، اس کا رنگ چیتے کے رنگ جیسا ہوگا، اس کی ڈھاک بلی کی ڈھاک جیسی ہوگی، اس کی دنب مینڈھے کی دنب جیسی ہوگی، اس کے پائے اونٹ کے پائیوں جیسے ہوں گے ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ہاتھ ہوگی۔ زمخشری نے کہا: ذراع سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا ذراع ہے۔ اس دابہ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان کی مہر ہوگی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے مسلمان کے چہرے پر سفید نشان لگائے گا تو اس کا چہرہ سفید ہو جائے گا اور کافر کے چہرے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر سے نشان لگائے گی تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا؛ یہ حضرت ابن زہیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

کتاب نقاش میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: دابہ سے مراد وہ سانپ ہے جو کعبہ کی دیوار سے جھانک رہا تھا جسے عقاب نے اچک لیا تھا جب قریش نے کعبہ کو بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ ماوردی نے محمد بن کعب سے وہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں آپ سے دابہ کے متعلق سوال کیا گیا انہوں نے جواب دیا: خبردار! اللہ کی قسم! اس کی دنب نہ ہوگی جب کہ سانپ کی دنب ہوتی ہے۔ ماوردی نے کہا: اس قول میں ارشاد ہے کہ وہ انسانوں میں سے ہوگا اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی گئی۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس لیے بعض متاخر مفسرین نے کہا: زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ دابہ انسان ہو کلام کرتا ہو اہل بدعت اور اہل کفر سے مناظرہ کرتا ہو اور ان سے جدل کرتا ہو تاکہ وہ ختم ہو کر رہ جائیں تاکہ جو ہلاک ہو تو وہ دلیل

سے ہلاک ہوا اور جو زندہ رہے تو وہ دلیل سے زندہ رہے۔ ہمارے شیخ امام ابوالعباس احمد بن عمر قرطبی اپنی کتاب المفهم میں کہتے ہیں: اس قائل کے نزدیک اقرب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تکلمھم اس تعبیر کی بنا پر یہ کوئی خاص نشانی نہ ہوگی جو خلاف عادت ہو اور یہ ان دس علامتوں میں سے بھی نہ ہو جن کا ذکر حدیث طیبہ میں ہے کیونکہ بدعتیوں کے خلاف مناظرہ کرنے والوں اور استدلال کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے یہ کوئی خاص نشانی نہیں اس لیے اسے دس علامات کے ساتھ ذکر کرنا مناسب نہیں اس کے وجود کی خصوصیت ختم ہو گئی جب قول واقع ہو گیا۔ پھر اس انسان جو مناظر ہے فاضل ہے اور اہل زمین پر عالم ہے اسے انسان کا نام دینے، عالم کا نام دینے یا امام کا نام دینے سے جو عدول کیا گیا یہاں تک کہ اس کا نام دابہ رکھا تو یہ فصحاء کی عادت کے خلاف ہے اور علماء کی تعظیم سے باہر نکلنا ہے یہ عقلاء کا طریقہ نہیں اولیٰ بات وہی ہے جو اہل تفسیر کا قول ہے اللہ تعالیٰ امور کے حقائق کے بارے میں زیادہ آگاہ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس دابہ کے بارے میں اشکال کو وہ حدیث ختم کر دیتی ہے جو ہم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس لیے اس پر بھروسہ کیجئے۔ کس جگہ سے یہ دابہ نکلے گا اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ مکہ مکرمہ میں جبل صفا سے نکلے گا صفا کا پہاڑ پھٹ جائے گا تو اس سے وہ دابہ نکلے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے: اگر میں اس کے نکلنے کی جگہ اپنا قدم رکھنا چاہوں تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ اسی طرح مروی ہے۔ زمین دابہ سے پھٹ جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہوں گے جب کہ ان کے ساتھ مسلمان سعی کی جگہ کی ایک طرف ہوں گے وہ دابہ صفا سے نکلے گا وہ مومن کی آنکھوں کے درمیان نشان لگائے گا کہ یہ مومن ہے وہ نشان ایسا ہوگا گویا وہ چمکتا موتی ہے کافر کی آنکھوں کے درمیان نشان لگائے گا کہ یہ کافر ہے۔ حدیث میں یہ مذکور ہے کہ وہ بالوں اور پروں والا ہوگا؛ مہدوی نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ گھاٹی سے نکلے گا اس کا سر بادلوں سے مس کر رہا ہوگا اور اس کے پاؤں زمین میں ہوں گے وہ باہر نہیں نکلیں گے وہ دابہ نکلے گا جب کہ اس کے ساتھ عصا موسیٰ ہوگا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ تین دفعہ نکلے گا ایک دفعہ وہ جنگل سے نکلے گا پھر چھپ جائے گا پھر وہ دیہاتوں میں ظاہر ہوگا جن میں امراء آپس میں قتال کریں گے یہاں تک کہ خونریزی زیادہ ہو جائے گی ایک دفعہ وہ سب سے بڑی، سب سے معزز، سب سے شرف والی اور سب سے فضیلت والی مسجد سے نکلے گا۔ زمخشری نے کہا: وہ دار بنی مخزوم کے بالمقابل حجر اسود کے سامنے سے مسجد کی دائیں جانب سے نکلے گا کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوں گے اور کچھ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ قتادہ سے مروی ہے: وہ تہامہ سے نکلے گا۔ ایک روایت کی گئی ہے: وہ کوفہ کی مسجد سے نکلے گا جہاں سے حضرت نوح علیہ السلام کا تنور پانی سے ابل پڑا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ طائف سے نکلے گا۔ ابوقبیل نے کہا: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے طائف کی زمین پر پاؤں مارا اور فرمایا: یہاں سے وہ دابہ نکلے گا جو لوگوں سے کلام کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ تہامہ کی ایک وادی سے نکلے گا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ شعب اجیاد کی ایک چٹان سے نکلے گا؛ یہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

یہ بحر سدوم سے نکلے گا؛ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔ ماوردی نے اپنی کتاب میں ان تین اقوال کا ذکر کیا ہے۔ امام بغوی ابو القاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز نے ذکر کیا کہ علی بن جعد، فضل بن مرزوق، رقاشی اغر (یحییٰ بن معین سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ ثقہ ہے) وہ عطیہ عوفی سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ دابہ کعبہ کے سوراخ سے تین دن نکلے گا اور نکلنے میں اتنا تیز ہوگا جتنا گھوڑا تیزی سے دوڑتا ہے اس کا تہائی بھی باہر نہیں نکلے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ صحابہ اور تابعین کے اقوال ہیں جو دابہ کے نکلنے اور اس کی صفت کے بارے میں ہیں یہ مفسرین کے اس قول کو رد کر دیتے ہیں جس میں ہے کہ دابہ انسان ہے وہ کلام کرنے والا ہے وہ اہل بدعت اور اہل کفر سے مناظرہ کرے گا۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دابہ نکلے گا تو وہ لوگوں کی ناکوں پر نشان لگائے گا''۔ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے: تکلمھم یہ تاء کے ضمہ اور لام مشددہ مکسورہ کے ساتھ ہے۔ یہ کلام سے مشتق ہے، یہ عام قرأت ہے اور حضرت ابی کی قراءت اس پر دلالت کرتی ہے جو تنبئھم ہے۔ سدی نے کہا: وہ اسلام کے سوا تمام ادیان کے باطل ہونے کی کلام کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان سے ایسی کلام کرے گا جو ان کو پریشان کر دے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ان سے لکنت والی زبان سے کلام کرے گا وہ ایسی آواز سے کلام کرے گا جس کو قریبی اور بعیدی سب سنیں گے۔ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ وہ دابہ کے نکلنے پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ دابہ کا نکلنا بھی آیات میں سے ہے وہ کہے گا: الا لعنة اللہ علی الظالمین خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ حضرت ابوزرعہ، حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور ابو رجا نے تکلمھم تاء کے فتحہ کے ساتھ کلام کی ہے یہ کلم سے مشتق ہے جس کا معنی زخم ہے۔ عکرمہ نے کہا: یعنی وہ ان کو زخم لگائے گی۔ ابو جوزاء نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ یہ تُكَلِّمُهُمْ یا تَكْلِمُهُمْ ہے انہوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ ان سے کلام کرے گا اور ان کو زخم لگائے گا وہ مومن سے کلام کرے گا اور کافر و فاجر کو زخم لگائے گا۔ ابو حاتم نے تُكَلِّمُهُمْ جس طرح تو کہتا ہے تُجَرِّحُهُمْ یہ تعبیر اس طرف جاتی ہے کہ یہ تَكْلِمُهُمْ میں کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے تفعیل کا وزن لاتے ہیں۔ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ کوفہ کے قراء، ابن ابی اسحاق اور یحییٰ نے ان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اہل حرمین، اہل شام اور اہل بصرہ نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اِن پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: ہمزہ مفتوحہ میں دو قول ہیں اسی طرح ہمزہ مکسورہ میں دو قول ہیں۔ اخفش نے کہا: مراد بانّ ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بانّ ہی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اس کا محل نصب ہے کیونکہ فعل اس پر واقع ہو رہا ہے تقدیر کلام یہ ہے تخبرھم أن الناس۔ کسائی اور فراء نے پڑھا اِنّ الناس یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اخفش نے کہا: یہ اس معنی میں ہے تقول إن الناس، الناس سے مراد کفار ہیں۔ بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ مراد قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ کافر سے ایمان قبول نہیں کرے گا اس دابہ کے نکلنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں مومن اور کافر ہی رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا فوج سے مراد جماعت ہے مِّمَّنْ یُّكَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا آیات سے مراد قرآن ہے اور ہماری وہ علامات ہیں جو حق پر دال ہیں۔ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ انہیں حساب کی جگہ کی طرف دھکیل کر یا ہانک کر لے جایا جائے گا۔

شماخ نے کہا:

وکَمْ وَزَعْنَا من خَمِیس جَحْفَلِ

ہم نے کتنے ہی لشکروں کو دھکیلا۔

قتادہ نے کہا: یوزعون ان میں سے پہلے کو آخر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: اَكَذَّبْتُمْ بِاٰیٰتِیْ تم میری ان آیات کو جھٹلاتے ہو جن کو میں نے اپنے رسولوں پر نازل کیا۔ اور ان آیات کو جھٹلاتے ہو جن کو میں نے اپنی توحید پر دلالت بنایا ہے۔ وَ لَمْ تُحِیْطُوْا بِهَا عِلْمًا تم نے ان آیات کے باطل ہونے کا از روئے علم کے احاطہ نہیں کیا یہاں تک کہ تم ان سے اعراض کرو بلکہ تم نے اس سے جاہل بنتے ہوئے استدلال کے بغیر جھٹلایا ہے۔ اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یہ تقریع و توبیخ ہے تم کس لیے عمل کرتے ہو جب تم اس میں بحث نہیں کرتے اور ان میں غور و فکر نہیں کرتے؟ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا ان کے ظلم یعنی شرک کی وجہ سے ان پر عذاب واجب ہو گیا۔ فَهُمْ لَا یَنْطِقُوْنَ ان کے لیے کوئی عذر اور حجت نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور وہ کلام نہ کر سکیں گے؛ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔

اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْكُنُوْا فِیْهِ یعنی وہ قرار حاصل کریں اور سو جائیں۔ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا وہ رزق کے حصول کے لیے اس میں دیکھتا ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ جو الله تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اپنی الوہیت اور قدرت پر دلیل ذکر کی یعنی کیا وہ ہماری کمال قدرت کو نہیں جانتے کہ وہ ایمان لاتے۔

وَ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ ۝ وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور جس دن پھونکا جائے گا صور تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے مگر جنہیں خدا نے چاہا (وہ نہیں گھبرائیں گے) اور سب حاضر ہوں گے اس کی بارگاہ میں عاجزی کرتے ہوئے اور تو جب (اس روز) پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال، یہ کاریگری ہے الله کی جس نے (اپنی حکمت سے) مضبوط بنایا ہر چیز کو، بے شک وہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا تو اسے کہیں بہتر اجر ملے گا اس نیک عمل سے اور یہ نیک بندے اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ اور جو برائی لے کر آئے گا تو ان کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں (اے بدکارو!) کیا تمہیں بدلہ ملے گا بجز اس کے جو تم عمل کیا کرتے تھے''۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ یوم سے پہلے اذکر ھم یاذکرھم فعل محذوف ہے۔ فراء کا مذہب ہے کہ معنی ہے ذلکم یوم ینفخ فی الصور اس میں حذف جائز ہے۔ صور میں صحیح یہ ہے کہ نور کا ایک قرن ہے جس میں حضرت اسرافیل پھونکیں گے۔ مجاہد نے کہا: یہ بوق کی شکل کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یمن کی زبان میں صور کا معنی بوق ہے۔ سورۂ انعام میں اس کی وضاحت اور علماء کا نقطہ نظر گزر چکا ہے۔

فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب آسمانوں کی تخلیق سے فارغ ہوا تو اس نے صور کو پیدا کیا اور حضرت اسرافیل کو دے دیا۔ وہ اسے اپنے منہ پر رکھے ہوئے ہیں اور اپنی نظر عرش کی طرف لگائے ہوئے ہیں وہ انتظار کر رہے ہیں کہ کب اسے پھونکنے کا حکم ملتا ہے''(1)۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صور کیا ہے؟ فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ عظیم سینگ ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اس کے دائرہ کا پھیلاؤ آسمان و زمین کی چوڑائی جتنا ہے اس میں تین دفعہ پھونکا جائے گا پہلا نفخہ فزع ہے (۲) نفخہ صعق (۳) اللہ تعالیٰ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا نفخہ'' حدیث کا ذکر کیا؛ اسے علی بن معبد، طبری، ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے اس کی تصحیح کی ہے۔ میں نے کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور وہاں ہم نے اس کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ صور میں نفخہ میں اصل یہ ہے کہ نفخے دو ہیں تین نہیں ہیں۔ نفخہ فزع سے مراد نفخہ صعق ہی ہے کیونکہ وہ دونوں امر اس کو لازم ہیں وہ سخت گھبرائیں گے اور اس سے مر جائیں گے یا یہ نفخہ بعث کی طرف راجع ہے؛ یہ امام قشیری اور دوسرے علماء کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ کیونکہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہا ہے: مراد نفخہ ثانیہ ہے وہ گھبرائے ہوئے راندہ ہوں گے وہ کہیں گے مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: 52) وہ ایسے امر کو دیکھیں گے جو انہیں خوفزدہ کر دے گا۔ یہ نفخہ بوق کی آواز کی طرح ہوگا تاکہ تمام مخلوق جزا کے میدان میں جمع ہو جائے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ماوردی نے کہا: وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ یہ قبروں سے اٹھنے کا دن ہے۔ کہا: اس فزع میں دو قول ہیں (۱) ندا کی طرف جلدی کرنا اور اس پر لبیک کہنا، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے فزعت الیک فی کذا تیری مدد کے لیے میں نے تیری آواز کی طرف جلدی کی (۲) یہاں فزع سے مراد خوف اور حزن کا معہود و معروف فزع ہے، کیونکہ انہیں ان کی قبروں میں پریشان کیا گیا وہ گھبرا گئے اور خوفزدہ ہو گئے؛ یہ دونوں قولوں میں سے زیادہ مناسب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی احادیث سے ثابت ہونے والی سنت دلالت کرتی ہے کہ دو نفخے ہیں تین نفخے نہیں۔ امام مسلم نے ان دونوں احادیث کو نقل کیا ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔ انشاء اللہ صحیح یہی ہے کہ نفخے دو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (الزمر: 68) یہاں استثناء کی ہے جس طرح نفخہ فزع میں استثناء کی ہے یہ اس امر پر حال ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ ابن مبارک نے حضرت حسن بصری سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دو نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ پہلے نفخہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو موت دے دے گا اور دوسرے نفخہ کے ساتھ

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 25

اللہ تعالیٰ ہر مردہ کو زندہ کر دے گا''۔ اگر یہ قول کیا جائے اللہ تعالیٰ کا فرمان: یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ (النازعات) سے لے کر زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ (النازعات) اس کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ تین نفخے ہیں۔ اسے کہا جائے گا: اس طرح معاملہ نہیں۔ زجرہ سے مراد دوسرا نفخہ ہے جس کے واقع ہونے پر تمام مخلوق قبروں سے باہر آ جائے گی۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، عطا، ابن زید وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: دو نفخے ہیں جہاں تک پہلے نفخہ کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ ہر چیز کو موت عطا کر دے گا جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہر چیز کو زندہ کر دے گا۔ عطا نے کہا: الراجفة سے مراد قیامت ہے اور الرادفة سے مراد بعث ہے۔ ابن زید نے کہا: الراجفة سے مراد موت ہے اور الرادفة سے مراد قیامت ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ اس مستثنیٰ میں اختلاف کیا گیا ہے وہ کون ہیں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''مراد شہداء ہیں ان کے رب کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے فزع زندوں کو ہی لاحق ہوتا ہے''۔ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے مراد وہ شہداء ہیں جو عرش کے ارد گرد گلے میں تلواریں لٹکائے ہوئے ہیں۔ قشیری نے کہا: مراد انبیاء ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہیں؛ کیونکہ ان کے لیے نبوت کے ساتھ شہادت بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فرشتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: فرشتوں کی کچھ جماعتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو دو نفخوں کے درمیان مریں گے۔ مقاتل نے کہا: مراد حضرت جبریل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حور عین ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مومنین ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَهُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ يَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ہمارے بعض علماء نے کہا: صحیح یہ ہے کہ ان کی تعیین میں خبر صحیح وارد نہیں سب محتمل ہے۔

میں کہتا ہوں: اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مخفی رہی جس کی تصحیح قاضی ابو بکر بن عربی نے کی یا چاہیے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ وہ تعیین میں نص ہے اور باقی سب اجتہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کے علاوہ کا ذکر سورۂ زمر میں آئے گا۔ فَفَزِعَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ یہ فعل ماضی ہے اور يُنۡفَخُ مستقبل ہے۔ تو یہ سوال کیا جائے گا فعل ماضی کا عطف فعل مستقبل پر کیسے کیا گیا ہے؟ فراء نے گمان کیا ہے: یہ معنی پر محمول ہے کیونکہ معنی بنتا ہے إذا نفخ فی الصور ففزع اور من شاء اللہ یہ استثناء کے طور پر منصوب ہے۔

وَكُلٌّ اَتَوۡهُ دٰخِرِيۡنَ ابو عمرو، عاصم، کسائی، نافع، ابن عامر اور ابن کثیر نے اسے آتوہ پڑھا ہے انہوں نے اسے فعل مستقبل یعنی اسم فاعل کا صیغہ بنایا ہے۔ اعمش، یحییٰ، حمزہ اور حفص نے عاصم سے وکل اتوہ ہمزہ پر زبر مد کے بغیر فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے بھی اسی طرح قراءت کی ہے۔ قتادہ سے مروی ہے: وكل أتاه داخرين۔ نحاس نے کہا: میری کتاب جو ابو اسحاق سے قراءت میں مروی ہے اس میں ہے جس نے پڑھا وکل اتوا واحد کا صیغہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے اور جس نے اسے آتوہ جمع کا صیغہ پڑھا ہے انہوں نے معنی کا اعتبار کیا ہے۔ یہ قول غلط اور قبیح ہے، کیونکہ جب کہا: وکل اتوہ یہ واحد کا صیغہ نہیں یہ جمع کا صیغہ ہے اگر واحد کا صیغہ ہوتا تو فرمان ہوتا اتاہ لیکن جس نے کہا: اتوہ یہ جمع کا صیغہ ہے معنی کا

اعتبار کیا ہے اور ماضی کا صیغہ آیا ہے کیونکہ اس نے اسے فزع کی طرف لوٹایا ہے اور جس نے پڑھا: وکل آتوہ اس نے بھی معنی پر محمول کیا اور کہا: آتوہ یہ ایسا جملہ ہے جو یہاں سے منقطع ہے۔ ابن نصر نے کہا: ابواسحاق سے وہ مروی ہے جو انہوں نے کہا یہی ابواسحاق کی نص ہے وکل أتوہ داخرین اور وہ قراءت کرتے ہیں آتوہ جس نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ وہ کل کے لفظ کا اعتبار کرتے ہیں اور جس نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے تو وہ معنی کا اعتبار کرتے ہیں وہ اس سے یہ ارادہ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم اور دوسری چیزوں میں جو کل کی خبر واحد ذکر کی گئی ہے وہ کل کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہے اور جمع کی صورت میں خبر معنی کے اعتبار سے ہے۔ ابوجعفر نے یہ معنی اخذ نہیں کیا۔ مہدوی نے کہا: جس نے وکل اتوہ داخرین قراءت کی ہے تو وہ اتیان سے فعل ہے اور کل کے معنی کا اعتبار کیا ہے لفظ کا اعتبار نہیں کیا۔ جس نے وکل آتوہ داخرین تو وہ اتی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۞ (مریم) جس نے پڑھا: وکل أتاہ اس نے کل کے لفظ پر محمول کیا ہے معنی کا اعتبار نہیں کیا۔ دٰخِرِيْنَ یہ معنی پر محمول ہے اس کا معنی صاغرین ہے ذلیل ورسوا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ سے مروی ہے سورۂ نحل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جامدۃ سے مراد ہے ٹھہرے ہوئے جب کہ وہ تیزی سے چل رہے ہیں۔ قتبی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑ بہت زیادہ ہیں اور انہیں چلایا جاتا ہے آنکھ کے دیکھنے میں وہ کھڑے ہیں جب کہ وہ چل رہے ہیں اسی طرح ہر عظیم شے اور جمع کثیر ہوتی ہے آنکھ جس سے قاصر ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اس کی اطراف میں بہت دوری ہوتی ہے۔ وہ دیکھنے والے کے گمان میں واقف کی طرح ہوتے ہیں جب کہ وہ چل رہے ہوتے ہیں۔ نابغہ نے لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

بِأَرْعَنَ مثلِ الطَّودِ تَحسبُ أنَّهمْ	وُقوفٌ بحَاجٍ والرِّكَابُ تُهمْلِجُ

ارعن کے مقام پر بڑے ٹیلے کی مانند تو انہیں گمان کرے گا کہ یہ حج کا وقوف ہے اور اونٹ نرم اور تیز چال چل رہے ہیں۔

قشیری نے کہا: یہ یوم قیامت ہے یعنی وہ کثرت کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ جامد ہیں آنکھ کے دیکھنے میں کھڑے ہیں اگرچہ وہ بادل کے چلنے کی طرح تیزی سے چل رہے ہیں۔ تیرے بادلوں کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں جب کہ وہ چل رہے ہیں وہ بادل کے گزرنے کی طرح گزر جاتے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۞ (النباء)

یہ جملہ کہا جاتا ہے: الله تعالیٰ نے پہاڑوں کی مختلف صفات بیان کی ہیں پس اس امر کی طرف لوٹتی ہیں کہ انہیں زمین کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور جن چیزوں کو یہ پوشیدہ کیے ہوتے تھے ان کو یہ ظاہر کرتے ہیں؛ ان صفات میں سے پہلی صفات ان کا باہم ٹکرانا اور ریزہ ریزہ ہونا ہے یہ زلزلہ سے قبل ہوگا۔ پھر وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے یہ اس وقت ہوگا جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا الله تعالیٰ نے ان دونوں کو جمع کیا فرمایا: يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۞ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۞ (المعارج) تیسری حالت یہ ہے کہ وہ باریک ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔ پہلے وہ دھنکی ہوئی

روئی کی طرح تھے پھر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ چوتھی حالت یہ ہے کہ انہیں اڑا دیا جائے گا کیونکہ احوال متقدمہ کے باوجود وہ اپنی حد پر قائم ہوں گے زمین اس کے نیچے ظاہر نہ ہو گی زمین سے ان پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا تا کہ وہ ظاہر ہو جائے جب انہیں اڑایا جائے گا تو ہواؤں کو ان پر بھیجا جائے گا۔ پانچویں حالت یہ ہوئی کہ ہوائیں پہاڑوں کو روئے زمین سے اٹھا لیں گی اور ہوا میں شعاع کی حیثیت سے انہیں ظاہر کریں گی گویا وہ غبار ہیں۔ جو آدمی دور سے انہیں دیکھے گا تو اس غبار کے گھنا ہونے کی وجہ سے جامد جسم خیال کرے گا۔ وہ حقیقت میں چل رہے ہوں گے مگر ان کا چلنا ہواؤں کے اوپر سے ہو گا، گویا وہ ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں اور ان کے اجزاء بکھر چکے ہوں گے۔ چھٹی حالت یہ ہے کہ وہ سراب ہوں جو آدمی ان کی جگہوں کو دیکھے گا تو ان میں سے کوئی چیز نہیں دیکھے گا گویا وہ سراب ہو۔ مقاتل نے کہا: وہ پہاڑ زمین پر واقع ہوں گے تو ان کے ساتھ زمین کو برابر کر دیا جائے گا۔ پھر ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بھی ایک مثال ہے۔ ماوردی نے کہا: ضرب الامثال کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) یہ ضرب المثل ہے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال دی ہے اسے دیکھنے والا گمان کرتا ہے کہ وہ اپنی جگہ کھڑی ہے جس طرح پہاڑ۔ یہ زوال میں سے اپنا حصہ لے رہی ہوتی ہے جس طرح بادل ہیں، یہ سہیل بن عبداللہ کا قول ہے (۲) یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی بیان کی ہے تو اسے دل میں ثابت گمان کرتا ہے جب کہ اس کا عمل آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہوتا ہے (۳) یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے نفس کی بیان فرمائی ہے جب روح نکلتی ہے اور روح عرش کی طرف جا رہی ہوتی ہے صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ یہ اللہ تعالیٰ کا عمل ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا عمل ہوتا ہے وہ بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ تَرَی یہ آنکھ کی رؤیت ہے۔ اگر یہ دل کی رؤیت ہوتی تو فعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا یہ اصل میں ترای ہے ہمزہ کی حرکت راء کو دی راء متحرک ہو گئی اور ہمزہ کو حذف کر دیا یہ ہمزہ میں تخفیف کا قاعدہ ہے جب اس کا ماقبل ساکن ہو۔ ورنہ تری کو تخفیف لازم ہوتی۔ اہل کوفہ تحسَبھا پڑھتے ہیں یعنی سین پر فتحہ ہے یہی قیاس ہے کیونکہ حَسِبَ یَحْسَبُ سے مشتق ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے برعکس مروی ہے۔ مگر مضارع میں کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے اس وقت یہ فَعِلَ یَفْعِلُ سے مشتق ہے جس طرح نَعِمَ یَنْعِمُ۔ بَئِسَ یَبْئِسُ اسی طرح یَبِسَ یَیْبِسُ ہے سالم سے نَعِمَ یَنْعِمُ ہے۔ ان حروف کے علاوہ کلام عرب میں یہ باب معروف نہیں۔

وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ تقدیر کلام یہ ہے مرمثل مر السحاب صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا اور مضاف کو مضاف الیہ کے قائم مقام رکھا۔ پہاڑوں کو روئے زمین سے اپنی جگہ سے زائل کر دیا جائے گا، انہیں جمع کیا جائے گا اور انہیں چلایا جائے گا جس طرح بادلوں کو چلایا جاتا ہے پھر انہیں توڑا جائے گا اور وہ زمین کی طرف لوٹ آئیں گے۔ جس طرح فرمایا: وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ (الواقعہ)

صُنْعَ اللّٰهِ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک مفعول مطلق کے طور پر منصوب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ اس پر دال ہے کہ اس نے یہ کام کیا۔ اغراء کے طریقہ پر نصب دینا بھی جائز ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت کو دیکھو۔ اس تعبیر کی بنا پر السَّحَابِ پر وقف کیا جائے گا اور پہلی تقدیر کی بنا پر اس پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ اس تقدیر کی بنا پر صُنْعَ اللّٰهِ پر رفع جائز ہے۔

الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ اس نے ہر شے کو محکم کر دیا۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رحم اللہ من عمل عملا فاتقنہ۔ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو عمل کرے تو اسے پختہ کرے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہر چیز سے اچھا۔ اتقان کا معنی پختہ کرنا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے رجل تقن ایسا آدمی جو اشیاء کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔ زہری نے کہا: اصل میں یہ ابن تقن ہے، یہ قوم عاد کا ایک آدمی تھا اس کا کوئی تیر ضائع نہ گرتا تو مثال بیان کی گئی؛ یہ جملہ کہا جاتا ہے: أرمی من ابن تقن۔ وہ ابن تقن سے بھی زیادہ تیرانداز ہے۔ پھر ہر وہ آدمی جو اشیاء کا ماہر ہوتا ہے اس کے لیے تقن کا لفظ استعمال کیا جاتا اِنَّهٗ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَفۡعَلُوۡنَ تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ جمہور کی قراءت ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ہشام نے یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَهٗ خَیۡرٌ مِّنۡهَا حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حسنہ سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ابو معشر نے کہا: ابراہیم قسم اٹھایا کرتے تھے باللہ الذی لا الہ الا ھو۔ وہ یہ استثناء نہیں کرتے تھے کہ نیکی لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ہے۔ حضرت علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے کہا: ایک آدمی نے غزوہ میں شرکت کی جب وہ کسی جگہ تنہا ہوتا تو کہتا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ اسی اثنا میں کہ وہ روم کے علاقہ میں جلفاء اور بردی کے علاقہ میں تھا اس نے بلند آواز سے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ تو ایک آدمی اس پر ظاہر ہوا جو گھوڑے پر سوار تھا جس کے جسم پر سفید لباس تھا۔ اس نے اسے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں اس کی جان ہے! یہ کلمہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَهٗ خَیۡرٌ مِّنۡهَا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا: ”اللہ سے ڈرو جب تو کوئی برا عمل کرے تو اس کے بعد اچھا عمل بھی کر لے جو اس برائی کو مٹا دے“۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا بھی حسنات میں سے ہے؟ فرمایا: ”یہ افضل حسنات میں سے ہے“۔ ایک روایت میں ہے: ”ہاں یہ بہترین نیکی ہے“۔ بیہقی نے اسے ذکر کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ہے جس نے اخلاص اور توحید کے ساتھ اچھا عمل کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے جو تمام فرائض ادا کرے۔

میں کہتا ہوں: جب وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو ایک حقیقت اور جو اس کی وجہ سے چیزیں لازم ہوتی ہیں ان کو لاتا ہے جس طرح سورۂ ابراہیم میں گزر چکا ہے تو وہ توحید، اخلاص اور فرائض کو لانے والا ہے۔ اس کے لیے خیر ہے فَلَهٗ خَیۡرٌ مِّنۡهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس تک اس کی بھلائی پہنچے گی، یہ مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے خوبصورت جزا ہے وہ جنت ہے۔ یہاں خَیۡرٌ کا کلمہ اسم تفضیل کا نہیں ہے۔ عکرمہ اور ابن جریج نے کہا: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس کے لیے اس سے خیر ہو تو ایسا نہیں کیونکہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے بہتر کوئی چیز نہیں لیکن اس کے لیے اس کی خیر ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَلَهٗ خَیۡرٌ مِّنۡهَا یہاں خیر اسم تفضیل کا صیغہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا بدلہ بندے کے عمل، اس کے قول اور اس کے ذکر سے بہتر ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا بندے کے لیے بندے کے عمل سے بہتر ہو گی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کئی گنا کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک کے بدلہ میں دس گنا عطا فرماتا ہے اور

1۔ الترغیب والترہیب، کتاب التوبہ والزہد، جلد 4، صفحہ 111

تھوڑی مدت کے ایمان کے بدلہ میں ابدی ثواب عطا فرماتا ہے؛ یہ محمد بن کعب اور عبد الرحمن بن زید کا قول ہے۔

**وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىٕذٍ اٰمِنُوْنَ** عاصم، حمزہ اور کسائی نے فزع یومئذ اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا: یہ میرے لیے زیادہ تعجب کا باعث ہے کیونکہ یہ دونوں تاویلوں کو عام ہے کہ اس روز تمام قسم کے خوفوں سے امن ہوگا۔ جب کہا: من فزع یومئذ گویا وہ ایسی فزع ہے جو فزع در فزع سے کم ہے۔ قشیری نے کہا: اسے من فزعٍ تنوین کے ساتھ پڑھا، پھر یہ کہا گیا: اس سے مراد ایک گھبراہٹ ہے، جس طرح فرمایا: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء: 103) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کثرت ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور مصدر کثرت کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تعبیر کی بنا پر دونوں قرائتیں ایک معنی میں ہیں۔ مہدوی نے کہا: جس نے من فزعٍ یومئذ تنوین کے ساتھ پڑھا اس نے یومئذ کو فزع مصدر سے نصب دی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ فزع کی صفت ہو اور محذوف کے متعلق ہو، کیونکہ مصادر کی خبر اسماء زمان کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور ان کے ساتھ صفت لگائی جاتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اسم فاعل کے متعلق ہو جو آمنون ہے۔ اور ظروف میں اضافت بطور مجاز ہوتی ہے جس نے تنوین کو حذف کیا اور میم کو فتحہ دیا تو اس نے اسے مبنی قرار دیا کیونکہ یہ ظرف زمان ہے ظرف زمان میں اعراب معرب کا نہیں ہوتا، جب یہ غیر منصرف کی طرف مضاف ہو یا غیر معرب کی طرف مضاف ہو تو یہ مبنی ہو جاتا ہے۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا۔

علی حینَ اَلْهَی النَّاسَ جُلُّ اُمُورِهم

جب لوگوں کو ان کے بڑے بڑے امور نے غافل کر دیا۔

محل استدلال حین ہے۔

**وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ**، سیئہ سے مراد شرک ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام نخعی، حضرت ابو ہریرہ، مجاہد، قیس بن سعد اور حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ اہل تاویل کی جانب سے یہ اجماع ہے کہ حسنہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سیئہ سے مراد شرک ہے یہی اس آیت میں تعبیر ہے۔ **فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں پھینک دیا جائے گا۔ ضحاک نے کہا: انہیں پرے پھینکا جائے گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کببت الاناء میں نے برتن کو اس کے منہ کے بل ... دیا۔ اس سے لازم رکب ہے۔ کلام عرب میں بہت ہی کم واقع ہوا ہے۔

**هَلْ تُجْزَوْنَ** انہیں کہا جائے گا: تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ پھر جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ مگر تمہیں اپنے اعمال کی جزا۔

اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ٘ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَۙ (91) وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ١ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ١ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (92) وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا١ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۠ (93)

''مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اس (مقدس) شہر کے رب کی جس نے عزت و حرمت والا بنایا ہے اس کو اور اسی کی ہے ہر شے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں شامل ہو جاؤں فرمانبرداروں کے زمرہ میں نیز (یہ بھی کہ) میں تلاوت کیا کروں قرآن کی پس جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے (تو اس کی قسمت)، فرماؤ: میں تو صرف ڈرانے والوں سے ہوں۔ اور آپ کہیے: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں وہ ابھی دکھائے گا تمہیں اپنی نشانیاں تو انہیں پہچان لو گے اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر ان کاموں سے جو (اے لوگو!) تم کیا کرتے ہو''۔

اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا مراد مکہ مکرمہ ہے اللہ تعالیٰ نے جس کی حرمت کو عظمت والا بنایا ہے یعنی اسے امن والا حرم بنایا ہے اس میں خون نہیں بہایا جاتا اور اس میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، کسی شکار کو شکار نہیں کیا جاتا، اس میں درخت کو نہیں کاٹا جاتا جس کی وضاحت کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے التی حرمھا، بلدہ کی صفت پڑھی ہے۔ جماعت کی قراءت الذی ہے یہ محل نصب میں ہے اور رب کی صفت ہے اگر لفظ رب معرف باللام ہوتا تو تو کہتا: المحرمھا اگر یہ بلدہ کی صفت ہوتا تو تو کہتا: المحرمھا ہو اگر تو کہتا: الذی حرمھا تو تو استدلال نہ کر سکتا کہ تو کہتا ھو۔

وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ پیدائش اور ملک کے اعتبار سے ہر شے اسی کی ہے۔ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اس کے حکم کو ماننے والے اس کی وحدانیت کا اقرار کرنے والے۔ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں یعنی اسے پڑھوں۔ فَمَنِ اهْتَدٰى اس کے لیے ہدایت کا ثواب ہے۔ وَ مَنْ ضَلَّ تو میرے ذمہ تو صرف پیغام حق پہنچانا ہے۔ آیہ قتال نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: وَ اَنْ اَتْلُوَ یہ ان کی وجہ سے منصوب ہے۔ فراء نے کہا: ایک قراءت میں واُن اُتل ہے اس کا گمان ہے کہ یہ امر کی وجہ سے جزم کے محل میں ہے اسی وجہ سے اس سے واؤ حذف ہے۔ نحاس نے کہا: ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے یہ قراءت کی ہو۔ یہ تمام مصاحف کے خلاف ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اس نے جو نعمتیں کی ہیں اور اس نے جو ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے۔

سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ تمہاری ذاتوں میں اور تمہارے علاوہ دوسری چیزوں میں اپنی آیات دکھائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ (فصلت: 53) فَتَعْرِفُوْنَهَا تم اپنی ذاتوں، آسمانوں اور زمین میں اس کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل پہچان لو گے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الذاریات) وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اہل مدینہ، اہل شام اور حفص نے عاصم سے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا تو کلام ایک ہی نظم پر ہو جائے گی۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ صیغہ پڑھا ہے کہ اس کلام کو ماقبل کی طرف لوٹا دیا جائے۔ فَمَنِ اهْتَدٰى تو اس آیت کے بارے میں خبر دی۔ سورت مکمل ہو گئی الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علیہ سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ و سلم۔

# سورۃ القصص

ایاتھا ۸۸ | ۲۸ سورۃ القصص مکیۃ ۴۹ | رکوعاتھا ۹

حضرت حسن بصری، عکرمہ اور عطا کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: مگر ایک آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان نازل ہوئی۔ ابن سلام نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو یہ جحفہ کے مقام پر نازل ہوئی وہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ مقاتل نے کہا: اس میں مدنی آیات یہ بھی ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ٘ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ٘ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ۝ اس کی اٹھاسی آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

**طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَ نُرِیَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ ۝**

"طا، سین، میم، یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی۔ ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعہ ٹھیک ٹھیک ان لوگوں (کے فائدہ) کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ بے شک فرعون متکبر (وسرکش) بن گیا سرزمین (مصر) میں اور اس نے بنا دیا وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ وہ کمزور کرنا چاہتا تھا ایک گروہ کو ان میں، یہ ذبح کیا کرتا ان کے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑ دیتا ان کی عورتوں کو، بے شک وہ فساد برپا کرنے والوں سے تھا۔ اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث اور تسلط بخشیں انہیں سرزمین (مصر) میں اور ہم دکھائیں فرعون اور ہامان

اوران کی فوجوں کوان کی جانب سے (وہی خطرہ) جس کا وہ اندیشہ کیا کرتے تھے"۔

طٰسٓمّٓ اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ تلك محل رفع میں ہے یہ ھذہ، تلك کے معنی میں ہے آیات اس سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تتلو کی وجہ سے محل نصب میں ہو۔ آیات اس سے بدل ہو تو اس کو نصب دے گا جس طرح تو کہتا ہے: زیدا ضربت۔

الْمُبِيْنِ اس کی برکت اور خیر کو واضح کرنے والی ہے، حق کو باطل سے واضح کرنے والی ہے، حلال کو حرام سے واضح کرنے والی ہے۔ انبیاء کے قصے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو واضح کرنے والی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: بان الشیء و أبان شے واضح ہوگئی۔ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور قارون کے قصہ کا ذکر کیا اور قریش کے مشرکین کے خلاف استدلال کیا۔ اور اس امر کو واضح کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قارون کی رشتہ داری نے قارون کو اس کے کفر کے ساتھ کوئی نفع نہ دیا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کی قرابت انہیں کوئی نفع نہ دے گی۔ اس امر کو واضح کیا کہ فرعون نے زمین میں بالادستی اور ظلم کو اپنایا یہ اس کے کفر میں سے ایک صورت تھی اسے چاہیے کہ زمین میں بالادستی سے اجتناب کرتا اسی طرح کثرت مال سے غلبہ حاصل کرنا یہ فرعون اور قارون کی سیرت ہے۔ نَتْلُوْا عَلَيْكَ جبریل امین ہمارے حکم سے تم پر پڑھتے ہیں مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ یعنی دونوں کی خبریں۔ مِنْ بعضیہ ہے مِنْ نَّبَاِ، نتلو کا مفعول ہے یعنی ہم ان کی بعض خبریں تم پر تلاوت کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تنبت بالدھن اور بالحق کا معنی ہے اس سچائی کے ساتھ جس میں شک اور جھوٹ نہیں۔ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ اس قوم کے لیے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے جو ایمان نہ لایا تو یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ یہ حق ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ اس نے تکبر کیا اور جبر کو اپنایا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس نے اپنے کفر کی وجہ سے اپنے رب کی عبادت سے اپنے نفس میں بڑائی کو پایا اور ربوبیت کا دعویٰ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے ملک اور بادشاہت کی وجہ سے اپنے ماتحت لوگوں سے بڑا اور بلند ہو گیا۔ فِي الْاَرْضِ سے مراد مصر کا علاقہ ہے۔ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا خدمت میں مختلف جماعتیں اور صنفیں بنا دیا۔ اعشی نے کہا:

حتی تراہ علیھا یبتغی الشیعا

یہاں تک کہ تو اسے اس پر پائے گا کہ وہ جماعتوں کی خواہش کرتا ہے۔

يَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ، طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ ضمیر سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ (آیت 49) کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاہنوں نے کہا: ایک بچہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا تیری بادشاہت اسی کے ہاتھ پر ختم ہو جائے گی یا نجومیوں نے اسے یہ کہا تھا یا اس نے خواب دیکھا تو اس کی یہ تعبیر لی۔

زجاج نے کہا: اس کی حماقت پر تعجب ہے کہ وہ یہ نہ جان سکا کہ اگر کاہن نے سچ بولا ہے تو قتل اسے کوئی نفع نہ دے گا اور

اگر اس نے جھوٹ بولا تو قتل کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے ان کے کئی گروہ بنا دیئے جنہوں نے بنی اسرائیل کی ہر جماعت کا اس کے عمل پر مذاق اڑایا۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ وہ زمین میں عمل، معاصی اور ظلم و جبر کے ساتھ فساد برپا کرنے والا تھا۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ ہم ان پر فضل و احسان فرماتے ہیں اور ہم ان پر انعام کرتے ہیں یہ حکایت گزر چکی ہے وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بھلائی میں قیادت کرنے والے۔ مجاہد نے کہا بھلائی کی طرف دعوت دینے والے۔ قتادہ نے کہا: والی اور بادشاہ۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ: 20)

میں کہتا ہوں: یہ عام ہے کیونکہ بادشاہ امام ہوتا ہے اس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ وَ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ فرعون کے ملک کے وارث بنانے والے ہیں وہ اس کے وارث بنیں گے اور قبطیوں کے مسکنوں میں رہائش رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ١ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف: 137) کا یہی معنی ہے۔

وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ ہم انہیں زمین اور اس کے اہل پر قدرت حاصل کرنے والے بنا دیں گے یہاں تک کہ شام اور مصر کے علاقہ پر والی بنا دیا جائے گا۔ وَ نُرِیَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہم فرعون کو دکھائیں۔ اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور خلف نے یری یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ کہ یہ فعل ثلاثی ہے جو رأی سے مشتق ہے۔ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مرفوع ہیں کیونکہ یہ فعل کے فاعل ہیں۔ باقی قراء نے نری نون کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ فعل رباعی ہے أری، یری سے مشتق ہے یہ سیاق کلام کے مطابق ہے کیونکہ اس سے ماقبل نرید اور اس کے بعد نمکن ہے۔ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ فراء نے دیری فرعون یاء کے ضمہ راء کے کسرہ اور آخری یاء کے فتحہ کے ساتھ قراءت کو جائز قرار دیا ہے معنی ہے اللہ تعالیٰ فرعون کو دکھائے۔ مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں خبر دی گئی کہ ان کی ہلاکت بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے ہاتھ پر ہوگی وہ اس وجہ سے بنی اسرائیل سے خوفزدہ تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ کچھ دکھا دیا جس سے وہ ڈرتے تھے۔ قتادہ نے کہا: فرعون کا ایک نجومی تھا اس نے کہا: اس سال ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیرا ملک چھین لے گا۔ فرعون نے اس سال بچوں کے قتل کا حکم دے دیا۔

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ١ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ١ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۝ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا١ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ۝ وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَ لَكَ١ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ١ۖۗ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝

”اور ہم نے الہام کیا موسیٰ کی والدہ کی طرف کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہ، پھر جب اس کے متعلق تمہیں

اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے۔ پس (دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھر والوں نے تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے، بے شک فرعون، ہامان اور ان کے لشکری خطا کار تھے اور کہا فرعون کی بیوی نے: (اے میرے سرتاج!) یہ بچہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرنا شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے اپنا فرزند بنالیں اور وہ (اس تجویز کے انجام کو) نہ سمجھ سکے''۔

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ وحی کا معنی اور اس کے مصداق کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف جو وحی کی گئی ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: یہ قول اس کی نیند میں کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ الہام تھا۔ ایک جماعت نے کہا: وہ فرشتہ تھا جو مثالی شکل میں اس کے پاس آیا تھا۔ مقاتل نے کہا: حضرت جبریل امین یہ پیغام لائے تھے۔ اس تعبیر کی بنا پر وہ وحی اعلام تھی الہام نہیں تھا۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے وہ نبی نہ تھیں۔ اس کی طرف فرشتے کے بھیجنے کی صورت وہی تھی جس طرح فرشتے نے اقرع، ابرص اور اعمی سے گفتگو کی تھی جس کا ذکر حدیث مشہور میں ہے امام بخاری اور امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے سورۂ براءۃ میں ہم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مروی ہے کہ فرشتوں نے لوگوں سے ان کی نبوت کے بغیر کلام کیا۔ عمران بن حصین کو سلام کیا وہ نبی نہیں تھا اس کا نام ایارخا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ کی ماں کا نام ایارخت تھا؛ سہیلی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا نام لوحابنت ہاند بن لاوی بن یعقوب تھا۔

اَنْ اَرْضِعِیْهِ عمر بن عبد العزیز نے ان ارضعیہ نون کے کسرہ اور الف وصل کی صورت میں پڑھا ہے۔ ارضع کے ہمزہ کو تخفیف کے طریقہ پر حذف کیا پھر دو ساکنوں کے جمع ہونے کی وجہ سے نون کو کسرہ دیا۔ مجاہد نے کہا: یہ وحی ولادت سے پہلے رضاعت کے بارے میں تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ وحی ولادت کے بعد تھی۔ سدی نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جنا تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ولادت کے بعد اسے دودھ پلائیں اور اس بچے کے ساتھ وہ کچھ کریں جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ خوف ولادت کے بعد شروع ہوا تھا۔ ابن جریج نے کہا: انہیں حکم دیا گیا کہ چار ماہ تک ایک باغ میں دودھ پلائیں اور جب اس کے چیخنے کا خوف ہوا (کیونکہ ان کا دودھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کافی نہ تھا) تو اس وقت انہوں نے یہ کہا۔ پہلا قول زیادہ نمایاں ہے مگر دوسرے قول کی تائید فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ کے الفاظ کرتے ہیں اذا یہ زمانہ مستقبل کے لیے آتا ہے روایت بیان کی جاتی ہے انہوں نے بردی لکڑی کا تابوت بنایا اس کے اندر کی جانب تارکول ملا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھا اور دریائے نیل میں اسے بہا دیا۔ اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب بنی اسرائیل مصر میں بہت زیادہ ہو گئے تو وہ لوگوں پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے برائیاں کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قبطیوں کو مسلط کر دیا۔ اور انہوں نے بنی اسرائیل کو سخت عذاب میں مبتلا کیا یہاں تک کہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر نجات ہوئی۔ وہب نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی تلاش میں ستر ہزار بچے ذبح کیے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: نوے ہزار بچے ذبح کیے۔ یہ روایت کی جاتی ہے جب ولادت کا عمل قریب آیا اور آپ کی ماں کو دردزہ شروع ہوا اور ایک دائی جو بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں پر معین تھی وہ آپ کی والدہ کی مخلص اور محبت کرنے والی تھی۔ آپ کی والدہ نے کہا: ممکن ہے تیری محبت مجھے آج نفع دے اس دائی نے آپ کی والدہ کا علاج کیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام زمین پر آئے تو آپ کی آنکھوں کے درمیان موجود نور نے اسے خوفزدہ کر دیا اس کا ہر جوڑ کانپنے لگا اور آپ کی محبت اس کے دل میں پیوست ہوگئی پھر اس نے کہا: میں تیرے پاس اس لیے آئی تھی کہ تیرے بچے کو قتل کروں اور فرعون کو خبر دوں لیکن میں نے تیرے بیٹے کے لیے ایسی محبت پائی ہے جیسی محبت میں نے کسی کے لیے نہیں پائی اس بچے کی حفاظت کرنا۔ جب دائی نکلی تو فرعون کے جاسوس آ گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور دہکتے ہوئے تنور میں ڈال دیا وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ تنور اس بچے کے ساتھ کیا کرے گا وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے بچے کو تلاش کیا مگر کوئی چیز نہ پائی وہ چلے گئے مگر وہ بچے کی جگہ کو نہیں پہچانتی تھی اس نے تنور سے بچے کے رونے کی آواز سنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ٹھنڈک اور سلامتی والا بنا دیا۔

**وَلَا تَخَافِيْ** اس میں دو وجوہ ہیں (۱) تو اس پر غرق ہونے کا خوف نہ کر، یہ ابن زید کا قول ہے۔ (۲) تو اس کے بارے میں ضائع ہونے کا خوف نہ کر۔ **وَلَا تَحْزَنِيْ** اس میں بھی دو وجوہ ہیں (۱) اس کے فراق پر غمگین نہ ہو؛ یہ ابن زید کا قول ہے (۲) اس کے قتل ہونے کے بارے میں غم نہ کر؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپ کو ایسے تابوت میں رکھا جس کی لمبائی پانچ بالشت اور چوڑائی بھی پانچ بالشت تھی۔ اس کی چابی تابوت کے ساتھ رکھی اور اسے موج کے سپرد کر دیا جب کہ آپ کو چار ماہ تک دودھ پلا چکی تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: تین ماہ دودھ پلا چکی تھی۔ کئی دوسرے علماء نے کہا: آٹھ ماہ دودھ پلا چکی تھی؛ یہ کلبی کی حکایت میں ہے۔ حکایت بیان کی گئی ہے جب بڑھئی تابوت بنانے سے فارغ ہو گیا اس نے فرعون کو چغل خوری کی اس نے سپاہی اس کے ساتھ بھیجا جو اسے لے آئے اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور دل کو بے نور کر دیا تو وہ راستہ بھول گیا اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی بچہ ہے جس سے فرعون کو خوف ہے تو وہ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا وہ آل فرعون کا مومن ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تابوت ان کی والدہ کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا شیطان نے ان کو شرمندہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے دل میں کہا: اگر وہ میرے پاس ذبح کر دیا جاتا اور میں اسے اپنے ہاتھ سے کفن دیتی اور دفن کرتی تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہوتا بنسبت اس کے کہ میں نے سمندر میں پھینکا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ** اہل مصر کی طرف رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں۔ اصمعی نے کہا: میں نے ایک بدوی لڑکی کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

استغفر الله لذنبي كله قبّلتُ إنسانا بغير حِلّه
مثل الغزال ناعماً في دَلّه فانتصف الليل ولم أصلّه

میں اللہ تعالیٰ سے اپنے ہر گناہ پر معافی مانگتی ہوں میں نے بغیر حلت کے ایک انسان کو بوسہ دیا ہے۔ ہرن کی مانند وہ ناز و

ادا میں نرم و نازک تھا رات آدھی ہوگئی اور میں نے اس کی نماز نہیں پڑھی۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے قتل کرے تو کتنی فصیح ہے۔ اس نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ہوتے ہوئے اس کو فصیح شمار کیا جا سکتا ہے وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ اللہ تعالیٰ نے اس ایک آیت میں دو امر، دو نہی، دو خبریں اور دو بشارتیں جمع کر دیں۔

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا کیونکہ ان کا اس بچے کو لینا اس امر کی طرف لے جاتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے دشمن ہوں گے اور انہیں غم عطا کریں گے تو لِيَكُوْنَ میں لام عاقبت اور لام صیرورت کا ہوگا؛ کیونکہ انہوں نے تو اس لیے پکڑا تھا تاکہ یہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اس امر کا انجام یہ تھا کہ یہ ان کے لیے دشمن ہوں گے اور غم کا باعث ہوں گے۔ تو حال کا ذکر مآل کے ساتھ کر دیا۔ جس طرح شاعر نے کہا:

وللمنايا تُرَبِّي كلُّ مُرْضِعةٍ ودُورُنا لخراب الدهر نَبْنِيها

موتوں کے لیے ہر دودھ پلانے والی پرورش کرتی ہے اور ہم اپنے گھر اس لیے بناتے ہیں کہ زمانہ ان کو کھنڈر بنا دے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فللموت تَغْذُو الوالداتُ سِخَالَهَا كما لخراب الدهر تُبْنَى المساكنُ

مائیں موت کے لیے اپنے بچوں کو غذا دیتی ہیں جس طرح زمانہ کے برباد کرنے کے لیے گھر بنائے جاتے ہیں۔

تعمیر کا انجام بربادی ہے اگرچہ فی الحال اس پر خوش ہوا جاتا ہے۔ التقاط سے مراد طلب اور ارادہ کے بغیر کسی چیز کو پانا۔ عرب جب کسی چیز کو طلب اور ارادہ کے بغیر پاتے ہیں تو کہتے ہیں: التقطه التقاطا۔ لقيت فلانا التقاطا۔ راجز نے کہا:

ومَنْهَلٍ وردتُه التقاطا میں اچانک گھاٹ پر وارد ہوا۔

اسی سے لقطہ ہے۔ سورۂ یوسف میں اس کے احکام کے متعلق اتنی بحث گزر چکی ہے جو اس کے لیے کافی وشافی ہے۔

اعمش، یحییٰ، مفضل، حمزہ، کسائی اور خلف نے وحزنا حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ ابو عبید نے اس کو پسند کیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس میں تفخیم کا قاعدہ جاری ہوتا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح العَدَم اور العُدْم۔ السَقَم اور السُقْم، الرَشَد اور الرُشْد۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ہامان قبطیوں میں سے اس کا وزیر تھا وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ وہ نافرمان تھے، مشرک تھے اور گناہگار تھے۔

وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت آسیہ جو فرعون کی بیوی تھی اس نے تابوت کو پانی میں تیرتے ہوئے دیکھا اس نے حکم دیا کہ اس تابوت کو اس کی طرف لایا جائے اور اسے کھولا جائے اس نے تابوت میں ایک چھوٹا بچہ دیکھا تو اس پر اسے رحم آ گیا اور اس کے دل میں بچے کی محبت پیدا ہوگئی۔ اس نے فرعون سے کہا: یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ قرۃ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے؛ یہ کسائی کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں

ایک بعیدی توجیہ ہے جسے ابواسحاق نے ذکر کیا ہے اس نے کہا: یہ مبتدا ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے اس کی خبر لا تقتلوہ ہے یہ بعید اس لیے ہے کیونکہ معنی یہ بنتا ہے یہ معروف ہے کہ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کا یہ معنی بھی کرنا جائز ہے جب یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو تم اسے قتل نہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام ولك پر مکمل ہو جاتی ہے۔ نحاس نے کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت ہے وقالت امراۃ فرعون لا تقتلوہ قرۃ عین لی ولك نصب بھی جائز ہے معنی ہوگا جو چیز میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو اس نے کہا: لا تقتلوہ یہ نہیں کہا: لا تقتلہ، یہ فرعون سے خطاب کر رہی ہے جس طرح جابروں سے خطاب کر رہی ہے اور جس طرح وہ اپنے بارے میں خبر دے رہے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے کہا لا تقتلوہ اسے قتل نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے کسی اور علاقہ سے لایا ہے یہ بنی اسرائیل سے نہیں ہے۔

**عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا** ممکن ہے یہ ہمیں نفع دے اور اس سے بھلائی حاصل کریں یا ہم اسے بچہ بنالیں۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی؛ اس نے فرعون سے وہ بچہ مانگ لیا اور فرعون نے وہ بچہ اسے دے دیا۔

فرعون نے جب خواب دیکھا اور اسے اپنے کاہنوں اور علماء پر پیش کیا جس طرح پہلے گزر چکا ہے انہوں نے اسے کہا: بنی اسرائیل کا ایک بچہ تیری بادشاہت کو برباد کر دے گا۔ اس نے بنی اسرائیل کے بچے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی رائے تھی کہ ان کی نسل ختم کر دے گا۔ وہ ایک سال تک بچے ذبح کرتا اور ایک سال تک زندہ رکھتا حضرت ہارون علیہ السلام کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال وہ بچوں کو زندہ رکھتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اس سال ہوئی جس سال میں اس نے بچوں کو ذبح کرنے کا معمول بنایا ہوا تھا۔

**وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ** یہ ابتدا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کلام ہے وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی ہلاکت اس بچے کے سبب سے ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عورت کا کلام ہے یعنی بنی اسرائیل نہیں جانتے کہ ہم نے اسے پکڑ لیا ہے اور وہ نہیں جانتے مگر یہ کہ یہ ہمارا بچہ ہے۔ علماء تاویل نے اس وقت میں اختلاف کیا ہے جس وقت میں فرعون کی بیوی نے کہا تھا: **قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَ لَكَ** ایک جماعت کا خیال ہے یہ بات اس نے اس وقت کہی جب تابوت کو پکڑا اور اس نے فرعون کو اس کا احساس دلایا جب اس نے فرعون کو بتایا تو فرعون کے ذہن میں گیا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہے اس نے یہ ارادہ اس لیے کیا تاکہ وہ ذبح سے چھٹکارا پائے۔ اس نے کہا: مجھ پر ذبح کرنے والے لاؤ۔ تو اس کی بیوی نے وہ کہا جس کا ذکر ہوا۔ فرعون نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر فرعون نعم کہہ دیتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا اور وہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتے'' (1)۔ سدی نے کہا: بلکہ فرعون کی بیوی نے اس کو پالا یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے لگا فرعون نے آپ میں ذہانت دیکھی تو اسے گمان ہوا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہے اسے اپنے ہاتھ میں اٹھایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور فرعون کی داڑھی کے بال نوچ لیے اس وقت فرعون نے آپ کو ذبح کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس وقت فرعون کی بیوی نے یہ بات کہی۔ اور یاقوت اور انگارہ کے ذریعے اس کا تجربہ کیا تو

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 41

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان جل گئی اور لکنت پیدا ہوگئی جس طرح سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔

فراء نے کہا: میں نے محمد بن مروان سے سنا جنہیں سدی کہا جاتا وہ کلبی سے وہ ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت آسیہ نے کہا: قُرَّتُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَ لَکَ پھر کہا: تَقۡتُلُوۡہُ۔ فراء نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ ابن انباری نے کہا: فراء نے اس پر تقدیم و تاخیر کا قول کیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کلام یوں ہوتی تقتلونہ یعنی فعل کے آخر میں نون ہوتا کیونکہ فعل مستقبل مرفوع ہوتا ہے یہاں تک کہ اس پر ناصب یا جازم داخل ہو۔ اس میں نون علامت رفع ہوتی ہے۔ فراء نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت اس کی تائید کرتی ہے وقالت امراۃ فرعون لا تقتلوہ قرۃ عین لی ولک یعنی لا تقتلوہ مقدم ہے۔

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ فَقَالَتۡ ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَہۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَہٗ لَکُمۡ وَ ہُمۡ لَہٗ نٰصِحُوۡنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدۡنٰہُ اِلٰۤی اُمِّہٖ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ وَ لِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۴﴾

''اور موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہوگیا قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دے اس راز کو اگر ہم نے مضبوط نہ کر دیا ہوتا اس کے دل کو تاکہ وہ بنی رہے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی اور اس نے کہا موسیٰ کی بہن سے کہ اس کے پیچھے پیچھے ہولے پس وہ اسے دیکھتی رہی دور سے اور وہ اس (حقیقت کو) نہ سمجھتے تھے اور ہم نے حرام کر دیں اس پر ساری دودھ پلانے والیاں اس سے پہلے تو موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں پتہ دوں تمہیں ایسے گھر والوں کا جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر اور وہ اس بچہ کے خیر خواہ بھی ہوں تو (اس طرح) ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف تاکہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور (اس کے فراق میں) غمزدہ نہ ہوں اور وہ یہ بھی جان لے کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے اور جب پہنچ گئے موسیٰ اپنے شباب کو اور ان کی نشوونما مکمل ہوگئی تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو''۔

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، عکرمہ، قتادہ، ضحاک، ابو عمران جونی اور ابو عبیدہ نے فٰرِغًا کا معنی یہ کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل آپ کے ذکر کے سوا دنیا کی ہر شے کے ذکر سے خالی تھا۔ حضرت حسن بصری نے یہ بھی کہا نیز ابن اسحاق اور ابن زید نے کہا: وہ وحی سے خالی تھی کیونکہ ان کی طرف وحی کی گئی جب اسے حکم دیا گیا کہ وہ اس بچے کو پانی میں پھینک دے وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں سے کیا وہ یہ

وعدہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واپس اس کی طرف لوٹائے گا اور اسے رسولوں میں سے بنائے گا۔ شیطان نے اسے کہا: اے موسیٰ کی ماں! تو نے یہ تو ناپسند کیا کہ فرعون حضرت موسیٰ کو قتل کرے مگر تو نے خود اسے غرق کر دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو یہ خبر پہنچی کہ اس کا بیٹا فرعون کے پاس ہے تو عظیم مصیبت نے اسے وہ وعدہ بھلا دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا: فٰرِغًا یعنی غم اور حزن سے خالی، کیونکہ اسے علم ہو چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غرق نہیں ہوئے؛ یہ اخفش کا قول بھی ہے۔ علاء بن زیاد نے کہا: فٰرِغًا کا معنی ہے نفرت کرنے والا۔ کسائی نے کہا: بھولنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شدت غم سے متحیر؛ اسے سعید بن جبیر نے روایت کیا ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے: اس سے مراد عقل کا چلا جانا ہے۔ معنی ہے جب اس نے یہ سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ہاتھ پہنچ چکے ہیں تو شدت غم کی وجہ سے اور شدت دہشت کی وجہ سے عقل اڑ گئی۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ ۝ (ابراہیم) یعنی خالی، ان کی کوئی عقل نہ تھی۔ جس طرح سورۂ ابراہیم میں پہلے گزر چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل عقول کا مرکز ہوتے ہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں دیکھا: فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ (الحج: 46) جس نے فزعا پڑھا ہے اس کی قراءت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ نحاس نے کہا: سب سے صحیح قول پہلا ہے۔ جنہوں نے وہ قول کیا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ جب آپ کی والدہ کا دل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے سوا ہر ذکر سے خالی تھا تو وہ وحی سے بھی فارغ تھا۔ ابو عبیدہ کا قول وہ غم سے خالی تھا، یہ بہت ہی قبیح ہے کیونکہ اس کے بعد اِنۡ كَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِهٖ لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِهَا ہے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: قریب تھا کہ وہ کہتی وا ابناہ ہائے بیٹے۔ فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ، محمد بن سمیقع، ابو العالیہ اور ابن محیصن نے پڑھا فزعا یہ فا، اور عین کے ساتھ ہے۔ یہ فزع سے مشتق ہے۔ یہ اسے خوف تھا کہ کہیں اسے قتل ہی نہ کر دیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھا: قرعا قاف، راء اور عین کے ساتھ۔ آخری دونوں حرف نقطہ کے بغیر ہیں۔ یہ جماعت کی قراءت کی طرف راجع ہے جو فارغا ہے۔ اسی وجہ سے وہ سر جس پر بال نہ ہوں اس کو اقرع کہتے ہیں، کیونکہ وہ بالوں سے فارغ ہوتا ہے۔ قطرب نے حکایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے پڑھا فرغا یعنی فاء، راء اور غین معجمہ کے ساتھ یہ الف کے بغیر ہے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے ھدرا و باطلا یہ جملہ بولا جاتا ہے: دماء ھم بینھم فرغ یعنی ان کے باہم قصاص باطل ہو گئے۔ معنی ہے اس کا دل باطل ہو گیا اور چلا گیا اور وہ یوں ہو گئی کہ اس کا دل ہی نہیں یہ اس غم کی شدت کی وجہ سے ہوا جو اس پر وارد ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اَصۡبَحَ اس میں دو وجوہ ہیں (۱) اس نے رات کو پانی میں تابوت پھینکا تو دن کے وقت اس کا دل فارغ ہو چکا تھا (۲) اس نے دن کے وقت پھینکا تھا۔ اصبح کا معنی صار ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

مضى الخلفاء بالأمر الرشيد　　وأصبحت المدينة للوليد

خلفاء صحیح امر کے ساتھ چلے گئے اور مدینہ ولید کے لیے رہ گیا۔

اِنۡ كَادَتۡ اصل میں یہ انہا کادت تھا۔ جب ضمیر کو حذف کیا تو نون ساکن ہو گیا یہ ان مخففہ ہے اسی وجہ سے لَتُبۡدِیۡ بِهٖ پر

لام داخل ہے۔ مراد ہے اس کے امر کو ظاہر کر دے یہ بدا یبدو سے مشتق ہے جب وہ ظاہر ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ پھینکنے کے وقت چیخی۔ ہائے بیٹے! سدی نے کہا: جب وہ دودھ پلانے کے لیے اٹھاتی اور چھاتی سے لگاتی تو قریب تھا کہ وہ کہتی: یہ میرا بیٹا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو لوگ کہتے موسیٰ بن فرعون۔ ان کی ماں پر یہ بات شاق گزرتی اور ان کا سینہ تنگ ہوتا۔ قریب تھا کہ وہ کہہ اٹھتی: یہ میرا بیٹا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بہ میں ھاء ضمیر وحی کی طرف لوٹ رہی ہے اس کی تقدیر کلام یہ ہے ان کانت لتبدی بالوحی الذی اوحیناہ الیہا ان نردہ علیہا، قریب تھا کہ وہ اس وحی کو ظاہر کر دیتی جو ہم نے اس کی طرف وحی کی تھی کہ ہم موسیٰ کو اس پر لوٹا دیں گے۔ پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قریب تھا کہ وہ کہتی: میں اس کی ماں ہوں۔ فراء نے کہا: قریب تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کا نام ظاہر کر دیتی کیونکہ اس کا سینہ تنگ پڑ تا تھا۔

لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا قتادہ نے کہا: اگر ہم ایمان کے ساتھ اس کا دل مضبوط نہ کرتے۔ سدی نے کہا: اگر ہم عصمت کے ساتھ اس کا دل مضبوط نہ کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہم صبر کے ساتھ اس کا دل مضبوط نہ کرتے ربط علی القلب سے مراد صبر کا الہام ہے۔ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق کرنے والی ہو جائے جب اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ۔

لَتُبْدِيْ بِهٖ فرمایا: لتبدیہ نہیں فرمایا کیونکہ حروف کی صفات بعض اوقات کلام میں زائد کی جاتی ہیں تو کہتا ہے: اخذت الحبل وبالحبل، یعنی کبھی واسطہ ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی واسطہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام لتبدی القول بہ ہے۔

وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے فرمایا: اس کے پیچھے جاؤ تا کہ تمہیں اس کی خبر سے آگاہی ہو۔ اس کا نام مریم بنت عمران تھا اس کا نام حضرت مریم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھی کے نام کے موافق تھا؛ سہیلی اور ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے ضحاک سے ذکر کیا ہے: اس کا نام کثمہ تھا۔ سہیلی نے کہا: اس کا نام کلثوم تھا اس کا ذکر زبیر بن بکار نے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "میں نے محسوس کیا ہے کہ جنت میں اللہ تعالیٰ نے میری شادی تیرے ساتھ ساتھ حضرت مریم بنت عمران، حضرت کلثوم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن ہیں اور حضرت آسیہ جو فرعون کی بیوی تھی سے شادی کی" (1)۔ حضرت خدیجہ نے عرض کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی خبر دی ہے فرمایا: ہاں۔ عرض کی یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے عرض کی: بالرفاء والبنین یہ لفظ مبارکباد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معنی اتفاق اور بیٹوں والا ہونا ہے۔

فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ جنب کا معنی دوری ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس سے اجنبی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَلَا تَحْرِمَنِّی نَائِلًا عن جَنَابَةٍ ... فِاِنِّی امرؤٌ وسْطَ القِبَابِ غَرِیبُ

---

1۔ در منثور، جلد 5، صفحہ 230

دوری کی وجہ سے مجھے عطیہ سے محروم نہ رکھنا بے شک میں بتوں کے درمیان اجنبی آدمی ہوں۔

اصل میں یہ مکان جنب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عن جنب سے مراد جانب ہے۔ نعمان بن سالم نے قراءت کی عن جانب معنی ہے ایک طرف سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے شوق سے۔ ابو عمرو بن علاء نے حکایت بیان کی ہے یہ بنوجزام کی لغت ہے۔ وہ کہتے ہیں: جنبت الیك میں تیرا مشتاق ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عن جنب ان کی ماں ان سے اجنبی ہے۔ کسی طریقے سے وہ نہیں پہچانتے تھے کہ یہ اس کی ماں ہے۔ قتادہ نے کہا: تو ایک طرف سے اس کو دیکھتی رہ گویا تو اس کا ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ اس کو عن جنب جیم کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھتے۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ کہ یہ اس بچے کی بہن ہے کیونکہ وہ ساحل سمندر پر چلتی رہی یہاں تک کہ اس نے دیکھ لیا کہ انہوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔

وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ ہم نے اس کو اس کی ماں اور بہن کے آنے سے منع کر دیا۔ مراضع یہ مرضع کی جمع ہے۔ جس نے مراضیع پڑھا ہے تو یہ مرضاع کی جمع ہے فعال یہ جمع کثرت کے لیے وزن استعمال ہوتا ہے۔ اس وزن میں مذکر و مونث میں فرق کرنے کے لیے ہاء داخل نہیں کی جاتی کیونکہ یہ وزن فعل پر جاری نہیں ہوتا۔ جس نے مرضاعہ کہا تو وہ ھاء کے ساتھ مبالغہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: مطرابة۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو دودھ پلانے والی بھی لائی جاتی حضرت موسیٰ اسے قبول نہ کرتے اس حرمت سے مراد روکنا ہے یہ حرمت شرعی نہیں۔ امرء القیس نے کہا:

جَالَتْ لِتَصرَعَنِی فقلت لها اقصری　　اِنِّی امرؤٌ صَرْعِی علیكِ حَرَامُ

اس نے چکر لگایا تا کہ وہ پچھاڑ دے میں نے اسے کہا: رک جا میں ایسا آدمی ہوں تجھ پر مجھ کو پچھاڑنا حرام ہے۔

حرام ممتنع کے معنی میں ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے یہ دیکھا تو اس نے کہا: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ اس کی بات وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ سن کر انہوں نے اسے کہا: تجھے کیسے پتہ ہے؟ ممکن ہے تو اس کے گھر والوں کو پہچانتی ہو؟ اس نے کہا: نہیں مگر وہ بادشاہ کی خوشی کے حریص رہتے ہیں یا اس کی دایہ بننے میں رغبت رکھتے ہیں۔ سدی اور ابن جریج نے کہا: جب اس نے کہا وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ تو اسے کہا گیا: تو اس بچے کے اہل کو پہچانتی ہے تو ہماری اس بارے میں رہنمائی کرو۔ اس نے کہا: میں نے ارادہ کیا ہے کہ وہ بادشاہ کے مخلص ہیں تو اس نے ان کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں پر رہنمائی کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن ان کے حکم سے گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لے آئی۔ بچہ فرعون کے ہاتھ میں تھا وہ شفقت کے انداز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہلا رہا تھا جب کہ وہ دودھ کی طلب میں رو رہا تھا۔ فرعون نے وہ بچہ اسے دے دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کی خوشبو پائی تو اس کے پستانوں کو قبول کر لیا۔ ابن زید نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا: وهم للملك ناصحون تو انہیں شک پڑ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب اس نے کہا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وہ اس عورت کی تلاش میں مبالغہ سے کام لے رہے تھے جو اس کے پستان کو قبول کر لے۔ انہوں نے کہا: وہ کون ہے؟ اس نے کہا: میری ماں ہے۔ اسے کہا گیا: اس کا دودھ ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی ولادت کے وقت کا دودھ۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی ولادت ایسے سال میں ہوئی

تھی جس سال بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے کہا: تو نے سچ بولا ہے اللہ کی قسم! وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ یعنی ان میں شفقت اور اخلاص ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کا دودھ پی لیا تو اس سے کہا گیا: اس نے تیرا دودھ کیسے پی لیا ہے جب کہ اس نے کسی اور کا دودھ نہیں پیا؟ اس نے کہا: میں ایسی عورت ہوں جس کی خوشبو اچھی ہے اور دودھ بھی پاکیزہ ہے۔ میرے پاس کوئی بچہ نہیں لایا جاتا مگر وہ میرا دودھ پی لیتا ہے۔ ابو عمران جونی نے کہا: فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ہر ایک روز ایک دینار دیا کرتا تھا۔ زمخشری نے کہا: اگر تو یہ کہے اس کے لیے کیسے حلال ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے پر اجر لیتی؟ تو میں کہوں گا: وہ اس لیے دینار نہیں لیتی تھی کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت لیتی بلکہ یہ حربی کا مال تھا وہ استباحت کے طریقہ پر مال لے لیتی تھیں۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ ہم نے اسے اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کے دل کو اس پر مہربان کر دیا اور اس بارے میں ہمارا اس سے وعدہ بھی تھا۔ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا تا کہ اپنے بچہ کی وجہ سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ وَ لَا تَحْزَنَ اور وہ اپنے بچے کے فراق سے غمگین نہ ہو۔ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ تا کہ اس کے وقوع کو جانے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے بچے کا اس کی طرف لوٹانا عنقریب ہوگا۔ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی آل فرعون میں سے اکثر نہیں جانتے تھے یعنی وہ تقدیر اور قضاء کے راز سے غفلت میں تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جو بھی وعدہ کرے وہ حق ہے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا سورۃ الانعام میں اَشُدَّ کے بارے میں کلام گزر چکی ہے، ربیعہ اور مالک کا قول ہے: جو اس بارے میں قول کیا گیا ہے بلوغت اس میں اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء: 6) یہ اشد کا آغاز ہے اور اس کی انتہائی عمر چونتیس سال ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔ اسْتَوٰۤى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے۔ حکم سے مراد نبوت سے قبل حکمت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے دین میں فقہ ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ سدی کے قول کے مطابق علم سے مراد فہم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نبوت ہے۔ مجاہد نے کہا: مراد فقہ ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: مراد اپنے اور اپنے آبا کے دین کا علم۔ بنی اسرائیل کے نو آدمی تھے جو ان کی بات سنتے اور اقتدا کیا کرتے تھے اور ان کے پاس جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ نبوت سے قبل ہوا۔

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا، اپنے بچے کو سمندر میں پھینک دیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو سچ کر دکھایا۔ ہم نے اس کا بچہ اس کی طرف تحفوں اور شان و شوکت کے ساتھ لوٹا دیا جب کہ وہ آمنہ تھیں پھر ہم نے اسے عقل، حکمت اور نبوت عطا کی اسی طرح ہم ہر محسن کو جزا دیتے ہیں۔

وَ دَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ٘ۗ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ٘ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ۝

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝ قَالَ رَبِّ
بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَهِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ خَآئِفًا
یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَهٗ بِالۡاَمۡسِ یَسۡتَصۡرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوۡسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ
مُّبِیۡنٌ ۝ فَلَمَّاۤ اَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّبۡطِشَ بِالَّذِیۡ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوۡسٰۤی اَتُرِیۡدُ اَنۡ
تَقۡتُلَنِیۡ کَمَا قَتَلۡتَ نَفۡسًۢا بِالۡاَمۡسِ ٭ۖ اِنۡ تُرِیۡدُ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ جَبَّارًا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا
تُرِیۡدُ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ۝

’’وہ شہر میں داخل ہوئے اس وقت جب بے خبر سو رہے تھے اس کے باشندے پس آپ نے پایا وہاں دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے یہ ایک ان کی جماعت سے تھا اور دوسرا ان کے دشمنوں سے پس مدد کے لیے پکارا آپ کو اس نے جو آپ کی جماعت سے تھا اس کے مقابلہ میں جو آپ کے دشمن گروہ سے تھا تو سینہ میں گھونسا مارا موسیٰ نے اس کو اور اس کا کام تمام کر دیا۔ آپ نے فرمایا: یہ کام شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے بے شک وہ کھلا دشمن ہے بہکا دینے والا۔ آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر پس بخش دے مجھے تو الله تعالیٰ نے بخش دیا اسے بے شک وہی غفور رحیم ہے۔ عرض کرنے لگے: میرے رب! مجھے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر فرمائے! اب میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا پھر آپ نے صبح کی اس شہر میں ڈرتے ہوئے اس انتظار میں کہ کیا ہوتا ہے تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ موسیٰ نے اسے فرمایا: بے شک تو کھلا ہوا گمراہ ہے پس جب آپ نے ارادہ کیا کہ جھپٹ پڑیں اس پر جو ان دونوں کا دشمن تھا وہ کہنے لگا: اے موسیٰ! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر ڈالے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا تھا تو نہیں چاہتا بجز اس کے کہ تو ملک میں بڑا بن جائے اور تو نہیں چاہتا کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو‘‘۔

**وَ دَخَلَ الۡمَدِیۡنَةَ عَلٰی حِیۡنِ غَفۡلَةٍ مِّنۡ اَهۡلِهَا** ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حق کو پہچان لیا جو ان کے دین میں تھا تو قوم فرعون جس حالت پر تھی اس پر عیب لگایا یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عام ہو گئی انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈرایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ڈرایا حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے شہر میں چوری چھپے اور ڈرتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ سدی نے کہا: اس قصہ کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ تعلق تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی سواریوں پر سوار ہوتے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا بیٹا سمجھا جاتا۔ ایک روز فرعون سواری پر سوار ہوا اور مصر کے شہروں میں سے ایک شہر کی طرف چلا جسے ’’منف‘‘ کہا جاتا۔ مقاتل نے کہا: یہ مصر سے دو فرسخ کے مقام پر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سوار ہونے کا علم ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں سوار ہوئے اور قیلولہ کے وقت اس بستی میں جا پہنچے یہ غفلت کا وقت تھا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ بھی کہا: یہ عشاء اور عتمہ

(خوب تاریکی) کے درمیان کا وقت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: بلکہ مدینہ سے مراد مصر ہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر فرعون کے خلاف اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا اور بتوں اور فرعون کی عبادت پر ان پر عیب لگایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک روز شہر کے مکینوں کی غفلت کے موقع پر اس میں داخل ہوئے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا: دوپہر کے وقت داخل ہوئے جب کہ لوگ سوئے ہوئے تھے۔ ابن زید نے کہا: فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دشمنی کا اظہار کیا اور آپ کو شہر سے نکال دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی سال تک اس شہر سے غائب رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جب کہ لوگ غفلت میں تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو بھول چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے ساتھ کا زمانہ طویل ہو چکا تھا۔ وہ عید کا دن تھا۔

ضحاک نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر میں داخل ہونے کے لیے غفلت کا وقت تلاش کیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کا علم ہو گیا تو آپ اس میں داخل ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک ایسا آدمی مارا گیا تھا جب کہ اس کے قتل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے بخشش طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا۔ گفتگو میں یہ کہا جاتا ہے: دخلت المدینۃ حین غفل اھلھا۔ یہ نہیں کہا جاتا: علی حین غفل اھلھا، یہاں علی حرف جار داخل ہوا ہے کیونکہ غفلت ہی مقصود تھی۔ یہ اسی طرح ہو گیا جس طرح تو کہتا ہے: جئت علی غفلۃ اگر تو چاہے تو تو کہہ: جئت علی حین غفلۃ اسی طرح آیت ہے۔ فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۟ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ معنی ہے جب دیکھنے والوں نے دونوں کی طرف دیکھا تو کہا: یہ اس کی جماعت میں سے ہے یعنی یہ بنی اسرائیل سے ہے۔ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ اور یہ فرعون کی قوم میں سے ہے فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد کو طلب کیا۔ مابعد آیت میں اسی طرح ہے۔ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ یعنی وہ ایک اور قبطی کے خلاف مدد طلب کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی مدد کی کیونکہ مظلوم کی مدد تمام ادیان میں امتوں پر فرض ہوتی ہے اور تمام شریعتوں میں فرض ہے۔

قتادہ نے کہا: قبطی نے ارادہ کیا تھا کہ اسرائیلی کو مجبور کرے کہ وہ فرعون کے مطبخ کے لیے لکڑیاں اٹھا کر لے جائے تو اسرائیلی نے لکڑیاں اٹھانے سے انکار کر دیا۔ تو اس اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کی سعید بن جبیر نے کہا: وہ قبطی فرعون کا نانبائی تھا فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى قتادہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا سے اسے مارا۔ مجاہد نے کہا: اپنے ہاتھ سے اسے دھکا دیا۔ وکنہ، لکز، لھز اور لھد سب کا ایک ہی معنی ہے اس سے مراد ہتھیلی کو جمع کرتے ہوئے ضرب لگانا ہے جس طرح تہتر کا عقد ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے فلکزہ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہے لکز سے مراد جبڑے پر اور وکنہ سے مراد دل پر گھونسا مارنا ہے۔ ثعلبی نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں فنکزہ ہے معنی ایک ہی ہے۔ جوہری نے ابو عبیدہ سے روایت نقل کی ہے لکز سے مراد سینہ پر گھونسا مارنا ہے۔ ابو زید نے کہا: پورے جسم میں گھونسا مارنا۔ لھز سے مراد پورے ہاتھ سے سینے میں گھونسا مارنا ہے جس طرح لکز ہوتا ہے؛ ابو عبیدہ سے یہی مروی ہے۔ ابو زید نے کہا جبڑے اور گردن پر گھونسا مارنا الرجل ملھز میم کے نیچے کسرہ ہے جبڑے اور گردن میں مکہ مارنے

والا۔ اصمعی نے کہا: نکزہ اسے مارا اور دھکا دیا۔ کسائی نے کہا: نہزہ یہ نکزہ اور وکنہ کی طرح ہے، یعنی اسے مارا اور دھکا دیا۔ لھدہ لھدا اس کی ذلت کی وجہ سے اسے دھکا دیا تو وہ دھکا کھانے والوں میں سے ہو گیا۔ اسی طرح لھدہ ہے۔ طرفہ ایک آدمی کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:

بطئٍ عن الداعی سریعٍ إلی الخنا ذَلُول بأجْماعِ الرجالِ مُلَھَّدِ

وہ داعی سے سستی کرنے والا ہے، فحش کلامی کی طرف جلدی کرنے والا ہے، تمام لوگوں کے سامنے مطیع ہے اور دھکے کھانے والا ہے۔

ملھد کا معنی ہے اسے دھکا دیا جاتا ہے، اسے مشدد کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: فلھدنی لھدۃ او جعنی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دھکا دیا جس نے مجھے تکلیف دی؛ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہی کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے قتل کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دھکا دیا اسی میں اس کی روح تھی فَقَضٰى عَلَيْهِ کا معنی یہی ہے۔ ہر وہ شے جس پر تو متوجہ ہوا اور اس سے فارغ ہو گیا تو تو نے اس کا معاملہ تمام کر دیا۔ شاعر نے کہا:

قَدْ عَضَّهُ فَقَضَى علیه الْاَشْجَعُ

اس نے اسے کاٹا اور اشجع نے اس کا معاملہ تمام کر دیا۔

**قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ** یعنی اس نے ورغلایا تو یہ کام واقع ہوا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حال میں اس روز کافر کے قتل کو حلال خیال نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ حالت قتال سے رو کنے کی حالت تھی۔ **اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ** جملہ میں خبر کے بعد ضمیر ہے۔

**قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ** حضرت موسیٰ علیہ السلام اس گھونسے پر شرمندہ ہوئے جس میں ایک جان چلی گئی۔ ان کی شرمندگی نے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی اور اپنے گناہ سے بخشش طلب کرنے پر برانگیختہ کیا۔ قتادہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام پہچان گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس مصیبت سے نجات دینے والا ہے اس لیے استغفار کی۔ پھر لگاتار حضرت موسیٰ علیہ السلام اس عمل کو ذکر کرتے رہے جب کہ ان کو علم ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہے، یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ کہیں گے: میں نے ایک ایسے نفس کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے اوپر گناہ شمار کیا تھا۔ عرض کی: **ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ** اسی وجہ سے کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ حکم کے بغیر قتل کرے نیز انبیاء ایسی شفقت کرتے ہیں جیسی شفقت کوئی اور نہیں کرتا۔ نقاش نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کے ارادہ سے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ آپ نے اسے گھونسا مارا مقصود اس کو ظلم سے روکنا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ واقعہ نبوت سے پہلے ہوا۔ کعب نے کہا: یہ اس وقت واقع ہوا جب آپ کی عمر بارہ سال تھی۔ اس کے باوجود یہ قتل خطا تھا، کیونکہ گھونسا مارنے سے عموماً قتل واقع نہیں ہوتا۔

امام مسلم نے سالم بن عبداللہ سے روایت نقل کی ہے فرمایا: اے اہل عراق! تم صغیرہ کے بارے میں کتنے ہی سوال کرتے ہو اور کبیرہ پر کتنے ہی سوار ہو جاتے ہو؟ میں نے اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''فتنہ یہاں سے آئے گا اور اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، جہاں سے شیطان کے دو سینگ طلوع ہوں گے تم ایک دوسرے کی گردنیں اڑاؤ گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آل فرعون میں سے ایک فرد کو خطاً قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (طٰہٰ: 40)

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ جو معرفت، حکمت اور توحید کی صورت میں تو نے مجھ پر انعام کیا ہے فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ میں کافروں کا مددگار نہیں۔ قشیری نے کہا: بما انعمت علی من المغفرۃ نہیں کہا، کیونکہ یہ وحی سے قبل کا واقعہ ہے۔ اس وقت آپ یہ نہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قتل کے عمل کو معاف کر دیا ہے۔ ماوردی نے کہا: بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ اس میں دو وجوہ ہیں (۱) مغفرت، مہدوی اور ثعلبی نے اسی طرح ذکر کیا ہے مہدوی نے کہا: بما أنعمت علی من المغفرۃ تو نے مغفرت کی صورت میں جو مجھ پر انعام کیا اور مجھے کوئی سزا نہ دی (۲) ہدایت کی صورت میں جو تو نے مجھ پر انعام کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: فَغَفَرَ لَهٗ مغفرت پر دال ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ زمخشری نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان: بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ کے بارے میں جائز ہے کہ یہ قسم ہو اس کا جواب محذوف ہو تقدیر کلام یہ ہو أقسم بانعامك علی بالمغفرۃ لأتوبن۔

فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفقت و مہربانی کا سوال ہے، گویا عرض کی: اے میرے رب! تو نے مجھ پر مغفرت کی صورت میں جو انعام کیا ہے اس کے وسیلہ سے مجھے محفوظ رکھ، اگر تو نے مجھے محفوظ رکھا تو میں مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔ مجرمین کی مدد سے مراد یا تو فرعون کی صحبت، اس کی جماعت میں شامل ہونا اور اس کے لشکر میں اضافہ کرنا ہے کیونکہ آپ اس کے ساتھ اسی طرح سوار ہوا کرتے تھے جس طرح بچہ والد کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ابن فرعون کہا جاتا یا ایسی مدد ہے جو جرم اور گناہ کی طرف لے جائے، جس طرح اسرائیلی کی مدد جو اسے قتل کی طرف لے گئی جس کا قتل آپ کے لیے حلال نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارادہ کیا اگرچہ میں نے اس قتل میں غلطی کی ہے جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا پھر بھی میں مسلمان کی مجرم کے خلاف مدد کو ترک کرنے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسرائیلی مومن تھا اور مسلمان کی مدد تمام شریعتوں میں واجب ہے۔ بعض روایات میں ہے: وہ اسرائیلی کافر تھا اس کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے انہ من شیعۃ وہ اسرائیلی تھا دین میں موافقت کا ارادہ نہیں کیا اسی وجہ سے آپ کو شرمندگی ہوئی کیونکہ آپ نے کافر کے خلاف کافر کی مدد کی تھی۔ تو فرمایا: لا اکون بعدھا ظھیرا للکافرین ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خبر نہیں بلکہ دعا ہے اس کا معنی ہوگا: اے میرے رب مجھے مجرموں کا مددگار نہ بنا۔

فراء نے کہا: معنی ہے میں کبھی بھی مجرمین کا مددگار نہیں بنوں گا، یہ گمان کیا کہ اس کا یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: اس کا خبر کے معنی میں ہونا زیادہ مناسب ہے اور سیاق کلام کے زیادہ مشابہ ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: لا أعصيك لأنك أنعمت علی میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا کیونکہ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حقیقت میں یہ قول ہے نہ کہ وہ جو فراء نے بیان کیا ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے استثناء نہ کی تو دوسرے دن ہی آزمائش میں ڈال دیئے گئے استثناء دعا میں نہیں ہوتی یہ نہیں کہا جاتا: اللھم اغفرلی إن شئت اے اللہ! مجھے بخش دے اگر تو چاہے۔ سب سے تعجب والی چیز ہے کہ فراء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کی پھر ان سے قول کی حکایت کی۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی سورۂ نمل میں ملخص مبین گزر چکا ہے کہ یہ خبر ہے دعا نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے استثناء نہ کی تو انہیں ایک دفعہ پھر آزمائش میں ڈالا گیا یعنی انہوں نے یہ نہ کہا: فلن أكون إن شاء الله یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے(1): وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (ہود: 113)

**مسئلہ نمبر 2**۔ سلمہ بن نبیط نے کہا: عبدالرحمن بن مسلم نے ضحاک کی طرف اہل بخاری کے عطیات بھیجے اور کہا: انہیں عطا کر دیں۔ انہوں نے کہا: مجھے معاف رکھو، وہ لگاتار معذرت کرتے رہے یہاں تک کہ عبدالرحمن نے انہیں اس ذمہ داری سے بری کر دیا۔ ان سے کہا گیا: تم پر کیا حرج تھا کہ تم وہ عطیات انہیں دے دیتے اور ان کے حق میں کچھ کمی نہ کرتے؟ انہوں نے جواب دیا: میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں ظالموں کی کسی بھی چیز میں کوئی مدد کروں۔ عبداللہ بن ولید وصافی نے کہا میں نے عطاء بن ابی رباح سے کہا: میرا ایک بھائی ہے وہ اپنے قلم سے رزق کماتا ہے جو مال خزانہ میں آتا ہے اور جو نکلتا ہے اس کا حساب رکھتا ہے اس کے عیال بھی ہیں اگر وہ اس ذمہ داری کو چھوڑے تو محتاج ہو جائے اور مقروض ہو جائے۔ پوچھا: سردار کون ہے؟ میں نے جواب دیا: خالد بن عبداللہ قسری۔ فرمایا: کیا تو وہ نہیں پڑھتا جو عبد صالح کہتا ہے: بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہی تو انہیں دوبارہ امتحان میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی، تیرا بھائی ان کی مدد نہیں کرتا اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے۔

عطاء نے کہا: کسی کے لیے بھی حلال نہیں کہ وہ ظالموں کی مدد کرے اس کے لیے نہ حساب کتاب لکھے اور نہ ہی اس کی سنگت اختیار کرے اگر اس نے اس میں سے کوئی بھی عمل کیا تو وہ ظالموں کا مددگار ہو جائے گا۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''قیامت کے روز ایک منادی کرنے والا ندا کرے گا: ظالم کہاں ہیں؟ ظالموں کی مشابہت اختیار کرنے والے کہاں ہیں؟ اور ظالموں کے مددگار کہاں ہیں؟ یہاں تک کہ جس نے ان کی دوات کی روشنائی کو درست کیا یا ان کے لیے قلم چھیلی تو انہیں لوہے کے ایک تابوت میں جمع کیا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''جو آدمی کسی مظلوم کے ساتھ چلا تاکہ اس کے ظلم کے خلاف اس کی مدد کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے قدم صراط پر ثبت فرما دے گا جس روز قدم پھسل جائیں گے اور جو آدمی ظالم کے ساتھ چلا تاکہ

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 85، حدیث نمبر 14953

اس کے ظلم پر اس کی مدد کرے اللہ تعالیٰ اس کے قدموں کو پھسلا دے گا جس روز قدم پھسل جائیں گے"۔ حدیث طیبہ میں ہے: "جو ظالم کے ساتھ چلا تو اس نے جرم کیا"۔ ظالم کے ساتھ چلنا جرم نہیں مگر اس صورت میں جب وہ اس کی مدد کرے کیونکہ اس نے ایسے امر کا ارتکاب کیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:2)

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا سورۂ طٰہٰ اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام خوف کیا کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں کا رد ہے جو اس کے خلاف قول کرتے ہیں خوف نہ تو معرفت کے خلاف ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے توکل کے خلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نفس کے قتل کی وجہ سے خوفزدہ نہ ہوتے کہ اس پر آپ کا مواخذہ کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنی قوم سے خوف تھا کہ کہیں وہ آپ کو فرعون کے سپرد ہی نہ کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ سے خوف تھا۔ يَّتَرَقَّبُ سعید بن جبیر نے کہا: خوف کی وجہ سے مڑ کر پیچھے دیکھتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تلاش کا انتظار کرتے تھے اور اس امر کا انتظار کرتے تھے لوگ جو باتیں کر رہے ہیں۔ قتادہ نے کہا: وہ طلب کی انتظار کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نکلے تا کہ خبر سے آگاہی حاصل کریں۔ اسرائیلی کے علاوہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ قبطی کو کس نے قتل کیا ہے۔ اصبح اس کے بارے میں احتمال ہے کہ وہ صار کے معنی میں ہے یعنی جب قتل کیا تو خوفزدہ ہو گئے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس صبح میں داخل ہوئے یعنی اس دن کی صبح میں جو اس دن کے پیچھے تھا۔ خَآئِفًا یہ منصوب ہے کیونکہ یہ اصبح کی خبر ہے اگر تو چاہے تو اسے حال بنالے تو پھر ظرف خبر کے محل میں ہوگی۔

فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ تو کیا دیکھتے ہیں وہی اسرائیلی جسے گزشتہ روز آپ نے نجات عطا فرمائی تھی وہ ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے جو آپ سے مدد طلب کرنے کا خواہش مند تھا الاستصراخ کا معنی مدد طلب کرنا ہے۔ یہ صراخ سے مشتق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مدد طلب کرنے والا مدد لینے کے لیے چیختا ہے اور آواز نکالتا ہے۔ شاعر نے کہا:

كُنَّا إذا ما أتانا صارخٌ فَزِعٌ كَانَ الصُّراخُ له قرعَ الظَّنَابِيب

جب کوئی گھبرایا ہوا مدد طلب کرنے والا ہمارے پاس آتا ہے تو اس کی چیخ معاملہ کو آسان کر دیتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مدد طلب کرنے والا اسرائیلی وہ سامری تھا جسے فرعون کے نانبائی نے مطبخ تک لکڑیاں اٹھانے کا مطالبہ کیا تھا، قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ الَّذِي یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ يَسْتَصْرِخُهٗ خبر کی جگہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ امس اس دن کو کہتے ہیں جو تیرے دن سے پہلے ہو۔ یہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے مبنی بر کسرہ ہے۔ جب اس پر الف لام داخل ہو یا یہ مضاف ہو تو معرب ہو جاتا ہے تو اس کو رفع اور فتحہ کے ساتھ اعراب دیا جاتا ہے؛ یہ اکثر نحویوں کا نقطہ نظر ہے۔ اس میں سے کچھ وہ ہیں جو اس کو مبنی قرار دیتے ہیں جب کہ اس میں الف لام ہو۔ سیبویہ اور دوسرے علماء نے کہا کہ عربوں میں سے کچھ وہ ہیں کہ وہ اس کو رفع کے محل میں خصوصاً غیر منصرف قرار دیتے ہیں بعض اوقات شاعر مجبور ہوتا ہے تو وہ محل جر اور محل نصب میں بھی غیر منصرف قرار دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

لقد رأيتُ عجبًا مُذْ أَمْسَ

یہاں اس کو منذ کی وجہ سے جر دی ہے جب کہ عمدہ لغت رفع ہے لغت ثانیہ کی بنا پر اس کو محل جر میں رفع کی جگہ رکھا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ، غوی کا معنی نقصان اٹھانے والا ہے کیونکہ تو اس کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے جس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تو گمراہ ہے جس کی گمراہی واضح ہے میں نے کل تیری وجہ سے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور آج تو مجھے ایک اور کے لیے بلاتا ہے۔ غوی یہ أغوی یُغوی سے فعیل کا وزن ہے۔ یہ مغوٰے معنی میں ہے یہ وجیع اور الیم کی طرح ہے۔ جو موجع اور مولم کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غوی یہ غاوی کے معنی میں ہے تو ایسے آدمی کے ساتھ جنگ کرنے میں گمراہ ہے جس کی شر کو دور کرنے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: آپ نے قبطی سے فرمایا اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ یعنی اس اسرائیلی سے خدمت لینے میں تو گمراہ ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے بَطَشَ یَبْطِشُ، ضمہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ ایسا فعل ہے جو متعدی نہیں ہوتا۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ ابن جبیر نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ قبطی کو پکڑیں تو اسرائیلی نے گمان کیا کہ آپ اسے پکڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ آپ نے اس سے سخت کلامی کی تھی۔ اس اسرائیلی نے کہا: اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ قبطی نے یہ گفتگو سن لی اور راز کو افشا کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسرائیلی نے قبطی کو پکڑنے کا ارادہ کر لیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے منع کیا تو اسرائیلی کو خوف لاحق ہوا تو کہا: اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ

اِنْ تُرِیْدُ، ان ما نافیہ کے معنی میں ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ، جبار کا معنی قتال ہے۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: ایک آدمی اس وقت تک جبار نہیں ہو سکتا جب تک وہ آدمیوں کو ناحق قتل نہ کرے۔ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ یعنی ان لوگوں میں سے جو لوگوں کے درمیان اصلاح احوال کی کوشش کرتے ہیں۔

وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰى٘ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ٘ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۠ ﴿۲۱﴾ وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۲۲﴾

''اور آیا ایک آدمی شہر کے آخر گوشہ سے دوڑتا ہوا اس نے (آکر) بتایا: اے موسیٰ! سردار لوگ سازش کر رہے ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کو قتل کر ڈالیں اس لیے نکل جائیے (یہاں سے) بے شک میں آپ کا خیر خواہ ہوں پس آپ نکلے وہاں سے ڈرتے ہوئے (اپنی گرفتاری کا) انتظار کرتے ہوئے عرض کی: میرے رب! بچا لے مجھے ظلم وستم کرنے والوں سے اور جب آپ روانہ ہوئے مدین کی جانب (تو دل میں) کہنے لگے: امید ہے میرا رب میری رہنمائی فرمائے گا سیدھے راستہ کی طرف''۔

وَ جَآءَ رَجُلٌ اکثر مفسرین کی رائے ہے اس آدمی سے مراد حزقیل بن صبورا ہے جو آل فرعون کا مومن تھا۔ وہ فرعون کا چچا

زاد تھا، ثعلبی نے یہ ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ طالوت تھا؛ یہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے: وہ شمعون تھا جو آل فرعون کا مومن تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ شمعان تھا۔ دار قطنی نے کہا: شین کے ساتھ شمعان معروف نہیں مگر وہ آل فرعون کا مومن تھا۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم دیا اس آدمی کو خبر پہنچی تو اس نے کہا: یٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ تیرے قتل کا مشورہ کررہے ہیں اس قبطی کے بدلے میں جس کو تو نے گزشتہ کل قتل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایک دوسرے کو حکم دے رہے تھے۔ ازہری نے کہا: ائتمر القوم و تآمروا ان میں سے بعض نے بعض کو حکم دیا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اْتَمِرُوْا بَیْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق: 6)

نمبر بن تولب نے کہا:

أری النّاس قد أحدثوا شِیمةً　وفی کل حادثةٍ یُؤتَمَرُ

میں لوگوں کو دیکھتا ہوں انہوں نے خصلت بنالی ہے ہر حادثہ میں مشورہ کیا جاتا ہے۔

فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ وہ تلاش کا انتظار کررہے تھے۔

قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبار اسے کہتے ہیں جس کا وہ ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے جیسے مارنا اور ظلم سے قتل کرنا وہ انجام میں کوئی غور نہیں کرتا اور احسن طریقہ سے دفاع نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد متعظم ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تواضع نہیں کرتا۔

وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے، خوفزدہ ہو کر بھاگتے ہوئے مدین کی طرف نکلے ان کے ساتھ نہ کوئی زاد راہ تھا، نہ سواری تھی اور نہ ہی جوتے تھے، اس نسب کی وجہ سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے درمیان تھا، کیونکہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت، راستہ سے ناواقفیت اور زاد راہ وغیرہ سے خالی ہونے کو دیکھا تو اپنے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ عَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ یہ اضطرار کی حالت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام درخت کے پتوں سے قوت حاصل کرتے آپ یہاں نہ پہنچے یہاں تک کہ آپ کے قدموں کا موزہ بھی گر گیا۔ ابو مالک نے کہا: فرعون نے آپ کی تلاش میں آدمی بھیجے اور انہیں کہا: ان جگہوں سے اسے تلاش کرو جہاں سے پہاڑی راستے الگ ہوتے ہیں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام راستے سے واقف نہیں۔ ایک فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا جو گھوڑے پر سوار تھا اس کے پاس نیزہ تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرے پیچھے چلو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی پیروی کی تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راستہ دکھا دیا۔ یہ کہا جاتا ہے: اس نے آپ کو نیزہ دیا یہی آپ کا عصا تھا۔ ایک روایت یہ کی جاتی ہے: آپ کا عصا وہ تھا جو آپ نے مدین سے بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے حاصل کیا تھا؛ یہ قول اکثر علماء سے مروی ہے اور زیادہ صحیح ہے۔ مقاتل اور سدی نے کہا:

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل امین کو آپ کی طرف بھیجا؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے مدین اور مصر کے درمیان آٹھ ایام کا فاصلہ تھا؛ یہ ابن جبیر اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔ مدین کا ملک فرعون کی حکومت میں شامل نہیں تھا۔

وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ
امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا
شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ
خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ
لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ
نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ
اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ
عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ
اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ ؕ
اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

”اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر لوگوں کا ایک انبوہ ہے جو (اپنے مویشوں کو) پانی پلا رہے ہیں اور دیکھیں اس انبوہ سے الگ تھلگ دو عورتیں کہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں آپ نے پوچھا کہ تم کیوں اس حال میں کھڑی ہو؟ ان دونوں نے کہا: ہم نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے اپنے مویشوں کو لے کر واپس نہ چلے جائیں اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں تو آپ نے پانی پلا دیا ان (کے ریوڑ) کو پھر لوٹ کر سایہ کی طرف آ گئے اور عرض کرنے لگے: میرے مالک! واقعی میں اس خیر و برکت کا جو تو نے میری طرف اتاری ہے محتاج ہوں کچھ دیر بعد آئی آپ کے پاس ان دونوں میں سے ایک خاتون شرم و حیاء سے چلتی ہوئی (اور آ کر) کہا: میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تا کہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں پس جب آپ ان کے پاس آئے اور اپنا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا: ڈرو نہیں تم بچ کر نکل آئے ظالموں (کے پنجہ) سے ان دو میں سے ایک خاتون نے کہا: میرے (محترم) باپ اسے نوکر رکھ لیجئے بے شک بہتر آدمی جس کو آپ نوکر رکھیں وہ ہے جو طاقتور بھی ہو اور دیانت دار بھی ہو۔ آپ نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں بیاہ دوں تمہیں ایک اپنی دو بچیوں سے بشرطیکہ تو میری خدمت کرے آٹھ سال تک پھر اگر پورے کرو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کروں تو پائے گا مجھے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا نیک لوگوں سے (جو وعدہ ایفاء کرتے ہیں) موسیٰ نے کہا: یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے پا گئی

ان دو میعادوں سے جو میعاد میں گزار دوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور الله تعالیٰ جو قول وقرار ہم نے کیا ہے اس پر نگہبان ہے''۔

اس میں تیئس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے رہے یہاں تک کہ مدین کے چشمہ پر پہنچے۔ وَرَدَ مَآءَ سے مراد ہے اس تک پہنچ گئے اس کا یہ مطلب نہیں اس میں داخل ہو گئے ورود کا لفظ بعض اوقات مورد میں داخل ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، بعض اوقات اطلاع پانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی پہنچنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ اس میں داخل نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چشمہ پر وارد ہونے سے مراد اس تک پہنچنا ہے۔ اس معنی میں زہیر کا قول ہے:

فَلَمَّا وَرَدْنَ الماءَ زُرْقًا جِمَامُهُ وَضَعْنَ عِصِيَّ الحاضِرِ المُتَخَيِّمِ

جب وہ اس چشمہ پر وارد ہوئیں جس کا لبالب پانی آسمان کے رنگ جیسا نظر آ رہا تھا۔

یہ معانی الله تعالیٰ کے فرمان: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) میں گزر چکے ہیں۔ مدین غیر منصرف ہے کیونکہ یہ معروف شہر ہے۔

شاعر نے کہا:

رُهبانُ مدينَ لو راوْكِ تنزّلُوا

مدین کے راہب اگر تجھے دیکھ لیتے تو اپنی عبادت گاہوں سے نیچے اتر آتے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسا قبیلہ ہے جو حضرت مدین بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔ امة سے مراد جمع کثیر ہے۔ يَسْقُوْنَ کا معنی ہے وہ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ مِنْ دُوْنِهِمُ معنی ہے اس جانب سے جس جہت سے آپ آئے تو آپ ان عورتوں تک جا پہنچے قبل اس کے کہ اس جماعت تک پہنچتے۔ آپ نے ان دونوں کو پایا کہ وہ اپنے ریوڑ کو روک رہی ہے۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فَلَيُذَادَنَّ رجالٌ عن حوضي میرے حوض سے لوگوں کو روکا جا رہا ہوگا۔ بعض مصاحف میں ہے: امراتين حابستين تذودان یہ جملہ بولا جاتا ہے: ذاد يذود جب وہ روکے ذدت الشيء میں نے شے کو روکا؛ شاعر نے کہا:

أَبِيت على باب القَوَافِي كأنَّما أذُودُ بها سِرْبًا من الوحشِ نُزَّعَا

میں قافیوں (شکاری کا گڑھا) کے دروازے پر رات گزارتا ہوں گویا میں وہاں سے وحشی جانوروں کی جماعت کو روکتا ہوں۔ اذود کا معنی ہے میں روکتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تذودان کا معنی ہے وہ دھتکار رہی تھیں؛ شاعر نے کہا:

لقد سَلبتْ عصاكَ بنو تميمٍ فما تَدْرِي بأيِّ عصًا تَذُودُ

بنو تمیم نے تیرے عصا کو سلب کر لیا ہے تو نہیں جانتا تو کس عصا کے ساتھ دھتکارے گا۔

تذود کا معنی تو دھتکارے گا، تو روکے گا۔ ابن سلام نے کہا: وہ اپنے ریوڑ کو روک رہی تھیں تاکہ لوگوں کے ریوڑ کے ساتھ

مل نہ جائیں۔ مفعول کو حذف کر دیا گیا یا تو مقصد مخاطب کو وہم دلانا ہے یا اس کے علم کی وجہ سے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ قوی پانی پلانے والوں کے ڈر سے اپنے ریوڑ کو پانی سے روک رہی تھیں۔ قتادہ نے کہا: وہ لوگوں کو اپنے ریوڑ سے روکے ہوئے تھیں۔ نحاس نے کہا: پہلا معنی زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس کے بعد ہے قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ اگر وہ لوگوں کو اپنے ریوڑ سے روک رہی ہوتیں تو وہ یہ خبر نہ دیتیں کہ وہ اپنے ریوڑ کو اس وقت پلاتی ہیں جب چرواہے چلے جائیں گے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس انداز کو دیکھا تو کہا: مَا خَطْبُكُمَا یعنی تمہارا کیا معاملہ ہے؟ رؤبہ نے کہا:

یا عَجَبًا ما خَطْبُه و خَطْبِی

تعجب ہے اس کے اور میرے کام پر۔

ابن عطیہ نے کہا: مصیبت زدہ، مظلوم، جس پر شفقت مقصود ہو یا جو عجیب و غریب کام کرے اس سے سوال کرنے کے لیے لفظ خطب استعمال ہوتا ہے، گویا یہ لفظ شر کے بارے میں سوال کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دونوں نے اپنے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ ان کے باپ انتہائی بوڑھے شخص ہیں معنی ہے وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ریوڑ کے معالات نہیں سنبھال سکتے اور وہ دونوں بہنیں اپنے ضعف اور طاقت کی کمی کی وجہ سے قوی لوگوں کے ساتھ مزاحمت کی طاقت نہیں رکھتیں۔ ان دونوں کی عادت یہ ہے کہ وہ آہستگی اپناتی ہیں یہاں تک کہ لوگ پانی سے چلے جاتے ہیں اور چشمہ خالی ہو جاتا ہے۔ وہ اس وقت وارد ہوتی ہیں۔ ابن عامر اور ابو عمرو نے پڑھا یَصْدُرُ یہ صَدَرَ سے مشتق ہے یہ ورد کی ضد ہے، یعنی جب چرواہے واپس چلے جاتے ہیں۔ باقی یُصْدِرُ پڑھتے ہیں یہ اَصْدَرَ سے مشتق ہے، یہاں تک کہ ان کے چوپائے پانی سے واپس چلے جاتے ہیں۔ رعاء یہ راعی کی جمع ہے۔ جس طرح تاجر کی جمع تجار، صاحب کی جمع صحاب آتی ہے۔ ایک فرقہ کہتا ہے: کنویں اوپر سے کھلے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ازدحام ان دونوں کو روکتا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ ان کے ریوڑ کو پانی پلائیں تو آپ نے لوگوں سے مزاحمت کی اور پانی پلانے میں ان پر غلبہ پایا یہاں تک کہ آپ نے پانی پلایا۔ اسی غلبہ کی وجہ سے ان دونوں میں سے ایک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت سے وصف بیان کیا۔ ایک جماعت نے کہا: وہ حوضوں میں ان کے بچے ہوئے پانی پر آتیں اگر دونوں حوض میں باقی ماندہ پانی پاتیں تو یہی ان کے جانوروں کی سیرابی کا باعث ہوتا اگر اس میں کوئی پانی نہ ہوتا تو ان کا ریوڑ پیاسا رہ جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان پر ترس آ گیا آپ نے ایک کنویں کا قصد کیا جو اوپر سے ڈھانپا گیا تھا لوگ دوسرے کنویں سے پانی پلا رہے تھے۔ اس کنویں کے پتھر کو سات آدمی ہی اٹھا سکتے تھے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: دس آدمی اٹھا سکتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیس آدمی اٹھا سکتے تھے۔ زجاج نے کہا: چالیس آدمی اٹھا سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اکیلے اسے اٹھا لیا اور دونوں عورتوں کے ریوڑ کو پانی پلا دیا۔ اس پتھر کے اٹھانے کی وجہ سے ان میں سے ایک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت کے ساتھ صفت لگائی ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا کنواں ایک تھا۔ آپ نے وہ پتھر چرواہوں کے چلے جانے کے بعد اٹھایا تھا۔ جب کہ دونوں عورتوں کی عادت یہ تھی کہ وہ بچے ہوئے پانی کو پلایا کرتی

تھیں۔ عمرو بن میمون نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: جب چرواہوں نے پانی پلالیا تو انہوں نے کنویں پر ایک پتھر رکھ دیا جسے دس آدمی ہی اٹھا سکتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے آپ نے وہ پتھر ہٹایا اور پانی کا ایک ہی ڈول نکالا کسی اور ڈول کی ضرورت نہ رہی تو آپ نے ان کے ریوڑ کو سیراب کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر یہ سوال کیا جائے: اللہ کے نبی جو حضرت شعیب علیہ السلام ہیں کے لیے کیسے جائز تھا کہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ ان کے جانوروں کو پانی کے لیے ان کی بیٹیاں کام کریں؟ اس کو جواب دیا جائے گا: یہ کوئی ممنوع نہیں۔ دین اس کا انکار نہیں کرتا۔ جہاں تک مروت کا تعلق ہے تو لوگوں کی آراء مختلف ہیں۔ لوگوں کی عادت جدا جدا ہے۔ عربوں کے احوال عجمیوں کے احوال سے مختلف ہیں۔ دیہاتی لوگوں کا رویہ شہریوں سے مختلف ہے، خصوصاً جب مجبوری ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ آپ سمرہ (ببول) درخت کے سایہ کی طرف گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اس سوال کی طرف متوجہ ہوئے جو آپ کو کھانا کھلائے اس کا ذکر اس قول میں ہے: اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ آپ نے سات دن سے کوئی کھانا نہیں کھایا تھا، آپ کا پیٹ پشت سے لگ چکا تھا۔ دعا کی اور سوال کی وضاحت نہ کی۔ تمام مفسرین نے اس طرح روایت کیا ہے کہ آپ نے اس کلام میں کھانے کو طلب کیا۔ خیر یہاں کھانے کے معنی میں ہے جس طرح اس آیت میں ہے اور مال کے معنی میں ہے جس طرح فرمایا: اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖۚ (البقرہ: 180) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝ (العادیات) یہ لفظ قوت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس طرح فرمایا: اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (الدخان: 37) یہ عبادت کے معنی میں ہے جس طرح فرمایا: وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ (الانبیاء: 73) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بھوک انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور پیٹ میں سبزیاں کھانے سے رنگ زرد پڑ چکا تھا جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے معزز تھے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ مدین تک نہیں پہنچے تھے یہاں تک کہ پاؤں کے نیچے والے حصے گر چکے تھے۔ اس میں یہ شعور دلایا گیا ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حقیر ہے ابو بکر بن طاہر نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ کے بارے میں کہا: میں محتاج ہوں اس چیز کا جو تو نے فضل اور غنا نازل فرمائی کہ تو مجھے اپنے غیر سے غنی کر دے۔

میں کہتا ہوں: اہل تفسیر نے جو کہا وہ اولیٰ ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کے واسطہ سے آپ کو غنی کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ اس کلام میں اختصار ہے جس پر یہ کلام ظاہر دلالت کرتا ہے۔ ابن اسحاق یا ابو اسحاق نے یہ کہا ہے: وہ دونوں تیزی سے اپنے باپ کی طرف گئیں ان کا معمول یہ تھا کہ وہ پانی پلانے میں دیری کیا کرتی تھیں۔ دونوں نے اس مرد کے بارے میں بتایا جس نے ان کے ریوڑ کو پانی پلایا تھا۔ آپ نے اپنی بڑی بیٹی کو حکم دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اپنی چھوٹی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ اس مرد کو بلا لائے۔ تو وہ بچی آئی جس طرح اس آیت میں ذکر ہے۔ عمر بن میمون نے کہا: وہ ایسی عورتوں میں سے نہ تھی جو مردوں پر جری ہوتی ہیں اور حیلہ گر ہوتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا

ہے: وہ اپنی قمیص کے پلو سے اپنے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ یہ حضرت عمر بن خطاب نے قول کیا ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے ان دونوں میں سے ایک کا نام لیا اور دوسری کا نام صفوریا تھا یہ دونوں شیرون کی بیٹیاں تھیں اور شیرون ہی حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی پوتیاں تھیں اور حضرت شعیب علیہ السلام کا وصال ہو چکا تھا۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں۔ قرآن کا ظاہر یہی بتاتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (اعراف: 85) میں اسی طرح ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْــَٔیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ (شعراء) قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو اصحاب ایکہ اور اصحاب مدین کی طرف بھیجا۔ سورۂ اعراف میں ان کے باپ کے نام کے بارے میں اختلاف گزر چکا ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ جب وہ لڑکی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پیغام لائی تو آپ اس کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے درمیان تین میل کا فاصلہ تھا۔ ہوا چلی تو قمیص جسم کے ساتھ چپک گئی اور اس کی سرین کی کیفیت کو بیان کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے دیکھنے میں گناہ محسوس کیا فرمایا: میرے پیچھے ہو لے اور اپنی آواز کے ساتھ مجھے راستہ کے بارے میں آگاہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ابتداءً کہا: میرے پیچھے ہو لے میں عبرانی آدمی ہوں میں عورتوں کی پشت کو نہیں دیکھتا مجھے دائیں بائیں بتا کر راستہ پر میری راہنمائی کرو۔ اس بچی نے آپ کی امانت کے ساتھ جو وصف بیان کیا تھا اس کا سبب یہی تھا: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بلانے والے تک پہنچ گئے اور اپنی تمام سرگزشت سنائی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنے اس قول کے ساتھ آپ سے انس کا اظہار کیا: لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ مدین کا علاقہ فرعون کی مملکت سے باہر تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھانا پیش کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نہیں کھاؤں گا۔ ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہم اپنا دین زمین بھر سونے کے بدلے میں بھی نہیں بیچتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا: یہ پانی پلانے کا عوض نہیں بلکہ یہ میرے اور میرے آباء کا معمول ہے کہ ہم مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، کھانا کھلاتے ہیں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھانا کھایا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اجارہ مشروع تھا اور معلوم و معروف بھی تھا۔ ہر ملت میں یہ اسی طرح ہے۔ یہ انسان کی ضرورت ہے اور لوگوں کے درمیان میل جول کی مصلحت میں سے ہے۔ اصم نے اس میں اختلاف کیا ہے کیونکہ وہ سننے سے بہرہ تھا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اس میں یہ معنی ہے کہ ولی اپنی بیٹی کسی آدمی پر پیش کرتا ہے یہ مروج سنت ہے۔ مدین کے صالح نے اپنی بیٹی بنی اسرائیل کے صالح کو پیش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عثمان غنی پر پیش کی۔ ایک عورت نے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا۔ یہ اچھی بات ہے کہ مرد اپنی رشتہ دار عورت کسی پر پیش کرے اور ایک عورت اپنے آپ کو صالح مرد پر پیش کرے اس میں سلف صالحین کی اقتدا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت حفصہ بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان سے کہا: اگر تو چاہے تو میں تیرا

نکاح حفصہ بنت عمر سے کردوں۔ امام بخاری نے تنہا اس روایت کو نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ نکاح کا اختیار ولی کو ہے عورت کا اس میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ مدین کے صالح نے اس کی ذمہ داری کو قبول کیا۔ شہروں کے فقہاء نے یہی قول کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ یہ بحث گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ باپ کو حق حاصل ہے کہ وہ مشورہ کے بغیر اپنی باکرہ بالغہ کی شادی کردے، امام مالک کا یہی قول ہے آپ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ یہ اس باب میں قوی اور ظاہر ہے آپ کا اس سے استدلال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے وہ اسرائیلیات پر اعتماد کرتے تھے۔ جس طرح پہلے گزرا ہے۔ اس مسئلہ میں امام مالک کے قول کی وجہ سے امام شافعی اور دوسرے کثیر علماء نے بھی یہی قول کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب بچی بالغ ہو جائے تو کوئی آدمی بھی اس کی مرضی کے بغیر شادی نہ کرے کیونکہ وہ مکلف بننے کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ جب وہ چھوٹی ہو تو اس کی مرضی کے بغیر بھی شادی کرسکتا ہے کیونکہ چھوٹی عمر میں نہ اس کا اذن ہے اور نہ اس کی رضا کی کوئی اہمیت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اصحاب الشافعی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ سے یہ استدلال کیا ہے کہ نکاح، لفظ تزویج اور لفظ نکاح پر موقوف ہے۔ یہی قول ربیعہ، ابوثور، ابوعبید، داؤد، امام مالک نے کیا ہے آپ سے یہ قول اختلاف سے مروی ہے ہمارے علماء کا مشہور قول یہ ہے: نکاح ہر لفظ سے منعقد ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: نکاح ہر ایسے لفظ سے منعقد ہو جاتا ہے جو دائمی ملکیت کا تقاضا کرتا ہے۔ جہاں تک شافعیہ کا تعلق ہے ان کے لیے اس آیت میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ یہ ہم سے پہلی امتوں کا حکم ہے اور پہلی شریعتوں کے حکم کو مشہور مذہب کے مطابق وہ حجت تسلیم نہیں کرتے، جہاں تک امام ابوحنیفہ، آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی کا تعلق ہے انہوں نے کہا: ہبہ وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے جب اس پر گواہ قائم کر دیئے جائیں کیونکہ طلاق لفظ صریح اور لفظ کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا: اس طرح نکاح بھی واقع ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خصوصی حکم دیا وہ یہ ہے کہ عوض کے بغیر بضع کی ملکیت حاصل نہ کی جائے۔ لفظ ہبہ سے نکاح منع نہیں کیا، ابن قاسم نے ان کی موافقت کی ہے۔ کہا: اگر اس نے اپنی بیٹی ہبہ کی جب کہ وہ اس کے نکاح کا ارادہ کرتا ہو تو پس امام مالک سے اس بارے میں کوئی چیز یاد نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک یہ چیز اسی طرح ہے جس طرح بیع کا لفظ استعمال کرنا۔ ابوعمر نے کہا: صحیح یہ ہے کہ ہبہ کے لفظ سے نکاح منعقد نہیں ہوتا، جس طرح نکاح کے الفاظ سے اموال میں سے کسی چیز کا ہبہ نہیں ہوتا نیز نکاح میں وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس پر شہادت دی جاسکے۔ یہ طلاق کی ضد ہے تو اس پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے؟ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نکاح أبحت لك اور أحللت لك کے الفاظ سے منعقد نہیں ہوتا اسی طرح ہبہ کے الفاظ سے عقد نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **استحللتم فروجهن بكلمة الله**(1) تم ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے حکم سے حلال کرو۔ کلمۃ اللہ سے مراد قرآن ہے قرآن حکیم میں لفظ ہبہ سے عقد نکاح کا ذکر

---

1۔ الحج، باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 397

نہیں۔ اس میں تزویج اور نکاح کا ذکر ہے۔ لفظ ہبہ کے ساتھ نکاح کے جواز کا قول کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے بعض کا ابطال لازم آتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ** اس میں یہ دلالت ہے کہ یہاں ایک کو پیش کیا جارہا ہے عقد نہیں کیا جارہا ہے، کیونکہ اگر یہ عقد نکاح ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے معقود علیہ کو معین کر دیا جاتا، کیونکہ علماء اگرچہ اس صورت میں بیع کے جواز میں اختلاف کرتے ہیں جب کوئی کہے: بعتك أحد عبدي هذين بثمن كذا میں نے ان دو غلاموں میں سے ایک کو اس قیمت پر تیرے ہاتھ بیچا۔ انہوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ نکاح کے اندر یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں اختیار ہے اور اختیار میں سے کسی چیز کا نکاح سے کوئی تعلق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 11۔** مکی نے کہا: اس آیت میں نکاح کے خصوصی احکام ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیوی کو معین نہیں کیا اور عرصہ کے آغاز کو معین نہیں کیا اور اجارہ کو مہر بنایا ہے اور نقد کوئی شے نہیں دی۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ چار مسائل ہیں جنہیں گیارہ نمبر مسئلہ اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔

(ا) چار مسائل میں سے ایک تعیین ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جہاں تک تعیین کا تعلق ہے تو یہ اس کے مشابہ ہے کہ یہ متوجہ کرنے کے مرحلہ میں ہو پہلے معاملہ کو مجمل انداز میں پیش کیا اور بعد میں اس کی تعیین کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی شادی صفوریا سے کر دی۔ یہی حضرت شعیب کی چھوٹی بیٹی تھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تجھ سے سوال کیا جائے: دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری کی تو کہنا ان دونوں میں سے بہتر اور کامل مدت پوری کی۔ اگر تجھ سے سوال کیا جائے: کس عورت سے شادی کی؟ تو کہنا: چھوٹی سے۔ یہی وہ تھی جو اس کے پیچھے آئی اور اس نے کہا: يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ''(1)۔

لیکن قول یہ کیا گیا ہے: بڑی سے پہلے چھوٹی سے شادی کرنے میں حکمت یہ تھی اگرچہ بڑی کو مردوں کی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ حضرت شعیب کو توقع تھی کہ وہ اس کی طرف مائل ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیغام لاتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور جب حضرت موسیٰ اس کے باپ کی طرف آرہے تھے اس وقت اس کے ساتھ چلے تھے اگر حضرت شعیب علیہ السلام اس پر بڑی کو پیش کرتے ممکن تھا کہ وہ اس کے لیے پسندیدگی کو ظاہر کر دیتے جب کہ دل میں کسی غیر کو پوشیدہ رکھے ہوتے۔ اس کے علاوہ بھی قول کیا گیا ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بعض روایات میں ہے: آپ نے بڑی سے شادی کی تھی؛ قشیری نے اسے بیان کیا ہے۔

(ب) مدت کے آغاز کا جو ذکر کیا گیا ہے آیت میں ایسی کوئی دلالت نہیں جو اس کے اسقاط کا تقاضا کرے بلکہ اسکے بیان سے یہ خاموش ہے۔ ممکن ہے دونوں نے اسے لکھ لیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے جب عقد ہوگا اس وقت سے اس مدت کا آغاز ہوگا۔

---

1۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 33، حدیث نمبر 3021

(ج) اجارہ کے بدلے نکاح یہ تو آیت میں ظاہر ہے۔ یہ ایسا امر ہے جس کو ہماری شرع نے بیان کیا ہے اور اس حدیث میں اس کا ذکر ہے جس کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی ایک سند میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن حکیم میں سے جسے تو یاد رکھتا ہے''(1)۔ اس نے عرض کی: سورۂ بقرہ اور اس کے بعد والی سورت فرمایا: ''اسے بیس آیات کی تعلیم دے دے یہ تیری بیوی ہے''۔ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اس بارے میں ان کے تین اقوال ہیں (1) امام مالک نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، ابن قاسم نے اس سے منع کیا ہے، ابن حبیب نے اسے جائز قرار دیا ہے؛ یہ امام شافعی اور آپ کے اصحاب کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: یہ جائز ہے کہ حر (آزاد) کی منفعت مہر ہو جس طرح کپڑے سینا، تعمیر کرنا اور قرآن کی تعلیم دینا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: یہ صحیح نہیں اور اس امر کو جائز قرار دیا ہے کہ وہ اس عورت سے شادی کرے اور شرط یہ لگائے کہ اس کا غلام ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا یا اسے اپنے گھر میں ایک سال تک رکھے کیونکہ غلام اور گھر مال ہے۔ اپنی بیوی کا خود خدمت کرنا مال نہیں۔

ابو الحسن کرخی نے کہا: اجارہ کے لفظ کے ساتھ عقد نکاح جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (النساء: 24) ابوبکر رازی نے کہا: یہ صحیح نہیں کیونکہ اجارہ ایسا عقد ہے جس میں وقت کی تعیین ہوتی ہے اور عقد نکاح دائمی ہوتا ہے۔ یہ آپس میں منافی ہیں۔ ابن قاسم نے کہا: حقوق زوجیت ادا کرنے سے قبل یہ ختم ہو سکتا ہے اور اس کے بعد ثابت ہو جاتا ہے۔ اصبغ نے کہا: اگر اس نے ساتھ ہی کوئی چیز نقد بھی دی تو اس میں اختلاف ہے اگر ساتھ نقد کوئی چیز نہ دی تو یہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اگر اس کو ترک کیا تو یہ ہر حال میں نافذ ہوگا دلیل حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ ہے؛ یہ امام مالک، ابن معاذ اور اشہب کا قول ہے۔ اس مسئلہ میں متاخرین اور متقدمین کی ایک جماعت نے اس آیت پر اعتماد کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت اجارہ کی صورت میں نکاح کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے عقد صحیح ہے۔ یہ مکروہ ہے کہ اجارہ کو مہر بنایا جائے مناسب یہ ہے کہ مہر مال ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ (النساء: 24) یہ ہمارے تمام علماء کا قول ہے۔

(د) جہاں تک یہ قول ہے: ودخل ولم ینقد علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ جب عقد کیا اس وقت حقوق زوجیت ادا کیے یا جب ساتھ سفر کیا۔ اگر یہ اس وقت ہوا جب عقد کیا تو کیا کوئی نقد پیش کیا؟ ہمارے علماء نے دخول (حقوق زوجیت ادا کرنا) سے منع کیا یہاں تک کہ وہ کوئی چیز نقد پیش کرے اگرچہ وہ ایک چوتھائی دینار ہو؛ یہ ابن قاسم کا قول ہے۔ اگر نقد دینے سے پہلے دخول کیا تو یہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ ہمارے علماء میں سے متاخرین نے کہا: تمام مہر پہلے دینا یا اس میں سے کچھ پہلے دینا یہ مستحب ہے۔ اگر مہر ریوڑ کو چرانا ہو تو خدمت میں شروع ہونے سے ہی نقد ادائیگی ہو گی۔ اگر دخول اس وقت کیا جب ساتھ سفر کیا تو نکاح میں طویل انتظار جائز ہے، اگرچہ عرصہ کی طوالت شرط کے بغیر ہو۔ اگر شرط کی صورت میں ہو تو یہ جائز نہیں مگر اس صورت میں کہ غرض صحیح ہو جس طرح حرم میں داخل کرنے کی تیاری کرنا یا بیوی کا حقوق زوجیت کے اہل ہونے کا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی تزویج علی العمل من یعمل، جلد 1، صفحہ 287

انتظار کرنا اگر وہ بالغ نہ ہو اس پر ہمارے علماء نے تصریح کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ اس آیت میں اجارہ اور نکاح کا اجتماع ہے ہمارے علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے اس بارے میں تین اقوال ہیں (۱) ثمانیہ ابی زید میں کہا: ابتداءً مکروہ ہے اگر ایسا ہو گیا تو نافذ ہو جائے گا (۲) امام مالک اور ابن قاسم کا مشہور قول ہے: جائز نہیں، دخول سے قبل اور اس کے بعد فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں جس طرح باقی ماندہ مختلف عقود ہوتے ہیں (۳) اشہب اور اصبغ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہی صحیح ہے۔ آیت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ امام مالک نے کہا: نکاح بیع کے زیادہ مشابہ ہے تو پھر اجارہ اور بیع میں کیا فرق ہے؟ اور بیع اور نکاح میں کیا فرق ہے؟

مسئلہ: اگر اس نے یہ مہر مقرر کیا کہ وہ اپنی بیوی کو مباح شعر کی تعلیم دے تو یہ صحیح ہے؛ یہ مزنی نے کہا ہے۔ وہ شاعر کے قول کی طرح ہے:

يقول العبد فائدتي ومالي وتقوى الله أفضل ما استفادا

بندہ کہتا ہے: ہائے میرا فائدہ اور میرا مال! اللہ کا تقویٰ زیادہ افضل ہے جتنا وہ فائدہ اٹھائے۔

اگر اس نے یہ مہر مقرر کیا کہ وہ ایسے اشعار کی تعلیم دے گا جس میں ہجو اور فحش کلامی ہو تو یہ اسی طرح ہے جس طرح اس نے شراب یا خنزیر کو مہر کے طور پر مقرر کیا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ خدمت کا ذکر مطلق جاری ہوا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ جائز ہے اسے آپ عرف پر محمول کرتے ہیں خدمت کا ذکر کرنا کوئی ضروری نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا ظاہر یہی ہے، کیونکہ یہ اجارہ مطلقہ کا ذکر ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: یہ جائز نہیں یہاں تک کہ وہ نام لے کیونکہ یہ مجہول ہے۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے: باب من استاجر اجرا فبين له الاجل ولم يبين له العمل۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ مہلب نے کہا: بات اس طرح نہیں جس طرح آپ نے باب باندھا ہے، کیونکہ عمل ان کے نزدیک معلوم تھا کہ پانی پلانا ہے، ہل چلانا ہے اور ریوڑ چرانا ہے اور اس کی مثل جو دیہاتی علاقوں کے کام ہوتے ہیں۔ یہ عمل متعارف تھا۔ اگرچہ معین عمل اور معین مقدار کا ذکر نہ کیا جائے، جس طرح وہ اسے کہتے: انك تحرث كذا من السنة و ترعى كذا من السنة تو اتنے سال ہل چلائے گا اور اتنے سال جانور چرائے گا۔ یہ دیہاتی زندگی کا عام معمول ہے۔ جو چیز تمام علماء کے نزدیک جائز نہیں وہ یہ ہے کہ مدت مجہول ہو اور عمل غیر معروف ہو یہ عقد جائز نہ ہو گا یہاں تک کہ یہ معلوم ہو جائے۔ ابن عربی نے کہا: اہل تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ریوڑ چرانے کے عمل کو معین کیا یہ صحیح سند سے مروی نہیں لیکن انہوں نے کہا: مدین کے صالح کا ریوڑ چرانے کے سوا کوئی عمل نہ تھا، تو ان کا جو مال معلوم تھا وہ خدمت کی تعیین کے قائم مقام ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ جائز ہے کہ کوئی آدمی چرواہے کو چند معین مہینوں کے لیے اجرت پر

رکھے، اجرت معلوم ہو اس میں معین بھیڑ بکریوں کی بھی رعایت کی جائے اگر معین بکریاں ہوں تو اس میں ہمارے علماء کی تفصیل ہے۔ ابن قاسم نے کہا: یہ جائز نہیں یہاں تک کہ ان بکریوں کے نائب کی شرط لگائی جائے اگر وہ بکریاں مرجائیں۔ یہ بہت ہی کمزور روایت ہے۔ مدین کے صالح نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجرت پر رکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دیکھا اور آپ نے نائب کی شرط نہیں لگائی۔ اگر وہ مطلق ہوں نہ ان کا نام لیا گیا ہو اور نہ ہی وہ معین ہوں تو ہمارے علماء کے نزدیک یہ جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے کہا: ان کی جہالت کی وجہ سے جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے عرف پر اعتماد کیا ہے جس طرح ہم نے ابھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کو اتنی مزدوری دی جائے گی جس قدر وہ طاقت رکھتا ہوگا۔ ہمارے بعض علماء نے یہ زائد کہا ہے کہ یہ جائز نہیں یہاں تک کہ مزدور رکھنے والا اس کی قوت کا اندازہ جانتا ہو؛ یہ قول صحیح ہے کیونکہ مدین کے صالح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت کی مقدار کو جانتے تھے کیونکہ آپ نے پتھر اٹھایا تھا۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ امام مالک نے کہا: چرواہے پر کوئی ضمانت نہیں جو جانور ہلاک ہو یا جس کو چوری کیا گیا ہو اس کے بارے میں چرواہے کی بات کو تسلیم کیا جائے گا، کیونکہ وہ وکیل کی طرح امین ہے۔ امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے۔ باب إذا أبصر الراعی أو الوکیل شاۃ تموت أو شیئا یفسد فأصلح، یخاف الفساد اور کعب بن مالک کی حدیث کو ذکر کیا جو انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی۔ ان کی بکریاں تھیں جو سلع پہاڑ پر چرائی جاتی تھیں ہماری ایک لونڈی نے ہمارے ریوڑ میں سے ایک بکری دیکھی جو مر رہی تھی اس نے ایک پتھر توڑا اور اس پتھر کے ساتھ اسے ذبح کر دیا۔ اس نے انہیں کہا: نہ کھاؤ یہاں تک کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کروں یا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کوئی آدمی بھیجوں جو آپ سے سوال کرے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا یا آپ نے آدمی بھیجا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے کھانے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ نے کہا: مجھے اس امر نے متعجب کیا کہ وہ لونڈی ہے اور اس نے جانور ذبح کیا ہے۔ مہلب نے کہا: اس میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ چرواہے اور وکیل کی ان امور میں تصدیق کی جائے گی جس پر ہم نے اسے امین بنایا ہے یہاں تک کہ ان دونوں پر خیانت اور جھوٹ کی دلیل ظاہر ہو؛ یہ امام مالک اور جماعت کا قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: جب اسے بکری کے مرجانے کا خوف ہو تو اس نے اس بکری کو ذبح کر دیا تو وہ ضامن نہیں ہوگا اور جب وہ ذبح شدہ لائے گا تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ ضامن ہوگا یہاں تک کہ اس نے جو کچھ کہا وہ واضح ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ ابن قاسم اور اشہب نے اختلاف کیا ہے جب چرواہے نے جانوروں کی ماداؤں پر مالکوں کی اجازت کے بغیر نر چھوڑے تو وہ مادائیں ہلاک ہوگئیں تو ابن قاسم نے کہا: چرواہے پر کوئی ضمانت نہیں کیونکہ نر چھوڑنا مال کی اصلاح اور اس کو بڑھانے میں سے ہے۔ اشہب نے کہا: اس پر ضمانت ہوگی۔ ابن قاسم کا قول حضرت کعب کی حدیث کے زیادہ مشابہ ہے: اس کے اجتہاد سے جو چیز تلف ہوگئی اس میں اس پر کوئی ضمانت نہیں اگر وہ اہل اصلاح میں سے تھا اور اس کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ مال پر شفقت کرتا ہے اگر وہ فاسق و فسادی ہو اور صاحب مال نے ارادہ کیا کہ وہ اس سے ضمانت لے تو وہ ضمانت لے سکتا ہے کیونکہ جب اس کا فسق معروف ہو تو اس کی اس بات میں تصدیق نہیں کی جائے گی کہ اس

نے بکری میں موت کے آثار دیکھے تھے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ یہ منقول نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیا اجرت تھی؟ لیکن یحییٰ بن سلام نے روایت کی ہے کہ مدین کے صالح نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اجرت معین کی تھی کہ ہر وہ بچہ جو اپنی ماں کے رنگ کے خلاف پیدا ہو گا وہ ان کا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ تو ان کے درمیان اپنا عصا پھینک وہ سب اپنی ماؤں کے رنگ کے خلاف پیدا ہوں گے۔ یحییٰ کے علاوہ دوسرے علماء نے کہا: ہر وہ بچہ جو سیاہ وسفید رنگ والا پیدا ہو گا وہ اس کا ہو گا۔ تو سب نے ایسے ہی بچے جنے۔ قشیری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجرت پر رکھا تو انہیں کہا: فلاں کمرے میں داخل ہو جاؤ اور اس میں پڑے ہوئے عصاؤں میں سے عصا لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا نکالا یہ وہی عصا تھا جو حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے نکالا تھا۔ انبیاء اس کے وارث چلے آرہے تھے یہاں تک کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: وہ یہ عصا کمرے میں رکھ دے اور دوسرا عصا لے لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کمرے میں داخل ہوئے اور وہی عصا نکالا۔ یہ سلسلہ سات دفعہ ہوا ہر دفعہ آپ کے ہاتھ میں یہی عصا آتا۔ حضرت شعیب علیہ السلام جان گئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصی شان ہے جب صبح ہوئی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں کہا: اپنے ریوڑ کو دور لے جانا جہاں سے کئی راستے نکلتے ہیں اور دائیں راستے کو لینا وہاں زیادہ جھاڑیاں نہیں بائیاں راستہ نہ اپنانا کیونکہ وہاں بہت زیادہ جھاڑیاں ہیں اور بڑا سانپ ہے جو جانوروں کو برداشت نہیں کرتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تک ریوڑ کو لے آئے جہاں سے راستے جدا ہوتے ریوڑ نے بائیں جانب والا راستہ لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں نہ روک سکے۔ حضرت موسیٰ علی السلام سو گئے اژدھا نکلا عصا کھڑا ہو گیا اس کی دونوں شاخیں لوہے کی بن گئیں اس نے اژدھا سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ اس کو مار ڈالا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ آیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو عصا کو خون سے آلودہ پایا اور سانپ کو مرا ہوا دیکھا عشاء کے وقت حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف لوٹ آئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نابینا تھے تو آپ نے بکریوں پر ہاتھ پھیرا تو سبزے کا اثر ان پر نمایاں تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس واقعہ کا سوال کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب کچھ بتا دیا حضرت شعیب علیہ السلام خوش ہو گئے اور کہا: ان جانوروں میں سے جو بھی اس سال کئی رنگوں والا بچے جنے گا تو وہ تیرا ہو گا۔ اس سال تمام بچے مختلف رنگوں والے پیدا ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام کو علم ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام و مرتبہ ہے۔

عیینہ بن حصن نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اجرت پیٹ بھر کر کھانا اور اپنی شرمگاہ کی عفت رکھی تھی'' (1)۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں یہ فرمایا تھا: تیرے لیے ان میں سے یعنی ریوڑ کے بچوں میں سے وہ ہو گا جو مختلف رنگوں والا ہو جس میں عزوز، فشوش، کموش، ضبوب اور ثعول نہ ہو۔ ہروی نے کہا: عزوز سے مراد کم دودھ والی، یہ عزاز سے ماخوذ ہے اس سے مراد سخت زمین ہے قد تعززت الشاۃ بکری کم دودھ والی

1۔ در منثور، جلد 5، صفحہ 239

ہے۔ فشوش جس کا دودھ دوہنے کے بغیر ہی نکلتا رہے، یہ تھن کے سوراخ کے بڑا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی کی مثل فتوح اور ثرور ہے۔ عربوں کی امثال میں سے ہے: لَأُفُشَّنَّكَ فَشَّ الْوَطْبِ میں تیرا غصہ اور کبر تیرے سر سے نکال دوں گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فَشَّ السقاء، جب اس سے ہوا کو نکال دیا۔ اس معنی میں حدیث ہے: إنّ الشیطان یَفُشّ بین أَلْیَتَی أحدکم یُخَیِّلُ إلیہ أن أحدث شیطان تمہاری دوسرینوں کے درمیان ہلکی سی پھونک مارتا ہے یہاں تک کہ اس آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا ہے۔ کموش سے مراد چھوٹی کھیری والی، اس کو کمیشہ بھی کہتے ہیں۔ اسے یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی کھیری سکڑی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: رجل کمیش الإزار ایسا آدمی جس کا تہبند چھوٹا ہو۔ کشود یہ کموش کی طرح ہے۔ ضبوب اسے کہتے ہیں جس کے تھن کا سوراخ تنگ ہو۔ ضب سے مراد جس کا دودھ دوہنے کے لیے سختی سے نچوڑنا پڑے۔ ثعول سے مراد ایسی بکری ہے جس کا حلمہ زیادہ ہوں حلمہ سے مراد ثعل ہے اور ثعل سے مراد جس کے دانت زیادہ ہوں۔ اسی زیادتی کو راءول کہتے ہیں: رجل اثعل ثعل سے مراد دودھ کے نکلنے کی جگہ کا تنگ ہونا۔ ہروی نے کہا: حدیث میں قالب لون سے مراد ہے کہ وہ بچہ جو ماں کے رنگ سے مختلف ہو۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ مجہول عوض کے ساتھ اجارہ جائز نہیں ہوتا کیونکہ بھیڑ بکری کا بچہ دینا معلوم نہیں۔ بعض سرسبز و شاداب علاقوں میں بھیڑ بکریوں کا بچہ جننا، اس کی تعداد اور ان کے بچوں کا سلامت رہنا یہ قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے جس طرح مصر وغیرہ کے علاقے۔ مگر یہ ہماری شریعت میں جائز نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر سے منع کیا اور مضامین وملاقیح سے بھی منع کیا ہے۔ مضامین سے مراد جو مونث کے بطن میں ہوتے ہیں اور ملاقیح سے مراد جو نروں کی پشت میں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شاعر نے کہا:

مَلْقُوحَۃٌ فی بطنِ نابٍ حامِلٍ یہاں ملقوحہ کی نسبت مونث سے کی گئی ہے۔

سورۂ حجر میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ تاہم راشد بن معمر نے ایک تہائی اور ایک چوتھائی پر ریوڑ کو چرانے میں اجارہ کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن سیرین اور عطا نے کہا: کپڑے کے ایک حصہ کے بدلے میں کپڑے کو بنا جاتا ہے؛ امام احمد نے یہی کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ نکاح میں کفو کا اعتبار ہے۔ علماء نے اختلاف کیا ہے کہا: دین، مال اور حسب سب میں ان میں سے بعض کا اعتبار ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ موالی کا نکاح عربی عورت اور قریشی عورت سے جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: 13) حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف آئے اجنبی مسافر تھے، علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے، خوفزدہ تھے، تنہا تھے، بھوکے تھے، وافر لباس بھی نہ تھا، حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بچی کا نکاح ان سے کر دیا جب آپ کی امانت ان پر ثابت ہوگئی اور آپ نے ان کا حال دیکھ لیا، باقی چیزوں سے اعراض کیا۔ یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ بعض علماء نے کہا: حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے جو کچھ ہوا یہ عورت کے مہر کا ذکر نہیں تھا۔ یہ تو اپنے لیے ایک شرط تھی جس طرح بدو لوگ کرتے ہیں وہ اپنی بچیوں کے لیے مہر کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: میرے لیے

فلاں چیز خاص ہے اور مہر کو ترک کر دیتے ہیں اور بغیر مہر کے عقد نکاح کر دیتے ہیں بغیر مہر کے نکاح یہ جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا: بدو لوگ جو کچھ کرتے ہیں یہ حلوان اور مہر پر زیادتی ہے۔ یہ حرام ہے اور انبیاء کے مناسب نہیں مگر جب ولی اپنے لیے کوئی شرط ذکر کرے علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے جسے خاوند اپنے آپ سے نکالتا ہے اور عورت کے قبضہ میں نہیں دیتا۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں (۱) یہ جائز ہے (۲) یہ جائز نہیں۔ میرے نزدیک تقسیم صحیح ہے کیونکہ عورت اس سے خالی نہ ہوگی وہ باکرہ ہوگی یا ثیبہ ہوگی۔ اگر ثیبہ ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ نکاح اس کے اپنے قبضہ میں ہے ولی کا کام صرف ایجاب وقبول کی ذمہ داری ادا کرنا ہے جس طرح وکیل بیع کی صورت میں عوض لیتا ہے اسی طرح ولی بھی عوض لے سکتا ہے۔ اگر وہ باکرہ ہو تو عقد ولی کے اختیار میں ہے گویا اس نے نکاح میں بیوی کے علاوہ کسی اور کے لیے عوض مقرر کیا یہ باطل ہے۔ اگر ایسا ہوا تو حق زوجیت سے پہلے یہ ختم ہو جائے گا اور حقوق زوجیت کے بعد ثابت رہے گا یہ مشہور روایت ہے۔ الحمدللہ

**مسئلہ نمبر 21**۔ جب شرط ذکر کی اور اس کے بعد حسن معاشرت کے طور پر کوئی اضافی چیز ذکر کی تو ہر ایک اپنے اپنے حکم پر جاری ہوگی۔ دوسری پہلے کے ساتھ لاحق نہ ہوگی اور فرض ونفل کا کوئی اشتراک نہیں ہوگا، اسی وجہ سے عقود میں متفقہ شروط لکھی جاتی ہیں پھر کہا جاتا ہے: تطوع بکذا شرط اپنی جگہ جاری ہوگی اور نفل اپنے حکم پر جاری ہوگا۔ واجب نفل سے الگ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت شعیب علیہ السلام کے الفاظ میں حسن ہے جو انہوں نے عقد کے نکاح کے حوالے سے کہا: انکحه ایاہ یہ اس سے اولیٰ ہے: انکحها ایاہ اس کی وضاحت سورۂ احزاب میں آئے گی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے آٹھ سال بطور شرط ذکر کیے اور دس سال بطور حرمت ذکر کیے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ جب حضرت شعیب علیہ السلام کی گفتگو ختم ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی توثیق کی اور اسے پختہ کرنے کے انداز میں اس کے معنی کو مکرر کیا کہ شرط آٹھ سالوں میں ہوگی۔ اَيَّمَا یہ کلمہ استفہام ہے، قَضَيْتُ کی وجہ سے منصوب ہے۔ الْاَجَلَيْنِ یہ اس لیے مجرور ہے کیونکہ ای کا کلمہ اس کی طرف مضاف ہے۔ ما زائدہ ہے تاکید کے لیے ہے، اس میں شرط کا معنی موجود ہے اس کا جواب فَلَا عُدْوَانَ میں ہے۔ عُدْوَانَ کا لفظ لا کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن کیسان نے کہا: ما محل جر میں ہے ای اس کی طرف مضاف ہے۔ یہ نکرہ ہے اور الْاَجَلَيْنِ اس سے بدل ہے، اسی طرح فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: 159) میں ہے یعنی رحمة یہ ما سے بدل ہے۔ کلبی نے کہا: وہ کوشش کرتے کہ قرآن میں کسی چیز کو زائد نہ بنائیں اور اس کی کوئی ایسی توجیہ کریں جو اس کو زیادتی سے خارج کر دے۔ حضرت حسن بصری نے ایما یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جمہور علماء کی قراءت ہے: عدوان میں عین مضموم ہے۔ ابوحیوۃ نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی ہے مجھ پر کوئی گرفت نہ ہوگی اور مجھ سے زیادہ عمل کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ عدوان سے مراد غیر واجب امر میں تجاوز کرنا۔ حجج سے مراد سال ہیں؛ شاعر نے کہا:

لمن الديار بِقنة الحجر أقوين من حِجج ومن دهر

پہاڑ کی چوٹی پر کس کے گھر ہیں جو سالوں اور زمانہ سے قوی ہیں۔

حجج کا واحد حجہ ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عورت کے والد کے قول میں سے ہے۔ دونوں صالح ہستیوں نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانے پر اکتفا کیا مخلوقات میں سے کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ علماء نے نکاح میں گواہ بنانے کو واجب قرار دیا ہے۔ یہ تیئیسواں مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں (ا) نکاح دو گواہوں سے ہی منعقد ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ امام مالک نے کہا: نکاح گواہوں کے بغیر بھی منعقد ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عقد معاوضہ ہے اس میں گواہ بنانا شرط نہیں ہے اس میں اعلان اور تصریح شرط ہے آپ نے نکاح اور بدکاری میں فرق دف بجانے کے ساتھ کیا ہے۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں تفصیلی گزر چکا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے ایک اسرائیلی سے سوال کیا کہ وہ اسے ایک ہزار دینار ادھار دے تو دوسرے نے کہا: گواہ لے آؤ جن کو میں گواہ بناؤں۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے۔ دوسرے نے کہا: کوئی ضامن لے آؤ تو پہلے نے کہا: اللہ تعالیٰ ضامن کافی ہے۔ دوسرے نے کہا: تو نے سچ بولا ہے اور وہ دینار قرض کے طور پر دے دے (1)۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

"پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی اور (وہاں سے) چلے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر تو آپ نے دیکھی طور کی ایک طرف آگ، آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا: تم ذرا ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا آگ کی کوئی چنگاری تا کہ تم اسے تاپ سکو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ سعید بن جبیر نے کہا: نصرانیوں میں سے ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کون سی مدت پوری کی؟ میں نے کہا: میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں حبر العرب (عربوں کے عالم) یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آؤں اور ان سے سوال کروں، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے سوال کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں مدتوں میں اکمل مدت کو پورا کیا۔ تو میں نے اس نصرانی کو بتا دیا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! اس نے سچ بولا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے میں جبرئیل امین سے پوچھا تو جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال پورے کیے۔ طبری نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال پورے کیے اور اس کے بعد دس سال پورے کیے؛ اسے حکم بن ابان نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الکفالہ، جلد 1، صفحہ 306

**مسئلہ نمبر 2۔** وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں دلیل ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو جہاں چاہے لے جا سکتا ہے کیونکہ مرد کو عورت پر قوامیت کی فضیلت اور درجہ کی زیادتی حاصل ہے، مگر اس صورت میں کہ خاوند عورت کے لیے اپنے اوپر کوئی چیز لازم کرے مومن کی پہچان شرطوں کو پورا کرنے سے ہوتی ہے جن شرطوں کو پورا کیا جاتا ہے ان میں سے سب سے پختہ شرط وہ ہے جس کے ذریعے تم شرمگاہوں کو اپنے اوپر حلال کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا اس بارے میں گفتگو سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ جذوۃ میں عام قراءت جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حمزہ اور یحییٰ نے اسے ضمہ دیا ہے۔ عاصم، سلمی اور زر بن حبیش نے اسے فتحہ دیا ہے۔ جوہری نے کہا: جِذوۃ، جُذوۃ اور جَذوۃ سب کا معنی ایسا انگارہ ہے جو بھڑک رہا ہو۔ اس کی جمع جِذاً، جُذاً اور جَذاً ہے۔ مجاہد نے اللہ تعالیٰ کے فرمان جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ کی تفسیر میں کہا: انگارے کا ٹکڑا۔ یہ تمام عربوں کی لغت میں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: جذوۃ یہ جذمۃ کی طرح ہے، اس سے مراد لکڑی کا بڑا ٹکڑا ہے۔ اس کی ایک جانب آگ ہو یا نہ ہو۔ ابن مقبل نے کہا:

بَاتَتْ حَوَاطِبُ لَيْلَى يَلْتَمِسْنَ لَهَا　　جَزْلَ الْجِذَا غَيْرَ خَوَّارٍ وَلَا دَعِرِ

لیلیٰ کی لکڑہاریوں نے رات گزاری اس کے لیے بڑی بڑی لکڑیوں کو تلاش کرتے ہوئے جو چیری گئی تھیں اور ان کو جلانے کی صورت میں ان سے دھواں وغیرہ بھی نہ نکلتا تھا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وألقى على قَيْسٍ مِنَ النَّارِ جِذْوَةً　　شديدًا عليها حَمْيُها ولهيبُها

اس نے قیس پہ آگ کا ایسا ٹکڑا پھینکا جس کی تپش اور اس کا شعلہ شدید تھا۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ۙ

''پس جب آپ وہاں گئے تو ندا دی وادی کے دائیں کنارہ سے اس بابرکت مقام میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے''۔

**فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا،** ھا ضمیر سے مراد درخت ہے ضمیر کو اسم سے مقدم کیا۔ **نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ** پہلا اور دوسرا من ابتداء غایت کے لیے ہے آپ کو ندا وادی کی جانب سے درخت کی جانب سے آئی۔ **مِنَ الشَّجَرَةِ** یہ **مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ** سے بدل اشتمال ہے، کیونکہ درخت وادی کے کنارے پر اگا ہوا تھا۔ شاطی الوادی اور شط الوادی دونوں کا معنی اس کی جانب ہے۔ جمع شطان اور شواطی آتی ہے؛ قشیری نے اسے ذکر کیا ہے۔ جوہری نے کہا: شاطی الاودیۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع نہیں بنائی جاتی۔ شاطأت الرجل جب تو ایک کنارے پر چلے اور وہ دوسرے کنارے پر چلے۔ **الْاَيْمَنِ** حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہاڑ کی دائیں جانب سے۔ **فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ** اشہب عقیلی نے پڑھا فی البقعۃ ان کا قول بقاع یہ بقعۃ پر دلالت کرتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: جفنۃ جفان جس نے بقعۃ کہا اس نے جمع بقع ذکر کی جس طرح

غرفة کی جمع غراف آتی ہے۔

مِنَ الشَّجَرَةِ درخت کی جانب سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ درخت علیق کا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ببول کا درخت تھا۔ اور ایک قول یہ کیا گیا: وہ عوسج کا درخت تھا۔ اسی درخت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا؛ زمخشری نے یہ ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ عناب کا درخت تھا۔ عوسج کا درخت جب بڑا ہو جائے تو اس کو غرقد کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: یہ یہودیوں کا درخت ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور ان یہودیوں کو قتل کر دیں گے جو دجال کے ساتھ ہوں گے تو یہودیوں میں سے کوئی آدمی درخت کے پیچھے نہیں چھپے گا مگر وہ درخت بول پڑے گا۔ وہ درخت کہے گا: اے مسلمان! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اور اس کو قتل کرو مگر غرقد کا درخت نہیں بولے گا کیونکہ یہ یہودیوں کا درخت ہے (1)؛ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرش کے اوپر سے کلام کی اور جس طرح چاہا درخت سے اپنا کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سنایا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انتقال اور زوال کی صفت ذکر کی جاسکتی اس کی مثل مخلوق کی صفات ہیں۔

ابو المعالی نے کہا: اہل معانی اور اہل حق کہتے ہیں اللہ تعالیٰ جس سے کلام فرمائے اور اسے رتبہ عالی اور غایت قصوی کے ساتھ خاص کرے تو وہ انسان اس کے کلام قدیم کا ادراک کر لیتا ہے جو کلام حروف، اصوات، عبارات، نغمات اور لغات کی اقسام سے پاک ہوتا ہے، جس طرح کہ جس شخص کو کرامات کی منازل کے لیے طے کیا، اس پر اپنی نعمتیں مکمل کیں اور اپنے دیدار سے نوازا اس نے اپنے رب کا دیدار، اجسام کی مماثلت اور حوادث کے احکام سے منزہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا مثل نہیں۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں میں سے دوسرے منتخب افراد کو اپنی کلام کے ساتھ خاص کیا۔ الاستاذ ابو اسحاق نے کہا: اہل حق نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ایسی صلاحیت پیدا فرما دی جس کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کا ادراک کر لیا۔ کلام کے سماع میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت تھی اللہ تعالیٰ تمام مخلوق میں ایسی صلاحیت پیدا کرنے پر قادر ہے علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے۔ کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج کو اللہ تعالیٰ کا کلام سنا؟ کیا جبریل امین نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں: دونوں میں سے ایک کا طریقہ، قطعی روایت کا ہونا ہے اور یہ تو مفقود ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مخلوق کا اسے سننا قرآن کی قراءت کے وقت اس معنی میں ہے کہ انہوں نے ایسی عبارت سنی جس کے ساتھ وہ اس کے معنی کو پہچان گئے بعینہ اس کے کلام کو نہیں سنا۔ عبداللہ بن سعد بن کلاب نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا قدیمی کلام سنا جو پیدا کی گئی آوازوں میں تھا اللہ تعالیٰ نے جنہیں بعض اجسام میں ثبت کر دیا تھا۔

ابو المعالی نے کہا: بلکہ یہ ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے خرق عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے کلام کے ادراک کو تسلیم کیا جائے۔ اگر یہ قول نہ کیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی تخصیص نہ رہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ان

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب لی قتال المسلمین مع الیہود، جلد 2، صفحہ 396

سے کلام کی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کلام سنایا۔ ان کے لیے علم ضروری پیدا فرمایا یہاں تک کہ انہیں علم ہو گیا کہ جو کچھ انہوں نے سنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس ذات نے اس سے کلام کیا اور جس ذات نے اسے ندا کی وہ رب العالمین ہے۔ اقاصیص میں وارد ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں نے تمام اعضاء کے ساتھ اپنے رب کا کلام سنا اور میں نے اسے اپنی جہتوں میں سے کسی ایک جہت سے اسے نہیں سنا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

اَنْ یّٰمُوْسٰۤی ان محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جر محذوف ہے اصل کلام یوں تھی بأن یا ، موسیٰ۔

اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ نے غیر کے رب ہونے کی نفی کی ہے۔ اس کلام کے ذریعے آپ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو گئے رسولوں میں سے نہ ہوئے کیونکہ وہ رسول نہ ہوئے مگر اس کے بعد کہ آپ کو رسالت کا حکم دیا اور رسالت کا حکم اس کلام کے بعد ہوا۔

**وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾**

"اور (ذرا) ڈال دو (زمین پر) اپنے عصا کو، اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو آپ پیٹھ پھیر کر چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! سامنے آؤ اور ڈرو نہیں یقیناً تم (ہر خطرہ سے) محفوظ ہو"۔

وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ اس کا عطف اَنْ یّٰمُوْسٰۤی پر ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ نمل اور سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ مُدْبِرًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اسی طرح وَّ لَمْ یُعَقِّبْ کا حال ہے یہ بھی حال ہونے کی حیثیت میں محل نصب میں ہے۔ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ وہب نے کہا: اسے کہا جائے گا جہاں تھے واپس چلے جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس لوٹے اور اپنے جبے کا حصہ اپنے ہاتھ میں لپیٹا فرشتے نے آپ سے کہا: مجھے بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف کرے جس سے تو بچتا ہے تو کیا تیرا ہاتھ لپیٹنا تجھے نفع دے گا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: نہیں لیکن میں ضعیف ہوں میں ضعف سے پیدا کیا گیا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کو ننگا کیا اور اسے سانپ کے منہ میں داخل کر دیا تو وہ سانپ عصا بن گیا۔ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ جس سے تو ڈرتا ہے اس سے تو امن میں ہے۔

**اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ٘ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ٘ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ**

اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝۳۵

''ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں وہ نکلے گا سفید (چمکتا ہوا) بغیر کسی تکلیف کے اور رکھ لے اپنے سینہ پر اپنا ہاتھ خوف دور کرنے کے لیے تو یہ دو دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف (لے جانے کے لیے) بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ آپ نے عرض کی: میرے رب! میں نے تو قتل کیا تھا اس میں سے ایک شخص کو پس میں ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے قتل نہ کر ڈالیں اور میرا بھائی ہارون وہ زیادہ فصیح ہے مجھ سے گفتگو کرنے میں تو اسے بھیج میرے ساتھ میرا مددگار بنا کر تاکہ وہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھے جھٹلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم مضبوط کریں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور ہم عطا کریں گے تمہیں ایسا غلبہ (اور شوکت) کہ وہ تمہیں (اذیت) نہیں پہنچا سکیں گے ہماری نشانیوں کے باعث تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب آئیں گے''۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ من حرف جار وَلّی کے متعلق ہے یعنی ولی مدبرا من الرھب۔ حفص، سلمی، عیسیٰ بن عمر اور ابن ابی اسحاق نے مِنَ الرَّهَب راء کے فتحہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر، کوفہ کے قراء نے سوائے حفص کے راء کے ضمہ اور ہاء کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے راء اور ہاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (الانبیاء: 90) یہ سب لغتیں ہیں اور معنی خوف ہے۔ معنی ہے جب تیرے ہاتھ کا معاملہ اور اس کی شعاع تجھے پریشان کرے تو اسے اپنے گریبان میں داخل کرو اور اسے لوٹاؤ تو جس طرح وہ پہلے تھا اس طرح ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا ہاتھ اپنے سینے کے ساتھ ملانے کا حکم دیا تو اس کی وجہ سے سانپ کا خوف ختم ہو گیا؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ ضحاک نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جس کے دل میں خوف ہوتا پھر وہ اپنا ہاتھ داخل کرتا اور اسے اپنے سینے پر رکھتا تو اس کا خوف ختم ہو جاتا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز سے مروی ہے کہ ایک کاتب آپ کے سامنے لکھ رہا تھا اس کی ہوا خارج ہو گئی وہ شرمندہ ہوا، وہ اٹھا اور اپنا قلم زمین پر مارا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اسے فرمایا: اپنا قلم اٹھاؤ اور اپنے ہاتھ کو سینہ پر رکھو تیری روح خوش ہو جائے گی۔ میں کسی اور سے اسے اتنا نہیں سنتا جتنا میں یہ آواز اپنے آپ سے سنتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنا ہاتھ اپنے سینے پر مارتا کہ تیرے سینے میں جو خوف ہے اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خوف کی وجہ سے کانپتے تھے یا تو آل فرعون سے یا سانپ سے۔ ضم جناح سے مراد سکون ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) اس سے مراد نرمی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۱۵ (الشعراء) یعنی ان پر نرمی کیجیے۔ فراء نے کہا: جناح سے مراد عصا لیا ہے۔ بعض اہل معانی نے

کہا: الرھب سے مراد حمیر اور بنی حنیفہ کی لغت میں آستین ہے۔ مقاتل نے کہا: ایک بدوی عورت نے مجھ سے کوئی چیز مانگی جب کہ میں کھانا کھا رہا تھا میں نے ہتھیلی بھری اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کہا: ھا ھنا فی رھبی وہ اپنی آستین کا ارادہ کر رہی تھی یعنی میری آستین میں ڈالو۔ اصمعی نے کہا: میں نے ایک بدو کو دوسرے کو کہتے ہوئے سنا: اعطنی رھبتک میں نے اس سے رہب کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: آستین۔ اس تعبیر کی صورت میں معنی ہوگا اپنا ہاتھ اپنے جسم کے ساتھ جمع کرو اور اسے آستین سے نکالو کیونکہ آپ نے عصا پکڑا جب کہ ان کا ہاتھ ان کی آستین میں تھا۔ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ یہ قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مراد دایاں ہاتھ ہے کیونکہ جیب (گریبان) بائیں پر ہوتی ہے؛ قشیری نے یہ ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: علماء نے جو تفسیر بیان کی ہے کہ ہاتھ کو سینے پر رکھنے کا امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ گریبان سینے پر ہوتا ہے۔ سورۃ النور میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ زمخشری نے کہا: یہ عجیب تفسیر ہے کہ حمیر کی لغت میں رہب سے مراد آستین ہے وہ کہتے ہیں: اعطنی مما فی رھبك کاش میں جانتا کہ لغت میں یہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟ کہا: اس نے قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہے جن کی زبان پر رضامندی کا اظہار کیا جاتا ہے پھر کاش میں جانتا کہ آیت میں اس کا کیا موقع ہے اور کیسے قرآن کے باقی ماندہ کلمات کے ساتھ مفصل تطبیق ہوگی؟ اس کی وجہ یہ ہے جس رات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلام کا شرف حاصل کیا اس وقت ان کے جسم پر اون کا جبہ تھا جس کی آستینیں نہیں تھیں۔ قشیری نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ اس سے مراد دونوں ہاتھ ہیں اگر ہم کہیں: سانپ کے خوف سے امن کا ارادہ کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ اس سے مراد ہے آستینیں چڑھا لو اور تیاری کرلو تاکہ تو رسالت کا بوجھ اٹھا لے۔

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے کہا گیا ہے اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ یعنی تو رسولوں میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ (النمل) ابن بحر نے کہا: اس تاویل کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قول کے ساتھ رسول بن گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قول کے ساتھ رسول بنے: فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ىِٕهٖ برھانان سے مراد ید بیضا اور عصا ہے۔ ابن کثیر نے نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اس میں تخفیف کی ہے۔ ابو عمارہ نے ابو فضل سے وہ ابو بکر سے وہ ابن کثیر سے روایت نقل کرتے ہیں فذانیك یعنی تشدید اور یاء کے ساتھ۔ ابو عمرو سے یہ بھی مروی ہے کہ بنو ہذیل کی لغت فذانیك ہے قریش کی لغت فذانك ہے جس طرح ابو عمرو اور ابن کثیر نے قراءت کی ہے۔ اس کی علت میں پانچ قول ہیں (۱) ایک قول یہ کیا گیا: نون کو شد اس الف کے عوض دی گئی ہے جو اس ذالك میں ساقط ہے جو ذا مرفوع کا تثنیہ ہے۔ اس کو رفع ابتدا کی وجہ سے دیا گیا ہے ذا کا الف محذوف ہے کیونکہ اس پر الف تثنیہ داخل ہے۔ اجتماع ساکنین کی طرف توجہ نہیں کی کیونکہ اس کا اصل فذاانك ہے پہلے الف کو نون مشددہ کے عوض حذف کردیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تشدید، تاکید کے لیے ہے جس طرح انہوں نے اس میں لام کو داخل کیا۔

کلبی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے جس نے اس کو شد دی ہے اس نے اس کی بنیاد اس آدمی کی لغت پر رکھی ہے جس واحد میں ذلك کہا جب یہ بنا ہے تو نون تثنیہ کے بعد اس نے لام کو ثابت رکھا پھر لام کو نون میں مدغم کردیا یہ اس آدمی کے

ہے جس نے دوسرے حرف کو پہلے میں ادغام کا قول کیا ہے، جب کہ اصل قاعدہ یہ ہے کہ پہلے کو دوسرے حرف میں ادغام کیا جائے، مگر کوئی اس میں مانع ہو تو دوسرے حرف کو پہلے حرف میں مدغم کیا جاتا ہے۔ جو علت اس کے مانع ہے کہ پہلے حرف کو دوسرے حرف میں مدغم کیا جائے وہ یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو اس نون کی جگہ جو تثنیہ پر دلالت کرتی ہے اس کی جگہ لام مشدد ہو جاتا ہے تو تثنیہ کا لفظ ہی بدل جاتا ہے تو اس وجہ سے دوسرے حرف کو پہلے حرف میں مدغم کر دیا جاتا ہے تو وہ نون مشدد ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہ اس کے منافی ہے تو نون سے قبل لام کو ثابت رکھا پھر پہلے حرف کو دوسرے میں ادغام کیا جس طرح ادغام کا طریقہ ہے تو وہ نون مشدد ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کو شد اس لیے دی گئی تا کہ اس کے درمیان اور اس اسم ظاہر کے درمیان فرق کیا جائے اضافت جس کے نون کو ساقط کر دیتی ہے، کیونکہ ذان کا لفظ مضاف نہیں کیا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسم معرف اور اس اسم کے درمیان فرق کرنے کے لیے اسے شد دی گئی ہے۔ الذان اور ھذان کی تشدید میں یہی علت ہے۔ ابو عمرو نے کہا: ابو عمرو نے اس حرف کو تشدید کے ساتھ خاص کیا ہر تثنیہ میں یہ قاعدہ جاری نہیں کیا جو اس جنس سے تعلق رکھتا ہو، کیونکہ اس کے حروف تھوڑے ہیں تو اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس نے اسے فذانیك یاء کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ نون میں تخفیف ہے تو اس کے نزدیک اصل فذانك تشدید کے ساتھ ہے دوسرے نون کو یاء سے بدل دیا، کیونکہ ایک جنس کے حروف کو ناپسند کیا ہے جس طرح علماء نے کہا: لا املاء یہ اصل میں لا املہ تھا۔ دوسرے لام کو الف سے بدل دیا۔ جس نے نون مشدد کے بعد یاء پڑھا تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس نے نون کے کسرہ میں اشباع کا قاعدہ جاری کیا تو اس سے یاء نے جنم لیا۔

فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیجئے۔ یہ أردأته سے مشتق ہے جس کا معنی ہے میں نے اس کی مدد کی۔ ردء کا معنی مدد ہے۔ شاعر نے کہا:

ألم تر أنّ أصرم كان رِدئی وخيرَ النّاسِ فی قُلٍّ ومالِ

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اصرم میرا مددگار ہے مال ہو یا نہ ہو وہ بہترین انسان ہے۔

نحاس نے کہا: قد ارداہ، رداہ، دونوں کا معنی مدد کرنا ہے۔ تخفیف کے طریقہ پر ہمزہ کو ترک کر دیا؛ نافع نے یہی قرأت کی ہے۔ یہ مہموز کے معنی میں ہے۔ مہدوی نے کہا: عربوں کے اس قول سے ہمزہ کو ترک کرنا جائز ہے اردی علی الماۃ ھو سے زائد، گویا معنی ہے اسے میرے ساتھ بھیجئے تا کہ میری تصدیق میں اضافہ ہو؛ یہ مسلم بن جندب نے قول کیا ہے؛ شاعر کے شعر میں یہ الفاظ ہیں:

وأسمر خَطِّيًا كأنّ كعوبه نوى القَسْب قد أردیٰ ذراعا على العَشْر

مقام خط کے نیزے گویا ان کی گرہ ٹھوس خشک کھجور کی گٹھلی ہے وہ نیزہ دس ہاتھ سے ایک ذراع زائد ہے۔

ماوردی نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔ غزنوی اور جوہری نے صحاح میں قد أرمی ذکر کیا ہے۔ کہا: القسب سے مراد سخت ہے القسب خشک کھجور ہے گٹھلی کی سختی منہ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ کہا: شاعر نیزہ کی تعریف کرتا ہے۔ جوہری نے

کہا: ردُؤ الشیء یردؤ رداءۃ فھو ردی یعنی وہ فاسد ہے۔ اردأتہ میں نے اسے فاسد کیا۔ اردأتہ میں نے اس کی مدد کی۔ تو کہتا ہے: اردأتہ بنفسی میں اس کا مددگار تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ۔ نحاس نے کہا: وقد حکی رَدأتُہ، ردء او جمع ردء، ارداء۔ ردء کی جمع ارداء ہے۔ عاصم اور حمزہ نے یصدقنی رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اسے جزم دی ہے؛ یہ ابو حاتم کا پسندیدہ قول ہے۔ یہ دعا کے جواب میں ہے۔ ابو عبید نے أرسلہ میں جو ہا ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے رفع پسند کیا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ارسلہ ردءا مصدقا حالۃ التصدیق جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اَنۡزِلۡ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ (المائدہ: 114) تَكُوۡنُ، کائنۃ کے معنی میں ہے یہ حال ہے جو استقبال کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ردءا کی صفت ہے۔ اِنِّیۤ اَخَافُ اَنۡ یُّكَذِّبُوۡنِ جب میرا کوئی وزیر یا مددگار نہ ہو کیونکہ وہ میری بات سمجھنے والے نہیں۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیۡكَ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: ہم تیرے بھائی کے ذریعے تجھے قوت بہم پہنچائیں گے۔ یہ تمثیل ہے کیونکہ ہاتھ کی قوت بازو کے ساتھ ہی ہوتی ہے؛ طرفہ نے کہا:

بَنِی لُبَیۡنَی لستُمُ بیدٍ اِلَّا یدًا لیست لھا عَضُد

اے بنی لبینی تم ہاتھ نہیں ہو مگر ایسا ہاتھ جس کا بازو نہ ہو۔

اچھی دعا کے موقع پر یہ کہا جاتا ہے: شد اللہ عضدك اس کی ضد میں کہا جاتا ہے: فت اللہ فی عضدك اللہ تعالیٰ تیرے بازو کو مضبوط کرے۔ اللہ تعالیٰ تیرے بازو کو ریزہ ریزہ کرے۔

وَنَجۡعَلُ لَكُمَا سُلۡطٰنًا سلطان سے مراد حجت اور برہان ہے۔ فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡكُمَا وہ تم دونوں کو اذیت نہیں دے سکتے بِاٰیٰتِنَا تم ہماری آیات کی وجہ سے محفوظ و مامون رہو گے۔ جائز ہے کہ اِلَیۡكُمَا پر وقف کیا جائے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے ربما و من اتبعکما الغابون بایاتنا، یہ اخفش اور طبری کا قول ہے۔ مہدوی نے کہا: اس صورت میں صلہ موصول پر مقدم ہوتا ہے مگر یہ مقدر کیا جائے انتما غالبان بایاتنا انما و من اتبعکما الغالبون یہاں آیات سے مراد آپ کے باقی معجزات ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی وَّمَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی مِنۡ عِنۡدِهٖ وَمَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَاُ مَا عَلِمۡتُ لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرِیۡ ۚ فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوۡسٰی ۙ وَاِنِّیۡ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الۡكٰذِبِیۡنَ ﴿۳۸﴾ وَاسۡتَكۡبَرَ هُوَ وَجُنُوۡدُهٗ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اِلَیۡنَا لَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ ۚ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾

''پھر جب آئے فرعونیوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری روشن نشانیاں لے کر انہوں نے کہا: نہیں ہے یہ مگر جادو گھڑا ہوا اور ہم نے نہیں سنیں اس قسم کی باتیں اپنے پہلے آباء و اجداد کے زمانہ میں اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو اس کی بارگاہ سے (نور) ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس کا انجام اچھا ہوگا بے شک بامراد نہیں ہوتے ظلم و ستم کرنے والے (یہ سن کر) فرعون نے کہا: اے اہل دربار! میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور خدا ہے پس آگ جلا میرے لیے اے ہامان! اور اس پر اینٹیں پکوا میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کر شاید (اس پر چڑھ کر) میں سراغ لگا سکوں موسیٰ کے خدا کا اور میں تو اس بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے اور تکبر کیا ہے اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق اور وہ یہ گمان کرتے رہے کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ پس ہم نے پکڑ لیا اسے اور اس کے لشکریوں کو اور پھینک دیا انہیں سمندر میں دیکھو! کیسا (ہولناک) انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا۔ اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلا رہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف اور روز محشر ان کی مدد نہیں کی جائے گی اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن بھی ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا''۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح اور ظاہر آیات لائے۔ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى انہوں نے کہا: یہ گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔ وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیات جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توحید کے اثبات میں استدلال کیا ہے جو دلائل عقلیہ سے تعلق رکھتی ہیں ہم نے انہیں اپنے آباء سے تو نہیں سنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیات سے مراد معجزات ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰى عام قراءت واؤ کے ساتھ ہے۔ مجاہد، ابن کثیر اور ابن محیصن نے واؤ کے بغیر قال قراءت کی ہے اہل مکہ کے مصحف میں یہ اس طرح ہے رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى، ھدی سے مراد رشاد ہے۔ مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عاصم کے علاوہ کوفہ کے قراء نے یکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے عَاقِبَةُ الدَّارِ یعنی دار جزا اِنَّهٗ ہاء ضمیر امر و شان ہے لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کلام اور انا ربکم الاعلی کے قول کے درمیان چالیس سال کا عرصہ حائل ہے۔ اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے بلکہ اسے علم تھا کہ اس کا وہاں رب ہے جو اس کا اور اس کی قوم کا خالق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) اس نے کہا: فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ میرے لیے اینٹیں پکا دے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ قتادہ نے کہا: فرعون وہ پہلا شخص ہے جس نے اینٹیں پکوائیں اور ان سے عمارت بنوائی۔

جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ اس کے لیے محل بنائے تو ہامان نے مزدور جمع کیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے پچاس ہزار مستری جمع کیے معاونین اور مزدور اس کے علاوہ تھے اس نے اینٹیں پکانے، چونا تیار کرنے لکڑی چیرنے اور کیل لگانے کا حکم دے دیا۔ انہوں نے محل بنایا، محل کو خوب اونچا کیا اور اسے پختہ کیا جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا کوئی عمارت اس تک نہیں پہنچتی تھی۔ عمارت بنانے والا اس کی چوٹی پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آزمانے کا ارادہ کیا۔ سدی نے حکایت بیان کی ہے: فرعون اس چھت پر چڑھا اور ایک تیر آسمان کی طرف پھینکا وہ تیر خون میں لت پت واپس آیا۔ اس نے کہا: میں نے (حضرت) موسیٰ کے الٰہ کو قتل کر دیا ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے: اللہ تعالیٰ نے اس کی اس گفتگو کے موقع پر جبریل امین کو بھیجا حضرت جبریل امین نے اپنا پر مارا تو اس نے محل کے تین ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ٹکڑا فرعون کے لشکر پر پڑا جس کی وجہ سے ان کے دس لاکھ سپاہی مارے گئے ایک ٹکڑا سمندر میں جا گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں جا گرا اور وہ تمام ہلاک ہو گئے جنہوں نے اس محل کے بنانے میں کام کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بات کی صحت کو خوب جانتا ہے۔

**وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ** یہاں ظن سے مراد شک ہے۔ اس نے شک کرتے ہوئے انکار کیا کیونکہ اس نے ایسے دلائل دیکھے جن کا سمجھنا عقل مند پر کوئی مشکل نہ تھا۔

**وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ** فرعون نے خود اور اس کے لشکروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے اپنے آپ کو بڑا خیال کیا۔ **فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ**، بغیر الحق سے مراد سرکشی ہے یعنی اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہ تھی جس کے ساتھ وہ ان معجزات کا دفاع کر سکتا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔ **وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ** انہوں نے گمان کیا کہ نہ ان کے لیے معاد ہے اور نہ ہی دوبارہ اٹھانا ہے۔ نافع، ابن محیصن، شیبہ، حمید، یعقوب، حمزہ اور کسائی نے لایَرجِعون پڑھا یعنی یاء پر فتحہ اور جیم کے نیچے کسرہ ہے، اس بنا پر کہ یہ معروف کا صیغہ ہے۔ باقی قراء نے یُرجعون مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ پہلا قول ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ **فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ** وہ ستائیس لاکھ تھے۔ **فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ** ہم نے انہیں نمکین سمندر میں پھینک دیا۔ قتادہ نے کہا: مصر سے آگے ایک سمندر ہے جسے اساف کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں غرق کیا۔ وہب اور سدی نے کہا: وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں غرق کیا وہ بحر قلزم کی ایک جانب تھی جسے بطن جزیرہ کہا جاتا۔ وہ آج تک غصے میں ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد دریائے نیل ہے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ **فَانْظُرْ** اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم دیکھیے۔ **كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ** ان کے امر کا انجام کیسے ہوا؟ **وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً** ہم نے انہیں زعماء بنا دیا ہے جن کی کفر پر پیروی کی جاتی ہے ان پر ان کا بوجھ ہے اور ان کا بوجھ ہوتا ہے جو ان کی پیروی کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کی سزا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم میں سے ایسے سردار بنا دیئے جو ان میں سے بے وقوفوں کے سردار تھے تو وہ جہنم کی طرف دعوت دیتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایسے ائمہ تھے جن کی اتباع عبرت والے کرتے اور ان سے صاحب بصیرت نصیحت حاصل کرتے۔ **یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ** جہنمیوں کے عمل کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ **وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ** قیامت کے روز ان کی مدد نہ کی جائے گی۔

وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ہم نے بندوں کو حکم دیا کہ ان پر لعنت کریں تو جو بھی ان کا ذکر کرے تو ان پر لعنت کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی ہم نے ان پر لعنت کو لازم کیا یعنی خیر سے دوری کو لازم کیا۔ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ جس کو ہلاک کیا گیا ہو اور ان پر ناراضگی کی گئی ہوئی؛ یہ ابن کیسان اور ابو عبیدہ کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کے چہروں کے سیاہ ہونے اور آنکھوں کے نیلے ہونے کے ساتھ ان کی شکلیں ہی بدل گئی ہوں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دور کیے گئے لوگوں میں سے ہوں گے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: قبحه الله یعنی اسے یہ بھلائی سے الگ کر دیا گیا۔ قبحه و قبحه جب اسے قبیح بنا دیا۔ ابو عمرو نے کہا: قبحت وجهه جب شد نہ ہو تو اس کا معنی بھی قبحت ہی ہے یعنی مجرد اور مزید فیہ دونوں بابوں سے معنی ایک ہی ہے؛ شاعر نے کہا:

أَلَا قَبَحَ اللهُ البراجِمَ كلَّها وقَبَّحَ يَرْبوعا و قَبَّحَ دَارِمَا

الله تعالیٰ تمام براجم کو بھلائیوں سے دور کرے یربوع اور دارم کو بھلائی سے دور کرے۔

یَوْمَ کو نصب اس لیے دی ہے کیونکہ یہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا کے محل پر محمول ہے(1)۔ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ حرف عطف کا ذکر نہیں یعنی حرف عطف سے مستغنی ہے جس طرح الله تعالیٰ کے اس فرمان میں حرف عطف نہیں: سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکہف: 22) یہ بھی جائز ہے کہ یوم میں عامل مضمر ہو جس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ یہ اسی طرح ہے جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓىِٕكَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ (الفرقان: 22) یہ بھی جائز ہے کہ یوم میں عامل هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ہے اگرچہ ظرف متقدم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مجاز کے قاعدہ کے مطابق مفعول ہو گویا فرمایا: واتبعناهم فی هذه الدنیا لعنة یوم القیامة۔

## وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے دی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اس کے بعد کہ ہم نے ہلاک کر دیا تھا پہلی (نافرمان) قوموں کو (یہ کتاب) لوگوں کے لیے بصیرت افروز اور سراپا ہدایت و رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ، الکتاب سے مراد تورات ہے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ پہلی کتاب ہے یعنی تورات جس میں فرائض، حدود اور احکام نازل ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں کتاب سے مراد مثانی سبع میں سے چھ ہیں جنہیں الله تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اسے مرفوع روایت کیا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الله تعالیٰ نے کسی قوم، قرن (زمانہ کے لوگ) امت اور اہل قریہ کو آسمان کے عذاب سے ہلاک کیا اور نہ ہی زمین کے عذاب سے ہلاک کیا۔

1۔ درمنثور، جلد 5، صفحہ 235

جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل کیا سوائے اس بستی کے جن کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا تھا۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى ''۔ مراد قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کے بعد۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بعد اس کے کہ ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا اور قارون کو زمین میں دھنسایا۔ بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ یعنی ہم نے اسے کتاب دی جو بصیرتیں ہیں یعنی وہ اس سے بصیرت حاصل کریں۔ وَ هُدًى جو آدمی اس پر عمل کرے اس کو گمراہی سے ہدایت دینے والی ہے وَّ رَحْمَةً جو اس پر ایمان لائے اس کے لیے رحمت۔ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ تا کہ اس نعمت کو یاد کریں اور دنیا میں اپنے ایمان پر قائم رہیں اور آخرت میں اپنے ثواب پر اعتماد کریں۔

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِیًا فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ تَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ﴿۴۵﴾

''اور آپ نہیں تھے (طور کی) مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف (رسالت) کا حکم بھیجا اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے لیکن ہم نے پیدا فرمائیں کئی قومیں (یکے بعد دیگرے) اور کافی لمبا عرصہ گزر گیا ان پر (اور انہوں نے عہد خداوندی بھلا دیا) اور آپ اہل مدین میں مقیم نہ تھے تا کہ آپ پڑھ کر سناتے انہیں ہماری آیتیں لیکن ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے تھے''۔

وَ مَا كُنْتَ اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم آپ نہیں تھے بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ پہاڑ کی مغربی جانب؛ شاعر نے کہا:

أعطاكَ من أعطى الهُدَى النَّبِيَّا نُورًا يَزِينُ المِنبَرَ الغربِيَّا

جس نے سراپا ہدایت نبی عطا کیا اس نے تجھے ایسا نور عطا کیا جو منبر کی مغربی جانب کو مزین کرتا ہے۔

اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ جب ہم نے اسے اپنے امر اور اپنی نہی کا مکلف بنایا اور اپنا عہد اس پر لازم کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آپ کا امر پہنچایا اور ہم نے تیرا ذکر اچھے انداز میں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اِذْ قَضَیْنَاۤ کا معنی ہے یعنی ہم نے خبر دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بہترین امت ہے وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ تو حاضرین میں سے نہ تھا۔

وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد اور امر کو بھلا دیا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ الخ (الحدید: 16) اس کا ظاہر واجب کرتا ہے کہ اس وقت ہمارے نبی کا ذکر جاری ہوا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے مبعوث فرمائے گا، لیکن مدت لمبی ہو گئی سختی غالب آ گئی اور قوم اس کو بھول گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی اور ہم نے اس کی قوم سے عہد لیے پھر زمانہ طویل ہو گیا اور انہوں نے کفر کیا تو ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا مجدد بنا کر بھیج دیا اور مخلوق کو

اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والا بنا کر بھیج دیا۔

وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ آپ ان میں مقیم نہ تھے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام ان کے درمیان مقیم تھے۔ عجاج نے کہا:

فبات حیث یدخل الثَّوِیُّ اس نے وہاں رات گزاری جہاں اقامت کرنے والا مہمان داخل ہوتا ہے۔

تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا انہیں وعدہ اور وعید یاد دلائیں۔ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ہم نے تجھے اہل مکہ میں بھیجا اور ہم نے تجھے ایسی کتاب دی جس میں یہ خبریں ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آپ انہیں نہ جانتے ہوتے۔

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور آپ (اس وقت) طور کے کنارہ پر بھی نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو) ندا فرمائی لیکن یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے (کہ اس نے آپ کو ان حالات پر آگاہ کر دیا) تا کہ آپ (قہر الٰہی سے) ڈرائیں اس قوم کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے شاید وہ نصیحت قبول کریں''۔

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا جس طرح آپ مکان کی غربی جانب نہیں تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا اسی طرح آپ طور کی جانب بھی نہیں تھے جب ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا کی جب وہ ستر افراد کے ساتھ وقت مقررہ پر آئے تھے۔ عمرو بن دینار نے مرفوع روایت نقل کی ہے: ندا کی گئی: اے امت محمد! میں نے تمہاری دعا قبول کی قبل اس کے کہ تم دعا کرو اور میں نے تمہیں عطا کر دیا قبل اس کے کہ تم مجھ سے سوال کرو (1)۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہی فرمان ہے: وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے امت محمد! میں نے تمہاری دعا قبول کر لی قبل اس کے کہ تم مجھ سے دعا کرو اور میں نے تمہیں عطا کیا قبل اس کے کہ تم مجھ سے سوال کرو، تمہاری مغفرت طلب کرنے سے پہلے میں نے تمہیں بخش دیا اور تمہارے رحم طلب کرنے سے پہلے تم پر رحم کیا (2)۔

وہب نے کہا: اس کی وجہ یہ بنی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور آپ کی امت کی فضیلت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: کیوں نہیں اے میرے رب! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے امت محمد! تو انہوں نے اپنے آباء کی پشتوں سے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تمہاری عرض داشت کو پورا کیا قبل اس کے کہ تم مجھ سے دعا کرو۔ اس تعبیر کی بنا پر معنی ہوگا: آپ طور کی جانب نہیں تھے جب ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی اور ہم نے اسے تیری امت کو ندا کی اور ہم نے تیرے لیے اور تیری امت کے لیے قیامت تک جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے بارے میں اسے خبر دی۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 96 2۔ ایضاً

وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ یعنی جو ہم نے کہا ہے یہ تمہارے اوپر اپنی جانب سے رحمت کے طور پر کیا ہے۔ اخفش نے کہا: رَّحْمَةً مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے تقدیر کلام یہ ہے لکن رحمناك رحمة۔ زجاج نے کہا: یہ مفعول لاجلہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ فعل ذلك بك لاجل الرحمة۔ نحاس نے کہا: آپ نے انبیاء کے واقعات کا مشاہدہ نہ کیا اور نہ ہی انہیں آپ پر بیان کیا گیا لیکن ہم نے تجھے مبعوث کیا اور ہم نے رحمت کے لیے تیری طرف وحی کی۔ کسائی نے کہا: کان کی خبر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے لکن کان رحمة رفع دینا بھی جائز ہے یہ اس معنی میں ہے ھی رحمة۔ زجاج نے کہا: رفع جائز ہے اس معنی کا اعتبار کرتے ہوئے لکن فعل ذلك رحمة۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ قوم سے مراد عرب ہیں آپ نے ان اخبار کا مشاہدہ نہیں کیا لیکن ہم نے انہیں تیری طرف وحی کیا ان پر رحمت کرتے ہوئے جن کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے تا کہ آپ ان کے ذریعے انہیں ڈرائیں۔ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُوْتِیَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى ؕ اَوَ لَمْ یَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝

"(اور ان کی وجہ یہ ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب پہنچے انہیں کوئی مصیبت ان اعمال کے باعث جو انہوں نے کیے ہیں تو وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی اور ہم ہو جاتے ایمان لانے والوں سے۔ پھر جب آ گیا ان کے پاس حق ہماری جناب سے تو وہ کہنے لگے: کیوں نہ دیئے گئے انہیں اس قسم کے معجزے جو موسیٰ کو دیئے گئے تھے (ان نابکاروں سے پوچھو) کیا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا ان معجزات کا جو موسیٰ کو دیئے گئے تھے اس نے کہا: (موسیٰ و ہارون) دو جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں نیز انہوں نے کہا تھا: ہم ان تمام کا انکار کرتے ہیں"۔

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ، ھم ضمیر سے مراد قریش ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد یہودی ہیں۔ مُّصِیْبَةٌ اس سے مراد عقوبت اور انتقام ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اس سے مراد کفر اور معاصی ہیں۔ ایدی کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ عموماً کمائی اس سے واقع ہوتی ہے۔ لَوْ لَاۤ کا جواب محذوف ہے۔ ان کے سابقہ گناہوں کی وجہ سے انہیں کیوں عذاب نہیں پہنچا۔ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ، لولا، ھلا کے معنی میں ہے۔ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا ہم نے رسول کیوں نہیں بھیجے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے کیوں عذاب کو جلدی نہیں بھیجا؟ رسولوں کو مبعوث کرنا، کفار کے عذر کو ختم کرنے کے لیے ہے جس طرح سورۃ الاسراء اور سورۃ طہٰ کے آخر میں گزر چکا ہے۔ فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ فعل کو نصب تحضیض کے جواب کے طور پر ہے۔ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فعل کا عطف فنتبع پر ہے۔ مومنین سے مراد تصدیق کرنے والے ہیں۔ اس آیت سے اس نے استدلال کیا ہے

جس نے یہ کہا: عقل ایمان اور شکر کو واجب کر دیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یہ عقاب کا موجب ہے کیونکہ وجوب رسولوں کی بعثت سے قبل ثابت ہو چکا تھا۔ یہ عقل سے بھی جانا جا سکتا ہے۔ قشیری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ کلام محذوف یوں ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نئے رسول بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی، یعنی یہ کفار معذور نہیں کیونکہ ان تک سابقہ شریعتیں پہنچ چکی ہیں اور توحید کی دعوت بھی پہنچ چکی ہے لیکن زمانہ طویل ہو گیا اگر ہم ان کو عذاب دیتے تو ان میں سے کوئی کہنے والا کہتا: رسولوں کا زمانہ طویل ہو گیا۔ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ عذر ہے جب کہ ان کے لیے کوئی عذر نہیں کیونکہ انہیں رسولوں کی بعثت کی خبر پہنچی ہے لیکن ہم نے عذر کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور بیان کو مکمل کر دیا، پس اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے ان کی طرف مبعوث کیا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ وہ کس بندے کو بیان اور حجت کے اکمال اور رسولوں کی بعثت کے بعد ہی سزا دے گا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا حق سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ قَالُوْا یعنی کفار مکہ نے کہا: لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى، لولا، هلا کے معنی میں ہے مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ سے مراد عصا اور ید بیضا ہے اور تورات کی طرح آپ کو قرآن حکیم اکٹھے کیوں نازل نہیں کیا گیا؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا، ساحران سے مراد انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لیے ہیں جن دونوں نے باہم جادو پر تعاون کیا معاذ اللہ۔ کلبی نے کہا: قریش نے یہودیوں کی طرف پیغام بھیجا اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ان کے معاملہ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا: ہم تورات میں آپ کی نعت اور صفت پاتے ہیں۔ جب جواب ان تک پہنچا۔ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ایک قوم کا خیال ہے: یہودیوں نے مشرکوں کو تعلیم دی اور انہوں نے کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھو آپ کو اس طرح کی چیزیں کیوں نہ عطا کی گئیں جس طرح کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ہی دفعہ تورات دی گئی تھی۔ یہ استدلال یہودیوں پر وارد ہوتا ہے یعنی کیا ان یہودیوں نے یہ کہہ کر اس چیز کا انکار نہیں کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں یہ کہا تھا: هما ساحران یہ دونوں جادوگر ہیں۔

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ہم ان میں سے ہر ایک کا انکار کرنے والے ہیں۔ کوفیوں نے پڑھا سحران یہ الف کے بغیر ہے مراد انجیل اور قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تورات اور فرقان ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تورات اور انجیل ہے؛ یہ ابورزین کا قول ہے۔ باقی قراء نے ساحران الف کے ساتھ پڑھا ہے اس میں تین اقوال ہیں (۱) مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ یہ مشرکین عرب کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری کا قول ہے (۲) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ہیں؛ یہ یہودیوں کا قول ہے جو انہوں نے ان دونوں کی رسالت کی ابتدا کے موقع پر کیا تھا؛ یہ قول سعید بن جبیر، مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ تو استدلال ان کے خلاف ہو گا۔ یہ تعبیر اس امر پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے لولا ان تصيبهم مصيبة لما جددنا بعثة الرسل کیونکہ یہودیوں نے نبوتوں کا اعتراف کیا لیکن انہوں نے تحریف کی، تبدیلی کی اور عقاب کے مستحق ہو

گئے اور کہا: ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ان کے تمام عذر ختم کر دیئے (۳) مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ آج یہودیوں کا قول ہے؛ قتادہ نے یہی قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا تمام یہودیوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو تورات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اور اس تورات میں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ اس تورات میں انجیل اور قرآن کا ذکر ہے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور دونوں کتابوں کو سحر خیال کیا۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

"آپ فرمایئے: تم لے آؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو زیادہ ہدایت بخش ہو ان دونوں (قرآن و تورات) سے تو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہوئے۔ پس اگر وہ قبول نہ کریں آپ کے اس ارشاد کو تو جان لو کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں اور کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو، اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں"۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم کہو: اے مشرکوں کی جماعتو! جب تم نے ان دونوں کتابوں کا انکار کر دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو پس اس کی اتباع کروں گا تا کہ تمہارے لیے بھی کفر میں کوئی عذر ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اس میں سچے ہو کہ وہ دونوں جادوگر ہیں یا تم ایسی کتاب لاؤ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ یہ کوفیوں کی قراءت سحران کو قوت بہم پہنچاتی ہے۔ اتبعہ، فراء نے کہا: یہ رفع کے ساتھ ہے کیونکہ کتاب کی صفت ہے اور کتاب نکرہ ہے کہا: جب اسے جزم دی جائے جو اس میں ایک صورت ہے تو وہ شرط کی صورت میں ہوگی۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم اگر وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کتاب نہ لا سکیں فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ تو یہ جان لو کہ وہ اپنے دلوں کی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور جس چیز کو وہ اچھا خیال کرتے ہیں اور شیطان جس چیز کو ان کے لیے محبوب بنا کر پیش کرتا ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ کوئی اس سے بڑھ کر گمراہ نہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ یعنی ایک کے بعد دوسرا قول بھیجا اور ایک رسول کے بعد دوسرا رسول مبعوث کیا۔ حضرت حسن

بصری نے پڑھا: وصَلنا یہ مخفف ہے۔ ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا: وصلنا کا معنی ہے ہم نے مکمل کیا جس طرح تو کسی چیز کو مکمل کرتا ہے۔ ابن عیینہ اور سدی نے کہا: ہم نے بیان کیا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔ مجاہد نے کہا: ہم نے تفصیل بیان کر دی، اس طرح وہ قراءت بھی کرتے تھے۔ ابن زید نے کہا: ہم نے ان کے لیے دنیا کی خبر آخرت کی خبر کے ساتھ ملا دی گویا وہ دنیا میں ہی آخرت میں ہیں۔ اہل معانی نے کہا: اس کا معنی والینا اور تابعنا ہے یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا اس کا بعض بعض کے پیچھے ہیں، کبھی وعدہ، کبھی وعید، کبھی قصے، کبھی عبرتیں، کبھی نصائح اور کبھی مواعظ ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرلیں اور کامیاب ہوجائیں۔ اس کی اصل وصل الحبال بعضها ببعض ان کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا۔ شاعر نے کہا:

فقل لبني مروان ما بال ذِمّةٍ وحبلٍ ضعيف ما يزال يُوَصَّلُ

بنی مروان سے کہو: اس ذمہ اور کمزور رسی کا کیا ہے جس کو جوڑا ہی نہیں جاتا۔

امرؤالقیس نے کہا:

درير كَخُذروف الوليد أمَرَّه تَقَلُّبُ كفيه بخيط مُوَصَّلِ

محل استدلال موصل ہے۔

لَهُمُ میں ضمیر قریش کے لیے ہے؛ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ یہود کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان سب کے لیے ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کا رد ہے جس نے یہ کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن اکٹھا کیوں نہ دیا گیا۔

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں غور وفکر کریں اور آپ پر ایمان لے آئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ غور وفکر کریں اور اس سے ڈریں کہ ان پر ایسا ہی عذاب نہ نازل ہوجائے جو ان سے قبل لوگوں پر نازل ہوا؛ یہ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شاید وہ بتوں کی عبادت چھوڑ کر قرآن سے نصیحت حاصل کریں؛ نقاش نے یہ حکایت بیان کی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾

''جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزول) قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکے تھے''۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ یہ خبر دی بنی اسرائیل میں سے جنہیں کتاب دی گئی ان میں سے ایک قوم قرآن کے نازل ہونے سے پہلے قرآن پر ایمان رکھتی تھی۔ جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان اور نصاریٰ کے علماء میں سے جو مسلمان ہوئے وہ بھی اس میں داخل ہیں وہ چالیس لوگ تھے۔ وہ حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ مدینہ طیبہ آئے تھے بتیس آدمی حبشہ سے آئے تھے اور آٹھ آدمی شام سے آئے تھے وہ نصاریٰ کے ائمہ تھے ان میں بحیرا

راہب، ابرہہ، اشرف، عامر، ایمن، ادریس اور نافع تھے۔ ماوردی نے یہی نام ذکر کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ اور بعد والی آیت نازل کی ہے اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت تمیم داری، حضرت جارود عبدی اور حضرت سلمان فارسی کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اسلام لائے اور ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت رفاعہ قرظی سے مروی ہے: یہ آیت دس آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی، میں ان میں سے ایک ہوں۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت حضرت نجاشی اور ان کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی نجاشی نے بارہ آدمی بھیجے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مجلس میں بیٹھے ابوجہل اور اس کے ساتھی قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے وفد کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے ہو لیے ابوجہل نے انہیں کہا: اللہ تعالیٰ تمہارے جیسے قافلہ کو خائب و خاسر کرے اور تمہارے جیسے وفد کو قباحت میں ڈالے تم تھوڑی دیر بھی نہ ٹھہرے کہ تم نے ان کی تصدیق کر دی ہم نے تم سے بڑھ کر کوئی وفد زیادہ احمق اور زیادہ جاہل نہیں دیکھا انہوں نے ابوجہل کو جواب دیا: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ہم اپنے نفوس کو ہدایت کے نوازنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ یہ بحث سورۂ مائدہ میں و اذا سمعوا ما انزل الی الرسول کے تحت گزر چکی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہ ایسی قوم ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی قبل اس کے کہ آپ کو مبعوث کیا جاتا جب کہ ان میں سے بعض نے آپ کو پایا۔ مِنْ قَبْلِهٖ قرآن سے پہلے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے۔ هُمْ بِهٖ ہا ضمیر سے مراد قرآن ہے یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے يُؤْمِنُوْنَ۔

وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ جب ان پر قرآن حکیم پڑھا جاتا ہے وہ کہتے ہیں: اس میں جو کچھ ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ اس کے نزول سے پہلے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے موحد تھے اور ایمان رکھنے والے تھے کہ عنقریب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جائے گا اور آپ پر قرآن حکیم نازل کیا جائے گا۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؗ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ؗ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝

''یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ بوجہ اس کے صبر کے اور دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ سنتے ہیں کسی بیہودہ بات کو تو منہ پھیر لیتے ہیں اس سے اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں تم سلامت رہو ہم جاہلوں (سے الجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین قسم کے افراد ایسے ہیں جنہیں دوگنا اجر دیا جائے گا (۱) اہل کتاب میں سے آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، آپ کی اتباع کی اور آپ کی تصدیق کی۔ اس کے لیے دو اجر ہیں (۲) مملوک غلام جس نے اللہ تعالیٰ کے حق کو اور اپنے آقا کے حق کو ادا کیا اس کے لیے دو اجر ہیں (۳) ایک مرد جس کی ایک لونڈی تھی۔ اس نے اسے غذا دی اور اچھی غذا دی اسے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا پھر اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کی تو اس کے لیے دو اجر ہیں'' (1)۔ شعبی نے خراسان سے کہا: یہ حدیث بغیر کسی شے کے لے لو جب کہ ایک آدمی اس سے کم درجہ کی حدیث کے لیے مدینہ طیبہ تک کا سفر کیا کرتا تھا۔ اسے امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جب ان میں سے ہر ایک دو جہتوں سے دو امور کا مخاطب بنا تو ان میں سے ہر ایک دو اجروں کا مستحق ہوا۔ کتابی اپنے نبی کی جانب سے مخاطب تھا پھر ہمارے نبی کی جانب سے اسے خطاب کیا گیا اس نے اس دعوت کو قبول کیا اور اس کی پیروی کی تو اس کے لیے دو ملتوں کا اجر ہے۔ اس طرح غلام وہ اللہ تعالیٰ کی جہت سے مامور ہے اور اپنے سید کی جانب سے مامور ہے اور لونڈی کا مالک، جب اس نے وہ فرائض ادا کیے جسے اپنی لونڈی کی تربیت کے اور ادب کے حوالے سے خطاب کیا گیا تھا تو اس نے اسے تربیت کے ساتھ زندہ کیا پھر جب اس نے اسے آزاد کیا اور پھر اس سے شادی کی تو آزادی کے احیاء کے ساتھ زندہ کیا پھر اسے اپنے ساتھ لاحق کر لیا تو اس نے وہ امور سرانجام دیے جن کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ تو ہر ایک کے لیے دو اجر ہیں پھر ہر ایک اجر کو کئی گنا کر دیا جائے گا۔ ایک نیکی دس گنا ہے تو اس کے اجروں کو بھی کئی گنا کر دیا جائے گا، اسی وجہ سے کہا گیا: ہر وہ غلام جو اپنے آقا کا حق ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حق آزاد یعنی مالک کے حق سے زیادہ ہے یہی وہ چیز ہے جسے ابو عمر بن عبد البر اور دوسرے علماء نے پسند کیا ہے۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مملوک غلام جو اپنی اصلاح کرنے والا ہو اس کے لیے دو اجر ہیں'' (2)۔ مجھے اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں ابو ہریرہ کی جان ہے اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد، حج اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کا تصور نہ ہوتا تو میں اس کو پسند کرتا کہ میں مرتا اس حال میں کہ میں مملوک ہوتا۔ سعید بن مسیب نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حج نہ کیا یہاں تک کہ ان کی ماں مرگئی مقصد ماں کی خدمت تھی۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک مملوک کے لیے کتنا اچھا ہے کہ وہ فوت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کرتا ہو اور اپنے آقا کی خدمت اچھی طرح کرتا ہو اس غلام کے لیے کتنا اچھا ہے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** بِمَا صَبَرُوْا اپنی ملت پر صبر کرنے میں یہ عام ہے پھر اس عمل اور اس اذیت سے جو وہ کفار وغیرہ سے پاتے ہیں پر صبر کرتے ہیں۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالة نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 86

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب صحبة المماليك، جلد 2، صفحہ 53 | 3۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 3۔** وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وہ برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں۔ درأت یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو دفاع کرے۔ درء کا معنی دور کرنا ہے۔ حدیث میں ہے: ''حدود کو شبہات کے ساتھ دور کرو'' (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ برداشت اور اچھی کلام کے ساتھ اذی کو دور کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ توبہ اور استغفار کے ساتھ گناہوں کو دور کرتے ہیں۔ پہلی تعبیر کی صورت میں یہ مکارم اخلاق کا وصف ہے یعنی جو ان کے ساتھ برائی کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ نرمی کرتے ہیں اور اچھے قول کے ساتھ پیش آتے ہیں اس کے ساتھ وہ برائی کو دور کرتے ہیں یہ آیت صلح ہے یہ ابتداء اسلام میں تھا یہ وہ آیت ہے جسے آیت سیف نے منسوخ کر دیا ہے اور کفر کے سوا کے لیے اس کا حکم باقی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قیامت تک بجالاتی رہے گی۔ اسی معنی میں حضرت معاذ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا و خالق الناس بخلق حسن (2) برائی کے پیچھے نیکی لاؤ جو اس برائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے ملو۔ خلق حسن میں سے یہ بھی ہے کہ ناپسندیدہ چیز اور اذیت کو دور کرو ظلم پر اس سے اعراض اور نرم گفتگو کے ساتھ صبر کرو۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی کہ وہ اپنے اموال طاعات اور شرع کے احکام میں خرچ کرتے ہیں۔ اس میں صدقات پر برانگیختہ کیا گیا ہے بعض اوقات روزے اور نماز کی صورت بدنی صدقہ ہوتا ہے پھر لغو سے اعراض کرنے پر ان کی مدح کی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (الفرقان) مشرک جو انہیں اذیت دیتے اور گالیاں دیتے اس کو سنتے تو یہ اس سے اعراض کرتے یعنی اس میں مشغول نہ ہوتے۔ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ یہ کلام ایک دوسرے سے لاتعلق ہونے کی بنا پر ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان) یعنی ہمارے لیے ہمارا دین اور تمہارے لیے تمہارا دین ہے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ یعنی تمہیں ہم سے امن ہے ہم جنگ نہیں کرتے اور ہم تمہیں گالیاں نہیں دیتے یہاں سلام کا کوئی ذکر نہیں۔ زجاج نے کہا: یہ قتال کا حکم آنے سے قبل کا معاملہ ہے۔ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ہم انہیں جھگڑے، بات لوٹانے اور باہم گالی دینے کے لیے طلب نہیں کرتے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

''بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو''۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ زجاج نے کہا: مسلمانوں کا اس بارے میں اجماع ہے کہ یہ آیت ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ مفسرین کی بڑی تعداد کا اتفاق ہے کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ امام بخاری اور مسلم کی حدیث ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو سورۃ براءۃ میں گزر چکی ہے۔ ابوروق نے کہا: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ میں اشارہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ وَهُوَ اَعْلَمُ

1۔ تاریخ بغداد، جلد 9، صفحہ 303 2۔ الترغیب والترہیب، کتاب التوبہ والزھد، جلد 4، صفحہ 109

بِالْمُهْتَدِيْنَ مجاہد نے کہا: جس کے حق میں ہدایت کو مقدر کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَنْ اَحْبَبْتَ کا معنی ہے جس کی ہدایت پانے کو آپ پسند کرتے ہیں۔ جبیر بن مطعم نے کہا: وہ وحی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کی جاتی اس کو کسی نے نہیں سنا صرف حضرت ابوبکر صدیق نے اسے سنا کیونکہ انہوں نے حضرت جبریل امین کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے محمد! پڑھو اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔

وَ قَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝

''اور انہوں نے کہا: اگر ہم اتباع کریں ہدایت کا آپ کی معیت میں تو ہمیں اچک لیا جائے گا ہمارے ملک سے، کیا ہم نے بسا نہیں دیا حرم میں جو امن والا ہے کھچے چلے آتے ہیں اس کی طرف ہر قسم کے پھل یہ رزق ہے ہماری طرف سے لیکن ان کی اکثریت کچھ نہیں جانتی۔ اور ہم نے کتنے شہر برباد کر دیے جب وہ فخر کرنے لگے اپنی خوش حالی پر پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ اور (آخر کار) ہم ہی ان کے وارث بنے''۔

وَ قَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یہ مشرکین مکہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش میں سے یہ بات حرث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف قرشی نے کی: اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم جانتے ہیں کہ تیرا قول حق ہے لیکن ہمیں یہ خوف کہ عرب ہمیں اپنی سرزمین (مکہ) سے اچک لیں یہ خوف اس سے روکتا ہے کہ ہم تیرے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں اور تجھ پر ایمان لائیں گے، کیونکہ وہ سب ہمارے خلاف مجتمع ہیں اور ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں یہ ان کی حجت بازیوں میں سے تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی حجت بازیوں کا جواب دیا اور کہا: اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا، آمنا یہاں ذا امن کے معنی میں ہے اس کی وجہ یہ تھی عرب دور جاہلیت میں ایک دوسرے سے غارت گری مچاتے تھے، ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور اہل مکہ حرم کی حرمت کی وجہ سے امن میں ہوتے جہاں بھی ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ بیت اللہ کی حرمت کی وجہ سے انہیں امن دیا۔ ان سے ان کے دشمن کو روکا پس انہیں ڈرنا چاہیے کہ عرب ان کے ساتھ جنگ میں ان کی حرمت کو حلال سمجھیں گے۔ تخطف سے مراد تیزی سے اچک لینا ہے، یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم میرے حرم میں امن میں ہوتے ہو، تم میرا رزق کھاتے ہو اور میرے غیر کی عبادت کرتے ہو۔ کہا: تم اس وقت خوف کھاتے ہو جب تم میری عبادت کرو گے اور مجھ پر ایمان لاؤ گے۔

يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ تمام سرزمین اور تمام ملکوں کے پھل اس کی طرف جمع کیے جاتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: جبی الماء فی الحوض اس نے پانی کو حوض میں جمع کیا۔ جابیہ

سے مراد بڑا حوض ہے۔ نافع اسے تجبی تاء کے ساتھ پڑھتے۔ یہ ثمرات کی وجہ سے ہے باقی قراء نے کل شیء کی وجہ سے یاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ کہا: اسم مونث اور فعل کے درمیان فاصلہ حائل ہے نیز ثمرات جمع ہیں، یہ مونث حقیقی نہیں۔

رِزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا یعنی ہماری جانب سے وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لیکن ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے، یعنی وہ استدلال سے غافل ہیں، یعنی وہ ذات جس نے زمانہ گزشتہ میں حالت کفر میں انہیں رزق دیا ہے اور انہیں امن دیا ہے اگر وہ اسلام لائے تب بھی انہیں رزق دے گا اور حالت اسلام میں کفار کو ان سے روکے گا۔ رزقًا مفعول لاجلہ کی وجہ سے منصوب ہے مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے نصب دینا جائز ہے کیونکہ تجبی کا معنی ترزق ہے۔ اس کو یجنی پڑھنا بھی جائز ہے یہ جنا سے مشتق ہے یہ الی حرف جار کے ساتھ متعدی ہے جس طرح تیرا قول ہے: یجنی إلی فیه، فجنی إلی الخافة۔ خافہ سے مراد دانوں کے لیے برتن ہے۔

وَ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍۭ بَطِرَتۡ مَعِيۡشَتَهَا اس آدمی کے لیے اس امر کو واضح کیا جو یہ گمان کرتا ہے کہ اگر وہ ایمان لایا تو عرب اس سے قتال کریں گے ایمان کے ترک کرنے میں خوف بہت زیادہ ہے کتنی ہی قومیں ہیں جنہوں نے کفر کیا پھر ان پر ہلاکت واقع ہوئی۔ بطر سے مراد نعمت کے بدلے میں سرکشی کرنا ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ مَعِيۡشَتَهَا سے مراد فی معیشتها ہے جب فی کو حذف کیا تو فعل متعدی ہو گیا؛ یہ مازنی اور زجاج کا قول ہے، جس طرح اس ارشاد میں حرف جار حذف ہے: وَ اخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا (الاعراف: 155) فراء نے کہا: یہ تفسیر کے طور پر منصوب ہے اسی طرح فرمایا: جس طرح تو کہتا ہے أبطرت مالك وبطرته، اس کی مثل اس کے ہاں یہ ہے اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ (البقرہ: 130) اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا (النساء: 4) بصریوں کے نزدیک اسم معرفہ کو نصب دینا محال ہے کیونکہ تفسیر اور تمیز کا مطلب یہ ہے کہ واحد نکرہ ہو جو جنس پر دلالت کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بطرت کی وجہ سے منصوب ہے بطرت کا معنی ہے جہلت جاہل اور ناواقف ہے، معنی ہے وہ بستی اپنی معیشت پر شکر بجالانے سے جاہل ہے۔

فَتِلۡكَ مَسٰكِنُهُمۡ لَمۡ تُسۡكَنۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا ان کے اہل کے ہلاک ہونے کے بعد کچھ مسکن ہی آباد ہوئے اکثر برباد ہو گئے۔ استثناء مساکن کی طرف راجع ہے، یعنی بعض میں رہائش رکھی جاتی ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا اور کہا گیا: اگر استثناء مساکن کی طرف لوٹتی تو ارشاد یوں ہوتا: الا قلیل کیونکہ تو کہتا ہے: القوم لم تضرب الا قلیل قلیل کو رفع دیا جاتا ہے کیونکہ مارے جانے والے افراد تھوڑے ہوتے ہیں۔ جب تو نصب دے گا تو قلیل، ضرب کی صفت ہو گی۔ یعنی تھوڑا مارا گیا۔ تو اس وقت معنی ہوگا وہ ایسے مساکن ہیں جن میں مسافر ہی رہائش پذیر ہوتے اور وہ لوگ جو اس راستہ سے گزرے وہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے یعنی ان کے بعد تھوڑی ہی رہائش رکھی گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح کہا، یعنی ان میں مسافر یا راہ گزر وہی ایک دن یا دو دن رہا وَ كُنَّا نَحۡنُ الۡوٰرِثِيۡنَ یعنی ان کی ہلاکت کے بعد انہیں ان کا نائب بنایا گیا (1)۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 113

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾

''اور نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو یہاں تک کہ بھیجے ان کے مرکزی شہر میں کوئی رسول جو پڑھ کر سنائے وہاں کے رہنے والوں کو ہماری آیتیں اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہوں۔ اور جو چیز دی گئی ہے تمہیں تو یہ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اس کی زیب و زینت ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور دیر پا ہے، کیا تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ (تم خود سوچو) آیا وہ (نیک بخت) جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا ہے بہت اچھا وعدہ اور وہ اس کو پانے والا بھی ہے اس (بدبخت) کی مانند ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے پھر وہ (اس چند روزہ آزمائش کے بعد) روز قیامت (مجرموں کے کٹہرے میں) پیش کیا جائے گا''۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى یعنی ایسی بستیاں جن کے اہل کافر ہیں۔ حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا ہمزہ کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے کسرہ جر کی اتباع میں ہے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ رَسُوْلًا مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِيْٓ اُمِّهَا سے مراد ان میں سے سب سے بڑی۔ رَسُوْلًا ایسا رسول جو انہیں خبردار کرے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ان کے اوائل میں (1)۔

میں کہتا ہوں: مکہ مکرمہ اپنی حرمت اور اولیت کی بنا پر سب سے عظیم بستی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آل عمران: 96) رسول کی بعثت کے لیے ان بستیوں میں سے بڑی کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ رسولوں کو اشراف کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے وہ شہروں میں رہتے ہیں یہ اردگرد کی بستیوں کے لیے ام کا درجہ رکھتی ہے۔ سورۂ یوسف کے آخر میں یہ معنی گزر چکا ہے۔

يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا، یتلو صفت کے محل میں ہے یہ تالیا کے معنی میں ہے یعنی وہ رسول انہیں بتاتا ہے کہ عذاب ان پر نازل ہو گا اگر وہ ایمان نہ لائیں۔ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اضافت کی وجہ سے **مھلکی** کی نون گر گئی ہے جس طرح **ظالمی انفسہم** میں نون اضافت کی وجہ سے گر گئی ہے۔ اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ یعنی میں نے انہیں ہلاک نہیں کیا مگر وہ کفر پر اصرار کی وجہ سے ہلاکت کے مستحق ہو گئے تھے کیونکہ ان کے تمام عذر ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے عدل اور ظلم سے مبرا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 261

ہونے کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک نہیں کرتا مگر اس وقت جب وہ ظلم کے ساتھ ہلاکت کے مستحق ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کے ظالم ہونے کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کرتا مگر حجت کی تاکید اور رسولوں کی بعثت کے ساتھ اتمام حجت کے بعد ہی ہلاک کرتا ہے۔ ان کے احوال سے آگاہی کو ان کے خلاف حجت و دلیل نہیں بناتا اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ ان کو ہلاک کرے جب کہ وہ ظالم نہ ہوں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ (ہود) اس آیت میں ظلم کا لفظ ذکر کیا ہے اس بنا پر کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرتا جب کہ وہ اصلاح کرنے والے ہوتے تو یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر ظلم ہوتا جب کہ اس کی حالت ظلم کے منافی ہے یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس پر حرف نفی اور لام کے ساتھ دلالت کی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (البقرہ:143)

وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ، تم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا تم اپنی زندگی کے عرصہ میں اس سے لطف اندوز ہوئے ہو یا اپنی زندگی میں ایک عرصہ تک یا تو تم اس سے الگ ہو جاتے ہو یا وہ تم سے زائل ہو جاتی ہے۔ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى اللہ تعالیٰ کے ہاں جو کچھ ہے وہ افضل اور دائمی ہے۔ اس سے مراد دار آخرت ہے اور یہ جنت ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے کہ باقی رہنے والی چیز فانی سے افضل ہوتی ہے۔ ابو عمرو نے اسے یعقلون یاء کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے یہی پسندیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ ہاء ضمیر سے مراد جنت اور اس میں جو ثواب ہے كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اسے وہ عطا کیا جس کا ارادہ کیا۔

ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ آگ میں حاضر ہوگا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝ (الصافات) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت حضرت حمزہ بن عبد المطلب اور ابو جہل بن ہشام کے بارے میں نازل ہوئی۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ حضرت حمزہ اور حضرت علی اور ابو جہل اور عمارا اور ولید کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عمار اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ سدی کا قول ہے۔ قشیری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ آیت عموماً مومن اور کافر کے بارے میں نازل ہوئی۔ ثعلبی نے کہا: خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ آیت ہر کافر کے بارے میں نازل ہوئی جس نے دنیا میں عافیت اور غنا سے فائدہ اٹھایا آخرت میں اس کے لیے آگ ہے۔ اور یہ اس مومن کے بارے میں نازل ہوئی جس نے دنیا کی مصیبتوں پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ کیا اور اس کے لیے آخرت میں جنت ہے۔

وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ ۫ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝ وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 294

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَ
يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ
يَوْمَىِٕذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ
يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾

''اور اس دن اللہ انہیں آواز دے گا تو فرمائے گا: کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے، کہیں گے وہ لوگ جن پر عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا: اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں بھی گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ اور (انہیں) کہا جائے گا: (لو) اب پکارو اپنے شریکوں کو تو وہ انہیں پکاریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور دیکھ لیں گے عذاب تو کیا اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے اور اس دن اللہ تعالیٰ آواز دے گا انہیں پھر پوچھے گا: تم نے کیا جواب دیا تھا (ہمارے) رسولوں کو تو اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں اس دن پس وہ (مارے دہشت کے) ایک دوسرے سے کچھ پوچھ نہ سکیں گے۔ تو وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں ہوگا''۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کو ندا کرے گا۔ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ میرے شریک کہاں ہیں جنہیں تم گمان کرتے تھے کہ وہ تمہاری مدد کریں گے اور تمہاری سفارش کریں گے؟

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ان پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا وہ سردار ہیں، یہ کلبی کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد شیاطین ہیں رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ہم نے انہیں گمراہی کی طرف دعوت دی انہیں کہا جائے گا: کیا تم نے ان کو گمراہ کیا؟ انہوں نے کہا: اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا وہ مراد لیتے ہیں ہم نے انہیں گمراہ کیا جس طرح ہم گمراہ تھے۔ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ہم میں سے بعض نے بعض سے براءت کا اظہار کیا۔ شیاطین ان سے برآءت کا اظہار کر دیتے ہیں جو ان کی اطاعت کرتے ہیں اور سرداران سے براءت کا اظہار کر دیتے ہیں جنہوں نے ان سے اس امر کو قبول کیا تھا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ (الزخرف)

وَقِيْلَ کفار سے کہا جائے گا ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ دنیا میں جن کی تم عبادت کرتے رہے ان سے مدد طلب کرو تا کہ وہ تمہاری مدد کریں اور تم سے عذاب کو دور کر دیں۔ فَدَعَوْهُمْ انہوں نے معبودان باطلہ سے مدد طلب کی۔ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ بتوں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا اور انہوں نے بتوں سے کوئی نفع نہ اٹھایا۔ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ۔ زجاج نے کہا: لو کا جواب محذوف ہے معنی ہے اگر وہ ہدایت پاتے تو ہدایت انہیں نجات عطا کرتی اور عذاب کی طرف نہ لوٹتے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر وہ ہدایت حاصل کرتے تو انہیں نہ بلاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جب

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 114

انہوں نے عذاب کو دیکھا تو انہوں نے پسند کیا کاش وہ دنیا میں ہدایت پاتے یہ اس وقت کہیں گے جب وہ قیامت کے روز عذاب دیکھیں گے۔

**مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ** اللہ تعالیٰ انہیں ارشاد فرمائے گا: تم نے ان انبیاء کو کیا جواب دیا تھا جن کو تمہاری طرف مبعوث کیا گیا جب انہوں نے تمہیں پیغام پہنچایا **فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ** ان پر دلائل مخفی ہو گئے؛ یہ مجاہد کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان پر حجت تمام کر دی تھی قیامت کے روز ان کے لیے کوئی عذر اور حجت نہیں ہو گی (1)۔ الْاَنْۢبَآءُ کا معنی اخبار ہے۔ ان کی حجتوں کو انباء کا نام دیا کیونکہ وہ خبریں ہیں جو وہ دیتے۔ **فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ** وہ ایک دوسرے سے دلائل کے بارے میں نہیں پوچھیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلائل کو باطل کر دیا، یہ ضحاک کا قول ہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لا یتساءلون وہ دلیل کے بارے میں ایک دوسرے سے بات نہیں کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس لمحہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے۔ وہ اس ساعت کی ہولناکی کی وجہ سے نہ جانیں گے کہ کیا جواب دیں۔ پھر وہ جواب دیں گے جس طرح ان کے قول کی خبر دی: واللہ ربنا ما کنا مشرکین۔ مجاہد نے کہا: وہ انساب کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے کہ اس کے گناہوں میں سے کس چیز کو اٹھائے؟ ابن عربی نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔

**فَاَمَّا مَنْ تَابَ** جس نے شرک سے توبہ کی **وَاٰمَنَ** جس نے تصدیق کی **وَعَمِلَ صَالِحًا** فرائض کو ادا کیا اور نوافل کثرت سے ادا کیے **فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ** وہ سعادت کو پانے والے ہوں گے۔ جب فعل عسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وجوب ہو گا۔

**وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝**

''اور آپ کا رب پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جسے چاہتا ہے) نہیں ہے انہیں کچھ اختیار، اللہ تعالیٰ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو چھپائے ہوتے ہیں ان کے سینے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہی اللہ ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اسی کو زیبا ہے ہر قسم کی تعریف دنیا میں اور آخرت میں اور اس کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

**وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ** یہ ان شرکاء کے ذکر کے ساتھ متصل ہے جن کی انہوں نے عبادت کی اور انہوں نے شفاعت کے لیے انہیں اختیار کیا۔ شفعاء میں اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے مشرکین کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ولید بن مغیرہ کا جواب ہے جب اس نے کہا: **لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ** ۝ (الزخرف: 31)

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 115
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 262

یعنی اس نے اپنے آپ کو اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی کو عظیم خیال کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ یہودیوں کا جواب ہے جب انہوں نے کہا: اگر جبریل امین کے علاوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پیغام لانے والا ہوتا تو ہم اس پر ایمان لے آتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیرا رب مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے طاعت کے لیے چن لیتا ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: معنی ہے تیرا رب مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے نبوت کے لیے چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے: معنی ہے اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا فرماتا ہے اور اپنے دین کے مددگار پسند کر لیتا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: کتاب البزار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح اور مرفوع روایت ہے: ''اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور مرسلین کے علاوہ میرے صحابہ کو عالمین پر چن لیا ہے اور میرے صحابہ میں سے میرے لیے چار صحابہ کو چن لیا ہے یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرو فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم (2)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں میرے صحابہ بنایا ہے اور میرے تمام صحابہ میں خیر ہے، میری امت کو تمام امتوں پر چن لیا ہے اور میری امت میں سے چار قرون کو میرے لیے چن لیا ہے''۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے وہ وہب بن منبہ سے وہ اپنے باپ سے اس آیت وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ چوپاؤں میں سے بکری، پرندوں میں سے کبوتر، وَ يَخْتَارُ پر وقف تام ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ وقف تام ہے یہ جائز نہیں کہ مایختار کی وجہ سے محل نصب میں ہو کیونکہ اگر یہ محل نصب میں ہوتا تو فعل اس سے پہلے نہ ہوتا۔ کہا: اس میں قدریہ کا رد ہے۔ نحاس نے کہا: کلام وَ يَخْتَارُ پر مکمل ہو جاتی ہے یعنی وہ رسولوں کو چن لیتا ہے۔

مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ جن کو وہ پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بھیجتا۔ ابو اسحاق نے کہا: وَ يَخْتَارُ یہ وقف تام ہے اور پسندیدہ ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما، یختار کی وجہ سے منصوب ہو معنی ہے وہ اسے چنتا ہے جس میں ان کا اختیار ہوتا ہے۔ قشیری نے کہا: صحیح پہلا قول ہے کیونکہ ان سب کا وَ يَخْتَارُ کے وقف پر اتفاق ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ اہل سنت کے مذہب کے زیادہ مناسب ہے۔ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ میں ما تمام اشیاء کے لیے نفی عام ہے کہ اس میں بندے کے لیے کوئی چیز ہو سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسے حاصل کرے۔ زمخشری نے کہا: مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ یہ یختار کا بیان ہے کیونکہ اس کا معنی ہے جو چاہتا ہے پسند کرتا ہے اسی وجہ سے حرف عطف ذکر نہیں کیا۔ معنی ہے افعال میں اختیار اسی کا ہے اور وہ ان میں حکمت کی وجوہ کو خوب جانتا ہے یعنی مخلوق میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس پر اختیار رکھتا ہو۔ زجاج اور دوسرے علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ ما، یختار کی وجہ سے منصوب ہو(3)۔ طبری نے اس کا انکار کیا ہے کہ ما نافیہ ہو، تاکہ یہ معنی نہ ہو کہ زمانہ گزشتہ میں ان کا کوئی اختیار نہیں تھا اور زمانہ مستقبل میں ان کے لیے اختیار ہوگا، کیونکہ نفی کی صورت میں کلام پہلے نہیں گزری(4)۔ مہدوی نے کہا: یہ لازم نہیں آتا کیونکہ ما حال اور استقبال کی نفی کرتا ہے جس طرح لیس اسی وجہ سے ما، لیس کا

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 262
2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 635، حدیث نمبر 33094
3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 115
4۔ تفسیر طبری، جلد 207، صفحہ 116

سا عمل کرتا ہے اور کیونکہ آیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نازل ہوتیں جس قسم کے سوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے جاتے اور جیسے اعمال پر وہ مصر ہوتے اگرچہ یہ چیز نص میں نہیں ہے، طبری کے نزدیک آیت کی تقدیر یہ ہے ویختار لولایتہ الخیرۃ من خلقه کیونکہ مشرکین اپنے بہترین اقوال چنتے اور انہیں اپنے معبودوں کے لیے مختص کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ یعنی اپنی مخلوق میں سے جسے ہدایت کے لیے چنتا ہے جس کے متعلق اس کے علم میں پہلے سے سعادت موجود ہوتی ہے جس طرح مشرک اپنے اموال میں سے بہترین اموال اپنے معبودوں کے لیے مختص کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر ماذوی العقول کے لیے ہوگا اور یہ الذی کے معنی میں ہوگا۔ الْخِيَرَةُ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ لَهُمُ اس کی خبر ہے اور جملہ کان کی خبر ہے۔ اس کے مشابہ تیرا قول ہے: کان زید ابوہ منطلق اس میں ضعف ہے کیونکہ کلام میں ایسی ضمیر نہیں ہے جو کان کے اسم کی طرف لوٹے مگر اس صورت میں کہ حذف کو مقدر کیا جائے تو یہ دوری کی وجہ سے جائز ہوگا۔ طبری نے جو کہا ہے اس کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ ثعلبی نے کہا: مانافیہ ہے یعنی انہیں اللہ تعالیٰ پر کوئی اختیار نہیں (1)۔ یہ زیادہ صحیح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: 36) محمود وراق نے کہا:

توكّل على الرحمن لی كل حاجةٍ ... أردتَ فإنّ الله يقضی ويقدِر

إذا مايرِدْ ذوالعَرش أمرا بعبده ... يصبْه وما للعبد ما يتخير

وقد يهلك الإنسانُ من وجهِ حِذْره ... وينجو بحمد الله من حيث(2) يحذر

جس امر کا بھی تو ارادہ کرے اللہ تعالیٰ پر توکل کر بے شک اللہ تعالیٰ ہی قضا و قدر کا مالک ہے۔ جب عزت والا اپنے بندے کے متعلق کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے وہ پہنچا دیتا ہے بندے کا کوئی اختیار نہیں۔ بعض اوقات انسان احتیاط کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا ہے اور جو احتیاط نہیں کرتا بحمد للہ وہ نجات پا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

العبدُ ذوضَجَرٍ والربُّ ذو قَدَرٍ ... والدَّهرُ ذو دُوَلٍ والرِّزْقُ مقسومُ

والخيرُ أجمعُ فيما اختار خالقُنا ... وفی اختيار سواه اللَّومُ الشُّومُ

بندہ پریشان ہونے والا ہے اور رب قدرت والا ہے زمانہ چکر لگانے والا ہے اور رزق تقسیم کیا جا چکا ہے۔ ہمارا خالق جس کو اختیار کرے بھلائی اس میں زیادہ جمع ہے اس کے سوا کے اختیار میں ملامت اور نحوست ہے۔

بعض علماء نے کہا: کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ دنیا کے امور میں سے کسی امر کا ارادہ کرے یہاں تک کہ وہ اس میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا سوال کرے وہ بندہ دو رکعت نماز نفل استخارہ پڑھے پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ قُلْ يٰٓاَيُّهَا

---

1۔ تفسیر ثعلبی، جلد 3، صفحہ 280، دار احیاء التراث العربی

2۔ شاید صحیح من لیس یحذر ہے سیاق اس کی تائید کرتا ہے اور توکل کا مفہوم بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

بعض مشائخ نے یہ پسند کیا کہ وہ پہلی رکعت میں قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ اور دوسری رکعت میں وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب:36) یہ سب حسن ہے۔ پھر سلام کے بعد یہ دعا مانگے۔ وہ وہ دعا ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام امور میں ہمیں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے۔ جس طرح قرآن کی سورت کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ فرماتے: تم میں سے جب کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو فرضوں کے علاوہ دو رکعت نماز ادا کرے پھر یہ دعا کرے (1)۔

اللهم إني أستخيرك بعلمك وأستقدرك بقدرتك وأسألك من فضلك العظيم فإنك تقدر ولا أقدر وتعلم ولا أعلم وأنت علام الغيوب اللّٰهم ان كنت تعلم إن هذا الامر خيرلي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري او قال في عاجل امري وآجله فاقدره لي ويسره لي ثم بارك لي فيه اللّٰهم ان كنت تعلم إن هذا الأمر شرلي في ديني ودنياي ومعاشي وعاقبة امري او قال في عاجل امري وآجله۔ فأصرفه عني وأصرفني عنه وأقدر لي الخير حيث كان ثم رضني به

''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کا طالب ہوں، میں تیری قدرت سے قدرت طلب کرتا ہوں اور تیرے عظیم فضل کا سوال کرتا ہوں تو قادر ہے، میں قادر نہیں، تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا، تو علام الغیوب ہے اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ امر میرے دین، میری معاش اور میرے امر کے انجام کے اعتبار سے بہتر ہے یا فرمایا: میرے امر کے جلدی واقع ہونے یا دیر سے واقع ہونے میں میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرے حق میں مقدر فرما دے اور اسے میرے لیے آسان کر دے پھر میرے لیے اس میں برکت رکھ دے اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ امر میرے لیے میرے دین، میری دنیا، میری معاش اور میرے امر کے انجام کے اعتبار سے برا ہے یا فرمایا: میرے امر کے جلد وقوع پذیر ہونے یا دیر سے واقع ہونے کے اعتبار سے (برا ہے) تو اسے مجھ سے دور کر دے اور مجھے اس سے دور کر دے جہاں کہیں بھلائی ہے اسے میرے حق میں مقدر کر دے پھر مجھ سے راضی ہو جا''۔

پھر وہ اپنے کام اور حاجت کا ذکر کرے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی امر کا ارادہ فرماتے تو فرماتے میرے لیے خیر کو پسند فرما اور میرے لیے اسے چن لے حضرت انس نے روایت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس جب کسی امر کا ارادہ کرے تو اس کے متعلق سات دفعہ اپنے رب سے خیر کا طالب ہو پھر دیکھ تیرا دل کس طرف مائل ہے کیونکہ خیر اس میں ہے۔

علماء نے کہا: اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کا دل تمام قسم کے وساوس سے فارغ ہو یہاں تک کہ وہ کسی امر کی طرف

1۔ صحیح بخاری، باب الدعاء والاستخارہ، جلد 2، صفحہ 944

مائل نہ ہوتو اس وقت اس کا دل جس کی طرف سبقت لے جائے اس پر عمل کرے، کیونکہ بھلائی اسی میں ہے ان شاء اللہ۔ اگر وہ سفر کا قصد کرے تو اپنے سفر کے لیے جمعرات یا پیر کا انتخاب کرے اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کا ارادہ کر رہا ہو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے قول حق کے ساتھ پاکی بیان کی۔ فرمایا: سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰی وہ پاک ہے مقدس ہے وہ بزرگ و برتر ہے۔ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝ وَ رَبُّكَ یَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ابن محیصن اور حمید نے تکن تاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ سورۂ نمل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح بیان کی وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَةِ ٞ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ وہ وحدانیت میں منفرد ہے تمام محامد اس کے لیے ثابت ہیں حکم اس کا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ۝ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝ وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

"آپ فرمایئے: بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر رات ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لا دے تمہیں روشنی۔ کیا تم سن نہیں رہے۔ فرمایئے: بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر دن ہمیشہ کے لیے اور قیامت تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لا دے تمہیں رات جن میں تم آرام کر سکو کیا تمہیں (کچھ) نظر نہیں آتا۔ اور محض اپنی رحمت سے اس نے بنا دیا تمہارے لیے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے اور تاکہ شکر گزار بنو"۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا سرمد سے مراد دائمی ہے، اسی معنی میں طرفہ کا قول ہے:

لعمرك ما أمری علیّ بِغُمَّةٍ نهاری ولا لیلی علیّ بسرمد

تیری زندگی کی قسم! میرا معاملہ مجھ پر چھپا ہوا نہیں میرا دن اور میری رات مجھ پر ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے معیشت کے اسباب کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کی نعمتوں کا شکر بجا لائیں۔ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ؕ کون نور لائے گا جس میں تم اپنی روزی تلاش کرو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کون دن لائے گا جس میں تم اپنے رزق کے اسباب کو دیکھ سکو گے اور اس میں پھل اور نباتات درست ہوں گے۔ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ کیا تم فہم اور قبول والا سننا نہیں سنتے۔ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 296

تَسۡكُنُوۡنَ فِيۡهِ جس رات میں تم تھکاوٹ سے آرام پاتے ہو۔

اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ غیر کی عبادت سے تم غلطی میں ہو جب تم نے اقرار کر لیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا دن اور رات کے لانے پر کوئی قادر نہیں تو پھر تم اس کے ساتھ کیوں شرک کرتے ہو؟

وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ فیہ میں ضمیر رات اور دن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر ان کے لیے ہے جو رات اور دن ہے۔ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ دن میں تم اس کا رزق طلب کرو۔ یہاں فیہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۔

وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ۝ وَنَزَعۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا فَقُلۡنَا هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ فَعَلِمُوۡۤا اَنَّ الۡحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝

''اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے کر فرمائے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ پھر (ان امتوں کو) ہم کہیں گے: لے آؤ اپنی دلیل تو وہ جان لیں گے کہ بے شک حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور گم ہو جائیں گے ان سے جو افتراء وہ باندھا کرتے تھے''۔

وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ حالوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ضمیر کا اعادہ کیا۔ وہ ایک دفعہ ندا کرتے ہیں تو انہیں کہا جاتا تھا: اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ وہ بتوں کو بلائیں گے تو وہ انہیں جواب نہ دیں گے تو ان کی حیرت ظاہر ہو گی۔ پھر وہ دوبارہ ندا کریں گے اور خاموش ہو جائیں گے۔ یہ توبیخ اور رسوائی کی زیادتی ہے۔ یہ ندا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہ ہو گی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کفار سے کلام نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (البقرہ: 174) لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ایسے امور کا حکم دے گا جو ان کو شرمندہ کر دے گا اور لاجواب کرے گا۔ اور مقام حساب میں ان پر حجت تمام کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ احتمال ہے کہ ندا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یہ اس وقت ہو گا جب انہیں کہا جائے گا: اخۡسَئُوۡا فِيۡهَا وَلَا تُكَلِّمُوۡنِ ۝ (المومنون) اللہ تعالیٰ نے شرکائی کا لفظ ذکر کیا ہے کیونکہ وہ بتوں کے لیے اپنے اموال میں سے حصہ مختص کیا کرتے تھے۔

وَنَزَعۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا شہید سے مراد نبی ہے؛ یہ مجاہد سے مروی ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آخرت کے عادل ہیں جو بندوں پر گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں یہ عمل کرتے رہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ۝ (النساء) ہر امت کا شہید اس کا وہ رسول ہے جو اس امت پر گواہی دے گا۔ شہید سے مراد حاضر ہے یعنی ہم نے ان کے اس رسول کو حاضر کیا جو رسول ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 297

فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ برہان سے مراد حجت ہے۔ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ انہیں علم ہو گیا کہ انبیاء جو لائے ہیں وہ سچ ہے۔ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ ان سے چلا گیا اور باطل ہو گیا مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ جو وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑتے رہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَ ابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

”بے شک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا پھر اس نے سرکشی کی ان پر اور ہم نے دے دیئے تھے اسے اتنے خزانے کہ ان کی چابیاں (اپنے بوجھ سے) جھکا دیتی تھیں ایک طاقت ور جتھہ (کی کمروں) کو جب کہا اسے اس کی قوم نے: زیادہ خوش نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو، طلب کر (اس مال و زر) سے جو دیا ہے تجھے اللہ تعالیٰ نے آخرت کا گھر اور نہ فراموش کر اپنے حصہ کو دنیا سے اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے اور نہ خواہش کر فتنہ و فساد کی ملک میں یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا فساد برپا کرنے والوں کو“۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الشوریٰ:36) تو اس امر کو واضح کیا کہ قارون کو مال عطا کیا گیا، اس نے اس کے ساتھ دھوکہ کھایا اور مال و دولت قارون کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ نہیں رکھے گا جس طرح فرعون کو معصوم نہیں رکھے گا۔ اے مشرکو! تم تعداد اور مال میں قارون اور فرعون سے تعداد میں زیادہ نہیں ہو گے۔ فرعون کو اس کے لشکروں اور اموال نے کوئی فائدہ نہ دیا اور قارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رشتہ داری اور مال نے کوئی نفع نہ دیا۔ نخعی، قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد تھا یہی قارون بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب موسیٰ بن عمران بن قاہث ہے(1)۔ ابن اسحاق نے کہا: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ماں، باپ دونوں کی طرف سے چچا تھا(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ان کا خالہ زاد تھا۔ یہ عجمہ اور معرفہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے جو فاعول کے وزن پر عجمی ہو اس میں الف، لام اچھا نہیں ہوتا وہ معرفہ ہو تو منصرف نہیں ہوتا اور نکرہ میں منصرف ہوتا ہے۔ اگر اس میں الف لام اچھا ہو تو وہ منصرف ہو گا اگر یہ مذکر کا اسم ہو جس طرح طاؤس اور راقود ہے۔ زجاج نے کہا: اگر قارون قرنت الشیء سے ماخوذ ہو تو یہ منصرف ہو گا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 264 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 117

فَبَغٰی عَلَیۡهِمۡ اس کی بغاوت یہ تھی کہ اس نے اپنے کپڑے کی لمبائی ایک بالشت زیادہ رکھی ہوئی تھی؛ یہ شہر بن حوشب کا قول ہے حدیث طیبہ میں ہے: لا ینظر اللہ إلی من جرازارہ بطرا (1) جس آدمی نے تکبر کرتے ہوئے اپنے تہبند کو گھسیٹا اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کی سرکشی سے مراد یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی بغی سے مراد اپنے مال اور اولاد کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں کو حقیر جاننا، یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی بغی سے مراد اللہ تعالیٰ نے اسے جو خزانے دیے اس نے انہیں اپنی طرف منسوب کیا کہ اس نے یہ اموال اپنے علم اور حیلہ سے حاصل کیے ہیں؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بغی سے مراد اس کا یہ قول ہے جب نبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے اور مذبح وقربان ہارون کو حاصل ہے تو میرے لیے کیا ہے؟ یہ روایت بیان کی جاتی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر سمندر سے گزرے اور رسالت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوئی اور امامت حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے ہوئی جو قربانی پیش کرتا ہے اور ان میں سردار ہوتا قربانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے بھائی کے لیے مختص کر دیا۔ قارون نے دل میں ناراضگی پائی اور ان دونوں سے حسد کیا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: امر تم دونوں کے لیے ہے میرے لیے کچھ بھی نہیں میں کب تک صبر کروں گا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں تیری تصدیق نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو معجزہ لے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا عصا لائے آپ نے ان سب کا گٹھا بنایا اور انہیں اس قبہ میں ڈال دیا جس قبہ میں آپ پر وحی نازل ہوتی تھی وہ رات کو اپنے عصا کی حفاظت کرتے رہے انہوں نے صبح کی تو حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا ہل رہا تھا اور اس کے سبز پتے بھی تھے۔ وہ اخروٹ کے درخت کا تھا۔ قارون نے کہا: جو کچھ تو کرتا ہے وہ جادو سے زیادہ تعجب کا باعث نہیں۔ تو اس نے یہ کہہ کر ان پر ظلم کیا۔

یحییٰ بن سلام اور ابن مسیب نے کہا: قارون مال دار آدمی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے بنی اسرائیل پر عامل تھا اس نے ان پر تعدی کی اور ان پر ظلم کیا وہ ان میں سے ایک تھا۔

ساتواں قول یہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے زانی کو رجم کرنے کا حکم دیا تو قارون نے ایک بدکار عورت کا قصد کیا اور اسے مال دیا اور اسے برانگیختہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دعویٰ کرے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے ساتھ بدکاری کی ہے اور اسے حاملہ کر دیا ہے۔ یہ امر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر گراں گزرا آپ نے اس عورت سے اس اللہ کی قسم اٹھوائی جس نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر پھاڑا اور جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی کہ تو سچ بولے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اس نے کہا: پس گواہی دیتی ہوں کہ تو بری ہے اور قارون نے مجھے مال دیا اور مجھے برانگیختہ کیا کہ میں وہ کہوں جو میں نے کہا، آپ سچے ہیں اور قارون جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قارون کا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کر دیا اور زمین کو حکم دیا کہ تو اس کی اطاعت کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جب کہ وہ زمین کو کہہ

1۔ صحیح بخاری، باب من جر ثوبه، جلد 2، صفحہ 861

رہے تھے: اے زمین! اس کو پکڑ لے اے زمین! تو اس کو پکڑ لے، زمین اسے آہستہ آہستہ پکڑتی رہی جب کہ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اے موسیٰ! یہاں تک کہ وہ خود، اس کا گھر اور اس کے ساتھی جو اس کے مذہب پر تھے وہ زمین میں دھنس گئے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی: میرے بندوں نے تجھے مدد کے لیے پکارا تو نے ان پر رحم نہیں کیا اگر وہ مجھے بلاتے تو مجھے اپنے قریب پاتے اور دعا قبول کرنے والا پاتے۔ ابن جریج نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ہر روز وہ انسان کی قامت کے برابر زمین میں دھنستا رہے گا۔ وہ قیامت تک زمین کی پست ترین سطح تک نہیں پہنچیں گے۔

ابن ابی الدنیا نے کتاب الفرج میں ذکر کیا ہے: ابراہیم بن راشد، داؤد بن مہران سے وہ ولید بن مسلم سے وہ مروان بن جناح سے وہ یونس بن میسرہ بن حلبس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ قارون حضرت یونس علیہ السلام سے سمندر کی تاریکیوں میں ملا تو قارون نے حضرت یونس علیہ السلام کو ندا کی اس نے کہا: اے یونس! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کر تو پہلے قدم پر ہی اسے پائے گا کہ وہ تیری طرف رجوع فرمائے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اسے فرمایا: تجھے توبہ سے کس چیز نے روکا؟ اس نے کہا: میری توبہ میرے چچازاد بھائی کے سپرد کر دی گئی تو اس نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حدیث میں ہے: قارون جب ساتویں زمین کی قرارگاہ تک پہنچے گا تو حضرت اسرائیل صور میں پھونک دیں گے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

سدی نے کہا: اس بدکار عورت کا نام سبرتا ہے، قارون نے اسے دو ہزار درہم دیئے تھے (1)۔ قتادہ نے کہا: قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سمندر طے کیا اس کے حسن صورت کی وجہ سے تورات میں اسے منور نام دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ کے دشمن نے منافقت کی جس طرح سامری نے منافقت کی۔

**وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ** عطا نے کہا: قارون نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بہت سے خزانے پائے (2)۔ ولید بن مروان نے کہا: وہ کیمیاء گری کا کام کرتا تھا (3)۔ **مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ**، اِنّ اپنے اسم اور خبر سے مل کر ما کا صلہ ہے اور ما، آتینا کا صلہ ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا: کوفی صلہ کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ کتنی ہی قبیح بات ہے الذی اور اس کے اخوات کا صلہ انّ اور انّ کے معمول کو بنانا جائز نہیں قرآن حکیم میں **مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ** اس میں مفاتح، مفتح کی جمع ہے۔ مفتح اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ تالے کو کھولا جاتا ہے جس نے مفتاح کہا اس نے مفاتیح کہا ہے جس نے کہا: یہ خزانے ہیں تو اس کا واحد مفتح ہے جو میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ **لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ** اس بارے میں جتنے بھی اقوال کیے گئے ہیں ان میں سے سب سے بہترین معنی یہ ہے کہ اپنے بوجھ کی وجہ سے ان کو جھکا دے جب باء مفتوحہ ہوگی تو باء داخل ہوگی، جس طرح انہوں نے کہا: ھو یذھب بالبؤس ویذھب البؤس تو وہ **لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ** ہوگا (4) یعنی مشقت سے اٹھی، جس طرح تیرا قول ہے: قم بنا یعنی ہمیں یوں بنادو کہ ہم اٹھیں۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے ناءَ ینُوْءُ نوءًا جب وہ مشکل سے اٹھے۔ شاعر نے کہا:

تَنُوْءُ بِأُخْرَاهَا فَلَأْيًا قِيَامُهَا وَتَمْشِي الْهُوَيْنٰى عَن قَرِيبٍ فَتَبْهَرُ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 265 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 266

وہ اپنی سرین کو اٹھاتی ہے تو اس کا قیام دیر سے ہوتا ہے وہ نرمی سے قریب جگہ تک چلتی ہے اور ہانپنے لگتی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

أخذتُ فلم أملك و نُؤتُ فلم أَقُمْ كأنِّي من طول الزمان مقيّدُ

میں کوئی چیز پکڑتا ہوں تو اس پر قبضہ نہیں کرسکتا میں اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں اٹھ نہیں پاتا گویا میں طویل عرصہ سے مقید ہوں۔

اناءنی جب اس نے مجھے بوجھل کر دیا، یہ ابوزید سے مروی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کا قول لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اس میں قلب کا قاعدہ جاری ہورہا ہے۔ لتنؤ بها العصبة یعنی اس کے ساتھ اٹھتا ہے۔ ابوزید نے کہا: نسئوت بالحمل جب میں بوجھ کے ساتھ اٹھا۔ شاعر نے کہا:

إذا وجدنا خَلَفًا بئس الخَلَف عبدًا إذا ما ناء بالحِمل وقف

جب ہم نے خلف پایا تو وہ غلام کتنا برا خلف تھا جب اس نے بوجھ اٹھایا تو چلنے سے رک گیا۔

پہلی تعبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوصالح اور سدی کے قول کا معنی ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ نحاس نے اسے پسند کیا ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: ذهبت به، أذهبته جئت به و اجأته۔ نؤت به و أنأته۔ مجرد حرف جار باء کے ساتھ اور باب افعال سے فعل کا معنی ایک ہی ہے جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے: له عندی ما ساءه و ناءه تو یہ اتباع کے قاعدہ سے ہے ضروری یہ تھا کہ وہ کہتا: اناءه اس کی مثل هنانی الطعام و مرأنی ہے میرے لیے کھانا مبارک ہوا۔ وأخذه ما قدُم و ما حدُث پرانا اور نیا اس نے لے لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ نائی بمعنی بعد سے ماخوذ ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

يَنأونَ عنا وماتَنْأى مودّتُهم فالقلبُ فيهم رهينٌ حيثما كانوا

وہ ہم سے دور ہوتے ہیں اور ان کی محبت دور نہیں ہوتی وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے دل ان کے قبضہ میں ہے۔

بدیل بن میسرہ نے لینوٴ یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس وقت اس کا فاعل الواحد یا المذکور ہو گا معنی پر اسے محمول کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: میں نے روٴبۃ بن عجاج سے اس کے اس شعر کے بارے میں کہا:

فيها خطوطٌ من سوادٍ و بَلَقْ كأنه في الجِلدِ تَوْلِيعُ البَهَقْ

اس میں سیاہ اور سفید لکیریں ہیں گویا جلد میں برص کے مرض کو پھیلا دیا گیا ہے۔

اگر تو نے خطوط کا ارادہ کیا ہے تو تجھے کہنا چاہیے: کانها اگر تو نے سواد اور بلق کا ارادہ کیا ہے تو تو کہہ: کانهما اس نے کہا: میں نے سب کا ارادہ کیا ہے۔ عصبہ کے معنی میں اختلاف ہے جس سے مراد ایسی جماعت ہے جو ایک دوسرے کے لیے عصبیت کا اظہار کرتی ہے اس کے بارے میں گیارہ قول ہیں: (۱) تین آدمی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، ان سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر دس تک کے افراد ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: یہاں عصبہ سے مراد پندرہ سے بیس تک

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 117

کے افراد ہیں (1)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: دس سے لے کر پندرہ تک کے افراد ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: پانچ سے لے کر دس تک کے افراد ہیں۔ پہلا شعبی، دوسرا قول قشیری اور ماوردی کا اور تیسرا قول مہدوی کا ہے۔ ابو صالح، حکم بن عتیبہ، قتادہ اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد چالیس افراد ہیں (2)۔ سدی نے کہا: دس سے لے کر چالیس تک کے افراد ہیں؛ یہ قتادہ کا بھی قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: کچھ علماء وہ ہیں جو کہتے ہیں چالیس اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ستر: یہ ابو صالح کا قول ہے کہ عصبہ سے مراد ستر افراد ہیں۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پہلا قول ثعلبی نے اس سے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ساٹھ افراد ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد چھ یا سات افراد ہیں۔ عبد الرحمن بن زید نے کہا: تین سے لے کر نو تک یہی "نفر" ہے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد دس افراد ہیں (3) کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: **وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ** (یوسف: 8) یہ مقاتل کا قول ہے۔ خیثمہ نے کہا: میں نے انجیل میں پایا قارون کے خزانوں کی چابیاں ستر پنج کلیان خچروں کا وزن تھا۔ وہ ان چابیوں کے بوجھ کی وجہ سے جھک جاتی تھیں ان میں سے کوئی چابی ایک انگلی سے بڑی نہیں تھی۔ ہر چابی کے لیے ایک خزانہ تھا اگر وہ خزانہ اہل بصرہ پر تقسیم کیا جاتا تو انہیں کافی ہو جاتا۔ مجاہد نے کہا: وہ چابیاں اونٹ کے چمڑے سے بنائی گئی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ گائے کے چمڑے کی تھیں تاکہ اس کے لیے ہلکی پھلکی ہوں۔ قشیری نے ذکر کیا: جب وہ سفر پر روانہ ہوتا تو وہ ستر خچروں پر لادی جاتیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ پچاس خچروں پر لادی جاتیں: یہ ضحاک کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کی چابیوں سے مراد اس کے برتن ہیں۔ ابو صالح نے اسی طرح کہا ہے کہ مفاتح سے مراد خزانے ہیں؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ** بنی اسرائیل کے مومنوں نے اسے کہا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: یہاں قوم سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فراء نے کہا: یہ جمع کا صیغہ ہے مراد واحد ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ** (آل عمران: 173) یہاں الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ **لَا تَفْرَحْ** تو تکبر نہ کر **اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ** اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا؛ یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

ولستُ بِمِفْرَاحٍ إذا الدهرُ سَرَّنِي

جب زمانہ مجھے خوش کرے تو میں تکبر کرنے والا نہیں۔

زجاج نے کہا: معنی ہے تو مال پر خوش نہ ہو کیونکہ مال پر خوش ہونے والا اس کا حق ادا نہیں کرتا۔ بشر بن عبد اللہ نے کہا: **لَا تَفْرَحْ** کا معنی ہے تو فساد برپا نہ کر۔ شاعر نے کہا:

إذا أنتَ لم تبرح تؤدّي أمانةً　　وتحملُ أخرى أفرحتك الودائعُ

جب تو ابھی امانت ادا نہیں کرتا اور دوسری امانت لے لیتا ہے تو ودیعتیں تجھے خراب کریں گی۔

ابو عمرو نے کہا: أفرحه الدين کا معنی ہے قرض نے اسے بوجھل کر دیا۔ زجاج نے کہا: الفرحين اور الفارحين دونوں

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 266　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

برابر ہیں۔ فراء نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ کہا: الفرحین کا معنی ہے جو خوشی کی حالت میں ہو۔ الفارحین جو زمانہ مستقبل میں خوش ہوں گے اور گمان کیا اسی کی مثل طمع اور طامع ہے میت اور مائت ہے۔ یہ کلام اس کے خلاف دلالت کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ (الزمر) یہاں اللہ تعالیٰ نے مائت نہیں فرمایا۔ مجاہد نے یہ بھی کہا ہے: لَا تَفْرَحْ کا معنی ہے تو بغاوت نہ کر (1)۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ اللہ تعالیٰ بغاوت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ابن بحر نے کہا: اللہ تعالیٰ بخل کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (2)۔

وَ ابْتَغِ فِیْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ اللہ تعالیٰ نے تجھے جو دنیا عطا کی ہے اس میں دار آخرت کو طلب کرے اور دار آخرت سے مراد جنت ہے۔ مومن کا حق یہ ہے کہ دنیا کو ایسے امور میں صرف کرے جو اسے آخرت میں نفع دیں وہ تکبر اور سرکشی میں دنیا کو صرف نہ کرے۔

وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا ان میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء کا نقطہ نظر ہے (3): تو اپنی عمر ضائع نہ کر کہ تو اپنی دنیا میں عمل صالح نہ کرے کیونکہ آخرت کے لیے عمل کیا جاتا ہے انسان کا نصیب اس کی عمر اور اس میں اس کا عمل صالح ہے۔ اس تاویل کی صورت میں کلام نصیحت میں شدت ہے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے کہ تو اپنی دنیا میں سے اپنا حصہ ضائع نہ کر جیسے تو حلال سے لطف اندوز ہو اور اس کی طلب کر جب کہ تیری نظر تیری دنیا کی عاقبت کے لیے ہو۔ اس تاویل کی بنا پر کلام میں کچھ نرمی ہے اور اس امر کے حصول کی تگ و دو کرنا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا استعمال نصیحت کے ساتھ واجب ہے تا کہ سختی کی وجہ سے انسان دور ہی نہ ہو جائے؛ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں تاویلیں ایسی ہیں جن کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے اس قول میں جمع کر دیا ہے: أحرث لدنیاك کأنك تعیش أبدا و اعمل لآخرتك کأنك تموت غدا اپنی دنیا کے لیے تگ و دو کرو گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی آخرت کے لیے کوشش کر گویا تو کل ہی مر جائے گا (4)۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: زائد کو آگے بھیج دو اور جو ضرورت پوری کرے اس کو روک لو۔ امام مالک نے کہا: اس سے مراد بغیر اسراف کے کھانا اور پینا ہے (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نصیب سے مراد کفن ہے یہ متصل وعظ ہے، گویا انہوں نے کہا: تو نہ بھول کہ تو اپنا تمام مال چھوڑ جائے گا مگر اپنا حصہ جو کفن ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول ہے:

نَصِیْبُكَ مما تجمعُ الدهرَ كلَّه    رداء أن تُلْوَی فیهما و حَنُوط

جو تمام زمانہ جمع کرتا ہے اس میں سے تیرا حصہ دو چادریں ہیں جن میں تجھے لپیٹا جاتا ہے اور تیرا حصہ حنوط ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 267 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 299 5۔ ایضاً

هي القناعة لاتبغي بها بدلا فيها النعيم وفيها راحة البدن

أنظر لمن ملك الدنيا بأجمعها هل راح منها بغير القطن والكفن

یہ قناعت ہے جس کے بدلے تو بدل نہیں چاہتا اس میں نعمتیں ہیں اور اس میں بدن کی راحت ہے اسے دیکھ جو تمام دنیا کا مالک بن گیا۔ کیا اس نے روئی اور کفن کے بغیر کسی چیز سے راحت پائی؟

ابن عربی نے کہا: اس بارے میں میرے پاس سب سے عمدہ قتادہ کا قول ہے: تو اپنا حلال حصہ نہ بھول، یہ دنیا میں سے تیرا حصہ ہے۔ یہ کتنا اچھا قول ہے؟

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر اور اس کی عبادت کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر انعام کیا ہے اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے ما الاحسان احسان کیا ہے(1)؟ فرمایا: أن تعبد الله كأنك تراه تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مساکین کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس میں بے شمار اقوال ہیں ان سب کا جامع یہ قول ہے: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں استعمال کرو۔ امام مالک نے کہا: بغیر اسراف کے کھانا اور پینا۔ ابن عربی نے کہا: میرا خیال ہے امام مالک نے ان لوگوں کا رد کرنے کا ارادہ کیا ہے جو عبادت اور بدحالی میں غلو کرتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ (میٹھی چیز) کو پسند فرماتے، شہد پیتے، بھنی ہوئی چیز استعمال کرتے اور ٹھنڈا پانی پیا کرتے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ نافرمانیاں نہ کیا کرو۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

"یہ (دولت و ثروت) اس علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے کیا اس (مغرور) کو اتنا علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر ڈالیں اس سے پہلے قومیں جو اس سے قوت میں کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں کہیں زیادہ تھیں، اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ"۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ مراد علم تورات ہے یہ اس سے روایت کیا گیا ہے جو تمام لوگوں میں سے زیادہ قاری ہیں اور ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ وہ ان ستر علماء میں سے ایک تھا جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لیے منتخب کیا تھا۔ ابن زید نے کہا: مجھے یہ اس لیے عطا کیا گیا کیونکہ وہ میری فضیلت اور اس کی مجھ سے رضا سے آگاہ تھا(2)۔ قول: عِنْدِيْ اس کا معنی ہے میرے ہاں اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خزانے عطا کیے ہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اپنی فضیلت کی وجہ سے میں ان کا مستحق ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مجھے یہ عطا کیا گیا ہے کہ میرے پاس تجارت اور کمائی کے مختلف ذرائع ہیں؛ یہ علی بن عیسیٰ کا نقطہ نظر ہے(3) اسے یہ علم نہیں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے لیے مال کمانے کو آسان نہ کرتا تو یہ اموال اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 27 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 268 3۔ ایضاً

کے پاس جمع نہ ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیونکہ میرے پاس سونے کے کام کا علم ہے۔ اس نے علم کیمیا کی طرف اشارہ کیا۔ نقاش نے بیان کیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے کیمیا کی صنعت کا حضرت یوشع کو ایک تہائی اور حضرت ہارون کو ایک تہائی علم عطا کیا۔ قارون نے ان دونوں کے ساتھ دھوکہ کیا جب کہ وہ اس وقت حضرت موسیٰ پر ایمان رکھتا تھا یہاں تک کہ ان دونوں کے پاس جو علم کیمیا تھا وہ بھی سیکھ لیا اور کیمیا کا عمل کیا تو اس کے اموال بہت زیادہ ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تین افراد کو علم کیمیا سکھایا یوشع بن نون، کالب بن یوحنا اور قارون؛ زجاج نے پہلے قول کو پسند کیا اور اس کے قول کا انکار کیا جس نے کہا: وہ کیمیا کا عمل کرتا تھا۔ اس نے کہا: کیمیا باطل ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بہن کو علم کیمیا سکھایا جو قارون کی بیوی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے قارون کو علم سکھایا؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اَوَ لَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ یعنی عذاب کے ساتھ ہلاک کیا۔ مِنَ الْقُرُوْنِ گزشتہ کافر امتوں میں سے۔ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا مال زیادہ جمع کرنے والے تھے۔ اگر مال فضیلت پر دلالت کرتا تو انہیں ہلاک نہ کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قوت سے مراد آلات ہیں اور جمع سے مراد اعوان و انصار ہیں۔ کلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے قارون کے لیے خبردار کرنے کے طریقہ پر واقع ہوئی ہے، یعنی کیا قارون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل کن امتوں کو ہلاک کیا؟

وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ان سے سوال رضامندی طلب کرنے کے لیے نہیں ہوگا جس طرح فرمایا: وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ (الجاثیہ) وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾ (فصلت) ان سے سوال ان کو شرمندہ کرنے کے لیے ہو گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ (الحجر) یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(1)۔ مجاہد نے کہا: ملائکہ کل قیامت کے روز مجرموں سے سوال نہیں کریں گے کیونکہ وہ ان کو ان کے چہروں سے ہی پہچان لیں گے(2)۔ قیامت کے روز انہیں سیاہ چہروں اور نیلی آنکھوں کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کیونکہ وہ ظاہر ہوں گے اور کثیر ہوں گے، بلکہ وہ بلا حساب آگ میں داخل ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس امت کے مجرموں سے سابقہ امتوں کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا جن کو دنیا میں عذاب دیا گیا: ایک قول یہ کیا گیا ہے: سابقہ امتوں میں سے جن کو بھی ہلاک کیا وہ ان کے گناہوں کو جانتے ہوئے ہلاک کیا ان کے گناہوں کو پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

---

1۔ الماوردی، جلد 4، صفحہ 268 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 300

''الغرض (ایک دن) وہ نکلا اپنی قوم کے سامنے بڑی زیب و زینت کے ساتھ کہنے لگے وہ لوگ جو آرزومند تھے دنیوی زندگی کے: اے کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ و جلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو واقعی وہ تو بڑا خوش نصیب ہے اور کہا ان لوگوں نے جنہیں (دنیا کی بے ثباتی کا) علم دیا گیا تھا: حیف تمہاری عقل پر! اللہ کا ثواب بہتر ہے اس کے لیے جو ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے اور نہیں مرحمت کی جاتی یہ نعمت بجز صبر کرنے والوں کے''۔

**فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ**، **عَلٰى قَوْمِهٖ** سے مراد بنی اسرائیل پر ہے۔ اس حالت میں جو اس نے دنیاوی زندگی کے سامان میں سے جس میں زینت دیکھی اس کے ساتھ وہ ان پر نکلا یعنی کپڑے چوپائے اور عید کے دن بناؤ سنگھار۔ غزنوی نے کہا: مراد ہفتہ کا دن ہے **فِیْ زِیْنَتِهٖ** یہ مع زینتہ کے معنی میں ہے۔ شاعر نے کہا:

إذا ما قلوب القومِ طارت مخافةً     من الموت أرسوا بالنفوس المواجد

شعر میں بالنفوس، مع النفوس کے معنی میں ہے وہ ستر ہزار پیروکاروں کے ساتھ نکلا جن کے جسم پر عصفر سے رنگے ہوئے کپڑے تھے۔ وہ پہلا شخص تھا جس کے لیے کپڑوں کو عصفر سے رنگا گیا تھا۔

سدی نے کہا: وہ ہزار سفید رنگ کی لونڈیوں، سفید خچروں پر نکلا جن خچروں پر سونے کی زینیں تھیں اور ارجوانی (سرخ) کپڑے ان پر پڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سرخ خچروں پر نکلا۔ مجاہد نے کہا: سفید ترکی گھوڑوں پر نکلا جن پر سرخ زینیں تھیں ان کے بدنوں پر عصفر سے رنگے کپڑے تھے۔ یہ پہلا دن تھا جس میں عصفر سے رنگ کپڑے دیکھے گئے۔ قتادہ نے کہا: وہ چار ہزار سواریوں پر نکلا جن پر سوار لوگوں نے سرخ کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ان جانوروں میں سے ایک ہزار سفید خچر تھے جن پر سرخ کپڑے ڈالے گئے تھے۔ ابن جریج نے کہا: وہ سیاہی مائل سفید رنگ کے خچروں پر نکلا جن پر سرخ رنگ کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ تین سو لونڈیاں تھیں جو سیاہی مائل سفید رنگ کے خچروں پر سوار تھیں جن کے جسموں پر سرخ رنگ کے کپڑے تھے۔ ابن زید نے کہا: وہ ستر ہزار افراد میں نکلا جن پر عصفر بوٹی سے رنگے ہوئے کپڑے تھے (1)۔ کلبی نے کہا: وہ سبز کپڑوں میں نکلا اللہ تعالیٰ نے وہ کپڑا جنت سے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا۔ قارون نے یہ کپڑا (2) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چوری کر لیا تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کی زینت سرخ رنگ تھی۔

میں کہتا ہوں: قرمز سرخ رنگ جو ارجوان کی مثل ہوتا ہے ارجوان لغت میں سرخ رنگ کو کہتے ہیں؛ قشیری نے اس کو ذکر کیا ہے۔ **قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ**، **حَظٍّ عَظِیْمٍ** سے مراد دنیا کا وافر حصہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس وقت کے مومنوں کا قول ہے۔ انہوں نے دنیا میں رغبت کی بنا پر اس کے مال کی مثل کی آرزو کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسے لوگوں کا قول ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اس میں رغبت رکھتے تھے وہ کفار تھے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 269

2۔ یہ جتنے بھی اقوال ذکر کیے گئے ہیں اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں اس لیے کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ بنی اسرائیل کے علماء نے ان لوگوں سے کہا جنہوں نے قارون کے مکان کو حاصل کرنے کی خواہش کی تھی: وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ اللہ تعالیٰ کے ثواب سے مراد جنت ہے لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ یعنی اعمال صالحہ یا آخرت میں جنت صرف انہیں کو ملے گی جو اللہ تعالیٰ کی طاعت پر صبر کریں گے۔ یہاں ضمیر ذکر کرنا جائز ہے کیونکہ ثَوَابُ اللّٰهِ سے یہی مراد ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ ۚ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

''پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں تو نہ تھی اس کے حامیوں کی کوئی جماعت جو (اس وقت) اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور وہ خود بھی اپنا انتقام نہ لے سکا۔ اور صبح کی ان لوگوں نے جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے یہ کہتے ہوئے: (اوہو!) اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑھ دیتا، اوہو! (اب پتہ چلا) کہ کفار بامراد نہیں ہوتے''۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ مقاتل نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا تو زمین نے اسے نگل لیا بنی اسرائیل نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اس لیے ہلاک کیا ہے تاکہ اس کے مال کا وارث بن جائے، کیونکہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے، اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا اور تین دن کے بعد اس کے تمام اموال کو بھی زمین میں دھنسا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ تیرے بعد زمین کو کسی کی اطاعت کرنے کا حکم نہیں دوں گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: خَسَفَ الْمَكَانُ یَخْسِفُ خُسُوفًا۔ مکان زمین میں چلا گیا۔ خَسَفَ اللہ بہ الأرض خَسْفًا اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں غائب کر دیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ وہ زمین میں دھنس گیا، اسے زمین میں دھنسا دیا گیا۔ خسوف القمر سے مراد چاند کا گرہن لگ جانا ہے۔ ثعلب نے کہا: كَسَفَتِ الشَّمْسُ، خَسَفَ الْقَمَرُ یہ عمدہ کلام ہے۔ خسف کا معنی نقصان ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رضی فلان بالخسف وہ کم حصہ پر راضی ہو گیا۔

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ فئۃ سے مراد جماعت اور جتھہ ہے۔ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ اس پر خسف کی صورت میں جو عذاب نازل ہوا اس سے بچنے والا نہیں تھا۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ قارون ہر روز انسان کی قامت کے برابر نیچے جاتا ہے یہاں تک کہ جب زمین کی انتہائی گہرائی تک جا پہنچے گا تو حضرت اسرافیل صور پھونک دیں گے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ وہ اس آرزو پر شرمندہ ہوں گے۔ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ، وی حرف ندامت ہے۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سے سب سے اچھا قول خلیل، سیبویہ، یونس اور کسائی کا قول ہے قوم متنبہ ہوئی یا انہیں متنبہ کیا گیا انہوں نے کہا: وی۔ عربوں میں شرمندگی کا اظہار کرنے والا شرمندگی کے دوران وی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جوہری نے کہا: وی کلمہ تعجب ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: ویك، وی لعبد الله۔ تجھ پر تعجب ہے، الله کے بندے پر تعجب ہے۔ بعض اوقات وی کا لفظ کان مخففہ اور مشددہ پر داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے: وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ۔ خلیل نے کہا: یہ مفصول ہے تو کہتا ہے: وی پھر نئے سرے سے کلام شروع کرتا ہے اور تو کہتا ہے: کان۔ ثعلبی نے کہا: فراء نے کہا: یہ کلمہ تقریر ہے جس طرح تیرا قول ہے: أما تری إلی صنع الله وإحسانه کیا تو الله تعالیٰ کی کاری گری اور اس کے احسان کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ ذکر کیا کہ ایک بدوی عورت نے اپنے خاوند سے کہا: این ابنك ویلك اس نے جواب دیا: وی کأنه وراء البیت یعنی کیا تو اسے دیکھتی نہیں وہ گھر کے پیچھے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ویك کلمہ ابتدا اور کلمہ تحقیق ہے؟ اس کی تقدیر کلام یہ ہے ان الله یبسط الرزق۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلمہ تنبیہ ہے آلا کی جگہ استعمال ہوتا ہے جس طرح آلا تفعل اور أما کے قائم مقام ہوتا ہے جو تیرے قول: اما بعد میں ہے، شاعر نے کہا:

سألتانی الطلاقَ إذ رَأَتانِی　　قَلَّ مالی قد جِئْتُمانِی بِنُكْرٍ(1)
وَیْ كَأنْ مَنْ یَكُنْ له نَشَبٌ یُحبِبْ　　وَمَنْ یَفْتَقِرْ یَعِشْ عَیْشَ ضُرِّ

ان دونوں نے مجھ سے طلاق کا سوال کیا جب انہوں نے مجھے دیکھا کہ میرا مال کم ہو گیا ہے تحقیق تم عجیب مطالبہ لائی ہو۔ خبردار جب آدمی کے پاس مال ہو اس سے محبت کی جاتی ہے اور جو فقیر ہوتا ہے وہ تکلیف کی زندگی بسر کرتا ہے۔

قطرب نے کہا: یہ اصل میں ویلك ہے اس کا لام حذف ہو گیا اور کاف جو خطاب کا ہے اس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ عنترہ نے کہا:

ولقد شَفَی نفسی وأبرأَ سُقْمَها　　قَوْلُ الفوارِسِ وَیْكَ عَنْتَرُ أَقْدِمِ(2)

میرے نفس کو شفا دی اور اس کی بیماری کو ٹھیک کر دیا شاہسواروں کے اس قول نے: تو ہلاک ہوا اے عنتر! آگے بڑھو۔

نحاس اور دوسرے علماء نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ معنی صحیح نہیں کیونکہ قوم ایک فرد کو خطاب نہیں کرتی کہ وہ اسے کہے: ویلك اگر یہ ایسے ہوتا تو انه کسرہ کے ساتھ ہوتا نیز ویلك سے لام حذف کرنا جائز نہیں۔ ان میں سے بعض نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ویلك اعلم انه تو اعلم کو مضمر کر دیا۔ ابن اعرابی نے کہا: ویکان الله اعلم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے الم تر ان الله۔ قتبی نے کہا: اس کا معنی ہے رحمة لك: یہ حمیر کی لغت میں ہے۔ کسائی نے کہا: وی اس میں تعجب کا معنی ہے(3)۔ اس سے یہ بھی مروی ہے کہ وی پر وقف ہے اور کہا: یہ تفجع کا کلمہ ہے۔ جس نے کہا: ویك اور کاف پر وقف کیا تو اس کا معنی ہے خوش ہو جا کیونکہ الله تعالیٰ رزق کو فراخ کرنے والا ہے اور خوش ہو جا کیونکہ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ یہ بھی مناسب ہے کہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 140　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 270　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 302

کاف حرف خطاب ہو یہ اسم نہ ہو کیونکہ وی ان کلمات میں سے نہیں جن کو مضاف کیا جاتا ہے اسے اکٹھے لکھا جاتا ہے جب اس کا استعمال زیادہ ہوا اسے مابعد کے ساتھ ایک چیز بنا دیا گیا۔

لَوۡلَاۤ اَنۡ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا اگر الله تعالیٰ ایمان اور رحمت کے ساتھ ہم پر احسان نہ فرماتا اور قارون جس بغاوت اور تکبر پر تھا اس سے ہمیں محفوظ نہ رکھتا لَخَسَفَ بِنَا تو وہ ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ اعمش نے پڑھا لولا من الله علینا۔ حفص نے پڑھا لخسف بنا تو یہ معروف کا صیغہ ہے۔ باقی قراء نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے؛ یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ عبدالله کی قراءت لانخسف بنا جس طرح تو کہتا ہے: انطلق بنا اسی طرح اعمش اور طلحہ بن مصرف نے قراءت کی۔ ابو حاتم نے دو وجوہ سے جماعت کی قراءت کو پسند کیا ہے ان دونوں میں سے ایک قول ہے: فَخَسَفۡنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الۡاَرۡضَ۔ دوسرا قول: لَوۡلَاۤ اَنۡ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا اسے الله تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ اس کے قریب اسم ہے۔

تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَ الۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۸۳﴾ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزَى الَّذِيۡنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۴﴾

''یہ آخرت کا گھر ہم مخصوص کر دیں گے اس (کی نعمتوں) کو ان لوگوں کے لیے جو خواہش نہیں رکھتے زمین میں بڑا بننے کی اور نہ فساد برپا کرنے کی اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے جو کرتا ہے نیکی تو اس کے لیے بہتر صلہ ہے اس نیکی سے اور جو ارتکاب کرتا ہے برائی کا تو نہ بدلہ دیا جائے گا انہیں جنہوں نے بدکاریاں کیں مگر اتنا جتنا انہوں نے کیا''۔

تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ مراد جنت ہے اسم اشارہ بعید کا ذکر اس کی تعظیم اور تفخیم شان کے لیے ہے یعنی وہ جس کا ذکر تو نے سنا اور تجھ تک اس کا وصف پہنچا۔ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ یعنی ایمان اور مومنین پر بلندی اور تکبر کا ارادہ نہیں کرتے۔ وَلَا فَسَادًا معاصی پر عمل کرنا؛ یہ ابن جریج اور مقاتل کا نقطہ نظر ہے۔ عکرمہ اور مسلم بطین نے کہا: فساد سے مراد ناحق مال لینا ہے (1)۔ کلبی نے کہا: غیر الله کی عبادت کی طرف دعوت دینا ہے (2)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: اس سے مراد انبیاء اور مومنین کو قتل کرنا ہے۔

وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ضحاک نے کہا: عاقبۃ سے مراد جنت ہے۔ ابو معاویہ نے کہا: الذی لا یرید علوا سے مراد وہ ہے جو دنیا کی ذلت پر جزع فزع نہیں کرتا اور اس میں عزت حاصل کرنے کے لیے مقابلہ نہیں کرتا۔ الله تعالیٰ کے ہاں ان میں سے سب سے بلند وہ ہے جو ان میں سے سب سے متواضع ہے اور آخرت میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہوگا جو آج ان سب سے زیادہ عاجزی کو لازم کرنے والا ہوگا۔ سفیان بن عیینہ نے اسماعیل بن خالد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی بن

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 271
2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 262

طالب رضی اللہ عنہما مساکین کے پاس سے گزرے جو کھانے کے ٹکڑے کھا رہے تھے حضرت علی بن طالب نے انہیں سلام کیا تو مساکین نے انہیں کھانے کی دعوت دی تو آپ نے اس آیت کو تلاوت کیا: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ پھر آپ سواری سے اترے اور ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر فرمایا: میں نے تمہاری دعوت قبول کی اور اب تم بھی میری دعوت قبول کرو آپ انہیں اپنے مکان پر لے آئے انہیں کھانا کھلایا، انہیں لباس پہنایا اور پھر روانہ کیا۔

ابو القاسم طبرانی سلیمان بن احمد نے اسے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن احمد بن حنبل اپنے باپ سے وہ سفیان بن عیینہ سے روایت نقل کرتے ہیں اور اس روایت کو ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الدَّارُ الْاٰخِرَةُ کا لفظ ثواب اور عقاب کو شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس گھر سے وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو تقویٰ کو اختیار کرے اور جو تقویٰ اختیار نہ کرے تو یہ گھر اس کے لیے نہیں کیونکہ وہ دار اس کو نقصان دیتا ہے اور اسے نفع نہیں دیتا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا سورۂ نمل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ عکرمہ نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ معنی ہے جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لایا اس کے لیے اس میں سے خیر ہے۔ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ سیئہ سے مراد شرک ہے فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وہ ایسی سزا دیتا ہے جو اس کے عمل کے لائق ہو۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ يُّلْقٰۤى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ لَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

"(اے محبوب!) یقیناً وہ (قادر مطلق) جس نے آپ پر قرآن کی تبلیغ فرض کی ہے آپ کو واپس لے جائے گا جہاں آپ چاہتے ہیں آپ فرمایئے: میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو آیا ہدایت یافتہ ہو کر اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہو۔ اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ نازل کی جائے گی آپ کی طرف کتاب مگر یہ محض رحمت ہے آپ کے رب کی (جو آپ کو صاحب قرآن بنا دیا) تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں اور (خیال رہے) وہ ہرگز نہ روکیں آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیات سے اس کے بعد کہ وہ اتاری گئیں آپ کی طرف اور بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے۔ اور نہ پکار و اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، اسی کی حکمرانی ہے اور اس کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا"۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ سورت کا اختتام اپنے نبی کو بشارت دیتے ہوئے کیا کہ وہ حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ کی طرف اپنے دشمنوں پر غلبہ دیتے ہوئے لوٹائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آپ کو جنت کی بشارت ہے؛ پہلا قول اکثر علماء کا ہے؛ یہ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہم کا قول ہے(1)۔ قتبی نے کہا: معاد الرجل سے مراد اس کا ملک وشہر ہے کیونکہ وہ وہاں سے جاتا ہے پھر واپس لوٹ آتا ہے۔ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلاش کے خوف سے غیر معروف راستہ سے غار ثور سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے۔ جب راستے تک پہنچے اور جحفہ میں فروکش ہوئے تو مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ سے آگاہ ہوئے تو مکہ مکرمہ کے مشتاق ہوئے تو جبریل امین نے آپ سے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ** یعنی مکہ مکرمہ کی طرف غلبہ دیتے ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت جحفہ کے مقام پر نازل ہوئی۔ یہ نہ مکی ہے نہ مدنی ہے(2)۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: **اِلٰى مَعَادٍ** سے مراد موت تک ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے نیز عکرمہ، زہری اور حضرت حسن بصری سے مروی ہے معنی ہے تجھے یوم قیامت کی طرف لوٹانے والا ہے؛ یہ زجاج کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: میرے اور تیرے درمیان یوم قیامت ہے، کیونکہ اس میں لوگ زندہ لوٹیں گے۔ فرض کا معنی ہے اس نے نازل کیا۔ مجاہد، ابو مالک اور ابو صالح سے **اِلٰى مَعَادٍ** کا معنی جنت تک نقل کیا ہے؛ یہ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(3)، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ المعراج کو اس میں داخل ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ آپ کے جد اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام اس سے نکلے تھے۔

**قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ** کفار مکہ سے کہو: جب انہوں نے یہ کہا تھا: انك لفی ضلال مبین

**رَبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ** کہ میں گمراہ ہوں یا تم گمراہ ہو۔

**وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤى اِلَیْكَ الْكِتٰبُ** تو نہیں جانتا کہ ہم تجھے مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجیں گے اور تجھ پر قرآن نازل کریں گے۔ **اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ** کسائی نے کہا: یہ مستثنیٰ منقطع ہے، إلا، لکن کے معنی میں ہے۔ **فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ** یعنی کفار کے مددگار نہ بنو۔ سو اس سورت میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**وَ لَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ** یعنی ان کے اقوال، ان کا جھوٹ اور ان کی اذیت تجھے نہ روکے، ان کی طرف متوجہ نہ ہو جایئے اور اپنے معاملہ پر گامزن رہیے۔ یعقوب نے یصدنك نون کی جزم کے ساتھ پڑھا۔ اسے **یُصِدُّنَّكَ** بھی پڑھا گیا ہے یہ أصدہ جو صدہ کے معنی میں ہے سے مشتق ہے یہ بنو کلب کی لغت میں ہے۔

شاعر نے کہا:

أناس أصدوا الناس بالسيف عنهم

وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے لوگوں کو تلوار کے ساتھ ان سے روکا۔

**وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ** اپنے رب کی توحید کی طرف دعوت دو یہ اپنے ضمن میں ایک دوسرے سے لاتعلقی کے معنی کو لیے ہوئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 303 | 2۔ ایضاً | 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 272

ہے۔ یہ سب آیۃ سیف سے منسوخ ہے۔ اس آیت کا سبب وہ دعوت ہے جو قریش نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے بتوں کی تعظیم کی دعوت دی۔ اسی موقع پر شیطان نے آپ کی آرزو میں غرانیق (1) کا معاملہ ڈالا جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو کیونکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے، تمام معبودوں کی نفی ہے اور اس کی عبادت کا اثبات ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ مجاہد نے کہا: اِلَّا وَجْهَهٗ سے مراد ہے اِلَّا هُوَ۔ صادق نے کہا: مگر اس کا دین۔ ابو العالیہ اور سفیان نے کہا: مراد ہے الا ما ارید به وجهه قربت کے ساتھ جس کا قصد کیا جائے (2)۔ شاعر نے کہا:

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْبًا لستُ مُحْصِيَه		ربَّ العباد إليه الوَجْهُ والْعَمَلُ (3)

میں اللہ تعالیٰ سے گناہ کی بخشش کا طالب ہوں جو بندوں کا پالن ہار ہے میں ان گناہوں کو شمار نہیں کر سکتا اسی کے لیے میری ذات اور میرا عمل ہے۔

محمد بن یزید نے کہا: ثوری نے مجھے بیان کیا کہ میں نے ابو عبیدہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کے بارے میں سوال کیا فرمایا: اِلَّا وَجْهَهٗ جس طرح تو کہتا ہے: لفلان وجه فی الناس فلاں کی لوگوں میں شان و شوکت ہے۔ لَهُ الْحُكْمُ دنیا و آخرت میں اس کا حکم ہے۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ زجاج نے کہا: وَجْهَهٗ مستثنیٰ کے طور پر منصوب ہے اگر یہ قرآن کے علاوہ میں ہوتا تو اِلَّا وَجْهُهٗ مرفوع ہوتا۔ معنی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہلاک ہونے والی ہے۔ جس طرح فرمایا:

وكلُّ أخٍ مُفارقُهُ أخوه		لَعَمْرُ أبيكَ إلّا الفَرْقَدانِ

ہر بھائی اپنے بھائی سے جدا ہونے والا ہے تیرے باپ کی قسم مگر فرقدان۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اسی کی طرف تم کو لوٹایا جائے گا۔

---

1۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ غرانیق والا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔	2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 273	3۔ ایضاً

# سورة العنکبوت

آیاتھا ۶۹ ۲۹ سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ ۸۵ رکوعاتھا ۷

حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے نزدیک تمام سورت مکی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دو قولوں میں سے ایک قول(2) اور حضرت قتادہ کے نزدیک یہ تمام سورت مدنی ہے۔ ان کے دوسرے قول اور یہی یحیٰی بن سلام کا قول ہے کہ یہ سورت مکی ہے مگر اس کی پہلی دس آیات مدنی ہیں(3)، کیونکہ وہ آیات مدینہ طیبہ میں ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یہ کہا: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان نازل ہوئیں یہ ننانوے آیات ہیں(4)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾

”الف، لام، میم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں: ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے پس اللہ تعالیٰ ضرور دیکھے گا (ایمان کے) جھوٹے (دعویداروں) کو“۔

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات کے بارے میں بات گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے میں اللہ، بہتر جانتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سورت کا نام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قرآن کا نام ہے۔ اَحَسِبَ میں ہمزہ استفہام کا ہے مراد تقریر و توبیخ ہے۔ حَسِبَ کا معنی ظن ہے۔ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا محل نصب میں ہے جس کو نصب حَسِبَ نے دی ہے۔ سیبویہ کے قول کے مطابق یہ اور اس کا صلہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ اَنْ يَّقُوْلُوْٓا میں ان دو توجیہوں میں سے ایک توجیہ کے مطابق محل نصب میں ہے۔ معنی ہے لأن یقولوا، بأن یقولوا، علی أن یقولوا۔

دوسری جہت کی بنا پر اس میں تکرار ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا احسبوا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا: النَّاسُ سے مراد مومنوں کی قوم ہے(5) جو مکہ مکرمہ میں تھے قریش کے کفار

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 274 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 365

اسلام قبول کرنے کی وجہ سے انہیں اذیتیں اور تکالیف دیا کرتے تھے، جس طرح حضرت سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ، حضرت ولید بن ولید، حضرت عمار بن یاسر، حضرت یاسر ان کے والد، ان کی والدہ حضرت سمیہ اور بنی مخزوم کے کچھ افراد وغیرہ۔ یہ آیت نازل ہوئی تا کہ تسلی دے اور تعلیم دے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں یہی معمول ہے کہ وہ مومنوں کو آزماتا ہے اور فتنہ میں ڈالتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اگر چہ یہ آیت اسی سبب سے نازل ہوئی یا اس معنی میں جو اقوال ہیں ان میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت محمد ﷺ کی امت میں باقی ہے اس کا حکم آخر زمانہ تک موجود رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش مسلمانوں کی سرحدوں میں باقی رہے گی کبھی کسی کو گرفتار کر لیا جائے گا، کبھی دشمن کی جانب سے کوئی اذیت پہنچے گی اس کے علاوہ بھی صورتحال ہو سکتی ہے۔ اگر ہر جگہ کا اعتبار کیا جائے تو بھی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ بیماریاں واقع ہوں اور مختلف قسم کے امتحان واقع ہوں، لیکن وہ مصیبت جو قریش کی جانب سے واقع ہوئی اس کے مشابہ وہ ہے جو سرحد پر دشمن کی جانب سے واقع ہو سکتی ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: انہوں نے جو کہا کتنا اچھا کہا، جو کہا سچ کہا۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت حضرت مجع جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ یہ غزوہ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی جانب سے پہلا شہید تھا۔ عامر بن حضرمی نے اسے تیر مارا اور اسے شہید کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: سید الشھداء مھجع وھو اول من یدعی الی باب الجنۃ من ھذہ الامۃ، شہیدوں کا سردار مجع ہے یہ اس امت کا وہ پہلا شخص ہے جسے جنت کے دروازے کی طرف دعوت دی جائے گی۔ اس کے والدین اور اس کی بیوی نے اس پر جزع فزع کی تو یہ آیات نازل ہوئیں۔

شعبی نے کہا: اس سورت کا آغاز ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوا (2) جو مسلمانوں میں سے مکہ مکرمہ میں تھے نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے حدیبیہ سے انہیں خط لکھے کہ تمہارا اسلام کا اقرار کرنا قبول نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ تم ہجرت نہ کر دو وہ نکلے تو مشرکوں نے ان کا پیچھا کیا اور انہیں اذیتیں دیں تو ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی تو صحابہ نے انہیں خط لکھے کہ ان کے بارے میں فلاں فلاں آیت نازل ہوئی ہے تو انہوں نے کہا: ہم نکلیں گے اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔ مشرکوں نے ان کا پیچھا کیا تو انہوں نے ان سے جنگ کی ان میں سے کچھ قتل ہوئے اور کچھ نجات پا گئے۔ تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا (النحل: 110)

**وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ** کہ ان کا امتحان نہ لیا جائے گا۔ کیا ان لوگوں نے گمان کر لیا ہے جنہوں نے مشرکوں کی اذیتوں سے گھبراہٹ کا اظہار کیا کہ ان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم مومن ہیں اور ان کے امان، ذات اور اموال میں امتحان نہ لیا جائے گا جس سے ان کے ایمان کی حقیقت واضح ہو جائے۔

**وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** ہم نے گزشتہ لوگوں کو بھی آزمایا جس طرح حضرت خلیل کو آگ میں پھینکا گیا اور جس طرح

1۔ جامع اسباب النزول، سورۂ عنکبوت، صفحہ 257　　2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 365

کہ وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے دین کی وجہ سے آریوں سے چیر دی گئی تو وہ اس سے نہ پلٹے۔ امام بخاری نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت کی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں چادر کو تکیہ بنائے ہوئے تھے ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے مدد طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے دعا نہیں کریں گے؟ فرمایا: ''تم سے قبل ایک آدمی کو پکڑا جاتا زمین میں اس کے لیے گڑھا کھودا جاتا آری لائی جاتی، اسے اس کے سر پر رکھ دیا جاتا تو اس کو نصف نصف کر دیا جاتا اس کے گوشت اور ہڈیوں کو لوہے کی کنگی سے جسم سے الگ کیا جاتا تو یہ عمل اسے اس کے دین سے نہ پھیر سکتا۔ اللہ کی قسم! یہ امر مکمل ہو کر رہے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا، تو اسے کسی چیز کا خوف نہ ہوگا سوائے اللہ اور ریوڑ پر بھیڑیے کے لیکن تم تو جلدی مچا رہے ہو'' (1)۔

امام ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ کو سخت بخار تھا میں نے اپنا ہاتھ آپ پر رکھا تو میں نے لحاف کے اوپر سے اپنے ہاتھ میں آپ کے جسم کی حرارت کو پایا۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ پر کس قدر شدید ہے؟ فرمایا: ''ہمارے لیے اسی طرح آزمائش کئی گنا ہوتی ہے اور ہمارے لیے کئی گنا اجر ہوتا ہے'' (2)۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سے از روئے آزمائش کے کون سب سے سخت ہیں؟ فرمایا: ''انبیاء''۔ میں نے عرض کی: پھر کون؟ فرمایا: ''پھر صالحین (3)۔ ان میں سے کسی کو فقر سے آزمایا جاتا ہے وہ کوئی چیز نہیں پاتے مگر عباء جسے پھاڑ کر وہ گریبان بنا لیتا ہے ان میں سے کوئی آزمائش سے یوں خوش ہوتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک خوشحالی سے خوش ہوتا ہے''۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سے کون سخت مصیبت والا ہوتا ہے؟ فرمایا: ''انبیاء، پھر درجہ میں ان سے نیچے پھر درجہ میں ان سے نیچے ایک آدمی کو اس کے دین کے حساب سے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے آزمائش بندے کے ساتھ رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے یوں کر چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر چلتا ہے تو اس پر کوئی خطا نہیں ہوتی'' (4)۔

عبدالرحمن بن زید نے روایت کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک وزیر تھا ایک دن وہ سوار ہوا تو ایک درندے نے اسے پکڑ لیا اور اسے کھا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! تیرے دین میں میرا وزیر، بنی اسرائیل پر میرا نائب اور ان میں میرا خلیفہ تو نے اس پر ایک درندہ مسلط کر دیا تو وہ درندہ اسے کھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں اس کا میرے ہاں بلند مرتبہ تھا میں نے اس کا کوئی عمل ایسا نہ پایا جو اسے اس مقام تک پہنچائے تو میں نے اسے اس آزمائش میں ڈالا تو یہ عمل اسے اس مقام تک پہنچا دے گا۔ وہب نے کہا: میں نے حواری کی ایک کتاب میں دیکھا جب اللہ تعالیٰ تجھے آزمائش کے راستہ پر چلائے تو آنکھ کو ٹھنڈا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے انبیاء اور صالحین کے راستہ پر چلایا ہے اور جب تجھے خوشحالی کے راستہ پر چلائے تو اپنی ذات پر رو تحقیق تجھے ان کے راستہ سے مختلف راستہ پر چلایا گیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ، صفحہ 510
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 411، حدیث نمبر 4024
3۔ الترغیب والترہیب، صفحہ 282، حدیث نمبر 16
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، صفحہ 411

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا تاکہ جو ایمان میں سچے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دکھائے۔ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا: تاکہ اللہ تعالیٰ صادق کے صدق کو اس کی جانب سے صدق کے وقوع کو جانے جب کہ اللہ تعالیٰ صادق کو کاذب سے ان دونوں کی تخلیق سے پہلے بھی جانتا ہے لیکن یہاں ارادہ اس علم کے وقوع کا ہے جس پر جزا دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ صادق کے صدق کو واقع اور اس کے وقوع کو واقع ہونے والا جانتا ہے جب کہ وہ پہلے ہی جانتا ہے کہ ایسا وقوع ہوگا۔ نحاس نے کہا: اس میں دو قول ہیں (۱) صَدَقُوْا یہ صدق سے مشتق ہے اور الْكٰذِبِيْنَ کذب سے مشتق ہے جو صدق کی ضد ہے۔ معنی ہوگا انہوں نے جو سچ بولا اللہ تعالیٰ اسے واضح فرمائے گا۔ انہوں نے کہا تھا: ہم مومن ہیں اور اس کی مثل اعتقاد کیا۔ جب انہوں نے اس کے خلاف اعتقاد رکھا تو انہوں نے جھوٹ بولا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صَدَقُوْا یہ صدق سے مشتق ہے جو صلب ہے اور الْكٰذِبِيْنَ یہ کذب سے مشتق ہے جس کا معنی شکست کھانا ہے تو معنی ہوگا اللہ تعالیٰ انہیں جانے جو جنگ میں ثابت قدم رہے اور جنہوں نے شکست کھائی۔ جس طرح شاعر نے کہا:

لَيثٌ بِعَثَّرَ يَصْطَادُ الرجالَ إذا ما اللَّيثُ كَذَّبَ عن أقرانه صَدَقَا

عثر کے مقام پر شیر بہادروں کا شکار کرتا ہے وہ اس وقت بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے جب شیر اپنے ہم پلہ افراد سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

لَيَعْلَمَنَّ کے لفظ کو فَلَيُبَيِّنَنَّ کی جگہ مجازاً ذکر کیا۔ جماعت کی قراءت فليعلمن یاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یاء کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ اسی معنی کی وضاحت کرتی ہے جو نحاس نے کہا: یہ لفظ تین معانی کا احتمال رکھتا ہے (۱) ان صادقین اور کاذبین کو ان کے ثواب اور عقاب کی منازل اور دنیا میں جو ان کے اعمال تھے آخرت میں انہیں آگاہ کر دے (۲) مفعول اوّل محذوف ہے اس کی تقدیر یہ ہوگی لوگوں اور عالم کو ان صادقین اور کاذبین پر آگاہ کر دے یعنی انہیں رسوا کر دے اور انہیں مشہور کر دے۔ صادقین خیر میں اور کاذبین شر میں مشہور ہو جائیں۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہوگا (۳) یہ فعل علامت سے مشتق ہے یعنی ہر طائفہ کے لیے ایک علامت بنا دے جس کے ساتھ وہ مشہور ہو جائے۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی طرف اشارہ کرتی ہے: من أسر سريرة ألبسه الله رداءها(1) "جس نے راز کو پوشیدہ رکھا اللہ تعالیٰ اسے چادر زیب تن کرائے گا"۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 306

''کیا خیال کر رکھا ہے انہوں نے جو کر رہے ہیں برے کرتوت کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ جو شخص امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملنے کی تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی ہر بات سننے والا ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اور جو شخص کوشش کرتا ہے (حق کو سربلند کرنے کی) تو وہ اپنے فائدے کے لیے ہی کوشاں ہے، بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے تمام کائنات سے اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو ہم دور کر دیں گے ان سے ان کی برائیوں (کی نحوست) کو اور ہم انہیں بہت عمدہ بدلہ دیں گے ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ، السَّیِّاٰتِ سے مراد شرک ہے اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا وہ ہماری گرفت سے نکل سکتے ہیں اور ہمیں عاجز کر سکتے ہیں قبل اس کے کہ ہم ان کا مواخذہ کریں ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الَّذِیۡنَ سے مراد ولید بن مغیرہ، ابوجہل، اسود، عاص بن ہشام، شیبہ، عتبہ، ولید بن عتبہ، عقبہ بن ابی معیط، حنظلہ بن ابی سفیان اور عاص بن وائل ہیں۔ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ انہوں نے اپنے رب کی صفات میں جو یہ فیصلہ کیا وہ کتنا برا فیصلہ ہے کہ اس پر سبقت لی جا سکتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ مَا محل نصب میں ہے یہ ساء شیئا او حکما یحکمون کے معنی میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مَا محل رفع میں ہو معنی ہوگا ساء الشیء او الحکم حکمهم؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ ابن کیسان نے ان دو تقدیروں کے علاوہ دو اور تقدیریں مقدر کی ہیں۔ (۱) مَا یَحۡکُمُوۡنَ شئ واحد کی جگہ ہے جس طرح تو کہتا ہے: اعجبنی ما صنعت، یہاں ما صنعك، صنيعك کے معنی میں ہے مَا اور فعل مصدر کے حکم میں ہیں اور محل رفع میں ہیں۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ساء حکمهم، دوسری تقدیر یہ ہے کہ مَا کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو۔ یہ سَآءَ کے اسم کے قائم مقام ہے اسی طرح نعم اور بئس ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: میں اس امر کو پسند کرتا ہوں کہ جہاں تک میں قادر ہوں کہ میں مَا کا کوئی محل بناؤں (1)۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ (آل عمران: 159) اسی طرح فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ (النساء: 155) اور اسی طرح اَیَّمَا الۡاَجَلَیۡنِ قَضَیۡتُ (القصص: 28) ان تمام مواقع پر مَا محل جر میں ہے اور اس کا مابعد اس کے تابع ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً (البقرہ: 26) اس میں مَا محل نصب میں ہے اور بعوضۃً اس کے تابع ہے۔

مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ، یَرۡجُوۡ یہ یخاف کے معنی میں ہے ہذلی شہد اتارنے والے کے بارے میں کہتا ہے،

اذا لسعتهُ النحلُ لَایَرۡجُ لسعها

جب شہد کی مکھیاں اسے ڈستی ہیں تو وہ ان کے ڈنگوں سے نہیں ڈرتا۔

اہل تفسیر نے اس پر اجماع کیا ہے کہ معنی ہے جو آدمی موت سے ڈرتا ہے تو وہ عمل صالح کرے کیونکہ موت کا آنا ضروری ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ زجاج نے کہا: یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ثواب کی امید رکھتا ہے (2)۔ مَنۡ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 306 2۔ ایضاً

مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ کَانَ یہ خبر کے محل میں ہے۔ یہ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ یَرْجُوْا کان کی خبر کی جگہ اور جزا فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ جو آدمی دین میں جہاد کرتا ہے، کفار سے قتال اور طاعات کے اعمال پر صبر کرتا ہے۔ تو وہ اپنے لیے ہی کوشاں ہوتا ہے، یعنی ان کا سب کا ثواب اسے ہی ملے گا۔ ان میں سے کسی چیز کا نفع اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال سے غنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جو آدمی اپنی ذات کے لیے اس کے دشمن سے جہاد کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے جہاد کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جنہوں نے تصدیق کی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ہم مغفرت کے ساتھ ان کو ڈھانپ لیں گے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ان کے احسن اعمال جو طاعات ہیں کا بدلہ دیں گے۔ پھر یہ کہا گیا: یہ احتمال موجود ہے ان کی ہر وہ معصیت بخش دے گا جو انہوں نے حالت شرک میں کی۔ اور حالت اسلام میں جو انہوں نے اعمال حسنہ کیے ان پر ان کو ثواب دیا جائے گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ کفر اور اسلام دونوں میں ان سے واقع ہونے والی سیئات کو بخش دے گا اور حالت کفر و اسلام میں انہوں نے جو نیکیاں کیں ان پر انہیں بدلہ دیا جائے گا۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝

"اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اگر وہ یہ کوشش کریں تیرے ساتھ کہ تو شریک بنائے کسی کو میرا جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو (اس بات میں) ان کی اطاعت نہ کر، میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے پھر میں آگاہ کروں گا تمہیں ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے تو ہم ضرور شامل کریں گے انہیں نیکوں (کے زمرہ) میں"۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ امام ترمذی نے اس بارے میں روایت کی ہے۔ فرمایا: میرے بارے میں چار آیات نازل ہوئیں۔ اور واقعہ ذکر کیا۔ حضرت سعد کی والدہ نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے نیکی کا حکم نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں کھانا نہیں کھاؤں گی اور میں پانی نہیں پیوں گی یہاں تک کہ میں مر جاؤں یا تو کفر کرے۔ کہا: جب لوگ اس کو کھانا کھلانے کا ارادہ کرتے تو اس کے منہ میں لکڑی دیتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ حضرت سعد سے مروی ہے کہ میں اپنی ماں کے ساتھ بڑی نیکی کرتا میں اسلام لایا تو اس نے کہا: تو اپنے دین کو چھوڑے گا یا میں نہ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی یہاں تک کہ میں مر جاؤں تو تجھے میری وجہ

1۔ جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 150

2۔ سنن ترمذی، باب من سورۃ العنکبوت، حدیث نمبر 3113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے عار دلائی جائے گی اور کہا جائے گا: اے اپنی ماں کے قاتل! وہ ایک دو دن اسی طرح رہی۔ میں نے کہا: اے میری ماں! اگر تیری سو جانیں ہوں اور وہ ایک ایک نفس نکلیں تب بھی میں اس دین کو نہیں چھوڑوں گا، چاہے تو کھا چاہے تو نہ کھا۔ جب اس نے یہ دیکھا تو اس نے کھانا کھالیا اور یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِیۡ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت عیاش بن ابی ربیعہ جو ابو جہل کا ماں کی جانب سے بھائی تھا کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی ماں نے بھی اسی طرح کیا۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: یہ آیت تمام امت کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ صدیق کے علاوہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی آزمائش پر صبر نہیں کرتا۔ حُسۡنًا بصریوں کے نزدیک تکریر کے طور پر منصوب ہے یعنی وصینا حسنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ماقبل کلام سے قطع کے طور پر منصوب ہے اس کی تقدیر یہ ہوگی وصیناہ بالحسن، جس طرح تو کہتا ہے: وصیتہ خیرا، وصیتہ بالخیر۔ اہل کوفہ نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ووصینا الانسان ان یفعل حسنا فیُقدّر لہ فعلٌ۔ ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا کہ وہ اچھا عمل کرے تو اس کے لیے فعل مقدر کر دیا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا:

عَجِبتُ من دَهْمَاء إذ تَشكونَا(2) ومن أبي دَهْمَاءَ إذ يُوصينَا
خيرًا بها كأنما خافونا

میں اس گروہ پر متعجب ہوتا ہوں جو ہماری شکایت کرتا ہے اور جماعت کے سردار سے متعجب ہوتا ہوں جو ہمیں وصیت کرتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کریں گویا وہ ہمارے ماں جائے ہیں۔

تقدیر کلام یہ ہے: یوصینا أن نفعل بها خیرا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَطَفِقَ مَسۡحًا (ص:33) تقدیر کلام یہ ہے: یمسح مسحا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے: ووصینا أمرا ذا حسن صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا تھا، مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے ألزمناہ حسنا ہم نے اس پر اچھا کام لازم کیا۔ عام قراءت حاء کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔ ابو رجاء، ابو عالیہ اور ضحاک نے حاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جحدری نے احسانا مفعول مطلق کے طور پر پڑھا ہے، اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: ووصینا الإحسان أن تحسن إلیهما إحسانا یہ وصینا کے ساتھ منصوب نہیں کیونکہ اس کے پہلے ہی دو مفعول موجود ہیں۔ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ والدین کی طاعت میں وعید ہے یعنی جو ان کی اطاعت نہ کرے اور اس امر کا انکار کرے اس کے لیے وعید ہے۔ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۞ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ ۞ مومنین کی حالت کی تمثیل کو مکرر ذکر کیا تاکہ نفوس میں حرکت پیدا کی جائے تاکہ یہ لوگ بھی ان کے مراتب کو حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ معنی میں مبالغہ کے طور پر لام ذکر کی یعنی وہ لوگ صالحیت میں انتہا اور اس کی آخری حد کو پانے والے ہیں جب مومن کے لیے یہ حکم حاصل ہو جاتا ہے تو اس کا ثمرہ اور جزا بھی حاصل ہو جاتی ہے جو جنت ہے۔

1۔ صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، سعد بن ابی وقاص، جلد 2، صفحہ 281 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 308

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

''اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اللہ تعالیٰ پر پھر جب ستایا جائے اسے راہ خدا میں تو بنالیتا ہے لوگوں کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر اور اگر آجائے نصرت آپ کے رب کی طرف سے تو وہ کہنے لگتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ تھے کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہر اس چیز کو جو لوگوں کے سینوں میں (پنہاں) ہے اور ضرور دیکھ لے گا اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور ضرور دیکھ لے گا منافقوں کو''۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ یہ آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی جو کہتے تھے: ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ فتنہ سے مراد اذیت ہے۔ كَعَذَابِ اللّٰهِ جس طرح آخرت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے تو وہ اس پر ایمان لانے سے مرتد ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس سے یوں جزع فزع کرتا ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے جزع فزع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اذیت پر صبر نہیں کرتا۔

وَ لَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اگر تیرے رب کی جانب سے مومنوں کو مدد پہنچے گی تو یہ مرتد کہیں گے: ہم تمہارے ساتھ ہیں جب کہ وہ جھوٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نسبت ان کے سینے میں جو کچھ ہے اس کو خوب جانتا ہے۔ مجاہد نے کہا: ایسے لوگوں کے بارے میں آیت نازل ہوئی جو اپنی زبانوں سے ایمان رکھتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں کوئی آزمائش یا ان کی ذاتوں میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں (1)۔ ضحاک نے کہا: یہ آیت مکہ مکرمہ میں موجود منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ ایمان لاتے اور جب انہیں اذیت دی جاتی تو شرک کی طرف لوٹ جاتے۔ عکرمہ نے کہا: کچھ لوگ تھے جو اسلام لے آئے تھے مشرکوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ بدر کی طرف نکلیں تو ان میں سے بعض قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ (النحل: 28) تو مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے مکہ مکرمہ میں موجود مسلمانوں کی طرف خط لکھا وہ نکلے تو پیچھے سے مشرکوں نے انہیں آلیا تو بعض آزمائش میں مبتلا ہو گئے تو یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت عیاش بن ابی ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی وہ مسلمان ہوا، ہجرت کی پھر اسے اذیت دی گئی اور اسے مارا گیا تو وہ مرتد ہو گیا۔ اسے ابو جہل اور حرث نے تکلیفیں دیں یہ دونوں ماں کی جانب سے اس کے بھائی تھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پھر وہ بعد میں طویل عرصہ تک زندہ رہا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ قتادہ نے کہا: یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے مکہ مکرمہ کی طرف واپس کیا (3)۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 154　2۔ ایضاً، جلد 20، صفحہ 155　3۔ ایضاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ٝ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور کہا کافروں نے ایمان والوں سے: تم چلو ہماری راہ پر اور ہم اٹھالیں گے تمہارے گناہوں (کے بوجھ) کو اور وہ نہیں اٹھا سکتے ان کے گناہوں سے کچھ بھی وہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ، اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ اور ان سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن ان (جھوٹوں) کے متعلق جو وہ گھڑا کرتے تھے''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا، سَبِيْلَنَا سے مراد ہمارا دین ہے۔ وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ امر کی وجہ سے فعل مضارع کو جزم دی گئی۔ فراء اور زجاج نے کہا: یہ شرط و جزا کی تاویل میں امر ہے۔ مراد اگر تم ہمارے دین کی اتباع کرو تو ہم تمہاری خطاؤں کو اٹھالیں گے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فقلتُ ادعِی وأدعُ فإنّ أندَی لِصوتٍ أن یُنَادِیَ داعِیانِ(1)

میں نے کہا: اگر تو بلائے تو میں بھی بلاؤں گا بے شک زیادہ اونچی آواز اس وقت ہوتی ہے جب دو بلانے والے دعوت دیں۔ شعر میں ادعی وادع شرط و جزا کی صورت میں ہیں ان دعوتِ دعوتُ۔

مہدوی نے کہا: اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کا اس کے بعد وقوع، معنی پر حمل کرنے کی وجہ سے ہے، کیونکہ معنی ہے اگر تم ہمارے دین کی اتباع کرو تو ہم تمہاری خطاؤں کو اٹھائیں گے۔ جب صیغہ امر معنی میں خبر کی طرف راجع ہوتا ہے تو اس پر تکذیب واقع ہوتی ہے جس طرح خبر پر واقع ہوتی ہے۔ مجاہد نے کہا: قریش میں سے مشرکوں نے کہا: ہمیں اور تمہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اگر تم پر کوئی بوجھ ہوا تو وہ ہم پر ہوگیا، یعنی جو تم پر لازم ہوگا وہ ہم پر لازم ہوگا۔ یہاں حمل حمالہ کے معنی میں ہے یعنی ذمہ داری اٹھانے کے معنی میں ہے یہ پشت پر اٹھانے کے معنی میں نہیں ہے۔ روایت کی گئی ہے: یہ قول کرنے والا ولید بن مغیرہ ہے۔

وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ان کی حسنات سے فارغ ہونے کے بعد اس کے گناہ ان کے ذمہ کر دیئے جائیں گے جن پر انہوں نے ظلم کیا تھا اس کا معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ سورۂ آل عمران میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی نے کہا: قیامت کے روز ایک آدمی لایا جائے گا جب کہ اس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اس سے لگا تار قصاص لیا جاتا رہے گا یہاں تک کہ اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی پھر اس سے مطالبہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میرے بندے سے قصاص (بدلہ) لو۔ فرشتے عرض کریں گے: اس کی تو نیکیاں باقی نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: مظلوم کی برائیاں اس سے لے لو اور اس کے ذمہ کر دو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ کی تلاوت کی۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 156

قتادہ نے کہا: جس نے گمراہی کی طرف دعوت دی اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا بوجھ بھی اس پر ہو گا، ان کے بوجھوں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل: 25) اس کی مثل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من سنّ فی الاسلام سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها بعده من غير أن ينقص من اوزارهم شئ، (1) جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ شروع کیا تو اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور اس کا بھی بوجھ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا جب کہ ان کے بوجھوں میں سے کوئی کمی نہ کی جائے گی؛ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے راویوں سے روایت مروی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس آدمی نے ہدایت کی طرف دعوت دی اس کی پیروی کی گئی اور اس پر عمل کیا گیا تو اس کے لیے ان کے اجروں کی مثل اجر ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی، ان کے اجروں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ جس داعی نے گمراہی کی طرف دعوت دی اس کی پیروی کی گئی اور اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو اس پر ان کے بوجھوں کی مثل بوجھ ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی ان کے بوجھوں میں سے کچھ بھی کمی نہ کی جائے گی''۔ پھر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تلاوت کی: وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ۔

میں کہتا ہوں: یہ مرسل ہے، یہ ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا معنی ہے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نقل کیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کا متن یہ ہے: أيما داع دعا إلى ضلالة فاتبع فإن له مثل اوزار من اتبعه ولا ينقص من اوزارهم شيئا وأيما داع دعا إلى هدى فاتبع فإن له مثل أجور من اتبعه ولا ينقص من أجورهن شيئا ابن ماجہ نے اسے سنن میں نقل کیا ہے۔ جو بھی داعی گمراہی کی طرف دعوت دے تو اس کی اتباع کی جائے تو اس کے لیے ان کے بوجھوں کی مثل بوجھ ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی اور ان کے بوجھوں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور جو بھی دعوت دینے والا ہدایت کی طرف دعوت دے تو اس کی اتباع کی جائے تو اس کے لیے ان کے اجروں کی مثل اجر ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع کی اور ان کے اجروں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

اس باب میں حضرت ابو جحیفہ اور حضرت جریر سے مروی حدیث بھی ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ظالم کے مددگار ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اس کے بدعتی ہیں جب ان بدعتیوں کی اتباع کی جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نئے کام کرنے والے جب ان کے بعد ان پر عمل کیا جائے۔ معنی قریب قریب ہے حدیث سب کو جامع ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

1۔ صحیح مسلم، باب الحث علی الصدقۃ، جلد 1، صفحہ 327

2۔ ابن ماجہ، باب من سن سنۃ حسنۃ الخ، حدیث نمبر 202، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو وہ ٹھہرے رہے ان میں پچاس کم ہزار سال، آخر کار آ لیا انہیں طوفان نے اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ پس ہم نے نجات دے دی نوح کو اور کشتی والوں کو اور ہم نے بنا دیا اس کشتی کو ایک نشانی سارے جہان والوں کے لیے''۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل بھی انبیاء کو کفار کی وجہ سے آزمایا گیا تو انہوں نے صبر کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ وہ پہلے رسول تھے جن کو زمین کی طرف مبعوث کیا گیا۔ سورۂ ہود میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے کہ زمین کفر سے بھر چکی تھی۔ کسی نبی نے اپنی قوم سے ایسی تکالیف نہ اٹھائیں جیسی تکالیف حضرت نوح علیہ السلام نے اٹھائیں، جس طرح حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے سورۂ ہود میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قتادہ نے حضرت انس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''سب سے پہلے جو نبی بھیجا گیا وہ حضرت نوح علیہ السلام تھے'' (1)۔ قتادہ نے کہا: انہیں جزیرہ سے مبعوث کیا گیا۔ ان کی عمر کتنی تھی اس میں اختلاف ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی عمر وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کی ہے۔ قتادہ نے کہا: انہیں دعوت دینے سے قبل حضرت نوح علیہ السلام تین سو سال تک رہے۔ اور تین سو سال تک دعوت دی اور طوفان کے بعد تین سو پچاس سال تک رہے (3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں مبعوث کیا گیا آپ اپنی قوم کے درمیان نو سو پچاس سال تک رہے اور لوگوں کے غرق ہونے کے بعد ساٹھ سال تک رہے، یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور لوگ عام ہو گئے (4)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: آپ کو جب مبعوث کیا گیا تو آپ کی عمر اڑھائی سو سال تھی اور آپ اپنی قوم میں نو سو پچاس سال تک رہے اور طوفان کے بعد دو سو سال تک رہے۔ وہب نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار چار سو سال تھی۔ کعب احبار نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار بیس سال تھی (5)۔ عون بن ابی شداد نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا جب کہ آپ کی عمر تین سو پچاس سال تھی۔ آپ اپنی قوم میں نو سو پچاس سال تک رہے اور طوفان کے بعد تین سو پچاس سال تک رہے آپ کی عمر ایک ہزار، چھ سو پچاس سال تھی (6)؛ حضرت حسن بصری سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: جب ملک الموت حضرت نوح علیہ السلام کی روح قبض کرنے کے لیے آیا۔ پوچھا: اے نوح! تم دنیا میں کتنے عرصہ رہے؟ فرمایا: مبعوث ہونے سے پہلے تین سو سال ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں اور طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال۔ ملک الموت نے کہا: تو نے دنیا کو کیسے پایا؟ حضرت نوح نے کہا: اس گھر کی طرح جس کے دو دروازے ہیں ایک میں سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل گیا۔

حضرت انس سے حدیث مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 108 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 278 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

کی قوم کی طرف مبعوث کیا جب مبعوث کیا تو عمر اڑھائی سو سال تھی آپ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک رہے اور طوفان کے بعد اڑھائی سو سال تک رہے (1)۔ جب ملک الموت ان کے پاس آیا، تو پوچھا: اے نوح! اے انبیاء میں سب سے بڑے! اے طویل عمر والے! اے وہ جس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں! تو نے دنیا کو کیسے پایا؟ آپ نے فرمایا: اس آدمی کی طرح جس نے ایک گھر بنایا جس کے دو دروازے تھے وہ ایک دروازے سے داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے ایک میں داخل ہوا تھوڑا سا بیٹھا پھر دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ ابن وردی نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے سرکنڈے کا ایک گھر بنایا، آپ سے عرض کی گئی: کاش آپ اس کے علاوہ بھی گھر بنا لیتے۔ فرمایا: یہ اس کے لیے کثیر ہے جس نے مرنا ہے۔ اور مہاجر نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک بالوں سے بنے ایک خیمہ (گھر) میں رہے۔ ان سے عرض کی گئی: اے اللہ کے نبی! کوئی گھر ہی بنا لیجئے۔ فرمایا: میں آج یا کل مر جاؤں گا۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام پر پانچ سو سال گزر گئے آپ عورتوں کے قریب نہ گئے۔ یہ محض موت کے ڈر سے ہوا۔ مقاتل اور جویبر نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام جب بوڑھے ہو گئے آپ کی ہڈیاں نرم ہو گئیں۔ عرض کیا: اے میرے رب! میں کب تک کدو کاوش کرتا رہوں گا؟ فرمایا: اے آدم! یہاں تک کہ تیرا ختنہ کیا ہوا بچہ پیدا ہو۔ تو دس بطنوں (ایک دفعہ جب عورت کو حمل ہو تو اسے بطن کہتے ہیں) کے بعد نوح (2) کی پیدائش ہوئی اس وقت ان کی عمر نو سو چالیس سال تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی عمر نو سو ساٹھ سال تھی؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا نسب یوں ہے نوح بن لامک متوشلخ بن ادریس وہ اخنوخ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم ہیں (3)۔ حضرت نوح علیہ السلام کا نام سکن تھا ان کا نام سکن اس لیے رکھا گیا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد لوگ آپ کی بارگاہ سے سکون حاصل کرتے تھے۔ وہ لوگوں کے جد اعلیٰ تھے ان کی اولاد میں سام، حام اور یافث تھے۔ سام کی اولاد میں عرب، فارسی اور رومی ہیں ان سب میں خیر ہے۔ حام کی اولاد میں قبطی، حبشی اور بربر ہیں۔ یافث کی اولاد میں ترک، صقالبہ اور یاجوج ماجوج ہیں۔ ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سام کی اولاد میں سفید اور گندم گو ہیں، حام کی اولاد میں سیاہ اور تھوڑے سفید ہیں، یافث کی اولاد میں ترک اور صقالبہ زرد اور سرخ ہیں۔ ان کا چوتھا بیٹا تھا جو کنعان تھا جو غرق ہو گیا تھا۔ عرب اسے یام کہتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو نوح کہتے، کیونکہ آپ نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم پر نوحہ کیا، آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے رہے۔ جب انہوں نے کفر کیا تو حضرت نوح علیہ السلام ان پر روئے اور ان پر نوحہ کیا۔ قشیری ابو القاسم عبد الکریم نے اپنی کتاب التحبیر میں ذکر کیا: یہ روایت کی جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یشکر تھا لیکن حضرت نوح علیہ السلام اپنی خطا پر بہت زیادہ روئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی: اے نوح! تو کتنے عرصہ تک نوحہ کرتا رہے گا؟ اس وجہ سے آپ کا نام نوح پڑ گیا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 256
2۔ معروف قول یہی ہے۔
3۔ یہ قول محل نظر ہے کیونکہ بعد میں وضاحت آرہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام یملک بن متوشلخ کے بیٹے تھے۔

آپ کی خطا کون سی تھی؟ فرمایا: حضرت نوح علیہ السلام ایک کتے کے پاس سے گزرے آپ نے اپنے دل میں کہا: یہ کتنا قبیح ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی اس سے بہتر تو بنا دے۔

یزید رقاشی نے کہا: آپ کا نام نوح اس وجہ سے ہوا کیونکہ آپ نے اپنی ذات پر طویل عرصہ تک نوحہ کیا۔ اگر کہا جائے یہ کیوں فرمایا: اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا اسے تسعمائة و خمسین عامًا نہیں فرمایا۔ اس میں دو جواب ہیں (۱) مقصود عدد کی کثرت کو بیان کرنا ہے۔ الف کا ذکر لفظ اور عدد میں کثیر ہے (۲) یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ کو ایک ہزار سال عمر عطا کی گئی تو آپ نے پچاس سال اپنے ایک بیٹے کو عطا کر دیئے۔ جب وفات کا وقت آیا تو ہزار پورا کرنے کی طرف راجع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ذکر کیا کہ کمی اس (نوح علیہ السلام) کی جہت سے ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا: طوفان سے مراد بارش ہے(1)۔ ضحاک نے کہا: غرق ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد موت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے (2)، اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

أفناهم طوفانُ موتٍ جارف(3)

تباہی مچانے والی موت کے طوفان نے انہیں فنا کر دیا۔

نحاس نے کہا: یہ ہر اس شے کے لیے طوفان کا لفظ بولا جا سکتا ہے جو تمام کا احاطہ کر لے وہ بارش ہو، قتل ہو۔ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ جملہ حال بن رہا ہے۔ اَلْفَ سَنَةٍ ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا یہ مستثنیٰ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ سیبویہ کے نزدیک مفعول کے قائم مقام ہے مفعول کی طرح اس سے استغناء ہے، جہاں تک مبرد ابو العباس محمد بن یزید کا تعلق ہے اس کے نزدیک یہ مفعول محض ہے۔ گویا تو نے کہا: استثنیت زیدا۔

تنبیہ: حسان بن غالب بن نجیح ابو القاسم مصری مالک بن انس سے وہ زہری سے وہ ابن مسیب سے وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت جبریل امین میرے ساتھ حضرت عمر کی فضیلت میں مذاکرہ کیا کرتا تھا میں نے پوچھا: اے جبریل! حضرت عمر کی فضیلت کہاں تک پہنچی ہے؟ اس نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں آپ کے ساتھ اتنا عرصہ رہوں جتنا عرصہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں رہے ہیں آپ کے سامنے حضرت عمر کی فضیلت بیان نہیں کر سکتا''۔ اسے خطیب ابو بکر احمد بن ثابت بغدادی نے ذکر کیا۔ کہا: حسان بن غالب مالک سے روایت کرنے میں منفرد ہے، اس کی حیثیت ثابت نہیں۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ اصحاب السفینہ کا عطف ہاء ضمیر پر ہے۔ وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ، جَعَلْنٰهَا میں ہاء ضمیر سفینہ، عقوبة یا نجات کے لیے ہے اس بارے میں تین اقوال ہیں۔

وَ اِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 279 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ
اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَ مَا
عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾

''اور ابراہیم کو یاد کرو جب آپ نے فرمایا اپنی قوم کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس سے ڈرتے رہو، یہی بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو۔ تم تو پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی اور تم گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ، بے شک جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ مالک نہیں تمہارے رزق کے پس طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے رزق اور اس کی عبادت کیا کرو اور اس کا شکر ادا کیا کرو اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) جھٹلایا (اپنے نبیوں کو) ان امتوں نے بھی جو تم سے پہلے تھیں اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ (اللہ کا) حکم صاف طور پر پہنچا دے۔ کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کس طرح آغاز فرماتا ہے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا پھر وہ (کس طرح) اس کا اعادہ کرتا ہے، بلاشبہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے''۔

**وَاِبْرٰهِيْمَ** کسائی نے کہا: **اِبْرٰهِيْمَ** کا لفظ انجینا کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اس کا عطف ہاء ضمیر پر ہے۔ کسائی نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ اس کا عطف نوح پر ہے معنی ہے ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ ایک تیسرا قول ہے کہ یہ اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہو۔ **اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ** اللہ تعالیٰ کی ذات کو عبادت میں خاص کرو۔ **وَاتَّقُوْهُ** اس کے عقاب اور اس کے عذاب سے ڈرو۔ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** بتوں کی عبادت سے یہ بہتر ہے **اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** اگر تم جانتے ہو۔

**اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا**، اوثان کا معنی بت ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: صنم اسے کہتے ہیں جو سونے، چاندی اور تانبے کا بنایا جاتا ہے اور وثن جو گچ یا پتھر سے بنایا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا: وثن سے مراد بت ہے اس کی جمع وُثن اور اوثان آتی ہے جس طرح اُسد اور اوساد۔ **وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا** حضرت حسن بصری نے کہا: **تَخْلُقُوْنَ** کا معنی ہے تم تراشتے ہو (1)۔ معنی ہے تم بتوں کی عبادت کرتے ہو جب کہ تم خود ان کو بناتے ہو۔

مجاہد نے کہا: الافک سے مراد جھوٹ ہے معنی ہے تم بتوں کی عبادت کرتے ہو جب کہ تم جھوٹ گھڑتے ہو (2)۔ ابو عبدالرحمٰن نے **تَخَلَّقُوْنَ** قراءت کی ہے اسے تُخلقون پڑھا گیا ہے یہ خلق سے کثرت کے معنی میں ہے اور تخلقون یہ تخلق سے مشتق ہے۔ جو تکذب اور تخرص کے معنی میں ہے۔ اسے افکا بھی پڑھا گیا ہے اس میں دو وجوہ ہیں: یہ مصدر ہو

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 257 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 311

جس طرح کذب اور لعب ہے افك اس سے مخفف ہے جس طرح کذب اور لعب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ فعل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے یعنی خلقا إفکا یعنی ذا افك و باطل۔ أوثانا یہ تعبدون کی وجہ سے منصوب ہے اور ما کافہ ہے۔ قرآن کے علاوہ میں اوثان کو رفع دینا بھی جائز ہے کہ ما ان کا اسم ہے تعبدون اس کا صلہ ہے اسم کے لمبا ہونے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا۔ اور اوثان کو ان کی خبر بنا دیا۔ وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا یہ فعل کی وجہ منصوب ہے کسی اور کی وجہ سے منصوب نہیں۔ اس طرح لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ یعنی تم اپنے رزق کے لیے اپنی رغبتوں کو الله تعالیٰ کی طرف پھیر دو صرف اسی سے سوال کرو کسی غیر سے سوال نہ کرو۔ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے، یعنی جھٹلانا کفار کی عادت ہے رسولوں پر صرف تبلیغ لازم ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے یہ خبر اور اس کی توبیخ کے لیے ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ابو عبید نے کہا: امتوں کے ذکر کے لیے یاء کے ساتھ پڑھا گویا فرمایا: اولم یر الامم کیف۔ ابو بکر، اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور کسائی نے پڑھا تروا اس وقت یہ خطاب کا صیغہ ہوگا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ تُكَذِّبُوْا یہ کہا گیا ہے: وَاِنْ تُكَذِّبُوْا قریش کو خطاب ہے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نہیں۔ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ہا ضمیر سے مراد خلق اور بعث ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا الله تعالیٰ پھلوں کو کیسے پیدا فرماتا ہے وہ زندہ ہو جاتے ہیں پھر فنا ہو جاتے ہیں پھر الله تعالیٰ انہیں دوبارہ پیدا فرماتا ہے یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی طرح انسان کی تخلیق کا آغاز فرماتا ہے پھر اس سے بچے کی پیدائش کے بعد ہلاک کر دیتا ہے اس کے بچے سے بچہ جنم لیتا ہے۔ اس طرح باقی حیوانات بھی ہیں جب تم نے ابداء اور ایجاد پر اس کی قدرت کو دیکھ لیا تو وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ کیونکہ جب وہ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرماتا ہے: کن فیکون۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ
الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ
وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۡ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآىِٕهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ
يَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

"فرمایئے: سیر و سیاحت کرو زمین میں اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی پھر اللہ تعالیٰ (اسی طرح) پیدا فرمائے گا دوسری بار، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے اور نہیں ہو تم بے بس کرنے والے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں (بھاگ کر) اور نہ آسمان میں (پناہ لے کر) اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی ملاقات کا وہ لوگ مایوس ہو گئے میری رحمت سے، اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے آپ کی قوم سے کوئی جواب نہ بن آیا بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اسے قتل کر ڈالو یا اسے جلا دو سو بچا لیا اسے اللہ تعالیٰ نے آگ سے بے شک اس واقعہ میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اور ابراہیم نے کہا کہ تم نے بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو باہمی محبت (و پیار) کا ذریعہ اس دنیوی زندگی میں پھر قیامت کے دن تم انکار کرو گے ایک دوسرے کا اور پھٹکار بھیجو گے ایک دوسرے پر اور تمہارا ٹھکانہ آتش (جہنم) ہو گا اور نہیں ہو گا تمہارا کوئی مددگار"۔

**قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ** اے محمد! تم انہیں کہو زمین میں گھومو، پھرو۔ **فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ** دیکھو تو اللہ تعالیٰ نے کیسے مخلوق کو پیدا کیا جب کہ تعداد میں وہ کثیر ہیں، ہیئتیں مختلف ہیں، زبان، رنگ اور طبیعتیں مختلف ہیں تم سابقہ قوموں کے مسکن، گھر اور آثار دیکھو اللہ تعالیٰ نے کیسے انہیں ہلاک کیا تا کہ تم اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کو پہچانو۔

**ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ** ابو عمرو اور ابن کثیر نے النشاۃ شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا اور دونوں لغتیں ہیں جس طرح رأفة اور رآفة۔ جوہری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کی پیدائش کو پیدا کیا، اسم نشاۃ اور نشاءۃ مد کے ساتھ ہے، یہ ابو عمرو بن علاء سے مروی ہے۔

**اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۚ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ** اپنے عدل کے ساتھ جس کو عذاب دینا چاہتا ہے۔ **وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ** اور اپنے فضل کے ساتھ جس پر رحم کرنا چاہتا ہے۔ **وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ** اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔ **وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ** فراء نے کہا: معنی ہے یعنی نہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں۔ عربی لغت میں یہ امر مبہم ہے کیونکہ دوسرے حصے میں ضمیر ظاہر نہیں؛ یہ حدیث حضرت حسان کے قول کی طرح ہے:

فمن يَهجو رسول اللهِ منكم ويَمدحُهُ و يَنصرُه سَواءُ(1)

تم میں سے جو رسول اللہ کی ہجو کرے اور جو آپ کی مدح اور مدد کرے وہ برابر ہیں۔

یہاں اس سے ومن یمدحہ وینصرہ سواء کا ارادہ کیا ہے، من کو مضمر کیا؛ یہ عبد الرحمن بن زید کا قول ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ** ﴿﴾ (الصافات) یہاں بھی اصل میں من لہ تھا، من مضمر ہے۔ معنی ہے اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 312

تعالیٰ کو اہل زمین زمین میں اور اہل سماء آسمان میں عاجز نہیں کر سکتے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں۔ قطرب نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ولا فی السماء لو کنتم فیھا یعنی نہ آسمان میں اگر تم آسمان میں ہوتے، جس طرح تو کہتا ہے: لا یفوتنی فلان بالبصرۃ ولا ھاھنا معنی ہے اگر وہ بصرہ چلا جائے تب بھی میری گرفت سے باہر نہیں ہو سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نہ زمین میں بھاگ جانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ وہ آسمان میں بھاگ جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مبرد نے کہا: معنی ہے اور نہ وہ جو آسمان میں ہیں اس بنا پر کہ من موصولہ نہیں ہے، بلکہ نکرہ ہے۔ فِي السَّمَآءِ اس کی صفت ہے۔ صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا۔ علی بن سلیمان نے اس کا رد کیا اور کہا: یہ جائز نہیں اور کہا: من جب نکرہ ہو تو اس کی صفت کا لگانا ضروری ہے تو اس کی صفت صلہ کی طرح ہوگی۔ موصول کا حذف اور صلہ کا ترک جائز نہیں۔ معنی ہے لوگوں کو اسی چیز کے ساتھ خطاب کیا گیا جس کی وہ عقل رکھتے تھے۔ معنی ہے اگر تم آسمان میں ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو عاجز نہ کر سکتے، جس طرح فرمایا: وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء: 78)

وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ، نصیرٌ بھی جائز ہے کیونکہ محل رفع کا ہے اور من زائدہ ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖٓ آیات سے مراد قرآن ہے یا ادلہ اور اعلام میں سے جن کو قائم کیا گیا۔ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ رحمت سے مراد جنت ہے، اس کو ان کی طرف منسوب کیا گیا معنی ہے ان کو مایوس کر دیا گیا۔ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی جانب سے جملہ معترضہ کے طور پر ہیں تاکہ اہل مکہ کو یاد دلایا جائے اور انہیں نصیحت کی جائے، پھر خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کی طرف لوٹتا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ان کا جواب یہ تھا اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ پھر انہوں نے آپ کو جلانے پر اتفاق کیا۔ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ یعنی آگ کی اذیت سے نجات دی۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ یعنی اس بڑی آگ سے آپ کو نجات دینے میں، یہاں تک کہ آگ میں جب آپ کو پھینکا گیا تو اس نے آپ کو نہ جلایا۔ لَاٰيٰتٍ عام قراءت جواب کی باء کی نصب کے ساتھ ہے کیونکہ یہ کان کی خبر ہے۔ اَنْ قَالُوا یہ محل رفع میں ہے یہ کان کا اسم ہے۔ سالم افطس اور عمرو بن دینار نے جواب کا لفظ رفع کے ساتھ پڑھا ہے (1) کہ یہ کان کا اسم ہے اور ان خبر کے محل میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ وقال یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حفص اور حمزہ نے مودۃ بینکم پڑھا ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے مودۃُ بینکم قراءت کی ہے۔ اعمش نے ابو بکر سے وہ عاصم، ابن وثاب اور اعمش سے مودۃٌ بینکم قراءت کی ہے باقی قراء نے مودۃً بینکم قراءت کی ہے۔

جہاں تک ابن کثیر کی قراءت ہے تو اس میں تین توجیہیں ہیں، زجاج نے ان میں سے دو کا ذکر کیا ہے۔

مودۃ کا لفظ ان کی خبر کی وجہ سے مرفوع ہے اور ما، الذی کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہے: ان الذی اتخذتموہ من دون اللہ أوثانا مودۃ بینکم دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ مبتدا مضمر ہو کہ تقدیر کلام یہ ہوگی: ھی مودۃ او تلک مودۃ بینکم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 312

معنی ہے تمہارے الہ یا تمہاری جماعت تمہارے درمیان محبت ہے۔ ابن انباری نے کہا: اوثانا یہ وقف اس کے لیے اچھا ہے جس نے مودۃ کو رفع دیا اس تقدیر کی بنا پر ذلك مودة بينكم جس نے مودۃ کو اس بنا پر رفع دیا کہ یہ ان کی خبر ہے وہ اس پر وقف نہیں کرے گا۔

تیسری توجیہ یہ ہے جس کو اس نے ذکر نہیں کیا کہ مودۃ کا لفظ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فی الحیاۃ الدنیا اس کی خبر ہو۔ جہاں تک مودۃ کے لفظ کو بینکم کی طرف مضاف کرنے کا تعلق ہے تو بینکم کو اسم بنایا جائے گا مگر یہ ظرف نہ ہو گا۔ نحوی کہتے ہیں: اسے مجاز کی بنا پر مفعول بہ بنایا ہے۔ سیبویہ نے حکایت بیان کی ہے: یا سارق الليلة اهل الدار اس کی طرف مضاف کرنا جائز نہیں اس حال میں کہ یہ ظرف ہے وہ ایسی علت ہے جس کے ذکر کا یہ محل نہیں جس نے مودۃ کو رفع دیا اور اسے تنوین دی تو یہ اس معنی کی بنا پر ہے جو ذکر کیا گیا۔ بینکم ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ جس نے مودۃ کو رفع دیا اور اسے تنوین نہ دی اس نے اس کو مفعول بنایا کیونکہ اتخذ کا فعل اس پر واقع ہو رہا ہے۔ انما ایک حرف ہے اس نے اسے الذی کے معنی میں نہیں بنایا۔ مودۃ کو اس وجہ سے نصب دینا بھی جائز ہے کہ یہ مفعول لاجلہ ہے جس طرح تو کہتا ہے: جئتك ابتغاء الخير، وقصدت فلانا مودة له، بينم کو مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ جس نے مودۃ کو تنوین دی اور اسے نصب دی تو یہ اس تاویل کی بنا پر ہے جس کو ذکر کیا گیا بینکم منصوب ہے، اضافت کے بغیر ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے مودۃً بینکم اور مودة بينكم پڑھا اس نے اوثانا پر وقف نہیں کیا۔ اس نے الحیاۃ الدنیا پر وقف کیا آیت کا معنی ہے تم نے بتوں کو یوں بنا دیا ہے کہ اس پر باہم محبت کرتے ہو اور دنیاوی زندگی میں ان کی عبادت پر باہم محبت کرتے ہو۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا بت اپنے عبادت گزاروں اور سردار اپنے تابعداروں سے براءت کا اظہار کر دیں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۞ (الزخرف) وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ یہ بتوں کے عبادت گزاروں کو خطاب ہے وہ ان میں سے سردار ہوں یا پیروکار ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں بت داخل ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98)

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِىْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞

"تو ایمان لائے ان پر لوط۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف بے شک وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔ اور ہم نے عطا فرمایا آپ کو اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا پوتا) اور ہم نے رکھ دی ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جاں نثاری) کا اجر اس دنیا میں اور بلاشبہ وہ آخرت میں (صالحین کے زمرہ) میں ہوں گے"۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ حضرت لوط علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی جب آگ کو

آپ پر ٹھنڈی اور سلامتی والا پایا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے جب کہ حضرت لوط، حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بھانجے تھے حضرت سارہ بھی آپ پر ایمان لائیں جب کہ وہ آپ کی چچا زاد تھیں۔

وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ نخعی اور قتادہ نے کہا، جس نے کہا: اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (1)۔ قتادہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوثا سے ہجرت کی یہ سواد کوفہ کا ایک دیہات تھا پہلے حران کی طرف ہجرت کی پھر شام کی طرف ہجرت کی آپ کے ساتھ آپ کے بھتیجے حضرت لوط بن ہاران بن تارخ تھے اور آپ کی بیوی حضرت سارہ تھیں (2)۔ کلبی نے کہا: حران کے علاقہ سے فلسطین کے علاقہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں کہ آپ نے کفر کے علاقہ سے ہجرت کی۔ مقاتل نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، جب کہ آپ کی عمر پچھتر سال تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے کہا اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ وہ حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ بیہقی نے قتادہ سے ذکر کیا: جس نے سب سے پہلے اپنے اہل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کی وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ قتادہ نے کہا: میں نے حضرت نضر بن انس رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوحمزہ یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف نکلے جب کہ ان کے ساتھ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں ان کی خبر دیر سے پہنچی قریش کی ایک عورت آئی اس نے کہا اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے آپ کا داماد دیکھا جب کہ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھی۔ پوچھا: ''ان دونوں کو کس حال میں دیکھا''۔ اس نے عرض کی: میں نے انہیں دیکھا اس نے اپنی بیوی کو ایک گدھے پر بٹھا رکھا تھا جو اس دابہ (ایسا جانور جو آہستہ چلتا ہے) سے تعلق رکھتا تھا جب کہ وہ اس جانور کو ہانک رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں کا اللہ ساتھی ہے حضرت عثمان، حضرت لوط علیہ السلام کے بعد پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے اہل کے ساتھ ہجرت کی''۔ بیہقی نے کہا: یہ پہلی ہجرت میں ہوا، جہاں تک حبشہ کی طرف دوسری ہجرت کا تعلق تھا (3)۔ واقدی نے یہ گمان کیا ہے: یہ بعثت کے پانچویں سال ہوئی۔ اِلٰی رَبِّیْ میرے رب کی رضا کی طرف اور جس کی طرف اس نے مجھے حکم دیا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۞ ہجرت کے متعلق گفتگو سورۃ النساء اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ان پر احسان کیا۔ حضرت اسحاق بچے اور حضرت یعقوب کو پوتے کی صورت میں عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کے بعد حضرت اسحاق عطا فرمایا اور حضرت اسحاق کے بعد حضرت یعقوب عطا فرمایا۔ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں کیا مگر آپ کی نسل سے ہی مبعوث کیا۔ کتاب کو واحد ذکر کیا کیونکہ مصدر کا ارادہ کیا جس طرح نبوت ہے۔ مراد تورات، انجیل اور فرقان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ سب پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نوازشات ہوں۔

وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا دنیا میں اجر کی صورت یہ ہے کہ تمام ادیان والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر ایمان

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 314　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 281

3۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، الهجرة الاولیٰ الی الحبشہ، جلد 2، صفحہ 66

رکھتے ہیں؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ سفیان نے حمید بن قیس سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے ایک انسان کو حکم دیا کہ وہ عکرمہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بارے میں پوچھے وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا عکرمہ نے جواب دیا: تمام ادیان والے دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں: وہ ہم سے ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس نے سچ بولا۔ قتادہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَ اٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (النحل: 122) مراد عاقبت، عمل صالح اور اچھی تعریف؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام ادیان والے اس کی پیروی کرتے ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا اکثر انبیاء ان کی اولاد میں سے ہیں وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ، فِی الْاٰخِرَةِ صلہ میں داخل نہیں یہ وضاحت ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ دین حق پر صبر کرنے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا پر برانگیختہ کیا جائے۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ٘ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ
الْعٰلَمِیْنَ ۝۲۸ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ
الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِیْنَ ۝۲۹ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۳۰ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ
اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا
ظٰلِمِیْنَ ۝۳۱ قَالَ اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا ٙ لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗۤ
اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ۝۳۲ وَ لَمَّاۤ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ
وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ لَا تَحْزَنْ ٙ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ۝۳۳ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝۳۴ وَ لَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۳۵

"اور (ہم نے) لوط کو رسول بنا کر بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو کہ نہیں پہل کی تم سے اس (بے حیائی) کی طرف کسی نے دنیا بھر میں۔ کیا تم بدفعلی کرتے ہو مردوں کے ساتھ اور ڈاکے ڈالتے ہو عام راستوں پر اور اپنی کھلی مجلس میں گناہ کرتے ہو تو نہیں تھا کوئی جواب آپ کی قوم کے پاس بجز اس کے کہ انہوں نے کہا: اے لوط! لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم (اپنے دعویٰ) میں سچے ہو۔ آپ نے عرض کی: میرے مالک! میری مدد فرما ان فسادی لوگوں کے مقابلہ میں۔ اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے انہوں نے بتایا کہ ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس گاؤں کے باشندوں کو، بے

1۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 167

شک یہاں کے رہنے والے بڑے ظالم تھے۔ آپ نے کہا: اس میں تو لوط بھی رہتا ہے۔ فرشتوں نے عرض کی: ہم خوب جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں ہم ضرور بچالیں گے اسے اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی عورت کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں سے ہے۔ اور جب آئے ہمارے فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس تو بڑے غمزدہ ہوئے ان کی آمد سے اور دل تنگ ہوئے اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا: نہ خوفزدہ ہو اور نہ رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تجھے اور تیرے کنبہ کو سوائے تمہاری بیوی کے وہ پیچھے رہ جانوں والوں میں ہے۔ بے شک ہم اتارنے والے ہیں اس بستی کے باشندوں پر عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور بے شک ہم نے باقی رہنے دیئے اس بستی کے کچھ واضح آثار ان لوگوں (کی عبرت) کے لیے جو عقل مند ہیں''۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ کسائی نے کہا: معنی ہے ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کو نجات دی یا ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا۔ کہا: یہ توجیہ میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ معنی ہو لوط کو یاد کرو کیونکہ انہوں نے اپنی قوم کو شرمندہ کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے کہا: اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ، ائنکم اس میں قراءت اور اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔

وَتَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ڈاکو تھے؛ یہ ابن زید نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے راستوں سے لوگوں کو اٹھا لیتے تھے؛ ابن شجرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عورتوں سے مردوں کی طرف عدول کرنے سے نسل کو قطع کرنا ہے؛ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے وہ مردوں کی وجہ سے عورتوں سے مستغنی ہو گئے۔

میں کہتا ہوں: شاید یہ سب بیماریاں ان میں موجود تھیں وہ ڈاکہ مارا کرتے تھے تاکہ اموال کو حاصل کریں اور بدفعلی کریں اور جس وجہ سے وہ عورتوں سے مستغنی ہو جاتے۔ وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ، النادی سے مراد مجلس ہے وہ منکر جو کیا کرتے تھے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: وہ عورتوں کو کنکریاں مارا کرتے تھے، وہ اجنبی اور باہر سے آنے والے کو حقیر سمجھتے۔ حضرت ام ہانی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے، حضرت ام ہانی نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا: ''جو ان کے پاس سے گزرتا وہ اس کو کنکریاں مارا کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا کرتے، یہی وہ منکر عمل تھا جو وہ کیا کرتے تھے (1)'' اسے ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے، نحاس، ثعلبی، مہدوی اور ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے؛ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت معاویہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اپنی مجالس میں بیٹھا کرتی اور ہر آدمی کے پاس ایک پیالہ ہوتا جس میں مارنے کے لیے کنکریاں ہوتیں جب کوئی ان کے پاس سے گزرتا تو وہ اس پر کنکری پھینکتے جس کی کنکری اس

1۔ جامع ترمذی، سورۂ عنکبوت، جلد 2، صفحہ 150۔ ایضاً، حدیث نمبر 3114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو لگتی تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہوتا''۔ یعنی وہ اس کو بدکاری کے لیے لے جاتا۔ تو یہی الله تعالیٰ کے فرمان سے مراد ہے: وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ۔ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس، قاسم بن ابی بزہ اور قاسم بن محمد نے کہا: وہ اپنی مجالس میں گوز کرتے تھے (1)۔ منصور نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: وہ اپنی مجالس میں مردوں سے خواہش پوری کیا کرتے تھے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے تھے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: ان کا یہ معمول تھا وہ کبوتروں سے کھیلتے، انگلیوں کو مہندی سے رنگتے، سیٹیاں بجاتے اور تمام امور میں حیاء کو پس پشت ڈالتے۔

ابن عطیہ نے کہا: یہ امور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بعض نافرمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان چیزوں سے رکنا واجب ہے۔ مکحول نے کہا: اس امت میں قوم لوط کے اخلاق میں سے دس باتیں پائی جاتی ہیں: مصطگی کو چبانا، انگلیوں کو مہندی سے رنگنا، تہبند کھول دینا، انگلیوں کے چٹخارے نکالنا، وہ پگڑی جو سر کے ارد گرد لپیٹی جاتی ہے، انگلیوں کا جال بنانا، بندوق جس کے ساتھ کسی چیز کو پھینکا جاتا ہے، سیٹی بجانا، کنکری مارنا، لواطت کا عمل کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں فاحشہ کے علاوہ بھی گناہ تھے (2) ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ باہم ظلم کرتے، ایک دوسرے کو گالیاں دیتے، مجالس میں گوز مارتے، کنکریاں مارتے، نرد اور شطرنج کھیلتے، رنگے ہوئے کپڑے پہنتے، وہ مرغوں کو لڑاتے، اپنی انگلیوں کو مہندی لگاتے، مرد عورتوں کا لباس پہنتے اور عورتیں مردوں کا لباس پہنتیں، وہ ہر گزرنے والے پر ٹیکس لگاتے، ان سب برائیوں کے باوجود وہ الله تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے یہ پہلے لوگ تھے جن سے مردوں سے بدفعلی اور عورتوں کے ساتھ ہم جنسی کا فعل صادر ہوا۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں ان قبائح سے روکا تو وہ آپ کو جھٹلانے اور جھگڑنے کی طرف لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا: ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ یہ نہیں ہوگا اور نہ وہ اس پر قادر ہے۔ انہوں نے یہ بات نہیں کی مگر وہ حضرت لوط علیہ السلام کے جھوٹا ہونے کے اعتقاد پر سخت تھے۔

فطرت میں یہ صحیح نہیں کہ معاند یہ کہے پھر حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے رب سے مدد طلب کریں اور الله تعالیٰ ان پر عذاب کے فرشتے بھیج دے۔ پہلے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دے رہے تھے کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کی ان کی قوم کے خلاف مدد کرنے کے لیے آئے ہیں، جس کی وضاحت سورۂ ہود وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ اعمش، یعقوب، حمزہ اور کسائی نے لننجینه واهله کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اسے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر، ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے اِنَّا مُنْجُوْكَ وَاَهْلَكَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔ باقی قراء نے اسے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ انجی اور نجی دونوں ایک لغت ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ابن عامر نے اسے اِنَّا مُنَزِّلُوْنَ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس کی قراءت ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

**وَ لَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ** قتادہ نے کہا: اس آیت سے مراد وہ پتھر ہے جو باقی رکھا گیا (4)؛ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس امت کی ایک جماعت کو اس کے ساتھ رجم کیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 282 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 315 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 173

نے کہا: یہ ان کے کھنڈر گھروں کے آثار ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد روئے زمین پر سیاہ پانی ہے۔ یہ سب باقی ہے اس میں کوئی تعارض نہیں۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

"اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور امید رکھو پیچھے آنے والے دن کی اور ملک میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ پھر انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو آلیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنے کے بل گرے پڑے تھے"۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا یعنی ہم نے مدین کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ سورۂ اعراف اور ہود میں ان کا ذکر اور ان کے فساد کا ذکر گزر چکا ہے۔ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ یونس نحوی نے کہا: اس آخرت سے ڈرو جس میں اعمال پر جزا ہے۔ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ یعنی کفر نہ کرو کیونکہ کفر ہر فساد کی جڑ ہے۔ عثو اور عثی۔ شدید ترین فساد ہے عَثِيَ يَعْثَى اور عَثَا يَعْثُو دونوں کا معنی ایک ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ یعنی یوم آخرت کی تصدیق کرو کیونکہ لوگ اس کا انکار کرتے تھے۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾

"اور (ہم نے برباد کیا) عاد اور ثمود کو اور واضح ہیں تمہارے لیے ان کے مکانات اور آراستہ کر دیا ان کے لیے شیطان نے ان کے (برے) عملوں کو اور روک لیا انہیں راہ (راست) سے حالانکہ وہ اچھے بھلے سمجھ دار تھے"۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ کسائی نے کہا: بعض نے کہا: یہ سورت کے آغاز کی طرف راجع ہے، یعنی ہم نے ان کو آزمایا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور ہم نے عاد اور ثمود کو آزمایا۔ انہوں نے کہا: مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ اس کا عطف فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پر ہو یعنی رجفہ نے عاد اور ثمود کو پکڑ لیا۔ زجاج نے یہ گمان کیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے واھلکنا عادا و ثمودا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے عاد کو یاد کرو جب ہم نے ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلایا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور قوم ثمود کی طرف ہم نے حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تو ہم نے صیحہ کے ساتھ انہیں ہلاک کر دیا، جس طرح ہم نے عاد کو بانجھ ہوا کے ساتھ ہلاک کیا۔ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ اے کفار کی جماعت! مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ حجر اور احقاف میں ان کی ہلاکت کے آثار ہیں۔ تَّبَيَّنَ کا فاعل

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 138

حذف ہے۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ شیطان نے ان کے خسیس اعمال کو مزین کیا تو انہوں نے ان اعمال کو بلند گمان کیا۔ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ یعنی حق کے راستہ سے انہیں روک لیا۔

وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ اس میں دو قول ہیں (۱) وہ گمراہی میں بڑی بصیرت رکھنے والے تھے؛ یہ مجاہد کا قول ہے (۲) وہ بصیرت والے تھے انہوں نے براہین کے ظاہر ہونے کی وجہ سے حق کو باطل سے پہچان لیا تھا۔ یہ قول زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ کہا جاتا ہے: فلان مستبصر جب وہ کسی شے کو حقیقت کے طور پر پہچان لے۔ فراء نے کہا: وہ دانش منداور صاحب بصیرت تھے ان کی بصیرتوں نے ان کو نفع نہ دیا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے کیا جو کیا جب کہ ان کے لیے یہ واضح ہو چکا تھا کہ ان کا انجام عذاب ہے۔

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ۫ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۞ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۞

''اور (ہم نے ہلاک کر دیا) قارون، فرعون اور ہامان کو اور بلاشبہ تشریف لائے ان کے پاس موسیٰ روشن دلیلوں کے ساتھ پھر بھی وہ غرور وتکبر کرتے رہے زمین میں اور وہ (ہم سے) آگے بڑھ جانے والے نہ تھے پس ہر (سرکش) کو ہم نے پکڑا اس کے گناہ کے باعث پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں سے بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا زمین میں اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا اور الله تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرے بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے تھے''۔

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ کسائی نے کہا: اگر تو چاہے تو یہ عاد پر محمول ہو۔ اس میں ہوا جو ہوا۔ اگر تو چاہے تو فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ پر محمول کرے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وصدهم قارون و فرعون و هامان۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے ان کو ہلاک کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس رسل آئے۔

فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ انہوں نے زمین میں حق اور الله تعالیٰ کی عبادت سے تکبر کیا۔ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ وہ ہماری گرفت سے بچ جانے والے نہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کفر کی طرف سبقت لے جانے والے نہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کفر کی طرف سبقت لے جانے والے نہ تھے بلکہ ان سے پہلے بے شمار لوگ کفر کی طرف سبقت لے جانے والے تھے تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ کسائی نے کہا: فكلا، اخذنا کی وجہ سے منصوب ہے یعنی ہم نے ہر کسی کو اس کے گناہ کی وجہ سے

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 138

پکڑ لیا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا مراد قوم لوط ہے۔ حاصب سے مراد ایسی ہوا ہے جو سنگریزے لاتی ہے حصباء سے مراد چھوٹے سنگریزے ہیں۔ یہ لفظ ہر عذاب میں استعمال ہوتا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ مراد قوم ثمود اور مدین ہے۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ، من سے مراد قارون ہے۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا، من سے مراد قوم نوح اور قوم فرعون ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ اللہ تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ ظلم کرے، کیونکہ اسی نے ان کو ڈرایا، انہیں مہلت دی، ان کی طرف رسولوں کو مبعوث کیا اور ان کے عذر کو ختم کر دیا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝41 اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝42 وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝43

''ان نادانوں کی مثال جنہوں نے بنا لیے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دوست، مکڑی کی سی ہے اس نے (جالے کا) گھر بنایا اور (تم سب جانتے ہو) کہ تمام گھروں سے کمزور ترین مکڑی کا گھر ہوا کرتا ہے کاش! وہ بھی اس (حقیقت) کو جانتے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو وہ پوجتے ہیں اس کو چھوڑ کر اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے۔ اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم''۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا اخفش نے کہا: کمثل العنکبوت پر وقف تام ہے۔ پھر اس کے قصہ کو بیان کیا اور کہا: اتخذت بیتا۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ اتخذت بیتا یہ عنکبوت کا صلہ ہے، گویا فرمایا: کمثل التی اتخذت بیتا موصول کے بغیر صلہ پر وقف اچھا نہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فرمایا: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (الجمعہ: 5) یحمل، حمار کا صلہ ہے یحمل کی بجائے حمار پر وقف کرنا اچھا نہیں۔ فراء نے کہا: یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے بیان کی ہے جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کو معبود بناتا ہے جو نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان دیتے ہیں جس طرح مکڑی کا گھر نہ اسے گرمی سے بچاتا ہے اور نہ ہی ٹھنڈ سے بچاتا ہے۔ عنکبوت پر وقف اچھا نہیں کیونکہ اس کا گھر جو اسے کسی چیز سے نہیں بچاتا اس کی تشبیہ کا قصد کیا تو معبودان باطلہ جو نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان، ان کو اس کے گھر کے ساتھ تشبیہ دی۔

وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ گھروں میں سے سب سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ لو، بیت العنکبوت کے متعلق ہے، یعنی اگر وہ جانتے کہ بتوں کی عبادت مکڑی کے گھر بنانے کی طرح ہے جو انہیں کچھ نفع نہیں

دیتی تو وہ اس کی عبادت نہ کرتے یہ ان کی مثال ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاش وہ جانتے کہ مکڑی کا گھر تو کمزور ہے۔ نحویوں نے کہا: عنکبوت کے آخر میں تاء زائدہ ہے کیونکہ یہ تصغیر اور جمع بناتے وقت گر جاتی ہے، یہ لغت ہے، فراء نے حکایت بیان کی کہ یہ مذکر ہے اور یہ کہا:

علی هطّالهم منهمْ بیوتٌ　كأنّ العنكبوتَ قد ابتناها(1)

ان کے پہاڑ پر گھر ہیں۔ گویا عنکبوت نے انہیں بنایا۔ محل استدلال قد ابتناها ہے۔ اسے علی هطالهم منهم بیوتٌ روایت کیا گیا ہے۔ جوہری نے کہا: هطال پہاڑ کا نام ہے عنکبوت معروف کیڑا ہے جو ہوا میں باریک اور ہلکا سا جالا بناتا ہے۔ اس کی جمع عناکیب، عَنَاکِب، عِکَاب، عُکُب اور أعْکُب آتی ہے اسے عَنْکَب اور عَکَنْبَاۃ بھی حکایت کیا جاتا ہے؛ شاعر نے کہا:

كأنّما يَسقطُ من لُغَامِها　بيتُ عَكَنْبَاةٍ على زِمَامِهَا

محل استدلال عکنباۃ ہے۔ اس کی تصغیر بنائی جاتی ہے تو عُنَیْکِب کہا جاتا ہے یزید بن میسرہ سے مروی ہے کہ عنکبوت شیطان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسخ کیا(2)۔ عطا خراسانی نے کہا: عنکبوت نے دو دفعہ جالا بنایا ایک دفعہ حضرت داؤد علیہ السلام پر جب جالوت آپ کی تلاش میں تھا اور ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وجہ سے اس کے قتل سے منع کیا گیا ہے(3)۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے فرمایا: اپنے گھروں کو مکڑی کے جالوں سے پاک کرو کیونکہ گھروں میں اس کا چھوڑنا فقر کو لازم کرتا ہے۔ اور خمیر نہ دینا یہ بھی فقر لاتا ہے(4)۔

**اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ،** ما یہ الذی کے معنی میں ہے۔ من یہ بعضیہ ہے۔ اگر تاکید کے لیے زائدہ ہوتا تو معنی بدل جاتا۔ معنی ہے جس کی وہ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ضعف کو جانتا ہے۔ عاصم، ابو عمرو اور یعقوب نے پڑھا یدعون یاء کے ساتھ پڑھا(5)؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ پہلے امتوں کا ذکر ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ خطاب کا صیغہ ہے۔

**وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا** یہ مثال اور اس کے علاوہ سورۂ بقرہ، سورۂ حج اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ **نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ** ہم انہیں بیان کرتے ہیں۔ **وَ مَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ** اسے اللہ تعالیٰ سے آگاہی رکھنے والے ہی سمجھتے ہیں جس طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: العالم من عقل عن الله فعمل بطاعته واجتنب سخطه عالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتا ہو، اس کے احکام کی طاعت کرتا ہو اور اس کی ناراضگی سے بچتا ہو(6)۔

**خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۠**

"پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ بے شک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانی ہے ایمان والوں کے لیے"۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 138　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 376　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 383

4۔ ایضاً　5۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 318　6۔ تفسیر بغوی

حق سے مراد عدل و انصاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنی کلام اور قدرت کے ساتھ، یہی حق ہے۔ آیۃ سے مراد علامت اور دلالت ہے۔ مومنین سے مراد تصدیق کرنے والے ہیں۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

''آپ تلاوت کیجئے اس کتاب کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف اور نماز صحیح ادا کیجئے بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اُتْلُ تلاوت اور اس کو معمول بنانے کا حکم ہے، سورۂ طٰہٰ میں اس آدمی کے لیے وعید گزر چکی ہے جو اس سے اعراض کرتا ہے کتاب کے مقدمہ میں اس پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے۔ اقامۃ الصلاۃ سے مراد نماز کو اس کے اوقات میں اس کی قراءت، رکوع، سجود، قعود، تشہد اور تمام شروط کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے، اس لیے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں جو درمیان کے گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أرأیتم لو أن نهرا باب أحدکم فیغتسل من کل یوم خمس مرات هل یبقی من درنه شیٔ قالوا لا یبقی من درنه شیٔ۔ قال فذلك مثل الصلوات الخمس یمحوا اللہ بهن الخطایا (1) بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ ہر روز پانچ دفعہ غسل کرے کیا میل باقی رہ جائے گی۔ صحابہ نے عرض کی: میل میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، فرمایا: اس کی مثل پانچ نمازیں ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں الصلاۃ سے مراد قرآن ہے۔ معنی ہے جو قرآن نماز میں تلاوت کیا جاتا ہے وہ فحشاء، منکر، زنا اور معاصی سے روکتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی معنی میں صحیح حدیث ہے۔ ''نماز میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی ہے'' (3)۔ مراد سورۃ فاتحہ کی قراءت ہے۔ حماد بن ابی سلیمان، ابن جریج اور کلبی نے کہا: بندہ جب تک نماز میں ہوتا ہے وہ فحشاء اور منکر پر عمل نہیں کرتا، یعنی جب تک تو نماز میں ہے اس وقت تک نماز تجھے روکتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تو ابہام میں رکھنے والی بات ہے (4) یہ تعبیر اس روایت میں کیسے درست ہوگی جسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ انصار

---

1۔ جامع ترمذی، باب صلوات الخمس، جلد 2، صفحہ 110

2۔ جامع ترمذی، باب مثل صلوات الخمس، حدیث 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 170

4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 320

میں سے ایک نوجوان نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتا وہ فواحش اور چوری میں سے جس کا موقع پاتا اسے نہ چھوڑتا اسے کر گزرتا(1)۔ نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ان الصلاۃ ستنھاہ نماز عنقریب اسے روک دے گی۔ تھوڑا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس نے توبہ کر لی اور اس کا حال اچھا ہو گیا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں نے تم کو کہا نہیں تھا''(2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آیت کی ایک تیسری تاویل بھی ہے جسے محققین نے پسند کیا ہے اور مشائخ صوفیہ نے بھی یہی کہا ہے اور مفسرین نے اس کا ذکر کیا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ سے مراد نماز پر دوام اختیار کرنا اور اس کی حدود کو قائم کرنا ہے پھر اس کے حکم سے باخبر کیا کہ نماز پڑھنے والے اور اس کی بجا آوری کرنے والے کو فحشاء اور منکر سے روکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآن حکیم کی تلاوت پائی جاتی ہے جو نصیحت پر مشتمل ہوتی ہے اور نماز نمازی کے تمام بدن کو مشغول رکھتی ہے جب نمازی نماز کی جگہ داخل ہوتا ہے، خشوع کرتا ہے، اپنے رب کے حضور عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور اس امر کو یاد کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور کھڑا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات اس پر مطلع ہے اور اسے دیکھ رہی ہے اس کا نفس اس کے لیے خالص ہو جاتا ہے اور مطیع ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا قرب اس کو ڈھانپ لیتا ہے، اس کے اعضاء پر اس کی ہیبت ظاہر ہو جاتی ہے اس میں کوئی کمی نہیں آتی یہاں تک دوسری نماز کا وقت ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ بہترین حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ان روایات کا یہی معنی و مفہوم ہے کیونکہ مومن کی نماز ایسے ہی ہونی چاہیے۔

میں کہتا ہوں: خصوصاً اگر وہ اپنے نفس کو احساس دلائے کہ اس کا یہ عمل اس کا آخری عمل بھی ہو سکتا ہے یہ مقصود میں زیادہ بلیغ اور مراد میں کامل ہو سکتا ہے۔ موت کا کوئی معین وقت نہیں، کوئی مخصوص زمانہ نہیں، کوئی معلوم مرض نہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ان پر کپکپی طاری ہو جاتی، ان کا رنگ زرد پڑ جاتا اس بارے میں ان سے بات کی گئی فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، جب میں دنیا کے بادشاہوں کے سامنے کھڑا ہوں تو میرا یہ حال ہوتا ہے تو بادشاہوں کے بادشاہ کے ساتھ میرا حال کیا ہونا چاہیے۔ یہ نماز روکتی ہے خصوصاً فحشاء اور منکر سے روکتی ہے جس کی نماز جو اس کے اردگرد گھومتی ہے جس میں کوئی خشوع نہیں ہوتا، نہ نصیحت ہوتی ہے اور نہ ہی فضائل اس میں ہوتے ہیں جس طرح ہماری نماز ہوتی ہے کاش یہ جائز بھی ہو جائے تو وہ ایسی نماز ہے جو نمازی کو اس کے مقام پر ہی چھوڑے رکھتی ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو اگر وہ نافرمانی کے راستے پر گامزن ہو، جو معصیت اس کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہے تو نماز اس کو اس حال میں چھوڑے رکھتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دوری میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اس معنی میں وہ حدیث بھی ہے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور اعمش سے مروی ہے: جس کی نماز اسے فحشاء اور منکر سے نہ روکے وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی دوری میں ہی اضافہ کرتی ہے۔

یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت حسن بصری نے اسے نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت کیا ہے اس کی سند صحیح نہیں۔

---

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 377　　2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 447

ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا جب ہم نے تحقیق کی اور اس کے معنی میں غور وفکر کیا تو یہ کہنا جائز ثابت نہ ہوا کہ کوئی یہ کہے کہ نفس نماز اسے اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہے گویا یہ معصیت ہے (1)۔ جو معنی اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرنے میں موثر نہیں، بلکہ یہ نماز اس کو اس کے حال اور معاصی پر چھوڑے رکھتی ہے وہ منکر ہو، فحشاء اور بعد ہو نماز اس میں اضافہ نہیں کرتی مگر اس بعد پر اسے قائم رکھتی ہے جو اس کا راستہ تھا، گویا ایسی نماز نے اسے اللہ تعالیٰ سے دور کیا جب اللہ تعالیٰ کے بعد سے اسے نہ روکا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کی گئی: فلاں آدمی کثرت سے نماز پڑھا کرتا تھا آپ نے فرمایا: یہ نماز نفع نہیں دیتی مگر اسے جو اس کی اطاعت کرے (2)۔

میں کہتا ہوں: خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث لم تزدہ من اللہ إلا بعدا کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ فحشاء اور منکر کے مرتکب کی نماز کی کوئی قدر و منزلت نہیں کیونکہ معاصی اس بندے پر غالب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر کے معنی میں خبر ہے، یعنی نمازی کو فحشاء اور منکر سے رک جانا چاہیے نماز بذات خود اس سے نہیں روکتی بلکہ یہ رکنے کا سبب ہے۔ یہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ** (جاثیہ: 29) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ** ﴿﴾ (الروم)

**مسئلہ نمبر 4**۔ **وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** اللہ تعالیٰ تمہیں جو ثواب عطا فرماتا ہے اور جو تمہاری ثنا فرماتا ہے وہ تمہارے ذکر، جو تم عبادت میں اور اپنی نماز میں اس کا کرتے ہو، اس سے بڑھ کر ہے، یہ بھی حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابو دردا، حضرت ابوقرہ، حضرت سلمان رضی اللہ عنہم اور حضرت حسن بصری نے کہا ہے؛ یہی طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی حدیث میں نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے فرمان **وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** سے مراد ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا ذکر کرتا ہے وہ اس ذکر سے بڑھ کر ہے جو تم اس کا ذکر کرتے ہو'' (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم اپنی نماز میں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہو اور قرآن حکیم کی قراءت میں جو اس کا ذکر کرتے ہو وہ ہر شے سے افضل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر جو دوام کی صورت میں کیا جائے یہ فحشاء اور منکر سے روکنے میں نماز سے بڑھ کر ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ چیز جو حرام ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور اس کو چھوڑ دینا یہ سب سے عظیم ذکر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے فحشاء اور منکر سے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے بڑھ کر ہے۔ یہاں اکبر کبیر کے معنی میں ہے۔

ابن زید اور قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر شے سے بڑھ کر ہے یعنی ان تمام عبادات سے افضل ہے جس میں ذکر نہ ہو (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا ذکر معصیت سے روکتا ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا ہو وہ اس کی موافقت نہیں کرتا۔

ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے **وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** کا معنی مطلق ہے یہی انسان کو فحشاء اور منکر سے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 319
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 20، صفحہ 181
4۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 140

روکتا ہے ذکر کا وہ جز جو نماز میں ہے وہ یہ عمل کرتا ہے اس طرح جو نماز کے علاوہ ہے وہ بھی یہی عمل کرتا ہے کیونکہ رکنا اس سے نہیں ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذاکر ہو اور اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہو اس کا ثواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے یاد کرے جس طرح حدیث طیبہ میں ہے: من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی و من ذکرنی فی ملإ ذکرتہ فی ملإ خیر منھم (1) جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں اس کو دل میں یاد کرتا ہوں اور جو کسی مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ذکر ایسی مجلس میں کرتا ہوں جو ان سے بہتر ہوتی ہے۔ نماز میں جو حرکات ہیں نہی میں ان کا کوئی اثر نہیں۔ نافع ذکر وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ علم، دل کی توجہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر امر سے فارغ ہونے کی صورت میں ہو۔ وہ ذکر جو زبان سے تجاوز نہیں کرتا تو اس کا رتبہ اور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ وہ ہدایت اور نور علم سے اسے نوازتا ہے۔ یہ حقیقت میں بندے کا اپنے رب کے ذکر کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ: 152) آیت کا باقی ماندہ حصہ وعید اور مراقبہ پر برانگیختہ کرتا ہے۔

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقہ سے مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے اور تم کہو: ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تمہاری طرف اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔ اور (اے حبیب!) اس طرح ہم نے نازل کی آپ کی طرف کتاب پس وہ جنہیں ہم نے دی تھی کتاب (تورات) وہ ایمان لاتے ہیں قرآن پر اور صرف اہل مکہ سے بھی کئی لوگ ایمان لا رہے ہیں قرآن پر اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر کفار"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت محکم ہے اہل کتاب سے مجادلہ اس طریقہ سے کرنا جائز ہے جو احسن ہے مراد یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی جائے، حجج اور آیات پر آگاہ کیا جائے یہ امید رکھتے ہوئے کہ وہ ایمان کی دعوت قبول کریں گے۔ یہ مجادلہ سختی اور شدت کی صورت میں نہ ہو۔ اس تعبیر کی بنا پر معنی یہ ہوگا: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ اس کا معنی ہے مگر وہ جو تم پر ظلم کریں۔ ورنہ ظلم کا کلمہ عام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اہل کتاب میں سے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ان کے ساتھ جھگڑا نہ کرو، جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی جو ایمان لائے۔ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی ان چیزوں میں موافقت

1۔ جامع ترمذی، ماجاء فی جامع الدعوات من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 200

کرنے کے ساتھ جو وہ پہلی قوموں کی خبریں تمہیں بیان کریں اور اس طرح کے دوسرے معاملات۔ اس تاویل کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان میں سے کفر پر باقی رہیں، جس طرح بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہم میں سے جو لوگ کفر پر ہیں اور دھوکہ کیا۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ آیت محکم ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (توبہ:29) یہ قتادہ کا قول ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے بچہ بنایا۔ اور کہا: یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدہ:64) اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ (آل عمران:181) یہ سب مشرک ہیں جنہوں نے جنگ کی اور جزیہ ادا نہ کیا تو ان سے انتقام لو۔ نحاس اور دوسرے علماء نے کہا: جس نے یہ استدلال کیا کہ یہ آیت منسوخ ہے تو اس نے یہ استدلال کیا کہ یہ آیت مکی ہے اس وقت تو قتال فرض ہی نہ تھا اور نہ ہی جزیہ کا مطالبہ تھا اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی اور حکم تھا۔ مجاہد کا قول اچھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منسوخ ہیں مگر ایسی خبر کے ساتھ جو عذر کو ختم کر دے یا کوئی عقلی دلیل ہو؛ ابن عربی نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ اس کا معنی ہے مگر وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ شروع کی تو ان کے ساتھ جدال تلوار کے ساتھ ہوگا یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں یا جزیہ دیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور اہل اسلام کے لیے عربی زبان میں اس کی تفسیر بیان کرتے (1)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو"۔ اور یہ کہا: اس پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف نازل کیا اور جو تمہاری طرف نازل کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے: اہل کتاب سے کوئی چیز نہ پوچھو وہ تمہاری صحیح رہنمائی نہیں کریں گے وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں یا تو تم حق کو جھٹلاؤ گے یا باطل کی تصدیق کرو گے (2)۔ بخاری شریف میں ہے حمید بن عبدالرحمن نے حضرت معاویہ سے وہ مدینہ طیبہ میں موجود قریش سے روایت نقل کرتے ہیں (3) اور کعب الاحبار کا ذکر کیا: اگرچہ یہ ان میں سے سب سے سچا ہے جو اہل کتاب میں سے تم پر بیان کرتے ہیں اس کے باوجود ہم اس پر جھوٹ کو پرکھتے ہیں اور آزماتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

"اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1094

2۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 27، صفحہ 103

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسئلوا اہل الکتاب عن شئ، جلد 2، صفحہ 1094

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ۔ قَبْلِهٖ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے جو قرآن ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس سے قبل اسے نہیں پڑھتے تھے اور اہل کتاب سے اختلاف نہیں کرتے تھے، بلکہ ہم نے اسے اعجاز کے انتہائی درجہ پر فائز فرما کر غیوب کا ضامن بنا کر اور دوسرے مقاصد کے لیے اسے نازل کیا۔ اگر آپ کتاب پڑھتے ہوتے اور حروف لکھا کرتے لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ تو اہل کتاب میں سے باطل پرست شک میں مبتلا ہو جاتے اور ان کے شک کی کوئی وجہ بھی ہوتی۔ وہ کہتے: ہم نے اپنی کتابوں میں تو اسے امی پایا ہے جو نہ لکھتا ہے اور نہ پڑھتا ہے پس یہ وہ نہیں۔ مجاہد نے کہا: اہل کتاب اپنی کتابوں میں پاتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

نحاس نے کہا: یہ قریش کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے کیونکہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے، نہ لکھتے اور نہ ہی اہل کتاب کے ساتھ میل جول رکھتے اور نہ ہی مکہ مکرمہ میں کوئی اہل کتاب تھا جو ان کے پاس انبیاء اور امتوں کی خبریں لاتا۔ پس ریب اور شک زائل ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** نقاش نے اس آیت کی تفسیر میں امام شعبی سے یہ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ آپ نے لکھا اور ابو کبشہ سلولی کی حدیث کو بھی ذکر کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن کا صحیفہ پڑھا اور اس کا معنی بیان کیا(1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ سب ضعیف ہے اور باجی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول بھی اسی سے متعلق ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو صلح حدیبیہ کے متعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا کو فرمایا: ہمارے درمیان معاہدہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ(2) مشرکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر ہم جانتے کہ تو اللہ کا رسول ہے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ ایک روایت میں تابعناک کی جگہ بایعناک کے الفاظ ہیں بلکہ لکھو محمد بن عبداللہ، حضرت علی شیر خدا کو حکم دیا کہ وہ اس کو مٹا دے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں اسے نہیں مٹاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے اس کی جگہ دکھاؤ''۔ حضرت علی شیر خدا نے وہ جگہ دکھائی اور حضور نے اسے مٹا دیا۔ اور ابن عبداللہ لکھا۔ ہمارے علماء کہتے ہیں: اس کا ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول اللہ کا کلمہ اپنے ہاتھ سے مٹایا اور اس کی جگہ ابن عبداللہ لکھا۔ امام بخاری نے اس سے بھی ظاہر روایت ذکر کی ہے۔ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب لیا اور لکھا(3)۔ ایک اور سند سے یہ اضافہ کیا: آپ اچھی طرح نہیں لکھتے تھے۔ ایک جماعت نے کہا: اس کے ظاہر سے کتابت کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے اپنے ہاتھ سے لکھا ان میں سے سمنانی، ابوذر اور باجی ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے میں قدح کا باعث نہیں اور وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ کے خلاف نہیں اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب (4) کے خلاف ہے۔ ہم ایسے لوگ ہیں نہ لکھتے ہیں اور نہ ہی حساب جانتے ہیں بلکہ انہوں نے اسے معجزات میں ایک اور اضافہ کے طور پر دیکھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 322
2۔ صحیح مسلم، باب صلح الحدیبیۃ، جلد 2، صفحہ 105
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 452
4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 256

ہے۔ اور آپ کی صداقت اور رسالت کی صحت پر اظہار کے طور پر دیکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے کتابت سیکھے بغیر کتابت کی اور نہ ہی اس کے اسباب کو حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور آپ کے قلم پر ایسی حرکات جاری کیں جن سے ایسے خطوط عیاں ہوتے جن کا مفہوم ابن عبداللہ تھا جس نے بھی اسے پڑھا۔ یہ عادت کے خلاف تھا۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ سیکھے اور اکتساب کے بغیر اولین و آخرین کا علم رکھتے تھے۔ یہ آپ کے معجزات میں بلیغ ترین اور فضائل میں سب سے عظیم ہے۔ اس کے ساتھ آپ سے امی کا نام زائل نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اس حالت میں راوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ کہتا ہے: ولا یحسن ان یکتب آپ اچھی طرح نہیں لکھتے تھے۔ پس لکھنے کے باوجود امی کا نام باقی رہا۔

ہمارے شیخ ابو العباس احمد بن عمر نے کہا: اندلس کے کثیر فقہاء اور دوسرے علماء نے اس کا انکار کیا۔ انکار میں شدت کا اظہار کیا اور اس کے قائل کی طرف کفر کی نسبت کی ہے۔ کفر کی یہ نسبت کرنا علوم نظریہ کے نہ ہونے اور مسلمانوں کو کافر قرار دینے پر عدم آگاہی پر دلیل ہے وہ اس بات کو نہ سمجھ سکے کیونکہ مسلمان کو کافر قرار دینا اس کے قتل کی طرح ہے جس طرح صحیح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث آئی ہے خصوصاً ایسے آدمی پر ایسا الزام دینا جس کے فضل، علم اور امامت پر لوگ گواہی دیتے ہوں کہ یہ مسئلہ قطعی نہیں بلکہ جس پر انحصار ہے وہ اخبار احاد صحیحہ کا ظاہر ہے مگر عقل اس کو محال قرار نہیں دیتی شریعت میں بھی کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں جو اس کے وقوع کو محال قرار دے۔

میں کہتا ہوں: بعض متاخرین نے کہا: جس نے یہ کہا یہ خارق للعادۃ امر کی نشانی ہے تو اسے کہا جائے گا: یہ ایسی نشانی ہوتی جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اگر یہ کسی اور آیت کے مناقض نہ ہوتی وہ یہ ہے کہ آپ امی ہیں آپ لکھتے نہیں آپ کے امی امت میں امی ہونے سے حجت قائم ہو جاتی ہے، انکار کرنے والوں کو خاموش کرایا جا سکتا ہے اور شبہ ختم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کیسے آپ کے ہاتھ کو یہ موقع دیتا کہ وہ لکھے اور ایک علامت بنے آیت تو یہ ہوتی وہ ہاتھ نہ لکھتا۔ معجزات کے بارے میں یہ محال ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کریں۔ کتب واخذ القلم کا معنی ہے آپ نے اپنے کاتبوں میں سے کسی کو حکم دیا کہ وہ لکھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھبیس کاتب تھے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قاضی عیاض نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھا کرتے تھے (1) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: الق الدواۃ وحرف القلم واقم الباء وفرق السین ولا تعور المیم وحسن اللہ ومد الرحمن وجود الرحیم دوات رکھو اور قلم کو باریک کرو، باء کو لمبا کر کے لکھو، سین دندانے دار لکھو اور میم کو کانا کر کے نہ لکھو، اللہ کو خوبصورت لکھو، رحمن کو مد سے لکھو اور رحیم کو عمدگی سے لکھو۔

قاضی عیاض نے کہا: اس چیز کو ذہن نشین کر لو، اگرچہ یہ روایت ثابت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا کہ یہ کوئی بعید نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم دیا گیا ہو اور قراءت کتابت سے آپ کو روک دیا گیا ہو۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھا ایک حرف بھی نہیں لکھا آپ نے کاتب کو لکھنے کا حکم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الدجال، جلد 2، صفحہ 400

دیا اسی طرح آپ نے (کسی صحیفہ کو) نہیں پڑھا اور نہ ہی ہجے کیے۔ اگر یہ کہا جائے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا تو آپ نے ہجے کیے فرمایا: ''اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ک، ا، ف، ر (1)؟ جب کہ تم کہتے ہو کہ معجزہ اس صورت میں قائم ہے کہ آپ امی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا امة امية لانكتب ولا نحسب ہم امی لوگ ہیں نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب جانتے ہیں تو پھر یہ کس طرح؟ اس کا جواب وہ چیز ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کی حدیث میں بیان کی ہے حدیث قرآن کی طرح ہے جس کا بعض بعض کی تفسیر بیان کرتا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''اسے ہر مومن کاتب اور غیر کاتب پڑھتا ہے'' (2)۔ اس میں غیر کاتب جو امیوں میں سے ہے پر نص قائم کی ہے جو امر جلی ہے اس میں یہ سب سے واضح ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''بلکہ وہ روشن آیتیں ہیں جو ان کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا اور ظالموں کے بغیر ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کر سکتا''۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اس سے مراد قرآن ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: فراء نے حضرت عبداللہ کی قراءت میں گمان کیا ہے بل هي آيات بينات معنی ہے بلکہ قرآن کی آیات، آیات بینات ہیں (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کی مثل هٰذَا بَصَآىِٕرُ (الاعراف: 203) ہے اگر یہ جائز ہے تو اس کی مثل هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ (الکہف: 98) بھی جائز ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس امت کو حفظ کی صلاحیت سے نوازا گیا اس امت سے پہلے کے لوگ اپنی کتابوں کو دیکھ کر ہی پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ اسے بند کرتے تو سوائے انبیاء کے کوئی انہیں یاد رکھنے والا نہ ہوتا۔ حضرت کعب نے اس امت کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا: یہ علماء و حکماء ہیں اور فقہ میں انبیاء ہیں۔ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی یہ قرآن اس طرح نہیں جس طرح باطل پرست کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے یا شعر ہے بلکہ یہ ایسی علامات اور دلائل ہیں جن کی مدد سے اللہ کا دین، اس کے احکام کی پہچان ہوتی ہے۔

یہ ان لوگوں کے سینوں میں اس طرح ہے جن کو علم عطا کیا گیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور مومنین ہیں وہ اسے یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے علم سے صفت بیان کی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ذہنوں سے اللہ تعالیٰ کے کلام، انسانوں اور شیاطین کے کلام میں امتیاز کیا ہے۔ قتادہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ھو ضمیر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مراد اہل کتاب ہیں جو اپنے ہاں کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت ہے آپ امی ہیں نہ پڑھتے ہیں اور نہ ہی لکھتے ہیں، لیکن انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور انہوں نے بات کو چھپا دیا، یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ اس قول کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت اور ابن سمیقع کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الدجال، جلد 2، صفحہ 400

2۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، من معجزاته الباهرة، جلد 1، صفحہ 506　3۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 10

قراءت ہے بل ھذا آیات بینات حضور صلی اللہ علیہ وسلم آیات تھے ایک آیت نہ تھے کیونکہ آپ دین کے معاملہ میں آیات کثیرہ پر دلالت کرتے تھے، اسی وجہ سے فرمایا: بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ آیات بینات والے ہیں تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ، ظالمون سے مراد کفار ہیں کیونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور جو پیغام حق آپ لائے اس کا انکار کیا۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۱ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۵۲

''اور انہوں نے کہا: کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے۔ آپ فرمایئے: نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا انہیں کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اتاری ہے کتاب جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے مومنوں کے لیے۔ آپ فرمایئے: کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ، وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں باطل پر اور انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وہی لوگ گھاٹے میں ہیں''۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ یہ مشرکوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول ہے۔ اس کا معنی ہے ان پر ایسی آیت کیوں نازل نہیں ہوئی جیسی آیات انبیاء پر نازل ہوئیں؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت صالح علیہ السلام کو اونٹنی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے کا معجزہ دیا گیا۔ قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں کہہ دیجئے۔ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ معجزات تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو لاتا ہے، جب چاہتا ہے انہیں بھیج دیتا ہے یہ میرے قبضہ میں تو نہیں۔

وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ابن کثیر، ابو بکر، حمزہ اور کسائی نے آیۃ پڑھا(1)۔ باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قل انما الآیات عند اللہ۔

اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یہ ان کے قول: لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کا جواب ہے کیا مشرکوں کے لیے آیات میں سے یہ معجزہ کتاب کافی نہیں جس کے ساتھ آپ نے انہیں چیلنج کیا کہ وہ اس کی مثل لے آئیں یا اس کی ایک سورت کی مثل لے آئیں تو وہ عاجز آ گئے۔ اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 322

معجزات لے آتے تو وہ کہتے: یہ جادو ہے اور ہم جادو کو نہیں پہچانتے۔ کلام ان کی قدرت میں تھی اس کے باوجود وہ معارضہ سے عاجز آ گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس آیت کا سبب نزول وہ روایت ہے جسے ابو عیینہ نے عمرو بن دینار سے وہ حضرت یحییٰ بن جعدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ آپ کے ہاتھ میں کتاب تھی فرمایا: ''کسی قوم کی گمراہی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اس چیز سے اعراض کرے جو ان کا نبی ان کے پاس لایا اور اس چیز کی طرف رغبت کریں جسے ان کے نبی کے علاوہ کوئی اور نبی لایا ہے یا اس کی طرف رغبت کریں جو ان کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب لائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا'' (1)۔ اسے ابو محمد دارمی نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔

اہل تفسیر نے اسے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، اسی کی مثل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: ''اگر حضرت موسیٰ بن عمران زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا'' (2)۔ اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ غیر سے غنی نہ ہوا''۔ یعنی اس کے ساتھ غیر سے مستغنی نہ ہوا۔ امام بخاری کی اس آیت کی تفسیر میں یہی تاویل ہے۔ جب قرآن کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں رب العالمین کی طرف سے ملتی ہیں تو کتاب کے کلام میں جو کچھ ہے اس کو کثرت سے پڑھو اس (قرآن) کو چھوڑ کر غیر کی طرف رغبت کرنا گمراہی، خسارہ اور دھوکہ اور نقصان ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ، ذلک سے مراد قرآن ہے، لَرَحۡمَةً دنیا اور آخرت میں رحمت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دنیا میں رحمت ہے کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو گمراہی سے بچایا ہے۔ وَّ ذِكۡرٰی دنیا میں نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ان کی حق کی طرف رہنمائی کی۔ لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ

قُلۡ كَفٰی بِاللّٰهِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ شَهِیۡدًا جو لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں ان سے کہہ دیجئے: اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے میں جو دعویٰ کرتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اس کی کتاب ہے وہ میری صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اس پر کوئی شے مخفی نہیں۔ یہ ان کے خلاف استدلال ہے تو اس نے ان کے بارے میں جو گواہی دی ہے وہ صحیح ہے کیونکہ وہ اس کے علم کا اقرار کرتے ہیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی گواہی کا بھی اقرار کریں۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ یحییٰ بن سلام نے کہا: باطل سے مراد ابلیس ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بتوں کی عبادت ہے؛ یہ ابن شجرہ نے کہا ہے وَ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ کیونکہ وہ اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور اس کی کتابوں کو جھٹلاتے ہیں اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفر سے مراد جو انہوں نے بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا اور اس کی طرف اولاد اور اضداد کو منسوب کیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ وہ آخرت میں اپنی ذاتوں اور اپنے اعمال میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

**وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ لَوۡلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَهُمُ الۡعَذَابُ ؕ وَ لَیَاۡتِیَنَّهُمۡ بَغۡتَةً وَّ هُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیۡطَةٌۢ**

1۔ سنن دارمی، من لم یر کتابۃ الحدیث، جلد 1، صفحہ 102، حدیث نمبر 484

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 338 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 289 4۔ ایضاً

بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''وہ آپ سے جلدی عذاب نازل ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر میعاد مقرر نہ ہوتی تو آ جاتا ان پر عذاب اور (اپنے وقت پر) وہ ان پر اچانک آئے گا اور انہیں ہوش تک نہ ہوگا۔ وہ آپ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں (ذرا سی دیر ہے) جہنم یقیناً گھیر لے گا ان کافروں کو جس دن ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لو اب چکھو اپنے کرتوتوں کا مزہ''۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے انکار کی زیادتی کے طور پر کہا: وہ عذاب ہم پر جلدی لے آیئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بات کہنے والا النضر بن حارث اور ابوجہل تھا۔ دونوں نے کہا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) اور ان کا یہ کہنا: رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۝ (ص)

اللہ کا فرمان: وَ لَوْلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى اگر عذاب کے نازل ہونے میں معین وقت نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد ہے جو میں نے تم سے وعدہ کیا کہ میں تیری قوم کو عذاب نہ دوں گا اور قیامت تک انہیں مہلت دوں گا۔ اس کی وضاحت اس ارشاد میں ہے: بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ (القمر: 46) ضحاک نے کہا: یہ دنیا میں ان کی عمروں کی مدت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اجل مسمی سے مراد نفخہ اولیٰ ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ وقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ہلاکت اور ان کے عذاب کے لیے مقدر کیا ہے؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ غزوۂ بدر کے موقع پر قتل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے ہر عذاب کے لیے ایک اجل مقرر ہے نہ وہ پہلے ہوگی اور نہ ہی موخر ہوگی، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (الانعام: 67) لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ یعنی وہ عذاب جس کی وہ جلدی مچاتے تھے وہ انہیں آ پہنچے گا۔ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً اس کا معنی اچانک ہے۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ جب عذاب ان پر نازل ہوگا تو وہ اس کا علم نہ رکھیں گے۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ جو آپ سے عذاب کے جلد لانے کا مطالبہ کرتے ہیں جب کہ ان کے لیے جہنم تیار کی گئی ہے وہ انہیں ہر حال میں گھیرے گی، تو پھر جلدی مچانے کا کیا فائدہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت حضرت عبداللہ بن ابی امیہ اور اس کے مشرک ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا تھا: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (الاسراء: 92)

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا تعلق ماقبل کلام سے ہے یعنی جس روز انہیں عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے آ پہنچے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں ڈھانپ لے گا تو جہنم ان کو گھیر لے گی۔ وَ مِنْ تَحْتِ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 290

اَرْجُلِهِمْ فرمایا: یہ مقاربہ کے لیے ہے ورنہ غشیان عموماً اوپر سے ہوتا ہے؛ جس طرح شاعر نے کہا:

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وماءً ا بارِدًا

میں نے اسے گھاس کھلائی اور ٹھنڈا پانی پلایا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لقد كان قوّادَ الجيادِ إلى العِدَا     عليهنّ غابٌ من قَنًى ددروع

دشمن کی طرف جانے والے گھوڑوں کی قیادت کرنے والوں پر نیزوں اور زرہوں کا جنگل تھا۔

وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا اہل مدینہ اور اہل کوفہ نے نقول پڑھا۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ (الرعد: 43) یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ملک موکل انہیں کہے: ذوقوا دونوں قرائتیں ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں، یعنی فرشتہ ہمارے حکم سے کہے گا: تم چکھو۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۤ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو! میری زمین بڑی کشادہ ہے سو تم میری عبادت کیا کرو۔ ہر ایک موت کا مزہ چکھنے والا ہے پھر ہماری طرف ہی تم لوٹائے جاؤ گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہیں ہم ٹھہرائیں گے جنت کے بالا خانوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا وہ جنہوں نے (ہر حال میں) صبر کیا اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اور کتنے ہی زمین پر چلنے والے ہیں جو اٹھائے نہیں پھرتے اپنا رزق اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے انہیں بھی اور تمہیں بھی اور وہ سب باتیں سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ یہ آیت نازل ہوئی تاکہ جو مومن مکہ مکرمہ میں ہیں انہیں ہجرت پر برانگیختہ کیا جائے، یہ مقاتل اور کلبی کا قول ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی زمین کی وسعت کی خبر دی اور یہ بتایا کہ ایسے علاقہ میں رہنا جہاں کفار کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے یہ درست نہیں، بلکہ درست یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کے ساتھ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو تلاش کرے یعنی اگر تمہیں ایمان کے اظہار میں تنگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مدینہ کی طرف

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 383

ہجرت کر جاؤ وہ وسیع ہے کیونکہ وہاں توحید کا اظہار کرنا ممکن ہے۔ ابن جبیر اور عطا نے کہا: جہاں بھی ظلم اور منکر ہو وہاں اس آیت کا حکم مرتب ہوگا اور ایسے ملک کی طرف ہجرت کرنا لازم ہوگا جہاں حق ہو؛ یہ امام مالک کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: میری زمین وسیع ہے پس ہجرت کر جاؤ اور جہاد کرو۔ مطرف بن شخیر نے کہا: معنی ہے میری رحمت وسیع ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: میرا رزق تمہارے لیے وسیع ہے اسے زمین میں تلاش کرو۔ سفیان ثوری نے کہا: جب تو ایسے علاقے میں ہو جہاں مہنگائی ہو تو اس کے علاوہ کسی ایسے علاقہ کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں تیرا تھیلا ایک درہم کے بدلے میں روٹیوں سے بھر جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے میری زمین جو جنت کی زمین ہے وہ وسیع ہے۔

فَاعْبُدُوْنِ میری عبادت کرو تاکہ میں تمہیں اس کا مالک بنا دوں۔ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ، ایای یہ فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے فاعبدوا ایای فاعبدون یہ ایک فعل کی وجہ سے دوسرے فعل سے مستغنی ہو گیا۔ فایای میں فاء شرط کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: ان ضاق بکم موضع فایای فاعبدون فی غیرہ لأن أرضی واسعة۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ یہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ یہاں اسے ذکر کیا یہ دنیا کے امر اور اس کے خوف کو حقیر ثابت کرنے کے لیے ہے، گویا بعض مومنوں نے انجام کے بارے میں یہ سوچا کہ اپنے وطن مکہ سے نکلنے میں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مر جائے، اسے بھوک آئے یا اس طرح کی کوئی مصیبت آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے معاملہ کی حقارت بیان کی، یعنی تم لامحالہ مرو گے اور ہماری طرف اٹھائے جاؤ گے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی طرف ہجرت اور اس کے احکام کی بجا آوری کی طرف جلدی کرنی چاہیے۔ پھر ان مومنوں سے وعدہ کیا جو عمل کرتے ہیں کہ انہیں جنت میں رہائش دی جائے گی مقصود اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں برانگیختہ کرنا ہے اس جزا کا ذکر کیا جس کو وہ پائیں گے پھر اس ارشاد کے ساتھ ان کی صفت بیان کی: الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ابو عمر، یعقوب، جحدری، ابن اسحاق، ابن محیصن، اعمش، حمزہ، کسائی اور خلف نے یا عبادی یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا۔ باقی قراء نے اس یاء کو فتحہ دیا۔ اِنَّ اَرْضِيْ ابن عامر نے اسے فتحہ دیا اور باقی نے یاء کو سکون دیا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من فر بدینه من أرض إلى أرض ولو قید شبر استوجب الجنة وکان رفیق محمد وابراهیم علیهما السلام (1) جو اپنے دین کو بچانے کی خاطر ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگے اگرچہ بالشت بھر ہی ہو تو وہ جنت کا مستحق بن جاتا ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رفیق ہوگا۔

ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ سلمی اور ابو بکر نے عاصم سے یہ قراءت نقل کی۔ یرجعون یعنی یاء کے ساتھ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا بعض نے یہ اشعار پڑھے:

الموتُ فی کلِّ حینٍ ینشدُ الکفنا و نحن فی غفلةٍ عمّا یُرادُ بِنا

1۔ تفسیر کشاف

لا تَرکَنَنَّ إلی الدنیا وزَهرتها | وان تَوَشَّحَتْ من أثوابها الحَسَنَا
أین الأحبةُ والجیرانُ ما فَعَلُوا | أین الذین هُمُو كانوا لها سَكَنَا
سَقَاهُمُ الموتُ كأسًا غیرَ صافیةٍ | صیّرهم تحت أطباقِ الثَّرَیٰ رُهُنَا

موت ہر لحہ کفن کا ذکر کرتی ہے اور ہمارے بارے میں جو ارادہ کیا جا رہا ہے ہم اس سے غافل ہیں۔ تو دنیا اور اس کی تروتازگی کی طرف مائل نہ ہو اگرچہ تو اس سے اچھے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہو۔ محبوب اور پڑوسی کہاں ہیں انہوں نے جو کچھ کیا وہ کہاں ہیں جن کے یہ مکانات تھے۔ موت نے انہیں ایسا جام پلا دیا جو صاف نہ تھا موت نے انہیں مٹی کے نیچے رہن رکھ دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا حضرت ابن مسعود، اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے لَنُثْوِيَنَّهُمْ با کی جگہ ثاء کے ساتھ قراءت کی ہے (1) اس سے مراد اقامت ہے یعنی ہم انہیں ایسے کمرے عطا کریں گے جس میں یہ قیام کریں گے۔ رویس نے یعقوب، جحدری اور سلمی سے لَيُبَوِّئَنَّهُمْ نون کی جگہ یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ باقی قراء نے نون کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی ہم انہیں ٹھہرائیں گے۔ غرفا یہ غرفۃ کی جمع ہے اس سے مراد بالائی کمرہ ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنتی اہل غرف کو اپنے اوپر یوں دیکھیں گے جس طرح تم روشن ستارہ دیکھتے ہو جو مشرق و مغرب کے افق میں باقی ماندہ دیکھتے ہو'' (2)۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ انبیاء کی منازل ہیں کوئی اور ان تک نہیں پہنچ سکتا؟ فرمایا: ''کیوں نہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی''۔

امام ترمذی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں بالا خانے ہیں جن کے باہر والے حصے اندر سے اور اندر والے حصے باہر سے دکھائی دیتے ہیں'' (3)۔ ایک بدو اٹھا، عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کن کے لیے ہوں گے؟ فرمایا: ''یہ ان کے لیے ہوں گے جو اچھی گفتگو کرے، کھانا کھلائے، ہمیشہ روزے رکھے اور راتوں کو نماز پڑھے، جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں''۔ ہم نے کتاب ''تذکرۃ'' میں کچھ زائد چیزیں ذکر کی ہیں؛ الحمدللہ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ۔ واحدی نے یزید بن ہارون سے وہ حجاج بن منہال سے وہ زہری یعنی عبدالرحمن بن عطا سے وہ عطا سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک باغ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گرا ہوا پھل چننے لگے، اس سے کھانے لگے۔ فرمایا: ''اے ابن عمر! تجھے کیا ہو گیا ہے تو کھاتا نہیں؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے طلب نہیں۔ فرمایا: ''لیکن مجھے طلب ہے یہ چوتھی صبح ہے میں نے کھانا چکھا تک نہیں اگر میں چاہتا تو اپنے رب سے دعا کرتا تو وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 324
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 378
3۔ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة باب ما جاء فی صفة الجنة، جلد 2، صفحہ 75

مجھے قیصر و کسریٰ کے ملک جیسا ملک عطا کر دیتا، اے ابن عمر! تیرا کیا حال ہوگا جب تو ایسی قوم میں باقی رہے گا جو سال بھر کا رزق چھپا کر رکھیں گے اور یقین ان کا کمزور ہوگا"۔ فرمایا: تھوڑا وقت بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ دَآبَّةٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَ اِيَّاكُمۡ ۖ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ۔

میں کہتا ہوں: یہ روایت ضعیف ہے اس کو ضعیف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر والوں کے لیے سال بھر کا رزق ذخیرہ کرتے۔ امام بخاری اور امام مسلم اس پر متفق ہیں۔ صحابہ کرام بھی ایسا کیا کرتے تھے جب کہ وہ مقتدیٰ تھے، اہل یقین تھے اور بعد میں آنے والے متقین اور متوکلین کے امام تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں مومنین سے فرمایا جب مشرکوں نے انہیں اذیتیں دیں: "مدینہ طیبہ کی طرف نکل چلو، ہجرت کرو اور ظالموں کے پڑوس میں نہ رہو"۔ عرض کی: وہاں ہمارا کوئی گھر نہیں، کوئی جانتا نہیں اور نہ ہی وہاں ہمارا کوئی ایسا رشتہ دار ہے جو ہمیں کھانا کھلائے اور ہمیں پانی پلائے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ دَآبَّةٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَ اِيَّاكُمۡ یعنی اس کے پاس ذخیرہ کیا ہوا رزق نہیں ہوتا، اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارا دار ہجرت میں رزق عطا فرمائے گا؛ یہ پہلے قول سے زیادہ مشابہ ہے۔ کأین کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ یہ ای ہے اس پر کاف تشبیہ داخل ہے اور اس میں کم کا معنی پیدا ہو گیا ہے۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس کی تقدیر عدد کی طرح ہے، یعنی چوپاؤں میں سے کثیر تعداد۔ مجاہد نے کہا: یعنی پرندے اور چوپائے جو اپنے منہ سے کھاتے ہیں اور کوئی چیز اٹھا کر نہیں لاتے (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اس وقت ہی کھاتے ہیں اور کل کے لیے ذخیرہ نہیں کرتے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لا تحمل رزقها وہ اپنے رزق پر قادر نہیں اللہ یرزقها جہاں بھی جائیں اللہ تعالیٰ انہیں رزق عطا فرماتا ہے وہ تمہیں بھی رزق عطا فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا: حمل، حمالہ کے معنی میں ہے۔ نقاش نے حکایت بیان کی ہے: مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے آپ کھاتے اور ذخیرہ نہ کرتے (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ تعبیر کچھ بھی نہیں کیوں کہ دابہ کا لفظ مطلق ہے عرف میں اس کا استعمال آدمی پر نہیں ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیسے ہوگا؟ سورۃ النمل میں یہ بحث گزر چکی ہے؟ وَ اِذَا وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَيۡهِمۡ اَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ دَآبَّةً مِّنَ الۡاَرۡضِ تُكَلِّمُهُمۡ (النمل: 82) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: دواب سے مراد ہر وہ حیوان ہے جو رینگے ان میں سے انسان، چیونٹی اور چوہے کے سوا کوئی بھی خوراک کا ذخیرہ نہیں کرتا۔ بعض لوگوں سے یہ مروی ہے کہ میں نے بلبل کو دیکھا وہ اپنے دامن میں ذخیرہ کر رہی تھی۔ عقعق کو مخابئ کہا جاتا ہے مگر وہ اسے بھول جاتا ہے۔

اَللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَ اِيَّاكُمۡ حریص اور جو رزق میں توکل کرتا ہے، رغبت کرنے والے اور قانع، حیلہ کرنے والے اور عاجز میں برابری کرتا ہے تاکہ محنت کرنے والا دھوکہ میں مبتلا نہ ہو جائے کہ وہ اپنی کوشش کی وجہ سے رزق دیا جائے گا اور عاجز تصور نہ کرے کہ عجز کی وجہ سے اسے رزق سے روک دیا جائے گا۔ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: لو انکم توکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے جس طرح توکل کرنے کا حق تھا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 293 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تو وہ تمہیں رزق دیتا جس طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے وہ صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وہ تمہاری دعا اور قول کو سنتا ہے کہ ہم مدینہ طیبہ میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتے جس کو ہم خرچ کریں اور تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے بھی جانتا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾

''اور (اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے پھر وہ کہاں توحید سے پھرے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ جب مشرکوں نے مسلمانوں کو فقر کی عار دلائی اور کہا: اگر تم حق پر ہوتے تو تم فقراء نہ ہوتے یہ ملمع سازی تھی۔ کفار میں بھی فقراء تھے اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو زائل فرمایا۔ اس طرح اس کا قول جس نے یہ کہا: اگر ہم ہجرت کریں تو ہم ایسی کوئی چیز نہ پائیں جس کو ہم خرچ کریں، یعنی جب تم نے اس چیز کا اعتراف کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ان اشیاء کا خالق ہے تو تم رزق میں کیسے شک کرتے ہو جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی تخلیق ہے تو وہ بندے کو رزق دینے سے عاجز نہیں۔ اسی وجہ سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس کو ملایا ہے: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ تم کیسے میری توحید کا انکار کرو گے اور میری عبادت سے پھرو گے؟ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ یعنی ایمان اور کفر کے ساتھ رزق کا امر مختلف نہیں ہوتا رزق میں وسعت اور اس میں کمی اس کی جانب سے ہے اس لیے فقر کی وجہ سے عار نہیں دلائی جا سکتی۔ ہر شے قضا و قدر کے ساتھ ہے اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ وہ تمہارے احوال اور امور سے آگاہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مال میں کمی یا وسعت جو مناسب ہے اس کے بارے میں وہ جانتا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾

''اور اگر آپ پوچھیں ان سے کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کر دیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد تو ضرور کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے، آپ فرمایئے: الحمدللہ (حق واضح ہو گیا) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں، اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر لہو و لعب اور دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت

نہیں) کاش! وہ اس حقیقت کو جانتے''۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یعنی بادل سے بارش۔ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا اس کو خشک سالی اور اس کے اہل کے قحط میں مبتلا ہونے کے بعد۔

لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ یعنی جب تم نے اس کا اقرار کرلیا تو تم اس کے ساتھ کیوں شرک کرتے ہو اور دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہو۔ جب وہ اس پر قادر ہے تو مومنوں کو غنی کرنے پر بھی قادر ہے تو تاکید کے لیے اسے مکرر ذکر کیا۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ یعنی اس کی قدرت پر جو دلائل اور براہین واضح کیے گئے اس پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ لیکن اکثر ان دلائل میں تدبر نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے اقرار کیا اس پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پانی کے نازل کرنے اور زمین کو زندہ کرنے پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ یعنی دنیاوی زندگی ایسی چیز ہے جس کے ساتھ لہو ولعب کیا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اغنیاء کو جو دنیا عطا فرماتا ہے وہ ایسی چیز ہے جو زائل ہو جاتی ہے جس طرح کھیل کود اس کی کوئی حقیقت نہیں اس میں کوئی ثبات نہیں۔ بعض نے کہا: دنیا اگر تیرے لیے باقی رہی تو تو اس کے لیے باقی نہیں رہے گا۔ یہ اشعار پڑھے:

تروحُ لنا الدنیا بغیر الذی غَدَتْ و تَحدثُ من بعدِ الأمور أمورُ
وتجرِی اللیالی باجتماعٍ وفُرقةٍ وتطلُعُ فیها أنجمٌ و تَغورُ
فمن ظنّ أنّ الدھر باقٍ سرورہ فذاكَ محالٌ لا یَدُومُ سرورُ
عَفَا اللهُ عمّن صَیّرَ الهمّ واحدًا وأیقن أن الدائراتِ تَدورُ

دنیا شام کو ہمارے لیے ایسی چیز لاتی ہے جو اس کے برعکس ہے جس کو صبح لائی تھی اور اس کے بعد نئے امور جنم لیتے ہیں۔ راتیں اجتماع اور فرقت کے ساتھ رواں رہتی ہیں اور اس میں ستارے طلوع ہوتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں جس نے یہ گمان کیا کہ زمانے کی خوشی باقی رہنے والی ہے یہ محال ہے اس کی خوشی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے جس نے غم ایک ہی بنالیا ہے اور اس نے یقین کرلیا ہے کہ حادثات گردش کرتے رہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ سب کچھ امور دنیا کے متعلق ہے وہ مال ہو، جاہ وحشمت ہو، ضرورت سے زائد لباس ہو، وہ ضرورت جس پر زندگی کا انحصار ہے اور طاعات پر قوت ہے ان میں سے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں تو وہ آخرت کی چیزوں میں سے ہیں وہ باقی رہیں گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ یَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۚ (الرحمن) یعنی جس کے ساتھ اس کے لیے ثواب اور رضا کو چاہا جاتا ہے۔ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ یعنی باقی رہنے والی زندگی کا گھر جو نہ زائل ہو اور نہ اس میں موت آئے۔ ابو عبیدہ نے گمان کیا ہے: حیوان، حیاۃ اور حیی جب حاء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو سب ایک معنی میں ہیں (1)۔ جس طرح فرمایا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 293

قد تری إذ الحیاۃُ حِیِیْ

تو جانتا ہے کہ حیاۃ حی (زندگی) ہے۔ دوسرے علماء کہتے ہیں: حِی یہ جمع کا صیغہ ہے فعول کے وزن پر ہے جس طرح عصی۔ حیوان کا لفظ ہر زندہ چیز پر واقع ہوتا ہے۔ حیوان جنت میں ایک چشمہ بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حیوان کی اصل حَیَیَان ہے ایک یاء کو واؤ سے بدل دیا کیونکہ دو حرف ایک جنس کے اکٹھے آئے ہیں۔ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کاش وہ جانتے کہ یہ اس طرح ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚۙ وَ لِیَتَمَتَّعُوْا ٙ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

''پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خاص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے ذہن کو، پھر جب وہ سلامتی سے پہنچا تا ہے انہیں خشکی پر تو اسی وقت وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔ وہ ناشکری کریں جو نعمت ہم نے انہیں دی اور لطف اٹھالیں (اس سے) وہ عنقریب جان لیں گے (حقیقت کو)''۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ، فلک سے مراد کشتیاں ہیں جب وہ کشتیوں میں سوار ہوئے اور انہیں غرق ہونے کا خوف ہوا۔ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ اپنی نیتوں میں صادق بنتے ہوئے انہوں نے دعا کی بتوں کی عبادت اور ان کے پکارنے کو چھوڑا فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ جب اللہ تعالیٰ انہیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اوروں کو پکارتے ہیں جب کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا شرک یہ ہے کہ ان میں سے ایک قائل یہ کہتا ہے: لولا اللہ والرئیس الملاح لغرقنا اگر اللہ، رئیس یا ملاح نہ ہوتا تو ہم غرق ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو نجات عطا فرمائی ہے اس کے فعل کو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان تقسیم کرتے ہیں۔

لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚۙ وَ لِیَتَمَتَّعُوْا ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں دونوں لام لام کی ہیں، مراد ہے لکی یکفروا ولکی یتمتعوا ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ تاکہ ان کے شرک کا ثمرہ یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کریں اور دنیا سے لطف اندوز ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لام امر ہیں جس کا معنی تہدید اور وعید ہے یعنی ہم نے تمہیں جو نعمتیں دی ہیں اور تمہیں جو سمندر سے نجات عطا فرمائی ہے اس کا انکار کرو۔ اس کی دلیل حضرت ابی کی قراءت وتمتعوا ہے۔ ابن انباری نے کہا: اعمش، نافع اور حمزہ کی قراءت اس کو قوت بہم پہنچاتی ہے۔ وہ ولیتمتعوا لام کے جزم کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا: ولیتمتعوا لام کی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لام امر ہو کیونکہ لام امر میں اصل کسرہ ہے، مگر یہ ایسا امر ہے جس میں تہدید کا معنی پایا جاتا ہے۔ جس نے ولیتمتعوا لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اسے لام کی نہیں بنایا، کیونکہ لام کی ساکن پڑھنا جائز نہیں۔ یہ ابن کثیر، مسیبی، قالون کی نافع سے، حمزہ، کسائی اور حفص کی عاصم سے روایت ہے باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی

ہے۔ ابوالعالیہ نے لیکفروا بما آتیناھم فتمتعوا فسوف تعلمون قراءت کی اس میں تہدید اور وعید ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝

"کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا یا حق کو جھٹلایا جب وہ اس کے پاس آیا، کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا کفار کے لیے"۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا عبدالرحمن بن زید نے کہا: حرم سے مراد مکہ مکرمہ ہے وہ قریش ہیں مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں امن دیا (1)۔ وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ضحاک نے کہا: وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو قیدی بنالیتے ہیں (2)۔ خطف کا معنی تیزی سے اچک لینا ہے۔ سورۂ قصص اور دوسری صورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ نعمت یاد دلائی تاکہ وہ اس کی اطاعت بجالائیں یعنی میں نے ان کے لیے امن والا حرم بنایا جس میں وہ قید، غارت گری اور قتل سے امن میں ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں خشکی میں نجات عطا فرمائی ہے جس طرح سمندر میں انہیں نجات عطا فرمائی۔ وہ خشکی میں شرک کرتے ہیں اور سمندر میں شرک نہیں کرتے؛ یہ ان کے احوال کے تناقص پر تعجب کا اظہار ہے۔ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ قتادہ نے کہا: باطل سے مراد شرک ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: باطل سے مراد ابلیس ہے وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نعمت سے مراد عافیت ہے۔ ابن شجرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کا احسان اور عطا مراد ہے (4)۔ ابن سلام نے کہا: اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ نقاش نے کہا: مراد بھوک میں انہیں کھانا کھلانے اور خوف سے امن دینے کا وہ انکار کرتے ہیں (5)۔ یہ تعجب و انکار ہے جو استفہام کے طریقہ پر کلام آئی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اور اس کا بچہ تسلیم کیا اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ جب بھی کوئی برا فعل کیا تو کہا: وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (الاعراف: 28) ہم نے اپنے آباء کو ایسا کرتے ہوئے پایا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ یحییٰ بن سلام نے کہا: بالحق سے مراد قرآن ہے (6)۔ سدی نے کہا: مراد توحید ہے (7)۔ ابن شجرہ نے کہا: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ یہ قول دونوں قولوں کو جامع ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 325 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 294 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ مثوی سے مراد مستقر ہے یہ استفہام تقریر ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۶۹﴾

''اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے''۔

وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا یعنی جنہوں نے کفار سے ہماری رضا کی خاطر جہاد کیا۔ سدی وغیرہ نے کہا: یہ آیت جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ جہاد عرفی سے پہلے نازل ہوئی (1)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی رضا کی خاطر عام جہاد ہے۔ حضرت حسن بن ابی الحسن نے کہا: یہ آیت عبادت گزاروں کے حق میں نازل ہوئی (2)۔ حضرت ابن عباس اور ابراہیم بن ادہم نے کہا: یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی جو جسے جانتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من عمل بما علم علمه الله مالم يعلم (3) جو اس پر عمل کرے جسے وہ جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی تعلیم دیتا ہے جسے وہ نہیں جانتا۔ بعض علماء نے اسے اس ارشاد کی طرف منسوب کیا ہے: وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرہ:282) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: جس چیز کے علم سے ہم جاہل ہیں اس کے علم سے ہمیں اس چیز نے روک دیا جو ہم اس چیز پر عمل کرنے سے کوتاہی کرتے ہیں جس کا ہم علم رکھتے ہیں اگر ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کے بعض پر بھی عمل کرتے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس چیز کا علم عطا فرما دیتا کہ ہمارے بدن اس کو اٹھا نہ سکتے (4)۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرہ:282) ابو سلیمان دارمی نے کہا: آیت میں جہاد کا مصداق صرف کفار سے جہاد نہیں بلکہ اس سے مراد دین کی مدد ہے اور باطل پرستوں کا رد ہے، ظالموں کا قلع قمع کرنا ہے، معروف کی نصیحت کرنا ہے اور منکر سے منع کرنا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی طاعت میں نفوس کا مجاہدہ ہے اور یہی جہاد اکبر ہے۔ سفیان بن عیینہ نے حضرت ابن مبارک سے کہا: جب تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اختلاف میں پڑ گئے ہیں تو مجاہدین اور سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ۔ ضحاک نے کہا: آیت کا معنی ہے جنہوں نے ہجرت میں جہاد کیا ہم انہیں ایمان پر ثابت قدم رہنے کے راستوں کی طرف ہدایت عطا فرمائیں گے (5)۔ پھر فرمایا: دنیا میں سنت ایسے ہی ہے جس طرح آخرت میں جنت۔ جو آخرت میں جنت میں داخل ہو گیا وہ سلامتی پا گیا۔ اسی طرح وہ آدمی جو دنیا میں سنت کو لازم پکڑتا ہے وہ سلامت رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: جو لوگ ہماری اطاعت میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ثواب کے راستوں کی طرف ہدایت عطا فرمائیں گے۔ یہ قول طاعت کے عموم کی وجہ سے تمام اقوال کو شامل ہے، اسی کی مثل حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا قول ہے فرمایا: حکمت کہتی ہے جو مجھے تلاش کرلے اور مجھے نہ پائے تو وہ مجھے دو مواقع پر تلاش کرے۔ (۱) جس چیز کو جانتا ہے اس میں سے اچھی پر عمل کرے (۲) جو چیز جانتا ہے اس میں سے بری سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 326 2۔ ایضاً 3۔ الحلیۃ ابونعیم حدیث انس بن مالک
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 326 5۔ ایضاً

اجتناب کرے۔ حضرت حسن بن فضل نے کہا: اس میں تقدیم وتاخیر ہے مراد ہے جن کو ہم نے ہدایت عطا فرمائی وہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہماری رضا کی خاطر جہاد کیا۔

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا مراد جنت کا راستہ ہے؛ یہ سدی کا قول ہے۔ نقاش نے کہا: اللہ تعالیٰ انہیں دین حق کی توفیق نصیب فرماتا ہے۔ یوسف بن اسباط نے کہا: معنی ہے ہم ان کی نیتوں، صدقات، نمازوں اور روزوں کو خالص کر دیں گے(1)۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ لام تاکید کا ہے مع پر دو وجوہ میں سے ایک وجہ سے داخل ہوا ہے (۱) مع اسم ہو اور لام تاکید اسماء پر داخل ہوتا ہے (۲) یہ حرف ہے اور اس پر لام داخل ہوا ہے کیونکہ اس میں استقرار کا معنی پایا جاتا ہے، جس طرح تو کہتا ہے: ان زیدا لفی الدار، مع کو جب تو ساکن پڑھے تو یہ حرف نہیں ہوگا کوئی اور چیز نہ ہوگی۔ جب تو اس کو فتحہ دے تو یہ جائز ہے کہ اسم ہو اور حرف ہو۔ اکثر علماء کی رائے میں یہ حرف ہے جو معنی کے لیے آیا۔ احسان اور محسنین کی وضاحت سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔

انہیں اللہ تعالیٰ کی معیت، نصرت، معونت، حفظ اور ہدایت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور سب مخلوق کو معیت احاطہ اور قدرت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے دونوں معیتوں میں بڑا فرق ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 326

# سورة الروم

﴿ اٰیاتہا ٦٠ ﴾ ﴿ ٣٠ سُورَۃُ الرُّوْمِ مَکِّیَّۃٌ ٨٤ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ٦ ﴾

سورۂ روم تمام کی تمام مکی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اس کی ساٹھ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾

"الف، لام، میم، ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے چند برس کے اندر، اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد بھی اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے، وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ امام ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جب بدر کا دن تھا تو رومی ایرانیوں پر غالب آئے اس امر نے مومنوں کو خوش کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں (1)۔ فرمایا: مومن رومیوں کے ایرانیوں پر غالب آنے سے خوش ہو گئے۔ کہا: یہ حدیث اس سند سے غریب ہے۔ نصر بن علی جہضمی نے غَلَبَتِ الرُّوْمُ پڑھا (2) اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مکمل روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: یہ غَلَبتا اور غُلِبت ہے (3)۔ مشرک یہ پسند کرتے تھے کہ ایرانی رومیوں پر غالب آئیں کیونکہ وہ بت پرست تھے۔ مسلمان یہ پسند کرتے تھے کہ رومی ایرانیوں پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ مشرکوں نے اس کا ذکر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا اور حضرت ابوبکر صدیق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا، فرمایا: "خبردار وہ عنقریب غالب آئیں گے"۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر ان سے کیا۔ مشرکوں نے کہا: ہمارے اور اپنے درمیان اس کی مدت معین کرو اگر ہم غالب رہے تو ہمارے لیے یہ ہوگا۔ اگر تم غالب رہے تو تمہارے لیے یہ ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے پانچ سال کی مدت کا تعین کیا رومی اس عرصہ میں ایرانیوں پر غالب نہ آئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا

---

1۔ جامع ترمذی، سورۂ روم، جلد 2، صفحہ 150 2۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الروم، حدیث نمبر 3117، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 296

ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو نے اس سے زیادہ کا عرصہ کیوں نہیں معین کیا میرا خیال ہے تو نے دس سال کیوں نہیں معین کیا(1)''۔ ابوسعید نے کہا: بضع سے مراد دس سے کم ہے۔ فرمایا: پھر بعد میں رومی غالب آ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ سے یہی مراد ہے۔ سفیان نے کہا: میں نے سنا وہ ایرانیوں پر بدر کے روز غالب آئے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(2)۔ اور اسے نیار بن مکرم اسلمی سے بھی روایت کیا ہے۔ کہا: جب یہ آیات نازل ہوئیں ان دنوں میں ایرانی رومیوں پر غالب تھے۔ مسلمان یہ پسند کرتے تھے کہ رومی ایرانیوں پر غالب آئیں کیونکہ مسلمان اور وہ اہل کتاب تھے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا۔ وَ یَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ قریش یہ پسند کرتے تھے کہ ایرانی رومیوں پر غالب آئیں کیونکہ مشرک اور ایرانی اہل کتاب نہیں تھے اور نہ کسی دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ کے اطراف میں چیخ چیخ کر یہ آیات سنا رہے تھے: الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ قریش کے کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: یہ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط ہے تیرا صاحب یہ گمان کرتا ہے کہ رومی چند سالوں میں فارس پر غالب آ جائیں گے کیا ہم تیرے ساتھ باہم شرط نہ باندھ لیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں۔ یہ واقعہ شرط باندھنے کی حرمت سے پہلے کا ہے۔ حضرت ابوبکر اور مشرکوں نے شرط لگائی۔ اور رہن کے طور پر کوئی چیزیں رکھ دیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: تو بضع سے کتنے سال مراد لیتا ہے تین سال یا نو سال؟ تو ہمارے اور اپنے درمیان درمیانی مدت مقرر کرو جس پر تو اپنی شرط کا اختتام چاہتا ہے انہوں نے آپس میں چھ سال مقرر کر دیئے رومیوں کے غلبہ سے قبل چھ سال گزر گئے، مشرکوں نے حضرت ابوبکر صدیق کا رہن شدہ مال لے لیا جب ساتواں سال داخل ہوا تو رومی ایرانیوں پر غالب آ گئے۔ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر چھ سال مقرر کرنے پر عیب لگایا۔ کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بِضْعِ سِنِیْنَ فرمایا۔ کہا: اس موقع پر بے شمار لوگ مسلمان ہو گئے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(3)۔ قشیری، ابن عطیہ اور دوسرے علماء نے کہا: جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر صدیق مشرکوں کے پاس گئے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات خوش کرتی ہے کہ رومی غالب آئیں؟ کیونکہ ہمارے نبی نے ہمیں خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وہ چند سالوں میں عنقریب غالب آئیں گے۔ ابی بن خلف اور اس کے بھائی امیہ نے آپ کو کہا: ایک قول یہ کیا جاتا ہے ابوسفیان بن حرب نے کہا: اے ابافصیل! وہ کنایہ کے طور پر ''ابا بکر'' کی جگہ یہ استعمال کرتے تھے۔ آؤ ہم شرط باندھ لیں اور اس کے لیے کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ان کے ساتھ شرط باندھ لی اور مال رہن کے طور پر رکھ لیا۔

---

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 276

2۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الروم، حدیث نمبر 3117، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 3118

قتادہ نے کہا: یہ واقعہ اس وقت ہوا جب ابھی قمار حرام نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے رہن کے طور پر پانچ اونٹنیاں رکھیں اور مدت تین سال مقرر کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے رہن کے طور پر تین اونٹنیاں رکھیں پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بتایا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے اس کے لیے عرصے کو کیوں پیش نظر نہیں رکھا، کیونکہ بضع تین، نو اور دس کے درمیان ہوتا ہے بلکہ واپس جاؤ رہن کے مال میں اضافہ کرو اور ان سے مدت بھی زیادہ لو'' (1)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اونٹنیاں سو کر دیں اور عرصہ نو سال کر دیا۔ رومی اس کے دوران غالب آ گئے۔ امام شعبی نے کہا: وہ نو سال میں غالب آ گئے۔ قشیری نے کہا: روایات میں مشہور یہ ہے کہ رومیوں کا غلبہ اس وقت سے ساتویں سال میں ہوا تھا جس وقت ایرانی رومیوں پر غالب آئے تھے۔ ممکن ہے شعبی سے جس نے روایت کی ہے اس سے سات سے نو میں تصحیف ہوئی ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ اونٹنیاں سات سے نو کیں۔ یہ کہا جاتا ہے: یہ کسریٰ ابرویز کی آخری فتح تھی جس میں اس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا یہاں تک کہ اس میں ایک آتشکدہ بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی تو آپ کو بری لگی تو اللہ تعالیٰ نے ان دو آیات کو نازل فرمایا۔ نقاش اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کا ارادہ کیا تو ابی بن خلف نے انہیں پکڑ لیا اور کہا: مجھے رہن کا کوئی ضامن دیجئے اگر رومی مغلوب رہیں تو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے بیٹے عبدالرحمن کو ضامن بنایا جب ابی نے احد کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو عبدالرحمن نے اس سے ضامن طلب کیا تو اس نے ضامن دیا۔ پھر ابی مکہ مکرمہ میں اس زخم کی وجہ سے مر گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لگایا تھا۔ رومی صلح حدیبیہ کے موقع جب کہ شرط باندھے نو سال گزرے تھے ایرانیوں پر غالب آئے۔ امام شعبی نے کہا: ابھی وہ عرصہ نہیں گزرا تھا یہاں تک کہ رومی ایرانیوں پر غالب آ گئے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے مدائن میں باندھے اور وہاں رومیہ بنایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ابی پر شرط میں غالب رہے۔ اور اس کے وارثوں سے شرط کا مال لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے صدقہ کر دو'' تو انہوں نے اس کو صدقہ کر دیا۔ مفسرین نے کہا: رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ کا سبب ایک عورت تھی وہ فارس میں رہتی وہ بادشاہوں اور بہادروں کو ہی جنا کرتی تھی۔

کسریٰ نے کہا: میرا ارادہ ہے کہ میں تیرے بیٹوں میں سے ایک کو اس لشکر پر امیر مقرر کروں جس کو میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ اس عورت نے کہا: یہ ہرمز ہے جو لومڑی سے مکار اور شکرے سے زیادہ محتاط ہے یہ فرخان ہے جو تلوار سے تیز اور تیر سے زیادہ پار ہونے والا ہے۔ یہ شہر بزان ہے یہ فلاں سے زیادہ حلم والا ہے اس کا انتخاب کر لے۔ کہا: اس نے حلیم کو منتخب کر لیا اور اسے اس لشکر کا سپہ سالار بنا دیا وہ اہل فارس کے ساتھ رومیوں کی طرف چلا اور رومیوں پر غالب رہا۔ عکرمہ اور دوسرے علماء نے کہا: شہر بزان جب رومیوں پر غالب آ گیا اس نے ان کے گھروں کو برباد کر دیا یہاں تک کہ خلیج تک جا پہنچا۔ اس کے بھائی فرحان نے اسے کہا: میں نے اپنے آپ کو کسریٰ کے تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔

1۔ شرح مشکل الآثار، باب فی البضع ما ھو، جلد 7، صفحہ 441

کسریٰ نے شہر بزان کی طرف لکھا: میرے پاس فرخان کا سر بھیج دو تو اس نے ایسا نہ کیا کسریٰ نے ایرانیوں کی طرف خط لکھ بھیجا: میں نے تم پر فرخان کو امیر مقرر کیا ہے اور شہر بزان کو معزول کر دیا ہے اور فرخان کی طرف خط لکھا جب وہ لشکر کا والی بن جائے تو وہ شہر بزان کو قتل کر دے۔ فرحان نے شہر بزان کے قتل کا ارادہ کیا تو شہر بزان نے اسے کسریٰ کے تین خط نکال کر دیئے جن میں وہ فرخان کے قتل کا اسے حکم دیتا ہے۔ شہر بزان نے فرخان سے کہا: کسریٰ نے تین خط لکھے کہ میں تجھے قتل کر دوں میں نے تیرے معاملہ میں ہمیشہ اس کے حکم کو ٹال دیا، کیا تو مجھے ایک خط کی وجہ سے قتل کرتا ہے؟ اس نے حکومت اپنے بھائی کے سپرد کر دی۔ شہر بزان نے قیصر جو رومیوں کا بادشاہ تھا کی طرف خط لکھا، دونوں نے کسریٰ کے خلاف تعاون کا فیصلہ کیا۔ رومی فارس پر غالب آ گئے اور کسریٰ مر گیا۔ حدیبیہ کے دن نبی کریم ﷺ کو یہ خبر ملی۔ حضور ﷺ کے ساتھ جو مسلمان تھے وہ سب خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مقصود ہے۔ اَدْنَى الْاَرْضِ سے مراد شام کا علاقہ ہے۔ عکرمہ نے کہا: اذرعات کا علاقہ ہے؛ یہ عرب اور شام کے علاقہ کے درمیان کا علاقہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیصر نے ایک امیر بھیجا جس کا نام یحنس تھا اور کسریٰ نے شہر بزان کو بھیجا ان کا مقابلہ اذرعات اور بصرہ میں ہوا یہ عرب اور عجم کی سرزمین کے شام کا قریبی علاقہ ہے۔ مجاہد نے کہا: مراد جزیرہ ہے یہ عراق اور شام کے درمیان کا علاقہ ہے۔ مقاتل نے کہا: مراد اردن اور فلسطین کا علاقہ ہے(1)۔ ادنیٰ کا معنی سب سے قریب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اگر واقعہ اذرعات میں ہوا تو مکہ کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ قریب ترین علاقہ ہے(2) اس کا ذکر امرؤالقیس نے کیا ہے:

تنورتها من أذرعات وأهلُها يثرِبَ أدنى دارِها نظر عالِ(3)

اگر واقعہ جزیرہ میں ہو تو قیاس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسریٰ کے علاقہ کے زیادہ قریب ہے۔ اگر یہ واقعہ اردن میں ہوا تو یہ رومیوں کے علاقہ کے زیادہ قریب ہے۔ جب یہ واقعہ ہوا اور رومی مغلوب ہو گئے تو کفار خوش ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بشارت دی کہ رومی عنقریب مغلوب ہوں گے اور جنگ میں انہیں فتح نصیب ہوگی۔

سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری، حضرت علی بن ابی طالب اور معاویہ بن قرہ رضی اللہ عنہم نے غُلِبَتِ الرُّوْمُ غین اور لام کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ یوم بدر کو جو واقعہ ہوا وہ یہ تھا کہ رومی غالب آئے یہ امر قریش کے کفار پر شاق گزرا اور مسلمان اس سے خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو خوشخبری دی کہ وہ چند سالوں میں پھر فتح حاصل کریں گے۔ ابو حاتم نے اس تاویل کا ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اکثر لوگوں کی قراءت غُلِبَتِ الرُّوْمُ غین کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت ابو عمر اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دونوں نے غلب الروم پڑھا اور دونوں نے سیغلبون قراءت کی ہے۔ ابو حاتم نے حکایت بیان کی ہے کہ عصمہ نے ہارون سے روایت کی کہ یہ اہل شام کی قراءت ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں: یہ عصمہ ضعیف ہے اور ابو حاتم اکثر اس سے حکایت کرتے ہیں۔ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قراءت غلبت غین کے ضمہ کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 327 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہے۔ اس اخبار میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر دلیل ہے کیونکہ رومیوں پر ایرانیوں نے غلبہ پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خبر دی کہ چند سالوں میں رومی ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے اور مومن اس سے خوش ہوں گے، کیونکہ رومی اہل کتاب ہیں یہ امر علم غیب سے تعلق رکھتا تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا جس سے وہ آگاہ نہیں تھے اور حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ شرط لگائیں اور شرط میں اضافہ کریں پھر شرط لگانا حرام قرار دیا گیا اور قمار کی حرمت کے ساتھ شرط لگانے کو منسوخ کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: غین کے ضمہ کے ساتھ قراءت زیادہ صحیح ہے (1)۔ اس پر اجماع کیا ہے کہ قراءت سیغلبون یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اس سے مراد رومی ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیغلبون کو یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس قراءت میں اس معنی کا قلب ہے جس معنی کی روایات تائید کرتی ہیں۔

ابو جعفر نحاس نے کہا: جس نے قراءت کی سَیُغْلَبُوْنَ اس کے نزدیک معنی ہوگا یعنی ایرانی غلبہ کے بعد مغلوب ہو جائیں گے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ رومیوں کا مقابلہ ان سے غزوہ بدر کے دن ہوا جس طرح حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں ہے جو ترمذی شریف میں موجود ہے۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے مقام پر ہوا۔ اور خبر بیعت رضوان کے دن پہنچی، یہ عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: دونوں دنوں میں مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نصیب ہوئی؛ علماء نے ذکر کیا ہے۔

رومیوں کے غلبہ اور ان کے بارے میں غلبہ کی خواہش پر مسلمانوں کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ رومی مسلمانوں کی طرح اہل کتاب تھے اور ایرانی بت پرست تھے۔ جس کی وضاحت حدیث میں پہلے گزر چکی ہے۔

نحاس نے کہا: ایک اور قول بھی ہے اور وہ زیادہ بہتر ہے ان کی خوشی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو پورا کیا، کیونکہ اس میں نبوت پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی تھی کہ کچھ سالوں میں یہ ہوگا تو اسی طرح ہوا۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی یہ علت بیان کرنا بھی مناسب ہے جس کا تقاضا محبت کی نظر کرتی ہے کہ چھوٹا دشمن مغلوب ہو جائے کیونکہ وہ معونت میں ہلکا ہوتا ہے۔ جب بڑا دشمن غالب آتا ہے تو خوف زیادہ ہوتا ہے۔ اس معنی میں غور و فکر کے ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ ﷺ دین کے غلبہ اور وہ شریعت جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا اس کے غلبہ، امتوں پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے تھے، نیز کفار یہ ارادہ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر ایسا حاکم مسلط کر دے گا جو ان کو تہس نہس کر دے گا اور حضور ﷺ سے کفار کو آرام پہنچائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی خوشی اسی وجہ سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی مدد کی، کیونکہ جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو یوم بدر کو اس کی خبر دی؛ قشیری نے اسے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان کی خوشی ان سب چیزوں کے مجموعہ سے ہو وہ اس لیے خوش ہوتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دشمنوں پر غلبہ دیا، رومی بھی غالب آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ بھی پورا کیا۔ ابو حیوہ شامی اور محمد بن سمیقع

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 327

نے مِنۡۢ بَعۡدِ غَلۡبِهِم لام کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں؛ جس طرح ظَعْن اور ظَعَن۔

فراء نے گمان کیا ہے کہ اصل من بعد غلبتھم ہے تاء کو حذف کر دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ (الانبیائ:73) میں تاء حذف ہے یہ اصل میں اقامۃ الصلاۃ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے یہ اہل نحو میں کثیر تعداد پر امر مشتبہ نہیں کیونکہ اقام الصلاۃ مصدر ہے۔ فعل میں کیونکہ حرف میں قاعدہ جاری ہوتا ہے اس لیے مصدر میں بھی قاعدہ جاری ہوگا۔ یہ تاء محذوف حرف علت کے عوض ہے۔ غلب اس میں کوئی حرف علت نہیں اس سے کوئی چیز حذف نہیں۔ اصمعی نے حکایت بیان کی ہے طَرَدَ طَرَدًا، جَلَبَ جَلَبًا، حَلَبَ حَلَبًا، غَلَبَ غَلَبًا اس میں کون سا حذف ہے۔ کیا یہ جائز ہوگا کہ کہا جائے: اَكَلَ اَكْلًا اور جو اس کے مشابہ افعال ہیں کیا اس میں حذف ہے؟

فِيۡ بِضۡعِ سِنِيۡنَ، بِضۡعِ میں ہاء حذف ہے تاکہ مذکر اور مونث میں فرق کیا جائے۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ یوسف میں گزر چکی ہے اور سنین میں نون مفتوح ہے کیونکہ یہ جمع سالم ہے عربوں میں سے کچھ کہتے ہیں فِيۡ بِضۡعِ سِنِيۡنٍ جس طرح وہ کہتے ہیں: غسلین یہ جائز ہے کہ سنۃ کی جمع اس طرح بنادی جائے جس طرح ذوالعقول کی جمع واؤ نون اور یاء نون سے بنائی جاتی ہے کیونکہ اس سے کوئی چیز حذف ہے تو یہ جمع اس نقص کے عوض میں ہو جو نقص اس کے واحد میں ہے، کیونکہ سنۃ کی اصل سنہۃ یا سنوۃ ہے۔ اس کے سین کو کسرہ دیا گیا تاکہ اس امر پر دلالت ہو کہ اس کی جمع قیاس سے خارج ہے؛ یہ بصریوں کا قول ہے۔ فراء پر لازم ہوگا کہ وہ اس کو ضمہ دے کیونکہ وہ کہتا ہے: ضمہ واؤ پر دلیل ہے۔ دو قولوں میں سے ایک قول میں سنۃ کی واؤ کو حذف کیا گیا ہے ہم کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو اس کو ضمہ دیتا ہے۔

لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ اپنی قدرت میں منفرد ہے عالم میں جو بھی غلبہ وغیرہ واقع ہوتا ہے وہ بھی اس کی جانب سے، اس کے ارادہ سے اور اس کی قدرت سے ہی ہوتا ہے۔ فرمایا: لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ احکام کا نفاذ اسی کی شان ہے۔ من قبل و من بعد تقدیر کلام یہ ہے: من قبل ھذہ الغلبۃ و من بعدھا ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے ہر شے سے پہلے ہر شے کے بعد۔ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ دونوں ظرفیں ہیں مبنی برضمہ ہیں کیونکہ یہ جن کی طرف مضاف ہیں ان کے حذف کی وجہ سے یہ معرفہ ہیں اس مضاف الیہ کی وجہ سے جو حذف ہے اس کو یہ دونوں اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں۔

یہ اسماء کی تعریف کے خلاف ہیں۔ تضمین میں یہ دونوں حروف کے مشابہ ہیں پس یہ دونوں مبنی ہیں دونوں ضمہ کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ یہ دونوں منادی مفرد کے مشابہ ہیں جب یہ نکرہ ہوں اور انہیں مضاف کیا جائے تو ان کی بناء (مبنی ہونا) زائل ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ دونوں ہیں تو ان دونوں کو ضمہ دیا گیا اور کہا جاتا ہے: مِنۡ قَبۡلٍ وَ مِنۡۢ بَعۡدٍ کسائی نے بنی اسد کے ایک آدمی سے یہ حکایت بیان کی ہے۔ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلِ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ پہلا ظرف کا کلمہ مجرور اور غیر منون ہے اور دوسرا مضموم تنوین کے بغیر ہے۔

فراء نے اسے مِنۡ قَبۡلِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ حکایت کی ہے۔ تنوین کے بغیر مجرور ہیں۔ نحاس نے اس کا انکار کیا اور اس کو رد کیا ہے۔ فراء نے اپنی کتاب میں کہا: قرآن میں کثیر اشیاء ہیں جن میں غلطی (1) واضح ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے

1۔ یہ فراء کی خرافات ہیں نحاس نے انہیں کا انکار کیا اور رد کیا ہے۔ مترجم

گمان کیا کہ اسے من قبلِ و من بعدِ پڑھنا جائز ہے یہ بھی جائز ہے من قبلٍ و من بعدٍ کیونکہ یہ دونوں نکرہ ہیں۔ زجاج نے کہا: معنی ہے متقدم اور متاخر۔

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۙ بِنَصْرِ اللَّهِ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ اپنے اولیاء میں سے جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، کیونکہ اس کی مدد اس کے اولیاء کی اس کے دشمنوں کے خلاف غلبہ کی صورت میں مختص ہے۔ جہاں تک اس کے دشمن جو اس کے اولیاء کے خلاف غلبہ پاتے ہیں وہ اس کی مدد نہیں وہ تو آزمائش ہے ہاں اسے ظفر کہا جا سکتا ہے وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وہ انتقام لینے میں غالب ہے اور اطاعت کرنے والوں پر رحم کرنے والا ہے۔

وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ ۝

”یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ وہ جانتے ہیں دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو اور وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں“۔

وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ کیونکہ اس کا کلام سچا ہے۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ وہ کفار ہیں وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد مشرکین مکہ ہیں۔ وَعْدَ اللَّهِ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وعد ذلك وعدا پھر وہ جتنا جانتے ہیں اس کی مقدار کو بیان کیا۔ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وہ اپنی معاش اور دنیا کے امر کو جانتے ہیں۔ وہ کب فصل کاشت کریں، کب کاٹیں، کیسے درخت لگائیں اور کیسے عمارت بنائیں؟ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد محلات بنانا، نہریں کھودنا اور درخت لگانا ہے۔ معنی ایک ہی ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو شیاطین امور دنیا میں سے ان کی طرف القاء کرتے ہیں جب کہ انہوں نے آسمان دنیا سے انہیں چوری چھپے سنا تھا؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ظاہر و باطن ہے جس طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ (الرعد: 33)

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ظاہر الحیاۃ الدنیا کے زیادہ مناسب ہے یہاں تک کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اللہ کی قسم! ان میں سے ایک کا دنیا کے بارے میں علم اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ وہ درہم کی چھان بین کرتا ہے تو وہ تجھے اس کے وزن کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اور وہ اچھی طرح نماز نہیں پڑھ سکتا۔ ابو العباس مبرد نے کہا: کسریٰ نے اپنے دنوں کی تقسیم کی ہوئی تھی اس نے کہا: ہوا والا دن نیند کے لیے مناسب ہے، بادل والا دن شکار کے لیے مناسب ہے، بارش والا دن شراب پینے اور لہو ولعب کے لیے مناسب ہے اور دھوپ والا دن ضروریات کے لیے مناسب ہے۔ ابن خالویہ نے کہا: وہ دنیا کی سیاست کے بارے میں جو وہ بہتر جانتے تھے یہی ان دنیا کی زندگی میں سے ظاہر کو جاننا ہے۔ وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ وہ آخرت کے بارے میں علم اور عمل سے غافل ہیں۔ ان میں سے بعض نے کہا:

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 299　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 300

ومن البلیة أن تری لك صاحبا فی صورة الرجل السمیع المبصر

فَطِنَ بِکلّ مصیبة فی ماله وإذا یصا ب بدینه لم یَشْعُر

یہ بھی آزمائش میں سے ہے کہ تو اپنے لیے ایک ایسا ساتھی پائے جو انسان کی شکل میں سننے والا دیکھنے والا ہو۔ وہ اپنے مال میں ہر مصیبت کو سمجھ جاتا ہے۔ اور جب اس کے دین میں مصیبت آتی ہے تو اسے محسوس نہیں ہوتا۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ ۸

''کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا اپنے جی میں جنہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور ایک مقررہ مدت تک کے لیے اور بلاشبہ اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات کے سخت منکر ہیں''۔

فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ یہ تفکر کی ظرف ہے یہ مفعول نہیں یَتَفَکَّرُوْا حرف جر کے ساتھ اس کی طرف متعدی ہے کیونکہ ان کو حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی ذاتوں میں سوچ و بچار کریں انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ آسمان، زمین اور اپنی ذاتوں میں فکر و نظر کو استعمال کریں یہاں تک کہ انہیں علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور دوسری چیزوں کو حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے۔ زجاج نے کہا: کلام میں حذف ہے یعنی فیعلموا کیونکہ کلام میں اس پر دلیل ہے اِلَّا بِالْحَقِّ فراء نے کہا: معنی ہے حق کے لیے یعنی ثواب اور عقاب کے لیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مگر اقامت حق کے لیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بالحق کا معنی عدل کے ساتھ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حکمت کے ساتھ؛ معنی قریب قریب ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: بِالْحَقِّ وہ حق ہے اور حق کے لیے اسے پیدا کیا۔ وہ اس کی توحید اور قدرت پر دلالت ہے۔ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی آسمانوں اور زمین کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جس وقت پر پہنچ کر وہ ختم ہو جائیں گے وہ یوم قیامت ہے۔ یہ فنا پر تنبیہ ہے، اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر مخلوق کے لیے ایک وقت مقرر ہے، محسن کے ثواب اور مسیٔ کے عقاب پر تنبیہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَجَلٍ مُّسَمًّی سے مراد ہے جو بھی پیدا کیا اسے ایسے وقت میں پیدا کیا اس کا نام رکھا کہ اللہ تعالیٰ اس شے کو اس وقت میں پیدا فرمائے گا۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ لام تاکید کے لیے ہے تقدیر کلام یہ ہے لکافرون بلقاء ربهم اس میں تقدیم و تاخیر ہے لکافرون بالبعث بعد الموت۔

وہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں۔ تو کہتا ہے: ان زیدا فی الدار لجالس اگر تو کہے: ان زیدا لفی الدار لجالس تو یہ بھی جائز ہے اگر تو کہے: ان زیدا جالس لفی الدار تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا کیونکہ لام اس لیے لایا جاتا ہے تا کہ اس کے ساتھ ان کے اسم اور اس کی جزا کی تاکید لائی جائے جب تو ان دونوں کو لا چکے تو یہ جائز نہیں کہ تو اس لام کو لائے اس طرح اگر تو کہے: ان زیدا الجالس لفی الدار یہ بھی جائز نہیں۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۟ؕ

"کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے کیا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے وہ زیادہ تھے ان سے زور میں اور انہوں نے خوب ہل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے آباد کیا اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر پس نہ تھی اللہ کی یہ شان کہ وہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے"۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا اپنی آنکھوں اور دلوں سے دیکھیں۔ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ یعنی زمین کو زراعت کے لیے الٹ پلٹ کیا کیونکہ اہل مکہ کاشتکار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تُثِيْرُ الْاَرْضَ (البقرہ: 71)

وَ عَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا ان لوگوں نے اسے آباد کیا اس سے بڑھ کر جس قدر ان لوگوں نے اسے آباد کیا ان کی عمارت اور مدت کی طوالت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ بینات سے مراد معجزات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد احکام ہیں انہوں نے کفر کیا اور ایمان نہ لائے۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ انہیں ان گناہوں کے بغیر، رسولوں کے مبعوث کیے بغیر اور دلیل کے بغیر ہلاک کرے وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ وہ شرک اور نافرمانی کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟۠

"آخر کار ان کا انجام جنہوں نے برائی کی تھی بہت برا ہوا کیونکہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو اور وہ ان کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے"۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى، السُّوْٓاٰۤى یہ سوء سے فعلی کا وزن ہے یہ اسوء کا مونث ہے جس کا معنی قبیح ترین ہے جس طرح حسنیٰ یہ احسن کا مونث ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے یہاں نار (جہنم) مراد ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اَسَآءُوا کا معنی ہے انہوں نے شرک کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ دلالت کرتا ہے۔ السوءیٰ جہنم کا نام ہے جس طرح حسنیٰ جنت کا نام ہے۔ اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اصل میں لأن کذبوا تھا؛ یہ کسائی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اصل میں بان کذبوا تھا۔ نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے پڑھا ثم کان عاقبۃ الذین یہ رفع کے ساتھ کان کا اسم ہے اسے مذکر ذکر کیا کیونکہ اس کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ السوءیٰ کان کی خبر ہے۔ باقی قراء نے کان کی خبر کی وجہ سے اسے منصوب پڑھا ہے۔ السوءیٰ یہ رفع کے ساتھ کان کا اسم ہے یہ بھی جائز ہے کہ اس کا اسم التکذیب ہو تقدیر

کلام یہ ہو گی۔ ثم کان التکذیب عاقبة الذین اساءوا اور السوءی یہ اساءوا کا مفعول مطلق ہو گا یا محذوف کی صفت ہو گا، یعنی الخلة السوءی اعمش سے مروی ہے۔ انہوں نے پڑھا ثم کان عاقبة الذین أساء والسوء یعنی السوء پر رفع پڑھا۔ نحاس نے کہا: اسوء سے مراد شدید ترین شر ہے السوءی اس سے فعلی کا وزن ہے۔ اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ آیات اللہ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: مراد عذاب ہے جو ان پر نازل ہو گا۔ ضحاک نے کہا: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں (1)۔ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ تعالیٰ ابتدا کرتا ہے تخلیق کی پھر (فنا کرنے کے بعد) دوبارہ پیدا کرے گا اسے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس روز برپا ہو گی قیامت مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی اور نہیں ہوں گے ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے شفاعت کرنے والے اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے''۔

ابوعمرو اور ابوبکر نے یرجعون یاء کے ساتھ پڑھا اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ابوعبدالرحمٰن سلمی نے یبلس لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا لغت میں معروف یہ ہے أبلس الرجل جب وہ خاموش ہو جائے اور اس کی محبت منقطع ہو جائے، اور اسے امید نہ ہو کہ اس کے لیے حجت ہو، اس کے قریب قریب تحیر ہے جس طرح حجاج نے کہا:

يا صاحِ هل تَعرِفُ رَسْمًا مُكْرِها   قال نعم أعرفه و أبْلَسَا(2)

اے میرے ساتھی! کیا تو رسم مکرسی جانتا ہے اس نے کہا ہاں میں اسے پہچانتا ہوں اور متحیر ہو گیا۔

بعض نحویوں کا خیال ہے کہ ابلیس اس سے مشتق ہے وہ متحیر ہو گیا کیونکہ اس کی صحبت منقطع ہو گئی اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح اس نے کہا تو یہ اسم منصرف ہوتا جب کہ قرآن میں یہ غیر منصرف ہے۔ زجاج نے کہا: مبلس سے مراد ایسی خاموش ہے جس کی حجت منقطع ہو جائے اور ہدایت پانے سے مایوس ہو جائے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے جن کی عبادت کی شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ انہوں نے کہا: وہ معبود نہیں انہوں نے معبودوں سے براءت کا اظہار کر دیا اور معبودوں نے ان سے براءت کا اظہار کر دیا جس طرح پہلے کئی مواقع پر گزر چکا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور جس روز برپا ہو گی قیامت اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے تو وہ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 301
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 331

رہے تھے وہ باغ (جنت) میں مسرور (اور محترم) ہوں گے"۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ یعنی مومن کافروں سے جدا ہو جائیں گے۔ پھر اس امر کی وضاحت کی کہ وہ کیسے جدا جدا ہوں گے فرمایا: فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا نحاس نے کہا: میں نے زجاج کو کہتے ہوئے سنا: اما کا معنی ہے جس بحث میں ہم پڑے ہوئے ہیں اس کو چھوڑ دو اور کسی دوسری بات میں شروع ہو جاؤ؛ سیبویہ نے اسی طرح کہا ہے۔ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ضحاک نے کہا: روضہ سے مراد باغ ہے اور ریاض سے مراد باغات ہیں۔ ابو عبید نے کہا: روضہ اسے کہتے ہیں جو نشیبی جگہ میں ہو جب وہ بلند جگہ ہو تو اسے ترعۃ کہتے ہیں۔ ایک اور عالم نے کہا: بہترین روضہ وہ ہوتا ہے جو وہ بلند جگہ پر ہو۔ اعمش نے کہا:

ما رَوْضَةٌ من رياض الحَزْن مُعْشِبَةٌ خَضْرَاء جَادَ عليها مُسْبِلٌ هَطِلُ (1)

يضاحِكُ الشمسَ منها كوكَبٌ شَرِقٌ مُؤَزَّرٌ بعميم النَّبْتِ مُكْتَهِلُ

يومًا بأَطْيَبَ منها نَشْرَ رائحةٍ ولا بأحسنَ منها إذ دَنَا الأُصُلُ

اونچی جگہ کے باغوں سے بڑھ کر کوئی باغیچہ جو گھاس والا ہو سرسبز و شاداب ہو جس پر موسلا دھار بارش نے سخاوت کی ہو پانی سے لبریز کلیاں سورج کے گرد گھومتی ہیں جنہوں نے مکمل نباتات کا تہبند باندھ رکھا ہے اور وہ نباتات اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے کوئی دن اس سے بڑھ کر زیادہ خوشبو والا نہیں ہوتا اور نہ ہی عصر کے وقت اس سے زیادہ جمال والا ہوتا ہے۔

روضہ نہیں کہا جاتا مگر جب اس میں گھاس ہو اگر اس میں گھاس نہ ہو اور وہ بلند جگہ پر ہو تو اسے ترعہ کہتے ہیں۔ ترعۃ کی تعبیر میں اور اقوال بھی ہیں۔ قشیری نے کہا: عربوں کے نزدیک روضہ سے مراد تالاب کے اردگرد سبزیاں ہیں عربوں کے ہاں اس سے حسین ترین چیز کوئی نہیں ہوتی۔ جوہری نے کہا: اس کی جمع روض اور ریاض آتی ہے واؤ یاء ہو گئی ہے کیونکہ اس کا ماقبل مکسور ہے۔ روض جب پانی کی مشکیزہ میں اس کے نصف تک ہو اور حوض میں روضہ اس وقت بولتے ہیں جب پانی اس کے نچلے حصہ کو ڈھانپے ہوئے ہو۔ ابو عمرو نے شعر پڑھا:

ورَوْضَةٍ سَقَيْتُ منها نِضْوَتِي

کتنے ہی تالاب ہیں جن سے میں نے اپنی سواری کو سیراب کیا۔

يُحْبَرُوْنَ ضحاک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے ان کی عزت کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر انعام کیا جائے گا؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ خوش ہوں گے۔ سدی نے کہا: وہ خوش ہوں گے۔ عربوں کے ہاں حبرہ سے مراد سرور و فرحت ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ جوہری نے کہا: حَبر سے مراد حبور ہے جس کا معنی سرور ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: حَبَرَهُ يَحْبُرُهُ حَبْرًا وحَبْرَة۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ یعنی ان پر انعام کیا جائے گا، ان کی تعظیم کی جائے گی اور وہ خوش ہوں گے۔ رجل يحبور یفعول کا وزن ہے جو حبور سے مشتق ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی نے حکایت بیان کی ہے حبرته، میں نے اس کی تعظیم کی میں نے اس پر انعام کیا۔ میں نے علی بن

1۔ تفسیر طبری، جز 21-22، صفحہ 33 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 331

سلیمان کو کہتے ہوئے سنا۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: علی اسنانه حبرة یعنی اس کے دانتوں پر اثر ہے۔ یحبرون ان پر نعمتوں کا اثر ہے۔ حبر اس سے مشتق ہے۔ شاعر نے کہا:

لا تملأ الدَّلْوَ و عَرِّق فيها أما ترى حَبارَ من يَسْقيهَا

ڈول کو نہ بھر اس میں کچھ جگہ خالی چھوڑ کیا جو پانی پلاتا ہے اس کی فضیلت کو نہیں جانتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اصل تحبیر ہے جس کا معنی ''تحسین'' ہے یحبرون جس کو حسین بنایا جاتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان حسین الحبر و السبر جب وہ جمیل اور اچھی حالت والا ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: فلاں حسن الحبر و السبر یہ گویا تیرے اس قول کا مصدر ہے حبرتُه حَبرًا جب تو اس کو حسین بنائے۔ پہلا اسم ہے۔

اسی معنی میں حدیث ہے: یخرج رجل من النار ذهب حبره و سبره ایک آدمی جہنم سے نکلے گا تو اس کا حسن جا چکا ہوگا۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ کا معنی ہے وہ جنت میں غنائیں گے؛ یہ اوزاعی کا قول ہے۔ کہا: جب جنتی سماع شروع کریں گے تو جنت میں کوئی درخت نہیں ہوگا مگر وہ تسبیح و تقدیس کے ساتھ اس نغمہ کا جواب دے گا۔ اوزاعی نے کہا: حضرت اسرافیل سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی اچھی آواز والا نہیں جب وہ شروع کریں گے تو ساتوں آسمان والے اپنی نمازیں اور تسبیحات ترک کر دیں گے (1)۔

امام اوزاعی کے علاوہ دوسرے علماء نے کہا: جنت میں کوئی درخت نہیں ہوگا مگر وہ اس کا جواب دے گا۔ کوئی پردہ اور دروازہ نہیں ہوگا مگر اس میں ارتعاش پیدا ہوگا اور وہ کھل جائے گا کوئی حلقہ نہیں رہے گا مگر مختلف آوازوں کے ساتھ بجنے لگے گا۔ اور سونے کی جھاڑیوں میں سے کوئی جھاڑی نہ بچے گی مگر ان کے تنوں سے آواز واقع ہوگی اور وہ تنے بانسری کے نغمے الاپنے لگیں گے، حورعین میں سے کوئی لونڈی نہ رہے گی مگر وہ اپنے نغمے الاپنے لگے گی اور پرندے اپنی سریلی آوازوں میں گانے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو وحی کرے گا کہ انہیں جواب دو اور میرے ان بندوں کو سناؤ جنہوں نے اپنے کانوں کو شیاطین کے مزامیر سے پاک رکھا وہ مختلف روحانی سروں اور آوازوں کے ساتھ جواب دیں گے آوازیں مل جائیں گی تو سب ایک ہی مخلوط آواز بن جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اے داؤد! میرے عرش کے پائے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور میری بزرگی بیان کرو۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے رب کی بزرگی ایسی آواز سے بیان کرنے میں شروع ہو جائیں گے جو تمام آوازوں پر غالب آ جائے گی، انہیں جلا بخشے گی اور لذت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے: فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ، ترمذی حکیم نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ثعلبی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے (2)۔ آپ نے جنت اور اس میں جو کچھ بیویاں اور نعمتیں ہیں ان کا ذکر کیا، لوگوں کے پیچھے ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنت میں سماع ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔ اے بدو! جنت میں ایک نہر ہوگی جس کے دونوں کناروں پر باکرہ عورتیں ہوں

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 292
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 471

گی جو پتلی کمروں والی ہوں گی جو مختلف آوازوں میں گانا گائیں گی۔ جس کی مثل مخلوق نے نہ سنا ہوگا یہ جنت کے نعمتوں میں سے افضل نعمت ہوگی''۔ ایک آدمی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے سوال کیا؟ وہ کیا نغمے گائیں گی؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی تسبیح''۔ خمصانیہ سے مراد جن کالباس اعلیٰ، پتلی کمر اور نچلے والا دھڑ ضخیم۔

میں کہتا ہوں: یہ سب نعیم، سرور اور اکرام میں سے ہے اقوال میں کوئی تعارض نہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے کیا نسبت رکھتے ہیں۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدہ: 17) جس کا ذکر آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فیھا مالا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر اس میں ایسی نعمتیں ہوں گی جن کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہوگا، کسی کان نے نہیں سنا ہوگا اور کسی انسان کے دل پر اس کا کھٹکا بھی نہ ہوا ہوگا۔ یہ روایت کی گئی ہے: ''جنت میں ایسے درخت ہیں جن پر چاندی کی گھنٹیاں ہوں گی جب اہل جنت سماع کا ارادہ کریں گے اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے ایک ہوا بھیجے گا وہ گھنٹیاں ایسی آواز کے ساتھ قرأت کریں گی اگر اہل دنیا اس کو سنیں تو خوشی سے مرجائیں'' (1)۔ یہ زمخشری نے ذکر کیا۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے''۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ سے مراد بعث ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ وہ عذاب میں مقیم رہیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جمع ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نازل ہوں گے، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اذا حضر احدکم الموت یہاں بھی موت نازل ہوگی؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے، معنی قریب قریب ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں نیز (پاکی بیان کرو) سہ پہر کو جب تم دوپہر کرتے ہو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ اس میں تین قول ہیں (۱) ان اوقات میں عبادت کے امر اور نماز پر برانگیختہ کرنے کے ساتھ مومنوں کو خطاب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر ہے (2)۔ آپ سے عرض کی

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 471
2۔ تفسیر طبری، جز 21-22، صفحہ 35

گئی کہاں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ اس سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ مراد صبح کی نماز ہے۔ وَ عَشِیًّا عصر کی نماز۔ وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ مراد ظہر کی نماز ہے؛ یہ ضحاک اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا یہ قول ہے: آیت میں چار نمازوں پر تنبیہ ہے مغرب، صبح، عصر اور ظہر۔ علماء نے کہا عشاء ایک اور آیت میں ہے۔ وہ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (ہود: 114) اور پردہ کے اوقات میں ہے۔ نحاس نے کہا: اہل تفسیر کا کہنا ہے کہ یہ آیت فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ نمازوں کے متعلق ہے۔ میں نے حضرت علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا اس کی حقیقت میرے پاس ہے نمازوں میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو کیونکہ تسبیح نماز میں ہوتی ہے۔ یہ دوسرا قول ہے۔ تیسرا قول ہے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پہلا قول ذکر کیا ہے اس میں لفظ ہے: اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔ نماز کو تسبیح کا نام دینے کی دو وجہیں ہیں: (۱) نماز رکوع اور سجود میں تسبیح کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے (۲) یہ سبحہ سے ماخوذ ہے سبحہ کا معنی نماز ہے۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تکون لهم سبحة یوم القیامة قیامت کے روز ان کی نماز ہوگی (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات پر حمد کے درمیان یہ جملہ معترضہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وَ لَهُ الْحَمْدُ کا معنی ہے نماز اسی کے لیے ہے کیونکہ نماز حمد کی قراءت کے ساتھ خاص ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد اللہ تعالیٰ کی ایک قسم کی تعظیم ہے، اس کی عبادت پر برانگیختہ کرتا ہے اور اس کی نعمت کے دوام پر دلیل ہے۔ یہ نماز کے علاوہ ایک قسم ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ نماز مغرب سے اس کا ذکر شروع کیا کیونکہ رات دن پر مقدم ہوتی ہے سورۂ اسراء میں ظہر کی نماز سے شروع کیا کیونکہ یہ پہلی نماز ہے جو جبریل امین نے پڑھی۔ ماوردی نے کہا: رات کی نماز کو تسبیح کے نام اور دن کی نماز کو حمد کے نام کے ساتھ خاص کیا کیونکہ انسان کو دن کے وقت میں مختلف کاموں میں ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کو واجب کرتے ہیں۔ رات میں خلوت ہوتی ہے جو تمام برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پاکی کو واجب کرتے ہیں، اسی وجہ سے دن کے وقت حمد خاص ہوئی اس کے ساتھ دن کی نماز کا نام رکھا اور رات کے وقت تسبیح خاص ہوئی اس کے ساتھ رات کی نماز کا نام رکھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ عکرمہ نے پڑھا ہے حینا تمسون و حینا تصبحون اصل کلام یوں ہے حینا تمسون فیه و حینا تصبحون فیه تخفیف کے لیے فیه کو حذف کر دیا۔ اس میں گفتگو اسی طرح ہے جس طرح اس ارشاد میں گفتگو ہے: وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْــًٔا (البقرہ: 48) وَ عَشِیًّا جوہری نے کہا: العشی والعشیة سے مراد مغرب کی نماز سے رات کے ایک تہائی کا وقت ہے تو کہتا ہے: أتیته عشیة أمس وعشی أمس، عشی کی تصغیر عُشَیَّان ہے۔ یہ اپنے مکبر سے خلاف قیاس ہے، گویا انہوں نے اس کی تصغیر عَشْیَان بنائی۔ اس کی جمع عُشَیَّانَات ہے۔ اس کی تصغیر میں عشیشیان ہے جمع عُشَیْشِیَات ہے عشیة کی تصغیر عشیتیة ہے جمع عُشَیْشِیَات ہے۔ عشاء کسرہ اور مد کے ساتھ عَشِی کی مثل ہے عشاء ان

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 303

سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے۔ عشاء سے مراد سورج کے زوال سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت ہے۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا:

غدونا غدوۃ سحرا بلیل　　عشاء بعد ما انتصف النہار

اس شعر میں بھی عشاء کا لفظ نصف النہار کے بعد سے لے کر اگلے دن کی صبح تک کا لیا گیا ہے۔

ماوردی نے کہا: مساء اور عشاء کے درمیان فرق یہ ہے کہ مساء سے مراد سورج کے غروب ہونے کے بعد تاریکی کا شروع ہونا ہے (1)۔ عشاء سے مراد دن کا آخری پہر ہے جب سورج غروب ہونے کے لیے جھکے۔ یہ عشاء العین سے ماخوذ ہے جس سے مراد آنکھ کے نور کا کم ہونا ہے جس طرح سورج کا نور کم ہو جاتا ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿١٩﴾

”نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور یونہی (قبروں سے) تمہیں نکالا جائے گا“۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کو بیان کیا یعنی جس طرح اس نے زمین کو زندہ کیا اس سے نباتات کو نکال کر، جب کہ اس کا نام و نشان نہ تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ اٹھانے کے ساتھ زندہ کرے گا۔ اس میں قیاس کی صحت پر دلیل ہے۔ سورۂ آل عمران میں یُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کی وضاحت گزر چکی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۚ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿٢٦﴾

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 304

"اور اس (کی قدرت کی) نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر تم اچانک بشر بن کر (زمین میں) پھیل رہے ہو اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے اور پیدا فرما دیئے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے نیز تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، بے شک اس میں بھی نشانیاں ہیں اہل علم کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات کے وقت اور دن کے وقت اور تمہارا تلاش کرنا اس کے فضل کو، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی ڈرانے اور امید دلانے کے لیے اور اتارتا ہے آسمان سے پانی اور زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل مند ہیں۔ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے پھر جب بلائے گا تمہیں زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کے تابع فرمان ہیں"۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اس کی ربوبیت اور اس کی وحدانیت کی علامات میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا یعنی تمہارے جد اعلیٰ کو مٹی سے پیدا کیا اور فرع اصل کی طرح ہوتی ہے۔ سورۂ الانعام میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ ان محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اسی طرح اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔

ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ پھر تم عقلاء ہو، بامعنی کلام کرتے ہو، ایسے امور میں تصرف کرتے ہو جو تمہاری معاش کا سہارا ہیں اس کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہیں عبث پیدا کرے جو اس پر قادر ہے وہ عبادت اور تسبیح کا اہل ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا یعنی عورتیں جن سے تم سکون حاصل کرتے ہو۔ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ مردوں کے نطفہ سے اور اپنی جنس سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت حوا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا کیا: یہ قتادہ کا قول ہے(1)۔ وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: مودۃ سے مراد جماع ہے اور رحمت سے مراد ولد ہے؛ یہ قول حضرت حسن بصری نے بھی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مودۃ اور رحمۃ سے مراد ان کے دلوں کا ایک دوسرے پر مہربانی کرنا ہے۔ سدی نے کہا: مودۃ سے مراد محبت اور رحمۃ سے مراد شفقت ہے۔ یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: مودۃ سے مراد مرد کا اپنی عورت سے محبت کرنا ہے اور رحمۃ سے مراد مرد کا اپنی عورت کے بارے میں رحیم ہونا کہ اسے کوئی اذیت پہنچائے۔ یہ کہا جاتا ہے: مرد کی اصل زمین ہے اس میں زمین کی قوت ہے اس میں شرمگاہ ہے جس سے اس کی تخلیق کا آغاز ہوا تو اسے ضرورت تھی کہ جس سے وہ سکون حاصل کرے عورت کو پیدا کیا گیا تاکہ مرد اس سے سکون حاصل

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 305

کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اور فرمایا: وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا مرد کو عورت سے پہلا فائدہ جو ہوتا ہے وہ یہ ہے اسے عورت سے سکون حاصل ہوتا ہے کیونکہ مرد میں قوت کا جوش ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شرمگاہ اس میں موجود ہے تو پشت کا پانی اس کی طرف ہیجان کرتا ہے تو مرد عورت سے ہی سکون حاصل کرتا ہے اور عورت کے ذریعے وہ اس ہیجان سے خلاصی پاتا ہے۔ عورتوں کے بضع مردوں کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (الشعراء: 166) اللہ تعالیٰ نے مردوں کو آگاہ کیا کہ عورتوں کا وہ حصہ مردوں کے لیے پیدا کیا گیا تو عورت پر لازم ہے کہ خاوند جب بھی اسے دعوت دے وہ اسے پیش کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے سے رک جاتی ہے تو وہ ظالم اور حرج عظیم میں مبتلا ہے۔ تیرے لیے وہ حدیث کافی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! جو مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر آنے کی دعوت دیتا ہے وہ عورت اس کے پاس آنے سے انکار کر دیتی ہے تو آسمان میں جو بھی ہے وہ اس پر ناراض ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خاوند اس عورت پر راضی ہو جائے'' (1)۔ ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں: ''جب ایک عورت اپنے خاوند کے بستر سے علیحدہ رات گزارتی ہے تو فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ صبح کرتی ہے'' (2)۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وہ اعتراف کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ زبان منہ میں ہوتی ہے اس کی کئی لغتیں ہیں: عربی، عجمی، ترکی اور رومی۔ رنگوں کا اختلاف صورتوں میں ہوتا ہے سفید، سیاہ، سرخ۔ تو کسی کو نہیں دیکھے گا مگر تو اس کے اور اس کے غیر میں فرق کر لے گا۔ یہ نطفہ کے افعال نہیں، یہ والدین کے افعال میں سے نہیں، کسی نہ کسی فاعل کا ہونا ضروری ہے تو اس سے معلوم ہو گیا کہ فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مدبر اور باری (خالق) ہونے پر قطعی دلیل ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ اس میں نیک و بد کے لیے نشانیاں ہیں۔ حفص نے اسے للعالمین لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ عالم کی جمع ہے۔ وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس آیت میں تقدیم و تاخیر کا قاعدہ ہے۔ معنی ہے اس کی آیات میں سے ہے کہ تم رات کو سو جاتے ہو اور دن کے وقت اس کا فضل تلاش کرتے ہو۔ النہار سے پہلے حرف جار کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ اللیل کے ساتھ متصل ہے اور النہار کا عطف اللیل پر ہے۔ واؤ عاطفہ حرف جر کے قائم مقام ہو جاتا ہے جب وہ معطوف علیہ کے ساتھ متصل ہو خصوصاً اسم ظاہر میں۔ رات کے وقت نیند کو موت پر دلیل بنایا اور دن کے وقت تصرف کو بعث پر دلیل بنایا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ یہاں سماع سے مراد تفہیم اور تدبر کا سماع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حق سنتے ہیں اور اس کی اتباع کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ وعظ کو سنتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قرآن سنتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان سب سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جب قرآن پڑھا جاتا اور وہ حاضر ہوتے تو وہ اپنے کانوں کو بند کر لیتے یہاں

1۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 464　　2۔ ایضاً

تک کہ وہ اسے نہ سنتے، اللہ تعالیٰ نے ان دلائل کو ان پر واضح کیا۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے أن یریکم، أن کو حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ طرفہ نے کہا:

أَلَا أَیُّهٰذَا اللَّائِمِی أَحْضُرُ الوَغَی وأن أشْهَدَ اللَّذَّاتِ هل أنت مُخْلِدِی(1)

اے مجھے ملامت کرنے والے کہ میں جنگ میں حاضر ہوتا ہوں اور لذات میں حاضر ہوتا ہوں کیا تو مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر سکتا ہے؟

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یریکم البرق من آیاته وہ اپنی آیات میں سے تمہیں بھی دکھاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے ومن آیاته آیة یریکم بها البرق اس کی آیات میں سے ایسی آیت ہے جو تمہیں بجلی دکھاتی ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

وما الدّهر إلّا تارتان فمنهما أموتُ و أُخْرَی أبتغی العیش أكْدَحُ(2)

زمانہ نہیں مگر دو باریاں ان میں ایک میں مرتا ہوں اور دوسری باری میں زندگی کے لیے تگ و دو کرتا ہوں۔ شعر میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی آیات میں سے ہے وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے اپنی آیات سے ڈرانے اور طمع دلانے کے لیے؛ یہ زجاج کا قول ہے، پس جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ خَوْفًا مسافر کو خوف دلانے وَّ طَمَعًا اور مقیم کو امید دلانے کے لیے؛ یہ قتادہ کا قول ہے(3)۔ ضحاک نے کہا: کڑک سے خوف اور بارش میں طمع دلانے کے لیے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: سردی سے خوف کہ کہیں کھیتی ہلاک ہی نہ ہو جائے(4)۔ وَّ طَمَعًا اور بارش میں طمع کے لیے کہ وہ کھیتی کو زندہ کرے۔ ابن بحر نے کہا: خوف اس چیز کا کہ بجلی ایسی بجلی نہ ہو جو نظروں کو اچک ہی نہ لے اور بارش نہ برسائے اور بارش برسانے کی طمع(5)۔ شاعر کا شعر پڑھا:

لایکن بَرْقُكَ برقًا خُلَّبًا إنّ خیر البرق ما الغیث معه(6)

تیری بجلی برق خلب نہ ہو بہترین بجلی وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ بارش بھی ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فقد أرِدُ المیاهَ بغیر زاد سوی عدّی لها برق الغمام

برق خلب اسے کہتے ہیں جس میں بارش نہیں ہوتی گویا وہ دھوکہ کرنے والی ہوتی ہے اسی معنی میں اسے کہا جاتا ہے جو وعدہ کرے اور اسے پورا نہ کرے: إنما أنت كبرق خلب۔ خلب ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں جس میں بارش نہ ہو۔ یوں بھی کہا جاتا ہے: برق خلبٍ یعنی مضاف مضاف الیہ کی صورت میں۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 333 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 334
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 307 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ اس کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ان محل رفع میں ہے جس طرح یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ آسمانوں کا قیام اور ان کا ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ بغیر ستونوں کے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کی تدبیر اور اس کی حکمت کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کے منافع کے لیے بغیر ستونوں کے انہیں روکے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مخلوق کے منافع کے لیے بغیر ستونوں کے روکے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بامرہ سے مراد باذنہ ہے معنی ایک ہی ہے۔

ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ وہ ذات جس نے یہ اشیاء بنائیں وہ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہیں تمہاری قبروں سے اٹھائے۔ مراد یہ ہے اس کا وجود تیزی سے ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا توقف اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا جس طرح اس بلانے والے کو بلایا جانے والا جواب دیتا ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہو، جس طرح کسی قائل نے کہا:

دَعَوْتُ كُلَيبا باسمه فكأنما دَعَوْتُ برأس الطَّوْد أو هو أسرع

میں نے کلیب کو اس کے نام سے بلایا گویا میں نے صدائے بازگشت کو دعوت دی یا اس سے بھی وہ تیز تھا۔

راس الطود سے مراد وہ صدائے بازگشت لیتا ہے یا وہ پتھر جو لڑھکتا ہے۔ اس کا عطف السموات اور الارض پر ثم سے کیا کیونکہ اس امر سے جو وقوع پذیر ہوگا وہ بہت ہی عظیم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا ایسی چیزوں پر قادر ہونا یہ بھی اس کی عظمت پر دلیل ہے۔ وہ یہ فرمائے گا: یا اهل القبور قوموا اے قبر والو! اٹھ کھڑے ہو۔ تو اولین و آخرین میں سے کوئی روح نہ ہوگی مگر وہ دیکھنے لگے گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ۝ (الزمر)

پہلا اذا جو اِذَا دَعَاكُمْ میں ہے شرط کے لیے ہے اور دوسرا اذا جو اِذَاۤ اَنْتُمْ میں ہے مفاجات کے لیے ہے۔ یہ اس فاء کے قائم مقام ہے جو جواب شرط میں ہوتی ہے قراء کا یہاں تاء کے فتحہ میں جو تخرجون میں ہے سب کا اتفاق ہے سورۂ اعراف میں جو تاء ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اہل مدینہ نے اسے ومنها تخرجون تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل عراق نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو عبید اسی کی طرف میلان رکھتے ہیں دونوں معنی قریب قریب ہیں مگر اہل مدینہ نے سیاق کلام کی وجہ سے دونوں میں فرق کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں سیاق کلام ضمہ کے زیادہ مشابہ ہے، یعنی جب وہ تمہیں دعوت دے گا تو تم نکل پڑو گے یعنی تم اطاعت کرو گے تو فعل ان کے مناسب ہے۔ یہ نکلنا اس وقت ہوگا جب حضرت اسرافیل دوسرا نفخہ پھونکیں گے جس طرح پہلے گزرا اور بعد میں آئے گا۔ اسے تخرجون تاء کے ضمہ اور اس کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، زمخشری نے اسے ذکر کیا اور اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور جو ہم نے فرق بیان کیا ہے اس کا ذکر بھی نہیں کیا؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، خلق، ملک اور بندہ ہونے کے اعتبار سے آسمان وزمین اسی کے ہیں۔

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ حضرت ابو سعید خدری بنی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں: كل قنوت في القرآن فهو طاعة قرآن حکیم میں جہاں بھی قنوت کا لفظ ہے اس سے مراد طاعت ہے۔ حسن نے کہا: وہ اتقیاد کی سی طاعت کرتے ہیں۔ ایک قول

یہ کیا گیا ہے: قٰنِتُوْنَ وہ عبودیت کا اقرار کرتے ہیں خواہ وہ قولا ہو یا دلالۃ ہو؛ یہ قول عکرمہ، ابو مالک اور سدی کا ہے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قانتون کا معنی ہے اس کی نماز پڑھتے ہیں (2)۔ ربیع بن انس نے کہا: اس کا معنی ہے قیامت کے روز اس کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے (3)، جس طرح فرمایا: یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ (المطففین) اس روز لوگ حساب کے لیے کھڑے ہوں گے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سب یہ گواہی دیں گے کہ وہ ہر ایک اس کا بندہ ہے (4)۔ سعید بن جبیر نے کہا: قٰنِتُوْنَ کا معنی ہے وہ مخلص ہوں گے (5)۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝

''اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر (فنا کرنے کے بعد) اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ آسان تر ہے اس کے لیے اور اسی کے لیے برتر شان ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے''۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ پیدائش کا آغاز کرنے سے مراد رحم میں اس کی ولادت سے قبل نطفہ کو رحم کے ساتھ چسپاں کرنا ہے، جہاں تک اس کے اعادہ کا تعلق ہے تو موت کے بعد بعث کے لیے دوسرے نفخہ کے ساتھ اسے زندہ کرنا ہے انسان کی پیدائش کا آغاز جو معلوم ہے اسے اس کے اعادہ پر دلیل بنایا ہے جو مخفی ہے یہ غائب کا شاہد پر استدلال کرنا ہے۔ پھر اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ موکد کیا: وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم یبدی الخلق کو ابدء یبدئ سے قراءت کی ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ۝ (البروج) عام قراءت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ۝ (الاعراف) ھون، ھین کے معنی میں ہے یعنی دوبارہ زندہ کرنا اس پر آسان ہے: یہ ربیع بن خثیم اور حضرت حسن بصری کا قول ہے (6)۔ ھون یہ ھین کے معنی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی چیز کسی شے کے مقابلہ میں آسان نہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: جس نے اھون کی تعبیر یہ کی کہ ایک شے دوسری شے پر فضیلت رکھتی ہے اس کا قول اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ مردود ہے۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا۝ (النساء) اور اس فرمان کے ساتھ مردود ہے۔ وَ لَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا (البقرہ: 255) عرب افعل کے صیغہ کو فاعل پر محمول کرتے ہیں۔ اسی معنی میں فرزدق کا قول ہے:

إن الذی سَمَكَ السماء بنى لنا ۔۔۔ بيتًا دعائمه أعز وأطول

وہ ذات جس نے آسمان بنایا اس نے ہمارے لیے ایسا گھر بنایا جس کے ستون مضبوط اور طویل ہیں۔

اس شعر میں أعز اور اطول، عزیزۃ طویلۃ کے معنی میں ہیں۔ ایک اور شاعر نے کہا:

لَعَمْرُكَ ما أدری وإنی لأَوْجَل ۔۔۔ علی أينا تَعْدُو المنية أول

تیری زندگی کی قسم! میں نہیں جانتا جب کہ میں ڈر رہا ہوں کہ ہم میں سے کس پر پہلے موت آ جائے گی۔ شعر میں اوجل سے مراد وجل ہے۔ ابو عبیدہ نے یہ شعر پڑھا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 309 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 310

إنّي لأمْنَحُكَ الصُّدودَ وإنَّني قَسَمًا إليكَ مَعَ الصُّدودِ لأمْيَلُ

میں تجھے بے توجہی دوں گا تیری قسم! میں اس بے توجہی کے باوجود مائل ہوں۔

اس شعر میں بھی امیل، مائل کے معنی میں ہوگا۔

احمد بن یحییٰ نے یہ شعر پڑھا:

تَمَنّى رجالٌ أن أموتَ وإن أمُتْ فتلكَ سبيلٌ لستُ فيها بأوْحَدِ

لوگ میری موت کی آرزو کرتے ہیں اگر میں مر گیا تو وہ ایسا راستہ ہے جس میں میں تنہا نہیں۔

اس شعر میں بھی اوحد، واحد کے معنی میں ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

لعمرك إنّ الزبرقان لباذلٌ لمعروفه عند السنين وأفضلُ

تیری زندگی کی قسم! زبرقان مال خرچ کرنے والا ہے اس کی نیکی کئی سالوں تک فضیلت رکھتی ہے۔

یہاں بھی افضل، فاضل کے معنی ہے۔ اس کے معنی میں ان کا قول ہے: اللہ اکبر اس کا معنی ہے اللہ کبیر۔ معمر نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں ہے: وھو علیہ ھین مجاہد، عکرمہ اور ضحاک نے کہا: معنی ہے اللہ تعالیٰ پر دوبارہ زندہ کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے آسان ہے(1)۔ اگرچہ سب امور اللہ تعالیٰ پر آسان ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے بیان فرمائی ہے(2)۔ ارشاد فرمایا: مخلوقات پر شے کو لوٹانا اس کی ابتدا سے آسان ہوتا ہے تو چاہیے کہ جو تمہارے نزدیک اور تمہارے درمیان شروع کرنے پر قادر ہے اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: علیہ میں ضمیر مخلوقین کے لیے ہو، یعنی مخلوق پر آسان ہو۔ ان پر ایک چیخ ماری جائے گی وہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور انہیں کہا جائے گا: ہو جاؤ تو وہ ہو جائیں گے یہ ان پر آسان ہو جائے گا کہ وہ نطفہ ہوں، جما ہوا خون ہوں پھر مضغہ ہوں پھر جنین ہوں پھر طفل ہوں پھر غلمان ہوں پھر جوان ہوں پھر مرد و عورت ہوں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قطرب نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اھون کا معنی ہے زیادہ آسان۔

ربیع بن خثیم نے کہا: وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز غالب نہیں۔ عکرمہ نے کہا: کفار نے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں تعجب کا اظہار کیا تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ اللہ تعالیٰ نے جو بھی ارادہ کیا وہ ہو گیا۔ خلیل نے کہا: مثل سے مراد صفت ہے، یعنی اس کی اعلیٰ شان ہے۔ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جس طرح فرمایا: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (الرعد:35) یہاں مثل سے مراد صفت ہے۔ اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ مجاہد سے مروی ہے: الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ سے مراد لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے جس کے لیے اعلیٰ وصف ہے وہ ارفع ہے جس کی صفت وحدانیت ہے۔ قتادہ نے بھی اسی طرح کہا: مثل اعلیٰ یہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ

1۔ تفسیر طبری، جز 21-22، صفحہ 43
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 310

فرمان کرتا ہے: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (الروم: 28) جس کی وضاحت ہم ابھی کریں گے ان شاء اللہ۔ زجاج نے کہا: وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مثال بیان کی ہر ایسی چیز میں جو مشکل ہے اور آسان ہے؛ وہ پہلی تفسیر کا ارادہ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کی مثل کوئی بھی نہیں (1)۔ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۸

''اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ حتی کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم ڈرتے ہو آپس میں ایک دوسرے سے، یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو عقل مند ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فرمایا: مِّنْ اَنْفُسِكُمْ پھر فرمایا: مِّنْ شُرَكَآءَ پھر فرمایا: مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ پہلا من ابتدائیہ ہے گویا فرمایا: اس نے مثال اخذ کی اور تمہارے جو سب سے زیادہ قریبی شے ہے اس سے مثال کو اخذ کیا وہ تمہاری ذاتیں ہیں۔ دوسرا من تبعیض کے لیے ہے، تیسرا من زائدہ ہے استفہام کی تاکید کے لیے ہے۔ آیت قریش کے کفار کے لیے نازل ہوئی۔ وہ تلبیہ میں کہا کرتے تھے لبیك لا شریك لك إلا شریکا هولك تملکه و ما ملك؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ ایسی ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لیے بیان فرمائی ہے۔ معنی ہے کیا تم میں سے کوئی راضی ہے کہ اس کا مملوک اس کے مال اور نفس میں اس کی مثل ہو جب تم خود اس بات پر اپنے لیے راضی نہیں ہو تو تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے کیسے شریک بنا لیے؟

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے کہا: یہ آیت مخلوق میں شرکت میں اصل ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور احتیاج کی اللہ تعالیٰ سے نفی میں اصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تو ضروری ہے کہ وہ کہیں: تو نے جو ہمیں رزق دیا ہے ہمارے غلام ہمارے شریک نہیں۔ انہیں کہا جاتا: تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ تم اپنے آپ کو اپنے غلاموں کی مشارکت سے پاک ہونے کا کہتے ہو اور میرے بندوں کو میری مخلوق میں میرا شریک بنا دیتے ہو۔ یہ حکم فاسد ہے، قلت نظر کا باعث ہے اور دل کے اندھا ہونے پر دال ہے۔ جس کے سردار مالک ہیں جب کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں تو یہ امر باطل ہو گیا کہ عالم میں کوئی ایسی چیز بھی ہو

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 310

جو اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کسی چیز میں شریک ہو۔ جب وہ ایک ہی باقی ہے تو یہ محال ہو گیا کہ اس کا کوئی شریک ہو کیونکہ شرکت معاونت کا تقاضا کرتی ہے جب کہ ہم ایک دوسرے کے مال اور عمل میں معاونت کے محتاج ہیں قدیم ازلی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزہ ہے۔

یہ ایک مسئلہ طالب کے لیے اس چیز سے افضل ہے کہ وہ فقہ کا ایک پورا دیوان یاد کرے کیونکہ تمام عبادات بدنیہ درست نہیں ہوتیں مگر اسی صورت میں جب اس مسئلہ کو دل میں ثبت کیا جائے، اسی نقطہ کو یاد کر لو۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

''بلکہ پیروی کرتے رہے ظالم اپنی (نفسانی) خواہشات کی بغیر کسی دلیل کے۔ پس کون ہدایت دے سکتا ہے جسے (پیہم نافرمانی کے باعث) اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں''۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ جب حجت ان پر قائم ہو گئی تو یہ ذکر کیا کہ وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ ان کی عبادت میں اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں اور اس میں اسلاف کی تقلید کرتے ہیں فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کر دے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں، اس آیت میں قدریہ کا رد ہے۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ان کا کوئی مددگار نہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۤ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

''پس آپ کریں اپنا رخ دین (اسلام) کی طرف پوری یکسوئی سے (مضبوطی سے پکڑ لو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے، کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا اللہ کی تخلیق میں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ زجاج نے کہا: فطرة یہ منصوب ہے معنی ہے اتبع فطرة اللہ۔ کہا: کیونکہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ کا معنی ہے دین حنیف کی اتباع کرو اور اللہ تعالیٰ کی فطرت کی اتباع کرو۔ طبری نے کہا: فطرة اللہ مفعول مطلق ہے(1)۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ کے معنی میں ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: فطر اللہ الناس علی ذلک فطرة۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی ہے اس اللہ کے دین کی اتباع کرو جس نے لوگوں کو اپنے لیے پیدا کیا، اس قول کی بناء پر وقف حنیفا پر تام ہے۔ پہلے دو قولوں کی بنا پر یہ متصل ہو گا۔ حنیفا پر وقف نہیں ہو گا۔ فطرة کو دین کا نام دیا کیونکہ لوگوں کو اس کے لیے پیدا کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان

1۔ تفسیر طبری، جز 21-22، صفحہ 49

ہے: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۞ (الذاریات) یہ کہا جاتا ہے: علیھا، لھا کے معنی میں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7) فَاَقِمْ وَجْهَكَ کے ساتھ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ دین مستقیم کے لیے اپنے رخ کو سیدھا کرنے کا حکم ہے، جس طرح فرمایا: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ الْقَیِّمِ (الروم: 43) اس سے مراد دین اسلام ہے۔ اقامۃ الوجہ سے مراد مقصد اور قوت کو اعمال دین میں تگ و دو کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ وجہ کا خصوصا ذکر کیا کیونکہ یہ انسان کے حواس کو جامع ہے اور انسان کا اشرف حصہ ہے۔ اہل تاویل کا اتفاق ہے کہ اس خطاب میں امت بھی داخل ہے۔ حنیفا کا معنی ہے اعتدال پر ان تمام تحریف شدہ اور منسوخ ادیان سے اعراض کرتے ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا گیا''(1)۔ ایک روایت میں ہے: ''اس ملت پر پیدا کیا گیا اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں، اسے نصرانی بناتے ہیں اور اسے مجوسی بناتے ہیں جس طرح چوپایہ ایک مکمل چوپایہ جنم دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی چیز کٹی ہوئی پاتے ہو''۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے: چاہو تو یہ آیت پڑھو فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔

ایک روایت میں ہے: ''یہاں تک کہ تم اسے کاٹتے ہو'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں بتائیے جو چھوٹی عمر میں فوت ہو جاتا ہے؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے جو وہ عمل کرنے والے تھے''۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** علماء نے اس فطرت کے معنی میں اختلاف کیا ہے جو کتاب و سنت میں مذکور ہے اس میں علماء کے متعدد اقوال ہیں: (1) اس سے مراد اسلام ہے؛ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن شہاب اور اس کے علاوہ دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ان علماء نے کہا: علماء تاویل میں سے عام سلف صالحین کا یہی نقطہ نظر ہے۔ انہوں نے آیت اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے اور حضرت عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث اس کی تائید کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز لوگوں سے کہا: ''کیا میں تمہیں بیان نہ کروں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مجھے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو حنیف پیدا کیا۔ انہیں ایسا مال عطا کیا جو حلال تھا اس میں کوئی حرام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مال عطا کیا اس کو انہوں نے حلال و حرام بنا دیا''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں''(2)۔ ان پانچ چیزوں میں مونچھیں کاٹنا شمار کیا، یہ اسلام کے طریقوں میں سے ہے، اس تاویل کی بنا پر حدیث کا معنی ہو گا: اللہ تعالیٰ نے بچے کو کفر سے پاک اس میثاق پر پیدا کیا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت سے لیا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے لیا، جب وہ بالغ ہونے سے پہلے مر جائیں تو وہ جنت میں ہوں گے؛ وہ مسلمانوں کی اولاد ہوں یا کفار کی اولاد ہوں۔

دوسرے علماء نے کہا: فطرت سے مراد وہ آغاز ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کا آغاز کیا یعنی جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں

1۔ صحیح مسلم، کل مولود یولد علی الفطرۃ، جلد 2، صفحہ 336

2۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، جلد 2؛

تخلیق فرمایا یعنی انہیں زندگی، موت، سعادت اور شقاوت کے لیے پیدا کیا اور بالغ ہونے کے بعد جس کی طرف وہ لوٹیں گے۔ علماء نے کہا: کلام عرب میں فطرت سے مراد شروع کرنا ہے اور فاطر سے مراد شروع کرنے والا ہے۔ انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: میں نہیں جانتا کہ فاطر السموات والارض سے کیا مراد ہے یہاں تک کہ دو بدو ایک کنویں کے بارے جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے، ایک نے کہا: میں نے اس کے کھودنے کی ابتدا کی۔ مروزی نے کہا: حضرت امام احمد بن حنبل اس قول کی طرف جاتے تھے پھر اس کو ترک کیا۔ ابو عمر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں کہا امام مالک نے اپنے موطا میں کہا: اسلوب ہے آپ نے باب القدر میں کچھ آثار نقل کیے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کا اس میں یہ مذہب تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو کعب قرظی سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مروی ہے: فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ (الاعراف:30) کہا: اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو گمراہی کے لیے پیدا کیا تو اسے گمراہی کی طرف لوٹاوے گا اگرچہ وہ ہدایت کے اعمال کرے اور اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو ہدایت کے لیے پیدا کیا ہے اسے ہدایت کی طرف پھیر دے گا اگرچہ وہ گمراہی کے کام کرے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی تخلیق گمراہی پر کی اس نے فرشتوں کے ساتھ سعادت کے اعمال کیے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی طرف لوٹا دیا جس کے لیے اسے پیدا کیا تھا۔ فرمایا: کان من الکافرین۔

میں کہتا ہوں: سورۃ الاعرف میں کعب کا قول گزر چکا ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث سے اس کی ہم معنی روایت آئی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انصار کے ایک بچے کی نماز جنازہ کی دعوت دی گئی، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اسے مبارک ہو یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑی ہے، اس نے برا عمل نہیں کیا اور نہ اس حد تک پہنچا(1)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جنت کے اہل کو پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا جب کہ وہ اپنے آباء کی پشتوں میں تھے اور جہنم کے اہل کو پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا جب کہ وہ آباء کی پشتوں میں تھے''۔ ابن عامر نے اسے سنن میں نقل کیا ہے۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی ہے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں؟'' ہم نے عرض کی: نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مگر یہ کہ آپ ہمیں خبر دیں، وہ کتاب جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی اس کے بارے میں فرمایا: ''یہ رب العالمین کی جانب سے کتاب ہے اس میں جنتیوں کے نام ہیں، ان کے آباء کے نام ہیں اور ان کے قبائل کے نام ہیں پھر آخر تک ان کا اجمالی ذکر کیا۔ ان میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ ان میں کمی ہوگی'' (2)۔ حدیث کا ذکر کیا۔ اس کے بارے میں فرمایا: حدیث حسن ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: کل مولد یولد علی الفطرۃ سے عموم مراد نہیں۔ الناس سے مراد مومن ہیں اگر تمام لوگوں کو اسلام پر

1۔ صحیح مسلم، باب فی معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ، جلد 2، صفحہ 337

2۔ جامع ترمذی، ابواب القدر، جلد 2، صفحہ 36۔ ایضاً حدیث نمبر 2067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پیدا کیا جاتا تو کوئی بھی کفر نہ کرتا۔ یہ ثابت ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کو آگ کے لیے پیدا کیا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ (الاعراف: 179) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی صلب سے ذریت کو سیاہ اور سفید نکالا۔ اس بچے کے بارے میں فرمایا جسے حضرت خضر نے قتل کیا: ''جس روز اسے پیدا کیا گیا کافر ہی پیدا کیا گیا''۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی جب کہ دن بلند تھا۔ اس میں ہے ہم نے اس میں سے جو یاد رکھا وہ یہ ہے کہ فرمایا: ''خبردار! بنی آدم کو مختلف طبقات میں پیدا کیا گیا ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کو مومن کی حیثیت سے پیدا کیا جاتا ہے، وہ مومن کی حیثیت سے رہتا ہے اور مومن کی حیثیت سے مرتا ہے ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جن کو کافر کی حیثیت سے پیدا کیا جاتا ہے، کافر کی حیثیت سے زندہ رکھا جاتا اور کافر کی حیثیت سے مرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کو مومن کی حیثیت سے پیدا کیا جاتا ہے وہ مومن کی حیثیت سے زندہ رہتے ہیں اور کافر کی حیثیت سے مرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کافر کی حیثیت سے زندہ رہتے ہیں اور مومن کی حیثیت سے مرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اچھی قضا اور اچھی طلب والے ہوتے ہیں'' (1)۔

حماد بن زید بن سلمہ نے مسند طیالسی میں اسے ذکر کیا ہے۔ علی بن زید، ابو نضرہ سے وہ حضرت ابو سعید خدری سے روایت نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا: عربوں کی زبان میں عموم خصوص کا معنی اکثر استعمال ہوتا ہے۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف نہیں دیکھتے: تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف: 25) جب کہ اس نے آسمان اور زمین کو ہلاک نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (الانعام: 44) ان پر رحمت کے دروازے نہیں کھولے گا۔ اسحاق بن راہویہ حنظلی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (یونس: 105) یہ کلام مکمل ہو جاتی ہے، پھر فرمایا: فِطْرَتَ اللّٰهِ تقدیر کلام یہ ہے فطر اللہ الخلق فطرۃ اما بجنۃ او نار اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا یا تو جنت کے لیے یا جہنم کے لیے۔ اسی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ اسی وجہ سے فرمایا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ہمارے شیخ ابو العباس رضی اللہ عنہ نے کہا: جس نے کہا: اس سے مراد سعادت اور شقاوت کا پہلے سے ہونا ہے تو یہ اسی فطرت کے مناسب ہے جو قرآن میں مذکور ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ جہاں تک حدیث میں اس لفظ کا تعلق ہے تو وہ نہیں؛ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ حدیث میں خبر دی کہ اس میں تغیر و تبدل ہو جاتا ہے۔

اہل فقہ اور اہل نظر میں سے ایک طائفہ نے کہا: فطرت سے مراد وہ خلقت ہے جس پر بچے کو پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے رب کو پہچان لے، گویا فرمایا: یہ بچے کو ایسی خلقت پر پیدا کیا گیا جس کی مدد سے وہ اپنے رب کی پہچان کر سکتا ہے جب وہ معرفت کی حد تک پہنچتا ہے مراد ایسی خلقت ہے جو بہائم کی خلقت سے مختلف ہے جو جانور اپنی خلقت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت تک نہیں پہنچتے۔ انہوں نے یہ استدلال کیا کہ فطرت سے مراد خلقت ہے۔ فاطر سے مراد خالق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (فاطر: 1) مراد ان کا خالق ہے، اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ مَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ

1۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، جلد 2، صفحہ 42

الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (یٰسین:22) یہاں بھی فطرنی، خلقنی کے معنی میں ہے یعنی جس نے مجھے پیدا کیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ (الانبیاء:56) جس نے انہیں پیدا کیا۔ علماء نے کہا: فطرۃ سے مراد خلقت ہے، فاطر کا معنی خالق ہے۔ انہوں نے اس چیز سے انکار کیا ہے کہ بچے کو کفر، ایمان، معرفت یا انکار پر پیدا کیا جائے۔ انہوں نے کہا: بچہ عموما خلقت، طبع اور ڈھانچہ کے اعتبار سے سلامتی پر ہوتا ہے اس کے ساتھ ایمان، کفر، انکار اور معرفت نہیں ہوتی جب بالغ ہونے کے بعد وہ امتیاز کے قابل ہوتے ہیں تو وہ کفر و ایمان کا اعتقاد اپناتے ہیں۔ انہوں نے حدیث میں اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: کما تنتج البهيمة بهيمة جمعاء یعنی سالمة هل تحسون فيها من جدعاء جس طرح ایک جانور کامل بچہ جنم دیتا ہے کیا تم اس میں کسی چیز کو کٹا ہوا محسوس کرتے ہو، یعنی کیا تم اس کو کان کٹا دیکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں کو چوپاؤں سے تشبیہ دی کیونکہ وہ کامل بچے کو جنم دیتے ہیں اس میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ان کے کان اور ناک کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور انہیں یہ نام دیئے جاتے ہیں: بحائر، سوائب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اسی طرح بچوں کے دل میں جب وہ جنم لیتے ہیں تو ان کے لیے کفر ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان، معرفت ہوتی ہے اور نہ ہی انکار جس طرح چرنے والے چوپائے، جب بالغ ہوتے ہیں تو شیاطین انہیں حیران اور مبہوت کر دیتے ہیں تو ان میں سے اکثر کافر ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان میں سے کم افراد کو محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا: اگر بچے ابتدا سے ہی کفر و ایمان میں سے کسی چیز پر پیدا کیے جاتے تو وہ اس سے کبھی بھی منتقل نہ ہوتے، جب کہ ہم انہیں پاتے ہیں کہ وہ ایمان والے ہوتے ہیں پھر وہ کفر کرتے ہیں عقلی دلیل کے اعتبار سے یہ محال ہے کہ بچہ ولادت کے وقت کفر و ایمان کی سمجھ رکھتا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے حال میں پیدا کیا ہے کہ وہ اس وقت کچھ بھی نہیں سمجھتے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا (النحل:78) جب وہ کسی بھی چیز کو کچھ نہ جانتا تو اس سے کفر و ایمان، معرفت و انکار محال ہے۔

ابو عمر عبد البر نے کہا: فطرت کا معنی جس پر بچے کو پیدا کیا جاتا ہے۔ ان میں سے یہ صحیح ترین قول ہے۔ اس بارے میں دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (الطور) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (المدثر) جو عمل کے وقت تک نہ پہنچا وہ کسی چیز کا ذمہ دار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء) جب علماء نے اس پر اتفاق کیا تو دنیا میں حدود و قصاص اور گناہ ان سے اٹھا دیئے گئے ہیں تو آخرت میں تو بدرجہ اولیٰ ان کے لیے ایسا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

یہ محال ہے کہ فطرۃ مذکورہ سے مراد اسلام ہو جس طرح ابن شہاب نے کہا، کیونکہ اسلام اور ایمان زبان سے قول، دل کا اعتقاد اور اعضاء کے ساتھ عمل ہے بچے سے یہ معدوم ہے عقل مند آدمی اس سے جاہل نہیں، جہاں تک اوزاعی کا قول ہے: میں نے زہری سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے ذمہ ایک غلام کو آزاد کرنا لازم ہو گیا اس کی جانب سے بچہ کافی ہو گا کہ اسے آزاد کر دے جب کہ وہ ابھی دودھ پیتا ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں، کیونکہ وہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوا۔

اس کی آزادی اس کے نزدیک جائز ہے جو اس تعبیر کو جائز سمجھتا ہے کیونکہ اس کا حکم اس کے والدین کا حکم ہے۔ دوسرے علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اگر غلام آزاد کرنا واجب ہو تو اس میں ایسا غلام ہی آزاد کیا جا سکتا ہے جو روزہ رکھتا اور نماز پڑھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۞ (الاعراف) اور حدیث طیبہ: ان یختم اللہ للعبد بما قضاہ لہ وحدہ علیہ میں کوئی ایسی دلیل نہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ مومن یا کافر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عقول گواہ ہیں کہ اس وقت میں وہ ایمان و کفر کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا۔ وہ حدیث جس میں آیا ہے: ان الناس خلقوا علی طبقات یہ ان احادیث میں سے نہیں جس پر طعن نہ ہو کیونکہ علی بن زید بن جدعان اس کو روایت کرنے میں منفرد ہے۔ شعبہ پر اعتراض کیا جاتا ہے، ساتھ ہی ساتھ یولد مومنا میں یہ احتمال موجود ہے کہ مراد ہو اسے جنم دیا جاتا ہے تاکہ وہ مومن ہو، اسے جنم دیا جاتا ہے تاکہ وہ کافر ہو جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے علم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: خلقت ہولاء للجنۃ و خلقت ہولاء للنار میں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں جس پر ان کا خاتمہ ہوگا اس کی ان کے بارے میں رعایت کی جائے گی؛ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی طفولیت میں جنت یا جہنم کے مستحق ہیں یا وہ کفر و ایمان کی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ابو عمرو نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور اس کے لیے دلیل پیش کی ہے کئی محققین اس کی طرف گئے ہیں، ان میں ابن عطیہ بھی ہے اور ہمارے شیخ ابو العباس بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس لفظ کی تفسیر میں جس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد خلقت اور وہ ہیئت ہے جو طفل کے نفس میں ہوتی ہے وہ نفس اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مصنوعات کو امتیاز دیا جا سکے، اس کے ذریعے اس کے رب ہونے پر استدلال کیا جا سکے، شرائع کو پہچانا جا سکے اور اس پر ایمان لایا جا سکے، گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے چہرے کو اس دین کے لیے سیدھا کر لو جو دین دین حنیف ہے یہی اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے لیکن اسے عوارض لاحق ہوتے رہتے ہیں اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی بناتے ہیں۔

ابوین کا ذکر یہ اس عوارض کی مثال ہے جو کثرت سے واقع ہوتے ہیں۔ ہمارے شیخ نے اپنی عبارت میں کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے دل بنائے جو قبول حق کی اہلیت رکھتے ہیں جس طرح ان کی آنکھیں اور کان بنائے جو دیکھی جانے والی اور سنی جانے والی چیزوں کو قبول کرتے ہیں جب تک وہ اس قبول اور اس اہلیت پر باقی رہتی ہے وہ حق اور دین اسلام کو پانے والی ہیں یہی دین حق ہے، اس معنی کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: کما تنتج البہیمۃ بہیمۃ جمعاء ہل تحسون فیہا من جدعاء یعنی جو پایہ اپنے بچے کو کامل اور آفات سے محفوظ پیدا کرتا ہے اگر اسے اس خلقت پر چھوڑا جاتا تو وہ کامل اور عیوب سے بری ہوتا لیکن اس میں تصرف کیا جاتا ہے اس کے کان کاٹ دیئے جاتے ہیں، اس کے چہرے پر نشان لگا دیا جاتا ہے، اس پر آفات اور نقائص طاری ہوتے ہیں تو وہ اصل سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح انسان ہے یہ ایسی تشبیہ ہے جو واقع ہے

اور اس کی وجہ واضح ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول پہلے قول کے معنی میں موافق ہے اور یہ ادراک کے بعد ہے جب انہوں نے امور دنیا کو سمجھ لیا اور اللہ تعالیٰ کی حجت ان پر اس سے موکد ہو گئی جو واضح آیات ان پر قائم کی گئیں جیسے آسمانوں، زمین، سورج، چاند، خشکی، تری کی تخلیق اور رات اور دن کا اختلاف۔ جب ان میں ان کی خواہشات نے اپنا کردار ادا کیا شیاطین ان کے پاس آ گئے انہوں نے انہیں یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دی تو وہ ان کی خواہشات کو دائیں بائیں لے گئے۔ اگر وہ چھوٹی عمر میں مر جاتے تو وہ جنت میں ہوتے۔ مراد تمام بچے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو آپ کی پشت سے چھوٹی چیونٹیوں کی صورت میں باہر نکالا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ١ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ١ؕ قَالُوْا بَلٰى١ۛۚ شَهِدْنَا (الاعراف: 172) جب وہ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کر چکے اور یہ اقرار کر چکے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر انہیں واپس ان کی پشتوں کی طرف لوٹا دیا، پھر ماں کے پیٹ میں اس کے شقی یا سعید ہوئے کے بارے میں لکھ دیا جاتا ہے جس طرح کتاب اول میں تھا۔ جو آدمی کتاب اول میں شقی تھا اسے زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس پر قلم جاری ہوتا ہے تو وہ شرک کر کے اس میثاق کو توڑ دیتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر اس سے لیا گیا۔ جو آدمی کتاب اول میں سعید تھا اسے مہلت دی جاتی ہے یہاں تک کہ اس پر قلم جاری ہوتا ہے تو وہ سعید ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے بچوں میں سے جو فوت ہو جاتا ہے جب کہ اس پر قلم جاری ہو تو وہ اپنے آباء کے ساتھ جنت میں ہوتا ہے۔ جو مشرکوں کی اولاد میں سے ہوتا ہے اس پر قلم جاری ہونے سے پہلے ہی وہ مر جاتا ہے تو وہ اپنے آباء کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ پہلے میثاق پر ہی فوت ہو گئے جو ان سے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر لیا گیا تھا اور میثاق کو توڑا نہ گیا۔ اہل تاویل کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے: یہ تمام احادیث میں تطبیق کرنے والی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: اللہ اعلم بما کانوا عاملین مراد ہے اگر وہ بالغ ہوتے۔ اس تاویل پر امام بخاری کی حدیث دلالت کرتی ہے جو آپ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں حدیث طویل ہے جو حدیث رؤیاء ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: واما الرجل الطویل الذی فی الروضۃ فابراھیم علیہ السلام واما الولدان حولہ فکل مولود یولد علی الفطرۃ (1) وہ طویل آدمی جو روضہ میں ہوگا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور ان کے اردگرد بچے ہوں گے وہ بچے جنہیں فطرہ پر پیدا کیا گیا۔ عرض کی گیا: یا رسول اللہ! مشرکوں کی اولاد؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اور مشرکوں کی اولاد''۔ یہ ایسی نص ہے جو اختلاف کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ وہ صحیح ترین چیز ہے جو باب میں روایت کی گئی ہے اس کے علاوہ احادیث میں علل ہیں۔ ائمہ احادیث فقہاء نہیں؛ یہ ابو عمر بن عبد البر کا قول ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے

1۔ الترغیب والترہیب، سورۂ روم، باب من تاخیر الصلوۃ عن وقتہا، جلد 1، صفحہ 388

رسول اللہ ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: ''ان کی نیکیاں نہیں کہ انہیں بدلہ دیا جائے تو وہ جنت کے بادشاہوں میں سے ہو جائیں۔ ان کی برائیاں نہیں کہ انہیں سزا دی جائے تو وہ جہنمیوں میں سے ہو جائیں وہ جنتیوں کے خادم ہیں'' (1)۔ یحییٰ بن سلام نے اسے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے ہم نے کتاب ''التذکرۃ'' میں اس کی خوب وضاحت کی ہے۔ ہم نے مؤطا مالک بن انس کی شرح کتاب ''المقتبس'' میں اسے ذکر کیا ہے جسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔ الحمد للہ

اسحاق بن راہویہ نے ذکر کیا یحییٰ بن آدم، جریر بن حازم سے وہ ابو رجا عطاردی سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں اس امت کا معاملہ ہمیشہ قریب قریب رہے گا یا ایسا کلمہ ذکر کیا جو ان کے مشابہ ہے یہاں تک کہ وہ اطفال اور تقدیر کے بارے میں کلام کریں گے یا غور و فکر کریں گے۔ یحییٰ بن آدم نے کہا: میں نے اس کا ذکر ابن مبارک سے کیا: فرمایا: کیا انسان جہالت پر خاموش رہ سکتا ہے؟ میں نے کہا: کیا آپ کلام کا حکم دیتے ہیں؟ کہا: وہ خاموش ہو گئے۔ ابو بکر وراق نے کہا: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اس سے مراد فقر و فاقہ ہے۔ یہ اچھی کلام ہے کیونکہ وہ ولادت سے لے کر موت تک محتاج ہوتا ہے، ہاں اور آخرت میں (بھی)۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ یہ ایسی فطرت ہے خالق کی جانب سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، کسی صورت میں امراس کے خلاف نہیں ہوتا۔ جس کو اس نے سعید پیدا کیا وہ بدبخت نہیں ہوگا اور جس کو شقی پیدا کیا وہ سعید نہیں ہوگا۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی؛ یہ قتادہ، ابن جبیر، ضحاک، ابن زید اور نخعی کا قول ہے (2)۔ انہوں نے کہا: معتقدات میں یہی معنی ہے۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے معنی ہے: چوپاؤں میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی تبدیلی درست نہیں کہ ان کے نروں کو خصی کر دیا جائے معنی ہے کہ حیوانوں میں سے خصی کرنے سے نہی ہے۔ یہ بحث سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وہ درست فیصلہ ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (3)۔ مقاتل نے کہا: وہ واضح حساب ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الدِّیْنُ الْقَیِّمُ سے مراد دین اسلام ہے، وہی دین قیم اور مستقیم ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ وہ غور و فکر نہیں کرتے کہ وہ یہ جان لیں کہ ان کا خالق و معبود ہے اور قدیمی الٰہ ہے اس کی قضا سبقت لے جا چکی ہے اور اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔

مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

''(اے غلامان مصطفیٰ! تم بھی اپنا رخ اسلام کی طرف کر لو) اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے اور قائم کرو نماز کو اور نہ ہو جاؤ (ان) مشرکوں میں سے جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ

1۔ التذکرۃ فی احوال الموت، ما جاء فی اطفال المسلمین والمشرکین، جلد 2، صفحہ 681

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 312 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 313 4۔ ایضاً

گروہ ہو گئے، ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے"۔

**مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ** اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے: ایک قول یہ کیا گیا ہے: توبہ اور اخلاص کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ یحییٰ بن سلام اور فراء نے کہا: وہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے ہیں۔ عبد الرحمن بن زید نے کہا: اس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: گناہوں سے توبہ کر کے اس کی طرف لوٹنے والے ہیں، اسی معنی میں ابو قیس بن اسلت کا قول ہے:

فإن تابوا فإن بني سليم وقومهم هوازن قد أنابوا(1)

اگر انہوں نے توبہ کی تو بنی سلیم اور ان کی قوم ہوازن نے توبہ کی۔

معنی ایک ہی ہے: کیونکہ نَابَ، تَابَ، ثَابَ اور آبَ سب کا معنی لوٹنا ہے۔ ماوردی نے کہا: انابہ کی اصل میں دو قول ہیں: (۱) اس کا معنی کاٹنا ہے، اسی سے ناب کا اسم ہے کیونکہ وہ کاٹنے والا ہوتا ہے، گویا انابہ سے مراد طاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ہو رہنا (۲) اس کا معنی لوٹنا ہے، یہ نَابَ یَنُوبُ سے ماخوذ ہے جب وہ یکے بعد دیگرے لوٹے، اسی سے نوبہ ہے کیونکہ اس سے مراد عادت کی طرف لوٹنا ہے۔ جوہری نے کہا: أَنَابَ إِلَى اللهِ کا معنی ہے أَقْبَلَ وَتَابَ، نوبہ یہ نوب کا واحد ہے تو کہتا ہے: جاءت نوبتك ونابتك وهم يتناوبون النوبة فيما بينهم في الماء وغيره تیری باری آ گئی وہ پانی وغیرہ میں باری کرتے ہیں یہ حال کی حیثیت میں منصوب ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: فَاَقِمْ وَجْهَكَ کا معنی ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے تم اپنے چہروں کو سیدھا کر لو۔ فراء نے کہا: معنی ہے اپنے اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ توبہ کرتے ہوئے اپنے چہرے سیدھے کر لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ماقبل کلام سے قطع کرتے ہوئے اسے نصب دی ہے یعنی فاقم وجهك وأنت وامتك المنيبين اليه کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو امر ہے وہ آپ کی امت کے لیے امر ہے؛ یہ کتنا اچھا ہے مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق: 1)

**وَاتَّقُوْهُ** اس سے ڈرو اور اس نے تمہیں جو حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو۔ **وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** اس امر کو واضح کیا کہ عبادت نفع نہیں دیتی مگر اخلاص کے ساتھ ہی نفع دیتی ہے اسی وجہ سے فرمایا: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ بحث سورۃ النساء اور الکہف وغیرہ میں مفصل گزر چکی ہے۔

**مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہم نے کہا: اہل قبلہ میں سے اہل الاہواء، اور اہل البدع ہیں۔ سورۃ الانعام میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

ربیع بن انس نے کہا: الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ سے مراد یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب ہیں؛ یہ قتادہ اور معمر کا قول ہے۔ حمزہ اور کسائی نے پڑھا فارقوا دينهم۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی بھی یہی قراءت ہے وہ دین جس کی اتباع ضروری تھی اس میں انہوں نے تفرقہ کیا۔ وہ توحید ہے۔ **وَ كَانُوْا شِيَعًا** وہ کئی گروہ تھے: یہ کلبی کا قول ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کئی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 313 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 314 3۔ ایضاً

دین تھے؛ یہ مقاتل کا قول ہے(1)۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ وہ خوش وخرم تھے کیونکہ انہوں نے حق کو نہ پہچانا جب کہ ان پر لازم تھا کہ وہ حق کو پہچانتے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ فرائض کے نازل ہونے سے پہلے کا مرحلہ تھا۔ تیرا قول ہے: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا بعض اوقات اس کی نافرمانی سے خوش ہوتا ہے، یہی کیفیت شیطان اور ڈاکوؤں وغیرہ کی ہوتی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے۔ فراء نے گمان کیا کہ کلام وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ پر مکمل ہو اور معنی ہو ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ کیا وہ کئی گروہ تھے۔ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہو۔ نحاس نے کہا: جب یہ کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہو تو بصریوں کے نزدیک حرف کے اعادہ کے ساتھ بدل ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ (اعراف: 75) اگر یہ حرف کے بغیر ہو تو بھی جائز ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور جب پہنچتی ہے لوگوں کو کوئی تکلیف تو پکارنے لگتے ہیں اپنے رب کو رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب (ان کی فریاد کو قبول فرما کر) چکھاتا ہے انہیں رحمت اپنی جناب سے تو یکا یک ایک گروہ ان میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے''۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ، ضُرٌّ سے مراد قحط اور شدت ہے۔ دَعَوْا رَبَّهُمْ وہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ عذاب اٹھالے۔ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنے دل سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، وہ شرک نہیں کرتے۔ اس کلام کا معنی تعجب ہے اللہ تعالیٰ کے نبی نے مشرکوں پر تعجب کا اظہار کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے جب کہ ان پر پے در پے دلائل واقع ہوتے ہیں یعنی جب ان کفار کو مرض یا شدت میں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو دعوت دیتے ہیں یعنی جو مصیبت ان پر نازل ہوتی ہے وہ اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد لیتے ہیں وہ صرف اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کسی اور (بتوں) کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بتوں کے ہاں تکلیف سے رفع کی کوئی صورت نہیں۔

ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً، رَحْمَةً سے مراد عافیت اور نعمت ہے اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ عبادت میں اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''(اچھا) ناشکری کرلیں اس نعمت کی جو ہم نے دی ہے انہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھالو تمہیں (اس کا انجام) معلوم ہوجائے گا''۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 314

لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لام کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لام امر ہے اس میں تہدید کا معنی پایا جاتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: 29) فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ اس میں تہدید اور وعید ہے۔ حضرت عبداللہ کے مصحف میں ہے ولیتمتعوا ہم نے انہیں اس پر قادر بنایا تاکہ وہ لطف اندوز ہوں۔ یہ غائب کی خبر ہے جس طرح لِيَكْفُرُوْا ہے مصحف کے خط کے مطابق غائب کی خبر دینے کے بعد خطاب ہے، اے یہ کرنے والو! لطف اندوز ہو لو۔

## اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ۝

"کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل پس وہ گواہی دیتی ہے اس شرک (کی سچائی) کی جو وہ کرتے ہیں"۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا یہ ایسا استفہام ہے جس میں توقیف کے معنی ہیں۔ ضحاک نے کہا: سُلْطٰنًا سے مراد کتاب ہے(1)؛ یہ قول قتادہ اور ربیع بن انس نے کیا ہے۔ مجازا کلام کی نسبت کتاب کی طرف کی ہے۔ فراء نے یہ گمان کیا کہ عرب سلطان کو مونث قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں: قضت بہ علیك السلطان جہاں تک بصریوں کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک مذکر بنانا افصح ہے۔ قرآن حکیم میں بھی اسی طرح آیا ہے، ان کے نزدیک تانیث جائز ہے کیونکہ یہ حجت کے معنی میں ہے۔ ایک حجت ہے جو تمہارے شرک کے بارے میں گویا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک کا بھی قول ہے۔ علی بن سلیمان نے ابوالعباس محمد بن یزید سے روایت نقل کی ہے کہ سلطان، سلیط کی جمع ہے جس طرح رغیف کی جمع رغفان ہے اس کی تذکیر جمع کے معنی میں اور اس کی تانیث جماعت کے معنی میں ہے۔ سلطان کے بارے میں کلام آل عمران میں مفصل گزر چکی ہے۔ سلطان سے مراد جس کے ساتھ انسان اپنی ذات سے ایسا امر دور کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ عقوبت کا مستحق ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (النمل)

## وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝

"اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو رحمت کا (مزہ) تو وہ اس پر پھولے نہیں سماتے اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں"۔

وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا رحمت سے مراد سرسبزی، وسعت اور عافیت ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے(2)۔ نقاش نے کہا: مراد نعمت اور بارش ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد امن ہے۔ معنی قریب قریب ہے۔ فَرِحُوْا بِهَا ھا ضمیر سے مراد رحمت ہے۔ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ، سَيِّئَةٌۢ سے مراد آزمائش اور عقوبت ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے(3)۔ سدی نے کہا: بارش کا نہ ہونا ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ انہوں نے جو نافرمانیاں کیں۔ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ وہ رحمت اور وسعت و کشادگی سے مایوس ہو جاتے ہیں؛ یہ جمہور کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: قنوط سے مراد رازداری میں اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 315 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے فرائض کو ترک کرتا ہے۔ قَنِطَ یَقْنِطُ یہ عام قراءت ہے قَنَطَ یَقْنِطُ یہ ابو عمرو، کسائی اور یعقوب کی قراءت ہے۔ اعمش نے قَنِطَ یَقْنِطُ دونوں میں کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے جس طرح حَسِبَ یَحْسِبُ آیت کافر کی صفت ہے، وہ تنگی کے وقت مایوس ہوتا ہے اور نعمت کے وقت اتراتا ہے۔ جس طرح کہا:

کحمار السوء إن أعلفته رمح الناس وإن جاع نهق

برے گدھے کی طرح ہے اگر تو اسے چارہ کھلائے تو لوگوں کو لاتیں مارتا ہے اور اگر بھوکا ہو تو ہینگتا ہے۔

بے شمار لوگ جن کے دل میں ایمان راسخ نہیں ہوا ان کی یہی حالت ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے وہ نعمت کے وقت اپنے رب کا شکر بجالاتا ہے اور تکلیف کے وقت اس سے امید رکھتا ہے۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝

''کیا انہوں نے (بارہا) مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے)، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آتے ہیں''۔

جس کے لیے چاہتا ہے دنیا میں بھلائی کو وسیع کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے، اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ فقر انہیں مایوسی کی طرف دعوت دے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''پس دو رشتہ دار کو اس کا حق نیز مسکین اور مسافر کو یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں اور وہی لوگ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کمی کر دیتا ہے۔ جس کا رزق وسیع کیا گیا اس کو حکم دیا کہ وہ فقیر کو اس کی ضرورت کی چیز پہنچائے تاکہ غنی کے شکر کا امتحان لیا جائے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ اور آپ کی امت ہے کیونکہ اس نے فرمایا: ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ رشتہ داروں کو رشتہ داری کی وجہ سے مال دینے کا حکم دیا بہترین صدقہ وہ ہوتا ہے جو قریبی رشتہ دار کو دیا جائے، اس میں صلہ رحمی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریبی رشتہ داروں کو صدقہ دینے کو غلام آزاد کرنے پر فضیلت دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا جب کہ آپ نے ایک نوعمر لونڈی آزاد کی تھی: ''اگر تو یہ اپنے ننہالی رشتہ داروں کو دے دیتی تو تیرے لیے

زیادہ اجر ہوتا''(1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کی تعبیر میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت میراث سے منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ منسوخ نہیں بلکہ قریبی رشتہ داروں کے حق میں ہر حال میں نیکی کرنا لازم ہے؛ یہ قول صحیح ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: صلہ رحمی اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہے یہاں تک کہ مجاہد نے کہا: کسی ایسے آدمی کا صدقہ قبول نہیں جس کا قریبی رشتہ دار محتاج ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قربیٰ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ہیں۔ پہلا زیادہ صحیح ہے کیونکہ ان کا حق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں واضح ہے۔ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى (انفال: 41)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم استحباب کے طریقہ پر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حَقَّهٗ سے مراد خوشحالی میں ہمدردی کرنا ہے اور تنگ دستی میں اچھا قول کرنا ہے۔

وَ الْمِسْكِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو سائل گردش کناں ہو اس کو کھانا کھلا۔ ابن سبیل سے مراد مہمان ہے۔ ضیافت کو فرض قرار دیا۔ یہ تمام مباحث اپنے اپنے مقام پر مفصل گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ حق دینا روکنے سے افضل ہے جب اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور تقرب کا ارادہ کیا جائے۔ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہ اپنے مطلب کو پانے والا ہے یعنی آخرت کا ثواب۔ سورۃ البقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو روپیہ تم دیتے ہو بیاج پر تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں (سن لو) اللہ کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو رضائے الٰہی کے طلب گار بن کر پس یہی لوگ ہیں (جو اپنے مالوں کو) کئی گنا کر لیتے ہیں''۔

وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب اس چیز کا ذکر کیا جس کے ساتھ اس کی رضا کا ارادہ کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر بدلہ عطا فرماتا ہے اس کے علاوہ صفت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جمہور کی قراءت ہے آتیتم یہ مد کے ساتھ ہے معنی ہے أعطیتم جو تم دیتے ہو۔ ابن کثیر، مجاہد اور حمید نے مد کے بغیر پڑھا ہے معنی ہے جو تم ربا کا عمل کرو تاکہ وہ بڑھے جس طرح تو کہتا ہے: آتیت صوابا و آتیت خطاء تو نے صحیح کام کیا اور تو نے غلط کام کیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مد پر اتفاق کیا ہے وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ ربا کا معنی زیادتی ہے (2)۔ سورۂ بقرہ میں اس کا معنی گزر چکا ہے، وہاں وہ حرام ہے یہاں حلال

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل الصدقۃ، جلد 1، صفحہ 323　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 339

ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں: اس میں ایک قسم حلال ہے اور اس میں ایک قسم حرام ہے(1)۔ عکرمہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ میں کہا: ربا کی دو قسمیں ہیں ربا حلال اور ربا حرام۔

جہاں تک حلال ربا کا تعلق ہے اس سے مراد وہ ہے جو ہدیہ کے طور پر دیا جائے اور جو اس سے افضل ہو اس کو طلب کیا جائے۔ اس آیت میں ضحاک سے مروی ہے: اس سے مراد حلال ربا ہے جو ہدیہ کے طور پر دیا جائے تاکہ اس سے جو افضل ہو وہ ہدیہ کے طور پر اسے لوٹایا جائے نہ اس کے حق میں ہو اور نہ اس کے خلاف ہو۔ اس میں اس کے لیے اجر نہیں اور اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا مراد کسی آدمی کو ہدیہ دینا جس کے ساتھ وہ یہ امید رکھتا ہو کہ اسے اس سے افضل لوٹایا جائے، یہ ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں بڑھتی، اس کے مالک کو اجر نہیں دیا جاتا لیکن اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اسی معنی میں یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس، ابن جبیر، طاؤس اور مجاہد نے کہا: یہ آیت ہبۃ الثواب میں نازل ہوئی۔ ابن عطیہ نے کہا: انسان جو ایسا کام کرتا ہے تاکہ اسے بدلہ دیا جائے جیسے سلام یا جو بھی اس کے قائم مقام جاری ہو تو یہ ایسی چیز ہے جس میں کوئی گناہ نہیں، کوئی اجر نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی بڑھوتری نہیں (2)؛ یہی قول قاضی ابوبکر بن عربی نے کیا۔ نسائی کی کتاب میں حضرت عبدالرحمن بن علقمہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ثقیف کا وفد آیا، ان کے پاس ہدیہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے، اگر ہدیہ ہے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنی چاہیے اور ضرورت کو پورا کرنے کی نیت کرنی چاہیے اگر صدقہ ہے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنی چاہیے''(3)۔ انہوں نے عرض کی: نہیں بلکہ یہ ہدیہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ہدیہ قبول کر لیا آپ ان کے ساتھ بیٹھ گئے وہ آپ سے سوال کرتے اور آپ ان سے سوال کرتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا اور ابراہیم نخعی نے بھی یہ کہا ہے: یہ ایسے لوگوں کے بارے میں آیت نازل ہوئی جو اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے بھائیوں کو مال دیتے تاکہ انہیں نفع حاصل ہو، وہ مال دار ہو جائیں اور ان پر مال دینے والوں کی فضیلت ثابت ہو جائے، اور ان کے مال زیادہ ہو جائیں تاکہ انہیں نفع حاصل ہو(4)۔ شعبی نے کہا: آیت کا معنی ہے جس انسان نے کسی انسان کی کسی چیز کے ساتھ خدمت کی اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کیا تاکہ اس کے ساتھ دنیا میں نفع اٹھائے تو وہ نفع جس کے بدلے میں اس نے خدمت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ نہیں بڑھتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خصوصا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۞ (المدثر)(5) آپ کو اس چیز سے منع کیا کہ کوئی چیز آپ عطا کریں اور اس کے عوض میں زیادہ چیز لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے

---

1۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1491
2۔ الجواہر الحسان، جلد 2، صفحہ 547
3۔ سنن نسائی، کتاب العمری، عطیۃ المرأۃ بغیر اذن زوجها، جلد 2، صفحہ 141
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 339
5۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1492

اس سے مراد حرام شدہ ربا ہے۔ **فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ** کا، اس قول کی بنا پر معنی ہے اس کے لینے والے کے بارے میں حکم نہیں بلکہ یہ حکم اس کے لیے ہے جس سے وہ مال لیا گیا۔ سدی نے کہا: یہ آیت بنو ثقیف کے ربا کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ سود کا کاروبار کیا کرتے تھے اور قریش ان کے ساتھ معاملہ کیا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: آیت کا صریح معنی اس آدمی کے بارے میں ہے جو کوئی چیز ہبہ کرتا ہے اور بدلہ میں لوگوں سے زیادہ مال کا طالب ہوتا ہے۔ مہلب نے کہا: علماء نے اس آدمی کے بارے میں اختلاف کیا جو آدمی ہبہ کرتا ہے اور اس کے بدلے میں بدلہ کا طالب ہوتا ہے اور کہا: میں نے بدلہ کا ارادہ کیا۔ امام مالک نے کہا: اس میں غور وفکر کیا جائے گا۔ اگر وہ جس موہوب لہ سے بدلہ کا طالب ہے وہ ایسا ہی ہے تو اس کے لیے وہ ہوگا جس طرح فقیر غنی کو ہبہ کرے، خادم صاحب کو ہبہ کرے، کوئی آدمی اپنے امیر اور اس سے بالا کو ہبہ کرے یہ امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: اس کے لیے بدلہ نہ ہوگا جب اس نے شرط نہ لگائی ہو، یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے فرمایا: بدلہ کے لیے ہبہ باطل ہے یہ اسے کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ یہ مجہول ثمن کے بدلے میں بیع ہے۔ کوفہ کے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہبہ اصل میں بطور نفل ہے اگر ہم اس میں عوض کو واجب کر دیں تو اس میں فضل و احسان کا معنی باطل ہو جائے گا اور وہ معاوضات کے معنی میں ہو جائے گا۔ عربوں نے لفظ بیع اور لفظ ہبہ میں فرق کیا ہے انہوں نے لفظ بیع کو اس کے لیے خاص کیا ہے جس میں وہ عوض کا مستحق ہوتا ہے اور ہبہ اس کے خلاف ہے۔ ہماری دلیل وہ روایت ہے جسے امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب بڑلتے نے فرمایا: جس آدمی نے کوئی ہبہ کیا اس کی رائے تھی کہ یہ بدلہ کے طور پر ہے تو وہ ہبہ کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے یہاں تک کہ وہ بالعوض ہدیہ پر راضی ہو جائے۔

اسی کی مثل حضرت علی شیر خدا بڑلتے سے مروی ہے فرمایا: ہبہ تین قسم کے ہیں: (۱) ایسا ہبہ جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا جائے (۲) ایسا ہبہ جس سے لوگوں کی رضا کا ارادہ کیا جائے (۳) ایسا ہبہ جس سے بدلہ کا ارادہ کیا جائے۔ بدلہ کے لیے جو ہبہ دیا جائے تو ہبہ کرنے والا اسے واپس لے سکتا ہے جب اسے بدلہ نہ دیا جائے۔ امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب المکافاۃ فی الھبۃ (1) اور حضرت عائشہ صدیقہ بڑلتے کی حدیث ذکر کی: رسول اللہ سلیٹھ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ دیا کرتے تھے، وہ ہدیہ دینے والی اونٹنی پر بدلہ دیا اور اس اونٹنی کے مالک نے جب بدلہ طلب کیا تو حضور سلیٹھ نے اس کا انکار نہ کیا اور بدلہ کے لیے ناراضگی و ناپسندیدگی جب کہ وہ بدلہ ہدیہ کی قیمت پر زائد تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت علی شیر خدا بڑلتے نے جو ذکر کیا اور ہبہ کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ صحیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنے ہبہ میں تین احوال سے خالی نہیں: (۱) وہ ہبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے ہی بدلہ کا طالب ہو (۲) وہ اس کے ذریعے لوگوں کی رضا چاہتا ہے وہ ریاکاری کرتا ہے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس ہبہ کی وجہ سے اس کی ثنا کریں (۳) وہ موہوب لہ سے اس کے ساتھ بدلہ کا ارادہ کرتا ہے۔ اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ نبی کریم

---

1۔ صحیح بخاری، باب المکافاۃ فی الھبۃ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الأعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی (1) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر آدمی کے لیے وہ کچھ ہے جس کی وہ نیت کرے۔ جب ایک آدمی اپنے ہبہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کرے اور اس کی بارگاہ سے ثواب چاہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے فضل و رحمت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔

اسی طرح وہ آدمی جو اپنے قریبی رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے تاکہ وہ غنی ہو جائے اور وہ کسی پر بوجھ نہ بنے تو اس میں بھی نیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر وہ اس کے ساتھ دنیا چاہتا ہے تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہوگا۔ اگر وہ اس کی مدد اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس کا اس پر حق قرابت ہے اور ان کے درمیان رشتہ داری ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا (2)۔

اور وہ شخص جو اپنے ہبہ کے ساتھ لوگوں کی رضا چاہتا ہے مقصود ریاکاری ہے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کی وجہ سے اس کی ثنا کریں تو اس کے ہبہ میں اس کے لیے کوئی نفع نہیں، نہ دنیا میں بدلہ ہے اور نہ آخرت میں اجر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ (البقرہ: 264)

جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو موہوب لہ سے بدلہ کا طالب ہے تو اس کے لیے وہ کچھ ہے جس کا اس نے ارادہ کیا۔ ابن قاسم کا مذہب ہے: اگر وہ شخص جس کو وہ چیز ہبہ کے طور پر دی گئی وہ ہبہ کرنے والے کو ایسی چیز نہ دے جو اس کی قیمت کی حامل ہو یا اس سے زیادہ قیمت پر وہ راضی ہو تو ہبہ واپس کر سکتا ہے؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے قول کا ظاہر وہی ہے۔

واضح میں مطرف کا قول بھی یہی ہے: ہبہ ایسی چیز ہو جس کی اصل قائم رہنے والی ہو اگر زائد ہو جائے یا کم ہو جائے تو واہب کو اس میں رجوع کا حق ہے اگرچہ موہوب لہ اسے اس میں زیادہ دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ ایسی چیز ہو جس کی اصل باقی رہنے والی ہے وہ متغیر نہ ہو تو جو چاہے لے لے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے قیمت لازم ہوگی جس طرح نکاح تفویض میں ہوتا ہے اگر ہبہ کے فوت ہونے کے بعد مقابلہ ہو تو اس کے لیے بالاتفاق قیمت ہی ہوگی؛ یہ ابن عربی کا قول ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** لِّیَرْبُوَاۡ جمہور قراء سبعہ نے اسے پڑھا لیربوا یعنی یاء کے ساتھ پڑھا۔ فعل ربا کی طرف منسوب ہے۔ صرف نافع نے تاء کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یہ مخاطب کا صیغہ ہے معنی ہوگا تم زیادتی والے ہو؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، قتادہ اور شعبی کی قراءت ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ ہماری قراءت ہے۔ ابو مالک نے لتربوھا تانیث کی ضمیر کے ساتھ لکھا ہے۔ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وہ نہ بڑھتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ اس پر بدلہ دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اسی کو قبول فرماتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہوتا ہے۔ سورۃ النساء میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مِّنْ زَكٰوةٍ سے مراد صدقہ ہے۔ تو یہ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ یہی وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اسے دس گنا یا اس سے زیادہ بڑھا دیتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝ (الحدید) فرمایا: وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2 2۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1491 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1492

یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ وَ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ کَمَثَلِ جَنَّۃٍۭ بِرَبۡوَۃٍ (البقرہ:265) فرمایا: فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ یہ نہیں فرمایا: فانتم المضعفون کیونکہ خطاب کے صیغہ سے غیب کے صیغہ کی طرف رجوع کیا ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِہِمۡ (یونس:22)

مضعفین کے معنی میں دو قول ہیں: (۱) ان کے لیے نیکیوں کو کئی گنا کر دیا جاتا ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا (۲) ان کے لیے خیر اور نعمتوں کو کئی گنا بڑھا دے گا یعنی وہ اصحاب اضعاف ہیں جس طرح یہ کہا جاتا ہے: فلان مضعف یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اس کے اونٹ طاقتور ہوں یا اس کے ساتھی طاقتور ہوں۔ فلان مسمن اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے اونٹ موٹے ہوتے ہیں۔ فلان معطش اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے اونٹ پیاسے ہوں۔ فلان مضعف جب اس کے اونٹ کمزور ہوں۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللھم إنی أعوذ بك من الخبيث المخبث الشيطان الرجيم (1) مخبث اسے کہتے ہیں جسے خبث لاحق ہو۔ یہ کہا جاتا ہے: فلان ردی وہ خود ردی ہے فلان مردی اس کے ساتھی ردی ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ رَزَقَکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ؕ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّفۡعَلُ مِنۡ ذٰلِکُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۞

”اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا پھر (مقررہ وقت پر) تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں میں سے بھی کوئی ہے جو کر سکتا ہو ان کاموں میں سے کوئی، پاک ہے اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) اور بلند ہے ان سے جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں“۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ یہ کلام مبتدا اور خبر ہے کلام مشرکوں کے خلاف استدلال کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وہ خالق، رازق، زندگی عطا کرنے والا اور موت دینے والا ہے۔ پھر استفہام کے طریقہ پر کہا: ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّفۡعَلُ مِنۡ ذٰلِکُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ یعنی اس کے شریکوں میں سے تو کوئی بھی کچھ نہیں کرتے۔ پھر اپنی انداد، اضداد، بیوی اور اولاد سے پاکی بیان کی۔ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ شرکاء کی نسبت ان کی طرف کی کیونکہ وہ مشرک انہیں الہ اور شرکاء نام دیا کرتے تھے اور اپنے اموال کے لیے مختص کرتے ہیں۔

ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَہُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ۞

”پھیل گیا ہے فساد بر اور بحر میں بوجہ ان کرتوتوں کے جو لوگوں نے کیے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ چکھائے انہیں کچھ سزا ان کے (برے) اعمال کی شاید وہ باز آجائیں“۔

ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ علماء نے فساد بر اور بحر کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قتادہ اور سدی نے کہا: فساد کا معنی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، ما یقول عند الخلاء، جلد 1، صفحہ 26۔ ایضاً، حدیث نمبر 294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شرک ہے؛ یہ سب سے بڑا فساد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور مجاہد نے کہا: زمین میں فساد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے کا اپنے بھائی کو قتل کرنا ہے۔ قابیل نے حضرت ہابیل کو قتل کر دیا تھا۔ بحر میں فساد سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ جو ہر کشتی کو غصب کر لیتا ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فساد سے مراد قحط، نباتات کی کمی اور برکت کا چلا جانا ہے، اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرمایا: اس سے مراد بندوں کے اعمال کی وجہ سے برکت کا کم ہو جانا ہے تا کہ وہ توبہ کر لیں۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے بہترین تعبیر ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ بحر میں فساد سے مراد یہ ہے کہ بندوں کے گناہوں کی وجہ سے اس کے شکار کا ختم ہو جانا(2)۔ عطیہ نے کہا: جب بارش کم ہوتی ہے تو اس کی گہرائی میں کمی آ جاتی ہے(3)، شکاری پریشان ہو جاتے ہیں اور سمندر کے جانور اندھے ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب آسمان سے بارش ہوتی ہے تو سمندر میں سیپیاں کھل جاتی ہیں بارش کا جو قطرہ ان میں گرتا ہے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فساد سے مراد بھاؤ کی کساد بازاری اور معاش کی قلت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فساد سے مراد نافرمانیاں، ڈاکہ ڈالنا اور ظلم ہے، یعنی یہ عمل زراعت، عمارات اور تجارت میں مانع ہے۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔

بر اور بحر لغت اور لوگوں کے ہاں معروف و مشہور ہیں ان سے مراد وہ نہیں جو بعض لوگوں نے کہا کہ بر سے مراد لسان ہے، بحر سے مراد دل ہے کیونکہ زبان پر جو چیز ہوتی ہے وہ ظاہر ہوتی ہے اور دل میں جو چیز ہوتی ہے وہ مخفی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بر سے مراد جنگل و صحرا اور بحر سے مراد بستیاں ہیں؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ عرب شہروں کو بحار کہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: بر سے مراد ستونوں والے ہیں اور بحر سے مراد بستیوں اور سبزہ زاروں والے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بر سے مراد وہ شہر اور بستیوں والے ہیں جو دریا کے کنارے نہ ہوں اور بحر سے مراد وہ شہر اور بستیاں ہیں جو دریا کے کنارے ہوں(4)؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ فرمایا: خبردار اللہ کی قسم! وہ تمہارا یہ نہیں بلکہ ہر بستی جو جاری پانی پر ہو تو وہ بحر ہوتا ہے(5)؛ یہی معنی نحاس نے بھی کیا ہے: کہا اس کے معنی میں دو قول ہیں: (1) خشک سالی جنگلوں اور دیہاتوں میں غالب آ جائے اور فی البحر سے مراد مدن البحر۔ جو شہر دریاوں کے کناروں پر آباد ہوں۔ جس طرح ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82)۔ یہاں بھی القریة سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ فساد سے مراد ہے بارش کم ہو گئی اور بھاؤ بڑھ گئے۔

بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ یہاں بعض سے پہلے عقاب کا لفظ محذوف ہے۔ الَّذِيْ عَمِلُوْا دوسرا قول یہ ہے: معاصی غالب آ گئیں کہ ڈاکے پڑنے لگے اور ظلم عام ہو گیا یہ حقیقت میں فساد ہے۔ پہلا معنی مجاز ہے مگر دوسرے جواب کی شرط پر کلام میں حذف اور اختصار ہو کیونکہ محذوف پر مابعد کلام دلالت کرے گا۔ معنی ہے خشکی اور تری میں معاصی غالب آ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے برکت ختم کر دی اور ان کے جانور بڑھ گئے تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بعض اعمال

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 401　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 547　　3۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 58

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 317　　5۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 57

کا عذاب چکھائے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ممکن ہے وہ توبہ کریں۔ آیت میں بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا کہا گیا۔ بڑی جزا آخرت میں ہوگی۔ قراءت لیذیقھم یاء کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نون کے ساتھ قراءت کی ہے؛ یہ سلمی، ابن محیصن، قنبل اور یعقوب کی قراءت ہے جو برائے تعظیم ہے، یعنی ہم انہیں ان کے بعض اعمال کی سزا چکھائیں گے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝

"(اے محبوب!) آپ (انہیں) فرمائیے سیر و سیاحت کرو زمین میں اور دیکھو کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے، ان میں سے اکثر مشرک تھے"۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہیے: زمین میں گھومو پھرو تاکہ پہلے لوگوں کے احوال سے عبرت حاصل کر سکو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ۝

"پس کر لو اپنا رخ اس دین قیم کی طرف اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسے ٹلنا نہیں، اس روز یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے"۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ زجاج نے کہا: اپنے ارادہ کو سیدھا رکھو اور اپنی جہت کو دین قیم کی اتباع کی طرف رکھو۔ دین قیم سے مراد اسلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے حق واضح کرو، معذرت پیش کرنے میں مبالغہ سے کام لو جو کام کر رہے ہو اس میں مشغول رہو اور ان پر غمگین نہ ہو۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ اسے ان سے نہیں لوٹائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ اسے نہیں لوٹائے گا تو کسی کے بس میں نہ ہوگا کہ اس کو واپس کر سکے۔ سیبویہ کے علاوہ کے نزدیک لا مرد لہ کی جائز ہے، سیبویہ کے نزدیک یہ تعبیر بعید ہے مگر اس صورت میں کہ کلام میں عطف ہو۔ مراد یوم قیامت ہے۔ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے وہ بکھر جائیں گے۔ شاعر نے کہا:

وكنا كندمانَيْ جذيمة حقبة    من الدهر حتى قيل لن يتصدعا(1)

ہم جذیمہ کے ایک عرصہ تک ندیم رہے یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا: وہ جدا نہیں ہوں گے۔

اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝ (الروم) اور فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ (شوریٰ) حل یتصدعون ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تصدع القوم جب وہ بکھر جائے، اسی سے الصداع مشتق ہے کیونکہ یہ سر کے اجزاء

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 318

کو پہنچ رہا ہے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝

''جس نے کفر کیا تو اس پر ہے اس کے کفر کا وبال اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے لیے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں''۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ کفر سے پہلے جزاء کا لفظ محذوف ہے۔ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ وہ اپنے لیے عمل صالح کے بدلہ میں بستر، مسکن اور قرار کو تیار کریں گے، اسی سے مهد الصبی ہے۔ مہاد سے مراد فراش ہے قد مهدت الفراش مهدا میں نے بستر کو بچھایا۔ تمهيد الامور سے مراد ان کو درست کرنا ہے۔ تمهيد العذر سے مراد عذر کو پیش کرنا اور اس کو قبول کرنا ہے۔ التمهد کا معنی قدرت حاصل کرنا ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ یعنی قبر میں بستر بچھاتے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''تاکہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اپنے فضل و کرم سے بے شک وہ پسند نہیں کرتا کفار کو''۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہ اپنے لیے بستر بچھاتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے بدلہ عطا کرے، یعنی اس کلام کا تعلق تمهدون لانفسهم کے ساتھ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا تعلق يصدعون کے ساتھ ہے کلام یوں ہوگی: يصدعون ليجزيهم الله تاکہ کافر کو مسلمان سے الگ کر دے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے نیز تاکہ وہ تمہیں چکھائے اپنی رحمت سے اور تاکہ چلیں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ تم طلب کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو''۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ اس کی کمال قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجے بارش کی خوشخبری دینے والیاں کیونکہ ہوائیں بارش سے پہلے آتی ہیں۔ سورۃ الحجر میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ رحمت سے مراد بارش اور سرسبز و شادابی ہے۔ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ تاکہ ہواؤں کے چلنے کے ساتھ سمندر میں کشتیاں چلیں۔ بِاَمْرِهٖ کو زیادہ کیا کیونکہ ہوائیں کبھی چلتی ہیں مگر موافق نہیں ہوتیں، اس لیے ضروری ہے کہ کشتیوں کو ساحل پر باندھا جائے اور ان کے روکنے کا حیلہ کیا جائے۔ بعض اوقات ہوائیں چلتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کشتیوں کو غرق کر دیتی ہیں۔ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ یہاں فضل سے مراد تجارت سے رزق ہے۔ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ توحید اور اطاعت کے ساتھ ان نعمتوں

پر شکر بجالاؤ۔ یہ سب کچھ مفصل گزر چکا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

''اور بے شک ہم نے بھیجے آپ سے پہلے پیغمبران کی قوموں کی طرف پس وہ لے کر آئے ان کے پاس روشن دلیلیں پس ہم نے بدلہ لیا ان سے جنہوں نے جرم کیے، اور ہمارے ذمہ پر ہے اہل ایمان کی امداد فرمانا''۔

بینات سے مراد معجزات اور روشن دلائل ہیں۔ انہوں نے کفر کیا تو ہم نے کفر کرنے والے سے انتقام لیا۔ حقا، کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور نصر، کان کا اسم ہے۔ ابوبکر حقا پر وقف کرتے، تقدیر کلام یہ ہے کان عقابنا حقا پھر فرمایا: عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے یعنی اس نے خبر دی کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اور ہماری خبر بھی خلاف واقع نہیں ہوسکتی۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَذُبُّ عَنْ عِرْضِ اَخِيهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَنْ يَرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (1)۔

جو مسلمان بھی اپنے بھائی کی عزت کی حفاظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے کہ قیامت کے روز اس سے جہنم کی آگ کو دور کر دے۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی؛ نحاس، ثعلبی، زمخشری وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۞ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۞

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پس اللہ تعالیٰ پھیلا دیتا ہے اسے آسمان پر جس طرح چاہتا ہے اور کر دیتا ہے اسے ٹکڑے ٹکڑے پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ ٹپکنے لگتی ہے اس میں پھر جب وہ پہنچاتا ہے اسے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اس وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں اگرچہ وہ بندے اس سے پہلے کہ ان پر بارش ہوتی مایوس ہو چکے تھے''۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ ابن محیصن، ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے الریح کو واحد پڑھا ہے باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو عمر نے کہا: ریح کا لفظ جہاں بھی رحمت کے معنی میں ہو وہ جمع کا صیغہ ہے اور جو عذاب کے معنی میں ہو وہ واحد ہے۔ سورۂ بقرہ وغیرہ میں آیت کا معنی گزر چکا ہے۔

كِسَفًا یہ کسفۃ کی جمع ہے جس کا معنی قطعہ ہے۔ حضرت حسن بصری، ابو جعفر، عبد الرحمن الاعرج اور ابن عامر نے کسفا سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی کسفۃ کی جمع ہے جس طرح کہا جاتا ہے: سدرۃ و سدر اس قراءت کی بناء پر وہ ضمیر

1۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، ما جاء فی الذب عن عرض المسلم، جلد 2، صفحہ 15

جو اس کے بعد ہے اس کی طرف لوٹے گی، یعنی تو بارش کو دیکھے گا جو بادل کے درمیان سے نکلتی ہے کیونکہ جمع اور واحد کے درمیان صرف ہاء کا ہی فرق ہے اس لیے اسے مذکر ذکر کرنا اچھا ہے۔ ضحاک، ابو العالیہ اور ابن عالیہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فتری الودق یخرج من خللہ پڑھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خلل، خلال کی جمع ہے۔

فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ ہاء ضمیر سے مراد بارش ہے۔ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ وہ بارش کے نازل ہونے سے خوش ہوتے ہیں۔ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ وہ اس سے قبل مایوس اور رنجیدہ ہو چکے تھے، ان پر غم عیاں تھا کیونکہ ان سے بارش رک چکی تھی۔ مِّنْ قَبْلِهٖ اخفش کے نزدیک یہ مکرر ہے، تاکید کے لیے آئی ہے، اکثر نحویوں کا یہی قول ہے، یہ نحاس کا قول ہے۔

قطرب نے کہا: پہلا قبل انزال اور دوسرا بارش کے لیے ہے اس کی وضاحت یہ ہوگی إن کانوا من قبل التنزيل من قبل المطر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر بارش نازل ہونے سے پہلے کھیتی سے پہلے، زراع پر بارش دلالت کرتی ہے کیونکہ کھیتی بارش کے سبب سے ہی ہوتی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا (الروم: 51) جس طرح اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے بادل سے پہلے، اس کو دیکھنے سے قبل، اس قول کو نحاس نے پسند کیا ہے یعنی بادل دیکھنے سے قبل۔ لَمُبْلِسِيْنَ یعنی مایوس۔ سحاب کا ذکر گزر چکا ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''پس (چشم ہوش سے) دیکھو رحمت الٰہی کی علامتوں کی طرف (تمہیں پتہ چلے گا) کہ وہ کیسے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد، بے شک وہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ یعنی بارش کی طرف دیکھو یعنی عبرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو یعنی اس سے یہ استدلال کرو کہ جو اس پر قادر ہے تو وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے آثار جمع کا صیغہ پڑھا ہے باقی قراء نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ یہ مفرد کی طرف مضاف ہے۔ اثر، یُحیی کا فاعل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم ہو۔ جس نے آثار جمع کا صیغہ پڑھا ہے تو وہ اس لیے ہے کہ رحمت سے مراد کثرت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل: 18)۔ جحدری، ابو حیوہ اور دوسرے علماء نے پڑھا: کیف تحیی الارض تاء کے ساتھ پڑھا ہے تانیث لفظ رحمة کے اعتبار سے ہے کیونکہ رحمت کا اثر اس کے قائم مقام ہوتا ہے، گویا یہ بھی رحمت ہی ہے یعنی رحمت زمین اور آثار دیتے زندہ کرتی ہے جس نے یاء کے ساتھ یُحیی پڑھا ہے تو فاعل اللہ تعالیٰ، بارش اور اثر ہوگا۔ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ معنی پر محمول کرتے ہوئے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ لفظ، لفظ استفہام ہے اور حال خبر

ہے تقدیر کلام یہ ہوگی: فانظرالی اثر رحمة الله محیية للأرض بعد موتها۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ شاہد سے غائب پر استدلال ہے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ۝

''اور اگر ہم بھیجتے ایسی ہوا (جس کے اثر سے) وہ دیکھتے اپنے سرسبز کھیتوں کو کہ زرد ہو گئے ہیں تو اس کے باوجود وہ کفر پر اڑے رہتے''۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا یا ضمیر سے مراد الریح ہے اور الریح کو مذکر پڑھنا بھی جائز ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: ہر مونث جو غیر حقیقی ہو اسے مذکر قرار دینا ممتنع نہیں جس طرح أعجبنی الدار اور اس کے مشابہ جو دوسرے جملے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرأوا السحاب۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ضمیر سے مراد الزرع ہے، یہی اثر ہے معنی ہوگا وہ اثر کو زرد دیکھیں گے۔ کھیتی کے سبز ہونے کے بعد اس کا زرد ہونا اس کے خشک ہونے پر دال ہے، اسی طرح سحاب اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بارش نہیں برسائے گا اور ہوا ملاقحہ کا عمل نہیں کرے گی۔

لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ یعنی لیظلن فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی ذکر کرنا اچھا ہے کیونکہ کلام میں مجازاۃ کا معنی ہے اور مجازاۃ مستقبل میں نہیں ہوتا، یہ خلیل وغیرہ کا قول ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۗ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

''پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں اپنی پکار خصوصاً جب وہ پیٹھ پھیر کر چل رہے ہوں۔ اور نہ آپ ہدایت دے سکتے ہیں اندھوں کو ان کی گمراہی سے، آپ نہیں سنا سکتے مگر انہیں جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں''۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے دلائل کو واضح کر دیا لیکن وہ کفر میں اپنے اسلاف کی تقلید سے محبت کرتے ہیں اس وجہ سے ان کی عقول مرگئی ہیں اور ان کی بصیرتیں ناپید ہوگئی ہیں انہیں یہ پیغام حق سنانا اور انہیں ہدایت آپ کے لیے ممکن نہیں (1) یہ قدریہ کا رد ہے۔ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا یعنی آپ مومنوں کو ہی وعظ سنا سکتے ہیں جو توحید کے ادلہ کو توجہ سے سنتے ہیں اور میں نے ان کے لیے ہدایت کو تخلیق فرمایا ہے۔ سورۂ نمل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ یہاں بِهٰدِ الْعُمْيِ کا لفظ یاء کے بغیر واقع ہوا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ

1۔ آیات کی تفسیر سے یہ عیاں ہے کہ مردوں، بہروں اور اندھوں سے مراد وہ ہیں جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں یہاں یہ الفاظ اپنے حقیقی معنی میں نہیں۔ (مترجم)

قُوَّةٍ ضُعۡفًا وَّ شَيۡبَةً ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡقَدِيۡرُ ۝۵۴

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں (ابتدا میں) کمزور پیدا فرمایا پھر عطا کی (تمہیں) کمزوری کے بعد قوت پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دے دیا، پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بڑی قدرت والا ہے''۔

اَللّٰهُ الَّذِيۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ ضَعۡفٍ انسان کی ذات میں موجود اس کی قدرت پر ایک اور استدلال کا ذکر کیا کہ وہ عبرت حاصل کرے۔ مِّنۡ ضَعۡفٍ کا معنی ہے کمزور نطفہ سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِّنۡ ضَعۡفٍ کا معنی ہے کمزور حالت میں۔ اس سے مراد ہے جب وہ ابتدا میں طفولت اور چھوٹی عمر میں تھے۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضَعۡفٍ قُوَّةً مراد جوانی ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ ضُعۡفًا مراد بڑھاپا ہے۔ عاصم اور حمزہ نے اسے پڑھا سب میں ضاد مفتوح ہے۔ باقی قراء نے ضاد پر ضمہ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔

ضمہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت ہے۔ ضعفا یہ ضمہ کے ساتھ خاص ہے۔ ارادہ یہ کیا کہ دونوں لغتوں کو جمع کر دے۔ فراء نے کہا: ضاد پر ضمہ یہ قریش کی لغت ہے اور فتحہ یہ بنو تمیم کی لغت ہے۔ جوہری نے کہا: الضَّعف اور الضُّعف یہ قوت کی ضد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الضعف جب ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہو تو رائے میں کمزوری کو کہتے ہیں اور ضمہ کے ساتھ ہو تو جسم میں کمزوری کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں وہ حدیث ہے جو اس آدمی کے بارے میں ہے جو بیوع میں دھوکہ کھا جاتا تھا انہ یبتاع دفی عقدتہ ضعف (1) وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کے عقد کرنے میں کمزوری ہے۔ وَّ شَيۡبَةً یہ الشیب کی طرح مصدر ہے۔ مصدر سب کے لیے کافی ہے، اسی طرح ضعف اور قوت میں قول ہے۔ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ قوت وضعف میں سے جو چاہتا ہے اسے پیدا کرتا ہے۔ وَهُوَ الۡعَلِيۡمُ وہ تدبیر کو جانتا ہے اور اپنے ارادہ میں قوی ہے (2)۔ کوفہ کے نحویوں نے ضعف عین کے فتحہ کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ ہر اس لفظ میں ہے جس کا عین یا لام کلمہ حرف حلقی ہو۔

وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۙ مَا لَبِثُوۡا غَيۡرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوۡا يُؤۡفَكُوۡنَ ۝۵۵

''اور جس روز قیامت قائم ہوگی قسمیں اٹھائیں گے مجرم کہ نہیں ٹھہرے وہ (دنیا میں) مگر ایک گھڑی یونہی وہ (پہلے بھی) غلط بیانی کیا کرتے تھے''۔

وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ مشرک قسم اٹھائیں گے۔ مَا لَبِثُوۡا غَيۡرَ سَاعَةٍ اس میں عذاب قبر کا رد نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سندوں سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی اور پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ ان روایات میں سے ایک یہ ہے جسے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! مجھے میرے خاوند جو رسول اللہ ہیں، میرے باپ حضرت ابو سفیان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاجارۃ، باب فی الرجل یقول فی البیع لا خلابۃ، جلد 2، صفحہ 138 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 322

میرے بھائی حضرت معاویہ (کی زندگی) سے لطف اندوز کر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تحقیق تو نے بیان کی گئی آجال اور تقسیم کیے گئے رزقوں کے بارے میں پوچھا بلکہ تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر کہ وہ تجھے عذاب جہنم سے پناہ دے اور عذاب قبر سے پناہ دے" (1)۔ یہ احادیث مشہورہ میں سے ہے جنہیں امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے بیان کیا ہے۔ ہم نے ان تمام احادیث کو کتاب "التذکرۃ" میں ذکر کر دیا ہے۔

**مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ** میں دو قول ہیں: (1) یوم قیامت سے قبل بے ہوشی کا ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ما لبثنا غیر ساعۃ ہم ساعت بھر رہے۔ (۲) مراد وہ دنیا لیتے ہیں کیونکہ وہ زائل اور منقطع ہونے والی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا۝** (النازعات) گویا وہ دن کی کچھ گھڑیاں ٹھہرے ہیں اگرچہ انہوں نے امور غیب پر اور اس چیز پر قسم اٹھائی جس کو نہیں جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ** وہ دنیا میں جھوٹ بولا کرتے تھے (2)۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: افك الرجل جب اسے صدق اور خیر سے پھیر دیا جائے۔ ارض ما فوكة ایسا علاقہ جس سے بارش کو روک دیا گیا ہو۔ اہل نظر کی ایک جماعت نے گمان کیا کہ قیامت میں جھوٹ جائز نہیں کیونکہ وہ اس میں ہوں گے جب کہ قرآن اس کے برعکس پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ** جس طرح انہیں ان کی قسموں میں حق سے پھیر دیا گیا کہ وہ صرف ایک لحہ بھر اس میں ٹھہرے اسی طرح وہ دنیا میں حق سے پھیر دیئے گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۭ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ۝** (المجادلہ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا** (الانعام: 23)

**وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۵۶**

"اور کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم اور ایمان دیا گیا (انہیں) کہ تم ٹھہرے رہے نوشتہ الٰہی کے مطابق روز حشر تک پس یہ (آ گیا) ہے یوم محشر لیکن تم نہیں جانتے تھے"۔

**وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ**، **الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ** کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ملائکہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد انبیاء ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد امتوں کے علماء ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد اس امت کے مومن ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تمام مومن ہیں یعنی کافر مومنوں سے کہیں گے، مقصود ان کا رد کرنا ہوگا: تم اپنی قبروں میں یوم بعث تک رہے۔ **فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ** میں فاء شرط محذوف کے جواب کے لیے ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ معنی یہ بنتا ہے: ان كنتم منكرين البعث فهذا يوم البعث۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، باب بیان ان الاجال والارزاق وغیرھا، جلد 2، صفحہ 338
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 323

یعقوب نے بعض قراء سے بیان کیا جب کہ یہ حضرت حسن بصری کی قراءت ہے اِلٰی یَوْمِ الْبَعَثِ یعنی عین متحرک ہے۔ یہ ان تمام الفاظ میں قاعدہ جاری ہوتا ہے جس میں حرف حلقی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ مراد الله کے حکم میں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ بنے گی قال الذین أوتوا العلم فی کتاب الله والإیمان لقد لبثتم فی یوم البعث،(1) یہ مقاتل، قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ قشیری نے کہا: اس تعبیر کی بناء پر اُوْتُوا الْعِلْمَ، کِتٰبِ اللّٰهِ کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی وہ لوگ جن کے حق میں کتاب میں علم کا فیصلہ کیا گیا۔

فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ یعنی یہ وہ دن ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

"پس اس دن نہ نفع دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ توبہ کر کے الله کو راضی کر لیں"۔

قیامت کا علم اور اس دن کی معذرت انہیں کوئی نفع نہ دے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب مومنوں نے ان کو رد کر دیا انہوں نے دنیا کی طرف لوٹ جانے کا سوال کیا اور انہوں نے معذرت پیش کی تو ان کا عذر قبول نہ کیا گیا۔

وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ان کی وہ حالت نہیں جو رجوع کرنے والے کی ہوتی ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: استعتبته فاعتبنی میں نے اس سے رضا کو طلب کیا پس اس نے مجھے راضی کر لیا۔ یہ اس صورت میں ہے جب تو اس پر جنایت کرنے والا ہو اعتبته کی حقیقت یہ ہے تو نے اس کی ناراضگی کو زائل کیا سورۂ فصلت میں اس کا بیان آئے گا۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے فیومئذ لاینفع یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

"اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں (کے بھلے) کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال اور اگر آپ لے آئیں ان کے پاس کوئی نشانی تو (جواباً) یہی کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا: نہیں ہو تم مگر باطل پرست یونہی مہر لگا دیتا ہے الله تعالیٰ دلوں پر جو (حق کو) نہیں جانتے سو آپ صبر فرمائیں بے شک الله کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو پھسلا نہ دیں (راہ حق سے) وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے"۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ہر قسم کی مثال جو ان کی رہنمائی کرتی ہے جس کے وہ محتاج ہیں اور انہیں توحید اور رسولوں کی صداقت پر آگاہ کرتی ہے۔ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ آیہ سے مراد معجزہ ہے جس طرح سمندر کا پھٹنا، عصا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 323

اور دوسرے معجزات۔ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ کافر مومنوں کو کہیں گے: تم باطل اور جادو کی اتباع کرتے ہو۔ كَذٰلِكَ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی آیات کو نہیں سمجھتے، اسی طرح يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو توحید کے ادلہ کو نہیں جانتے۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ان کی اذیتوں پر صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ تیری مدد فرمائے گا۔ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ تجھے تیرے دین سے نہ پھسلا دیں جو یقین نہیں رکھتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد نضر بن حارث ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مراد آپ کی امت ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: استخف فلان فلانا فلاں نے فلاں کو حقیر جانا یہاں تک کہ اسے سرکشی میں اپنی اتباع پر برانگیختہ کیا، یہ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے اسے نون ثقیلہ کے ساتھ موکد کیا تو اسے مبنی برفتحہ بنا دیا گیا جس طرح دو چیزوں کو مبنی برفتحہ بنایا جاتا ہے جب ان میں سے ایک کو دوسری کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ یہ محل رفع میں ہے عربوں میں سے کچھ کہتے ہیں الاذن یہ محل رفع میں ہے۔ سورۂ فاتحہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

# سورۃ لقمان

﴿ایاتها ۳۴﴾ ﴿۳۱ سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ مَکِّیَّۃٌ ۵۷﴾ ﴿رکوعاتها ۴﴾

دو آیتوں کے سوا یہ سورت مکی ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کے شروع سے دو آیتوں کے آخر تک ان دونوں میں سے پہلی وَلَوْ اَنَّ مَافِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سورت کی تین آیات (مدنی ہیں) باقی سورت مکی ہے ان میں سے پہلی وَلَوْ اَنَّ مَافِی الْاَرْضِ ہے اس کی کل چونتیس آیات ہیں (1)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۞ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۞ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

''الف، لام، میم۔ یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی، سراپا ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لیے، وہ جو صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی توفیق سے، اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں کامران ہیں''۔

الٓمّٓ ۞ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ سورتوں کے آغاز میں کلام گزر چکی ہے۔ تِلْكَ یہ محل رفع میں ہے کیونکہ مبتدا مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہے ھذہ تلک۔ یہ بھی پڑھا جاتا ہے تیك اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ یہ تلك کا بدل ہے۔ کتاب سے مراد قرآن اور حکیم سے مراد محکم ہے، یعنی اس میں کوئی خلل اور کوئی تناقض نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حکمت والا ہے۔ اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حاکم ہے۔

هُدًى وَّ رَحْمَةً یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کی مثل هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (اعراف: 73) یہ دونوں مدنیوں، ابوعمرو، عاصم اور کسائی کی قراءت ہے۔ حمزہ نے ھدی و رحمۃ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہے: (۱) مبتدا مضمر ہے کیونکہ یہ پہلی آیت ہے (۲) یہ تلك کی خبر ہے۔ محسن وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے گویا وہ اسے دیکھ رہا ہو، اگر بندہ اسے نہ دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دین میں محسن ہیں۔ دین سے مراد اسلام ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (النساء: 125) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یہ صفت ہے موصوف سے الگ ہونے کی بنا پر یہ محل رفع میں ہے جو اس معنی میں ہے ھم الذین۔ نصب أعنی مضمر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 345

ہونے کی وجہ سے ہے اس آیت اور اس کے بعد والی آیات میں گفتگو سورۂ بقرہ وغیرہ میں گزر چکی ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

''اور کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوپار کرتے ہیں (مقصد حیات سے) غافل کر دینے والی باتوں کا تا کہ بھٹکاتے رہیں راہ خدا سے (اس کے نتائج بد سے) بےخبر ہو کر اور اس کا مذاق اڑاتے رہیں یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ من محل رفع میں مبتدا ہے لَهْوَ الْحَدِيْثِ اس سے مراد غنا ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس وغیرہما کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ کتاب وسنت سے ممنوع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے من یشتری ذالھو او ذات لھو یعنی مضاف محذوف ہے جس طرح وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) یہاں بھی الْقَرْيَةَ سے پہلے اہل کا لفظ محذوف ہے یا تقدیر کلام یہ ہے: لما کان إنما اشتراھا یشتریھا و یبالغ فی ثمنھا کأنه اشتراھا للھو۔

میں کہتا ہوں: یہ ان تین آیات میں سے ایک ہے جن سے علماء نے استدلال کیا کہ غنا مکروہ ہے اور اس سے علماء نے منع کیا ہے۔ دوسری آیت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝ (النجم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قبیلہ حمیر کی زبان میں اس سے مراد غنا ہے یعنی غَنِّ لنا یعنی ہمارے لیے گانا گا۔ تیسری آیت وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (الاسراء: 64) مجاہد نے کہا: غنا اور مزامیر ہے۔ سورۃ الاسراء میں اس کے بارے میں یہ بات گزر چکی ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابوامامہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: لا تبیعوا القینات ولا تشتروھن ولا تعلموھن ولا خیر فی تجارۃ فیھن و ثمنھن حرام (1) اسی کی مثل میں یہ آیت نازل ہوئی۔ گانا بجانے والی لونڈیاں نہ بیچو، انہیں نہ خریدو اور انہیں اس کی تعلیم نہ دو ان کی تجارت میں کوئی بھلائی نہیں ان کی قیمت حرام ہے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث غریب ہے، یہ قاسم سے وہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں قاسم، ثقہ ہے علی بن یزید کو حدیث میں کمزور قرار دیا جاتا ہے، یہ محمد بن اسماعیل کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے یہی تفسیر مروی ہے اور مجاہد نے بھی یہی بیان کیا ہے، ابوالفرج جوزی نے حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر، قتادہ اور نخعی سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں، اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ قول ان سب سے اعلیٰ ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تین دفعہ باللہ الذی لا الہ الا ھو کے ساتھ قسم اٹھائی کہ اس سے مراد غنا ہے (2)۔ سعید بن جبیر نے ابوصہباء بکری سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کے بارے میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۂ لقمان، جلد 2، صفحہ 151
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ [illegible]

پوچھا گیا: فرمایا: اس سے مراد غنا ہے اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! اس قسم کو تین دفعہ دہرایا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد گانا ہے۔ عکرمہ، میمون بن مہران اور مکحول سے اسی طرح مروی ہے۔ شعبہ اور سفیان نے حکم سے اور حماد نے ابراہیم سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: غنا (گانا) دل میں نفاق کو جنم دیتا ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے اور یہ اضافہ کیا کہ آیت میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا سننا اور اسی طرح کی باطل چیزوں کو سننا ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا بجانے کے آلات اور گانا ہے(1)۔ قاسم بن محمد نے کہا: غنا باطل ہے اور باطل جہنم میں ہے۔ ابن قاسم نے کہا: میں نے امام مالک سے اس بارے میں پوچھا، فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس: 32) یہ حق ہے(2)۔ امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب کل لھو باطل إذا شغل عن طاعة الله ومن قال لصاحبه تعال أقامِرْك(3) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا امام بخاری کا قول: اذا شغل عن طاعة الله یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے ماخوذ ہے۔ حضرت حسن بصری سے بھی یہ مروی ہے اس سے مراد: کفر اور شرک ہے۔ ایک قوم نے ایسی باتوں کی بھی تاویل کی ہے جن کے ساتھ اہل باطل اور اہل لعب، لہو ولعب کا شکار رہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی (4)۔ اس نے عجمیوں کی کتابیں رستم اور اسفند یار خریدیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں بیٹھا کرتا جب قریش اسے کہتے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ کہا ہے، تو وہ اس سے ہنستا اور قریش کو فارس کے بادشاہوں کے قصے بیان کرتا اور وہ کہتا: میری یہ کہانی (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سے اچھی ہے۔ فراء، کلبی اور دونوں کے علاوہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ گانا گانے والی لونڈیاں خریدتا وہ کسی ایسے آدمی کو نہ پاتا جو اسلام قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہوتو اسے اپنی لونڈی کی طرف لے جاتا وہ لونڈی سے کہتا: اسے کھانا کھلاؤ، اسے مشروب پلاؤ اور اسے نغمہ سناؤ۔ اور وہ کہتا: یہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے ہیں یعنی نماز، روزہ اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا؛ یہ قول اور پہلا قول شراء میں ظاہر ہے۔

ایک طائفہ کا کہنا ہے: اس آیت میں شراء مجازی معنی میں ہے۔ یہ آیت قریش کی باتوں، اسلام کے بارے میں ان کے لہو ولعب اور باطل میں ان کے داخل ہونے کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن عطیہ نے کہا: جس فعل کا کرنا واجب تھا اس کو ترک کرنا اور ان منکرات کو بجالانا ان کا شراء ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ: 16) انہوں نے ایمان کے بدلے میں کفر حاصل کیا یعنی کفر کو ایمان سے بدل لیا اور کفر کو ایمان پر ترجیح دی۔ مطرف نے کہا: شراء لھو الحدیث سے مراد لھو الحدیث کو پسند کرنا ہے۔ قتادہ نے کہا: ممکن ہے وہ اس میں اپنا مال خرچ نہ کرے لیکن اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 345
2۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، ماجاء فی النرد، صفحہ 724
3۔ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب کل لھو باطل، جلد 2، صفحہ 932
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 346

سننا اس کو خریدنا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں جو کچھ کہا گیا ہے پہلا قول زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس کے بارے میں حدیث مرفوع ہے صحابہ اور تابعین کا قول ہے۔ اس میں ثعلبی اور واحدی نے حضرت ابو امامہ کی حدیث میں اضافہ کیا ہے: ''جو آدمی گانے کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر شیطانوں کو بھیج دیتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک کندھے پر ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے کندھے پر ہوتا ہے وہ لگاتار اسے اپنے پاؤں مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتا ہے'' (1)۔

امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ فرمایا: دو ملعون اور فاجر آوازیں ہیں میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں صوت مزمار و رنة شيطان عند نغمة و مرح و رنة عند مصيبة لطم خدود و شق جيوب۔ (2) بانسری کی آواز اور شیطانی آواز وہ نغمہ اور اترانے کے وقت آواز نکالنا اور مصیبت کے وقت آواز نکالنا ہے رخساروں پر طمانچہ مارنا اور گریبان پھاڑنا ہے۔

جعفر بن محمد اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے وہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے آلات لہو ولعب کے توڑنے کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے'' (3)۔ اسے ابو طالب غیلانی نے نقل کیا ہے۔ ابن بشران عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے لہو لعب اور طبل کو توڑنے کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے'' (4)۔ امام ترمذی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب میری امت پندرہ عمل کرے گی تو اس پر آزمائش اترے گی۔ ان میں سے یہ امور ذکر کیے: جب وہ گانا بجانے والی لونڈیوں اور آلات لہو ولعب کو اپنا لیں گے''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے وظهرت القِيان والمعازِف گانے بجانے والی لونڈیاں اور آلات لہو ولعب غالب آجائیں گے (5)۔

ابن مبارک نے مالک بن انس سے وہ محمد بن منکدر سے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو کسی لونڈی کے پاس بیٹھا تا کہ اس سے گانا سنے تو قیامت کے روز اس کے کان میں سیسہ ڈال دیا جائے گا'' (6)۔ اسد بن موسیٰ، عبد العزیز بن ابی سلمہ سے وہ محمد بن منکدر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا: ''میرے وہ بندے کہاں ہیں جو اپنی ذاتوں اور کانوں کو لہو ولعب اور شیطان کے آلات سے بچاتے تھے، انہیں کستوری کے باغات میں اتار دو اور انہیں خبر دو کہ میں نے ان پر اپنی رضا اتار دی ہے'' (7)۔

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 3، صفحہ 491-490

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، ماجاء فی الرخصة فی البكاء على الميت، جلد 1، صفحہ 119۔ ایضاً، حدیث نمبر 926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 226، حدیث نمبر 40689　　4۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 216، حدیث نمبر 40640

5۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ما جاء فی علامة حلول المسخ والخسف، جلد 2، صفحہ 44

6۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 221-220، حدیث نمبر 40669　　7۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1493

ابن وہب نے مالک سے وہ محمد بن منکدر سے اس کی مثل روایت نقل کرتے ہیں۔

اور المسک کے قول کے بعد یہ اضافہ کیا "پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا" انہیں میری حمد، میرا شکر اور میری ثنا سناؤ اور انہیں بتاؤ کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور وہ غمگین نہ ہوں گے"۔ یہی معنی حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی حدیث مرفوع سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے مغنی کی آواز کو توجہ سے سنا تو اسے اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ روحانیوں کو سنیں۔ عرض کی گئی: روحانیون کون ہیں؟ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: "اہل جنت کے قاری" (1)۔ اسے ترمذی حکیم ابوعبداللہ نے "نوادر الاصول" میں نقل کیا ہے، ہم نے اسے کتاب "التذکرۃ" میں امثلہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ "جس نے دنیا میں شراب پی آخرت میں اس کو نہیں پیے گا" (2)۔ "جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اس کو نہیں پہنے گا" (3)۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جس طرح ہم نے انہیں بیان کیا ہے۔ مکحول نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو آدمی مرجائے اور اس کے پاس مغنیہ لونڈی ہو تو اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو"۔

ان آثار وغیرہا کی وجہ سے علماء نے کہا: گانا گانا حرام ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ عام علماء کے نزدیک اس سے مراد معتاد غنا ہے جو نفوس کو حرکت دے اور ان نفوس کو خواہش نفس، غزل، مخول اور بے حیائی پر برانگیختہ کرے جو ساکن کو حرکت دے اور پوشیدہ جذبہ کو بھڑکائے۔ جب یہ نوع شعر میں ہو تو اس میں عورتوں کا ذکر ان کے محاسن کا ذکر، شراب کا ذکر اور محرمات کا ذکر کرے اس کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ سب کا اتفاق ہے کہ یہ لہو ہے اور غنا مذموم ہے مگر جو اس سے محفوظ ہو تو خوشی کے اوقات میں تھوڑا بہت جائز ہے جس طرح شادی، عید، اور اعمال شاقہ پر چستی دلانا، جس طرح غزوہ خندق کے موقع پر ہوا، اونٹوں کو تیز چلانے کے موقع پر ہوا اور حضرت سلمہ بن اکوع کا واقعہ ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جسے صوفیاء نے آج اپنا لیا ہے کہ ہمیشہ آلات لہو ولعب سے سنتے ہیں جن میں مختلف قسم کے آلات استعمال ہوتے ہیں تو وہ حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک جنگ کی طبل کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ نفوس کو مضبوط کرتا ہے اور دشمن کو خوفزدہ کرتا ہے۔ چرواہے کے مزمار میں تردد ہے۔ دف مباح ہے۔

جوہری نے کہا: بعض اوقات چرواہے کی بنسری جس کے ساتھ گانا گاتا ہے اسے ہیرعہ اور ہراعہ کہتے ہیں۔ قشیری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس روز مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دف بجایا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جھڑ کنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے ابابکر! انہیں چھوڑ دو تا کہ یہودی جان لیں کہ ہمارا دین وسعت والا ہے" (4)۔ بچیاں دف بجاتیں اور کہتیں: ہم بنی نجار کی بچیاں ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کتنے اچھے پڑوسی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نکاح کے موقع پر طبل دف کی طرح ہے اسی طرح وہ آلات جو نکاح کے اعلان کا باعث ہوں ان کا استعمال

---

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 154

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربہ، من شرب الخمر فی الدنیا، صفحہ 250

3۔ ایضاً، کتاب اللباس، صفحہ 264

4۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 214، حدیث نمبر 40628

اس میں جائز ہے جب کہ کلام اچھی ہو اس میں رفث نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ہمیشہ کے لیے غنا میں مصروف رہنا بے وقوفی ہے اس کے ساتھ شہادت رد کر دی جائے گی۔ اگر وہ گانے میں ہمیشہ مشغول نہ رہتا ہو تو اس کی شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ اسحاق بن عیسیٰ طباع نے ذکر کیا۔ کہا: میں نے امام مالک بن انس سے پوچھا: اہل مدینہ غنا میں سے کسی چیز کی رخصت دیا کرتے تھے۔ فرمایا: ہمارے ہاں فاسق لوگ یہ کام کیا کرتے تھے۔

ابوطیب بن عبداللہ طبری نے ذکر کیا کہا: جہاں تک امام مالک بن انس کا تعلق ہے آپ نے گانا گانے اور اس کو سننے سے منع کیا ہے۔ فرمایا: جب کوئی آدمی لونڈی خریدے اور اسے گانا گانے والا پائے تو عیب کی وجہ سے اسے لوٹا دے؛ یہ عام اہل مدینہ کا مذہب ہے مگر ابراہیم بن سعد، ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان سے ذکریا ساجی نے ذکر کیا ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھا کرتے تھے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ صناعت (فن) کو جانتے تھے جب کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ وہ حرام ہے، ان سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: میں نے اس صناعت (فن) کو سیکھا جب کہ میں نوجوان تھا، میری ماں نے مجھے کہا: اے بیٹے! یہ فن اس کے لیے مناسب ہوتا ہے جو خوبصورت چہرے والا ہو اور تو اس طرح نہیں ہے لہٰذا تم تو علوم دینیہ کو حاصل کرو تو میں نے حضرت ربیع کی صحبت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر رکھ دی۔

ابوطیب طبری نے کہا: جہاں تک امام اعظم ابوحنیفہ کا تعلق ہے آپ نبیذ کے پینے کو مباح جاننے کے باوجود غنا کو مکروہ جانتے تھے۔ اور غنا کے سماع کو گناہ شمار کرتے تھے، اہل کوفہ کا مذہب بھی یہی ہے، جیسے ابراہیم، شعبی، حماد اور ثوری وغیرہ۔ اس مسئلہ میں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے مکروہ ہونے اور اس سے منع کرنے کے بارے میں اہل بصرہ کے درمیان میں کوئی اختلاف معروف نہیں، مگر وہ روایت جو عبید اللہ بن حسن عنبری سے مروی ہے کہ آپ اس میں کوئی حرج خیال نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک امام شافعی کا تعلق ہے فرمایا: غنا مکروہ ہے اور باطل کے مشابہ ہے۔ جس نے اس عمل کو کثرت سے کیا تو وہ بے وقوف ہے اس کی گواہی کو رد کر دیا جائے گا۔ ابوفرج جوزی نے امام احمد بن حنبل سے تین روایات نقل کی ہیں: (۱) ہمارے اصحاب نے ابوبکر خلال اور ان کے صاحب عبدالعزیز سے غنا کی اباحت کا ذکر کیا۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ ان کے دور میں جو زہدیہ قصائد پڑھے جاتے تھے امام احمد اسے مکروہ نہیں کہتے اسی قول کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس پر یہ واقعہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو مر گیا اس نے اپنے پیچھے ایک بچہ اور مغنیہ لونڈی چھوڑی بچہ اس لونڈی کو بیچنے کا محتاج ہوا فرمایا: اسے بیچا جائے گا کہ وہ سادہ لونڈی ہے نہ کہ اس شرط پر بیچا جائے گا کہ وہ مغنیہ ہے۔ آپ سے عرض کی گئی: وہ تیس ہزار کے ہم پلہ ہے اگر اسے سادہ عام لونڈی کی حیثیت سے بیچا جائے تو وہ بیس ہزار کے برابر ہے؟ فرمایا: اسے نہ بیچا جائے مگر اس شرط پر کہ وہ سادہ لونڈی ہے۔ ابوالفرج نے کہا: امام احمد نے یہ قول اس لیے کیا کیونکہ یہ لونڈی زہد والے قصائد نہیں پڑھا کرتی تھی بلکہ ایسے اشعار پڑھا کرتی تھی جو عشق و محبت کے جذبات کو بھڑکانے والے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ گانا گانا ممنوع ہے اگر یہ عمل ممنوع نہ ہوتا تو یتیم پر اس کے مال کو ضائع کرنا جائز نہ ہوتا، یہ اسی طرح ہو گیا جس طرح

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: عندی خمر لایتام؟ میرے پاس یتیموں کا شراب پڑا ہوا ہے؟ فرمایا: ''اسے بہا دو'' (1)۔ اگر اس کو درست کرنا جائز ہوتا تو یتیموں کے مال کو ضائع کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ طبری نے کہا: مختلف شہروں کے علماء نے غنا کی کراہت اور اس سے روکنے پر اتفاق کیا ہے۔ ابراہیم بن سعد اور عبید اللہ عنبری نے جماعت سے اختلاف کیا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علیکم بالسواد الاعظم (2) ومن فارق الجماعة مات میتة جاهلیة سواد اعظم کو لازم پکڑو جو جماعت سے الگ ہوا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ ابوالفرج نے کہا: ہمارے اصحاب میں سے قفال نے کہا: مغنی اور رقاص کی شہادت قبول نہ کی جائے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ امر جائز نہیں تو اس پر اجرت جائز نہیں۔ ابو عمر بن عبد اللہ نے اس عمل (گانا گانے) پر اجرت لینے کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۃ الانعام میں وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (59) کے ضمن میں بحث گزر چکی ہے تیرے لیے وہ کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: جہاں تک لونڈیوں کے گانے کے سننے کا تعلق ہے تو مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی لونڈی کا نغمہ سنے کیونکہ اس پر اس کی کوئی چیز حرام نہیں نہ اس کے ظاہر سے کوئی چیز حرام ہے اور نہ اس کے باطن میں سے کوئی چیز حرام ہے تو اس کی آواز سے لذت حاصل کرنا کیسے حرام ہوگا؟ مگر عورتوں کا مردوں کے سامنے آنا، ان کے پردہ کو پامال کرنا اور بے حیائی کی بات سننا جائز نہیں جب وہ ایسی چیز کی طرف نکلے جو حلال نہ ہو اور جائز نہ ہو تو اس کو ابتدا سے منع کر دیا جائے گا اور اس کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے گا (3)۔ ابوالطیب طبری نے کہا: ایسی عورت سے جو محرم نہ ہو تو اصحاب شافعی نے کہا: یہ جائز نہیں؛ وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی ہو۔ کہا: امام شافعی نے فرمایا: لونڈی کا مالک اگر گانا سننے کے لیے عورتوں کو بھی جمع کرے تو وہ سفیہ ہوگا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ پھر اس میں سخت گفتگو کی۔ فرمایا: وہ بدکاری ہے اس کے مالک کو بے وقوف قرار دیا جائے گا کیونکہ اس نے لوگوں کو باطل کی طرف دعوت دی ہے اور جو لوگوں کو باطل کی طرف بلائے تو وہ سفیہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عام قراءت یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی غیر کو صراط مستقیم سے گمراہ کر دے جب وہ دوسروں کو گمراہ کرے تو خود بھی گمراہ ہوا۔ ابن کثیر، ابن محیصن، حمید، ابوعمرو، رویس اور ابن ابی اسحاق نے یاء کے فتحہ کے ساتھ لازم پڑھا ہے تاکہ خود صراط مستقیم سے گمراہ ہو۔

وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا اور مدنی قراء، ابوعمرو اور عاصم کی قراءت رفع کی صورت میں ہے اس کا عطف من یشتری پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ اعمش، حمزہ اور کسائی نے اسے ویتخذها نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف لِيُضِلَّ پر ہے دونوں صورتوں میں بِغَيْرِ عِلْمٍ پر وقف مستحسن نہیں اور هُزُوًا پر عطف ہوگا۔ يَتَّخِذَهَا میں ہا ضمیر آیات سے کنایہ ہے۔ یہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، ما جاء فی بیع الخمر والنهی عن ذالك، جلد 1، صفحہ 155

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، صفحہ 292۔ ایضاً، حدیث نمبر 3939، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1494

بھی جائز ہے کہ یہ السبیل سے کنایہ ہو کیونکہ السبیل کا لفظ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ سخت عذاب ہوگا جو انہیں ذلیل ورسوا کر دے گا۔ شاعر نے کہا:

ولقد جذعت إلى النصارى بعد ما لَقِيَ الصليبُ من العذاب مهينا

میں نے نصاری کی پناہ لی بعد اس کے کہ صلیب نے ذلت والا عذاب پایا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اسے ہماری آیتیں تو منہ پھیر لیتا ہے تکبر کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں جیسے اس کے دونوں کان بہرے ہیں سو آپ اسے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں''۔

اٰيٰتُنَا سے مراد قرآن ہے۔ وَلّٰى کا معنی اس نے اعراض کیا۔ مُسْتَكْبِرًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ وَقْرًا بوجھ اور گرانی ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے، اور وہی سب پر غالب ہے بڑا دانا ہے''۔

جب کفار کے عذاب کا ذکر کیا تو مومنوں کے لیے نعمتوں کا بھی ذکر کیا۔ خٰلِدِيْنَ کا معنی ہے ہمیشہ ہمیشہ۔ وَعْدَ اللّٰهِ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ ایسا سچا وعدہ ہے جس میں کوئی خلاف ورزی نہ ہوگی۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو اور کھڑے کر دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین ڈولتی نہ رہے ساتھ تمہارے اور پھیلا دیئے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی، پس اگائے ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکو!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں) مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں''۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، تَرَوْنَهَا یہ محل جر میں ہے جو عمد کی صفت ہے ممکن ہے وہاں ستون تو ہوں لیکن

دکھائی نہ دیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ السَّمٰوٰتِ سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو اور وہاں کوئی ستون نہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا، بہتر یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور وہاں کوئی ستون نہ ہوں؛ یہ مکی کا قول ہے اور بغیر عمد تمہ کے طور پر کلام ہو۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ الرعد میں گزر چکی ہے۔ وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ، رَوَاسِيَ سے مراد مضبوط پہاڑ ہیں۔ اَنْ تَمِيْدَ یہ محل نصب میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کراهیة أن تمید کوفیہ یہ کلام مقدر کرتے ہیں معنی ہے لئلا تمید۔

وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ کا معنی ہے من کل لون حسن ہر اچھی قسم۔ امام شعبی نے اسے لوگوں پر محمول کیا ہے کیونکہ وہ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اور ان میں سے جو جنت کی طرف جائے گا وہ کریم ہے اور ان میں سے جو آگ کی طرف جائے گا وہ لئیم (کمینہ) ہوگا، دوسرے علماء نے یہ تاویل کی کہ نطفہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے قرآن کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور خلق مخلوق کے معنی میں ہے یہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے تم آنکھوں سے اس کا معائنہ کرتے ہو۔ خَلْقُ اللّٰهِ یعنی اللہ کی مخلوق، یعنی اللہ تعالیٰ نے شریک کے بغیر اس کو پیدا کیا۔ فَاَرُوْنِيْ اے مشرکوں کی جماعتو! مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ یعنی بتوں نے کسے پیدا کیا؟ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ بلکہ مشرک واضح خسارے میں ہیں۔ ما استفہامیہ ہے جو محل رفع میں ہے اور اس کی خبر ذا ہے جو الذی کے معنی میں ہے اور خلق کا مفعول ضمیر محذوف ہے جو ھاء محذوفہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فأرونی ای شیء خلق الذین من دونه، جملہ أرونی کی وجہ سے محل نصب میں ہے خلق کے ساتھ ھاء ضمیر مضمر کی ہے جو الذین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مراد ہے مجھے ایسی اشیاء دکھاؤ جن کو غیر اللہ نے پیدا کیا۔ اس قول کی بنا پر تو کہتا ہے: ماذا تعلمت أنحو أم شعر تو نے کیا سیکھا علم نحو یا علم شعر۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما محل نصب میں ہے جس کو نصب أرونی دے رہا ہے اور ذا زائدہ ہے۔ اس تاویل کی بنا پر تو کہتا ہے: ماذا تعلمت أنحوا أم شعرا تو نے کیا سیکھا علم نحو یا شعر کا علم؟۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے عنایت فرمائی لقمان کو حکمت (ودانائی اور فرمایا) اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر ادا کرتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو کفران نعمت کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے''۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ لقمان اور الحکمة دونوں مفعول ہیں۔ لقمان منصرف نہیں کیوں کہ اس کے آخر میں الف، نون زائدتان ہے، تو یہ اس فعلان کے مشابہ ہو گیا جس کی مونث فعلی ہے تو یہ معرفہ میں منصرف نہ ہوگا کیونکہ یہ دوسرا ثقل ہو گا۔ نکرہ کی صورت میں یہ منصرف ہوگا کیونکہ دو ثقلوں میں سے ایک زائل ہو چکا ہے، یہ نحاس کا قول ہے۔ یہ لقمان بن باعوراء بن ناحور بن تارح وہی آزر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ (1) تھا۔ محمد بن اسحاق نے یہی نسب ذکر کیا ہے۔ ایک قول

1۔ جب کہ محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ آزر آپ کا چچا تھا اور آپ کے والد کا نام تارخ تھا۔ آزر اور تارح دو افراد ہیں ایک نہیں۔

یہ کیا گیا ہے: وہ لقمان بن عنقاء بن سرون ہے وہ نوبیا تھا جو اہل ایلہ سے تعلق رکھتا تھا؛ سہیل نے اسے ذکر کیا ہے۔ وہب نے کہا: وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔

مقاتل نے کہا: یہ ذکر کیا گیا کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے خالہ زاد تھے (1)۔ زمخشری نے کہا: وہ لقمان بن باعوراء ہیں جو حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے یا خالہ زاد ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ آذر کی اولاد میں سے ہیں وہ ہزاروں سال تک زندہ رہے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کو پایا اور ان سے علم سیکھا وہ حضرت داؤد سے پہلے فتویٰ دیا کرتے تھے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام مبعوث ہوئے تو آپ نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تو آپ سے عرض کی گئی تو آپ نے فرمایا: اَلَا اَکْتَفِی اِذْ کُفِیتُ جب معاملہ مجھے کفایت کرتا ہے تو میں اکتفا کیوں نہ کروں۔

واقدی نے کہا: وہ بنی اسرائیل میں قاضی تھے۔ سعید بن مسیب نے کہا: حضرت لقمان مصر کے حبشیوں میں سے تھے بڑے ہونٹوں والے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے حکمت سے نوازا اور نبوت سے محروم رکھا (3)؛ جمہور اہل تاویل کا یہی نقطہ نظر ہے۔ وہ ولی تھے نبی نہ تھے۔ عکرمہ اور شعبی نے ان کے نبی ہونے کا قول کیا ہے اس تعبیر کی بنا پر حکمت کا معنی نبوت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ حکیم تھے۔ یہی قول اعتقاد، دین و عمل میں سمجھ کے اعتبار سے درست ہے وہ بنی اسرائیل میں قاضی تھے، سیاہ رنگ کے تھے، پاؤں پھٹے ہوئے تھے، بڑے ہونٹوں والے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''حضرت لقمان نبی نہیں تھے وہ ایسے بندے تھے جو بہت زیادہ غور و فکر کرنے والے اور اچھا یقین رکھنے والے تھے اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے محبت کی۔ اس پر حکمت کا احسان کیا اور اسے اختیار دیا کہ اسے خلیفہ بنا دے جو حق کے ساتھ فیصلہ کرے۔ حضرت لقمان نے عرض کی: اے میرے رب! اگر تو نے مجھے اختیار دیا ہے تو میں عافیت کو قبول کرتا ہوں اور آزمائش کو ترک کرتا ہوں اگر تو نے میرے بارے حتمی فیصلہ فرما دیا ہے تو سر تسلیم خم ہے بے شک تو مجھے معصوم رکھے گا'' (4)۔ ابن عطیہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے اس کا اضافہ کیا ہے۔ فرشتوں نے اسے آواز دی حضرت لقمان انہیں دیکھ رہے تھے، اے لقمان کیوں؟ کہا: حاکم سخت ترین منزل پر ہوتا ہے مظلوم ہر جانب سے اسے ڈھانپے ہوتا ہے اگر اس کی مدد کی جائے تو وہ نجات پانے کے لائق ہے اگر خطا کرے تو جنت کے راستہ کو بھول جائے۔ جو دنیا میں ذلیل ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیا میں معزز ہو جو آخرت پر دنیا کو اختیار کرتا ہے دنیا اس پر غضب ناک ہو جاتی ہے اور وہ آخرت کو بھی نہیں پاتا۔ فرشتے اس کی اچھی گفتگو سے متعجب ہوتے وہ سوئے تو انہیں حکمت دی گئی وہ بیدار ہوئے تو حکمت کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو اس امر کے بارے میں ندا کی گئی تو انہوں نے خلافت کو قبول کر لیا۔

حضرت لقمان نے جو شرط لگائی اس شرط کا ذکر حضرت داؤد علیہ السلام نے نہ کیا تو آپ سے کئی دفعہ خطا ہوئی۔ سب

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 409 — 2۔ تفسیر کشاف، جلد 3، صفحہ 492

3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 331 — 4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 347

خطاؤں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ حضرت لقمان علیہ السلام اپنی حکمت کے ساتھ ان کی مدد کرتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں کہا: اے لقمان! تیرے لیے مبارک ہو تجھے حکمت سے نوازا گیا اور تجھ سے آزمائش دور کر دی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافت عطا کی گئی اور انہیں بلا اور فتنہ سے آزمایا گیا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کو نبوت اور حکمت میں اختیار دیا تو آپ نے نبوت پر حکمت کو ترجیح دی۔ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے حضرت جبریل امین نے ان پر حکمت کو بکھیر دیا۔ آپ نے صبح کی تو حکمت کی باتیں کر رہے تھے۔ آپ سے عرض کی گئی: تو نے نبوت پر حکمت کو کیسے اختیار کیا جب کہ تیرے رب نے تجھے اختیار دیا تھا ہے؟ فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مجھے نبوت کو بطور فرض لازم کرتا تو میں اس معاملہ میں اس سے مدد کا طالب ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا تو مجھے خوف ہوا کہ میں نبوت کے فرائض کی ادائیگی میں کمزور نہ پڑ جاؤں تو حکمت مجھے زیادہ محبوب تھی (1)۔

ان کے پیشہ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ درزی تھے؛ یہ سعید بن مسیب کا قول ہے۔ آپ نے ایک حبشی سے کہا: تو اس پر غم نہ کر کہ تو حبشی ہے (2)، لوگوں میں سے بہترین تین حبشی تھے۔ حضرت بلال، حضرت مجع جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور حضرت لقمان۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہر روز اپنے آقا کے لیے لکڑیوں کا ایک گٹھا لاتے تھے۔ آپ نے ایک ایسے آدمی سے کہا جو آپ کو دیکھ رہا تھا: اگر تو مجھے اس لیے دیکھ رہا ہے کہ میرے ہونٹ موٹے ہیں ان کے درمیان سے نرم گفتگو نکلتی ہے۔ اگر تو مجھے اس لیے دیکھتا ہے کہ میں سیاہ رنگ کا ہوں تو میرا دل سفید ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ چرواہا تھا ایک آدمی نے اسے دیکھا جو اسے پہلے سے جانتا تھا اس نے اسے کہا: تو فلاں کا غلام نہیں؟ حضرت لقمان نے کہا: کیوں نہیں؟ اس نے کہا: جو میں دیکھتا ہوں وہ تجھ تک کیسے پہنچا؟ فرمایا: اللہ کی تقدیر، میرا امانت کو ادا کرنا، سچی بات کرنا اور لایعنی باتوں کو ترک کرنا؛ یہ قول عبد الرحمٰن بن زید نے حضرت جابر سے نقل کیا ہے۔ خالد ربعی نے کہا: وہ بڑھئی تھے۔ ان کے آقا نے کہا: میرے لیے ایک بکری ذبح کرو اور میرے پاس اس میں دو اچھے ٹکڑے لے کر آؤ۔ حضرت لقمان اس کے پاس زبان اور دل لائے۔ آقا نے اسے کہا: اس بکری میں ان دو چیزوں سے اچھی چیز نہیں تھی؟ حضرت لقمان خاموش رہے پھر آقا نے اسے ایک اور بکری ذبح کرنے کا حکم دیا اور کہا: اس میں سے خبیث ترین ٹکڑے پھینک دو تو حضرت لقمان نے اس میں سے زبان اور دل کو پھینک دیا۔ آقا نے آپ سے کہا: میں نے تجھے حکم دیا کہ تو میرے پاس اس میں سے عمدہ ترین ٹکڑے لے آ تو تو میرے پاس زبان اور دل لایا اور میں نے تجھے حکم دیا کہ تو ان میں سے خبیث ترین ٹکڑے پھینک دے تو تو نے زبان اور دل کو پھینک دیا۔ حضرت لقمان نے آقا سے کہا: جب یہ پاکیزہ ہوں تو ان دونوں سے پاکیزہ تر چیز کوئی نہیں اور جب یہ خبیث ہوں تو ان دونوں سے بڑھ کر کوئی خبیث نہیں (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی کئی مرفوع احادیث سے ثابت ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1495 2۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 79

3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 64

''خبردار جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب فاسد ہو جائے تو تمام جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ دل ہے''(1)۔ زبان کے بارے میں بے شمار صحیح اور مشہور آثار آتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جسے اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کے شر سے بچایا وہ جنت میں داخل ہو گیا جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور جو دو ٹانگوں کے درمیان ہے''(2)۔ حضرت لقمان کی حکمت کی بے شمار باتیں مروی ہیں ان میں سے یہ ہے آپ سے پوچھا گیا: لوگوں میں سے کون سب سے برا ہے؟ فرمایا: جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اسے برا خیال کریں۔

میں کہتا ہوں: اس کے ہم معنی مرفوع روایت بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں سے ہر ایک سلامتی میں ہے مگر جو اعلانیہ بدکاری کرے اعلانیہ بدکاری میں سے یہ ہے کہ ایک آدمی رات کے وقت کوئی عمل کرے پھر وہ صبح کرتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی ہو تو وہ کہتا ہے: اے فلاں! میں نے گزشتہ رات یہ یہ کیا۔ اس نے رات گزاری جب کہ اس کا رب اس کی پردہ پوشی کر رہا تھا وہ صبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے پردہ کو چاک کرنے والا تھا(3)؛ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا؛ امام بخاری نے اسے نقل کیا۔ وہب بن منبہ نے کہا: میں نے حضرت لقمان کی حکمت کی اتنی باتیں پڑھی ہیں جو دس ہزار باب سے بڑھ کر ہیں۔ روایت بیان کی جاتی ہے: حضرت لقمان، حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے جب کہ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بن رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو یوں نرم کر دیا تھا جس طرح مٹی ہوتی ہے ارادہ کیا کہ آپ سے پوچھیں تو حکمت نے انہیں آلیا اور خاموش ہو گئے جب حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے مکمل کر لیا اور زرہ کو پہنا کہا: تو جنگ کا کتنا اچھا لباس ہے۔ حضرت لقمان نے کہا: خاموشی حکمت ہے اس پر عمل کرنے والے کم ہی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں کہا: تجھے جو حکیم کہا گیا وہ درست ہے۔

**اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ** اس میں دو تقدیریں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ان مفسرہ ہو، معنی ہوگا ہم نے اسے کہا تو شکر بجالا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ محل نصب میں ہے اور فعل اس کے صلہ میں داخل ہے جس طرح سیبویہ نے بیان کیا ہے: کتبت إلیہ أن قم مگر یہ توجیہ اس کے نزدیک بعید ہے۔ زجاج نے کہا: معنی ہے تحقیق ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے پس اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ وہ ہمارا شکر بجالانے کی وجہ سے حکیم ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کے شکر سے مراد اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہو اس کی طاعت کرنا(4)۔ اس کی لغوی اور معنوی حقیقت کے بارے میں قول سورۂ بقرہ وغیرہ میں گزر چکا ہے۔

**وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ** یعنی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اپنے لیے ہی عمل کرتا ہے کیونکہ ثواب کا نفع اسی طرف لوٹتا ہے۔ **وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ** جس نے نعمتوں کا انکار کیا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بیان نہ کیا تو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، فصل من استبرأ الدینہ، جلد 1، صفحہ 13

2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، حفظ اللسان، جلد 2، صفحہ 958

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ستر المومن علی نفسہ، جلد 2، صفحہ 896

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 332

تعالیٰ اپنی مخلوق کی عبادت سے غنی ہے اور مخلوق کے ہاں حمد کیا گیا ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: اپنی مخلوق سے غنی اور اپنے افعال میں محمود ہے(1)۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾

''اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اسے نصیحت کرتے ہوئے: اے میرے پیارے فرزند! کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا، یقیناً شرک ظلم عظیم ہے''۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ سہیلی نے کہا: ان کے بیٹے کا نام ثاران تھا؛ یہ طبری اور قتبی کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا نام مشکم تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام انعم تھا(2)؛ یہ نقاش نے حکایت بیان کی ہے۔ قشیری نے کہا: ان کا بیٹا اور ان کی بیوی دونوں کافر تھے آپ ان دونوں کو لگاتار نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گئے۔

میں کہتا ہوں: اس امر پر اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ بھی دلالت کرتا ہے۔

صحیح مسلم اور دوسری کتب میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہا(3): جب یہ آیت اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (الانعام:82) نازل ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ پر بڑا شاق گزرا انہوں نے کہا: ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جو اپنے آپ پر ظلم نہیں کرتا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جیسا تم گمان کرتے ہو بات اس طرح نہیں بلکہ ظلم سے مراد ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: اے میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرو بے شک شرک ظلم عظیم ہے''۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت لقمان علیہ السلام کا کلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے حضرت لقمان علیہ السلام کی کلام سے منقطع ہے اور ظاہری طور پر متصل ہے تاکہ معنی کی تاکید کا فائدہ دے، اس چیز کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے کہ جب یہ آیت اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ ڈر گئے انہوں نے عرض کی: ہم میں سے کس نے ظلم نہیں کیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ان کے خوف کو سکون ہو گیا۔ ان کے خوف کو سکون اس لیے ہوا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے۔ بعض اوقات خوف کو سکون اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کے بارے میں ذکر کرے جس کی صفت حکمت اور سداد سے لگائے۔

اِذْ محل نصب میں ہے اس سے پہلے اذکر فعل محذوف ہے۔ زجاج نے اپنی کتاب جو قرآن کے متعلق ہے میں یہ کہا: اذ، آتینا کی وجہ سے محل نصب میں ہے معنی ہوگا تحقیق ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی جب اس نے کہا۔ نحاس نے کہا: میں اسے غلط گمان کرتا ہوں کیونکہ کلام میں واؤ ہے جو اس سے مانع ہے۔ اور کہا: یا بنی یاء کے کسرہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے کیونکہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 333 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، صدق الایمان و اخلاصہ، جلد 1، صفحہ 77

یہ یاء محذوفہ پر دال ہے۔ جس نے اسے فتحہ دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک فتحہ خفیف ترین حرکت ہے۔ سورۂ ہود میں اس بارے میں قول گزر چکا ہے۔

یٰبُنَیَّ کا قول حقیقت میں مصغر نہیں اگرچہ لفظ میں اس کے وزن پر ہے۔ یہ نرمی پیدا کرنے کے لیے ہے جس طرح ایک آدمی کو کہا جاتا ہے: یا اخی اور بچے کو کہتے ہیں: یا کویس۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور ہم نے تاکیدی حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے شکم میں اٹھائے رکھا ہے اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری کے باوجود اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے (اسی لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ دباؤ ڈالیں تم پر کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اس کو جس کا تجھے علم تک نہیں تو ان کا یہ کہنا نہ مان البتہ گزران کر وان کے ساتھ دنیا میں خوبصورتی سے اور پیروی کرو اس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہوا پھر میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے پس میں آگاہ کروں گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ یہ دونوں آیات حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیت کے درمیان جملہ معترضہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بھی ان چیزوں میں شامل ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی، یعنی حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرو اور شرک کرنے میں اپنے والدین کی اطاعت نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طاعت کی وصیت کی ان تمام امور میں جو شرک نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: ہم نے حضرت لقمان علیہ السلام سے کہا ان چیزوں میں جو ہم نے حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت عطا کی۔ اور ہم نے انسان کو والدین کے حسن سلوک کی وصیت کی یعنی ہم نے اسے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ اور ہم نے اسے کہا: ہم نے انسان کو وصیت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا: تو شرک نہ کرنا اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی یعنی ہم نے لوگوں کو اس کا حکم دیا۔ اور حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اس کا حکم دیا، قشیری نے ان اقوال کا ذکر کیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں

آیات حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئیں، جس طرح سورت عنکبوت میں گزرا ہے؛ مفسرین کی ایک جماعت کا یہی نقطہ نظر ہے۔

اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی طاعت کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب اور فرض عین کو ترک کرنے میں ملحوظ خاطر نہیں رکھا جائے گا ہاں مباح امور میں ان دونوں کی طاعت لازم ہوگی اور ان کی وجہ سے مندوب طاعات کو ترک کرنا مستحسن ہے۔ اسی میں جہاد کفایہ کا امر ہے۔ حالت نماز میں ماں بلائے تو اس کی آواز پر لبیک کہنا یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ نماز کا اعادہ ممکن ہے جب کہ یہ مندوب سے قوی ہے، لیکن اس امر کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ماں کی ہلاکت کا خوف ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کے دوسرے امور جو نماز کے قطع کرنے کو مباح کر دیتے ہیں۔ یہ ندب سے اقوی نہیں۔ حضرت حسن بصری نے اس تفصیل میں مخالفت کی ہے فرمایا: اگر اس کی ماں شفقت کی وجہ سے عشاء کی نماز میں حاضر ہونے سے روکے تو وہ اس کی اطاعت نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے ماں کو، حمل کا ذکر کرنے کے ساتھ اور رضاعت کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کے درجہ کو خاص کیا تو اس طرح ماں کو تین درجے حاصل ہو گئے اور باپ کے لیے ایک درجہ ہو گیا۔ اسی کے مشابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جب ایک آدمی نے آپ کی خدمت میں عرض کی: میں کس کے ساتھ نیکی کروں؟ فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ''۔ عرض کی: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ''۔ عرض کی: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ''۔ عرض کی: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: ''اپنے باپ کے ساتھ'' (1)۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی میں سے چوتھا حصہ باپ کے لیے بنایا جس طرح اس آیت میں ہے۔ یہ سب باتیں سورۂ سبحان میں گزر چکی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ ماں نے اسے اپنے پیٹ میں اٹھایا اسی طرح ہر روز اس کی کمزوری میں اضافہ ہوتا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عورت خلقت میں کمزور ہے پھر حمل اس کو کمزور کر دیتا ہے۔ عیسیٰ ثقفی نے اسے پڑھا وَهَنًا عَلٰى وَهَنٍ دونوں جگہ ہاء پر فتحہ ہے حضرت ابو عمرو سے مروی ہے دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ قعنب جوام صاحب کا بیٹا ہے نے کہا:

هل للعواذل من ناهٍ فَيزجُرَها إن العواذل فيها الأَيْنُ والوَهَنُ (2)

کیا ملامت کرنے والیوں کو کوئی روکنے والا ہے کہ وہ انہیں جھڑکتا ان ملامت کرنے والیوں میں تھکن اور کمزوری ہے۔

محل استدلال الوھن ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: وَهَنَ يَهِنُ، وَهُنَ يوهُنُ، وهِن يهِن جس طرح وَرِم يرِم ہوتا ہے۔ وھنا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے؛ قشیری نے اسے ذکر کیا۔ نحاس نے کہا: مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے حرف جر ساقط ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے حملته بضعف علی ضعف جمہور نے پڑھا وَفِصَالُهٗ حضرت حسن بصری اور یعقوب نے پڑھا وَفصله یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی دودھ چھڑانا دو سالوں میں ہے۔ فصال سے مقصود دودھ چھڑانا ہے اس کی غایت اور انتہا کا ذکر کیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: انفصل عن کذا وہ ممتاز ہو گیا؛ اسی وجہ سے فصیل کہتے ہیں۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلہ، ما جاء فی بر الوالدین، جلد 2، صفحہ 12

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 334

**مسئلہ نمبر 4**۔ احکام اور خرچہ میں تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ رضاعت کی مدت دو سال ہے جہاں تک دودھ کی حرمت کا تعلق ہے ایک فرقہ نے ایک سال مقرر کیا ہے نہ کم اور نہ زیادہ، ایک فرقہ کا خیال ہے دو سال اور جو اس کے ساتھ مہینے ملے ہوتے ہیں جب دودھ پلانے میں اتصال ہو۔ ایک جماعت کا خیال ہے: اگر بچے کو دو سال سے قبل دودھ چھڑا دیا گیا اور اس بچے نے دودھ چھوڑ دیا اگر اس نے اس کے بعد دو سالوں کے دوران دودھ پیا تو یہ دودھ حرمت ثابت نہیں کرے گا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اَنِ اشْكُرْ لِیْ، اَنْ زجاج کے قول کے مطابق محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی کہ میرا شکر بجالاؤ۔ نحاس نے کہا: ان میں سے سب سے عمدہ قول ہے کہ ان مفسرہ ہو معنی ہے ہم نے اسے کہا: میرا شکر بجالاؤ اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نعمت ایمان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ اور تربیت کی نعمت پر والدین کا شکر بجالاؤ۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: جس نے پانچ نمازیں پڑھیں تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور جس نے نمازوں کے بعد اپنے والدین کے لیے دعا کی اس نے ان کا شکر ادا کیا (1)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اور اس سے قبل والی آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئیں جب آپ اسلام لائے ان کی والدہ جو حمنہ بنت ابی سفیان بن امیہ تھی اس نے قسم اٹھائی کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی جس طرح ماقبل آیت کی تفسیر میں گزرا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہے مصاحبا معروفا یہ جملہ بولا جاتا ہے: صاحبتُه مصاحبة و مصاحبا، معروفا سے مراد جو اچھا ہو۔

آیت اس امر پر دلیل ہے کہ کافر والدین اگر وہ فقیر ہوں تو مال سے جتنا ممکن ہو ان کی مدد کرنی لازم ہے نرم گفتگو اور نرمی سے اسلام کی طرف دعوت دینا لازم ہے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی جب ان کے پاس ان کی خالہ یا رضائی ماں آئی تھی انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میری ماں میرے پاس آئی ہے جب کہ وہ راغبہ ہے کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ فرمایا: "ہاں"، راغبہ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ اسلام سے اعراض کرنے والی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک ظاہر معنی یہ ہے وہ صلہ رحمی میں رغبت رکھتی ہے اگر اس کو حاجت نہ ہوتی تو حضرت اسماء کی خدمت میں حاضر نہ ہوتی۔ حضرت اسماء کی والدہ کا نام قتیلہ بنت عبد العزیٰ بن عبد اسد تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبد الرحمن کی والدہ قدیمی مسلمان تھیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ تمام عالم کے لیے وصیت ہے، گویا مامور انسان ہے۔ اَنَابَ اس کا معنی مائل ہونا اور کسی شے کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ انبیاء اور صالحین کا راستہ ہے۔ نقاش نے حکایت بیان کی ہے: جن کو حکم دیا گیا ہے

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 410
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 349

وہ حضرت سعد ہیں۔ والذی اناب سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ کہا: جب حضرت ابوبکر صدیق مسلمان ہوئے تو حضرت سعد، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت سعید اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم ان کے پاس آئے اور پوچھا: آپ ایمان لے آئے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ تو آپ کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (الزمر: 9) جب ان چھ افراد نے یہ سنا تو وہ بھی ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی۔

وَ الَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِۙ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ (الزمر: 17) (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے: الذی اناب سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: جب حضرت سعد اسلام لائے تو ان کے ساتھ ان کے دو بھائی عامر اور عویمر بھی اسلام لے آئے ان میں صرف عتبہ مشرک رہ گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کیا کہ جو قبور میں ہیں ان کو دوبارہ اٹھائے گا، جزا کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہوگا اور اللہ تعالیٰ چھوٹے بڑے اعمال پر آگاہ ہے (2)۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝۱۶

''(لقمان نے کہا) پیارے فرزند! اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر وزنی ہو یا پھر وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں (چھپی) ہو تو لے آئے گا اسے اللہ تعالیٰ، بے شک اللہ تعالیٰ بہت باریک بین، ہر چیز سے باخبر ہے''۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! یہ قول حضرت لقمان علیہ السلام کا ہے اس قول کے ذریعے حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آگاہ کرنا چاہا (3)۔ یہ وہ آخری حد تھی جس کو سمجھانا ممکن تھا، کیونکہ خردلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے: حس اس کے وزن کا ادراک نہیں کرسکتی، کیونکہ یہ ترازو کو نہیں جھکاتا، یعنی اگر ان مواقع پر رائی کے دانہ کے برابر رزق ہو اللہ تعالیٰ اسے لے آتا ہے اور وہاں تک پہنچاتا ہے جس کا یہ رزق ہوتا ہے، یعنی رزق کا ایسا اہتمام نہ کر یہاں تک کہ تو اس کے ساتھ فرائض سے غافل ہو جائے اور جس نے میری طرف رجوع کیا ہے اس کے راستہ کی اتباع سے غافل ہو جائے۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عبداللہ بن مسعود کو ارشاد ہے: لا تکثر همك ما يُقَدَّرُ يكون وما ترزق يأتيك (4) اپنی کدوکاوش کو زیادہ نہ کرو جو مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گا اور جو تیرے حق میں رزق مقدر کیا گیا ہے وہ تجھ تک پہنچ جائے گا۔ اس آیت نے اس امر کو بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا اپنے علم سے احاطہ کیے ہوئے ہے، اس نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 349
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 350
3۔ ایضاً
4۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 109، حدیث نمبر 505

ہر شے کو شمار کر رکھا ہے، وہ پاک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت لقمان کے بیٹے نے اپنے باپ سے اس دانہ کے بارے پوچھا جو سمندر کے تہہ میں پڑا ہوتا ہے کیا اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے؟ تو حضرت لقمان نے اس آیت کے معنی میں جواب دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس نے اعمال، معاصی اور طاعات کا ارادہ کیا، یعنی اگر نیکی یا خطا دانہ برابر ہو اللہ تعالیٰ اسے بھی لے آئے گا یعنی جس انسان سے اس کا وقوع مقدر ہے وہ اس سے فوت نہ ہوگی۔ اس معنی کے اعتبار سے موعظہ میں امید اور خوف حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وضاحت کی طرف منسوب ہے پہلے قول میں امید اور خوف نہیں ہے۔

**مِثْقَالَ حَبَّةٍ** اس سے مراد ہے جو جواہر کے مناسب ہے یعنی دانہ کی مقدار اور اعمال کے مناسب ہو، یعنی جسے دانہ کے برابر مماثلت کے طریقہ پر وزن کیا جاتا ہے۔ جس نے کہا: یہ جواہر میں سے ہے اس کی تائید اس کا قول کرتا ہے جو عبد الکریم جزری کی قراءت ہے فَتَكِنَّ کاف کے کسرہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے یہ کن سے مشتق ہے جس سے مراد ڈھانپی ہوئی چیز ہے اس کا اسم مضمر ہے اس کی تقدیر یوں ہوگی اِن تَكُ تاء کے ساتھ مثقال سے اوپر جو کہ کان کی جر کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا اسم مضمر ہے اس کی تقدیر مسالتك ہے جس طرح روایت کی گئی ہے یا اس کا اسم المعصية والطاعة ہے؛ یہ دوسرے قول کے اعتبار سے ہے۔ اس کی صحت پر ابن لقمان کا اپنے باپ کے لیے قول دلالت کرتا ہے: اے میرے باپ! اگر میں ایسی جگہ کوئی غلطی کروں جہاں مجھے کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے کیسے جانے گا؟ حضرت لقمان علیہ السلام نے اسے کہا: **يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ** ان کا بیٹا مضطرب ہی رہا یہاں تک کہ وہ مر گیا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔

**اِنَّهَاۤ** کی ضمیر ضمیر قصہ ہے، جس طرح تو کہتا ہے: انها هند قائمة یعنی اگر وہ عمل دانہ برابر ہو۔ بصری اسے جائز خیال کرتے ہیں: إنها زيد ضربته یعنی ہاء ضمیر سے مراد قصہ ہو۔ کوفی اسے مونث میں ہی جائز سمجھتے ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ نافع نے پڑھا: مثقال یعنی مرفوع پڑھا ہے۔ اس اعتبار سے تك، خردله کے معنی کی طرف لوٹے گی، یعنی إن تك حبة من خردل۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مثقال کی طرف ایسا فعل منسوب کیا جس میں تانیث کی علامت ہے اس حیثیت سے کہ وہ مثقال مونث کی طرف مضاف ہے وہ مثقال اسی کی جنس سے ہے لان مثقال الحبة من الخردل امام سيئة او حسنة کیونکہ رائی کے دانہ کے وزن کے برابر یا تو برائی ہوگی یا نیکی ہوگی جس طرح فرمایا **فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا** (الانعام: 160) یہاں عشر کو مونث ذکر کیا (کیونکہ یہ اپنی تمیز کے خلاف استعمال ہوتا ہے) اگرچہ مثل کا لفظ مذکر ہے کیونکہ یہاں امثال سے حسنات کا ارادہ کیا؛ جس طرح شاعر کا قول ہے۔

مَشَيْنَ كما اهتزت رِماحٌ تسفَّهتْ أعاليها مَرُّ الرياحِ النَّواسِمِ(1)

جب وہ چلتی ہیں تو وہ اپنی چال میں جھومتی ہیں اور دہری ہوتی ہیں گویا وہ نیزے ہیں جن کو کھڑا کیا گیا ہے جن پر ہوائیں چل رہی ہیں تو وہ جھول رہے ہیں اور دہرے ہو رہے ہیں۔ محل استدلال تسفهت ہے جس کا فاعل مر مصدر ہے، یہاں تک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 350

تقع کے معنی میں ہے اس لیے یہ خبر کا تقاضا نہیں کرتا۔

فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام کا معنی تفہیم میں مبالغہ کرنا اور انتہا کو پہنچنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی چیز تک پہنچتی ہے جو تہہ در تہہ چٹانوں میں ہو، جو آسمانوں میں ہو اور جو زمین میں ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں صخرہ سے مراد سات زمینوں کے نیچے چٹان ہے جس پر زمین ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسی چٹان ہے جو حوت مچھلی کی پشت پر ہے(1)۔ سدی نے کہا: یہ ایسی چٹان ہے جو آسمان اور زمین میں نہیں، بلکہ سات زمینوں سے ماوراء ہے اس پر ایک فرشتہ کھڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ ان آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ سے کفایت ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا قول ہے جو ممکن ہے یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ تاکید ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (العلق) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (الاسراء:1)

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝17

''میرے پیارے بچے نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو اس مصیبت پر جو تمہیں پہنچے، بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اپنے بیٹے کو طاعات میں سے عظیم طاعت کی وصیت کی وہ نماز، معروف کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ اس سے یہ ارادہ کرتا ہے کہ پہلے خود اس کو بجالائے اور منکر سے رکے یہاں یہ لفظ تمام طاعات اور فضائل کو جامع ہے۔ جس نے بھی کہا، بہترین کہا:

وابدر بنفسك فانهها عن غيها فإذا انتهت عنه فأنت حكيم

اپنی ذات سے شروع کرو اور اسے سرکشی سے روکو جب نفس اس سے رک گیا تو تو حکیم ہے۔

ان اشعار کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ تجھے منکر کو ختم کرنے پر برانگیختہ ہونا چاہیے اگرچہ تجھے ضرر پہنچے۔ یہ اس امر کا شعور دلانا ہے کہ منکر کو ختم کرنے والے کو بعض اوقات اذیت دی جاتی ہے۔ یہ مقدار ندب اور استحباب کے طریقہ پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قوت کے اعتبار سے ہے جہاں تک اس کے لزوم کا تعلق ہے تو ایسا نہیں (2)۔ یہ بحث سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں آپ کو دنیا کے مصائب پر صبر کا حکم دیا گیا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 337 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 351

ہے جس طرح امراض وغیرہ ہوتی ہیں اور یہ حکم دیا گیا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے الله تعالیٰ کی معصیت کی طرف نہ نکلیں۔ یہ اچھا قول ہے کیونکہ یہ عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات پر صبر کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نماز قائم کرنا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے، یعنی یہ ان امور میں سے ہے جن کا الله تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مراد ہو کہ یہ مکارم اخلاق اور محتاط لوگوں جو نجات کے راستے پر چلنے والے ہیں ان کے امور میں سے ہیں۔ ابن جریج کا قول زیادہ صحیح ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾

''اور (تکبر کرتے ہوئے) نہ پھیر لے اپنے رخسار کو لوگوں کی طرف سے اور نہ چلا کر زمین میں اتراتے ہوئے، بے شک الله تعالیٰ نہیں پسند کرتا کسی گھمنڈ کرنے والے، فخر کرنے والے کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** نافع، ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور ابن محیصن نے تصاعر صاد کے بعد الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہ باب تفاعل سے ہے ابن کثیر، عاصم، ابن عامر، حضرت حسن بصری اور مجاہد نے تصعر پڑھا ہے جوزی نے تصعر صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی قریب قریب ہے۔ صعر کا معنی باقی ہونا ہے۔ اس معنی میں بدو کا قول ہے: قد أقام الدهر صعری، بعد أن أقمت صعره

زمانے نے میرے جھکاؤ کو سیدھا کر دیا بعد اس کے کہ میں نے اس کا جھکاؤ سیدھا کیا تھا۔ اسی معنی میں عمرو بن حنی تغلبی کا قول ہے:

وكنا إذا الجبّار صَعّر خدّه أقمنا له من مَيْله فتقوّمِ(1)

جب جبار اپنے رخسار کو پھیر لیتا ہے تو ہم اس کے میلان کو سیدھا کر دیتے ہیں تو وہ سیدھا ہو جاتا ہے۔

طبری نے اسے فتقوما پڑھا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ شعر کا قافیہ مخفوض (مجرور) ہے۔ ایک اور شعر میں ہے: أقمناله من خده لمتصعر ہم اس کے مڑے ہوئے رخسار کو سیدھا کر دیتے ہیں۔

ہروی نے کہا: ولا تصاعر یعنی تکبر کرتے ہوئے ان سے اعراض نہ کیجئے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے اصاب البعیر صَعَرٌ وَصَيَدٌ جب اونٹ کو کوئی ایسی بیماری لگے جس سے اس کی گردن مڑ جائے۔ متکبر کو کہا جاتا ہے: فیہ صعرٌ وصیدٌ۔ لا تصعر کا معنی ہے اپنے رخسار کو ہمیشہ موڑے نہ رکھ۔ حدیث طیبہ میں ہے: یاتی علی الناس زمان لیس فیھم إلا أصعر او ابتر لوگوں پر ایسا زمانہ بھی آئے گا جس زمانہ میں لوگوں میں متکبر اور بے نسل کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ اصعر اسے کہتے ہیں جو تکبر کی وجہ سے منہ موڑے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 351

ہوئے ہو، مراد کمینے لوگ ہیں جن کا کوئی دین نہ ہوگا۔ حدیث طیبہ میں ہے: کل صعار ملعون ہر متکبر ملعون ہے(1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ آیت کا معنی ہے: آپ اپنے رخسار کو لوگوں پر تکبر کرتے ہوئے، فخر کرتے ہوئے اور انہیں حقیر جانتے ہوئے ایک طرف نہ کرو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت کا قول ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جب تیرے سامنے کسی کا ذکر کیا جائے تو تو اپنی باچھ کو ایک طرف کر لے گویا تو اس کو حقیر جانتا ہو، معنی ہے تواضع کرتے ہوئے، انس و محبت کرتے ہوئے ان کی طرف توجہ کیجئے جب ان میں سے چھوٹے سے چھوٹا بھی آپ سے بات کرے تو اس کی بات توجہ سے سنیے یہاں تک کہ وہ اپنی بات مکمل کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح عمل فرمایا کرتے تھے(3)۔

میں کہتا ہوں: اسی معنی میں وہ روایت ہے جسے امام مالک نے ابن شہاب سے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں فرمایا: ''باہم بغض نہ رکھا کرو ایک دوسرے سے اعراض نہ کیا کرو، باہم حسد نہ کیا کرو اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن تک لاتعلق رہے''(4)۔ حدیث میں موجود لفظ التدابر کا معنی ہے اعراض کرنا، کلام، سلام وغیرہ ترک کرنا۔ اعراض کو تدابر کا نام دیا گیا کیونکہ جس سے تو بغض کرتا ہے تو اس سے اعراض کرتا ہے اور اپنی پشت کو اس کی طرف کر لیتا ہے، اسی طرح وہ تیرے ساتھ اسی طرح کرتا ہے۔ جس سے تو محبت کرتا ہے تو اپنا منہ اس کی طرف کر لیتا ہے اور تو اس کے بالمقابل ہوتا ہے تاکہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو۔ جو آدمی اپنا رخسار پھیر لیتا ہے اس میں تدابر کا معنی موجود ہے، مجاہد نے بھی اس کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ سے مراد ہے گویا اللہ تعالیٰ نے منع کیا کہ انسان اپنے آپ کو بغیر ضرورت کے ذلیل کرتا رہے اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: لیس للانسان ان یذل نفسہ (5) انسان کے لیے مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا تکبر کرتے ہوئے زمین میں چلے۔ مَرَحًا مصدر ہے حال کی جگہ واقع ہے۔ سورۃ الاسراء میں بحث گزر چکی ہے۔ اس کا معنی چستی اور خوشی سے چلنا جب کہ کوئی کام اور حاجت نہ ہو۔ اس اخلاق و کردار والے فخر کو لازم پکڑتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں۔ مرح اسے کہتے ہیں جو اپنی چال میں تکبر کرتا ہے۔ یحییٰ بن جابر کائی، ابن عائذ ازدی سے وہ غضیف بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر بیت المقدس آئے۔ کہا: ہم حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کے پاس بیٹھے میں نے انہیں کہتے ہوئے سنا: قبر بندے سے کلام کرتی ہے جب اسے قبر میں رکھا جاتا ہے وہ بندے کو کہتی ہے: اے انسان! تجھے کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں رکھا؟ کیا تجھے علم نہیں تھا میں تنہائی کا گھر ہوں؟ کیا تو نہیں جانتا میں تاریکی کا گھر ہوں؟ کیا تو نہیں جانتا میں حق کا گھر ہوں؟ اے انسان

---

1۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 3، صفحہ 31
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 351
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1497
4۔ مؤطا امام مالک، حسن الخلق، ما جاء فی الھجرۃ، صفحہ 706
5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الأمر بالمعروف و النھی عن المنکر، صفحہ 298

تجھے کس چیز نے میرے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کیا؟ تو میرے اردگرد متکبر بنتے ہوئے چلا کرتا تھا۔

ابن عائذ نے کہا: میں نے غضیف سے کہا: اے ابا اسماء فداد سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اے بھتیجے! بعض اوقات جو تیری چال ہوتی ہے۔ ابو عبید نے کہا: معنی ہے زیادہ مال والا اور تکبر والا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تکبر کرتے ہوئے اپنے کپڑے کو گھسیٹا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا'' (1)۔ فَخُوْرٍ اسے کہتے ہیں جو اسے عطا کیا گیا ہے اس کو شمار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا نہیں لاتا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس سے مراد نسب پر اور دوسرے امور میں فخر کرنا۔

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

''اور میانہ روی اختیار کر اپنی رفتار اور دھیمی کر اپنی آواز بے شک سب سے وحشت انگیز آواز گدھے کی آواز ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ جب مذموم اخلاق سے منع کیا تو اخلاق کریمہ کو آپ کے لیے بیان کیا جن اخلاق کریمہ کو اپنانا چاہیے۔ فرمایا: وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ اس میں میانہ روی اپناؤ۔ قصد سے مراد تیزی اور سستی کی درمیانی حالت ہے بعض مرنے کا بہانہ کرنے والوں کے چلنے کی طرح رینگ رینگ کر نہ چلو اور اور چالاکوں کی طرح اچھل اچھل کر نہ چلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیز رفتاری مومن کے رعب کو ختم کر دیتی ہے'' (2)۔ جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چلا کرتے تو تیز چلا کرتے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قول: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ چلتے تو تیز چلتے تو اس سے مراد وہ تیزی تھی جو بناوٹی مرنے والے کی چال سے بڑھ کر ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ جس کی یہ صفت ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کی ہے جس کی وضاحت سورۂ فرقان میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اپنی آواز کو پست رکھو یعنی آواز بلند کرنے میں تکلف سے کام نہ لو اور اتنی آواز بلند کرو جتنی ضرورت ہو، کیونکہ ضرورت سے زائد آواز کو بلند کرنا یہ تکلف ہے جو اذیت دیتا ہے۔ سب سے مراد تواضع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موذن سے فرمایا جس نے اپنی طاقت سے بڑھ کر آواز کو بلند کرنے کا تکلف کیا: مجھے خوف ہوا کہ تیرا مریطاء پھٹ جائے گا موذن حضرت ابو محذورہ سمرہ بن معیر تھے مریطاء سے مراد ناف سے لے کر شرمگاہ تک کا حصہ ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ان میں سے قبیح ترین اور وحشت ناک ہے۔ اس معنی میں یہ جملہ ہے: اتانا بوجه منكر وہ ہمارے پاس ناپسندیدہ چہرے کے ساتھ آیا۔ گدھا بلیغ مذمت اور گالی میں ضرب الشال کے طور پر استعمال ہوتا ہے اسی طرح اس کا ہینگنا۔ وہ ان کے الگ ذکر کو برائی خیال کرتے ہیں وہ اس کا ذکر کنایہ کے انداز میں

1۔ صحیح بخاری، فضائل الصحبه، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو كنت متخذا خليلاً، جلد 1، صفحہ 517

2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 412، حدیث نمبر 41620 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1498

کرتے ہیں اور صراحت کے ساتھ ذکر کرنے سے اعراض برتتے ہیں، وہ کہتے ہیں: الطویل الاذنین گدھا۔ جس طرح وہ گندی چیزوں کا ذکر صراحت سے نہیں کرتے۔ اس امر کو خلاف ادب سمجھا گیا ہے کہ صاحب مروت لوگوں کی مجلس میں گدھے کا ذکر کیا جائے۔ عرب ننگ و عار کی وجہ سے گدھے پر سواری نہیں کرتے تھے اگرچہ انہیں پیدل بھی چلنا پڑتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور تواضع کی خاطر اس پر سوار ہو جاتے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آیت میں اس امر پر دلیل ہے کہ گفتگو میں اور ناراضگی کے وقت آواز کو بلند کرنا قبیح ہے کیونکہ گدھوں کی آواز قبیح ہے کیونکہ ان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ”جب تم گدھے کے ہینگنے کی آواز سنو تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ انہوں نے شیطان کو دیکھا ہے“ (1)۔ یہ بھی مروی ہے: گدھا نہیں ہینگتا اور کتا نہیں بھونکتا مگر وہ شیطان کو دیکھتا ہے“۔ سفیان ثوری نے کہا: ہر شی کی آواز تسبیح ہے مگر گدھوں کی آواز (2)۔ عطا نے کہا: گدھوں کا ہینگنا ظالموں کے خلاف بددعا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ادب ہے کہ لوگوں کے سامنے ان کو ذلیل سمجھتے ہوئے چیخنے کو ترک کیا جائے یا مطلق چیخنے کو ترک کیا جائے۔ عرب بلند آواز پر فخر کیا کرتے تھے ان میں سے جس کی آواز شدید ہوتی تو وہ زیادہ معزز ہوتا۔ اور ان میں سے جس کی آواز پست ہوتی تو وہ ذلیل ہوتا۔ ان کے شاعر نے کہا:

جهير الكلام جهير العُطاس　جهير الرّواء جهير النَّعَم

میرا ممدوح اونچی گفتگو کرنے والا، زوردار چھینک مارنے والا، خوبصورت چہرے والا اور بہت زیادہ اونٹوں والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس جاہلیت کے خلق سے اس ارشاد کے ساتھ منع کیا (4): اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ یعنی اگر آواز کی وجہ سے کسی سے ڈرا جاتا تو گدھے سے ڈرا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مثال میں برابر کر دیا (5)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ لام تاکید کے لیے ہے۔ صوت کے لفظ کو واحد ذکر کیا اگرچہ یہ جماعت کی طرف مضاف ہے کیونکہ یہ مصدر ہے مصدر کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ صات یَصُوت صَوْتا وھو صائت کا مصدر ہے یوں بھی کہا جاتا ہے: صوّت یصوت فھو مصوّت رجل صاتٌ ایسا آدمی جس کی آواز شدید ہو، جس طرح ان کا قول ہے: رجل مالٌ و نالٌ ایسا آدمی جس کا مال و منال زیادہ ہو۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ۗ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۗ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، خیر المال غنم، جلد 1، صفحہ 466　2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 412
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 341　4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 352
5۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 279

اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور تمام کر دی ہیں اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں ظاہری بھی اور باطنی بھی اور بعض ایسے نادان لوگ بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں (رسول کریم سے) اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہ ان کے پاس علم ہے نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو کیا وہ (انہیں کی اتباع کریں گے) خواہ شیطان انہیں (اسی طرح) دعوت دے رہا ہو بھڑکتے ہوئے عذاب کی''۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا ذکر کیا جو اس نے انسانوں پر کی ہیں اور یہ کہ اس ذات پاک نے انسانوں کے لیے ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو آسمانوں میں ہیں جیسے سورج، چاند، ستارے اور فرشتے جو ان کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے منافع ان کی طرف کھینچ کر لا رہے ہیں۔

وَ مَا فِي الْاَرْضِ یہ پہاڑوں، درختوں، پھلوں اور جن چیزوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا ان سب کو شامل ہے۔ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ اس نے تم پر اپنی نعمتوں کو مکمل کیا۔ حضرت ابن عباس اور یحییٰ بن عمارہ نے سین کی بجائے صاد سے پڑھا ہے، کیونکہ حروف مستعلیہ سین کو اس کی پستی سے اس کی بلندی کی طرف کھینچتے ہیں اور اسے صاد کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔

النعم یہ نعمت کی جامع ہے جس طرح سورۃ کی جمع سور آتی ہے سدرہ اور سدر دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ نافع، ابو عمر اور حفص کی قراءت ہے۔ باقی قراء نے نعمۃ مفرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ اور مفرد کا صیغہ بھی کثرت پر دلالت کرتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) صحیح سندوں سے یہی ثابت ہے کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی اسلام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا جب کہ انہوں نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تھا: ''الظاہرہ سے مراد اسلام اور تیری شکل وصورت میں سے جو حسن ہے وہ مراد ہے اور الباطنہ سے مراد جو تیرے برے اعمال میں سے تجھ پر پوشیدہ ہیں'' (1)۔

نحاس نے کہا: اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بارے میں کہا: وَ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ (المائدہ: 6) فرمایا: تمہیں جنت میں داخل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی بندے پر کامل نعمت یہ ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے جب اسلام کے معاملہ کا انجام جنت ہے تو اسے نعمت کا نام دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظاهرة سے مراد صحت اور کمال خلق ہے اور باطنہ سے مراد معرفت اور عقل ہے۔ محاسبی نے کہا: ظاهرة سے مراد دنیاوی نعمتیں ہیں اور باطنة سے مراد اخروی نعمتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظاهرة سے مراد وہ چیزیں ہیں جو آنکھوں سے دیکھی جائیں جیسے مال، جاہ وحشمت، لوگوں میں جمال، طاعت کی توفیق اور باطنہ سے مراد وہ ہیں جسے انسان اپنے نفس میں پاتا ہے۔ اللہ

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 279

تعالیٰ کی معرفت، حسن یقین اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے جو آفات دور کرتا ہے۔ ماوردی نے اس بارے میں تیرہ اقوال ذکر کیے ہیں سب اس طرف لوٹتے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ اس کا معنی سورۃ الحج وغیرہ میں داخل ہے۔ یہ ایک یہودی کے حق میں آیت نازل ہوئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا عرض کی: یا محمد! مجھے اپنے رب کے بارے میں بتایئے؟ وہ کس چیز کا ہے؟ ایک بجلی آئی جس نے اسے مار ڈالا، یہ مجاہد کا قول ہے۔ سورۃ الرعد میں بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ کہا کرتا تھا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وہ کسی دلیل کے بغیر خصومت کرتا ہے۔ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ واضح کتاب۔ شیطان اس کی طرف جو القا کرتا ہے اس کے ساتھ وہ خصومت کرتا ہے۔ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام: 121) شیطان انہیں یہی القا کرتا ہے کہ وہ اپنے آباء کی پیروی کریں، جس طرح مابعد آیت میں ہے۔ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ یعنی شیطان انہیں عذاب سعیر کی طرف دعوت دے تب بھی وہ اس کی پیروی کریں گے۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۞

''اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے درآنحالیکہ وہ محسن ہو تو بے شک اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا مضبوط حلقہ کو اور اللہ کی طرف ہی ہے تمام کاموں کا انجام''۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ جو اپنی عبادت اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرتا ہے۔

وَ هُوَ مُحْسِنٌ کیونکہ عبادت احسان اور دل کی معرفت کے بغیر کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ (طٰہٰ: 112) حضرت جبریل امین کی حدیث میں ہے عرض کی: مجھے احسان کے بارے میں بتایئے؟ فرمایا: ''تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے'' (2)۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عروہ وثقیٰ سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے (3)۔ سورۃ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ حضرت علی شیر خدا، سلمی اور عبداللہ بن مسلم بن یسار نے اسے ومن یسلّم پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: يُسْلِمْ اس میں زیادہ معروف ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ (آل عمران: 20) اس کا معنی ہے: میں نے اپنی عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قصد کیا۔ یسلّم کثرت کی بناء پر ہے، مگر سلمت، دفعت کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: سلمت فی الحنطۃ بعض اوقات یہ جملہ بولا جاتا ہے: اسلمت۔ زمخشری نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 343
2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 343

حضرت علی شیر خدا نے اسے وَمَنْ يُسَلِّمْ شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أسلِم أمرك، سلّم أمرك إلى الله معاملہ اللہ کے سپرد کردو۔

اگر تو کہے: کیا وجہ ہے اسے الی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے جب کہ اسے اس ارشاد میں لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (البقرہ:112) میں جواب دوں گا جب اسے لام کے ساتھ متعدی کیا جائے اس نے پوری ذات اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کردی۔ اور جب الی کے ساتھ متعدی ہوتو اس سے مراد ہوتا ہے کہ اس نے اپنا آپ اس کے سپرد کردیا ہے، جس طرح کوئی سامان کسی کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ اس صورت میں مراد اس پر بھروسہ کرنا اور ایک چیز اس کے سپرد کرنا ہے(1)۔ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ اس کا انجام اللہ کے سپرد ہے۔

وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝

”اور جس نے کفر کیا تو نہ غمزدہ کرے آپ کو اس کا کفر، ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پس ہم آگاہ کریں گے انہیں جو انہوں نے کیا تھا، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (چھپا) ہے۔ ہم لطف اندوز ہونے دیں گے انہیں تھوڑی دیر، پھر ہم انہیں ہانک کرلے جائیں گے سخت عذاب کی طرف“۔

فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا کا مطلب ہے کہ ہم انہیں بدلہ دیں گے۔ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ہم دنیا میں انہیں تھوڑے عرصہ کے لیے باقی رکھیں گے جس سے وہ لطف اندوز ہوں گے۔ ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ پھر ہم انہیں پناہ دیں گے اور ہم انہیں ہانک کرلے جائیں گے۔ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ اس سے مراد عذاب جہنم ہے۔ من کا لفظ واحد اور جمع سب کے لیے موزوں ہے اسی وجہ سے فرمایا: کُفرہ پھر فرمایا مرجعهم اور مابعد معنی کے اعتبار سے ہے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

”اور اگر دریافت کریں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے، فرمایئے: الحمدللہ (حق واضح ہوگیا) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً اللہ ہی بے نیاز ہے (اور) ہر تعریف کے لائق“۔

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے تو وہ اس کے علاوہ کسی اور کی کیوں عبادت کرتے ہیں؟ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اس نے ہماری جو اپنے دین کی طرف راہنمائی کی اس پر الحمدللہ اس ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے حمد نہیں۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وہ نظر وفکر نہیں کرتے اور تدبر نہیں کرتے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب ملکیت اور خلق

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 499

کے اعتبار سے اسی کا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی مخلوق سے اور ان کی عبادت سے غنی اور بے نیاز ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تاکہ بندوں کو نفع پہنچائے۔ وہ اپنی صفت پر حمد کے لائق ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے (مزید) سیاہی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گے اللہ کی باتیں، بے شک اللہ سب پر غالب، بڑا دانا ہے''۔

جب مشرکین کے خلاف استدلال کیا ہے جس کے ساتھ استدلال کیا ہے تو اس امر کو واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے کلام کے معانی ختم نہیں ہوں گے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ قفال نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اس امر کو ذکر کیا کہ اس ذات پاک نے ان کے لیے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور ان پر اپنی نعمتیں بہائی ہیں تو اس امر پر بھی آگاہ کیا کہ اگر درخت قلمیں ہوتے اور سمندر روشنائی ہوتی اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت کے عجائبات کو لکھا جاتا جو عجائبات اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے تو وہ عجائبات ختم نہ ہوتے۔

قشیری نے کہا: ان کلمات کے معنی کو مقدورات کی طرف پھیرنا اور آیت کو کلام قدیم پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ مخلوق کی تو کوئی نہ کوئی انتہا ہوگی، جب اس کی مقدورات کی انتہا سے نفی کر دی گئی تو یہ اس انتہا کی بھی نفی ہوگی جو مستقبل میں اس کی ایجاد کی تقدیر سے متعلق ہو۔ یہی وہ چیز ہے جسے موجود محصور کر دے اور اس کا شمار کر دے تو اس کے لیے انتہا ہونا ضروری ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ قدیم کی کوئی انتہا نہیں۔ سورۂ کہف کے آخر میں كَلِمٰتُ اللّٰهِ کے معنی کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

ابو علی نے کہا: کلمات سے مراد (اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) وہ چیز ہوگی جو تحت القدرت ہو نہ کہ اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو وجود کی طرف نکل چکی ہے یعنی موجود ہو چکی ہو(1)۔ یہ اس کی مثل ہے جو قفال نے کہا: غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے معانی کی کثرت کو بیان کرنا ہے۔ یہ فی نفسہا غیر متناہی ہیں۔ متناہی چیز کے ساتھ امر کو انسان کے ذہن کے قریب کیا ہے کیونکہ یہ وہی غایت ہے انسان کثرت میں سے جس سے آگاہ ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ اگر اس سے زیادہ کلام اور سمندر ہوں تو وہ ختم ہو جائیں گے۔ آیت کے نزول کا معنی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ کلمات سے مراد قدیم کلام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم اس آیت کا مصداق کیسے ہو سکتے ہیں وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاسراء) جب کہ ہم کو تورات عطا کی گئی جس میں اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کے احکام ہیں اور آپ کے ہاں یہ بھی ہے کہ یہ ہر چیز کا بیان ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تورات کثیر میں سے قلیل ہے(2)'' اور یہ آیت نازل ہوئی، آیت مدنی ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ بات واضح ہے کہ یہاں کلمات سے مراد علم اور حقائق الاشیاء ہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 354　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 353

کیونکہ اللہ تعالیٰ مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ان کو پیدا کرنے سے پہلے بھی علم رکھتا تھا وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو ذرہ کا وزن رکھتی ہیں، تمام اجناس کا علم رکھتا ہے، ان میں جو مال اور اعضاء ہیں ان کو بھی جانتا ہے، درخت میں جو پتے ہیں انہیں بھی جانتا ہے اس میں شکل وصورت کی جو اقسام بنتی ہیں انہیں جانتا ہے اس میں جو تصرف کیا جاتا ہے جیسے ذائقہ اور رنگ ان کو جانتا ہے۔ اگر وہ ہر جانور کا رنگ نام رکھ دے، قلیل وکثیر میں سے جو جانتا ہے ان کے نام رکھ لے، اس پر جو احوال متغیر ہوں گے، ہر زمانہ میں ان میں جو اضافہ ہوگا ان سب کے نام رکھ دے ہر درخت کو الگ واضح کر دے، اس سے جو شاخیں پھوٹتی ہیں اس کو واضح کر دے اور ہر زمانہ میں اس سے جو خشک ہوتا ہے اس کو مقدر کر دے پھر ان میں سے ہر ایک پر بیان اس چیز کو لکھے اللہ تعالیٰ ان میں سے جس کا احاطہ کیے ہوئے ہے پھر سمندر اس بیان کی سیاہی بن جائے جسے اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے بارے میں بیان کیا ہے بعد میں سات اور سمندروں سے اس کی مدد کی جائے تو وہ بیان ان اشیاء سے زیادہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ قفال کے قول کا معنی ہے ان شاء اللہ۔ یہ اچھا قول ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے قریش نے کہا: یہ کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے عنقریب مکمل ہو جائے گی، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ سدی نے کہا: قریش نے کہا: محمد کا کلام کتنا ہی زیادہ ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ جمہور کی قراءت رفع کے ساتھ ہے یہ مبتدا ہے اس کی خبر جملہ میں اس کے بعد ہے اور جملہ حال کے محل میں ہے۔ گویا فرمایا: والبحر هذه حاله سیبویہ نے بھی کلام اسی طرح مقدر کی ہے۔ ایک نحوی نے کہا: اس کا عطف ان پر ہے کیونکہ وہ مبتدا ہونے کی حیثیت میں محل رفع میں ہے۔ ابو عمرو اور ابن ابی اسحاق نے اسے والبحر منصوب پڑھا ہے اس کا عطف ما پر ہے جو ان کا اسم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اگر سمندر اس میں اضافہ کرتا۔ ابن ہرمز اور حضرت حسن بصری نے یمدہ پڑھا ہے جو امدۃ سے مشتق ہے۔ ایک فرقہ کا کہنا ہے: دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: مجرد کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب ایک چیز کا بعض بعض میں اضافہ کرے جس طرح تو کہتا ہے: مد النيل الخليج یعنی نیل نے اس میں اضافہ کر دیا۔ أمد الشئ جب ایک چیز دوسری چیز کا جز نہ ہو۔ یہ بحث سورۂ بقرہ اور آل عمران میں گزر چکی ہے۔

جعفر بن محمد نے پڑھا: والبحر مداده، ما نفدت كلمات الله اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ یہ بھی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہاں بحر سے مراد میٹھا پانی ہے جو قلموں کو اگاتا ہے جہاں تک نمکین پانی کا تعلق ہے تو وہ قلموں کو نہیں اگاتا۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

"نہیں ہے تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا (اللہ کے نزدیک) مگر ایک نفس کی مانند، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے"۔

ضحاک نے کہا: تم سب کی تحقیق ایک نفس کی تخلیق کی طرح ہی ہے اور قیامت کے روز تمہارا اٹھانا ایک نفس کے اٹھانے کی طرح ہوگا۔ نحاس نے کہا: نحویوں نے یہی مقدر کیا ہے کہ تم سب کو پیدا کرنا ایک نفس کے پیدا کرنے کی طرح ہوگا، یعنی لفظ خلق

مقدر ہے جس طرح اس ارشاد میں ہے: وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) مجاہد نے کہا: کیونکہ وہ قلیل اور کثیر کے لیے فرماتا ہے کُنْ فَیَكُوْنُ (الانعام: 73) ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے (1)۔ یہ آیت ابی بن خلف، ابی الاسدین، منبہ اور نبیہ جو حجاج بن سباق کے بیٹے تھے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا پہلے نطفہ، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوتھڑا پھر ہڈیاں۔ پھر آپ کہتے ہیں: ہمیں ایک لحہ میں کامل صورت میں پیدا کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا کیونکہ بندوں پر جو چیز مشکل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ پر کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ اس کا پوری کائنات کو پیدا کرنا ایک نفس کے پیدا کرنے کی طرح ہے (2)۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ یعنی جو وہ کہتے ہیں بَصِیْرٌ اور دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ٘ كُلٌّ یَّجْرِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ﴿۳۰﴾

"کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو ہر ایک چل رہا ہے (اپنے مدار میں) وقت مقرر تک اور یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔ یہ ہیں اس کی قدرت کے کرشمے تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ ہی حق ہے اور بلاشبہ جنہیں وہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ سب باطل ہیں اور بلاشبہ اللہ ہی بڑی شان والا بزرگ ہے"۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ اس کے بارے میں گفتگو سورۃ الحج اور سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ اوقات کا اندازہ لگانے اور منافع کی تکمیل کے لیے طلوع و غروب کے ساتھ انہیں مسخر کرایا (2)۔ كُلٌّ یَّجْرِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى حضرت حسن بصری نے کہا: مراد یوم قیامت ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: اجل مسمی سے مراد اس کے طلوع و غروب کا وقت ہے نہ اس سے تجاوز کرتا ہے اور نہ اس سے پہلے طلوع و غروب کرتا ہے (4)۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ یعنی جو ان چیزوں پر قادر ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں کو جاننے والا ہو اور ان اشیاء کو جاننے والا تمہارے اعمال کا جاننے والا ہو۔ عام قراءت تعلمون تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ ہے۔ سلمی، نصر بن عاصم اور دوری نے ابو عمرو سے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یہ خطاب نہیں خبر ہے۔ ذلك اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کیا تاکہ تم جان لو اور اقرار کرو ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ باطل ہے۔ باطل سے مراد شیطان ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: باطل سے مراد ہے بتوں میں سے جن کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ وہ مقام و مرتبہ میں بلند اور بادشاہت میں بڑا ہے (5)۔

---

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 210　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 345
3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 280　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 346　5۔ ایضاً

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ۝۳۱

''کیا تم ملاحظہ نہیں کرتے کہ کشتی چلتی ہے سمندر میں محض اس کی مہربانی سے تاکہ وہ دکھائے تمہیں اپنی (قدرت) کی نشانیاں بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے''۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ، فلک سے مراد کشتیاں ہیں۔ تَجۡرِیۡ یہ جملہ خبر بن رہا ہے۔ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ تم پر جو وہ مہربانی فرماتا ہے اور تم پر جو رحمت فرماتا ہے کہ تمہیں اس سے خلاصی عطا فرماتا ہے۔ ابن ہرمز نے بنعمات اللہ قراءت کی۔ یہ نعمة کی جمع ہے اس کا معنی سلامتی ہے: اصل یہ تھا کہ عین کو حرکت دی جاتی پھر اسے ساکن کر دیا گیا۔ لِیُرِیَكُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِهٖ، من بعضیہ ہے یعنی تاکہ تمہیں کشتیوں کو چلتے ہوئے دکھائے؛ یہ یحییٰ بن سلام نے کہا۔ ابن شجرہ نے کہا: مِّنۡ اٰیٰتِهٖ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جو نشانیاں تم دیکھتے ہو۔ نقاش نے کہا: اللہ تعالیٰ انہیں جو رزق عطا فرماتا ہے (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سمندر کی چابی کشتیاں ہیں اور زمین کی چابی راستے ہیں اور آسمان کی چابی دعا ہے (2)۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ جو آدمی اس کی قضا پر صبر کرتا ہے اور اس کی نعمتوں پر شکر بجالاتا ہے۔ اہل معانی نے کہا: مومنوں میں سے جو بھی اس صفت کے حامل ہیں اس کا ارادہ کیا، کیونکہ صبر اور شکر ایمان کی خصلتوں میں سے سب سے فضیلت والی خصلتیں ہیں۔ آیت کا معنی علامت ہے اور علامت یہ مومن کے سینے میں ظاہر نہیں ہوتی یہ ظاہر ہوتی ہے جو بلا پر صبر کرے اور خوشحالی پر شکر کرے۔ شعبی نے کہا: صبر نصف ایمان ہے شکر نصف ایمان ہے، یقین کامل ایمان ہے کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں دیکھا: اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۝ (الذریات) (3) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ایمان کے دو حصے ہیں نصف صبر ہے اور نصف شکر ہے'' (4)۔

وَ اِذَا غَشِیَهُمۡ مَّوۡجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ۬ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمۡ اِلَی الۡبَرِّ فَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ ۝۳۲

''اور جب ڈھانپ لیتی ہیں انہیں پہاڑوں جیسی موجیں اس وقت پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خاص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے عقیدہ کو پھر جب بچالاتا ہے انہیں ساحل تک تو ان میں سے (چند ہی) حق پر رہتے ہیں اور نہیں انکار کرتا ہماری آیتوں کا مگر ہر وہ شخص جو غدار (اور) ناشکرا ہے''۔

وَ اِذَا غَشِیَهُمۡ مَّوۡجٌ كَالظُّلَلِ مقاتل نے کہا: پہاڑوں کی مانند۔ کلبی نے کہا: بادلوں کی مانند (5)؛ یہ قتادہ کا قول ہے یہ ظلة کی جمع ہے موج کو اس کے ساتھ تشبیہ اس کے بڑے اور بلند ہونے کی وجہ سے دی۔ نابغہ نے سمندر کی تعریف میں کہا:

یماشیھن　أخضر　ذو　ظلال　　علی　حافاته　فِلقُ　الدنان (6)

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 348　2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 280　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 347
4۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 36، حدیث نمبر 61　5۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 416　6۔ المحرر الوجیز، جلد 7، صفحہ 355

موج کو ظلل کے ساتھ تشبیہ دی موج واحد ہے اور ظلل جمع ہے کیونکہ موج آہستہ آہستہ آتی ہے اور اس کا بعض بعض پر سوار ہو جاتا ہے جس طرح پہاڑ ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جمع کے معنی میں ہے اس کو جمع کا صیغہ نہیں بنایا گیا کیونکہ یہ مصدر ہے اس کا اصل معنی حرکت اور ازدحام ہے اسی سے ماج البحر اور الناس یموجون ہے۔ کعب نے کہا:

فجئنا إلى موج من البحر وسطه أحابيش منهم حاسد و مقنع

ہم سمندر کی موج کی طرف آئے جس کے وسط میں حبشی تھے۔ ان میں سے کچھ حاسد اور کچھ سر جھکائے ہوئے تھے۔

محمد بن حنفیہ نے اسے پڑھا موج کالظلال یہ ظل کی جمع ہے: دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اس کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہوئے وہ اپنے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے دعا نہیں کرتے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ یعنی جب سمندر سے نجات عطا کی (1)۔ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سمندر میں اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرنے والے ہیں۔ نقاش نے کہا: وعدہ میں عدل کرنے والے ہیں۔ سمندر میں اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا خشکی میں اس کو پورا کرنے والے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مُّقْتَصِدٌ کا معنی ہے مومن ہیں اور توحید و طاعت کو اپنانے والے ہیں (2)۔ مجاہد نے کہا: قول میں درست ہیں اور کفر کو چھپانے والے ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں حذف ہے، معنی اس طرح ہے ان میں سے کچھ حق پرست ہیں اور کچھ کافر ہیں محذوف پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے:

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ختار کا معنی دھوکہ ہے۔

ختر کا معنی بہت ہی برا دھوکہ ہے، عمرو بن معدیکرب نے کہا:

فإنك لو رأيت أبا عمير ملأت يديك من غدر وختر(4)

اگر تو ابو عمیر کو دیکھے گا تو تو اپنے ہاتھوں کو دھوکہ سے بھر لے گا۔

اعشیٰ نے کہا:

بالأبلقِ الفَرْدِ من تَيماء منزِلُهُ حِصنٌ حَصين و جارٌ غيرُ ختار

جوہری نے کہا: ختر کا معنی دھوکہ ہے۔ یوں جملہ بولا جاتا ہے: خترہ فهو ختار۔ ماوردی نے کہا: یہ جمہور کا قول ہے: عطیہ نے کہا: اس سے مراد انکار کرنے والا ہے یوں جملہ بولا جاتا ہے: خَتَرَ يَخْتُرُ وَيَخْتِرُ خَتْرًا۔ قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے، جحد الآیات سے مراد آیات کے ایمان کا انکار کرنا اور الجحد بالآیات سے مراد ان کے دلائل کا انکار کرنا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۫ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 348
2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 281
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 348
4۔ ایضاً

"اے لوگو! ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلہ دے سکے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے اور نہ ہی بیٹا بدلہ دے گا اپنے باپ کی جانب سے کچھ بھی، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور نہ دھوکہ دے تمہیں دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کرے تمہیں اللہ سے وہ بڑا مکار دھوکہ باز"۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ، النَّاسُ سے مراد مومن اور کافر ہے، یعنی اس سے ڈرو اور اس کی وحدانیت کا انکار نہ کرو۔ وَ اخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ٘ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْـًٔا سورۂ بقرہ وغیرہ میں یجزی کا معنی گزر چکا ہے اگر یہ کہا جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس کے ایسے تین بیٹے فوت ہو جائیں جو بلوغت کی عمر کو نہ پہنچے ہوں انہیں جہنم کا عذاب نہیں پہنچے گا مگر قسم پوری کرنے کے لیے" (1)۔ فرمایا: "جس آدمی کو ان بیٹیوں کے ساتھ آزمایا گیا اس نے ان پر احسان کیا تو وہ بچیاں اس کے لیے جہنم سے پردہ ہوں گی" (2)۔ اسے جواب دیا جائے گا: اس آیت سے مراد ہے کوئی والد اپنے بچے کا گناہ نہیں اٹھائے گا، کوئی بچہ اپنے والد کا گناہ نہیں اٹھائے گا اور کسی کا دوسرے کی وجہ سے مواخذہ نہیں ہوگا اور احادیث سے مراد ہے موت پر صبر اور بچیوں کے ساتھ احسان کا ثواب بندے کو آگ سے محجوب کر دے گا اور بچہ جنت کی طرف اسے لے جانے والا ہوگا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وعدہ سے مراد بعث ہے۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا دنیاوی زندگی اپنی زینت اور جس کی طرف یہ دعوت دیتی ہے وہ چیزیں تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالیں کہ تم اسی پر بھروسہ کرنے لگو، اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور آخرت کے لیے عمل کو چھوڑ دو۔

وَ لَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ یہاں عام قراءت سورۂ ملائکہ میں اور سورۃ الحدید میں غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مجاہد وغیرہ کے قول کے مطابق اس سے مراد شیطان ہے یہی مخلوق کو دھوکہ دیتا ہے، دنیا کی آرزو دلاتا ہے اور آخرت سے غافل کرتا ہے (3)۔ سورۃ النساء میں ہے یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ (120) سماک بن حرب، ابوحیوہ اور ابن سمیقع نے غین کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تم دھوکہ نہ کھاؤ۔ گویا یہ غر یغر غرور کا مصدر ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد ہے وہ معصیت کا فعل کرے اور مغفرت کی تمنا کرے (4)۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۠

"بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم اور وہی اتارتا ہے مینہ اور جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، فصل من مات لہ ولد، جلد 1، صفحہ 167
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، اتقوا النار ولو بشق التمر، جلد 1، صفحہ 190
3۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 210
4۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 417

میں ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور خبیر ہے''۔

فراء نے گمان کیا ہے کہ اس میں نفی کا معنی موجود ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس میں نفی اور ایجاب دونوں کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر آگاہ کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (انعام: 53) فرمایا: ''اس سے مراد یہی چیزیں ہیں''۔

میں کہتا ہوں: ہم نے سورۃ الانعام میں اس بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کا ذکر کیا، حضرت جبریل امین کی حدیث میں ہے عرض کی: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے؟ (1) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس سے اس کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے سائل سے زیادہ نہیں جانتا، یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے، وہ جانتا ہے کہ رحم میں کیا ہے اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا'' حضرت جبریل امین نے فرمایا: آپ نے سچ فرمایا''۔ الفاظ ابوداؤد طیالسی کے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: پانچ چیزوں کے علاوہ ہر چیز تمہارے نبی کو دے دی گئی۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جنہیں اللہ ہی جانتا ہے اسے کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل نہیں جانتا جس نے کہا: وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے اس نے قرآن کا انکار کیا کیونکہ اس نے قرآن کی مخالفت کی۔ پھر انبیاء اللہ تعالیٰ کی پہچان کرانے سے بہت سے اور غیب جانتے ہیں مراد کاہنوں، نجومیوں اور جو ستاروں کی مدد سے بارش کے ہونے کی باتیں کرتا ہے ان کا ابطال کرنا ہے۔ بعض اوقات طویل تجربہ سے کچھ اشیاء کی پہچان ہو سکتی ہے جس طرح حمل کا مذکر و مونث ہونا وغیرہ۔ جس طرح سورۃ الانعام میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ بعض اوقات تجربات مختلف ہو جاتے ہیں عادت کے برعکس معاملہ ہو جاتا ہے اور علم قطعی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے باقی رہتا ہے۔

ایک روایت کی جاتی ہے: ایک یہودی علم نجوم سے حساب لگاتا۔ اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اگر تو چاہے تو میں تجھے تیرے بیٹے کے نجم سے آگاہ کروں وہ دس دن کے بعد فوت ہو جائے گا اور آپ فوت نہیں ہوں گے مگر آپ نابینا ہو جائیں گے اور مجھ پر ایک سال نہیں گزرے گا کہ میں مر جاؤں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: اے یہودی! تیری موت کہاں ہو گی؟ اس نے عرض کی: میں یہ تو نہیں جانتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما واپس آئے اور اپنے بیٹے کو بخار میں مبتلا پایا۔ وہ بچہ دس دنوں کے بعد فوت ہو گیا۔ یہودی ایک سال سے قبل فوت ہو گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نابینا حالت میں فوت ہوئے۔ علی بن حسین جو اس حدیث کے راوی ہیں انہوں نے کہا: یہ حدیثوں میں سے سب سے عجیب حدیث ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت ایک بدو کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام وارث بن عمرو بن حارثہ تھا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12

نے عرض کی: میری بیوی حاملہ ہے مجھے بتائیے کہ وہ کیا جنے گی؟ ہمارے علاقہ قحط زدہ ہیں بتائیے کب بارش نازل ہوگی؟ مجھے علم ہے جب میں پیدا ہوا مجھے بتائیے میں کب مروں گا؟ مجھے علم ہے میں نے آج کیا کیا ہے مجھے بتائیے میں کل کیا کروں گا؟ اور مجھے بتائیے قیامت کب برپا ہوگی؟(1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا؛ قشیری اور ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ابوملیح، ابوعزہ ہذلی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی روح کسی علاقہ میں قبض کرنا چاہتا ہے تو وہاں اس کی ضرورت پیدا فرما دیتا ہے اس کی زندگی ختم نہیں ہوگی مگر وہ اس جگہ آتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی''۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا(2)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود سے اس کی ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں اس کو مکمل ذکر کیا ہے عام قراءت وَيُنَزِّلُ تشدید کے ساتھ ہے۔

ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پڑھا ہے بایة أرض باقی قراء نے بأی أرض پڑھا۔ فراء نے کہا: ارض کی تانیث کا اکتفاء ای کی تانیث پر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ارض سے مراد مکان ہے۔ اس وجہ سے مذکر ذکر کیا۔ شاعر نے کہا:

فلا مُزْنَة وَدَقَتْ ودْقَها ولا أرضَ أبْقَل إبقالَها

کسی بادل نے پورا پانی نہیں برسایا اور کسی قطعہ زمین سے اپنا سبزہ نہیں اگایا۔

اخفش نے کہا: یہ جائز ہے مررت بجارية أی جارية وأية جارية سیبویہ نے ای کی تانیث کو کل کی تانیث کے مشابہ قرار دیا، جس طرح ان کا قول ہے: كُلَّتُهُنَّ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ خَبِيْرٌ یہ علیم کی نعت ہے یا خبر کے بعد خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 351	2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 350

# سورۃ السجدہ

آیاتہا ۳۰ ۳۲ سُوْرَۃُ السَّجْدَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۷۵ رکوعاتہا ۳

تین آیات جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں باقی تمام سورت مکی ہے وہ یہ آیات ہیں اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا یہاں سے تین آیات مدنی ہیں؛ یہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء نے کہا: مگر پانچ آیات مدنی ہیں۔ وہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ سے لے کر الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ تک ہیں (1)۔ اس سورت کی تیس آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی انتیس آیات ہیں صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز صبح کی نماز میں سورۃ السجدہ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (دہر: 1) پڑھا کرتے تھے (2)۔ داری ابو محمد نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ سجدہ اور سورۂ تبارک کی تلاوت کیے بغیر نہیں سویا کرتے تھے (3)۔ داری نے کہا: ابو مغیرہ عبد سے وہ خالد بن معدان سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: منجیہ کو پڑھا کرو وہ سورۂ سجدہ ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک آدمی اس کو پڑھا کرتا تھا وہ اس کے بغیر کوئی چیز نہیں پڑھا کرتا تھا اس کی بہت زیادہ غلطیاں تھیں اس سورت نے اس پر پر پھیلا دیے اور کہا: اے اللہ! اسے بخش دو کیونکہ وہ اکثر مجھے پڑھا کرتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی اس بارے میں شفاعت کو قبول کر لیا۔ فرمایا: ''اس کی ہر خطا کے بدلہ ایک نیکی لکھ لو اور اس کا ایک ایک درجہ بلند کرتے جاؤ''۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

''الف، لام، میم۔ اس کتاب کا نزول اس میں ذرا شک نہیں، سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے''۔

الٓمّٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ، تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ کے رفع پر سب کا اجماع ہے اگر یہ مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہو تو یہ بھی جائز ہے؛ جس طرح کوفیوں نے اسے پڑھا اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ (یٰسین) تنزیل مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اس کی خبر لَا رَیْبَ فِیْهِ ہے۔ یا یہ خبر ہے اور اس کا مبتدا مضمر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ھذا تنزیل یا المتلو تنزیل یا ھذہ الحروف تنزیل۔ الم یہ حروف کے ذکر پر دال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ یہ الْكِتٰبِ سے حال ہے۔ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ خبر ہے۔ مکی نے کہا: یہ ان میں سے احسن ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ہے یہ جادو، شعر، کہانت اور پہلے لوگوں کے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 352 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، ما یقرا فی صلوٰۃ الفجر یوم الجمعة، جلد 1، صفحہ 122

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل سورۃ الملک، حدیث نمبر 2817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قصے کہانیاں ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جس کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پائیں''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ یہ اَمْ منقطعہ ہے بل اور ہمزہ استفہام کے ساتھ اس کی تقدیر بیان کی جاتی ہے یعنی بل أیقولون یہ اس پر دال ہے کہ ایک بات سے دوسری بات کی طرف نکلا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کو ثابت کیا کہ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، پھر اس سے اس ارشاد کی طرف کلام کو پھیرا اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ یعنی خود اسے گھڑا ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ افترا کے دعویٰ میں ان کو جھٹلایا۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا قتادہ نے کہا: قوم سے مراد قریش ہے (1)۔ وہ ایک امی امت تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انہیں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ لِتُنْذِرَ یہ ماقبل سے متعلق ہے اس لیے مِنْ رَّبِّكَ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہو۔ تقدیر کلام یہ ہے أنزله لتنذر قوما تو اس صورت میں مِنْ رَّبِّكَ پر وقف کرنا جائز ہے۔ مَّاۤ اَتٰىهُمْ میں ما نافیہ ہے۔ مِّنْ نَّذِيْرٍ من زائدہ ہے اور نذیر محل رفع میں ہے۔ اس سے مراد آگاہ کرنے والا اور ڈرانے والا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قوم سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان دور فترہ ہے، یہ حضرت ابن عباس اور مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی حجت ان پر مکمل ہو چکی تھی کہ جو رسول پہلے گزرے ان کے ساتھ انہیں خبردار کر دیا گیا اگرچہ انہوں نے رسول کو نہ دیکھا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا تخت (سلطانی) پر، نہیں تمہارے لیے اس کے بغیر کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارشی، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے''۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ انہیں اپنی کمال قدرت سے آگاہ کیا تاکہ وہ قرآن کو سنیں اور اس میں غور وفکر کریں۔ خلق کا معنی عدم اور کوئی چیز نہ ہونے کے بعد نئے سرے سے بنانا اور وجود عطا کرنا ہے۔ فِيْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 418

سِتَّةِ اَيَّامٍ اتوار کے دن سے لے کر جمعہ کے دن تک۔

حضرت حسن بصری نے کہا: دنیا کے دنوں سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان چھ دنوں میں سے ایک دن جس میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس کی مقدار دنیا کے سالوں میں سے ہزار سال کے برابر تھا۔ ضحاک نے کہا: چھ ہزار سالوں میں، آخرت کے دنوں میں سے چھ دنوں میں۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اس کی بحث سورۃ الاعراف، بقرہ وغیرہما میں گزر چکی ہے۔ علماء کا اس بارے میں جو نقطہ نظر ہے وہ میں نے الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں ذکر کر دیا ہے۔ یہاں ثم کا لفظ ترتیب کے لیے نہیں بلکہ یہ واؤ کے معنی میں ہے۔ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ یعنی کافروں کا کوئی ایسا دوست نہیں ہوگا جو ان سے عذاب کو روک سکے اور نہ ہی ان کا کوئی سفارشی ہوگا۔ محل کے اعتبار سے رفع جائز ہے۔ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ اس کی قدرت اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر نہیں کرتے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

”تدبیر فرماتا ہے ہر (چھوٹے بڑے) کام کی آسمان سے زمین تک پھر رجوع کرے گا ہر کام اس کی طرف اس روز جس کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شمار کرتے ہو“۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا قضاء و قدر کو نازل کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: جبریل کے ذریعے وحی نازل کی جاتی ہے۔ عمرو بن مرہ نے عبدالرحمن بن سابط سے روایت کیا ہے: امر دنیا کی چار فرشتے تدبیر کرتے ہیں۔ حضرت میکائیل، ملک الموت اور حضرت اسرافیل صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ جہاں تک حضرت جبریل کا تعلق ہے ان کی ذمہ داری ہوائیں اور لشکر ہیں۔ جہاں تک حضرت میکائیل کا تعلق ہے وہ بارش اور پانی کے ذمہ دار ہیں۔ جہاں تک ملک الموت کا تعلق ہے ان کے ذمہ روحوں کا معاملہ ہے۔ جہاں تک حضرت اسرافیل کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا امر نازل کرے گا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عرش تدبیر کا محل ہے جس طرح عرش کے نیچے والی جگہ تفصیل کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (الرعد: 2) آسمانوں سے نیچے والی جگہ تصرف کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا (الفرقان: 50)

ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ یحییٰ بن سلام نے کہا: فعل کی ضمیر سے مراد حضرت جبریل امین ہیں یہ وحی کے نزول کے بعد آسمانوں کی طرف بلند ہوتے ہیں۔ نقاش نے کہا: مراد وہ فرشتہ ہے جو آسمانوں سے زمین تک امور کی تدبیر کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اہل زمین کی خبریں ہیں جو اس کی بارگاہ کی طرف بلند ہوتی ہیں جب کہ ساتھ ساتھ فرشتے ہوتے ہیں جو ان خبروں کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے (2)۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 353

2۔ ایضاً

فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ کا معنی ہے دنیا کے ختم ہونے کے بعد امر و تدبیر اس کی طرف لوٹتا ہے فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ اس سے مراد یوم قیامت ہے۔ متقدم اقوال کی صورت میں یَعْرُجُ کی ضمیر فرشتے کے لیے ہے اس کا پہلے ذکر نہیں ہوا کیونکہ یہ معنی سے سمجھا جا رہا ہے سورۂ سال سائل میں آیت تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَیْهِ (المعارج:4) میں اس کا صراحۃ ذکر ہے۔ الیہ میں ضمیر اس کے قول کے مطابق جو السماء کو مذکر خیال کرتا ہے السماء کی طرف لوٹے گی اور فرشتے کے مکان کی طرف لوٹے گی جس جگہ کی طرف وہ لوٹتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے اسم کی طرف لوٹے گی مراد وہ جگہ ہے جس میں اسے قرار عطا کیا۔ جب تو ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے تو تو نے اسے السماء کی طرف لوٹایا یعنی سدرۃ المنتھی کیونکہ زمین سے جو چیز بلند ہوتی ہے وہ اس کی طرف بلند ہوتی ہے اور جو چیز نازل ہوتی ہے وہ اس سے ہی نیچے آتی ہے۔ یہ معنی صحیح مسلم میں ثابت ہے۔ مقدارہ کی ضمیر تدبیر کی طرف راجع ہے۔ معنی ہے اس تدبیر کی مقدار دنیا کے سالوں میں سے ہزار سال ہے، یعنی وہ ہزار سال کے امور کی تدبیر ایک دن میں کر دیتا ہے، یعنی وہ ایک دن میں ہزار سال کے امور کا فیصلہ کر دیتا ہے پھر اسے اپنے فرشتوں کی طرف القا فرماتا ہے۔ جب ایک ہزار سال گزر جاتا ہے تو ایک اور ہزار سال کا فیصلہ فرماتا ہے، پھر ہمیشہ اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہا ضمیر عروج کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قیامت کے قائم ہونے تک امور دنیا کی تدبیر فرماتا ہے۔ پھر وہ امر اس کی طرف لوٹ جاتا ہے، تو وہ ایک ایسے دن میں امور کا فیصلہ کرے گا جس کی مقدار ہزار سال کے برابر ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ سورج کے امر یعنی اس کے طلوع، غروب اور طلوع کی جگہ کی طرف لوٹنے کے معاملہ کی تدبیر کرتا ہے ایسے دن میں جس کی مسافت میں مقدار ایک ہزار سال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے اگر فرشتے کے علاوہ کوئی اور چلتا تو اسے ایک ہزار سال لگ جاتے، کیونکہ اترنے میں پانچ سو سال اور چڑھنے میں پانچ سو سال کا عرصہ لگتا ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت سے یہ مروی ہے: یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے؛ مہدوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ پہلے قول کا معنی ہے۔ حضرت جبریل امین اپنی تیز رفتاری کے باعث ایک ہزار سال کی مسافت تمہارے دنوں میں سے ایک دن میں طے کر لیتا ہے؛ زمخشری نے اسے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک سے ذکر کیا ہے کہ فرشتہ ایک دن میں ہزار سال کی مسافت طے کر لیتا ہے(2)۔ قتادہ سے مروی ہے: فرشتہ ایک ایسے دن میں نیچے اترتا ہے اور اوپر چڑھتا ہے جس کی مقدار ہزار سال ہے۔ اس کے اترنے کی مقدار پانچ سو سال اور اس کے اوپر چڑھنے کی مقدار پانچ سو سال ہے؛ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک کا قول ہے: اترنے میں ہزار سال اور اوپر چڑھنے میں بیس سال۔

مِّمَّا تَعُدُّوْنَ دنیا کے ایام میں سے جن کو تم شمار کرتے ہو۔ اس دن سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا اندازہ جہاں کے سالوں میں سے ہزار سال کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ دن نہیں جو دو راتوں کے درمیان دن کا احاطہ کیے ہوتا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں ہوتا۔ عرب بعض اوقات زمانہ کے عرصہ کو یوم سے تعبیر کرتے ہیں؛ جس طرح شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 354 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 353

يومان يومُ مُقامات و أندية　　ويومُ سيرٍ إلى الأعداء تأويب

دو دن ہیں ایک دن ٹھہرنے اور مجلس کا ہے اور ایک دن دشمنوں کی طرف سارا دن چلنے کا ہے۔

یہاں شاعر نے دو مخصوص دنوں کا ارادہ نہیں کیا۔ اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ان کا زمانہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ دونوں حصوں کو اس نے یوم سے تعبیر کیا ہے (1)۔ ابن ابی عبلہ نے اسے یعرج مجہول کے انداز میں پڑھا ہے۔ اسے یعدون یاء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ کا تعلق ہے تو اس آیت کے ساتھ اس کی تعبیر میں اشکال ہے۔ عبداللہ بن فیروز دیلمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں اور اس آیت فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا: یہ دن ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہیں؟ میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ ان کے بارے میں وہ کہوں جسے میں جانتا بھی نہیں (2)۔ پھر حضرت سعید بن مسیب سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا: میں نہیں جانتا تو میں نے انہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں آگاہ کیا۔ ابن مسیب نے سائل سے فرمایا: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو اس سے ڈرے کہ وہ اس کے بارے میں کچھ کہیں جب کہ وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ پھر علماء نے اس بارے میں گفتگو کی تو کہا گیا: آیت سَاَلَ سَآئِلٌ اس میں یوم قیامت کی طرف اشارہ ہے جب کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ نہیں۔ معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اس دن کے مشکل ہونے کی وجہ سے کفار پر اسے پچاس ہزار سال کی طرح بنا دیا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ عرب ناپسندیدہ دنوں کو لمبے ہونے اور خوشی کے دنوں کو چھوٹے ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

ويوم كظل الرمح قصر طوله　　دمُ الزق عنا واصطفاقُ المزاهر

اور دن جو نیزے کے سایہ کے برابر ہے جس کی طوالت کو شراب اور سارنگی کے نغموں نے ہمارے لیے چھوٹا کر دیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے دن میں کئی ایام ہیں ان میں سے ایک دن ایسا ہے جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے۔ ایک دن ایسا ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے اوقات مختلف ہیں۔ کافر کو ایک ہزار سال تک ایک قسم کا عذاب دیا جائے گا پھر اسے دوسری قسم کے عذاب کی طرف منتقل کر دیا جائے گا جس کی مدت پچاس ہزار سال ہوگی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے مواقف کی تعداد پچاس ہیں۔ موقف ہزار سال کا ہوگا۔ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ کا معنی ہے وقت کی مقدار یا یوم قیامت کے موقف کی مقدار ہزار سال ہے۔ نحاس نے کہا: یوم کا لفظ لغت میں وقت کے معنی میں ہے۔ معنی ہے فرشتے اور روح اس کی طرف ایسے وقت میں عروج کرتے ہیں جس کی مقدار ہزار سال ہے اور ایک دوسرے وقت جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ کہا: یہ مقدار زمین کی پستی سے لے کر عرش تک ہے۔ ثعلبی نے مجاہد، قتادہ اور ضحاک سے اس آیت تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 354　　2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 420

وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ ۝ (المعارج) کی تعبیر میں قول نقل کیا ہے۔ زمین سے سدرۃ المنتہیٰ کا ارادہ کیا جہاں حضرت جبریل امین ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔ حضرت جبریل امین اور فرشتے جوان کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس جگہ رہتے ہیں جو حضرت جبریل امین کا مقام ہے تو وہ ایک دن میں اتنا سفر کر لیتے ہیں جو دنیا کے پچاس ہزار سالوں میں کیا جاتا ہے۔ اِلَيۡهِ یعنی اس مکان کی طرف جس کی طرف بلند ہونے کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا۔ یہ قول بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کی طرح ہے: اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ۝ (الصافات) اس میں بھی مراد شام کا علاقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنۡ يَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَيۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ (النساء:100) یہاں بھی اِلَى اللّٰهِ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میرے رب کی جانب سے ایک فرشتہ پیغام لے کر آیا پھر اس نے اپنا پاؤں اٹھایا تو اس نے اسے آسمان کے اوپر رکھا دوسرا قدم زمین پر رکھا اسے بعد میں نہ اٹھایا''۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝

''وہی جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا سب پر غالب، ہمیشہ رحم فرمانے والا''۔

اس سے مراد ہے مخلوق سے جو غائب ہے اور جو اس کے لیے حاضر ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ ذٰلِكَ، انا کے معنی میں ہے، جس طرح اس کی وضاحت سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ کلام میں تہدید اور وعید کا معنی موجود ہے۔ یعنی اپنے افعال اور اقوال میں اخلاص سے کام لو کیونکہ میں تمہیں ان پر بدلہ دینے والا ہوں۔

الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۝

''وہ جس نے بہت خوب بنایا جس چیز کو بھی بنایا اور ابتداء فرمائی انسان کی تخلیق کی گارے سے۔ پھر پیدا کیا اس کی نسل کو ایک جوہر سے یعنی حقیر پانی سے پھر اسی (کے قد و قامت) کو درست فرمایا اور پھونک دی اس میں اپنی روح اور بنادیئے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو''۔

الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے اسے خلقہ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے سہولت کی وجہ سے اسے اختیار کیا ہے۔ یہاں فعل ماضی ہے محل جر میں ہے کیونکہ یہ شی کی صفت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو معنی مروی ہے وہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے جس شے کو بھی پیدا کیا اس کو محکم بنایا، یعنی جو ارادہ کیا اس کو لے آیا اس کے ارادہ میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا (1)۔

ایک دوسرا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے جس شے کو بھی پیدا کیا وہ خوبصورت ہے کیونکہ کوئی دوسرا بھی اس کی مثل لانے پر قادر

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 355

نہیں۔ یہ اس کے خالق ہونے پر دال ہے۔ جس نے لام کو ساکن کیا وہ سیبویہ کے نزدیک مصدر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ اس امر پر دال ہے خلق کل شیء خلقا یہ اس کلام کی مثل ہے صُنْعَ اللّٰهِ (النحل:108) كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ (النساء:24) دوسرے علماء کے نزدیک کل سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی ہر شے کی تخلیق کو اچھا کیا۔ بعض نحویوں کے نزدیک یہ مفعول ثانی ہے، اس تاویل کی صورت میں کہ اَحْسَنَ کا معنی أفهم اور أعلم ہے تو یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا تو تقدیر کلام یہ ہوگی: افهم كلّ شي خلقه۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔ معنی ہے أفهم كلّ شي خلقا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حرف جر کے گرانے کی وجہ سے منصوب ہے اصل میں کلام یوں تھی أحسن كلّ شي في خلقه۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے: احسن اس کا معنی پختہ کرنا ہے (1)، یعنی اس سے جس مقصد کا ارادہ کیا گیا اس اعتبار سے یہ احسن ہے۔ اسی اعتبار سے حضرت ابن عباس اور عکرمہ نے کہا: بندر کی سرین خوبصورت نہیں لیکن متقن اور محکم ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ کا معنی ہے ہر شے کی تخلیق کو پختہ کیا (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ (طٰہٰ:50) انسان کو حیوان کی شکل پر پیدا نہیں کیا اور حیوان کو انسان کی شکل پر پیدا نہیں کیا۔ خلقه کو رفع دینا بھی جائز ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: ذلك خلقه۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لفظ میں عام اور معنی میں خاص ہے۔ اس نے ہر اچھی چیز کی صورت کو اچھا بنایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لفظ اور معنی میں عام ہے۔ جس شے کو بنایا اس کو اچھا بنایا، یہاں تک کہ کتے کو اس کی صورت میں اچھا بنایا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: بندر کی سرین میں حسن ہے (3)۔

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ سورۂ مومنون اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا: مهين کا معنی کمزور ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: مهين سے مراد ہے لوگوں کے ہاں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ ضمیر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی قد و قامت کو درست کیا۔ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ اس میں اپنی روح پھونکی، پھر ان کی اولاد کی طرف رجوع کیا۔ فرمایا: وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: پھر اس حقیر پانی سے خوبصورت مخلوق بنا دی۔ اس میں روح کو ملایا اور اس کے شرف کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی طرف سے منسوب کیا۔ اور اس لیے بھی کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے واقع ہوا، جس طرح بندے کی نسبت اس ارشاد عبدی میں اپنی ذات کی طرف کی اسے نفخ کے ساتھ تعبیر کیا کیونکہ روح ہوا کی جنس میں سے ہے۔ سورۃ النساء اور دوسری سورتوں میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ یعنی تم شکر نہیں کرتے بلکہ ناشکری اور کفر کرتے ہو۔

وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۝۱۰

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 359 2۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 211 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 355

''اور کہنے لگے: کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے در حقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کر رہے ہیں''۔

**وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ** یہ بعث کے منکروں کا قول ہے یعنی ہم ہلاک ہو جائیں اور مٹی ہو جائیں۔ اس کی اصل عربوں کا قول ہے: ضل الماء فی اللبن جب پانی دودھ میں ناپید ہو جائے۔ عرب اس شے کے بارے میں کہتے ہیں جس پر کوئی دوسری چیز ایسی غالب آ جائے کہ اس میں اس کا اثر بھی چھپ جائے: قد ضل۔ اخطل نے کہا:

كنتَ القَذَى فی موجِ أكدر مُزْبِد قذف الأتی به فضلّ ضلالا(1)

تو مٹیالے رنگ جھاگ والی موج میں ایک تنکا تھا جس میں اجنبی کو پھینک دیا گیا اور وہ موج اس پر غالب آ گئی۔

قطرب نے کہا: ضللنا کا معنی ہے ہم زمین میں غائب ہو جائیں اور نابغہ ذبیانی کا شعر پڑھا:

فآبَ مُضِلّوہ بعینٍ جلیّة و غُودِر بالجَوْلانِ حَزْمٌ ونَائِلُ(2)

اس کو غائب کرنے والے روشن آنکھ کے ساتھ لوٹے اور حزم اور نائل کے ساتھ جولان کے مقام پر دھوکہ ہوا۔

ابن محیصن اور یحییٰ بن یعمر نے ضَلِلْنَا لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ جوہری نے کہا: قد ضللت اَضِل یہ اس کا باب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ** (سبا: 50) یہ نجد کی لغت ہے اور یہ فصیح لغت ہے۔ اہل عالیہ کہتے ہیں: ضَلِلْتُ، أَضَلُ فهو ضالّ و تالّ یہی ضلالۃ و تلالۃ ہے أضلہ اس کو ضائع کر دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أضِلَ المیت جب اسے دفن کیا جائے گا۔ فآب مضلوہ اسے دفن کرنے والے لوٹے۔

ابن سکیت نے کہا: أضللت بعیری جب وہ اونٹ تجھ سے چلا گیا۔ ضللت المسجد و الدار جب تو مسجد اور اس کے گھر کو نہ پہچانتا ہو۔ اس طرح ہر وہ چیز موجود ہو لیکن اس تک پہنچا نہ جا سکے۔ حدیث میں ہے لعلی أضِل اللہ یہ ارادہ کیا ہے ممکن ہے میں اس پر مخفی ہوں (3)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ** جب ہم زمین میں چھپ جائیں۔

اضلہ اللہ فضلّ اللہ تعالیٰ نے اسے چھپایا تو وہ چھپ گیا۔ تو جملہ بولتا ہے: انك لا تھدِی الضال ولا تھدِی المتضال تو چھپنے والے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور تو جان بوجھ کر چھپنے والے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اعمش اور حضرت حسن بصری نے کہا: صَلَلْنَا صاد کے ساتھ قراءت کی۔ جب ہم بدبودار ہو جائیں؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں صللنا معروف نہیں لیکن یہ جملہ کہا جاتا ہے: صلّ اللحمُ و أصلّ، خَمّ و أخمّ جب وہ بدبودار ہو جائے۔ جوہری نے کہا: صلّ اللحم یصلّ، صلولا، گوشت کا بدبودار ہونا۔ وہ پکا ہوا ہو یا کچا ہو۔ حطیئہ نے کہا:

ذات فتًی یَبْذُل ذَا قِدْرِہ لایُفْسِدُ اللحمَ لدیه الصُّلُولُ

وہ ایسا نوجوان ہے جو اپنی ہنڈیا میں موجود چیز کو خرچ کرتا ہے اس کے ہاں کچا یا پکا گوشت خراب نہیں ہوتا۔ اصل اس کی مثل ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 356 2۔ ایضاً 3۔ النہایہ فی غریب الحدیث، جلد 3، صفحہ 98

اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ہم اس کے بعد جدید مخلوق پیدا کرتے ہیں۔ اسے ائنا بھی پڑھا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں عربی کا مشکل سوال ہے۔ سوال کیا جاتا ہے: اذا میں کون عامل ہے؟ اور ان کا مابعد، اس کے ماقبل میں عامل نہیں ہوتا۔ استفہام میں سوال اس سے شدید تر ہے کیونکہ استفہام کا مابعد انّ کے ماقبل میں بدرجہ اولیٰ عمل نہیں کرنا چاہیے۔ جب دونوں اکٹھے ہو جائیں تو مابعد، ماقبل میں کیسے عامل ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے انا پڑھا ہے تو اس میں عامل ضللنا ہوگا جس نے آئنا پڑھا اس میں عامل مضمر ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی أنبعث إذا متنا اس میں ایک اور سوال ہے، سوال یہ کیا جاتا ہے: پہلی قراءت کی صورت میں اذا کا جواب کہاں ہے کیونکہ اس میں شرط کا معنی موجود ہے؟ اس میں قول یہ ہے کہ اس کا مابعد فعل ماضی ہے اسی وجہ سے یہ جائز ہے بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ وہ دوبارہ لوٹانے کی اس کی قدرت کا انکار نہیں کرتے کیونکہ وہ اس کی قدرت کو پہچانتے ہیں لیکن وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان پر کوئی حساب نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات نہیں کریں گے۔

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

''فرمایئے: جان قبض کرے گا تمہاری موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے پھر اپنے رب کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ جب اس امر کو ذکر کیا کہ وہ دوبارہ اٹھانے کو بعید خیال کرتے ہیں تو ان کی وفات اور دوبارہ اٹھائے جانے کے امر کو ذکر کیا۔ یَتَوَفّٰىكُمْ یہ توفی العدد والشیء سے مشتق ہے۔ جب وہ پورا پورا اسے لے اور پورے کے پورے پر قبضہ کر لے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: توفاہ اللہ یعنی اس کی روح کو پورا پورا لیا پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ تَوَفَّیْتُ مالی من فلان یعنی میں نے اس سے پورا پورا مال لے لیا۔ مَّلَكُ الْمَوْتِ اس کا نام عزرائیل ہے جس کا معنی اللہ کا بندہ ہے۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اس کا سارے کا سارا تصرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کی تخلیق و اختراع سے ہوتا ہے۔ حدیث طیبہ میں مروی ہے: ''ملک الموت کی بجائے اللہ تعالیٰ تمام چوپاؤں کی روحوں کو قبضہ میں لے گا، گویا ان کی زندگی کو ختم کرے گا'' (1)۔ ابن عطیہ نے اس کا ذکر کیا۔

میں کہتا ہوں: اس کے برعکس بھی مروی ہے ملک الموت تمام مخلوقات کی روحوں کو قبض کرے گا یہاں تک کہ پسو اور مچھر کی روحوں کو بھی قبض کرے گا۔ جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کے سر کے پاس ملک الموت کو دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''میرے صحابی کے ساتھ نرمی کرو کیونکہ وہ مومن ہے''۔ ملک الموت نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو جایئے اور آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں میں ہر مومن کے ساتھ نرمی کرنے والا ہوں۔ یہ چیز ذہن نشین کر لیجئے مٹی کا گھر ہو یا بالوں سے بنا خیمہ وہ خشکی پر ہو یا سمندر میں اس کے رہنے والوں میں سے کوئی فرد نہیں مگر میں ہر روز پانچ دفعہ اس سے مصافحہ کرتا ہوں یہاں تک میں ان میں سے چھوٹے بڑے ہر فرد کو اس کی ذات کے اعتبار سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 360

پہچان لیتا ہوں اللہ کی قسم! اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں یہ ارادہ کرتا کہ میں ایک مچھر کی روح کو قبض کروں تو میں اس پر قادر نہ ہوتا یہاں تک اللہ تعالیٰ اس کی روح کو قبض کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جعفر بن علی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے وہ نماز کے اوقات کے مواقع پر ان سے مصافحہ کرتا ہے (1)؛ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بغدادی نے ذکر کیا مجھے ابومحمد حسن بن محمد خلال نے انہیں ابومحمد عبداللہ بن صفار نے انہیں ابوبکر حامد بصری نے انہیں یحییٰ بن ایوب علاف نے انہیں سلیمان بن مہیر کلابی نے روایت کی کہ میں حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ایک آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے پوچھا: اے ابا عبداللہ! کیا پسوؤں کی روحوں کو ملک الموت قبض کرتا ہے؟ امام مالک نے طویل عرصہ تک سر جھکائے رکھا پھر پوچھا: کیا اس کا نفس (روح) ہوتا ہے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ملک الموت ان کی روحوں کو قبض کرتا ہے

**اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا** (الزمر: 42)

ابن عطیہ نے حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا: انسان میں بھی معاملہ اسی طرح ہے، مگر یہ ایک ایسی نوع ہے اسے ملک الموت کے تصرف کے ساتھ شرف بخشا گیا ہے جب یہ ان کی روحوں کو قبض کرتا ہے تو اس کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو پیدا کیا اور اس کے ہاتھ پر روحوں کے قبض کرنے، جسموں سے انہیں کھینچنے اور ان سے نکالنے کے امر کو بھی پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لشکر کو پیدا فرمایا جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کے حکم پر عمل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ** (الانفال: 50) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا** (الانعام: 61) یہ معنی سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام کی خالق ہے وہی ہر فعل کا حقیقت میں خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا** (الزمر: 42) **الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ** (ملک: 2) **یُحْیٖ وَیُمِیْتُ** (البقرہ: 258) ملک الموت قبض کرتا ہے مددگار تگ و دو کرتے ہیں اللہ تعالیٰ روح کو لے جاتا ہے۔ آیات و احادیث میں تطبیق کی صورت یہی ہے لیکن جب ملک الموت اس امر کا ذمہ دار ہے خواہ یہ عمل وہ واسطہ کے ساتھ کرے یا براہ راست کرے تو موت کو اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس طرح خلق کی نسبت فرشتے کی طرف کی جاتی ہے جس طرح سورۂ حج میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ مجاہد سے مروی ہے: دنیا ساری کی ساری ملک الموت کے سامنے اس طرح ہے جس طرح انسان کے سامنے ایک تھال ہو جہاں سے وہ چاہتا ہے کوئی چیز لیتا ہے (2)۔ یہ معنی مرفوع حدیث میں بھی مروی ہے۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرۃ'' میں کیا ہے۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے: اللہ تعالیٰ نے جس وقت ملک الموت کو روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری سونپی ملک الموت نے عرض کی: اے میرے رب! تو نے مجھے یوں بنا دیا کہ لوگ میرا ذکر برائی کے ساتھ کریں گے اور مجھے گالیاں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: میں موت کے لیے امراض میں سے علتیں اور اسباب بنا دوں گا لوگ موت کو اس کی طرف منسوب کریں گے کوئی آدمی بھی تیرا ذکر خیر کے بغیر نہیں کرے گا (3)۔ ہم نے اس کا ذکر

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 357 2۔ تفسیر ثعلبی، جلد 4، صفحہ 328

3۔ التذکرہ، ما جاء فی سبب قبض ملک الموت، جلد 1، صفحہ 113

''تذکرہ'' میں مفصل کر دیا ہے۔ ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ روحوں کو دعوت دیتا ہے روحیں اس کے پاس آتی ہیں اور وہ انہیں قبض کر لیتا ہے۔ پھر وہ انہیں رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ کتاب ''تذکرہ'' میں ایسی بحث موجود ہے کہ جو آدمی حقیقت حال پر آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ اس کے لیے کافی وشافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء میں سے بعض نے اس آیت سے وکالت کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ وُكِّلَ بِكُمْ اسے تمہاری روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری دی ہے۔ یہ اس کے لفظ سے استنباط ہے اس کے معنی میں استنباط نہیں مگر یہ حکم عام ہوتا تو ہم الله تعالیٰ کے فرمان: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: 158) کے بارے میں کہتے: یہ الله تعالیٰ کی جانب سے نیابت ہے اور اس کی رسالت کی تبلیغ میں وکالت ہے۔ تو ہم اس ارشاد: وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 43) کے بارے میں کہتے: یہ بھی وکالت ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے ہر جاندار کے رزق کی ضمانت اٹھائی ہے اغنیاء کو غذاؤں کے ساتھ خاص کیا اور انہیں اشارہ کیا کہ فقراء کا رزق ان کے پاس ہے اور معلوم وقت میں معلوم مقدار ان کے سپرد کرنے کا حکم دیا، اپنے علم سے اس کی تدبیر فرمائی، اپنے حکم سے اسے نافذ فرمایا اور اپنی حکمت کے ساتھ اسے مقدر کیا۔ احکام الفاظ کے ساتھ متعلق نہیں ہوتے ہاں اس صورت میں متعلق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد مطلوبہ میں موضوعات اصلیہ پر وارد ہوں۔ اگر وہ اپنے مقصد کے علاوہ میں ظاہر ہوں تو یہ ان پر متعلق نہیں ہوتے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بیع وشراء کا لفظ اور معنی معلوم ہے الله تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: 111) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیت دلیل ہے کہ آقا اپنے غلام سے بیع وشراء کر سکتا ہے کیونکہ دونوں مقصد مختلف ہیں مگر جب معانی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے کہ قاضی ایسے آدمی کو نائب بنائے جو سختی سے اس آدمی سے حق لے جس پر وہ حق لازم ہے اس کے بغیر کہ اس کا اس میں کوئی عمل ہو یا اس کی رضا شامل ہو جب کہ ایسی صورت پائی جائے۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲

''اور کاش! تم دیکھو جب مجرم اپنے سر جھکائے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے (کہیں گے) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اور (کانوں سے) سن لیا پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب ہم نیک عمل کریں گے''۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ یہ جملہ اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ مبتدا اور خبر ہے۔ زجاج نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب، امت کو خطاب ہے۔ معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ بعث کے منکروں کو قیامت کے روز دیکھتے تو عجیب وغریب بات دیکھتے۔ ابو العباس کا مذہب اس کے علاوہ ہے۔ معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم مجرم سے کہیے: کاش تم دیکھتے جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکاتے ہوں گے تو تجھ سے افعال سرزد ہوتے اس پر شرمندگی کا اظہار کرتا۔ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ شرمندگی، رسوائی، حزن، ذلت اور غم کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے ہوتے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ جب ان کا رب ان کا

محاسبہ کرے گا اور انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ رَبَّنَآ وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اَبْصَرْنَا ہم جو جھٹلاتے رہتے تھے اس کو ہم نے دیکھ لیا۔ وَ سَمِعْنَا ہم جو انکار کیا کرتے تھے اس کو سن لیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے تیرے وعدہ کی صداقت کو دیکھ لیا اور تیرے رسولوں کی تصدیق کو سن لیا۔ ابصروا انہوں نے اس کو اس وقت دیکھا جب دیکھنا انہیں نفع نہیں دے گا اور انہوں نے اس وقت سنا جب سننا انہیں نفع نہیں دے گا۔ فَارْجِعْنَا ہمیں دنیا کی طرف بھیج دو۔ نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ہم دوبارہ اٹھانے کی تصدیق کرنے والے ہیں؛ یہ نقاش کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم اس کی تصدیق کرنے والے ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے کہ وہ حق ہے، یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلایا۔ فرمایا: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ (الانعام) (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنَّا مُوْقِنُوْنَ کا معنی ہے اب ہم سے شکوک زائل ہو چکے ہیں وہ دنیا میں دیکھا اور سنا کرتے تھے لیکن وہ تدبر نہیں کیا کرتے تھے تو وہ اس آدمی کی طرح ہوتے جو نہ دیکھتا اور نہ سنتا ہے جب وہ آخرت میں متنبہ ہوئے اس وقت گویا وہ ہو گئے کہ وہ سن اور دیکھ رہے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے ہمارے رب! حجت و دلیل تو تیری ہی ہے ہم نے تیرے رسولوں اور دنیا میں تیری مخلوقات کے عجائب کو دیکھا اور ہم نے ان کی کلام کو سنا تو ہمارے لیے کوئی دلیل نہیں۔ یہ ان کی طرف سے اعتراف ہے پھر انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے تاکہ وہ ایمان لائیں۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳﴾

"(جواب ملے گا) اور اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے"۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا، جب انہوں نے کہا: رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ تو اس قول کے ساتھ اس کا رد فرمایا: وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اگر میں چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت عطا فرما دیتا ان میں سے کوئی بھی ہدایت سے پیچھے نہ رہتا۔ وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ ابن مبارک نے رقائق میں طویل حدیث ذکر کی ہے ہم نے اس کا ذکر "التذکرہ" میں کیا (2)۔ نحاس نے کہا: وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا کے معنی میں دو قول ہیں: (۱) دنیا میں (۲) سیاق کلام دلالت کرتا ہے کہ یہ آخرت میں ہوگا۔ اگر ہم چاہتے کہ ہم انہیں دنیا اور امتحان کی طرف لوٹا دیتے جس طرح انہوں نے سوال کیا۔ وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ میری طرف سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ جس نے میری نافرمانی کی میں اسے آگ کا عذاب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اگر وہ انہیں لوٹاتا تو وہ لوٹ جاتے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام: 28)۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 359
2۔ التذکرہ، جلد 2، صفحہ 561

اس ہدایت سے مراد دل میں معرفت پیدا کرنا ہے اور معتزلہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں: اگر ہم چاہتے تو خوفناک نشانیوں کو ظاہر کر کے ہم انہیں ہدایت پر مجبور کر دیتے لیکن ایسا کرنا اس کی جانب سے اچھا نہ ہوتا کیونکہ یہ اس مقصد کے خلاف ہوتا جو اس بندے کو احکام کا مکلف بنانے سے حاصل ہوتا ہے وہ ثواب ہے اور اس ثواب کا مستحق نہیں بن سکتا مگر وہی شخص جو اپنے اختیار سے کوئی فعل کرتا ہے۔ امامیہ نے اس کی تاویل میں کہا: یہ جائز ہے کہ اس سے وہ ہدایت مراد لے جو آخرت میں جنت کے راستہ کی طرف ہے اور کسی کو سزا نہ دے لیکن اس کی جانب سے یہ قول ثابت ہے کہ وہ جہنم کو بھر دے گا۔ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کوئی لازم نہیں کہ سب کو جنت کی طرف ہدایت دے۔ علماء نے کہا: بلکہ واجب معصومین کو ہدایت دینا ہے۔ جس کا گناہ ہو تو اس کی جہنم کی طرف راہنمائی جائز ہوگی یہ ان کے افعال پر جزا ہے، اس کو جائز قرار دینا درست نہیں، کیونکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں ہدایت سے مراد ایمان کی طرف ہدایت ہے۔ علماء نے ان کے بارے میں ان دو تاویلوں کے متعلق ایسی گفتگو کی ہے جو دین کے اصول میں کفایت کرتی ہے۔ جواب میں سب سے مناسب و موزوں یہ ہے کہ کہا جائے: ہمارے اور تمہارے نزدیک یہ باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جبر و اکراہ کے ساتھ ہدایت نصیب فرمائے کیونکہ اگر اسے تسلیم کیا جائے تو یہ جبریہ کے مذہب کی طرف لے جاتا ہے وہ مذہب ہمارے اور تمہارے نزدیک بے وقعت ہے تو کوئی چیز باقی نہیں بچتی مگر یہ ہے کہ مومنوں میں سے ہدایت یافتہ کو اللہ تعالیٰ بندے کے اختیار کی بنا پر انہیں ایمان و طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے یہاں تک کہ اسے مکلف بنانا صحیح ہو جاتا ہے۔

وہ جو چاہے وہ اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ایمان و طاعت اپنا لے بطور جبر ایسا نہ کرے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۞ (التکویر) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۞ (المزمل) پھر اس کے پیچھے ان دو آیتوں کو بیان کیا وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانسان: 30) مومنوں کا ایمان اس کی مشیت سے واقع ہوا اور اس امر کی نفی کر دی کہ وہ کوئی چیز چاہ سکتے ہیں وہ اس وقت کوئی چیز چاہیں گے جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اسی وجہ سے جبریہ نے مزید تفریط سے کام لیا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے۔ انہوں نے کہا: مخلوق اپنے تمام تر امور میں مجبور ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو دیکھتے: وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانسان: 30) اور قدریہ نے بھی حد سے تجاوز کیا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی ایمان کی طرف ہدایت بندوں کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے۔ انہوں نے کہا: مخلوق اپنے افعال کی خود خالق ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف توجہ کی: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۞ (التکویر)

ہمارا مذہب دونوں کے درمیان میانہ روی پر مشتمل ہے۔ ہمارا مذہب جبریہ اور قدریہ کے درمیان ہے اور بہترین امر درمیانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل حق نے کہا: ہم جس کی طرف مجبور کیے جائیں اور جس میں ہمیں اختیار ہوتا ہے اس میں ہم فرق کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم فرق کا ادراک کرتے ہیں، اس رعشہ کی حرکت میں جو انسان کے ہاتھ میں بغیر کسی حیلہ اور ارادہ کے ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اس کی قدرت شامل نہیں ہوتی، اور اس اختیاری حرکت کے درمیان جب وہ اپنے ہاتھ کو

حرکت دیتا ہے جو رعشہ کی حرکت کے مماثل ہوتی ہے۔ جو دونوں حرکتوں یعنی رعشہ کی حرکت اور اختیاری حرکت میں فرق نہیں کرتا جب کہ وہ دونوں اس کی ذات میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں محسوس کی جاتی ہیں وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور اس کا حاسہ، ادراک بھی کرتا ہے تو ایسا شخص پاگل ہے، اس کی حس میں خلل ہے اور عقلاء کی جماعت سے خارج ہے یہی وہ واضح حق ہے۔ یہی افراط وتفریط کے طریقوں کے درمیان اعتدال کا راستہ ہے۔

كلا طرفي قصد الامور ذميم

میانہ روی کی دونوں جانبیں مذموم ہیں۔ اسی اعتبار سے علماء میں سے اہل نظر نے پسند کیا کہ دو منزلوں کے درمیان اس منزل کو کسب کا نام دیں۔ انہوں نے یہ نام کتاب اللہ سے اخذ کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ:286)

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"پس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو، ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا اور چکھو ابدی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے"۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اس میں دو قول ہیں: (۱) یہ اس نسیان سے ماخوذ ہے جس کے ساتھ کوئی یاد نہ ہو۔ یعنی انہوں نے اس دن کے لیے کوئی عمل نہ کیا تو وہ بھولنے والوں کے قائم مقام ہو گئے۔ (۲) جو تم چھوڑ آئے اس کو تم نے بھلا دیا۔ اسی طرح اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ہے۔ محمد بن یزید نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ:115) سے استدلال کیا ہے۔ کہا: اس امر پر دلیل کہ یہ ترک کے معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے بارے میں بتایا فرمایا: مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ (الاعراف:20) اگر حضرت آدم علیہ السلام اسے بھول گئے تھے تو شیطان نے تو آپ کو یاد دلایا تھا۔ اور یہ شعر پڑھا:

كأنه خارجا من جَنْب صَفحته سَفُودُ شَرْبٍ نَسُوهُ عند مُفْتَادِ

اس شعر میں بھی نسوہ، ترکوہ کے معنی میں ہے۔ اگر یہ نسیان میں سے ہوتا تو انہوں نے اس پر ایک دفعہ عمل کیا ہوتا۔ ضحاک نے کہا: نسیتم تم نے میرے امر کو ترک کر دیا۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: تم نے اس دن میں دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان کو ترک کر دیا۔ نسیناکم ہم نے تمہیں بھلائی کے معاملہ میں ترک کر دیا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: ہم نے تم کو عذاب میں چھوڑ دیا(1)۔ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ سے کلام کو شروع کرنے اور فعل کی بناء ان کے اسم پر رکھنے میں ان سے انتقام لینے میں شدت ہے۔ معنی ہے اسے چکھو، یعنی جس میں تم ہو جیسے مر چکے ہوتے، رسوائی اور غم یہ سب اللہ تعالیٰ کو بھولنے کے سبب ہیں۔ یعنی دائمی عذاب چکھو یہ ایسا دائمی ہے جو جہنم میں کبھی ختم نہ ہو گا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 360

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ یعنی دنیا میں جو تم گناہ کرتے رہے ہو۔ بعض اوقات وہ چیز جو نفس پر طاری ہوتی ہے اسے ذوق سے تعبیر کرتے ہیں اگرچہ وہ چیز کھائی جانے والی نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کھائی جانے والی چیز کو چکھنے سے احساس ہوتا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

فذُق هيرها إن كنت تزعم أنها فسادٌ ألا يا رُبَّما كذب الزعم

طفیل نے کہا:

فذوقوا كما ذقنا غداة محجّر من الغيظ في اكبادنا والتحوب

پس تم چکھو جس طرح ہم نے محجر کی صبح اپنے جگروں میں غصہ اور گناہ کو چکھا تھا۔

تذوقتُه میں نے اسے تھوڑا تھوڑا چکھا۔ اور امر مستذاق معلوم اور تجربہ شدہ امر۔

شاعر نے کہا:

وعهدُ الغانيات كعهد قَيْنٍ وَنَتْ عنه الجعائل مُسْتذاق

نغمہ گانے والیوں کا وعدہ غلاموں کے وعدہ کی طرح ہے جس سے تجربہ شدہ اور معلوم اجرتیں تھک جاتی ہیں۔

ذواق کا معنی اکتایا ہوا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩

''صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے''۔

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے یعنی وہ کفر سے محبت رکھنے کی بنا پر تم پر ایمان نہیں رکھتے۔ تجھ پر اور قرآن پر وہ لوگ ایمان لائیں گے جو تدبر کرنے والے ہوں گے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے والے ہوں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جب ان پر قرآن پڑھا جائے گا تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ خَرُّوا سُجَّدًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سُجَّدًا کا معنی ہے رُکعا۔ مہدوی نے کہا: یہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ہے جو سجدہ تلاوت رکوع میں کرنے کو جائز سمجھتا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے۔ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۞ (ص) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد سجدہ ہے؛ اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔ وہ اپنے مونہوں کے بل سجدہ میں گر پڑے وجہ آیات کی تعظیم اور اس کی سطوت و عذاب سے خوف ہے۔

وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ انہوں نے حمد کے ساتھ تسبیح کو ملا دیا، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی اور اس کی حمد بیان کی۔ انہوں نے اپنے سجدوں میں کہا: سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان ربی الاعلی و بحمدہ یعنی وہ مشرکوں کے قول سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

سفیان نے کہا: انہوں نے اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہوئے نماز پڑھی (1)۔ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ وہ اس کی عبادت میں تکبر نہیں کرتے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ نقاش نے کہا: وہ اہل مکہ کی طرح سجدہ کرنے سے تکبر نہیں کرتے (2)۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۖ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

''دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے، پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہتے ہیں''۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ بستروں سے ان کے پہلو جدا اور دور رہتے ہیں۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یعنی متجافیة جنوبهم، مضاجع یہ مضجع کی جمع ہے۔ اس سے مراد نیند کی جگہیں ہیں۔ اس سے مراد لیٹنے کے اوقات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ مجاز ہے حقیقی معنی اولیٰ ہے (3)۔ اسی معنی میں حضرت عبد الله بن رواحہ کے اشعار ہیں:

وفينا رسول الله يتلو كتابه　　إذا انشق معروف من الصبح ساطع (4)

يبيت يجافي جنبه عن فراشه　　إذا استثقلت بالمشركين المضاجع

ہمارے درمیان الله کا رسول ہے جو اس کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے جب معروف یعنی صبح پھیلتی ہے وہ رات گزارتا ہے جب کہ آپ کا پہلو بستر سے جدا رہتا ہے جب مشرکوں کے بستر ان سے بوجھل ہوتے ہیں۔

زجاج اور رمانی نے کہا: تجافی سے مراد اوپر کی جانب سے الگ ہونا۔ یہ اسی طرح ہے جب کوئی آدمی خطا کار سے درگزر کرے جب وہ گالی وغیرہ دے۔ جنوب یہ جنب کی جمع ہے۔ ان کے پہلو بستر سے کیوں جدا رہتے ہیں اس میں دو قول ہیں: (۱) الله تعالیٰ کے ذکر کے لیے وہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں؛ یہ حضرت ابن عباس اور ضحاک کا قول ہے (۲) نماز کے لیے۔ وہ نماز جس کے لیے ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں اس کے بارے میں چار قول ہیں: (۱) رات کے وقت نفل پڑھنا؛ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے؛ یہی اکثر لوگوں کا قول ہے، اسی میں مدح ہے؛ یہ مجاہد، اوزاعی، مالک بن انس، حسن بن ابی الحسن، ابو العالیہ وغیرہم کا قول ہے۔ اس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ: 17) کیونکہ انہیں ایسے امور پر جزا دی گئی جس کو انہوں نے مخفی رکھا تھا۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

رات کے وقت قیام کرنے کے بارے میں بے شمار احادیث ہیں ان میں سے ایک حضرت معاذ بن جبل کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''کیا میں تمہاری خیر کے دروازوں کی طرف رہنمائی نہ کروں روزہ ڈھال ہے، صدقہ خطا کو ناپید کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رات کے وسط میں آدمی کی نماز پھر ان آیات کا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۖ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءً

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 361　2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1499　4۔ الجواہر الحسان، جلد 2، صفحہ 559

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ کی تلاوت کی''(1)۔ ابوداؤد طیالسی نے اپنی سند میں، قاضی اسماعیل بن اسحاق اور ابو عیسیٰ ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اس کے بارے میں کہا: حدیث حسن صحیح ہے۔(۲) اس سے مراد عشاء کی نماز ہے جسے عتمہ کہتے ہیں(2)؛ یہ حضرت حسن بصری اور عطا کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت انس بن مالک سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت اس نماز کی انتظار کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جسے عتمہ کہتے ہیں(3)۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔(۳) مغرب اور عشاء کے درمیان نفل پڑھنا؛ یہ قتادہ اور عکرمہ کا قول ہے۔ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں(4) جو مغرب اور عشاء کے درمیان نفل پڑھتے ہیں(۴) ضحاک نے کہا: تجافی الجنوب سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی عشاء اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے؛ یہ قول حضرت ابو الدرداء اور حضرت عبادہ نے کیا۔

میں نے کہا: یہ اچھا قول ہے۔ یہ معنوی طور پر تمام اقوال کو جامع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عشاء کی نماز کا انتظار کرنے والا یہاں تک کہ وہ نماز پڑھے نماز اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہوتا ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک آدمی ہمیشہ نماز میں ہوتا ہے جب تک وہ نماز کا انتظار کرتا ہے''(5)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: آیت سے مراد عشاء کی نماز کا انتظار کرنا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے ایک تہائی تک اسے موخر کیا کرتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: جاہل لوگ غروب آفتاب کے ساتھ ہی سو جاتے ہیں اور اس وقت سو جاتے ہیں جس وقت انسان چاہتا ہے تو عشاء کے وقت کا انتظار مشکل ہو جاتا ہے۔ صبح کی نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنے والا خصوصاً اوّل وقت میں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ نادر اور مشکل ہو چکا ہے۔

عبادت یہ ہے جو آدمی اوّل وقت میں اس نماز کی محافظت کرتا ہے وہ سحری کے وقت اٹھتا ہے وضو کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوتی ہے۔ پھر بستروں سے دوری رات کے اوّل اور آخر میں ثابت ہو جاتی ہے۔ اس سے اضافہ وہ روایت کرتی ہے جو امام مسلم نے حضرت عثمان بن عفان سے نقل کی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے فرمایا: ''جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا اس نے نصف رات قیام کر لیا''۔ ترمذی اور ابوداؤد کی اس حدیث میں الفاظ یہ ہیں۔ ''جو آدمی جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز میں حاضر ہوا تو اس کو نصف رات کا قیام ثابت ہو گیا اور جس نے عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو اس کے لیے پوری رات کا قیام ثابت ہو گیا''(6)۔ سورۃ النور میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں روایت مروی ہے جس نے عشاء کی نماز کے بعد چار رکعات پڑھیں تو وہ چار رکعات اس کے لیے لیلۃ القدر کے قائم مقام ہوں گی۔

مغرب اور عشاء کے درمیان نماز کی فضیلت اور رات کے قیام کے بارے میں بہت اچھے آثار آئے ہیں۔ ابن مبارک

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، ما جاء فی حرمۃ الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 86 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 363

3۔ جامع ترمذی، تفسیر سورۂ لقمان، باب سورۂ سجدہ، جلد 2، صفحہ 151۔ ایضاً، حدیث نمبر 3120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داود، کتاب الصلوٰۃ، وقت قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 187

5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، ما جاء فی القعود، جلد 1، صفحہ 44 6۔ ایضاً، ما جاء فی فضل العشاء والفجر، جلد 1، صفحہ 30

نے ذکر کیا۔ کہا: یحییٰ بن ایوب، محمد بن حجاج سے یا ابن ابی الحجاج سے وہ عبد الکریم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے مغرب اور عشاء کے درمیان میں رکعات پڑھیں اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا''۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ پھر تو ہمارے محلات اور گھر زیادہ ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ اکبر و افضل۔ یا فرمایا: اطیب۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: ''اوابین کی نماز وہ خلوت ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہوتی ہے یہاں تک کہ لوگ نماز کی طرف لوٹتے ہیں''۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے اور کہتے: صلوٰۃ الغفلۃ یہ مغرب اور عشاء کے درمیان ہوتی ہے؛ ابن مبارک نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسے مرفوع نقل کیا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پہلو مغرب اور عشاء کے درمیان بستر سے دور رہے اس کے لیے جنت میں ایسے محل بنائیں جائیں گے جو ایک سال کی مسافت تک پھیلے ہوں گے۔ ان دونوں میں ایسے درخت ہوں گے اگر اہل مشرق اور اہل مغرب اس کے نیچے اتریں تو پھل ان کو کافی ہو جائے گا''۔ یہ اوابین کی نماز اور غافلین کی غفلت ہے۔ بے شک دعا مستجاب میں سے جسے رد نہیں کیا جاتا وہ دعا ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہوتی ہے۔

## فصل تجافی کی فضلیت میں

حضرت عبد اللہ بن مبارک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: جب قیامت کا دن ہو گا ایک منادی کرنے والا ندا کرے گا آج عنقریب تم جان لو گے کہ اصحاب کرم کون لوگ ہیں؟ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں، وہ اٹھیں گے تو انہیں جنت کی طرف لطف اٹھانے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔ پھر دوبارہ وہ ندا کرے گا آج تم جان لو گے، اصحاب کرم کون ہیں؟ وہ اٹھ کھڑے ہوں جن کے پہلو بستروں سے الگ رہے، جو خوف وطمع میں اپنے رب کی عبادت کیا کرتے تھے اور ہم نے انہیں جو رزق دیا اس میں سے خرچ کرتے۔ وہ اٹھیں گے اور انہیں جنت کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ پھر وہ تیسری دفعہ ندا کرے گا آج تم جان لو گے اصحاب کرم کون ہے؟ وہ اٹھ کھڑے ہوں گے جنہیں تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے، نماز کے قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتے تھے، وہ اس دن سے ڈرتے تھے جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ اٹھیں گے اور جنت کی طرف انہیں بھیج دیا جائے گا۔

ثعلبی نے اس حدیث کو حضرت اسماء بنت یزید سے مرفوع نقل کیا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کر دے گا تو ایک ندا کرنے والا آئے گا وہ بلند آواز سے اعلان کرے گا جسے تمام مخلوق سنے گی: آج اہل محشر جان لیں گے کون کرم کا زیادہ مستحق ہے؟ وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں جن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے تھے۔ وہ اٹھیں گے وہ تعداد میں تھوڑے ہوں گے، وہ دوبارہ ندا کرے گا: آج تم جان لو گے کون کرم کا زیادہ مستحق ہے؟ وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جنہیں تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے تھے وہ اٹھیں گے پھر وہ تیسری دفعہ اعلان کرے گا: آج تم جان لو گے کون کرم کا زیادہ مستحق ہے؟ ہر حال خوشحالی اور تنگ دستی میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے والے اٹھ

کھڑے ہوں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوں گے وہ تعداد میں تھوڑے ہوں گے ان سب کو جنت کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ پھر باقی لوگوں کا حساب ہوگا۔

ابن مبارک نے ذکر کیا ہے معمر نے ایک آدمی سے وہ ابو العلاء بن شخیر سے وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں: تین قسم کے لوگ ایسے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ کر ہنسے گا اور ان کو دیکھ کر خوش ہوگا: (۱) وہ آدمی جو رات کو اٹھا اپنے بستر اور گرمائش کو ترک کیا، پھر اس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا پھر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: ''میرے بندے نے جو کچھ کیا ہے اس پر کس چیز نے اسے برانگیختہ کیا؟'' وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو ہماری بنسبت اسے بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: ''میں بہتر جانتا ہوں لیکن تم مجھے خبر دو''۔ وہ عرض کریں گے: تو نے اسے کسی چیز کی امید دلائی تو اس نے اس کی امید کی اور تو نے اسے ڈرایا تو وہ اس سے ڈرا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: ''میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ جس چیز سے یہ ڈرا میں نے اس سے اسے امن دیا اور جو اس نے امید رکھی میں نے اسے اس کے لیے ثابت کر دیا''۔ کہا: ایک آدمی ایک چھوٹے لشکر میں تھا وہ دشمن سے ملا، اس کے ساتھی شکست کھا گئے اور وہ ثابت قدم رہا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا گیا یا اللہ تعالیٰ نے ان پر اسے فتح دے دی تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے اسی واقعہ کی طرح ارشاد فرمائے گا۔ ایک آدمی رات بھر چلتا رہا یہاں تک کہ جب رات کا آخری پہر تھا وہ بھی اترا اور اس کے ساتھی بھی اترے اس کے ساتھی سو گئے اور وہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مثل فرشتوں سے فرمائے گا۔ قصہ کا ذکر کیا۔

یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یہ بھی جائز ہے کہ صفت مستانفہ ہو، یعنی تتجافی جنوبهم وهم أيضا في كل حال يدعون ربهم ليلهم و نهارهم یعنی ان کے پہلو جدا رہتے ہیں اور وہ ہر حال میں رات اور دن اپنے رب سے دعا کرتے رہتے ہیں۔ خوفا یہ مفعول لاجلہ ہے یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق ہو وَّ طَمَعًا یہ بھی مفعول لاجلہ ہے۔ یعنی عذاب سے ڈرنے کے لیے اور ثواب کی طمع میں۔ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، ما، الذی کے معنی میں ہوگا۔ مصدری معنی میں ہو گا۔ دونوں صورتوں میں یہ مِن سے الگ ہوگا۔ یُنْفِقُوْنَ اس کا معنی فرض زکوٰۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نفل صدقہ ہے۔ یہ قول زیادہ مناسب ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

''پس نہیں جانتا کوئی شخص جو (نعمتیں) چھپا کر رکھی گئی ہیں ان کے لیے جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی یہ صلہ ہے ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

حمزہ نے مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اس یاء کو فتحہ دیا ہے۔ عبداللہ کی قراءت میں ما نخفی نون مضموم کے ساتھ ہے۔ مفضل نے اعمش سے مایخفی لھم یاء مضمومہ اور فاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے من قرات اعین پڑھا ہے جس نے ما اخفی کی یاء کو سکون دیا ہے تو یہ فعل مضارع کا صیغہ ہوگا اس کا الف، متکلم کا الف ہوگا۔ ما، اخفی سے محل نصب میں ہوگا اور یہ استفہامیہ ہوگا اور جملہ محل نصب میں ہوگا

کیونکہ یہ مفعولوں کے قائم مقام ہوگا اور ضمیر عائد محذوف ہوگی۔ جس نے یاء کو فتحہ دیا تو یہ ماضی مجہول کا صیغہ ہوگا۔ ما یہ محل رفع میں مبتدا ہے اور اس کی خبر اخفی اور اس کا مابعد ہے اور اخفی میں ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

زجاج نے کہا: اسے ما أخفى لهم کو ما اخفى الله لهم کے معنی میں پڑھا گیا ہے؛ یہ محمد بن کعب کی قراءت ہے اور ما محل نصب میں ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے قرات اعین قراءت کی ہے یہ قُرّۃ کی جمع ہے اس میں جمع کا صیغہ اچھا ہے کیونکہ یہ جمع کی طرف مضاف ہے اور مفرد اس لیے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ مصدر ہے اور یہ اسم جنس ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: یہ مصحف کے خلاف ہے کیونکہ قرۃ کی تاء اس کی لغت کے مطابق تاء سے لکھی جاتی ہے جو وقف پر بھی وصل کا قاعدہ جاری کرتا ہے، جس طرح انہوں نے رحمت اللہ کو تاء کے ساتھ لکھا ہے۔ قراءت سے خط میں الف کا ساقط ہونا جب کہ وہ بولنے میں موجود ہو کوئی عجیب نہیں، جس طرح السموات سے الف کا ساقط ہونا کوئی عجیب بات نہیں یہ زبان اور نطق میں ثابت ہے۔ معنی مراد ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان نعمتوں کے بارے میں بتایا جنہیں کوئی نفس، کوئی بشر اور کوئی فرشتہ نہیں جانتا۔ اسی آیت کے معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: میں نے صالح بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور کسی بشر کے دل پر اس کا کھٹکا نہیں ہوا، پھر اسی آیت کو بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تک پڑھا۔ صحیح میں حضرت سہیل بن سعد ساعدی سے یہ حدیث مروی ہے(1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تورات میں لکھا ہوا ہے: وہ لوگ جن کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ایسی نعمتیں ہیں جنہیں کسی انسان نے نہیں دیکھا، کسی کان نے انہیں نہیں سنا اور کسی انسان کے دل پر ان کا گزر نہیں ہوا(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کی تفسیر جاننے سے معاملہ بڑا اور عظیم ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ کرامت ان لوگوں کے لیے ہے جو جنت میں سب سے بلند درجہ رکھتے ہیں جس طرح صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے واضح طور پر روایت آئی ہے حضرت مغیرہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے مرفوع نقل کرتے ہیں۔ فرمایا: ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا عرض کی: اے میرے رب! جنت میں سب سے کم مرتبہ کا کون ہوگا؟۔ فرمایا: وہ شخص ہوگا جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ آئے گا تو اسے کہا جائے گا: جنت میں داخل ہو جاؤ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! کیسے جب کہ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اتر چکے ہیں اور اپنے اپنے حصے لے چکے ہیں؟ تو اسے کہا جائے گا: کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تیرے لیے دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کے ملک کے برابر ملک ہو۔ وہ عرض کرے گا: میرے رب! میں راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیرے لیے وہ اس کے ساتھ اس کی مثل، اس کی مثل، اس کی مثل اور اس کی مثل۔ پانچویں دفعہ اس نے عرض کیا: اے میرے رب! میں راضی ہوں۔ اسے کہا جائے گا: تیرے لیے یہ اور اس کے دس گنا اور تیرے لیے وہ کچھ ہے جو تیرا نفس چاہے، تیری آنکھیں لذت حاصل کریں۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں راضی ہوں۔ عرض کی: اے میرے رب! ان میں سے سب سے بلند مرتبہ والا کون ہوگا؟ فرمایا: وہ لوگ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 704

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 363

ہوں گے جن کو میں نے چن لیا اور ان کی کرامت کو اپنے ہاتھ سے لگایا یعنی میں نے خود اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر مہر لگائی۔ کسی آنکھ نے اس کو نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور کسی انسان کے دل پر وہ نہیں کھٹکا۔ فرمایا: کتاب اللہ میں اس کا مصداق یہ فرمان ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (السجدہ)(1) حضرت مغیرہ بن شعبہ سے ان کا قول موقوفا مروی ہے۔

امام مسلم نے بھی اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی چیز تیار کر رکھی ہے جسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی کے دل پر اس کا کھٹکا نہیں ہوا (2)۔ وہ ذخیرہ شدہ ہے اللہ تعالیٰ نے جس پر آگاہ کیا اس کو چھوڑ دو۔ پھر پڑھا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدہ: 17)

ابن سیرین نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کچھ لوگوں نے اپنے اعمال کو مخفی رکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسی چیز کو مخفی رکھا جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور کسی کان نے نہیں سنا (3)۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ ۝

''تو کیا جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ (نہیں) یہ یکساں نہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ یعنی مومن فاسق کی طرح نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے ہم نے ان مومنوں کو ثواب عظیم عطا فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء بن یسار نے کہا: یہ آیت حضرت علی شیر خدا اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ دونوں میں گفتگو ہوئی۔ ولید نے آپ سے کہا: میں تم سے اچھی گفتگو کرنے والا، تلوار چلانے میں ماہر اور جسمانی قوت کے اعتبار سے پورے لشکر کا منہ موڑنے والا ہوں۔ أرد الکتیبة کی جگہ أملاٴ الکتیبة کے الفاظ ہیں، پورے لشکر میں امید کی کرن ہوں (☆)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اسے منع فرمایا: خاموش ہو جا تو تو فاسق ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی (4)۔

زجاج اور نحاس نے ذکر کیا: یہ آیت حضرت علی شیر خدا اور عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن عطیہ نے کہا: اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آیت مکی ہو کیونکہ عقبہ مدینہ میں تو نہیں تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے واپس آرہے تھے تو وہ مکہ کی طرف جاتے ہوئے مر گیا تھا۔ ولید پر فسق کے نام کے اطلاق سے دوسرا قول آڑے آرہا ہے اس کی وجہ یہ احتمال

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، اثبات الشفاعة و اخراج الموحدین، جلد 1، صفحہ 106

2۔ صحیح مسلم، صفة الجنة، الجنة صفة نعیمها و اهلها، جلد 2، صفحہ 378

3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 284

4۔ اسباب النزول، صفحہ 266

☆ قرطبی کے ایک نسخہ میں املاٴ الکتیبة جسدا ہے تو پھر معنی ہوگا میں پورے لشکر میں سب سے بھرے جسم والا ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ولید میں کوئی ایسا عمل تھا جس وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا یا جو روایت کی گئی ہے کہ اس نے بنی مصطلق کے بارے میں ایسی بات کہی جو ان میں نہ تھی، یہاں تک کہ ان کے بارے میں آیت نازل ہوئی: اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (الحجرات:6) جس کی وضاحت سورۃ الحجرات میں آئے گی۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ شریعت نے اس پر اسی نام کا اطلاق کیا ہو کیونکہ وہ بغاوت کے کنارے پر تھا یہی وہ شخص ہے جس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شراب پی تھی۔ اس نے صبح کی نماز لوگوں کو پڑھائی اور کہا: کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ میں تمہیں کچھ زائد پڑھاؤں۔ اس کے بارے میں گفتگو طویل ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور ان فاسقوں کے درمیان تقسیم کر دی وہ فاسق جنہیں کفر کی وجہ سے فاسق قرار دیا (کیونکہ آیت کا اختتام اس کا تقاضا کرتا ہے) تو اس نے اس امر کا تقاضا کیا کہ مومن اور کافر میں مساوات کی نفی کی جائے اس وجہ سے دونوں میں قصاص کا حکم جاری کرنے سے منع کیا کیونکہ قصاص واجب کرنے کے لیے قاتل اور مقتول کے درمیان برابری ضروری ہے۔

اسی وجہ سے ہمارے علماء نے امام اعظم ابو حنیفہ کے خلاف استدلال کیا ہے کہ کسی مسلمان کو ذمی کے مقابلہ میں قتل کیا جائے۔ امام اعظم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ثواب میں مساوات کی نفی کا ارادہ کیا ہے اور دنیا میں عدالت کے اعتبار سے نفی کا ارادہ کیا ہے۔ ہم نے اسے اس کے عموم پر محمول کیا ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ کوئی دلیل ایسی نہیں جو تحقیق پر دال ہو؛ یہ ابن عربی کا قول ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ لا یستوون زجاج اور دوسرے علماء نے کہا: من واحد اور جمع کے لیے مناسب ہے۔ نحاس نے کہا: من کا لفظ جماعت کا معنی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: لا یستوون؛ یہ کثیر نحویوں کا قول ہے۔ بعض نے کہا: لا یستوون دو افراد کے لیے ہے کیونکہ دو بھی جمع ہے کیونکہ یہ ایسا واحد ہے جو دوسرے کے ساتھ مل کر جمع ہو گیا؛ یہ بھی زجاج کا قول ہے۔ حدیث اس قول پر دلالت کرتی ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے لوگوں سے مروی ہے فرمایا اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا یہ حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ کے حق میں نازل ہوئی۔ كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا یہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے حق میں نازل ہوئی۔ شاعر نے کہا:

الیس الموت بینهما سواء إذا ماتوا وصاروا فی القبور

کیا موت ان دونوں میں برابر نہیں جب وہ مر گئے اور قبروں میں چلے گئے۔

محل استدلال هما ضمیر اور فعل ماتوا اور صاروا جمع کے صیغے ہیں۔

اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑲ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1503

أُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

''پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانا ہیں بطور ضیافت ان (نیکیوں) کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے اور جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ابدی ٹھکانا آگ ہے جتنی مرتبہ وہ ارادہ کریں گے کہ (کسی طرح) یہاں سے نکل جائیں تو (ہر بار) انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں اور انہیں کہا جائے گا: چکھو آگ کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے''۔

آخرت میں دونوں فریقوں کا جو ٹھکانا ہوگا اس کے بارے میں خبر دی مومنین کے لیے جنات الماوی ہے وہ جنتوں کو ٹھکانہ بنائیں گے۔ جنات کو ماوی کی طرف مضاف کیا کیونکہ جگہ جگہ جنات کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ نُزُلًا کا معنی ضیافت ہے۔ نزل اسے کہتے ہیں جو آنے والے اور مہمان کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں یہ بحث گزر چکی ہے یہ جنات سے حال کے طور پر منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لھم الجنات معدۃ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول لہ ہو۔ جو ایمان سے کفر کی طرف نکلے ان کا مقام جہنم میں ہوگا۔ جب آگ کا شعلہ انہیں بلندی کی طرف لے جائے گا تو انہیں پھر جہنم میں ان کی جگہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا کیونکہ وہ اس سے نکلنے کی طمع رکھتے تھے۔ سورۂ حج میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے یا اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا: اس آگ کے عذاب کو چکھو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ذوق کا لفظ محسوس چیز اور معنوی چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''اور ہم ضرور چکھاتے رہیں گے انہیں تھوڑا تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ وہ (فسق و فجور سے) باز آجائیں''۔

وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى حضرت حسن بصری، ابو العالیہ، ضحاک، ابی بن کعب اور ابراہیم نخعی نے کہا: الْعَذَابِ الْاَدْنٰى سے مراد دنیا کے مصائب اور اس کی بیماریاں ہیں جس کے ساتھ بندوں کو آزمایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کریں گے(1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ مراد حدود ہیں؛ حضرت ابن مسعود، حضرت حسن بن علی اور حضرت عبداللہ بن حارث سے مروی ہے۔ اس سے مراد غزوۂ بدر کے روز قتل کرنا ہے۔ مقاتل نے کہا: مراد مکہ مکرمہ میں سات سال تک خشک سالی ہے یہاں تک کہ انہوں نے مردار کھائے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: الْعَذَابِ الْاَدْنٰى سے مراد عذاب قبر ہے؛ یہ حضرت براء بن عازب کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: اکبر سے مراد یوم قیامت کا عذاب ہے۔ قشیری نے کہا: مراد عذاب قبر ہے۔ اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ کہا: جس نے عذاب کا اطلاق قتل پر کیا ہے تو اس نے لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ کا معنی کیا ہے ان میں سے جو باقی بچے وہ شاید لوٹ آئیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عذاب اکبر سے مراد عذاب جہنم ہے، مگر جو امام جعفر بن محمد سے مروی

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 285

ہے کہ اس سے مراد حضرت امام مہدی کا تلوار کے فیصلہ کے ساتھ نکلنا ہے۔ الادنی سے مراد بھاؤ کا زیادہ ہو جانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ کا معنی مجاہد اور براء کے قول کے مطابق ہے۔

شاید وہ رجوع کا ارادہ کریں اور اسے طلب کریں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (السجدہ:12) رجوع کے ارادہ کو رجوع کا نام دیا جس طرح قیام کے ارادہ کو قیام کا نام دیا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ:6) اس پر اس کی قراءت بھی دلالت کرتی ہے جس نے اسے یُرجعون مجہول کا صیغہ پڑھا؛ زمخشری نے اسے ذکر کیا۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پھر اس نے روگردانی کی ان سے بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے''۔

یعنی اس آدمی سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جس کو اس کے رب کی آیات یعنی دلائل اور علامات کے ساتھ نصیحت کی گئی پھر اس نے قبول کو ترک کر کے ان سے اعراض کیا تو ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں کیونکہ انہوں نے جھٹلایا اور اعراض کیا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی تھی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب تو آپ شک میں مبتلا نہ ہوں اس کتاب کے ملنے سے اور ہم نے بنایا تھا اسے ہدایت بنی اسرائیل کے لیے اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے جب تک وہ صابر رہے اور جب تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ بے شک آپ کا پروردگار ہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن امور میں وہ (باہمی) اختلاف کیا کرتے تھے''۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات میں شک میں مبتلا نہ ہو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے۔ قتادہ نے کہا: آپ اس بارے میں شک میں مبتلا نہ ہوں کہ آپ معراج کی رات ان سے ملے ہیں۔ معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے روز حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات میں شک میں مبتلا نہ ہوں۔ آپ ضرور اس روز ان سے ملیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ اس میں شک میں مبتلا نہ ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتاب کو قبول کیا؛ یہ مجاہد اور زجاج کا قول ہے(1)۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 366

حضرت حسن بصری سے مروی ہے، انہوں نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا: انہیں اذیت دی گئی اور انہیں جھٹلایا گیا آپ کو اس میں شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ جیسی تکذیب ان کی کی گئی اور جو اذیتیں انہیں دی گئیں وہ آپ کو بھی ملیں گی۔ ہاء ضمیر محذوف کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لقاء کا معنی ملاقی ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غریب قول ہے، مگر یہ عمرو بن عبید سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے کہہ دیجئے: وہ ملک الموت تمہاری روحوں کو قبض کرے گا جسے تمہاری موتوں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اس کی ملاقات میں شک نہ کیجئے یہ کلام وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اور وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ وَ جَعَلْنٰهُ کی ضمیر میں دو وجوہ ہیں: (۱) ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے (۲) ضمیر الکتاب کے لیے ہے۔ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(1)۔ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً قائد اور مقتدیٰ بنا دیا جن کی دین میں اقتدا کی جاتی ہے۔ کوفی ائمة پڑھا کرتے تھے۔ نحاس نے کہا: تمام نحویوں کے نزدیک یہ مناسب نہیں کیونکہ ایک کلمہ میں دو ہمزے جمع ہیں اور یہ نحو کا دقیق مسئلہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے: اصل میں یہ اأممة تھا پھر میم کی حرکت ہمزہ کو دی گئی اور میم میں ادغام کیا گیا اور دوسرے ہمزہ میں تخفیف کی گئی تاکہ دو ہمزے جمع نہ ہوں دو ہمزوں کو دو حرفوں میں جمع کرنا بعید ہے، جہاں تک ایک حرف کا تعلق ہے تو دوسرے ہمزہ میں تخفیف کے بغیر کوئی صورت جائز نہیں، جس طرح تیرا قول ہے: آدم و آخر۔ یوں کہا جاتا ہے: هذا أوم من هذا و أيم اسے واؤ اور یاء کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ سورۂ براءۃ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

بِاَمْرِنَا وہ مخلوق کو ہماری طاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ بِاَمْرِنَا یعنی ہم نے انہیں اس کا حکم دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بِاَمْرِنَا یہ لامرنا کے معنی میں ہے یعنی وہ لوگوں کو ہمارے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر کہا گیا: مراد انبیاء علیہم السلام ہیں، یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فقہاء اور علماء ہیں۔ لَمَّا صَبَرُوْا عام لوگوں کی قراءت لمّا ہے۔ یعنی لام مفتوح، میم مشدد اور اس پر زبر ہے، یعنی جب انہوں نے صبر کیا۔ یحییٰ، حمزہ، کسائی، خلف اور اویس نے یعقوب سے لما صبروا قراءت نقل کی ہے، یعنی ان کے صبر کے باعث ہم نے انہیں ائمہ بنا دیا۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت بما صبروا کی وجہ سے ابو عبید نے لما صبروا کی قراءت کو پسند کیا ہے۔ یہ صبر ایسا صبر ہے جو دین اور آزمائش پر صبر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے دنیا سے صبر کیا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی وہ کافروں اور مومنوں کے درمیان فیصلہ فرماتا ہے اور ہر ایک کو ایسا بدلہ دیتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ انبیاء اور ان کی قوموں کے درمیان فیصلہ فرماتا ہے؛ یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔

**اَوَ لَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾**

”کیا یہ چیز ان کی ہدایت کا باعث نہ بنی کتنی تو میں تھیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا حالانکہ یہ چل پھر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 366

رہے ہیں ان کے مکانوں میں، بے شک ان میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں کیا وہ (ان در و دیوار سے داستان عبرت) نہیں لے رہے''۔

اَوَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ ابو عبدالرحمن سلمی، قتادہ اور ابو زید نے یعقوب سے نهد لهم نون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ واضح قراءت ہے یاء کے ساتھ قراءت میں اشکال ہے کیونکہ یہ کہا جاتا ہے: فعل، فاعل سے خالی نہیں ہوتا تو یهد کا فاعل کیا ہے؟ نحویوں نے اس بارے میں گفتگو کی ہے۔ فراء نے کہا: کم، یهد کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یہ نحویوں کے اپنے اصول کے خلاف ہے کلمہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا اور نہ ہی کم میں اس کا ماقبل عمل کرتا ہے۔ ابو العباس کا مذہب ہے کہ یهد الهدی پر دلالت کرتا ہے کلام کی صورت یہ بنے گی: أولم یهد لهم الهدی ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت نہیں دی تو پھر یاء اور نون دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہوگا، یعنی کیا ہم نے ان کے لیے واضح نہیں کر دیا کہ ہم نے ان سے پہلے سابقہ قوموں کو ہلاک کیا۔

زجاج نے کہا: کم، أهلكنا کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ فعل میں ضمیر مرفوع احتمال رکھتی ہے کہ وہ ان چلنے والوں کے لیے ہو جو ہلاک ہونے والوں کے مسکنوں میں گھومتے پھرتے ہیں، یعنی یہ چلتے ہیں اور عبرت حاصل نہیں کرتے۔ یہ احتمال موجود ہے کہ ہلاک ہونے والوں کے لیے ہو تو فعل حال ہوگا معنی ہوگا: ہم نے انہیں ہلاک کیا جب کہ وہ اپنے مسکنوں میں چلتے پھرتے تھے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور نصیحتوں کو نہیں سنتے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کرتے؟

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

''کیا انہوں نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بنجر زمین کی طرف پھر ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے سے کھیتی، کھاتے ہیں اس سے ان کے چوپائے اور وہ خود بھی، کیا وہ (یہ بھی) نہیں دیکھتے''۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ کیا وہ ہماری کمال قدرت کو نہیں جانتے کہ ہم پانی کو خشک زمین کی طرف لے گئے جس میں کوئی نباتات نہیں ہوتی تاکہ ہم اسے زندہ کریں۔ زمخشری نے کہا: جرز ایسی زمین کو کہتے ہیں جس کی نباتات کاٹ دی گئی ہو(1)۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پانی ہی نہ ہو یا اسے چرا گیا اور اسے زائل کر دیا گیا۔ وہ زمین جو کھیتی نہ اگائے جس طرح شور یدہ زمین ہوتی ہے اسے جرز نہیں کہتے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یمن کا علاقہ ہے۔

مجاہد نے کہا: یہ واضح ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد پیاسی زمین ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد مردہ اور پیاسی زمین ہے۔

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 516

فراء نے کہا: ا ۔ سے مراد وہ زمین ہے جس میں نباتات نہ ہو۔ اصمعی نے کہا: ایسی زمین کو کہتے ہیں جو کوئی چیز نہیں اگاتی۔ محمد بن یزید نے کہا: یہ بعید ہے کہ اس سے مراد معین سرزمین ہو کیونکہ اس پر الف، لام داخل ہے مگر یہ جائز ہے اس کے قول کے مطابق جو یہ کہتا ہے: العباس، الضحاک۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ اسناد صحیح ہے اس میں کوئی طعن نہیں۔ یہ نعت ہے۔ اسم معرفہ کی نعت الف، لام کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: رجل جروز اس آدمی کے لیے کہتے ہیں جو ہر چیز کھا جاتا ہے کوئی باقی نہیں چھوڑتا۔ راجز نے کہا:

خَبٌّ جروز وإذا جاع بکی　　ویأکل التمر ولا یُلقی النَّوی(1)

یہ کینہ ہے ہر چیز ہڑپ کر جاتا ہے جب بھوکا ہوتا ہے تو روتا ہے اور کھجور کھاتا ہے اور گٹھلی کو نہیں پھینکتا۔

اس طرح ناقة جروز ہوتی ہے جب وہ اونٹنی ہر اس چیز کو کھا جاتی ہے جسے وہ پاتی ہے۔ سیف جراز کاٹ دار تلوار۔ جرزت الجراد الزرع ٹڈی کھیت کو چٹ کر گئی۔ فراء اور دوسرے علماء نے کہا: یہ کہا جاتا ہے: ارض جُرُز، جُرْز، جَرَز، جَرْز اسی طرح الفاظ بخل، رعب، رہب ہے؛ ان چاروں الفاظ میں چار لغتیں ہیں۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے: یہ ایسے علاقے ہیں جن میں دریا نہیں، یہ سمندر ۔ ۔ رہیں، ہر سال ان میں موٹے قطرات والی بارش آتی ہے تو وہ سال میں تین دفعہ کاشت کرتے ہیں۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے۔ یہ نیل کا علاقہ ہے۔ فَنُخْرِجُ بِهٖ ہا ضمیر سے مراد پانی ہے۔ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ یعنی گھاس وغیرہ۔ وَ اَنْفُسُهُمْ یعنی دانے، سبزیاں اور پھل۔ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے تو وہ جانتے کہ ہم ان کو لوٹانے پر قادر ہیں۔ فنخرج یہ نسوق پر معطوف ہے یا اس کا ماقبل کلام سے تعلق نہیں۔ تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ نعت ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۸ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِيْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۲۹

''اور بار بار پوچھتے ہیں: یہ فیصلہ کب ہوگا؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ آپ فرمایئے: فیصلے کے دن نہ فائدہ پہنچائے گا کافروں کو ان کا ایمان لانا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، متی محل رفع میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہو۔ قتادہ نے کہا: فتح کا معنی فیصلہ کرنا ہے۔ فراء اور قتبی نے کہا: مراد فتح مکہ ہے۔ ان سب سے اولیٰ وہ ہے جو مجاہد نے کہا ہے، یعنی یوم قیامت۔ یہ روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ مومنوں نے کہا: عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا، اللہ تعالیٰ محسن کو بدلہ عطا فرمائے گا اور گناہگار کو سزا دے گا۔ کفار نے بطور مذاق کہا: یوم فتح کب ہوگا؟ یعنی یہ حکم کب ہوگا؟

حکم کو فاتح اور مفتاح بھی کہتے ہیں کیونکہ اشیاء اس کے ہاتھ پر کھل جاتی ہیں اور جدا ہو جاتی ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (الاعراف: 89) یہ بحث سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔ قُلْ يَوْمَ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 367

الْفَتْحِ یوم ظرف کی بنا پر منصوب ہے اور فراء نے رفع بھی جائز قرار دیا ہے۔ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِیْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ انہیں توبہ کے لیے مہلت نہیں دی جائے گی اگر یوم فتح سے مراد یوم بدر یا فتح مکہ ہو۔ غزوہ بدر میں وہ قتل کیے گئے اور فتح مکہ کے روز وہ بھاگ گئے حضرت خالد بن ولید پیچھے سے انہیں آکر ملے اور انہیں قتل کیا۔

## فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ انْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ۠ ۳۰

''پس (اے حبیب!) رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے اور انتظار فرمایئے وہ بھی منتظر ہیں''۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے ان کی بے وقوفی سے اعراض کیجئے اور انہیں جواب نہ دیجئے مگر جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا۔ وَ انْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ یوم فتح کا انتظار کیجئے جس روز اللہ تعالیٰ ان کے خلاف تمہارے حق میں فیصلہ فرمائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش مکہ میں سے مشرکوں سے اعراض کیجئے۔ آیت سیف کے ساتھ یہ منسوخ ہے جو سورت براءت میں ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5)

وَ انْتَظِرْ میرا جو تجھ سے وعدہ ہے اس کا انتظار کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد یوم بدر ہے۔ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ وہ تمہارے بارے میں حادثات زمانہ کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ منسوخ نہیں کیونکہ قتال کے حکم کے ہوتے ہوئے اعراض ہو سکتا ہے جس طرح صلح وغیرہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ ان سے اعراض کر لیجئے بعد اس کے کہ آپ نے حجت پہنچا دی آپ بھی انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے: وہ قیامت کا کیسے انتظار کرتے ہیں جب کہ وہ ایمان بھی نہیں رکھتے؟ اس کے دو جواب ہیں: (۱) وہ موت کا انتظار کرتے ہیں جب کہ وہ قیامت کے اسباب میں سے ہے تو یہ مجاز ہوگا (۲) ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو شک میں مبتلا تھے اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جو قیامت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ تو یہ ان دونوں قسموں کو جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابن سمیقع نے پڑھا انهم منتظرون ظاء مفتوح ہے؛ یہ مجاہد اور ابن محیصن سے مروی ہے۔ فراء نے یہ کہا: یہ اضمار کی صورت میں ہی صحیح ہو سکتا ہے، معنی ہوگا: ان کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: صحیح کسرہ ہے یعنی آپ ان کے عذاب کا انتظار کریں وہ تیری ہلاکت کا انتظار کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ابن سمیقع کی قراءت ظاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے: ان کی ہلاکت کا انتظار کیجئے بے شک وہ اس امر کے حق دار ہیں کہ ان کی ہلاکت کا انتظار کیا جائے (1)، یعنی وہ ہر حال میں ہلاک ہونے والے ہیں۔ آپ اس کا انتظار کیجئے کیونکہ آسمان میں فرشتے اس کا انتظار کر رہے ہیں؛ زمخشری نے اس کا ذکر کیا ہے؛ یہ فراء کے قول کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 517

# سورۃ الاحزاب

(ایاتھا ۷۳) (۳۳ سورۃ الاحزاب مدنیۃ ۹۰) (رکوعاتھا ۹)

تمام کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی ہے۔ یہ سورت منافقوں، جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دیتے، آپ پر طعن کرتے اور آپ کے نکاح کرنے وغیرہ کے متعلق نازل ہوئی۔ یہ تہتر آیات ہیں۔ یہ سورت، سورۂ بقرہ کے برابر تھی اس میں آیت رجم تھی الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔

حضرت ابی بن کعب سے ابو بکر انباری نے اسے ذکر کیا ہے۔ اہل علم اسے اس پر محمول کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب سے بڑھ کر اپنی طرف اٹھالیا ہے جس قدر یہ ہمارے پاس موجود ہے۔ آیت رجم کے الفاظ اٹھالیے گئے۔ احمد بن ہیثم بن خالد، ابو عبید قاسم بن سلام سے وہ ابن ابی مریم سے وہ ابن لہیعہ سے وہ ابو الاسود سے وہ عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''سورۃ احزاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو سو آیات کے برابر تھی جب مصحف کی کتابت کی گئی تو اس پر قدرت ہوئی جو اس وقت موجود ہے''۔ ابو بکر نے کہا: حضرت ام المومنین کے قول کا معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب سے اس سے زائد اٹھالیا جتنی اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ نسخ کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ سورۃ البقرہ میں بحث مفصل گزر چکی ہے۔ زر نے روایت کی ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے مجھے کہا: تم سورۃ الاحزاب کی کتنی آیات شمار کرتے ہو؟ میں نے عرض کی: تہتر آیات۔ کہا: اس ذات کی قسم جس کے ساتھ ابی قسم اٹھاتا ہے یہ سورۂ بقرہ کی مثل تھی یا اس سے طویل تھی۔ ہم نے اس میں سے آیت رجم کی قراءت کی: الشیخ والشیخوخۃ اذا زنیا فارجوھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔ حضرت ابی نے ارادہ کیا کہ یہ بھی ان میں سے ہے جسے قرآن سے منسوخ کر دیا گیا ہے، جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ وہ زیادہ حصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھا اور ایک بکری کھا گئی تھی تو یہ بے دینوں اور رافضیوں کی اختراع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾

''اے نبی (مکرم!) (حسب سابق) ڈرتے رہیے اللہ تعالیٰ سے اور نہ کہنا مانیے کفار اور منافقین کا بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑا دانا ہے''۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ ای کے کلمہ کو ملایا گیا کیونکہ منادی مفرد ہے اور تنبیہ اسی کو لازم ہے لفظ النَّبِيُّ نحویوں کے نزدیک

اس کی صفت ہے مگر اخفش کے نزدیک صفت نہیں، کیونکہ وہ کہتا ہے: یہ ای کا صلہ ہے۔ مکی نے کہا: کلام عرب میں یہ معروف نہیں کہ اسم مفرد کسی شے کا صلہ ہو۔ نحاس نے کہا: اکثر نحویوں کے نزدیک یہ غلط ہے کیونکہ صلہ جملہ ہوا کرتا ہے۔ اس نے جو کہا اس کی صحت کے لیے یہ حیلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نعت لازم ہے اسے صلہ کا نام دیا گیا۔ کوئی نکرہ کی نعت کو صلہ کا نام دیتے ہیں۔ اکثر نحویوں کے نزدیک محل کا اعتبار کرتے ہوئے نصب دینا جائز نہیں۔ مازنی نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اس نے اسے تیرے اس قول کی طرح بنایا ہے: یازید الظریف زید کے محل کا اعتبار کرتے ہوئے الظریف کو نصب دی۔ مکی نے کہا: یہ ایسی نعت ہے جس سے موصوف غنی ہوتا ہے اور ای کی نعت سے موصوف غنی نہیں ہوتا اس وجہ سے محل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے نصب دینا جائز نہیں ہوتا۔ نیز یہ بھی ہے کہ ای کی نعت معنی میں منادی ہوا کرتی ہے اس وجہ سے اسے نصب دینا جائز نہیں۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی آپ پسند کرتے تھے کہ یہودی اسلام قبول کر لیں۔ وہ بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے نفاق کی صورت میں آپ کی اتباع کی۔ آپ ان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ان کے چھوٹے بڑے کی تعظیم کرتے جب ان میں سے کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو آپ ان سے درگزر فرماتے، آپ ان کی باتیں سنتے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت ابوسفیان بن حرب، عکرمہ بن ابی جہل، ابوالاعور بن سفیان کے حق میں نازل ہوئی جس کا ذکر واحدی، قشیری، ثعلبی، ماوردی وغیرہ نے کیا۔ یہ غزوہ احد کے بعد رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے پاس آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں امان دی تھی کہ وہ بات چیت کر لیں۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور طعمہ بن ابیرق بھی آیا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی جب کہ آپ کے پاس حضرت عمر بن خطاب موجود تھے: ہمارے معبودوں لات، عزیٰ اور مناۃ کا ذکر چھوڑ دیں اور یہ کہ وہ جو ان کی عبادت کرے یہ ان کی شفاعت کریں گے اور ان کا دفاع کریں گے، ہم تجھے اور تیرے رب کو چھوڑتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا شاق گزرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ان کے قتل کی اجازت دیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں نے انہیں امان دی ہوئی ہے“۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب کے ساتھ نکل جاؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دیا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

**یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈریئے۔ **وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ** اہل مکہ کے کافروں کی اطاعت نہ کیجئے۔ یہاں کافروں سے مراد ابوسفیان، ابواعور اور عکرمہ ہیں۔ **وَ الْمُنٰفِقِیْنَ** اہل مدینہ کے منافق مراد عبداللہ بن ابی، طعمہ اور عبداللہ بن ابی سرح ہیں۔ ان تمام امور میں ان کی بات نہ مانیے جس سے آپ کو منع کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف مائل نہ ہوں۔ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا** اللہ تعالیٰ ان کے کفر کو جانتا ہے اور ان کے ساتھ جو بھی معاملہ کرتا ہے اس میں حکیم ہے۔ زمخشری نے کہا: یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوسفیان بن حرب، عکرمہ بن ابی جہل اور ابواعور اسلمی اس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جو باہم صلح کا دور تھا۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی، معتب بن قشیر اور جد بن قیس بھی حاضر ہوئے۔ انہوں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: ہمارے معبودوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیجیے۔ اور پھر ماقبل روایت کے ہم معنی روایت ذکر کی۔ آیت اس عہد و پیمان کو توڑنے کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ مراد مکہ مکرمہ کے کافر ہیں۔ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ مراد اہل مدینہ کے منافق ہیں۔ ان امور میں ان کی بات نہ مانیے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ وہ اپنا دین چھوڑ دیں۔ وہ اپنے اموال کا ایک حصہ آپ کو دے دیں گے۔ شیبہ بن ربیعہ اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو دے دے گا۔ مدینہ کے منافقوں نے آپ کو ڈرایا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین سے رجوع نہ کیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں گے، تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ نحاس نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا سے یہ دلیل ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف مائل تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود انہیں اسلام کی طرف دعوت دینا تھا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ آپ کے ان کی طرف میلان میں کوئی منفعت ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے منع نہ کرتا کیونکہ وہ حکیم ہے، پھر یہ کہا گیا: خطاب آپ کو اور آپ کی امت کو ہے۔

وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

"اور پیروی کرتے رہیے جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف اپنے رب کی جانب سے یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے (اور اے محبوب!) بھروسہ رکھیے اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز"۔

وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ مراد قرآن حکیم ہے اس میں جاہلیت کے مراسم کی اتباع سے جھڑکنا ہے اور ان سے جہاد کرنے اور لاتعلق ہونے کا حکم ہے اس میں ایسی دلیل موجود ہے کہ اس کی موجودگی میں رائے کی اتباع کو ترک کر دیا جائے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا عام قراءت خطاب کی تاء کے ساتھ ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ سلمی، ابو عمرو اور ابن ابی اسحاق کی قراءت یعملون ہے یعنی یہ غائب کا صیغہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ (الفتح) میں ہے۔

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اپنے تمام احوال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجیے وہی تیرا دفاع کرے گا اور جو آدمی تیرا ساتھ چھوڑ جائے وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا، وکیل کا معنی نگہبان ہے۔ اہل شام کے ایک شیخ نے کہا: بنو ثقیف کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ ایک سال تک لات سے انہیں متمتع ہونے دیں یہی وہ طاغیہ ہے جس کی بنو ثقیف عبادت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عرض کی: تاکہ قریش ہمارے اس مقام و مرتبہ کو جان لیں جو ہمارا آپ کے ہاں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارادہ کر لیا، تو یہ آیت نازل ہوئی یعنی آپ جن

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 430 2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 519

باتوں میں خوف کھاتے ہیں ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے۔ بِاللّٰهِ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ فاعل ہے وَكِيْلًا یہ بیان اور حال کے طریقہ پر منصوب ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ④

''نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کے لیے دو دل اس کے شکم میں اور نہیں بنایا اس نے تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں اور نہیں بنایا اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے فرزند یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے اور وہ ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ پر چلنے کی''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت قریش کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے ذا القلبین (دو دلوں والا) کہا جاتا۔ وہ خود بھی کہتا: میرے پیٹ میں دو دل ہیں میں ان دونوں میں سے ہر ایک سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل سے بہتر سمجھتا ہوں۔ کہا: وہ فہر قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ واحدی، قشیری وغیرہما نے کہا: یہ آیت جمیل بن معمر فہری کے بارے میں نازل ہوئی وہ جو سنتا اسے یاد کر لیتا۔ قریش نے کہا: وہ اشیاء کو یاد نہیں رکھتا مگر اس کے دو دل ہیں۔ وہ کہتا: میرے دو دل ہیں میں ان دونوں کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ بوجھ سے بہتر سمجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر مشرکوں کو شکست ہوئی ان کے ساتھ جمیل بن معمر بھی تھا ابوسفیان نے اسے اونٹوں کے قافلہ میں دیکھا جب کہ وہ ایک جوتا اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا جوتا اس کے پاؤں میں تھا۔ ابوسفیان نے پوچھا: لوگوں کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: لوگ بھاگ گئے ہیں۔ ابوسفیان نے پوچھا: کیا وجہ ہے تیرا ایک جوتا تیرے ایک ہاتھ میں اور دوسرا جوتا تیرے پاؤں میں ہے؟ اس نے کہا: میں نے یہی خیال کیا کہ یہ دونوں میرے پاؤں میں ہیں۔ لوگوں کو اس روز پتہ چلا اگر اس کے دو دل ہوتے تو وہ اپنا جوتا اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھولا نہ ہوتا(1)۔ سہیلی نے کہا: جمیل بن معمر جمحی یہ ابن معمر بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح تھا جمح کا نام تیم تھا اس کو ذوالقلبین کہا جاتا اس کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ اس کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

وكيف ثوائي بالمدينة بعدما　　قضى وطرًا منها جميلُ بن معمر

مدینہ میں میرا ٹھکانہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ جمیل بن معمر اپنا مطلب حاصل کر چکا ہے۔

میں نے کہا: جمیل بن معمر نے اس طرح کہا ہے۔ زمخشری نے کہا: جمیل بن اسد فہری۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ کسی منافق نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دل ہیں کیونکہ بعض اوقات وہ ایک امر میں ہوتے ہیں پھر

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 431

دوسرے میں شروع ہوتے ہیں پھر پہلے امر کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے کہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جھٹلایا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت عبداللہ بن خطل کے بارے میں نازل ہوئی۔ زہری اور ابن حبان نے کہا: یہ حضرت زید بن حارثہ میں تمثیل کے طور پر نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے انہیں متبنی بنایا۔ مطلب ہے جس طرح ایک آدمی کے دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح ایک بچہ دو مردوں کا نہیں ہوسکتا۔ نحاس نے کہا: یہ قول ضعیف ہے لغت میں صحیح نہیں یہ زہری کی منقطعات میں سے ہے معمر نے اسے اس سے روایت کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مثال ہے جو مظاہر کے لیے بیان کی گئی ہے یعنی جس طرح ایک آدمی کے دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح مظاہر کی بیوی اس کی ماں نہیں ہوسکتی یہاں تک کہ اس کی دو مائیں ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منافقوں میں سے ایک کہا کرتا تھا: میرا ایک دل ہے جو مجھے اس امر کا حکم دیتا ہے اور میرا دوسرا دل ہے جو مجھے اس امر کا حکم دیتا ہے۔ منافق دو دلوں والا ہوتا ہے مقصود منافق کا رد کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایمان اور کفر ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، جس طرح دو دل ایک پیٹ میں جمع نہیں ہو سکتے۔ معنی ہے دو مختلف اعتقاد ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ آیت سے مجموعی طور پر چند ایسی اشیاء کی نفی ظاہر ہوتی ہے اس وقت عرب جن چیزوں کا اعتقاد رکھتے تھے اور حقیقت کا اظہار ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قلب صنوبرہ کی شکل میں گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا ہے(2)۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا اور اسے علم کا محل بنایا۔ بندہ اس سے ایسے علوم جمع کر لیتا ہے جو کتابوں میں جمع نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس میں خط الٰہی میں لکھتا رہتا ہے اور حفظ ربانی کی صورت میں ضبط کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کو شمار کر لیتا ہے اور اس میں سے کسی چیز کو نہیں بھولتا۔ وہ دو لموں کے درمیان ہے ایک لمہ فرشتے کی جانب سے ہوتا ہے اور ایک لمہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے، جس طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، امام ترمذی نے اسے نقل کیا(3)۔ سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہ خطرات، وساوس کا محل، کفر و ایمان کا مکان، اصرار اور بار بار عمل کا محل، پریشانی اور طمانیت کا محل ہے اس میں ہر اس چیز کی نفی ہے جس کے بارے میں حقیقت و مجاز کا کوئی وہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ کسی کے بھی دو دل نہیں اس میں ان منافقین پر طعن ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی دل ایک ہی ہے یا تو اس میں ایمان ہوگا یا اس میں کفر ہوگا، کیونکہ نفاق کا درجہ گویا درمیانی درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی کی اور اس امر کو واضح کیا کہ یہ ایک دل ہے۔ اس طریقہ پر انسان اس آیت سے استدلال کرتا ہے جب وہ کسی چیز کو بھول جاتا ہے یا اسے وہم ہوتا ہے۔ وہ معذرت کے طریقہ پر کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے دل میں دو دل نہیں بنائے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓیْٔ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ مرد کا اپنی بیوی سے کہنا: انت علی کظھر امی یہ

1۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الاحزاب، حدیث نمبر 3123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1504
3۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بحث سورۂ مجادلہ میں مذکور ہے۔ جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَآءَ كُمْ علماء تفسیر نے اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت حضرت زید بن حارثہ کے حق میں نازل ہوئی۔ ائمہ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم حضرت زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (1) جس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے: حضرت زید کو شام سے گرفتار کیا گیا تہامہ کے ایک گھڑ سوار دستہ نے اسے گرفتار کیا اور اسے حکیم بن حزام بن خویلد نے خریدا اس نے یہ غلام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کو ہبہ کر دیا۔ حضرت خدیجہ نے یہ غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کر دیا اور اپنا متبنی بنا لیا۔ حضرت زید ایک عرصہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی رہے پھر ان کا چچا اور ان کا والد آئے وہ ان کا فدیہ دینا چاہتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے فرمایا۔ یہ بعثت سے قبل کا واقعہ ہے: دونوں اس کو اختیار دے دو اگر وہ تم دونوں کو اختیار کر لے تو وہ فدیہ کے بغیر تمہارا ہے" تو حضرت زید نے اپنی آزادی اور اپنی قوم پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر کہا: "اے قریش کی جماعت! گواہ رہنا یہ میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث بنے گا اور میں اس کا وارث بنوں گا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے حلقوں پر چکر لگاتے اور انہیں اس امر پر گواہ بناتے۔ اس پر اس کا چچا اور ان کا باپ راضی ہو گئے اور واپس چلے گئے۔ جب ان کو گرفتار کیا گیا تو ان کا باپ شام میں گھومتا اور کہتا (2):

بَكَيْتُ على زيدٍ ولم أدرِ ما فعل		أحيٌّ يُرجى أم أتى دونه الأجَلْ
فواللّٰه لا أدري وإني لسائل		أغالك بعدي السَّهلُ أم غالك الجبلْ
فياليت شعري هل لك الدهرَ أوبَةٌ		فحسبي من الدنيا رجوعُك لي بَجَلْ
تُذَكِّرُنيه الشمس عند طلوعها		وتَعْرِضُ ذكراه إذا غَرْبُهَا أَفَلْ
وإن هَبَّت الأرياح هَيَّجْنَ ذِكْرَه		فيا طول حُزْنِي عليه وما وَجَلْ
سأُعمِلُ نصَّ العِيسِ في الأرض جاهدًا		ولا أسأم التَّطواف أو تسأم الإبل
حياتيَ أو تأتيَ عليَّ مَنِيَّتي		فكلُّ امرئٍ فانٍ وإن غرَّه الأملْ

میں زید پر رویا میں نہیں جانتا اس کے ساتھ کیا ہوا کیا وہ زندہ ہے کہ اس سے امید کی جائے یا اسے موت آچکی ہے۔ اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا میں تو سائل ہوں کیا میرے بعد ہموار زمین نے تجھے پکڑ لیا یا پہاڑ نے تجھے پکڑ لیا؟ کاش! میں جانتا کہ زمانہ میں تیرا لوٹنا ہے۔ ہاں میرے لیے دنیا میں سے تیرا لوٹنا ہی کافی ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا طلوع مجھے اس کی یاد دلاتا ہے جب وہ غروب ہونے لگتا ہے تو اس کی یاد آجاتی ہے اگر ہوائیں چلیں تو اس کے ذکر کو بھڑکا دیتی ہیں۔ ہائے اس پر طویل حزن اور خوف! میں زمین میں کوشش کرتے ہوئے اونٹ کو کام میں لاؤں گا۔ میں اس وقت تک نہیں اکتاؤں گا یہاں تک کہ اونٹ اکتا جائے۔ میری زندگی کی قسم! یا مجھ پر موت آجائے پس ہر آدمی فانی ہے اگرچہ امید اسے دھوکا میں ڈال دے۔

---

1۔ صحیح مسلم، الفضائل، فضائل زید بن حارثہ، جلد 2، صفحہ 283		2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 368

اسے بتایا گیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں ہے وہ اپنے بیٹے کے پاس آیا اور اس کے پاس ہلاک ہو گیا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دیا جس طرح ہم نے ذکر کیا اور وہ وہیں چلا گیا (1)۔ اس کے ذکر، فضل اور شرف میں سے ایسی بحث آئے گی جو کافی وشافی ہوگی۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا (الاحزاب: 37) ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت زید بن حارثہ آٹھ ہجری میں شام کے علاقہ میں مؤتہ میں شہید ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں انہیں امیر بنایا تھا۔ فرمایا: ''اگر حضرت زید شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر اگر حضرت جعفر طیار شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ یہ تینوں جلیل القدر صحابہ کرام اس غزوہ میں شہید ہو گئے'' (2)۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت زید اور حضرت جعفر کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ روئے۔ فرمایا: اخوای، مونسای و محدثای۔ میرے دونوں بھائی، میرے دو غمگسار اور مجھ سے باتیں کرنے والے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑤

''بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک، اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں، اور نہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں ان پر ضرور گرفت ہوگی اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ یہ آیت حضرت زید بن حارثہ کے حق میں نازل ہوئی جس طرح پہلے وضاحت گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ہم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد پکارا کرتے تھے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ متبنی بنانا دور جاہلیت اور دور اسلام کا معمول تھا۔ اس کے ذریعہ باہم وارث بنا جاتا اور باہم ایک دوسرے کی مدد کی جاتی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ اس عمل کو منسوخ کر دیا: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی انصاف والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متبنی بنانے کا حکم ختم کر دیا یہ لفظ بولنے سے منع کر دیا اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس کی طرف رہنمائی کی کہ اولیٰ اور موزوں یہ ہے کہ مرد اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ یہ کہا جاتا ہے: دور جاہلیت میں جب کسی آدمی کو اس کی بہادری اور ظرافت اچھی لگتی تو وہ آدمی اسے اپنے ساتھ ملا لیتا اور اپنی میراث میں سے مذکر اولاد کے برابر اس کا حصہ مقرر کر دیتا۔ اس لڑکے کو اس آدمی کی طرف منسوب کیا جاتا اور کہا جاتا: فلاں بن فلاں۔ نحاس نے کہا: یہ آیت اس متبنی بنانے کے حکم کو منسوخ کرنے والی ہے جو ان کے ہاں پہلے سے رواج تھا۔ اس میں سنت کو آیت سے منسوخ کرنے کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1505
2۔ دلائل النبوۃ، جلد 4، صفحہ 361

ثبوت ملتا ہے۔ تو حکم دیا گیا کہ جس کو بھی بلاؤ اسے اس کے معروف باپ کی نسبت سے بلاؤ۔ اگر اس کا باپ معروف نہ ہو تو اس کو اس کی ولاء (☆) کی طرف منسوب کرو اگر اس کی ولاء بھی معروف نہ ہو تو اسے کوئی بلائے تو یوں بلائے: یا اخی یعنی اے میرے دینی بھائی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات:10)

**مسئلہ نمبر2**۔ اگر کسی آدمی نے اسے ایسے باپ کی طرف منسوب کر دیا جس کا وہ متبنی تھا اگر تو یہ غلطی سے ہوا یعنی بغیر ارادہ کے اس کی زبان پر آ گیا تو اس پر کوئی گناہ اور مواخذہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ اسی طرح اگر تو کسی آدمی کو بلاتا ہے اور اس کی نسبت اس کے اپنے باپ کی طرف کرنے کی بجائے کسی اور کی طرف کرتا ہے جب کہ تو خیال کرتا ہے یہ اس کا باپ ہے تو تجھ پر کوئی حرج نہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ یہ حکم اس پر جاری نہیں ہوگا جس کا متبنی ہونے کے اعتبار سے نام زیادہ مشہور ہو گیا ہو جس طرح حضرت مقداد بن عمرو، ان پر متبنی ہونے کے اعتبار سے نام غالب آ گیا تھا۔ یہ حضرت مقداد بن اسود کے نام سے مشہور و معروف تھے کیونکہ اسود بن یغوث نے دور جاہلیت میں انہیں متبنی بنایا تھا اور اسی وجہ سے معروف و مشہور تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی مقداد نے کہا: میں ابن عمرو ہوں۔ اس کے باوجود اس پر اطلاق باقی رہا۔ جو علماء گزر چکے ہیں ان میں سے کسی سے یہ نہیں سنا گیا کہ اس پر اس نام کا اطلاق کرنے والے کو گناہگار قرار دیا گیا ہو اگرچہ وہ جان بوجھ کر نام لے۔

اسی طرح حضرت سالم مولی ابی حذیفہ وہ مولی ابو حذیفہ کے نام سے پکارے جاتے ان کے علاوہ بھی کئی افراد ہیں جن کو متبنی بنایا گیا اور انہیں اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کیا گیا، اس میں مشہور ہوئے اور وہ نام ان پر غالب آیا، لیکن حضرت زید بن حارثہ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ انہیں اب زید بن محمد کہنا جائز نہیں اگر کسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والا ہوگا۔ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ تو پھر تم پر گناہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اسی وجہ سے بعد میں فرمایا: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا غفور یعنی جان بوجھ کر اس عمل کے کرنے والے کو بخشنے والا ہے اور رَّحِيْمًا خطا کے اثم کو ختم کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر3**۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ یہ مجمل ہے یعنی تم نے جو غلطی کی ہے اس میں تم پر کوئی حرج نہیں؛ یہ عطا اور کثیر علماء کا فتویٰ تھا۔ اسی تعبیر کی بنا پر کہا گیا: جب کوئی آدمی قسم اٹھائے کہ وہ اپنے مقروض کا پیچھا نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ وہ اس سے اپنا پورا پورا حق لے لے، تو اس نے اس سے وہ دینار لے لیے جن کو وہ عمدہ خیال کرتا تھا پھر اس نے ان کو کھوٹے پایا تو اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اسی طرح اس کے نزدیک یہ بھی ہے جب اس نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں کو سلام نہیں کرے گا اس نے اسے سلام کیا جب کہ وہ اسے پہچانتا نہیں تھا وہ حانث نہیں ہوگا کیونکہ اس نے اس میں قصد نہیں کیا۔ ما محل جر میں ہے (اس ما سے مراد وہ ما ہے جو مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ میں ہے) اس ما کو اس ما کی

---

☆ ولاء، یہ ایک اصطلاح ہے عرب جس کی پناہ لیتے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے۔ جس کے غلام ہوتے اس کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے بعد میں جس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جاتا اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔

طرف لوٹایا گیا ہے جو اخطاتم میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو کیونکہ مبتدا محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ولکن الذی تواخذون بہ ما تعمدت قلوبکم قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: جس آدمی نے کسی کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا جب کہ اس کا خیال ہو کہ وہ اس کا باپ ہے اس نے یہ بات خطأ کی تو یہ اس خطا سے ہوگی جس پر سے اللہ تعالیٰ نے گناہ کو اٹھا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ گفتگو کرتے ہوئے اسے یہ کہے: اے بیٹے! جب کہ اس نے یہ گفتگو اس کے متعلق کی جو اس کا متبنیٰ نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ، (1) بِاَفْوَاهِكُمْ قول کے باطل ہونے کی تاکید ہے، یعنی یہ ایسا قول ہے جس کی وجود میں کوئی حقیقت نہیں، یہ صرف زبانی قول ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: أنا امشی الیك علی قدمی میں قدموں پر چل کر تیرے پاس آؤں گا۔ اس سے مراد حسن معاملہ ہے، یہ کثرت سے واقع ہوتا ہے۔ یہ کئی مواضع پر بحث واقع ہوئی ہے۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ، الْحَقَّ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یقول القول الحق، یھدی اس کا معنی واضح ہے یہ فعل حرف جار کے واسطہ کے بغیر متعدی ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الادعیاء یہ دعی کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ایسے بیٹے کا دعویٰ کرے جس کا پہلے باپ معروف نہ ہو اور یا وہ اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے۔ مصدر دعوۃ دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ادعیاء کو اپنے صلبی باپوں کے ساتھ بلایا جائے۔ جو آدمی اس اعتبار سے مجہول ہو اور ان کے نسب مشہور نہ ہوں تو وہ مولی اور دینی بھائی ہوگا۔ طبری نے ذکر کیا کہ ابوبکر نے اس آیت کو پڑھا اور کہا: میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا باپ معروف نہیں میں تمہارا دینی بھائی اور مولیٰ ہوں۔ ان سے روایت کرنے والے نے کہا: اللہ کی قسم! اگر انہیں علم ہوتا کہ اس کا باپ گدھا ہے تو وہ اپنی نسبت اس سے کر لیتا۔ محدثین ابوبکر کے بارے میں یوں ذکر کرتے ہیں: نُفَیع بن حارث

**مسئلہ نمبر 6**۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابوبکرہ دونوں کے بارے میں صحیح روایت مروی ہے کہا: میرے دونوں کانوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب کہ میرے دل نے اسے یاد رکھا: ”جس نے اپنی نسبت اپنے غیر باپ کی طرف کی جب کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس کا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے“ (2)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ”جس آدمی نے اپنے غیر باپ سے ہونے کا دعویٰ کیا جب کہ وہ اسے جانتا بھی ہو تو اس نے کفر کیا“ (3)۔

---

1۔ سورۂ احزاب کی آیت نمبر 4 کے الفاظ ہیں۔ تاہم تمام نسخوں میں یہ مسئلہ یہاں ہی مذکور ہے اگرچہ الفاظ کے ظاہر کو دیکھا جائے تو ان کا تعلق ماقبل آیت سے بنتا ہے۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، من ادعی الی غیر ابیہ، جلد 2، صفحہ 1007

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان حال الایمان من رغب، جلد 1، صفحہ 57

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی
اَوْلِیٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ
مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا
مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۝ۙ

''نبی (کریم) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں کتاب اللہ کی رو سے عام مومنوں اور مہاجرین سے مگر یہ کہ تم اگر چاہو اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی (تو اس کی اجازت ہے) یہ (حکم) کتاب (الٰہی) میں لکھا ہوا ہے اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی، اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا تھا''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ یہ وہ آیت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو زائل فرمایا جو ابتداء اسلام میں تھے۔ (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی کا نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے جس کے ذمہ کوئی قرض ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتوحات سے نوازا فرمایا: ''میں مومنوں سے ان کی ذاتوں سے زیادہ قریب ہوں جو مومن فوت ہو اور اس پر قرض ہو تو اس قرض کو ادا کرنا میری ذمہ داری ہے اور جو مال چھوڑ جائے تو اس کے وارثوں کا ہے'' (1)۔ دونوں صحیحوں نے نقل کیا ہے۔ ان میں یہ بھی ہے: ''تم میں سے جو قرض یا بال بچے چھوڑ جائے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں''۔ ابن عربی نے کہا: اب معاملہ گناہوں کی صورت میں پلٹ گیا ہے اگر وہ مال چھوڑ جائیں تو عصبات اس میں شریک ہوں گے اور اگر وہ بال بچے چھوڑ جائیں تو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس آیت میں ولایت مذکورہ کی یہ تفسیر اس تفسیر کی طرح ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور تنبیہ کی۔ ولا عطر بعد عروس عروس کے بعد کوئی عطر نہیں (2)۔

ابن عطیہ نے کہا: علماء عارفین میں سے ایک نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نفسوں سے زیادہ خیر خواہ ہیں کیونکہ ان کے نفوس انہیں ہلاکت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نجات کی طرف بلاتے ہیں۔ اسی امر کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کرتا ہے: انا آخذ بحجزكم عن النار وأنتم تقحمون فيها تقحم الفراش (3) میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ کر جہنم سے بچا رہا ہوں جب کہ تم اس میں یوں داخل ہونا چاہتے ہو جس طرح پتنگ آگ میں گرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس آیت کے معنی اور تفسیر میں یہ اچھا قول ہے۔ وہ حدیث جو ذکر کی گئی ہے اسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، من ترك مالا فلاهله، جلد 2، صفحہ 997

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1508

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 370

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنما مثلی و مثل أمتی کمثل رجل إستوقد نارا فجعلت الدواب والفراش یقعن فیه وأنا آخذ بحجزکم وانتم تقحمون فیه (1) میری اور میری امت کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو آگ کو روشن کرتا ہے تو جاندار اور پتنگ اس میں گرنا شروع ہو جاتے ہیں میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ کر آگ سے بچا رہا ہوں جب کہ تم اس میں گرنا چاہتے ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے: وأنتم تفلتون من یدی جب کہ تم میرے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہو۔ علماء نے کہا: حجزہ پائجاموں کے لیے اور معقد تہبند کے لیے ہوتا ہے۔ مراد وہ جگہ ہے جہاں ان کی گرہ باندھی جاتی ہے۔ جب کوئی اس آدمی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جس کے گرنے کا خوف ہو تو اس کی یہی جگہ پکڑتا ہے۔ یہ اس میں مثال ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری نجات کے لیے تگ و دو کرتے ہیں اور وہ ہلاکتیں جو ہمارے سامنے ہیں ان سے ہمیں بچانے کے حریص ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہماری جانوں سے زیادہ خیر خواہ ہیں۔ ہم اس سے ناواقف ہیں، ہم پر ہماری شہوتوں کا غلبہ ہے اور ہمارا لعین دشمن ہم پر کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم فراش سے زیادہ حقیر اور پتنگ سے زیادہ ذلیل ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: أولی بھم سے مراد ہے جب آپ کسی چیز کا حکم دیں اور نفس کسی اور چیز کی طرف دعوت دے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اطاعت کے زیادہ لائق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اولی بھم سے مراد ہے آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ مومنوں کو حکم دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ان کی ذاتوں میں نافذ ہو یعنی جو وہ اپنے بارے میں حکم دیتے ہیں اور وہ آپ کے حکم کے خلاف ہوتا ہے اس کی بجائے آپ کا حکم اطاعت کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے کہا: امام پر لازم ہے کہ فقراء کا قرض بیت المال سے ادا کرے وہ اس امر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وجوب کی تصریح کی ہے۔ فرمایا: فعلیّ قضاءہ، الضیاع یہ ضاع کا مصدر ہے۔ پھر یہ لفظ ہر اس چیز کا نام بنا دیا گیا جو ضائع ہوا چاہتی ہو خواہ وہ اس کے عیال سے تعلق رکھتی ہو یا وہ بیٹے ہوں، جن کا کوئی کفیل نہ ہو اور مال ہو جس کا کوئی نگہبان نہ ہو۔ زمین کو ضیعہ کا نام دیا کیونکہ وہ ضائع ہونے کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ اس کی جمع ضیاع ضاد کے کسرہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو شرف سے نوازا کہ انہیں مومنوں کی مائیں بنا دیا، یعنی ان کی تعظیم، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تکریم اور مردوں کے ساتھ ان کے نکاح کی حرمت واجب ہے اسی طرح اپنی ماؤں کے برعکس ان سے پردہ کرنا واجب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ان کی شفقت ماؤں کی شفقت جیسی ہے تو انہیں ماؤں کے قائم مقام رکھا۔ پھر یہ ماں کا رشتہ میراث کو ثابت نہیں کرے گا جس طرح متبنیٰ ہونے کی وجہ سے ماں کا رشتہ وراثت کو ثابت نہیں کرتا۔ ان کی بیٹیوں سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا جائز ہے انہیں لوگوں کی بہنیں نہیں بنایا جائے گا۔ آیت تطہیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، شفقة النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی امته، جلد 2، صفحہ 248

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا وہ مردوں اور عورتوں کی مائیں ہیں یا صرف مردوں کی مائیں ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں: امام شعبی نے مسروق سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں ایک عورت نے آپ سے کہا: اے ماں! حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں تیری ماں نہیں ہوں۔ میں صرف تمہارے مردوں کی ماں ہوں (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: عورتوں کے سوا مردوں کے لیے اس حکم کی اباحت کے حصر کے اختصاص میں کوئی فائدہ نہیں میرے لیے جو امر ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کی مائیں ہیں۔ مقصد اس حق کی عظمت کا اظہار ہے جو حق ان کا مردوں اور عورتوں پر ہے جس پر آیت کا ابتدائی حصہ دلالت کرتا ہے: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ یہ حکم بدیہی طور پر مردوں اور عورتوں کو شامل ہوگا۔ اس پر حضرت ابو ہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ سب کی طرف لوٹ رہا ہے۔ پھر حضرت ابی کے مصحف میں وازواجه أمهاتهم و هو رب لهم کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے پڑھا من أنفسهم و هواب لهم و ازواجه امهاتهم یہ سب کچھ اس موقف کو کمزور کر دیتا ہے جسے مسروق نے روایت کیا اگر ترجیح کی جہت سے وہ صحیح ہو۔ اگر وہ صحیح نہ ہو تو تخصیص میں اس سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے اور ہم اس اصل پر باقی رہ جاتے ہیں جو عموم ہے وہ عموم جو ذہنوں کی طرف جلدی سبقت لے جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مومنین سے مراد انصار اور مہاجرین سے مراد قریش ہیں اس میں دو قول ہیں: (۱) ہجرت کی وجہ سے جو وراثت جاری تھی اس کو منسوخ کر دیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ سورۃ الانفال میں یہ حکم نازل ہوا: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا (الانفال: 73) مسلمان باہم ہجرت کی وجہ سے وارث بننے لگے۔ کوئی بدو مسلمان اپنے قریبی مسلم مہاجر کا اس وقت تک وارث نہ بنتا یہاں تک کہ وہ ہجرت کرتا پھر اس سورت میں اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ۔

(۲) یہ اس وراثت کے حکم کے لیے ناسخ ہے جو وراثت باہمی معاہدہ اور دینی مواخات کی وجہ سے جاری تھی۔ ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جماعت قریش جب مدینہ طیبہ آئے تو ہمارے پاس کوئی مال وغیرہ نہیں تھا۔ ہم نے انصار کو بہت ہی اچھا بھائی پایا ہم نے ان سے مؤاخات قائم کی انہوں نے ہمیں اپنا وارث بنایا اور ہم نے انہیں وارث بنایا۔ حضرت ابو بکر صدیق حضرت خارجہ بن زید کے ساتھ بھائی بنے اور میں حضرت کعب بن مالک کے بھائی بنا میں اس کے پاس پہنچا میں نے اسے پایا کہ اسلحہ نے اسے بوجھل کیا ہوا ہے اللہ کی قسم! اگر وہ اس وقت دنیا سے فوت ہوتے تو میرے سوا ان کا کوئی وارث نہ ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو ہم اپنی اپنی وراثتوں کی طرف لوٹ گئے (2)۔

---

1۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1509　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 375

حضرت عروہ سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر اور حضرت کعب بن مالک کے درمیان مؤاخات قائم کی حضرت کعب غزوۂ احد کے موقع پر مرتث ہوئے (وہ مجاہد جسے میدان جنگ سے باہر لایا جائے اور اس میں زندگی کے آثار ہوں) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان کی سواری کو لگام پکڑ کر لائے اگر اس روز حضرت کعب ضح اور ریح (کثیر مال) کے ساتھ فوت ہو جاتے تو حضرت زبیر ان کے وارث ہوتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو واضح کیا کہ رشتہ داری باہمی معاہدہ سے اولیٰ ہے۔ جو باہمی معاہدہ سے وراثت جاری ہوئی اس کو ترک کر دیا گیا اور وہ قرابت سے وارث ہوئے۔ سورۃ الانفال میں ذوی الارحام کے وارث بننے کے احکام گزر چکے ہیں۔ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں احتمال ہے کہ مراد قرآن حکیم ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ مراد لوح محفوظ ہو جس میں مخلوق کے احوال کا فیصلہ کر دیا گیا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ جار مجرور اولی کے متعلق ہے۔ اولو الارحام کے متعلق نہیں۔ یہی اجماع ہے کیونکہ یہ بعض مومنوں کی تخصیص کو ثابت کرتا ہے اس کے عموم میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہی اس کے اشکال کا حل ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے (1)۔ نحاس نے کہا: وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ یہ جائز ہے کہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، اُولُو کے متعلق ہو تو تقدیر کلام یہ ہوگی واولو الارحام من المومنین و المہاجرین یہ جائز ہے کہ معنی ہو مومنین سے اولی۔ مہدوی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی ہے اولو الارحام ان میں سے بعض بعض سے کتاب اللہ میں قریبی ہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے یہ جائز ہے کہ انہیں امہات المومنین کے نام سے پکارا جائے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ماؤں کی طرح ہوں حرمت کے اعتبار سے اور انہیں دیکھنے کے اعتبار سے۔ اس بارے میں دو قول ہیں: (۱) وہ محرم ہیں انہیں دیکھنا حرام نہیں (۲) انہیں دیکھنا حرام ہے کیونکہ ان کے ساتھ نکاح کرنا اس لیے تھا کہ ان کے بارے میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے اس کی حفاظت کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی حفاظت اس میں ہے کہ ان کی طرف دیکھنا بھی حرام ہو، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب کسی بچے کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دینا چاہتیں تو آپ اپنی بہن حضرت اسماء کو کہتیں کہ وہ اسے دودھ پلا دے تاکہ وہ ان کا بھانجا بن جائے تو وہ آپ کا محرم بن جاتا جس کے لیے آپ کو دیکھنا مباح ہو جاتا۔ جن عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری زندگی میں طلاق دے دی ان کے لیے حرمت کے ثبوت میں تین اقوال ہیں: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کو غلبہ دیتے ہوئے ان کے لیے بھی یہ حرمت ثابت ہو جائے گی۔ (۲) ان کے لیے یہ حرمت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ وہ تمام دوسری عورتوں کی طرح ہوں گی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عصمت کو ثابت کیا اور فرمایا: "دنیا میں جو میری بیویاں ہیں وہی آخرت میں میری بیویاں ہوں گی"۔ (۳) ان میں سے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق زوجیت ادا کیے ان کی حرمت ثابت ہوگی اور اس کے ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہوگا اگرچہ آپ نے اسے طلاق دے دی۔ مقصد ان کی حرمت کی حفاظت اور آپ کی خلوت کی نگہبانی تھی۔

1۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1509

جس کے ساتھ دخول نہ کیا ان کے لیے یہ حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو رجم کرنے کا ارادہ کیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدائی اختیار کی تھی۔ اور اس عورت نے بعد میں شادی کی تھی۔ اس عورت نے کہا: یہ حکم کس وجہ سے ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر پردہ نہیں ڈالا اور نہ اس کو ام المومنین کا لقب دیا گیا، حضرت عمر اس پر رجم کرنے سے رک گئے (1)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اب کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (الاحزاب: 40) بلکہ کہا جائے گا: کمثل الاب للمومنین مومنوں کے لیے باپ کی طرح، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: إنما أنا لكم بمنزلة الوالد أعلمكم (2) میں تمہارے لیے والد کے قائم مقام ہوں میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔ ابوداؤد نے اسے نقل کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ کہنا جائز ہے: انه اب للمومنین آپ حرمت وتکریم میں مومنوں کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (الاحزاب: 40) یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے نسبی باپ نہیں۔ اس کی بحث بعد میں آئے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھا من أنفسهم وهو اب لهم وازواجه حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قراءت کو سنا اور اس کا انکار کیا۔ فرمایا: اے بچے! اس کا حکم۔ حضرت ابن عباس نے عرض کی: یہ حضرت ابی کے مصحف میں ہے۔ حضرت عمر حضرت ابی کی طرف گئے اور ان سے پوچھا۔ حضرت ابی نے آپ سے کہا: قرآن مجھے ہر چیز سے غافل رکھتا تھا اور آپ کو بازار میں تجارت ہر چیز سے بے نیاز رکھتی تھی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے سخت جملے کہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے قول سے کہا تھا: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ (ہود: 78) مراد ان کی مومنات تھیں یعنی ان سے شادی کرو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: آپ کی بیٹیوں کو مومنوں کی بہنیں اور امہات المومنین کی بہنوں اور بھائیوں کو مومنوں کے خالو اور خالائیں نہیں کہا جائے گا۔ امام شافعی نے کہا: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے شادی کی جب کہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ کی ہمشیرہ تھیں۔ انہیں مومنوں کی خالہ نہیں کہا گیا: ایک قوم نے اس لفظ کا اطلاق کیا اور کہا: حضرت معاویہ مومنوں کے خالو ہیں یعنی حرمت میں نہ کہ نسب میں خالو ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا مراد زندگی میں احسان اور موت کے وقت وصیت ہے یعنی یہ جائز ہے؛ یہ قتادہ، حسن بصری اور عطا کا نقطہ نظر ہے۔ محمد بن حنفیہ نے کہا: یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی کہ کوئی مومن یہودی اور عیسائی کے حق میں وصیت کرے، یعنی مومن ولی اور قریبی رشتہ دار کے حق میں وصیت کرسکتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو۔ مشرک نسب میں ولی ہے دین میں ولی نہیں پس وہ اس کے حق میں وصیت کرسکتا ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کیا کافر کو وصی بنایا جا سکتا ہے؟ بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا اور بعض نے اس سے منع کیا۔ بعض علماء نے اس معاملہ کو سلطان کی طرف لوٹا دیا۔ ان میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مجاہد، ابن زید اور رمانی اس طرف گئے ہیں کہ معنی ہے: مومن اولیاء کے حق میں وصیت کرو۔ آیت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 374

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطهارة، كراهية استقبال القبلة عند قضاء، جلد 1، صفحہ 3

کے الفاظ اس مذہب کی تائید کرتے ہیں۔ ولی کو عام رکھنا یہ بھی اچھا ہے۔ نسب کی ولایت یہ کافر کو رد نہیں کرتی یہ اس امر کو رد کرتی ہے اس کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم کیا جائے جس طرح اسلام کے اعتبار سے ولی سے محبت کی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا، الْكِتٰبِ انہیں دو وجوہ کا احتمال رکھتی ہے جن کا ذکر کتاب اللہ میں ہو چکا ہے۔ مَسْطُوْرًا یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: سطرت الکتاب جب تو اسے سطروں کی صورت میں ثبت کر دے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔ قتادہ نے کہا: ایک قراءت میں ہے کان ذلك عند الله مکتوبا۔ قرظی نے کہا: مراد ہے تورات میں یہ اس طرح ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ یعنی انبیاء کو جو ذمہ داریاں دی گئیں ان کو پورا کرنے کا وعدہ لیا گیا، یہ وعدہ لیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کو بشارت دیں گے اور ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے یعنی وہ مسطور تھا جب اللہ تعالیٰ نے کہا جو کچھ ہونے والا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ لیا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: کان مسطورا حین کتب الله ما ھو کائن حین أخذ الله تعالى المواثيق من الانبياء، ومنك ضمیر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ان پانچ انبیاء و رسل کو خاص کیا اگرچہ یہ انبیاء کے زمرہ میں داخل تھے۔ یہ اولوالعزم رسولوں اور امتوں کے ائمہ میں سے تھے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے یہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ولایت کو ختم کرنے کی تعظیم کے لیے ہو یعنی یہ ایسی بات ہے جس میں انبیاء کی شریعتوں میں کوئی اختلاف نہیں یعنی اسلام کے ابتدائی دور میں ہجرت کی وجہ سے باہم وراثت جاری تھی اور ہجرت دیانت میں قوی سبب تھا۔ پھر ایمان کے ہوتے ہوئے قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے باہم وارث بنے یہ بھی بڑا مضبوط سبب ہے جہاں تک مومن اور کافر کے درمیان وراثت کا تعلق ہے تو یہ ان انبیاء میں سے کسی نبی کے دین میں نہیں جن سے پختہ وعدہ لیا گیا، اس لیے تم ان میں کمزوری نہ دکھاؤ اور کفار سے دوستی نہ اپناؤ۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (الشوریٰ:13) دین میں تفرق کو ترک کرنا اس کی ایک صورت کفار سے دوستی کو ترک کرنا بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی مومنوں کی ذاتوں پر ان پر زیادہ حق رکھتا ہے یہ کتاب میں لکھا ہوا تھا اور انبیاء سے اس کا پختہ وعدہ بھی لیا گیا تھا۔

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا یعنی ہم نے ان سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ انہوں نے رسالت کی تبلیغ کی ذمہ داری اٹھائی ہے اور یہ ذمہ داری اٹھائی کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے۔ میثاق سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھانا ہے۔ دوسرا میثاق یہ اللہ کے نام کی قسم کے ساتھ پہلے میثاق کی تائید ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلا میثاق یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا اقرار ہے اور دوسرا میثاق نبوت کے متعلق ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ (آل عمران:81) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ اعلان کریں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ اعلان کریں گے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلے ذکر کیا کیونکہ حضرت

قتادہ نے حضرت حسن بصری سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ارشاد کے بارے میں پوچھا گیا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ فرمایا: ''میں پیدائش میں ان سے اول ہوں اور بعثت میں سب سے آخری ہوں'' (1)۔ مجاہد نے کہا: یہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں ہوا (2)۔

لِّیَسْـَٔلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۠

''یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق اور اس نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے دردناک عذاب''۔

اس کی چار توجیہیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ انبیاء سے پوچھے کہ انہوں نے اپنی قوموں تک پیغام حق پہنچایا ہے؛ نقاش نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ اس میں تنبیہ ہے یعنی جب انبیاء سے پوچھا جائے گا تو دوسروں سے کیسے نہیں پوچھا جائے گا؟ (3)

(۲) انبیاء سے یہ پوچھا جائے گا کہ ان کی قوموں نے انہیں کیا جواب دیا ہے: یہ علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ (4)

(۳) اللہ تعالیٰ انبیاء سے اس وعدہ کے پورا کرنے کے بارے میں پوچھے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا تھا؛ ابن شجرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ (5)

(۴) سچے مومنوں سے مخلص دلوں کے بارے میں پوچھے (6) قرآن حکیم میں ہے فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۙ (الاعراف) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان سے سوال کا فائدہ یہ ہے کہ کفار کو شرمندہ کیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (المائدہ: 116) وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا اس سے مراد عذاب جہنم ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۚ

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا''۔

مراد غزوہ خندق، احزاب اور غزوہ بنی قریظہ ہے یہ سخت ترین حالات تھے جس کے بعد نعمت، خوشحالی اور سرور کی کیفیت تھی یہ کثیر احکامات اور آیات واضحہ اور غالبہ کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دس مسائل میں ایسی بحث کریں گے جو کافی متاثر ہو گی۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 377　2۔ تفسیر مجاہد، جلد 1، صفحہ 213
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 378　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ کس سال واقعہ ہوا؟ ابن اسحاق نے کہا: یہ پانچ ہجری شوال میں ہوا تھا۔ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت نقل کی ہے: غزوۂ خندق کا واقعہ 4ھ میں ہوا تھا۔ یہ اور غزوہ بنو قریظہ اسی دن ہوا تھا۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے واقعہ کے درمیان چار سال کا عرصہ حائل ہے۔ ابن وہب نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں جہاد کا حکم دیا گیا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: 10) کہا: یہ غزوہ خندق کا موقع تھا قریش اس جانب سے، یہودی اس جانب سے اور نجدی یہاں سے آئے تھے۔ امام مالک ارادہ کرتے ہیں۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ سے مراد بنو قریظہ ہیں۔ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ سے مراد قریش وغطفان ہیں (1) اس کا سبب یہ ہوا کہ یہودیوں کی ایک جماعت جن میں کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم، حیی بن اخطب نضری، ہوذہ بن قیس، ابو عمار، بنو حلال سے یہ سب یہودی تھے یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ان لشکروں کو بلایا تھا، انہیں دعوت دی اور انہیں جمع کیا تھا۔ یہ لوگ بنو نضیر کی جماعت اور بنو وائل کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے یہ مکہ مکرمہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کی دعوت دی اور اپنی جانب سے وعدہ کیا کہ وہ ہر ممکن ان کی مدد کریں گے۔ اہل مکہ نے ان کی آواز پر لبیک کہی۔ پھر یہی یہودی غطفان کی طرف گئے انہیں بھی ایسی ہی دعوت دی تو انہوں نے بھی ان کی بات کو تسلیم کر لیا۔ قریش نکلے ان کی قیادت ابو سفیان کر رہا تھا غطفان نکلے ان کا قائد عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر فزاری جو فزارہ کا سردار تھا، حارث بن عوف مری جو بنو مرہ کا قائد تھا، مسعود بن رحیلہ جو اشجع کا سردار تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اجتماع اور اپنے علاقوں سے چل پڑنے کے بارے میں سنا تو اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلیمان فارسی نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مشورہ پر راضی ہو گئے۔ مہاجرین نے اس روز کہا: سلمان ہم میں سے ہے۔ انصار نے کہا: سلمان ہم میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے'' (2)۔ غزوۂ خندق وہ پہلا غزوہ تھا جس روز حضرت سلمان فارسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے وہ اس روز آزاد تھے۔ عرض کی: یا رسول اللہ! جب ہم محاصرہ میں آ جائیں تو ہم خندق کھودتے ہیں مسلمانوں نے خندق کھودنے میں بڑی محنت کی۔ منافقین نے کمزوری کا اظہار کیا اور ایک دوسرے کی اوٹ میں کھسکنے لگے تو ان کے بارے میں قرآن کی آیات نازل ہوئیں جن کا ابن اسحاق اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے مسلمانوں میں سے جو اپنے حصہ سے فارغ ہو گیا تو اس نے دوسرے کی مدد کی یہاں تک کہ خندق مکمل ہو گئی اس میں واضح نشانیاں اور نبوت کی علامات تھیں۔ میں کہتا ہوں: یہ خبر جو ہم نے ذکر کی ہے اس میں فقہی مسئلہ ہے، یہی دوسرا مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سلطان کا اپنے ساتھیوں اور اپنے خاص لوگوں سے قتال کے بارے میں مشورہ کرنا۔ یہ بحث سورۂ آل عمران اور سورۃ النمل میں گزر چکی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ دشمن سے حفاظت کا اہتمام کرنا چاہیے جس قدر اسباب اور ان کا استعمال ممکن ہو۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ خندق کا کھودنا لوگوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے جو

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1510 2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 337

فارغ ہوا اس نے اس کی مدد کی جو فارغ نہ ہوا تھا۔ مسلمان دوسروں کے مقابلہ میں ایک ہاتھ تھے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت براء بن عازب سے مروی ہے (1): جب غزوۂ احزاب کا موقع تھا اور رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھود رہے تھے میں نے آپ کو دیکھا آپ خندق سے مٹی نکال رہے تھے یہاں تک کہ مٹی نے آپ کے بطن کی جلد کو مجھ سے چھپا دیا تھا آپ کے جسم پر کثیر بال تھے اور میں نے آپ کو حضرت ابن رواحہ کے کلمات کے ساتھ رجز پڑھتے ہوئے سنا اور آپ کہہ رہے تھے۔

اللّٰھُمَّ لولا أنت ما اھتدینا　ولا تصدّقنا ولا صلّینا

فأنزِلن سکینۃً علینا　وثبّت الأقدام إن لاقینا

اے الله! اگر تو نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے، نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ ہی نماز پڑھتے۔ ہم پر سکینہ کو نازل فرما اگر ہماری دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔

اس واقعہ میں جو نشانیاں ہیں وہ یہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ نسائی نے ابی سکینہ سے جو جہنم کی آگ سے آزاد کیے گئے لوگوں میں سے تھے نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودنے کا حکم دیا تو ان کے سامنے ایک چٹان آئی جو صحابہ اور خندق کھودنے کے درمیان حائل ہوئی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے کدال لی اپنی چادر خندق کے ایک کونہ پر رکھی، فرمایا: **وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا** (الانعام: 115) تو ایک تہائی پتھر ٹوٹ گیا جب کہ حضرت سلیمان فارسی کھڑے دیکھ رہے تھے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرب کے ساتھ بجلی چمکی پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی، زبان سے کہا: **وَ تَمَّتْ**، تو تیسرا حصہ ٹوٹ گرا بجلی چمکی جسے حضرت سلمان فارسی نے دیکھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری ضرب لگائی، زبان سے کہا: **وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا**، تو باقی ماندہ تیسرا حصہ بھی ٹوٹ گیا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اپنی چادر لی اور بیٹھ گئے۔ حضرت سلمان نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے آپ کو دیکھا جب آپ نے ضرب لگائی۔ آپ ضرب نہیں لگاتے تھے مگر اس کے ساتھ بجلی نکلتی تھی۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے سلیمان! تو نے وہ دیکھا؟'' عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! یا رسول الله! فرمایا: ''جب میں نے پہلی ضرب لگائی تو میرے لیے کسریٰ کے مدائن کو بلند کیا گیا اور اس کے اردگرد بے شمار شہر تھے یہاں تک کہ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا''۔ جو صحابہ آپ کے پاس حاضر تھے انہوں نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم الله تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم پر ان شہروں کو فتح کرے، ان کے بچے ہمیں مال غنیمت کے طور پر دے اور ہمارے ہاتھوں سے ان کے شہروں کو برباد کرے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی، پھر میں نے دوسری ضرب لگائی تو میرے لیے قیصر کے شہر اور اس کے اردگرد جو شہر تھے وہ بلند کیے گئے یہاں تک کہ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صحابہ نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم الله تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ انہیں ہم پر فتح کرے اور ہمیں ان کے بچے مال غنیمت کے طور پر دے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی۔ پھر میں نے تیسری ضرب لگائی تو میرے لیے حبشہ کے شہر اور اس

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ خندق، جلد 2، صفحہ 589

کے ارد گرد کے شہر بلند کیے گئے یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تک اہل حبشہ تمہیں چھوڑے رہیں تم انہیں چھوڑے رکھو اور ترکوں کو چھوڑے رکھو جب تک وہ تمہیں چھوڑے رکھیں''(1)۔ حضرت براء نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ کہا: جب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خندق کھودنے کا حکم دیا تو ایک چٹان ہمارے سامنے آ گئی ہماری کدالیں اس میں کوئی نفع نہ دے رہی تھیں۔ ہم نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی رسول اللہ ﷺ تشریف لائے آپ نے چادر رکھی اور کدال لی اور فرمایا: ''بسم اللہ'' آپ نے ایک ضرب لگائی تو چٹان کا تیسرا حصہ ٹوٹ گیا۔ پھر فرمایا: ''اللہ اکبر مجھے شام کی چابیاں دے دی گئیں اللہ کی قسم! میں اس جگہ سے اس کے سرخ محلات دیکھ رہا ہوں''۔ پھر آپ ﷺ نے دوسری ضرب لگائی فرمایا: ''باسم اللہ'' تو ایک تہائی چٹان کو توڑ دیا پھر فرمایا: ''اللہ اکبر مجھے فارس کی چابیاں دے دی گئیں۔ اللہ کی قسم! میں مدائن کے سفید محل دیکھ رہا ہوں''۔ پھر آپ نے تیسری ضرب لگائی۔ فرمایا: ''بسم اللہ'' آپ نے پتھر توڑ دیا اور فرمایا: ''اللہ اکبر مجھے یمن کی چابیاں دے دی گئیں، اللہ کی قسم! میں صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں'' ابو محمد عبد الحق نے اس کی تصحیح کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب رسول اللہ ﷺ خندق کھودنے سے فارغ ہو گئے قریش دس ہزار کے لشکر کے ساتھ آئے ان کے ساتھ بنو کنانہ اور اہل تہامہ موجود تھے۔ غطفان اہل نجد کے ساتھ آئے یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کی ایک جانب اترے۔ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان سلع پہاڑ کو پشت پر رکھتے ہوئے تین ہزار کی تعداد میں نکلے۔ اپنے لشکر کو ترتیب دیا جب کہ خندق ان کے درمیان اور مشرکوں کے درمیان تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کو مدینہ طیبہ پر عامل مقرر کیا؛ یہ ابن شہاب کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ کا دشمن حیی بن اخطب نضری نکلا یہاں تک کہ کعب بن اسد قرظی کے پاس پہنچا وہ بنو قریظہ کی جانب سے معاہدہ کرنے والا اور ان کا رئیس تھا۔ اسی نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کیا تھا۔ جب کعب بن اسد نے حیی بن اخطب کے بارے میں سنا تو اپنے قلعہ کا دروازہ اس پر بند کر لیا اور دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ حیی نے کہا: اے میرے بھائی! میرے لیے دروازہ کھولو۔ کعب نے کہا: میں تیرے لیے دروازہ نہیں کھولوں گا تو منحوس آدمی ہے۔ تو مجھے حضرت محمد ﷺ سے وعدہ توڑنے کے لیے کہے گا جب کہ میں نے ان سے معاہدہ کیا ہے۔ میں نے ان سے وفا اور سچائی ہی دیکھی ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان جو معاہدہ ہے میں اسے توڑنے والا نہیں۔ حیی نے کہا: میرے لیے دروازہ کھولو یہاں تک کہ میں تجھ سے بات کروں اور تیرے پاس سے واپس چلا جاؤں۔ کعب نے کہا: میں ایسا نہیں کروں گا۔ حیی نے کہا: تو اس سے ڈرتا ہے کہ میں تیرے ساتھ تیرا دلیا کھاؤں گا۔ کعب غصے ہو گیا اور دروازہ کھول دیا۔ حیی نے کہا: اے کعب! میں تیرے پاس زمانہ کی عزت لایا ہوں۔ میں تیرے پاس قریش اور اس کے سردار لایا ہوں۔ میں تیرے پاس غطفان اور ان کے سردار لایا ہوں انہوں نے باہم معاہدہ کیا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو جڑ سے اکھیڑ دیں۔ کعب نے اسے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، غزوۂ ترک وحبشہ، جلد 2، صفحہ 63

اللہ کی قسم! تو میرے پاس زمانہ کی ذلت لایا ہے تو ایسا بادل لایا ہے جس میں بارش نہیں، تجھ پر افسوس اے حیی! مجھے چھوڑ دے۔ میں وہ کام کرنے والا نہیں جس کی طرف تو مجھے دعوت دیتا ہے۔ حیی لگاتار کعب سے وعدہ، وعید کرتا رہا اسے دھوکہ دیتا رہا یہاں تک کہ کعب نے اس کی طرف رجوع کر لیا اور اس نے حیی سے اس امر پر معاہدہ کر لیا کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دے گا اور حیی کا ساتھ دے گا۔ حیی بن اخطب نے کعب سے کہا: اگر قریش اور غطفان واپس چلے گئے تو میں ان یہودیوں کے ساتھ تیرے پاس آ جاؤں گا جو میرے ساتھ ہیں۔ جب کعب اور حیی کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ جو خزرج کے سردار تھے اور حضرت سعد بن معاذ جو اوس کے سردار تھے کو بھیجا ان دونوں کے ساتھ حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت خوات بن جبیر کو بھی بھیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''بنو قریظہ کی طرف جاؤ اگر وہ بات درست ہو جو ہم سے کی گئی ہے تو ذومعنی انداز میں ہم سے بات کرنا اور لوگوں کی قوت کو منتشر نہ کرنا اگر وہ بات جھوٹ ہو تو اعلانیہ بات کرنا''۔ وہ صحابہ چلے یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچے تو ان کو اس سے ابتر حالت میں پایا جو ان کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ اور جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات سنی تھی۔ انہوں نے کہا: ہمارے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی عہد نہیں۔

حضرت سعد بن معاذ نے انہیں برا بھلا کہا اور انہوں نے حضرت سعد بن معاذ کو برا بھلا کہا۔ ان میں بات تیز ہونے لگی۔ حضرت سعد بن عبادہ نے حضرت سعد سے کہا: ان کو برا بھلا نہ کہو ہمارے اور ان کے درمیان معاملہ اس سے آگے بڑھ چکا ہے پھر حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ واپس آئے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلمانوں کی جماعت میں پہنچے دونوں نے عرض کی: عضل والقارۃ دونوں عضل اور قارہ کے دھوکہ کا اشارۃً ذکر کر رہے تھے جو اصحاب رجیع حبیب اور اس کے ساتھی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے مسلمانوں کی جماعت! تمہیں بشارت ہو''۔ اس موقعہ پر آزمائش بڑھ گئی اور خوف شدید ہو گیا۔ مسلمانوں پر دشمن ان کی اوپر کی جانب سے یعنی مشرق کی جانب سے وادی کے اوپر سے اور ان کے نیچے کی جانب سے یعنی وادی کے بطن سے مغرب کی جانب سے آ گیا، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمانات کرنے لگے اور منافقوں نے وہ کچھ ظاہر کر دیا جس کو وہ پہلے چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ نے کہا: ہمارے گھر الگ تھلگ ہیں ہم ان کی طرف جاتے ہیں کیونکہ ہمیں ان کے بارے میں خوف ہے۔ جس نے یہ بات کی وہ اوس بن قیظی تھا۔ ان میں سے کچھ نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسریٰ وقیصر کے خزانوں کے فتح ہونے کا وعدہ کرتے ہیں اور آج ہم میں سے ایک قضائے حاجت کو جانے کے لیے محفوظ نہیں جس نے یہ کہا: وہ معتب بن قشیری جو بنی عمرو بن عوف میں سے تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین بیس دن سے اوپر تقریباً ایک ماہ تک مقیم رہے ان کے درمیان کوئی جنگ نہ ہوئی مگر تیر اندازی اور پتھر برسائے جاتے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسلمانوں پر آزمائش سخت ہو گئی ہے تو آپ نے عیینہ بن حصن فزاری اور حارث بن عوف مری کی طرف پیغام بھیجا یہ دونوں غطفان کے قائد تھے انہیں مدینہ طیبہ کی فصل کا ایک تہائی دینے کا وعدہ کیا تاکہ وہ لوگوں کو لے کر چلے جائیں اور قریش کا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنی قوم کے ساتھ ان سے واپس

چلے جائیں۔ یہ گفتگو بہلانے پھسلانے کے لیے تھی یہ کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھا کہ انہوں نے رجوع کا فیصلہ کرلیا ہے اور وہ دونوں راضی ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ کے پاس آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا ذکر ان دونوں سے کیا اور ان سے مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ یہ ایسا امر ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں تو آپ کی رضا کے لیے ایسا کرلیں گے یا ایسی شے ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے تو ہم اس کو پسند اور اطاعت کریں یا یہ ایسا امر ہے جو آپ ہماری سہولت کے لیے کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا: ''بلکہ یہ ایسا امر ہے جسے میں تمہارے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں ایسا نہیں کروں گا مگر اسی وقت جب میں عربوں کو دیکھوں کہ وہ سب تمہیں ایک کمان سے تیر مار رہے ہیں''۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اللہ کی قسم! ہم اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے، ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے تھے، ہم اس کی پہچان نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی اس کی طمع بھی نہیں کی کہ وہ ہمارے پھل کو حاصل کریں مگر خرید کر یا ضیافت کے طور پر۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے نوازا ہماری اس کی طرف رہنمائی کی اور آپ کے ساتھ ہمیں عزت بخشی تو ہم انہیں اپنے مال نہیں دیں گے مگر تلوار کے ساتھ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ اس سے خوش ہو گئے فرمایا: ''انتم ذاك'' تمہیں اختیار ہے وہی کرو جو تمہیں پسند ہے۔

آپ نے عیینہ اور حارث سے فرمایا: ''دونوں واپس چلے جاؤ تمہارے لیے ہمارے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں''۔ حضرت سعد نے صحیفہ لیا اس میں کوئی شہادت نہیں تھی تو آپ نے اسے مٹا دیا۔ رسول اللہ ﷺ اور مشرک اسی حال پر رہے مشرک ان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے ان کے درمیان کوئی جنگ وغیرہ نہیں ہو رہی تھی، مگر قریش کے شاہسوار جن میں عمرو بن عبدود عامری جو بنو عامر بن لوی سے تعلق رکھتا تھا، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ بن ابی وہب، ضرار بن خطاب فہری یہ قریش کے شاہسوار اور ان کے بہادر لوگ تھے وہ آئے اور خندق پر آکر کھڑے ہو گئے۔ جب انہوں نے خندق کو دیکھا انہوں نے کہا: یہ تو خفیہ تدبیر ہے عرب تو خفیہ تدبیر نہیں کرتے تھے۔ پھر انہوں نے خندق کی تنگ جگہ کا قصد کیا انہوں نے گھڑسواروں کو دوڑایا گھوڑے انہیں لے کر اس میں داخل ہوئے اور انہوں نے خندق کو عبور کرلیا اور یہ لوگ خندق اور سلع پہاڑ کے درمیان آئے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ انہیں اس آسان راستہ (جگہ) پر آلیا جہاں سے وہ داخل ہوئے تھے شاہسوار ان کی طرف متوجہ ہوئے عمرو بن عبدود کو غزوہ بدر کے موقع پر زخم لگا تھا اور وہ غزوۂ احد میں حاضر نہ تھا۔ اس نے غزوۂ خندق کے موقع پر ارادہ کیا کہ اس کے مقام و مرتبہ کو دیکھا جائے۔ جب وہ اور اس کا گھوڑا کھڑا ہوا تو اس نے آواز دی: کون مقابلہ کرے گا؟ حضرت علی شیر خدا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اسے فرمایا: اے عمر! جو ہمیں خبر پہنچی ہے کہ تو نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے کہ تجھے دو باتوں میں ایک کی دعوت دی جائے گی تو ان دونوں میں سے ایک کو ضرور اپنا لے گا۔ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: میں تجھے اللہ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا: مجھے اس کی کوئی

حاجت نہیں۔ فرمایا: میں تجھے مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا: اے بھتیجے! اللہ کی قسم! میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں تجھے قتل کروں اس کی وجہ میرے اور تیرے والد کے درمیان تعلقات تھے۔ حضرت علی شیر خدا نے اسے فرمایا: اللہ کی قسم! میں تجھے قتل کرنا پسند کرتا ہوں۔ عمرو بن عبدود کو غیرت آئی اور وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ اور اس کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت علی شیر خدا کی طرف چلا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نیچے اترنے کا کہا۔ دونوں نے چکر لگایا، دونوں کے درمیان غبار اڑا یہاں تک کہ غبار دونوں کے درمیان حائل ہوگیا۔ غبار نہ چھٹا یہاں تک حضرت علی شیر خدا کو دیکھا گیا کہ آپ عمرو کے سینہ پر ہیں اور اس کا سر کاٹ رہے ہیں۔ جب عمرو کے ساتھیوں نے دیکھا کہ حضرت علی شیر خدا نے اسے قتل کر دیا ہے تو وہ شکست کھا کر بھاگتے ہوئے اپنے گھوڑوں کے ساتھ آسان راستہ سے داخل ہوتے ہوئے نکل گئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کہا:

نصر الحجارةَ من سفاهة رأيِه و نصرتُ دِينَ محمد بِضراب
نازلته فتركته متجدِّلًا كالجِذْع بين دَكادِكٍ و رَوَابی
و عففتُ عن أثوابه ولو أنني كنت المقطَّرَ بَزَّنِی أثوابی
لا تحسبُن الله خاذلَ دينه و نبِيه يا معشر الأحزاب(1)

اس نے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پتھر کی مدد کی اور میں نے وار کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کی۔ میں نے اسے دعوت مبارزت دی اور میں نے اسے یوں چھوڑا کہ وہ زین کے ساتھ لگا ہوا تھا جس طرح تنا ہوتا ہے نرم ریت اور اٹھی ہوئی زمین کے درمیان۔ میں نے اس کے لباس سے اپنا ہاتھ کھینچے رکھا اگر میں زمین پر پہلو کے بل گرا ہوتا تو وہ میرے کپڑے چھین لیتا۔ تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمان نہ کرو کہ وہ اپنے دین اور اپنے نبی کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا اے مختلف جماعتوں کے گروہ!

ابن ہشام نے کہا: اکثر اہل علم ان اشعار کی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ ابن ہشام نے کہا: عکرمہ بن ابی جہل نے اس روز اپنا نیزہ پھینکا جب کہ وہ عمرو کو چھوڑ کر بھاگنے والا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کہا:

فَرَّ وألقَى لنا رُمحَه لعلّك عِكرِمَ لم تَفعلِ
ووليت تعدو كعَدْوِ الظَّلِيـ يم ما إن تجور عن المَعْدِلِ
ولم تُلق ظهرك مستأنسا كأن قَفاك قَفا فُرْعُلْ

وہ بھاگا اور اس نے ہمارے لیے اپنا نیزہ پھینک دیا اے عکرمہ! شاید تو نے ایسا نہیں کیا تو ظلیم کی طرح بھاگتے ہوئے مڑ گیا تو معدل پھرنے کی جگہ سے نہیں بھاگتا تھا۔ تو اپنی پشت خوشی سے سامنے نہیں کرتا گویا تیری گدی فرعل کی گدی ہے۔

ابن ہشام نے کہا: فرعل چھوٹا بجو ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بنی حارثہ کے قلعہ میں تھیں حضرت سعد بن معاذ کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1512

والدہ آپ کے ساتھ تھیں حضرت سعد نے ایسی ذرہ زیب تن کر رکھی تھی جو بڑی گھنی تھی۔ اس سے آپ کا بازو باہر تھا ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ تھا۔ وہ کہہ رہے تھے:

لَبِثْ قليلًا يلحق الهَيْجَا حَمَلْ لا بأس بالموت إذا كان الأجَلْ(1)

اس روز حضرت سعد بن معاذ کو ایک تیر مارا گیا جس نے ان کے بازو کی درمیانی رگ کو کاٹ دیا جس نے تیر مارا اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حبان بن قیس بن عرفہ نے تیر مارا جو بنی عامر بن لؤی کا ایک فرد تھا۔ جب اس نے تیر مارا تو اس سے کہا: خذها وأنا ابن العرقه اسے لو میں ابن عرفہ ہوں۔ حضرت سعد نے اسے کہا: عرق الله وجهك فی النار اللہ تعالیٰ تیرے چہرے کو آگ میں شرابور کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس شخص نے آپ کو تیر مارا وہ خفاجہ بن عاصم بن حبان تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے آپ کو تیر مارا وہ ابواسامہ جشمی تھا، جو بنو مخزوم کا حلیف تھا۔ حضرت حسان کی حضرت صفیہ بنت عبد المطلب کے ساتھ ایک دلچسپ گفتگو ہے جسے ابن اسحاق اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔

حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا نے کہا: ہم غزوۂ احزاب کے موقع پر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعہ میں تھے۔ حضرت حسان ہمارے ساتھ عورتوں اور بچوں میں تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ دشمن کے سامنے تھے وہ ہماری طرف نہیں آسکتے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک یہودی وہاں چکر لگا رہا ہے۔ میں نے حضرت حسان سے کہا: اس کی طرف جاؤ اور اسے قتل کر دو، انہوں نے کہا: اے بنت عبد المطلب! میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔ حضرت صفیہ نے خیمہ کے ستون کی ایک لکڑی لی آپ نیچے اتریں اور اسے قتل کر دیا۔ میں نے کہا: اے حسان! نیچے جاؤ اور اس کا لباس چھین لو مجھے کوئی چیز اس کا لباس و اسلحہ چھیننے سے نہیں روکتی تھی مگر یہ کہ وہ ایک مرد ہے۔ حضرت حسان نے کہا: اے بنت عبد المطلب! مجھے اس کے کپڑے چھیننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو میں نیچے اتری اور اس کا اسلحہ وغیرہ لے لیا۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: اہل سیر میں سے ایک جماعت نے اس کا انکار کیا انہوں نے کہا: اگر حضرت حسان میں وہ بزدلی ہوتی جس کا تم نے ذکر کیا ہے تو اس بارے میں وہ لوگ ان کی ہجو کرتے جن کی حضرت حسان دور جاہلیت اور دور اسلام میں ہجو کیا کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے ان کے بیٹے عبد الرحمن کی ہجو کی جاتی کیونکہ حضرت حسان عرب شعراء میں سے کثیر لوگوں کی ہجو کیا کرتے تھے جس طرح نجاشی وغیرہ۔

**مسئلہ نمبر 6۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نعیم بن مسعود بن عامر اشجعی حاضر ہوا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمان ہو چکا ہوں میری قوم میرے اسلام لانے سے آگاہ نہیں مجھے جو چاہیں حکم دیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''تو غطفان کا ایک آدمی ہے اگر تو چلا جائے اور ہم سے الگ تھلگ ہو جائے اگر تو طاقت رکھے تو یہ امر ہمارے نزدیک تیرے ہمارے ساتھ باقی رہنے سے زیادہ پسندیدہ ہے تو چلا جا بے شک جنگ ایک چال ہے''(2)۔

نعیم بن مسعود وہاں سے نکلے اور بنو قریظہ کے پاس آئے یہ دور جاہلیت میں ان کے دوست تھے کہا: اے بنو قریظہ! تم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1515 2۔ السیرۃ النبویۃ، جلد 3، صفحہ 171، انوار محمدیہ قاہرہ

اپنے لیے میری محبت کو پہچانتے ہو۔ اور میرے اور تمہارے درمیان جو تعلقات ہیں انہیں بھی جانتے ہو۔ انہوں نے کہا: کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو تو ہمارے نزدیک ایسا نہیں جس پر تہمت لگائی جائے۔ نعیم بن مسعود نے انہیں کہا: قریش اور غطفان ان کی حالت اس طرح نہیں جس طرح تمہاری حالت ہے ملک تمہارا ہے اس میں تمہاری اولادیں، تمہارے بیٹے اور تمہاری عورتیں ہیں۔ قریش اور غطفان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں جب کہ تم نے ان کی مدد کی ہے مگر انہوں نے کوئی موقع پایا تو وہ اس سے فائدہ اٹھالیں گے اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو وہ اپنے اپنے ملکوں کو چلے جائیں گے اور تمہارے اور اس ہستی کے درمیان میدان خالی چھوڑ دیں گے، جب کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس طاقت نہیں تم قوم کے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو یہاں تک کہ تم ان سے کوئی چیز رہن رکھو۔ پھر وہ وہاں سے نکلے اور قریش کے پاس آئے ان سے کہا: اے قریش کی جماعت! تم اپنے لیے میری محبت کو جانتے ہو۔ اور حضرت محمد سے جو میری جدائی اور دوری ہے اسے بھی جانتے ہو۔ مجھے ایک خبر پہنچی ہے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اخلاص کے تعلقات کی بنا پر تم تک وہ پیغام پہنچاؤں۔ اسے اپنی ذات تک رکھنا۔ قریش نے کہا: ہم ایسا ہی کریں گے۔ کیا تم جانتے ہو یہودی اس بات پر شرمندہ ہیں جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ توڑا ہے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا ہے ہم اپنے کیے پر نادم ہیں کیا یہ بات آپ کو خوش کرتی ہے کہ ہم قریش و غطفان میں سے اشراف کو پکڑیں اور آپ کے حوالے کر دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ پھر ہم آپ کے ساتھ رہیں یہاں تک کہ ان لوگوں کو نیست نابود کر دیں۔ پھر وہ غطفان کے پاس آئے اور اسی قسم کی گفتگو کی جب ہفتہ کی رات تھی یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول اور مومنوں کے لیے بڑا احسان ہوا کہ ابوسفیان نے عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے چند افراد کے ساتھ بنو قریظہ کی طرف بھیجا تاکہ انہیں کہیں: ہم اپنے گھر بیٹھے ہوئے نہیں۔ اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اگلے روز جنگ کے لیے نکلو تاکہ ہم (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اپنا حساب بے باک کریں۔ بنو قریظہ نے ان کی طرف پیغام بھیجا: یہ دن تو ہفتہ کا دن ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس نے ہفتہ کو حد سے تجاوز کیا اس وجہ سے ہمیں کیا مصیبت آئی۔ ساتھ ہی ساتھ ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں گے یہاں تک کہ تم ہمیں کوئی چیز رہن کے طور پر دو۔ جب قاصد اس پیغام کے ساتھ واپس آیا تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! نعیم بن مسعود نے ہم سے سچ کہا۔ اور قاصد ان کی طرف واپس بھیجے اور کہا: اللہ کی قسم! ہم کبھی بھی تمہیں رہن کے طور پر کوئی چیز نہیں دیں گے اگر چاہو تو ہماری مدد کے لیے جنگ کے لیے نکلو ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ بنو قریظہ نے کہا: اللہ کی قسم! نعیم بن مسعود نے سچ بولا۔ اللہ تعالیٰ نے سخت سردی کی راتوں میں تیز ہوا بھیجی ہوا ان کے برتنوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی اور ان کی ہانڈیوں کو الٹا رہی تھی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اختلاف کی خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان کو بھیجا تاکہ ان کی خبر لے آئیں۔ حضرت حذیفہ ان کے پاس آئے اور ان کی انبوہ میں چھپ گئے۔ حضرت حذیفہ نے ابوسفیان کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے قریش کی جماعت! ہر آدمی اپنے ساتھی کی پہچان کر لے۔ حضرت حذیفہ نے کہا: میں نے اپنے

ساتھ بیٹھنے والے کا ہاتھ پکڑا اور کہا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں فلاں بن فلاں ہوں۔ پھر ابو سفیان نے کہا: اے قریش کی جماعت! تم ہلاک ہو۔ الله کی قسم! تم اپنے گھروں میں نہیں ہو۔ گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو رہے ہیں۔ بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ اور ہم نے یہ ہوا پائی ہے جسے تم دیکھ رہے ہو ہمارے لیے نہ خیمہ قائم رہتا ہے نہ ہنڈیا چولے پر ٹھہرتی ہے اور نہ ہی ہماری آگ جلتی ہے۔ چلو کوچ کرو میں تو کوچ کرنے والا ہوں۔ اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا اور اس کا ڈھنگا نہ کھولا مگر کھڑے کھڑے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ملحوظ نہ ہوتا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بھیجتے وقت لیا تھا مجھے فرمایا تھا: ''قوم کی طرف جاؤ، جس حالت پر وہ ہیں اس کو جانو اور کوئی نیا کام نہ کرنا''۔ تو میں تیر سے اسے قتل کر دیتا۔ پھر ان کے کوچ کے بعد میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہوئے نماز پڑھتے ہوئے پایا آپ کے جسم پر آپ کی ازواج میں سے کسی کی منقش چادر تھی۔ ابن ہشام نے کہا: مراجل سے مراد یمن کی منقش چادروں میں سے ایک قسم کی چادر ہے (1)۔ میں نے آپ کو خبر دی تو آپ نے الله تعالیٰ کی حمد کی۔

میں کہتا ہوں: حضرت حذیفہ کا یہ واقعہ صحیح مسلم میں مذکور ہے اس میں عظیم نشانیاں ہیں (2) اس واقعہ کو جریر نے اعمش سے وہ ابراہیم تیمی سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم حضرت حذیفہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے کہا: اگر میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پاتا تو میں آپ کی معیت میں جہاد کرتا اور اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا۔ حضرت حذیفہ نے کہا: تو ایسا کرتا۔ ہم نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیلۃ الاحزاب کو اپنے آپ کو دیکھا ہمیں سخت آندھی اور ٹھنڈک نے آلیا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو میرے پاس قوم کی خبر لائے الله تعالیٰ قیامت کے روز اسے معیت عطا کرے گا''۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ اور ہم میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ فرمایا: ''اے حذیفہ! اٹھو اور ہمارے پاس قوم کی خبر لاؤ''۔ جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لیا تو میرے لیے اٹھنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا۔ فرمایا: ''جاؤ اور قوم کی خبر میرے پاس لاؤ۔ انہیں خوفزدہ کر کے میری طرف متوجہ نہ کر دینا''۔ کہا: جب میں آپ کے پاس سے اٹھا تو گویا میں حمام میں چل رہا تھا یہاں تک کہ میں ان کے پاس پہنچا میں نے ابو سفیان کو دیکھا جو آگ سے اپنی پشت کو تاپ رہا تھا۔ میں نے تیر کمان پر چڑھایا تو میں نے اسے تیر مارنے کا ارادہ کیا تو مجھے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آ گیا۔ ولا تذعرھم علی انہیں خوفزدہ کر کے میری طرف متوجہ نہ کرنا۔ اگر میں اس کو تیر مارتا تو اس کو مار سکتا تھا۔ میں واپس پلٹا میں اس طرح چل رہا تھا جس طرح حمام میں چلتا ہوں جب میں آپ کے پاس آیا تو میں نے قوم کے معاملات کا بتایا۔ میں فارغ ہوا تو مجھے ٹھنڈ لگنا شروع ہو گئی۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے باقی ماندہ چادر اوڑھا دی جس میں آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں سویا رہا یہاں تک کہ میں نے صبح کی۔ جب میں نے صبح کی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قم یا نومان اے سونے والے اٹھو۔ جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی تو لشکر جا چکے تھے۔ آپ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹے اور مسلمانوں نے اپنا اسلحہ رکھ دیا تو حضرت جبریل امین حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں آئے آپ ایک خچر پر سوار تھے جس پر ریشم کا ایک کپڑا تھا حضرت جبریل امین نے آپ

---

1۔ السیرۃ النبویۃ، جلد 3، صفحہ 174

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 107

سے عرض کی: اے محمد! اگر تم نے اپنا اسلحہ اتار دیا ہے تو فرشتوں نے اپنا اسلحہ نہیں اتارا۔ اللہ تعالیٰ تجھے حکم دیتا ہے کہ بنو قریظہ کی طرف نکلیں میں ان کی طرف جانے والا ہوں اور ان پر ان قلعوں کو جھنجھوڑنے والا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک منادی کو حکم دیا، تو اس نے نداکی یہی؛ آٹھواں مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ کوئی آدمی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ کے علاقہ میں نماز پڑھے (1)؛ کچھ لوگوں کو خوف ہوا کہ وقت فوت ہو جائے گا تو انہوں نے بنو قریظہ کے علاقہ سے پہلے ہی نماز پڑھ لی۔ دوسروں نے کہا: ہم عصر کی نماز نہیں پڑھیں گے مگر جب رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیں اگرچہ وقت فوت ہو جائے رسول اللہ ﷺ نے کسی فریق کے بارے میں سختی نہ کی۔ اس میں یہ فقہی حکم ملتا ہے کہ مجتہد جس نتیجہ پر پہنچے وہ درست ہے۔ یہ بحث سورۃ الانبیاء میں گزر چکی ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جب تیر لگا تو آپ نے اپنے رب سے دعا کی عرض کی: اے اللہ! اگر تو نے قریش کے ساتھ جنگ کو باقی رکھا ہے تو مجھے بھی اس کے لیے باقی رکھ کیونکہ کوئی ایسی قوم نہیں جس سے میں جہاد کرنا پسند کرتا ہوں اس قوم سے بڑھ کر جس نے تیرے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور آپ کو آپ کے وطن سے نکالا۔ اے اللہ! اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کو ختم کر دیا تو اسی زخم کو میرے لیے شہادت بنا دے اور مجھے موت عطا نہ کر یہاں تک کہ بنو قریظہ سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں (2)۔

ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے گزرے جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ قلعہ فارع میں اور بھی عورتیں تھیں جب کہ آپ کے جسم پر گھنی بنی ہوئی زرہ تھی جس کی آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ آپ پر زردی کے آثار تھے اور آپ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

لَبِثْ قليلًا يُدْرِكِ الهَيْجَا حَمَلْ	لا بأس بالموت إذا حان الأَجَلْ

تھوڑا ٹھہر کہ جنگ حمل کو پالے موت میں کوئی حرج نہیں جب اجل کا وقت آچکا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضرت سعد کے بارے میں مجھے یہی خوف تھا کہ آپ کی اطراف سے ہی کوئی تیر لگے گا تو آپ کی اکحل (بازوؤں کی درمیانی رگ) میں تیر لگا (3)۔

ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے سوا حضرت سعد بن معاذ سے بڑھ کر کوئی خوبصورت مرد نہیں دیکھا۔ ان کی اکحل میں تیر لگا۔ آپ نے دعا کی: اگر قریظہ سے جنگ میں کوئی چیز باقی نہیں بچی تو مجھے قبض کر لے اگر کوئی چیز باقی ہے تو مجھے باقی رکھ یہاں تک کہ میں تیرے رسول کے ساتھ آپ کے دشمنوں سے جنگ کروں۔ جب بنو قریظہ کا فیصلہ ہو چکا تو آپ کا وصال ہو گیا۔ لوگ خوش ہوئے اور کہا: ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ کی دعا قبول ہوئی (4)۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، جلد 2، صفحہ 591	2۔ السیرۃ النبویۃ، جلد 3، صفحہ 169

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1514	4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1515

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب مسلمان بنو قریظہ کی طرف نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا کو جھنڈا عطا فرمایا اور مدینہ طیبہ پر حضرت ابن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر کیا حضرت علی شیر خدا اور ان کے ساتھ ایک طائفہ اٹھا یہاں تک کہ بنو قریظہ تک پہنچے اور انہیں اپنے قلعوں سے نیچے اترنے کا کہا اور انہوں نے سنا بنو قریظہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے رہے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واپس پلٹ آئے۔ عرض کی: ان تک نہ پہنچے اور اشارۃً بات کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: ''میرا گمان ہے تو نے ان سے سنا کہ وہ مجھے گالیاں دے رہے ہیں اگر وہ مجھے دیکھیں گے تو وہ اس چیز سے رک جائیں گے'' (1)۔ آپ ان کی طرف اٹھے جب یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو وہ رک گئے۔ انہیں ارشاد فرمایا: ''اے بندرو کے بھائیو! تم نے وعدہ خلافی کی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل و رسوا کیا اور تم پر اپنا عذاب نازل کر دیا''۔ انہوں نے کہا: تو جاہل نہیں اے محمد! ہم پر جہالت کی باتیں نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور بیس سے اوپر دن ان کا محاصرہ کیا۔

بنو قریظہ کے سردار کعب نے ان پر تین باتیں پیش کیں تاکہ ان میں سے جو چاہیں اپنا لیں۔ یا تو سب مسلمان ہو جاؤ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو ان باتوں میں جو وہ پیغام لائے ہیں اور سلامتی پائیں کہا: اپنے احوال، اپنی عورتیں اور اپنے بچے محفوظ کر لو، اللہ کی قسم! تم خوب جانتے ہو کہ یہ وہی ہے جسے تم اپنی کتابوں میں لکھا پاتے ہو۔ یا وہ اپنے بیٹوں اور اپنی عورتوں کو قتل کر دیں پھر وہ مسلمانوں کی طرف آگے بڑھیں تو وہ قتال کریں گے یہاں تک کہ ان کا آخری آدمی مر جائے یا ہفتہ کی رات مسلمانوں پر حملہ کر دیں جس رات انہیں حملہ سے اطمینان ہوگا، تو ان سب کو قتل کر دو۔ بنو قریظہ نے کعب سے کہا: جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ہم اسلام نہیں لائیں گے اور تورات کے حکم کی مخالفت نہیں کریں گے۔ جہاں تک ہمارا اپنے بیٹوں اور عورتوں کے قتل کا تعلق ہے تو ہمارے قتل کرنے سے ان مسکینوں کو ہماری طرف سے کیا جزا ملے گی۔ اور ہم ہفتہ کے روز تو حد سے تجاوز نہیں کریں گے۔ پھر انہوں نے حضرت ابولبابہ کو بلا بھیجا بنو قریظہ بنی عمرو بن عوف اور باقی اوس کے حلیف تھے۔ حضرت ابولبابہ ان کے پاس آئے بنو قریظہ نے اپنے بیٹے، اپنی عورتیں اور اپنے مرد سب ان کے لیے جمع کر دیئے انہوں نے حضرت ابولبابہ سے کہا: اے ابولبابہ! تمہاری کیا رائے ہے ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر اپنے قلعوں سے نیچے اتر آئیں؟ حضرت ابولبابہ نے فرمایا: ہاں۔ اور اپنے ہاتھ سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر حضرت ابولبابہ اس وقت شرمندہ ہوئے اور انہیں علم ہو گیا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے اور یہ ایسا امر ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے مخفی نہیں رکھے گا۔ حضرت ابولبابہ مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ لوٹے اور اپنے آپ کو ستون کے ساتھ باندھ دیا اور قسم اٹھائی کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لے۔ ان کی بیوی ہر نماز کے وقت انہیں کھول دیتی۔ ابن عیینہ اور دوسرے علماء نے کہا: انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ (الانفال: 27) (2) اور یہ

1۔ ... جلد 4، صفحہ 453 2۔ السیرۃ النبویہ، جلد 3، صفحہ 179

قسم اٹھائی کہ وہ بنو قریظہ کے علاقہ میں کبھی نہیں جائیں گے کیونکہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں ان سے گناہ سرزد ہوا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابولبابہ کے عمل کے بارے اطلاع ہوئی۔

فرمایا: ''خبردار اگر وہ میرے پاس آتا تو میں اس کے حق میں بخشش طلب کرتا جب اس نے یہ فعل خود کیا ہے تو میں اسے نہیں کھولوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے آزاد کر دے''(1) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہ کے بارے میں اس آیت کو نازل فرمایا: وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ (توبہ: 106) جب اس کے متعلق قرآن حکیم نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آزاد کرنے کا حکم دے دیا جب بنو قریظہ نے صبح کی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر قلعوں سے نیچے اتر آئے۔ قبیلہ اوس کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیڑ کر لی۔ عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے حلیف ہیں آپ نے عبداللہ بن ابی بن سلول کی بنو نضیر کے بارے میں بات مانی جو خزرج کے حلیف تھے ہمارا حصہ و مقام کسی اور کے حصہ اور مقام سے کم نہیں یہ ہمارے حلیف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے قبیلہ اوس کی جماعت! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہیں میں سے ایک آدمی ان کے بارے میں فیصلہ کرے''(2)۔ انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں؟ فرمایا: ''یہ معاملہ حضرت سعد بن معاذ کے سپرد ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں ان کے لیے خیمہ لگوایا تھا تاکہ وہ زخم جو انہیں غزوہ خندق میں لگا اس کی قریب سے تیمارداری کر سکیں۔ حضرت سعد نے ان کے بارے میں فیصلہ کیا کہ ان میں سے جو جنگ کے قابل ہیں ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان پر کیا ہے''(3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حکم دیا تو انہیں اس جگہ کی طرف لے جایا گیا جہاں آج بازار ہے (مراد حضرت ابن اسحاق کے زمانہ میں جہاں بازار تھا) وہاں خندقیں کھودی گئیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو ان خندقوں میں ان کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ اس روز حیی بن اخطب اور کعب بن اسد کو قتل کر دیا گیا۔ یہ دونوں قوم کے سردار تھے۔ ان لوگوں کی تعداد چھ سے سات سو تھی۔ حیی پر گلابی رنگ کا حلہ تھا اس نے اس کو ہر جانب سے پورا پورا سوراخ کر دیا تھا تاکہ اس کو اس کے جسم سے اتارا نہ جائے۔ جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب اسے لایا گیا اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ رسی سے باندھے گئے تھے اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ کے ساتھ دشمنی پر اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا۔

ولکنه من یخذل الله یخذل (4)

لیکن جسے اللہ تعالیٰ بے یار و مددگار چھوڑ دے اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا: اے لوگو! اللہ کے حکم کے سامنے کسی کو مجال نہیں کتاب، تقدیر اور ملحمہ قتل بنی اسرائیل پر لکھا جا چکا تھا۔ پھر وہ بیٹھا اور اس کی گردن اڑا دی گئی۔ ان کی عورتوں میں سے صرف ایک عورت قتل کی گئی۔ یہ بنانہ تھی جو حکم قرظی کی بیوی تھی جس نے حضرت خلاد بن سوید پر چکی پھینکی تھی اور

1۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 171 2۔ ایضاً، جز 21، صفحہ 172 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

انہیں قتل کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بچوں میں سے ہر اس بچے کو قتل کرنے کا حکم دیا جس کے بال اگ آئے تھے اور جن کے بال نہیں اگے تھے ان کو چھوڑ دیا۔ عطیہ قرظی کے بال نہیں اگے تھے رسول اللہ ﷺ نے اسے زندہ رہنے دیا۔ اس کا ذکر صحابہ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثابت بن قیس بن شماس کو زبیر بن باطا کی اولاد ہبہ کی۔ انہوں نے انہیں زندہ رہنے دیا۔ ان میں عبدالرحمن بن زبیر مسلمان ہوا اور اس کو صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ حضور ﷺ نے رفاعہ بن سموءل قرظی، حضرت ام منذر سلمی بنت قیس کو ہبہ کیا جو سلیط بن قیس کی بہن تھی یہ بنونجار میں سے تھا یہ وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی نماز پڑھی حضرت رفاعہ مسلمان ہوئے انہیں صحابیت کا شرف حاصل ہے اور ان کی روایات بھی ہیں۔

ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس، ابن باطا کے پاس آئے ابن باطا کا حضرت ثابت پر احسان تھا۔ کہا: میں نے تجھے رسول اللہ ﷺ سے اس لیے بطور ہبہ طلب کیا تھا، کیونکہ تیرا مجھ پر ایک احسان تھا۔ ابن باطا نے کہا: کریم، کریم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا: ایک ایسا آدمی کس طرح زندگی بسر کرسکتا ہے جس کا نہ بچہ ہو اور نہ ہی بیوی ہو؟ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس کے بارے اس امر کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابن باطا کو اس کے بچے اور اس کی بیوی واپس کر دی۔ حضرت ثابت اس کے پاس آئے اور سب کچھ بتایا۔ اس نے کہا: ایک آدمی کیسے زندگی بسر کرسکتا ہے جس کے پاس مال ہی نہ ہو؟ حضرت ثابت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مال کا مطالبہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اس کا مال بھی دے دیا۔ حضرت ثابت اس کی طرف آئے اور اسے بتایا۔ اس نے پوچھا: ابن ابی حقیق کا کیا بنا جس کا چہرہ گویا چینی آئینہ تھا؟ آپ نے فرمایا: اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پوچھا مجلسان یعنی بنی کعب بن قریظہ اور بنی عمرو بن قریظہ کا کیا ہوا؟ فرمایا: وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ اس نے پوچھا: دونوں جماعتوں کا کیا ہوا؟ فرمایا: دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس نے کہا: میں تیرے ذمہ سے بری ہوں میں کبھی بھی کھجوروں کے باغ کو پانی نہیں دوں گا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ لاحق کر دو۔ حضرت ثابت نے اسے قتل کرنے سے انکار کر دیا تو اسے کسی اور نے قتل کر دیا۔ ابن باطا کا حضرت ثابت پر جو احسان تھا وہ یہ کہ یوم بعاث کو ان کو قیدی بنا لیا گیا ابن باطا نے ان کی پیشانی کے بال کاٹے اور انہیں آزاد کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کے مال تقسیم کیے۔ آپ نے شاہسوار کو تین حصے اور پیدل کو ایک حصہ عطا فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شاہسوار کے لیے دو اور پیدل کے لیے ایک حصہ۔ اس دن مسلمانوں کے چھتیس گھوڑے تھے۔ ان کے قیدیوں میں سے رسول اللہ ﷺ کے حصہ میں ریحانہ بنت عمرو بن جنافہ جو بنی عمرو بن قریظہ میں تھی آئی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی رہی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وہ مال غنیمت تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے شاہسوار اور پیدل کے درمیان تقسیم کیا۔ یہ وہ پہلی غنیمت تھی جس میں خمس معین کیا۔ جب کہ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ پہلی غنیمت حضرت عبداللہ بن جحش کے لشکر سے حاصل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: اس میں تطبیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41)

آیت کے نازل ہونے کے بعد بنو قریظہ کی پہلی غنیمت تھی جس میں خمس جاری ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے پہلے اپنی مہم میں حاصل ہونے والے مال سے خمس عطا کیا تھا۔ پھر قرآن کا حکم اس طرح نازل ہوا جس طرح انہوں نے کیا۔ یہ چیز ان کے فضائل سے تعلق رکھتی ہے۔

قریظہ کی فتح 5ھ کے ذی قعدہ کے آخر اور ذی الحجہ کے آغاز میں ہوئی تھی۔ جب بنی قریظہ کا معاملہ مکمل ہوا تو فاضل، صالح حضرت سعد بن معاذ کی دعا قبول ہوئی ان کا زخم کھل گیا۔ ان کی رگ خون بہانے لگی۔ ان کا خون جاری ہو گیا اور وہ وصال کر گئے۔ یہی وہ ہستی ہیں جن کے بارے میں حدیث آئی ہے۔ اهتزلموته عرش الرحمن (1) یعنی عرش کے مکین یعنی فرشتے ان کی روح کے آنے کی وجہ سے خوش ہو گئے اور ان کی وجہ سے جھومنے لگے۔ ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے مجھے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا: حضرت سعد بن معاذ کے وصال پر ستر ہزار ایسے فرشتے نازل ہوئے جو اس سے قبل نازل نہیں ہوئے تھے (2)۔ امام مالک نے کہا: غزوۂ خندق کے موقع پر چار یا پانچ مسلمان شہید ہوئے۔

میں کہتا ہوں: غزوۂ خندق کے موقع پر چھ مسلمان شہید ہوئے جن کا ذکر سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ، ابو عمرو جو بنو عبدالاشہل میں سے تھے۔ حضرت انس بن اوس بن عتیک، عبداللہ بن سہل یہ دونوں بنی عبدالاشہل میں سے تھے حضرت طفیل بن نعمان، حضرت ثعلبہ بن غنمہ دونوں بنی سلمہ سے تعلق رکھتے تھے حضرت کعب بن زید جو بنو دینار بن نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک اجنبی تیر وہاں آپ کو لگا اور آپ کو قتل کر دیا۔ رضی اللہ عنہم۔

کفار میں سے تین آدمی قتل ہوئے: منبہ بن عثمان بن عبید بن سباق بن عبدالدار۔ اسے ایک تیر لگا جس وجہ سے وہ مکہ مکرمہ میں مر گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ عثمان بن امیہ بن منبہ بن عبید بن سباق تھا۔ نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی۔ یہ خندق میں داخل ہوا اور اس میں پھنس گیا اور قتل ہو گیا۔ مسلمان اس کے جسم پر غالب آ گئے۔ زہری نے روایت کی ہے کہ مشرکین نے اس کی لاش حاصل کرنے کے لیے دس ہزار درہم دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہمیں اس کی لاش اور اس کی قیمت سے کوئی غرض نہیں'' (3)۔ اور انہیں لاش لے جانے کی اجازت دے دی۔ عمرو بن عبدود جسے دعوت مبارزت کے بعد حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

غزوۂ قریظہ کے موقع پر مسلمانوں میں سے حضرت خلاد بن سوید بن ثعلبہ بن عمرو جو بنو حارث بن خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پر بنو قریظہ کی ایک عورت نے چکی پھینک دی تھی اور آپ کو قتل کر دیا تھا۔ محاصرہ کے موقع پر حضرت ابو سنان بن محصن بن حران اسدی، اخو عکاشہ بن محصن۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بنو قریظہ کے قبرستان میں دفن کیا جس میں مسلمان اپنی میتیں دفن کرتے ہیں جو وہاں آج رہتے ہیں۔ ان دو افراد کے علاوہ کوئی شہید نہ ہوا۔

غزوۂ خندق کے بعد قریش کے کفار نے مومنوں پر حملہ نہ کیا۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے کہ یزید

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، مناقب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 536

2۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1515

3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 1512

بن ہارون، ابن ابی ذہب سے وہ مقبری سے وہ عبدالرحمن بن ابی اسید خدری سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ غزوہ خندق کے موقع پر ہمارا محاصرہ کیا گیا یہاں تک کہ رات کا لمبا حصہ گزر گیا یہاں تک کہ ہماری کفایت کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ (الاحزاب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا انہوں نے اقامت کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی تو اس کو اچھی طرح پڑھایا جس طرح وقت میں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تو انہوں نے عصر کی اقامت کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تو انہوں نے مغرب کی اقامت کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغرب کی نماز پڑھائی پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تو حضرت بلال نے عشاء کی اقامت کہی تو آپ نے نماز پڑھائی (1)۔ یہ طریقہ اس سے قبل کا تھا جب یہ آیت نازل ہوئی فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (البقرہ:239) امام نسائی نے بھی اسے نقل کیا ہے یہ مسئلہ سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔ ہم نے اس غزوہ کے دس مسائل میں بہت سے احکام ان لوگوں کے لیے ذکر کر دیئے ہیں جو ان میں غور و فکر کریں۔ پھر ہم آیات کے ابتدائی حصہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ انیس آیات ہیں ان چیزوں کو ضمن میں لیے ہوئے ہیں جن کو ہم نے ذکر کیا ہے۔

اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ جنود سے مراد احزاب ہیں۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا مجاہد نے کہا: ریحا سے مراد صبا ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر لشکروں پر ہوا بھیجی گئی یہاں تک کہ اس نے ان کی ہانڈیوں کو الٹ دیا اور ان کے خیموں کو اکھیڑ دیا۔ کہا: جنود سے مراد فرشتے ہیں۔ انہوں نے اس روز جنگ نہیں کی تھی (2)۔ عکرمہ نے کہا: جنوب (ہوا) نے شمال (ہوا) سے احزاب والی رات کو کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کے لیے چل۔ شمال نے کہا: محوۃ (ہوا کا نام) رات کو نہیں چلتی۔ جو ہوا ان پر بھیجی گئی وہ صبا تھی (3)۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صبا سے میری مدد کی گئی اور دبور (ہوا) سے قوم عاد کو ہلاک کیا گیا'' (4)۔ یہ ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے معجزہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان احزاب کے بالکل قریب تھے۔ مسلمانوں اور احزاب کے درمیان صرف خندق تھی۔ مسلمان اس سے محفوظ تھے اور مشرکوں پر جو کچھ گزر رہی تھی اس کی انہیں کچھ خبر نہ تھی۔

وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا اسے یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی مشرکوں نے انہیں نہیں دیکھا۔ مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر فرشتے بھیجے۔ انہوں نے ان کی میخیں اکھیڑ دیں، خیموں کی رسیاں کاٹ دیں، آگ کو بجھا دیا، ہانڈیوں کو الٹ دیا، گھوڑے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب مسلط کر دیا۔ لشکر کے اردگرد فرشتے اللہ تعالیٰ کے نعرے کثرت سے لگانے لگے، یہاں تک کہ ہر خیمہ کا سردار کہتا: اے بنو فلاں! میری طرف آؤ، جب وہ جمع ہوتے تو وہ کہتا: النجاء النجاء بچاؤ بچاؤ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب کو بھیج دیا (5)۔

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، الاذان للفائت، جلد 1، صفحہ 108-107

2۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 214

3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 36-435

4۔ صحیح بخاری، بدء الخلق، فی قولہ تعالیٰ ھو الذی ارسل الریاح، جلد 1، صفحہ 455

5۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 436

وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا اسے یاء کے ساتھ یعملون پڑھا گیا ہے، یہ غائب کا صیغہ ہے یہ ابوعمرو کی قراءت ہے باقی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی جس نے خندق کو کھودا اور دشمنوں سے بچاؤ کیا۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝

''جب انہوں نے بلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے''۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ، اذ محل نصب میں ہے اس سے پہلے اذکر فعل محذوف ہے اسی طرح وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ (الاحزاب: 13) مِّنْ فَوْقِكُمْ وادی کے اوپر والے حصہ سے یہ مشرق کی جانب اس کا بالائی حصہ ہے۔ اس جانب سے مالک بن نصر، عیینہ بن حصن اہل نجد سے اور طلیحہ بن خویلد اسدی بنو اسد کے ساتھ گیا تھا۔ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وادی کے زیریں علاقہ سے جو مغرب کی جانب تھا، اس جانب سے ابوسفیان بن حرب اہل مکہ کے سردار کی حیثیت سے، یزید بن جحش قریش کے سردار کی حیثیت سے آیا۔ ابواعور اسلمی، اس کے ساتھ حیی بن اخطب یہودی بنی قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ ان کے ساتھ عامر بن طفیل تھا یہ خندق کی جانب سے آئے تھے۔

وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ جب آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آنکھیں جھک گئیں۔ خوف کی زیادتی کی وجہ سے دہشت زدہ ہو کر وہ دشمن کی طرف ہی متوجہ تھیں۔ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وہ سینوں میں اپنی جگہوں سے زائل ہو گئے تھے یہاں تک کہ حلقوم تک پہنچ گئے تھے۔ حناجر واحد حنجرة ہے (1)۔ اگر حلقوم اس سے تنگ نہ ہوتا تو دل باہر نکل جاتے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے: یہ عربوں کے مذہب کے مطابق مبالغہ کے معنی میں ہے اور کا دمضمر ہے کہا:

إذا ما غضبنا غضبة مضرية هتكنا حجاب الشمس أوقطرت دما

''جب ہم مضر غصہ میں ہوتے ہیں تو ہم سورج کے حجاب کو تار تار کر دیتے ہیں قریب ہوتا ہے کہ وہ خون گرانے لگے''۔

یہ کادت تقطر کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: پھیپھڑا خوف کے وقت پھول جاتا ہے اور دل اوپر کو اٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ قریب ہوتا ہے کہ وہ حلقوم تک جا پہنچے۔ اسی وجہ سے بزدل کے بارے میں کہا جاتا ہے: انتفخ سحرہ اس کا پھیپھڑا پھول گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خوف کی زیادتی میں ضرب المثل ہے کہ دل حلقوم تک پہنچ گئے، اگرچہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا کیونکہ زندگی باقی ہے؛ یہ معنی عکرمہ نے بیان کیا ہے (2)۔ حماد بن زید، ایوب سے وہ عکرمہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: خوف انتہا کو پہنچ گیا۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے اس سے مراد اضطراب قلب اور اس کا شدید دھڑکنا ہے، گویا وہ شدید اضطراب کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 379 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 80-379

وجہ سے حلقوم تک پہنچ گیا۔ حنجرہ اور حنجور (نون کی زیادتی کے ساتھ) سے مراد حلق کی ایک جانب ہے۔

وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا حضرت حسن بصری نے کہا: منافقوں نے گمان کیا کہ مسلمانوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے گا اور مومن امید رکھتے تھے کہ ان کی مدد کی جائے گی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مومنوں کو خطاب ہے یعنی تم نے کہا: حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ ہلاک ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: الظُّنُوْنَا، الرسول اور السبیلا کی قراءت میں قراء نے اختلاف کیا ہے۔ نافع اور ابن عامر نے وقف اور وصل دونوں صورتوں میں الف کو ثابت رکھا ہے۔ ابوعمرو اور کسائی سے یہ مروی ہے وہ مصحف، مصحف عثمان اور تمام شہروں میں جو مصاحف ہیں ان کے خط سے تمسک کرتے تھے۔ ابوعبید نے اسے اپنایا مگر کہا: قاری کو نہیں چاہیے کہ اس کے بعد بھی قراءت کرے بلکہ ان پر وقف کرے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ عرب اشعار کے قوافی اور ان کے مصرعوں میں اسی طرح کرتے ہیں۔ کہا:

نحن جلبنا القرح القوافلا تستشفر الأواخر الأوائلا

محل استدلال القوافلا اور الاوائلا ہے۔

ابوعمرو، حجدری، یعقوب اور حمزہ نے وصل اور وقف میں اس کے خلاف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ علماء نے کہا: یہ خط میں زائد ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: وَّلَاۡاَوۡضَعُوۡا خِلٰلَكُمۡ (التوبہ: 47) میں الف زائد کیا جاتا ہے وہ یوں ہے ولا أوضعوا انہوں نے اسے اسی طرح لکھا اس کے علاوہ بھی امثلہ ہیں، جہاں تک شعر کا تعلق ہے تو ضرورت کا محل ہے، کیونکہ اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ فصیح ترین لغت ہے اس میں کوئی ضرورت نہیں۔ ابن انباری نے کہا: جس نے الظنون، السبیل اور الرسول تینوں حروف کو الف کے بغیر پڑھا اور مصحف میں ان کا خط الف کے ساتھ ہے کیونکہ أطعنا میں الف اور الرسول، الظنون اور السبیل کے شروع میں جو داخل ہے یہ اس الف کو کفایت کر جاتا ہے جو اس کے آخر میں ہے۔ جس طرح ابوجاد کا الف ہواز (2) کے الف سے کفایت کر جاتا ہے۔ اس میں ایک اور دلیل ہے الف فتحہ کے قائم مقام ہے اور اس کے قائم مقام ہے جسے اس وقت حرکت کے سہارا کے لیے لاحق کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے ہو اس میں نیت سقوط کی ہوتی ہے۔ جب اس پر عمل کیا جائے تو الف فتحہ کے ساتھ ایک شے کی طرح ہو جائیں گے۔ وقف ان دونوں کے سقوط کو واجب کرے گا اور اس چیز میں عامل ہوگا کہ خط میں الف کی صورت بولنے میں اس کی حیثیت کو ثابت نہیں کرے گی۔ یہ اس الف کی طرح ہو جائے گی جو ساحران، فاطر السموات والارض، واعدنا موسیٰ اور ان کے مشابہ الفاظ میں ہے۔ جس سے الف کو خط میں حذف کر دیا جاتا ہے جب کہ وہ بولنے میں موجود ہوتا ہے جب کہ وہ لکھنے میں ساقط ہوتا ہے۔ اس میں ایک تیسری دلیل بھی ہے۔ یہ اس آدمی کی لغت پر لکھا گیا ہے جو یہ کہتا ہے: لقیت الرجلا اور اس کی لغت پر پڑھا گیا ہے جو کہتا ہے: لقیت الرجل

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 290

2۔ اس سے مراد ابجد، ہوز کے حروف ہیں ابجد کی اصل ابوجاد ہے اور ہوز کی اصل ھواز ہے۔ یعنی جب حرف کی ایک دفعہ مثال دے دی جائے تو دوبارہ سے غنی کر دیتی ہے۔

یعنی الف کے بغیر۔ احمد بن یحییٰ، اہل لغت کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں کہ وہ عربوں سے روایت کرتے ہیں: قام الرجلو واؤ کے ساتھ مررت برجلی یاء کے ساتھ وقف اور وصل دونوں صورتوں میں روایت کیا ہے۔ لقیت الرجلا دونوں حالتوں میں الف کے ساتھ روایت کیا۔ شاعر نے کہا:

أسائلةٌ عُميرةُ عن أبيها　خلالَ الجش تَعْتَرِف الرّكابا

کیا عمیرۃ اپنے باپ کے بارے لشکر کے درمیان پوچھتی ہے وہ سواروں کو پہچانتی ہے۔

الرکابا میں الف کو ثابت رکھا اس لغت پر بنا کی ہے۔ ایک اور نے کہا:

إذا الجوزاء أردفت الثريا　ظننت بآل فاطمة الظنونا

جب جوزاء ثریا کے پیچھے ہوا تو میں نے آل فاطمہ کے بارے میں گمانات کیے۔

محل استدلال الظنونا ہے یہ بنی نافع کی لغت کے اعتبار سے ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصن اور کسائی نے نصف میں الف ثابت رکھتے ہوئے اور وصل میں حذف کرتے ہوئے قراءت کی ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے الف کے بغیر وصل کیا اور الف کے ساتھ وقف کیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ استدلال کرے کہ سکتہ کے وقت وہ الف کا محتاج تھا مقصد فتحہ کی بقاء پر حرص ہے۔ اور الف اس فتحہ کا سہارا بنتا ہے اور اسے قوت بہم پہنچاتا ہے۔

## هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ⑪

''اس موقع پر خوب آزمالیا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے''۔

هُنَا یہ ظرف مکان قریب کے لیے ہے اور هُنَالِكَ ظرف مکان بعید کے لیے ہے۔ ھناك ظرف مکان درمیانی کے لیے ہے۔ اس کے ساتھ وقت کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے یعنی اس موقع پر مومنوں کو آزمایا گیا تاکہ مخلص منافق سے ممتاز ہو جائے۔ یہ آزمائش خوف، قتال، بھوک، محصوری اور دشمنوں کے آنے کی صورت میں تھی۔ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا یعنی انہیں حرکت دی گئی۔ زجاج نے کہا: مضاعف کا مصدر ضلال کے وزن پر ہوتا ہے۔ اس میں فاء کلمہ پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں، جس طرح یہ جملہ ہے: قلقلته قِلقالًا و قَلقالًا زلزلوا زِلزالًا و زَلزالًا کسرہ زیادہ مناسب ہے، کیونکہ غیر مضاف کا مصدر کسرہ کے ساتھ آتا ہے۔ جس طرح دحرجته دحراجا عام قراءت راء کے ساتھ ہے۔ عاصم اور حجدری نے راء کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ زِلْزَالًا ابن سیبویہ نے کہا: معنی ہے انہیں خوف کے ساتھ سخت حرکت دی گئی۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد انہیں اپنی جگہوں سے ہلانا ہے، یہاں تک کہ ان کے لیے کوئی چیز باقی نہ رہی مگر خندق کی جگہ (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس حالت پر وہ تھے اس سے ان کا مضطرب ہونا ہے۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جو اپنی ذات کے بارے میں مضطرب ہوئے اور کچھ اپنے دین کے بارے میں مضطرب ہوئے (2)۔ هُنَالِكَ یہ جائز ہے کہ اس میں ابتلی عامل ہے هُنَالِكَ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں عامل وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ہو اور ھنالك پر وقف کیا جائے گا۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 381　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 380

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫

''اور اس وقت کہنے لگے تھے منافق اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وہ وعدہ کیا تھا ہم سے (فتح کا) اللہ اور اس کے رسول نے مگر صرف دھوکہ دینے کے لیے''۔

مرض سے مراد شک اور نفاق ہے۔ غُرُوْرًا سے مراد باطل قول ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طعمہ بن ابیرق، معتب بن قشیر اور ایک جماعت جن کی تعداد ستر کے قریب تھی انہوں نے غزوہ خندق کے موقع پر کہا تھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسریٰ اور قیصر کے خزانوں کا کیسے وعدہ کرتے ہیں جب کہ ہم میں سے کوئی قضائے حاجت بھی نہیں کر سکتا؟ انہوں نے یہ بات اس وقت کی تھی جب صحابہ کرام میں یہ بات عام ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹان پر ضرب لگائی تھی جس طرح امام نسائی کی حدیث میں یہ پہلے گزر چکا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ⑬

''اور یاد کرو جب کہتی پھرتی تھی ان میں سے ایک جماعت کہ اے یثرب والو! تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں (جان عزیز ہے) تو لوٹ چلو (اپنے گھروں کو) اور اجازت مانگنے لگا ان میں سے ایک گروہ نبی کریم سے یہ کہہ کر (حضور) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے (اس بہانہ سازی سے) ان کا ارادہ محض (میدان جنگ سے) فرار تھا''۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا طائفہ کا لفظ ایک اور اس سے زائد افراد پر صادق آتا ہے یہاں اس سے مراد اوس بن قیظی ہے جو عرابہ بن اوس کا والد تھا جس کے بارے میں شماخ کہتا تھا:

إذا ما رايةٌ رُفعت لمَجد تلقاها عَرابةُ باليمين

بزرگی کے لیے جب بھی کوئی جھنڈا اٹھایا جاتا ہے تو عرابہ اسے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

یثرب سے مراد مدینہ طیبہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام طیبہ اور طابہ رکھا۔ ابو عبید نے کہا: یثرب ایک علاقہ کا نام ہے مدینہ اس کی ایک جانب واقع تھا (1)۔ سہیل نے کہا: اس کو یثرب نام اس لیے دیا گیا کیونکہ عمالقہ میں سے جو یہاں آکر اترا اس کا نام یثرب بن عمیل بن مہلائیل بن عوض بن عملاق بن لاوذ بن ارم تھا۔ ان اسماء میں سے بعض میں اختلاف ہے۔ بنو عمیل وہ ہیں جو جحفہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ اور سیلاب انہیں بہالے گیا تھا، اسی وجہ سے اسے جحفہ کا نام دیا گیا۔

لَا مُقَامَ لَكُمْ عام قراءت میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ حفص، سلمی، جحدری اور ابو حیوہ نے میم کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ اقام یقیم سے مصدر میمی ہے، یعنی یہاں کوئی اقامت نہیں یا یہاں کوئی جگہ نہیں جس میں تم ٹھہر سکو۔ جس نے میم کو فتحہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 446

دیا اس کے نزدیک یہ اسم مکان ہے یعنی یہاں کوئی جگہ نہیں جس میں تم ٹھہر سکو۔ فَارْجِعُوْا اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ۔ انہیں حکم دیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے بھاگ جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہودیوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے منافق ساتھیوں سے کہا: کون سی چیز تمہیں برانگیختہ کرتی ہے کہ تم اپنے آپ کو ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے ہلاک کرو؟ مدینہ کی طرف لوٹ جاؤ۔ بے شک ہم ان احزاب کے ساتھ ہیں پس تم امان میں ہو (1)۔

وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ ایک فریق نے مدینہ میں اپنے اپنے گھروں کی لوٹ جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول میں وہ بنو حارثہ بن حارث تھے (2)۔ یزید بن رومان نے کہا: یہ بات اوس بن قیظی نے اپنی قوم کے سرداروں سے کی تھی۔ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ الگ تھلگ اور ضائع ہونے والے ہیں وہ قلعہ میں نہیں۔ یہ اس گھر کو کہتے ہیں جو دشمنوں کے سامنے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: چوروں کے لیے وہاں چوری کرنا ممکن ہے کیونکہ وہ گھر مردوں سے خالی تھے۔ یہ کہا جاتا ہے: دار معورۃ و ذات عورۃ ایسے گھر کے لیے بولتے ہیں جب اس میں داخل ہونا آسان ہو جملہ کہا جاتا ہے: عوِر المکان عَوَرا فھو عوِر، بیوت عوِرۃ، وأعور فھو معور ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عوِرۃ ہے جس کا معنی ذات عورۃ ہے ہر وہ مکان جہاں جانے میں رکاوٹ نہ ہو اور کوئی پردہ نہ ہو تو وہ عورۃ کہلاتا ہے؛ یہ ہروی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، مجاہد اور ابو رجا عطاردی نے پڑھا (3) عوِرۃ یعنی جس کی دیواریں چھوٹی اور ان میں سوراخ ہوں۔ عرب کہتے ہیں: دار فلان عورۃ جب وہ قلعہ نما نہ ہو۔ قد اعور الفارس جب تلوار کا وار کرنے اور نیزہ مارنے میں کوئی نقص ظاہر ہو۔ شاعر نے کہا:

متی تَلْقھم لم تَلْقَ فی البیت مُعْوِرًا ولا الضیفَ مفجوعاً والاالجار مُرْمِلاَ

جب تو انہیں ملے گا تو تو انہیں گھر میں معور نہیں ملے گا، یعنی اس کے ذار میں کچھ نقص نہ ہوگا۔

جوہری نے کہا: عورۃ اس کجی کو کہتے ہیں جس سے ڈرا جاتا ہے خواہ وہ سرحد میں ہو یا جنگ میں ہو۔ نحاس نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے اعور المکان جب اس میں کوئی خلل واقع ہو۔ اعور الفارس جب اس میں نقص کی جگہ واضح ہو۔ مہدوی نے کہا: جس نے عورۃ میں واؤ کو کسرہ دیا تو یہ شاذ ہے۔ اس کی مثل ان کا قول ہے رجل عور یعنی اس کے لیے کوئی چیز نہیں۔ قیاس تو یہ تھا کہ اس میں تعلیل کی جاتی تو کہا جاتا: عار، کیوم راح، ورجلٍ مالٍ یہ اصل میں روح اور مول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ انہوں نے جو کچھ ذکر کیا ان کو جھٹلانے اور ان کا رد کرنے کے لیے یہ کہا۔ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا وہ بھاگ جانے کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قتل سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دین سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ نقاش نے کہا: یہ آیت انصار کے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی، بنو حارثہ اور بنو سلمہ (4)۔ انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ غزوہ خندق کے موقع پر اپنے مراکز کو ترک کر دیں۔ انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 448 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 383 4۔ ایضا

(آل عمران:122) جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے کہا: ہم نے جو ارادہ کیا تھا وہ ہمیں کوئی دکھ نہیں دیتا جب اللہ تعالیٰ ہمارا ولی ہے۔ سدی نے کہا: جن لوگوں نے اجازت طلب کی تھی ان میں دو آدمی انصار میں سے بنو حارث سے تعلق رکھتے تھے (۱) ابو عرابہ بن اوس (۲) اوس بن قیظی۔ ضحاک نے کہا: اسی آدمی بغیر اجازت کے لوٹ آئے تھے (1)۔

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾

''اور اگر گھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کی اطراف سے پھر ان سے درخواست کی جاتی فتنہ انگیزی میں شرکت کی تو فوراً اسے قبول کر لیتے اور توقف نہ کرتے اس میں مگر بہت کم''۔

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا، ہا ضمیر سے مراد بیوت ہیں یا مدینہ ہے یعنی ان کی اطراف اور جوانب سے۔ واحد قطر ہے جس کا معنی جانب اور ناحیہ ہے۔ اسی طرح قتر یہ بھی قطر میں ایک لغت ہے۔ ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا تو وہ اس میں آ پڑے۔ یہ نافع اور ابن کثیر کی قراءت قصر کے ساتھ ہے باقی قراء نے اسے جر کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اپنی جانب سے وہ اسے دیتے۔ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا گیا اور ان سے شرک کا مطالبہ کیا گیا ہر کسی نے وہ بات مان لی جس کا اس سے مطالبہ کیا گیا مگر حضرت بلال۔ اس میں مد کی قراءت کی دلیل ہے۔ جس کا معنی عطا کرنا ہے قصر کی قراءت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ (الاحزاب:15) یہ لاتوھا میں ہمزہ کے مقصور ہونے پر دال ہے۔ فتنہ کی یہاں دو توجیہیں ہیں: (۱) ان سے عصبیت کی وجہ سے سوال کیا جائے تو وہ اس میں جلدی کرتے ہیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے (۲) ان سے یہ شرک کا مطالبہ کیا جائے تو وہ جلدی سے اسے قبول کر لیتے ہیں، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے (2)۔

وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ وہ کفر کے بعد مدینہ طیبہ میں تھوڑا ہی ٹھہرتے یہاں تک کہ ہلاک ہو جاتے؛ یہ سدی، قتیبی، حضرت حسن بصری اور فراء کا قول ہے (3)۔ اکثر مفسرین نے کہا: فتنہ شرک سے تھوڑے ہی بچتے اور شرک کی دعوت کو بہت جلد قبول کرتے۔ یہ ان کی نیتوں کے ضعف اور نفاق کی زیادتی کی وجہ سے تھا۔ اگر دشمن کے لشکر ان کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے تو وہ کفر کو ظاہر کر دیتے۔

وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

''حالانکہ یہی لوگ پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے''۔

وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ غزوۂ خندق سے پہلے اور غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا۔ قتادہ نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غزوۂ بدر سے غائب رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو جو کرامت اور نصرت عطا کی تھی اس کو

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 282　2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 291　3۔ ایضاً

انہوں نے دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا: اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنگ کا موقع دیا تو ہم ضرور جنگ کریں گے (1)۔ یزید بن رومان نے کہا: وہ بنو حارثہ تھے انہوں نے غزوۂ احد کے موقع پر بنو سلمہ کے ساتھ مل کر بزدلی کا ارادہ کیا تھا۔ جب ان کے بارے میں نازل ہوا جو نازل ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس چیز کا ذکر کیا جو انہوں نے اپنی طرف سے پیش کیا تھا (2)۔

**وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا** اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مقاتل اور کلبی نے کہا: وہ ستر افراد تھے انہوں نے لیلۃ العقبہ کو نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انہوں نے عرض کی: اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے شرطیں لگا لو جو بھی آپ چاہیں۔ فرمایا: ''میں اپنے رب کے لیے شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے۔ اور میں اپنے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری حفاظت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی عورتوں، اپنے اموال اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہو''۔ انہوں نے عرض کی: یا نبی اللہ! اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمارے لیے کیا ہوگا۔ فرمایا: ''تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں جنت ہوگی'' (3)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے یہی مراد ہے: **وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا** یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس بارے میں پوچھے گا۔

**قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٦﴾**

''فرمادیجئے: (اے بھگوڑو!) تمہیں نفع نہیں دے گا بھاگنا اگر تم بھاگنا چاہتے ہو موت سے یا قتل سے اور (اگر بھاگ کر تم نے جان بچا بھی لی) تو تم لطف اندوز نہ ہو سکو گے مگر تھوڑی مدت''۔

جس کی اجل آجائے گی وہ مر جائے گا یا قتل ہو جائے گا تو بھاگنا اسے کوئی نفع نہیں دے گا۔ پس بھاگنے کے بعد تم دنیا میں تھوڑا عرصہ ہی لطف اندوز ہو گے یہاں تک کہ تمہاری آجال پوری ہو جائیں گی۔ ہر وہ چیز جو آنے والی ہو وہ قریب ہی ہوتی ہے۔ ساجی نے یعقوب حضرمی سے روایت نقل کی ہے وَ اِذًا لَّا يُمَتَّعُوْنَ یاء کے ساتھ ہے۔ بعض روایات میں ہے واذا لا تُمتعوا، اذا کے ساتھ منصوب ہے رفع اس معنی میں ہے ولا تمتعون اور اذا ملغی ہے۔ اس کو عامل بنانا بھی جائز ہے۔ یہ اس کا حکم اس وقت ہوگا جب اس سے پہلے واؤ اور فاء ہو۔ جب اس سے کلام شروع ہو تو تو اس کے ساتھ نصب دے گا تو تو کہے گا: اذا اکرمک۔

**قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿١٧﴾**

''فرمائیے: کون بچا سکتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اگر وہ عذاب دینے کا ارادہ کرلے یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے، اور نہیں پائیں گے وہ لوگ اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار''۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے تمہیں کون بچائے گا؟ اگر وہ تمہارے بارے میں ہلاکت کا ارادہ کرلے۔ رَحْمَةً سے مراد خیر، مدد اور

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 447 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

عافیت ہے۔ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا یعنی نہ وہ ایسا قریبی پائیں گے جو انہیں نفع دے اور نہ ایسا مددگار پائیں گے جو ان کی مدد کرے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾

''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاد سے روکنے والوں کو تم میں سے اور انہیں جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں (اسلامی کیمپ چھوڑ کر) ہماری طرف آ جاؤ اور خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر برائے نام''۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ تم میں سے جو لوگ آڑے آتے ہیں کہ وہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روکیں یہ عاقنی من کذا سے مشتق ہے یعنی اس نے مجھے فلاں سے پھیر دیا۔ عوّق، یہ کثرت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا یہ اہل حجاز کی لغت کے مطابق ہے۔ دوسرے کہتے ہیں: هلمّوا یہ جماعت کے لیے ہے۔ هلمّی یہ عورت کے لیے۔ کیونکہ اصل میں ہا تنبیہ کے لیے ہے اس کے ساتھ لم ملا دیا گیا ہے پھر تخفیف کے لیے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اسے مبنی بر فتحہ بنایا گیا ہے اس میں کسرہ اور ضمہ جائز نہیں کیونکہ یہ منصرف نہیں۔ ھلم کا معنی اقبل ہے یعنی آؤ۔ یہ دو گروہ تھے یعنی تم میں سے وہ لوگ ہیں جو روکتے ہیں۔ عوق کا معنی روکنا اور پھیرنا ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے عَاقَهٗ يَعُوْقُهٗ عوقا، عوقه اعتاقة سب ایک معنی میں ہیں۔ مقاتل نے کہا: وہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی تھے جو سب منافق تھے۔

وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ ان کے بارے میں تین قول ہیں: (۱) وہ منافق تھے انہوں نے مسلمانوں سے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بہت ہی تھوڑے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی ہلاک ہونے والے ہیں۔ پس ہماری طرف آ جاؤ (۲) وہ بنو قریظہ کے یہودی تھے۔ انہوں نے اپنے منافق بھائیوں سے کہا: ہمارے پاس آ جاؤ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ وہ تو ہلاک ہونے والے ہیں اگر ابو سفیان کامیاب ہو گیا تو تم میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ (۳) ابن زید نے جو بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک نیزوں اور تلواروں کے درمیان تھے اس کے حقیقی بھائی نے اسے کہا: میری طرف آ جاؤ۔ تیرے اور تیرے ساتھی کو گھیر لیا گیا ہے اس صحابی نے کہا: تو نے جھوٹ بولا ہے۔ اللہ کی قسم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے بارے میں آگاہ کروں گا۔ وہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گیا تا کہ آپ کو بتائے تو اس نے پایا کہ حضرت جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لا چکے ہیں: قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا۔ ماوردی اور ثعلبی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (1)۔ اس کے الفاظ ہیں: ابن زید نے کہا: یہ احزاب کا دن ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک صحابی چلا تو اس نے اپنے بھائی کو پایا کہ اس کے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور نبیذ ہے۔ اس صحابی نے کہا: تو اس حال میں ہے جب کہ ہم نیزوں اور تلواروں کے درمیان وقت گزار رہے ہیں؟ اس نے کہا: میرے پاس آ جاؤ تحقیق تجھے اور تیرے ساتھیوں کو گھیر لیا گیا ہے وہ ذات جس کی تو قسم اٹھاتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اب کبھی بھی مستحکم نہ ہوگا۔ فرمایا: تو نے جھوٹ بولا۔ وہ صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 384

تا کہ سب کچھ بتائے تو حضرت جبریل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ وَلَا يَأْتُوْنَ الْبَأْسَ اِلَّا قَلِيْلًا وہ موت کے ڈر سے جنگ میں بہت ہی کم شامل ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جنگ میں ریاکاری اور شہرت کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ⑲

''پرلے درجے کے کنجوس ہیں تمہارے معاملہ میں جب خوف (ودہشت) چھا جائے تو آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں گے وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے، بڑے حریص ہیں مال غنیمت کے حصول میں (درحقیقت) یہ لوگ ایمان ہی نہیں لے آتے پس اللہ تعالیٰ نے ضائع کر دیئے ہیں ان کے اعمال اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے''۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ تم پر بخیل ہیں خندق کھودنے میں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہاری معیت میں جنگ کرنے میں بخیل ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے فقراء اور مساکین پر خرچ کرنے میں بخیل ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے (2): جب وہ غنیمت کا مال پاتے ہیں تو اس کے بارے میں بڑے بخیل ہوتے ہیں، یہ سدی کا قول ہے۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: فراء کے نزدیک اس پر نصب چار وجوہ سے ہے: (۱) یہ مذمت کے طور پر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کے نزدیک نصب یعوقون أشحة کے معنی میں ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام ہو القائلین أشحة اس کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ کلام یوں ہو: ولا یأتون البأس إلا قليلًا أشحة یعنی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو وہ غنیمت کے مال کے بارے میں فقراء پر بخل کرنے والے ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اس میں المعوقین کا عامل ہونا جائز نہیں اور نہ ہی القائلین کا عامل ہونا جائز ہے تا کہ صلہ اور موصول کے درمیان فاصلہ نہ کیا جائے۔ ابن انباری نے کہا: إلا قليلا غیر تام ہے۔ کیونکہ أشحة اول کے متعلق ہے یہ چار وجوہ سے منصوب ہے: (۱) یہ المعوقین سے الگ ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔ گویا فرمایا: قد يعلم الله الذين يعوقون عن القتال ويشحون عن الانفاق على فقراء المسلمين۔ یہ بھی جائز ہے کہ القائلین سے الگ ہونے کی وجہ سے منصوب ہو، یعنی وهم أشحة۔ یہ بھی جائز ہے یاتون میں جو ہے اس سے الگ ہونے کی وجہ سے منصوب ہو، گویا فرمایا: ولا یاتون البأس إلا جبناء بخلاء۔ یہ بھی جائز ہے کہ ذم کے طریقہ پر أشحة منصوب ہو۔ اس چوتھی وجہ سے اِلَّا قَلِيْلًا، اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ پر وقف کرے یہ اچھا وقف ہے اس کی مثل اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ، سَلَقُوْكُمْ میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے یہی اس میں عامل ہے۔

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ان کی صفت جبن (بزدلی)

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 385 2۔ ایضاً

سے لگائی ہے۔ بزدل کا یہی طریقہ ہوتا ہے وہ دائیں بائیں اپنی نظر کو تیز کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ بعض اوقات اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ الخوف میں دو وجوہ ہیں: (۱) جب دشمن آگے بڑھے تو دشمن سے جنگ کرنے کی وجہ سے (1)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ (۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خوف کی وجہ سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غالب آئیں؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے (2)۔ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ پہلے قول کے مطابق جنگ سے خوف کھانے کی بنا پر۔ اور دوسرے قول کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خوف کی وجہ سے۔ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ ان کی آنکھیں گھومتی ہیں کیونکہ ان کی عقلیں جا چکی ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ کسی طرف بھی صحیح نہیں دیکھتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں شدید خوف لاحق ہوتا ہے وہ ڈرتے ہیں کہ انہیں ہر جانب سے قتل کا وار ہو سکتا ہے (3)۔

فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ فراء نے کہا: یہ صلقوکم ہے یعنی صاد کے ساتھ ہے۔ جب خطیب بلیغ ہو تو اس کو خطیب مسلاق اور مصلاق بولتے ہیں صلق کا اصل معنی آواز ہے۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لعن الله الصالقة والحالقة والشاقة (4) اللہ تعالیٰ کی ایسی عورت پر لعنت ہو جو مصیبت کے وقت چلا کر روئے، بال منڈائے اور گریبان پھاڑے۔

اعشیٰ نے کہا:

فیھم المجد والسماحة والنجدة فیھم والخاطب السلاق (5)

ان میں بزرگی، سخاوت اور شرافت ہے اور بلند آواز والا خطیب ہے۔

قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہوں نے غنیمت کا مال تقسیم ہوتے وقت، تمہارے بارے میں اپنی زبانوں کو لمبا کیا۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں عطا کیجئے ہمیں عطا کیجئے ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ غنیمت کے وقت لوگوں میں سب سے بخیل اور سب سے زیادہ زبان دراز ہیں اور جنگ کے وقت لوگوں میں سے سب سے بزدل اور سب سے زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس کے بعد اَشِحَّةً عَلَى الْخَیْرِ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ تمہارے ساتھ جھگڑنے اور دلیل قائم کرنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ قتبی نے کہا: وہ شدید کلام کے ساتھ تمہیں اذیت دیتے ہیں۔ سلق کا معنی اذیت ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

ولقد سلقنا ھوازنا بنو أھلٍ حتی انجینا (6)

تحقیق ہم نے ہوازن کو اذیت دی جو بنو اہل ہیں یہاں تک ہم مڑ آئے۔

اَشِحَّةً عَلَى الْخَیْرِ مال غنیمت پر بخیل؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے (7)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرنے والے ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے (8)۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ یُؤْمِنُوْا وہ اپنے دلوں سے ایمان نہیں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 385 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، ما نہی عن الحلق عند المصیبة، جلد 1، صفحہ 173 5۔ السیرۃ النبویۃ، جلد 3، صفحہ 188
6۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 386 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

لائے تھے، اگرچہ بظاہر مومن تھے۔ منافق حقیقت میں کافر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفر کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی ہے۔ فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ عطا نہیں فرمائے گا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا تھا۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا اس میں بھی دو احتمال ہیں: (۱) ان کا نفاق اللہ تعالیٰ پر آسان ہے (۲) ان کا اعمال ضائع کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے(1)۔

یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا ۚ وَ اِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآىِٕكُمْ ؕ وَ لَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِیْلًا ۠﴿۲۰﴾

''(دشمن بھاگ گیا لیکن یہ بزدل) یہی خیال کر رہے ہیں کہ ابھی جتھے نہیں گئے اور اگر جتھے (دوبارہ پلٹ کر) آ جائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحرا میں بدوؤں کے طرف ہوتے (آنے جانوں والوں سے) تمہاری خبریں پوچھتے اور اگر یہ (بزدل) تم میں موجود ہوتے تو یہ (دشمن سے) جنگ نہ کرتے مگر برائے نام''۔

یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے گمان کرتے ہیں کہ لشکر نہیں گئے جب کہ لشکر جا چکے ہیں لیکن وہ دور نہیں گئے۔ وَ اِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ اگر لشکر قتال کے لیے ان کی طرف لوٹ آئیں۔ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ وہ آرزو کریں گے کہ اگر وہ بدوؤں کے ساتھ ہوتے تو وہ قتل سے بچتے ہیں اور حادثات زمانہ کا انتظار کرتے ہیں۔ طلحہ بن مصرف نے پڑھا لو انھم بدّی فی الاعراب یوں کہا جاتا ہے: باد، بدّی۔ جس طرح غازی کی جمع غزی اس کی تائید میں ہے صائمہ، او صوام۔

بدا فلان یبدو اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی جنگل کی طرف نکل جائے۔ یہ لفظ بِداوۃ اور بَداوۃ کسرہ اور فتحہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے کلمہ کا اصل بدو ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے: یَسْاَلُوْنَ یعقوب نے رویس کی قراءت میں یتساء لون عن انبائکم قراءت کی ہے، یعنی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبروں کے بارے میں پوچھتے ہیں(2)، وہ باتیں کرتے ہیں: کیا حضرت محمد اور آپ کے صحابہ ہلاک نہیں ہوئے؟ کیا ابوسفیان اور لشکر غالب نہیں آئے؟ یعنی وہ پسند کرتے ہیں کہ جنگ میں ہوتے وہ تمہاری خبروں کے بارے میں پوچھتے اور جنگ میں حاضر نہ ہوتے۔ یہ ان کی بزولی کی زیادتی کی وجہ سے ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے ہمیشہ مسلمانوں کی خبروں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کیا انہیں کوئی مصیبت نہیں پہنچی؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے کچھ لوگ مدینہ کے اطراف میں تھے جو غزوہ خندق میں حاضر نہ ہوئے۔ وہ تمہاری خبریں پوچھتے ہیں اور مسلمانوں کی شکست کی تمنا کرتے ہیں۔

وَ لَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِیْلًا وہ تیر پھینکتے اور پتھر پھینکتے یہ ریا اور شہرت کے طریقہ پر کرتے اگر یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا تو قلیل بھی کثیر ہوتا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 387 2۔ ایضاً

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾

''تمہاری رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے یہ نمونہ اس کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ قتال سے چھوڑ کر گھر بیٹھے رہنے والوں ہی کے لیے عتاب ہے یعنی تمہارے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین اُسوہ ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے جان کو صرف کر رہے ہیں کہ آپ غزوۂ خندق کے لیے گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ اُسوہ کا معنی قدوہ اور نمونہ ہے۔ عاصم نے اسوۃ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ فراء کے نزدیک دونوں کی جمع ایک ہی ہے۔ جس کے واحد میں کسرہ دیا اس کے نزدیک ضمہ کی علت یہ ہے کہ ناقص واوی اور یائی میں یہ فرق ہے وہ کہتے ہیں: كِسوة كُسا، لِحية، لُحا۔ جوہری نے کہا: أُسوة اور إِسوة دو لغتیں ہیں۔ اس کی جمع أُسی اور إِسی ہے۔ عقبہ بن حسان ہجری نے امام مالک بن انس سے وہ نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوک کے بارے میں ہے (1)؛ خطیب ابوبکر احمد نے اسے ذکر کیا ہے۔ کہا: عقبہ بن حسان امام مالک سے منفرد ہیں۔ میں نے اسے اسی سند سے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ أُسْوَةٌ اس کا معنی نمونہ ہے۔ اسوۃ اسے کہتے ہیں جس سے تسلی حاصل کی جائے اور اس کے تمام افعال میں اقتدا کی جائے، اور تمام احوال میں اس سے تسلی حاصل کی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو زخمی کیا گیا، آپ کی رباعیہ (سامنے والے دانت) کو توڑا گیا، آپ کے چچا کو قتل کیا گیا، آپ کا پیٹ بھوکا رہا اور آپ کو نہ پایا گیا مگر صابر اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والا شکر کرنے والا اور راضی بر رضا رہنے والا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھوک کی شکایت کی اور ہم نے اپنے پیٹوں سے کپڑا اٹھایا جس پر ایک ایک پتھر تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھایا جب کہ آپ کے پیٹ پر دو پتھر تھے۔ حضرت ابو عیسیٰ ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اس بارے میں فرمایا: یہ حدیث غریب ہے (3)۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کیا گیا تو آپ نے یوں دعا کی: اللهم اغفر لقومي فانهم لا يعلمون اے اللہ! میری قوم کو بخش دے وہ نہیں جانتے (4)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

---

1۔ میزان الاعتدال، جلد 2، صفحہ 204، حدیث نمبر 1608، السعادۃ بجوار محافظہ مصر

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد، لي معيشة اصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 60

3۔ صحیح بخاری، کتاب استتابة المعاندين، اذا عرض الذمي، جلد 2، صفحہ 1024

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 388

لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ سعید بن جبیر نے کہا: معنی ہے جو ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اور اس بعث کی تصدیق کرتا ہے جس میں اعمال کی جزا ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو یوم آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ثواب کی امید رکھتا ہے۔ نحویوں میں سے حاذق نحویوں کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ یرجو کو لکھا جائے مگر الف کے بغیر جب وہ واحد کے لیے ہو، کیونکہ جمع میں جو علت ہے وہ واحد میں نہیں۔ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وہ اللہ تعالیٰ کے عقاب سے ڈر کر اور ثواب کی امید میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ ذکر کرتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لمن یہ لکم سے بدل ہے۔ بصریوں نے اسے جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ غائب، مخاطب سے بدل نہیں ہو سکتا۔ لمن کا لام حسنة کے متعلق ہے۔ اسوة کان کا اسم ہے لکم اس کی خبر ہے۔ اس خطاب کے ساتھ جس کا ارادہ کیا گیا ہے اس میں اختلاف ہے اس کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) منافق۔ ان سے جو پہلے خطاب کیا گیا ہے اس پر عطف ہے (۲) مومن، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا یہ واجب ہے یا مستحب ہے؟ (۱) واجب ہے یہاں تک کہ استحباب پر دلیل قائم ہو جائے۔ (۲) مستحب ہے یہاں تک کہ وجوب پر کوئی دلیل قائم ہو جائے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ امور دین میں وجوب پر محمول کیا جائے اور دنیا کے امور میں استحباب پر محمول کیا جائے (2)۔

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

"(منافقین کا حال آپ پڑھ چکے) اور جب ایمان والوں نے (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو (فرط جوش سے) پکار اٹھے: یہ ہے وہ لشکر جس کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا تھا اور سچ فرمایا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور دشمن کے لشکر جرار نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا"۔

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ عربوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں: راء اس کا اطلاق دل پر ہوتا ہے۔ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ اس سے مراد سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ:214)

جب غزوہ خندق کے موقع پر احزاب کو دیکھا تو انہوں نے کہا: هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ، یہ قتادہ کا قول ہے (3)۔ دوسرا قول وہ ہے جسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو مزنی نے اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال خطبہ دیا جس میں احزاب کا ذکر ہوا ہے۔ فرمایا: "حضرت جبریل امین نے مجھے خبر دی کہ میری امت اس پر غلبہ پانے والی ہے۔ یعنی حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات پر، پس تمہیں فتح کی بشارت ہو"۔ مسلمان خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا: الحمد للہ۔ سچا وعدہ ہے کیونکہ محاصرہ کے بعد ہم سے فتح کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لشکر سامنے آ گئے تو مومنوں نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 388 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ مَا وَعَدَنَا میں ما کو اگر تو الذی کے معنی میں بنائے تو ضمیر عائد محذوف ہوگی۔ اگر تو اسے مصدر بنائے تو یہ ضمیر کی محتاج نہ ہوگی۔

وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا فراء نے کہا: احزاب کو دیکھنا ان میں اضافہ نہیں کرتا۔ علی بن سلیمان نے کہا: زای کالفظ رؤیت پر دلالت کرتا ہے اور رؤیت کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ معنی ہے رویت نے اضافہ نہ کیا مگر رب پر ایمان میں اور قضا کے تسلیم کرنے میں؛ یہ حضرت حسن بصری نے کہا (2)۔ اگر وہ کہے: ماذا دوھم تو یہ بھی جائز ہے۔ جب مسلمانوں پر معاملہ شدید ہو گیا اور خندق میں قیام طویل ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس ٹیلے پر ایک رات کھڑے ہوئے جس پر مسجد فتح ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس مدد کا وعدہ کیا تھا اس کی امید کی۔ فرمایا: ''کون جائے گا تاکہ ان کی خبر لائے تو اس کے لیے جنت ہے''۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری یا تیسری دفعہ فرمایا تو کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جانب دیکھا۔ پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' عرض کی حذیفہ۔ فرمایا: ''کیا تو وہ بات نہیں سن رہا جو میں آج رات سے کہہ رہا ہوں؟'' حضرت حذیفہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بدحالی اور ٹھنڈک نے مجھے جواب دینے سے روکا۔ فرمایا: ''جاؤ یہاں تک کہ قوم میں داخل ہو۔ اس کی گفتگو سنے اور ان کی خبر میرے پاس لائے۔ اے اللہ اس کی اس کے سامنے سے، اس کے پیچھے سے، اس کی دائیں جانب سے اور اس کی بائیں جانب سے حفاظت فرما یہاں تک کہ یہ میری طرف لوٹ آئے۔ جاؤ، کوئی نیا کام نہ کرنا یہاں تک کہ تو میرے پاس آئے''۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنا اسلحہ لے کر نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھایا: ''اے غم زدوں کی آواز سننے والے! اے مجبوروں کی دعا قبول کرنے والے! میری مصیبت، میرے غم اور کرب کو دور فرما دے تو میرا اور میرے صحابہ کا حال دیکھ رہا ہے''۔ حضرت جبریل نازل ہوئے، عرض کی: اللہ تعالیٰ نے تیری دعا کو سن لیا ہے، اور تیرے دشمن کی جانب سے پیدا ہونے والے خوف کو کافی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑے، اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا، اپنی آنکھوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور یوں کہہ رہے تھے۔ ''شکر شکر تو نے مجھ پر رحم فرمایا اور تو نے میرے صحابہ پر رحم فرمایا''۔ حضرت جبریل امین نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف ہوا کو بھیجنے والا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بشارت دی۔ حضرت حذیفہ نے کہا: میں ان تک پہنچا، ان کی آگیں جل رہی تھیں تیز ہوا آئی اس میں سنگریزے تھے۔ اس نے ان کی آگ کو نہ چھوڑا مگر اسے بجھا دیا کوئی خیمہ نہ چھوڑا مگر اسے گرا دیا وہ سنگریزوں سے بچنے کے لیے چیزوں کو ڈھال بنا رہے تھے۔ ابوسفیان اپنی سواری کی طرف اٹھا اور قریش میں چیخا۔ النجاء النجاء، بچاؤ بچاؤ۔ عیینہ بن حصن، حارث بن عوف اور اقرع بن حابس نے بھی اسی طرح کہا، لشکر بکھر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی اور مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ کے بال پراگندہ اور جسم گرد آلود تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پانی لائیں اور سر دھونے لگیں۔ حضرت جبریل امین آئے اور عرض کی: آپ نے اسلحہ اتار دیا ہے جب کہ اہل سماء نے اسلحہ نہیں اتارا! میں لگاتار ان کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ میں انہیں روحاء سے آگے چھوڑ آیا۔ پھر عرض کی: بنو قریظہ کی طرف اٹھو۔ ابوسفیان

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 389 2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 292

نے کہا: میں اسلحہ کی جھنکار لگا تار سنتا رہا یہاں تک کہ میں روحاء سے آگے نکل آیا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

''اہل ایمان میں سے ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا ان جوانمردوں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعض (اس ساعت سعید کا) انتظار کر رہے ہیں (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویہ میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی۔ (اذن جہاد میں ایک حکمت یہ بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کے سچ کے باعث اور عذاب دے منافقوں کو اگر اس کی مرضی ہو یا ان کی توبہ قبول فرما لے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ رجال مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ صَدَقُوْا اس کی صفت ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ، من محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ اسی طرح وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ میں من ہے اور خبر جار مجرور ہے۔ نحب کا معنی نذر اور عہد ہے تو اس کا باب یوں ذکر کرتا ہے: نَحَبت أنحبُ یعنی عین کلمہ پر ضمہ ہے۔ شاعر نے کہا:

وإذا نحبت كلبٌ على الناس إنهم أحق بتاج الماجد المتكرم(1)

جب بنو کلب لوگوں پر عہد کریں تو وہ بزرگی اور کرم کے تاج کے زیادہ حقدار ہیں۔

ایک اور شاعر نے یہ لفظ یوں استعمال کیا۔

قد نحب المجدُ علینا نَحْبًا

بزرگی نے ہمارے ساتھ عہد کیا۔ ایک اور شاعر نے کہا:

أنَحْبٌ فيقضى أم ضلالٌ و باطلُ

کیا کوئی وعدہ ہے جو پورا کیا جائے یا یہ قول باطل ہے۔

امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (2) کہا: میرے چچا حضرت انس بن نضر نے کہا ان کا بھی یہی کام تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بدر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان پر یہ معاملہ بڑا شاق گزرا تھا۔ انہوں نے کہا: پہلی جنگ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہوئے تھے میں اس سے غائب رہا۔ خبردار! اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں غزوہ دکھایا تو اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کہا: وہ اس سے ڈرے کہ اس کے علاوہ کوئی اور کلمہ کہیں۔ اگلے سال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ احد میں شامل ہوئے۔ حضرت

1۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 164 2۔ سنن ترمذی، باب و من سورۃ الاحزاب، حدیث نمبر 3124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سعد بن مالک انہیں ملے۔ پوچھا: اے ابو عمرو کہاں؟ جواب دیا: جنت کی ہوا کیا ہی خوب ہے۔ میں اسے احد کی جانب سے پاتا ہوں۔ انہوں نے جہاد کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر اسی سے زائد زخم، تلوار، نیزہ اور تیر کے پائے گئے۔ میری پھوپھی ربیع بنت نضر نے کہا: میں نے اپنے بھائی کو اس کے پوروں سے پہچانا اور یہ آیت رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا نازل ہوئی (1)۔ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ڈٹے رہے یہاں تک کہ ان کا ہاتھ شل ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اوجب طلحه الجنة (2) حضرت طلحہ نے ایسا کام کیا ہے جس کے بدلہ میں حضرت طلحہ کے لیے جنت ثابت ہو گئی ہے۔ ان سے ترمذی شریف میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ایک جاہل بدو سے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھئے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا؟ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار کا لحاظ رکھتے اور ڈرا کرتے تھے۔ اس بدو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا۔ اس نے پھر سوال کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض کیا۔ پھر میں مسجد کے دروازے سے ظاہر ہوا جب کہ میرے جسم پر سبز لباس تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو فرمایا: ''وہ سائل کہاں ہے جو یہ پوچھ رہا تھا کہ کس نے وعدہ کا حق ادا کیا ہے؟'' بدو نے عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوں۔ فرمایا: ''یہ ان میں سے ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا''۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اسے یونس بن بکیر کی حدیث سے جانتے ہیں (3)۔

بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب احد سے واپس لوٹے تو حضرت مصعب بن عمیر کے پاس سے گزرے جب کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں شہید پڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر کھڑے ہوئے اور ان کے حق میں دعا کی، پھر اس آیت کو تلاوت کیا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ قیامت کے روز یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید ہوں گے ان کے پاس آؤ اور ان کی زیارت کرو مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! قیامت تک ان پر کوئی سلام پیش نہیں کرے گا مگر یہ اس کو جواب دیں گے'' (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نحب کا معنی موت ہے (5) جس پر عہد کیا اسی پر موت آئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نحب کا معنی وقت اور مدت ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: قضى فلان نحبه جب وہ فوت ہو جائے۔ ذو رمہ نے کہا:

عَشِيَّة فرّ الحارثيّون بعدما قَضَى نَحْبه فی ملتقَى الخيل هَوْبَرُ (6)

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، من المومنين رجال صدقوا، جلد 1، صفحہ 393

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجهاد، فی الدرع، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، حدیث نمبر 1615، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 152۔ سنن ترمذی، حدیث نمبر 3127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ دلائل النبوۃ، جلد 3، صفحہ 284، ما جرى بعد انقضاء الحرب 5۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 165 6۔ ایضاً، جز 21، صفحہ 164

اس شام حارثی بھاگ گئے بعد اس کے کہ ہو بر گھوڑوں کی جنگ کے دوران فوت ہوا۔

نحب کا معنی حاجت ہے۔ ایک قائل کہتا ہے۔ مالی عندھم نحب ان کے ہاں میرا کوئی کام نہیں۔ آیت سے یہ مراد نہیں۔ یہاں نحب سے مراد نذر ہے جس طرح ہم نے پہلے کہا، یعنی ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنا وعدہ نبھانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر لیں یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے جس طرح حضرت حمزہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت انس بن نضر وغیرہ۔ ان میں سے کچھ اپنی شہادت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد اور نذر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے قراءت کی: فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر ومنهم من بدل تبديلا۔ ابوبکر انباری نے کہا: اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مروی ہے کیونکہ اجماع اس کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ان مومنوں اور لوگوں پر لعن ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے مدح کی، صدق اور وفا سے شرف بخشا۔ ان میں کوئی تبدیلی والا معروف نہ ہوا اور نہ ان کی جماعت میں تبدیلی کرنے والا پایا گیا۔ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا تا کہ آخرت میں سچوں کو ان کے سچ پر جزا دے وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اور آخرت میں منافقوں کو عذاب دے۔ اِنْ شَآءَ اگر چاہے گا کہ انہیں عذاب دے تو انہیں توبہ کی توفیق نہیں دے گا۔ اگر ان کو عذاب دینا نہیں چاہے گا تو موت سے قبل ان پر نظر کرم فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿25﴾

''اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآنحالیکہ اپنے غصہ میں (پیچ وتاب کھا رہے) تھے (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا اور بچا لیا اللہ نے مومنوں کو جنگ سے، اور اللہ تعالیٰ بڑا طاقت ور، ہر چیز پر غالب ہے''۔

محمد بن عمرو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ یہاں الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد ابوسفیان اور عیینہ بن بدر ہے، ابوسفیان تہامہ کی طرف اور عیینہ نجد کی طرف لوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لشکروں پر ہوا اور لشکروں کو بھیجا یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اور بنو قریظہ اپنے قلعوں کی طرف لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ قریظہ پر رعب ڈالنے کے ساتھ کافی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا امر قوی ہے اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿26﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿27﴾

''اہل کتاب سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار لیا اور ان کے

دلوں میں رعب ڈال دیا ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔ اور اس نے وارث بنا دیا تمہیں ان کی زمینوں اور ان کے مکانوں اور ان کے مال و متاع کا اور وہ ملک بھی تمہیں دے دیئے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ یہاں اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جنہوں نے لشکروں کی مدد کی، لشکروں سے مراد قریش اور غطفان ہیں یہ بنو قریظہ تھے۔ ان کا واقعہ گزر چکا ہے۔ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ ان کے قلعوں میں؛ اس کا واحد صیصہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فأصبحت الثِّيران صَرْعَى وأصبحتْ نساء تميم يبتدِرْن الصياصِيا(1)

بیل مردہ پڑے تھے اور تمیم قبیلہ کی عورتیں قلعوں کی طرف جلدی جلدی جا رہی تھیں۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ جولاہے کا کانٹا جس کے ساتھ وہ تانے اور بانے کو درست کرتا ہے اسے صیصہ کہا جاتا ہے۔ درید بن صمہ نے کہا:

فجئتُ إليه والرماحُ تَنُوشُه كوقعِ الصَّياصِي في النسيج الممدّد(2)

میں اس کی طرف آیا جب کہ نیزے اسے نوچ رہے تھے جس طرح کانٹے بنے جانے والے کپڑے میں پڑتے ہیں۔

اسی سے صیصۃ الدیك ہے جو مرغ کے پاؤں میں ہوتا ہے۔ صیاصی البقر سے مراد ان کے سینگ ہیں، کیونکہ ان کے ساتھ وہ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ بعض اوقات لوہے کے پھل کی جگہ ان کو نیزے پر لگایا جاتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: جَذَّ الله صئصئه اللہ تعالیٰ نے اس کی جڑ کاٹ دی۔

وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ تم مردوں کو قتل کرتے ہو۔ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا یہاں فریق سے مراد عورتیں اور بچے ہیں، جس طرح پہلے گزرا ہے۔ وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِیَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا جس زمین کو تم نے ابھی تک نہیں روندا۔ یزید بن رومان، ابن زید اور مقاتل نے کہا: مراد غزوہ حنین ہے۔ ابھی تک انہوں نے اس کا موقع نہیں پایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ان سے وعدہ فرمایا۔ قتادہ نے کہا: ہم یہ باتیں کرتے تھے اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے(3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد فارس و روم ہے(4)۔ عکرمہ نے کہا: مراد وہ تمام علاقے ہیں جو قیامت تک فتح ہوں گے(5)۔

وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ۠ اس کی دو توجیہیں ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں انتقام یا عفو جس کا بھی ارادہ کرے اس پر قادر ہے؛ یہ محمد بن اسحاق کا نقطہ نظر ہے(6)۔ (۲) جن قلعوں اور بستیوں کو فتح کرنے کا ارادہ کرے اس پر قادر ہے؛ یہ نقاش کا قول ہے(7)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ جن

---

1۔ السیرۃ النبویہ، جلد 3، صفحہ 190
2۔ تفسیر طبری، جز 21، صفحہ 174
3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 458
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 393
7۔ ایضاً

چیزوں کا وعدہ کیا ان پر قادر ہے اس کی مدد کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے عجز کو ثابت کرنا جائز نہیں۔ یہ کہا جاتا ہے: تاسِمون، تاسُمون یعنی سین کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے؛ فراء نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

''اے نبی مکرم! آپ فرما دیجئے اپنی بیبیوں کو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش (و آسائش) کی خواہاں ہو تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں اور پھر تمہیں رخصت کر دوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جو تم میں سے نیکو کار ہیں اجر عظیم''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت اس گزری ہوئی کلام کے معنی کے ساتھ متصل ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینے سے روکا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ازواج مطہرات میں سے بعض سے اذیت پہنچی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ازواج مطہرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دنیاوی مال کا مطالبہ کیا تھا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کیا تھا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے ایک دوسرے پر غیرت کا اظہار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دی تھی (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان پر اس آیت کو تلاوت کریں اور دنیا و آخرت میں انہیں اختیار دیں (4)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: جو آدمی ایک بیوی کا مالک ہو اس پر اسے اختیار دینا لازم نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی عورتوں کو اختیار دیں تو ازواج مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہیں تو آپ بادشاہ نبی ہوں اور دنیا کے خزانوں کی چابیاں پیش کیں اور چاہیں تو مسکین نبی ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل امین سے مشورہ کیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسکنہ کا مشورہ دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکنہ کو اپنا لیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اختیار کیا تو یہ سب سے بلند مقام بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنی ازواج کو اختیار دیں۔ بعض اوقات ان سے ایسی بات ظاہر ہوتی جس سے عیاں ہوتا کہ وہ اس تنگدستی کے عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس امر کی وجہ سے اختیار دیا گیا وہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے ایک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لیے سونے کا ایک حلقہ بنوائیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے چاندی کا ایک حلقہ بنوایا اور اس پر سونے کا پانی چڑھوایا۔ ایک قول یہ کیا گیا: زعفران کا رنگ چڑھوایا، تو اس نے لینے سے انکار کر دیا مگر

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 459 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 380

اس صورت میں کہ سونے کا ہو۔ تو یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اختیار دیا۔ ان سب نے کہا: ہم اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے ایک نے فراق کو اپنایا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے جب کہ الفاظ مسلم کے ہیں (1) سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں آپ نے لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پایا کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں سے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ کہا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اجازت مل گئی تو وہ داخل ہوئے پھر حضرت عمر آئے انہوں نے اجازت طلب کی تو انہیں بھی اجازت مل گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاموش بیٹھے ہوئے پایا آپ کے اردگرد ازواج مطہرات موجود تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں ایسی بات کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسا دے گی۔ عرض کی: یا رسول اللہ! اگر میں بنت خارجہ کو پاؤں جو مجھ سے نفقہ کا سوال کرے تو میں اس کی طرف اٹھوں گا اور اس کی گردن دبوچ لوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر ہنسنے لگے۔ فرمایا: ''یہ میرے اردگرد ہیں جس طرح تو دیکھتا ہے وہ مجھ سے نفقہ کا سوال کر رہی ہیں''۔ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف ان کی گردن دبانے کے لیے اٹھے اور حضرت عمر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن دبانے کے لیے اٹھے۔ دونوں کہہ رہے تھے: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کا سوال کرتی ہو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ سب نے کہا: اللہ کی قسم! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بھی ایسی چیز کا سوال نہیں کریں گی جو آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ پھر آپ نے ان سے ایک مہینہ یا انتیس دن علیحدگی اختیار کر لی، پھر یہ آیت نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۞ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۞

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے اس اختیار کو شروع کیا۔ فرمایا: ''اے عائشہ! میں تجھ پر ایک ایسا امر پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہوں میں پسند کرتا ہوں تو اس بارے میں جلدی نہ کرے یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ کر لے''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اس پر تلاوت کی۔ عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں آپ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ بلکہ میں اللہ، اس کے رسول اور دار آخرت کو پسند کرتی ہوں۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ آپ اپنی دوسری بیویوں کو نہیں بتائیں گے۔ فرمایا: ''ان میں سے جو بیوی بھی مجھ سے اس کا سوال کرے گی میں اسے بتا دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے معنت (ہلاکت میں ڈالنے والا) اور متعنت (غلطی کی جستجو کرنے والا) بنا کر نہیں بھیجا بلکہ مجھے معلم اور سہولت دینے والا بنا کر بھیجا ہے''۔

امام ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی بیویوں کو اختیار دیں تو آپ نے مجھ سے اس کا آغاز کیا فرمایا: ''اے عائشہ! میں تیرے لیے ایک امر کا ذکر کروں تجھ پر کوئی حرج نہیں ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، ان تخییرہ امراتہ لایکون طلاقاً الا بالنیۃ، جلد 1، صفحہ 480

گا کہ تو جلدی نہ کرے یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ کر لے'' (1)۔ حضرت عائشہ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ میرے والدین مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فراق کا حکم دینے والے نہیں تھے۔ پھر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللہ تعالیٰ حکم ارشاد فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ میں نے عرض کی: کیا میں اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دار آخرت کا ارادہ رکھتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے وہی کہا جو میں نے کہا تھا۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ علماء نے کہا: جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ حکم دینا کہ وہ اپنے والدین سے مشورہ کرے اس لیے تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ سے محبت کیا کرتے تھے۔ آپ خوف رکھتے (2) تھے کہ جوانی کا عالم انہیں اس امر پر برانگیختہ نہ کرے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فراق کو ہی اختیار نہ کر لیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے والدین آپ کو فراق کا مشورہ نہیں دیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ازواج تھیں۔ ان میں سے کچھ وہ تھیں جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق زوجیت ادا کیے تھے، کچھ سے صرف عقد نکاح کیا تھا اور حقوق زوجیت ادا نہیں کیے تھے۔ اور کچھ وہ تھیں جن کو دعوت نکاح دی مگر ان کے ساتھ عقد نکاح مکمل نہ ہوا۔

(1) حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقد نکاح سے پہلے آپ ابو ہالہ کے عقد میں تھیں اس کا نام زرارہ بن نباش اسدی تھا اس سے قبل عتیق بن عائذ کے عقد میں تھیں ان سے ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام عبدمنان تھا اور ابو ہالہ سے اس کا بیٹا ہند بن ابی ہالہ پیدا ہوا۔ طاعون کے زمانہ تک زندہ رہا اور اس میں مر گیا۔

ایک قول یہ کیا جاتا ہے: جو بچہ طاعون کے زمانے تک زندہ رہا وہ ہند بن ہند تھا جب یہ فوت ہوا تو اس وقت حضرت خدیجہ سے یہ بین سنا گیا واھند بن ھنداہ، وا ربیب رسول اللہ ہائے ہند بن ہند، ہائے رسول اللہ کے پروردہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ الکبریٰ کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی نہ کی یہاں تک کہ وہ وصال فرما گئیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کی تو اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ اور اعلان نبوت کے سات سال بعد یا دس سال بعد ان کا وصال ہو گیا۔ جب ان کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ یہ وہ پہلی عورت تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد ان سے تھی صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ حکیم بن حزام نے کہا: حضرت خدیجہ کا وصال ہوا تو ہم نے انہیں گھر سے نکالا یہاں تک حجون میں ان کو دفن کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے ان دنوں نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ نہ تھا (3)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 152
2۔ تاویل تو کی جاسکتی ہے مگر اچھی تاویل نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جواب خود اس کی نفی کر رہا ہے۔
3۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 18، دار صادر

(2) حضرت سودہ بنت زمعہ بن قیس بن عبد شمس العامریہ۔ یہ قدیمی مسلمان تھیں انہوں نے بیعت کی۔ وہ اپنے چچا زاد بھائی کے عقد میں تھیں جس کو سکران بن عمرو کہا جاتا وہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔ دونوں نے دوسری ہجرت میں حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ جب یہ مکہ مکرمہ آئے تو ان کا خاوند فوت ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ حبشہ میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ جب ان کی عدت ختم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دعوت نکاح دی۔ ان سے نکاح کر لیا اور مکہ مکرمہ میں ہی انہیں اپنے حرم میں داخل کر لیا اور ان کے ساتھ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ جب یہ بوڑھی ہو گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ کیا تو حضرت سودہ نے یہ عرض کی کہ آپ ایسا نہ کریں، اسے اپنی ازواج میں رہنے دیں اور انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہ کو دے دی، جیسا صحیح میں مذکور ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اپنے پاس روک لیا۔ ان کا وصال مدینہ طیبہ میں شوال سن چون ہجری کو ہوا۔

(3) حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا۔ ان کی نسبت جبیر بن مطعم سے تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے دعوت نکاح بھیجی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے موقع دیجئے کہ میں جبیر سے اس کو نرمی سے آزاد کرا لوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں ہجرت سے دو سال قبل نکاح کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: تین سال قبل نکاح کیا اور مدینہ طیبہ میں انہیں حرم میں داخل کیا جب کہ ان کی عمر نو سال تھی اور نو سال تک یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ ان کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بھی باکرہ عورت سے شادی نہیں کی۔ ان کا وصال 59 یا 58ھ کو ہوا۔

(4) حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب قریشی عدوی رضی اللہ عنہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے شادی کی پھر انہیں طلاق دی تو حضرت جبریل امین آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ حضرت حفصہ سے رجوع کر لیں، کیونکہ وہ روزے دار اور راتوں کو قیام کرنے والی ہیں (1)۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے رجوع کر لیا۔ واقدی نے کہا: ان کا وصال شعبان 45ھ میں حضرت امیر معاویہ کے دور حکومت میں ہوا ان کی عمر ساٹھ سال تھی (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا وصال حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ طیبہ میں ہوا۔

(5) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کا نام ہند بنت ابی امیہ مخزومی تھا۔ ابو امیہ کا نام سہیل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے نکاح 4ھ میں شوال میں کیا۔ صحیح قول یہی ہے کہ ان کا نکاح ان کے بیٹے حضرت سلمہ نے کیا۔ ان کے بیٹے کی عمر چھوٹی تھی۔ ان کا وصال 59ھ میں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا وصال 62ھ میں ہوا؛ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت سعید بن زید نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت ابو ہریرہ نے پڑھائی، ان کی قبر بقیع میں ہے اس وقت ان کی عمر چوراسی سال تھی۔

(6) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ ان کا نام رملہ بنت ابوسفیان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو نجاشی کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپ کی جانب سے حضرت ام حبیبہ کو دعوت نکاح دے تو نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح

---

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 18، صفحہ 365، حدیث نمبر 934، مکتبۃ العلوم والحکم

2۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 86

حضرت ام حبیبہ سے کر دیا یہ ہجرت کا ساتواں سال تھا۔ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کی جانب سے انہیں چار سو دینار مہر کے طور پر دیئے اور حضرت شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ انہیں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں بھیج دیا۔ ان کا وصال 44ھ میں ہوا(1)۔ دارقطنی نے کہا: حضرت ام حبیبہ عبید اللہ بن جحش کے عقد میں تھیں وہ حبشہ کے علاقہ میں نصرانی کی حیثیت سے مرا۔ نجاشی نے حضرت ام حبیبہ کا نکاح نبی کریم ﷺ سے کر دیا اور چار ہزار مہر مقرر کیا۔ اور شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ انہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بھیج دیا(2)۔

(7) حضرت زینب بنت جحش بن رئاب اسدیہ رضی اللہ عنہا۔ ان کا نام برہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام زینب رکھا۔ ان کے باپ کا نام برہ تھا۔ عرض کی: یارسول اللہ! میرے باپ کا نام بدل دیجئے کیونکہ برہ حقیر چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: ”اگر تیرا باپ مومن ہوتا تو ہم اس کا نام اپنے اہل بیت کے نام پر رکھتے لیکن میں نے اس کا نام جحش رکھا ہے اور جحش برہ میں سے ہے“۔ دارقطنی نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے 5ھ میں شادی کی۔ ان کا وصال 20ھ میں ہوا جب کہ عمر ترپن سال تھی۔

(8) حضرت زینب بنت خذیمہ بن حارث بن عبد اللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ ہلالیہ اور ان کو دور جاہلیت میں ام المساکین کا لقب دیا جاتا، کیونکہ یہ مساکین کو کھانا کھلایا کرتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے مدینہ طیبہ میں شادی کی جب کہ ہجرت کو اکتیس ماہ گزر چکے تھے یہ صرف آٹھ ماہ تک حضور ﷺ کے حرم میں رہیں اور آپ کی زندگی میں ہی ربیع الاوّل کے آخر ہجرت کے انتالیسویں ماہ میں وصال ہو گیا ان کو بقیع میں دفن کیا گیا۔

(9) حضرت جویریہ بنت حارث بن ابی ضرار خزاعیہ مصطلقیہ ان کو غزوہ بنی مصطلق میں گرفتار کیا گیا۔ یہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئیں جنہوں نے ان کے ساتھ عقد مکاتبہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکاتبہ کا مال عطا کر دیا اور ان سے شادی کر لی۔ یہ ہجرت کے چھٹے سال شعبان میں ہوئی، اس کا نام برہ تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام جویریہ رکھا یہ 6ھ ربیع الاوّل 56ھ میں فوت ہوئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: 50ھ میں فوت ہوئیں جب کہ ان کی عمر اکسٹھ سال تھی۔

(10) حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب ہارونی۔ غزوہ خیبر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے انہیں گرفتار کیا اور اسے اپنے لیے چن لیا۔ وہ مسلمان ہو گئیں اور اسے آزاد کر دیا۔ حضور ﷺ نے اس کی آزادی کو ہی اس کا مہر مقرر فرمایا۔ صحیح میں ہے کہ یہ حضرت دحیہ کلبی کے حصہ میں آئیں رسول اللہ ﷺ نے اسے سات حصوں کے برابر خریدا(3)، اور یہ 50ھ میں وفات پا گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: 52ھ میں ان کا وصال ہوا اور انہیں بقیع میں دفن کیا گیا۔

(11) حضرت ریحانہ بنت زید بن عمرو بن خنافہ جو بنو نضیر سے تعلق رکھتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے گرفتار کیا اور اسے آزاد کر دیا اور 6ھ میں ان سے شادی کی۔ یہ حجۃ الوداع کے موقع لوٹتے ہوئے فوت ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے

---

1۔ سنن ابی داؤد، باب الصداق، حدیث نمبر 1802، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 3، صفحہ 246

3۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 122

انہیں بقیع میں دفن کیا۔ واقدی نے ذکر کیا: یہ 16ھ میں فوت ہوئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: میں نے ایک آدمی کو کہتے ہوئے سنا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو آزاد نہیں کیا تھا بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لونڈی کی حیثیت سے ہی رہتی تھیں (1)۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے ابوالقاسم عبدالرحمٰن سہیلی نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج میں شمار نہیں کیا۔

(12) حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے عقد نکاح سرف کے مقام پر کیا جو مکہ مکرمہ سے دس میل دور ہے۔ یہ عمرہ قضاء میں 7ھ کو ہوا۔ یہ وہ آخری عورت ہیں جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ مقرر کیا کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے حرم میں داخل کیا وہیں ان کا وصال ہوا اور وہیں ان کو دفن کیا گیا۔ ان کا وصال 61ھ میں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ 63ھ میں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ 68ھ میں ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی مشہور ازواج ہیں۔ یہی وہ بیویاں ہیں جن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقوق زوجیت ادا کیے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہن۔

جہاں تک ان عورتوں کا تعلق ہے جن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کیا اور ان کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہیں کیے، ان میں سے کلابیہ ہے۔ اس کے نام میں علماء نے اختلاف کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا نام فاطمہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام عمرہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا نام عالیہ تھا۔ زہری نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ بنت ضحاک کلابیہ سے نکاح کیا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پناہ مانگی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے طلاق دی۔ وہ کہا کرتی تھی: میں شقیہ ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 8ھ میں ذی قعدہ میں نکاح کیا یہ ساٹھ ہجری میں فوت ہوئی (2)۔

ان میں سے اسماء بنت نعمان بن جون بن حارث کندیہ ہے یہی جونیہ ہے۔ قتادہ نے کہا: جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے تو اسے دعوت دی تو اس نے کہا: آپ ادھر آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے طلاق دے دی۔ دوسرے علماء نے کہا: اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پناہ مانگی تھی۔ بخاری شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا۔ جب اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، گویا اس نے اسے ناپسند کیا (3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو اسید کو فرمایا اس کا سامان تیار کرے اور کپڑے دے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں حضرت ابو اسید نے کہا: جونیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے تو فرمایا: هبی لی نفسك اپنی ذات کو میرے لیے ہبہ کر دو۔ اس نے کہا: هل تهب الملكة نفسها للسوقة کیا ملکہ اپنا آپ رعیت کو ہبہ کرتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اس پر رکھیں تاکہ وہ سکون پائے۔ اس نے کہا: اعوذ باللہ منك میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ فرمایا: ''تو نے اس ذات کی پناہ چاہی جس کی پناہ چاہی جاتی ہے'' پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے فرمایا: ''اے ابا اسید! اسے دو سفید رازقی کپڑے دے دو اور اس کو اس کے گھر والوں کی طرف بھیج دو''۔

---

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 131 2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 141 3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 790

قتیلہ بنت قیس۔ یہ اشعث بن قیس کی بہن تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شادی اس کے بھائی اشعث نے کی پھر وہ حضر موت چلا گیا۔ وہ اسے سوار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لایا تو اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ملی تو وہ واپس اپنے علاقہ میں لے گیا وہ مرتد ہو گیا اور یہ بھی مرتد ہو گئی پھر اس سے حضرت عکرمہ بن ابو جہل سے شادی کی تو اس سے حضرت ابو بکر صدیق کو سخت رنج ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کی: اللہ کی قسم! یہ رسول اللہ کی ازواج میں سے نہ تھی (1)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ انہیں اختیار دیا اور اور نہ ہی حجاب میں لیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارتداد کے ساتھ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بری کر دیا۔ حضرت عروہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا ہو۔

ام شریک ازدیہ۔ اس کا نام غزیہ بنت جابر بن حکیم تھا۔ اس سے قبل یہ ابو بکر بن ابی سلمی کے عقد میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق دے دی اور اس سے حقوق زوجیت ادا نہیں کیے۔ یہی وہ عورت تھی جس نے اپنے آپ کو آپ پر پیش کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس عورت نے اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا تھا وہ خولہ بنت حکیم تھی۔

خولہ بنت ہذیل بن ہبیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا اور آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی۔

شراف بنت خلیفہ۔ یہ حضرت دحیہ کی بہن تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا اور اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہیں کیے۔

یعلی بنت خطیم۔ یہ قیس کی بہن تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا یہ بڑی غیور تھی اس نے نکاح کے ختم کرنے کا مطالبہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ عقد نکاح کو ختم کیا۔

عمرہ بنت یادیہ کندیہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا۔ شعبی نے کہا: کندہ کی ایک عورت سے نکاح کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اسے لایا گیا۔

ابنۃ جندب بن ضمرہ جندعیہ۔ بعض نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا اور بعض نے اس کے وجود کا انکار کیا۔

غفاریہ۔ بعض علماء نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو غفار کی ایک عورت سے شادی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا تو اس نے اپنے کپڑے اتارے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیدی دیکھی تو فرمایا: ''تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا'' (2)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سفیدی آپ نے کلابیہ میں دیکھی تھی۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد نکاح کیا اور ان سے حقوق زوجیت ادا نہیں کیے۔

جہاں تک ان عورتوں کا تعلق ہے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت نکاح تو دی مگر عقد نکاح نہ ہوا اور جن عورتوں نے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ ان میں سے حضرت ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا۔ ان کا نام فاختہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت نکاح دی تو انہوں نے عرض کی: میں بچوں والی ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معذرت پیش کی تو آپ نے ان کی معذرت قبول کر لی۔ ان میں سے ایک ضباعہ بنت عامر بھی تھی۔ ان میں سے ایک صفیہ بنت بشامۃ بن نضلہ

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 148　2۔ المستدرک للحاکم، جلد 4، صفحہ 37، حدیث نمبر 2406، باب ذکر العالیہ

تھی ، نبی کریم ﷺ نے انہیں دعوت نکاح دی ان کو حضور ﷺ نے گرفتار کیا نبی کریم ﷺ نے انہیں اختیار دیا۔ فرمایا: ''اگر تو میرے پاس رہنا چاہے تو میرے پاس رہے اور اگر تو چاہے تو اپنے خاوند کے پاس چلی جا؟(1)'' اس نے عرض کی: میں اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بھیج دیا۔ بنو تمیم نے اس پر لعن طعن کیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ ان میں سے ایک ام شریک تھی۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک لیلی بنت خطیم تھی اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان میں سے خولہ بنت حکیم بن امیہ تھی اس نے اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ہبہ کیا۔ حضور ﷺ نے اس کے معاملہ کو مؤخر کر دیا تو اس نے حضرت عثمان بن مظعون سے شادی کر لی۔

ان میں سے ایک جمرہ بنت حارث بن عوف مری ہیں نبی کریم ﷺ نے انہیں دعوت نکاح دی تو اس کے باپ نے کہا: اس میں بیماری ہے جب کہ اس میں بیماری نہیں تھی اس کا باپ اس کے پاس واپس آیا تو وہ برص کی بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی۔ یہ شبیب بن برصاء شاعر کی ماں تھی۔

ان میں سے سودہ قرشیہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے دعوت نکاح دی یہ بچوں والی تھی اس نے عرض کی: مجھے ڈر آتا ہے کہ میرے بچے آپ کے سر کے پاس شور کریں گے۔ حضور ﷺ نے اس کی تعریف کی اور اس کے حق میں دعا کی۔

ان میں سے ایک عورت ایسی تھی جس کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ مجاہد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو دعوت نکاح دی اس نے عرض کی: میں اپنے باپ سے مشورہ کروں گی۔ وہ اپنے باپ سے ملی تو باپ نے اجازت دے دی وہ رسول اللہ ﷺ سے ملی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: قد التحفنا لحافا غیرك (2) ہم نے تیرے سوا کوئی اور لحاف اپنا لیا ہے۔ نکاح کا ارادہ ترک کرنے سے کنایہ ہے۔

یہ سب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں۔

لونڈیوں میں سے دو لونڈیاں تھیں: (۱) حضرت ماریہ قبطیہ، حضرت ریحانہ، یہ قتادہ کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: چار لونڈیاں تھیں حضرت ماریہ، حضرت ریحانہ، جمیلہ جو آپ نے قیدیوں میں سے پائی۔ ایک لونڈی جو حضرت زینب بنت جحش نے آپ کو پیش کی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، اِنْ شرطیہ ہے اس کا جواب فَتَعَالَيْنَ ہے۔ تخییر کو شرط کے ساتھ معلق کیا۔ یہ کلام اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تخییر اور طلاق جو شرط پر معلق کی جائیں تو دونوں صحیح ہوں گی، وہ دونوں نافذ ہوں گی اور ان کا حکم جاری ہو جائے گا۔ جاہل اور بدعتی اس کی مخالفت کرتے ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ایک مرد جب اپنی بیوی سے کہے: انت طالق اذا دخلت الدار اگر بیوی گھر میں داخل ہو بھی جائے تو طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ طلاق شرعی وہ ہوتی ہے جو فی الحال نافذ ہو جائے اس کے علاوہ کوئی طلاق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ فَتَعَالَيْنَ یہ جواب شرط ہے۔ یہ بہت سی عورتوں کا فعل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ہے یہ امر کی

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8، صفحہ 154 2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 128، حدیث نمبر 18326، باب النکاح

طرف متوجہ کرنے کے لیے دعوت ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: تعال یہ اقبل کے معنی میں ہے۔ اس کے لیے وضع کیا گیا ہے جس کے لیے جلالت اور رفعت ہو۔ پھر یہ لفظ ہر اس بلانے والے کے لیے استعمال ہونے لگا جو کسی کی توجہ چاہتا ہو۔ جہاں تک اس محل کا تعلق ہے تو یہ اپنے اصل پر ہے کیونکہ داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اُمَتِّعۡكُنَّ سورۂ بقرہ میں متعہ کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اسے أمتعکن عین کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اسی طرح اسرحکن حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ سراح جمیل سے مراد یہ ہے کہ اسے طلاق سنت دے دی جائے نہ اسے تکلیف دی جائے اور نہ اس کا حق روکا جائے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو کس طرح اختیار دیا۔ (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں اختیار دیا کہ وہ بیوی کی حیثیت سے باقی رہیں یا وہ طلاق لے لیں، تو انہوں نے بیوی کی حیثیت سے رہنے کو پسند کیا؛ یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ، مجاہد، عکرمہ، شعبی، ابن شہاب اور ربیعہ کا تھا۔ ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کا اختیار دیا۔ وہ دنیا کو پسند کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جدائی اختیار کر لیں گے اگر وہ آخرت کو پسند کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے پاس روک لیں گے تا کہ ان کے لیے بھی مرتبہ بلند ہو جس طرح ان کے خاوند کا مرتبہ بلند ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق میں اختیار نہیں دیا؛ یہ قول حضرت حسن بصری اور قتادہ کا بھی ہے (1)۔ صحابہ میں سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے جس قول کو امام احمد بن حنبل نے ان سے روایت کیا ہے۔ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو اختیار دنیا اور آخرت کے بارے میں دیا۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے جب ان سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو اختیار دیتا ہے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اختیار دیا تھا، کیا وہ طلاق تھی (2)؟ ایک روایت میں ہے کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق شمار نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تخییر ثابت نہیں جس کا آپ کو حکم دیا گیا وہ نکاح کی بقا اور طلاق کے درمیان اختیار تھا، اسی وجہ سے فرمایا: ''اے عائشہ! میں تیرے سامنے ایک ایسے امر کا ذکر کرنے والا ہوں تجھ پر کوئی حرج نہیں کہ تو اس میں جلدی نہ کرے یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ کر لے'' (3)۔ اس سے یہ معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور اس کی زینت کو آخرت پر ترجیح دینے کے حوالے سے مشورہ کا ارادہ نہیں کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ فرقت اور نکاح کے بارے ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے اس عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس کو اختیار دیا گیا تھا تو اس نے خاوند کو اختیار کیا۔ سلف صالحین میں سے جمہور علماء، دوسرے علماء اور ائمہ فتاوی نے کہا: اسے طلاق لازم نہیں ہوئی۔ نہ ایک نہ زیادہ؛ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 294 2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، من خیر النساء، جلد 2، صفحہ 792

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، وان کنتن تردن الحیوۃ، جلد 2، صفحہ 705

کا قول ہے تابعین میں سے علماء، مسروق، سلیمان بن یسار، ربیعہ اور ابن شہاب کا قول ہے۔ حضرت علی شیر خدا اور حضرت زید سے یہ بھی مروی ہے اگر اس نے اپنے خاوند کو اختیار کیا تو ایک طلاق بائنہ ہوگی؛ یہ حضرت حسن بصری اور لیث کا قول ہے۔ خطابی اور نقاش نے اسے امام مالک سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اس کا قول: اختاری طلاق واقع کرنے سے کنایہ ہے۔ جب اس نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ جس طرح اس کا کہنا: انت بائن صحیح پہلا قول ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اختیار دیا(1)۔ تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے طلاق شمار نہ کیا۔ صحیحین نے اسے نقل کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ وہ عورت جس کو اختیار دیا گیا تھا جب وہ اپنے خاوند کو اختیار کر لے تو وہ طلاق نہ ہوگی۔ اور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو اختیار کر لے تو اسے طلاق ہو جائے گی خاوند رجوع کا مالک ہوگا، کیونکہ یہ جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر طلاق دیں؛ یہ قول حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، ثوری اور امام شافعی کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ ابن خویز منداد نے امام مالک سے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے کہ جب عورت نے اپنے آپ کو اختیار کر لیا تو اسے تین طلاقیں ہو جائیں گی، یہ حضرت حسن کا قول ہے، امام مالک اور لیث کا بھی یہی قول ہے کیونکہ ملکیت تو اسی طرح عورت کو حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب عورت اپنے آپ کو اختیار کرے تو کچھ بھی واقع نہ ہوگا(2)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: جب وہ اپنے خاوند کو اختیار کرے تو اسے طلاق رجعیہ واقع ہوگی(3)۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مدینہ طیبہ کی ایک جماعت اور دوسرے علماء اس طرف گئے ہیں کہ تملیک اور تخییر برابر ہیں۔ دونوں میں فیصلہ ایک ہی ہوگا؛ یہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ کا قول ہے۔ ابن شعبان نے کہا: یہ ہمارے اصحاب میں سے کثیر لوگوں کا نقطہ نظر ہے۔ یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابوعمرو نے کہا: اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ آپ دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک تملیک یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو کہتا ہے: قد ملکتك مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک، دو یا تین طلاقوں کا اختیار دیا ہے میں تجھے اس کا مالک بناتا ہوں۔ جب یہ جائز ہے کہ وہ اسے بعض کا مالک بنائے اور بعض کا مالک نہ بنائے اور اس کا وہ دعویٰ بھی کرے تو جب وہ عورت کے ساتھ جھگڑا کرے تو قسم کے ساتھ قول اس کا معتبر ہوگا۔ اہل مدینہ میں سے ایک طائفہ نے کہا: خاوند کو تملیک اور تخییر میں جھگڑا کرنے کا برابر حق ہے جب کہ وہ عورت مدخول بھا ہو؛ پہلا قول امام مالک کا مشہور قول ہے۔ ابن خویز منداد نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ خاوند کو حق حاصل ہے کہ تین طلاقوں میں مخیرہ عورت سے جھگڑا کرے یہ ایک طلاق بائنہ ہوگی، جس طرح امام ابوحنیفہ نے کہا: ابوجہم نے بھی یہی کہا ہے۔ سحنون نے کہا: یہی ہمارے اکثر اصحاب کا نقطہ نظر ہے۔

امام مالک کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ عورت جس کو اختیار دیا گیا جب وہ اپنے آپ کو اختیار کرے اور اس کے ساتھ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، ان تخییرہ امراتہ، جلد 1، صفحہ 480 2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 535 3۔ ایضاً

خاوند نے حقوق زوجیت ادا کیے ہوئے ہوں، تو اسے کلی طلاق ہو جائے گی۔ اگر خاوند اس کا انکار کرے تو اسے انکار کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اگر وہ ایک طلاق کو اختیار کرے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ اختیار قطعی طلاق کا تھا چاہے اپنا لے، چاہے ترک کر دے، کیونکہ تخییر کا معنی تسریح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت تخییر میں فرمایا: فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ تسریح کا معنی قطعی طلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ:229) تسریح باحسان سے مراد تیسری طلاق ہے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مروی ہے، جس طرح پہلے گزرا ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس کا قول: اختاری نفسی یا اختاری نفسك تقاضا کرتا ہے کہ جب عورت اپنے آپ کو اختیار کر لے تو خاوند کو اس پر کوئی حق نہ ہو اور خاوند اس سے کسی چیز کا مالک نہ ہو، کیونکہ خاوند نے معاملہ اس کے سپرد کر دیا ہے کہ خاوند اس کے بارے میں جس چیز کا مالک ہے اس سے نکل جائے یا وہ عورت اسی کے ساتھ رہے جب وہ اپنے خاوند کو اختیار کرے۔ جب عورت نے طلاق میں سے بعض کو اختیار کیا تو اس نے لفظ کے مقتضی پر عمل نہ کیا۔ یہ اس کے قائم مقام ہو گیا جس کو دو چیزوں کا اختیار دیا گیا تو اس نے ان کے علاوہ کسی اور چیز کو اختیار کیا۔ جہاں تک اس عورت کا تعلق ہے جس کے ساتھ اس نے دخول نہیں کیا تھا تو اسے تخییر اور تملیک میں اس کے ساتھ جھگڑا کا حق ہے جب وہ اپنے آپ کو ایک طلاق دے، کیونکہ وہ فی الحال جدا ہو جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ امام مالک سے روایت میں اختلاف ہے کب تک اس کو اختیار رہو گا؟ ایک دفعہ کہا: اسے مجلس میں اس وقت تک خیار ہوگا جب تک وہ اس سے نہ اٹھے اور ایسے کام میں مشغول نہ ہو جو اعراض پر دلالت کرے اگر اس نے اختیار کو نہ اپنایا اور کوئی فیصلہ نہ کیا یہاں تک کہ وہ مجلس میں جدا ہو گئے تو اسے جو اختیار دیا گیا تھا وہ باطل ہو جائے گا؛ یہ اکثر فقہاء کا نقطہ نظر ہے۔ ایک دفعہ فرمایا: اسے ہمیشہ کے لیے اختیار ہوگا، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے اختیار کو ترک کر دیا ہے اس کا ترک اس طرح معلوم ہوتا ہے تو وہ خاوند کو وطی اور مباشرت کا موقع دے۔ اس تعبیر کی بنا پر اگر وہ اپنے آپ سے خاوند کو روکے اور کسی شے کو اختیار نہ کرے تو خاوند کو حق حاصل ہوگا کہ وہ حاکم کے پاس معاملہ لے جائے کہ وہ عورت اس اختیار کو واقع کرے یا اس کو ساقط کرے اگر وہ عورت ایسا کرنے سے انکار کر دے تو حاکم اس کی تملیک کو ساقط کر دے گا۔ پہلے قول کی بناء پر جب وہ اس کے علاوہ کسی اور کام میں شروع ہو گئی جیسے کسی بات میں، کسی عمل میں یا وہ چل پڑی یا ایسے کام میں شروع ہو گئی جس کا تخییر سے کوئی تعلق نہ تھا، جس طرح ہم نے ذکر کیا تو اس کی تخییر ساقط ہو جائے گی۔ اس قول کے قائل ہمارے بعض اصحاب نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ (النساء:140)

ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ خاوند نے اس کے لیے قول مطلق کیا تھا تاکہ عورت کی جانب سے پسند سامنے آئے، تو یہ اس طرح ہو گیا جس طرح دونوں کے درمیان عقد ہوتا ہے۔ اگر قبول کرے تو ٹھیک ورنہ وہ ساقط ہو جائے گا۔ جس طرح کوئی کہتا ہے: قد وھبت لك یا بایعتك اگر وہ قبول کر لے تو ٹھیک ورنہ ملکیت اپنی جگہ باقی رہے گی؛ یہ ثوری، کوفیوں، اوزاعی، لیث، شافعی اور ابوثور کا قول ہے، یہ ابن قاسم کا اختیار ہے۔ دوسری روایت کی دلیل یہ ہے کہ یہ امر عورت کے قبضہ میں ہو گیا اور خاوند کے مالک بنانے کی وجہ سے عورت اس کی مالک بن گئی جب عورت اس کی مالک بن گئی تو ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ میں باقی

رہے جس طرح اس کے خاوند کے ہاتھ میں یہ رد باقی تھا۔

میں کہتا ہوں: یہ ہی صحیح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''میں تجھ سے ایسے امر کا ذکر کرنے والا ہوں تجھ پر کوئی حرج نہیں ہوگا کہ تو اس میں جلدی نہ کرے یہاں تک کہ تو اپنے والدین سے مشورہ کر لے'' (1)۔ اسے صحیح نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اسے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ باب کے شروع میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ یہ اس کے لیے حجت ہے جو یہ کہے: جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اختیار دے یا اسے مالک بنائے تو عورت کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اس بارے میں فیصلہ کرے اگرچہ وہ مجلس سے جدا ہو جائیں، یہ حضرت حسن بصری اور زہری سے مروی ہے۔ امام مالک نے اپنی دو روایتوں میں سے ایک میں کہا: ابو عبید نے کہا: اس باب میں ہمارے نزدیک یہ ہے اس حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے معاملہ ہی کی پیروی سنت کی اتباع ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اختیار کو یوں بنایا تو وہ اپنے والدین سے مشورہ کریں اور ہم نے مجلس سے اٹھنے کو اختیار سے نکلنا شمار نہیں کیا۔ مروزی نے کہا: میرے نزدیک یہ سب سے صحیح قول ہے: یہ ابن منذر اور طحاوی کا قول ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝

''اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی ہوئی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے اور جو تم میں سے فرمانبردار بنی رہی اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نیک عمل کرتی رہی تو ہم اس کو اس کا اجر بھی دو چند دیں گے اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی فضیلت کا ذکر کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی تکریم کے لیے ارشاد فرمایا: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ اور ان کا حکم دوسروں سے جدا کر دیا فرمایا: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ان کی طاعت کا ثواب اور ان کی معصیت کا عقاب دوسروں سے زیادہ کر دیا۔ فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے جو فاحشہ لائی (اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 152

اس سے محفوظ رکھنے والی ہے جس طرح حدیث افک میں گزر چکا ہے) اللہ تعالیٰ ان کے لیے عذاب کو دگنا کر دے گا۔ یہ ان کے مقام کے شرف اور درجہ کی فضیلت کی وجہ سے ہے۔ اور ان کے دوسری تمام عورتوں پر تقدم کی وجہ سے یہ حکم لگایا۔ شریعت نے یہ بیان کیا جس کا ذکر کئی مواقع پر گزر چکا ہے جس طرح اس کی وضاحت میں گزر چکا ہے کہ جب حرمتیں اور عزتیں زیادہ ہوں گی تو پھر ان کو پامال کیا جائے تو عقوبتیں بھی کئی گنا ہوں گی۔ اسی وجہ سے غلام کے بدلہ میں آزاد اور باکرہ کے مقابلہ میں ثیبہ کی حد دگنی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج وحی کے نازل ہونے کی جگہ رہتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کے نازل ہونے کی جگہ رہتی تھیں تو ان پر معاملہ قوی ہو گیا تو ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے ان پر ایسی چیز لازم ہو گی جو اس سے زائد ہو گی جو ان کے علاوہ پر لازم ہو گا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کی وجہ ان کے جرائم کا ضرر بڑھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کی وجہ سے ان کا جرم اتنا بڑا ہو گیا تو عقوبت بھی اس پر اسی قدر ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ اس قول کو طبری نے پسند کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ایک قوم کا کہنا ہے: اگر ان میں سے کسی ایک سے بدکاری واقع ہوئی جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اس جرم سے محفوظ رکھا تو عظمت شان کی وجہ سے اس کو دو حدیں جاری کی جاتیں، جس طرح آزاد عورت کو لونڈی کے مقابلہ میں زیادہ کوڑوں کی صورت میں حد جاری کی جاتی ہے۔ یہاں عذاب حد کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ (النور) اس اعتبار سے ضعفین کا معنی مثلین یا مرتین ہے ابو عبیدہ نے کہا: ضعف الشیء سے مراد دو چیزیں ہیں یہاں تک کہ وہ تین ہو جائیں (2)۔

ابو عمرو نے یہ قول کیا جو طبری نے اس سے حکایت بیان کی ہے تو اس کی طرف دو عذابوں کو منسوب کیا جائے جو دونوں اس کی مثل ہوں گے تو یہ تین عذاب ہو جائیں گے۔ طبری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس طرح یہ غیر صحیح ہے، اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے اس کا احتمال موجود ہے۔ اجر کا دو دفعہ ہونا اس قول کو فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ فاحشہ میں عذاب، طاعت میں اجر کے مقابل ہے؛ یہ ابن عطیہ کا قول ہے (3)۔ نحاس نے کہا: ابو عمرو نے یضاعف اور یضعف میں فرق کیا ہے۔ کہا: یضاعف کئی دفعہ کے لیے اور یضعف دو دفعہ کے لیے بولا جاتا ہے، اسی وجہ سے اسے یضعف پڑھا گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: يُضْعَفْ لَهَا الْعَذَابُ اس کو تین عذاب بنا دیا جائے گا (4)۔ نحاس نے کہا: ابو عمرو اور ابو عبیدہ نے جو فرق بیان کیا ہے جن علماء لغت کو میں جانتا ہوں ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا۔

یضاعف اور یضعف کا معنی ایک ہی ہے یعنی اسے دوگنا کر دیا جائے گا، جس طرح تو کہتا ہے: ان دفعت الی درهما دفعت الیك ضعفیه یعنی اگر تو نے مجھے ایک درہم دیا تو میں تجھے دو درہم دوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 382
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 397
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 382
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 397

دلالت کرتا ہے۔عذاب اجر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ایک اور موقع پر فرمایا: اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ یہاں بھی دو مثل ہے۔معمر نے قتادہ سے يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ کی یہ تعبیر روایت کی ہے کہ دنیا کا عذاب اور آخرت کا عذاب۔قشیری ابونصر نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ضعفین سے مراد دو مثل ہیں، کیونکہ ارشاد فرمایا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وصایہ میں ہے۔اگر کسی انسان نے کسی انسان کے حق میں اپنے بچے کے حصہ سے دو ضعف وصیت کی تو یہ اس امر کی وصیت ہوگی کہ اس آدمی کو بچے کے حصہ سے تین گنا دیا جائے گا، کیونکہ وصیتیں عرف کے مطابق جاری ہوتی ہے۔اور کلام اللہ کی تفسیر کلام عرب کی طرف پھیری جاتی ہے۔اور کلام میں ضعف کا لفظ مثل اور مازاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔یہ دو مثل متصور نہیں۔یہ جملہ بولا جاتا ہے: هذا ضعف هذا یعنی یہ اس کی مثل ہے۔هذا ضعفاه یہ اس کی مثل ہے۔اصل میں ضعف اس زیادتی کے لیے بولا جاتا ہے جو غیر محصور ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ (سبا: 37) اس سے ایک مثل یا دو مثل کا ارادہ نہیں کیا، یہ سب ازہری کا قول ہے۔سورۂ نور میں وہ اختلاف گزر چکا ہے جو اس آدمی پر حد کے بارے میں ہے جو ان میں سے کسی پر تہمت لگاتا ہے۔الحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ابورافع نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر صبح کی نماز میں سورۂ یوسف اور سورۂ احزاب کی تلاوت کیا کرتے تھے۔جب آپ اس آیت يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ پر پہنچتے تو اپنی آواز کو بلند کرتے۔

اس کے بارے میں آپ سے عرض کی گئی تو فرمایا: میں انہیں وعدہ یاد دلاتا ہوں (1)۔جمہور نے من یأت قراءت کی اسی طرح من يَّقْنُتْ کو من کے لفظ پر محمول کیا ہے۔القنوت کا معنی طاعت ہے۔یہ بحث گزر چکی ہے۔یعقوب نے من تأت اور تَقْنُتْ تاء کے ساتھ پڑھا ہے وہ معنی پر محمول کرتے ہیں۔ایک قوم نے کہا: فاحشہ کا لفظ جب معرفہ وارد ہو تو اس سے مراد زنا اور لواطت ہے (2)۔جب یہ نکرہ واقع ہو تو اس سے مراد باقی ماندہ معاصی ہیں۔جب یہ بطور منعوت واقع ہو تو اس سے مراد یہاں بیوی کی ناچاقی اور حسن معاشرت کا نہ ہونا ہے۔ایک جماعت نے کہا: بلکہ اس کا فرمان بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ تمام معاصی کو عام ہے (3)۔اسی الفاحشۃ کا لفظ جس طرح بھی وارد ہو۔

ابن کثیر نے مبینة یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔نافع اور ابوعمرو نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ایک جماعت نے یضاعف عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں فعل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب ہوگا۔ابوعمرو نے خارجہ کی روایت میں نضاعف نون مضموم اور العذاب کے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے، یہ ابن محیصن کی قراءت ہے۔یہ ایک فرد کی جانب سے باب مفاعلہ کا اظہار ہے، جس طرح طارقت النعل عاقبت اللص میں باب مفاعلہ ایک فاعل کے لیے ہے۔نافع، حمزہ اور کسائی نے یضاعف کو یاء اور عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور العذاب کو مرفوع پڑھا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، ابن کثیر اور عیسیٰ کی قراءت کی ہے۔ابن کثیر اور ابن عامر نے نضعف کو نون اور عین مشددہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اور العذاب کو منصوب پڑھا ہے۔مقاتل نے کہا: عذاب میں یہ تضعیف آخرت میں ہوگی؛ کیونکہ اجر کا دو دفعہ ہونا

---

1۔المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 381 2۔ایضاً 3۔ایضاً، جلد 4، صفحہ 382

آخرت میں ہوگا۔ یہ حسن ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ازواج ایسا جرم نہیں کریں گی جو حد کو واجب کرتا ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کی بیوی نے کبھی بھی بدکاری نہیں کی۔ انہوں نے ایمان اور طاعت میں خیانت کی۔ بعض مفسرین نے کہا: وہ عذاب جس کے دگنا ہونے کی انہیں دھمکی دی گئی وہ دنیا اور آخرت کا عذاب ہے (1)۔ اسی طرح اجر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے (2)، مگر اس صورت میں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج سے دنیا کی حدود ان سے آخرت کے عذاب کو ختم نہ کریں، جیسا لوگوں کا حال ہے جو حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ ایسا امر ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی نہیں اور نہ اس کے ثبوت کو محفوظ کیا گیا ہے۔ اہل تفسیر کا قول ہے کہ رزق کریم سے مراد جنت ہے، نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

"اے نبی کی ازواج (مطہرات) تم نہیں ہو دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند اگر تم پرہیز گاری اختیار کرو پس اس نرمی سے بات نہ کرو کہ طمع کرنے لگے وہ (بے حیا) جس کے دل میں روگ ہے اور گفتگو کرو تو باوقار انداز سے کرو"۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ یعنی فضل و شرف میں عام عورتوں کی طرح نہیں۔ کأحد فرمایا کواحدۃ نہیں فرمایا کیونکہ احد یہ مذکر، مونث، واحد اور جماعت سے نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کا ذکر ایسی چیز کے لیے ہوتا ہے جو آدمی نہ ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: لیس فیھا احد یعنی اس میں کوئی بکری اور اونٹ بھی نہیں۔ النساء کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ گزری ہوئی عورتوں میں حضرت آسیہ اور حضرت مریم بھی ہیں۔ قتادہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ان کی باہمی فضیلت کے بارے میں اختلاف کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔ وہاں اس میں غور وفکر کر لے۔
پھر فرمایا: اِنِ اتَّقَيْتُنَّ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اس امر کو واضح کیا کہ فضیلت ان کے لیے تقویٰ کی شرط کے ساتھ مکمل ہوگئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور آپ کے ہاں عظیم مقام عطا کیا اور ان کے حق میں قرآن نازل فرمایا۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ یہ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے، مگر یہ اسی طرح مبنی ہے جس طرح فعل ماضی مبنی ہوتا ہے؛ یہ سیبویہ کا مذہب ہے، یعنی قول میں نرمی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ان کا قول باوقار ہونا چاہیے اور کلام فیصلہ کن ہونی چاہیے وہ ایسی صورت پر نہیں ہونی چاہیے جو دل میں لگاؤ پیدا کرے اس کی وجہ اس کلام کی نرمی ہو، جس طرح عربوں کی عورتوں کی حالت ہوتی جب وہ مردوں سے کلام کرتے ہوئے رویہ اپناتیں کہ آواز کو توڑتیں اور اس میں نرمی پیدا کرتیں، جس طرح ان عورتوں کی کلام ہوتی ہے جو شک ڈالتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

فَيَطْمَعَ یہ منصوب ہے اور نہی کے جواب میں ہے الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ مرض سے مراد شک اور نفاق ہے، یہ قتادہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 382　　2۔ ایضاً

سدی سے مروی ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد فجور کے لیے آراستہ ہونا ہے وہ فسق اور عورتوں سے باتیں کرنے میں دلچسپی کا اظہار ہے (2)؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔ اس آیت میں نفاق کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ابو حاتم نے حکایت بیان کی کہ اعرج نے فیطمع یاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: میں گمان کرتا ہوں یہ غلط ہے اور یہ کہ اس نے فیطمِع میم کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہو اور اس کا عطف تخضعن پر ہو۔ یہ توجیہ عمدہ اور اچھی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فیطمع یہ فیطمع الخضوع او القول کے معنی میں ہو۔

**وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا۔ عورت کے لیے مستحب یہ ہے کہ جب وہ اجنبی لوگوں سے خطاب کرے اور اسی طرح جب ان محرم لوگوں سے خطاب کرے جو رشتہ مصاہرت کی وجہ سے محرم ہیں کہ وہ قول میں سختی لائے جب کہ آواز کو بلند نہ کرے، کیونکہ عورت کو پست انداز میں کلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قول معروف سے مراد وہ درست عمل ہے جس کو شریعت اور نفوس ناپسند نہ کریں۔

**وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ﴿۳۳﴾**

''اور ٹھہری رہو اپنے گھروں میں اور اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو جیسے سابق دور جاہلیت میں رواج تھا اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے دور کر دے پلیدی کو اے نبی کے گھر والو! اور تم کو پوری طرح پاک صاف کر دے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ قَرْنَ جمہور قراء نے اسے وقِرن قاف کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ عاصم اور نافع نے قاف کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ جہاں تک پہلی قراءت کا تعلق ہے تو یہ دو وجوہ کا احتمال رکھتی ہے: (۱) یہ وقار سے مشتق ہو۔ تو کہتا ہے: وَقَرَ یَقِرُ وَقَارًا اس کا معنی سکونت اختیار کرنا ہے۔ امر قِرْ ہے اور النساء کے لیے قِرن ہے۔ جس طرح عِدْن، زِنّ ہے (۲) یہ مبرد کا قول ہے یہ قرار سے مشتق ہو (3)۔ تو کہتا ہے: قررت بالمکان یہ راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اس سے امر کا صیغہ اِقْرِ ہے اصل میں یہ اَقْرِرْنَ راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ پہلی راء تخفیف کی وجہ سے حذف ہے، جس طرح انہوں نے ظللت میں ظلت، مسست میں مست کیا اس کی حرکت کو قاف کی طرف نقل کیا قاف کے متحرک ہونے کی وجہ سے یہ ہمزہ وصلی سے مستغنی ہو گیا۔ ابو علی نے کہا: بلکہ اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ راء کو یاء سے بدلا ایک جنس کے دو حروف اکٹھے ہونے کو ناپسند کرتے ہوئے جس طرح قیراط اور دینار میں کیا۔ یاء کے لیے وہ حرکت ہوگی جو حرکت اس حرف کی تھی جس کو یاء سے بدلا گیا۔ تقدیر کلام یہ ہو

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 399 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383 3۔ ایضاً

گی: اِقْرِرْنَ پھر یاء کے کسرہ کے ناپسند ہونے کی وجہ سے یاء کی حرکت قاف کو دی گئی تو یاء اجتماع ساکنین کی وجہ سے ساقط ہو گئی۔ ہمزہ وصل ساقط ہو جائے گا کیونکہ اس کا مابعد متحرک ہے تو یہ قِرْنَ ہو گیا۔

جہاں تک اہل مدینہ اور عاصم کی قراءت ہے تو یہ عربوں کی لغت پر ہے: قرِرت فی المکان جب تو اس میں مقیم ہو (1)۔ راء کے نیچے کسرہ ہے اقر قاف پر فتحہ ہے یہ حِمد یحمَد کا باب ہے۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے ابوعبید نے اسے الغریب المصنف میں کسائی سے ذکر کیا یہ ان کے اجل مشائخ میں سے ہے؛ اسے زجاج اور دوسرے علماء نے ذکر کیا۔ اصل اقرَرن ایک جنس کے دو حروف اکٹھے ہونے کی وجہ سے ثقل واقع ہوا تو پہلی راء کو حذف کر دیا۔ اس کی حرکت قاف کو دی تو تو کہے گا: قِرن، فراء نے کہا: یہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: احسَتُ صاحبك یعنی هل اَحَسَسْت ہے۔ ابوعثمان ہزلی نے کہا: قررت به عینا اس کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا بھی درست ہے کوئی اور صورت نہیں یہ قرۃ العین سے مشتق ہے۔ قررت فی المکان میں کسرہ جائز نہیں یہ راء کے فتحہ کے ساتھ قررت ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قراءت ثابت ہے تو اس کا ناپسند کرنا قراءت میں قدح کا باعث نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قراءت ثابت ہو اس کے ساتھ لغت کی صحت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ابو حاتم بھی اس طرف گئے ہیں کہ قرن کلام عرب میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔ نحاس نے کہا: جہاں تک ابو حاتم کے قول کا تعلق ہے یہ اس کا مذہب نہیں۔ اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اس میں دو مذہب ہیں: (۱) جسے کسائی نے بیان کیا ہے (۲) جو میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا۔ اس نے کہا: یہ قررت به عینا اقر سے مشتق ہے۔ معنی ہے: اپنے گھروں میں ٹھنڈی آنکھ سے رہو۔ یہ اچھی توجیہ ہے، مگر حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ پہلے قول سے ماخوذ ہے، جس طرح یہ روایت کی گئی ہے حضرت عمار نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو اپنے گھر میں رہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے ابا یقظان! تو ہمیشہ حق کہتا رہا (2)۔

حضرت عمار نے کہا: اس اللہ کے لیے تمام تر تعریفیں ہیں جس نے مجھے اس طرح بنایا جو آپ کی زبان پر ہے۔ ابن ابی عبلہ نے واقررن الف وصلی اور دو راؤں کے ساتھ پڑھا اور پہلی راء مکسور ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اس آیت کا معنی ہے گھر میں رہنے کا حکم ہے۔ اگرچہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تاہم دوسری عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ یہ حکم لازم ہے اگرچہ کوئی ایسی دلیل وارد نہ ہو جو تمام عورتوں کو خاص کرے۔ یہ حکم کیسے نہ ہو جب کہ شریعت مطاہرہ تمام عورتوں کے لیے اس حکم کو لازم کرتی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں اور وہ اپنے گھروں سے باہر ہونے سے رکی رہیں، مگر ضرورت کی بناء پر وہ گھر سے باہر جا سکتی ہے، جس طرح کئی مواقع پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی ازواج کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں میں ہی رہیں اور انہیں خطاب فرمایا مقصود ان کو شرف عطا کرنا اور تبرج سے انہیں روکنا ہے۔ یہ چیز جان لو کہ یہ جاہلیت اولیٰ کا فعل ہے۔ اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ اس چیز کو ظاہر کیا جائے جس کو پردہ میں رکھنا اچھا تھا۔ یہ اس سے ماخوذ ہے جس میں وسعت کا معنی ہو جس طرح کہا جاتا ہے: فی اسنانه برج جب وہ جدا جدا ہوں؛ یہ مبرد کا قول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383 2۔ ایضاً

ہے۔ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ زمانہ ہے(1) جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی عورت موتیوں سے بنی قمیص پہنتی وہ راستہ کے درمیان میں چلتی اور اپنے آپ کو مردوں پر پیش کرتی۔ حکیم بن عیینہ نے کہا: الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کا درمیانی عرصہ ہے(2)۔ یہ آٹھ سو سال کا عرصہ ہے۔ ان کے بارے میں مذموم سیرتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام کے درمیان کا زمانہ ہے(3)۔ کلبی نے کہا: حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان کا عرصہ ہے(4)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عورتیں موتیوں سے بنی ہوئی قمیص پہنتیں جو دونوں جانب سے سلی ہوئی نہیں ہوتی تھیں وہ باریک کپڑے پہنا کرتی تھیں اور اپنے بدن کو نہیں چھپاتی تھیں۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: یہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان کا عرصہ ہے(5)۔ امام شعبی نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا عرصہ ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا زمانہ ہے(6)۔ اس دور میں عورت کی موتیوں سے جڑی قمیص ہوتی جو دونوں جانب سے سلی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ ابو العباس مبرد نے کہا: الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: الجاهلية الجهلاء کہا: الجاهلية الجهلاء میں عورتیں اس کو ظاہر کرتیں جس کا اظہار قبیح ہوتا، یہاں تک کہ عورت اپنے خاوند اور اپنے دوست کے ساتھ بیٹھتی اس کا دوست اس کے ازار بند سے لے کر جسم کے اوپر والے حصہ سے لطف اندوز ہوتا اور اس کا خاوند ازار بند سے نیچے والے حصے سے لطف اندوز ہوتا بعض اوقات ان میں سے ایک دوسرے کے حصہ کا مطالبہ کر دیتا۔ مجاہد نے کہا: عورتیں مردوں کے درمیان چلتیں۔ یہی تبرج تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: جو چیز میرے نزدیک ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جاہلیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو وہ اپنا چکی تھیں انہیں حکم دیا گیا کہ ان کی سیرت کو چھوڑ دیں وہ وہ سیرت تھی جو شریعت سے پہلے کافروں کی سیرت تھی، کیونکہ ان کے ہاں کوئی غیرت نہ تھی۔ عورتوں کا معمول حجاب کے بغیر تھا۔ اسے اولیٰ بنانا اس اعتبار سے ہے جس میں تھیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ وہاں کوئی اور جاہلیت تھی۔ جاہلیت کا اسم اس مدت پر واقع کیا گیا جو اسلام سے قبل تھا۔ انہوں نے کہا: شعراء میں جاہلی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول بخاری میں ہے سمعت ابی فی الجاهلية يقول میں نے اپنے باپ کو جاہلیت میں کہتے ہوئے سنا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں(7)۔

میں نے کہا: یہ اچھا قول ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عرب تو بدحال اور تنگ دست تھے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے: خوش پوشی اور زینت کا اظہار یہ سابقہ زمانوں میں بھی جاری رہا۔

الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى سے مراد یہی چیز ہے اور آیت کا مقصود یہ ہے کہ ان سے قبل جو عورتوں کا وطیرہ تھا اس کی مخالفت کی

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 537
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 400
4۔ ایضاً
5۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383
6۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 400
7۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 384

جائے، جیسے ناز و نخرہ کرنا اور مردوں کے لیے محاسن کو ظاہر کرنا، اس کے علاوہ تمام وہ چیزیں جو شرعاً جائز نہیں۔ یہ تمام اقوال کو شامل ہے اور انہیں عام ہے پس وہ اپنے گھروں میں ہی رہیں۔ اگر انہیں گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو تو وہ ترک زینت اور کامل پردہ کی حالت میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ثعلبی اور دوسرے علماء نے ذکر کیا (1) کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب اس آیت کو پڑھتیں تو آپ روتیں یہاں تک کہ آپ کی اوڑھنی تر ہو جاتی۔ یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت سودہ نے انہیں کہا: تو کیوں حج اور عمرہ نہیں کرتیں جس طرح تیری بہنیں (دوسری ازواج مطہرات) کرتی ہیں؟ فرمایا: میں نے حج کر لیا اور میں نے عمرہ کر لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے گھر میں ٹھہروں۔ راوی نے کہا: اللہ کی قسم! وہ اپنے حجرہ کے دروازہ سے باہر نہ نکلیں یہاں تک کہ ان کا جنازہ نکالا گیا۔ ابن عربی نے کہا: میں تقریباً ایک ہزار دیہاتوں میں داخل ہوا۔ میں نے نابلس کی عورتوں سے بڑھ کر اپنے عیال کی حفاظت کرنے والی اور سب سے زیادہ پاک دامن کسی عورت کو نہیں دیکھا۔ جہاں حضرت خلیل علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا میں وہاں رہا میں نے دن کے وقت کسی عورت کو راستہ میں نہیں دیکھا مگر جمعہ کے روز وہ جمعہ کی نماز کے لیے نکلتیں جس یہاں تک کہ مسجد ان سے بھر جاتی۔ جب نماز ختم ہوتی اور وہ اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاتیں دوسرے جمعہ تک ان میں سے کسی پر بھی میری نظر نہ پڑتی۔ میں نے مسجد اقصیٰ میں پاک دامن عورتوں کو دیکھا وہ اپنی اعتکاف والی جگہ سے نہ نکلتیں یہاں تک ان کی وہاں شہادت ہو جاتی (2)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** ابن عطیہ نے کہا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا رونا ایام جمل میں سفر کے سبب تھا (3)۔ اسی موقع پر آپ سے حضرت عمار نے کہا تھا: اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو اپنے گھر میں رہے۔ ابن عربی نے کہا: رافضیوں (4) نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے کہا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی جب وہ لشکروں کی قیادت کرتے ہوئے نکلیں، جنگوں میں براہ راست حصہ لیا، نیزوں اور تلواروں کے وار پڑنے کی جگہ داخل ہوئیں جو نہ ان پر فرض تھا اور نہ ان کے لیے جائز تھا۔ انہوں نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا گیا۔ جب آپ نے یہ منظر دیکھا تو آپ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا تو سواری پیش کی گئی تاکہ آپ مکہ مکرمہ کی طرف جائیں۔ مردوں نے آپ سے عرض کی: اے ام المومنین! یہاں ہی رہیں اور ان چرواہوں کو واپس کیجئے، کیونکہ لوگوں کے درمیان آپ کے حج کرنے سے بہتر ہے۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے کہا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فتنہ سے قبل حج کی نذر مانی تو آپ نے نذر چھوڑنے کو مناسب خیال نہیں کیا۔ اگر اس شورش میں نکلتیں تو یہ آپ کے لیے صحیح ہوتا۔ جہاں تک جنگ جمل میں نکلنے کا تعلق ہے آپ جنگ کے لیے نہیں نکلی تھیں لیکن لوگ آپ سے چمٹ گئے اور انہوں نے طمع کی کہ جب آپ مخلوق کے لیے کھڑی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1535
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 383
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1536-1535

ہوں گی تو لوگ حیاء کریں گے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے گمان کیا یہ اس طرح ہی ہوگا، تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اقتدا کرتے ہوئے نکل پڑیں اسلام کا یہ فرمان ہے: لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ (النساء: 114) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا (الحجرات: 9)

اصلاح احوال کا امر ایسا ہے جس کے مخاطب تمام لوگ ہیں، وہ مرد ہوں، عورتیں ہوں، آزاد ہوں یا غلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قضاء سابق کی بنا پر اس کا ارادہ نہ کیا کہ اصلاح واقع ہو، لیکن نیزے پڑے اور زخم لگے یہاں تک کہ قریب تھا کہ دونوں فریق فنا ہو جاتے تو کسی نے اس اونٹ کا قصد کیا اس نے اس اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں۔ جب اونٹ اس پہلو گرا تو محمد بن ابو بکر نے حضرت عائشہ صدیقہ کو تھام لیا اور انہیں بصرہ لے گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ تیس عورتوں کے ساتھ نکلیں جو عورتیں حضرت علی شیر خدا نے ان کے ساتھ ملائی تھیں، یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو مدینہ طیبہ، برہ، تقیہ اور مجتہدہ کی حیثیت سے پہنچایا جو بھی آپ نے تاویل کی اس میں مصیب اور ثواب کی مستحق تھیں جو بھی کیا اس پر ان کو اجر ملے گا، کیونکہ ہر مجتہد احکام میں مصیب ہوتا ہے۔ سورۃ النحل میں اس اونٹ کا نام گزر چکا ہے اسی کی مناسبت سے وہ دن معروف ہے۔

وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ جو ان کو امر کیا گیا اور جس سے منع کیا گیا اس کی اطاعت کرتی ہیں۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ زجاج نے کہا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور آپ کے وہ اہل ہیں جو اہل بیت شمار ہوتے ہیں۔ جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔ اَهْلَ الْبَیْتِ مدح کے طور پر منصوب ہے۔ کہا: اگر تو چاہے تو کہے یہ بدل کے طور پر منصوب ہے کہ رفع اور جر دونوں جائز ہیں۔ نحاس نے کہا: اگر اسے کم سے بدل بناتے ہوئے جر دی جائے تو ابو العباس محمد بن یزید کے نزدیک جائز نہیں۔ کہا: مخاطبہ اور مخاطب سے بدل نہیں بنایا جاتا کیونکہ دونوں بیان کے محتاج نہیں ہوتے۔ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا، تطہیر مفعول مطلق ہے اور اس میں تاکید کا معنی پایا جاتا ہے۔

وَ اذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا ۝۳۴

''اور یاد رکھو اللہ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا لطف فرمانے والا ہر بات پر باخبر ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ اذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ یہ الفاظ یہ معنی دیتے ہیں کہ اہل بیت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں۔ اہل علم نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ اہل بیت کون ہیں؟(1)۔ عطا، عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد صرف آپ کی ازواج ہیں ان کے ساتھ کوئی مرد اہل بیت میں شامل نہیں۔ وہ اس طرف گئے ہیں کہ بیت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ، ایک فرقہ نے کہا: جن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 384

میں کلبی بھی ہیں: مراد حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں (1)۔ اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث مروی ہیں۔ انہوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ اگر یہ خاص کر عورتوں کے لیے حکم ہوتا تو یوں ارشاد ہوتا عنکن ویطھرکن مگر یہ احتمال موجود ہے کہ کم ضمیر لفظ اہل کے اعتبار سے ہو، جس طرح ایک آدمی اپنے ساتھی سے کہتا ہے: کیف أھلك مراد ہوتا ہے تیری بیوی یا تیری بیویاں کیسی ہیں؟ وہ کہتا ہے: ھم بخیر وہ اچھی ہیں۔ محل استدلال ھم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ہود:73)

آیت سے جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ آیت تمام اہل بیت کو عام ہے، وہ بیویاں ہوں یا اور۔ فرمایا: وَيُطَهِّرَكُمْ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ان میں شامل تھے۔ جب مذکر اور مونث جمع ہو جائیں تو مذکر کو غلبہ دیا جاتا ہے۔ آیت تقاضا کرتی ہے کہ بیویاں اہل بیت سے ہیں، کیونکہ انہیں کے متعلق ہے اور ان کو یہی خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی پر سیاق کلام بھی دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ جہاں تک حضرت ام سلمہ کا تعلق ہے انہوں نے کہا: یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ خیبر کی بنی چادر میں داخل ہو گئے۔ فرمایا: ''یہ میرے اہل بیت ہیں''۔ اور آیت کو پڑھا۔ دعا کی۔ ''اے اللہ! ان سے رجس کو دور کر دے اور انہیں پاکیزہ بنا دے''۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں؟ فرمایا: انت علی مکانك وأنت علی خیر تو اپنے مرتبہ پر ہے اور تو بھلائی پر ہے۔ امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے (2)۔

قشیری نے کہا: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے اپنا سر چادر میں داخل کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ ثعلبی نے کہا: اہل بیت سے مراد بنو ہاشم ہیں (3)۔ یہ تعبیر دلالت کرتی ہے کہ بیت سے مراد نسب کا بیت ہے تو حضرت عباس، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچے اور ان کی اولاد اس میں شامل ہوں گے۔ اس کی مثل حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کلبی کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاذْكُرْنَ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی ابتدا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو ہو رہا ہے (4)۔ یہ نصیحت کے انداز میں اور اس نعمت کو شمار کرنے کے انداز میں ہے وہ نعمت جو ان کے گھروں میں اللہ تعالیٰ کی آیات اور حکمت کی باتیں کی جاتی ہیں۔

علماء تاویل کہتے ہیں کہ آیات اللہ سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاذْكُرْنَ ماقبل کے ساتھ متعلق ہے۔ عنکم۔ اھل کی وجہ سے فرمایا پس اہل مذکر ہے۔ اگرچہ وہ مونث ہیں پھر بھی انہیں مذکر کے ساتھ یاد کیا اس وجہ سے عنکم ہو گیا کلبی اور اس جیسے لوگوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس تفسیر میں ایسی اشیاء پائی جاتی ہیں اگر سلف

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 384
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 152
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 384
4۔ ایضاً

صالحین کے زمانہ میں پائی جاتیں تو وہ اسے اس سے روک دیتے اور اس پر حجر کا حکم لگا دیتے۔ تمام آیات یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا تک سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ درمیان میں کوئی ایسی کلام ہو جو منفصل ہو اور غیر کے لیے ہو۔ بے شک یہ احادیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر کا قصد کیا۔ اسے ان پر لپیٹا، پھر اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا: ''اے میرے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں، اے اللہ! ان سے رجس کو دور فرما دے اور انہیں پاکیزہ کر دے''(1)۔ آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بلایا، تو آپ نے پسند کیا کہ انہیں بھی اس آیت کے حکم میں داخل کر دیں جس کے ساتھ ازواج کو خطاب کیا گیا تھا۔ کلبی اور ان کی موافقت کرنے والے اس طرف گئے ہیں اور اس آیت کو ان کے لیے خاص کیا ہے جب کہ ان کے حق میں دعا کرنا تنزیل کے حکم سے خارج ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ذکر کا لفظ تین معانی کا احتمال رکھتا ہے: (۱) وہ نعمت کے محل کو یاد کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے گھروں والا بنا دیا جن میں اللہ تعالیٰ کی آیات اور حکمت کو تلاوت کیا جاتا ہے۔ (۲) وہ اللہ تعالیٰ کی آیات یاد کریں اور ان کی قدر پہنچانیں اور ان میں غور و فکر کریں یہاں تک کہ تم میں سے ہر ایک ایسی حالت پر ہو تم اللہ تعالیٰ کی نصیحتوں سے نصیحت حاصل کرو جس کا یہ حال ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ اس کے افعال اچھے ہوں۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَاذْكُرْنَ کا معنی ہے تم یاد کرو، انہیں پڑھو اور زبانوں پر اسے لازم کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کو یاد رکھو۔ یہی وہ چیز ہے جن کی تمہارے گھروں میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی صورت میں تلاوت کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ جو قرآن حکیم ان کے گھروں میں نازل ہوتا ہے اس کی خبر دیں اور جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال دیکھتی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو اقوال سنتی ہیں اس کی خبر دیں تاکہ یہ لوگوں تک پہنچیں تو لوگ ان پر عمل کریں اور اس کی اقتدا کریں۔ یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ دین کے معاملہ میں مردوں اور عورتوں کی جانب سے خبر واحد قبول کی جائے گی۔

(۳) ابن عربی نے کہا: اس آیت میں عمدہ مسئلہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا جائے اس کی تبلیغ کریں اور دین میں سے جن امور سے آگاہ ہوں اس کی تعلیم دیں (2)۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک پر آیت پڑھ دیتے یا کوئی اتفاقاً اس کو سن لیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرض ساقط ہو جاتا تو اسے جو سنتا اس پر لازم تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ لازم نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب صحابہ کو یہ ذکر کریں۔ اسی طرح جب آپ کی بیویاں اس کو جان لیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ لازم نہیں تھا کہ لوگوں کی طرف نکلیں اور انہیں کہیں: فلاں حکم نازل ہوا اور یہ نازل نہیں ہوا اسی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں: شرمگاہ کے چھونے سے وضو کے وجوب کے حکم پر عمل کرنا جائز سمجھتے ہیں (3) وہ بسرہ بنت صفوان سے مروی ہے کیونکہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 152 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 39-1538

3۔ ابن ماجہ، باب الوضوء من مس الذکر، حدیث نمبر 471، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے وہی روایت کیا جو انہوں نے سنا اور اسی کو آگے پہنچایا جو انہوں نے یاد کیا یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حکم مردوں تک پہنچتا، جس طرح امام ابوحنیفہ(1) نے کہا کیونکہ انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایات نقل کی ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآىِٕمِیْنَ وَ الصّٰٓىِٕمٰتِ وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝

”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں تیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ترمذی نے ام عمارہ انصاریہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے عرض کی: میں ہر چیز مردوں کے لیے دیکھتی ہوں، میں عورتوں کو نہیں دیکھتی کہ ان کا کسی حوالے سے ذکر ہو(2)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ الْمُسْلِمِیْنَ، ان کا اسم ہے۔ وَ الْمُسْلِمٰتِ اس پر معطوف ہے۔ بصریوں کے نزدیک اسے رفع دینا بھی جائز ہے جہاں تک فراء کا تعلق ہے اس کے نزدیک رفع جائز نہیں مگر اس میں جس میں اعراب ظاہر نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلام کے ذکر سے آغاز کیا جو ایمان اور اعضاء کے اعمال کو عام ہے پھر ایمان کا ذکر کیا مقصد اس کی تخصیص کرنا اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ ایمان اسلام کا عظیم حصہ اور اس کا سہارا ہے۔ قانت کا معنی عبادت گزار اور مطیع ہے۔ صادق سے مراد ہے وہ اسے پورا کرے جس کا اس سے وعدہ لیا گیا۔ صابر جو ناپسندیدہ اور پسندیدہ حال میں شہوات سے اور طاعات پر صبر کرے۔ خاشع سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ڈرنے والا، متصدق فرض و نفل صدقہ کرنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں اس سے مراد فرض صدقہ دینے والا ہے۔ پہلا قول زیادہ مدح کا باعث ہے۔ صائم بھی اسی طرح ہے۔

وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وہ اپنی شرمگاہوں کو زنا وغیرہ جو امور حلال نہیں سے حفاظت کرنے والے ہیں۔

1۔ امام اعظم کا استدلال یہ ہے کہ حضرت بسرہ کے مقابلہ میں دوسرے صحابہ سے اس بارے میں مرفوع روایات ہیں جو اس روایت کے مقابلہ میں عقلا اور نقلا قوی ہیں۔ اسی لیے ان روایات پر عمل کیا جائے گا۔

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 53-152

اَلْحٰفِظٰتِ میں حذف ہے جس پر متقدم کلام دلالت کرتی ہے تقدیر کلام یہ ہے والحافظاتها متقدم پر یہی اکتفا کیا۔ الذاکرات بھی اسی کی مثل ہے اس کی مثل شاعر کا قول ہے:

وَكُمْتًا مُدَمَّاةً كَأَنَّ متونها جرى فوقها واستشعرتْ لَوْنَ مُذْهَبِ

کمت یہ اکمت کی جمع ہے یہ ایسی سرخی ہے جو سیاہی مائل ہو مدماۃ سونے کی طرح سرخ۔ متون یہ متن کی جمع ہے جس کا معنی پشت ہے۔

سیبویہ نے لَوْنَ مُذْهَبِ نصب کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ہاء کو حذف کرتے ہوئے لون پر رفع پڑھنا بھی جائز ہے گویا کہا: واستشعرته اس کے بارے میں جو لون کو رفع دے۔ الذاکر کی مراد کے بارے میں ایک قول ہے: جو نمازوں کے بعد اور صبح وشام ذکر کرتے ہیں بستروں پر لیٹے ہوئے اور نیند سے بیدار ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سب مباحث ان کے مواقع پر مفصل گزر چکی ہیں اور ان پر جو فوائد اور احکام مرتب ہوتے ہیں وہ بھی مفصل گزر چکے ہیں۔ اس لیے اعادہ سے انہوں نے غنی کر دیا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ مجاہد نے کہا: ایک آدمی اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والا اس وقت تک نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹ کر ذکر نہ کرے (1)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: جس نے اپنے اہل کو رات کے وقت اٹھایا اور دونوں نے چار رکعت نماز پڑھی تو ان دونوں کو کثرت سے ذکر کرنے والوں اور کثرت سے ذکر والیوں میں لکھ لیا جائے گا (2)۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿٣٦﴾

''نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو جب فیصلہ فرما دے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اپنے اس معاملہ میں اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قتادہ، حضرت ابن عباس اور مجاہد نے اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش کو دعوت نکاح دی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں حضرت زینب نے یہ گمان کیا کہ دعوت نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے دی ہے جب انہیں یہ پتہ چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت زید کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے اسے ناپسند کیا، انکار کیا اور ایسا کرنے سے مانع ہوگئیں، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس وقت حضرت زینب نے بات مان لی اور حضرت زید سے شادی کر لی۔ ایک روایت میں ہے یہ خود بھی اس سے انکاری ہوئیں اور ان کا بھائی عبد اللہ بھی اس سے انکاری

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 466

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الحث علی قیام اللیل، جلد 1، صفحہ 205۔ ایضاً حدیث نمبر 1114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوا کیونکہ قریش میں ان کا بڑا ذیشان خاندان تھا۔ حضرت زید پہلے غلام تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ان کے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: جو چاہیں مجھے حکم دیں، اور حضرت زینب کی شادی حضرت زید سے کردی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی، اس نے اپنا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شادی حضرت زید بن حارثہ سے کردی، تو حضرت ام کلثوم اور اس کے بھائی نے اسے ناپسند کیا۔ دونوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ کیا تو آپ نے ہمارا رشتہ کسی اور سے کردیا، تو اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی تو دونوں نے حضرت زید سے شادی کو قبول کرلیا؛ یہ ابن زید کا قول ہے (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو زیبا نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی نافرمانی کریں (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مَا كَانَ، یا ینبغی اور اس جیسے جو الفاظ ہیں ان کا معنی حظر اور منع ہے بعض اوقات یہ الفاظ حظر شی اور حظر حکم کے لیے آتا ہے یعنی ایسا نہیں ہوگا، جس طرح اس آیت میں ہے بعض اوقات وہ شے عقلاً ممتنع ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: 60) بعض اوقات اس کے ممتنع ہونے کا علم شرعی طور پر ہوتا ہے۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (الشوریٰ: 51) بعض اوقات یہ امر مندوبات میں ہوتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: ما كان لك يا فلان أن تترك النوافل اے فلاں! تیرے لیے مناسب نہیں کہ تو نوافل و ترک کردے، اس کی مثل دو مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں دلیل ہے بلکہ یہ اس امر میں نص ہے کہ حسب میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہوتا دیانت میں کفاءت کا اعتبار ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، مغیرہ اور سحنون نے اس میں اختلاف کیا ہے اس کی وجہ ہے کہ غلاموں نے قریش میں شادیاں کیں۔ حضرت زید بن حارثہ نے حضرت زینب بنت جحش سے شادی کی۔ حضرت مقداد بن اسود نے حضرت ضباعہ بنت زبیر سے شادی کی۔ حضرت ابو حذیفہ نے حضرت سالم کی شادی حضرت فاطمہ بنت ولید بن عتبہ سے کی۔ حضرت بلال نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی بہن سے شادی کی۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ کوفیوں نے ان یکون یاء کے ساتھ قراءت کی ہے؛ یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے، کیونکہ فعل اور فاعل جو مونث ہے اس میں فاصلہ ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ قراءت کی ہے کیونکہ لفظ مونث ہے اور فعل کی تانیث اچھی ہے اور فعل کو مذکر لانا اختیاری ہوتا ہے۔ الخیرۃ مصدر ہے جو اختیار کے معنی میں ہے۔ ابن سمیقع نے الخیرۃ یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ کے معنی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے پھر اللہ تعالیٰ نے دھمکی دی اور خبر دی کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے، یہ وہ سب سے قوی دلیل ہے جس کی طرف ہمارے فقہاء کے جمہور گئے ہیں، امام شافعی کے بعض اصحاب اور بعض اصولی گئے ہیں کہ افعل کا صیغہ اپنی اصل وضع میں وجوب کے لیے ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اللہ تعالیٰ اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 5-404
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 296

اس کے رسول کا اور سننے کے بعد مکلف سے اختیار کی نفی کی ہے، پھر امر کے صادر ہونے کے بعد جس کے لیے اختیار باقی ہو اس کے لیے معصیت کا اسم ذکر کیا پھر معصیت پر ضلال کو معلق کیا پس امر کا وجوب پر حمل لازم آ گیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

''اور یاد کیجئے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا: اپنی بی بی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر، اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن وتشنیع) کا حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تا کہ (اس عمل سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام ترمذی نے روایت کیا علی بن حجر، داؤد بن زبرقان سے وہ داؤد بن ابی ہند سے وہ شعبی سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کوئی چیز چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت کے ساتھ اس پر انعام کیا(1)۔ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اور آپ نے اسے آزاد کرتے ہوئے اس پر انعام کیا۔ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس سے شادی کی تو لوگوں نے کہا: آپ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو متبنی بنایا تھا جب کہ وہ چھوٹا تھا وہ آپ کے پاس ہی رہا یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا، اسے زید بن محمد کہا جاتا، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ فلاں فلاں کا مولیٰ ہے اور فلاں فلاں کا بھائی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مناسب اور قرین انصاف ہے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث غریب

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 152

ہے۔ داؤد بن ابی ہند نے شعبی سے وہ مسروق سے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کسی چیز کو چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ یہ الفاظ اپنی طوالت کے ساتھ مروی نہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: اتنی مقدار ہی کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے (2)۔ اسی کو امام ترمذی نے اپنی جامع میں صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہ کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اور حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے بڑھ کر شدید کوئی آیت رسول اللہ پر نازل نہیں کی (3)۔ حضرت حسن بصری اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر وحی میں سے کوئی چیز چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے کیونکہ یہ آیت آپ پر بہت شدید تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت زید نے شام کی اور اپنے بستر پر لیٹے، حضرت زینب نے کہا: زید نے مجھ پر استطاعت نہ رکھی میں اس سے نہیں بچتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے روک دیا تھا، وہ مجھ پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ یہ روایت ابو عصمہ نوح بن ابی مریم کی روایت ہے۔ حدیث کو زینب تک پہنچایا ہے کہ انہوں نے یہ قول کیا ہے۔

بعض روایات میں ہے: حضرت زید بن حارثہ حضرت زینب کے قریب ہونا چاہتے تو انہیں اس وجہ سے ورم لاحق ہو جاتا۔ یہ بھی پہلی روایت کے قریب ہی ہے۔ حضرت زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ عرض کی: حضرت زینب اپنی زبان سے مجھے اذیت دیتی ہیں اور یہ کہتی ہیں، میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو''۔ حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی تو یہ آیت نازل ہوئی: وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ۔

لوگوں نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، قتادہ، ابن زید اور مفسرین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے ان میں طبری وغیرہ بھی ہے (4) کہ حضرت زینب بنت جحش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی لگیں جب کہ وہ حضرت زید کے عقد میں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حریص تھے کہ حضرت زید اسے طلاق دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس سے شادی کریں۔ پھر جب حضرت زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی خبر دی کہ وہ ان سے جدائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کی زبان کی سختی اور نافرمانی، زبانی اذیت اور شرف میں بڑائی کی شکایت کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اللہ سے ڈر جو تو اس کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے اور اپنی بیوی اپنے پاس روک لے''۔ جب کہ آپ اس کے حریص تھے کہ حضرت زید اسے طلاق دے دیں۔ یہی وہ امر تھا جو آپ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے، مگر جو امر بالمعروف واجب تھا اس کو لازم پکڑا۔ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش کی شادی حضرت زید سے کر دی۔ حضرت زینب ان کے پاس کچھ عرصہ تک

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 152
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، وتخفی فی نفسك، جلد 2، صفحہ 706
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 297
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 386

رہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کی تلاش میں ان کے پاس آئے، تو آپ نے حضرت زینب کو کھڑے ہوئے دیکھا وہ سفید رنگ کی خوبصورت اور جسیم عورت تھی اور قریش کی کامل ترین عورت تھی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت کرنے لگے۔ اور کہا: سبحان اللہ مقلب القلوب (1) میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں اے دلوں کے پھیرنے والے! حضرت زینب نے تسبیح کو سن لیا اور اس کا ذکر حضرت زید سے کیا۔ حضرت زید اسے سمجھ گئے انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حضرت زینب کو طلاق دینے کی اجازت دیجئے کیونکہ اس میں کبر اور مجھ پر بڑائی کا احساس ہے اور مجھے اپنی زبان سے اذیت دیتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنی بیوی اپنے پاس رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی اس نے پردہ کو ہٹا دیا اور حضرت زینب اپنے گھر میں کام کاج والا لباس پہنے ہوئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو دیکھا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ذیشان محسوس ہوئیں۔ اور حضرت زینب کے دل میں خیال گزرا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلی لگی ہیں یہ اس وقت ہوا تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کی تلاش میں آئے تھے حضرت زید آئے تو حضرت زینب نے انہیں بتایا تو حضرت زید کے دل میں خیال گزرا کہ وہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ آپ اپنے دل میں ان کی محبت کو چھپاتے ہیں وَ تَخْشَى النَّاسَ آپ لوگوں سے حیا محسوس کرتے ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ ڈرتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے ناپسند کرتے ہیں اگر آپ اسے کہیں کہ اسے طلاق دے دے وہ کہیں گے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا پھر جب اس نے طلاق دے دی تو اس سے نکاح کر لیا۔ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ اللہ تعالیٰ اس امر کا زیادہ حق دار ہے کہ آپ ہر حال میں اس سے ڈریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے حیا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کو حکم نہ دیں کہ وہ اپنی بیوی کو روکے رکھے بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتا دیا ہے کہ وہ عنقریب آپ کی بیوی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تمام امر پر آپ کو عتاب کیا۔

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف وحی کی کہ حضرت زید، حضرت زینب کو طلاق دیں گے اور آپ اس سے شادی کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کی شادی اس سے کر دے گا (3)۔ جب حضرت زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت زینب کے اخلاق کی شکایت کی اور یہ شکایت کی کہ وہ ان کی اطاعت نہیں کرتی، اور یہ بتایا کہ وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور ادب و وصیت اسے فرمایا: ''اپنی بات میں اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھو''۔ جب کہ آپ جانتے تھے کہ حضرت زید، حضرت زینب سے جدائی اختیار کر لیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس سے شادی کریں گے۔ یہی وہ بات تھی جو آپ نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ نہ کیا کہ انہیں طلاق کا حکم دیں اس وجہ سے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ عنقریب اس سے نکاح کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈرے کہ آپ کو لوگوں کی یہ بات لاحق ہوگی کہ آپ نے حضرت زید کے بعد حضرت زینب سے شادی کی ہے جب کہ

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 468 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 386

حضرت زید آپ کے غلام تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی بات پر عتاب کیا کہ آپ لوگوں سے اس معاملہ میں ڈر رہے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مباح کر دیا ہے کہ آپ نے کہا اپنی بیوی کو اپنے پاس روکنے کے لیے جب کہ آپ کو علم تھا کہ حضرت زید، حضرت زینب کو طلاق دے دیں گے۔ اور یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے یعنی ہر حال میں ڈرا جائے۔ ہمارے علماء نے کہا: اس آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ ان سب سے احسن ہے۔ محقق مفسرین اور راسخ علماء کا یہی نقطہ نظر ہے جس طرح زہری، قاضی بکر بن علاء قشیری، قاضی ابو بکر بن عربی وغیرہم۔ وَ تَخْشَى النَّاسَ سے مراد یہ ہے کہ منافقین شور مچائیں گے کہ آپ نے اپنے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے سے منع کیا اور خود اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی بیوی سے محبت کرنے لگے اور بعض محبت کرنے والوں نے اس کے لیے لفظ عشق استعمال کیا یہ ایسے آدمی سے اس قسم کا لفظ صادر ہو سکتا ہے جو عصمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عاری ہے یا آپ کی حرمت کی پامالی کرنے والا ہے۔ ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں کہا اور اپنے قول کی نسبت حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما کی طرف کی: حضرت علی بن حسین اسے خزانہ علم سے جواہرات میں سے ایک جوہر اور موتیوں میں سے ایک موتی لائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر عتاب اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہو گی تو پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے کیسے فرمایا: ''اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھو'' اور تجھے لوگوں کے خوف نے آ لیا کہ وہ کہیں گے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ اس کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ نحاس نے کہا: بعض علماء نے کہا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خطا نہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس امر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو توبہ کا حکم دیا گیا اور نہ ہی استغفار کا حکم دیا گیا۔ بعض اوقات ایک امر خطا نہیں ہوتا مگر اس کا غیر اس سے احسن ہوتا ہے، آپ نے اسے دل میں اس لیے پوشیدہ رکھا کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: اگر یہ سوال کیا جائے کہ کس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا: ''اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھو'' (1)۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا تھا کہ حضرت زینب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہونے والی ہیں؟ ہم کہیں گے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ اس امر کو جان لیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ نہیں کیا تھا کیا حضرت زید اس میں رغبت رکھتے ہیں یا اس سے اعراض کرنے والے ہیں؟ تو حضرت زید نے ان سے اپنی نفرت اور کراہت کو ظاہر کر دیا جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کے حضرت زینب کے بارے میں رویہ سے آگاہ نہ تھے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اسے اپنے پاس روکنے کا کہیں جب کہ آپ جانتے تھے کہ جدائی تو ضروری ہے؟ یہ تو تناقض ہے۔ ہم کہیں گے: بلکہ یہ مقاصد صحیحہ کے لیے صحیح رویہ ہے تاکہ حجت قائم ہو جائے اور عاقبت کا پتہ چل جائے کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ بندے کو ایمان کا حکم دیتا ہے جب کہ اسے علم ہوتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ امر کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1544

متعلق علم کے متعلق کے خلاف ہونا ایسی چیز نہیں جو امر کے مانع ہو نہ یہ عقلاً ایسا ہے اور نہ یہ حکماً ایسا ہے۔ یہ نفس علم ہے اس پر یقین رکھو اور اسے قبول کرو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاتَّقِ اللّٰهَ اسے طلاق دینے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اسے طلاق نہ دو یہاں نہی تنزیہی کا ارادہ کیا ہے نہی تحریمی کا ارادہ نہیں کیا کیونکہ اولیٰ یہی ہے کہ وہ اسے طلاق نہ دے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ سے ڈر، اس کی مذمت اس بنا پر نہ کر کہ تو اس کی طرف کبر اور خاوند کو اذیت دینے کی نسبت کرے۔ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد قلبی لگاؤ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد زید کا حضرت زینب سے جدائی اختیار کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ جاننا ہے کہ حضرت زید اسے عنقریب طلاق دے دیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آگاہ کر دیا تھا کہ ایسا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا: ''میں تجھ سے زیادہ اپنے لیے کسی کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا جاؤ حضرت زینب کو میری طرف سے دعوت نکاح دو'' (1)۔ حضرت زید نے کہا: میں گیا اور انہیں اپنی پشت کی جانب رکھا مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی توقیر و تعظیم تھی میں نے انہیں دعوت نکاح دی تو وہ اس سے خوش ہو گئیں اور کہا: میں کوئی کام کرنے والی نہیں یہاں تک کہ میں اپنے رب سے مشورہ کرلوں۔ تو وہ اپنی مسجد کی طرف اٹھیں اور قرآن کا حکم نازل ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے شادی کی اور انہیں اپنے حرم میں داخل کیا۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کا معنی صحیح میں ثابت ہے اور امام نسائی نے یہ باب باندھا ہے۔ صلاۃ المرأۃ إذ اخطبت و استخارتھا ربھا۔ ائمہ نے اسے روایت کیا الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے: جب حضرت زینب کی عدت ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا: ''اسے میری جانب سے دعوت نکاح دو'' (2)۔ کہا: حضرت زید گئے یہاں تک کہ ان تک پہنچے جب کہ وہ آٹا گوندر ہی تھیں۔ حضرت زید نے کہا: جب میں نے حضرت زینب کو دیکھا تو اس کی وجہ سے میرے اوپر ہیبت طاری ہوگئی یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ بھی نہ سکا اور اس کی جرأت بھی نہ ہوئی کہ میں کہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کا ذکر کیا ہے، میں نے انہیں اپنی پشت کی جانب کیا اور اپنی ایڑیوں پر پلٹا میں نے کہا: اے زینب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھیجا ہے آپ تیرا ذکر کر رہے تھے۔ حضرت زینب نے کہا: میں کوئی چیز کرنے والی نہیں یہاں تک کہ میں اپنے رب سے مشورہ کروں، وہ اپنی مسجد کی طرف اٹھیں قرآن نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اور بغیر اجازت اندر تشریف لائے۔ کہا: ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں روٹی اور گوشت کھلایا جب دن طویل ہوگیا۔ ایک روایت میں ہے: یہاں تک کہ صحابہ نے آپ کو چھوڑا۔ حضرت انس کی روایت میں ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی عورت سے شادی پر ایسا ولیمہ کیا ہو جیسا ولیمہ حضرت زینب کے ساتھ شادی پر کیا۔ آپ نے ایک بکری ذبح کی۔ ہمارے علماء نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زید کو یہ فرمانا فاذکرھا علی سے مراد ہے اسے دعوت نکاح دو، جس طرح پہلی حدیث وضاحت کرتی ہے۔ یہ حضرت زید کا امتحان تھا تاکہ ان کا صبر، اطاعت اور رضامندی ظاہر ہو۔ اس سے یہ استدلال کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 387

2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، زواج بنت جحش، جلد 1، صفحہ 61-460

جا سکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کو کہے: فلاں کو میری طرف سے دعوت نکاح دو یعنی جو اس دوست کی مطلقہ بیوی تھی۔ اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب حضرت زینب نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اس کا سپرد کرنا صحیح ثابت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے نکاح کے عمل کو اپنے ذمہ لے لیا، اسی وجہ سے فرمایا: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔ امام جعفر صادق بن محمد اپنے آباء سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے بارے میں آگاہ کیا تو بغیر اجازت کے آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ نہ نیا نکاح کیا گیا اور نہ ہی مہر مقرر ہوا (1)۔ اور ہمارے حقوق میں جو شرط ہے اور جو ہمارے لیے مشروع ہے اس میں سے کوئی بھی چیز نہ ہوئی۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے جن میں کوئی آپ کے ساتھ شریک نہیں۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے، اسی وجہ سے حضرت زینب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر فخر کیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں: تمہاری شادیاں تمہارے آباء نے کیں اور میری شادی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کی (2)۔ امام نسائی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت زینب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر فخر کیا کرتی تھیں اور کہتیں: اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح آسمان میں کیا۔ انہیں کے بارے میں حجاب کا حکم نازل ہوا (3)۔ اس کی بحث آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس آیت میں منعم علیہ حضرت زید بن حارثہ ہیں جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کی خبر سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ ان کا چچا ایک دن انہیں مکہ مکرمہ میں ملا، وہ مکہ مکرمہ میں اپنے ایک کام کے لیے آیا تھا۔ اس نے پوچھا: تیرا کیا نام ہے اے بچے؟ آپ نے جواب دیا: زید۔ اس نے پوچھا: تو کس کا بیٹا ہے؟ جواب دیا: حارثہ کا بیٹا ہوں۔ پوچھا: وہ کس کا بیٹا ہے؟ آپ نے جواب دیا: شراحیل کلبی کا۔ اس نے پوچھا: تیری ماں کا کیا نام ہے؟ آپ نے جواب دیا: سعدی۔ اور میں بنو طی کے ننہال سے ہوں۔ چچا نے حضرت زید کو اپنے سینہ سے لگایا۔ اور چچا نے اپنے بھائی اور قوم کو پیغام بھیجا تو وہ حاضر ہو گئے۔ انہوں نے آپ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ انہوں نے پوچھا: تو کس کی زیر کفالت ہے؟ حضرت زید نے جواب دیا: حضرت محمد بن عبد اللہ کے ہاں۔ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور گزارش کی: یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہماری طرف لوٹا دیں۔ فرمایا: میں یہ معاملہ اس پر پیش کرتا ہوں اگر اس نے تمہیں اختیار کیا تو اس کا ہاتھ پکڑ لینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی طرف پیغام بھیجا۔ فرمایا: کیا تو انہیں پہچانتا ہے؟ عرض کی: جی ہاں۔ یہ میرا باپ ہے، یہ میرا بھائی ہے اور یہ میرا چچا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''میں تیرے لیے کیسا مالک ہوں؟'' تو حضرت زید رونے لگے اور عرض کی: آپ نے مجھ سے اس بارے میں کیوں پوچھا ہے؟ فرمایا: ''میں تجھے اختیار دینا چاہتا ہوں اگر تو پسند کرے کہ ان کے ساتھ جائے تو ان کی طرف چلے جانا اگر تو ارادہ کرے کہ تو یہاں ہی رہے تو مجھے تو پہچانتا ہی ہے''۔ حضرت زید نے عرض کی: میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔ ان کے چچا نے انہیں اپنی طرف کھینچا اور کہا: اے زید! تو نے اپنے باپ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 387 2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 1104 3۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 75

اور چچا پر غلامی کو ترجیح دی ہے۔ حضرت زید نے کہا: اللہ کی قسم! حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے ہاں غلامی مجھے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں تمہارے پاس ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گواہ رہنا میں اس کا وارث ہوں اور یہ میرا وارث ہے''۔ تو پھر زید بن محمد کے نام سے وہ پکارے جاتے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ اور یہ آیت نازل ہوئی: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام ابو القاسم عبد الرحمٰن سہیلی نے کہا: ان کو زید بن محمد ہی پکارا جاتا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ تو انہوں نے کہا: میں زید بن حارثہ ہوں۔ ان پر یہ کہنا حرام ہو گیا: انا زید بن محمد جب ان سے یہ شرف اور یہ فخر لے لیا گیا اور اللہ تعالیٰ کو ان کی وحشت و تنہائی کا علم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خصوصیت سے نوازا جس کے ساتھ کوئی صحابی خاص نہیں وہ خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کا نام لیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا ضمیر سے مراد حضرت زینب ہے اللہ تعالیٰ جس کا نام قرآن حکیم میں رکھ دے تو اس کا نام بھی قرآن ہو گیا جس کو عبادت گاہوں میں تلاوت کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں انتہائی شہرت سے نوازا۔ اس میں آپ کے لیے انس تھا اور حضرت محمد ﷺ کی ابوت کے فخر کے مقابلہ میں اس عزت سے نوازا گیا۔ آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ قول سنا جب نبی کریم ﷺ نے انہیں کہا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ پر فلاں سورت پڑھوں'' (1)۔ تو وہ رونے لگے عرض کی: کیا میرا وہاں ذکر ہوا؟ ان کا یہ رونا خوشی کے طور پر تھا، جب انہیں یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ہے تو اس کا کیا حال ہوگا جس کا اسم قرآن میں ہوگا جس کو ہمیشہ تلاوت کیا جائے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ جب اہل دنیا قرآن کو پڑھیں گے تو اسے بھی پڑھیں گے۔ اہل جنت کا بھی یہی حال ہے یہ مومنوں کی زبانوں پر ہمیشہ رہے گا، جس طرح رب العالمین کے ہاں اس کا خصوصی ذکر ہوتا رہے گا کیونکہ قرآنی کلام قدیم ہے وہ باقی رہنے والا ہے ختم نہ ہوگا۔

حضرت زید کا نام ان مکرم، مرفوع اور مطہر صحیفوں میں موجود ہے سفرہ کراما بررۃ، تلاوت کرتے وقت اس کا ذکر کرتے ہیں یہ شرف مومنوں کے ناموں میں سے کسی نام کو حاصل نہیں مگر انبیاء میں سے نبی کے اسم کو حاصل ہے۔ حضرت زید بن حارثہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بدلہ عطا ہوا جو آپ سے حضرت محمد ﷺ کے اب ہونے کا شرف لیا تھا۔ آیت میں یہ زائد ہے کہ فرمایا: وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ اس پر انعام فرمایا۔ تو یہ اس امر پر دال ہے کہ وہ جنتی ہے۔ اس کا علم موت سے پہلے ہو گیا یہ ایک اور فضیلت ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَطَرًا، وطر مرد کی اس حاجت کو کہتے ہیں جس میں اسے کوئی پریشانی لاحق ہو۔ اس کی جمع اوطار ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس حاجت کا ارادہ کیا یعنی جماع تو اس کو پورا کر چکے۔ اس میں اضمار ہے، یعنی جب حضرت زید نے حاجت پوری کر لی اور اسے طلاق دے دی تو ہم نے آپ کی اس سے شادی کر دی۔ اہل بیت کی قراءت زوجتکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وطر سے مراد طلاق ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، لم یکن الذی، جلد 2، صفحہ 741

**مسئلہ نمبر 8۔** بعض علماء اس آیت سے اور حضرت شعیب (1) کے قول اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ (القصص: 27) سے اس نقطہ نظر کی طرف گئے ہیں کہ نکاح میں اس معنی کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے انکحه ایاها خاوند کی ضمیر پہلے ہو جس طرح دونوں آیتوں میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر والے سے یہ فرمایا تھا: اذهب فقد أنكَحْتكها بما معك من القرآن جا میں نے تیرا اس عورت سے نکاح کر دیا ہے اس کے بدلے میں جو تیرے پاس قرآن ہے (2)۔

ابن عطیہ نے کہا: یہ کوئی لازم نہیں کیونکہ خاوند اس آیت میں مخاطب ہے تو اس کو مقدم رکھنا اچھا تھا (3)۔ نکاح میں دونوں برابر ہیں پس جس کو چاہے مقدم کر دے۔ اب مردوں کے درجہ کے علاوہ ترجیح کی کوئی صورت باقی نہ رہی کیونکہ مرد ہی گھر کا نظام چلانے والے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 9۔** زَوَّجۡنٰكَهَا اس امر پر دلیل ہے کہ نکاح میں ولی کی حیثیت ثابت ہے۔ اس بارے میں اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما نے باہم فخر کیا۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں وہ ہوں جسے فرشتہ سفید ریشم کے ایک ٹکڑا میں لایا اور اس نے کہا: یہ آپ کی زوجہ ہے۔ صحیح نے اسے نقل کیا ہے (4)۔ حضرت زینب نے کہا: میں وہ ہوں جس کی شادی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) کی (5)، امام شعبی نے کہا: حضرت زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتیں: میں تین باتوں کی وجہ سے آپ پر ناز وادا کر سکتی ہوں۔ آپ کی ازواج میں سے کوئی ان کے ساتھ ناز وادا نہیں کر سکتیں۔ میرے جد اعلیٰ اور آپ کے جد اعلیٰ ایک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ میرا نکاح آسمان میں کیا۔ اور اس میں سفیر حضرت جبریل امین تھے (6)۔ حضرت زینب سے مروی ہے: جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں قدر و منزلت والی ہوئی تو حضرت زید مجھ پر کوئی قدرت نہیں رکھتے وہ اس سے نہ رکے مگر اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے روک دیا تو وہ مجھ پر قادر نہ ہوئے۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنۡ حَرَجٍ فِيۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ۙ ۳۸ الَّذِيۡنَ يُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخۡشَوۡنَهٗ وَلَا يَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا ۳۹

''نہیں ہے نبی پر کوئی مضائقہ ایسے کام کرنے میں جنہیں حلال کر لیا ہے اللہ نے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے ان (انبیاء) کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں وہ نہیں ڈرا کرتے کسی سے اللہ تعالیٰ کے سوا، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ حساب لینے والا''۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 387
2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، التزویج علی القرآن، جلد 2، صفحہ 774
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 387
4۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فی فضل عائشہ، جلد 2، صفحہ 285
5۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 1104
6۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 387

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے تمام امت کو خطاب ہے۔ الله تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا یہ اور اس طرح کی دوسری چیزیں انبیاء کی قدیمی سنتیں ہیں کہ وہ ان چیزوں کو حاصل کریں جن کو الله تعالیٰ نے ان کے لیے حلال کیا۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نکاح میں جو وسعت عطا کی یہ گزشتہ انبیاء کی سنت تھی جس طرح حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک سو بیویاں اور تین سو لونڈیاں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تین سو بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ ثعلبی نے مقاتل اور ابن کلبی سے روایت نقل کی ہے کہ اشارہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے آپ کو اور جس عورت کی وجہ سے آپ آزمائش میں پڑے دونوں کو الله تعالیٰ نے جمع کیا۔ سنة کا لفظ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی سن الله له سنة واسعة، الذين خلوا اس سے مراد انبیاء ہیں۔ اس کی دلیل وہ صفت ہے جس کا ذکر بعد میں کیا۔ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

”نہیں ہے محمد (فداہ روحی) کسی کے باپ تمہارے مردوں میں سے بلکہ وہ الله کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور الله تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی تو لوگوں نے کہا: آپ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی حضرت زید رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے نہیں یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کی بیوی حرام ہوتی، بلکہ آپ اپنی امت کے باپ ہیں۔ یہ شان اور عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں ان پر حرام ہیں منافقوں اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ واقع ہوا تھا الله تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ سب کو دور کر دیا۔ یہ چیز ذہن نشین کر لو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصر تھے۔ اس آیت سے یہ مقصد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ آپ کے مذکر بچے ہوئے حضرت ابراہیم، حضرت قاسم، حضرت طیب اور حضرت طاہر، لیکن کوئی بیٹا زندہ نہ رہا یہاں تک کہ وہ مرد کہلاتا۔ جہاں تک حضرت حسن اور حضرت حسین کا تعلق ہے وہ آپ کے ہم عصر مرد نہیں تھے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ اخفش اور فراء نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ولكن كان رسول الله دونوں نے رفع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اسی طرح ابن ابی عبلہ اور بعض لوگوں نے ولكن رسول الله رفع کے ساتھ قراءت کی ہے معنی ہوگا هو رسول الله و خاتم النبيين ایک جماعت نے ولكن نون کی تشدید کے ساتھ قراءت کی ہے۔ رسول الله کو نصب اس بنا پر دی کہ لكن کا اسم ہے اور خبر محذوف ہے۔ عاصم نے صرف وخاتم تاء کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے معنی ہوگا آپ کے ساتھ ان پر مہر لگائی گئی۔ پس آپ خاتم اور طابع کی طرح ہوئے۔ جمہور نے تاء کے کسرہ کے

ساتھ قراءت کی۔ معنی ہے آپ نے ان کو ختم کر دیا ہے یعنی آپ ان کے آخر میں آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خاتِم اور خاتَم دو لغتیں ہیں جس طرح طابِع اور طابَع۔ دانِق اور دانَق، طابِق اور طابَق۔ آخری الفاظ گوشت کی کڑاہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ الفاظ علماء امت کی جماعت کے ہاں، وہ اسلاف میں سے ہوں یا بعد کے عموم تام کے لیے ہیں اور اس بیان کا تقاضا کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں (1)۔ قاضی ابو الطیب نے اپنی کتاب جو ''ہدایہ'' کے نام کے ساتھ موسوم ہے میں جو یہ ذکر کیا ہے اس آیت کے الفاظ میں احتمال کو جائز قرار دیا ہے، ضعیف ہے۔ اور اس آیت کی تفسیر میں امام غزالی نے جو ذکر کیا ہے یہ مفہوم ان کی اس کتاب میں ہے جسے انہوں نے ''الاقتصاد'' کا نام دیا ہے میرے نزدیک الحاد ہے۔ اور ختم نبوت کے بارے میں مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے اس میں تشویش کرنے کی خبیث کوشش ہے۔ اس سے بچو، اس سے بچو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ہدایت دینے والا ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''میرے بعد نبوت میں سے کوئی چیز نہیں مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے'' (2)۔ ابو عمرو نے کہا: جس کی استثنا کی وہ خواب ہیں؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ سچے خواب نبوت کا جز ہیں۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میرے بعد نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی صرف سچے خواب''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قراءت کی: من رجالکم ولکن نبیا ختم النبیین (3) رمانی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اصلاح احوال کو ختم کر دیا۔ جو آدمی آپ کے ذریعے اپنی اصلاح نہیں کرتا تو اس کی اصلاح سے قطعی مایوسی ہے۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (4) مجھے مبعوث کیا گیا ہے تا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''میرے اور انبیاء کی مثال ایسے آدمی جیسی ہے جس نے گھر بنایا اسے مکمل کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس گھر میں داخل ہوئے اور اس پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے اس اینٹ کی جگہ کو کیوں نہیں مکمل کیا'' (5)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اس اینٹ کی جگہ ہوں میں آیا اور انبیاء کے سلسلہ کو ختم کر دیا''۔ اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر یہ کہا: ''میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿41﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿42﴾

''اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے اور اس کی پاکی بیان کیا کرو صبح وشام''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ وہ اس کا ذکر کریں اور اس کا شکر بجالائیں اور ذکر کثرت سے کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 388
2۔ سنن ابن ماجہ، تعبیر الرویا، الرؤیا الصالح، صفحہ 286
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 388
4۔ السنن الکبری، کتاب الشہادات، جلد 10، صفحہ 192
5۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، ذکر کونہ خاتم النبیین، جلد 2، صفحہ 248

نے ان پر انعام کیا اللہ تعالیٰ نے بندے کی سہولت کی خاطر اسے بغیر کسی حد کے بنایا ہے۔ اور اس لیے بھی کیونکہ اس میں اجر عظیم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کا ذکر ترک کرنے میں کوئی معذور نہیں مگر جس کا عقل مغلوب ہو (1)۔ حضرت ابوسعید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو یہاں تک لوگ کہیں کہ یہ مجنون ہے'' (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذکر کثیر وہ ہے جو دل کے اخلاص کے ساتھ ہو۔ اور قلیل ذکر وہ ہے جو نفاق کی صورت میں ہو جس طرح صرف زبان سے ذکر۔

یعنی اپنے احوال کے اکثر حصہ میں اپنی زبانوں کو تسبیح (سبحان اللہ) تہلیل (لا الہ الا اللہ) تحمید (الحمد للہ) اور تکبیر (اللہ اکبر) کے ساتھ مشغول رکھا کرو۔ مجاہد نے کہا: یہ وہ کلمات ہیں جنہیں پاکیزہ، جس کا وضو نہ ہو اور جنبی بھی کہہ سکتا ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کی بارگاہ میں دعا کیا کرو۔ جریر نے کہا:

فلا تنس تسبيح الضُّحى إن يوسفًا دَعَا ربّه فاختاره حين سَبَّحا (4)

چاشت کی دعا نہ بھولو کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس وقت چن لیا جب انہوں نے دعا کی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے صبح وشام اللہ کی نماز پڑھا کرو۔ نماز کو تسبیح کہتے ہیں۔ فجر، مغرب اور عشاء کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ یہ برانگیختہ کیے جانے کے زیادہ لائق ہیں کیونکہ یہ رات کی اطراف کے ساتھ متصل ہیں۔ قتادہ اور طبری نے کہا: اشارہ صبح اور عصر کی نماز کی طرف ہے (5)۔ الاصل سے مراد پچھلا پہر ہے اس کی جمع اصائل اور الاصل یہ اصیل کے معنی میں ہے اس کی جمع آصال آتی ہے؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اصل یہ اصیل کی جمع ہے جس طرح رغیف کی جمع رغف آتی ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: یہ آیت مدنی ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ نماز اصل میں پہلے دو نمازوں کے طور پر فرض کی گئی یہ دن کی دونوں اطراف میں تھی۔ اس کے ساتھ اس آیت کا تعلق نہیں اس کے بارے میں روایت ضعیف ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ نماز کے فرض ہونے کی کیفیت کے بارے میں گفتگو اور علماء کا اس بارے میں جو نقطہ نظر ہے وہ سورۂ اسراء میں گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝۴۳

''اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں) تا کہ وہ نکال کر لے جائے تمہیں (طرح طرح کے) اندھیروں سے نور کی طرف اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم

1۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 23
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 68
3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 473
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 410
5۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 23

فرمانے والا ہے''۔

**هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ نازل ہوئی تو مہاجرین اور انصار نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو خاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ اس میں ہمارے لیے تو کچھ بھی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اس امت پر سب سے بڑی نعمت ہے اور تمام دوسری امتوں پر فضیلت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کے لیے صلاۃ یہ اس کی رحمت اور اس کے ہاں برکت ہے۔ ملائکہ کی صلاۃ مومنوں کے لیے دعا اور ان کے لیے استغفار ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر: 7) اس کی بحث بعد میں آئے گی۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: کیا تیرا رب صلاۃ کا عمل کرتا ہے؟ تو یہ امر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر گراں گزرا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی میری صلاۃ یہ ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے''۔ نحاس نے اسے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ایک جماعت نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر صلاۃ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''سبوح قدوس میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے'' (1)۔ اس قول کی تاویل میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی کلام میں سے کلمہ ہے یہی اس کے بندوں پر اس کی صلاۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سبوح قدوس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام میں سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کو ادا کرنے سے پہلے ذکر کیا جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی صلاۃ ہیں وہ رحمتی سبقت غضبی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل سے یہ سمجھا کہ سائل نے بندوں پر اللہ تعالیٰ کی صلاۃ سے ایسا معنی سمجھا ہے جو مناسب و موزوں نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے خبر دینے سے قبل تنزیہ اور تعظیم کا ذکر کیا۔

**لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** گمراہی سے ہدایت کی طرف تمہیں نکالے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت پر ثابت قدم کرتا ہے کیونکہ خطاب کے وقت وہ ہدایت پر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ مومنوں پر رحمت فرمانے والا ہے مقصود ان سے انس کا اظہار کرتا ہے۔ فرمایا: وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔

**تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ۝**

''انہیں یہ دعا دی جائے گی جس روز وہ اپنے رب کریم سے ملیں گے ہمیشہ سلامت رہو اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے عزت والا اجر''۔

**يَلْقَوْنَهٗ** کی ضمیر جس اسم کی طرف لوٹ رہی ہے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عذاب سے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 389

محفوظ رکھے گا۔ اس دن وہ اس سے ملاقات کریں گے۔ تَحِيَّتُهُمْ بعض کا بعض کے لیے سلام ہوگا۔ سلام یعنی ہماری اور تمہاری اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سلامتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلام ہوگا۔ معنی ہے: اللہ تعالیٰ انہیں آفات سے محفوظ رکھے گا یا مختلف قسم کے خوفوں سے امن کی بشارت دے گا۔ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ قیامت کے روز جنت میں داخل ہونے کے بعد وہ اس سے ملاقات کریں گے۔ کہا: یہ زجاج نے معنی کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استشہاد کیا۔ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (یونس: 10) ایک قول یہ کیا گیا ہے: يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سے مراد ہے جس روز وہ ملک الموت سے ملیں گے۔ یہ وارد ہوا ہے کہ ملک الموت کسی مومن کی روح قبض نہیں کرتا مگر اسے سلام کہتا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ سے مراد ہے ملک الموت روح کے قبض کرنے کے وقت مومن کو سلام کرتا ہے۔ وہ مومن کی روح قبض نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے سلام کرتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

"اے نبی (مکرم!) ہم نے بھیجا ہے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے اور آفتاب روشن کر دینے والا"۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنوں کے لیے انس پیدا کیا جا رہا ہے اور ان سب کی تکریم کی جا رہی ہے۔ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھ اسماء کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ اور ہمارے نبی کے کثیر اسماء ہیں اور جلیل القدر علامات ہیں۔ ان کا ذکر کتاب، سنت اور متقدم کتب میں وارد ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے اسماء میں سے محمد اور احمد کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ثقہ اور عادل لوگوں نے جو آپ سے روایت نقل کی ہیں ان میں ہے۔ "میرے پانچ نام ہیں میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں اللہ میرے ساتھ کفر کو مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں لوگ میرے قدم پر اٹھیں گے اور میں عاقب ہوں" (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام رؤف اور رحیم رکھا (2)۔ اس میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے لیے اپنے ناموں کا ذکر کرتے۔ آپ فرماتے: "میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں مقفی ہوں، میں حاشر ہوں، میں نبی توبہ ہوں اور میں نبی رحمت ہوں" (3)۔ قاضی ابو الفضل عیاض نے اپنی کتاب جس کا نام "الشفاء" ہے اس میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ جو اسماء کتاب اللہ میں آتے ہیں، جو رسول اللہ کی سنت میں ہیں، جو کتب مقدمہ میں منقول ہوں اور امت نے جو کثیر اسماء اور مختلف صفات کا ذکر کیا ہے۔ یہ مسمیات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صادق آتے ہیں اور آپ کی ذات میں ان کے معانی پائے گئے ہیں۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے احکام میں اس آیت کی تفسیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے 67 ناموں کا ذکر کیا ہے اور وسیلۃ المتعبدین الی متابعۃ سید المرسلین کے مصنف نے حضرت

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، ماجاء فی اسماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 501

2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فی اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 261 3۔ ایضاً

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے ایک سو اسی نام ہیں۔ جو ان کی طلب رکھتا ہے وہ ان کو وہاں پا لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ کو بلایا اور دونوں کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا: ''دونوں جاؤ دونوں بشارت دینا، تنفر نہ کرنا، سہولت پیدا کرنا، سختی نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ نازل کیا ہے اور اس آیت کی تلاوت کی'' (1)۔

شَاهِدًا سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: آپ اپنی امت پر شاہد ہیں کہ آپ نے انہیں تبلیغ کی اور تمام امتوں پر گواہ ہیں کہ ان کے انبیاء نے انہیں تبلیغ کی (2)۔ اسی طرح دوسرے اقوال ہیں۔ مُبَشِّرًا اس کا معنی ہے مومنوں کو اللہ کی رحمت اور جنت کی بشارت دینے والے ہیں۔ وَّنَذِيْرًا اس کا معنی ہے نافرمانوں اور جھٹلانے والوں کو آگ اور دائمی عذاب سے خبردار کرنے والے ہیں۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کا مطلب یہ ہے توحید کی تبلیغ کرنا، اس کو اپنانا اور کفار سے جہاد کرنا ہے۔ بِاِذْنِهٖ یہاں اس کا معنی ہے اس کا تجھے حکم دینا اور اس کا اس کے وقت اور اس کے حالات میں مقدر کرنا۔ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا یہاں یہ اس نور سے مجاز ہے جسے آپ کی شرع اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَسِرَاجًا سے مراد گمراہی کی تاریکی سے ہدایت دینے والے ہیں جب کہ آپ روشن چراغ کی طرح ہیں۔ یہاں انارہ کے ساتھ صفت ذکر کی کیونکہ چراغوں میں سے کچھ وہ بھی ہوتے ہیں جو روشنی نہیں دیتے جب ان کا تیل کم ہو اور اس کی بٹ باریک ہو۔ ان میں سے بعض کی کلام میں ہے: تین چیزیں کمزور کر دیتی ہیں ست قاصد، چراغ جو روشنی نہ دے اور ایسا دستر خوان جس کا آنے والا انتظار کرے، ان میں سے بعض سے ان چیزوں کے بارے میں پوچھا گیا جس سے وحشت محسوس کی جاتی ہے۔ فرمایا: ایسی تاریکی جو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے ہو اور ایسا چراغ جو روشنی نہ دے (3)۔ نحاس نے سند بیان کی۔ محمد بن ابراہیم رازی، عبدالرحمٰن بن صالح ازدی سے وہ عبدالرحمٰن بن محمد محاربی سے وہ شیبان نحوی سے وہ قتادہ سے وہ عکرمہ سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کرتے ہیں: جب یہ آیت يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ نازل ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما کو بلایا، فرمایا: ''دونوں جاؤ بشارت دینا اور سختی نہ کرنا، کیونکہ آج کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایک آیت نازل کی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا'' یعنی آگ سے ڈرانے والا۔

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ کہا: اس سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ بِاِذْنِهٖ سے مراد اس کے امر سے وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا کہا: اس سے مراد قرآن ہے۔ زجاج نے کہا: وَسِرَاجًا یعنی ایسا سراج جو نور والا ہے، یعنی روشن کتاب۔ یہ بھی جائز قرار دیا کہ یہ اس معنی میں ہو وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرنے والے ہیں۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

---

1۔ المعجم الکبیر، جلد 11، صفحہ 312　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 389　　3۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 547

''اور آپ مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ رکھو اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ ( آپ کا) کارساز''۔

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ واو عاطفہ ہے جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ معنی ماقبل سے منقطع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل کبیر کی بشارت دے۔ زجاج کے قول ذاسراجا منیرو تالیاسراجا منیرا کے مطابق یہ کاف پر معطوف ہوگا مگر ارسلناک کے کاف پر معطوف نہیں ہوگا (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہمیں حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے نزدیک کتاب اللہ میں یہ سب سے امید والی آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ مومنوں کو بشارت دے کہ اس کے ہاں ان کے لیے فضل کبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کبیر کی وضاحت اپنے اس ارشاد میں کی ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ (الشوریٰ) اس سورت میں جو آیت ہے وہ خبر ہے اور سورت حم عسق میں جو آیات ہے وہ اس کی تفسیر ہے (2)۔

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وہ ان کے معاملہ میں جس مداہنت کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں اس معاملہ میں ان کی اطاعت نہ کیجئے اور ان کی طرف مائل نہ ہو جائیے۔ الْكٰفِرِيْنَ سے مراد ابوسفیان، عکرمہ، ابواعور اسلمی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہا کریں، تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ سے مراد عبداللہ بن ابی، عبداللہ بن سعد اور طعمہ بن ابیرق ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس امر پر برانگیختہ کیا کہ وہ مصلحت کی غرض سے آپ کی اس پیشکش کو قبول کریں۔

وَ دَعْ اَذٰىهُمْ اس امر کو چھوڑ دیں کہ وہ جو آپ کو اذیتیں دیتے ہیں اس کے بدلے میں آپ بھی انہیں اذیتیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ان کو سزا دینے کا ارادہ ترک کر دیں۔ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائیں۔ اس تاویل کی صورت میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ اس تاویل کی بنا پر جو امر کافروں کے ساتھ خاص ہے وہ منسوخ ہے۔ اس کا ناسخ آیت سیف ہے۔ اس میں دوسرا معنی بھی ہے: ان کی باتوں اور جو وہ آپ کو اذیتیں دیتے ہیں ان سے اعراض کیجئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں مشغول نہ ہوں۔ اس تاویل کی بنا پر مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے؛ یہ مجاہد کی تاویل ہے۔ آیت، آیت سیف سے منسوخ ہے۔ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم دیا اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ انس پیدا کیا۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا کلام کی قوت میں مدد کا وعدہ ہے۔ وکیل سے مراد معاملہ کی حفاظت کرنے والا اور اس کو بجالانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

''اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مومن عورتوں سے پھر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 547
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 90-389

پس تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو لہٰذا انہیں کچھ مال دے دو اور انہیں رخصت کر دو خوبصورتی سے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ جب حضرت زید اور حضرت زینب کا طلاق کا واقعہ ہوا جب کہ وہ ایسی عورت تھیں جن کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے گئے تھے۔ ان کی عدت کے ختم ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت نکاح دی۔ جس طرح ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خطاب کیا جب کہ انہوں نے اپنی بیویوں کو حقوق زوجیت ادا کرنے سے قبل طلاق دے دی ہو۔ اور اس حکم کو امت کے لیے واضح کیا۔ مطلقہ اگر ایسی ہو کہ اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کیے گئے ہوں تو اس پر عدت لازم نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہے اگر اس کے ساتھ خاوند نے دخول کیا ہو تو بالاتفاق اس پر عدت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ نکاح کا حقیقی معنی وطی کرنا ہے۔ عقد کو نکاح اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کا عقد نکاح کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے کیونکہ عقد نکاح وطی تک پہنچنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ علماء نے خمر کو اثم کا نام دیا کیونکہ یہ گناہ کا سبب ہے۔ کتاب اللہ میں لفظ نکاح عقد کے معنی میں ہے، کیونکہ اس کا حقیقی معنی وطی ہے۔ اس کو مختلف الفاظ کے ساتھ کنایۃً ذکر کرنا یہ قرآن کے آداب میں سے ہے جیسے ملامسہ، مماسہ، قربان، تغشی اور اتیان۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ بعض علماء نے ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ میں ثُمَّ کے لفظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔ جس نے نکاح سے پہلے عورت کو طلاق دی اگر اس نے اس عورت کو معین کر دیا تو یہ طلاق اسے لازم نہ ہوگی۔ یہ قول تقریباً تیس علماء کا ہے جن میں صحابہ، تابعین اور ائمہ شامل ہیں۔ امام بخاری نے بائیس افراد کا نام لیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے لا طلاق قبل نکاح نکاح سے قبل طلاق نہیں (1)۔ اس کا معنی ہے طلاق واقع نہیں ہوتی یہاں تک کہ نکاح ہو جائے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح کیا: ان تزوجتك فانت طالق اگر میں تجھ سے شادی کروں تو تجھے طلاق؟ آپ نے جواب دیا: کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے طلاق سے پہلے نکاح کا ذکر کیا ہے۔ علماء کے ایک طائفہ نے کہا: معینہ عورت کو نکاح سے قبل طلاق دی جائے وہ ذات کے اعتبار سے معین ہو، قبیلہ کے اعتبار سے معین ہو اور شہر کے اعتبار سے معین ہو وہ طلاق لازم ہو جائے گی (2)۔ ان میں امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور آپ کے تمام اصحاب ہیں اور امت کے عظیم علما بھی یہی کہتے ہیں۔ سورۂ براءت میں اس بارے میں گفتگو اور فریقین کے دلائل گزر چکے ہیں۔ الحمدللہ

جب اس نے کہا: کل امرأة أتزوجها فهي طالق وكل عبد اشتريته فهو حر میں جس عورت سے شادی کروں اسے

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، لا طلاق قبل النکاح، صفحہ 148۔ ایضاً، حدیث نمبر 2037، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 390

طلاق ہے اور میں جس غلام کو خریدوں وہ آزاد ہے۔ تو کچھ بھی لازم نہ کرے گا۔ اگر اس نے کہا: اگر میں بیس سال تک جس عورت سے بھی شادی کروں یا کہا: اگر میں فلاں شہر یا فلاں قبیلہ سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے تو اس پر طلاق واقع ہو جائے گی جب تک اسے لمبے سالوں کی وجہ سے اپنے اوپر بدکاری کا خوف نہ ہو یا غالب طور پر اس کی عمر اس حد تک نہ پہنچتی ہو تو اسے نکاح کرنے کا حق ہوگا، اس پر طلاق لازم نہ ہوگی جب اس نے یہ بات عموم کے اعتبار سے کی کیونکہ اس نے اپنے اوپر نکاح کے معاملہ کو تنگ کر دیا ہے۔ اگر ہم اس کو روکیں کہ وہ شادی نہ کرے تو وہ حرج میں مبتلا ہوگا اور اس پر بدکاری کا خوف ہوگا۔ ہمارے بعض اصحاب نے کہا: اگر وہ کوئی لونڈی پائے تو نکاح نہ کرے یہ کوئی بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضرورتیں اور عذر احکام کو اٹھا دیتے ہیں یہ ضرورت کے اعتبار سے اس آدمی کی طرح ہے جس نے قسم ہی نہیں اٹھائی؛ یہ قول ابن خویز منداد کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ داؤد اور جوان کے ہمنواؤں نے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلقہ رجعیہ سے جب اس کا خاوند رجوع کرے جب کہ اس کی عدت ختم نہ ہوئی ہو پھر اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دے دے تو اس پر عدت کو مکمل کرنا لازم نہیں اور نہ ہی اس پر نئی عدت گزارنا لازم ہے کیونکہ اسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے قبل طلاق دے دی گئی، عطا بن ابی رباح اور ایک جماعت نے کہا: وہ پہلی طلاق کی عدت کو جاری رکھے گی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک یہی قول ہے کیونکہ جب اس نے حقوق زوجیت ادا نہیں کیے تھے تو اس کی طلاق اس طلاق کے حکم میں ہے جو ایک آدمی اپنی عورت کو عدت میں طلاق دے جس کے ساتھ اس نے رجوع نہیں کیا اور جس نے اپنی بیوی کو ہر طہر میں ایک طلاق دی وہ عورت اس عورت کو پہلی عدت پر بنا کرے گی اور نئے سرے سے عدت شمار نہیں کرے گی۔ امام مالک نے کہا: جب اس نے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اپنی سابقہ عدت پر بنا نہیں کرے گی۔ جس روز سے اس نے اسے طلاق دی ہے اس روز سے وہ نئی عدت شمار کرے گی۔ اس کے خاوند نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس نے غلطی کی اگر اس نے اس سے رجوع کیا جب کہ اس کو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی؛ اکثر علماء کا یہی نقطہ نظر ہے کیونکہ یہ عورت بھی ان بیویوں کے حکم میں ہے جن کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے گئے ہوں نفقہ میں، رہائش میں اور دوسرے امور میں، اسی وجہ سے جس روز اس نے اسے طلاق دی نئے سرے سے عدت شمار کرے گی؛ یہ بصرہ، کوفہ، مکہ، مدینہ اور شام کے جمہور فقہاء کا نقطہ نظر ہے۔ ثوری نے کہا: ہمارے نزدیک فقہاء نے اس پر اجماع کیا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر اسے طلاق بائنہ دی گئی مگر تین طلاقیں نہ دی گئی ہوں، تو خاوند نے اس عورت سے عدت میں نکاح کر لیا، پھر اسے حقوق زوجیت سے قبل طلاق دے دی تو اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام زفر اور عثمان بتی نے کہا: اس کو نصف مہر ملے گا اور باقی ماندہ عدت پوری کرے گی؛ یہ حضرت حسن بصری، عطا، عکرمہ اور ابن شہاب کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، ثوری اور اوزاعی نے کہا: اس کے لیے نکاح ثانی کی وجہ سے کامل مہر اور نئی عدت ہوگی۔ اسے مدخول بہا کے حکم میں رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے پانی کو ہی شمار کر رہی تھی۔ داؤد نے کہا: اس کو نصف مہر ملے گا۔ اس پر باقی ماندہ پہلی عدت نہ ہوگی اور نہ ہی نئی عدت ہوگی۔ اولیٰ وہ ہی ہے جو امام مالک اور امام شافعی نے کہا؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ: 228) اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَالّٰٓـِٔیْ یَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق: 4) کے لیے مخصوص ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے اور متعہ کے باب میں بھی گفتگو گزر چکی ہے۔ دوبارہ اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا اس میں دو توجیہیں ہیں: (۱) خوشحالی اور تنگ دستی کی بنا پر متعہ دیا جائے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(1)۔ (۲) اس سے مراد اسے طلاق دینا ہے جب کہ وہ طہارت کی حالت میں ہو اور اس سے جماع بھی نہ کیا گیا ہو؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طلاق کے بعد انہیں ان کے اہل کی طرف بھیج دیا جائے مرد اور مطلقہ عورت ایک جگہ جمع نہ ہوں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ فَمَتِّعُوْهُنَّ سعید نے کہا: یہ آیت اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے(2) جو سورۂ بقرہ میں ہے یہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: 237) یہاں متعہ کا ذکر نہیں۔ سورۂ بقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَسَرِّحُوْهُنَّ کا معنی ہے انہیں طلاق دو امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک تسریح یہ طلاق سے کنایہ ہے کیونکہ یہ غیر حقیقی معنی میں استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے نیت کی ضرورت ہوتی ہے امام شافعی کے نزدیک یہ لفظ صریح ہے اس بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ جَمِیْلًا یعنی سنت طریقہ پر نہ کہ بدعت کے انداز میں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ٘ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا٘ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ٘ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ لِكَیْلَا یَكُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ٘ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۞

''اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہے آپ کے لیے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں اور آپ کی کنیزیں جو اللہ تعالیٰ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں، اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ اور مومن عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کر دے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں۔ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 413
2۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 26

بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں انیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ سدی نے ابو صالح سے وہ حضرت ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں (1)۔ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دعوت نکاح دی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معذرت کی تو آپ نے میری معذرت کو قبول کر لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا: اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ۔ کہا: میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال نہ تھی کیونکہ میں نے ہجرت نہ کی تھی میں طلقاء (جن کو چھوڑ دیا گیا) میں سے تھی۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے روایت کیا ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن ہے، ہم اسے اسی سند سے پہچانتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ بہت ہی ضعیف ہے۔ یہ حدیث کسی ایسی صحیح سند سے مروی نہیں جس سے استدلال کیا جا سکے (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عورتوں کو اختیار دیا اور عورتوں نے آپ کو پسند کر لیا تو ان سے زائد سے شادی کرنا آپ کے لیے حرام کر دیا گیا اور ان کی جگہ کسی اور سے شادی کرنا بھی حرام کر دیا گیا یہ اصل میں ان کے اس عمل کا بدلہ تھا جو ازواج مطہرات نے کیا تھا۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ کیا یہ حلال تھا کہ اس کے بعد آپ کسی ایک کو طلاق دے دیں؟ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آپ کے لیے حلال نہیں تھا یہ اصل میں بدلہ تھا کہ جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال تھا جس طرح دوسرے لوگوں کے لیے حلال تھا لیکن اس کے بدلہ میں آپ کسی سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ پس اس حرمت کو منسوخ کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مباح کر دیا کہ جس عورت سے چاہیں شادی کر لیں۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ احلال تقاضا کرتا ہے کہ اس سے قبل حرمت بھی ہو۔ آپ کی وہ بیویاں جو آپ کی زندگی میں تھیں وہ آپ پر حرام نہیں تھیں۔ آپ پر حرام عورتوں سے نکاح کرنا تھا تو احلال ان کی طرف پھر گیا، کیونکہ آیت کے سیاق میں فرمایا: بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ یہ بات تو معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچا زاد، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ماموں زاد اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خالہ زاد کوئی بھی نہ تھی اس سے ثابت ہوا کہ ابتداءً ان کے ساتھ شادی کرنا حلال تھا۔ یہ آیت اگرچہ تلاوت میں مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے متاخر ہے، اس وجہ سے اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا جس کو بعد میں تلاوت کیا جاتا ہے، جس طرح سورۂ بقرہ میں وفات کے متعلق دو آیات ہیں۔

اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ کی تاویل میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہر ایسی عورت سے نکاح کرنا حلال کر دیا ہے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہر دیں (3)؛ یہ ابن زید اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر محرمات کے علاوہ تمام عورتوں کو یہ آیت آپ کے لیے حلال کرنے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 153۔ ایضاً، حدیث نمبر 3138، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1553

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 391

ہے: اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ سے مراد ہے جو بیویاں آپ کے پاس ہیں کیونکہ انہوں نے دنیا و آخرت پر آپ کو ترجیح دی ہے؛ یہ علماء میں سے جمہور کا نقطہ نظر ہے، یہی ظاہر قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ یہ فعل ماضی ہے اور فعل ماضی استقبال کے معنی میں چند شرطوں کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ اس تاویل کی بنا پر امر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تنگ ہو جاتا ہے۔ اس تاویل کی تائید وہ قول بھی کرتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس خاندان میں چاہتے شادی کر لیتے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر شاق گزرتا(1)، جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس وجہ سے آپ پر تمام عورتیں حرام ہو گئیں مگر جن کا نام لیا گیا تو اس وجہ سے آپ کی عورتیں خوش ہو گئیں۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ اس کی صحت پر وہ قول بھی دلالت کرتا ہے جسے امام ترمذی نے عطا سے روایت کیا ہے۔ کہا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے نکاح کرنا آپ کے لیے حلال کر دیا(2)۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے مطلقاً لونڈیاں حلال کر دیں۔ اور اپنے نبی کے لیے بیویاں بھی مطلقاً حلال کر دیں، باقی لوگوں کے لیے مخصوص تعداد کی صورت میں حلال کر دیا۔ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ کفار کی عورتوں میں سے جو تم پر لوٹائے۔ غنیمت کو بعض اوقات فیی بھی کہتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو تم پر لوٹایا یعنی جو عورتیں قہر اور غلبہ کی صورت میں پکڑی گئیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وہ بیویاں جن کو آپ نے مہر دے دیا اور جو آپ کی باندیاں ہیں ان سے زائد آپ کے لیے ہم نے عورتیں آپ کے لیے حلال کر دی ہیں؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ کیونکہ اگر یہ ارادہ ہوتا کہ ہم نے آپ کے لیے وہ عورت حلال کر دی ہے جس سے آپ نے نکاح کیا اور آپ نے اسے مہر دے دیا تو اس کے بعد یہ نہ فرماتا: وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ کیونکہ یہ تو ماقبل میں داخل ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ لازم نہیں آتا ان کا خصوصاً ذکر کیا مقصد ان کی شرافت کا اظہار ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمٰن) اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ اس میں دو قول ہیں: (۱) آپ کے قریبی رشتہ داروں میں سے جس طرح تیرے چچا حضرت عباس کی بیٹیاں، اس کے علاوہ عبد المطلب کی اولاد، عبد المطلب کی بیٹیوں کی اولاد کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں، جو عبد مناف بن زہرہ کی بیٹیوں کی اولاد، حلال نہیں مگر جو مسلمان ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمہاجر من ہجر ما نہی اللہ عنہ (3) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو اس کو چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالَّذِيْنَ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 391 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 153۔ ایضاً، حدیث 3140، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون، جلد 1، صفحہ 6

اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا (الانفال: 72) جس نے ہجرت نہ کی وہ کامل نہ ہوا اور جو کامل نہیں ہوا وہ اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کامل نہیں جو کمال والا، شرف والا اور عظمت وشان والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** مَعَكَ یہاں معیت سے مراد ہجرت میں اشتراک ہے صحبت میں اشتراک نہیں جس نے ہجرت کی وہ آپ کے لیے حلال ہو گیا۔ جب اس نے ہجرت کی اس وقت وہ آپ کی صحبت میں تھا یا نہیں تھا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: دخل فلان معی و خرج معی یعنی اس کا عمل میرے عمل کی طرح ہے، اگرچہ اس میں تم دونوں کا عمل ملا ہوا نہ ہو۔ اگر تو کہے: خرجنا معا اس نے دو معنوں کا اکٹھے تقاضا کیا: فعل میں اشتراک اور اس میں اقتران۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اللہ تعالیٰ نے عم کو مفرد اور عمات کو جمع ذکر کیا، اسی طرح فرمایا: خالك، و خالاتك اس میں حکمت یہ ہے کہ عم اور خال اطلاق میں اسم جنس ہے، جس طرح شاعر اور راجز۔ جب کہ عمہ اور خالہ اس طرح نہیں یہ عرف لغوی ہے۔ کلام اشکال کو دور کرنے کے لے حد درجہ بلیغ انداز میں واقع ہوئی ہے۔ یہ دقیق ہے پس تم اس میں غور وفکر کرو؛ یہ ابن عربی کا قول ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8۔** وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اس کا عطف أحللنا پر ہے۔ معنی ہے اور ہم نے آپ کے لیے اس عورت کو بھی حلال کیا ہے جو بغیر مہر کے اپنا آپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہبہ کرتی ہے۔ اس معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی عورت بھی نہ تھی مگر اس کے ساتھ آپ نے عقد نکاح کیا ہوا تھا یا وہ آپ کی لونڈی تھی (2)۔ جہاں تک ہبہ کا تعلق ہے تو ایسی کوئی عورت بھی آپ کے پاس نہیں تھی۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: آپ کے پاس ہبہ کرنے والی بھی عورت تھی (3)۔

میں کہتا ہوں: صحیحین میں جو روایت ہے وہ اس قول کو قوت بہم پہنچاتی ہے اور اس کی تائید کرتی ہے۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں ان عورتوں پر غیرت کھاتی تھی جو اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کرتی تھیں اور میں کہا کرتی تھی: کیا کوئی عورت حیا نہیں کرتی کہ وہ اپنا آپ بطور ہبہ کسی مرد کو پیش کرے (4) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ میں نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں آپ کے رب کو دیکھتی ہوں کہ وہ آپ کی خواہش پوری کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: حضرت خولہ بنت حکیم ان عورتوں سے تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں ہبہ کیا (5)۔ یہ روایت اس امر پر دال ہے کہ وہ کئی عورتیں تھیں؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

زمخشری نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے اپنے آپ کو ہبہ کرنے والیاں چار ہیں: حضرت میمونہ بنت حارث، حضرت زینب بنت خزیمہ ام المساکین انصاریہ، حضرت ام شریک بنت جابر، حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہن (6)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1557
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 391
3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 477
4۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جواز ہبتھا نوبتھا الضرتھا، جلد 1، صفحہ 473
5۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، هل المرأة تهب نفسها، جلد 2، صفحہ 766
6۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 550

میں کہتا ہوں: ان میں سے بعض میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ میمونہ بنت حارث ہے (1)۔ امام شعبی نے کہا: وہ زینب بنت خزیمہ ام المساکین جو انصار میں سے ایک ہے (2)۔ علی بن حسین، ضحاک اور مقاتل نے کہا: وہ ام شریک بنت جابر اسدیہ ہے۔ عروہ بن زبیر نے کہا: ام حکیم بنت اوقص سلمیہ ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 9۔** اپنا آپ ہبہ کرنے والی کے نام میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ام شریک انصاری ہے اس کا نام غزیہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام غزیلہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لیلیٰ بنت حکیم تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت میمونہ بنت حارث تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے اسے دعوت نکاح دی ان کے پاس دعوت نکاح دینے والا آیا جب کہ آپ اونٹ پر تھیں۔ انہوں نے کہا: اونٹ اور جو اونٹ پر ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ام شریک عامریہ ہے۔ یہ ابو عکر ازدی کے عقد میں تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ طفیل بن حارث کے عقد میں تھیں ان کے بطن سے ان کا بیٹا شریک پیدا ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کی یہ امر ثابت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اسے ابو عمر بن عبد العزیز نے ذکر کیا۔ امام شافعی اور عروہ نے کہا: وہ زینب بنت خزیمہ ام المساکین ہیں (4)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔** جمہور نے اِن وھبت ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی۔ یہ امر کے نئے سرے سے شروع ہونے پر دال ہے یعنی اگر یہ واقع ہو تو یہ اس کے لیے حلال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے مروی ہے دونوں نے کہا: نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی موہوبہ عورت نہ تھی۔ ہم نے اس کے خلاف پر دلیل قائم کر دی ہے۔ ائمہ نے سہل اور دوسرے واسطوں سے صحاح میں روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے کہا: میں اس لیے حاضر ہوئی کہ میں اپنا آپ آپ کو ہبہ کروں (5)۔ حضور ﷺ خاموش ہو گئے یہاں تک کہ ایک آدمی اٹھا اس نے عرض کی: اگر آپ کو حاجت نہیں تو میری اس سے شادی کر دیں۔ اگر یہ ہبہ جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ خاموش نہ رہتے کیونکہ آپ باطل پر قائم نہ رہتے جب اسے سنتے۔ مگر یہ احتمال موجود ہے کہ سکوت بیان کے انتظار میں ہو، تو یہ آیت تحلیل اور تخییر کے متعلق نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے اس کے ترک کو اختیار کیا اور اس کی شادی ایک اور مرد سے کر دی۔

یہ بھی احتمال موجود ہے کہ حضور ﷺ نے خاموشی اس لیے اختیار کی ہو تا کہ اس بارے میں غور کریں یہاں تک کہ آدمی اس کی طلب میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت حسن بصری، حضرت ابی بن کعب اور امام شعبی نے ان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اعمش نے وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ قراءت کی۔ نحاس نے کہا: ان ہمزہ کا کسرہ معانی کو جامع ہے کیونکہ کہا گیا: وہ عورتیں ہیں۔ جب ہمزہ کو فتحہ دیا جائے تو معنی ہوگا ان میں سے ایک معین، کیونکہ فتحہ امراۃ سے بدل کے طور پر ہوگا یا یہ لأن کے معنی میں ہوگا۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 414-415   2۔ ایضاً   3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 392

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 414-415   5۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، اذا کان الولی ھو الخاطب، جلد 2، صفحہ 770

**مسئلہ نمبر 11۔** مُّؤْمِنَةً یہ لفظ اس پر دال ہے کہ کافرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں امام الحرمین نے کہا: آزاد کافرہ کے آپ پر حرام ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہی ہے کہ وہ آپ پر حرام ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ممتاز ہیں (1)۔ جہاں تک فضائل اور کرامت کی جانب ہے تو اس میں آپ کا حصہ زیادہ ہے اور جو نقص والی جانب ہے تو آپ اس سے زیادہ پاکیزہ ہیں ہمارے لیے آزاد کتابی کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جلالت شان کی بنا پر مومنات تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ جب آپ کے لیے وہ عورت حلال نہیں جس نے ہجرت نہیں کی کیونکہ اس میں ہجرت کی فضیلت نہیں تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ آپ کے لیے کافرہ کتابیہ حلال نہ ہو کیونکہ اس میں کفر کا نقص موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 12۔** اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نکاح صفات مخصوصہ پر عقد معاوضہ ہے۔ سورۃ النساء اور دوسری سورتوں میں یہ بات گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا: اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ کا معنی ہے حلت وہ حلال کرے۔ حضرت حسن بصری نے پڑھا ان وهبت ہمزہ پر فتحہ ہے۔ ان محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: اصل میں یہ لان تھا۔ دوسرے علماء نے کہا: ان وھبت یہ امرأۃ سے بدل اشتمال ہے۔

**مسئلہ نمبر 13۔** اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا جب عورت نے اپنا آپ ہبہ کر دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر لیا تو وہ آپ کے لیے حلال ہو گئی اگر آپ نے اس کو قبول نہ کیا تو یہ چیز لازم نہ ہوگی، جس طرح اس نے کسی مرد کو کوئی چیز ہبہ کی تو اس کو قبول کرنا لازم نہیں ہوگا، مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق میں سے یہ ہے کہ آپ واہب کا ہبہ قبول کریں اور کریم لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس کا رد کرنا عادت میں طیب ہے۔ واہب کے لیے ہبہ اور اس کے دل کے لیے اذیت کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اسے واضح کیا، اسے قرآن بنایا جس کی تلاوت کی جاتی ہے تا کہ اس سے حرج دور ہو اور لوگوں کی عادت اور قول میں جو باطل چیزیں ہیں وہ باطل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 14۔** خَالِصَةً لَّكَ عورتوں کا اپنے آپ کو ہبہ کرنا یہ ایسی خصلت ہے جو جائز نہیں۔ یہ جائز نہیں کہ عورت اپنے آپ کو مرد کے لیے ہبہ کرے۔ خاصیت کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ عورت دخول سے قبل مہر کے فرض کرنے کا مطالبہ کرے تو یہ اس کا حق نہ ہوگا۔ جہاں تک مفوضہ کے حق میں ہمارے ہاں حقوق زوجیت ادا کرنے سے قبل مہر کے مطالبہ کا حق ہے اور حقوق زوجیت کی ادائیگی کے بعد مہر مثل کے مطالبہ کا حق ہے۔

**مسئلہ نمبر 15۔** علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت کا اپنی ذات کو ہبہ کرنا جائز نہیں اور لفظ ہبہ سے نکاح مکمل نہیں ہوتا۔ مگر امام ابوحنیفہ (2) اور صاحبین سے یہ مروی ہے انہوں نے کہا: جب اس نے ہبہ کیا اور مرد نے اپنے آپ پر مہر کی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1559

2۔ ائمہ احناف کے نزدیک عقد نکاح کے لیے دو قسم کے الفاظ ہیں الفاظ صریحہ جیسے نکاح اور تزویج۔ الفاظ کنایہ۔ جن میں ملکیت ثابت ہو جیسے بیع، شراء، ہبہ، تملیک۔ اس میں دونوں فریقوں کی جانب سے ایجاب و قبول لازم ہے اس موقع پر جو مہر ذکر کیا جائے تو وہی لازم ہوگا بصورت دیگر مہر مثل لازم ہوگا۔

گواہی دی تو یہ جائز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ان کے قول میں نہیں مگر یہ عبارت اور لفظ ہبہ کا ذکر کرنا جائز ہے مگر افعال جس کی انہوں نے شرط لگائی ہے وہ بعینہ افعال نکاح ہیں (1)۔ یہ مسئلہ سورۃ القصص میں مفصل گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 16**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو احکام شریعت میں چند چیزوں میں خاص کیا ہے جن میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں۔ یہ فرض، حرمت اور حلت کے احکام ہیں یہ امت پر فضیلت کے طور پر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور ایسا مرتبہ ہے جو آپ کے لیے خاص ہے۔ چند چیزیں آپ پر فرض کی گئیں جو دوسروں پر فرض نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر چند امور حرام کیے گئے جو دوسروں پر حرام نہیں تھے آپ کے لیے چند چیزیں حلال کی گئیں جو لوگوں کے لیے حلال نہ کی گئیں۔ ان میں سے کچھ متفق علیہ ہیں اور کچھ مختلف فیہ ہیں۔

جو چیزیں آپ پر فرض کی گئیں وہ نو ہیں: (۱) رات کے تہجد۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رات کا قیام آپ پر فرض تھا یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ (المزمل: 1) منصوص یہ ہے کہ آپ پر یہ واجب ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ منسوخ ہوگیا: وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء: 79) اس کی وضاحت آئے گی۔ (۲) چاشت کے نفل (۳) قربانی (۴) وتر۔ یہ تہجد کی قسم میں داخل ہے (۵) مسواک (۶) جو تنگ دست مر جائے اس کا قرض دینا (۷) شریعت کے علاوہ دیگر معاملات میں ذوی الارحام سے مشاورت کرنا (۸) عورتوں کو اختیار دینا (۹) جب عمل کریں تو اس پر دوام اختیار کریں اور اس کو ثابت رکھیں۔

دوسرے علماء نے کہا: آپ پر یہ بھی فرض تھا جب کوئی منکر دیکھیں تو اس کا انکار کریں اور انکار کو ظاہر کریں کیونکہ کسی کے عمل کو دیکھ کر اس سے منع نہ کرنا اس عمل کے جواز پر دال ہے۔ یہ بات صاحب البیان نے ذکر کی ہے۔

جو چیزیں آپ پر حرام ہیں ان کی تعداد دس ہے: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کو زکوٰۃ لینا حرام ہے (۲) آپ کے لیے نفل صدقہ لینا حرام اور آپ کی آل کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس میں تفصیل ہے (۳) آنکھ کی خیانت۔ اس سے مراد ایسی چیز ظاہر کرنا جو پوشیدہ امر کے خلاف ہو یا جو چیز ثابت ہو اس سے دھوکہ کھانا جب کہ آپ نے اجازت لینے پر کفار کی مذمت کی پھر اس کے داخل ہونے پر ان کے لیے قول کو نرم کیا (2)۔ (۴) اللہ تعالیٰ نے ان پر اس امر کو حرام کر دیا جب آپ زرہ پہن لیں کہ اسے اتاریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے والے کے درمیان فیصلہ فرما دے (۵) ٹیک لگا کر کھانا (۶) ناپسندیدہ بدبودار کھانے کھانا۔ (۷) بیویوں میں تبدیلی کرنا یعنی پہلی کو طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی کرنا۔ اس کی بحث آئے گی۔ (۸) ایسی عورت سے نکاح کرنا جس کی صحبت کو ناپسند کرتے ہوں۔ (۹) آزاد کتابیہ عورت سے شادی کرنا (۱۰) کسی لونڈی سے نکاح کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے بعض چیزیں آپ پر حرام کیں جنہیں اور لوگوں پر حرام نہیں یا مقصود آپ کی طہارت اور پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنا، شعر کہنا اور اس کی تعلیم دینا حرام کر دیا مقصود آپ کی حجت کی تاکید اور معجزہ کا بیان ہے۔ اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 392

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب مدارۃ من یتقی فحشہ، جلد 2، صفحہ 322

تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت:48) نقاش نے اسے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ آپ نے لکھا: پہلا قول زیادہ مشہور ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر اس امر کو حرام کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نظریں ایسی چیز کی طرف اٹھائیں جن سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو متمتع کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر:88)

وہ چیزیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال کی گئیں ان کی تعداد سولہ ہے: (۱) مال غنیمت میں سے چنی ہوئی چیز (۲) خمس کا خمس یا خمس (پانچواں حصہ) لینا (۳) صوم وصال (۴) چار عورتوں پر زیادہ عورتوں سے شادی کرنا (۵) ہبہ کے لفظ سے نکاح کرنا (٦) ولی کے بغیر نکاح کرنا (٧) مہر کے بغیر نکاح کرنا (۸) احرام کی حالت میں نکاح کرنا (۹) بیویوں کے درمیان باری کا ساقط ہونا، اس کی بحث بعد میں آئے گی (۱۰) جب آپ کی نظر کسی عورت پر پڑ جائے اس عورت کے خاوند پر طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے اور آپ کے لیے نکاح کرنا حلال ہو جاتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام الحرمین نے یہی کہا ہے اس کے متعلق حضرت زید کے قصہ میں علماء کی بحث گزر چکی ہے(1) (۱۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ کو آزاد کیا اور اس کی آزادی ہی اس کا مہر بنا دیا (۱۲) احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہونا۔ ہمارے بارے میں اس حکم میں اختلاف ہے (۱۳) مکہ مکرمہ میں جنگ کرنا (۱۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وارث نہیں ہوگا اسے تحلیل کی قسم میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ جب کوئی آدمی مرض کی وجہ سے موت کے قریب ہوتا ہے تو اس کی اکثر ملکیت زائل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے صرف ایک تہائی باقی رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت باقی رہی جس طرح آپ کی مواریث میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اور سورۂ مریم میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے (۱۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی زوجیت کے رشتہ کا باقی رہنا (۱٦) جب آپ کسی عورت کو طلاق دے دیں تو آپ کی حرمت اس پر باقی رہے گی وہ نکاح نہیں کر سکے گی۔ یہ تینوں اقسام اپنی اپنی جگہ پر مفصل گزر چکی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مباح ہے کہ آپ کھانا اور مشروب بھوکے اور پیاسے سے بھی لے لیں، اگرچہ وہ بھوکا پیاسا ایسا ہو جس کو اپنے ہلاک ہونے کا خوف ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ مسلمانوں میں سے ہر ایک پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرے۔ آپ کے لیے یہ مباح ہے کہ آپ اپنی جان کی حفاظت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے غنیمتوں کو حلال کرنے کے ساتھ آپ کو عزت دی۔ زمین کو آپ کے لیے مسجد اور طہور بنا دیا گیا جب کہ انبیاء میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کی عبادت ان کی عبادت گاہ میں ہی صحیح ہوتی تھی۔ آپ کی رعب سے مدد کی گئی۔ آپ کا دشمن ایک ماہ کی مسافت سے آپ سے ڈرا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء بعض کی طرف مبعوث ہوئے اور بعض کی طرف مبعوث نہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سابقہ انبیاء کے معجزات کے برابر یا اس سے بھی زائد بنائے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ عصا اور پتھر سے چشموں کا پھوٹنا تھا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چاند شق ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی نکلا۔ حضرت عیسیٰ علیہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1563

السلام کا معجزہ مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو درست کرنا تھا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کنکریوں نے تسبیح پڑھی اور تنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مشتاق ہوا، یہ بلیغ ترین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انبیاء پر پوری فضیلت عطا کی کہ قرآن آپ کے لیے معجزہ ہو گیا اور آپ کا معجزہ قیامت تک باقی رہنے والا بنا دیا، اسی وجہ سے آپ کی نبوت ابدی بنادی گئی جو قیامت تک منسوخ نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا کہ آپ سے نکاح کریں۔ یہ کہا جاتا ہے: نکح، استنکح دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح عجب اور استعجب، عجل اور استعجل کا معنی ایک ہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استنکاح سے مراد نکاح کو طلب کرنا ہو یا وطی کو طلب کرنا ہو۔ خالصة حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یہ زجاج کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس ضمیر متصل سے حال ہے جو فعل مضمر کے ساتھ متصل ہے جس پر ظاہر فعل دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: احللنالك ازواجك و أحللنالك امراءة مؤمنة أحللناها خالصة بلفظ الهبة وبغير صداق و بغیر ولی۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اس کا فائدہ یہ ہے کہ کفار اگرچہ ہمارے نزدیک شریعت کے فرعی مسائل کے مخاطب ہیں مگر ان میں کوئی عمل دخل نہیں، کیونکہ احکام کا نفاذ ان میں اس وقت ہوگا جب وہ اسلام لائیں گے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ یعنی جو ہم نے مومنوں پر واجب کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شادی نہ کریں گے مگر صرف چار عورتوں سے وہ بھی مہر، گواہ اور ولی کی موجودگی میں۔ اس کا یہ معنی حضرت ابی بن کعب، قتادہ اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ آپ کسی ایسے امر میں تنگی میں نہ پڑیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کشادگی کے محتاج ہوں، یعنی ہم نے اس کو بیان کر دیا اور اس کی وضاحت کر دی ہے تا کہ آپ پر کوئی حرج نہ ہو۔ لکیلا یہ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ کے متعلق ہے، یعنی آپ کا دل تنگ نہ پڑے یہاں تک کہ آپ سے ایسا امر ظاہر ہو کہ آپ نے اپنے رب کے ہاں کسی معاملہ میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے ساتھ غفران اور رحمت کے اظہار کے ساتھ اس کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِيْۤ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝

"(آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے اور اپنے پاس رکھیں جس کو آپ چاہیں اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں، اس (رخصت) سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے بڑا بردبار ہے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ ترجی کو مہموز اور غیر مہموز دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے أرجیت الامر، ارجأتہ۔ جب تو اسے موخر کر دے۔ وَتُؤْوِیْٓ آپ ملائیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: آوی الیہ الف پر مد ہے اس کا معنی اپنے ساتھ ملانا ہے۔ آوی الف مقصورہ کے ساتھ۔ اس کے ساتھ ملنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں جو اقوال ذکر کیے گئے ہیں ان میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر باری ترک کرنے کی سہولت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیویوں میں باری واجب نہیں۔ یہ قول اس کے مناسب ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ یہی وہ معنی ہے جو صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے۔ کہا: میں ان عورتوں پر غیرت کرتی تھی جو اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں ہبہ کیا کرتی تھیں (1)۔ میں کہتی: کیا ایک عورت اپنے نفس کو مرد کے لیے ہبہ کرتی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ۖ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ تو حضرت عائشہ نے کہا: میں کہتی ہوں: اللہ کی قسم! میں آپ کے رب کو نہیں دیکھتی مگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کو پورا کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہی صحیح میں ثابت ہے اسی پر اعتماد کرنا چاہیے معنی مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بیویوں میں اختیار دیا گیا چاہیں تو باری مقرر کریں اور چاہیں تو باری کو ترک کر دیں (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس امر میں خاص کیا گیا کہ اس معاملہ میں امر آپ کے سپرد کر دیا گیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جانب سے باری مقرر کرتے یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض نہ تھا، یہ ازواج مطہرات کے دلوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے اور انہیں غیرت کے لیے ان اقوال سے بچانے کے لیے ہوتا تھا جو انہیں ایسے امر تک پہنچا دیتے جو مناسب نہیں ہوتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ باری مقرر کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی واجب تھا پھر اس آیت کے ساتھ آپ سے وجوب ساقط ہو گیا۔ ابورزین نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے عرض کی: ہمارے لیے جو چاہیں باری مقرر کر دیں۔ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملایا وہ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن تھیں۔ ان کی آپ کی جانب سے باری اور مال سب میں برابری تھی۔ جن کو آپ نے مؤخر کیا وہ حضرت سودہ، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت میمونہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہن تھیں۔ آپ ان کے لیے جو چاہتے باری مقرر کر دیتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہبہ کرنے والیاں ہیں۔

ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کے بارے میں یہ قول نقل کرتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ ان عورتوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا۔ امام شعبی نے کہا: اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے بعض سے نکاح کر لیا اور بعض کو ترک کر دیا۔ زہری نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جواز ھبتھا نوبتھا لضرتھا، جلد 1، صفحہ 473 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1568

اپنی ازواج میں سے کسی کو بھی مؤخر کیا ہو بلکہ سب کو اپنے ساتھ ملایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں طلاق دے دیں اور جس کو چاہیں روکے رکھیں۔ اس کے علاوہ بھی قول کیا گیا ہے۔ ہر ایک کی توجیہ موجود ہے۔ یہ آیت ایسی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سہولت اور اباحت کی گنجائش رکھی گئی ہے ہم نے جو معنی اور مفہوم اپنایا ہے وہ زیادہ صحیح ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ھبۃ اللہ، الناسخ والمنسوخ میں اس طرف گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ کے لیے ناسخ ہے، کہا: کتاب اللہ میں کوئی ناسخ اس کے سوا منسوخ سے پہلے نہیں (1)۔ اس کی کلام کئی اعتبار سے کمزور ہے۔ سورۂ بقرہ میں متوفی عنہا کی عدت چار ماہ دس دن ہے یہ سال کو منسوخ کرنے والی ہے یہ بھی منسوخ سے پہلے ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ، ابْتَغَیْتَ تو نے طلب کیا۔ الابتغاء کا معنی طلب کرنا ہے۔ عَزَلْتَ تو نے اس کو زائل کر دیا۔ العزلہ کا معنی ازالہ کرنا، الگ کرنا ہے، یعنی اگر آپ نے ارادہ کیا کہ آپ اپنے ساتھ اس عورت کو ملائیں جوان عورتوں میں سے ہے جن کو آپ نے باری سے الگ کر دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ساتھ جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس بارے میں آپ پر کوئی حرج نہیں اسی طرح ارجاء کا حکم ہے۔ دونوں طرفوں میں سے ایک دوسرے پر دلالت کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ کوئی جھکاؤ نہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: جنحت السفینۃ۔

یعنی کشتی زمین کی طرف جھک گئی، یعنی آپ پر ملامت اور توبیخ کا کوئی جھکاؤ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6۔** ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: یہ اختیار جو ہم نے آپ کو ان کی صحبت کے بارے میں دیا ہے یہ ان کو راضی کرنے کا زیادہ باعث ہے کیونکہ یہ ہماری جانب سے ہے کیونکہ جب وہ جانیں گی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ احسان ہے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ راضی ہوں گی کیونکہ انسان جب یہ جانے کہ اس کا کسی شے میں کوئی حق نہیں تو اسے جو بھی دیا جائے اس پر راضی ہو جاتا ہے اگرچہ وہ چیز تھوڑی ہی ہو۔ اگر اسے علم ہو کہ یہ اس کا حق ہے تو اسے جو کچھ عطا کیا جائے اس پر قانع نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت شدید ہو جاتی ہے اور اس بارے میں اس کا حرص زیادہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آپ کی بیویوں کا معاملہ سپرد کیا یہ ان کی زیادہ رضا کا باعث تھا اور زیادہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث تھا جو بھی آپ ان کے لیے کرم نوازی کریں چہ جائیکہ ان کا دل ان سے زیادہ کے ساتھ چمٹا رہے۔ اسے تقر اعینھن تاء کے ضمہ اور اعین کے نصب کے ساتھ بھی قراءت کی گئی ہے۔

اسے مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں برابری کرنے کے لیے اپنے آپ پر سختی کیا کرتے تھے۔ مقصود ان کے دلوں کو پاکیزہ بنانا تھا، جس طرح ہم نے اسے پہلے ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے: ''اے اللہ! یہ میری قدرت ہے جس کا میں مالک ہوں۔ اور مجھے اس کے بارے میں ملامت نہ کر جس کا تو مالک ہے اور میں مالک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 393

نہیں'' (1)۔ مراد دل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ترجیح دیتے مگر اپنے افعال میں سے کسی فعل میں اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس بیماری میں بھی ازواج مطہرات کے گھروں میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ کے ہاں قیام کی اجازت مانگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء میں حضرت میمونہ کے ہاں تکلیف ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج سے اجازت مانگی کہ آپ بیماری کے دن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گزاریں تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دے دی۔ صحیح نے اسے نقل کیا ہے (2)۔

صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تلاش میں رہتے فرماتے: ''آج میں کہاں ہوگا؟ کل میں کہاں ہوگا؟'' (3)۔ گویا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دن آنے کو بعید سمجھتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جب میرا دن تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو میرے پہلو اور میرے سینے کے درمیان قبض کر لیا۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مرد پر لازم ہے کہ اپنی عورتوں میں ایک دن اور ایک رات کے اعتبار سے مساوات کرے؛ یہ عام علماء کا قول ہے۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ رات کے اعتبار سے واجب ہے دن کے اعتبار سے واجب نہیں عورت کا مرض اور اس کا حیض اس کے حق کو ساقط نہیں کرے گا۔ اس کے دن اور اس کی رات میں اس کے پاس ٹھہرنا لازم ہے مرد پر یہ بھی لازم ہے کہ جس طرح وہ اپنی صحت میں برابری کیا کرتا تھا وہ اپنی حالت مرض میں بھی برابری کرے ہاں جب وہ حرکت سے عاجز آ جائے تو وہ وہاں ہی مقیم ہو جائے جہاں اس پر مرض غالب آئی تھی۔ جب صحت مند ہو تو نئے سرے سے باری کا سلسلہ شروع کرے۔ لونڈی بیوی، آزاد بیوی، کتابی بیوی اور مسلمان بیوی اس حق میں برابر ہیں۔ عبدالملک نے کہا: آزاد بیوی کے لیے دو راتیں اور لونڈی بیوی کے لیے ایک رات ہوگی، جہاں تک اپنی لونڈیوں کا تعلق ہے ان میں اور آزاد بیویوں میں کوئی باری نہیں اور اپنی لونڈیوں کا اس میں کوئی حق نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ان سب کو ایک مکان میں جمع نہ کرے مگر ان کی رضامندی کے ساتھ اور ضرورت کے بغیر ایک کی باری میں اس کے دن اور رات میں کسی اور کے ہاں داخل نہ ہو۔ حاجت اور ضرورت کی بنا پر بھی اس کے ہاں جانے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اکثر جواز کے قائل ہیں۔ امام مالک اور دوسرے علماء کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ ابن حبیب کی کتاب میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ ابن بکیر، مالک سے وہ یحییٰ بن سعید سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل کی دو بیویاں تھیں جب ان میں سے ایک کی باری ہوتی تو دوسری بیوی کے گھر سے آپ پانی بھی نہ پیتے تھے۔ ابن بکیر نے کہا: امام مالک نے یحییٰ بن سعید سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل کی دو بیویاں تھیں جو طاعون کی مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھیں تو آپ نے دونوں میں قرعہ اندازی کی کہ جس کے نام قرعہ نکلے گا اسے پہلے دفن کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: دونوں میں نفقہ اور کسوہ کے اعتبار سے مساوات کرے جب کہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، ماجاء فی تسویۃ بین، جلد 1، صفحہ 136۔ ایضاً، حدیث نمبر 1059۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1822 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، الغسل والوضوء فی المخضب، جلد 1، صفحہ 32 3۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فی فضل عائشہ رضی اللہ عنہا، جلد 2، صفحہ 286

وہ سب ایک حال کی ہوں جب ان کی حیثیتیں مختلف ہوں تو یہ چیز لازم نہ ہوگی۔ امام مالک نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ لباس میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دے مگر میلان کے طریقہ پر نہ ہو۔ جہاں تک محبت اور بغض کا تعلق ہے تو یہ انسان کے اختیار سے خارج ہیں ان میں عدل واقع نہ ہو سکے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باری معین کرنے کے بارے میں ارشاد کا یہی معنی ہے: ''اے اللہ! جس کا میں مالک ہوں اس میں یہ میرا عمل ہے اور جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں اس میں مجھے ملامت نہ کر'' (1)۔

امام نسائی اور ابو داؤد نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے۔ ابو داؤد کی کتاب میں ہے یعنی دل۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں اشارہ کیا ہے: وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (النساء: 129) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ یہاں اس کے خصوصی ذکر کرنے کی یہی وجہ ہے۔ اس کی جانب سے ہمیں تنبیہ ہے کہ وہ ذات جانتی ہے کہ ہمارے دلوں میں ہماری عورتوں میں سے بعض کے لیے بعض کی بنسبت جو میلان ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ (آل عمران: 5) يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ (طٰہٰ) لیکن اس بارے میں اس نے درگزر سے کام لیا، کیونکہ بندہ طاقت نہیں رکھتا کہ بندہ اس میلان سے اپنے دل کو پھیر سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان متوجہ کرتا ہے: وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

اس ارشاد میں یہ بھی ہے ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ یہی دسواں مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ یہ اس کے زیادہ مناسب ہے کہ وہ غمگین نہ ہوں جب وہ ان میں سے کسی کو دوسرے کے ساتھ جمع نہ کرے اور وہ ترجیح اور میلان کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے کسی کی طرف مائل ہو جائے تو وہ قیامت کے روز آئے گا جب کہ اس کی ایک جانب جھکی ہوگی'' (2)۔

وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ، كُلُّهُنَّ یہ ضمیر کی تاکید ہے یعنی یرضین کلھن۔ ابو حاتم اور زجاج نے اسے اس مضمر کی تاکید بنانا بھی جائز قرار دیا ہے جو اٰتَيْتَهُنَّ میں ہے۔ فراء اس کو جائز قرار نہیں دیتا کیونکہ معنی اس کی تائید نہیں کرتا کیونکہ معنی ہے ان میں سے ہر ایک راضی ہو۔ اس کا معنی یہ نہیں جو تم نے سب کو عطا کیا ہے۔ نحاس نے کہا: جو کچھ انہوں نے کہا وہ حسن ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ یہ عام خبر ہے اور اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ایک شخص کی محبت ہے دوسرے کی نہیں، اسی طرح اس معنی میں مومن بھی داخل ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جیش ذات سلاسل کا امیر بنا کر بھیجا میں نے عرض کی: لوگوں میں سے کون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: ''حضرت عائشہ صدیقہ'' (3)۔ میں نے عرض کی: مردوں میں؟ فرمایا:

---

1۔ سنن ابی داود، کتاب النکاح، القسم بین النساء، جلد 1، صفحہ 290۔ ایضاً حدیث نمبر 1822　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، قول النبی لو کنت متخذا خلیلا، جلد 1، صفحہ 517

''ان کا باپ''۔ میں نے عرض کی: پھر کون؟ فرمایا: ''عمر بن خطاب''۔ تو آپ نے چند مردوں کا ذکر کیا۔ سورۂ بقرہ اور اس سورت کے آغاز میں دل کے متعلق اس پر بحث گزر چکی ہے جو اس مسئلہ میں کفایت کر جاتی ہے۔

یہ روایت کی جاتی ہے کہ لقمان حکیم ایک بڑھئی تھے (1) ان کے آقا نے انہیں کہا: ایک بکری ذبح کرو اور ان میں سے جو سب سے پاکیزہ ٹکڑے ہیں وہ لے آؤ تو وہ ان کے پاس زبان اور دل لے آئے۔ پھر آقا نے ایک اور بکری ذبح کرنے کا حکم دیا تو کہا: اس میں سے اس کے دو خبیث ترین جز پھینک دو تو اس نے زبان اور دل کو پھینک دیا۔ آقا نے کہا: میں نے تجھے حکم دیا کہ تو میرے پاس اس میں سے دو پاکیزہ ٹکڑے لے آ تو تو زبان اور دل لے آیا اور میں نے تجھے حکم دیا کہ تو ان میں سے دو ناپسندیدہ چیزیں پھینک دے۔ تو نے دل اور زبان کو پھینکا، لقمان حکیم نے کہا: جب پاکیزہ ہوں تو ان دونوں سے زیادہ کوئی پاکیزہ نہیں اور جب یہ دونوں خبیث ہوں تو ان دونوں سے بڑھ کر کوئی اور خبیث نہیں۔

لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿۵۲﴾

''حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس کے بعد اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کر لیں ان ازواج سے دوسری بیویاں اگرچہ آپ کو پسند آئے ان کا حسن بجز کنیزوں کے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء کا اس ارشاد لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ کی تاویل میں سات اقوال ہیں:

(ا) یہ آیت سنت سے منسوخ ہے اس کی ناسخ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے عورتوں کو حلال کر دیا (2)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ ایک اور آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ امام طحاوی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کر دیا کہ آپ عورتوں میں سے جس سے چاہیں شادی کر لیں مگر محرم کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے (3)۔ وہ آیت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُؤْوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ، نحاس نے کہا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اولیٰ ہے۔ نسخ کے بارے میں یہ اور حضرت عائشہ کا قول ایک ہی چیز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ ارادہ کیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے نکاح کرنا حلال قرار دیا ہو، ساتھ ہی ساتھ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہم اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ کوفہ کے بعض فقہاء نے اس سے معارضہ کیا ہے اور کہا: یہ محال ہے کہ یہ آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ۔ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ کو منسوخ کرے کیونکہ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مصحف میں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 332

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ احزاب، جلد 2، صفحہ 153

3۔ شرح مشکل الآثار، باب ما روی عن عائشہ و سلمۃ، جلد 1، صفحہ 453

پہلے ہے تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور اس کے قول کو ترجیح دی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت سنت سے منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ معارضہ لازم نہیں آتا اور اس کا قائل غلط ہے، کیونکہ قرآن ایک سورت کے قائم مقام ہے، جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پورے کا پورا قرآن آسمان دنیا کی طرف رمضان شریف کے مہینے میں نازل ہوا۔ تیرے لیے یہ واضح ہے کہ اس معترض کا اعتراض لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ (البقرہ:240) اہل تاویل کے مطابق منسوخ ہے۔ ہم علماء میں باہم اختلاف سے آگاہ نہیں اس کی ناسخ وہ آیت ہے جو اس سے قبل ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ:234)

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ممنوع کر دیا گیا کہ آپ ان بیویوں کی موجودگی میں کسی اور عورت سے شادی کریں، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دار آخرت کو اپنایا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، حضرت ابن سیرین، ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: ممکن ہے یہ قول اسی طرح ہو پھر منسوخ کر دیا گیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب ازواج مطہرات پر حرام کر دیا گیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی سے شادی کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حرام کر دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے علاوہ کسی سے شادی کریں؛ یہ ابوامامہ بن سہل بن حنیف کا نقطہ نظر ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وہ اصناف جن کا ذکر کر دیا گیا ہے ان کے بعد؛ یہ حضرت ابی بن کعب، عکرمہ اور ابورزین کا نقطہ نظر ہے (1)؛ یہی محمد بن جریری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ جس نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اباحت مطلق تھی اس نے کہا: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ سے مراد ہے آپ کے لیے یہودی اور نصرانی عورتوں سے شادی کرنا حلال نہیں (2)۔ یہ ایسی تاویل ہے جس میں بعد ہے۔ مجاہد، سعید بن جبیر اور عکرمہ سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ چھٹا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تاکہ کافرہ مومنوں کی ماں نہ ہو۔ یہ قول بعید ہے کیونکہ اس صورت میں اس کلام کو مقدر ماننا پڑتا ہے۔ من بعد المسلمات یہاں تو مسلمات کا ذکر نہیں، اسی طرح اس نے مقدر کیا: وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ یعنی نہ یہ کہ آپ مسلمان عورت کو طلاق دیں اور اس کے بدلے میں کتابی عورت سے شادی کریں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ حلال تھا کہ جس سے چاہیں اس سے شادی کریں۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ کہا: اسی طرح آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام تھے: یہ محمد بن کعب قرظی کا نقطہ نظر ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ ابن زید نے کہا: یہ ایسا عمل تھا جو عرب کہا کرتے تھے عربوں میں سے کوئی کہتا: میری بیوی لے لو اور اپنی بیوی مجھے دے دو۔ دار قطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (3): دور جاہلیت میں بدل یوں ہوتا کہ ایک آدمی دوسرے کو کہتا: انزل لی عن أمراتك وأنزل لك عن أمراتي اور میں کچھ زائد بھی تجھے دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کو نازل فرمایا: وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ کہا: عیینہ بن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 394　2۔ ایضاً　3۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 218

حصن فزاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ ﷺ کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں وہ بغیر اجازت کے اندر داخل ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عیینہ! اجازت کہاں گئی؟'' (تو نے اجازت نہیں لی) اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب سے میں بالغ ہوا ہوں میں نے بنو مضر کے کسی فرد سے اجازت نہیں مانگی۔ اس نے عرض کی: یہ آپ کے پہلو میں حمیراء کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ عائشہ ام المومنین ہے''۔ اس نے کہا: افلا أنزل لك عن احسن الخلق کیا میں آپ کو مخلوق میں سے خوبصورت ترین پیش نہ کروں؟ فرمایا: اے عیینہ! اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کر دیا ہے''۔ جب وہ باہر چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کون ہے؟ فرمایا: ''احمق جس کی اطاعت کی جاتی ہے جس طرح تو دیکھ رہی ہے کہ یہ اپنی قوم کا سردار ہے''۔

طبری، نحاس اور دوسرے علماء نے اس کا انکار کیا ہے جس کی ابن زید نے عربوں سے حکایت بیان کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو باہم بدلا کرتے تھے۔ طبری نے کہا: عربوں نے کبھی بھی ایسا عمل نہیں کیا(1)۔ عیینہ بن حصن کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ ﷺ کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں یہ تبدیلی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اس کا ارادہ کیا تھا اس نے حضرت عائشہ صدیقہ کو حقیر جانا کیونکہ آپ بچی تھیں تو اس نے یہ بات کی۔

میں کہتا ہوں: میں نے جو زید بن اسلم کی حدیث ذکر کی ہے کہ وہ عطاء بن یسار سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ دور جاہلیت میں بدل اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے جس کا انکار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مبرد نے کہا: لایحل کو یاء اور تاء کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس نے تاء کے ساتھ قراءت کی ہے تو وہ عورتوں کی جماعت کے معنی میں ہے، جس نے یاء کے ساتھ قراءت کی تو تمام عورتوں کے معنی میں ہے۔ فراء نے گمان کیا کہا: قراء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ قراءت یا کے ساتھ ہے، یہ غلط ہے۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے: قراء کا اتفاق ہے جب کہ ابو عمرو نے تاء کے ساتھ قراءت کی ہے ان سے اس بارے میں کوئی اختلاف مروی نہیں۔

(۳) وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے سبب سے آیت نازل ہوئی (2)۔ جب حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت پر ان کے حسن نے رسول اللہ ﷺ کو متعجب کیا، تو حضور ﷺ نے اس سے شادی کا ارادہ کیا۔ یہ حدیث ضعیف ہے؛ یہ قول ابن عربی نے کیا ہے۔

(۴) اس آیت میں دلیل ہے کہ مرد جس عورت سے شادی کا ارادہ کرے وہ اسے دیکھ سکتا ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ نے ایک عورت سے شادی کا ارادہ کیا نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''اسے دیکھ لے کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت کے دوام کا باعث ہوگا'' (3)۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے دیکھ لے کیونکہ انصار کی آنکھ میں کچھ نقص ہوتا ہے'' (4)۔ صحیح نے اسے نقل کیا ہے۔ حمیدی اور ابو فرج جوزی نے کہا: یعنی پیلی یا نیلی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی آنکھ میں میل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 394 2۔ ایضاً
3۔ ... کتاب النکاح، النظر الی المرأۃ اذا اراد أن یتزوجہا، صفحہ 135 4۔ صحیح مسلم، باب ندب النظر الی وجہ المرأۃ، جلد 1، صفحہ 456

(کیچڑ) ہوتی ہے۔

(۵) جس عورت کو دعوت نکاح دی جائے اس کو دیکھنے کا حکم مصلحت کے لیے ارشاد کے طریقہ پر ہے جب مرد اسے دیکھے گا تو ممکن ہے اس میں ایسی چیز دیکھے جو اس کے نکاح میں رغبت دلائے۔ جو امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ امر ارشاد کے طریقہ پر ہے وہ وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "تم میں جب کوئی کسی عورت کو دعوت نکاح دے اگر اس کے لیے ممکن ہو کہ عورت کی ایسی خصلات دیکھے جو اسے اس کے ساتھ نکاح پر راغب کرے تو وہ ایسا کرے" (1)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: فان استطاع فلیفعل اس قسم کا قول واجب کے بارے میں نہیں کیا جاتا۔

یہی بات جمہور فقہاء، امام مالک، امام شافعی، کوفہ کے فقہاء، دوسرے فقہاء اور اہل الظاہر نے کی ہے۔ ایک قوم نے اسے ناپسند کیا ہے۔ ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ سہل بن حثمہ نے کہا: میں نے محمد بن مسلمہ کو دیکھا جو ثبیتہ بنت ضحاک کو مدینہ طیبہ کی بلند جگہوں سے ایک جگہ سے تاڑ رہے تھے (2) میں نے انہیں کہا: کیا آپ اس طرح کرتے ہیں، انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کسی عورت کو دعوت نکاح کا خیال ڈالے تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے دیکھے" (3)۔ اجار کا معنی چھت یا بلند جگہ ہے، یہ اہل شام اور اہل حجاز کی لغت ہے۔ ابو عبید نے کہا: اجار کی جمع اجاجیر اور اجاجرہ ہے۔

(۶) کس حصہ کو دیکھے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: اس کے چہرہ اور اس کی ہتھیلیوں کو دیکھے، اس کی اجازت کے بغیر اسے نہ دیکھے۔ امام شافعی اور امام احمد نے کہا: اس کی اجازت اور بغیر اجازت کے دیکھے جب وہ پردہ میں ہو۔ اوزاعی نے کہا: وہ اسے دیکھے، وہ کوشش کرے اور اس کے گوشت والی جگہوں کو دیکھے۔ داؤد نے کہا: اس کے تمام جسم کو دیکھے۔ وہ لفظ کے ظاہر سے تمسک کرتے ہیں۔ شریعت کے اصول اس پر اس امر کو رد کرتے ہیں کیونکہ پردہ کی جگہوں پر آگاہی حاصل کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

(۷) اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ علماء نے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا کافرہ لونڈی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حلال ہے؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) وہ حلال ہے کیونکہ یہ ارشاد: اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ عام ہے؛ یہ مجاہد، سعید بن جبیر، عطا اور حکم کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ اس سے مراد ہے غیر مسلم عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں، جہاں تک یہودی، نصرانی اور مشرک عورتوں کا تعلق ہے وہ آپ پر حرام ہیں یعنی آپ کے لیے حلال نہیں کہ آپ کافرہ سے شادی کریں تو وہ مومنوں کی ماں بن جائے، اگرچہ اس کا حسن آپ کو خوش کرے مگر جو آپ کی مملوکہ ہو کیونکہ ایسی عورت کے ساتھ خواہش کرنا جائز ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، فی الرجل ینظر الی المرأۃ، جلد 1، صفحہ 284 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 394

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، النظر الی المرأۃ اذا، صفحہ 135

(۲) یہ حلال نہیں تا کہ آپ کی اس امر میں پاکیزگی بیان کی جائے کہ آپ کافرہ کے ساتھ مباشرت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (الممتحنہ:10) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ کیسے جائز ہوگا: اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ میں ما محل رفع میں ہے یہ النساء سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استثناء کے طریقہ پر محل نصب میں ہو، اس میں ضعف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر یہ ہو تقدیر کلام یہ ہوگی اِلا ملك يمينك ملک یہ ملوک کے معنی میں ہے۔ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اس چیز سے استثناء ہے جو ماقبل کی جنس سے نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ۙ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ ۫ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا ۝۵۳

''اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو نبی کریم کے گھروں میں بجز اس (صورت) کے کہ تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے۔ اور نہ کھانا پکنے کا انتظار کیا کرو لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو اندر چلے آؤ پس جب کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ اور نہ وہاں جا کر دل بہلانے کے لیے باتیں شروع کر دیا کرو تمہاری یہ حرکتیں (میرے) نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں (اور چپ رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کسی کا شرم نہیں کرتا حق بیان کرنے میں اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر، یہ طریقہ پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لیے نیز ان کے دلوں کے لیے، اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو اور تمہیں اس کی بھی اجازت نہیں کہ تم نکاح کرو ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی، بے شک ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ عظیم ہے''۔

اس میں سولہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ، ان محل نصب میں ہے۔ یہ اس معنی میں ہے اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ یعنی جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے یہ استثناء اوّل یعنی بیوت النبی سے نہیں (بلکہ لَا تَدْخُلُوْا کی ضمیر سے ہے)۔ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ غیر یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی تم اس حال میں داخل نہ ہو۔ غیر میں جر طعام کی صفت ہونے کے اعتبار سے درست نہیں کیونکہ اگر یہ نعت ہوتی تو فاعل کا ظاہر کرنا ضروری تھا تو ارشاد ہوتا: غیر ناظرین اناہ انتم اسی کی مثل علم نحو میں ہے هذا رجل مع رجل ملازم له اگر تو چاہے تو کہے: هذا رجل مع رجل ملازم له هو۔

یہ آیت دو قصوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے: (۱) کھانے اور بیٹھنے کے آداب (۲) حجاب کا حکم۔ حماد بن زید نے کہا: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے آپ کو پریشان کیا تھا۔ پہلا قصہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے، اس کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب بنت جحش جو حضرت زید کی مطلقہ تھیں سے شادی کی تو اس پر دعوت ولیمہ کی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بلایا، جب وہ کھانا کھا چکے تو ان میں سے کچھ لوگ مختلف حلقے بنا کر بیٹھ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں باتیں کرنے لگے جب کہ رسول اللہ ﷺ کی اہلیہ اپنا منہ دیوار کی طرف کیے ہوئے تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پریشان کر دیا۔ حضرت انس نے کہا: میں نہیں جانتا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ لوگ جا چکے ہیں یا آپ ﷺ نے مجھے خبر دی۔ کہا: آپ چلے یہاں تک کہ گھر میں داخل ہوئے اور میں بھی آپ کے ساتھ داخل ہونے لگا تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور حجاب کا حکم نازل ہوا(1)۔ کہا: حضور ﷺ نے لوگوں کو نصیحت کی جن امور کے ساتھ نصیحت کی جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ۙ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ ۫ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا ﴿۵۳﴾ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کتاب الثعلبی میں کہا: یہ واقعہ حضرت ام سلمہ کے گھر میں واقع ہوا(2) جب کہ پہلا قول صحیح ہے جس طرح صحیح نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت مومنوں میں سے چند افراد کے بارے میں نازل ہوئی (3)، وہ نبی کریم ﷺ کے کھانے کے وقت کا انتظار کرتے اور حضور ﷺ کے کھانا شروع کرنے سے قبل گھر میں داخل ہو جاتے وہ بیٹھ جاتے یہاں تک کہ آپ کھانا پاتے، پھر کھاتے اور گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ اسماعیل بن حکیم نے کہا: یہ ادب ہے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سکھایا جو پریشانی کا باعث بنا کرتے (4)۔ ابن ابی عائشہ نے کتاب الثعلبی میں کہا: ثقلاء (پریشانی کا باعث بننے والے) کے لیے یہی کافی ہے کہ شرع نے انہیں برداشت نہیں کیا(5)۔

جہاں تک حجاب کے قصہ کا تعلق ہے تو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت نے کہا: اس کا سبب زینب کا ابھی گزرنے والا واقعہ ہے(6)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ایک جماعت نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کی ازواج مطہرات کے ہاں نیک اور برے لوگ آتے ہیں۔ کاش! آپ انہیں حجاب کا حکم دیتے، تو یہ آیت نازل ہوئی (7)۔

صحیح نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے اپنے رب سے تین امور میں موافقت کی ہے(8)۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، زوج زینب بنت جحش، جلد 1، صفحہ 461
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 395
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً
7۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 48
8۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، ما جاء فی القبلۃ، جلد 1، صفحہ 58

مقام ابراہیم، حجاب اور بدر کے قیدیوں میں۔ حجاب کے بارے میں جو بھی اقوال ذکر کیے گئے ہیں ان میں سے یہ صحیح ترین ہے۔ ان دو اقوال کے علاوہ جتنے بھی اقوال ہیں سب کے سب کمزور ہیں، کوئی بھی اصل پر قائم نہیں۔ ان میں سے کمزور ترین وہ روایت ہے جو حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو حجاب کا حکم دیا، تو حضرت زینب بنت جحش نے کہا: اے ابن خطاب! تم ہمارے بارے میں غیرت کھاتے ہو جب کہ ہمارے گھروں میں وحی نازل ہوتی ہے(1)، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ یہ روایت باطل ہے کیونکہ حجاب کا حکم اس روز نازل ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب کو حرم میں داخل کیا۔ جس طرح ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور دوسرے علماء نے اسے نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا کھا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چند صحابہ بھی کھانا کھا رہے تھے۔ ان صحابہ میں سے ایک کا ہاتھ حضرت عائشہ صدیقہ کے ہاتھ کو جا لگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ناپسند کیا تو یہ آیت حجاب نازل ہوئی(2)۔

ابن عطیہ نے کہا: قوم کا معمول یہ تھا جب ان کے لیے دعوت ولیمہ یا اس طرح کی کوئی دعوت ہوتی جو چاہتا جلدی پہنچ جاتا وہ کھانا پکنے کا انتظار کرتا(3)، اسی طرح جب کھانے سے فارغ ہوتے تو اسی طرح بیٹھے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں مومنوں کو اس قسم کا طرز عمل اپنانے سے منع کیا۔ اسی نہی میں سارے مومن داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جو ادب سکھایا وہ تمام لوگوں کو لازم ہو گیا۔ انہیں گھر میں داخل ہونے سے منع کر دیا مگر کھانے کے وقت جب اجازت دی جائے، نہ کہ اس سے قبل کہ تم کھانا پکنے کا انتظار کرو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بُيُوْتَ النَّبِيِّ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ بیت مرد کا ہوتا ہے۔ اور اس کا اسی کے حکم میں فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت کی نسبت مرد کی طرف کی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ ہم کہیں گے: بیوت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت ملکیت کے اعتبار سے ہے اور بیوت کی ازواج کی طرف نسبت محل کے اعتبار سے ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اجازت دینے کا اختیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا ہے، اجازت دینے کا حق مالک کو ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں کے بارے میں اختلاف ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل اس میں مقیم تھے کیا یہ گھر ان اہل کی ملکیت ہوں گے یا ملکیت نہیں ہوں گے؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) ایک طائفہ کا قول ہے: یہ گھر ان ازواج مطہرات کی ملکیت ہوں گے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اپنی وفات تک ان میں سکونت پذیر رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یہ گھر اپنی حیات میں عطا کر دیئے تھے۔ (۲) یہ صرف رہائش رکھنے کے لیے تھے جس طرح کوئی آدمی اپنے گھر والوں کو اس میں رکھتا ہے، یہ ہبہ نہیں ہوتے، موت تک ان کی رہائش ان گھروں میں ہی رہی(4)؛ یہ ہی صحیح قول ہے۔ یہی وہ قول ہے جسے

1۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 47 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 395 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1575

ابو عمر بن عبد البر، ابن عربی اور دوسرے علماء نے پسند کیا ہے، کیونکہ ان کی ذمہ داریوں میں سے ایسی ذمہ داری تھی رسول اللہ ﷺ نے جن کی استثناء کر دی تھی، جس طرح حضور ﷺ نے ان کے نفقات کو مستثنیٰ کر دیا تھا جب فرمایا: ''میرے ورثاء، میرے ورثہ کو دینار اور درہم کی صورت میں تقسیم نہیں کریں گے جو کچھ میں نے چھوڑا ہے وہ میرے اہل کے نفقہ اور عامل کی مزدوری کے بعد صدقہ ہے''(1)۔ اہل علم نے اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اس پر یہ امر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان گھروں کے مالک ان ازواج مطہرات کے وارث مالک نہیں بنے تھے۔ انہوں نے کہا: اگر یہ گھر ان ازواج مطہرات کی ملکیت ہوتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ازواج مطہرات کے ورثاء ان گھروں کے مالک بھی ہوتے۔ علماء نے کہا: جب ان کے وارثوں نے ان گھروں کو چھوڑ دیا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ ان کی ملکیت نہ تھی۔ یہ صرف ایسے گھر تھے جن میں وہ اپنی زندگی تک رہائش رکھ سکتی تھیں۔ جب ان کا وصال ہو گیا تو ان گھروں کو مسجد میں شامل کر لیا گیا جس مسجد کا نفع تمام مسلمانوں کو حاصل ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ترکہ میں سے جسے ان کے نفقہ کے لیے مختص کیا گیا تھا جب ان ازواج کا وصال ہو گیا تو اسے واپس اصل مال میں شامل کر لیا گیا اور تمام مسلمانوں کے منافع کے لیے اسے صرف کیا گیا جس کا نفع تمام کو عام تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وہ اس کھانے کے پکنے کا انتظار نہ کر رہے ہوں۔ اناہ الف مقصورہ کے ساتھ ہے اس میں کئی لغتیں ہیں۔ انی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ شیبانی نے کہا:

وکِسْرَیٰ إذ تقسمه بَنُوه بأسیاف کما اقْتُسِم اللِّحام
تمخضت المنون له بیوم أنَیٰ ولکل حاملة تمام

کسریٰ، جب اس کے بیٹوں نے اس کی بادشاہت کو تلواروں سے تقسیم کیا جس طرح گوشت تقسیم کیا جاتا ہے لوگوں نے اسے اس دن کے قریب کر دیا جو پہنچنے والا تھا اور ہر حاملہ کے لیے تکمیل تھا۔

ابن ابی عبلہ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ طعام کی صفت بناتے ہوئے غیر کو مجرور پڑھا ہے۔ زمخشری نے کہا: یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ یہ صفت غیر حقیقی ہے۔ حقیقت میں یہ جس کی طرف منسوب ہے اس ضمیر کا لفظوں میں ظاہر ہونا ضروری ہے تو پھر کہا جاتا: غیر ناظرین اناہ انتم جس طرح تیرا قول ہے: ھند زید ضاربتہ ھی۔ انی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور اناء ہمزہ کے فتحہ اور الف ممدودہ کے ساتھ بھی ہے۔ حطیئہ نے کہا:

وأخرت العَشاء إلی سُهَيْل أو الشِّعْرَیٰ فطال بیَ الإناءُ

رات کے کھانے کو سہیل ستارہ یا شعری ستارہ کے طلوع ہونے تک مؤخر کیا گیا پس میرا فارغ ہونا طویل ہو گیا۔

مراد سہیل ستارہ کا طلوع ہوتا ہے۔ انا یہ أنی الشئ یأنی کا مصدر ہے جب وہ فارغ ہو جائے اس کا وقت ہو جائے اور پالے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا منع کرنے کو مؤکد کیا اور دخول کے وقت کو خاص کیا کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، نفقة القیم للوقف، جلد 1، صفحہ 389

یہ اجازت کے ساتھ ہونا چاہیے اور ادب کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور اس حاضری کو ناپسندیدہ طوالت سے بچایا جائے۔ ابن عربی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے، لیکن جب تمہیں دعوت دی جائے اور تمہیں داخل ہونے کی دعوت دی جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ صرف دعوت داخل ہونے کے لیے کافی اجازت نہیں۔ اذا کے جواب میں فاء ضروری ہے کیونکہ اس میں جزا کا معنی موجود ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کھانا کھانے کے بعد سب الگ الگ ہو جائیں اور منتشر ہو جائیں۔ مراد یہ ہے کہ جب کھانے کا مقصود پورا ہو جائے تو گھر سے نکل آنا ان پر لازم ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ داخل ہونا حرام ہے۔ داخل ہونا صرف اس وقت جائز تھا جب کھانا کھانا ہو۔ جب کھانا ختم ہو چکا تو اس کو مباح کرنے والا سبب زائل ہو گیا اور حرمت اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ مہمان میزبان کی ملکیت کی بنا پر کھانا کھاتا ہے وہ کھانا اپنی ملکیت ہوتے ہوئے نہیں کھاتا کیونکہ فرمایا: فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا اس مہمان کے لیے کھانے کے سوا کچھ نہیں اور کھانے کو ان کی طرف مضاف نہیں کیا اور ملکیت اپنے اصل پر باقی رہی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اس کا عطف غَيْرَ نٰظِرِيْنَ پر ہے۔ غیر، لکم ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی غیر ناظرین ولا مستانسین یعنی مقصود یہ ہے بات چیت میں دل چسپی رکھتے ہوئے وہاں نہ رک جائے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے حضرت زینب کے ولیمہ میں کیا تھا۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ یعنی حق کے بیان اور اس کے اظہار سے نہیں رہتا۔ جب یہ رکنا انسان سے حیا کی بنا پر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس علت کی نفی کر دی جو انسان میں اس کا سبب تھی۔ صحیح میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ام سلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں کرتا، جب عورت کو احتلام ہو تو کیا اس پر غسل کرنا لازم ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب وہ پانی دیکھے'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ وَإِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا ابو داؤد طیالسی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چار امور میں اپنے رب سے موافقت کی ہے (2)۔ اس میں ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ اپنی ازواج پر حجاب کو لازم کر لیں، کیونکہ ان کے پاس نیک اور بدکار داخل ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ سامان کے بارے میں سوال کرنے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایسی چیز جس کو عام طور پر لیا جاتا ہے۔ ایک قول کیا گیا: فتویٰ پوچھا جا سکتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: قرآن کا صحیفہ مانگا جا سکتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ اجازت ان تمام چیزوں کے بارے میں ہے جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے خواہ وہ روزمرہ ضرورت کی چیز ہو یا دین و دنیا کے منافع کی چیز ہو۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ ضرورت کے وقت پردہ کے پیچھے سے ان

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، وجوب الغسل، جلد 1، صفحہ 146

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ احزاب، جلد 2، صفحہ 706

سے سوال کیا جا سکتا ہے یا ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جا سکتا ہے۔ اس میں معنوی اعتبار سے تمام عورتیں داخل ہیں اور اصل شریعہ جس چیز کو اپنے ضمن میں لیے ہو اس اعتبار سے بھی تمام عورتیں شامل ہیں کہ عورت کا تمام بدن پردہ کرنے کا محل ہے۔ اس کا بدن اور اس کی آواز بھی، جس طرح پہلے گزر چکا ہے ضرورت کے بغیر اس کا ظاہر کرنا جائز نہیں جس طرح اس پر گواہی دینی ہو یا اس کے جسم میں کوئی بیماری ہو یا کوئی سوال جو عارض آ جائے اور اس کے ہاں متعین ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے پردہ کے پیچھے سے چیز لے سکتے ہیں کیونکہ اعمی (نابینا) کی شہادت جائز ہے اور نابینا آدمی اپنی بیوی سے وطی کرتا ہے محض اس کی گفتگو سے پہچان کر لیتا ہے۔ اور اکثر علماء نے نابینا کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور دوسرے علماء نے اسے جائز قرار نہیں دیا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: نسب میں شہادت جائز ہے۔ امام شافعی نے کہا: نابینا کی شہادت نہیں مگر اس کے بارے میں جس کو اس نے نظر جانے سے پہلے دیکھا ہو۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ اس سے ان وساوس کا ارادہ کیا ہے جو مردوں کے دلوں میں عورتوں کے متعلق لاحق ہوتے ہیں اور عورتوں کے دلوں میں مردوں کے متعلق لاحق ہوتے ہیں۔ یہ شک کی زیادہ نفی کرنے والا، تہمت کو زیادہ دور کرنے والا اور حفاظت میں زیادہ قوی ہے۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ خلوت میں اپنی ذات پر اعتماد کرے جو عورت اس کے لیے حلال نہیں، کیونکہ ایسی عورت سے الگ تھلگ رہنا اس کی حالت کے لیے زیادہ اچھا، اس کے نفس کے لیے زیادہ حفاظت کرنے والا اور اس کی عصمت کے لیے زیادہ مکمل ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ یہ علت کا تکرار ہے اور اس کے حکم کی تاکید ہے۔ علت کو مؤکد کرنا احکام میں زیادہ قوت کا باعث ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا اسماعیل بن اسحاق، محمد بن عبید سے وہ محمد بن ثور سے وہ معمر سے وہ قتادہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کروں گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ کو نازل کیا۔ قشیری ابو نصر عبد الرحمٰن نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش کے دس سرداروں میں سے ایک نے دل میں کہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حراء پر تھے: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو میں حضرت عائشہ سے نکاح کروں گا کیونکہ وہ میری چچا زاد ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تھے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ آدمی اس پر شرمندہ ہوا جو اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا۔ وہ پیدل مکہ مکرمہ کی طرف گیا اور جہاد میں دس مجاہدین کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک غلام کو آزاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خطا کو بخش دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ روایت کی گئی ہے (2) کہ یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ کسی صحابی نے کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 483
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 396

حضرت عائشہ صدیقہ سے عقد نکاح کروں گا۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو رسول اللہ ﷺ کو اس سے اذیت پہنچی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صحابی کا کنایۃً ذکر کیا ہے۔ مکی نے معمر سے روایت نقل کی ہے کہ وہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تھے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے معمر سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد حضرت طلحہ تھے، یہ صحیح نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت ابن عباس کا بھلا کرے (1)۔ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت طلحہ بن عبید اللہ مراد لینا صحیح نہیں۔ ہمارے شیخ ابو العباس نے کہا: یہ قول بعض فاضل صحابہ سے مروی ہے، ان فاضل صحابہ سے ایسی بات واقع ہونا بہت ہی بعید ہے اور اس کا نقل کرنا سراسر جھوٹ ہے۔ اس قسم کا قول منافق اور جاہل ہی کر سکتا ہے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک منافق نے کہا جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو سلمہ کے بعد حضرت ام سلمہ سے شادی کی اور خنیس بن حذافہ کے بعد حضرت حفصہ سے شادی کی: حضرت محمد ﷺ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہماری عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں اللہ کی قسم! اگر آپ کا وصال ہوا تو ہم بھی آپ کی ازواج سے شادیاں کریں گے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو ماں کا حکم دے دیا (2)۔ یہ حضور ﷺ کے خصائص میں سے ہے مقصد آپ کی شرافت کو ممتاز کرنا اور آپ کے مرتبہ پر آگاہ کرنا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: وہ ازواج مطہرات جو اس وقت آپ ﷺ کے عقد نکاح میں تھیں جب حضور ﷺ کا وصال ہوا ان کے ساتھ نکاح کرنا کسی کے لیے بھی حلال نہیں، کیونکہ جنت میں بھی یہی آپ کی بیویاں ہیں۔ بے شک جنت میں ایک عورت اس کی بیوی ہوگی دنیا میں جس آخری مرد کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا۔ حضرت حذیفہ نے اپنی بیوی سے کہا: اگر تجھے یہ بات خوش کرے تو جنت میں بھی میری بیوی ہو اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں جمع کرے تو میرے بعد کسی سے عقد نکاح نہ کرنا کیونکہ عورت اپنے آخری خاوند کے ساتھ ہوگی (3) ہم علماء کی جو اس بارے میں آراء ہیں وہ کتاب ''التذکرہ'' میں جنت کے ابواب میں ذکر کر چکے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کیا آپ کی بیویاں رہی ہیں یا موت کے ساتھ نکاح زائل ہو چکا ہے؟ جب موت کے ساتھ نکاح زائل ہو گیا کیا ان پر عدت ہوگی یا عدت نہیں ہوگی؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر عدت ہوگی، کیونکہ حضور ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت یہ آپ کے عقد میں تھیں اور عدت عبادت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر کوئی عدت نہیں۔ عدت انتظار کی مدت ہوتی ہے عورت کے مباح ہونے کے لیے اس کا انتظار کیا جاتا ہے، یہی صحیح قول ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو میں نے چھوڑا ہے وہ میرے بعد میرے اہل و عیال کا نفقہ ہے'' (4)۔ عیال کے لیے اہل کا لفظ بھی مذکور ہے۔ یہ لفظ زوجیت کے ساتھ خاص ہے۔ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کی زندگی تک ان کے لیے نفقہ اور سکنی باقی رکھا ہے، کیونکہ یہ تو قطعی بات ہے کہ یہ آخرت میں حضور ﷺ کی بیویاں ہیں باقی ماندہ لوگوں کا معاملہ مختلف ہے، کیونکہ کوئی آدمی یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے اہل کے ساتھ ایک ہی گھر میں ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جنت میں ہو اور دوسرا جہنم میں ہو تمام مخلوق کے حق میں یہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 396 2۔ ایضاً

3۔ التذکرہ، اذا اہتکی الرجل امراۃ، جلد 2، صفحہ 640 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1580

سبب منقطع ہو چکا ہے اور نبی کریم ﷺ کے حق میں یہ سبب باقی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دنیا میں جو میری بیویاں ہیں وہ آخرت میں بھی میری بیویاں ہیں'' (1)۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر سبب اور نسب ختم ہو جائے گا مگر میرا سبب اور نسب باقی رہے گا کیونکہ یہ قیامت تک باقی ہے'' (2)۔

فرع: جہاں تک ان ازواج کا تعلق ہے جن سے حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی جدائی اختیار کر لی تھی جیسے کلبیہ اور دوسری عورتیں کیا کسی اور کے لیے ان سے نکاح کرنا جائز ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ یہ روایت کی گئی ہے کہ کلبیہ سے رسول اللہ ﷺ نے علیحدگی اختیار کی تھی تو حضرت عکرمہ بن ابی جہل نے اس سے شادی کی جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اشعث بن قیس کندی نے اس سے شادی کی۔ قاضی ابوطیب نے کہا: اس سے مہاجر بن ابی امیہ نے شادی کی اور اس کا کسی نے انکار نہیں کیا جو اس بات پر دال ہے کہ یہ اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا یعنی رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا اور آپ کی بیویوں سے نکاح کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ہے۔ اسے گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے اور اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ ہم حضرت انس کی حدیث اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے حجاب کے نزول کا سبب بیان کر چکے ہیں۔ حضرت عمر، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا کرتے جب وہ باہر نکلتیں جب کہ وہ طویل قد کی تھیں: اے سودہ! ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے (3)۔ آپ یہ بات اس امر کے حریص ہونے کے لیے کرتے کہ حجاب کا حکم نازل ہو تو اللہ تعالیٰ نے حجاب کا حکم نازل کر دیا۔ یہ بات حقیقت سے کوئی بعید نہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے یہ سب اسباب ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے مگر حضرت زینب بنت جحش کا وصال ہوا تو حضرت عمر نے فرمایا: اس کے جنازہ میں ذو محرم کے علاوہ کوئی حاضر نہ ہو (4)۔ مقصود اس حجاب کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا جن کی وجہ سے حجاب کا حکم نازل ہوا تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس نے حضرت عمر کی رہنمائی کی کہ ان کی چارپائی پر قبہ نما پردہ ڈالا جائے اور حضرت عمر کو یہ بھی بتایا کہ آپ نے حبشہ کے علاقہ میں اسے دیکھا تھا تو حضرت عمر نے ایسا ہی کیا۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم ﷺ کی بیٹی تھیں ان کے جنازہ میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾

''چاہے تم کسی بات کو ظاہر کر دو یا اسے چھپاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے''۔

اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو ظاہر ہے یا مخفی ہے۔ وہ اسے بھی جانتا ہے جو ہو چکا ہے اور جو ابھی تک واقع نہیں ہوا۔ اس پر کوئی گزرا ہوا مخفی نہیں اور نہ آنے والا مستقبل مخفی ہے۔ یہ اپنے عموم پر ہے اس کے ساتھ اس کی مدح کی جارہی ہے وہ مدح اور حمد کا مستحق ہے۔ یہاں اس سے مراد توبیخ اور اس کے لیے وعید ہے جس کی سابقہ آیت میں اشارۃً بات کی گئی تھی۔ وہ ان

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 374 2۔ المستدرک للحاکم، کتاب معرفۃ الصحابۃ، جلد 3، صفحہ 153، حدیث نمبر 282

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیئذان، آیۃ الحجاب، جلد 2، صفحہ 922

4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 396

لوگوں میں سے تھا جس کی طرف اس آیت کے ساتھ اشارہ کیا گیا تھا: ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ اور جس کی طرف اس ارشاد میں اشارہ کیا گیا تھا: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا انہیں اس آیت میں فرمایا: اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو جانتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو وہ اعتقادات ہوں اور دل میں جو ناپسندیدہ وساوس ہوں اور ان پر تمہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ یہ آیت ماقبل آیت سے منقطع ہے اور اس کے لیے بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآئِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآئِهِنَّ وَ لَاۤ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآئِهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَ اتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

”کوئی حرج نہیں ان پر اگر ان کے ہاں آئیں ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے اور ان کے بھانجے اسی طرح مسلمان عورتوں اور لونڈیوں کی آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ (اے عورتو!) ڈرا کرو اللہ (کی نافرمانی) سے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب حجاب والی آیت نازل ہوئی تو آباء، ابناء اور قریبی رشتہ داروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: ہم بھی ان سے حجاب کے پیچھے سے بات کریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان افراد کا ذکر کیا ہے جن کے سامنے عورت ظاہر ہو سکتی ہے چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں والدین کے قائم مقام ہیں۔ چچا کو بھی اب کہہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ (البقرہ:133) حضرت اسماعیل علیہ السلام کے چچا تھے۔ زجاج نے کہا: چچا اور ماموں بعض اوقات اپنی اولاد کے سامنے عورت کی صفت بیان کرتے ہیں، کیونکہ عورت چچازاد اور ماموں زاد بھائی کے لیے حلال ہوتی ہے اسی وجہ سے دونوں کے لیے دیکھنا مکروہ ہے۔ امام شعبی اور عکرمہ نے اسے ناپسند کیا ہے کہ عورت اپنی اوڑھنی اپنے چچا اور ماموں کے ہاں اتارے۔ یہاں بعض محارم کا ذکر کیا اور سورۂ نور میں تمام محارم کا ذکر کیا(1)۔ یہ آیت اس آیت کا بعض ہے۔ وہاں مفصل گفتگو گزر چکی ہے۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ اتَّقِيْنَ اللّٰهَ جب اللہ تعالیٰ نے ان اقسام میں رخصت عطا فرمائی اور اباحت قطعی ہو گئی تو تقویٰ کے امر کو ان پر عطف کیا جس طرح جملہ کا عطف جملہ پر ہوتا ہے یہ آیت حد درجہ کی بلاغت اور ایجاز میں ہے۔ گویا فرمایا: اسی پر اپنے آپ کو محدود کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس میں ڈرو کہ تم کسی اور کی طرف تجاوز کرو۔ عورتوں کا خصوصی ذکر کیا اور اس امر میں ان کی تعیین کی کیونکہ وہ کم تحفظ کرتی ہیں اور ان کی اوڑھنیاں اکثر ڈھلک جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ پھر اس ارشاد کے ساتھ دھمکی دی: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدًا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 397

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس نبی مکرم پر، اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود بھیجا کرو اور (بڑے ادب و محبت سے) سلام عرض کیا کرو“۔

یہ ایسی آیت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور آپ کی موت کی حالت میں بھی شرف بخشا۔ اللہ کی بارگاہ میں آپ کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہر اس آدمی کے برے فعل سے پاکیزہ بنا دیا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی سوچ اپنائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں بری سوچ اپنائی یا اس طرح کا کوئی معاملہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جب لفظ صلاۃ کی نسبت کی جائے تو اس سے مراد اس کی رحمت اور رضا ہے، فرشتوں کی طرف جب نسبت ہو تو مراد دعا اور استغفار ہے اور امت کی جانب سے ہو تو دعا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی تعظیم ہے۔

**مسئلہ**: يُصَلُّوْنَ کی ضمیر کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ ایک فرقہ کا خیال ہے: اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے لیے ہے(1)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قول ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے فرشتوں کو شرف بخشا ہے۔ خطیب کے قول میں جو اعتراض ہے وہ اسے لاحق نہیں ہوتا۔ خطیب نے کہا تھا: من يطع الله و رسوله فقد رشد و من يعصهما فقد غوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ”تو کتنا برا خطیب ہے (2)، تو کہہ: و من يعص الله و رسوله“ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔ علماء نے کہا: کسی ایک کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ایک ضمیر میں غیر کے ساتھ جمع کرے اور اللہ تعالیٰ جیسے چاہے کرے۔

ایک جماعت نے کہا: کلام میں حذف ہے۔ اس کی تقدیر ہے: ان الله يصلی و ملائكته يصلون آیت میں ضمیر کا اجتماع نہیں انسان کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی بنا پر بئس الخطيب انت نہیں فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہ اس لیے فرمایا کیونکہ خطیب نے و من يعصهما پر سکتہ کیا تھا۔ انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا جسے ابو داؤد نے حضرت عدی بن حاتم سے روایت نقل کی ہے کہ ایک خطیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں خطبہ دیا۔ اس نے کہا: من يطع الله و رسوله و من يعصهما فرمایا یا کہا: ”جا تو کتنا برا خطیب ہے“(3) مگر یہ احتمال رکھتا ہے کہ جب اس نے وقفہ میں خطا کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: بئس الخطيب اس کے بعد اس کی تمام کلام کی اصلاح کی، فرمایا: کہہ و من يعص الله و رسوله۔ جس طرح مسلم کی کتاب میں ہے۔ یہ پہلے قول کی تائید کرتی ہے کہ اس نے و من يعصهما پر وقف نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھا و ملائكته یعنی رفع کے ساتھ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا عطف ان کے داخل ہونے سے پہلے لفظ اللہ اسم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 397 2۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، فی ایجاز الخطبہ، جلد 1، صفحہ 286

3۔ سنن ابی داؤد، باب الرجل یخطب علی قوس، حدیث نمبر 925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جلالت کے محل کے اعتبار سے ہے۔ جمہور نے اسے نصب دی ہے اس کا عطف لفظ اللہ اسم جلالت پر ہے جو مکتوب ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں دوسرے انبیاء کے بارے میں ایسا حکم نہیں مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت کو ظاہر کرنا تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں زندگی میں ایک دفعہ درود شریف پڑھنا فرض ہے۔ اور ہر لحہ ایسے واجبات میں سے ہے جو سنن مؤکدہ کی طرح واجب ہو۔ جس کے ترک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور اس سے غافل نہیں ہوتا مگر وہی شخص جس میں کوئی خیر نہ ہو۔ زمخشری نے کہا: اگر تو کہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا واجب ہے یا مستحب؟ میں جواب دوں گا: واجب۔ اس کے وجوب کے حال میں اختلاف ہے۔ ان میں سے کچھ علماء تو ایسے ہیں جو اس کو واجب قرار دیتے ہیں جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''جس کے ہاں میرا ذکر کیا گیا تو اس نے مجھ پر درود نہ پڑھا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمتوں سے دور کرے'' (1)۔ یہ روایت کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ کے بارے میں بتائیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ پوشیدہ علم میں سے ہے اگر تم مجھ سے اس بارے میں سوال نہ کرتے میں تمہیں اس کے بارے میں نہ بتاتا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دو فرشتے مقرر کیے ہیں کسی مسلمان کے ہاں میرا ذکر نہیں کیا جاتا مگر وہ مجھ پر درود پڑھتا ہے تو وہ فرشتے کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ تجھے بخشے۔ اللہ اور اس کے فرشتے ان کے جواب میں کہتے ہیں: آمین۔ اور میرا کسی بندہ مسلم کے پاس ذکر نہیں کیا جاتا اور وہ مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر وہ دو فرشتے کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ تجھے نہ بخشے تو اللہ تعالیٰ (☆) اور اس کے فرشتے ان فرشتوں کے جواب میں کہتے ہیں: آمین'' (2)۔

علماء میں سے کچھ نے کہا: ہر مجلس میں ایک دفعہ درود پڑھنا واجب ہے، اگرچہ آپ کا ذکر مکرر ہو، جس طرح آیت سجدہ اور چھینک مارنے والے کے جواب میں ہے، اسی طرح ہر دعا کے اول اور آخر میں درود پڑھنا واجب ہے (3)۔ ان علماء میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے عمر میں اسے واجب کیا ہے، اسی طرح شہادتین کے اظہار میں بھی کہا۔ احتیاط جس امر کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جائے درود پڑھنا واجب ہے، کیونکہ اس بارے میں احادیث وارد ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود پڑھنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ ہم حضرت سعد بن عبادہ کی مجلس میں تھے حضرت بشیر بن سعد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود بھیجیں۔ ہم کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود بھیجیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے یہاں تک کہ ہم نے تمنا کی کہ کاش وہ سوال نہ کرتا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراهیم وبارك علی محمد وعلی آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم فی العالمين انك

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 557 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 558 (☆) اللہ تعالیٰ کا ذکر برائے تکریم ہے۔

حمید۔ سلام کو تم جانتے ہو(1)۔

امام نسائی نے حضرت طلحہ سے اس کی مثل روایت نقل کی ہے اس میں فی العالمین کے الفاظ ساقط کیے ہیں۔ اسی طرح والسلام کما قد علمتم کو بھی ساقط کیا ہے۔ اس باب میں کعب بن عجرہ، ابی حمید ساعدی، حضرت ابوسعید خدری، حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت بریدہ خزاعی، حضرت زید بن خارجہ، ابن حارث بھی کہا جاتا ہے سے روایت مروی ہے۔ ائمہ اہل حدیث نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو حمید ساعدی کی روایت نقل کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: شعبہ اور ثوری نے حکم بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور وہ حضرت کعب بن عجرہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا نازل ہوا۔ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے کو تو ہم نے پہچان لیا ہے تو درود کیسے ہے؟ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: کہو اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و بارك علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انك حمید مجید (2)۔ یہ الفاظ ثوری کی حدیث کے ہیں شعبہ کی حدیث کے نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ کی تفسیر ہے۔ اس امر کو واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود کیسے پڑھنا ہے اور التحیات میں انہیں سلام پڑھنا سکھایا وہ یہ قول ہے: السلام علیك ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاته (3)۔ مسعودی نے عون بن عبد اللہ سے وہ ابو فاختہ سے وہ اسود سے وہ حضرت عبد اللہ سے روایت نقل کرتے ہیں۔ کہ فرمایا: جب تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود پڑھو تو اچھی طرح درود شریف پڑھو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اسے آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ لوگوں نے عرض کی: ہمیں اس کی تعلیم دو، کہا: کہو اللھم اجعل صلواتك و رحمتك و برکاتك علی سید المرسلین و امام المتقین و خاتم النبیین محمد عبدك ونبیك و رسولك امام الخیر و قائد الخیر و رسول الرحمة اللھم ابعثه مقاما محمودا یغبطه به الاولون والاخرون۔ (4)

اے اللہ! اپنی عنایات، اپنی رحمت اور اپنی برکات سید المرسلین، متقین کے امام، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تیرے بندے، تیرے نبی، تیرے رسول، خیر کے امام، خیر کے قائد اور رحمت کے رسول ہیں ان پر کر۔ اے اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر مبعوث فرما جس کی وجہ سے اگلے پچھلے آپ پر رشک کریں۔

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انك حمید مجید، اللھم بارك علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی براھیم وعلی آل ابراھیم انك حمید مجید۔ ہمیں قاضی عیاض کی کتاب ''الشفا'' (5) میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے متصل سند کے ساتھ روایت نقل کی گئی ہے کہا: انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 175 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، ماجاء فی التشہد، صفحہ 65 4۔ الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 66 5۔ الشفاء، جلد 2، صفحہ 642

نے میرے ہاتھوں میں شمار کیا اور کہا: انہیں جبریل امین نے میرے ہاتھوں میں شمار کیا اور کہا اسی طرح رب العزت کے ہاں یہ نازل ہوئے۔

اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى ابراهيم انك حميد مجيد۔ اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد۔ اللهم وترحم على محمد وعلى آل محمد كما ترحمت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد۔ اللهم تحنن على محمد وعلى آل محمد كما تحننت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد۔

ابن عربی نے کہا: ان روایات سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ کمزور ہیں۔ ان میں سے صحیح ترین روایت وہ ہے جسے امام مالک نے روایت کیا ہے اسی پر اعتماد کیا ہے اسی پر اعتماد کرو (1)۔ امام مالک کے علاوہ روایت میں الصلاۃ کے علاوہ رحمت کے الفاظ زائد ہیں اور اس روایت کے علاوہ کوئی قوی روایت نہیں۔ لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے دینی امور میں غور و فکر کریں جس طرح وہ اپنے اموال میں غور و فکر کرتے ہیں وہ بیع میں عیب والا دینار نہیں لیتے، وہ پاکیزہ اور سالم دینار لیتے ہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی روایات ہی لینی چاہئیں جن کی سند صحیح ہو۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کی کوئی صورت نہ بنے۔ بعض اوقات وہ فضیلت کا طالب ہوتا ہے تو وہ نقص کو پالیتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ واضح خسارہ پالیتا ہے۔

## مسئلہ نمبر 3۔ درود شریف کی فضیلت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر اس کی وجہ سے دس دفعہ رحمتیں نازل فرماتا ہے'' (2)۔ حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا عبادت میں سے افضل عبادت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں نے اس امر کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، پھر اس کے بارے میں مومنوں کو حکم دیا۔ تمام عبادات اس طرح نہیں۔ ابو سلیمان دارانی نے کہا: جو اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کے سوال کرنے کا ارادہ کرے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درود پڑھنے سے آغاز کرے پھر اپنی حاجت کا سوال کرے پھر اس کا اختتام بھی درود پر کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ دونوں درود قبول فرماتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ درمیان والے کو رد کر دے۔ سعید بن مسیب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے فرمایا: دعا کو آسمان کے نیچے سے روک دیا جاتا ہے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پیش کیا جائے (3)۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود آجاتا ہے تو دعا کو اوپر اٹھا لیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کتاب میں مجھ پر درود شریف پڑھا تو فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے رہیں گے جب تک میرا نام اس کتاب میں موجود رہے گا'' (4)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ جس پر جم غفیر اور جمہور

1۔ احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 1584
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 175
3۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 88-87، حدیث نمبر 3269
4۔ المعجم الاوسط، جلد 2، صفحہ 496، حدیث نمبر 1856

کثیر ہے وہ یہ ہے کہ یہ نماز کی سنت اور اس کا مستحب ہے۔ ابن منذر نے کہا: مستحب یہ ہے کہ کوئی آدمی نماز نہ پڑھے مگر اس میں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھے۔ اگر کوئی درود کو ترک کر دے تو امام مالک، اہل مدینہ، سفیان ثوری، اصحاب الرائے میں سے اہل کوفہ اور دوسرے علماء کے نزدیک نماز جائز ہے، اہل علم میں سے کثیر لوگوں کا یہ قول ہے۔ امام مالک اور سفیان سے یہ مروی ہے کہ آخری تشہد میں یہ مستحب ہے اور تشہد میں درود کو ترک کرنے والا گناہگار ہوگا۔ امام شافعی نے الگ رائے قائم کی آپ نے نماز میں درود ترک کرنے والے پر اعادہ کو واجب کیا ہے۔ اسحاق نے نماز کے اعادہ کو واجب کیا ہے جب کہ وہ جان بوجھ کر درود کو ترک کرے بھول کر نہ چھوڑے۔ ابو عمر نے کہا: امام شافعی نے کہا: جب نمازی آخری تشہد میں تشہد کے بعد اور سلام سے پہلے درود نہ پڑھے تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ کہا: اگر اس نے تشہد سے پہلے درود پڑھا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں۔ یہ وہ قول ہے جو حرملہ بن یحییٰ نے ان سے نقل کیا ہے۔ اس قسم کی روایت امام شافعی سے نہیں پائی جا سکتی مگر حرملہ سے پائی جا سکتی ہے۔ یہ امام شافعی کے کبار شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے امام شافعی کی کتب لکھی ہیں۔ امام شافعی کے اصحاب نے اس کو اپنایا، اس کی طرف مائل ہوئے اور اس پر غور و فکر کیا ان کے نزدیک یہی ان کے مذہب کا خلاصہ ہے۔ امام طحاوی نے گمان کیا ہے: ان کے علاوہ کسی اہل علم نے ایسا قول نہیں کیا۔ خطابی نے کہا جب کہ وہ امام شافعی کے اصحاب میں سے ہے یہ نماز میں واجب نہیں۔ یہ فقہاء کے جماعت کا قول ہے مگر امام شافعی اس میں شامل نہیں۔ اس امر پر دلیل کہ یہ نماز کے فرائض میں سے ہے وہ امام شافعی سے قبل سلف صالحین کا عمل اور ان کا اجماع ہے۔ اس مسئلہ میں امام شافعی پر سخت گرفت کی گئی ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے جسے امام شافعی نے اپنایا نبی کریم ﷺ نے اس کی تعلیم دی ہے۔ اس میں نبی ﷺ پر درود نہیں۔ اسی طرح ہر وہ راوی جس نے نبی کریم ﷺ سے تشہد روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ کر تشہد کی تعلیم دیا کرتے تھے، جس طرح تم بچوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی منبر پر تشہد کی تعلیم دی۔ اس میں نبی کریم ﷺ پر درود کا ذکر نہیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے اصحاب میں سے محمد بن مواز نے نماز میں نبی کریم ﷺ پر درود کے واجب ہونے کا قول کیا ہے جو ابن قصار اور عبد الوہاب نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے حدیث صحیح کی وجہ سے اسے اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آپ کی بارگاہ میں درود پڑھیں تو ہم کیسے آپ کی بارگاہ میں درود پڑھیں (1)؟ حضور ﷺ نے درود اور اس کا وقت بتایا تو درود کیفیت اور وقت کے اعتبار سے متعین ہوگیا۔ دار قطنی نے ابی جعفر محمد بن علی بن حسین سے یہ قول ذکر کیا ہے: اگر میں ایسی نماز پڑھوں جس میں میں نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھوں اور نہ ہی آپ کے اہل بیت پر درود پڑھوں تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ نماز مکمل نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے؛ صحیح یہ ہے کہ یہ ابو جعفر کا قول ہے یہ دار قطنی نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** قاضی ابو بکر بن بکیر نے کہا: یہ آیت نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، الصلوٰۃ علی النبی ﷺ، جلد 1، صفحہ 175

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی بارگاہ میں سلام پیش کریں۔ اسی طرح جو بعد کے مسلمان ہیں ان کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ آپ کی بارگاہ میں سلام پیش کریں جب وہ آپ کی قبر پر حاضر ہوں اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کیا جائے۔ امام نسائی نے عبداللہ بن ابی طلحہ سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن تشریف لائے جب کہ خوشی آپ کے چہرہ سے عیاں تھی۔ میں نے عرض کی: ہم آپ کے چہرہ پر خوشی دیکھتے ہیں۔ فرمایا: ''میرے پاس ایک فرشتہ آیا ہے، اس نے کہا: اے محمد! آپ کا رب ارشاد فرماتا ہے کیا آپ کو یہ بات راضی نہیں کرتی کہ کوئی بندہ آپ پر درود نہیں پڑھے گا مگر میں اس پر دس دفعہ کرم فرماؤں گا۔ کوئی آپ پر ایک دفعہ سلام عرض نہیں کرے گا مگر میں اس پر دس دفعہ سلام بھیجوں گا'' (1)۔ محمد بن عبدالرحمن سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب میرا وصال ہو جائے گا تو تم میں سے کوئی مجھ پر سلام پیش نہیں کرے گا مگر اس کا سلام جبریل امین کے ساتھ میرے پاس آئے گا۔ جبریل امین کہیں گے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فلاں بن فلاں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ میں جواب میں کہوں گا: وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔ امام نسائی نے حضرت عبداللہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے فرشتے ہیں جو زمین میں سیاحت کرتے ہیں، وہ میری امت کی جانب سے مجھے سلام عرض کرتے ہیں'' (2)۔ قشیری نے کہا: سلام تیرا یہ قول ہے: سلام علیك۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝

''بے شک جو لوگ ایذا پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے رسوا کن عذاب''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اذیت دینے سے کیا مراد ہے؟ علماء میں سے جمہور نے کہا: اس کا معنی ہے اس کے ساتھ کفر کرنا، بیوی، بچے اور شریک کو اس کی طرف منسوب کرنا اور اس کی ایسی صفت ذکر کرنا جو اس کے شایان نہ ہو (3)، جس طرح یہودی نے کہا: اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے۔ یہودیوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ نے کہا: حضرت مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ مشرکوں نے کہا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور بت اس کے شریک ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اسے یہ حق نہ تھا، اس نے مجھے گالی دی اور اسے یہ حق نہ تھا'' (4)۔ سورت مریم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''اللہ

---

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوۃ، الفضل فی الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 189

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 189

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 398

4۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قل ھو اللہ احد، جلد 2، صفحہ 744

تعالیٰ کا فرمان ہے: ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے وہ کہتا ہے یا خیبة الدھر تم میں سے کوئی بھی یا خیبة الدھر نہ کہے بے شک میں ہی دہر ہوں، میں ہی اس کے دن اور رات کو لوٹاتا ہوں۔ جب میں چاہتا ہوں ان دونوں کو قبض کر لیتا ہوں'' (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف حدیث اسی طرح آئی ہے۔ ان سے ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔ ''ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے میں زمانہ ہوں میں ہی دن اور رات کو الٹتا ہوں'' (2)۔ اسے امام مسلم نے بھی نقل کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ تصویر بنا کر اور ایسا فعل کر کے جسے اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے جس طرح چھیل کر تصویریں بنانا اور اس کے علاوہ دوسرے امور۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مصوروں پر لعنت کرے'' (3)۔ میں کہتا ہوں: یہ ان چیزوں میں ہے جو مجاہد کے قول کو تقویت باہم پہنچاتی ہے کہ وہ درخت اور دوسری چیزوں کی تصویر بنانے سے منع کرتے، کیونکہ یہ سب اختراع کی صفت اور اللہ تعالیٰ کے فعل کے ساتھ تشبہ ہے جس فعل میں اللہ تعالیٰ کی ذات منفرد ہے۔ سورۂ نمل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔ ایک فرقہ نے کہا: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے یوذون اولیاء اللہ (4)۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو اذیت دیتے ہیں۔ جہاں تک اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ تمام اقوال ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتے ہیں اور ایسے افعال بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کو اذیت دیتے ہیں جہاں تک ان کے قول کا تعلق ہے: وہ ساحر، شاعر، کاہن، مجنون۔ جہاں تک ان کے فعل کا تعلق ہے وہ غزوہ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رباعیہ کو توڑنا اور آپ کے چہرہ کو زخمی کرنا ہے۔ اور مکہ مکرمہ میں جب سجدہ کی حالت میں تھے اس وقت آپ پر اوجھ پھینک دینا، اس کے علاوہ دوسرے افعال۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طعن کیا تھا جب آپ نے حضرت صفیہ بنت حیی کو اپنے حرم میں لیا تھا (5)۔ اللہ تعالیٰ کو اذیت اور اس کے رسول کی اذیت کو مطلق ذکر کیا اور مومنوں اور مومنات کی اذیت کو مقید کیا کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت ہمیشہ ناحق ہوتی ہے اور مومنوں اور مومنات کو اذیت کبھی ناحق اور کبھی حق کے ساتھ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے علماء نے کہا: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کا امیر بنایا تو اس پر طعن یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہے (6)۔ صحیح نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ کیا، اس پر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا لوگوں نے ان کی امارت پر طعن کیا (7)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے فرمایا: ''اگر تم اس کی امارت پر طعن کرتے ہو تو تم نے پہلے اس کے باپ کی امارت پر بھی طعن کیا تھا، اللہ کی قسم! یہ امارت کا مستحق ہے یہ مجھے لوگوں میں سے محبوب ترین ہے یہ اس کے بعد مجھے لوگوں میں سے محبوب ترین ہوگا''۔ یہ لشکر اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے وہی تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کے لیے تیار کیا تھا ان پر حضرت اسامہ کو امیر بنایا تھا اور حضرت اسامہ کو حکم

---

1۔ صحیح مسلم، باب النھی عن سب الدھر، جلد 2، صفحہ 237 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 398

4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

7۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، مناقب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 528

دیا تھا کہ وہ ''ابنی'' پر حملہ کرے یہ وہ بستی تھی جو موتہ کے قریب تھی جہاں حضرت زید کو شہید کیا گیا تھا ساتھ ہی حضرت جعفر طیار اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ شہید ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ لے تو جس کے دل میں کچھ شک تھا اس نے آپ کی امارت پر طعن کیا تھا، کیونکہ یہ غلاموں میں سے تھے، یعنی غلام کے بیٹے تھے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ چھوٹی عمر کے تھے، کیونکہ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا جب کہ یہ لشکر مدینہ طیبہ سے باہر نکل چکا تھا لیکن ابھی دور نہیں گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امر کو نافذ کیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس حدیث میں یہ واضح دلیل موجود ہے کہ مولیٰ اور مفضول کی امامت ان کے غیر پر جائز ہے مگر امامت کبریٰ جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں حضرت سالم جو ابو حذیفہ کے غلام تھے انہیں نماز کے لیے امام بنایا۔ حضرت سالم ان کی امامت کرتے جب کہ صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور دوسرے کبار قریش ہوتے تھے۔ صحیح عامر بن واثلہ سے روایت کرتی ہے کہ حضرت نافع بن عبد الحارث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عسفان میں ملے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مکہ مکرمہ پر عامل بنایا ہوا تھا، پوچھا: تو نے اس وادی پر کس کو عامل بنایا ہے؟ انہوں نے عرض کی: ابن ابزی کو۔ پوچھا ابن ابزی کون ہے؟ عرض کی: ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام۔ پوچھا: تو نے غلاموں میں سے ایک غلام کو ان پر عامل بنایا ہے؟ عرض کی: وہ کتاب اللہ کا قاری ہے، وہ علم فرائض کو جانتا ہے۔ فرمایا: خبردار! تمہارے نبی کا ارشاد ہے ''اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کئی لوگوں کو بلند فرماتا ہے اور کئی کو پست کرتا ہے'' (1)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ محبوب تھے محبوب کے بیٹے تھے۔ اسی لقب سے بلائے جاتے تھے۔ ان کا رنگ شدید سیاہ تھا ان کے والد روئی سے بھی زیادہ سفید تھے۔ ابو داؤد نے احمد بن صالح سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ احمد کے علاوہ نے کہا: حضرت زید چمکیلے رنگ والے تھے اور حضرت اسامہ شدید قسم کے گندم گوں تھے۔ یہ بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ کو بناتے سنوارتے جب کہ وہ چھوٹے تھے ان کے ریشہ کو صاف کرتے اور ان کی ناک کو صاف کرتے اور فرماتے: ''اگر اسامہ بچی ہوتی تو ہم اس کو مزین کرتے، اس کا بناؤ سنگھار کرتے اور ہم اسے مرد خاوندوں کے لیے محبوب بنا دیتے''۔ یہ ذکر کیا گیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عربوں کے ارتداد کا سبب ان کا یہ گستاخانہ کلام تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر جبل عرفہ پر عرفہ کی شام روانگی کے وقت تھے حضرت اسامہ کی وجہ سے تھوڑا وقت رکے یہاں تک کہ حضرت اسامہ آ گئے انہوں نے کہا: آپ صرف اس کے لیے رکے ہیں۔ انہوں نے یہ بات حضرت اسامہ کی حقارت بیان کرنے کے لیے کی تھی۔ ان کا یہی گستاخانہ قول ان کی حقارت کا سبب بنا۔ امام بخاری نے اس کا ہم معنی قول نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ کے لیے عطیہ میں پانچ ہزار اور اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ کے لیے دو ہزار معین کیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کو فضیلت دی جب کہ میں ایسی جنگوں میں شریک ہوا ہوں

1۔ ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 512، حدیث نمبر 2275

جن میں حضرت اسامہ شریک نہیں ہوئے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت اسامہ تیری بنسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد حضرت زید تیرے والد کی بنسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے محبوب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب کو ترجیح دی۔ اسی طرح لازم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس سے محبت کریں اس سے محبت رکھی جائے اور جس سے بغض رکھیں اس سے بغض کیا جائے (1)۔ مروان نے اس محبت کے برعکس رویہ اپنایا اس کی صورت یہ ہوئی کہ مروان حضرت اسامہ بن زید کے پاس سے گزرا جب کہ حضرت اسامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ مروان نے آپ سے کہا: تو نے ارادہ کیا کہ ہم تیرے مقام و مرتبہ کو دیکھیں پس ہم نے تیرے مقام و مرتبہ کو دیکھا ہے اللہ تعالیٰ نے جو تیرے ساتھ سلوک کیا ہے اور اس نے قبیح قول کیا۔ حضرت اسامہ نے اسے کہا: تو نے مجھے اذیت دی ہے تو فاحش متفحش ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ فاحش متفاحش کو ناپسند کرتا ہے''۔ دونوں رویوں کو دیکھو دونوں افراد کو دیکھو بنوامیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوبوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوبوں کی شان کم کرنے کی کوشش کی۔

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ انہیں ہر بھلائی سے دور کر دیا گیا۔ لغت میں لعن سے مراد دور کرنا ہے اسی سے لعان ہے۔ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا اس کا معنی کئی دفعہ گزر چکا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

## وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

''اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھا لیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ''۔

مومنوں اور مومنات کو اذیت بھی قبیح افعال اور قبیح اقوال کے ساتھ ہوتی ہے، جس طرح گھڑا ہوا بہتان اور فحش تکذیب اس آیت کی مثل ہے جو سورۂ نساء میں ہے وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء) جس طرح یہاں فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اذیت سے مراد یہ ہے کہ اسے مذموم حسب کی وجہ سے یا مذموم پیشہ کی وجہ سے یا ایسی چیز کی وجہ سے جس کو جب سنے تو اس کے لیے بوجھ بنے، کیونکہ اس کو اذیت دینا فی الجملہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت میں اور مومنوں کی اذیت میں فرق کیا ہے پہلے کو کفر اور دوسرے کو گناہ کبیرہ بنایا ہے مومنوں کو اذیت دینے کے بارے میں فرمایا: فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میں نے گزشتہ رات یہ آیت پڑھی تو میں اس سے گھبرا گیا وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا اللہ کی قسم! میں تو انہیں مارتا ہوں اور انہیں جھڑکتا ہوں۔ حضرت ابی نے عرض کی: اے امیر المومنین! آپ ان میں سے نہیں ہے۔ آپ تو معلم اور

---

1۔ جامع ترمذی، باب مناقب زید بن حارثہ، حدیث نمبر 3749، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سیدھا کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار کی ایک بچی دیکھی اسے مارا اور اس نے جو زینت کی ہوئی تھی اس کو ناپسند کیا تو اس کے گھر والے نکل آئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زبانی اذیت دی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت علی شیر خدا کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ منافق انہیں اذیت دیتے اور ان کی تکذیب کیا کرتے تھے (1)۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

''اے نبی مکرم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ جب وہ باہر نکلیں، تو ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو اس طرح وہ با آسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کی ایک ایک فضیلت کے بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ قتادہ نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں نو ازواج تھیں۔ پانچ قریش کے خاندان سے حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حفصہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت سودہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن۔ تین عام عربوں میں سے تھیں حضرت میمونہ، حضرت زینب بنت جحش اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہن اور ایک حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا۔ جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کا تعلق ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں مذکر اور مونث بھی تھے۔ مذکر اولاد میں سے حضرت قاسم، ان کی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ آپ کے نام سے ہی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے سب سے پہلے یہی فوت ہوئے۔ آپ دو سال تک زندہ رہے۔ حضرت عروہ نے کہا: حضرت خدیجہ الکبریٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار بیٹے ہوئے: حضرت قاسم، حضرت طاہر، حضرت عبداللہ اور حضرت طیب۔ ابوبکر برقی نے کہا: یہ قول بھی کیا جاتا ہے طاہر سے مراد طیب ہیں اور وہی عبداللہ ہیں۔ حضرت ابراہیم ان کی والدہ ماجدہ حضرت ماریہ قبطیہ تھیں۔ حضرت ابراہیم کی ولادت آٹھ ہجری ذی الحجہ میں ہوئی۔ یہ سولہ ماہ کے تھے تو ان کا وصال ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کی عمر اٹھارہ ماہ تھی (2)؛ دارقطنی نے اسے ذکر کیا ہے۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان کی دودھ پلانے والی تھی جوان کی رضاعت جنت میں پوری کرے گی''۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ آپ کی تمام اولاد حضرت خدیجہ الکبریٰ سے تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام اولاد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں وصال کر گئی صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باقی تھیں۔

جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں بچیوں کا تعلق ہے ان میں حضرت فاطمہ زہرہ بنت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ حضرت خدیجہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 423
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ما جاء فی الصلوٰۃ علی ابن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ 110

الکبری کے ہاں ان کی ولادت ہوئی جب قریش بیت اللہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے یعنی اعلان نبوت سے پانچ سال قبل ان کی ولادت ہوئی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے 2 ھ میں رمضان میں ان سے شادی کی اور ذی الحجہ میں انہیں گھر لائے۔ ایک قول یہ کیا گیا: رجب میں ان سے شادی کی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑا عرصہ بعد ان کا وصال ہوا اہل بیت میں سے سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لاحق ہونے والی تھیں۔

ان میں حضرت زینب تھیں جن کی والدہ حضرت خدیجہ الکبری تھیں۔ ان سے ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع نے شادی کی۔ عاص کی ماں ہالہ بنت خویلد تھیں جو حضرت خدیجہ الکبری کی ہمشیرہ تھیں۔ ابو العاص کا نام لقیط تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام ہاشم تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام ہشیم تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام مقسم تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بیٹی تھیں ان کا وصال 8 ھ میں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں خود اترے۔

ان میں حضرت رقیہ بھی تھیں۔ ان کی والدہ ماجدہ بھی حضرت خدیجہ الکبری تھیں۔ اعلان نبوت سے قبل عتبہ بن ابی لہب سے ان کی نسبت ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کو نازل فرمایا: تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (الہب: 1) ابولہب نے اپنے بیٹے سے کہا: اگر تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو طلاق نہ دی تو میرا سر تیرے سر پر حرام ہے۔ عتبہ نے حضرت رقیہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور وہ آپ کو اپنے گھر نہیں لایا تھا۔ حضرت رقیہ اس وقت اسلام لے آئی تھیں جب ان کی والدہ حضرت خدیجہ الکبری اسلام لائی تھیں۔ حضرت رقیہ اور ان کی بہنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس وقت بیعت کی جب عورتوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ حضرت عثمان بن عفان نے ان سے شادی کی۔ جب حضرت عثمان نے ان سے شادی کی تو قریش کی عورتیں کہتی تھیں:

أحسنُ شخصين رأى انسانُ رقيةٌ و بعلها عثمانُ

دو ذاتوں میں سے بہترین جسے کوئی انسان دیکھے وہ حضرت رقیہ ہیں اور ان کے خاوند حضرت عثمان ہیں۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان کے ساتھ حبشہ کے علاقہ کی جانب دو ہجرتیں کیں۔ حضرت عثمان سے ان کا ایک نامکمل بچہ پیدا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد حضرت عبداللہ کی ولادت ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حالت اسلام میں ان کے نام سے اپنی کنیت ذکر کرتے۔ ان کی عمر چھ سال ہوئی تو مرغ نے ان کے چہرے پر چونچ ماری تو ان کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی ولادت نہ ہوئی۔ انہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، بیمار ہوئیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کی تیاری کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہ کی خدمت کے لیے انہیں پیچھے چھوڑا ان کا وصال ہو گیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں تھے۔ ہجرت کو سترہ ماہ گزر چکے تھے۔ حضرت زید بن حارثہ بدر سے خوشخبری دینے کے لیے آئے یہ مدینہ طیبہ میں اس وقت پہنچے جب حضرت رقیہ کی قبر پر مٹی درست کی جارہی تھی۔ ان کے دفن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے۔

ان میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی تھیں، ان کی والدہ حضرت خدیجہ الکبریٰ تھیں عتیبہ بن ابی لہب کی ان سے نسبت ہوئی جو عتبہ کا بھائی تھا یہ اعلان نبوت سے قبل ہوا۔ اس کو ابولہب نے حکم دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو چھوڑ دے اسی مذکورہ

سبب سے جس کی وجہ سے حضرت رقیہ کو عتبہ نے چھوڑا تھا۔ عتیبہ انہیں اپنے گھر نہیں لے گیا تھا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں رہیں۔ جب ان کی والدہ حضرت خدیجہ الکبری ایمان لائیں تو یہ بھی ایمان لے آئیں۔ جب عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو اپنی بہنوں کے ساتھ انہوں نے بھی بیعت کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو انہوں نے بھی ہجرت کی۔

جب حضرت رقیہ کا وصال ہوا تو حضرت عثمان نے ان سے شادی کی۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان کا لقب ذوالنورین ہے یہ نو ہجری کو شعبان کے مہینہ میں فوت ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر پر بیٹھے۔ ان کی قبر میں حضرت علی، حضرت فضل اور حضرت اسامہ اترے۔ زبیر بن بکار نے ذکر کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے بیٹے حضرت قاسم پھر حضرت زینب پھر حضرت عبداللہ انہیں ہی طیب اور طاہر کہا جاتا تھا۔ یہ اعلان نبوت (☆) کے بعد پیدا ہوئے اور چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ پھر حضرت ام کلثوم، پھر حضرت فاطمہ پھر حضرت رقیہ، حضرت قاسم مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے پھر حضرت عبداللہ فوت ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** عربی عورتوں کا معمول تھا کہ وہ وقار سے گری ہوئی حرکتیں کرتیں وہ اپنے چہرے کو کھلا رکھتیں جس طرح لونڈیاں کھلا رکھتی ہیں۔ یہ اس امر کا سبب تھا کہ مرد انہیں دیکھیں اور ان کے بارے میں فکر پراگندہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان عورتوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی چادروں کے پلو لٹکا کر رکھیں جب وہ اپنی ضروریات کے لیے نکلنے کا ارادہ کریں۔ لیٹرینیں بنائے جانے سے قبل وہ صحراء میں قضائے حاجت کے لیے جایا کرتی تھیں۔ اس طرح آزاد عورتوں اور لونڈیوں کے درمیان فرق ہو جاتا۔ آزاد عورتیں اپنے پردہ کی وجہ سے پہچان لی جاتی تھیں تو جو آوارہ یا نوجوان ہوتا وہ ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے رک جاتا۔ مومنوں کی عورتوں میں سے کوئی ایک اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے اپنی ضرورت کے لیے نکلتی بعض فجار ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے وہ یہ خیال کرتے کہ یہ لونڈیاں ہیں وہ عورت اس پر چلاتی تو وہ چلے جاتے۔ لوگوں نے اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی؛ یہ معنی حسن بصری اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ، جلابیب، جلباب کی جمع ہے۔ یہ اوڑھنی سے بڑا کپڑا ہوتا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: اس سے مراد ردا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد قناع ہے (جس سے سر ڈھانپا جاتا ہے)۔ صحیح قول یہ ہے کہ جلباب سے مراد ایسا کپڑا ہے جس کے ساتھ سارا بدن ڈھانپا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم میں سے کچھ عورتوں کے پاس جلباب نہیں ہوتا۔ فرمایا: ''اس کی بہن اسے اپنا جلباب (چادر) دے دے'' (3)۔

☆۔ حضرت مفسر کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ بیٹیوں کے حوالے سے جو گفتگو پہلے کی ہے وہ اس کے سراسر خلاف ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 399
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 423
3۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ العیدین، ذکر اباحۃ خروج النساء فی العیدین، جلد 1، صفحہ 291

**مسئلہ نمبر 4**۔ چادر کے لٹکانے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبیدہ سلمانی نے کہا: اس کی صورت یہ ہے کہ عورت اسے یوں لپیٹ لے کہ عورت کی صرف ایک آنکھ دکھائی دے جس کے ساتھ وہ دیکھے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: اس کی صورت یہ ہے کہ پیشانی کے اوپر اسے لپیٹے اور اسے باندھ دے پھر اسے اپنے ناک پر جھکا دے اگرچہ اس کی آنکھیں ظاہر ہوں، وہ سینہ اور چہرے کا اکثر حصہ چھپا کر رکھے (2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اپنے نصف چہرے کو ڈھانپ کر رکھے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ نے تمام عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا پردہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی جلد کو عیاں نہ کرے ہاں جب وہ اپنے خاوند کے پاس ہو تو جو چاہے لباس پہنے، کیونکہ مرد کو حق حاصل ہے کہ جیسے چاہے لطف اندوز ہو۔ یہ امر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات بیدار ہوئے تو کہا: سبحان اللہ سبحان اللہ ماذا أنزل الليلة من الفتن و ماذا فتح من الخزائن من يوقظ صواحب الحجر رُبَّ كاسيةٍ في الدنيا عاريةٍ في الآخرة''۔ سبحان اللہ آج رات کتنے فتنے نازل ہوئے اور آج رات کتنے خزانے کھولے گئے آج حجرے والوں کو کون بیدار کرے گا دنیا میں کچھ لباس زیب تن کرنے والے آخرت میں ننگے ہوں گے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت دحیہ کلبی جب ہرقل کے پاس سے واپس آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتان سے بنا کپڑا عطا فرمایا۔ فرمایا: ''اس کے نصف سے قمیص بنا لو اور اپنی بیوی کو نصف دے دو وہ اس سے اوڑھنی بنا لے'' (3)۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اپنی بیوی کو حکم دینا کہ وہ اس کے نیچے کوئی چیز لگا لے تاکہ یہ کپڑا اس کے جسم کی بناوٹ کو ظاہر نہ کرے''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عورتوں کے لیے باریک کپڑوں کا ذکر کیا تو فرمایا: لباس پہننے والیاں، ننگے بدن والیاں اور خوشحال عورتیں بدبخت عورتیں۔ بنو تمیم کی عورتیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں جن پر باریک لباس تھا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر تم مومن ہو تو یہ لباس مومن عورتوں کا نہیں اگر تم غیر مومن ہو تو تم اس سے لطف اندوز ہو لو۔ ایک دلہن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اس پر کتان سے بنی اوڑھنی تھی جس کو عصفر سے رنگا گیا تھا۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ نے اسے دیکھا تو فرمایا: تو سورۂ نور پر ایمان نہیں رکھتی۔ ایک عورت یہ لباس پہنتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے: ''ایسی عورتیں جو لباس پہنتی ہیں ان کے جسم ننگے ہوتے ہیں وہ جھکنے والی ہوتی ہیں جھکانے والی ہیں ان کے سربختی اونٹوں کی کہانوں کی طرح ہوتے ہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور اس کی خوشبو بھی نہیں پائیں گی'' (4)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: مسلمان عورتوں کو کیا چیز روکتی ہے جب اسے کام ہو تو وہ بوسیدہ کپڑے میں نکلے یا اپنی پڑوسن کے بوسیدہ کپڑوں میں نکلے وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اسے کوئی بھی نہ جانے یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 399 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 399

3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، الترغیب فی لمن تکشف بیابہا، جلد 2، صفحہ 234

4۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، الکیاسات العاریات، جلد 2، صفحہ 205

**مسئلہ نمبر 6۔** ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ یہ زیادہ مناسب ہے کہ آزاد عورتیں پہچانی جائیں تاکہ وہ لونڈیوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں۔ جب ان کو پہچان لیا جائے گا تو ادنی تعرض کے لیے ان کے سامنے نہ آیا جائے گا یہ ان کے مرتبہ حریت کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے ہوگا۔ تو ان سے ہر قسم کی طمع ختم ہو جائے گی۔ ان تعرف المراۃ کا معنی یہ نہیں کہ یہ جانا جائے کہ وہ کون ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی لونڈی کو دیکھتے کہ اس نے پردہ کیا ہوا ہے تو اسے درہ سے مارتے اصل میں آپ آزاد عورتوں کے لباس کی حفاظت کے لیے ایسا کرتے تھے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اب ہر آزاد اور لونڈی کے حق میں پردہ اور سر کا ڈھانپنا واجب ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد عورتوں کو مسجدوں سے روک دیا تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد تھا: ''اللہ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو'' (1)۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے اس وقت تک زندہ رہتے تو آپ عورتوں کو مساجد میں داخل ہونے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو مسجدوں سے روک دیا تھا۔

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اس امر شروع سے قبل عورتیں جو جلابیب کو ترک کرتی رہیں ان کے بارے میں عورتوں کو مانوس کیا جا رہا ہے۔

لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۛۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

''اگر (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے تو ہم آپ کو مسلط کر دیں گے ان پر پھر وہ ٹھہر نہ سکیں گے آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں مگر چند روز وہ بھی اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی، جہاں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور جان سے مار ڈالے جائیں گے۔ اللہ کی سنت ان (بدقماشوں) کے متعلق بھی یہی تھی جو پہلے گزر چکے اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ اہل تفسیر نے کہا: یہ تین اوصاف ایک شے کے ہیں۔ جس طرح سفیان بن سعید نے منصور سے وہ حضرت ابورزین سے روایت نقل کرتے ہیں کہ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، ھل علی من لم یشھد الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 123

**فِي الْمَدِيْنَةِ** سب ایک چیز ہیں یعنی انہوں نے ان اشیاء کو جمع کیا۔ واؤ زائدہ ہے۔ جس طرح کہا:

إلى الملك القَرْمِ وابن الهمام ولَيْثِ الكتيبة فى المُزْدحم

ملک، قرم، ابن ہمام، لیث الکتیبۃ سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں ایسے لوگ تھے جو افواہیں اڑایا کرتے تھے، کچھ لوگ ایسے تھے جو شک کی بنا پر عورتوں کا پیچھا کیا کرتے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو مسلمانوں میں شک ڈالا کرتے تھے۔ عکرمہ اور شہر بن حوشب نے کہا: **الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** سے مراد ہے جن کے دلوں میں بدکاری کا میلان ہے۔

طاؤس نے کہا: یہ آیت عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ سلمہ بن کہیل نے کہا: یہ بدکاروں کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **الْمُنٰفِقُوْنَ** اور **الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** ایک ہی چیز ہیں۔ انہیں الفاظ سے تعبیر کیا۔ اس کی دلیل سورۂ بقرہ کے آغاز میں منافقین والی آیت ہے۔

**الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ** سے مراد ایسے لوگ ہیں جو مومنوں کو دشمنوں کے بارے میں بری خبریں دیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے لشکر باہر جاتے تو وہ کہتے: انہیں شہید کر دیا گیا ہے یا انہیں شکست ہوگئی ہے اور دشمن تم تک پہنچا چاہتا ہے؛ یہ قتادہ اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کہا کرتے تھے اصحاب صفہ ایسے لوگ ہیں جن کی بیویاں نہیں، یہی لوگ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت تھی جو فتنہ کو پسند کرنے کی بنا پر جھوٹی خبریں پھیلایا کرتے تھے۔ بہتان لگانے والوں میں سے مسلمان لوگ بھی تھے لیکن وہ فتنہ کو پسند کرنے کی بنا پر اس میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ارجاف سے مراد فتنہ کو تلاش کرنا ہے (2)۔ ارجاف سے مراد غم میں مبتلا کرنے کے لیے جھوٹ اور باطل کو عام کرنا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دل کو حرکت دینا ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: رجفت الأرض فرجف رجفا زمین میں حرکت ہوئی اور اس میں زلزلہ برپا ہوا۔ رجفان سے مراد شدید اضطراب ہے۔ رجاف سے مراد سمندر ہے، سمندر کے مضطرب ہونے کی بنا پر اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ شاعر نے کہا:

المُطعِمون اللحم كلَّ عشية حتى تَغيب الشمسُ فى الرَّجاف

وہ ہر شام گوشت کھلاتے ہیں یہاں تک کہ سورج سمندر میں غائب ہو جاتا ہے۔

ارجاف کی جمع اراجیف ہے اس کا معنی خبریں ہیں۔ قد أرجفوا فی الشیء وہ اس میں داخل ہوئے۔ شاعر نے کہا:

فإنا وإن عيرتمونا بقتله وأرجف بالإسلام باغ و حاسدُ

اگر تم ہمیں ان کے قتل پر عار دلاتے ہو اسلام میں باغی اور حاسد داخل ہو گیا ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 424 2۔ ایضاً

ایک اور شاعر نے کہا:

أبالأراجيف يا بن اللؤم توعدنی وفی الأراجيف خِلت اللؤمُ والخور

اے کمینے! کیا تو مجھے اراجیف کی دھمکی دیتا ہے اور تو نے گمان کیا کہ اراجیف میں ملامت اور ذلت ہے۔

ارجاف حرام ہے کیونکہ اس میں اذیت ہوتی ہے۔ آیت اس امر پر دال ہے کہ ارجاف کے ذریعے اذیت دینا حرام ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ہم تجھے ان پر مسلط کر دیں گے تو آپ قتل کے ذریعے ان کی جڑیں کاٹ دیں گے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ عورتوں کو اذیت دینے سے نہ رکے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر تسلط عطا کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (التوبہ: 84) اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کرنے کا حکم دیا۔ یہی وہ اغراء ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر اس آیت میں جو اس آیت کے بعد ہے تسلط عطا فرمایا جبکہ کلام اس کے ساتھ متصل ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۝ اس آیت میں ان کو قتل کرنے اور ان کو پکڑنے کا امر ہے جب وہ نفاق اور ارجاف پر قائم رہیں تو یہ ان کا حکم ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: خمس يقتلن فی الحِلِّ والحَرَم (2) پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کو حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا۔ اس میں امر کا معنی ہے یہ حدیث آیت کی طرح حکم میں برابر ہے۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تعبیر میں جو اقوال کیے جاتے ہیں ان میں سے یہ سب سے خوبصورت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ارجاف سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آپ کو تسلط عطا نہ کیا۔ لنغرینك کا لام لام قسم ہے، قسم اسی پر واقع ہو رہی ہے۔ ان پر لام داخل کیا گیا تا کہ قسم کا شعور دلائے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ، ھا ضمیر سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اِلَّا قَلِيْلًا یہ یجاورونك کی ضمیر سے حال ہے۔ اور اس طرح ہوگا جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کیونکہ وہ تھوڑے ہی تھے۔ یہ فراء کے دو جوابوں میں سے ایک جواب ہے۔ اس کے نزدیک یہی اولیٰ ہے۔ وہ آپ کے پاس نہیں رہتے مگر اپنے قلیل ہونے کی حالت میں۔ دوسرا جواب ہے معنی ہو الا وقتا قلیلا مگر تھوڑا وقت، یعنی تیرے ساتھ تھوڑا وقت ہی رہیں گے، یعنی وہ اس میں تھوڑا عرصہ رہیں گے یہاں تک کہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تو یہ محذوف مصدر یا محذوف ظرف کی صفت ہوگا۔ یہ اس پر دال ہے کہ جو مدینہ طیبہ میں آپ کے ساتھ رہ رہا ہے تو وہ ''جار'' ہے۔ سورۃ النساء میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** مَّلْعُوْنِيْنَ محمد بن یزید کے ہاں اس پر کلام مکمل ہوتی ہے۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ابن انباری نے کہا: قَلِيْلًا۝ مَّلْعُوْنِيْنَ اس پر وقف کرنا اچھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے کہ اِلَّا قَلِيْلًا پر کلام مکمل ہو اور مَّلْعُوْنِيْنَ کو نصب شتم (گالی) کے طور پر ہو۔ جس طرح عیسیٰ بن عمر نے قراءت کی ہے۔ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ

---

1۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 737

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج باب ما یندب للمحرم وغیرہ، جلد 1، صفحہ 381

الحطب○ (لہب) ایک نحوی سے یہ مروی ہے اس نے کہا: معنی ہے جہاں بھی ہوں گے ملعون ہونے کی حیثیت میں پکڑے جائیں گے یہ غلط ہے کیونکہ ما مجازات کا معنی رکھتے ہوئے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیت کا معنی ہے اگر وہ نفاق پر اصرار کریں تو انہیں مدینہ میں ٹھہرنے کا کوئی حق نہیں اگر وہ رہیں گے تو دھتکارے ہوئے ملعون رہیں گے۔ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا، کیونکہ جب سورۂ براءت نازل ہوئی تو وہ جمع ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے فلاں! اٹھ اور نکل جا کیونکہ تو منافق ہے، اے فلاں اٹھ'' ان کے مسلمان بھائی اٹھے اور مسجد سے انہیں نکالنے کے ذمہ دار بنے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ سُنَّةَ اللّٰهِ یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو انبیاء کے بارے میں غلط باتیں عام کرے اور اپنے نفاق کو ظاہر کرے کہ اسے پکڑ لیا جائے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا تو اللہ تعالیٰ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا (1)؛ نقاش نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ سدی نے کہا: جس کو حق کی بنا پر قتل کیا گیا تو اس کے قاتل پر کوئی دیت لازم نہ ہوگی (2)۔ مہدوی نے کہا: آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ وعید کے نفاذ کو ترک کرنا جائز ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ منافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ اہل فضل میں معروف یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کیا جائے اور وعید کو موخر کر دیا جائے۔ یہ بحث سورۂ آل عمران وغیرہ میں گزر چکی ہے۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝

''لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں، فرمائیے: اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور اے سائل! تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو''۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے والوں کو جب عذاب کی دھمکی دی گئی تو انہوں نے قیامت کے بارے میں سوال کیا، ان کے سوال کا مقصود اس امر کو بعید خیال کرنا اور اس کو جھٹلانا تھا، وہ یہ وہم دلانا چاہتے تھے کہ یہ امر وقوع پذیر نہیں ہوگا۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ان کے سوال کا جواب دیجئے اور کہہ دیجئے: اس کا علم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت کو مخفی رکھا ہے تو یہ میری نبوت کو باطل کرنے والا نہیں اور نبی ہونے کی یہ شرط نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر غیب جانے۔ وَ مَا يُدْرِيْكَ کس نے آپ کو آگاہ کیا لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ممکن ہے قیامت قریب ہی زمانہ میں ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بعثت أنا والساعة کهاتين (3) میں اور قیامت ان دو کی طرح مبعوث کیے گئے ہیں اور انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ اہل صحیح نے اسے نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ترکیب یوں ہے لیست الساعة تكون قريبا اس کی ہاء تانیث حذف ہو گئی کہ الساعة کو یوم کی طرف لے جایا گیا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 425 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ماجاء فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 44

جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ (الاعراف) قریبۃ نہیں فرمایا کیونکہ رحمت کو عفو کی طرف پھیر دیا گیا ہے، کیونکہ اس کی تانیث اصلی نہیں۔ یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے وقت کو مخفی رکھا تا کہ بندہ ہر وقت اس کے لیے مستعد رہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے محروم کر دیا کفار کو اور تیار کر رکھی ہے اس نے ان کے لیے بھڑکتی آگ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں تا ابد نہ پائیں گے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کو دھتکار دیا اور انہیں دور کر دیا۔ لعن کا معنی دھتکارنا اور رحمت سے دور کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ فِيْهَاۤ میں ھا ضمیر سعیرا کے لیے ہے سعیر کو مونث قرار دیا کیونکہ یہ النار کے معنی میں ہے وہ کوئی ایسا مددگار نہیں پائے گا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس میں ہمیشہ رہنے سے نجات عطا فرمائے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾

''جس روز منہ کے بل آگ میں پھینکے جائیں گے تو (بصد یاس) کہیں گے: اے کاش! ہم نے اطاعت کی ہوتی اللہ تعالیٰ کی اور ہم نے اطاعت کی ہوتی رسول اکرم کی۔ اور عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی پس ان (ظالموں نے) ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے''۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ عام قراءت تاء کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے اور فعل مجہول ہے۔ عیسیٰ ہمدانی اور ابن اسحاق نے نقلب نون اور لام مکسور کے ساتھ قراءت کی ہے۔

وُجُوْهُهُمْ منصوب ہے۔ عیسیٰ نے یہ قراءت کی ہے۔ تقلب تاء مضموم اور لام مکسور ہے معنی یہ ہے جہنم ان کے چہروں کو الٹ دے گی۔ یہ الٹنا آگ کی لپک کے ساتھ ان کے رنگوں کو بدل دینا ہے۔ کسی لمحہ وہ سیاہ ہو جائیں گے اور کسی لمحہ سبز ہو جائیں گے۔ جب ان کی جلدوں کو دوسری جلدوں سے بدل دیا جائے گا تو وہ اس وقت تمنا کریں گے کہ وہ کفر نہ کرتے۔

يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ یہ جائز ہے کہ معنی ہو جس روز ان کے چہرے آگ میں الٹے جائیں گے تو اس روز کہیں گے: ہائے کاش! اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا یہ کفر نہ کرتے تو ہم اس عذاب سے نجات پا جاتے جس طرح مومن نجات پا گئے۔ یہ الف فواصل میں واقع ہوتا ہے اس پر وقف کیا جاتا ہے اور وصل نہیں کیا جاتا اسی طرح السبیلا ہے۔ سورت کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

حضرت حسن بصری نے اس کی قراءت کی انا اطعنا ساداتنا یعنی تاء کے نیچے کسرہ پڑھا ہے۔ یہ سادۃ کی جمع ہے۔ اس آیت میں تقلید سے جھڑک ہے۔ سادۃ یہ سید کی جمع ہے۔ یہ فعلۃ کا وزن ہے، جس طرح کتبۃ، فجرۃ، ساداتنا یہ جمع کی

جمع ہے۔ سادۃ اور کبراء دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ سردار ہیں جو غزوۂ بدر کے موقع پر مشرک فوج کو کھانا کھلایا کرتے تھے (1)۔ اظہر یہ ہے کہ یہاں شرک اور ضلالت میں جو قائدین اور سردار ہیں ان کو یہ لفظ عام ہے، یعنی ہم نے تیری نافرمانی کر کے ان کی اطاعت کی اور جس امر کی طرف بھی انہوں نے ہمیں دعوت دی ہم نے ان کی پیروی کی۔ فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا انہوں نے ہمیں السبیل یعنی توحید سے گمراہ کر دیا۔ جب جار کو حذف کر دیا گیا اور فعل کے ساتھ السبیل کو ملا دیا گیا تو اس پر نصب آئی، اضلال کا لفظ حرف جار کے واسطہ کے بغیر دو مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ (الفرقان: 29)

## رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝۶۸

''اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت''۔

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ قتادہ نے کہا: مراد عذاب دنیا اور عذاب آخرت ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفر کا عذاب اور گمراہ کرنے کا عذاب ہے (3)، یعنی جس قدر تو ہمیں عذاب دیتا ہے انہیں اس کا دوگنا عذاب دے کیونکہ وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے گمراہ کیا۔ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، آپ کے اصحاب، یحییٰ اور عاصم نے باء کے ساتھ قراءت کی باقی قراء نے ثاء کے ساتھ قراءت کی۔ اسے ابوحاتم، ابوعبید اور نحاس نے اپنایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ (البقرہ) یہ معنی اکثر واقع ہوتا ہے۔

محمد بن ابی السری نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں عسقلان کی مسجد میں ہوں گویا ایک آدمی مجھ سے اس آدمی کے بارے میں مناظرہ کر رہا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بغض رکھتا ہے۔ اس نے کہا: وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا اس نے یہ بات بار بار مجھ سے کی پھر وہ غائب ہو گیا۔ وہ اسے ثاء کے ساتھ ہی کہتا۔ باء کی قراءت ثاء کے معنی کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ جو چیز بڑی ہوتی ہے وہ کثیر اور عظیم قدر والی ہوتی ہے۔

## يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝۶۹

''اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا پس بری کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے جو انہوں نے کہا اور آپ لوگوں کے نزدیک بڑے شان والے تھے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور کفار کا ذکر کیا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو اذیت دی مقصود مومنوں کو ایسی چیزوں سے خبردار کرنا تھا جو اذیت کا باعث ہوتی ہیں اور بنی اسرائیل کے ساتھ مشابہت سے مومنوں کو منع کیا جنہوں نے اپنے نبی

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 226 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 426 3۔ ایضاً

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی تھی۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کس طرح اذیت دیتے تھے؟ نقاش نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو ان کی اذیت یہ تھی کہ وہ یہ قول کرتے تھے: زید بن محمد۔ ابو وائل نے کہا: حضور ﷺ کو اذیت یہ دی گئی کہ حضور ﷺ نے مال تقسیم کیا تو ایک انصاری نے کہا: یہ ایسی تقسیم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے لیے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ ناراض ہوئے۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں اس سے زیادہ اذیت دی گئی تو انہوں نے صبر کیا''(1)۔

جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دینے کا تعلق ہے تو حضرت ابن عباس اور ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جسے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بنو اسرائیل ننگے غسل کیا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پردہ کا بہت زیادہ اہتمام کرتے اور اپنے بدن کو چھپاتے۔ کچھ لوگوں نے کہا: ان کے خصیتین سوجے ہوئے ہیں، انہیں برص کا مرض ہے یا کوئی اور آفت ہے ایک روز آپ شام کے علاقہ میں ایک چشمہ پر غسل کرنے کے لیے گئے اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے وہ پتھر آپ کے کپڑوں کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے لباس اس کے پیچھے دوڑے آپ کہتے: اے پتھر! میرے کپڑے اے پتھر میرے کپڑے یہاں تک کہ وہ پتھر بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں جا پہنچا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا جب کہ آپ بناوٹ میں خوبصورت ترین اور سب سے معتدل صورت پر تھے۔ آپ میں ایسا عارضہ نہیں تھا جس کا انہوں نے تذکرہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: **فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا** کا یہی مفہوم ہے''۔

امام بخاری اور امام مسلم نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ ''بنو اسرائیل ننگے غسل کیا کرتے تھے وہ ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھا کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام الگ تھلگ غسل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی چیز نہیں روکتی کہ ہمارے ساتھ غسل کریں مگر یہ کہ ان کو ادرہ (خصیتین کا سوج جانا) کی بیماری ہے۔ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے کے لیے گئے آپ نے اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے تیزی سے دوڑے آپ کہتے: اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے، یہاں تک کہ بنو اسرائیل نے آپ کی شرمگاہ کو دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام میں تو کوئی بیماری نہیں۔ پتھر ٹھہر گیا یہاں تک آپ کو دیکھ لیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے لے لیے اور پتھر کو مارنے لگے''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مارنے سے پتھر میں چھ یا سات نشان تھے۔ یہ ایک قول ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہا: بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی کہ انہوں نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے(2)۔ وہ واقعہ یوں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول اللہ تعالیٰ وصل علیہم، جلد 2، صفحہ 938　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 401

ظاہر ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام تیہ کے زرعی علاقہ سے پہاڑی علاقہ کی طرف نکلے حضرت ہارون علیہ السلام وہاں ہی فوت ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ نے اسے قتل کر دیا ہے۔ وہ آپ کی بنسبت ہمارے لیے نرم اور زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ اس طرح بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت ہارون کی لاش کو ان پر گھمائیں۔ انہوں نے ایک عظیم نشانی دیکھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر ان کی راہنمائی کی۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی لاش میں قتل کی کوئی علامت نہ تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا: فرشتوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی موت کے بارے میں کلام کی ان کی قبر کی جگہ کو رخم (گدھ) کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ نے اسے بہرہ اور گونگا بنا دیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تیہ میں فوت ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تیہ کا عرصہ گزرنے سے دو ماہ پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔

قشیری نے حضرت علی شیر خدا سے روایت نقل کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو زندہ کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں خبر دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں قتل نہیں کیا۔ پھر وہ فوت ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی اذیت یہ تھی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادو اور جنون کا الزام لگایا (1)۔ صحیح پہلا قول ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے یہ سب کام کیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان سب امور سے بری کیا۔

**مسئلہ:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر پر کپڑے رکھنا اور پانی میں ننگے داخل ہونے میں اس امر کے جائز ہونے کی دلیل ہے؛ یہ جمہور کا مذہب ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور ایسی حدیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح نہیں۔ وہ یہ ارشاد ہے: "پانی میں داخل نہ ہو مگر تہبند کے ساتھ کیونکہ پانی میں بھی رہنے والا ہوتا ہے"۔ قاضی عیاض نے کہا: یہ اہل علم کے نزدیک ضعیف ہے۔

میں کہتا ہوں: پردہ کرنا مستحب ہے کیونکہ اسرائیل عبدالاعلیٰ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما ایک جوہڑ میں داخل ہوئے جب کہ آپ کے جسم پر چادر تھی جس کو آپ لپیٹے ہوئے تھے۔ جب آپ باہر نکلے تو ان سے اس بارے میں عرض کی گئی، فرمایا: میں نے اس سے پردہ کیا ہے جو مجھے دیکھتا ہے اور میں اسے نہیں دیکھتا، یعنی اپنے رب اور فرشتوں سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو ایسی ندا کیوں کی جو ذوالعقول کو ندا کی جاتی ہے؟ ایک جواب یہ دیا جاتا ہے: پتھر سے ایسا عمل صادر ہوا تھا جو ذوی العقول سے صادر ہوتا ہے۔

حجر یہ منادی مفرد ہے جس کا حرف ندا محذوف ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (یوسف: 29) ثوبی فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اعطنی ثوبی، اترک ثوبی فعل کو حذف کر دیا گیا کیونکہ حال اس پر دلالت کرتا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 226

وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا، وجیہ سے مراد عظیم ہے۔ عربوں کے ہاں وجیہ سے مراد وہ ہوتا ہے جو عظیم قدر والا اور بلند مقام والا ہوتا ہے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرما دیتے۔ حضرت ابن مسعود نے یہ قراءت کی وکان عبدًا لله۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَجِيْهًا کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔

ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں کہا: جنہوں نے قرآن میں طعن کیا ہے انہوں نے کہا: مسلمان نے قرآن میں تصحیف کی وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا جب کہ صحیح یہ ہے وکان عبد اللہ وجیھا یہ چیز اس کے مقصد کے ضعف، فہم کے نقصان اور قلت علم پر دال ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کو اگر اس کے قول پر محمول کیا جائے اور اسے پڑھا جائے: وکان عبدا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ثنا میں نقص واقع ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وَجِيْهًا اہل دنیا، اس کے اہل زمان اور اہل آخرت کے ہاں ذیشان ہوتا ہے۔ یہ مکاں مدح پر آگاہ نہ کرے گا، کیونکہ اگر وہ دنیا کے لوگوں کے ہاں ذیشان ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انعام ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثنا واضح نہیں ہوتی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدح کے محل کو اپنے اس ارشاد کے ساتھ واضح کیا: وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا آپ شرف اور عظیم رفعت کے مستحق ہوئے کیونکہ ان کی وجاہت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ جس نے ایک لفظ میں تبدیلی کی اس نے اللہ تعالیٰ کے نبی سے سب سے قابل فخر ثنا اور سب سے عظیم مدح کو دور کر دیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ سچی (اور درست) بات کہا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور جو شخص حکم مانتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا تو وہ ہی شخص حاصل کرتا ہے بہت بڑی کامیابی“۔

قَوْلًا سَدِيْدًا یعنی ایسا قول جو اعتدال پر ہو اور حق ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: درست۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا: حضرت زینب اور حضرت زید کے بارے میں درست قول کرو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب نہ کرو جو حلال نہ ہو۔ عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قول سدید، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کا ظاہر اس کے باطن کے موافق ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہو اس کے علاوہ کا ارادہ نہ کیا گیا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دو جھگڑنے والوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنا ہے۔ یہ تسدید السہم (1) سے ماخوذ ہے تاکہ اس کے ساتھ ٹارگٹ پر تیر مارا جائے۔ قول سداد تمام بھلائیوں کو عام ہے، جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اسے اور غیر کو عام ہے۔

آیت کا ظاہر یہ معنی دیتا ہے کہ اشارہ اس قول کی طرف ہے جو اس اذیت کے خلاف ہو جو اذیت کا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 428

کے متعلق ہو اور مومنین کے متعلق ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ قول سدید پر اعمال کو درست کر کے اور گناہوں کو بخش کر جزا دے گا۔ تیرے لیے درجہ اور رفعت منزلت کے اعتبار سے یہ کافی ہے۔

جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ان امور میں اطاعت کی جن کا اسے حکم دیا گیا اور جن سے اسے منع کیا گیا تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے، بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی تاکہ عذاب دے اللہ تعالیٰ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو اور نگاہ لطف و کرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں احکام کو بیان کیا جن احکام کو بھی بیان کیا تو اوامر کے التزام کا حکم دیا۔ امانت صحیح قول کے مطابق دین کے تمام فرائض کو عام ہے؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ ترمذی حکیم ابوعبداللہ نے اسماعیل بن نصر سے وہ صالح بن عبداللہ سے وہ محمد بن یزید بن جوہر سے وہ ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: اے آدم! میں نے آسمانوں اور زمین پر امانت کو پیش کیا تو وہ اس کو نہ اٹھا سکے کیا تو اس کو اٹھا سکتا ہے جو کچھ اس میں ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! اس میں کیا ہے؟ فرمایا: اگر تو نے اس کو اٹھا لیا تو تمہیں اجر دیا جائے گا اور اگر تو نے ضائع کر دیا تو تجھے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے اٹھا لیا اس چیز کے ساتھ جو اس میں ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام جنت میں اتنے عرصہ ہی ٹھہرے جتنا عرصہ پہلی نماز سے لے کر عصر کی نماز کا وقت ہوتا ہے، یہاں تک کہ شیطان نے آپ کو جنت سے نکال دیا'' (1)۔

امانت سے مراد وہ فرائض ہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جن پر امین بنایا۔ ان میں سے بعض کی تفاصیل اقوال ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اموال کی امانتیں ہیں جس طرح ودیعت وغیرہ (2)۔ ان میں یہ بھی روایت مروی ہے کہ یہ تمام فرائض ہیں ان میں سے شدید ترین مال کی امانت ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: یہ بھی امانت میں سے ہے کہ عورت اپنی

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 402

2۔ ایضاً

شرمگاہ پر امین رہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: جنابت کا غسل بھی امانت ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دین میں سے اس کے علاوہ کسی اور امر پر امین نہیں بنایا۔

حدیث مرفوع میں ہے: ''امانت سے مراد نماز ہے اگر تو چاہے تو کہے میں نے نماز پڑھ لی ہے اگر تو چاہے تو تو کہے میں نے نماز نہیں پڑھی۔ روزے اور غسل جنابت بھی اسی طرح ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء میں سب سے پہلے اس کی شرمگاہ بنائی۔ فرمایا: یہ امانت ہے جو میں تجھے ودیعت کرتا ہوں۔ اسے استعمال نہ کر مگر حق کے ساتھ۔ اگر تو نے اس کی حفاظت کی تو یہ تیری حفاظت کرے گی۔ شرمگاہ امانت ہے، کان امانت ہے، آنکھ امانت ہے، زبان امانت ہے، بطن امانت ہے، ہاتھ امانت ہے، پاؤں امانت ہے۔ جس میں صفت امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔

سدی نے کہا: اس سے مراد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے قابیل کو اپنی اولاد اور اہل پر امین بنایا۔ قابیل کی حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ یہ خیانت تھی کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: اے آدم! کیا تو جانتا ہے کہ زمین میں میرا ایک گھر ہے؟ عرض کی: اے میرے اللہ! نہیں۔ فرمایا: میرا مکہ مکرمہ میں ایک گھر ہے۔ اس میں آؤ۔ حضرت آدم علیہ السلام نے آسمان سے کہا: امانت کے طور پر میرے بچے کی حفاظت کرو، تو اس نے انکار کر دیا۔ زمین سے کہا: امانت کے طور پر میرے بچے کی حفاظت کیجئے۔ اس نے انکار کر دیا۔ پہاڑوں سے فرمایا: انہوں نے بھی انکار کر دیا، قابیل سے فرمایا: امانت کے طور پر میرے بچے کی حفاظت کرو۔ قابیل نے کہا: ٹھیک ہے آپ جائیں، آپ واپس آئیں تو آپ بچے کو پائیں گے جس طرح وہ تجھے خوش کرے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام لوٹے تو اسے پایا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا کا یہی مقصود ہے۔

معمر نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ امانت آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی گئی انہوں نے پوچھا: اس میں کیا ہے؟ انہیں کہا گیا: اگر تو نے اچھا کیا تو تجھے جزا دی جائے گی اور اگر تو نے برائی کی تو تجھے سزا دی جائے گی۔ انہوں نے کہا: نہیں (2)۔ مجاہد نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو امانت اس پر پیش کی حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی: وہ کیا ہے؟ فرمایا: اگر تو اچھا کرے گا تو میں تجھے اجر دوں گا اور اگر تو برا عمل کرے گا تو میں تجھے عذاب دوں گا۔ عرض کی: اے میرے رب! میں نے اس کو اٹھا لیا ہے۔

مجاہد نے کہا: جس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے امانت اٹھائی تو اتنا وقت بھی نہیں گزرا تھا کہ انہیں جنت سے نکال دیا گیا جتنا وقت ظہر اور عصر کی نماز کے درمیان ہوتا ہے۔ علی بن طلحہ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ امانت سے مراد فرائض ہیں (3)، اللہ تعالیٰ نے جن کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ اگر وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 402 2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 312 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 311

فرائض کو ادا کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ عطا فرمائے گا اگر وہ ضائع کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ انہوں نے معصیت کے بغیر اسے ناپسند کیا اور ڈر گئے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی تعظیم کی خاطر انہوں نے ایسا کیا کہ وہ اس کو بجا نہ لا سکیں گے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر پیش کیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے اسے قبول کر لیا جو کچھ اس میں تھا۔

نحاس نے کہا: یہ ایسا قول ہے جس پر اہل تفسیر کا اتفاق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت آدم علیہ السلام پر وفات کا وقت آیا تو آپ نے ارادہ کیا کہ امانت کو مخلوق پر پیش کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے امانت پیش کر دی تو آپ کے بیٹوں کے سوا کسی نے بھی اس کو قبول نہ کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وہ امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمین، پہاڑوں اور مخلوق میں اپنی ربوبیت پر دلائل کی صورت میں ودیعت کی ہے کہ وہ ان دلائل کو ظاہر کریں تو انہوں نے ان کو ظاہر کر دیا مگر انسان نے ان دلائل کو چھپایا اور ان کا انکار کر دیا؛ یہ قول بعض متکلمین کا ہے۔

**عَرَضْنَا** کا معنی اظهرنا ہے جس طرح تو کہتا ہے: عرضت الجاریۃ علی البیع میں نے لونڈی کو بیع کے لیے پیش کیا۔ معنی ہے ہم نے امانت اور اس کے ضیاع کو اہل آسمان اور اہل زمین جو فرشتے، انسان اور جن ہیں ان پر پیش کیا۔ **فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا** تو انہوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ** (العنکبوت: 13) **وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ** حضرت حسن بصری نے کہا: الانسان سے مراد کافر اور منافق ہے (1)۔ **اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا** وہ اپنی ذات پر ظلم کرنے والا اور اپنے رب سے جاہل تھا۔ اس تعبیر کی بنا پر جواب مجازا ہوگا، جس طرح **وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ** (یوسف: 82) ہے۔ اس میں ایک جواب بھی ہے کہ یہ کلام اپنے حقیقی معنی میں ہو کہ واقعی امانت اور اس پر ثواب وعقاب کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا گیا ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اس امر کو ان کے لیے ظاہر کیا ہو۔ انہوں نے اس کا بوجھ نہ اٹھایا اور ڈر گئے اور عرض کی: ہم ثواب اور عقاب کو نہیں چاہتے۔ ہر کوئی کہہ رہا تھا: ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے، ہم تیرے حکم کو سنتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا گیا اور جس کے لیے انہیں مسخر کیا گیا؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا۔

علماء نے کہا: یہ بات تو معلوم ہے کہ جمادات نہ سنتے ہیں اور نہ ہی جواب دیتے ہیں۔ دوسرے قول کی بنا پر ان میں زندگی کو مقدر کرنا ضروری ہے۔ یہ پیشی اختیاری تھی لازمی نہیں تھی۔ انسان پر پیشی لازمی تھی۔ قفال اور دوسرے علماء نے کہا: اس آیت میں پیشی ضرب المثل ہے۔ آسمان اور زمین اپنی بڑی جسامت کے باوجود اگر انہیں مکلف بنانا جائز ہوتا تو انہیں شریعتوں کا مکلف بنا دیا جاتا کیونکہ ان میں ثواب اور عقاب ہے، یعنی مکلف بنانا ایسا امر ہے جس کا حق یہ ہے کہ اس سے آسمان، زمین اور پہاڑ عاجز آ گئے۔ انسان کو اس کا مکلف بنایا گیا اگر یہ سمجھتا تو یہ ظلوم جہول ہوتا، یہ ارشاد اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ** (الحشر: 21) پھر فرمایا: **وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ**۔

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 314

قفال نے کہا: جب یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرب الامثال بیان فرماتا ہے اور ہم پر ایسی خبر وارد ہو جو ضرب المثل کے طور پر آتی ہے تو اس کا حمل ضرب المثل پر کرنا ضروری ہے۔

ایک قوم نے کہا: آیت مجاز میں سے ہے۔ جب ہم نے امانت کے بوجھ کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کی قوت کے ساتھ موازنہ کیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر یہ چیزیں کلام کرتیں تو انکار کر دیتیں اور ڈر جاتیں۔ اس معنی کو اپنے اس ارشاد کے ساتھ تعبیر کیا: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ یہ اسی طرح ہے جس طرح تیرا قول ہے: عارضت الحمل علی البعیر فاباہ میں نے بوجھ اونٹ پر پیش کیا تو اس نے اٹھانے سے انکار کر دیا، جب کہ تو یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تو نے اس کی قوت کو سامان کے بوجھ کے ساتھ موازنہ کیا تو تو نے دیکھا کہ وہ اس سے قاصر ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَرَضْنَا یہ عارضنا الامانۃ بالسموات والارض والجبال کے معنی میں ہے۔ یہ اشیاء امانت سے ضعیف ہو گئیں۔ اور امانت اپنے ثقل کی وجہ سے ان پر راجح ہو گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت کا پیش کرنا حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد پر خلیفہ بنایا اور زمین میں جو بھی جانور، پرندے اور وحشی ہیں سب پر ان کو مسلط کر دیا اور ان سے عہد لیا جس میں انہیں حکم دیا، انہیں منع کیا، کچھ چیزوں کو حرام کیا اور کچھ چیزوں کو حلال کیا حضرت آدم علیہ السلام نے اسے قبول تو کر لیا اور ہمیشہ اس پر عامل رہے جب ان کی وفات کا وقت آیا اللہ تعالیٰ نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ آگاہ کریں کس کو وہ بعد میں خلیفہ بنائے گا اور کس کو امانت سپرد کر دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ وہ اس امانت کو اسی شرط کے ساتھ آسمانوں پر پیش کرے جو شرط اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ لگائی ہے اگر اطاعت کرے تو ثواب حاصل ہوگا اگر نافرمانی کرے گا تو سزا ملے گی تو انہوں نے عذاب کے ڈر سے اسے قبول کرنے سے انکار کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ وہ امانت زمین پر پیش کرے اور تمام پہاڑوں پر پیش کرے تو دونوں نے انکار کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس امانت کو اپنی اولاد پر پیش کرے تو حضرت آدم علیہ السلام نے امانت اپنی اولاد پر پیش کی تو اولاد نے شرط کے ساتھ اسے قبول کر لیا، ابن آدم اس چیز سے خوفزدہ نہ ہوا جس چیز سے آسمان، زمین اور پہاڑ خوفزدہ ہوئے۔ وہ اپنی ذات پر ظلم کرنے والا اور اپنے رب کے لیے جس امر کو اپنا قلادہ بنانے والا تھا اس کے انجام سے جاہل تھا۔

ترمذی حکیم ابو عبد اللہ محمد بن علی نے کہا: میں اس قول کرنے والے پر تعجب کا اظہار کرتا ہوں، وہ یہ قصہ کہاں سے لے آیا۔ اگر ہم آثار کو دیکھیں تو اس نے جو کہا تھا ہم اس کے برعکس پاتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ظاہر کو دیکھیں تو ہم اسے اس کے برعکس پاتے ہیں جو اس نے کہا، اگر ہم اس کے باطن کو دیکھیں تو جو اس نے کہا اس سے بہت ہی بعید پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امانت کے ذکر کو مکرر ذکر کیا اور یہ ذکر نہیں کیا کہ امانت کیا ہے مگر وہ اپنے مقام میں یہ اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں جو کچھ ہے اس پر مسلط کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سے عہد لیا ہے جس میں امر، نہی، حلت اور حرمت کے احکام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ اسے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کرے۔ آسمان، زمین اور پہاڑ

حلال وحرام سے کیا کریں گے؟ چوپائیوں، پرندوں اور وحشیوں پر اس کے تسلط کا کیا معنی ہے؟ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس امانت کو اپنی اولاد پر پیش کیا اس نے اسے قبول کیا اور مابعد کی ذریت پر اسے نافذ کر دیا؟

قرآن کریم میں واقعہ کی ابتدا میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا یہاں تک کہ ان سے انکار ظاہر ہوا۔ پھر اس کا ذکر کیا کہ انسان نے اس کو اٹھالیا، یعنی اپنی جانب سے اس کو اٹھالیا نہ کہ اس پر اسے لازم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ظلوما کا نام دیا کیونکہ وہ اپنی ذات پر ظلم کرنے والا ہے اور جھولا نام دیا کیونکہ جو اس امانت میں تھا اس سے وہ ناواقف تھا۔ جہاں تک ان آثار کا تعلق ہے جو اس کے برعکس ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ میرے والد فیض بن فضل کوفی سے وہ سری بن اسماعیل سے وہ عامر شعبی سے وہ مسروق سے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے امانت کو پیدا کیا تو اسے چٹان سے تشبیہ دی پھر جہاں چاہا اسے رکھ دیا۔ پھر اس کو اٹھانے کے لیے آسمان، زمین اور پہاڑوں کو دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: یہ امانت ہے اس پر ثواب وعقاب ہے۔ انہوں نے عرض کی: اے میرے رب! ہم میں اس کے اٹھانے کی کوئی طاقت نہیں۔ انسان دعوت دیئے جانے سے قبل ہی متوجہ ہوا اس نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے کہا: تم کیوں رک گئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہمارے رب نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اس کو اٹھالیں ہم اس سے ڈر گئے ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔

انسان نے اپنے ہاتھ سے اسے ہلایا اور کہا: اللہ کی قسم! اگر میں چاہوں کہ میں اس کو اٹھاؤں تو میں اس کو اٹھا سکتا ہوں۔ انسان نے اس کو اٹھایا یہاں تک کہ اسے اپنے گھٹنوں تک لے گیا، پھر اسے رکھ دیا۔ عرض کی: اللہ کی قسم! میں چاہوں کہ میں اس سے زائد اٹھاؤں تو میں اس کو مزید اٹھا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اٹھاؤ۔ انسان نے اس کو اٹھایا یہاں تک کہ اسے ڈھاکوں تک پہنچایا۔ پھر اسے رکھ دیا کہا: اللہ کی قسم! اگر میں چاہوں کہ میں اس کو مزید اٹھاؤں تو میں اس کو مزید اٹھا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اٹھاؤ۔ انسان نے اس کو اٹھایا یہاں تک کہ اسے اپنے کندھے پر رکھا۔ جب انسان اسے رکھنے کے لیے جھکا تو انہوں نے کہا: اپنی جگہ پر ہی رہو۔ یہ امانت ہے اس پر ثواب بھی ہے اور عقاب بھی ہے۔ ہمارے رب نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اس کو اٹھائیں تو ہم اس سے ڈر گئے، تو نے اس کو اٹھالیا جب کہ تجھے اس کی دعوت بھی نہیں دی گئی تھی۔ اب یہ تیری گردن میں ہے اور قیامت تک تیری اولاد کی گردن پر ہے۔ بے شک تو ظلوم وجہول ہے۔ اور کئی واقعات صحابہ اور تابعین سے نقل کیے جن میں سے اکثر کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

**وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ** اس کے حقوق بجالانے کو لازم کرلیا وہ اس میں اپنے آپ پر ظلم کرنے والا تھا۔ قتادہ نے کہا: وہ امانت کے بارے میں ناواقف تھا کہ اس میں کیا کچھ داخل ہے! یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اپنے رب کے بارے میں ناواقف ہے۔ کہا: **حَمَلَهَا** کا معنی ہے اس میں خیانت کی۔

زجاج نے کہا: اس تاویل کی بنا پر یہ آیت کافر، منافق اور نافرمانوں کے بارے میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ان کے اصحاب، ضحاک وغیرہ نے کہا: انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں آپ نے امانت اٹھائی ایک دن بھی مکمل نہ ہوا

یہاں تک کہ ایسی نافرمانی کی جس نے اسے جنت سے نکال دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: کیا تو اس امانت کو اٹھاتا ہے جو کچھ اس میں ہے۔ عرض کی: اس میں کیا ہے؟ فرمایا: اگر تو نے اچھائی کی تو تجھے جزا دی جائے گی اگر تو نے برائی کی تو تجھے سزا دی جائے گی۔ عرض کی: اس میں جو کچھ ہے میں اسے اپنے کانوں اور کندھوں کے درمیان میں اٹھالیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ارشاد فرمایا: میں تیری مدد کروں گا، میں نے تیری آنکھ کے لیے حجاب بنایا ہے اسے اس کے لیے، بند رکھنا جو تیرے لیے حلال نہ ہو اور تیری شرمگاہ کے لیے لباس بنایا ہے اسے نہ کھولنا مگر اسی پر جو میں نے تیرے لیے حلال کیا ہے۔

ایک قوم نے کہا: انسان سے مراد تمام نوع ہے۔ یہ اچھی تعبیر ہے کہ امانت میں عموم پایا جاتا ہے، جس طرح ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ سدی نے کہا: انسان سے مراد قابیل ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ، لِيُعَذِّبَ کا لام حمل کے متعلق ہے۔ اس پر لازم کیا تاکہ عاصی کو عذاب دے اور مطیع کو ثواب دے۔ یہ لام تعلیل ہے، کیونکہ عذاب امانت اٹھانے کا نتیجہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عرضنا کے متعلق ہے یعنی ہم نے تمام پر امانت کو پیش کیا پھر ہم نے انسان کو اس کا مقلد بنا دیا تاکہ مشرک کا شرک اور منافق کا نفاق ظاہر ہو تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے اور مومن کا ایمان ظاہر ہو تاکہ اللہ تعالیٰ اسے بدلہ دے۔

وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ حضرت حسن بصری کی قراءت رفع کے ساتھ ہے یہ پہلی کلام سے الگ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں ان پر نظر کرم کرے گا۔

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، رَّحِيْمًا یہ کان کی خبر کے بعد خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ غفور کی صفت ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ضمیر سے حال ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی صحیح امر کو جانتا ہے۔

# سورۂ سبا

(اٰیاتھا ۵۴) (۳۴ سورۃ سبا مکیۃ ۵۸) (رکوعاتھا ۶)

تمام کے قول میں یہ سورت مکی ہے (1) مگر ایک آیت میں اختلاف ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ایک جماعت نے کہا: یہ مکی ہے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے مومن ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک جماعت کا قول ہے: یہ مدنی ہے (2) مومنین سے مراد جو مدینہ طیبہ میں اسلام لائے جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے مومن کوئی بھی ہو۔ اس کی چون آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ①

"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور ہر اس چیز کا جو زمین میں ہے اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آخرت میں اور وہی بڑا دانا ہر بات سے باخبر ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، الَّذِيْ محل جر میں ہے نعت ہونے کے اعتبار سے یا بدل ہونے کے اعتبار سے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا کے مضمر ہونے کے اعتبار سے محل رفع میں ہو اور اعنی کے مضمر ہونے کے اعتبار سے محل نصب میں ہو۔

سیبویہ نے یہ حکایت بیان کی ہے الحمد للہ اھل الحمد لفظ اہل رفع، نصب اور جر کے ساتھ ہے۔ کامل حمد اور ثناء شامل سب اللہ کے لیے ہے، کیونکہ تمام تر نعمتیں اس کی جانب سے ہے۔

سورۂ فاتحہ کے آغاز میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (الزمر: 74) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس) وہ آخرت میں محمود ہے جس طرح دنیا میں محمود ہے وہ آخرت کا مالک ہے جس طرح دنیا کا مالک ہے۔

وَهُوَ الْحَكِيْمُ وہ اپنے فعل میں حکیم ہے اور اپنی مخلوق کے امر کے بارے میں باخبر ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 404
2۔ ایضاً

هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝

''وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے نیز وہ جانتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا اور جو آسمان کی طرف عروج کرتا ہے اور وہی ہمیشہ رحم فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے''۔

زمین میں جو قطرہ وغیرہ داخل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ (الزمر:21) یعنی خزانے، دفینے اور مردے زمین جن کو محفوظ کرنے کی جگہ ہے۔ زمین سے جو نباتات وغیرہ اگتی ہے اسے بھی جانتا ہے۔ آسمان سے جو بارش، برف، اولے، بجلیاں، رزق، مقادیر اور برکات نازل ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے تشدید کے ساتھ وما ننزل قراءت کی ہے۔ آسمان کی طرف فرشتے اور بندوں کے جو اعمال بلند ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں بھی جانتا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے لوگوں کا قول ہے(1)۔ اور وہ رحیم وغفور ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

''اور کفار کہتے ہیں: ہم پر قیامت نہیں آئے گی آپ فرمایئے: ضرور آئے گی مجھے اپنے رب کی قسم جو عالم الغیب ہے تم پر قیامت ضرور آئے گی نہیں چھپی ہوئی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ کوئی چھوٹی چیز ذرہ سے اور نہ کوئی بڑی چیز مگر وہ کتاب مبین میں (درج) ہے (قیامت آئے گی) تاکہ اللہ تعالیٰ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، یہی وہ (نیک بخت) لوگ ہیں جن کے لیے بخشش اور رزق کریم ہے''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اہل مکہ ہیں۔ مقاتل نے کہا: ابوسفیان نے کفار مکہ سے کہا: لات وعزیٰ کی قسم! ہم پر قیامت کبھی نہیں آئے گی اور ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قل اے محمد! کہیے: بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ہارون نے طلق معلم سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے اپنے مشائخ کو پڑھتے ہوئے سنا: قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَيَاْتِيَنَّكُمْ یاء کے ساتھ۔ اسے معنی پر محمول کیا ہے، گویا کہا: تمہیں بعث اور اس کا امر ضرور آئے گا جس طرح فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ (الانعام:158) یہ کفار ابتدا کا اقرار کرتے اور اعادہ کے منکر تھے۔ انہوں نے دوبارہ اٹھانے کی قدرت کا جو اعتراف کیا تھا یہ اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: اگر وہ قادر ہے تب بھی اس طرح نہیں کرے گا۔ جب اس نے رسولوں کی زبانوں پر یہ خبر دی کہ وہ مخلوق کو دوبارہ اٹھائے گا تو اس کے بعد یہ تمہیں حکم ہے

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 315

جب خبر کسی شے کے لیے وارد ہو وہ فعل کے اعتبار سے ممکن ہو تو وہ مقدور ہو گی جس کا صدق ثابت ہو اس کی تکذیب محال ہو۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ رفع کے ساتھ قراءت نافع اور ابن کثیر کی ہے۔ یہ مبتدا ہے اس کی خبر لَا يَعْزُبُ عَنْهُ ہے۔ عاصم اور ابوعمرو نے عٰلِمِ جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو گی الحمد لله العالم اس قراءت کی بنا پر لتاتینکم پر وقف اچھا نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے علام الغیوب مبالغہ اور نعت کے طریقہ پر قراءت کی ہے۔ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ اس سے غائب نہیں ہوتا۔ ويَعْزِبُ بھی قراءت ہے۔

فراء نے کہا: کسرہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ یحییٰ بن وثاب کی قراءت ہے یہ معروف لغت ہے یوں کہا جاتا ہے: عزب یعزُب و یعزِب۔ جب وہ دور ہو جائے اور غائب ہو جائے۔ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ چھوٹی چیونٹی کے برابر۔ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اعمش کی قراءت میں ہے ولا اصغر من ذلك ولا اكبر دونوں پر فتحہ ہے اس کا عطف ذرۃ پر ہے، عام قراءت رفع کے ساتھ ہے اس کا عطف مثقال پر ہے۔ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ جو اس نے پیدا کیا اس نے جو پیدا کیا اس کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ لِيَجْزِيَ یہ لام کی کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے لتاتینکم لیجزی الذین آمنوا و عملوا الصالحات ایمان داروں اور اعمال صالحہ کرنے والوں کو ثواب اور کافروں کو عقاب دے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ مومنوں کے لیے گناہوں کی بخشش اور جنت ہے۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ⑤

''اور جو (بدبخت) کوشش کرتے رہے ہیں کہ ہماری آیتوں کو جھٹلا کر ہمیں ہرا دیں، یہی ہیں جن کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے''۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا جنہوں نے ہمارے ادلہ کو باطل کرنے اور ہماری آیات کو جھٹلانے کی کوشش کی۔ مُعٰجِزِيْنَ وہ سبقت کی کوشش کرتے ہیں، وہ گمان کرتے تھے کہ وہ ہماری قدرت سے باہر نکل جائیں گے۔ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ الله تعالیٰ آخرت میں انہیں دوبارہ اٹھانے پر قادر نہیں۔ وہ گمان کرتے تھے کہ ہم انہیں مہلت دے دیں گے۔

لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یوں کہا جاتا ہے: عاجزه و أعجزه جب اس پر غالب آ جائے اور اس پر سبقت لے جائے۔ اَلِيْمٍ کسرہ کے ساتھ نافع کی قراءت ہے۔ یہ رِّجْزٍ کی صفت ہے، کیونکہ رِّجْزٍ سے مراد عذاب ہی ہے۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (البقرہ: 59) ابن کثیر اور حفص نے حضرت عاصم سے لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ پڑھا ہے یعنی الیم پر رفع پڑھا ہے یہاں اور سورۃ الجاثیہ میں یہ عذاب کی صفت ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصن، حمید بن قیس، مجاہد اور ابوعمر نے مُعَجِّزِيْنَ قراءت کی ہے یعنی وہ لوگوں کو ایمان سے روکنے والے ہیں۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ⑥

''اور جانتے ہیں وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہی (عین) حق ہے اور عزت والے، سب خوبیوں سراہے (خدا) کا راستہ دکھاتا ہے''۔

جب ان لوگوں کا ذکر کیا جنہوں نے نبوت کو باطل کرنے کی کوشش کی تو اس امر کو واضح کیا کہ جن لوگوں کو علم دیا گیا وہ یہ جانتے ہیں کہ قرآن حق ہے۔ مقاتل نے کہا: الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد اہل کتاب میں سے مومن ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تمام مسلمان ہیں۔ یہ اپنے عموم کی وجہ سے صحیح ترین ہے۔ رویت یہ علم کے معنی میں ہے۔ یہ محل نصب میں ہے اس کا عطف لیجزی پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لیجزی ولیری؛ یہ زجاج اور فراء کا قول ہے۔ اس میں اعتراض کی گنجائش ہے، کیونکہ اس کا فرمان لِيَجْزِيَ اس کے فرمان لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ کے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا: تاکہ تمہارے اوپر قیامت آئے تاکہ اہل علم جان لیں کہ قرآن حق ہے کیونکہ وہ اسے حق ہی خیال کرتے ہیں اگرچہ قیامت برپا نہ ہو۔ صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ کے طور پر مرفوع ہے؛ قشیری نے اسے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: جب لِيَجْزِيَ اس معنی کے متعلق ہے اس نے اسے کتاب مبین میں ثابت کیا ہے تو وَيَرَى کا عطف لِيَجْزِيَ پر کرنا اچھا ہوگا، یعنی اس نے ثابت کیا تاکہ اہل علم جان لیں کہ قرآن حق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔

الَّذِيْٓ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ یَرٰی کا مفعول اول ہے۔ هُوَ الْحَقَّ، الْحَقَّ مفعول ثانی ہے۔ هُوَ ضمیر فصل ہے۔ کوفی کہتے ہیں: هُوَ ضمیر سہارا ہے۔ اس پر الَّذِيْٓ کو مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔ الْحَقّ اس کی خبر ہے جملہ مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے۔ جس میں الف لام ہو اس میں تمام نحویوں کے نزدیک نصب اکثر آتی ہے۔ اسی طرح وہ نکرہ جس پر الف لام داخل نہ ہو تو وہ معرفہ کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اگر خبر اسم معرفہ ہو جس طرح تیرا قول ہے: کان اخوك هو زيد تو فراء نے گمان کیا ہے: اس میں رفع پسندیدہ ہے۔ اسی طرح كان محمد هو عمرو ہے۔ اس کے رفع کو پسند کرنے کی علت یہ ہے جب اس میں الف لام نہیں تو یہ نکرہ کے مشابہ ہو گیا۔ تیرے قول میں ہے: كان زيد هو جالس کیونکہ اس میں رفع کے سوا کوئی چیز جائز نہیں۔

وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ قرآن اسلام کے طریقہ کی طرف دعوت دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اپنے اس ارشاد العزیز سے اس امر پر دلالت کی کہ اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا اور الْحَمِيْدِ کے قول سے اس پر دلالت ہے کہ عجز کی صفت اس کے شایان شان نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝

''اور منکرین (قیامت) کہتے ہیں: (اے یارو!) کیا ہم پتہ بتائیں تمہیں اس شخص کا جو تمہیں خبردار کرتا ہے کہ جب تم (مرنے کے بعد) ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے تو تم از سر نو پیدا کیے جاؤ گے''۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ اگر تو چاہے تو فعل کے لام کو ندلکم کے نون میں مدغم کر دے کیونکہ لام نون کا قریب المخرج ہے۔ یُنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ جس نے یہ کہا تھا لا تاتینا الساعة اس کی جانب سے ہی یہ خبر ہے۔ یعنی کیا ہم تمہیں ایسے آدمی کے بارے میں رہنمائی کریں جو تمہیں آگاہ کرے اور تمہیں کہے: تم کو قبروں میں بوسیدہ ہونے کے بعد اٹھایا جائے گا۔ یہ ان کے حد درجہ انکار کی وجہ سے کلام صادر ہو رہی ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تو یہ کہے رسول اللہ ﷺ قریش میں نام سے مشہور و معروف تھے آپ ﷺ کی جانب سے بعث کے بارے میں خبر دینا یہ مشہور و معروف تھا تو ان کے اس قول کا کیا معنی ہے؟

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ یُّنَبِّئُكُمْ انہوں نے آپ کو اجنبی کی حیثیت دی اور آپ پر رہنمائی کرتے ہوئے ان پر پیش کیا جس طرح مجہول کے بارے میں مجہول امر میں رہنمائی کی جاتی ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: وہ اس سے طنز، مزاق اور تمسخر کا ارادہ کرتے تھے تو انہوں نے اس ذات کو پیش کیا جس طرح اس آدمی کو پیش کیا جاتا ہے جس کے بارے میں حکایت کی جا رہی ہو، پہیلی کے انداز میں جس پہیلی کو ہنسی اور مذاق کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اس کے بارے میں اور اس کے معاملہ کے بارے میں جان بوجھ کر جاہل بنا دیتا ہے۔ اذا محل نصب میں ہے، اس میں عامل مُزِّقْتُمْ ہے، یہ نحاس کا قول ہے۔ اس میں یُنَبِّئُكُمْ کو عامل بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ انہیں اس وقت خبر نہیں دیتا۔ اس میں عامل ان کا مابعد بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان کے ماقبل میں عامل نہیں ہوتا۔ جس کا محل اس کا مابعد ہے اور جو اس کا معمول ہے اسے اس سے مقدم نہ کیا جائے۔ زجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ اس میں عامل محذوف ہو۔ تقدیر کلام یہ ہے: اذا مزقتم کل ممزق بعثتم یا تقدیر کلام یہ ہوگی: ینبئکم بانکم تبعثون اذا مزقتم۔

مہدوی نے کہا: مُزِّقْتُمْ اس میں عامل نہیں کیونکہ یہ مضاف الیہ ہے اور مضاف الیہ، مضاف میں عامل نہیں ہوتا۔ بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ اذا کو مجازات کے لیے بنا دیا جائے۔ اس وقت اس کا مابعد اس میں عامل ہوگا، کیونکہ اذا مابعد کی طرف مضاف نہیں۔ شعر میں اذا اکثر مجازات کے لیے آتا ہے۔ مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ کا معنی ہے تمہیں کلی طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ مزق کا معنی اشیاء کو پھاڑنا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ثوب مزیق و ممزوق و متمزق و ممزق پھٹا ہوا کپڑا۔

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِی الْعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ ۝

"یا تو اس نے (یہ کہہ کر) اللہ پر جھوٹا بہتان لگایا ہے یا یہ دیوانہ ہے (میرا حبیب نہ مفتری ہے نہ دیوانہ) بلکہ وہ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ (کل) عذاب میں اور (آج) دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں"۔

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا جب ہمزہ استفہام میں داخل ہوا تو اس نے ہمزہ وصلی سے مستغنی کر دیا تو اس کو حذف کر دیا گیا۔ ہمزہ استفہام پر فتحہ یہ ہمزہ استفہام اور ہمزہ وصلی کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ سورۂ مریم میں یہ بحث اطلع الغیب میں مفصل گزر چکی ہے۔

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 570

اَمۡ بِهٖ جِنَّةٌ اس کلام کو مشرکوں کے اس قول کی طرف پھیرا جائے گا جو پہلے گزر چکا ہے۔ مشرکوں نے کہا تھا: کیا اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو جنون کا مرض لاحق ہے۔ افتراء کا معنی بات کو گھڑنا ہے۔ اَمۡ بِهٖ جِنَّةٌ یا اس کو جنون ہے۔ وہ ایسی بات کرتا ہے جب کہ اس کو پتہ ہی نہیں۔ پھر ان کا رد کیا اور فرمایا: بَلِ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ فِی الۡعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الۡبَعِیۡدِ یعنی یہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے کہا، بلکہ وہ تو سب سچوں سے سچا ہے۔

جو بعث کا انکار کرتا ہے تو وہ کل عذاب میں ہوگا آج وہ صحیح راستہ سے گمراہ ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز قرار دینے اور افترا کی نسبت اسی ذات کی طرف کرنے والا ہو گیا ہے جس کی تائید اللہ تعالیٰ نے معجزات سے کی ہے۔

اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَیۡهِمۡ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ۟

”کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ انہیں آگے اور پیچھے سے آسمان اور زمین نے گھیر رکھا ہے اور اگر ہم چاہیں تو دھنسا دیں انہیں زمین میں یا گرا دیں ان پر چند ٹکڑے آسمان سے درحقیقت اس میں (کھلی) نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہے“۔

اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا کہ وہ ذات پاک جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ دوبارہ اٹھانے اور انہیں جلد سزا دینے پر بھی قادر ہے۔ اپنی اس قدرت کے ساتھ ان پر استدلال کیا اور یہ بتایا کہ آسمان اور زمین اس کی ملک ہیں یہ دونوں ان کو ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہیں تو وہ زمین میں دھنسائے جانے اور آسمان کا ٹکڑا گرائے جانے سے کیسے امن میں ہیں؟ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قارون اور اصحاب ایکہ کے ساتھ کیا۔ حمزہ اور کسائی نے ان یشاء یخسف بهم الارض او یسقط میں تینوں فعل یاء کے ساتھ پڑھے ہیں، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دے تو زمین ان کو دھنسا دے، آسمان کو حکم دے تو آسمان ان پر ٹکڑا گرا دے۔ باقی قراء نے نون کے ساتھ قراءت کی ہے یہ بطور تعظیم ہے۔

سلمی اور حفص نے کسفا سین کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ الاسراء اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً وہ جو ہم نے اپنی قدرت میں سے ذکر کیا ہے اس میں واضح دلالت ہے۔ لِّکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ہر ایسے بندے کے لیے جو توبہ کرنے والا ہو اور اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ منیب کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کے دلائل اور آیات میں غور و فکر کے ساتھ نفع اٹھانے والا ہے۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَهٗ وَالطَّیۡرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الۡحَدِیۡدَ ۙ۟

”بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے بڑی فضیلت بخشی (ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو! تسبیح کہو اس کے ساتھ مل کر اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا نیز لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا“۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکروں کے لیے اس امر کو بیان کیا کہ رسولوں کو بھیجنا کوئی نیا امر نہیں بلکہ ہم نے رسولوں کو مبعوث کیا اور معجزات کے ساتھ ان کی تائید کی اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی ہم نے ان پر عذاب کو نازل فرما دیا۔ آتینا فضلا ہم نے انہیں ایسا امر عطا کیا جس کے ذریعے ہم نے اسے دوسرے لوگوں پر فضیلت دی۔ اس فعل میں اختلاف ہے جس کے بارے میں نو قول ہیں: (۱) نبوت (۲) زبور (۳) علم، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: 15) (۴) قوت، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ (ص: 17) (۵) پہاڑوں اور لوگوں کو مسخر کرنا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ (سبا: 10) (۶) توبہ، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ (ص: 25) (۷) عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (ص: 26) (۸) لوہے کو نرم کرنا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ (سبا) (۹) حسن صوت، حضرت داؤد علیہ السلام اچھی آواز والے اور خوبصورت چہرے والے تھے۔ اچھی آواز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہبہ اور اس کی طرف سے فضل و احسان تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (فاطر: 1) سے یہی مراد ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ آئے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لقد أوتيت مزمارا من مزامير آل داود (1) تجھے آل داؤد کے مزامیر میں سے مزمار عطا کیا گیا ہے۔ علماء نے کہا: مزمار اور مزمور سے مراد اچھی آواز ہے اسی وجہ سے موسیقی کے آلات کو مزمار کہتے ہیں۔ مختلف شہروں کے کثیر فقہاء نے تزئین کے ساتھ اور بار بار پڑھنے کو اچھا خیال کیا ہے۔ یہ بحث کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ ہم نے کہا: اے پہاڑو! تم بھی اس کے ساتھ تسبیح بیان کرو (2)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۝ (ص) ابو میسرہ نے کہا: جنتیوں کی زبان میں اس کا معنی تسبیح کرنا ہے۔ پہاڑوں کی تسبیح سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں تسبیح پیدا کر دی جس طرح درخت میں کلام پیدا کر دی۔ اس سے بھی وہی چیز سنی جاتی ہے جو تسبیح کرنے والے سے سنی جاتی ہے۔ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے معجزہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کے ساتھ چلو جہاں وہ چاہے۔ یہ اس تاویب سے ماخوذ ہے جس سے مراد سارا دن چلنا ہے اور رات کے وقت پڑاؤ ڈالنا ہے۔ ابن مقبل نے کہا:

لَحِقنا بحيّ أوّبوا السير بعدما دفعنا شُعاع الشمس والطرف يجنح (3)

ہم ایسے قبیلہ کو جا لاحق ہوئے جو سارا دن چلتا رہا بعد اس کے سورج کی شعاعیں ہمیں دھکیل رہی تھیں اور آنکھ جھک رہی تھی۔

حضرت حسن بصری، قتادہ اور دوسرے علماء نے پڑھا: اَوِّبِيْ مَعَهٗ یعنی اس کے ساتھ تسبیح کو دہراؤ۔ یہ آب یئوب، أوبا، أوبة، إيابا سے مشتق ہے۔ جب وہ لوٹے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت داؤد علیہ السلام دن کے وقت جو کام کرتے ہیں تم

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، حسن الصوت بقراءة القرآن، جلد 2، صفحہ 755

2۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 232 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 407

بھی اس کے ساتھ وہی کرو۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام زبور کو پڑھتے تو پہاڑ بھی اس کے ساتھ آواز نکالتے اور پرندے توجہ سے سنتے گویا انہوں نے وہی کیا جو حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا۔ وہب بن منبہ نے کہا: معنی ہے تم بھی اس کے ساتھ آہ و زاری کرو اور پرندے بھی اس امر پر اس کی مدد کریں (1)۔

حضرت داؤد علیہ السلام جب آہ و زاری کرتے تو پہاڑ اس کی صدا پر آپ کو جواب دیتے اور پرندے اس کے اوپر ٹھہر جاتے۔ پہاڑوں سے صدائے بازگشت جسے لوگ سنتے ہیں وہ اس دن سے آج تک قائم ہے۔ پہاڑوں اور پرندوں کی مدد کے ساتھ ان کی تائید کی گئی تا کہ آپ اس بارے میں کوئی ضعف نہ پائیں۔ جب ضعف پیدا ہوتا آپ میں جوش پیدا ہوتا اور آپ حرکت کرتے اور پہاڑوں اور پرندوں کے وسیلہ سے قوت حاصل کرتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ایسی آواز دی گئی تھی کہ آپ کی اچھی آواز کی وجہ سے پہاڑوں کے وحشی جانور بھیڑ کر لیتے۔ جاری پانی آپ کی آواز پر چلنا رک جاتا۔ والطیر رفع کے ساتھ؛ یہ ابن ابی اسحاق، نصر کی عاصم سے، ابن ہرمز اور مسلمہ بن عبدالملک کی قراءت ہے۔ اس کا عطف الجبال کے لفظ پر ہے۔ یا اَوِّبِیْ میں جو ضمیر ہے اس پر اس کا عطف ہے۔ مع کے ساتھ فصل نے اسے حسین بنا دیا ہے۔ باقی قراء نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ یا جبال کے محل پر معطوف ہے، یعنی ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو ندا کی؛ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ ابو عمرو بن علاء کے نزدیک فعل کے مضمر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی سخرنالہ الطیر (2)۔ کسائی نے کہا: یہ معطوف ہے تقدیر کلام یہ ہے وآتیناہ الطیر بہ وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا پر محمول ہوگا۔ نحاس نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول معہ ہو تقدیر کلام یہ، ہو و مع الطیر۔

وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لوہا آپ کے لیے موم کی طرح ہو گیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ہو گیا (3)۔ حضرت داؤد علیہ السلام آگ کے بغیر اس سے چیز بناتے تھے۔ سدی نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا تر مٹی، گوندھے ہوئے آٹے اور موم کی طرح ہو گیا۔ وہ جیسے چاہتے اس کو استعمال کرتے۔ نہ آگ میں داخل کرتے اور نہ ہتھوڑا مارتے؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ آپ دن کے کچھ حصہ میں یا رات کے کچھ حصہ میں زرہ سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس زرہ کی قیمت ایک ہزار درہم ہوتی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی قوت عطا کی تھی جس کے ساتھ وہ لوہے کو دوہرا کر لیتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بادشاہ بنے تو آپ ایک فرشتہ سے ملے حضرت داؤد علیہ السلام اسے ایک انسان گمان کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا بھیس بدلا ہوا تھا آپ اس لیے نکلے تھے تا کہ اپنے بارے اور اپنی سیرت کے بارے میں خفیہ طریقہ سے بنی اسرائیل میں معلومات حاصل کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس شخص سے پوچھا جو انسان کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا: اس داؤد بادشاہ کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ فرشتے نے آپ سے کہا: وہ کتنا اچھا بندہ ہے اگر اس میں ایک بات نہ ہو۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 407
2۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 233
3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 316

حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرشتے نے کہا: وہ بیت المال سے رزق حاصل کرتا ہے اگر وہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا تو اس کے فضائل مکمل ہو جاتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام واپس آئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اسے کوئی ہنر سکھا دے اور اسے آپ پر آسان کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زرہ بنانے کا ہنر عطا کر دیا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں فرمایا، حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کر دیا گیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے زرہیں بنائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام رات اور دن کے درمیان ایک زرہ بنا لیتے جو ایک ہزار درہم کے برابر ہوتی، یہاں تک کہ آپ کے پاس کثیر مال جمع ہو گیا اور گھر کی زندگی میں وسعت آ گئی۔ آپ وہ مال فقراء اور مساکین پر صدقہ کیا کرتے تھے۔ آپ ایک تہائی مال مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کیا کرتے تھے۔ یہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے زرہ لی اور اسے بنایا۔ اس سے قبل چوڑے تختے استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ قول کیا جاتا ہے: آپ ہر زرہ چار ہزار درہم میں بیچا کرتے تھے۔ درع کا لفظ جب جنگ کے لیے استعمال ہو تو یہ مونث ہوتا ہے اور عورت کی درع مذکر ہوتی ہے۔

**مسئلہ**: اس آیت میں دلیل ہے کہ اہل فضل کو بھی ہنر سیکھنا چاہیے اور ہنر ان کے منصب میں کمی نہیں کرتا بلکہ یہ ان کے فضل اور فضائل میں زیادتی کا باعث ہوگا، کیونکہ اس طرح ان کی ذاتوں میں تواضع اور غیر سے استغناء حاصل ہوگا۔ حلال کمائی یہ احسان جتلانے سے خالی ہوتی ہے۔ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''انسان سب سے بہترین جو کھانا کھاتا ہے وہ اس کے ہاتھ کی کمائی ہوتی ہے(1)، اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے''۔ سورۃ الانبیاء میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ۖ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

''(اور حکم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (ان کے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں''۔

أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ کھلی زرہیں یعنی کامل اور وسیع۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: سبغ الدرع والثوب وغیرهما جب زرہ کا کپڑا وغیرہ ہر اس چیز کو ڈھانپ لے جس پر وہ ہے اور اس سے کچھ بچ بھی جائے۔ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ قتادہ نے کہا: زرہیں اس سے قبل تختے ہوتے تھے اور وہ سخت بھاری ہوتے، اسی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ ایسی چیز بنائیں جو ہلکی اور حفاظت کرنے والی ہو، یعنی ایسی چیز بناؤ جو ان دونوں معنوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہو۔ صرف حفاظت کا قصد نہ کریں کہ وہ بوجھل ہو جائے اور نہ ہلکی کا ارادہ کریں کہ حفاظت نہ کر سکے۔ ابن زید نے کہا: جس اندازے کا آپ کو حکم دیا گیا وہ حلقہ کی مقدار میں تھا، یعنی اسے چھوٹا نہ بنا کہ وہ کمزور ہو اور زرہ دفاع پر قادر نہ ہو اور نہ اسے بڑا بنا کہ اس کے پہننے والے تک پہنچا جا سکے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس چیز کے اندازے کے بارے میں حکم دیا گیا وہ کیل تھے، یعنی زرہ کے کیل کو باریک نہ بنائیں کہ وہ اپنی جگہ سے ہل جائے اور نہ موٹا ہو کہ حلقہ کو توڑ دے۔ اسے یقصم روایت کیا گیا ہے اور فاء کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، کسب الرجل وعملہ بیدہ، جلد 1، صفحہ 278

بھی روایت ہے۔

فِي السَّرْدِ، سرد سے مراد زرہ کے حلقہ کو بننا ہے، اسی وجہ سے زرہ کے حلقے بنانے والے کو سراد اور زراد کہتے ہیں سین کو زاء سے بدلا گیا ہے جس طرح کہا گیا ہے: سراط، زراط یہاں بھی سین کو زاء سے بدلا گیا ہے۔ سرد سے مراد ستالی سے سینا ہے۔ سَرَدَ یَسْرُدُ یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ ستالی سے سیئے۔ مسرد سے مراد ستالی ہے۔ سراد بھی کہتے ہیں۔ شماخ نے کہا:

فظلت تباعا خیلنا فی بیوتکم کما تابعت سرد العنان الخوارز

ہمارے گھوڑے تمہارے گھروں میں یوں پے در پے داخل ہوئے جس طرح گھونگے لگام کے رسی میں ہوتے ہیں۔

سراد سے مراد وہ تسمہ بھی ہے جس کے ساتھ سیا جاتا ہے۔ لبید نے کہا:

کما خرج السراد من النقال

جس طرح تسمہ پرانے موزے سے نکل جاتا ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: قد سرد الحدیث والصوم۔ ان دونوں میں سرد سے مراد ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی انداز ے میں پے در پے لائے، اسی سے سرد الکلام ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح روانی سے کلام نہیں کرتے تھے آپ اس طرح بات کرتے اگر کوئی گننے والا الفاظ گننے کا ارادہ کرتا تو انہیں شمار کر لیتا۔ سیبویہ نے کہا: اسی سے رجل سَرَنْدَی ہے جس سے مراد جری آدمی ہے۔ کہا: کیونکہ وہ آگے ہی جاتا ہے۔ اس کی اصل سرد الدرع ہے اس کا معنی ہے کہ وہ زرہ کو مضبوط بنائے اور اس کے حلقوں کا نظم پے در پے کرے مختلف نہ بنائے۔ بعید نے کہا:

صنع الحدید مضاعفا أسرادہ لینال طول العیش غیر مَرُومِ

اس نے لوہے کو بنایا کہ اس کی زرہیں تہہ در تہہ ہیں تا کہ ساری زندگی اسے پایا جائے کہ اس کا قصد نہ کیا گیا ہو۔

ابو ذؤیب نے کہا:

وعلیہما مسرودتان قضاہما داودُ أو صَنَعُ السوابغِ تُبَّعُ(1)

دونوں پر ایسی زرہیں ہیں جن دونوں کو حضرت داؤد علیہ السلام نے بنایا یا تبع بادشاہ کی بنی ہوئی ہیں۔

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا یعنی عمل صالح کرو۔ یہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے اہل کو خطاب ہے(2) جس طرح فرمایا:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا:13)

اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ۝

2۔ زاد المسیر، جلد 6، صفحہ 234

''اور ہم نے مسخر کر دی سلیمان کے لیے ہوا اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی ہوتی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی اور ہم نے جاری کر دیا ان کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ، اور کئی جن (ان کے تابع کر دیے) جو کام میں جتے رہتے ان کے سامنے ان کے رب کے اذن سے اور جو سرتابی کرتا ان میں سے ہمارے حکم (کی تعمیل) سے تو ہم اسے چکھاتے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب''۔

**وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ** زجاج نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے وسخرنا لسلیمان الریح (1)۔ عاصم نے ابو بکر کی روایت میں یہ قراءت کی ہے **الرِّيْحُ** یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے (2)۔ اس کی تعبیر یوں ہوگی: ولسلیمان تسخیر الریح۔ لسلیمان بالاستقرار الریح یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا ٹھہری ہوئی ہے۔ اس میں بھی پہلے والا معنی ہے۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: جب تو کہے، أعطیت زیدا درهما ولعمرو دینار تو تو نے دینار کو رفع دیا تو اس میں پہلے جملے کا معنی موجود نہیں، یہ جائز ہے کہ تو نے اسے دینار عطا نہ کیا ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معاملہ اسی طرح ہے لیکن آیت معنی کے اعتبار سے اس کے برعکس ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی نے بھی اسے مسخر نہیں کیا۔

**غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ** یعنی ایک ماہ کی مسافت۔ حضرت حسن بصری نے کہا: آپ دمشق میں صبح کرتے اور اصطخر کے مقام پر قیلولہ کرتے (3)۔ دونوں شہروں کے درمیان تیز رفتار مسافر کے لیے ایک ماہ کی مسافت تھی پھر آپ پچھلے پہر اصطخر سے چلتے اور کابل میں رات گزارتے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان تیز رفتار مسافر کے لیے ایک ماہ کی مسافت تھی۔ سدی نے کہا: آپ ایک دن میں دو ماہ کی مسافت طے کرتے تھے۔ سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے تھے: حضرت سلیمان علیہ السلام جب بیٹھتے تو آپ کے اردگرد چار سو کرسیاں لگا دی جاتیں پھر انسانوں میں سے رؤساء آپ کے قریب بیٹھتے اور چھوٹے درجے کے لوگ ان کے ساتھ بیٹھتے اور جنوں کے سردار چھوٹے درجے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھتے اور چھوٹے درجے کے جن ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ہر کرسی کے پاس ایک پرندہ مقرر تھا جس کے ذمہ ایسا کام ہوتا جس کو وہ پہنچاتا تھا۔ پھر ہوا انہیں اٹھا لیتی اور پرندے سورج کی شعاعوں سے انہیں سایہ دیے رہتے ہوتے۔ آپ صبح کو بیت المقدس سے اصطخر سفر کرتے اور بیت المقدس میں رات گزارا کرتے۔ پھر حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تلاوت کی۔ **غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ** وہب بن منبہ نے کہا: میرے لیے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دجلہ کے کنارے ایک منزل ہے جس میں لکھا ہوا ہے: جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک ساتھی نے لکھا ہے وہ جنوں سے تھا یا انسانوں میں سے تھا ''ہم یہاں اترے ہم نے اس کو نہیں بنایا ہم نے اس کو بنا ہوا پایا ہم اصطخر سے صبح کے وقت چلے ہم نے یہاں قیلولہ کیا ہم یہاں سے پچھلے پہر کوچ کرنے والے ہیں ان شاء اللہ اور شام میں رات گزاریں گے''۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کو گھوڑوں نے مشغول کر دیا یہاں تک کہ ان کی عصر کی نماز فوت ہوگئی۔ آپ نے گھوڑوں کی گردنیں اڑا دیں اللہ تعالیٰ نے آپ

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 234 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 317

کو اس کا بدل عطا فرمایا جو ان گھوڑوں سے بہتر اور زیادہ تیز رفتار ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہوا اس کا بدل عطا فرمایا جو آپ کے حکم سے چلتی ہے جہاں آپ چاہتے ہیں۔ آپ کا پہلے پہر کا سفر ایک ماہ کی مسافت کا ہوتا ہے اور پچھلے پہر کا سفر ایک ماہ کی مسافت کا ہوتا ہے۔

ابن زید نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کا مستقر قدم شہر میں تھا۔ آپ نے شام سے عراق کی طرف روانہ ہونے سے قبل شیاطین کو حکم دیا تو انہوں نے آپ کے لیے چوڑے باریک پتھروں اور سفید و زرد سنگ مرمر سے آپ کے لیے قیام گاہ بنا دی۔ اس کے متعلق نابغہ کہتا ہے:

إلّا سليمانَ إذ قال الإلٰه له ... قُمْ في البرِيّة فاحدُدْها عن الفَنَد

وَخَيِّس الجن إني قد أذنت لهم ... يبنون تَدْمر بالصُّفاح والعَمَد

فمن أطاعك فانفعه بطاعته ... كما أطاعك وأدْلُلْه على الرشد

ومن عصاك فعاقبه معاقبةً ... تَنْهَى الظّلومَ ولا تَقْعُد على ضَمَد

مگر سلیمان جب اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: مخلوق میں کھڑے ہو جاؤ اور اسے گناہ سے روکو، جنوں کو اپنا مطیع بناؤ میں نے انہیں حکم دے دیا ہے وہ تدمر کو بڑے چوڑے پتھروں سے بنائیں گے۔ جو تیری اطاعت کرے اس کو طاعت پر نفع دیجئے جس طرح اس نے تیری اطاعت کی اور ہدایت پر اس کی رہنمائی کیجئے۔ جو تیری نافرمانی کرے تو اس کو سزا دیجئے جو ظالم کو روک دے اور کینہ پر قائم نہ رہے۔

میں نے ان شعروں کو یشکر کے علاقہ میں ایک چٹان میں کندہ دیکھا جن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے کسی ساتھی نے کہا تھا:

ونحن ولاحولٌ سوى حول ربّنا ... نروح إلى الأوطان من أرض تَدْمُرِ

إذا نحن رُحْنا كان رَيْثُ رواحِنا ... مسيرةَ شهرٍ والغُدُوُّ لآخَرِ

أناسٌ شَرَوا لله طَوْعًا نفوسَهم ... بنصر ابن داوُدَ النبيِّ المطهَّر

لهم في معالي الدِّين فضلٌ ورفعة ... وان نُسِبُوا يومًا فمن خير مَعْشَرِ

متى يركبوا الريح المطيعةَ أسرعتْ ... مبادِرةً عن شَهْرِها لم تُقَصِّرِ

تظلّهم طيرٌ صفوفٌ عليهمُ ... متى رَفْرَفَتْ من فوقهم لم تُنَفَّرِ

ہمارے رب کی طاقت کے سوا کوئی طاقت نہیں ہم تدمر کے علاقہ سے پچھلے پہر وطن کی طرف روانہ ہوتے ہیں جب ہم چلتے ہیں تو ہمارے آرام کا وقفہ ایک ماہ کی مسافت ہوا کرتی ہے اور اگلی صبح کسی اور جگہ کے لیے ہوتی ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے خوشی خوشی اپنے نفوس اللہ تعالیٰ کے ہاں بیچ دیے ہیں ان کا مقصود حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے جو نبی مطہر ہیں کی مدد کرنا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 318

ان لوگوں کی دین کے امور میں فضیلت اور رفعت ہے۔ اگر کسی روز ان کے نسب کا ذکر کیا جائے تو یہ بہترین خاندان کے لوگ ہیں جب وہ مطیع ہوا پر سوار ہوتے ہیں تو وہ جلدی کرتی ہے وہ ایک ماہ کی مسافت تیزی سے طے کرتی ہے۔ وہ کوتاہی نہیں کرتی۔ ان پر پرندے صفیں بنا کر ان پر سایہ کرتے ہیں جب وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں تو ایک سے جدا نہیں ہوتی۔

**وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ،** قطر سے مراد پگھلا ہوا تانبا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: تین دن کی مسافت سے وہ آپ پر یوں بہتا جس طرح پانی بہتا ہے۔ وہ یمن کے علاقہ میں تھا (1)۔ روایت بیان کی گئی ہے: آپ سے قبل تانبا نہ بہا، وہ نہیں بہتا تھا۔ آپ کے زمانے سے بہا۔ لوگ آج بھی اسی تانبا سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے نکالا تھا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ جاری کر دیا جس مقصد کے لیے چاہتے اسے استعمال فرماتے۔ عکرمہ سے پوچھا گیا: وہ کہاں تک بہا؟ جواب دیا: میں نہیں جانتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سدی نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کے تانبے کا چشمہ تین دن اور تین رات بہتا رہا۔ قشیری نے کہا: تین دن تک چشمہ کے بارے میں پتہ نہیں کہ اس کی حد کیا ہے؟ ممکن ہے یہ ناقل کا وہم ہو۔ کیونکہ مجاہد سے مروی ہے: یہ چشمہ صنعاء سے تین دن کی مسافت سے بہا، یہ جگہ کی طرف اشارہ کرتا ہے مدت کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ظاہر یہ ہے کہ تانبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اپنی کان میں بہا وہ اس طرح بہتا تھا جس طرح پانی کا چشمہ بہتا تھا۔ یہ آپ کی نبوت پر دلالت تھی۔ خلیل نے کہا: قطر سے مراد پگھلا ہوا تانبا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی دلیل اس کی قراءت ہے جس نے قراءت کی من قطرٍ آنٍ۔

**وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ،** اذن سے مراد امر ہے۔ **وَ مَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا** جو حضرت سلیمان کی طاعت سے سرتابی کرتا جن امور میں ہم نے اسے حکم دیا۔ **نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ** ہم اسے آخرت میں بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھائیں گے؛ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دنیا میں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک ایسا فرشتہ مقرر کر دیا ہے جس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے سرتابی کرتا ہے تو وہ فرشتہ اسے اس کوڑے کے ساتھ ضرب لگاتا ہے جسے وہ دیکھتا نہیں تو وہ کوڑا اسے جلا دیتا ہے۔ من محل نصب میں ہے۔ معنی ہے ہم نے جنوں کو آپ کے لیے مسخر کر دیا ہے جو آپ کا کام کرتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، جس طرح الریح کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے۔

**یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾**

”وہ بناتے آپ کے لیے جو آپ چاہتے پختہ عمارتیں، مجسمے، بڑے بڑے لگن جیسے حوض ہوں اور بھاری دیگیں جو چولہوں پر جمی رہتی ہیں، اے داؤد کے خاندان والو! (ان نعمتوں پر) شکر ادا کرو اور بہت کم ہیں میرے بندوں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 437

میں سے جو شکر گزار ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَتَمَاثِیۡلَ لغت میں محراب سے مراد ہر بلند جگہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس میں نماز پڑھی جائے وہ محراب ہے، کیونکہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کو بلند کیا جائے اور اس کی تعظیم بجالائی جائے۔ ضحاک نے کہا: مِنۡ مَّحَارِیۡبَ سے مراد ہے مساجد (1)۔ قتادہ نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: محاریب یہ محلات سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: محراب سے مراد گھر کا سب سے اچھا کمرہ ہے (2)۔

شاعر نے کہا:

وما ذا علیه أن ذکرتُ أوانسًا کغزلان رَمْل فی محاریبِ أقیالِ

شعر میں محاریب اقیال سے مراد بادشاہوں کی بہترین خواب گاہیں ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف سیڑھیوں کے ذریعے بلند ہوا جاتا ہے جس طرح اچھا بالا خانہ، جس طرح فرمایا: اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ۝ (ص) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ (مریم: 11) یعنی ان پر جھانکے۔ حدیث میں آتا ہے: ''ان کو حکم دیا گیا کہ اپنی کرسی کے اردگرد ہزار عبادت گاہیں بنوائیں جن میں ہزار آدمی ہوں جن پر ٹاٹ کا لباس ہو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لگاتار آہ و زاری کرتے رہیں۔ آپ اپنے خیمہ میں کرسی پر ہوتے عبادت گاہیں آپ کے اردگرد ہوتیں جب آپ سوار ہوتے تو آپ اپنے لشکروں کو فرماتے: فلاں جگہ تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو جب وہ اس جگہ تک پہنچتے تو فرماتے: فلاں نشان تک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو۔ جب وہ اس جگہ تک پہنچتے تو فرماتے: فلاں نشان تک اللہ اکبر کہو، تمام لشکر اس طرح ایک ہی لے میں تسبیح و تہلیل کرتا رہتا''۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَتَمَاثِیۡلَ یہ تمثال کی جمع ہے اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو کسی صورت کی مثل بنایا جائے وہ حیوان ہو یا حیوان کے علاوہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا: شیشے، تانبے اور سنگ مرمر سے ایسی چیزوں کے مجسمے بنائے جاتے جو حیوان نہ ہوتے۔ یہ بھی ذکر کیا گیا: یہ انبیاء اور علماء کی تصاویر ہوتیں، عبادت گاہوں میں انہیں بنایا جاتا تا کہ لوگ انہیں دیکھیں تو وہ زیادہ عبادت کریں اور کوشش کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا جب ان میں کوئی صالح آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر وہ مسجد بنا دیتے اور اس میں صورتیں بنا دیتے تا کہ ان کی عبادت کو یاد کریں اور عبادت میں کوشش کریں'' (3)۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تصویر اس زمانہ میں مباح تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت نے اس اباحت کو منسوخ کر دیا۔ سورۂ نوح میں اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تماثیل سے مراد طلسمات تھے جن پر وہ عمل کیا کرتے تھے وہ اس چیز پر جس کی تصویر بناتے اس

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 409 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 438

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النھی عن بناء المساجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

امر کو حرام کر دیتے کہ وہ اس سے تجاوز کریں تو وہ اس سے آگے تجاوز نہ کرتے وہ مکھی، مچھر اور مگر مچھ کے لیے ایک مکان میں تمثال بناتے اور انہیں حکم دیتے کہ وہ اس سے آگے تجاوز نہ کریں تو کوئی ایک بھی اس سے تجاوز نہ کرتا جب تک وہ تمثال وہاں موجود ہوتا۔ تماثیل کی واحد تمثال ہے جو تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ کہا:

ویارُبّ یومٍ قد لھَوْتُ ولیلۃٍ	بآنسۃ کأنہا خط تمثالِ

کتنے ہی دن اور راتیں ہیں جن کو میں نے آنسہ کے ساتھ لہو ولعب میں گزرا گویا وہ تمثال کا خط ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تماثیل مرد تھے جن کو اس نے تانبے سے بنایا تھا اور اپنے رب سے سوال کیا تھا کہ ان میں روح پھونک دے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں اور ان میں اسلحہ اثر نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اسفند یار بھی ان میں سے ایک تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے دو شیر بنائے اور کرسی پر دو گدھ بنائیں۔ جب آپ کرسی پر بیٹھنے کے لیے اوپر چڑھتے تو دونوں گدھ اپنے بازو بچھا دیتے اور جب آپ بیٹھ جاتے تو دونوں گدھ اپنے پر کھول دیتے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مکی نے اپنے ''ہدایہ'' میں یہ بیان کیا ہے: ایک جماعت تصویر کو جائز قرار دیتی ہے اور اس آیت سے استدلال کرتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ غلط ہے میں نے علم کے ائمہ میں سے کسی سے یہ یاد نہیں کیا جو اس امر کو جائز قرار دیتا ہو۔

میں کہتا ہوں: مکی نے جو حکایت کی ہے اس سے پہلے نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: ایک قوم نے کہا: اس آیت کی وجہ سے تصویر بنانا جائز ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بتایا ہے۔ ایک قوم نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں نہی ثابت ہے جو آدمی اس پر عمل کرے یا اس کو بنائے اس کے لیے وعید ثابت ہے۔ جو امر پہلے مباح تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے جب کہ تصویروں کی عبادت کی جاتی تھی، زیادہ مناسب ان کو زائل کرنا ہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ تمثال کی دو قسمیں ہیں: حیوان (ذی روح) اور موات (غیر ذی روح) موات کی دو قسمیں ہیں۔ جمادات، نامی (نمو پانے والے جیسے درخت) جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ان سب کے نشان بناتے تھے کیونکہ ارشاد عام ہے۔ اسرائیلیات میں ہے کہ پرندوں کے مجسمے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر تھے۔ اگر یہ کہا جائے: وَ تَمَاثِيْلَ میں کوئی عموم نہیں، کیونکہ یہ نکرہ ہے اور کلام مثبت میں ہے۔ نکرہ جب مثبت کلام میں ہو تو اس میں عموم نہیں ہوتا۔ عموم اس وقت ہوتا ہے جب نکرہ منفی کلام میں ہو۔ ہم کہتے ہیں: بات اسی طرح ہے مگر نکرہ میں اس اثبات کے ساتھ ایسی چیز مل گئی ہے جو عموم پر حمل کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مَا يَشَآءُ اس کے ساتھ مشیئت کا ملنا اس کے عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: وہ صورتیں جن سے منع کیا گیا تھا ان کو آپ نے کیسے جائز قرار دیا؟ ہم کہیں گے: یہ ان کی شریعت میں جائز تھا اور ہماری شریعت میں یہ منسوخ ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے ابو العالیہ سے مروی ہے اس وقت تصویر بنانا حرام نہیں تھا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ احادیث کا مقتضی یہ ہے کہ تصویریں ممنوع ہیں پھر یہ حدیث آئی الا ما جاء رقما فی الثوب مرجو

کپڑے میں نقش ہو۔ تمام تصویروں سے اسے خاص کر دیا پھر اس میں کراہیت ثابت ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا: ''اس کو مجھ سے دور کر دو کیونکہ میں نے اسے جب بھی دیکھا تو مجھے دنیا یاد آ گئی'' (1)۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کپڑے کو پھاڑ دینا جس میں تصاویر تھیں جو حضرت عائشہ صدیقہ پر تھا یہ اس سے روکنا ہے۔ پھر اسے دو تکیوں کی صورت میں کاٹنا جس کے ساتھ صورت متغیر ہوگئی اور اپنی ہیئت سے خارج ہوگئی یہ جائز اس وقت ہے جب صورت متصل ہیئت میں نہ ہو اگر اس کی ہیئت متصل ہو تو پھر یہ جائز نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان تصویر والے تکیوں کے بارے میں عرض کی: میں نے یہ آپ کے لیے خریدے ہیں تا کہ آپ ان پر بیٹھیں اور ان کو تکیہ بنائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور اس پر وعید بتائی۔ تصویروں کی طرف نماز پڑھنے والی حدیث سے یہ واضح ہوا کہ کپڑے میں نقش تصویر جائز ہے پھر اس سے منع نے اسے منسوخ کر دیا۔ اور امر اس پر قرار پذیر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے: ہمارا ایک پردہ تھا جس میں پرندے کی تصویر تھی۔ گھر میں داخل ہونے والا جب داخل ہوتا تو یہ تصویر اس کے سامنے ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس کو اس جگہ سے ہٹا دو کیونکہ میں جب اندر داخل ہوتا ہوں تو اسے دیکھتا ہوں تو میں دنیا کو یاد کرتا ہوں'' (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہمارا ایک کپڑا تھا ہم کہا کرتے تھے اس پر ریشم کی تصویر ہے ہم اسے پہنا کرتے تھے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے جب کہ میں نے ایک باریک کپڑے سے پردہ کیا ہوا تھا جس میں تصویر تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا آپ نے اس کپڑے کو لیا اور اسے پھاڑا پھر فرمایا: ''قیامت کے روز جن لوگوں کو شدید ترین عذاب دیا جائے گا وہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے ساتھ مشابہت کی کوشش کرتے ہیں'' (3)۔

ان سے یہ بھی مروی ہے: ان کا ایک کپڑا تھا جس میں تصاویر تھیں جو طاق تک لٹکا ہوا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے فرمایا: ''اسے مجھ سے دور کر دو'' (4)۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: میں نے اسے وہاں سے ہٹا دیا اور میں نے اس سے دو تکیے بنا دیئے۔ بعض علماء نے کہا: یہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کپڑا پھاڑا اور اس کپڑے کو ہٹانے کا جو حکم دیا وہ تقویٰ کی بنا پر ہو، کیونکہ نبوت اور رسالت کا محل کمال ہے۔ اس میں غور و فکر کر لو۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مزنی نے امام شافعی سے روایت نقل کی ہے: اگر کسی آدمی کو شادی پر دعوت دی جائے وہ ذی روح تصویر یا تصاویر دیکھتا ہے اگر وہ کسی جگہ نصب ہیں تو وہاں داخل نہ ہو۔ اگر ان پر قدم رکھے جاتے ہیں تو کوئی حرج نہیں اگرچہ وہ درختوں کی تصاویر ہوں۔ علماء نے اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا کہ وہ پردے جو لٹکے ہوئے ہوں ان میں تصاویر مکروہ ہیں حرام نہیں۔ اس طرح ان تصاویر کی حیثیت ہے جو کسی عمارت میں کندہ کی گئی ہوں یا نقش بنائے گئے ہوں۔ بعض نے ان تصاویر کو مستثنیٰ کیا ہے جو کپڑے میں نقش ہوں کیونکہ حضرت سہل بن حنیف کی حدیث ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1602
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 200
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1601
4۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ نے تصویریں بنانے والے پر لعنت کی اور کوئی استثناء نہیں کی۔ حضور ﷺ کا ارشاد کہ ''تصویر بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا جو تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو'' (1)۔ اور کوئی استثناء نہیں کی۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: ''قیامت کے روز جہنم سے ایک گردن ظاہر ہو گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی، وہ دونوں دیکھیں گی، ان کے دو کان ہوں گے جو سنیں گے اور ایک زبان ہوگی جو بولے گی وہ کہے گی: مجھے تین قسم کے افراد پر ذمہ داری سونپی گئی ہے (۱) ہر عناد رکھنے والے جبار پر (۲) جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت کی (۳) تصویریں بنانے والے (2)۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز جن کو سب سے سخت عذاب دیا جائے گا وہ مصور ہوں گے''۔ یہ تصویر بنانے سے منع پر دال ہے تصویر کوئی بھی ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا** (النمل: 60) جس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اس کو ذہن نشین کرلو۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس باب سے بچیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی جب کہ ان کی عمر سات سال تھی۔ انہیں اپنے حرم میں داخل کیا جب کہ ان کی عمر نو سال تھی جب کہ ان کی گڑیاں ان کے ساتھ تھیں۔ حضور ﷺ کا وصال ہو گیا جب کہ ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی میری سہلیاں تھیں جو میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لاتے تو وہ آپ سے چھپ جاتیں آپ انہیں میرے پاس بھیج دیتے تو وہ لڑکیاں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ امام مسلم نے ان دونوں روایات کو نقل کیا ہے۔

علماء نے کہا: یہ ضرورت کی بنا پر تھا اور بچیوں کو بھی ان کی ضرورت تھی تا کہ انہیں اپنے بچوں کی تربیت کا تجربہ ہو جائے۔ پھر ان چیزوں کی کوئی بقا نہیں ہوتی۔ اس طرح حلوہ اور گوندھے ہوئے آٹے سے جو چیز بنائی جاتی ہے وہ بھی باقی رہنے والی نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے اس میں رخصت دی گئی۔

**وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ** ابن عرفہ نے کہا: جوابی یہ جابیہ کی جمع ہے۔ یہ حوض کی طرح گڑھا ہوتا ہے۔ کہا: جس طرح [illegible] کے حوض ہوتے ہیں۔ ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے: کالجوبة من الارض (3) معنی قریب قریب ہے۔ ایک لگن پر ہزار ہزار آدمی بیٹھتا۔ نحاس نے کہا: **وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ** صحیح تر یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ ہو۔ جس نے یاء کو حذف کیا ہے اس نے کہا: الف لام کا طریقہ یہ ہے کہ نکرہ پر داخل ہو اور اس کو اس کی حالت سے تبدیل نہ کرے۔ جب جواب کہا جاتا ہے اور اس پر الف لام داخل ہوا تو اسے اپنی حالت پر رکھا تو یاء کو حذف کر دیا گیا۔ جوابی کا واحد جابیہ ہے۔ اس سے مراد

1۔ صحیح بخاری، عذاب المصورین یوم القیمۃ، جلد 2، صفحہ 880

2۔ جامع ترمذی، باب صفۃ الجہنم، جلد 2، صفحہ 81۔ ایضاً، حدیث نمبر 2497، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1602

عظیم ہانڈی ہے اور ایسا بڑا حوض جس میں کسی شے کو جمع کیا جاتا ہے۔ اسی سے جبیت الخراج اور جبیت الجراد ہے، یعنی میں نے چادر کو پھیلایا اور اس میں مکڑیوں کو جمع کیا مگر لیث نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے کہا: الجوابی یہ جوبہ کی جمع ہے، جوبہ سے مراد بڑا گڑھا ہے جو پہاڑ میں ہوتا ہے جس میں بارش کا پانی ہوتا ہے۔ کسائی نے کہا: جبوت الماء فی الحوض و جبیتہ یعنی میں نے اسے جمع کیا۔ جابیہ ایسے حوض کو کہتے ہیں جس میں اونٹوں کے لیے پانی کو جمع کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تروح علی آل المُحَلَّقِ جَفْنَة کجابیه الشیخ العراق تَفْهَقُ

تو آل محلق پر پیالہ گھماتا ہے جس طرح شیخ عراقی کا حوض چھلک رہا ہے۔

اسے جابیۃ السیح بھی روایت کیا گیا ہے۔ سیح سے مراد روئے زمین پر ظاہر پانی ہے۔

وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ سعید بن جبیر نے کہا: یہ تانبے کی ہانڈیاں ہیں جو ایران کے علاقہ میں ہوتی ہیں۔ ضحاک نے کہا: یہ ایسی ہانڈیاں ہیں جو پہاڑوں سے بنائی جاتی ہیں۔ ایسے پہاڑ جن کے پتھر پیوست ہوتے ہیں ان میں کوئی سوراخ نہیں ہوتا ان کو تراشا گیا یہ شیاطین نے آپ کے لیے کام کیا تھا۔ ان کے چولہے بھی اسی طرح پہاڑوں سے بنائے جاتے تھے۔ راسیات کا معنی جمی ہوئی۔ نہ انہیں اٹھایا جاتا ہے اور نہ انہیں حرکت دی جاتی ہے کیونکہ وہ بڑی عظیم ہوتی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: عبداللہ بن جدعان کی ہانڈیاں بھی اسی طرح کی تھیں اور جاہلیت میں سیڑھی لگا کر ان کی طرف چڑھا جاتا۔ اسی کے متعلق طرفہ بن عبد نے کہا:

کالجوابی لاتَنِي مُتْرَعَة لِقِرَى الأضياف أو للمحتضِر(1)

ہانڈیاں جوابی (جوہڑوں) کی طرح چھلک رہی ہیں مہمانوں کی ضیافت کے لیے اور مقامی لوگوں کے لیے۔

ابن عربی نے کہا: میں نے حضرت ابوسعید کی خانقاہ میں اسی طرح کی صوفیوں کی ہانڈیاں دیکھی ہیں وہ سب پکاتے ہیں اور اکٹھے کھاتے ہیں ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں ہوتی۔

اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں شکر کا معنی گزر چکا ہے۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور اس آیت کی تلاوت کی، پھر فرمایا: ''تین چیزیں جس کو دی گئیں اس کو آل داؤد کی مثل دیا گیا'' (2)۔ میں نے عرض کی: وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا: ''خوشی اور ناراضگی میں عدل کرنا، فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرنا مخفی اور اعلانیہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا''۔

ترمذی حکیم ابوعبداللہ، عطا بن یسار سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں تیری نعمتوں پر تیرا شکر کیسے ادا کر سکتا ہوں؟ میرا الہام اور تیرے شکر پر میری قدرت یہ بھی تیری نعمت ہے۔ فرمایا: اے داؤد! اب تو نے پہچان لیا ہے۔ یہ بحث سورۂ ابراہیم میں گزر چکی ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اعتراف کیا جائے اور اس کی طاعت میں اس کو استعمال کیا جائے اور ناشکری سے مراد اسے معصیت میں استعمال کرنا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے جو ایسا کرتے ہیں، کیونکہ خیر شر سے قلیل ہے طاعت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1602
2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 811، حدیث نمبر 43224

معصیت سے قلیل ہے جس طرح پہلے ہی مقدر ہو چکا ہے۔

مجاہد نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا: اللہ تعالیٰ نے شکر کا ذکر کیا ہے تو میری جانب سے دن کی نماز کے لیے کافی ہو میں تیری جانب سے رات کی نماز کے لیے کافی ہو جاؤں گا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرض کی: میں اس پر قادر نہیں۔ فرمایا: میرے لیے کافی ہو جا۔ فریابی نے کہا: میرا خیال ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا ظہر کی نماز تک کے لیے کافی ہو جا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرض کی: ہاں۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے لیے کافی ہو گئے۔

زہری نے کہا: اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا یعنی الحمدللہ کہو۔ شکراً مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے، یعنی ایسا عمل کرو جو شکر ہو گویا نماز، روزے اور تمام عبادات فی نفسہا شکر ہے کیونکہ یہ شکر کے قائم مقام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی وضاحت کرتا ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ مَّا هُمْ (ص: 24) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ سے یہی مراد ہے۔ سفیان بن عیینہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ان اشکرلی کی تاویل میں کہا: شکر سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو قیام فرماتے یہاں تک کہ آپ کے قدم پھٹ جاتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی مشقت کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں؟ فرمایا: ''کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں''۔ امام مسلم اس کو نقل کرنے میں منفرد ہیں۔ قرآن اور سنت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ شکر ابدان کے عمل سے ہوتا ہے صرف زبان کے عمل پر مقصود نہیں۔ افعال کے ساتھ شکر ارکان کا عمل ہے اور قول کے ساتھ شکر زبان کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ یہ احتمال موجود ہے کہ خطاب آل داؤد کو ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہو۔ ابن عطیہ نے کہا: ہر صورت میں تنبیہ اور تحریض ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! مجھے قلیل میں سے بنا دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیسی دعا ہے؟ اس نے عرض کی: میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ارادہ کیا ہے: وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! تمام لوگ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام خود جو کھایا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو موٹے آٹے سے بنا کھانا کھلایا کرتے تھے اور مساکین کو باریک آٹے سے بنا کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ راکھ کھا لیا کرتے تھے اور اس پر لیٹ جاتے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ راکھ کھانا نہیں۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا آپ سے اس بارے میں عرض کی گئی تو فرمایا: میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں گا تو میں بھوکوں کو بھول جاؤں گا۔ یہ بھی شکر کی صورت ہے اور ان قلیل افراد میں سے ہونا ہے۔ اس میں غور و فکر کرو، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾

''پس جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا نہ پتہ بتایا جنات کو آپ کی موت کا مگر زمین کی دیمک نے جو کھا تا رہا آپ کے عصا کو پس جب آپ زمین پر آرہے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کو جانتے ہوتے تو (اتنا عرصہ) نہ رہتے اس رسوا کن عذاب میں''۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ جب ہم نے حضرت سلیمان علیہ اسلام پر موت کا فیصلہ کر دیا یہاں تک کہ موت ایسا امر ہو گیا جس سے فراغت ہو چکی ہوتی ہے اور اسی سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ منساۃ حبشہ کی زبان میں عصا کو کہتے ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ یمن کی لغت میں ہے؛ قشیری نے اسے ذکر کیا ہے۔ آپ اس طرح فوت ہو گئے اور آپ اسی طرح رہے کہ آپ کا حال مخفی رہا یہاں تک کہ مردہ کی حیثیت سے زمین پر گر گئے کیونکہ عصا ٹوٹ گیا تھا کیونکہ دیمک اسے کھا گئی تھی۔ اس طرح آپ کی موت کا علم ہوا۔ دیمک آپ کی موت پر دلالت کرنے والی تھی یعنی آپ کی موت کو ظاہر کرنے کا سبب تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ جن آپ کی موت سے آگاہ نہ ہوں یہاں تک کہ ان پر ایک سال گزر جائے۔ آپ نے یہ سوال کیوں کیا اس کے سبب میں دو قول ہیں: (۱) جو قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا ہے۔ کہا: جن علم غیب کا دعویٰ کرتے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور آپ کی موت ان پر مخفی ہو گئی۔

تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: آپ ایک سال تک کھڑے رہے اور جن آپ کے سامنے کام کرتے رہے یہاں تک کہ دیمک آپ کا عصا کھا گئی اور آپ گر گئے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب آپ گر پڑے تو یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ کب فوت ہوئے تو دیمک کو عصا پر چھوڑا گیا دیمک نے عصا کو دن رات کھایا۔ پھر انہوں نے حساب لگایا تو انہوں نے پایا کہ یہ ایک سال سے فوت ہو چکے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: جنوں کے سردار سات تھے۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اطاعت گزار تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس کی بنیاد رکھی تھی۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام فوت ہوئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو وصیت کی کہ وہ بیت المقدس کی مسجد کو مکمل کریں حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو اس بارے میں حکم دیا۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو آپ نے اپنے اہل سے فرمایا: جنوں کو میری موت کی خبر نہ دینا یہاں تک کہ وہ مسجد کو مکمل کر لیں اس کے مکمل ہونے میں ایک سال لگنا تھا۔

حدیث میں یہ بھی ہے کہ ملک الموت آپ کے دوست تھے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے اپنی موت کے بارے میں پوچھا۔ ملک الموت نے کہا: تیرے سجدہ کی جگہ سے ایک درخت نکلے گا جسے خرنوبہ کہتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں صبح نہ کرتے مگر بیت المقدس میں ایک درخت اگتا حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے پوچھتے: تیرا نام کیا ہے؟ درخت کہتا: میرا نام یہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پوچھتے: تو کس کام کے لیے اگایا گیا ہے؟ وہ کہتا: فلاں فلاں

کام کے لیے۔ آپ اس کے بارے میں حکم دیتے اسے وہاں سے اکھیڑ لیا جاتا اور اپنے باغ میں لگا دیتے اور آپ اس درخت کے منافع، نقصانات اس کا نام اور طب میں جس مقصد کے لیے وہ ہوتا لکھ لینے کا حکم دیتے۔ اس اثنا میں کہ ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ نے ایک درخت کو دیکھا جو آپ کے سامنے اگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے کہا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے عرض کی خرنوبہ۔ پوچھا: تو کس شے کے لیے اگایا گیا ہے؟ اس نے کہا: اس مسجد کو برباد کرنے کے لیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ اسے برباد کرے جب کہ میں زندہ ہوں تو ہی وہ درخت ہے تیرے سامنے میری ہلاکت ہوگی اور بیت المقدس کی ہلاکت ہوگی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے وہاں سے اکھاڑا اور اسے اپنے باغ میں لگا دیا پھر فرمایا: اے اللہ! جنوں سے میری موت کو چھپائے رکھنا یہاں تک کہ لوگ جان لیں کہ جن غیب نہیں جانتے۔ جن انسانوں کو بتایا کرتے کہ وہ غیب میں سے کچھ چیزوں کو جانتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کل کیا ہوگا۔ پھر اپنا کفن پہنا خوشبو لگائی اور نماز پڑھنے لگے اور اپنے تخت پر عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ آپ فوت ہو گئے اور جنوں کو علم نہ ہوا یہاں تک سال گزر گیا اور مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔

ابو جعفر نحاس نے کہا: اس آیت کے بارے میں جو قول کیا گیا ہے وہ سب سے بہترین ہے۔ اس کی صحت پر حدیث مرفوع دلالت کرتی ہے۔ ابراہیم بن طہمان، عطا بن سائب سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام جب نماز پڑھا کرتے تو اپنے سامنے ایک درخت اگتا ہوا دیکھتے آپ اس درخت سے پوچھتے: تیرا نام کیا ہے؟ اگر وہ کاشت کرنے کے لیے ہوتا تو آپ اسے کاشت کرتے اگر وہ کسی دوائی کے لیے ہوتا تو اسے لکھ لیا جاتا۔ اس اثنا میں کہ آپ ایک روز نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک درخت آپ کے سامنے اگتا ہے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: خرنوبہ۔ پوچھا: کس مقصد کے لیے تجھے اگایا گیا ہے؟ اس نے کہا: اس بیت کو برباد کرنے کے لیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے اللہ! جنوں سے میری موت کو پوشیدہ رکھنا تاکہ لوگ جان لیں کہ جن علم غیب نہیں جانتے۔ آپ نے وہاں عصا گاڑھ لیا اور اس پر ایک سال تک ٹیک لگائی وہ نہیں جانتے تھے کہ عصا گر گیا لوگوں کو علم ہو گیا کہ جن غیب نہیں جانتے انہوں نے اس کی مقدار میں غور و فکر کیا تو اسے ایک سال پایا'' (1)۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت میں ہے۔ تبینت الانس ان لو کان الجن یعلمون الغیب یعقوب نے عیسی کی قراءت میں تُبُيِّنَت الجن ہے یہ فعل مجہول ہے۔ نافع اور ابن عمر نے کہا: تاکل منساته سین اور تاء کے درمیان الف ہے ہمزہ نہیں ہے باقی قراء نے کہا: الف کی جگہ ہمزہ مفتوحہ ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ مگر ابن ذکوان نے تخفیف کے طریقہ پر ہمزہ کو ساکن کیا ہے۔

شاعر نے ہمزہ کو ترک کرتے ہوئے کہا:

إذا دَبَبْتَ علی المِنْسَاةِ من كِبَرٍ　　فقد تباعد عنك اللَّهْوُ الغَزَلُ (2)

---

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 4، صفحہ 446، حدیث نمبر 8222　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 441

جب تو بڑھاپے کی وجہ سے عصا پر رینگتا ہے تحقیق لہو اور عورتوں سے باتوں کا وقت تجھ سے دور چلا گیا۔

ایک اور شاعر نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے:

ضربنا بمنسأة وجهه فصار بذاك مهينا ذليلا

ہم نے ڈنڈے کے ساتھ اس کے چہرے کو پیٹا تو اس کے ساتھ وہ ذلیل ورسوا ہو گیا۔

نحاس نے کہا: اس کا اشتقاق اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مہموز ہے کیونکہ یہ نسأته سے مشتق ہے میں نے اسے مؤخر کیا اور اسے دھکیلا۔ اسے منسأۃ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ کسی چیز کو دھکیلا جاتا ہے اور اسے مؤخر کیا جاتا ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد عصا ہے۔ پھر قراءت کی منساۃ ہمزہ کو الف سے بدل دیا۔ اگر یہ قول کیا جائے: الف سے بدلنا بہت ہی قبیح ہے یہ شعر میں جائز ہے لیکن بعید اور شاذ ہے۔ ابو عمرو بن علاء نے کہا: اس جیسے آدمی سے اس قسم کی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ خصوصاً اہل مدینہ کی یہ قراءت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب اس کلمہ میں بدل کو استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح بولتے ہیں، جس طرح بدل اس کے علاوہ میں واقع ہوتا ہے۔ اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ ابو عمرو نے کہا: میں نہیں جانتا کہ یہ کس سے منقول ہے مگر یہ غیر مہموز ہے، کیونکہ جو مہموز ہوتا ہے بعض اوقات اس کا ہمزہ ترک کر دیا جاتا ہے مگر مہموز نہ ہو تو اس کو کسی صورت میں بھی ہمزہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہوتا۔

مہدوی نے کہا: جس نے ہمزہ ساکنہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے تو وہ شاذ اور بعید ہے، کیونکہ تانیث کی ھا نہیں ہو گی مگر اس سے قبل حرف متحرک ہوتا ہے یا اس سے پہلے الف ہوتا ہے، لیکن یہ جائز ہے کہ استخفاف کے طریقہ پر مفتوح کو ساکن کیا گیا ہو۔ یہ جائز ہے کہ جس ہمزہ کو الف سے خلاف قیاس بدلا گیا ہو تو الف کو ہمزہ سے بدل دیا جائے جس طرح انہوں نے عالم اور خاتم میں بدلا ہے۔

سعید بن جبیر سے من الگ اور سأته مہموز اور تاء کے نیچے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سئة القوس سے مشتق ہے یہ اس کی لغت میں ہے جس نے اسے ہمزہ دیا۔ رؤبہ سے سیة القوس کو ہمزہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے جوہری نے کہا: سیة القوس سے مراد وہ ہے جس کو اس کی دونوں طرفوں کی جانب سے موڑا گیا ہو۔ اس کی جمع سیات آتی ہے، ہاء واؤ کا عوض ہے۔ اس سے اسم منسوب سیوی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: رؤبہ سیة القوس کو ہمزہ دیا کرتے تھے، باقی عرب اس کو ہمزہ نہیں دیا کرتے تھے۔ دَآبَّةُ الْاَرْضِ میں دو قول ہیں: (۱) اس سے مراد دیمک ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ اسے دابة الارض راء کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یہ ارضہ کی جمع ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے (۲) یہ ایسا کیڑا ہے جو لکڑی کو کھا جاتا ہے، جوہری نے کہا: الارضہ یہ چھوٹا سا کیڑا ہے جو لکڑی کو کھا جاتا ہے یہ کہا جاتا ہے: ارضت الخشبة تورض أرضا فهي ماروضة جب اسے کھا جائے۔

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گر گئے تو جنوں کو ان کی موت کا علم ہوا۔ دوسرے علماء نے کہا: جنوں کا امر ظاہر ہوا یعنی مضاف محذوف ہے جس طرح وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اصل میں واسأل اهل القرية ہے۔

صحیح سندوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال تک کھڑے رہے ان کی موت کا علم نہیں تھا۔ آپ اپنے عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھے جن ان امور میں مصروف تھے جس کا حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں حکم دیا تھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گرے تو لوگوں کو پتہ چلا اگر جن غیب جانتے تو وہ اس ذلیل کرنے والے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قراءت تفسیر کے طریقہ پر ہے۔

حدیث میں ہے: ''جنوں نے اس پر دیمک کا شکریہ ادا کیا وہ جہاں بھی ہوتی ہے وہ اس کے پاس پانی لے آتے ہیں''۔ سدی نے کہا: وہ مٹی بھی لاتے ہیں کیا تو اس مٹی کو نہیں دیکھتا جو لکڑی کے درمیان ہوتی ہے اسے شیاطین ہی لاتے ہیں وہ دیمک کے شکریہ کے طور پر لاتے ہیں۔ جنوں نے کہا: اگر طعام اور مشروب کھائے گی تو ہ دونوں چیزیں تیرے پاس لائیں گے۔ ان محل رفع میں ہے یہ الجن سے بدل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: جنوں کا امر ظاہر ہو گیا، مضاف کو حذف کیا یعنی انسانوں کے لیے معاملہ واضح اور ظاہر ہو گیا۔ اور ان پر جنوں کا امر منکشف ہو گیا کہ وہ غیب نہیں جانتے۔ یہ بدل اشتمال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو، لام محذوف ہے۔

لَبِثُوْا وہ قائم رہے۔ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ سے مراد مسخر ہونا، بوجھ اٹھانا، عمارات تعمیر کرنا اور دوسرے معاملات۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ترپن سال زندہ رہے ان کی حکومت کا دورانیہ چالیس سال تھا۔ آپ اس وقت حاکم بنے جب آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ بیت المقدس کی تعمیر اس وقت شروع کی جب کہ ان کی عمر سترہ سال تھی۔ سدی اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر 67 سال تھی۔ آپ بادشاہ بنے جب کہ ان کی عمر سترہ سال تھی۔ آپ نے بیت المقدس کی تعمیر شروع کی جب کہ ان کی عمر بیس سال تھی ان کی بادشاہت پچاس سال رہی۔ یہ حکایت کی گئی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر شروع کی جب کہ ان کی حکومت کا چوتھا سال تھا۔ اس کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے بارہ ہزار بیل اور بیس ہزار بکریاں ذبح کیں۔ جس روز اس کی تعمیر سے فارغ ہوئے اس کو عید کے طور پر منایا اور صخرہ پر آپ کھڑے ہوئے جب کہ دعا کے لیے اپنے ہاتھ اپنے رب کے حضور اٹھائے ہوئے تھے اور دعا کی: اللّٰھم انت وھبت لی ھذا السلطان وقویتنی علی بناء ھذا المسجد اللّٰھم فاوزعنی شکرک علی ما أنعمت علیّ و توفنی علی ملتك ولا تزغ قلبی بعد اذ ھَدَیْتَنِیْ اللّٰھم إنی أسالك لمن دخل ھذا المسجد خمس خصال۔

اے اللہ! تو نے مجھے یہ حکومت عطا کی، تو نے اس مسجد کی تعمیر پر مجھے قوت عطا کی۔ اے اللہ! تو نے مجھ پر جو انعام کیا ہے اس پر شکر ادا کرنے کی مجھے توفیق عطا فرما، مجھے اپنے دین پر موت عطا کر، جب تو نے مجھے ہدایت کر دی ہے تو میرے دل کو نہ پھسلا، اے اللہ! میں تیری بارگاہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اسے پانچ چیزیں عطا فرما جو بھی اس میں داخل ہو۔

کوئی گناہگار اس میں داخل نہ ہو جو توبہ کے لیے اس میں داخل ہو مگر تو اسے بخش دے اور اس پر نظر کرم فرما، کوئی خوفزدہ داخل نہ ہو مگر تو اسے امان دے، کوئی مریض داخل نہ ہو مگر تو اسے شفا عطا کرے، کوئی فقیر داخل نہ ہو مگر تو اس کو غنی کر، جو آدمی اس میں داخل ہو تو اس سے اپنی نظر کو نہ پھیرے یہاں تک کہ وہ اس سے نکلے ہاں جو آدمی اس میں الحاد یا ظلم کا ارادہ کرے۔

اے رب العالمین! ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ روایت اس روایت سے زیادہ صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سے فراغت نہ ہوئی مگر آپ کی موت کے ایک سال بعد۔ اس کی صحت پر دلیل وہ روایت ہے جسے امام نسائی اور دوسرے علماء نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو حدیث حضرت عبدالله بن عمرو سے وہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی تو الله تعالیٰ سے تین سوال کیے۔ اپنا فیصلہ جو الله تعالیٰ کے فیصلہ کے ساتھ موافقت رکھتا ہو تو یہ آپ کو عطا کر دیا گیا (1)۔ الله تعالیٰ سے ایسی بادشاہت کا سوال کیا جو ان کے بعد کسی کے لیے روانہ ہو تو یہ بھی ان کو عطا کر دیا گیا۔ جب مسجد کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو الله تعالیٰ سے یہ التجا کی کہ اس میں کوئی آدمی نہ آئے وہ اس میں نماز پڑھنے کے لیے ہی سفر کر رہا ہو تو وہ اپنے گناہوں سے یوں نکل جائے جس طرح وہ گناہوں سے اس وقت پاک تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا''۔ ہم نے اس حدیث کا ذکر آل عمران میں کیا ہے اور سورۂ اسراء میں اس کی تعمیر کا ذکر کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ⑮

''قوم سبا کے لیے ان کے مسکن میں نشانی موجود تھی، (وہاں) دو باغ تھے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو، اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور!''۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ نافع اور دوسرے علماء نے سبا کو منصرف اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اصل میں یہ ایک آدمی کا نام تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اسی طرح واقع ہوا ہے۔ امام ترمذی نے روایت کی ابو کریب اور عبد بن حمید، ابو اسامہ سے وہ حسن بن حکم نخعی سے وہ ابو سبرہ نخعی سے وہ حضرت فروہ بن مسیک مرادی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے عرض کی: یا رسول الله! کیا میں اپنی قوم کے ان لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کروں جو پیچھے بیٹھے رہے، اپنی قوم کے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جو ان میں سے آتے ہیں (2)؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور مجھے امیر بنا دیا۔ جب میں آپ کے پاس چلا آیا تو آپ نے میرے بارے میں پوچھا: غطیفی نے کیا کیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا میں روانہ ہو چکا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پیچھے آدمی بھیجا اور مجھے واپس لوٹایا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ صحابہ کی ایک جماعت میں تھے۔ فرمایا: ''اپنی قوم کو دعوت دو اس میں سے جو مسلمان ہو جائے تو اس کا اسلام قبول کر و اور جو اسلام نہ لائے اس کے بارے میں جلدی نہ کرنا یہاں تک کہ میں تجھے نیا حکم نہ دوں''۔ کہا: تو سبا کے بارے میں آیات نازل ہوئیں جو نازل ہوئیں۔ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم یہ سبا کیا ہے یہ کوئی علاقہ ہے یا کوئی عورت ہے؟ فرمایا: ''نہ یہ علاقہ اور نہ ہی کوئی عورت ہے لیکن عربوں میں سے یہ ایسا

1۔ سنن نسائی، کتاب المساجد، فضل المسجد الاقصیٰ الصلوٰۃ فیہ، جلد 1، صفحہ 112

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ سبا، جلد 2، صفحہ 154

آدمی تھا جس کے دس بچے ہوئے ان میں سے چھ یمن کی طرف چلے گئے اور چار شام کی طرف چلے گئے۔ جو شام کی طرف گئے وہ فلخم، جذام، عسان اور عاملہ تھے اور جو یمن کی طرف گئے تو وہ ازد، اشعری، حمید، کندہ، مذجح اور انمار ہیں''۔ ایک آدمی نے کہا: انمار کون ہیں؟ فرمایا: ''جن میں سے خثعم اور بجیلہ ہیں''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے نبی کریم ﷺ سے یہی روایت نقل کی ہے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے(1)۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے لسبا غیر منصرف پڑھا ہے۔ انہوں نے اسے قبیلہ کا نام بنایا ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ انہوں نے اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ اس کے بعد فِیْ مَسْكَنِهِمْ ہے۔ نحاس نے کہا: اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح انہوں نے کہا ہے تو کلام یوں ہوتی فی مساکنھا۔ سورۃ النمل میں اس معنی سے زیادہ وضاحت گزر چکی ہے۔ ایک شاعر نے اس کو منصرف قرار دیتے ہوئے یوں کہا ہے:

الواردون وتَيْمٌ فی ذُرى سبأٍ قد عضّ أعناقهم جِلدُ الجواميس

ایک اور شاعر نے سبا کے لفظ کو غیر منصرف پڑھا ہے:

من سَبَأَ الحاضرين مأرِبَ إذ يَبْنُون من دون سَيْلها العَرِما

سبا قبیلہ سے مآرب حاضر ہونے والے ہیں کیونکہ وہ سیلاب سے بچنے کے لیے بند بناتے ہیں۔

قنبل، ابو حیوہ اور جحدری نے لسبا ہمزہ کے اسکان کے ساتھ قراءت کی ہے۔ فِیْ مَسْكَنِهِمْ عام قراءت جمع کے ساتھ ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ ان کے مسکن بہت زیادہ تھے کوئی ایک مسکن نہ تھا۔ ابراہیم، حمزہ اور حفص نے مسکنھم واحد کا صیغہ پڑھا ہے مگر انہوں نے کاف کو فتحہ دیا ہے۔ یحییٰ، اعمش اور کسائی نے اسی طرح اسے واحد پڑھا ہے مگر انہوں نے کاف کو کسرہ دیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں ساکن واضح ہے کیونکہ یہ لفظ اور معنی دونوں کو جامع ہے۔ جب تو مسکنھم کہے گا تو اس میں دو تقدیریں ہیں: (۱) یہ واحد ہو معنی جمع کا دے رہا ہو (۲) مصدر ہو جس کا نہ تثنیہ بنایا جاتا ہے اور جس کی نہ جمع بنائی جاتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ (البقرہ: 7) سمع واحد آیا ہے اسی طرح مَقْعَدِ صِدْقٍ (القمر: 55) ہے مسکن مسجد کی طرح ہے یہ قیاس سے خارج ہے۔ اس قسم کا لفظ سماع سے ثابت ہے۔ آیۃ کان کا اسم ہے یہ ایسی علامت ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دال ہے کہ ان کا ایک خالق ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور اگر تمام مخلوق جمع ہو جائے کہ لکڑی سے پھل نکالیں تو ان کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ پھلوں کی اجناس، ان کے انواع، ان کے ذائقوں، ان کی خوشبوؤں اور ان کی کلیوں کے اختلاف پر آگاہ نہ ہو سکیں۔ اس میں ایسی چیز ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ سب کچھ ایسی ذات سے ہو سکتا ہے جو عالم و قادر ہو۔

جَنَّتٰنِ یہ جائز ہے کہ یہ آیۃ سے بدل ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ اس صورت میں آیۃ پر وقف ہوگا یہ وقف تام نہ ہوگا۔ زجاج نے کہا: کلام یوں ہے الآیۃ جنتان، جنتان کو رفع اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ فراء نے کہا: یہ آیۃ کی تفسیر کی بنا پر مرفوع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ آیۃ کو نصب دی جائے کیونکہ یہ کان کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ سبا، حدیث نمبر 3146، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ تو جنتین کو خبر کی بنا پر نصب دے جب کہ وہ قرآن کے علاوہ میں ہو۔

عبدالرحمن بن زید نے کہا: وہ آیت جو اہل سبا کی ان کے مساکن میں تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے مساکن میں کبھی بھی مچھر، مکھی، پسو، جوں، بچھو، سانپ اور اس کے علاوہ کیڑے مکوڑے نہیں دیکھتے تھے (1)۔ جب کوئی قافلہ آتا ان کے کپڑے میں جوئیں وغیرہ ہوتیں جب قافلہ والے ان کے گھروں کو دیکھتے تو وہ کیڑے مکوڑے مر جاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیت یہی دو باغ تھے۔ ایک عورت ان کے درمیان چلتی جب کہ اس کے سر پر ٹوکری ہوتی، اس کے ہاتھ لگائے بغیر وہ ٹوکری بھر جاتی؛ یہ قتادہ کا قول ہے (2)۔

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ دونوں باغ یمن کے دو پہاڑوں کے درمیان تھے۔ سفیان نے کہا: ان دونوں باغوں میں دو محل تھے ان میں سے ایک پر لکھا ہوا تھا: ہم نے لگا تار ستر سالوں میں سلحین بنایا۔ دوسرے پر لکھا ہوا تھا: ہم نے اسے صرواح بنایا تھا یہ قیلولہ اور آرام کی جگہ ہے۔ ایک باغ وادی کی دائیں جانب اور دوسرا اس کی بائیں جانب تھا۔ قشیری نے کہا: جنتین سے دو باغوں کا ارادہ نہیں کیا بلکہ جنتین سے مراد دایاں اور بایاں مراد لیا ہے، یعنی ان کے شہر، باغوں، درختوں اور پھلوں والے تھے۔ لوگ ان کے سایوں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

**كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ** انہیں کہا گیا: کھاؤ۔ وہاں کوئی امر نہیں تھا بلکہ وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسولوں نے ان کو کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے مباح کیا، یعنی ان نعمتوں کو تمہارے لیے مباح کیا طاعت اختیار کر کے اس کا شکر بجا لاؤ۔ **مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ** دونوں باغوں کے پھلوں سے۔ **وَاشْكُرُوْا لَهٗ** اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ۔ **بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ** یہ نئی کلام ہے یعنی ھذہ بلدۃ طیبۃ یہ پاکیزہ شہر ہے جو بہت زیادہ پھلوں والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ شور زدہ نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پاکیزہ ہے اس میں کیڑے مکوڑے نہیں کیونکہ آب و ہوا عمدہ ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد صنعاء کا شہر ہے۔ **وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ** جو تم پر یہ انعام فرمانے والا ہے وہ رب غفور ہے وہ تمہارے گناہوں پر پردہ ڈالنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے گناہوں کی بخشش اور عمدہ شہر کے ساتھ نعمتوں کو جمع کیا تمام مخلوق کے لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مغفرت کا ذکر کیا یہ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ رزق میں بعض اوقات کوئی چیز حرام بھی ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان جتلایا کہ اس نے ان کو معاف کر دیا ایسا عذاب نہ دیا جو ان کی اصل کو ختم کر دے کیونکہ انہوں نے اس طرح تکذیب کی جس طرح سابقہ انبیاء کی لوگوں نے تکذیب کی یہاں تک کہ انہوں نے اصرار پر دوام اختیار کیا اور ان کی نسل کو ہی ختم کر دیا گیا۔

**فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ**

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 443 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 444

خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ ﴿۱۶﴾

"(اہل سبا! تمہاری خوش بختی کا کیا کہنا) پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا اور ہم نے بدل دیا ان کے دو باغوں کو ایسے دو باغوں سے جن کے پھل ترش اور کڑوے تھے اور ان میں جھاؤ کے بوٹے اور چند بیری کے درخت تھے"۔

انہوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کے رسولوں کی اتباع سے اعراض کیا۔ سدی اور وہب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اہل سبا کی طرف تیرہ رسول بھیجے تو اہل سبا نے ان کو جھٹلایا۔ قشیری نے کہا: ان کا ایک رئیس تھا جسے حمار کا لقب دیا جاتا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان فترت کے دور میں تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا ایک بیٹا تھا وہ مر گیا اس نے اپنا سر آسمان کی طرف بلند کیا اور تھوکا اور کفر کیا۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے اکفر من حمار حمار سے زیادہ کافر۔ جوہری نے کہا: ان کا قول اکفر من حمار وہ قوم عاد کا ایک آدمی تھا اس کے بچے مر گئے تو اس نے عظیم کفر کیا۔ اس کے علاقے سے کوئی آدمی نہ گزرتا مگر وہ اسے کفر کی طرف دعوت دیتا۔ اگر وہ اس کی دعوت کو قبول کرتا تو ٹھیک ورنہ وہ اسے قتل کر دیتا۔ پھر جب سیلاب ان کے باغوں کو بہا کر لے گیا تو وہ مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔ اس وجہ سے ضرب المثل ذکر کی جاتی ہے: تفرقوا أیادی سبا☆۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اوس و خزرج بھی ان میں سے ہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے اس میں عرم سے مراد بند ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے سیل السد العرم عطا نے کہا: عرم وادی کا نام ہے۔ قتادہ نے کہا: عرم سبا کی وادی ہے (1)۔ کئی وادیاں اس میں جمع ہوتیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سمندر سے اور یمن کی وادیوں سے۔ انہوں نے دو پہاڑوں کے درمیان تین بند باندھے۔ اور اس بند سے تین دروازے بنائے جو ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ وہ پہلے سب سے اونچے دروازے سے سیراب کرتے، پھر درمیانی سے پھر تیسرے سے جس قدر ان کی ضرورت ہوتی۔ ان کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا اور ان کے اموال بہت زیادہ ہو گئے۔ جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اللہ تعالیٰ نے ان پر چوہے کو مسلط کر دیا جس نے بند کو توڑ دیا۔

وہب نے کہا: وہ گمان رکھتے تھے وہ اپنے علم اور کہانت سے جانتے ہیں کہ ان کے بند کو ایک چوہا برباد کرے گا وہ دو پتھروں کے درمیان کوئی سوراخ نہیں دیکھتے تھے مگر وہاں ایک بلی باندھ دیتے تھے۔ جب وہ وقت آ گیا جس وقت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارادہ کیا تھا تو سرخ رنگ کا ایک چوہا ان بلیوں میں سے ایک بلی کے پاس آیا اس کے ساتھ سرگوشی کی تو وہ بلی اس پتھر سے پیچھے ہٹ گئی۔ پھر وہ چوہا اچھلا اور اس کے ساتھ جو تھا اس کے ساتھ اس سوراخ میں داخل ہو گیا اور اس بند میں نقب لگائی یہاں تک کہ سیلاب کے لیے اسے کمزور کر دیا جب کہ وہ نہیں جانتے تھے۔ جب وہ سیلاب آیا تو اس سوراخ میں داخل ہو گیا یہاں تک کہ اس بند تک پہنچ گیا۔ اور پانی ان کے اموال پر بہہ پڑا اور انہیں غرق کر دیا اور ان کے گھروں کو دفن کر دیا۔

زجاج نے کہا: العرم اس چوہے کا نام ہے جس نے ان پر بند میں سوراخ کیا تھا، اسے ہی خلد کہتے ہیں؛ یہ قتادہ کا بھی قول

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 238

☆ وہ ایسے بکھرے کہ اس کے بعد جمع نہ ہو سکے۔

ہے سیلاب کو اس کی طرف منسوب کیا کیونکہ سیلاب اس کے سبب سے آیا تھا۔ ابن عربی نے بھی یہ کہا ہے: یہ العرم چوہے کا نام ہے۔ مجاہد اور ابن ابی نجیح نے کہا: العرم سرخ پانی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس بند میں بھیجا جس نے اسے پھاڑ دیا اور اسے گرادیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: العرم سے مراد شدید بارش ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: العرم راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ضحاک سے مروی ہے: یہ فترت کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوران ہوا۔ عمرو بن شرحبیل نے کہا: عرم سے مراد سیلاب کو روکنے والا بند ہے؛ یہ جوہری کا قول ہے۔ کہا: اس کا لفظوں میں کوئی واحد نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا واحد عرمۃ ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: العرم ہر اس شے کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان آڑ ہے۔ اسی کو سکر کہتے ہیں۔ یہ عرمۃ کی جمع ہے۔ نحاس نے کہا: عرم اسے کہتے ہیں دو پہاڑوں کے درمیان جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اس کے سامنے مسناۃ ہوتا ہے اس کو ہی عرم کہتے ہیں۔ مسناۃ وہ چیز ہے جسے اہل مصر جسر کہتے ہیں۔ جب وہ چاہتے اس کو کھول لیتے جب ان کے باغ سیراب ہو جاتے تو وہ اسے بند کر دیتے۔

ہروی نے کہا: مسناۃ یعنی ضفیرہ جسے سیلاب کے لیے بنایا جاتا ہے تاکہ اسے روک دے۔ اسے مسناۃ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں پانی کے دروازے ہوتے ہیں۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ عرم ایک بند تھا جسے ملکہ بلقیس نے بنایا تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی زوجہ تھیں۔

حمیر کی لغت میں مسناۃ ہے ملکہ بلقیس نے اسے پتھروں اور تارکول سے بنایا تھا اس نے اس کے تین دروازے بنوائے جو اوپر نیچے تھے۔ یہ عرامہ سے مشتق ہے جس کا معنی مضبوطی ہے۔ اسی سے رجل عارم ہے، یعنی مضبوط آدمی۔ عرمت العظم أعرمه و اعرمه عرما میں نے ہڈی سے گوشت اتارا۔ اسی سے عرمت الابل الشجر یعنی اونٹ نے درخت سے کھایا۔ العرام جب ضمہ کے ساتھ ہو تو ہڈی سے اور درخت سے جس کو کھالیا گیا ہو۔ تعرمت العظم میں نے ہڈی سے گوشت کھایا۔ صبی عارم بین العرام جو بچہ بد خلق ہو۔ قد عرم یعرُم و یعرِم عرَامة والعرم العارم یہ جوہری سے مروی ہے۔

وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَیْهِمْ جَنَّتَیْنِ ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ ابو عمرو نے اکل خمط تنوین کے بغیر مضاف کی صورت میں پڑھا ہے۔ علماء تفسیر اور خلیل نے کہا: خمط سے مراد پیلو کا درخت ہے (1)۔ جوہری نے کہا: خمط سے مراد پیلوں کی ایک قسم ہے جس کا پھل کھایا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ ایسا درخت ہے جو کانٹوں والا ہو اس میں کڑواہٹ ہو۔ زجاج نے کہا: ہر ایسی بوٹی جس میں کڑواہٹ ہو جس کا کھانا ممکن نہ ہو۔ مبرد نے کہا: خمط ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اس قدر بدل جائے جس کی خواہش نہ رہے۔ دودھ کو خمط کہتے ہیں جب وہ کھٹا ہو جائے۔ ان کے نزدیک قراءت میں اولی ذواتی اکل خمط تنوین کے ساتھ ہوگی اس بنا پر کہ یہ اکل کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے کیونکہ اکل ان کے نزدیک خمط ہی ہے۔ جہاں تک اضافت کا تعلق ہے تو یہ بھی جائز ہے اس کی تقدیر کلام یہ ہوگی: ذواتی اکل حموضۃ او اکل مرارۃ۔

اخفش نے کہا: کلام عرب میں اضافت احسن ہے، جس طرح عربوں کا قول ہے: ثوب خز، خمط سے مراد کھٹا دودھ ہے۔

---

1۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 740

ابوعبید نے ذکر کیا کہ دودھ جب اس سے مٹھاس جاتی رہے اور اس کا ذائقہ نہ بدلے تو اسے سامط کہتے ہیں۔ جب اس میں کچھ بو سی پیدا ہو جائے تو وہ خامط اور خمیط ہوتا ہے۔ جب اس کا ذائقہ بھی بدل جائے تو اسے ممحل کہتے ہیں۔ جب اس میں مٹھاس کا ذائقہ ہو تو اسے فوهة کہتے ہیں☆۔ تخمط الفحل جب نر نیچے آگرے۔ تخمط فلان جب وہ غصے ہو اور تکبر کرے۔ تخمط البحر جب وہ موجزن ہو۔ خمطتُ الشاۃَ أخمِطها خمطا جب تو بکری کی جلد اتارے اور اس کو بھونے، تو یہ خمیط ہے۔ اگر تو اس کے بال اتارے اور اس کو بھونے تو یہ سمیط ہے۔

خمطہ اس شراب کو کہتے ہیں جب اس میں پکنے کی بو ہو جیسی سیب کی ہوتی ہے ابھی پکا نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: حامصنہ کہتے ہیں، یہ جوہری کا قول ہے۔ قتبی نے ادب الکاتب میں کہا: حامضة کو خمطہ کہتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے: خمطہ اسے کہتے ہیں جب اس نے کچھ بو سی پکڑ لی ہو؛ اور اس شعر کو پڑھا:

عُقارٌ کماء النّيِّ لیست بخمطة ولاخَلّةٍ یکْوِی الشُّروبَ شِهابُها

اس شعر میں خمطہ کا لفظ اس معنی میں ہے۔

واثل، فراء نے کہا: یہ طرفاء (درخت) سے مشابہ ہوتا ہے مگر لمبائی میں اس سے بڑا ہوتا ہے اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر بنایا گیا۔ اثل کا تنا مضبوط ہوتا ہے جس سے دروازے بنائے جاتے ہیں۔ اس کے پتے طرفاء درخت کے پتوں جیسے ہوتے ہیں۔ اس کی واحد اثلہ ہے جمع اثلات ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الاثل ایک مکڑی ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ لکڑی کی ایک قسم ہے جو طرفاء کے مشابہ ہوتی ہے، میں نے فید میں دیکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کیکر کا درخت ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ نضار کا درخت ہے نضار کا معنی سونا ہے اور نضار ایسی لکڑی ہے جس سے پیالے بنائے جاتے ہیں اسی سے قدح نُضار ہے۔

**وَّ شَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ** فراء نے کہا: اس سے مراد ببول کا درخت ہے؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ازہری نے کہا: سدر ایک درخت ہے اس کی دو قسمیں ہیں: خشکی والا۔ اس سے نفع حاصل نہیں کیا جاتا اس کے پتے کسی چیز کو دھونے کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کا کسیلا پھل ہوتا ہے جسے کھایا نہیں جاتا۔ اسی کو ہی ضال کہا جاتا ہے (۲) سدر جو پانی پر اگتا ہے اس کا پھل نبق ہے اس کے پتے کسی چیز کو دھونے کے کام آتے ہیں یہ عناب کے درخت کے مشابہ ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس اثناء میں کہ قوم کا درخت بہترین درخت تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے اعمال کے باعث بدترین درخت بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پھل دار درختوں کو ہلاک کر دیا اور اس کے بدلے میں اراک، طرفاء اور سدر کو اگا دیا۔ قشیری نے کہا: جنگلوں کے درختوں کو جنت اور بستان نہیں کہتے، لیکن جب دوسرا پہلے کے مقابلہ میں آئے تو اس کے لیے بھی لفظ جنت استعمال کر دیتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثۡلُهَا** (الشوریٰ: 40) یہ بھی احتمال ہے کہ قلیل کا لفظ ان کی طرف لوٹ رہا ہو جس کا پہلے ذکر ہوا جیسے خمط، اثل اور سدر۔

**ذٰلِكَ جَزَیۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا ؕ وَ هَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾**

☆ کوهة، ایسا دودھ جو تھوڑا سا متغیر ہو جائے جب کہ اس میں دودھ کی حلاوت باقی ہو شاید فوهة تصحیف ہے۔

''یہ بدلہ دیا ہم نے انہیں بوجہ انکی احسان فراموشی کے اور بجز احسان فراموش کے ہم کسے ایسی سزا دیتے ہیں''۔

یہ تبدیلی ان کے کفر کا بدلہ تھا۔ ذٰلِكَ محل نصب میں ہے یعنی جزینا ھم ذلك بکفرھم عام قراءت یجازی یاء مضموم اور زا مفتوحہ کے ساتھ ہے۔ الکفور نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یعقوب، حفص، حمزہ اور کسائی نے نون مضموم اور راء مکسور کے ساتھ اور الکفور کو نصب کے ساتھ قراءت کی ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے کہا: کیونکہ اس سے پہلے جزینا ھم ہے جوزوا نہیں کہا گیا۔ نحاس نے کہا: اس سے امر بڑا وسیع ہے اس میں معنی واضح ہے۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: خلق الله تعالیٰ آدم علیہ السلام من طین اور دوسرا کہے: خلق آدم علیه السلام من طین دونوں کا معنی تو ایک ہی ہے۔

**مسئلہ**: اس آیت میں ایک سوال ہے اس سورت میں اس سے سخت سوال نہیں وہ یہ ہے کہ کہا جائے: الله تعالیٰ نے جزا کے لیے کفور کو ہی کیوں خاص کیا ہے اور اصحاب معاصی (گناہگاروں) کا ذکر نہیں کیا۔ علماء نے اس بارے میں گفتگو کی ہے۔

ایک قول کا خیال ہے: یہ جزا جس سے مراد جڑ سے اکھیڑ دینا اور ہلاک کر دینا ہے یہ صرف کافروں کے لیے ہے۔ مجاہد نے کہا: یہاں یجازی، یعاقب کے معنی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کی خطائیں الله تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے اور کافر کو ہر برے عمل کا بدلہ دیا جاتا ہے۔

مومن کے لیے یجزی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کے لیے یجازی کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا، کیونکہ اسے بدلہ دیا جاتا ہے۔ طاؤس نے کہا: اس سے مراد حساب میں مناقشہ ہے۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے اس کے حساب میں مناقشہ نہیں ہوتا۔ قطرب نے اس کے برعکس کہا ہے۔ اور اسے کفار کے علاوہ اہل معاصی کے لیے خاص کیا ہے۔ کہا: معنی ہے جس نے نعمتوں کا انکار کیا اور گناہ کبیرہ کیے۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو سب سے عمدہ اور عظیم الشان بات کی جاتی ہے وہ وہ ہے جو اس کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ حضرت حسن بصری نے کہا: مثلا بمثل، برابر۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس کا محاسبہ کیا گیا وہ ہلاک ہو گیا'' (1)۔ میں نے عرض کی: اے الله کے نبی! الله تعالیٰ کے فرمان: فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ (الانشقاق) سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''یہ تو پیشی ہے جس کے حساب کا مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہو گیا''۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ کافر کو اس کے اعمال پر بدلہ دیا جائے گا، اس کا محاسبہ ہوگا، اس نے جو بھلائی کا عمل کیا ہوگا اس کو ختم کر دیا جائے گا۔ پہلے کے بارے میں الله تعالیٰ کا فرمان واضح کرتا ہے: ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا۔ دوسرے کے بارے میں یہ قول دلالت کرتا ہے: وَ هَلْ نُجْزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ، یجازی کا معنی ہے ہر عمل پر بدلہ دیا جائے گا۔ جزینا ھم کا معنی ہے ہم اسے پورا بدلہ دیں گے۔ یہ لغت میں حقیقی معنی ہے اگرچہ مجازی طور پر جازی، جزی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝۱۸

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، من سمع شیأ لم یفقھہ فراجعہ، جلد 1، صفحہ 21

''اور ہم نے بسادی تھیں ان کے درمیان اور ان شہروں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھ دی تھی کئی اور بستیاں سر راہ اور ہم نے منزلیں مقرر کر دی تھیں ان میں آنے جانے کی، سیر و سیاحت کرو ان میں (جب چاہو) رات یا دن کے وقت امن و امان سے''۔

**وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ الْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا قُرًى ظَاهِرَةً** حضرت حسن بصری نے کہا: یعنی یمن اور شام کے درمیان بستیاں جن میں برکت رکھ دی گئی ہے جیسے شام، اردن اور فلسطین (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: برکت جن بستیوں میں رکھی گئی تھی وہ چار ہزار سات سو دیہات تھے۔ ان کے درختوں، پھلوں اور پانی میں برکت رکھ دی گئی تھی۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ کثرت تعداد کے ساتھ ہم نے ان میں برکت رکھی ہو۔ **قُرًى ظَاهِرَةً** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد مدینہ اور شام کا درمیانی علاقہ ہے۔ قتادہ نے کہا: **ظَاهِرَةً** کا معنی ہے وہ راستہ پر متصل تھیں۔ وہ صبح چلتے اور ایک بستی میں قیلولہ کرتے پچھلے پہر چلتے تو رات ایک اور بستی میں گزارتے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: میل پر بستی تھی جس میں منڈی تھی۔ یہی راستہ کے پر امن ہونے کا سبب تھا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: عورت اپنی سلائی کے ساتھ نکلتی اور اس کے سر پر اس کی ٹوکری ہوتی اور وہ اپنی سلائی سے بنائی کرتی رہتی وہ گھر نہ آتی مگر اس کی ٹوکری ہر قسم کے پھل سے بھر جاتی (2)۔ شام اور یمن کے درمیان بھی اسی طرح کی صورت حال تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **ظَاهِرَةً** سے مراد بلند ہے: یہ مبرد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں **ظَاهِرَةً** کہا گیا ہے کیونکہ وہ ظاہر تھے، یعنی جب تو اس سے نکلے گا تو تیرے لیے دوسرا دیہات ظاہر ہو جائے گا۔ وہ بستیاں معروف تھیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھذا امر ظاھر یعنی یہ امر معروف ہے۔

**وَ قَدَّرْنَا فِیْهَا السَّیْرَ** ہم نے ان کی بستیوں اور ان بستیوں جن کو ہم نے بابرکت بنا دیا تھا کے درمیان منازل مقدر کر دیں یعنی ایک منزل سے دوسری منزل اور ایک بستی سے دوسری بستی کے درمیان مسافت مقدر کر دی تھی یعنی دو بستیوں کے درمیان ہم نے نصف یوم کی مسافت مقدر کر دی یہاں تک کہ ان کا قیلولہ ایک بستی میں اور ان کی رات دوسری بستی میں ہوتی تھی۔ انسان رفتار میں تیزی دکھاتا ہے کیونکہ اس کے پاس زاد راہ نہیں ہوتا اور نہ ہی پانی ہوتا ہے اور راستہ میں خوف بھی ہوتا ہے۔ جب زاد راہ اور امن پایا جائے تو وہ اپنی ذات پر مشقت نہیں اٹھاتا اور جہاں ارادہ ہوتا ہے وہ فروکش ہو جاتا ہے۔ **سِیْرُوْا فِیْهَا** ہم نے انہیں کہا: اس مسافت میں گھومو پھرو۔ یہ امر قدرت دینے کے بارے میں ہے۔ وہ جب بھی ارادہ کرتے تو بڑے امن سے اپنے مقاصد کی طرف چلے جاتے۔ یہ امر خبر کے معنی میں ہے۔ اس میں قول مضمر ہے۔

**لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا** دونوں ظرفیں ہیں۔ **اٰمِنِیْنَ** حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ **لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا** نکرہ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ ان کا سفر انتہائی مختصر تھا یعنی انہیں طویل سفر کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ جس چیز کی انہیں ضرورت ہوتی وہ وہاں ہی مل جاتی تھی۔ قتادہ نے کہا: وہ خوف، بھوک اور پیاس کے بغیر سفر کیا کرتے تھے (3)۔ وہ ان کے ساتھ

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 322 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 445

چار چار ماہ کا سفر کرتے وہ ایک دوسرے سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرتے اگر کوئی آدمی اپنے باپ کے قاتل کو بھی ملتا تو اسے کچھ نہ کہتا۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

''پھر وہ بولے: اے ہمارے رب! دور دراز کر دے ہماری مسافتوں کو (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا پس ہم نے انہیں افسانہ بنا دیا اور ہم نے ان (کی جمعیت) کو پارہ پارہ کر دیا (سبا کی اس داستان) میں عبرت کی نشانیاں ہیں بہت صبر، بہت شکر کرنے والے کے لیے''۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا جب انہوں نے تکبر کیا، سرکشی کی، راحت پر اکتا گئے اور امن و عافیت پر صبر نہ کیا تو انہوں نے لمبے سفر اور معیشت میں مشقت کی آرزو کی جس طرح بنی اسرائیل کا قول ہے: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا (البقرہ: 61) جس طرح نضر بن حارث نے کہا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کر لی۔ اسے انتقام کے طور پر غزوہ بدر کے موقع پر تلوار سے قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح یہ لوگ دنیا میں بکھر گئے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان اور شام کے درمیان کئی جنگلات وسیع علاقے بنا دیئے جن میں وہ سواریوں پر سوار ہو کر جاتے اور زاد راہ ساتھ رکھتے۔ عام قراءت ربنا نصب کے ساتھ ہے کہ یہ منادی مضاف ہے۔ یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول بہ ہے کیونکہ اس کا معنی ہے نادیت، دعوت۔ باعد، انہوں نے اپنے سفروں میں دوری کا سوال کیا۔

ابن کثیر، ابو عمرو، ابن محیصن اور ہشام نے ابن عامر سے ربنا قراءت نقل کی ہے اسی طرح دعا کے طریقہ پر بعّد قراءت کی یہ تبعید سے مشتق ہے۔ نحاس نے کہا: باعد، بعّد دونوں معنی میں ایک ہی ہیں جس طرح تو کہتا ہے قارب، قرّب۔ ابو صالح، محمد بن حنفیہ، ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور یعقوب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی قراءت مروی ہے۔ ربنا مرفوع ہے باعد عین اور دال کے فتحہ کے ساتھ یہ ماضی غائب کا صیغہ ہے تقدیر کلام اس طرح ہے لقد باعد ربُّنا بین اسفارنا گویا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ہم نے ان کے لیے ان کے سفروں کو قریب کر دیا تو انہوں نے تکبر کے طور پر کہا: ہم پر ہمارے سفر دور کر دیئے گئے۔ اس قراءت کو ابو حاتم نے پسند کیا ہے۔ انہوں نے سفروں کی دوری کو طلب نہیں کیا تھا انہوں نے تکبر اور اپنے کفر پر عجب کا اظہار کرتے ہوئے اس سے بھی قرب کا مطالبہ کیا۔ یحییٰ بن یعمر، عیسیٰ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے قراءت یہ ہے ربنا بعّد بین اسفارنا عین مشدد ہے الف نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہا: انہوں نے شکایت کی کہ ان کے رب نے ان کے سفروں کو دور کر دیا ہے۔ سعید بن ابی الحسن جو حضرت حسن بصری کے بھائی ہیں کی قراءت ہے ربنا بعد بین اسفارنا۔ ربنا یہ منادی مضاف ہے۔ اس کے بعد انہوں نے خبر دی اور کہا: بعد بین اسفارنا، بین کو فعل کے ساتھ رفع دیا تقدیر کلام یہ ہوئی بعد ما یتصل باسفارنا۔ فراء اور ابو اسحاق نے چھٹی قراءت روایت کی ہے جو اس کی مثل ہے جو اس سے قبل ہے۔ جس میں عین مضموم ہے۔ مگر تو بین کو ظرف کی

وجہ سے نصب دے گا۔ عربی زبان میں اس کی تقدیر یہ ہوگی بعدُ سیرُنا بین اسفارنا۔

نحاس نے کہا: ان قرائتوں کے معانی جب مختلف ہیں تو یہ کہنا جائز نہیں کہ ان میں سے ایک دوسری سے عمدہ ہے جس طرح اخبار احاد میں یہ نہیں کہا جاتا جب ان کے معانی مختلف ہیں، لیکن ان کے بارے میں خبر دی کہ انہوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ ان کے سفروں میں دوری پیدا کر دے ان کی یہ دعا سرکشی اور تکبر کے طور پر تھی۔ ان کے بارے میں یہ خبر دی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو اس کے بارے میں انہیں خبر دی گئی اور انہوں نے شکایت کی، جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔

**وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ** انہوں نے کفر اختیار کرتے ہوئے اپنے اوپر ظلم کیا۔ **فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ** ہم نے ان کو اس طرح بنا دیا کہ ان کی باتیں کی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں اس کی تقدیر ہے ذوی احادیث۔

**وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ** جب انہیں لاحق ہوا جو انہیں لاحق ہوا وہ بکھر گئے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ شعبی نے کہا: انصار یثرب آ گئے، غسان شام چلے گئے، اسد عمان چلے گئے، خزاعہ تہامہ چلے گئے عرب ان کے بارے میں مثال ذکر کرتے تھے اور کہتے: تفرقوا أیدی سبا وأیادی سبأ یعنی وہ سبا کے مذہب اور ان کے راستوں پر بکھر گئے۔ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ** صبار اسے کہتے ہیں جو معاصی سے رکتا ہے۔ یہ صابر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس اسم کے ساتھ اس کی مدح بیان کی جاتی ہے۔ اگر تو یہ ارادہ کرے کہ اس نے معصیت سے صبر کیا ہے تو اس میں استعمال نہیں کیا جاتا مگر صبار عن کذا، شکور وہ نعمتوں پر شکر بجالانے والا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے۔

## وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''اور بے شک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان سو وہ اس کی تابعداری کرنے لگے بجز مومنوں کے ایک گروہ کے جو حق پر ڈٹا رہا''۔

**وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ** اس میں چار قرائتیں ہیں۔ ابوجعفر، شیبہ، نافع، ابوعمرو، ابن کثیر اور ابن عامر، مجاہد سے بھی یہی مروی ہے انہوں نے یہ قراءت کی ہے **وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ** تخفیف کے ساتھ قراءت کی۔ ابلیس رفع کے ساتھ ظنہ نصب کے ساتھ ہے یعنی فی ظنہ۔ زجاج نے کہا: یہ مصدر کے طریقہ پر ہے، یعنی کلام یوں ہے صدق علیہم ظنا ظنہ اذ صدق فی ظنہ اسے مصدر یا ظرف کے طریقہ پر نصب دی۔ ابوعلی نے کہا: ظنہ یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول بہ ہے، یعنی شیطان نے جو گمان کیا اس کو سچ کر دکھایا جب اس نے کہا تھا: **لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ** ۝ (الاعراف) جب اس نے کہا: **لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ** ۝ (الحجر) یہ صدق فی الحدیث ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، یحییٰ بن وثاب، اعمش، عاصم، حمزہ اور کسائی نے صدق تشدید کے ساتھ اور ظنہ نصب کے ساتھ قراءت کی ہے کیونکہ اس پر فعل واقع ہوا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس نے گمان کیا تو معاملہ اس طرح ہوا جس طرح اس نے گمان کیا تو اس نے اپنے گمان کو سچ کر دکھایا۔ جعفر بن محمد اور ابوالجہجاہ نے صَدَقَ عَلَيْهِمْ تخفیف کے ساتھ، ابلیس کو نصب

اور ظنہ رفع کے ساتھ قراءت کی ہے۔

ابو حاتم نے کہا: میرے نزدیک اس قراءت کی کوئی توجیہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ فراء نے اس قراءت کو جائز قرار دیا ہے۔ زجاج نے اس کا ذکر کیا اور ظن کو صدق کا فاعل بنایا ہے اور ابلیس کو مفعول بہ بنایا ہے۔ معنی ہے ابلیس، اس کے لیے اس کے گمان نے کسی شے کو آراستہ کر کے پیش کیا تو اس کا گمان سچا ہو گیا۔ گویا کہا: ان پر ابلیس کا گمان سچ ہو گیا۔ علی صدق کے متعلق ہے، جس طرح تو کہتا ہے: صدقتُ علیك فیما ظننتُه بك میں نے تیرے بارے میں جو گمان کیا ہے تو نے اسے اپنے آپ پر سچ کر دکھایا۔ تو ظن کے متعلق نہ کر کیونکہ صلہ میں سے کسی چیز کو موصول پر مقدم کرنا محال ہے۔ چوتھی قراءت یہ ہے وَ لَقَدْ صَدَقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنُّهٗ ابلیس اور ظن دونوں مرفوع ہیں۔ صدق میں تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اس صورت میں ظنہ یہ ابلیس سے بدل ہے اور بدل اشتمال ہے پھر کہا گیا: یہ اہل سبا کے بارے میں ہے یعنی انہوں نے کفر کیا، تبدیلی کی اور بدل دیا بعد اس کے کہ وہ مومن تھے مگر ان میں سے ایک مومن جماعت تھی جو اپنے رسولوں پر ایمان لائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عام ہے یعنی ابلیس نے اپنا گمان تمام لوگوں پر سچ کر دکھایا مگر جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا ان کے ساتھ حضرت حوا تھیں اور ابلیس بھی نیچے اترا، تو اس نے کہا: جب میں نے والدین تک رسائی حاصل کر لی ہے تو اولاد تو بہت ہی کمزور ہے۔ یہ ابلیس کی جانب سے ظن تھا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کو نازل فرمایا: وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ابلیس نے کہا: میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور حضرت آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں آگ ہر شے کو جلا دیتی ہے(2)۔ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۲﴾ (الاسراء) شیطان نے اس پر اپنے گمان کو سچ کر دکھایا۔ زید بن اسلم نے کہا: ابلیس نے کہا: اے میرے رب! یہ وہ لوگ ہیں جن کو تو نے عزت بخشی انہیں شرف سے نوازا اور مجھ پر فضیلت دی تو ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں پائے گا(3)۔ یہ اس کی طرف سے ظن تھا ابلیس نے ان پر اپنا ظن سچا کر دکھایا۔

قلبی نے کہا: اس نے یہ گمان کیا تھا اگر اس نے ان کو اغوا کیا تو وہ اسے جواب دیں گے۔ اگر اس نے ان کو گمراہ کیا تو وہ اس کی اطاعت کریں گے تو اس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ فَاتَّبَعُوْهُ حضرت حسن بصری نے انہیں کہا: شیطان نے انہیں ڈنڈے اور عصا سے نہیں مارا اس نے جو گمان بھی دلایا اپنے وسوسہ ڈالنے کے ساتھ گمان دلایا(4)۔ اِلَّا فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ استثناء کے طور پر منصوب ہے۔ اس میں دو قول ہیں: اس سے بعض مومن مراد ہیں، کیونکہ کثیر مومن گناہ کرتے ہیں اور بعض معاصی میں ابلیس کی اقتدا کرتے ہیں یعنی مومنوں میں سے ایک جماعت کے سوا کوئی محفوظ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:42) سے یہی مراد ہے جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعلق ہے۔ ان سے یہ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ سب مومن ہیں، پس من بیانیہ ہے بعضیہ نہیں ہے۔ اگر یہ

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 323　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 447
3۔ ایضاً　4۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 323

سوال کیا جائے: ابلیس کو اپنے گمان کے سچا ہونے کا کیسے پتہ چلا جب کہ وہ غیب نہیں جانتا؟ اسے کہا جائے گا: جب حضرت آدم علیہ السلام میں اس کا امر نافذ ہو گیا جو نافذ ہو گیا تو اس نے گمان کیا کہ اس کی اولاد میں بھی اس کی مثل نافذ ہو جائے گا۔ اس نے جو گمان کیا تھا وہ نافذ ہو گیا۔ ایک اور جواب بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں دیا گیا: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ (الاسراء: 64) اللہ تعالیٰ نے اسے قوت اور استطاعت عطا فرمائی اس نے گمان کیا کہ وہ اس کے ذریعے ان سب کا مالک ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نظر رحمت کی اور عنقریب اس کی نسل ہوگی جو جنت تک اس کی پیروی کرے گی اور کہا: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ (الحجر) اسے علم ہو گیا کہ اس کے بھی پیروکار ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے بھی پیروکار ہیں، تو اس نے گمان کیا کہ اس کے پیروکار حضرت آدم علیہ السلام کے پیروکاروں سے زیادہ ہیں۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں میں شہوات کی قوت رکھ دی گئی اور شہوات لوگوں کے پیٹوں میں رکھ دی گئیں۔ جب اس نے ان میں پھونکا اور ان کی نظروں میں ان شہوات کو مزین کیا اور انہیں ان خواہشات کی طرف جھوٹی آرزوؤں اور دھوکوں سے آمادہ کیا تو اس نے جو گمان کیا تھا وہی نکلا تو اس نے جو گمان کیا تھا اس گمان کو ان پر سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝

"اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں) مگر یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم دکھانا چاہتے تھے کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون ان کے متعلق شک میں مبتلا ہے، اور (اے حبیب!) آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے"۔

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ابلیس نے انہیں کفر پر مجبور نہیں کیا، اس کی طرف سے تو صرف دعوت اور تزیین تھی۔ سلطان کا معنی قوت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حجت ہے، یعنی اس کے پاس کوئی ایسی حجت نہیں تھی جو ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کی اتباع کریں انہوں نے اس کی پیروی شہوت، تقلید اور خواہش نفس کی بنا پر کی، صحبت اور دلیل کی بنا پر نہ کی۔

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ اس سے مراد علم شہادت ہے جس کے ساتھ ثواب اور عقاب واقع ہوتا ہے، جہاں تک علم غیب کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ فراء کا مذہب ہے کہ معنی ہو کہ ہم اسے تمہارے پاس جانیں، جس طرح فرمایا: اَيْنَ شُرَكَآءِيَ (النحل: 27) تمہارے قول اور تمہارے ہاں جو شریک ہیں وہ کہاں ہیں۔ اِلَّا لِنَعْلَمَ یہ ظاہر میں وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ کا جواب نہیں۔ یہ معنی پر محمول ہے، یعنی ہم نے اس کے لیے سلطان نہیں بنائی مگر اس لیے کہ ہم جان لیں۔ استثناء منقطع ہے یعنی اسے ان پر کوئی تسلط اور قابو نہیں تھا لیکن ہم نے انہیں اپنے وسوسہ کے ساتھ آزمایا تا کہ ہم جان لیں۔ الا یہ لکن کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ استثناء متصل ہے، معنی ہوگا اسے ان پر کوئی قابو نہ تھا سوائے اس

کہ ہم نے اسے ان پر مسلط کیا تا کہ آزمائش مکمل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کان زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ماله علیهم من سلطان جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ (آل عمران: 110) یعنی تم بہترین امت ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب اس کی ایک طرف سبا کے قصہ کے ساتھ متصل ہے تو کہا: ابلیس کو ان کفار پر کوئی سلطان نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہمارے سابقہ فیصلہ کے مطابق اسے ان پر کوئی تسلط حاصل نہیں تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا لِنَعْلَمَ یہ الا لنظهر کے معنی میں ہے۔

یہ اس طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: النار تحرق الحطب ایک اور کہتا ہے: نہیں بلکہ الحطب یحرق النار تو پہلے کہتا ہے: آؤ تا کہ ہم آگ اور حطب کا تجربہ کریں تا کہ ہم جان لیں کون کس کو جلاتا ہے یعنی ہم اسے ظاہر کریں اگرچہ انہیں یہ معلوم ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ تم جان لو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ ہمارے اولیاء اور ملائکہ اس کو جان لیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (المائدہ: 33) یہاں بھی یہ یحاربون اولیاء اللہ ورسولہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لیعلم کا معنی لیمیز ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (الانفال: 37) یہ معنی سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں گزر چکا ہے۔ زہری نے اسے لیعلم مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ وہ بندہ کے عمل کو محفوظ رکھتا ہے تا کہ اسے بدلہ عطا کرے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

''آپ فرمائیے: (اے مشرکو!) تم پکار دیکھو جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا معبود خیال کرتے ہو یہ تو ذرہ برابر کے بھی مالک نہیں ہیں نہ آسمانوں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا زمین و آسمان میں کچھ حصہ ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے''۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ ہی وہ چیز ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے یعنی حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور سبا کے قصہ میں میری قدرت کے آثار گزر چکے ہیں۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان مشرکوں سے کہیں: کیا تم جن کو شریک بناتے ہو انہیں بھی ان چیزوں پر قدرت حاصل ہے۔ یہ خطاب توبیخ کے لیے ہے۔ اس میں کلام مضمر ہے۔ قل ادعوا الذین زعمتم انهم آلهة لكم من دون الله یعنی انہیں بلاؤ جنہیں تم معبود گمان کرتے ہو اللہ کے سوا تا کہ تمہیں نفع دیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں جو فیصلہ کیا ہوا ہے اس سے تم کو بچا سکیں وہ تو اس امر کے مالک نہیں۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ یعنی ان میں سے کوئی بھی کسی شے کو پیدا کرنے میں مددگار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا ایجاد کرنے والا ہے وہ ایسی ذات ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے اور غیر کی عبادت محال ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ

قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝

''اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لیے اس نے اجازت دی ہو یہاں تک کہ جب دور کر دی جاتی ہے گھبراہٹ ان کے دلوں سے تو پوچھتے ہیں: کیا ارشاد فرمایا تمہارے رب نے؟ وہ کہتے ہیں: اس نے حق فرمایا ہے اور وہ بڑی شان والا سب سے بڑا ہے''۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ یعنی فرشتوں اور دوسرے افراد کی شفاعت نفع نہیں دیتی۔ عندہ اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ عام قراءت اذن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ان کی شفاعت کوئی نفع نہ دے گی جن کا اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے اُذن ہمزہ کے ساتھ قراءت کی ہے یہ فعل مجہول ہے۔ آذِن اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، مَن کے متعلق تیرے لیے جائز ہے کہ تو اسے شفاعت کرنے والوں کی طرف لوٹا دے اور یہ بھی جائز ہے کہ تو اسے ان کی طرف لوٹا دے جن کی شفاعت کی جا رہی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خوف ان کے دلوں سے نکل چکا ہو۔ قطرب نے کہا: ان میں جو خوف ہے اس کو نکال دیا گیا ہو(1)۔ مجاہد نے کہا: قیامت کے روز ان کے دلوں سے پردہ ہٹا دیا گیا ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کی جاتی ہے جیسے فرشتے، انبیاء اور بت (2) ان کی شفاعت نہیں ہوگی مگر اللہ تعالیٰ انبیاء اور فرشتوں کو شفاعت کا اذن دے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے حد درجہ خوفزدہ ہوں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ (الانبیاء) اس کا معنی ہے جب انہیں شفاعت کا اذن دیا جائے گا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا کلام وارد ہوگا تو وہ گھبرا جائیں گے اس کی وجہ اس حالت میں ہولناک امر اور خوف کا ملنا ہے کہ کہیں انہیں جو اجازت دی گئی ہے اس میں ان سے کوئی کوتاہی واقع نہ ہو جائے جب خوف ان سے دور ہوگا تو وہ ان فرشتوں کو کہیں گے جو ان سے اوپر ہوں گے وہ اوپر والے فرشتے وہ ہوں گے جن پر اجازت والی وحی وارد ہوگی: مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ اللہ تعالیٰ نے کیا حکم دیا ہے؟ تو وہ کہیں گے: قَالُوا الْحَقَّ وہ امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مومنوں کی شفاعت کی اجازت دی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ اسے حق حاصل ہے وہ اپنے بندوں میں جس کا ارادہ کرے اس کا حکم دے، پھر یہ جائز ہے کہ یہ دنیا میں کچھ لوگوں کے حق میں شفاعت کا اذن ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اذن آخرت میں ہو۔ کلام میں اضمار ہے، یعنی اس کے ہاں کسی کو شفاعت کا حق نہیں مگر جسے وہ اجازت دے جب اس پر اذن وارد ہوگا اللہ تعالیٰ کے کلام کی ہیبت کی وجہ سے وہ گھبرا جائے گا یہاں تک کہ جب خوف ان کے دلوں سے دور ہو جائے گا تو وہ اطاعت کو بجا لائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آج یہ گھبراہٹ فرشتوں کے لیے ہر اس امر میں ہے جس کا رب العالمین حکم دیتا ہے، یعنی شفاعت فائدہ نہیں دے گی مگر فرشتوں کی جو آج گھبراتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ جمادات اور شیاطین کی شفاعت نفع دے گی۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 448

2۔ فرشتوں اور انبیاء کو بتوں کی صف میں کھڑا کرنا بڑا عجیب سا لگتا ہے حضرت مفسر نے کس مزاج میں آکر یہ جملہ لکھ دیا ہے۔

صحیح ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے اس کے ارشاد پر عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پروں کو حرکت دیتے ہیں(1)، گویا صاف چٹان پر زنجیر ماری جائے، جب ان کے دلوں سے خوف ختم ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ فرشتے کہتے ہیں: حق فرمایا۔ وہ بلند ہے اور بڑا ہے۔ کیا شیاطین ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔(2)

نواس بن سمعان نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جب ارادہ فرماتا ہے کہ کسی امر کے بارے میں وحی کرے تو وحی سے تکلم فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے خوف کھاتے ہوئے آسمانوں کو اس وحی کی وجہ سے اضطراب اور شدید کپکپی طاری ہو جاتی ہے، جب آسمان والے اس کو سنتے ہیں تو ان پر بجلی سی گرتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جاتے ہیں سب سے پہلے جبریل امین اپنا سر اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے کلام فرماتا ہے۔ اور جس کا ارادہ ہوتا ہے اپنے وحی سے اسے فرماتا ہے پھر جبریل امین فرشتوں کے پاس سے گزرتے ہیں جب بھی آپ کسی آسمان سے گزرتے ہیں فرشتے ان سے پوچھتے ہیں: اے جبریل! ہمارے رب نے کیا کہا ہے؟ جبریل امین وحی کے ساتھ وہاں تک جاتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہوتا ہے''(3)۔

بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: **حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ** کی تفسیر یہ نقل کی ہے۔ کہا: جنوں کی ہر جماعت کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ ہے جہاں سے وہ وحی کو سنتے ہیں جب وحی نازل ہوتی ہے تو اس کی آواز سنی جاتی ہے جس طرح چٹیل چٹان پر کوئی زنجیر گزاری جائے آسمانوں پر وہ نازل نہیں ہوتی مگر وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں جب ان کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: حق فرمایا وہ بلند اور بڑا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں: سال اس طرح ہوگا اور اس طرح ہوگا تو جن اسے سن لیتے ہیں اور وہ کاہنوں کو خبر دیتے ہیں کاہن لوگوں کو خبر دیتے ہیں کہتے ہیں: سال اس طرح ہوگا، سال اس طرح ہوگا تو وہ اسے اسی طرح پاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معبوث فرمایا تو انہیں شہابیوں کے ساتھ دھتکارا گیا۔ جب جنوں نے عربوں کو کچھ نہ بتایا تو عربوں نے کہا: آسمان میں جو ہے وہ ہلاک ہو گیا تو اونٹوں والا ہر روز ایک اونٹ ذبح کرتا اور گائیوں والا ہر روز ایک گائے ذبح کرتا اور بھیڑ بکریوں والا ہر روز ایک بکری ذبح کرتا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اموال میں جلدی کی۔ ثقیف نے کہا جو عربوں میں سے سب سے زیادہ دانش مند تھے: اے لوگو! اپنے اموال کو روک لو، کیونکہ آسمان میں جو ہے وہ مرا نہیں۔ بے شک یہ نظام کا درہم برہم ہونا نہیں۔ کیا تم ستاروں میں سے اپنی نشانیوں کو نہیں دیکھتے وہ اس طرح ہیں سورج، چاند، رات اور دن۔ ابلیس نے کہا: آج زمین میں کوئی واقعہ ہوا ہے، میرے پاس ہر علاقہ سے مٹی لاؤ تاکہ میں اس کو سونگھوں۔ وہ اس کے پاس ہر علاقہ کی مٹی لائے وہ ہر مٹی کو سونگھنے لگا۔ جب اس نے مکہ مکرمہ کی مٹی سونگھی۔ اس نے کہا: یہاں وہ واقعہ ہوا ہے، وہ خاموش ہو گئے تو

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ سبا، جلد 2، صفحہ 154 2۔ ایضاً، باب و من سورۃ سبا، حدیث نمبر 3147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 109

کیا معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے تھے۔ سورۂ حجر میں یہ معنی مرفوع حدیث سے مختصر انداز میں گزر چکا ہے۔
جنوں کو شہابیوں سے مارنے اور انہیں جلانے کا واقعہ بھی گزر چکا ہے۔ سورۃ الجن میں اس کی وضاحت آئے گی۔ ان شاء اللہ

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قیامت کے برپا ہونے پر خوفزدہ ہو جائیں گے۔ کلبی اور کعب نے کہا: حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما السلام کے درمیان پانچ سو پچاس سال کا عرصہ فترت کا دور ہے اس میں رسل تشریف نہ لائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کے ساتھ رسالت کے بارے میں کلام فرمایا۔ جب فرشتوں نے کلام کو سنا تو انہوں نے گمان کیا کہ قیامت برپا ہوگئی ہے۔ وہ وحی سن کر بے ہوش ہو گئے۔ جب حضرت جبریل امین نیچے آئے تو ہر آسمان کے پاس سے گزرتے تو ان سے پردہ کو ہٹاتے وہ اپنے سروں کو اٹھاتے اور ایک دوسرے سے کہتے: تمہارے رب نے کیا کہا؟ وہ نہ جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا، لیکن انہوں نے کہا: حق فرمایا وہ بلند اور بڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آسمان والوں کے ہاں قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔

ضحاک نے کہا: وہ فرشتے جو اہل زمین کی طرف آگے پیچھے آتے ہیں وہ لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں بھیجتا ہے۔ جب وہ نیچے آتے ہیں تو ان کی شدید آواز سنی جاتی ہے وہ فرشتے جو نیچے ہوتے ہیں وہ پھر گمان کرتے ہیں کہ قیامت کا حکم ہو گیا ہے، وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ انہیں علم ہو جاتا ہے کہ یہ قیامت کا امر نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ ہے اور اس بات کی خبر دینا ہے کہ فرشتے مخلوقات میں سے چنے ہوئے ہونے کے باوجود اور مقام کی رفعت کے باوجود وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ کسی کے حق میں شفاعت کریں یہاں تک کہ انہیں اجازت دی جائے۔ جب انہیں اجازت دی جاتی ہے اور وہ سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کا حال ہوتا ہے تو بت کیسے شفاعت کریں گے اور تم کیسے شفاعت کی امید رکھتے ہو جب کہ تم قیامت کا اعتراف نہیں کرتے؟

حضرت حسن بصری، مجاہد اور ابن زید نے کہا: جب مشرکوں کے دلوں سے خوف ختم ہو جائے گا یہ آخرت میں موت کے نازل ہونے کے وقت ہوگا یہ اتمام حجت کے لیے ہوگا(1)۔ فرشتے انہیں کہیں گے: دنیا میں تمہارے رب نے کیا کہا؟ تو وہ کہیں گے: حق فرمایا، وہ بلند اور بڑا ہے۔ انہوں نے اس وقت اقرار کیا جب اقرار انہیں کوئی نفع نہیں دے گا، یعنی وہ کہیں گے اس نے حق فرمایا۔ عام قراءت فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا فَزَّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا فاعل ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسم کی طرف لوٹتی ہے۔ جس نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے تو اس صورت میں جار اور مجرور محل رفع میں ہوں گے۔ فعل معنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا۔ دونوں قراءتوں کی صورت میں معنی ہے گھبراہٹ ان کے دلوں سے دور کر دی جائے گی۔ جس طرح وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

اسی کی مثل اَشْکَاہ ہے جب اس نے اس چیز کو زائل کیا جس کی وہ شکایت کرتا تھا۔ حضرت حسن بصری نے قراءت کی فُزِعَ یہ عام قراءت کی مثل ہے مگر زاء میں تخفیف کی گئی ہے۔ جار اور مجرور محل رفع میں ہے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے:

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 324

انصرف عن کذا إلی کذا، إنصرف فعل کو معروف اور مجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔اسی طرح فزع راء اور غین معجمہ تخفیف کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھتے ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ سے یوں مروی ہے اور ان دونوں سے فرغ راء اور غین معجمہ کے ساتھ معروف کا صیغہ بھی مروی ہے۔ معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے خوف کو دور فرما دیا۔ اسی طرف مجہول کی قراءت بھی لوٹتی ہے۔ حضرت حسن بصری سے فرغ تشدید کے ساتھ بھی قراءت مروی ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''آپ فرمایئے: کون روزی دیتا ہے تمہیں آسمانوں اور زمین سے، خود ہی فرمایئے: اللہ، اور ہم یا تم (دونوں میں سے ایک) ہدایت پر ہے اور (دوسرا) کھلی گمراہی میں ہے''۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جب اس امر کا ذکر کیا کہ ان کے معبود ذرہ برابر اس چیز کے مالک نہیں جس پر رب قادر ہے اس امر کو موکد بیان کیا فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں سے کہو: مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمان سے یعنی بارش، سورج، چاند، ستاروں اور ان سے جو رزق اور منافع حاصل ہوتے ہیں انہیں کون پیدا فرماتا ہے وَالْاَرْضِ اور وہ رزق جو زمین سے یعنی پانی اور نباتات سے نکلتے ہیں ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ یہ کہیں: یہ ہمارے معبودوں کا فعل ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم نہیں جانتے، تو فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ کرتا ہے وہ تمہارے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔ اگر وہ کہیں: اللہ تعالیٰ ہمیں رزق بہم پہنچاتا ہے، تو دلیل ثابت ہوئی کہ اس ذات کی عبادت کی جانی چاہیے۔

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یہ دلیل میں انصاف کے طریقہ پر ہے، جس طرح کوئی کہنے والا کہتا ہے: أحدنا کاذب ہم میں سے کوئی جھوٹا ہے جب کہ وہ جانتا ہے کہ وہ سچا ہے اور اس کا ساتھی جھوٹا ہے۔ معنی ہے ہم اور تم ایک امر پر نہیں بلکہ متضاد امور پر ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت ہدایت کی پابند ہے اور دوسری گمراہی پر ہے اور وہ تم ہو، تو صراحۃ جھٹلانے سے احسن انداز میں ان کو جھٹلا دیا۔ معنی ہے تم گمراہ ہو جب تم نے اس ذات کے ساتھ شرک کیا جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہے۔ اَوْ اِيَّاكُمْ یہ ان کے اسم پر معطوف ہے۔ اگر اس کا عطف اس کے محل پر ہوتا تو یہ أو انتم ہوتا لَعَلٰى هُدًى یہ اوّل کے لیے ہوگا غیر کے لیے نہیں ہوگا۔ جب تو کہے: أو ایاکم تو دوسرے کے لیے یہ اولیٰ ہے اور اوّل سے حذف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ پہلے کے لیے ہو؛ یہ مبرد کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ اس کا معنی ایسے ہی ہوگا جس طرح صاحب بصیرت اپنے ساتھی کو وعید کی صحت اور واضح حجت کو ظاہر کرنے کے لیے کہتا ہے: أحدنا کاذب جب کہ معنی معروف ہے۔

جس طرح تو کہتا ہے: انا افعل کذا و تفعل أنت کذا و أحدنا مخطئ میں ایسا کرتا ہوں اور تو ایسا کرتا ہے اور ہم میں سے ایک غلطی کرنے والا ہے جب کہ یہ معروف ہے کہ وہ خطاکار ہے۔ اسی طرح یہ کلام ہے: وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ، او بصریوں کے نزدیک اپنے اصلی معنی میں ہے۔ یہ شک کے لیے نہیں، لیکن یہ جس طرح عرب استعمال کرتے ہیں اس قسم کے کلام میں اس معنی میں استعمال ہوتا ہے جب مخبر یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ وضاحت کرے جب کہ وہ معنی کو جانتا ہے۔

ابوعبیدہ اور فراء نے کہا: یہ او، واؤ کے معنی میں ہے اس کی تقدیر یہ ہے انا علی هدی وایاکم فی ضلال مبین (1) جریر نے کہا:

أثعلبة الفوارس أو رياحًا عدلْتَ بهم طَهَيَّةَ والرَّبابا

اس شعر میں أو ریاحًا، و ریاحا کے معنی میں ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فلما اشتد أمر الحرب فينا تأملنا رياحا أو رِزاما

جب جنگ کا معاملہ ہمارے درمیان سخت ہوا تو ہم نے ہواؤں اور جنگجو لوگوں کی امید کی۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۵

''فرمایئے: تم سے باز پرس نہیں ہوگی ان جرموں کی جو ہم نے کیے اور نہ ہم سے باز پرس ہوگی تمہارے کرتوتوں کی''۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا یعنی جو ہم نے جرم کیے ہیں وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور جو تم کرتے رہے ان کے بارے میں ہم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ جس امر کی طرف میں تمہیں دعوت دوں گا اس میں تمہارے بارے میں بھلائی کا ارادہ کرتا ہوں نہ کہ مجھے تمہارے کفر کا ضرر پہنچے گا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ (الکافرون) اللہ تعالیٰ سب کو بدلہ دینے والا ہے۔ یہ آیت ایک دوسرے معاملہ کو ترک کرنے اور صلح پر دال ہے۔ یہ آیت آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت آیت سیف سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۗ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ۝۲۶

''فرمایئے: ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر وہ فیصلہ کرے گا ہمارے درمیان حق (وانصاف) کے ساتھ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا مراد یوم قیامت ہے۔ ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وہ فیصلہ فرمائے گا ہدایت یافتہ کو ثواب عطا فرمائے گا اور گمراہ کو سزا دے گا۔ وَهُوَ الْفَتَّاحُ وہ حق کے ساتھ فیصلہ فرمانے والا ہے۔ الْعَلِيْمُ وہ مخلوق کے احوال سے آگاہ ہے۔

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۷

''فرمایئے: مجھے بھی دکھاؤ تو وہ شریک جنہیں تم نے اللہ کے ساتھ ملا دیا ہے ہرگز ایسا نہیں، بلکہ فقط وہی اللہ ہے جو زبردست بڑا دانا ہے''۔

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ یہاں أرونی رویت قلب سے تعلق رکھتا ہے۔ شرکاء مفعول ثالث ہوگا، یعنی مجھے اصنام اور اوثان کی پہچان تو کراؤ جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا ہے۔ کیا وہ کسی شے کی تخلیق میں شریک ہیں پس بیان کرو وہ کیا ہیں؟ ورنہ تم کیوں ان کی عبادت کرتے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ رویت بصر سے ہو تو پھر شرکاء حال ہوگا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 449

كَلَّا معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم گمان کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: كَلَّا ان کے محذوف جواب کا رد ہے۔ گویا فرمایا: مجھے وہ دکھاؤ جن کو تم نے ان کا شریک بنایا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ اصنام ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہرگز نہیں یعنی اس کے شریک نہیں۔ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشیر اور نذیر بنا کر، لیکن (اس حقیقت کو) اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور وہ کہتے ہیں: کب پورا ہوگا یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔ فرمایئے: (اے منکرو!) تمہارے لیے وعدہ کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ (ایک لحہ) آگے بڑھ سکو گے''۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ زجاج نے کہا: مراد ہے ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر انذار اور ابلاغ کے ساتھ تمام لوگوں کو جمع کرنے والا۔ کافۃ یہ جامع کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام لوگوں کو روکنے والا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کفر سے روکنے والے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ ہاء مبالغہ کے لیے ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے الا ذا کافۃ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، معنی بنتا ہے لوگوں کو اس سے روکنے والے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے دور بھاگیں یا انہیں کفر سے روکنے والے۔ اسی سے ہے: کف الثوب کیونکہ اس نے اس کی دونوں طرفوں کو ملایا۔ بَشِيْرًا جو اطاعت کرے اسے جنت کی بشارت دینے والے ہیں۔ وَّنَذِيْرًا جو کفر کرے اس کو آگ سے خبردار کرنے والے۔ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو ہے اس کو نہیں جانتے، جب کہ وہ مشرک ہیں۔ وہ اس وقت مومنوں سے تعداد میں زیادہ تھے۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یعنی قیامت برپا ہونے کا وعدہ کب پورا ہوگا؟

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں کہیں: لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ اس کی تاخیر تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ میعاد کا معنی میقات ہے۔ اس میعاد سے مراد بعث کا وقت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد موت کے حاضر ہونے کا وقت ہے، یعنی یوم قیامت سے قبل تمہارے لیے وقت معین ہے جس میں تم مر جاؤ گے تو تم میرے قول کی حقیقت جان لو گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس یوم سے مراد یوم بدر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر یہ دن ان کے عذاب کا دن تھا۔ نحویوں نے اس اعراب کو بھی جائز قرار دیا ہے مِّيْعَادُ يَوْمٍ اس تعبیر کی بنا پر کہ میعاد مبتدا ہو، یوم اس سے بدل ہو اور خبر لکم ہو۔ انہوں نے اس اعراب کو بھی جائز قرار دیا ہے میعاد یوما اس صورت میں یوما ظرف ہوگی عنہ کی ہاء ضمیر یوم کی طرف لوٹے گی۔ یہ

صحیح نہیں میعاد یوم لا تستاخرون تنوین کے بغیر ہوگی۔ یوم کا لفظ مابعد کی طرف مضاف ہوگا جب تو ہاء کو یوم کی طرف لوٹنے والا مقدر کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ شے اپنی ذات کی طرف مضاف ہوگی اس کی وجہ وہ ہاء ہے جو جملہ میں موجود ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہاء میعاد کے لیے ہے یوم کے لیے نہیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ۭ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

"کفار (اب تو) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے کیے جائیں گے اپنے رب کے روبرو اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے، کہیں گے وہ لوگ جو (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے ان سے جو بڑے بنا کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان دار ہوتے، جواب دیں گے متکبر، ان کمزوروں کو: کیا ہم نے تمہیں روکا تھا ہدایت (قبول کرنے) سے جب (نور ہدایت) تمہارے پاس آیا تھا درحقیقت تم خود مجرم تھے۔ کہیں گے وہ کمزور لوگ ان مغروروں سے: (یوں نہیں) بلکہ تمہارے شب و روز کے مکر و فریب نے ہمیں ہدایت سے باز رکھا جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کو ماننے سے انکار کر دیں اور (بتوں کو) اس کا ہمسفر بنا دیں، اور دل ہی دل میں پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب کو اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے) کیا انہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو کیا کرتے تھے"۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مراد قریش کے کفار ہیں۔ لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد کتب اور انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد آخرت ہے۔ ابن جریج نے کہا: یہ قول کرنے والا ابو جہل بن ہشام ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اہل کتاب نے مشرکوں سے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہماری کتابوں میں ہے پس تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو۔ جب انہوں نے سوال کیا تو اہل کتاب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 451

نے جو کہا تھا اسی کے موافق پایا۔ مشرکوں نے کہا: ہم اس قرآن پر اور اس پر جو اس سے قبل نازل ہوا یعنی تورات اور انجیل پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ ہم سب کا انکار کرتے ہیں۔

وہ اس سے قبل اہل کتاب سے رجوع کرتے تھے اور ان کے قول سے دلیل پکڑتے تھے۔ اس سے ان کے کردار میں تضاد اور ان کے علم کی قلت ظاہر ہوگئی۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کے بارے میں خبر دی فرمایا: اے محمد! ﷺ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ وہ حساب کے میدان میں محبوس ہوں گے وہ ملامت اور عتاب کے ساتھ کلام کو ایک دوسرے کی طرف لوٹائیں گے جب کہ وہ دنیا میں دوست اور باہم مددگار رہتے تھے۔ لو کا جواب محذوف ہے جو یہ ہے لرایت امرا ھائلا فظیعا پھر یہ ذکر کیا جو ان کے درمیان گفتگو ہوئی، فرمایا: يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا کافروں میں سے جو دنیا میں کمزور تھے لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا جو قائدین اور رؤساء تھے۔ لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے۔ فصیح لغت لولا انتم ہے عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو لولا کم کہتے ہیں: اسے سیبویہ نے بیان کیا ہے لولا مضمر کو جر دیتا ہے اور اس کے بعد اسم ظاہر مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہوتا ہے اور اس کی خبر محذوف ہوتی ہے۔ محمد بن یزید کہتا ہے: لولا کم پڑھنا جائز نہیں کیونکہ مضمر مظہر کے پیچھے ہوتا ہے جب اسم ظاہر بالاجماع مرفوع ہے تو ضروری ہوگا کہ مضمر بھی مرفوع ہو۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى یہ استفہام انکار کے معنی میں ہے یعنی ہم نے تمہیں ہدایت سے نہیں روکا اور نہ ہی تمہیں مجبور کیا۔ بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ یعنی تم مشرک اور کفر پر مصر تھے۔ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ کلام عرب میں مکر کا اصل معنی حیلہ سازی کرنا اور دھوکہ دینا ہے یہ یوں باب چلتا ہے مَكَرَ به يَمْكُرُ فهو مَاكِرٌ و مَكَّارٌ۔ اخفش نے کہا: کلام اس تقدیر کی بنا پر ہے هذا مكر الليل و النهار۔ نحاس نے کہا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے بلکہ تمہارا دن اور رات کو مکر یعنی تمہارا ہمارے ساتھ سرگوشی کرنا اور تمہارا ہمیں کفر کی طرف دعوت دینا اس نے ہمیں اس پر برانگیختہ کیا۔ سفیان ثوری نے کہا: بلکہ تمہارا دن اور رات کا عمل (1)۔ قتادہ نے کہا: بلکہ تمہارے دن اور رات کے مکر نے ہمیں روکا۔ مکر کو ان دونوں کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ یہ دن اور رات میں واقع ہوتا ہے، یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ (نوح: 4) اجل کو اپنی ذات کی طرف مضاف کیا پھر فرمایا: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً (الاعراف: 34) کیونکہ اجل ان کی ہوتی ہے۔ یہ تیرے اس قول کے قبیل سے ہے: لیلہ قائم و نہارہ صائم مبرد نے کہا: بلکہ تمہارا دن رات کا مکر، جس طرح عرب کہتے ہیں: نہار دقانہ و لیلہ قائم اور جریر کا یہ شعر پڑھا:

لقد لُمْتِنَا يا أمَّ غَيْلَانَ في السُّرَى — ونمتِ وما ليلُ المَطِيِّ بنائم (2)

اے ام غیلان! تو نے ہمیں رات کے چلنے پر ملامت کی اور تو خود سو گئی جب کہ سواری کی رات سوتی نہیں۔

سیبویہ نے یہ شعر پڑھا:

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 451
2۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 247

فنام لیلی وتجلّی همی

میری رات سوگئی اور میرا غم عیاں ہوگیا۔

جریر کے شعر میں نبتُ فیہ کلام مقدر کی جائے گی۔

اس کی مثل وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس: 67) ہے۔ قتادہ نے پڑھا: مكرٌ الليلَ والنهارَ مکر پر تنوین ہے اور اللیل والنہار پر نصب ہے تقدیر کلام یہ ہے بل مکر کائن فی اللیل والنہار تو اس سے کائن کو حذف کر دیا گیا۔ حضرت سعید بن جبیر بل مکر کاف کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جو کہ دَر کے معنی میں ہے۔ یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کے ساتھ مرفوع ہو جس پر اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ دلالت کرتا ہے گویا جب انہوں نے ان کو کہا: کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا تھا؟ انہوں نے کہا: بلکہ ہمیں رات اور دن کے مکر نے روکا تھا۔

سعید بن جبیر سے مروی ہے بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کہا جب کہ رات اور دن کے گزرنے کی وجہ سے وہ غافل ہو گئے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا: طویل عرصہ تک امن وسلامتی نے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ (الحدید: 16) راشد نے بل مکر اللیل والنہار نصب کے ساتھ قراءت کی جس طرح تو کہتا ہے: رایته مقدم الحاج یہ اس صورت میں جائز ہے جو معرف باللام ہو اگر تو کہے رایته مقدم زید تو یہ جائز نہیں۔ نحاس نے اس کا ذکر کیا۔ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا، انداد کا معنی مشابہ، مثل اور نظیر ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: فلان ند فلان فلاں کی مثل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: ندید۔ یہ شعر پڑھا:

أینما تجعلون إلیّ ندّا وما أنتم لذی حسب ندید

تم میرا مثل کیسے بناتے ہو جب کہ تم کسی شریف کے ہم پلہ نہیں۔

سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ انہوں نے ندامت کا اظہار کیا۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ یہ اخفاء اور ابداء کے معنی میں ہے۔ امرء القیس نے کہا:

تجاوزت أحراسا وأهوال مَعْشَرٍ علیّ حراصا لو یُسِرُّون مَقْتَلی

محل استدلال لو یسرون ہے۔ اسے یشرون بھی روایت کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ ندامت ان کے چہروں کے اسرار میں واضح ہوگئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ندامت ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ یہ دل میں ہوتی ہے۔ ندامت سے جو چیز متولد ہوتی ہے وہ ظاہر ہوتی ہے جس طرح اس کی وضاحت سورۂ یونس اور سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی ندامت کا اظہار ان کا یہ قول ہے: فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء) ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے باہم ندامت کا اظہار کیا اور اس کے بارے میں قول کو ظاہر نہ کیا جس طرح فرمایا: وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى (طٰہٰ)

وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، اغلال، غل کی جمع ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فی رقبته غل من حدید

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 451

اس کی گردن میں لوہے کا طوق ہے۔ اسی طرح برے اخلاق والی عورت کو کہتے ہیں: غلٌ قملٌ اصل بات یہ تھی کہ طوق چمڑے کا بنا ہوتا جس پر بال ہوتے تو اس میں جوئیں پڑ جاتیں۔

غللتُ یدہ إلی عنقه، وقد غل فهو مغلول میں نے اس کا ہاتھ اس کی گردن میں جکڑ دیا اور وہ مغلول ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ماله الّ وغلّ نہ اس کی گدی پر ضرب لگانے والا ہے اور نہ ہی گلے میں طوق ہے۔ الغل اور الغلة کا معنی پیاس کی گرمی ہے اسی طرح غلیل ہے، اسی سے یہ قول کیا جاتا ہے: غُلَّ الرجل یُغَلُّ غللا فهو مغلول یہ مجہول کا صیغہ ہے؛ یہ جوہری سے مروی ہے یعنی پیروی کرنے والا اور جن کی پیروی کی جاتی تھی سب کی گردنوں میں طوق ڈال دیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان دونوں فریقوں کے علاوہ کے لیے بھی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ان کی طرف لوٹ رہا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے کلام اس قول پر مکمل ہو جاتی ہے۔ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ پر کلام نئے سرے سے شروع کی اور فرمایا: وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ یعنی تمام کفار کے گردنوں میں ہم نے طوق ڈال دیے ہیں۔ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ یعنی دنیا میں وہ جو عمل کرتے رہے اس کا بدلہ ہی انہیں دیا جائے گا۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝۳۵ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۶ وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝۳۷ وَ الَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓىِٕكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝۳۸

”اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر یہ کہ (برملا) کہہ دیا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے: ہم اس (دین) کا جو دے کر تم بھیجے گئے ہو انکار کرتے ہیں اور کہتے: (تم کون ہو ہمیں ڈرانے والے) ہمارا مال بھی (تم سے) زیادہ ہے اور اولاد بھی اور ہمیں عذاب نہیں دیا جا سکتا۔ آپ فرمائیے: بے شک میرا رب کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) لیکن اکثر لوگ (ان حکمتوں کو) نہیں جانتے اور (یاد رکھو) نہ تمہارے اموال اور نہ ہی تمہاری اولاد ایسی چیزیں ہیں وہ تمہیں ہمارا قرب بخش دیں مگر جو ایمان اور نیک عمل کرتا رہا (اسے ہی ہمارا قرب نصیب ہوگا) پس یہ لوگ ہیں جن کے لیے دوگنا صلہ ہے ان کے عملوں کا اور وہ بالا خانوں میں امن و امان سے رہیں گے اور جو لوگ کوشاں ہیں ہماری آیتوں کی تکذیب میں تاکہ ہمیں ہرا دیں وہی لوگ عذاب میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے“۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ قتادہ نے کہا: مترفوھا سے مراد ان کے اغنیاء، ان کے رؤساء،

ان کے جابر لوگ اور شریروں کے قائدین ہیں انہوں نے رسولوں سے کہا: اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ہمیں تم پر اموال اور اولاد میں فضیلت دی گئی ہے۔ اگر تمہارا رب اس دنیا اور فضل پر راضی نہ ہوتا جس پر ہم ہیں تو وہ ہمیں ہر چیز عطا نہ کرتا۔ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ کیونکہ جو اس کے نزدیک اچھی حالت میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عذاب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو رد کر دیا اور غنا سے انہوں نے جو استدلال کیا تھا اس کو رد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا: قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ جس کے حق میں چاہتا ہے رزق کو وسیع فرما دیتا ہے۔ وَ یَقْدِرُ اور جس کے حق میں چاہتا ہے اس میں کمی کر دیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں میں رزق کے اعتبار سے فرق رکھتی ہے تاکہ ان کا امتحان لے ان میں سے کوئی بھی چیز انجام پر دلالت نہیں کرتی۔ دنیا میں رزق کی وسعت آخرت کی سعادت پر دال نہیں تم اپنے اموال اور اولاد کے بارے میں گمان نہ کرو کہ وہ کل تمہیں فائدہ دیں گے۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے کیونکہ وہ غور و فکر نہیں کرتے پھر تاکید کے طور پر فرمایا: وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی مجاہد نے کہا: زلفی سے مراد قربیٰ ہے(1)۔ زلفة سے مراد قرابت ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی قرب عطا کر دیں، یہ اسم مصدر ہے۔ قربیٰ محل نصب میں ہے، گویا فرمایا: جو تمہیں ہمارے قریب کر دے۔ فراء نے گمان کیا ہے کہ التی اموال اور اولاد سب کے لیے ہے۔ اس کا ایک اور قول بھی ہے۔ یہ ابو اسحاق زجاج کا مذہب ہے معنی ہوگا: تمہارے اموال تمہیں ہمارے قریب نہیں کریں گے اور نہ ہی تمہاری اولادیں تمہیں قریب کریں گی پھر پہلی خبر کو حذف کر دیا گیا کیونکہ دوسری خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأيُ مختلفُ(2)

جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم اس پر اور جو کچھ تمہارے پاس ہے تم اس پر راضی ہو رائے مختلف ہے۔

قرآن کے علاوہ میں اللتین، اللاتی، اللواتی، الذین، الذین اولاد کے لیے خاص ہو۔ اموال ہمارے ہاں تمہارے درجے کو زائد نہ کریں گے اور تمہیں قرب عطا نہ کریں گے۔ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا سعید بن جبیر نے کہا: معنی ہے مگر جو ایمان لایا اور عمل صالح کیا تو اس کا مال اور اس کی اولاد دنیا میں اسے کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے۔ لیث نے طاؤس سے روایت نقل کی ہے وہ کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے ایمان اور عمل عطا فرما، مجھے مال اور اولاد سے دور رکھ، جو تم نے وحی کی ہے میں نے اسے سنا ہے: وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔(3)

میں کہتا ہوں: طاؤس کے قول میں نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ معنی ہے مجھے اس مال اور اولاد سے دور کر دے جو سرکشی کرنے والے ہیں یا جن میں کوئی بھلائی نہیں جہاں تک صالح مال اور صالح اولاد کا تعلق ہے صالح آدمی کے لیے تو وہ کتنا اچھا ہے۔ یہ بحث سورۂ آل عمران، سورۂ مریم اور سورۂ فرقان میں گزر چکی ہے۔ من محل نصب میں ہے مستثنیٰ منقطع ہے۔ مگر جو ایمان لایا اور اس نے عمل صالح کیا تو اس کا ایمان اور عمل صالح اسے میرے قریب کر دے گا۔ زجاج نے گمان کیا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 453 2۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 248 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 453

استثناء کے ساتھ محل نصب میں ہے اور تُقَرِّبُكُمْ میں کم ضمیر اس سے بدل ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول غلط ہے کیونکہ کم مخاطب کے لیے ہے اس لیے بدل جائز نہیں اگر یہ جائز ہو تو یہ بھی جائز ہو رأیتك زیدا۔

ابو اسحاق کا یہ قول فراء کا قول ہے مگر فراء بدل کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ یہ کوفیوں کا لفظ نہیں لیکن اس کا قول اس کی طرف لوٹتا ہے اس نے یہ گمان کیا ہے کہ اس کی مثل اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ (شعراء) یہ اس کے نزدیک ینفع کے ساتھ منصوب ہے۔ فراء نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ من محل رفع میں ہو، معنی ہو ما ھو الا من آمن اس نے اسی طرح کیا ہے میں اس کا معنی نہیں سمجھتا۔

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا اس سے مراد یہی قول ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (الانعام:160) ضعف کا معنی زیادتی ہے، یعنی ان کے لیے کئی گنا بدلہ ہے یہ اس باب سے ہے کہ مصدر مفعول کی طرف مضاف ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے کئی گنا بدلہ ہے۔ ضعف جمع کے معنی میں ہے ضعف کی نسبت جزا کی طرف اسی طرح ہے جس طرح شی کی نسبت اس کی ذات کی طرف ہوتی ہے، جس طرح حق الیقین، صلاۃ الاولی، یعنی ان کے لیے کئی گنا بدلہ ہے، ایک کے بدلہ میں دس اور اس سے زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے۔

اس آیت سے استدلال کیا ہے اس نے جس نے غنا کو فقر پر فضیلت دی۔ محمد بن کعب نے کہا: مومن جب غنی اور متقی ہو اللہ تعالیٰ اسے اس آیت کی وجہ سے دوگنا اجر عطا فرمائے گا۔ وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ عام قراءت جزاء الضعف ہے یعنی مضاف مضاف الیہ ہے۔ زہری، یعقوب اور نصر بن عاصم نے جزاء کو منصوب منون اور الضعف کی رفع کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی ان کے لیے کئی گنا جزا ہے۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ جزاءٌ الضعف یعنی انہیں کئی گنا بدلہ دیا جائے گا۔ جزاء الضعف یہ دونوں مرفوع ہیں۔ الضعف یہ جزاء سے بدل ہے۔ جمہور نے فی الغرفات جمع پڑھا ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ قول ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا (العنکبوت:58) اسے فی الغرفات راء کے ضمہ، فتحہ اور سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے (1)۔ اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور خلف نے فی الغرفۃ واحد کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ (الفرقان:75) الغرفۃ سے بعض اوقات اسم جمع اور اسم جنس مراد لیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ یاقوت، زبرجد اور موتیوں کے کمرے ہیں۔ اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اٰمِنُوْنَ وہ عذاب، موت، بیماریوں اور غموں سے امن میں ہوں گے۔ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا جو ہمارے ادلہ، حجت اور ہماری کتاب کو باطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مُعٰجِزِيْنَ عناد کرتے ہوئے وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ہم سے اپنے آپ کو بچا لیں گے۔ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ زبانیہ انہیں جہنم میں حاضر کریں گے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 586

''آپ فرمایئے: بے شک میرا پروردگار کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔

**قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ** اسے تاکید کے لیے مقرر ذکر کیا۔ **وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ** اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال اور اولاد سے دھوکہ کھانے والوں کو کہیے: اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اس میں تنگی کر دیتا ہے تم اموال اور اولاد سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں اسے خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں جو بھی تم خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا بدل عطا فرماتا ہے۔ اس میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے: فهو يخلفه عليكم یہ جملہ بولا جاتا ہے: أخلف له، أخلف عليه یعنی تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ یہ بدل دنیا میں ہوگا یا آخرت میں ہوگا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''ہر وہ دن جس میں لوگ صبح کرتے ہیں اس میں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ دعا کرتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما اور بخل کرنے والے کو ہلاکت عطا فرما'' (1)۔

اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا: خرچ کرو، خرچ کرو'' (2)۔ یہ اس بدلے کی طرف اشارہ ہے جو خرچ کیے ہوئے مال کے بدلہ میں دیا جاتا ہے جب خرچہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں ہو۔ بعض اوقات دنیا میں بدلہ نہیں دیا جاتا جس طرح دعا ہوتی ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ خواہ دعا قبول ہو جائے، گناہوں کا کفارہ بن جائے یا ذخیرہ کر لیا جائے۔ یہاں ذخیرہ کیا جانا اجر کی مثل ہوتا ہے۔

**مسئلہ**: دارقطنی، ابو احمد بن عدی نے عبد الحمید ہلالی سے وہ محمد بن منکدر سے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاد فرمایا: ''ہر نیکی صدقہ ہے جو آدمی اپنی ذات اور اپنے اہل پر خرچ کرتا ہے تو اس کے حق میں صدقہ لکھ لیا جاتا ہے جس کے ساتھ آدمی اپنی عزت کی حفاظت کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ اور جو بندہ خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کا بدل ہے، مگر وہ مال جو عمارت بنانے یا معصیت میں خرچ کیا جائے''۔ عبد الحمید نے کہا: میں نے ابن منکدر سے کہا: ما وقى الرجل عرضه سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ کسی شاعر اور زبان دراز کو مال دیتا ہے۔ عبد الحمید کو ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو اس نے معصیت میں مال خرچ کیا تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نہ اسے بدلہ دیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا بدل دیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس عمارت کا تعلق ہے جو ضروری تھی جس کے ساتھ انسان اپنا پردہ کرتا ہے اور اپنی حفاظت کرتا ہے تو اسے اس کا بدل بھی دیا جاتا ہے اور اس کے بنانے پر اجر بھی دیا جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی اپنے جسم کی حفاظت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، بیان الصدقۃ یقع علی کل نوع، جلد 1، صفحہ 325

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، الحث علی النفقۃ، جلد 1، صفحہ 322

اور ستر عورت کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان چیزوں کے علاوہ بندے کا کوئی حق نہیں گھر جس میں وہ سکونت اختیار کرلے، کپڑا جس کے ساتھ وہ پردہ کا اہتمام کرے، روٹی کی کور یعنی ٹکڑا اور پانی'' (1)۔ یہ بحث سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ جب انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ اپنے عیال کو رزق دیتا ہے اور امیر اپنے لشکر کو کھلاتا ہے۔ کہا: وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ مخلوق میں سے رزق دیتا ہے لیکن یہ ایسا مال ہوتا ہے جس کا وہ مالک ہوتا ہے پھر یہ مال ختم ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خزانوں سے رزق دیتا ہے جو فنا نہیں ہوتے اور ختم بھی نہیں ہوتے۔ جو کسی چیز کو عدم سے وجود کی طرف نکالے وہی حقیقت میں رازق ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ (الذاریات)

**وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝**

''اور جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمہاری پوجا کرتے تھے؟ فرشتے عرض کریں گے: تو پاک ہے ہر شرک سے، ہمارا مالک تو ہے، ہمارا ان سے کیا واسطہ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے''۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ متصل ہے: وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ (سبا:31) یعنی اگر آپ انہیں اس حالت میں دیکھتے تو خوفناک امر دیکھتے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مراد وہ اور اس کی امت ہے۔ پھر فرمایا: کاش آپ انہیں اس دن بھی دیکھتے جس روز ہم ان تمام عبادت گزاروں اور معبودوں کو جمع کریں گے، یعنی حساب کے لیے انہیں جمع کریں گے۔ ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: یہ استفہام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ:116) نحاس نے کہا: معنی ہے جب فرشتوں نے ان کی تکذیب کی تو اس میں ان کو لاجواب کرنا تھا۔ یہ استفہام عبادت کرنے والوں کی توبیخ کے لیے ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ تیرے لیے پاکی ہے۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ یہ تو ہمارا وہ رب ہے جس کو ہم اپنا ولی بناتے ہیں، ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں، ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے لیے عبادت کو خاص کرتے ہیں۔ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ وہ ابلیس اور اس کے مددگاروں کی اطاعت کرتے ہیں۔ تفاسیر میں ہے: ایک قبیلہ تھا جسے بنو ملیح کہتے ہیں یہ بنو خزاعہ کی شاخ تھی وہ جنوں کی پوجا کیا کرتے تھے وہ گمان کرتے تھے کہ جن ان کو دیکھتے ہیں اور وہ ملائکہ ہیں، وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات:158) کا یہی معنی ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، ماجاء فی الزھد فی الدنیا، جلد 2، صفحہ 57۔ حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝

''پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نقصان کی، اور ہم کہیں گے جنہوں نے ظلم کیا تھا کہ چکھو آتش (جہنم) کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے''۔

نَّفْعًا سے مراد شفاعت اور نجات ہے۔ ضَرًّا سے مراد عذاب اور ہلاکت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتے اپنی عبادت کرنے والوں سے تکلیف دور نہیں کر سکتے مضاف کو حذف کر دیا گیا، یعنی اصل میں دفع ضر تھا۔ یہ جائز ہے کہ قائل اللہ تعالیٰ کی ذات ہو یا فرشتے ہوں وہ کہیں: ذُوْقُوْا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں انہیں ہماری آیتیں درآنحالیکہ وہ بالکل واضح ہیں کہتے ہیں: نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جس نے ارادہ کر لیا ہے کہ روک دے تمہیں ان (معبودوں) سے جن کی تمہارے باپ دادا پوجا کیا کرتے تھے نیز کہتے ہیں: نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹا گھڑا ہوا اور کفار کہتے ہیں حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا کھلا''۔

اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ رَجُلٌ سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے۔ اٰبَآؤُكُمْ سے مراد تمہارے اسلاف ہیں یعنی تمہارے اسلاف جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ مَا هٰذَاۤ، هٰذَاۤ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یہ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جھوٹ ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ جادو ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ من گھڑت بات ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ نے کہا: یہ جادو ہے اور کچھ نے کہا: یہ من گھڑت بات ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۝ وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

''اور نہ ہی ہم نے انہیں کوئی کتابیں دیں جن کا یہ مطالعہ کرتے ہوں اور نہ ہم نے بھیجا ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔ اور (انبیاء کی) تکذیب کی جو ان سے پہلے گزرے اور یہ (کفار مکہ) نہیں پہنچے دسویں حصہ کو بھی جو (قوت، دبدبہ) ہم نے ان کو دیا تھا پس جب انہوں نے جھٹلایا میرے رسولوں کو کتنا ہولناک تھا میرا عذاب''۔

وَ مَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَهَا جو آپ پیغام حق لائے ہیں انہوں نے اس کے باطل ہونے کا اس کتاب میں نہیں پڑھا جو کتاب ان کو دی گئی اور جو رسول ان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اس سے باطل ہونے کا نہیں سنا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الزخرف) ان کے جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں جس سے وہ استدلال کریں اور کوئی شبہ اس سے متعلق ہے جس طرح اہل کتاب کہتے ہیں اگرچہ وہ باطل پرست ہیں: ہم اہل کتاب اور اہل شریعت ہیں۔ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول کی طرف منسوب ہیں پھر اپنے حق کو ارشاد کے ساتھ ان کے جھٹلانے پر انہیں وعید سنائی: وَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان سے قبل اقوام نے ان کو جھٹلایا جو پکڑ میں ان سے سخت تھے، اولاد اور اموال میں ان سے بڑھ کر تھے، خوشحال تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا جس طرح قوم ثمود اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا۔

وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ اہل مکہ ان امتوں کے دسویں حصہ تک بھی نہیں پہنچے۔ معشار اور عشر برابر ہیں۔ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معشار دسویں کا دسواں حصہ ہے۔ جوہری نے کہا: معشار الشی سے مراد اس شے کا دسواں حصہ ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ معشار، عشر کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو ان سے پہلے تھے شکر میں اس کے دسویں حصہ تک بھی نہ پہنچے جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا، نقاش نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے قبل لوگوں کو اس کا دسواں حصہ عطا کیا جو انہیں علم، بیان، حجت اور برہان عطا کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کوئی امت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے بڑھ کر علم والی نہیں اور اس کتاب سے بڑھ کر کوئی کتاب بین نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معشار یہ عشیر کا دسواں ہے۔ عشیر یہ عشر کا دسواں حصہ ہے پس یہ ہزار کا ایک جز ہو گا۔ ماوردی نے کہا: یہ زیادہ نمایاں ہے کیونکہ قلت کا اظہار کرنے میں مبالغہ کا اظہار ہے (1)۔

فَكَذَّبُوْا رُسُلِیْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ امتوں میں میرا عقاب کیسے تھا؟ اس میں کلام محذوف ہے اس کی تقدیر کلام یہ ہے فاهلكناهم فكيف كان نكير۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ﴿۴۶﴾

''(اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمایئے: میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں (یہ تو مان لو) کہ تم اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ دو دو یا اکیلے اکیلے پھر خوب سوچو (تمہیں ماننا پڑے گا) تمہارے اس رفیق میں جنون کا شائبہ تک نہیں نہیں ہے وہ مگر بروقت خبردار کرنے والا تمہیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے''۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ مشرکوں پر حجتوں کو مکمل کر دیا، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں فرما دیجئے: اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمْ تم جس پر ہو میں اس کے برے انجام سے تمہیں نصیحت کرنے اور ڈرانے والا ہوں۔ بِوَاحِدَةٍ، واحدة کا موصوف کلمة محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے بكلمة واحدة میں تمہیں ایسی بات کی نصیحت کرنے والا ہوں جو تمام کلام کو جامع ہے، جو شرک کی نفی اور معبود

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 455

برحق کو ثابت کرتی ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی کا قول ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد اللہ کی طاعت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد قرآن ہے کیونکہ یہ تمام مواعظ کو جامع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی تقدیر کلام یہ ہے بخصلة واحدة پھر ان کے ساتھ اس کی وضاحت کی۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى، ان محل جر میں ہے اور یہ واحدة سے بدل ہے یا محل رفع میں ہے اور مبتدا مضمر ہے، تقدیر کلام یہ ہے ھی أن تقوموا۔ زجاج کا مذہب یہ ہے کہ یہ محل نصب میں ہے اور یہ لان تقوموا کے معنی میں ہے۔ اس قیام کا معنی حق کی طلب میں کمر بستہ ہو جانا ہے اس سے مراد وہ قیام نہیں جو قعود (بیٹھنے) کی ضد ہے، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے: قام فلان با مر کذا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے تقرب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء: 127) مثنی و فرادی یعنی اکیلے اکیلے اور مجتمع ہو کر؛ یہ سدی کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنی رائے میں منفرد اور غیر سے مشورہ لیتے ہوئے (2)۔ یہ ایسا قول ہے جو منقول ہے۔ قتبی نے کہا: غیر کے ساتھ بحث وتمحیص کرتے ہوئے اور اپنے دل میں سوچ و بچار کرتے ہوئے۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مثنی سے مراد دن کا عمل اور فرادی سے مراد رات کا عمل ہے، کیونکہ دن میں وہ معاون ہوتا ہے اور رات میں تنہا ہوتا ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرمایا: مَثْنٰى وَ فُرَادٰى کیونکہ دین بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے یہی عقل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وافر عقل عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں وافر حصہ عطا فرمایا۔ جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو فکر ایک ہوتی ہے اور جب دو دو ہوتے ہیں تو دو ذہن بالمقابل ہوتے ہیں تو دونوں کے لیے ایسا علم ظاہر ہوتا ہے جو منفرد سے کئی گنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ابو حاتم اور ابن الانباری کے نزدیک وقف ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وقف کا محل نہیں، کیونکہ معنی ہے پھر تم غور و فکر کرو کیا تم نے اپنے صاحب کے بارے میں جھوٹ کا تجربہ کیا ہے یا تم نے اس میں جنون کے آثار دیکھے ہیں یا اس کے احوال میں فساد دیکھا ہے یا اس کے پاس آتے جاتے ہوئے دیکھا ہے جو جادو کیے جانے کا وعدہ کرتا ہو یا اس نے کسی سے قصے کہانیاں سیکھے ہوں یا کتابیں پڑھی ہوں؟ تم نے انہیں اس حال میں پہچانا ہو کہ یہ تمہارے اموال میں طمع رکھتے ہوں یا ایک سورت میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے ہو؟ جب تم اس فکر کے ذریعے اس کی سچائی کو پہچان چکے ہو تو اس دشمنی کا کیا مقصد؟

اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ صفا کی پہاڑی پر چڑھے تو بلند آواز سے ندا کی: یا صباحاہ؟ لوگوں نے کہا: یہ کون آواز دے رہا ہے؟ دوسرے لوگوں نے بتایا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ آپ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 456 | 2۔ ایضاً

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بنی فلاں! اے بنی فلاں! اے بنی عبد مناف! اے بنی عبد المطلب!'' سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے۔ فرمایا: ''مجھے بتاؤ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک گھڑ سوار دستہ اس پہاڑ کے پیچھے سے نکلے گا، کیا تم میری تصدیق کرو گے؟'' سب نے کہا: ہمارا آپ کے بارے میں جھوٹ کا تجربہ نہیں۔ فرمایا: ''میں تمہیں آنے والے شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں''۔ تو ابولہب نے کہا: تیرے لیے ہلاکت ہو کیا تو نے ہمیں اس کے لیے جمع کیا تھا؟ تو یہ سورت تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (الہب) نازل ہوئی۔ اعمش نے آخر تک سورت کی قراءت کی۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

''فرمایئے: (لوگو!) جو معاوضہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ تم اپنے پاس رکھو میری (دلسوزیوں) کا اجر تو (میرے) اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے''۔

مِّنْ اَجْرٍ سے رسالت کی تبلیغ پر انعام (1)، یعنی اگر میں نے تم سے انعام کا مطالبہ کیا ہے تو وہ تمہارے لیے ہے۔ شَهِيْدٌ سے مراد تاڑنے والا، عالم اور حاضر ہے یعنی میرے اعمال اور تمہارے اعمال سے آگاہ ہے اس پر کوئی امر مخفی نہیں وہ سب کو بدلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝

''فرمایئے: بے شک میرا رب (باطل پر) حق سے ضرب لگاتا ہے وہ سب غیبوں کو جاننے والا ہے''۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ وہ حجت کو ظاہر کرتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ قتادہ نے کہا: بِالْحَقِّ سے مراد وحی ہے ان سے یہ بھی مروی ہے: الحق سے مراد قرآن ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عَلَّامُ الْغُيُوْبِ باطل پر حق کے ساتھ ضرب لگاتا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے اسے پڑھا علام الغیوب کہ یہ بدل ہے تقدیر کلام یہ ہوگی: قل ان ربی علام الغیوب یقذف بالحق۔ زجاج نے کہا: یہاں عَلَّامُ الْغُيُوْبِ پر رفع دو وجوہ سے ہے کیونکہ یہ رفع کا محل ہے یا يَقْذِفُ میں جو ضمیر ہے اس سے یہ بدل ہے۔ نحاس نے کہا: رفع میں دو اور وجوہ بھی ہیں۔ یہ خبر کے بعد خبر ہو۔ مبتدا مضمر ہو۔ فراء نے گمان کیا: اس جیسی صورت میں رفع کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے جب وہ ان کی خبر کے بعد آئے، اس کی مثل یہ ہے: اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ۝ (ص) اسے الْغُيُوْبِ غین کی تین حرکتوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ الْغُيُوْبِ یہ البیوت کی طرح ہے۔ الغیوب یہ الصبور کی طرح ہے۔ اس سے مراد ایسا امر ہے جو بہت ہی زیادہ غائب اور مخفی ہو۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝

''(اے محبوب!) اعلان کر دیجئے: حق آ گیا اور باطل کی قوت کا خاتمہ ہو گیا''۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 251

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ الحق سے مراد قرآن ہے (1)۔ نحاس نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے جاء صاحب الحق یعنی ایسی کتاب جس میں براہین اور دلائل ہیں۔ وَ مَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ قتادہ نے کہا: اس سے مراد شیطان ہے، یعنی شیطان کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا۔ وَ مَا یُعِیْدُ، ما نافیہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما استفہامیہ ہو، یہ ای شیء کے معنی میں ہوگا۔ یعنی حق آ گیا تو باطل کے لیے کیا چیز باقی رہ گئی ہے کہ وہ اسے لوٹائے اور اسے نئے سرے سے شروع کرے یعنی کوئی چیز باقی نہیں بچی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ۝

”فرمایئے: (تمہارے گمان کے مطابق) اگر میں بہک گیا ہوں تو اس کا وبال میری جان پر ہوگا، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو (محض) اس وحی کے باعث جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے، بے شک وہ سب کچھ سننے والا بالکل نزدیک ہے“۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے کہا: تو نے اپنے آباء کے دین کو ترک کر دیا ہے اور تو گمراہ ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ارشاد فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دو اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں جس طرح تم گمان کرتے ہو تو اس کا وبال میری ذات پر ہے۔ عام قراءت لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور دوسرے علماء نے پڑھا: قل ان ضَلِلت یعنی لام کے نیچے کسرہ ہے اور اَضَل کے ضاد پر فتحہ دیا۔ ضلال اور ضلالت یہ ارشاد کی ضد ہے۔

قد ضللت اضل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ یہ نجد کی لغت ہے۔ یہ فصیح لغت ہے۔ اہل عالیہ کہتے ہیں: ضللت، اضل یعنی میری گمراہی کا گناہ میری ذات پر ہے۔ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ میرا رب میری طرف حکمت اور بیان کی جو وحی کرتا ہے اس وجہ سے میں ہدایت پر ہوں۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ جو مجھ کو بلائے میں اس کی بات سننے والا ہوں اور دعا قبول کرنے میں قریب ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نظم کلام یوں ہے کہہ دیجئے: میرا رب حق کے ساتھ باطل پر ضرب لگاتا ہے اور حجت کو واضح کرتا ہے جو آدمی گمراہ ہے اس کی گمراہی حجت کو باطل نہیں کرتی۔ اگر میں گمراہ ہوں گا تو اپنے آپ کو نقصان پہنچاؤں گا نہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حجت کو باطل کر دے، جب میں ہدایت یافتہ ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کیونکہ اس نے مجھے حجت پر ثابت قدم رکھا، بے شک وہ سمیع ہے قریب ہے۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ ۝

”کاش! تم دیکھو جب یہ گھبرائے ہوں گے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے“۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ کفار کے احوال ایسے وقت میں ذکر کیے جس میں وہ حق کی معرفت کے محتاج ہوں گے معنی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 457

ہے اگر آپ دنیا میں دیکھتے جب موت ان پر نازل ہوئی یا اللہ تعالیٰ کی ان پر جو پکڑ نازل ہوئی؛ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد صیحہ کی وجہ سے ان کا قبروں میں خوفزدہ ہونا ہے (1)۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: یہ گھبراہٹ اس وقت ہوئی جب وہ قبروں سے نکلیں گے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن مغفل نے کہا: جب وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے عقاب کو دیکھیں گے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد غزوہ بدر کے روز ان کا ڈرنا ہے جب فرشتوں کی تلواروں سے ان کی گردنیں اڑائی گئیں تو نہ وہ بھاگ سکے اور نہ ہی توبہ کی طرف رجوع کر سکے (2)۔

سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد وہ لشکر ہے جو بیداء کے مقام پر دھنسایا جائے گا ان میں سے ایک آدمی باقی رہ جائے گا تو وہ لوگوں کو اس کے بارے میں بتائے گا جو اس کے ساتھیوں کو مصیبت لاحق ہوئی تو وہ سب گھبرا جائیں گے (3)۔ یہی ان کی فزع ہے۔ فَلَا فَوْتَ ان کے لیے کوئی نجات نہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: ان کے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ ہوگی۔ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ، مَّكَانٍ قَرِيْبٍ سے مراد قبریں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جہاں کہیں ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوں گے وہ اس سے دور نہیں جا سکیں گے اور نہ ہی اس کو غائب پائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ان اسی ہزار افراد کے بارے میں آیت نازل ہوئی جو کعبہ پر حملہ کریں گے تاکہ اس کو گرا دیں۔ جونہی وہ بیداء میں داخل ہوں گے انہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ یہی قریب جگہ سے پکڑنا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اور ایک ایسے فتنہ کا ذکر کیا جو اہل مشرق اور اہل مغرب کے درمیان ہوگا۔ وہ اس طرح ہوں گے کہ جلد ہی خشک وادی سے ان پر سفیانی نکلے گا، یہاں تک کہ وہ دمشق میں اترے گا وہ دو لشکر روانہ کرے گا ایک لشکر مشرق کی طرف اور ایک لشکر مدینہ طیبہ کی طرف۔ لشکر مشرق کی طرف چلے گا یہاں تک کہ لشکری بابل کے علاقہ میں اتریں گے جو ملعون شہر ہے اور خبیث علاقہ ہے مراد بغداد کا علاقہ ہے۔ وہ تین ہزار سے زائد افراد کو قتل کریں گے اور سو سے زائد عورتوں تک رسائی حاصل کریں گے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تین سو سرداروں کو قتل کریں گے پھر وہ شام کی طرف نکلیں گے۔ کوفہ سے ہدایت کا علم بلند ہوگا اور دونوں میں اس لشکر تک جا پہنچے گا۔ وہ ان کو قتل کریں گے۔ ان میں سے کوئی خبر دینے والا بھی نہیں بچے گا۔ ان کے ہاتھوں میں جو قیدی اور مال غنیمت ہوگا وہ اس کو اچھا خیال نہ کریں گے۔ اس کا دوسرا لشکر مدینہ طیبہ فرد کش ہوگا۔ وہ تین دن اور تین راتوں تک اہل مدینہ کو ڈراتا رہے گا۔ پھر مکہ مکرمہ کے ارادہ سے وہ لشکری نکلیں گے یہاں تک کہ جب وہ بیداء کے مقام ہوں گے اللہ تعالیٰ جبریل امین کو بھیجے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اے جبریل! جاؤ ان کو ہلاک کر دو۔ حضرت جبریل امین اپنے پاؤں سے انہیں ایک ٹھوکر ماریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا، اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ سے یہی مقصود ہے ان میں سے صرف دو آدمی بچیں گے۔ ان میں سے ایک خوشخبری سنانے والا اور ایک ڈرانے والا ہوگا۔ یہ دونوں جہینہ سے تعلق رکھتے

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 328　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 458　3۔ ایضاً

ہوں گے۔ اسی وجہ سے یہ قول آیا ہے: وعند جهينة الخبر اليقين جہینہ کے ہاں یقینی خبر ہے''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ یعنی ان کی روحیں وہاں ہی قبض کر لی جائیں گی اور موت سے فرار ان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ یہ تعبیر اس آدمی کے قول کے موافق ہے جو یہ کہتا ہے یہ گھبراہٹ نزع کے وقت ہوگی۔ یہ احتمال بھی موجود ہے یہ اس فزع سے ہو جو اجابہ (قبول کرنا) کے معنی میں ہو، یہ جملہ بولا جاتا ہے: فزع الرجل یعنی اس نے چیخنے والے کو جواب دیا جو خوف نازل ہونے کے وقت مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: جب آپ نے انصار سے فرمایا: ''طمع کے وقت تم کم ہوتے ہو اور جنگ کے وقت زیادہ ہوتے ہو''۔ جس نے کہا: دنیا میں خسف اور قتل سے مراد یوم بدر ہے۔ کہا: آخرت میں پکڑ سے قبل دنیا میں پکڑ لیے گئے۔ جس نے کہا: یہ قوم قیامت کی گھبراہٹ ہے اس نے کہا: انہیں زمین کے اندر سے اس کے ظاہر کی طرف پکڑا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ سے مراد ہے انہیں جہنم سے پکڑا گیا اور اس میں پھینک دیا گیا۔

**وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾**

''اس وقت کہیں گے: ہم ایمان لے آئے ان پر لیکن اب کیونکر پا سکتے ہیں ایمان کو اتنی دور جگہ سے''۔

وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ہاء ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد الله تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد بعث ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا: التناوش سے مراد لوٹنا ہے (2) یعنی وہ دنیا کی طرف لوٹنے کا مطالبہ کریں گے تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ یہ مطالبہ کتنا ہی حقیقت سے دور ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

تمنى أن تئوب إلى مَیّ وليس إلى تنا و شها سبيل(3)

مَی نے آرزو کی کہ میری طرف لوٹ آئے جب کہ اس کے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔

سدی نے کہا: اس سے مراد توبہ ہے، یعنی انہوں نے توبہ طلب کی جب کہ وہ دور ہو چکی تھی کیونکہ توبہ تو دنیا میں قبول ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: التَّنَاوُشُ سے مراد پانا اور حاصل کرنا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: ایک آدمی جب کسی آدمی کی طرف بڑھے تاکہ اس کا سر اور اس کی داڑھی پکڑے تو اس کے لیے یہ فعل ذکر کیا جاتا ہے: ناشه. ينوشه، نوشا۔ اور یہ شعر پڑھا:

فهي تنوش الحض نَوْشًا مِن عَلَا نَوْشًا به تَقْطَعُ أجوازَ الفلا(4)

یعنی وہ اونٹ حوض کے پانی کو اوپر سے پیتے ہیں اور بہت زیادہ پیتے ہیں جس کے ساتھ جنگلوں کے وسط کو طے کرتے ہیں، انہیں کسی اور پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کہا: اسی معنی میں جنگ میں مناوشہ ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب دونوں فریق جنگ میں قریب ہو جاتے ہیں۔

رجل نووش سخت پکڑ والا آدمی۔ التناوش کا معنی پکڑنا اور لینا ہے۔ انتیاش کا بھی یہی معنی ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

کانت تنوش العنق انتیاشا

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 329 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 459 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وہ گردنوں کو پکڑتے ہیں۔

وَ اَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: آخرت میں ان کا ایمان کو پانا کیسے ممکن ہے جب کہ انہوں نے دنیا میں کفر کیا۔ ابوعمرو، کسائی، اعمش اور حمزہ نے کہا: اَنّٰی لَهُمُ التَّنَاؤُشُ یہ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبیدہ اس قراءت کو بعید خیال کرتے تھے، کیونکہ التناوش جب ہمزہ کے ساتھ ہوتو اس کا معنی بعد ہوتا ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے، بعید مکان سے ان کے لیے بعد کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ ابوجعفر نے کہا: قراءت جائز اور حسن ہے۔ کلام عرب میں اس کی دو وجوہ ہیں: یہ بعیدی تاویل اس کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ دونوں وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ اصل مہموز نہ ہو پھر واؤ کو ہمزہ بنا دیا گیا کیونکہ اس میں حرکت خفیف ہوتی ہے۔ یہ کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے مصحف میں جسے جماعت نے جماعت سے نقل کیا ہے وہ ہے وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ (المرسلات) اصل میں یہ وقتت تھا، کیونکہ یہ وقت سے مشتق ہے۔ دار کی جمع ادؤر کہی جاتی ہے۔ ایک اور وجہ جسے ابواسحاق نے ذکر کیا ہے یہ نئش سے مشتق ہے اس سے مراد آہستہ آہستہ حرکت ہے، یعنی ان کے لیے حرکت کہاں سے ہوگی اس چیز میں جو دور ہو چکی ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: ناشئت الشی میں نے اسے دور سے پکڑا۔ النئیش سے مراد ست شے ہے۔ جوہری نے کہا: التناوش سے مراد پیچھے ہونا اور دور ہونا ہے۔ قد ناشت الأمر أناشه نأشا فانتأش میں نے اسے مؤخر کیا اور وہ مؤخر ہو گیا۔ یہ کہا جاتا ہے: فعلہ نئیشا اس نے آخر میں کیا۔

شاعر نے کہا:

تمنى نئيشا أن يكون أطاعنی وقد حدثت بعد الأمور أمور

اس نے آخر میں آرزو کی کہ وہ میری اطاعت کرے جب کہ نئے امور یکے بعد دیگرے واقع ہو چکے تھے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قعدت زمانا عن طلابك للعلا وجئت نئيشا بعد مافاتك الخبر

میں ایک زمانہ تک بیٹھا رہا جب کہ تو بلندی کا طالب تھا میں اخیر میں آیا جب کہ تجھ سے خبر فوت ہو چکی تھی۔

فراء نے کہا: تناوش میں ہمزہ کو لانا اور ہمزہ کو ترک کرنا قریب قریب ہے جس طرح ذمت الرجل اور ذأمته دونوں کا معنی ہے میں نے اس پر عیب لگایا۔ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ یعنی آخرت سے۔ ابواسحاق تمیمی سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں: وَ اَنّٰی لَهُمُ یعنی لوٹنا۔ انہوں نے لوٹنے کا سوال کیا جب کہ وہ لوٹنے کا وقت نہیں۔

وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ یَقْذِفُوْنَ بِالْغَیْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۵۳﴾

''حالانکہ وہ کفر کرتے رہے ان سے اس سے پہلے اور دور سے بن دیکھے یاوہ گوئیاں کرتے رہے''۔

وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ ہا ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ مِنْ قَبْلُ یعنی دنیا میں۔ وَ یَقْذِفُوْنَ بِالْغَیْبِ عرب ہر ایسے شخص کے بارے میں کہتے ہیں جو ایسی گفتگو کرتا ہے جو مناسب نہیں: وتی: هو يقذف ويرجم بالغيب۔ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ جو آدمی پتھر پھینکتا ہے اور وہ صحیح جگہ نہیں پہنچتا، اس کے لیے

تمثیل کے طریقہ پر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ ظن و تخمین کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کوئی دوبارہ اٹھانا نہیں، کوئی نشور نہیں (1)، کوئی جنت نہیں اور کوئی دوزخ نہیں۔ وہ یہ باتیں ظن و تخمین کے طور پر کرتے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قرآن پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ جادو ہے، یہ شعر ہے اور یہ پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ وہ حضرت محمد علیہ التحیۃ والثناء کے بارے میں ایسی بات کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: یہ جادوگر، شاعر، کاہن اور مجنون ہیں۔

مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ اللہ تعالیٰ نے انہیں بعید کر دیا ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو جانیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دل سے دور ہونے کا ارادہ کیا ہے یعنی ان کے دلوں سے دور جگہ۔ مجاہد نے قراءت کی وَ يُقْذَفُوْنَ بِالْغَيْبِ فعل مجہول ہے۔ یعنی انہیں پھینکا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو انہیں گمراہ کرتا تھا اور بہکاتا تھا اسے ان کی طرف پھینکا جائے گا۔

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ۠ ۝

''اور رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جو وہ دل سے چاہتے ہوں گے جیسے ان کے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ پہلے کیا گیا تھا، وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو دوسروں کو بھی شک میں ڈالنے والا تھا''۔

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ یعنی ان کے درمیان اور ان کی نجات کے درمیان عذاب حائل ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے درمیان اور دنیا میں جو وہ اموال اور اہل کے خواہش کرتے تھے ان کے درمیان عذاب حائل ہو جائے گا۔ قتادہ کا مذہب ہے جب انہوں نے عذاب دیکھا تو اس وقت وہ خواہش رکھتے تھے کہ ان کی جانب سے یہ قبول ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کو بجا لائیں اور باقی چیزوں سے رک جائیں، تو ان کے درمیان اور ان کی خواہش کے درمیان رکاوٹ قائم کر دی جائے گی، کیونکہ اس کا وقت دنیا تھا اور اس وقت میں یہ چیز زائل ہو چکی ہے۔ اصل حول ہے واؤ کی حرکت حاء کو دی گئی تو واؤ یاء ہو گئی۔

كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ، اشیاع یہ شیع کی جمع ہے۔ شیع یہ شیعۃ کی جمع ہے۔ من قبل اس سے مراد گزری ہوئی کافر قومیں ہیں۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ وہ رسولوں، بعثت، جنت اور دوزخ کے بارے میں شک میں مبتلا تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ دین اور توحید کے بارے میں شک میں مبتلا تھے۔ معنی ایک ہی ہے۔ مریب جس کے ساتھ شک میں پڑا جاتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اراب الرجل وہ شک والا ہو گیا۔ جس نے کہا: یہ اس ریب سے ہے جس کا معنی شک اور تہمت ہے اس نے کہا: یہ کہا جاتا ہے شک مریب جس طرح کہا جاتا ہے: عجب عجیب، شعر شاعر، یہ تاکید کے لیے ہوتا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 253

# سورۂ فاطر

آیاتہا ۴۵ ۳۵ سورۃ فاطر مکیۃ ۴۳ رکوعاتہا ۵

تمام کے قول میں یہ سورت مکی ہے، اس کی پینتالیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

سب تعریفیں الله کے لیے جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا جس نے بنایا ہے فرشتوں کو پیغام رساں جو پردار بازوں والے ہیں کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار، وہ زیادہ کرتا ہے بناوٹ میں جو چاہتا ہے، بے شک الله تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، فَاطِرِ میں تین وجوہ ہیں: (۱) جر یہ صفت ہونے کی بنا پر ہے (۲) رفع یہ مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر ہے۔ (۳) نصب مدح کی بنا پر ہے۔ سیبویہ نے یہ حکایت بیان کی ہے الحمد الله اهل الحمد مثله اس طرح جاعل الملائكة میں تین اعراب ہو سکتے ہیں۔ فاطر سے مراد خالق ہے۔ سورۂ یوسف اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ فطر سے مراد کسی شے سے کسی چیز کو پھاڑنا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فطرته فانفطر میں نے اسے پھاڑا تو وہ پھٹ گیا۔ اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فطر ناب البعير اونٹ کی داڑھ ظاہر ہوئی۔ بعير فاطر جس اونٹ کی داڑھ ظاہر ہو چکی ہو۔ تفطر الشی شے پھٹ گئی۔ سیف فطار ایسی تلوار جس میں دندانے پڑھ چکے ہو۔ عنترہ نے کہا:

وسیفی کالعقیقة فھو کِمْعِی سلاحی لا أَفَلّ وَلا فُطَارا

میری تلوار شعاع کی طرح ہے وہ میرا بستہ ہے میرا اسلحہ نہ کند ہوا اور نہ ہی اس میں دندانے پڑے۔

فطر کا معنی ابتدا کرنا اور ایجاد کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں یہ نہیں جانتا تھا کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا کیا معنی ہے (1) یہاں تک کہ میرے پاس دو بدو آئے جو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑ رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتها میں نے اسے شروع کیا تھا۔ فطر سے مراد انگشت شہادت اور انگوٹھے سے اونٹنی کو دوہنا ہے۔ آسمانوں اور زمین کے ذکر سے مراد تمام عالم ہے۔ اس استدلال کے ساتھ اس امر پر متنبہ کیا کہ جو ابتدا پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 461

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ اسم فاعل میں تنوین جائز نہیں کیونکہ یہ ماضی کے معنی میں ہے۔ رُسُلًا یہ مفعول ثانی ہے۔ یہ قول بھی کیا جاتا ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر منصوب ہے، کیونکہ اسم فاعل کا صیغہ جب ماضی کے معنی میں ہو تو وہ کسی چیز میں عمل نہیں کرتا۔ اس کے عمل کی صورت یہ ہوگی کہ یہ مستقبل کا معنی دے اور اس سے تنوین تخفیف کے طور پر حذف ہو۔ ضحاک نے اسے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا یہاں رسل سے مراد حضرت جبریل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت ہیں صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ حضرت حسن بصری نے: جَاعِلُ الْمَلٰٓئِكَةِ رفع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ خلید بن نشیط نے جعل الملائکۃ قراءت کی ہے، یہ سب ظاہر ہے۔

اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ یہ صفت ہے، یعنی پروں والے۔ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یعنی دو دو، تین تین اور چار چار۔ قتادہ نے کہا: ان میں سے بعض کے دو پر ہیں، بعض کے تین پر ہیں اور بعض کے چار پر ہیں، ان کے ساتھ وہ آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں اور زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں ایک وقت میں اتنی مسافت ہوتی ہے۔ یعنی انہیں قاصد بنایا۔

یحییٰ بن سلام نے کہا: انبیاء کی جانب۔ سدی نے کہا: بندوں کی جانب رحمت اور انتقام کے ساتھ۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل امین کو دیکھا جب کہ آپ کے چھ سو پر تھے (1)۔ زہری سے مروی ہے کہ حضرت جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ حضرت اسرافیل کو دیکھتے ان کے بارہ ہزار پر ہیں ان میں سے ایک پر مشرق میں اور ایک پر مغرب میں ہے۔ عرش ان کے کندھے پر ہے بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ وصع کی طرح ہو جاتا ہے، وصع ایک چھوٹی چڑیا ہے یہاں تک کہ تیرے رب کے عرش کو اس کی عظمت کے سوا کوئی چیز اٹھائے ہوئے نہیں ہوتی۔ اولو، ذو کی اسم جمع ہے۔ جس طرح ھولاء، ذا کی اسم جمع ہے۔ اسم معرب میں ان دونوں کی مثل مخاض اور خلفہ ہے۔ مثنی، ثلاث اور رباع میں گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ یہ غیر منصرف ہیں۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اکثر مفسرین کا قول ہے: ملائکہ کی تخلیق میں اضافہ فرماتا ہے؛ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد ہے فرشتوں کے پروں میں جتنا چاہتا ہے اضافہ فرماتا ہے (2)۔ زہری اور ابن جریج نے کہا: حسن صورت میں اضافہ فرماتا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ ہیثم فارسی نے کہا: میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو ہیثم ہے جو اپنی آواز کے ساتھ قرآن کو خوبصورت انداز میں پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے''۔ قتادہ نے کہا: يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ سے مراد ہے وہ آنکھوں میں ملاحت، ناک میں حسن اور منہ میں مٹھاس کا اضافہ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اچھا خط۔ مہاجر کلاعی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اچھا خط کلام کی وضاحت میں اضافہ کرتا ہے'' (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد خوبصورت چہرہ ہے۔ ایک قول یہ کیا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، معنی قولہ تعالی ولقد راٰہ نزلۃ اخری، جلد 1، صفحہ 98

2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 331

3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 462

گیا ہے: اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت ہے: ''خوبصورت چہرہ، اچھی آواز اور اچھے بال''۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ نقاش نے کہا: اس سے مراد گھنگھریالے بال ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عقل اور تمیز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد علوم اور صنائع ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اللہ تعالیٰ کمی اور بیشی پر قادر ہے۔ زمخشری نے کہا: آیت مطلق ہے جو ہر زیادتی کو شامل ہے وہ قد و قامت کی طوالت، صورت میں اعتدال، اعضاء میں کمال، پکڑ میں قوت ہو، عقل میں پختگی ہو، رائے میں استحکام ہو، دل میں جرأت ہو، نفس میں سخاوت ہو، زبان میں روانی ہو، گفتگو میں مہارت ہو اور سرانجام دینے میں نرمی اور بہترین اسلوب ہو اور اس کے علاوہ صورتیں ہو سکتی ہیں وصف جن کا احاطہ نہیں کر سکتا (1)۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

''جو عطا فرمائے اللہ تعالیٰ لوگوں کو (اپنی) رحمت سے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اسے کوئی دینے والا نہیں اس کے روکنے کے بعد اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے''۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا قرآن کے علاوہ نحویوں نے فَلَا مُمْسِكَ لَهَا جائز قرار دیا ہے وہ ما کے لفظ کا اعتبار کرتے ہیں اور لہا میں معنی کا اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے و ما یمسك فلا مرسل لها کو بھی جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے یہ بھی جائز قرار دیا ہے مَا یَفْتَحُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ یعنی یفتح پر رفع کو جائز قرار دیا ہے۔ ما یہ الذی کے معنی میں ہے، یعنی رسولوں کو لوگوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی بھی ان کو بھیجنے پر راضی نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ ان پر بارش یا رزق بھیجتا ہے کوئی اسے روکنے پر قادر نہیں (2)۔ اور اس میں سے جسے روکے کوئی اس کو بھیجنے پر قادر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دعا ہے (3)؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد توبہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد توفیق اور ہدایت ہے۔

میں کہتا ہوں: لفظ رحمت سب کو جامع ہے کیونکہ یہ اشتراک اور ابہام کا انکار کرتی ہے، یہ بدل کے طریقہ پر ہر رحمت کو شامل ہے۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ ان سب کو عام ہے۔ موطا امام مالک میں ہے انہیں یہ خبر پہنچی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے جب وہ صبح کرتے اور لوگوں پر بارش ہوئی ہوتی؛ ہم پر نوء فتح سے بارش کی گئی، پھر اس آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 596 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 462 3۔ ایضاً

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۝

''اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی (بھلا یہ تو بتاؤ) کیا اللہ کے بغیر کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں رزق دیتا ہے آسمان اور زمین سے، نہیں کوئی معبود بجز اس کے سو (اس سے) منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو؟''۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اس ذکر سے مراد شکر ہے هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ غیر کے لفظ میں رفع، نصب اور جر جائز ہیں۔ رفع دو وجوہ سے ہے: ایک صورت یہ ہے کہ کلام اس معنی میں ہے هل من خالق الله یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی خالق نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے۔ یہ خالق کی صفت ہو مگر اعراب میں خالق کے محل کا اعتبار ہے، کیونکہ معنی ہے هل خالق غیر الله، من زائدہ ہے۔ نصب استثناء کے طریقہ پر ہے۔ جر لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہے۔ حمید طویل نے کہا: میں نے حضرت حسن بصری سے کہا: شر کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: سبحان اللہ! کیا اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے، اسی نے خیر اور شر کو پیدا کیا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے قراءت کی هل من خالق غیر الله باقی قراء نے رفع کے ساتھ قراءت کی ہے۔

یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ، السَّمَآءِ سے مراد بارش ہے۔ وَالْاَرْضِ سے مراد نباتات ہے (1)۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ یہ افک سے مشتق ہے جس میں ہمزہ مفتوح ہے، جس کا معنی پھیرنا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے، ما افك عند كذا کس چیز نے تجھے اس سے پھیر دیا؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ افک سے مشتق ہے، جس کا معنی جھوٹ ہے۔ یہ بحث اسی طرف لوٹ جاتی ہے جو پہلے گزر چکی ہے، کیونکہ یہ ایک قول ہے جس کو صدق اور جواب سے پھیر دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کی تکذیب تمہارے لیے کہاں واقع ہوئی؟ یہ آیت قدریہ پر حجت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے علاوہ کسی کے خالق ہونے کی نفی کی ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اوروں کو بھی خالق مانتے ہیں، جس طرح کئی مواقع پر یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۝

''اور اے حبیب! اگر آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو کوئی نئی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا اور (آخرکار) اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جاتے ہیں''۔

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ ضمیر مرفوع سے مراد کفار قریش ہیں۔ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہا ہے اور صبر میں متقدمین کی اقتدا کا حکم دے رہا ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔

حضرت حسن بصری، اعرج، یعقوب، ابن عامر، ابوحیوہ، ابن محیصن، حمید، اعمش، حمزہ، یحییٰ، کسائی اور خلف تاء پر فتحہ کے ساتھ قراءت کرتے ہیں کہ یہ معروف کا صیغہ ہے۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ۝ (الشوریٰ) باقی فعل مجہول کی بنا پر تُرْجَعُ قراءت کرتے ہیں۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 256

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٝ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

''اے لوگو! (یادرکھو!) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، پس دھوکہ میں نہ ڈال دے تمہیں یہ دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کردے تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریبی''۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ رسولوں کو جھٹلانے والوں کو وعظ کیا جارہا ہے جب کہ پہلے قول کی صحت پر دلیل کی وضاحت کی کہ بعث، ثواب اور عقاب حق ہے۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا سعید بن جبیر نے کہا: دنیاوی زندگی کے غرور سے مراد ہے کہ انسان دنیا کی نعمتوں اور اس کی لذتوں میں مشغول رہے اور آخرت کے عمل سے اعراض برتے یہاں تک کہ وہ کہے: يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۝ (الفجر) ہائے کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کوئی چیز آگے بھیجی ہوتی۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ابن سکیت اور ابو حاتم نے کہا: الغرور سے مراد شیطان ہے۔ غرور یہ غر کی جمع ہے غر مصدر ہے۔ ابو اسحاق کے علاوہ کے نزدیک الغرور کا مصدر ہونا بعید ہے کیونکہ غررته متعدی ہے۔ متعدی مصدر فعل کے وزن پر آتا ہے۔ جس طرح ضربته ضربا مگر چند افعال میں ایسا آتا ہے جس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا: لزمته لزوما، نهكه نهوكا جہاں تک لفظ کے معنی کا تعلق ہے تو جو حضرت سعید بن جبیر نے کہا وہ سب سے اچھا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکہ میں مبتلا ہونے کی صورت یہ ہے کہ انسان برائیوں کا عمل کرے پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی آرزو کرے (1)۔ عام قراءت الغرور فتحہ کے ساتھ ہے اس سے مراد شیطان ہے۔ وہ تمہیں اپنے وساوس کے ساتھ دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ اللہ تعالیٰ تم پر فضل کرتے ہوئے تم سے درگزر فرمائے گا۔ ابو حیوہ، ابو سمال عدوی اور محمد بن سمیقع نے الغرور قراءت کی ہے جس سے مراد باطل ہے۔ یعنی باطل تمہیں دھوکہ میں مبتلا کرتا ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ غرور، غار کی جمع ہے، جس طرح قاعد کی جمع قعود ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غر کی جمع ہے یا یہ ان کے قول کے مشابہ ہے: نهكه المرض نهوكا۔ لزمه لزوما۔ زمخشری نے کہا: یا یہ غرہ کا مصدر ہے جس طرح لزوم اور نہوک ہے (2)۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ ۝ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لیے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے''۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 332
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 599

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا پس تم بھی اس سے دشمنی کرو اور اس کی اطاعت نہ کرو اس کا تمہارے جد اعلیٰ کو جنت سے نکالنا اس کی دشمنی پر دلالت کرتا ہے اور اس کا تمہیں گمراہ کرنے کی ضمانت اٹھانا ولا ضلنهم ولا مَنِّيَنَّهُمْ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے اللہ تعالیٰ نے شیطان کا قصہ اور اس نے ہمارے جد اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا اس کو بیان کیا۔ شیطان نے ہمارے سے پہلے اور اس کے بعد کیسے ہماری عداوت اور دھوکہ دینے کا اطلاق کیا اور ہم اس کے باوجود اس سے دوستی کرتے ہیں اور ہم اس کی ان امور میں اطاعت کرتے ہیں جس میں وہ ہماری ہلاکت کا ارادہ کرتا ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض کہا کرتے تھے: اے جھوٹے انسان! اور اے افتراء باندھنے والے! اعلانیہ شیطان کو گالیاں نہ دے جب کہ تو خفیہ طریقہ سے اس کا دوست ہے۔ ابن سماک نے کہا: اس آدمی پر تعجب ہے جو احسان پہچاننے کے بعد محسن کی نافرمانی کرتا ہے اور لعین کی دشمنی پہچاننے کے بعد لعین کی اطاعت کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ میں یہ جائز ہے کہ وہ عدو، معاد کے معنی میں ہو تو اس صورت میں اس کا تثنیہ اور جمع اور مونث کا صیغہ بنایا جاتا ہے۔ یہ نسبت کے معنی میں ہوتا ہے تو یہ ہر حال میں واحد ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ (الشعراء: 77) مونث میں بھی یہ عدو ہوگا۔ نحاس نے کہا: بعض نحویوں کا قول کہ واؤ خفیفہ ہے وہ اسے ہاء کے ساتھ لاتے ہیں تو یہ غلط ہے بلکہ واؤ مضبوط حرف ہے۔

اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ، ما نے ان کو عمل سے روک دیا تو اس کے بعد فعل واقع ہوا۔ حزبہ اپنے حمایتیوں کو۔ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ تا کہ وہ جہنمی ہو جائیں یہی اس کی علامت ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ، اَلَّذِيْنَ یہ اصحاب سے بدل ہے تو یہ محل جر میں ہوگا یا یہ حزبہ سے بدل ہے تو یہ محل نصب میں ہوگا یا یہ واؤ سے بدل ہوگا تو یہ محل رفع میں واقع ہوگا۔ ایک چوتھا قول ہے اور وہ سب سے اچھا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اس کی خبر لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ہے گویا اللہ تعالیٰ نے اس کی موافقت اور مخالفت کی حالت کو بیان کیا کلام مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ پر مکمل ہو جائے گی، پھر نئی کلام شروع کی فرمایا: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اس کی خبر لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ہے ان کے گناہوں کی بخشش اور جنت ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

”پس کیا وہ شخص جس کے لیے مزین کر دیا گیا ہے اس کا برا عمل اور وہ اس کو خوبصورت نظر آتا ہے (اس کے لیے آپ آزردہ کیوں ہوں) بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لیے فرط غم سے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو (کرتوت) وہ کیا کرتے تھے“۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ، من محل رفع میں ہے اور مبتدا ہے اس کی خبر محذوف ہے۔ کسائی نے کہا: اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ دلالت کرتا ہے، معنی ہے جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کیا گیا تو اس نے اسے اچھا گمان کیا اس پر حسرت کرتے ہوئے تیرا نفس نکلا جا رہا ہے؟ کہا: یہ عربی زبان کی بڑی عمدہ کلام ہے جسے چند افراد ہی جانتے ہیں، زمخشری نے اسے زجاج سے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے کسائی نے سب سے اچھی بات کہی ہے جو اس نے محذوف پر دلالت کا ذکر کیا ہے، اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کے بارے میں شدت غم کرنے اور ان کے بارے میں حزن کرنے سے منع کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (الکہف: 6) اہل تفسیر نے کہا: باخع کا معنی قاتل ہے۔ نصر بن علی نے کہا: میں نے اصمعی سے اہل یمن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بارے میں پوچھا: هم أرق قلوبا وانجع طاعة کہ انجع کا کیا معنی ہے؟ جواب دیا: وہ زیادہ مخلص ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: علماء تفسیر جیسے مجاہد اور دوسرے علماء اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے بارے میں کیا کہتے ہیں: اس کا معنی ہے اپنے نفس کو قتل کرنے والے۔ فرمایا: یہ بعینہ وہ معنی ہے، گویا ان کے زیادہ مخلص ہونے کی وجہ سے اپنے نفس کو قتل کرنے والے ہیں۔ حسین بن فضل نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا معنی ہے کیا وہ شخص جس کا برا عمل اس کے لیے مزین کیا گیا اس نے اسے اچھا خیال کیا پس تیرا نفس ان پر حسرت کرتے ہوئے ہلاک نہ ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے اسے گمراہ کرتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب محذوف ہے، معنی ہے کیا وہ جس کا برا عمل اس کے لیے مزین کیا گیا وہ اس طرح ہو سکتا ہے جس کو ہدایت دی گئی۔ اس محذوف پر یہ الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔

یزید بن قعقاع نے پڑھا: فلا تذهب نفسك۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ میں چار قول ہیں: (۱) اس سے مراد یہودی، نصرانی اور مجوسی ہیں؛ یہ ابو قلابہ کا قول ہے۔ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی ہے (۲) اس سے مراد خوارج ہیں؛ عمر بن قاسم نے اسے روایت کیا ہے سُوْٓءُ عَمَلِهٖ سے مراد تاویل میں تحریف ہے۔ (۳) اس سے مراد شیطان ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(1)۔ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ سے مراد گمراہ کرنا ہے (۴) مراد کفار قریش ہیں؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ سے مراد شرک ہے۔ کہا: یہ آیت عاص بن وائل سہمی اور اسود بن مطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ آیت ابو جہل بن ہشام کے حق میں نازل ہوئی۔ فَرَاٰهُ حَسَنًا حسن سے مراد صحیح ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد خوبصورت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول کہ اس سے مراد کفار قریش ہیں یہ تمام اقوال سے اظہر قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ (البقرہ: 272) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ (آل عمران: 176) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ⑥ (الکہف) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 333

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء) اس آیت میں فرمان ہے: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ یہ ظاہر و بین ہے یعنی آپ ﷺ جو ان کے کفر پر تاسف کر رہے ہیں یہ کوئی نفع نہیں دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کیا ہے۔

یہ آیت قدریہ کا قول جو گزر چکا ہے اس کا رد کرتی ہے، یعنی کیا جس کا برا عمل اس کے لیے مزین کیا گیا ہے وہ اسے اچھا گمان کرتا ہے تو اسے ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے تیرے سپرد نہیں، آپ کے ذمہ تو تبلیغ ہے۔ ابو جعفر، شیبہ اور ابن محیصن نے پڑھا فلا تُذهِب یعنی تاء پر ضمہ اور ہاء پر کسرہ ہے۔ نفسك مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ دونوں معنی قریب قریب ہیں۔ حَسَرٰتٍ منصوب ہے مفعول لاجلہ ہے، یعنی حسرتوں کے لیے اپنے نفس کو نہ گھلائیے۔ عَلَيْهِمْ یہ تَذْهَبْ کا صلہ ہے، جس طرح تو کہتا ہے: هلك عليه حبا و مات عليه حزنا وہ اس کی محبت کی وجہ سے ہلاک ہو گیا اور وہ اس پر غم کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ جس پر حسرت کی جا رہی ہے یہ اس کا بیان ہے۔ یہ جائز نہیں کہ یہ حَسَرٰتٍ کے متعلق ہو، کیونکہ مصدر پر اس کا صلہ متقدم نہیں ہوتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو گویا یہ سب حسرت کی زیادتی کی وجہ سے اس پر حسرت ہو گئے۔ جس طرح جریر نے کہا:

مَشق الهواجرُ لحمهنَّ مع السُّرَى حتى ذهبن كلا كلا و صدورا(1)

شاعر ارادہ کرتا ہے کہ اونٹ لوٹے تو وہ صرف کلاکل اور سینے ہی رہ گئے تھے۔ کلاکل سے مراد اونٹ کے سینے کے نیچے جو گول سا نشان ہوتا ہے۔ اس معنی میں ایک دوسرے شاعر کا قول ہے:

فعلى إثرهم تساقط نفسي حسرات وذكرهم لي سقام

ان کے پیچھے حسرت کرتے ہوئے تیرا نفس گرتا ہے اور ان کا ذکر میرے لیے بیماری ہے۔

یا یہ مصدر ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

## وَ اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھا لاتی ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف پھر ہم زندہ کر دیتے ہیں اس بادل (کے مینہ) سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد یونہی انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا''۔

وَ اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ، مَّيْتٍ اور میت دونوں کا معنی ایک ہے، اسی طرح میتة اور ميتة ہے؛ یہ نحویوں میں سے ماہر لوگوں کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: یہ بصریوں کا قول ہے اس نے کسی کی استثناء نہ کی؛ اس نے اس پر دلائل قطعیہ سے استدلال کیا۔ اور یہ اشعار پڑھے:

ليس من مات فاستراح بميْتٍ إنما الميْت ميت الأحياء
إنما الميْت يعيش كئيبا كاسِفا بالُه قليل الرجاء

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 600

وہ آدمی نہیں مرا جو مرنے سے راحت پا گیا۔ مردہ تو حقیقت میں زندوں سے مرنے والا ہے۔ میت تو حقیقت میں وہ ہے جو غمگین ہو کر زندگی گزارتا ہے اس کا دل بجھا ہوا اور امید کم ہوتی ہے۔

کہا: کیا تو میت اور میت میں فرق دیکھتا ہے اور یہ شعر پڑھا:

هَيْنون لَيْنون أيسارٌ بنو يَسَرٍ سُواس مَكْرُمة أبناء أَيْسار

کہا سب نے اس پر اتفاق کیا کہ ہینون اور لینون ایک ہی چیز ہیں۔

اسی طرح میت اور میت، سید اور سید ایک ہی چیز ہیں۔ وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ کے بعد فَسُقْنٰهُ فرمایا: التفات کے قاعدہ سے ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اس کا طریقہ تو یہ تھا فتسوقه ہوتا کیونکہ فرمایا: فَتُثِيْرُ سَحَابًا۔ زمخشری نے کہا: اگر تو پوچھے کہ فتثیر مضارع کا صیغہ کیوں آیا ہے (1)، اس سے ماقبل اور مابعد مضارع کا صیغہ نہیں؟ میں اس کا جواب دوں گا: تا کہ اس حال کی حکایت بیان کرے جس میں ہوائیں بادلوں کو اڑاتی ہیں اور اس عمدہ صورت کو حاضر کرتی ہیں جو قدرت ربانیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ علماء ایسے فعل کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپناتے ہیں جس میں کسی قسم کا امتیاز ہو اور ایسے حال کی خصوصیت ہو جو عجیب وغریب ہے یا مخاطب کو اہمیت دلائے یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو، جس طرح تابط شرا نے کہا:

بأني قد لقيت الغول تهوى بِسَهْب كالصحيفة صحصحان

فأضربها بلا دَهش فخرت صريعا لليدين و للجران(2)

تابط شرا ان اشعار میں اپنی قوم کے سامنے اس حالت کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں بہادری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ وہ جہلاء پر وار کرتا ہے۔ گویا وہ اپنی قوم کے جہلاء دکھاتا ہے۔ مشاہدہ کے ساتھ اس کی حقیقت پر مطلع کرتا ہے تا کہ اس امر پر تعجب کا اظہار کیا جائے کہ وہ ہر ہولناک چیز پر حملہ کی جرأت رکھتا ہے اور یہ مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے۔ اسی طرح مردہ شہر کی طرف بادلوں کو ہانکنا ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی غالب قدرت پر دلائل میں سے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے فسقنا اور أحیینا غیبت کے لفظ سے اس کی طرف عدول کیا گیا ہے جس کا اختصاص میں زیادہ عمل دخل ہے اور اس پر زیادہ دال ہے۔ عام قراءت الریاح ہے۔ ابن محیصن، ابن کثیر، اعمش، یحییٰ، حمزہ اور کسائی نے الریح واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس آیت کی وضاحت اور اس کے بارے میں مفصل گفتگو گزر چکی ہے۔

كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ یعنی اس طرح تمہارے مرنے کے بعد تمہیں زندہ کیا جائے گا۔ یہ نشر الانسان نشورا سے ماخوذ ہے۔ کاف محل رفع میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے مثل أحياء الموت، نشر الاموات۔ ابورزین عقیلی سے مروی ہے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے اور اس کی مخلوق میں اس کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا: ”کیا تو ایسی وادی میں سے نہیں گزرا جو خشک سالی کی وجہ سے ہلاک کی گئی پھر تو اس کے پاس سے گزرا تو وہ سرسبز وشاداب لہرا رہی تھی“ (3)۔ میں نے عرض کی: ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور یہی مخلوق میں

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 601 2۔ ایضاً 3۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 257

اس کی آیت ہے''۔ ہم نے اس کی وضاحت سورۃ الاعراف وغیرہ میں کر دی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝

''جو عزت کا طلبگار ہو (وہ جان لے) کہ ہر قسم کی عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے، اور جو لوگ فریب کاریاں کرتے ہیں۔ برے کاموں کے لیے ان کے لیے شدید عذاب ہے اور ان کا مکر (وفریب) تباہ ہو کر رہے گا''۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا فراء کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے من کان یرید علم العزۃ اسی طرح دوسرے علماء نے بھی فرمایا ہے یعنی جو عزت کے علم کا ارادہ کرتا ہے جس کے ساتھ کوئی ذلت نہیں کیونکہ وہ عزت جو ذلت کی طرف لے جائے تو یہ ذلت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔ وہ عزت جس کے ساتھ کوئی ذلت نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ جمیعا یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ زجاج نے اس کا یہ معنی مقدر کیا ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے عزت کا خواہش مند ہے جب کہ عزت اللہ سبحانہ کے لیے ہے بے شک اللہ تعالیٰ اسے دنیا وآخرت میں عزت دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بہت اچھی تاویل ہے جس طرح روایت آئے گی اس بارے میں ایک مرفوع روایت مروی ہے۔ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سامعین کو اس کی عزت سے مایوس کیا جائے۔ اور انہیں یہ بتانا ہے کہ جو چیز اس ذات کے لیے ثابت ہے اس میں کسی غیر کے لیے کوئی محل طمع نہیں، تو لفظ العزۃ پر جو الف لام ہے یہ عہد خارجی کے لیے ہوگا، ان لوگوں کے نزدیک جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے لیے جو ثابت ہے اسے جانتے ہیں۔ سورۂ یونس میں جو ارشاد ہے: وَ لَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ (یونس:65) اس سے یہی سمجھا جا رہا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرے کہ ہمت والوں کو آگاہ کرے کہ کہاں سے عزت بحال کی جا سکتی ہے اور کہاں سے مستحق بنا جا سکتا ہے؟ پس الف لام استغراق کے لیے ہوگا۔ اس سورت کی آیات سے یہی مفہوم ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ سے عزت چاہی اور فقر اور خضوع کے ذریعے اس کی تصدیق کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو پالے گا۔ ان شاء اللہ۔ نہ اس سے روکا جائے گا اور نہ ہی اس سے حجاب میں رکھا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع کی اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتا ہے''(1) اور جس نے اسے غیر سے طلب کیا تو اللہ تعالیٰ اسے اسی کے سپرد کر دیتا ہے جس سے اس نے اسے طلب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی جماعت کا ذکر کیا جنہوں غیر سے طلب کی فرمایا: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (النساء) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تجھے صراحۃً آگاہ کر دیا جس میں کوئی اشکال نہیں کہ عزت اس کے لیے ہے اس سے جسے چاہتا ہے عزت دار بنا دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے ذلیل بنا دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ

1۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ۔ ما جاء فی التواضع، جلد 2، صفحہ 24

فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جو آدمی دونوں جہانوں کی عزت کا طالب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے'' (1)۔ یہی زجاج کے قول کا معنی ہے۔ جس نے کہا کتنا اچھا کیا:

وإذا تذللت الرقاب تواضعا منا إليك فعزها فی ذلها

جب ہماری گردنیں تیری بارگاہ میں عاجزی سے جھکتی ہیں تو ان کی عزت ان کی عاجزی میں ہوتی ہے۔

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ اس پر کلام مکمل ہوئی، تو پھر شروع کرے گا۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند فرمائے گا یا اس کے صاحب کو رفعت عطا کرے گا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی ہو عمل صالح پاکیزہ کلمات کو بلند کرے گا تو کلام متصل ہوگی جس طرح اس کی وضاحت آرہی ہے۔ صعود سے مراد بلندی کی طرف حرکت ہے اس سے مراد عروج بھی ہے۔ کلام میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ عرض ہے لیکن اس کی قبولیت کو صعود سے بیان کیا ہے کیونکہ ثواب کا محل اوپر کی جانب ہے اور عذاب کا محل نیچے کی جانب ہے۔ زجاج نے کہا: یہ جملہ کہا جاتا ہے: ارتفع الأمر إلى القاضی مراد ہے معاملہ قاضی کے علم میں آ گیا ہے۔ پس یہ علم کے معنی میں ہوگا۔ کلمہ طیب کا خصوصاً ذکر کیا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ثواب اسی پر ہوتا ہے۔ الیہ اس سے مراد ہے الی اللہ یصعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف بلند ہوتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے آسمان اور اس کے محل کی طرف بلند ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کتاب جس میں بندوں کی طاعات ہوتی ہیں انہیں آسمانوں کی طرف بلند کیا جاتا ہے۔ اَلْكَلِمُ الطَّیِّبُ سے مراد توحید ہے جو پاکیزہ عقیدہ سے صادر ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تحمید اور تمجید ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر وغیرہ ہے انہوں نے یہ اشعار پڑھے:

لا ترضَ من رجلٍ حلاوةَ قوله حتى يُزَيِّن ما يقول فَعالُ

فإذا وزنت فعاله بمقاله فتوازنا فإخاء ذاك جَمالُ

تو کسی آدمی کی میٹھی گفتگو سے راضی نہ ہو یہاں تک کہ عمل اس کے قول کو مزین نہ کرے۔ جب تو اس کے عمل کا اس کے قول کے ساتھ موازنہ کرے اور وہ متوازن ہوں تو اس کے روپ میں جمال ہے۔

ابن مقفع نے کہا: عمل کے بغیر قول ایسا ثرید ہے جس میں گوشت کی چکنائی نہ ہو اور ایسا بادل ہے جس میں بارش نہ ہو، ایسی کمان ہے جس میں تانت نہ ہو۔ اسی کے بارے میں ایک شاعر نے کہا:

لا يكون المقال إلا بفعلٍ كلُّ قولٍ بلا فعالٍ هَبَاءُ

إنَّ قولًا بلا فعالٍ جميل ونكاحًا بلا وَلِيٍّ سواء

قول فعل کے بغیر کچھ بھی نہیں ہر قول فعل کے بغیر ہوا میں اڑنے والے ذرات کی مانند ہے، بے شک ایسا قول جو

1۔ تاریخ بغداد خطیب، جلد 4، صفحہ 80، جلد 8، صفحہ 171

خوبصورت عمل کے بغیر ہو اور جو نکاح ولی کے بغیر ہو برابر ہیں۔

ضحاک نے یصعد یاء کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی جمہور لوگوں نے الکلم کلمۃ کی جمع قراءت کی۔ ابوعبدالرحمن نے الکلام قراءت کی۔

میں کہتا ہوں: اس تعبیر کی بنا پر کلام کا لفظ کبھی کلم کے معنی میں اور کبھی اس کے برعکس پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ ابو القاسم کا قول بھی اس معنی میں لیا جاتا ہے: کلام کی تین قسمیں ہیں: پس کلام کو کلم کی جگہ رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے عمل صالح پاکیزہ کلمات کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے(1)، حدیث طیبہ میں ہے: ''اللہ تعالیٰ عمل کے ساتھ قول کو قبول کرتا ہے اور قول و عمل کو قبول نہیں کرتا مگر نیت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور قول، عمل اور نیت کو قبول نہیں کرتا مگر سنت کو پانے کے ساتھ قبول فرماتا ہے''(2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، پاکیزہ کلمہ کہے اور فرائض ادا کرے تو اس کا قول، عمل کے ساتھ بلند ہوتا ہے۔ اور جب اس نے اچھا قول تو کیا اور اس نے فرائض ادا نہ کیے تو اس کا قول اس کے عمل کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا قول ہے اہل سنت کے معتقدات جس کا رد کرتے ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں۔ حق یہ ہے کہ نافرمان فرائض کو ترک کرنے والا جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور پاکیزہ کلام کرتا ہے تو اس کے حق میں یہ لکھا جاتا ہے اور اس سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے حق میں نیکیاں ہوتی ہیں اور اس کے خلاف برائیاں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایسے شخص سے اچھا عمل قبول کرتا ہے جو شرک سے بچتا ہے، نیز پاکیزہ کلام بھی عمل صالح ہے۔ جو یہ کہتا ہے: عمل ہی کلام کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے اس کا قول بھی درست ہو سکتا ہے کہ اس کی یوں تاویل کی جائے کہ یہ اسے مزید بلند کرتا ہے، اور اس کا موقع محل زیادہ حسین ہو جاتا ہے جب عمل قول کے ساتھ مل جائے، جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اعمال کرنے والے کے لیے معاملہ ہوتا ہے۔ جب اعمال کے درمیان پاکیزہ کلمات آجائیں اور وہ انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو اعمال زیادہ شرف کا باعث ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ یہ نصیحت ہے، تذکرہ ہے اور اعمال پر برانگیختہ کرنا ہے۔ جہاں تک اقوال کا تعلق ہے وہ اپنی ذات میں اعمال ہیں، جس طرح توحید اور تسبیح یہ مقبول ہیں۔

ابن عربی نے کہا: انسان کا کلام جو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی صورت میں ہو اگر اس کے ساتھ عمل صالح مقترن نہ ہو تو وہ کچھ نفع نہ دے گا، کیونکہ جس کا قول اس کے فعل کے خلاف ہو وہ اس کے لیے وبال ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ عمل جب قول کی قبولیت میں شرط نہ ہو تو اس کا پاکیزہ کلمہ بھی اس کے حق میں لکھا جائے گا اور اس کا برا عمل بھی لکھا جائے گا، دونوں میں موازنہ ہو گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی، نفع اور نقصان کا فیصلہ فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں: ابن عربی نے جو کچھ کہا ہے اس میں تحقیق کی گئی ہے ظاہر یہ ہے کہ عمل صالح پاکیزہ قول کے قبول کرنے میں شرط ہے۔ آثار میں یہ آیا ہے کہ بندہ جب یہ کہتا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جب کہ اس کی نیت صادق ہوتی ہے تو فرشتے اس کے عمل کو

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 333　2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 603

دیکھتے ہیں۔ اگر عمل اس کے قول کے موافق ہو تو دونوں بلند ہو جاتے ہیں اگر عمل مخالف ہو تو اس کا قول رک جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے عمل سے توبہ کر لے۔ اس تعبیر کی بنا پر عمل صالح پاکیزہ کلمہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند کرتا ہے۔ **یَرْفَعُهٗ** میں ضمیر **الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** کی طرف لوٹتی ہے؛ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، شہر بن حوشب، سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، ابوالعالیہ اور ضحاک کا ہے۔

اور **الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** سے مراد توحید ہے (1)، یہی عمل صالح کو بلند کرتا ہے، کیونکہ عمل صالح ایمان اور توحید کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے اور عمل صالح کو پاکیزہ کلمہ بلند کرتا ہے۔ ضمیر عمل صالح کی طرف لوٹے گی؛ یہ قول شہر بن حوشب سے مروی ہے، کہا: **الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** سے مراد قرآن ہے اور عمل صالح قرآن کو بلند کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ عمل صالح کو پاکیزہ کلمہ پر بلند کرتا ہے، کیونکہ عمل کلمہ کو ثابت کرتا ہے اور عامل، قائل سے زیادہ مشقت برداشت کرتا ہے، یہی کلام کی حقیقت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی رفعت عطا کرنے والی ہے اور پستی دینے والی ہے۔ دوسری اور پہلی تعبیر میں مجاز کا قاعدہ ہے لیکن وہ جائز ہے۔ نحاس نے کہا: پہلا قول زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح ہے کیونکہ جس نے کہا ہے وہ بلند رتبہ والا ہے اور وہ عربی زبان میں بھی اولی ہے کیونکہ قراء العمل کو رفع دیتے ہیں۔ اگر معنی ہو عمل صالح کو اللہ تعالیٰ بلندی عطا فرماتا ہے یا عمل صالح الکلم الطیب کو رفعت عطا کرتا ہے تو پسندیدہ اعراب العمل پر نصب تھی۔ ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے العمل کو نصب دی ہو مگر جو حضرت عیسیٰ بن عمر سے مروی ہے انہوں نے کہا: کچھ لوگوں نے اسے العمل الصالح یرفعه الله قراءت کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عمل صالح اپنے عامل کو بلندی عطا کرتا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے عزت کا ارادہ کیا اور اس نے جانا کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کی جاتی ہے (2)؛ قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ذکر کیا کہ کتا نماز کو توڑ دیتا ہے اور اس آیت کی قراءت کی۔ **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ** یہ سلف کے مذہب کے مطابق عمومی لفظ سے عموم کا استدلال ہے۔ جب کہ وہ نماز میں اس کی شرائط کے ساتھ داخل ہوا کوئی چیز اس پر نماز کو قطع نہ کرے گی مگر جو اس قطع کو ثابت کر دے جو قرآن، سنت اور اجماع سے ثابت ہو۔ جو یہ رائے رکھتا ہے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: ''نماز کو عورت، گدھا اور سیاہ کتا توڑ دیتا ہے'' (3)۔ میں نے پوچھا: سیاہ کتا کیوں، سفید کتا اور سرخ کتا کیوں نہیں؟ فرمایا: ''سیاہ کتا شیطان ہے''۔ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔

ایک ایسی روایت آئی ہے جو اس کے معارض ہے، وہ وہ روایت ہے جسے امام بخاری نے ابن شہاب کے بھتیجے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے چچا سے پوچھا کہ نماز کو کون سی چیز توڑ دیتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اسے کوئی چیز بھی نہیں توڑتی۔ عروہ بن زبیر نے مجھے خبر دی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوتے رات کو نماز پڑھتے جب کہ میں، آپ اور قبلہ کے درمیان آپ کے اہل کے بستر پر دائیں بائیں لیٹی ہوتی (4)۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 464
2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ما یستر المصلی، جلد 1، صفحہ 197
4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، من قال لا یقطع الصلوٰۃ شیء، جلد 1، صفحہ 74

**وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ** طبری نے کتاب آداب النقوش میں ذکر کیا ہے یونس بن عبداللہ، سفیان سے وہ لیث بن ابی سلیم سے وہ حضرت شہر بن حوشب اشعری سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: اس سے مراد ریاکاری کرنے والے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خفیہ تدبیر کی جب وہ دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں برے اعمال کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا: مراد شرک ہے السیئات اس کا مفعول ہوگا۔ یہ کہا جاتا ہے بَارَ يَبُوْرُ جب وہ ہلاک اور باطل ہو جائے۔ بَارَتِ السوق جب کساد بازاری ہو جائے۔ اسی سے یہ دعا ہے: نعوذ باللہ من بوار الایم میں بیوگی کی ہلاکت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ○ (الفرقان) تم ہلاک ہونے والی قوم ہو۔ مکر سے مراد وہ عمل ہے جو حیلہ اور دھوکہ کے طریقہ پر کیا جائے۔ سورۂ سبا میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○**

"اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تمہیں مٹی سے پھر پانی کی بوند سے پھر تمہیں بنا دیا جوڑے جوڑے اور نہیں حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے، اور نہ لمبی زندگی دی جاتی ہے کسی طویل العمر کو اور نہ کم رکھی جاتی ہے کسی کی عمر مگر (اس کی تفصیل) کتاب میں درج ہے، بے شک یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے"۔

**وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ** سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی۔ خلق أصلكم من تراب۔

**ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ** پھر نطفہ سے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اباء کی پشتوں سے نکالا۔ **ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا** تم میں سے بعض کو بعض سے ملا دیا۔ مذکر مونث کا زوج (جوڑا) ہے تاکہ دنیا میں بقا مکمل ہو یہاں تک کہ اس کی مدت مکمل ہو۔ **وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ** اللہ تعالیٰ نے تمہیں جوڑا جوڑا بنایا پس مذکر، مونث سے شادی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ان سے نسل جاری ہوتی ہے کوئی حمل نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی کوئی بچہ جنم لیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے تو کوئی شے اس کی تدبیر سے خارج نہیں ہوتی۔

**وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ** اسے معمر نام دیا جس کی طرف وہ جانے والا ہے (1)۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے: کسی کو لمبی عمر نہیں دی جاتی مگر اس کی عمر لکھ لی جاتی ہے کہ وہ کتنے

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 603

سال ہے، کتنے مہینے ہے، کتنے دن اور کتنی ساعتیں ہیں، پھر ایک اور کتاب میں لکھا جاتا ہے: اس کی زندگی سے ایک دن کم ہو گیا ہے ایک مہینہ کم ہو گیا ہے، ایک سال کم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ اس کی عمر پوری ہو جاتی ہے؛ یہ قول سعید بن جبیر کا بھی ہے۔ کہا: اس کی عمر سے جو وقت گزر جاتا ہے تو وہی نقصان ہے اور جو آئندہ ہے تو وہی اس کی عمر لمبی کی جاتی ہے۔ اس صورت میں ہاء ضمیر معمر کے لیے ہوگی۔

سعید سے یہ قول بھی مروی ہے: اس کی عمر اتنے اتنے سال لکھی جاتی ہے پھر اس کے نیچے لکھا جاتا ہے: ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آ جاتا ہے۔ قتادہ سے مروی ہے: معمر اسے کہتے ہیں جس کی عمر ساٹھ سال تک ہو۔ جس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے وہ وہ ہے جس کو ساٹھ سال پہلے موت آ جائے۔ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ کے معنی کے بارے میں فراء کا مذہب ہے جو اس کی عمر ہوتی ہے۔ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ سے مراد دوسرا معمر ہے یعنی دوسرے کی عمر میں کمی نہیں کی جاتی مگر کتاب میں۔ عمرہ کی ضمیر دوسرے کی طرف لوٹتی ہے پہلے کی طرف نہیں لوٹتی۔ اس کو ہاء ضمیر کے ساتھ کنایہ کے طور پر ذکر کیا گویا وہ پہلا ہی معمر ہے اس کی مثل تیرا یہ قول ہے: عندی درهم ونصفه یعنی میرے پاس ایک درہم اور اس کے علاوہ ایک اور نصف ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انسان کی عمر سو سال لکھی ہے اگر وہ اطاعت کرے اور نوے سال لکھی ہے اگر وہ نافرمانی کرے۔ وہ جس عمر تک بھی پہنچا تو وہ کتاب میں ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی طرح ہے: من احب ان یبسط له فی رزقه وینسأله فی اثرہ فلیصل رحمه (1) جو آدمی یہ پسند کرے کہ اس کے رزق میں فراخی کی جائے اور اس کی عمر میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے، یعنی لوح محفوظ میں لکھا جاتا ہے: فلاں کی عمر اتنے سال ہے اگر اس نے صلہ رحمی کی تو اس کی عمر میں اتنے سال اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک اور جگہ من اللوح المحفوظ کی وضاحت کی وہ صلہ رحمی کرے گا۔ جو پہلے ارشاد پر مطلع ہوا دوسرے ارشاد پر مطلع نہ ہوا اس نے یہ گمان کیا کہ یہ زیادتی اور کمی ہے۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت بھی گزر چکا ہے: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ (الرعد: 39) اس صورت میں ضمیر عمر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ کا معنی ہے بوڑھا ہو جانا (2)، یعنی بڑھاپے کی عمر میں کمی نہیں کی جاتی مگر کتاب میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے فیصلہ سے ایسا ہوتا ہے؛ اس کا معنی ضحاک سے مروی ہے اور نحاس نے اسے پسند کیا ہے۔ کہا: یہ قرآن کے ظاہر کے مشابہ ہے اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس تعبیر کی صورت میں ہاء کے بارے میں جائز ہے کہ یہ معمر کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ غیر معمر کے لیے ہو۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ اعمال اور آجال کی کتابت اس پر متعذر نہیں عام قراءت يُنْقَصُ یاء کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ایک جماعت جس میں یعقوب بھی ہے اس نے يَنْقُصُ قراءت کی ہے۔ یاء پر فتحہ اور قاف پر ضمہ ہے یعنی اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، من بسط له فی الرزق بصلة الرحم، جلد 2، صفحہ 885

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 465

کی عمر میں سے کچھ کی بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: نَقَصَ الشئُ بنفسہ، نَقَصہ غیرُہٗ زَادَ بنفسہ، زَادَہٗ غَیرُہٗ۔ یہ افعال متعدی اور لازم دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اعرج اور زہری نے من عمرہ کو میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے ضمہ دیا ہے۔ یہ سُحق اور سُحُق کی مثل دونوں لغتیں ہیں۔ یسیر یعنی طویل عمر ہو یا چھوٹی عمر ہو اس کا شمار کرنا ان پر کوئی مشکل نہیں۔ اس سے فعل یسر ہے۔ اگر تو اس کے ساتھ کسی انسان کا نام رکھے تو وہ منصرف ہوگا کیونکہ یہ فعیل کا وزن ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲

''اور یکساں نہیں ہو سکتے پانی کے دو ذخیرے یہ (ایک میٹھا) ہے بہت شیریں اس کا پینا بڑا خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) سخت نمکین، کھاری، تلخ اور دونوں میں سے تم کھاتے ہو تر وتازہ گوشت اور نکالتے ہو زینت کا سامان جسے تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو پانی میں کہ اسے چیرتی شور مچاتی چلی جارہی ہیں تاکہ تم تلاش کر سکو اس کے فضل کو اور (یہ سب نوازشات اس لیے ہیں) تاکہ تم شکر ادا کرو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرات کا معنی میٹھا ہے اور اجاج کا معنی کڑوا ہے۔ طلحہ نے قراءت کی هٰذَا مَلِحٌ اُجَاجٌ میم پر فتحہ اور لام کے نیچے کسرہ ہے الف نہیں ہے۔ جہاں تک مالح کا تعلق ہے وہ وہ ہوتا ہے جس میں نمک ڈالا جاتا ہے۔ عیسیٰ اور ابن ابی اسحاق نے سَیِّغٌ شَرَابُهٗ قراءت کی ہے جس طرح سید اور میت ہے وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ: گوشت (مچھلی) ان دونوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ النحل میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ابواسحاق کا مذہب یہ ہے کہ زیور نمکین سمندر سے نکالا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان دونوں سے نکالا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں ملے ہوتے ہیں۔ ایک اور نے کہا: وہ سیپیاں جن میں موتی وغیرہ ہوتے ہیں وہ ایسی جگہ سے نکالے جاتے ہیں جہاں میٹھا اور کھاری پانی اکٹھا ہوتا ہے جس طرح چشمے یہ ان دونوں سے نکالا جاتا ہے، کیونکہ سمندر میں میٹھے چشمے ہوتے ہیں جب یہ ملتے ہیں تو موتی نکلتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بارش سے۔ محمد بن یزید نے چوتھا قول کیا ہے: موتی یہ صرف نمکین سمندر سے نکالے جاتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ ان میں سے سب سے اچھا قول ہے کیونکہ وہ دونوں سمندر ملے ہوتے ہیں، لیکن وہ جمع ہوئے پھر ان میں سے ایک کے بارے میں خبر دی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) اور جس طرح تو کہتا ہے: لو رایت الحسن والحجاج لرأیت خیرا شرا جس طرح تو کہتا ہے: لو رأیت الأصمعی و سیبویہ لملأت

یدل لغۃ و نحوا اگر تو اصمعی اور سیبویہ کو دیکھتا تو تیرا ہاتھ لغت اور نحو سے بھر جاتا۔ اس کا معنی معروف ہے۔ یہ کلام بہت ہی فصیح ہے۔ اسی طرح ہے: وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا پہلے میں دونوں اکٹھے ہیں اور دوسرے میں نمکین سمندر منفرد ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ تَلْبَسُوْنَهَا اس پر دلیل ہے کہ ہر شے کا لباس اس کے مناسب ہوتا ہے انگوٹھی انگلی میں ڈالی جاتی ہے، کنگن بازو میں ڈالا جاتا ہے، ہار گردن میں ڈالا جاتا ہے، پازیب پاؤں میں ڈالا جاتا ہے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں ابن سیرین سے مروی ہے کہ میں نے عبیدہ سے کہا: ریشم کا بستر بنانا اس کے پہننے کی طرح ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ صحاح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: فقمت علی حصیر لنا قد أسود من طول ما لبس۔(1) محل استدلال ما لبس ہے میں اپنی ایسی چٹائی پر کھڑا ہوا جو طویل وقت تک استعمال کرنے کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ نحاس نے کہا: یہاں نمکین سمندر مراد ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ارشاد ہوتا: فیھا، قد مخرت السفینۃ تمخر جب وہ پانی کو پھاڑے۔ سورۃ النحل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ مجاہد نے کہا: دور دراز ملکوں کی طرف تجارت کشتیوں کے ذریعے تھوڑی مدت میں ہوتی ہے، جس طرح سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فضلہ سے مراد جو زیور نکالا جاتا ہے اور جو اس کی مچھلیاں شکار کی جاتی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ الله تعالیٰ نے جو تمہیں فضل سے نوازا اس پر تم شکر بجالاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو اس نے تمہیں خوف سے نجات عطا فرمائی (2)۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝

''وہ داخل کرتا ہے (کبھی) رات (کے ایک حصہ) کو دن میں اور (کبھی) داخل کرتا ہے دن (کے ایک حصہ) کو رات میں اور اس نے پابند حکم کر دیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک، یہ ہے الله جو تمہارا رب ہے اسی کی ساری بادشاہی ہے، اور وہ (بت) جن کی تم پوجا کرتے ہو الله تعالیٰ کے سوا وہ تو گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں''۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ سورۂ آل عمران اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى سورۂ لقمان میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ جس کی یہ کاریگری ہے وہی خالق ہے، مدبر ہے، قادر ہے اور مقتدر ہے اسی کی عبادت کی جاتی ہے۔ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ، مِنْ دُوْنِهٖ سے مراد بت ہیں۔ ما یملکون من قطمیر وہ اس پر اور اس کو پیدا

1۔ [illegible] جلد 1 صفحہ 55

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 467

کرنے پر قادر نہیں۔ قطمیر سے مراد وہ رقیق سا سفید پردہ ہے جو کھجور اور گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے؛ یہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد گٹھلی کا شق ہے؛ یہ مبرد کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے اور یہ قتادہ کا قول ہے۔ قتادہ سے یہ بھی مروی ہے: قطمیر سے مراد وہ ڈنڈی ہے جو گٹھلی کے سرے پر ہوتی ہے۔ جوہری نے کہا: اس سے مراد وہ سفید نقطہ ہے جو گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے اسی سے کھجور اگتی ہے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَ لَا یُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِیْرٍ ۠

''اگر تم انہیں پکارو تو نہ سن سکیں گے تمہاری پکار اور اگر وہ بالفرض سن بھی لیں تو وہ تمہاری التجا قبول نہیں کر سکیں گے اور روز قیامت (صاف) انکار کریں گے تمہارے شرک کا اور (حقیقت حال سے) تجھے کوئی آگاہ نہیں کر سکتا خدائے خبیر کی مانند''۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ اگر وہ مصائب میں ان سے مدد طلب کریں تو وہ تمہاری دعا کو نہ سنیں گے کیونکہ یہ جمادات ہیں جو نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی سنتے ہیں۔ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ کیونکہ ہر سننے والا، بولنے والا نہیں ہوتا۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے اگر وہ سن بھی لیں تو تمہیں کوئی نفع نہ دیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہم ان کی عقلیں اور زندگی بنا دیں اور وہ تمہاری دعا کو سنیں تو وہ تمہاری بنسبت اللہ تعالیٰ کی اطاعت زیادہ کریں اور کفر پر ہوتے ہوئے تمہیں کوئی جواب نہ دیں۔

وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وہ انکار کر دیں گے کہ تم نے ان کی عبادت کی ہے اور وہ تم سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے؟ پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام ان معبودوں کی طرف لوٹے جو عقل رکھتے ہیں، جس طرح ملائکہ، جن، انبیاء اور شیاطین، یعنی وہ اس امر کا انکار کر دیں گے کہ تو نے جو کچھ کیا ہے وہ حق ہے اور اس سے انکار کر دیں گے کہ انہوں نے تمہیں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر دی، مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ (المائدہ: 116) میرے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے حق نہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں بت شامل ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کرے گا یہاں تک کہ وہ خبر دیں گے کہ وہ عبادت کے اہل نہیں تھے۔

وَ لَا یُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِیْرٍ خبیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو جاننے والا نہیں، اس کی مثل اس کے عمل یا علم کے بارے میں تجھے کوئی آگاہ کرنے والا نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ۝

''اے لوگو! تم سب محتاج ہو اللہ تعالیٰ کے اور اللہ ہی غنی ہے سب خوبیوں سراہا، اگر اس کی مرضی ہو تو سب کو نابود کر دے اور لے آئے ایک نئی مخلوق اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعاً دشوار نہیں''۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ تم اپنی بقا اور اپنے اصولوں میں اس کے محتاج ہو۔ زمخشری نے کہا: اگر تو کہے

الفقراء کو معرف باللام کیوں لایا گیا ہے؟ میں کہوں گا: اس سے اس امر کا قصد کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دکھائے کہ وہ اس کے شدید محتاج ہونے کی وجہ سے وہ فقراء کی جنس ہیں، اگرچہ تمام مخلوق انسان ہوں یا غیر سب اس کے محتاج ہیں، کیونکہ فقراء ان چیزوں میں سے ہے جو ضعف کے تابع ہوتا ہے جب بھی فقیر زیادہ کمزور ہوگا وہ زیادہ محتاج ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں انسان کے ضعف کی گواہی دی ہے: وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ (النساء) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم: 54) اگر فقراء نکرہ ہوتا تو معنی ہوتا تم فقراء کا بعض ہو۔ اگر تو کہے: الفقراء، الغنی کے بالمقابل رکھا گیا ہے تو الحمید کا کیا معنی ہے؟ میں جواب دوں گا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی بارگاہ میں احتیاج کو ثابت کر دیا اور ان سے اپنی بے نیازی کو ثابت کر دیا جب کہ ہر غنی اپنی غنا کے ساتھ نفع پہنچانے والا نہیں ہوتا مگر جب وہ غنی سخی اور انعام کرنے والا ہو۔ جب وہ سخاوت کرے اور انعام کرے تو جس پر انعام کیا جا رہا ہوتا ہے تو ان پر اس کی حمد کرنا لازم ہو جاتا ہے، الحمید کا ذکر کیا تا کہ اس کے ساتھ اس امر پر دلالت کرے کہ وہ غنی ہے، اپنی غنا کے ساتھ اپنی مخلوق کو نفع پہنچانے والا ہے، وہ سخی ہے اور ان پر انعام فرمانے والا ہے۔ وہ ان پر انعام کرنے کی وجہ سے اس امر کا مستحق ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ خلیل کے نزدیک دوسرے ہمزہ کی تخفیف سب سے عمدہ صورت ہے، پہلے ہمزہ کی تخفیف، دونوں کی تخفیف اور دونوں کی تحقیق بھی جائز ہے۔

وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ، ھو زائد ہے۔ اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوتا۔ یہ مبتدا ہو تو اس کا محل رفع ہوگا۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اس میں حذف ہے معنی ہے اگر وہ تمہیں لے جانا چاہے تو تمہیں فنا کر دے۔ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وہ نئی مخلوق لے آئے جو تمہاری بنسبت زیادہ اطاعت گزار ہو اور تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہو۔ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ اللہ تعالیٰ پر مشکل نہیں۔ سورۂ ابراہیم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

''اور بوجھ نہیں اٹھائے گا کوئی گنہگار کسی دوسرے کا بوجھ اور اگر بلائے گا پشت پر بوجھ اٹھانے والا (کسی کو) اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے تو نہ اٹھائی جا سکے گی اس کے بوجھ سے کوئی شے اگرچہ کوئی قریبی رشتہ دار ہی ہو، آپ صرف ان کو ڈرا سکتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز، اور جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے سو وہ اپنی بھلائی کے لیے اختیار کرتا ہے اور (یاد رکھو آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے''۔

اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے، یہ کلام ماقبل کلام سے الگ کی گئی ہے اصل میں یہ توزر تھا، یزر کی اتباع سے واؤ کو حذف کر دیا گیا۔ وازرۃ یہ محذوف موصوف کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہے نفس وازرۃ اسی طرح وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا ہے فراء نے کہا: نفس مثقلة أو دابة مثقلة اور کہا: یہ نفس مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اخفش

نے کہا: اگر تدع کا مفعول یہ انسان ہو تو مراد اس کے گناہ ہوں گے (1) اور حمل سے مراد وہ چیز ہے جو کسی کی پشت پر ہو اور حمل یہ عورت کا حمل اور کھجور کا حمل ہے۔ کسائی نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ بیان کیا ہے کسی اور طریقہ سے بیان نہیں کیا۔ ابن سکیت نے بیان کیا کہ حمل النخلۃ کھجور کا حمل، یہ فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

**لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى** اخفش کے قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے ولو کان الإنسان المدعو ذا قربی (2)۔ فراء نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے **وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى** سیبویہ کے نزدیک یہ جائز ہے، اس کی مثل **وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ** (البقرہ: 280) ہے تو یہ کان، وقع کے معنی میں ہوگا یا خبر محذوف ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وان کان فیمن تطالبون ذو عسرۃ سیبویہ نے حکایت بیان کی ہے الناس مجزیون بأعمالھم ان خیر فخیر لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا دی جائے گی اگر اعمال اچھے ہوئے تو بدلہ بھی اچھا ملے گا؛ یہ تعبیر دوسرے قول کے اعتبار سے ہے اور ان خیرا فخیر یہ؛ پہلی تعبیر کی بنا پر ہے۔

عکرمہ سے مروی ہے کہ کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہودی اور نصرانی قیامت کے روز مسلمان کو دیکھے گا وہ مسلمان کو کہے گا: کیا میں نے تیری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا؟ کیا میں نے تجھ پر احسان نہیں کیا تھا؟ مسلمان کہے گا: کیوں نہیں۔ یہودی کہے گا: مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ مسلمان لگاتار اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا رہے گا یہاں تک کہ اس کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی۔ ایک آدمی قیامت کے روز اپنے باپ کے پاس آئے گا، وہ عرض کرے گا: کیا میں تیرے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا تھا؟ تجھ پر شفقت نہیں کرتا تھا؟ تجھ پر احسان نہیں کرتا تھا؟ جب کہ تو دیکھ رہا ہے جس مصیبت میں، میں گرفتار ہوں، اپنی نیکیوں میں سے ایک نیکی مجھے عطا کر دے، ایک خطا اپنے ذمہ لے لو۔ باپ کہے گا: تو نے مجھ سے جو سوال کیا ہے وہ معمولی چیز ہے لیکن میں بھی اسی چیز سے ڈرتا ہوں جس سے تو ڈرتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے سے اس کی مثل کہے گا، تو بیٹا بھی اپنے باپ کو اسی طرح کا جواب دے گا۔ مرد اپنی بیوی سے کہے گا: کیا میں تیرے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا تھا؟ مجھ سے ایک خطا اٹھا لو ممکن ہے میں نجات پا جاؤں بیوی کہے گی یہ معمولی چیز ہے لیکن میں اس چیز سے ڈرتی ہوں جس سے تو ڈرتا ہے پھر عکرمہ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ فضیل بن عیاض نے کہا: ہر عورت اپنے بچے سے ملے گی وہ کہے گی: اے بیٹے! کیا میرا پیٹ تیرے لیے حفاظت کرنے والا برتن نہیں تھا؟ کیا میرا پستان تیرے لیے مشکیزہ نہ تھا؟ کیا میری گود تیری آرام گاہ نہ تھی؟ وہ بچہ کہے گا: کیوں نہیں، اے میری ماں! وہ کہے گی: اے میرے بیٹے! میرے گناہ بوجھل ہو گئے ہیں مجھ سے میرے ایک گناہ کو اٹھا لے، بچہ کہے گا: اے ماں! مجھ سے دور ہو جا میں تیرے بجائے اپنے گناہوں میں مشغول ہوں۔

**اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ** جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہی تیرے ڈرانے کو قبول کرتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: **اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ** (یاسین: 11)

**وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ** جو ہدایت پاتا ہے وہ اپنے لیے ہدایت پاتا ہے۔ اس میں ایک قراءت یہ بھی ہے ومن أزکی فإنما یزکی لنفسہ۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 261 2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 522

وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ تمام مخلوقات نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا اور نہ (یکساں ہیں) اندھیرے اور نور اور نہ (یکساں ہے) سایہ اور تیز دھوپ اور نہ ہی ایک جیسے ہیں زندے اور مردے، بے شک اللہ تعالیٰ سناتا ہے جس کو چاہتا ہے اور آپ نہیں سنانے والے جو قبروں میں ہیں''۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ یعنی کافر اور مومن، جاہل اور عالم برابر نہیں (1)، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ (المائدہ:100)

وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ اخفش اور سعید نے کہا: لا زائدہ ہے اس کا معنی ہے ولا الظلمات والنور ولا الظل والحرور نہ تاریکیاں اور نور اور نہ سائے اور تپش۔ اخفش نے کہا: حرور (تپش) سورج کے ساتھ ہوتی ہے اور سموم رات کے ساتھ ہوتی ہے (2)۔ ایک قول اس کے برعکس کیا گیا ہے۔ مہدوی نے حکایت بیان کی ہے، فراء نے کہا: سموم دن کے وقت ہوتی ہے اور حرور دن اور رات میں ہوتی ہے (3)۔ نحاس نے کہا: یہ قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ حرور فعول کا وزن ہے یہ حر سے مشتق ہے اس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے یعنی تکلیف دہ گرمی۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جہنم نے عرض کی: اے میرے رب! میرے بعض نے بعض کو کھالیا ہے مجھے اجازت دیجئے کہ میں دو سانس لے لوں ایک سانس موسم سرما میں اور ایک سانس موسم گرما میں۔ تم جو سردی یا سخت ٹھنڈک پاتے ہو تو یہ جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے ہے اور تم جو گرمی یا شدید گرمی پاتے ہو تو یہ جہنم کی سانس کی وجہ سے ہے'' (4)۔ زہری نے سعید سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ''تم جو گرمی پاتے ہو تو یہ اس کی سموم سے ہے اور تم جو شدت کی سردی پاتے ہو تو اس کی زمہریر سے ہے'' (5)۔ یہ ان تمام اقوال کو جامع ہے۔ سموم اور حرور یہ رات اور دن کو ہوتے ہیں۔ جنت دائمی سائے والی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (الرعد:35) جہنم گرمی والی ہے؛ یہ معنی سدی نے کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رات کا سایہ اور دن کے وقت سموم کی گرمی (6)۔ قطرب نے کہا: حرور سے مراد گرمی اور ظل سے مراد سردی ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 523 | 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 469 | 3۔ ایضاً

4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، استحباب الابراد بالظہر، جلد 1، صفحہ 224

5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 224 | 6۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 469

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ابن قتیبہ نے کہا: احیاء سے مراد عقلاء ہیں اور اموات سے مراد جہلاء ہیں (1)۔ قتادہ نے کہا: یہ سب امثال ہیں، یعنی جس طرح یہ اشیاء برابر نہیں ہو سکتیں اسی طرح کافر اور مومن برابر نہیں ہو سکتے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ اپنے ان اولیاء کو سناتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے پیدا کیا۔ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ یعنی وہ کفار جن کے دلوں کو کفر نے مار دیا ہے۔ یعنی جس طرح جو مر چکا ہے اسے آپ نہیں سناتے اسی طرح جس کا دل مردہ ہے اسے آپ نہیں سناتے۔ حضرت حسن بصری، عیسیٰ ثقفی اور عمرو بن میمون نے بمسمع من فی القبور تنوین کو حذف کرتے ہوئے تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے یعنی وہ اہل قبور کے قائم مقام ہیں کہ جسے سنتے ہیں اس سے نفع نہیں اٹھاتے اور اسے قبول نہیں کرتے۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝

''نہیں ہیں آپ مگر بروقت ڈرانے والے''۔

یعنی آپ ڈرانے والے رسول ہیں آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے، آپ کے ذمہ ہدایت دینا نہیں، ہدایت اللہ تعالیٰ نے اپنے قبضہ قدرت میں رکھی ہوئی ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝

''ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو''۔

یعنی اہل طاعت کو جنت کی بشارت دینے والا (2) اور اہل معصیت کو جہنم سے ڈرانے والا اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ سے مراد ہے ہر امت میں نبی گزرا ہے۔ ابن جریج نے کہا: مگر عربوں میں نہیں گزرا۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

''اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو (کوئی تعجب نہیں) بے شک جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے تشریف لاتے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں، آسمانی صحیفے اور نور والی کتاب لے کر پھر (جب ان کی سرکشی کی حد ہو گئی) تو میں نے پکڑ لیا کفار کو بس (ساری دنیا جانتی ہے) میرا عذاب کیسا تھا''۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ مراد قریش کے کفار ہیں یعنی اگر قریش کے کفار تمہیں جھٹلائیں۔

فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی اپنے انبیاء کو جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تسلی دے رہا ہے۔ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ان کے پاس ان کے رسول ظاہر معجزات اور واضح شرعی احکام لائے۔ وَ

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 262
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 470

بِالزُّبُرِ سے مراد لکھی ہوئی کتب ہیں۔ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ سے مراد واضح کتاب ہے۔ زبر اور کتاب کو مکرر ذکر کیا کیونکہ لفظ مختلف ہیں جب کہ دونوں ایک چیز ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بینات، زبر اور کتاب سب ایک معنی کی طرف راجع ہیں۔ اس سے وہ کتب مراد ہیں جو انبیاء پر نازل ہوئیں۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ میری ان کو سزا کیسی تھی؟ ورش نے نافع سے جو روایت نقل کی ہے اور شیبہ نے نکیری میں یاء کو ثابت رکھا ہے جب وہ وصل میں واقع ہو وقف میں اسے ثابت نہیں رکھا، یعقوب نے دونوں حالتوں میں اسے ثابت رکھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اسے حذف کر دیا ہے۔ یہ تمام بحث گزر چکی ہے۔ الحمد للہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۭ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝۲۷ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝۲۸

”کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اتارتا ہے آسمان سے پانی پس ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں سے بھی رنگ برنگے ٹکڑے ہیں کوئی سفید، کوئی سرخ مختلف رنگوں میں (کوئی شوخ کوئی مدہم) اور بعض حصے سخت سیاہ اور انسانوں، چارپایوں اور جانوروں کے رنگ بھی اسی طرح جدا جدا ہیں اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب بہت بخشنے والا ہے“۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یہ رویت دل اور علم کی رویت ہے۔ کیا آپ کا علم انتہا کو نہیں پہنچا اور تیرے دل نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر رویۃ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ یہ التفات کے قاعدہ سے ہے۔

مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا، مختلفا کو نصب دی ہے کیونکہ یہ ثمرات کی صفت ہے۔ الوانہا یہ مختلفا کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ ثمرات کی صفت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے کیونکہ ذکر اسی طرف لوٹتا ہے۔ قرآن کے علاوہ میں اسے مرفوع پڑھنا جائز ہے اس کی مثل یہ جملہ ہے: رایت رجلا خارجا ابوہ۔

بہ ضمیر سے مراد پانی ہے یہ واحد ہے اور ثمرات مختلف ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا (فاطر: 27) جدد یہ جُدّہ کی جمع ہے۔ یہ مختلف کیفیتوں کے راستے ہیں اگرچہ سب پتھر یا مٹی ہوتے ہیں۔ اخفش نے کہا: اگر یہ جدید کی جمع ہوتی تو ارشاد فرماتا: جُدُد۔ یعنی جیم اور دال پر ضمہ ہوتا جس طرح سریر اور سُرُر ہے۔

زہیر نے کہا:

كأنه أسفع الخدين ذو جُدُدٍ طاوٍ ويرتع بعد الصيف عُريانا(1)

محل استدلال ذو جدد ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جدد کا معنی ٹکڑے ہیں یہ جددتُ الشیء سے ماخوذ ہے جب تو اسے کاٹے (2)؛ ابن بحر نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ جوہری نے کہا: جُدّہ سے مراد وہ لکیر ہے جو گدھے کی پشت پر ہوتی ہے اور اس کے عمومی رنگ کے خلاف ہوتی ہے۔ جدہ کا معنی راستہ ہے اس کی جمع جدد ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا یعنی ایسے راستے جو پہاڑ کے رنگ کے خلاف ہوتے ہیں، اسی معنی میں ان کا قول ہے: رکب فلان جدة من الامر یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ کوئی رائے قائم کرے۔ کساء مجدد چادر میں مختلف لکیریں ہوں۔ زمخشری نے کہا: زہری نے پڑھا جُدُد، جدائد جس طرح سفینة، سُفُن اور سَفائن۔ ابوذؤیب کے قول نے اس کی تفسیر بیان کی ہے:

جَوْنُ السَّراةِ له جدائد أربع

محل استدلال جدائد ہے۔

ان سے جَدَد دو فتحوں کے ساتھ مروی ہے، اس سے مراد واضح روشن راستہ ہے اسے طرائق اور واضح خطوط کی جگہ رکھا جو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ اسے والدواب تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس تخفیف کی نظیر اس کی قراءت ہے جس نے پڑھا ولا الضالین کیونکہ ان میں سے ہر ایک اجتماع ساکنین سے بھاگا ہے۔ ولا الضالین میں اس نے پہلے ساکن یعنی الف کو حرکت دی اور والدواب میں اس نے دوسری باء کو حذف کر دیا (3)؛ یہ زمخشری کا قول ہے۔

وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ یعنی ان میں سرخ، سفید، سیاہ وغیرہ ہیں (4)۔ ان میں سے ہر ایک صانع پر دال ہے جو مختار ہے۔ فرمایا: مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ من کی رعایت کرتے ہوئے ضمیر کو مذکر ذکر کیا؛ یہ مورج کا قول ہے۔ ابوبکر بن عیاش نے کہا: ضمیر مذکر ذکر کی کیونکہ یہ ما مضمرہ کی طرف منسوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی ومن الناس ومن الدواب، ومن الانعام ماهو مختلف ألوانه لوگوں، چوپاؤں اور جانوروں میں سے مختلف رنگوں کے ہیں، یعنی کچھ سفید، کچھ سرخ اور کچھ سیاہ۔

وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ابوعبید نے کہا: غربیب سے مراد سخت سیاہ ہے، کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے پہاڑوں میں سے سخت سیاہ ہیں۔ عرب شدید سیاہ چیز جس کا رنگ کوے کے رنگ جیسا ہو (5) اس کے بارے میں کہتے ہیں: أسود غرابيب۔ جوہری نے کہا: تو کہتا ہے: هذا اسود غرابيب یہ سخت سیاہ ہے، جب تو کہے: غرابيب سود تو تو سود کو غرابیب سے بدل بنائے گا، کیونکہ رنگوں کی تاکید متقدم نہیں ہوتی۔ حدیث طیبہ میں ہے: ان الله يبغض الشيخ الغربيب (6) اللہ تعالیٰ اس بوڑھے کو

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 470 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 610

4۔ ایضاً 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 471 6۔ ایضاً

ناپسند کرتا ہے جو سیاہ رنگ کا خضاب لگاتا ہے۔ امرء القیس نے کہا:

العین طامحة والید سابحة والرِّجل لافحة والوجه غرابیب(1)

نظر اٹھی ہوئی، اگلا پاؤں تیر رہا ہے اور پاؤں تیزی سے حرکت کر رہا ہے اور چہرہ سیاہ ہے۔

ایک اور شاعر کرم کی تعریف کرتا ہے:

ومن تعاجیب خلق الله غاطیةٌ یُعْصَر منها مُلاحِیٌ و غِرابیب

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے عجوبہ روزگار وہ درخت ہے جس کی شاخیں لمبی ہیں جس سے سفید اور سیاہ رس نچوڑا جاتا ہے۔ محل استدلال غرابیب ہے۔

کَذٰلِكَ یہاں کلام مکمل ہو جاتی ہے یعنی اس طرح خشیت میں بندوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں۔ پھر نئے سرے سے کلام کی اور فرمایا: اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ یعنی وہ علماء جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ڈرتے ہیں جس آدمی کو علم ہو کہ اللہ تعالیٰ قدیر ہے تو اسے یقین ہوگا کہ وہ معصیت پر سزا دینے پر قادر ہے(2)، جس طرح علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہاں علماء سے مراد ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ ربیع سے انس نے کہا: جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں (3)۔ مجاہد نے کہا: بے شک عالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ کی خشیت کے لیے علم کافی ہے اور دھوکہ کھانے کے لیے جہالت کافی ہے۔ سعد بن ابراہیم سے کہا گیا: اہل مدینہ میں سے کون سب سے زیادہ فقیہ ہے(4)؟ فرمایا: جو ان میں سے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔ مجاہد سے مروی ہے: فقیہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے(5)۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حقیقی فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی رخصت نہیں دیتا، انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف نہیں کرتا اور قرآن چھوڑ کر کسی اور چیز میں رغبت نہیں کرتا۔ ایسی عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں علم نہ ہو۔ وہ علم علم نہیں جس میں فقہ نہ ہو، وہ قراءت قراءت نہیں جس میں تدبر نہ ہو(6)۔ داری ابو محمد نے مکحول سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے ادنی آدمی پر ہے(7)، پھر اس آیت کی تلاوت کی: اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ بے شک اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے، اہل آسمان، اہل زمین اور سمندر میں مچھلیاں ان لوگوں پر درود پڑھتے ہیں جو لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں''۔ خبر مرسل ہے(8)۔

دارمی نے کہا: ابو نعمان، حماد بن زید سے وہ یزید بن حازم سے وہ اپنے چچا جریر بن زید سے وہ تبیع سے وہ حضرت کعب

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 471 2۔ ایضاً 3۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 263
4۔ سنن داری، جلد 1، صفحہ 76 5۔ ایضاً، حدیث نمبر 302 6۔ ایضاً، حدیث نمبر 303
7۔ ایضاً، صفحہ 75، حدیث نمبر 295 8۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الفقه، حدیث نمبر 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے روایت نقل کرتے ہیں میں ایسی قوم کی صفت پاتا ہوں جو عمل کے بغیر علم حاصل کرتے ہیں (1)، عبادت کے بغیر تفقہ حاصل کرتے ہیں، آخرت کے عمل کے ساتھ دنیا طلب کرتے ہیں، وہ بھیڑوں کی جلدیں پہنتے ہیں جب کہ ان کے دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوتے ہیں وہ میری وجہ سے دھوکہ کھاتے ہیں اور میرے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں، میں نے قسم اٹھا رکھی ہے میں ان کے لیے ایسا فتنہ مقدر کروں گا جو حلیم کو ان میں حیران و پریشان چھوڑے گا۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابو درداء سے مرفوع روایت کیا ہے ہم نے اسے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تو کہے جو آدمی اس آیت میں لفظ اللہ پر رفع اور العلماء پر نصب پڑھتا ہے تو اس کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے (2)؟ وہ قراءت کرنے والے حضرت عمر بن عبد العزیز ہیں، امام ابوحنیفہ سے بھی یہ قراءت بیان کی جاتی ہے۔ میں اس کا جواب دوں گا: اس قراءت میں خشیة، استعارہ ہے معنی ہے اللہ تعالیٰ سب لوگوں کے سامنے ان کی عزت بڑھائے گا، ان کو تعظیم عطا فرمائے گا جس طرح لوگوں میں سے اس کی عزت کی جاتی ہے جس سے ڈرا جاتا ہے۔

**اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ** یہ خشیت کے وجوب کی علت ہے، کیونکہ یہ نافرمانوں کی سزا اور ان کے قہر پر دلیل ہے۔ اور جو اہل طاعت ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بدلہ عطا فرمائے گا، ان کو معاف کر دے گا جو سزا دے اور بدلہ دے اس کا حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

**اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾**

"بے شک جو (غور و تدبر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے راز داری سے اور اعلانیہ وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے اور مزید اضافہ کرے ان کے اجر میں اپنے فضل سے، بے شک وہ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے"۔

یہ ان قراء کے بارے میں آیت ہے جو عمل کرنے والے ہیں، عالم ہیں جو فرض اور نفل نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہی حکم انفاق کے بارے میں ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں وہ بحث گزر چکی ہے قاری کو جن چیزوں سے آراستہ ہونا چاہیے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: **يَرْجُوْنَ** اپنے متعلقات سے مل کر ان کی خبر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زیادت سے مراد آخرت میں شفاعت ہے، یہ دوسری آیت کی طرح ہے **رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ**

1۔ سنن دارمی، صفحہ 77، حدیث نمبر 305
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 611

(النور: 37) سورہ نساء کے آخر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (آیت، 173) وہاں ہم نے ان کی وضاحت کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشنے والا ہے، وہ عمل خالص میں سے قلیل کو قبول کرتا ہے اور بہت بڑا ثواب عطا فرماتا ہے۔

وَ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ۝۳۱

''اور جو کتاب بذریعہ وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے سراسر حق ہے وہ تصدیق کرتی ہے پہلی کتابوں کی، بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سارے احوال سے باخبر ہے اور دیکھنے والا ہے''۔

کتاب سے مراد قرآن ہے لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ سے مراد کتب ہیں۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ۝۳۲ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ۝۳۳ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝۳۴ الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝۳۵

''پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے چن لیا تھا اپنے بندوں سے، بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض سبقت لے جانے والے ہیں نیکیوں میں اللہ کی توفیق سے، یہی (اللہ تعالیٰ کا) بہت بڑا فضل (وکرم) ہے۔ سدا بہار باغات، یہ ان میں داخل ہوں گے پہنائے جائیں گے انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہوں گی۔ (شکر نعمت کے طور پر) کہیں گے: سب ستائش اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)، یقیناً ہمارا رب بخشنے والا بڑا قدر دان ہے، جس نے ہمیں بسایا ہے ابدی ٹھکانے پر اپنے فضل (واحسان) سے نہ چھوئے گی ہمیں یہاں کوئی تکلیف اور نہ چھوئے گی ہمیں یہاں کوئی تھکن''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ آیت مشکل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا پھر فرمایا: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ اس میں علماء جو صحابہ، تابعین اور ان کے بعد سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے گفتگو کی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ سے مراد کافر ہے؛ اسے ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے وہ عطا سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ

مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ کہا: دو فرقے نجات پا گئے عربی میں تقدیر کلام یہ ہو گی فمنهم من عبادنا ظالم لنفسه یہاں ظالم سے مراد کافر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد فاسق ہے۔

يَدْخُلُوْنَهَا میں جو ضمیر ہے وہ مقتصد اور سابق کی طرف لوٹے گی ظالم کی طرف نہیں لوٹے گی۔ عکرمہ، قتادہ، ضحاک اور فراء نے کہا کہ مقتصد سے مراد مومن نافرمان ہے۔ اور سابق سے مراد مطلق متقی ہے۔ علماء نے کہا: یہ آیت سورۂ واقعہ کی آیت کی مثل ہے وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ علماء نے کہا: یہ بعید ہے کہ ظالم کو چنا جائے؛ اسے مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ سے مراد اصحاب مشامہ ہیں۔

وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ سے مراد اصحاب میمنہ ہیں۔ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ تمام لوگوں سے سبقت لے جانے والے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: يَدْخُلُوْنَهَا میں ضمیر تین اصناف کی طرف لوٹتی ہے، اس شرط پر کہ یہاں ظالم سے مراد کافر اور فاسق نہیں۔ جن سے یہ قول مروی ہے وہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابو درداء، حضرت ابن مسعود، حضرت عقبہ بن عمرو اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس قول کی بنا پر تقدیر کلام یہ ہو گی کہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا وہ ہے جو چھوٹے گناہ کرتا ہے۔ مُّقْتَصِدٌ محمد بن یزید نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جو دنیا کو اپنا حق دیتا ہے اور آخرت کو اس کا حق دیتا ہے۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا اس مضاف کی صورت میں ضمیر تمام کی طرف لوٹے گی؛ یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

کعب الاحبار نے کہا: کعبہ کے رب کی قسم! وہ سب ہم مرتبہ ہیں اور انہوں نے اپنے اعمال کے ساتھ باہم فضیلت حاصل کی (1)۔ ابو اسحاق سبیعی نے کہا: جو میں نے ساٹھ سال سے سنا ہے یہ ہے کہ "وہ سب نجات پانے والے ہیں" (2)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھا پھر کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہم میں سے سبقت لے جانے والا سبقت لے جانے والا ہے، ہم میں سے میانہ روی اختیار کرنے والا نجات پانے والا ہے اور ہمارا ظالم بخشا ہوا ہے" (3)۔ اس قول کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا میں اِصطفينا کا مفعول مقدر ہو گا جو مضاف ہو گا اس کو اسی طرح حذف کر دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) میں مضاف مقدر ہے یعنی اصطفينا دينهم مضاف کے حذف کے بعد اصطفيناهم باقی بچا پھر ضمیر عائد کو حذف کر دیا جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی تھی جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ (ہود:31) میں حذف ہے یہ اصل میں تزدريهم تھا پس اصطفاء کو ان کے دین کی طرف پھیرا گیا ہے جس طرح فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ (البقرہ:132)

نحاس نے کہا: ایک تیسرا قول بھی ہے کہ ظالم سے مراد کبیرہ گناہ کرنے والا ہو اور مقتصد وہ ہو جو برائیوں پر زیادہ نیکیوں کے ساتھ جنت کا مستحق نہ ہوا۔ اور جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا یہ خوشخبری صرف ان لوگوں کے لیے ہو جو بھلائی میں سبقت لے گئے یہ کسی اور کے لیے نہ ہو؛ یہ قول اہل نظر کی ایک جماعت کا ہے کیونکہ نظر و فکر کے اعتبار سے ضمیر کو قریب ترین مرجع کی طرف لوٹانا زیادہ مناسب ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 266 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 155 3۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 613

میں کہتا ہوں: درمیانہ قول زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ کافر اور منافق اللہ تعالیٰ کی تعریف کے لیے چنے ہوئے نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے دین کو چنا؛ یہ چھ صحابہ کا قول ہے اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ ہم باقی ماندہ آیت میں اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ یعنی ہم نے کتاب عطا کی۔ میراث عطا ہی ہوتی ہے حقیقۃً ہو یا مجازاً ہو (1)، کیونکہ یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ چیز ایک انسان کی موت کے بعد دوسرے کے لیے ہو اور یہاں الکتاب سے مراد کتاب کے معانی، اس کا علم، اس کے احکام اور اس کے عقائد ہیں گویا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو قرآن عطا فرمایا جبکہ وہ نازل کردہ کتابوں کے معانی کو اپنے ضمن میں لیے ہوتے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اسی کتاب کا وارث بنایا جو ہم سے قبل امتوں میں سے تھا (2)۔

اصْطَفَيْنَا ہم نے انہیں چن لیا۔ یہ صفوہ سے مشتق ہے اس سے مراد ہے آلودگیوں سے پاک ہونا۔ یہ اصل میں اصتفونا تھا تاء کو طاء سے اور واؤ کو یاء سے بدل دیا۔

مِنْ عِبَادِنَا ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے (3)۔ یہ لفظ ہر امت کے مومنوں کا احتمال رکھتا ہے مگر کتاب کا وارث بنانے کی وضاحت صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے ہے جب کہ پہلی امتیں وارث نہ ہوئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جن کو چنا گیا ہے وہ انبیاء ہیں (4)۔ وہ کتاب کے وارث بنے اس کا معنی ہوگا یہ امر بعض سے بعض کی طرف منتقل ہوا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (النمل: 16) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (مریم: 6) جب یہ جائز ہے کہ نبوت موروثی ہو تو کتاب بھی اسی طرح ہوئی۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو گناہ صغیرہ میں واقع ہوئے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول کئی وجوہ سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ یعنی ان کی ذریت میں ایسا شخص ہوگا جو اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوگا۔ وہ مشرک ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ان کی امتوں میں سے کچھ ظالم ہوں گے، جس طرح ظالم کے بارے میں اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔

یہ آیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بارے میں ہے۔ صاحب دل لوگوں کی عبارات، ظالم، مقتصد اور سابق کے بارے میں مختلف ہیں۔ حضرت سہیل بن عبد اللہ نے کہا: سابق سے مراد عالم ہے (5)، مقتصد سے مراد دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے اور سابق سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو نہ بھولے۔ انطاکی نے کہا: ظالم جو اقوال والا ہے، مقتصد جو افعال والا ہے اور سابق جو احوال والا ہے۔ ابن عطا نے کہا: ظالم وہ ہے جو دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے، مقتصد وہ ہے جو

---

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 264 — 2۔ ایضاً — 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 473 — 5۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 527

آخرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو حق کی مراد کے ساتھ اپنی مراد ساقط کر دیتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم سے مراد وہ ہے جو جہنم کے ڈر سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے، مقتصد وہ ہے جو جنت کی طمع میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے کسی اور سبب سے اس کی عبادت نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اس کے حصہ کو ترک کر دیا وہ معرفت اور محبت ہے، مقتصد سے مراد عارف ہے اور سابق سے مراد محب ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم سے مراد وہ ہے جو آزمائش کے وقت جزع فزع کرتا ہے، مقتصد وہ ہے جو آزمائش پر صبر کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو آزمائش سے لذت حاصل کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جو غفلت اور عادت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے، مقتصد وہ ہے جو رغبت اور خوف کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو اس کی ہیبت کی بنا پر عبادت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جسے عطا کیا گیا تو اس نے مال روک لیا، مقتصد وہ ہے جس کو مال عطا کیا گیا تو اس نے خرچ کیا اور سابق وہ ہے جس سے مال روکا گیا تو اس نے شکر کیا اور دوسروں کو ترجیح دی۔

یہ روایت کی جاتی ہے کہ دو عبادت گزار آپس میں ملے ایک نے پوچھا: بصرہ میں تمہارے بھائیوں کا کیا حال ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: اچھا حال ہے۔ اگر انہیں عطا کیا جائے تو شکر کرتے ہیں اگر انہیں کوئی چیز نہ ملے تو صبر کرتے ہیں تو پہلے نے کہا: ہمارے ہاں بلخ میں یہ کتوں کی حالت ہے۔ ہمارے دوستوں کو اگر کچھ نہ ملے تو شکر کرتے ہیں اگر انہیں کچھ عطا کیا جائے تو دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جو اپنے مال کے ساتھ غنی ہو اور مقتصد وہ ہے جو اپنے دین کے ساتھ غنی ہو اور سابق وہ ہے جو اپنے رب کے ساتھ غنی ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم سے مراد وہ ہے جو قرآن کی تلاوت کرے اور اس پر عمل نہ کرے (1) اور مقتصد وہ ہے جو قرآن کی تلاوت کرے اور اس پر عمل کرے اور سابق ایسا قاری ہے جو قرآن پر عمل کرے اور اس کا علم بھی حاصل کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سابق وہ ہے جو موذن کی آذان سے پہلے مسجد میں داخل ہوا اور مقتصد وہ ہے جو مسجد میں اس وقت داخل ہو جب آذان ہو چکی ہو اور ظالم وہ ہے جو مسجد میں اس وقت داخل ہو جب اقامت کہی جا چکی ہو، کیونکہ اس نے اجر میں کمی کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اس نے اپنے نفس کو وہ چیز نہ دی جو غیر نے اپنے نفس کو دی تھی۔ بعض علماء نے اس بارے میں کہا: بلکہ سابق وہ ہے جو وقت اور جماعت دونوں پائے اور دونوں فضیلتیں حاصل کرے اور مقتصد وہ ہے اگر اس سے جماعت فوت ہو جائے تو وقت کو فوت نہ کرے اور ظالم وہ ہے جو نماز سے غافل ہو یہاں تک کہ وقت اور جماعت دونوں فوت ہو جائیں تو یہ ظالم کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جو اپنی ذات سے محبت کرتا ہو، مقتصد وہ ہے جو اپنے دین سے محبت کرتا ہو اور سابق وہ ہے جو اپنے رب سے محبت کرتا ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم وہ ہے جو انصاف چاہتا ہے اور وہ خود انصاف نہیں کرتا، مقتصد وہ ہے جو انصاف چاہتا ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 527

اور انصاف کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو انصاف کرتا ہے اور اس سے انصاف نہیں کیا جاتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے: سابق وہ ہے جس نے ہجرت سے قبل اسلام قبول کیا، مقتصد وہ ہے جس نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا اور ظالم وہ ہے جس نے تلوار کی وجہ سے اسلام قبول کیا یعنی مسلمانوں کے غلبہ کی وجہ سے اسلام قبول کیا، یہ سب مغفور ہیں۔

میں کہتا ہوں: ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ان اقوال کو اور کچھ زائد اقوال کو ذکر کیا، خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں طرفیں اور واسطہ ہے مقتصد وہ ہے جو میانہ روی کو لازم پکڑتا ہے اس سے مراد کسی جانب مائل ہونے کو ترک کرنا ہے اس معنی میں جابر بن حنی تغلبی کا قول ہے:

نعاطی الملوك السّلم ما قصدوا لنا　　ولیس علینا قتلُهم بمحرّم

مراد ہے جو ہمارے ساتھ میانہ روی کرے یعنی ہم پر ظلم نہ کرے تو ہم ان کے ساتھ صلح کرتے ہیں اگر وہ ظلم کریں تو ان کو قتل کرنا ہم پر حرام نہیں۔

اسی وجہ سے مقتصد دونوں منزلوں کے درمیان منزل ہے، یہ اپنی جان پر ظلم کرنے والے سے اوپر اور خیرات کی طرف سبقت لے جانے والے سے نیچے ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ یعنی انہیں ہماری جانب سے کتاب کا دیا جانا بڑا فضل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے عیوب جاننے کے باوجود انہیں منتخب کرنا بڑا فضل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان تینوں طبقات کے ساتھ جنت کا وعدہ کرنا بڑا فضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ظالم کو مقتصد اور سابق پر کیوں مقدم کیا گیا اس میں علماء نے گفتگو کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذکر میں مقدم ہونا یہ شرف کا تقاضا نہیں کرتا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (الحشر: 20) آیت میں اصحاب النار کو مقدم کیا گیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم کو مقدم اس لیے کیا گیا کیونکہ اکثر فاسق ان میں سے ہوتے ہیں اور ان کا غلبہ ہوتا ہے اور مقتصد ان کے مقابلہ میں تھوڑے ہوتے ہیں اور سابقین تو بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں (1)؛ اسے زمخشری نے ذکر کیا ہے کیونکہ اس کے حق میں رجا مقدم ہے کیونکہ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس پر بھروسہ کیا جائے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ مقتصد حسن ظن پر اعتماد کرتا ہے اور سابق طاعت پر اعتماد کرتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظالم کو مقدم کیا گیا ہے تا کہ اس کے حق میں امید کو مؤکد کیا جائے کیونکہ اس کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں جس پر وہ اعتماد کرے صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی چیز ہے جس پر وہ اعتماد کر سکتا ہے۔ سابق کو مؤخر کیا تا کہ وہ اپنے عمل پر عجب کا اظہار نہ کرے۔

جعفر بن محمد بن علی صادق رضی اللہ عنہم نے کہا: ظالم کو متقدم کیا تا کہ اس بات کی خبر دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 613

مگر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم سے قرب حاصل کرسکتا ہے، کیونکہ جہاں عنایت ہو وہاں ظلم انتخاب میں موثر نہیں ہوسکتا پھر دوسرے نمبر پر مقتصدین کا ذکر کیا کیونکہ وہ خوف و رجاء کے درمیان ہیں پھر سابقین پر کلام کو ختم کیا تا کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہ ہو۔ یہ سب کلمہ اخلاص کی حرمت کے باعث جنت میں ہیں، کلمہ اخلاص یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

محمد بن علی ترمذی نے کہا: اصطفاء میں سب کو جمع کیا مقصود عطا سے جور کا وٹیں ہیں ان کو زائل کرنا ہے کیونکہ اصطفاء یہ ارث کو ثابت کرتا ہے، ارث، اصطفاء کو ثابت نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے حکمت میں کہا: نسبت کو ثابت کر پھر میراث میں دعویٰ کر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سابق کو موخر کیا تا کہ وہ جنات اور ثواب کے زیادہ قریب ہو، جس طرح صوامع اور بیع کو سورۂ حج میں مساجد پر مقدم کیا تا کہ صوامع گرانے اور برباد کیے جانے کے زیادہ قریب ہو جائیں اور مساجد اللہ کے ذکر کے زیادہ قریب ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے جب وہ چند چیزوں کو اکٹھا ذکر کرنا چاہتے ہیں تو وہ ادنیٰ کو پہلے لاتے ہیں جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴿۱۶۵﴾ (الانعام) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ﴿۴۹﴾ (الشوریٰ) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَسْتَوِیْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (الحشر:20)

میں کہتا ہوں جس نے کہا کتنا اچھا کہا:

وغاية الجود أنت وإنما یوافی إلی الغایات فی آخر الأمر

اس سخاوت کی انتہاء تو ہے بے شک امر کے آخر میں ہی غایات تک پہنچا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا جنت میں داخل ہونے کے امر میں سب کو جمع کیا کیونکہ یہ میراث ہے نافرمان اور اطاعت گزار میراث میں برابر ہوتے ہیں جب وہ نسب کا اعتراف کریں نافرمان اور اطاعت گزار رب کا اقرار کرتے ہیں۔ اسے جنة عدن بھی پڑھا گیا ہے(1) گویا وہ ایسی جنت ہے جو سابقین کے لیے خاص ہے کیونکہ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں، جس طرح پہلے گزرا ہے۔ اسے جنات عدن بھی پڑھا گیا ہے(2) فعل مضمر ہے جس کی تفسیر ظاہر فعل کرتا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یدخلون جنات عدن یدخلونہا یاء کے ضمہ اور خاء کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے، اس نے یہ قول یحلون کی وجہ سے کیا ہے سورۂ حج میں اس بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ﴿۲۳﴾ (الحج:23)

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ابو ثابت نے کہا: ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا تو اس نے یوں دعا کی! اے اللہ! میری مسافرت پر رحم فرما، میری تنہائی میں مجھ پر مہربانی کر اور مجھے صالح ساتھی عطا فرما۔ حضرت ابو درداء نے ارشاد

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 613 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 614

فرمایا: اگر تو سچا ہے تو میں اس کے ساتھ تیری بنسبت زیادہ سعادت مند ہوں (1)، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ کہا: وہ سبقت لے جانے والا آئے گا وہ حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوگا۔ جہاں تک مقتصد کا تعلق ہے تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور جہاں تک اپنی جان پر ظلم کرنے والے کا تعلق ہے تو اسے اس کی جگہ محبوس رکھا جائے گا، اسے شرمندہ کیا جائے گا، اسے تنبیہ کی جائے گی پھر وہ جنت میں داخل کیا جائے گا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ''۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ ''جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا انہیں میدان محشر میں طویل عرصہ تک محبوس رکھا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنی آغوش رحمت میں لے لے گا تو یہی وہ لوگ ہیں جو کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہی وہ شخص ہے جس کو اسی جگہ پکڑ لیا جائے گا یہاں تک کہ جو اسے غم اور حزن پہنچے گا اس کے ساتھ اس کا کفارہ ادا ہوگا اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (النساء:123) یعنی دنیا میں اسے بدلہ دے دیا جائے گا۔ ثعلبی نے کہا: یہ تاویل ظاہر کے زیادہ مشابہ ہے۔ کیونکہ ارشاد فرمایا: جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا اور ارشاد فرمایا الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا کافر اور منافق کو نہیں چنا گیا۔

میں کہتا ہوں: یہی صحیح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے ریحانہ کی مثل ہے جس کی خوشبو عمدہ ہے اور اس کا ذائقہ کڑوا ہے'' (2)۔ خبر دی کہ منافق اسے پڑھے گا اور حق تعالیٰ نے یہ بھی خبر دی کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوگا۔ کفار، یہودیوں اور نصاریٰ میں سے کثیر لوگ ہمارے زمانے میں اسے پڑھتے ہیں۔ امام مالک نے کہا: بعض اوقات قرآن ایسا شخص پڑھتا ہے جس میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ نصب کا معنی تھکاوٹ ہے لغوب کا معنی تھکا دینا ہے (3)۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝ وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝

''اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے دوزخ کی آگ (تیار) ہے نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مرجائیں اور نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے دوزخ کا عذاب اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر ناشکر گزار کو۔ اور وہ اس میں چیختے چلاتے ہوں گے (فریاد کریں گے) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 526 2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 757 3۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 267

نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے (جواب ملے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کرسکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی)، پس اب (اپنے کیے کا) مزا چکھو ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں''۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ جب اہل جنت، ان کے احوال اور ان کے قول کا ذکر کیا تو اہل نار، ان کے احوال اور ان کے قول کا ذکر کیا۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا یہ اسی طرح ہے جس طرح اس ارشاد میں ہے: لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طہ)

وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا یہ اسی کی مثل ہے جس طرح فرمایا: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (النساء:56) كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ یعنی الله اور اس کے رسول کا انکار کرنے والا۔ حضرت حسن بصری نے فیموتون نون کے ساتھ قراءت کی ہے اس وقت یہ نفی کا جواب نہیں ہوگا اور فیموتون، یقضی پر معطوف ہوگا اس کی تقدیر یہ ہوگی لا یقضی علیهم ولا یموتون(1) جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (المرسلات) کسائی نے کہا: ولا یوذن لهم فیعتذرون مصحف میں نون کے ساتھ ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا یہ آیت کا سرا نہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک میں وہ صورت جائز ہے جو دوسری میں جائز ہے۔ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا وہ جہنم میں بلند آواز سے چیخیں گے۔ صراخ سے مراد بلند آواز ہے صارخ سے مراد مدد طلب کرنے والا اور مصرخ سے مراد مدد کرنے والا ہے۔ شاعر نے کہا:

كنا إذا ما أتانا صارخ فَزِعٌ — كان الصراخُ له قرع الظّنابيب

جب کوئی خوفزدہ مدد کا طالب ہمارے پاس آتا ہے تو اس کی چیخ کیل کا ٹھوکنا ہوتی ہے۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں جہنم سے نکال دو اور ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دو۔ نَعْمَلْ صَالِحًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ نقل کیا گیا ہے عمل صالح سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ جو ہم شرک کرتے تھے اس کے برعکس ہے، یہی ان کے قول کا معنی ہے، یعنی ہم کفر کی بجائے ایمان لاتے ہیں، معصیت کی بجائے اطاعت کرتے ہیں اور رسولوں کی اطاعت کرتے ہیں۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ یہ ان کی دعا کا جواب ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا پس قول مضمر ہے۔ امام بخاری نے یہ باب باندھا ہے: باب من بلغ ستين سنة فقد اعذر الله اليه فى العمر لقوله عزوجل، اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ، یہاں نذیر سے مراد بڑھاپا ہے۔ عبدالسلام، عمر بن علی سے وہ معن بن محمد غفاری سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''الله تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑا جس کی عمر کو لمبا کیا یہاں تک کہ اسے ساٹھ سال کر دیا(2)۔ خطابی نے کہا: اعذر اليه اسے آخری عذر تک پہنچا دیا۔ اسی معنی میں ان کا قول ہے: قد اعذر من انذر جس کو خبردار کیا جائے اس

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 615
2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، من بلغ ستين سنة فقد أعذر الله، جلد 2، صفحہ 950

کے لیے کوئی عذر نہ چھوڑا۔

اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ساٹھ سال کی عمر عطا کی اس کے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑا، کیونکہ ساٹھ سال کی عمر موتوں کا معرکہ ہے، یہ لوٹنے، عاجزی کا اظہار کرنے، موت کی تاڑ میں رہنے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی عمر ہے اس میں ایک عذر کے اختتام کے بعد دوسرے عذر کا اختتام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: ''موت چالیس اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان ہے''۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ کی تاویل میں کہا: اس سے مراد ساٹھ سال ہیں (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نصیحت میں ارشاد فرمایا: ''جس ذات نے خبردار کیا اس نے کوئی عذر نہیں چھوڑا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی کرنے والا ساٹھ سال کی عمر کے لوگوں کو ندا کرتا ہے: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ'' حکیم ترمذی، عطا بن ابی رباح کی حدیث سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب قیامت کا روز ہوگا تو ساٹھ سال کے عمر کے لوگوں کو ندا کی جائے گی یہی وہ عمر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ'' (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس سے مراد چالیس سال ہیں۔

حضرت حسن بصری اور مسروق سے اسی کی مثل مروی ہے۔ اسی قول کی وجہ سے بھی وہ صحیح ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف: 15) چالیس سال کی عمر میں عقل مکمل ہوجاتی ہے اس سے قبل اور اس کے بعد اس میں کمی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ امام مالک نے کہا: میں نے اپنے شہر کے علماء کو پایا کہ وہ دنیا اور علم کے طالب ہوتے اور لوگوں سے میل جول رکھتے یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی عمر چالیس سال ہوجاتی۔ جب اس کی عمر چالیس سال کی ہوجاتی تو وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہوجاتا اور قیامت کی تیاری میں مشغول ہوجاتا یہاں تک کہ اسے موت آجاتی۔ سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت کی عمر ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوگی جو لوگ اس عمر سے تجاوز کریں گے وہ بہت تھوڑے ہوں گے'' (3)۔

وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ اسے جاء تکم النذر بھی پڑھا گیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: النذیر سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول ہے؛ یہ زید بن علی اور ابن زید نے کہا (4)۔ حضرت ابن عباس، عکرمہ، سفیان، وکیع، حسین بن فضل، فراء اور طبری نے کہا: اس سے مراد بڑھاپا ہے (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نذیر سے مراد بخار ہے (6)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اہل اور قریبی رشتہ داروں کی موت (7)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کمال عقل۔ اور نذیر انذار کے معنی میں ہے (8)۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 476 2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 339

3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 529۔ سنن ابن ماجہ، باب الأمل والأجل، حدیث نمبر 4225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 476 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: بڑھاپا، بخار اور اہل کی موت سب موت سے خبردار کرنے والے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بخار موت کی تلاش کرنے والا ہے''(1)۔ ازہری نے کہا: اس کا معنی ہے بخار موت کا پیغام لانے والا ہے، گویا یہ بخار موت کے آنے کا شعور دلانے والا اور اس کے آنے سے خبردار کرنے والا ہے۔ بڑھاپا (بالوں کا سفید ہونا) بھی نذیر ہے یہ پختگی کی عمر میں آتا ہے یہ بچپنے کی عمر کی جدا ہونے کی علامت ہے جو عمر لہو لعب کی عمر تھی۔ شاعر نے کہا:

رأیت الشیب من نُذُرِ المنایا　　لصاحبه و حَسْبُكَ من نذیر

میں نے بالوں کی سفیدی کو سفید بالوں والے کے لیے موتوں سے خبردار کرنے والا خیال کیا تیرے لیے خبردار کرنے والا کافی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فقلت لها المشیبُ نذیرُ عمری　　ولست مسودا وجه النذیر

میں نے اسے کہا: بالوں کی سفیدی خبردار کرنے والی ہے، میں خبردار کرنے والے کا چہرہ سیاہ کرنے والا نہیں۔

جہاں تک اہل، قریبی رشتہ داروں، اصحاب اور بھائیوں کی موت کا تعلق ہے تو یہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں کوچ کے بارے میں خبردار کرنے والا امر ہے۔

شاعر نے کہا:

وأراك تحملهم ولستَ تردهم　　فكأنني بك قد حُمِلت فلم تُرَدَّ

میں تجھے دیکھتا ہوں کہ تو انہیں اٹھاتا ہے اور تو انہیں واپس نہیں لاتا گویا مجھے تیرے ہاتھوں اٹھایا گیا تجھے واپس نہیں کیا گیا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الموت فی كل حین ینشر الكفنا　　ونحن فی غفلة عما یُرادُ بنا

موت ہر لحہ کفن کو کھولتی ہے اور ہمارے بارے میں جو ارادہ کیا جاتا ہے ہم اس سے غفلت میں ہیں۔

جہاں تک کمال عقل کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ ہی امور کے حقائق کو پہچانا جاتا ہے اور نیکیوں اور برائیوں میں فرق کیا جاتا ہے عاقل آخرت کے لیے عمل کرتا ہے اور اس کے رب کے ہاں جو کچھ ہوتا ہے اس میں رغبت رکھتا ہے تو پس عقل خبردار کرنے والا ہے۔ جہاں تک حضرت محمد مصطفی علیہ التحیۃ والثناء کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بندوں کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مقصود ان کی حجتوں کو ختم کرنا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء: 165) اور فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء)

**فَذُوْقُوْا** مراد جہنم کا عذاب ہے کیونکہ تم نے نہ عبرت حاصل کی اور نہ ہی تم نے نصیحت حاصل کی۔ **فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ** ظالموں کے لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 477

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین میں ہر چھپی ہوئی چیز کو، یقیناً وہ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو''۔

اس کی وضاحت کئی مواقع پر گزر چکی ہے معنی ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اگر وہ تمہیں دنیا کی طرف لوٹائے تو تم اچھے اعمال نہیں کرو گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام: 28) عالم، اسم فاعل کا صیغہ جب تنوین کے ساتھ نہ ہو تو یہ زمانہ ماضی اور زمانہ مستقبل کا معنی دیتا ہے اور جب تنوین کے ساتھ ہو تو صرف زمانہ ماضی کے لیے ہوگا۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ۝۳۹

''وہی ہے جس نے تمہیں (گزشتہ قوموں کا) جانشین بنایا زمین میں، پس جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال بھی اسی پر ہوگا، اور نہیں اضافہ کرے گا کفار کے لیے ان کا کفر اللہ کی جناب میں بجز ناراضگی کے اور نہ اضافہ کرے گا کفار کے لیے ان کا کفر بجز گھاٹے (اور خسران) کے''۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ قتادہ نے کہا: نائب کے بعد نائب، قوم کے بعد قوم۔ خلف سے مراد متقدم کے بعد آنے والا ہوتا ہے، اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: اے اللہ کے خلیفہ! فرمایا: میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں بلکہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہوں اور میں اس پر راضی ہوں (1)۔

فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ یعنی اس پر کفر کی جزا ہے اس سے مراد عقاب اور عذاب ہے۔ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا، مقت سے مراد بغض اور غضب ہے۔ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا، خسارا سے مراد ہلاکت اور گمراہی ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝

''آپ فرمائیے: کیا تم نے دیکھے ہیں اپنے شریک جنہیں تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا، مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے یا ان کی کوئی شراکت ہو آسمانوں (کی تخلیق) میں یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہو اور وہ اس کے روشن دلائل پر عمل پیرا ہوں (کچھ بھی نہیں) بلکہ یہ ظالم محض ایک دوسرے کے ساتھ جھوٹے (دلفریب) وعدے کرتے رہتے ہیں''۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 477

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ، شرکاء کم فعل رویۃ کی وجہ سے منصوب ہے اس پر رفع دینا جائز نہیں۔ سیبویہ کے نزدیک رفع دینا جائز ہے ان کا قول ہے: قد علمت زیدا ابومن ھو؟ زید مستفھم عنہ کے معنی میں ہے اگر تو کہے: أریت زیدا أبومن ھو؟ اس صورت میں زید پر رفع دینا جائز نہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے اس کا معنی ہے مجھے اس کے بارے میں بتائیے اسی طرح اس آیت کا معنی ہے: مجھے اپنے شریکوں کے بارے میں بتاؤ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہو کیا تم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہو کیونکہ ان کا آسمانوں کی تخلیق میں کوئی حصہ ہے یا انہوں نے زمین کی کسی چیز کو پیدا کیا ہے؟

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا یا ان کے پاس کوئی کتاب ہے جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے جس میں شرکت کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کی عبادت کرتا ہے اس کا اس میں رد ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے کسی کتاب کو نہیں پاتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہو کہ غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔

فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ اور حفص نے عاصم سے علی بینۃ واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ دونوں معانی قریب قریب ہیں مگر جمع کی قراءت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جس نے بینۃ قراءت کی وہ اس امر سے خالی نہیں کہ اس نے سواد اعظم کی مخالفت کی یا وہ اس آدمی کی لغت میں اسے لایا جو یہ کہتا ہے: جاءنی طلحت اور تاء پر وقف کرتا ہے، یہ لغت شاذ اور قلیل ہے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ ابوحاتم اور ابوعبید نے کہا: جمع کا صیغہ ذکر کرنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ خط کے موافق ہے کیونکہ مصحف عثمانی میں یہ بینات الف تاء کے ساتھ ہے۔

بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا یعنی ایسی باطل چیزوں کا وعدہ کرتے جو سراسر دھوکہ دینے والی تھیں۔ یہ سرداروں کا نچلے درجے کے لوگوں کے لیے قول تھا کہ یہ معبود تمہیں نفع پہنچائیں گے اور تمہیں قرب عطا کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شیطان مشرکوں سے یہ وعدہ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان سے وعدہ کیا کہ ان کی مدد کی جائے گی (1)۔

## اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ روکے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو تا کہ وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور اگر وہ سرکنے لگیں تو کوئی نہیں روک سکتا انہیں اللہ تعالیٰ کے بعد، بے شک وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے''۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا جب اس امر کو واضح کیا کہ ان کے معبود آسمانوں اور زمین کی کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں تو اس امر کو بیان کیا کہ ان کا خالق اور اس کو ان کی جگہ روکنے والا اللہ تعالیٰ ہے کوئی حادث چیز پیدا نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ ہی اسے پیدا فرماتا ہے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی مگر اس کی بقا کے ساتھ باقی رہتی ہے۔ ان محل نصب میں ہے اور اس معنی میں ہے کراھۃ ان تزولا یا لئلا تزولا یا اس معنی پر محمول ہوگا کیونکہ معنی ہے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو سرکنے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 478

سے روکتا ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر اضمار کی کوئی ضرورت نہیں؛ یہ زجاج کا قول ہے۔

وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ فراء نے کہا: یعنی اگر دونوں اپنی جگہ سے زائل ہو جائیں تو کوئی انہیں روکنے والا نہیں (1)۔ ان، ما کے معنی میں ہے۔ فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے: وَ لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ۝ (الروم) ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد قیامت کے روز دونوں کا اپنی جگہ سے زائل ہو جانا ہے۔ ابراہیم سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک شاگرد کعب الاحبار کے پاس گیا تاکہ اس سے علم سیکھے جب وہ واپس آیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو نے کعب الاحبار سے کیا سیکھا؟ اس نے عرض کی: میں نے کعب کو کہتے ہوئے سنا: آسمان قطب پر گھوم رہا ہے جس طرح چکی کا قطب ہوتا ہے جو اس ستون میں ہے جو ایک فرشتے کے کندھے پر ہے (2)۔ حضرت عبداللہ نے اسے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ تو اپنی سواری اور اس کے کجاوے کو الٹا دے کعب نے جھوٹ بولا اس نے اپنی یہودیت کو ترک نہیں کیا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا آسمان نہیں گھومتے اگر گھومتے ہوتے تو اپنی جگہ سے زائل ہو جاتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی اس کی مثل مروی ہے آپ نے شام سے آنے والے ایک آدمی سے فرمایا: تو وہاں کس سے ملا؟ اس نے عرض کی: کعب سے۔ پوچھا: تو نے اسے کیا کہتے ہوئے سنا؟ اس نے عرض کی: میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: آسمان فرشتے کے کندھے پر ہیں۔ فرمایا: کعب نے جھوٹ بولا ہے۔ کیا اس نے ابھی تک یہودیت کو ترک نہیں کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا آسمان سات ہیں اور زمینیں سات ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ ان دونوں کا ذکر فرماتا ہے تو ان کو دو چیزوں کی حیثیت سے ذکر فرماتا ہے تو پس ضمیر ان دونوں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: 30) پھر آیت کو اس ارشاد پر ختم کیا: اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا کیونکہ وہ معنی جسے بعض اہل تاویل نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو اس سے روکتا ہے کہ وہ کافروں کے کفر اور ان کے قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے کی وجہ سے زائل ہی نہ ہو جائیں۔ کلبی نے کہا: جب یہودیوں نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نصاریٰ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں تو قریب تھا کہ آسمان اور زمین اپنی جگہ سے ہل جائیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک لیا (3)، اور اس بارے میں اس آیت کو نازل فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْـًٔا اِدًّا۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ (مریم)

**وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ لَّیَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۟ۙ اسْتِكْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّیِّئِ ؕ وَ لَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ ۚ**

1۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 269 2۔ تفسیر طبری، جز 22، صفحہ 170 3۔ زاد المسیر، جز 6، صفحہ 269

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ۝

"اور (کفار مکہ) اللہ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ زیادہ ہدایت قبول کریں گے پہلی امتوں سے پس جب آ گیا ان کے پاس ڈرانے والا تو ان کی (حق سے) نفرت اور بڑھ گئی وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے زمین میں اور گھناؤنی سازشیں کرنے لگے، اور نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے، پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو پہلے (نافرمانوں) کے ساتھ کیا گیا تھا (اگر یہ بات ہے) تو آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی اور آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تغیر"۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ قسم اٹھانے والوں سے مراد قریش ہیں (1) اس سے قبل کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمائے قریش نے یہ قسم اٹھائی تھی جب انہیں یہ خبر پہنچی کہ اہل کتاب نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا قریش نے ان لوگوں پر لعنت کی جنہوں نے اپنے نبی کو جھٹلایا تھا اور اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھائی تھی کہ اگر ان کے پاس نبی آیا۔

لَیَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ یعنی اہل کتاب میں سے جنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ وہ ان سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے۔ عرب یہ آرزو کرتے تھے کہ کاش ان میں سے بھی کوئی رسول ہوتا جس طرح بنی اسرائیل میں سے رسول تھے۔ جب انہیں میں سے نذیر آ گیا جس کی انہوں نے تمنا کی تھی تو انہوں نے اس سے نفرت کی اور اس پر ایمان نہ لائے۔ استکبارا یعنی ایمان سے سرکشی کرتے ہوئے ایمان نہ لاتے۔

وَ مَكْرَ السَّیِّئِ برے عمل کا مکر۔ اس سے مراد کفر اور کمزور لوگوں کو دھوکہ دینا ہے اور ان کا ایمان سے لوگوں کو روکنا ہے تا کہ ان کے پیروکار زیادہ ہوں۔ أمة کے مونث ہونے کی وجہ سے من إحدى الأمم کو مونث ذکر کیا؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ حمزہ اور اخفش نے ومکر السییٔ ولا یحیق المکر السییٔ پڑھا یعنی پہلے مکر سے اعراب کو حذف کیا اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا۔ زجاج نے کہا: یہ لحن ہے، یہ لحن اس لیے ہوا کیونکہ اس سے اعراب کو حذف کیا گیا ہے۔ مبرد نے گمان کیا ہے: یہ انداز کلام اور شعر میں جائز نہیں کیونکہ اعراب کی حرکات کو حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ حرکات معانی میں فرق کرنے کے لیے داخل ہوئیں۔ بعض نحویوں نے اس امر کو بڑا عظیم جانا کہ اعمش اپنی حالت اور قیام و مرتبہ کے باوجود یہ اس طرح قراءت کرتا ہے کہا: اعمش اس پر وقف کرتا، جس نے اس کی طرف سے یہ تعبیر کی ہے اس نے غلطی کی۔ کہا: اس پر دلیل یہ ہے کہ اس پر کلام مکمل ہوتی ہے اور دوسرے پر کلام مکمل نہیں ہوتی تو بالاتفاق اس پر اعراب دیا جائے گا۔ دوسرے میں السییٔ میں حرکت پہلے السییٔ کی بنسبت زیادہ ثقیل ہے، کیونکہ یہ دو کسروں کے درمیان ضمہ ہے۔ بعض نحویوں نے اس بارے میں سیبویہ کے قول سے استدلال کیا ہے۔ اس نے اور دوسروں نے یہ مصرعہ پڑھا:

إذا اعوججن قلتُ صاحبْ قوّمِ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 476

جب ان میں کجی واقع ہوگئی تو میں نے کہا: اے ساتھی! انہیں سیدھا کر۔ محل استدلال صاحب ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فالیوم أشْرَبْ غیرَ مُسْتَحْقِبِ إثْمًا من الله ولا واغِل(1)

آج میں پیوں گا میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوں گا اور نہ ہی دعوت کے بغیر داخل ہونے والا ہوں گا۔ محل استدلال اشرب ہے۔

اس میں کوئی حجت نہیں، کیونکہ سیبویہ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا۔ اس نے اسے بعض نحویوں سے حکایت کیا ہے۔ جب کوئی بات ایسی ہو جس میں علماء کا اعتراض ہو تو وہ حجت نہیں ہوتی تو یہ کیسے حجت ہو سکتی ہے جب وہ شاذ کے طور پر اور ضرورت شعری کے طور پر واقع ہو؟ زجاج نے یہ گمان کیا ہے کہ ابو العباس نے یوں پڑھا۔ إذا أعوجَجْنَ قُلْتُ صاحِ قَوِّمْ۔

اور اس نے پڑھا: فالیومَ فاشربْ غیرَ مُستحقِبِ

نحاس نے ان سب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ زمخشری نے کہا: حمزہ نے ومکر السیئ ہمزہ کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے(2)۔ اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ اس پر حرکات ثقیل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے اس نے اختلاس کا قاعدہ جاری کیا ہو تو اسے سکون گمان کیا گیا یا خفیف سا وقف کیا پھر ابتدا کی ولا یحیق۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ومکرا سیئا قراءت کی۔ مہدوی نے کہا: جس نے ومکر السیئ میں ہمزہ کو سکون دیا تو وہ وقف کے طریقہ پر ہے پھر وقف کے طریق پر وصل کو جاری کیا یا ہمزہ کو ساکن کیا کیونکہ کسرے پے در پے اور یاء پے در پے ہیں۔ جس طرح کہا:

فالیوم اشرب غیر مستحقب

قشیری نے کہا: حمزہ نے ومکر السیئ ہمزہ کے سکون کے ساتھ قراءت کی۔ لوگوں نے اس کی اس قراءت کو غلط قرار دیا ہے ایک قوم نے کہا: ممکن ہے اس نے اس پر وقف کیا ہو کیونکہ کلام اس پر مکمل ہوتی ہے۔ تو راوی نے غلطی کی۔ یہ امر ان سے ادراج میں روایت کیا گیا۔ اس کی مثل میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

ہم نے کہا: جو امر خبر مستفیض اور خبر متواتر سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پڑھا تو یہ جائز ہے۔ یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ لحن ہے۔ جس نے اس قراءت کو خطا پر محمول کیا ہے شاید اس کی مراد یہ ہو کہ دوسری قراءت افصح ہے اگرچہ یہ بھی فصیح ہے۔ وَ لَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ یعنی جس نے شرک کیا اس پر شرک کا عقاب نازل ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہے۔ شاعر نے کہا:

وقد دفعوا المنیةَ فاستقلتْ ذراعاً بعد ما کانت تحیق(3)

اس شعر میں تحیق، تنزل کے معنی میں ہے؛ یہ قطرب کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: یحیق، یحیط کے معنی میں ہے(4)۔ حوق کا معنی احاطہ کرنا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: حاق بہ کذا یعنی اس کا احاطہ کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 443 2۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 619 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 479 4۔ ایضاً

کعب الاحبار نے حضرت ابن عباس سے کہا: میں تورات میں پاتا ہوں جس نے اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودا وہ خود اس میں گر گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں یہ چیز قرآن میں تجھے دکھا سکتا ہوں۔ کعب الاحبار نے پوچھا: وہ کہاں ہے؟ فرمایا: پڑھو وَ لَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ امثال عرب میں ہے: مَنْ حَفَرَ لاخیه جُبا وقع فیه منکبا(1) جو آدمی اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے تو اس میں منہ کے بل گرتا ہے۔ زہری نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نہ مکر کرو اور نہ ہی مکر کرنے والے کی مدد کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ لَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ نہ خود بغاوت کرو نہ ہی باغی کی مدد کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ (الفتح: 10) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا بَغۡیُکُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ (یونس: 23) ایک حکیم نے کہا:

یأیها الظالم فی فعله والظلم مردود علی من ظلم
إلی متی أنت وحتی متی تُحصی المصائب وتَنسی النِّعم

اے اپنے افعال میں ظلم برتنے والے جب کہ ظلم ظالم کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے: تو کب تک مصائب کا شمار کرتا رہے گا اور کب تک نعمتوں کو بھلائے رکھے گا۔

حدیث میں ہے: المکر والخدیعة فی النار مکر اور دھوکہ آگ میں ہیں۔ فی النار سے مراد ہے یعنی آخرت میں مکر اور دھوکہ کرنے والے جہنم میں ہوں گے، کیونکہ یہ کفار کے اخلاق میں سے ہے نیک مومنوں کے اخلاق میں سے نہیں اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے سیاق میں فرمایا: ولیس من اخلاق المومن المکر والخدیعة والخیانة مکر، دھوکہ اور خیانت مومن کے اخلاق میں سے نہیں۔ اس حدیث میں ایسے مذموم اخلاق کو اپنانے اور ایمان کے کریمانہ اخلاق کو چھوڑنے پر بلیغ ترین تحذیر ہے۔

**فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ** وہ اس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں جو پہلے کفار پر نازل ہوا۔ **فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا** اللہ تعالیٰ نے کفار پر عذاب کو جاری فرمایا اور کفار کے بارے میں اسی کو سنت بنائے گا جو اس عذاب کا مستحق بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس کی مثل عذاب دے گا۔ سنة کا معنی طریقہ ہے اس کی جمع سنن ہے۔ آل عمران میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایک اور موقع پر فرمایا: سُنَّۃَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنۡ رُّسُلِنَا (الاسراء: 77) قوم کی طرف مضاف کیا کیونکہ ایسا امر ہے جو جانبین سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اجل کی طرح ہے کبھی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور کبھی قوم کی طرف اسے مضاف کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ (العنکبوت: 5) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ (الاعراف: 34)

**اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ**

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 443

اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

''کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھ لیتے کہ کتنا (دردناک) انجام ہوا ان (سرکشوں) کا جو ان سے پہلے گزر چکے حالانکہ وہ قوت (وطاقت) میں ان سے (کئی گنا) زیادہ تھے، اور سنو اللہ تعالیٰ ایسا (کمزور) نہیں ہے کہ اسے آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز نیچا دکھا سکے وہ ہر بات جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے''۔

جس صفت کا ذکر کیا تھا اس کو بیان کیا کیا انہوں نے نہیں دیکھا جو ہم نے قوم عاد، قوم ثمود، مدین اور ان جیسی قوموں پر اسے نازل کیا؟ جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اگر انہوں نے دیکھا ہے تو وہ ان کے مسکنوں اور گھروں کو دیکھ کر تدبر کرتے اور ان پر جو عذاب نازل ہوا اس کو تواتر سے سن کر غور و فکر کرتے کیا اس میں ان کے لیے عبرت اور ان کے لیے بیان نہیں یہ لوگ ان سے بہتر اور قوی نہیں بلکہ وہ زیادہ قوی تھے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر عذاب کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

''اور اگر اللہ تعالیٰ (فوراً) پکڑ لیا کرتا لوگوں کو ان کے کرتوتوں کے باعث تو نہ (زندہ) چھوڑتا زمین کی پشت پر کسی جاندار کو لیکن (اس کی سنت یہ ہے) وہ ڈھیل دیتا رہتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک پس جب ان کی میعاد آ جائے گی تو بے شک اللہ کے سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں''۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا، ما کسبوا سے مراد گناہ ہیں (1)۔ مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: مراد تمام حیوانات ہیں جو رینگ کر چلتے تھے یا کسی اور صورت میں چلتے تھے (2)۔ قتادہ نے کہا: یہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا۔ کلبی نے کہا: دابہ سے مراد جن اور انسان ہیں ان کے علاوہ کوئی نہیں، کیونکہ دونوں عقل ہونے کی وجہ سے مکلف ہیں (3)۔ ابن جریر، اخفش اور حسین بن فضل نے کہا: یہاں دابہ سے مراد صرف لوگ ہیں کوئی اور نہیں۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ وہ ایک جلیل القدر صحابی سے مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قریب ہے کہ سیاہ بھنورے کو اس کی بل میں انسان کے گناہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے (4)۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: ایک آدمی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا۔ ایک آدمی نے اسے کہا: اپنا خیال کرو، کیونکہ ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے جھوٹ بولا؟ واللہ الذی لا الہ الا ھو پھر کہا والذی نفسی بیدہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بے شک سرخاب ظالم کے ظلم کی وجہ سے اپنے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 479 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 444 3۔ تفسیر الکشاف، جلد 3، صفحہ 619 4۔ ایضاً

گھونسلہ میں کمزوری کی وجہ سے مرجاتا ہے ☆۔ ثمالی اور یحییٰ بن سلام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ بارش روک لیتا ہے اور ہر چیز ہلاک ہو جاتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیت وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ کی تفسیر میں عکرمہ اور مجاہد سے اس کی مثل روایت گزر چکی ہے کہ وہ حشرات اور چوپائے ہیں جنہیں ان علماء سو کے گناہوں کی وجہ سے خشک سالی آ لیتی ہے جو حق کو چھپاتے ہیں تو یہ چیزیں ان پر لعنت کرتی ہیں۔ ہم نے وہاں حضرت براء بن عازب سے دوسری روایت نقل کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''مراد زمین کے جانور ہیں'' (1)۔

وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى مقاتل نے کہا: اجل مسمی سے مراد وہ اجل ہے (2) لوح محفوظ میں جس کا وعدہ کیا گیا۔ یحییٰ نے کہا: اس سے مراد یوم قیامت ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا یعنی بندوں میں سے جو عذاب کے مستحق ہوتے ہیں ان کو دیکھنے والا ہے۔ اذا میں لفظ بصیر کو عامل بنانا جائز نہیں جس طرح اس مثال میں خارج کو الیوم میں عامل بنانا جائز نہیں الیوم ان زید اخارج لیکن اس میں عامل جاء ہے کیونکہ اذا ایسے حروف مجازات اور اسماء مجازات کے مشابہ ہے جن کا مابعد ان میں عمل کرتا ہے۔ سیبویہ اذا کے ساتھ مجازات کو درست نہیں سمجھتے تھے مگر شعر میں مجازات جائز سمجھتے تھے، جس طرح کہا:

إذا قَصُرت أسيافنا كان وصلها	خُطانا إلى أعدائنا فنضارِبِ

محل استدلال فنضارب ہے جو اذا کی جزا ہے۔

الحمد للہ اولا و آخرا

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے حبیب کریم علیہ الف الف صلاۃ وتسلیم کے طفیل تفسیر قرطبی کے ترجمہ کو مکمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائی۔ ناچیز کے حصہ میں آخری چار جلدیں آئیں ان چار جلدوں میں سے آخری جلد کا ترجمہ پہلے ہوا اور ساتویں جلد کا ترجمہ آخر میں ہوا۔ آج مورخہ 19 ستمبر 2008 بروز جمعۃ المبارک بمطابق 18 رمضان شریف طلوع فجر کے بعد اختتامی الفاظ لکھنے نصیب ہوئے۔

میں احکم الحاکمین جو ہم سب کا خالق و مالک ہے اور اس کی بارگاہ میں سب نے حاضر ہونا ہے، کی بارگاہ عالی میں عرض گزار ہوں کہ میری اس کاوش کو میرے لیے توشہ آخرت بنائے۔ حضور ضیاء الامت کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور میرے والدین، میرے اساتذہ اور دوستوں اور تمام مومنین کی مغفرت فرمائے اس ترجمہ کو لوگوں کے لیے نفع مند بنائے۔ اسی کے فضل وکرم کا سہارا ہے اور بس۔

محمد بوستان
مدرس دار العلوم محمدیہ غوثیہ
بھیرہ شریف ضلع سرگودھا

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العقوبات، صفحہ 300
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 4، صفحہ 480
☆ تفسیر قرطبی نے اس کی مثل روایت نقل کی ہے۔

# تفسیر قرطبی
مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

**کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

## ☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

**﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾**

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیرِ قرطبی جلد ہشتم

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مُترجمین

مولانا ملک محمد بوستان    مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی    مولانا شوکت علی چشتی

زیرِ اہتمام:

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور- کراچی ○ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد ہشتم) |
| مفسر | امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، باراول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

# ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

## سورۂ یٰسین

# سورہ یٰس

لہا ۸۳ ۔ ۳۶ سورۃ یٰس مکیۃ ۴۱ ۔ رکوعاتہا ۵

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔ اس کی تراسی (83) آیات ہیں۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ انصار کے خاندان بنی سلمہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوا جب انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں آ جائیں جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ابوداؤد میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے مردوں پر سورۂ یٰس پڑھو(1)'' آجُرّی نے حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس میت پر سورۂ یٰس پڑھی جاتی ہے اس پر معاملہ آسان کر دیا جاتا ہے(2)۔ مسند دارمی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی رات بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر سورۂ یٰس پڑھی اسے اسی رات بخش دیا جاتا ہے(3)''۔ اسے ابونعیم حافظ نے نقل کیا ہے۔

امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان لكل شیٔ قلبا و قلب القرآن یٰس و من قرأ یٰس کتب اللہ له بقرأتها قرأة القرآن عشر مرات(4)۔ ہر شے کا دل ہوتا ہے قرآن کا دل سورۂ یٰس ہے جس نے سورۂ یٰس پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے کی وجہ سے اسے دس دفعہ قرآن پڑھنے کا ثواب دے گا۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے اس کی سند میں ہارون بن محمد مجہول ہے۔ اس باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت مروی ہے جبکہ سند کے اعتبار سے ان کی حدیث صحیح نہیں اس کی سند ضعیف ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خبردار! قرآن میں ایک سورت ہے یہ اپنے پڑھنے والوں کے حق میں شفاعت کرتی ہے، اس کے سننے والے کو بخش دیا جاتا ہے۔ خبردار! وہ سورۂ یٰس ہے اسے تورات میں معمہ کہتے ہیں''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ معمہ کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ اپنے قاری کو دنیا کی ہر بھلائی پہنچانے والی ہے اور یہ آخرت کی تمام ہولناکیوں سے دور کرنے والی ہے، اسے دافعہ اور قاضیہ بھی کہتے ہیں''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کس طرح؟ فرمایا: ''وہ اپنے قاری سے ہر برائی کو ختم کرتی ہے، اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتی ہے جس نے اس سورت کی قراءت کی یہ سورت اس کے بیس حجوں کے برابر ہو جائے گی، جس نے اسے سنا اس کے لئے ایک ہزار دیناروں کے برابر ہو جائے گی جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، جس نے اسے لکھا اور اسے پی لیا تو اس کے پیٹ میں ہزار

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب القرأة عند المیت، جلد 2، صفحہ 89
2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 563، حدیث نمبر 42186
3۔ شعب الایمان للبیہقی، جلد 2، صفحہ 480، حدیث نمبر 2464
4۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی یس، جلد 2، صفحہ 112

دوائیاں، ہزار نور، ہزار یقین، ہزار رحمتیں، ہزار شفقتیں، ہزار ہدایتیں داخل کی جائیں گی اور اس سے ہر بیماری اور ہر گناہ، کھوٹ کو دور کر دیا جائے گا'' اسے ثعلبی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اور حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مسند روایت کیا ہے (1)۔

مسند دارمی میں شہر بن حوشب سے روایت مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''جس نے صبح کے وقت سورۂ یٰسٓ پڑھی تو اسے شام تک آسانی دے دی جائے گی جس نے رات کے شروع میں اسے پڑھا تو اسے صبح تک رات کی آسانی دے دی جائے گی''۔

نحاس نے عبد الرحمن بن ابی لیلی سے روایت نقل کی ہے کہ ہر شے کا دل ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰسٓ ہے جس نے دن کے وقت اسے پڑھا تو یہ اس کے کاموں کے لیے کافی ہو جائے گی جس نے رات کے وقت اسے پڑھا تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

شہر بن حوشب نے کہا اہل جنت صرف سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسٓ پڑھتے ہیں۔ دارمی نے ان تینوں روایات کو مرفوع نقل کیا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر شے کا دل ہوتا ہے قرآن کا دل یٰسٓ ہے جس نے اسے کسی رات میں پڑھا تو اسے اس رات کی آسانی دے دی جاتی ہے جس نے اسے دن کے وقت پڑھا تو اسے اس دن کی آسانی دے دی جائے گی، جنتیوں سے قرآن اٹھالیا گیا ہے وہ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسٓ کے علاوہ کوئی چیز نہیں پڑھتے'' (2)۔

یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جس نے سورۂ یٰسٓ رات کے وقت پڑھی وہ صبح تک خوش خوش رہے گا جس نے صبح کے وقت اسے پڑھا تو وہ شام تک خوش خوش رہے گا (3)۔ جس نے اس کا تجربہ کیا تھا اس نے مجھے یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ ثعلبی اور ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں عبد الاعلیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں محمد بن صلت نے عمرو بن ثابت سے وہ محمد بن مروان سے وہ ابو جعفر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جس کے دل میں سختی ہو تو وہ زعفران سے کسی جام میں سورۂ یٰسٓ لکھے اور اسے پی لے۔

مجھے میرے والد نے انہوں نے اصرم بن حوشب سے وہ بقیہ بن ولید سے وہ معمر بن اشرف سے وہ حضرت محمد بن علی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا قرآن ہر چیز سے افضل ہے قرآن حکیم کی باقی کلاموں پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات پر فضیلت ہے، جس نے قرآن کی عزت کی اللہ تعالیٰ اسے عزتیں دے گا جس نے قرآن کی عزت نہ کی اللہ تعالیٰ اسے عزتوں سے نہیں نوازے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں قرآن کی حرمت اس طرح ہے جس طرح اولاد کے ہاں والد کی حرمت ہوتی ہے، قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 335 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 35 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 445

شفاعت قبول کی جاتی ہے اور ایسا جھگڑا کرنے والا ہے جس کی تصدیق کی جاتی ہے قرآن جس کے حق میں شفاعت کرے اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے اور جس کے حق میں جھگڑا کرے اس کی تصدیق کی جاتی ہے۔ جو آدمی اسے امام بنائے قرآن اسے جنت کی طرف لے جاتا ہے اور جو اسے اپنے پیچھے رکھے وہ اسے جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کے حاملین اللہ تعالیٰ کی رحمت سے گھرے ہوتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کا نور زیب تن کرایا جاتا ہے انہیں کلام اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے جو ان لوگوں سے دوستی کرے تو اس نے اللہ تعالیٰ سے دوستی کی جس نے ان سے دشمنی کی اس نے اللہ تعالیٰ سے دشمنی کی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی عزت کر کے اس کی دعوت پر لبیک کہو اللہ تعالیٰ تمہاری محبت میں اضافہ فرمادے گا۔ اپنے بندوں کے ہاں تمہیں محبوب بنادے گا۔ قرآن سننے والے سے دنیا کی آزمائش دور کردے گا اور قرآن کی تلاوت کرنے والے سے آخرت کی آزمائش دور فرمادے گا جس نے کتاب اللہ کی ایک آیت کو سنا تو یہ عمل عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے، اس سے اس کے لیے بہتر ہوگا۔ کتاب اللہ میں ایک سورت ہے جسے عزیزہ کہتے ہیں قیامت کے دن اس کے پڑھنے والے کو شریف کے نام سے یاد کیا جائے گا اس کی تلاوت کرنے والے کی شفاعت ربیعہ اور مضر قبیلہ کے افراد سے زیادہ افراد کے حق میں قبول کی جائے گی وہ سورۂ یٰس ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے جمعہ کی رات سورۂ یٰس پڑھی تو وہ صبح اس حالت میں کرے گا کہ اس کی بخشش کی جاچکی ہوگی“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو قبرستان میں داخل ہوا اس نے سورۂ یٰس پڑھی تو اللہ تعالیٰ اس روز اہل قبور سے عذاب میں تخفیف فرمائے گا اور پڑھنے والے کے لیے اس کے حروف کی تعداد کے برابر نیکیاں ہونگی“۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں کہ جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ

”اے سید (عرب وعجم) قسم ہے قرآن حکیم کی بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں یقیناً آپ راہ راست پر ہیں نازل فرمایا ہے (قرآن حکیم) عزیز (اور) رحیم نے“۔

يٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ یٰس میں قراءت کی کئی صورتیں ہیں۔ اہل مدینہ اور نسائی نے نون کو واو میں ادغام کر کے پڑھا ہے۔ ابو عمرو، اعمش اور حمزہ نے یٰس کو نون کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے عیسیٰ بن عمر نے يٰسِنَ یعنی نون کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن ابی اسحاق اور نصر بن عاصم نے اسے نون کے کسرہ کی ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون اعور اور محمد بن سمیقع نے يٰسِنُ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ پانچ قرائتیں ہیں۔ پہلی قراءت ادغام کے ساتھ ہے جس

طرح لغت عربیہ میں ضروری ہے کیونکہ نون کو واو میں مدغم کیا جاتا ہے جس نے ادغام کے بغیر پڑھا ہے اس نے کہا: حروف ہجاء کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر وقف کیا جائے ادغام تو درمیان کلام میں ہوتا ہے وقف پر نہیں ہوتا۔

سیبویہ نے نصب کا ذکر کیا ہے اور نصب دو وجوہ سے ذکر کی ہے: (1) ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ مفعول ہے وہ اسے منصرف قرار نہیں دیتے کیونکہ اس کے نزدیک یہ عجمی لفظ ہے اور ہابیل کے قائم مقام ہے تقدیر کلام یہ ہے اذکر یٰسن سیبویہ نے اسے سورت کا نام بنا دیا ہے (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مبنی بر فتحہ ہے جیسے کیف اور این ہے۔ جہاں تک کسرہ کا تعلق ہے فراء نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ عربوں کے قول: جیرِ افعل کے مشابہ ہے اس سورت میں یس قسم ہوگی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ امسِ، حذامِ، ھولاءِ اور رقاشِ کے مشابہ ہے۔ جہاں تک اس کے مضموم ہونے کا تعلق ہے تو اس صورت میں یہ منذ، حیث اور قط کے مشابہ ہے اور منادی مفرد کے مشابہ ہے جب تو کہے: یا رجل جو آدمی اس پر وقف کرتا ہے ابن سمیقع اور ہارون نے کہا: اس کی تفسیر میں یا رجل کہا ہے، مناسب اس پر ضمہ ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے کہا یہ سورت کا آغاز ہے تو اس کے لیے وقف کرنا اچھا ہے جس نے کہا: یٰسٓ کا معنی یا رجل تو اس پر وقف نہ کرے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس کا معنی ہے اے انسان، اللہ تعالیٰ کا فرمان: سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ۞ (الصافات) کے بارے میں کہا یعنی آل محمد پر سلامتی ہو (1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ سورت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اس کی دلیل اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ ہے سید حمیری نے کہا:

يانفس لاتَمحضِى بالنُّصحِ جاهدةً   عَلَى المودَّةِ إلا آلَ ياسينَ (2)

اے نفس! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے سوا کسی سے محبت کرنے میں نصیحت کو خالص نہ کر جبکہ تو کوشش کرنے والا ہو۔

ابو بکر وارق نے کہا: اس کا معنی ہے اے سید البشر! ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ امام مالک کا قول ہے، اشہب نے ان سے روایت کیا ہے۔ کہا: جس نے آپ سے پوچھا کیا کسی کے لیے مناسب ہے کہ اپنا نام یاسین رکھ لے؟ فرمایا: میں تو اسے مناسب خیال نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۞ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یہ میرا نام یٰسٓ ہے ابن عربی نے کہا: یہ بہت عمدہ کلام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بندے کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے رب کے اسماء میں سے ایسا نام رکھ لے جبکہ اس بندے میں اس کا معنی موجود ہو جس طرح عالم، قادر، سید اور متکلم ہے امام مالک نے یٰسن نام رکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے جس کا معنی معلوم نہیں بعض اوقات کوئی ایسا وصف ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ یکتا ہوتا ہے تو اس لیے یہ جائز نہیں کہ بندہ اس پر آگے بڑھے۔

اگر یہ سوال کیا جائے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ۞ (الصافات)

ہم اس کا جواب دیں گے: یہ حروف تہجی کے ساتھ لکھا گیا ہے اس لیے اس کے ساتھ نام رکھنا جائز ہے یہ یٰسٓ ایسا اسم ہے جس کے ہجے نہیں لکھے گئے؛ امام مالک نے اس کے بارے میں یہی گفتگو کی ہے کیونکہ اس میں اشکال موجود ہے؛ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 341 2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 445

بہتر جانتا ہے۔

بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا آغاز یاء اور سین کے ساتھ کیا ہے ان دونوں میں خیر ہی خیر ہے شروع کرنے والے کی اس پر راہنمائی کی گئی ہے کہ یہ سورت دل ہے اور دل جسم کا امیر ہے اسی طرح یٰسٓ تمام دوسری سورتوں کی امیر ہے تمام قرآن کے معانی پر مشتمل ہے۔

علماء نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ سعید بن جبیر اور عکرمہ نے کہا: یہ حبشہ کی لغت کا لفظ ہے۔ شعبی نے کہا: یہ بنوطی کی لغت کا لفظ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ بنوکلب کی لغت کا لفظ ہے۔ کلبی نے کہا: یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، عربوں نے اپنی زبان میں اسے استعمال کیا تو یہ ان کی لغت کا ایک لفظ بن گیا۔ یہ بحث سورۂ طٰہٰ اور کتاب کے مقدمہ میں مفصل گزر چکی ہے۔ قاضی عیاض نے یٰسٓ کے معنی کے متعلق مفسرین کے اقوال اچھی طرح بیان کیے ہیں ابومحمد مکی نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ میرے، میرے رب کے ہاں دس نام ہیں ان میں سے طٰہٰ اور یٰسٓ کا ذکر کیا۔

میں نے کہا: ماوردی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں میرے سات ناموں کا ذکر کیا ہے محمد، احمد، طٰہٰ، یٰس، مزمل، مدثر اور عبداللہ (1)'' یہ قاضی عیاض کا قول ہے۔

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ ارادہ کیا ہے اے سید! اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یٰس کا معنی ہے اے انسان! اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ کیا ہے، کہا: یہ قسم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے؛ زجاج نے کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اے محمد! ایک قول یہ کیا گیا: اے مرد! ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے انسان! ابن حنفیہ سے مروی ہے یٰسٓ سے مراد ہے اے محمد! کعب سے مروی ہے یٰسٓ سے مراد قسم ہے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے تخلیق سے دو ہزار سال پہلے اس کے ساتھ قسم اٹھائی فرمایا: اے محمد! تو مرسلین میں سے ہے پھر فرمایا: وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ۔ اگر یہ مقدر کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور یہ صحیح ہو کہ یہ قسم ہے تو اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہوگا اس پر دوسری قسم کا جو عطف کیا گیا ہے اس کے ساتھ پہلی قسم کو مؤکد کیا گیا ہے اگر یہ ندا کے معنی میں ہو تو اس کے بعد قسم اس لیے آئی ہے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کیا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر گواہی دی جائے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف وحی کی، آپ ایمان کے صراط مستقیم پر ہیں یعنی یہ ایسا راستہ ہے جس میں کوئی کجی نہیں اور حق سے کوئی اعراض نہیں۔ نقاشی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی رسالت کے لیے قسم نہیں اٹھائی اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عظمت اور شرف کا اظہار ہے۔ یہ تعبیر اس کے مطابق ہے جس نے اس کی یہ تاویل کی یا سید کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)'' ان کی گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 5　2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر فی سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 143

قشیری نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: قریش کے کفار نے کہا تو مرسل نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف مبعوث نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی قسم اٹھا کر فرمایا: آپ رسولوں میں سے ہیں۔ حکیم کا معنی محکم ہے یہاں تک کہ باطل اور تناقض لاحق نہیں ہوتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1)

اسی طرح یہ قرآن نظم اور معنی میں محکم ہے اسے کوئی خلل لاحق نہیں ہوتا بعض اوقات لفظ حکیم اللہ تعالیٰ کے حق میں محکم کے معنی میں ہوتا ہے جس طرح الیم، مؤلم کے معنی میں ہوتا ہے۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ یعنی دین مستقیم پر ہوتا ہے اس سے مراد اسلام ہے۔ زجاج نے کہا: اس سے مراد ہے آپ سابقہ انبیاء کے طریقہ پر ہیں۔ کہا: لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ان کی خبر ہے(1) اور عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دوسری خبر ہے یعنی آپ رسولوں میں سے ہیں اور آپ صراط مستقیم پر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنہیں استقامت پر بھیجا گیا تو اس صورت میں عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، الْمُرْسَلِيْنَ کا صلہ ہوگا، یعنی آپ ان رسولوں میں سے ہیں(2) جنہیں صراط مستقیم پر بھیجا گیا تھا؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (شوری) یعنی اللہ تعالیٰ کا راستہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ ابن عامر، حفص، اعمش، یحیی، حمزہ، نسائی، اور خلف نے تنزیل پڑھا ہے یعنی یہ مفعول مطلق ہے تقدیر کلام یہ ہے۔ نزّل اللہ ذالك تنزیلا(3) مصدر کو مضاف کیا تو وہ معرفہ ہوگیا جس طرح یہ قول ہے: فَضَرْبَ الرِّقَابِ (محمد: 4) یہ اصل میں ضرب بالرقاب تھا باقی قراء نے تنزیل کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی تقدیر کلام یہ ہوگی ھو تنزیل یا تقدیر یہ ہوگی الذی انزل الیك تنزیل العزیز الرحیم (4)۔ اس نقطہ لطیفہ کو محفوظ کرلو۔ اسے تنزیلِ کرکے بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ قرآن سے بدل ہوگا اور تنزیل قرآن کی طرف لوٹے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہا ہے معنی یہ بنے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں میں سے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز و رحیم کی تنزیل ہیں، اس صورت میں تنزیل، ارسال کے معنی میں ہوگا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا (الطلاق) یہ جملہ بولا جاتا ہے: أرسل اللہ المطر وانزلہ۔ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے بارش نازل کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل کی۔ جس نے اسے منصوب پڑھا ہے اس نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں میں سے ہیں جسے عزیز و رحیم کی جانب سے بھیجا گیا ہے الْعَزِيْزِ یعنی اپنے مخالف سے انتقام لینے والا۔ الرَّحِيْمِ اہل اطاعت پر رحیم ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝

''تاکہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا اس لیے وہ غافل

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 272 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہیں۔ بے شک (ان کے پیہم کفر و عناد کے باعث) یہ بات لازم ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اس لیے ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں''۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ اکثر علماء تفسیر کے نزدیک ما کا اعراب میں کوئی محل نہیں، ان میں سے قتادہ بھی ہیں کیونکہ یہ نافیہ ہے(1) تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جسے آپ سے قبل کسی ڈرانے والے نے نہیں ڈرایا، یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: ما اور فعل مصدر ہیں تقدیر کلام یہ ہوئی لتنذر قوما ماانذار آباثهم۔ ایک قول یہ کیا گیا: ما، الذی کے معنی میں ہے(2) معنی یہ ہوگا آپ انہیں ڈرائیں جس طرح ان کے آبا کو ڈرایا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ عربوں کو تواتر سے انبیاء کی خبریں پہنچی ہوں معنی یہ ہوگا انہیں میں سے کسی رسول میں سے انہیں نہ ڈرایا گیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہیں خبر تو پہنچی ہو لیکن انہوں نے غفلت کی ہو، اعراض کیا ہو اور وہ بھول گئے ہوں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس قوم کو خطاب ہو جن تک کسی نبی کی خبر نہ پہنچی ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۝ (سبا) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (القصص) یعنی ان کے پاس کوئی نبی نہیں آیا۔ جس نے یہ کہا ان تک انبیاء کی خبریں پہنچیں تو اس کا معنی ہوگا وہ اب اعراض کرنے والے ہیں اس سے جان بوجھ کر غافل بنتے ہیں۔ جو آدمی کسی چیز سے اعراض کرتا ہے اسے غافل کہتے ہیں: ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سزا سے غافل ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ یعنی ان میں سے اکثر پر عذاب ثابت ہو چکا ہے وہ آپ کے خبردار کرنے پر ایمان نہیں لائیں گے یہ پھر ان لوگوں کے بارے میں ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی تھا کہ وہ کفر پر مریں گے(3)۔ پھر انہوں نے جو ایمان ترک کیا اس کا سبب ذکر کیا فرمایا: اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت ابوجہل بن ہشام اور اس کے دو مخزومی ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی اس کی وجہ یہ بنی، ابوجہل نے قسم اٹھائی اگر اس نے (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ ان کا سر پتھر سے کچل دے گا۔ جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ مارنے کے لیے گیا، پتھر اٹھایا، جب پتھر مارنے کا قصد کیا تو اس کا ہاتھ گردن کی طرف لوٹ آیا اور پتھر اس کی گردن کے ساتھ چمٹ گیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو جو کچھ دیکھا وہ بتایا۔ ایک آدمی جس کا نام ولید بن مغیرہ تھا اس نے کہا: میں اس کا سر کچل دوں گا۔ وہ پتھر مارنے کے لیے آیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز پڑھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے اندھا کر دیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سن رہا تھا مگر دیکھتا نہیں تھا وہ اپنے ساتھیوں کی

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 272 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 6-5، صفحہ 273

طرف لوٹا مگر اپنے ساتھی بھی نظر نہیں آئے یہاں تک کہ انہوں نے اسے ندادی۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے اسے دیکھا نہیں، اس کی آواز سنی ہے۔ تیسرے نے کہا: میں اس کا سر پیس دوں گا پھر پتھر اٹھایا وہ چلا پھر پچھلے پاؤں واپس پلٹا یہاں تک کہ اپنی گدی کے بل گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا اسے کہا گیا: تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا: میرا معاملہ بڑا عظیم ہے میں نے اسے دیکھا جب میں اس کے قریب ہوا تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نر اونٹ اپنی دم ہلا رہا ہے میں نے اس جیسا بڑا نر کبھی بھی نہیں دیکھا وہ میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گیا لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں اس کے قریب ہوتا تو وہ مجھے کھا جاتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے یوں پڑھا ہے انا جعلنا فی ایمانھم۔ زجاج سے اسے انا جعلنا فی ایدیھم پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قراءت تفسیر ہے۔ مصحف کے برعکس قراءت نہیں کی جائے گی جماعت کی قراءت میں کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یوں گی انا جعلنا فی أعناقھم وفی أیدیھم أغلالا فھی إلی الأذقان عرب اس قسم کے الفاظ کو حذف کر دیتے ہیں اس کی مثل سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) تقدیر کلام یہ ہوگی وسرابیل تقیکم البرد تو اس کو حذف کر دیا گیا۔ کیونکہ جو چیز گرمی سے بچاتی ہے وہ سردی سے بچاتی ہے کیونکہ طوق جب گردن میں ہوتا ہے تو لازماً ہاتھ میں ہوتا ہے خصوصاً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ اس سے مراد ہاتھ ہیں پس وہ اپنے سروں کو اٹھائے ہوں گے وہ انہیں نیچے کرنے کی طاقت نہ رکھیں گے کیونکہ جس کا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے ساتھ جکڑا ہوا ہو تو اس کا سر بلند ہوتا ہے۔

عبد اللہ بن یحییٰ سے مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے انہیں الاقماح کا طریقہ بتایا آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی داڑھی کے نیچے رکھا دونوں کو ساتھ چمٹایا اور اپنے سر کو اوپر اٹھایا (1)۔ اس لفظ کے معنی کی تعبیر میں جو کچھ روایت کیا گیا ہے اس میں سے یہ ذی شان ہے، یہ معنی اس چیز سے ماخوذ ہے جو اصمعی نے ذکر کیا ہے اس نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے اقمحت الدابۃ جب تو اس کی لگام کو کھینچے تاکہ اپنے سر کو اوپر اٹھائے۔ نحاس نے کہا: قاف، کاف سے بدلا ہوا ہے کیونکہ یہ اس کا قریبی لفظ ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے: قھرتہ، کھرتہ۔ اصمعی نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے اکمحت الدابۃ۔ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس کی لگام کھینچے یہاں تک کہ وہ اپنا سر اوپر اٹھالے، اسی معنی میں یہ قول ہے: والراس مکمح سر اوپر اٹھا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ جملے بولے جاتے ہیں اکمحتھا، أکفحتھا اور کبحتھا۔ سب کا معنی ایک ہے کبحتھا باب افعال کے وزن پر نہیں، اصمعی سے یہ بھی مروی ہے قمح البعیر قموحا جب اونٹ حوض پر اپنے سر کو اٹھالے اور وہ پانی پینے سے رک جائے، اسی سے بعیر قامح اور قمح ہے یہ بھی جملہ بولا جاتا ہے: شرب فتقمح وانقمح دونوں کا معنی ایک ہے جب وہ اپنا سر اٹھالے اور سیراب ہونے کی وجہ سے پانی پینے سے رک جائے یہ جملہ بولا جاتا ہے: وقد قامحت إبلك جب وہ پانی پر وارد ہو اور پانی نہ پیئے اس نے اپنا سر کسی بیماری کی وجہ سے اٹھالیا یا سردی کی وجہ سے ایسا کیا اس کے ساتھ یوں صفت بھی ذکر کی جاتی ہے ابل مقامحۃ، بعیر مقامح، ناقۃ مقامح اس کی جمع خلاف قیاس قماح آتی ہے؛ بشر کشتی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونحن علی جوانبھا قُعُودٌ نَغُضّ الطرفَ کالإبل القِمَاحِ (2)

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 447
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 8

''ہم کشتی کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے ہم آنکھیں بند کئے ہوئے تھے جس طرح وہ اونٹ آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو پانی پینے سے رک جاتے ہیں''۔ اقماح کا معنی سر اٹھانا اور آنکھیں بند کرنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اقمحه الغل جب وہ تنگی کی وجہ سے اپنا سر اوپر کو اٹھالے، شھر قماح ایسا مہینہ جس میں سخت سردی ہوتی ہے وہ دونوں دسمبر اور جنوری ہیں انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اونٹ جب پانی پر وارد ہوتا ہے تو پانی کی ٹھنڈک اسے اذیت دیتی ہے تو وہ اپنا سر اوپر کو اٹھالیتا ہے اسی سے ایک جملہ قمحت السویق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بیان فرمائی ہے کہ وہ ہدایت سے یوں رکے ہوئے ہیں جس طرح وہ آدمی رکا ہوتا ہے جس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہو؛ یہ یحییٰ بن سلام اور ابو عبیدہ نے کہا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان حمار یعنی وہ ہدایت کو نہیں دیکھتا۔ جس طرح شاعر نے کہا:

لهم عن الرشد اغلال واقیاد

ہدایت پانے میں انہیں طوق اور بیڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ذؤیب دور جاہلیت میں ایک عورت سے محبت کرتے تھے جب وہ مسلمان ہو گئے تو اس عورت نے انہیں بہلانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگے:

فلیس کعهدِ الدار یا أُم مَالِكٍ ولکن أحاطت بالرقاب السلاسل

وعاد الفتی کالکهلِ لیس بقائلٍ سِوی العدل شیأً فاستراح العوٰذِلُ

انہوں نے یہ کہنا چاہا تھا کہ اسلام کے احکام نے ہمیں بدکاری اور فسق سے روک دیا ہے۔ فراء نے بھی یہی کہا ہے: یہ ضرب المثل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے ہمیں روک دیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ (الاسراء: 29) یہ ضحاک کا قول بھی ہے

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ حق کو قبول کرنے سے تکبر میں اس طرح ہو گئے ہیں جس طرح وہ آدمی ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طوق ہے اور اسے اس کی گردن کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہو وہ ہمہ وقت سر اٹھائے ہی رہتا ہے وہ اسے جھکا نہیں سکتا وہ اپنی آنکھ بند رکھتا ہے وہ اسے کھولتا نہیں۔ متکبر کی صفت بھی اسی چیز کے ساتھ لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنی گردن کھڑی کئے ہوئے ہے۔ ازہری نے کہا: جب ان کے ہاتھ ان کی گردنوں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں تو ان طوقوں نے ان کی ٹھوڑیوں کو اوپر اٹھا دیا جبکہ ان کے سر سیدھے کھڑے ہیں جس طرح وہ اونٹ ہوتے ہیں جو اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں یہ رکاوٹ اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں میں کفر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک قوم کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے سزا کے طور پر توفیق سلب کر لیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا جائے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور بیڑیاں ہونگی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ (غافر: 71) ماضی کے لفظ کے ساتھ اسے تعبیر فرمایا یعنی فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا۔

مُّقْمَحُوْنَ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ مجاہد نے کہا: مُّقْمَحُوْنَ کا معنی ہے انہیں ہر بھلائی سے روک دیا گیا ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

وَ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑩ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ⑪

''اور ہم نے بنادی ہے ان کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ اور یکساں ہے ان کے لیے چاہے آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ تو صرف اس کو ڈرا سکتے ہیں جو اتباع کرتا ہے قرآن کا اور ڈرتا ہے (خداوند) رحمٰن سے بن دیکھے پس مژدہ سنایئے ایسے شخص کو مغفرت کا اور بہترین اجر کا''۔

**وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا** مقاتل نے کہا: جب ابو جہل اپنے ساتھیوں کے پاس گیا جبکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچ پایا تھا اور پتھر اس کے ہاتھ سے گر گیا تو بنی مخزوم کے ایک اور آدمی نے پتھر اٹھایا اور کہا: میں اسے اس پتھر کے ساتھ قتل کروں گا جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو بے نور کر دیا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا تو وہ اپنے ساتھیوں کو بھی نہ دیکھ سکا یہاں تک کہ ساتھیوں نے اسے ندا دی؛ آیت کا یہ معنی ہے۔

محمد بن اسحاق نے اپنی روایت میں کہا: عتبہ اور شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے ابو جہل اور امیہ بن خلف بیٹھے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاڑ میں تھے تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچا سکیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف نکلے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ یس پڑھ رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں مٹی بھی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف وہ مٹی پھینکی اور پڑھا **وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا** انہوں نے سر نیچے کر لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزر گئے۔ سورۂ سبحان میں اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے سورۂ کہف میں **سَدًّا** کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے کہ سدا سین کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے یہ دونوں اس کی لغتیں ہیں۔

**فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ⑨** ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور یحییٰ بن نعیم نے اسے فاعشیناهم پڑھا ہے(1)۔ یہ عشا سے عین کے ساتھ ہے جس کا معنی ہے اس کی نظر کمزور ہے وہ رات کو نہیں دیکھ سکتا۔ شاعر نے کہا:

متی تاته تعشوالی ضوء نارہ

جب تو اس کے پاس آتا ہے تو تو اس کی آگ کی روشنی سے اندھا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ** (الزخرف: 36) دونوں الفاظ کے معنی قریب قریب ہیں معنی ہے ہم نے انہیں اندھا کر دیا جس طرح شاعر نے کہا:

ومن الحوادثِ لا أَبَالَكَ أَنَّنِی ضُرِبَتْ علی الأرض بالأَسْدَادِ

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 274

لا أهتدي فيها لموضع تلعة بين العذيب وبين أرض مراد

تیرا باپ نہ رہے حوادثات زمانہ میں سے یہ بھی ہے کہ مجھ پر زمین پہاڑوں کے ساتھ پھینک دی گئی ہے ان میں میں عذیب اور مراد کے علاقہ کے درمیان تلعۃ کی جگہ کو نہیں پاتا۔

وہ ہدایت کو نہیں دیکھ سکتے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ضحاک نے کہا: آیت میں مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ سَدًّا سے مراد دنیا ہے اور وَّمِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا سے مراد آخرت ہے یعنی وہ دوبارہ اٹھائے جانے سے اندھے ہو گئے اور دنیا میں شرائع کو قبول کرنے سے اندھے ہو گئے؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَقَيَّضۡنَا لَهُمۡ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوۡا لَهُمۡ مَّا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ (حم سجدہ:25) یعنی ان شیطانوں نے ان کے لیے دنیا کو مزین کیا اور آخرت کو جھٹلانے کی دعوت دی۔

ایک قول یہ کیا گیا: مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ سَدًّا سے مراد ہے دنیا کے بارے میں دھوکہ میں مبتلا ہونا اور مِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا سے مراد آخرت کو جھٹلانا۔ ایک قول کیا گیا ہے: مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ سے مراد آخرت ہے اور مِنۡ خَلۡفِهِمۡ سے مراد دنیا ہے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۝ سورۂ بقرہ میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ یہ آیت قدریہ اور دوسرے لوگوں کا رد کرتی ہے۔

ابن شہاب سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے غیلان قدری کو طلب کیا پوچھا: اے غیلان! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو تقدیر کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! لوگ مجھ پر جھوٹ بولتے ہیں پھر کہا: اے امیر المومنین! کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان آپ نے نہیں دیکھا: اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا۝ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا۝ (الدہر) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ارشاد فرمایا: اے غیلان! آگے پڑھو یہاں تک کہ اس نے فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا۝ (المزمل) تک پڑھا۔ فرمایا: آگے پڑھو تو اس نے وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الدہر:30) تک پڑھا کہا: اللہ کی قسم! اے امیر المومنین! میں جانتا ہی نہیں تھا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: اے غیلان! سورۂ یٰسین کا ابتدائی حصہ پڑھو تو اس نے پڑھا یہاں تک کہ وہ اس حد تک پہنچا وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۝ غیلان نے کہا: اللہ کی قسم! اے امیر المومنین! گویا میں نے اس سے قبل کبھی بھی اسے نہیں پڑھا، اے امیر المومنین! گواہ رہیے میں توبہ تائب ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: اے اللہ! اگر یہ سچا ہے تو اس پر نظر رحمت فرما اور اسے ثابت قدم رکھ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اس آدمی کو مسلط فرما جو اس پر رحم نہ کرے اور اسے مومنوں کے لیے نشانی بنادے۔ ہشام نے اسے پکڑ لیا اور غیلان کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دیئے اور اسے سولی پر لٹکا دیا۔ ابن عون نے کہا: میں نے اسے دمشق کے دروازے پر سولی پر لٹکا ہوا دیکھا ہم نے اس سے پوچھا: اے غیلان! تجھے کیا ہوا؟ اس نے کہا: مجھے ایک صالح شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بددعا لگی ہے۔ اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ كَرِيۡمٍ۝

ذکر سے مراد قرآن ہے یعنی اس پر عمل کیا۔ بِالْغَیْبِ سے مراد جو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور آگ سے غائب ہوا، یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے اور تنہا اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اسے گناہ کی بخشش اور جنت کی بشارت دیجئے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ۣ وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾

''بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں ان کے اعمال کو جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے ان آثار کو جو وہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں''۔

(1) اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے مقصود کافروں کا رد ہے۔ ضحاک اور حسن نے کہا: ہم انہیں جہالت کے بعد ایمان کے ساتھ زندہ کرتے ہیں (1)۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے ہم جزا کے لیے بعث کے ساتھ انہیں زندہ کریں گے پھر تمام اعمال لکھنے کے ساتھ انہیں دھمکی دی۔

(2) اللہ تعالیٰ ہر چیز کا شمار کئے ہوئے ہے اور انسان جو کچھ کرتا ہے اسے شمار کئے ہوئے ہے۔ قتادہ نے کہا: یعنی اس نے جو عمل کیا۔ مجاہد اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ (الانفطار) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ (القیامۃ: 13) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر: 18) انسان کے اعمال جو باقی رہیں گے اور جنہیں ذکر کیا جائے گا خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ہوں اس پر انہیں بدلا دیا جائے گا اچھا عمل جیسے علم جس کی اس نے تعلیم دی، جیسے کتاب جو اس نے تصنیف کی، وقف جو اس نے وقف کیا یا ایسی عمارت جو انہوں نے بنائی وہ مسجد ہو، سرائے اور پل وغیرہ۔ یا برا عمل ہو جس طرح کوئی ایسا ٹیکس ہو جو کسی ظالم حکمران نے مسلمانوں پر لگایا ہو یا ایسی گلی جو اس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بنائی ہو یا کوئی ایسی چیز جو اس نے مسلمانوں کو ذکر سے روکنے کے لیے بنائی ہو جس طرح گانے بجانے کے مراکز، لہو و لعب کے میدان اسی طرح ہر اچھی سنت اور بری سنت جس پر عمل کیا جاتا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ نشانات ہیں جو مسجد کی طرف پیدل آنے والوں کے قدموں سے بنتے ہیں؛ اس آیت کا یہی معنی حضرت عمر، حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بیان کیا ہے (2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وَ اٰثَارَهُمْ کا معنی ہے مساجد کی طرف جاتے ہوئے ان کے قدم۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ہے ان سب میں سے یہ بہترین معنی ہے کیونکہ نحاس نے کہا: یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی تھی کیونکہ انصار کے مکانات مسجد سے دور تھے ایک حدیث مرفوع میں ہے: یکتب لہ برجل حسنۃ وتحط

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 343

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ باب الابعد فالابعد من المسجد اعظم اجرا، حدیث نمبر 776، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عنه برجل سيئة ذاهبا و راجعا إذا خرج إلى مسجد ایک قوم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک قدم پر ایک برائی مٹادی جاتی ہے یہ صورت مسجد آتے اور جاتے ہوئے ہوتی ہے جب وہ مسجد کی طرف نکلے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنوسلمہ مدینہ طیبہ کی ایک جانب رہتے تھے انہوں نے مسجد کے قریب گھر بنانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں'' تو وہ مسجد کے قریب منتقل نہ ہوئے (1)۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ثوری سے مروی ہے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنوسلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب آجائیں جگہ بھی خالی تھی، یہ خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی تو ارشاد فرمایا: ''اے بنوسلمہ اپنے گھروں میں ہی رہو تمہارے قدم لکھے جاتے ہیں'' انہوں نے کہا: ہم منتقل ہوتے تو یہ چیز ہمیں خوش نہ کرتی (2)۔

ثابت بنانی نے کہا: میں حضرت انس بن مالک کے ساتھ نماز کی طرف نکلا تو میں نے جلدی کی تو انہوں نے مجھے روک لیا جب نماز ختم ہوگئی تو کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے روک لیا جب نماز ختم ہوگئی تو فرمایا: ''کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قدم لکھے جاتے ہیں (3)'' آیت کا مصداق بھی یہی ہے۔

قتادہ، مجاہد اور حسن بصری نے کہا: اس آیت میں آثار سے مراد قدم ہیں۔ ثعلبی نے کہا: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آثار سے مراد جمعہ کی طرف جانے والے قدم ہیں (4)۔ آثار کا واحد اثر ہے اسے اثر بھی کہتے ہیں۔

**(3)** یہ احادیث جو آیات کی تفسیر بیان کرتی ہیں ان میں اس امر پر دلیل ہے کہ مسجد سے دوری افضل ہے۔ اگر کوئی آدمی مسجد کے پڑوس میں ہو تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ مسجد سے دور چلا جائے اس میں اختلاف ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ قضائے حاجت کی جگہ دور اختیار کرے۔ دوسرے صحابہ سے مروی ہے کہ جو آدمی مسجد سے جتنا دور ہوگا اس کا اجر اتنا ہی بڑا ہوگا حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے اسے مکروہ جانا ہے کہا: وہ مسجد کے پڑوس کو نہ چھوڑے کیونکہ کوئی دوسرا آجائے گا؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے۔ اپنی مسجد کو چھوڑ کر بڑی مسجد میں جانے میں دو قول ہیں: (1) ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کا اپنے گھر کے قریب والی مسجد میں نماز ایک نماز ہے اور قبائل کی مسجد میں ایک نماز پچیس نمازیں ہیں اور وہ نماز جو جامع مسجد میں پڑھی جائے وہ پانچ سو نمازیں ہیں'' (5)۔

**(4)** دیارکم، اغراء کے طریقہ پر منصوب ہے یعنی اپنے گھروں کو لازم پکڑو۔ تُكْتَبُ امر کے جواب کے طور پر مجزوم ہے۔ كُلَّ کا لفظ فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے جس پر أَحْصَيْنٰهُ دلالت کرتا ہے گویا کلام یوں ہے واحصینا کل شئ

---

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ یٰسین، جلد 2، صفحہ 155۔ ایضاً، حدیث نمبر 3150، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ، جلد 1، صفحہ 235

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 448

4۔ ایضاً

5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب ما جاء فی الصلوٰۃ فی المسجد الجامع، جلد 1، صفحہ 103

احصیناہ۔ اسے مبتدا کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے کیونکہ یہ مبتدا بن سکتا ہے تاہم نصب دینا بہتر ہے تاکہ فعل جس پر عمل کر رہا ہے اس کا اس پر عطف کیا جائے جس پر فعل نے عمل کیا؛ یہ سیبویہ اور خلیل کا قول ہے۔ الامام سے مراد وہ کتاب ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے وہ حجت ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ابن فرید نے کہا: امام سے مراد لوح محفوظ ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس سے مراد اعمال کے صحیفے ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

''اور بیان فرمایئے ان کے سمجھانے کے لیے مثال اس گاؤں کے باشندوں کی جب آئے وہاں ہمارے رسول۔ جب (پہلے) ہم نے بھیجے ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے تقویت دی انہیں ایک تیسرے رسول سے تو ان تینوں نے انہیں کہا کہ ہمیں تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ بستی والوں نے کہا: نہیں ہو تم مگر انسان ہماری مانند اور نہیں اتاری رحمن نے کوئی چیز، نہیں ہو تم مگر جھوٹ بول رہے ہو۔ رسولوں نے کہا: ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور نہیں ہم پر کوئی ذمہ داری بجز اس کے کہ پیغام حق کھول کر پہنچا دیں۔ وہ کہنے لگے: ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور پہنچے گا تمہیں دردناک عذاب۔ رسولوں نے کہا: تمہاری بدفالی تمہیں نصیب ہو حیرت ہے اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے تو تم دھمکیاں دینے لگتے ہو بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو''۔

خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے سامنے اصحاب قریہ کا واقعہ بیان کریں (1)۔ ماوردی نے بیان کیا ہے کہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے یہ اہل انطیس کی طرف منسوب ہے یہ اس آدمی کا نام ہے جس نے اس بستی کو آباد کیا تھا جب اسے عربی زبان میں منتقل کیا گیا تو اس میں تبدیلی کر دی گئی؛ یہ قول امام سہیلی نے ذکر کیا ہے اس کے بارے میں ایک لفظ یہ بھی ہے ان تاکیہ یعنی طاء کی جگہ تاء ہے وہاں ایک بادشاہ تھا جسے انطیخس بن انطیخس بن انطیخس کہا جاتا، وہ بتوں کی پوجا کیا کرتا تھا؛ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر نے اسے کعب اور وہب سے نقل کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف تین رسولوں کو بھیجا وہ حضرت صادق، حضرت مصدوق اور حضرت شمعون تھے شمعون ہی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 10

تیسرا تھا؛ یہ طبری کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ حضرت شمعون اور حضرت یوحنا تھے۔ نقاشی نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت شمعون اور حضرت یحییٰ تھے دونوں نے حضرت صادق اور حضرت مصدوق کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مثلا اور اصحاب قریہ، اضرب کے دونوں مفعول ہوں یا اصحاب قریہ، مثلا سے بدل ہو تقدیر کلام یوں ہوگی اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مشرکین کو اس عذاب سے ڈرائیں کہ ان مشرکوں پر وہ عذاب نازل ہوسکتا ہے جو اس بستی کے کفار پر نازل ہوا تھا جن کی طرف تین رسول بھیجے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسل من اللہ، مبتدا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان تین افراد کو انطاکیہ کی طرف بھیجا تھا تا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائیں اللہ تعالیٰ نے ان کے بھیجنے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم سے انہیں بھیجا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا تو لوگوں نے انہیں جھٹلایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگوں نے دونوں کو مارا اور دونوں کو قیدی بنالیا تو ہم نے تیسرے کے ساتھ انہیں قوت بخشی اور تیسرے کے ساتھ رسالت کو پختہ کیا۔

ابوبکر نے عاصم سے یہ قراءت نقل کی ہے فعززنا بثالث جبکہ باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے قوت بخشی اور مضبوط کیا اس حساب سے دونوں قرائتیں ایک معنی میں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: تخفیف کی صورت میں یہ غلبنا اور قھرنا کے معنی میں ہے اس معنی میں وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ (ص) تشدید قوینا اور کثرنا کے معنی میں ہے۔ ابوعمرو بن علاء نے متلمس کے لیے شعر پڑھا:

أُجُدٌ إذا رَحَلَت تَعَزَّزَ لَحْمُها　　وإذا تُشَدِ بنسعها لا تَبْنِسُ

قصہ میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف دو قاصد بھیجے وہ ایک بوڑھے کو ملے جو اپنی بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا وہ حبیب نجار صاحب یس تھا دونوں نے اسے اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دی دونوں نے کہا: ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ہم تجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دیتے ہیں اس نے دونوں سے معجزہ طلب کیا دونوں نے کہا: ہم مریض کو شفاء دیتے ہیں۔ اس حبیب نجار کا ایک بیٹا مجنون تھا، ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ بستر پر مریض پڑا تھا دونوں نے اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ اللہ کے حکم سے صحیح وسالم اٹھ کھڑا ہوا وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہی وہ آدمی تھا جو شہر کے دور دراز علاقہ سے دوڑتا ہوا آیا تھا اس نے دونوں کے امر کو ظاہر کر دیا دونوں نے بہت سے لوگوں کو شفا عطا فرمائی۔

بادشاہ نے دونوں کو بلا بھیجا جبکہ وہ بتوں کی عبادت کیا کرتا تھا تا کہ دونوں کے احوال کو سمجھے دونوں نے کہا: ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا: تمہاری نشانی کیا ہے؟ دونوں نے کہا: ہم مادرزاد اندھوں، کوڑھ کے مریضوں کو اور دوسرے مریضوں کو اللہ کے حکم سے درست کرتے ہیں اور ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں بادشاہ نے ان کو مارنے کا ارادہ کیا۔ وہب نے کہا: بادشاہ نے دونوں کو گرفتار کرلیا اور دونوں کو سو کوڑے مارے یہ خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچی تو آپ نے تیسرے قاصد کو بھیجا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ شمعون صفا تھا جو حواریوں کا سردار تھا دونوں کی

مدد کے لئے اسے بھیجا اس نے بادشاہ کے ہم نشین کے ساتھ راہ ورسم پیدا کیے یہاں تک کہ وہ ان کے ہاں ذیشان ہو گیا اور وہ لوگ اس سے مانوس ہو گئے انہوں نے اس کی بات بادشاہ تک پہنچائی وہ بھی اس سے مانوس ہو گیا پھر ایک دن اس نے بادشاہ سے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے ان دو افراد کو قید کر رکھا ہے جنہوں نے تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تھی کاش! تو ان سے پوچھتا اس کا پس منظر کیا ہے؟ بادشاہ نے کہا: غصہ میرے اور ان کے سوال کے درمیان غالب آ گیا تھا اس آدمی نے کہا: کاش! تو انہیں حاضر ہونے کا حکم دیتا؟ اس نے ایسا ہی کیا شمعون نے دونوں سے کہا: تم جو دعویٰ کرتے ہو اس پر دلیل کیا ہے؟ دونوں نے کہا: ہم مادر زاد اندھوں کو اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرتے ہیں۔ ایک ایسا لڑکا لایا گیا جس کی آنکھوں کے نشان ہی نہ تھے اس کی آنکھوں کی جگہ ایسی تھی جس طرح پیشانی ہوتی ہے دونوں نے اپنے رب کے حضور دعا کی تو آنکھ کی جگہ پھٹ گئی دونوں نے مٹی کے ڈھیلے لیے اور اس کے رخسار پر رکھ دیئے تو دونوں اس کی آنکھیں بن گئیں جن کے ساتھ وہ دیکھنے لگا۔ بادشاہ متعجب ہوا اس نے کہا: یہاں ایک لڑکا ہے جو سات دن پہلے فوت ہو گیا ہے میں نے اسے دفن نہیں کیا یہاں تک کہ اس کا باپ آئے کہا: کیا تمہارا رب اسے زندہ کر سکتا ہے؟ دونوں نے اعلانیہ دعا کی اور شمعون نے آہستہ دعا کی وہ مردہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: میں سات دن پہلے مر گیا تھا مجھے مشرک کی حیثیت سے پایا گیا مجھے آگ کی سات وادیوں میں داخل کیا گیا جس حالت پر ہوں اس سے میں تمہیں خبردار کرتا ہوں پھر آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے تو میں نے ایک خوبصورت چہرے والے جوان کو دیکھا جو ان تین افراد کے حق مین سفارش کر رہا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ کیا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس کا کوئی شریک نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی روح اور کلمہ ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ لوگوں نے اس سے پوچھا: یہ شمعون بھی انہیں کا ساتھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں یہ ان سے افضل ہے۔ شمعون نے لوگوں کو بتایا کہ اسے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف بھیجا تھا اس کی گفتگو بادشاہ پر اثر انداز ہوئی اس نے بادشاہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی بادشاہ بے شمار لوگوں کے ساتھ مومن ہو گیا اور دوسرے بے شمار لوگوں نے کفر اختیار کیا۔

قشیری نے یہ ذکر کیا ہے کہ بادشاہ تو ایمان لے آیا تھا لیکن اس کی قوم مومن نہ ہوئی تھی، حضرت جبریل امین نے ایک چیخ ماری تو باقی ماندہ سب کافر مر گئے۔

یہ روایت کی گئی ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا کہ وہ اس بستی کی طرف جائیں تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی! ہم ان لوگوں کی زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں دعا کی تو اسی جگہ پر سو گئے وہ نیند سے اٹھے تو فرشتوں نے انہیں اٹھایا اور انطاکیہ میں جا پہنچایا تو ان میں سے ہر ایک ان کی زبان میں بات کر رہا تھا اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرۃ: 87) کا یہی مفہوم ہے سب نے کہا: ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا: تم تو محض ہماری طرح انسان ہو تم کھانا کھاتے ہو اور بازاروں میں چلتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تو کوئی چیز نازل نہیں کی جس کے ساتھ وہ حکم دے یا منع کرے تم تو اپنی رسالت کے دعویٰ میں جھوٹ بولتے ہو، رسولوں نے کہا: ہمارا رب خوب جانتا ہے کہ

ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اگر چہ تم ہمیں جھٹلاؤ ہمارے ذمے تو یہ پیغام پہنچانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ لوگوں نے ان سے کہا: ہم نے تم سے فال بدلیا۔ مقاتل نے کہا: تین سال تک ان سے بارش روک لی گئی۔ لوگوں نے کہا: یہ تمہاری نحوست ہے۔ یہ بھی قول کیا جاتا ہے: دس سال تک انہیں ڈراتے رہے لوگوں نے کہا: اگر تم ہمیں ڈرانے سے نہ رکے تو ہم تمہیں رجم کر دیں گے۔ فراء نے کہا: ہم تمہیں قتل کر دیں گے (1)۔ کہا: قرآن حکیم میں رجم سے مراد قتل کرنا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد پتھر مار مار کر مار ڈالنا ہے۔ ایک قول یہ ہے: کہا گیا ہے اس کا معنی ہے ہم تمہیں گالیاں دیں گے۔ سب بحث پہلے گزر چکی ہے۔

عَذَابٌ اَلِیْمٌ سے مراد قتل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تکلیف دہ عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد قتل سے قبل تکلیف دہ عذاب ہے جیسے کھال اتارنا، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور سولی پر لٹکانا۔ رسولوں نے کہا: خیر اور شر میں سے حصہ تمہارا ہے اور تمہاری گردنوں میں لٹکا ہوا ہے وہ سب کچھ ہماری نحوست کی وجہ سے نہیں؛ یہ معنی ضحاک نے بیان کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہارا رزق اور تمہارا عمل ہے، معنی ایک ہی ہے۔

حضرت حسن بصری نے اسے اطیرکم پڑھا ہے جو تطیرکم کے معنی میں ہے ائن ذکرتم قتادہ نے کہا: تقدیر کلام یہ ہوگی ان ذکرتم تطیرتم اس میں نو قرائتیں ہیں۔ اہل مدینہ نے اسے أین ذکرتم یعنی دوسرے ہمزہ میں تخفیف ہے اہل کوفہ نے أان دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں ہمزوں کے درمیان الف فاصل ہے کیونکہ دو ہمزوں کا اجتماع ناپسندیدہ ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے ہمزہ کے بعد الف ہے اور الف کے بعد ہمزہ مخففہ ہے۔ پانچویں صورت دو مفتوح ہمزوں کے درمیان الف ہے۔ چھٹی صورت یہ ہے دونوں مفتوح ہمزوں کو ثابت رکھا گیا ہے۔ فراء نے کہا: یہ قراءت ابورزین کی قراءت ہے۔

میں کہتا ہوں: ثعلبی نے اسے زر بن حبیش اور ابن سمیقع سے نقل کیا ہے۔ عیسیٰ بن عمر اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یوں اس کی قراءت کی قالوا طائرکم معکم أینَ ذکرتم، این جو حیث کے معنی میں ہے۔ یزید بن قعقاع، حسن بصری اور طلحہ نے کہا: ذُکِرتم تخفیف کے ساتھ ہے۔ نحاس نے یہ سب اقوال ذکر کیے ہیں۔ مہدوی نے طلحہ بن مصرف اور عیسیٰ ہمدانی سے نقل کیا ہے آن ذکرتم یعنی مد کے ساتھ اسے پڑھا ہے کہ ہمزہ استفہام، ہمزہ مفتوحہ پر داخل ہوا ہے ماجشون نے کہا: ان ذکرتم ایک ہمزہ مفتوح کے ساتھ ہے، یہ نو قرائتیں ہیں۔ ابن ہرمز نے اسے طَیْرُکُمْ مَعَکُم، أئِن ذُکِّرتم پڑھا ہے کیونکہ انہیں نصیحت کی گئی، یہ نیا کلام ہے یعنی اگر تمہیں نصیحت کی جائے تو تم فال پکڑنے لگتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے اس وقت فال بدلیا جب انہیں یہ خبر پہنچی کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو دعوت دی تو انہوں نے وہ دعوت قبول نہ کی ان کا انجام ہلاکت ہے۔

قتادہ نے کہا: تم فال پکڑنے میں اسراف سے کام لینے والے ہو۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: تم اپنے کفر میں اسراف کرنے والے ہو۔ ابن بحر نے کہا: سرف سے یہاں مراد فساد ہے اس کا معنی ہے بلکہ تم لوگ فسادی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم مشرک ہو (2)۔ اسراف کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے مشرک بھی حد سے تجاوز کرتا ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 276
2۔ ایضاً

وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ ﴿۲۷﴾ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

''دریں اثناء آیا شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا اس نے کہا: اے میری قوم! پیروی کرو رسولوں کی پیروی کروان (پاکبازوں) کی جو تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے اور وہ سیدھی راہ پر ہیں۔ اور مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اس کی جس نے مجھے پیدا فرمایا اور اسی کی طرف تم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔ کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں بنالوں اسے چھوڑ کر کوئی اور خدا؟ ہرگز نہیں اگر رحمن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے ذرا فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ (اگر میں شرک کروں) تو میں بھی اس وقت کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں ایمان لے آیا ہوں تمہارے رب پر پس میرا اعلان سن لو۔ حکم ہوا: جا جنت میں داخل ہو جا، وہ بولا کاش! میری قوم بھی جان لیتی کہ بخش دیا ہے مجھے میرے رب نے اور شامل کر دیا ہے مجھے باعزت لوگوں میں۔ اور نہ اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس کی شہادت کے بعد کوئی لشکر آسمان سے اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی۔ نہ تھی مگر ایک گرج پس وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے''۔

رَجُلٌ سے مراد حبیب بن مری ہے وہ بڑھئی تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اسکاف (جوتا) بنانے والا تھا۔ ایک قول کیا گیا: وہ دھوبی تھا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور مقاتل نے کہا: وہ حبیب بن اسرائیل نجار تھا وہ بت تراشا کرتا تھا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جبکہ درمیان میں چھ سو سال کا عرصہ ہے جس طرح تبع اکبر ورقہ بن نوفل اور دوسرے لوگ ایمان لائے کوئی فرد کسی نبی پر ایمان نہیں لایا تھا مگر اس وقت جب وہ نبی ظاہر ہو چکا تھا(1)۔

وہب نے کہا: حبیب کو جزام کا مرض تھا اس کا گھر شہر کے دروازوں میں سے آخری دروازے کے پاس تھا وہ ستر سال تک بتوں کی عبادت میں مصروف رہا اور دعا کرتا رہا ممکن ہے وہ بت اس پر رحم کریں اور اس کی تکلیف رفع کر دیں تو بتوں نے اس کی کوئی دعا قبول نہ کی۔ جب قاصدوں نے اسے دیکھا تو اسے اللہ کی طرف دعوت دی تو اس نے پوچھا: کوئی نشانی بھی

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 10

ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم قادر رب کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں تو جو تکلیف تجھے لاحق ہے اللہ تعالیٰ اسے تجھ سے دور کر دے گا پوچھا: وہ ایک دن میں کیسے اس تکلیف کو دور فرما دے گا؟ انہوں نے کہا: ہاں ہمارا رب جو چاہتا ہے اس پر قادر ہے، یہ بت تو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان کر سکتے ہیں۔ وہ ایمان لے آیا۔ انہوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تکلیف کو رفع کر دیا گویا اسے کوئی تکلیف تھی ہی نہیں پھر وہ اپنی کمائی کی طرف متوجہ ہوا جب اس نے شام کی تو اپنی کمائی کو صدقہ کر دیا اس نے نصف اپنے عیال کو کھلایا اور نصف صدقہ کیا۔ جب اس کی قوم نے قاصدوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا: بھیجے گئے افراد کی اتباع کرو۔ قتادہ نے کہا: وہ ایک غار میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا جب اس نے بھیجے گئے افراد کے بارے میں سنا تو وہ دوڑتا ہوا آیا تو اس نے بھیجے گئے افراد سے کہا: تم جو کچھ لائے ہو اس پر اجر بھی طلب کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں ہمارا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ابو عالیہ نے کہا: اسے ان کی صداقت کا یقین ہو گیا اور وہ ان پر ایمان لے آیا اور اپنی قوم کی طرف اس قول کے ساتھ متوجہ ہوا: اے میری قوم! ان بھیجے گئے افراد کی اتباع کرو، ان کی اتباع کرو جو کوئی اجر طلب نہیں کرتے اگر یہ جھوٹے ہوتے تو تم سے اجر طلب کرتے، وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

قتادہ نے کہا: اس کی قوم نے پوچھا: تو ان لوگوں کے دین پر ہے؟ تو جواب دیا: مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے میں اس کی اتباع نہ کروں کیونکہ تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ ان کے خلاف اس کی طرف سے حجت قائم کرنا تھا۔

فطرت کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر نعمت ہے جو شکر اور دوبارہ اٹھائے جانے کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ وہ وعید ہے جو اجر کا تقاضا کرتی ہے گویا نعمت کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا یہ شکر کو زیادہ نمایاں کرنے والا ہے اور دوبارہ اٹھائے جانے کو کافر کی طرف منسوب کرنا شر میں زیادہ بلیغ ہے(1)۔

**اٰلِهَةً** سے مراد بت ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے یعنی جو اسے بیماری لگی ہے تو ان بتوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی اور وہ مجھے آزمائش سے چھٹکارا نہ دلا سکیں گے اور میں ایسا کروں تو میں واضح خسارے میں ہوں گا، میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا تم میرے گواہ بن جاؤ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس نے بھیجے گئے افراد سے خطاب کیا کہ وہ انکے رب پر ایمان لے آیا ہے۔ اور **فَاسْمَعُوْنِ** کا معنی ہے تم میرے ایمان لانے پر گواہ بن جاؤ۔ کعب اور وہب نے کہا: اس نے یہ بات اپنی قوم سے کہی تھی میں تمہارے اس رب پر ایمان لایا ہوں جس کا تم نے انکار کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب اس نے اپنی قوم سے کہا ان بھیجے گئے افراد کی اتباع کرو، تم اس کی پیروی کرو جو تم سے اجر کا سوال نہیں کرتے تو لوگ اسے بادشاہ کے پاس لے گئے اور کہا: تو نے ہمارے دشمنوں کی پیروی کی ہے۔ اس نے ان کے ساتھ گفتگو کو طویل کیا تا کہ اس کے ذریعے بھیجے گئے افراد کے قتل سے انہیں غافل کر دے یہاں تک کہ اس نے کہا: **اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ** تو وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: انہوں نے اسے اپنے پاؤں سے روند ڈالا یہاں تک کہ اس کی انتڑیاں اس کی دبر سے

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 277

نکل آئیں اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا، وہی رس ہے وہ اصحاب رس ہیں (1)۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے: لوگوں نے ان تینوں افراد کو قتل کر دیا۔ سدی نے کہا: انہوں نے اسے پتھر مارے جبکہ وہ کہہ رہا تھا: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے یہاں تک کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا (2)۔ کلبی نے کہا: انہوں نے ایک گڑھا کھودا اور اس میں اسے ڈال دیا اور اس پر مٹی ڈال دی اور وہ مٹی کے نیچے دب کر مر گیا۔

حضرت حسن بصری نے کہا: انہوں نے اسے آگ میں جلا دیا (3) اسے شہر کی فصیل سے لٹکا دیا اس کی قبر انطاکیہ کی دیوار میں ہے؛ یہ ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ قشیری نے کہا: حضرت حسن بصری نے کہا: جب قوم نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کی طرف اٹھا لیا تو وہ جنت میں ہے وہ نہیں مرے گا مگر جب آسمان فناء ہو جائے گا اور جنت ہلاک ہو جائے گی جب اللہ تعالیٰ جنت کو دوبارہ لوٹائے گا تو اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا (4)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے اسے آری کے ساتھ چیر دیا یہاں تک کہ وہ اس کی دو ٹانگوں کے درمیان سے نکلی اللہ کی قسم! اس کی روح نہیں نکلی مگر اسے جنت میں داخل کر دیا گیا اللہ تعالیٰ کا فرمان: قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ کا یہی معنی ہے جب اس نے جنت کا مشاہدہ کیا تو اس نے کہا: ہائے کاش! میری قوم وہ کچھ جان لیتی جو میرے رب نے مجھے بخشا ما فعل کے ساتھ ملکر مصدر کے حکم میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ الذی کے معنی میں ہے ضمیر عائد محذوف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استفہامیہ ہے جو تعجب کے معنی میں ہے گویا کہا: کاش! میری قوم جانتی کہ کس وجہ سے میرے رب نے مجھے بخشا ہے؟ یہ فراء کا قول ہے۔ کسائی نے اس پر اعتراض کیا ہے اس نے کہا: اگر یہ صحیح ہو تو بم کا لفظ کہتا۔ فراء نے کہا کہ ما الف کے ساتھ کہا جائے یہ استفہامیہ ہے اور اس میں کئی اشعار پڑھے۔

زمخشری نے کہا: الف کے بغیر پڑھنا زیادہ اچھا ہے اگرچہ الف کو ثابت رکھنا بھی جائز ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: قد علمت بما صنعت ھذا و بم صنعت۔ مہدوی نے کہا: استفہامیہ کی صورت میں الف کو ثابت رکھنا قلیل ہے اس صورت میں یعلمون پر وقف کیا جائے گا۔

ایک جماعت نے کہا: ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ کا معنی ہے تیرے لیے جنت ثابت ہو گئی۔ یہ خبر ہے تو جنت میں داخل ہو جا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل کر دیا وہ اس میں زندہ ہے اسے رزق دیا جاتا ہے بطور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ جس طرح آل عمران میں پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِيۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ سائل کے سوال کی وجہ سے کلام ذکر کی گئی ہے جو سوال اتنی بڑی کامیابی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جو بخشش اور تکریم کی صورت میں متحقق ہوئی اسے مِنَ مُكۡرَمِيۡنَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس تمنی میں دو قول ہیں:

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 10
2۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 278
3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 344
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 245

(1) اس نے تمنا کی کہ وہ اس کے حال سے آگاہی حاصل کریں تاکہ اس کے حسن انجام اور پسندیدہ عاقبت سے آگہی حاصل کریں (2) اس نے تمنا کی کہ وہ اس کے ایمان کی مثل ایمان لائیں اور اس کی حالت جیسی حالت والے ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس نے اپنی قوم کو زندہ اور مردہ حالت میں نصیحت کی (1)۔ قشیری نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں کہا کہ ''اس نے اپنی زندگی اور موت کے بعد انہیں نصیحت کی''۔

ابن ابی لیلیٰ نے کہا: امتوں کے سابقین تین افراد ہیں (2) انہوں نے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یہ ان میں سے افضل ہیں، آل فرعون کا مومن اور صاحب یٰسٓ یہ صدیق ہیں؛ زمخشری نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں عظیم تنبیہ ہے (3) اور غصہ پی جانے، جہلاء سے حلم کرنے، جو آدمی اپنے آپ کو شریر اور باغیوں کی آبادی میں پھنسا لے اس پر شفقت کرنے، اس کو چھٹکارا دلانے میں کوشش کرنے، اس کا فدیہ دینے میں مہربانی کرنے، اس کے دشمنوں کو خوش کرنے والے عمل سے اور اسے بددعا دینے سے اعراض کرنے کے وجوب پر دلالت موجود ہے کیا تم دیکھتے نہیں اس نے اپنے قاتلوں کے لیے، اس کے لیے ہلاکت چاہنے والوں کے لیے خیر کی تمنا کی جبکہ وہ کافر تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ جب حبیب کو قتل کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے غضبناک ہو گیا اور قوم پر جلد عذاب کو مسلط کر دیا، جبریل امین کو حکم دیا اس نے ان پر ایک چیخ ماری تو وہ سب کے سب مر گئے اللہ تعالیٰ کا فرمان: **وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ۝** کا یہی مفہوم ہے، یعنی ہم نے اس کے قتل کے بعد ان پر کوئی نبی اور رسول مبعوث نہ کیا؛ یہ قتادہ، مجاہد اور حسن کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جند سے مراد لشکر ہیں (4) یعنی ان کو ہلاک کرنے کے لیے لشکروں کو بھیجنے کا محتاج نہیں بلکہ میں انہیں ایک چیخ کے ساتھ ہلاک کر دوں گا؛ یہ حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء نے معنی بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: **وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ** ان کے امر کو حقیر قرار دینا ہے یعنی ہم نے اس کے قتل کے بعد یا آسمان کی طرف اٹھانے کے بعد ایک چیخ کے ساتھ ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم ان کے پہلوؤں پر اسے نازل کرنے والے نہ تھے۔

زمخشری نے کہا: اگر تو یہ کہے: یوم بدر اور یوم خندق کو کیوں لشکر نازل کیے گئے؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا** (الاحزاب: 9) اللہ تعالیٰ کا فرمان: **اَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ۝ بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُسَوِّمِیْنَ۝** (آل عمران)

میں جواب دوں گا: ایک فرشتہ ہی کافی تھا قوم لوط کے شہر حضرت جبریل امین کے ایک پر سے ہلاک کر دیئے گئے (5)، قوم ثمود کے شہر اور قوم صالح کے شہر ایک چیخ سے برباد کر دیئے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء اور اولی العزم رسولوں پر فضیلت دی۔ حبیب نجار کی کیا حیثیت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرامت اور اعزاز کے اسباب عطا فرمائے جیسے

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 11　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 10　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 11
4۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 345　5۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 12

اسباب کسی اور کو عطا نہ فرمائے اسی وجہ سے الله تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسمان سے لشکر نازل فرمائے گویا الله تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا۔۔۔۔ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۞ کیونکہ لشکروں کو نازل کرنا عظیم امور میں سے ہے جن کا تیرے سوا کوئی اہل نہیں اور ہم تیرے سوا کسی اور کے لیے کچھ بھی کرنے والے نہیں۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً عام قراءت واحدۃ نصب کے ساتھ ہے تقدیر کلام یوں ہوگی ماکانت عقوبتهم الاصیحة واحدۃ۔

ابوجعفر بن قعقاع، شیبہ اور اعرج نے صیحةٌ (مرفوع) پڑھا ہے الله تعالیٰ کا فرمان: اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً میں کون کو وقوع اور حدوث کے معنی میں لیا ہے گویا یوں کلام کی: ماوقعت علیهم الاصیحه واحدۃ۔ ابوحاتم اور دوسرے بہت سے نحویوں نے تانیث کے سبب اس قراءت کو ناپسند کیا ہے جبکہ یہ قول ضعیف ہے جس طرح ماقامت إلاهند ضعیف ہے اس کی وجہ یہ ہے معنی ہے ماقام احد الاهند۔ ابوحاتم نے کہا: اگر بات اس طرح ہو جس طرح ابوجعفر نے قراءت کی ہے تو کلام یوں ہوتی ان کان الاصیحة نحاس نے کہا: ان میں سے کوئی شے بھی ممتنع نہیں یہ جملہ کہا جاتا ہے: ماجائتنی إلاجاریتك تو اس معنی میں ہے ماجائتنی إمراة اوجارية إلاجاريتك۔ رفع کی صورت میں قراءت میں تقدیر کلام یوں ہوگی جو ابواسحاق نے کہا ہے کہا: اس کا معنی ہے إن كانت عليهم صيحة إلاصيحة واحدة۔ دوسرے علماء نے اس کی یوں تقدیر کلام ذکر کی ہے ماوقعت عليهم صيحة واحدة۔ کان کا لفظ وقع کے معنی میں کلام عرب میں اکثر واقع ہوتا ہے؛ عبدالرحمن ابن اسود نے اس کی یوں قراءت کی۔ یہ بھی قول کیا جاتا ہے: حضرت عبدالله کی قراءت میں بھی اسی طرح ہے ان كانت الازَقية واحدة یہ مصحف کے مخالف ہے نیز یہ بھی ہے کہ معروف لغت زقا یزقو ہے جس کا معنی ہے چیخنا اس معنی میں ضرب المثل ہے: أثقلُ من الزَّواق۔ اس صورت میں نقية کی جگہ یزقو زقوة کا لفظ ہوگا، یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: جوہری نے کہا الزَقو اور الزَقِی مصدر ہیں قد زقا الصدی یزقو زقاء اس نے چیخ ماری ہر چیخ مارنے والے کو زاق کہتے ہیں اور زَقیة کا معنی چیخ ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے کہا جاتا ہے زَقوة اور زَقیة دو لغتیں ہیں قراءت صحیح ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۞ تو اچانک وہ مردہ تھے۔ انہیں ٹھنڈی راکھ کے ساتھ تشبیہ دی قتادہ نے کہا: خٰمِدُوْنَ کا معنی ہلاک ہونے والے ہیں۔ معنی سب کا ایک ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۞ وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۞

''صد افسوس ان بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگ گئے۔ کیا

انہیں علم نہیں کہ کتنی امتوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا اور وہ آج تک ان کی طرف لوٹ کر نہ آئے۔ اور ان سب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا''۔

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ، حسرۃ منصوب ہے کیونکہ نکرہ کو ندا کی جارہی ہے۔ بصریوں کے نزدیک نصب کے علاوہ کوئی صورت جائز نہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں یاحسرۃ العباد یعنی حسرۃ کا لفظ مضاف ہے(1)۔ لغت میں حسرت کا معنی یہ ہے کہ انسان کو شرمندگی لاحق ہو جس کی وجہ سے یہ حسیر یعنی افسوس کرنے والا ہو جائے۔ فراء نے کہا: پسندیدہ قراءت نصب ہے۔ اگر نکرہ کو رفع دیا جائے جو صلہ کے ساتھ ملا ہوا ہو تو یہ بھی صورت درست ہے اور چند چیزوں سے دلیل قائم کی ہے ان میں سے یہ ہے کہ انہوں نے عربوں سے سنا یامُهْتَمُّ بأمرنا لاتهتم اور یہ مصرعہ پڑھا:

یا دارُ غَيَّرَها البِلیٰ تَغْيِيرَا

اے گھر! جسے بوسیدگی نے تبدیل کر دیا۔

نحاس نے کہا: اس میں تو نداء کے تمام احکام یا اکثر احکام کا ابطال ہے کیونکہ وہ خالص نکرہ کو رفع دیتا ہے اور اسے جو اپنی طوالت میں مضاف کے قائم مقام ہوتا ہے اس کو رفع دیتا ہے اور تنوین کے حذف کے ساتھ رفع دیتا ہے جبکہ وہ متوسط ہو اور اسے رفع دیتا ہے جو معنی میں مفعول ہو جبکہ ایسی علت نہ ہو جو اسے واجب کرے۔

عربوں سے جو کچھ اس نے حکایت بیان کی ہے وہ تو اس کے مشابہ نہیں جس کو اس نے جائز قرار دیا ہے کیونکہ یامُهْتَمُّ بأمرنا لاتهتم کی تقدیر تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے معنی ہے یاایها المُهْتَمَّ لاتهتم بأمرنا اس مصرعہ کی تقدیر کلام یوں ہے یا ایتها الدار پھر خطاب کو تبدیل کیا اور کہا: اے لوگو! اس گھر کو بوسیدگی نے بدل دیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ (یونس: 22) حسرۃ کا لفظ ندا کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح تو کہتا ہے: یا رجلاً اقبل۔ ندا کا مطلب یہ ہوگا یہ حسرت کے حاضر ہونے کی جگہ ہے۔ طبری نے کہا: معنی ہے بندوں کی اپنی ذاتوں پر حسرت اور شرمندگی ہے کہ وہ اللہ کے رسولوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے ہائے بندوں پر ہلاکت۔ ان سے یہ بھی قول مروی ہے: یہ لوگ اس جگہ واقع ہوتے ہیں جن پر حسرت کی جاتی ہے۔

ربیع نے انس سے وہ ابو العالیہ سے روایت نقل کرتے ہیں: یہاں عباد سے مراد رسول ہیں اس کی وجہ ہے کفار نے جب عذاب کو دیکھا تو انہوں نے کہا: یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ تو انہوں نے قتل کرنے، ایمان کو ترک کرنے پر حسرت کا اظہار کیا انہوں نے اس وقت ایمان کی تمنا کی جب ایمان انہیں کوئی نفع نہ دے سکتا تھا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: جب کفار نے رسولوں کو جھٹلایا تو فرشتوں نے کفار پر حسرت کی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ اس آدمی کا قول تھا جو شہر کے دور دراز حصہ سے دوڑتا ہوا آیا تھا جب قوم کے لوگ اسے قتل کرنے کے لیے جھپٹ پڑے تھے۔

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 13

ایک قول یہ کیا گیا کہ ان تین افراد نے یہ بات کہی تھی جب قوم نے اس آدمی کو قتل کر دیا تھا اور بھیجے گئے افراد ان سے جدا ہو گئے تھے یا انہوں نے تین بھیجے گئے افراد کے ساتھ اس آدمی کو بھی قتل کر دیا جس طرح روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے: ہائے ان بھیجے گئے افراد پر افسوس! اس آدمی پر افسوس کاش! ہم ان پر اس وقت ایمان لاتے جس وقت ایمان انہیں نفع دیتا۔ اس کے بارے میں گفتگو مکمل ہو چکی ہے پھر نئے سرے سے گفتگو شروع کی فرمایا: مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ۔

ابن یزید، مسلم بن جندب اور عکرمہ نے یاحسرۃ علی العباد پڑھا ہاء کو ساکن پڑھا ہے مقصود بیان پر حرص دلانا اور نفس میں معنی کو پختہ کرنا ہے کیونکہ موقع وعظ و نصیحت کا تھا عرب اس موقع پر اس قسم کا عمل کرتے ہیں اگرچہ وقف کا موقع نہ بھی ہو اس معنی میں وہ روایت بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک حرف (1) قراءت کرتے مقصود بیان اور سمجھانے پر حرص دلانا تھا گویا حسرۃ پر وقف کو مقدر کیا اور ھاء کو کسرہ دیا پھر کہا: علی العباد یعنی میں بندوں پر حسرت کرتا ہوں۔

حضرت ابن عباس، ضحاک اور دوسرے علماء سے یہ مروی ہے یاحسرۃ العباد میں حسرۃ کا لفظ مضاف ہے اور علی کا لفظ محذوف ہے۔ یہ مصحف کے خلاف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہو تو العباد اس کا فاعل ہوگا گویا جب انہوں نے عذاب کا مشاہدہ کیا تو انہوں نے حسرت کا اظہار کیا تو یہ کلام تیرے اس قول کی طرح ہوگی: یا قیام زید۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول کی طرف مضاف ہونے سے تعلق رکھتی ہو اس صورت میں عباد کا لفظ مفعول ہوگا گویا بندوں پر وہ حسرت کا اظہار کرتا ہے جو ان پر شفقت کرتا ہے، جس نے یاحسرۃ علی العباد کی قراءت کی ہے وہ اس معنی کو قوت بخشتی ہے۔ سیبویہ نے کہا أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ میں ان، کم أهلكنا سے بدل ہے یہاں کم خبر یہ ہے اس وجہ سے اس سے اس چیز کو بدل بنانا جائز ہے جو استفہام نہ ہو معنی اس کا یہ بن جائے گا: کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جن قوموں کو ہم نے ہلاک کیا ہے وہ ان کی طرف لوٹنے والے نہیں۔

فراء نے کہا: کم دو وجہ سے محل نصب میں ہے: (1) یروا کی وجہ سے، اس پر دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات سے پیش کی ہے وہ قراءت اس طرح ہے الم یروا من اھلکنا (2) أَهْلَكْنَا کی وجہ سے کم منصوب ہے۔

نحاس نے کہا: پہلا قول محال ہے کیونکہ کم میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا کیونکہ یہ استفہامیہ ہے اور یہ بات محال ہے کہ استفہام ماقبل کی خبر پر داخل ہو جب یہ خبر یہ ہو تو اس وقت بھی اس کی صورت حال یہی ہوگی اگرچہ سیبویہ نے ان میں سے بعض چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور انھم کو کم سے بدل بنایا ہے۔ محمد بن زید نے اس کا شدید ترین رد کیا ہے اور کہا کم اھلکنا کی وجہ سے منصوب ہے اور انھم محل نصب میں ہے اس کے نزدیک معنی یہ ہوگا: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے قبل کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں من اھلکنا ہے۔

حضرت حسن بصری نے اسے إنھم الیھم لا یرجعون پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے (2)، یہ آیت اس آدمی کا رد ہے جو

---

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء کیف کانت قراءۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 2847، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر الکشاف، جلد 5، صفحہ 14

یہ گمان کرتا ہے کہ مخلوقات میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جو موت کے بعد قیامت سے پہلے لوٹیں گیں۔

وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ سے مراد یوم قیامت ہے، جزا کے لیے انہیں حاضر کیا جائے گا۔ ابن عامر، عاصم، اور حمزہ نے لَمَّا پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے لما پڑھا ہے۔ انْ مثقلہ سے مخففہ ہے اس کا مابعد مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اس کا مابعد خبر ہے جب اس کا لفظ بدل گیا تو اس کا عمل باطل ہو گیا اس کی خبر پر لام کا داخل کرنا لازم ہے تا کہ ان تاکید یہ اور ان نافیہ کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ ابو عبیدہ کے نزدیک ما زائدہ ہے اس کے نزدیک تقدیر کلام یوں ہوگی وان کل لجمیع۔ فراء نے کہا: جس نے اسے مشدد پڑھا ہے اس نے لما کو الا کے معنی میں بنایا ہے اور ان، ما کے معنی میں ہے جس طرح یہ قول ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ (المومنون: 25) وہ نہیں مگر ایسا آدمی جس کو جنون ہے۔ سیبویہ نے سألتك بالله لما فعلت میں حکایت بیان کی ہے۔ کسائی نے کہا: یہ معروف نہیں۔ یہی بحث سورۂ ہود میں گذر چکی ہے۔ حضرت ابی کی قراءت میں وان منہم الا جمیع لدینا محضرون ہے۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖۚ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور ایک نشانی ان کے لیے یہ مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتے ہیں اور ہم نے اگائے اس میں باغات کھجور اور انگوروں کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے تا کہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے اور نہیں بنایا اس کو ان کے ہاتھوں نے کیا وہ ان نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے۔ ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفسوں کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جنہیں وہ ابھی نہیں جانتے"۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے انہیں مردوں کے زندہ کرنے پر متنبہ کیا اور ان کے سامنے اپنی توحید اور کمال قدرت کا ذکر کیا یہ مردہ زمین ہے جسے نباتات اور نباتات سے دانہ نکالنے کے ساتھ اسے زندہ کیا اس دانہ سے تم غذا حاصل کرتے ہو اہل مدینہ نے المیتۃ کے لفظ کو مشدد پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مخفف پڑھا ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ اور ہم نے اس زمین میں باغات بنائے کھجور اور انگوروں کا خصوصی طور پر ذکر کیا کیونکہ یہ دونوں اعلیٰ قسم کے پھل ہیں ان باغات میں ہم نے چشمے جاری کر دیئے ثمرہ میں جو ضمیر ہے وہ عیون کے پانی کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ پھل اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جرجانی، مہدوی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جن کا ہم نے ذکر کیا وہ اس کے پھل کھائیں جس طرح ارشاد فرمایا: وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ (النحل: 66) حمزہ اور کسائی نے اسے من ثمرہ پڑھا ہے

جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ اعمش نے یہ لفظ ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بارے میں گفتگو الانعام میں گزر چکی ہے۔

وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ میں ما کا لفظ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف من ثمرہ پر ہے یعنی مما عملتہ ایدیھم کوفیون نے اسے هاء کے بغیر پڑھا ہے باقی قراء نے اپنے اصل پر حذف کے بغیر پڑھا ہے۔ کلام میں ضمیر عائد کا حذف اکثر ہوتا ہے کیونکہ اسم طویل ہوتا ہے (کیونکہ اسم موصول صلہ کے ساتھ ملکر ایک اسم کے حکم میں ہوتا ہے) یہ بھی جائز ہے کہ ما نافیہ ہو اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو اسے صلہ اور ضمیر عائد کی کوئی ضرورت نہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اگائی ہے وہ ان کے ہاتھوں کے پیدا کردہ نہیں؛ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور مقاتل کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کا معنی ہے ان پھلوں میں سے جو ان کے ہاتھوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں اور میٹھی اور کھانے کی مختلف اقسام میں سے اور وہ چیزیں جو کسی خاص طریقہ سے دانوں سے بناتے ہو جس طرح روٹی اور تیل جو تلوں اور زیتون سے نکالا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس طرف راجع ہے جسے لوگ کھاتے ہیں، یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہا اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ۝ کا مفعول نعمہ ہے کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجا نہیں لاتے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ اللہ تعالیٰ نے کفار کے قول سے اپنی پاکی بیان کی ہے کیونکہ کفار نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کے آثار کو دیکھنے کے بعد غیر اللہ کی عبادت کی۔ اس کلام میں فعل امر کی تقدیر ہے مراد یہ ہے سبحوہ ونزھوہ عمالایلیق بہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تعجب کا معنی ہے یعنی ان کافروں کے کفر پر تعجب ہے جو ان آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اس کا انکار کرتے ہیں۔ جو کسی چیز پر تعجب کا اظہار کرتا ہے تو وہ سبحان اللہ کہتا ہے۔ ازواج کا معنی انواع واصناف ہیں ہر زوج صنف ہوا کرتا ہے کیونکہ وہ رنگ، ذائقہ، شکل، چھوٹے بڑے ہونے میں مختلف ہوتے ہیں ان کا اختلاف ہی ان کا ازدواج ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد مذکر اور مؤنث ہے۔

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ سے مراد نباتات ہیں کیونکہ اس کی اقسام ہوتی ہیں وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ سے مراد ایسی اولاد ہے جو جوڑے جوڑے ہیں ان میں سے مذکر اور مؤنث ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے خشکی، سمندر، آسمان اور زمین میں ایسی مخلوقات میں سے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے پیدا فرماتا ہے اسے کوئی انسان نہ جانتا ہو اور فرشتے اسے جانتے ہوں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس مخلوق کو کوئی دوسری مخلوق نہ جانتی ہو۔ اس آیت میں استدلال کی صورت یہ ہے کہ جب وہ پیدا کرنے میں منفرد ہے تو مناسب نہیں کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَ الشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝

''اور دوسری نشانی ان کے لیے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو یوں وہ یکلخت اندھیرے میں رہ جاتے ہیں، یہ آفتاب ہے جو چلتا رہتا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف، یہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اس خدا کا جو عزیز

(اور) حلیم ہے''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی قدرت اور اس کی اہمیت کے ثبوت پر علامت ہے سلخ کا معنی اتارنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سلخه الله من دينه اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دین سے الگ کر دیا پھر یہ نکالنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے روشنی جانے اور تاریکی کے آنے کو، کسی شے سے چمڑے کو اتارنے اور جسم کے ظاہر ہونے کی طرح ہے پس یہ اشارہ ہے مُّظْلِمُوْنَ۝ وہ تاریکی میں داخل ہونے والے ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: اظلمنا ہم رات کی تاریکی میں داخل ہوتے ہیں أظھرنا ہم ظہر کے وقت میں ہوتے ہیں اسی طرح أصبحنا، أضحينا اور أمسينا ہے، یعنی ہم صبح کے وقت، چاشت کے وقت اور شام کے وقت میں داخل ہوئے۔

ایک قول یہ کیا گیا منه، عنه کے معنی میں ہے اس کا معنی ہے ہم نے اس سے دن کی روشنی کو الگ کر دیا تو اچانک وہ تاریکی میں تھے کیونکہ دن کا نور ہوا میں داخل ہوتا ہے تو وہ روشن ہو جاتا ہے جب وہ ہوا سے نکل جاتا ہے تو وہ تاریک ہو جاتا ہے (1)۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا یہ جائز ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو آية لهم الشمس۔ یہ بھی جائز ہے کہ الشمس اس فعل کی وجہ سے مرفوع ہو جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ الشمس مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ تَجْرِیْ خبر ہے جو جارية کے معنی میں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کے بارے میں سوال کیا۔ فرمایا: ''اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے (2)'' اس بارے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ سورج کہاں جاتا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''یہ سورج چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہ عرش کے نیچے اپنے سفر کی انتہا کرتا ہے پھر وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے وہ اسی طرح رہتا ہے یہاں تک کہ اسے کہا جاتا ہے: تو اٹھ اور جہاں سے تو آیا ہے اس کی طرف واپس لوٹ جا تو وہ صبح کے وقت اپنے مطلع سے طلوع کرتا ہے، پھر وہ چلتا رہتا ہے لوگ اس سے کوئی عجیب چیز نہیں دیکھتے یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے اس ٹھکانے تک جا پہنچتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے: اٹھ تو مغرب سے کل صبح طلوع کر تو وہ مغرب سے طلوع کرے گا''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ کب ہوگا؟ یہ اس وقت ہوگا جس وقت کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا اس نے اپنے ایمان میں کوئی خیر کا عمل نہ کیا تھا''۔

بخاری شریف کے الفاظ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہیں (3) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اس وقت کہا جب سورج غروب ہوا: ''کیا تو جانتا ہے سورج کہاں جاتا ہے؟'' میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا: ''یہ جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے وہ اجازت طلب کرتا ہے تو اسے اجازت دی جاتی ہے ممکن ہے وہ سجدہ کرے تو اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے وہ اجازت طلب کرے تو اسے اجازت نہ دی جائے اسے کہا جائے: جہاں

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 280 2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 542 3۔ صحیح بخاری، سورۂ یٰسین، جلد 2، صفحہ 709

سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جا تو وہ مغرب کی جانب سے طلوع کرے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾ کا یہی مفہوم ہے۔

ترمذی شریف کے الفاظ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہیں (1): جب سورج غروب ہو گیا تو میں مسجد میں داخل ہوا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے ابوذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے؟'' میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا: ''یہ جاتا ہے سجدہ کی اجازت مانگتا ہے تو اسے اجازت دی جاتی ہے گویا اسے کہا جاتا ہے جہاں سے آیا ہے وہاں سے طلوع ہو تو وہ مغرب سے طلوع کرتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلاوت کی''۔ ذالك مستقرها کہا: یہ حضرت عبداللہ کی قراءت ہے۔ امام ترمذی حضرت ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

عکرمہ نے کہا: سورج جب غروب ہوتا ہے وہ عرش کے نیچے ایک محراب میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے یہاں تک کہ وہ صبح کرتا ہے جب وہ صبح کرتا ہے تو باہر آنے سے اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے فرماتا ہے: کس لیے؟ سورج عرض کرتا ہے: جب میں نکلوں گا تو تیرے سوا میری عبادت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: نکل اس وجہ سے تجھ پر کوئی قدغن نہیں میں ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی طرف جہنم بھیجوں گا وہ اسے کھینچتے ہوئے لائیں گے یہاں تک کہ فرشتے ان سب کو جہنم میں داخل کریں گے''۔ کلبی اور دوسرے لوگوں نے کہا: اس کا معنی وہ غروب میں بعید ترین منزل کی طرف چلے گا پھر وہ قریب ترین منزل کی طرف لوٹے گا اس کا ٹھکانہ اس کا اس جگہ تک پہنچنا ہے جہاں سے وہ آگے نہیں جاتا بلکہ اس جگہ سے لوٹ آتا ہے جس طرح ایک انسان ہے وہ مسافت طے کرتا ہے یہاں تک کہ آخری منزل تک پہنچتا ہے اور اپنا کام مکمل کرتا ہے پھر اس پہلی منزل کی طرف لوٹ آتا ہے جہاں سے اس نے اس سفر کا آغاز کیا تھا سورج کا اپنی آخری منزل تک پہنچنا جبکہ وہ اس کا مستقر ہے جب وہ ہنعہ (جیسے تئیس 23 جون) کو طلوع ہوتا ہے یہ سال کا سب سے لمبا دن ہوتا ہے اور اس کی رات سب سے چھوٹی ہوتی ہے دن پندرہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات نو گھنٹے کی ہوتی ہے پھر دن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور سورج لوٹ آتا ہے جب ثریا طلوع کرتا ہے تو رات اور دن برابر ہو جاتے ہیں تو رات اور دن میں سے ہر ایک بارہ بارہ گھنٹے کے ہو جاتے ہیں پھر وہ قریبی منزل تک پہنچ جاتا ہے اور نعائمہ (تئیس 23 دسمبر) کو طلوع ہوتا ہے۔ یہ سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے اور رات پندرہ گھنٹے کی ہوتی ہے یہاں تک کہ فرغ دلو موخر (تئیس 23 مارچ) کو طلوع کرتا ہے تو رات اور دن برابر ہو جاتے ہیں ہر رات دن سے ہر روز گھنٹے کا تیسواں حصہ لیتی ہے ہر دس دن گھنٹے کا ایک تہائی لیتے ہیں اور ہر ماہ ایک گھنٹہ لیتا ہے یہاں تک کہ رات اور دن برابر ہو جاتے ہیں اور رات حصہ لیتی رہتی ہے یہاں تک کہ پندرہ گھنٹے کی ہو جاتی ہے اور دن بھی رات سے اسی طرح حصہ لیتا رہتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سورج کے سال میں تین سو ساٹھ مطلع ہوتے ہیں ہر روز ایک مطلع میں نزول کرتا ہے پھر ایک سال تک اس میں نزول نہیں کرتا وہ انہیں منازل میں گردش کرتا رہتا ہے (2) یہی

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، فی سورۂ یٰسین، جلد 2، صفحہ 155۔ ایضاً، حدیث نمبر 3151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 345

اس کا مستقر ہے یہ معنی میں اس جیسا ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: جب سورج غروب ہوتا ہے اور اس جگہ تک جا پہنچتا ہے جس سے آگے تجاوز نہیں کرتا تو وہ طلوع ہونے تک اس کے نیچے قرار پر رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو کہا ہے وہ تمام اقوال کو جامع ہے اس میں غور کرو۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یوں قراءت کی والشمس تجری لمستقر لها کہ وہ رات اور دن میں جاری رہتا ہے اس میں نہ ٹھہراؤ ہے نہ ہی قرار ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت کے روز اسے گرا دے گا۔ جس نے مصحف کی مخالفت کی اس نے کہا: میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت کو پڑھتا ہوں۔ ابن انباری نے کہا: جس نے یہ قول نقل کیا ہے وہ باطل ہے اس پر اسے لوٹا دیا جائے گا، کیونکہ ابوعمر نے مجاہد سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابن کثیر نے مجاہد سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا یہ دونوں سندیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی گئی ہیں جن کی صحت پر اجماع گواہی دیتا ہے اور جو ضعیف سند کے ساتھ جماعت اور امت کے متفق علیہ مذہب کی مخالفت کرتا ہے یہ دونوں سندیں اس کو باطل کر دیتی ہیں۔

میں کہتا ہوں: وہ ثابت شدہ احادیث جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کے قول کو رد کر دیتی ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے وہ اللہ پر کتنا جری ہے۔

قول لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا میں لام، الی کے معنی میں ہے۔ مستقر سے مراد قرار کی جگہ ہے یعنی رات، دن اور سورج کا جو مقام ذکر کیا گیا ہے یہ عزیز و علیم و تقدیر ہے۔

## وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝۳۹

''اور ذرا چاند کو دیکھ ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لیے منزلیں آخر کار ہو جاتا ہے کھجور کی بوسیدہ شاخ کی مانند''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالْقَمَرَ اس کی تقدیر کلام یوں ہے وآیة لهم القمر۔ یہ بھی جائز ہے کہ القمر مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو کوفیوں نے اسے والقمر منصوب پڑھا ہے کیونکہ فعل مضمر ہے؛ یہ ابوعبیدہ کا پسندیدہ مسلک ہے، اس نے کہا: اس سے قبل نسلخ فعل ہے اور اس کے بعد قدرنا فعل ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میرا جہاں تک علم ہے تمام عربی اس قول کی مخالفت کرتے ہیں جو ابوعبیدہ نے کیا۔ ان میں سے ایک فراء ہے اس نے کہا: رفع مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے ان کے نزدیک رفع زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ اس کا ماقبل پر عطف ہے اس سے مراد وآیة لهم القمر ہے اس کا قول اس سے پہلے نسلخ فعل ہے اس سے قبل جو فعل زیادہ قریبی ہے وہ تجری ہے اور اس سے قبل والشمس رفع کے ساتھ ہے اس نے اس کے بعد جس فعل کا ذکر کیا ہے وہ قدرناہ ہے وہ هاء میں عامل ہے۔ ابو حاتم نے کہا: اس میں رفع بہتر ہے کیونکہ تو نے ضمیر کی وجہ سے فعل کو اس سے غافل کر دیا ہے تو تو اسے رفع دے گا۔ یہ قول کیا جاتا ہے: چاند کی منازل نہیں ہوتیں تو پھر کیسے ارشاد فرمایا: قَدَّرْنٰهُ

مَنَازِلَ اس بارے میں دو جواب ہیں: (1) اس سے مراد ہے ہم نے اسے منازل والا بنادیا ہے جس طرح وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) سے مراد اھل قریة ہے (2) اصل کلام یوں تھا قدرنالہ منازل پھر لام کو حذف کردیا گیا اس کا حذف بہت اچھا ہے تا کہ فعل دو مفعولوں کی طرف واسطہ کے بغیر متعدی ہو جس طرح اس ارشاد میں ہے: وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا (الاعراف: 155) منازل اٹھائیس ہیں۔ چاند ہر روز ایک منزل میں اترتا ہے وہ شرطان، بطین، ثریا، دبران، ہقعہ، ہنعہ، ذراع، نثرہ، طرف، جبہہ، خراتان، صرفہ، عواء، سماک، غفر، زبانیان، اکلیل، قلب، شولہ، نعائم، بلدہ، سعد الذابح، سعد بلع، سعد السعود، سعد الاخبیہ، الفرغ المقدم، الفرغ الموخر اور بطن الحوت (1)۔

جب چاند اس آخری منزل میں پہنچتا ہے تو پھر پہلے کی طرف لوٹ آتا ہے وہ فلک کو اٹھائیس راتوں میں طے کرتا ہے پھر چھپ جاتا ہے پھر ہلال کی صورت میں طلوع کرتا ہے اور فلک طے کرنے میں منازل کی طرف لوٹ آتا ہے یہ بروج پر منقسم ہے ہر برج دو منزلیں اور ایک تہائی ہے حمل کے لیے شرطان، بطین اور ثریا ایک تہائی ہے، ثور کے لیے ثریا کے دو ثلث اور دبران اور ہقعہ کے دو تہائی ہیں ہر باقی کے لیے بھی یہی صورتحال ہے۔ سورۂ حجر میں بروج کے ناموں کا ذکر ہو چکا ہے۔ الحمد اللہ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو آگ سے پیدا کیا ہے پھر طلوع کے وقت انہیں نور کا لباس عطا کیا جہاں تک سورج کے نور کا تعلق ہے تو وہ عرش کے نور سے ہے جہاں تک چاند کے نور کا تعلق ہے تو وہ کرسی کا نور ہے وہ ان کی پیدائش کی اصل اور یہ ان کا لباس ہے جہاں تک سورج کا تعلق ہے تو اس کے لباس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تا کہ وہ شعاع والا اور روشن ہوتا رہے جہاں تک چاند کا تعلق ہے روح الامین نے اپنے پروں کو اس کے چہرہ پر پھیرا تو اس کی روشنی کو پروں کے غلبہ سے مٹادیا کیونکہ وہ روح ہیں اور روح اس کی سلطان ہے جو تمام اشیاء پر غالب ہے اس کا محو باقی رہا جیسا اسے مخلوق دیکھتی ہے پھر اسے پانی کے غلاف میں رکھ دیا پھر اس کے لیے گذرگاہ بنائی ہر رات مخلوق کے لیے اس غلاف سے اس قدر چاند ظاہر ہوتا ہے جس قدر وہ ان کے لیے ظاہر ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کا ظہور ان کے لیے مکمل ہو جاتا ہے اور مخلوق اس چاند کو مکمل اور پورا گول دیکھتی ہے پھر ہر رات اس میں سے کچھ حصہ اس غلاف کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اسی مقدار سے دکھائی دینے میں کم ہوتا جاتا ہے جس قدر ظاہر ہونے میں ظاہر ہوا تھا اور اسی جانب سے نقصان میں کمی شروع ہو جاتی ہے جس جانب سورج اسے نہیں دیکھتا وہ اس کی غروب کی جانب ہے یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتی ہے وہ قوس وار ٹہنی ہے اس کی وجہ اس کا خشک ہونا اور باریک ہونا ہے۔ اسے قمر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی سفیدی کی وجہ سے فضا کو سفید کردیتا ہے یہاں تک کہ وہ چھپ جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ زجاج نے کہا: یہ کھجور کی ایسی شاخ ہے جس پر چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ہوں (2) یہ انعراج سے فعلون کا وزن ہے انعراج کا معنی مڑ جانا ہے یعنی وہ اپنی منازل میں چلتا ہے جب وہ آخری منزل میں پہنچتا ہے تو وہ باریک ہو جاتا ہے،

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 16 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 17

قوس دار ہو جاتا ہے اور تنگ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کھجور کی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر نون زائدہ ہے۔ قتادہ نے کہا: عرجون سے مراد کھجور کی خشک مڑی ہوئی شاخ ہے۔ ثعلب نے کہا العرجون سے مراد کھجور کا گچھا جب کاٹا جائے تو جو باقی رہ جائے وہ عرجون ہے القدیم سے مراد بوسیدہ ہے۔ خلیل نے کہا: عرجون سے مراد شاخ کی جڑ ہے یہ زرد رنگ کی چوڑی ہوتی ہے جب چاند ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو اسے اس شاخ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ جوہری نے کہا: عرجون سے مراد شاخ کی جڑ ہے جس کی چھوٹی شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں تو وہ کھجور کے درخت پر ہی باقی رہتی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: عَرْجَنَه اسے شاخ کے ساتھ مارا ان لوگوں کے قول کے مطابق نون اصلیہ ہے اسی معنی میں اعشیٰ بن قیس کا شعر ہے:

شرق المسك والعبير بها فهي صفراء كعرجون القمر

کستوری اور عبیر اس پر چمک اٹھی وہ زرد ہے جس طرح چاند جب شاخ کی طرح ٹیڑھا ہوتا ہے

کھجور کی شاخ جب خشک اور قوس دار ہو جاتی ہے تو چاند کی باریکی اور زردی میں اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ اسے اہان، کباسہ اور قنو بھی کہتے ہیں، اہل مصر اسے اسباطہ کہتے ہیں۔ اسے عِرجون بھی پڑھتے ہیں(1) یہ فِعلون کا وزن ہے یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح بُزیون اور بِزیون۔ زمخشری نے یہ ذکر کیا ہے اور کہا: عرجون کھجور کی شاخ کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو کھجور اور اس کے پتوں کے درمیان ہوتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھ سال چار موسموں پر منقسم ہے ہر موسم کی سات منازل ہیں پہلا موسم بہار ہے اس کا آغاز آذار (مارچ) کی پندرہ تاریخ سے ہوتا ہے اس کے دنوں کی تعداد بانوے (92) ہے اس موسم میں سورج تین برج حمل، ثور، اور جوزاء اور سات منازل شرطان، بطین، ثریا، دبران، ہقعہ، ہنعہ اور ذراع کو عبور کرتا ہے پھر موسم گرما حزیران (جون) کی پندرہ تاریخ کو داخل ہو جاتا ہے اس کے دنوں کی تعداد بانوے (92) ہے اس موسم میں سورج تین برجوں شرطان، اسد اور سنبلہ اور سات منازل کو طے کرتا ہے وہ سات منازل نثرہ، طرف، جبہہ، خراتان، صدفہ، عواء اور سماک ہیں، پھر ایلول (ستمبر) کی پندرہ تاریخ کو موسم خزاں داخل ہو جاتا ہے اس کے دنوں کی تعداد اکانوے (91) ہے اس موسم میں سورج تین برجون یعنی میزان، عقرب اور قوس اور سات منازل یعنی غفر، زبان، اکلیل، قلب، شولہ، نعائم اور بلدہ کو طے کرتا ہے کانون اوّل (دسمبر) کی پندرہ تاریخ کو موسم سرما داخل ہو جاتا ہے اس کے دنوں کی تعداد نوے ہے بعض اوقات اس کے دنوں کی تعداد اکانوے ہوتی ہے اس موسم میں سورج تین برجون یعنی جدی، دلو اور حوت کو طے کرتا ہے اور سات منازل کو طے کرتا ہے سعد الذابح، سعد بلع، سعد سعود، سعد اخبیہ، فرغ مقدم، فرغ موخر اور بطن حوت۔ یہ سریانیوں کی مہینوں کی تقسیم ہے تشرین الاول (اکتوبر) تشرین الثانی (نومبر) کانون الاول (دسمبر) کانون الثانی (جنوری) اشباط (فروری) آذار (مارچ) نیسان (اپریل) ایار (مئی) حزیران (جون) تموز (جولائی) آب (اگست) ایلول (ستمبر) سب اکتیس دن کے ہوتے ہیں مگر تشرین ثانی (نومبر) نیسان (اپریل) حزیران (جون) اور ایلول (ستمبر) یہ تیس دن کے ہوتے ہیں اشباط (فروری)

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 17

اٹھائیس مکمل اور 1/4 دن کا ہوتا ہے اس سے ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کرے اللہ تعالیٰ کا فرمان وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ کا یہی مفہوم ہے جب سورج ایک منزل میں ہوتا ہے تو ہلال اس کے بعد والی منزل میں پڑاؤ کرتا ہے اور فجر دو منزلیں اس سے پہلے ہوتی ہیں جب سورج اپریل کی پچیس تاریخ کو ثریا میں ہوتا ہے تو فجر شرطین میں ہوتی ہے اور چاند دبران میں پڑاؤ کرتا ہے پھر ہر رات میں اس کی ایک منزل ہوتی ہے یہاں تک کہ اٹھائیس راتوں میں وہ اٹھائیس منزلیں طے کرتا ہے سورج نے دو منزلیں طے کی ہوتی ہیں تو چاند ان دونوں کو طے کرتا ہے پھر وہ سورج کی منزل کی بعد والی میں طلوع کرتا ہے یہی عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ زمخشری نے قدیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: جب وہ شاخ پرانی ہو جاتی ہے تو وہ باریک ٹیڑھی اور زرد ہو جاتی ہے چاند کو اس کے ساتھ تین وجوہ سے تشبیہ دی جاتی ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس چیز کی صفت قدیم کے لفظ کے ساتھ بیان کی گئی ہو اس کا کم سے کم عرصہ سال ہوتا ہے اگر کوئی آدمی کہے: کل مملوك لى قديم فهو حر یا اس نے اپنی وصیت میں یہ قول کیا ہو تو جو غلام ایک سال یا اس سے زیادہ اس کی ملک میں رہا ہو تو وہ آزاد ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں: چاند پر جو احکام مرتب ہوتے ہیں ان کا ذکر سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے الحمد اللہ۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

''نہ سورج کی یہ مجال کہ پیچھے سے چاند کو آ پکڑے اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ دن سے آگے نکل جائے اور سب سیارے اپنے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں''۔

لفظ الشَّمْسُ کو رفع دیا گیا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور لا معرفہ میں عمل نہیں کرتا۔ علماء نے اس آیت کے معنی میں گفتگو کی ہے بعض نے کہا: اس کا معنی سورج چاند کو نہیں پا سکتا کہ اس کی حقیقت اور افادیت کو باطل کر دے ہر ایک کی اپنے دائرہ کار میں حاکمیت ہے ان میں سے کوئی ایک بھی دائرے پر اس طرح داخل نہیں ہو سکتا کہ اس کی حکومت کو ختم کر دے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں جو تدبیر فرمائی ہے اس کو باطل کر دے تو سورج اس کے مغرب سے طلوع ہو جائے جس طرح اس کی وضاحت سورۃ الانعام میں گذر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب سورج طلوع ہوتا ہے تو چاند کی روشنی نہیں ہوتی اور جب چاند طلوع ہوتا ہے تو سورج کی روشنی نہیں ہوتی (2)؛ یہ معنی حضرت ابن عباس اور ضحاک سے مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: ایک روشنی دوسرے کی روشنی جیسی نہیں ہوتی (3)۔ قتادہ نے کہا: ہر ایک کی حد اور نشانی ہے نہ وہ اس سے تجاوز کرتا ہے اور نہ اس سے پہلے ہی رک جاتا ہے جب ایک کی حکومت آتی ہے تو دوسرے کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: یہ دونوں آسمان میں جمع نہیں ہوتے خصوصاً چاند کی رات جمع نہیں ہوتے یعنی سورج باقی نہیں

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 17 2۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 12 3۔ ایضاً

رہتا یہاں تک کہ چاند طلوع ہوتا ہے لیکن جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو چاند طلوع ہو جاتا ہے (1)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: معنی ہے چودھویں رات کی چاند خاص کر سورج چاند کو نہیں پاتا کیونکہ چاند سورج کے طلوع ہونے سے قبل غروب ہونے میں جلدی کرتا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جب وہ آسمان میں جمع ہوتے ہیں وہ منازل میں ایک دوسرے سے آگے ہوتے ہیں دونوں ان میں شریک نہیں ہوتے (3)، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے: چاند آسمان دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان میں ہے سورج اس کو نہیں پا سکتا؛ یہ نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس کے معنی میں جو سب سے اچھا اور واضح قول کیا گیا ہے جس کا رد نہیں کیا جا سکتا کہ چاند کی رفتار تیز ہے سورج چال میں چاند کو نہیں پا سکتا؛ یہ مہدوی نے بھی ذکر کیا ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ﴿۹﴾ (القیامہ) یہ اس وقت ہوگا جب سورج کو طلوع ہونے سے روک دیا جائے گا جس کی وضاحت سورۃ الانعام کے آخر میں گذر چکی ہے اور سورۃ القیامۃ میں بھی آئیگی ان دونوں کا جمع ہونا یہ دنیا کے ختم ہونے اور قیامت کے برپا ہونے کی علامت ہوگی۔

سورج اور چاند اپنے فلک میں رواں دواں ہیں۔ ایک قول کیا گیا ہے: معنی ہے وہ چکر لگا رہے ہیں یہاں تسبیح کا صیغہ ذکر نہیں کیا کیونکہ اپنے فعل کے ساتھ صفت بیان کی جس کے ساتھ ذوالعقول کی صفت بیان کی جاتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سورج، چاند اور ستارے آسمان و زمین کے درمیان فلک میں ہیں اس کے ساتھ چپٹے ہوئے نہیں اگر یہ چپٹے ہوئے ہوتے تو نہ چلتے (4)؛ یہ ثعلبی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ کہ دن کو رات سے قبل بنایا گیا رات خلق میں اس سے سبقت نہیں لے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے وقت پر آتا ہے ان میں سے کوئی اپنے ساتھی پر سبقت نہیں لے جاتا یہاں تک کہ قیامت کے روز سورج اور چاند کو جمع کر دیا جائے گا جس طرح فرمایا: وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ﴿۹﴾ (القیامۃ) اس وقت یہ آگے پیچھے اس لیے آ رہے ہیں تاکہ بندوں کے مصالح مکمل ہوں اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب کو جان لو، رات آرام کے لیے اور دن کام کاج کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (القصص: 73) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ (النباء) یعنی نیند کو دن کے کام کاج سے تمہارے بدنوں کو آرام پہنچانے کے لیے بنایا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ رات دن پر غالب آنے والی نہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: سبق فلان فلانا۔ فلاں فلاں پر غالب آ گیا۔ مبرد نے ذکر کیا ہے میں نے عمارہ کو ولا اللیل سابقُ النہار پڑھتے ہوئے سنا میں نے کہا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے سابق النہار کا ارادہ بیان کیا ہے میں نے تنوین کو حذف کر لیا ہے کیونکہ یہ خفیف ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے النہار تنوین کے بغیر منصوب ہو اور تنوین اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف ہو۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 18 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 347

یَرْكَبُوْنَ ۝ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ بھی ہے کہ ہم نے سوار کیا ان کی اولاد کو ایک کشتی میں جو بھری ہوئی تھی اور ہم نے پیدا کیں ان کے لیے اس کشتی کی مانند اور چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پس کوئی ان کی فریاد سننے والا نہیں اور نہ وہ ڈوبنے سے بچائے جا سکیں بجز اس کے کہ ہم ان پر رحمت فرمائیں اور انہیں کچھ وقت تک لطف اندوز ہونے دیں''۔

اٰیَةٌ لَّهُمْ میں تین معانی کا احتمال ہے: (1) یہ ان کے لیے عبرت ہے کیونکہ آیات میں عبرتیں ہیں (2) ان پر نعمت ہے کیونکہ آیات میں انعام ہے (3) انہیں خبردار کرنا ہے کیونکہ آیات میں خبردار کرنے کا پہلو موجود ہوتا ہے (1)۔

اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ سورت میں مشکل ترین آیت ہے کیونکہ انہیں ہی کشتی میں سوار کیا گیا تھا، ایک قول یہ کیا گیا: اہل مکہ کے لیے نشانی ہے کہ ہم نے سابقہ قوموں کی اولادوں کو بھری کشتی میں سوار کیا۔ دونوں ضمیریں مختلف ہیں؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ نحاس نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا ہے اور اس کی حکایت بیان کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: دونوں ضمیریں اہل مکہ کے لیے ہیں کہ ذُرِّیَّتَهُمْ سے مراد ان کی اولادیں اور ان کے ضعیف لوگ ہیں پہلے قول کے مطابق الفلك سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہے اور دوسری تاویل کی بنا پر یہ اسم جنس ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و احسان کا ذکر کیا کہ اس نے کشتیوں کو پیدا کیا ان میں انہیں سوار کر دیا جس کے لیے چلنا اور سواری پر سوار ہونا مشکل ہوتا ہے جیسے اولادیں اور کمزور لوگ۔ اس تعبیر کی بنا پر دونوں ضمیریں متفق ہوں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا: ذریة سے مراد آباء و اجداد ہیں (2) اللہ تعالیٰ نے جنہیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار کیا آباء ذریت ہیں، اور ابناء بھی ذریت ہیں اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے یہ ابوعثمان کا قول ہے۔ آباء کو ذریت اس لیے کہتے ہیں کیونکہ انہیں میں سے بیٹوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ایک چوتھا قول یہ بھی ہے: ذریة سے مراد نطفے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے پیٹوں میں اٹھایا اور ان بٹیوں کو فلک مشحون سے تشبیہ دی؛ یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے، ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے (3)۔ سورۃ البقرہ میں لفظ ذریة کا اشتقاق اور اس کے بارے میں مفصل گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔ مشحون کا معنی بھری ہوئی ہے۔ فلك کا لفظ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔

مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ اصل میں مایرکبونه ہے اسم موصول کی طوالت کی وجہ سے صلہ کی ضمیر حذف ہے اور اس لیے بھی کہ یہ آیت کا سرا ہے اس کے معنی میں تین قول ہیں: (1) مجاہد، قتادہ اور مفسرین کی ایک جماعت کا مذہب ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ من مثله سے مراد اونٹ ہے، اونٹ خشکی میں سواری کے لیے اسی طرح پیدا کیا گیا ہے جس طرح سمندر میں سواری کے لیے کشتی پیدا کی گئی ہے۔ عرب اونٹوں کو کشتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں، طرفہ نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 19 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

كَأَنَّ حُدُوجَ المالكيةِ غُدوةً خَلَايَا سفينٍ بالنواصِفِ مِن دَدِ(1)

گویا صبح کے وقت مالکیہ کے حودج بڑی کشتیاں ہیں جو دد کے کھلے میدان میں ہیں۔

خلایا، خلیة کی جمع ہے جس کا معنی بڑی کشتی ہے۔

(2) اس سے مراد اونٹ، چوپائے اور سواری کا ہر جانور ہے۔

(3) اس سے مراد کشتیاں ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ قول صحیح ترین ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند متصل کے ساتھ مروی ہے کہ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ۝ سے مراد اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کشتیاں بنائیں جو اونٹوں کی مثل ہیں جن میں وہ سوار ہوتے ہیں۔ ابو مالک نے کہا: اس سے مراد چھوٹی کشتیاں ہیں (2) جنہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی کشتیوں کی طرح بنایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری سے اسی طرح مروی ہے۔ ضحاک اور دوسرے علماء نے کہا: اس سے مراد وہ کشتیاں ہیں جنہیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے بعد بنایا گیا ہے۔ ماوردی نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی تاویل کے نتیجے میں یہ پانچواں قول سمجھ آتا ہے کہ فلك مشحون میں ذرية سے مراد وہ نطفے ہیں جو عورتوں کے بطن میں ہیں کہ اس کا معنی یہ ہو کہ عورتیں اس لیے پیدا کی گئیں ہیں تا کہ خاوند ان پر سوار ہوں (3)، لیکن میں نے کسی کو یہ بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ یعنی ہم انہیں سمندر میں غرق کر دیتے۔ ضمیر اصحاب ذریت کی طرف لوٹے گی یا سب کی طرف لوٹے گی یہ تاویل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی صحت پر دلالت کرتی ہے جس نے یہ کہا: من مثله سے مراد کشتیاں ہیں اونٹ نہیں تو ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا (4)؛ یہ سعید نے قتادہ سے روایت کی ہے۔ شیبان نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے: ان کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی۔ دونوں کا معنی قریب قریب ہے۔ صریخ، مصرخ کے معنی میں ہے یعنی فعیل، مفعل کے معنی میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ کیونکہ اس کے بعد ایسی چیز ہے جس میں رفع کے بغیر کوئی چیز جائز نہیں، نحوی یہ پسند کرتے ہیں لا رجل فی الدار ولا زید۔

لَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ۝ کا معنی ہے انہیں غرق ہونے سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عذاب سے انہیں کوئی بچانے والا نہ ہوگا مگر ہماری رحمت ہی انہیں عذاب سے بچائے گی۔ کسائی نے کہا: اِلَّا رَحْمَةً یہ مستثنیٰ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: مفعول لہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی رحمت کے لیے مَتَاعًا اس کا معطوف ہے۔ حِيْنٍ سے مراد موت ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: قیامت تک مراد ہے معنی ہوگا مگر یہ کہ ہم ان پر رحمت کریں اور ان کی آجال تک انہیں لطف اندوز ہونے دیں (5)۔ اللہ تعالیٰ سابقہ امتوں کا عذاب جلدی لے آیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے عذاب کو موت اور قیامت تک موخر کر دیا اگرچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلائیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ وَ مَا تَاْتِيْهِمْ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 20 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝
مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ یَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَةً
وَّ لَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ یَرْجِعُوْنَ ۝

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ڈرو عذاب سے جو تمہارے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں سے مگر وہ اس سے روگردانی کرنے لگتے ہیں۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے، تو کافر کہتے ہیں اہل ایمان کو: کیا ہم انہیں کھانا کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا (اے ناصحو!) تم تو بالکل بہک گئے ہو اور کافر کہتے ہیں: یہ وعدہ کب آئے گا اگر تم سچے ہو تو اس کا مقررہ وقت بتا دو۔ یہ نا ہنجار نہیں انتظار کر رہے مگر ایک گرج کا جو اچانک انہیں دبوچ لے گی جب وہ بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے، پس نہ وہ اس وقت کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر آ سکیں گے''۔

قتادہ نے کہا: مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد تم سے قبل کی امتوں کے واقعات ہیں (1) اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد آخرت ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور مجاہد نے کہا: مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد سابقہ گناہ ہیں (2) اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد آنے والے گناہ ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد جو تمہاری عمر گذر چکی ہے (3) اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد جو باقی ماندہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد دنیا ہے اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد عذاب آخرت ہے؛ یہ سفیان کا قول ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے برعکس قول نقل کیا ہے کہ مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد امر آخرت اور اس کے لیے اعمال ہیں اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد دنیاوی امور ہیں ان سے بچو اور اس کے ساتھ دھوکہ میں مبتلا نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد جو تمہارے لیے ظاہر ہے اور وَ مَا خَلْفَكُمْ سے مراد جو تمہارے لیے مخفی ہے (4)۔ جواب محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی: اذا قیل لھم ذلك أعرضوا اس کی دلیل مابعد قول ہے: وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝ جواب کی بجائے اس دلیل پر اکتفا کیا۔

اَنْفِقُوْا سے مراد فقراء پر صدقہ کرو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہودیوں کو جب فقراء پر صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ضمیر کا مصداق مشرکین ہیں انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فقراء صحابہ نے یہ کہا (5): تم اپنے اموال میں سے جن کے

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 17 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 21 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 348
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 21 5۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 19

بارے میں یہ خیال کرتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں وہ ہمیں دو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (الانعام: 136) وہ اسی پر دلالت کرتا ہے، تو انہوں نے فقراء کو محروم رکھا اور مذاق کے طور پر کہا: اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں کھلاتا ہم تمہیں کچھ بھی نہ کھلائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے دین کی طرف لوٹو۔ انہوں نے کہا: کیا ہم تمہیں دیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے کھلاتا۔ انہیں مسلمانوں کا یہ قول پہنچا تھا کہ رازق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تو انہوں نے مذاق کے انداز میں کہا: کیا ہم اسے کھلائیں کہ اللہ تعالیٰ اگر اسے کھلانا چاہتا تو اسے غنی کر دیتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مکہ مکرمہ میں زنادقہ تھے (1) جب انہیں مساکین پر صدقہ کرنے کا حکم دیا جاتا تو وہ کہتے: اللہ کی قسم! نہیں کیا اللہ تعالیٰ تو اسے فقیر بنائے اور ہم اسے کھلائیں؟ وہ مومنوں کی باتیں سنا کرتے وہ افعال کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کرتے وہ کہتے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فلاں کو غنی کر دیتا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فلاں کو عزت دے دیتا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس طرح ہو جاتا۔ انہوں نے یہ جواب مومنوں کا استہزاء کرنے کے لیے نکالا اور اس کا مذاق اڑانے کے لیے دیا جو مومن امور کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف معلق کر دیتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے یہ قول اس لیے کیا تھا تا کہ مومنوں کے قول کو اپنے ساتھ مشروط کر دیں اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں رزق دیا تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ تمہیں بھی رزق دے تو پھر تم ہم سے کیوں رزق طلب کرتے ہو؟ یہ استدلال باطل تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو مال کا مالک بناتا ہے پھر اس میں حق لازم کر دیتا ہے گویا اتنا حصہ اس سے الگ کر دیا تو اعتراض کی کوئی وجہ نہیں رہتی وہ اپنے اس قول لَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ میں سچے تھے لیکن دلیل میں جھوٹے تھے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا (الانعام: 148) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ کفار کا مومنوں کے حق میں قول ہے یعنی تم جو مال کا سوال کرتے ہو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہو اس میں تم گمراہی میں مبتلا ہو۔ کہا: یہ مقاتل اور دوسرے علماء نے معنی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کفار کے حق میں قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا کفار کے حق میں قول ہے جب انہوں نے اس جواب کے ساتھ رد کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمان مساکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے تو ابو جہل ان سے ملا اور کہا: اے ابوبکر! کیا تیرا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان فقراء کو کھانا کھلانے پر قادر ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، اس نے پوچھا: کیا وجہ ہے اس نے ان کو نہیں کھلایا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو فقر کے ساتھ آزمایا اور کچھ لوگوں کو غنا کے ساتھ آزمایا ہے، فقراء کو صبر کا حکم دیا اور اغنیاء کو کھانا کھلانے کا حکم فرمایا۔ تو ابو جہل نے کہا: اللہ کی قسم! اے ابوبکر! تو گمراہ ہے کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کھلانے پر قادر ہے اور وہ انہیں نہیں کھلاتا پھر تو انہیں کھلاتا ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: فَاَمَّا مَنْ

1۔ تفسیر ابن عطیہ، جلد 4، صفحہ 19

اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿۶﴾ (اللیل) نازل ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت زنادقہ کے حق میں نازل ہوئی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو زندیق تھے وہ اس کائنات کے صانع پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس قول کے ذریعے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے قشیری اور ماوردی نے اس کا ذکر کیا (1)۔

جب کفار کو یہ کہا گیا: اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ تو انہوں نے کہا: مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یہ قیامت کب برپا ہوگی؟ یہ کفار کی جانب سے استہزاء تھا یعنی یہ وعید متحقق نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وہ صرف حضرت اسرافیل کے نفحہ کا انتظار کر رہے ہیں جو انہیں اپنی گرفت میں لے لے گی جبکہ وہ دنیا کے امور میں جھگڑ رہے ہوں گے تو وہ اسی جگہ مرجائیں گے، یہ صعق کا نفحہ ہے۔

یَخِصِّمُوْنَ میں پانچ قرائتیں ہیں: ابو عمرو اور ابن کثیر نے یَخَصِّمون پڑھا ہے یعنی یاء اور خاء کو مفتوح اور صاد پر شد پڑھی ہے ورش نے نافع سے اسی طرح روایت کی ہے۔

اصحاب قراءات اور ورش کے سوا اصحاب نافع نے یَخْصِّمون روایت کیا ہے یعنی خاء کو ساکن اور صاد کو مشدد پڑھا ہے یعنی دو ساکنوں کو جمع ذکر کیا ہے۔ یحییٰ بن وثاب، اعمش اور حمزہ نے اسے یَخْصِمون پڑھا ہے خاء کو ساکن اور صاد کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یہ خصمہ سے مشتق ہے۔ عاصم اور کسائی نے اسے یَخِصِّمون پڑھا ہے یعنی خاء مکسور اور صاد مشدد ہے اس کا معنی ہے وہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا۔ نفحہ انہیں آپہنچے گا جبکہ وہ آپس میں یہ دلائل قائم کر رہے ہوں گے کہ انہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا (2)۔ ابن جبیر، ابو بکر سے وہ عاصم سے اور حماد، عاصم سے یاء اور خاء کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: پہلی قراءت ان سب سے واضح ہے اصل میں یہ یختصمون تھا تاء کو صاد میں مدغم کر دیا گیا اس کی حرکت خاء کی طرف نقل کر دی گئی۔ ابی کی قراءت میں یختصمون خاء کو ساکن کرنا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں دو ساکنوں کا اجتماع ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی حرف مدہ اور لین نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے خاء کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے ساکن پڑھا ہے معنی ہے وہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوں گے تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ یہ بھی جائز ہے کلام اس معنی میں ہو یَخِصمون مجادلهم عند انفسهم تو مفعول کو حذف کر دیا گیا۔

ثعلبی نے کہا: یہ حضرت ابی بن کعب کی قراءت ہے۔ نحاس نے کہا: یَخِصّمون کی اصل یختصمون ہے تاء کو صاد میں مدغم کیا گیا پھر اجتماع ساکنین کی وجہ سے خاء کو کسرہ دیا گیا۔ فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ قراءت سب سے عمدہ اور اکثر مروی ہے اور جو صورت بہتر تھی اس کو ترک کر دیا یعنی تاء کی حرکت خاء کو دی اور اس کے لیے ایک اور حرکت لے آیا اور پھر یاء اور کسرہ کو جمع کر دیا اور گمان یہ کیا۔ یہ عمدہ اور اکثر مستعمل ہے۔ یہ اکثر کی قراءت کیسے ہوسکتی ہے جبکہ فتحہ کے ساتھ قراءت اہل مکہ، اہل بصرہ، اور اہل مدینہ کی قراءت ہے؟ عاصم سے یاء اور خاء کے کسرہ کے ساتھ جو مروی ہے وہ اتباع کی وجہ سے ہے۔ یہ بحث یخطف میں سورۂ بقرہ میں اور یهدی میں سورۂ یونس میں گذر چکی ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 21 2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 20

عکرمہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً کے بارے میں کہا: اس سے مراد صور میں پہلا نفخہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگ بازاروں میں ہوں گے کوئی دودھ دوہ رہا ہوگا، کوئی کپڑا ماپ رہا ہوگا اور کوئی کام کاج میں مصروف ہوگا کہ صور پھونک دیا جائے گا۔

نعیم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت برپا ہو جائے گی جبکہ دو آدمی کپڑے کی خرید و فروخت کے لیے اسے پھیلائے ہوئے ہوں گے وہ اسے ابھی نہیں لپیٹیں گے یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے گی، ایک آدمی اپنا حوض درست کر رہا ہوگا تا کہ وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلائے ابھی وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی، ایک آدمی اپنا ترازو نیچے جھکائے گا ابھی وہ اسے اوپر نہیں اٹھائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی، ایک آدمی اپنا لقمہ منہ کی طرف اٹھائے گا ابھی وہ اسے نہیں نگلے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی'' (1)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ''سب سے پہلے جو آدمی صور کی آواز سنے گا وہ وہ آدمی ہوگا جو اپنے حوض کو درست کر رہا ہوگا وہ چیخ مارے گا اور دوسرے لوگ بھی چیخ ماریں گے'' (2)۔

وہ ایک دوسرے کو توبہ وغیرہ کی وصیت کی طاقت نہ رکھیں گے بلکہ اپنے بازاروں اور اپنے اپنے مواقع پر ہی مر جائیں گے جب وہ مر جائیں گے تو وہ اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹیں گے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے کہ وہ ان کے لیے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ نہیں کہیں گے۔ قتادہ نے کہا: وہ اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹیں گے کیونکہ ان کے ساتھ بہت جلد معاملہ کیا گیا ہے۔

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّ لَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور (دوبارہ جب) صور پھونکا جائے گا تو فوراً وہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے (اس وقت) کہیں گے: ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہماری خواب گاہوں سے؟ آواز آئے گی: یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور سچ کہا تھا اس کے رسولوں نے: نہیں ہوگی مگر ایک زوردار کڑک پھر وہ فوراً سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔ پس آج ظلم نہیں کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور نہ ہی بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے''۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 22
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، باب خروج الدجال، جلد 2، صفحہ 403
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 22

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ یہ دوبارہ اٹھانے کے لیے دوسرا نفخہ ہے (1)۔ سورۂ نمل میں ہم وضاحت کرآئے ہیں کہ نفخے دو ہیں تین نہیں ہیں، یہ آیت اسی معنی پر دال ہے۔ مبارک بن فضالہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دو نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا پہلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر زندہ چیز کو موت عطا فرمائے گا اور دوسرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر مردہ چیز کو زندہ کرے گا'' (2)۔ قتادہ نے کہا: صور، صورۃ کی جمع ہے صورۃ اور صور اسی طرح ہیں جس طرح عمارت کی سورۃ (دیوار) اور سور ہوا کرتی ہے۔ عجاج نے کہا:

سِرت إليه فى أعالِى السُّورِ

میں اس کی طرف بلند دیواروں میں چلا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ☆ سے مروی ہے کہ انہوں نے وَنُفِخَ فِي الصُّوَرِ قراءت کی۔ نحاس نے کہا: الصُّوْر ہے یعنی واو ساکن ہے اس سے مراد سینگھ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے اور کلام عرب میں یہ اسی طرح مروی ہے۔ اہل لغت نے یوں کہا:

نحنُ نَطَحْنَاهُمْ غَداةَ الْغُورَيْن بالضَّابحاتِ فى غُبَار النَّقْعَيْن

نَطْحًا شديدًا لاكَنَطْحِ الصُّورَيْن

ہم نے غورین کے دن آواز نکالنے والے گھوڑوں کے ساتھ شدید جنگ کی جبکہ غبار شدید تھا وہ جنگ سینگھ لڑانے والی جنگ نہ تھی۔

یہ بحث سورۃ الانعام میں مفصل گذر چکی ہے۔ الاجداث سے مراد قبریں ہیں اسے الاجداف بھی پڑھا گیا ہے (3)؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے یہ کہا جاتا ہے: جدث، جدف فصیح لغت جدث ہے اس کی جمع أجدث اور أجداث آتی ہے متنخل ہذلی نے کہا: عرفتُ بأجْدُثٍ میں نے قبروں کو پہچان لیا۔ اجتدث یعنی اس نے قبر بنائی۔

اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ وہ نکلتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا قول ہے (4) اس معنی میں بچے کو نسل کہتے ہیں کیونکہ وہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ جلدی کرتے ہیں کیونکہ نسلان اور عسلان جلدی جلدی چلنے کو کہتے ہیں، اسی معنی میں بھیڑیے کی چال ہے۔ شاعر نے کہا:

بَرَدَ الليلُ عليه فَنَسَلْ (5)

رات اس پر ٹھنڈی ہوئی اور وہ تیز چلا یہ جملہ بولا جاتا ہے: عسل الذئب ونسل، ليعسل وينسل الذئب۔ یہ ضَرَبَ يَضْرِبُ کے باب سے ہے ينسل بھی کہتے ہیں اس سے مراد تیز چلنا ہے، معنی ہے وہ تیزی سے نکلتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان: 28) يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۞ (القمر) يَوْمَ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 23 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 439 3۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 21

4۔ ایضاً 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 23 ☆ ایک نسخہ میں ابن ہرمز ہے یہی صحیح ہے۔

یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (المعارج) یعنی وہ بتوں کی طرف جلدی جاتے ہیں حدیث طیبہ میں ہے ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کمزوری کی شکایت کی تو فرمایا: ''علیکم بالنسل تم جلدی چلا کرو کیونکہ یہ انسان کو چست بنا دیتا ہے(1)''۔

ابن انباری نے کہا: یٰوَیْلَنَا پر وقف اچھا ہے پھر مَنْۢ بَعَثَنَا سے آغاز کرے بعض قراء سے مروی ہے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا، من کا میم اور بعثنا کا ثاء مکسور ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا سے بھی مروی ہے اس نقطہ نظر کے مطابق یٰوَیْلَنَا پر وقف کرنا اچھا نہیں یہاں تک کہ وہ پڑھے مِنْ مَّرْقَدِنَا۔

حضرت ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق مِنْ مَّرْقَدِنَا کے ساتھ وصل ہے تو یہ عام لوگوں کے مذہب کی صحت کی دلیل ہے۔ مہدوی نے کہا: ابن ابی لیلی نے قالوایاویلتنا قراءت کی ہے یہ ویلکی تانیث ہے اس کی مثل یٰوَیْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ (ہود:72) حضرت علی شیر خدا نے یاویلتا من بعثنا قراءت کی ہے من ویل سے متعلق ہے یاویلتا سے حال ہے تو من محذوف کے متعلق ہوگا گویا یہ کہا یاویلتا کائنا من بعثنا جس طرح جار مجرور کو ویل سے خبر بنانا صحیح ہے اسی طرح اس سے حال بنانا صحیح ہے مِنْ مَّرْقَدِنَا جار مجرور بعث کے متعلق ہے پھر یہ کہا گیا: انہوں نے یہ بات کیسے کہی جبکہ وہ تو اپنی قبروں میں عذاب دیے جا رہے ہوں گے؟ اس کا جواب ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے کہا: وہ سو رہے ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے: وہ کہیں گے۔ ہائے افسوس! کس نے ہمیں ہماری قبروں سے اٹھایا ہے؟ ابوبکر انباری نے کہا: یہ حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ ھبنا کا لفظ قرآن کا حصہ ہے جس طرح وہ آدمی کہتا ہے جو قرآن پر طعن کرتا ہے بلکہ یہ تو بعثنا کی تفسیر ہے یا یہ اس کے کسی معنی کی تعبیر ہے۔

ابوبکر نے کہا: میں نے من ھبنا الف کے بغیر یاد کیا ہے جبکہ من کا نون ساکن ہے۔ لغت کے طریقہ کے مطابق یہ تیخ ہے من اھبنا لون کو فتحہ دیا کہ اھب کے ہمزہ کے فتحہ کو من کے نون کو دیا اور ہمزہ کو ساقط کر دیا جس طرح عرب کہتے ہیں: مَن اخبرك، مَن اعلمت وہ اس سے مراد مَنْ اَخبرك لیتے ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: اھببت النائم فھب النائم میں نے سونے والے کو اٹھایا تو وہ اٹھ گیا۔ احمد بن یحیی نحوی نے ہمیں یہ سنایا:

دعاذلة هَبَّت بلَيْلٍ تَلُوْمُنى

مجھے ملامت کرنے والی اٹھی اور ملامت کرنے لگی۔

ابو صالح نے کہا: جب پہلا نفخہ ہوگا تو اہل قبور سے عذاب اٹھا لیا جائے گا تو وہ دوسرے نفخہ تک سو جائیں گے دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا اسی وجہ سے ان کا یہ قول ہوگا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا قول ہے۔

علماء معانی نے کہا: کفار جب جہنم اور اس کے عذاب کی انواع کو دیکھیں گے تو انہیں قبروں میں جو عذاب دیا گیا تھا وہ جہنم

---

1۔ النہایہ لابن الاثیر، جلد 5، صفحہ 49

کے عذاب کے مقابلے میں نیند کی طرح ہوگا۔ مجاہد نے کہا: مومن انہیں کہیں گے: یہ ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا۔ قتادہ نے کہا: الله تعالیٰ نے جسے ہدایت دی ہوگی وہ ان کفار کو یہ کہیں گے: یہ ہے وہ جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا۔ فراء نے کہا: فرشتے انہیں یہ کہیں گے۔ نحاس نے کہا: یہ تمام اقوال متفق ہیں کیونکہ ملائکہ مومنوں میں سے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں الله تعالیٰ نے ہدایت دی اس معنی میں الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ۝ (البینہ) اسی طرح یہ حدیث ہے المؤمن عند الله خیر من کل ما خلق (1) مومن الله تعالیٰ کے ہاں تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ فرشتوں اور دوسرے مومنوں نے انہیں یہ بات کہی ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا: جب کفار نے ایک دوسرے کو کہا: کس نے ہمیں ہماری قبروں سے اٹھایا تو انہوں نے جب اس چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کی انبیاء نے انہیں خبر دی تھی تو انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی پھر انہوں نے کہا: یہ ہے وہ جس کا رحمن نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور مرسلین نے سچ بولا تھا اور ہم نے اس کو جھٹلایا تھا، انہوں نے اس وقت اقرار کیا جب اقرار نے انہیں کچھ نفع نہ دیا بعض قاری یعنی حفص مِنْ مَّرْقَدِنَا پر وقف کرنے اور پھر کلام کو شروع کرتے هٰذَا ابوبکر بن انباری نے کہا: مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا پر عطف بہت اچھا ہے پھر تو کلام کو شروع کرے هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ یہ بھی جائز ہے کہ تو هٰذَا پر وقف کرے اور مرقد کی اتباع میں هٰذَا کو جر دے اور مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ سے کلام کا آغاز کرے معنی ہوگا تمہارا اٹھایا جانا رحمن کا وعدہ ہے۔ نحاس نے کہا: کلام مِنْ مَّرْقَدِنَا پر مکمل ہو جاتی ہے اور هٰذَا مبتدا ہونے کی حیثیت میں محل رفع میں ہے اور اس کی خبر مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ ہے۔ یہ بھی جائز ہے هٰذَا، مَّرْقَدِنَا کی صفت ہونے کی حیثیت سے مجرور ہو تو اس صورت میں کلام مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا پر مکمل ہوگی اور مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ تین وجوہات سے محل رفع میں ہوگی۔

ابو اسحاق نے اس کی دو وجوہ ذکر کی ہیں: (1) هٰذَا مضمر ہے (2) کلام اس معنی میں ہو حقّ ما وعد الرحمن بعثکم (3) کلام اس معنی میں ہو بعثکم ما وعد الرحمن۔

ان کو دوبارہ اٹھانا اور انہیں زندہ کرنا ایک چیخ کی صورت میں ہوگا وہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا یہ کہنا ہے: اے بوسیدہ ہڈیو! اے ٹوٹے ہوئے جوڑ اور ٹوٹے ہوئے بالو! الله تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلہ کے لیے اکٹھے ہو جاؤ، حق کے قول کا بھی یہی معنی ہے یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝ (ق) اور مُّهْطِعِیْنَ اِلَى الدَّاعِ (القمر: 8) کا مفہوم بھی یہی ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت اگر واقعی یہ آپ سے ثابت ہے ان کانت إلا زَقْیة واحدة اس میں زَقْیة کا معنی چیخ ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ هم ضمیر مبتدا ہے اس کی خبر جمیع ہے جو نکرہ ہے اور مُحْضَرُوْنَ اس کی صفت ہے محضرون کا معنی ہے انہیں جمع کیا جائے گا، انہیں حساب کے موقف میں حاضر کیا جائے گا وہ الله تعالیٰ کے اس فرمان: وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ (النحل: 77) کی طرح ہے۔

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب المسلمون فی ذمة الله، حدیث نمبر 3936، روایت بالمعنی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس روز ان کے حساب میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ میں ما دو وجوہ سے محل نصب میں ہوگی: (1) فعل مجہول کا مفعول ثانی ہے، حرف جر حذف کر دیا گیا اصل میں بما کنتم تعملون تھا۔ یعنی تعملونہ۔ پس اسے حذف کر دیا گیا۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

”بے شک اہل بہشت آج (حسب مراتب) اپنے اپنے شغل سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے وہ اور ان کی بیویاں سایہ میں (مرصع) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لیے وہاں طرح طرح کے لذیز پھل ہوں گے اور انہیں ملے گا جو وہ طلب کریں گے۔ تم سلامت رہو انہیں یہ کہا جائے گا اپنے رحیم رب کی طرف سے۔ اور حکم ہوگا: اے مجرمو! میرے دوستوں سے آج الگ ہو جاؤ“۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، قتادہ ارمجاہد نے کہا: باکرہ عورتوں کے ساتھ حقوق زوجیت نے انہیں غافل کر دیا ہوگا۔ ترمذی حکیم نے اپنی کتاب ”مشکل القرآن“ میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ ہمیں محمد بن حمید رازی نے انہوں نے یعقوب قمی سے انہوں نے حفص بن حمید سے انہوں نے شمر بن عطیہ سے، انہوں نے شقیق بن سلمہ سے انہوں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ باکرہ بیویوں سے حقوق زوجیت نے انہیں مشغول کر رکھا ہوگا (1)۔

محمد بن حمید، ہارون بن مغیرہ سے وہ نہشل سے وہ ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں۔

ابو قلابہ نے کہا: اسی اثنا میں کہ ایک جنتی اپنے اہل کے ساتھ مصروف ہوگا کہ اسے کہا جائے گا: اپنے اہل کی طرف توجہ کرو وہ کہے گا: اپنے اہل کے ساتھ مشغول ہوں۔ اسے کہا جائے گا: اپنے اہل کی طرف توجہ کرو۔

ایک قول یہ کیا گیا: جنتی جنت کی لذات اور نعمتوں میں مصروف ہوں گے انہیں نافرمانوں کے جہنم میں جانے کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی اور اس میں جو دردناک عذاب ہوگا اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی اگرچہ ان لوگوں میں اس کے قریبی رشتہ دار اور گھر والے ہوں گے؛ یہ سعید بن مسیب اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔ وکیع نے کہا: شغل کا معنی سماع ہے۔ ابن کیسان نے کہا: فی مشغل کا معنی ہے وہ ایک دوسرے کی ملاقات میں مصروف ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اللہ تعالیٰ کی ضیافت میں مصروف ہوں گے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: میرے وہ بندے کہاں ہیں جنہوں نے میری اطاعت کی اور بن دیکھے میرے عہد کو یاد رکھا؟ وہ کھڑے ہوں گے گویا ان کے چہرے چودھویں کے چاند اور روشن ستارے ہوں گے وہ نور کی اونٹنیوں پر سوار ہوں گے ان کی لگامیں یاقوت کی ہونگی جو لوگوں کے سروں پر سے انہیں لے کر اڑتی

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 23

ہوں گی یہاں تک کہ وہ عرش کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میرے ان بندوں پر سلام جنہوں نے میری اطاعت کی اور بن دیکھے میرے عہد کی حفاظت کی، میں نے تمہیں چن لیا، میں نے تمہیں منتخب کرلیا ہے اور میں نے تمہیں اختیار کیا ہے جاؤ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو جاؤ، نہ آج تم پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم غمگین ہو گے، وہ پل صراط سے اچکنے والی بجلی کی طرح گزر جائیں گے، ان کے لیے دروزے کھول دیئے جائیں گے پھر مخلوق ابھی میدان محشر میں کھڑی ہو گی تو وہ ایک دوسرے کو کہیں گے: اے قوم! فلاں کہاں ہے؟ فلاں کہاں ہے؟ جس وقت وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے تو ایک منادی ندا کرے گا: اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۝۔

شُغُل اور شُغْل اس میں دو لغتیں ہیں دونوں کے ساتھ اسے پڑھا بھی گیا ہے جس طرح رُعُب اور رُعْب، سُحُت اور سُحْت یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: فٰكِهُوْنَ کا معنی مسرورون ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی فرحون ہے(2)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: اس کا معنی معجبون ہے۔ سدی نے کہا: اس کا معنی ناعمون ہے۔ سب کا معنی باہم قریب ہے۔ فکاہت کا معنی بھی مزاح اور اچھی گفتگو ہے۔

ابوجعفر، شیبہ اور اعرج نے کہا فَكِهُوْنَ الف کے بغیر ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح فارِہٌ اور فرِہٌ اور حاذِرٌ اور حذِرٌ؛ یہ فراء کا قول ہے۔ کسائی اور ابو عبیدہ نے کہا: الفاکہ سے مراد ذوالفاکھة ہے یعنی اسم فاعل نسبت کے معنی میں ہے جس طرح شاتم، لاحم، تامر اور لابن ہے اور فَكِهٌ سے مراد متفکہ اور متنعم ہے۔ فکھون قتادہ کے قول میں الف کے بغیر ہے جس کا معنی معجبون (خوش ہونے والے) ہے۔ ابو زید نے کہا: یہ کہا جاتا ہے: رجل فکہ جب خوش ہونے والا اور مسکرانے والا ہو۔ طلحہ بن مصرف نے فاکہین پڑھا ہے یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۝ مبتدا اور خبر ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھم تاکید ہو اور أزواجھم کا عطف ضمیر پر ہو اور متکئون، فاکھون کی صفت ہوئی۔ عام لوگوں کی قراءت فِيْ ظِلٰلٍ ظاء کے کسرہ اور الف کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن مسعود، عبید بن عمیر، اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور خلف نے اسے فی ظُلَل پڑھا ہے ظاء پر ضمہ ہے اور الف کے بغیر ہے ظِلال، ظل کی جمع ہے اور ظُلَل، ظلۃ کی جمع ہے۔

ارائک سے مراد خیموں میں پلنگ ہیں اس کا واحد اریکہ ہے جس طرح سفینہ کی جمع سفائن آتی ہے شاعر نے کہا:

كَاَنَّ احمرارَ الوردِ فوق غُصُونه بوقتِ الضحی فی روضةِ المتضاحِك
خُدُودُ عذارَی قد خَجِلن من الحَيَا تَهَادَيْنَ بالريحان فوق الأَرَائِك

گویا گلاب کے پھول کی سرخی اس کی ٹہنیوں پر چاشت کے وقت مسکراتے باغیچے میں کنواری عورتوں کے رخسار ہیں جو حیاء کی وجہ سے شرمندہ ہیں جو پلنگوں پر ریحان کا پھول باہم تحفہ دیتی ہیں۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 351 2۔ احکام القرآن للطبری، جز23، صفحہ 25

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنتی جب بھی اپنی عورتوں سے حقوق زوجیت ادا کر چکیں گے تو ان کی عورتیں باکرہ ہوجائیں گی (1)''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک جنتی ستر سال تک حور سے معانقہ کرے گا نہ مرد اس سے اکتائے گا اور نہ وہ مرد سے اکتائے گی جب بھی وہ جنتی اس کے پاس آئے گا اسے باکرہ پائے گا جب بھی اس حور کی طرف لوٹے گا تو مرد کی شہوت لوٹ آئے گی وہ اس حور کے ساتھ ستر مردوں کی قوت کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرے گا ان کے درمیان منی نہ ہوگی وہ منی کے بغیر آئے گا اور وہ منی کے بغیر آئے گی۔

لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ یہ مبتدا اور خبر ہیں لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ میں دوسرا دال اصل میں تاء ہے کیونکہ دعا سے یفتعلون کے وزن پر ہے یعنی وہ جو طلب کرے گا وہ چیز اسے عطا کر دی جائے گی؛ یہ ابوعبید نے معنی بیان کیا ہے۔ يَدَّعُوْنَ کا معنی ہے وہ آرزو کریں گے یہ دعا سے مشتق ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے جو جس چیز کا دعویٰ کرے گا وہ اسی کی ہوجائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی فطرت پر پیدا کیا ہوگا کہ وہ ایسی چیز کا ہی دعویٰ کریں گے جو ان کے لیے جمیل اور حسین ہوگی۔ یحییٰ بن سلام نے کہا يَدَّعُوْنَ کا معنی ہے وہ خواہش کریں گے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ سوال کریں گے۔ معنی قریب قریب ہے ابن انباری نے کہا: وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ پر وقف کرنا اچھا ہے پھر سَلٰمٌ سے تو کلام کو شروع کرے معنی یہ ہوگا: ذلك لهم سلام، سلام کو اس طریقہ پر رفع دینا بھی جائز ہے وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ مسلم خالص جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں ان کے لیے وہ مسلم اور خالص ہوگا۔ اس تعبیر کی بنا پر مَا يَدَّعُوْنَ پر وقف کرنا اچھا نہیں۔ زجاج نے کہا: سلام یہ ما سے بدل کے طور پر مرفوع ہے معنی یہ بنے گا: ولهم أن سلام الله عليهم ان کا حق ہے اللہ تعالیٰ ان پر سلام بھیجے یہ جنتیوں کی خواہش ہوگی۔

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسی اثنا میں کہ جنتی نعمتوں میں ہوں گے کہ ان کے لیے نور چمکے گا وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اوپر کی جانب سے ظاہر ہوگا فرمایا: اے جنتیو! تم پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی مفہوم ہے (3)، اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا اور وہ اس کا دیدار کریں گے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر رہے ہوں گے اس وقت تک وہ جنت کی کسی اور نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے یہاں تک کہ وہ حجاب میں ہوجائے گا جبکہ اس کا نور اور اس کی برکات ان کے گھروں میں باقی رہیں گے (4)؛ یہ ثعلبی اور قشیری نے ذکر کیا ہے اس کا معنی صحیح مسلم میں بھی ثابت ہے ہم نے اس کی وضاحت سورۂ یونس آیت 26 میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ میں بیان کر دی ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما نکرہ ہو اور سلام اس کی صفت ہو معنی ہو جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں وہ ان کے لیے مسلم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع اور سلام اس کی خبر ہو ان صورتوں میں وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں سلاما

1۔ مجمع الزوائد، کتاب اهل الجنة، باب ماجاء في نساء اهل الجنة، جلد 10، صفحہ 771

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 26

3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 479، حدیث نمبر 39339

4۔ سنن ابن ماجہ، باب فيما انكرت الجهمية، حدیث نمبر 179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مفعول مطلق ہے اگر تو چاہے تو اسے حال کی حیثیت سے منصوب تسلیم کر لے تقدیر کلام یوں ہوگی ولھم مایدّعون ذا سلام أو سلامة او مسلما اس تاویل کی صورت میں یَدَّعُوْنَ پر وقف اچھا نہیں۔ محمد بن کعب قرظی نے سِلْمٌ پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا کہا: ذلك سلم لھم اس میں وہ کوئی تنازع نہیں کرتے تو اس صورت میں ولھم یدعون مکمل جملہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے سَلٰمٌ، وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ سے بدل ہو اور مَّا يَدَّعُوْنَ کی خبر لھم ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے سلام دوسری خبر ہو تو اس صورت میں کلام کا معنی ہو وہ انہیں کے لیے خالص ہے اس میں کوئی نزاع کرنے والا نہیں قَوْلًا یہ مفعول مطلق ہے تقدیر کلام یوں ہوگی قال اللہ ذالك قولا یا یقوله قولا فعل محذوف پر مصدر کا لفظ دلالت کرتا ہے اور دوسرے مذہب کی بنا پر یَدَّعُوْنَ پر وقف کرنا اچھا نہیں۔ سجستانی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان سَلٰمٌ پر وقف مکمل ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ قول ماقبل سے خارج ہے۔

یہ کہا جاتا ہے: تمیزوا، امازوا اور امتازوا کا معنی ایک ہی ہے اور مجرد سے یوں مطاوعت کا صیغہ آتا ہے مُزْتُه فانماز و امتاز اور تفعیل سے یوں صیغہ آتا ہے میزته فتمیز جب جنتیوں کو جنت کی طرف جانے کا حکم دیا جائے گا تو سوال کے لیے جب وہ کھڑے ہوں گے تو اس وقت انہیں یہ بات کہی جائے گی، یعنی ان سے نکل جاؤ۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے یہ بہشت سے الگ کر دیئے گئے (1)۔ ضحاک نے کہا: مجرم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے (2)، یہودی ایک جماعت کی صورت میں الگ ہوں گے، نصاریٰ ایک جماعت کی صورت میں الگ ہوں گے، مجوسی ایک فرقہ کی صورت میں الگ ہوں گے، صابی ایک فرقہ کی صورت میں الگ ہوں گے اور بت پرست ایک فرقہ کی صورت میں الگ ہوں گے۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: ہر جماعت کا جہنم میں ایک کمرہ ہوگا جس میں اسے داخل کر دیا جائے گا اور وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ وہ کسی کو دیکھیں گے اور نہ وہ کسی کو دکھائی دیں گے۔ داؤد بن جراح نے کہا: مسلمان مجرموں سے الگ ہو جائیں گے مگر خواہش کے پجاری مجرموں کے ساتھ ہوں گے (3)۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٢﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٦٣﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٦٤﴾

''کیا میں نے تمہیں یہ تاکیدی حکم نہیں دیا تھا اے اولاد آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے، گمراہ کر دیا شیطان نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔ یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا آج اس کی آگ تاپو اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے''۔

آیت کریم میں عہد سے مراد وصیت ہے کیا میں نے تم کو وصیت نہیں کی اور رسولوں کی زبانوں پر تمہیں پیغام حق نہیں

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 29　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 25　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 27

پہنچایا کہ تم میری نافرمانی کرتے ہوئے شیطان کی اطاعت نہیں کرو گے۔ کسائی نے کہا لا نہی کے لیے ہے اَنِ اعْبُدُوْنِيْ یہ نون کے کسرہ کے ساتھ اپنے اصل پر ہے جس نے اسے ضمہ دیا ہے اس نے کسرہ کے بعد ضمہ کو ناپسند کیا ہے۔

اضل کا معنی اغوی ہے یعنی اس نے گمراہ کیا جبلا کا معنی مخلوق ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی جموعا کثیرہ ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی امما کثیرہ ہے معنی سب کا ایک ہی ہے۔ اہل مدینہ اور عاصم نے جِبِلًّا پڑھا ہے ابو عمرو اور ابن عامر نے جُبلا پڑھا ہے باقی قراء نے جُبُلا پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری، ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمر، عبداللہ بن عبید اور نضر بن انس نے اسے مشدد پڑھا ہے یہ پانچ قراءتیں ہیں۔ مہدوی اور ثعلبی نے کہا: سب لغتیں خَلق کے معنی میں ہیں۔ نحاس نے کہا: سب سے واضح پہلی قراءت ہے اس پر دلیل یہ ہے کی سب نے اتفاق کیا ہے کہ انہوں نے وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (الشعرا) پڑھا ہے تو جبلا، جبلة کی جمع ہے سب کا اشتقاق ایک ہے، اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا فرمایا۔ اس میں چھٹی قراءت بھی ذکر کی گئی ہے وہ ہے جِبلا ضحاک سے یہ مروی ہے کہ ایک جبل سے مراد ستر ہزار افراد ہیں کثیر سے مراد ہے کہ جس کا شمار اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی بھی نہیں کر سکتا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ کیا تم شیطان کی عداوت کو نہیں جانتے اور تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب ہے جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے یہ وہ جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تو تم نے اسے جھٹلایا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ انسانوں، جنوں، اولین و آخرین کو ایک میدان میں جمع کرے گا پھر جہنم کی گردن مخلوقات پر جھانکے گی تو وہ ان سب کو گھیر لے گی پھر ایک منادی کرنے والا منادی کرے گا: هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ اس موقع پر لوگ اپنے گھٹنوں کے بل جھک جائیں گے ہر حاملہ اپنا حمل گرا دے گی اور ہر دودھ پلانے والی اپنے بچے سے غافل ہو جائے گی، تو لوگوں کو نشے کی حالت میں دیکھے گا جبکہ وہ نشے کی حالت میں نہیں ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے''۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝ وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝

''آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان بدکاریوں پر جو وہ کمایا کرتے تھے۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان کی آنکھوں کا نشان تک محو کر دیتے پھر وہ راستہ کی طرف دوڑ کر آتے بھی تو ان اندھوں کو راستہ کیسے نظر آتا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 27

انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے ان کی جگہوں پر وہ نہ آگے جاسکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں تو کمزور کر دیتے ہیں اس کی طبعی قوتوں کو پھر کیا یہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے''۔

صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے پوچھا: ''کیا تم جانتے ہو کس وجہ سے میں ہنسا ہوں؟'' ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''بندہ اپنے رب سے جس انداز میں خطاب کرتا ہے اس وجہ سے میں ہنسا ہوں بندہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! کیا تم نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیوں نہیں۔ بندہ عرض کرتا ہے: میں اپنے سوا کسی کو اپنے اوپر گواہ جائز نہیں جانتا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: آج تجھ پر تیرا نفس اور کراما کاتبین ہی گواہ کافی ہیں۔ فرمایا: اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی تو اس کے اعضاء سے کہا جائے گا: بول تو وہ عضو اس کے اعمال کے بارے میں بات کرے گا پھر اس کے اور ان کی گفتگو کے درمیان رکاوٹیں ختم کر دی جائیں گی تو وہ اعضاء کو کہے گا: تمہارے لیے ہلاکت ہو کیا میں اس لیے تمہاری حفاظت کرتا رہا؟''(1)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت مروی ہے اس میں ہے ''پھر اسے کہا جائے گا: اب ہم تم پر کوئی گواہ لاتے ہیں، وہ اپنے بارے میں سوچ و بچار کرے گا مجھ پر کون گواہی دے گا؟ تو اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اس کی ران اس کا گوشت اور اس کی ہڈیوں سے کہا جائے گا: بول تو اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال کے بارے میں بتائیں گی۔ یہی وہ شخص ہے جو گناہ کیا کرتا تھا، یہی منافق تھا اور یہی وہ شخص ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا''۔

امام ترمذی نے حضرت معاویہ بن حیدہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ فرمایا اور فرمایا: ''یہاں سے لے کر وہاں تک تمہیں سوار اور پیدل جمع کیا جائے گا تمہیں قیامت کے روز کھینچا جائے گا تمہارے مونہوں پر چھینکے ہوں گے تم سترویں امت کو پورا کرو گے تم ان میں سے بہترین ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے معزز ہو، تمہارے اعضاء میں سے سب سے پہلے جو اظہار کرے گی وہ اس کی ران ہوگی''۔ دوسری روایت میں ''اس کی ران اور اس کی ہتھیلی ہوگی''۔ فدام سے مراد وہ کپڑا ہے جو کوزے اور لوٹے کے اوپر باندھا جاتا ہے؛ یہ لیث نے کہا۔

ابو عبیدہ نے کہا: یعنی انہیں گفتگو سے روک دیا جائیگا یہاں تک کہ ان کی رانیں گفتگو کریں گی۔ تو گفتگو سے روکنے کے عمل کو اس کپڑے سے تشبیہ دی گئی ہے جسے لوٹے پر باندھا جاتا ہے منہ پر مہر لگانے کی چار وجوہ ذکر کی گئی ہیں: (1) انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! اے ہمارے رب ہم شرک کرنے والے نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مونہوں پر مہریں لگا دیں یہاں تک کہ ان کے اعضاء نے گفتگو کی؛ یہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کا قول ہے۔

(2) اہل موقف انہیں پہچان لیں اور ان سے ممتاز ہو جائیں گے؛ یہ ابن زیاد کا قول ہے۔

(3) غیر ناطق کا اقرار اس کے اقرار سے دلیل میں یہاں بلیغ ہوتا ہے جو گفتگو کر سکتا ہو کیونکہ اس کی گفتگو معجزہ کے حکم میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، جلد 2، صفحہ 409

ہوتی ہے اگرچہ اس دن کسی معجزہ کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

(4) تا کہ وہ خود جان لے کہ اس کے اعضاء اس کے بارے میں مددگار تھے تو وہ اس کے رب کے حق میں گواہ ہو گئے

اگر یہ سوال کیا جائے: یہ کیوں فرمایا: وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ ہاتھ کے اظہار کو کلام اور پاؤں کے اظہار کو گواہی قرار دی؟ اس کا جواب دیا جائے گا: ہاتھ خود عمل کرتا ہے اور پاؤں حاضر ہوتا ہے اور حاضر کا قول غیر پر گواہ ہوتا ہے فاعل کا اپنے بارے میں قول اقرار ہوا کرتا ہے خواہ وہ قول کرے یا عمل کرے اسی وجہ سے ہاتھوں سے جو کچھ صادر ہوگا اس کو قول سے تعبیر کیا اور جو کچھ پاؤں سے صادر ہوا اس کو شہادت کہتے ہیں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس روز منہ پر مہر لگا دی جائے گی اس روز جو ہڈی سب سے پہلے کلام کرے گی وہ بائیں ٹانگ کی ران ہوگی''، یہ ماوردی اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں جو گمان کرتا ہوں کہ انسان کی ہڈی جو سب سے پہلے گفتگو کرے گی وہ اس کی دائیں ران ہوگی؛ یہ بھی مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے ذکر کیا: یہ احتمال موجود ہے کہ اعضاء میں سے پہلے ران گفتگو کرے گی کیونکہ وہ گناہوں کی لذت کا ادراک ان حواس سے کرتا ہے جو اس کے نچلے دھڑ میں ہوتے ہیں ان میں سے ران بھی ہے تو کیونکہ وہ قریب ترعضو ہے اس لیے وہ گواہی دینے میں سب سے پہلے ہوگی کہا: بائیں ران پہلے گواہی دے گی کیونکہ دائیں اعضاء میں شہوت بائیں اعضاء کی بنسبت قوی ہوگی اسی وجہ سے بائیں ران، دائیں ران پر گواہی دینے میں مقدم ہوگی کیونکہ اس میں شہوت کم ہوتی ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: یا اس کے برعکس ہوگا کیونکہ شہوت کا غلبہ ہوگا یا دونوں رانیں اور ہتھیلی اکٹھے گواہی دیں گے کیونکہ اس کے مجموعے سے ہی شہوت اور لذت مکمل ہوتی ہے۔

کسائی نے یوں حکایت بیان کی ہے: طَمَسَ، یَطْمِسُ، یَطْمُسُ اہل لغت کے نزدیک مطموس اور طمس اس اندھے کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں میں شق ہی نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے انہیں ہدایت سے اندھا کر دیا وہ کبھی بھی حق کے راستہ کی طرف ہدایت پانے والے نہیں۔ حضرت حسن بصری اور سدی نے کہا: ہم نے انہیں اندھا بنا کر چھوڑ دیا وہ متردد گھومتے پھرتے ہیں اس کا معنی ہے ہم نے انہیں اندھا بنا دیا وہ اپنے گھروں اور دوسری جگہ اپنے تصرفات کے طریقہ کو نہیں دیکھتے، یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔

پس انہوں نے راستہ کی طرف جلدی کی تا کہ وہ گذر جائیں تو وہ کہاں سے دیکھیں۔ عطا، مقاتل اور قتادہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ہم ان کی گمراہی کی آنکھوں کو پھاڑ دیتے ہم انہیں ان کی گمراہی سے اندھے کر دیتے اور ان کی نظروں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیتے پس وہ ہدایت پا جاتے، اپنی ہدایت کو دیکھ لیتے اور آخرت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 28

کے راستہ کی طرف جلدی کرتے جبکہ ہم نے ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا تو وہ کیسے ہدایت پا سکتے تھے جبکہ ہدایت کی آنکھ ہی بند تھی اور گمراہی پر باقی تھی۔

حضرت عبداللہ بن سلام سے سابقہ گفتگو سے مختلف مروی ہے انہوں نے یہ تاویل کی کہ یہ قیامت کے روز ہوگا کہا: جب قیامت کا دن ہوگا پل کو بچھا دیا جائیگا ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی امت کھڑی ہو جائے تو ان میں سے نیک و بد سب کھڑے ہو جائیں گے وہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے چلیں گے تا کہ وہ پل صراط سے گذر جائیں پھر ایک منادی اعلان کرے گا: چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کھڑی ہو۔ آپ علیہ السلام اور آپ کی امت کھڑی ہوگی تو نیک و گناہگار ان کے پیچھے چل پڑیں گے تو ان کا راستہ وہی ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہوگا باقی ماندہ انبیاء کی حالت بھی ایسے ہی ہوگی؛ نحاس نے یہ ذکر کیا ہم نے اس کا ذکر ''تذکرہ'' میں کیا ہے یہ اسی کے مناسب ہے جو ابن مبارک نے ''رقائق'' میں ذکر کیا ہے اور قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اسود بن اسود نے ایک پتھر اٹھایا جبکہ اس کے ساتھ بنی مخزوم کی ایک جماعت تھی اس نے پتھر اس لیے اٹھایا تھا تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسے پھینکے اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ کو بند کر دیا پتھر کو اس کے ہاتھ کے ساتھ چمٹا دیا نہ اس نے دیکھا اور نہ اس نے ہدایت پائی اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ مطموس اسے کہتے ہیں جس کی پلکوں کے درمیان شق نہ ہو یہ طمس الریح الاثر سے مشتق ہے؛ یہ اخفش اور قتبی نے کہا۔

مسخ سے مراد خلقت کو تبدیل کر دینا ہے اسے پتھر، جماد یا چوپایا بنا دینا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: معنی ہے ہم نے انہیں بٹھا دیا وہ طاقت نہیں رکھتے کہ آگے گزریں اور پیچھے ہٹیں اسی طرح جامع چیز آگے اور پیچھے نہیں ہو سکتی بعض اوقات مسخ انسان کو چوپایا بنانے کی صورت میں ہوتا ہے پھر وہ چوپایا کسی ایسے موقع و محل کی سمجھ نہیں رکھتا کہ جس کا وہ قصد کرے پس وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے نہ آگے بڑھتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے(1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: معنی ہے اگر ہم چاہتے تو ہم ان کے مسکنوں میں ہی انہیں ہلاک کر دیتے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر ہم چاہتے تو ہم اسے اس جگہ پر مسخ کر دیتے جہاں اسنے نافرمانی کی جرأت کی تھی۔ حضرت ابن سلام نے کہا: یہ سب کچھ قیامت کے روز ہوگا اللہ تعالیٰ پل صراط پر سے گذرتے وقت ان کی آنکھوں کو مسخ کر دے گا۔ حضرت حسن بصری، سلمی، زر بن حبیش اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں مکاناتھم جمع کا صیغہ ہے جبکہ باقی نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے ابو حیوہ نے فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا قراءت کی ہے۔ المضی جب میم کے ضمہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہوتا ہے جس کا معنی جانا ہے۔

عاصم اور حمزہ نے نُنَكِّسْهُ پڑھا ہے یہ تنکیس سے مشتق ہے جبکہ باقی قراء نے اسے نَنْكُسْه پڑھا ہے یہ نکست الشیٔ انکسه نکسا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے سر کے بل الٹایا تو وہ الٹ گیا۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ نے اسے اس بڑھاپے کی حالت کی طرف پھیرا جو بچے کی حالت کے مشابہ ہے۔ سفیان نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: جب وہ اسی سال کی عمر کا ہو جاتا ہے تو اس کے جسم میں تبدیلی آجاتی ہے اور اس کی قوت کمزور ہو جاتی ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 353 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 29 3۔ ایضاً

من عاش أخلقتِ الأيامُ جِدَّتَهُ وخانه ثِقَتَاه السَمْعُ والبصرُ(1)

جو آدمی طویل عرصہ تک زندہ رہتا ہے تو ایام اس کی تروتازگی کو بوسیدہ کر دیتے ہیں اور اس کی دو قابل اعتماد چیزیں یعنی قوت سماعت اور قوت بصارت اس کے ساتھ خیانت کرتی ہیں۔

لمبی عمر جوانی کو بڑھاپے، قوت کو ضعف، زیادتی کو نقص میں تبدیل کر دیتی ہے یہی غالب طریقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارذل عمر کی طرف لوٹائے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی (2)۔ سورۂ نحل میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس نے ایسا کیا ہے وہ تمہیں دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے۔ نافع اور ابن ذکوان نے تعلقون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے يَعْقِلُوْنَ پڑھا ہے۔

وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور نہیں سکھایا ہم نے اپنے نبی کو شعر اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے، نہیں ہے یہ مگر نصیحت اور قرآن جو بالکل واضح ہے تا کہ وہ بروقت خبردار کرے اسے جو زندہ ہے اور تا کہ حجت تمام کر دے کفار پر''۔

اس آیت میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے حال کی خبر دی اور کفار کے قول کا رد کیا ہے کہ آپ ﷺ شاعر ہیں اور قرآن شعر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اسی طرح رسول اللہ ﷺ شعر نہیں کہتے تھے اور نہ موزوں کلام کیا کرتے تھے جب آپ کوئی مثال بیان کرنے کے لیے کوئی مصرعہ کہنے کا ارادہ کرتے تھے تو اس کے وزن کو توڑ دیتے آپ صرف معانی کی حفاظت کا اہتمام کرتے تھے اسکی مثال یہ ہے کہ ایک روز آپ ﷺ نے (3) طرفہ کا شعر پڑھا:

سَتُبْدِی لك الأيام ماكنتَ جاهلًا ويأتيكَ من لم تزوّدْه بالأخبار (4)

زمانہ تیرے لیے وہ چیز ظاہر کر دے گا جس سے تو ناواقف تھا اور تیرے لیے وہ خبریں لے آئے گا جس کو تو نے زادِ راہ نہ دیا۔ ایک روز آپ ﷺ نے یہ شعر پڑھا:

ألم تریانی كلما جئت طارقًا وجدتُ بها وان لم تطيّب طيبًا(5)

ایک روز آپ نے یہ شعر پڑھا:

أتجعلُ نَهْبِی ونَهْبَ العبيد بين الأقرعِ وعُيَيْنَه(6)

1۔ الحماسہ، صفحہ 144 مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن

2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب استعاذۃ من ارذل العمر، جلد 2، صفحہ 943

3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 461

4۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان، باب ما جاء فی انشاد الشعر، جلد 2، صفحہ 108

5۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 461

6۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اعطاء المؤلفۃ، جلد 1، صفحہ 339

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاید ہی کبھی صحیح شعر پڑھا ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کا شعر پڑھا:

يَبِيتُ يُجافي جَنْبَهُ عن فراشهِ إذا استثقلت بالمشركين المضاجعُ(1)

اس کا پہلو بستر سے الگ تھلگ رات گزارتا ہے جبکہ بستر مشرکین سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ حضرت حسن بن ابی الحسن نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا:

كَفَى بالإسلام والشيبِ للمرء ناهيا(2)

اسلام اور بڑھاپا انسان کو خبردار کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاعر نے تو کہا ہے:

هريرةَ ودِّعْ إن تجهزْتَ غاديا كَفَى الشيبُ والإسلامُ للمرء ناهيًا

حضرت ابوبکر یا حضرت عمر نے عرض کی: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ خلیل بن احمد سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں شعر سب سے مرغوب کلام تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعر کہتے نہیں تھے۔

**مسئلہ نمبر2**۔ کبھی کبھی صحیح وزن سے کلام کرنا اس امر کو ثابت نہیں کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعر جانتے تھے اس طرح آپ نثر میں سے ایسا کلام کرتے تھے جو موزوں ہوتا جس طرح یوم حنین اور دوسرے مواقع پر فرمایا۔

هل أنت إلا إصبعٌ دَمِيتِ وفي سبيلِ اللهِ مالَقِيتِ(3)

تو تو محض ایک انگلی ہے جو خون آلود ہوئی تو نے اللہ کی راہ مین دشمن سے ملاقات نہیں کی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کہنا:

أنا النبيْ لا كَذِبْ أنا ابن عبدِالمطلبْ(4)

میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں میں ابن عبدالمطلب ہوں۔

آپ قرآن کی آیات اور ہر کلام میں اسی طرح کا انداز اپناتے نہ وہ شعر ہوتا اور نہ ہی اس کے معنی میں ہوتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:92) اللہ تعالیٰ کا فرمان: نصر من الله وفتح قريب۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا:13) اس کے علاوہ کئی اور آیات ہیں۔ ابن عربی نے ان میں سے آیات کا ذکر کیا ہے ان پر گفتگو کی اور وزن سے خارج کیا کہا: ابوالحسن اخفش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد انا النبی لا کذب کے بارے میں کہا: یہ شعر نہیں۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب هجاء المشركين، جلد 2، صفحہ 909

2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 353

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 1، صفحہ 393

4۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب من قاد دابة، جلد 1، صفحہ 401

خلیل نے کتاب ''العین'' میں کہا: جو تجع دو جزءوں میں آئے وہ شعر نہیں ہوتا ان سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ یہ منہوک الرجز (1) میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ منہوک الرجز میں سے نہیں ہوتا مگر جب لا کذب اور عبد المطلب کی باء پر وقف کیا جائے کسی کو یہ معلوم نہیں نبی کریم ﷺ نے کیسے کہا۔ ابن عربی نے کہا: غالب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے لا کذب کی باء کو مرفوع کہا اور عبد المطلب کی باء کو اضافت کی وجہ سے مکسور پڑھا ہے۔

نحاس نے کہا: بعض نے کہا روایت اعراب کے ساتھ ہے جب روایت اعراب کے ساتھ ہو تو وہ شعر نہیں ہوگا کیونکہ وہ جب پہلے بیت کی باء کو فتحہ دیں یا ضمہ دیں یا تنوین دیں اور دوسرے مصرعے کی باء کو کسرہ دیں تو وہ شعر کے وزن سے نکل جائے گا۔ بعض نے کہا: یہ وزن شعر کا نہیں یہ بڑے لوگوں کا مکابرہ ہے کیونکہ عربوں کے اشعار اس وزن پر خلیل اور دوسرے علماء نے روایت کیے ہیں جہاں تک نبی کریم ﷺ کا یہ قول ہے هل أنت إلا اصبعٌ دَميتِ (2) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ بحر سریع میں سے ہے یہ اس وقت ہوگا جب تو دمیت کی تاء کو کسرہ دے اگر اسے ساکن پڑھا جائے تو کسی صورت میں بھی شعر نہیں ہوگا کیونکہ اس حقیقت پر دونوں کلمے فعول کا وزن ہوتا ہے جبکہ بحر سریع میں فعول کا کوئی دخل نہیں شاید نبی کریم ﷺ نے اسے تاء ساکنہ یا تاء متحرکہ کی اتباع کے بغیر کہا ہو۔ انفعال کی صورت میں اعتماد اس پر ہوگا کہ اسے شعر تسلیم کر لیا جائے اور اعتراض ساقط ہو جاتا ہے اس سے پھر بھی لازم نہیں آتا کہ نبی کریم ﷺ شعر کا علم رکھتے تھے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ آپ شاعر تھے بیت نزر کی شکل اختیار کرنا اور رجز وغیرہ کے دو قافیوں کا پانا اس امر کو ثابت نہیں کرتا کہ اس کا قائل شعر کو جانتا ہے۔ اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اسے شاعر نہیں کہتے جس طرح کوئی آدمی ایک دفعہ کپڑا سی لے تو اسے خیاط نہیں کہتے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا کہ وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ کا معنی ہے کہ ہم نے اسے شاعر نہیں بنایا یہ اس کے مانع نہیں کہ آپ ﷺ کو شاعر کہیں۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ہے یہ اس میں سے بہترین گفتگو ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر کی تعلیم نہیں دی مگر اس کی خبر نہیں دی کہ آپ شعر نہ کہیں یہی کلام کا ظاہر معنی ہے اس میں ایک واضح قول کیا گیا ہے۔ قول کرنے والے نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ اہل لغت کا اجماع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے کہا ہے: جس نے کوئی موزوں کلام کیا جس کے ساتھ وہ شعر کا قصد نہیں کرتا تھا تو وہ شعر نہیں ہوتا وہ شعر کے موافق ہوتا ہے، یہ واضح قول ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے جس چیز کی نفی کی ہے وہ شعر اس کے اصناف قوافی کے علم کی نفی ہے اور اس کے ساتھ متصف ہونے کی نفی کی ہے۔ سرور دو عالم ﷺ اس کے ساتھ متصف نہ تھے کیا تم دیکھتے نہیں کہ قریش آپس میں مشورہ کرتے تھے کہ موسم حج کے موقع پر جب عرب ان کے پاس آئیں گے تو وہ انہیں کیا کہیں گے؟ بعض نے کہا: ہم کہیں گے وہ شاعر ہے؛ ان میں سے بعض ذہین لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! عرب تم کو جھٹلا دیں گے کیونکہ وہ شعر کی اصناف کو خوب سمجھتے ہیں اللہ کی قسم! ان کا کلام تو شعروں میں سے کسی کے بھی مشابہ نہیں اور نہ ہی ان کا قول شعر ہے۔ حضرت انیس جو حضرت ابوذر کے بھائی تھے کہا: تحقیق میں نے ان کے کلام کو

---

1۔ بحر رجز کے دو ثلث (دو تہائی) کو حذف کرنا بقیہ کو منہوک کہتے ہیں۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب من ينكب، جلد 1، صفحہ 393

شعر کی اصناف پر پیش کیا تو یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ شعر ہے؛ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت انیس عربوں کے عمدہ شاعر تھے۔ اسی طرح عتبی بن ربیعہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کی تو کہا: اللہ کی قسم! وہ شعر نہیں، وہ کہانت نہیں، وہ جادو نہیں جس کی وضاحت سورۂ فصلت میں انشاء اللہ آئے گی اس کے علاوہ بھی عرب کے فصحاء اور بلغاء نے یہی کہا ہے۔ زبان پر جو کلام موزوں جاری ہوتا ہے اسے شعر نہیں کہتے اس موزوں کلام کو شعر شمار کیا جاتا ہے جو شعر کے وزن پر ہو اور شعر کا قصد بھی کیا جائے کوئی کہنے والا کہتا ہے: ایک بزرگ نے ہمیں بیان کیا ینادی یا صاحب الکسائی۔ اسے شعر شمار نہیں کیا جاتا۔ ایک آدمی اپنی مرض میں یوں ندا کیا کرتا تھا: اذھبوابی الی الطبیب وقولوا قد اکتوی یہ کوئی شعر نہیں۔

**مسئلہ نمبر3**۔ ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ ان سے شعر کہنے کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: زیادہ شعر نہ کہا کرو اس کا عیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنے پاس شعراء کو جمع کرو اور ان سے شعر کے بارے میں پوچھو کیا ان کے ہاں شعر کی پہچان باقی ہے؟ حضرت ابوموسیٰ نے لبید کو حاضر کیا کہا: اس نے انہیں جمع کیا اور ان سے پوچھا انہوں نے کہا: ہم شعر پہچانتے ہیں اور ہم شعر کہتے ہیں، انہوں نے لبید سے سوال کیا تو لبید نے کہا: جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کا کلام: الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ سنا میں نے شعر نہیں کہا۔ ابن عربی نے کہا: یہ آیت شعر کا عیب نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ (عنکبوت: 48) کتابت کے عیب میں سے نہیں ہے جب امیت خط کے عیب میں سے نہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شعر کی نفی شعر کا عیب نہیں۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ مامون نے ابوعلی منقری سے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو امی ہے تو شعر صحیح نہیں کہہ سکتا اور تو غلطی کر جاتا ہے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! جہاں تک غلطی کا تعلق ہے بعض اوقات سبقت لسانی سے ایسا ہو جاتا ہے جہاں تک امی ہونے اور شعر کو توڑ دینے کا تعلق ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تو نہیں لکھتے تھے اور شعر درست نہیں پڑھتے تھے تو مامون نے کہا: میں نے تجھ سے تین عیبوں کے بارے میں پوچھا تھا تو نے چوتھے کا اضافہ کر دیا ہے وہ جہالت ہے اے جاہل! جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس وصف کا تعلق ہے وہ فضیلت ہے جبکہ تجھ میں اور تیرے جیسے دوسرے افراد میں نقص ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے روکا گیا تھا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک تہمت کو ختم کیا جائے شعر اور کتابت میں کسی عیب کی وجہ سے ایسا نہیں کیا گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر4**۔ شعر کہنا آپ کے لیے مناسب نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامات میں سے ایک علامت بنایا ہے تاکہ جن کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معبوث کیا گیا ہے انہیں اشتباہ نہ ہو تو اس سے یہ گمان پیدا نہ ہو کہ آپ قرآن پر اس لیے قوی تھے کیونکہ آپ کو شعر کہنے کی قوت حاصل ہے ملحد کو اس بنا پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں کہ قرآن حکیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں وزن اتفاقاً پایا جا رہا ہے کیونکہ جس کا وزن شعر کے وزن کے موافق ہے جبکہ شعر کا قصد نہیں کیا تو وہ شعر نہیں ہوتا تو عام لوگوں میں سے جو بھی موزون کلام کرتا وہ شعر ہوتا جبکہ لوگ اسے شاعر نہیں کہتے، جس کی وضاحت پہلے

گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے کسی کا شعر دہرانا اور اپنی جانب سے شعر کہنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسان نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تم پر تلاوت کرتے ہیں وہ ذکر اور قرآن حکیم ہے۔

حَیًّا سے مراد دل کا زندہ ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: حَیًّا سے مراد دانشمند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈرائیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مومن ہے۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوگی جب تاء کے ساتھ قراءت ہو اور خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو۔ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں فعل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف لوٹے گا یا فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن حکیم کی طرف منسوب ہوگا۔ ابن سمیقع سے لِیُنْذَرَ مروی ہے۔ وَیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ۝ یعنی کافروں پر قرآن کے ذریعے حجت ثابت ہو چکی ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ۝ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا یَاْكُلُوْنَ۝ وَ لَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ۝

"کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے پیدا فرمائے ان کے لیے اس مخلوق سے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی مویشی پھر اب یہ ان کے مالک ہیں۔ اور ہم نے تابعدار بنا دیا انہیں ان کا پس ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کے لیے ان مویشیوں میں اور بھی کئی منفعتیں ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے"۔

آیت میں رؤیت سے مراد دل کا دیکھنا ہے یعنی کیا وہ نظر و فکر نہیں کرتے، عبرت حاصل نہیں کرتے اور سوچ و بچار نہیں کرتے ان اعمال میں جو ہم نے بغیر مثال کے کیے ہیں اور واسطہ، وکالت اور شراکت کے بغیر کیے ہیں مِّمَّا میں ما، الذی کے معنی میں ہے ضمیر عائد اسم کی طوالت کی وجہ سے حذف کر دی گئی اگر ما کو مصدریہ بنایا جائے تو ضمیر حذف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انعام یہ نعم کی جمع ہے اور نعم مذکر ہے۔ اب یہ لوگ ان جانوروں کے مالک ہیں اور ان پر غالب ہیں (1)۔ ہم نے ان جانوروں کو ان کے لیے مسخر کیا ہے (2) یہاں تک کہ ایک بچہ بڑے اونٹ کی مہار کو پکڑ کر چلتا ہے، اسے مارتا ہے جیسے چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے اور اس کی طاعت سے نہیں نکلتا ان جانوروں میں سے کچھ ایسے ہیں جن پر سواری کی جاتی ہے رکوب کی عام قراءت راء کے فتحہ کے ساتھ ہے جس طرح حلوب محلوب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اعمش، حسن بصری اور ابن سمیقع نے رُکوبھم پڑھا ہے یعنی راء مضموم ہے اور مصدر ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے اسے رکوبتھم پڑھا ہے ان کے مصحف میں بھی ایسا ہے۔ رکوب اور رکوبۃ کا معنی ایک ہی ہے جس طرح حلوب اور حلوبہ، حمول اور حمولہ۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 27 2۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 292

نحوی کوفیوں نے حکایت بیان کی ہے کہ عرب کہتے ہیں: امراۃ صبور، شکور اس کے آخر میں ھاذ کر نہیں کرتے وہ کہتے ہیں شاۃ حلوبۃ، ناقۃ رکوبۃ کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اس امر میں فرق کریں کہ کس کا فعل ہے اور کس پر فعل واقع ہو رہا ہے؟ فاعل سے انہوں نے ھاء کو حذف کر دیا ہے اور مفعول میں اسے ثابت رکھا جس طرح شاعر نے کہا:

فیها اِثنتانِ وأربعون حَلُوبَةً ‏ سُودًا کخافیةِ الغرابِ الأسْحَمِ(1)

''ان میں بیالیس ایسی اونٹنیاں ہیں جنہیں دوہا گیا ہے وہ سیاہ رنگ کی ہیں جس طرح سیاہ کوے کے پر ہیں''۔ اس تعبیر کی بنا پر رکوبتھم ہونا واجب ہے۔ جہاں تک بصریوں کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں: ھاء تانیث نسبت کی وجہ سے حذف ہے۔ پہلے قول کی دلیل وہ ہے جو جرمی نے ابوعبیدہ سے نقل کی ہے کہا: رکوبۃ یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے ہے اور رکوب صرف جمع کے لیے ہے اس تعبیر کی بنا پر یہ جمع کے مذکر ہونے کے لیے ہے۔ ابوحاتم نے گمان کیا: فَمِنْهَا رُكُوبُهُمْ راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں کیونکہ وہ مصدر ہے اور رکوب اسے کہتے ہیں جس پر سوار ہوا جاتا ہے، فراء نے اسے جائز قرار دیا ہے یعنی راء کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے جس طرح تو کہتا ہے: فمنها اُکلهم ومنها شُربهم ان میں سے کچھ ان کا کھانا ہے اور ان میں سے کچھ ان کا مشروب ہے اور ان کے گوشت تم کھاتے ہو ان کے کئی اور منافع بھی ہیں یعنی اون، بال وغیرہ ان کی چربیاں اور گوشت وغیرہ۔ مشارب سے مراد ان کے دودھ ہیں (2)۔ یہ منصرف نہیں کیونکہ دونوں جمع ہیں واحد میں ان کی کوئی مثال نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر بجا نہیں لاتے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٦﴾

''اور ان ظالموں نے بنا لیے ہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور خدا کہ شائد وہ ان کی مدد کریں۔ یہ جھوٹے خدا نہیں مدد کر سکتے ان کی اور یہ کفار ان معبودوں کے لیے تیار شدہ لشکر ہیں۔ پس نہ رنجیدہ کرے آپ کو اے حبیب! ان کا قول، ہم خوب جانتے ہیں جس بات کو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں''۔

ان لوگوں نے ہماری قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھا ہے پھر انہوں نے ہمیں چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی فعل پر قدرت نہیں رکھتے جبکہ وہ ان کی اس وقت مدد کی امید رکھتے ہیں اگر ان پر عذاب نازل ہو عرب یوں کلام کرتے ہیں لعله ان یفعل جبکہ وہ معبودان باطلہ ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے۔ بتوں کے لیے فعل واو نون کے ساتھ جمع ذکر کیا ہے کیونکہ ان کے بارے میں خبر دی گئی ہے جس طرح انسانوں کے بارے میں خبر دی جاتی ہے۔

جبکہ کفار ان جھوٹے معبودوں کے حاضر لشکر ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ان معبودوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں (3)۔ قتادہ نے کہا: کفار دنیا میں ان کے لیے غضبناک ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: کفار ان معبودوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کرتے ہیں پس کفار ان کے لیے لشکر کے حکم میں ہوتے ہیں جبکہ یہ

1۔ دیوان عنترہ، صفحہ 12 ‏ 2۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 293 ‏ 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 357

معبودان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ تینوں قول قریب المعنی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: معبودان باطلہ، اپنے عبادت گذاروں کے لشکر ہوں گے ان کے ساتھ جہنم میں حاضر ہوں گے ان میں سے بعض کا دفاع نہیں کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے بت جہنم میں ان کفار کے خلاف اللہ تعالیٰ کے لشکر ہوں گے کیونکہ یہ بت ان مشرکوں پر لعن طعن کریں گے اور ان کی عبادت سے براءت کا اظہار کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معبودان باطلہ ان کے لشکر ہوں گے قیامت کے روز انہیں حاضر کیا جائیگا تاکہ یہ بت ان کے گمانات میں ان کی مدد کریں۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''یہ قوم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی عبادت کیا کرتی تھی اسے ایک مثالی صورت دی جائیگی وہ قوم جہنم کی طرف اس معبود کے پیچھے پیچھے چلے گی پس وہ کفار ان کے حاضر لشکر ہوں گے''۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کا معنی جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ترمذی شریف میں ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ قوموں کو کھلے میدان مین جمع کرے گا پھر اللہ رب العالمین ان کی طرف جھانکے گا ارشاد فرمائے گا: خبردار! ہر انسان اس کے پیچھے چلے جس کی وہ عبادت کیا کرتا تھا، صلیب کی پوجا کرنے والے کے لیے صلیب کو مثالی صورت دی جائے گی، تصاویر کی پوجا کرنے والے کے لیے تصویر کو مثالی صورت دی جائیگی اور آگ کی پرستش کرنے والے کے لیے آگ کو مثالی صورت دی جائے گی تو جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے وہ ان کے پیچھے چلیں گے اور مسلمان باقی رہ جائیں گے(1)'' اور طویل حدیث ذکر کی۔

اے محبوب! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گفتگو غمگین نہ کرے یَحْزُنْكَ کو مجرد سے معروف پڑھنا یہ فصیح لغت ہے عربوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: یُحزنك اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے یعنی ان کا یہ کہنا: وہ شاعر ہے، جادوگر ہے تجھے غمگین نہ کرے گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا فرمایا: اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ قول و عمل کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ ظاہر کرتے ہیں پس ہم اس کے مطابق انہیں بدلہ دیں گے۔

اَوَ لَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝

''کیا انسان اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پس اب وہ ہمارا کھلا دشمن بن بیٹھا ہے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انسان سے مراد عبداللہ بن ابی ہے(2)۔ سعید بن جبیر نے کہا: وہ عاصی بن وائل سہمی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ ابی بن خلف جمحی ہے؛ یہ ابن اسحاق کا قول ہے۔ ابن وہب نے اسے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

نطفہ سے مراد تھوڑا سا پانی ہے نطف سے مراد ہے جب وہ ٹپکائے۔ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝ سے مراد ہے(3) وہ خصومت میں

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، باب ماجاء فی خلود أهل الجنة وأهل النار، جلد 2 صفحہ 79، ایضاً، حدیث 2480، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن للطبری، جز 23 صفحہ 38 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5 صفحہ 33

جدال کرنے والے اور حجت کو بیان کرنے والا ہے، اس سے یہ مراد ہے کہ بعد اس کے کہ وہ قابل ذکر چیز نہ تھا اب جھگڑنے والا اور حجت کو بیان کرنے ولا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں ایک پرانی ہڈی لایا اس نے کہا: اے محمد! کیا تیری یہ رائے ہے کہ اس ہڈی کے بوسیدہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں اللہ تعالیٰ تجھے زندہ کرے گا اور تجھے جہنم میں داخل کرے گا☆'' تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۞ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۞

''اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لیے عجیب وغریب مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا ہے اپنی پیدائش کو، گستاخ کہتا ہے: اجی! کون زندہ کرسکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہوچکی ہوں؟ آپ فرمائیے: اے گستاخ! سن زندہ فرمائے گا انہیں وہی جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو خوب جانتا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وہ بھول گیا کہ ہم نے اسے مردہ نطفہ سے پیدا کیا اور ہم نے اس میں زندگی کو رکھ دیا یعنی اس کی ذات میں ہی جواب موجود ہے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں اللہ تعالیٰ تجھے اٹھائے گا اور تجھے جہنم میں داخل کرے گا(1)'' اس میں قیاس کی صحت پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منکرین بعث کے خلاف پہلی دفعہ پیدا کرنے سے استدلال کیا ہے۔

رَمِيْمٌ کا معنی بوسیدہ ہے یوں جملہ بولا جاتا ہے: رَمَّ العظمُ فهو رَمِيمٌ و رِمَام۔ رمیم فرمایا رمیمہ نہیں کہا کیونکہ یہ فاعلۃ سے معدول ہے جو کلمہ اپنے وزن سے معدول ہو اسے اعراب سے بھی پھیر دیا جاتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۞ (مریم) بَغِيًّا کے آخر سے یاء کو گرا دیا کیونکہ اسے باغیۃ سے پھیرا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کافر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا: بتایئے اگر میں اسے پیس دوں اور ہوا میں بکھیر دوں کیا اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندے کرے گا(2)؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی فرما دیجئے: وہ ذات اسے زندہ کرے گی جس نے اسے پہلی بار بغیر مثال کے پیدا کیا تو وہ دوبارہ کسی شے کو پیدا کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے(3) وہ شے عَجْمُ الذَّنَب ہے اسے عَجْبُ الذَّنَب بھی کہتے ہیں۔ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۞ وہ ہر چیز کو جانتا ہے یعنی کیسے اسے پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور کیسے اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے(4)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ ہڈیوں میں زندگی ہے اور موت کے ساتھ وہ ناپاک ہوجاتی ہیں؛ یہ امام ابوحنیفہ اور بعض اصحاب شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: ہڈی میں کوئی زندگی نہیں۔ یہ بحث سورۂ نحل میں پہلے گذر چکی ہے۔

اگر یہ کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ سے مراد اصحاب عظام لیے ہیں اور مضاف الیہ کا مضاف کی جگہ واقع ہونا

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 553 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 33 4۔ ایضاً ☆تفسیر طبری، الدرالمنثور

لغت میں بہت زیادہ ہے اور شریعت میں بھی موجود ہے۔

ہم کہتے ہیں: یہ اس وقت ہوتا ہے جب ضرورت ہو جبکہ یہاں کوئی ضرورت نہیں جو اس اضمار کا باعث ہو یہاں تک کہ اس تقدیر کلام کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے اور وہ اس پر قادر ہے حقیقت اس کی گواہی دیتی ہے کیونکہ احساس جو زندگی کی علامت ہے اس میں موجود ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؔ بَلٰی ۗ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''جس نے اپنی حکمت سے رکھ دی تمہارے لیے سبز درختوں میں آگ پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو۔ کیا وہ قادر مطلق جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو قدرت نہیں رکھتا کہ پیدا کر سکے ان جیسی چھوٹی سے مخلوق بے شک وہ ایسا کر سکتا ہے اور وہی پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے پس۔ وہ ہر عیب سے پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائیگا''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر متنبہ فرمایا اور مردوں کو زندہ کرنے کے ساتھ اپنی کمال قدرت پر دلیل قائم کی ان چیزوں سے جنہیں وہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ تر لکڑی سے ایسی چیز نکالی جو جلانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور خشک ہوتی ہے اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ کافر نے کہا: نطفہ زندگی کی طبعیت کی وجہ سے گرم تر ہے اور ہڈی موت کی طبیعت کی بنا پر ٹھنڈی اور خشک ہے تو اس سے زندگی کیسے نکلتی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا کہ سرسبز درخت پانی سے جنم لیتا ہے پانی ٹھنڈا تر ہے جو آگ کی ضد ہے یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں اللہ تعالیٰ نے اس سے آگ کو پیدا کیا تو وہ اس پر قادر ہے کہ ضد کو ضد سے نکالے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس سے مراد مَرْخ اور عَفَار میں جو آگ ہے، یہ عربوں کی زنادہ ہے؛ اسی سے ان کا قول ہے: فی كل شجر نار و اسْتَمْجَدَ المَرْخُ والعَفَار۔(1) ہر درخت میں آگ ہے مرخ اور عفار نے خوب حصہ لیا عفار کو زند کہتے ہیں یہ اوپر والی لکڑی ہے مرخ زندہ ہے یہ نیچے والی لکڑی ہے؛ دونوں سے دو ٹہنیاں لی جاتی ہیں جس طرح دو مسواک ہوتے ہیں دونوں پانی گرا رہی ہوتی ہیں ایک کو دوسری کے ساتھ رگڑا جاتا ہے تو ان دونوں سے آگ نکلتی ہے۔

**الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ** فرمایا الخضراء نہیں فرمایا جبکہ یہ جمع ہے(2) کیونکہ اسے (الأخضر) کے لفظ کی طرف پھیرا گیا ہے۔ عربوں میں سے کچھ یہ بھی کہتے ہیں: الشجر الخضراء جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝ فَمَالِئُوْنَ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 31　　2۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 295

مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ (الواقعہ) پھر اللہ تعالیٰ نے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ، مثلهم سے مراد بعث کا انکار کرنے والوں کی مثل ہے سلام، ابو منذر اور یعقوب حضرمی نے یَقْدِرُ علی ان یخلق مثلهم پڑھا ہے کہ یقدر فعل ہے۔ بَلٰى: کیوں نہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق ان کو پیدا کرنے سے بہت بڑھ کر ہے وہ ذات پاک جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ انہیں دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ وہ خلاق وعلیم ہے حضرت حسن بصری نے اسے خالق پڑھا ہے(1)۔

کسائی نے فیکون نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا عطف یقول پر ہے یعنی جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مشقت وتھکاوٹ کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی عجز وانکساری سے پاکی بیان کی ہے ملکوت اور ملکوتی عربوں کے کلام ہیں ملک کے معنی میں ہے عرب کہتے ہیں: جبروتی خیر من رحموتی۔ میرا جبروت، میرا رحموت سے بہتر ہے۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد ہر شے کی چابیاں ہیں۔ طلحہ بن مصرف، ابراہیم تیمی اور اعمش نے اسے ملکة پڑھا ہے یہ ملکوت کے معنی میں ہے مگر یہ مصحف کے خلاف ہے۔

وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ تمہاری موت کے بعد اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا عام قراءت تاء کے ساتھ ہے اور خطاب کا صیغہ ہے۔ سلمی، زر بن جیش اور حضرت عبداللہ کے شاگردوں نے یرجعون پڑھا ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 6-5، صفحہ 295

# سورۃ الصافات

آیاتھا ۱۸۲ ۳۷ سورۃ الصّٰفّٰت مکیۃ ۵۶ رکوعاتھا ۵

تمام کے قول میں یہ سورت مکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۭ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۭ

"قسم ہے (مقام نیاز میں) پرے باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی، پھر خوب جھڑ کنے والوں کی، پھر قرآن کی تلاوت کرنے والوں کی کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور مالک ہے مشرقوں کا"۔

ان تین آیات کی جو قراءت مروج ہے یہی اکثر قراء کی قراءت ہے۔ حمزہ نے ان میں ادغام کے ساتھ قراءت کی ہے یہ وہ قراءت ہے جب امام احمد بن حنبل نے اسے سنا تو اسے ناپسند کیا۔ نحاس نے کہا: تین وجوہ سے لغت عربی میں یہ بعید ہے: (1) تاء صاد کے مخرج میں سے نہیں، زاء کے مخرج میں سے نہیں، ذال کے مخرج میں سے نہیں نہ ہی ان کے اخوات کے مخرج میں سے ہے اس تاء کی اخت، طاء اور دال ہے زاء کی اخت، صاد اور سین ہے ذال کی اخت، ظاء اور ثاء ہے۔ (2) تاء ایک کلمہ میں ہے اور دوسرے حروف دوسرے کلمہ میں ہیں۔ (3) جب تو انہیں جمع کرے گا تو تو دو کلموں کے دو ساکنوں کو جمع کریگا اس جیسی صورت میں دو ساکنوں کو اس وقت جمع کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ دونوں ایک کلمہ میں ہوں جس طرح دابۃ، شابۃ۔

حمزہ کی قراءت کے جواز کی صورت یہ بنتی ہے کہ تاء ان حروف کا قریب المخرج ہے الصّٰٓفّٰتِ یہ قسم ہے یہاں واؤ، باء کا بدل ہے معنی ہے صافات کے رب کی قسم فَالزّٰجِرٰتِ کا اس پر عطف ہے۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ یہ جواب قسم ہے کسائی نے قسم میں ان کے ہمزہ کو فتحہ دینا جائز قرار دیا ہے الصافات سے لے کر التالیات تک سے مراد فرشتے ہیں (1)؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ فرشتے آسمان میں اسی طرح صف باندھتے ہیں جس طرح دنیا میں مخلوقات نماز کے لیے صفیں باندھتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ فضا میں اپنے پروں کو صف در صف کیے ہوتے ہیں (2) وہ فضا میں کھڑے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس چیز کا حکم دیتا ہے جو وہ ارادہ فرماتا ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح غلام اپنے مالکوں کے سامنے صفیں بنائے کھڑے ہوتے ہیں۔

1۔ المستدرک مع التلخیص، جلد 2، صفحہ 429
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 36

حضرت حسن بصری نے کہا: مراد ہے وہ اپنے رب کے حضور نماز کے لیے صفیں بناتے ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: صافات سے مراد پرندے ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ (الملک: 19) صف کا معنی ہے جمیعت کو ایک لائن میں ترتیب دینا جس طرح نماز میں صف باندھی جاتی ہے۔ الصافات اس کی جمع ہے یہ کہا جاتا ہے: جماعۃ صافۃ پھر اس کی جمع صافات بنائی جاتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: الصّٰفّٰتِ سے مراد مومنوں کی جماعت ہے (1) جب وہ نماز یا جہاد میں صف میں کھڑے ہوتے ہیں؛ یہ امام قشیری نے ذکر کیا ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، مسروق اور دوسرے علماء کے نزدیک فَالزّٰجِرٰتِ سے مراد فرشتے ہیں انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ بادلوں کو جھڑکتے ہیں اور انہیں ہانکتے ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے یا اس لیے کیونکہ نصیحتوں کے ذریعے معاصی سے جھڑکتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد قرآن کے زواجر ہیں۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے ہیں؛ یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، مجاہد، جبیر اور سدی کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت جبریل امین علیہ السلام ہیں جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ فرشتوں میں سے سب سے بڑے ہیں تو وہ لشکروں اور متبعین سے خالی نہیں ہوتے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ تمام افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قرآن اور اس کی کتابوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد قرآن کی آیات ہیں، آیات کی صفت تلاوت سے اسی طرح لگائی گئی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ (نمل: 76) قرآن کی آیات کو تالیات کہنا اس لیے بھی جائز ہے کیونکہ بعض حروف بعض کے پیچھے ہوتے ہیں؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے یہ ذکر کیا ہے کہ تالیات سے مراد انبیاء ہیں جو وحی کو اپنی اپنی امت کی طرف تلاوت کرتے ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ صفات میں فاء عاطفہ کس حیثیت سے آئی ہے؟ اسے کہا جائے گا: یا تو یہ وجود (پائے جانے) میں معانی کی ترتیب پر دلالت کرتا ہے جس طرح یہ شعر ہے:

يَالَهفَ زَيَابَةَ لِلحَارِثِ الصَابِحِ فَالغَانِمِ فَالآيِبِ (3)

''زیابہ کا حارث کے لیے افسوس جس نے صبح کے وقت حملہ کیا غنیمت حاصل کی اور صحیح وسالم واپس لوٹ گیا''۔ یا بعض اعتبارات سے باہم فرق کی بنا پر انہیں مرتب کرنے کا فائدہ دیتا ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے: خذ الافضل فالاکمل۔ و اعمل الاحسن والاجمل۔ افضل کو پھر اکمل کو لو۔ احسن پھر اجمل کام کرو یا صفات کے موصوفات میں ترتیب ثابت کرنے کا فائدہ دیتا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: رحم اللہ المحلقین فالمقصرین (4) حلق کرانے والوں پر رحم فرما پھر قصر کرانے والوں پر رحم فرما۔ ان تین قوانین کی بناء پر صفات میں فاء عاطفہ لایا جاتا ہے؛ یہ زمخشری کا قول ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 36
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 358
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 34
4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تفضیل الحلق علی التقصیر، جلد 1، صفحہ 420

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ یہ جواب قسم ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے کفار نے کہا: تو تمام معبودوں کو ایک معبود بناتا ہے وہ ایک خدا تمام مخلوقات کو کیسے کافی ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے عظمت و شان کو ظاہر کرنے کے لیے ان صفات کے ساتھ قسم اٹھائی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن انباری نے کہا: یہاں پر وقف کرنا اچھا ہے پھر رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے تو ابتدا کرے معنی یہ ہوگا وہ آسمانوں کا رب ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خبر کے بعد خبر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد سے بدل ہو۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں صورتوں میں لواحد پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ اخفش نے رب السموات و رب المشارق پڑھا ہے اس صورت میں یہ ان کے اسم کی صفت ہوگی یعنی آسمان اور زمین کا خالق اور ان لوگوں کا مالک۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت الوہیت اور کمال قدرت کو بیان فرمایا کہ وہ رب السموات والارض یعنی ان کا خالق و مالک ہے۔

وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝ یعنی سورج کے مطالع کا مالک۔ حضرت ابن عباس نے کہا: سورج کا ہر روز ایک مشرق اور مغرب ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کے مطلع کے لیے تین سو پینسٹھ روشن دان بنائے ہیں اسی طرح مغرب میں دنوں کی تعداد کے مطابق غروب ہونے کے لیے روشن دان بنائے ہیں ہر روز ان میں سے ایک روشن دان سے وہ طلوع ہوتا ہے اور ایک روشن دان میں غائب ہوتا ہے۔ وہ اگلے سال اسی روشن دان سے طلوع ہوتا ہے وہ طلوع نہیں ہوتا مگر مجبوری کے عالم میں ہی طلوع ہوتا ہے وہ کہتا ہے: اے میرے رب! مجھے اپنے بندوں پر طلوع نہ کر کیونکہ وہ تیری نافرمانی کرتے ہیں: ابو عمر نے اسے کتاب التمہید میں ذکر کیا ہے۔ ابن انباری نے کتاب الرد میں عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی: مجھے بتایئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امیہ بن صلت کے بارے میں مروی ہے امن شعرہ و کفر قلبہ فرمایا: وہ حق ہے تم نے اس میں سے کس چیز کو عجیب جانا ہے؟ میں نے کہا: ہم نے اس کے اس قول کو عجیب و غریب جانا ہے:

والشمسُ تطلعُ كلَّ آخرِ ليلةٍ حمراءَ يُصبحُ لونُها يتورّدُ
ليست بطالعةٍ لَهُمْ فى رسْلِها اِلَّا مُعَذَّبَةً وَاِلَّا تُجْلَدُ

"سورج ہر رات کے آخر میں سرخ طلوع ہوتا ہے صبح کے وقت اس کا رنگ گلاب کے پھول کی طرح ہو جاتا ہے وہ ان پر طلوع نہیں ہوتا مگر اسے عذاب دیا جا رہا ہوتا ہے اور کوڑے مارے جا رہے ہوتے ہیں"۔ کیا وجہ ہے کہ سورج کو کوڑے مارے جا رہے ہوتے ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! سورج کبھی بھی طلوع نہیں ہوتا مگر ستر ہزار فرشتے اسے کچوکے دیتے ہیں، فرشتے اسے کہتے ہیں: تو طلوع ہو، تو طلوع ہو۔ وہ کہتا ہے: میں اس قوم پر طلوع نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میری اطاعت کرتی ہے۔ ایک فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور انسانوں کی روشنی کے لیے اسے اوپر اٹھاتا ہے، شیطان اس کے پاس آتا ہے وہ اسے طلوع ہونے سے روکنے کا ارادہ کرتا ہے سورج اس کے دو سینگوں کے درمیان طلوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سورج کے نیچے جلا دیتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا بھی یہی

مطلب ہے: ''یہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور اس کے دو سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور جب بھی غروب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتا ہے، شیطان اس کے پاس اسے سجدے سے روکنے کے لیے آتا ہے تو وہ اس کے سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ اسے اس کے نیچے جلا دیتا ہے''۔ یہ انباری کے الفاظ ہیں۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی صلت کے اس شعر کی تصدیق کی۔

زُحَلٌ وثَوْرٌ تحتَ رِجلِ يَمِينِهِ والنَّسر لأخرى وليثٌ مُرْصَدُ

والشَّمسُ تَطلعُ كلَّ آخرِ ليلةٍ حمراء يصبِحُ لونُها يَتَوَرَّدُ

ليست بطالعة لهم فى رِسْلِها إلّا مُعذَّبةً وإلّا تُجْلَدُ

عکرمہ نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی: اے میرے آقا! کیا سورج کو بھی کوڑے مارے جاتے ہیں؟ فرمایا: اسے سیرابی نے کوڑوں پر مجبور کرایا لیکن وہ عقاب سے ڈرتا ہے مطالع کا ذکر مغارب پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اللہ کا فرمان ہے: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) مشارق کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ طلوع غروب سے پہلے ہوتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ مشرقین سے مراد وہ دور دراز کا مطلع ہے جہاں سے طویل ترین دن سورج طلوع ہوتا ہے اور سال کے چھوٹے ترین دن میں جہاں سے طلوع ہوتا ہے جس طرح سورۂ یٰس میں گذرا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ ہم نے آراستہ کیا ہے آسمان دنیا کو ستاروں کے سنگھار سے اور اسے محفوظ کر دیا ہر سرکش شیطان کی رسائی سے نہیں سن سکتے کان لگا کر عالم بالا کی باتوں کو اور پتھراؤ کیا جاتا ہے ان پر ہر طرف سے ان کو بھگانے کے لیے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے مگر جو شیطان کچھ جھپٹ لینا چاہتا ہے تو تعاقب کرتا ہے اس کا تیز شعلہ''۔

قتادہ نے کہا: ستارے تین مقاصد کے لیے پیدا کئے گئے ہیں (1)، شیاطین کو رجم کرنے کے لیے، ایسے نور کے لیے جس کیساتھ راہنمائی حاصل کی جاتی ہے اور آسمان دنیا کی زینت کے لیے۔ مسروق، اعمش، نخعی، عاصم اور حمزہ نے بزینةٍ پڑھا ہے یعنی مجرور اور منون اور الکواکب کو زینة سے بدل کے طور پر مجرور پڑھا ہے کیونکہ کواکب ہی زینت ہیں۔ ابوبکر نے اسی طرح پڑھا ہے مگر الکواکب کو زینة مصدر کی وجہ سے نصب دی ہے اس کا معنی ہے ہم نے آسمانوں سے ستاروں کو مزین کیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اعنی کی وجہ سے منصوب ہو گویا کہا: ہم نے اسے زینت سے مزین کیا ہے یعنی ستاروں سے مزین کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ زینة سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے زینةِ الکواکبِ پڑھا جائے معنی ہوگا اس کی زینت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 38

ستارے ہیں یا معنی ہو یہی کواکب ہیں۔ باقی قراء نے اسے اضافت کے ساتھ بزینة الکواکب پڑھا ہے معنی ہے ہم نے آسمان دنیا کو کواکب کی تزیین کے ساتھ مزین کیا یعنی ان کے حسن کے ساتھ مزین کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ قراءت تو اس کی قرءت کی طرح ہو جس نے اسے تنوین دی مگر تخفیف کے لیے اسے حذف کر دیا وحفظا یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی حفظناہ حفظا۔

**وَمِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ** جب الله تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ فرشتے آسمان سے وحی کے ساتھ نازل ہوتے ہیں تو یہ بھی واضح کیا الله تعالیٰ نے کواکب کے ساتھ آسمان کو مزین کرنے کے بعد آسمان کی اس چیز سے حفاظت کا اہتمام کیا کہ کوئی چوری چھپے آسمان کی خبریں سن لے۔ مارد جنوں اور انسانوں میں سے جو سرکش ہوتا ہے اسے کہتے ہیں، عرب اسے شیطان کہتے ہیں۔

**لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى** ابو حاتم نے کہا کلام اس طرح ہے لئلا یسمعوا پھر اَن کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو رفع دیا گیا **الْمَلَاِ الْاَعْلٰى** سے مراد آسمان دنیا اور دوسرے آسمانوں والے ہیں۔ تمام کو اعلیٰ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ زمین کے مکینوں کی بنسبت وہ اعلیٰ ہیں **يَسَّمَّعُوْنَ** میں ضمیر شیاطین کے لیے ہے۔ جمہور نے اسے يَسْمَعُوْنَ پڑھا ہے یعنی سین ساکن ہے اور میم مخفف ہے حمزہ اور عاصم نے حفص کی روایت میں لَا يَسَّمَّعُوْنَ پڑھا ہے اس وقت یہ تسمیع سے مشتق ہے☆، پہلی قراءت کی صورت میں اس کے سماع کی نفی کر دی ہے اگرچہ وہ سننے کی کوشش کریں گے۔ یہی صحیح معنی ہے اس کی تائید الله تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے: **اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ** (الشعراء)

دوسری قراءت کی صورت میں ان سے استماع اور سماع دونوں کی نفی واقع ہیں۔ مجاہد نے کہا: وہ سننے کی کوشش کریں گے اور سن نہ سکیں گے **يَسَّمَّعُوْنَ** کی اصل یتسمعون ہے(1) تاء کو سین میں مدغم کر دیا گیا ہے کیونکہ تاء سین کا قریب المخرج ہے؛ ابو عبیدہ نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ عرب کم ہی کہتے ہیں: سمعت إليه وہ کہتے ہیں تسمعت إليه ویقذفون من کل جانب انہیں ہر جانب سے شہابیے مارے جائیں گے۔ دحورا مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے کیونکہ **يُقْذَفُوْنَ** کا معنی بھی یدحرون ہے دحرته دحرا ودحورا یعنی میں نے اسے دھتکار دیا۔ سلمی اور یعقوب حضرمی نے دَحُوْرًا پڑھا ہے اس وقت یہ فَعول کے وزن پر مصدر ہوگا جہاں تک فراء کا تعلق ہے انہوں نے اسے اسم فاعل کی حیثیت دی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یقذفون بما یدحرهم یعنی دحور سے پہلے باء حذف ہے کوئی اس کو اکثر استعمال کرتے ہیں جس طرح انہوں نے یہ شعر کہا:

تَمرُّونَ الديارَ ولَمْ تَعوجُوا

یہاں الدیار سے پہلے باء حذف ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ شہابیوں کے ساتھ مارنا سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تھا یا بعثت کی وجہ سے اس کے بعد تھا اس بارے میں دو قول ہیں: اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے روایات سورۂ جن میں آئیں گی۔ ان دونوں کے درمیان جمع کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے جنہوں نے یہ کہا: شیاطین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 35

☆ متن میں اسی طرح ہے مگر یہ درست نہیں صحیح تسمع ہے۔

بعثت سے قبل نہیں مارا جاتا تھا پھر انہیں مارا جانے لگا یعنی انہیں ایسا نہیں مارا جاتا تھا جو انہیں سننے سے روک دے لیکن انہیں کسی وقت مارا جاتا اور کسی وقت نہ مارا جاتا، ایک جانب سے مارا جاتا اور دوسری طرف سے نہ مارا جاتا شاید اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿٩﴾ سے اسی معنی کی طرف اشارہ ہے یعنی پہلے انہیں بعض جوانب سے ہی مارا جاتا تھا تو اب ان کے لیے دائمی عذاب ہے اس سے قبل وہ انسانوں کی جانب سے جاسوسی کیا کرتے تھے ان میں سے کوئی اس کی حاجت پوری کر دیتا اور کوئی اسے پورا نہ کر سکتا کوئی محفوظ رہتا اور کوئی محفوظ نہ رہتا بلکہ اسے پکڑ لیا جاتا اور اسے عبرتناک سزا دی جاتی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آسمان کی حفاظت میں اضافہ کر دیا گیا ان کے لیے ایسے شہابیے تیار کیے گئے جو پہلے تیار نہیں کیے گئے تھے تاکہ آسمان کی تمام جوانب سے انہیں پتھر مارے جائیں پہلے جن جگہوں پر وہ بیٹھتے تھے وہ اب وہاں نہ بیٹھ سکیں جو چیز آسمان میں جاری ہوتی اب وہ اس کے سماع پر قادر نہیں مگر یہ کہ کوئی چیز تیزی سے اچک لیں تو زمین کی طرف آنے اور اپنے دوستوں تک اسے القاء کرنے سے قبل کوئی شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرے اور اسے جلا دے اس طرح کہانت باطل ہوگئی اور رسالت و نبوت حاصل ہوگئی۔

اگر سوال کیا جائے: اگر یہ شہابیوں کے ساتھ مارنا نبوت کی وجہ سے تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی یہ سلسلہ کیوں جاری رہا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت دائمی ہے اس لیے یہ سلسلہ بھی قائم و دائم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہانت کے باطل ہونے کی خبر دی ہے فرمایا: لیس منا من تکھن جس نے کہانت کی وہ ہم میں سے نہیں۔

اگر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حفاظت و نگہبانی کا سلسلہ نہ ہوتا تو جن پھر سننا شروع کر دیتے اور کہانت لوٹ آتی تو یہ باطل ہونے کے بعد جائز نہیں کیونکہ جب حفاظت نبوت کی وجہ سے ہوئی تھی تو حفاظت و نگہداشت کا ختم ہونا اور کہانت کا دوبارہ شروع ہونا ضعیف مسلمانوں کے لیے شبہ کا باعث ہوتا اور اس کا خوف موجود تھا کہ لوگ یہ گمان کرتے کہ کہانت اس لیے لوٹ آئی ہے کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے تو یہ بات صحیح ہے کہ حکمت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی اس کی حفاظت ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿٩﴾ ۔ واصب کا معنی دائم ہے یہ مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی شدید ہے۔ کلبی، سدی اور صالح نے اس کا معنی موجع کیا ہے یعنی جس کا درد دل تک جا پہنچتا ہے۔ یہ وصب سے ماخوذ ہے جس کا معنی مرض ہے (1)۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ یہ وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ سے مستثنیٰ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: استثناء غیر وحی کی طرف راجع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿٢١٢﴾ فرشتے ایک دوسرے کو جو بات پہنچاتے یہ ان میں سے کوئی چیز چوری چھپے سن لیتے یہ ان امور میں سے ہوتے جو عالم میں وقوع پذیر ہونے والے ہوتے جبکہ اہل زمین کو اس کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 39

ابھی علم نہ ہوتا۔ یہ اس وجہ سے ہوتا کیونکہ شیاطین کے اجسام خفیف ہوتے تو اس وقت انہیں شہابیوں سے مارا جاتا۔

اس بارے میں صحیح احادیث مروی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ شیاطین آسمانوں کی طرف بلند ہوتے (1) وہ ایک دوسرے کے اوپر سننے کے لیے بیٹھتے سب سے زیادہ جسارت کرنے والا آسمان کے زیادہ قریب ہوتا پھر اس طرح یکے بعد دیگرے دوسرے ہوتے اللہ تعالیٰ اہل زمین کے بارے میں حکم دیتے اہل سموات اس کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتے تو قریبی شیطان اسے سن لیتا اور وہ اسے نیچے والے کی جانب القا کرتا کبھی شہاب ثاقب اسے جلا دیتا اور بعض اوقات وہ کلام القا کر لیتا اور شہاب ثاقب اسے نہ جلاتا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو وہ بات کاہنوں تک جا پہنچتی وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے اور وہ بات سچی ہوتی جس طرح ہم نے سورۃ الانعام میں بیان کیا ہے جاہل سب کو سچ تسلیم کر لیتے۔

جب اللہ تعالیٰ اسلام لے آیا تو آسمان کی شدت سے حفاظت کی گئی تو کوئی شیطان نہ بچا جس نے کوئی حتمی بات سنی مارے جانے والے ستارے وہی ہیں جنہیں لوگ ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں۔

نقاش اور مکی نے کہا: اس سے مراد وہ ستارے نہیں جو آسمان میں جاری ہیں کیونکہ ان کی حرکت نہیں دیکھی جاتی یہ پھینکے جانے والے ستارے ہیں جن کی حرکت دیکھی جاتی ہے کیونکہ یہ ان ستاروں میں سے قریب ترین ہیں۔ سورۂ حجر میں اس کے بارے میں کافی وضاحت گذر چکی ہے۔ ہم نے سورۂ سباء میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث ذکر کی ہے اس میں ہے: ''شیاطین ایک دوسرے کے اوپر تھے''۔ (2) اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''شیاطین تیزی سے اچک لیتے ہیں (3) تو انہیں شہابیے مارے جاتے ہیں وہ ان باتوں کو اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں جو وہ بات اس طریقہ پر کریں تو وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں اور اس میں اضافہ کر دیتے ہیں'' کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ خطف کا معنی تیزی سے کسی چیز کو لے لینا ہے۔ یہ لفظ یوں استعمال ہوتا ہے خَطَف، خَطِف، خَطَّف، خِطِّف اور خِطِف۔ مشدد میں اصل اختطف ہے تاء کو طاء میں مدغم کیا گیا کیونکہ یہ اس کی اخت ہے خاء کو فتحہ دیا گیا ہے کیونکہ تاء کی حرکت اس پر ڈالی گئی ہے۔ جس نے اسے کسرہ دیا تو وہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہے جس نے طاء کو کسرہ دیا ہے تو اس نے کسرہ کو کسرہ کے تابع کیا ہے۔

ثاقب سے مراد روشن ہے؛ یہ ضحاک، حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد آگ کے ستارے ہیں جو ان کا پیچھا کرتے ہیں یہاں تک کہ انہیں سمندر میں گرا دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الشھب کے بارے میں فرمایا: وہ ان شیاطین کو موت کے بغیر جلاتے ہیں وہ شہابیے جن کے ساتھ لوگوں کو مارا جاتا ہے وہ ان ثابت ستاروں سے نہیں ہوتے اس پر ان کی حرکات کا دکھائی دینا دلالت کرتا ہے ثابت کواکب چلتے ہیں ان کی دوری کی وجہ سے ان کی حرکات دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ بحث بھی گذر چکی ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 466 2۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ سبا، جلد 2، صفحہ 154

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 155، ایضاً، باب و من سورۃ سبا، حدیث 3148، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شہاب کی جمع شُھُب ہے جمع قلت میں قیاس اشبہہ ہے اگر چہ عربوں سے یہ جمع کا وزن نہیں سنا گیا۔ ثاقب کا معنی روشن ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد اور ابو مجاہد کا قول ہے؛ اسی معنی میں یہ قول ہے:

وَ زَنْدُكَ أَثْقَبُ أَزْنادِها

یعنی تیری زند (وہ لکڑی جس سے آگ روشن کی جاتی تھی) تمام زندوں سے زیادہ روشن ہے اخفش نے اس کی جمع کے بارے میں کہا شُھُبٌ ثُقُبٌ، ثواقب اور ثقاب۔ نسائی نے کہا: ثقبت النار تثقب ثقابة وثقوبا، جب وہ روشن ہو اثقبتها انا میں نے اسے روشن کیا۔ زید بن اسلم نے ثاقب کے بارے میں کہا: وہ روشن ہے؛ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے اَثْقِبْ زَنْدَكَ یعنی اپنی آگ روشن کر، یہ اخفش کا قول ہے اور شاعر کا قول پڑھا:

بينما المرءُ شِهابٌ ثاقبٌ ضربَ الدهرُ سَناهُ فَخَمَدْ(1)

اس اثناء میں کہ انسان ایک روشن ستارہ ہوتا ہے زمانہ اس کی چمک کو ضرب لگاتا ہے تو وہ بجھ جاتا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ⑫ وَ اِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ⑬ وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ⑭ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑮ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ⑯ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ⑰

''پس آپ ان سے پوچھئے: آیا وہ زیادہ مضبوط ہیں خلقت کے اعتبار سے یا دوسری چیزیں جنہیں ہم نے پیدا فرمایا بے شک ہم نے پیدا کیا ہے انہیں لیسدار کیچڑ سے آپ تو اظہار تعجب کرتے ہیں قدرت کے کرشمے دیکھ کر اور وہ تمسخر اڑاتے ہیں اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں: نہیں ہے مگر یہ کھلا جادو، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟''۔

یعنی اہل مکہ سے پوچھیے۔ یہ مفتی سے فتویٰ طلب کرنے سے ماخوذ ہے اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا سے مراد آسمان، زمین، پہاڑ اور سمندر ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں فرشتے اور سابقہ امتیں داخل ہیں اس پر یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ اسے من کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد فرشتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: من سے مراد سابقہ امتیں ہیں (3) جو ہلاک ہو چکیں وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے یہ آیت اشد بن کلدہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اسے ابوالاشد اس لیے کہا گیا کیونکہ اس کی پکڑ اور قوت بہت زیادہ تھی اس کا ذکر سورۃ البلد میں آئیگا اس کی مثل یہ آیت ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (مومن: 57) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ (النازعات: 27)

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 39 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 40 3۔ ایضاً

لَّازِبٍ کا معنی لیسدار مٹی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اس معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

تَعَلَّمْ فَإِنَّ اللهَ زادكَ بَسطةً　　وأخلاقَ خيرٍ كُلُّها لكَ لَازِبُ(1)

علم حاصل کرو اللہ تعالیٰ تیرے جسم اور بھلائی کے اعمال میں اضافہ کرے وہ سب تیرے ساتھ وابستہ ہوں۔

قتادہ ابن زید نے کہا: لَّازِبٍ کا معنی ہے چمٹنے والی۔ ماوردی نے کہا: لاصق اور لازق میں فرق یہ ہے (2) کہ لاصق اسے کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ دوسرے کے ساتھ چمٹا ہوا ہو اور لازق اسے کہتے ہیں جو جس چیز کے ساتھ لگتا ہے اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: لَّازِبٍ کا معنی لزج ہے یعنی لیسدار۔ سعید بن جبیر نے کہا: گرم گوند جو ہاتھ سے چمٹ جائے۔ مجاہد نے کہا: لَّازِبٍ سے مراد لازم ہے عرب کہتے ہیں: طین لازب، لازم۔ باء میم سے بدلی ہوئی ہے اس کی مثل ان کا قول ہے: لاتب، لاتم باء میم سے بدلی ہوئی ہے لازب کا معنی ثابت ہے تو کہتا ہے: صار الشئ ضربة لازب۔ یہ ضربہ لازم سے زیادہ بلیغ ہے نابغہ نے کہا:

ولا تَحْسَبُونَ الخيرَ لاشَرَّ بعدَهٗ　　ولا تَحْسَبُونَ الشَّرَّ ضربةَ لَازِبِ(3)

تم خیر کو گمان نہیں کرتے اس کے بعد شر نہیں ہوگی اور تم شر کو ضرب لازب خیال نہیں کرتے۔

فراء نے عربوں سے یہ حکایت بیان کی ہے: طین لاتب یہ لازم کے معنی میں ہے لاتب کا معنی ثابت ہے اسی سے تو یہ باب ذکر کرتا ہے لَتَبَ يَلْتُبُ لَتْبًا ولُتُوبًا یہ لزب يَلْزُبُ لزوبا کی طرح ہے۔ ابو جراح نے لاتب کے بارے میں یہ شعر پڑھا ہے:

فإنْ يَكُ هذا من نَبِيذٍ شَرِبْتُهٗ　　فإنّي من شربِ النَّبيذِ لَتَائِبُ

صُدَاعٌ وَتَوصيمُ العِظَامِ وفَتْرَةٌ　　وغَمٌّ مع الإِشْرَاقِ في الجَوفِ لَاتِبُ(4)

"اگر یہ اس نبیذ سے ہے جسے میں نے پیا ہے تو میں نبیذ کو پینے سے تائب ہوں سر درد، ہڈیوں میں سراخ، شکستگی اور چمٹ جانے والا غم جبکہ پیٹ میں آگ روشن ہے"۔ لاتب سے مراد لاحق ہے جو لازب کی مثل ہے؛ اصمعی سے جوہری نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ سدی اور کلبی نے کہا: لازب سے مراد خالص ہے۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد بدبودار ہے۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ۝ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم نے عجبت کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے یعنی قرآن میں سے جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اس سے آپ تعجب کا اظہار کرتے ہیں جبکہ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، یہ شریح کی قراءت ہے اور ضمہ والی قراءت کرنا پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی چیز پر تعجب کا اظہار نہیں کرتا تعجب کا اظہار وہ کرتا ہے جو علم نہیں رکھتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے بلکہ وہ جو بعث کا انکار کرتے ہیں اس پر آپ تعجب اظہار کرتے ہیں۔ عاصم کے علاوہ کوفہ کے قراء نے اسے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو عبید اور فراء نے اسے پسند کیا ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے اسے بل عجبتُ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 40　　2۔ ایضاً

3۔ دیوان النابغہ الذبیانی، صفحہ 18　　4۔ احکام القرآن للطبری، جز 23، صفحہ 51

فراء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝ کے بارے میں کہا: لوگوں نے اسے تاء کے رفع اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ رفع مجھے زیادہ محبوب ہے کیونکہ حضرت علی شیر خدا، حضرت عبداللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

ابوزکریا فراء نے کہا: فعل عجب کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے گا تو اس کا وہ معنی نہ ہوگا جو معنی اس وقت ہوگا جب اسے بندوں کی طرف منسوب کیا جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرۃ: 15) اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کی صورت میں اس کا وہ معنی نہیں ہوگا جو معنی بندوں کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں شریح کے قول کا رد ہے جب اس نے اس قراءت کا انکار کیا۔

جریر اور اعمش نے ابووائل شقیق بن سلمہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اسے بل عجبت ویسخرون پڑھا ہے۔ شریح نے کہا: اللہ تعالیٰ کسی چیز کی وجہ سے تعجب کا اظہار نہیں کرتا تعجب کا اظہار وہ کرتا ہے جو علم نہیں رکھتا (1)۔ اعمش نے کہا: میں نے ابراہیم کے سامنے اس کا ذکر کیا، انہوں نے کہا: شریح کو اپنی رائے اچھی لگتی ہوگی بے شک حضرت عبداللہ شریح سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ اسے بل عجبتُ پڑھتے۔ ہروی نے کہا: بعض ائمہ نے کہا بل عجبت کا معنی ہے بلکہ میں انہیں کے تعجب پر بدلہ دوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کئی مواقع پر ان کے بارے میں خبر دی کہ وہ حق سے تعجب کا اظہار کرتے ہیں: وَعَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ (ص: 3) فرمایا: اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ ارشاد فرمایا: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ (یونس: 2) اللہ تعالیٰ کا فرمان: بَلْ عَجِبْتَ بلکہ میں نے انہیں ان کے تعجب پر سزا دی۔

میں کہتا ہوں: یہ فراء کے قول کا خلاصہ ہے؛ بیہقی نے اسے پسند کیا۔ علی بن سلیمان نے کہا: دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہی ہے تقدیر کلام یوں ہوگی قل ای محمد بل عجبت، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بہت اچھا قول ہے۔ قول اکثر مضمر ہوتا ہے بیہقی نے کہا: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ بھی جائز ہے اللہ تعالیٰ کے اپنے نفس کے بارے میں تعجب کے اظہار کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ جس نے اس کا انکار کیا اس کے بارے میں اس نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے اسے مخلوق کی جانب سے تعجب کے قائم مقام رکھ دیا جائے جس طرح جس بات پر وہ راضی ہوتا ہے اس کے بارے میں خبر دینے کو ضحک پر محمول کیا جاتا ہے جس طرح حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ جس سے وہ راضی ہوا اس کے اظہار کو مجازاً مخلوقات کے ضحک کے قائم مقام رکھا۔

ہروی نے کہا: عجب ربکم کا معنی ہے تمہارا رب راضی ہوا اور اس نے بدلہ دیا اسے عجب کا نام دیا مگر حقیقت میں وہ عجب نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَيَمْكُرُ اللّٰهُ (انفال: 30) اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ انہیں ان کے مکر پر بدلہ دیتا ہے اس کی مثل حدیث ہے: عجب ربکم من إلکم وقنوطکم (2) تمہارا رب تمہاری آہ وزاری اور تمہاری مایوسی پر تمہیں بدلہ دیتا ہے۔ بعض اوقات عجب کا لفظ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم ہوتا ہے اس صورت میں بل

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 38 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 37

عجبت کا معنی ہے بلکہ ان کا فعل میرے ہاں عظیم ہے۔ بیہقی نے کہا: یہ بھی امکان ہے کہ یہ حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث کے معنی کے مشابہ ہو۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: عجب ربك من شباب ليس له صبوة (1) تیرے رب کے ہاں اس نوجوان کا مکالمہ عظیم ہے جس میں خواہش نفس کی طرف میلان نہ ہو۔ امام بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے وہ بھی اسی کی مثل ہے: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قوم کا معاملہ عظیم ہے جو جنت میں بیڑیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے''۔ بیہقی نے کہا: یہ حدیث اور جو اس کی مثل احادیث وارد ہوئی ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو کرم اور شفقت فرماتا ہے اس کے فرشتے اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں جب انہیں برانگیختہ کیا کہ وہ ایمان لائیں یہ صورت قتال اور بیڑیوں میں جکڑنے کے ساتھ واقع ہوئی یہاں تک کہ جب وہ ایمان لائے تو انہیں جنت میں داخل کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: بَلْ عَجِبْتُ کا معنی ہے بلکہ میں نے اسے عجیب و غریب جانا۔ نقاش نے اسے بیان کیا ہے۔ حسن بن فضل نے کہا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعجب سے مراد کسی شے کو عجیب و غریب جاننا اور اس کی عظمت شان بیان کرنا ہے۔ یہ عربوں کی لغت ہے حدیث طیبہ میں آیا ہے: عَجِبَ رَبُّكم مِنْ إِلكم وقُنوطِكم اللہ تعالیٰ نے تمہاری آہ وزاری اور تمہاری مایوسی کو عجیب و غریب جانا۔

وَيَسْخَرُوْنَ۝ میں واؤ حالیہ ہے تقدیر کلام یوں ہوگی عجبت منهم في حال سخريتهم۔ ایک قول یہ کیا گیا: بل عجبت پر کلام مکمل ہو گئی پھر نئی کلام شروع ہوئی اور فرمایا: وَيَسْخَرُوْنَ یعنی وہ اس کا تمسخر اڑاتے جو آپ لائے جب تو نے اسے ان پر تلاوت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دعوت دیتے ہیں تو وہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔

وَ اِذَا ذُكِّرُوْا قتادہ کے قول کے مطابق جب انہیں قرآن کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے لَا يَذْكُرُوْنَ۝ تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے (2)۔ سعید بن جبیر نے کہا: جب ان کے سامنے اس عذاب کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان سے قبل جھٹلانے والوں پر نازل ہوا تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس میں تدبر نہیں کرتے۔

وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً جب وہ کسی معجزہ کو دیکھتے ہیں تو وہ مذاق اڑاتے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ وہ کہتے: وہ جادو ہے استسخر اور سخر دونوں کا ایک ہی معنی ہے (3) جس طرح استقر اور قر کا معنی ایک ہی ہے اور استعجب اور عجب کا معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یَسْتَسْخِرُوْنَ۝ کا معنی ہے وہ غیروں سے مذاق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے وہ استہزاء کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ آیت مذاق ہے۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝ جب وہ معجزات کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں تو کہتے ہیں: یہ جادو، خیال اور دھوکہ ہے۔ ءَاِذَا مِتْنَا جب ہم مر جائیں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ یہ استفہام انکار اور مذاق کے لیے ہے اور ہمارے آباء کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ ہمزہ استفہام کو حرف عطف پر داخل کیا گیا ہے۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا نافع نے اَوْ کو واؤ کے سکون ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بحث سورۃ الاعراف میں گذر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى (اعراف: 98)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 467 2۔ زاد المسیر، جلد 5.6، صفحہ 300 3۔ ایضاً، جلد 5.6، صفحہ 301

قُلۡ نَعَمۡ وَ اَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿ۚ۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا هٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾

''فرمایئے: ہاں ضرور اسی حال میں کہ تم ذلیل وخوار ہو گے۔ پس قیامت تو ایک جھڑکی ہو گی پس وہ اٹھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں گے۔ اور کہیں گے: ہم برباد ہو گئے یہ تو یوم جزا ہے۔ ہاں ہاں یہی فیصلہ کا دن ہے جس (کی آمد) کو تم جھٹلایا کرتے تھے''۔

قُلۡ نَعَمۡ ہاں تمہیں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ وَ اَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ جبکہ تم ذلیل وخوار ہو گے کیونکہ جس چیز کا انہوں نے انکار کیا تھا اس کے وقوع کو دیکھیں گے تو لامحالہ وہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: عنقریب قیامت برپا ہو گی اگرچہ تم ناپسند کرو تمہارے نہ چاہتے ہوئے یہ امر واقع ہو گا اگرچہ تم اپنے گمان کے مطابق اس کا انکار کرو۔

یہ تو ایک چیخ ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(1)۔ اس سے مراد دوسرا نفخہ ہے۔ صیحہ کو زجرہ کا نام دیا ہے(2) کیونکہ اس سے مقصود جھڑکنا ہی ہے یعنی اس کے ساتھ انہیں جھڑکا جائے گا جس طرح ہانکتے وقت اونٹوں اور گھوڑوں کو جھڑکا جاتا ہے تو وہ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ انتظار کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کہا گیا: یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَارُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا (انبیاء: 97) ایک قول یہ کہا گیا ہے: وہ اس بعث کو دیکھیں گے جس کا انہوں نے انکار کیا۔

وَ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا هٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿۲۰﴾ وہ اپنے لیے ہلاکت کو پکاریں گے کیونکہ اس روز انہیں علم ہے جو ان پر واقع ہونے والا ہے۔ بصریوں کے نزدیک ویل کا لفظ منصوب ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ فراء نے یہ گمان کیا ہے: اس کی تقدیر کلام یوں ہو گی یا وی لنا اور وی، حزن کے معنی میں ہے۔ نحاس نے کہا: اگر یہ اسی طرح ہو جس طرح اس نے کہا تو یہ الگ ہوتا جبکہ مصحف میں یہ متصل ہے، ہم ہر کسی کو جانتے ہیں کہ وہ اسے متصل ہی لکھتا ہے یَوۡمُ الدِّیۡنِ سے مراد یوم حساب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد یوم جزا ہے۔

هٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان کا ایک دوسرے کے لیے قول ہے یعنی یہ وہ دن ہے جس کو ہم نے جھٹلایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا ان کے حق میں قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ فرشتوں کا قول ہے یہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کا دن ہے وہ حق پرست کو باطل پرست سے الگ کر دے گا پس ایک جنت میں اور ایک فریق جہنم میں ہو گا۔

اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَهُمۡ وَ مَا كَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿ۙ۲۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۲۳﴾ وَ قِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ﴿ۙ۲۴﴾ مَا لَكُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ بَلۡ

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 360
2۔ زاد المسیر، جلد 5،6، صفحہ 301

هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْۤا اِنَّكُمْ
كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾
فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اے فرشتو! جمع کرو جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی یہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پس سیدھا لے چلو جہنم کی راہ کی طرف اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی، تمہیں کیا ہو گیا ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے بلکہ آج تو وہ سر تسلیم خم کیے جائیں گے اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف اور سوال و جواب کیے جائیں گے۔ پیروکار سرداروں سے کہیں گے کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کروفرے سے (اور ہمیں کفر پر مجبور کیا کرتے تھے) وہ جواب دیں گے: بلکہ تم ایمان ہی کب لائے تھے (کہ ہم نے تم کو گمراہ کر دیا) اور نہ ہمیں تم پر کوئی غلبہ حاصل تھا بلکہ تم بذات خود سرکش لوگ تھے۔ پس لازم ہو گیا ہم سب پر اپنے رب کا حکم اب (خواہ مخواہ) ہم عذاب کو چکھنے والے ہیں۔ پس ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا ہم خود بھی گم راہ تھے۔ پس وہ (سب) اس روز عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔ ہم اس طرح سلوک کرتے تھے مجرموں کے ساتھ (کفار کا یہ حال ہے کہ) جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں''۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ یہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کے لیے فرمان ہے یعنی مشرکوں اور شرک میں جو ان کے ساتھی تھے انہیں اٹھاؤ۔ شرک سے مراد ظلم ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) کافر کو کافر کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ یہ قتادہ اور ابو العالیہ کا قول ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعبیر کرتے ہوئے کہا: بدکار کو بدکار کے ساتھ، شرابی کو شرابی کے ساتھ اور چور کو چور کے ساتھ اٹھایا جائے گا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اَزْوَاجَهُمْ سے مراد ان کی مثل ہیں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَزْوَاجَهُمْ سے مراد ان کی وہ بیویاں ہیں جو شرک میں ان کے موافق ہیں (2)؛ یہ مجاہد اور حسن بصری کا نقطہ نظر ہے۔ نعمان بن بشیر نے حضرت عمر بن خطاب سے یہی روایت کیا ہے ضحاک نے کہا: اَزْوَاجَهُمْ سے مراد شیاطین میں سے ان کے ساتھی ہیں (3)؛ یہ مقاتل کا بھی قول ہے۔ یہ کافر کو اس کے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑ کر اٹھایا جائے گا وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت، شیطان اور ابلیس ہے (4)۔ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ انہیں جہنم کی طرف لے چلو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 43　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 39　4۔ زاد المسیر، جلد 5،6، صفحہ 302

ان کی راہنمائی کرو، یوں کہا جاتا ہے: هديته الى الطريق، هديته الطريق، یعنی میں نے اس کی راستہ کی طرف راہنمائی کی اس طرح اهديت الهدية وهديت العروس۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے: اهديتها یعنی میں نے اسے ہدیہ کے قائم مقام بنا دیا۔

وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ کے بارے میں عیسیٰ بن عمر نے کہا: ان فتحہ کے ساتھ ہے۔ کسائی نے کہا تقدیر کلام یوں ہے لانهم، بانهم، یوں باب بیان کیا ہے وقفتُ الدابة أقفها وَقْفا فوقفت هي وقوفًا۔ کبھی یہ فعل متعدی استعمال ہوتا ہے اور کبھی غیر متعدی استعمال ہوتا ہے یعنی انہیں روک۔ یہ انہیں جہنم کی طرف ہانکے جانے سے قبل ہوگا؛ اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی انہیں حساب کے لیے روکو پھر انہیں جہنم کی طرف ہانک کر لے جاؤ۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: پہلے انہیں آگ کی طرف ہانکا جائے گا پھر وہ جہنم کے قریب پہنچیں گے تو انہیں سوال و جواب کے لیے روک لیا جائے گا۔ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ان سے ان کے اعمال، اقوال اور افعال کے بارے میں سوال کیا جائے گا؛ یہ قرظی، کلبی اور ضحاک نے کہا: ان سے ان کی خطاؤں کے بارے میں پوچھا جائے گا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے بارے میں پوچھا جائے گا ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے مخلوق پر ظلم کی جانب سے پوچھا جائے گا۔ ان سب میں یہ دلیل موجود ہے کہ کفار سے بھی حساب لیا جائے گا۔ سورۃ الحجر میں اس کے بارے میں گفتگو پیچھے گذر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ان سے سوال یہ ہوگا کہ ان سے کہا جائے گا: کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے یہ حجت قائم کرنے کے لیے ہوگا انہیں کہا جائے گا: مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ کیا وجہ ہے تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ یہ شرمندہ کرنے کے لیے سوال کیا جائے گا کہ تم میں سے بعض بعض کی مدد کرتا اور اسے اللہ کے عذاب سے محفوظ کرتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: غزوہ بدر کے موقع پر ابوجہل کے قول کی طرف اشارہ ہے(1) نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ (القمر) اصل میں تتناصرون تھا تخفیف کے طریقہ پر ایک طاء کو حذف کر دیا گیا۔ بزی نے وصل کی صورت میں تاء کو مشدد پڑھا ہے۔

قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سر تسلیم خم کیے ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ذلیل و عاجز ہوں گے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اطاعت شعار ہوں گے۔ سب کا معنی قریب ہے۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ رؤساء اور پیروکار باہم جھگڑنے لگیں گے۔ ایک قول یہ بھی کیا جاتا ہے: اصل میں لا یتساءلون ہے لا ساقط ہو گیا۔

نحاس نے کہا: لغت سے ناواقف آدمی نے غلطی کی ہے اس نے یہ وہم کیا ہے اس کلام کا تعلق بھی اس قول سے ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (مومنون) جبکہ یہ اصل میں لایتساءلون بالارحام ہے ان میں سے ایک کہتا ہے: میں تجھ سے اس رشتہ داری کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جو میرے اور تیرے درمیان ہے جس کے باعث تو نے مجھے نفع دیا یا تیرا حق جو مجھ پر تھا اسے ساقط کر دیا یا تو نے مجھے نیکی ہبہ کر دی یہ واضح ہے کیونکہ اس سے قبل فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ (مومنون: 101) ہے یعنی وہ اس نسب کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے جو ان کے درمیان ہے جس طرح حدیث طیبہ میں آیا

1۔ المحرر الوجیز

ہے: ''بے شک انسان اس امر سے خوش ہوگا کہ اس کا اپنے باپ یا بیٹے پر حق ثابت ہو تو وہ اس سے لے کیونکہ وہ نیکیاں ہوں گی یا برائیاں ہوں گی''۔ ایک حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جس کا اپنے بھائی کے ہاں کوئی حق تھا وہ مال سے متعلق تھا یا عزت سے متعلق تھا وہ اس بھائی کے پاس آیا اور اپنے مطالبہ سے پہلے اس کو اپنے لیے حلال جان لیا تو وہ اس کی نیکیوں میں سے لے گا اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہونگی تو مطالبہ کرنے والے کی برائیوں میں سے اس پر اضافہ کر دیا جائے گا'' ☆۔ یہاں یَتَسَآءَلُوْنَ کا معنی ہے وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور اس بارے میں شرمندہ کریں گے کہ اس نے اسے گمراہ کر دیا یا اس کے لیے معصیت کا دروازہ کھول دیا مابعد کلام اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ۝ اس کی وضاحت کرتی ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ کفار کا شیاطین کے لیے قول ہے: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ۝

مجاہد نے کہا: یہ کفار کا شیاطین کے لیے قول ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ انسانوں کا جنوں کے لئے قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پیروکاروں کا سرداروں کے لیے قول ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ (سبا: 31) سعید نے قتادہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ تم ہمارے پاس بھلائی کے راستے سے آتے تھے اور ہمیں اس سے روک دیتے تھے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی مثل مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تم ہمارے پاس قسم کے طریقہ سے آتے تھے جسے ہم پسند کرتے اور جس سے ہم فال لیا کرتے تھے تاکہ نصیحت کے انداز میں ہمارے ساتھ دھوکہ کریں۔ قسم کے انداز میں جو کلام لائی جاتی عرب اس سے فال لیا کرتے اور اسے سانح کا نام دیتے۔ ایک قول یہ کیا گیا: تم ہمارے پاس اس آدمی کے آنے کی طرح آتے جو ہمارے سامنے قسم اٹھاتا تو ہم اس کی تصدیق کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا: تم ہمارے پاس دین کا لبادہ اوڑھ کر آتے تو ہم پر شریعت کے معاملہ کو ہلکا کر دیتے اور تم ہمیں اس سے نفرت دلاتے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول بہت اچھا ہے کیونکہ دین کے واسطہ سے خیر اور شر کی پہچان ہوا کرتی ہے یمین، دین کے معنی میں ہے یعنی تم ہمارے سامنے گمراہی کو مزین کر کے پیش کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یمین کا معنی قوت ہے یعنی تم ہمیں قوت، غلبہ اور قہر سے روک دیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ۝ (صافات) یہاں یمین قوت کے معنی میں ہے اور انسان کی طاقت اس کی قسم میں ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

إذا مَا رَايةٌ رُفِعَت لمجدٍ تلقّاها عَرابَةُ باليمين(3)

جب کوئی جھنڈا بزرگی کے لیے بلند کیا جاتا ہے عرابہ اسے بڑی قوت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: تم ہمارے پاس حق کے راستہ سے آتے تھے اور یہ ظاہر کرتے کہ حق تمہارے ساتھ ہے(4)۔ سب کا معنی قریب ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 45 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 470 4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 46

☆ جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ باب ماجاء فی شان الحساب، حدیث نمبر 2343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے کہا بلکہ تم تو مومن ہی نہ تھے یہ شیاطین کا ان لوگوں کے حق میں ایمان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رؤساء کا قول ہے یعنی تم تو کبھی بھی مومن نہ تھے کہ ہم تمہیں ایمان سے کفر کی طرف منتقل کرتے بلکہ تم تو کفر پر ہی تھے اور اس کے ساتھ مانوس ہوئے اور عادت کی وجہ سے اسی پر قائم رہے۔ وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اور حق کو ترک کرنے میں ہمیں تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ۝ بلکہ تم گمراہ اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ہم پر ہمارے رب کا فرمان ثابت ہو گیا۔ یہ بھی پیروکاروں کا قول ہے یعنی ہم پر اور تم پر ہمارے رب کا حکم ثابت ہو گیا ہم میں سے ہر ایک عذاب چکھنے والا ہے جس طرح الله تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے اور رسولوں کی زبانوں سے ہمیں خبردار کیا ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝ (ص) یہ حدیث کے موافق ہے "الله تعالیٰ نے جہنم کے اہل لکھ دیئے ہیں اور جنت کے اہل لکھ دیئے ہیں نہ ان میں اضافہ ہو گا اور نہ ان میں کمی ہو گی"۔ فَاَغْوَيْنٰكُمْ پس جس کفر پر تم تھے ہم نے اسے ہی تمہارے لیے مزین کر کے پیش کیا تھا۔ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ۝ ہم تو وسوسہ اور استدعاء کر کے گمراہ کیا کرتے تھے پھر ان سب کے بارے میں خبر دی کہ اس روز گمراہ اور گمراہ کرنے والے عذاب میں شریک ہوں گے ہم مشرکوں کے ساتھ اسی قسم کا فعل کرتے ہیں جب انہیں کہا جاتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تو وہ تکبر کا اظہار کرتے ہیں یہاں قول مضمر ہے۔

يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے نصب کے محل میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ رفع کے محل میں ہو کیونکہ یہ انّ کی خبر ہے اور کان ملغا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کی وفات اور قریش کے اجتماع کے موقع پر کہا: قولوا لا اله الا الله تملکوا بها العرب وتدین لکم بها العجم، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو اس کلمہ کے واسطہ سے تم عربوں کے مالک بن جاؤ گے اور عجمی تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ کہنے سے انکار کر دیا اور اس سے نفرت کرنے لگے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے الله تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اور اس قوم کا ذکر کیا ہے جنہوں نے تکبر کیا تھا تو فرمایا: اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ اور الله تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (فتح: 26) کلمہ تقویٰ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے مشرکوں نے حدیبیہ کے موقع پر اس سے تکبر کا اظہار کیا تھا جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی مدت کے حوالے سے یہ کلمہ لکھوایا تھا؛ اس خبر کو بیہقی نے ذکر کیا ہے اور اس سے قبل کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۝ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ۝ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ۝ وَ مَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۝

"اور کہتے ہیں: کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے خداؤں کو ایک شاعر اور دیوانے کے کہنے سے (دیوانے تو یہ خود ہیں) وہ تو دین حق لے کر آئے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں سارے رسولوں کی۔ اے مجرمو! تم ضرور چکھو

گے دردناک عذاب کو اور نہیں بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر اسکا جو تم کیا کرتے تھے البتہ اللہ کے مخلص بندے اس عذاب سے محفوظ رہیں گے''۔

کیا ہم شاعر و مجنوں کے کہنے سے اپنے معبودوں کو ترک کر دیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس قول کو رد کر دیا۔ حق سے مراد قرآن اور توحید ہے بلکہ وہ تو قرآن لایا اور توحید کا سبق دیا اور رسول جو توحید کا پیغام لائے تھے ان کی تصدیق کی انکم لذائقوا العذاب الالیم تم عذاب الیم چکھنے والے ہو۔ لَذَآئِقُوا اصل میں لذائقون تھا نون استخفاف کے لیے حذف کر دی گئی اور اضافت کی وجہ سے مابعد کو الْعَذَابِ الْاَلِیْمِ کسرہ دیا گیا۔ اس میں نصب پڑھنا بھی جائز ہے جس طرح سیبویہ نے شعر کو پڑھا:

فألفيتُه　غيرَ　مُسْتَعْتِبٍ　وَلَا　ذَاكِرِ　الله　إلّا　قليلا

''میں نے اسے پایا کہ وہ رضامندی کا طالب نہیں تھا اور وہ اللہ کا ذکر بھی تھوڑا کرتا تھا'' سیبویہ نے اس وجہ سے والمقیمی الصلاۃ کو جائز قرار دیا ہے۔ اور تم جو شرک کا ارتکاب کرتے رہے ہو اس کا ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ جو عذاب چکھتا ہے اس سے یہ مستثنیٰ ہیں۔ اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی قراءت المخلصین یعنی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت، اپنے دین اور اپنی دوستی کے لیے خالص کر لیا ہے باقی قراء نے اسے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے معنی ہوگا جنہوں نے عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی اے مجرمو! تم عذاب کا ذائقہ چکھنے والے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے عذاب نہیں چکھیں گے۔

أُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۴۵﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

''وہی ہیں انہیں وہ رزق دیا جائے گا جس کی کیفیت معلوم ہے لذیذ پھل اور ان کا بڑا احترام و اکرام کیا جائے گا اور وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے زرنگار پلنگوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے پھرائے جائیں گے ان پر چھلکتے جام (شراب طہور کے) چشموں سے پر کر کے دودھ سے زیادہ سفید بڑے لذیذ پینے والوں کے لیے نہ اس میں مضر صحت کوئی چیز ہے اور نہ وہ اس کے پینے سے مدہوش ہوں گے ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی آہو چشم (عورتیں) گویا وہ (شتر مرغ کے) انڈوں کی مانند گرد و غبار سے محفوظ ہیں''۔

لَهُمْ سے مراد مخلصین ہیں یعنی ان کے لیے معلوم عطیہ ہے جو ختم نہ ہوگا۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد جنت ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس سے مراد جنت کا رزق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ پھل ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ اس کی خواہش کریں گے۔ ابن سائب نے کہا: یہ صبح اور شام کے کھانے کی مقدار کے مطابق ہوں گے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ (مریم) فواکہ یہ فاکھۃ کی جمع ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ

(طور:22) اس سے مراد سب پھل ہیں وہ تر ہوں یا خشک ہوں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے درجات کی بلندی، کلام کے سننے اور اس کی ملاقات کے ذریعے اکرام ہے۔ جنات نعیم سے مراد ایسے باغات ہیں ہیں جن میں وہ لطف اندوز ہوں گے۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ جنتیں سات ہیں۔ سورۂ یونس میں ان کا ذکر ہو چکا ہے، ان میں سے نعیم بھی ہے۔

عکرمہ اور مجاہد نے کہا: وہ باہمی تعلق اور باہمی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے: پلنگ جس طرح وہ چاہیں گے گھومتے پھریں گے ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ایسے پلنگوں پر ہوں گے جن پر موتیوں، یاقوت اور زبرجد کے تاج ہوں گے چارپائی صنعاء سے جابیہ تک ہوگی اور عدن سے ایلہ تک ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک منزل کے اہل پر وہ گھومتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانوں کا ذکر کیا تو ان کے مشروبات کا بھی ذکر کیا۔ اہل لغت کے نزدیک کاس سے مراد وہ برتن ہے جس میں مشروب بھی ہو اگر وہ برتن مشروب سے خالی ہو تو اس کو کاس نہیں کہتے۔ ضحاک اور سدی نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی کاس کا ذکر ہے اس سے مراد شراب ہے۔ عرب اس برتن کو کاس کہتے ہیں جس میں شراب ہو جب اس میں مشروب نہ ہو تو اسے اناء اور قدح کہتے ہیں۔

نحاس نے کہا: اہل لغت میں سے جن پر اعتماد کیا جاتا ہے اس نے حکایت بیان کی ہے کہ عرب پیالے کو اس وقت کاس کہتے ہیں جب اس میں شراب ہو، جب اس میں شراب نہ ہو تو اسے قدح کہتے ہیں جس طرح دستر خوان پر جب کھانا ہو تو اسے مائدہ کہتے ہیں جب اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مائدہ نہیں کہتے۔ ابو الحسن بن کیسان نے کہا: اسی سے ظعینہ کا لفظ ہے جب ہودج میں عورت ہو۔ زجاج نے کہا: بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝ سے مراد ہے کہ شراب یوں جاری ہوگی جس طرح چشمے زمین پر جاری ہوتے ہیں۔ معین سے مراد وہ جاری پانی ہے جو ظاہر ہے بیضاء یہ کاس کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد شراب ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: جنت کی شراب دودھ سے زیادہ سفید ہوگی۔ زجاج نے کہا: لذة سے مراد ذات لذة ہے تو مضاف کو حذف کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اصل میں مصدر ہے جسے اسم بنا دیا گیا ہے یعنی وہ سفید اور لذیذ ہوگی، یوں قول کیا جاتا ہے: شراب لذّ، شراب لذیذ، جس طرح یہ کہا جاتا ہے: نبات غض، غضیض۔

جہاں تک شاعر کا شعر ہے:

ولذٍ كطَعْمِ الصَّرْخَدِيِّ تركتُهُ بأرض العِدَا مِنْ خَشيةِ الحَدَثَانِ(1)

کتنی ہی نیندیں ہیں جو صرخدی شراب کی مانند تھیں جن کو میں نے دشمن کے علاقہ میں حادثہ کے ڈر سے ترک کر دیا۔ یہاں لذ سے مراد نیند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگوں نے انہیں اپنے قدموں سے پامال نہیں کیا۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 42

اس جنت میں ان کی عقلیں خراب نہ ہونگی انہیں کوئی مرض اور سر درد نہیں ہوگا اور اس شراب کو پینے کی وجہ سے انکی عقلیں ضائع نہ ہوں گی؛ یہ قول کیا جاتا ہے: الخمر غول للحلم والحرب غول للنفوس یعنی شراب حلم کو ختم کر دیتی ہے اور جنگ نفوس کو تباہ کر دیتی ہے؛ یہ قول بھی کیا جاتا ہے: نُزِف الرجلُ يُنْزَفُ فهو منزوفٌ ونزيفٌ یہ اس وقت کہتے ہیں جب اسے نشہ ہو جائے۔ امرءالقیس نے کہا:

وإذ هي تمشي كمشي النز يف يَصْرَعُهُ بالكثيب البَهَرْ

جب وہ مدہوش کی چال کی طرح چلتی ہے تو چھوٹے ٹیلے پر سانسوں کا انقطاع اسے گرا دیتا ہے۔

بعد والے شعروں میں بھی نزیف اسی معنی میں ہے:

نَزِيفٌ إذاقامتْ لوجهٍ تمايلت　تُرَاشِي الفوادَ الرَّخْصَ أَلَّا تَخَتَّرَا

فلثمتُ فاهَا آخِذًا بقرونها　شُرْبَ النَّزِيفِ ببرد ماءِ الحَشْرَجِ(1)

حمزہ اور کسائی نے زاء کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے یہ انزف القوم سے مشتق ہے جب ان کے نشہ کا وقت ہو گیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: احصد الزرع جب فصل کاٹنے کا وقت ہو گیا۔ أقْطَفَ الكرمُ جب انگور کی بیلوں کو کاٹنے کا وقت آ گیا، اركبَ السهرُ جب ان پر سوار ہونے کا وقت ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے وہ اپنی شراب کو ختم نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کی عادت ہے یہ جملہ یوں بولا جاتا ہے: انزف الرجل، فهو منزوف یہ اس وقت کہتے ہیں: جب اس کی شراب ختم ہو جائے۔ حطیہ نے کہا:

لَعَمْرِي لئن أَنزفتُم أوصَحَوْتُمُ　لبئس النَّدَامَى كنتُم آلَ أَبْجَرَا(2)

میری زندگی کی قسم! اگر شراب کو ختم کر دو یا تم ہوش میں آ جاؤ تو تم کتنے برے شرابی ہوا ے آل ابجر۔

نحاس نے کہا: پہلی قراءت معنی میں زیادہ واضح ہے اور صحیح ہے کیونکہ جلیل القدر مفسرین کے نزدیک يُنْزَفُوْنَ کا معنی ہے ان کی عقلیں ختم نہیں ہوتیں، ان مفسرین میں سے مجاہد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب سے ان آفات کو ختم کر دیا جو دنیا میں شراب کی وجہ سے سر درد اور نشہ وغیرہ کی صورت میں پہنچتی ہیں۔

يُنْزَفُوْنَ کے بارے میں صحیح یہ ہے کہ یہ کہا جائے: انزف الرجل جب اس کی شراب ختم ہو جائے، یہ بعید ہے کہ جنت کی شراب کی یہ صفت ذکر کی جائے لیکن مجازی معنی اس کا یہ ہے کہ یہ اس معنی میں ہے کہ وہ کبھی بھی ختم نہ ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لاینزفون کا معنی ہے انہیں نشہ نہیں ہوگا؛ یہ معنی زجاج اور ابوعلی نے ذکر کیا ہے جسے قشیری نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اس کا معنی نشہ کرنا درست نہیں کیونکہ اس سے قبل لَا فِيْهَا غَوْلٌ ہے یعنی ان کی عقلوں میں خلل نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں تکرار آتا ہے ہاں سورۂ واقعہ میں یہ معنی کرنا درست ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہے لَا فِيْهَا غَوْلٌ وہ مریض نہ ہوں گے تو معنی ہوگا نہ انہیں نشہ ہوگا اور نہ ان کی شراب ختم ہوگی۔ قتادہ نے کہا: غول کا معنی پیٹ کا درد ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے لَا فِيْهَا غَوْلٌ کا یہ معنی نقل کیا ہے اس میں پیٹ درد نہیں ہوگا(3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا یہ قول حضرت ابن عباس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 472　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 47　3۔ ایضاً

رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس کا معنی ہے اس میں کوئی سر درد نہیں ہوگا (1)۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ شراب میں چار خصلتیں ہیں۔ نشہ، سر درد، قی اور پیشاب (2)۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب کا ذکر کیا اور ان خصلتوں سے اسے پاک قرار دیا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد بیماری ہے۔ یہ تمام اقوال قریب قریب ہیں۔ کلبی نے کہا: غول کا معنی گناہ ہے (3)؛ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا (واقعہ) شعبی، سدی اور ابوعبیدہ نے کہا: وہ ان کی عقلوں میں خلل نہیں ڈالے گی کہ انہیں لے ہی جائے (4)؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

وما زالتِ الكأسُ تغتالُنا وتَذهبُ بالأوّلِ الأوّلِ

لگا تار جام ہماری عقلوں کو مختل ہی کرتا رہا اور ایک ایک کر کے انہیں پچھاڑتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اہل جنت سے نشہ کو دور کر دیا ہے تا کہ جنت میں ان کے لیے جو نعمتیں ہیں ان سے لذت کا حصول ان سے منقطع نہ ہو۔ علماء معانی نے کہا: غول سے مراد ایسا فساد ہے جو خفیہ طریقہ سے لاحق ہوتا ہے یہ کہا جاتا ہے: اغتاله اغتيالا جب اس پر معاملہ خفیہ طریقہ سے فاسد ہو جائے، اسی سے غول اور غیلہ ہے جس کا معنی ہے خفیہ طریقہ سے قتل کرنا۔

ان کے پاس ایسی بیویاں ہونگی جو اپنی نظروں کو اپنے خاوند تک محدود رکھیں گی وہ کسی اور کی طرف نہ دیکھیں گی؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، محمد بن کعب، اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ عکرمہ نے کہا: قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ کا معنی ہے وہ اپنے خاوند پر محبوس ہوں گی۔ پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے کیونکہ آیت میں لفظ مقصورات نہیں لیکن دوسری جگہ مقصورات ہے جس کی وضاحت آئے گی۔ قاصرات یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے؛ قد اقتصر على كذا جب وہ اسی پر قناعت کرے اور غیر سے رخ پھیر لے۔ امرء القیس نے کہا:

من القاصراتِ الطَّرفِ لودَبَّ مُحْوِلٌ من الذَّرِّ فَوْقَ الإتْبِ منها لَأثَّرا

ایسی عورتوں میں سے ہیں جو اپنی نظروں کو محدود رکھتی ہیں اگر انتہائی باریک چیونٹی بھی ان کی قمیص پر رینگے تو وہ اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ شعر میں فوق الاتب کی جگہ فوق الخدمر وی ہے۔ اتب کا معنی قمیص ہے، محول کا معنی چھوٹی چیونٹی ہے۔ مجاہد نے بھی کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ دوسری بیویوں پر غیرت نہیں کرتیں بلکہ وفادار و تابعدار ہیں۔

عین اس سے مراد بڑی آنکھوں والی ہیں اس کا واحد عیناء ہے؛ یہ سدی نے کہا: مجاہد نے کہا عین کا معنی ہے وہ خوبصورت آنکھوں والی ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جن کی آنکھوں کی سفیدی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی سیاہی بھی شدید ہے۔ پہلا معنی لغت میں بہت زیادہ ہے یہ کہا جاتا ہے: رجل اعین جس کی آنکھ کھلی ہو آنکھ واضح ہو۔ اس کی جمع عین آتی ہے اس کی اصل فُعل ہے تو عین کو کسرہ دیا گیا تا کہ یاء کو واؤ سے نہ بدل دیا جائے، اسی سے ایک لفظ عین ہے وحشی گائے کو کہتے ہیں اور اسی طرح کہتے ہیں: الثور اعین والبقرة عيناء۔

مَّكْنُوْنٌ کا معنی محفوظ ہے۔ حضرت حسن بصری اور ابن زید نے کہا: ان عورتوں کو شتر مرغ کے انڈوں (5) سے تشبیہ دی گئی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 47 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 48

ہے شتر مرغ جسے ہوا اور غبار سے پروں میں چھپائے رکھتا ہے اس کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے یہ عورت کے رنگوں میں سے سب سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور سدی نے کہا، ان عورتوں کو انڈے کے بطن سے تشبیہ دی قبل اس کے کہ ان کا چھلکا پھاڑا جائے اور ہاتھ سے مس کریں (1)۔ عطا نے کہا: ان عورتوں کو اس جھلی سے تشبیہ دی جو اوپر والے پردے اور انڈے کے مغز کے درمیان ہوتا ہے (2)۔ ہر شے کا سحاہ اس کا چھلکا ہوتا ہے اس کی جمع سحا ہے؛ یہ جوہری نے کہا، اسی کی مثل طبری کا قول ہے کہا: یہ رقیق پردہ ہے جو انڈے کے اوپر ہوتا ہے اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ عرب عورتوں کو صفائی اور سفیدی میں انڈے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ امرء القیس نے کہا:

بیضۃِ خِدْرٍ ولایرامُ خِبائُها

کتنے ہی پردے کے انڈے ہیں (عورتیں ہیں) جنکے خیمہ کا قصد نہیں کیا جاتا۔

عرب جب کسی چیز کی حسن ونظافت میں صفت بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں: کانه بیض النعام المغطّی بالریش ایک قول یہ کیا گیا ہے: مکنون سے مراد ہے جو توڑنے سے محفوظ ہو، یعنی وہ کنواری ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بیض سے مراد موتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۙ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ (واقعہ) یعنی جو سیپوں میں ہوتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:۔

هی بیضاءُ مِثلُ لُؤلُؤۃِ الغواصِ　مِیزَتْ مِنْ جَوْهَرٍ مَکْنونِ(3)

وہ غواص کے موتی کی طرح سفید ہے جسے جوہر مکنون سے الگ کیا گیا ہو۔

مَّكْنُوْنٌ کا لفظ ذکر کیا ہے جبکہ بیض جمع ہے کیونکہ صفت کو لفظ کی طرف پھیرا گیا ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۙ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۙ وَ لَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۙ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝

''پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور سوال جواب کریں گے۔ کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ کیا تو قیامت پر ایمان لانے والوں میں سے ہے، کیا جب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 48　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 49　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 48

ہم مریں گے اور مر کر مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے کیا اس وقت ہمیں جزا دی جائی گی؟ ارشاد ہوگا: کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو پس جب اس نے جھانکا تو دیکھا اپنے یار کو جہنم کے وسط میں۔ جنتی بول اٹھے گا: بخدا! تو تو مجھے ہلاک ہی کرنا چاہتا تھا اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی آج پکڑ کر لائے جانے والوں میں سے ہوتا۔ جنتی کہے گا: کیا اب تو ہمیں مرنا نہیں ہوگا بجز اپنی پہلی موت کے اور نہ ہمیں اب عذاب دیا جائے گا۔ بے شک یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے ایسی ہی عظیم الشان کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے"۔

وہ آپس میں گفتگو شروع کر دیں گے جو دنیا میں ہوا کرتی تھی۔ یہ جنت میں ان کے حد درجہ انس کا اظہار ہے اسکا عطف يُطَافُ عَلَيْهِمْ کے معنی پر ہے معنی یہ بنے گا وہ پئیں گے اور شراب پر باہم گفتگو کریں گے جس طرح شراب نوشوں کی عادت ہوا کرتی ہے۔ ایک شاعر نے کہا:

وما بقيتُ من اللذاتِ إلّا　　أحاديثُ الكِرامِ على المُدامِ(1)

لوگوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر یہ کہ کریم لوگ شراب پر آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

یعنی وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور جو اچھی یا بری صورتحال گذری ہوگی اس کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے مگر اسے ماضی کے صیغے کے ساتھ تعبیر کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا خبر دیتے وقت معمول ہے۔

ایک جنتی کہے گا: میرا ایک دوست تھا وہ کہتا تھا تو دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا کی تصدیق کرنے والا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: قرینہ سے مراد اس کا ساتھی ہے۔ سورۂ کہف میں ان کا ذکر، ان کا قصہ اور ان کے ناموں میں اختلاف اللہ تعالیٰ کے فرمان: اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ (کہف: 32) کے تحت گذر چکا ہے ان دو کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ﴿۵۱﴾ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۙ﴿۵۶﴾ وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۵۷﴾

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں قرین سے مراد اس کا شیطان دوست ہے جو دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار کا وسوسہ پیدا کرتا تھا اسے اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَّدِّقِیْنَ ﴿۵۲﴾ بھی پڑھا گیا ہے؛ اسے علی بن کیسہ نے سلیم سے وہ حمزہ سے روایت نقل کرتے ہیں۔

نحاس نے کہا: یہاں اسے المصّدّقین پڑھنا جائز نہیں کیونکہ یہاں صدقہ کا کوئی معنی نہیں۔

قشیری نے کہا: حمزہ کی قراءت میں ائنك لمن المصّدّقين ہے اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ تصدیق سے ہے تصدق سے نہیں جبکہ اعتراض باطل ہے کیونکہ قراءت جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے تو اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے معنی یہ بنے گا تو ثواب کی طلب کے لیے مال کا صدقہ کرنے والا ہے۔

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 44

کیا جب ہم مرجائیں گے مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا اس وقت ہمیں بدلہ دیا جائے گا یعنی موت کے بعد ہمیں جزا دی جائے گی اور ہمارا محاسبہ کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے جنتیوں سے فرمایا: کیا تم جہنم کی طرف جھانکنے والے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومن جنت میں اپنے مومن بھائیوں سے کہے گا: کیا تم جہنم کی طرف جھانکنے والے ہوتا کہ ہم دیکھیں تو سہی اس دوست کا کیا حال ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ فرشتوں کا قول ہے اور هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ استفہام نہیں یہ تو امر کے معنی میں ہے یعنی جھانکو؛ یہ ابن عربی اور دوسرے لوگوں کا نقطہ نظر ہے، اس معنی میں ہے جب شراب کے حکم والی آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوئے پھر آسمان کی طرف سر اٹھایا پھر کہا: اے میرے رب! شراب کے بارے میں ایسا حکم نازل فرما جو اس سے بھی زیادہ واضح ہو تو فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (مائدہ) نازل ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا: اے ہمارے رب! ہم رک گئے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ مشدد نہیں اور فَاُطْلِعَ پڑھا یعنی ہمزہ قطعی ہے اور طاء مخففہ ہے معنی ہوگا هل انتم مقبلون فاقبل۔ نحاس نے کہا: فاطلع فراٰه میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ فعل مستقبل ہے اسکا معنی پس میں جھانکوں گا، تو یہ استفہام کے جواب میں ہونے سے منصوب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ فعل ماضی ہے تو اطلع اور اطلع ایک ہے۔ زجاج نے کہا: طلع، أطلع اور اطّلع سب کا ایک ہی معنی ہے۔ یہ بھی حکایت بیان کی گئی ہے هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنِ ۝ یعنی نون مکسور ہے۔ ابو حاتم اور دوسرے علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سراسر غلط ہے یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں نون اور اضافت کو جمع کر دیا گیا ہے اگر یہ مضاف ہوتا تو یہ ہوتا هل انتم مطلعی اگرچہ سیبویہ اور فراء نے اس کی مثل حکایت بیان کی ہے دونوں نے یہ شعر پڑھا:

هُمُ القائلُوْنَ الخیرَ والآمِرُوْنَهٗ وہ بھلائی کی بات کہنے والے اور اس کا حکم دینے والے ہیں۔

فراء نے والفاعلونه پڑھا۔ سیبویہ نے اکیلے یہ پڑھا: ولم یَرْتَفِق والنّاس مختضِرونه محل استدلال محتضرونه ہے۔
یہ شاذ ہے اور کلام عرب سے خارج ہے۔ جو اس قسم کا کلام ہے اس کے ذریعے کتاب اللہ میں استدلال نہیں کیا جاسکتا اور یہ کلام فصیح میں داخل بھی نہیں۔

اس کی توجیہ میں ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اسم فاعل کو فعل مضارع کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے قریب ہے پس مُطلعون کو یُطلِعون کے قائم مقام رکھا؛ یہ ابوالفتح عثمان بن جنی نے ذکر کیا ہے اور یہ کہا: أقائِلُنَّ احضِروا الشُّهُودَا کیا تم یہ کہو گے گواہوں کو حاضر کرو۔ محل استدلال اقائلُنَّ ہے جو اتَقولُن کے معنی میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: جنت میں ایک روشن دان ہے جنتی جس سے جہنم اور جہنمیوں کو دیکھیں گے۔

ابن مبارک نے جو ذکر کیا ہے اس میں کعب نے بھی یہی ذکر کیا ہے کہا: جنت اور دوزخ میں ایک روشن دان ہے جب کوئی

1۔ جامع سنن الترمذی، باب ومن سورۃ المائدۃ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مومن ارادہ کرتا ہے کہ اس دشمن کو دیکھے جو دنیا میں اس کا دشمن تھا تو وہ اس روشن دان سے جھانکے گا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ ، سَوَآءِ الْجَحِیْمِ سے مراد جہنم کا وسط ہے جبکہ کانٹے دار پودے اس کے ارد گرد ہوں گے؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: تعبت حتی انقطع سَوائی میں تھکا یہاں تک کہ میری کمر ٹوٹ گئی، یہاں بھی سواء سے مراد وسط ہے۔

قتادہ سے مروی ہے کہ بعض علماء نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اس جہنمی کی اس جنتی کو پہچان نہ کرائے تو وہ اسے نہ پہچان سکے گا اس کا رنگ اور اس کی حالت بدل جائے گی (1) اس موقع پر وہ کہے گا: تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۝ اس میں ان مثقلہ سے مخففہ ہے یہ کاد پر اسی طرح داخل ہے جس طرح کان پر داخل ہے اسی کی مثل اِنْ كَادَ لَیُضِلُّنَا (الفرقان: 42) ہے لام ان مخففہ اور ان نافیہ کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت نہ ہوتی تو میں بھی جہنم میں حاضر ہوتا۔ کسائی نے کہا: لتردین کا معنی ہے تو مجھے ہلاک کر دیتا۔ الردی کا معنی ہلاکت ہے مبرد نے کہا: اگر کہا جاتا لَتُرْدِیْنِ یعنی تو ضرور مجھے آگ میں گرا دیتا تو یہ بھی جائز تھا۔

اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عصمت اور اسلام کا حلقہ مضبوطی سے پکڑنے کی اور برے دوست سے براءت کی توفیق مجھے حاصل نہ ہوتی تو میں جہنم میں ہوتا۔ لولا کا مابعد سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کی حیثیت میں مرفوع ہے اس کی خبر محذوف ہے لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ۝ فراء نے کہا: تو میں بھی جہنم میں تمہارے ساتھ حاضر ہوتا۔ احضر کا لفظ صرف شر میں استعمال ہوتا ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے (2)۔

بِمَیِّتِیْنَ کو بمائتین بھی پڑھتے ہیں افما ہمزہ استفہام کے لیے ہے جو فاء عاطفہ پر داخل ہے معطوف اس کا محذوف ہے اس کا معنی ہوگا: کیا ہم ہمیشہ رہیں گے، نعمتیں دیئے جاتے رہیں گے، ہمیں موت نہ آئے گی اور نہ ہمیں عذاب دیا جائے گا اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى یہ استثناء ہے یہ پہلی کلام سے استثنا نہیں۔ موتۃ سے مصدر ہے کیونکہ یہ موصوف ہے یہ جنتیوں کی فرشتوں کے سامنے گفتگو ہوگی موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اے جنتیو! ہمیشہ کی زندگی ہے اب کوئی موت نہیں اور اے جہنمیو! ہمیشہ کی زندگی ہے اب کوئی موت نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مومنوں کی گفتگو تحدیث نعمت کے طور پر ہوگی کہ وہ نہ مریں گے اور نہ ہی انہیں عذاب دیا جائے گا یعنی یہ ہماری حالت اور ہماری صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مومن کی کافر کے لیے گفتگو ہوگی کیونکہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتا تھا اور موت صرف دنیا کی ہی موت ہے جنت میں جو کچھ ہوگا مومن اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے گا: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ ھو مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے اور جملہ ان کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ ھو ضمیر فصل ہے۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝ یہ احتمال موجود ہے کہ یہ مومن کا کلام ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں جو کچھ تیار کیا اور جو کچھ اسے عطا کیا جب اسے دیکھا تو یہ کہا کہا: لِمِثْلِ هٰذَا سے مراد عطا اور فضل ہے فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ یہ اسی کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 50
2۔ ایضاً

مثل ہے جو کافر نے اسے کہا: اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا (الکہف) یہ بھی احتمال موجود ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو۔ ایک قول یہ کیا ہے کہ یہ الله تعالیٰ کا اہل دنیا کے لیے قول ہے یعنی جنت میں جو خیرات اور جزا ہے اس کو تم نے سنا تو عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ نحاس نے کہا: تقدیر کلام یوں ہوگی فلیعمل العاملون لمثل هذا۔

اگر کوئی سوال کرے: عربی زبان میں فاء اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے بعد والا اوّل کے بعد واقع ہوتا ہے تو اس کی بعد والے کو پہلے کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ تقدیم تاخیر کی طرح ہے کیونکہ حروف جارہ اور ان کے مابعد کا حق یہ ہوتا ہے کہ وہ متاخر ہوں۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۞ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۞ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۞ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۞ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۞ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۞ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۞

”بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔ ہم نے بنا دیا ہے اسے آزمائش ظالموں کے لیے۔ یہ ایک درخت ہے جو اگتا ہے جہنم کی تہہ میں، اس کے شگوفے گویا شیطانوں کے سر ہیں۔ پس انہیں ضرور کھانا ہوگا اس سے اور بھریں گے اس سے اپنے پیٹ۔ پھر انہیں زقوم کھانے کے بعد کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جہنم کی طرف“۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ یہ مبتدا اور خبر ہے یہ الله تعالیٰ کا فرمان: نُّزُلًا اسکا بیان ہے اسکا معنی ہے کیا جنت کی نعمتیں بہترین ضیافتیں ہیں یا زقوم کا درخت بہترین ضیافت ہے؟ نزل لغت میں اس رزق کو کہتے ہیں جس میں وسعت ہو۔ نحاس نے کہا: اسی طرح النزل اور نزل ہے مگر یہ بھی جائز ہے کہ نزل بھی اس کی ایک لغت ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اصل میں یہ نزل ہو اس سے یہ جملہ ہو اقیم للقوم نزلهم قوم کے لیے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اس کا اشتقاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وہ غذا ہے جو اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ وہ پڑاؤ کرتے اور اس ہی میں مقیم رہتے۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں یہ گزر چکا ہے۔ شجرة الزقوم یہ تزقم سے مشتق ہے یہ مشقت کے ساتھ نگلنا ہے کیونکہ وہ ناپسندیدہ اور بدبودار ہوتا ہے۔

مفسرین نے کہا: یہ جہنم کی لپک کے ساتھ اسی طرح زندہ رہتا ہے جس طرح درخت پانی کی ٹھنڈک کے ساتھ زندہ رہتا ہے جو اس کے اوپر والے حصے میں رہتے ہیں ان جہنمیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی طرف نیچے اتریں اور اس سے کھائیں اسی طرح جو اس سے نیچے والے حصہ میں رہتے ہیں وہ اس کی طرف اوپر چڑھیں۔

اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس سے مراد دنیا کا درخت ہے جسے عرب پہچانتے ہیں یا نہیں پہچانتے (1)؟ اس کے بارے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 51-50

میں دو قول ہیں: (1) یہ وہی درخت ہے جو دنیا میں معروف ہے۔ جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں بھی اختلاف ہے۔ قطرب نے کہا: یہ سخت کڑوا درخت ہے جو تہامہ میں ہوتا ہے اور خبیث ترین درخت ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ قاتل نبات ہے۔ (2) دنیا کے درختوں میں یہ معروف نہیں۔ جب زقوم کے درخت کے بارے میں آیت کریمہ نازل ہوئی تو قریش نے کہا: ہم تو اس درخت کو نہیں پہچانتے تو افریقہ کا ایک آدمی ان کے پاس آیا قریش نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: ہمارے نزدیک تو اس سے مراد مکھن اور کھجور کے مجموعے کو کہتے ہیں تو ابن زبعری نے کہا: اللہ تعالیٰ ہمارے گھروں میں زقوم کی کثرت کرے۔ ابوجہل نے اپنی لونڈی سے کہا: ہمیں زقوم کھلاؤ تو وہ اس کے پاس مکھن اور کھجور لے آئی پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: زقوم سے لطف اندوز ہو یہ وہ چیز ہے جس سے ''محمد'' ہمیں ڈراتے ہیں وہ گمان کرتے ہیں کہ آگ درخت کو اگاتی ہے جبکہ آگ درخت کو جلا دیتی ہے۔

فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ میں ظالمین سے مرد مشرکین ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا: آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آگ تو درخت کو جلا دیتی ہے؟ یہ بحث سبحان کے لفظ کے ضمن میں گذر چکی ہے انہوں نے اس کو خفیف اسی طرح جانا تھا جس طرح انہوں نے عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ (المدثر) کو خفیف جانا تھا وہ کیا معاملہ ہے جس نے اس عدد کو خاص کیا ہے یہاں تک کہ ان میں سے ایک نے کہا تھا میں اتنوں کو تو تمہاری طرف سے کافی ہوں باقی کو تم میری طرف سے کافی ہو جانا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (مدثر: 31) فتنہ کا معنی آزمائش ہے ان کی طرف سے یہ قول سراسر جہالت تھی کیونکہ عقلا ایسا محال نہیں کہ اللہ تعالیٰ آگ میں اس کی جنس سے ایسا درخت پیدا کرے جسے آگ نہ کھاتی ہو جس طرح جہنم میں اللہ تعالیٰ بیڑیاں، طوق، سانپ، بچھو اور جہنم کے داروغے پیدا فرماتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تعجب جس طرح کفار کو ہوا تھا اسی طرح اس وقت ملاحدہ کو بھی ہے یہاں تک کہ جنت اور جہنم کو انہوں نے ایسی نعمت اور عقاب پر محمول کیا ہے جس میں روحیں داخل ہوتی ہیں انہوں نے اعمال کے وزن کرنے، صراط، لوح اور قلم کو ایسے معنی پر محمول کیا ہے جو انہوں نے خود اپنے دلوں میں تصور کیے نہ کہ ان کی وہ تعبیر کرتے ہیں جو مسلمان شرعی دلائل سے سمجھے ہیں۔ جب صادق و امین کی خبر ایسی چیز کے بارے میں وارد ہو جس کا عقل وہم ہی کر سکے تو اس کی تصدیق واجب ہے اگرچہ یہ جائز ہو کہ اسکی کوئی تاویل کی جا سکے پھر ایسی تاویل باطل ہوگی جس کے بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہو کہ یہ تاویل باطل ہے مسلمان ان اشیاء کو حاصل ہونے کو جائز سمجھتے ہیں اسے باطن کے علم کی طرف نہیں پھیرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ظالمین کے لیے سزا ہے جس طرح فرمایا: ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ (ذاریات)

اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ سے مراد جہنم کی گہرائی ہے یہاں سے ہی یہ جنم لے گا پھر یہ جہنم میں پھیل جائے گا۔ طلعها سے مراد اسی کا پھل ہے۔ پھل کو طلع کا نام اس لیے دیا کیونکہ یہ طلوع کرے گا۔

رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ سے مراد شیاطین کی ذاتیں ہیں ان کی قباحت کی وجہ سے ان پھلوں کو رءوس سے تشبیہ دی گئی شیاطین کے سروں کا تصور نفوس میں ہی ہوگا اگرچہ وہ دکھائی نہ دیں گے اس معنی میں عربوں کا قول یہ ہے کہ ہر قبیح کے لیے وہ یہ

کہتے ہیں: ھو کصورۃ الشیطان اور ہر خوبصورت شے کو کہتے ہیں: ھی کصورۃ الملک اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو اس نے ان عورتوں کے قول کی حکایت کے طور پر کہا: اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف: 31)

یہ تشبیہ تخییلی ہے؛ یہی معنی حضرت ابن عباس اور قرظی سے منقول ہے اسی معنی میں امراء القیس کا قول ہے:

مَسْنُونَةٌ زُرْقٌ كَأَنْيَابِ أَغْوَالِ

مسنونۃ زرق سے مراد ایسے تیر ہیں جنہیں تیز کیا گیا ہو البتہ غول (جن بھوت) معروف نہیں لیکن نفوس میں ان کی قباحت متصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (انعام: 112) انسانوں میں سے تو سرکش ایسے شیاطین ہیں جو دکھائی دیتے ہیں حدیث صحیح میں ہے ولکأن نخلھا رءوس الشیاطین(1) گویا اس کی کھجوریں شیاطین کے سر ہیں۔ بہت سے عربوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے شیاطین اور جنوں کو دیکھا ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا: شیاطین سے مراد سانپ ہیں جن کے سر اور کلغیاں ہوتی ہیں یہ سانپوں میں سے قبیح ترین، خبیث ترین اور جسموں میں سے سب سے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ راجز نے کہا: عورت کو ایسے سانپ سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کی کلغی ہو۔

عَنْجَرِدٌ تَحْلِفُ حِينَ أَحْلِفُ كَمِثْلِ شَيْطَانِ الْحَمَاطِ أَعْرَفُ

کلغی والی عنجرد جو حماط کے شیطان کی مثل ہے وہ اس وقت قسم اٹھاتی ہے جب میں قسم اٹھاتا ہوں۔

شاعر اپنی اونٹنی کی صفت بیان کرتا ہے:

تُلَاعِبُ مَثْنَى حَضْرَمِيٍّ كَأَنَّهُ تَعَمُّجُ شَيْطَانٍ بِذِي خِرْوَعٍ قَفْرِ

تعمج سے مراد چال میں ٹیڑھا پن ہے، سہم عموج اس تیر کو کہتے ہیں جو جاتے وقت مڑ جاتا ہے تعمجت الحیۃ۔ جو چلتے ہوئے مڑ جائے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے اس قبیح بوٹی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو یمن میں ہوتی ہے جسے استن اور شیطان کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ عربوں کے ہاں معروف نہ تھا۔ زمخشری نے کہا: اس سے مراد ایسا درخت ہے جو کھردرا، کڑوا اور ناپسندیدہ صورت والا ہو۔ اس کے پھل کو رءوس الشیاطین کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: شیاطین سے مراد سانپوں کی ایسی قسم ہے جو بہت ہی قبیح ہوتی ہے۔

اہل جنت کے مقابلہ میں ان کا یہ کھانا اور پھل ہوگا، سورۂ غاشیہ میں آیا ہے لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ اس کا ذکر بعد میں آئے گا اس درخت کے کھانے کے بعد کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا شوب سے مراد آمیزہ ہے شَوب اور شُوب سے مراد دونوں لغتیں ہیں جس طرح فَقر اور فُقر ہے اور فتحہ زیادہ مشہور ہے۔ فراء نے کہا: شاب طعامہ وشرابہ۔ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب ان دونوں کے ساتھ کوئی چیز ملائی جائے اس کا مصدر شوبا اور شیابۃ آتا ہے یہ خبر دی کہ ان کے لیے کھولتے ہوئے پانی کو ملایا جائے گا حمیم سے مراد گرم پانی ہے تاکہ یہ کھانا ان کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہو جائے اللہ تعالیٰ کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب إن اللہ یامر بالعدل، جلد 2، صفحہ 896

فرمان ہے: وَ سُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ۝ (محمد)

سدی نے کہا: ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ان کی آنکھوں کے پانی ان کی پیپ اور ان کے خون کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے زقوم کو کھولتے ہوئے پانی میں ملا یا جائے گا تا کہ ان کے لیے زقوم کی کڑواہٹ اور کھولتے ہوئے پانی کی گرمی کو جمع کر دیا جائے مقصود ان کے عذاب میں سختی اور ان کی آزمائش میں جدت پیدا کرنا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاۡ اِلَی الۡجَحِیۡمِ ۝ اس امر پر دلالت کرتا ہے جب وہ جہنم کے عذاب کے علاوہ زقوم کو کھالیں گے پھر انہیں جہنم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ مقاتل نے کہا: حمیم، جحیم سے باہر ہوگا وہ پانی پینے کے لیے کھولتے ہوئے چشمے پر وارد ہوں گے پھر انہیں جہنم (جحیم) کی طرف لوٹا دیا جائے گا کیونکہ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیۡ یُکَذِّبُ بِهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝ یَطُوۡفُوۡنَ بَیۡنَهَا وَ بَیۡنَ حَمِیۡمٍ اٰنٍ ۝ (رحمٰن) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرجعهم کی بجائے منقلبهم پڑھا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہاں ثم کا لفظ واو کے معنی میں ہو۔ قشیری نے کہا: شائد حمیم جہنم کی ایک طرف میں ہو۔

اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّیۡنَ ۝ فَهُمۡ عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ یُهۡرَعُوۡنَ ۝ وَ لَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَکۡثَرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۝ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِیۡهِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ ۝ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ۝

''انہوں نے پایا تھا اپنے باپ دادا کو گمراہ پس وہ (بے سوچے سمجھے) ان کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے اور بہک گئے تھے ان سے قبل بہت سے پہلے لوگ اور ہم نے بھیجے تھے ان میں ڈرانے والے پس (اے مخاطب!) ذرا دیکھ کیسا انجام ہوا جنہیں ڈرایا گیا تھا (مگر وہ نہ سنبھلے) سوائے ان کے جو الله کے مخلص بندے تھے''۔

یعنی انہوں نے آباء کو گمراہ پایا تو ان کی اقتدا کی تو یہ ان کے پیچھے تیزی سے بھاگے جا رہے ہیں؛ یہ قتادہ سے مروی ہے مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے هرولہ (چال کا انداز) کے انداز میں جا رہے ہیں۔ فراء نے کہا: اهراع سے مراد کانپتے ہوئے تیز چلنا۔ ابو عبیدہ نے کہا: یهرعون کا معنی ہے پیچھے سے ان پر مٹی ڈالی جا رہی ہوگی اسی کی مثل مبرد کا قول ہے۔ المهرع سے مراد ہے جس کو تیزی سے چلایا جا رہا ہو یہ جملہ کہا جاتا ہے: جاء فلان یهرع الی النار۔ فلاں آیا اسے آگ کی طرف تیزی سے لے جایا جا رہا تھا یہ اس وقت بولتے ہیں جب سردی اسے آگ کی طرف تیزی سے لے جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں تیزی کی سختی کی وجہ سے دھتکارا جا رہا ہو؛ یہ فضل کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: یہ جملہ کہا جاتا ہے هرع و أهرع جب اسے پیچھے سے تیز چلایا جائے اور دھتکارا جائے۔

اَکۡثَرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۝ سے مراد ہے سابقہ امتیں۔ مُّنۡذِرِیۡنَ ۝ سے مراد ہے ایسے رسول جنہوں نے ان لوگوں کو عذاب سے خبردار کیا تھا تو ان لوگوں نے کفر کیا۔ عَاقِبَةُ سے مراد ان کے امر کا انجام ہے۔ عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ۝ سے مراد ہے الله

تعالیٰ نے جنہیں کفر سے بچالیا۔ یہ بحث گذر چکی ہے پھر یہ کہا گیا یہ الْمُنْذَرِیْنَ سے مستثنیٰ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وَ لَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ سے مستثنیٰ ہے۔

وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ۝ وَ نَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝ وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ۝ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۝

"اور فریاد کرتے ہوئے پکارا ہمیں نوح نے پس ہم بہترین فریاد رس ہیں۔ اور ہم نے نجات دے دی انہیں اور ان کے گھرانے کو ایسی مصیبت سے جو بڑی زبردست تھی اور ہم نے بنا دیا فقط اس کی نسل کو باقی رہنے والا اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں۔ نوح پر سلام ہو تمام جہانوں میں۔ ہم اس طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو۔ بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔ پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے لوگوں کو"۔

یہاں ندا سے مراد استغاثہ ہے یعنی حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے لیے دعا کی اور یوں عرض کی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۝ (نوح)

ہم کتنے ہی اچھے دعا قبول کرنے والے تھے۔ کسائی نے کہا: تقدیر کلام یوں ہے فلنعم المجیبون له كنا ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کو نجات دی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لا چکے تھے جس طرح پہلے گذر چکا ہے ان کی تعداد اسی تھی۔ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝ سے مراد غرق ہونا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے باہر نکلے تو جو مرد اور عورتیں آپ کے ساتھ تھے سب فوت ہو گئے صرف آپ کا بیٹا اور اس کی بیویاں تھیں: اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ۝ سے یہی مراد ہے۔

حضرت سعید بن مسیب نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے(1) لوگ سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں سام عربوں، ایرانیوں، رومیوں، اور یہود و نصاریٰ کے جد اعلیٰ ہیں حام کالون کے جد اعلیٰ ہیں یہ مشرق میں ہیں یا مغرب میں جیسے سندھی، ہندی، نوبی، زنجی، حبشی، قبطی اور بربری وغیرہ۔ یافث صقالبہ، ترکوں، ابر، خرز، یاجوج اور ماجوج کے جد اعلیٰ ہیں۔

ایک قوم نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کے علاوہ بھی نسل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ (بنی اسرائیل: 3)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 53

وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ہود) اس معنی پر یہ آیت ہے وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ یہ کافروں کی اولاد سے الگ ہیں کیونکہ ان سب کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ یعنی ہر قوم میں اس کے لیے ہم نے اچھی تعریف چھوڑی ہے کیونکہ وہ سب کا محبوب ہے یہاں تک کہ مجوسی بھی انہیں کہتے ہیں وہ افریدون ہے؛ یہی معنی مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ کسائی نے گمان کیا ہے اس میں دو تقدیریں ہیں: (1) وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ، يقال سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ یعنی ہم نے اس کے لیے اچھی تعریف چھوڑی ہے؛ یہ ابو العباس مبرد کا قول ہے یعنی ہم نے اس پر یہ کلمہ باقی چھوڑا ہے یعنی لوگ اس پر سلامتی بھیجتے ہیں اور اس کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ یہ اس کلام میں سے ہے جس کی حکایت بیان کی جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا (نور: 1)

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہو ہم نے اس پر باقی رکھا اور گفتگو مکمل ہو گئی پھر کلام نئے انداز میں شروع کی اور کہا سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ یعنی اس کے لیے سلامتی ہے اس چیز سے کہ اس کے بارے میں بعد کے لوگوں میں براذ کر ہو۔

کسائی نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں سلاما منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہے ترکنا علیہ ثناء حسنا سلاما۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِي الْاٰخِرِيْنَ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: انبیاء میں اس کا ذکر خیر باقی رکھا گیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی ایسا نبی مبعوث نہیں کیا گیا مگر اسے حضرت نوح علیہ السلام کی اقتدا کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا (شوریٰ: 13)

سعید بن مسیب نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے جو شام کے وقت یہ کہے: سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ اسے بچھو نہیں کاٹے گا۔ ابو عمر نے اسے التمہید میں ذکر کیا ہے۔ موطا میں حضرت خولہ بنت حکیم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی کسی جگہ پڑاؤ ڈالے تو وہ یہ پڑھے اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق تو اسے کوئی چیز نقصان نہ دے گی یہاں تک کہ وہ وہاں سے کوچ کرے گا''۔ اس میں یہ روایت بھی ہے کہ بنو اسلم کے ایک آدمی نے کہا: میں رات سو نہ سکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کس وجہ سے؟'' عرض کی: مجھے ایک بچھو نے ڈس لیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خبردار! اگر تو شام کے وقت یہ پڑھ لے تو تجھے کوئی چیز تکلیف نہ دے گی اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق'' (1)۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ یعنی ہم ان پر اچھی جزا باقی رکھیں گے۔ کاف محل نصب میں ہے یعنی جزاء کذلک۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ یہ اس کے احسان کا بیان ہے۔

جنہوں نے کفر کیا ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ الآخرین کی جمع اُخر ہے☆ اس میں اصل تو یہ ہے من الآخرین مگر من کو حذف کر دیا کیونکہ معنی معروف ہے۔ آخر کوئی نہیں ہو سکتا مگر اس سے پہلے اس کی جنس میں سے کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ ثم

1۔ موطا امام مالک، باب ما یؤمر من التعوذ، صفحہ 722

☆ عبارت اسی طرح لکھی ہوئی ہے مگر صحیح یہ ہے آخرین یہ آخر کی جمع ہے۔

یہاں تراخی کے لیے نہیں بلکہ یہ نعمتوں کا شمار کرنے کے لیے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البلد) پھر میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ میں نے دوسروں کو غرق کر دیا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝۸۳ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝۸۴ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝۸۵ اَىِٕفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۝۸۶ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۷ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ۝۸۸ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝۸۹ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۝۹۰

”اور ان کی جماعت میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ۔ جب انہوں نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو؟ کیا جھوٹے گھڑے ہوئے خدا، اللہ تعالیٰ کے علاوہ چاہتے ہو؟ پس تمہارا کیا خیال ہے سارے جہانوں کے پروردگار کے بارے میں۔ جو آپ نے ایک بار دیکھا ستاروں کی طرف پھر کہا: میری طبیعت ناساز ہے۔ چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے چھوڑ کر میلہ دیکھنے چلے گئے“۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مِنْ شِيْعَتِهٖ سے مراد ہے ان کے دین والے (1)۔ مجاہد نے کہا: اسکا معنی ہے اس کے طریقہ اور سنت پر ہیں (2)۔ اصمعی نے کہا: شیعہ سے مراد حمایتی و مددگار ہیں (3)۔ یہ شیاع سے ماخوذ ہے اس سے مراد وہ چھوٹی لکڑیاں ہیں جو بڑی کے ساتھ جلائی جاتی ہیں تاکہ آگ روشن ہو۔

کلبی اور فراء نے کہا: معنی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعوان میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (4)۔ شیعتہ میں ضمیر سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ پہلی تعبیر کی صورت میں ضمیر سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں یہ تعبیر زیادہ نمایاں ہے کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہی پہلے ذکر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دو نبی تھے حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار، چھ سو چالیس سال کا عرصہ ہے؛ یہ زمخشری نے بیان کیا ہے۔

قلب سلیم سے مراد شرک اور شک سے پاک دل ہے۔ عوف اعرابی نے کہا میں نے محمد بن سیرین سے پوچھا قلب سلیم کیا ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص ہونا۔ طبری نے غالب قطان سے، عوف اور دوسرے علماء نے محمد بن سیرین سے یہ روایت نقل کی ہے وہ حجاج کو کہتے ہیں: ابو محمد مسکین ہیں اگر اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا تو اس کے گناہ کے باعث دے گا اور اگر اسے بخش دے تو اس کے لیے مبارک ہے اگر اس کا دل سلیم ہے تو گناہ تو اسے بھی پہنچے ہیں جو اس سے بہتر تھے۔ عوف نے کہا: میں نے محمد سے پوچھا قلب سلیم کیا ہے؟ فرمایا: وہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، قیامت قائم ہونے والی ہے قبروں میں جو ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ اٹھانے والا ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 54 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہشام بن عروہ نے کہا: ہمارے والد ہمیں کہا کرتے تھے اے بیٹو! تم لعن طعن کرنے والے نہ ہو جانا، کیا تم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے کبھی بھی کسی چیز پر لعن طعن نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ ان کا اپنے رب کی طرف آنا(1) اس کی دو صورتیں ہیں: (1) وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی دعوت دیتے تھے (2) جب آپ علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ میں اب سے مراد آزر ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝ میں ما مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور ذا اس کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ ماذا، تعبدون کی وجہ سے منسوب ہو۔ ائفکا یہ مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب ہے یہ کلام اس معنی میں ہے أتریدون إفکا کیا تم بہتان کا ارادہ کرتے ہو۔ مبرد نے کہا افک یہ بہت برا جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ وہ جھوٹ ہوتا ہے جو ثابت نہیں ہوتا اور مضطرب رہتا ہے اس سے ائتفکت بھم الارض ہے۔ آلھۃ یہ افک سے بدل ہے۔ تریدون کا معنی ہے تم عبادت کرتے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو معنی ہو کیا تم بہتان لگاتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہو جب تم اپنے رب سے ملاقات کرو گے تو اس بارے میں کیا گمان ہو گا جبکہ تم نے دوسرے معبودوں کی عبادت کی ہوگی؟ یہ خبردار کرنا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان: مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ (انفطار) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کس وجہ سے تم وہم کا شکار ہوئے یہاں تک کہ تم نے دوسروں کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرا دیا؟

ابن زید نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف پیغام بھیجا کہ کل ہماری عید ہے ہمارے ساتھ چلیے تو آپ علیہ السلام نے ایک طلوع ہونے والے ستارے کی طرف دیکھا فرمایا: یہ ستارہ میری بیماری کے ساتھ طلوع ہوتا ہے(2)۔ علم نجوم ان لوگوں میں استعمال ہوتا تھا اس میں نظر و فکر کی جاتی تھی تو آپ نے انہیں اس طریقہ سے وہم میں مبتلا کر دیا اور ان کے اعتقادات کے باعث اپنے لیے عذر پیش کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مویشی پالتے اور زراعت کیا کرتے تھے یہ دونوں ذریعہ معاش ایسے تھے جن میں ستاروں کی چال میں نظر و فکر کی ضرورت ہوا کرتی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: علم نجوم بھی نبوت میں سے تھا جب اللہ تعالیٰ نے سورج کو حضرت یوشع بن نون پر روک دیا تو اس علم کو باطل کر دیا(3)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس میں علم نبوی کی حیثیت سے غور کیا تھا۔

جویبر نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے: علم نجوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک باقی تھا یہاں تک کہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایسی جگہ داخل ہوتے جس کے بارے میں کسی کو اطلاع نہ تھی(4)۔ حضرت مریم نے لوگوں سے پوچھا: تم نے اس کی جگہ کا علم کیسے حاصل کیا؟ تو لوگوں نے بتایا: ستاروں کے ذریعے، اس موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی: اے اللہ! انہیں علم نجوم کا فہم نصیب نہ کرنا تو کوئی بھی علم نجوم کو نہیں جانتا۔ شرع میں اس کا حکم ممنوع ہو گیا اور لوگوں میں اس کا علم مجہول ہو گیا۔ کلبی نے کہا: وہ لوگ بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک دیہات میں رہتے جسے ہرمزجرد کہا جاتا وہ ستاروں میں نظر و فکر کیا کرتے تھے: یہ ایک قول ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 55 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 56 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 55 4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 56-55

حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے جب لوگوں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ ان کے ساتھ چلیں تو آپ نے اپنے معمولات میں غور و فکر کیا اس تعبیر کی بنا پر معنی یہ ہوگا کہ ان کے لیے جو رائے ظاہر ہوئی اس میں غور و فکر کیا تو آپ کو علم ہوا کہ ہر زندہ آدمی بیمار ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ سَقِیْمٌ میں بیمار ہوں۔ خلیل اور مبرد نے کہا: جبکہ کوئی آدمی کسی چیز میں غور کرتا ہے تو اس آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: نظرفی النجوم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ گھڑی جس میں انہوں نے آپ کے ساتھ جانے کو کہا تھا یہ وہ گھڑی تھی جس میں آپ کو بخار نے آلیا تھا ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اشیاء میں سے جو چیزیں ظاہر ہوئیں تو ان میں آپ نے غور و فکر کیا تو آپ کو علم ہو گیا کہ ان کا ایک خالق اور مدبر ہے اور ان میں اسی طرح تبدیلی واقع ہو گی جس طرح ان اشیاء میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو کہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ۔ ضحاک نے کہا سقیم کا معنی ہے مجھے عنقریب موت کی بیماری لگے گی کیونکہ جس پر موت لکھ دی گئی ہو عموماً وہ بیمار ہوتا ہے پھر وہ مرجاتا ہے۔ یہاں توریہ اور تعریض کا قائدہ جاری ہو رہا ہے جس طرح آپ نے بادشاہ سے اس وقت کہا تھا: میری بہن ہے جب اس نے سارہ کے بارے میں پوچھا تھا یعنی دینی اخوت ہے۔

حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور ضحاک نے یہ بھی کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے ایسی مرض اور سقیم کا اشارہ کیا جو متعدی ہوتا ہے جس طرح طاعون۔ وہ لوگ طاعون سے بھاگتے تھے وہ اس عدویٰ کے خوف سے آپ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ترمذی حکیم نے یہ روایت کی ہے کہ مجھے میرے باپ نے روایت کی انہیں عمرو بن حماد نے انہیں اسباط نے انہیں سدی نے انہیں ابو مالک اور ابو صالح نے انہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت بیان کی ہے۔ سمرہ نے ہمدانی سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ابو ابراہیم نے کہا: ہماری ایک عید ہوتی ہے کاش! تم ہمارے ساتھ نکلتے تو ہمارا طریقہ تمہیں خوش کرتا، جب عید کا دن ہوا تو وہ لوگ عید کے لیے نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کے ساتھ نکلے ابھی آپ راستہ میں ہی تھے کہ آپ گر گئے اور فرمایا: میں تو بیمار ہوں، میری ٹانگ میں تکلیف ہے۔ انہوں نے آپ کی ٹانگ پر قدم رکھے جبکہ آپ نیچے گرے پڑے تھے جب وہ آگے چلے گئے تو پیچھے آپ نے آواز دی: تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (انبیاء: 57) ابو عبداللہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے جو کچھ کہا تھا یہ اس کے معارض نہیں کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ان کے لیے دو امر جمع ہو گئے ہوں۔

میں کہتا ہوں: صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین خلاف واقع باتیں کی ہیں (1)'' سورۃ الانبیاء میں یہ بحث پہلے گذر چکی ہے جو اس بات پر دال ہے کہ آپ مریض تو نہ تھے آپ نے تعریض سے کام لیا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ (زمر)

اس کا معنی ہے زمانہ آئندہ میں میں مریض ہوں انہوں نے یہ گمان کیا آپ اس وقت بیمار ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے یہ کلام میں تعریض کی صورت ہے اس معنی میں مشہور مثل ہے کفی بالسلامۃ داء، سلامتی بیماری کے طور پر کافی ہے۔ لبید کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً، جلد 1، صفحہ 474

بھی ایک شعر ہے:

فدعوتُ رَبِّی بالسلامةِ جاهِدًا لِيُصِحَّنِى فإذا السَّلَامَةُ داءُ(1)

میں نے کوشش کرتے ہوئے اپنے رب سے سلامتی کی دعا کی تا کہ وہ مجھے صحت عطا فرمائے کیونکہ سلامتی بھی بیماری ہے۔

ایک آدمی اچانک مر گیا تو لوگوں نے اس پر بھیڑ کر لی لوگوں نے کہا: وہ مر گیا ہے جبکہ وہ صحت مند تھا تو ایک بندہ نے کہا: اصحیح مَنِ الموت فی عنقه۔ کیا وہ آدمی جس کی گردن میں موت ہے وہ صحیح ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سچے تھے مگر انبیاء کو اللہ تعالیٰ کا قرب ہوتا ہے اور وہ چنے ہوئے تھے تو اسے بھی گناہ شمار کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۸۲﴾ (شعراء) اس کی مفصل بحث گذر چکی ہے الحمد للہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے کفر کی وجہ سے آپ کی طبعیت میں اضطراب تھا۔ نجوم یہ نجم کی جمع ہے واحد ہو تو اصل میں یہ مصدر ہے۔

فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِہَتِہِمۡ فَقَالَ اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿ۚ۹۱﴾ مَا لَکُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَیۡہِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡیَمِیۡنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَیۡہِ یَزِفُّوۡنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴿ۙ۹۵﴾ وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

''پس آپ چپکے سے ان کے دیوتاؤں کی طرف گئے اور کہا: کیا تم یہ مٹھائیاں نہ کھاؤ گے۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بولتے بھی نہیں۔ پھر پوری قوت سے ضرب لگائی ان پر داہنے ہاتھ سے۔ رنگ رلیاں منانے کے بعد آئے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آپ نے فرمایا: کیا تم پوجتے ہو انہیں جنہیں تم خود تراشتے ہو حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو''۔

سدی نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کی طرف گئے (2)۔ ابو مالک نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام متوجہ ہوئے۔ قتادہ نے کہا: وہ ان کی طرف مائل ہوئے۔ کلبی نے کہا: ان کی طرف آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: راغ کا معنی ہے پھرے۔ سب کا معنی قریب قریب ہے رَاغَ یَرُوْغُ رَوْغًا وَ رَوَغَانًا جب وہ جھکا۔ طریق رائغ یعنی ایسا راستہ جو ایک طرف جھکا ہوا ہو۔ شاعر نے کہا:

ويُرِيكَ من طَرَفِ اللسانِ حَلَاوةً وَيَرُوغُ عنك كما يَرُوغ الثعلبُ

وہ زبان کی ایک جانب سے تیرے لیے مٹھاس دکھاتا ہے اور تم سے یوں مکر کرتا ہے جس طرح لومڑی کرتی ہے۔

اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۹۱﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں سے یوں خطاب کیا جس طرح عقلاء کو خطاب کیا جاتا ہے کیونکہ بت پرست بتوں کو عقلاء کا درجہ دیا کرتے تھے اسی طرح: مَا لَکُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۹۲﴾ میں عقلاء جیسا خطاب کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بتوں کے سامنے کھانا پڑا ہوا تھا لوگوں نے وہ کھانا اس کے لیے رکھ چھوڑا تھا کہ جب وہ عید سے واپس لوٹیں گے تو وہ

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 49

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 57

اس کھانے کو کھلائیں گے انہوں نے یہ کھانا اس لیے رکھا تھا تا کہ ان کے اعتقاد کے مطابق کھانے میں بتوں کی برکت حاصل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے کھانا بتوں کے خدام کے لیے چھوڑا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استہزاء کے طور پر وہ کھانا بتوں کے قریب کیا اور کہا: اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ (صافات)

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۝ دائیں ہاتھ سے ضرب کو خاص کیا کیونکہ اس کی ضرب قوی اور سخت ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں یمین بمعنی عدل ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ (الحاقہ) عدل، یمین کے لیے اور جور شمال کے لیے استعمال ہوتا ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ دشمنی اور معاصی کا ذکر کرنا ہو تو شمال کا ذکر کرتے ہیں اور طاعت کا ذکر کرنا ہو تو یمین کا ذکر کرتے ہیں اسی وجہ سے فرمایا: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ۝ (صافات) یعنی طاعت کے طریقہ پر، یمین عدل کی جگہ ہے اور شمال ظلم کی جگہ ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوم میثاق کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی بیعت کی تھی پس بیعت دائیں ہاتھ سے ہوئی اسی وجہ سے قیامت کے روز کتاب دائیں ہاتھ میں دی جائیگی کیونکہ اس نے بیعت کا حق ادا کیا بیعت کو توڑنے والے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی جان بچا کر بھاگنے والے کو بائیں ہاتھ میں کتاب دی جائے گی کیونکہ وہاں ظلم کا تصور موجود ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۝ یعنی اس عدل کے ساتھ جس پر یوم میثاق اللہ تعالیٰ کی بیعت کی تھی پھر اسے یہاں پورا کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جس طرح جذیذہ ہے اس سے مراد ستو ہے۔ یہاں یمین قوت کے معنی میں نہیں۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝ حمزہ نے پڑھا یُزِفون باقی قراء نے یَزِفون پڑھا ہے وہ تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے؛ یہ ابن زید نے کہا۔ قتادہ اور سدی نے کہا: معنی ہے وہ چلتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ سب آرام سے چل رہے تھے، وہ اس سے بے خوف تھے کہ کسی نے ان کے معبودوں کو کوئی نقصان پہنچایا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ چلنے اور دوڑنے کی درمیانی چال میں چلتے ہیں اسی سے زَفِیف النعامہ ہے۔ ضحاک نے کہا: معنی ہے وہ دوڑتے ہیں (1)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ غصہ سے کانپ رہے ہوتے ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ تکبر کے انداز میں چلتے ہیں (3)؛ یہ مجاہد کا قول ہے؛ اسی معنی میں یہ قول ہے: زفاف العروس الی زوجہا دلہن کا اپنے خاوند کی طرف ناز و ادا سے چلنا۔ فرزدق نے کہا:

وجاء قَرِيعُ الشَّولِ قبلَ إفَالِهَا  يَزِفُّ و جاءت خَلْفَه و هي زُفَّفُ

جس نے اسے یُزفون پڑھا ہے اس کا معنی ہوگا وہ دوسرے لوگوں کو تزخیف پر ابھارتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر مفعول محذوف ہے۔ اصمعی نے کہا: ازففت الابل میں نے اونٹ کو تیز چلنے پر برانگیختہ کیا: ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں یوں کہا جاتا ہے: زف القوم و أزفُوا، زففت العروسَ أزففتُها و أزدفتها۔ سب کا ایک ہی معنی ہے، مزفۃ سے مراد وہ پالکی ہے جس میں دلہن کو لایا جاتا ہے؛ یہ خلیل سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا: یُزفون یا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ابو حاتم نے گمان کیا ہے: یہ لغت معروف نہیں جبکہ علماء کی ایک جماعت اس معنی سے آگاہ ہے ان میں فراء بھی ہے اس نے اسے ان

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 57 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے اس قول کے ساتھ تشبیہ دی ہے: اطردت الرجل میں نے اسے دھتکارا گیا بنادیا۔ طردته میں نے اسے ایک طرف کردیا اس نے اور دوسرے علماء نے یہ شعر ذکر کیا:

تَمنّیٰ حُصینٌ أن یسودَ جِذَاعةً　فأمسیٰ حُصینٌ قد أذِلَّ وأُقهِرَا

حصین نے آرزو کی کہ وہ بنی جزاعہ کا سردار بنے حصین ذلیل کیا گیا اور مجبور کیا گیا ہو گیا یعنی اسے یوں بنادیا گیا اسی طرح یُزفون ہے انہیں جلدی چلنے والا بنادیا گیا (یعنی باب افعال میں صیرورت کا خاصہ پایا جارہا ہے) محمد بن زید نے کہا: زفیف کا معنی تیز چلنا ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: زفیف سے مراد چوپائے کے دوڑنے کے آغاز کو کہتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: کسائی نے یہ گمان کیا ہے کہ ایک قوم نے پڑھا فاقبلوا الیہ یزفون اس وقت یہ وزن یزف سے مشتق ہو گا جس طرح وزن یزن ہے نحاس نے کہا: یہ ابو حاتم کی حکایت ہے اور ابو حاتم نے کسائی سے کوئی چیز نہیں سنی ہے۔ فراء نے کسائی سے سنا کہ وہ یَزِفون کو مخفف نہیں پہچانتے۔ فراء نے کہا: میں اسے نہیں پہچانتا۔ ابو اسحاق نے کہا: ان دونوں کے علاوہ علماء جو اسے پہچانتے ہیں یہ جملہ کہا جاتا ہے: وزف یزف جب وہ تیزی کرے۔ نحاس نے کہا: ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے یَزِفون پڑھا ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ عبد اللہ بن زید کی قراءت ہے جو مہدوی نے ذکر کی ہے۔ زمخشری نے کہا وَیُزفون مجہول کا صیغہ ہے اور یزفون یہ زفاف سے مشتق ہے جب وہ اس کے لیے حدی خوانی کرے گویا ان میں سے بعض بعض کے لیے حدی خوانی کرتے ہیں تا کہ وہ سب اس کی طرف جلدی چلیں۔ ثعلبی نے حضرت حسن بصری، مجاہد اور ابن سمیقع سے یَزِفون ذکر کیا ہے یعنی یہ راء کے ساتھ ہے یہ رفیف النعام سے مشتق ہے اس سے مراد چلنے اور اڑنے کے درمیان دوڑنے کا عمل ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ اس کلام میں حذف ہے قالوا من فعل ھذا بألھتنا انہوں نے کہا: ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ تم اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو۔ نحت کا معنی چھیلنا ہے نحته ینحته نحتا۔ اسے چھیلا نحاته: البراية والمنحت۔ جس کے ساتھ چھیلا جائے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ما محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی ان چیزوں کو پیدا کیا جن سے تم بناتے ہو مراد لکڑی، پتھر وغیرہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ (انبیا: 56)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے اس سے مقصود ان کے عمل کی حقارت بیان کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما نافیہ ہے معنی ہے کہ تم تو انہیں نہیں بناتے بلکہ ان سب چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے زیادہ بہتر ہے کہ ما فعل کے ساتھ مصدر کے حکم میں ہو تقدیر کلام یہ ہو واللہ خلقکم وعلمکم یہ اہل سنت کا مذہب ہے کہ افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور بندے کا کسب ہے اس میں قدریہ اور جبریہ کا ابطال ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے ان اللہ خالق کل صانع وصنعته (1) اللہ تعالیٰ ہر عامل اور اس کے عمل کو پیدا کرنے والا ہے؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے حذیفہ کی حدیث سے اسے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان اللہ عزوجل صنع کل صانع وصنعته فھو الخالق

---

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الایمان، جلد 1 صفحہ 85

وھو الصانع سبحانہ اللہ تعالیٰ ہر عامل اور اس کے عمل کو پیدا کرنے والا ہے پس اللہ تعالیٰ ہی خالق وصانع ہے وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ ہم نے یہ تمام چیزیں الکتاب الأسنی فی شرح أسماء اللہ الحُسنیٰ میں بیان کر دی ہیں۔

**قَالُوا ابْنُوا لَهٗ بُنْیَانًا فَاَلْقُوْهُ فِی الْجَحِیْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِیْنَ ﴿۹۸﴾**

''انہوں نے (فیصلہ کن انداز میں) کہا، بناؤ اس کے لیے وسیع آتشکدہ پھر پھینک دو اسے اس بھڑکتی آگ میں۔ انہوں نے تو چاہا کہ آپ کے ساتھ مکر کریں لیکن ہم نے انہیں ذلیل کر دیا۔''

جس طرح یہ بحث سورۃ الانبیاء میں گذر چکی ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان پر دلیل کے ساتھ غالب آگئے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا انہوں نے کہا: اس کے لیے ایک عمارت بناؤ جس کو لکڑیوں سے بھر دو پھر اسے دہکاؤ پھر اسے اس آگ میں پھینک دو یہی جحیم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے پتھر کی ایک دیوار بنائی اس کی اونچائی تیس ہاتھ تھی انہوں نے اسے آگ سے بھر دیا اور اس آگ میں پھینک دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: جب آپ آگ میں پہنچے تو کہا: حسبی اللہ ونعم الوکیل۔ الجحیم میں الف لام ضمیر پر دلالت کرتا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فی جحیمہ یعنی اس مکان کی آگ میں؛ طبری نے یہ ذکر کیا ہے۔

طبری نے یہ ذکر کیا ہے: اس کہنے والے کا نام ہیزن تھا جو فارس کے دیہاتی علاقوں کا تھا جو ترک ہیں وہ وہی آدمی ہے جس کے بارے میں حدیث وارد ہے ''اسی اثنا میں ایک آدمی اپنے حلہ میں چل رہا ہوگا وہ اس حلہ میں تکبر کر رہا ہوگا اسے زمین میں دھنسا دیا جائے گا تو روز قیامت تک وہ زمین میں دھنستا ہی چلا جائے گا'' (1)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مکر کیا۔ کید سے مراد مکر ہے یعنی انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہلاک کرنے کا قصد کیا تو ہم نے ان لوگوں کو مقہور و مغلوب بنا دیا کیونکہ ان پر ایسی جگہ سے اس کی محبت نافذ ہوگئی جہاں سے اسے دور کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس کا مکر اور خفیہ تدبیر نافذ نہ ہوئی۔

**وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾**

''اور آپ نے کہا: میں جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف وہ میری راہنمائی فرمائے گا۔ دعا مانگی: میرے رب! عطا فرما دے مجھے ایک نیک بچہ۔ پس ہم نے مژدہ سنایا انہیں ایک حلیم فرزند کا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یہ آیت ہجرت میں اصل ہے۔ سب سے پہلے جس نے یہ عمل کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب من جر ثوبہ من الخیلاء، جلد 2، صفحہ 861

اس وقت ہوا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے چھٹکارا دیا تو آپ نے کہا: میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں یعنی میں اپنی قوم کے شہر اور جائے پیدائش سے ہجرت کرنے والا ہوں جہاں میرے لیے اپنے رب کی عبادت کرنا ممکن ہوگا میں نے جب صحیح عمل کی نیت کی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اس کی ہدایت دینے والا ہے۔

مقاتل نے کہا: یہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے مخلوقات میں سے حضرت لوط اور حضرت سارہ کے ساتھ ارض مقدسہ یعنی شام کے علاقہ کی طرف ہجرت کی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے میں اپنے عمل، اپنی عبادت، اپنے دل اور نیت کو اپنے رب کی طرف لے جانے والا ہوں۔ اس تعبیر کی بنا پر وہ عمل کو لے جانے والے تھے، بدن کو لے جانے والے نہیں تھے۔ سورت کہف میں اس کی وضاحت مکمل گذر چکی ہے۔ پہلی ہجرت شام اور بیت المقدس کی طرف تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ حران کی طرف نکلے وہاں ایک عرصہ تک رہے اسے پھر یہ کہا گیا: یہ بات آپ نے اس شخص سے کی تھی جو آپ کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اسی نے آپ سے علیحدگی اختیار کی تھی، یہ قول اس کے لیے توبیخ کے طور پر تھا ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے یہ بات اس شخص سے کی تھی جس نے آپ کی معیت میں ہجرت کی تھی مقصود اسے رغبت دلانا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بات آپ نے آگ میں پھینکے جانے سے قبل کی تھی اس قول کی بنا پر اس میں دو تاویلیں ہیں: (1) میرے رب نے میرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے میں اس کی طرف جانے والا ہوں (2) میں مرنے والا ہوں جس طرح آدمی فوت ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے: قد ذهب الى الله۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خیال کیا تھا کہ آگ میں پھینکے جانے سے ہی وہ مر جائیں گے کیونکہ آگ کے بارے میں معمول یہی ہے کہ جس آدمی کو آگ میں پھینکا جاتا ہے وہ مر جاتا ہے یہاں تک کہ آگ کو فرمایا گیا: كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا (الانبیاء: 69) اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام محفوظ ہو گئے۔

اس تاویل کی بنا پر سَيَهْدِيْنِ میں دو تاویلیں ہو سکتی ہیں: (1) اس آگ سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی صورت پیدا فرمائے گا (2) جنت کی طرف جانے کی کوئی صورت پیدا فرمائے گا۔

سلیمان بن صرد نے کہا: یہ ان لوگوں میں سے ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگ میں پھینکنے کا ارادہ کیا تو وہ آپ کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنے لگے، ایک بوڑھی عورت اپنی پشت پر لکڑیاں اٹھائے ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی: اذهب به إلى هذا الذي يذكر آلهتنا میں یہ اس کی طرف لے جا رہی ہوں جو ہمارے معبودوں کا ذکر کرتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لے جایا گیا تا کہ آگ میں پھینکا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا انی اذهب الی ربی جب آپ کو آگ میں پھینکا گیا تو کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا تو حضرت لوط علیہ السلام کے باپ نے کہا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا زاد تھا۔ اسے آگ نے اس لیے نہیں جلایا کیونکہ اسے مجھ سے قرابت حاصل تھی تو اللہ تعالیٰ نے آگ سے ایک تنا نما انگارہ بھیجا جس نے اسے جلا دیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے پہچان کرا دی کہ وہ حضرت ابراہیم کو چھٹکارا دلانے والا ہے تو حضرت ابراہیم

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 59

علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ایک بچے سے اس کی مدد فرمائے جو اس کی تنہائی میں انس کا باعث ہو۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ آل عمران میں پہلے گذر چکی ہے۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یوں ہے ھب لی ولدا صالحا من الصالحین۔ اس قسم کا حذف بہت زیادہ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ یعنی وہ بڑا ہو کر حلیم ہوگا گویا اس بچے کی بقا کی خوشخبری دی کیونکہ چھوٹے بچے کی اس صفت کے ساتھ صفت نہیں لگائی جاتی۔ سورۂ ہود میں جس طرح گذر چکا ہے یہ بشارت فرشتوں کی زبانی ہوئی تھی، سورۃ الذاریات میں بھی اس کا ذکر ہوگا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ٛ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ وَ نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَ بٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَ عَلٰۤی اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ ۝

''اور جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے آپ نے فرمایا: اے میرے پیارے فرزند! میں نے دیکھا ہے خواب میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں اب بتا تیری کیا رائے ہے؟ عرض کیا: میرے پدر بزرگوار! کر ڈالیے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں سے پائیں گے۔ پس جب دونوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم! (بس ہاتھ روک لو!) بے شک تو نے سچ کر دکھایا خواب کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنوں کو۔ بے شک یہ بڑی کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے بچالیا اسے فدیہ میں ایک عظیم ذبیحہ دے کر۔ اور ہم نے چھوڑا ان کا ذکر خیر آنے والوں میں۔ سلام ہو ابراہیم پر، اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر، اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بچہ عطا فرمایا جب وہ اس عمر کو پہنچا کہ وہ مددگار کے طور پر اپنے باپ کے ساتھ معاملات میں دوڑ دھوپ کرے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے بیٹے! میں خواب میں

دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ مجاہد نے کہا: جب وہ جوان ہوگیا اور اس کی قدو کاوش حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدو کاوش تک جا پہنچی۔ فراء نے کہا: وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ قتادہ نے کہا: جب وہ اپنے باپ کے ساتھ چلے (1)۔ حضرت حسن بصری اور مقاتل نے کہا: اس سے مراد دانش اور سمجھ بوجھ ہے جس کے ساتھ حجت قائم ہو۔ ابن زید نے کہا: جب وہ عبادت کرنے لگے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب انہوں نے نماز و روزہ رکھنا شروع کر دیا (2) کیا تم اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنتے: وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (بنی اسرائیل: 19)

علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کس کے ذبح کا حکم دیا گیا تھا؟ اکثر کی رائے یہ ہے اس سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ یہ قول جنہوں نے کیا ان میں حضرت عباس بن عبد المطلب، ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ ہیں۔ حضرت عبد اللہ سے صحیح یہی ہے۔ ثوری اور ابن جریج حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہیں کہا: ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے بھی یہی منقول ہے ایک آدمی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے سنا: یابن الاشیاخ الکرام تو حضرت عبد اللہ نے جواب میں کہا: وہ حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ حماد بن زید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ان الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں'' (3)۔ یعنی کریم بن کریم بن کریم بن کریم حضرت یوسف، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ابوزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں؛ یہی قول حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے۔ یہ سات صحابہ ہیں۔ تابعین اور دوسرے علماء نے بھی یہ قول کیا ہے جن میں علقمہ، شعبی، مجاہد، سعید بن جبیر، کعب الاحبار، قتادہ، مسروق، عکرمہ، قاسم بن ابی بزہ، عطا، مقاتل، عبد الرحمٰن بن سابط، زہری، سدی، عبد اللہ بن ہزیل اور امام مالک بن انس ہیں سب نے کہا: ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں؛ یہی نقطہ نظر اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا ہے۔ کئی علماء نے اسی کو اختیار کیا ان میں حضرت نحاس، طبری اور دوسرے علماء ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: مجھے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام دکھائے گئے آپ قربان گاہ میں آئے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ماہ کی مسافت ایک دن میں طے کرائی یہاں تک کہ منیٰ میں مینڈھے کو ذبح کریں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مینڈھے کو ذبح کیا آپ نے ایک ماہ کی مسافت ایک رات میں مکمل کی آپ کے لیے وادیاں اور پہاڑ لپیٹ دیئے گئے تھے؛ یہ قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین سے نقل کرنے میں بہت قوی ہے۔

دوسرے علماء نے کہا: ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں جن علماء نے یہ بات کہی ان میں حضرت ابوہریرہ، حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ ہیں یہی قول حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے تابعین میں سے سعید بن مسیب، شعبی،

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 60 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب ام کنتم شہداء، جلد 1، صفحہ 479

یوسف بن مہران، مجاہد، ربیع بن انس، محمد بن کعب قرظی، کلبی اور علقمہ سے مروی ہے۔ ابو سعید ضریر سے ذبیح کے بارے میں پوچھا گیا: تو انہوں نے یہ اشعار کہے:

إنّ الذبيح هُدِيتَ إسمٰعيلُ    نطق الكتابُ بذالك والتنزيلُ

شرفٌ به خصّ الإلٰهُ نبيَّنا    وأتى به التفسيرُ والتأويلُ

إن كنتَ امّته فلا تُنكِرَنَّهُ    شرفًا به قد خصّه التفضيلُ

تجھے ہدایت نصیب ہو بے شک ذبیح حضرت اسماعیل ہیں کتاب وسنت اس کے بارے میں ناطق ہیں یہ ایسا شرف ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کو خاص کیا تفسیر وتاویل اسی بارے میں آئی ہے اگر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے تو تو ان کے لیے ایسے شرف کا انکار نہ کر جسے فضیلت نے خاص کیا ہے۔

اصمعی نے کہا: میں نے ابو عمرو بن علاء سے ذبیح کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے اصمعی! تیری عقل تجھ سے کہاں چلی گئی؟ حضرت اسحاق علیہ السلام مکہ مکرمہ میں کہاں تھے حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ مکرمہ تھے انہوں نے ہی اپنے والد کے ساتھ بیت اللہ کی تعمیر کی اور قربان گاہ مکہ مکرمہ میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں''۔

پہلی تعبیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین سے بہت زیادہ سندوں کے ساتھ منقول ہے۔

ان علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ خبر دی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ہاں ہجرت کی تو آپ نے شام کی جانب اپنی بیوی حضرت سارہ اور اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کی فرمایا: میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، مجھے ضرور ہدایت عطا فرمائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ اے اللہ! مجھے ایک صالح بچہ عطا فرما تو اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا: فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ (مریم: 49) اور کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۝ اس میں یہ ذکر کیا ہے کہ فدیہ حلیم بچہ میں ہوا جس حلیم بچے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی دی گئی تھی کیونکہ ارشاد فرمایا: وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ اور یہاں فرمایا: بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۝ یہ واقعہ اس سے قبل کا ہے جب آپ نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ قرآن میں صرف یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق کی بشارت دی گئی۔

جس نے یہ کہا: اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، وہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت صبر سے بیان کی حضرت اسحاق علیہ السلام کی صفت بیان نہیں کی ارشاد فرمایا: وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ۝ (الانبیاء) وہ ان کا ذبح پر صبر کرنا تھا اس کی صفت صدق وعدہ سے بیان کی فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم: 54) اس نے اپنے باپ سے صبر پر وعدہ کیا اور اسے پورا کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا

تو اسے ذبح کرنے کا کیسے حکم دے سکتے تھے جبکہ ان کے بارے میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ نبی ہونگے نیز یہ ارشاد فرمایا: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ۝ (ہود: 71) تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں وعدہ پورا ہونے سے قبل کیسے انہیں ذبح کا حکم ہوسکتا تھا۔

نیز یہ بھی وارد ہے کہ مینڈھے کے سینگوں کو بیت اللہ شریف میں لٹکا دیا گیا۔ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اگر ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہوتے تو ذبح کا عمل بیت المقدس میں ہوتا۔ پس یہ استدلال نزاع کو ختم نہیں کرتا۔

جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبح کرنے کا کیسے حکم دیا جاسکتا ہے جبکہ ان کے بارے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ نبی ہوں گے؟ کیونکہ اس کے بارے میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ ذبح کے حکم کے بعد ان کے لیے نبوت کی بشارت دی گئی ہو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اس کی وضاحت بعد میں آئیگی ممکن ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبح کا حکم حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد ہو تو یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم میں یہ تو مذکور نہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہوگی۔

جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ اگر ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہوتے تو ذبح کا عمل بیت المقدس میں ہوتا؟

اسکا جواب وہ ہے جو سعید بن جبیر نے دیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ذبیح دونوں میں سے کون ہے؟ یہ تیسرا مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مقاتل نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین راتیں پے درپے خواب دیکھا۔ محمد بن کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسولوں کے پاس وحی بیداری اور نیند کی حالت میں آتی ہے کیونکہ انبیاء کے دل نہیں سوتے یہ حدیث میں ثابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ہم جو انبیاء کی جماعت ہیں ہماری آنکھیں سو جاتی ہیں ہمارے دل نہیں سوتے“۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں اور اسی آیت سے استدلال کیا۔ سدی نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق کی ولادت سے قبل ہی ان کی ولادت کی خوشخبری دی گئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ پھر وہ اللہ کے لیے ذبیح ہے انہیں خواب میں کہا گیا: تو نے ایک نذر مانی تھی تو اپنی نذر پوری کرو (1)۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آٹھویں ذی الحجہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے: اللہ تعالیٰ تجھے اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جب آپ نے صبح کی تو آپ نے اپنے دل میں سوچا کیا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی جانب سے ہے؟ تو اس کو یوم ترویہ کا نام دیا گیا جب اگلی رات ہوئی تو آپ نے وہی خواب دیکھا تو آپ کو وعدہ یاد دلایا گیا جب صبح کی تو پہچان گئے کہ یہ خواب اللہ کی جانب سے ہے تو اسے یوم عرفہ کا نام دیا گیا پھر تیسری رات بھی یہی خواب دیکھا تو آپ نے ذبح کا ارادہ کیا تو اسے یوم نحر کا نام دیا گیا۔

1۔ تفسیر بغوی

یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا تو حضرت جبریل امین نے کہا: اللہ اکبر اللہ اکبر تو حضرت ذبیح علیہ السلام نے کہا: لا الہ الا اللہ واللہ اکبر تو حضرت ابراہم علیہ السلام نے کہا: اللہ اکبر ولِلّٰہ الحمد۔ تو یہ تکبیر سنت بن گئی۔ اس امر کے وقوع میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اہل سنت نے کہا: نفس ذبح واقع نہیں ہوا ذبح کا امر ذبح کے وقوع سے پہلے واقع ہو گیا اگر یہ ذبح کا عمل ہو جاتا تو اس کے اٹھانے کا تصور نہ ہوتا یہ چیز فعل کے وقوع سے پہلے نسخ کے باب سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اگر ذبح کے امر کی اطاعت سے فراغت حاصل ہو جاتی تو فدیہ کا ثبوت نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے آپ کو جس سے آگاہ کیا اس کو آپ نے ثابت کر دیا جو آپ کے لیے ممکن تھا وہ آپ کر گزرے پھر جب ہم نے تجھے روک دیا تو تم رک گئے۔ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا یہ اس میں صحیح ترین ہے۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ ان چیزوں میں سے نہیں جو کسی وجہ سے منسوخ ہو کیونکہ ذبحت الشئ کا معنی ہے میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا؛ مجاہد کے قول سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے۔ حضرت اسحاق نے حضرت ابراہیم سے عرض کی: لا تنظر الیّ فترحمنی ولکن اجعل وجھی الی الارض میری طرف مت دیکھنا کہ کہیں تمہیں مجھ پر رحم آ جائے بلکہ میرا چہرہ زمین کی طرف کر دینا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری لی اسے حضرت اسحاق کے حلق پر پھیرا تو وہ الٹی ہو گئی تو حضرت اسحاق نے پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ فرمایا: چھری الٹ گئی ہے۔ حضرت اسحاق نے کہا: اسے نیزے کی طرح مجھ میں چبھو دیں۔ بعض نے کہا: جب بھی آپ کوئی حصہ کاٹتے تو وہ جڑ جاتا۔ ایک طائفہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا حلق تانبے کا پایا یا تانبے سے ڈھکا ہوا پایا جب آپ اسے کاٹنے کا ارادہ کرتے تو اسے محفوظ پاتے۔ یہ سب قدرت الٰہیہ میں جائز ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ سند صحیح ہو کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کو نظر و فکر سے نہیں جانا جا سکتا اس کے جاننے کا طریقہ خبر ہی ہے اگر یہ ایسا ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کے لیے ضرور بیان کرتا اور فدیہ کو بیان کرنے سے اس کی وضاحت کرنا زیادہ مناسب ہوتی۔

بعض علماء نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذبح حقیقی کا حکم نہیں دیا گیا تھا جس سے مراد رگوں کو کاٹنا اور خون بہانا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کے لیے لٹایا ہے تو انہیں وہم ہوا کہ اسے ذبح حقیقی کا حکم دیا گیا ہے جب آپ نے وہ کام کر دیا جس کا آپ کو حکم دیا گیا تھا یعنی پہلو کے بل لٹانے کا تو آپ کو کہہ دیا گیا: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ تعبیر مفہوم سے خارج ہے؛ خلیل اور ذبیح کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں اس امر سے وہ سمجھیں جو اس کا حقیقی معنی و مفہوم نہ ہو یہاں تک کہ دونوں کو وہم ہوا ہو۔ اگر یہ چیزیں صحیح ہوں تو فدیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ عاصم کے علاوہ دوسرے کوفہ کے علماء نے اسے ماذا تُرِی پڑھا ہے یعنی تاء مضموم ہے اور راء مکسور ہے۔ فراء نے کہا: معنی ہے دیکھ تو کسی تو اپنے صبر اور جزع میں سے کیا دیکھتا ہے (1)۔ زجاج نے کہا: یہ قول اس کے علاوہ کسی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 61

اور نے نہیں کیا۔ علماء نے کہا: تو کیا رائے رکھتا ہے۔ ابوعبیدہ نے تری کا انکار کیا ہے کیونکہ یہ آنکھ کے ساتھ دیکھنے کو خاص ہے۔ ابو حاتم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے یہ آنکھ سے اور دوسری چیز سے دیکھنا ہے؛ یہی مشہور ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: أريتَ فلانا الصواب اريتہ رُشدہ تو نے فلاں کو صحیح خیال کیا ہے، تو نے اسے ہدایت یافتہ خیال کیا ہے؛ یہ آنکھ سے دیکھنا تو نہیں۔ باقی قراء نے تَرَی پڑھا ہے جو رایت کا مضارع ہے۔ ضحاک اور اعمش سے تُرِی مجہول کا صیغہ مروی ہے۔ حضرت ابراہم علیہ السلام نے انہیں یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں مشورہ کریں آپ نے ان سے اس لیے مشورہ کیا تھا تا کہ اللہ تعالیٰ کے امر کے بارے میں اس کے صبر کو جان لیں یا تا کہ آپ کی آنکھ ٹھنڈی ہو جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں اپنے بیٹے کی فرمانبرداری کو دیکھیں۔

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ اصل میں ماتؤمربه ہے یہاں سے حرف جار کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح اس قول سے حرف جار کو حذف کر دیا گیا ہے

امرتُك الخير فافعل ما أُمِرتَ به (1)

اصل میں بالخیر تھا فعل کو ضمیر کے ساتھ ملا دیا گیا تو یہ تؤمرہ ہو گیا پھر ضمیر کو حذف کر دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (النمل: 59) اصل میں اصطفاهم تھا جس طرح پہلے بحث گذر چکی ہے ما، الذی کے معنی میں ہے یعنی اہل اشارہ نے کہا: جب ان شاء اللہ کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے صبر کی توفیق دی۔ یا ابت اور یا بنی کے بارے میں گفتگو پہلے سورۂ یس وغیرہ میں گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** جب دونوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم نے فلما سلما قراءت کی انہوں نے اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے جب دونوں نے تابعداری کی۔ قتادہ نے کہا: جب ان دونوں میں سے ایک نے اپنا آپ اللہ کے سپرد کیا اور دوسرے نے اپنا بیٹا سپرد کر دیا۔ وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ قتادہ نے کہا: اسے منہ کے بل گرایا اس کے چہرہ کو قبلہ کی طرف کیا۔ بصریوں کے نزدیک لما کا جواب محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ فدیناه بکبش۔ کوفیوں نے کہا جواب: نَادَيْنٰهُ ہے واؤ زائدہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ (یوسف: 15) یہ اوحیناہ ہے واؤ زائدہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ اقْتَرَبَ (الانبیاء) یہ بھی اقترب تھا واؤ زائدہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ (الزمر: 73) اصل میں قال تھا واؤ زائدہ ہے یعنی قال لهم۔ امرؤ القیس نے کہا:

فلما أجزنا ساحة وانتحى

اصل میں انتحی تھا واؤ زائد ہے یہ بھی کہا:

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 54

حتّی إذا حملت بطونکم ورأیتم ابناءکم شبوا
وقلبتم ظهر المجنّ لنا إن اللئیم الفاجر الخبّ

یہاں تک کہ تمہارے پیٹوں نے اٹھایا اور تم نے اپنے بیٹوں کو دیکھا کہ وہ جوان ہو گئے۔ اور تم نے ہمارے لیے اپنی دشمنی کو ظاہر کر دیا بے شک کمینہ فاجر نقصان اٹھانے والا ہوتا ہے۔

یہاں بھی اصل میں قلبتم تھا واؤ زائدہ ہے۔

نحاس نے کہا: واؤ حروف معانی میں سے ہے اسے زائد کرنا جائز نہیں، حدیث میں ہے کہ ذبیح نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔ اے میرے والد! میرے اعضاء کو باندھ دو تاکہ میں نہ پھڑکوں، اپنے کپڑوں کو سمیٹ لو تاکہ میرے خون کا کوئی چھینٹا اس پر نہ پڑے کہ میری ماں دیکھے اور وہ غمگین ہو جائے، چھری کو میرے حلق پر جلدی چلانا تاکہ مجھ پر موت آسان ہو جائے، مجھے منہ کے بل لٹانا تاکہ تو میرے چہرے کو نہ دیکھے کہ تجھے مجھ پر رحم آ جائے اور میں چھری کو نہ دیکھوں کہ میں گھبرا جاؤں، جب تو میری ماں کے پاس جائے تو اسے میرا اسلام کہنا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری چلائی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی گردن پر تانبا چڑھا دیا چھری نے کچھ عمل نہ کیا پھر اس کی پیشانی پر مارا اور پھر اس کی گدی میں اسے چلایا تو چھری نے کچھ عمل نہ کیا اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ کا یہی معنی ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے: اس کا معنی ہے اسے اس کے منہ کے بل گرا دیا تو ندا دی گئی: يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا آپ متوجہ ہوئے تو وہاں ایک مینڈھا کھڑا تھا؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اس کی عدم صحت کے بارے میں اشارہ پہلے گذر چکا ہے، معنی یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وجوب کا اعتقاد کر لیا اور عمل کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ ذبح کی حالت ہے اور یہ مذبوح کی صورت ہے دونوں نے ذبح کی جگہ فدیہ دے دیا وہاں چھری کا چلنا نہیں۔ اس تاویل کی بنا پر فعل کے بجالانے سے قبل نسخ کا ثبوت متحقق ہوتا ہے جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

جوہری نے کہا: وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ یعنی اسے نیچے لٹایا جس طرح تو کہتا ہے: کبه لوجهه اسے منہ کے بل گرا دیا۔ مہدوی نے کہا: تل کا معنی دھکا دینا اور گرانا ہے، اسی معنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: وتترکوٹ لِتَتَلَّك یہ لمصرعك کے معنی میں ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: فجاء بناقة کَوْمَاءَ فَتَلَّهَا وہ اونچی کہان والی اونٹنی لایا تو اسے بٹھایا۔ حدیث طیبہ میں ہے بینا أنا نائم أتیت بمفاتیح خزائن الأرض فَتُلَّتْ فی یدی(1) اسی اثنا میں کہ میں سویا ہوا تھا کہ مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں تو وہ میرے ہاتھ میں دے دی گئیں۔ ابن انباری نے کہا: میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں، یہ جملہ کہا جاتا ہے: تللتُ الرجل جب تو اسے گرائے۔ ابن اعرابی نے کہا: تو تیرے ہاتھ میں ڈال دی گئیں۔ تل کا معنی ڈالنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تُلَّ یُتَلّ جب اسے انڈیلا جائے تَلَّ یَتِلّ جب وہ گر جائے۔

بعض اہل اشارہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کیا پھر اپنے بچے کو محبت کی نظر سے دیکھا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب رؤیا اللیل، جلد 2، صفحہ 1036

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا محبوب مشترک محبت پر راضی نہ ہوا، اسے حکم دیا گیا: اے ابراہیم! میری رضا کی خاطر اپنے بچے کو ذبح کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آستین چڑھا لیں، چھری پکڑ لی، اپنے بچے کو پہلو کے بل لٹا دیا پھر یوں دعا کی: اے اللہ! اپنی رضا کی خاطر مجھ سے یہ قبول کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: اے ابراہیم! مقصود بچے کو ذبح کرنا نہیں تھا، مقصود یہ تھا کہ تو اپنے دل کو میری طرف پھیر دے جب تو نے اپنے دل کو کلیۃً میری طرف پھیر دیا تو ہم نے تیرا بچہ تیری طرف لوٹا دیا ہے۔

کعب اور دوسرے علماء نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں ان کے بچے کے ذبح کو دکھایا گیا تو شیطان نے کہا: اللہ کی قسم! اگر میں نے اس مرحلہ میں آل ابراہیم کو آزمائش میں نہ ڈالا تو میں ان میں سے کسی کو بھی آزمائش میں نہ ڈال سکوں گا، شیطان نے ان کے سامنے ایک انسان کی شکل اختیار کی پھر اس بچے کی ماں کے پاس آیا پوچھا: کیا تو جانتی ہے ابراہیم تیرے بیٹے کو کہاں لے جا رہا ہے؟ کہا: نہیں۔ اس نے کہا: وہ اس کو ذبح کرنے کے لیے لے جا رہا ہے۔ بچے کی ماں نے کہا: ہرگز نہیں وہ اس کے بارے میں اس سے زیادہ شفیق ہے۔ شیطان نے کہا: ابراہیم کا خیال ہے اس کے رب نے اسے اس کا حکم دیا ہے۔ بچے کی ماں نے کہا: اگر اس کے رب نے اسے اس کا حکم دیا ہے تو اسکا اپنے رب کی اطاعت کرنا بہت اچھا ہے۔ پھر شیطان بچے کے پاس آیا کہا: کیا تو جانتا ہے تیرا باپ تجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ کہا: نہیں۔ کہا: وہ تجھے ذبح کرنے کے لیے لے جا رہا ہے۔ پوچھا: کیوں؟ کہا: اس کا گمان ہے کہ اس کے رب نے اسے یہ حکم دیا ہے۔ بچے نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے جو حکم دیا ہے وہ اسے ضرور کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا پوچھا: تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ اللہ کی قسم! میرا گمان ہے کہ شیطان تیرے پاس نیند کی حالت میں آیا ہے اس نے تجھے تیرا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام شیطان کو پہچان گئے فرمایا: اے اللہ کے دشمن! مجھ سے دور ہو جا، اللہ کی قسم! میں اپنے رب کے حکم پر ضرور عمل کروں گا۔ ملعون نے ان سے کچھ حصہ نہ پایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ☆ پھر درمیانی جمرہ کے پاس شیطان آیا آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ وہ چلا گیا پھر آخری جمرہ کے پاس شیطان ان کے سامنے آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ وہ چلا گیا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لائے (1)۔

اس جگہ کے بارے میں اختلاف ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کا ارادہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مکہ مکرمہ میں مقام ابراہیم پر۔ ایک قول یہ کیا گیا: منیٰ میں قربان گاہ میں جمروں کے پاس جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابلیس کو کنکریاں ماری تھیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے! یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، محمد بن کعب اور سعید بن مسیب کا قول ہے۔

---

1۔ تفسیر بغوی

☆ تو جمرہ عقبہ کے پاس شیطان کے سامنے آیا تو آپ نے سات کنکریاں ماریں تو وہ چلا گیا۔

سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ آپ نے منیٰ میں ثبیر پہاڑ کے نیچے چٹان پر ذبح کیا تھا۔ ابن جریج نے کہا: آپ نے شام میں ذبح کیا تھا جو بیت المقدس سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔

پہلا قول اکثر بیان کیا گیا ہے کیونکہ احادیث میں یہ وارد ہے کہ مینڈھے کے سینگوں کو کعبہ کے ساتھ لٹکایا گیا تھا یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ میں ذبح کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اسلام کا ابتدائی دور تھا اس مینڈھے کا سر اپنے دونوں سینگوں کے ساتھ میزاب کعبہ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا وہ خشک تھا۔

جس نے یہ کہا کہ ذبح کا عمل شام میں ہوا تھا اس نے سر کے لٹکانے کا یہ جواب دیا: ممکن ہے یہ سر شام سے مکہ مکرمہ کی طرف لایا گیا ہو؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ دنیا و آخرت میں شدائد سے چھٹکارے کے ساتھ انہیں جزا دیں گے یہ ظاہر و باہر نعمت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أبلاہ اللہ ابلاء و بلاء جب وہ اس پر احسان کرے۔ بعض اوقات بلاہ بھی کہا جاتا ہے، زہیر نے کہا:

**فا بْلاھما خَیْرَ البلاءِ الذی یَبْلو**　　اس نے ان دونوں پر بہترین احسان وانعام کیا۔

ایک قوم کا گمان ہے یہ دونوں لغتوں کے ساتھ آیا ہے، دوسرے علماء نے کہا: بَلَاہُ یَبْلُوہُ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس کا امتحان لے، اختبار کے لیے بَلَاہُ یَبْلُوہُ استعمال کرتے ہیں ابْتِلَاء کے لیے یَبْلُوہُ کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ اختیار کی اصل یہ ہے کہ وہ بھلائی کی صورت میں ہو یا شر کی صورت میں ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً (الانبیاء: 35) ابوزید نے کہا: یہ بھی اسی آزمائش میں سے تھا کہ ان پر یہ حکم نازل ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔ کہا: یہ ایسی آزمائش تھی جو پسندیدہ نہ تھی۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ ذبح مذبوح کا اسم ہے اس کی جمع ذبوح آتی ہے جس طرح طحن مطحون کا اسم ہے۔ ذبح فتحہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہوتا ہے، عظیم سے مراد قدر و منزلت کی عظمت ہے اس سے عظیم الجثہ مراد نہیں اس کی قدر کو عظیم قرار دیا کیونکہ اس کے ساتھ ذبح کا فدیہ دیا اس وجہ سے اس کی عظیم صفت ذکر کی کیونکہ وہ عمل قبول ہوا۔ نحاس نے کہا: لغت میں عظیم کا لفظ کبیر اور شریف کے لیے بولا جاتا ہے۔ اہل تفسیر نے کہا: یہاں یہ شریف کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا جو قبول ہوا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ مینڈھا ہے جو حضرت ہابیل نے قربانی کے طور پر دیا تھا، یہ جنت میں چرتا پھرتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ حضرت اسماعیل کا فدیہ دیا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد وہ مینڈھا ہے جو اللہ تعالیٰ نے جنت سے بھیجا، یہ چالیس سال تک جنت میں چرتا رہا تھا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ پہاڑی بکروں میں سے نرکو دیا گیا جو ثبیر پہاڑ سے نیچے اترا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اپنے بیٹے کے فدیہ کے طور ذبح کیا تھا؛ یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دیکھا، اسے پکڑا اسے ذبح کیا اور اپنے بیٹے کو آزاد کر دیا اے بیٹے! آج تو مجھے ہبہ کیا گیا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ قول

کیا گیا ہے آپ نے وعل فدیہ دیا، وعل سے مراد پہاڑی نر ہے۔ اہل تفسیر کا قول ہے کہ مینڈھے کو فدیہ کے طور پر دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ غنم (بھیڑ بکری) کی قربانی اونٹ اور گائے سے افضل ہے؛ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے، انہوں نے کہا: قربانیوں میں سے بہترین بھیڑوں میں سے نر ہے بھیڑوں میں سے مادہ، بکری کے نر سے بہتر ہے اور بکریوں میں سے نر، اونٹ اور گائے سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ ۔ یعنی جس کا جسم بھاری اور موٹا تھا یہ مینڈھا تو ہو سکتا ہے اونٹ اور گائے نہیں ہو سکتی۔ مجاہد اور دوسرے علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ان سے ایک آدمی نے پوچھا: میں نے نذر مانی ہے کہ میں اپنے بیٹے کو قربان کروں؟ فرمایا: تیرے لیے موٹا مینڈھا کافی ہے پھر یہ آیت پڑھی: وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ ۔

بعض علماء نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں مینڈھے سے افضل حیوان ہوتا تو اس کے ساتھ حضرت اسحاق کا فدیہ دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سرمگیں مینڈھوں کی قربانی دی جس کی اکثر قربانی دی جاتی ہے وہ مینڈھا ہی ہوتا ہے۔

ابن ابی شیبہ، ابن علیہ سے وہ لیث سے وہ مجاہد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ذبح سے مراد بڑی بکری ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کونسی چیز افضل ہے قربانی یا اس کی قیمت کا صدقہ؟ امام مالک اور آپ کے شاگردوں کا نقطہ نظر ہے: قربانی افضل ہے مگر منیٰ میں کیونکہ وہ قربانی کی جگہ نہیں؛ یہ ابو عمر نے حکایت بیان کی ہے۔ ابن منذر نے کہا: اسے ہم نے بلال سے روایت کیا ہے کہ کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں ایک مرغے کی قربانی کروں ایک یتیم کے ہاتھ میں دے دینا جو خاک نشین ہے، محدث نے اس طرح کہا ہے، مجھے زیادہ محبوب ہے کہ میں اس کی قربانی دوں؛ یہ امام شافعی کا قول ہے کہ صدقہ افضل ہے یہی امام مالک اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس میں دوسرا قول بھی ہے ابو عمر اور امام احمد بن حنبل نے کچھ اضافہ کیا ہے انہوں نے کہا: قربانی صدقہ سے افضل ہے کیونکہ قربانی نماز عید کی طرح سنت مؤکدہ ہے اور یہ بات معلوم و مشہور ہے کہ نماز عید تمام نوافل سے افضل ہے اسی طرح سنن تمام نوافل سے افضل ہے۔ ابو عمر نے کہا: قربانی کی فضیلت میں آثار حسن مروی ہیں ان میں سے ایک سعید بن داؤد سے مروی ہے وہ ابو زبیر سے وہ مالک سے وہ ثور بن زید سے وہ عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صلہ رحمی کے بعد کوئی نفقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں خون بہانے (قربانی کرنے) سے افضل نہیں'' (1)۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث غریب ہے جو مالک سے مروی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: اے لوگو! قربانی دو اور خوش دلی سے دو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے بھی اپنی قربانی کو قبلہ رو لٹایا اس کا خون، اس کے سینگ اور اس کی اون قیامت کے روز اس کے میزان میں حاضر کیے جائیں گے کیونکہ خون اگر مٹی میں واقع ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں چلا جاتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے روز قربانی کرنے والے کو اس کا پورا پورا حساب دیا جاتا ہے'' ابو عمر نے یہ روایت کتاب ''التمہید'' میں ذکر کی ہے۔

امام ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یوم نحر کے اعمال

---

1۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 102

میں سے کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں خون بہانے' قربانی دینے سے بہتر نہیں قیامت کے روز وہ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذیشان مقام تک جا پہنچتا ہے، خوش دلی سے قربانی دیا کرو(1)''۔ کہا اس باب میں عمران بن حسین زید بن ارقم سے بھی یہ روایت مروی ہے، یہ حدیث حسن ہے(2)۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ قربانی واجب نہیں بلکہ سنت اور معروف ہے۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قربانی والے دن دو درہم دے کر مجھے بھیجتے میں ان کے لیے گوشت خرید کر لاتا اور کہتے: جس سے تو ملے تو اسے کہنا: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قربانی ہے۔

ابو عمر نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے بارے میں جو مروی ہے کہ وہ قربانی نہیں دیا کرتے تھے اہل علم کے نزدیک اس کا مصداق یہ ہے کہ اس عمل پر دوام سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ عمل واجب وفرض ہے، وہ ائمہ تھے، مابعد لوگ ان کی اقتدا کیا کرتے تھے، دینی معاملات میں ان کی طرف دیکھا جاتا تھا کیونکہ یہ ہستیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے درمیان واسطہ تھیں ان کے لیے اس بارے میں ایسا اجتہاد جائز تھا جو کسی اور کے لیے جائز نہیں۔

امام طحاوی نے اپنی مختصر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے کہا: قربانی مقیم لوگوں پر واجب ہے جبکہ وہ قربانی پاتے ہوں اور شہروں میں مقیم ہوں مسافر پر واجب نہیں کہا: آدمی پر اپنے چھوٹے بچے کی جانب سے قربانی اسی طرح واجب ہے جس طرح اس پر اپنی ذات کی جانب سے واجب ہوتی ہے۔

ابو عمر نے کہا: یہ امام مالک کا قول ہے۔ کہا: کسی کے لیے اسے ترک کرنا مناسب نہیں وہ مسافر یا مقیم ہو اگر اسے ترک کیا تو اس نے کتنا ہی برا عمل کیا ہاں جب اس کے لیے عذر ہو مگر منیٰ میں حاجی کے لیے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

امام شافعی نے کہا: تمام لوگوں پر سنت ہے منیٰ میں حاجیوں پر قربانی کرنا سنت ہے یہ واجب نہیں جو علماء اسے واجب قرار دیتے ہیں وہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہ بن نیار کو حکم دیا کہ دوبارہ قربانی دے کیونکہ جو واجب نہ ہو اس کے دوبارہ بجالانے کا حکم نہیں دیا جاتا۔

دوسرے علماء نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''جب ذی الحجہ کا عشرہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی دینے کا ارادہ کرے(3)'' انہوں نے استدلال کیا: اگر قربانی واجب ہوتی تو اس امر کو قربانی کرنے والے کے ارادہ کی طرف منسوب نہ کیا جاتا؛ یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت ابو مسعود بدری اور حضرت بلال کا نقطہ نظر ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الأضاحی، باب ما جاء فی فضل الأضاحی، جلد 1، صفحہ 180

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاضاحی باب ما جاء فی فضل الاضحیۃ، حدیث نمبر 1413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الأضاحی، من اراد ان یضحی، صفحہ 234

**مسئلہ نمبر 11**۔ مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جن جانوروں کی قربانی دی جاسکتی ہے ان کی آٹھ قسمیں ہیں: بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے (یعنی اس میں سے مذکر اور مونث)۔ ابن منذر نے کہا: حسن بن صالح سے مروی ہے کہا: جنگلی گائے کی سات افراد کی جانب سے قربانی دی جاسکتی ہے۔ ہرن کو ایک آدمی کی جانب سے قربانی دیا جاسکتا ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر جنگلی بیل، پالتو گائے پر واقع ہوتا ہے یا پالتو بیل جنگلی گائے پر واقع ہوتا ہے تو ان سے جنم لینے والا جانور قربانی نہیں دیا جاسکتا۔ اصحاب رائے نے کہا: یہ جائز ہے کیونکہ اس کا بچہ ماں کے قائم مقام ہوتا ہے۔ ابوثور نے کہا: اس کی قربانی جائز ہے جب وہ انعام کی طرف منسوب ہے (یعنی جب وہ انعام میں داخل ہے)۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ ذبح کے وقت اور قربانی کا گوشت کھانے کے بارے میں مفصل گفتگو سورۃ الحج میں گذر چکی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سرمگیں سینگوں والے مینڈھے اپنے ہاتھ سے ذبح کیے بسم اللہ شریف پڑھی اور تکبیر کہی اور اپنے پاؤں کو اس کی پسلیوں پر رکھا(1)''۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کہہ رہے تھے: بسم اللہ واللہ اکبر۔ سورۃ الانعام میں حضرت عمران بن حصین کی حدیث گذر چکی ہے اور سورۂ مائدہ میں ذبح کرنے کا طریقہ، اس کی وضاحت، جس کے ساتھ ذبح کیا جاتا ہے اور جنین کا ذبح اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے مفصل گذر چکا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگ والے مینڈھے کا حکم دیا۔ فرمایا ''اے عائشہ! چھری لاؤ'' پھر فرمایا: ''اسے پتھر پر تیز کرو'' تو میں نے ایسا ہی کیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری پکڑی اور اس مینڈھے کو پکڑا اسے پہلو کے بل لٹایا اور ذبح کیا پھر کہا: بسم اللہ اللّٰھم تَقَبَّل من مُحَمَّدٍ وآل محمد ومن اُمّۃ محمد (2)، بسم اللہ، اے اللہ! محمد، آل محمد اور امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے قبول فرما پھر اسے چاشت کے وقت کھایا۔

علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے حضرت حسن بصری قربانی کے بارے میں کہا کرتے تھے: بسم اللہ واللہ اکبر ھذا منک ولک تقبل من فلان، بسم اللہ اللہ اکبر، یہ تیری جانب سے ہے، تیرے لیے ہے اسے فلاں سے قبول فرما۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے ایسا کیا تو بہت اچھا کیا اگر اس نے اس طرح نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام لے لیا تو یہ اسے کافی ہو جائے گا۔

امام شافعی نے کہا: ذبیحہ پر تسمیہ صرف بسم اللہ کے الفاظ ہیں اگر اس کے بعد اس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں سے کسی چیز کا اضافہ کیا یا حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر درود شریف پڑھا تو میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا یا کہا: اے اللہ! اسے مجھ سے قبول فرمایا فلاں کی جانب سے قبول فرما تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لینا میرے نزدیک مکروہ ہے میرے نزدیک یہ کہنا بھی مکروہ ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت کہے: اے اللہ! فلاں کی جانب سے اسے قبول فرما اگر اس نے بسم اللہ کہنے سے قبل یا ذبح کے لیے لٹانے سے قبل ایسا کہا تو پھر کوئی حرج نہیں۔ حضرت عائشہ کی حدیث اس قول کا رد کرتی ہے یہ بات پہلے گذر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأضاحی، التکبیر عند الذبح، جلد 2، صفحہ 835

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، مایستحب من الضحایا، جلد 2، صفحہ 30

چکی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا تو کہا تھا: اللہ اکبر و الحمد للہ تو یہ سنت کے طور پر باقی رہا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کن کن جانوروں کی قربانی سے بچنا چاہیے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہا: ''چار'' حضرت براء اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے اور کہتے میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے چھوٹا ہے لنگڑی: ''جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو، کانی جس کا کانا پن ظاہر ہو، بیمار جس کی بیماری ظاہر ہو، کمزور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو'' (1)۔ امام مالک کے الفاظ ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں تھوڑے سے عیب میں اختلاف ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آنکھ اور کان کو غور سے دیکھیں اور ہم مقابلہ، مدابرہ اور خرقاء کی قربانی نہ دیں کہا: ''مقابلہ سے مراد ہے جس کے کان کی ایک طرف کٹی ہو، مدابرہ جس کے کان کی جانب کٹی ہوئی ہو، شرقاء جس میں شق ہے، خرقاء جس میں سوراخ ہو (2)'' کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مؤطا شریف میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر ایسی ضحایا اور بُدن سے بچتے جو مسنہ نہ ہوں اور جن میں کوئی عیب ہو۔ امام مالک نے کہا: میں نے اس بارے میں جو کچھ سنا ہے اس میں سے یہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ قتبی نے کہا: لم تُسنن کا معنی ہے جس کے دانت نہ اگے ہوں گویا اسے دانت دیئے ہی نہیں گئے یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے: فلان لم یلبن یعنی اسے دودھ نہیں دیا گیا، لم یُسْمَن اسے گھی نہیں دیا گیا، لم یُعسل اسے شہد نہیں دیا گیا یہ ایسے ہی ہے جیسے قربانیوں میں ہتماء (جس کے اگلے دانت جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں) سے منع کیا گیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایسی بکری کو قربانی دیا جائے جس کے سامنے کے دانت جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں جبکہ اس کے دانت بڑھاپے کی وجہ سے ٹوٹے ہوں اور وہ موٹی ہو؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے اگر وہ بکری ابھی جوان ہو اور اس کے دانت ٹوٹ گئے ہوں تو اسے قربانی دینا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا عیب خفیف نہیں نقصان سب کا سب مکروہ ہے اس کی وضاحت اور تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مروی ہے ''اپنی سواریوں کو موٹا کرو کیونکہ یہی پل صراط پر تمہاری سواریاں ہیں'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نذر مانی کہ وہ اپنے بیٹے کو نحر کرے گا یا اسے ذبح کرے گا تو وہ ایک مینڈھا اس کا فدیہ دے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کا فدیہ دیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان سے دوسری روایت بھی مروی ہے: وہ سو اونٹ ذبح کرے جس طرح عبد المطلب نے اپنے بیٹے کا فدیہ دیا تھا۔ امام شافعی نے یہ دونوں روایتیں ان سے نقل کی ہیں۔ قاسم بن محمد نے ان سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ کفارہ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الأضاحی، مالا یجوز من الأضاحی، جلد 1 صفحہ 181۔ ایضاً، حدیث 1417، ابوداؤد، حدیث 2420، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الضحایا، صفحہ 495 3۔ تفسیر الکشاف، جلد 4 صفحہ 55

یمین کافی ہو جائے گا۔ مسروق نے کہا: اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ امام شافعی نے کہا: یہ معصیت ہے وہ ایسی نذر ماننے پر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے۔

امام ابوحنیفہ نے کہا: یہ ایسا کلمہ ہے جس کی وجہ سے اولاد کے حق میں تو اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہو گی اولاد کے علاوہ میں کوئی چیز لازم نہ ہو گی۔ امام محمد نے کہا: جس نے اپنے غلام کو نحر کرنے کی قسم اٹھائی تو اس پر اسی قسم کی چیز لازم ہو گی جیسی چیز اپنے بیٹے کو نحر کرنے کی وجہ سے لازم ہوتی تھی جب وہ اس قسم کو توڑے۔

ابن عبدالحکم نے امام مالک سے اس آدمی کے بارے میں روایت نقل کی ہے جو یہ کہتا ہے: میں اپنا بچہ مقام ابراہیم پر ذبح کروں گا، وہ یہ قسم اٹھاتا ہے پھر وہ اس قسم کو توڑ دیتا ہے تو اس پر ہدی لازم ہو گی۔ کہا: جس نے یہ نذر مانی کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کرے گا اور مقام ابراہم کا ذکر نہ کیا اور نہ ہی اس کا ارادہ کیا تو اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ کہا: جس نے اپنے بیٹے کو ہدی بنایا تو اس کی جانب سے ہدی دے۔ قاضی ابن عربی نے کہا: اس پر بکری لازم ہو گی جس طرح امام ابوحنیفہ نے کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرعی طور پر بچے کے ذبح کرنے کو بکری کا ذبح کرنا بنا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بچے کو ذبح کرنا لازم کیا تھا اور مینڈھے کے ذبح کرنے کے ساتھ اسے اس حکم سے فارغ کر دیا اسی طرح اگر کوئی غلام اپنے بچے کو ذبح کرنے کی نذر مانے تو اس پر بھی لازم ہے کہ وہ بکری بھیڑ وغیرہ ذبح کر دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج: 78) ایمان ایسی چیز ہے جو اصلاً لازم ہے اور نذر ایسی چیز ہے جو فرعی طور پر لازم ہے تو ضروری ہے کہ اسے اس پر محمول کیا جائے۔ اگر یہ سوال کیا جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیسے ذبح کا حکم دیا جا سکتا ہے جبکہ یہ معصیت ہے اور معصیت کا حکم جائز نہیں ہوتا؟

ہم کہتے ہیں: یہ کتاب اللہ پر اعتراض ہے جو آدمی اسلام پر اعتقاد رکھتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکتا تو وہ حلال و حرام کے بارے میں کیسے فتویٰ دے گا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ اس بارے میں جو چیز لوگوں کے دلوں سے اس التباس کو دور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ معاصی اور طاعات اعیان کے ذاتی اوصاف نہیں۔ بے شک طاعات وہ چیزیں ہیں کہ جس فعل کے ساتھ امر متعلق ہو اور معصیت سے مراد وہ چیز ہے کہ جس فعل کے ساتھ نہی متعلق ہو جب امر اس چیز سے متعلق تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیں تو یہی طاعت اور آزمائش ہو گئی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ کیونکہ بچے اور نفس کو ذبح کرنے پر صبر کرنا تھا جب ہمارے بارے نہی اس چیز سے متعلق ہے کہ ہم اپنے بیٹوں کو ذبح کریں تو یہی معصیت ہو گی۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ نذر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ معصیت ہے؟ ہم اس کا جواب یہ دیں گے: یہ معصیت ہو گی اگر وہ نذر کی وجہ سے بچے کے ذبح کا قصد کرتے اور اور فدیہ کی نیت نہ کرتے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: اگر ایسا واقع ہو جائے اس نے معصیت کا قصد کیا ہو اور فدیہ کی نیت نہ کی ہو؟ ہم کہیں گے: اگر اس نے اس کا قصد کیا ہو تو یہ چیز اس کے قصد میں اسے کوئی نقصان نہ دے گی اور اس کی نذر میں اس کا کوئی اثر نہ ہو گا کیونکہ بچے کی نذر شرعی طور پر بھیڑ، بکری کے ذبح کی صورت بن گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ علیہ میں ضمیر سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یعنی ہم نے

ان کے بعد کی امتوں میں اچھی تعریف چھوڑی ہے کوئی بھی امت نہیں مگر وہ آپ پر درود پڑھتی ہے اور ان سے محبت کرتی ہے۔

ایک قول یہ کیا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہے وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ (الشعراء) عکرمہ نے کہا: اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سلام ہے یعنی ہماری طرف سے سلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے آفات سے سلامتی ہے جس طرح ارشاد فرمایا: سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی ان مومن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے عبودیت کا حق ادا کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کے مستحق بن گئے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی نبوت کی بشارت دی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بشارت دو دفعہ دی گئی اسی وجہ سے کہا گیا کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں کہ انہیں نبوت کی بشارت اس بنا پر دی گئی کہ انہوں نے صبر کیا، اپنے رب کے حکم پر راضی ہوئے اور سر اطاعت خم کر دیا تو جزا کے طور پر یہ انعام ہوا۔

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ یعنی ہم نے ان دونوں پر نعمت کو دگنا کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم نے ان کی اولاد کو زیادہ کر دیا یعنی ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر برکتیں نازل کیں اور حضرت اسحاق علیہ السلام پر برکتیں نازل کیں کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کو ان کی پشت سے نکالا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: علیہ میں ضمیر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں۔ مفضل نے کہا: صحیح جس پر قرآن پاک دلالت کرتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ذبیح کے قصہ کو بیان کیا جب قصہ کے آخر میں کہا: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ پھر فرمایا: سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فرمایا: وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ۔ علیہ میں ضمیر سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا تھا پھر کہا: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا یہ اس امر پر دال ہے کہ اس سے مراد حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہے۔ راوی اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کرتے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

میں کہتا ہوں: ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے بڑے تھے۔ قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ بشارت حضرت اسحاق علیہ السلام کی دی گئی تھی جب نص سے ثابت ہے کہ بشارت حضرت اسحاق علیہ السلام کی تھی تو بے شک ذبیح بھی حضرت اسحاق علیہ السلام ہونگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دو دفعہ دی گئی: (1) بچے کی ولادت کی (2) اس کی نبوت کی جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اور نبوت بڑھاپے میں ہوگی۔

نَبِيًّا حال کی حیثیت سے منصوب ہے اور عَلَيْهِ میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں یہاں تک کہ ضمیر ان کی طرف لوٹے۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ حضرت معاویہ کی سند سے یہ مروی ہے کہا میں نے ایک آدمی کو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں یوں خطاب کرتے ہوئے سنا: یا ابن الذبیحین نبی کریم ﷺ ہنس پڑے پھر حضرت معاویہ نے کہا: حضرت عبدالمطلب نے جب بئر زمزم کو کھودا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس معاملہ کو آسان کر دیا تو وہ ضرور اپنے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو ذبح کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کنویں کے معاملہ کو ان کے لئے آسان کر دیا تو قرعہ حضرت عبداللہ کے نام نکلا ان کے ماموؤں نے حضرت عبدالمطلب کو اس امر سے روکا انہوں نے کہا: اپنے بیٹے کا فدیہ دو۔ حضرت عبدالمطلب نے سو اونٹوں کا فدیہ دیا پھر حضرت عبداللہ ذبیح ہوئے حضرت اسماعیل دوسرے ذبیح ہیں۔ اس بارے میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس کی سند ثابت نہیں جس طرح ہم نے کتاب الأعلام فی معرفة مولد المصطفٰی علیه الصلوٰة والسلام میں ذکر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب چچا کو بھی اب کہہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ** (البقرۃ:133) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ** (یوسف:100) وہ دونوں اس کے والد اور اس کی خالہ تھی اسی طرح فرزدق شاعر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اگر اس کی سند صحیح ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ فرزدق کی ذات میں ہی اعتراض کی گنجائش موجود ہے؟

**مسئلہ نمبر 17۔** **وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ** جب اولاد میں کثرت اور برکت کا ذکر کیا تو فرمایا: ان میں سے کچھ سیاہ کار ہونگے، سیاہ کار کو نبی کا بیٹا ہونا کوئی نفع نہ دے گا (1) یہود و نصاریٰ اگرچہ حضرت اسحاق کی اولاد ہیں اور عرب اگرچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں تب بھی محسن اور مسیٔ، مومن اور کافر میں فرق ضروری ہے قرآن حکیم میں ہے: **وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ** (مائدہ:18)

**وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ نَجَّیْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾**

''ہم نے احسان فرمایا موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) پر۔ اور ہم نے بچا لیا ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑے غم واندوہ سے۔ اور ہم نے ان کی مدد فرمائی پس ہو گئے وہی غلبہ پانے والے۔ اور ہم نے بخش دی ان دونوں کو ایسی کتاب جو نہایت واضح ہے۔ اور ہم نے ہدایت دی انہیں سیدھے راستہ کی۔ اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں، سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام

1۔ کافر: کفر کی صورت میں ہی یہ رشتہ کوئی نفع نہ دے گا ورنہ گناہگار کے لیے تو شفاعت ثابت ہے۔ (مترجم)

کرنے والوں کو۔ بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں''۔

جب اس امر کا ذکر کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبح ہونے سے نجات دی اور نبوت کے بعد جوان پر احسان کیا ساتھ یہ بھی ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ علیہما السلام پر جو احسان کیا۔ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ سے مراد وہ غلامی ہے جو بنی اسرائیل کو لاحق ہوئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فرعون غرق ہو گیا اور بنی اسرائیل اس سے بچ گئے تھے۔

وَنَصَرْنٰهُمْ فراء نے کہا: ضمیر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے لئے ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دو بھی جمع ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاٰتَيْنٰهُمَا اور وَهَدَيْنٰهُمَا ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ھم ضمیر حضرت موسیٰ، حضرت ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم کے لئے ہے، یہی درست ہے کیونکہ اس سے قبل وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا ہے۔

الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ سے مراد تورات ہے یوں کہا جاتا ہے، واستبان کذا یعنی وہ واضح ہو گیا استبانه فلان فلان نے اسے واضح کر دیا۔ یہ اس کی مثل ہے تبیّن الشیٔ بنفسه اور تبیینه فلاں۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ سے مراد دین قویم ہے جس میں کوئی کجی نہیں وہ دین اسلام ہے وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سے مراد اچھی تعریف ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور بے شک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں۔ (یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں، کیا تم عبادت کرتے ہو بعل کی اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو یعنی اللہ کو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے۔ پھر انہوں نے آپ کو جھٹلایا پس یقیناً انہیں پکڑ کر حاضر کیا جائے گا بجز اللہ کے بندوں کے جو مخلص ہیں۔ اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں، سلام ہو الیاس پر۔ ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو۔ بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہیں''۔

مفسرین نے کہا: حضرت الیاس بنی اسرائیل میں سے ایک نبی تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسرائیل

سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور الیاس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں اور یوں قراءت کی وان ادریس؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ کہا: حضرت عبداللہ کے مصحف میں وإنّ إدریس لمن المرسلین تھا حضرت عبداللہ بن مسعود یہ قول کرنے میں منفرد ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: اس سے مراد حضرت یسع کے چچا ہیں (1)۔ ابن اسحاق اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت یوشع کے بعد بنی اسرائیل کے معاملات کے نگران حضرتِ کالب بن یوقنا تھے پھر حضرت حزقیل تھے پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقیل نبی کو موت عطا کردی تو بنی اسرائیل میں بڑے بڑے حادثات رونما ہوئے، وہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو بھول گئے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو نبی بنا کر معبوث کیا اور حضرت یسع ان کے پیچھے آئے وہ حضرت الیاس پر ایمان لائے جب بنو اسرائیل نے ان پر سرکشی کی تو انہوں نے اپنے رب کے حضور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اسے ان سے نجات عطا کریں تو انہیں کہا گیا: فلاں دن فلاں جگہ کی طرف نکلو جو چیز بھی تیرے سامنے آئے اس پر سوار ہو جاؤ اور اس سے خوفزدہ نہ ہونا۔ آپ نکلے اور ان کے ساتھ حضرت یسع بھی تھے عرض کی: اے الیاس! آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ حضرت الیاس نے اوپر کی جانب سے ان کے اوپر اپنی چادر پھینک دی۔ یہ بنی اسرائیل پر انہیں نائب بنانے کی علامت تھی۔ یہ حضرت الیاس کا حضرت یسع کے ساتھ آخری وقت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس علیہ السلام سے کھانے اور پینے کی لذت کو ختم کردیا اسے پر عطا کئے اور نور کا لباس پہنایا اور وہ فرشتوں کے ساتھ اڑ گئے وہ انسان، فرشتہ آسمانی اور زمینی ہو گئے (2)۔

ابن قتیبہ نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس سے فرمایا: مجھ سے سوال کر میں تجھے عطا کروں گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی: تو مجھے اپنی طرف اٹھالے اور مجھ سے موت کے ذائقے کو مؤخر کردے تو وہ فرشتوں کے ساتھ اڑنے لگے۔ بعض نے کہا: آپ مریض ہوئے اور موت کی آہٹ کو محسوس کیا اور روئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: تو کیوں روتا ہے؟ دنیا کی حرص میں یا موت کی گھبراہٹ سے یا آگ کے ڈر سے؟ عرض کی: نہیں تیری عظمت وجلال کی قسم! ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں، میری گھبراہٹ یہ ہے میرے بعد حمد کرنے والے کیسے حمد کریں گے جبکہ میں تیری حمد نہیں کروں گا؟ میرے بعد ذکر کرنے والے کیسے تیرا ذکر کریں گے جبکہ میں تیرا ذکر نہیں کروں گا؟ میرے بعد روزے دار کیسے روزے رکھیں گے جبکہ میں روزہ نہ رکھوں گا؟ وہ کیسے تیری نماز پڑھیں گے جبکہ میں نماز نہیں پڑھوں گا؟ اسے کہا گیا: اے الیاس! میری عزت کی قسم میں تجھے اس وقت تک مہلت دوں گا جس میں کوئی ذاکر میرا ذکر نہیں کرے گا یعنی قیامت کے دن تک تجھے مہلت دوں گا۔

عبدالعزیز بن رواد نے کہا: حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال بیت المقدس میں رمضان شریف کے مہینہ میں روزے رکھتے ہیں، وہ ہر سال حج کرتے ہیں۔ ابن ابی دینا نے ذکر کیا ہے کہ جب حج کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ماشاء اللہ ماشاء اللہ جو نعمت بھی ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے ماشاء اللہ ماشاء اللہ توکلت علی اللہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل سورۂ کہف میں گذر چکا ہے۔

---

1۔ تفسیر بغوی 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 64

مکحول کی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ کیا یہاں تک کہ ہم ایک پتھر کے پاس اونٹنی کی گذرگاہ میں تھے اچانک ہم آواز سن رہے تھے جو آدمی کہہ رہا تھا: اللهم أجعلني من أمة محمد المرحومة المغفورة لها المتوب عليها المستجاب لها۔ اے اللہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے بنا دے جو مرحومہ، مغفورہ ہے جس کی توبہ قبول کی جاتی ہے اور جس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے انس! دیکھو یہ آواز کیسی ہے؟'' تو میں پہاڑ کے اندر چلا گیا تو اچانک میں ایک آدمی کے پاس تھا جس کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے جس کے جسم پر سفید کپڑے تھے اس کی لمبائی تین سو ہاتھ تھی جب اس نے مجھے دیکھا تو کہا: تو نبی کا بھیجا ہوا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: اس کی طرف واپس جائیے اسے میرا اسلام کہنا اور اس سے کہنا: یہ تیرا بھائی الیاس ہے جو تیری ملاقات چاہتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جبکہ میں ان کے ساتھ تھا یہاں تک کہ جب ہم ان کے قریب ہوئے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھے اور میں پیچھے ہٹ گیا، دونوں نے طویل گفتگو کی، دونوں پر آسمان سے کوئی چیز نازل ہوئی جو دستر خوان کے مشابہ تھی، دونوں نے مجھے بلایا تو میں نے ان دونوں کے ساتھ کھایا اس میں کھمبی، انار اور اجوائن تھی۔ جب میں نے کھانا کھالیا تو میں اٹھ گیا اور ایک طرف ہو گیا۔ ایک بادل آیا جس نے اسے اٹھالیا جبکہ میں ان کے کپڑوں کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں یہ کھانا جو ہم نے کھایا ہے کیا یہ آسمان سے نازل ہوا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے کہا: حضرت جبریل امین ہر چالیس دنوں میں ایک دفعہ کھانا لاتے ہیں اور ہر سال میں ایک دفعہ زمزم کا پانی لاتے ہیں بعض اوقات میں نے انہیں گہرے کنویں پر دیکھا وہ ڈول بھرتے اور خود پیتے اور بعض اوقات مجھے بھی پلایا''(1)۔

ثعلب نے کہا: علماء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان بعلا میں اختلاف کیا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہاں بعل سے مراد بت ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہاں بعل سے مراد فرشتہ ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: اس سے مراد عورت ہے جس کی وہ عبادت کیا کرتے تھے؛ پہلا قول اکثر علماء کا ہے۔

حکم بن ابان، عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ یہاں بعل سے مراد بت ہے۔ عطا بن سائب، عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ بعلا کا معنی رب ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں قول صحیح ہیں کہا: تم بت کی عبادت کرتے ہو جسے تم نے رب بنایا ہوا ہے یہ جملہ بھی کہا جاتا ہے: ھذا بعل الدار یہ گھر کا مالک ہے معنی ہوگا: کیا تم اسے رب کہتے ہو جسے تم نے خود گھڑا ہے؟ اتدعون یہ اتسمون کے معنی میں ہے کیا تم اسے یہ نام دیتے ہو، یہ سیبویہ نے بیان کیا ہے۔

مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور سدی نے کہا: یمن کی لغت میں بعل کا معنی رب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک یمنی آدمی

1۔ امام ذہبی نے ''التلخیص'' میں اس روایت پر سخت جرح کی ہے۔

کو کہتے ہوئے سنا جو منیٰ میں اونٹنی چرا رہا تھا: من بعل هذه یعنی اسکا مالک کون ہے؟ اسی وجہ سے خاوند کو بعل کہتے ہیں۔ ابو داؤد نے کہا:

ورأيتُ بَعْلَكِ في الوغَى مُتقلِّدا سيفًا ورمُحًا

میں نے تیرے خاوند کو جنگ میں دیکھا جو تلوار اور نیزہ سنبھالے ہوئے تھا۔

مقاتل نے کہا: بعل سے مراد وہ بت ہے جسے حضرت الیاس نے توڑا اور ان لوگوں کے پاس سے بھاگ گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بت سونے کا تھا، اس کی لمبائی بیس ہاتھ تھی اس کے چار منہ تھے اس کی وجہ سے لوگ آزمائش میں مبتلا ہوئے، لوگوں نے اس بت کی تعظیم کی یہاں تک کہ اس کی خدمت پر سو آدمی لگائے اور ان افراد کو اس کے انبیاء بنایا شیطان بعل کے پیٹ میں داخل ہوتا اور گمراہی کی باتیں کرتا خدام انہیں یاد کرتے اور لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتے یہی لوگ شام کے علاقہ میں اہل بعلبک کہلاتے اسی وجہ سے ان کے شہر کا نام بعلبک پڑ گیا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔

وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اس کے لئے جو نام ذکر کئے جاتے ہیں ان میں بہترین خالق ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ معنی ہے وہ بہترین صانع ہے کیونکہ لوگ بناتے ہیں تخلیق نہیں کرتے۔

اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ تینوں اسماء منصوب ہیں۔ ربیع بن خثیم، حسن بصری، ابن ابی اسحاق، ابن وثاب، اعمش، حمزہ اور نسائی نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ابو عبید نے کہا: یہ صفت ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے یہ بدل کی حیثیت سے منصوب ہیں یہاں صفت بنانا جائز نہیں کیونکہ یہاں تحلیہ نہیں۔

ابن کثیر، ابو عمرو، عاصم، ابو جعفر، شیبہ اور نافع نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: تقدیر کلام یوں ہے هو الله ربکم نحاس نے کہا: جو کہا اس میں سے بہترین یہ ہے یہ کلام مبتدا خبر ہے نہ اضمار ہے اور نہ ہی حذف ہے۔

میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا کہ وہ اس طرف گئے ہیں رفع دینا زیادہ بہتر اور اچھا ہے کیونکہ اس سے قبل آیت کا سرا ہے پس نئے سرے سے کلام شروع کرنا اولیٰ ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے نصب دی یا رفع دیا اس نے اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ پر مکمل وقف نہیں کیا کیونکہ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس سے مراد ہے۔

حضرت الیاس کی قوم کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے حضرت الیاس کو جھٹلایا پس وہ عذاب میں حاضر کئے جائیں گے مگر ان کی قوم کے مخلص لوگ عذاب سے نجات پائیں گے اسے المخلصین پڑھا ہے۔ یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اعرج، شیبہ اور نافع کی قراءت آل یاسین۔ عکرمہ، ابو عمرو، ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے الیاسین قراءت کی ہے حضرت حسن بصری نے سلام علی الیاسین الف کو وصلیہ کرتے ہوئے پڑھا ہے گویا اصل میں یاسین تھا اس پر الف، لام تعریف کا داخل ہوا ہے اس سے مراد حضرت الیاس علیہ السلام ہیں اسی پر سلام واقع ہوا ہے لیکن یہ عجمی اسماء میں منصوب ہو جاتے ہیں وہ اکثر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 65

ابن جنی نے کہا: عرب عجمی اسماء میں کھیلتے رہتے ہیں یاسین، الیاس اور الیاسین ایک ہی چیز ہے۔ زمخشری نے کہا: جب وصل کرتے تو نصب دیتے اور جب وقف کرتے تو رفع دیتے اسے علی الیاسین ادریسین، ادرَسین اور ادراسین پڑھتے یہ الیاس اور ادریس کی لغتیں ہیں شاید سریانی زبان میں یاء اور نون کی زیادتی کی کوئی حکمت ہو۔ نحاس نے کہا: جس نے سلام علی آل یاسین پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس نے اس کا اسم الیاس اور یاسین بنایا ہے پھر اس کی آل یعنی اس کے شہر والوں اور جو اس کے مذہب والے تھے ان پر سلام بھیجا اس سے یہ بات معلوم ہوگئی ہے جب اس کی وجہ سے اس کی آل پر سلام بھیجا گیا تو وہ اس سلامتی میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللھم صل علی آل ابی اوفی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (غافر) جس نے الیاسین پڑھا ہے علماء کے اس میں کئی اقوال ہیں۔ ہارون نے ابن ابی اسحاق سے روایت نقل کی ہے کہ الیاسین، ابراہیم کی مثل ہے وہ اس طرف گیا ہے کہ یہ نام ہے۔ ابو عبیدہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ جمع سالم ہے کیونکہ ان پر اور ان کے اہل بیت پر سلام بھیجا گیا ہے اس نے یہ شعر پڑھا ہے:

قَدْنِیَ من نَصْرِ الْخُبَیْبِین قَدِی

یہ کہا جاتا ہے قَدِنی اور قَدِی دو لغتیں ہیں ان کا معنی حسب یعنی کافی ہے وہ ابو حبیب عبداللہ بن زبیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو جمع بنانا کہ جو بھی ان کے طریقہ پر تھا وہ اس کے ساتھ ہے۔ ابو عبیدہ کے علاوہ علماء نے اسے الخُبَیْبِیْنِ تثنیہ نقل کیا ہے اس سے مراد عبداللہ اور مصعب ہیں علی بن سلیمان اس سے زیادہ وضاحت کرتا ہے۔ کہا: عرب کسی قوم کا نام اپنے میں سے جلیل القدر آدمی کے نام پر رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: مہالبہ انہوں نے اپنے میں سے ہر آدمی کا نام مہلب کے نام پر رکھ دیا کہا اسی تاویل پر سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ ۝ ہے۔ ان میں سے یہ ایک الیاس کا نام دیا گیا۔ سیبویہ نے اپنی کتاب میں اس میں سے کچھ ذکر کیا ہے مگر اس نے یہ ذکر کیا عرب اس نسبت کے طریقہ پر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: اشعرون اس سے وہ نسبت کا ارادہ کرتے ہیں۔

مہدوی نے کہا: جس نے الیاسین پڑھا تو یہ جمع کا صیغہ ہے جس طرح جمع مکسر میں سے یاء نسبت حذف ہو جاتی ہے جس طرح مھالبہ، مھلبی کی جمع ہے اسی طرح جمع سالم میں بھی اسی طرح حذف ہے پس مھلبون کہا گیا سیبویہ نے حکایت کی ہے۔ اشعرون، نمیرون اس سے وہ اشعریین اور نمیریین مراد لیتے ہیں۔

سہیلی نے کہا: یہ صحیح نہیں بلکہ یہ الیاس میں لغت ہے جو کچھ انہوں نے کہا اگر اس کا ارادہ ہوتا تو الف، لام داخل کیا جاتا جس طرح المھالبہ اور الاشعریین میں داخل کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتا ہے: سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ ۝ کیونکہ علم کی جب جمع بنا دی جاتی ہے تو وہ نکرہ کے حکم میں ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس پر الف، لام داخل کیا جاتا ہے تو یہ نہیں کہتا: سلام علی زیدین بلکہ تو کہتا ہے: سلام علی الزیدین۔

الیاس کے لفظ میں تین لغتیں ہیں۔ نحاس نے کہا: ابو عبیدہ نے اپنی قراءت میں سلام علی الیاسین سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ بھی آپ کا نام ہے جس طرح الیاس ان کا نام ہے کیونکہ سورت میں ان کے علاوہ کسی آل پر سلام نہیں جس طرح دوسرے انبیاء کا نام ذکر کیا گیا ہے اسی طرح ان کا نام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ استدلال اصل میں ابو عمرو کا ہے جو غیر لازم ہے

کیونکہ اہل لغت کے قول کو ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب کسی کی وجہ سے اس کی آل پر سلام بھیجا جائے تو اس کی ذات پر بھی سلام ہوتا ہے۔ یہ قول کہ اس کا نام الیاسین تھا وہ دلیل اور روایت کا محتاج ہے اس معاملہ میں اشکال واقع ہو گیا ہے۔ ماوردی نے کہا: حضرت حسن بصری نے پڑھا ہے سلام علی یاسین اس میں الف اور لام کو ساقط کر دیا ہے اس کی دو صورتیں ہیں: (1) ان سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (2) ان سے مراد حضرت یاسین کی آل ہے اس تعبیر کی بنا پر یاسین میں زیادتی میں دو وجہیں ہیں: (1) اس لئے زیادتی کی گئی تا کہ آیات برابر ہو جائیں جس طرح ایک موقع پر طور سیناء اور دوسرے موقع پر طور سینین فرمایا، اس صورت میں سلام ان کے اہل پر ہو گا اور ان کی ذات پر نہیں ہو گا، اس صورت میں اضافت شرافت کو ظاہر کرنے کے لیے ہو گی۔

(2) جمع کرنے کے لیے داخل ہوا ہے پس حضرت یاسین بھی ان میں داخل ہیں پس سلام ان پر اور ان کی آل پر ہو گا سہیلی نے کہا: متکلمین نے معانی القرآن میں کہا: آل یاسین سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہے۔ اس قول کی طرف وہ گئے ہیں جنہوں نے یٰسٓ کی تفسیر میں کہا: یا محمد! یہ قول بہت سی وجوہ سے باطل ہے۔

(1) سیاق کلام الیاسین کے قصہ میں ہے تو لازم ہے کہ یہ اس طرح ہو جس طرح حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے قصہ میں ہے اور سلام ان پر لوٹ رہا ہے یہاں بھی سلام الیاس کی طرف لوٹے گا کلام کو مقصود سے نکالنے کا کوئی معنی نہیں، اگر یہ قول کیا بھی جائے تو یہ کسی اور آیت میں بھی کہا جا سکتا ہے جبکہ اس قول میں ضعف موجود ہے کیونکہ یٰسٓ، حٰمٓ اور الٓمٓ وغیرہ ان سب میں ایک قول ہے وہ یہ کہ یہ حروف مقطعات ہیں یا تو یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ماخوذ ہیں جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے یا قرآن کی صفات سے ماخوذ ہیں یا اس طرح جس طرح امام شعبی نے کہا ہے: اللہ کی ہر کتاب میں راز ہیں قرآن حکیم میں اس کا راز سورتوں کے آغاز ہیں نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لی خمسة اسماء (1) میرے پانچ نام ہیں ان میں یٰسٓ، کا ذکر نہیں ہے نیز یٰسٓ میں تلاوت سکون اور وقف کی صورت میں آتی ہے اگر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہوتا تو یہ مضموم ہوتا یاسین جس طرح فرمایا: يُوسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف: 46) پس جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس کی وجہ سے یہ قول باطل ہو گیا تو الیاسین وہ مذکورہ الیاس ہے اور اسی پر سلام ہے۔

ابو عمرو بن العلاء نے کہا: یہ ادریس اور ادراسین کی طرح ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں یہ اس طرح ہے وان ادریس لمن المرسلین پھر فرمایا: سلام علی ادراسین۔

وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ بِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور بے شک لوط بھی پیغمبروں میں سے ہیں۔ یاد کرو جب بچا لیا ہم نے انہیں اور ان کے سارے اہل خانہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب فی اسماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1 صفحہ 501

کو بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی، پھر ہم نے برباد کر دیا دوسرے لوگوں کو۔ اور تم گزرتے رہتے ہو ان کے اجڑے دیاروں پر صبح کے وقت اور رات کے وقت کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے''۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ پہلے گذر چکا ہے یعنی بعد والوں کو عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا وَ اِنَّكُمْ میں عربوں کو خطاب ہے یعنی تم صبح کے وقت ان کے مکانات اور آثار کے پاس سے گزرتے رہتے ہو اور رات کے وقت بھی تم گزرتے رہتے ہو کیا تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور تدبر نہیں کرتے۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''اور بے شک یونس بھی ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔ جب وہ بھاگ کر گئے تھے بھری ہوئی کشتی کی طرف سوار ہونے کے لئے پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے اور دھکیلے ہوؤں میں سے ہو گئے، پس نگل لیا انہیں حوت نے درآنحالیکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ پس اگر وہ اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں سے نہ ہوتے تو پڑے رہتے مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت یونس ہی ذوالنون ہیں جو متی کے بیٹے ہیں یہ اسی بوڑھی کے بیٹے ہیں جس کے پاس حضرت الیاس علیہ السلام ٹھہرے تھے چھ ماہ تک حضرت الیاس علیہ السلام اپنی قوم سے چھپے رہے جبکہ حضرت یونس دودھ پیتے بچے تھے حضرت یونس علیہ السلام کی والدہ خود ہی ان کی خدمت کرتی اور موانست کیا کرتی تھی اور جس پر بھی قادر ہوتی حضرت الیاس کی تکریم کی خاطر ذخیرہ نہ کرتی۔ حضرت الیاس علیہ السلام گھر والوں کی تنگی سے اکتا گئے اور پہاڑوں کی طرف چل دیئے، اس عورت کا بیٹا حضرت یونس فوت ہو گیا وہ عورت حضرت الیاس کے پیچھے نکل کھڑی ہوئی وہ ان کے پیچھے پہاڑوں میں سرگرداں رہی یہاں تک کہ انہیں تلاش کر لیا اس عورت نے سوال کیا کہ وہ اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کے بیٹے کو زندہ کر دے۔ حضرت الیاس علیہ السلام بچے کی وفات کے چودہ ماہ بعد آئے وضو کیا، نماز پڑھی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے یونس بن متی کو حضرت الیاس علیہ السلام کی دعا سے زندہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو اہل نینوی کی جانب بھیجا جو موصل کے علاقہ میں بستی تھی وہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے پھر وہ توبہ تائب ہوئے جیسا کہ اس کی وضاحت سورۂ یونس میں اور سورۂ انبیاء میں حضرت یونس علیہ السلام کے غصہ کی حالت میں وہاں سے نکل جانے کے بارے میں گذر چکی ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی رسالت اس سے قبل تھی جب مچھلی نے انہیں نگلا تھا یا اس کے بعد ہوئی تھی۔

طبری نے شہر بن حوشب سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یونس علیہ السلام کے پاس آئے فرمایا: نینویٰ کے پاس جاؤ انہیں خبردار کرو کہ عذاب ان کے پاس آنا چاہتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: میں سواری تلاش کرلوں حضرت جبریل امین نے کہا: معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی والا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: میں جوتے تلاش کرلوں؟ حضرت جبریل امین نے کہا: معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی والا ہے۔ کہا: حضرت یونس علیہ السلام غصہ میں آگئے کشتی کی طرف چلے اور اس میں سوار ہو گئے جب کشتی پر سوار ہوئے تو کشتی نہ آگے جاتی تھی اور نہ پیچھے ہوتی تھی کہا: انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا مچھلی دنب ہلاتی ہوئی آئی تو مچھلی کو ندا کی گئی: اے مچھلی! ہم نے یونس کو تیرا رزق نہیں بنایا ہم نے تجھے اس کے لئے پناہ گاہ اور مسجد بنایا ہے مچھلی نے انہیں وہاں سے لقمہ بنالیا یہاں تک کہ وہ ابلہ سے گزری پھر وہ انہیں لے کر چلی یہاں تک کہ دجلہ کے پاس سے گذری پھر وہ چلی یہاں تک کہ انہیں نینویٰ میں جا پھینکا۔

حرث، حسن سے وہ ابو ہلال سے وہ شہر بن حوشب سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کی رسالت اس وقت شروع ہوگئی تھی جب مچھلی نے انہیں باہر پھینکا تھا۔ ان لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ رسول، اللہ تعالیٰ سے ناراض ہوکر نہیں نکلتا جو کچھ ہوا وہ نبوت سے پہلے تھا۔

دوسرے علماء نے یہ کہا ہے: یہ واقعہ اس کے بعد ہوا کہ آپ نے لوگوں کو دعوت دی جن کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا تھا آپ نے لوگوں کو ان کی طرف دعوت دی تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا انہیں رسالت کی تبلیغ کی تھی لیکن ان سے وعدہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب جس سے انہیں وہ ڈرا رہے ہیں ایک مخصوص وقت میں ان پر نازل ہوگا۔ جب لوگ توبہ تائب نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف نہ لوٹے تو حضرت یونس علیہ السلام ان سے علیحدہ ہو گئے جب قوم پر عذاب سایہ فگن ہوگیا اور ان پر چھا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ تائب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سے عذاب کو اٹھالیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے جس عذاب کا وعدہ کیا تھا اس عذاب کے اٹھ جانے اور ان کی سلامتی کی خبر پہنچی تو اس وجہ سے وہ غضبناک ہو گئے کہا: میں نے ان سے وعدہ کیا تھا تو اس نے مجھے جھٹلا دیا اور زیادتی کی، وہ اپنے رب سے سخت ناراض ہوکر نکل کھڑے ہوئے اور ان کی طرف لوٹنے کو ناپسند کیا جبکہ لوگوں نے ان کے جھوٹے ہونے کا تجربہ کرلیا تھا۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے یہ بحث سورۃ الانبیاء میں گذر چکی ہے اور وہی صحیح ہے جس طرح اس کا ذکر: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ میں آئے گا لفظ یونس منصرف نہیں کیونکہ یہ عجمی نام ہے اگر یہ عربی ہوتا تو منصرف ہوتا اگرچہ اس کے آغاز میں یاء ہے کیونکہ افعال میں **یفعل** کا وزن نہیں جس طرح تو کسی کا نام **یعفر** رکھے تو تو اسے منصرف پڑھے گا اگر تو کسی کا نام یَعفر پڑھے تو تو اسے منصرف نہیں پڑھے گا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مبرد نے کہا: ابق کا اصل معنی دور ہونا ہے اسی سے غلام آبق ہے دوسرے علماء نے یہ کہا ہے: حضرت یونس علیہ السلام بھاگ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر لوگوں سے چھپتے ہوئے نکل گئے تھے۔

مشحون کا معنی ہے بھری ہوئی فلک مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہو سکتا ہے یہ واحد و جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

ترمذی حکیم نے کہا: حضرت یونس علیہ السلام کا نام آبق رکھا کیونکہ وہ عبودیت سے بھاگے تھے کیونکہ عبودیت کا مفہوم ہے خواہش نفس کو چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کے امور کے موقع پر اپنی جان قربان کر دینا۔ جب فرشتے کی جانب سے سختی ہوئی تو انہوں نے اپنے نفس کی قربانی نہ دی جس کی وضاحت سورۃ الانبیاء میں پہلے گذر چکی ہے اور اپنی خواہش نفس کو ترجیح دی تو ان پر آبق کا نام لازم آگیا۔ فرشتہ کی جانب سے سختی اللہ تعالیٰ کے امر میں تھی اپنے ذاتی امر میں نہ تھی اللہ تعالیٰ کے حق کے متعلق تھی اپنے حق کے متعلق نہ تھی حضرت یونس علیہ السلام نے سختی کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں جو درست بات تھی اس کو نہ پایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے آبق اور ملیم کا نام دیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مبرد نے فساھم کا معنی کیا ہے اس نے قرعہ اندازی کی اس کی اصل وہ تیر ہیں جو گھمائے جاتے ہیں تو وہ مغلوبین میں سے ہو گیا (1)، فراء نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے دحضت حجته و اد حضھا اللہ۔ اسکا اصل معنی پھسلنا ہے؛ شاعر نے کہا:

قَتَلْنا المُدْحَضِينَ بكُلِّ فَجٍّ فقد قرّتْ بقتلِهِمُ العيونُ(2)

ہم نے ہر ایک راستہ پر مغلوبین کو قتل کیا ان کے قتل سے آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ مچھلی نے اسے نگل لیا جبکہ اس نے ایسا کام کیا جس پر ملامت کی جاتی ہے: ملوما اسے کہتے ہیں جس کی ملامت کی جائے وہ اس کا مستحق ہو یا نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ملیم کا معنی جس میں عیب ہو جب کوئی آدمی عمل کرے اور اس عمل کی وجہ سے عیب دار ہو جائے تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے: لام الرجل۔

**فَلَوْلَآ اَنَّهٗ** کسائی نے کہا: یہاں ان کے ہمزہ کو لام کے داخل ہونے کی وجہ سے کسرہ نہیں دیا کیونکہ یہ اس کے لئے نہیں۔ نحاس نے کہا: بات اسی طرح ہے جس طرح اس نے کہی لام یہ تو لولا کے جواب میں ہے مسبحین کا معنی ہے نماز پڑھنے والے۔

اگر وہ نماز پڑھنے والوں میں سے نہ ہوتا تو بطور سزا قیامت تک اس کے پیٹ میں رہتا یعنی مچھلی کا پیٹ قیامت تک اس کی قبر ہوتا۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وہ کتنا عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے؟ سدی، کلبی اور مقاتل بن سلیمان نے کہا: چالیس دن۔ ضحاک نے کہا: بیس دن۔ عطاء نے کہا: سات دن (3)۔ مقاتل بن حبان نے کہا: تین دن (4)۔ ایک قول کیا گیا: ایک ساعت۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ طبری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس کو محبوس کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو وحی کی کہ اسے پکڑ لے اس

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 67 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 68 4۔ ایضاً

کے گوشت کو خراش نہ لگانا اور اس کی ہڈی کو نہ توڑنا۔ مچھلی نے اسے پکڑ لیا پھر سمندر میں اپنے مسکن میں جا بیٹھی جب وہ سمندر کے انتہائی گہرے حصہ میں پہنچی تو حضرت یونس علیہ السلام نے کچھ آواز محسوس کی تو اپنے دل میں خیال کیا یہ کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی جبکہ وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے۔ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ تو حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں تسبیح کی فرشتوں نے اس کی تسبیح سنی انہوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہم اجنبی علاقہ سے ایک کمزور سے تسبیح سن رہے ہیں فرمایا: وہ میرا بندہ یونس ہے، اس نے میری نافرمانی کی تو میں نے اسے سمندر میں مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا ہے۔ انہوں نے عرض کی: تیرا وہ نیک بندہ جس کے ہر روز تیری بارگاہ میں نیک اعمال بلند ہوتے تھے؟ فرمایا: ہاں، فرشتوں نے اس کے حق میں سفارش کی، مچھلی کو حکم دے دیا گیا کہ اسے ساحل پر اس بچے کی طرح پھینک دے جس کا نفس ہو جس کا گوشت اور ہڈیاں ایک ہو چکی ہوں۔

ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ مچھلی کشتی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا ہوا تھا جس میں حضرت یونس علیہ السلام سانس لے رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بھی کر رہے تھے وہ مچھلی ان سے جدا نہ ہوئی یہاں تک کہ وہ خشکی تک جا پہنچے مچھلی نے آپ کو صحیح وسالم باہر پھینک دیا ان کی کسی چیز میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی تو سب لوگ مسلمان ہو گئے؛ زمخشری نے اسے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا: مجھے کئی ساتھیوں نے امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ بن یوسف جوینی سے یہ واقعہ سنایا کہ ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کس سمت میں ہے؟ فرمایا: نہیں وہ اس سے بالا ہے۔ پوچھا گیا: اس پر دلیل کیا ہے؟ فرمایا: اس پر دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا تفضلونی علی یونس بن متی تم مجھے حضرت یونس متی پر فضیلت نہ دو۔ ان سے پوچھا گیا: اس حدیث میں دلیل کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: میں وہ نہیں بتاؤں گا یہاں تک کہ میرا یہ مہمان ہزار دینار لے جس کے ساتھ اپنا قرضہ ادا کر لے۔ دو آدمی اٹھے انہوں نے کہا: یہ ہم پر لازم ہے، آپ نے فرمایا: وہ دو کا پیچھا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس پر شاق گذرے گا ان میں سے ایک نے کہا: یہ میرے ذمہ ہے۔

آپ نے فرمایا: حضرت یونس بن متی نے اپنے آپ کو سمندر میں پھینکا مچھلی نے انہیں لقمہ بنالیا وہ سمندر کی گہرائی میں تین تاریکیوں میں جا پہنچے اور یوں ندا کی: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیاء) جس طرح اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب سبز رفرف پر بیٹھے اور اس کے ذریعے بلندیوں پر چڑھے یہاں تک کہ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے قلموں کے چلنے کی آواز سن رہے تھے اللہ تعالیٰ نے ان سے مناجات کی جو مناجات کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی جو وحی کی اس وقت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے حضرت یونس علیہ السلام سے زیادہ قریب نہ تھے جبکہ وہ سمندر کی تاریکی میں مچھلی کے پیٹ میں تھے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** طبری نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام جب کشتی میں سوار ہوئے تو اس کے سواروں کو سخت ہوا نے آلیا انہوں نے کہا: یہ تم میں سے کسی کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا جبکہ وہ جان چکے

تھے کہ غلطی انہی کی ہے: یہ میری غلطی ہے مجھے سمندر میں پھینک دو، انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ قرعہ اندازی کر لیں انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ ان کے نام نکلا۔ حضرت یونس نے کہا: میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ یہ مصیبت میرے گناہ کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ دوبارہ قرعہ ڈالیں تو قرعہ انہیں کے نام نکلا انہوں نے پھر بھی انہیں سمندر میں پھینکنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ تیسری بار قرعہ ڈالیں تو پھر بھی قرعہ انہیں کے نام نکلا جب حضرت یونس علیہ السلام نے دیکھا تو اپنے آپ کو سمندر میں پھینک دیا یہ رات کا وقت تھا تو ایک مچھلی نے انہیں نگل لیا۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو نقاب اوڑھ لیا اور سو گئے کشتی والے چلے ابھی تھوڑی دور بھی نہ گئے تھے کہ ہوا نے انہیں آلیا قریب تھا کہ کشتی غرق ہو جاتی کشتی والے اکٹھے ہو گئے انہوں نے الله تعالیٰ کے حضور دعا کی انہوں نے کہا: اس سوئے آدمی کو جگائیے وہ بھی ہمارے ساتھ دعا مانگے حضرت یونس نے ان کے ساتھ دعا مانگی تو الله تعالیٰ نے ان سے ہوا کو دور کر دیا حضرت یونس علیہ السلام پھر اپنی جگہ کی طرف چلے گئے اور سو گئے پھر ہوا آ گئی قریب تھا کہ کشتی غرق ہو جاتی انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو بیدار کیا اور سب نے دعا کی تو ہوا ختم ہو گئی کہا: وہ لوگ اسی حالت میں تھے کہ ایک مچھلی جس کا سر بہت بڑا تھا بلند ہوئی اس نے ارادہ کیا کہ کشتی کو ہی نگل جائے تو حضرت یونس علیہ السلام نے لوگوں کو کہا: اے میری قوم! یہ میری وجہ سے ہے اگر تم مجھے سمندر میں پھینک دو تو تم چلتے رہو گے اور تم سے ہوا اور خوف دور ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا: ہم تمہیں سمندر میں نہیں پھینکیں گے یہاں تک کہ ہم قرعہ اندازی کر لیں۔ جس کے نام قرعہ نکلے گا ہم اسے سمندر میں پھینک دیں گے لوگوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! مجھے سمندر میں پھینک دو میری وجہ سے ہی تمہیں یہ مصیبت آئی ہے۔ انہوں نے کہا: ہم ایسا نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہم ایک دفعہ پھر قرعہ ڈال لیں انہوں نے ایسا ہی کیا تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام ہی نکلا حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! مجھے سمندر میں پھینک دو میری وجہ سے ہی تمہیں یہ مصیبت پہنچی ہے الله تعالیٰ کا فرمان: **فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** ۝ کا یہی معنی ہے یعنی قرعہ ان کے نام پڑا وہ اسے لے کر کشتی کے سامنے والے حصہ کی طرف گئے تاکہ اسے پھینک دیں کہ اچانک ایک مچھلی اپنا منہ کھولے ہوئے تھی پھر وہ اسے کشتی کی ایک طرف لے گئے تو وہاں ایک مچھلی تھی پھر اسے لے کر دوسری جانب گئے تو وہاں بھی ایک مچھلی اپنا منہ کھولے ہوئے تھی جب یہ دیکھا تو اپنے آپ کو سمندر میں پھینک دیا تو مچھلی نے انہیں نگل لیا تو الله تعالیٰ نے مچھلی کی طرف وحی کی: میں نے اسے تیرا رزق نہیں بنایا بلکہ میں نے تیرے پیٹ کو اس کا برتن بنا دیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چالیس دن تک رہے تو انہوں نے تاریکیوں میں یہ دعا کی: **لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ** ۝ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے (1)، پھر بھی آئے گی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہم سے قبل کی شریعتوں میں قرعہ کا عام معمول تھا ہماری شریعت میں بھی یہ معمول ہے جس طرح سورۂ آل عمران میں آیا ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 67

ابن عربی نے کہا: شرع میں تین مقامات پر قرعہ کا ذکر آیا ہے(1): (1) نبی کریم ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی ازواج مطہرات میں قرعہ اندازی کرتے جس کے نام قرعہ نکلتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔

(2) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ ایک آدمی نے چھ غلام آزاد کر دیئے ان کے علاوہ اس کا کوئی مال نہ تھا نبی کریم ﷺ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی تو دو کو آزاد کر دیا اور چار کو باقی رہنے دیا۔

(3) دو آدمیوں نے آپ کی بارگاہ میں میراث کا جھگڑا کیا جس کے آثار مٹ چکے تھے فرمایا: ''دونوں جاؤ حق کو تلاش کرو قرعہ ڈالو اور تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کے لئے اس کو حلال کر دے''۔ یہ تین مواقع ہیں وہ نکاح میں باری، آزادی اور تقسیم ان میں قرعہ کا اجراء، اشکال کو دور کرنے اور خواہش کی مرض کو ختم کرنے کے لئے ہے۔

جنگ کے موقع پر بیویوں میں قرعہ اندازی نکالنے کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے(2) اس بارے میں دو قول ہیں: (1) صحیح یہ ہے کہ قرعہ اندازی کی جائے؛ فقہاء نے بھی یہی کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام کو سفر پر لے جانا ممکن نہیں ان میں سے ایک کا انتخاب ترجیح بنتی ہے اس لیے قرعہ کی صورت ہی رہ جاتی ہے، چھ غلاموں میں بھی یہی صورتحال تھی کیونکہ ان میں سے دو، ایک تہائی بنتا ہے یہ وہ مقدار ہے جس کی مرض موت میں آزادی جائز ہے محض خواہش نفس اور من پسندی شرعاً جائز نہیں تو قرعہ کے بغیر کوئی صورت باقی نہ رہی اسی طرح وہ جھگڑا جو وراثت کے مال کی ذاتوں میں ہوا تھا تو قرعہ کے بغیر حق کو کوئی امتیاز عطا نہیں کرتا تھا پس جب مشکل پڑ جائے تو قرعہ ہی مستحق کی تعیین میں اصل بن گیا۔

کہا: میرے نزدیک حق یہ ہے کہ ہر مشکل میں یہ جاری ہوگا پس یہی اس کو زیادہ واضح کرنے والا، حکم میں قوی، اشکال کی صورت کو دور کرنے میں نمایاں ہوگا اسی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں: بیویوں میں طلاق میں قرعہ، لونڈی میں آزادی میں قرعہ کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ سمندر میں کسی آدمی کو پھینکنے کے لئے قرعہ اندازی کرنا جائز نہیں یہ حضرت یونس علیہ السلام اور ان کے زمانہ میں دلیل کے ثبوت اور ایمان کی زیادتی کی وجہ سے تھا جو آدمی گناہگار رہا اسے قتل کرنا اور اسے آگ یا سمندر میں پھینک دینا جائز نہیں بلکہ اس کے جرم کے مطابق حد یا تعزیر جاری ہوگی۔ بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ سمندر جب قوم کو خوفزدہ کر دے وہ کشتی کو ہلکا کرنے پر مجبور ہو جائیں تو قرعہ ڈالا جائے گا اور کچھ کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ قول فاسد ہے کیونکہ بعض افراد کو سمندر میں پھینک دینے سے بوجھ ہلکا نہیں ہوگا بلکہ یہ طریقہ اموال کو پھینکنے میں اپنایا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام تسبیح کرنے والوں میں سے تھے اور ان کی تسبیح ہی ان کی نجات کا باعث بنی تھی اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ عمل صالح عمل کرنے والے کو اوپر اٹھاتا ہے جب وہ لڑکھڑا کر گر پڑے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ کا معنی ہے نمازیوں میں سے۔ قتادہ نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کی نماز اس لیے پڑھا کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا تھا پس اللہ تعالیٰ نے اسے نجات عطا فرمائی۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1622 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1623

ربیع بن انس نے کہا: اگر انہوں نے اس سے قبل عمل صالح نہ کیا ہوتا تو وہ مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہتے کہا: حکمت میں لکھا ہوا ہے جب کوئی بندہ پھسلتا ہے تو عمل صالح اسے اٹھا دیتا ہے۔

مقاتل نے کہا: مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ سے مراد ہے وہ معصیت سے پہلے نمازیوں اور اطاعت شعاروں میں سے تھے۔ وہب نے کہا: معنی ہے وہ عبادت گذاروں میں سے تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مچھلی کے پیٹ میں ان کی کوئی نماز نہ تھی بلکہ انہوں نے آسودگی کے دور میں اچھا عمل کیا ہوا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حالت آزمائش میں اس کا ذکر کیا، بے شک عمل صالح عامل کو اٹھاتا ہے جب وہ لغزش کھاتا ہے تو یہ عمل اسکا سہارا بن جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من استطاع منكم أن تكون له خبيئة من عمل صالح فليفعل(1) جو آدمی یہ طاقت رکھتا ہو کہ اس کے لیے عمل صالح میں سے کوئی پوشیدہ عمل ہو تو وہ ایسا کرے یعنی بندے کو یہ کوشش کرنی چاہیے اور عمل صالح میں سے کسی عمل پر حریص ہونا چاہیے جس میں وہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان خالص ہو اپنی ضرورت کے دن کے لئے وہ اسے ذخیرہ کرے اپنی کدوکاوش کے ساتھ اسے چھپائے مخلوق سے اسے چھپائے اس کا نفع اسے پہنچے گا جبکہ وہ اس کا زیادہ ضرورت مند ہوگا۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسی اثنا میں کہ تین آدمی چل رہے تھے ایک روایت میں ہے کہ تم سے قبل کے زمانہ میں انہیں بارش نے آلیا انہوں نے ایک پہاڑ کی ایک غار میں پناہ لینی چاہی غار کے منہ پر پہاڑ سے ایک چٹان گر پڑی جس نے ان پر غار کا منہ بند کر دیا ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے کہا: ان اعمال پر غور و فکر کرو جو تم نے اچھے اعمال کئے ہیں ان کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو ممکن ہے اللہ تعالیٰ تم سے اس معصیت کو دور کر دے'' (2)۔ یہ حدیث مشہور ہے اس کی شہرت نے تمام حدیث کو بیان کرنے سے ہمیں غنی کر دیا ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا: جب حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں کہا: لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) مچھلی نے انہیں پھینک دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ سے مراد مچھلی کے پیٹ میں سے نماز پڑھنے والے تھے۔

میں کہتا ہوں: زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ زبان سے تسبیح تھی جو دل کے موافق تھی اسی پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس کا ذکر طبری نے کیا۔ کہا: حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں تسبیح کی تو فرشتوں نے اس کی تسبیح کو سنا فرشتوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم اجنبی علاقہ سے ایک کمزور سی تسبیح کی آواز سنتے ہیں۔ اس قول کی بنا پر کان زائدہ ہے کلام اس طرح ہوگی فلولا انه من المسبحين۔

ابوداؤد کی کتاب میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دعاء

---

1۔ العلل، دارقطنی، جلد 4، صفحہ 254

2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب اجابة دعاء من بر بوالدیه،

ذی النون فی بطن الحوت لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

جب مسلمان نے کسی بھی مصیبت پر یہ دعا کی اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا۔ یہ بحث سورۂ انبیاء میں گذر چکی ہے حضرت یونس علیہ السلام اس سے پہلے بھی نمازی اور تسبیح کرنے والے تھے مچھلی کے پیٹ میں بھی معاملہ اسی طرح ہے حدیث میں ہے: ''مچھلی کو ندا کی گئی: ہم نے یونس کو تیرے لئے رزق نہیں بنایا ہم نے تجھے اس کی جائے پناہ اور مسجد بنائی ہے''۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۱۴۸﴾

''پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے۔ اور ان کی حفاظت کے لئے ہم نے اگا دی ان پر کدو کی بیل۔ اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف۔ پس وہ ایمان لائے اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں کچھ وقت تک''۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ مچھلی نے انہیں موصل کی ایک دیہات کے ایک ساحل پر پھینک دیا۔ ابن قسیط نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: ''حضرت یونس علیہ السلام کو خالی جگہ پھینک دیا اللہ تعالیٰ نے ان پر کدو کی بیل اگا دی ہم نے پوچھا: اے ابو ہریرہ یقطینہ کیا ہے؟ کہا: کدو کا درخت، اللہ تعالیٰ نے ایک جنگلی بکری ان کے لیے تیار کر دی جو زمین کا گھاس پھوس کھاتی وہ ان پر اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی اور ہر صبح اور شام انہیں دودھ پلایا کرتی یہاں تک کہ وہ پروان چڑھے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: مچھلی انہیں لے کر نکلی یہاں تک کہ انہیں سمندر کے ساحل پر پھینکا اللہ تعالیٰ نے اس پر کدو کی بیل اگا دی۔ اس کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے شجرۃ القرع کے الفاظ ہیں جو اس پر دودھ ٹپکاتا یہاں تک کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوت لوٹ آئی پھر ایک روز وہ بیل کی طرف لوٹے تو اسے خشک پایا وہ غمگین ہو گئے اور اس پر روئے تو حضرت یونس علیہ السلام کو عتاب کیا گیا ان سے کہا گیا: تم ایک بیل پر غمگین ہوئے اور اس پر روئے اور بنی اسرائیل کے لاکھ سے زیادہ افراد کی ہلاکت پر غمگین نہ ہوئے جو میرے خلیل حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے تھے جو دشمنوں کے ہاتھوں قید ہوئے اور تو نے سب کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ انجیر کا درخت تھا۔ ایک قول کیا گیا ہے کہ وہ کیلے کا درخت تھا جو اپنے پتوں سے اسے ڈھانپتا، آپ اس کی شاخوں سے سایہ حاصل کرتے اور اس کے پھل سے افطار کرتے، اکثر علماء کی رائے ہے وہ کدو کی بیل تھی جس طرح اس کا ذکر آئے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا اور صالحین میں سے بنا دیا پھر اسے حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کا قصد کیا یہاں تک کہ ایک چرواہے سے ملے حضرت یونس علیہ السلام نے اس سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اور ان کے حال کے بارے میں پوچھا، اس چرواہے نے

انہیں بتایا کہ وہ بہت بہتر حالت میں ہیں اور وہ اس امید میں ہیں کہ ان کا رسول ان کی طرف لوٹ آئیگا۔

حضرت یونس علیہ السلام نے اس چرواہے سے فرمایا انہیں بتا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے ملا تھا اس چرواہے نے کہا: میں گواہی کے بغیر اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اس کے ریوڑ میں سے ایک بکری کو منتخب کیا فرمایا: یہ تیرے حق میں گواہی دے گی تو واقعی حضرت یونس علیہ السلام سے ملا تھا اس چرواہے نے کہا اور کیا؟ کہا: زمین کا قطعہ تمہارے حق میں گواہی دے گا کہ تو نے حضرت یونس علیہ السلام سے ملاقات کی اس نے کہا اور کیا؟ فرمایا: یہ درخت تیرے حق میں گواہی دے گا کہ تو حضرت یونس علیہ السلام سے ملا تھا۔ وہ چرواہا اپنی قوم کی طرف آیا اور انہیں بتایا کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام سے ملا ہے تو قوم کے افراد نے اسے جھٹلایا اور اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا اس نے کہا: مجھ پر جلدی نہ کرو یہاں تک کہ میں صبح کروں جب اس نے صبح کی تو وہ انہیں اس قطعہ زمین پر لے آیا جہاں اسے حضرت یونس علیہ السلام ملے تھے اس نے قطعہ زمین سے بولنے کا مطالبہ کیا تو اس قطعہ زمین نے خبر دی کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام سے ملا ہے اس نے بکری اور درخت سے بولنے کا مطالبہ کیا تو دونوں نے اسے بتایا کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام سے ملا ہے پھر اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام ان کے پاس آگئے، یہ اور اس سے ماقبل خبر طبری نے بیان کی ہے **فَنَبَذۡنٰهُ** ہم نے اسے پھینک دیا۔ اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے اسے صحراء میں چھوڑ دیا؛ یہ ابن اعرابی کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: کھلی جگہ۔ ابو عبیدہ نے کہا: کھلی زمین۔ فراء نے کہا: خالی جگہ۔ ابو عبیدہ نے کہا: عراء سے مراد روئے زمین ہے۔ خزاعہ کے ایک آدمی نے یہ شعر پڑھا:

ورفعتُ رِجْلًا لا أخافُ عِثارها ونَبَذْتُ بالبلَدِ العراءِ ثِيابي(1)

میں نے قدم اٹھایا جس کی لغزش کا مجھے خوف نہیں اور میں نے سطح زمین پر اپنے کپڑے پھینک دیے۔

اخفش نے **وَهُوَ سَقِيۡمٌ** کے بارے میں حکایت بیان کی ہے سقیم کی جمع سقمی، سقامی اور سقام ہے اس سورت میں **فَنَبَذۡنٰهُ بِالۡعَرَآءِ** کہا اور سورۃ القلم میں **لَوۡلَاۤ اَنۡ تَدٰرَكَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَهُوَ مَذۡمُوۡمٌ** ۝ آیت فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خبر دی کہ انہیں کھلی جگہ پھینکا گیا جبکہ وہ مذموم نہ تھے اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو وہ مذموم ہوتے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: **وَاَنۡۢبَتۡنَا عَلَيۡهِ شَجَرَةً مِّنۡ يَّقۡطِيۡنٍ** ۝ اس میں علیہ، عندہ کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَلَهُمۡ عَلَىَّ ذَنۡۢبٌ** (الشعراء:14) اس میں بھی علی عندی کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: علیہ، لہ کے معنی میں ہے **يَّقۡطِيۡنٍ** سے مراد کدو کی بیل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس کے علاوہ ہے۔ ابن اعرابی نے اس کا ذکر کیا ہے حدیث میں یہ بھی ہے ''کدو اور تربوز جنت کے پھل ہیں'' ہم نے اس کا ذکر کتاب التذکرہ میں کیا ہے۔

مبرد نے کہا: ہر وہ پودا جس کا تنا نہ ہو جن کے پتے زمین پر بچھ جائیں اسے یقطینہ کہتے ہیں جس طرح کدو، تربوز، خربوزہ اور تنبہ۔ اگر اس کا تنا ہو جو اسے اٹھائے ہوئے ہو تو اسے شجرہ کہتے ہیں، اگر بچھی ہوئی جڑوں پر کھڑا ہو تو اسے نجمہ کہتے ہیں جس

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 68

کی جمع نجم آتی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ (رحمٰن) اس کی مثل حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور مقاتل سے مروی ہے انہوں نے کہا: ہر جڑی بوٹی جو لمبی ہو جائے اور زمین پر بچھ جائے صحیح وسالم باقی نہ رہے اور اس کا تنا نہ ہو جس طرح ککڑی، خربوزہ، تربوز، کدو اور تنبہ تو وہ یقطین ہوگی۔ سعید بن جبیر نے کہا: ہر وہ شے جو اگے پھر اسی سال مر جائے اس تعریف کی بنا پر کیلا بھی اس میں داخل ہے۔

میں کہتا ہوں: يَّقْطِيْنٍ اسے کہتے ہیں جس کا تنا ہو۔ جوہری نے کہا: یقطین اسے کہتے ہیں جس کا تنا نہ ہو جس طرح کدو کی بیل۔ زجاج نے کہا: یقطین، قطن سے مشتق ہے یہ قطن بالمکان سے مشتق ہے جب وہ اسی جگہ مقیم ہو یہ یفعیل کا وزن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عجمی نام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یقطین کا خصوصاً ذکر ہوا ہے کیونکہ اس پر مکھی نہیں بیٹھتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہاں کوئی یقطین نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اسے اگا دیا آیت میں ایسی چیز کا ذکر ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وہ چیز بچھی ہوتی تھی تاکہ اس کا سایہ ہو۔

ثعلبی نے کہا: وہ اسے سایہ عطا کرتی تھی حضرت یونس علیہ السلام نے اس کی سرسبزی کو دیکھا تو اس کی سرسبزی نے اسے خوش کر دیا تو وہ خشک ہو گئی تو آپ اس پر غمگین ہونے لگے اسے کہا گیا: اے یونس! نہ تو تو نے اسے پیدا کیا، نہ تو نے اسے پانی دیا اور نہ ہی تو نے اسے اگایا تو ایک چھوٹے سے درخت پر غمگین ہوتا ہے جبکہ میں نے ایک لاکھ سے زائد افراد پیدا کئے تو مجھ سے یہ ارادہ کرتا تھا کہ میں انہیں لمحہ بھر میں جڑ سے اکھیڑ دوں انہوں نے توبہ کی اور میں نے ان کی توبہ قبول کر لی تو تیری رحمت کہاں گئی اے یونس! جبکہ میں تو ارحم الرحمین ہوں☆۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گوشت اور کدو کے ساتھ بنایا گیا ثرید کھاتے تھے آپ کدو کو پسند کرتے آپ فرماتے: یہ میرے بھائی یونس کا درخت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں شوربہ پیش کیا گیا جس میں کدو اور گوشت کے ٹکڑے تھے آپ پیالے کے اطراف میں کدو کو تلاش کرتے تھے (1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس دن سے کدو کو پسند کرتا ہوں۔ اس روایت کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی رسالت اس کے بعد شروع ہوئی جب مچھلی نے انہیں پھینک دیا تھا اس کی سند حضرت شہر بن حوشب سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا: اسناد کے اعتبار سے سب سے عمدہ اور سب سے صحیح وہ روایت ہے جو علی بن حسین سے مروی ہے کہ حسن بن محمد، عمرو بن عنقزی سے وہ اسرائیل سے وہ اسحاق سے وہ عمرو بن میمون سے وہ عبداللہ بن مسعود سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وہ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم سے عذاب کا وعدہ کیا اور انہیں بتایا کہ عذاب تین دن میں آجائے گا لوگوں نے ہر والدہ اور اس کے بچے کو الگ کر دیا وہ بستی سے باہر نکلے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائے اور اس سے مغفرت کے طالب ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب کو روک دیا حضرت یونس علیہ السلام عذاب کا انتظار کرتے رہے مگر کوئی چیز نہ دیکھی۔ وہاں کا قانون تھا جو آدمی جھوٹ بولے اور اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو

1۔ موطا امام مالک، کتاب النکاح، ماجاء فی الولیمہ، صفحہ 509

☆ عرائس المجالس صفحہ 414-413

اسے قتل کر دیا جاتا ہے ☆ تو میرے حق میں کون گواہی دے گا؟ آپ نے فرمایا: یہ درخت اور یہ قطعہ زمین۔ اس نے عرض کی: ان دونوں کو حکم دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے دونوں سے کہا: جب تم دونوں کے پاس یہ لڑکا آئے تو اس کے حق میں گواہی دینا۔ دونوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ وہ لڑکا آپ کی قوم کے پاس آیا اس کے پاس قوت تھی اور اس کے بھائی تھے وہ بادشاہ کے پاس آیا اس نے کہا: میں حضرت یونس علیہ السلام کو ملا ہوں وہ تجھے سلام کہتے تھے، بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا لوگوں نے کہا: اس کے پاس گواہ ہیں لوگوں کو اس کے ساتھ بھیج دو وہ درخت اور اس قطعہ زمین کے پاس آیا اور دونوں نے کہا: میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم میرے حق میں گواہی دو کہ واقعی میں حضرت یونس علیہ السلام کو ملا ہوں؟ دونوں نے کہا: ہاں لوگ گھبرائے ہوئے واپس آئے کہہ رہے تھے: درخت اور زمین نے اس کے حق میں گواہی دی ہے۔ لوگ بادشاہ کے پاس آئے اور جو کچھ دیکھا تھا اس کے بارے میں خبر دی۔

حضرت عبداللہ نے کہا: بادشاہ نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جگہ بٹھایا اور کہا: تو میری بنسبت اس جگہ پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: اس لڑکے نے چالیس سال تک ان کے امور مملکت چلائے۔

ابو جعفر نحاس نے کہا: اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں جانے سے پہلے مبعوث کیا گیا تھا، یہ امر قیاس سے نہیں لیا جا سکتا۔

اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لے آئی تھی اور شرمندگی کا اظہار کیا تھا کیونکہ اس میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ عذاب تین دن تک ان پر آ جائے گا تو انہوں نے ہر والدہ اور بچے کو الگ الگ کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ و زاری کی۔ اس باب میں یہ صحیح ہے ان کے بارے میں حق دوسروں کے حکم جیسا نہیں تھا ارشاد باری

☆ حضرت یونس علیہ السلام ناراض ہو کر نکل پڑے آپ ایک کشتی میں لوگوں کے پاس آئے لوگوں نے آپ کو کشتی پر سوار کر لیا اور آپ کو پہچان لیا جب کشتی میں داخل ہوئے تو کشتی رک گئی کشتی دائیں بائیں ڈولتی۔ لوگوں نے کہا: تمہاری کشتی کو کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہم تو کچھ نہیں جانتے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: اس میں ایک غلام اپنے رب سے بھاگا ہوا ہے یہ کشتی نہیں چلے گی یہاں تک کہ تم اس کو پھینک دو۔ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے نبی ہم آپ کو نہیں پھینکیں گے آپ نے فرمایا: تم قرعہ ڈالو جس کے نام قرعہ نکلے تو وہ اس میں چھلانگ لگا دے لوگوں نے قرعہ ڈالا۔ قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ لوگوں نے آپ کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: تین دفعہ قرعہ ڈالو جس کے نام قرعہ نکلے وہ اس میں چھلانگ لگا دے۔ لوگوں نے قرعہ ڈالا تو تینوں دفعہ قرعہ آپ کے نام نکلا۔ آپ نے چھلانگ لگا دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک مچھلی کے سپرد کر دیا اور مچھلی آپ کو نگل گئی اور زمین کی تہہ تک آپ کو لے گئی حضرت یونس علیہ السلام نے سنگریزوں کی تسبیح کو سنا، فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۤ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیا: 87) کہا: رات کی تاریکی، سمندر کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی۔ فرمایا: فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِيْمٌ ۝، کہا: آپ اس پرندے کے بچے کی طرح تھے جس کے پر نوچ لیے گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کدو کی ایک بیل کو اگایا تو وہ اگ آئی۔ حضرت یونس اس سے سایہ حاصل کرتے، وہ بیل خشک ہو گئی تو آپ اس پر روئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کیا تو ایک درخت کے خشک ہونے پر روتا ہے اور ایک لاکھ سے زائد افراد پر نہیں روتا جن کو تو نے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نکلے تو وہ ایک چرواہے بچے کے پاس پہنچے۔ پوچھا: اے بچے تو کون ہے؟ اس نے عرض کی یونس علیہ السلام کی قوم سے۔ فرمایا جب تو قوم کے پاس جائے تو انہیں بتانا کہ تو یونس علیہ السلام سے ملا ہے۔ بچے نے کہا: اگر آپ یونس ہیں تو آپ کو علم ہے کہ جو آدمی جھوٹ بولتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

تعالیٰ ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (الغافر) وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (النساء:18)

بعض علماء نے کہا: انہوں نے عذاب کے آثار دیکھے تو توبہ کرلی یہ کوئی ممنوع نہیں اس بارے میں علماء کی آراء سورۂ یونس میں گذر چکی ہیں وہاں دیکھ لو۔

اَوْ يَزِيْدُوْنَ سورۂ بقرۃ میں اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً میں او کے بارے میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ فراء نے کہا: او، بل کے معنی میں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ او واؤ کے معنی میں ہے؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

فلما اشتد أمرُ الحربِ فينا تأمّلنا رِياحا او رِزاما(1)

اس شعر میں او واؤ کے معنی میں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی اس زبان کی طرح ہے: وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (النحل:77)

جعفر بن محمد نے اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ہمزہ کے بغیر صرف واؤ پڑھی ہے يَزِيْدُوْنَ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اصل میں کلام یوں تھی هم يزيدون۔ نحاس نے کہا: بصریوں کے نزدیک یہ دونوں قول صحیح نہیں انہوں نے او کو بل اور واؤ کے معنی میں لینے سے انکار کیا ہے بلکہ بل پہلے کلام سے اضراب اور مابعد کو ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بالا ہے یا ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف نکلنے کے لئے ہوتا ہے یہ بھی اس کا موقع محل نہیں واؤ کا معنی او کے خلاف ہے اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے معنی میں ہو تو معانی باطل ہو جائیں گے اگر ایسا جائز ہوتا تو وارسلناہ الی اکثر مائتی الف زیادہ مختصر ہوتا۔

مبرد نے کہا: معنی ہے ہم نے اسے ایسی جماعت کی طرف بھیجا اگر تم انہیں دیکھتے تو تم کہتے یہ ایک لاکھ یا اس سے زائد ہیں کیونکہ لوگوں کو خطاب اس انداز سے کیا جاتا ہے جس سے وہ واقف ہوتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: جاءنی زید او عمرو جبکہ تو جانتا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کون تیرے پاس آیا ہے مگر تو نے مخاطب پر اس معاملہ کو مبہم کر دیا ہے۔

اخفش اور زجاج نے کہا: معنی ہے یا تمہارے اندازے کے مطابق اس سے زائد ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھے۔ حضرت ابی بن کعب نے اسے مرفوع نقل کیا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے وہ تیس ہزار تھے۔ حضرت حسن بصری اور ربیع نے کہا: وہ تیس ہزار سے کچھ زائد تھے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وہ ستر ہزار تھے۔ اِلٰى حِيْنٍ سے مراد ان کی عمروں کی انتہا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 70 2۔ جامع ترمذی، باب ومن سورة الصافات، حدیث 3153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ٟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

''ذرا پوچھیے ان نادانوں سے: کیا آپ کے رب کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے آیا جب ہم نے فرشتوں کو مؤنث بنایا تو کیا وہ موجود تھے۔ غور سے سنو وہ جھوٹی تہمت لگاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بچے جنے اور وہ بلاشبہ جھوٹ بکتے ہیں، کیا اس نے پسند کی ہیں اپنے لئے بیٹیاں، بیٹوں کو چھوڑ کر تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو کیا تم غور وفکر نہیں کیا کرتے۔ کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے تو اپنی وہ دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو''۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے سابقہ قوموں کی خبروں کو ذکر کیا تو اب کفار کے قول کے خلاف استدلال کیا ہے وہ یہ کہتے: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں فَاسْتَفْتِهِمْ سورت کے آغاز میں جو اس قسم کا کلام ہے اس پر معطوف ہے اگرچہ دونوں میں طویل مسافت ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ سے پوچھو! کیا تیرے رب کی بیٹیاں ہیں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہینہ، خزاعہ، بنو ملیح، بنو سلمہ اور بنو عبدالدار نے یہ گمان کیا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، یہ سوال زجر و توبیخ کے لئے ہے۔

شٰهِدُوْنَ کا معنی ہے جب ہم نے فرشتوں کو مؤنث بنایا اس وقت وہ حاضر تھے یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ (الزخرف: 19)

اِفْكِهِمْ کا معنی ہے وہ بڑا برا جھوٹ تھا وہ اس بات میں جھوٹے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جس نے نہ کسی کو جنا اور نہ ہی کسی نے اسے جنا ہے اَلَآ کے بعد ان کا ہمزہ مکسور ہوتا ہے کیونکہ اس سے کلام کا آغاز ہوتا ہے۔ سیبویہ نے یہ کہا ہے کہ اَمَا کے بعد اس کا ہمزہ مفتوح ہوتا ہے یا مکسور ہوتا ہے جب ہمزہ مفتوح ہو تو اما، حقا کے معنی میں ہوگا جب ہمزہ مکسور ہو تو اما، الا کے معنی میں ہوگا۔

نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے اَلَآ کے بعد ان کے ہمزہ کو فتحہ دینا جائز ہے اس صورت میں الا، اما کے مشابہ ہوگا جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے تو اس میں ہمزہ کے نیچے کسرہ دینا جائز ہے کیونکہ اس کے بعد اسم مرفوع ہے الکاذبون پر کلام مکمل ہو جاتی ہے پھر اصطفی سے نئی کلام شروع ہو جاتی ہے مقصود تقریع و توبیخ ہے۔ (شرمندہ کرنا ہے)

گویا فرمایا: تم پر افسوس اس نے بیٹیاں منتخب کیں اور بیٹوں کو ترک کر دیا عام قراء کی قراءت اصطفی ہے یعنی ہمزہ قطعی ہے کیونکہ یہ ہمزہ استفہام ہے جو ہمزہ وصلی پر داخل ہے، ہمزہ وصلی حذف ہو گیا اور ہمزہ استفہام مفتوح باقی رہا جس طرح اَطَّلَعَ الْغَيْبَ (مریم: 78) ہے جیسے پہلے گذر چکا ہے۔ ابو جعفر، شیبہ، نافع اور حمزہ نے ہمزہ وصلی کے ساتھ اسے پڑھا ہے یہ جملہ خبریہ ہے یہاں استفہام نہیں کیونکہ اس کا مابعد مَا لَكُمْ ٟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ ہے کلام توبیخ کے طریقہ پر دو جہتوں سے جاری ہے ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے جو جھوٹ بولا ہے یہ اس کا بیان و تفسیر ہو اور مَا لَكُمْ ٟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ماقبل سے منقطع ہو دوسری یہ ہے کہ نحویوں نے حکایت بیان کی ہے ان میں فراء بھی ہے کہ توبیخ استفہام اور بغیر استفہام کے ہوا کرتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (الاحقاف: 20) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام مضمر ہے تقدیر کلام یوں ہے ویقولون اصطفی البنات یا یہ ولد اللہ سے بدل ہے کیونکہ بچیوں کو جننا اور انہیں بیٹیاں بنانا ان کو منتخب کرنا ہی ہے فعل ماضی کو فعل ماضی سے بدل بنایا گیا ہے اس وجہ سے لکاذبون پر وقف نہیں کیا جائے گا کیا تم غور وفکر نہیں کرتے کہ یہ جائز نہیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہو یا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل اور برہان موجود ہے اگر تم سچے ہو تو دلائل لے آؤ۔

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اور ٹھہرا دیا انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ، حالانکہ جن خود جانتے ہیں کہ انہیں پکڑ کر پیش کیا جائے گا، پاک ہے اللہ تعالیٰ لغویات سے جو یہ بیان کرتے ہیں مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے (ایسی ہرزہ سرائی نہیں کرتے)''۔

اکثر اہل تفسیر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں الجنہ سے مراد فرشتے ہیں۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قریش کے کفار نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ان کی مائیں کونسی ہیں؟ تو قریش نے جواب دیا: ان کی باپردہ۔ اہل اشتقاق نے کہا: انہیں جن اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دکھائی نہیں دیتے۔ مجاہد نے کہا: فرشتوں کے خاندانوں میں سے ایک خاندان ہے جنہیں الجنہ کہتے ہیں (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اسرائیل، سدی سے وہ ابو مالک سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: انہیں جنہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ جنتوں کے خازن ہیں تمام فرشتے جنہ ہیں نسبا سے مراد رشتہ مصاہرت ہے۔

قتادہ، کلبی اور مقاتل نے کہا: یہودیوں نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے ساتھ مصاہرت کا رشتہ قائم کیا ہے فرشتے انہیں میں سے ہیں (2)؛ مجاہد، سدی اور مقاتل نے بھی یہ کہا ہے یہ بات کرنے والے کنانہ اور خزاعہ تھے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنوں کی سردار عورتوں کو دعوت نکاح دی تو جنوں نے اللہ تعالیٰ کی شادی اپنی بامروت بیٹیوں سے کردی فرشتے جنوں کی بامروت عورتوں سے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شیطان کو شریک کیا تو وہ نسب ہے جو انہوں نے قائم کیا (3)۔

میں کہتا ہوں: حضرت حسن بصری کا قول اس بارے میں بہت ہی اچھا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ (الشعراء) یعنی ہم تمہیں عبادت میں رب العالمین کے ساتھ برابر قرار دیتے ہیں حضرت عباس، ضحاک اور حضرت حسن نے کہا: اس سے مراد ان کا یہ قول ہے اللہ تعالیٰ اور ابلیس دونوں بھائی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے جھوٹے قول سے بہت ہی بالا ہے (4)۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 71	2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 70	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

ملائکہ کو علم ہے کہ ایسا قول کرنے والے جہنم میں موجود ہونگے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ حساب کے لئے حاضر ہوں گے۔ ثعلبی نے کہا: پہلا قول اولیٰ ہے کیونکہ اس آیت میں احضار کا لفظ مکرر ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ نے عذاب کے علاوہ کی چیز کا ارادہ نہیں کیا۔

جو کچھ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے مگر جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں وہ جہنم سے نجات پائیں گے۔

فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

''پس تم اور جن (جھوٹے خداؤں) کی پوجا کرتے ہو تم سب مل کر اللہ کے خلاف کسی کو نہیں بہکا سکتے مگر اسے جو تاپنے والا ہے بھڑکتی آگ کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ میں ما، الذی کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر یہ ہے یعنی تم اور تمہاری ان بتوں کی عبادت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم اپنے ان معبودوں کے ساتھ جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو یہ کہا جاتا ہے: جاء فلاں وفلان، جاء فلان مع فلان دونوں کا معنی ومفہوم ایک ہی ہے۔

عَلَيْهِ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بِفٰتِنِيْنَ یعنی گمراہ کرنے والے۔ نحاس نے کہا: جتنا مجھے علم ہے اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے تم کسی کو گمراہ کرنے والے نہیں مگر جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ مقدر کر دے کہ وہ اسے گمراہ کریں۔ شاعر نے کہا:

فردّ بنعمته کیدَہٗ علیہِ وکان لنا فاتِنا(1)

اس نے اپنی نعمت سے اس کا مکر اسی پر لوٹا دیا جبکہ وہ ہمیں گمراہ کرنے والا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں قدریہ کا رد ہے۔ عمرو بن ذر نے کہا: ہم حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس حاضر ہوئے ان کے سامنے تقدیر کا ذکر کیا گیا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا کہ اس کی نافرمانی نہ کی جائے تو وہ ابلیس کو پیدا نہ فرماتا جبکہ وہ گناہ کی جڑ ہے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں علم ہے اسے پہچان لیا جس نے پہچان لیا اور جاہل رہ گیا جو جاہل رہ گیا پھر یہ آیت پڑھی فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ مگر وہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جہنم میں داخل ہونے کے بارے میں لکھ دیا فرمایا: اس آیت نے لوگوں کے درمیان فرق کر دیا ہے اس میں یہ راز ہے شیاطین کسی کو بھی گمراہ نہیں کر سکتے مگر جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہو کہ وہ ہدایت نہ پائیں اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا تو وہ ہدایت پائے گا تو اس بندے اور شیطان کے درمیان حائل ہو جاتا اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ (الاسراء: 64) یعنی تو ان تک کوئی چیز نہیں پہنچا سکتا مگر جو میرے علم میں ہے۔

لبید بن ربیعہ نے تقدیر کی حقانیت کے بارے میں کہا اور خوب کہا:

إنّ تَقْوَى ربّنا خير نَفَلْ وبِإذْنِ الله رَيْثِي وعَجَلْ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 72

أَحْمَدُ　اللہ　فلا　نِدَّ　لہٗ　بِيَدِيهِ　الخيرُ　ماشاء　فَعَلْ

مَنْ　هَدَاهُ　سُبُلَ　الخير　اهتدى　ناعِمِ　البَالِ　ومَنْ　شاء　أَضَلْ

بے شک تقوی بہترین احسان ہے اللہ کے اذن سے میری سستی اور تیزی ہے میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں اس کا کوئی مدمقابل نہیں اسی کے قبضہ قدرت میں خیر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے جسے وہ بھلائی کے راستہ کی طرف ہدایت دے وہ بڑی آسانی سے ہدایت پا جاتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے گمراہی مقدر کر دیتا ہے۔

فراء نے کہا: اہل حجاز کہتے ہیں فتنت الرجل میں نے انسان کو گمراہ کر دیا۔ اہل نجد مزید فیہ کا فعل ذکر کرتے ہیں اَفْتَنْتُه میں نے اسے گمراہ کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ پڑھا: اِلَّا مَنْ هُوَ صَالُ الْجَحِيْمِ یعنی لام مضموم ہے۔ نحاس نے کہا: مفسرین کی جماعت کا کہنا ہے یہ غلطی ہے کیونکہ یہ کہنا جائز نہیں: هذا قاض المدينة۔ اس بارے میں میں نے جو علی بن سلیمان سے سنا ہے وہ سب سے بہترین ہے کہا: ھو معنی پر محمول ہے کیونکہ من کا معنی جماعت ہے تقدیر کلام یوں ہوگی صالون اضافت کی وجہ سے نون حذف ہے اور واؤ اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اصل میں یہ فاعل کے وزن پر تھا مگر اسے صال سے صایل کی طرف قلب کیا گیا یاء کو حذف کر دیا گیا اور لام مضموم ہی رہ گیا یہ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (التوبہ: 109) کی مثل ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صال کا لام کلمہ تخفیف کے طریقہ پر حذف کر دیا گیا اور اعراب اس کے عین کلمہ پر جاری ہوا جس طرح عربوں کے اس قول سے حذف ہے مابالیت به بالة اصل میں یہ بالية تھا یہ بالی سے ماخوذ ہے جس طرح عافية، عافی سے ماخوذ ہے اس کی مثل اس کی قراءت ہے وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ (الرحمٰن) اور وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (الرحمٰن: 24) یہاں بھی عین کلمہ پر اعراب جاری کیا گیا ہے جماعت کی قراءت میں صالی یاء کے ساتھ ہے کاتب نے تحریر میں اسے حذف کر دیا کیونکہ تلفظ میں یہ ساقط ہے۔

وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

''اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے اور ہم پرے باندھے (مقام نیاز میں) کھڑے ہیں اور بے شک ہم اس کی پاکی بیان کرنے والے ہیں''۔

یہ فرشتوں کا قول ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں کہا ہے اور جنہوں نے ان کی عبادت کی تھی ان کے انکار کے لیے ہے۔

مقاتل نے کہا: یہ تین آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھے حضرت جبریل امین پیچھے ہٹ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''یہاں تو مجھے چھوڑ جائے گا'' حضرت جبریل امین نے عرض کی کہ میں اس کی طاقت نہیں رکھتا کہ میں اپنے مقام سے آگے بڑھوں ☆۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے ان

☆۔ تفسیر کشاف

آیات کو نازل فرمایا: وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔

کوفیوں کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے: و ما منا إلا من له مقام معلوم تو اسم موصول کو حذف کر دیا گیا۔ بصریوں کے نزدیک اس کی تقدیر کلام یہ ہے و ما منا ملك إلا له مقام معلوم یعنی عبادت میں اس کا معین مکان ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود اور ابن جبیر کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آسمانوں میں بالشت بھر ایسی زمین نہیں مگر اس پر ایک فرشتہ نماز پڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آسمان میں کوئی ایسی جگہ نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ سجدہ ریز ہے یا کھڑا ہے'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے وہ آواز نکال رہا ہے اس کا حق ہے کہ وہ آواز نکالے اس میں چار انگل کے برابر جگہ نہیں مگر ایک فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہا ہے اللہ کی قسم! جو میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے، بستروں پر تم اپنی بیویوں سے لذت حاصل نہ کرتے، تم پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے میں تو خواہش کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا (1)''۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اس بارے میں کہا یہ حدیث حسن غریب ہے ایک دوسری سند سے یوں مروی ہے کہ حضرت ابوذر نے کہا: میں پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا؛ حضرت ابوذر سے یہ موقوف مروی ہے۔

قتادہ نے کہا: آپ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے نماز پڑھایا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ کہا: تو مرد آگے ہو گئے اور عورتیں پیچھے ہو گئیں۔

کلبی نے کہا: فرشتوں کی صفیں بھی اسی طرح ہیں جس طرح زمین میں اہل دنیا کی صفیں ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم مسجد میں تھے فرمایا: ''کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناؤ گے جس طرح فرشتے اپنے رب کے ہاں صفیں بناتے ہیں (2)'' ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فرشتے اپنے رب کے ہاں کیسے صفیں بناتے ہیں؟ ''پہلی صفوں کو مکمل کرتے اور صف میں مل کر کھڑے ہوتے ہیں''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نماز کے لیے کھڑا ہوتے تو کہتے: اپنی صفوں کو سیدھا کرو اور سیدھے ہو جاؤ (3) اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں اس ہدایت کا ارادہ کرتا ہے جو فرشتوں کو ان کے رب کے ہاں حاصل ہے اور یہ آیت تلاوت کیا کرتے تھے وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ اے فلاں پیچھے ہٹ، اے فلاں آگے ہو پھر آگے بڑھتے اور تکبیر کہتے: سورۂ حجر میں اس کی وضاحت گذر چکی ہے۔

ابو مالک نے کہا: لوگ الگ الگ نماز پڑھا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد، فضل البكاء من خشية الله، جلد 2، صفحہ 55۔ ایضاً، حدیث نمبر 2234، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوة، الامر بالسكون في الصلوة، جلد 1، صفحہ 181
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 72

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو صفیں بنانے کا حکم دیا۔ شعبی نے کہا: جبریل امین یا ایک فرشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: آپ رات کے دو تہائی اس کا نصف اور اسکا ایک تہائی قیام کرتے ہیں فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں آسمان میں کوئی فرشتہ فارغ نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ہم ہوا میں اپنے پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں ہم انتظار کرتے ہیں کہ ہمیں کیا حکم دیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم عرش کے اردگرد صفیں بنائے ہوئے ہوتے ہیں

وانا لنحن المسبحون اور ہم نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرک اس کی طرف جو بات منسوب کرتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پاکی بیان کرتے ہیں (1) مراد یہ ہے وہ خبر دیتے ہیں کہ وہ تسبیح اور نماز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں نہ فرشتے معبود ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کا مشرکین کے لیے قول ہے، یعنی ہمارا اور تمہارا آخرت میں معین مقام ہے اور وہ مقام حساب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم میں سے کچھ وہ ہیں جن کے لئے مقام خوف ہے اور ہم میں سے کچھ وہ ہیں جن کے لئے مقام رجا ہے اور ہم میں سے کچھ وہ ہیں جن کے لئے مقام اخلاص ہے اور ہم میں سے کچھ وہ ہیں جن کے لئے مقام شکر ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ کہتا ہوں یہ ملائکہ کے قول وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ کی طرف راجع ہے۔ واللہ اعلم

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور وہ (بعثت نبوی سے پہلے) کہا کرتے تھے: اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے تو ہم اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے پس (جب نصیحت آئی تو اسے ماننے سے) انکار کر دیا وہ عنقریب اپنا انجام جان لیں گے''۔

مشرکین نے جو باتیں کیں ان کی خبر دینے کی طرف رجوع کیا یعنی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل انہیں جہالت کے ساتھ عار دلائی جاتی تو مشرکین مکہ کہتے: لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ یعنی وہ کہتے اگر ہماری طرف کوئی نبی مبعوث کیا جاتا جو شرعی احکام کی وضاحت کرتا تو ہم اس کی اتباع کرتے جب ان کو مخفف کیا تو وہ فعل پر داخل ہوا اور اسے لام لازم ہو گیا تا کہ نفی اور ایجاب میں فرق ہو۔ کوفی کہتے ہیں ان، ما کے معنی میں ہے اور لام، الا کی معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہمارے پاس انبیاء کی کتب میں سے ایک کتاب ہوتی تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہوتے یعنی ہمارے پاس ذکر آتا جس طرح پہلے لوگوں کے پاس ذکر آیا ہے تو عبادت کو اللہ کے لئے خالص کرتے، تو انہوں نے ذکر کا انکار کیا۔ فراء حذف کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 73

صورت میں تقدیر کلام کرتے ہیں یعنی حضرت محمد ﷺ ذکر لائے تو انہوں نے انکار کر دیا ان پر تعجب کا اظہار ہے یعنی ان کے پاس نبی آیا اور ان پر کتاب نازل کی گئی۔ اس میں اس چیز کا بیان ہے جس کے وہ محتاج تھے پس انہوں نے کفر کیا اور جو بات کہی تھی اسکو پورا نہ کیا۔

زجاج نے کہا: وہ اپنے کفر کا انجام جان لیں گے۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی۔ اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے، پس آپ رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر کے لئے اور ملاحظہ فرماتے رہیے ان کے حالات کو وہ خود بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے کیا وہ ہمارے عذاب کے اترنے کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ پس جب وہ اترے گا ان کے آنگن میں تو وہ صبح بڑی خوفناک ہوگی جنہیں ڈرایا جاتا تھا۔ اور رخ انور پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر کے لئے اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھتے رہیے۔ وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے''۔

فراء نے بالسعادة کا لفظ مقدر مانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ (المجادلہ: 21) حضرت حسن بصری نے کہا: صاحب شریعت کو کبھی بھی قتل نہیں کیا گیا حجت اور غلبہ کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے آیت میں الغالبون کا لفظ ذکر ہوا یہ جند کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ہے۔ اگر لفظ کا اعتبار ہوتا تو جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿۱۱﴾ (ص) شیبانی نے کہا: یہاں جمع کا صیغہ آیا ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے۔

آپ ان سے موت کے وقت تک اعراض کریں۔ قتادہ نے حِيْنٍ کا معنی موت کیا ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اس وقت تک ان سے اعراض کریں جتنا عرصہ انہیں مہلت دی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد غزوہ بدر کے موقع پر قتل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت، آیت سیف سے منسوخ ہے۔

قتادہ نے کہا: وہ عنقریب سب کچھ دیکھ لیں گے جب انہیں دیکھنا کچھ نفع نہ دے گا عسیٰ (2) جب اللہ تعالیٰ کی جانب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 73

2۔ کتابت میں عسیٰ ہے، لیکن ہے سوف، کیونکہ متن میں عسیٰ کی بجائے سوف کا لفظ ہے۔

سے ہو تو یہ وجوب کے لیے آتا ہے۔ ابصار کے ساتھ اسے تعبیر کیا گیا تا کہ امر کی تقریب کا اظہار ہو یعنی وہ قریب ہی دیکھ لیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے قیامت کے روز وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔

وہ جھٹلانے کی وجہ سے یہ کہا کرتے تھے متی هذا العذاب یہ عذاب کب ہوگا یعنی تم عذاب کے بارے میں جلدی نہ کرو وہ ضرور وقوع پذیر ہوگا۔

جب عذاب ان کے آنگن میں اترے گا۔ زجاج نے کہا: ان لوگوں کا عذاب قتل کی صورت میں تھا۔ بِسَاحَتِهِمْ کا معنی ہے ان کے گھر میں۔ سدی اور دوسرے علماء نے کہا: الساحة اور السحسة سے مراد گھر کا وسیع آنگن ہے۔ فراء نے کہا: ان پر عذاب برابر طور پر نازل ہوا۔

جن لوگوں کو عذاب سے ڈرایا گیا تھا ان کی صبح کتنی بری ہوئی۔ اس میں اضمار ہے یعنی فساء الصباح صباحهم۔ صباح کا خصوصاً ذکر ہوا ہے ان پر عذاب اسی وقت آیا تھا اس معنی میں وہ حدیث ہے جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر آئے تو وہ لوگ اپنی اپنی کھیتیوں کی جانب جا رہے تھے ان کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں انہوں نے کہا: محمد اور بڑا لشکر اور وہ اپنے اپنے قلعوں کی طرف لوٹ گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الله اکبر خربت خیبر اذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرین(1) اللہ اکبر خیبر برباد ہو گیا جب ہم کسی قوم کے میدان میں اترتے ہیں تو ڈرائے لوگوں کی صبح کتنی بری ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں ساحہ کا معنی وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشاد میں مراد لیا ہے۔

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ اسے تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا اسی طرح وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ بھی تاکید کے لیے ہے۔

**سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾**

"پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان ناسزا باتوں سے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور سلامتی ہو سب رسولوں پر۔ اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان چیزوں سے پاکی زیادہ بیان کی ہے جو مشرکوں نے ان کی طرف منسوب کی تھیں رَبِّ الْعِزَّةِ یہ ربك سے بدل ہے مدح کے طور پر اسے نصب دینا بھی جائز ہے اور رفع پڑھنا بھی جائز ہے اس وقت یہ هو رب العزة کے معنی میں ہوگا۔

عَمَّا يَصِفُوْنَ یعنی بیوی اور بچے سے پاک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سبحان اللہ کے معنی کے بارے میں پوچھا گیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ خیبر، جلد 2، صفحہ 604

فرمایا: ''ہر برائی و عیب سے الله تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا''۔ سورۂ بقرۃ میں بحث گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ محمد بن سحنون سے رَبِّ الْعِزَّةِ کے معنی کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کس طرح جائز ہے جبکہ عزت تو صفات ذات میں سے ہے یہ کہنا جائز نہیں رب القدرۃ اسی طرح دوسری صفات ذات کی طرف رب کی وضاحت کرنا درست نہیں۔

محمد بن سحنون نے جواب دیا: العزۃ یہ صفت ذات بھی ہے اور صفت فعل بھی ہے صفت ذات جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان: فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا (فاطر: 10) اور صفت فعل جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: رَبِّ الْعِزَّةِ معنی ہوگا اس عزت کے رب جس عزت سے مخلوق باہم ایک دوسرے پر غلبہ چاہتی ہے پس یہ الله تعالیٰ کے خلق میں سے ہوئی۔

کہا: تفسیر میں آیا ہے یہاں عزت سے مراد فرشتے ہیں۔ کہا ہمارے بعض علماء نے کہا: جس نے بعزۃ الله کے الفاظ کے ساتھ قسم اٹھائی اگر اس نے عزت سے مراد وہ عزت لی جو اس کی صفت ہے اس نے قسم کو توڑا تو اس پر کفارہ ہوگا اگر اس نے اس معنی کا ارادہ کیا جو الله تعالیٰ نے بندوں کے درمیان عزت بنادی ہے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

ماوردی نے کہا: رَبِّ الْعِزَّةِ دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے: (1) مالك العزۃ (2) رب کل شیٔ متعزز۔ ہر عزت والی چیز کا رب خواہ وہ چیز بادشاہ ہو یا جبروت والی ہو۔ میں کہتا ہوں: دونوں صورتوں میں کوئی کفارہ نہیں ہوگا جب کوئی قسم اٹھانے والا قسم اٹھائے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سلام کہنے سے قبل یہ پڑھا کرتے تھے: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ الی آخر السورۃ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: میں نے شیخ، امام، محدث، حافظ ابو علی حسن بن محمد بن محمد بن عمروک بکری پر جزیرہ میں جو منصورہ کے سامنے تھا جو دیار مصر سے تعلق رکھتا ہے انہوں نے حرہ ام المؤید زینب بنت عبدالرحمٰن بن حسن شعری سے پہلی دفعہ نیشاپور میں سنا انہوں نے کہا ہمیں ابو محمد اسماعیل بن ابی بکر قاری نے بتایا کہا ہمیں ابو الحسن عبدالقادر بن محمد فارسی نے کہا ہمیں ابو سہل بشر بن احمد نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ابو داؤد بن حسین بیہقی نے بیان کیا ہے کہا ہمیں ابو زکریا یحییٰ بن یحییٰ بن عبدالتیمی نیشاپوری نے بیان کیا کہا ہمیں ہشیم نے انہوں نے کہا ابو ہارون عبدی سے انہوں نے کہا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہا میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز کے آخر میں یا جب آپ پھرتے تو یہ کہتے ہوئے سنا: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۚ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۔

ماوردی نے کہا: جسے یہ بات خوش کرے کہ اسے قیامت کے دن پورا پورا کیل دیا جائے تو جب وہ مجلس کے اختتام پر مجلس سے اٹھنے کا ارادہ کرے تو کہے (1): سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۚ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 74

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۲﴾ ثعلبی نے حضرت علی شیر خدا کے واسطہ سے اسے مرفوع روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ الْمُرْسَلِیْنَ سے مراد ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے توحید و رسالت کا پیغام پہنچایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم مجھ پر سلام کہو تو مرسلین پر بھی سلام کیا کرو بے شک میں رسولوں میں سے ایک رسول ہوں'' (1)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز ان کے لیے امن ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بشیر اور نذیر بنا کر جو بھیجا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر جو انعامات کیے ہیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرکوں کے ہلاک ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس کی دلیل فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۵﴾ (الانعام) ہے۔

میں کہتا ہوں: سب مراد ہے اور حمد عام ہے یَصِفُوْنَ کا معنی ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں تقدیر کلام یہ ہوگی عما یصفون من الکذب۔

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 137

# سورۂ ص

(آیاتہا ۸۸) (۳۸ سورۃ ص مکیۃ ۳۸) (رکوعاتہا ۵)

تمام کے قول میں یہ سورت مکی ہے اس کی چھیاسی آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اٹھاسی آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۝ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۝

''ص قسم ہے قرآن، سراپا نصیحت کی (دعوت محمدی حق ہے) لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں اندھے ہو گئے ہیں۔ بہت سی امتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا اس سے پہلے پس وہ فریاد کرنے لگے اور نہیں تھا یہ وقت بچ نکلنے کا''۔

عام قراءت دال کی جزم کے ساتھ وقف کی صورت میں ہے کیونکہ یہ حروف تہجی میں سے ایک ہے جس طرح الٓمٓ اور الٓمٓرٰ ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حضرت حسن بصری، ابن اسحاق اور نصر بن عاصم نے صادِ پڑھا ہے یعنی دال کے نیچے کسرہ ہے اور تنوین نہیں۔ اس کی قراءت کی وجہ سے دو مذہب ہیں: (1) یہ صَادَی یُصَادِی سے مشتق ہے جب یہ عارض کے معنی میں ہو اسی سے فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۝ (عبس) ہے یعنی تو اس کا سامنا کرتا ہے مصاداۃ کا معنی معارضہ ہے اسی سے ایک لفظ صدی ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو خالی جگہوں میں آواز کے مقابل ہوتی ہے اس کا معنی ہے قرآن کے مقابل ہو اپنے عمل کے ساتھ اور اس کے اوامر پر عمل کر اور اس کی نواہی سے رک جا۔

نحاس نے کہا: یہ مذہب حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے انہوں نے اس کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے ان کی قراءت صحیح روایت ہے ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے اس کی تلاوت کیجئے اور اس کی قراءت کا سامنا کیجئے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ دال اجتماع ساکنین کی وجہ سے مکسور ہے عیسیٰ بن عمر نے صادَ یعنی دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کی مثل قاف اور نون ہے اس کا آخر مفتوح ہے اس بارے میں بھی تین مذہب ہیں: (1) یہ اُتْلُ کے معنی میں ہو (2) فتحہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہو اور فتحہ کو اتباع کی وجہ سے اختیار کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حرکات میں سے خفیف ترین حرکت ہے (3) یہ قسم کی بنا پر حذف ہے اور فعل قسم موجود نہیں جس طرح تیرا یہ قول ہے: اللہ لأفعلن ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اغراء کی وجہ سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخلوقات کے دلوں کو شکار کیا اور انہیں مائل کیا یہاں تک کہ وہ آپ پر ایمان لے آئے۔

ابن ابی اسحاق نے صادٍ پڑھا ہے یعنی دال مکسور ہے اور اس پر تنوین ہے اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حرف قسم کے

حذف کی وجہ سے مجرور ہے۔ یہ قول بعید ہے اگر چہ سیبویہ نے اس کی مثل کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے ان اصوات کے مشابہ قرار دیا گیا ہو جو غیر منصرف ہیں ہارون اعور اور محمد بن سمیقع نے اسے صادُ، قافُ اور نونُ پڑھا ہے کیونکہ یہ اکثر مبنی ہوتا ہے جس طرح منذ، قط، قبل، بعد۔

صٓ کو جب تو سورت کا نام بنائے تو یہ منصرف نہ ہوگا جس طرح جب تو کسی مؤنث کا نام اسم مذکر سے رکھے تو وہ منصرف نہیں ہوتا اگر چہ اس کے حروف قلیل ہی کیوں نہ ہوں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت جابر بن عبداللہ سے صٓ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا: نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صٓ کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: صٓ مکہ مکرمہ میں ایک سمندر تھا اسی پر رحمٰن کا عرش تھا جب رات اور دن نہیں تھا۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا: صٓ سے مراد وہ سمندر ہے جس کے ذریعے دو نفخوں کے درمیان اللہ تعالیٰ مخلوقات کو زندہ کرے گا۔

ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: صٓ ایک قسم ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قسم اٹھائی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے؛ یہ سدی نے کہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

محمد بن کعب نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کی چابی ہے جو صمد، صانع المصنوعات اور صادق الوعد ہیں۔ قتادہ نے کہا: یہ رحمٰن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے(1)۔ مجاہد نے کہا: یہ سورت کا آغاز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان چیزوں میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ واؤ کی وجہ سے یہ اسم مجرور ہے واؤ، باء کا بدل ہے۔ قرآن کی قسم اٹھائی مقصد اس کی عظمت شان پر آگاہی تھی کیونکہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے یہ سینوں میں موجود ہر مرض کی شفا ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔

ذِی الذِّكْرِ ۝ صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے جس کی علامت یاء ہے یہ ایسا اسم ہے جس میں حرف علت ہے اس میں اصل ذَوَی ہے جو فعل کا وزن ہے۔ حضرت ابن عباس اور مقاتل نے کہا: ذِی الذِّكْرِ کا معنی ہے ذی البیان۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے ذی الشرف یعنی جو اس پر ایمان لایا وہ اس کے لیے دارین میں شرف کا باعث ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ (الانبیاء: 10) اس آیت میں ذِكْرُكُمْ سے مراد تمہارے لیے شرف ہے۔ قرآن بذات خود شریف ہے کیونکہ یہ ایک معجزہ ہے اور ان چیزوں پر مشتمل ہے جس پر غیر مشتمل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذِی الذِّكْرِ سے مراد ہے اس میں اس چیز کا ذکر ہے امور دین میں سے جس چیز کے وہ محتاج ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذِی الذِّكْرِ سے مراد ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی عظمت کا ذکر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ موعظت اور ذکر والا ہے جواب قسم محذوف ہے۔ کئی وجوہ سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب قسم صٓ ہے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 75

کیونکہ اس کا معنی ہے حق پس یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَالْقُرْاٰنِ کا جواب ہے جس طرح تو کہتا ہے: حقا واللہ، نزل واللہ، وحب واللہ۔ اس صورت میں وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ پر عطف کرنا بہت اچھا ہے اور فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ پر وقف تام ہوگا؛ یہ ابن انباری کا قول ہے اور ثعلبی نے یہی معنی فراء سے نقل کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ۝ ہوگا کیونکہ بل سابقہ امر کی نفی اور اس کے غیر کا اثبات ہے، یہ قتبی نے کہا گویا یوں کلام کی وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ۝ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ۝ یعنی وہ حق قبول کرنے اور حضرت محمد ﷺ سے دشمنی میں اندھے ہوگئے ہیں یا وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو کہ تو جادوگر، جھوٹا ہے کیونکہ وہ آپ کی سچائی اور امانت کو پہچانتے ہیں بلکہ وہ حق کو قبول کرنے سے تکبر کر رہے ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ۝ بَلْ عَجِبُوْۤا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا جواب كَمْ اَهْلَكْنَا ہے گویا کلام یوں ہوگی والقرآن لکم اھلکنا جب کم کو موخر کیا تو لام کو حذف کر دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا۝ (الشمس) پھر فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ (الشمس: 9) اصل میں لقد افلح تھا۔

مہدوی نے کہا: یہ فراء کا مذہب ہے۔ ابن انباری نے کہا: اس توجیہ کی بنا پر فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ پر وقف مکمل نہ ہوگا۔ اخفش نے کہا: جواب قسم اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ۝ ہے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝ (الشعراء) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ۝ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ۝ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ (الطارق) ابن انباری نے کہا: یہ قبیح ہے کیونکہ دونوں کے درمیان کلام طویل ہوگئی ہے اور آیات وقصص بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ کسائی نے کہا: جواب قسم اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ۝۔

ابن انباری نے کہا: یہ پہلے سے بھی زیادہ قبیح ہے کیونکہ کلام قسم اور جواب قسم میں بہت طویل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا جواب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ۝ ہے۔ قتادہ نے کہا: جواب محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ، لتبعثن ہے۔

فِیْ عِزَّةٍ بلکہ کافر تکبر میں مبتلا ہیں اور حق کو قبول کرنے سے رکے ہوئے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (البقرۃ: 206) عربوں کے ہاں عزت سے مراد غلبہ اور قہر ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: عَزَّہٗ یعنی غالب ہوا اور مال سلب کرلیا اسی معنی میں وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ۝ ہے یعنی وہ مجھ پر غالب آگیا جریر نے کہا۔

یَعُزُّ عَلَی الطریق بِمَنْکِبیه

وہ اونٹ اپنے دونوں کندھوں کے ساتھ راستے پر غالب آجاتا ہے۔

شِقَاقٍ یعنی اختلاف اور جدائی کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ یہ شق سے ماخوذ ہے گویا یہ ایک حصہ میں ہیں اور وہ دوسرے حصہ میں ہیں اور سورۂ بقرۃ میں اس کے بارے میں گفتگو مفصل گزر چکی ہے۔

قَرْنٍ سے مراد قوم ہے جو ان سے زیادہ طاقتور تھے کم کثرت کا معنی دے رہا ہے۔ انہوں نے مدد چاہتے ہوئے اور توبہ

کرتے ہوئے ندا کی۔ ندا کا اصل معنی آواز کا بلند کرنا ہے اس معنی میں حدیث ہے أَلْقِهِ علی بلالٍ فإنّه أندیٰ منك صوتا بلال پر یہ کلمات پیش کرو کیونکہ اس کی آواز تجھ سے بلند ہے☆۔

وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ حضرت حسن بصری نے کہا: انہوں نے توبہ کے ساتھ آواز کو بلند کیا جبکہ یہ توبہ کا وقت نہ تھا اور نہ ہی یہ وہ وقت تھا جب عمل نفع دے۔ نحاس نے کہا: یہ حضرت حسن بصری کی جانب سے وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ کی تفسیر ہے جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے اس نے ابو اسحاق سے وہ تمیمی سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ کا معنی ہے یہ کوئی بھاگنے کا وقت نہیں۔ کہا: تمام قوم روک دی گئی۔ کلبی نے کہا: جب وہ جنگ کرتے اور بے بس ہو جاتے تو وہ ایک دوسرے کو کہتے مَنَاصٍ یعنی تم پر بھاگ جانا لازم ہے جب ان پر عذاب آیا تو انہوں نے کہا: بھاگ جاؤ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ۔ قشیری نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر تقدیر کلام یہ ہوگی فنادوا مناص کیونکہ باقی کلام فنادوا پر دلالت کرتی تھی اسی لیے اسے حذف کر دیا گیا یعنی جو تم آوازیں لگا رہے ہو یہ اس کا وقت نہیں۔ اس میں ایک قسم کا استہزاء ہے کیونکہ یہ کہنا بعید از قیاس ہے کہ سابقہ قوموں میں سے جو بھی ہلاک ہوا وہ اضطرار کے وقت یہ کہتا ہو۔ مناص ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ کا معنی یہ ہو یعنی کوئی چھٹکارے کی صورت نہیں اس کو نصب اس لیے دی گئی ہے کیونکہ اس پر لا واقع ہے۔

قشیری نے کہا: اس میں اعتراض کی گنجائش موجود ہے کیونکہ اس صورت میں وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ میں واؤ کا کوئی معنی نہیں رہتا۔ جرجانی نے کہا: معنی ہے انہوں نے اس گھڑی کی ندا کی جس ساعت کوئی نجات نہیں جب لا کو مقدم کیا اور حین کو موخر کیا تو اس نے واؤ کا تقاضا کیا جس طرح حال تقاضا کرتا ہے جب اسے مبتدا اور خبر بنا دیا جائے جس طرح تیرا یہ قول ہے: جاء زید راکبا۔ جب تو اسے مبتدا اور خبر بنا دے گا تو یہ واؤ کا تقاضا کرے گا جس طرح جاءنی زید وھو راکب ہے حِيْنَ یہ فَنَادَوْا کی ظرف ہے مناص یہ پیچھے ہٹنے، بھاگ جانے اور چھٹکارا پانے کے معنی میں ہے یعنی انہوں نے اس وقت نجات پانے کے لیے ندا کی جس وقت میں ان کے لیے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ فراء نے کہا:

أمِنْ ذکر لیلی إذ نأتك تَنُوصُ (1)

کیا لیلی کو یاد کر کے جب وہ تجھ سے دور ہو گئی تو اس کی طرف آگے بڑھتا ہے کہا جاتا ہے: ناص عن قرنه یَنُوص نَوصاً ومَناصاً یعنی بھاگ کھڑا ہوا۔ نحاس نے کہا: کہا جاتا ہے ناص ینوص جب وہ آگے بڑھے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل کی بنا پر یہ اضداد میں سے ہے۔ نوص سے مراد وحشی گدھے ہیں استناص یعنی پیچھے ہٹ گیا۔ نحویوں نے وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ اور اس پر وقف کرنے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے کتاب القرأت میں اس کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو کی ہے۔ سوائے چند باتوں کے جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے وہ سب مردود ہے۔ سیبویہ نے کہا: لات یہ مشابہ بلیس ہے اس میں اسم ضمیر ہے تقدیر کلام یوں ہے لیست أحیاننا حین مناص۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 77

☆ سنن ابی داؤد، باب کیف الأذان، حدیث نمبر 421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکایت بیان کی گئی ہے کہ عربوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے ساتھ اسم کو رفع دیتے ہیں اور کہتے ہیں وَّلَاتَ حِیْنُ مَنَاصٍ۔ یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ رفع قلیل ہے اور خبر محذوف ہے جس طرح کہ نصب اسم میں محذوف تھا یعنی تقدیر کلام یوں تھی ولات حین مناص لنا۔ سیبویہ اور فراء کے نزدیک ولات کی تاء پر عطف ہوگا پھر حین مناص سے تو نئی کلام شروع کرے گا؛ یہ ابن کیسان اور زجاج کا قول ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: قول اسی طرح ہے جس طرح سیبویہ نے کہا کیونکہ اس نے اسے لیس کے مشابہ قرار دیا تو جس طرح لیست کہا جاتا ہے اسی طرح لات کہا جاتا ہے۔ کسائی کے نزدیک اس پر وقف ھاء پر ہوگا یعنی ولاہ یہی مبرد بن محمد بن یزید کا قول ہے علی بن سلیمان نے اس سے حکایت بیان کی کہ اس میں دلیل یہ ہے کہ اس پر ھاء کلمہ کی تانیث کے لیے داخل ہوئی ہے جس طرح ثمہ اور ربہ کہا جاتا ہے۔ قشیری نے کہا: بعض اوقات ثمت، ثمہ کے معنی میں کہا جاتا ہے اور ربت، ربہ کے معنی میں کہا جاتا ہے گویا انہوں نے لا میں ھاء کا اضافہ کر دیا اور انہوں نے لاہ کہا انہوں نے ثم میں ثمہ کہا ہے جب وصل ہوا تو یہ تاء ہو گئی۔

ثعلبی نے کہا: اہل لغت نے کہا وَّلَاتَ حِیْنَ دونوں مفتوح ہیں گویا یہ دونوں ایک کلمہ ہیں بے شک یہ اصل میں لا ہے جس میں تاء کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس طرح رب اور ربت، ثم اور ثمت ابوزبید طائی نے کہا:

طَلَبُوا صُلْحَنا ولَاتَ أَوَانٍ فأَجَبْنَا أَنْ لیس حِینَ بقَاءِ

انہوں نے ہماری صلح کا مطالبہ کیا جبکہ وہ اس کا وقت نہ تھا ہم نے جواب دیا کہ یہ بقاء کا وقت نہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تذكَّر حُبَّ ليلى لَاتَ حِينا وأمسى الشَّيْبُ قد قَطَعَ الْقَرِينا

اس نے لیلی کی محبت کو یاد کیا جبکہ وہ اس کا وقت نہ تھا بڑھاپے نے دوستی کو قطع کر دیا۔

کچھ عرب اس لفظ کے ساتھ مابعد اسم کو جر دیتے ہیں؛ فراء نے یہ شعر پڑھا:

فَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مَشْمُولَةً وَلَتَنْدَمَنَّ ولَاتَ ساعةِ مَنْدَمِ

تو جمع شدہ مخلوقات کو پہچان لے گا اور تو شرمندہ ہوگا جبکہ وہ شرمندگی کا وقت نہیں۔

کسائی، فراء، خلیل، سیبویہ اور اخفش اس طرف گئے ہیں وَّلَاتَ حِیْنَ میں تاء، حین سے منقطع ہے وہ کہتے ہیں: اس کا معنی لیست ہے۔ مصاحف جدد اور عتق میں اسی طرح ہے یعنی حین سے تاء کو الگ کر دیا گیا ہے، ابوعبیدہ معمر بن مثنی اسی طرف گیا کہا ہے۔

ابوعبید قاسم بن سلام نے کہا: میرے نزدیک ولا پر وقف ہے اور ابتداتحین مناص سے ہے اس صورت میں تاء حین کے ساتھ ہوگی۔ بعض نے کہا: لات پھر وہ کلام کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے: حین مناص مہدوی نے کہا: ابوعبید نے ذکر کیا ہے کہ مصحف میں تاء حین کے ساتھ متصل ہے جبکہ نحویوں کے نزدیک یہ غلط ہے اور مفسرین کے قول کے خلاف ہے، ابوعبید کی حجت یہ ہے کہ اس نے کہا: ہم عربوں کو نہیں پاتے کہ وہ اس تاء کو زائد کرتے ہوں مگر وہ حین، اوان اور الان میں زائد کرتے

ہیں؛ اور ابو وجزہ سعدی کا شعر ذکر کیا:

العاطِفُون تَحِينَ ما مِنْ عاطِفٍ والمُطْعِمُون زَمانَ أَيْنَ المُطْعِمُ

وہ اس وقت مہربانی کرتے ہیں جب مہربانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ زمانے کو کھلاتے ہیں جب کھلانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ابوزبید طائی نے شعر ذکر کیا:

طلبوا صلحنا ولاتأوانٍ فأجبنا أن ليس حين بقاءِ(1)

انہوں نے ہماری صلح کو طلب کیا جبکہ وہ صلح کا وقت نہ تھا تو ہم نے جواب دیا اب بقاء کا وقت نہیں۔

یہاں اوان میں تاء کو داخل کیا۔ ابو عبید نے کہا: الان میں تاء کو داخل کرنے کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ان سے ایک آدمی نے حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں پوچھا تھا تو حضرت ابن عمر نے حضرت عثمان کے مناقب کا ذکر کیا پھر فرمایا: اذهب بها تَلَان مَعك۔ اسے لے جا اب وہ تیرے ساتھ ہیں۔ اس قول میں تلان محل استدلال ہے۔ اسی طرح شاعر نے کہا:

نَوِّلِي قبل نأيِ دَارِي جُمانا و صِلِينا كما زَعَمْتِ تَلَانَا

ابو عبید نے کہا: اس سب بحث کے باوجود میں نے اس مصحف میں نظر کی جسے امام ''مصحف عثمان'' کہا جاتا ہے تو میں نے پایا کہ تاء حین کے ساتھ متصل ہے وہاں تحین لکھا ہوا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: جہاں تک پہلے شعر کا تعلق ہے جو اس نے ابو وجزہ کا ذکر کیا ہے علماء لغت نے اسے چار طریقوں سے روایت کیا ہے سب اس کے برعکس ہیں جو اس نے کہا اس میں دو تقدیریں ہیں ابو العباس محمد بن یزید نے اسے روایت کیا ہے العاطفون ولات مامن عاطف۔ دوسری روایت العاطفون ولات حين تعاطف۔ تیسری روایت جسے ابن کیسان نے روایت کیا ہے العاطفونة حين مامن عاطف۔ اس نے اسے وقف میں هاء اور درمیان کلام میں تاء بنا دیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ حرکت کے بیان کے لیے ہے اور اسے ہاء تانیث کے مشابہ قرار دیا ہے۔ چوتھی روایت العاطفونه حين مامن عاطف۔ اس روایت میں دو تقدیریں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے اور وہی اسماعیل بن اسحاق کا مذہب ہے کہ ھاء نصب کے محل میں ہے جس طرح تم کہتے ہو الضاربون زیدا جب تو ضمیر ذکر کرے گا تو تو کہے گا الضاربوه سیبویہ نے شعر میں الضاربونه جائز قرار دیا ہے۔ اسماعیل، سیبویہ کے مذہب کے موافق تانیث کے ساتھ لایا ہے جس طرح اس نے اس کی مثل میں اجازت دی ہے۔

دوسری تقدیر یہ ہے کہ العاطفونه میں هاء حرکت کو بیان کرنے کے لیے ہے جس طرح تو کہتا ہے: مررنا المسلمونه یہ وقف کی صورت میں ہے پھر وصل میں بھی اسے اسی طرح رکھا گیا ہے جس طرح وقف میں رکھا گیا تھا جس طرح اہل مدینہ نے پڑھا: أَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾ (الحاقۃ)

جہاں تک دوسرے شعر کا تعلق ہے اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ ولات أوان پر وقف ہے مگر اس میں ایک مشکل ہی

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 71

ہے کیونکہ اس میں ولات أوان مجرور مروی ہے، جبکہ لات کے بعد جو چیز واقع ہے وہ مرفوع یا منصوب ہے اگر چہ عیسیٰ بن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ولات حین مناص پڑھا ہے یعنی لات کی تاء اور حین کی نون پر کسرہ پڑھا ہے جبکہ ان سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے ولات حین مناص پڑھا ہے لات کو مبنی بر کسرہ اور حین کو نصب دی گئی جہاں تک ولات اوان کا تعلق ہے اس میں دو تقدیریں ہیں۔

اخفش نے کہا: اس میں لفظ مضمر ہے یعنی کلام یوں تھی ولات حین اوان۔ نحاس نے کہا: اس قول میں واضح خطا موجود ہے ابو اسحاق سے دوسری تقدیر مروی ہے ولات اوانتا مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا تو ضروری ہو گیا کہ اس کو اعراب نہ دیا جائے اور اس پر کسرہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہے۔ محمد بن یزید نے ولات اوان رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ جہاں تک تیسرے شعر کا تعلق ہے یہ دور اسلام کے شاعر کا شعر ہے جس کے قائل کا کوئی پتہ نہیں اس کے ساتھ دلیل قائم کرنا صحیح نہیں کہ محمد بن یزید نے اسے روایت کیا ہے کما زعمت انت الان اور دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے کما زعمت انت الان اس نے انت سے ہمزہ اور نون کو حذف کر دیا ہے۔

جہاں تک ان کا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال ہے جب آپ نے اس آدمی کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب کا ذکر کیا تو اسے کہا اذھب بھا تلان الی اصحابك تو اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ محدث اس حدیث کو بالمعنی روایت کر رہا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ مجاہد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس حدیث کو روایت کرتا ہے اور اس میں ہے اذھب فاجھد جھدك ایک اور نے اسے روایت کیا ہے اذھب بھا الان معك جہاں تک ان کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے امام میں تحین پایا ہے تو اس میں بھی ان کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ امام کا معنی ہے کہ وہ مصاحف کا امام ہے اگر وہ مصاحف کے خلاف ہوگا تو وہ مصاحف کا امام تو نہ ہوا تمام مصاحف میں ولات ہے اگر اس میں صرف یہی استدلال ہوتا تو وہ کافی ہوتا مناص کی جمع منادص ہے۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۴ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۵

”اور وہ اس پر حیران تھے کہ آیا ہے ان کے پاس ایک ڈرانے والا ان میں سے اور کفار کہنے لگے کہ یہ شخص ساحر ہے کذاب ہے، کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بے شک یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے“۔

**اَنْ جَآءَهُمْ** میں اَنْ محل نصب میں ہے اس کا معنی ہے من ان جاء ھم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا تعلق **فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ** کے ساتھ ہے تقدیر کلام یہ بنے گی فی عزۃ وشقاق وعجبوا اور کم اھلکنا جملہ معترضہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہیں بلکہ یہاں سے کلام کا آغاز ہے یعنی ان کی جہالت میں سے یہ بات ہے کہ انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان کے پاس انہیں میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔

کافروں نے کہا: یہ جادوگر ہے یہ آراستہ کلام لاتا ہے جس کے ساتھ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے جادو کے ذریعے والد اور اس کے بچے، خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی پیدا کرتا ہے کَذَّابٌ یعنی دعویٰ نبوت میں جھوٹا ہے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا یہ دونوں مفعول ہیں یعنی اس نے بہت سے معبودوں کو ایک معبود بنا دیا ہے بے شک یہ تو عجیب وغریب چیز ہے سلمی نے عُجَّاب پڑھا ہے عُجَاب، عُجّاب اور عجب سب کا معنی ایک ہی ہے۔ خلیل نے عجیب اور عجاب میں فرق کیا ہے کہا عجیب، عجب ہی ہے عجاب عجب کی حد کو تجاوز کرتا ہے۔ طویل جس میں طول ہو طوال اسے کہتے ہیں جس نے طول کی حد کو تجاوز کیا ہو۔

جوہری نے کہا: عجیب اس امر کو کہتے ہیں جس سے تعجب کا اظہار کیا جائے اسی طرح عجاب ضمہ کے ساتھ ہے عجاب جب شد کے ساتھ ہو تو وہ اس سے بڑھ کر ہے اسی طرح أعجوبه ہے۔ مقاتل نے کہا: عجاب یہ از دشنوء کی لغت ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابو طالب مریض ہوئے (1) تو قریش ان کے پاس آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے جبکہ ابو طالب کے سر کی طرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی ابو جہل اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جگہ سے روکے قریش نے ابو طالب کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت کی، ابو طالب نے کہا: اے بھتیجے! تو اپنی قوم سے کیا چاہتا ہے؟ فرمایا: ''اے میرے چچا جان! میں ان سے ایک کلمہ کہنے کی خواہش کرتا ہوں جس کے باعث تمام عرب ان کی اطاعت کریں گے اور انہیں جزیہ دیں گے''۔ پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قریش نے کہا: کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک معبود بنا دیا تو ان کے بارے میں قرآن نازل ہوا صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۞ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۞ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۞ وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۞ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۞ وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۞ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۞ امام ترمذی نے بالمعنی روایت کیا ہے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے تو قریش پر ان کا اسلام بڑا شاق گذرا تو قریش ابو طالب کی خدمت میں جمع ہوئے کہا: ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان فیصلہ کر دیجئے۔ ابو طالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا اور کہا: اے بھتیجے! یہ تیری قوم مجھ سے انصاف کا تقاضا کرتی ہے اپنی قوم پر ظلم نہ کر۔'' پوچھا وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں'' انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اور ہمارے معبودوں کا ذکر چھوڑ دو ہم تجھے اور تیرے معبود کو چھوڑتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم مجھے ایک کلمہ دیتے ہو جس کے باعث تم عربوں کے مالک بن جاؤ گے اور عجمی تمہاری اطاعت کریں گے'' ابو جہل نے کہا: تیرا بھلا ہو ہم تجھے وہ کلمہ اور دس اس جیسے اور کلمات دینے کو تیار ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ ص، جلد 2، صفحہ 155۔ ایضاً، حدیث نمبر 3156، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارشاد فرمایا کہو: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وہ اس سے بدک گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: کیا اس نے تمام خداؤں کو ایک خدا بنا دیا ہے اس تمام مخلوق کو ایک خدا کیسے پورا ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ تک آیات کو نازل فرمایا۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۚ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۚ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۚ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۫ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۝ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝

”اور تیزی سے چل دیے قوم کے سردار رسول کے پاس سے (اور قوم سے کہا) یہاں سے نکلو اور جمے رہو اپنے بتوں پر بے شک اس میں اس کا کوئی (ذاتی) مدعا ہے۔ ہم نے تو ایسی بات آخری ملت (نصرانیت) میں بھی نہیں سنی یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے۔ کیا نازل کیا گیا ہے اس پر الذکر (قرآن) ہمارے درمیان میں سے، بلکہ یہ کفار شک میں مبتلا ہیں میرے ذکر کے متعلق بلکہ انہوں نے ابھی نہیں چکھا میرے عذاب کا مزا۔ کیا ان کے قبضہ میں ہیں خزانے آپ کے رب کی رحمت کے جو عزت والا ہے بے حساب عطا کرنے والا ہے۔ کیا ان کے لیے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، پس چاہیے کہ چڑھ جائیں (آسمانوں پر) اس کی راہوں سے۔ (درحقیقت) کفار کے لشکروں میں سے یہ ایک چھوٹا سا لشکر ہے جسے وہاں بدر میں شکست دی جائے گی“۔

الْمَلَاُ کا معنی اشراف ہیں انْطَلَقَ کا معنی تیزی سے جانا ہے یعنی یہ کفار رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکلے وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے: جس طریقہ پر تم پہلے ہو اسی پر گامزن رہو اور اس کے دین میں داخل نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ابو طالب بن ہشام، شیبہ اور عتبہ جو ربیعہ بن عبد شمس کے بیٹے تھے امیہ بن خلف، عاص بن وائل اور ابو معیط تھے وہ ابو طالب کے پاس آئے تھے انہوں نے کہا: تو ہمارا سردار ہے اور ہمارے بارے میں بہتر انصاف کرنے والا ہے اپنے بھتیجے اور اس کے ساتھ جو بے وقوف لوگ ہیں ان کے ساتھ ہمارے بارے میں معاملات اپنے ہاتھ میں لیں انہوں نے ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیا اور ہمارے دین میں طعن کیا۔ ابو طالب نے نبی کریم ﷺ کو بلا بھیجا اور کہا: تیری قوم تجھے انصاف کی طرف دعوت دیتی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں انہیں ایک بات کی دعوت دیتا ہوں“۔ ابو جہل نے کہا: ایک کیا دس۔ فرمایا: تم کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک معبود بنا دیا ہے۔

اَنِ امْشُوْا میں ان محل نصب میں ہے معنی بان امشوا یعنی باء حرف جار محذوف ہے اور اس کے حذف کی وجہ سے محل

نصب میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: أن، ای کے معنی میں ہے یعنی امشوا، انطلق کی تفسیر ہے اس کا مطلب ہے یہ نہیں کہ انہوں نے یہ لفظ بولا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان میں سے معززین چلے اور انہوں نے عوام سے کہا: اَمْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ یعنی اپنے بتوں کی عبادت پر صبر کرو اِنَّ هٰذَا یعنی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں جس کے ساتھ اہل زمین کے بارے میں اس چیز کا ارادہ کیا گیا ہے کہ قوم سے نعمتوں کا زوال ہو اور جوان پر نازل ہوا ہے ان کو تبدیل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ کلمہ تخدیر ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کہتے ہیں اس کے ساتھ وہ ہم سے اطاعت کے طالب ہیں تاکہ وہ ہم پر غالب آجائیں اور ہم اس کے پیروکار بن جائیں تو اس طریقہ سے جو وہ چاہے اس پر حکم چلائے تو اس کی اطاعت کرنے سے بچو۔ مقاتل نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے اور ان کے ذریعے سے اسلام کو قوت و شوکت نصیب ہوئی تو یہ امر قریش پر شاق گذرا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر کے اسلام لانے سے اسلام کو ایسی قوت حاصل ہوئی ہے جس کا ارادہ کیا جا رہا تھا(1)۔

حضرت ابن عباس، قرظی، مقاتل، کلبی، اور سدی نے کہا: وہ ملة آخرة سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملت مراد لیتے ہیں یہ ملتوں میں سے آخری ملت ہے، نصاریٰ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ الٰہ بناتے ہیں۔ مجاہد اور قتادہ نے یہ بھی کہا: وہ قریش کی ملت مراد لیتے تھے(2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ہم نے یہ نہیں سنا تھا کہ یہ آخری زمانہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اہل کتاب سے یہ نہیں سنا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول حق ہیں۔

یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے کہ یہ جملہ کہا جاتا ہے: خلق واختلق یعنی اس نے نیا کام شروع کیا خلق اللہ الخلق اسی معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر مثال کے پیدا کیا۔

ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا یہ کلام استفہام انکاری ہے، ذکر سے یہاں مراد قرآن ہے یعنی انہوں نے آپ کو وحی کے ساتھ خاص کرنے کا انکار کیا مِّنْ ذِكْرِیْ سے مراد میری وحی ہے وہ قرآن ہے یعنی وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ ہمیشہ سے ان کے درمیان سچے رہے ہیں میں نے جو آپ پر نازل کیا ہے اس کے بارے میں انہوں نے شک کیا کہا: وہ میری جانب سے ہے یا میری جانب سے نہیں۔

اصل میں لمبی مہلت کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہوئے ہیں اگر شرک کی بنا پر میرا عذاب چکھ لیتے تو ان سے شک زائل ہو جاتا اور وہ یہ بات نہ کرتے لیکن اس وقت انہیں ایمان کوئی نفع نہ دے گا لما یہ لم کے معنی میں ہے اور ما زائدہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عَمَّا قَلِیْلٍ (المومنون: 40) اور فَبِمَا نَقْضِهِمْ (المائدہ: 13)

کیا ان کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان نعمتوں خصوصاً نبوت کو روک لیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کی ہے۔ ام کا لفظ کبھی تقریع کے معنی میں آتا ہے جب کلام ما قبل کے ساتھ متصل ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الٓمّٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ (السجدہ)

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 79
2۔ ایضاً

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ متصل ہے وَ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے رسول بنا کر مبعوث کرتا ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہیں یا زمین وآسمان کے خزانے ان کی ملکیت ہیں اگر وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں پس انہیں چاہیے آسمانوں کی طرف چڑھیں اور فرشتوں کو اس بات سے روک دیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئیں۔ یہ کہا جاتا ہے: رقی یرقی اور أرتقی یعنی وہ بلند ہو گئے رقی، یرقی اور رقیا یہ رمی یرمی اور رمیا کی طرح ہے یہ رقیۃ سے مشتق ہے ربیع بن انس نے کہا: اسباب بال سے باریک اور لوہے سے مضبوط ہیں لیکن وہ دکھائی نہیں دیتے۔ لغت میں سبب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو مطلوب تک پہنچانے والی ہو وہ رسی ہو یا کوئی اور چیز۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسباب سے مراد آسمان کے ابواب یا اسباب ہیں جن سے فرشتے اترتے ہیں؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ زہیر نے کہا:

لَوْرَامَ أسبابَ السماءِ بِسُلَّمِ

کاش وہ سیڑھی کے ذریعے آسمان اسباب کا قصد کرتا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسباب سے مراد آسمان ہیں یعنی انہیں چاہیے کہ وہ ایک ایک آسمان پر چڑھیں۔ سدی نے کہا: فی اسباب سے مراد فضل اور دین ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسباب سے مراد رسیاں ہیں (1) یعنی اگر وہ رسیاں اور سبب پائیں جن میں وہ آسمان کی طرف بلند ہوں تو وہ چڑھیں۔ یہ امر توبیخ اور تعجیز کے لیے ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے خلاف اپنے نبی کی مدد کا وعدہ کیا جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ یہاں ما زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ھم جند پس جند مبتدا محذوف کی خبر ہے مھزوم یعنی ذلیل اور رسوا ہونگے ان کی دلیل ختم ہو جائے گی کیونکہ وہ اس مرحلہ تک نہیں پہنچیں گے کہ وہ یہ کہیں یہ ہمارے لیے ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تھزمت القربۃ جب وہ مشکیزہ ٹوٹ جائے، ھزمت الجیش میں نے لشکر کو شکست دے دی کلام ماقبل کے ساتھ مربوط ہے یعنی وہ شکست خوردہ لشکر ہیں تو ان کا تکبر اور قبول حق سے رکنا تجھے غم میں نہ ڈالے بے شک میں ان کی جمعیتوں کو شکست دے دوں گا اور ان کی عزت کو سلب کر دوں گا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انس عطا کرتا ہے بدر کے روز آپ کے ساتھ ساتھ ایسا کیا بھی گیا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں شکست دے گا جبکہ وہ مکہ مکرمہ میں تھے تو اس کی تاویل بدر کے روز سامنے آئی هُنَالِكَ میں بدر کی طرف اشارہ ہے یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے اکٹھے ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: احزاب سے مراد وہ گروہ ہیں جو مدینہ طیبہ آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے برسر پیکار ہوئے۔ یہ بحث سورۂ احزاب میں گذر چکی ہے۔ احزاب کا معنی لشکر ہے جس طرح کہا جاتا ہے: جند من قبائل شتی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ احزاب سے مراد کفار کی گذشتہ قومیں ہیں یعنی یہ لشکر ان کے طریقہ پر ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ (البقرۃ:249) من سے مراد ہے وہ میرے دین اور مذہب پر ہے۔ فراء نے کہا: وہ مغلوب لشکر ہیں یعنی انہیں اس چیز سے روک دیا گیا ہے کہ وہ آسمان کی طرف بلند ہوں۔ قتبی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 79

نے کہا: یعنی وہ ان معبودوں کے شکست خوردہ لشکر ہیں وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے معبودان باطلہ سے کسی چیز کا مطالبہ کریں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانوں سے اپنے لیے کسی چیز کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور نہ ہی آسمانوں اور زمین سے کسی چیز کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ۭ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾

''جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور میخوں والے فرعون نے اور ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ نے، یہی وہ گروہ ہیں (جن کا ذکر پہلے گذر چکا)۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو ان پر لازم ہو گیا میرا عذاب''۔

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تعزیت اور آپ کی تسلی کے لیے کیا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یہ تیری قوم کے لوگ ہیں متقدمہ قوموں کے لشکر ہیں جنہوں نے اپنے انبیاء کے خلاف لشکر کشی کی وہ لوگ ان سے زیادہ طاقتور تھے پس انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قوم کو تانیث کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا (1) علماء عرب نے اس بارے میں دو قول نقل کیے ہیں:

(1) اس میں تذکیر و تانیث جائز ہے (2) یہ مذکر ہے اس کی تانیث جائز نہیں مگر اس صورت میں کہ معنی عشیرہ اور قبیلہ پر واقع ہو تو لفظ میں اس معنی کا حکم غالب ہو گا جو معنی مضمر ہے مقصود اس پر تنبیہ کرنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ (عبس) یہاں اسے ذکر نہیں کیا کیونکہ جب اس پر مضمر معنی مذکر تھا تو اسے مذکر ذکر کیا گیا اگرچہ لفظ تانیث کا تقاضا کرتا ہے۔

فرعون کی صفت ذُو الْاَوْتَادِ سے ذکر کی اس کی تاویل میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے مضبوط عمارتوں والا۔ ضحاک نے کہا: وہ بے شمار عمارتوں والا تھا اور عمارتوں کو اوتاد کہتے ہیں (2)۔ حضرت ابن عباس، قتادہ اور عطا سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے کیل، رسیاں اور کھیل کے میدان تھے جن پر اس کے لیے کھیلا جاتا تھا۔ ضحاک سے یہ بھی مروی ہے کہ قوت و پکڑ والا تھا۔ کلبی اور مقاتل نے کہا: وہ لوگوں کو کیلوں کے ذریعے عذاب دیا کرتا تھا جب وہ کسی پر ناراض ہوتا تو زمین پر چار کیل گاڑھ کے ان کے درمیان چت لٹا دیتا تھا اور اس پر بچھو اور سانپ چھوڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مر جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عذاب دیے جانے والے شخص کو چار ستونوں پر تان دیتا اس انسان کی ایک جانب ایک ستون کی طرف ہوتی جس میں لوہے کا ایک کیل گڑھا ہوتا اور اسے چھوڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مر جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذو الاوتاد سے مراد کثیر لشکروں والا ہے۔ جنود کو اوتاد کہا گیا ہے کیونکہ وہ اس امر کو قوی بناتا ہے جس طرح کیل گھر کو قوی بناتا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا: عرب کہتے ہیں: هم فی عزثابت الاوتاد وہ ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے دائمی اور قوی عزت ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ گھر بالوں کے خیمے ہوتے وہ میخوں کے ساتھ ہی مضبوط اور قوی ہوتے۔ اسود بن یعفر نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 80
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 81

ولقد غنوا فیها بأنعم عیشۃ فی ظل ملك ثابت الأوتاد(1)

وہ زندگی کی نعمتوں کے ساتھ اس میں مستغنی ہوئے ایسے ملک کے سایہ میں جو مضبوط ہے۔

اوتاد کی واحد وتد ہے یہ تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور وَتَد بھی اس میں ایک لغت ہے۔ اصمعی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے وَتَد واتد جس طرح یہ کہا جاتا ہے: شغل شاغل۔ کہا: بعض اوقات آدمی کو جذل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَصۡحٰبُ لۡـَٔیۡكَةِ سے مراد اصحاب غیضہ ہیں اس کا ذکر سورۂ شعراء میں گذر چکا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابن عامر نے اسے لیکہ ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے باقی قراء نے ہمزہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا ذکر بھی پہلے گذر چکا ہے۔

یہی لوگ قوت اور کثرت سے متصف تھے جس طرح تو کہتا ہے: فلان ھو الرجل، اِنۡ كُلٌّ یہاں ان، ما کے معنی میں ہے فَحَقَّ عِقَابِ یعنی اس جھٹلانے کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا یعقوب نے عذابی اور عقابی میں یاء کو دونوں حالتوں میں ثابت رکھا ہے اور باقی قراء نے اسے دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَقَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡكُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ۙ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ (غافر) ان امتوں کو احزاب کا نام دیا گیا۔

**وَمَا یَنۡظُرُ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنۡ فَوَاقٍ ۞ وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ ۞**

"اور نہیں انتظار کر رہے ہیں یہ کفار مکہ مگر ایک کڑک کا جن کے بعد کوئی مہلت نہیں ہوگی۔ وہ (مذاقاً) کہتے ہیں: اے ہمارے رب! جلدی دے دے ہمارے حصہ کا عذاب یوم حساب سے پہلے"۔

یہاں یَنۡظُرُ ینتظر کے معنی میں ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُنۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِكُمۡ (الحدید:13)

هٰۤؤُلَآءِ سے مراد کفار مکہ ہیں اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً سے مراد قیامت کا نفخہ ہے یعنی غزوہ بدر میں جو مصیبت انہیں پہنچی اس کے بعد وہ قیامت کے نفخہ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے زندہ لوگ اس وقت صرف صیحہ کا ہی انتظار کر رہے ہیں صیحہ سے مراد صور پھونکنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً تَاۡخُذُهُمۡ وَهُمۡ یَخِصِّمُوۡنَ ۞ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ تَوۡصِیَةً (یٰسٓ) یہ قیامت اور موت کے قریب ہونے کی خبر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس امت کے آخر کے کفار جو ان لوگوں کے طریقہ کو اپنائے ہوئے ہونگے وہ انتظار نہیں کرتے ہونگے مگر ایک صیحہ کا انتظار کر رہے ہونگے جو نفخہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: آسمان میں صیحہ نہیں ہوتا مگر اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر غضبناک ہوتا ہے۔

مَا لَهَا مِنۡ فَوَاقٍ ۞ جس کو لوٹایا نہیں جا سکے گا(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے یہ مروی ہے کہ اس کے لیے لوٹنا نہیں۔ قتادہ نے کہا: اس کے لیے واپس آنا نہیں ہوگا۔ سدی نے کہا: اس سے افاقہ کی سورت نہ ہوگی۔ حمزہ اور کسائی نے

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 81
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 85

اسے مالها من فُواق پڑھا ہے باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جوہری نے کہا: فَواق اور فُواق سے مراد دو دفعہ دو ہنے کے درمیان کا جو عرصہ ہوتا ہے کیونکہ جانور کو دوہا جاتا ہے پھر اسے تھوڑا ترک کیا جاتا ہے تا کہ بچہ دودھ پیے تا کہ جانور دودھ اتارے پھر اسے دوبارہ دوہا جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ماأقام عندہ إلا فواقا یعنی وہ گھڑی بھر اس کے پاس ٹھہرا۔ حدیث طیبہ میں ہے العیادۃ قدر فواق الناقۃ (1) عیادت اونٹنی دو ہنے کے وقت تک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَّا لَهَا مِنۡ فَوَاقٍ اسے فتحہ اور ضمہ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے یعنی اس کے واقع ہونے پر راحت اور افاقہ کی صورت نہ ہوگی۔ الفیقۃ اس دودھ کو کہتے ہیں جو دو دفعہ دو ہنے کے درمیان جمع ہو جاتا ہے واؤ یاء ہوگئی ہے کیونکہ اس کا ماقبل مکسور ہے۔ اعشی گائے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

حتّٰی إذافِیقَةٌ فی ضَرعِها اجتمعتْ جاءتْ لِتُرضِعَ شِقَّ النَّفْسِ لَوْرَضَعا

یہاں تک کہ اس کی کھیری میں دودھ جمع ہوتا وہ آئی تا کہ نفس کے حصہ کو دودھ پلائے۔

فیقة کی جمع فیق ہے پھر اس کی جمع افواق ہے جس طرح شبر کی جمع اشبار ہے پھر اس کی جمع افاویق ہوتی ہے؛ ابن ہمام سلوی نے کہا:

وذَمُّوالنا الدنیا وهُمْ یَرْضَعُونَها أَفَاوِیقَ حتّٰی مایدِرُّلها ثُعَلُ

وہ ہمارے سامنے دنیا کی مذمت کرتے ہیں جبکہ وہ خود اس کے جمع شدہ دودھ چوستے ہیں یہاں تک کہ ثعل اس کے لیے دودھ نہیں دیتا۔

افاویق اس پانی کو بھی کہتے ہیں جو بادل میں جمع ہو جاتا ہے وہ یکے بعد دیگرے بارش برساتا ہے أفاقت الفاقة إفاقة۔ اونٹنی کی کھیری میں دودھ جمع ہوگیا اس سے اسم فاعل مفیق اور مفیقه ہے۔ ابوعمرو سے مروی ہے کہ اس کی جمع مفاویق ہے فراء ابوعبیدہ اور دوسرے علماء نے کہا: من فواق ہے یعنی فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کا معنی راحت ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا معنی یہ طویل ہوگا جو ختم نہیں ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا جبکہ ہم آپ کے صحابہ کے ایک طائفہ میں تھے اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو نفخہ اولی کا حکم دے گا ارشاد فرمائے گا: نفخہ فزع پھونکو تو تمام آسمان و زمین والے خوف زدہ ہو جائیں گے مگر جسے اللہ تعالیٰ چاہے گا اللہ تعالیٰ اسے حکم دے گا وہ اسے پھیلائے گا، اسے دوام دے گا اور اسے طویل کرے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمَا یَنۡظُرُ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنۡ فَوَاقٍ ۞ اور حدیث کو ذکر کیا اسے علی بن معبد اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے جس طرح ہم نے کتاب التذکرہ میں ذکر کیا ہے۔

مجاہد نے کہا قطنا کا معنی ہے ہمارا عذاب؛ قتادہ نے بھی یہی کہا ہے یعنی عذاب میں سے ہمارا حصہ۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جنت میں ہمارا حصہ تا کہ دنیا میں اس سے لطف اندوز ہوں یہی سعید بن جبیر نے کہا: لغت میں یہ معروف ہے کہ

1۔ النہایۃ لابن الاثیر، جلد 3، صفحہ 479

نصیب (حصہ) کو قط کہتے ہیں اور وہ کتاب جو انعام کے لیے لکھی گئی ہو اسے بھی قط کہتے ہیں۔ فراء نے کہا: کلام عرب میں قط سے مراد حصہ ہے اسی معنی میں رجسٹری کو قط کہتے ہیں۔ ابو عبید اور کسائی نے کہا: قط سے مراد وہ تحریر ہے جو انعامات کے لیے لکھی گئی ہو اس کی جمع قطوط ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

ولاالمِلكُ النُّعمانُ يومَ لَقِيتُهُ بِغِبْطَتِه يُعطِي القُطوطَ وَيَأفِقُ(1)

قطوط سے مراد انعامات کی تحریر ہیں۔ بغبطته کی جگہ بنعمته کے الفاظ ہیں یعنی اپنے احسان کے ساتھ جلیل القدر حالت کے ساتھ یأفق یعنی اصلاح احوال کرتا ہے قط کی جمع میں قططه کہتے ہیں اور جمع قلت اقط اور اقطاط ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ سدی نے کہا: انہوں نے یہ سوال کیا تھا کہ جنت میں ان کی جو منازل ہیں ان کی مثالی شکل دکھائی جائے تاکہ انہیں علم ہو جائے کہ جو ان سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

اسماعیل بن ابی خالد نے کہا: معنی ہے ہمارے رزق ہمیں جلدی دیئے جائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہمیں وہ چیز جلدی دی جائے جو ہماری ضروریات کے لیے کافی ہو یہ عربوں کے قول قطی سے ماخوذ ہے یعنی یہ میرے لیے کافی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے یہ بات ان کتابوں کے بارے میں کی تھی جو ان کے دائیں اور بائیں ہاتھوں میں دی جانی تھیں ان پر یہ قرآن پڑھا گیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فاما من اوتی کتابه بیمینه۔ واما من اوتی کتابه وراء ظهره۔ قط کا اصل معنی کاٹنا ہے اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے قط القلم قط کسی شے کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جس طرح قِسم اور قَسم ہے اس کا اطلاق، نصیب، کتاب اور رزق پر ہوتا ہے کیونکہ وہ غیر سے الگ ہوتا ہے مگر اس کا اطلاق کتاب (تحریر) میں زیادہ استعمال ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے قوی ہے؛ امیہ بن ابی صلت نے اسی معنی میں یہ شعر کہا ہے:

قومٌ لهم ساحةُ العِراقِ وما يُجبى إليه وَالقِطُّ والقَلَمُ(2)

وہ ایسی قوم ہیں جن کے لیے عراق کا علاقہ اور جو اس کے لیے اکٹھا کیا جاتا ہے اور ان کے لیے تحریر اور قلم ہے۔

**قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ⑯** یعنی دنیا میں ہی قیامت سے قبل اگر معاملہ اس طرح ہے جس طرح محمد ﷺ کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی جانب سے استہزاء کے طور پر تھا۔

**اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ⑰**

"(اے حبیب!) صبر کرو ان کی نامعقول باتوں پر اور یاد فرمایئے ہمارے بندے داؤد کو جو بڑا طاقتور تھا وہ ہماری طرف بہت رجوع کرنے والا تھا"۔

جب کفار نے مذاق کیا تو نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کا حکم دیا۔ یہ آیت آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے واقعات اور ان کی دشمنی کا ذکر کیا اور سابقہ قوموں کی ہلاکت کا ذکر کر کے انہیں خبردار کیا تو نبی کریم ﷺ کو ان کی اذیتوں پر صبر کا حکم دیا اور جو کچھ پہلے مذکور ہوا اس کے ساتھ آپ ﷺ کو تسلی دی، پھر حضرت داؤد علیہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 496 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 83

السلام اور انبیاء کا ذکر شروع کیا تا کہ جن لوگوں نے صبر کیا ان کے صبر سے آپ بھی تسلی پائیں اور آپ کو یہ علم ہو جائے کہ آخرت میں آپ کے لیے کئی گنا اجر ہوگا اس اجر کی بنسبت جو حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کو عطاء کیا گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان کے قول پر صبر کیجئے اور ان کے لیے انبیاء کے قصے بیان کیجئے تا کہ وہ قصے آپ کی نبوت کی صحت پر دلیل بن جائیں۔

ذَا الْاَیْدِ سے مراد ''عبادت میں قوی'' ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ یہ روزہ سب سے مشکل اور سب سے فضیلت والا ہے۔ آپ نصف رات نماز پڑھا کرتے تھے جب دشمن سے ملاقات ہوتی تو نہیں بھاگا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے میں بڑے قوی تھے۔ عَبْدَنَا کا قول اضافت کے ساتھ شرف کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

اسے الاید اور الآدبھی کہا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: العیب و العاب شاعر نے کہا:

لم یک ینآد فامسی انادا۔		وہ لکڑی ٹیڑھی نہیں تھی وہ اب ٹیڑھی ہوگئی۔

اسی سے رجل اید ہے یعنی قوی آدمی۔ تایدّ الشیٔ شی قوی ہوگئی اس معنی میں شاعر نے کہا:

إذا القوس وَتَّرهَا أَیِّدٌ رَمَی فَاصَابَ الکُلی وَالذُّرا

شاعر کہتا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اس کی کمان کی تانت کو کسا جو بادلوں میں ہے اور اسے پھینکا تو وہ اونٹوں کے گردوں کو جا لگا اور انہیں چربی کے ساتھ موٹا کر دیا۔ مراد اس سے نباتات ہے جو بارش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ضحاک نے کہا: اس کا معنی توبہ کرنے والا (1)۔ اور دوسروں سے مروی ہے کہ جب بھی وہ کسی لغزش کو یاد کرتے یا ان کے دل میں ان کے بارے میں کھٹکا پیدا ہوتا تو اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہوتے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں دن اور رات میں سو دفعہ استغفار کرتا ہوں، آب یئوب اس وقت کہتے ہیں جب وہ لوٹ آئے؛ جس طرح شاعر نے کہا:

وکلُّ ذی غَیْبَةٍ یئوبُ وغائبُ الموت لایئوبُ

ہر غائب لوٹ آتا ہے اور موت کی وجہ سے غائب ہونے والا نہیں لوٹتا۔

حضرت داؤد علیہ السلام ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رضا کی طرف لوٹنے والے تھے وہ اس لائق تھے کہ ان کی اقتدا کی جائے۔

## اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾

''ہم نے فرمانبردار بنا دیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** یُسَبِّحْنَ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے جو وہ برہان اور معجزہ لائے اور اللہ تعالیٰ نے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 84

اس کا ذکر فرمایا وہ پہاڑوں کا ان کے ساتھ تسبیح کرنا ہے۔ مقاتل نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تو پہاڑ بھی ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہاڑوں کی تسبیح کو سمجھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یُسَبِّحْنَ کا معنی ہے وہ نماز پڑھتے تھے ہر چیز معجزہ ہوگئی جب لوگوں نے اسے دیکھا اور اسے پہچانا۔

محمد بن اسحاق نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام کو خوبصورت آواز دی گئی تھی پہاڑوں میں اس کی وجہ سے جو ہلکی آواز پیدا ہوتی ہے اور پرندے اس کی طرف جو کان لگاتے اور اس کے ساتھ آوازیں نکالتے جو پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو مسخر کیا تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں تو یہ ان پہاڑوں کی تسبیح ہوگی کیونکہ یہ چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی مشابہت سے پاک ہے اس کے بارے میں گفتگو سورۂ سبا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (الاسراء: 44) میں گزر چکی ہے۔ اقوال میں سے صحیح ترین قول وہ ہے: جو قولی تسبیح ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اشراق سے مراد سورج کے طلوع ہونے کے بعد اس کا سفید ہونا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: شرقت الشمس جب وہ طلوع ہو اشرقت جب وہ خوب روشن ہو جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سورج کے طلوع اور غروب کے وقت نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہا: میں اس آیت بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ کے پاس سے گزرتا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا ہے یہاں تک کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے مجھے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے آپ نے پانی منگوایا وضو کیا پھر چاشت کی نماز پڑھی فرمایا: ''ام ہانی یہ اشراق کی نماز ہے'' عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صلاۃ الضحی کے بارے میں میرے ذہن میں الجھن سی تھی یہاں تک کہ میں نے اسے قرآن میں پایا یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما چاشت کی نماز نہیں پڑھتے تھے پھر اسے بعد میں پڑھنے لگے۔ روایت کی گئی ہے کہ کعب الاحبار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں سورج کے طلوع ہونے کے بعد ایک نماز پاتا ہوں وہ اوابین کی نماز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں تجھے قرآن دکھاتا ہوں وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں ہے یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ۔

**مسئلہ نمبر 3۔** چاشت (1) کی نماز نفل اور مستحب ہے (2) یہ دن کے پہلے پہر میں اسی طرح ہے جس طرح دن کے پچھلے پہر میں عصر ہے۔ نماز پڑھنا مناسب نہیں یہاں تک کہ سورج طلوع ہونے کے بعد سفید ہو جائے اس کا گدلا پن ختم ہو جائے وہ اپنی روشنی کی وجہ سے منور ہو جائے جس طرح عصر کی نماز اس وقت پڑھنا مناسب نہیں جب سورج زرد ہو جائے۔

---

1۔ من صلاۃ الضحیٰ کے الفاظ ہیں جس کا لغوی معنی چاشت کی نماز ہے لیکن جو تعبیر کی گئی ہے وہ اشراق کے نوافل بنتے ہیں جو سورج کے طلوع ہونے کے تقریباً بیس پچیس منٹ بعد پڑھے جاتے ہیں۔ صلاۃ الضحیٰ تو تقریباً دو، اڑھائی گھنٹے بعد پڑھی جاتی ہے۔

2۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1625

صحیح مسلم میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صلاۃ الأوابین حین ترمض الفصالُ اوابین کی نماز اس وقت ہوتی ہے جب اونٹوں کے بچے گرمی محسوس کرنے لگیں۔ فصال اور فصلان، فصیل کی جمع ہے اس سے مراد اونٹ کا وہ بچہ ہوتا ہے جسے دودھ چھڑا دیا گیا ہو۔ رمضاء سے مراد زمین میں گرمی کی شدت ہے۔ یہاں فصال کا خصوصاً ذکر کیا ہے کیونکہ یہ اس وقت گرمی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ابھی گرمی کی شدت انتہاء کو نہیں پہنچتی جس وقت ان کی مائیں گرمی محسوس کرتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں قوت برداشت کم ہوتی ہے یہ چاشت کے وقت اور اس کے تھوڑا وقت بعد ہوتا ہے، یہ سورج کے طلوع ہونے اور زوال کے درمیان کا وقت ہوتا ہے؛ یہ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: لوگوں میں سے اس سے کچھ تھوڑا پہلے نماز پڑھتے ہیں کیونکہ انہیں جلدی ہوتی ہے کیونکہ انہیں کوئی مصروفیت ہوتی ہے پس اس وجہ سے عمل میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی کیونکہ وہ ممنوع وقت میں نماز پڑھتا ہے اور وہ ایسا بھی کرتا ہے جو اس کے خلاف چلا جاتا ہے وہ اس کے حق نہیں ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ امام ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من صلی الضحی ثنتی عشرۃ رکعۃ بنی اللہ لہ قصرا من ذھب فی الجنۃ(1) جو چاشت کے بارہ نوافل پڑھے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے سونے کا ایک محل بنا دے گا۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''تمہاری ہڈیوں میں سے چھوٹی ہڈی پر صدقہ ہے پس ہر تسبیح (سبحان اللہ) صدقہ ہے ہر تہلیل (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) صدقہ ہے ہر تکبیر (اللہ اکبر) صدقہ ہے نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے نہی عن المنکر صدقہ ہے دو رکعتیں ان کے قائم مقام ہو جاتی ہیں جو آدمی چاشت کے وقت پڑھتا ہے''(2)۔

ترمذی نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے چاشت کے دو نفلوں میں مواظبت اختیار کی تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ جتنے ہوں''(3)۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: ''میرے خلیل نے مجھے تین چیزوں کی وصیت کی، میں اپنی موت تک انہیں نہیں چھوڑوں گا ہر ماہ تین روزے، چاشت کی نماز اور وتر پڑھ کر سونا''(4)۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔ امام مسلم نے یہ روایت کیا ہے: چاشت کے دو نفل ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو درداء سے روایت نقل کی ہے جس طرح امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ یہ سب بحث اس پر دلالت کرتی ہے کہ چاشت کی نماز کی کم سے کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الوتر، ما جاء فی صلوٰۃ الضحی، جلد 1، صفحہ 62

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، استحباب الصلوٰۃ الضحی، جلد 1، صفحہ 250

3۔ جامع ترمذی، کتاب الوتر، ما جاء فی صلوٰۃ الضحی، جلد 1، صفحہ 63

4۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، صلوٰۃ الضحی فی الحضر، جلد 1، صفحہ 157

سُلامٰی کا اصل معنی انگلیوں، ہتھیلیوں اور پاؤں کی ہڈیاں ہیں پھر اس کا استعمال جسم کی تمام ہڈیوں اور جوڑوں میں ہونے لگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بنی آدم میں ہر انسان تین سو ساٹھ جوڑوں پر پیدا کیا گیا ہے جس نے اللہ اکبر، الحمد للہ، لا إلہ إلا اللہ، سبحان اللہ، أستغفر اللہ کہا، راستہ سے کوئی پتھر، کوئی کانٹا یا راستہ سے کوئی ہڈی ہٹائی، نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اس نے یہ عمل تین سو ساٹھ کی تعداد کے برابر کیا تو وہ اس روز چلے گا جبکہ اس نے اپنے آپ کو آگ سے محفوظ کر لیا ہوگا (1)'' ابو توبہ نے کہا: بعض اوقات یمشی کا لفظ ذکر کیا۔ امام مسلم نے اسی طرح نقل کیا ہے ان کا قول ہے ویجزی من ذلك ركعتان یعنی ان اعضاء کی جانب سے ان صدقات کے لیے دو رکعتیں کافی ہو جائیں گی اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز ایک ایسا عمل ہے جس کو جسم کے تمام اعضاء کے ساتھ کیا جاتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے تو جسم کا ہر عضو وہ فریضہ سرانجام دیتا ہے جو اس پر لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۖ كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ ﴿١٩﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿٢٠﴾**

''اور پرندوں کو وہ بھی تسبیح کے وقت جمع ہو جاتے اور سب ان کے لیے فرمانبردار تھے۔ اور ہم نے مستحکم کر دیا ان کی حکومت کو اور ہم نے بخشی انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ''۔

**وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً** اس کا عطف الجبال پر ہے۔ فراء نے کہا: اگر اسے والطیر محشورۃٌ پڑھا جائے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ یہاں فعل ظاہر نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام جب تسبیح کرتے تو پہاڑ انہیں جواب دیتے اور پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے اور ان کے ساتھ تسبیح کہتے، ان کا آپ کے پاس جمع ہونا ہی ان کا حشر ہے معنی ہے کہ ہم نے پرندوں کو مسخر کیا کہ وہ آپ کے پاس جمع ہوتے تاکہ وہ آپ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ہم نے ہوا کو مسخر کیا تاکہ پرندے ان کے پاس جمع ہوں تاکہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں یا ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ پرندوں کو جمع کریں ہر ایک حضرت داؤد علیہ السلام کا تابعدار تھا یعنی ان کے پاس آتا اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: لہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے **وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ** یعنی ہم نے اسے قوی کیا یہاں تک کہ وہ پختہ ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے ہیبت اور دلوں میں رعب ڈال کر ان کی حکومت کو پختہ کیا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لشکروں کی زیادتی کے ساتھ ہم نے اس کے ملک کو پختہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: تائید اور نصرت کے ساتھ ہم نے اس کے ملک کو مضبوط کیا: یہ ابن عربی کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام شان و شوکت کے اعتبار سے سب سے قوی بادشاہ تھے ہر رات ان کی عبادت گاہ کی تیس ہزار سے اوپر لوگ نگہبانی کیا کرتے تھے جب آپ صبح کرتے تو کہا جاتا واپس چلو تم سے اللہ کا نبی راضی ہے۔ ملک کا معنی ملکیت کی زیادتی ہے آدمی کی ملکیت ہوتی ہے مگر اس وقت ملک نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس کی مملوکہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، ان اسم الصدقۃ، جلد 1، صفحہ 325
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 84

چیزیں کثیر نہ ہو جائیں اگر ایک آدمی گھر اور بیوی کا مالک ہو جائے تو وہ اس وقت تک مَلِک نہیں کہلاتا یہاں تک کہ اس کے پاس خادم ہو جو منافع میں تصرف کی ذمہ داری کو کافی ہو جس کا ایک انسان محتاج ہوا کرتا ہے یہ معنی سورۂ براءہ میں گذر چکا ہے اور ملک کی حقیقت سورۂ نمل میں گذر چکی ہے۔

وَ اٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ حکومت سے مراد نبوت ہے (1)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد عدل ہے۔ ابو عالیہ نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد سنت ہے۔ شریح نے کہا: اس سے مراد علم اور فقہ ہے۔ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ابو عبد الرحمٰن سلمی اور قتادہ نے کہا: قضاء میں فیصلہ ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود، حضرت حسن بصری، کلبی اور مقاتل کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد بیان کلام ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب نے کہا: اس سے مراد یہ ارشاد ہے البینة علی المدعی والیمین علی من انکر شریح، قتادہ اور شعبی کا قول ہے: ابو موسیٰ اشعری اور شعبی نے کہا یہ ان کا قول اما بعد ہے۔ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے اما بعد کا کلمہ استعمال کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ فَصْلَ الْخِطَابِ سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا بیان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کثیر معانی کا قلیل الفاظ میں سمو دینا ہے۔ ان اقوال کے معنی قریب قریب ہیں۔ حضرت علی شیر خدا کا قول اس کو جامع ہے کیونکہ فیصلہ کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری کا قول اس سے مختلف ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: جہاں تک علم قضا کا تعلق ہے (2) تیرے معبود کی قسم! یہ علم کی ایک انوکھی قسم ہے اور اس کی مؤکد فصل ہے، یہ احکام کی معرفت اور حلال و حرام کی بصیرت سے الگ ہے حدیث طیبہ میں ہے أقضاكم علی وأعلمكم بالحلال والحرام معاذ بن جبل (3) تم میں سے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے حضرت علی ہیں اور تم میں سے سب سے زیادہ حلال و حرام کے مسائل جاننے والے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعض اوقات ایک آدمی افعال کے احکام کو جانتا ہے حلال و حرام کو پہچانتا ہے وہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن بھیجا کچھ لوگوں نے شیر کو شکار کرنے کے لیے ایک گڑھا کھودا اس میں شیر گر پڑا لوگ اس گڑھے پر اکٹھے ہو گئے اس گڑھے میں ایک آدمی گرا وہ ایک اور آدمی کے ساتھ چمٹ گیا وہ ایک آدمی کے ساتھ چمٹ گیا یہاں تک کہ وہ کل چار آدمی ہو گئے شیر نے انہیں زخمی کر دیا تو وہ ہلاک ہو گئے لوگوں نے اسلحہ تھام لیا قریب تھا کہ ان کے درمیان جنگ ہو جاتی فرمایا: میں ان کے پاس آیا اور میں نے کہا: کیا تم چار آدمیوں کی وجہ سے دو سو آدمیوں کو قتل کرتے ہو آؤ میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں اگر تم اس پر راضی ہو تو وہ تمہارے درمیان فیصلہ ہوگا اگر تم وہ فیصلہ ماننے سے انکار کرو تو تم وہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کر دینا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیصلہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، حضرت علی شیر

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 84 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 29-28-1627

3۔ سنن ابن ماجہ، باب فضائل خباب رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر 150، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خدا نے پہلے کے لیے چوتھائی دیت، دوسرے کے لیے ایک تہائی دیت، تیسرے کے لیے نصف دیت اور چوتھے کے لیے پوری دیت کا فیصلہ کیا اور تمام دیتیں ان افراد پر لازم کر دیں جنہوں نے وہ گڑھا کھودا تھا اور اسے ان چار قبائل پر تقسیم کر دیا کچھ لوگ راضی ہو گئے اور کچھ لوگ ناراض ہو گئے پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعات بیان کیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا ایک آدمی نے عرض کی: حضرت علی شیر خدا نے ہمارے درمیان ایک فیصلہ کیا ہے، حضرت علی شیر خدا نے جو فیصلہ کیا تھا اسے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فیصلہ تو وہی ہے جو حضرت شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کیا ہے''۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی شیر خدا کا فیصلہ نافذ کر دیا۔

اسی طرح المعرفة بالقضاء میں ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے پاس ایک آدمی آیا عرض کی کہ ابن ابی لیلیٰ جو کوفہ کے قاضی تھے نے ایک مجنونہ عورت کو دو حدیں جاری کرتے ہوئے کوڑے مارے جس نے ایک آدمی کو کہا: اے دو بدکاری کرنے والوں کے بیٹے جبکہ وہ عورت کھڑی تھی حضرت امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اس نے چھ وجوہ سے غلطی کی ہے۔

ابن عربی نے کہا: امام ابوحنیفہ نے یہ قول بدیہی طور پر کر دیا علماء کے علاوہ کوئی آدمی روایت کو نہیں جانتا۔ جہاں تک حضرت علی شیر خدا کے فیصلہ کا تعلق ہے اس کو تھوڑا علم رکھنے والا نہیں جان سکتا اور احکام میں تجربہ رکھنے والا اس کا ادراک نہیں کر سکتا مگر وہ جو طویل عرصہ تک اس پر اپنی توجہات کو مرکوز کیے ہوئے ہو۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ جو چار مقتول ہیں خطاً قتل ہوئے کیونکہ جو لوگ وہاں حاضر تھے ان میں دھکم پیل ہوئی اور جن لوگوں نے اس گڑھے کو کھودا ان پر ان مرنے والوں کی دیت خطاً لازم ہوگئی مگر جو پہلا ہے دھکم پیل کی وجہ سے مقتول ہے جس نے تین دوسرے افراد کو کھینچتے ہوئے قتل کیا اس کے لیے قتل ہونے کی وجہ سے دیت ہوگی اور اس پر تین چوتھائی دیت لازم ہوگی ان افراد کی جن کو اس نے کھینچ کر قتل کیا ہے جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے اس کے لیے ایک تہائی دیت ہوگی اور اس پر ان دو افراد کی دو تہائی دیت لازم ہوگی جن دو کو اس نے کھینچ کر قتل کیا۔

جہاں تک تیسرے کا تعلق ہے اسکے لیے نصف دیت ہوگی اور اس پر بھی نصف دیت ہوگی کیونکہ اس نے ایک آدمی کو کھینچ کر قتل کیا تھا اس طرح ان میں تقسیم ہوگی اور اور عاقلہ جاری قصاص کے بعد اس طرح چٹی بھریں گے یہ بہت عمدہ استنباط ہے۔

جہاں تک امام ابوحنیفہ کا تعلق ہے تو آپ نے متعلقہ اسباب کو دیکھا تو آپ نے غلطی کی چھ وجوہ کو دیکھا۔

(1) مجنون پر کوئی حد نہیں ہوتی کیونکہ جنون احکام کے مکلف ہونے کے حکم کو ساقط کر دیتا ہے یہ اس وقت ہوتا جب تہمت جنون کی حالت میں لگائی ہو جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جسے کسی وقت جنون لاحق ہوتا ہو اور کسی وقت افاقہ ہوتا ہو تو اسے افاقہ کی حالت میں حد قذف لگائی جائے گی۔ (2) اس کا قول: اے دو بدکاروں کے بیٹے! تو اس کے کوڑے دو حدوں کی صورت میں لگنے چاہئیں تھے ہر اک کی وجہ سے ایک حد جاری ہونی تھی، امام ابوحنیفہ نے اپنے مذہب کے مطابق اسے غلط قرار دیا ہے کیونکہ حد قذف میں تداخل واقع ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس طرح شراب اور بدکاری کی حد ہے جہاں تک امام شافعی اور امام مالک کا تعلق ہے دونوں کی رائے یہ ہے کہ حد قذف یہ بندے کا حق ہے اس وجہ سے

جب وہ افراد متعدد ہیں جن پر تہمت لگائی گئی ہے تو حدیں بھی متعدد ہونگی۔(3) قاضی نے مقذوف کے مطالبہ کے بغیر حد لگائی ہے اور امت کا اجماع ہے کہ حد قذف مطالبہ کے بعد ہی جائز ہے خواہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ بندے کا حق ہے اس تعبیر کی بنا پر یہ دلیل قائم ہو جاتی ہے کہ جو یہ خیال کرتا ہے کہ یہ بندے کا حق ہے اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوتا تو مطالبہ پر موقوف نہ ہوگی جس طرح کہ حد زنا ہے۔(4) اس نے پے در پے دو حدیں جاری کیں جبکہ جس پر حدیں واجب ہوں انہیں پے در پے جاری نہیں کیا جاتا بلکہ ایک حد جاری کی جاتی ہے پھر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ زخم مندمل ہو جائیں پھر اس پر دوسری حد جاری کی جائے گی۔(5) اس نے عورت پر حد جاری کی ہے جبکہ وہ کھڑی تھی جبکہ عورت پر حد اس وقت جاری کی جاتی ہے جبکہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور پردے میں ہو۔(6) اس نے مسجد میں حد جاری کی ہے جبکہ مسجد میں حد جاری نہیں کی جاتی جبکہ اس پر اجماع ہے کہ حدود مسجد میں جاری نہیں کی جاتیں۔

مسجد میں فیصلہ کرنے اور تعزیر کرنے میں اختلاف ہے۔

قاضی نے کہا: یہی مفصل خطاب اور علم قضاء ہے حدیث أقضاكم علی کی جو تاویلیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک تاویل کی بنا پر اسی علم کی طرف اشارہ ہے جس نے کہا: اس سے مراد ایجاز ہے۔ تو وہ عربوں کے لیے ہے عجمیوں کے لیے نہیں ہوگا اسی طرح ایجاز سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہوگا دوسرے عربوں کے لیے نہ ہوگا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں وضاحت کی ہے: وأوتيت جوامع الكلم (1) مجھے جوامع کلم سے نوازا گیا۔ جس نے کہا: اس سے مراد اما بعد ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں: اما بعد یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ دور جاہلیت میں سب سے پہلے جس آدمی نے یہ لفظ استعمال کیا وہ سحبان بن وائل تھا یہی وہ پہلا شخص ہے جو بعث بعد الموت پر ایمان لایا تھا اور وہی پہلا شخص ہے جس نے عصا پر ٹیک لگائی تھی اور اس کی عمر ایک سو اسی سال ہوئی اگر یہ درست ہو کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ کہا تھا تو وہ عربی زبان میں نہیں ہوگا بلکہ وہ ان کی اپنی زبان میں ہوگا۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿٢١﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَ لَا تُشْطِطْ وَ اهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ هٰذَاۤ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّ لِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَ عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴿٢٤﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٢٥﴾

---

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب فضائل سید المرسلین

''اور کیا آئی ہے آپ کے پاس اطلاع فریقین مقدمہ کی جب انہوں نے دیوار پھاندی عبادت گاہ کی اور جب اچانک داخل ہوئے داؤد پر پس آپ کچھ گھبرا گئے ان سے انہوں نے کہا: ڈریئے نہیں ہم تو مقدمہ کے دو فریق ہیں زیادتی کی ہے ہم سے ایک نے دوسرے پر آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ فرمائیے اور بے انصافی نہ کیجئے اور دکھائیے ہمیں سیدھا راستہ (صورت نزاع یہ ہے کہ) یہ میرا بھائی ہے اور ان کی ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دے اور سختی کرتا ہے میرے ساتھ گفتگو میں۔ آپ نے فرمایا: بے شک اس نے ظلم کیا تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا دے اور اکثر حصہ دار زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر سوائے ان حصہ داروں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ اور فوراً خیال آ گیا داؤد کو کہ ہم نے اسے آزمایا ہے سو وہ معافی مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گر پڑے رکوع میں پس ہم نے بخش دی ان کی تقصیر، اور بے شک ان کے لیے ہمارے ہاں بڑا قرب ہے اور خوبصورت انجام ہے''۔

اس میں چوبیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ خصم کا لفظ ایک، دو اور جماعت پر واقع ہوتا ہے(1) کیونکہ اصل میں یہ مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

وخَصْمٍ غِضَابٍ يَنْفُضُونَ لِحَاهُمُ　　كنفضِ البَرَاذِينِ العِرابِ المَخَالِيَا

وہ غصیلے دشمن ہیں وہ اپنی داڑھیوں کو یوں جھاڑتے ہیں جس طرح ترکی و عربی گھوڑے توبروں کو جھاڑتے ہیں۔

نحاس نے کہا: اہل تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہاں خصم سے مراد دو فرشتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: تَسَوَّرُوا یہ لفظ خصم پر محمول کرتے ہوئے جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے اگرچہ جھگڑا کرنے والے دو تھے کیونکہ یہ جمع کے لفظ کے ساتھ ہے اور اس کے مشابہ ہے جس طرح الرکب اور الصحب ہے۔ اس کی تقدیر پر دو کے لیے ذوا خصم ہوگی اور جماعت کے لیے ذوو خصم ہوگی۔

**تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ** وہ دیوار کے اوپر سے ان کے پاس آئے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تسور الحائط وہ اس پر چڑھا السور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں یہ ہمزہ کے بغیر ہوتی ہے اسی طرح السور ہے یہ سورۃ کی جمع ہے جس طرح بسرۃ کی جمع بسر آتی ہے یہ تعمیر کی ہر منزل کو کہتے ہیں اسی سے سورۃ القرآن ہے کیونکہ یہ بھی ایک منزل کے بعد دوسری منزل ہوتی ہے جو دوسری سے الگ ہوتی ہے اس کی وضاحت کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ نابغہ کا قول ہے:

ألم تَرَ أنَّ الله أعْطاكَ سُورَةً　　تَرَى كُلَّ مَلْكٍ دونها يتذبذب

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے مرتبہ عطا کیا ہے تو ہر بادشاہ کو اس مرتبہ سے نیچے متذبذب دیکھے گا۔

اس شعر میں سورۃ سے مراد شرف اور منزلت ہے۔

جہاں تک اس سؤر کا تعلق ہے جو ہمزہ کے ساتھ ہے اس سے مراد برتن میں بچا کچا کھانا ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 85

ابن عربی نے کہا: فارسی زبان میں سؤر سے مراد ولیمہ ہے حدیث طیبہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر کہا تھا: ان جابرا قد صنع لکم سؤرا فحی ھلا بکم (1)۔

یہاں محراب سے مراد کمرہ ہے کیونکہ وہ کمرہ میں ہی ان کے پاس آئے تھے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد صدر مجلس ہے؛ اسی معنی میں مسجد کا محراب ہوتا ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ یہاں اذ دو دفعہ آیا ہے کیونکہ یہ دونوں فعل ہیں۔ فراء نے گمان کیا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک لما کے معنی میں ہے دوسرا قول یہ ہے کہ دوسرا اذا اپنے مابعد سے مل کر اپنے ماقبل کا بیان ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ دونوں انسان تھے؛ یہ نقاشی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دو فرشتے تھے؛ یہ ایک جماعت کا قول ہے۔

ایک جماعت نے ان دونوں کو معین کیا ہے انہوں نے کہا: وہ حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دو فرشتے تھے جو دو انسانوں کی صورت میں تھے اللہ تعالیٰ نے دونوں، حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کے روز، ان کے پاس بھیجے تھے نگہبانوں نے اندر جانے سے انہیں روکا تھا تو وہ دیوار کے اوپر سے ان کے پاس حاضر ہو گئے جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو محسوس تک نہ ہوا کیونکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے وہ دونوں ان کے سامنے بیٹھ گئے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ کا بھی یہی مطلب ہے یعنی وہ اوپر چڑھے اور عبادت والے کمرے کے اوپر سے نیچے اترے؛ یہ سفیان ثوری اور دوسرے علماء نے کہا۔

اس کا سبب وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ اپنا بچاؤ کر لیں گے اگر انہیں آزمائش میں ڈالا گیا تو انہیں کہا گیا: تجھے آزمایا جائے گا تو اس دن کو بھی جان لے گا جس میں تجھے آزمایا جانا ہے تو اپنی احتیاط کر لینا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور لی، عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور کسی کو بھی اندر داخل ہونے سے منع کر دیا اسی اثنا میں کہ وہ زبور پڑھ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک پرندہ آیا جو پرندوں میں سے حسین ترین تھا وہ پرندہ آہستہ آہستہ قریب ہونے لگا حضرت داؤد علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ اس پرندے کو پکڑ لیں وہ مزید آگے ہوا یہاں تک کہ وہ عبادت گاہ کے روشن دان میں جا گرا حضرت داؤد علیہ السلام اس کے قریب ہوئے تا کہ اسے پکڑ لیں تو وہ اڑ گیا آپ جھانکے تا کہ اس پرندے کو دیکھیں تو آپ کی نظر ایک عورت پر جا پڑی جو غسل کر رہی تھی جب عورت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے جسم کو اپنے بالوں سے ڈھانپ لیا۔ سدی نے کہا: وہ عورت آپ کے دل میں گھر کر گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا خاوند اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا غازی تھا جس کا نام اوریا بن حنان تھا حضرت داؤد علیہ السلام نے مجاہدین کے امیر کو خط لکھا کہ وہ اس کے خاوند کو تابوت اٹھانے والوں میں معین کرے تابوت اٹھانے والوں کو یا تو اللہ تعالیٰ فتح عطا کرتا ہے یا وہ قتل ہو جاتے ہیں امیر نے اسے آگے رکھا تو وہ قتل ہو گیا جب اس عورت کی عدت ختم ہو گئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے دعوت نکاح دی، اس عورت نے یہ شرط لگائی: اگر اس کا لڑکا ہوا تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد ان کا

1۔ دلائل النبوۃ، باب ما ظهر في الطعام، جلد 3، صفحہ 426

خلیفہ ہوگا اس نے اس بارے میں با قاعدہ تحریر لکھی اور بنی اسرائیل کے پچاس آدمیوں کو گواہ بنایا تھوڑا وقت بھی نہ گذرا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور وہ جوان ہو گئے اور دو فرشتے دیوار پھلانگ کر داخل ہوئے ان دونوں کا وہی واقعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے؛ ماوردی اور دوسرے علماء نے اسے ذکر کیا وہ صحیح (1) نہیں۔ ابن عربی نے کہا: جو کچھ اس بارے میں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے یہ مناسب ترین ہے۔

میں کہتا ہوں ترمذی حکیم نے نوادر الاصول میں اس کی ہم معنی مرفوع روایت نقل کی ہے وہ یزید رقاشی سے مروی ہے کہ اس نے حضرت انس بن مالک کو کہتے ہوئے سنا کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب اس عورت کو دیکھا اور اس سے محبت کرنے لگے تو آپ نے بنی اسرائیل کو ایک لشکر تیار کرنے کا حکم دیا اور امیر لشکر کو حکم دیا جب دشمن حاضر ہوا تو فلاں کو دشمن کے قریب معین کرنا اس آدمی کا نام بھیجا امیر نے اسے تابوت کے قریب معین کیا (2)۔

اس زمانہ میں تابوت کے ذریعے نصرت طلب کی جاتی تھی جسے تابوت کے سامنے رکھا جاتا تو وہ واپس نہیں لوٹتا تھا یہاں تک کہ وہ قتل ہو جائے یا وہ لشکر شکست کھا جائے جس سے وہ برسر پیکار ہے اس آدمی کو آگے رکھا گیا تو اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا تو دو فرشتے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے، اور تمام واقعہ بیان کیا۔

سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس عورت کے خاوند کی طرف خط لکھا جبکہ وہ بلقاء شہر کے قلعہ میں تھا کہ وہ دروازے کا حلقہ پکڑے اس میں موت احمر تھی وہ آگے بڑھا اور قتل ہو گیا۔

ثعلبی نے کہا علماء کی ایک جماعت نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان ایک خطا کے ساتھ لیا کیونکہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب کی بارگاہ میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے مقام و مرتبہ کی تمنا کی عرض کی: اے میرے رب! سب بھلائی میرے آباؤ اجداد لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی انہیں ایسے امتحان میں ڈالا گیا جیسے امتحان میں کسی اور کو نہ ڈالا گیا۔ حضرت ابراہم علیہ السلام کا امتحان نمرود، آگ اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی صورت میں لیا گیا حضرت اسحاق علیہ السلام کا امتحان ذبح ہونے کی صورت میں لیا گیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا امتحان حضرت یوسف علیہ السلام پر غم اور بینائی چلی جانے کی صورت میں لیا گیا تمہارا تو ان میں سے کسی چیز کے

---

1۔ امام قرطبی نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اسرائیلیات میں سے ہے ان کی صحت کا کوئی اعتبار نہیں یہ محض افتراء ہے جس طرح امام بیضاوی نے کہا اور یہ روایت ان چیزوں میں سے ہے جو عصمت انبیاء پر قدح کا باعث ہیں ابوحیان نے بہت عمدہ بات کی ہے وہ کہتے ہیں: یہ بات قطعی ہے کہ انبیاء گناہوں سے محفوظ ہیں ان میں سے کوئی چیز انبیاء سے واقع نہیں ہوئی کیونکہ یہ بدیہی بات ہے اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو ان پر جائز قرار دیں گے تو شرعی احکام باطل ہو جائیں گے اور جو وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف وحی کرتا ہے ہم ان میں سے کسی بات پر بھی اعتماد نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو ذکر کیا ہے ہم اسے اسی پر محمول کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے اور جو قصہ گو لوگ بیان کرتے ہیں اور ان باتوں میں منصب نبوت کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہوگا تو ہم اسے ترک کر دیں گے تحقیق کے مطابق نقاشی کی روایات مطروح ہیں مفسر نے خود بھی بعد میں نحاس کا قول نقل کیا ہے جو ہمارے قول کی تائید کرتا ہے۔

2۔ نوادر الاصول، باب فی ھم الانبیاء الثلاث، صفحہ 186

ساتھ امتحان نہیں لیا گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: میرا بھی امتحان لے جس طرح ان کا امتحان لیا اور مجھے بھی وہ مقام عطا کر جو تو نے انہیں مقام عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی: تیرا فلاں مہینہ میں جمعہ کے روز امتحان ہوگا جب وہ دن آیا تو آپ عبادت گاہ میں چلے گئے دروازہ بند کر لیا نماز پڑھنے لگے اور زبور کی تلاوت کرنے لگے اسی اثنا میں کہ آپ یہ کام کر رہے تھے کہ شیطان نے ان کے لیے سونے کی کبوتری کی صورت اختیار کی اس میں ہر قسم کا خوبصورت رنگ موجود تھا وہ آپ کے قدموں کے ساتھ ٹھہر گئی آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تا کہ اسے پکڑ لیں اور اپنے چھوٹے بیٹے کو دے دیں وہ تھوڑی دور تک اڑ گئی مگر اپنی ذات سے حضرت داؤد علیہ السلام کو مایوس نہ کیا حضرت داؤد علیہ السلام اس کی طرف بڑھے تا کہ اسے پکڑ لیں تو وہ تھوڑی اور دور چلی گئی حضرت داؤد علیہ السلام اس کے پیچھے ہوئے وہ اڑی یہاں تک کہ وہ روشن دان میں جا گری حضرت داؤد علیہ السلام آگے بڑھے تا کہ اسے پکڑیں تو وہ اڑ گئی حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اس کے پیچھے بلند ہو رہی تھی تا کہ اس کے پیچھے کسی کو بھیجیں جو اسے پکڑ لے تو آپ نے ایک تالاب کے کنارے ایک عورت کو غسل کرتے ہوئے دیکھا؛ یہ کلبی کا قول ہے۔

سدی نے کہا: وہ عورت چھت پر بے لباس غسل کر رہی تھی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے بہت خوبصورت پایا اس عورت نے آپ کا سایہ دیکھا تو اس نے اپنے بالوں کو جھاڑا تو اپنے بدن کو ڈھانپ لیا تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اور بھی بھلا لگا اس عورت کا خاوند اوریا بن حنان تھا جو ایوب بن صوریا کے ساتھ جنگ میں شامل تھا حضرت ایوب حضرت داؤد علیہ السلام کے بھانجے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت ایوب کی طرف خط لکھا کہ اوریا کو فلاں فلاں جگہ متعین کرے ایوب نے اسے تابوت کے سامنے متعین کر دیا۔ جس آدمی کو تابوت کے سامنے متعین کیا جاتا اس کے لیے حلال نہیں ہوتا تھا کہ وہ پیچھے ہٹے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فتح دے دے یا شہید ہو جائے۔ ایوب نے اسے آگے رکھا تو اسے فتح نصیب ہوئی تو ایوب نے حضرت داؤد علیہ السلام کو تمام حالات لکھ بھیجے۔

کلبی نے کہا: اوریا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں زمین میں اللہ تعالیٰ کی تلوار تھے جب وہ کوئی وار کرتے اور اللہ اکبر کہتے تو حضرت جبریل ان کی دائیں جانب اور حضرت میکائیل ان کی بائیں جانب اللہ اکبر کہتے اور اس کی تکبیر کی وجہ سے آسمان کے فرشتے بھی اللہ اکبر کہتے یہاں تک کہ یہ سلسلہ عرش تک جا پہنچتا تو عرش کے فرشتے اس کی تکبیر سے اللہ اکبر کہتے اللہ تعالیٰ کی تلواریں تین تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کالب بن یوفنا، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اوریا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ۔

جب ایوب نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اوریا کے ہاتھ پر فتح نصیب فرمائی ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ایوب کو خط لکھا کہ اسے فلاں لشکر میں بھیج دو اور تابوت کے آگے متعین کرو اللہ تعالیٰ نے اس مہم میں بھی آپ کو فتح عطا فرمائی اور تیسری دفعہ وہ شہید ہو گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی بیوی سے عدت ختم ہونے کے بعد شادی کر لی یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے امتحان کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے دل میں سوچا کہ وہ ایک دن بغیر کوئی چیز کھائے گذار سکتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ایک حصہ عورتوں کے لیے، ایک حصہ عبادت کے لیے، ایک حصہ بنی اسرائیل کے لیے وہ آپ کے ساتھ مذاکرہ کرتے اور آپ ان کے ساتھ مذاکرہ کرتے وہ آپ کو رلاتے اور آپ ان کو رلاتے تھے اور ایک حصہ فیصلوں کے لیے۔ بنی اسرائیل نے آپ سے گفتگو کی: کیا انسان پر کوئی ایسا دن بھی گذر سکتا ہے جس میں کوئی گناہ نہ کرے حضرت داؤد علیہ السلام نے دل میں خیال کیا کہ وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں آپ نے عبادت والے دن دروازہ بند کر لیا اور حکم دیا کہ آج ان کی خدمت میں کوئی حاضر نہ ہو آپ نے زبور کی تلاوت مین اپنی توجہات مذکور کرلیں تو سونے کی ایک چڑیا آپ کے سامنے گری اور اسی طرح کا واقعہ ذکر کیا جو پہلے مذکور ہو چکا ہے ہمارے علماء نے کہا ہے: اس میں یہ دلیل ہے (2) کہ حاکم پر کوئی لازم نہیں کہ ہر روز وہ لوگوں کے لیے متعین کرے اور انسان کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنی بیویوں سے وطی کرنا ترک کرے اگرچہ وہ عبادت میں مشغول ہو۔ سورۃ النساء میں یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ کعب الاحبار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آپ کی موجودگی میں اسی امر کا فیصلہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے فرمایا: ان لزوجك عليك حقا بے شک بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ حضرت حسن بصری اور مجاہد نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا جب انہیں خلیفہ بنایا گیا اللہ کی قسم! میں تمہارے درمیان عدل کروں گا اور انشاء اللہ نہ کہا تو اس وجہ سے آپ کو آزمائش میں ڈالا گیا۔ ابوبکر وراق نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام بہت زیادہ عبادت کیا کرتے تھے اس وجہ سے انہوں نے اپنے آپ پر عجب کا اظہار کیا اور کہا: کیا زمین میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھ جیسا عمل کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو ان کی طرف بھیجا فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے فرماتا ہے: تو نے اپنی عبادت پر عجب کا اظہار کیا ہے عجب عبادت کو یوں کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے اگر تو نے دوبارہ عجب کا اظہار کیا تو میں تجھے تیرے نفس کے حوالے کر دوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! ایک سال تک مجھے میرے نفس کے حوالے کر دے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ عرصہ ہے۔ عرض کی: ایک مہینہ تک مجھے میرے نفس کے حوالے کر دیجئے فرمایا: یہ بھی زیادہ عرصہ ہے عرض کی: ایک دن۔ فرمایا: یہ بھی زیادہ ہے۔ عرض کی: یارب مجھے ایک ساعت کے لیے میرے نفس کے حوالے کر دیجئے فرمایا: ایک ساعت کے لیے تیرا نفس تیرے حوالے ہے۔ آپ نے معاملہ نگہبانوں کے حوالے کر دیا خود اون کا لباس پہنا اور عبادت گاہ میں داخل ہو گئے زبور اپنے ساتھ رکھ لی اسی اثنا میں کہ وہ عبادت میں مصروف تھے کہ ایک پرندہ آپ کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تو عورت کا واقعہ ہوا جو ہوا۔

سفیان ثوری نے کہا: ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور التجا کی اے میرے رب! کوئی دن ایسا نہیں ہوتا مگر داؤد کے خاندان میں سے کوئی فرد روزے سے ہوتا ہے اور کوئی رات نہیں ہوتی مگر آل داؤد میں سے کوئی تیرے حضور قیام کی حالت میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی: اے داؤد! یہ تیری وجہ سے ہے یا میری وجہ سے ہے میری عزت کی قسم! میں ضرور تجھے تیرے نفس کے حوالے کر دوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب!

مجھے معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں ایک سال تک کے لیے تجھے تیرے نفس کے حوالے کر دیتا ہوں عرض کی: نہیں تیری عزت کی قسم! فرمایا: ایک ماہ۔ عرض کی: نہیں تیری عزت کی قسم! فرمایا: ایک ہفتہ، عرض کی: نہیں تیری عزت کی قسم! فرمایا: ایک دن، عرض کی: نہیں تیری عزت کی قسم! ایک گھنٹہ، عرض کی: نہیں تیری عزت کی قسم! فرمایا: ایک لحظہ، شیطان نے کہا: ایک لحظہ کی کیا حیثیت ہے؟ عرض کی: ایک لحظہ کے لیے مجھے میرے نفس کے حوالے کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لحظہ کے لیے اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیا اسے کہا گیا: فلاں دن فلاں وقت میں جب وہ دن آیا تو آپ نے وہ دن عبادت کے لیے خاص کر دیا آپ نے نگہبانوں کو اس مکان کے اردگرد معین کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ تیس ہزار یا تینتیس ہزار تھے۔ اپنے رب کی عبادت کے لیے خلوت گزیں ہو گئے اور اپنے سامنے زبور کو پھیلا دیا ایک کبوتری آئی اور آپ پر آ گری تو اس لمحہ اس عورت کا معاملہ ہوا جو ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ولادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے ان کی طرف بھیجے ان دونوں نے انبیاء کی مثال پیش کی جب مثال کو سنا تو اپنی خطا یاد آئی حتیٰ کہ چالیس راتوں تک سجدہ ریز رہے جس کا ذکر بعد میں آنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** **فَفَزِعَ مِنْهُمْ** آپ ان سے گھبرا گئے کیونکہ دونوں رات کے وقت اس وقت داخل ہوئے جس وقت جھگڑے والے لوگ داخل نہیں ہوتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ اس لیے گھبرائے تھے کیونکہ وہ بغیر اجازت کے داخل ہوئے تھے ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ وہ عبادت گاہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں دیوار پھلانگ کر آئے تھے وہ دروازے سے داخل نہ ہوئے تھے۔

ابن عربی نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام کا عبادت خانہ اوپر چڑھ کر داخل ہونے سے محفوظ تھا کیونکہ آدمی کسی حیلہ سے بھی اوپر نہیں چڑھ سکتا تھا مگر اس صورت میں کہ وہ کئی دنوں یا کئی مہینوں تک اس کے لیے تگ و دو کرتا جبکہ اس کے ساتھ کئی مددگار بھی ہوں اور مختلف انواع کے آلات ہوں۔ اگر ہم کہیں کہ وہ محراب کے دروازے سے اس تک پہنچے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں خبر دینے کے لیے یہ ارشاد نہ فرماتا **تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ** کیونکہ جو آدمی سیڑھی کی جانب سے اور نیچے کی جانب سے اوپر آئے تو اس کے لیے تسور المحراب و الغرفة کا لفظ استعمال نہیں کرتے مگر بطور مجاز ایسا کہا جا سکتا ہے جب تو روشن دان کو دیکھے جس سے دو جھگڑا کرنے والے داخل ہوں تو تجھے قطعی طور پر علم ہو جائے گا کہ وہ دونوں فرشتے ہیں کیونکہ وہ بلند ہوتا ہے اور وہاں تک کوئی عالم بالا کا مکین ہی پہنچ سکتا ہے۔ ثعلبی نے کہا ایک قول یہ کیا گیا ہے: داخل ہونے والے بنی اسرائیل میں سے دو حقیقی بھائی تھے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیا تو ایک فرشتہ نے کہا: اے داؤد! تو نے اپنے بارے میں یہ فیصلہ کیوں نہ کیا۔ پہلی تعبیر زیادہ اچھی ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے دونوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا جو حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا تھا۔

میں کہتا ہوں: اکثر اہل تاویل نے بھی یہی کہا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ یہ کہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ فرشتے کہیں: **خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ** یہ تو سراسر جھوٹ ہے اور فرشتے اس قسم کے جھوٹ سے منزہ ہیں۔

اسکا جواب یہ ہوگا: کلام میں تقدیر ضروری ہے گویا دونوں نے کہا: قدرنا کأننا خصمان بغی بعضنا علی بعض ہمارے بارے میں مقدر کیجئے گویا ہم دو جھگڑا کرنے والے ہیں ہم میں سے ایک نے دوسرے پر بغاوت کی ہے۔ اسی معنی پر ان دونوں کے قول کو محمول کیا جائے گا اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً کیونکہ یہ اگرچہ خبر کی صورت میں تھا مگر مقصود تقدیر میں لانا تھا تا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کچھ کیا اس پر انہیں آگاہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اگر یہ سوال کیا جائے: حضرت داؤد علیہ السلام کیوں گھبرائے جبکہ وہ نبی تھے جبکہ ان کا نفس نبوت کے ساتھ قوی ہو گیا تھا اور وحی کی وجہ سے مطمئن تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو مقام و مرتبہ آپ کو عطا کیا تھا اس پر پورا بھروسہ تھا آپ کے ہاتھوں کئی معجزات ظاہر فرمائے تھے اور شجاعت میں بڑے مقام و مرتبہ پر فائز تھے؟

اسے جواب دیا جائے گا: ان سے قبل کے انبیاء کا طریقہ بھی یہی تھا وہ قتل اور اذیت سے محفوظ نہ تھے جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام تو ان سے خوفزدہ ہوئے تھے کیا تم حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو نہیں دیکھتے دونوں نے کیسے کہا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ (طٰہٰ) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَخَفْ (ہود: 70) فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو فرمایا: اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ (ہود: 81) اسی طرح دو فرشتوں نے یہاں کہا لَا تَخَفْ محمد بن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف دو فرشتوں کو بھیجا جو آپس میں جھگڑ رہے تھے جبکہ آپ اپنے عبادت خانہ میں مصروف عبادت تھے ایک ایسی مثال جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اور اوریا کے لیے بیان فرمائی آپ نے دونوں کو اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھا پوچھا کونسی چیز تمہیں میرے پاس لے آئی؟ دونوں نے کہا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ ہم تیرے پاس اس لیے آئے ہیں تا کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کریں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن عربی نے کہا: اگر یہ سوال کیا جائے آپ نے دونوں کو نکل جانے کا حکم کیوں نہ دیا جبکہ آپ نے آنے کا مدعا جان لیا تھا ان دونوں کو ادب کیوں نہ سکھایا جبکہ دونوں اجازت کے بغیر داخل ہوئے تھے؟۔

اس کا جواب چار طریقوں سے دیا جا سکتا ہے: (1) ہم نہیں جانتے کہ حجاب اور اذن کے کیا احکام تھے جواب اسی کے مطابق ہوگا جیسے احکام ہونگے ہماری شریعت کے آغاز میں اسکے بارے میں واضح احکام موجود نہ تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح کیا۔ (2) اگر ہم حجاب کے احکام پر جواب دینا چاہیں تو یہ احتمال موجود ہے کہ وقتی گھبراہٹ نے آپ کو اس چیز سے غافل کر دیا ہو جو امر اس بارے میں آپ پر واجب تھا۔ (3) آپ نے ارادہ کیا کہ آپ ان کی پوری گفتگو سن لیں جس وجہ سے وہ دونوں داخل ہوئے تھے یہاں تک کہ اس کی حقیقت سے آپ آگاہ ہو جائیں اور یہ دیکھ لیں کہ کیا بغیر اجازت کے داخل ہونا لازم آتا ہے یا کہ نہیں، کیا اس کے ساتھ ساتھ کوئی عذر بھی ہوا ہے یا ان کے لیے کوئی عذر نہیں آخری صورت حال یہ ظاہر ہوئی کہ یہ تو محض آزمائش اور امتحان تھا اور مثال تھی جو اللہ تعالیٰ نے قصہ میں بیان کرنا چاہی اور یہ ایک ادب تھا جو دعویٰ عصمت واقع ہوا تھا۔ (4) یہ احتمال موجود ہے کہ یہ مسجد میں ہوا ہو اور مسجد میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کسی کو روکنا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ پانچواں قول ہے جسے قشیری نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے کہا: جب پہرے داروں نے ہمیں اجازت نہ دی تو ہم دیواریں پھلانگ کر پہنچ گئے اور ہمیں ڈر تھا کہ معاملہ ہمارے درمیان سر پٹول کا باعث بن جائے گا حضرت داؤد علیہ السلام نے اس عذر کو قبول کیا اور ان کے قول کی طرف توجہ کی۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ خَصْمٰنِ اگر یہ سوال کیا جائے کہ خَصْمٰنِ کیسے فرمایا جبکہ اس سے قبل فرمایا تھا اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تو دو بھی جمع ہے۔ خلیل نے کہا: جس طرح تو کہتا ہے: نحن فعلنا جب تم دو ہوتے ہو۔ کسائی نے کہا: جب خبر تھی تو جمع کا ذکر کیا جب خبر ختم ہوگئی اور مخاطبہ شروع ہوا تو دونوں نے اپنے بارے میں خبر دی تو کہا: خَصْمٰنِ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے نحن خصمان دوسرے علماء نے کہا: قول محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یقول خصمان بغی بعضنا علی بعض۔ کسائی نے کہا: اگر کلام یوں ہو بغی بعضهما علی بعض تو یہ بھی جائز ہوتا۔ ماوردی نے کہا: دونوں فرشتے تھے وہ نہ جھگڑا کرنے والے تھے اور نہ ہی باغی تھے اور نہ ہی ان سے کوئی جھوٹی بات واقع ہوئی تھی (1)۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: إن أتاك خصمان قالا بغی بعضنا علی بعض۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تقدیر کلام یوں ہے نحن فریقان من الخصوم بغی بعضنا علی بعض اس بنا پر یہ احتمال موجود ہے کہ خصومت دو افراد کے درمیان ہو اور ہر ایک کے ساتھ ایک جمعیت ہو۔ یہ احتمال بھی موجود ہے ایک فریق کے ہر ایک فرد کی دوسرے فریق کے ہر ایک آدمی کے ساتھ خصومت ہو وہ اپنی اپنی خصومتوں کے لیے حاضر ہوئے ہوں لیکن ان میں سے دو افراد نے آغاز کیا ہو اور حضرت داؤد علیہ السلام نکاح کے ذکر سے تمام قصہ سے آگاہ ہو گئے ہیں اور اس چیز نے انہیں دوسری خصومات سے مستغنی کر دیا ہے۔ بغی کا معنی تعدی کرنا اور فریضہ سے نکلنا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے بغی الجرح۔ جب درد بڑھ جائے اور بہت بڑا ہو جائے اسی سے ایک جملہ بولا جاتا ہے: بغت المرأة۔ جب وہ بدکاری کا ارتکاب کرے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ یعنی ناانصافی نہ کیجئے؛ یہ سدی نے کہا ہے۔ ابو عبید نے کہا: شططت علیه واشططت۔ میں نے اس پر ظلم کیا۔ تمیم داری کی حدیث میں ہے انك لشاطی یعنی تو حکم میں مجھ پر ظلم کرنے والا ہے۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے تو مائل نہ ہو۔ اخفش نے کہا: آپ اسراف سے کام نہ لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: آپ افراط سے کام نہ لیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ اس کا اصل معنی دور ہونا ہے یہ شَطَتِ الدار سے ماخوذ ہے یعنی گھر دور ہے شطت الدار تشِط، تشَط شطا و شطوطا گھر دور ہے اشط فی القضیته۔ اس نے فیصلہ میں ظلم کیا اشط فی السوم واشتط۔ بھاؤ لگانے میں بہت دور چلا گیا۔ اشطوا فی طلبی انہوں نے میری طلب میں بہت کوشش کی۔ ابو عمرو نے کہا شطط کا معنی ہے ہر شے میں حد سے بڑھنا حدیث طیبہ میں ہے لها مهر مثلها لاوکس ولا شطط اس کے لیے مہر مثل ہے نہ کم نہ زیادہ۔ قرآن حکیم میں ہے: لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ (الکہف) یعنی ہم نے ظلم کیا اور حق سے بہت بعید بات کی اور ہماری سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی فرما۔ سواء الصراط سے مراد قصد السبیل ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 86

**مسئلہ نمبر 8۔** اس فرشتہ نے کہا جس نے اوریا کی جانب سے گفتگو کی: یہ میرا دینی بھائی ہے اور مدعی علیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ أخی سے مراد میرا ساتھی ہے۔ حضرت حسن بصری نے تسع و تسعون پڑھا ہے۔ یہ شاذ لغت ہے۔ حضرت حسن بصری کی قراءت میں یہی صحیح ہے؛ یہی نحاس نے کہا ہے۔ عرب عورت کو کفاية، نعجة اور شاة سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس میں سکون، عجز اور کمزوری پائی جاتی ہے بعض اوقات اسے بقرہ، حجرہ اور ناقہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ سب سواریاں ہیں۔ ابن عون نے اسی حوالے سے کہا:

أنا أبوهنّ ثلاثٌ هُنَّهْ رابعةٌ فی البیت صُغرا هُنَّهْ
ونعجتی خمسا تُوفِیهِنَّهْ ألا فتًی سمْحٌ یُغذِّیهِنَّهْ
طیُّ النَّقَا فی الجوع یَطْوِیهِنَّهْ ویلُ الرَّغیفِ ویلَهٗ مِنْهُنَّهْ

عنترہ نے کہا:

یَا شاۃَ ماقَنَصٍ لِمن حَلَّتْ لَهٗ حَرُمتْ علیَّ ولیتَها لم تَحْرُمِ
فَبَعَثْتُ جاریتی فقلتُ لها إذْهَبِی فَتَجَسَّسِی أخبارَها لی وَاعلِمِ
قَالتْ رَأَیْتُ منَ الأعادی غِرَّةً والشَّاۃُ مُمْکِنَةٌ لمن هو مُرْتَمِ
فَکَأَنَّمَا الْتَفَتَتْ بجِیدِ جِدایةٍ رَشَاءٍ مِنَ الغِزْلانِ حُرٍ أَرْثَمِ

ایک اور شاعر نے کہا:

فَرَمَیْتُ غَفْلَةَ عَیْنِهِ عَنْ شَاتِه فَأَصَبْتُ حَبَّةَ قَلْبِها وطِحَالَهَا(1)

میں نے اس کی آنکھ کو اپنے بیوی سے غافل پایا تو میں اس کے دل کے نقطہ اور اس کی تلی تک جا پہنچا۔

یہ بہت ہی اچھی تعریض ہے کہ عورتوں کو دنبیوں سے تعبیر کیا۔ حسین بن فضل نے کہا: یہ دونوں فرشتوں کی جانب سے تعریض اور تنبیہ ہے جس طرح ان کا قول ہے ضرب زید عمروا جبکہ وہاں مارنے کا کوئی تصور نہ تھا جبکہ وہاں دنبیاں حقیقت میں نہ تھیں گویا یوں کہا: نحن خصمان هذه حالنا ہم دو جھگڑا کرنے والے ہیں یہ ہماری حالت ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: اس کے بارے میں جو بہترین گفتگو کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دو جھگڑا کرنے والے کہتے ہیں: ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے یہ سوال کے انداز میں تھا جس طرح تو کہتا ہے: ایک آدمی ہے جو عورت کو یہ کہتا ہے تو اس مرد پر کیا چیز واجب ہوئی؟

میں کہتا ہوں: امام شافعی کے ایک مقلد المزنی نے اس آیت اور ابن شہاب سے مروی حدیث جو موطا امام مالک میں ہے هولكَ یا عبدُ بنَ زَمْعَةَ کی تاویل ایک جیسی کی ہے۔ مزنی نے کہا: میرے نزدیک اس حدیث کا یہ احتمال ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کا جواب دیا اور انہیں حکم سے آگاہ کیا کہ یہ حکم اس وقت ہوگا جب ایک آدمی صاحب فراش ہونے اور دوسرا بدکار ہونے کا دعویٰ کرے نہ کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے عتبہ کے خلاف سعد کا قول قبول کیا اور نہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 500

ہی زمعہ کے خلاف اس کا قول قبول کیا کہ وہ ولد زنا ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے ایک اور شخص کے بارے میں خبر دی تھی۔ تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کسی ایک آدمی کا اقرار کسی دوسرے فرد کے خلاف قبول نہ کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حضرت داؤد اور فرشتوں کے قصہ میں اسی کی مثل ذکر کیا ہے جب وہ آپ کے پاس آئے تو حضرت داؤد علیہ السلام ان کو دیکھ کر گھبرا گئے انہوں نے کہا: خوف زدہ نہ ہوں وہ جھگڑا کرنے والے ہیں، جبکہ وہ جھگڑا کرنے والے نہ تھے نہ ان میں سے ایک کی ننانوے دنبیاں تھیں لیکن انہوں نے ایک مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تاکہ وہ پہچان لیں جس کی پہچان کرانے کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصہ میں سوال کے بارے میں حکم لگایا ہو اگرچہ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو حدیث میں اس تاویل پر میری موافقت کرتا ہو کیونکہ میرے نزدیک یہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ نحاس نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً انثی اس آیت میں کان اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء) جہاں تک اس آیت میں انثی کا تعلق ہے تو یہ تاکید کے لیے ہے جس طرح یوں کہا جاتا ہے: هو رجل ذكر یہ بھی تاکید ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہ کہا جائے هذه مأة نعجة اگرچہ ان میں کچھ تھوڑے سے مذکر بھی ہوں تو یہ کہنا جائز ہوگا، انثی تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان میں کوئی بھی مذکر نہیں تفسیر میں ہے اس کی ننانوے بیویاں ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اگر وہ ساری آزاد ہوں تو یہ انکا شرعی حکم ہوگا اگر وہ لونڈیاں ہوں تو یہ ہماری شریعت میں بھی جائز ہے ظاہر بات یہ ہے کہ ہم سے قبل شریعتوں میں یہ حکم کسی عدد میں محصور نہ تھا یہ صرف حضرت محمد مصطفی علیہ التحیۃ والثناء کی شریعت میں ہے کیونکہ بدن کمزور ہیں اور عمریں کم ہیں۔

قشیری نے کہا: یہ بھی جائز ہے یہ معین عدد نہ ہو بلکہ مقصود ضرب المثل ہو جس طرح تو کہتا ہے: لو جئتني مأة مرة لم أقض حاجتك مراد ہے اگر آپ کئی دفعہ آئیں تو تب بھی میں تمہارا کام نہ کروں گا۔

ابن عربی نے کہا: ایک مفسر نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں نہ تھیں یہ ننانوے کا ذکر بطور مثال ہے معنی ہے یہ بیوی سے غنی ہے اور میں بیوی کا محتاج ہوں یہ دو وجوہ سے فاسد ہے: (1) بغیر دلیل کے ظاہر معنی سے عدل کسی بھی حوالے سے درست نہیں اور ایسی کوئی دلیل نہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہو کہ ہم سے قبل کی شریعتیں عورتوں کی تعداد کے بارے میں مخصوص حکم دیتی ہوں جس طرح ہماری شریعت میں ہے۔ (2) امام بخاری اور دوسرے محدثین نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا میں آج رات سو عورتوں پر چکر لگاؤں گا ہر عورت سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے گا اور ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ یعنی میری ایک بیوی ہے اب اس نے کہا ہے میرے لیے اس سے الگ ہو جا یہاں تک کہ میں اس کی کفالت کروں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تو یہ مجھے دے دے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: تو میرے لیے اس سے الگ تھلگ ہو جا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: اسے میرے حوالے

کر دے تا کہ میں اس کا کفیل بن جاؤں۔ ابن کیسان نے کہا: اسے میرا حصہ بنادے۔

وَعَزَّنِیْ وہ مجھ پر غالب آ گیا ہے۔ ضحاک نے کہا: معنی ہے اگر یہ گفتگو کرے تو یہ مجھ سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے اگر یہ جنگ کرے تو مجھ سے زیادہ طاقتور ہے یوں کہا جاتا ہے عَزَّہٗ یَعِزُّہٗ عَزًّا۔ اس پر غالب آ گیا۔ ضرب المثل ہے مَنْ عَزَّبَزَّ۔ جو غالب آیا اس نے مال سلب کر لیا اسی سے اسم عزۃ ہے جس کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ شاعر نے کہا:

قَطَاۃٌ عَزَّھَا شَرَکٌ فَبَاتَتْ تُجَاذِبُہٗ وَقَدْ عَلِقَ الْجَنَاحُ

کونج پر پھندا غالب آ گیا اس نے جال کو کھینچتے ہوئے رات گذاری جبکہ پر جکڑے ہوئے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبید بن عمیر نے وعازنی فی الخطاب قراءت کی جس کا معنی ہے اس نے مجھ پر غلبہ پایا یہ معازہ سے مشتق ہے جس کا معنی مغالبہ ہے عازہ، اس پر غلبہ پایا۔ ابن عربی نے کہا: غلبہ کے سبب کے بارے میں اختلاف ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے بیان کے ذریعے مجھ پر غالب پا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنی حکومت کی وجہ سے مجھ پر غالب ہے کیونکہ جب یہ اس سے سوال کرے تو وہ اس کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتا۔ ہمارے شہر میں ایک امیر تھا جسے سیر بن ابی بکر کہتے میں نے اس سے گفتگو کی کہ وہ میرے لیے ایک آدمی سے ضرورت کا سوال کرے اس نے مجھے کہا کیا تجھے علم نہیں کہ حاکم کا کسی کام کا مطالبہ اس کا غضب ہوا کرتا ہے میں نے کہا: جب وہ عدل ہو تو وہ غضب نہیں ہو گا میں اس کے عجمی ہونے، ضرب المثل کے یاد کرنے اور اس کی ذہانت پر متعجب ہوا جس طرح وہ میرے جواب سے متعجب ہوا اور اسے غریب جانا۔

**مسئلہ نمبر 11۔** قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ نحاس نے کہا: یہ کہا جاتا ہے یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خطا تھی کیونکہ آپ نے کہا لَقَدْ ظَلَمَكَ کیونکہ دعویٰ گواہوں سے ثابت نہ ہوا تھا اور نہ ہی خصم کا اقرار ہوا تھا کہ کیا بات اسی طرح ہوئی تھی یا نہ ہوئی تھی۔ یہ ایک بحث ہے۔

اس کے بعد مسئلہ میں اس کی وضاحت آئے گی۔ ان شاء اللہ وہ بہت اچھی گفتگو ہو گی۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: جہاں تک ان علماء کے قول کا تعلق ہے جس کے قول کو رد نہیں کیا جا سکتا ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں کیونکہ انہوں نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کہ میرے لیے اپنی بیوی سے الگ ہو جا۔ ابو جعفر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو عتاب کیا اور اس پر انہیں متنبہ کیا یہ گناہ کبیرہ نہیں۔ جس نے اس کے علاوہ میں گفتگو کی تو بے شک وہ ایسی بات لاتا ہے جو عالم سے صحیح تصور نہیں کی جا سکتی اور اس کی وجہ سے عظیم گناہ بھی لاحق ہوتا ہے اسی کتاب اعراب قرآن میں کہا: اور اپنی کتاب معانی القرآن میں بھی اسی کی مثل کہا۔ کہا: حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کے بارے میں جو قصے اور روایات آتی ہیں ان میں سے اکثر صحیح نہیں اور ان کی سند متصل نہیں جب تک ان کی صحت کی پہچان نہ ہو اس جیسی گفتگو پر جرأت نہیں کرنی چاہیے ☆۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1633

☆ اس واقعہ کے حوالے سے جو بھی روایات مروی ہیں ان کے بارے میں یہی تجزیہ موزوں ہے۔ مترجم

ان روایات میں سے صحیح ترین وہ ہے جسے مسروق نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے زائد کلام نہیں کی اَكْفِلْنِيْهَا یعنی میرے لیے اس سے الگ ہو جا۔ منہال نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے زائد کچھ نہیں کہا اَكْفِلْنِيْهَا یعنی اسے میرے حوالے کر دے اور اسے میرے ساتھ ملا دے (1)۔ ابوجعفر نے کہا: اس بارے میں روایات مروی ہیں ان میں سے سب سے یہ عظیم روایت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا سے سوال کیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے جس طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہتا ہے کہ وہ اپنی لونڈی بیچ۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اس پر آگاہ کیا اور اس لیے عتاب فرمایا کیونکہ ان کی ننانوے بیویاں تھیں حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے یہ مطالبہ اس لیے ناپسند کیا کہ وہ عورتوں میں اضافہ کے ساتھ دنیا میں مشغول ہو جائیں جہاں تک اس کے علاوہ واقعات کا تعلق ہے اس میں جرأت نہیں کرنی چاہیے۔

ابن عربی نے کہا: جہاں تک اس قول کا تعلق ہے جب وہ عورت آپ کو اچھی لگی تو آپ نے اس کے خاوند کے بارے میں حکم دیا کہ جہاد میں اسے آگے رکھا جائے سب باطل ہے (2) کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام محض اپنی ذاتی غرض سے کسی کا خون بہانے والے نہ تھے صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے کسی ساتھی سے کہا میرے لیے اپنے گھر والے سے لاتعلق ہو جاؤ۔ اور اس بارے میں پختہ عزم کیا جس طرح ایک آدمی دوسرے سے سچی رغبت کے ساتھ کسی ضرورت کا مطالبہ کرتا ہے خواہ وہ ضرورت اہل میں ہو یا مال میں ہو۔

حضرت سعید بن ربیع نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں بھائی چارہ قائم کیا تھا میری دو بیویاں ہیں میں تیرے لیے ان میں سے سب سے زیادہ خوبصورت سے الگ ہوتا ہوں تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ تیرے اہل میں تیرے لیے برکت ڈالے جو فعل ابتداء جائز ہو اس کی طلب بھی جائز ہوتی ہے قرآن حکیم میں ہے کہ ایسی کوئی تصریح نہیں نہ اس کی وضاحت ہے کہ اس مرد کی عصمت کے بعد آپ نے شادی کی ہو نہ یہ تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس عورت سے ولادت ہوئی تھی یہ کس سے روایت کی جاتی ہے اور کس کی سند چلتی ہے کس کی نقل پر اعتماد کیا جاتا ہے کوئی آدمی بھی ثقہ لوگوں سے اسے بیان نہیں کرتا۔

سورت احزاب میں ایک نکتہ ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ایک عورت حضرت داؤد علیہ السلام کی بیوی بنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (الاحزاب: 38) یعنی ایک قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جس کو آپ نے دیکھا تھا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش سے شادی کی مگر حضرت زینب سے شادی اس کے بغیر ہوئی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کے خاوند سے جدائی کا مطالبہ کیا ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ فضیلت ان فضائل عالیہ کی طرف

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 87
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 37-1636

منسوب ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہیں۔

لیکن یہ بات کی جاسکتی ہے سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (احزاب:388) کا معنی یہ ہو کہ انبیاء نے ان عورتوں سے مہر کے بغیر شادیاں کی ہوں جنہوں نے اپنے آپ کو انبیاء کے حضور پیش کیا ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کا وہ طبقہ ہے جو نکاح اور دوسرے معاملات اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری میں کرتے ہیں؛ یہ قول صحیح ترین ہے۔

مفسرین نے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے سو عورتوں سے شادی کی یہ قرآن کی نص ہے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تین سو بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ تیرا رب خوب جانتا ہے۔

طبری نے احکام میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ میں بیان کیا ہے، محققین جو انبیاء کے بارے میں گناہ کبیرہ سے پاک ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک ایسی عورت کو دعوت نکاح دی جس کو ایک اور آدمی نے دعوت نکاح دی تھی جو ''اوریا'' تھا اس عورت کے رشتہ داروں نے حضرت داؤد علیہ السلام میں رغبت اور پہلے مرد سے اعراض کی وجہ سے اس عورت کی شادی آپ سے کر دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا آپ کے لیے ممکن تھا کہ آپ اس سے آگاہی حاصل کرتے تو اس رغبت سے اعراض کرتے اور اس رغبت سے اعراض کرتے، اس دعوت نکاح سے اعراض کرتے مگر آپ نے ایسا نہ کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ عورت آپ کو اچھی لگی تھی یا تو کسی نے اس کے اوصاف بیان کیے تھے یا بغیر ارادہ کے مشاہدہ کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی کثیر بیویاں تھیں دوسرے دعوت نکاح دینے والے کی کوئی بیوی نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کے دیوار پھلانگ کر اندر آنے سے اس امر پر آپ کو آگاہ کیا اور انہوں نے جو مثال بیان کی بطور تعریض حضرت داؤد علیہ السلام کو اس امر پر آگاہ کیا تا کہ اس کے واسطہ سے وہ عتاب کے موقع کو پہچان لیں اور اس طریقہ سے ہٹ جائیں اور اس چھوٹے گناہ سے اپنے رب سے بخشش طلب کریں۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ اس جھگڑے میں ایک فریق کی گفتگو سننے اور دوسرے کی گفتگو سننے سے قبل فتویٰ دے دیا اس قول کا ظاہر مفہوم یہی ہے (1)۔

ابن عربی نے کہا: یہ طریقہ کسی کے نزدیک جائز نہیں، کسی ملت میں جائز نہیں اور کسی بشر کے لیے یہ ممکن نہیں تقدیر کلام یہ ہے دو جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک نے دعویٰ کیا اور دوسرے نے دعویٰ کو تسلیم کر لیا تو اس کے بعد فتویٰ واقع ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض لأحدهما حتی تسمع من الآخر۔ (2) جب تیرے پاس دو جھگڑے والے آئیں تو آپ کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ کریں یہاں تک کہ آپ دوسرے کی بات سنیں۔ ایک قول یہ کیا گیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1637

2۔ سنن ابی داؤد، باب کیف القضاء، روایت بالمعنی، حدیث نمبر 3111، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء فی القاضی لا یقضی بین الخصمین، حدیث نمبر 1252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: حضرت داؤد علیہ السلام نے دوسرے کے حق میں فیصلہ نہیں کیا یہاں تک کہ دوسرے فریق نے اعتراف نہیں کر لیا(1)۔
ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے لقد ظلمك إن كان كذالك اگر معاملہ اس طرح ہے تو اس نے تجھ پر ظلم کیا۔

میں نے کہا: ان دونوں توجیہات کا ذکر قشیری، ماوردی اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ قشیری نے کہا: لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ خصم کا کلام سنے بغیر فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ یہ کہنا ممکن ہے: آپ نے یہ بات دوسرے فریق کی گفتگو سننے اور اس کے اعتراف کے بعد فیصلہ کیا ہو یہ بیان کیا گیا ہے اگرچہ اس کی روایت ثابت نہیں یہ قرائن حال سے مفہوم ہے۔ یا یہ ارادہ کیا ہو اگر بات اس طرح ہو جس طرح تو کہتا ہے تو اس نے تجھ پر ظلم کیا آپ نے یہ قول کر کے اس کو خاموش کرایا ہو اور اسے صبر کی تلقین کی تا کہ دوسرے فریق سے بات پوچھ لیں۔ کہا: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کہا جائے ان کا قانون یہ ہو جب مدعیٰ علیہ خاموش ہو جائے تو مدعی کے قول پر اعتماد کیا جائے جب قول کا انکار ظاہر نہ ہو۔

حلیمی ابو عبد اللہ نے کتاب منہاج الدین میں کہا: وہ نعمت جس کا انتظار ہو جب وہ حاضر ہو یا پوشیدہ ہو تو ظاہر ہو جائے تو اس کے شکر میں حکم آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتا ہے۔ کہا: اس میں اصل وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ۔۔۔ وَ حُسْنَ مَاٰبٍ۝ ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں خبر دی آپ نے دو جھگڑا کرنے والوں میں سے مظلوم بننے والے فرد کی گفتگو سنی اور یہ نہیں بتایا کہ آپ نے کسی دوسرے سے سوال کیا یہ بیان کیا کہ اس نے ظلم کیا ہے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے گفتگو کرنے والے میں کمزوری کی علامات دیکھیں تو آپ نے اس کے معاملہ کو اس بات پر محمول کیا کہ وہ مظلوم ہے جس طرح وہ کہتا ہے اس چیز نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس طرف دعوت دی کہ آپ خصم سے نہ پوچھیں تو آپ نے جلدی کرتے ہوئے اسے کہا: لَقَدْ ظَلَمَكَ جبکہ یہ امکان تھا کہ اگر آپ اس سے پوچھتے تو وہ کہتا: میری سو دنبیاں تھیں اور اس کی کوئی چیز نہ تھی اس نے میری ایک دنبی چوری کی تھی۔ جب میں نے وہ دنبی اس کے پاس پائی تو میں نے اسے کہا: اسے میری طرف لوٹا دو میں نے اسے اَكْفِلْنِيْهَا نہیں کہا اسے علم تھا کہ میں یہ مسئلہ آپ کی بارگاہ میں پیش کروں گا تو قبل اس کے کہ میں اسے آپ کے پاس لاتا یہ مجھے آپ کے پاس کھینچ کر لے آیا ہے اور میرے حاضر کرنے سے پہلے یہ مظلوم بن کر آ گیا ہے تا کہ آپ یہ گمان کریں کہ یہ حق پر ہے اور میں ظالم ہوں جب حضرت داؤد علیہ السلام نے گفتگو کی جس گفتگو پر جلد بازی نے آپ کو مجبور کیا تھا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی لمحہ اسے اور اس کے نفس کو آزاد چھوڑ دیا تھا وہ وہی آزمائش تھی جس کا ہم نے ذکر کیا اور یہ امران کی ایک لغزش سے ہوا تھا تو انہوں نے اپنے رب سے مغفرت طلب کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے کہ اس نے انہیں محفوظ رکھا کہ انہوں نے اس آدمی کے بارے میں ظالم ہونے کے قول پر اکتفا کیا اس سے بڑھ کر انہیں جھڑکنا، مارنا وغیرہ کا عمل نہیں کیا جو اس کے مناسب تھا جو دل میں سوچتا ہے کہ واقعی وہ ظالم ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی غلطی معاف کر دی پھر عتاب کے انداز میں اس کی طرف توجہ کی فرمایا: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

1۔ المستدرک للحاکم، باب استماع بیان الخصمین واجب علی القاضی، جلد 4، صفحہ 93

اللہ تعالیٰ نے جو نصیحت آموز قصہ بیان کیا جسے مغفرت کے بعد انہوں نے پہچانا تھا کہ خطا حکم میں تقصیر اور اس آدمی کو ظالم قرار دینے میں جلدی کرنے میں تھی جس کا ظلم ان کے نزدیک ثابت نہ تھا پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتباع میں سجدہ کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سجدہ شکر انبیاء علیہم السلام کی سنت متواترہ ہے۔

بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے سوال سے ھاء ضمیر کو گرادیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ (حم السجدہ: 49) اس میں یہ دعائه الخیر تھا۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ، خلیط کی جمع خلطاء ہے مگر طویل کی جمع طولاء نہیں کہتے کیونکہ واؤ پر حرکت ثقیل ہے اس میں دو توجیہیں ہو سکتی ہیں: (1) وہ دونوں ساتھی تھے (2) وہ دونوں شریک تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: خلطاء کا اطلاق شرکاء پر بہت ہی بعید ہے، علماء نے خلطاء کی صفت میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر علماء نے ذکر کیا ہے یہ ایک آدمی اپنا ریوڑ لائے، ان سب کو ایک چرواہا، ایک ڈول اور چراگاہ جمع کرے۔ طاؤس اور عطا نے کہا: خلطاء، شرکاء ہی ہوتے ہیں، یہ حدیث کے خلاف ہے وہ حدیث یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا يُجمع بين مفترق ولا يُفرّق بين مجتمع خشية الصدقه وما كان من خليطين فإنهما يتراجعان بينهما بالسوية (2) صدقہ کے ڈر سے جو الگ الگ کی ملکیت ہیں ان کو جمع نہیں کیا جائے گا اور جو ایک کی ملکیت ہیں ان کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا جو دو خلیطوں کی ہیں ان پر برابر حکم ہوگا۔ روایت بیان کی گئی: فانهما يترادان الفضل۔ جبکہ شریکوں میں زائد چیز کو لوٹانے کا کوئی محل نہیں اسے خوب ذہن نشین کر لیجئے۔ خُلطه کے احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ امام مالک، آپ کے اصحاب اور علماء کی ایک جمیعت کا نقطہ نظر ہے اس آدمی پر زکوٰۃ نہیں جس کے حصہ میں اتنا مال نہ ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

ربیع، لیث اور علماء کی ایک جماعت جن میں امام شافعی بھی ہیں: جب تمام مال اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہو تو ان سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ امام مالک کا کہنا ہے: اگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان سے زکوٰۃ وصول کرتا ہے تو وہ آپس میں اسے باہم حصہ کے مطابق تقسیم کریں گے کیونکہ اس میں اختلاف ہے یہ بھی حاکم کے اس حکم کی طرح ہے جس میں اختلاف کیا گیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وہ تعدی کرتا ہے اور ظلم کرتا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کیونکہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ یعنی وہ صالحین تھوڑے ہیں یہاں ما زائدہ ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما، الذین کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی قليل الذين هم۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دعا میں یہ کہتے ہوئے سنا: اللّٰھم اجعلنی من عبادك القليل اے اللہ! مجھے اپنے قلیل بندوں میں سے بنادے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: یہ دعا کیسی ہے تو اس آدمی نے عرض کی: میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ارادہ کیا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 88

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، لایجمع بین مفترق ولا یفرق بین مجتمع، جلد 1، صفحہ 195

ھُمْ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! تمام لوگ تجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ یعنی ہم نے اسے آزمایا(1) وَظَنَّ کا یہاں معنی ہے اسے یقین ہوگیا۔ ابو عمرو اور فراء نے کہا: ظن، أیقن کے معنی میں ہے مگر فراء نے یہ وضاحت کی ہے جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا جار ہا ہو اس میں ظن، یقین کے معنی میں ہوتا ہے۔ قراءت نون کی تشدید کے ساتھ ہے تاء مشدد نہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے فَتَنّٰاہ پڑھا ہے یہ مبالغہ کے لیے ہوگا۔ قتادہ، عبید، ابن عمیر اور ابن سمیقع نے فتناہ پڑھا ہے۔ علی بن نصر نے ابوعمرو سے اسی طرح روایت کی ہے اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے مسجد میں دونوں کے درمیان فیصلہ کیا تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیا، حضرت داؤد علیہ السلام سمجھ نہ سکے دونوں نے پسند کیا کہ ان دونوں کو پہچان کرائیں تو دونوں ان کے سامنے آسمان میں بلند ہو گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام کو علم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا ہے اور اس آزمائش پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کر دیا۔

میں کہتا ہوں: قرآن حکیم میں کوئی ایسی آیت نہیں جو مسجد میں فیصلہ پر دلالت کرتی ہو مگر یہ آیت ولالت کرتی ہے جو آدمی یہ کہتا ہے کہ مسجد میں فیصلہ کرنا درست ہے وہ اسی آیت سے استدلال کرتا ہے امام شافعی جس طرح کہتے ہیں اس طرح اگر یہ ناجائز ہوتا تو حضرت داؤد علیہ السلام انہیں وہاں نہ ٹھہراتے بلکہ ارشاد فرماتے: فیصلہ کی جگہ چلو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء مساجد میں فیصلہ کرتے۔ امام مالک نے فرمایا: مسجد میں فیصلہ قدیمی معاملہ ہے(2) یعنی بہت سے امور میں ایسا کرنا جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسجد کے صحن میں قاضی بیٹھے تا کہ کمزور، مشرک اور حائضہ عورت وہاں تک پہنچ سکے اس میں حدود قائم نہ کرے تھوڑی بہت تنبیہ میں کوئی حرج نہیں۔ اشہب نے کہا: وہ اپنے گھر میں اور جہاں چاہے فیصلہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: خلفاء خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ امراء میں سے سب سے پہلے جس نے فیصلہ کرانا چاہا وہ حضرت امیر معاویہ تھے۔ امام مالک نے کہا: قاضیوں کو چاہیے کہ علماء سے مشورہ لیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: وہ فیصلہ نہ کرے یہاں تک کہ گذشتہ قاضیوں کے آثار سے آگاہ نہ ہو، اصحاب رائے سے مشورہ لے، حلیم، پاکدامن ہو کہا: وہ متقی ہو۔ امام مالک نے کہا: مناسب یہ ہے کہ وہ بیدار مغز ہو، حیلوں بہانوں سے بہت زیادہ بچنے والا ہو، وہ شروط سے واقف ہو، جتنی عربی کے بغیر چارہ نہ ہو اتنا اسے جانتا ہو کیونکہ عبارات، دعووں، اقرار، شہادت جو محکوم علیہ کے حقوق کو متضمن ہو ان کے مختلف ہونے سے احکام مختلف ہو جاتے ہیں۔ قاضی کے لیے مناسب ہے کہ وہ مطلوب کو حکم نافذ کرنے سے پہلے کہے: کیا تیری کوئی دلیل باقی ہے۔

اگر وہ کہے کہ کوئی دلیل باقی نہیں تو وہ اس پر حکم لگا دے وہ حکم کے نفاذ کے بعد کوئی دلیل قبول نہیں کرے گا، مگر اس صورت میں کہ اس کی کوئی وجہ ہو یا دلیل ہو۔ قضا اور قاضیوں کے احکام جو ان کے حق میں ہیں یا خلاف ہیں کسی اور جگہ مذکور ہیں۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 88

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1638

**مسئلہ نمبر 18۔ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ** مفسرین نے اس خطا کی تفسیر میں اختلاف کیا جس سے حضرت داؤد علیہ السلام نے مغفرت طلب کی تھی انہوں نے کہا: اس کی چھ صورتیں ہیں:

1۔ آپ نے اس عورت کو دیکھا یہاں تک کہ سیر ہوئے (1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: ان کی آزمائش دیکھنا ہی تھی۔ ابواسحاق نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے عورت کو ارادۃً نہیں دیکھا تھا لیکن نظر دوبارہ اس کی طرف لوٹ گئی۔ پہلی نظر ان کے حق میں رہی اور دوسری نظر ان کے خلاف ہوئی۔

2۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تابوت کے حملہ میں اس عورت کے خاوند کو جنگ میں بھیجا (2)۔

3۔ انہوں نے یہ نیت کی تھی اگر اس کا خاوند فوت ہو گیا تو وہ اس عورت سے شادی کر لیں گے (3)۔

4۔ اوریا نے اس عورت کو دعوت نکاح دی تھی جب وہ کہیں چلا گیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اس عورت کو دعوت نکاح دی تو اس عورت نے حضرت داؤد علیہ السلام کی جلالت شان کی وجہ سے آپ سے شادی کر لی، اوریا اس وجہ سے غمگین ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس امر پر عتاب کیا کہ آپ نے اس کے منگیتر کے لیے اسے کیوں نہ چھوڑا جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاں پہلے سے ننانوے بیویاں تھیں۔

5۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کے قتل پر ایسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا جس طرح آپ اس وقت پریشانی کا اظہار کرتے تھے جبکہ کوئی لشکر میں سے آدمی قتل ہوتا، پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے انہیں عتاب کیا، کیونکہ انبیاء کے گناہ اگرچہ چھوٹے ہوں تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم ہوتے ہیں۔

6۔ آپ نے دوسرے فریق کی گفتگو سننے سے قبل ہی فیصلہ کر دیا تھا۔

قاضی ابن عربی نے کہا: جس نے یہ کہا کہ آپ نے دوسرے فریق کی گفتگو سننے سے قبل ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا تو یہ بات انبیاء کے بارے میں کہنا جائز نہیں اسی طرح اس کے خاوند کو قتل کے لیے پیش کرنا بھی صحیح نہیں (4)۔

جہاں تک اس آدمی کے قول کا تعلق ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس عورت کو دیکھا اور جی بھر کر دیکھا تو میرے نزدیک یہ کسی حال میں بھی جائز نہیں کیونکہ نظر کا سرکش ہونا ان اولیاء کے حق میں مناسب نہیں جو عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں تو ان انبیاء کے حق میں کیسے جائز ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ اور غیب کا مشاہدہ کرنے والے ہیں۔

سدی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: اگر میں نے کسی انسان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے کسی حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے تو میں اس کو ایک سو ساٹھ کوڑے ماروں گا کیونکہ عام انسانوں پر تہمت لگانے والے پر اسی کوڑے اور انبیاء پر تہمت لگانے والوں کے لیے ایک سو ساٹھ کوڑے ہوں گے: اسے ماوردی اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1638　2۔ ایضاً
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 89　4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 39-1638

ثعلبی نے کہا: حرث اعور نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جس نے حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ اس انداز میں بیان کیا جس طرح قصہ گو آدمی بیان کرتے ہیں جبکہ وہ اس کا اعتقاد بھی رکھتا ہو تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا، کیونکہ اس نے اس ہستی جس کے مقام کو اللہ تعالیٰ نے بلند کیا ہے، اپنی مخلوق میں سے جس پر راضی ہوا ہے تو اسے دونوں جہانوں کے لیے رحمت اور مجتہدین کے لیے حجت بنایا ہے، اس ہستی پر اس نے تہمت لائی ہے تو اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔

ابن عربی نے کہا: یہ روایت ان میں سے نہیں جو حضرت علی شیر خدا سے صحیح منسوب ہے (1) اگر یہ سوال کیا جائے: تمہارے نزدیک اس کا کیا حکم ہے؟۔

ہم کہتے ہیں: جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو یہ کہے: نبی نے بدکاری کی ہے، تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے اس سے کم درجہ کا جرم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جیسے دیکھنا اور ہاتھ سے چھونا ہے تو لوگوں سے اس بارے میں مختلف اقوال مروی ہیں: اگر ایک آدمی آپ کے بارے میں قطعی رائے کا اظہار کرے اور اس امر کو ان کی طرف منسوب کرے تو میں اسے قتل کر دوں گا، کیونکہ یہ اس تعزیر کے خلاف ہے جس کا حکم کیا گیا ہے۔

جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ آپ کی نظر ایسی عورت پر پڑی جو غسل کر رہی تھی اور ننگی تھی۔ جب اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے بال بکھیر لیے اور اپنے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اجماع امت کے ساتھ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ پہلی نظر نے ان کے لیے دیکھی جانے والی چیز کو ظاہر کیا اسے دیکھنے والا گناہ گار نہ ہوگا۔ جہاں تک دوسری نظر کا تعلق ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔

جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ آپ نے یہ نیت کی تھی کہ اگر اس کا خاوند فوت ہو گیا تو وہ اس عورت سے شادی کر لیں گے تو اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی کیونکہ آپ نے اسے موت کے لیے پیش نہیں کیا۔ جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ آپ نے اوریا کی دعوت نکاح کے بعد دعوت نکاح دی تو یہ باطل ہے۔ قرآن اور تمام تفسیری آثار اس کو رد کرتے ہیں۔

اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ جو کبوتری آئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے قریب گری وہ سونے کی تھی جب حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے دیکھا تو وہ آپ کو بھلی لگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اٹھے تاکہ اسے پکڑ لیں وہ ہاتھ بھر ہی دور تھی پھر آپ نے یہ عمل دو دفعہ کیا پھر وہ اڑ گئی آپ کی نظر اس کے پیچھے گئی تو آپ کی نظر اس عورت پر جا پڑی جبکہ وہ عورت غسل کر رہی تھی اور اس کے لمبے بال تھے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ چالیس دن تک سجدہ ریز رہے یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں کی آنسوؤں سے گھاس اُگ آئی۔

ابن عربی نے کہا: جہاں تک مفسرین کا یہ قول ہے کہ ایک پرندہ آپ کے پاس داخل ہوا آپ نے اسے پکڑنے کا ارادہ کیا آپ نے اس کا پیچھا کیا تو یہ عبادت کے منافی نہیں کیونکہ اس کا کرنا مباح ہے خصوصاً وہ چیز حلال ہو اور حلال کا طلب کرنا فرض ہے۔ آپ نے اس کا پیچھا اس پرندے کی ذات کی وجہ سے کیا تھا اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں کیا تھا کیونکہ خوبصورتی میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1639

آپ کے لیے کوئی نفع نہ تھا۔ مفسرین کا پرندے کے حسن کا ذکر کرنا یہ جہالت میں اختراع ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ پرندہ سونے کا تھا آپ نے اس کا پیچھا کیا تا کہ اسے پکڑ لیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس طرح صحیح میں مروی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام ننگے غسل کر رہے تھے تو ان پر سونے کی ٹڈیاں گرنے لگیں (1) آپ ان سے چلو بھرنے لگے اور اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے ایوب! کیا میں نے تجھے غنی نہیں کیا؟ عرض کی: کیوں نہیں میرے رب! لیکن تیری برکت سے بے نیاز نہیں''۔

قشیری نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑیں تا کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو دے دیں تو وہ پرندہ اڑ گیا اور کمرے کے روشن دان میں جا گرا؛ یہ ثعلبی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ وہ سجدہ میں گر گئے سجود کو رکوع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا:

فخرّ علی وجهه راكعًا وتابَ إلى الله مِنْ كُلِّ ذنب (2)

وہ منہ کے بل سجدہ میں گر گیا اور اس نے ہر گناہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی۔

ابن عربی نے کہا: علماء میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہاں رکوع سے مراد سجدہ ہے (3) کیونکہ سجود سے مراد مائل ہونا اور رکوع سے مراد دوہرا ہونا ہے، ان میں سے ایک دوسرے میں داخل ہے لیکن بعض اوقات ان میں سے ہر ایک اپنی نیت کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پھر یہ ایک دوسرے کے نام کے ساتھ واقع ہوا ہے اور سجود کو رکوع کا نام دیا ہے۔

مہدوی نے کہا: ان کا رکوع میں سجدہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا سجود رکوع تھا۔ مقاتل نے کہا: وہ اپنے رکوع سے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئے، یعنی جب آپ نے معاملہ کو محسوس کیا تو نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے پھر رکوع سے سجدہ میں گرے کیونکہ دونوں دوہرا ہونے پر مشتمل ہیں۔

وَّ اَنَابَ یعنی اپنی خطا سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے۔ حسین بن فضل نے کہا کہ مجھ سے عبداللہ بن طاہر (جو والی تھا) نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَخَرَّ رَاكِعًا کے بارے میں پوچھا: کیا رکوع کرنے والے کو خر سے تعبیر کرتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ پوچھا: اس آیت کا معنی کیا ہے؟ میں نے کہا: اس کا معنی ہے پہلے رکوع میں تھے پھر سجدہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سجدہ میں اختلاف کیا گیا ہے، کیا یہ ان فرائض سے ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے یا نہیں؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ○ کی تلاوت کی جب سجدہ تک پہنچے تو نیچے اترے سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا جب دوسرا دن ہوا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، ایوب إذ نادی ربه أني مسني الضر، جلد 1، صفحہ 480

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 89

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 40-1639

اس کی قراءت کی تو پھر سجدہ کے لیے تیار ہوئے (1) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”یہ ایک نبی کی توبہ تھی لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم نے سجدہ کا ارادہ کیا ہے“ آپ اترے اور سجدہ کیا؛ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (2)۔

بخاری اور دوسری کتب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: سورۂ ص کا سجدہ قرآن کے فرائض میں سے نہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا: ”ص“ کا سجدہ ایک نبی کی توبہ تھی اور آپ اس میں سجدہ نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ ایک نبی اور تمہارے نبی کی توبہ ہے؛ جن کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے۔

ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک یہ سجدہ کی جگہ نہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے سجدہ کیا تو ہم نے آپ کی اقتدا کرتے ہوئے سجدہ کیا۔ سجود کا معنی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور عاجزی کرتے ہوئے اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے اور اپنی خطا سے توبہ کرتے ہوئے سجدہ کیا۔ جب کوئی اس میں سجدہ کرے تو اسی نیت سے اس میں سجدہ کرے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کی اتباع کے واسطہ سے اس کے گناہ بخش دے۔ یہ مسئلہ برابر ہے کہ ہم کہیں کہ ہم سے قبل کی شریعت ہمارے لیے شریعت ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہ ایسا امر ہے جو ہر امت میں ہر ایک کے لیے مشروع ہے۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ ابن خویز منداد نے کہا: وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ میں یہ دلیل موجود ہے کہ اکیلا سجدہ شکر جائز نہیں کیونکہ اس کے ساتھ رکوع کا ذکر موجود ہے جو جائز ہے وہ یہ ہے کہ وہ شکرانہ کے طور پر دو رکعت نماز پڑھے۔ جہاں تک اکیلے سجدہ کا تعلق ہے تو یہ جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بشارتیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد ائمہ کو بھی آتی رہی تھیں۔ ان میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں کہ نبیوں نے سجدہ شکر کیا ہو۔ اگر اس پر عمل ہوتا تو ظاہر طور پر عمل ہوتا کیونکہ عام لوگوں کو اس کی حاجت تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ یہ قربت تھی۔

میں کہتا ہوں: سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی جس روز آپ کو ابوجہل کے مرنے کی بشارت دی گئی (3)۔ ابوبکرہ کی حدیث سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تک اگر کوئی ایسا امر پہنچتا جو آپ کو خوش کرتا تو شکر بجالاتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے (4)؛ یہ امام شافعی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ امام ترمذی اور دوسرے علماء نے روایت کیا کہ ایک انصاری رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حاجت کی نماز پڑھتا اور ایک درخت کی اوٹ لیتا وہ پڑھا کرتا صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۞ جب سجدہ تک پہنچتا تو سجدہ کرتا اور اس کے ساتھ درخت بھی سجدہ کرتا۔ اس صحابی نے اس درخت کو کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! اس سجدہ کے ساتھ میرے اجر کو بڑا کر دے اور اس کے بدلے میں شکر کی توفیق نصیب فرما (5)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1640
2۔ سنن ابی داؤد، باب السجود، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 200، ایضاً، حدیث 1201
3۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الصلاۃ والسجدۃ عند الشکر، حدیث 1380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1383۔ ایضاً ابوداؤد، باب فی سجود الشکر، 2393، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ سنن الترمذی، باب ما یقول فی سجود القرآن، حدیث نمبر 528، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں نے کہا: ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا عرض کی: میں نے آج رات وہ دیکھا ہے جو سونے والا دیکھتا ہے گویا میں ایک درخت کے تنے کے پاس نماز پڑھتا ہوں میں نے آیت سجدہ پڑھی تو میں نے سجدہ کیا تو میرے سجدہ کی وجہ سے درخت بھی سجدہ ریز ہو گیا۔ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! اس کے وسیلہ سے مجھ سے گناہ کو دور کر دے، اس کے بدلہ میں میرے لیے اجر لکھ دے، اپنے ہاں میرے لیے ذخیرہ بنا دے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے آیت سجدہ کو پڑھا اور سجدہ کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سجدہ میں اس قسم کے کلمات کہتے ہوئے سنا جو اس آدمی نے درخت کے کلمات بتائے تھے☆؛ ثعلبی نے اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا گویا میں درخت کے نیچے ہوں اور درخت سورۂ ص کی تلاوت کر رہا ہے جب وہ آیت سجدہ تک پہنچا تو اس میں درخت نے سجدہ کیا تو میں نے اسے سجدہ میں کہتے ہوئے سنا: میرے لیے اس کے بدلے میں اجر لکھ دے، اس کی وجہ سے مجھ سے گناہ کو اتار دے، اس کے بدلہ میں مجھے شکر کی توفیق نصیب فرما، اسے مجھ سے قبول فرما جس طرح تو نے اپنے بندے حضرت داؤد کے سجدہ کو قبول کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: ''اے ابو سعید! تو نے سجدہ کیا''؟ میں نے عرض کی: نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: ''تو درخت کی بنسبت سجدہ کرنے کا زیادہ مستحق تھا''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ ص کی تلاوت کی یہاں تک کہ سجدہ تک پہنچے اور سجدہ کیا پھر اس کی مثل کہا جس طرح درخت نے کہا تھا۔

**مسئلہ نمبر 23۔** فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ یعنی ہم نے اس کا گناہ بخش دیا (2)۔ ابن انباری نے کہا: فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ پر وقف تام ہے پھر تو وَ اِنَّ لَهٗ سے کلام شروع کرے گا۔ قشیری نے کہا: فَغَفَرْنَا لَهٗ پر عطف کرنا جائز ہے پھر ذٰلِكَ وَ اِنَّ لَهٗ سے تو کل کر شروع کرے گا جس طرح یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هٰذَا ۗ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ یعنی امر یہ ہے۔

عطا خراسانی اور دوسری علماء نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام چالیس روز سجدہ ریز رہے (3) یہاں تک کہ آپ کے چہرہ کے اردگرد کھیتی اگ گئی اور آپ کے سر کو ڈھانپ لیا اور یہ ندا کی گئی کہ کیا تو بھوکا ہے کہ تجھے کھلایا جائے۔ کیا تو ننگا ہے کہ تجھے پہنایا جائے تو آپ نے ایک آہ بھری تو گھاس آپ کے پیٹ کی گرمی سے خشک ہو گئی تو آپ کو بخش دیا گیا اور اس پر پردہ ڈال دیا گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! یہ میرے اور تیرے درمیان گناہ تھا جسے تو نے بخش دیا ہے تو فلاں فلاں کا کیا بنے گا؟ آپ نے بنی اسرائیل کے لوگوں کا ذکر کیا جس کی اولادوں کو میں نے یتیم چھوڑا اور ان کی بیویوں کو بیوہ چھوڑا؟ فرمایا: اے داؤد! قیامت کے روز کوئی ظلم مجھ سے تجاوز نہیں کرے گا جس پر میں نے تجھے اختیار دیا پھر میں تجھے

1۔ صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، ذکر ما یدعو المرء بہ فی سجود التلاوۃ فی صلوٰتہ، جلد 6، صفحہ 473

2۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 178 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 89

☆ سنن ابن ماجہ، باب سجود القرآن، حدیث نمبر 1042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کے بدلے میں جنت کا ثواب دوں گا عرض کی: اے میرے رب! اس طرح تو مغفرت آسان ہو جائے گی پھر کہا جائے گا: اے داؤد! اپنے سرکو اٹھاؤ وہ اپنا سر اٹھانے کی کوشش کریں گے تو وہ زمین سے چمٹ چکا ہوگا جبریل امین تشریف لائیں گے اور زمین سے الگ کریں گے جس طرح درخت سے اس کی گوند کو الگ کیا جاتا ہے؛ اسے ولید بن مسلم نے ابن جابر سے وہ عطا سے روایت نقل کرتے ہیں۔

ولید نے کہا مجھے منیر بن زبیر نے خبر دی ہے کہ آپ کی سجدہ گاہیں زمین کے ساتھ چمٹ چکی تھیں جتنے عرصہ تک اللہ تعالیٰ نے چاہا تھا ولید نے کہا ابن لہیعہ نے کہا آپ اپنے سجدہ میں کہا کرتے تھے: تو پاک ہے یہ میرے آنسو میرے مشروب ہیں۔ یہ میرا کھانا ہے جو میرے ہاتھوں میں راکھ کی صورت میں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ چالیس روز تک سجدہ ریز رہے وہ فرض نماز کے سوا اپنا سر نہیں اٹھاتے تھے آپ روتے رہے یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے گھاس اگ آئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس راتوں تک سجدہ ریز رہے (1) یہاں تک کہ آنسوؤں کی وجہ سے سر پر گھاس اگ آئی اور زمین نے آپ کی پیشانی کا حصہ کھالیا تھا جبکہ آپ سجدہ میں کہہ رہے تھے: اے میرے رب! داؤد نے لغزش کی جس کے باعث وہ اللہ کی رحمت سے اتنا دور ہو گیا ہے جتنی دوری مشرق و مغرب کی درمیان ہے اے میرے رب اگر تو حضرت داؤد علیہ السلام کی کمزوری پر رحم نہ فرمائے اور اس کا گناہ نہ بخشے تو اس کے گناہ کو اس کے بعد مخلوقات میں زبان زد خاص و عام کر دے۔ حضرت جبریل امین نے چالیس سال کے بعد انہیں کہا: اے داؤد اللہ تعالیٰ نے تیرے ارادہ کو معاف کر دیا جو تو نے کیا تھا۔

وہب نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام کو ندا کی گئی کہ میں نے تجھے بخش دیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے پھر بھی اپنا سر نہ اٹھایا یہاں تک کہ جبریل امین آئے کہا: تو نے اپنا سر کیوں نہ اٹھایا جبکہ تیرے رب نے تجھے بخش دیا تھا؟ عرض کی: اے میرے رب! کیسے جبکہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ نے جبریل امین سے فرمایا داؤد کی طرف جاؤ اور اسے کہو اوریا کی قبر کی طرف جاؤ اور اس سے فراغت پاؤ میں اس کی ندا کو سنوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ٹاٹ کا لباس پہنا اور اوریا کی قبر کے پاس بیٹھ گئے اور آواز لگائی اوریا! اس نے جواب دیا: لبیک۔ کس نے میری لذت کو مجھ پر قطع کیا ہے اور مجھے بیدار کیا ہے؟ کہا: میں تیرا بھائی داؤد ہوں میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے کیونکہ میں نے تجھے قتل پر پیش کیا تھا اوریا نے کہا: تو نے تو مجھے جنت پر پیش کیا تھا تو مجھ سے بری ہے۔ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام خطا کے بعد خطا کاروں کے پاس بیٹھتے تھے اور کہتے تھے: داؤد خطا کار کے پاس آؤ، کوئی مشروب نہ پیتے (2) مگر اپنے آنسوؤں کو اس میں ملاتے آپ جو کی خشک روٹی ایک پیالہ میں رکھتے لگاتار روتے رہتے یہاں تک کہ وہ روٹی آپ کے آنسوؤں سے تر ہو جاتی آپ اس پر راکھ اور نمک بکھیر دیتے اور اسے کھاتے تھے اور یہ کہتے: یہ خطا کاروں کا کھانا ہے۔ آپ خطا سے پہلے نصف رات قیام کیا کرتے تھے اور نصف زمانہ روزہ رکھا کرتے پھر آپ نے ہمیشہ روزہ رکھنا شروع کر دیا اور ساری رات قیام کیا کرتے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 89 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 90

عرض کی: اے میرے رب! میری غلطی کو میرے ہاتھ میں رکھ دے تو ان کی خطا ان کی ہتھیلی پر نقش ہوگئی آپ ہتھیلی کو کھانے پینے اور کسی اور چیز کے لیے نہ پھیلاتے مگر اسے دیکھتے تو وہ خطا آپکو رلا دیتی اگر ان کے پاس پیالہ لایا جاتا جس کا دوثلث پانی ہوتا جب آپ اسے لیتے تو اپنی خطا دیکھتے تو ابھی اپنے ہونٹوں سے الگ نہ کرتے مگر وہ آپ کے آنسوؤں سے بھر جاتا۔

ولید بن مسلم نے روایت بیان کی ہے کہ مجھے ابو عمر واوزاعی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دو آنکھوں کی مثال دو مشکیزوں جیسی ہے جن سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ آنسوؤں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے چہرے میں یوں گڑھے بنا دیئے تھے جس طرح پانی زمین میں گڑھے بنا دیتا ہے۔

ولید نے کہا ہمیں عثمان بن ابی عاتکہ نے بیان کیا: حضرت داؤد علیہ السلام جبکہ آپ خطا سے خالی تھے ان کے قول میں خطا کاروں کے بارے میں شدت تھی وہ کہا کرتے: اللھم لا تغفر للخطائیں اے اللہ! خطا کاروں کو نہ بخش، پھر آپ یہ کہنے لگے: اے اللہ! خطا کاروں کو بخش دے تا کہ تو ان کے ساتھ داؤد کو بخش دے (1)، اے نور کو پیدا کرنے والے! تو پاک ہے اے میرے اللہ! میں تیرے بندوں میں سے اطباء میں سے سوال کرنے کے لیے نکلا کہ وہ میری کی دوا کریں سب نے میری تیری طرف راہنمائی کی اے میرے اللہ! میں نے ایسی خطا کی ہے مجھے ڈر ہے کہ تو اس کا پھل قیامت کے روز اپنے عذاب کو بنائے گا اور تو اسے نہ بخشے اے نور کو پیدا کرنے والے! تو پاک ہے اے میرے اللہ! جب میں اپنی خطا کو یاد کرتا ہوں تو زمین اپنی کشادگی کے باوجود مجھ پر تنگ ہو جاتی ہے اور جب میں تیری رحمت کو یاد کرتا ہوں تو میری روح لوٹ آتی ہے۔

حدیث طیبہ میں یہ بھی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب منبر پر چڑھتے تو دایاں ہاتھ اٹھاتے اور لوگوں کے سامنے اسے کرتے تا کہ اپنی خطا کا نقش انہیں دکھائیں آپ یوں ندا کیا کرتے: اے میرے اللہ! جب میں اپنی خطا کو یاد کرتا ہوں تو زمین اپنی کشادگی کے باوجود مجھ پر تنگ پڑ جاتی ہے اور جب میں تیری رحمت کو یاد کرتا ہوں تو میری روح میری طرف لوٹ آتی ہے اے میرے رب! خطا کاروں کو بخش دے (2) تا کہ تو حضرت داؤد علیہ السلام کو ان کے ساتھ بخش دے۔ آپ چھال کے سات بستروں پر بیٹھا کرتے تھے جن میں راکھ بھری ہوتی آپ اپنے آنسو اپنے پاؤں کے نیچے گراتے یہاں تک کہ وہ سات بستروں سے نیچے چلے جاتے جب حضرت داؤد علیہ السلام کے رونے کا دن ہوتا تو ان کا منادی کرنے والا راستوں، بازاروں، وادیوں، گھاٹیوں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں کے مونہوں پر اعلان کرتا خبردار! یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے نوحہ کا دن ہے جو اپنے گناہ پر رونا چاہتا ہے تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے اور ان کی مدد کرے غاروں اور وادیوں سے سیاح نیچے اترتے آپ کے منبر کے اردگرد آوازیں بلند ہوتیں، وحشی جانور، درندے اور پرندے سر جھکائے ہوتے اور بنی اسرائیل آپ کے منبر کے اردگرد ہوتے جب آپ رونا شروع کرتے اور اندرونی آگ آنسوؤں کے منابع کو جوش دیتی تو ساری جماعت رونے اور چیخنے میں یک آواز ہوتی یہاں تک کہ اس روز انسانوں کی ایک بڑی جماعت مرجاتی اچانک ہفتہ کے دن حضرت داؤد علیہ السلام فوت ہو گئے ملک الموت آیا جبکہ وہ اپنی عبادت گاہ میں اوپر چڑھ رہے تھے یا نیچے اتر رہے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 90
2۔ ایضاً

تھے فرمایا: میں تو تیری روح قبض کرنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: مجھے مہلت دو یہاں تک کہ میں نیچے اتر آؤں یا اوپر چڑھ جاؤں عرض کی: میرا اس میں کوئی اختیار نہیں ایام، مہینے، سال، آثار اور رزق ختم ہو چکے ہیں آپ اس کے بعد کوئی اثر چھوڑنے والے نہیں کہا: حضرت داؤد علیہ السلام سیڑھی کے زینے پر سجدہ ریز ہو گئے تو ملک الموت نے اسی حال میں ان کی روح قبض کر لی۔ ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان پانچ سو نناوے سال کا عرصہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پانچ سو اناسی سال کا عرصہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سو سال تک زندہ رہے اور اپنے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں خلافت کی وصیت کی۔

**مسئلہ نمبر 24۔** وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۞ محمد بن کعب اور محمد بن قیس نے کہا: لَزُلْفٰى سے مراد ہے مغفرت کے بعد قربت ہوگی دونوں نے یہ بھی کہا: اللہ کی قسم! قیامت کے روز سب سے پہلے جو جام پیے گا وہ حضرت داؤد علیہ السلام ہوں گے۔ مجاہد نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے زلفی سے مراد قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا قرب ہے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ قیامت کے روز حضرت داؤد علیہ السلام کو اٹھایا جائے گا جبکہ ان کی خطا ان کے ہاتھ میں نقش ہوگی جب آپ قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے تو ان سے بچنے کی کوئی پناہ نہ پائیں گے مگر یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی پناہ چاہیں گے کہا: پھر وہ اپنی خطا دیکھیں گے تو پریشان ہونگے تو انہیں کہا جائے گا۔ یہاں یہاں، پھر وہ اپنی خطا کو دیکھیں گے تو پریشان ہونگے تو انہیں کہا جائے گا: یہاں یہاں، پھر وہ خطا کو دیکھیں گے تو پریشان ہونگے تو انہیں کہا جائے گا: یہاں یہاں۔ یہاں تک کہ انہیں قریب کر دیا جائے گا تو وہ سکون پا جائیں گے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۞ یہ ترمذی حکیم نے ذکر کیا ہے۔ کہا: فضل بن محمد، عبد الملک بن اصبغ سے وہ ولید بن مسلم سے وہ ابراہیم بن محمد فزاری سے وہ عبد الملک بن ابی سلیمان سے وہ مجاہد سے روایت نقل کرتے ہیں اور اسے ذکر کیا ہے ترمذی نے کہا: میں طویل عرصہ تک ان آیات کو پڑھتا رہا میرے لیے مراد اور معنی ظاہر نہ ہوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا لغت میں قط سے مراد صحیفہ ہے کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انس پر تلاوت کی فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۞ (الانشقاق) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: انكم ستجدون هذا كله في صحائفكم تعطونها بشمالكم۔ انہوں نے عرض کی رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا، قِطَّنَا سے مراد ہمارے صحیفہ۔ قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ ۞ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ۔ ان کی خطا والے قصہ کو آخر تک بیان کیا میں کہا کرتا تھا جو ان کفار نے کہا اس پر صبر کا حکم دیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کا حکم دیا تو اس ذکر سے کیا مراد ہے اس صبر اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کو کیسے جوڑوں میں کسی ایسی چیز پر مطلع نہیں ہوتا تھا جو میرے دل کو سکون عطا کرے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک دن ہدایت عطا فرمائی اور مجھے الہام کیا گیا کہ ان لوگوں نے ان کے قول کا انکار کیا ہے ان کی کتابیں ان کے بائیں ہاتھ میں دی جائیں گی ان میں ان کے گناہ اور خطائیں ہونگی انہوں نے یہ باتیں استہزاء کے طور پر کی تھیں انہوں نے کہا: رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ ۞ ان کے استہزاء نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ دیا اللہ تعالیٰ نے ان کی گفتگو پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر کا حکم دیا اور یہ حکم دیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کریں

جنہوں نے خطا کے بارے میں جلدی کی تھی کہ وہ اپنی خطا کو اپنی ہتھیلی میں نقش دیکھیں تو اس وجہ سے ان پر وہ مصیبت آئی جو مصیبت آئی جب حضرت داؤد علیہ السلام اسے دیکھتے تو پریشان ہو جاتے اور پیالہ ان کے آنسوؤں سے بھر جاتا جب آپ اس خطا کو دیکھتے تو روتے یہاں تک کہ وہ آنسو چھال سے بنے ان سات بستروں سے پار ہو جاتے جن میں راکھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کا مطالبہ مغفرت اور خصمہ سے جو چھٹی لازم آتی تھی اس کی ضمانت کے بعد یہ سوال کیا تھا جبکہ وہ اللہ کے حبیب، اس کے ولی اور صفی بھی تھے اس مرتبہ کے باوجود خطا کے نقش کو دیکھنا ان کے ساتھ یہ معاملہ کرتا تھا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوتا جب یہی چیز اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مخلوقات اور ذلیل ورسوا لوگوں میں سے کسی کو لاحق ہوتی اگر ان کے صحائف جلدی دے دیے جاتے تو ان خطاؤں کی سورتوں کو دیکھتے جو انہوں نے کفر و انکار کی صورت میں کیے اور ان پر کیا گزرتی جب وہ ان صحیفوں میں ان خطاؤں کو دیکھتے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی: فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (الکہف: 49) حضرت داؤد علیہ السلام مغفرت، بشارت اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے باوجود اپنی حالت پر نہ رہتے جبکہ ہم نے حدیث میں بیان کیا ہے جب قیامت کے روز وہ اپنی غلطی کو اپنی ہتھیلی میں نقش دیکھیں گے تو پریشان ہوں گے یہاں تک کہ اسے کہا جائے گا: یہاں یہاں پھر وہ اپنی خطا دیکھیں گے تو پریشان ہونگے پھر انہیں کہا جائے گا: یہاں یہاں پھر وہ اپنی خطا دیکھیں گے تو وہ مضطرب ہونگے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے قرب عطا کرے گا تو وہ سکون پا جائیں گے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

”اے داؤد! ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو اپنا نائب زمین میں پس آپ فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے، بے شک جو لوگ بہک جاتے ہیں راہ خدا سے ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ انہوں نے بھلا دیا تھا یوم حساب کو“۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ہم نے تمہیں مالک بنایا تاکہ تو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے تاکہ تو اپنے سے قبل انبیاء اور صالحین کی نیابت کرے۔ سورۂ بقرہ میں خلیفہ اور اس کے متعلقہ احکام مفصل گذر چکے ہیں۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرو (1)۔ یہ امر وجوب کے لیے ہے، یہ کلام اپنے ماقبل کے ساتھ مربوط ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو عتاب اس وجہ سے کیا گیا تھا کیونکہ آپ نے ایک خاوند سے اس کی عورت کا مطالبہ کیا تھا یہ عدل نہ تھا اس کے بعد انہیں فرمایا گیا: لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرو اور اپنی اس خواہش

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 90

کی اقتدا نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے امر کے خلاف ہے کہ وہ تجھے جنت کے راستے سے گمراہ کر دے جو لوگ اس راستہ کو چھوڑ دیتے ہیں ان کے لیے جہنم میں دردناک عذاب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے راستہ پر چلنے کو ترک کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان نَسُوْا سے مراد ہے انہوں نے ایمان کو ترک کر دیا یا اس پر عمل کو ترک کر دیا(1) تو وہ بھولنے والوں کی طرح ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ حکم حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ حکم اس وقت ہوا جب ان کی توبہ قبول ہوگئی اور ان کی خطا معاف کر دی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ فیصلوں کے بارے میں اصل احکام یہ ہیں یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدہ:49) لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء:105) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ:8) اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بارے میں کہا: اگر دو آدمی جھگڑا لے کر تیرے پاس آئیں ان دونوں میں سے کسی کے متعلق تمہارے دل میں میلان ہو تو اپنے دل میں یہ خواہش نہ کر کہ حق اس کے لیے ہوتا کہ وہ اپنے مدمقابل پر غالب آ جائے اگر تو نے ایسا کیا تو میں تیرا نام نبوت سے خارج کر دوں گا پھر نہ تو تو میرا خلیفہ ہوگا اور نہ ہی اہل کرامت ہوگا۔ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے اور وہ دونوں فریقوں میں سے کسی فریق کی طرف قرابت نفع کی امید کی وجہ سے میلان نہ رکھے اور نہ کسی سبب کی طرف رجحان رکھے جو میلان کا تقاضا کریں جیسے صحبت، دوستی اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد محض اس وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے کیونکہ ان کے پاس دو فریق آئے تو حضرت سلیمان نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ حق فلاں کے لیے ہو۔

عبدالعزیز بن سداد نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بنی اسرائیل کے دور میں ایک قاضی تھا وہ اپنی کوشش سے اس مقام تک جا پہنچا کہ اپنے رب سے اس کا مطالبہ کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اور اس کے درمیان علامت بنا دے۔ جب وہ حق کا فیصلہ کرے تو وہ اسے پہچان جائے۔ جب وہ کوتاہی کرے تب بھی اسے پہچان لے۔ اسے کہا گیا: اپنے گھر داخل ہو جا پھر دیوار کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو لمبا کر پھر دیکھ تیری انگلیاں کہاں تک پہنچتی ہیں وہاں ایک خط کھینچ لے جب تو مجلس قضا سے اٹھے تو اس خط کی طرف لوٹ اس کی طرف ہاتھ کو لمبا کر جب تو نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا ہوگا تو تو وہاں تک پہنچ جائے گا اگر تو نے حق میں کوتاہی کی ہوگی تو تیری انگلیاں نیچے رہ جائیں گی۔

وہ صبح کو قضا کے لیے جاتا جبکہ وہ مجتہد تھا وہ حق کے ساتھ ہی فیصلہ کرتا جب مجلس سے اٹھتا اور فارغ ہوتا نہ کھانا کھاتا اور نہ پانی پیتا نہ گھر والوں کا کوئی کام کرتا یہاں تک کہ اس خط کے پاس آتا جب اس خط تک پہنچ جاتا تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا اور اللہ تعالیٰ

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 602

نے اہل، کھانے اور پینے میں جس چیز کو حلال کیا تھا اس تک رسائی حاصل کرتا جب ایک دن وہ مجلس قضا میں مصروف تھا تو دو آدمی اس کے پاس آئے جو اس سے فیصلہ کے طالب تھے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ دونوں اس کے پاس (قضیہ) پیش کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ایک اس کا دوست تھا اس قاضی کا دل اس محبت کی وجہ سے متحرک ہوا کہ حق اس کے دوست کے حق میں ہوتا کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے جب دونوں نے گفتگو کی تو حق دوست کے خلاف چلا گیا تو اس نے دوست کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ جب وہ مجلس قضا سے اٹھا تو اس خط کی طرف گیا جس طرح ہر روز جایا کرتا تھا تو اس نے خط کی طرف ہاتھ بڑھایا تو خط دور چلا گیا یہاں تک کہ وہ چھت تک سمٹ گیا وہ اس تک نہیں پہنچ پا رہا تھا تو وہ سجدہ میں گر گیا وہ کہہ رہا تھا: اے میرے رب! میں نے کوئی گناہ کا کام نہیں کیا اور نہ میں نے ارادہ کیا ہے جو ہے اسے میرے لیے واضح کر دے۔ اسے کہا گیا: کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے دل کی خیانت پر آگاہ نہیں جب تو نے چاہا تھا کہ حق تیرے دوست کے حق میں ہوتا کہ تو اس کے حق میں فیصلہ کرے، تو نے اس کا ارادہ کیا تھا اور تو نے یہ پسند کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حق حقدار کو لوٹا دیا جبکہ تو یہ ناپسند کرتا تھا۔

لیث سے مروی ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کی خدمت میں دو آدمی جھگڑا لے کر حاضر ہوئے، آپ نے ان دونوں کو اٹھا دیا، پھر وہ واپس لوٹے تو آپ نے ان دونوں کو اٹھا دیا پھر وہ لوٹے تو آپ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیا تو آپ کی خدمت میں عرض کی گئی۔ فرمایا: وہ دونوں میرے پاس آئے تو میں نے ان دونوں میں سے ایک کے حق میں وہ چیز پائی جو میں نے دوسرے کے حق میں نہ پائی تھی تو میں نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کو ناپسند کیا، وہ پھر واپس آئے تو میں نے ایک کے لیے کچھ ایسے ہی جذبات پائے وہ پھر آئے جبکہ وہ چیز جا چکی تھی تو میں نے دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیا۔

شعبی نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت اُبی کے درمیان کوئی جھگڑا تھا دونوں نے حضرت زید بن ثابت سے فیصلہ کرانا چاہا جب دونوں حضرت زید بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت زید نے حضرت عمر کو اپنے تکیہ کی طرف اشارہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تیرا پہلا ظلم ہے، مجھے اور اسے ایک ہی مجلس میں بٹھاؤ، تو دونوں حضرت زید کے سامنے بیٹھ گئے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ یہ آیت اس امر سے منع کرتی ہے کہ حاکم اپنے علم سے فیصلہ کرے کیونکہ حاکموں کو اگر یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کریں تو جب ان میں سے کوئی اپنے دوست کی حفاظت اور اپنے دشمن کی ہلاکت کا ارادہ کرے گا تو وہ اپنے فیصلہ کے بارے میں اپنے علم کا دعویٰ کر دے گا۔ اس کی مثل صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے، اس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں: اگر میں کسی آدمی کو دیکھوں کہ اس پر حدود اللہ میں سے کوئی حد جاری ہوتی ہے تو میں اس کا مواخذہ نہ کروں گا یہاں تک کہ کوئی اور آدمی میرے پاس گواہی دے۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس نے عرض کی: فلاں کے خلاف میرے دعویٰ کا فیصلہ کر دیجئے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرا فلاں پر حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو یہ ارادہ کرے کہ میں تیرے حق میں گواہی دوں تو ٹھیک ہے جہاں تک فیصلہ کا تعلق ہے تو میں ایسا نہیں کروں گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قسم اور ایک گواہ کی وجہ سے فیصلہ کیا۔

یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گھوڑا خریدا تو بیچنے والے نے انکار کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے علم کی بنا پر اس کے خلاف فیصلہ نہ کیا حضرت خذیمہ اٹھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں گواہی دی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کیا اس حدیث کو ابوداؤد اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ سورۂ بقرۃ میں یہ بحث گذر چکی ہے (1)۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ۝۲۷ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؗ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ۝۲۸ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹

''اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے فائدہ، یہ تو کفار کا گمان ہے پس بربادی ہے کفار کے لیے آگ کے عذاب سے۔ کیا ہم بنادیں گے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بنادیں گے پرہیز گاروں کو فاجروں کی طرح۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اس کی آیتوں میں اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقلمند''۔

بَاطِلًا سے مراد ہے مقصد اور کھیل تماشا ہے یعنی ہم نے آسمان اور زمین کو محض امر صحیح کے لیے پیدا کیا ہے وہ ہماری قدرت پر دلالت ہے یہ کفار کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو باطل پیدا کیا ہے۔

کفار کو شرمندہ کرنے کے لیے فرمایا: اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ ام میں میم زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہے أنجعل الذين اس آیت میں مربہ کا رد ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں: یہ جائز ہے کہ مفسد، صالح کی طرح ہو یا اس سے درجہ میں بلند ہو بعد والی کلام نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ بھی اسی طرح ہے یعنی کیا ہم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو کفار کی طرح بنادیں گے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ متقین، فجار اور کفار کو عام ہے۔ یہ تعبیر سب سے اچھی ہے جو دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں ان کا بھی اس میں رد ہے جنہوں نے مطیع اور عاصی کا ٹھکانا ایک چیز بنایا ہے۔

كِتٰبٌ یہ خبر ہے اس کا مبتدا محذوف ہے لِّیَدَّبَّرُوْۤا اصل میں لیتدبروا تھا تاء کو دال میں مدغم کیا گیا ہے اس میں یہ دلیل ہے کہ قرآن کے معانی کی معرفت واجب ہے اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تیز پڑھنے سے افضل ہے جس طرح ہم نے کتاب التذکار میں بیان کیا ہے تیز پڑھنے کی صورت میں تدبر نہیں ہو سکتا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: آیات میں تدبر سے مراد ان کی اتباع ہے (2) عام قراءت لیدبروا ہے۔ ابوجعفر اور شیبہ نے لیدبروا یعنی دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے؛ حضرت علی شیر خدا کی قراءت بھی یہی ہے اصل میں لتتدبروا تھا

1۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ باب اذا علم الحاکم صدق الشاهد والواحد یجوز له ان یحکم به، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 383

تخفیف کی وجہ سے ایک تاء حذف ہے۔

اُولُوا الْاَلْبَابِ سے مراد اصحاب عقول ہیں اس کا واحد لب ہے اس کی جمع اَلُبّ بھی آتی ہے جس طرح بؤس کی جمع ابؤس آتی ہے اور نعم کی جمع انعم آتی ہے۔ ابو طالب نے کہا:

قلبی إلیه مُشرِفُ الألُبِّ

محل استدلال الب ہے بعض اوقات ضرورت شعری کی بنا پر تضعیف کو ظاہر کرتے ہیں کمیت نے کہا:

إلیکم ذوِی آلِ النَّبِیِّ تَطَلَّعَت نوازِعُ من قلبِی ظِماءٌ وَأَلبُبُ

محل استدلال البب ہے۔

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذْ عُرِضَ عَلَیْهِ بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا داؤد کو سلیمان جیسا فرزند بڑی خوبیوں والا بندہ بہت رجوع کرنے والا، جب پیش کئے گئے آپ پر سہ پہر کو تین پاؤں پر کھڑے ہونے والے تیز رفتار گھوڑے تو آپ نے کہا: مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے اپنے رب کی یاد کے لیے پھر انہیں چلانے کا حکم دیا یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے (حکم دیا) واپس لاؤ انہیں میرے پاس تو ہاتھ پھیرنے لگے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر''۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کر چکے تو حضرت سلیمان السلام کا ذکر کیا۔ اَوَّابٌ کا معنی مطیع ہے اَلْجِیَادُ کا معنی گھوڑے ہیں یہ جواد کی جمع ہے جس کا معنی گھوڑا ہے جس طرح انسان کو جواد کہتے ہیں جب وہ طبعاً بہت ہی سخی ہو یہ کہا جاتا ہے: قوما اجواد خیل جیاد یہ بھی کہا جاتا ہے: جاد الرجل بمالہ یجود جُودا فھو جواد۔ یعنی آدمی اپنے مال کے ساتھ سخاوت کرتا ہے قوم جود جس طرح قَذَالٍ کی جمع قُذُلٍ آتی ہے یہاں واؤ کو ساکن کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ حرف علت ہے اس کی جمع أجواد، أجاود، جُوداء بھی آتی ہے اسی طرح یہ کہتے ہیں: امراۃ جواد، نسوۃ جود جس طرح نوار اور نور آتی ہے شاعر نے کہا:

صناعٌ بِاشفاھا حَصانٌ بِشَکرِھا جوادٌ بِقُوتِ البَطنِ والعِرْقِ زاخِرُ

محل استدلال جواد ہے جب اسے شدید بھوک لگی ہوتی ہے تب اپنے بطن کی قوت کو بھی سخاوت کرنے والی ہے اور تو کہتا ہے: سِرنا عُقْبَۃً جوادا وعُقبتین جَوادین وعُقَبا جیادا۔ یہ کہا جاتا ہے: جاد الفرس یعنی وہ خوبصورت ہو گیا یجود جُودۃ فھو جواد یہ جواد کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسے یوں بھی استعمال کیا جاتا ہے خیل جیاد و أجیا دوا جاوید۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد لمبی گردن والے ہیں یہ جید سے مشتق ہے جس کا معنی گردن ہے کیونکہ گھوڑوں میں گردنوں کا لمبا ہونا ان کی عمدگی کی صفات ہیں اَلصّٰفِنٰتُ میں دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی صفون سے مراد ان کا کھڑا ہونا ہے۔ قتبی اور فراء نے کہا کہ کلام عرب میں صافن سے مراد کھڑا ہونا ہے وہ گھوڑے ہوں یا کوئی

اور چیز ہوا سی معنی میں نبی کریم ﷺ سے روایت مروی ہے من سرہ ان یقوم لہ الرجال صفونا فلیتبوأ مقعدہ من النار (1) جسے یہ بات خوش کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہی رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے قطرب نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے اور نابغہ کا قول ذکر کیا ہے:

لنا قُبَّةٌ مَضروبةٌ بِفنائها عِتاقُ المهاری والجِیادُ الصَّوافن (2)

ہمارا ایک قبہ تھا جو ان کے صحن میں لگا ہوا تھا اعلیٰ نسل کے بچھیرے اور ہمیشہ کھڑے رہنے والے عمدہ گھوڑے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صفون سے مراد یہ ہے کہ دونوں اگلے پاؤں میں سے ایک کے کھر کو اٹھانا یہاں تک کہ باقی تین پاؤں پر کھڑا ہونا جس طرح شاعر نے کہا:

أَلِفَ الصُّفونَ فما يَزَالُ كأنَّهُ مِمَّا يقومُ على الثَّلاثِ كَسِيرا

عمرو بن کلثوم نے کہا:

تَرَكْنا الخيل عاكِفَةً عَلَيهِ مُقَلَّدَةً أَعِنَّتَهَا صُفونَا

''ہم نے گھوڑوں کو اس پر جھکے ہوئے دیکھا ہے ان کی لگامیں ان کا قلادہ تھیں وہ تین پاؤں پر کھڑے تھے'' یہ مجاہد کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اہل دمشق اور نصیبین سے جنگ کی تو ان سے ایک ہزار گھوڑے پائے (3)۔ مقاتل نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ سے ایک ہزار گھوڑوں کے وارث ہوئے ان کے والد نے یہ گھوڑے عمالقہ سے حاصل کیے تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ ایسے گھوڑے تھے جو سمندر سے نکلے تھے (4)؛ ان کے پر تھے یہ ضحاک کا قول ہے۔ وہ ایسے گھوڑے تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے سمندر سے نکالے گئے تھے وہ منقوش تھے وہ پہلے پروں والے تھے۔ ابن زید نے کہا: شیطان نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے سمندر سے گھوڑے نکالے تھے جن کے پر تھے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کہا: وہ بیس گھوڑے تھے جو پروں والے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ سو گھوڑے تھے۔ ایک روایت میں ابراہیم تیمی سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ گھوڑے بیس ہزار تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ۔ الخیر سے مراد گھوڑے ہیں عرب انہیں یہی نام دیتے ہیں وہ راء اور لام کو یکے بعد دیگرے لاتے ہیں تو کہتا ہے: اِنہملتِ العینُ، اِنہمرتْ، ختلتُ و خترتُ جب تو دھوکہ دے۔ دونوں جگہ پر لام اور راء ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ فراء نے کہا: کلام عرب میں خیر اور خیل ایک ہی چیز ہے۔ نحاس نے کہا: حدیث طیبہ میں ہے کہ الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الی یوم القیامۃ (5) گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لیے بھلائی رکھ دی گئی ہے گویا گھوڑوں کو خیر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے حدیث میں ہے کہ جب زید الخیل نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 91
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 92
3۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 603
4۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 91
5۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 93

ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انت زید الخیر وہ حقیقت میں زید بن مہلہل شاعر تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں خیر اس لیے نام دیا گیا کیونکہ اس کی ذات میں کئی منافع تھے۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام جانور پیش کیے ان سے کہا گیا: ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیں تو انہوں نے گھوڑا پسند کیا تو انہیں کہا گیا: تم نے اپنی ذات کو اختیار کیا ہے تو اسی وجہ سے اس کا نام خیر پڑ گیا اور اسے خیل کا نام دیا گیا کیونکہ یہ قوت اور غلبہ کے ساتھ موسوم ہے۔ اسے فرس اس لیے نام دیا گیا کیونکہ یہ فضا کی مسافتوں کو چیرتا ہے جس طرح شیر شکار کو چیر پھاڑ دیتا ہے اور ان مسافتوں کو یوں طے کرتا ہے جس طرح وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ہر شے کو لقمہ بنالیتا ہے۔ اسے عربی نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بیت اللہ شریف کی تعمیر کی جزا کے طور پر دیا گیا حضرت اسماعیل عربی تھے تو یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لیے عطیہ تھا تو اس گھوڑے کو عربی کہا گیا: لفظ حب فراء کے قول کے مطابق مفعول ہے معنی ہے إنی أثرت حب الخیر فالهانی عن ذکر ربی میں نے گھوڑوں کی محبت کو ترجیح دی تو اس محبت نے مجھے میرے رب کے ذکر سے غافل کر دیا۔

دوسرے علماء اسے مفعول مطلق تسلیم کرتے ہیں جو مفعول کی اضافت ہے تو تقدیر کلام یہ ہوگی یعنی أحببت الخیر حبا فالهانی عن ذکر ربی ایک قول یہ کیا گیا: أحببت کا معنی ہے میں بیٹھ گیا اور پیچھے ہٹ گیا؛ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے احب البعیر یہ جملہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ بیٹھ جائے اور پیچھے ہٹ جائے أحب فلان اس نے اپنا سر جھکایا۔ ابوزید نے کہا یہ جملہ بولا جاتا ہے: بعیر محب، وقد أحب احبابا یہ اس وقت بولتے ہیں جب اسے کوئی مرض لاحق ہو یا عضو ٹوٹ جائے وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے یہاں تک کہ وہ درست ہو جائے یا مر جائے۔ ثعلب نے کہا: بعیر حسیر کے لیے کہا جاتا ہے محب معنی ہوگا تو میرے رب کے ذکر سے بیٹھ گیا اس تعبیر کی بنا پر حب کا لفظ مفعول لہ ہوگا۔ ابو فتح ہمدانی نے کتاب التبیان میں یہ ذکر کیا ہے۔ احببت یہ لزمت کے معنی میں ہے اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

مِثْلَ بعیرِ السُّوءِ إذ أَحَبَّا

اس برے اونٹ کی مثل جب وہ ایک جگہ کو لازم پکڑے۔

**حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ** ﴿۳۲﴾ یعنی سورج چھپ گیا۔ یہاں ذکر کے بغیر ضمیر ذکر کی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **مَا تَرَكَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ** (فاطر: 45) اس میں ھا ضمیر سے مراد الارض ہے عرب کہتے ہیں: ھاجبت باردۃ معنی ہے ھاجت الریح باردۃ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ** ﴿۸۳﴾ (الواقعہ) یعنی نفس حلقوم تک جا پہنچا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ** ﴿۳۲﴾ (المرسلات) یہاں نار کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔ زجاج نے کہا: ضمیر کا ذکر کرنا جائز نہیں جب کسی چیز کا ذکر رہا ہو یا دلیل کا ذکر رہا ہو یہاں دلیل موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

**بِالْعَشِیِّ** عشی سے مراد زوال کے بعد کا وقت ہے تواری سے مراد آنکھوں سے چھپ جانا ہے، حجاب سے مراد سبز پہاڑ ہے جو تمام مخلوق کو محیط ہے(1)؛ یہ قتادہ اور کعب کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جبل قاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 93

یہ ایسا پہاڑ ہے جو قاف کے علاوہ ہے۔ حجاب سے مراد رات ہے۔ اسے حجاب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس چیز کو چھپا لیتی ہے جو اس میں ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حَتّٰى تَوَارَتْ سے مراد گھوڑے دوڑ میں چھپ جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک گول میدان تھا جس میں گھوڑوں میں مقابلہ کرایا جاتا یہاں تک کہ وہ مسابقت میں آپ کی آنکھ سے چھپ جاتے کیونکہ سورج کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

نحاس نے ذکر کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نماز میں تھے آپ کی خدمت میں گھوڑے لائے گئے تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کیے جائیں جو غنیمت کے طور پر حاصل ہوئے تھے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا یہاں تک کہ گھوڑے چھپ گئے اصطبلوں کی دیواروں نے انہیں چھپا دیا جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: رُدُّوْهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًا یعنی ان پر ہاتھ پھیرنے لگے اس کے معنی میں دو قول ہیں: آپ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے تاکہ ان کی تکریم کا اہتمام کریں اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ معزز آدمی کے لیے یہ کوئی قبیح نہیں کہ وہ اپنے گھوڑوں کے ساتھ یہ معاملہ کرے۔ اس قول کے کرنے والے نے یہ کہا: وہ کیسے قتل کر سکتے ہیں؟ جبکہ اس میں مال برباد کرنا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہوا سے سزا دینا لازم آتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں مسح سے مراد قتل کرنا ہے آپ کو قتل کی اجازت دی گئی تھی۔ حضرت حسن بصری، کلبی اور مقاتل نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے نماز پڑھی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے جبکہ گھوڑے آپ پر پیش کیے جا رہے تھے وہ ایک ہزار گھوڑے تھے آپ پر نو سو گھوڑے پیش کیے جا چکے تھے تو آپ نماز عصر کے لیے متوجہ ہوئے جب کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور نماز فوت ہو گئی تھی آپ کی ہیبت کی وجہ سے آپ کو آگاہ نہ کیا گیا تو آپ غمگین ہوئے تو فرمایا: انہیں میرے پاس لاؤ تو گھوڑوں کو آپ پر دوبارہ پیش کیا گیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان کی کونچیں کاٹ دیں ان میں سے سو گھوڑے بچ گئے آج لوگوں کے پاس جو اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہیں وہ انہیں گھوڑوں کی نسل میں سے ہیں۔ قشیری نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے اس وقت نہ ظہر کی نماز تھی اور نہ عصر کی نماز ہوتی تھی بلکہ وہ نماز نفلی نماز تھی تو آپ اس سے غافل ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بڑے جاہ و جلال والے تھے تو کسی نے بھی انہیں آگاہ نہیں کیا خواہ وہ فرض نماز تھی یا نفل نماز تھی تو انہوں نے گمان کیا کہ یہ تاخیر مباح ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ فوت شدہ نماز یاد کی اور بطور افسوس کہا: اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ یہاں ذکر سے مراد نماز ہے (1)۔ آپ نے گھوڑوں کو لوٹانے کا حکم دیا اور ان کی کونچیں اور ان کی گردنیں مارنے کا حکم دیا، یہ کوئی گھوڑے کو عذاب دینا نہیں تھا جب جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہو تو ان جانوروں کو ذبح کرنا جائز ہوتا ہے بلکہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالا تاکہ اس کے بعد گھوڑے آپ کو نماز سے غافل نہ کریں شاید آپ نے ان کی کونچیں اس لیے کاٹیں تاکہ ان کو ذبح کریں آپ نے انہیں بھاگنے سے روکنے کے لیے ان کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر انہیں اسی وقت ذبح کر دیا تاکہ ان کا گوشت صدقہ کریں یا ان کی شریعت میں یہ امر مباح تھا تو جس چیز نے آپ کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دیا اس کو تلف کر دیا تاکہ اس چیز کا تعلق اپنے آپ سے ختم کر دیں جس نے انہیں اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیا تھا اللہ تعالیٰ نے

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 603

اس وجہ سے ان کی تعریف کی اور واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں انہیں یہ بدلہ دیا کہ ان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا آپ ہوا کے دوش پر ایک دن میں اتنا سفر طے کر لیتے جتنا سفر گھوڑے پر دو ماہ صبح و شام سفر کرتے ہوئے طے کرتے تھے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: رُدُّوْهَا عَلَيَّ میں هاء سورج کے لیے ہے گھوڑوں کے لیے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا: تجھے اس بارے میں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں نے کہا: میں نے کعب کو کہتے ہوئے سنا ہے جب حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑے کے معائنہ میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ سورج حجاب میں چھپ گیا اور ان سے نماز فوت ہو گئی کہا: اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ یعنی میں نے ترجیح دی گھوڑوں کی محبت کو اپنے رب کے ذکر سے رُدُّوْهَا عَلَيَّ یعنی گھوڑوں کو مجھ پر واپس لوٹاؤ۔ گھوڑے چودہ تھے تو آپ نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تلوار سے کاٹ دیا اللہ تعالیٰ نے چودہ دن تک ان سے حکومت کو چھین لیا کیونکہ انہوں نے گھوڑوں پر ظلم کیا تھا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: کعب نے جھوٹ بولا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام جہاد کی تیاری کی وجہ سے گھوڑوں کے معائنہ میں مصروف رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا آپ نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے ان فرشتوں کو حکم دیا جو سورج پر معین ہیں: سورج کو لوٹاؤ تو فرشتوں نے سورج کو ان پر لوٹا دیا یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصر کے وقت نماز پڑھی اللہ تعالیٰ کے انبیاء ظلم نہیں کرتے کیونکہ وہ معصوم ہیں۔

میں کہتا ہوں: اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جو چیز حجاب میں چھپی تھی وہ سورج تھا اور سورج کے ذکر کو ترک کر دیا کیونکہ منافع کے لیے اس پر دلالت موجود ہے کیونکہ اسے ذکر کیا گیا ہے جس کا سورج کے ساتھ تعلق ہے جس طرح اس کا بیان گذر چکا ہے اکثر لوگ سورج کو ذکر کیے بغیر مضمر کر دیتے ہیں۔ لبید نے کہا:

حتّی إذا ألقتْ یدًا فی کافرٍ　　وأجنّ عوراتِ الثغورِ ظلامُها(1)

اس شعر میں بھی الشمس کے لیے ہے اور اس کے ذکر سے پہلے ضمیر لائی گئی ہے۔

ردوها میں ها گھوڑوں کے لیے ہے اور ان پر ہاتھ پھیرنے سے زہری اور ابن کیسان نے یہ مراد لیا ہے کہ آپ ان کی پنڈلیوں اور ان کی گردنوں پر ہاتھ پھیرتے اور ان سے غبار کو دور کرتے کیونکہ آپ کو گھوڑوں سے محبت تھی؛ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب دکھایا گیا جبکہ آپ اپنے گھوڑے کو اپنی چادر سے پونچھ رہے تھے اور فرمایا: ''آج رات مجھے گھوڑوں کے بارے میں عتاب کیا گیا(2)'' موطا میں یحییٰ بن سعید سے مرسل روایت نقل کی گئی ہے اور موطا کے علاوہ میں مسند اور متصل سند سے مروی ہے امام مالک، یحییٰ بن سعید سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں سورۃ الانفال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذر چکا ہے۔ وامسحوا بنواصیها واکفالها ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو تلواروں سے کاٹ دیا۔

میں کہتا ہوں: شبلی اور دوسرے صوفیاء نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اسی فعل سے کپڑوں کے پھاڑ دینے کا استدلال

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 384　　2۔ موطا امام مالک، کتاب الجهاد، ماجاء فی الخیل والمسابقة، صفحہ 481

کیا ہے۔ یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ یہ جائز نہیں کہ نبی معصوم کی طرف یہ منسوب کیا جائے کہ اس نے فساد والا فعل کیا ہے۔ مفسرین نے آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے کسی نے کہا: آپ نے گھوڑوں کی تکریم کی خاطر ان کی گردنوں اور ان کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا: تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہے تو یہ اچھا عمل ہے۔ ان میں سے کچھ نے کہا: آپ نے ان کی کونچیں کاٹیں پھر انہیں ذبح کر دیا۔ گھوڑوں کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت کھانا جائز ہے۔ سورۂ نحل میں اس کی وضاحت گذر چکی ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر آپ نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس پر قدغن لگائی جاسکتی ہو۔ جہاں تک صحیح کپڑے کے پھاڑنے کا تعلق ہے جبکہ غرض صحیح نہ ہو تو یہ جائز نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو کیا ہو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں جائز ہو جبکہ یہ ہماری شریعت میں جائز نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے گھوڑوں کے ساتھ جو بھی کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مباح کر دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے گھوڑوں کے مسح کرنے سے مراد کاویہ سے انہیں نشان لگانا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں معین کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے کیونکہ پنڈلیاں کسی حال میں بھی نشان لگانے کا محل نہیں۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے: پنڈلی پر کاویہ سے نشان لگانا علاط کہلاتا ہے اور گردن پر نشان لگانا وثاق کہلاتا ہے۔ جوہری کی صحاح میں ہے عَلَطَ البعیرَ عَلْطًا اس نے اونٹ کی گردن میں نشان لگایا۔ علاطان سے مراد گردن کی دونوں جانبیں ہیں۔

میں کہتا ہوں: رُدُّوْهَا میں ھا ضمیر کو جس نے سورج کی طرف لوٹایا ہے تو یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزات میں سے ہے۔ اسی کی مثل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی واقع ہوا امام طحاوی نے مشکل الحدیث میں حضرت اسماء بنت عمیس سے دو سندوں سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی جارہی تھی جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت علی شیر خدا کی گود میں تھا۔ حضرت علی شیر خدا نے عصر کی نماز نہ پڑھی تھی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''اے علی! کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟'' عرض کی: نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے اللہ! اگر یہ تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا تو سورج کو اس پر لوٹا دے''۔ حضرت اسماء نے کہا: میں نے اسے غروب ہوتا ہوا دیکھا تھا پھر میں نے غروب ہونے کے بعد پہاڑوں اور زمین پر اسے طلوع حالت میں دیکھا جبکہ آپ خیبر میں صہباء کے مقام پر تھے۔

امام طحاوی نے کہا: یہ دونوں حدیثیں ثابت ہیں ثقہ لوگوں نے انہیں روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو فرج ابن جوزی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کہا: حضرت علی شیر خدا کی محبت میں رافضیوں کے غلو نے انہیں اس امر پر برانگیختہ کیا کہ وہ آپ کے فضائل میں بے شمار احادیث وضع کریں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سورج غائب ہو گیا تو حضرت علی شیر خدا کی عصر کی نماز فوت ہو گئی تو آپ کے لیے سورج کو لوٹایا گیا (1)۔ از روئے نقل کے محال ہے۔ اور معنی کے اعتبار سے بھی محال ہے کیونکہ وقت فوت ہو چکا تھا اور اس کا لوٹنا نیا طلوع تھا جو وقت کو نہیں لوٹاتا جس نے کہا تھا: خیر گھوڑوں کی طرف لوٹتی ہے وہ گھوڑے دوڑ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اس میں گھوڑوں

1۔ حضرت مفسر نے یہ رائے قائم کی اور ابن جوزی اور ابن تیمیہ کی رائے کو اہمیت دی جب کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کہا: ابن جوزی نے یہ غلط کہا ہے نور الانور میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

کی دوڑ میں دلیل موجود ہے۔ یہ مشروع امر ہے اس کے بارے میں گفتگو سورۂ یوسف میں گذر چکی ہے۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

''اور ہم نے فتنہ میں ڈالا سلیمان (علیہ السلام) کو اور ڈال دیا ان کے تخت پر ایک بے جان جسم پھر وہ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے۔ عرض کی: میرے رب! مجھے معاف فرمادے اور عطا فرما مجھے ایسی حکومت جو کسی کو میسر نہ ہو میرے بعد بے شک تو ہی بے اندازہ عطا کرنے والا ہے۔ پس ہم نے ہوا کو آپ کا فرمانبردار بنادیا، چلتی تھی آپ کے حسب حکم آرام سے جدھر آپ چاہتے اور سب دیو بھی ماتحت کر دیئے کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور اور ان کے علاوہ (جو سرکش تھے) باندھ دیئے گئے زنجیروں میں، (اے سلیمان!) یہ ہماری عطا ہے چاہے (کسی کو بخش کر) احسان کر چاہے اپنے پاس رکھ تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی اور بے شک انہیں ہمارے ہاں بڑا قرب حاصل ہے اور خوبصورت انجام''۔

**وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ** ایک قول یہ کیا گیا: حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہ بنے بیس سال گذر چکے تھے کہ آپ کو فتنہ میں ڈالا گیا اور آزمائش کے بعد آپ بیس سال تک حاکم رہے؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ **فَتَنَّا** یعنی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور ہم نے سزا دی (1)۔ اس کا سبب وہ روایت ہے جو سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں دو فریق حاضر ہوئے ان میں سے ایک فریق جرادہ کے خاندان سے تھا جو آپ کی بیوی تھی۔ حضرت سلیمان اس سے محبت کرتے تھے تو آپ نے خواہش کی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو۔ پھر دونوں کے درمیان فیصلہ انصاف سے کیا۔ آپ کو جو بھی مصیبت پہنچی اسی خواہش کی بنا پر تھی۔

سعید بن مسیب نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام تین دن تک لوگوں سے حجاب میں رہے آپ نے کسی کے درمیان فیصلہ نہ کیا نہ مظلوم کو ظالم سے انصاف دلایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی: میں نے تجھے خلیفہ اس لیے نہیں بنایا کہ تو میرے بندوں سے حجاب کرے بلکہ اس لیے خلیفہ بنایا ہے کہ تو ان کے درمیان فیصلہ کرے اور مظلوم کو انصاف دلائے۔

شہر بن حوشب اور وہب بن منبہ نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک بادشاہ کی بیٹی کو گرفتار کیا جس کے ساتھ سمندر کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ میں جہاد کیا تھا (2)، جس بادشاہ کو صیدون کہتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دل میں اس

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 94
2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 604

کی محبت ڈال دی گئی جبکہ وہ آپ سے اعراض کرتی تھی، وہ ترچھی نظروں سے آپ کو دیکھتی اور الٹی سیدھی باتیں کرتی تھی، اس کی آنکھوں سے اپنے والد کے غم میں آنسو نہ چھوٹتا تھا وہ بہت ہی خوبصورت تھی پھر اس نے یہ سوال کیا کہ وہ اس کے باپ کا اس کی صورت کے مطابق بت بنا دے تاکہ وہ اسے دیکھا کرے۔ حضرت سلیمان نے اس کا حکم دیا تو اس کے لیے مجسمہ بنا دیا گیا اس عورت نے اس کی تعظیم کی اور اس کے سامنے سجدہ کیا اور اس کی لونڈیوں نے بھی اس کے ساتھ سجدہ کیا۔ وہ ایک ایسا بت بن گیا جس کی حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھر میں عبادت کی جا رہی تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا یہاں تک کہ چالیس دن گذر گئے۔ اس کی خبر بنی اسرائیل میں عام ہوگئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی علم ہوگیا تو آپ نے اسے توڑ دیا پھر اسے جلا دیا پھر اس کے ذرات سمندر میں بکھیر دیئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت سلیمان نے صیدون کی بیٹی کو پایا جس کا نام جرادہ تھا جس طرح کہ زمخشری نے ذکر کیا ہے تو وہ عورت آپ کو بہت اچھی لگی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس پر اسلام کو پیش کیا تو اس نے انکار کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے ڈرایا تو اس عورت نے کہا: مجھے قتل کر دو میں اسلام قبول نہیں کروں گی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی جبکہ وہ مشرک تھی۔ وہ یاقوت کے بنے بت کی چالیس روز تک حضرت سلیمان علیہ السلام سے پوشیدہ عبادت کرتی رہی یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چالیس روز تک حکومت کے زوال کے ساتھ سزا دی گئی۔ کعب الاحبار نے کہا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو قتل کر کے گھوڑوں پر ظلم کیا تو آپ کی حکومت سلب کر لی گئی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے حیض یا کسی اور عارضہ کی صورت میں اپنی کسی بیوی کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی عورت سے شادی نہ کریں تو آپ نے ان کے علاوہ کسی اور عورت سے شادی کر لی تو اس وجہ سے انہیں سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا اکثر مفسرین کے نزدیک وہ شیطان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی شبیہ اس پر ڈالی اس کا نام صخر بن عمیر صاحب السحر تھا یہی وہ تھا جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی رہنمائی الماس (ہیرہ) پر کی تھی جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس بنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب پتھروں کو لوہے سے تراشا جاتا تو ان میں آواز پیدا ہوتی انہوں نے الماس (ہیرہ) لیا اور اس کے ساتھ پتھر، نگینے اور دوسری چیزیں کاٹنے لگے تو کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ سرکش جن تھا تمام شیاطین بھی اس پر غالب نہ آتے وہ ہمیشہ حیلہ سازی کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بیت الخلا میں انگوٹھی کے ساتھ داخل نہیں ہوتے تھے۔ صخر حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل میں آیا تو اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عورتوں سے ایک عورت، جسے امینہ کہا جاتا، سے انگوٹھی لی جو آپ کی تھی؛ یہ شہر بن حوشب اور وہب کا قول ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے کہا: اس کا نام جرادہ تھا وہ چالیس روز تک حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت پر قابض رہا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھاگے ہوئے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انگوٹھی اور بادشاہت انہیں واپس کر دی۔

سعید بن مسیب نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی انگوٹھی اپنے بستر کے نیچے رکھ دی اور شیطان نے اسے اٹھالیا۔ مجاہد نے کہا: شیطان نے انگوٹھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے لے لی تھی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شیطان سے پوچھا جبکہ اس کا نام آصف تھا: تم لوگوں کو کس طرح گمراہ کرتے ہو؟ شیطان نے آپ سے کہا: مجھے اپنی انگوٹھی دو تا کہ میں تمہیں بتادوں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنی انگوٹھی دے دی۔ جب شیطان نے انگوٹھی لے لی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل بنا کر آپ کی کرسی پر بیٹھ گیا وہ آپ کی بیویوں کے پاس جاتا ناحق فیصلے کرتا اور غلط احکامات دیتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کے پاس جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ وہ ان کے پاس ان کے حیض کے دنوں میں آیا تھا۔ مجاہد نے کہا: اسے آپ کی بیویوں کے پاس آنے سے منع کردیا گیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے حکومت زائل ہوگئی تو آپ ساحل سمندر کی طرف بھاگ نکلے آپ وہاں لوگوں سے ضیافت طلب کرتے اور اجرت پر شکاریوں کی مچھلیاں اٹھایا کرتے تھے جب وہ لوگوں کو بتاتے کہ وہ سلیمان بن داؤد ہیں تو لوگ انہیں جھٹلاتے تھے۔

قتادہ نے کہا: جب بنی اسرائیل نے شیطان کے احکامات کو عجیب وغریب جانا تو آپ نے شکاری سے ایک مچھلی لی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ نے وہ کھانے کے لیے لی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مچھلیاں اٹھانے کی اجرت کے طور پر لی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے شکار کیا تھا، جب اس کے پیٹ کو چیرا تو اپنی انگوٹھی اس میں موجود پائی تھی۔ یہ واقعہ آپ کی بادشاہت کے زائل ہونے سے چالیس دن بعد ہوا تھا یہ دنوں کی وہی تعداد ہے جتنے دنوں میں آپ کے گھر میں بت کی عبادت کی گئی تھی آپ نے وہ انگوٹھی مچھلی کے پیٹ میں پائی تھی کیونکہ شیطان نے وہ انگوٹھی سمندر میں پھینک دی تھی۔

حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے: اسی اثنا میں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سمندر کے کنارے انگوٹھی سے کھیل رہے تھے کہ وہ انگوٹھی سمندر میں گر گئی جبکہ ان کی حکومت اس انگوٹھی میں تھی۔

حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تھا یحییٰ بن ابی عمرو شیبانی نے حکایت بیان کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی انگوٹھی عسقلان میں پائی تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع کی خاطر بیت المقدس کی طرف پیدل گئے۔

حضرت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک لوٹایا تو آپ نے صخر کو پکڑ لیا جس نے انگوٹھی لی تھی اس کے لیے چٹان میں سراخ کیا اور اس میں اسے داخل کیا اور دوسری چٹان کے ساتھ اسے بند کردیا اور لوہے اور سکہ کے ساتھ اسے جوڑ دیا اس پر اپنی مہر لگائی اور سمندر میں پھینک دیا فرمایا: قیامت تک یہ تیرا قید خانہ ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے انگوٹھی لے لی تو شیاطین، جن، انسان، پرندے

وحشی جانور اور ہوا آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ شیطان بھاگ گیا جو آپ کا نائب بنا تھا وہ سمندر میں ایک جزیرہ میں آیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے شیاطین کو اس کے پاس بھیجا انہوں نے کہا: ہم اس پر قادر نہیں لیکن وہ ہفتہ میں ایک روز جزیرہ کے ایک چشمہ پر آتا ہے ہم اس پر قابو نہیں پا سکتے جب تک وہ نشے میں نہ ہو کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے پانی نکلوایا اور اس میں شراب ڈال دی وہ اس چشمہ پر آنے والے دن اس پر آیا تو اس میں شراب تھی اس نے کہا: اللہ کی قسم! تو عمدہ مشروب ہے مگر تو حلیم کو جوش دلاتی ہے، جاہل کی جہالت میں اضافہ کرتی ہے پھر اسے شدید پیاس لگی پھر وہ اسی چشمہ کے پاس آیا اور اسی جیسی گفتگو کی پھر اسے پیا تو شراب اس کی عقل پر غالب آ گئی ان شیاطین نے اسے انگوٹھی دکھائی تو اس نے کہا: ہر حکم سنوں گا اور اطاعت بھی کروں گا۔ وہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لے آئے آپ نے اسے جکڑ دیا اور ایک پہاڑ کی طرف بھیج دیا۔ علماء نے ذکر کیا ہے کہ وہ دھویں کا پہاڑ ہے انہوں نے کہا: وہ دھواں جو تم دیکھتے ہو یہ اس کی سانسیں ہیں اور وہ پانی جو اس پہاڑ سے نکلتا ہے وہ اس کا پیشاب ہے۔

مجاہد نے کہا: اس شیطان کا نام آصف ہے۔ سدی نے کہا: اس کا نام حبقیق ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے کیونکہ شیطان انبیاء کی صورت نہیں اپنا سکتا، پھر یہ بھی محال ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مملکت کے لوگوں پر شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کی صورت اپنا کر معاملہ خلط ملط کر دے یہاں تک کہ وہ اسے یہ گمان کریں کہ یہ نبی برحق ہے اور وہ شیطان کے ساتھ ملکر باطل کام شروع کر دیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جسد سے مراد بچہ ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں پیدا ہوا جب وہ پیدا ہوا تو شیاطین جمع ہو گئے ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: اگر اس کا بیٹا زندہ رہا تو ہم اسکی غلامی اور تسخیر سے آزاد نہ ہونگے آؤ ہم اس کے بیٹے کو قتل کر دیں یا اسے بگاڑ دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم ہو گیا آپ نے ہوا کو حکم دیا تو وہ بچے کو بادلوں میں لے گئی ان کا بیٹا شیاطین کے خوف سے بادلوں میں رہا تو اللہ تعالیٰ نے شیاطین سے خوفزدہ ہونے کی بنا پر آپ کو سزا دی آپ نے محسوس ہی نہ کیا کہ وہ آپ کے تخت پر مردہ پڑا ہوا تھا؛ یہ معنی شعبی نے بیان کیا ہے یہی وہ جسد ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی كُرْسِیِّهٖ جَسَدًا میں بیان کیا ہے۔

نقاش اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے: اکثر لونڈیاں جن سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس لیے وطی کی تھی کہ ان سے اولاد ہوگی تو آپ کا آدھے جسم والا بچہ پیدا ہوا تو اس کی حیثیت اس جسم والی تھی جسکو آپ کے تخت پر پھینک دیا گیا ہو۔ دائی اسے لائی تھی اور اس نے وہاں پھینک دیا تھا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: آج رات میں نوے عورتوں کے پاس چکر لگاؤں گا ان میں سے ہر ایک شاہسوار جنے گی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے گا آپ کے مصاحب نے کہا: ان شاء اللہ کہو تو آپ نے انشاء اللہ نہ کہا، آپ نے رات کے وقت اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا تو ایک عورت کے سوا کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی وہ بھی آدھا بچہ لائی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے!

اگر وہ انشاء اللہ کہہ دیتے تو وہ سب شاہسوار کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے''(1)۔

ایک قول یہ کیا گیا: جسد سے مراد آصف بن برخیا صدیق تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے کاتب تھے۔ اس کی وجہ یہ بنی جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمایا گیا تو انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے گر پڑی اس میں آپ کی بادشاہت تھی آپ نے دوبارہ اسے اپنے ہاتھ میں ڈالا تو وہ پھر گر پڑی تو آپ کو آزمائش کا یقین ہو گیا۔ آصف بن برخیا نے آپ سے عرض کی: آپ کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے اس لیے وہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ٹھہرتی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تائب ہونے کی حیثیت سے رجوع کرو میں تیری حکومت میں تیرے قائم مقام رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کی توبہ قبول کر لے۔ آپ کی آزمائش کے چودہ دور ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔ آصف بن برخیا نے انگوٹھی لے لی اسے اپنے ہاتھ میں رکھا تو وہ وہاں ٹھہر گئی ان کے پاس کتاب کا علم تھا آصف بن برخیا حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت اور آپ کے عیال میں قائم مقام رہے جیسی چال حضرت سلیمان علیہ السلام کی تھی ایسی چال چلتے اور جو عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کا تھا ایسا ہی عمل آصف کا ہوتا یہاں تک حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے گھر توبہ تائب ہو کر لوٹ آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ملک انہیں لوٹا دیا۔ آصف بن برخیا آپ کی مجلس میں رہے آپ کی کرسی پر بیٹھے اور انگوٹھی اپنے ہاتھ میں رکھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جسد حضرت سلیمان علیہ السلام کا تھا، اس کی وجہ یہ بنی کہ آپ شدید بیمار ہوئے یہاں تک کہ محض ایک جسم کی حیثیت سے ہو گئے ایک کمزور مریض کی یوں صفت بیان کی جاتی ہے: کالجسد الملقی۔

## حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی اور آپ کا ملک

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے چھ سو کرسیاں بچھائی جاتیں پھر انسانوں میں سے معززین حاضر خدمت ہوتے تو وہ آپ کے قریب بیٹھ جاتے پھر جنوں میں سے معززین آتے تو وہ انسانوں کے قریب بیٹھ جاتے پھر پرندے آتے جو ان کو سایہ کر لیتے پھر آپ ہوا کو بلاتے جو ان سب کو اٹھا لیتی وہ ایک دن میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتی۔ وہب، کعب اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام جب اپنے باپ کے بعد حاکم بنے تو آپ نے کرسی بنانے کا حکم دیا تا کہ فیصلہ کرنے کے لیے اس پر بیٹھیں اور یہ حکم دیا کہ ایسے خوفناک انداز میں بنایا جائے کہ جب باطل پرست یا جھوٹا گواہ اسے دیکھے تو کانپ جائے اور خوف زدہ ہو جائے آپ نے یہ حکم دیا کہ اس کرسی کو ہاتھی کے دانتوں سے بنایا جائے جس پر موتی، یاقوت اور زبرجد کے نگینے جڑے ہوئے ہوں اسے سونے کے بنے چار درختوں سے گھیرا گیا ہوا سے سونے کی بنی چار کھجوروں کے ساتھ گھیرا گیا جس کی ٹہنیاں سرخ یاقوت اور سبز زبرجد کی تھیں دو کھجوروں کے سروں پر سونے کے دو مور تھے اور دو کھجوروں کے سروں پر سونے کی دو گدھیں تھیں جو ایک دوسرے کے مقابل تھے کرسی بنانے والوں نے کرسی کی دونوں جانب سونے کے دو شیر بنائے ان دونوں میں سے ہر ایک کے سر پر سبز زمرد کا ستون تھا، انہوں نے کھجوروں

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، ووھبنا لداؤد سلیمان نعم العبد انہ اواب، جلد 1، صفحہ 487

کے درختوں پر سرخ سونے کی بیلیں جوڑ دیں ان کے گچھے سرخ یاقوت کے تھے اس طرح ان بیلوں نے کھجوروں اور کرسی کو سایہ کیا ہوا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب اس پر چڑھنے کا ارادہ کرتے تو اس کے نیچے والے زینہ پر اپنے دونوں قدم رکھتے تو کرسی اتنی تیزی سے گھوم جاتی جس طرح تیز چکی گھومتی ہے وہ گدھیں اور مور اپنے پر پھیلا دیتے دونوں شیر اپنے ہاتھ پھیلا لیتے اور اپنی دمیں زمین پر مارتے، جس زینے پر بھی آپ چڑھتے یہ چیزیں اسی طرح کا ہی عمل کرتیں جب اس کے آخری زینے پر بیٹھ جاتے تو وہ دونوں گدھیں جو کھجور کے درختوں کے اوپر ہوتیں وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تاج پکڑتیں اور اسے آپ کے سر پر رکھ دیتیں پھر کرسی گھوم جاتی اس کے ساتھ دونوں گدھیں، دونوں مور اور دونوں شیر اپنے سروں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جھکاتے ہوئے گھوم جاتے اور اپنے پیٹوں سے کستوری اور عنبر کو چھڑکتے پھر وہ کبوتری جو سونے کی بنی ہوئی تھی جو کرسی کے اوپر موتیوں اور جواہرات سے بنے ستونوں پر ہوتی تورات حضرت سلیمان علیہ السلام کو پکڑاتی حضرت سلیمان علیہ السلام اسے کھولتے اسے لوگوں پر پڑھتے اور لوگوں کو فیصلہ کی طرف دعوت دیتے۔

انہوں نے یہ بھی کہا: بنی اسرائیل کے علماء سونے کی بنی کرسیوں پر بیٹھتے جن پر جواہرات جڑے ہوتے یہ آپ کی دائیں جانب ہزار کرسیاں تھیں اور جنوں کے معززین چاندی کی کرسیوں پر بیٹھتے جو ہزار کرسیاں تھیں پھر پرندے انہیں سایہ کرتے ہوئے گھیر لیتے لوگ فیصلوں کے لیے آگے بڑھتے جب گواہ گواہیوں کے لیے آگے بڑھتے تو کرسی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ تیز چکی کے گھومنے کے ساتھ گھوم جاتی دونوں شیر اپنے ہاتھوں کو پھیلا لیتے اور اپنی دمیں زمین پر مارتے دونوں گدھیں اور دونوں مور اپنے پروں کو پھیلا لیتے گواہ ڈر جاتے اور حق بات کی گواہی دیتے وہ چیز جو اس کی کرسی کو گھماتی وہ سونے کی بنی مچھلی تھی وہ کرسی اس پر تھی۔ صخر جنی نے جو آپ کے لیے چیزیں بنائی تھیں ان میں سے یہ ایک عظیم چیز تھی۔

جب کرسی کے گھومنے کا احساس ان گدھوں، شیروں اور موروں کو ہوتا جو کرسی کے اوپر سے نیچے تک تھے تو وہ سب چیزیں گھوم جاتیں جب ٹھہرتیں تو سب چیزیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سر پر ٹھہر جاتیں جبکہ آپ بیٹھے ہوتے پھر ان کے پیٹوں میں مشک اور عنبر میں سے جو ہوتا انہیں آپ پر نچھاور کرتے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو بخت نصر نے آدمی بھیجے جو کرسی کو لے آئے جب اسے انطاکیہ لے جایا گیا اس نے ارادہ کیا کہ اس پر چڑھے اسے یہ علم نہیں تھا کیسے اس پر چڑھنا ہے جب اس نے ایک قدم اس پر رکھا تو شیر نے اس کے پاؤں پر ضرب لگا دی اور اسے توڑ دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب اس پر چڑھتے تو دونوں قدم رکھتے بخت نصر مر گیا اور کرسی بیت المقدس کی طرف واپس کر دی گئی کوئی بادشاہ اس پر نہ بیٹھ سکا لیکن کوئی اس کے انجام سے بھی آگاہ نہیں ممکن ہے اسے آسمانوں کی طرف اٹھا لیا گیا ہو۔

ثُمَّ اَنَابَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور توبہ کی یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ یعنی میرے گناہ بخش دو، وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیسے دنیا کو طلب کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی، اس سے ناراضگی کی اور اپنی بارگاہ میں اسے حقیر جانا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے: علماء کے نزدیک یہ طلب اس پر محمول ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کریں گے، ملک کے امور

اچھے انداز میں چلائیں گے، مخلوقات کی منازل کو ترتیب سے رکھیں گے، اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم کریں گے، اس کی رسوم کی حفاظت کریں گے، اس کے شعائر کی تعظیم کریں گے، اس کی عبادت ظاہراً کریں گے، اس کی اطاعت کو لازم پکڑیں گے جو حکم اس پر نافذ ہوگا، اس کے قانون کو منظم کریں گے، وعدوں کو ثابت کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ وہ جانتا ہے جسے مخلوقات میں سے کوئی نہیں جانتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے سامنے تصریح کی ہے: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ)

حاشا و کلا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ سوال محض دنیا کی طلب کے لیے ہو کیونکہ آپ اور انبیاء تمام مخلوقات پر زیادہ زاہد ہوتے ہیں آپ نے مملکت کا سوال محض اللہ تعالیٰ کے لیے کیا تھا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اس کی تباہی اور ہلاکت کا سوال اللہ تعالیٰ کے لیے کیا تھا دونوں سوال پسندیدہ تھے اور دونوں مقبول ہوئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عرضداشت مقبول ہوئی تو جو بھی روئے زمین پر تھا اسے ہلاک کر دیا گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو مملکت عطا کر دی گئی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مطالبہ اللہ تعالیٰ کے امر سے کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ تمام بندوں میں سے صرف آپ ہی ان امور کو چلا سکتے ہیں یا یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ کہیں: عظیم ملک تو کہا: لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اس میں اعتراض کی گنجائش موجود ہے پہلی تعبیر زیادہ مناسب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝

حضرت حسن بصری نے کہا: کوئی بھی آدمی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا بار ہے مگر حضرت سلیمان بن داؤد کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذَا عَطَآؤُنَا۔

میں کہتا ہوں: یہ چیز اس کو رد کر دیتی ہے جو ایک روایت میں مروی ہے کہ جنت میں تمام انبیاء کرام میں سے سب سے آخر میں داخل ہونے والے حضرت داؤد علیہ السلام ہیں کیونکہ دنیا میں ان کو بادشاہت ملی۔ بعض روایات میں ہے: حضرت سلیمان علیہ السلام انبیاء کے جنت میں داخل ہونے کے چالیس سال بعد جنت میں داخل ہونگے اسے صاحب قوت نے ذکر کیا ہے۔ یہ ایسی روایت ہے جس کی اصل نہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے تو اس پر کوئی بوجھ نہیں کیونکہ یہ بطریق احسان انہیں نصیب ہوئی ہے تو پھر وہ کیسے جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونگے جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۝ صحیح میں ہے لکل نبی دعوة مستجابة فتعجل کل نبی دعوته ہر نبی کے لیے ایک مقبول دعا ہے پس ہر نبی نے اپنی دعا میں جلدی کی۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے تو ان کے سوال سے پہلے ہی پوری کی جانے والی حاجت بنا دی گئی اس وجہ سے ان پر اس کا کوئی بوجھ نہیں۔

لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ کا معنی ہے میرے بعد کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کا سوال کرے گویا انہوں نے ایسا سوال کیا جس کا سوال بعد میں ممنوع قرار دیا گیا یہاں تک کہ کسی کی امید اس کے ساتھ متعلق نہ ہوئی اور قبولیت کے ممنوع ہونے کی وجہ سے اس نے اس کا سوال بھی نہ کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: ان کا بادشاہت کا سوال کرنا آپ کے بعد کسی کے لیے مناسب نہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ آسمان و زمین کی تخلیق میں ظاہر و عیاں رہے کیونکہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام و مرتبہ میں ایک سبقت موجود ہے ہر

ایک پسند کرتا ہے کہ اس کے لیے خصوصیت ہو جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مقام و مرتبہ پر استدلال کیا جا سکے یہی وجہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفریت کو پکڑا جس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ آپ کی نماز کو قطع کرے، اللہ تعالیٰ نے اس عفریت پر آپ کو قدرت بھی دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے باندھنے کا ارادہ کیا پھر اپنے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول یاد آ گیا: رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (1) تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا۔ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بھی کسی کو یہ حکومت عطا کی جاتی تو خصوصیت ختم ہو جاتی گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خصوصیت میں مزاحمت کو ناپسند کیا اس کے بعد کہ آپ نے اس چیز کو جان لیا تھا کہ یہی وجہ ہے جو آپ کی خصوصیت ہے کہ شیاطین کو آپ کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور آپ کی یہ دعا قبول ہو گئی ہے کہ آپ کے بعد کسی کے لیے ایسی حکومت نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً۔ رخاء کا معنی ہے نرم جبکہ اس میں قوت اور شدت موجود ہے یہاں تک کہ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ ہوا آپ کی چھاؤنی، آپ کے لشکروں اور آپ کے تخت کو اٹھا لیتی تھی جس طرح روایت بیان کی گئی ہے کہ آپ کا تخت فرسخ در فرسخ تھا اس میں سو (100) درجے تھے جو ایک کے اوپر نیچے تھے ہر درجہ میں ایک قسم کے لوگ ہوتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام سب سے اوپر والے درجہ میں اپنی عورتوں اور خدام کے ساتھ رہتے تھے۔

ابو نعیم حافظ نے ذکر کیا ہے احمد بن جعفر، عبد اللہ بن احمد بن احمد بن حنبل سے وہ احمد بن ایوب وہ ابو بکر بن عیاش سے وہ ادریس بن وہب بن منبہ سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سو کمرے تھے ان میں سے سب سے اونچا شیشے کا تھا اور سب سے نچلے والا لوہے کا تھا، ایک روز آپ ہوا کے دوش پر سوار ہوئے تو آپ ایک کسان کے پاس سے گذرے تو کسان نے ان کی طرف دیکھا تو کہا: آل داؤد کو عظیم بادشاہت دی گئی ہے، ہوا نے اس کی گفتگو سن لی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے کان میں ڈالی آپ اترے یہاں تک کہ اس کسان کے پاس آئے فرمایا: میں نے تیری بات سنی ہے میں تیرے پاس اس لیے چل کر آیا ہوں تا کہ تو اس چیز کی تمنا نہ کرے جس پر تو قادر نہیں تیرا ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا جسے اللہ تعالیٰ قبول کر لے اس حکومت سے بہتر ہے جو آل داؤد کو دی گئی ہے، کسان نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے غم کو دور کرے تو نے میرے غم کو دور کیا ہے۔

حَيْثُ اَصَابَ ۝ اصاب کا معنی ارادہ کیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے عرب کہتے ہیں: اصاب الصواب واخطأ الجواب (2)۔ صحیح کا ارادہ کیا اور جواب میں غلطی کی؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

أَصَابَ الكلامَ فلم يَستطِعْ فأخطأَ الجوابَ لَدَى المفصَلِ

اس نے گفتگو کا ارادہ کیا تو اس نے طاقت نہ رکھی اس نے فیصلہ کے وقت جواب میں غلطی کی

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حمیر کی لغت میں اصاب کا معنی اراد ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ ھجر کی زبان میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حَيْثُ اَصَابَ کا معنی ہے حینما قصد یہ اصل میں اصابۃ السھم الغرض المقصود سے ماخوذ ہے تیر ٹارگٹ پر جا لگا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، ووھبنا لداؤد سلیمان، جلد 1، صفحہ 487

2۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 609

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ یعنی ہم نے اس کے لیے شیاطین کو مسخر کر دیا (1) جبکہ اس سے قبل کسی کے لیے یہ مسخر نہ تھے کُلَّ بَنَّآءٍ یہ شیاطین سے بدل ہیں اصل کلام یوں ہے کُلَّ بَنَّاءٍ مِنْهُمْ وہ اس کے لیے وہ چیز بناتے ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

إِلَّا سُلَيْمَانَ إِذْ قَالَ الْإِلٰهُ لَهُ قُمْ فِي الْبَرِيَّةِ فَاحْدُدْهَا عَنِ الْفَنَدِ

وَخَيِّسِ الْجِنَّ إِنِّي قَدْ أَذِنْتُ لَهُمْ يَبْنُونَ تَدْمُرَ بِالصُّفَّاحِ وَالْعُمُدِ

مگر سلیمان علیہ السلام، جب اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: جنگل میں کھڑے ہو جاؤ، اسے خطا سے پاک کر دو، جنوں کو ذلیل ورسوا کر دو میں نے انہیں حکم دے دیا ہے وہ باریک پتلے پتھروں اور ستونوں کے ساتھ عمارتیں بنائیں گے۔ وَّغَوَّاصٍ وہ سمندروں سے ان کے لیے موتی نکالیں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پہلے شخص تھے جن کے لیے سمندر سے موتی نکالے گئے۔ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ ہم نے ان کے لیے سرکش شیاطین کو مسخر کیا یہاں تک کہ آپ نے لوہے کی زنجیروں اور بیڑیوں میں انہیں جکڑ دیا؛ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد طوق ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد کرسیاں ہیں؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

فَآبُوا بِالنِّهَابِ وَبِالسَّبَايَا وَأُبْنَا بِالْمُلُوكِ مُصَفَّدِينَا

وہ چھینے ہوئے مال، قیدیوں کے ساتھ لوٹے اور ہم رسیوں میں جکڑے ہوئے بادشاہوں کے بیٹوں کے ساتھ واپس لوٹے۔

یحییٰ بن سلام نے کہا: آپ یہ معاملہ ان کے کفار کے ساتھ کرتے تھے جب وہ ایمان لے آتے تو آپ انہیں آزاد چھوڑ دیتے انہیں اپنا مطیع نہیں بناتے۔

هٰذَا عَطَآؤُنَا اسم اشارہ سے مراد بادشاہت ہے، یہ بادشاہت ہماری عطا ہے جسے چاہیں آپ عطا کریں اور جسے چاہیں نہ دیں آپ پر کوئی حساب نہیں۔ حضرت حسن بصری، ضحاک اور دوسرے علماء سے مروی ہے، حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس پر بھی جو نعمت کی ہے اس پر اس کی وجہ سے کوئی نہ کوئی بوجھ ہوگا مگر حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے مستثنیٰ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ قتادہ نے کہا: اسم اشارہ سے مراد حقوق زوجیت ادا کرنے پر قوت ہے آپ کی تین سو بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں آپ کی پشت میں سو آدمیوں کی قوت تھی؛ یہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے؛ اسی کی ہم معنی روایت بخاری میں موجود ہے۔ اس تاویل کی بنا پر فَامْنُنْ منی سے مشتق ہوگا (2) یہ کہا جاتا ہے: اَمْنَى يُمْنِي، مَنَى يَمْنِي دونوں لغتیں ہیں جب تو امنی سے امر کا صیغہ بنائے گا تو تو کہے گا اَمْنِ اور مَنَى يَمْنِي کا صیغہ اِمْنِ ہوگا جب تو فعل کے نون کے ساتھ نون خفیفہ لائے تو کہے گا امنن۔

جو احسان کی طرف گیا ہے اس نے کہا: یہ مَنّ علیہ سے مشتق ہے، جب وہ اس سے امر کا صیغہ بنائے گا تو دونوں نونوں کو ظاہر

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 609 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 100

کرے گا کیونکہ یہ مضاعف ہے تو اس نے کہا: اُمْنُنْ حدیث میں روایت کیا گیا ہے کہ آپ کے لیے شیاطین کو مسخر کیا گیا جس کے حق میں آپ چاہیں اسے آزاد کر دیں اور چھوڑ دیں اور جس کے بارے میں چاہیں آپ اسے روکے رکھیں؛ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت نقل کی ہے اس کی تعبیر یہ ہے اپنی عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہو حقوق زوجیت ادا کرو اور جس کے بارے میں چاہو اس کے ساتھ حقوق زوجیت سے رکے رہو آپ پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۝ یعنی اگر ہم نے ان پر دنیا میں انعام کیا ہے تو اس کے لیے آخرت میں بھی قربت اور لوٹنے کی بہترین جگہ ہوگی۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝۴۱ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ۝۴۲ وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۴۳

''اور یاد فرمایئے ہمارے بندے ایوب کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو (الٰہی!) پہنچائی ہے مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ (حکم ہوا) اپنا پاؤں (زمین پر) مار و یہ نہانے کے لیے ٹھنڈا پانی ہے۔ اور پینے کے لیے اور ہم نے عطا فرمایا انہیں ان کا اہل و عیال اور ان کی مانند ان کے ساتھ بطور رحمت اپنی جناب سے اور بطور نصیحت اہل عقل کے لیے''۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ مشکلات میں صبر پر ان کی اقتدا کریں ایوب یہ عبدنا سے بدل ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝۴۱ عیسیٰ بن عمر نے ان ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: قراء نے بِنُصْب پر اتفاق کیا ہے یعنی نون مضموم اور صاد ساکن ہے شد نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے اس کے بعد مناقض ہے اور وہ بھی غلط ہے کیونکہ اس نے کہا: قراء نے اس پر اجماع کیا اس کے بعد یہ حکایت کی کہ قراء نے یزید بن قعقاع سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اسے بِنَصب پڑھا ہے اور ابو جعفر کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے، ابو جعفر نے بِنُصُب پڑھا ہے: ابو عبید اور دوسرے قراء نے اسی طرح بیان کیا ہے؛ حضرت حسن بصری سے اسی طرح مروی ہے جہاں تک بِنَصب کا تعلق ہے یہ عاصم جحدری اور یعقوب حضرمی کی قراءت ہے؛ حضرت حسن بصری سے بھی یہی قراءت مروی ہے بِنَصَب ابو جعفر سے بھی مروی ہے۔ اکثر نحویوں کے نزدیک یہ سب نَصَب کے معنی میں ہیں نُصب اور نَصَب، حُزن اور حَزَن کی طرح ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ نُصب، نَصب کی جمع ہو جس طرح وَثَن کی جمع وُثُن آتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ نُصُب، نُصْب کے معنی میں ہو اس سے ضمہ حذف ہے جہاں تک وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدہ: 3) کا تعلق ہے تو ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نصاب کی جمع ہے۔ ابو عبید اور دوسرے علماء نے کہا: نُصب کا معنی شر اور آزمائش ہے اور نَصَب کا معنی تھکاوٹ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں کا معنی ایک ہی ہے، اس آیت سے مراد ہے شیطان جو وسوسہ لاحق کرتا ہے اس نے مجھے وہی پہنچایا ہے

کوئی اور چیز اس نے مجھے لاحق نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نصب سے مراد وہ چیز ہے جو اس کے بدن کو لاحق ہو اور عذاب سے مراد وہ چیز ہے جو اس کے مال کو لاحق ہو اس میں حقیقت سے بعید بات ہے۔

مفسرین نے کہا: ایوب رومی تھے یہ بثنیہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی؛ یہ واقدی کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت کے لیے چن لیا ان کے پاس مال اور اولاد کی کثرت تھی وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالانے والے تھے اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ہمدردی کرتے، نیک، رحم دل تھے۔ تین افراد کے علاوہ کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ دنوں میں ایک دن ابلیس کے لیے ساتویں آسمان میں ٹھہرنے کا موقع بنا ابلیس اپنی عادت کے مطابق وہاں بیٹھا اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا یا اسے کہا گیا: کیا تو میرے بندے ایوب پر کوئی قدرت رکھتا ہے؟ ابلیس نے عرض کی اے میرے رب! میں اس پر کس طرح قادر ہوسکتا ہوں جبکہ تو نے اسے مال اور عافیت کے ساتھ آزمائش میں ڈال رکھا ہے اگر تو نے آزمائش اور فقر کے ذریعے آزمائے اور جو کچھ تو نے اسے عطا کر رکھا ہے وہ اس سے واپس لے لے تو وہ اپنی حالت سے بدل جائے گا اور تیری اطاعت سے نکل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تجھے اس کے اہل اور مال پر تسلط دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دشمن آسمان سے نیچے اترا اس نے جنوں میں سے سرکش جنوں کو اکٹھا کیا اور انہیں سب کچھ بتایا، ان میں سے ایک نے کہا: میں ایک بگولہ بنوں گا جس میں آگ ہوگی تو میں اس کا مال ہلاک کردوں گا وہ حضرت ایوب کی خدمت میں مال کے منتظم کی صورت میں آیا اور اس کے مال پر جو کچھ واقع ہوا تھا وہ سب بتایا تو حضرت ایوب نے کہا: الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ہی مال عطا کیا ہے اور اسی نے مال روک لیا ہے۔ پھر وہ آپ کے اس محل میں آیا جہاں آپ کے گھر والے اور آپ کی اولاد تھی اس نے محل کو اطراف سے اٹھایا اور اسے آپ کے اہل و اولاد پر دے مارا پھر وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا تو حضرت ایوب نے مٹی اپنے سر پر ڈالی ابلیس آسمان کی طرف چڑھا تو حضرت ایوب علیہ السلام کی توبہ اس سے سبقت لے جا چکی تھی۔

ابلیس نے کہا: اے میرے رب! مجھے اس کے بدن پر غلبہ عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں نے تجھے اس کے بدن پر مسلط کیا مگر اس کی زبان، اس کے دل اور اس کی آنکھ پر تسلط عطا نہیں کیا۔ اس نے حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر ایک پھونک ماری جس کی وجہ سے آپ کا جسم جل گیا تو آپ کے جسم میں مسے نکل آئے آپ نے انہیں اپنے ناخنوں سے رگڑا یہاں تک کہ ان سے خون نکلنے لگا پھر ٹھیکری کے ساتھ ملا تو آپ کا گوشت گر گیا اسی موقع پر کہا تھا: مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ پیٹ کے اندر تک کوئی بیماری نہ پہنچی کیونکہ نفس کی بقاء پیٹ کے اندرونی حصہ سے ہوا کرتی ہے آپ کھاتے اور پیتے آپ تین سال تک اسی طرح رہے جب حضرت ایوب علیہ السلام اس پر غالب آگئے تو وہ آپ کی بیوی کے پاس آیا انسانوں میں سے خوبصورت ترین اور معزز ترین فرد کی صورت میں آیا اس نے آپ کی بیوی سے کہا: میں زمین کا معبود ہوں، میں نے ہی تیرے خاوند کے ساتھ کیا جو کچھ کیا اگر تو مجھے ایک سجدہ کر دے تو میں اس کے اہل اور اس کا مال اس کی طرف لوٹا دوں گا جبکہ وہ سب میرے پاس ہیں اسی شیطان نے وہ تمام چیزیں ایک وادی میں آپ کی بیوی کے سامنے کر دیں اس عورت نے وہ تمام باتیں حضرت

ایوب کو بتائیں تو حضرت ایوب نے قسم اٹھائی اگر وہ صحت مند ہوئے تو ضرور اس بیوی کو ماریں گے۔ مفسرین نے ان کی آزمائش کے سبب، اپنے رب کی طرف مراجعت، اس مصیبت سے چھٹکارا جو مصیبت ان پر واقع ہوئی تھی اور وہ تین افراد جو آپ پر ایمان لائے جنہوں نے آپ کو اس سے منع کیا تھا اور آپ پر اعتراض کیا تھا پر طویل گفتگو کی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک مظلوم نے آپ سے مدد طلب کی تھی تو حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کی مدد نہ کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک دن آپ نے لوگوں کو کھانے پر بلایا تو آپ نے ایک فقیر کو داخل ہونے سے روک دیا اس وجہ سے وہ آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: آپ ایک بادشاہ سے برسرپیکار تھے جبکہ آپ کے ریوڑ اس کی مملکت میں تھے تو اس ریوڑ کی وجہ سے اس کے ساتھ غزوہ کو ترک کر کے اس کے ساتھ نرمی کی تو اس وجہ سے آپ کو آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگ آپ کی بیوی سے مرض کے پھیل جانے سے دور رہتے وہ کہتے: ہم عدوی سے ڈرتے ہیں جبکہ وہ آپ کی بیوی سے نفرت کرتے اسی وجہ سے فرمایا: مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ آپ کی بیوی لیا بنت یعقوب تھی۔ حضرت ایوب، حضرت یعقوب علیہ السلام کے دور میں تھے ان کی ماں حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت ایوب کی بیوی رحمہ بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام تھی؛ ان دونوں قولوں کو طبری نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا: مفسرین نے جو یہ کہا کہ ابلیس کا سال میں ایک دن ساتویں آسمان میں بیٹھنے کی جگہ تھی تو یہ قول باطل ہے کیونکہ شیطان کو زمین کی طرف لعنت اور ناراضگی کے ساتھ اتارا گیا تو وہ محل رضا کی طرف کیسے بلند ہو سکتا ہے؟ انبیاء کے مقامات میں کیسے گھوم پھر سکتا تھا؟ وہ آسمانوں کو پھاڑتا تو انبیاء کی منازل کی طرف ساتویں آسمان کی طرف بلند ہوتا اور حضرت خلیل کی جگہ جا کر ٹھہرتا بے شک یہ بہت بڑی غلطی ہے اور جہالت کی پیداوار ہے۔

جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تجھے اس کے مال اور اس کی اولاد پر تسلط عطا کر دیا ہے یہ قدرت میں ممکن ہے لیکن اس قصہ میں بعید ہے اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ شیطان نے آپ کے جسم میں پھونک ماری جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ان کے جسم پر غلبہ دیا یہ بھی حقیقت سے بہت ہی بعید بات ہے اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو پیدا فرمائے جبکہ شیطان کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہو یہاں تک کہ شیطان کی اس بات سے آنکھ ٹھنڈی ہو کہ اسے انبیاء کے اموال، ان کے اہل اور ان کی ذاتوں میں قدرت حاصل ہوئی ہے۔ جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ شیطان نے آپ کی زوجہ سے یہ بات کی کہ وہ زمین کا الہ ہے اگر تو اللہ کا ذکر چھوڑ دے اور تو مجھے سجدہ کرے تو میں اسے درست کر دوں گا۔ یہ بات ذہن نشین کر لو اور تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر وہ تم میں سے کسی کے سامنے آئے جبکہ اس انسان کو درد ہو اور شیطان سے یہ بات کرے تو اس کے نزدیک یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس کا زمین میں ایک خدا ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ شیطان کو سجدہ کرے اور شیطان اسے مصیبت سے عافیت دلائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کی زوجہ اس سے شک میں مبتلا ہو؟ اگرچہ وہ دیہاتی بیوی ہو یا کم عقل بربری عورت ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں۔

جہاں تک شیطان کے اس معاملہ کا تعلق ہے کہ اس نے حضرت ایوب کی بیوی کے لیے اموال اور ان کے اہل کو ایک

وادی میں مثالی صورت میں پیش کیے ابلیس کسی حال میں بھی اس پر قادر نہیں نہ ہی وہ جادو کے طریقہ پر ایسا کر سکتا ہے ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسی جنس سے تھا۔ اگر یہ تصور کیا جائے تو آپ کی بیوی پہچان جاتی کہ یہ جادو ہے جس طرح ہم جان لیتے ہیں جبکہ وہ ہماری بنسبت اس بارے میں زیادہ پہچان رکھتی تھی کیونکہ جادو، اس کے بارے میں گفتگو، لوگوں کے درمیان اس کے جاری ہونے اور اس کی تصویر کشی سے کوئی زمانہ آج تک خالی نہیں رہا۔

قاضی نے کہا: جس چیز نے ان اقوال پر جری کر دیا ہے اور انہوں نے اس کے بارے میں زیادہ گفتگو کی وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شیطان کے مس کرنے کی شکایت کی تو انہوں نے اپنی رائے سے ان چیزوں کو ملا دیا جن اقوال کا ذکر پہلے گزر چکا ہے جبکہ معاملہ اس طرح کا نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا ہے جبکہ تمام افعال اچھے ہوں یا برے ہوں ایمان ہو یا کفر، اطاعت ہو یا نافرمانی سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ان کے خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں اور ان کے علاوہ چیزوں کی تخلیق میں بھی کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں لیکن شرک ذکر میں اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا اگرچہ خلق میں اسی سے موجود ہے یہ بطور ادب ہے جس کی بطور ادب ہمیں تعلیم دی گئی اور بطور رحمہ جو ہمیں سکھایا گیا نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اسی معنی میں ہے: والخیر فی یدیك والشر لیس الیك۔ اسی معنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ (الشعراء) نوجوان نے حضرت کلیم سے یہ کہا تھا: وَ مَاۤ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ (الکہف: 63)

جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ ایک مظلوم نے مدد طلب کی تو آپ نے اس کی مدد نہ کی کون ہمارے لیے اس قول کی صحت کو ثابت کرے گا یہ امر اس سے خالی نہ ہوگا کہ آپ اس کی مدد پر قادر تھے تو کسی کے لیے بھی اس کو ترک کرنا حلال نہیں پس اس پر ملامت کی جائے گی کہ انہوں نے نافرمانی کی جبکہ حضرت ایوب علیہ السلام اس سے منزہ تھے یا وہ مدد کرنے سے عاجز تھے تو پھر اس وجہ سے ان پر کوئی قدغن نہ ہوئی اسی طرح ان کا یہ قول بھی ہے کہ آپ نے فقیر کو داخل ہونے سے روکا تھا اگر آپ کو علم ہوتا تو یہ ان کے بارے میں کہنا باطل ہے اگر جانتے ہی نہ تھے تو ان پر کوئی قدغن نہیں۔

جہاں تک یہ کہنا ہے کہ بھیڑ بکریوں کی وجہ سے کافر بادشاہ سے نرمی کی تھی تو تو داھن کا لفظ نہ کہہ بلکہ داری کا لفظ کہہ۔ کافر اور ظالم کو نفس اور مال سے مال کے ذریعے دور کرنا جائز ہے ہاں اچھی گفتگو سے ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

ابن عربی قاضی ابو بکر نے کہا: حضرت ایوب کے بارے میں کچھ ثابت نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان دو آیات میں جو خبر دی ہے: وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ (الانبیاء: 83) دوسری سورت میں ہے: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝

جہاں تک نبی کریم ﷺ کا تعلق ہے تو آپ سے کوئی چیز صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں مگر یہ قول ملتا ہے بینما أیوب یغتسل اِذْ خَرَّ عَلَیْهِ رِجل من جراد من ذھب(1)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، إذ نادى ایوب علیہ السلام أنی مسنی الضر، جلد 1، صفحہ 480

جب حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں آپ سے نہ قرآن اور نہ حدیث سے کوئی چیز ثابت ہے مگر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے تو وہ کون ہے جو سامع تک اپنی خبر پہنچا دیتا ہے یا کس زبان سے اس نے یہ بات سنی ہے۔ علماء کے نزدیک اسرائیلی روایات قطعی طور پر ترک کر دی گئی ہیں ان کی تحریروں سے اپنی نظر کو دور رکھو اور ان کو سننے سے اپنے کانوں کو بند رکھو کیونکہ اسرائیلیات تجھے صرف خیال عطا کریں گی اور تیرے دل میں سوائے فساد کے کسی چیز کا اضافہ نہ کریں گی۔

صحیح میں ہے جبکہ الفاظ امام بخاری کے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اے مسلمانوں کی جماعت! تم اہل کتاب سے سوال کرتے ہو جبکہ تمہاری وہ کتاب جو تمہارے نبی پر نازل کی گئی یہ اللہ تعالیٰ کی خبریں دینے میں سے سب سے نئی ہے تم اسے خالص پڑھتے ہو اس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں اس نے تمہارے سامنے یہ بیان کیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تبدیلی کی ہے اپنے ہاتھوں سے کتابیں لکھیں اور کہا: هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرہ: 79)

تمہارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمہیں ان سے سوال کرنے سے نہیں روکتا نہیں ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! ہم نے ان میں سے کسی ایک آدمی کو بھی نہیں دیکھا جو تم سے اس چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جو تم پر نازل ہوا جبکہ مؤطا کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر کو عجیب جانا کہ حضرت عمر تورات کی قراءت کر رہے تھے۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ، رکض سے مراد ہے پاؤں سے دھکیلنا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رَكَضَ الدَّابَّةَ و رَكَضَ ثَوْبَهٗ بِرِجْلِهٖ اس نے جانور کو پاؤں مارا۔ اس نے کپڑے کو اپنے پاؤں سے پرے کیا۔ مبرد نے کہا: رَكْض کا معنی حرکت دینا ہے اسی وجہ سے اصمعی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے رُكِضَتِ الدَّابَّةُ یہ نہیں کہا جاتا: رَكَضتْ هی کیونکہ رکض کا معنی ہے سوار کا اپنی ٹانگوں کو حرکت دینا۔ اس سواری کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

سیبویہ نے یہ کہا: رَكَضتُ الدَّابَّةَ فرکضتْ جس طرح یہ جملہ ہے جَبرتُ العظمَ فَجَبَرَ و حَزَنْتُه فحَزِن میں نے سواری کو حرکت دی تو اس نے حرکت کی میں نے ہڈی کو جوڑا تو وہ جڑ گئی، میں نے اسے غمگین کیا تو وہ غمگین ہو گیا؛ کلام میں اضمار ہے یعنی ہم نے کہا: اُرْكُض یہ کسائی کا قول ہے۔

هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾ یہ اس وقت کہا جب اللہ تعالیٰ نے اسے عافیت عطا کر دی۔ حضرت ایوب نے پاؤں مارا تو اسکی وجہ سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا تو آپ نے اس سے غسل کیا تو ظاہر سے بیماری چلی گئی پھر آپ نے اس سے پانی پیا تو باطن سے بھی بیماری رفع ہو گئی۔ قتادہ نے کہا: یہ دونوں شام کی سرزمین میں دو چشمے ہیں جس سرزمین کو جابیہ کہتے ہیں آپ نے ان میں سے ایک سے غسل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ظاہر سے بیماری کو دور کر دیا اور دوسرے چشمے سے پانی پیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے باطن سے بیماری کو دور کر دیا (1)؛ اسی کی مثل حضرت حسن بصری اور مقاتل سے مروی ہے کہ مقاتل نے کہا: گرم چشمہ پھوٹ پڑا آپ نے اس کے پانی سے غسل کیا تو صحیح و سالم وہاں سے نکلے پھر دوسرا چشمہ پھوٹا تو آپ نے اس سے میٹھا پانی پیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پاؤں مارنے کا حکم اس لیے دیا تاکہ آپ کے جسم میں جو بھی بیماری ہے وہ جھڑ جائے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 102

مغتسل سے مراد وہ پانی ہے جس سے غسل کیا جاتا ہے؛ یہ قتبی نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں غسل کیا جاتا ہے۔ مقاتل کا قول ہے جوہری نے کہا: اِغْتَسلتُ بالماء، غَسُول اس پانی کو کہتے ہیں جس پانی سے غسل کیا جاتا ہے اسی طرح مُغتسل بھی وہ پانی ہے جس کے ساتھ غسل کیا جاتا ہے مَغسِل اور مَغسَل مردوں کے غسل کی جگہ کو کہتے ہیں اس کی جمع مغاسل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کتنا عرصہ آزمائش میں مبتلا رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سات سال، سات ماہ، سات دن اور سات گھنٹے (1)۔

وہب بن منبہ نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام نے سات سال تک بیماری پائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام سات سال تک قید میں رہے بخت نصر کو عذاب دیا گیا اور سات سال تک اسے درندوں میں محبوس کیا گیا؛ یہ ابونعیم نے ذکر کیا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: دس سال تک آپ کی بیماری رہی۔ ایک قول یہ کیا گیا: آٹھ سال تک آپ کی بیماری رہی؛ اسے حضرت انس نے مرفوع نقل کیا ہے جسے ماوردی نے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ یونس بن یزید، عقیل سے وہ ابن شہاب سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز حضرت ایوب علیہ السلام اور انہیں جو آزمائش آئی اس کا ذکر کیا اور یہ ذکر کیا کہ آزمائش جو آپ کو پہنچی تھی وہ اٹھارہ سال تک رہی، قشیری نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ عرصہ چالیس سال تھا۔

**وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ** اس کے بارے گفتگو سورۃ الانبیاء میں گذر چکی ہے۔ رحمۃ سے مراد نعمت ہے؛ یہ دانشمندوں کے لیے عبرت ہے۔

**وَ خُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾**

''اور حکم ملا پکڑلو اپنے ہاتھ سے تنکوں کا ایک مٹھا اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو، بے شک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری کے بارے میں یہ قسم اٹھائی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو سو کوڑے ماریں گے اس کے سبب کے بارے میں چار اقوال ہیں: (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حکایت بیان کی ہے کہ ابلیس ایک طبیب کی صورت میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو ملا جس نے حضرت ایوب علیہ السلام کے علاج معالجہ کے لیے اسے دعوت دی تو ابلیس نے کہا: میں اس کا اس شرط پر علاج کروں گا کہ جب وہ صحت مند ہو جائے تو وہ یہ کہے: تو نے مجھے شفا دی ہے، اس کے سوا میں اس سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا بیوی نے کہا: ٹھیک ہے بیوی نے اس بارے میں حضرت ایوب علیہ السلام

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 102

سے مشورہ کیا تو آپ نے قسم اٹھادی کہ میں ضرور اسے ماروں گا فرمایا: تو ہلاک ہو وہ تو شیطان تھا۔

2۔ سعید بن مسیب نے بیان کیا: پہلے جتنی روٹیاں وہ لاتی تھی اس سے زائد وہ روٹیاں لائی تو آپ کو اس کی خیانت کا خوف ہوا تو آپ نے قسم اٹھادی کہ وہ ضرور اسے ماریں گے۔

3۔ جو یحییٰ بن سلام اور دوسرے علماء نے کہا ہے: شیطان نے اسے گمراہ کیا کہ وہ حضرت ایوب کو مجبور کرے کہ وہ ایک بکری کا بچہ اس کی عبادت کے طور پر ذبح کرے اور وہ صحت یاب ہو جائے، بیوی نے اس کا ذکر ان سے کیا تو آپ نے قسم اٹھادی کہ اگر وہ صحت مند ہو گئے تو اسے سو کوڑے ماریں گے۔

4۔ اس نے اپنی مینڈھیاں دو روٹیوں کے عوض بیچیں جب اس نے کوئی چیز نہ پائی کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس لے جائے حضرت ایوب علیہ السلام جب اٹھنے کا ارادہ کرتے تو وہ ان مینڈھیوں کا سہارا لیتے اسی وجہ سے آپ نے اس کو مارنے کی قسم اٹھائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو شفادی تو اسے حکم دیا کہ ایک گھٹا لیں اور اس کے ساتھ ماریں۔ آپ نے چھوٹی ٹہنیاں لیں ان کی تعداد سو پوری کی اور اسے ایک ہی دفعہ مارا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضغث سے مراد گھاس کا مٹھا ہے جس میں تر اور خشک تنکے ملے ہوتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد کھجور کی ٹہنی جس میں چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر** 2۔ یہ آیت اس بات کو ضمن میں لیے ہوئے ہے کہ مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ادب سکھانے کے لیے مارے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی نے غلطی کی تو آپ نے قسم اٹھائی کہ اسے سو کوڑے ماریں گے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کھجوروں کے گچھے سے ماریں؛ یہ حدود میں جائز نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اس لیے دیا کہ وہ حد ادب سے بڑھ کر اپنی بیوی کو نہ ماریں اس کی وجہ یہ ہے کہ خاوند کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ادب سے بڑھ کر اپنی بیوی کو مارے اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ جس طرح سورۂ نساء میں گذر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر** 3۔ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے: کہا یہ حکم عام ہے یا صرف حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ یہ حکم صرف حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ مہدوی نے عطا بن ابی رباح سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم باقی ہے جب کسی نے سو شاخوں کے ساتھ ایک ہی دفعہ مارا تو وہ آدمی بری ہو جائے گا؛ امام شافعی نے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے؛ اسی کی مثل ایک اپاہج کے بارے میں حکم دیا جس سے ایک لونڈی حاملہ ہو گئی تھی اور آپ نے حکم دیا کہ آپ شاخوں کا گچھا ماریں جس میں چھوٹی سو شاخیں ہوں وہ ایک ہی دفعہ ماریں۔

قشیری نے کہا: عطا سے کہا گیا کیا آج بھی اس پر عمل کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: قرآن نازل نہیں کیا گیا مگر اس لیے تاکہ آج اس پر عمل کیا جائے اور اسکی پیروی کی جائے۔ ابن عربی نے کہا: عطا سے یہ روایت کی گئی ہے کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے خاص حکم تھا۔ ابو زید نے ابن قاسم سے وہ امام مالک سے روایت نقل کرتے ہیں جس نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ اپنے غلام کو سو کوڑے مارے گا اس نے ان کو جمع کیا اور پھر ایک ہی دفعہ اسے مارا تو وہ بری نہ ہوگا۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: امام مالک

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کرتے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدہ:48) یہ حکم ہماری شریعت کے ساتھ منسوخ ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے ولید بن عقبہ کو ایسی چھڑی سے مارا جس کی دو شاخیں تھیں اسے چالیس ضربیں لگائیں امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کی: فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور:2) یہ اصحاب الرائی کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے اس کی سند میں گفتگو کی گئی ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ حدیث جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے استدلال کیا ہے اسے ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ احمد بن سعید ہمدانی، ابن وہب سے وہ یونس سے وہ ابن شہاب سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے بیان کیا ہے کہ انہیں ایک انصاری صحابی نے بیان کیا کہ ان میں سے ایک آدمی بیمار ہوا یہاں تک کہ بہت ہی کمزور ہو گیا وہ محض ہڈی پر چمڑا ہی رہ گیا کسی کی لونڈی اس کے پاس آئی اس کے دل میں لونڈی کے لیے میلان پیدا ہوا اور اس سے اپنی خواہش پوری کر بیٹھا جب اس کی قوم کے افراد اس کے پاس آئے تا کہ اس کی عیادت کریں تو اس مریض نے انہیں سب واقعہ بیان کر دیا اور کہا: میرے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کرو میں نے ایک لونڈی سے خواہش پوری کی ہے جو میرے پاس داخل ہوئی تھی انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا انہوں نے عرض کی: ہم نے کسی میں ایسی تکلیف نہیں دیکھی جو اس کو لاحق ہے اگر ہم اسے آپ کے پاس اٹھا کر لائیں تو اس کی ہڈیاں الگ الگ ہو جائیں گی وہ محض ہڈیوں پر چمڑا ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ سو چھوٹی شاخیں لائیں اور ایک ہی دفعہ اسے ماریں۔ امام شافعی نے کہا: جب ایک آدمی نے کہا میں فلاں کو سو کوڑے ماروں گا یا سو ضربیں لگاؤں گا اس نے ضربا شدیدا کا ذکر نہیں کیا اور دل میں اس کی نیت بھی نہ کی تو اس کے لیے وہی ضرب کافی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے وہ حانث نہ ہوگا۔

ابن منذر نے کہا: جب ایک آدمی قسم اٹھائے کہ وہ اپنے غلام کو سو کوڑے مارے گا اور اس نے اسے ہلکے ہلکے کوڑے مارے تو وہ قسم سے بری ہو جائے گا؛ یہ امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے کا نقطہ نظر ہے۔ امام مالک نے کہا: ضرب وہی ہے جو درد دے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَلَا تَحْنَثْ یہ ارشاد اس عمل پر دلیل ہے کہ قسم میں استثناء حکم کو ختم نہیں کرتی اگرچہ وہ متراخی ہی کیوں نہ ہو اس کے بارے میں بحث سورۂ مائدہ میں گذر چکی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: حَنِثَ فِي يَمِينِهِ يَحْنَثُ جب اس نے قسم کو پورا نہ کیا ہو کوفیوں کے نزدیک واؤ زائدہ ہے کلام یوں ہے فاضرب لاتحنث۔

**مسئلہ نمبر 5۔** ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ دو وجہوں میں سے ایک پر دلالت کرتا ہے(1): (1) ان کی شریعت میں کفارہ نہ تھا اس میں صرف قسم سے بری ہونا اور قسم توڑنا تھا (2) ان سے نذر صادر ہوئی تھی قسم صادر نہ ہوئی تھی۔ جب نذر معین ہو تو امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر کفارہ نہیں۔ امام شافعی نے کہا: ہر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1652

نذر میں کفارہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول کہ ان کی شریعت میں کفارہ نہ تھا یہ صحیح نہیں کیونکہ حضرت ایوب علیہ السلام جب آٹھ سال تک مصیبت میں رہے جس طرح ابن شہاب کی روایت میں ہے تو آپ کے دو صحابہ نے کہا: تحقیق آپ نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے میرا گمان نہیں کسی کو اس کی خبر ہوئی ہو۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا: میں نہیں جانتا تم کیوں کہتے ہو سوائے اس کے کہ میرا رب جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں کے پاس سے گذرتا جو ایک دوسرے کی مدد کرتے تو ہر ایک قسم اٹھاتا یا جماعت کے پاس سے گذرتا جو آپس میں مدد کر رہے ہوتے، میں ان کی قسموں کی طرف سے کفارہ ادا کر دیتا تا کہ ان میں سے کوئی بھی گناہ گار نہ ہو وہ اس کا ذکر کرتا ہے یا ذکر نہیں کرتا مگر حق کے ساتھ۔ تو آپ نے اپنے رب کے حضور یہ ندا کی: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ (الانبیاء) اور حدیث کا ذکر کیا یہ حدیث تجھے یہ فائدہ پہنچاتی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے زمانہ میں کفارہ تھا جس نے بغیر اجازت کے کفارہ ادا کیا تو اس نے اس کی طرف سے فریضہ ادا کیا اور دوسرے سے کفارہ ساقط ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ بعض جاہل زاہدوں اور صوفیوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو جو یہ ارشاد فرمایا: اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ اس میں رقص کا جواز ہے۔ ابو فرج نے کہا: یہ تو غیر ذمہ دارانہ استدلال ہے کیونکہ اگر آپ کو پاؤں مارنے کا حکم خوشی سے ہوتا تو اس میں کوئی شبہ ہو سکتا تھا آپ کو پاؤں مارنے کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ پانی نکلے۔

ابن عقیل نے کہا: وہ آدمی جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو اس کے بارے میں کہاں دلالت موجود ہے کہ جب مصیبت رفع ہو تو وہ زمین پر اپنا پاؤں مارے تا کہ پانی کا چشمہ ابل پڑے کہ یہ رقص کا اعجاز ہے اگر یہ جائز ہو کہ پاؤں کو حرکت دینا یہ اسلام میں رقص کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ تو یہ بھی جائز ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے صادر ہوا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (البقرہ: 60) تو اس میں یہ دلالت ہوتی کہ دشمن کو شاخوں سے مارا جائے ہم شرع کے ساتھ اس کھیل سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

بعض کوتاہ اندیشوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: أنت مني وأنا منك تو آپ ایک ٹانگ پر چلے آپ نے حضرت جعفر سے فرمایا: أشبهتَ خَلْقي وخُلُقي تو وہ ایک ٹانگ پر چلے آپ نے حضرت زید سے فرمایا: أنت أخونا ومولانا تو وہ ایک ٹانگ پر چلے ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حبشیوں نے جنگی کرتب دکھائے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ رہے تھے اس کا جواب یہ ہے جہاں تک ''حجل'' کا تعلق ہے یہ چال کی ایک نوع ہے جو خوشی کے موقع پر اپنائی جاتی ہے یہ چال اور رقص کہاں۔ اسی طرح حبشیوں کا ''زفن'' یہ بھی چال کی ایک صورت ہے جو جنگ کے موقع پر اپنائی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا یعنی ہم نے اسے آزمائش میں صابر پایا۔ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ وہ توبہ کرنے والے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے اور مطیع ہیں۔ سفیان سے ان دو افراد کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ان میں سے ایک کو آزمایا گیا تو اس نے صبر کیا دوسرے پر انعام کیا گیا اس نے شکر کیا تو فرمایا: دونوں برابر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے دونوں بندوں کی تعریف کی ہے ان میں سے ایک صابر تھا اور دوسرا شاکر تھا دونوں پر ایک جیسی تعریف کی حضرت ایوب علیہ السلام کی تعریف میں کہا: نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ۞ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعریف میں کہا گیا: نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ۞۔

میں کہتا ہوں: صاحب القوت نے اس کلام کو رد کیا ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے اس فقیر کی غنی پر فضیلت کا ذکر کیا ہے اور طویل گفتگو کی جس کے ذریعے اپنی کلام کو قوی کیا ہم نے اس کا ذکر کتاب منہج العباد و محجۃ السالکین والزھاد میں کیا ہے ان پر یہ امر مخفی رہا کہ آزمائش سے قبل اور اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام غنی انبیاء میں سے تھے آپ کا امتحان آپ کے مال اور اولاد کے چلے جانے اور جسم میں بڑی بیماری کی صورت میں ہوا تھا اسی طرح دوسرے انبیاء نے بھی صبر کیا جو بھی ان پر امتحان آیا اور انہیں آزمائش میں ڈالا گیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام جس کیفیت میں امتحان میں داخل ہوئے اس کیفیت میں اس سے نکلے نہ ان کی حالت بدلی اور نہ ہی ان کی گفتگو بدلی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام معنی مقصود میں حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ جمع ہوئے وہ تبدیلی کا نہ ہونا تھا جس میں بعض لوگ بعض پر فضیلت رکھتے ہیں اس اعتبار سے غنی شاکر اور فقیر صابر برابر ہیں بات اسی طرح ہے جس طرح سفیان نے کہی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابن شہاب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نکلے جب وہ اپنی حاجت کے لیے اس کی طرف نکلا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: اپنا پاؤں زمین کی طرف مارو، یہ ٹھنڈا پانی ہے اور مشروب ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس سے غسل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا گوشت، بال اور جلد خوبصورت ترین انداز میں لوٹا دی پھر اس پانی کو پیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے پیٹ میں جو درد یا کمزوری تھی اس کو دور کر دیا اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ان کے لیے سفید کپڑے اتارے ایک کو آپ نے تہبند بنایا اور دوسری کو چادر بنایا پھر چلتے ہوئے اپنے گھر کی طرف آئے اور بیوی پر آنے میں دیر کی وہ بیوی آئی یہاں تک کہ آپ کو ملی جبکہ وہ آپ کو پہچان نہیں رہی تھی اس نے آپ کو سلام کیا پوچھا اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے: کیا تو نے اس آزمائش میں پڑے آدمی کو دیکھا ہے؟ آپ نے پوچھا: وہ کون ہے؟ بیوی نے کہا: اللہ کے نبی حضرت ایوب علیہ السلام۔ اللہ کی قسم! میں نے کسی کو تجھ سے بڑھ کر اس سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا جب وہ تندرست تھے فرمایا: میں ایوب ہوں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے ایک گھٹا لیا اور بیوی کو مارا۔ ابن شہاب نے گمان کیا ہے: وہ گھٹا ثمامہ بوٹی کا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کے اہل اور ان کی مثل ان کی طرف لوٹا دیئے ایک بادل آیا وہ اس جگہ سونے کے ساتھ برسا جہاں گندم صاف کی جاتی یہاں تک کہ اس جگہ کو بھر دیا ایک دوسرا بادل اسی جگہ کی طرف آیا جہاں جو صاف کیے جاتے اور قطانیہ (چنے کی قسم کے دانے) صاف کیے جاتے وہ چاندی کے ساتھ برسا یہاں تک کہ وہ بھر گیا۔

وَ اذۡكُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ اُولِى الۡاَيۡدِىۡ وَ الۡاَبۡصَارِ ۞ اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ۞ وَ اِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِ ۞

''اور یاد فرماؤ ہمارے (مقبول) بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب بڑی قوتوں والے اور روشن دل تھے۔ ہم نے مختص کیا تھا انہیں ایک خاص چیز سے اور وہ دار آخرت کی یاد تھی، اور یہ (حضرات) ہمارے نزدیک چنے ہوئے تھے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عبدنا پڑھا ہے یہ سند صحیح کے ساتھ ثابت ہے۔ ابن عیینہ نے عمرو سے وہ عطا سے روایت نقل کرتے ہیں وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں؛ یہ مجاہد، حمید ابن محیصن اور ابن کثیر کی قراءت ہے اس قراءت کی بنا پر ابراهیم، عبدنا سے بدل ہوگا اور اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ اس پر معطوف ہونگے اس صورت میں ابراہیم اور مابعد اس کا بدل ہونگے۔

عربی لغت کے مطابق اس کی شرح یہ ہوگی جب تو کہے: رایت اصحابنا زیدا وعمروا وخالدا تو اس صورت میں زید، عمرو، خالد بدل ہونگے وہی اصحاب ہیں جب تو کہے: رایت صاحبنا زیدا عمرا وخالدا تو صرف زید بدل ہوگا عمرو اور خالد کا عطف صاحبنا پر ہوگا وہ مصاحبت میں داخل نہیں مگر اس کے علاوہ دلیل سے، مگر اسے یہ علم ہے وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ عبودیت میں داخل ہیں۔

جس نے یہ کہا تھا کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں اس نے اسی آیت سے استدلال کیا جس طرح ہم نے اپنی کتاب الأعلام بمولد النبی علیہ السلام میں ذکر کیا ہے؛ یہی قول صحیح ہے۔

اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ نحاس نے کہا: جہاں تک الابصار کا تعلق ہے اس کی تاویل پر تو اتفاق ہے کہ یہاں بصائر سے مراد دین اور علم میں بصیرتیں ہیں جہاں تک الۡاَیۡدِیۡ کا تعلق ہے تو اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اہل تفسیر کہتے ہیں: اس سے مراد قوت ہے ایک قوم کہتی ہے: الۡاَیۡدِیۡ یہ ید کی جمع ہے جس سے مراد نعمت ہے وہ نعمتوں والے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ انعام و احسان کرنے والے لوگ ہیں انہوں نے احسان کیا اور بھلائی کو آگے بھیجا، یہ طبری کا نقطہ نظر ہے۔

وَ اِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَیۡنَ الۡاَخۡیَارِ ۝ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اونا س سے پاک کیا اور اپنی رسالت کے لیے پسند کیا مصطفین یہ مصطفی کی جمع ہے اصل میں مصتفی تھا۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گذر چکی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ۔ آیت 132۔ اخیار یہ خیر کی جمع ہے۔

اعمش، عبدالوارث، حسن بصری اور عیسیٰ ثقفی نے اولی الاید یاء کے بغیر پڑھا ہے یہ وقف اور وصل کی صورت میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وہ قوی تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی جماعت کی قراءت کے مطابق ہو اور یاء تخفیف کے طور پر حذف ہو۔

اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ۝ عام قراء کی قراءت بخالصة تنوین کی صورت میں ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا اختیار ہے۔ نافع، شیبہ، ابو جعفر اور ہشام نے ابن عامر سے بخالصة ذکری الدار اضافت کی صورت میں پڑھا ہے جس

نے خالصة پر تنوین پڑھی ہے اس نے ذکری الدار کو بدل بنایا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی: إنا أخلصنا هم بأن يذكروا الدار الاخرة ہم نے انہیں خالص کیا کہ وہ دار آخرت کو یاد کریں، اس کے لیے تیاری کریں، اس میں رغبت کریں اور لوگوں میں رغبت دلائیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ خالصة، خلص کا مصدر ہو ذکری رفع کے محل میں ہو کیونکہ یہ فاعل ہے معنی ہوگا ہم نے انہیں خالص کیا یعنی میں نے ان کے لیے دار آخرت کے ذکر کو خالص کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ خالصة، اخلصتُ کا مصدر ہو تا زیادتی حذف ہوگئی اس صورت میں ذکری محل نصب میں ہوگا تقدیر کلام یوں ہوگی بان اخلصوا ذکری الدار۔

دار سے مراد دنیا لینا بھی جائز ہے معنی یہ ہوگا وہ دنیا سے نصیحت حاصل کریں اس میں زہد اپنائیں تا کہ ان کے لیے اچھی تعریف خالص ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ (مریم:50) یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد دار آخرت ہو اور مخلوق کو یاد دلا کر نصیحت کی گئی جس نے خالصہ کو الدار کی طرف مضاف کیا ہے تو اس صورت میں یہ الاخلاص کے معنی میں مصدر ہے الذکر مفعول بہ ہے جو فاعل کی طرف مضاف ہے اور خالصہ یہ مصدر ہے خلوص کے معنی میں ہے یعنی میں نے ان کے لیے دار کا ذکر خالص کر دیا۔ دار سے مراد دنیا ہو یا آخرت ہو جس طرح پہلے گذرا ہے۔

ابن زید نے کہا: معنی ہوگا وہ آخرت کا ذکر کرتے ہیں وہ اس میں رغبت رکھتے ہیں اور دنیا میں زہد اختیار کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے ہم نے ان کے لیے جنت کا ذکر کیا۔

وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾ هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِـِٔينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾

''اور یاد فرمائیے: اسماعیل، یسع، اور ذی الکفل کو یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں یہ نصیحت ہے، اور بے شک پرہیزگاروں کے لیے عمدہ ٹھکانہ ہے، سدا بہار باغات کھلے ہوں گے ان کے لیے سب دروازے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان میں طلب فرماتے ہوں گے وہاں طرح طرح کے پھل اور مشروبات اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی (عمر، جمال وکمال میں) ہم مثل (حوریں) ہونگی یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ روز حساب (تمہیں ملے گا)۔ بے شک یہ ہمارا دیا ہوا رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا''۔

حضرت یسع کا ذکر سورۃ الانعام اور ذی الکفل کا ذکر سورۃ الانبیاء میں گذر چکا ہے ان میں سے ہر ایک کو نبوت کے لیے چنا گیا ہے۔ دنیا میں یہ ان کا ذکر جمیل ہے اور ایسا شرف ہے جس کے ساتھ دنیا میں ان کا ذکر کیا جاتا رہے گا دنیا میں اس ذکر کے ساتھ ساتھ قیامت میں اچھا ٹھکانہ ہے پھر اس کی وضاحت اس ارشاد سے کی جَنّٰتِ عَدْنٍ۔ لغت میں عدن کا معنی ٹھہرنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: عدن بالمکان جب وہ مقیم ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: جنت میں ایک محل ہے جس کو عدن کہتے ہیں جس کے ارد گرد برج اور سبزہ زار ہیں اس کے پانچ ہزار دروازے ہیں ہر دروازے پر پانچ ہزار دھاری دار یمنی چادریں ہیں اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا مگر نبی، صدیق اور شہید۔ مفتحۃ ترکیب کلام میں حال بن رہا ہے۔

الْاَبْوَابُ کو رفع دیا گیا ہے کیونکہ یہ نائب الفاعل ہے۔ زجاج نے تقدیر کلام یوں کی ہے مفتحۃ لھم الأبواب منھا فراء نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے مفتحۃ لھم ابوابھا یعنی ابواب پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ فراء نے اس قراءت کو بھی جائز قرار دیا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یعنی الابواب کو نصب دی ہے۔ فراء نے کہا: اصل میں مفتحۃ الابوابِ ہے پھر تو تنوین لایا اور الابواب کو نصب دی۔

فراء اور سیبویہ نے یہ شعر پڑھا:

ونأخذ بعدہٗ بِذِنَابِ عَيْشٍ　　أَجَبَّ الظَّهْرَ ليس له سَنَامُ

ہم اس کے بعد زندگی کی دموں کو پکڑنے والے ہونگے کمزوری کی وجہ سے جس کی کہان نہیں۔

یہاں مفتّحۃ فرمایا مفتوحۃ نہیں فرمایا کیونکہ انہیں حکم کے ساتھ کھولا گیا ہے ہاتھ لگانے سے وہ نہیں کھلے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یوں کہا جاتا ہے انفتحی فتنفتح، انغلقی فتنغلق(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فرشتے ان کے لیے دروازے کھولیں گے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا یہ حال ہے جسے عامل پر مقدم کر دیا گیا ہے عامل يَدْعُوْنَ ہے یعنی وہ جنات میں طلب کرتے ہوں گے، جبکہ وہ ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے، رنگا رنگ پھل اور کثیر مشروب کیونکہ کلام دلالت کر رہی ہے اس لیے کثیر کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔

وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ایسی بیویاں ہونگی جو اپنی نظریں خاوندوں تک محدود رکھتی ہیں کسی اور طرف نظر نہیں کرتیں سورۃ الصافات میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ اَتْرَابٌ۝ ہم عمر ان کی عمریں ایسی ہوں گی گویا سب ایک ہی دن میں پیدا ہوئی ہیں وہ حسن، جوانی میں برابر ہیں اور تینتیس سال کی ہونگی۔

اتراب، ترب کی جمع ہے یہ قاصرات کی صفت ہے کیونکہ قاصرات نکرہ ہے اگرچہ معرفہ کی طرف مضاف ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ الف لام اس پر داخل ہوتا ہے جس طرح شاعر نے کہا:

مِن القاصِراتِ الطَّرْفِ لَوْدَبَّ مُحْوِلٌ　　من الذَّرِّ فوقَ الإتْبِ مِنها لأَثَّرا

وہ جھکی نظروں والی ہیں اگر ایک باریک چیونٹی ان کی قمیص کے اوپر سے گذرے تو وہ بھی اثر چھوڑ جاتی ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ۝ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ عام قراءت تاء کے ساتھ ہے ما وعدون أیھا المومنون یعنی اے مومنو! یہ وہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ابن کثیر، ابن محیصن، ابو عمرو اور یعقوب نے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 389

اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے(1)؛ یہ سلمی کی قراءت ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
وَ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ پس یہ خبر ہے لِیَوْمِ الْحِسَابِ میں لام، فی کے معنی میں ہے۔ اعشی نے کہا:

المُهِينِين مَا لَهُمْ لِزمانِ السَّوءِ حتّى إذا أفاق أفاقوا

وہ ذلیل ورسوا ہیں برے زمانے میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں جب زمانہ کو افاقہ ہوتا ہے تو انہیں افاقہ ہوتا ہے۔
اس شعر میں لام، فی کے معنی میں ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ جنت کی نعمتیں ہمیشہ ہونگی ختم نہ ہونگی جس طرح فرمایا:
عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ (ہود) فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۶﴾ (التین)

هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ ﴿۶۱﴾

"یہ تو پرہیزگاروں کے لیے ہے اور بلاشبہ سرکشوں کے لیے برا ٹھکانہ ہوگا یعنی جہنم وہ داخل ہوں گے اس میں تو یہ کتنا تکلیف دہ بچھونا ہوگا۔ یہ کھولتا پانی اور پیپ ہے پس چاہیے کہ وہ اسے چکھیں اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب، یہ لو دوسری فوج گھسنا چاہتی ہے تمہارے ساتھ کوئی خوش آمدید نہیں انہیں یہ ضرور آگ تاپنے والے ہیں۔ وہ کہیں گے: ظالمو! تمہیں کوئی خوش آمدید نہ ہو تم نے یہی آگے کیا اس عذاب کے لیے، سو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ کہیں گے: اے ہمارے رب! جس بدبخت نے آگے کیا ہے ہمارے لیے یہ عذاب پس بڑھا دے اس کا عذاب دوگنا آگ میں"۔

جب متقین کا ذکر کیا تو سرکشوں کے انجام کا بھی ذکر کیا۔ زجاج نے کہا: هٰذَا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہے الامر هذا اس وجہ سے هٰذَا پر وقف ہوگا۔ ابن انباری نے کہا: هٰذَا پر وقف اچھا ہے پھر تو وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ سے کلام کا آغاز کرے گا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔

مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ سے مراد لوٹنے کی جگہ ہے جس کی طرف وہ لوٹیں گے پھر اس کی وضاحت اس ارشاد سے کی: جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ انہوں نے جو اپنے لیے ٹھکانہ تیار کیا ہے وہ کتنا برا ہے یا یہ بستر ان کے لیے کتنا برا ہے اسی سے بچے کا پنگھوڑا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے بئس موضع المهاد۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 612

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ جس کی صفت بیان کی گئی ہے وہ ان متقین کے لیے ہے پھر فرمایا کہ سرکشوں کے لیے لوٹنے کی بری جگہ ہے، تو اس صورت میں هٰذَا پر وقف کیا جائے گا۔

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ هٰذَا مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اس کی خبر حمیم ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہے هذا حميم وغساق فليذوقوه، فَلْيَذُوْقُوْهُ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ هٰذَا مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو اور فَلْيَذُوْقُوْهُ خبر ہو فعل پر فاء اس لیے آئی ہے کیونکہ هٰذَا میں الذی کا معنی پایا جاتا ہے اس صورت میں فَلْيَذُوْقُوْهُ پر عطف کیا جائے گا اور حمیم کو اس تقدیر کی بنا پر رفع دیا جائے گا هذا حميم۔

نحاس نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ معنی هو الأمر هذا حمیم اور غساق کو جب تو خبر نہ بنائے تو ان دونوں کا رفع اس تقدیر پر ہوگا هو حميم وغساق فراء نے اس تعبیر کی بنا پر دونوں کو رفع دیا ہے۔ منه حميم ومنه غساق اور یہ شعر پڑھا:

حتى إذا ما أضاءَ الصُّبحُ فی غَلَسٍ وغُودِرَ البَقْلُ مَلْوِيٌّ ومَحْصُودُ

جب تاریکی میں صبح روشن ہوئی سبزیوں کو چھوڑ دیا گیا ان میں سے کچھ لپٹی ہوئی تھیں اور کچھ کٹی ہوئی تھیں۔

محل استدلال ملوی و محصود ہے اصل میں منه ملوی اور منه محصود تھا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لها مَتاعٌ واعوان غَدَوْن به قِتْبٌ و غَرْبٌ إذا ما أُفرِغَ انسحفا

یہ بھی جائز ہے کہ هٰذَا محل نصب میں ہو اور فعل مضمر ہو جس کی تفسیر فَلْيَذُوْقُوْهُ بیان کرتا ہے اور حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ سے تو نئی کلام شروع کرے گا تقدیر کلام یوں ہوگی الأمر حميم وغساق۔

اہل مدینہ، اہل بصرہ اور بعض کوفیوں کے نزدیک غساق میں قراءت سین کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ یحییٰ بن وثاب، اعمش، حمزہ اور کسائی نے غسّاق تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش کے قول میں دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں کا معنی مختلف ہے جس نے اس کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں یہ محض اسم ہوگا جیسے عذاب، جواب، صواب، جس نے اسے مصدر پڑھا ہے اس نے کہا: یہ اصل میں اسم مبالغہ ہے جو مبالغہ کے طریقہ پر فعال کی طرف نقل کیا گیا ہے جیسے ضراب، قتال۔ یہ غسق یغسق سے فعال کے وزن پر ہے اس سے اسم فاعل غَسّاق اور غاسق کے وزن پر آتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد سخت ٹھنڈک ہے جو انہیں اپنی ٹھنڈک کے ساتھ خوفزدہ کرے گی۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا: اس سے مراد ایسی برف ہے جس کی ٹھنڈک انتہاء کو پہنچی ہوئی ہوگی (1)۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ اپنی سردی کے ساتھ اسی طرح جلائے گی جس طرح حمیم اپنی گرمی کے ساتھ جلائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: گاڑھی پیپ ہوگی اگر اس میں کوئی چیز مشرق میں گرے تو جو مغرب میں ہوگا وہ اس کی وجہ سے بدبودار ہو جائے گا اگر اس میں سے کوئی چیز مغرب میں گرے تو جو مشرق میں ہیں اس سے بدبودار ہو جائیں گے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے جو بدکاروں کی شرمگاہوں

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 612

سے اور کافروں کے گوشتوں اور ان کی جلدوں سے کچ لہو اور پیپ میں سے بدبودار چیز نکلے گی۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ جہنمیوں کا نچوڑ ہے، یہ قول لغت کے زیادہ مشابہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: غَسَق الجرح یَغْسِق غسقا یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب اس سے زیادہ پانی نکلے۔ شاعر نے کہا:

إذا ما تَذَكَّرْتُ الحياةَ وطِيبَها　　إليّ جَرَى دَمْعٌ من اللَّيلِ غاسِقُ

جب میں نے زندگی اور اس کی اچھائی کو ظاہر کیا تو آنکھ سے ٹھنڈا آنسو بہہ پڑا۔

یہ کہا جاتا ہے لیل غاسق کیونکہ وہ دن سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ سدی نے کہا: غساق سے مراد وہ چیز ہے جو ان کی آنکھوں اور آنسوؤں سے بہے جسے وہ حمیم (کھولتے ہوئے پانی) کے ساتھ پیتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: حمیم سے مراد ان کی آنکھوں کے آنسو ہیں جو جہنم کے حوضوں میں جمع ہونگے جسے وہ پئیں گے۔ صدید اسے کہتے ہیں جو ان کے چمڑوں سے نکلے گی۔ اس قول کو ختیار کرنے کی بنا پر غساق سیال کی طرح ہوگا۔ کعب نے کہا: غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جس میں بچھو اور سانپ وغیرہ کا زہر اس کی طرف بہتا رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ظلمت اور سواد سے ماخوذ ہے، غسق سے مراد رات کی تاریکی کا آغاز ہے قد غسق اللّیل اس وقت کہتے ہیں جب وہ تاریک ہو جائے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو أن دلوا من غساق يهراق في الدنيا لانتن اهل لدنيا اگر غساق کا ایک ڈول دنیا میں بہایا جائے تو دنیا والے بدبودار ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ پہلے اشتقاق کے زیادہ مناسب ہے جس طرح ہم نے بیان کیا مگر یہ احتمال موجود ہے کہ غساق بہنے کے ساتھ سیاہ ہو جائے تو دونوں اشتقاق صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ ابو عمرو نے واُخَر پڑھا ہے یہ اخری کی جمع ہے جس طرح کُبرٰی کی جمع کُبَر آتی ہے۔ باقی قراء نے اسے وآخر مفرد مذکر پڑھا ہے ابو عمرو نے وآخر کا انکار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَزْوَاجٌ جمع کی خبر واحد سے نہیں لگائی جاتی۔ عاصم جحدری نے واُخر کا انکار کیا ہے اگر یہ واخر ہوتا تو کلام یوں ہوتی من شکلها دونوں امر لازم نہیں دونوں قراءتیں صحیح ہیں واخر ہو تو معنی یہ ہوگا حمیم اور غساق کے سوا دوسرا عذاب۔

مِنْ شَكْلِهٖۤ قتادہ نے کہا: اسی کی مثل حضرت ابن مسعود نے کہا: وہ زمہریر ہے وَّاٰخَرُ مرفوع ہے(1) کیونکہ یہ مبتدا ہے اَزْوَاجٌ یہ دوسرا مبتدا ہے مِنْ شَكْلِهٖۤ یہ اس کی خبر ہے اور جملہ (آخر) کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ وَّاٰخَرُ مبتدا ہو اور اس کی خبر مضمر ہو جس پر یہ کلام دلالت کرتی ہے هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ کیونکہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ یہ انہیں کے لیے ہے گویا یہ کلام کی ولهم آخر تو اس صورت میں مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ، اٰخَرُ کی صفت ہوگی پس مبتدا صفت کے ساتھ خاص ہو جائے گا اَزْوَاجٌ ظرف کے ساتھ مرفوع ہے۔ جس نے وَّاٰخَرُ پڑھا اس نے ارادہ کیا عذاب کی اور قسموں کا، جس نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا اور زمہریر کا ارادہ کیا تو زمہریر کی کئی جنسیں بنائیں تو اسے جمع ذکر کیا کیونکہ جنس مختلف ہیں یا ان سے ہر جز کو

1۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 122

زمہریر بنا دیا پھر اس کی جمع بنائی جس طرح عربوں نے کہا: شابت مفارقہ یا ء جمع کا صیغہ ہے کیونکہ کلام میں جمع کے جواز پر دلالت موجود ہے کیونکہ زمہریر جو سردی کی انتہاء کو کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں جمع کے مقابل ہے: هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ شَكْلِهٖٓ میں ضمیر جائز ہے کہ وہ حمیم یا غساق کی طرف لوٹے یا اس معنی کی طرف لوٹے جو ہم نے وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ میں ذکر کیے ہیں آخر کو جب جمع کے صیغہ کی حیثیت سے پڑھیں گے تو یہ مبتدا ہونے کی حیثیت میں مبتدا ہوگا مِنْ شَكْلِهٖٓ اس کی صفت ہوگا اس میں ضمیر مذکر ہے جو مبتدا کی طرف لوٹتی ہے اور اَزْوَاجٌ مبتدا کی خبر ہے یہ جائز نہیں کہ اس تقدیر پر اسے محمول کیا جائے ولھم اخر، مِنْ شَكْلِهٖٓ اس کی صفت ہو اور ازواج ظرف کے ساتھ مرفوع ہے جس طرح یہ افراد میں جائز ہے کیونکہ جب ازواج مرفوع ہو تو صفت میں کوئی ضمیر نہ ہوگی؛ یہ ابوعلی نے کہا۔ اَزْوَاجٌ کا معنی عذاب کی اصناف و الوان ہیں۔ یعقوب نے کہا: جب شکل شین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی مثل ہوگا اور جب شین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایسی عورت ہوگا جو اچھی گفتگو کرنے والی، اچھے مزاج اور ہیئت والی ہوگی۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب قائدین جہنم میں داخل ہوں گے(1) پھر ان کے بعد ان کے پیروکار داخل ہونگے تو خازن، سرداروں کو کہیں گے: یہ تمہارے پیروکار ہیں۔ فوج کا معنی جماعت ہے مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ تمہارے ساتھ جہنم میں داخل ہونے والے ہیں تو سردار کہیں گے: ان کی منازل آگ میں خوشگوار نہ ہوں گی۔ الرحب کا معنی وسعت ہے اسی سے رحبۃ المسجد ہے یعنی مسجد کا صحن۔ یہ دعا کے لیے لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسی وجہ سے نصب دی جاتی ہے نابغہ نے کہا:

لَا مَرْحَبًا بِغَدٍ وَلَا اَهْلًا بِهٖ    اِنْ كَانَ تَفْرِيْقُ الْاَحِبَّةِ فِيْ غَدٍ

کل کو نہ مرحبا ہے اور نہ ہی اہلا وسہلا ہے اگر کل دوستوں کے درمیان جدائی ہوئی ہے۔

ابوعبید نے کہا: عرب کہتے ہیں لا مرحبا بك۔ نہ تیرے لیے زمین خوشگوار ہوئی اور نہ ہی وسیع ہوئی۔

اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قائدین کا قول ہے؛ یہ جہنم میں داخل ہونے والے ہیں جس طرح ہم نے انہیں جہنم میں داخل کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ملائکہ کا قول ہے یہ ان کے قول هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ اور قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ کے ساتھ متصل ہے؛ یہ متبعین کا قول ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ پہلی جماعت مشرکین کے سردار اور بدر کے روز انہیں کھانا کھلانے والوں کی ہوگی، دوسری جماعت بدر میں ان کی اتباع کرنے والوں کی ہوگی۔ آیت کا ظاہر اس پر دال ہے کہ یہ ہر تابع اور متبوع کو عام ہے۔

اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا یعنی تم نے ہمیں عصیان کی طرف دعوت دی فَبِئْسَ الْقَرَارُ ہمارا اور تمہارا ٹھکانہ کتنا برا ہے قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا پیروکاروں نے کہا: فراء نے کہا: جس نے ہمارے لیے اس عمل کو جائز قرار دیا اور اس کی سنت قائم کی۔ دوسرے علماء نے کہا: جس نے ہمارے حق میں عذاب کو مقدر کیا کہ ہمیں معاصی کی طرف دعوت دی فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 612

فِي النَّارِ ۝ یعنی ان کے حق میں اس وجہ سے بھی عذاب مقدر ہے کہ انہوں نے ہمیں اس امر کی طرف بلایا تو اس طرح ان کے حق میں یہ دگنا ہو جائے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: عَذَابًا ضِعْفًا سے مراد چھوٹے بڑے سانپ ہیں (1) اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (الاعراف: 38)

وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ۝ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ۝

''اور کہیں گے: کیا وجہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے یہاں وہ لوگ جنہیں ہم شمار کرتے تھے برے لوگوں میں۔ ہم جن کا تمسخر اڑایا کرتے تھے یا پھر گئی ہیں ان کی طرف سے ہماری آنکھیں۔ یقیناً یہ سچ ہے دوزخی آپس میں جھگڑیں گے''۔

وَ قَالُوْا یعنی مشرکین کے اکابر نے کہا: کیا وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے جنہیں ہم شریر شمار کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ اشرار سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ لیتے۔ ابوجہل کہے گا: بلال کہاں ہے، صہیب اور عمار کہاں ہے؟ وہ فردوس میں ہونگے۔ ابوجہل پر تعجب ہے وہ بیچارہ مسکین، اس کا بیٹا حضرت عکرمہ مسلمان ہو گیا اسکی بیٹی جویریہ مسلمان ہو گئی اس کی ماں مسلمان ہو گئی اور اس کا بھائی مسلمان ہو گیا جبکہ اس نے کفر کیا۔ شاعر نے کہا:

ونورًا أضاءَ الأرضَ شرقًا و مغربًا ومَوضِعُ رِجلِي مِنهُ أسوَدُ مُظلِمُ

وہ نور جس نے زمین کے مشرق و مغرب کو روشن کر دیا اور میرے قدم کی جگہ اس سے تاریک و سیاہ ہے۔

اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا مجاہد نے کہا: ہم نے دنیا میں ان کا مذاق اڑایا تو ہم نے غلطی کی اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ۝ یا ہماری آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں تو ہم ان کا مکان نہیں جانتے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا، انہوں نے صحابہ کا مذاق اڑایا اور دنیا میں ان کی آنکھیں ان سے پھر گئی تھیں کیونکہ وہ انہیں حقیر خیال کرتے تھے (2)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ کا معنی ہے کیا وہ ہمارے ساتھ جہنم میں ہی ہیں ہم انہیں دیکھتے نہیں ابن کثیر، اعمش، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝ اَتَّخَذْنٰهُمْ پڑھا کرتے تھے یعنی ہمزہ وصلی کو حذف کرتے تھے۔ ابو جعفر، شیبہ، نافع، عاصم اور ابن عامر اتخذناھم پڑھا کرتے تھے یعنی ہمزہ استفہام کا ہمزہ قطعی پڑھتے اور ہمزہ وصل ساقط ہو گیا کیونکہ اب اس سے استغناء ثابت ہو چکی ہے جس نے الف کے حذف کے ساتھ پڑھا تو وہ الاشرار پر وقف نہیں کرے گا کیونکہ اتخذناھم حال ہے۔ نحاس اور سجستانی نے کہا: یہ رجال کی صفت ہے۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ لغت نہ تو ماضی کا صیغہ ہوتا ہے نہ ہی مستقبل کا صیغہ ہوتا ہے۔

جس نے اتخذناھم ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اس نے الاشرار پر وقف کیا۔ فراء نے کہا: یہاں استفہام توبیخ اور

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 612 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 391

تعجب کے لیے ہے جب تو اتخذناھم کو استفہام کے ساتھ پڑھے تو امر تسویہ کے لیے ہوگا جب تو استفہام کے بغیر پڑھے تو یہ بل کے معنی میں ہوگا۔ ابو جعفر، نافع، شیبہ، مفضل، ہبیرہ، یحییٰ، اعمش، حمزہ اور کسائی نے سخریا پڑھا ہے باقی نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا: جس نے اس کو کسرہ دیا اس نے اسے ھزء سے بنایا ہے اور جس نے اس کو ضمہ دیا اس کا معنی تسخیر کیا۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ لَحَقٌّ، اِنَّ کی خبر ہے اور تَخَاصُمُ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہوگا ھو تخاصم یہ بھی جائز ہے کہ یہ حق سے بدل ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ خبر کے بعد خبر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذلك سے بدل ہو معنی ہوگا جہنمیوں کا جہنم میں جھگڑا حق ہے جس طرح یہ قول: لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ اور اس جیسے دوسرے اقوال۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنْذِرٌ ۖۗ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾

”اے حبیب! آپ فرمایئے: میں تو فقط ڈرانے والا ہوں اور نہیں ہے کوئی خدا مگر الله جو ایک ہے سب پر غالب ہے مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عزت والا بخشنے والا ہے۔ فرمایئے: یہ بڑی اہم اور عظیم خبر ہے تم اس سے منہ موڑے ہوئے ہو، مجھے کوئی علم نہ تھا عالم بالا کے بارے میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر یہ کہ میں فقط کھلا ڈرانے والا ہوں“۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنْذِرٌ جو آدمی الله تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے میں اسے الله تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ الہ کا معنی معبود ہے الله تعالیٰ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ پر رفع صفت ہونے کے اعتبار سے ہے اگر تو پہلے کو نصب دے تو اسے بھی نصب دے گا پہلے کو رفع اور مابعد کو مدح کے طور پر نصب دینا بھی جائز ہے الْعَزِيْزُ کا معنی محفوظ ہے جس کی کوئی مثل نہ ہو الْغَفَّارُ سے مراد جو مخلوقات کے گناہوں کو بخشنے والا ہو۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اے محمد! انہیں کہو حساب، ثواب اور عقاب کے بارے میں جو تمہیں ڈرا رہا ہوں یہ عظیم الشان خبر ہے مناسب نہیں کہ اسے ہلکا جانا جائے؛ یہ قتادہ نے معنی کیا ہے اس کی مثل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿۲﴾ (النباء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ نے کہا: اس سے مراد قرآن حکیم ہے (1) جس نے تمہیں اس کے بارے میں آگاہ کیا ہے وہ عظیم الشان خبر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبأ عظیم سے مراد عظیم منفعت ہے۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ ملا اعلیٰ سے مراد ملائکہ ہیں (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 109
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 110

کے قول کے مطابق فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اس وقت جھگڑا کیا تھا جب آپ کو تخلیق کیا گیا فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (البقرۃ:30) ابلیس نے کہا: اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ اس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے واقعات کی خبر دی اللہ تعالیٰ کی تائید کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر معجزہ قائم ہے انہیں کیا ہو گیا کہ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے اعراض کرتے ہیں جبکہ وہ تدبر کر کے آپ کی صداقت کو پہچان سکتے تھے اسی وجہ سے اس قول کو، اس قول: قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ جوڑا ہے۔ دوسرا قول جسے ابواشہب نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میرے رب! نے مجھ سے پوچھا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرشتے کس بات میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے عرض کی: کفارات اور درجات میں جھگڑ رہے ہیں پوچھا: کفارات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی: جماعت کے لیے قدموں پر چل کر جانا، سخت سردی میں اچھی طرح وضو کرنا اور نماز کے بعد مساجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا، پوچھا: درجات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی سلام کو عام کرنا، کھانا کھلانا، رات کے وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں (1)۔ امام ترمذی سے اسی معنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس کے بارے میں کہا: حدیث غریب ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے بارے میں کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2) ہم نے اسے مکمل طور پر کتاب الأسنی فی شرح أسماء اللہ الحسنی میں تحریر کیا ہے اور ہم نے اس کے اشکال کو بیان کیا ہے۔ الحمد للہ۔ سورۂ یس میں مساجد کی طرف چلنے کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے قدم سیآت کا کفارہ بنتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ملا اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں یَخْتَصِمُوْنَ میں ضمیر دونوں فرقوں کے لیے ہے اس سے مراد ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور جس نے یہ کہا وہ ایسے معبود ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ملا اعلیٰ سے مراد قریش ہیں ان کے اختصام سے مراد ان کا رازداری سے جھگڑا کرنا ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو آگاہ کر دیتا۔

اِنْ یُّوْحٰۤى اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۰﴾ میری طرف انذار کی وحی کی جاتی۔ ابوجعفر بن قعقاع نے اسے الا انما پڑھا ہے کیونکہ وحی بھی ایک قول ہے گویا کہا: میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں واضح خبردار کرنے والا ہوں۔ جس نے ہمزہ کو فتحہ دیا اس نے اسے محل رفع میں رکھا ہے کیونکہ یہ نائب الفاعل ہے۔ فراء نے کہا: گویا آپ نے کہا میری طرف انذار کے سوا وحی نہیں کی گئی۔ نحاس نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ انما محل نصب میں ہو۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۴﴾

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1653

2۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3158-3159، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اے حبیب! یاد فرمایئے جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے۔ پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی طرف سے خاص روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔ پھر سجدہ کیا سب کے سب فرشتوں نے سوائے ابلیس کے، اس نے گھمنڈ کیا اور ہو گیا کافروں میں سے''۔

اِذْ کا تعلق یَخْتَصِمُوْنَ کے ساتھ ہے معنی یہ ہے جب وہ جھگڑ رہے تھے تو مجھے ملا اعلیٰ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا اِذْ قَالَ یہ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ سے بدل ہے یَخْتَصِمُوْنَ محذوف کے متعلق ہے کیونکہ معنی ہے جب ملا اعلیٰ والے جھگڑ رہے تھے تو مجھے ان کی گفتگو کا کچھ علم نہ تھا فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ اذا یہ ماضی کے فعل کو مستقبل کی طرف پھیر دیتا ہے کیونکہ یہ حروف شرط کے مشابہ ہے اس کا جواب حرف شرط کے جواب جیسا ہوتا ہے یعنی جب میں نے اسے پیدا کیا مِنْ رُّوْحِیْ سے مراد ایسی روح ہے جس کا میں مالک ہوں میرے سوا کوئی اس کا مالک نہیں یہ اضافت کا معنی ہے سورۃ النساء آیت 171 میں وَ رُوْحٌ مِّنْهُ کے ضمن میں یہ بحث مفصل گذر چکی ہے۔

سٰجِدِیْنَ۝ حال کی حیثیت سے منصوب ہے یہ اسلام کا سجدہ تھا سجدہ عبادت نہ تھا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۝ انہوں نے حکم کی اطاعت کی اور اس کے سامنے عاجزی کرتے اور حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہوئے سجدہ کیا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ابلیس جہالت کی بنا پر سجدہ سے رک گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ استکبار کے طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے رکنا کفر ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے امر سے استکبار کیا تھا اس لیے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ۝ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ۝ۚۖ وَّ اِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ۝ۙ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ۝ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۝

''ارشاد ہوا: اے ابلیس! کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے، کیا تو نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے۔ وہ (گستاخ) بولا: میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے۔ حکم ملا (اے بے حیا!) نکل جا؛ تو جنت سے بے شک تو پھٹکارا گیا ہے اور بے شک تجھ پر میری لعنت برسے گی قیامت تک۔ ابلیس بولا: اگر یہی اٹل فیصلہ ہے تو میرے رب مجھے مہلت دیجئے روز حشر تک۔ جواب ملا: بے شک تو مہلت دیے

جانے والوں میں سے ہے یہ مہلت مقررہ وقت کے دن تک ہے۔ کہنے لگا: تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا''۔

**مَا مَنَعَكَ** کس نے تجھے حکم بجالانے سے پھیر دیا اور اس سے روک دیا کہ تو سجدہ کرے **لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ** الله تعالیٰ نے اس کی خلقت کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا مقصود حضرت آدم علیہ السلام کی کرامت کا اظہار کا تھا اگرچہ وہ ہر شے کا خالق ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح الله تعالیٰ نے اپنی طرف روح، بیت، ناقہ اور مساجد کو مضاف کیا لوگوں سے اسی طریقہ سے خطاب کیا جس طرح لوگ اپنے معمولات میں آگاہ تھے کیونکہ مخلوقات میں سے رئیس اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتا مگر اس شے کی عظمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے یہاں بھی ید کا ذکر اسی معنی میں ہے۔ مجاہد نے کہا یہاں ید کا ذکر تاکید کے لیے اور زائد ہے اس کا معنی ہے لما خلقت انا جس طرح الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ** (الرحمٰن: 27) اس سے مراد یبقی ربك ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ الله تعالیٰ کی تخلیق میں ید کے ذکر میں یہ دلیل ہے کہ یہاں یہ لفظ نعمت، قوت اور قدرت کے معنی میں نہیں یہ دونوں الله تعالیٰ کی ذات کی صفات میں سے دو صفتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ید سے مراد قدرت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مالی بهذا الامريد اس کام کو بجالانے کی مجھ میں طاقت نہیں و مالی بالحمل الثقيل يدان اس بوجھ کو اٹھانے میں میری طاقت نہیں، اس معنی پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ بالا جماع پیدا کرنا قدرت کے ساتھ ہی واقع ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَحَمَّلْتُ مِنْ عَفْرَاءَ مالیس لِی بِه ولالِلْجِبالِ الرَّاسِياتِ يَدَانِ

میں نے عفراء سے یہ تکلیفیں اٹھائیں جن کو اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ تھی اور نہ ہی مضبوط پہاڑوں کو طاقت تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: **لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ** کا معنی ہے جسے میں نے واسطہ کے بغیر پیدا کیا کہا: تو نے سجدہ کرنے سے تکبر کیا یا تو اپنے رب پر تکبر کرنے والوں میں سے ہے۔ محمد بن صالح، شبل سے وہ ابن کثیر اور اہل مکہ سے بیدی استکبرت الف موصولہ کے ساتھ جملہ خبریہ کے طور پر پڑھا **أَمْ كُنْتَ** میں ام منقطع ہے جو بل کے معنی میں ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح **أَمْ يَقُولُوْنَ افْتَرٰىهُ** (ہود: 13) ہے جس نے ہمزہ استفہام پڑھا ہے تو اس کے نزدیک ام متصلہ ہوگا اور اس کا مابعد ہمزہ کے مابعد کا معادن ہوگا ہمزہ استفہام تقدیر و توبیخ کے لیے ہوگا یعنی جب تو نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا کیا تو نے اپنے آپ کو بڑا جانا یا تو اس قوم سے ہے جو تکبر کرتے ہیں تو تو نے بھی اس وجہ سے تکبر کیا۔

**قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ** فراء نے کہا: عربوں سے کچھ کہتے ہیں انا اخیر منه و اشر منه اصل یہی ہے مگر کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ حذف ہو گیا۔

**خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ** ۝ اس نے آگ کو مٹی پر فضیلت دی جبکہ یہ اس کی جانب سے جہالت تھی کیونکہ جواہر ایک دوسرے کی ہم جنس ہیں۔ اس نے قیاس کیا تو اس نے قیاس میں خطا کی۔ سورۃ الاعراف میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

تو جنت سے نکل جا اور تو شہا بچوں سے رجم کیا جانے والا ہے تیرے لیے میری رحمت سے دوری قیامت کے دن تک کے لیے ہے۔ اس نے کیونکہ کفر پر اصرار کیا اس لیے اس امر کی وضاحت کی کیونکہ لعنت تو اس روز منقطع ہو جاتی ہے پھر جب جہنم میں اسے داخل کر دیا جائے گا تو اس کے حق میں لعنت کا ثابت ہونا ظاہر ہو جائے گا قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ ملعون نے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اسے موت نہ آئے تو اس کی گزارش قبول نہ کی گئی یہ وہ دن ہے جس میں مخلوق کو موت لاحق ہوئی اس کے ساتھ نرمی کرتے ہوئے اسے مہلت دی گئی۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ جب اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام کے سبب دھتکارا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی کہ وہ شہوات کو مزین کرنے اور ان پر شبہات وارد کرنے کے ساتھ انسانوں کو گمراہ کرے گا لَأُغْوِيَنَّهُمْ کا معنی ہے میں انہیں معاصی کی طرف بلاؤں گا جبکہ یہ معلوم ہے کہ وہ وسوسہ کے سوا کسی چیز پر رسائی نہیں رکھتا اگر وہ وسوسہ نہ کرتا تو وہ کسی کی زندگی میں فساد نہیں ڈال سکتا تھا مگر اسی کے لیے ایسا کر سکتا ہے جو اپنی اصلاح نہیں کرتا اسی وجہ سے فرمایا: إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ یعنی وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو تو نے اپنی عبادت کے لیے خالص کر دیا ہے اور جس کو تو نے مجھ سے محفوظ کر دیا ہے۔ سورۃ الحجر میں یہ بحث مفصل گذر چکی ہے۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝

''فرمایا: تو میں حق ہوں اور میں سچ ہی کہتا ہوں، میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور تیرے سب فرمانبرداروں سے۔ آپ فرمائیے: میں نہیں مانگتا تم سے کوئی اجر اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔ نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت سب جہانوں کے لیے۔ اور (اے کفار) تم ضرور جان لو گے اس کی خبر کچھ عرصہ بعد''۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝ یہ اہل حرمین، اہل بصرہ اور کسائی کی قراءت ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عاصم، اعمش اور حمزہ نے پہلے لفظ الحق کو رفع دیا۔ فراء نے اس میں جر کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ دوسرے میں اختلاف نہیں کہ وہ أَقُولُ کی وجہ سے منصوب ہے اور پہلے کو نصب اغراء کی وجہ سے ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فاتبعوا الحق واستمعوا الحق دوسرا لفظ الحق اس وجہ سے منصوب ہے کیونکہ قول کا فعل اس پر واقع ہو رہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ أُحِقُّ الْحَقَّ کے معنی میں ہے۔ ابوعلی نے کہا: پہلا الحق فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یحق اللہ الحق یا یہ قسم کی وجہ سے منصوب ہے اور حرف جار کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح تو کہتا ہے: اللہ لافعلن معنی ہوگا فرمایا: حق کی قسم! اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی والحقَّ اقولُ یہ جملہ ہے جو قسم اور جواب قسم کے درمیان ہے یہ قصہ تاکید کے لیے آیا ہے جب لفظ الحق کو فعل

مضمر کے ساتھ منصوب بتایا جائے گا تو لَاَمۡلَئَنَّ قسم کے ارادہ پر کلام ہوگی۔

فراء اور ابو عبید نے الحق کو حقا کے معنی میں کرتے ہوئے منصوب ذکر کیا ہے یہ تعبیر نحویوں کی ایک جماعت کے نزدیک غلط ہوگی یہ کہنا جائز نہیں زید الا ضربن کیونکہ لام کا مابعد ماقبل سے الگ ہوتا ہے اس لیے مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا دونوں کے قول کے مطابق لاملأن جھنم حقا۔ جس نے لفظ الحق کو مرفوع پڑھا تو اس نے مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فانا الحق یا الحق منی۔ دونوں نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یہ ہو ھذا الحق۔

سیبویہ اور فراء کے مذہب کے مطابق تیسرا قول ہے: حق یہ ہے کہ جہنم کو بھر دوں گا، مجرور پڑھنے کی صورت میں دو قول ہیں؛ یہ ابن سمیقع اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے (1) حرف قسم محذوف ہے؛ یہ فراء کا قول ہے جس طرح وہ کہا کرتے: اللہ عزوجل لافعلن سیبویہ نے اس جیسی صورت کے جواز کا قول کیا ہے۔ ابو العباس نے اس میں غلطی کی ہے وہ جر کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ حروف جار کو مضمر نہیں کیا جاتا (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ فاء، واؤ قسم کا بدل ہے جس طرح انہوں نے یہ شعر ذکر کیا:

فمثلكِ حُبْلَى قد طَرَقْتُ ومُرْضِع

یہاں محل استدلال مثلك ہے۔

لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ، مِنۡكَ سے مراد تیری ذات اور تیری اولاد ہے وَمِمَّنۡ تَبِعَكَ سے مراد بنی آدم ہے قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وحی کی تبلیغ پر کسی انعام کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وحی کے ذکر کی تبلیغ کے بعد علیہ کی ضمیر اس کے لیے ذکر کی ایک قول یہ کیا گیا عَلَيۡهِ کی ضمیر ءَاُنۡزِلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَيۡنِنَا کی طرف لوٹ رہی ہے وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ۞ نہ میں تکلیف کرتا ہوں اور جس کا مجھے حکم نہیں دیا جاتا میں اسے اندازہ نہیں کہتا مسروق نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: جس سے کسی ایسی چیز کے بارے سوال کیا جائے جس کا وہ علم نہ رکھتا ہو وہ کہہ دے میں نہیں جانتا اور وہ تکلف سے کام نہ لے کیونکہ اس کا کہنا لا اعلم یہ بھی علم ہے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا: قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ۞

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للمتکلف ثلاث علامات ینازع من فوقه ویتعاطی ما لاینال ویقول مالا یعلم (1) متکلف کی تین علامتیں ہیں وہ اپنے برتر سے جھگڑا کرتا ہے وہ ایسی چیز کا لین دین کرتا ہے جو پاتا نہیں اور وہ کہتا ہے جو نہیں جانتا ہے۔

دارقطنی کی سند سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں نکلے آپ رات کو چلتے رہے صحابہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے حوض کے پاس بیٹھا ہوا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: اے حوض والے! آج رات تیرے حوض پر درندے آئے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اے حوض والے! اسے نہ بتانا یہ تکلف کرنے والا ہے۔ ان درندوں کے لیے وہ ہے جو انہوں نے پی لیا اور ہمارے لیے وہ ہے جو باقی ہے وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1655

مشروب ہے اور پاک کرنے والا ہے''۔

مؤطا میں یحییٰ بن عبدالرحمن بن حاطب سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب ایک قافلہ میں نکلے ان میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تھے یہاں تک کہ وہ ایک حوض پر وارد ہوئے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: اے حوض والے! کیا تیرے حوض پر درندے وارد ہوتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے حوض والے! ہمیں نہ بتا ہم درندوں پر وارد ہوتے ہیں اور درندے ہم پر وارد ہوتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں پانیوں کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ ھو ضمیر سے مراد قرآن ہے، عالمین سے مراد جن اور انسان ہیں وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ہ ضمیر سے مراد ذکر ہے اور ذکر سے مراد قرآن ہے یعنی وہ حق ہے (1)۔

بَعْدَ حِيْنٍ قتادہ نے کہا: موت کے بعد۔ زجاج نے بھی یہی قول کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور ابن زید نے کہا: یوم قیامت۔ فراء نے کہا: موت کے بعد موت سے پہلے۔ جب مسلمانوں کی تلواریں تمہیں اپنی گرفت میں لے لیں گی تو تمہارے لیے اس قول کی حقیقت ظاہر ہوگی جو میں تمہیں کہتا ہوں۔ سدی نے کہا: حین سے مراد یوم بدر ہے۔ حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے: اے انسان! موت کے وقت یقینی خبر تیرے پاس پہنچے گی (2)۔ عکرمہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے یہ قسم اٹھائی لیصنعن کذا إلی حین فرمایا: بعض حین ایسے ہیں جس کا تو ادراک نہیں کر سکتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ اور بعض حین ایسے ہیں جس کا تو ادراک کر لیتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) گابے نکلنے سے کھجور کاٹنے تک چھ ماہ کا عرصہ لگتا ہے۔

اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ اور سورۂ ابراہیم میں گزر چکی ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 112

2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 393

# سورة الزمر

(اٰیاتھا ۷۵) (۳۹ سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ ۵۹) (رکوعاتھا ۸)

اسے سورۂ غرف کہتے ہیں۔ وہب بن منبہ نے کہا: جو یہ پسند کرے کہ الله تعالیٰ کی قضا جو اسکی مخلوق میں ہے، اسے پہچانے تو وہ سورۂ غرف کو پڑھے۔ حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا، اور جابر بن زید کے قول میں مکی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مگر دو آیتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں (1) اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (2) قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ۔ دوسرے علماء نے کہا: مگر سات آیات مدنی ہیں قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ یہ وحشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئیں۔ امام ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ زمر اور بنی اسرائیل کی تلاوت کے بغیر نہیں سویا کرتے تھے(2)۔ یہ پچھتر آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بہتر آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴

"اتاری گئی ہے یہ کتاب الله کی طرف سے جو عزیز اور حکیم ہے۔ ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ پس آپ عبادت کریں الله کی خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اطاعت کو، خبردار! صرف الله کے لیے ہے دین خالص۔ اور جنہوں نے بنالیے اس کے سوا اور والی اور (کہتے ہیں) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لیے کہ یہ ہمیں الله کا مقرب بنا دیں، بے شک الله تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان جن باتوں میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں، بلاشبہ الله تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا اور بڑا ناشکرا ہو۔ اگر الله چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے تو چن لیتا اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا وہ پاک ہے، وہی الله ہے جو

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 113

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی فضل جاهر القران، جلد 2، صفحہ 114۔ ایضاً، حدیث نمبر 3327، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک ہے سب سے زبردست''۔

تَنْزِيْلُ کو رفع، مبتدا کی وجہ سے دیا گیا اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس حیثیت سے مرفوع ہو ھذا تنزیل یہ فراء نے کہا۔ کسائی اور فراء نے تنزیل منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ مفعول بہ ہے۔ کسائی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے اتبعوا اقرءوا تنزیل الکتاب۔ فراء نے کہا: یہ اغراء کی حیثیت میں منسوب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (النساء: 24) تقدیر کلام ہے الزموا کتاب اللہ کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اسے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ مکتوب ہے۔

یہ کتاب کی تنزیل اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے ہم نے اسے حق کے ساتھ نازل کیا ہے حق سے مراد صدق ہے یعنی یہ باطل اور مذاق نہیں۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ مخلصا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو موحد بنتے ہوئے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ الدِّيْنُ سے مراد اطاعت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عبادت ہے۔ یہ مفعول بہ ہے۔ الدِّيْنُ الْخَالِصُ سے مراد ہے جس میں کسی شے کی آمیزش نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی شے کو صدقہ کرتا ہوں اور میں کوئی عمل کرتا ہوں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور لوگوں کی تعریف کا ارادہ رکھتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: والذی نفس محمد بیدہ لا یقبل اللہ شیأ شورك فیہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے! اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں فرماتا جس میں شراکت کی گئی ہو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ یہ وضاحت سورۂ بقرۃ، سورۃ النساء اور سورۃ الکہف میں مفصل گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: یہ آیت اس بارے میں دلیل ہے کہ ہر عمل میں نیت واجب ہے ان اعمال میں سب سے عظیم وضو ہے جو ایمان کا جز ہے (1) جبکہ امام ابو حنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور ولید بن مسلم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے دونوں کہتے ہیں: وضو نیت کے بغیر بھی کفایت کر جاتا ہے۔ نیت کے بغیر نہ وہ ایمان کی شرط بنتا ہے اور نہ ہی ناخنوں اور بالوں سے خطائیں نکلتی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اولیاء سے مراد بت ہیں اس کی خبر محذوف ہے وہ قالوا ہے قتادہ نے کہا: جب انہیں کہا جاتا: من ربکم وخالقکم (2) تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا خالق کون ہے؟ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ آسمان سے کس نے پانی نازل کیا؟ سب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے۔ انہیں کہا جاتا: تمہاری بتوں کی عبادت سے کیا مراد ہے؟ وہ کہتے ہیں: تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں اور ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کریں (3)۔ کلبی نے کہا: اس کلام کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1656　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 4　3۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 128

جواب سورۃ الاحقاف میں ہے: فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً (الاحقاف:28) زلفی سے مراد قربت ہے تاکہ وہ ہمیں اس کے قریب کر دیں۔ زلفی مصدر کے حکم میں ہے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور مجاہد کی قراءت میں والذین اتخذوا من دونہ اولیاء قالوا نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ حضرت ابی کی قراءت میں و الذین اتخذوا من دونہ اولیاء مانعبد کم الا لِتُقَرِّبُونا الی اللہ زلفی، یہ نحاس نے ذکر کیا ہے کہا: اس میں حکایت واضح ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اہل ادیان میں فیصلہ فرمائے گا ہر ایک جس کا مستحق ہوگا اسے جزا دے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ۝ جس کے بارے میں پہلے ہی کفر کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ اس دین کی ہدایت نہیں پائے گا، جس پر وہ راضی ہے وہ دین اسلام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ:3) اس آیت میں قدر یہ اور دوسرے مکاتب فکر کا رد ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرتا کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کو یہ نام دیتا تو اللہ تعالیٰ یہ امران کے سپرد نہ کرتا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝ اولاد سے پاکی بیان کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۭ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۝

''اس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ، وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر اور اس نے مسخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک رواں ہے مقررہ معیاد تک، غور سے سنو وہی عزت والا اور بہت بخشنے والا ہے۔ اس نے پیدا کیا تمہیں فرد واحد سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور پیدا کیے تمہارے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے، وہ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں ایک حالت سے دوسری حالت تین اندھیروں میں، یہ قدرت والا اللہ تمہارا رب ہے اس کی حکومت ہے، نہیں کوئی معبود بجز اس کے پھر تم کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو''۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وہ کامل طور پر قادر ہے وہ بیوی اور اولاد سے مستغنی ہے جو اس طرح ہو تو اس کا حق ہے کہ وہ عبادت کیے جانے میں یکتا ہو نہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے ذریعے اس امر پر متنبہ کیا کہ اسے حق حاصل ہے کہ لوگوں سے جو چاہے خدمت لے جبکہ اس نے اس طرح کیا بھی۔

یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ یُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ ضحاک نے کہا: اس کو اس پر ڈالا جاتا ہے اور اس کو اس پر ڈالا جاتا ہے یہ تعبیر لغت میں تکویر کے معنی میں منحصر ہے جس سے مراد ہے ایک شے کو دوسری پر ڈالنا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کور المتاع اس نے کچھ سامان دوسرے سامان پر ڈال دیا، اسی سے کور العمامة ہے یعنی اس نے پگڑی لپیٹی۔ اس آیت کے معنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے کہا: جو حصہ رات سے کم ہوتا ہے وہ دن میں داخل ہو جاتا ہے اور جو حصہ دن سے کم ہوتا ہے وہ رات میں داخل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان: یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ (لقمان: 29) کا یہی معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ سے مراد ہے کہ رات دن پر چھا جاتی ہے(1) یہاں تک کہ دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور دن رات پر چھا جاتا ہے تو اس کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: یغشی اللیل النهار یطلبه حثیثا کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ بندوں کے منافع کے لیے طلوع و غروب کے ساتھ سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ان میں سے ہر ایک اپنے فلک میں چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی وہ یوم قیامت ہے جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے بکھر جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اجل مسمی سے مراد وہ وقت ہے جس میں سورج اور چاند کا سفر ان منازل پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو غروب اور طلوع کے لیے ترتیب دی گئی ہیں۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد وہ دونوں اپنی بعیدی منزل تک چلتے ہیں پھر دونوں قریبی منازل کی طرف لوٹتے ہیں وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ اس کی وضاحت سورۂ یس میں گزر چکی ہے۔

اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ۝ الا تنبیہ کے لیے ہے یعنی متنبہ ہو جاؤ میں غالب ہوں اور اپنی رحمت کے ساتھ مخلوق کے گناہوں کو چھپانے والا ہوں۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ تناسل کا عمل جاری ہو۔ اعراف اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ۔ اَزْوَاجٍ کی خبر نزول کے ساتھ دی کیونکہ یہ نباتات سے پیدا ہوتے ہیں اور نباتات اس پانی سے ہوتی ہیں جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اسے ہی تدریج کہتے ہیں اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا (الاعراف: 26) ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اَنْزَلَ پیدا کرنے کے معنی میں ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی پیدا کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان چوپاؤں کو جنت میں پیدا کیا پھر انہیں زمین کی طرف اتارا جس طرح اس ارشاد میں فرمایا: وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ (الحدید: 25) کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین کی طرف اترے تو ان کے ساتھ ہی لوہا اتارا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے تمہیں عطا فرمائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پیدا کرنے کو انزال قرار دیا کیونکہ پیدائش ایسے امر کے ساتھ ہوتی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے معنی ہوگا تمہارے لیے یہ چیزیں نازل ہونے والے امر کے ساتھ پیدا کیں۔ قتادہ نے کہا: اونٹ میں سے دو، گائے میں سے دو، بکری میں سے دو، اور

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 115

بھیڑ میں سے دوان میں سے ایک جوڑا ہے (1)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ** قتادہ اور سدی نے کہا: پہلے نطفہ، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوتھڑا پھر ہڈی پھر گوشت۔ ابن زید نے کہا: پہلے آباء کی پشتوں پھر تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد باپ کی پشت، پھر ماں کے پیٹ پھر وضع حمل کے بعد پیدائش؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

**فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ** اس سے مراد پیٹ کی ظلمت، رحم کی ظلمت اور جھلی کی ظلمت ہے (2)؛ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ ابن جبیر نے کہا: جھلی کی ظلمت، رحم کی ظلمت، اور رات کی ظلمت؛ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: باپ کے پشت کی تاریکی، عورت کے بطن کی تاریکی اور رحم کی تاریکی؛ یہ ابوعبیدہ کا مذہب ہے یعنی تاریکی اسے نہیں روک سکتی جس طرح مخلوق کو روک دیتی ہے **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ** وہ یہی ہے جس نے ان اشیاء کو پیدا فرمایا وہ تمہارا رب ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم اس کی عبادت کو چھوڑ کر کہاں پھرے جا رہے ہو؟ حمزہ نے اسے **اِمِّهِتِكُمْ** پڑھا ہے یعنی ہمزہ اور میم دونوں مکسور ہیں۔ کسائی نے ہمزہ مکسور اور میم کو مفتوح پڑھا ہے باقی قراء نے ہمزہ مضموم اور میم کو مفتوح پڑھا۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۫ وَ لَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''اگر تم ناشکری کرتے ہو تو بے شک اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، اور وہ پسند نہیں کرتا اپنے بندوں سے ناشکری کو اگر تم شکر ادا کرو تو وہ پسند کرتا ہے تمہارے لیے، اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے، بے شک وہ خوب جاننے والا ہے سینے کے رازوں کو''۔

**اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ** یہ کلام شرط و جزا پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ** (الاسراء: 65) اور جس طرح فرمایا: عینا یشرب بها عباد الله یہ تعبیر ان علماء کے نزدیک ہے جو رضا اور ارادہ میں فرق نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ کفر سے راضی نہیں ہوتا اگرچہ اس کا ارادہ کرے اللہ تعالیٰ کافر سے کفر کا ارادہ کرتا ہے کافر نے اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہی کفر کیا ہے اللہ تعالیٰ اس پر راضی نہیں ہوتا اور اسے پسند بھی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ ایسی چیز کا ارادہ کرتا ہے جس پر راضی نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ ابلیس پر راضی نہیں پس ارادہ رضا سے مختلف ہے؛ یہ اہل سنت کا مذہب ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 115 2۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 234

وَ اِنۡ تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ یعنی تمہارے شکر پر راضی ہوتا ہے کیونکہ تَشۡكُرُوۡا اس پر دلالت کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں شکر کے بارے میں بحث گزر چکی ہے یرضی کا معنی بدلہ دینا اور تعریف کرنا ہے، اس صورت میں رضا سے مراد یا تو ثواب ہوگا تو اس صورت میں فعل کی صفت ہوگا: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ (ابراہیم: 7) یا اس سے مراد اس کی ثنا ہے تو اس صورت میں وہ ذات کی صفت ہوگا۔ ابوجعفر، ابوعمر، شیبہ، اور ہبیرہ نے عاصم سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اسے دیرضہ پڑھا یعنی ہاء کو ساکن پڑھا۔ ابن ذکوان، ابن کثیر، ابن محیصن، کسائی اور ورش نے نافع سے ضمہ کے اشباع کے ساتھ قراءت نقل کی ہے باقی قراء نے اس میں اختلاس کا قاعدہ جاری کیا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝ اس کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيۡبًا اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً مِّنۡهُ نَسِىَ مَا كَانَ يَدۡعُوۡۤا اِلَيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِيۡلًا ۖ اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۝۸ اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَيَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۹

''اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف اس وقت پکارتا ہے اپنے رب کو دل سے رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب عطا کرتا ہے اسے نعمت اپنی (جناب سے) تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے لیے فریاد کرتا رہا تھا اس سے پہلے اور بناتا ہے اللہ کے ہم مثل تاکہ بہکا دے اس کی راہ سے، (اے مصطفیٰ! آپ اسے) فرمایئے لطف اٹھالے اپنے کفر سے تھوڑے دن، بے شک تو دوزخیوں میں سے ہے۔ بھلا جو شخص عبادت میں صرف کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے کبھی کھڑے ہوئے بایں ہمہ ڈرتا ہے آخرت سے اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی آپ پوچھیے کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل البتہ عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

الۡاِنۡسَانَ سے مراد کافر ہے ضُرٌّ سے مراد فقر اور آزمائش میں سختی ہے مُنِيۡبًا اِلَيۡهِ یعنی اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے، عاجزی کرتے ہوئے، اس کی اطاعت کرتے ہوئے اور اس شدت کو زائل کرنے میں مدد چاہتے ہوئے خَوَّلَهٗ اسے عطا کی اور اسے مالک بنایا، یہ جملہ بولا کہا جاتا ہے: خولك اللہ الشئ اللہ تعالیٰ نے تجھے اس چیز کا مالک بنایا۔ ابو عمرو بن علاء یہ شعر پڑھا کرتا:

هُنَالِكَ إن يُستَخوَلُوا المَالَ يُخوِلُوا(1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 522

ان سے اگر مال عاریۃً مانگا جائے تو وہ ادھار دے دیتے ہیں۔
خَوَلُ الرجلِ سے مراد اس کے خدام ہیں اس کی واحد خائل ہے۔
ابوالنجم نے کہا:

أَعْطَى فلم يَبْخَلْ ولم يُبَخَّلِ　　كُومَ الذُّرى مِن خَوَلِ الْمُخَوَّلِ (1)

نَسِیَ مَا كَانَ يَدْعُوٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وہ اسی رب کو بھول جاتا ہے جس کو اس سے قبل مصیبت کے دور کرنے میں یاد کیا کرتا تھا۔ اس تعبیر کی صورت میں مَا اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہوگا اور یہ الذی کے معنی میں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ما، من کے معنی میں ہے جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۝ (الکافرون) معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اس دعا کو بھول جاتا ہے جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور آہ و زاری کیا کرتا تھا یعنی وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہوا کرتی تھی۔ اس تعبیر کی صورت میں ما اور فعل مصدر کے حکم میں ہوں گے۔
اَنْدَادًا سے مراد بت ہیں۔ سدی نے کہا: یہاں انداد سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر وہ اپنے تمام امور میں اعتماد کیا کرتے تھے ان کا مقصود یہ ہے کہ جاہل ان کی اقتدا کریں۔
قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اس انسان کو کہہ دو: لطف اندوز ہولے۔ یہ امر دھمکانے کے لیے ہے پس دنیا کا سامان قلیل ہے اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۝ تیرا ٹھکانہ جہنم ہے۔
اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کی مومن اس کافر جیسا نہیں جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے حضرت حسن بصری، ابو عمرو، عاصم اور کسائی نے امن تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔
نافع، ابن کثیر، یحییٰ بن وثاب، اعمش اور حمزہ نے امن تخفیف کے ساتھ ندا کے معنی میں پڑھا ہے گویا یوں کلام کی یا من ھو قانت فراء نے کہا: الف یاء کے قائم مقام ہے تو کہتا ہے: یا زیدُ اَقْبِل، اَزَيْدُ اَقْبِل سیبویہ اور تمام نحویوں سے نقل کیا گیا ہے جس طرح اوس بن حجر نے کہا:

أَبَنِي لُبَيْنَى لَسْتُمُ بِيَدٍ　　إِلَّا يَدًا لَيْسَتْ لها عَضُدُ

اے لبینی کی اولاد! تم ایسا ہاتھ ہو جس کا بازو نہیں۔
اس تعبیر کی بنا پر کلام یہ ہوگی قل تَمَتَّعْ بکفرك قليلًا إنك من أصحاب النار وہ شخص جو عبادت میں وقت بسر کرتا رہا تو جنتی ہے جس طرح عام گفتگو کی جاتی ہے: فلان لا يصلي ولا يصومُ فيا من يصلي ويصوم أبشر۔ فلاں نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزہ رکھتا ہے اے وہ شخص جو نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے تجھے بشارت ہو۔ کلام کیوں کہ اس پر دلالت کرتی ہے اس لیے اس کو حذف کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اَمن میں الف استفہام کا ہے معنی یہ ہوگا کیا وہ شخص جو رات کو عبادت کرتا ہے وہ افضل ہے یا وہ افضل ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے شریک بنائے تقدیر کلام یہ ہوگی الذی ھو قانت خیر۔ جو عبادت کرتا ہے وہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 116

بہتر ہے جس نے امن کو مشدد پڑھا ہے معنی ہوگا وہ نافرمان جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے وہ بہتر ہے یا وہ جو عبادت کرتا رہا پس وہ جملہ جو ام کا معادل ہے وہ محذوف ہے اصل کلام یوں تھی ام من ایک میم کو دوسری میم میں مدغم کر دیا۔ نحاس نے کہا: ام، بل کے معنی میں ہے اور من الذی کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی: ام الذی ھو قانت افضل ممن ذکر۔

قَانِتٌ میں چار توجیہیں ہیں: (1) اس کا معنی مطیع ہے (1)؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے (2) اپنی نماز میں خشوع کرنے والا؛ یہ ابن شہاب کا قول ہے (3) نماز میں قیام کرنے والا؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے (4) اپنے رب سے دعا کرنے والا (2)؛ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول سب کو جامع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''قرآن کریم میں جہاں بھی قنوت کا ذکر ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے''۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کونسی نماز افضل ہے؟ فرمایا: ''لمبا قیام''۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے اس سے مراد لمبا قیام اور قرآن کی قراءت ہے۔ مجاہد نے کہا: قنوت سے مراد لمبا رکوع اور آنکھ کو جھکانا۔ علماء جب نماز میں کھڑے ہوتے تو آنکھوں کو جھکا کر رکھتے خضوع کا اظہار کرتے، نماز میں کسی اور کی طرف توجہ نہ دیتے، فضول عمل نہ کرتے اور امور دنیا میں سے کسی چیز کا ذکر نہ کرتے مگر بھول کر۔

نحاس نے کہا: اس میں اصل یہ ہے کہ قنوت کا معنی اطاعت ہے۔ اس کی تعبیر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے یہ سب اشیاء اطاعت میں داخل ہیں اور طاعت سے جو بڑھ کر ہیں وہ بھی جس طرح حضرت نافع نے کہا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا: اٹھو نماز پڑھو، میں نماز پڑھنے کے لیے اٹھا جبکہ میرے جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے آپ نے مجھے بلایا آپ نے مجھے فرمایا: بتاؤ اگر میں تجھے کسی کام کے لیے بھیجوں کیا تو اسی طرح چلا جائے گا؟ میں نے عرض کی: میں زیب و زینت کا اہتمام کروں گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ زیادہ اس شان کے لائق ہے کہ تو اس کے لیے زیب و زینت کا اہتمام کرے۔

یہاں قَانِتٌ کی تعیین میں اختلاف ہے۔ یحییٰ بن سلام نے ذکر کیا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ضحاک آپ سے روایت کرتے ہیں: اس سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد حضرت عمار بن یاسر ہیں۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد حضرت صہیب، حضرت ابوذر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہیں۔ کلبی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ ہر اس شخص کے بارے میں ہے جو اس حال پر ہو۔

اٰنَآءَ الَّیۡلِ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد اس کی ساعتیں ہیں پہلی، درمیانی اور آخری۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سے مراد رات کا درمیانی حصہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جسے یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس پر وقوف کو آسان کر دے تو وہ رات کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ (سے امید رکھے کہ وہ) اسے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے دیکھے جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہو۔ ایک قول یہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 117 2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 116

کیا گیا ہے: اس سے مراد مغرب و عشاء کے درمیان کا وقت ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ عام ہے۔

یَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ سعید بن جبیر نے کہا: وہ آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ یعنی وہ جنت کی نعمتوں کی امید رکھتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت حسن بصری سے کسی ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو نافرمانیوں میں بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور امید بھی رکھتا ہے فرمایا: وہ تمنا کرنے والا ہے۔ جس نے اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ کو ندا کے معنی میں لیا ہے تو وہ رَحْمَةَ رَبِّهٖ پر وقف نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ متصل ہے مگر اس صورت میں کہ کلام میں حذف مقدر کیا جائے یہ زیادہ آسان ہے جس طرح وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

زجاج نے کہا: جس طرح علم والے اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح مطیع اور نافرمان برابر نہیں ہو سکتے۔ دوسرے علماء نے کہا: جو علم رکھتے ہیں وہی اپنے علم سے نفع اٹھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں رہا وہ شخص جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاہل کے قائم مقام ہوئے۔ بے شک مومنوں میں سے اصحاب عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ⑩

"آپ فرمائیے: اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے، اور (یاد کرو) ان کے لیے جنہوں نے نیک اعمال کیے اس دنیا میں نیک صلہ ہے، اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے، مصائب و آلام میں صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میرے مومن بندوں سے کہہ دو: اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچو اتَّقُوْا میں تاء واؤ کا بدل ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا مصداق حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام ہیں جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ حسنہ اولی سے مراد طاعت اور دوسری سے مراد جنت میں ثواب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جنہوں نے دنیا میں نیکی کی ان کے لیے دنیا میں نیکی ہے تو یہ آخرت کے ثواب سے زیادہ ہے (1)۔ دنیا میں زائد حسنہ سے مراد صحت، عافیت، کامیابی اور غنیمت ہے۔ قشیری نے کہا: پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ کافر نے دنیاوی نعمتیں تو حاصل کی ہیں۔

میں کہتا ہوں: کافر کے ساتھ مومن بھی دنیاوی نعمتیں حاصل کرتا ہے جب وہ ان نعمتوں پر شکر بجالاتا ہے تو اس کے لیے جنت میں زائد نعمتیں دی جاتی ہیں۔ دنیا میں نعمت اچھی تعریف اور آخرت میں جزا ہے (2)۔

وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ تم اس میں ہجرت کرو اور جو آدمی نافرمانیاں کرتا ہے تم اس کے ساتھ مقیم نہ رہو۔ اس بارے میں بحث سورۃ النساء میں مفصل گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد جنت کی زمین ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی وسعت اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 118 2۔ ایضاً

نعمتوں میں رغبت دلائی ہے جس طرح فرمایا: وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ( آل عمران:133 )
جنت کو بعض اوقات ارض کہہ دیتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (الزمر:74)
پہلا قول زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ یہ ہجرت کا حکم ہے یعنی تم مکہ سے اس جگہ کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں تمہیں امن ہو۔ ماوردی نے کہا: یہ بھی احتمال ہے وسعت ارض سے مراد رزق کی وسعت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں رزق زمین سے ہی عطا کرتا ہے تو اس کا معنی ہو گا اللہ تعالیٰ کا رزق وسیع ہے؛ یہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس کی وسعت کو احسان جتلانے کے انداز میں ذکر کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ تم مہنگے علاقہ سے سستے علاقے کی طرف چلے جاؤ جس طرح حضرت سفیان ثوری نے کہا: تو وہاں رہ، جہاں ایک درہم سے روٹیوں کا تھیلا بھر لے۔

اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۞ بغیر اندازے کے انہیں پورا اجر دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انہیں زیادہ ثواب دیا جائے گا کیونکہ اگر ان کو عمل کے مطابق عطا کیا جائے تو یہ حساب کے مطابق ہو گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بِغَیْرِ حِسَابٍ کا معنی ہے بغیر مطالبہ کے انہیں اجر دیا جائے گا جس طرح دنیاوی نعمتوں کے بارے میں مطالبہ کیا جاتا ہے۔

الصّٰبِرُوْنَ سے یہاں مراد روزے دار ہیں، اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی خبر دی گئی ہے الصوم لی وأنا أجزی بہ روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دیتا ہوں۔ علماء نے کہا: ہر اجر کا کیل اور وزن کیا جاتا ہے مگر روزہ اس کا اجر دونوں ہاتھوں سے بغیر حساب کے دیا جاتا ہے(1)؛ حضرت علی شیر خدا سے بھی یہی مروی ہے۔ مالک بن انس نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ کے بارے میں فرمایا: اس سے مراد دنیا کے مصائب اور احزان پر صبر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جس نے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور جس سے منع کیا گیا تھا اس کو چھوڑ دیا تو اس کے اجر کی کوئی مقدار نہیں۔ قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! وہاں کوئی پیمانہ اور ترازو نہ ہو گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا: ''ترازو گاڑھے جائیں گے صدقہ کرنے والوں کو لایا جائے گا تو ترازووں سے انہیں پورا اجر دیا جائے گا(2) اسی طرح نماز اور حج کا معاملہ ہے مصیبت کے شکار لوگوں کو لایا جائے گا نہ ان کے لیے ترازو نصب کیا جائے گا نہ ان کے لیے دیوان کھولا جائے گا ان کے لیے اجر بغیر حساب کے انڈیلا جائے گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ یہاں تک کہ دنیا میں سلامتی سے رہنے والے آرزو کریں گے کہ ان کے جسم قینچیوں سے کاٹے جائیں اس آرزو کی وجہ مصائب کا شکار لوگوں کی فضیلت ہو گی''۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''فرائض کو ادا کر تو لوگوں میں سے زیادہ عبادت گزار ہو جائے گا تجھ پر قناعت کرنا لازم ہے تو لوگوں میں سے سب سے غنی ہو جائے گا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 119
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 118

اے بیٹے! جنت میں ایک درخت ہے جسے شجرہ بلوی کہتے ہیں اہل بلاء کو بلایا جائے گا ان کے لیے ترازو نصب نہیں کیا جائے گا ان کے دیوان کو نہیں پھیلایا جائے گا ان پر اجر انڈیلا جائے گا''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ لفظ صابر کے ساتھ مدح کی جاتی ہے یہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو نافرمانیوں سے صبر کرے جب تو یہ ارادہ کرے کہ اس نے مصیبت پر صبر کیا ہے تو کہے گا: صابر علی کذا؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝

''فرمائیے: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اطاعت کو اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں۔ آپ فرمائیے: میں ڈرتا ہوں اگر میں حکم عدولی کروں اپنے رب کی اس بڑے دن کے عذاب سے۔ فرمائیے: اللہ کی ہی میں عبادت کرتا ہوں خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو بس تم عبادت کرو جس کی چاہو اس کے سوا، نیز فرما دیجئے: اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو گھاٹے میں ڈالے گئے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن، سنو یہی پہلا کھلا گھاٹا ہے۔ ان (بدبختوں) کے لیے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور نیچے سے بھی شعلے۔ اس عذاب الیم سے ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو۔ اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو''۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ سورت کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ یعنی اس امت کا پہلا مسلمان ہوں بات حقیقت میں ایسے ہی تھے کیونکہ آپ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے آباء کے دین کی مخالفت کی، بتوں سے لاتعلق ہوئے، اللہ تعالیٰ کے حضور جھکے اور اس پر ایمان لائے اور اسی امر کی طرف دعوت دی لِاَنْ اَكُوْنَ میں لام زائد ہے؛ یہ جرجانی اور دوسرے علماء نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا: یہ لام اجل ہے اس کلام میں حذف ہے یعنی مجھے عبادت کا حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا مسلمان بنوں۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ اس سے مراد یوم قیامت کا عذاب ہے۔ یہ اس وقت کہا جب ان کی قوم نے آپ کو اپنے آباء کے دین کی دعوت دی؛ یہ اکثر اہل تفسیر نے کہا: ابوحمزہ ثمالی اور ابن مسیب نے کہا: یہ آیت اللہ

تعالیٰ کے فرمان لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) کے ساتھ منسوخ ہے، یہ آیت نبی کریم ﷺ کے ذنب کی مغفرت سے قبل کے لیے تھی۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ لفظ اسم جلالت پر نصب اَعْبُدُ کی وجہ سے ہے۔ دین سے مراد اطاعت اور عبادت ہے فَاعْبُدُوْا یہ امر تہدید کے لیے ہے یہ وعید و توبیخ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (فصلت:40) ایک قول یہ کہا گیا ہے: یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: کوئی آدمی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں بیوی پیدا کی جب وہ جہنم میں داخل ہوا تو اس نے اپنی ذات کا اور اپنے اہل کا نقصان کیا(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عمل کیا تو اس کے لیے وہ منزل اور اہل ہو نگے مگر جو اس کے لیے اس سے پہلے تھا اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ⑩ (المومنون)

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ان کے جو نیچے ہیں انہیں ظلل کا نام دیا کیونکہ وہ اپنے سے نیچے والوں کو سایہ دیتے ہیں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (الاعراف:40) اور يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (العنکبوت:55) کی مثل ہے ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عِبَادَهٗ سے مراد اس کے اولیاء ہیں يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ⑯ اے میرے اولیاء! مجھ سے ڈرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مومن اور کافر میں عام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کفار کے ساتھ خاص ہے۔

**وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ⑰ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑱**

''اور جو لوگ بچتے ہیں شیطان سے کہ اس کی عبادت کریں اور دل سے جھکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے لیے مژدہ ہے مژدہ سنا دیں میرے ان بندوں کو جو غور سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اچھی بات کی، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ دانشور ہیں''۔

اخفش نے کہا: طاغوت جمع ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد مونث ہو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ معنی ہے وہ طاغوت سے دور ہے وہ اس سے ایک طرف ہے انہوں نے طاغوت کی عبادت نہ کی۔ مجاہد اور ابن زید نے کہا: اس سے مراد شیطان ہے۔ ضحاک اور سدی نے کہا: اس سے مراد بت ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کاہن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 395

یہ عجمی نام ہے جس طرح طالوت، جالوت، ہاروت اور ماروت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عربی نام ہے یہ طغیان سے مشتق ہے انْ محل نصب میں ہے طاغوت سے بدل ہے، تقدیر کلام یہ ہے والذین اجتنبوا عبادة الطاغوت۔

وَ اَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کی طرف رجوع کیا لَهُمُ الْبُشْرٰى دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں انہیں جنت کی بشارت ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان شخصیات نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو آپ نے انہیں اپنے ایمان کی خبر دی تو وہ ایمان لے آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت زید بن عمرو بن نفیل، حضرت ابوذر اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا تھا۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو اچھی اور بری بات سنتے ہیں پھر اچھی بات کا ذکر کرتے ہیں اور قبیح چیز سے رک جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قرآن اور غیر قرآن کی اتباع کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کو سنتے ہیں اور ان میں سے احسن یعنی محکم کی اتباع کرتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عزیمت اور رخصت کو سنتے ہیں وہ رخصت کی بجائے عزیمت پر عمل کرتے ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عقوبت اور عفو کو سنتے ہیں اور عفو کو اپناتے ہیں۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے: بہترین قول اس کا ہے جس نے اس آیت کا مصداق ان لوگوں کو بنایا ہے جو اسلام سے قبل توحید کا اقرار کرتے تھے یعنی یہ کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: یہ آیت زید بن عمرو بن نفیل، حضرت ابوذر اور حضرت سلمان فارسی کے بارے میں نازل ہوئی (2) جنہوں نے دور جاہلیت میں طاغوت کی عبادت کرنے سے اجتناب کیا ان تک جو بات پہنچی تھی اس میں سے احسن کی اتباع کی اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی طرف ہدایت دی جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا اور وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عقلوں سے فائدہ اٹھایا۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾

''بھلا جس پر واجب ہو گیا عذاب کا حکم تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں ہے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کے ایمان کے بارے میں حریص تھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے حق میں شقاوت سبقت لے جا چکی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد ابولہب، اس کی اولاد اور خاندان کے وہ افراد ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تھے اَفَاَنْتَ میں ہمزہ کو تاکید کے لیے مکسور ذکر کیا ہے کیونکہ کلام بہت طویل ہو گئی ہے۔ سیبویہ نے اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 121
2۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 191

کے فرمان: اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ (المومنون) کے بارے میں یہی بات کہی ہے جس طرح پہلے بحث گزر چکی ہے۔

معنی ہے کیا جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے کیا تو اس کو بچانے والا ہے؟ یہ کلام شرط اور اس کے جواب پر مشتمل ہے اسے استفہام کے ساتھ پڑھا گیا ہے تا کہ توقیف وتقدیر پر دلالت کرے۔

فراء نے کہا: اس کا معنی ہے جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے تو اس کو بچائے گا۔ معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہوئی أفمن حق علیه کلمة العذاب ینجومنه اس کا مابعد جملہ مستانفہ ہے اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ دوسری جگہ فرمایا: حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ کیونکہ فعل جب پہلے ہو اور فعل اور جس اسم کی اس کے ساتھ صفت بیان کی جارہی ہو کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل ہو تو اس میں تذکیر و تانیث جائز ہوتی ہے کیونکہ یہاں تانیث حقیقی نہیں بلکہ کلمہ، کلام اور قول کے معنی میں ہے مراد ہو گا أفمن حق علیه قول العذاب۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝۲۰

''البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لیے بالا خانے ہیں جس کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں رواں ہیں جن کے نیچے سے نہریں، یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا''۔

جب یہ بیان کیا کہ کفار کے لیے آگ کے اوپر اور نیچے سے سائے ہونگے اب یہ بیان کیا کہ متقین کے لیے بالا خانوں پر بالا خانے ہیں کیونکہ جنت کے کئی درجات ہیں ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں۔ لکن یہاں استدراکیہ نہیں ہے کیونکہ نفی نہیں آئی جس طرح یہ قول ہے: ما رأیت زیدا لکن عمرا اس میں نفی موجود ہے بلکہ یہ ایک قصہ کو ترک کر کے دوسرے قصہ کی طرف منتقل ہونے کے لیے ہے: وقصہ پہلے کے مخالف ہوتا ہے جس طرح تیرا قول ہے جائنی زید لکن عمرو لم یأت۔

غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ بالا خانے زبرجد اور یاقوت کے بنے ہوئے ہونگے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی یہ نزہت کے اسباب کو جامع ہوں گے وَعْدَ اللّٰهِ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ لَهُمْ غُرَفٌ کا معنی ہے وعدهم الله ذلك وعدا اس پر رفع پڑھنا بھی جائز ہے ذلك وعدُ الله۔

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝ میعاد سے مراد ہے جو دونوں جماعتوں سے وعدہ کیا گیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۲۱

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی پھر جاری کیا اسے زمین کے چشموں سے پھر اگاتا ہے اس کے ذریعے فصلیں جن کے رنگ جدا جدا ہیں پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے پس تو دیکھتا ہے اسے زردی مائل پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے، یقیناً اس (کرشمۂ قدرت) میں نصیحت ہے اہل عقل کے لیے"۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اللہ تعالیٰ مخلوق کو زندہ کرنے اور مومن وکافر میں تمیز دینے کے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا وہ اس پر قادر ہے جس طرح وہ آسمان سے پانی نازل کرنے پر قادر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے بادل سے بارش کو نازل کیا۔

فَسَلَکَهٗ اسے زمین میں داخل کیا اور اس میں سکونت دی جس طرح فرمایا: فَاَسۡکَنّٰهُ فِی الۡاَرۡضِ (المومنون: 18) یَنَابِیۡعَ یہ ینبوع کی جمع ہے یہ یفعول کا وزن ہے یہ نَبَعَ، ینبُعُ، ینبَعُ اور ینبِعُ کے وزن پر اس کا مضارع آتا ہے۔ نحاس نے کہا: ابن کیسان نے شاعر کے قول میں یوں بھی بیان کیا:

یَنۡبَاعُ مِنۡ ذِفۡرَی غَضُوبٍ جَسۡرَةٍ

ینباع کا معنی ینبع ہے اس کے فتحہ میں اشباع کا قاعدہ جاری کیا تو یہ الف ہو گیا جس کا معنی نکلنا ہے ینبوع سے مراد پانی کا چشمہ ہے اس کی جمع ینابیع آتی ہے سبحان سورۃ اسراء میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

پھر وہ پانی زمین کے چشموں سے نکلتا ہے اس کے ذریعے کھیتی نکالتا ہے زَرۡعًا جنس کے لیے ہے یعنی مختلف کھیتیاں سرخ، زرد، نیلی اور سبز۔ شعبی اور ضحاک نے کہا: ہر وہ پانی جو زمین میں موجود ہے وہ آسمان سے ہی اترتا ہے وہ آسمان سے صخرہ کی طرف نازل ہوتا ہے پھر وہاں سے چشموں اور کنووں کی طرف تقسیم ہو جاتا ہے ثُمَّ یَهِیۡجُ پھر وہ خشک ہو جاتا ہے تو تو اس کے سبز ہونے کے بعد زرد دیکھے گا۔ مبرد نے کہا: اصمعی نے کہا یہ جملہ بولا جاتا ہے: هاجت الأرض یهیج إذا أدبر نبتُها دولی کہا اسی طرح: هاجت النبت کا جملہ بولا جاتا ہے کہا: اسی طرح اصمعی کے علاوہ نے بھی کہا: جوہری نے کہا: هاج النبت هیاجا یعنی نباتات خشک ہو گئی۔ أرض هائجة جب اس کی نباتات خشک ہو جائے یا وہ زرد ہو جائے أهاجت الریح النبت ہوا نے نباتات کو خشک کر دیا۔ أهیجنا الأرض یعنی ہم نے زمین کو خشک نباتات والا پایا۔ هاج هائجه اس کا غضب بھڑک اٹھا هدأ هائجه اس کا جوش کم ہو گیا۔

ثُمَّ یَجۡعَلُهٗ حُطَامًا پھر وہ اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے یہ تحطم العود سے مشتق ہے جب وہ خشکی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے معنی اس کا یہ ہے جو اس پر قادر ہے وہ دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن اور زمین سے جو چیز نکلتی ہے اس کے لیے بیان فرمائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے قرآن نازل کیا اور پھر اسے مومنوں کے دلوں میں داخل کیا ثُمَّ یُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ یہاں زرعا سے مراد دین ہے جو مختلف ہوگا ان میں سے بعض بعض سے افضل ہونگے جہاں تک مومنوں کا تعلق ہے اس کا ایمان و یقین زائد ہوگا جہاں تک اس آدمی کا تعلق

ہے جس کے دل میں مرض ہے تو وہ اسی طرح خشک ہو جائے گا جس طرح کھیتی خشک ہو جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بیان فرمائی ہے یعنی جس طرح سبز نباتات متغیر ہو جاتی ہے اور وہ زرد ہو جاتی ہے اسی طرح دنیا اپنی رونق کے بعد ماند پڑ جاتی ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲۲

”بھلا وہ سعادت مند کشادہ فرمایا ہو اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لیے تو وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے، پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لیے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں“۔

شرح کا معنی کھولنا اور وسیع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا یہاں تک کہ وہ اس میں ثبت ہو گیا (1)۔ سدی نے کہا: اس کے سینہ کو اسلام کے ساتھ وسیع کر دیا کیونکہ اس پر وہ خوش ہوا اور اس سے اطمینان ہوا۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ جائز ہے کہ یہ شرح اسلام کے بعد ہو پہلی تعبیر کی صورت میں یہ جائز ہے کہ شرح اسلام سے قبل ہو۔

فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وہ اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر ہے جس طرح ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا اس حذف پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ دلالت کرتا ہے۔ مبرد نے کہا: جب دل سخت ہو جائے تو کہا جاتا ہے: قسا القلب اسی طرح عتا اور عسا اس کے قریب قریب ہیں قلب قاس ایسا دل جو سخت ہو جو نرم نہ ہو۔ مفسرین نے کہا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ سے مراد حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ نقاش نے یہ بیان کیا کہ اس سے مراد حضرت عمر بن خطاب ہیں۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد حضرت عمار بن یاسر ہیں۔ مقاتل اور کلبی سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آیت ان تمام افراد کے لیے عام ہے جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان تخلیق فرما کر کھلا کر دیا۔

مرہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہا ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ نے اس کے سینہ کو کیسے کھول دیا؟ فرمایا: ”جب نور دل میں داخل ہوتا ہے تو وہ کھل جاتا ہے (2)“ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا: الإنابة إلى دار الخلود والتجافي عن دار الغرور والإستعداد للموت قبل نزوله جنت کی طرف متوجہ ہونا، دنیا سے پہلو تہی کرنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین خصلتوں کا ذکر کیا اس میں کوئی شک نہیں جس میں یہ خصلتیں ہوں تو وہ کامل ایمان والا ہے کیونکہ انابہ سے مراد نیکی کے اعمال ہیں کیونکہ جنت نیک اعمال کی جزا کے طور پر بنائی گئی ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی مواقع پر کیسے اس کا ذکر کیا پھر اس کے بعد فرمایا: جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الواقعہ) پس جنت اعمال کی جزا ہے جب بندہ نیکی کے کاموں میں منہمک ہو جاتا ہے تو یہی اس کا دار خلود کی طرف لوٹنا ہوتا ہے جب دنیا سے اس کی حرص ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور اس کی طلب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 121	2۔ ایضاً

سے غافل ہو جاتا ہے اور ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اسے دنیا سے بے نیاز کر دیتی ہیں تو وہ اسی پر اکتفا کر لیتا ہے اور قانع ہو جاتا ہے پس وہ دنیا سے پہلو تہی کر لیتا ہے جب وہ اپنے امور کو تقویٰ کے ساتھ پختہ کر لیتا ہے تو وہ ہر امر میں غور و فکر کرنے والا ہوتا ہے وہ ادب کو کام میں لاتا ہے، پختگی سے کام کرتا ہے، احتیاط سے کام لیتا ہے، اس چیز سے بچتا ہے جو اسے شک میں ڈالے اور ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اسے شک میں نہ ڈالیں، تو تحقیق اس نے موت کے لیے تیاری کر لی یہ ظاہر میں اس کی علامات ہیں کیونکہ وہ موت کو دیکھتا ہے اور دنیا سے آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دنیا کو دار غرور دیکھتا ہے یہ رؤیت اسے اس لیے حاصل ہوتی ہے کیونکہ نور اس کے دل میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔

**فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ** ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد ابولہب اور اس کی اولاد ہے مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد ہے کہ ان کے دلوں کی سختی قرآن سننے سے بڑھ جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ من، عن کے معنی میں ہے معنی ہوگا اللہ کا ذکر قبول کرنے سے ان کے دل سخت ہو گئے ہیں، یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قال الله تعالى أطلبوا الحوائج من السمحاء فإني جعلت فيهم رحمتي ولا تطلبوها من القاسية قلوبهم فإني جعلت فيهم سخطي اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اپنی ضروریات سخی لوگوں سے طلب کیا کرو کیونکہ میں نے ان میں اپنی رحمت رکھ دی ہے تم اپنی حاجت سخت دل لوگوں سے نہ مانگا کرو کیونکہ میں نے ان میں اپنی ناراضگی رکھ دی ہے۔

مالک بن دینار نے کہا: کسی بندے کو سخت دلی سے بڑھ کر بڑی سزا نہیں دی گئی اور اللہ تعالیٰ کسی قول پر ناراض نہیں ہوتا مگر ان کے دلوں سے رحمت چھین لیتا ہے۔

**اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾**

”اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جاتی ہیں اور کانپنے لگتے ہیں اس کے پڑھنے سے بدن ان کے جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف، یہ اللہ کی ہدایت ہے راہنمائی کرتا ہے اس کے ذریعے جسے چاہتا ہے، اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ سے مراد قرآن حکیم ہے (1) جب یہ ارشاد فرمایا: فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ تو اس امر کی وضاحت کی کہ جس کو سنا جاتا ہے اس میں سے سب سے بہترین چیز وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے وہ قرآن ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 122

حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے عرض کی: کاش! آپ ہمارے سامنے بیان فرماتے تو اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا(1) اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ صحابہ کرام نے عرض کی: کاش! آپ ہمیں نصیحت کرتے تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید:16)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام اکتاہٹ کا شکار ہوئے تو انہوں نے عرض کی: کاش! آپ ہمیں بیان کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حدیث اسے کہتے ہیں جسے محدث بیان کرتا ہے قرآن کو حدیث کا نام دیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ اور اپنی قوم کو یہ بیان کیا کرتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف) اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (النجم) اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکہف) وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (النساء) فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ (القلم:44)

قشیری نے کہا: ایک قوم نے وہم کیا ہے کہ حدیث حدوث سے نکلا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس کا کلام حادث ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ (الانبیاء:2) میں لفظ حدیث کا ارادہ نہیں کرتا جبکہ انہوں نے کہا حدوث یہ تلاوت کی طرف لوٹتا ہے متلو کی طرف نہیں لوٹتا تو یہ مذکور کے ساتھ ذکر کیا ہے جب ہم اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ذکر کرتے ہیں۔

كِتٰبًا، اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ سے بدل کے طور پر منصوب ہے یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس سے حال ہو مُّتَشَابِهًا حسن اور حکمت میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور وہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں اس میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں (2)۔ قتادہ نے کہا: آیات اور حروف میں اس کا بعض، بعض کے مشابہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ان کتابوں کے مشابہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام پر نازل کی گئیں کیونکہ یہ امر، نہی، ترغیب اور ترہیب کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اگرچہ یہ ان سب کو اعم ہے اور سب سے بڑھ کر عاجز کرنے والی ہے پھر اس کی صفت بیان کی اور فرمایا: مَّثَانِيَ اس میں قصے، وعظ اور احکام کو بار بار ذکر کیا جاتا ہے اس کی تلاوت بار بار کی جاتی ہے مگر اکتایا نہیں جاتا۔

تَقْشَعِرُّ اس میں جو وعید ہے اس سے خوف کی وجہ سے ان کی جلدیں مضطرب اور متحرک ہو جاتی ہیں ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ آیت رحمت کے موقع پر ان کی جلدیں اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ کتاب اللہ پر عمل اور اس کی تصدیق کے لیے دل نرم ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد اسلام ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر جب قرآن پڑھا جاتا تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور ان کی جلدیں کانپنے لگتیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کی ہے ان سے عرض کی: آج کل کچھ ایسے لوگ ہیں جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان میں سے کوئی بے ہوش ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے تو انہوں نے کہا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

---

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 192	2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 122

سعید بن عبدالرحمن جحمی نے کہا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل قرآن میں سے ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو گرا ہوا تھا آپ نے پوچھا: اسے کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا: جب اس پر قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو گر پڑتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور نہیں گرتے تھے پھر فرمایا: شیطان ان کے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کا یہ عمل نہ تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: حضرت ابن سیرین کے ہاں ان لوگوں کا ذکر ہوا جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ گر پڑتے ہیں فرمایا: ہمارے اور ان کے درمیان یہ چیز فیصلہ کرنے والی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مکان کی چھت پر اپنے دونوں قدم نیچے پھیلا کر بیٹھے پھر اس پر ابتدا سے لے کر آخر تک قرآن پڑھا جائے اگر وہ اپنے آپ کو نیچے گرا دے تو وہ سچا ہے۔

ابوعمران جونی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک روز بنی اسرائیل کو وعظ کیا تو ایک آدمی نے اپنی قمیص کو پھاڑ دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی: قمیص والے کو کہہ دو وہ اپنی قمیص نہ پھاڑے میں فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا وہ اپنے دل کو میرے لیے کھولے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ زید بن اسلم نے کہا: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں تلاوت کی جبکہ ان کے ساتھ آپ کے صحابہ بھی موجود تھے ان کے دل نرم پڑ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دل کی نرمی کے وقت دعا کو غنیمت جانو کیونکہ وہ رحمت ہے'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب مومن کی جلد اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتی ہے تو اس سے اس کے گناہ یوں جھڑ جاتے ہیں جس طرح بوسیدہ درخت سے اس کے اوراق جھڑ جاتے ہیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی بندے کی جلد نہیں کانپتی مگر اللہ تعالیٰ آگ پر اسے حرام کر دیتا ہے''(1)۔

شہر بن حوشب نے حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے: انسان کے دل میں خوف شاخوں کے جلنے کی طرح ہے کیا تو کپکپی نہیں پاتا؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کیونکہ اس موقع پر دعا قبول ہوتی ہے۔

ثابت بنانی سے مروی ہے فلاں نے کہا: میں جانتا ہوں کب میری دعا قبول ہوتی ہے؟ لوگوں نے پوچھا: تجھے اس کا کیسے علم ہوتا ہے؟ کہا: جب میری جلد میں کپکپی طاری ہوتی ہے، میرے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے اور میری آنکھیں بہہ پڑتی ہیں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب میری دعا قبول ہوتی ہے۔ یوں اس کا باب ذکر کیا جاتا ہے اِقْشَعَرَّ جِلْدُ الرجل إقشعرارا فهو مقشعر اس کی جمع قشاعر ہے تو اس کی میم حذف کر دی جاتی ہے کیونکہ یہ زائدہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أَخَذَته قشعريرة امراؤالقیس نے کہا:

فَبِتُّ أكابِدُ ليلَ التَّمَامِ　والقلبُ من خشيةٍ مُقْشَعِرُّ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 12

میں نے تمام رات بڑی تکلیف میں گزاری جبکہ دل خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قرآن جب بہت ہی ذی شان اور بلیغ ہے جب وہ اس کا مقابلہ کرنے سے اپنے آپ کو عاجز دیکھتے تو اس کی عظمت کی بنا پر اس کے حسن سے تعجب کی خاطر اور اس میں جو کچھ ہے اس سے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے ان کی جلدوں میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر: 21) تضرع یہ اقشعرار کے قریب قریب ہے خشوع اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے قریب ہے ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ لین قلب کا معنی اس کی نرمی، طمانیت اور اس کا سکون ہے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ اسم اشارہ سے مراد قرآن ہے قرآن اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عقاب کا خوف اور ثواب کی جو امید عطا کی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جسے بے یار و مددگار چھوڑ دے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں یہ آیت قدریہ اور دوسرے لوگوں کا رد کرتی ہے۔ یہ تمام بحث کئی مواقع پر مفصل گزر چکی ہے الحمد اللہ۔

ابن کثیر اور ابن محیصن نے کہا: دونوں مواقع پر ھاء پر یاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور باقی قراء نے یاء کے بغیر وقف کیا ہے۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَ قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''بھلا وہ شخص جو ڈھال بنائے گا شدید عذاب کے سامنے اپنے چہرہ کو روز قیامت وہ کتنا بدنصیب ہوگا اور کہا جائے گا ظالموں کو: اب چکھو جو کچھ تم کمایا کرتے تھے۔ جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تو آیا ان پر عذاب وہاں سے جہاں سے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ پس چکھائی انہیں اللہ نے ذلت اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے کاش وہ جان لیتے''۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ عطا اور ابن زید نے کہا: اس کے ہاتھ جکڑ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا اس کے جسم میں سے جسے سب سے پہلے آگ مس کرے گی وہ اس کا منہ ہوگا۔ مجاہد نے کہا: اسے منہ کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا (1)۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد کافر ہے اسے آگ میں پھینکا جائے گا اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ جکڑے ہوئے ہونگے اس کی گردن پر کبریت کی بڑی چٹان ہوگی جس طرح بڑا پہاڑ ہوتا ہے پتھر میں آگ بھڑک اٹھے گی جبکہ وہ اس کی گردن میں معلق ہوگا اس کی گرمی اس کی گردن پر پہنچے گی وہ طوقوں کی وجہ سے آگ کو چہرے سے دور نہ کر سکے گا۔ خبر محذوف ہے۔ اخفش نے کہا تقدیر کلام یہ ہوگی اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ أفضل أم من سعد۔ جس طرح یہ ارشاد ہے:

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 235

افمن یلقی فی النار خیر من یاتی آمنا یوم القیمۃ۔

وَ قِيۡلَ لِلظّٰلِمِيۡنَ خازن کفار کو کہیں گے: ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ۞ یعنی اپنے معاصی کی جزا کو چکھو۔ اس کی مثل هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ۞ (التوبۃ)

كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتٰىهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۞ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡىَ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مبرد نے کہا: کسی عضو کو چیز لگتی ہے اس کے بارے میں کہتے قد ذاقہ یعنی وہ اس عضو تک اسی طرح پہنچی جس طرح مٹھاس اور کڑواہٹ چکھنے والے کو پہنچتی ہے کہا: خزی کا لفظ مکروہ کے لیے اور خزایۃ کا لفظ استحیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ جو عذاب انہیں دنیا میں پہنچا ہے آخرت کا عذاب اس سے بڑھ کر ہے۔

**وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۞ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ۞**

''اور ہم نے بیان کی ہیں لوگوں کے لیے اس قرآن حکیم میں ہر قسم کی مثالیں تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔ اور ہم نے دیا ہے انہیں قرآن جو عربی زبان میں ہے جس میں ذرا کجی نہیں تا کہ وہ اللہ سے ڈریں''۔

یعنی ہر ایسی مثال بیان کی ہے جس کے لوگ محتاج ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا فَرَّطۡنَا فِى الۡكِتٰبِ مِنۡ شَىۡءٍ (الانعام: 38) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی ہم نے سابقہ امتوں کی ہلاکت کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کے لیے مثال ہے ممکن ہے کہ ان سے نصیحت حاصل کریں۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اخفش نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ معرفہ ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: عَرَبِيًّا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے قُرۡاٰنًا یہ حال کی تمہید کے لیے ہے جس طرح تو کہتا ہے: مررت بزید رجلا صالحا تو تیرا قول صالحا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: عَرَبِيًّا حال کی حیثیت سے منصوب ہے اور قُرۡاٰنًا تاکید ہے۔ غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ نحاس نے کہا: ضحاک نے جو کہا وہ سب سے احسن ہے۔ کہا: اس میں اختلاف نہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے؛ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ غیر مخلوق ہے۔ مہدوی نے اسے ذکر کیا۔ ثعلبی نے جو ذکر کیا ہے اس میں ہے یہی سدی کا قول ہے، حضرت عثمان بن زید نے کہا: اس میں کوئی تضاد نہیں۔ مجاہد نے کہا: اس میں التباس نہیں (1)۔ بکر بن عبداللہ مزنی نے کہا: اس میں کوئی غلطی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں کوئی شک نہیں؛ یہ سدی کا قول ہے جس کا ذکر مہدوی نے کیا ہے کہا:

وقد أتاكَ يقينٌ غيرُ ذي عِوَجٍ مِن الإلهِ وقولٌ غيرُ مكذوبِ(2)

تیرے پاس اللہ کی طرف سے قرآن آچکا ہے جس میں کوئی شک نہیں اور ایسا قول آچکا جس میں کوئی جھوٹ نہیں ممکن ہے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 124
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 125

وہ کفر اور جھوٹ سے بچیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

"بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال، ایک غلام ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں جو سخت بدخو ہیں اور ایک غلام ہے جو پورا ایک مالک کا ہے، کیا ان دونوں کا حال یکساں ہے، سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے"۔

کسائی نے کہا: رَجُلًا کو نصب دی گئی ہے کیونکہ یہ مَثَلًا کی تفسیر و وضاحت ہے اگر تو چاہے تو حرف جر کے حذف کے ساتھ اسے نصب دے تقدیر کلام یہ ہوگی ضرب اللہ مثلا برجل۔

فراء نے کہا: مُتَشٰكِسُوْنَ کا معنی ہے مختلفون یعنی مختلف۔ مبرد نے کہا: اس کا معنی ہے سخت ترش۔ یہ شکسُ یَشْکُسُ شُکْسًا فهو شَکِسٌ سے مشتق ہے جس طرح عَسُرَ یَعْسُرُ عُسْرًا فهو عَسِرٌ ہے یہ کہا جاتا ہے: رجل شَکِسٌ، شَرِسٌ، ضَرِسٌ، ضَبِسٌ یہ بھی کہا جاتا ہے: رجل ضَبِسٌ و ضَبِیسٌ۔ اس کا معنی ہے بدخلق سخت مزاج ہونا، یہ جوہری نے کہا ہے۔ زمخشری نے کہا: التشاکس اور التشاخس کا معنی اختلاف ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تشاکست أحواله و تشاخست أسنانه اس کے احوال مختلف ہو گئے اور اس کے دانت بے ترتیب ہو گئے یہ جملہ کہا جاتا ہے: شاکسنی فلان یعنی اس نے میرے حق میں بخل سے کام لیا۔ جوہری نے کہا: رجل شَکُسٌ سخت اخلاق والا۔ راجز نے کہا:

شَكُسٌ عَبُوسٌ عَنْبَسٌ عَذَوَّرُ

محل استدلال شکس ہے۔

یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے قوم شُکُسٌ جس طرح رَجُلٌ صَدُقٌ اور قوم صُدُقٌ ہے۔

شَکِس شَکَاسَۃً بھی استعمال ہوتا ہے۔ فراء نے حکایت بیان کی ہے رجل شَکِسٌ۔ یہ قیاس ہے یہ اس آدمی کے لیے ضرب المثل ہے جس نے کثیر معبودوں کی عبادت کی۔

وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ جو ایک آقا کا خالص غلام ہو یہ اس آدمی کی مثال ہے جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرتا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا کیا وہ برابر ہو سکتے ہیں، یعنی وہ غلام جو جماعت کی خدمت کرتا ہے جو اس کی ملکیت میں شریک ہیں ان کے اخلاق مختلف ہیں، نیتیں متضاد ہیں اسے کوئی آدمی نہیں ملتا مگر اسے کھینچتا ہے اور اس سے خدمت لیتا ہے وہ ان سے مشقت، تکلیف اور عظیم مصیبت پاتا ہے اس کے باوجود کسی کو بھی اپنی خدمت کے ساتھ راضی نہیں کر پاتا کیونکہ اس کے ذمہ بہت ہی زیادہ حقوق ہیں۔ وہ غلام جو ایک آقا کی خدمت کرتا ہے اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرتا جب وہ اس کی اطاعت کرے گا تو وہ اس کا قدردان ہوگا اور جب وہ لغزش کرے گا تو مالک اس کی لغزش سے درگزر کرے گا تو ان دونوں میں سے کون زیادہ تھکاوٹ اٹھاتا ہے اور کون زیادہ ہدایت پر ہے۔

اہل کوفہ اور اہل مدینہ نے اسے وَ رَجُلًا سَلَمًا پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت حسن بصری، عاصم جحدری، ابو عمرو، ابن کثیر اور یعقوب نے ورجلا سالما پڑھا ہے؛ ابو عبید نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ اس میں تفسیر صحیح ہے کہا: سالم خالص، مشترک کی ضد ہے اور سلم، حرب (جنگ) کی ضد ہے یہاں جنگ کا کوئی موقع نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ استدلال لازم نہیں کیونکہ جب لفظ کے دو معنی ہوں تو اسے ان میں سے اولی پر محمول کیا جاتا ہے اگرچہ سلم، حرب کی ضد ہے اس کا کوئی اور موقع ہوتا ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح تیرے لیے یہ کہا جاتا ہے: فی ھذا المنزل شرکاء فصار سالما لک اس گھر میں شریک ہوتے تھے پس یہ تیرے لیے خالص ہو چکا ہے، سالم میں بھی اس پر وہی چیز لازم ہوگی جو اس نے غیر پر لازم کیا ہے کیونکہ یہ جملہ کہا جاتا ہے: شئ سالم یعنی اس میں کوئی بیماری نہیں۔ دونوں قراتیں حسن ہیں آئمہ نے ان کو پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے اہل مدینہ کی قراءت سلما کو پسند کیا ہے کہا: اس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سعید بن جبیر، عکرمہ، ابو العالیہ اور نصر نے سلما پڑھا ہے سِلما اور سَلما دونوں مصدر ہیں تقدیر کلام یہ ہوئی رجلا ذا سلم مضاف کو حذف کر دیا مَثَلًا تمیز کی حیثیت سے صفت ہے معنی ہوگا کیا ان دونوں کی صفات اور حالات برابر ہوں گے، تمیز میں واحد پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ جنس کو بیان کرنا مقصود ہے۔ الحمد للہ۔ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے کہ اس کی اتباع کرتے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

”بے شک آپ نے بھی دنیا سے انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے، پھر تم سب روز حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے“۔

ابن محیصن، ابن ابی عبلہ، عیسیٰ بن عمر اور ابن ابی اسحاق نے اسے انک مائت وانھم مائتون پڑھا ہے یہ اچھی قراءت ہے؛ حضرت عبد اللہ بن زبیر نے بھی یہی قراءت کی ہے اس قسم کا الف شاذ قراءتوں میں حذف کر دیا جاتا ہے مائت زمانہ مستقبل میں کلام عرب میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح جو مریض ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: انہ لمارض من ھذا الطعام۔

حضرت حسن بصری، فراء اور کسائی نے میت پڑھا ہے یہ لم یمت و سیموت سے مشتق ہے المَیْت جب تخفیف کے ساتھ پڑھیں اس سے مراد وہ شخص ہو جس سے روح الگ ہو جائے اسی وجہ سے یہاں اس میں تخفیف نہیں کی گئی۔ قتادہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ذات اور تمہیں تمہاری ذاتوں کی موت کی خبر دی گئی۔

ثابت بنانی نے کہا: ایک آدمی صلہ بن اشیم کو اس کے بھائی کی موت کی خبر دینے کے لیے گیا تو اسے کھانا کھاتے ہوئے پایا صلہ بن اشیم نے اسے کہا: قریب ہو اور کھانا کھاؤ مجھے میرے بھائی کی موت کی خبر بہت عرصہ پہلے دی گی آنے والے نے کہا: وہ کیسے جبکہ میں تیرے پاس پہلا خبر لانے والا ہوں۔ صلہ بن اشیم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی موت کی خبر دے دی ہے اور یہ پڑھا: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿﴾ (1) یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 125

موت اور ان کی موت کی خبر دی۔

اس کی پانچ وجوہ ہو سکتی ہیں: (1) آخرت سے ڈرانا مقصود ہوتا ہے (2) عمل پر برانگیختہ کرنے کے لیے اس کا ذکر کیا (3) موت کی تمہید کے طور پر اس کا ذکر کیا (4) آپ کی موت میں اختلاف نہ کریں جس طرح پہلی امتوں نے دوسروں کی موت میں اختلاف کیا یہاں تک کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رک گئے (5) تاکہ اللہ تعالیٰ اس امر سے آگاہ کردے کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں مخلوق کو برابر رکھا ہے جبکہ دوسرے معاملات میں باہم فضیلت موجود ہے تاکہ تسلی زیادہ ہو جائے اور حسرت کم ہو جائے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝ اس سے مراد کافر اور مومن، ظالم اور مظلوم کا جھگڑا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: حدیث میں اس کا طویل ذکر ہے خصوصیت قیامت کے روز اس حد تک جا پہنچے گی کہ روح اور جسم آپس میں جھگڑا کریں گے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی ہم نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو معاملات ہمارے درمیان ہوتے رہے خصوصی گناہوں کے ساتھ کیا ان کے بارے میں ہمارے ساتھ تکرار کیا جائے گا؟ فرمایا: ہاں تمہارے ساتھ تکرار کیا جائے گا یہاں تک کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے گا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! بے شک معاملہ سخت ہے (1)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم نے کچھ وقت گذارا ہم یہ خیال کرتے تھے کہ یہ آیت ہمارے اور اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝ ہم کہتے: ہم کیسے جھگڑیں گے جبکہ ہمارا نبی ایک ہے اور ہمارا دین ایک ہے یہاں تک کہ ہم نے بعض کو تلواروں کے ساتھ بعض کی گردنیں اڑاتے دیکھا تو مجھے علم ہو گیا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم کہا کرتے تھے ہمارا رب ایک ہے ہمارا دین ایک ہے اور ہمارا نبی ایک ہے تو یہ جھگڑا کیسا۔ جب جنگ صفین کا موقع آیا اور ہم میں سے بعض نے بعض پر تلواروں سے حملہ کیا تو ہم نے کہا: ہاں وہ یہی ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کہنے لگے: ہمارے درمیان ہماری خصومت کیا ہوگی؟ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو صحابہ نے کہا: یہی ہمارے درمیان خصومت ہوگی۔ ایک قول کیا گیا ہے: ان کے تخاصم سے مراد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فیصلہ طلب کرنا ہے ظالم کی نیکیوں سے اس کے ظلم کے برابر حق لیا جائے گا اور جس کے لیے حق ثابت ہوا اس کو دے دیا جائے گا یہ حکم تمام مظالم کے بارے میں ہے جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے''؟ صحابہ نے عرض کی: ہمارے درمیان مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم نہ ہو اور سامان نہ ہو، فرمایا: ''میری امت میں سے مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزوں اور زکوۃ کے ساتھ آئے گا وہ آئے گا کہ اس نے اس کو گالیاں دی ہونگی اس پر تہمت لگائی ہوگی اس کا مال کھایا ہوگا، اس

1۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ زمر، حدیث نمبر 3160، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا خون بہایا ہوگا اور اس کو مارا ہوگا اس کو اس کی نیکیوں سے بدلہ دیا جائے گا اور دوسرے کو اس کی نیکیوں سے دیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں واجبات ادا کرنے سے پہلے ختم ہوگئیں تو مظلوم کی برائیاں لی جائیں گی اور ظالم پر پھینک دی جائیں گی پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا'' اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے سورۂ آل عمران میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس آدمی کا کسی پر عزت یا کسی اور حوالے سے کوئی ظلم ہو تو آج ہی اس سے معافی لے لے اس سے پہلے کہ اس کے پاس کوئی دینار اور درہم نہ رہے اگر اس کا کوئی عمل صالح ہوگیا تو اس کے ظلم کے مطابق اس سے لے لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہونگی تو مظلوم کے گناہ لیے جائیں گے اور ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے'' (1)۔ حدیث مسند یہی ہے ''سب سے پہلے خصومات دنیا میں ہوں گی''۔ ہم نے تمام بحث ''التذکرۃ'' میں ذکر کر دی ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَ كَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۞ وَ الَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۞ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

''پس اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور تکذیب کرتا ہے اس سچ کی جب وہ اس کے پاس آیا، کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور وہ ہستی جو اس سچ کو لے کر آئی اور جنہوں نے اس سچائی کی تصدیق کی یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں۔ انہیں ملے گا جو چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے، یہ صلہ ہے محسنوں کا تاکہ ڈھانپ لے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے بدترین اعمال کو اور عطا فرمائے انہیں انکے بہترین اعمال کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس آدمی سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد اور شریک ہے اور قرآن کی تکذیب کرتا ہے اَلَيْسَ میں ہمزہ استفہام تقریری ہے یعنی کیا جہنم انکار کرنے والوں کے لیے ٹھکانہ نہیں یہ ثوی بالمکان سے مشتق ہے جب وہ وہیں ٹھہرے اس کا قصد ثَوَاء، ثُوِيًا آتا ہے جس طرح مضی فعل کا مصدر ہے مَضَاء اور مُضِيًا آتا ہے اگر یہ اثوا سے مشتق ہوتا تو مُثْوًى ہوتا یہ اس بات پر دال ہے کہ ثوی ہی فصیح لغت ہے۔ ابو عبید نے اَثْوَى نقل کیا ہے، اعشی کا قول ذکر کیا:

أَثْوَى وَقَصَّرَ لَيْلَةً لِيُزَوَّدَا　　وَمَضَى وَأَخْلَفَ مِنْ قُتَيْلَةَ مَوْعِدَا

محل استدلال اثوی ہے۔

اصمعی صرف ثوی کو ہی جانتا ہے اور شعر کو روایت کرتا ہے کہ اثوی استفہام کے طریقہ پر ہے اثویت غیری متعدی ہوتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، من كانت له مظلمة عند الرجل، جلد 1 صفحہ 331

ہے اور وہ متعدی نہیں۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳ ۔ وَالَّذِیْ مبتدا ہونے کی حیثیت میں محل رفع میں ہے اس کی خبر اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ہے الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور صَدَّقَ بِهٖۤ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ ہیں۔ سدی نے کہا: الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد جبریل امین اور الذی صدق بہ سے مراد مومن ہیں (1)، اس پر استدلال اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ سے کیا۔

نخعی اور مجاہد نے کہا: الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ سے مراد مومن ہیں جو قیامت کے روز قرآن کے ساتھ آئیں گے اور کہیں گے: یہ ہے وہ چیز جو تم نے ہمیں عطا کی اس میں جو کچھ ہے ہم نے اس کی پیروی کی اس تعبیر کی صورت میں الَّذِیْ جمع کے معنی میں ہوگا جس طرح من جمع میں ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسم کی طوالت کی وجہ سے اس کے آخر سے نون حذف ہے۔ شعبی نے یہ تاویل کی ہے کہ یہ واحد ہے اور کہا: الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اسی وجہ سے اس کی خبر جماعت ہے جس طرح جس آدمی کی تعظیم مقصود ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے: ھو فعلوا، زید فعلوا کذا کذا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہر آدمی کے حق میں عام ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دی؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا: طبری نے اسے پسند کیا۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے والذی جاء وا بالصدق وصدقوا بہ یہ قراءت تفسیر کے طریقہ پر ہے ابو صالح کوفی کی قراءت والذی جاء بالصدق وصدق بہ ہے یعنی صدق مخفف ہے یعنی اس کے بدلے میں سچ بولا یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سچ کا اظہار کیا۔ سورۂ بقرہ میں الَّذِیْ کے متعلق گفتگو پہلے گزر چکی ہے کہ یہ واحد اور جمع دونوں طرح ہوتا ہے۔

لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ یعنی جنت میں نعمتوں میں سے جو چاہیں گے وہ ہونگی جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: لک إکرام عندی یعنی میری طرف سے تجھے اکرام پہنچے گا ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ ۝۳۴ یعنی دنیا میں ثنا اور آخرت میں ثواب ہوگا۔

لِیُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ یعنی صدقوا۔ لِیُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ انہوں نے صدقہ کیا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف فرما دے، سُوْٓءَ الَّذِیْ عَمِلُوْا یعنی اللہ تعالیٰ انہیں عزتوں سے نوازیں گے اور اسلام سے قبل جو عمل وہ کرتے رہے اس پر اللہ تعالیٰ ان کا مواخذہ نہیں فرمائے گا اور جو وہ دنیا میں اعمال حسنہ کرتے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس پر اجر عطا فرمائے گا اور وہ جنت ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۶ۚ وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ۝۳۷

''کیا اللہ کافی نہیں اپنے بندے کے لیے (یقیناً کافی ہے) اور وہ نادان ڈراتے ہیں آپ کو ان معبودوں

1۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 131

سے جو اللہ کے رسول ہیں اور جسے اللہ گمراہ ہونے دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جس کو ہدایت بخش دے اللہ تعالیٰ تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا''۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ۔ کاف سے یاء حذف کر دی گئی ہے کیونکہ یاء خود بھی ساکن ہے اور اس کے بعد تنوین بھی ساکن ہے اصل تو یہ تھا کہ وقف میں یاء کو حذف نہ کیا جاتا کیونکہ تنوین زائل ہے مگر اسے حذف کر دیا گیا ہے تاکہ علم ہو کہ فصل میں بھی یہی صورتحال ہے عربوں میں ایسے بھی ہیں کہ وقف کی صورت میں بھی یاء کو باقی رکھتے ہیں وجہ اس کی اصل کو ملحوظ رکھنا ہے وہ کہتے ہیں: کافی عام قراء کی قراءت عبدہ ہے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اللہ تعالیٰ کی ذات مشرکین کی وعید اور ان کے مکر کے لیے کافی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے عبادہ پڑھا ہے (1) وہ انبیاء ہیں یا انبیاء اور مومن ہیں۔ ابو عبید نے جمع کے صیغہ کی قراءت کو پسند کیا ہے کیونکہ اس کے بعد یہ قول ہے وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ یہ بھی احتمال ہے العبدلفظ جنس ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ (العصر) اس تاویل کی بنا پر پہلی قراءت دوسری قراءت کی طرف راجع ہے کفایت بتوں کے شر کے لیے ہے کیونکہ مشرکین مومنوں کو بتوں کے سامنے ڈرایا کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَكَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ (الانعام: 81) جرجانی نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے اور کافر بندے کو ثواب دے کر اور عقاب دے کر کافی ہے۔

وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتوں کی مضرت سے خبردار کیا تھا، انہوں نے کہا: کیا آپ ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان معبودوں کے ذکر سے نہیں رکیں گے تو یہ تجھے پاگل کر دیں گے یا تجھے کوئی نقصان پہنچائیں گے۔ قتادہ نے کہا: حضرت خالد بن ولید عزی بت کی طرف گئے تاکہ اسے کلہاڑے کے ساتھ توڑ دیں اس کے خادم نے آپ کو کہا: اے خالد! میں تجھے اس سے خبردار کرتا ہوں کیونکہ اس میں ایسی طاقت ہے کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت خالد عزی بت کی طرف بڑھے اور اس کی ناک توڑ دی یہاں تک کہ کلہاڑے سے اسے توڑ دیا ان کا حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ڈرانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرانا تھا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی انہیں بھیجا تھا آیت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ اپنے لشکروں کی زیادتی اور قوت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا کرتے تھے جس طرح ارشاد فرمایا اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ (القمر)

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۗ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۝ یعنی جو اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھے یا اس کے رسولوں سے دشمنی رکھے کیا اللہ تعالیٰ غالب اور انتقام لینے والا نہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 127

بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۳۸ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۴۰ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۴۱

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمان اور زمین کو؟ تو ضرور کہیں گے: اللہ نے، آپ فرمایئے: پھر ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود دور کر دیں گے اس تکلیف کو یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہتا ہے تو کیا وہ روک سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو فرما دیجئے: مجھے کافی ہے اللہ تعالیٰ فقط اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔ فرمایئے: اے میری قوم! تم عمل کیے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرتا رہوں گا پس تم ضرور جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون ہے جس پر دائمی عذاب اترتا ہے۔ اے حبیب! ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے حق کے ساتھ پس جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ اپنا بھلا کرتا ہے اور جو بھٹکتا ہے تو وہ بھٹکتا ہے اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے لیے اور آپ ان بدبختوں کے ذمہ دار نہیں“۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان سے پوچھیں لَيَقُوْلُنَّ یہ امر واضح کیا کہ وہ بتوں کی عبادت کرنے کے باوجود یہ اقرار کیا کرتے تھے کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے جب اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے تو وہ تجھے اپنے ان معبودوں سے کیسے ڈراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں جبکہ تو اس کا رسول ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور آسمانوں و زمین کو پیدا کیا۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جب انہوں نے یہ اعتراف کر لیا ہے تو اب ان سے کہو: مجھے بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ مجھے تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا یہ بت تکلیف کو رفع کر دیں گے اور اگر وہ مجھے رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ دوسرے علماء نے کہا: انہوں نے کہا وہ کسی ایسی چیز کو دور نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دی ہو لیکن وہ شفاعت کریں گے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ انکے جواب کو ترک کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے یعنی وہ کہیں گے: نہ وہ کسی مصیبت کو دور کر سکتے ہیں اور نہ رحمت کو روک سکتے ہیں تو پس آپ کہیں: مجھے میرا اللہ کافی ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں۔ توکل کے متعلق گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ نافع، ابن کثیر اور عاصم کے علاوہ کوفیوں نے کاشفات ضرہ پڑھا ہے۔ ابو عمرو، شیبہ اور حضرت حسن کی قراءت میں معروف اور عاصم سے یہی مروی ہے **هل هن كاشفات ضرّه** اور **ممسكات رحمته** اصل کے اعتبار سے اس پر تنوین پڑھی ہے؛ یہی ابو عبید اور ابو حاتم کی قراءت ہے کیونکہ یہ اسم فاعل ہے جو استقبال کے معنی میں ہے جب بات صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ہے تو تنوین زیادہ مناسب ہے۔

شاعر نے کہا:

الضاربون عُمَيْراً عن بيوتهم بالليل يوم عُمَير ظالمٌ عادی

محل استدلال عميراً ہے وہ رات کے وقت عمیر کو اپنے گھروں سے ہی مارنے والے ہیں عمیر کا دن ظالم اور زیادتی کرنے والا ہے۔ اگر اسم فاعل ماضی کے معنی میں ہو تو اس میں تنوین جائز نہیں ہوتی تنوین کو حذف کر دیا گیا۔ جب تنوین کو حذف کر دیا گیا تو دو اسموں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہی تو دوسرے اسم کو اضافت کی وجہ سے جر دی گئی کلام عرب میں تنوین کا حذف بہت زیادہ ہے' موجود ہے اور اچھا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ: 95) محل استدلال بالغ ہے۔ فرمایا: انا مرسلو الناقة محل استدلال مرسلو ہے سیبویہ نے کہا: اس کی مثل غیر محلی الصید ہے سیبویہ نے کہا:

هل أنتَ باعِثُ دِينارٍ لحاجتِنا

کیا تو ہماری ضرورت کے لیے دینار بھیجنے والا ہے۔ محل استدلال باعث ہے۔

نابغہ نے کہا:

أحكُمْ كَحُكْمِ فتاةِ الحَيِّ إذ نَظَرَتْ إلى حَمَامِ شِرَاعٍ وَارِدِ الثَّمَدِ

اس کا معنی وارد الثمد ہے، تنوین کو حذف کر دیا گیا۔

**قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ** تم اپنی جگہ کام کرو میں اپنی جگہ پر عمل کرنے والا ہوں یعنی اس جہت پر جو میرے بس میں ہے۔

ابوبکر نے مکاناتکم پڑھا۔ سورۃ الانعام میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**يُّخْزِيْهِ** اسے دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیا یہ بھوک اور تلوار کے ساتھ ہے اور آخرت میں دائمی عذاب واقع ہوگا۔

**اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝** اس کے بارے میں گفتگو کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

**اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝**

''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا ان کی روحیں حالت نیند میں، پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو موت کا فیصلہ کرتا ہے اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک، بے شک اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ **اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا** ان کی عمروں کے ختم ہونے پر نفوس کو قبض کر لیتا ہے **وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا** اس کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے جسموں میں روحوں کے باقی رکھنے کے ساتھ

تصرف سے انہیں روک دیتا ہے۔

فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی یعنی وہ نفوس جو سوئے ہوتے ہیں انہیں موت کے وقت تک آزاد چھوڑ دیتا ہے؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: معنی ہے وہ نفوس جو نیند میں نہیں مرتے ان کی عمروں کے ختم ہونے پر ان کو قبض کر لیتا ہے۔ کہا: بعض اوقات قبض کرنا اس کی نیند ہی ہوا کرتی ہے تو اس صورت میں تقدیر کلام اس صورت میں ہوگی والتی لم تمت وفاتھا نومھا۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے مفسرین نے کہا: زندوں اور مردوں کی روحیں نیند کی حالت میں ملتی ہیں اللہ تعالیٰ جتنا چاہتا ہے وہ آپس میں متعارف ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ ان سب کے اجسام میں رجوع کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مردوں کی روحوں کو اپنے پاس روک لیتا ہے اور زندوں کی روحوں کو انکی طرف بھیج دیتا ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا: اللہ تعالیٰ مردوں کی روحوں کو قبض کرتا ہے جب وہ مر جاتے ہیں (1) اور زندوں کی روحوں کو قبض کر لیتا ہے جب وہ سو جاتے ہیں وہ آپس میں متعارف ہوتی ہیں جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ متعارف ہوں یُرۡسِلُ کا معنی ہے وہ انہیں واپس کرتا ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: سونے والے کا نفس جبکہ وہ آسمان میں ہوتا ہے ابھی اسے اس کے جسم کی طرف نہیں لوٹایا جاتا تو وہ سچی خوابیں ہوتی ہیں اور جس چیز کو ان کے بھیجنے کے بعد اور جسموں میں قرار پکڑنے سے پہلے دیکھتا ہے وہ شیطان القا کرتا ہے اور باطل ان میں خیال ڈالتے ہیں تو وہ جھوٹے خواب ہیں۔

ابن زید نے کہا: نیند وفات ہے اور موت بھی وفات ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تمہیں موت دی جاتی ہے اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تمہیں اٹھایا جائے گا'' (2)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نیند موت کا بھائی ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنتی سوئیں گے؟ فرمایا: لا النوم أخو الموت والجنة لا موت فیھا نہیں نیند موت کا بھائی ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں؛ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انسان میں نفس اور روح ہے دونوں کے درمیان سورج کی شعاع جیسا تعلق ہے نفس کے ساتھ سمجھ اور تمیز ہوتی ہے اور روح کے ساتھ سانس کی حرکت ہوتی ہے جب بندہ سوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا نفس قبض کر لیتا ہے اور اس کی روح قبض نہیں کرتا؛ یہ ابن انباری اور زجاج کا قول ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: یہ بات حقیقت سے بہت ہی دور ہے کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں نفس مقبوض ایک ہی چیز ہے اسی وجہ سے فرمایا: فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی پس اللہ تعالیٰ دونوں حالتوں یعنی نیند اور حالت موت میں روح کو ہی قبض کرتا ہے جسے حالت نیند میں قبض کرتا ہے تو اس کا معنی ہے اسے بھانپ لیتا ہے یعنی تصرف سے اسے روک دیتا ہے گویا وہ بھی ایسی چیز

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 29-128 2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

ہے جس پر قبضہ کر لیا گیا ہے اور جسے موت کی حالت میں قبض کرتا ہے تو اسے روک لیتا ہے اور قیامت تک اسے نہیں چھوڑتا۔

وَيُرْسِلُ الْأُخْرٰى جو چیز اسے روک رہی تھی اس کو زائل کر دیتا ہے تو وہ لوٹ آتا ہے جس طرح وہ پہلے تھا نفس کی حالت نیند میں وفات حس کو زائل کرنے، غفلت کو پیدا کرنے اور ادراک کے محل میں آفت کو پیدا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے اور حالت نیند میں وفات سے مراد موت پیدا کرنا اور کلی طور پر حس کو ختم کرنا ہوتا ہے فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ یعنی اس میں ادراک پیدا نہیں کرتا۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں موت پیدا کر دی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت کی وجہ سے لوگوں نے نفس اور روح میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں یا یہ دو چیزیں ہیں جیسے ہم نے ذکر کیا ہے؟ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ دونوں ایک چیز ہیں اسی پر صحیح آثار دلالت کرتے ہیں جس طرح ہم اس باب میں ذکر کریں گے۔

اسی ضمن میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوسلمہ کے ہاں تشریف لے گئے جبکہ ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی آنکھ کو بند کر دیا پھر فرمایا: الروح إذا قبض تبعه البصر روح جب قبض کی جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ألم تروا الإنسان إذا مات شخص بصره کیا تم انسان کو نہیں دیکھتے جب وہ مرتا ہے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے فرمایا: ''یہ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ اس وقت نظر نفس کا پیچھا کرتی ہے'' دونوں روایات کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب بندہ نیک ہوتا ہے تو ملائکہ حاضر ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: اے پاکیزہ نفس! نکلو جب وہ پاکیزہ جسم میں ہوتا ہے تو نکل جبکہ تو تعریف کی گئی ہے تجھے روح و ریحان کی بشارت ہو تجھے راضی رب کی بشارت ہو وہ غصہ میں نہیں، اسے لگاتار یہ بات کی جاتی ہے یہاں تک کہ اسے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے'' اس کی سند صحیح ہے؛ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ہم نے اس کا ذکر تذکرہ میں کیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ''جب فرشتے کسی شخص کی روح کو نکالتے ہیں تو اسے دو فرشتے وصول کر لیتے ہیں جو اسے اوپر کی طرف لے جاتے ہیں''۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وادی والی حدیث (جس میں حضرت بلال کو ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ نماز کے لیے صحابہ کو بیدار کریں) میں کہا: یارسول اللہ! میرے نفس کو اسی ذات نے اپنی گرفت میں لے لیا جس ذات نے آپ کے نفس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ زید بن مسلم کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مقابل یہ ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کر لیا تھا اگر وہ چاہتا تو انہیں ہماری طرف اس وقت کے علاوہ وقت میں لوٹا دیتا''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس میں صحیح یہ قول ہے کہ ایک لطیف جسم ہے اجسام محسوسہ کے ساتھ چنگل مارے ہوئے ہے اسے کھینچا جاتا ہے اور اسے نکالا جاتا ہے اسے کفن میں لپیٹا جاتا ہے اور اسے کفن میں داخل کیا جاتا ہے اسے ہی آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے اسے موت نہیں آتی وہ فنا نہیں ہوتا یہ پاکیزہ خوشبو اور خبیث خوشبو والا ہے جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی

حدیث میں ہے یہ اجسام کی صفات ہیں اعراض کی صفت نہیں ہم نے اس بارے میں تمام اخبار کتاب التذکرۃ باحول الموتی والدار الآخرۃ میں ذکر کی ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ (واقعہ) اس سے مراد نفس ہے جب وہ جسم سے نکلتا ہے یہ جسم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** امام بخاری اور امام مسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا أوی أحدکم إلی فراشہ فلیأخذ داخلۃ إزارہ فلینفض بھا فراشہ ولیسمّ اللہ فإنہ لا یعلم ما خلفہ بعد علی فراشہ فإذا أراد أن یضطجع فلیضطجع علی شقہ الأیمن ولیقل سُبحانك ربّ وضعت جنبی وبك أرفعہ إن أمسکت نَفسی فاغفر لھا(1)۔ جب تم میں سے کوئی اپنے بستر کا ارادہ کرے تو وہ تہبند کے اندر کا حصہ لے اور اس کے ساتھ اپنے بستر کو جھاڑے اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد کون اس کا نائب رہا جب وہ لیٹنے کا ارادہ کرے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹے اور کہے: اے میرے رب! تو پاک ہے میں نے اپنا پہلو رکھ دیا ہے اور تجھی کے سہارے میں اسے اٹھاؤں گا اگر تو میرے نفس کو روک لے تو اسے بخش دے۔

بخاری، ابن ماجہ اور ترمذی نے فاغفر لھا کی جگہ فارحمھا کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ الفاظ بھی ذکر کیے اگر تو اسے چھوڑ دے تو اس کی حفاظت فرما جن چیزوں سے تو اپنے صالح بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔ امام ترمذی نے یہ الفاظ زائد ذکر کیے ہیں: جب وہ بیدار ہو تو کہے: اس ذات کے لیے تمام تعریفیں ہیں جس نے میرے جسم کو عافیت عطا فرمائی میری روح کو میری طرف لوٹا دیا اور اپنے ذکر کا مجھے اذن دیا۔

امام بخاری نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت سوتے تو اپنا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے پھر کہتے: اللّٰھمّ باسمك أموت وأحیا اے میرے اللہ! تیرے نام سے مرتا ہوں اور تیرے نام سے زندہ ہوتا ہوں۔ جب وہ بیدار ہوتے تو کہتے: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما أماتنا والیہ النشور(2) اس اللہ کی تمام تر تعریفیں ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی عطا کی اور اسی کی طرف اٹھنا ہے۔

فَيُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ یہ عام قراءت ہے فعل معروف ہے اور الموت پر نصب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر موت کا فیصلہ کر دیا؛ یہ ابو حاتم اور ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ آیت کے شروع میں اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ پس وہ ہی نفس پر فیصلہ فرماتا ہے۔ اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے اسے قضی علیھا الموت پڑھا ہے یعنی فعل مجہول۔ نحاس نے کہا: معنی ایک ہے مگر پہلی قراءت زیادہ واضح اور سیاق کلام کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے وَ یُرْسِلُ انہوں نے اسے ویرسل نہیں پڑھا۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت، الوہیت میں منفرد ہونے، جو چاہے کرنے، زندگی دینے اور موت عطا کرنے پر تنبیہ ہے اس ذات کے علاوہ کوئی اس پر قادر نہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ یعنی میت اور سونے والے کا نفس قبض کرنے اور سونے والے نفس کو چھوڑ دینے اور میت کے نفس کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الخلاء، جلد 2، صفحہ 936

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر المیت والاستعداد لہ، صفحہ 324

روک لینے میں کئی نشانیاں ہیں۔

اصمعی نے کہا میں نے معتمر کو کہتے ہوئے سنا: انسان کی روح کاتے ہوئے دھاگے کے بنڈل کی طرح ہے روح کو چھوڑا جاتا ہے وہ جاتی ہے پھر اسے لپیٹا جاتا ہے تو وہ آتی ہے اور جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے حالت نیند میں روح کا کچھ حصہ چھوڑا جاتا ہے اس کا اکثر حصہ بدن میں ہوتا ہے اس کا جو حصہ جسم سے نکلتا ہے اس کے ساتھ اس کا مخفی اتصال موجود ہوتا ہے انسان جب بیدار ہوتا ہے تو روح کا وہ حصہ جو پھیل چکا تھا جسم میں موجود اکثر حصہ اسے اپنی طرف کھینچتا ہے تو وہ لوٹ آتی ہے، اس کے علاوہ بھی بات کی گئی۔ سبحان میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔـا وَّ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

''کیا انہوں نے بنالیے ہیں الله کو چھوڑ کر اور سفارشی، پوچھیے: اگرچہ وہ مزعومہ سفارشی کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں۔ آپ فرمایئے: سب شفاعت الله کے اختیار میں ہے اسی کے لیے بادشاہی ہے آسمان اور زمین کی پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جب ذکر کیا جائے اکیلے الله کا تو کڑھنے لگتے ہیں ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب ذکر کیا جاتا ہے اس کے سوا دوسروں کا تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں''۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ بلکہ انہوں نے اپنے بتوں کو شفیع بنالیا ہے۔ کلام میں ایسی چیز ہے جو لم کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے تقدیر کلام یوں ہے لم یَتَفَكَّرُوا لیکن انہوں نے اپنے معبودوں کو شفیع بنالیا ہے قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔـا اے محمد! انہیں کہو کیا تم انہیں شفیع بناتے ہو اگرچہ یہ شفاعت میں سے کسی چیز کے مالک نہیں اور نہ ہی یہ عقل رکھتے ہیں کیونکہ یہ جمادات ہیں؛ یہ استفہام انکاری ہے۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا یہ اس میں بیان ہے کہ شفاعت صرف الله وحدہ لاشریک کے لیے ہے جس طرح الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:255) یعنی اس کی شفاعت کے بغیر کوئی شافع نہیں اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیا:28) جَمِيْعًا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جَمِيْعًا دو یا اس سے زائد افراد کے لیے ہوتا ہے جبکہ شفاعت تو واحد ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ شفاعت مصدر ہے اور مصدر دو اور جمیع افراد کا معنی دیتا ہے

وَحْدَهٗ خلیل کے نزدیک مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے اور یونس کے نزدیک حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ مبرد نے کہا: اشْمَاَزَّتْ کا معنی ہے منقبض ہونا؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے(1)۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 236

ہے نفرت کرنا، تکبر کرنا، کفر کرنا اور نافرمانی کرنا۔ مؤرج نے کہا: اس کا معنی ہے انکار کرنا۔ اشمئزاز کا اصل معنی نفور اور ازورار ہے یعنی نفرت کرنا اور ناپسند کرنا۔

عمرو بن کلثوم نے کہا:

إذا عضّ الثِّقافُ بها اشْمأزّتْ وَوَلَّتْهُمْ عَشَوْزَنَةً زَبُونَا

اور زید نے کہا: اشماز الرجل کا معنی ہے وہ خوف سے گھبرا گیا مشرکوں سے جب کہا جاتا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتے اور کفر کرتے۔

وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ یعنی جب بتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے چہروں سے خوشی اور مسرت عیاں ہوتی ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝٤٦ وَ لَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝٤٧ وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٤٨

”آپ عرض کیجیے: اے اللہ! اے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین کے! اے جاننے والے غیب اور شہادت کے! تو ہی فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا ان میں جو کچھ ہے سب کچھ ہو اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تو چاہیں گے کہ بطور فدیہ ادا کریں اسے میرے عذاب کے عوض، قیامت کے دن اور (اس روز) ظاہر ہو جائے گا ان پر اللہ کی طرف سے جس کا وہ گمان بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اور ظاہر ہو جائیں گے ان پر وہ برے اعمال جو انہوں نے کمائے تھے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے“۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یہ منصوب ہے کیونکہ یہ منادی ہے اور مضاف ہے اسی طرح عٰلِمَ الْغَيْبِ بھی ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس کا نعت ہونا جائز نہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس چیز سے نماز کا آغاز کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ رات کو اٹھتے تو نماز کا آغاز ان الفاظ سے کرتے اللّٰھم ربّ جبریل و میکائیل و اسرافیل فاطر السموات والأرض عالم الغیب والشھادۃ أنت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیہ یختلفون اے اللہ! جبریل میکائیل واسرافیل کے رب! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا

کرنے والے! اے غیب وشہادت کو جاننے والے! تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے ان چیزوں میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

وَ لَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا جو جھوٹ بولیں اور شرک کریں اگر وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب فدیہ دے دیں۔ یہ بحث سورۂ آل عمران اور سورۃ الرعد میں گزر چکی ہے۔

وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ اسی معنی میں وہ روایت کی گئی ہے جسے منصور نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہا: انہوں نے ایسے اعمال کیے انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ نیکیاں ہیں جبکہ وہ برائیاں تھیں؛ یہ سدی کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے ایسے اعمال کیے انہوں نے گمان کیا تھا کہ وہ موت سے قبل اس برے عمل سے توبہ کرلیں گے تو توبہ کرنے سے پہلے موت نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا جبکہ وہ گمان کیا کرتے تھے کہ وہ توبہ سے نجات پا جائیں گے یہ بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ وہم کیا تھا کہ انہیں توبہ کے بغیر ہی بخش دیا جائے گا تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ ظاہر ہوا جس کا وہ گمان نہیں رکھتے تھے، یعنی انہیں جہنم میں داخل کردیا جائے گا۔

سفیان ثوری نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: ریاکاروں کے لیے ہلاکت ہے، ریاکاروں کے لیے ہلاکت ہے یہ ان کی آیت اور ان کا قصہ ہے۔ عکرمہ بن عمار نے کہا: محمد بن منکدر نے موت کے وقت بڑی جزع وفزع کی آپ سے کہا گیا: یہ جزع وفزع کیسی ہے؟ کہا: میں اللہ تعالیٰ کی ایک آیت سے ڈرتا ہوں وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ میں ڈرتا ہوں کہ میرے لیے وہ چیز ظاہر ہو جس کا میں گمان نہیں رکھتا تھا۔ ان کے لیے کفر ومعاصی کا عقاب ظاہر ہوا اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے ان کا احاطہ کرلیا۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَ لَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

''پس جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم عطا کردیتے ہیں اسے نعمت اپنی طرف سے تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت مجھے دی گئی ہے (اپنے) علم (وفضل) کے باعث (اے غافل! یوں نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ کہی تھی یہ بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے (جب ہم نے انہیں پکڑا) تو نہ فائدہ پہنچایا انہیں (مال و دولت نے) جو وہ کمایا کرتے تھے۔ پس جو برے کام انہوں نے کیے ان کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑا، اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان لوگوں میں سے انہیں بھی عنقریب

اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی اور یہ عاجز نہیں کر سکتے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کشادہ فرماتا ہے رزق جس کو چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کو چاہتا ہے)، یقیناً اس (تقسیم رزق) میں اس کی (حکمت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لیے"۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت حذیفہ بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ قتادہ نے کہا: عَلٰى عِلْمٍ یعنی میرے نزدیک کمائی کی کئی صورتیں تھیں، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ عَلٰى عِلْمٍ کا معنی ہے(1) اس خیر کی وجہ سے جو میرے پاس تھی۔
ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَلٰى عِلْمٍ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس علم کی بنا پر جو میری فضیلت کے بارے میں موجود تھا۔
حضرت حسن بصری نے کہا: عَلٰى عِلْمٍ کا معنی ہے اس علم کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کہ مجھے علم تھا کہ جب دنیا میں عطا کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا مقام و مرتبہ ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلکہ یہ آزمائش ہے یعنی جو نعمتیں تجھے دی گئی ہیں وہ آزمائش ہیں جس کے ساتھ تجھے آزمایا جائے گا۔
فراء نے کہا: یہاں ھی ضمیر مونث ذکر کی گئی ہے کیونکہ فتنہ کا لفظ مونث ہے اگر یہ ھو فتنۃ ہوتا تب بھی جائز تھا۔ نحاس نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے بل أعطیتہ فتنۃ بلکہ اسے جو میں نے عطا کیا ہے وہ آزمائش ہے۔
قَدْ قَالَهَا ھا ضمیر اس لیے ذکر کی کیونکہ کلمہ مونث ہے الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس سے مراد کفار ہیں جس طرح قارون وغیرہ جب اس نے یہ کہا تھا: اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ (القصص: 78)
فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝ ما نافیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کی اولاد اور اموال نے کچھ نفع نہ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے ان کے اموال نے انہیں کس چیز کا نفع دیا فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا یعنی ان کے اعمال کی برائیوں کی جزا۔ سیئہ کی جزا کو بھی سیئہ کہتے ہیں وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا یعنی جنہوں نے اس امت میں شرک کیا تو انہیں بھوک اور تلوار کی صورت میں اعمال کی سزا ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں نہ یہ اللہ تعالیٰ کو ناپید پائیں گے اور نہ ہی ان کے سابقین نے انہیں ناپید پایا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔
اَوَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۝ مومن کا خصوصاً ذکر کیا ہے کیونکہ وہی آیات میں تدبر کرتا ہے اور ان سے نفع حاصل کرتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رزق کی وسعت بعض اوقات خفیہ تدبیر اور استدراج ہوا کرتا ہے اور اس میں کی رفعت اور عظمت شان ہوا کرتی ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۝ وَ اَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۝ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ

1۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 134

رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

''آپ فرمائیے: اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کیں اپنے نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو، بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اور سچے دل سے لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور سر خم کر دو اس کے سامنے اس سے پہلے کہ آجائے تم پر عذاب پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔ اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اس سے پیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تمہیں خبر تک نہ ہونے پائے اس وقت کوئی شخص یہ کہنے لگے: صد حیف! ان کوتاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں اور میں تو تمسخر اڑانے والوں سے تھا، یا یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں ہو جاتا پرہیزگاروں میں سے، یا یہ کہنے لگے جب عذاب دیکھے کاش! مجھے ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں گا، ہاں ہاں آئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے انہیں جھٹلایا اور گھمنڈ کرتا رہا اور تو کفر کرنیوالوں میں سے تھا''۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اگر تو چاہے تو یاء کو حذف کر دے کیونکہ ندا بھی حذف کا موقع ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں نمایاں ترین وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں (1): جب ہم نے ہجرت کا ارادہ کر لیا تو میں، ہشام بن عاص بن وائل سہمی اور عیاش بن ابی ربیعہ بن عتبہ نے عہد و پیمان کیا کہا: ہمارے اکٹھے ہونے کی جگہ بنو غفار کا کنواں ہے ہم نے کہا: جو ہم سے پیچھے رہ گیا تو وہ محبوس سمجھا جائے گا پس اس کا ساتھی اپنا سفر جاری رکھے میں اور عیاش بن عتبہ پہنچ گئے اور ہشام کو ہم سے روک لیا گیا اسے آزمائش میں ڈالا گیا پس وہ فتنہ میں مبتلا ہو گیا، ہم مدینہ میں کہا کرتے تھے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا، اللہ کے رسول پر ایمان لائے پھر انہیں آزمائش میں ڈالا گیا جو انہیں لاحق ہو گئی ہم ان کے لیے کوئی توبہ نہیں دیکھتے وہ اپنے دلوں میں بھی یہی تصور کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ نازل فرمایا: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 192

يَاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اپنے ہاتھ سے اس آیت کو لکھا پھر اسے ہشام کی طرف بھیج دیا، ہشام نے کہا: جب خط میرے پاس پہنچا تو میں اسے لے کر ذی طوی کی طرف نکلا میں نے کہا: اے اللہ! مجھے اس کی سمجھ عطا فرمادے تو میں پہچان گیا کہ یہ آیت میرے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے میں لوٹا اپنے اونٹ پر بیٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: مشرکوں میں سے کچھ لوگوں نے قتل کیے تو بہت زیادہ قتل کیے انہوں نے بدکاری کی تو بہت زیادہ بدکاری کی (1) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی یا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا: جس چیز کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ بہت اچھی ہے کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ ہمارے لیے توبہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ۔ امام بخاری نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے وہ سورۂ فرقان میں گزر چکی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گمان کرتا ہے کہ جس نے بتوں کی پوجا کی اور جس نے ایسے نفس کو قتل کیا جس کا قتل کرنا حرام تھا اسے نہیں بخشا جائے گا تو ہم کیسے ہجرت کریں اور اسلام قبول کریں جبکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبودوں کی عبادت کی اور ہم نے ایسے نفوس کو قتل کیا جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے عبادت کے معاملہ میں اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور انہیں خوف تھا کہ ان کی توبہ ان گناہوں کی وجہ سے قبول نہ ہوگی جو دور جاہلیت میں ان سے ہوئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: یہ آیت وحشی کے حق میں نازل ہوئی جس نے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا اس نے یہ گمان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا اسلام قبول نہیں کرے گا۔ ابن جریج نے عطا سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وحشی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ سے پناہ مانگنے کے لیے آیا ہوں مجھے پناہ دیجئے تاکہ میں اللہ کا کلام سنوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں یہ پسند کرتا تھا کہ میں تجھے پناہ کے بغیر دیکھوں مگر جب تو پناہ چاہتے ہوئے آ گیا ہے تو تو میری پناہ میں ہے یہاں تک کہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام سنے''۔ اس نے کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، میں نے اس نفس کو قتل کیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا اور میں نے بدکاری کی کیا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے یہاں تک کہ یہ آیت نازل فرمائی: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ زمر، جلد 2، صفحہ 710

اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ (الفرقان: 68) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ آیت تلاوت کی اس نے عرض کی: میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں ممکن ہے میں کوئی نیک عمل نہ کرسکوں میں آپ کی پناہ میں رہنا چاہتا ہوں تا کہ میں اللہ تعالیٰ کا کلام سنوں تو یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء: 48) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اس پر آیت کی تلاوت کی اس نے عرض کی: ممکن ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے بارے میں وہ نہ چاہے میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں یہاں تک کہ میں اللہ تعالیٰ کا کلام سنوں تو یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: 53) اس نے عرض کی: اب میں کوئی شرط نہیں دیکھتا تو وہ مسلمان ہو گیا۔

حماد بن سلمہ نے ثابت سے وہ شہر بن حوشب سے وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پڑھتے ہوئے سنا: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اسے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ وہ غفور رحیم ہے(1)۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں ہے اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا لمن یشاء۔

ابوجعفر نحاس نے کہا: یہ دونوں قرائتیں تفسیر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے اسے بخش دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی پہچان کرادی ہے جن کو وہ بخشا چاہتا ہے وہ توبہ کرنے والا ہے یا جس نے گناہ صغیرہ تو کیا اور اس کا گناہ کبیرہ نہ تھا اور اس پر راہنمائی کی کہ وہ مابعد کلام سے تائب ہونے کا ارادہ کرتا ہے وَ اَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ تائب کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) یہ ایسا امر ہے جس پر کوئی اشکال نہیں۔

حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس آیت سے بڑھ کر کوئی وسعت والی آیت نہیں قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ یہ بحث سورت سبحان (الاسراء) میں گزر چکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: قرآن حکیم میں سب سے امید والی آیت یہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا رد کیا ہے اور کہا: قرآن حکیم میں سب سے امید والی آیت وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ (الرعد: 6) ہے سورۃ الرعد میں یہ بات گزر چکی ہے اسے ولا تقنطوا یعنی نون کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے؛ سورۂ حجر میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

وَ اَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ یعنی اطاعت کے ساتھ اس کی طرف لوٹ آؤ جب اس امر کی وضاحت کی کہ جس نے شرک سے توبہ کی اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے اب توبہ اور اس کی بارگاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا۔ انابہ کا معنی ہے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ اس کے سامنے خضوع کا اظہار کرو اور اس کی اطاعت کرو۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ قبل اس کے کہ دنیا میں عذاب آجائے ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۝ پھر تمہیں اس کے عذاب سے محفوظ نہیں رکھا جائے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے

1۔ جامع الترمذی، باب ومن سورۃ زمر، حدیث نمبر 3161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من السعادۃ أن یطیل اللہ عمر المرء فی الطاعۃ ویرزقہ الإنابۃ وان من الشقاوۃ أن یعمل المرء ویعجب بعملہ (1) یہ سعادت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں انسان کی عمر کو لمبا کرے اور اسے انابت (اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع) کی توفیق دے اور شقاوت میں سے یہ بھی ہے کہ انسان عمل کرے اور اپنے عمل پر عجب کا اظہار کرے۔

وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾، اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ اور یہ سب کا سب حسن ہے حضرت حسن بصری نے جو کہا اس کا معنی ہے اس کی اطاعت کو لازم پکڑو اور اس کی معصیت سے اجتناب کرو (2)۔ سدی نے کہا: احسن سے مراد وہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد محکمات ہیں اور متشابہ کا علم اس کے عالم کے سپرد کر دو کہا: اللہ تعالیٰ نے کئی کتابیں نازل کیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن حکیم کو نازل کیا اور اس کی اتباع کا حکم دیا؛ یہی احسن ہے اور وہ معجزہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ یہ احسن ہے کیونکہ یہ تمام کتابوں کے لیے ناسخ اور ان پر غالب ہے تمام کتابیں منسوخ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عفو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم کو عفو اور قصاص میں اختیار دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم کو جس کا علم دیا جبکہ وہ قرآن نہیں ہے پس وہ حسن ہے اور جو قرآن آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے وہ احسن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف سابقہ امتوں کی جو خبریں نازل کی ہیں وہ احسن ہیں۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰى، ان محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہے کراھۃ أن تقول کوفیوں کے نزدیک یہ تقدیر ہے لئلا تقول بصریوں کے نزدیک حذر أن تقول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے أن تقول نفس کیونکہ اس سے نفوس میں سے بعض نفوس ہیں وہ کافر کا نفس ہے۔ یہ جائز ہے اس سے مراد وہ نفس ہو جو نفس میں سے ممتاز ہے یا اس وجہ سے کہ وہ کفر میں شدید جھگڑا کرتا ہے یا اسے عظیم عقاب دیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد کثرت ہو؛ جس طرح اعشیٰ نے کہا:

وَرُبَّ بَقِیعٍ لَوْ هَتَفْتُ بِجَوِّهٖ أَتَانِی كَرِیمٌ یَنْفُضُ الرَّأْسَ مُغْضَبًا (3)

یہاں کریم سے مراد معززین کی جماعتیں ہیں یہاں ایک کریم مراد نہیں جس طرح یہ ہے رب بلد قطعت، رُبّ بطل قارعت ان دو مثالوں میں بھی کثرت کا ہی ارادہ ہے یاحسرتا اصل میں یاحسرتی تھا یاء کو الف سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ حرف خفیف ہے اور آواز کو لمبا کرنے کے ساتھ استغاثہ میں زیادہ موثر ہے بعض اوقات اس کے آخر میں ھاء لاحق کر دیتے ہیں۔ فراء نے شعر پڑھا ہے:

یَا مَرْحَبَاهُ بِحِمَارِ نَاجِیَهْ إِذَا أَتَى قَرَّبْتُهُ لِلسَّانِیَهْ

محل استدلال مرحباہ ہے۔

بعض اوقات وہ الف کے بعد یاء کو لاحق کر دیتے ہیں تاکہ وہ اضافت پر دلالت کرے۔ ابو جعفر نے بھی اسے اسی طرح

1۔ شعب الایمان، بیہقی، حدیث نمبر 10589 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 398 3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 136

پڑھا ہے یاحسرتای حسرت سے مراد شرمندگی ہے۔

عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ حضرت حسن بصری نے کہا: فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے(1)۔ ضحاک نے کہا: اللہ عزوجل کے ذکر میں کہا یعنی قرآن اور اس پر عمل کرنا۔

ابوعبید نے کہا: فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ سے مراد اللہ تعالیٰ کے ثواب میں۔ فراء نے کہا: جنب سے مراد قرب اور پڑوس ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: فلان یعیش فی جنب فلان یعنی فلاں، فلاں کے پڑوس یا پناہ میں رہتا ہے اسی سے الصاحب بالجنب ہے یعنی میں نے اس کے جوار اور قرب کی طلب میں یعنی جنت کی طلب میں کوتاہی کی ہے۔ زجاج نے کہا: یعنی میں نے اس راستہ میں کوتاہی کی جو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے مجھے دعوت دی۔ عرب کسی شے کی طرف جانے والے راستہ کو جنب کہتے ہیں، تو کہتا ہے: تجرعت فی جنبك غصصا یہاں فِيْ جَنْۢبِ کا معنی تیرے لیے تیرے سبب سے اور تیری رضا کی خاطر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ سے مراد ہے اس جانب میں جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کی طرف لے جاتی ہے عرب جانب کو جنب کہتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

النَّاسُ جَنْبٌ والأَمِيْرُ جَنْبُ

یعنی لوگ ایک جانب میں ہیں اور امیر دوسری جانب میں ہے۔

ابن عرفہ نے کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کا امر ترک کر دیا یہ جملہ کہا جاتا ہے ما فعلت ذلك فی جنب حاجتی۔ یعنی میں نے یہ کام اپنی ضرورت کی وجہ سے نہیں کیا؛ کثیر نے کہا:

أَلَا تَتَّقِيْنَ اللّٰه فِى جَنْبِ عَاشِقٍ(2)

کیا تو عاشق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتی۔

مجاہد نے بھی اسی طرح کہا یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کا امر ضائع کر دیا(3)۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: ''کوئی آدمی کسی مجلس میں نہیں بیٹھا، نہ چلنے والی جگہ چلا اور نہ کسی بستر پر لیٹا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا مگر قیامت کے روز وہ اس پر حسرت میں ہوگا''۔ ابوداؤد نے اس معنی کی روایت نقل کی ہے ابراہیم تیمی نے کہا: قیامت کے روز حسرتوں میں سے ایک یہ ہوگی کہ انسان اپنے اس مال کو جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا تھا قیامت کے روز غیر کے میزان میں دیکھے گا جس کا دوسرا فرد وارث بنا تھا اور اس میں حق کے مطابق عمل کیا تو عمل کرنے والے کے لیے اجر ہوگا اور دوسرے پر بوجھ ہوگا۔ اور حسرتوں میں سے ایک حسرت یہ بھی ہوگی کہ ایک بندہ اپنے غلام کو دیکھے گا جو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں عطا کیا تھا وہ مقام و مرتبہ میں مالک سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا یا ایک آدمی کو دیکھے گا جسے وہ دنیا میں نابینا پہچانتا تھا اب قیامت کے روز وہ بینا ہے اور وہ خود نابینا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝ یعنی تو نہیں ہے مگر دنیا میں قرآن، رسول اور اللہ کے اولیاء سے استہزاء کرنے والوں

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 398	2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 137	3۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 236

میں سے (1)۔ قتادہ نے کہا: یعنی اس کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ضائع کیا یہاں تک کہ اس نے اطاعت گذاروں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اِنْ كُنْتُ حال ہونے کی حیثیت سے منسوب ہے گویا کہا: میں نے کوتاہی کی جبکہ میں مذاق کرنے والا تھا یعنی میں نے مذاق اڑانے کی حالت میں کوتاہی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں نہیں تھا مگر مذاق، کھیل اور باطل میں یعنی میری سب کاوش غیر اللہ کی عبادت میں تھیں۔

اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٥٧﴾ یا یہ نفس کہے گا: کاش! اللہ تعالیٰ میری راہنمائی اپنے دین کی طرف کرتا تو میں شرک اور معاصی سے بچنے والوں میں سے ہوتا یہ قول ''اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دیتا تو میں ہدایت یافتہ ہو جاتا'' سچا قول ہے یہ مشرکین کے اس استدلال کے قریب ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں دی ہے: سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا (الانعام: 148) یہ کلمہ حق ہے جس کے ساتھ باطل کا ارادہ کیا گیا جس طرح حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب ایک خارجی نے کہا: لاحکم الاللہ۔

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ یعنی جب وہی نفس عذاب دیکھے گا تو وہ کہے گا: کاش! میرے لیے دوبارہ لوٹنا ہوتا فاکون تمنی کے جواب کے طور پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو یہ کرۃ پر معطوف ہو کیونکہ اس کا معنی ہے اَنْ اَكَرَّ جس طرح شاعر نے کہا:

لَلُبْسُ عَبَاءَةٍ وَتَقَرَّ عَيْنِي أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ لُبْسِ الشُّفُوفِ

فراء نے یہ شعر پڑھا:

فَمالَكَ مِنها غَيْرُ ذِكْرى وخَشْيَةٍ وتَسْأَلَ عن رُكْبانِها أَيْنَ يَمَّمُوا (2)

یہاں وتسألَ کو نصب الذکری کے محل کی وجہ سے ہے کیونکہ کلام کا معنی ہے فمالك منها الاان تذکر یہی صورت حال للبس عباءۃ وتقر میں ہے کیونکہ اس کا معنی ہے لان البس عباءۃ وتقر ابو صالح نے کہا: بنی اسرائیل کے ایک عالم نے رقعہ پایا کہ ایک آدمی طویل عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے وہ اپنے حق میں اپنے عمل کا اختتام جہنمی کے عمل سے کرتا ہے تو وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے ایک آدمی طویل عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں عمل پیرا رہتا ہے پھر وہ اپنے حق میں اپنے عمل کا اختتام جنتی کے عمل سے کرتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اس نے کہا: میں کس وجہ سے اپنے آپ کو تھکاؤں اس نے عمل ترک کر دیا اور فسق و معصیت میں شروع ہو گیا ابلیس نے اسے کہا: تیری عمر طویل ہے تو دنیا سے لطف اندوز ہو لے پھر توبہ کر لینا وہ فسق میں شروع ہو گیا اور اپنا مال فجور میں خرچ کرنے لگا موت کا فرشتہ اس کے پاس اس حالت میں آیا جبکہ وہ لذیذ ترین عمل میں مصروف تھا تو اس نے کہا: ہائے میرا افسوس! جو میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی کی میری عمر شیطان کی اطاعت میں گزر گئی اس نے اس وقت شرمندگی کا اظہار کیا جس وقت شرمندگی اسے نفع دینے والی نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر قرآن میں نازل کی۔ قتادہ نے کہا: اس کی کئی صنفیں ہیں ان میں سے ایک صنف نے کہا: يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُ فِيْ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 133
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 538

جَنْۢبِ اللّٰهِ ایک صنف نے کہا: لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۵۷﴾ ایک صنف نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کی کلام کا رد کرتے ہوئے کہا: بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰیٰتِیْ۔

زجاج نے کہا: بَلٰى نفی کا جواب ہے کلام میں نفی نہیں لیکن لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ کا معنی ہے ماھدانی اس نے مجھے ہدایت نہیں دی گویا اس قائل نے کہا: میری راہنمائی نہیں کی گئی تو کہا گیا: کیوں نہیں تیرے لیے ہدایت کا راستہ واضح کیا گیا اگر تو ارادہ کرتا کہ تو ایمان لائے تو تیرے لیے ایمان لانا ممکن تھا اٰیٰتِیْ سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: آیات سے مراد معجزات ہیں یعنی دلیل واضح ہوگئی اور تو نے اس کا انکار کر دیا اور اس کو جھٹلا دیا۔

وَاسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۵۹﴾ تو نے ایمان لانے سے تکبر کیا کہا: وَاسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ یہ مذکر کو خطاب ہے کیونکہ نفس کا لفظ مذکر اور مونث پر واقع ہوتا ہے یہ کہا جاتا ہے: ثلاثۃ انفس مبرد نے کہا: عرب کہتے ہیں نفس واحد یعنی ایک انسان۔

ربیع بن انس نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں قراءت کی قَدْ جَآءَتْكِ اٰیٰتِیْ فَكَذَّبْتِ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتِ وَ كُنْتِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۵۹﴾ اعمش نے اسے یوں پڑھا بَلٰى قَدْ جَآءَتْهُ اٰیٰتِیْ یہ مذکر پر دال ہے (1)۔ ربیع بن انس حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں ملے مگر قراءت جائز ہے کیونکہ نفس کا لفظ مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس قراءت کا بعض لوگوں نے انکار کیا ہے اور کہا: پھر اس صورت میں تاء کو کسرہ دیتے ہوئے یہ پڑھنا واجب ہوگا وکنت من الکوافر أو من الکافرات۔ نحاس نے کہا: یہ لازم نہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس سے پہلے اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ ہے پھر فرمایا: وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ۔ من السواخر اور من الساخرات نہیں فرمایا تاء کے کسرہ کی صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی واستکبرت وکنتِ من الجمع الساخرین أو من النّاس الساخرین أو من القوم الساخرین۔

وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَى الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ ﴿۶۰﴾ وَ یُنَجِّی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا یَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۫ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

”اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ انکے چہرے سیاہ ہوں گے، کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا تکبر کرنیوالوں کا؟ اور نجات دے گا اللہ تعالیٰ متقیوں کو کامیابی کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 538

ساتھ نہ چھوئے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا، اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا وہی لوگ خسارہ میں ہیں۔ آپ فرمائیے: اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں''۔

وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ان کا یہ حال اس وجہ سے ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی نے گھیر رکھا ہے۔ اخفش نے کہا: تَرَى، وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ میں عامل نہیں کیونکہ وہ مبتدا اور خبر ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تَرَى سے مراد رویۃ بصر لیا جائے تو یہ جملہ حال ہوگا اگر رویۃ قلب مراد ہو تو یہ اس کا دوسرا مفعول ہوگا (1)۔

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبر کے معنی کی وضاحت کی فرمایا: سفه الحق وغمص الناس حق کی ناقدری کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا اور ان کی حقارت بیان کرنا۔ سورۂ بقرہ اور دوسری آیات میں یہ بحث گزر چکی ہے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: یحشر المتکبرون یوم القیمة کالذر یلحقهم الصغار حتی یؤتی بهم إلی سجن جهنم متکبروں کو قیامت کے روز کیڑیوں کی صورت میں اٹھایا جائے گا انہیں حقارت لاحق ہوگی یہاں تک کہ انہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا (2)۔

وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اسے يُنْجِي بھی پڑھا گیا ہے یعنی جو شرک اور نافرمانیوں سے بچتے رہیں بِمَفَازَتِهِمْ مفازة کا واحد کا صیغہ ہے عام قراءت یہی ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ کوفیوں نے بمفازاتهم پڑھا ہے (3)۔ یہ جائز ہے جس طرح تو کہتا ہے بسعاداتهم اس آیت کی تفسیر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ساتھ اس کا عمل بھی اٹھائے گا مومن کا عمل اس کے ساتھ خوبصورت ترین اور عمدہ ترین خوشبو کے ساتھ ہوگا جب کبھی بھی رعب یا خوف ہوگا تو وہ اس آدمی کو کہے گا: تو خوفزدہ نہ ہو تو اس سے مراد نہیں اور نہ ہی تو اس سے مقصود ہے، جب یہ بات کافی دفعہ ہو چکی ہوگی تو وہ کہے گا: تو کتنا ہی خوبصورت ہے تو کون ہے؟ وہ کہے گا: تو مجھے نہیں پہچانتا میں تیرا نیک عمل ہوں تو نے میرے بوجھل ہونے کے باوجود اٹھائے رکھا اللہ کی قسم! اب میں تجھے اٹھاؤں گا اور تیرا دفاع کروں گا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾۔

وکیل سے مراد نگہبان اور امور بجالانے والا ہے، یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا واحد مقلید ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا واحد مقلاد ہے اکثر اس میں اقلید استعمال ہوتا ہے۔ مقالید سے مراد چابیاں ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: آسمان کے خزانوں سے مراد بارش ہے اور

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 140
2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفة اوان الحوض، حدیث نمبر 2416، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 539

زمین کے خزانوں سے مراد نباتات ہیں اس میں ایک اور لغت اقالید ہے اسی تعبیر کی بنا پر اس کی واحد اقلید ہے۔ جوہری نے کہا: اقلید سے مراد چابی ہے مقلد کا معنی بھی چابی ہے جس طرح منجل ہے بعض اوقات اس کے ساتھ گھاس کو باٹا جاتا ہے جس طرح قت (صحرائی بوٹی) کو باٹا جاتا ہے جب اس سے رسی بنائی جائے اس کی جمع مقالید ہے اقلد البحر علی خلق کثیر یعنی سمندر نے انہیں غرق کر دیا گویا اس نے ان پر دروازہ بند کر دیا۔

بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا (1) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کسی نے بھی مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھا وہ لا إله إلا الله، الله أكبر، سُبحان الله وبحمده، أستغفر الله، لاحول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم هو الأول والآخر والظاهر والباطن يحيي ويميت بيده الخير وهو على كل شئ قدير ہے (2)

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے اور ان کلمات کا اضافہ کیا: ”جس نے صبح اور شام کے وقت دس مرتبہ ان کلمات کو پڑھا اللہ تعالیٰ اسے چھ انعامات سے نوازے گا (1) اس کی ابلیس سے حفاظت کرے گا (2) بارہ ہزار فرشتے اس کے پاس حاضر ہوں گے (3) اسے ایک قنطار اجر دیا جائے گا (4) اس کا درجہ بلند کیا جائے گا (5) اللہ تعالیٰ حور عین سے اس کی شادی کرے گا (6) اس کے لیے اتنا اجر ہوگا جتنا اجر اس آدمی کو دیا جائے گا جس نے قرآن، تورات، انجیل اور زبور پڑھی ہوگی اس کے لیے مزید اس آدمی جیسا اجر ہوگا جس نے حج اور عمرہ کیا ہوگا جس کا حج اور عمرہ قبول ہوگا اگر وہ اس رات فوت ہو جائے تو وہ شہید کی موت مرے گا“۔

حارث نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقالید کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا فرمایا: ”اے علی! تو نے عظیم مقالید کے بارے میں سوال کیا (3) جب تو صبح کرے یا شام کرے تو تو کہہ: لا إله إلا الله، الله أكبر، سبحان الله، الحمد لله، أستغفر الله لاحول ولا قوة إلا بالله الأول والآخر والظاهر والباطن له الملك وله الحمد بيده الخير وهو على كل شئ قدير جس نے صبح کے وقت انہیں دس بار کہا اور جس نے شام کے وقت دس بار کہا اللہ تعالیٰ اسے چھ انعامات سے نوازے گا (1) شیطان اور اس کے لشکروں سے اسے محفوظ رکھے گا انہیں اس پر کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوگا (2) اسے جنت میں ایک قنطار دیا جائے گا جو ترازو میں احد پہاڑ سے بڑھ کر ہوگا (3) اس کا درجہ بلند کیا جائے گا جسے نیک لوگ ہی حاصل کریں گے (4) اللہ تعالیٰ اس کی شادی حور عین سے فرمائے گا (5) اس کے پاس بارہ ہزار فرشتے حاضر ہوتے ہیں جو ان کلمات کو ان کے حق میں ”رق منشور“ میں لکھتے ہیں اور قیامت کے روز اس کے حق میں گواہی دیں گے (6) اس کے لیے اتنا اجر ہوگا گویا اس نے تورات، انجیل، زبور اور فرقان کی قراءت کی۔ ہے اور اس آدمی کی طرح اجر ہوگا جس نے حج اور عمرہ کیا جس کا حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اگر وہ اس دن، اس رات یا اس مہینے میں فوت ہو گیا تو وہ شہید کے طور پر لکھا جائے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مقالید سے مراد اطاعت ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: ألقى إلى فلان بالمقاليد یعنی اس نے اسے جس بھی امر

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 539　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 540　3۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 41-140

کا حکم دیا اس میں اس نے اطاعت کی۔ آیت کا معنی یہ ہے آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی ہے سب اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ آیات سے مراد قرآن، دلائل اور دلالات ہیں اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ یہ اس وقت ہوا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی دعوت دی جس پر وہ قائم تھے یعنی بتوں کی وہ عبادت کیا کرتے تھے انہوں نے کہا: یہ تیرے آباء کا دین ہے غیر پر نصب اعبد فعل کی وجہ سے ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اعبد غیر الله فیما تامرونني یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف کی بناء پر تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اسے نصب دے تقدیر کلام یہ ہوگی أتامرونّ بغیر الله أعبدہ کیونکہ ان مقدرہ ہے اور ان اور فعل مصدر ہیں یہ غیر سے بدل ہے تقدیر کلام یہ ہے أتامرونّي بعبادۃ غیر الله۔

نافع نے تأمرونِ پڑھا ہے یعنی ایک نون مخففہ اور یاء کو فتحہ دیا ہے (1) ابن عامر نے تامرونَنِي اپنے اصل پر پڑھا ہے باقی قراء نے ایک نون مشددہ پڑھا ہے جس میں ادغام کا قاعدہ جاری ہے؛ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ مصحف عثمانی میں اسی طرح ہے۔ نافع نے اسے دوسرے نون کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے محذوف دوسرا نون ہوگا کیونکہ تکرار اور ثقل اسی کی وجہ سے واقع ہوتا ہے، دوسری بات یہ بھی ہے کہ پہلے کا حذف جائز ہی نہیں کیونکہ وہ تو رفع کی علامت ہے۔ سورۃ الانعام میں اس کی وضاحت اتحاجونی میں گزر چکی ہے اَعْبُدُ اصل میں ان اعبد تھا جب ان کو حذف کر دیا گیا تو اسے رفع دیا گیا یہ کسائی کا قول ہے اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

أَلَا أَيُّهٰذَا الزاجِرِي أَحْضُرُ الوَغَى

محل استدلال احضرُ الوغی ہے اصل میں أن احضرَ تھا۔ اس توجیہ کی صحیح دلیل اس کی قراءت ہے جس نے اسے اعبد منصوب پڑھا ہے۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

''اور بے شک وحی کی گئی ہے آپ کی طرف اور ان کی طرف جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے بلکہ صرف اللہ کی ہی عبادت کیا کرو اور ہو جاؤ شکر گزاروں میں سے''۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہوئی لقد أوحي إليك لئن أشركت وأوحي إلى الذين من قبلك كذلك ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اپنے طریقہ پر ہے۔ مقاتل نے کہا: یعنی آپ کی طرف اور آپ سے قبل انبیاء کی طرف توحید کی وحی کی گئی اور توحید محذوف ہے پھر فرمایا: لئن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 540

اشرکت یا محمد۔ اے محمد! ﷺ اگر آپ شرک کریں لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ تو تیرے عمل برباد ہو جائیں گے یہ خاص نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ آپ شرک نہیں کرتے اور آپ سے شرک واقع نہیں ہوتا۔ احباط کا معنی باطل کرنا اور فاسد کرنا ہے۔ قشیری نے کہا: جس نے ارتداد کیا تو اس کو سابقہ اطاعتیں نفع نہ دیں گی لیکن ارتداد کے ساتھ اعمال کا برباد ہونا کفر پر وفات کے ساتھ مشروط ہے اسی وجہ سے فرمایا: من یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم یہاں مطلق، مقید پر محمول ہے اسی وجہ سے ہم نے کہا: جس نے حج کیا پھر مرتد ہو گیا پھر اسلام کی طرف لوٹ آیا تو اس پر فرض حج کا اعادہ نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ امام شافعی کا مذہب ہے، امام مالک کے نزدیک اس پر حج واجب ہے اس پر گفتگو سورۂ بقرۃ میں گزر چکی ہے۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ نحاس نے کہا: میری کتاب میں ابو اسحاق سے یہ تحریر ہے کہ لفظ اللہ اسم جلالت منصوب ہے جس کا عامل اعبد ہے اس مسئلہ میں بصریوں اور کوفیوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ نحاس نے کہا: فراء نے کہا یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے؛ یہ مہدوی نے کسائی سے حکایت بیان کی ہے۔ جہاں تک زجاج کا تعلق ہے زجاج نے کہا: یہ مجازات کے لیے ہے۔ اخفش نے کہا: یہ زائدہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فَاعْبُدْ کا معنی فَوَحِّدْ ہے اس کی وحدانیت بیان کرو۔ دوسرے علماء نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور مشرکین کے برعکس اس کے انعامات کا شکر بجالاؤ۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ ۶۷ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۞ ۶۸

''اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے کہ) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے، پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے۔ اور پھونکا جائے گا صور پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا کہ بے ہوش نہ ہوں پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگ جائیں گے اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے''۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ مبرد نے کہا: انہیں اللہ تعالیٰ کی جس طرح عظمت بجالانا تھی ایسی عظمت بجانہ لائے یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: فلان عظیم القدر نحاس نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر معنی ہوگا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

عبادت کے ساتھ دوسرے معبودان باطلہ کی عبادت کی جبکہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا مالک اور خالق ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کماحقہ تعظیم نہ کی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور عظمت کا ذکر کیا وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی پاکی بیان کی کہ یہ کسی عضو کے ساتھ ہو فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت ہے کہ ایک یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کو ایک انگلی پر روکتا ہے اور مخلوقات کو ایک انگلی پر روکتا ہے پھر فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنسے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں (1) پھر فرمایا: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ (الانعام: 91) کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز زمین کو قبض کرے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹے گا پھر فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟'' ترمذی شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ کے بارے میں پوچھا کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس روز لوگ کہاں ہوں گے (2)؟ فرمایا: جہنم کے پل پر، ایک روایت میں ہے کہ ''اے عائشہ! صراط پر'' کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ، ویقبض اللہ الارض سے مراد اس کی قدرت اور تمام مخلوقات کا احاطہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مافلان الافی قبضتی وہ اس سے مراد لیتے ہیں اشیاء اس کی ملک اور قدرت میں ہیں بعض اوقات قبض اور طے کا معنی کسی شے کو فنا کرنا اور ختم کرنا ہوتا ہے وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد تمام زمین قیامت کے روز تباہ و برباد ہونے والی ہے۔ الارض سے مراد ساتوں زمینیں ہیں اس کی دو شہادتیں ہیں۔ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا کیونکہ یہ موقع تفخیم کا ہے اور وہ مبالغہ کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ سے مراد کسی کدو کاوش سے لپیٹنا نہیں اس سے مراد فنا اور تباہ ہونا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: قد انطوی عنا ماکنا فیہ وجاءنا غیرہ، انطوی عنا دھر کا معنی ہے یعنی زمانہ ہم سے گزر گیا ہے۔ لفظ یمین، کلام عرب میں کبھی قدرت اور ملک کے معنی میں ہوتا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (النساء: 3) سے مراد ملک ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ۝ (الحاقۃ) یعنی ہم نے اس کی قوت اور قدرت گرفت میں لے لی۔ فراء اور مبرد نے کہا: یمین کا معنی قوت اور قدرت ہے دونوں نے یہ شعر پڑھا:

إذا مارایۃٌ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ تَلَقَّاهَا عَرَابَةُ بِالْیَمِیْنِ

جب کبھی جھنڈا بزرگی کے لیے بلند کیا گیا تو عرابہ نے اسے قوت سے پکڑ لیا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ زمر، جلد 2، صفحہ 156۔ ایضاً، حدیث نمبر 3162، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 157۔ ایضاً حدیث نمبر 3164-3165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک اور شاعر نے کہا:

ولما رأيتُ الشمسَ أشرق نورُها    تناولتُ منها حاجتي بيمينِ

جب میں نے سورج کو دیکھا کہ اس کا نور روشن ہے تو میں نے اس سے اپنی حاجت کو بڑی قوت سے لے لیا۔

قتلتُ شُنيعفًا ثم فارانَ بعده    وكان على الايات غيرَ امين

یہاں قیامت کو خصوصاً ذکر کیا اگرچہ اس کی قدرت ہر چیز کو شامل ہے کیونکہ قیامت کے روز تمام دعوے ختم ہو جائیں گے جس طرح فرمایا: وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (الانفطار:19) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (فاتحہ:4) جس طرح سورت فاتحہ میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے اسی وجہ سے حدیث طیبہ میں فرمایا: ثم يقول أنا الملك اين ملوك الأرض (1) پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں ہم نے "التذکرہ" میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ثم يطوى الأرض بشماله میں شمال کے ذکر پر گفتگو کی ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ زمین کو قبض کرنے اور آسمان کو لپیٹنے کے درمیان صور پھونکا جائے گا یہ دو نفخے ہونگے ان میں سے پہلے نفخہ کے موقع پر مخلوقات مرجائے گی اور دوسرے نفخہ کے موقع پر وہ زندہ ہونگے بحث سورۂ نمل اور انعام میں گزر چکی ہے۔ جو صور پھونکے گا وہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہونگے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے ساتھ حضرت جبریل امین ہونگے جس طرح حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے، صور پھونکنے والوں کے ہاتھوں میں دو سینگ ہیں وہ نظر لگائے ہوئے ہیں کہ کب انہیں حکم دیا جائے (2)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ ابو داؤد کی کتاب میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صور پھونکنے والے کا ذکر کیا اور کہا: اس کی دائیں جانب حضرت جبریل امین اور بائیں جانب حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (3)۔

جو لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں ان کے بارے میں اختلاف ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ شہداء ہونگے جو عرش کے ارد گرد اپنی تلواریں گلے میں لٹکائے ہوئے ہونگے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے جس کا ذکر قشیری نے کیا اور حضرت عبداللہ کی حدیث ہے جسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرات جبریل امین، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (الزمر:68) تو صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! وہ کون لوگ ہیں جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے کی ہے؟ فرمایا: وہ حضرت جبریل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، یقبض اللہ الأرض، جلد 2، صفحہ 965
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، ذکر البعث، صفحہ 326
3۔ سنن ابی داؤد، الحروف والقرات، باب القرات، جلد 2، صفحہ 199

فرمائے گا: اے ملک الموت! میری مخلوق میں سے کون باقی ہے جبکہ وہ خوب جانتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! جبریل، میکائیل اور اسرافیل اور تیرا ضعیف بندہ ملک الموت باقی ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اسرافیل اور میکائیل کی روح قبض کر لے تو وہ دونوں مر کر گر پڑیں گے جس طرح وہ پہاڑ ہوں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اے ملک الموت! تو بھی مر جا، تو وہ بھی مر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جبریل امین سے فرمائے گا: اے جبریل! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: تو برکتوں والا ہے تو بلند ہے اے صاحب جلال و اکرام! تیری ذات باقی ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے جبکہ جبریل مرنے والا فانی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اے جبریل! تیری موت ضروری ہے، وہ سجدہ میں گر پڑے گا وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہا ہوگا: وہ کہے گا اے میرے رب! تو پاک ہے تو برکتوں والا ہے تو بلند و بالا ہے اے صاحب جلال و اکرام! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جبریل امین کی تخلیق حضرت میکائیل علیہ السلام کی تخلیق پر یوں فضیلت رکھتی ہے جس طرح بڑے پہاڑ کو چھوٹے ٹیلے پر فضیلت ہوا کرتی ہے'' اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

اسے نحاس نے بھی ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحاق، یزید رقاشی سے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ کا مصداق حضرت جبریل، حضرت میکائیل، حاملین عرش، ملک الموت اور حضرت اسرافیل علیہم السلام ہیں اس حدیث میں ہے: ان میں موت میں سب سے آخر حضرت جبریل علیہ السلام ہونگے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو شہداء کے متعلق ہے وہ اصح ہے جس طرح سورۂ نمل میں گزر چکا ہے ضحاک نے کہا: مستثنیٰ رضوان حور، مالک اور زبانیہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہنمیوں کے بچھو اور اس کے سانپ ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہ اہل آسمان اور اہل زمین میں سے کسی چیز کو نہیں چھوڑے گا مگر اسے موت کا ذائقہ چکھائے گا (1)۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ مستثنیٰ کو خوب جانتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ میں مستثنیٰ وہ ہیں جو نفخہ اولیٰ سے پہلے مر گئے یعنی اہل آسمان اور اہل زمین مر جائیں گے مگر جن کو پہلے ہی موت آچکی ہے کیونکہ وہ مردہ تھے۔

صحیحین اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے کہ ایک یہودی نے مدینہ طیبہ کے بازار میں یہ کہا: اس ذات کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انسانوں پر انتخاب کے ساتھ فضیلت دی (2)۔ ایک انصاری نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اسے تھپڑ مارا کہا: تو یہ بات کرتا ہے جبکہ ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ موجود ہیں، میں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيۡهِ اُخۡرٰى فَاِذَا هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ ۝ میں سب سے پہلے اپنا سر اٹھاؤں گا تو میں اچانک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہونگا جو عرش کے ایک پائے کو پکڑے ہونگے میں نہیں جانتا کہ انہوں نے اپنا سر مجھ سے پہلے اٹھایا یا وہ ان افراد میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس نے یہ کہا: میں حضرت یونس بن متی علیہ

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 400 2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، نفخ الصور، جلد 2، صفحہ 965

السلام سے بہتر ہوں تو اس نے جھوٹ بولا'' (1)۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ قشیری نے کہا: جس نے استثناء کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور شہداء پر محمول کیا ہے تو یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ صعقہ عقل کے زوال کی صورت میں ہو زندگی کے زوال کی صورت میں نہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ موت کی صورت میں ہو یہ کوئی بعید نہیں کہ یہ موت اور حیات کی صورت میں ہو ان میں سے ہر ایک کو عقل جائز قرار دیتی ہے اس کا وقوع خبر صادق پر موقوف ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی بعض احادیث میں آیا ہے فرمایا: '' مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو کیونکہ لوگوں پر صعقہ طاری ہوگا میں سب سے پہلا وہ شخص ہونگا جو اس سے افاقہ پائے گا کیا دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش کی ایک جانب کو پکڑے ہوئے ہونگے میں نہیں جانتا کہ کیا وہ ان لوگوں میں سے ہونگے جن پر صعقہ طاری ہوا تو مجھ سے قبل انہیں افاقہ ہوا یا اللہ تعالیٰ نے اس سے آپ کو مستثنیٰ کیا'' اسے امام مسلم نے نقل کیا اسی کی مثل حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے ''افاقہ'' یہ غشی اور زوال عقل سے ہوا کرتا ہے نہ کہ موت کے بعد زندگی کو لوٹانے کی صورت میں ہوا کرتا ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ** تو اچانک اہل زمین اور اہل آسمان کے مردے زندہ ہونگے جنہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا ان کے بدن کی روحیں ان کی طرف لوٹا دی جائیں گی وہ اٹھیں گے کہ دیکھیں انہیں کیا حکم دیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونگے وہ اس حشر کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نظر، انتظار کے معنی میں ہوگی یعنی ان کے ساتھ جو معاملہ کیا جانے والا ہے اس کا انتظار کریں گے۔ کسائی نے قیام کو نصب دینا بھی جائز قرار دیا ہے جس طرح تو کہتا ہے فاذا زید جالسا (محل استدلال جالسا ہے)۔

**وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾**

''اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے اور رکھ دیا جائے گا دفتر عمل اور حاضر کیے جائیں گے انبیاء اور دوسرے گواہ اور فیصلہ کر دیا جائے گا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر رتی بھر ظلم بھی نہیں کیا جائے گا۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں''۔

**وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا** اس کے اشراق سے مراد اس کا روشن ہونا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: أشرقت الشمس۔ جب سورج روشن ہو جائے وشرقت الشمس جب وہ طلوع ہو جائے اور بِنُوْرِ رَبِّهَا کا معنی ہے بعدل ربہا یعنی نور کا معنی عدل ہے (2)؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ضحاک نے نور کا معنی حکم کیا ہے، معنی ایک ہی ہے یعنی زمین

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ذکر البعث، حدیث 4263۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ زمر، حدیث 3168، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 135

اللہ تعالیٰ کے عدل اور بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کے لیے روشن ہوگی ظلم تاریکیاں ہیں اور عدل نور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نور پیدا کرے گا جو روئے زمین پر پڑے گا تو اس کی وجہ سے زمین روشن ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں جس نور کا ذکر ہے اس سے مراد سورج اور چاند کا نور نہیں ہے بلکہ ایسا نور ہے جسے اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا جس کے ساتھ زمین روشن ہو جائے گی۔ ایک روایت یہ کی گئی ہے: اس روز زمین چاندی کی ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ روشن ہو جائے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کے لیے جلوہ گر ہوگا اس صورت میں معنی ہوگا کہ زمین ایسے نور سے روشن ہوگی جسے اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا اللہ تعالیٰ نے نور کو اپنی ذات کے ساتھ مضاف کیا ہے جس طرح ملک کو مالک کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایسا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہ ایسا دن ہے جس کی رات نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبید بن عمیر نے اسے یوں پڑھا ہے واشرقت الارض جبکہ فعل مجہول ہے(1) یہ قراءت تفسیر کی بناء پر ہے یہاں کچھ لوگ گمراہ ہو گئے انہوں نے یہ وہم کیا کہ اللہ تعالیٰ نور کی جنس اور محسوس روشنی سے ہے جبکہ وہ محسوسات کی مشابہت سے بالا ہے جبکہ وہ آسمانوں اور زمین کو منور کرنے والا ہے خلق وانشاء کے اعتبار سے تمام نور اس کی طرف منسوب ہیں۔

ابو جعفر نحاس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا اس حدیث مرفوع کی وضاحت کرتا ہے جو کثیر صحیح سندوں سے مروی ہے: تنظرون إلى الله عزوجل لا تضامّون في رؤية(2) اسے چار انداز سے روایت کیا گیا ہے لا تضامون، لا تضارون، لا تضامّون، لا تضارّون۔ لا تضامون کا معنی ہے انہیں کوئی ظلم لاحق نہیں ہوگا جس طرح تمہیں دنیا میں لاحق ہوتا تھا جب بادشاہوں کو دیکھا جاتا ولا تضارون تمہیں کوئی تکلیف لاحق نہ ہوگی لا تضامون۔ تم ایک دوسرے کو نہ ملو کے دیکھنے کے لیے اس سے پوچھو۔ لا تضارون تم میں سے بعض بعض کے مخالف نہ ہوں گے یہ جملہ کہا جاتا ہے: ضارّہ مضارّۃ وضرارا۔ یعنی اس کی مخالفت کی۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد کتاب اور وہ صحیفے ہیں جس میں انسانوں کے اعمال ہوتے ہیں انسان اسے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوتا ہے یا بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہوتا ہے وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ انبیاء کو لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ ان کی امتوں نے انہیں کیا جواب دیا وَالشُّهَدَآءِ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے دوسری امتوں پر گواہی دیں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ: 143) ایک قول یہ کیا گیا ہے: شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوئے وہ قیامت کے روز گواہی دیں گے کہ کس نے دین کا دفاع کیا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: وہ کراماً کاتبین ہیں جو لوگوں کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 542 2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، وجوہ یومئذ، جلد 2، صفحہ 1106

گے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (ق) سائق اسے حساب کی طرف ہانک کر لے جائے گا اور شہید اس پر گواہی دے گا اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان پر مقرر ہے جس کی وضاحت سورۂ قاف میں آئیگی وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ حق سے مراد سچائی اور عدل ہے وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: ان کی نیکیوں میں سے کوئی کمی نہ کی جائے گی اور ان کی برائیوں پر اضافہ نہ کیا جائے گا ماعملت سے مراد خیر یا شر ہے وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۝ یعنی وہ دنیا میں جو کچھ کرتے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے اسے کسی کتاب اور شاہد کی کوئی ضرورت نہیں اس کے باوجود اتمام حجت کے لیے کتابیں اور گواہ حاضر کیے جائیں گے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ۝

''اور ہانکے جائیں گے کفار جہنم کی طرف گروہ درگروہ وہ جب اس کے پاس آئیں گے تو کھول دیے جائیں گے اس کے دروازے اور پوچھیں گے ان سے جہنم کے پہرے دار: کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے جو پڑھ کر سناتے تمہارے رب کی آیتیں اور ڈراتے تمہیں اس دن کی ملاقات سے، کہیں گے: بیشک آئے تھے لیکن ثبت ہو چکا تھا لوح محفوظ میں عذاب کا حکم کفار پر۔ انہیں کہا جائے گا: داخل ہو جاؤ دوزخ کے دروازوں سے اس حال میں کہ تم ہمیشہ اس میں رہو گے پس کتنا برا ٹھکانہ ہے مغروروں کا''۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا کافر کو آگ کی طرف اور مومن کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا زُمَرًا کا معنی جماعتیں ہیں اس کا واحد زمرۃ ہے جس طرح ظلمۃ اور غرفۃ ہے۔ اخفش اور ابو عبیدہ نے کہا: زمر کا معنی متفرق جماعتیں ہیں جن میں سے بعض بعض کے پیچھے ہوتی ہیں شاعر نے کہا:

وتَرى النَّاسَ إلى مَنزِله زُمَرًا تَنْتَابُه بَعْدَ زُمَرْ

تو دیکھے گا لوگ اس کے گھر کی طرف جماعتوں کی صورت میں پے درپے آتے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

حتّی احزألّت زُمَرٌ بعدَ زُمَرْ

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ زمر کا معنی ہے آواز کے ساتھ اسے دور کرنا اور جھڑکنا جس طرح مزمار کی آواز ہوتی ہے فتحت ابوابھا یہ اذا کا جواب ہے، یہ کل سات دروازے ہیں سورۂ حجر میں اس کی بحث گذر چکی ہے۔

خَزَنَتُهَآ اس کی واحد خازن ہے جس طرح سادن کی جمع سدنہ ہوتی ہے یہ بات انہیں دھمکانے اور شرمندہ کرنے کے لیے ہوگی اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ۔ اٰيٰتِ رَبِّكُمۡ سے مراد انبیاء پر نازل ہونے والی کتابیں ہیں يُنۡذِرُوۡنَكُمۡ جو تمہیں خبردار کرتے تھے قَالُوۡا بَلٰى یعنی انہوں نے کہا: تحقیق ہمارے پاس آچکی ہے، یہ ان کی طرف سے اعتراف ہے کہ ان کے خلاف دلیل قائم ہو چکی ہے وَلٰكِنۡ حَقَّتۡ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ۝ اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ۝ (السجدہ) انہیں کہا جائے گا: جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے دروازوں کے بارے میں گفتگو گذر چکی ہے۔ وہب نے کہا: جہنم کے داروغے آگ کے ہنٹروں کے ساتھ ان کا سامنا کریں گے اور اپنے ہنٹروں کے ساتھ انہیں دھکا دیں گے وہ ایک ہی دھکے کے ساتھ ربیعہ اور مضر کی تعداد کے برابر انہیں آگ میں پھینک دیں گے یہ متکبروں کا کتنا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ کے بارے میں بھی بحث پہلے گذر چکی ہے۔

وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا وَقَالَ لَهُمۡ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِيۡنَ۝ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ صَدَقَنَا وَعۡدَهٗ وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّةِ حَيۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ۝ وَتَرَى الۡمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ ۚ وَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَقِيۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۝

''اور لے جایا جائے گا انہیں جو ڈرتے رہے تھے عمر بھر اپنے رب سے جنت کی طرف گروہ در گروہ حتی کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہونگے تو کہیں گے انہیں جنت کے محافظ: تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اور وہ (خوش بخت) کہیں گے: ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لیے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس پاک زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے پس کتنا عمدہ اجر ہے نیک کام کرنے والوں کا۔ اور (اے حبیب!) آپ دیکھیں گے فرشتوں کو حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد تسبیح پڑھ رہے ہوں گے اپنے رب (جلیل) کی حمد کے ساتھ اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ، اور کہا جائے گا: سب تعریفیں اللہ کے لیے جو رب العالمین ہے''۔

وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا، زمرا سے مراد شہداء، زہداء، علماء، قراء اور دوسرے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اور اس کی اطاعت کے مطابق عمل کرتے رہے دونوں فریقوں کے بارے میں فرمایا: وَسِيۡقَ یعنی ایک ہی لفظ ذکر کیا جہنمیوں کو ہانکنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں رسوائی اور ذلت کے ساتھ دھتکارا جس طرح قیدیوں اور سلطان کے خلاف خروج کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جب انہیں قید کرنے کے لیے اور قتل کرنے کے لیے ہانکا جاتا ہے اور جنتیوں کو

ہانکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سواریوں کو کرامت اور رضوان کے گھر کی طرف لے جایا جاتا ہے کیونکہ انہیں سوار کر کے ہی لے جایا جاتا ہے جس طرح اس آدمی کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے جس کی عزت اور تکریم مقصود ہو جس طرح بادشاہ کی خدمت میں جب وفود کو پیش کیا جاتا ہے دونوں طرح کے لے جانے میں کتنا فرق ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ایک قول یہ کیا گیا ہے: واؤ یہاں عطف کے لیے ہے جملے کا عطف جملہ پر ہے جواب محذوف ہے۔ مبرد نے کہا: وہ سعادت مند ہوئے اور جنت کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے، کلام عرب میں جواب کا حذف بلیغ ہے:

فَلَو أنَّها نَفْسٌ تَمُوتُ جَمِيعَةً ولٰكِنَّها نَفْسٌ تَسَاقَطُ أَنْفُسَا

کاش وہ ایسا نفس ہوتا جو ایک ہی بار نکل جاتا لیکن وہ ایسا نفس ہے جو کئی نفسوں کی طرح نکلتا ہے۔

یہاں لو کا جواب محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے لکان اروح۔ زجاج نے کہا: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا کا معنی ہے وہ اس میں داخل ہوئے۔ یہ پہلے معنی کے قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: واؤ زائدہ ہے؛ یہ کوفیوں کا نقطہ نظر ہے جبکہ بصریوں کے نزدیک یہ غلط ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: واؤ کی زیادتی اس امر پر دلیل ہے کہ دروازے ان کے آنے سے پہلے ہی کھول دیئے جاتے ہیں مقصود ان کی تعظیم ہے تقدیر کلام یہ ہے حتی إذا جاء وھا وأبوابھا مفتحة اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ (ص) اہل نار کے قصہ میں واؤ حذف ہے کیونکہ وہ جہنم کے پاس کھڑے رہے اور ان کے کھڑے رہنے کے بعد دروازے کھولے گئے مقصود انہیں ذلیل و رسوا کرنا ہے اور انہیں خوف زدہ کرنا تھا؛ مہدوی نے یہ ذکر کیا ہے یہی معنی نحاس نے بھی اس سے قبل بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا: دوسرے سوق میں واؤ کو ذکر کیا گیا اور پہلے سوق میں واؤ ذکر نہیں کی گئی اس بارے میں کچھ علماء نے ایسی گفتگو کی ہے میں نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں کسی اور اہل علم نے اس سے پہلے گفتگو کی ہو وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے بارے میں فرمایا: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا اس کلام کے ساتھ اس امر پر دلالت ہے کہ وہ بند تھے اور جب جنتیوں کے بارے میں فرمایا: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا اس کے ساتھ اس امر پر دلالت ہے کہ یہ واؤ ثمانیہ ہے کیونکہ قریش کی عادت تھی وہ ایک سے گنتی شروع کرتے وہ کہتے پانچ، چھ، سات اور آٹھ۔ جب وہ سات پر پہنچتے تو کہتے اور آٹھ، یہ ابو بکر بن عیاش کا قول ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقۃ: 7) فرمایا اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (التوبہ: 112) پھر آٹھویں صفت کے بارے میں فرمایا: وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: 112) فرمایا: وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ (الکہف: 22) فرمایا: ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ۝ (التحریم) سورۂ براءۃ میں یہ بحث مفصل گذر چکی ہے اور سورۂ کہف میں بھی گذر چکی ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے یہ کہا ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اس نے اس سے استدلال کیا ہے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مامنكم من أحد يتوضأ فَيُبْلِغ أو فَيُسْبِغ الوضوء (1)، پھر کہا أشهد أن لا إله إلا الله وأنّ محمدًا عبده ورسوله إلا فتحت له أبواب الجنة الثمانية يدخل من أيها

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، الذکر المستحب، جلد 1، صفحہ 122

شاء پھر اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں جس سے چاہے وہ اس میں داخل ہو، اسے امام مسلم اور دوسرے علماء نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور اس میں کہا: فتح له أبواب الجنة ثمانية أبواب يوم القيمة(1) اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یعنی قیامت کے روز آٹھ دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اس میں من زائد ہے یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جنت کے دروازے آٹھ سے بڑھ کر ہیں ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے اس کی تعداد تیرہ ہے ہم نے وہاں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ دروازے کتنے بڑے اور کتنے وسیع ہیں جس طرح حدیث میں یہ وارد ہوا جو آدمی اس کا ارادہ کرے تو وہاں سے آگاہی حاصل کرلے۔

**وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ** ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ واؤ ملغا ہے تقدیر کلام اس کی یہ ہے **حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا** تم پر سلامتی ہو تم دنیا میں پاکیزہ رہے۔ مجاہد نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم نیک عمل کرتے رہے۔ نقاش نے یہ بیان کیا ہے جبکہ معنی ایک ہی ہے۔ مقاتل نے کہا: جب انہوں نے جہنم کے پل کو طے کرلیا تو انہیں جنت اور جہنم کے درمیان پل پر روک لیا گیا تو ان کے ایک دوسرے پر دنیا میں جو مظالم تھے ان کا قصاص لیا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ مہذب ہوگئے اور ان کو پاکیزہ بنا دیا گیا تو رضوان اور ان کے ساتھیوں نے کہا: **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ** یہاں سلام، تحیہ کے معنی میں ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے قنطرہ والی اس حدیث کو اپنی جامع میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن آگ جہنم سے چھٹکارا پائیں گے تو انہیں جہنم اور جنت کے درمیان پل پر روک لیا جائے گا تو ان کے ایک دوسرے پر مظالم کا قصاص لیا جائے گا جو مظالم ان کے درمیان دنیا میں ہوئے تھے یہاں تک کہ جب وہ پاک صاف ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی اس ذات کی قسم جس کی قدرت میں محمد کی جان ہے! ان میں سے ہر کوئی جنت میں اپنے گھر کی طرف جانے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوگا جتنا وہ دنیا میں اپنے گھر کی طرف جانے میں ہدایت یافتہ ہوگا''(3)۔

نقاش نے بیان کیا: جنت کے دروازے پر ایک درخت ہے اس کے تنے سے دو چشمے نکلتے ہیں مومن ان میں سے ایک سے پئیں گے تو ان کے پیٹ پاک ہو جائیں گے(4) یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا** (دہر) پھر دوسرے چشمہ سے وہ غسل کریں گے اس سے ان کے چمڑے پاکیزہ ہو جائیں گے اسی موقع پر جنہم کے داروغے ان سے

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطهارة، فيما يقال بعد الوضوء، جلد 1، صفحہ 9۔ ایضاً، حدیث نمبر 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 138

3۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، القصاص یوم القیمۃ، جلد 2، صفحہ 967

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 138

کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۞ یہ معنی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ یعنی جب وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو کہیں گے۔

وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ، الارض سے مراد جنت کی سرزمین ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بے شک وہ اس زمین کے وارث بنے جو جہنمیوں کی ہوتی اگر وہ ایمان لاتے؛ یہ ابو العالیہ، ابو صالح، قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ دنیا کی زمین ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جنتیوں کا قول ہے یعنی یہ کتنا اچھا ثواب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے معنی ہے محسنوں کو جو ثواب دیا گیا ہے وہ کتنا اچھا ہے۔

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ اس روز عرش کو گھیرے ہوئے ہونگے وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہوں گے وہ اس سے لذت حاصل کر رہے ہونگے نہ کہ عبادت کی غرض سے ایسا کریں گے یعنی وہ اپنے رب کا شکر بجالاتے ہوئے عرش کے ارد گرد نماز پڑھ رہے ہونگے حافون سے مراد ہے کسی شے کی جانب اور طرف کو پکڑ لینا۔ اخفش نے کہا: اس کا واحد حاف ہے۔ فراء نے کہا: اس کا کوئی واحد نہیں ان کے لیے اسم واقع نہیں ہوتا مگر جب وہ جمع ہوں حول کے لفظ پر من داخل ہوا ہے کیونکہ حول ظرف ہے اور فعل ظرف کی طرف حرف جار اور حرف جار کے بغیر متعدی ہوتا ہے۔ اخفش نے کہا: من زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی حافین حول العرش یہ تیرے اس قول کی طرح ہے ماجاءنی من احد، من تاکید یہ ہے۔ ثعلبی نے کہا: عرب تسبیح میں کبھی باء داخل کرتے ہیں اور کبھی اسے حذف کر دیتے ہیں وہ کہتے ہیں: سبح بحمد ربك، سبح حمد اللہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۞ (الاعلیٰ)

وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ گواہیوں کے ساتھ انبیاء اور ان کی امتوں کے درمیان حق اور عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔

وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ مومن کہیں گے: اس اللہ کی تمام تعریفیں ہیں جس نے ہمیں اپنی نعمتوں اور احسان سے نوازا اور جنہوں نے ہم پر ظلم کیا ان کے خلاف ہماری مدد کی۔ قتادہ نے اس آیت کی وضاحت میں کہا: اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے آغاز کا ذکر الحمد اللہ سے کیا فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام: 1) اور اس کا اختتام بھی الحمد پر کیا فرمایا: وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ اس کی اقتدا ضروری ہے ہر امر کا آغاز بھی حمد سے اور اس کا اختتام بھی حمد سے ہونا چاہیے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یہ ملائکہ کے قول سے ہے۔ تو اس صورت میں فرشتوں کی اللہ تعالیٰ کے لیے حمد اس کے عدل اور فیصلہ پر ہوئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر سورۂ زمر کا آخری حصہ پڑھا تو منبر نے دو دفعہ حرکت کی۔

# سورۂ غافر

آیاتہا ۸۵ ۴۰ سُورَۃُ الْمُؤْمِنِ مَکِّیَّۃٌ ۶۰ رکوعاتہا ۹

یہ سورۂ مومن ہے اسے سورۂ طول بھی کہتے ہیں۔

حضرت حسن بصری، عطا، عکرمہ اور حضرت جابر نے کہا: یہ سورت مکی ہے(1)۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: مگر اس کی دو آیتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اور اس کے بعد والی آیت ہے۔ وہ پچاسی آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بیاسی آیات ہیں۔ مسند داری میں ہے کہ جعفر بن عون، مسعر سے وہ سعد بن ابراہیم سے روایت نقل کرتے ہیں حوامیم کو عرائس کا نام دیا جاتا ہے یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں حم ہے انہیں قرآن کی دلہنیں کہتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الحوامیم دیباج القرآن حم سورتیں قرآن کی دیباج ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل مروی ہے۔ جوہری اور ابو عبید نے کہا: آل حم قرآن میں سورتیں ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: آل حم سورتیں قرآن کا دیباج ہیں۔ فراء نے کہا: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے آل فلان، آل فلان گویا تمام سورتیں حم کی طرف منسوب ہیں؛ کمیت نے کہا:

وَجَدْنَا لکم فی آلِ حامیم آیۃً

ہم نے تمہارے لیے آل حمیم میں ایک آیت پائی۔

ابو عبید نے کہا: اموی نے اسے زاء کے ساتھ روایت کیا ہے، ابو عمرو اسے راء کے ساتھ روایت کرتا تھا۔ عام لوگوں کا قول ہے: الحوامیم، کلام عرب میں سے نہیں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الحوامیم قرآن میں سورتیں ہیں جن میں قیاس جاری نہیں ہوتا اور یہ مصرعہ پڑھا:

و بالحوامیم التی قد سُبِّعَتْ

کہا: زیادہ مناسب یہ ہے کہ ان کی جمع ذوات حم سے بیان کی جائے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر شے کا پھل ہوتا ہے اور قرآن کا پھل حم سورتیں ہیں، یہ خوبصورت باغ ہیں سرسبز و شاداب ہیں قریب قریب ہیں جو یہ پسند کرے کہ جنت کے باغوں میں چرے پھرے تو وہ حم سورتوں کو پڑھے'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن میں حم سورتیں اس طرح ہیں جس طرح کپڑوں میں دھاری دار چادریں ہوتی ہیں''(2)۔ دونوں کا ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا: حجاج بن محمد نے ابو معشر سے وہ محمد بن قیس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے خواب میں دیکھا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 403
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 545

سات خوبصورت آراستہ لونڈیاں ہیں اس نے پوچھا: تم کس کے لیے ہو؟ اللہ تعالیٰ تم میں برکت ڈالے، تو انہوں نے جواب دیا: ہم اس کے لیے ہیں جو حم سورتوں کو پڑھتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حٰمٓ ۞ تَنۡزِیۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۞ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ۞ مَا یُجَادِلُ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ اِلَّا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَلَا یَغۡرُرۡكَ تَقَلُّبُہُمۡ فِی الۡبِلَادِ ۞

''حامیم۔ اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا ہے اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے، نہیں کوئی معبود اس کے سوا، اسی کی طرف سب نے لوٹنا ہے۔ نہیں تنازع کیا کرتے اللہ کی آیتوں میں مگر کافر پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا بڑے کروفر سے آنا جانا مختلف شہروں میں''۔

حٰمٓ ۞ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ عکرمہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حٰمٓ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے یہ تیرے رب کے خزانوں کی چابیاں ہیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ الر، حم اور ن یہ رحمٰن کے حروف ہیں جو الگ الگ ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ قسم اٹھائی ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ سورتوں کے آغاز ہیں۔ عطا خراسانی نے کہا: حاء اللہ تعالیٰ کے اسماء حمید، حنان، حلیم اور حکیم کا آغاز ہے میم اس کے اسم ملک، مجید، منان، متکبر اور مصور کا آغاز ہے اس کے اوپر روایت دلالت کرتی ہے جو حضرت انس نے روایت کی: ایک اعرابی نے پوچھا: حم کیا ہے؟ ہم اپنی زبان میں اس کا معنی نہیں پہچانتے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ اسماء کے آغاز اور سورتوں کے فواتح ہیں''۔ ضحاک اور کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے جو ہونا تھا اس کا فیصلہ ہو چکا گو یا حم کے تہجی کی طرف اشارہ کا ارادہ کیا کیونکہ یہ حُمّ ہو جاتا ہے جب حاء پر پیش اور میم کو مشدد پڑھا جائے یعنی فیصلہ کیا گیا اور وہ واقع ہو گیا۔ کعب بن مالک نے کہا:

فلما تلاقیناهم ودارت بنا الرحی ولیس لأمرحته الله مدفع(1)

جب ہم ان سے ملے اور مصائب کی چکی ہم پر گھومی اللہ تعالیٰ جس امر کا قصد کرے اس کو دور کرنے والا کوئی نہیں۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ حم أمر اللہ کا معنی ہے اللہ کا امر قریب ہو گیا؛ جس طرح شاعر نے کہا:

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 141

قدحٰم یَومی فُسَّ قومُ

میرا دن قریب ہو گیا تو قوم کو خوشی ہوئی۔

اسی معنی میں حمی (بخار) ہے کیونکہ یہ موت کے قریب کر دیتا ہے معنی مراد ہے اس کی مدد اس کے اولیاء کے قریب آ گئی اور اس کا انتقام اس کے دشمنوں کے قریب آ گیا جس طرح یوم بدر کو ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد حروف ہجاء ہیں۔ جرمی نے کہا: اسی وجہ سے انہیں ساکن پڑھا جاتا ہے تو یہ حروف تہجی ہوئے جب اس کے ساتھ کسی شے کا نام رکھا جائے گا تو انہیں اعراب دیا جائے گا تو کہے گا: قراءت حم تو اسے نصب دے گا۔

عیسیٰ بن عمر ثقفی نے حٰمَ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس وقت اس کا معنی ہوگا میں حم پڑھتا ہوں یا اجتماع ساکنین کی وجہ سے اس پر زبر پڑھتے ہیں۔ ابن ابی اسحاق اور ابو سال نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے امالہ اور کسرہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہے یا قسم کے طریقہ پر اسے مجرور پڑھا۔ ابو جعفر نے حاء کو میم سے الگ کر کے پڑھا ہے باقی قراء نے وصل کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح حم، عسق ہے۔ ابو عمرو، ابو بکر، حمزہ، کسائی، خلف اور ابن ذکوان نے حاء میں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو سے دو لفظوں کے درمیان مروی ہے؛ یہ نافع، ابو جعفر اور شیبہ کی قراءت ہے جبکہ باقی نے فتحہ کے ساتھ اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ یہ مبتدا ہے اور خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تَنْزِيْلُ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہے ھذا تنزیل الکتاب یہ بھی جائز ہے کہ حم مبتدا ہو اور تنزیل اس کی خبر ہو اس کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا یہ منقول نہیں اور نہ ہی اس کو جھٹلانا جائز ہے۔

غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ۔ فراء نے کہا: اسے معرفہ کی لغت کی طرح بنا دیا ہے جبکہ یہ نکرہ ہے۔ زجاج نے کہا: یہ بدل کے طور پر مجرور ہے۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں کلام کی تحقیق اور تلخیص یہ ہے غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ میں جائز یہ ہے کہ دونوں معرفہ ہوں اس شرط پر کہ اسم کے صیغے ماضی کے معنی میں ہوں تو یہ دونوں نعت ہوں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں مستقبل اور حال کے معنی میں ہوں تو یہ دونوں نکرہ ہوں گے، یہ جائز نہیں کہ اس کی تعبیر کی بناء پر یہ نعت ہوں لیکن بدل ہونے کے اعتبار سے مجرور ہوں گے حال ہونے کی حیثیت سے مجرور پڑھنا بھی جائز ہے جہاں تک شَدِيْدِ الْعِقَابِ کا تعلق ہے تو وہ نکرہ ہے اس کو بدل کی حیثیت سے مجرور پڑھنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے لیے وہ غَافِرِ الذَّنْۢبِ (گناہوں کو بخشنے والا) ہے اور جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے لیے قَابِلِ التَّوْبِ ہے اور جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کہا اس کے لیے شَدِيْدِ الْعِقَابِ ہے۔

ثابت بنانی نے کہا: میں حضرت مصعب بن زبیر کے ایسے خیمہ میں ایسی جگہ تھا جہاں سے جانور نہیں گزرتے تھے میں نے کہا حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ کو شروع کیا ایک آدمی میرے پاس سے ایک چوپائے پر سوار ہو کر گزرا جب میں نے غَافِرِ الذَّنْۢبِ پڑھا اس نے کہا: کہو یا غافر الذنب! اغفرلی ذنبی اے گناہوں کو بخشنے والے! مجھ کو بخش

دے میں نے کہا: قَابِلِ التَّوْبِ تو اس نے کہا: کہو! یاقابل التوب! تَقَبَّلْ توبتی اے توبہ کو قبول کرنے والے! میری توبہ قبول فرما۔ جب میں نے کہا: شَدِيْدِ الْعِقَابِ اس نے کہا: کہو یا شدید العقاب! اعف عنی اے سخت عذاب والے! مجھے معاف فرمادے جب میں نے کہا: ذِي الطَّوْلِ اس نے کہا: کہو یا ذا الطول! طل علی بخیر اے فضل و احسان کرنے والے! مجھ پر بھلائی کے ساتھ فضل و احسان فرما۔ میں اس کی طرف اٹھا تو میری نظر سلب کر لی گئی میں دائیں بائیں متوجہ ہوا تو میں نے کوئی چیز نہ دیکھی۔ اہل اشارہ نے کہا: غَافِرِ الذَّنْبِ فضل ہے قَابِلِ التَّوْبِ وعدہ ہے شَدِيْدِ الْعِقَابِ عدل ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ فرد ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا جو شام کے علاقہ کا رہنے والا تھا وہ بڑا قوی اور بہادر تھا آپ سے عرض کی گئی: وہ تو لگاتار شراب پیتا رہتا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کاتب سے فرمایا: لکھو عمر کی جانب سے فلاں کی طرف، تجھ پر سلام ہو میں تیرے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ پھر خط پر مہر لگائی اور اپنے قاصد سے فرمایا: تو خط اسے نہ دینا مگر جب شور مچا رہا ہو، پھر آپ نے اپنے پاس بیٹھے لوگوں سے کہا: اس کے حق میں توبہ کی دعا کرو۔ جب اس آدمی کے پاس خط پہنچا تو وہ اسے پڑھنے لگا اور وہ کہتا: میرے رب نے مجھ سے بخشش کا وعدہ کیا ہے اور اپنے عقاب سے مجھے ڈرایا، وہ اسے لگاتار دہراتا رہا یہاں تک کہ رونے لگا پھر اس نے شراب کو چھوڑا تو اچھی طرح چھوڑا اور اس کی توبہ بہت اچھی ہوئی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک اس کی خبر پہنچی فرمایا: اس طرح کیا کرو جب تم کسی کو دیکھو کہ اس سے لغزش ہوگئی ہے تو اس کی راہنمائی کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ اس کی توبہ قبول فرمائے تم اس کے خلاف شیاطین کے مددگار نہ بنو (1) التوب اس میں یہ جائز ہے کہ یہ تاب یتوب کا مصدر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ توبہ کی جمع ہے جس طرح دَوْمَة سے دَوْم، عزمة سے عزم جمع آتی ہے اسی معنی میں یہ قول ہے:

فَيَخْبُو ساعَةً وَيَهُبُّ ساعا

محل استدلال ساعۃ اور ساعا ہے وہ کسی لمحہ دلکی چال چلتا ہے اور کبھی تیز قدموں سے چلتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ التوب، توبہ کے معنی میں ہو۔ ابو العباس نے کہا: میرے دل میں جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس فعل کو قبول فرماتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: قال قولا جب یہ جمع کا صیغہ ہو تو اس کا معنی ہوگا بہت زیادہ کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

ذِي الطَّوْلِ یہ بدل یا صفت کے طور پر محل جر میں ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔ طول کا اصل معنی انعام اور فضل ہے اسی معنی میں یہ دعا کی جاتی ہے: اللھم طل علینا یعنی اے اللہ! ہم پر انعام فرما اور فضل فرما۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ذِي الطَّوْلِ کا معنی ہے نعمتوں والا۔ مجاہد نے کہا: معنی غنا اور وسعت والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ذِي الطَّوْلِ یعنی جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کہتا اس سے غنی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ذِي الطَّوْلِ کا معنی ہے احسان والا (2)۔ جوہری نے

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 50-149　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 142

کہا: طول کا معنی احسان ہے، اسی معنی میں یہ قول کیا جاتا ہے: طال علیه وتطوّل علیه۔ جب اس پر احسان کرے۔ محمد بن کعب نے کہا: ذِی الطَّوْلِ کا معنی ہے فضل و احسان فرمانے والا (1)۔ ماوردی نے کہا: من اور تفضل میں فرق یہ ہے کہ من کا معنی ہے گناہ سے بخشنا اور تفضل کا معنی ہے غیر مستحق پر احسان کرنا (2)۔ طَول، طُول سے ماخوذ ہے گویا وہ غیر پر احسان کرنے کے لیے طویل ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے انعام کی مدت طویل ہو گئی۔ اَلْمَصِیْرُ کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔

مَا یُجَادِلُ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات میں مجادلہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر کفر کی مہر لگا دی ہے مراد ہے باطل کے ذریعے جھگڑا کرنا، اللہ تعالیٰ کی آیات میں طعن کرنا، حق کو رسوا کرنے کا ارادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے نور کو بجھا دینا، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔ جہاں تک آیات میں اس وجہ سے جدال کرنا تاکہ التباس کو واضح کیا جائے، اس کی پیچیدگی کو حل کیا جائے، اس کے معانی کے استنباط میں علماء کا بحث و تمحیص کرنا اور کج رو لوگوں کا رد کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت بڑا جہاد ہے۔ یہ بحث سورۂ بقرۃ میں آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ میں گزر چکی ہے (بقرہ: 258)

فَلَا یَغْرُرْكَ رَبَّكَ اسے فلا یغرك بھی پڑھا گیا ہے تَقَلُّبُهُمْ کا معنی ان کا گھومنا پھرنا، اگر تو انہیں مہلت بھی دے تو میں انہیں مہلت نہ دوں گا بلکہ میں انہیں سزا دوں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد مکہ مکرمہ سے شام اور یمن کی طرف ان کا تجارتی سفر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لا یغررك ان کے پاس جو مال و متاع اور رزق میں وسعت ہے یہ تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے کیونکہ یہ دنیا میں قلیل ہے۔ زجاج نے کہا: معنی ہے ان کا کفر کے باوجود سلامت رہنا تجھے دھوکہ میں نہ ڈالے کیونکہ ان کے انجام میں ہلاکت ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: جو لوگ قرآن میں جھگڑا کرتے ہیں یہ دو آیتیں ان کے لیے کتنی ہی شدید ہیں مَا یُجَادِلُ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۱۷۶﴾ (البقرۃ)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۪ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِیَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَیْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۵﴾ وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۶﴾ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۙ﴿۸﴾ وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 142
2۔ ایضاً

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور کئی دوسرے گروہوں نے ان کے بعد اور قصد کیا ہر امت نے رسول کے متعلق کہ اسے گرفتار کرلیں اور جھگڑتے رہے اس کے ساتھ ناحق تاکہ جھٹلادیں اس کے ذریعے حق کو پس میں نے پکڑ لیا، پس کتنا شدید تھا میرا عذاب۔ اور اسی طرح واجب ہو گیا اللہ کا فیصلہ کفار پر وہ دوزخی ہیں۔ جو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور جو عرش کے اردگرد حلقہ زن ہیں وہ تسبیح کرتے ہیں حمد کے ساتھ اپنے رب کی اور ایمان رکھتے ہیں اس پر اور استغفار کیا کرتے ہیں ایمان والوں کے لیے کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو گھیرے ہوئے ہے ہر شے کو اپنی رحمت وعلم سے پس بخش دے انہیں جنہوں نے کفر سے توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی اور بچالے انہیں عذاب جہنم سے۔ اے ہمارے رب! داخل فرما انہیں سدا بہار باغوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور جو قابل بخشش ہیں ان کے والدین ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے، بے شک تو ہی سب سے زبردست اور حکمت والا ہے، اور بچالے انہیں سزاؤں سے، اور جس کو تو بچالے سزاؤں سے اس دن تو گویا تو نے بڑی رحمت فرمائی اس پر، اور یہی ہے بہت بڑی کامیابی''۔

**كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ** جماعت کے مونث ہونے کے اعتبار سے فعل مونث ذکر کیا یعنی كَذَّبَتُ الرسل۔ **وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ** یعنی وہ قومیں جنہوں نے انبیاء کو جھٹلانے میں اجتماعیت کو اپنایا جس طرح قوم عاد اور قوم ثمود اور ان کے بعد جو قومیں ہوئیں۔

**لِيَاْخُذُوْهُ** یعنی نبی کو محبوس کردیں اور اسے اذیتیں دیں۔ قتادہ اور سدی نے کہا: وہ اسے قتل کردیں (1)۔ اخذ کا لفظ ہلاک کرنے کے معنی میں آتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ** ۝ (الحج) عرب اسیر کو اخیذ کہتے ہیں کیونکہ وہ قتل کے لیے ماسور ہوتا ہے۔ قطرب نے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا:

فَإِمَّا تَأْخُذُونِي تَقْتُلُونِي فَكَمْ مِنْ آخِذٍ يَهْوَى خُلُودِي (2)

اگر تم مجھے پکڑو گے تو تم مجھے قتل کرو گے اور کتنے ہی پکڑنے والے میری دائمی زندگی کو چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنے رسول کو کب پکڑا (3) اس کے بارے میں دو قول ہیں: (1) جب اس رسول نے انہیں دعوت دی (2) جب ان پر عذاب نازل ہوا۔

**لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ** یعنی اس کے ذریعے وہ حق کو زائل کردیں، اسی معنی میں یہ لفظ بولا جاتا ہے مکان دحض ایسی جگہ جو پھسلاہٹ والی ہو۔ باطل کو داحض بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ پھسل جاتا ہے اور زائل ہو جاتا ہے ایک جگہ قرار نہیں پاتا۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: انہوں نے شرک کر کے انبیاء کے ساتھ مجادلہ کیا تاکہ اس کے ذریعے ایمان کو باطل کردیں انہیں عذاب نے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 143 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً جلد 5، صفحہ 144

پکڑ لیا تو جھٹلانے والی قوموں کے لیے میرا عذاب کیسا تھا(1)، کہا: انہوں نے اسے حق نہیں پایا۔

وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ یعنی واجب ہوگئی اور لازم ہوگئی یہ حق سے ماخوذ ہے کیونکہ حق بھی لازم ہوتا ہے كَلِمَتُ رَبِّكَ یہ عام قراءت ہے یعنی واحد کا صیغہ ہے۔ نافع اور ابن عامر نے اسے کلمات جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اخفش نے کہا: اصل میں لانهم اور بانهم تھا۔ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ کو کسرہ دیتے ہوئے اِنهم پڑھا جائے اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی انہیں آگ کے ساتھ عذاب دیا جائے گا گفتگو مکمل ہوئی، پھر نئے سرے سے کلام شروع ہوئی اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ روایت کی جاتی ہے کہ عرش کو اٹھانے والے فرشتے ایسے ہیں کہ ان کے قدم سب سے نچلی زمین میں ہیں اور ان کے سر عرش کو پھاڑنے والے ہیں وہ سر جھکائے ہوئے ہیں وہ اپنی نظریں اٹھائے ہوئے نہیں وہ ملائکہ میں سے سب سے اشرف اور افضل ہیں (2)۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ صبح وشام حاملین عرش کو سلام پیش کریں مقصود تمام فرشتوں پر ان کی فضیلت کا اظہار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے عرش کو سبز موتی سے پیدا کیا ہے اس کے پائیوں میں سے دو پائیوں کے درمیان تیز رفتار پرندے کو اسی ہزار سال لگتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عرش کے ارد گرد فرشتوں کی ستر ہزار صفیں ہیں جو عرش کا طواف کرتے ہیں وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں اور اللہ اکبر کہہ رہے ہوتے ہیں ان کے پیچھے ستر ہزار فرشتوں کی صفیں ہیں جو کھڑے ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ اپنے کندھوں پر رکھے ہوتے ہیں وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اللہ اکبر کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کر رہے ہیں ان کے پیچھے ایک لاکھ صفیں ہیں جنہوں نے اپنے دائیں ہاتھ بائیں ہاتھوں پر رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک ایسے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہا ہے جن کے الفاظ کے ساتھ دوسرا تسبیح نہیں کر رہا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما نے العُرش پڑھا ہے۔ زمخشری نے ان تمام چیزوں کو ذکر کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کفار کے ذکر کے ساتھ متصل ہے؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، کیونکہ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ کا معنی ہے وہ اس چیز سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں جو کفار کہتے ہیں وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ مفسرین کے اقوال یہ ہیں کہ عرش ایک چارپائی ہے، ایک عظیم جسم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے فرشتوں کو اس کے اٹھانے کا حکم دیا اور ان پر لازم کیا کہ وہ عرش کی تعظیم بجالائیں اور اس کا طواف کریں جس طرح زمین میں ایک گھر بنایا اور انسانوں کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں اور نماز میں قبلہ رو ہوں۔

ابن طہمان، موسیٰ بن عقبہ سے وہ محمد بن منکدر سے وہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے اجازت دی گئی ہے کہ حاملین عرش فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کا ذکر کروں کہ اس کے کانوں کی لوؤں سے لے کر اس کے کندھے کے درمیان سات سو سال کی مسافت ہے(3)؛ یہ بیہقی نے ذکر کیا سورۂ بقرۃ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 144 2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 52-151

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب الجھمیۃ، جلد 2، صفحہ 294

کی آیت الکرسی میں عرش کا ذکر ہو چکا ہے کہ یہ سب سے عظیم مخلوق ہے۔

ثور بن یزید، خالد بن معدان سے وہ کعب الاحبار سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: جب الله تعالیٰ نے عرش کو پیدا فرمایا، اس نے کہا: الله تعالیٰ کبھی بھی مجھ سے بڑی مخلوق پیدا نہیں فرمائے گا تو وہ لرزنے لگا تو الله تعالیٰ نے اسے سانپ کا طوق پہنایا سانپ کے ستر ہزار بازو ہیں ایک بازو میں ستر ہزار پر ہیں ہر پر میں ستر ہزار چہرے ہیں ہر چہرے میں ستر ہزار منہ ہیں ہر منہ ستر ہزار زبانیں ہیں ہر روز ہر منہ سے، بارش کے قطرات کے برابر، درختوں کے پتوں کے برابر، سنگریزوں اور مٹی کی تعداد برابر، دنیا کے دنوں کی تعداد کے برابر فرشتوں کی تعداد کے برابر تسبیح نکلتی ہے سانپ عرش کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔ عرش سانپ کے نصف کے برابر ہے سانپ اس عرش کے ساتھ لپٹا ہوا (1) ہے۔ مجاہد نے کہا: ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ستر ہزار حجاب ہیں نور کا حجاب ہے، ظلمت کا حجاب ہے نور کا حجاب ہے اور ظلمت کا حجاب ہے۔

وہ کہتے ہیں: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا یعنی تیری رحمت اور علم ہر شے کو وسیع ہے جب فعل کو رحمت اور علم سے نقل کیا گیا تو یہ دونوں تفسیر کے طور پر منصوب ہوئے۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا یعنی جنہوں نے شرک اور معاصی سے توبہ کی انہیں بخش دے سَبِيْلَكَ سے مراد دین اسلام ہے وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۝ عذاب جہنم کو ان سے دور کردے یہاں تک کہ وہ ان تک نہ پہنچ سکے۔ ابراہیم نخعی نے کہا: اصحاب عبدالله کہا کرتے تھے ملائکہ ابن کواء سے بہتر ہیں وہ اہل زمین کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں جبکہ ابن کواء ان کے بارے میں کفر کی گواہی دیتا ہے۔ ابراہیم نے کہا: وہ کہا کرتے تھے وہ اہل قبلہ سے استغفار کو نہیں روکتے۔ مطرف بن عبدالله نے کہا: ہم نے الله کے بندوں کے سب سے مخلص فرشتے پائے ہیں اور ہم نے الله کے بندوں میں سے الله تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ سب سے زیادہ دھوکہ کرنے والے شیاطین پائے ہیں اور اس آیت کی تلاوت کی۔ یحییٰ بن معاذ رازی نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: اسے خوب سمجھو، عالم میں کوئی جنت نہیں جس کی اس سے امید کی جاتی ہو بیشک ایک فرشتہ اگر الله تعالیٰ سے تمام مومنین کے لیے مغفرت کا سوال کرے تو الله تعالیٰ انہیں بخش دے تو پھر کیا حال ہوگا جب تمام فرشتے اور حاملین عرش مومنوں کے لیے استغفار کر رہے ہوں۔ خلف بن ہشام بزار قاری نے کہا: میں سلیم بن عیسیٰ کو قرآن سنایا کرتا تھا جب میں اس آیت پر پہنچا تو رونے لگے پھر فرمایا: اے خلف! مومن الله تعالیٰ کی بارگاہ مین کتنا معزز ہے وہ اپنے بستر پر سویا ہوا ہے جبکہ فرشتے اس کے حق میں بخشش طلب کر رہے ہیں۔

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ یہ روایت کی جاتی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار سے فرمایا: جنات عدن کیا ہے؟ اس نے کہا: جنت میں سونے کے محلات ہیں جن میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور عادل امام داخل ہوں گے الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ التی محل نصب میں ہے جو جنات کی صفت ہے وَمَنْ صَلَحَ من محل نصب میں ہے اس کا عطف ھم پر ہے جو وَاَدْخِلْهُمْ میں ہے وَمَنْ صَلَحَ یعنی ایمان کے ساتھ صالح ہو گئے۔

1۔ یہ روایات اسرائیلیات پر مبنی ہیں جن کی صحت کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔

مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ سورۂ رعد میں اس آیت کی مثل گزر چکی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: ایک آدمی جنت میں داخل ہوگا عرض کرے گا: اے میرے رب! میرے باپ، دادا اور میری ماں کہاں ہے؟ میری اولاد اور میری اولاد کی اولاد اور میری بیویاں کہاں ہیں؟ تو کہا جائے گا: انہوں نے تیرے عمل جیسا عمل نہیں کیا تھا، تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں اپنے لیے اور ان کے لیے عمل کرتا تھا، تو اسے کہا جائے گا: انہیں جنت میں داخل کر دو پھر یہ آیت تلاوت کی اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۞ رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﹰالَّتِیْ وَ عَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ آیت کے قریب یہ آیت ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (طور: 21)

وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِ قتادہ نے کہا: انہیں ان چیزوں سے بچا جو انہیں تکلیف دیتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں گناہوں کے عذاب سے بچا یہ وقاہ اللہ یقیہ وقایۃ سے امر ہے یعنی اس کی حفاظت کر فَقَدْ رَحِمْتَهٗ یعنی جنت میں داخل کر کے ان پر قوم نے رحم فرمایا، وہ عظیم نجات ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِیْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۞ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۞ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ۞

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انہیں ندا دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تم سے بیزاری بہت زیادہ ہے اس بیزاری سے جو تمہیں اپنے آپ سے ہے (یاد ہے) جب تم بلائے جاتے ایمان کی طرف تو تم کفر کیا کرتے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا پس اب ہم اعتراف کرتے ہیں اپنے گناہوں کا سو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب پکارا جاتا اللہ تعالیٰ کو اکیلا تو تم انکار کر دیتے اگر شریک بنایا جاتا کسی کو اس کا تو تم مان لیتے پس حکم کا اختیار اللہ کے لیے ہے جو برتر و بزرگ ہے“۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اخفش نے کہا: لَمَقْتُ میں لام ابتدائیہ ہے جو یُنَادَوْنَ کے بعد واقع ہوا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے یقال لهم ندا بھی ایک قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے انہیں کہا جائے گا: لمقت اللہ ایاکم فی الدنیا اکبر من مقت بعضکم بعضا یوم القیمة دنیا میں اللہ تعالیٰ کی تم سے ناراضگی اس سے بڑھ کر ہوگی جو قیامت کے روز تمہاری ایک دوسرے سے ناراضگی ہوگی کیونکہ ان میں سے بعض بعض سے قیادت کے روز دشمنی کریں گے

اور ناراضگی کا اظہار کریں گے اس موقع پر وہ مطیع و فرمانبردار بنیں گے عاجزی کریں گے اور جہنم سے نکلنے کا مطالبہ کریں گے۔ کلبی نے کہا: جہنمیوں میں سے ہر ایک انسان اپنے آپ سے کہے گا: اے نفس! میں تجھ سے ناراض ہوں ملائکہ انہیں کہیں گے جبکہ وہ جہنم میں ہوں گے: جب تم دنیا میں تھے جبکہ تمہاری طرف رسول مبعوث کیے گئے تھے تو اللہ تعالیٰ کی تم سے ناراضگی آج تمہاری اپنے نفسوں سے ناراضگی سے بڑھ کر تھی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انہیں ان کی کتاب دی جائے گی جب وہ اپنی برائیوں کو دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ سے ناراض ہوں گے تو انہیں ندا دی جائے گی دنیا میں تم سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی، جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم کفر کرتے تھے، آج تمہاری اپنی ذاتوں سے جو ناراضگی ہے اس سے بڑھ کر تھی: یہ مجاہد نے معنی بیان کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے تم سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تو تم کفر کرتے اس سے بڑھ کر تھی جو تم اپنی ذاتوں سے ناراضگی کا اظہار کر رہے ہو جب تم نے جہنم کی آگ کو دیکھا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے: یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ناراض ہوئے؟ اس میں دو وجوہ ہیں: (1) انہوں نے اپنے نفسوں کو گناہ کی جگہ رکھا جو اس کا محل ہے جس سے ناراض ہوا جاتا ہے (2) جب وہ اس حالت تک جا پہنچے جن سے خواہش نفس زائل ہو گئی اور انہیں علم ہو گیا کہ ان کے نفوس نے ہی انہیں نافرمانیوں میں رکھا تو وہ اس پر ناراض ہوئے۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا: جب جہنمی اس چیز سے مایوس ہو گئے جو جہنم کے دروازوں کے پاس تھی تو مالک نے انہیں کہا تم اسی میں رہو گے، جس کا ذکر بعد میں آئے گا تو ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: اے ساتھیو! تم پر عذاب اور آزمائش نازل ہو چکی ہے جیسے تم دیکھتے ہو آؤ ہم صبر کریں ممکن ہے صبر ہمیں کچھ نفع دے جس طرح اہل طاعت نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کیا۔ جب انہوں نے صبر کیا تو صبر نے انہیں نفع دیا پس سب نے صبر پر اتفاق کیا انہوں نے صبر کیا تو ان کا صبر ان پر طویل ہو گیا پھر انہوں نے جزع فزع شروع کر دی اور یوں ندا کی: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (ابراہیم) محیص کا معنی پناہ گاہ ہے اس موقع پر ابلیس نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ (ابراہیم:22) اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (ابراہیم:22) جب انہوں نے شیطان کا قول سنا تو وہ اپنے آپ سے ناراض ہو گئے تو انہیں یوں ندا کی گئی: لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ تو ان کا رد اس طرح کیا گیا: ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ ابن مبارک نے اس کا ذکر کیا۔

قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ اہل تاویل نے اس کی کئی تعبیریں کی ہیں۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، قتادہ اور ضحاک نے کہا: وہ اپنے آباء کی پشتوں میں مردہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی دی پھر انہیں دنیا میں وہ دعوت دی (1) جس

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 146

کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں پھر انہیں بعث اور قیامت کے لیے دوبارہ زندہ کیا یہی دو زندگیاں اور دو موتیں ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (البقرہ:28) میں یہی مراد ہے۔

سدی نے کہا: انہیں دنیا میں موت دی گئی پھر سوال و جواب کے لیے قبروں میں انہیں زندہ کیا گیا پھر انہیں موت دی گئی پھر انہیں آخرت میں زندہ کیا گیا(1)، یہ تعبیر اس لیے کی گئی کیونکہ عرف میں نطفہ پر میت کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ علماء نے اس آیت سے قبر میں سوال کے اثبات کا استدلال کیا ہے اگر ثواب صرف روح کو ہونا ہوتا جسم کو نہ ہونا ہوتا تو زندہ کرنے اور مارنے کا کیا معنی تھا۔ جو لوگ آخرت کے احکام صرف ارواح تک محدود رکھتے ہیں اسے نہ موت آتی ہے نہ اس میں تغیر واقع ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خراب ہوتی ہے وہ بذات خود زندہ ہے اسے موت، غشی اور فنا لاحق نہیں ہوتی ابن زید نے رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ کے بارے میں کہا: اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں پیدا کیا انہیں نکالا، انہیں زندہ کیا اور ان سے وعدہ لیا پھر انہیں موت دی پھر انہیں دنیا میں زندہ کیا پھر انہیں موت دی۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا انہوں نے اس وقت اعتراف کیا جب اعتراف انہیں نفع نہیں دیتا تھا وہ اس وقت شرمندہ ہوئے جب شرمندگی انہیں کوئی نفع نہ دیتی تھی فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ کیا ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے گا تاکہ ہم آپ کی اطاعت کے مطابق عمل کریں، اس کی آیات یہ ہیں هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ (الشوریٰ) فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (السجدة:12) يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ (الانعام:27)

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ۔ ذٰلِكُمْ محل رفع میں ہے تقدیر کلام یہ ہے الامر ذلکم یا تقدیر کلام یہ ہوئی ذلکم العذاب الذی انتم فیہ بکفرکم کلام میں اس کی تقدیر متروک ہے۔ انہیں جواب دیا گیا کہ لوٹنے کی کوئی راہ نہیں، اس کی وجہ یہ ہے جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کیا گیا تو تم نے اس امر کا انکار کر دیا کہ الوہیت صرف اس کے لیے ہو اگر کوئی مشرک اس کے ساتھ شرک کرتا ہے تو تم اس کی تصدیق کرتے ہو اور اس کے قول پر ایمان لاتے ہو۔ ثعلبی نے کہا: میں نے ایک عالم کو کہتے ہوئے سنا: اگر دنیا کی طرف لوٹائے جانے کے بعد بھی اس کے ساتھ شرک کیا جائے تو تم شرک کی تصدیق کرتے ہو اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام:28)۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالا ہے کہ ان کی کوئی بیوی یا اولاد ہو۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۝ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 146

اَلْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

''وہی ہے جو دکھاتا ہے تمہیں اپنی آیتیں اور نازل فرماتا ہے تمہارے لیے آسمان سے رزق اور نہیں نصیحت قبول کرتا مگر وہ جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے، تو عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی خالص کرتے ہوئے اس کے لیے دین کو اگرچہ ناپسند کریں کفار۔ بلند درجات پر فائز کرنے والا عرش کا مالک نازل فرماتا ہے وحی اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے تا کہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے، وہ دن جب وہ ظاہر ہوں گے پوشیدہ نہ ہوگی اللہ تعالیٰ پر ان کے حالات سے کوئی شے، کس کی بادشاہی ہے آج؟ (کسی کی نہیں) صرف اللہ تعالیٰ کی جو واحد اور قہار ہے۔ آج بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا تھا، ذرا ظلم نہیں ہوگا آج، بے شک اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے''۔

اٰيٰتِهٖ سے مراد اس کی توحید اور قدرت کے دلائل ہیں۔ یہاں آیات کو ظاہر کرنا اور رزق کے نازل کرنے کو جمع کیا کیونکہ آیات کے ساتھ ادیان کا قوام ہوتا ہے اور رزق کے ساتھ ابدان کا قوام ہوتا ہے یہ آیات جو آسمان اور زمین ہیں اور ان کے درمیان جو کچھ ہیں اور ان میں سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل، بخارات، نہریں، چشمے، پہاڑ، درخت اور ہلاک ہونے والی قوم کے آثار ہیں۔

وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۝ ان آیات سے نصیحت حاصل نہیں کرتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار کرتا مگر جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عبادت سے مراد اطاعت ہے اگرچہ کافر اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ناپسند کریں تم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ۔ ذوالعرش مبتدا کے مضمر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اخفش نے کہا: مدح کی بنا پر نصب دینا بھی جائز ہے رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ کا معنی ہے بلند صفات والی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کلبی اور سعید بن جبیر نے کہا: سات آسمانوں کو بلند کرنے والا (1)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: جنت میں اپنے اولیاء کے درجہ کو بلند کرنے والا، اس صورت میں رفیع، رافع کے معنی میں ہوگا یعنی فعیل فاعل کے معنی میں ہے، پہلے قول کی بنا پر صفات ذات مراد ہونگی معنی ہوگا اس سے قدر و منزلت میں بڑھ کر کوئی نہیں وہی مدح و ثنا کے درجات کا مستحق ہے یہی درجات اس کی اصناف اور ابواب ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی ان کا مستحق نہیں؛ یہ حلیمی کا قول ہے ہم نے اس کا ذکر ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں کیا ہے۔ الحمد اللہ۔ ذُو الْعَرْشِ وہ عرش کا خالق اور مالک ہے وہ عرش کا محتاج نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ثُلَّ عرش فلاں یعنی اس کا مالک اور غلبہ زائل ہو گیا جبکہ اللہ تعالیٰ ذُو الْعَرْشِ ہے معنی ہے اس کی حکومت اور سلطنت قائم و ثابت ہے ہم نے اس کی وضاحت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 147

بھی ''شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں کی ہے۔

یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ روح سے مراد وحی اور نبوت ہے، اسے روح کا نام دیا گیا کیونکہ لوگ روح کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں جس طرح بدن روحوں سے زندہ ہوتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: روح سے مراد قرآن ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوری:52) ایک قول یہ کیا گیا ہے: روح سے مراد جبریل امین ہے(1) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِکَ (الشعراء:194) فرمایا: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (النحل:102)

مِنْ اَمْرِہٖ امر سے مراد قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد قضا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: من باء کے معنی میں ہے یعنی اس کے امر سے۔ مَنْ یَّشَآءُ سے مراد انبیاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ انبیاء ہو جائیں۔ اس میں کسی نبی کی مشیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ اللہ تعالیٰ رسول اس لیے مبعوث کرتا ہے تا کہ قیامت کے دن سے ڈرائے۔ لِیُنْذِرَ کی ضمیر رسول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے، معنی ہوگا اللہ تعالیٰ رسولوں کو مخلوقات کی طرف مبعوث کر کے انہیں ڈراتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے لِتُنْذِرَ پڑھا ہے، اس میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

یَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: یَوْمَ التَّلَاقِ سے مراد ہے جس روز آسمان اور زمین والے آپس میں ملیں گے۔ قتادہ، ابو العالیہ اور مقاتل نے کہا: جس میں مخلوق اور خالق ملیں گے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس روز عابد اور معبود ملیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ظالم اور مظلوم ملیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر انسان اپنے عمل کی جزا پائے گا۔ ایک ہی میدان میں پہلے اور بعد والے ملیں گے؛ یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس کا معنی صحیح ہے یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ یہ پہلے یوم سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: هم محل رفع میں ہے مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور بٰرِزُوْنَ اس کی خبر ہے جملہ اضافت کی وجہ سے محل رفع میں ہے اسی وجہ سے یوم سے تنوین کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ تعبیر سیبویہ کے نزدیک اس وقت ہوگی جب ظرف اذ کے معنی میں ہو تو کہتا ہے: لقیتك یوم زیدٌ امیرٌ جب یہ اذا کے معنی میں ہو تو پھر جائز نہیں جس طرح یہ ہے أنا ألقاك یوم زیدٌ امیرٌ بٰرِزُوْنَ کا معنی ہے وہ قبروں سے نکلیں گے انہیں کوئی چیز پوشیدہ نہ رکھے گی کیونکہ اس روز زمین کھلا میدان ہوگی، اس میں کوئی کجی اور نشیب و فراز نہ ہوگا، جس طرح اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ میں یہی عامل ہے یعنی جس روز وہ نکلیں گے اس پر ان میں سے اور ان کے اعمال میں سے کوئی چیز مخفی نہ ہوگی۔

لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ یہ مخلوق کے فنا ہونے پر بات ہوگی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سوال کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 148
2۔ ایضاً

جواب دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہوگا، کیونکہ یہ اس وقت فرمائے گا جس وقت کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا، تو وہ خود ہی جواب دے گا(1)، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔

نحاس نے کہا: اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سے صحیح ترین ابووائل کی روایت ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: لوگوں کو چاندی کی مثل سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جس پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی گئی ہوگی، ایک منادی کو ندا کرنے کا حکم ہوگا جو اعلان کرے گا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ تو مومن و کافر سب بندے کہیں گے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ مومن خوشی اور لذت حاصل کرتے ہوئے یہ کہیں گے اور کافر غم، عاجزی اور اطاعت کے طور پر کہیں گے۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ یہ سوال ہو اور مخلوق موجود نہ ہو تو یہ امر بعید ہے کیونکہ اس میں تو کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے وہ قول صحیح ہے یہ قول قیاس اور تاویل سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ نمایاں ہے کیونکہ مقصود بادشاہت میں انفرادیت کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ مدعیوں کے دعوے، انتساب کرنے والوں کے انتساب ختم ہو چکے ہیں کیونکہ ہر بادشاہ اور اس کا ملک، ہر متکبر اور اس کا ملک جا چکا ان کے نسب اور دعویٰ ختم ہو چکے ہیں۔ اسی چیز پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے کہ زمین کو لپیٹ لیا جائے گا روحیں قبض کر لی جائیں گی اور آسمان بھی لپیٹ لیے جائیں گے: أنا الملك اين ملوك الأرض(2) میں بادشاہ ہوں اور زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟ جس طرح حضرت ابوہریرہ اور حضرت عمر کی حدیث میں گزر چکا ہے پھر اللہ تعالیٰ زمین کو بائیں ہاتھ اور آسمانوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹے گا: پھر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں جبار کہاں ہیں؟ متکبر کہاں ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ یہ دنیا کے زمانہ کا انقطاع ہے اس کے بعد دوبارہ اٹھانا اور نشر ہوگا۔

محمد بن کعب نے کہا: یہ ارشاد دو نفخوں کے درمیان ہوگا جب مخلوقات فنا ہو جائیں گی اور خالق باقی رہے گا وہ اپنی ذات کے سوا نہ کوئی مالک اور نہ کوئی مملوک دیکھے گا(3) اسے کوئی جواب نہ دے گا کیونکہ تمام مخلوق مردہ ہوگی تو وہ خود ہی جواب دے گا وہ ارشاد فرمائے گا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کیونکہ وہ خود ہی باقی ہے اور اپنی مخلوق پر غالب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا وہ کہے گا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ تو جنتی اسے جواب دیں گے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ؛ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے(4)۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ انہیں یہ کہا جائے گا جب وہ اللہ وحدہ لاشریک کے لیے بادشاہت کا اقرار کر لیں گے یعنی ہر نفس نے خیر اور شر میں سے جو کچھ عمل کیا ہوگا اسے آج جزا دی جائے گی لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ہر ایک نے جو عمل کیا ہوگا اس کے بدلہ میں سے کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اسے تفکر اور گننے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی جس طرح حساب کرنے والے کرتے ہیں کیونکہ وہ

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 405
2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، یقبض اللہ الأرض، جلد 2، صفحہ 965
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 148
4۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 157

ایسا عالم ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی تو وہ کسی کی جزا میں تاخیر نہیں کرتا اس لیے کہ وہ کسی اور کو جزا دینے میں مشغول ہوتا ہے جس طرح وہ ایک ساعت میں سب کو رزق دیتا ہے اسی طرح وہ ایک ساعت میں سب کا محاسبہ کرے گا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''ابھی نصف النہار کا وقت نہیں ہوگا کہ جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں قیلولہ کریں گے۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ﴿۱۸﴾ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَ اللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۲۰﴾ اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

''اور آپ ڈرایئے انہیں قریب آنے والے دن سے جب کہ دل گلے میں اٹک جائیں گے خوف و دہشت سے بھرے ہوئے، نہ ہوگا ظالموں کے لیے کوئی دوست اور نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے۔ وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور ان باتوں کو جنہیں سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا حق کے ساتھ، اور جنہیں وہ اللہ کے بغیر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے، بے شک اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ جاننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے وہ قوت کے لحاظ سے بھی طاقتور تھے اور زمین میں چھوڑے ہوئے آثار کے لحاظ سے بھی تو پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کے باعث، اور نہیں تھا ان کے لیے اللہ سے کوئی بچانے والا۔ یہ اس لیے کہ لے کر آتے رہے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں تو انہوں نے ہر بات سے انکار کر دیا پس پکڑ لیا انہیں اللہ نے، بے شک وہ بڑا طاقتور سخت سزا دینے والا ہے''۔

يَوْمَ الْاٰزِفَةِ سے مراد یوم قیامت ہے۔ اسے یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ قریب ہے کیونکہ ہر وہ امر جو وقوع پذیر ہونے والا ہو وہ قریب ہی ہوا کرتا ہے أزف فلان یعنی فلاں قریب ہوا اس کا مضارع یأزف أزفا کے وزن پر آتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

أَزِفَ التَّرَحُّلُ غَيْرَ أَنَّ رِكَابَنَا　لَمَّا تَزَلْ بِرِحَالِنَا وَكَأَنْ قَدِ

اس میں ازف کے لفظ کا قریب معنی ہے یعنی ہمارے کوچ کا وقت قریب آ گیا اس آیت کی مثل اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ (النجم) ہے یعنی قیامت قریب آ گئی، ایک شاعر کہتا ہے:

أَزِفَ الرَّحِيلُ وَلَيْسَ لِي مِنْ زَادِ غَيْرَ الذُّنُوبِ لِشِقْوَتِي وَنَكَادِي

کوچ کا وقت قریب آ گیا میرے لیے میرے گناہوں کے سوا کوئی زاد نہیں یہ میری بدبختی اور محرومی کا باعث ہے۔

اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ۔ کاظمین حال ہے معنی پر محمول ہے۔ زجاج نے کہا: معنی ہے دل غصے کی حالت میں گلے میں ہوں گے۔ فراء نے اس کو جائز قرار دیا کہ یہ تقدیر ہو وانذرھم کاظمین، کاظمین کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یوم الآزفۃ سے مراد موت کے حاضر ہونے کا دن ہے (1)؛ یہ قطرب کا قول ہے اسی طرح اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ سے مراد بھی موت کے حاضر ہونے کا وقت ہے، پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔ قتادہ نے کہا: خوف کی وجہ سے گلے میں اٹک جائے گا نہ یہ نکلے گا اور نہ ہی وہ اپنی جگہ واپس جائے گا (2) یہ قیامت کی گھبراہٹ کی خبر ہے جس طرح فرمایا وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: 10) یوم کو الآزفۃ کی طرف مضاف کیا تقدیر کلام یوں ہوگی یوم القیامۃ أو یوم المجادلۃ۔

کوفیوں کے نزدیک یہ إضافۃ الشیٔ إلی نفسہ کے باب سے ہے جس طرح مسجد الجامع، صلاۃ الاولی۔ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ، حمیم کا معنی قریبی ہے جو نفع دے وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۞ اور نہ کوئی ایسا شفیع ہے جو ان کے بارے میں شفاعت کرے۔

يَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ مورج نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے کلام یوں ہے یعلم الأعین الخائنۃ وہ خائن آنکھوں کو جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا ہو ایک عورت ان کے پاس سے گزرے وہ اس کی طرف نظریں بچا کر دیکھتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو ایک عورت کی طرف دیکھتا ہے جب اس کے ساتھی اسے دیکھیں تو وہ اپنی نظریں جھکا لیتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ جان لیا ہے کہ وہ آدمی پسند کرتا کہ اس کی بے پردگی کو دیکھے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے اس کی طرف نظریں بچا کر دیکھنا (3)۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد انسان کا یہ قول ہے ما رایت جبکہ اس نے دیکھا تھا یا رایت جبکہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ سدی نے کہا: اس سے مراد آنکھ سے اشارہ کرنا ہے۔ سفیان نے کہا: اس سے مراد ایک نظر کے بعد دوسری نظر کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ معنی ہے اگر اس کے ساتھ خلوت کرتا تو اس کے ساتھ بدکاری کرتا یا نہ کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ سینے جس کو چھپائے ہوئے ہیں۔

جب عبداللہ بن ابی سرح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا جبکہ اہل مکہ مطمئن ہو چکے تھے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے امان طلب کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل وقت تک خاموش رہے تھے پھر فرمایا: ''ہاں''۔ جب عبداللہ بن ابی سرح چلا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس بیٹھے صحابہ سے فرمایا: ''میں خاموش نہیں ہوا تھا مگر اس لیے کہ تم میں سے کوئی ایک اٹھے اور اس کی گردن مار ڈالے''۔ ایک انصاری نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے مجھے اشارہ کیوں نہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 149 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 150

کر دیا تو فرمایا: ''للہ کا نبی خائن آنکھ والا نہیں ہوتا'' وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ جو آدمی محارم سے اپنی نظر کو جھکا کر رکھتا ہے اور جوان کی طرف دیکھتا ہے اور جو آدمی موقع ملنے پر فواحش کا ارادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ان کو جزا دے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ، مِنْ دُوْنِهٖ سے مراد بت ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے کیونکہ وہ کسی چیز کو نہیں جانتے اس پر قادر نہیں اور اس کے مالک نہیں۔ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ مسلک ہے۔ نافع، شیبہ اور ہشام نے تدعون تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ ھو زائد ہے اور فاصلہ کے لیے آئی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو اور اس کا مابعد خبر ہو اور جملہ ان کی خبر ہے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا، فَيَنْظُرُوْا جزم کے محل میں ہے اس کا عطف يَسِيْرُوْا پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو کیونکہ یہ جواب ہے تثنیہ اور جمع میں جزم اور نصب ایک ہی ہے كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ، عَاقِبَةُ، كَانَ کا اسم ہے اور اس کی خبر کیف ہے وَّاقٍ محل جر میں ہے لفظ پر عطف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو اس کے رفع اور جر کی حالت ایک ہی ہے کیونکہ یاء حذف ہو جاتی ہے اور کسرہ اس پر دلالت کرتا ہے کئی مواقع پر اس آیت کے معنی میں گفتگو گزر چکی ہے پس اس نے اعادہ سے ہمیں غنی کر دیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٢٣ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝٢٤ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝٢٥ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝٢٦ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝٢٧

''بے شک بھیجا ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں اور روشن سند کے ساتھ، فرعون ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا: یہ جادوگر ہے، بڑا جھوٹا ہے۔ پھر جب موسیٰ لے کر آئے ان لوگوں کے پاس حق ہمارے ہاں سے تو انہوں نے کہا: قتل کر ڈالو ان لوگوں کے بچوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور زندہ چھوڑ دو ان کی لڑکیوں کو، اور نہیں کافروں کا ہر مکر مگر رائیگاں۔ اور فرعون نے جھنجھلا کر کہا: مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کروں اور وہ بلائے اپنے رب کو اپنی مدد کے لیے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین بدل نہ دے یا فساد نہ پھیلا دے ملک میں اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا''۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا یہ نو نشانیاں ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں گزر چکا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى

تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (الاسراء:101) ان کی تعیین بھی گزر چکی ہے: وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اس سے مراد واضح حجت ہے، سلطان یہ مذکر اور مونث دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات ہے اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ ان کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دشمنی کی تدبیر کا دارومدار انہیں افراد پر تھا فرعون بادشاہ تھا، ہامان وزیر تھا اور قارون اموال اور خزانوں والا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے ان دونوں کے ساتھ جمع کر دیا کفر اور تکذیب میں اس کا عمل ان دونوں کے اعمال جیسا تھا فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو انہوں نے معجزات کو جادو پر محمول کر دیا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا یہاں حق سے مراد ظاہر معجزہ ہے قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قتادہ نے کہا: یہ قتل پہلے قتل سے مختلف ہے کیونکہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد بچوں کو قتل کرنا چھوڑ دیا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا تو سزا کے طور پر دوبارہ بنی اسرائیل کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا تا کہ لوگ ایمان لانے سے رک جائیں اور ان کی جمعیت میں اضافہ نہ ہو کہ وہ اپنی اولادوں میں سے مذکر افراد سے قوت حاصل نہ کریں اللہ تعالیٰ نے ان پر جو مختلف قسم کے عذاب نازل کیے جیسے مینڈکوں کی صورت میں عذاب، جوؤں کی صورت میں عذاب، خون اور طوفان کی صورت میں عذاب اس وجہ سے فرعونی بنی اسرائیل سے غافل ہو گئے یہاں تک کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا معنی بھی یہی ہے: وَ مَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝ ضلال کا معنی خسارہ اور ہلاکت ہے۔ لوگ ایمان لانے سے نہیں رُکتے اگرچہ وہ اس قسم کا عمل کرے تو اس کا مکر باطل چلا جاتا ہے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ لْیَدْعُ رَبَّهٗ اقتل فعل مجزوم ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے وَ لْیَدْعُ مجزوم ہے کیونکہ وہ امر ہے ذَرُوْنِیْٓ مجزوم نہیں اگرچہ امر ہے لیکن اس کا لفظ مجزوم کا لفظ ہے جبکہ وہ مبنی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ فرعون کو کہا گیا ہم ڈرتے ہیں کہ وہ تیرے خلاف بددعا کریں تو اس کی دعا قبول ہو جائے تو اس نے کہا: وہ اپنے رب کو بلائے یعنی وہ اپنے رب کا جو ذکر کرتا ہے وہ تمہیں خوفزدہ نہ کرے کیونکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں میں تمہارا بڑا رب ہوں اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ میں تو صرف اسی سے ڈرتا ہوں کہ تم جو میری عبادت کرتے ہو وہ اسے اپنے رب کی طرف نہ پھیر دے اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ اگر وہ تمہارے دین کو تبدیل کر سکے تو وہ زمین میں ضرور فساد برپا کر دے گا یعنی اس کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف واقع ہو جائے گا۔ کوفیوں کی قراءت ہے اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ یعنی یاء کو فتحہ اور الفساد کو رفع۔ کوفیوں کے مصاحف میں اسی طرح ہے اور الف کے ساتھ ہے؛ ابو عبید بھی اسی طرف گئے ہیں کہا: اس میں حرف زائدہ ہے اس میں فصل ہے اور او، واؤ کے معنی میں ہے۔ نحاس نے کہا حاذق نحویوں کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ او واؤ کے معنی میں ہو کیونکہ اس میں وضعی معنی کا بطلان ہوتا ہے اگر یہ جائز ہو کہ او، واؤ کے معنی میں ہو تو یہاں استدلال کی ضرورت ہی نہ ہوتی کیونکہ واؤ کا معنی ہے میں دونوں امروں سے خوف کھاتا ہوں او کا معنی ہے دونوں میں سے ایک سے ڈرتا ہوں یعنی میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا اگر یہ امر اس کے لیے مشکل ہو گیا تو وہ زمین

میں فساد کو ظاہر کر دے گا۔

وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ جب فرعون نے آپ کو قتل سے دھمکایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ یعنی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان سے اپنے آپ کو عظیم خیال کرتا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ وہ یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖۗ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸

''اور کہنے لگا ایک مرد مومن جو فرعون کے خاندان سے تھا اور چھپائے ہوئے تھا اپنے ایمان کو کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے: میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، حالانکہ وہ لے آیا ہے تمہارے پاس دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے، اسے اپنے حال پر رہنے دو اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کی شامت اس پر ہوگی اور اگر سچا ہوا (اور تم نے (انکو) گزند پہنچائی) تو ضرور پہنچے گا تمہیں عذاب اس کا جس نے تم سے وعدہ کیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اسے جو حد سے بڑھنے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے اس آدمی کا نام حبیب تھا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام شمعان تھا۔ سہیلی نے کہا: یہ سب سے صحیح قول ہے۔ تاریخ طبری میں ہے اس کا نام فیر تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام حزقیل تھا؛ ثعلبی نے یہ قول حضرت ابن عباس اور اکثر علماء سے ذکر کیا ہے۔ زمخشری نے کہا: اس کا حبیب یا شمعان تھا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام خربیل یا حزبیل تھا۔ یہ اختلاف ہے کہ وہ قبطی تھا یا اسرائیلی تھا۔ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا: یہ قبطی تھا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ فرعون کا چچازاد تھا (4)؛ یہ سدی کا قول ہے کہا: یہ وہی شخص تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بچا تھا اسی وجہ سے فرمایا: مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یہ وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مراد ہے وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰى٘ قَالَ یٰمُوْسٰۤى (القصص: 20) یہ مقاتل کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آل فرعون میں اس کے، فرعون کی بیوی اور جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈرایا تھا کوئی اور ایمان نہیں لایا تھا اس نے کہا تھا: سردار تمہیں قتل کرنے کے مشورے کر رہے ہیں (5)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: صدیقین، حبیب نجار جو آل یٰس کا مومن تھا آل فرعون کا مومن جس نے کہا تھا: کیا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 152　2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 162
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 407　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 152　5۔ ایضاً

تم اس آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے تیسرا ابو بکر صدیق ہے یہ ان سب سے افضل ہے اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ اپنی قوم کے مشرکوں پر تعجب نہ کریں اس آدمی کو فرعون کے ہاں بڑی وجاہت حاصل تھی اس لیے فرعون نے اس آدمی کے ساتھ کوئی برا رویہ نہ اپنایا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آدمی بنی اسرائیل میں سے تھا وہ اپنا ایمان آل فرعون سے چھپاتا تھا؛ سدی سے بھی یہی قول مروی ہے اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہے وقال رجلٌ مؤمن یکتم ایمانه من آل فرعون۔

جس نے اس آدمی کو قبطی بنایا تو اس کے نزدیک من اس محذوف کے متعلق ہے جو رجل کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہے وقال رجلٌ مؤمن منسوب من آل فرعون یعنی وہ فرعون کے اہل اور قریبیوں میں سے تھا۔ جس نے اسے اسرائیلی قرار دیا ہے تو اس صورت میں مِن، یکتم کے متعلق ہوگا یہ یکتم کا مفعول ثانی ہوگا۔ قشیری نے کہا: جس نے اسے اسرائیلی قرار دیا ہے اس میں بعد ہے کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کتمه أمر کذا یہ نہیں کہا جاتا: کتم منه۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ (النساء) نیز یہ بات بھی ہے فرعون بنی اسرائیل میں سے کسی سے اس قسم کا قول برداشت نہیں کرتا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ یہاں ان سے پہلے لام محذوف ہے یا من اجلیہ محذوف ہے ان محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جار محذوف ہے وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ بینات سے مراد نشانیاں ہیں وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور صداقت میں کوئی شک نہ تھا لیکن جو کچھ وہ کر رہے تھے اس سے روکنے میں اور اذیت سے دور کرنے میں نرمی چاہی۔ اگر یہ ان یکن ہوتا تو بھی یہ جائز تھا لیکن سیبویہ کے قول کے مطابق کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ سیبویہ کے قول کے مطابق یہ نون اعرابی ہے۔

**يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ** اگر تمہیں ان وعیدوں میں سے ایک ہی آپہنچے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ ابو عبیدہ کا مذہب یہ ہے کہ **بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ** کا معنی ہے کل الذی یعد کم یعنی بعض، کل کے معنی میں ہے۔ لبید کا شعر ذکر کیا:

تَرَّاكُ أمكِنَةٍ إذا لم أَرْضَهَا ‍ أو يَرْتَبِطْ بَعْضَ النفوسِ حِمَامُها

جب میں راضی نہ ہوں تو میں کئی جگہوں کو چھوڑ دیتا ہوں یا ان کی موت تمام نفوس کو جکڑ لے۔

یہاں بھی بعض، کل کے معنی میں ہے کیونکہ بعض جب انہیں لاحق ہوگی تو لامحالہ کل کو لاحق ہوگی کیونکہ وہ وعید میں داخل ہے وعظ میں کلام میں نرمی پیدا کرنا ہوتا ہے ماوردی نے ذکر کیا بعض کا لفظ کل کی جگہ استعمال ہوتا ہے مقصود خطاب اور کلام میں وسعت ہوتی ہے (1)؛ جس طرح شاعر نے کہا:

قَدْ يُدْرِكُ المتأنِّي بعضَ حَاجتِهِ ‍ قديكون مَعَ المُسْتَعْجِلِ الزَّلَلُ

بعض اوقات سستی کرنے والا اپنی حاجت پالیتا ہے اور جلد باز سے لغزشیں ہو جاتی ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس لیے فرمایا کہ آپ نے انہیں عذاب کی کئی انواع سے خبردار کیا تھا ان میں سے ہر نوع ہلاک

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 153

کر دینے والی تھی گویا انہیں اس چیز سے خبردار کیا کہ انہیں ان انواع میں سے کچھ لاحق ہو جائیں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں عذاب دنیا یا عذاب آخرت سے ڈرایا تھا اگر وہ کفر کریں معنی یہ ہوگا تمہیں ان میں سے ایک عذاب لاحق ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: تمہیں عذاب پہنچے گا وہ یہ دنیا میں کہتے تھے یہ بعض وعید ہے پھر آخرت میں اس کے مترادف ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر کفر کریں تو عذاب کا وعدہ کیا اور اگر ایمان لائیں تو ثواب کا وعدہ کیا جب انہوں نے کفر کیا تو جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اس کا بعض انہیں پہنچا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ جو اپنی ذات پر اسراف کرنے والا تھا كَذَّابٌ ۞ اپنے رب پر جھوٹ بولنے والا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے، یہ مومن کے قول میں سے ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے عناد میں اسراف کرنے والا ہے كَذَّابٌ وہ اپنے دعویٰ میں کذاب ہے، اس سے فرعون کی طرف اشارہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗۤ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: بعض نے یہ گمان کیا کہ مکلف جب اپنے ایمان کو چھپائے زبان سے اس کا اظہار نہ کرے تو وہ محض اپنے اعتقاد کی وجہ سے مومن نہ ہوگا (1)۔ امام مالک نے کہا: ایک آدمی جب اپنے دل سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت کرتا ہے اور اپنی زبان سے طلاق نہ کہے تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی جس طرح وہ اپنے دل کے اعتقاد کے ساتھ مومن اور کافر ہو جاتا ہے ایمان کا مدار دل پر ہے حقیقت میں معاملہ اسی طرح ہے لیکن علی الاطلاق ایسا نہیں ہم نے اس کی وضاحت اصول فقہ میں بیان کر دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مکلف جب اپنے دل سے کفر کا ارادہ کرے تو وہ کافر ہو جائے گا اگرچہ وہ اپنی زبان سے اظہار نہ کرے مگر جب وہ اپنے دل سے ایمان کی نیت کرے تو وہ کسی حال میں بھی مومن نہیں ہوگا یہاں تک کہ زبان سے اس کا اظہار کرے تقیہ اور خوف اس بات سے مانع نہیں کہ وہ اپنی زبان سے اس چیز کا اظہار کرے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملات ہیں۔ تقیہ اس چیز سے مانع ہوتا ہے جسے غیر کو سنائے ایمان کی یہ شرط نہیں کہ کسی اور کو وہ سنائے غیر کا سماع اس لیے شرط ہے کہ وہ اپنا اور مال کا دفاع کرے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** بخاری اور مسلم نے حضرت عروہ بن زبیر سے روایت نقل کی کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: مجھے وہ واقعہ سناؤ (2) جس میں مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت ترین رویہ اپنایا ہو کہا: اسی اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے صحن میں موجود تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کندھا پکڑا آپ کا کپڑا گردن میں لپیٹا اور سختی سے آپ کا گلا دبایا حضرت ابوبکر صدیق آئے اس کا کندھا پکڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو دور کیا فرمایا: کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے جبکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے بینات لایا ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔

ترمذی حکیم نے "نوادر الاصول" (3) میں جعفر بن محمد سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1659
2۔ صحیح بخاری، کتاب الفضائل، فضائل ابی بکر، جلد 1، صفحہ 20-519
3۔ نوادر الاصول، صفحہ 45-244

کرتے ہیں کہ قریش ابو طالب کی وفات کے تین دن بعد اکٹھے ہوئے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ایک آتا آپ کو مارتا اور یہ آتا آپ کو دھکے دیتا اس روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدد چاہی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ کی آپ کی دو مینڈھیاں تھیں آپ آگے بڑھے اس کو مارتے اور دوسرے کو پرے ہٹاتے اور بلند آواز سے کہتے: تم ہلاک ہو گیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اللہ کی قسم! وہ رسول ہیں اس دن حضرت ابو بکر صدیق کی ایک مینڈھی کٹ گئی۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! ابو بکر کا وہ دن آل فرعون کے مومن سے بہتر تھا، آدمی نے اپنے ایمان کو چھپایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی تعریف کی یہ ابو بکر صدیق ہیں جس نے اپنے ایمان کو ظاہر کیا اپنے مال اور جان کو اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کیا۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول اس آدمی نے اپنے ایمان کو چھپایا۔ آپ نے اس کے ابتدائی مرحلہ کا ارادہ کیا تھا جبکہ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے ایمان کو ظاہر کیا اور اسے نہ چھپایا ورنہ قرآن اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ آل فرعون کے مومن نے اپنے ایمان کو ظاہر کیا جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کی وضاحت آنے والی ہے۔

''نوادر الاصول'' (1) میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لوگوں نے حضرت اسماء سے پوچھا: وہ کون سا تکلیف دہ امر ہے جو تم نے دیکھا جو مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنایا؟ حضرت اسماء نے کہا: مشرک مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ وہ کیا کچھ ان کے معبودوں کے بارے میں کہتے ہیں ابھی وہ اسی طرح تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے سب اٹھ کھڑے ہوئے جب وہ آپ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھتے تو آپ ان کی تصدیق کرتے انہوں نے کہا: کیا تو ہمارے معبودوں کے بارے میں یہ نہیں کہتا؟ فرمایا: کیوں نہیں، تو وہ سب آپ پر جھپٹ پڑے ایک خبر دینے والا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا آپ سے کہا: اپنے ساتھی تک پہنچو۔ وہ ہمارے پاس سے نکلے جبکہ ان کی مینڈیاں تھیں وہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ وہ کہہ رہے تھے: تم ہلاک ہو گیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے جبکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے بینات لایا ہے؟ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہماری طرف لوٹے آپ اپنی مینڈھیوں میں سے کسی کو ہاتھ نہ لگاتے مگر وہ آپ کے ساتھ ہی آجاتی آپ کہتے: تبارکت یا ذاالجلال والاکرام: اکرام اکرام۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ وَ

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 45-244

قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۳﴾

''اے میری قوم! (مانا) آج حکومت تمہاری ہے نیز تمہیں غلبہ حاصل ہے اس ملک میں لیکن مجھے یہ بتاؤ کون بچائے گا ہمیں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آجائے۔ (یہ سن کر) فرعون کہنے لگا: میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں اور نہیں راہنمائی کرتا میں تمہاری مگر سیدھے راستہ کی طرف اور کہنے لگا وہی ایمان والا: اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی کہیں پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آجائے جیسا حال ہوا تھا قوم نوح، عاد اور ثمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے اور اللہ نہیں چاہتا بندوں پر ظلم کرے۔ اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے جس روز تم بھاگو گے پیٹھ پھیرتے ہوئے نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا اور جسے گمراہ کردے اللہ تعالیٰ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں''۔

یٰقَوۡمِ لَکُمُ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ یہ آل فرعون کے مومن کا قول ہے اس کا یہ قول یٰقَوۡمِ اس امر پر دلیل ہے کہ وہ قبطی تھا اسی وجہ سے اس نے انہیں اپنی ذات کی طرف منسوب کیا اس نے کہا: یٰقَوۡمِ تا کہ اس کے وعظ کو قبول کرنے کے قریب ہو جائیں آج حکومت تمہاری ہے اس لیے تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ ظٰہِرِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یعنی غالب۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی تمہارے غلبہ کی حالت میں یہاں ارض سے مراد ارض مصر ہے؛ یہ سدی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ اسی طرح فرمایا: وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ (یوسف: 56) مصر کے علاقہ میں فَمَنۡ یَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰہِ اِنۡ جَآءَنَا (المومن: 29) باس سے مراد عذاب ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے خبردار کرنا مقصود تھا اگرچہ حضرت موسیٰ سچے ہوں اس نے نصیحت کی اور خبردار کیا تو فرعون کو ان کی دلیل کے غلبہ کا علم ہو گیا تو اس نے کہا: مَاۤ اُرِیۡکُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰی۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا: میں تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جو میں بہتر خیال کرتا ہوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور ان پر ایمان لانے سے منع کرنے میں صحیح راستہ کی طرف ہی راہنمائی کرتا ہوں (1)۔

وَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ وعظ اور تخویف میں زیادتی کی اور اپنے ایمان کی وضاحت کی یا تو اس لیے یہ کہا کہ اپنے نفس کو قتل ہونے پر تیار کر رہے تھے یا یہ اعتقاد تھا کہ وہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائیں گے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے سچے قول کی وجہ سے ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 154

عام قراءت التناد ہے دال مخفف ہے وہ یوم قیامت ہے۔ امیہ بن ابی صلت نے کہا:

وبَثَّ الخلْق فيها إذْدَحاها فَهُمْ سُكَّانُها حتى التَّنَاد(1)

جب اس زمین کو پھیلا دیا تو اس میں مخلوق کو پھیلا دیا وہ قیامت تک اس کے رہائشی ہیں۔

اسے یہ نام دیا گیا کیونکہ یہ لوگ ایک دوسرے کو بلائیں گے اصحاب اعراف ایسے لوگوں کو بلائیں گے جن کو وہ چہروں سے پہچانتے ہوں گے اصحاب جنت' اصحاب النار کو آواز دیں گے: اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا (الاعراف: 44) اور جہنمی اصحاب جنت کو ندا کریں گے: اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ (الاعراف: 50) ایک منادی کرنے والا بد بختی اور سعادت کے حوالے سے اعلان کرے گا خبردار! فلاں بن فلاں ایسی بد بختی کے ساتھ بد بخت ہوا جس کے بعد وہ کبھی بھی سعادت مند نہ ہوگا خبر دار فلاں بن فلاں ایسی سعادت کے ساتھ سعادت مند ہوا ہے جس کے بعد وہ بد بخت نہیں ہوگا یہ اعمال کے وزن کے بعد ہوگا ملائکہ جنتیوں کو ندا کریں: اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ (الاعراف)

جب موت کو ذبح کر دیا جائے گا تو اس وقت ندا کی جائے گی: اے جنتیو! یہ ہمیشہ کی زندگی ہے اب موت نہیں اے جہنمیو! یہ ہمیشہ کی زندگی ہے اب موت نہیں۔ اس ندا کے علاوہ ہر قوم کو اپنے امام کے ساتھ ندا کی جائے گی۔ حضرت حسن بصری، ابن سمیقع، یعقوب، ابن کثیر اور مجاہد نے التناد وصل اور وقف دونوں صورتوں میں یاء کو ثابت رکھنے کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور عکرمہ نے یوم التناد دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے بعض اہل عربیہ نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ یہ ند، یند سے مشتق ہے یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ اسی طرف بھاگتا چلا جائے جس طرف اس کا منہ ہو۔ کہا: قیامت میں اس کا کوئی معنی نہیں۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ غلط ہے اس کی قراءت اچھی ہے جبکہ اس کا معنی یوم تنافر ہے۔ ضحاک نے کہا: جب وہ جہنم کی آواز کو سنیں گے تو وہ بھاگ کھڑے ہوں گے وہ زمین کے جس حصہ میں آئیں گے وہ فرشتوں کی صفیں پائیں گے تو اسی جگہ کی طرف لوٹ جائیں گے جہاں سے آئے تھے(2) یہی یوم التناد الله تعالیٰ کے فرمان: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الرحمٰن: 33) سے مراد ہے اور الله تعالیٰ کا فرمان: وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا (الحاقۃ: 17) ابن مبارک نے اس کے معنی کا ذکر کیا۔ عبد الرحمٰن بن یزید بن جابر، عبد الجبار بن عبد الله بن سلمان نے آیت اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۞ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ان کی آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ انہیں جواب دیں گی وہ روئیں گے یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے پھر آنکھیں خون کے ساتھ انہیں جواب دیں گی تو وہ روئیں گے یہاں تک کہ خون ختم ہو جائے گا پھر ان کی آنکھیں پیپ کے ساتھ جواب دیں گی کہا: ان پر الله تعالیٰ کی جانب سے امر بھیجا جائے گا تو وہ منہ پھیر لیں گے پھر ان کی آنکھیں پیپ کے ساتھ انہیں جواب دیں گی وہ روئیں گے یہاں تک کہ پیپ ختم ہو جائے گی ان کی آنکھیں اتنی گہری ہو جائیں گی جس طرح مٹی میں شق ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس وقت ہوگا جب حضرت اسرافیل فزع کا نفخہ پھونکیں گے؛ اسے علی بن معبد، طبری اور دوسرے علماء نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 154
2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 165

ذکر کیا ہے اس میں ہے زمین اس کشتی کی مانند ہو گی جو سمندر میں ہوتی ہے جسے موجیں تھپیڑے مارتی ہیں لوگ اس پر کانپنے لگیں گے دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں سے غافل ہو جائیں گی اور حاملہ اپنے حملوں کو گرا دیں گی بچے بوڑھے ہو جائیں گے شیاطین بھاگتے ہوئے اڑ رہے ہوں گے فرشتے انہیں ملیں گے ان کے منہ پر ماریں گے جبکہ ایک دوسرے کو ندا کر رہے ہوں گے اللہ تعالیٰ کے فرمان سے یہی مراد ہے: یَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا وہاں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

علی بن نصر نے ابو عمرو سے وصل کی صورت میں خاص طور پر التناد دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو معمر نے عبدالوارث سے وصل کی صورت میں خاص کر یاء کا اضافہ کیا ہے؛ یہ ورش کا مذہب ہے۔ ابو معمر سے دونوں حالت میں اس کا حذف مشہور ہے۔ ورش اور ابن کثیر کے علاوہ سب نے اسے اسی طرح پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے یَوْمَ التَّنَادِ اس لیے نام دیا گیا کیونکہ کافر اسی دن اپنے لیے ویل، ثبور اور حسرت کو پکارے گا؛ یہ ابن صریح نے کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں اضمار ہے تقدیر کلام یوں ہے اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ یَوْمَ التَّنَادِ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ یہ یَوْمَ التَّنَادِ سے بدل ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے دل میں گمراہی پیدا کر دے تو اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں (1) اس کے قائل کے بارے میں دو قول ہیں: (1) حضرت موسیٰ علیہ السلام (2) آل فرعون کا مومن؛ یہی زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰۗى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

''(اے میری قوم!) بے شک آئے تمہارے پاس یوسف (موسیٰ علیہما السلام) سے پہلے روشن دلائل لے کر پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لے کر آتے تھے یہاں تک کہ جب وہ وفات پا گئے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہوتا یونہی گمراہ کرتا ہے انہیں جو جھگڑتے رہتے اللہ کی آیتوں میں کسی معقول دلیل کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو یہ طریقہ بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر مغرور اور سرکش دل پر''۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ ایک قول یہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 155

کیا گیا ہے: یہ آل فرعون کے مومن کی نصیحت کا کلمہ ہے انہیں یاد دلایا کہ وہ انبیاء پر پہلے بھی سرکشی کرتے آتے ہیں یہ ارادہ کیا کہ حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام ان کے پاس بینات لائے: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف) ابن جریج نے کہا: اس سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب ہیں اللہ تعالیٰ نے جنہیں قبطیوں کی طرف بھیجا تھا جبکہ بادشاہ فوت ہو چکا تھا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا، بینات سے مراد خواب ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یوسف بن افرائیم ہیں۔ حضرت یوسف بن یعقوب ان کے درمیان بیس سال تک نبی کی حیثیت سے مقیم رہے نقاش نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جنوں میں سے ایک رسول بھیجا جسے یوسف کہا جاتا ہے (2)۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون حضرت یوسف کا ہی فرعون تھا اسے طویل عمر دی گئی تھی (3)۔ دوسرے علماء کہتے ہیں وہ کوئی اور تھا۔ نحاس نے کہا: آیت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس بات پر دلالت کرے کہ وہ وہی فرعون تھا کیونکہ جب نبی بنیات لایا ان کے لیے جو اس کے ساتھ ہیں اور ان کے لیے جو ان کے بعد ہیں تو وہ ان سب کے پاس لایا تو سب پر لازم ہے کہ وہ ان کی وجہ سے اس کی تصدیق کریں۔

فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ یعنی تمہارے اسلاف شک میں تھے حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا یعنی جو رسالت کا دعویٰ کرے كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ اس گمراہی کی طرح۔ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مسرف سے مراد مشرک ہے مُّرْتَابٌ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں شک کرے۔

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی غالب دلائل۔ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ بغیر حجت اور برہان کے الَّذِيْنَ یہ من سے بدل ہونے کی حیثیت میں محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں مجادلہ کرتا ہے الَّذِيْنَ محل نصب میں ہے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ مرفوع ہو تقدیر کلام هم الذين ہے، یا یہ مبتدا ہو اور خبر كَبُرَ مَقْتًا ہو پھر کہا گیا: یہ آل فرعون کے مومن کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب کا آغاز ہے مَقْتًا بیان کے طور پر منصوب ہے یعنی کبر جدالهم مقتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَبُرَتْ كَلِمَةً (الکہف: 5) مقت اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا ان کی مذمت کرنا، اللہ تعالیٰ کا انہیں اپنی رحمتوں سے دور کرنا اور ان پر عذاب کو نازل کرنا۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ⊙ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان جھگڑا کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگائی اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ ہدایت کو سمجھتا ہی نہیں اور حق کو قبول نہیں کرتا۔ عام قراءت عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ ہے یعنی قلب، متکبر کی طرف مضاف ہے: ابو حاتم اور ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یوں ہے كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ على كل مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ دوسرا كل حذف کر دیا گیا کیونکہ اس سے پہلے وہ گزر چکا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے جب کل کو حذف نہ کیا جائے تو معنی درست نہیں رہتا کیونکہ اس کا معنی بنتا ہے کہ وہ اس کے تمام دل پر مہر لگا دیتا ہے معنی اس طرح نہیں معنی اس کا یہ ہے کہ وہ متکبرین جبارین کے دلوں میں سے ایک ایک

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 155 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 166

دل پر مہر لگا دیتا ہے ابوداؤد کا قول بھی کل کے حذف پر دلالت کرتا ہے:

أَكُلَّ امرِئٍ تَحْسَبِيْنَ أَمْرًا وَنَارٍ تَوَقَّدُ بِاللَّيل نارا

کیا تو ہر انسان کو انسان گمان کرتا ہے اور ہر آگ جو رات کو روشن ہوتی ہے تو اسے ضیافت کی آگ سمجھتا ہے۔

حضرت ابن مسعود کی قراءت میں علی قلب کل متکبر ہے یہ قراءت تفسیر اور اضافت کی بنا پر ہے۔ اور عمرو، ابن محیصن اور ابن ذکوان نے اہل شام سے قلب نقل کیا ہے کہ متکبر قلب کی صفت ہے، قلب سے مراد پوری ذات ہے کیونکہ دل تکبر کرتا ہے اور باقی اعضاء اس کے تابع ہوتے ہیں اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنّ فی الجسد لمضغة إذا صلُحَت صلُح الجسد كلُّه وإذا فسدت فسد الجسد كلُّه ألا وهي القلب(1) بے شک جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جائے تو تمام جسم فاسد ہو جاتا ہے خبردار! وہ دل ہے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

''اور فرعون نے کہا: اے ہامان! بنا میرے لیے ایک اونچا محل اس پر چڑھ کر میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں (یعنی) آسمانوں کی راہوں تک پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے خدا کو اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے، اور یوں آراستہ کر دیا گیا فرعون کے لیے اس کا برا عمل۔ اور روک دیا گیا اسے راہ راست سے، اور نہیں تھا فرعون کا سارا فریب مگر اس کی اپنی تباہی کے لیے''۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا جب آل فرعون نے کہا جو کہا تو فرعون کو خوف ہوا کہ اس مومن کا کلام قوم کے دل میں اثر انداز ہوگا تو اسے خیال گزرا کہ وہ اس چیز کا امتحان لے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام توحید کا پیغام لائے ہیں اگر اس کا درست ہونا واضح ہو گیا تو وہ ان سے مخفی نہیں رکھے گا اگر وہ درست نہ ہو تو وہ انہیں ان کے دین پر پختہ رکھے گا اس نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ محل بنائے۔ سورۂ قصص میں اس کا ذکر گزر چکا۔

لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ پہلے الْاَسْبَابَ سے بدل ہے۔ قتادہ، زہری، سدی اور اخفش کے قول کے مطابق اسباب السماء سے مراد اس کے دروازے ہیں۔ اور یہ شعر پڑھا:

وَمَنْ هاب أَسْبَابَ المنايا يَنَلْنَهُ وَلَوْرَامَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ(2)

جو موتوں کے اسباب سے ڈرتا ہے وہ اسے پا لیتی ہیں اگرچہ آسمان کے دروازوں کا سیڑھی کے ذریعے قصد کرے۔

ابو صالح نے کہا: اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ سے مراد اس کے راستے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ امور ہیں جن کے وسیلہ سے آسمان مضبوط ہوتے ہیں۔ اسباب کو عظمت شان کے لیے مکرر ذکر کیا ہے کیونکہ جب کسی چیز کو مبہم ذکر کیا جائے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 13 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 156

پھر اس کی وضاحت کی جائے تو یہ اس کی عظمت شان کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى میں اس کے الہ کی طرف جھانکنے والے کی نظر سے دیکھوں۔ اس نے گمان کیا تھا کہ وہ ایسا جسم ہے جسے مکان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ فرعون الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا وہ خیال کرتا تھا کہ اسے ایسی جگہ بیٹھ کر ثابت کیا جا سکتا ہے جہاں سے کسی کی نگرانی کی جا سکے عام قراءت فَاَطَّلِعُ ہے اس کا عطف اَبْلُغُ پر ہے۔ اعرج، سلمی، عیسیٰ اور حفص نے فاطلع کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: لَعَلِّیْۤ کے جواب میں فاء کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا: نصب کا معنی رفع کے معنی کے خلاف ہے کیونکہ نصب کا معنی ہے جب میں اسباب تک پہنچوں گا میں مطلع ہو جاؤں گا، رفع کا معنی ہے میں اسباب تک پہنچوں پھر اس کے بعد اس کی اطلاع پاؤں مگر ثم، فاء کی بنسبت تراخی میں شدید ہے۔

وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گمان کرتا ہوں کہ وہ میرے سوا جو کسی کے الہ کا دعویٰ کرتے ہیں اس میں وہ جھوٹا ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ محض علت کو ختم کرنے کے لیے کر رہا ہوں یہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ فرعون کو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں شک تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ظن، یقین کے معنی میں ہے یعنی میں یقین کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے میں جو کچھ کہتا ہوں یہ شبہ کو زائل کرنے کے لیے کہتا ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ جس طرح فرعون نے یہ بات کی اور اسے شک ہوا شیطان نے یا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اس کے عمل کو مزین کر دیا مراد شرک اور جھٹلانا ہے۔

وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ یہ کوفیوں کی قراءت ہے وَ صُدَّ مجہول ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ قول ہے۔ وصِد کی قراءت بھی جائز ہے دال کے کسرہ کو صاد کی طرف نقل کر دیا؛ یہ یحییٰ بن وثاب اور علقمہ کی قراءت ہے۔ ابن ابی اسحاق اور عبد الرحمٰن بن بکرہ نے وصُدٌّ عن السبیل قراءت کی ہے یعنی رفع اور تنوین کے ساتھ قراءت کی ہے باقی قراء نے وصد یعنی فرعون نے لوگوں کو صراط مستقیم سے روکا۔ تَبَابٍ کا معنی خسران اور گمراہی ہے اسی سے تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ (لہب: 1) وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ۝ (ہود) ایک جگہ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے مینار کو گرا دیا وہ خود اور اس کی قوم ہلاک ہوگئی جس طرح پہلے بحث گزر چکی ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ۝۳۸ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ٘ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ۝۳۹ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا٘ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ۝۴۰ وَ يٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِؕ۝۴۱ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ٘ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ۝۴۲ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ

فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

''اور کہنے لگا تھا جو ایمان لایا تھا: اے میری قوم! میرے پیچھے چلو میں دکھاؤں گا تمہیں ہدایت کی راہ۔ اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو چند (روزہ) لطف اندوزی ہے اور آخرت ہی ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ جو برے کام کرتا ہے اسے سزا دی جائے گی اسی قدر اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو وہ داخل ہوں گے جنت میں رزق دیا جائے گا انہیں وہاں بے حساب۔ اور اے میری قوم! میرا بھی عجیب حال ہے کہ میں تو تمہیں دعوت دیتا ہوں نجات کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھے آگ کی طرف۔ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں الله کا انکار کروں اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ اس کو جس کا مجھے علم تک نہیں اور میرا حال یہ ہے کہ میں پھر بھی تمہیں اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو عزت والا بہت بخشنے والا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی (بندگی کی) طرف تم مجھے بلاتے ہو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے پکارا جائے اس دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یقیناً ہم سب کو لوٹنا ہے الله کی طرف اور یقیناً حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہیں۔ پس (اے میرے ہم وطنو!) عنقریب تم یاد کرو گے جو میں آج تمہیں کہہ رہا ہوں اور میں اپنا (سارا) کام الله کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک الله تعالیٰ دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو''۔

وَقَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ آل فرعون کے مومن نے جو کہا یہ اس کا تتمہ ہے یعنی دین میں میری اقتدا کرو اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ یعنی ہدایت کے راستہ کی طرف، اس سے مراد جنت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے اسے الرَّشّاد پڑھا ہے جبکہ اکثر عربوں کے نزدیک یہ غلط ہے کیونکہ باب افعال سے یوں فعل ذکر کیا جاتا ہے أرشد یُرشِد۔ افعال سے فعال کا وزن نہیں ہوتا یہ ثلاثی سے وزن آتا ہے جب تو رباعی سے کثرت کا ارادہ کرتا ہے تو تو مفعال کہتا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے کہ رشاد، یرشد کے معنی میں ہو نہ کہ یہ وہ اس سے مشتق ہو لیکن جس طرح یہ کہا جاتا ہے لَآال یہ لؤلؤ سے ہے یہ اس کے معنی میں ہے مگر اس سے مشتق نہیں مانا جاتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ رشاد یہ رَشَد یرشُد سے ہو جس کا معنی صاحب رشاد ہو۔ جس طرح کسی نے کہا:

كِلِيْنِي لِهَمٍّ يَا اُمَيْمَةَ نَاصِبِ

زمخشری نے کہا: اسے الرَّشّاد بھی پڑھا گیا ہے یہ فعال کا وزن ہے یہ رشد سے مشتق ہے جس طرح علام، عِلم سے مشتق ہے یا یہ رشَد سے مشتق ہو جس طرح عباد ہوتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارشد سے مشتق ہے جس طرح جبار، اجبر سے مشتق ہے یہ اس طرح نہیں کیونکہ افعل سے فعال چند کلمات سے ہی آتا ہے جس طرح دراك، سآر، قصار اور جبار ان قلیل کلمات پر قیاس صحیح نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ رشد کی طرف منسوب ہو جس طرح عواج اور بتات ہے اس میں فعل کی طرف نہیں دیکھا جاتا مصحف میں اتَّبِعُوْنِ یاء کے

بغیر ہے یعقوب اور ابن کثیر نے وصل اور وقف میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو اور نافع نے وقف میں اسے حذف کیا ہے اور وصل میں اسے ثابت رکھا ہے مگر ورش نے اسے دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے۔

**یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ** یعنی تھوڑا سا اس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر یہ دنیا منقطع ہو جاتی ہے اور زائل ہو جاتی ہے **وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ** ۝ یعنی آخرت قرار اور ہمیشگی کا گھر ہے۔ دار آخرت سے مراد جنت اور دوزخ ہے کیونکہ یہ دونوں فانی نہیں اس ارشاد کے ساتھ اس کی وضاحت کی **مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً** جس نے شرک کیا **مِثْلَهَا** سے مراد عذاب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عمل صالح سے مراد **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** ہے جبکہ وہ اپنے دل سے الله تعالیٰ اور انبیاء کی تصدیق کرنے والا ہو **يُدْخَلُوْنَ** یہ مجہول کا صیغہ ہے؛ یہ ابن کثیر، ابن محیصن، ابو عمرو، یعقوب اور ابو بکر کی عاصم سے روایت ہے باقی قراء نے اسے معروف کا صیغہ پڑھا ہے یعنی **يَدْخُلُوْنَ**۔

**وَ يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ** نجات سے مراد ایمان کا راستہ ہے جو جنتیوں تک پہنچانے والا ہے **وَ تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ** اس میں اس امر کی وضاحت کی کہ فرعون نے جو کہا تھا: **وَ مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ** ۝۔ یہ وہ گمراہی کا راستہ تھا جس کا انجام جہنم ہے انہوں نے آپ کو فرعون کی اتباع کی دعوت دی تھی اسی وجہ سے کہا: **تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ** اس سے مراد فرعون ہے۔ اور میں تمہیں عزیز وغفار کی طرف دعوت دیتا ہوں **لَا جَرَمَ** اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اس کا معنی ہے حقا، ان ما اس میں ما، الذی کے معنی میں ہے **لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ** زجاج نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے(1) لیس له استجابه دعوة تنفع اس کے لیے دعوت کی قبولیت نہیں جو نفع دے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کی ایسی دعوت نہیں جو اس کے لیے الوہیت کو ثابت کرے۔

**فِي الدُّنْيَا وَ لَا فِي الْاٰخِرَةِ** کلبی نے کہا: اس کے لیے دنیا و آخرت میں کوئی شفاعت نہیں، فرعون پہلے بتوں کی عبادت کی طرف بلاتا تھا پھر لوگوں کو گائے کی پوجا کی دعوت دی جب تک وہ زندہ ہوتی اس کی عبادت کی جاتی جب وہ بوڑھی ہو جاتی تو اسے ذبح کرنے کا حکم دے دیتا پھر دوسری گائے لے آتا تا کہ اس کی عبادت کی جائے۔ جب اس پر طویل زمانہ گزر چکا تو کہا: میں تمہارا بڑا رب ہوں۔

**وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ** ۝ قتادہ اور ابن سیرین نے کہا: مسرفین سے مراد مشرک ہیں(2)۔ مجاہد اور شعبی نے کہا: اس سے مراد سفہاء اور ناحق خون بہانے والے ہیں۔ عکرمہ نے کہا: مراد جبار اور متکبر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حدود الله سے تجاوز کیا۔ اس کی تعبیر میں جو بھی اقوال ذکر کیے گئے ہیں یہ ان سب سے جامع ہے۔ ان جتنے بھی مواقع پر آیا ہے وہاں یہ محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جار ساقط ہے۔ سیبویہ نے خلیل سے یہ قول نقل کیا ہے کہ **لَا جَرَمَ** کلام کا رد ہے اور ان کا محل رفع میں ہونا بھی جائز ہوگا تقدیر کلام یہ ہوگی وجب ان ماتدعونی الیه یعنی جس چیز کی طرف تم دعوت دیتے ہو وہ ثابت ہے گویا فرمایا: جس امر کی طرف تم دعوت دیتے ہو اس کا بطلان، الله تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 170　　2۔ ایضاً

مسرفین کا اصحاب نار میں سے ہونا ثابت ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ یہ دھمکی اور وعید ہے اور ما کا الذی کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے یعنی جو میں تمہیں کہتا ہوں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر یہ ہو جو میں نے تمہیں کہا ہے جب تم پر عذاب واقع ہوگا اس وقت تم میرا قول یاد کرو گے۔

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ میں اس پر بھروسہ کرتا ہوں اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارشاد اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مقاتل نے کہا: یہ مومن پہاڑ کی طرف بھاگ گیا تھا اور وہ اسے پکڑنے پر قادر نہ ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بات کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے، زیادہ ظاہر یہی ہے کہ بات کہنے والا آل فرعون کا مومن تھا(1)، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

"پس بچا لیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے حیلہ کیا اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کرو فرعونیوں کو سخت عذاب میں"۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا عذاب کی جو انواع انہوں نے آپ کو پہنچانے کا مکر کیا تھا انہوں نے اسے تلاش کیا اور نہ پایا کیونکہ اس نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا تھا۔ قتادہ نے کہا: وہ قبطی تھا اللہ تعالیٰ نے اسے اسرائیل کے ساتھ نجات دی، اس تعبیر کی بنا پر ھاء ضمیر آل فرعون کے مومن کے لیے ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوگی جس طرح یہ اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔

وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ کسائی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے حَاقَ یَحِیقُ حَیْقًا وحُیُوقًا یعنی کوئی چیز نازل ہو اور لازم ہو پھر عذاب کی وضاحت کی اور فرمایا: اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا اس میں چھ وجوہ ہیں: یہ مرفوع ہو اور سوء سے بدل ہو یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو ھو النار یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو۔ فراء نے کہا: یہ ضمیر عائد کی وجہ سے مرفوع ہو تقدیر کلام یوں ہو النار علیھا یعرضون رفع میں یہ چار وجوہ ہیں۔ فراء نے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس کے مابعد ضمیر عائد ہے اور اس سے ماقبل وہ چیز ہے جس کے ساتھ یہ متصل ہے۔ اخفش نے الْعَذَابِ سے بدل کے طور پر جر کو جائز قرار دیا ہے۔ جمہور نے کہا ہے یہ پیشی برزخ میں ہے۔

بعض علماء نے اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا سے عذاب قبر کا اثبات کیا ہے جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا؛ مجاہد، عکرمہ، مقاتل اور محمد بن کعب نے اسی طرح کا قول کیا ہے سب نے کہا: یہ آیت دنیا میں عذاب قبر پر دلالت کرتی ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ عذاب آخرت کے بارے میں فرمایا: وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 158

الْعَذَابِ ۞ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حدیث طیبہ میں ہے: ''آل فرعون اور جو ان کی مثل کافر ہیں ان کی روحوں کو صبح اور شام کے وقت آگ پر پیش کیا جاتا ہے انہیں کہا جاتا ہے: یہ تمہارا گھر ہے''۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: ''ان کی روحیں سیاہ پرندوں کے پیٹوں میں ہیں وہ ہر روز صبح اور شام کے وقت دو دفعہ جہنم پر جاتے ہیں'' یہی ان کی پیشی ہے۔ شعبہ نے یعلی بن عطا سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے میمون بن مہران کو کہتے ہوئے سنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صبح کے وقت یہ اعلان کرتے: الحمد اللہ ہم نے صبح کی اور آل فرعون کو آگ پر پیش کیا گیا جب شام ہوتی تو اعلان کرتے الحمد اللہ ہم نے شام کی اور آل فرعون کو آگ پر پیش کیا گیا: کوئی بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نہ سنتا مگر آگ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا۔

صخر بن جویریہ، نافع سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کافر جب فوت ہوتا ہے تو اسے صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پھر یہ آیت تلاوت کی اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا جب مومن فوت ہوتا تو اس کی روح صبح و شام جنت پر پیش کی جاتی ہے''۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی فوت ہوتا ہے تو صبح اور شام کو اس کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہو تو جنتی ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے اگر وہ جہنمی ہو تو جہنمی ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔ اسے کہا جاتا ہے: یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تجھے دوبارہ اٹھائے گا'' (1)۔

فراء نے کہا: غداۃ اور عشیہ یہ اس دنیا کے اعتبار سے ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ کہا: غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا یہ دنیا کے ایام کے اعتبار سے ہے۔ حماد بن محمد فزاری نے کہا: ایک آدمی نے اوزاعی سے کہا ہم پرندے دیکھتے ہیں جو سمندر سے نکلتے ہیں جو مغرب کی سمت کو جاتے ہیں وہ سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں وہ فوج در فوج ہوتے ہیں ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا جب پچھلا پہر ہوتا ہے تو اسی کی مثل سیاہ پرندے لوٹتے ہیں فرمایا: یہی وہ پرندے ہیں جن کی پوٹوں میں آل فرعون کی روحیں ہیں جنہیں صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے وہ اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہیں جبکہ ان کے پر جل چکے ہوتے ہیں اور وہ سیاہ ہو جاتے ہیں رات کے وقت ان کے سفید پر اگتے ہیں پھر وہ صبح کرتے ہیں تو انہیں صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پھر وہ اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ جب تک دنیا رہے گی ان کا یہ معمول رہے گا جب قیامت ہو گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞۔ اَشَدَّ الْعَذَابِ سے مراد ھاویہ ہے۔ اوزاعی نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے وہ چھبیس لاکھ ہیں غُدُوًّا اصل میں مصدر ہے مجازاً اسے ظرف بنایا گیا ہے وَّ عَشِیًّا کا اس پر عطف کیا گیا ہے گفتگو یہاں مکمل ہوئی پھر تو نئی کلام شروع کرے گا وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یوم کو نصب اَدْخِلُوْۤا کے قول سے دی گئی ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُعْرَضُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہو معنی ہو گا دنیا میں انہیں آگ پر پیش کیا جائے گا وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اس پر وقف نہ کیا جائے گا۔

نافع، اہل مدینہ، حمزہ اور کسائی نے ادخلوا پڑھا ہے یعنی ہمزہ قطعی ہے اور خا مکسور ہے یہ اَدْخَلَ سے مشتق ہے؛ یہ ابو عبید

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، المیت یعرض علیه مقعده، جلد 1، صفحہ 184

کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ وہ انہیں جہنم میں داخل کریں اس کی دلیل اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا ہے باقی قراء نے اسے اُدخلوا پڑھا ہے یہ دخل سے مشتق ہے یعنی انہیں کہا جائے گا: اے آل فرعون! شدید ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ؛ یہ ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کہا: پہلی قراءت کے مطابق آل مفعول اول ہے اور أشد مفعول ثانی ہے یہاں حرف جار حذف ہے دوسری قراءت میں یہ منصوب ہے کیونکہ یہ منادی مضاف ہے اور آل فرعون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کے دین اور مذہب پر تھے۔ وہ لوگ جو اس کے مذہب اور دین پر تھے ان کا عذاب شدید ترین تھا تو اس کے اپنے عذاب کا عالم کیا ہوگا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے: ''بے شک بندہ جو مومن کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے مومن کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے اور مومن کی حیثیت سے مرتا ہے ان میں سے حضرت یحییٰ بن زکریا ہیں وہ مومن کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں، مومن کی حیثیت سے زندہ رہے اور مومن کی حیثیت سے فوت ہوئے اور ایک بندہ کافر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے کافر کی حیثیت سے زندہ رہتا ہے اور کافر کی حیثیت سے مرتا ہے ان میں سے ایک فرعون ہے کافر کی حیثیت سے پیدا ہوا، کافر کی حیثیت سے زندہ رہا اور کافر کی حیثیت سے مرا''۔ نحاس نے اس کا ذکر کیا۔

فراء نے آیت میں تقدیم و تاخیر کا قاعدہ جاری کیا ہے تقدیر کلام یوں ہے اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا عرض آخر میں رکھا یہ نقطہ نظر اس کے خلاف ہے جو جمہور کا نقطہ نظر ہے کہ کلام کو اس کے سیاق پر رکھتے ہیں، جس طرح یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُلٌّ فِیْهَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْۤا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰی ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

''(اور کتنا ہوش ربا سماں ہوگا) جب باہم جھگڑیں گے دوزخ میں پس کہیں گے کمزور لوگ انہیں جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے پس کیا تم دور کر سکتے ہو ہم سے کچھ حصہ آگ (کے عذاب) کا۔ جواب دیں گے متکبر ہم سب آگ (میں بھن) رہے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے بندوں کے متعلق (اب اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا) اور کہیں گے سارے دوزخی جہنم کے داروغوں کو دعا کرو اپنے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ) تخفیف فرما دے۔ وہ (جواب میں) کہیں گے نہیں آیا کرتے تھے تمہارے پاس تمہارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ، وہ کہیں گے بے شک! داروغے کہیں

گے خود ہی دعا مانگو اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے کافروں کی دعا مگر محض بے سود''۔

وَ اِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ جب وہ آگ میں جھگڑیں گے تو کمزور لوگ انہیں کہیں گے جو انبیاء کی اطاعت سے تکبر کیا کرتے تھے: ہم دنیا میں تمہاری ان معاملات میں پیروی کیا کرتے تھے جس شرک کی طرف تم ہمیں بلایا کرتے تھے کیا تم ہم سے اس چیز کو اٹھاتے ہو جو عذاب میں سے جزا کی صورت میں ہمیں ملا ہے۔ تبع یہ واحد ہے اور بصریوں کے قول کے مطابق یہ جمع ہے اس کی واحد تابع ہے۔ اہل کوفہ نے کہا: یہ جمع ہے اس کا کوئی واحد نہیں جس طرح مصدر ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اس کی جمع نہیں بنائی جاتی اگر اس کی جمع بناتے تو کہتے: اتباع۔ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُلٌّ فِیْهَاۤ، فیھا میں ھا ضمیر سے مراد جہنم ہے اخفش نے کہا: کل مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ کسائی اور فراء نے انا کلا فیھا نصب کے طور پر پڑھا ہے انا میں جو ضمیر ہے اس سے کلا نعت اور تاکید ہے۔ ابن سمیقع اور عیسیٰ بن عمر نے اسی طرح پڑھا ہے۔ کوفی تاکید کو نعت کہتے ہیں۔ سیبویہ نے اس سے منع کیا ہے اس نے کہا کل صفت بیان نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے ساتھ صفت بیان کی جاتی ہے اس میں بدل بھی جائز نہیں کیونکہ جس کے بارے میں خبر دی جارہی ہو اسکو کسی غیر کا بدل نہیں بنایا جا سکتا؛ مبرد نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے یہاں اسم ضمیر کا بدل ذکر کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ مخاطب ہے اور مخاطب کا بدل ذکر نہیں کیا جاتا اور اسی طرح مخاطب کا بدل بھی ذکر نہیں کیا جاتا کیونکہ ان دونوں میں کوئی اشکال نہیں ہوتا کہ ان کا بدل ذکر کیا جائے؛ یہ اس کی کلام کی نص ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ۝ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ کسی کا دوسرے کے گناہ کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرے گا پس ہم میں سے ہر ایک کافر ہے (اس لیے ہم دونوں طبقات کو جہنم میں ڈالا گیا ہے)۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ یعنی کافر امتوں میں سے لوگوں نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں اللذون یہ جمع سالم ہے معرب ہے اور جس نے حالت رفع میں الَّذِیْنَ کہا تو اس نے اسے مبنی قرار دیا ہے جس طرح وہ واحد میں مبنی تھا اخفش نے کہا: الذی کے ساتھ نون ملایا گیا ہے تو یہ خمسۃ عشر کی طرح ہو گیا اور یہ مبنی برفتحہ ہو گیا خزنہ یہ خازن کی جمع ہے یہ کہا جاتا ہے: خُزَّان، خُزَّن۔

ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ۝ یخفف جواب ہے اور مجزوم ہے اگر یہ فاء کے ساتھ ہو تو یہ منصوب ہوگا مگر کلام میں اکثر جواب امر اور اس جیسی صورتوں میں فاء کے بغیر آتا ہے اسی وجہ سے قرآن فصیح ترین لغت میں آیا ہے جس طرح کہا:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرٰی حَبِیْبٍ وَ مَنْزِلِ تم دونوں ٹھہرو! ہم محبوب اور منزل کو یاد کر کے رولیں۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے یا میرے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جہنمیوں نے جہنم کے داروغوں سے مدد چاہی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ۝ انہوں نے ایک دن سوال کیا کہ ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے تو ان کے مطالبہ رد کر دیا گیا۔

اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰی ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ۝ حدیث میں ہے

امام ترمذی اور دوسرے محدثین حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جہنمیوں پر بھوک مسلط کر دی جائے گی یہاں تک کہ بھوک ان کے ہم پلہ ہو جائے گی جس عذاب میں وہ مبتلا ہو جائیں گے (1) وہ مدد طلب کریں گے تو انکی ضریع کے ساتھ مدد کی جائے گی نہ وہ جسم کو موٹا کرے گا اور نہ بھوک سے نفع دے گا وہ اسے کھائیں گے وہ انہیں کچھ نفع نہ دے گا وہ مدد طلب کریں گے تو ان کی مدد ایسے کھانے سے کی جائے گی جو گلے میں اٹک جاتا ہے تو اس کے ساتھ ان کے گلے اٹک جائیں گے وہ یاد کریں گے کہ وہ گلے میں رکاوٹ کو پانی سے ختم کرتے تھے وہ مشروب طلب کریں گے تو نکڑوں کے ساتھ کھولتا ہوا پانی ان کی طرف بلند کیا جائے گا جب وہ کھولتا ہوا پانی ان کے مونہوں کے قریب ہوگا تو وہ انہیں جلا دے گا جب وہ کھولتا ہوا پانی انکے پیٹوں میں پہنچے گا تو ان کی انتڑیوں اور جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہوگا اس کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ وہ فرشتوں سے مدد طلب کریں گے وہ کہیں گے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ فرشتے انہیں جواب دیں گے: اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ ضلال کا معنی گھاٹا اور ہلاکت ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

"بے شک ہم اب بھی مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی ان کی دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوں گے، اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی اور ان کے لیے لعنت ہوگی اور ان کے لیے دوزخ کا بدترین گھر ہوگا۔ اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو نور ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا جو سراپا ہدایت اور نصیحت تھی عقلمندوں کے لیے"۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا رسلنا کے ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کرنا جائز ہے تو کہا جائے گا: رُسْلَنَا اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اسم موصول محل نصب میں ہے اس کا عطف الرسل پر ہے اس سے مراد وہ مومن ہے جس نے وعظ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رسل اور مومنین میں عام ہے۔ ابو العالیہ کے قول کے مطابق ان کی مدد سے مراد ان کے دلائل کو غلبہ دینا اور ان کو کامیابی دینا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے دشمنوں سے انتقام لینا ہے۔ سدی نے کہا: کسی قوم نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا یا ایسی قوم کو قتل نہیں کیا جو مومن تھے (3) اور حق کی طرف دعوت دے رہے تھے مگر اللہ تعالیٰ ان پر ایسے آدمی کو مسلط کر دیتا ہے جو ان سے انتقام لیتا ہے تو وہ سب رحمت سے دور کیے گئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ الطعام، جلد 2، صفحہ 82

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 160

3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 161

ہوتے ہیں اگرچہ قتل ہی کیے جائیں۔

**وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ** ﴿۵۱﴾ قیامت کے روز وہ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ زید بن اسلم نے کہا: اشہاد چار ہیں فرشتے، انبیاء، مومن اور جسم (1)۔ مجاہد اور سدی نے کہا: اشہاد سے مراد ملائکہ ہیں جو انبیاء کے بارے میں یہ گواہی دیں گے کہ انہوں نے پیغام حق پہنچایا اور امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے انبیاء کی تکذیب کی (2)۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ملائکہ اور انبیاء ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **الْاَشْهَادُ** شہید کی جمع ہے جس طرح شریف کی جمع اشراف آتی ہے۔ زجاج نے کہا: الاشهاد، شاهد کی جمع ہے جس طرح اصحاب، صاحب کی جمع ہے (4)۔ نحاس نے کہا: فاعل کے وزن کی جمع افعل کے وزن پر نہیں آتی اور نہ ہی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے مگر جو الفاظ اس بارے میں مسموع ہیں انہیں اس طرح ادا کیا جائے گا جس طرح انہیں سنا گیا اس میں حروف زائد کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اخفش اور فراء نے ديوم تقوم الاشهاد فعل کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ جمع مونث ہوتی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ اور دوسرے محدثین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''جس نے اپنے مسلمان بھائی کی عزت کی حفاظت کی تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے کہ اس سے جہنم کی آگ کو دور کرے پھر یہ آیت تلاوت کی''۔ **اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت مروی ہے: ''جس نے کسی مومن کی ایسے منافق کے مقابلہ میں حمایت کی جو منافق مومن کی غیبت کیا کرتا تھا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجے گا جو آگ سے اس کو بچائے گا۔ جس نے کسی مسلمان کا ذکر کسی ایسی چیز کے ساتھ کیا جو اس کے لیے عیب کا باعث تھا اللہ تعالیٰ اسے جہنم کے پل پر روک لے گا یہاں تک کہ جو کچھ اس نے کہا تھا اس سے نقل کیا جائے گا'' (5)۔ **يَوْمَ** یہ پہلے یوم سے بدل ہے **لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ** نافع اور کوفیوں نے یاء کے ساتھ اسے ينفع پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے **وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ** ﴿۵۲﴾ لعنت سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے اور **سُوْٓءُ الدَّارِ** سے مراد جہنم ہے۔

**وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى** یہ دنیا و آخرت میں رسولوں کی مدد میں داخل ہے یعنی ہم نے اسے تورات اور نبوت عطا فرمائی۔ تورات کو ھدی کہا گیا کیونکہ تورات میں ہدایت اور نور ہے قرآن حکیم میں ہے **اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ** (المائدہ: 44)

**وَاَوْرَثْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ** ﴿۵۳﴾ کتاب سے مراد تورات ہے یعنی ہم نے تورات کو ان کی میراث بنایا ہے **هُدًى** یہ **الْكِتٰبَ** سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اصل میں هو هدی ہو یعنی ذلك الكتاب اور اصحاب عقول کے لیے نصیحت ہے۔

**فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ** ﴿۵۵﴾ **اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ** ﴿۵۶﴾

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 161　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 160　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 161

5۔ سنن ابی داود، کتاب الأدب، الرجل یذب، جلد 2، صفحہ 313۔ ایضاً، حدیث نمبر 4230، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾

''پس (اے محبوب!) آپ صبر فرمایئے (کفار کی اذیتوں) پر بے شک الله کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرتے رہیے اپنی کوتاہیوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے شام کے وقت اور صبح کے وقت۔ جو لوگ جھگڑتے ہیں الله کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو نہیں ہے ان کے سینوں میں بجز بڑائی کی ایک ہوس کے جس کو پا نہیں سکیں گے تو آپ الله کی پناہ طلب کیجئے بے شک وہی سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ بے شک پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا بہت بڑا کام ہے لوگوں کو پیدا کرنے سے لیکن بہت سے لوگ (اس کھلی حقیقت کو) نہیں جانتے۔ اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں، تم بہت کم غور کرتے ہو۔ یقیناً قیامت آکر رہے گی ذرا شک نہیں اس میں لیکن بہت سے لوگ (قیامت پر) ایمان نہیں لاتے''۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی اذیتوں پر صبر کیجئے جس طرح ان لوگوں نے صبر کیا جو آپ سے پہلے تھے تیری مدد اور تیری جانب سے غلبہ کا وعدہ حق ہے جس طرح تو نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مدد کی۔ کلبی نے کہا: یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اصل میں لذنب امتك ہے مضاف حذف کر دیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے لذنب نفسك ہے جو صغائر کو انبیاء کے لیے جائز سمجھتا ہے جس نے کہا: صغیرہ بھی انبیاء کے لیے جائز نہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جس طرح فرمایا: وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا (آل عمران: 194) اس کا فائدہ یہ ہے کہ درجات زیادہ ہو جائیں اور دعا مابعد لوگوں کے لیے سنت ہو جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الله تعالیٰ سے اس گناہ کی بخشش طلب کریں جو نبوت سے قبل آپ سے صادر ہوئے۔

وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ اس سے فجر کی نماز اور عصر کی نماز مراد ہے(1)۔ حضرت حسن بصری، اور قتادہ نے کہا۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ نماز ہے جو پانچ نمازوں کے فرض ہونے سے قبل مکہ میں پڑھی جاتی تھی وہ رکعتیں صبح اور دو رکعتیں شام کو۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2): یہ ان آیات میں سے ہے جس کا حکم منسوخ ہے بِحَمْدِ رَبِّكَ اس کا شکر بجالانا اور اس کی ثناء کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ سے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 409 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 161

مراد نماز میں اور نماز کے باہر بھی تسبیح پر دوام اختیار کرو تا کہ اس کے ذریعے جلد مدد چاہنے سے مشرف ہو جائیں۔

**اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ** بے شک وہ لوگ جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات میں بغیر دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو ان کے سینوں میں کبر ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے ان کے سینوں میں کبر ہی ہے وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے والے نہیں۔ زجاج نے کلام میں حذف تسلیم کیا ہے تقدیر کلام یوں ہے ما ھم ببالغی إرادتھم فیہ دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے وہ اپنے کبر کو پانے والے نہیں اس میں حذف نہیں کیونکہ یہ ایسی قوم ہیں جنہوں نے یہ رائے قائم کی اگر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اتباع کی تو ان کی بلندی میں کمی واقع ہو جائے گی اور ان کے حالات خراب ہو جائیں گے جب وہ آپ کی تابعداری نہیں کریں گے تو وہ بلند مقام پائیں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ جس بلندی کی امید رکھتے تھے جھٹلانے کی صورت میں اس بلندی تک نہیں پہنچ پائیں گے مراد مشرک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یہودی ہیں، آیت مدنی ہے جس طرح سورت کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے معنی اس کا یہ بنتا ہے اگر وہ حضرت محمد ﷺ سے اپنے آپ کو عظیم خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دجال عنقریب ظاہر ہوگا اور ملک ہماری طرف لوٹا دیا جائے گا اور اس کے ساتھ نہریں چلیں گی جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت ہے تو وہ ایسا کبر ہے جس تک وہ پہنچ سکیں گے تو یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ ابو العالیہ اور دوسرے علماء نے بات کی ہے۔ سورۂ آل عمران میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ وہ نکلے گا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے سوا تمام علاقوں کو روندے گا ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں اس کا مفصل ذکر کر دیا ہے وہ یہودی ہے اس کا نام صاف ہے اس کی کنیت ابو یوسف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہر وہ شخص ہے جو نبی کریم ﷺ کا انکار کرے؛ یہ اچھی تعبیر ہے کیونکہ یہ عام ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے ان کے سینوں میں عظمت ہے وہ اسے پانے والے نہیں معنی ایک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کبر سے مراد بڑا امر ہے یعنی وہ نبوت کا مطالبہ کرتے ہیں یا بڑے امور کو طلب کرتے ہیں جس کے ذریعے وہ آپ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی قتل وغیرہ۔ وہ اس کو پانے والے نہیں یا آپ کا دین مکمل ہونے سے قبل آپ کی موت کی آرزو کرتے ہیں جبکہ وہ اسکو پانے والے نہیں۔

**فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ** ایک قول یہ کیا گیا: دجال کے فتنہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیے یہ اس کے قول کے مطابق ہے جو کہتا ہے کہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسرے قول کے مطابق کفار کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کفر اور کبر جیسی جس مصیبت میں مبتلا ہوئے اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہ **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝** ۔ وہ سمیع و بصیر ہے **اِنَّهٗ هُوَ** میں ھو ضمیر فصل ہے یہ مبتدا ہو گی اور اس کا مابعد خبر ہو گی اور جملہ ان کی خبر ہو گا جس طرح پہلے بحث گزر چکی ہے۔

**لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ** یہ مبتدا اور خبر ہے؛ یہ ابو العالیہ کا قول ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی تخلیق دجال کی تخلیق سے بڑھ کر ہے جب یہودیوں نے اس کی عظمت بیان کی (1)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: یہ منکرین بعث کے خلاف استدلال ہے یعنی وہ دونوں انسانوں کو دوبارہ تخلیق کرنے سے بڑھ کر ہیں تو انہوں نے کیوں یہ اعتقاد رکھا کہ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 162

میں اس سے عاجز ہوں۔

وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ يَعْلَمُوْنَ کا مفعول بہ ذلك ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ یعنی مومن اور کافر، گمراہ اور ہدایت یافتہ برابر نہیں ہو سکتے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ جو اچھے اعمال کرتا ہے اور جو برے اعمال کرتا ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۞ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے؛ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا کیونکہ اس سے قبل اور مابعد غائب کے صیغے ہیں۔ کوفیوں نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ یہ لام تاکید ہے جو ان کی خبر پر داخل ہے اس کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ کلام کے شروع میں ہو کیونکہ یہ جملہ کی تاکید کے لیے آتا ہے مگر اسے اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے سیبویہ نے بھی اسی طرح کہا ہے تو کہتا ہے: ان عمرا لخارج عمرو جانے والا ہے۔ اسے اپنی جگہ سے موخر کیا گیا ہے تا کہ لام مفتوح اور ان دونوں جمع نہ ہو جائیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں اسی طرح بصریوں کے نزدیک ان ان کو جمع نہیں کیا جاتا۔ ہشام نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ ان ان زیدا منطلق حق اگر تو حق کے لفظ کو حذف کر دے تو میں کسی نحوی کو نہیں جانتا کہ جس نے کہا ہو کہ یہ جائز ہے جتنا میں علم رکھتا ہوں؛ یہ نحاس کا قول ہے۔

لَا رَيْبَ فِيْهَا اس میں کوئی شک نہیں وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ یعنی وہ اس کی تصدیق نہیں کرتے اس سے اطاعت شعار اور گناہگار کے درمیان جو فرق ہے واضح ہو جاتا ہے۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۞ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۞ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۞ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۞ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔ اللہ ہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تا کہ تم آرام کرو اور (بنایا ہے) دن کو روشن، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل (و کرم)

کرنے والا ہے لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ (اس کی نعمتوں) کا شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ ہے اللہ تمہارا رب پیدا کرنے والا ہر چیز کا کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے پس کیسے راہ حق سے تم روگردانی کرتے ہو۔ اسی طرح (راہ حق سے) منہ پھیر دیا جاتا ہے ان (بدنصیبوں) کا جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے زمین کو قیام کی جگہ اور آسمان کو چھت (کی مانند) اور تمہاری صورت گری کی، حسین بنادیا تمہاری صورتوں کو اور کھانے کے لیے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں ایسی خوبیوں والا اللہ تمہارا پروردگار ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے پس اس کی عبادت کرو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے، سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے''۔

**وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ** حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''دعا ہی عبادت ہے(1)'' پھر اس آیت **وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ** ۝ تلاوت کی۔ ابو عیسیٰ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(2)۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ دعا ہی عبادت ہے؛ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا معنی یہ ہے تم میری وحدانیت کو بیان کرو اور میری عبادت کرو میں تمہاری عبادت کروں گا اور میں تمہیں بخش دوں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ذکر، دعا اور سوال ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کو اپنی حاجت کا سوال اپنے رب سے کرنا چاہیے یہاں تک کہ اس کی جوتی کا تسمہ جب ٹوٹ جائے تو اس کا سوال بھی اپنے رب سے کرے'' ایک قول یہ کیا جاتا ہے: دعا سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے۔ قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ کعب الاحبار نے کہا: اس امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں کہ ان سے قبل نبی کے سوا کسی امت کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں جب کسی نبی کو بھیجا جاتا تو اسے کہا جاتا تو اپنی امت پر شاہد ہے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے بارے میں فرمایا: **لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (بقرۃ: 143) نبی کو کہا جاتا تھا: لیس علیك فی الدین من حرج اور اس امت کو کہا گیا **وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** (حج: 78) ایک نبی کو کہا جاتا تھا مجھ سے دعا کر میں تیری دعا کو قبول کروں گا جبکہ اس امت سے فرمایا گیا: **ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ**۔

میں کہتا ہوں: اس قسم کی بات اپنی رائے سے نہیں کی جاسکتی، ایک مرفوع حدیث ہے جسے لیث، شہر بن حوشب وہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''میری امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جیسی مجھ سے قبل انبیاء کو دی گئیں اللہ تعالیٰ جب کسی نبی کو مبعوث فرماتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے: مجھ سے دعا مانگ میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس امت کے بارے میں فرمایا: مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، جلد 2، صفحہ 121

2۔ جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، حدیث نمبر 3294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا، اللہ تعالیٰ جب کسی نبی کو مبعوث کرتا تو ارشاد فرماتا: مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ اور اس امت کے لیے فرمایا: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج:78) اللہ تعالیٰ جب کسی نبی کو مبعوث فرماتا تو اسے اپنی قوم پر گواہ بناتا اور اس امت کو لوگوں پر گواہ بنایا''۔ اسے ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔

خالد بن ربعی کہا کرتے تھے: اس امت کی عجیب شان ہے اس امت کو کہا گیا: اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ انہیں دعا کا حکم دیا اور قبول کرنے کا وعدہ کیا دونوں کے درمیان کوئی شرط نہیں۔ ایک قائل نے اسے کہا: اس کی مثال کیا ہے؟ فرمایا: اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ:25) یہاں شرط ذکر کی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (یونس:2) اس میں عمل کی شرط نہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اس میں شرط ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں کوئی شرط نہیں۔ امتی گھبراہٹ میں ضرورتوں کے وقت اپنے انبیاء کی طرف جاتے تھے یہاں تک کہ انبیاء ان کے حق میں سوال کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مطلق ہے جبکہ سورۂ بقرہ میں مقید ہے جو بحث پہلے گزر چکی ہے یعنی استجبْ لکم ان شئتُ۔ اگر میں چاہوں گا تو تمہاری دعا قبول کروں گا جس طرح ارشاد فرمایا: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام:41) بعض اوقات دعا کی قبولیت عین مطلوب کے علاوہ میں ہوتی ہے جس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزر چکی ہے وہاں ہی اس میں غور کر لو۔ ابن کثیر، ابن محیصن، رویس نے یعقوب سے، عیاش نے ابو عمرو سے ابو بکر اور مفضل نے عاصم سے قراءت نقل کی ہے کہ سَيُدْخَلُوْنَ یہ فعل مجہول ہے باقی قراء نے اسے معروف کا صیغہ پڑھا ہے داخرین کا معنی ہے وہ حقیر و ذلیل ہوں گے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ اس میں جعل، خلق کے معنی میں ہے جب جعل، خلق کے معنی میں ہو اور جب وہ خلق کے معنی میں نہ ہو تو عرب ان میں فرق کرتے ہیں جب یہ خلق کے معنی میں ہو تو اس وقت یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور جب یہ خلق کے معنی میں نہ ہو تو اس وقت یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (الزخرف:3) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا یعنی دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس دن میں اپنی ضروریات کو دیکھو اور اپنی معاش کی طلب میں چل پھر سکو اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام کا شکر بجا نہیں لاتے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور اپنی قدرت پر دلالت کو واضح کیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ جب تمہارے لیے دلائل واضح ہو چکے ہیں تو تم ایمان سے کیسے پھرتے ہو یعنی جس طرح دلیل کے قائم ہونے کے باوجود تم حق سے پھرتے ہو اسی طرح ان لوگوں کو حق سے پھیر دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات سے انکار کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا تعریف اور دلیل کی تاکید میں زیادتی کی، زمین کو تمہاری زندگی اور تمہاری موت کے بعد ٹھکانہ بنا دیا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً، کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ یعنی تمہیں بہترین صورت میں پیدا کیا۔ ابو رزین اشہب عقیلی نے صِوَرَکم پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: صُور میں صِوَر بھی ایک قراءت ہے یہ صورۃ کی جمع ہے اس شعر کو اس لغت پر پڑھا جاتا ہے وہ لونڈیوں کی تعریف کرتا ہے:

أَشْبَهْنَ مِنْ بَقَرِ الْخَلْصَاء أَعْيُنَها　　وهُنَّ أَحْسَنُ مِن صِيرانِها صِوَرًا

محل استدلال صور ہے صیران یہ صُوار یا صِوار کی جمع ہے یہ گائیوں کا ریوڑ ہے صوار کا معنی کستوری کا برتن بھی ہے شاعر نے دونوں کو اس شعر میں جمع کیا:

إذا لاح الصِّوارُ ذكرتُ لَيْلَى　　وأذكُرُها إذا نَفَحَ الصُّوارُ

جب گائیوں کا ایک ریوڑ ظاہر ہوتا ہے تو میں لیلیٰ کو یاد کرتا ہوں اور جب کستوری کا برتن مہکے تو تو اسے یاد کر۔

الصیار بھی اس میں ایک لغت ہے۔

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اس کے بارے میں بھی گفتگو پہلے گزر چکی ہے هُوَ الْحَيُّ وہ باقی رہنے والا ہے مرے گا نہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ دین سے مراد اطاعت وعبادت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فراء نے کہا: یہ جملہ خبریہ ہے اور اس میں فعل امر مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ادعوہ واحمدوہ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔(1)

قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

”آپ فرما دیجئے: مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا (میں ان کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں) جب آ گئی ہیں میرے پاس دلیلیں اپنے رب کی طرف سے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سر تسلیم خم کر دوں رب العالمین کے سامنے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے) بچہ بنا کر پھر (پرورش کی تمہاری) تا کہ تم پہنچو اپنی جوانی کو پھر تمہیں زندہ رکھا تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور بعض تم میں سے فوت ہو جاتے ہیں پہلے ہی

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 52

اور (یہ سارا نظام اس لیے ہے) کہ تم پہنچ جاؤ مقررہ میعاد تک اور تاکہ (تم اپنے رب کی عظمتوں کو) سمجھنے لگ جاؤ۔ وہی ہے جو جلاتا ہے مارتا ہے پس جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے"۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے مجھے اس اللہ نے منع کیا ہے جو حی و قیوم ہے اور لا الہ الا غیرہ ہے کہ میں کسی اور کی عبادت کروں لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ یہاں بینات سے مراد توحید کے دلائل ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عاجزی کا اظہار کروں رب العالمین کے لیے۔ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آباء کے دین کی طرف دعوت دی تو آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ یہ کہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا یہاں طفل بمعنی اطفال ہے یہ بحث پہلے گزر چکی ہے ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ یہ وہ حالت ہے جس میں قوت مجتمع ہو جاتی ہے اور عقل مکمل ہو جاتی ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ وضاحت گزر چکی ہے۔

ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا، شیوخا میں شین کے ضمہ کے ساتھ۔ نافع، ابن محیصن، حفص، ہشام، یعقوب اور ابو عمرو نے اپنے اصل پر پڑھا ہے کیونکہ یہ فَعْل کی جمع ہے جس طرح قَلْب کی جمع قلوب ہے اور رأس کی جمع رءوس آتی ہے باقی قراء نے یاء کی رعایت کرتے ہوئے شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے دونوں جمع کثرت کے صیغے ہیں بہت تھوڑی تعداد میں اشیاخ کا وزن آتا ہے جو اصل میں اشیخ تھا جس طرح فلس کی جمع افلس ہے مگر یاء میں حرکت ثقیل ہے اسے شیخا واحد بھی پڑھا گیا ہے جس طرح طفلا۔ یعنی تم میں سے ہر ایک۔ واحد پر اقتصار کیا گیا ہے کیونکہ غرض جنس کا بیان ہے۔ صحاح میں ہے شیخ کی جمع شیوخ، اشیاخ، شِیَخة، شِیخان، مشیخة، مشایخ اور مشیوخاء آتی ہے عورت کے لیے شیخہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے عبید نے کہا:

كأنها شَیْخَةٌ رَقُوْبُ گویا وہ نگاہ رکھنے والی بڑھیا ہے۔

یوں اس کا باب ذکر کیا جاتا ہے شاخ الرجلُ یَشِیخ شَیخًا یہ اپنے اصل پر حرکت کے ساتھ ہے شیخوخة۔ اصل میں یاء متحرک ہے تو اسے کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ کلام میں مفعول کا وزن نہیں شَیَّخَ، تشییخا۔ یعنی وہ بوڑھا ہو گیا۔ و شیخته۔ میں نے اس کی تکریم کی خاطر اس کو شیخ کے طور پر بلایا۔ شیخ کی تصغیر شییخ ہے شِیَیْخ شین کے کسرہ کے ساتھ ہے تو شویخ نہ کہہ۔ نحاس نے کہا: اگر شاعر مجبور ہو تو اس کے لیے اشیخ کہنا جائز ہے جس طرح عین اور اعین ہے کیونکہ عین میں حسن ہے کیونکہ یہ مونث ہے۔ شیخ اسے کہتے ہیں جس کی عمر چالیس سال سے بڑھ جائے۔

وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ مجاہد نے کہا: اس سے مراد قبل اس کے کہ وہ بوڑھا ہو جائے یا ان احوال سے قبل جب وہ ماں کے پیٹ سے نامکمل بچہ کی حیثیت سے نکلے وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى۔ مجاہد نے کہا: موت تو سب کے لیے ہے اور فعل میں لام عاقبت کا ہے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ اس کا مفعول ذلك ہے پس تم جانو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ تنبیہ میں اضافہ کیا یعنی وہی ذات ہے جو زندہ کرنے اور موت دینے پر قادر ہے فَاِذَا قَضٰۤى

اَمْرًا یعنی جب وہ کسی عمل کو کرنے کا ارادہ کرلے تو اسے فرماتا ہے کُنْ فَيَكُوْنُ۝ بن عامر نے جواب امر کے طور پر یکونَ نصب دی ہے۔ سورۃ البقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّىٰ يُصْرَفُونَ ۝٦٩ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝٧٠ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ
وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ۝٧١ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ۝٧٢ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا
كُنتُمْ تُشْرِكُونَ ۝٧٣ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُو مِن قَبْلُ
شَيْئًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ۝٧٤ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ ۝٧٥ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ
مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ۝٧٦ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي
نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ۝٧٧ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم
مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ
بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ۝٧٨

''کیا تم نہیں دیکھتے ان نادانوں کی طرف جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں، یہ کہاں بھٹک رہے ہیں۔ جن لوگوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس چیز کو جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا انہیں (اپنی تکذیب کا انجام) معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا کھولتے ہوئے پانی میں پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے پھر پوچھا جائے گا ان سے کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک ٹھہراتے تھے اللہ کے سوا؟ (بصد یاس) کہیں گے: وہ تو گم ہو گئے ہم سے بلکہ ہم تو کسی چیز کو پوجتے ہی نہ تھے، اس سے پہلے اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے کافروں کو۔ یہ سزا (اور رسوائی) بدلہ ہے اس کا کہ تم خوشیاں منایا کرتے تھے آپس میں (اپنے عارضی اقتدار پر) ناحق اور بدلہ ہے اس کا جو تم (اپنے فانی اموال واملاک پر) اترایا کرتے تھے۔ اب داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں تم وہاں ہمیشہ رہنے والے ہو پس یہ بہت برا ٹھکانہ ہے تکبر وغرور کرنے والوں کا۔ (اے حبیب!) آپ ان کی نازیبا حرکتوں پر صبر فرمائیے اللہ کا وعدہ سچا ہے سو ہم خواہ آپ کو دکھائیں اس عذاب کا کچھ حصہ جس کا ان سے وعدہ کیا ہے یا (اس سے پہلے ہی) آپ کو دنیا سے اٹھالیں (یہ بچ نہیں سکتے) آخر کار ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور ہم نے بھیجے تھے پیغمبر آپ سے پہلے بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا اور ان میں سے بعض کا ذکر (قرآن کریم میں) آپ سے نہیں کیا اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ لے آتا کوئی

نشانی اللہ کی اجازت کے بغیر پس جب آجائے گا اللہ کا حکم (تو) فیصلہ کر دیا جائے گا حق (وانصاف) کے ساتھ اور باطل پرست وہاں سراسر گھاٹے میں رہیں گے''۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾ ابن زید نے کہا: اس سے مراد مشرک ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت قدریہ کے حق میں نازل ہوئی۔ ابن سیرین نے کہا: اگر یہ آیت قدریہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی تو میں نہیں جانتا کہ یہ کس کے حق میں نازل ہوئی؟ ابوقبیل نے کہا: میں تقدیر کو جھٹلانے والوں کے بارے میں گمان کرتا ہوں کہ وہی ایمان والوں سے مجادلہ کرتے ہیں۔ عقبہ بن عامر نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ آیت قدریہ کے بارے میں نازل ہوئی'' یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ یعنی عنقریب انہیں علم ہو جائے گا کہ جس عقیدہ کو انہوں نے اپنا رکھا تھا اس میں وہ باطل ہیں جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور ان کے ہاتھ ان کی گردنوں سے جکڑ دیئے جائیں گے۔ تیمی نے کہا: اگر جہنم کے طوقوں میں سے ایک طوق پہاڑ پر رکھا جائے تو اسے ریزہ ریزہ کر دے گا یہاں تک کہ سیاہ پانی تک پہنچ جائے گا۔

السَّلٰسِلُ عام قراءت رفع کے ساتھ ہے اس کا عطف الْاَغْلٰلُ پر ہے ابو حاتم نے کہا: يُسْحَبُوْنَ اس قراءت کی بنا پر جملہ مستانفہ ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہے اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ مسحوبین حضرت ابن عباس، ابو جوزاء، عکرمہ اور حضرت ابن مسعود نے السَّلٰسِلُ کو منصوب پڑھا ہے اور يُسْحَبُوْنَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس قراءت کی صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی یسحبون السلاسل ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب وہ اسے کھینچیں گے تو یہ ان پر بہت سخت ہوگا بعض سے یہ السلاسِلِ جر کی صورت میں مروی ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ معنی پر محمول ہے کیونکہ اس کا معنی ہے ان کی گردنیں اغلال اور سلاسل میں ہیں؛ یہ فراء نے کہا: زجاج نے کہا: جس نے وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ جر کی صورت میں پڑھا ہے اس کے نزدیک اس کا معنی ہے زنجیروں میں انہیں گھسیٹا جائے گا۔ ابن انباری نے کہا: اس معنی کی بنا پر جر جائز نہیں کیونکہ جب تو یہ کہے زید فی الدار تو یہ اچھا نہیں کہ تو فی کو مضمر کر دے اور تو کہے زید الدار لیکن معنی کے اعتبار سے جر دینا جائز ہے کیونکہ ان کی گردنیں اغلال اور سلاسل میں ہونگی تو سلاسل کو عطف کی وجہ سے جر دینا جائز ہے کیونکہ اغلال جر کی تاویل میں ہے جس طرح تو کہتا ہے: خاصم عبداللہ زید العاقلین تو تو العاقلین کو نصب دے دونوں کو رفع دینا بھی جائز ہے کیونکہ دونوں میں سے جب ایک اپنے ساتھی سے مخاصمت کرے تو اس کا ساتھی بھی اس سے مخاصمت کرے گا؛ فراء نے یہ شعر پڑھا:

قد سَالَم الحیاتِ مِنه القدَمَا    الأفعُوَانَ الشُّجاعَ الشَّجْعَما

الافعوان کو نصب، حیات کی اتباع میں دی گئی جب انہوں نے قدم سے صلح کر لی تو قدم نے بھی ان سے صلح کر لی۔ جو آدمی السلاسل کو نصب دے گا یا اس کو جر دے گا تو وہ اس پر وقف نہیں کرے گا۔ حمیم اسے کہتے ہیں جو گرمی میں اپنی انتہاء کو پہنچا ہوا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد کھولتی ہوئی پیپ ہے۔

ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ۝ یعنی اس آگ میں پھینکا جائے گا تو وہ اس کے لیے ایندھن ہوں گے، یہ مجاہد کا قول ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے سجرت، التنور میں نے تنور کو روشن کیا، سجرتہ۔ میں نے اسے بھر دیا۔ اسی سے وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ۝ (الطور) ہے یعنی بھرا ہوا سمندر۔ اس تعبیر کی صورت میں معنی یہ ہوگا ان کے ساتھ جہنم بھر جائے گی۔ شاعر ایک پہاڑی بکرے کی تعریف کرتا ہے:

إِذَا شَاءَ طَالَعَ مَسْجُوْرَةً تَرَى حَوْلَهَا النَّبْعَ والسَّمْسَمَ

جب وہ چاہتا ہے تو بھرے ہوئے چشمے پر جا پہنچتا ہے تو اس چشمے کے اردگرد نبع کے درخت اور تل کے پودے دیکھے گا۔

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ کلام شرمندہ کرنے کے لیے ہے قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا یعنی ہلاک ہو گئے اور ہم سے دور چلے گئے اور ہمیں عذاب میں چھوڑ دیا یہ ضل الماء فی اللبن سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پانی دودھ میں چھپ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس طرح ہو گئے کہ ہم انہیں نہیں پاتے بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا یعنی ایسی چیز جو نہ دیکھتی ہے، نہ سنتی ہے، نہ تکلیف دیتی ہے اور نہ نفع دیتی ہے یہ بتوں کی عبادت کا انکار نہیں بلکہ یہ اس امر کا اعتراف ہے کہ وہ بتوں کی جو عبادت کرتے رہے وہ باطل تھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ۝ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں گمراہی کو تخلیق کیا اسی طرح ہر کافر کے بارے میں یہی کرتا ہے۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ اسم اشارہ کا مشار الیہ عذاب ہے یعنی یہی وہ عذاب ہے کہ تم نافرمانیاں کرتے خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ بات انہیں شرمندہ کرنے کے لیے کہی جائے گی مراد یہ ہے کہ تمہیں یہ چیز اس لیے پہنچی ہے کہ دنیا میں معصیت، کثرت مال، کثرت خدام اور تابعداروں کی زیادتی اور صحت پر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں پر ان کی خوشی سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں سے کہا ہم جانتے ہیں کہ ہم کو نہ دوبارہ اٹھایا جائے گا اور نہ ہی ہمیں عذاب دیا جائے گا۔ مجاہد نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (المؤمن: 83) میں یہی کچھ کہا ہے۔

بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ۝ مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: یہ اس کے بدلہ میں ہے جو تم اترایا کرتے تھے ''سبحان'' میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ ضحاک نے کہا: فرح کا معنی خوش ہونا ہے مرح کا معنی سرکشی کرنا ہے۔ خالد، ثور سے انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان الله يبغض البذخين الفرحين ويحب كل قلب حزين ويبغض أهل بيت لحمين ويبغض كل حبر سمين (1) بے شک اللہ تعالیٰ متکبروں اور خوش ہونے والوں سے بغض رکھتا ہے اور ہر غمگین دل والے سے محبت کرتا ہے، غیبت کرنے والوں سے بغض رکھتا ہے اور ایسے علم سے بغض رکھتا ہے جو اپنا علم دوسرے لوگوں کو نہیں بتاتا۔

اهل بيت لحمين سے مراد وہ لوگ ہیں جو غیبت کے ذریعے لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں حبر سمین سے مراد وہ ہے جو بہت بڑا عالم ہو اور لوگوں کو اس علم سے آگاہ نہ کرے یعنی جس کے پاس علم وافر ہو اور لوگوں کو اس سے فائدہ نہ پہنچائے؛ یہ ماوردی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 165

نے ذکر کیا ہے۔ لحمین کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ گوشت کھاتے ہوں اسی معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: اتقوا هذه المجازر، فإن لها ضراوة كضراوة الخمر گوشت کھانے کی عادت سے بچو اس میں ایسی عادت ہے جس طرح شراب کی عادت ہوا کرتی ہے؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے، پہلا سفیان ثوری کا قول ہے اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ یعنی انہیں یہ بات کہی جائے گی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ (الحجر:44)

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے ہے۔ ہم تیرے لیے ان سے انتقام ضرور لیں گے اس دنیا میں اور آخرت میں فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے "ما" تاکید کی وجہ سے زائدہ ہے اسی طرح نون بھی تاکید کے لیے ہے جزم زائل ہوگئی اور فعل مبنی بر فتحہ ہوگیا۔ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ اس کا اس پر عطف ہے فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ یہ شرط کا جواب ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ اس آیت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ ان سے قبل رسولوں نے تکلیفیں پائی ہیں مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ یعنی ہم نے ان کی خبریں تمہیں بتائیں اور انہوں نے اپنی قوموں سے جو کچھ حاصل کیا وہ تمہیں بتایا وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ یعنی کوئی رسول بھی اپنی جانب سے کوئی آیت نہیں لایا تھا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ یعنی جب ان کے عذاب کا مقررہ وقت آپہنچا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اس میں تاخیر اس لیے ہو رہی ہے تاکہ وہ لوگ اسلام لے آئیں جن کے اسلام لانے کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے اور اسی طرح جو ان کی پشتوں میں ہیں اور انہوں نے اسلام قبول کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے ساتھ غزوہ بدر میں قتل کی طرف اشارہ ہے قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ مبطلون سے مراد ہے جو باطل اور شرک کی اتباع کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اللہ پاک وہ ہے جس نے بنائے تمہارے لیے مویشی تاکہ ان میں سے کسی پر سواری کرو اور کسی کا (گوشت) کھاؤ اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں اور ان میں سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ ان پر سوار ہو کر اس منزل تک پہنچو جو تمہارے سینے میں ہے اور ان مویشیوں پر اور کشتیوں پر تم لدے پھرتے ہو۔ اور وہ دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے"۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ ابو اسحاق زجاج نے کہا: انعام سے مراد یہاں اونٹ ہیں لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ جن علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ گھوڑے کا گوشت کھانا منع ہے اور اونٹ کا گوشت کھانا مباح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انعام کے بارے میں فرمایا: وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ اور گھوڑوں کے بارے میں فرمایا: وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا (النحل:8) ان کے کھانے کی اباحت کا ذکر نہیں کیا۔ سورۂ نحل میں یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اونٹ کے بالوں، اون، بکری کے بالوں، دودھ، مکھن، گھی اور پنیر وغیرہ میں تمہارے لیے منافع ہے وَ

لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ یعنی یہ جانور بوجھ اٹھاتے ہیں اور دور دراز سفروں پر لے جاتے ہیں۔ سورۂ نحل میں مفصل بحث گزر چکی ہے اب اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر فرمایا: وَعَلَيْهَا یعنی خشکی میں اونٹوں پر وَعَلَى الْفُلْكِ اور سمندر میں کشتیوں پر تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ یہاں آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾، تُنْكِرُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ کلمہ استفہام کلام کے شروع میں آتا ہے اس لیے اس میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا اگر فعل کے ساتھ ایسی ضمیر ہو جو اسی کی طرف لوٹے تو اس میں رفع پسندیدہ ہے اگر استفہام ہمزہ یا ھل کی صورت میں ہو اور ان کے بعد کوئی اسم، اس کے بعد فعل ہو جس کے ساتھ ایسی ضمیر ملی ہو جو اس اسم کی طرف لوٹے تو نصب دینا پسندیدہ ہوگا معنی یہ بنے گا جبکہ اس کا انکار نہیں کرتے کہ یہ اشیاء اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں تو تم دوبارہ اٹھانے پر اس کی قدرت کا کیوں انکار کرتے ہو؟۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

"کیا ان منکروں نے کبھی سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ انہیں نظر آجاتا کہ کیا انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان سے پہلے گزرے وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں زبردست تھے اور زمین میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے (کہیں ہنرمند تھے) پس یہ بتائیں کہ کیا فائدہ پہنچایا انہیں اس دولت نے جو وہ کماتے تھے۔ پس جب آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو انہوں نے کفر کیا اور نافرمان رہے اس علم پر جو ان کے پاس تھا اور (آخرکار) گھیر لیا انہیں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تو کہنے لگے: ہم ایمان لائے ہیں ایک اللہ پر اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔ پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب یہ دستور ہے اللہ تعالیٰ کا جو (قدیم سے) اس کے بندوں میں جاری ہے اور سراسر خسارہ میں رہے اس وقت حق کا انکار کرنے والے"۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی کہ وہ سابقہ قوموں کے آثار کا مشاہدہ کرتے جو ان سے تعداد میں زیادہ تھے فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ یعنی عمارات، اموال، اولاد اور پیروکاروں نے انہیں کچھ

نفع نہ دیا یہ جملہ بولا جاتا ہے: دلوت بفلان إليك یعنی میں نے اسے تیرے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ اس تاویل کی بنا پر مانافیہ ہے یعنی اس چیز نے انہیں کوئی نفع نہ دیا ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے یعنی جب وہ ہلاک ہوئے تو کس چیز نے انہیں نفع نہ دیا۔ اَكْثَرَ غیر منصرف ہے کیونکہ وہ فعل کے وزن پر ہے کوفیوں کا خیال ہے کہ ہر وہ اسم جو غیر منصرف ہو تو اسے منصرف پڑھنا جائز ہے مگر افعل من کذا منصرف نہیں ہوگا کیونکہ اسے شعر اور کسی دوسری صورت میں منصرف پڑھنا جائز نہیں جب اس کے ساتھ مِن ہو۔ ابوالعباس نے کہا: اگر مِنْ منصرف ہونے سے مانع ہے تو یہ ضروری ہوگا کہ یہ نہ کہا جائے: مررت بخیر منك وشر منك ومن عمرو۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ بینات سے مراد واضح آیات ہیں فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اس کے معنی میں تین قول ہیں: مجاہد نے کہا: بے شک اس علم کی وجہ سے خوش تھے جو ان کے پاس موجود تھا وہ کہتے ہم ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں کہ نہ ہمیں عذاب دیا جائیگا اور نہ ہی ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفار کے پاس جو دنیوی علم تھا اس پر وہ خوش تھے جس طرح اس آیت میں ہے يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم: 7) ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو خوش ہوئے وہ سوال کرتے تھے جب ان کی قوم نے انہیں جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ کافروں کو ہلاک کرنے والا ہے اور رسولوں اور مومنوں کو نجات دینے والا ہے تو رسول مومنوں کی نجات سے آگاہی حاصل کرنے کی بنا پر خوش ہوئے وَحَاقَ بِهِمْ بھم سے مراد وہ کفار ہیں مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ یعنی جو رسل ان کے پاس لائے ان کا ان کفار نے استہزاء اڑایا تو اس کے عقاب نے ان کا احاطہ کر لیا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا جب انہوں نے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ یعنی ہم ان بتوں کا انکار کرنے والے ہیں جنہیں ہم نے عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے عذاب کو دیکھ لیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا انہیں کچھ نفع نہ دے گا۔

سُنَّتَ اللّٰهِ، سنة مصدر ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں سَنَّ یسن سنا و سُنة۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کفار میں یہ ضابطہ نافذ کر دیا ہے کہ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو ایمان انہیں کچھ نفع نہ دے گا۔ سورۃ النساء اور سورۂ یونس میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ عذاب دیکھنے اور علم ضروری کے حصول کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے اہل مکہ! کفار کو ہلاک کرنے کا جو ضابطہ ہے اس سے ڈرو سُنَّتَ اللّٰهِ یہ تحذیر و اغراء کے طور پر منصوب ہے۔

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ زجاج نے کہا: وہ اس سے قبل خسارے میں تھے مگر جب انہوں نے عذاب کو دیکھا تو ہمارے لیے ان کا خسران واضح ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہے فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا، وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ جس طرح تمام کافروں میں ہماری سنت ہے پس سنة کا لفظ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی تمام امتوں میں ضابطہ ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 165

# سورۃ فصلت

﴿ ایاتہا ۵۴ ﴾ ﴿ ۴۱ سورۃ حم السجدۃ مکیۃ ۶۱ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ۶ ﴾

تمام علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے اس کی چون آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی پچپن آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَ فِیْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾

"حا۔میم۔ اتارا گیا (یہ قرآن) رحمٰن ورحیم خدا کی طرف سے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں یہ قرآن عربی زبان میں ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو علم وفہم رکھتے ہیں یہ مژدہ سنانے والا (بروقت) خبردار کرنے والا ہے بایں ہمہ منہ پھیر لیا ان میں سے اکثر نے پس وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ اور (ان ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں"۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۲﴾ زجاج نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا رفع ھذا کے مضمر ہونے کی بنا پر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ کہا جائے کِتٰبٌ یہ تَنْزِیْلٌ سے بدل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ تَنْزِیْلٌ کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حٰمٓ کی تقدیر یہ ہے ھذہ حم جس طرح تو کہتا ہے: باب کذا اصل میں ھو باب کذا تھا پس حم یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اصل میں یہ ھو حم تھا تَنْزِیْلٌ دوسرا مبتدا ہے اور کِتٰبٌ اس کی خبر ہے فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ یعنی ان کی وضاحت وتفسیر بیان کردی گئی ہے۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے اس کے حرام سے اس کے حلال کو اور اس کی معصیت سے اس کی اطاعت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وعدہ اور وعید کو بیان کر دیا گیا۔ سفیان نے کہا: ثواب اور عقاب کو بیان کر دیا گیا ہے (1)۔ اسے فَصَلَت بھی پڑھا گیا ہے یعنی ان آیات نے حق اور باطل میں فرق کر دیا ہے یا ان آیات میں سے بعض اپنے معانی میں اختلاف کی وجہ سے دوسری آیات سے مختلف ہیں۔ تیسرا قول فصل من البلد سے مشتق ہے یعنی وہ ملک سے دور ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 167

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا اس کے منصوب ہونے کی کئی وجوہ ہیں: اخفش نے کہا: یہ مدح کی حیثیت میں منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فعل کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اذکر قرآنا عربیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دوبارہ وہی فعل ہے یعنی فصلنا قرآنا عربیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے، یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی آیات کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اس حال میں کہ وہ قرآن عربی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب فصلت کا فعل آیات کے ساتھ مشغول ہو گیا یہاں تک کہ وہ نائب فاعل ہو گیا تو قُرْاٰنًا اس کا بیان ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے منصوب اس لیے پڑھا گیا ہے کہ اسے ماقبل کلام سے الگ کیا گیا ہے۔

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ضحاک نے کہا: قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ جانتے ہیں کہ تورات اور انجیل میں وہ ایک الٰہ ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لغت عربی کو جانتے ہیں اور وہ اس کی مثل لانے سے عاجز ہیں اگر یہ عربی زبان میں نہ ہوتا تو اسے نہ جانتے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ترین ہے یہ قریش کو عاجز کرنے اور انہیں شرمندہ کرنے کے لیے ہے کہ قرآن معجزہ ہے بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا یہ دونوں الآیات سے حال ہیں اور اس میں عامل فصلت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ دونوں قرآن کی لغتیں ہیں بَشِيْرًا یہ اولیاء اللہ کے لیے ہے اور نَذِيْرًا یہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے ہے اسے بشیر و نذیر بھی پڑھا گیا ہے یہ کتاب کی صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ یعنی اکثر اہل مکہ نے اعراض کیا تو ایسا سننا نہیں سنتے کہ وہ اس سے نفع اٹھائیں۔

روایت کیا گیا ہے کہ ریان بن حرملہ نے کہا کہ قریش کے سرداروں اور ابو جہل نے کہا: ہم پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ملتبس ہو گیا ہے اگر تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرتے جو شعر، کہانت اور جادو کو جانتا ہوتا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرے پھر اس کے معاملہ کی ہمارے سامنے وضاحت کرے(2)۔ عتبہ بن ربیعہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے کہانت، شعر اور جادو کو سنا ہے میں اس کے بارے میں اتنا علم رکھتا ہوں اگر معاملہ ایسا ہوا تو مجھ سے مخفی نہیں رہے گا، انہوں نے کہا: ان کے پاس جاؤ اور ان سے بات کرو۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تو بہتر ہے یا قصی بن کلاب؟ تو بہتر ہے یا ہاشم؟ تو بہتر ہے یا عبد المطلب؟ تو بہتر ہے یا عبد اللہ؟ تو کس وجہ سے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے؟ ہمارے آباء کو گمراہ قرار دیتا ہے؟ ہمارے دانشمند لوگوں کو بے وقوف قرار دیتا ہے؟ اور ہمارے دین کی مذمت کرتا ہے؟ اگر تو ریاست چاہتا ہے تو ہم اپنے سارے جھنڈے تیرے سپرد کر دیتے ہیں جب تک تو زندہ رہے گا تو ہمارا سردار ہو گا، اگر تو شادی کا ارادہ رکھتا ہے تو ہم قریش کی بچیوں میں سے دس عورتوں سے تیری شادی کر دیتے ہیں جن سے تو چاہتا ہے، اگر تو مال کی خواہش رکھتا ہے تو ہم تیرے لیے مال جمع کر دیتے ہیں جس سے تو اور تیرے بعد والے غنی ہو جائیں گے، اگر یہ سب کچھ جن کے سایہ کی وجہ سے ہے جو تجھ پر غالب آ چکا ہے تو ہم تیرا علاج کروانے کے لیے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں یہاں تک کہ ہم تیرے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 168　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 61-60

بارے میں اس پر غالب آ جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ جب وہ گفتگو سے فارغ ہوا فرمایا: ''اے ابو ولید! تو فارغ ہو گیا ہے؟'' اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ''اے بھتیجے سنتا ہے؟ اس نے کہا: سنتا ہوں۔ پڑھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ
فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا
عٰمِلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ
لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ
غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ
جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ
يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۤ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ فَاِنْ
اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ تو عتبہ اچھل پڑا اور اپنا ہاتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر رکھ دیا اور آپ کو الله اور رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ وہ خاموش ہو جائیں، وہ گھر لوٹ آیا اور قریش کے پاس نہ گیا۔ ابو جہل اس کے پاس آیا پوچھا: کیا تو نے محمد کا دین قبول کر لیا ہے؟ یا اس کا کھانا تجھے اچھا لگا ہے؟ تو عتبہ غضبناک ہو گیا اور قسم اٹھائی کہ وہ محمد سے کبھی بھی ملاقات نہیں کرے گا پھر کہا: الله کی قسم! تم جانتے ہو میں قریش سے سب سے زیادہ مالدار ہوں لیکن جب میں نے اس پر واقعہ بیان کیا تو انہوں نے مجھے ایسا جواب دیا الله کی قسم! وہ شعر نہیں، نہ کہانت ہے اور نہ ہی جادو ہے، پھر اس نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنا تھا وہ اس پر تلاوت کیا صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ تو میں نے اس کا منہ روکا اور رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ وہ رک جائے۔ تم خوب جانتے ہو کہ جب وہ کچھ کہتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا، الله کی قسم! مجھے ڈر ہے کہ تم پر الله تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گا جتنی صاعقہ نازل ہو گا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا حم فصلت یہاں تک کہ آیت سجدہ تک پہنچے تو سجدہ کیا جبکہ عتبہ توجہ سے سن رہا تھا اس نے پشت کے پیچھے سے ہاتھوں پر سہارا لیا ہوا تھا جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءت کو ختم کیا تو اسے کہا: ابو ولید! تو نے وہ سن لیا ہے جو میں نے تجھ پر پڑھا ہے اب تو جو چاہے کر۔ عتبہ قریش کی مجلس میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا: الله کی قسم! ابو ولید تمہارے پاس اس چہرے سے آ رہا ہے جس چہرے سے گیا نہیں تھا پھر انہوں نے کہا: الله کی قسم! ابو ولید کیا چھوڑ آئے ہو؟ اس نے کہا: الله کی قسم! میں محمد سے ایسا کلام سن آیا ہوں جیسا کلام میں نے کبھی بھی کسی سے نہیں سنا تھا، الله کی قسم! وہ شعر نہیں اور نہ ہی وہ کہانت ہے اس مسئلہ میں میری اطاعت کرو اور میرے کہنے پر اس کے ساتھ معاملہ کرو محمد اور اس کے معاملہ کو چھوڑ دو اس سے الگ تھلگ ہو جاؤ الله کی قسم! میں نے جو اس کا کلام سنا ہے اس کی شان ہے اگر عرب اس تک رسائی حاصل کر لیں تو تم غیروں کے ہاتھوں اسے کافی ہو گے اگر وہ بادشاہ یا نبی ہو تو تم اس کی وجہ سے سب سے زیادہ سعادت مند ہو کیونکہ اس کا ملک تمہارا ملک ہے، اس کا شرف تمہارا شرف ہے انہوں نے کہا: دور ہو جا اے ابو ولید! محمد نے تجھ پر جادو کر دیا

ہے۔ ابو ولید نے کہا: یہ میری رائے ہے تم جو چاہو کرو۔

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ، اکنه، کنان کی جمع ہے جس کا معنی ڈھکنا ہے۔ سورۂ بقرۃ میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے: مجاہد نے کہا: کنان دل کے لیے اسی طرح ہوتا ہے جس طرح تیر کے لیے جنہ (جو تیر پر چڑھا دیا جائے) ہوتا ہے(1)۔

وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ہمارے کانوں میں گرانی ہے، تیرا کلام ہمارے کانوں میں داخل نہیں ہوتا، ہمارے دل فہم سے پردہ میں ہیں وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہے یعنی دین میں اختلاف ہے کیونکہ وہ بتوں کی عبادت کیا کرتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے، یہ معنی فراء اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایسا پردہ جو قبول کرنے کے مانع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ابو جہل نے اپنا سر کپڑے سے ڈھانپا اور کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے اور تیرے درمیان پردہ ہے، یہ بات اس نے مذاق کے انداز میں کی؛ یہ بات نقاش نے کی اور زمخشری نے اسے ذکر کیا۔ یہاں حجاب سے مراد کپڑا ہے۔

فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝ یعنی ہماری ہلاکت کا اہتمام کرو ہم تیری ہلاکت کا اہتمام کرنے والے ہیں(2)؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: تو اپنے اس الہ کے لیے سرگرم عمل رہ جس نے تجھے بھیجا ہے اور ہم اپنے معبودوں کے لیے کام کرتے رہیں گے جس کی ہم عبادت کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تیرا دین جو تقاضا کرتا ہے وہ کر اور ہم وہ کریں گے جو ہمارا دین تقاضا کرے گا۔ پانچویں قول کا بھی احتمال ہے اپنی آخرت کے لیے کام کرو ہم اپنی دنیا کے لیے کام کریں گے(3)؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

''آپ فرمائیے: میں انسان ہی ہوں (بظاہر) تمہاری مانند البتہ وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے پس متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف اور مغفرت طلب کرو اس سے، اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لیے جو زکوۃ نہیں دیتے، اور وہ آخرت کے منکر ہیں بے شک وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہوگا''۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں بادشاہ نہیں بلکہ میں انسان ہوں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع کی تعلیم دی يُوْحٰٓى اِلَيَّ یعنی فرشتوں کے ذریعے آسمانوں سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے(4)۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا معبود ایک ہے اس پر ایمان لاؤ اور دعا کرتے وقت اور سوال کرتے وقت اس کی طرف متوجہ ہو وَاسْتَغْفِرُوْهُ اپنے شرک پر مغفرت طلب کرو۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 241　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 168　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 412

وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦﴾ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت نہیں دیتے یہ نفس کی زکوۃ ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ زکوۃ کے فرض ہونے کا اقرار نہیں کرتے۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا: وہ صدقہ نہیں کرتے اور اطاعت میں خرچ نہیں کرتے انہیں بخل پر شرم دلائی گئی ہے جس سے صاحب فضل لوگ نفرت کرتے ہیں۔ اس میں یہ دلالت موجود ہے کہ کافر کو اس کے کفر پر عذاب دیا جائیگا۔

فراء اور دوسرے علماء نے کہا: مشرک مال خرچ کرتے، حاجیوں کو پانی پلاتے، انہیں کھانا کھلایا کرتے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے ان پر ان چیزوں کو مشرکین نے حرام کر دیا تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٧﴾ وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اطاعت میں خرچ نہیں کرتے اور نہ ہی گناہوں پر بخشش طلب کرتے ہیں۔

زمخشری نے کہا: اگر تو یہ سوال کرے کہ مشرکین کے اوصاف میں سے زکوۃ کا انکار آخرت کے انکار کے ساتھ کیوں ملایا گیا ہے (1)؟ میں اس کا جواب دوں گا: انسان کو سب سے محبوب چیز اس کا مال ہوا کرتی ہے مال اس کی روح کا جزو اس ہے جب انسان اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے ثابت قدم ہونے، اس کی استقامت، صدق نیت اور خلوص عمل پر دلیل ہے کیا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں دیکھتا: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (البقرۃ: 256) اپنے نفسوں کو ثابت رکھتے ہیں اور اپنے مال خرچ کر کے اس کے ثبات پر دلائل قائم کرتے ہیں مولفہ قلوب (وہ کفار جن کو زکوۃ کا مال تالیف قلوب کے لیے دیا جاتا تھا) ان کے ساتھ تھوڑے سے دنیاوی مال پر تدبیر کی گئی جس سے ان کی رشتہ داری قومی ہوگئی اور ان کی طبیعتوں میں نرمی آگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد مرتدین نے زکوۃ کے انکار کے لیے ہی باہم تعاون کیا تو انکے ساتھ جنگیں کی گئیں اور جہاد کیا گیا: اس میں مومنوں کو زکوۃ کی ادائیگی پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور اس کے روکنے پر سخت ڈرایا گیا ہے کیونکہ زکوۃ روکنے کو مشرکین کی صفات قرار دیا گیا ہے اور آخرت کے انکار کے ساتھ اسے ملایا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٨﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کا معنی غیر مقطوع کیا ہے وہ ختم نہ ہوگا یہ مننت الحبل سے ماخوذ ہے جب تو اس کو کاٹ دے اسی معنی میں ذی الاصبع کا شعر ہے:

إِنِّي لَعَمْرُكَ مَا بَابِي بِذِي غَلَقٍ عَلَى الصَّدِيقِ وَلَا خَيْرِي بِمَمْنُونِ (2)

تیری زندگی کی قسم! میرا دروازہ دوست پر کبھی بند نہیں ہوا اور نہ میرا احسان ختم ہوا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فَتَرَى خَلْفَهَا مِنَ الرَّجْعِ وَالْوَقْعِ مَنِيْنًا كَأَنَّهُ أَهْبَاءُ

منین سے مراد الغبار المنقطع الضعیف ہے۔

---

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 87-186 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 169

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے (1)؛ مقاتل نے کہا: اس میں نقص نہیں ہوگا اسی سے منون کا لفظ ہے کیونکہ موت انسان کی قوت کو کمزور کر دیتی ہے۔ زہیر نے کہا:

فَضْل الجیاد علی الخیل البطاء فَلَا یُعْطِی بِذٰلِكَ مَنْنُونًا ولا نَزِقًا

جوہری نے کہا: اس کا معنی کاٹنا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس کا معنی نقص ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔ لبید نے کہا:

غُبْسٌ كَوَاسِبُ لَا يُمَنُّ طَعَامُها

مجاہد نے کہا: اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر کوئی احسان نہیں جتلایا جائیگا۔ سدی نے کہا: یہ آیت اپاہج، مریضوں اور بوڑھوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اطاعت بجالانے سے کمزور ہوئے تو ان کے لیے اتنا اجر لکھا جاتا رہے گا جتنا اجر ان کے لیے اس وقت لکھا جاتا تھا جب وہ عمل کیا کرتے تھے۔

قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۹﴾ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾

"آپ ان سے پوچھیے: کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لیے مدمقابل وہ تو رب العالمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہوسکتا ہے)۔ اور اس نے ہی بنائے ہیں زمین میں گڑھے ہوئے پہاڑ جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازہ سے مقرر کردیں ہیں اس میں غذائیں (ہر نوع کے لیے) چار دنوں میں (ان کا حصول) یکساں ہے طلب گاروں کے لیے۔۔ پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف وہ اس وقت محض دھواں تھا پس فرمایا اسے اور زمین کو کہ آجاؤ تعمیل حکم اور ادائے فرائض کے لیے خوشی سے یا مجبوراً، دونوں نے عرض کی: ہم خوشی خوشی (دست بدستہ) حاضر ہیں۔ پس بنا دیا انہیں سات آسمان دو دنوں میں اور وحی فرمائی ہر آسمان میں اس کے حسب حال، اور ہم نے مزین کر دیا آسمان دنیا کو چراغوں سے اور اسے خوب محفوظ کر دیا، یہ سارا نظام سب سے عالم سب کچھ جاننے والے (خدا کا) ہے"۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 169

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ، ائنکم دو ہمزوں کے ساتھ ہے دوسرا ہمزہ بین بین ہے اور دو ہمزوں کے درمیان الف ہے اس کا معنی شرمندہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو حکم دیا تا کہ انہیں شرمندہ کیا جائے اور ان کے فعل پر تعجب کا اظہار کیا جائے معنی ہے تم کیوں اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہو جبکہ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟ يَوْمَيْنِ سے مراد اتوار اور سوموار ہے أَنْدَادًا کا معنی اضداد اور شریک ہیں وَجَعَلَ فِيْهَا ضمیر سے مراد زمین ہے، رواسی سے مراد پہاڑ ہیں۔ وہب نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اسے پانی پر پھیلا دیا جبریل امین سے فرمایا: اے جبریل! اسے ایک جگہ ٹھہرا دو حضرت جبریل امین اترے اسے ایک جگہ روکا تو ہوائیں حضرت جبریل امین پر غالب آگئیں عرض کی: اے میرے رب! تو خوب جانتا ہے میں تو اس میں مغلوب ہو گیا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اسے پہاڑوں کے ساتھ مضبوط کر دیا۔

وَبٰرَكَ فِيْهَا یعنی اس زمین میں جو منافع پیدا کیے۔ سدی نے کہا: اس میں درخت اگائے وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا سدی اور حسن بصری نے کہا: اہل زمین کے رزق اور ان کے مصالح مقرر فرمائے (1)۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: اس میں نہریں، درخت اور چوپائے منگل اور بدھ کو پیدا فرمائے۔ عکرمہ اور ضحاک نے کہا: وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا سے مراد ہے اس میں اس کے مکینوں کے رزق اور جو لوگوں کی معیشت کے مناسب چیزیں تھیں وہ پیدا کیں یعنی تجارت، درخت اور منافع ایک شہر میں ایسی چیزیں پیدا کیں جو دوسرے شہر میں پیدا نہ کیں تا کہ بعض لوگ بعض لوگوں سے تجارت کریں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف سفر کریں۔ عکرمہ نے کہا: یہاں تک کہ بعض ممالک ہیں وہ سونے کو نمک کے برابر خریدتے ہیں۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: وہ سابری (بڑھیا کھجور) سابور سے، بڑی چادریں ری سے اور دھاری دار چادریں یمن سے لیتے ہیں۔

فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ یعنی چار دنوں کی تکمیل میں، اس کی مثل ایک قائل کا قول ہے: خرجت من البصرة الى بغداد في عشرة أيام والى الكوفة في خمسة عشر يوما (2) یعنی پندرھویں دن کے مکمل ہونے پر میں کوفہ پہنچا؛ یہ معنی ابن انباری اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔

سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ۝ حضرت حسن بصری نے کہا: معنی ہے مکمل چار دنوں میں (3)۔ فراء نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے اس نے ان میں ان کی روزیاں پیدا کیں جن کا حصول محتاجوں کے لیے یکساں ہے؛ یہ قول طبری نے پسند کیا ہے۔ حضرت حسن بصری اور یعقوب حضرمی نے پڑھا سواء للسائلین ابن قعقاع سے سواء مرفوع ہے نصب مفعول مطلق ہونے کے اعتبار سے ہے جو استواء کے معنی میں ہے یعنی استوت استواء۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حال ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے جر، ایام یا اربعة کی صفت کے اعتبار سے ہے تقدیر کلام یہ ہے فی اربعة ایام مستوية تامة۔ رفع مبتدا کے اعتبار سے ہے اور خبر لِّلسَّائِلِيْنَ ہے یا اس تقدیر کی بنا پر مرفوع ہے هذه سواء للسائلين۔ اہل معانی نے کہا: معنی ہے وہ سائلین اور غیر سائلین کے لیے برابر ہے یعنی زمین اور زمین میں جو کچھ ہے وہ برابر ہے اس کے لیے جو سوال کرے اور اس کے لیے جو سوال نہ کرے اور وہ عطا فرماتا ہے جو سوال کرے اور جو سوال نہ کرے۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 414 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 171 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 414

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ یعنی آسمان کی تخلیق کا ارادہ کیا اور اس کے درست کرنے کا قصد کیا۔ اکثر اقوال کے مطابق استواء افعال کی صفت ہے اس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (البقرۃ: 29) اس کے بارے میں بحث گذر چکی ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ یعنی اس کا امر آسمان کی طرف بلند ہوا؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ جس نے یہ کہا یہ صفۃ ذاتیہ زائدہ ہے اس نے کہا: ازل میں اپنی صفات کا قصد کیا ثم کا لفظ ذکر کیا تو آسمان کو دخان کی صفت سے حالت کثافت منتقل کیا یہ دھواں پانی کے سانس لینے سے پیدا ہوتا تھا جس طرح سورۂ بقرہ میں حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء سے منقول ہے۔

فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا یعنی میں نے تم دونوں سے جو منافع اور مصالح پیدا کیے تھے ان کو لے آؤ اور میری مخلوق کے لیے نکالو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الله تعالیٰ نے آسمان سے فرمایا اپنے سورج، اپنے چاند اور اپنے ستاروں کو طلوع کرو اور اپنی ہوائیں اور بادل جاری کرو اور زمین سے فرمایا: اپنے دریاؤں کو جاری کرو، اپنے درخت اور پھلوں کو نکالو راضی ہو کر یا مجبور ہو کر۔ دونوں نے جواب دیا: ہم انہیں خوشی خوشی لے آئے ہیں۔ کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے أتینا أمرك، طَآىِٕعِیْنَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس امر سے مراد تسخیر ہے یعنی تم دونوں ہو جاؤ تو وہ ہو گئے جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۠ (النحل) اس تعبیر کی بنا پر یہ ارشاد الله تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے کیا ان دونوں کو جو ارشاد فرمایا اس کی دو توجیہیں ہیں: (1) یہ ایسا قول ہے جس کا تکلم ہوا۔ (2) یہ الله تعالیٰ کی جانب سے قدرت ہے جو ان دونوں کے حق میں ظاہر ہوئی تو مقصد کو پانے میں یہ کلام کے قائم مقام ہوگئی؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ اس میں بھی دو توجیہیں ہیں: (1) جب انہوں نے اطاعت کی اور جواب دیا تو دونوں سے اطاعت ظاہر ہوگئی تو یہ اطاعت ان کے قول کے قائم مقام ہوگئی؛ اسی معنی میں راجز کا قول ہے:

امْتَلَأَ الحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِی مَهْلاً رُوَیْدًا قَدْ مَلَأْتُ بَطْنِی

حوض بھر گیا اور کہا: میرے لیے کافی ہے مہلت دو اور میں نے اپنا پیٹ بھر لیا ہے۔

یعنی اس میں یہ امر ظاہر ہو گیا ہے، اس نے قول نہیں کیا اکثر اہل علم لوگوں کی رائے ہے الله تعالیٰ نے دونوں میں کلام کو پیدا کیا تو دونوں نے اس طرح کلام کی جس طرح الله تعالیٰ نے ارادہ کیا تھا۔ ابو نصر سکسکی نے کہا: وہ کعبہ مشرفہ کی جگہ سے گویا ہوئی اور آسمان کی جو جگہ اس کے مقابل ہے وہ وہاں سے گویا ہوئی تو الله تعالیٰ نے اس میں اپنا حرم رکھ دیا(1)۔ فرمایا: طَآىِٕعِیْنَ، طاعتین نہیں فرمایا، لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اور نہ طائعات کہا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے کیونکہ دونوں کئی آسمان اور زمینیں ہیں کیونکہ خبر ان دونوں میں جو کچھ ہے ان کے بارے میں دی جا رہی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ان کی صفت قول اور جواب دینے سے لگائی گئی جو ذوالعقول کی صفات ہیں تو ضمیر میں بھی انہیں ذوی العقول کے قائم مقام رکھا گیا اسی کی مثل رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف) یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ حدیثہ طیبہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 173

میں ہے: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! اگر میں آسمان اور زمین کو جب یہ کہوں: أتیا طوعا او کرھا تو وہ تیری نافرمانی کریں تو تو ان کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟ فرمایا: میں اپنے جانوروں میں سے ایک جانور کو حکم دوں گا تو وہ ان دونوں کو نگل جائے گا عرض کی: اے میرے رب! وہ دابہ (جانور) کہاں ہے؟ فرمایا: میری چراگاہوں میں سے ایک چراگاہ میں عرض کی: وہ چراگاہ کہاں ہے؟ فرمایا: میرے علم میں''۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، سعید بن جبیر اور عکرمہ نے آتیا مد اور فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اٰتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ** معنی ہے تم دونوں اپنی جانب سے اطاعت پیش کرو۔ دونوں نے کہا: ہم نے خوشی خوشی اطاعت کی تو دونوں مفعول حذف کر دیئے گئے۔ اور یہ بھی جائز ہے اور یہ بہتر بھی ہے کہ آتینا فاعلنا کا وزن ہو تو ایک مفعول حذف کر دیا گیا۔ جس نے اَتَیْنَا پڑھا ہے تو معنی ہوگا جو کچھ ہم میں تھا ہم اسے لے آئے جس طرح اس کی وضاحت کئی مقامات پر گذر چکی ہے۔ الحمد اللہ۔

**فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ** انہیں مکمل کیا اور ان سے فارغ ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے انہیں پختہ کیا جس طرح کہا:

وعليهما مسرودتانِ قَضَاهُمَا داؤد أوْ صَنَعُ السَّوابِغِ تُبَّعُ

ان دونوں پر زرہیں ہیں جنہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے پختہ بنایا ہے۔

**فِيْ يَوْمَيْنِ** ان چار ایام کے علاوہ جن میں زمین کو پیدا کیا پس آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دنوں میں واقع ہوئی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ** (یونس: 3) جس طرح اس کی وضاحت سورۂ اعراف میں گذر چکی ہے۔ مجاہد نے کہا: ان چھ دنوں میں سے ایک دن ہزار سال کی طرح ہے جسے تم شمار کرتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا اور دو دنوں میں اس کی روزیوں کو پیدا کیا دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا کیا، زمین کو اتوار اور سوموار میں پیدا کیا منگل اور بدھ میں اس کی روزیوں کو مقرر کیا، آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کو پیدا کیا اور جمعہ کے روز آخری ساعت میں جلدی میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اسی گھڑی میں قیامت برپا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جو جانور بھی پیدا کیا ہے وہ جمعہ کے دن سے ڈرتا ہے مگر انسان اور جن نہیں ڈرتے، علماء تفسیر کا یہی نقطہ نظر ہے مگر امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث روایت کی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز پیدا کیا (1)'' ہم نے اس کی سند کے بارے میں سورۃ الانعام میں گفتگو کی ہے۔

**وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا** قتادہ اور سدی نے کہا: اس میں اس کا سورج، اس کا چاند، اس کے ستارے اور افلاک پیدا کیے اور ہر آسمان میں اس کی مخلوق یعنی فرشتے اور اس میں اس کی مخلوق یعنی سمندر، اولوں اور برفوں کے پہاڑ پیدا کیے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کہا: ہر آسمان میں اللہ تعالیٰ کا ایک گھر ہے جس کا فرشتے حج کرتے ہیں اور طواف کرتے ہیں یہ گھر کعبہ کے مقابلہ میں ہے جو گھر آسمان دنیا میں ہے وہ بیت معمور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ **وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ**

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صفۃ القیامۃ، جلد 2، صفحہ 371

اَمْرَهَا کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جس کا ارادہ کیا اور جس کا حکم دیا ایحاء سے مراد کبھی امر ہوا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزلۃ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ (المائدہ: 111) یعنی میں نے انہیں حکم دیا اور یہ امر تکوین ہے۔

وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ مصابیح سے مراد ایسے ستارے ہیں جو روشن ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر آسمان میں روشن ستارے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو آسمان دنیا کے ساتھ خاص ہیں وَحِفْظًا اس کی تقدیر کلام یہ ہے وحفظنا ھا حفظا یعنی ان شیاطین سے ہم نے اسے محفوظ کیا جو چوری چھپے سنتے تھے۔ یہ ستاروں کے ساتھ جو حفاظت ہے یہ وہی ہے جو شیاطین کو ان کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے جیسا سورۂ حجر میں بیان گذر چکا ہے۔ اس آیت کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ زمین کو آسمان سے پہلے تخلیق کیا گیا، ایک دوسری آیت میں ہے: اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۝ (النازعات) پھر فرمایا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) دحو، خلق سے مختلف چیز ہے اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا پھر آسمانوں کو پیدا کیا پھر زمین کو پھیلا دیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گذر چکی ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝

''پس اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ فرمایئے کہ میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی۔ (کچھ یاد ہے) جب آئے تھے ان کے پاس رسول سامنے سے اور پیچھے سے یعنی (ہر طرف سے) یہ سمجھانے کے لیے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو انہوں نے کہا: اگر ہمارے رب کی مرضی ہوتی کہ ہمیں کچھ سمجھائے تو فرشتے نازل کرتا پس ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے (اس کا سراسر) انکار کرتے ہیں۔ پس قوم عاد نے تو سرکشی اختیار کی زمین میں ناحق اور کہنے لگے: ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا وہ ان سے زیادہ قوی ہے، اور وہ تو ہمیشہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ پس ہم نے بھیج دی ان پر سخت ٹھنڈی ہوا منحوس دنوں میں تاکہ ہم انہیں چکھائیں ذلت آمیز عذاب، اس دنیوی زندگی میں، اور آخرت کا عذاب تو بہت زیادہ رسوا کن ہوگا اور ان

کی ہرگز مدد نہ کی جائے گی"۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر کفار قریش ایمان سے اعراض کریں جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ۝ یعنی ہم نے ڈرایا ہلاکت سے جس طرح عاد اور ثمود کی ہلاکت تھی اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ یعنی ان کی طرف انہیں مبعوث کیا گیا اور ان سے قبل قوموں کی طرف مبعوث کیا گیا اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اَنْ محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جر حذف ہے اصل میں کلام یوں تھی بالا تعبدوا۔ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً یعنی رسولوں کی جگہ فرشتے مبعوث کرتا فَاِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝ یعنی انذار اور تبشیر کا انکار کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان کی طرف سے استہزاء ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلے انہوں نے اقرار کیا ہے کہ ان کی طرف رسول مبعوث ہوئے اس کی بعد انکار اور عناد ہے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ انہوں نے اللہ کے بندوں حضرت ہود اور مومنوں پر تکبر کیا۔ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً جب انہیں عذاب کی دھمکی دی تو انہوں نے اپنے جسموں کی وجہ سے دھوکہ کھایا انہوں نے کہا: ہم اپنی قوت کی زیادتی کی وجہ سے اپنے آپ سے عذاب دور کرنے پر قادر ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لمبے جسموں والے اور موٹے تھے۔ سورۂ اعراف میں بحث گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان میں سے طویل ترین سو ہاتھ اور چھوٹا ساٹھ ہاتھ کا ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً، قوۃ کا معنی قدرت ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ کے قدرت دینے سے قادر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زیادہ قادر ہے وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ۝ وہ ہمارے معجزات کا انکار کرتے تھے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا یہ صاعقہ کی تفسیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر بھیجی تھی ایسی ہوا جو سخت ٹھنڈی تھی آواز شدید اور تیز چل رہی تھی۔ یہ کہا جاتا ہے: اصل میں صرر تھا جو صر سے مشتق ہے جس کا معنی ٹھنڈک ہے درمیانی راء کو فعل کے فاء کلمہ سے بدل دیا جس طرح ان کا قول ہے کبکبوا اصل میں کببوا تھا۔ تجفجف الثوب اصل میں تجفف الثوب ہے۔ ابو عبید نے کہا: صرصرا کا معنی ہے سخت آندھی، عکرمہ اور سعید بن جبیر نے کہا: سخت سرد۔ قطرب نے ابوحطیہ کا قول ذکر کیا:

المُطْعِمون　إذا　هَبَّتْ　بِصِرْصَرَةٍ　والحامِلون إذا اسْتُودُوا على النّاس(1)

جب سخت ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں تو وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور وہ جھنڈے اٹھانے والے ہیں جب لوگوں پر سردار بنایا جائے۔

مجاہد نے کہا: سخت زہریلی (2)۔ معمر نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے اس کا معنی ٹھنڈی ہے؛ یہ عطا نے کہا: کیونکہ صرصر یہ صر سے ماخوذ ہے کلام عرب میں صر سے مراد سرد ہے:

رُكِبْنَ　فی　یومِ　ریحٍ　وصِرّ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 174　2۔ ایضا

ان پر سواری کی جاتی ہے سخت ہوا اور سردی میں۔

سدی نے کہا: سخت آواز (1)۔ اسی سے صرّ القلم والباب، یصر صریرا۔ جب قلم اور دروازہ آواز نکالے یہ جملہ کہا جاتا ہے: درھم صَرِّیٌّ وصِرِّیٌّ۔ جس کی آواز ہو جب اس کی چھان بین کی جائے۔ ابن سکیت نے کہا: صرصر جائز ہے کہ وہ صر سے ہو جس کا معنی ٹھنڈک ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صریر الباب سے مشتق ہو اور الصرۃ سے مشتق ہو جس کا معنی صیحہ ہے اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ (الذاریات: 29) صرصر، عراق میں ایک نہر کا نام ہے۔

فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ منحوس دنوں میں؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ شوال کے آخر میں ایک بدھ سے لے کر اگلے بدھ تک تھے یہی مراد ہیں سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا (الحاقہ: 7) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کسی قوم کو عذاب نہیں دیا گیا مگر بدھ کے روز ہی (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَّحِسَاتٍ کا معنی ٹھنڈے ہیں؛ نقاش نے یہ بیان کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پے در پے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا: سخت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غبار والا؛ یہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے؛ اسی معنی میں راجز کا قول ہے:

قدِ اغْتدَی قبل طُلوعِ الشَّمسِ لِلصَّیْدِ فی یَوْمٍ قَلیلِ النَّحْسِ(3)

وہ سورج کے طلوع ہونے سے قبل شکار کے لیے ایسے دن میں جا پہنچا جس میں غبار کم تھا۔

ضحاک اور دوسرے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تین سالوں تک ان سے بارش کو روکے رکھا اور ہوائیں بارش کے بغیر ان پر خوب چلیں ان میں سے ایک جماعت مکہ مکرمہ کی طرف نکلی تاکہ وہاں بندوں کے لیے دعا کریں۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو کوئی مصیبت آ پہنچتی تو وہ مکہ مکرمہ میں آ کر اللہ تعالیٰ سے کشادگی کو طلب کرتے ان کا مطالبہ اللہ تعالیٰ سے بیت اللہ شریف کے پاس مکہ مکرمہ میں ہوتا وہ مسلمان ہوتے یا کافر ہوتے، مکہ مکرمہ میں کثیر لوگ جمع ہوتے جن کے دین مختلف ہوتے ہر ایک مکہ مکرمہ کی تعظیم کرتا وہ اس کی حرمت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے مرتبہ کو پہچانتا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ اور تیمی نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا تو اللہ تعالیٰ ان پر بارش کو نازل کرتا ہے اور زیادہ ہواؤں کو روک لیتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے بارے میں برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان سے بارش کو روک لیتا ہے اور سخت ہواؤں کو ان پر مسلط کرتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے نَحْسَاتٍ حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے نحوست والے، جو قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نحس مصدر ہے وہ یہ ہے فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ (القمر) اگر یہ صفت ہوتا تو یوم کا لفظ اس کی طرف مضاف نہ ہوتا، ابو عمرو اپنی قراءت پر اسی آیت سے استدلال کیا کرتا تھا؛ ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ ابو عبید نے دوسری قراءت کو پسند کیا ہے کہا: ابو عمرو کی حجت صحیح نہیں کیونکہ اس نے یوم کے لفظ کو نحس کی طرف مضاف کیا ہے اور اس کی حاء کو ساکن کیا یہ دلیل تب ہوتی اگر یوم کو تنوین دی جاتی اور اس کی صفت لگائی جاتی اور اسے ساکن کیا جاتا اور وہ کہتا: فی یوم نحس یہ قراءت کسی نے بھی نہیں کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 174 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 175

جس کو ہم جانتے ہوں۔ مہدوی نے کہا: نخس میں اسکان ہی سنا گیا ہے۔

جوہری نے کہا: فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ میں اسے صفت کے طور پر پڑھا گیا ہے جبکہ اضافت بہت زیادہ اور عمدہ ہے قد نحس الشیٔ فھو نَحِس شاعر نے کہا:

أبلِغْ جزاما ولَخْما أنّ إخوتهم طَيًا وبَهْراء قوم نصرهم نَحِس

جزام اور لخم کو خبر پہنچا دو ان کے بھائی طی اور براء ایسی قوم ہیں جن کی مدد غبار والے دن نے کی۔

اسی معنی میں ہے اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ ہے۔

لِّنُذِیْقَهُمْ تاکہ ہم ان کو چکھائیں۔ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی بانجھ ہوا کے ساتھ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی آخرت کا عذاب بڑا اور شدید ہوگا۔

وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝ وَ نَجَّیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝

"باقی رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے تھے اور (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے) ڈرتے رہتے تھے"۔

وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ یعنی ہم نے ان کے لیے ہدایت اور گمراہی کو واضح کر دیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری، ابن ابی اسحاق اور دوسرے علماء نے اما ثمود نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو سورۃ الاعراف میں گذر چکی ہے۔

فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی انہوں نے ایمان پر کفر کو پسند کیا۔ ابو العالیہ نے کہا: انہوں نے وضاحت پر اندھے پن کو پسند کیا۔ سدی نے کہا: معصیت کو اطاعت پر پسند کیا (1)۔

فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ، الھون ضمہ کے ساتھ ہے جس کا معنی ذلت و رسوائی ہے۔ ہون بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر جو کنانہ اور اسد سے تعلق رکھتا تھا۔ اھانہ اس کو حقیر و خفیف جاننا اس کا اسم ھوان اور مھانہ ہے۔ صاعقہ کو عذاب کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ صاعقہ کہتے ہیں ہلاک کرنے والی چیز کو۔ گویا فرمایا: مهلك العذاب یعنی ایسا عذاب جو مہلک ہے ھون اگرچہ مصدر ہے اس کا معنی أهانه ہے اور أهانه کا معنی عذاب ہے۔ یہ جائز ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی صفت بنا دیا جائے گویا کہا: صاعقة الھون وہ تیرے اس قول کی طرح ہے: عندی علم الیقین اور عندی العلم الیقین۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھون، دون کی طرح ایک اسم ہو یہ جملہ کہا جاتا ہے: عذاب ھون یعنی ایسا عذاب جو ذلیل کرنے والا ہے جس طرح فرمایا: مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ۝ (سبا) ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایسے عذاب کا صاعقہ جو ذلت والا ہے بِمَا كَانُوْا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 175

یَکْسِبُوْنَ ۞ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں جس طرح یہ گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔
وَ نَجَّیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی حضرت صالح علیہ السلام اور جو ایمان لائے تھے یعنی ہم نے انہیں کفار سے ممتاز کر دیا ان پر وہ عذاب نازل نہ ہوا جو کفار پر نازل ہوا تھا، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم تیری قوم کے مومنوں اور ان کے کافروں کے ساتھ یہی معاملہ کریں گے۔

وَ یَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۞ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۞ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞

''اور (ذرا خیال کرو) اس دن کا جب جمع کیے جائیں گے اللہ کے دشمن آتش (جہنم) کی طرف پھر وہ گروہوں میں بانٹ دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب آجائیں گے تو (حساب شروع ہوگا اس وقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے، تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی۔ وہ کہیں گے: (ہم بے بس ہیں) ہمیں تو گویا کر دیا ہے اللہ نے جس نے گویا کیا ہے ہر شے کو اور اسی نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ اور اب اسی کی طرف تم لوٹائے جا رہے ہو''۔

نافع نے نحشر نون کے ساتھ پڑھا ہے اور اعداء کو نصب دی ہے باقی قراء نے یُحْشَرُ یاء مضموم کے ساتھ پڑھا ہے اَعْدَآءُ مرفوع ہے دونوں کا معنی واضح ہے۔ اَعْدَآءُ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور ان کے امر کی مخالفت کی فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ انہیں ہانکا جائے گا اور جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔ قتادہ اور سدی نے کہا: پہلوں کو انکے آخری افراد پر روک لیا جائیگا یہاں تک کہ وہ جمع ہو جائیں گے۔ ابو احوص نے کہا: جب تعداد مکمل ہو جائے گی تو جرم کے اعتبار سے سب سے بڑے پھر اس کے بعد بڑے کا آغاز کیا جائے گا یُوْزَعُوْنَ کے بارے میں گفتگو سورۃ النحل میں مفصل گذر چکی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۞ حَتّٰۤى اِذَا مَا میں ما زائدہ ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ چمڑے بذات خود ان پر گواہی دیں گے۔ سدی اور عبید اللہ بن ابی جعفر اور فراء نے کہا: جلود سے مراد شرمگاہیں ہیں۔ ایک ادیب نے عامر بن جویہ کا شعر پڑھا:

المرءُ یسعی للسلا مة والسلامةُ حسبه
أو سالم من قد تثنّی جلدهُ وابیض رأسه

وَ قَالُوْا یعنی کفار نے کہا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا تم تمہاری جانب سے جھگڑا کیا کرتے تھے تو قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ

الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ انہوں نے کہا: اس اللہ تعالیٰ نے ہمیں گویا کیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا: جب انہوں نے خطاب کیا اور انہیں خطاب کیا گیا تو انہیں ذوی العقول کے قائم مقام رکھا گیا وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی پہلے تم نطفہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر زندگی پیدا کر دی جو اس پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ چمڑے اور دوسرے اعضاء کو گویا کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کلام کا آغاز ہے۔

وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے تو آپ ہنسے، پوچھا گیا: ''کیا تم جانتے ہو میں کس وجہ سے ہنسا ہوں؟'' ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا: ''بندے کے اپنے رب سے خطاب کی وجہ سے ہنسا ہوں۔ بندہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیوں نہیں۔ وہ عرض کرتا ہے: میں اپنے خلاف کسی کو گواہ بننے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اللہ تعالیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: آج تیری ذات تیرے خلاف گواہ ہوگی اور کراماً کاتبین تیرے خلاف گواہ کافی ہوں گے فرمایا: اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی تو اس کے اعضاء کو کہا جائیگا: تم بولو، تو وہ اس کے اعمال کے بارے میں گفتگو کریں گے پھر اسکے اور اس کی گفتگو کے درمیان رکاوٹ ختم کر دی جائے گی تو وہ کہے گا: تمہارے لیے ہلاکت ہو، میں اس لیے تمہاری حفاظت کیا کرتا تھا'' (1)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے پھر کہا جائیگا: ''اب ہم اپنا گواہ تیرے خلاف پیش کرتے ہیں وہ دل میں سوچے گا کون میرے خلاف گواہی دے گا؟ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اس کی ران، اس کے گوشت اور ہڈیوں سے کہا جائیگا: بول، اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے عمل کے بارے میں گفتگو کریں گی یہ اس لیے ہوگا کیونکہ اس نے بکثرت گناہ کیے ہوں گے وہ منافق ہوگا اور یہی وہ شخص ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا (2)'' اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ یَّشْهَدَ عَلَیْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَعْلَمُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۲۲ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ۝۲۳ فَاِنْ یَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ یَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ۝۲۴ وَ قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ۝۲۵

''اور تم چھپا نہیں سکتے تھے اپنے آپ کو اس امر سے کہ گواہی نہ دیں تمہارے خلاف تمہارے کان اور نہ تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں بلکہ تم تو یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہی نہیں تمہارے اکثر اعمال کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد، جلد 2، صفحہ 409　　2۔ ایضاً، أن الأعضاء متطوقة، جلد 2، صفحہ 409

جوتم کرتے ہو۔ اور تمہارے اسی گمان نے جوتم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم ہو گئے نقصان اٹھانے والوں سے۔ پس وہ صبر کریں یا نہ کریں آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے اور اگر وہ (اس وقت) رضائے الٰہی چاہیں گے تو وہ ان میں سے نہیں ہوں گے جن پر اللہ راضی ہوا۔ اور ہم نے مقرر کر دیئے ان کے لیے کچھ ساتھی پس انہوں نے آراستہ کر دکھایا انہیں اگلے اور پچھلے گناہوں کو اور ثابت ہو گیا ان پر فرمان (عذاب) ان قوموں کی طرح جو ان سے پہلے گذر چکی تھیں جنوں اور انسانوں سے وہ سب (اگلے اور پچھلے) نقصان اٹھانے والے تھے"۔

وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ یہ جائز ہے کہ یہ اعضاء کا ان کے لیے قول ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ یا فرشتوں کا قول ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ بیت اللہ شریف کے پاس تین افراد جمع ہوئے دو قریشی تھے اور ایک ثقفی یا دو ثقفی اور ایک قریشی۔ ان کے دلوں میں فہم کم تھا اور پیٹوں کی چربی بہت زیادہ تھی ان میں سے ایک نے کہا: بتاؤ جو ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے سنتا ہے۔ دوسرے نے کہا: اگر ہم بلند آواز سے بات کریں تو وہ سنتا ہے اور اگر ہم خفیہ طریقہ سے بات کریں تو وہ نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا: جب ہم بلند آواز سے بات کریں تو وہ سنتا ہے پھر جب ہم مخفی طریقہ سے بات کریں گے تب بھی وہ سنتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1): وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے کہا: بیت اللہ شریف کے پاس تین آدمی اکٹھے ہوئے پھر حرف حرف اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ہناد، ابو معاویہ سے وہ اعمش سے وہ عمارہ بن عمیر سے وہ عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت نقل کرتے ہیں کہا حضرت عبداللہ نے کہا: میں اپنے آپ کو بیت اللہ شریف کے پردوں سے چھپائے ہوئے تھا کہ تین افراد آئے ان کے پیٹ بڑھے ہوئے تھے اور دانش کم تھی ایک قریشی اور دو اس کے داماد ثقفی یا ایک ثقفی اور دو اس کے داماد قریشی تھے انہوں نے آپس میں گفتگو کی جس کو میں نہ سمجھ سکا ان میں سے ایک نے کہا: بتاؤ، اللہ تعالیٰ ہماری گفتگو سنتا ہے؟ دوسرے نے کہا: جب ہم اپنی آوازیں بلند کریں تو وہ سن لیتا ہے اور جب ہم اپنی آوازوں کو بلند نہ کریں تو نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا: اگر وہ ہماری گفتگو سے کچھ سنتا ہے تو وہ تمام کچھ سن لیتا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا: وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(2)۔ ثعلبی نے کہا: ثقفی عبد یالیل تھا اور اسکے داماد ربیعہ اور صفوان بن امیہ تھے۔

تَسْتَتِرُوْنَ کا اکثر علماء کے نزدیک معنی ہے جسے تم چھپاتے ہو یعنی جسے اپنے نفوس سے چھپاتے ہو کہ اعضاء تمہارے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، و ذالکم ظنکم، جلد 2، صفحہ 713

2۔ جامع الترمذی، باب و من سورۃ حم السجدہ، حدیث نمبر 3171-3172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خلاف گواہی نہ دیں کیونکہ انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے نفس سے کوئی عمل چھپا سکے پس استخفاء، معصیت کو ترک کرنے کے معنی میں ہوگا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: استتار، اتقاء کے معنی میں ہے یعنی تم دنیا میں تقویٰ اختیار کرنے والے نہیں کہ آخرت میں تمہارے اعضاء تمہارے خلاف کوئی گواہی دیں گے تو تم اس شہادت کے خوف سے معاصی کو ترک کر دو؛ یہ معنی مجاہد نے بیان کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ یعنی تم گمان نہیں رکھتے کہ وہ کہے میں نے حق کو سنا اور میں نے یاد نہیں رکھا اور میں نے وہ بات سنی جو معاصی میں سے تھی اور سننا جائز نہ تھی وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ یعنی وہ کہیں: میں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو دیکھا اور میں نے عبرت حاصل نہ کی اور میں نے ایسی چیز کو دیکھا جو جائز نہ تھی وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَعْلَمُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ لیکن تمہارا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزوں کو نہیں جانتا جنہیں تم جانتے ہو پس تم اس بات پر جھگڑتے ہو یہاں تک کہ تمہارے اعضاء تمہارے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے۔

بہز بن حکیم نے اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اَنْ یَّشْهَدَ عَلَیْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ کی تفسیر کے بارے میں روایت نقل کرتے ہیں ''قیامت کے روز تمہیں بلایا جائیگا تمہارے مونہوں میں فدام (جانور کے منہ پر ایسی چیز چڑھانا کہ وہ چر نہ سکے) چڑھایا گیا ہوگا انسان کے اعمال کے بارے میں سب سے پہلے جو چیز وضاحت کرے گی وہ اس کی ران اور ہتھیلی ہوگی''۔ عبداللہ بن عبدالاعلی شامی نے کہا اور خوب کہا:

العُمْرُ يَنْقُصُ والذُّنوب تَزِيدُ وتُقالُ عَثَراتُ الفتى فيعودُ
هل يستطيعُ جُحُودَ ذنبٍ واحدٍ رجلٌ جوارِحُه عليه شُهودُ
والمرءُ يسأل عن سِنيهِ فيشتهي تقليلَها وعنِ المماتِ يحيدُ

عمر کم ہو رہی ہے اور گناہ بڑھ رہے ہیں نوجوان کی لغزشوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور واپس لوٹتا ہے۔ کیا کوئی انسان کسی ایک گناہ کے انکار کی طاقت رکھتا ہے جبکہ اعضاء اس پر گواہ ہیں۔ انسان سے اس کی عمر کے بارے میں پوچھا جاتا ہے وہ کمی کی خواہش کرتا ہے اور موت سے پہلو تہی کرتا ہے۔

حضرت معقل بن یسار، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''کوئی دن جو انسان پر آتا ہے نہیں ہے مگر وہ اعلان کرتا ہے اے انسان! میں نئی مخلوق ہوں جو کچھ تو کرے گا میں کل تیرے خلاف اس پر گواہ ہوں گا مجھ میں اچھا عمل کر میں کل تیرے حق میں گواہی دوں گا اگر میں ایک دفعہ گذر گیا تو مجھے کبھی نہیں دیکھے گا اور رات بھی اسی طرح کہتی ہے(1)''۔ ابونعیم حافظ نے اسے ذکر کیا ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرۃ'' میں زمیں، راتوں، دنوں اور مال کی شہادت کے بارے میں کیا ہے۔ محمد بن بشیر نے کہا اور خوب کہا:

مَضَى أمسُك الأدنى شَهيدًا معدَّلًا ويومُك هذا بِالفِعالِ شهيدُ

1۔ کتاب التذکرہ، جلد 1، صفحہ 389

فإنْ تكُ بِالأمسِ اقترفت إساءةً		فثنِّ بِإحسانٍ وأنتَ حميدُ
ولا تُرْجِ فِعْلَ الخير مِنك إلى غدٍ		لعلّ غدًا يأتِي وأنت فقِيدُ

تیرا قریبی کل گذر گیا جو ایسا گواہ ہے جس کو عادل قرار دیا گیا ہے تیرا یہ دن اعمال پر گواہی دینے والا ہے اگر تو نے گذشتہ کل برا عمل کیا ہے تو دوگنا احسان کر جبکہ تو محمود ہے۔ اچھے عمل کو کل تک موخر نہ کر ممکن ہے کل آئے اور تو نہ ہو۔

وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ یعنی تمہیں ہلاک کر دے اور تمہیں جہنم میں داخل کر دے، قتادہ نے کہا: یہاں ظن کا لفظ علم کے معنی میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا يموتنَّ أحدُكم إلّا وهو يحسن الظنّ بالله فإنّ قوما أساءوا الظنّ بربّهم فأهلكم تم میں سے کوئی آدمی نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو اگر کوئی قوم اپنے رب کے بارے میں سوء ظن رکھے تو وہ انہیں ہلاک کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ کا یہی مطلب ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا: کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں آرزوؤں نے غافل کر دیا ہے (1) یہاں تک کہ وہ دنیا سے نکلے تو ان کے لیے کوئی نیکی نہ تھی ان میں سے ایک کہتا ہے: میں اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہوں اور وہ جھوٹ بولتا ہے اگر وہ اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا تو حسن عمل کرتا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کی۔ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قتادہ نے کہا: جو آدمی یہ طاقت رکھتا ہو کہ وہ مرے تو اپنے رب کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہو تو وہ ایسا کرے کیونکہ گمان دو طرح کے ہیں ایک ظن نجات دیتا ہے اور ایک ظن ہلاک کرتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بدکاریاں کرتے رہے تھے اور ان سے توبہ نہ کرتے تھے، وہ مغفرت کے بارے میں گفتگو کرتے تھے یہاں تک کہ وہ دنیا سے مفلس کی حیثیت سے نکلے پھر اس آیت کو پڑھا: وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾۔

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ اگر وہ دنیا میں جہنمیوں کے اعمال پر صبر کرتے رہے تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہو گا اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ (بقرہ) جس طرح یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا اگر دنیا میں رضاء الٰہی کے طالب ہوتے جبکہ وہ اپنے کفر پر قائم ہوں تو انہیں اللہ کی رضا نصیب نہیں ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر وہ جہنم میں صبر کریں یا وہ جزع فزع کریں تو جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہے اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جزع پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا کیونکہ مستعتب جزع کرتا ہے اور معتب اسے کہتے ہیں جس کی جزع قبول ہو، نابغہ نے کہا:

فإن أكُ مظلومًا فعَبْدٌ ظلمتَه		وإن تكُ ذا عُتْبى فمِثْلُك يُعتِبُ

اگر میں مظلوم ہوں تو ایسا بندہ ہوں جس پر تو نے ظلم کیا اگر تو رضا والا ہے تو تیری مثل ہی ناراضگی کا سبب دور کرتا ہے۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 416

یعنی تیری مثل ہی وہ ذات ہے جو صالحیت کو قبول کرتی ہے اور مراجعت کو قبول کرتی ہے جب اس سے اس کا سوال کیا جائے۔ خلیل نے کہا: عتاب سے مراد ہے محبت سے خطاب کرنا اور ناراضگی کا ذکر کرنا تو کہتا ہے: عاتبته معاتبة۔ میں نے اس سے ناراضگی اور محبت کے ساتھ اظہار کیا یہ کہا جاتا ہے: بینھم أعتوبة یتعاتبون بھا۔ یہ جملہ بھی کہا جاتا ہے: إذا تعاتبوا أصلح مابینھم العتاب أعتبنی فلان، جب وہ ناراضگی سے میری خوشی کی طرف لوٹا۔ اس سے اسم عتبی آتا ہے اس سے مراد جس پر عتاب کیا جا رہا تھا وہ اس امر کی طرف لوٹا جس سے عتاب کرنے والا راضی ہوتا ہے۔ استعتب اور اعتب کا معنی ایک ہی ہے۔ استعتب کا معنی یہ بھی ہے کہ اس نے رضامندگی کا مطالبہ کیا تو کہتا ہے: استعتبته فاعتبنی میں نے اسے راضی کرنا چاہا تو اس نے مجھے راضی کر دیا۔ وَ اِنْ یَّسْتَعْتِبُوْا معنی ہے انہوں نے رضا کو طلب کیا تو اس طلب نے انہیں کچھ نفع نہ دیا بلکہ ان کے لیے جہنم ضروری ہے۔ تفاسیر میں یہ معنی لکھا ہوا ہے اگر وہ اپنے رب سے بخشش کے طالب ہوں گے تو وہ بخشے جانے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے (1)۔ عبید بن عمیر اور ابو العالیہ نے اسے پڑھا أن یُسْتَعْتَبوا یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ ﴿﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی طرف لوٹا دے تب بھی وہ اس کی اطاعت والے عمل نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہے کہ وہ بد بخت ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام: 28) یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلب نے کہا: جب وہ ناراض ہو تو کہا جاتا ہے اعتب، جب وہ راضی ہو تو کہتے ہیں اعتب (2)۔

وَ قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ نقاش نے کہا: ہم نے ان کے لیے شیاطین کو تیار کر دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے ان پر ایسے شیاطین مسلط کر دیے ہیں جو ان کے ہاں معاصی کو مزین کر کے پیش کرتے ہیں یہ جنوں، شیاطین اور انسانوں میں سے قرناء ہوں گے یہ کہا جاتا ہے: قیض اللہ فلانا بفلان۔ وہ اس کے پاس اسے لایا اور اس نے اس کے لیے قصد کیا اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ۔ قشیری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے میرے لیے رزق کو مقرر کیا جس طرح میں اسے طلب کرتا تھا تقیض کا معنی بدل دینا ہے اسی سے مقایضہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: قایضتُ الرجلَ مقایضة یعنی میں نے اس کے ساتھ سامان کے ساتھ مبادلہ کیا۔

فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ، مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ سے مراد امور دنیا ہیں ان شیاطین نے اسے ان کے لیے مزین کیا یہاں تک کہ اسے آخرت پر ترجیح دی وَ مَا خَلْفَهُمْ ان کی موت کے بعد مزین کیا اور انہیں امور آخرت کی تکذیب کی طرف دعوت دی؛ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ یعنی جہنم میں فَزَیَّنُوْا لَهُمْ دنیا میں ان کے اعمال کو مزین کیا معنی ہے ہم نے ان پر مقرر کیا کہ ایسا ہوگا اور ہم نے ان کے خلاف اس کا فیصلہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے انہیں اقران کا محتاج کر دیا یعنی ہم نے فقیر کو غنی کا محتاج کر دیا تا کہ وہ اس سے لے اور غنی کو فقیر کا محتاج کر دیا ہے تا کہ وہ اس سے مدد لے تو ان میں سے بعض نے بعض کے لیے معاصی کو مزین کیا وَ مَا خَلْفَهُمْ کا عطف مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ پر نہیں بلکہ معنی ہے انہوں نے آخرت کو ان سے بھلا دیا، اس میں اضمار ہے۔ حضرت ابن عباس

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 177 2۔ ایضاً

رضی اللہ عنہما نے کہا: مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد ہے ان کا امور آخرت کو جھٹلانا اور وَ مَا خَلْفَهُمْ سے مراد ہے دنیا میں رغبت دلانا۔ زجاج نے کہا: مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد ہے جو انہوں نے اعمال کیے (1) وَ مَا خَلْفَهُمْ سے مراد ہے انہوں نے جن اعمال کا ارادہ کیا۔ مجاہد کا قول پہلے گذر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے گناہ کیے اور وَ مَا خَلْفَهُمْ سے مراد جو ان کے بعد عمل کیا جاتا رہا۔

وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيٓ أُمَمٍ ان پر عذاب ثابت ہو گیا جو عذاب ان سے قبل امتوں پر ثابت ہوا تھا جو کافر ہوئے جس طرح انہوں نے کفر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِيٓ، مع کے معنی میں ہے معنی ہوگا وہ کافر امتوں کے ساتھ داخل ہوں گے جو ان سے قبل ہوئیں ایسے امور میں جن میں وہ داخل ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِيٓ أُمَمٍ، فی جملة أمم کے معنی میں ہے اسی کی مثل شاعر کا قول ہے:

إنْ تَكُ عَنْ أَحْسَنِ الصَّنِيعَةِ مَأْ فُوكًا فَفِي آخَرِينَ قد أفكوا

شاعر یہ ارادہ کرتا ہے تو آخرین کے زمرہ میں ہے تو کوئی اکیلا نہیں۔ فِيٓ أُمَمٍ محل نصب میں ہے عَلَيْهِمُ کی ضمیر سے حال ہے تقدیر کلام یہ ہوگی حق علیهم القول کائنین فی جُملة أُمَم۔

إِنَّهُمْ كَانُوا خٰسِرِينَ ۝ دنیا میں اپنے اعمال میں خسارہ اٹھانے والے اور قیامت کے روز اپنی ذاتوں اور اہل میں خسارہ اٹھانے والے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ۝٢٦ فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٢٧ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ ۝٢٨ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْاَسْفَلِينَ ۝٢٩

''اور کہنے لگے وہ کافر: مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان شاید تم اس طرح غالب آ جاؤ۔ پس ہم ضرور چکھائیں گے کفار کو شدید عذاب کا مزہ اور انہیں بدلہ دیں گے بہت برا اس (نافرمانی) کا جو وہ کیا کرتے تھے۔ یہ ہے سزا اللہ کے دشمنوں کی یعنی آگ، ان کے لیے اس میں ہی ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے، یہ سزا ہے اس بات کی کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ اور کافر کہیں گے: اے ہمارے رب ہمیں دکھا وہ دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے ہم انہیں روند ڈالیں گے اپنے قدموں کے نیچے تاکہ وہ ہو جائیں پست ترین لوگوں سے''۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 178

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ جب الله تعالیٰ نے قوم ہود، قوم صالح اور دوسرے لوگوں کے کفر کا ذکر کیا تو قریش کے مشرکین کے بارے میں خبر دی اور یہ بتایا کہ انہوں نے قرآن کو جھٹلایا اور کہا: لَا تَسْمَعُوْا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَا تَسْمَعُوْا کا معنی ہے تم اطاعت نہ کرو یہ جملہ کہا جاتا ہے: سمعتُ لك، یعنی میں نے تیری اطاعت کی وَالْغَوْا فِيْهِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ابوجہل نے کہا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھیں تو اس کے سامنے چیخنا چلانا شروع کر دیا کرو تا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے نہ سمجھا جا سکے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب قرآن نے انہیں عاجز کر دیا تھا تو اس وقت انہوں نے کہا: مجاہد نے کہا: شور مچانے، سیٹیاں بجانے اور گفتگو میں خلط ملط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لغو ہو جائے (1)۔

ضحاک نے کہا: زیادہ گفتگو کیا کرو تا کہ جو کچھ وہ کہیں وہ خلط ملط ہو جائے۔ ابو العالیہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہے: اس میں عیب لگاؤ۔

لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ ممکن ہے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت پر غالب آ جاؤ نہ وہ لوگوں پر غالب آئیگا اور نہ وہ دلوں کو مائل کرے گا۔

عیسیٰ بن عمر جحدری، ابن ابی اسحاق، ابوحیوہ اور بکر بن حبیب سہمی نے اسے والغُوا پڑھا ہے یہ لغا یلغو کی ایک لغت ہے۔ جماعت کی قراءت لغِی یَلْغَی مہدوی نے کہا: وَالْغَوْا فِيْهِ کا معنی ہے اس کا سامنا ایسی کلام سے کرو جو سمجھ نہ آتی ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے لغوت، الغُو اُلْغَی لغِی، یَلْغَی۔ یہ تین لغتیں ہیں۔ لغو کا معنی سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے۔ لغو اسے کہتے ہیں جس کی حقیقت کا علم نہ ہو۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا یہ بحث پہلے گذر چکی ہے کہ ذوق محسوس ہوا کرتا ہے۔ عذاب شدید کا معنی یہ ہے جو پے در پے ہو منقطع نہ ہو ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد تمام اجزاء میں عذاب ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یعنی ہم آخرت میں ان کے ان برے اعمال کی جزا دیں گے جو عمل وہ دنیا میں کرتے رہے۔ اور اعمال میں سے سب سے برا شرک ہے۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ یعنی وہ عذاب شدید الله تعالیٰ کے دشمنوں کی جزا ہے۔ پھر الله تعالیٰ نے اس کی وضاحت النَّارُ سے کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے ذلك جزاء اعداء الله النار دار الخلود پڑھا ہے دار کو النار سے تعبیر کیا یہی آیت کا معنی ہے ذلك مبتدا ہے اور جزاء اس کی خبر ہے النار، جزا سے بدل ہے یا مضمر مبتدا کی خبر ہے اور جملہ پہلے جملہ کے بیان کے محل میں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وہ جہنم میں یہ بات کریں گے۔ اسے ماضی کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا مراد مستقبل ہے رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، الذین سے مراد ابلیس اور حضرت آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا؛ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء سے یہ مروی ہے اس قول کی تائید حدیث مرفوع کرتی ہے مَا مِنْ مُسْلِمٍ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 178

يُقْتَلُ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابن آدم الأوّل كفل من ذنبه لأنّه أوّل من سنّ القتل (1) جو مسلمان بھی ظلماً کسی کو قتل کرتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے پر اس کے گناہ کا حصہ ہوتا ہے کیونکہ اس نے ہی سب سے پہلے قتل کیا تھا۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الَّذَيْنِ اسم موصول تثنیہ ذکر کیا ہے مگر مراد جنس ہے کیونکہ دونوں جنسیں مختلف ہیں۔

نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ۝ انہوں نے یہ سوال اس لیے کیا تا کہ ان سے شفا حاصل کریں کہ انہیں اپنے قدموں کے نیچے رکھیں الْأَسْفَلِينَ سے مراد ہے کہ وہ سب سے نچلے گڑھے میں ہوں۔ انہوں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ اس کے لیے عذاب کو کئی گنا کر دے جو جن وانس میں سے ان کی گمراہی کا سبب بنا تھا۔ ابن محیصن اور سوسی نے ابو عمرو، ابن عامر، ابو بکر اور مفضل نے اسے أَرْنَا پڑھا ہے یعنی راء ساکن ہے۔ ابو عمرو نے اس میں اختلاس کا قاعدہ جاری کیا ہے باقی نے کسرہ میں اشباع کا قاعدہ جاری کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۝

''بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا: ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے، اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ شے ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو گے۔ یہ مہربانی ہے بہت بخشنے والے ہمیشہ رحم فرمانے والے کی طرف سے''۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، اس کی وجہ یہ بنی کی مشرکین نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں تو انہوں نے استقامت کا مظاہرہ نہ کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارا رب وحدہ لاشریک ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو آپ نے استقامت کا مظاہرہ کیا۔

ترمذی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (3) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قراءت کی إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فرمایا: ''لوگوں نے یہ کہا پھر ان میں سے اکثر نے کفر کیا جو اس پر مر گیا تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے استقامت کا مظاہرہ کیا''۔ کہا یہ حدیث غریب ہے۔ اس آیت کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق،

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، ماجاء فی الدال، جلد 2، صفحہ 92

2۔ ایضاً، باب ماجاء الدال علی الخیر کفاعلہ، حدیث نمبر 2597، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ سجدہ، جلد 2، صفحہ 157

حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم سے معنی مروی ہے۔

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی سے صحیح مسلم میں روایت مروی ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام میں ایک ایسی نصیحت کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی سے بھی سوال نہ کروں (1)۔ فرمایا: ''کہہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پھر اس پر استقامت کا اظہار کر''۔ ترمذی نے اس کا اضافہ کیا ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جس چیز کے بارے میں آپ مجھ پر زیادہ خوف کھاتے ہیں وہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی فرمایا: ''یہ'' (2) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کا معنی ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کیا۔ اسود بن بلال نے ان سے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: تم ان دو آیات کے بارے میں کیا کہتے ہو اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ انہوں نے جواب دیا: انہوں نے استقامت کا مظاہرہ کیا اور گناہ نہ کیے اور اپنے ایمان کو خطا کے ساتھ خلط ملط نہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے اسے ایسے معنی پر محمول کیا ہے جو اس کا معنی نہیں ہے قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا مراد ہے وہ کسی اور الہ کی طرف متوجہ نہ ہوئے اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ (الانعام: 82) انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہ کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے طریقہ پر قائم رہے پھر انہوں نے لومڑی کے مکر جیسے مکر نہ کیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے پھر انہوں نے عمل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: انہوں نے فرائض ادا کیے۔ تابعین کے اقوال بھی اسی معنی میں ہیں۔

ابن زید اور قتادہ نے کہا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اطاعت کا مظاہرہ کیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے امر پر مستقیم رہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجالاتے رہے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا (3)۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت پر مستقیم رہے یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے۔ سفیان ثوری نے کہا: اس کے موافق عمل کیا۔ ربیع نے کہا: انہوں نے ماسوی اللہ سے اعراض کیا۔

فضیل بن عیاض نے کہا: فانی دنیا میں زہد اختیار کیا اور باقی (آخرت) میں رغبت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے مخفی طریقہ سے استقامت کا مظاہرہ کیا جس طرح اقرار میں استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے فعل میں اسی طرح استقامت کا مظاہرہ کیا جس طرح قول میں استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: رب کعبہ کی قسم! وہ میری امت ہیں۔ امام ابن فورک نے کہا: اس میں سین، طلب کی سین ہے جس طرح استسقی میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جامع اوصاف الاسلام، جلد 1، صفحہ 48

2۔ جامع الترمذی، باب ما جاء فی حفظ اللسان، حدیث نمبر 2334، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 417

سوال کیا کہ وہ انہیں دین پر ثابت رکھے۔ حضرت حسن بصری جب اس آیت کو پڑھا کرتے تو کہتے: اے اللہ! تو ہمارا رب ہے ہمیں استقامت عطا فرما (1)۔

میں کہتا ہوں: اگر چہ ان اقوال میں مفہوم باہم ملا ہوا ہے ان کی تلخیص یہ ہے عقیدہ، قول اور عمل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اعتدال سے کام لو اور اس پر ہمیشگی اختیار کرو۔

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ابن زید اور مجاہد نے کہا: یہ موت کے وقت ہوگا (2)۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا: جب وہ اپنی قبروں سے بعث کے لیے کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آخرت میں فرشتوں کی جانب سے ان کے لیے بشارت ہوگی۔ وکیع اور ابن زید نے کہا: بشارت تین مقامات پر ہوگی موت، قبر اور دوبارہ اٹھانے کے وقت (3)۔

اَلَّا تَخَافُوْا اصل میں بأَلّاتخافوا تھا تو حرف جار کو حذف کر دیا گیا۔ مجاہد نے کہا موت سے نہ ڈرو۔ وَ لَا تَحْزَنُوْا اپنی اولاد پر غم نہ کھاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارا ان پر نائب ہے۔ عطا بن ابی رباح نے کہا: اپنے ثواب کے رد کا خوف نہ کرو کیونکہ وہ مقبول ہے، اپنے گناہوں کا غم نہ کرو کیونکہ میں انہیں تمہارے حق میں بخشنے والا ہوں۔ عکرمہ نے کہا: آنے والے وقت کا خوف نہ کرو اور اپنے گناہوں پر غمگین نہ ہو۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ یہ بات انہیں فرشتے کہیں گے جو بشارت لے کر ان پر نازل ہوں گے۔ مجاہد نے کہا: ہم تمہارے ساتھی ہیں دنیا میں ہم تمہارے ساتھ تھے جب قیامت کا دن ہوگا تو کہیں گے: ہم تم سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تمہیں جنت میں داخل کر دیں۔ سدی نے کہا: ہم دنیا میں تمہارے اعمال کے محافظ تھے اور آخرت میں تمہارے دوست ہوں گے (4)۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قول ہو کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی اور مولیٰ ہے۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ یعنی لذت والی چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ جو تم سوال کرتے ہو اور جس کی تم تمنا کرتے ہو نُزُلًا سے مراد رزق اور ضیافت ہے۔ سورۂ آل عمران مین یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے انزلناہ نزلا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نازل کی جمع ہے تقدیر کلام یہ ہوگی لکم ماتدعون نازلین، تَدَّعُوْنَ میں جو ضمیر مرفوع ہے اس سے حال ہے یا لَكُمْ میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 417　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 180　　3۔ ایضاً　　4۔ ایضاً

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۶﴾

''اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہے جس نے دعوت دی الله کی طرف اور نیک عمل کیے اور کہا کہ میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں سے ہوں۔ نہیں یکساں ہوتی نیکی اور برائی، برائی کا تدارک اس نیکی سے کرو جو بہتر ہے ناگہاں وہ شخص تیرے اور اس کے درمیان میں عداوت یوں بن جائیگا گویا تمہارا جانی دوست ہے۔ اور نہیں توفیق دی جاتی ان خصائل حمیدہ کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نہیں توفیق دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو۔ اور اے سننے والے! اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اس کے شر سے الله کی پناہ مانگ، یقیناً وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

**وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا** جنہوں نے قرآن میں لغوبات کرنے کی ایک دوسرے کو وصیت کی تو انہیں شرمندہ کیا جارہا ہے معنی ہے قرآن سے بہتر کون سا کلام ہے اور الله تعالیٰ اور اس کی اطاعت کی طرف دعوت دینے والے سے بہتر قول میں کون اچھا ہوسکتا ہے؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ ابن سیرین، سدی، ابن زید اور حسن بصری نے کہا: وہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (1)۔ حضرت حسن بصری جب یہ آیت پڑھتے تو کہتے: یہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ حبیب الله ہیں، یہ الله کے ولی ہیں، یہ الله تعالیٰ کے چنے ہوئے ہیں، یہ الله تعالیٰ کی بہترین مخلوق ہیں، الله کی قسم! یہ الله تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے محبوب ہیں، الله تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور لوگوں کو ایسے امر کی طرف دعوت دی جس کو الله تعالیٰ نے قبول کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ، عکرمہ، قیس بن ابی حاتم اور مجاہد نے کہا: یہ آیت موذنوں کے حق میں نازل ہوئی۔ فضیل بن رفیدہ نے کہا: میں حضرت عبدالله بن مسعود کے اصحاب کا موذن تھا مجھے عاصم بن ہبیرہ نے کہا: جب تو آذان کہے اور تو کہے: الله اکبر الله اکبر لا الہ الا الله، تو کہہ میں مسلمانوں میں سے ہوں پھر اس آیت کی تلاوت کی۔

ابن عربی نے کہا: پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور آذان مدنی ہے آذان آیت میں معنی کے اعتبار سے داخل ہو جائے گی نہ یہ کہ یہ قول کے وقت مقصود تھی اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی داخل ہوں گے جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس وقت کہا جب ملعون لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے کو دبایا: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (غافر: 28) یہ آیت ان تمام کلاموں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جن میں توحید اور ایمان کا ذکر ہو۔

میں کہتا ہوں: تیسرا قول ہے یہ سب سے اچھا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ آیت ہر اس آدمی میں عام ہے جس نے الله تعالیٰ کی طرف دعوت دی (2)۔ قیس بن ابی حازم نے یہی کہا ہے کہا: یہ ہر مومن کے بارے میں نازل ہوئی وَ عَمِلَ صَالِحًا کا معنی ہے آذان اور اقامت کے درمیان نماز۔ ابو امامہ نے کہا: آپ نے آذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھی۔ عکرمہ نے کہا: وَ عَمِلَ صَالِحًا سے مراد ہے نماز پڑھی اور روزہ رکھا۔ کلبی نے کہا: فرائض ادا کیے (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ سب سے اچھی تعبیر ہے جبکہ وہ محارم سے اجتناب اور مستحب امور کو کثرت سے بجالائے۔ الله تعالیٰ بہتر

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 418　　2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 419　　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 181

جانتا ہے وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ابن عربی نے کہا: جو بحث پہلے گذر چکی ہے(1) وہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں اسلام مراد ہے لیکن جب قول اور تلوار کے ساتھ دعوت اعتقاد اور غلبہ کے لیے ہوتی ہے اور عمل ریاء اور اخلاص کے لیے ہوسکتا ہے یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وضاحت ضروری ہے ان سب میں اعتقاد اللہ کے لیے ہے اور عمل اس کی رضا کی خاطر ہے۔

مسئلہ: جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ اسے یہ نہیں فرمایا کہ کہے: ان شاء اللہ۔ اس میں اس آدمی کا رد ہے جو یہ کہتا ہے: أنا مسلم ان شاء اللہ۔

وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ فراء نے کہا: لا زائدہ ہے کلام یوں ہے ولا تستوی الحسنۃ والسیئۃ اور یہ شعر پڑھا:

ما كان يَرْضَى رسولُ الله فِعْلَهُمُ　والطَّيِّبانِ أبو بكر ولاعمرُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر دونوں پاکیزہ ہستیاں ان کے عمل پر راضی نہ تھے۔ شعر میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا ارادہ کیا یعنی توحید جس پر آپ ہیں اور شرک جس پر مشرک ہیں برابر نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حسنہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور سیئہ شرک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حسنہ سے مراد طاعت ہے اور سیئہ سے مراد شرک ہے بعینہ یہ پہلا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حسنہ سے مراد عفو و درگزر ہے اور سیئہ سے مراد انتقام ہے۔ ضحاک نے کہا: حسنہ سے مراد علم ہے اور سیئہ سے مراد فحش ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حسنہ سے مراد آل رسول سے محبت ہے اور سیئہ سے مراد ان سے بغض ہے(2)۔

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ آیت سیف کی وجہ سے یہ منسوخ ہے اور اس میں سے مستحب باقی ہے وہ حسن معاشرت، برداشت کرنا اور چشم پوشی کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آدمی تیرے ساتھ جہل سازی کرتا ہے اپنے حلم کے ساتھ اس کے جہل کو دور کرے۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: مراد ایسا آدمی ہے جو دوسرے کو گالی دیتا ہے دوسرا کہتا ہے: اگر تو سچا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے بخش دے، اسی طرح ایک اثر مروی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہی بات ایک ایسے آدمی سے کہی جس سے آپ نے اس قسم کی اذیت پائی تھی۔

مجاہد نے کہا: بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ سے مراد یہ ہے سلام کہنا جب وہ اپنے دشمن سے ملے؛ یہ عطا کا قول ہے۔ ایک تیسرا قول ہے جو قاضی ابو بکر بن عربی نے احکام میں ذکر کیا ہے(3) جو مصافحہ ہے ایک اثر میں ہے تصافحوا یذھب الغل(4) باہم مصافحہ کیا کرو کینہ جاتا رہتا ہے۔ امام مالک مصافحہ کی رائے نہ رکھتے تھے آپ کی سفیان کے ساتھ ملاقات ہوئی اور مصافحہ کے بارے میں گفتگو کی۔ سفیان نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر طیار سے اس وقت مصافحہ کیا تھا جب آپ حبشہ سے واپس لوٹے تھے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ حکم خاص ہے۔ سفیان نے ان سے کہا: جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے وہ ہمارے لیے بھی خاص ہے جو آپ کے لیے عام ہے وہ ہمارے لیے بھی عام ہے، مصافحہ ثابت ہے اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1662
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 182
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1663
4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، ماجاء فی المهاجرة، صفحہ 7-706

کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

قتادہ نے روایت کی ہے کہا میں نے حضرت انس سے کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مصافحہ کا معمول تھا(1)؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ایک اثر ہے: محبت کا کمال ہاتھ پکڑنا ہے۔ محمد بن اسحاق (جو امام مقدم ہے) زہری سے وہ عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت زید بن حارثہ مدینہ طیبہ آئے جبکہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تھے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے اس کی طرف بڑھے جبکہ جسم پر پورا لباس نہ تھا الله کی قسم! میں نے اس سے قبل اور اس کے بعد آپ کو بے لباس نہ دیکھا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ معانقہ کیا اور اسے بوسہ دیا(2)۔

میں کہتا ہوں: امام مالک سے مصافحہ کا جواز مروی ہے یہی علماء کی جماعت کا نقطہ نظر ہے۔ سورۂ یوسف میں یہ بحث گذر چکی ہے وہاں ہم نے حضرت براء کی حدیث کا ذکر کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں ان میں سے ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑتا ہے وجہ دونوں میں محبت اور خلوص ہوا کرتی ہے تو ان کے گناہ ان دونوں کے درمیان گرا دیے جاتے ہیں'' (3)۔

**فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَكَ وَ بَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ۞ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ** یعنی قریبی دوست۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت ابوسفیان بن حرب کے حق میں نازل ہوئی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچایا کرتا پہلے وہ دشمن تھا بعد مین رشتہ مصاہرت کی وجہ سے دوست بن گیا پھر وہ اسلام لے آیا۔ اسلام میں ولی اور قرابت میں حمیم بن گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دیا کرتا الله تعالیٰ نے نبی کریم کو اس پر صبر اور درگزر کا حکم دیا؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے(4)۔ پہلا قول ثعلبی اور قشیری نے ذکر کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَكَ وَ بَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ۞** ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے حکم تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الله تعالیٰ نے اس آیت میں غضب کے وقت صبر، جہل کے وقت حلم، زیادتی کے وقت عفو کا حکم دیا جب لوگ ایسا کرتے ہیں تو الله تعالیٰ انہیں شیطان سے محفوظ رکھتا ہے اس کے دشمن کو زیر کر دیتا ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی شیر خدا کے غلام قنبر کو گالی دی حضرت علی شیر خدا نے اپنے غلام کو آواز دی: اے قنبر! اپنے گالی دینے والے کو چھوڑ دو، اس سے بے نیاز ہو جا رحمٰن تجھ سے راضی ہوگا شیطان ناراض ہوگا اور تو اپنے گالی دینے والے کو سزا دے گا احمق کو اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں کہ اس کو جواب نہ دیا جائے انہوں نے یہ اشعار ذکر کیے:

وَلَلْكَفُّ عن شَتْم اللئيم تَكَرُّمًا أَضَرُّله مِنْ شَتْمِهِ حين يُشْتَمُ

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان، ما جاء فی المصافحہ، جلد 2، صفحہ 97

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان، ما جاء فی المصافحۃ، جلد 2، صفحہ 98-97

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی المصافحۃ، جلد 2، صفحہ 352

4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 182

شرافت کی بنا پر کمینے آدمی کو گالی پر جواب نہ دینا اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہے بنسبت اس کے کہ گالی کے وقت اسے گالی دی جائے۔

ایک اور نے کہا:

وما شیءٌ أحبُّ إلى سفیهٍ إذا سَبَّ الكَرِیمَ مِن الْجَوَابِ

مُتَارَكَةُ السَّفِیهِ بلا جوابٍ أَشَدُّ على السَّفِیهِ من السِّبابِ

بے وقوف کے لیے جو سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں جب وہ جو کریم کو گالی دے۔ جواب کے بغیر سفیہ کو چھوڑ دینا سفیہ بے وقوف کے لیے گالی دینے سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

محمود وراق نے کہا:

سَأُلزِمُ نفسِي الصَّفحَ عن كلّ مذنِبٍ وإن كَثُرَتْ منه لَدَيّ الْجَرائمُ

میں ہر گناہگار سے درگذر کرنا اپنے اوپر لازم کرتا ہوں اگرچہ اس کے جرائم میرے ہاں بہت زیادہ ہو جائیں۔

فما الناس إلّا واحِدٌ من ثلاثةٍ شریفٌ ومَشْروفٌ ومِثْلٌ مقاوِمُ

فأمّا الذی فَوْقِی فَأعرِفُ قَدْرَهُ وَأَتْبَعُ فیه الْحَقَّ وَالحَقُّ لازِمُ

لوگ تینوں میں سے ایک ہی ہوتا ہے شریف، کمینہ اور مدمقابل جو مجھ سے بلند مرتبہ ہے میں اس کی قدرو منزلت کو پہچانتا ہوں اور میں اس کے بارے میں حق کی اتباع کرتا ہوں اور حق لازم ہے۔

وأمّا الذِی دونِی فإنْ قال صُنْتُ عن إجابَتِه عِرضِی وإن لَامَ لَائِمُ

جو مجھ سے مرتبہ میں کم ہے اگر وہ کچھ بات کرے تو میں اپنی عزت کو اس کا جواب دینے سے محفوظ رکھتا ہوں اگرچہ ملامت کرنے والا ملامت کرے۔

وأَمّا الذِی مِثْلِی فإنْ زَلّ أوهفَا تَفَضَّلْتُ إنّ الفَضْلَ بالحِلم حاكِمُ

جو مرتبہ میں میری مثل ہے اگر وہ لغزش کرے تو میں بڑائی کا اظہار کروں بے شک فضیلت کا فیصلہ حلم کے ساتھ ہی ہونے والا ہوتا ہے۔

وَ مَا یُلَقّٰىهَاۤ ھا ضمیر سے مراد معزز فعل اور اعلیٰ خصلت ہے اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا جو غصہ پی کر اور اذیت برداشت کر کے صبر کرتے ہیں وَ مَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾ حظ عظیم سے مراد بھلائی میں سے وافر حصہ ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(1): قتادہ اور مجاہد نے کہا: حَظٍّ عَظِیْمٍ سے مراد جنت ہے(2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حظ جنت کے بغیر کبھی بھی عظیم نہیں ہوتا(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یُلَقّٰىهَاۤ میں ضمیر سے مراد جنت ہے یعنی جنت صرف صابر لوگ ہی پاتے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 182 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

''اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات بھی ہے اور دن بھی، سورج بھی ہے اور چاند بھی مت سجدہ کرو سورج اور چاند کو بلکہ سجدہ کرو اللہ کو جس نے انہیں پیدا فرمایا ہے اگر تم واقعی اس کے پرستار ہو۔ پھر بھی اگر وہ تکبر کرتے رہیں تو ان کی قسمت' پس وہ فرشتے جو آپ کے رب کے پاس ہیں تسبیح کرتے رہتے ہیں اس کی شب و روز اور وہ نہیں تھکتے۔ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ کسی وقت خشک بنجر ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں ان پر بارش کا پانی تو جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے، بے شک وہ قادر مطلق ہے جس نے زندہ کر دیا ہے زمین کو وہی زندہ کرنے والا ہے مردوں کا بلاشبہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

اٰیٰتِهٖ سے مراد وہ علامات ہیں جو اس کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرتی ہے الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ یہ بحث کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔ پھر ان دونوں کو سجدہ کرنے سے منع کیا اگرچہ یہ دونوں عظیم مخلوق ہیں لیکن ان میں یہ فضیلت ان کی حالت کی وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ عبادت کے مستحق بن جائیں کیونکہ ان دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو نیست و نابود کر دے یا ان کے نور کو ختم کر دے۔

وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اللہ تعالیٰ نے انہیں صورت عطا کی اور انہیں مسخر کیا ضمیر سورج، چاند، رات اور دن کی طرف لوٹتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خاص کر سورج اور چاند کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ تثنیہ بھی جمع ہوا کرتا ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر آیات کے معنی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

ضمیر کو مونث ذکر کیا ہے جمع مذکر ہونے کی بنا پر اس میں مذکر و مونث کے اعتبار سے تغلیب کا قاعدہ جاری نہیں کیا کیونکہ یہ ایسے اسماء ہیں جو ذوالعقول ہیں۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا یعنی کفار اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے سے تکبر کریں فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ اسم موصول سے مراد ملائکہ ہیں یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ ۝ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہیں اکتاتے۔ زہیر نے کہا:

سَئِمْتُ تَکَالِیفَ الحیاۃِ ومَنْ یَعِشْ　ثمانِین حَوْلًا لا أبالَكَ یَسْأَمِ

میں زندگی کے امور سے اکتا گیا اور جو آدمی اسی سال کا ہو جائے۔ تیرا باپ نہ رہے۔ وہ اکتا جاتا ہے۔

**مسئلہ**: یہ آیت بلا اختلاف آیۂ سجدہ ہے سجود کے محل کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: اس کا

محل اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ ہے کیونکہ یہ امر کے ساتھ متصل ہے۔ حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے تھے۔ ابن وہب اور امام شافعی نے کہا: اس کا محل وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ہے کیونکہ یہی کلام کا تتمہ، عبادت اور اطاعت کی غایت ہے امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما: يَسْـَٔمُوْنَ پر سجدہ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ان دونوں میں سے آخری پر سجدہ کرو۔ مسروق، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابراہیم نخعی، ابوصالح، یحییٰ بن وثاب، طلحہ، زبید یمانی، حسن بصری اور ابن سیرین سے اسی طرح مروی ہے۔ ابووائل، قتادہ اور بکر بن عبداللہ يَسْـَٔمُوْنَ پر سجدہ کیا کرتے تھے (1)۔ ابن عربی نے کہا: امر قریب ہے (2)۔

**مسئلہ**: ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے یہ آیت چاند گرہن اور سورج گرہن والی نماز کو متضمن ہے کیونکہ عرب کہا کرتے تھے: سورج اور چاند کو گرہن عظیم آدمی کی وفات سے ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صلاۃ کسوف پڑھی ہے۔

میں کہتا ہوں: صلاۃ کسوف صحاح بخاری و مسلم وغیرہما میں ثابت ہے اس نماز کی کیفیت میں بہت زیادہ اختلاف ہے کیونکہ آثار مختلف ہیں صحیح مسلم میں جو کچھ ہے وہ تیرے لیے کافی ہے اس باب میں وہی بہترین ہے، اللہ تعالیٰ صحیح کی توفیق دینے والا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً خطاب ہر دانشمند کو ہے اس کی آیات جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً تو زمین کو خشک اور بنجر دیکھے گا۔ یہ زمین کی خشوع سے صفت بیان کرنا ہے۔ نابغہ نے کہا:

رمادٌ ككُحْلِ العَيْنِ لَأْيًا أُبِينُهُ ‏ ‏ ‏ ‏ ونُؤْيٌ كَجِذْمِ الحَوْضِ أَثْلَمُ خَاشِعُ

الْاَرْضَ خَاشِعَةً سے مراد ایسی مٹی ہے جو فصل نہ اگائے بلد خاشعة سے مراد ایسی زمین ہے جس کی کوئی منزل نہ ہو اسی طرح مکان خاشع ہے۔

فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ یعنی نباتات سے جھومنے لگتی ہے (3)، یہ مجاہد کا قول ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: اهتز الانسان یعنی انسان نے حرکت کی اسی معنی میں یہ قول ہے:

تراه كنَصْلِ السيفِ يَهْتَزُّ لِلنَّدى ‏ ‏ ‏ ‏ تو اسے دیکھے گا کہ وہ تلوار کے پھل کی طرح سخاوت کے لیے جھومتا ہے۔

وَرَبَتْ وہ پھول جاتی ہے، یہ مجاہد کا قول ہے یعنی اپنی موت کے بعد نباتات سے اوپر کو اٹھ آتی ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر کلام میں تقدیم وتاخیر ہے ربت و اهتزت، اهتزاز اور ربو بعض اوقات زمین سے نکلنے سے پہلے ہوتا ہے اور بعض اوقات سطح زمین کی طرف نکلنے کے بعد ہوتا ہے اس کے ربو سے مراد اس کا بلند ہونا ہے بلند جگہ کو ربوۃ اور رابية کہتے ہیں نبات ظاہر ہونے کے لیے حرکت کرتی ہے پھر طولاً اور عرضاً اس کا جسم بڑا ہو جاتا ہے۔ ابوجعفر اور خالد نے وربأت پڑھا ہے اس کا معنی عظیم الجثہ ہونا ہے، یہ ربيئة سے مشتق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بارش سے خوش ہوئی اور نبات سے پھول گئی زمین جب

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 419 ‏ ‏ 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 184 ‏ ‏ 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1664

نبات سے پھٹتی ہے تو تحک کے ساتھ اس کی صفت بیان کی جاتی ہے اس کی صفت استبشار سے لگانا بھی جائز ہے کہ ربوا ور اهتزاز ایک ہی چیز ہے یہ نبات کے نکلنے کی حالت ہے۔ سورۂ حج میں یہ معنی گذر چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰىؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ کئی مواقع پر اس کی بحث گذر چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَاؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰى فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْۚ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌۙ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ۝ مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ۝

''بے شک جو لوگ ہماری آیتوں میں اپنی طرف سے اضافے کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو پھینکا جائے گا آگ میں وہ بہتر ہے یا جو آئیگا امن و سلامتی کے ساتھ قیامت کے دن (وہ بہتر ہے) تم وہ کرو جو تمہاری مرضی، یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو وہ خود دیکھ رہا ہے۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا جب وہ ان کے پاس آیا تو (وہ ہٹ دھرم لوگ ہیں) اور بے شک وہ بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے اس کے نزدیک نہیں آ سکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے، یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے سب خوبیاں سراہے کی طرف سے۔ (اے حبیب!) نہیں کہا جاتا آپ کو مگر وہی جو کچھ کہا گیا پیغمبروں کو آپ سے پہلے۔ بے شک آپ کا پروردگار اہل ایمان کے لیے بہت بخشنے والا اور (منکرین کے لیے) دردناک عذاب دینے والا ہے''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا یعنی ہمارے دلائل میں حق سے روگردانی کرتے ہیں۔ الحاد کا معنی ایک طرف جھکنا اور صراط مستقیم کو چھوڑنا ہے اسی سے قبر میں لحد ہے کیونکہ اسے قبر سے ایک طرف بنایا گیا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: الحد فی دین اللہ یعنی اس سے ایک طرف ہو گیا لحد اس میں ایک لغت ہے یہ کلام بھی انہیں کے متعلق ہے جنہوں نے کہا: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِیْهِ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیات میں الحاد کیا اور حق سے ایک طرف جھک گئے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے وہ شعر ہے یا جادو ہے۔ آیات سے مراد قرآن کی آیات ہیں۔ مجاہد نے کہا: یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا سے مراد ہے وہ قرآن کی تلاوت کے موقع پر شور کرنے، لغو اور غناء کرنے کے ساتھ الحاد کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی کلام کو تبدیل کرنا اور بے موقع اسے رکھنا ہے۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے وہ ہماری آیات میں جھوٹ بولتے ہیں (1)۔ سدی نے کہا: وہ دشمنی اور مخالفت کرتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: وہ شرک کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں، سب معنی قریب ہیں۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 185

مقاتل نے کہا: یہ آیات ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیات سے مراد معجزات ہیں، یہ پہلے قول کی طرف راجع ہے کیونکہ قرآن حکیم معجز ہے۔

اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ کہا: وہ جسے منہ کے بل آگ میں ڈالا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کے نزدیک وہ ابوجہل ہے خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَنْ يَّاْتِيْٓ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت عمار بن یاسر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت حمزہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت عمر بن خطاب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مومنین ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عام ہے جسے آگ میں پھینکا جائے گا اس سے مراد کافر ہے جو قیامت کے روز امن سے آئے گا وہ مومن ہے۔ یہ ابن بحر کا قول ہے (1)۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ یہ امر تہدید کے لیے ہے یہ جاننے کے بعد کہ وہ برابر نہیں ہو سکتے تو تمہارے لیے جزاء لازمی ہے اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ یہ تہدید کے ساتھ وعید اور وعدہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ تمام کے اقوال میں یہاں ذکر سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس میں احکام ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے خبر محذوف ہے تقدیر کلام ھالکون أو معذبون ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خبر اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝ درمیان میں مَا يُقَالُ لَكَ جملہ معترضہ ہے پھر ذکر کی طرف کلام کو لوٹایا اور فرمایا وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا پھر فرمایا اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ پہلا قول پسندیدہ ہے۔ نحاس نے کہا: نحویوں کے نزدیک سب اقوال درست ہیں جنکا میں علم رکھتا ہوں۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ الله تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ان سے ایک قول یہ مروی ہے: الله تعالیٰ کی جانب سے معزز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عزیز کا معنی کریم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ الله تعالیٰ نے اسے غالب کیا ہے باطل اس میں راہ نہیں پا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مناسب یہ ہے کہ اس کی عزت کی جائے اس کی عظمت شان کا اظہار کیا جائے اور اس میں کوئی لغو عمل نہ کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اس چیز سے محفوظ ہے کہ شیطان اس میں تبدیلی کرے؛ یہ سدی کا قول ہے (2)۔ مقاتل نے کہا: یہ شیطان اور باطل سے محفوظ ہے۔ سدی نے کہا: یہ غیر مخلوق ہے اس کی کوئی مثل نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عزیز کا معنی ہے اس سے ممتنع ہے کہ لوگ اس قسم کی کلام کریں (3)۔

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ جو اس سے قبل نازل ہوا وہ اس کی تکذیب نہیں کرتا اور نہ اس کے بعد کوئی کتاب نازل ہوگی جو اسے باطل اور منسوخ کردے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ سدی اور قتادہ نے کہا: اس کے پاس شیطان نہیں آتا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ اس میں تبدیلی کرے نہ اس میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کمی کر سکتا ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا: اس میں تکذیب داخل نہیں ہو سکتی۔ ابن جریج نے کہا: اس میں باطل نہیں آ سکتا جو ان چیزوں میں

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 185 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً

جن کی زمانہ گذشتہ کے اعتبار سے خبر دی اور نہ ہی اس میں جن کی زمانہ آئندہ کے اعتبار سے خبر دی(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ سے مراد اللہ تعالیٰ اور مِنۡ خَلۡفِهٖ سے مراد حضرت جبریل امین ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنی مخلوق میں حکیم اور محمود ہے۔ قتادہ نے کہا اپنے امر میں حکیم اور اپنی مخلوق میں محمود ہے(2)۔

مَا يُقَالُ لَكَ اذیت اور تکذیب میں سے جو بات کی جاتی ہے اِلَّا مَا قَدۡ قِيۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِكَ اس میں اپنے نبی کو تسلی دینا مقصود ہے اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ تجھے اور تیرے صحابہ کو بخشنے والا ہے ذُوۡ عِقَابٍ اَلِيۡمٍ۝ تیرے دشمنوں کے لیے دردناک عذاب دینے والا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کو جو یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ لَقَدۡ اُوۡحِيَ اِلَيۡكَ وَ اِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) یعنی آپ انہیں دعوت نہ دیں مگر اسی کی طرف جس کی طرف تمام انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں اس لیے وہ آپ کا انکار کرتے ہیں اس کا کوئی معنی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ استفہام ہے تقدیر کلام ہے: ای شیٔ یقال لك الا ما قیل للرسل من قبلك۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنَّ رَبَّكَ نئی کلام ہے اس سے قبل کلام مکمل ہے جب خبر مضمر ہو، ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام مَا يُقَالُ لَكَ کے ساتھ متصل ہے اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ وَّ ذُوۡ عِقَابٍ اَلِيۡمٍ۝ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار اور تبشیر کا حکم دیا گیا ہے۔

**وَ لَوۡ جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِيًّا لَّقَالُوۡا لَوۡ لَا فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعۡجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ قُلۡ هُوَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ فِيۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ وَّ هُوَ عَلَيۡهِمۡ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ۝**

"اور بالفرض ہم اسے بنا کر بھیجتے قرآن عجمی زبان میں تو کہتے کیوں نہ کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں کیا (اچھا ہے) کتاب عجمی اور نبی عربی۔ آپ فرمایئے: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر ہر حال میں مشتبہ رہتا ہے، انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ لَوۡ جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِيًّا یعنی یہ عربی لغت میں نہ ہوتا لَّقَالُوۡا لَوۡ لَا فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ یعنی اس کی آیات ہماری زبان میں کیوں نہ بیان کی گئیں کیونکہ ہم عرب ہیں ہم عجمی زبان کو تو نہیں سمجھتے تو یہ واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی زبان میں نازل فرمایا تاکہ اعجاز کی حقیقت ان پر واضح ہو جائے کیونکہ نظم ونثر کے اعتبار سے وہ کلام کی اقسام کو خوب جانتے تھے۔ جب وہ اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے تو یہ سب سے قوی دلیل بن گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اگر یہ عجمی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 186 — 2۔ ایضاً

زبان میں ہوتا تو کہتے ہمیں اس زبان کا علم نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** جب یہ بات ثابت ہے تو اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ قرآن عربی ہے اور یہ لغت عرب میں نازل ہوا ہے یہ عجمی زبان میں نازل نہیں ہوا اور جب اسے کسی اور زبان میں نقل کیا جائے گا وہ قرآن نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ابوبکر، حمزہ، کسائی نے اسے ااعجمی و عربی دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ عجمی اسے کہتے ہیں جو عربی نہ ہو خواہ فصیح ہو یا نہ ہو اعجمی اسے کہتے ہیں جو فصیح نہیں ہوتا وہ عربی ہو یا عجمی ہو۔ اعجم، فصیح کی ضد ہے وہ وہ ہوتا ہے جو اپنے کلام کی وضاحت نہیں کر سکتا حیوان جو غیر ناطق ہے اسے اعجم کہتے ہیں اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: صلاۃ النہار عجماء اس میں قراءت بلند آواز سے نہیں کی جاتی۔ اعجم کی طرف نسبت زیادہ موکد ہے کیونکہ عجمی کی طرف نسبت بیان میں زیادہ موکد ہے معنی ہوگا کیا قرآن عجمی اور نبی عربی ہو؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ حضرت حسن بصری، ابوالعالیہ، نصر بن عاصم، مغیرہ اور ہشام نے ابن عامر سے اعجمی ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے معنی ہوگا اس کی آیات کو کیوں بیان نہیں کیا گیا ان میں سے کوئی عربی تھا تو وہ عربی سمجھ لیتا اور کوئی عجمی تھا تو وہ عجمی سمجھ لیتا۔

سعید بن جبیر نے روایت نقل کی ہے کہ قریش نے کہا: قرآن عجمی اور عربی کیوں نازل نہیں کیا گیا اس کی بعض آیات عجمی ہوتیں اور بعض عربی ہوتیں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی قرآن حکیم میں ہر لغت سے کچھ نہ کچھ نازل کیا گیا ہے ان میں سجیل بھی ہے یہ فارسی ہے اس کی اصل سنگِ گل ہے یعنی مٹی اور پتھر۔ اسی سے ایک لفظ فردوس ہے یہ رومی زبان کا لفظ ہے اسی طرح قسطاس ہے۔ اہل حجاز، ابو عمرو، ابن ذکوان اور حفص نے استفہام کے انداز میں پڑھا ہے مگر انہوں نے اپنے اصول کے مطابق ہمزہ کو لین کر کے پڑھا ہے صحیح قراءت استفہام کی قراءت ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ قرآن شک، ریب اور درد سے ہدایت اور شفا ہے ہر اس آدمی کے لیے جو اس پر ایمان لایا۔

وَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ یعنی قرآن کے سننے سے بہرے ہیں، اسی وجہ سے وہ آپس میں باہم لغو عمل کی وصیت کرتے ہیں اس آیت کی مثل وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ لَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ (الاسراء) ہے یہ بحث مکمل گذر چکی ہے عام قراءت عَمًی ہے یہ مصدر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت عمرو بن عاص، حضرت معاویہ اور سلیمان بن قتہ نے اسے دھو علیھم عمٍ میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ان کے لیے وہ واضح نہیں ابو عبید نے پہلی قراءت کو پسند کیا کیونکہ سب لوگوں کا اس پر اجماع ہے کیونکہ پہلا قول ہے: هُدًى وَّ شِفَآءٌ اگر یہ ھاد اور شاف ہوتا تو عمی میں کسرہ عمدہ ہوتا تاکہ یہ نعت ہوتا تقدیر کلام یہ بنتی ہے جو ایمان نہیں رکھتے قبول کو ترک کرنے میں ان کے قائم مقام ہیں جن کے کانوں میں ثقل ہے اور قرآن ان پر عمی والا ہے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وَقْرٌ ہی ان پر عَمًی ہے۔

اُولٰٓىٕكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۴۴﴾ یہ قول اس آدمی کے لیے کیا جاتا ہے جو تمثیل کو نہیں سمجھتا۔ اہل لغت نے حکایت

بیان کی ہے کہ جو آدمی سمجھتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: انت تسمع من قریب اور جو نہیں سمجھتا تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: انت تنادی من بعید گویا اسے دور سے ندا دی جاتی ہے تو وہ آواز کو نہیں سنتا اور اسے نہیں سمجھتا۔ ضحاک نے کہا: قیامت کے روز انہیں قبیح ترین نام سے بلایا جائے گا مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ یہ ان کے لیے شدید ترین ہوگا مقصد انہیں شرمندہ کرنا اور ذلیل کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے قرآن میں تدبر نہیں کیا تو وہ امی اور اصم کی طرح ہوگا تو اسے دور کے مکان سے ندا کی جاتی ہے بلانے والے کی آواز اس تک نہیں پہنچتی تو وہ نہیں سنتا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور مجاہد نے کہا: وہ ان کے دلوں سے دور ہے(1)۔ تفسیر میں ہے گویا انہیں آسمان سے ندا کی جاتی ہے تو وہ اسے نہیں سنتے؛ نقاش نے یہ معنی بیان کیا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

”اور ہم نے عطا فرمائی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات طے نہ ہوئی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو (ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان اور بے شک وہ ایک شک میں مبتلا ہیں اس کے بارے میں جو بے چین کر دینے والا ہے۔ جو نیک عمل کرتا ہے تو اپنے بھلے کے لیے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اس پر ہے اور آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں“۔

الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے فَاخْتُلِفَ فِيْهِ یعنی کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نے جھٹلایا۔ ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے یعنی آپ کی قوم جو آپ کی کتاب میں اختلاف کرتی ہے وہ آپ کو غمگین نہ کرے جو آپ سے قبل انبیاء ہو گذرے ہیں ان کی کتابوں میں بھی اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ یعنی انہیں مہلت دینے کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے عذاب کے جلدی آنے کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ وہ قرآن کے بارے میں سخت شک میں مبتلا ہیں۔ اس کے بارے میں بحث پہلے گذر چکی ہے۔ کلبی نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ اس وقت کے عذاب کو قیامت تک موخر نہ کرتا تو انہیں عذاب آچکا ہوتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری امتوں کے ساتھ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے عذاب میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی صلبوں سے مومن نکلنے والے تھے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ یہ کلام شرط اور جواب ہے، اسی طرح یہ کلام ہے وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا اللہ تعالیٰ بندوں کی اطاعت سے مستغنی ہے پس جو اطاعت کرے اس کے لیے ثواب ہے اور جو برائی کرے عقاب اسی پر ہوگا وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے تھوڑے اور زیادہ ظلم سے نفی کی۔ جب مبالغہ کی نفی ہوئی تو غیر کی بھی نفی ہوگئی اس کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 187

دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا (یونس: 44) عادل ثقہ، ائمہ ثبات نے زاہد عادل سے امین ارض سے وہ امین السماء سے وہ رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام کر دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان حرام کر دیا تم باہم ظلم نہ کیا کرو نیز وہ حکیم و مالک ہے مالک اپنی مملوکہ چیز میں جو تصرف کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ اسے اپنی مملوکہ چیز میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا حق ہوتا ہے۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿٤٧﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٤٨﴾

''اسی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم اور نہیں نکلتا کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے اس کے علم کے بغیر، اور جس روز وہ انہیں پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک کہیں گے ہم (پہلے) عرض کر چکے ہیں ہم میں سے کوئی بھی (اس پر) گواہی نہ دے گا، اور گم ہو جائیں گے ان سے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں''۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ یعنی کب وہ قائم ہوگی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا: اے محمد! اگر تو نبی ہے تو ہمیں بتاؤ قیامت کب برپا ہوگی؟ تو یہ آیت نازل ہوئی وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ من زائدہ ہے، مراد ہے جو اس کا پھل نکلتا ہے مِّنْ اَكْمَامِهَا اپنے برتنوں سے۔ اکمام پھلوں کے برتن ہوتے ہیں اس کی واحد کمۃ ہے یہ مال اور دوسری چیزوں کا برتن ہوتا ہے اسی وجہ سے گابھے کے چھلکے کو کمۃ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کمہ، کفری اس وقت ہوتا ہے جو ابھی پھٹا نہ ہو جب وہ پھٹ جائے تو وہ کمہ نہیں ہوتا۔ سورۃ الرحمٰن میں اس کی مزید وضاحت آئیگی۔ نافع، ابن عامر اور حفص نے جمع کا صیغہ مِنْ ثَمَرٰتٍ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے واحد کا صیغہ پڑھا ہے مراد جمع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى یہاں بھی جمع مراد ہے فرماتا ہے: قیامت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے جس طرح پھلوں اور بچوں کے جننے کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اللہ تعالیٰ مشرکین کو ندا کرے گا: اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ دنیا میں جن کے بارے میں تم گمان کیا کرتے تھے کہ وہ الہ ہیں اور سفارش کریں گے وہ کہاں ہیں؟ قَالُوْٓا بتوں نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مشرک ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد عابد اور معبود سب ہیں اٰذَنّٰكَ ہم نے تجھے سنایا اور تجھے آگاہ کیا کہا جاتا ہے آذن یؤذن جب وہ آگاہ کرے، کہا:

آذنتنا ببینھا أسماء — اسماء نے اپنے بیٹوں کے بارے میں ہمیں آگاہ کیا۔

مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿٤٧﴾ ہم تجھے آگاہ کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی بھی ایسا نہیں جو اس امر کی گواہی دے کہ تیرا کوئی شریک ہے۔ جب انہوں نے قیامت کو دیکھا تو انہوں نے بتوں سے براءت کا اظہار کیا اور بتوں نے ان سے براءت کا اظہار کر دیا، جس طرح یہ بحث کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ دنیا میں جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے وہ سب ان سے گم ہو جائیں گے اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ آگ سے فرار کی کوئی صورت نہیں یہاں ما حرف ہے اسم نہیں اس وجہ سے ظن نے اس میں عمل نہیں کیا اور فعل کو ملغا کر دیا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وظنوا انهم مالهم من محيص ولا مهرب یہ جملہ کہا جاتا ہے حاص، يحيص حيصا و محيصا جب وہ بھاگ جائے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ظن، غالب رائے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس میں انہیں کوئی شک نہیں کہ وہ جہنمی ہیں لیکن وہ یہ طمع کرتے ہیں کہ اس سے نکل جائیں گے، یہ کوئی بعید نہیں کہ ان کا ظن اور رجاان کے مایوس ہونے تک رہے۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ٘ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿٤٩﴾ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ٘ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٠﴾ وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿٥١﴾

”نہیں اکتاتا انسان بھلائی کی دعا کرنے سے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے رحمت اپنی جانب سے اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے تو کہتا ہے: میں اسی کا مستحق ہوں اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میرے لیے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا (یہ احمق کیا سوچ رہے ہیں) ہم تو آگاہ کریں گے کافروں کو جو کرتوت انہوں نے کئے اور ہم ضرور چکھائیں گے انہیں سخت عذاب۔ اور جب ہم احسان فرماتے ہیں انسان پر تو وہ (تکبر سے) منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے“۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ بھلائی کی دعا کرنے سے نہیں اکتاتا۔ یہاں خیر سے مراد مال، صحت، غلبہ اور عزت ہے۔ سدی نے کہا: یہاں انسان سے مراد کافر ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ولید بن مغیرہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عتبہ اور شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے اور ولید بن خلف۔ عبداللہ کی قراءت میں لايسام الانسان من دعاء المال ہے۔

وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ شر سے مراد فقر اور مرض ہے، اگر اسے فقر اور مرض پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَيَـُٔوْسٌ دعا کی قبولیت کے حوالے سے اور قنوط اپنے رب کے بارے میں سوء ظن کے حوالے سے ذکر کیا ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَيَـُٔوْسٌ سے مراد ہے کہ اسے جو تکلیف لاحق ہے اس کے زائل ہونے سے مایوس ہے اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 188

قنوط اس معنی میں ذکر کیا کہ یہ تکلیف ہمیشہ رہے گی۔ معنی قریب قریب ہے۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا یہاں رحمت سے مراد عاقبت، آسودگی اور غنا ہے۔ ضراء سے مراد تکلیف، بیماری، سختی، اور فقر ہے لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ یہ وہ چیز ہے جس کا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحق بن چکا ہوں کیونکہ وہ میرے لیے عمل پر راضی ہو چکا ہے تو وہ نعمت کو حتمی اور اللہ تعالیٰ پر واجب خیال کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: هٰذَا لِیْ کا معنی ہے یہ میرے پاس ہے۔

وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّیْۤ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى حسنیٰ سے مراد جنت ہے اور لام تاکید کے لیے ہے وہ عمل کے بغیر آرزوئیں کرتا ہے حضرت حسن بن محمد بن علی بن ابی طالب نے کہا: کافر کی دو آرزوئیں ہونگی جہاں تک دنیاوی آرزو کا تعلق ہے وہ کہے گا: لَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّیْۤ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ اور آخرت کے بارے میں کہے گا: یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (الانعام) اور یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (النباء)

فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ہم ضرور انہیں جزا دیں گے۔ یہ قسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر قسم اٹھائی ہے۔ غلیظ کا معنی شدید ہے۔

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ انسان سے مراد کافر ہے اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف ہیں جنہوں نے اسلام سے اعراض کیا اور اس سے دور ہوئے نَاٰ بِجَانِبِهٖ کا معنی ہے حق کی اطاعت کرنے سے اپنے آپ کو بلند جانا اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء پر تکبر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَاٰ کا معنی دور ہونا ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: نأیته ونأیت عنه نأیا۔ میں اس سے دور ہوا أنایته فانتای میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ تناءوا۔ وہ دور ہو گئے منتأی۔ دور جگہ۔ نابغہ نے کہا:

فإنّك كاللّيلِ الّذِى هو مُدْرِكِى وإنْ خِلْتُ أَنّ الْمُنْتَأى عنْكَ واسِعُ

تو رات کی طرح ہے جو مجھے پانے والی ہے اگرچہ میں خیال کرتا تھا کہ تجھ سے دوری بہت وسیع ہے۔

یزید بن قعقاع نے اسے ناء بجانبه پڑھا ہے یعنی ہمزہ سے پہلے الف ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ ناء سے مشتق ہو جب وہ اٹھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ قلب کیا گیا ہو معنی پہلے والا ہی ہے وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ ۝ جب اسے تکلیف پہنچے تو بہت زیادہ دعائیں کرتا ہے۔ عرب طول اور عرض کا لفظ کثرت کے معنی میں استعمال کرتا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: اطال فلان فی الکلام واعرض فی الدعاء؛ جب وہ گفتگو اور دعا کثرت سے کرے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ تضرع کرنے والا اور مدد طلب کرنے والا ہے۔ کافر مصیبت میں اپنے رب کو پہچانتا ہے اور خوشحالی میں اسے نہیں پہچانتا۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ۝ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ اَلَاۤ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۝

"آپ فرمائیے: (اے کافرو!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن الله کی طرف سے ہو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت زیادہ دور نکل گیا ہو۔ ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے، کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے سنو! یہ لوگ شک میں مبتلا ہیں اپنے رب سے ملنے کے بارے میں یاد رکھو! وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے"۔

**قُلْ اَرَءَيْتُمْ** اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہو: اے مشرکو! اگر یہ قرآن الله تعالیٰ کے پاس سے ہو پھر تم اس کا انکار کرو تو زیادہ گمراہ کون ہے تم سے زیادہ گمراہ کوئی نہیں کیونکہ تمہاری دشمنی بہت زیادہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں ضمیر اسی کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا ذکر اس فرمان میں ہے: اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (المومنون: 49) پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

**سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ** ہماری وحدانیت اور ہماری قدرت کی نشانیاں سابقہ امتوں کی منازل کی بربادی میں ہیں اور ان کی ذاتوں یعنی جو انہیں آزمائشیں اور امراض لاحق ہوتی ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِي الْاٰفَاقِ سے مراد آسمان کی نشانیاں اور فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ سے مراد زمین کے حادثات ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: فِي الْاٰفَاقِ سے مراد بستیوں کی فتوحات ہیں (2)۔ الله تعالیٰ نے ان کی فتوحات کو اپنے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد خلفاء اور آفاق دنیا میں اس کے دین کے مددگاروں کے لیے فتوحات کو مشرق و مغرب کے علاقوں کو عموماً اور مغرب کے علاقوں کو خصوصاً آسان کر دیا کیونکہ یہ ایسی فتوحات ہیں جو ان سے قبل زمین کے کسی حاکم کے لیے آسان نہ ہوئیں اس طرح جابر حکمرانوں، فارس کے کسریٰ تھوڑے لشکر کو کثیر لشکر پر فتح دینا، کمزوروں کو قوی لوگوں پر غلبہ دینا اور ان سے ایسے امور کا صادر کرانا جو عام معمول سے ہٹ کر تھے سب صادر ہوئے فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ سے مراد فتح مکہ ہے؛ (3) یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے یہ منہال بن عمرو اور سدی کا قول ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: فِي الْاٰفَاقِ سے مراد قوموں میں واقعات اور فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ سے مراد غزوہ بدر کا واقعہ ہے (4)۔ عطا اور ابن زید نے یہ بھی کہا ہے کہ فِي الْاٰفَاقِ سے مراد آسمانوں اور زمین کے قطر ہیں یعنی سورج، چاند، ستارے، رات، دن، ہوائیں، بارشیں، کڑک، بجلی، صواعق، نبات، درخت، پہاڑ، سمندر وغیرہ (5)۔ صحاح میں ہے: آفاق سے مراد اطراف ہیں اس کا واحد اُفْق اور اُفُق ہے جس طرح عُسْر اور عُسُر ہے رجل اَفَقِيٌّ یعنی ہمزہ اور فاء مفتوح ہے جب وہ زمین کے آفاق سے ہو؛ یہ ابو نصر نے حکایت بیان کی ہے۔ بعض کہتے ہیں اُفُقی جوہری کے علاوہ کسی اور نے یہ شعر پڑھا:

اَخَذْنَا بِآفَاقِ السَّمَاءِ عَلَيْكُمُ　　لَنَا قَمَرَاهَا وَالنُّجُوْمُ الطَّوَالِعُ (6)

ہم نے تمہارے خلاف آسمان کے افق اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں ہمارے لیے اس کے دونوں چاند اور روشن ستارے ہیں۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 106　　2۔ ایضاً　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 189
4۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 106　　5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 72　　6۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 136

فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ یہ لطیف صنعت اور بدیع حکمت میں سے ہے یہاں تک کہ براز اور بول کے راستے اس میں شامل ہیں کیونکہ انسان ایک محل سے کھاتا پیتا ہے اور وہ کھانا پینا دو الگ الگ جگہوں سے نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صنعت اور حکمت میں بداعت اس کی آنکھوں میں نمایاں ہوتی ہے دونوں پانی کا ایک قطرہ ہیں وہ ان دونوں کے ساتھ زمین سے آسمان تک دیکھتا ہے جس کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے، اس کے دونوں کانوں کے درمیان میں بداعت کا اظہار ہے جن کے ساتھ انسان مختلف آوازوں میں فرق کرتا ہے اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی بداعت کی امثلہ ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ وہ نطفہ تھا اس کے علاوہ اس کے احوال میں جو انتقال ہے جس طرح سورۂ مومنوں میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے عنقریب تم وہ فتنے اور غیب کی خبریں دیکھو گے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبریں دی ہیں۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ اس میں چار وجوہ ہیں: (1) وہ قرآن ہے (2) اسلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں (3) اللہ تعالیٰ جو مظاہر انہیں دکھاتا ہے اور جو کرتا ہے وہ حق ہے (4) محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہی رسول برحق ہیں۔

اَوَ لَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ، بربک محل رفع میں ہے کیونکہ یہ یَکۡفِ کا فاعل ہے اَنَّہٗ، ربک سے بدل ہے اگر محل سے بدل بنائیں تو یہ مرفوع ہوگا اگر لفظ سے بدل بنائیں تو یہ مجرور ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ لام کے حذف کے ساتھ منصوب ہو معنی ہوگا کیا تیرا رب انہیں کافی نہیں ہوگا جس توحید پر اس نے ان کی راہنمائی کی ہے، کیونکہ وہ ہر شے پر شہید ہے جب وہ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے تو اس پر جزا دے گا۔ یہ قول کیا گیا ہے: کیا تیرا رب کفار کو سزا دینے میں کافی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کیا تیرا رب کافی نہیں کہ وہ کفار کے اعمال پر گواہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کیا تیرا رب گواہ کافی نہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا یہ کافی نہیں کہ بندہ جو بھی عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے۔ یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جس کا معنی حضور ہے کیا تیرا رب ہر چیز کے پاس حاضر ہونے کے اعتبار سے کافی نہیں۔

اَلَاۤ اِنَّہُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ، مریۃ کا معنی شک ہے مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّہِمۡ آخرت میں اپنے رب کی ملاقات سے۔ سدی نے کہا: بعث سے۔ خبردار! وہ اپنے رب کی ملاقات سے شک میں مبتلا ہیں (1) اَلَاۤ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ۝ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے؛ سدی نے یہ قول کیا۔ کلبی نے کہا: اس کی قدرت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے (2)۔ خطابی نے کہا: اس کی قدرت تمام مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہی ذات پاک ہے جس نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کیا ہوا ہے اور ہر چیز کا شمار کر رکھا ہے، یہ اسم تشیر طور پر وعید کے ضمن میں آتا ہے اس کا حقیقی معنی ہر شے کا احاطہ کرنا ہے جس کا احاطہ کیا ہوا ہے اس کو جڑ سے اکھیڑنا ہے یہ اصل میں مُحیط تھا یاء کی حرکت حاء کی طرف نقل کر دی تو یاء ساکن ہوگئی اسی سے یہ کہا جاتا ہے: أحاط یُحیط إحاطة وحیطة۔ اسی سے حائط الدار (گھر کی دیوار) ہے حاطت الخیل بفلان یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اس آدمی کو ہر جانب سے گھیر لیا جائے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ (کہف: 42) اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 190　2۔ ایضاً

# سورۃ الشوریٰ

(آیاتہا ۵۳) (۴۲ سورۃ الشوریٰ مکیۃ ۶۲) (رکوعاتہا ۵)

حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور جابر کے نزدیک یہ سورت مکی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: مگر چار آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں: قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى الی آخرہ۔ یہ ترپن آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞ كَذٰلِكَ یُوْحِیْۤ اِلَیْكَ وَ اِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۞ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۞

"حا، میم، عین، سین، قاف اسی طرح (کے مطالب نفیسہ) وحی فرماتا ہے آپ کی طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو آپ سے پہلے گذرے ہیں اللہ جو زبردست (اور) بہت دانا ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور وہی سب سے اعلیٰ اور عظمت والا ہے"۔

حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞ عبدالمؤمن نے کہا: میں نے حسین بن فضل سے پوچھا حٰمٓ کو عٓسٓقٓ سے کیوں الگ کیا گیا ہے جبکہ کھیعص، المرا اور المص کو الگ الگ نہیں کیا گیا (2)۔ فرمایا: کیونکہ حٰمٓ عسق سورتوں کے درمیان ہے جن میں سے پہلی حٰمٓ ہے تو یہ ماقبل اور مابعد کے نظائر پر جاری ہوئی گویا حٰمٓ مبتدا ہے اور عٓسٓقٓ خبر ہے اور اس کی اخوات جن کو اکٹھے لکھا گیا ہے وہ ایک آیت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حروف معجمہ سب کے سب ایک معنی میں ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ بیان بنیاد اور کلام کا قاعدہ ہے؛ یہ جرجانی نے ذکر کیا حٰمٓ۔ عسق کو الگ الگ کر کے لکھا گیا ہے اور کھیعص کو متصل لکھا گیا ہے کیونکہ کلام یہ کی گئی ہے حٰمٓ سے مراد ہے مم ما ھو کائن۔ جو ہو کر رہنے والا ہے اس کا قصد کر لیا گیا ہے انہوں نے فرق کیا ہے جس میں فعل مقدر ہوتا ہے یا فعل مقدر نہیں ہوتا پھر اگر اسے الگ الگ کر دیا جاتا اور اسے متصل لکھا جاتا تو بھی جائز تھا۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس کی قراءت میں حم سق ہے (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے ذریعے فتنوں کو پہچانا کرتے تھے۔ ارطاۃ بن منذر نے کہا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی جبکہ ان کے پاس حضرت حذیفہ بن یمان موجود تھے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے فرمان حم عسق کی تفسیر کے بارے میں بتایئے، تو آپ نے اس سے اعراض کیا یہاں تک کہ اس نے تین دفعہ اپنے سوال کو دہرایا تو پھر بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے اعراض کیا، حضرت حذیفہ بن یمان نے کہا: میں تجھے اس کے بارے میں آگاہ کرتا ہوں میں خوب جانتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 158　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 73　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 25

نے اس کی تفسیر بیان کرنے سے کیوں اجتناب کیا! یہ آیت اہل بیت کے ایک فرد کے بارے میں نازل ہوئی جسے عبدالالہ اور عبداللہ کہا جائے گا وہ مشرق کے دریاؤں میں سے ایک دریا پر فروکش ہوگا اس پر دو شہر بسائے گا دریا دونوں کو الگ الگ کر دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ ان کے ملک کے زوال اور حکومت کے ختم ہونے کا ارادہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ رات کے وقت ایک آگ بھیجے گا تو وہ شہر صبح کے وقت تاریک سیاہ ہو جائے گا وہ سب کا سب جل جائے گا گویا وہ اس جگہ شہر تھا ہی نہیں۔ اس کی مالکہ صبح کے وقت متعجب ہوگی یہ سب کچھ کیسے الٹ ہو گیا وہ دن ابھی روشن ہی ہوگا یہاں تک کہ اس میں ہر جابر سرکش جمع ہو جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے اور انہیں سب کو دھنسا دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے حٰمٓ ۚ عٓسٓقٓ (1) یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق ہے اور فتنہ وقضا جس کا قصد کر لیا گیا ہے حٰم۔ ع۔ عدلا منہ اس کی جانب سے عدل۔ س، سیکون عنقریب ہوگا۔ ق، واقع ان دو شہروں میں واقع ہوگا۔

اس تفسیر کی مثل وہ روایت ہے جو جریر بن عبداللہ بجلی نے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''دجلہ اور دجیل، قطربل اور صراہ کے درمیان ایک شہر آباد کیا جائے گا جس میں زمین کے جابر حکمران جمع ہوں گے وہ زمین جس میں خزانے جمع کیے جائیں گے وہ اپنے مکینوں کے ساتھ زمین میں دھنس جائیں گے وہ زمین میں اس عمدہ کیل سے جلدی جائیں گے جو نرم زمین میں جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عین کے بغیر حم سق پڑھا ہے (2)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں یہ اسی طرح ہے؛ یہ طبری نے بیان کیا ہے۔ نافع نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے: حا اسکے حلم سے، میم، اس کی مجد سے، عین اس کے علم سے، سین اس کی سنا سے اور قاف اس کی قدرت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم اٹھائی ہے۔

محمد بن کعب سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم، اپنی مجد، اپنی علو، اپنی سنا اور اپنی قدرت کی قسم اٹھائی ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو عذاب نہیں دے گا جو خلوص دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی پناہ چاہتا ہے۔

جعفر بن محمد اور سعید بن جبیر نے کہا: حا، رحمن سے، میم مجید سے، عین علیم سے، سین قدوس سے اور قاف قاصر سے۔ مجاہد نے کہا: یہ سورتوں کے فواتح ہیں۔ عبداللہ بن بریدہ نے کہا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جو دنیا کو محیط ہے۔ قشیری نے ذکر کیا جبکہ الفاظ ثعلبی کے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر پریشانی پہچانی جاسکتی تھی۔ آپ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کس چیز نے آپ کو غمگین کیا؟ فرمایا: ''مجھے ان امتحانات کے بارے میں بتایا گیا ہے جو میری امت میں واقع ہوں گے یعنی زمین میں دھنسنا، پتھروں کی بارش کرنا، آگ جو انہیں جمع کرے گی، ہوا جو انہیں سمندر میں پھینک دے گی، پے در پے آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا نکلنا'' اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے متعلق ہے حاء سے مراد آپ کا حوض جس پر ہر کوئی وارد ہوگا، میم سے مراد آپ کی وسیع حکومت، عین سے مراد موجود عزت، سین سے مراد وہ بلندی جس کی گواہی دی جائے گی، قاف سے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 192 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 25

مراد مقام محمود میں آپ کا کھڑا ہونا اور کرامت و بزرگی کے مقام پر اپنے مالک و معبود کے قریب ہونا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کوئی صاحب کتاب نبی نہیں مگر اس کی طرف وحی کی گئی حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ۔ اسی وجہ سے فرمایا: یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ (1)۔ مہدوی نے کہا: حدیث میں آیا ہے کہ حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ کا معنی ہے متقدمین انبیاء کی طرف وحی کی گئی۔ ابن محیصن، ابن کثیر اور مجاہد نے پڑھا یوحی۔ کہ یہ فعل مجہول ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جار مجرور محل رفع میں ہے کیونکہ یہ فاعل کے قائم مقام ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسکا نائب فاعل مضمر ہو یعنی آپ کی طرف قرآن وحی کیا جاتا ہے جسے یہ سورت اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے تو لفظ اللہ فعل مضمر کے ساتھ مرفوع ہوگا تقدیر کلام یہ ہوئی: اللہ تعالیٰ تیری طرف وحی کرتا ہے جس طرح ابن عامر اور ابو بکر کی قراءت ہے یسبح له فیها بالغدو والآصال رجال یعنی لوگ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا:

لِیُبْكَ یزیدُ ضارعٌ بخصومة　　وأشعث ممّن طوّحته الطوائح(2)

کہا: لِیُبْكَ یزید۔ پھر اس کی وضاحت کی من ینبغی أن یبکیه۔ معنی ہے اسے ضارع رلاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو گویا فرمایا: اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے یا کلام مبتدا کے مضمر ہونے کے اعتبار سے ہے الموحی اللہ یا یہ مبتدا ہے اور خبر الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ہے باقی قراء نے یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اسم اللہ کو فاعل ہونے کی حیثیت سے رفع دیا لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ۝ اس کی وضاحت کئی مقامات پر گذر چکی ہے۔

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِهِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝

"قریب ہے کہ (جلال الٰہی سے) آسمان پھٹ پڑیں اپنے اوپر سے اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے تسبیح کر رہے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور بخشش طلب کر رہے ہیں اہل زمین کے لیے، سن لو یقیناً اللہ ہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ عام قراءت تاء کے ساتھ ہے۔ نافع، ابن وثاب اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے یَتَفَطَّرۡنَ۔ نافع اور دوسرے قراء نے یاء، تاء اور طاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ عام قراءت ہے۔ ابو عمرو، ابو بکر، مفضل، ابو عبید نے ینفطرن انفطار کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۝ (الانفطار) سورۂ مریم میں اس کی وضاحت گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ یعنی آسمانوں میں سے ہر ایک آسمان اس آسمان کے اوپر سے پھٹ جائے گا جو اس کے قریب ہے(3)۔ ضحاک نے کہا: یَتَفَطَّرۡنَ وہ آسمان اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال سے اپنے اوپر سے لپٹ جائیں گے(4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَوۡقِهِنَّ سے مراد زمینوں کے اوپر سے اللہ تعالیٰ کے خوف سے لپٹ جاتے اگر وہ ان چیزوں سے ہوتے جو عقل رکھتے ہیں۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 74　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 26　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 192　4۔ ایضاً

وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وہ اللہ تعالیٰ کی ان چیزوں سے پاکی بیان کرتا ہے جو اس کے وصف میں جائز نہیں اور جو اس کے جلال کے لائق نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مشرکین کی جراتوں سے متعجب ہوتے ہیں اور تعجب کے موقع پر تسبیح کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کی تسبیح ان چیزوں پر تعجب کا اظہار ہے جو وہ دیکھتے ہیں کہ مشرک اپنے کام کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہوتے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے جس کو وہ دیکھتے ہیں (2)۔ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ کا معنی ہے ان کے رب کے امر سے؛ یہ سدی کا قول ہے۔

وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ضحاک نے کہا: لِمَنْ فِي الْاَرْضِ سے مراد مومن ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے اس کی وضاحت سورۃ المومن: وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں گذر چکی ہے یہاں ملائکہ سے مراد حاملین عرش (عرش کو اٹھانے والے) ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام فرشتے مراد ہیں۔ کلبی کے قول سے یہی ظاہر ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ منسوخ ہے یہ جگہ مومنین کے لیے خاص ہے۔ مہدوی نے کہا: صحیح یہی ہے کہ وہ منسوخ نہیں ہے کیونکہ یہ خبر ہے اور مومنین کے لیے خاص ہے۔ ابوالحسن ماوردی نے کلبی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ فرشتوں نے جب ان دونوں فرشتوں کو دیکھا جن کو آزمایا گیا اور زمین کی طرف انہیں بھیجا گیا تا کہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ زہرہ کی وجہ سے آزمائش میں پڑ گئے اور وہ دونوں حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف بھاگ گئے جو حضرت نوح علیہ السلام کے پردادا تھے۔ دونوں فرشتوں نے حضرت ادریس علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ ان دونوں کے حق میں دعا کریں۔ فرشتوں نے اپنے رب کی حمد بیان کرنے کے ساتھ تسبیح بیان کی اور بنی آدم کے لیے مغفرت طلب کی (3)۔ ابوالحسن بن حصار نے کہا: بعض جاہلوں نے یہ گمان کیا کہ یہ آیت ہاروت و ماروت کے سبب نازل ہوئی ہے اور یہ، مومنوں کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی اس کے ساتھ منسوخ ہے اور وہ نہیں جانتے کہ حاملین عرش تو مومنوں کے استغفار کے لیے خاص ہیں، اللہ تعالیٰ کے اور فرشتے ہیں جو اہل زمین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: فرشتوں کے اہل زمین کے لیے استغفار میں (4) دو قول ہیں: (1) گناہوں اور خطاؤں سے؛ مقاتل کے قول کا ظاہر یہی معنی ہے (2) ان کے لیے رزق اور خوشحالی کی طلب ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی زیادہ نمایاں ہے کیونکہ زمین کافر اور غیر کو عام ہے مقاتل کے قول کے مطابق کافر اس میں داخل نہیں اس بارے میں ایک روایت مروی ہے جسے عاصم احول نے ابوعثمان سے وہ سلمان سے نقل کرتے ہیں کہ بندہ جب خوشحالی کے دور میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اسے تنگ دستی آتی ہے فرشتے کہتے: وہ خوشحالی کے دور میں اللہ کا ذکر کرتا اب اسے تنگ دستی نے آلیا ہے تو وہ اس کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ کمزور آدمی سے معروف آواز ہے اور جب وہ خوشحالی کے دور میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا تھا تو اسے تکلیف نے آلیا تو فرشتے کہتے ہیں: انسان سے اجنبی سی آواز ہے وہ خوشحالی کے دور میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا تھا تو اسے مصیبت لاحق ہوئی تو وہ اس کے لیے بخشش طلب نہیں کرتے۔ یہ تعبیر اس امر پر دلالت کرتی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 192 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 193 | 4۔ ایضاً

ہے کہ یہ آیت کریمہ اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کا ذکر خوشحالی اور تنگدستی میں کیا کرتا تھا تو یہ آیت اہل زمین سے یعنی مومنوں کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے استغفار سے ارادہ طلب حلم اور طلب غفران لیا ہو اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَ لَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝ (فاطر) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ (الرعد: 6)

یہاں استغفار سے مراد ان کے بارے میں حلم کرنا اور انتقام میں جلدی نہ کرنا ہے تو یہ حکم ہو گیا (1)؛ یہ زمخشری کا قول ہے۔ مطرف نے کہا: ہم نے اللہ کے بندوں کے ساتھ سب سے مخلص فرشتے پائے ہیں اور اللہ کے بندوں کے ساتھ سب سے زیادہ دھوکہ کرنے والے شیطانوں کو پایا ہے (2)۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں ڈرایا اور عظمت شان کو بیان کیا اور آخر میں مہربانی کا ذکر کیا اور بشارت دی۔

## وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ اللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ ۖ٘ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۝

"اور جنہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور دوست اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کے حالات سے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں"۔

اَوْلِیَآءَ سے مراد بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ وہ ان کے اعمال کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ان اعمال پر انہیں بدلہ دے وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۝ یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے، حدیث طیبہ میں ہے: أطّت السماء وحُقّ لها أن تئط (3) آسمان اپنے مکینوں کے بوجھ کی وجہ سے آواز نکالنے لگا کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوتاہی نہیں کرتے اور یہ کفار اس کے ساتھ شرک کرتے تھے۔

## وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ۝

"اور یونہی ہم نے وحی کے ذریعے اتارا ہے آپ کی طرف قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس (آباد) ہیں اور تاکہ آپ ڈرائیں اکٹھے ہونے کے دن سے جس کی آمد پر کچھ شبہ نہیں (اس دن) ایک فریق جنت اور دوسرا بھڑکتی آگ میں ہوگا"۔

جس طرح ہم نے آپ کی طرف اور آپ سے پہلے انبیاء کی طرف ان معانی کو وحی کیا اسی طرح ہم نے آپ کی طرف عربی قرآن وحی کیا ہم نے اسے لغت عرب میں بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ پر قرآن عربی آپ کی قوم کی

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 209　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 193
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الحزن والبکاء، جلد 1، صفحہ 319

زبان میں نازل کیا جس طرح ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا۔ معنی ایک ہی ہے۔
اُمَّ الْقُرٰی سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ مکہ کو ام القری اس لیے کہتے ہیں کیونکہ زمین اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے وَ مَنْ حَوْلَهَا یعنی باقی مخلوق۔ وَ تُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ یوم الجمع سے مراد یوم قیامت ہے لَا رَیْبَ فِیْهِ اس میں کوئی شک نہیں فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ۞ یہ مبتدا خبر ہے۔ کسائی نے نصب کو جائز قرار دیا ہے تقدیر کلام یوں ہے لتنذر فریقا فی الجنة وفریقا فی السعیر۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۞

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا ان (سب) کو ایک امت لیکن وہ داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں، اور جو ظلم کرنے والے ہیں نہ ان کا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار''۔

ضحاک نے کہا: اُمَّةً وَّاحِدَةً سے مراد ہے ایک دین والے، یعنی سب گمراہ یا سب ہدایت یافتہ۔ حضرت انس بن مالک نے کہا: رحمت سے مراد اسلام ہے وَ الظّٰلِمُوْنَ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے(1) اس کی خبر مابعد مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۞ ہے نصیر کا عطف لفظ پر ہے اسے لا نصیر پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا عطف محل پر ہوگا اور من زائدہ ہوگا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِیُّ وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ٞ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۞

''کیا انہوں نے بنا لیے ہیں اسے چھوڑ کر دوسرے کارساز پس اللہ ہی حقیقی کارساز ہے اور زندہ کرتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

اَمِ یہاں بل کے معنی میں ہے۔ اولیاء سے مراد بت ہیں۔ اے محمد! اللہ تعالیٰ کی ذات ہی تیرا اور تیرے پیروکاروں کا ولی ہے اس کے سوا کوئی ولی نہیں وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی سے مراد بعث بعد الموت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے جبکہ اس کے سوا کوئی کسی شے پر قادر نہیں۔

وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۗ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ۞

''اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دو یہی اللہ میرا رب ہے اور اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں''۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 194

اس میں رسول اللہ ﷺ کو مومنین کے لیے فرمان کی حکایت ہے یعنی اہل کتاب میں اور مشرکین میں سے کفار دین کے معاملہ میں تم سے اختلاف کریں تو انہیں کہو: اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، تمہارے سپرد نہیں اس نے فیصلہ کر دیا کہ دین تو اسلام ہی ہے اور شریعت کے امور اللہ تعالیٰ کے بیان سے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں (1)۔

**ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ** یعنی جو ان صفات سے موصوف ہے وہ ہی میرا رب یکتا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی اے محمد! انہیں کہو وہ ذات جو مردوں کو زندہ کرتی ہے وہی اللہ ہے اور جو مختلف امور میں فیصلہ کرنے والا ہے وہی میرا رب ہے اسی پر میں نے اعتماد کیا اور اسی کی طرف میں لوٹنے والا ہوں۔

**فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○**

''وہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا، اسی نے بنائے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے اور مویشیوں سے بھی جوڑے بنائے وہ پھیلاتا رہتا ہے تمہاری نسل کو اس کے ذریعہ، نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

**فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ** یہ لفظ اللہ کی صفت ہونے کی بنا پر مرفوع ہے یا تقدیر کلام یہ ہے ھو فاطر۔ ندا کے طور پر اسے نصب دینا بھی جائز ہے اور علیہ کی ضمیر سے بدل کے طریقہ پر جر دینا بھی جائز ہے۔ فاطر کا معنی مبدع اور خالق ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

**جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا** ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ازواجا کا معنی عورتیں ہیں یہاں **مِّنْ اَنْفُسِكُمْ** فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا کیا۔ مجاہد نے کہا: معنی نسل کے بعد نسل ہے (2)۔

**وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا** یعنی آٹھ جوڑے جن کا ذکر سورۂ انعام میں گذر چکا ہے اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور ان کے جوڑے۔

**يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ** تمہیں رحم میں پیدا کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بطن ہے۔ فراء اور ابن کیسان نے کہا: **فِيْهِ** میں ف، باء کے معنی میں ہے اسی طرح زجاج نے کہا: **يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ** کا معنی ہے وہ تمہیں اس کے ذریعے زیادہ کرتا ہے یعنی تمہیں زیادہ کرتا ہے کہ تمہاری اس نے بیویاں بنادیں کیونکہ بیویاں نسل کا سبب بنتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **فِيْهِ** میں ضمیر جعل کے لیے ہے اس پر جعل دلالت کرتا ہے گویا فرمایا وہ تمہیں جعل میں پیدا کرتا ہے اور تمہیں زیادہ کرتا ہے۔

ابن قتیبہ نے کہا: **فِيْهِ** میں ضمیر زوج کے لیے ہے یعنی وہ تمہیں عورتوں کے بطن میں پیدا کرتا ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **فِيْهِ** میں ضمیر سے مراد رحم ہے۔ یہ تعبیر حقیقت سے بعید ہے کیونکہ رحم مونث ہے اور اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

**لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○** ایک قول یہ کیا گیا ہے: کاف زائدہ تاکید کے لیے ہے یعنی اس کی مثل کوئی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 211 2۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 244 3۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 112

چیز نہیں۔ شاعر نے کہا:

و صالیات ککما یؤثفین (1)

یہاں کاف کو کاف پر داخل کیا گیا مقصود تشبیہ میں تاکید بیان کرنا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مثل تاکید کے لیے زائد ہے، یہ ثعلب کا قول ہے لیس کھوشئی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ: 137) یہاں بھی مثل زائد ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں فان آمنوا بما آمنتم بہ فقد اھتدوا اور بن حجر نے کہا:

وقتلیٰ کمثل جذوع النخیل　یغشاہم مطر منہمر(2)

کتنے ہی مقتول ہیں جو کھجور کے تنوں کی طرح ہیں جنہیں موسلا دھار بارش نے ڈھانپ رکھا ہے۔

شعر میں اصل کجذوع تھا۔ یہاں سے جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت، کبریائی، ملکوت، اسماء حسنیٰ، صفات کی بلندی میں اپنی مخلوقات میں سے کسی شے کے بھی مشابہ نہیں جہاں تک ان اسماء کا تعلق ہے جن کو شرع نے خالق اور مخلوق دونوں کے لیے ذکر کیا ہے تو معنی حقیقی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی مشابہت نہیں کیونکہ قدیم ذات کی صفات مخلوق کی صفات سے مختلف ہیں کیونکہ مخلوقات کی صفات اغراض واعراض سے جدا نہیں ہوتیں جبکہ اللہ تعالیٰ غرض وعرض سے پاک ہے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی صفات واسماء کے ساتھ رہتا ہے جس طرح ہم نے اس کی وضاحت الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں کی ہے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کافی ہے۔ بعض علماء محققین نے فرمایا: توحید کا مطلب ہے ایسی ذات کو ثابت کرنا جو کسی ذات کے مشابہ نہ ہو اور نہ ہی وہ صفات سے معطل ہو۔ واسطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ زائد بیان کیا ہے اس کی ذات جیسی کوئی ذات نہیں، اس کے اسم جیسا کوئی اسم نہیں، اس کے فعل جیسا کوئی فعل نہیں، اس کی صفت جیسی کوئی صفت نہیں مگر لفظ میں موافقت ہو سکتی ہے ذات قدیمہ اس سے بالا ہے کہ اس کی صفت حادث ہو جس طرح یہ محال ہے کہ حادث ذات کی کوئی صفت قدیم ہو؛ یہ اہل السنہ والجماعۃ کا مذہب ہے۔

## لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫

''اسی کے قبضہ میں ہیں کنجیاں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے)، بے شک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کی وضاحت سورۂ زمر میں گذر چکی ہے۔ نحاس نے کہا: جو چابیوں کا مالک ہوتا ہے وہ خزانوں کا بھی مالک ہوتا ہے (3)۔ مفتاح کو اقلید کہتے ہیں اس کی جمع خلاف قیاس آتی ہے جس طرح حسن کی جمع

1۔ تفسیر طبری، جز 25، صفحہ 18　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 28　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 29

خلاف قیاس محاسن آتی ہے یَبْسُطُ الرِّزْقَ ۔ اس کی بحث کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَ مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝

''اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کہ اس دین کو قائم رکھنا اور تفرقہ نہ ڈالنا، اس میں بہت گراں گذرتی ہے مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ انہیں بلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے۔ اور نہ بٹے وہ فرقوں میں مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس (صحیح) علم یہ (تفرقہ) محض باہمی حسد کے باعث تھا، اور اگر یہ فرمان پہلے نہ ہو چکا ہوتا آپ کے رب کی طرف سے کہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی جائے تو فیصلہ ہو چکا ہوتا ان کے درمیان اور جو لوگ وارث بنائے گئے تھے کتاب کے ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے''۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ وہ ذات پاک جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہیں اس نے تمہارے لیے وہ دین مقرر فرمایا جو قوم نوح، قوم ابراہیم، قوم موسیٰ اور قوم عیسیٰ علیہم السلام کے لیے مقرر فرمایا تھا پھر اس کی وضاحت اپنے اس ارشاد سے بیان کی اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بیان کرنا، اس کی اطاعت کرنا، اس کے رسولوں، کتابوں، یوم جزا اور باقی ماندہ تمام امور جنکو بجالانے سے ایک آدمی مسلمان ہوتا ہے پر ایمان لانا ہے۔ اور شرعی احکام جو امتوں کی مصلحتوں پر قائم ہیں اس طرح وارد نہیں ہوئے وہ مختلف اور متفاوت ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ: 48) اس بارے میں گفتگو گذر چکی ہے۔

شرع کا معنی ہے راستوں کو واضح کرنا قد شرع لھم یشرع شرعا یعنی سنن سنت قائم کی، واضح کیا۔ شارع سے مراد راستہ ہے قد شَرَعَ المَنْزِلُ جب وہ ایسے راستے پر ہو جو آگے کھلتا ہو۔ وشرعتُ الابل۔ جب تو اونٹ کو گھاٹ پر جانے کا موقع دے شرعتُ الادیم۔ جب تو اس کا چمڑا اتارے۔ یعقوب نے کہا: میں نے ام الحارس بکریہ کو کہتے ہوئے سنا شرعتُ لی ھذا

الامر شہ و عا یعنی میں اس میں گھس گیا۔

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ ان محل رفع میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی والذی وصی به نوحًا أن اقیموا الدین اس تعبیر کی بنا پر عیسیٰ پر وقف کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان محل نصب میں ہے اس نے اقامت دین کو تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بہ کی ھاء ضمیر سے بدل ہے گویا فرمایا: به أقیموا الدین ان دو تعبیروں کی بنا پر عِیْسٰی پر وقف کرنا جائز نہیں یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو جیسے اَنِ امْشُوْا (ص:6) میں ہے اس صورت میں اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: حدیث صحیح میں ثابت ہے (1) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کبیر والی مشہور حدیث میں کہا: ''بلکہ تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف بھیجا، وہ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے وہ عرض کریں گے: آپ پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف بھیجا'' یہ صحیح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں جس طرح حضرت آدم علیہ السلام پہلے نبی ہیں اس میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام صرف نبی ہی تھے آپ کے لیے فرائض معین ہوئے نہ محارم کا حکم دیا گیا، بعض امور کے بارے میں صرف تنبیہ تھی، معاش کی ضرورت تک معاملہ کو محدود رکھا گیا تھا، حیات و بقا کے کچھ معاملات کو اپنانے کا حکم تھا اور معاملہ حضرت نوح علیہ السلام تک آپہنچا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ماؤں، بیٹیوں، اور بہنوں کی حرمت کے ساتھ مبعوث کیا کچھ واجبات ان پر لازم کیے، دیانات میں آداب کو واضح کیا یہ امر رسولوں کے ساتھ موکد ہوتا رہا اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یکے بعد دیگرے اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کے ساتھ پختہ ہوتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسکا اختتام بہترین امت جو ہماری امت ہے پر کیا۔ اس کا ذکر تمام رسولوں سے معزز ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا معنی ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو اور حضرت نوح علیہ السلام کو ایک دین کی وصیت کی یعنی اصول جن میں شریعت مختلف نہیں ہوتی وہ توحید، نماز، زکوۃ، روزے، حج، اعمال صالحہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا، صدق، عہد کو پورا کرنا، امانت ادا کرنا، صلہ رحمی، کفر، قتل، زنا اور مخلوقات کو اذیت پہنچانے کی حرمت کیسی بھی صورت ہو، حیوانات پر ظلم کرنا کسی بھی طریقہ سے ہو، ذلت و پستی کے امور میں داخل ہونے کی حرمت، جو امور مروت کو ختم کر دیں ان کی حرمت یہ سب امور مشروع تھے ان میں سب دین ایک دین اور سب ملتیں ایک ملت ہیں، انبیاء کی زبانوں سے ان امور میں کوئی اختلاف نہیں اگرچہ ان کی قومیں اور زمانے مختلف تھے اللہ تعالیٰ کے فرمان سے یہی مقصود ہے: اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ یعنی اسے قائم رکھو اس سے مراد دائمی محفوظ ہے اس میں سے کسی قسم کا اختلاف نہ کرو کیونکہ ان امور میں کوئی اختلاف اور اضطراب نہیں۔ مخلوقات میں سے کچھ نے اس وعدہ کو پورا کیا اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جس نے اس کو توڑا۔ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ (فتح:10) ان چیزوں کے علاوہ میں شریعتوں میں چند امور میں اختلاف ہوا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا، مصلحت نے جس کا تقاضا کیا اور حکمت نے مختلف زمانوں میں امتوں پر ان کے رکھنے کو لازم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1666

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تاکیدی حکم دیا (1) وہ نماز قائم کرے، زکوۃ دے، اللہ تعالیٰ کے لیے اطاعت کا اقرار کرے یہی وہ دین ہے جو ان کے لیے مشروع کیا گیا، یہی قول واسطی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے؛ یہی کلبی کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: حلال کو حلال قرار دینا اور حرام کو حرام قرار دینا (2)۔ حکم نے کہا: ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو حرام قرار دینا۔ قاضی نے جو ذکر کیا ہے وہ ان تمام اقوال کو جامع ہے اور اس سے زائد بھی ذکر کیا ہے۔

حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کو خصوصا ذکر کیا کیونکہ وہ شریعتوں والے ہیں۔

**كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ** مشرکوں پر بہت بھاری ہے **مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ** جس کی طرف آپ انہیں بلاتے ہیں یعنی توحید اپنانا اور بتوں کو چھوڑنا۔ قتادہ نے کہا: مشرکین پر یہ بہت عظیم ہے ان پر شدید ترین لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے اس کے ساتھ ابلیس اور اس کے لشکر تنگ پڑ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند کیا کہ وہ اس کی مدد کرے اسے بلند کرے اور جو اس کا مقابلہ کرے اس پر اسے غالب کرے (3)۔

**اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ** اللہ تعالیٰ اختیار کرتا ہے۔ اجتباء کا معنی اختیار ہے یعنی توحید کے لیے جسے چاہتا ہے اپناتا ہے **وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ** ۝ اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنے دین کے لیے چن لیتا ہے **وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: واؤ سے مراد قریش ہیں **اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ** علم سے مراد حضرت **محمد** صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، قریش یہ آرزو کرتے تھے کہ ان کی طرف نبی مبعوث کیا جائے اس کی دلیل سورۂ فاطر 42 میں یہ ارشاد ہے: **وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ**۔ اس میں نذیر سے مراد نبی ہے سورہ بقرہ میں ہے **فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ** (89) اس کی وضاحت وہاں گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: واؤ ضمیر سے مراد متقدمین انبیاء ہیں کیونکہ جب ان کا زمانہ طویل ہو گیا تو انہوں نے باہم اختلاف کیا کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: واؤ ضمیر سے مراد اہل کتاب ہیں اس کی دلیل سورۂ منفکین کی آیت ہے **وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ** ۝ (البینہ) مشرکوں نے کہا: اسے نبوت کے ساتھ کیوں خاص کیا گیا؟ یہودیوں نے اس وقت حسد کیا جب آپ کو مبعوث کر دیا گیا، نصاریٰ کی بھی یہی صورتحال ہے **بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ** وہ ریاست کو طلب کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر بغاوت کرتے تھے ان کا یہ تفرقہ بیان اور حجج میں کوتاہی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ بغاوت، ظلم اور دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے تھا **وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ** ان لوگوں سے عذاب کو موخر کرنے کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا **اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى** ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد قیامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ** (قمر: 46) ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ وقت ہے جس میں ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے **لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ** یعنی نزول عذاب کے ساتھ مومنوں اور کافروں میں فیصلہ کر دیا جاتا **وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ** اسم موصول سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ **مِنْۢ بَعْدِهِمْ** حق میں اختلاف کرنے والوں کے بعد۔ **لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ** ۝ انبیاء نے

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 197 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

جس کا تاکیدی حکم دیا اس میں شک میں مبتلاء ہیں۔ یہاں کتاب سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ سے مراد قریش ہیں مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ضمیر سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں لَفِیۡ شَکٍّ قرآن یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شک میں مبتلا ہیں (1)۔ مجاہد نے کہا: مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ کا معنی ہے ان سے قبل یعنی مشرکین مکہ سے پہلے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔

فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿ؕ۱۵﴾

''پس اس دین کی طرف آپ دعوت دیتے رہیے اور ثابت قدم رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور نہ اتباع کیجئے ان کی خواہشات کی اور فرمائیے کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل کروں تمہارے درمیان، اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال، کسی بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہمارے اور تمہارے درمیان، اللہ ہم سب کو جمع کر دے گا اور اسی کی طرف سب نے پلٹنا ہے''۔

فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ جب یہ جائز ہے کہ شک یہود اور نصاریٰ کی جانب سے ہے یا شک قریش کی جانب سے ہے اس لیے آپ کو فرمایا: آپ نے ان کے شک کو پہچان لیا ہے پس آپ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں یعنی اس دین کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے لیے مشروع کیا اور انہیں اس کا تاکیدی حکم دیا۔ یہاں لام، الی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَہَا ؕ﴿۵﴾ (زلزال) اس میں لھا، إلیھا کے معنی میں ہے اور ذٰلک، ھذا کے معنی میں ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ معنی ہے قرآن کی طرف دعوت دیجیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے اسی وجہ سے تم دعوت اور استقامت کا مظاہرہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مخلوق کو قرآن کی دعوت دو وَ اسۡتَقِمۡ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے امر پر استقامت کا مظاہرہ کرو (2)۔ سفیان نے کہا: قرآن پر استقامت کا مظاہرہ کرو۔ ضحاک نے کہا: رسالت کی تبلیغ پر استقامت کا مظاہرہ کرو (3)۔

وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ جو آدمی آپ کی مخالفت کرتا ہے اس کی مخالفت کی طرف نہ دیکھو وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ۔ لِاَعۡدِلَ لِاَنۡ أعدل ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۶﴾ (غافر) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ لام کئی ہے معنی بنے گا لکی اعدل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو العالیہ نے کہا: تا کہ میں تمہارے درمیان دین میں برابری کروں اور میں ہر کتاب اور ہر رسول پر ایمان لاؤں۔ دوسرے علماء نے کہا: میں تمام احوال میں عدل کروں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ عدل، احکام میں عدل ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تبلیغ میں عدل ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 198 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 199 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: خطاب یہودیوں کو ہے یعنی ہمارے لیے ہمارا دین اور تمہارے لیے تمہارا دین ہے، کہا: پھر اس ارشاد کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہوگیا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ: 29)

مجاہد نے کہا: لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ کا معنی ہے ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی خصوصیت نہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم منسوخ نہیں کیونکہ براہین ظاہر ہو چکیں اور دلائل قائم ہو چکے اب عناد کے سوا کوئی چیز باقی نہیں اور عناد کے بعد کوئی حجت اور جدال نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ معنی کرنا بھی جائز ہے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تمہارے خلاف دلیل قائم کی جائے اور تم سے جنگ کی جائے پھر اسے منسوخ کر دیا گیا جس طرح تحویل قبلہ سے پہلے کوئی کہے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو پھر لوگوں کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا تو یہ جائز ہے کہ یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا یوم قیامت کا ارادہ کیا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۞ جب ہم اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو وہ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے گا اور ہر ایک کو اسی کے مطابق جزا دی جائیگی جس پر وہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ اپنی دعوت اور دین سے قریش کے دین کی طرف پلٹ آئیں شرط انہوں نے یہ لگائی کہ ولید آپ کو اپنا نصف مال دے دے گا اور شیبہ اپنی بیٹی کا رشتہ آپ سے کر دے گا (2)۔

**وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۞**

''اور جو لوگ حجت بازی کرتے ہیں اللہ (کے دین) کے بارے میں اس کے بعد کہ (اکثر حق شناس) اس کو مان چکے ہیں سو ان کی حجت بازی لغو ہے ان کے رب کے نزدیک اور ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کے لیے سخت عذاب ہے''۔

وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ مشرکین کی طرف رجوع کیا۔ مجاہد نے کہا: لوگوں کے اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دین میں حجت بازیاں کرتے ہیں۔ کہا: ان لوگوں نے وہم کیا کہ جاہلیت لوٹ آئے گی (3)۔ قتادہ نے کہا: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں حجت بازیاں کرتے ہیں وہ یہود و نصاریٰ ہیں (4)، ان کی حجت بازی ان کا یہ قول تھا: ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، وہ اپنی فضیلت کا تصور رکھتے تھے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور انبیاء کی اولاد ہیں مشرکین کہتے ہیں اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ۞ (مریم) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کے لیے کوئی ثبات نہیں اس شے کی طرح جو اپنی جگہ سے پھسل جاتی ہے لہ میں ھا ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے بعد اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کی جا چکی تھی جیسے اہل بدر اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کی تھی یوں اس کا باب ذکر کیا جاتا ہے دحضت حجۃ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 199 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 200 4۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 245

دُحوضًا وہ باطل ہوگئی ادحضہا اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باطل کر دیا۔ ادحاض کا معنی پھسلانا ہے۔ مکان دَحْض و دَحَض ایسی جگہ جس پر پھسلن ہو۔ دَحضت رجلُہ تَدحَض دَحْضًا اس کا پاؤں پھسل گیا دحضت الشمس عند کبد السماء سورج زائل ہوگیا وَّ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ مراد دنیا ہے یعنی دنیا میں اپ پر غضب ہوگا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ اس سے مراد ہے آخرت میں ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نازل کیا ہے کتاب کو حق کے ساتھ اور نازل کیا ہے میزان کو اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو''۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ قرآن اور باقی کتب منزلہ ہیں۔ بِالْحَقِّ حق سے مراد صدق ہے وَالْمِيْزَانَ سے مراد عدل ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول ہے (1)۔ عدل کو میزان کہتے ہیں کیونکہ میزان انصاف اور عدل کا آلہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میزان سے مراد وہ ہے جو کتاب میں واضح کیا گیا ہے جس پر عمل کرنا انسان پر واجب ہے۔ قتادہ نے کہا: میزان سے مامور اور منہی میں عدل کرنا ہے (2)۔ یہ تمام اقوام معنی میں قریب قریب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اطاعت پر ثواب کے ساتھ جزا دینا اور معصیت پر عقاب سے جزا دینا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میزان سے مراد ترازو ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان سے نازل کیا اور لوگوں کو اس کے ساتھ وزن کرنے کی تعلیم دی تاکہ لوگوں میں باہم ظلم اور حقوق میں کمی نہ ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید:25)

مجاہد نے کہا: یہ وہ چیز ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے انزل المیزان کا معنی ہے مخلوق کو الہام کیا کہ اس کو کام میں لائیں (3)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ میزان سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے جو تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ قیامت کے وقت کے بارے میں آپ کو آگاہ نہ کیا کتاب اللہ پر عمل، عدل، برابری اور شرائع پر عمل کرنے پر برانگیختہ کیا قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں محاسبہ اور اعمال کا وزن ہو جس نے ان احکام پر پورا پورا عمل کیا تھا اس کو پورا پورا اعطا کرے گا اور جس نے اس میں کمی کی ہوگی اس کے حق میں کمی کرے گا۔

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ ممکن ہے قیامت آپ کے قریب ہو جبکہ آپ اپنی دانش سے اس کو نہ جانیں۔ یہاں قریب فرمایا ہے قریبۃ نہیں فرمایا کیونکہ اس کی تانیث غیر حقیقی ہے کیونکہ یہ وقت کی طرح ہے (4)؛ یہ زجاج کا قول ہے معنی ہے ممکن ہے بعث یا قیامت کا آنا قریب ہو۔ کسائی نے کہا: قریب صفت ہے جس کے ساتھ مذکر، مونث اور ایسی جمع کی صفت لگائی

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 114 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 200 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 31

جاتی ہے جو معناً جمع ہو اور لفظاً واحد ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (اعراف)
شاعر نے کہا:

كنا قريبا والديار بعيدة

ہم قریب تھے اور گھر دور تھے۔ محل استدلال قریبا ہے۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۗ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝

''جلدی مچاتے ہیں اس کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے اس پر اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ خوفزدہ رہتے ہیں اس سے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، خبردار! جو لوگ شک کرتے ہیں قیامت کے متعلق وہ بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں''۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وہ یہ کلام استہزاء کے طور پر کرتے، ان کا گمان یہ تھا کہ قیامت واقع نہ ہوگی یا کمزور لوگوں کو وہم دلاتے تھے کہ وہ واقع نہ ہوگی مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وہ اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اطاعت میں جس طرح انہیں کوشش کرنی چاہیے اس میں انہوں نے کوتاہی کی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرمان ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ (مومنون) وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔

اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ وہ قیامت کے برپا ہونے میں شک کرتے ہیں اور اس میں مخاصمت کرتے ہیں لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وہ حق اور عبرت کے راستہ سے بہت بعید ہیں کیونکہ اگر وہ سوچ و بچار کرتے تو وہ یہ جان لیتے کہ جس ذات پاک نے انہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے یہاں تک کہ وہ پہنچے جہاں تک پہنچے تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ انہیں دوبارہ اٹھائے۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝

''اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہی قوی اور زبردست ہے''۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ان پر شفیق ہے۔ عکرمہ نے کہا: وہ ان کے ساتھ نیکی کرنے والا ہے۔ سدی نے کہا: وہ ان کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ نیک اور فاجر کے ساتھ مہربانی کرنے والا ہے کیونکہ ان کے معاصی کی وجہ سے وہ بھوکوں نہیں مرتے۔ قرظی نے کہا: وہ پیشی اور محاسبہ کے موقع پر شفقت فرمانے والا ہے۔ کہا:

غدا عند مَوْلَى الخلق للخلق موقفٌ يسائلهم فيه الجليل ويلطف

قیامت کے روز مخلوق نے خالق کے ہاں کھڑا ہونا ہے، اس روز اللہ تعالیٰ ان سے باز پرس کرے گا اور مہربانی فرمائے گا۔

جعفر بن محمد بن علی بن حسین نے کہا: رزق میں دو طریقوں سے مہربانی فرماتا ہے: (1) اس نے تیرا رزق پاکیزہ چیزوں سے بنایا ہے (2) اس نے رزق تجھے ایک ہی دفعہ نہیں دے دیا کہ تو اس میں فضول خرچی کر دے۔ حسین بن فضل نے کہا: قرآن میں اس کے ساتھ شفقت کرنے والا ہے، اس کی تفسیر اور تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ جنید نے کہا: وہ اپنے اولیاء پر

مہربانی کرنے والا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پہچان لیتے ہیں اور اگر وہ اپنے دشمنوں پر مہربانی فرماتا تو وہ اس کا انکار نہ کرتے۔
محمد بن علی کتانی نے کہا: لَطِیْفٌ سے مراد اس کے بندوں سے جو اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہے جب وہ مخلوق سے مایوس ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے اور اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے اور اس پر توجہ فرماتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث طیبہ میں آیا ہے ''اللہ تعالیٰ بوسیدہ قبروں کی طرف جھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ان کے آثار مٹ گئے اور ان کی صورتیں محو ہو گئیں اور ان پر عذاب باقی ہے جبکہ میں لطیف ہوں اور أرحم الراحمین ہوں، ان سے عذاب میں تخفیف کردو، تو ان سے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے'' (1)۔ ابو علی ثقفی رحمہ اللہ نے کہا:

أمر بأفناء القبور كأنني أخوفطنة والثوب فيه نحيف
ومن شق فاه الله قدر رزقه وربي بمن يلجأ إليه لطيف

میں قبرستانوں سے گذرتا ہوں گویا میں سمجھدار ہوں جبکہ کپڑا اس میں کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کا منہ کھولتا ہے اس کا رزق مقرر کر دیتا ہے اور جو اس کی پناہ لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لطیف اسے کہتے ہیں جو اپنے بندوں کے مناقب کو عام کرتا ہے اور ان کے گناہوں کو چھپاتا ہے اسی تعبیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یا من أظهر الجمیل وستر القبیح اے وہ ذات پاک! جو جمیل کو ظاہر کرتی ہے اور قبیح امر کو پوشیدہ رکھتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لطیف اسے کہتے ہیں کہ قلیل کو قبول کرے اور عظیم چیز کو خرچ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کرے اور مشکل کو آسان کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس سے مراد وہ ذات ہے جس کے عدل سے ڈرا جاتا ہے اور اس کے فضل سے امید رکھی جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ ذات ہے جو اپنے بندے پر ہمت سے بڑھ کر نعمت کرتا ہے اور طاقت سے بڑھ کر اطاعت کی توفیق دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) وَ اَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان: 20) وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج: 78) یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (النساء: 28) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جو خدمت پر مدد کرتا ہے اور زیادہ مدح کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو اس کی نافرمانی کرے اس کو جلدی سزا نہیں دیتا اور جو اس سے امید رکھے اسے خائب وخاسر نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے سائل کو خالی نہیں لوٹاتا اور امید رکھنے والے کو مایوس نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو لغزش کرتا ہے اسے معاف کر دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس پر رحم فرماتا ہے جو اپنے آپ پر رحم نہیں فرماتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ ذات ہے جو عارفین کے دلوں میں مشاہدہ کا چراغ روشن کرتی ہے اور صراط مستقیم کو اس کا منہاج بنا دیتی ہے اور اپنے نیکی کے بادلوں سے ان کے لیے موسلا دھار بارش برساتی ہے۔ سورۃ الانعام میں ابو العالیہ اور جنید کا قول گذر چکا ہے ہم نے یہ سب باتیں الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں لطیف اسم کے ضمن میں ذکر کر دی ہیں۔ الحمد للہ۔

1۔ صاوی علی الجلالین، جلد 4، صفحہ 31

یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے، کسی قوم کو مال میں فضیلت دینے میں حکمت ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کے محتاج رہیں جس طرح ارشاد فرمایا: لِیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا (زخرف: 32) یہ بندوں پر مہربانی ہے، یہ بھی مقصود ہے کہ اس کے ذریعے غنی کو فقیر اور فقیر کو غنی کے ساتھ امتحان میں ڈالا جائے جس طرح ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ (فرقان: 20) اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ﴿۲۰﴾

''جو طلبگار ہو آخرت کی کھیتی کا تو ہم اپنے فضل و کرم سے اس کی کھیتی کو اور بڑھا دیں گے اور جو شخص خواہشمند ہو صرف دنیا کی کھیتی کا تو ہم اسے دیں گے اس سے اور نہیں ہوگا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ''۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ حرث سے مراد عمل اور کسب ہے، اسی معنی میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: تو دنیا کے لیے تگ و دو کر گویا تو نے ہمیشہ رہنا ہے اور اپنی آخرت کے لیے کوشش کر گویا تو نے کل ہی مر جانا ہے (1)۔ اسی وجہ سے انسان کو حارث کہتے ہیں معنی ہے ہم نے اسے رزق دیا ہے جو اسے آخرت کی کھیتی کے طور پر طلب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتا ہے اور دین کی عزت کی خاطر مال خرچ کرتا ہے تو ہم اس کا ثواب ایک کے بدلہ میں دس گنا، سات سو گنا اور اس سے زیادہ تک دیتے ہیں۔

وَ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا اللہ تعالیٰ نے اسے جو مال دیا ہے وہ اس کے ذریعہ دنیا کی ریاست چاہتا ہے ممنوعات تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ہم اسے رزق سے محروم نہیں کرتے لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان: مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ (بنی اسرائیل)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ کا معنی ہے ہم اسے عبادت کی توفیق دیتے ہیں اور ہم اسے ان پر آسان کر دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حَرْثَ الْاٰخِرَةِ سے مراد اطاعت ہے یعنی جس نے اطاعت کی اس کے لیے ثواب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ کا معنی ہے ہم اسے دنیا' آخرت کے ساتھ دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے یعنی جس نے جہاد کے ساتھ آخرت کا ارادہ کیا اسے ثواب دیا جائے گا جس نے اپنے جہاد سے غنیمت کا ارادہ کیا تو اسے غنیمت دے دی جائے گی۔

قشیری نے کہا: آیت کافر کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ جسے دنیا میں وسیع رزق دیتا ہے یعنی اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس سے دھوکہ میں مبتلا ہو کیونکہ دنیا باقی رہنے والی نہیں۔ قتادہ نے کہا: جو آخرت کی نیت کرتا ہے (2) اللہ تعالیٰ اسے دنیا کی چیزیں بھی عطا فرماتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور جس نے دنیا کی نیت کی اسے صرف دنیا میں عطا فرماتا ہے، یہ بھی فرمایا اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 32
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 200

ارشاد فرماتا ہے: جو آدمی آخرت کے لیے عمل کرتا ہے تو ہم اسکے عمل میں اضافہ کر دیتے ہیں اور دنیا سے اسے وہ کچھ عطا کرتے ہیں جو کچھ ہم نے اس کے لیے لکھا ہوتا ہے اور جو اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے تو ہم اس کے لیے آخرت میں صرف آگ کا ہی حصہ بنا دیتے ہیں اور دنیا سے وہی رزق پاتا ہے جو ہم نے اس کے لیے تقسیم کر رکھا ہوتا ہے جو اسے دیا جانا ضروری ہوتا ہے خواہ وہ ترجیح دے یا نہ دے۔

جویبر نے ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب ہے: جو ابرار سے ہوتا ہے وہ اپنے عمل صالح کے ساتھ آخرت کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کی نیکیوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اور جو فاجر ہوا کرتا ہے وہ اپنے عمل حسن کے ساتھ دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اسے وہی دے دیتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ یہ منسوخ ہو گیا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (اسرائیل: 18) صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ یہ خبر ہے اور تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوا کرتی ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث صحیح ثابت ہے لا يقل أحدكم اللّٰهم أغفر لي إن شئت اللّٰهم ارحمني إن شئت(1)۔ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: اے اللہ! مجھے بخش دے اگر تو چاہے، اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے۔ قتادہ نے کہا: جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے وہ تیرے سامنے اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ نسخ نہیں۔ ہم نے سورۂ ہود میں اس امر کی وضاحت کی ہے یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہے اور نسخ اخبار میں داخل نہیں ہوتا۔

**مسئلہ:** یہ آیت امام ابوحنیفہ کے اس قول کو باطل کرتی ہے(2): جس نے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے وضو کیا تو یہ وضو اس کے فرض کے قائم مقام ہو جائے گا کیونکہ وضو کی فرضیت آخرت کی کھیتی ہے اور ٹھنڈک حاصل کرنا امور دنیا سے ہے ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر داخل نہ ہوگا اس آیت کے ظاہر سے اس کی نیت اس کے قائم مقام نہ ہوگی؛ (☆) یہ ابن عربی کا قول ہے۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَإِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿21﴾

"کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے مقرر کیا ہے ان کے لیے ایسا دین جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی اور اگر ان کے فیصلہ کی بات پہلے سے طے نہ ہوتی تو ان کا قصہ کبھی کا چکا دیا گیا ہوتا اور جو ظالم ہیں یقیناً ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا ام میں میم زائدہ ہے اور ہمزہ تقریع کے لیے ہے یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب العزم فی الدعاء، جلد 2، صفحہ 342

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1667

☆۔ ائمہ احناف یہ کہتے ہیں کہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی عطا کرنے والا بنایا ہے۔ قرآن حکیم میں وضو کو نیت کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا اگر ایک آدمی پانی استعمال کرتا ہے اور وضو کے ارکان وسنن بجالاتا ہے تو اس کا وضو ہو جائے گا تاہم وضو میں نیت کرتا تو اس کے اعضاء کے گناہ زائل ہو جاتے۔

یہ نُوۡحًا اور اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ کے ساتھ متعلق ہے۔ وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے تھے کیا ان کے اپنے معبود ہیں جنہوں نے ان کے لیے شرک مشروع کیا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی جب یہ محال ہے تو اللہ تعالیٰ نے شرک کو شروع نہیں کیا تو پھر تم کس طرح اس کو اپناتے ہو۔

وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃُ الۡفَصۡلِ اس سے مراد یوم قیامت ہے کیونکہ ارشاد فرمایا: بَلِ السَّاعَۃُ مَوۡعِدُہُمۡ (قمر:46) لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ دنیا میں ہی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا یعنی ظالم کو جلدی عذاب دیتا اور اطاعت شعار کو ثواب دیتا۔ ظالمین سے مراد مشرک ہیں ان کے لیے دنیا میں قتل، قید اور مغلوب ہونا ہے اور آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ ابن ہرمز نے کہا اَنّ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃُ پر ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ لولا کے جواب کے ساتھ جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان محل رفع میں ہو تقدیر کلام یہ ہوگی وجب أن الظالمین لھم عذاب الیم اسی صورت میں یہ کلام ماقبل سے منقطع ہوگی جس طرح جب ان کے ہمزہ کے نیچے کسرہ پڑھا جائے۔

تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿۲۲﴾

"آپ دیکھیں گے ظالموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے ان (کرتوتوں) سے جو انہوں نے کمائے اور وہ ان پر واقع ہو کر رہے گا، اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہوں گے انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے، یہی بڑا فضل ہے"۔

مُشۡفِقِیۡنَ کا معنی ڈرنے والے ہیں۔ مِمَّا کَسَبُوۡا جو کچھ انہوں نے کیا اس کی جزا۔ یہاں ظالموں سے مراد کافر ون ہیں، کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان تقسیم والی دلیل موجود ہے۔

وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ان پر نازل ہونے والا ہے رَوۡضٰتِ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں بہت زیادہ سرسبزی ہوتی ہے۔ سورۂ روم میں یہ بحث گذر چکی ہے لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یعنی ان کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمتیں اور عظیم ثواب ہے۔

ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿۲۲﴾ اس کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا اور عقلیں اس کی صفت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے لیے کبیر کا لفظ استعمال کرے تو کون اس کا اندازہ لگائے گا؟

ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ وَ مَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿۲۳﴾

"یہ وہ چیز ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے ہیں۔

آپ فرمایئے میں نہیں مانگتا اس دعوت حق پر کوئی معاوضہ بجز قرابت کی محبت کے، اور جو شخص کماتا ہے کوئی نیکی ہم دوبالا کریں گے اس کے لیے اس میں حسن، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا قدردان ہے''۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، یُبشرہ کو باب تفعیل سے یُبشِّرُہ باب افعال سے یُبْشِرُہ اور مجرد سے یبشُرُہ بھی پڑھا گیا ہے اس میں حذف ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس کی بشارت دیتا ہے تا کہ انہیں جلدی خوشنودی حاصل ہو اور اطاعت میں وہ زیادہ شوق و محبت پائیں۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے میں رسالت کی تبلیغ پر تم سے انعام کا سوال نہیں کرتا۔

زجاج نے کہا: اِلَّا الْمَوَدَّةَ مستثنیٰ ہے معنی یہ بنتا ہے میں تم سے کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتا مگر یہ کہ تم میری قرابت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو اور میری حفاظت کرو (1)۔ خطاب خاص طور پر قریش کے لیے تھا؛ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، ابو مالک، شعبی وغیرہ کا قول ہے۔ شعبی نے کہا: اس آیت کے بارے میں لوگوں نے ہم سے بہت زیادہ سوال کیے تو ہم نے اس کے متعلق سوال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں لکھ بھیجا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: قریش کے خاندانوں میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جنا ہو یعنی (سب کے ساتھ ننہال کی رشتہ داری تھی کسی کے ساتھ اپنی اور کسی کے ساتھ آباء واجداد کی) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا: قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى یعنی جو رشتہ داری میرے اور تمہارے درمیان ہے تم اس کا لحاظ رکھو اور میری تصدیق کرو۔ یہاں الْقُرْبٰى سے مراد ننہال کی رشتہ داری ہے گویا فرمایا: اگر تم میری اتباع نبوت کی وجہ سے نہیں کرتے تو رشتہ داری کا پاس رکھتے ہوئے ہی میری اتباع کرو۔ عکرمہ نے کہا: قریش ننہالی رشتہ داری کا بڑا پاس کرتے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو انہوں نے اسے قطع کیا تو فرمایا: ''تم میرے ساتھ ایسی ہی صلہ رحمی کرو جس طرح تم کیا کرتے تھے''۔ اس تعبیر کی بنا پر معنی یہ ہوگا میں تم سے اجر کا سوال نہیں کرتا لیکن میں تمہیں اپنی قرابت یاد دلاتا ہوں؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

بخاری شریف میں طاؤس سے مروی ہے (2) وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ان سے اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے بارے میں پوچھا گیا تو سعید بن جبیر نے کہا: قربیٰ سے مراد آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تو نے بہت جلدی کی ہے قریش کے خاندانوں میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری نہ ہو تو فرمایا: مگر یہ کہ تم رشتہ داری کی وجہ سے صلہ رحمی کرو؛ یہ ایک قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ قربیٰ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے، معنی ہے میں تم سے اجر کا سوال نہیں کرتا (3) مگر یہ کہ تم میری قرابت اور اہل بیت اطہار سے محبت کرو جس طرح انہیں قریبی رشتہ داروں کی تعظیم کا حکم دیا؛ یہ قول علی بن

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 201 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب حم عسق، جلد 2، صفحہ 713 3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 202

حسین، عمرو بن شعیب اور سدی کا ہے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے ''جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا صحابی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہیں جن سے ہم محبت کریں؟ فرمایا: ''علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے (1)'' اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حسد کی شکایت کی فرمایا: ''کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو ان چار میں چوتھا ہو جو جنت میں پہلے داخل ہوں گے میں، تو، حسن اور حسین ہماری ازواج ہمارے دائیں اور بائیں ہونگی اور ہماری اولادیں ہماری بیویوں کے پیچھے ہونگی'' (2)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان لوگوں پر جنت حرام کر دی گئی جس نے تیرے اہل بیت پر ظلم کیا، میری عترت کے بارے میں مجھے اذیت دی، جس نے عبدالمطلب کے خاندان میں سے کسی فرد کے ساتھ حسن سلوک کیا اس نے اسے بدلہ نہ دیا جب قیامت کے روز وہ مجھے ملے گا تو میں اسے بدلہ دوں گا'' (3)۔

حسن بصری اور قتادہ نے یہ کہا: معنی ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں اور اس کی اطاعت اپنا کر اس کا قرب حاصل کریں (4)۔ اس صورت میں قربیٰ، قربت کے معنی میں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: قربۃ اور قربیٰ ایک معنی میں ہیں جس طرح زلفۃ اور زلفیٰ ہے۔

قزعہ بن سوید، ابن ابی نجیح سے وہ مجاہد سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فرمادیجئے جو میں تمہارے پاس لایا ہوں اس پر میں تم سے اجر کا سوال نہیں کرتا مگر یہ کہ تم باہم محبت کرو اور اطاعت اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو'' (5)۔

منصور اور عوف نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ مراد ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں اور اس کی اطاعت اختیار کر کے اس کا قرب حاصل کریں۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: یہ آیت منسوخ ہے، یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی مشرک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دیا کرتے تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ساتھ محبت کرنے اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو انصار نے آپ کو پناہ دی اور آپ کی مدد کی اور اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے انبیاء بھائیوں کے ساتھ لاحق کر دے کیونکہ انہوں نے کہا تھا: وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (شعراء) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ ۝ (ص) اور اس ارشاد: اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ (مومنون: 72) اور اس ارشاد: اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ (طور) کے ساتھ منسوخ ہوگئی؛ یہ ضحاک اور

1۔ تفسیر ابن عباس و مروياته في التفسير من كتب السنة، جلد 2، صفحہ 780　2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 220

3۔ ایضاً　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 202

5۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، توضیح معنی الا المودۃ فی القربیٰ، جلد 2، صفحہ 82-481، حدیث نمبر 796

حسین بن فضل کا نقطہ نظر ہے۔ جویبر نے ضحاک سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں ثعلبی نے کہا: یہ قوی نہیں جو آدمی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس کی اطاعت کے ساتھ، اس کے نبی کی محبت کے ساتھ اور اہل بیت کی محبت کے ساتھ والا امر منسوخ ہے اس کے قول کی قباحت کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ شہید کی حیثیت سے مرا، جو آدمی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں مرا اللہ تعالیٰ اس کی قبر کے زائرین رحمت کے فرشتوں کو بنادے گا، جو آدمی آل محمد کے بغض پر مرا تو وہ قیامت کے روز یوں آئیگا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہے، جو آدمی آل محمد کے بغض پر مرا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا، جو میرے آل بیت کے بغض پر مرا تو میری شفاعت میں سے اس کا کوئی حصہ نہیں''۔

میں کہتا ہوں: اس روایت کو زمخشری نے اپنی تفسیر میں اس سے بھی طویل نقل کیا ہے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آل محمد کی محبت پر مرا تو وہ شہید کی حیثیت سے فوت ہوا اور جو آل محمد کی محبت پر فوت ہوا تو مومن کی حیثیت سے فوت ہوا جبکہ وہ کامل ایمان والا ہوگا خبردار! جو آل محمد کی محبت پر مرا ملک الموت پھر منکر نکیر اسے جنت کی بشارت دیں گے خبردار! جو آل محمد کی محبت میں مرا اسے جنت کی طرف یوں لے جایا جائے گا جس طرح دلہن کو اس کے خاوند کے گھر لے جایا جاتا ہے خبردار! جو آل محمد کی محبت پر مرا اس کی قبر میں دو دروازے جنت کی طرف کھول دیئے جاتے ہیں خبردار! جو آل محمد کی محبت پر مرا اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ بنا دیتا ہے خبردار! جو آل محمد کی محبت پر مرا وہ سنت اور جماعت پر مرا خبردار! جو آل محمد کے بغض پر مرا وہ قیامت کے روز یوں آئیگا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہے خبردار! جو آل محمد کے بغض پر مرا وہ کافر کی حیثیت سے مرا خبردار! جو آل محمد کے بغض پر مرا وہ جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا''(1)۔ نحاس نے کہا: عکرمہ کا مذہب ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ کہا: قریش صلہ رحمی کیا کرتے تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو انہوں نے قطع رحمی کی۔ فرمایا: ''میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا مگر یہ کہ تم مجھ سے محبت کرو میری قرابت کی حفاظت کرو اور مجھے نہ جھٹلاؤ''۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس کا قول جو بخاری میں ہے امام شعبی نے بھی ان سے یہی قول نقل کیا ہے یہ کوئی منسوخ نہیں۔ نحاس نے کہا حضرت حسن بصری کا قول حسن ہے اس کی صحت پر یہ حدیث مسند دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے جسے احمد بن محمد ازدی، ربیع بن سلیمان مرادی سے وہ اسد بن موسیٰ سے وہ قزعہ بن یزید بصری سے وہ عبداللہ بن ابی نجیح سے وہ مجاہد سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو کچھ بینات اور ہدایات میں تمہیں پہنچاتا ہوں اس پر میں تم سے کوئی سوال نہیں کرتا مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اس کی اطاعت اختیار کر کے اس کا قرب حاصل کرو'' اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ واضح امر ہے آپ سے قبل انبیاء نے بھی یہی بات کہی تھی: اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (سبا: 47)

**مسئلہ نمبر 2۔** اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 220

کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی مشکلات بار بار آتیں اور ایسے حقوق ادا کرنے پڑتے جو کچھ وسائل آپ کے پاس ہوتے وہ آپ کو کفایت نہ کرتے۔ انصار نے کہا: اس ذات نے تمہاری اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کی ہے جبکہ یہ تمہارے عزیز بھی ہیں انہیں ایسے حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسے حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ انہیں کافی نہیں ہوتا ہم آپ کے لیے مال جمع کرتے ہیں انہوں نے اسی طرح کیا پھر وہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت حسن بصری نے کہا: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انصار اور مہاجرین نے باہم فخر کیا، انصار نے کہا: ہم نے یہ کیا، مہاجرین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت پر فخر کیا(1)۔ مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی امر کے بارے میں سنا تو خطبہ ارشاد فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا: ''کیا تم بے بس نہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری وجہ سے عزت دی؟(2)'' فرمایا: ''تم مجھے جواب نہیں دو گے؟'' انصار نے عرض کی: ہم کس طرح آپ کو جواب دیں؟ فرمایا: ''تم کہتے کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کو رد نہیں کر دیا تھا تو ہم نے آپ کو پناہ دی؟ کیا انہوں نے آپ کو جھٹلایا نہیں تھا تو ہم نے آپ کی تصدیق کی؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتیں ان پر شمار کیں کہا: صحابہ کرام گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا: ہماری جانیں اور ہمارے مال آپ کے لیے ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قتادہ نے کہا: مشرکوں نے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز لاتے ہیں شائید اس کے ساتھ اجر کے طالب ہیں، تو یہ آیت نازل ہوئی تاکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رشتہ داروں کی محبت پر برانگیختہ کرے۔ ثعلبی نے کہا: یہ تعبیر آیت کے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ سورت مکی ہے۔

**وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً**۔ **يَقْتَرِفُ** کا معنی يكتسب ہے۔ قرف کا اصل معنی کسب ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: فلان يقرف لعياله فلاں اپنے اہل وعیال کے لیے مزدوری کرتا ہے۔ اقتراف کا معنی اکتساب ہے؛ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے رجل قرفة جب وہ محنت مزدوری کرتا ہو۔ سورۂ انعام میں اس کے بارے میں بحث گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: **وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً** سے مراد ہے جس نے آل محمد سے محبت کی **نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا** ہم اس کے لیے دس یا اس سے زائد گنا اجر دے دیں گے۔ **اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ** ﴿۲۳﴾ قتادہ نے کہا: **غَفُوْرٌ** یعنی گناہوں کو بخشنے والا **شَكُوْرٌ** یعنی نیکیوں پر خوش ہونے والا (3)۔ سدی نے کہا: آل محمد علیہم السلام کے گناہ بخشنے والا اور ان کی نیکیوں پر اجر دینے والا (4)۔

**اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ۭ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** ﴿۲۴﴾

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے پس اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو مہر لگا دیتا آپ کے دل پر، اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے ارشادات سے، بے شک وہ جاننے والا

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 423	2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 202	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

ہے جو کچھ سینوں میں ہے''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا، ام میں میم زائد ہے تقدیر کلام یہ ہے أيقولون افتری کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (الشوریٰ: 15) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (شوریٰ: 17) بیان کو مکمل کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا واؤ ضمیر سے مراد کفار قریش ہیں انہوں نے کہا: (حضرت) محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑا ہے۔

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ یہ شرط اور جواب ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مہر لگا دے گا اور تجھے قرآن بھلا دے گا، اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی اگر حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے تو اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ یوں ہی معاملہ کرتا جس کی اس نے اس آیت میں خبر دی ہے۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تیرے دل کو ان کی اذیتوں پر مضبوط کر دے ان کے قول سے آپ کے دل کو کوئی مشقت نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تیری دانش کو زائل کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تیرے دل میں خیال آئے کہ تو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے تو وہ تیرے دل پر مہر لگا دے (1)؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کفار کے دلوں اور زبانوں پر مہر لگا دے اور جلدی عذاب میں مبتلا کر دے، خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور کفار مراد ہیں؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے، پھر کلام شروع کی اور فرمایا: وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ ابن انباری نے کہا: يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ۔ کسائی نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے کلام اس طرح ہے وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ مصحف میں واؤ محذوف ہے (2) یہ کلام محل رفع میں ہے جس طرح ان آیات میں حذف ہے سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿﴾ (علق) کیونکہ اس کا عطف يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ پر ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا مکمل گفتگو ہے وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ یہ ان لوگوں کے خلاف استدلال ہے جو نبی کریم ﷺ کے پیغام حق کا انکار کرتے ہیں یعنی اگر نبی کریم ﷺ جو پیغام لاتے ہیں وہ باطل ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا جس طرح بہتان لگانے والوں کے بارے میں اس کی عادت ہے۔

وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ حق سے مراد اسلام ہے یعنی اسلام کو قرآنی آیات کے ساتھ ثابت کرتا ہے اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿﴾ یہ عام ہے یعنی بندوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ حکم خاص ہے اس کا معنی ہے اگر تیرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ تو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور تیرے دل پر مہر لگا دے گا۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿﴾

''اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو''۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 202
2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 18

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب آیت قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا نازل ہوئی کچھ لوگوں نے اپنے دلوں میں سوچا آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنے بعد ہمیں اپنے قریبی رشتہ داروں کی اتباع پر برانگیختہ کررہے ہیں جبریل امین نے اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگائی ہے تو یہ آیت اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا نازل ہوئی تو ان لوگوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور ہم توبہ کرتے ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنے اولیاء اور اہل اطاعت کی توبہ قبول فرماتا ہے، آیت عام ہے (2)۔ توبہ کے معنی اور اس کے احکام کے متعلق گفتگو گذر چکی ہے۔ سورۂ براءت میں یہ لفظ گذر چکا ہے۔

وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ یعنی اسلام لانے سے قبل جو شرک کیا کرتا تھا اس کو معاف فرماتا ہے اور تم جو اچھا یا برا عمل کرتے ہو اسے جانتا ہے۔ حمزہ، کسائی، حفص اور خلف نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان شاگردوں کی قراءت ہے باقی نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ یہ دو خبروں کے درمیان ہے پہلی خبر وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ اور دوسری يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہے۔

## وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝

''اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کے حق سے بھی انہیں زیادہ اجر دیتا ہے اپنی مہربانی سے، اور کفار، ان کے لیے سخت عذاب ہے''۔

الَّذِيْنَ محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس آدمی کی عبادت قبول فرماتا ہے جس نے دل کے اخلاص کے ساتھ عبادت کی ہو اور اپنے بدن کے ساتھ اطاعت کی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں تو وہ ان کی عرضداشت کو قبول فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مومنوں کے حق میں ایک دوسرے کی دعا قبول فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اجاب اور استجاب کا ایک معنی ہے۔ سورۂ بقرۃ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ مومنوں کی ایک دوسرے کے حق میں شفاعت قبول فرماتا ہے وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ کا معنی ہے وہ ان کے بھائیوں کے حق میں سفارش قبول فرماتا ہے (3)۔ مبرد نے کہا: وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا معنی ہے ولیستدع الذین آمنوا الاجابة باب استفعال کے معنی میں طلب پائی جاتی ہے الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے۔

## وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 83 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 84 3۔ ایضاً

''اور اگر کشادہ کر دیتا اللہ تعالیٰ رزق کو اپنے (تمام) بندوں کے لیے تو سرکشی کرنے لگتے زمین میں لیکن وہ اتارتا ہے ایک اندازے سے جتنا چاہتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب آگاہ ہے سب کچھ دیکھنے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ آیت کے نزول کے بارے میں ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت اہل صفہ کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے رزق کی وسعت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضرت حباب بن ارت نے کہا: یہ ہمارے بارے میں آیت نازل ہوئی ہم نے بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع کے اموال کو دیکھا تو ہم نے اس کی تمنا کی تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ لَوْ بَسَطَ اس کا معنی ہے وسیع کرنا۔ بسط الشیٔ کا معنی ہے اس کو پھیلا دیا، جب یہ لفظ سین کی بجائے صاد کے ساتھ ہو تب بھی اس کا یہی معنی ہوتا ہے۔

لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وہ سرکش ہو جاتے اور نافرمانی کرتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بغیھم سے مراد ہے ایک منزل کے بعد دوسری منزل، ایک جانور کے بعد دوسرا جانور، ایک سواری کے بعد دوسری سواری اور ایک لباس کے بعد دوسرا لباس طلب کرنا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ انہیں کثیر مال دیتا تو وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتے کیونکہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر انسان کی سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی خواہش کرتا ہے (3)''۔ یہی بغی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا یہی مطلب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہم سب کو مال میں برابر کر دیتے تو ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی اطاعت نہ کرتا اور صنعتیں معطل ہو کر رہ جاتیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رزق سے مراد بارش ہے رزق سبب ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ بارش لگاتار عطا فرماتا رہتا تو وہ دعا سے غافل ہو جاتے وہ کبھی کبھی بارش روک لیتا ہے تو وہ آہ وزاری شروع کر دیتے ہیں اور کبھی اس میں فراخی عطا فرماتا ہے تو وہ شکر بجالاتے ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے جب وہ خوشحال ہوتے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر غارت گری مچاتے ہیں تو بغی کو اس پر محمول کرنا کوئی بعید نہیں۔ زمخشری نے کہا: لَبَغَوْا بغی سے مشتق ہے جس کا معنی ظلم ہے یعنی ایک دوسرے پر ظلم کرے اور دوسرا پہلے پر ظلم کرے کیونکہ مال و دولت تکبر و غرور کا باعث ہوا کرتی ہے قارون عبرت کے لیے کافی ہے (4)۔

اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أخوف ما أخاف على أمتي زهرة الدنيا وكثرتها جن چیزوں سے میں اپنی امت سے ڈرتا ہوں ان میں سے خوفناک ترین دنیا کی ترو تازگی اور کثرت ہے۔ ایک عرب نے کہا:

وقد جعل الوسْمِيّ يُنبت بيننا ودبين بني دُودَان نَبْعًا وشَوْحَطَا

---

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 194

2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 84

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، کراهية الحرص على الدنيا، جلد 1، صفحہ 235

4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 223

موسم بہار کی پہلی بارش ہمارے اور بنی دودان کے درمیان نبع اور شوحط ( دو قسم کے درخت ) کو اگاتی ہے۔
یعنی ان میں خوشحالی آئی تو انہوں نے بغاوت اور باہم ظلم کا ارادہ کیا یا یہ لفظ بغی سے مشتق ہے جس کا معنی تکبر و غرور ہے یعنی تا کہ وہ زمین میں تکبر کریں اور وہ غلبہ پانے اور فساد برپا کرنے کی کوشش کریں جو اس کبر کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔
**وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ** وہ ان کے رزق اس مقدار میں نازل فرماتا ہے جتنا چاہتا ہے اور جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ مقاتل نے کہا: **يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ** جسے چاہتا ہے غنی بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے فقیر بنا دیتا ہے۔
**مسئلہ نمبر 2۔** ہمارے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ کے افعال مصلحتوں سے خالی نہیں ہوں گے اگرچہ اللہ تعالیٰ پر یہ واجب نہیں۔ وہ اپنے بندے کے حال کو جانتا ہے کہ اگر وہ اس پر رزق کو وسیع کر دے تو یہ اسے فساد کی طرف لے جائے گا تو وہ مصلحت کے باعث اس سے دنیا لپیٹ لیتا ہے، یہ رزق کی کمی اس کی ذلت نہیں اور نہ ہی رزق کی وسعت فضیلت ہے اس نے کئی قوموں کو رزق کی فراوانی دی جبکہ اسے علم تھا کہ وہ اسے فساد میں استعمال کریں گے اگر وہ اس کے برعکس کرے تو یہ صلاح کے زیادہ قریب ہوگا مجموعی طور پر امر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سپرد ہے اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں استصلاح کا نقطہ نظر لازم کرنا ممکن نہیں۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''جس نے میرے دوست کو ذلیل کیا اس نے مجھے دعوت مبارزت دی، میں اپنے دوستوں کی مدد کرنے میں دوسروں سے زیادہ تیز ہوں میں ان کے لیے اس طرح غضبناک ہوتا ہوں جس طرح غضبناک شیر غصہ میں ہوتا ہے جس چیز کو میں کرنے والا ہوتا ہوں میں کسی میں بھی اتنا متردد نہیں ہوتا جتنا متردد اس مومن کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہوں جو موت کو ناپسند کرتا ہے، میں اسے ناراض کرنا ناپسند کرتا ہوں اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوتا بندہ مومن کسی ذریعہ سے میرے قریب نہیں ہوتا جس قدر وہ فرائض کی بجا آوری کے ذریعے قریب ہوتا ہے بندہ مومن نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، زبان اور ہاتھ اور تائید کرنے والا بن جاتا ہوں اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطا کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، میرے مومن بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو مجھ سے عبادت کے ایک دروازے کا سوال کرتے ہیں جبکہ میں جانتا ہوں اگر میں انہیں وہ دے دوں تو اس میں عجب داخل ہو جائے گا اور وہ چیز انہیں تباہ و برباد کر دے گی اور میرے مومن بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جسے غنا ہی درست کر سکتی ہے اگر میں اسے فقر و تنگدستی دوں تو فقر اسے تباہ و برباد کر دے اور میرے مومن بندوں میں سے کچھ ایسے ہیں جنہیں فقر ہی درست کر سکتا ہے اگر میں اسے غنی کر دوں تو غنا اسے فاسد کر دیتی ہے۔ میں اپنے بندوں میں سے بعض سے اعراض برتتا ہوں کیونکہ مجھے ان کے دلوں کا علم ہوتا ہے، کیونکہ میں علیم و خبیر ہوں'' (1)۔ پھر حضرت انس نے دعا کی: اے میرے اللہ! میں تیرے ان مومن بندوں میں سے ہوں جنہیں غنا ہی درست رکھتی ہے اپنی رحمت کے ساتھ مجھے محتاج نہ کرنا۔

**وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۸**

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 84

''اور وہی ہے جو برساتا ہے مینہ اس کے بعد کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلا دیتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی کارساز حقیقی اور سب تعریفوں کے لائق ہے''۔

ابن کثیر، ابن محیصن، مجاہد، ابو عمرو، یعقوب، ابن وثاب، اعمش اور کسائی نے ینزل کو مخفف پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن وثاب، اعمش اور دوسرے قراء نے قنطوا پڑھا ہے۔ یہ سب بحثیں پہلے گذر چکی ہیں۔ غیث کا معنی بارش ہے، غیث کو غیث اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ مخلوق کی مدد کرتا ہے قد غاث الغیث الارض زمین پر بارش ہوئی غاث اللہ البلاد یَغِیثُھا غَیثًا اسی طرح یوں بھی استعمال ہوتا ہے غیث الأرض تغاث غیثا فھی أرض مغیثة و مغیوثة۔ اصمعی نے کہا: میں ایک عرب قبیلہ کے پاس سے گذرا جبکہ ان پر بارش ہوئی تھی میں نے ان کی ایک بوڑھی سے پوچھا تم پر بارش ہوئی ہے؟ تو اس نے جواب دیا: غِثنا ما شئنا غیثا یعنی ہم پر بارش ہوئی ہے۔ ذو رمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ بنی فلاں کی لونڈی کو ہلاک کرے وہ کتنی فصیح ہے میں نے اسے کہا: تمہارے ہاں بارش کیسے ہوئی؟ تو اس نے جواب دیا غثنا ما شئنا پہلے قول کا ذکر ثعلبی نے کیا ہے اور دوسرے قول کا ذکر جوہری نے کیا ہے۔ بعض اوقات سحاب اور نبات کو بھی غیثا کہتے ہیں قنوط کا معنی مایوس ہونا ہے، یہ قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا ہے۔ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کی! اے امیر المومنین قحط المطر و قل الغیث و قنط الناس بارش ناپید ہوگئی نباتات ناپید ہوگئی اور لوگ مایوس ہو گئے؟ تو آپ نے فرمایا: ان شاء اللہ تم پر بارش ہوگی پھر اس آیت کی تلاوت کی۔ غیث اس بارش کو کہتے ہیں جو اس وقت میں نافع ہو۔ مطر اس بارش کو کہتے ہیں جو کسی وقت نافع ہوتی ہے اور کسی وقت نقصان دہ ہوتی ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے(1)۔

وَ یَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ رحمت کا معنی بارش ہے؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بارش کے بعد سورج کا ظاہر ہونا؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا: اہل مکہ سے سات سال تک بارش رکی رہی یہاں تک کہ وہ مایوس ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ نے بارش کو نازل فرمایا(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایک بدو کے بارے میں آیت نازل ہوئی جس نے جمعہ کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش کے متعلق سوال کیا تھا جس کا ذکر استسقاء میں ہے؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ولی اسے کہتے ہیں جو اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے، حمید اسے کہتے ہیں جس کی ہر زبان سے تعریف کی جائے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَ هُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

''اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے اور جو جاندار اس نے پھیلا دیے ہیں آسمان و زمین میں اور وہ جب چاہے ان کو جمع کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

آیات سے مراد وہ علامات ہیں جو اس کی قدرت کی دلالت کرتی ہیں مِنْ دَآبَّةٍ میں فرشتے اور انسان بھی داخل ہیں اللہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 203		2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 84

تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل) فراء نے کہا: یہاں مراد زمین میں پھیلائی جانے والی چیزیں ہیں نہ کہ وہ چیزیں جو آسمان میں ہیں جس طرح یہ فرمان ہے يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ ۝ (الرحمٰن) یہ نمکین سمندر سے نکلتے ہیں میٹھے سمندر سے نہیں نکلتے ہیں۔ ابوعلی نے کہا: اس کی تقدیر یوں ہے جو ان میں سے ایک میں پھیلائیں، تو مضاف کو حذف کر دیا گیا يَخْرُجُ مِنْهُمَا یعنی من احدھما قیامت کے روز ان کے جمع کرنے پر قادر ہے۔

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚۖ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝

''اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ کریم درگذر فرما دیتا ہے تمہارے بہت سے کرتوتوں سے۔ اور تم عاجز نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ کو زمین میں اور نہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار''۔

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ نافع اور ابن عامر نے بما کسبت فاء کے بغیر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے فاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ حرف اور اجر میں زیادتی ہے۔ مہدوی نے کہا: اگر تو یہ مقدر کرے کہ ما موصولہ ہے تو فاء کا حذف اور اس کا اثبات جائز ہے اور فاء کو ثابت رکھنا بہت اچھا ہے۔ اگر تو اسے شرطیہ کہے تو سیبویہ کے نزدیک اس کا حذف جائز نہیں۔ اخفش نے اسے جائز قرار دیا ہے اور اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام) یہاں مصیبت سے مراد معاصی پر حدود ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری نے کہا: ضحاک نے کہا: کسی انسان نے قرآن سیکھا پھر اس کو بھول گیا تو یہ کسی گناہ کے ہی سبب ہوگا (1) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ پھر کہا: قرآن بھولنے سے بڑی مصیبت کونسی ہوگی؟ اسے ابن مبارک نے عبدالعزیز بن ابی رواد سے نقل کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ ترک کرنے پر ہے جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو تلاوت کرتا رہتا ہے وہ اس کے حفظ پر حریص ہوتا ہے مگر نسیان اس پر غالب آجاتا ہے تو یہ اس میں سے نہیں جو چیز اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن بھول جایا کرتے یہاں تک کہ آپ کو یاد دلایا جاتا۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں ایک آدمی کی قراءت کو سنا تو فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پر ہو اس نے مجھے ایسی آیات یاد دلائی ہیں جن کو میں فلاں فلاں سورت سے بھول گیا تھا'' (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما، الذی کے معنی میں ہے معنی ہے زمانہ گذشتہ میں جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے باعث ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: کتاب اللہ میں سے زیادہ امید والی یہ آیت ہے جب وہ مصائب کے ساتھ مجھ سے خطاؤں کو بخش دیتا ہے اور بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے تو کفارہ اور معافی کے بعد کیا رہ جاتا ہے (3)۔ یہی چیز آپ نے

---

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 424 2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب نسیان القرآن و ھل یقول کذا و کذا، جلد 2، صفحہ 753
3۔ ہادی علی الجلالین، جلد 4، صفحہ 35

ایک مرفوع حدیث میں بھی بیان کیا ہے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تمہیں کتاب اللہ میں سے سب سے افضل آیت کے بارے میں آگاہ نہ کروں جس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کیا ہے وہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ہے فرمایا: ''اے علی! جو تمہیں بیماری، تکلیف یا آزمائش دنیا میں آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے باعث ہے اللہ تعالیٰ اس سے بالا ہے کہ وہ آخرت میں تمہیں دوبارہ سزا دے اور دنیا میں جس گناہ کو اس نے معاف کر دیا ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ حلم والا ہے کہ وہ معافی کے بعد اس پر سزا دے'' (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: جو رگ پھڑکتی ہے، جو لکڑی سے خراش آتی ہے اور جو انسان پتھر پر گرتا ہے تو یہ کسی نہ کسی گناہ کے باعث ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ بہت سے گناہ بخش دیتا ہے'' (2)۔

حضرت حسن بصری نے کہا: ہم عمران بن حصین کے پاس گئے تو ایک آدمی نے کہا: جو تکلیف میں تجھ میں دیکھ رہا ہوں میں اس کے بارے میں تم سے ضرور سوال کروں گا۔ عمران نے کہا: اے میرے بھائی! اس طرح نہ کر اللہ کی قسم! میں درد کو پسند کرتا ہوں اور جو اسے پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے (3)، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۝ یہ میرے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے جو گناہ باقی بچے ہیں میرے رب نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ وہ تعداد میں بہت بڑھ کر ہیں۔

مرہ ہمدانی نے کہا: میں نے شریح کی ہتھیلی کی پشت پر ایک زخم دیکھا میں نے پوچھا: اے ابوامیہ! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ میرے ہاتھوں کی کمائی ہے اور وہ بہت زیادہ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

ابن عون نے کہا: جب محمد بن سیرین پر قرض چڑھ جاتا تو اس وجہ سے وہ غمگین ہوتے فرماتے: میں اس غم کو پہچانتا ہوں یہ اس گناہ کی وجہ سے ہے جو میں نے چالیس سال پہلے کیا تھا۔

احمد بن ابی حواری نے کہا: ابوسلیمان دارانی سے کہا گیا: ان عقلاء کو کیا ہو گیا ہے انہوں نے ان لوگوں سے ملامت کو زائل کر دیا ہے جنہوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی؟

انہوں نے جواب دیا: کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے باعث آزمائش میں ڈالا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۝۔

عکرمہ نے کہا: انسان کو گرنے کی صورت میں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے یا اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس گناہ کے باعث ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس مصیبت کے ساتھ بخشنے والا تھا یا وہ ایسا درجہ پائے جس درجہ تک اس مصیبت کو برداشت کیے بغیر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایک روایت کی گئی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: اے موسیٰ! علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے

---

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء لایزنی الزانی وھو مومن، روایت بالمعنی، حدیث نمبر 2550۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 25-424 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 37

میرے حق میں ایک حاجت کا سوال کیجئے کہ وہ میری حاجت پوری فرمادے (1) جبکہ اللہ تعالیٰ اس حاجت کو بخوبی جانتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی طرح کیا جب وہ نیچے آئے تو وہ اسی آدمی کے پاس تھے جسے درندے نے چیر پھاڑ دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! یہ کیا معاملہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسے ارشاد فرمایا: اے موسیٰ! اس نے مجھ سے ایک ایسے درجے کا سوال کیا جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ اپنے عمل کے ذریعے یہاں نہ پہنچ پائے گا تو میں نے اسے وہ تکلیف دی جسے تو دیکھ رہا ہے تاکہ میں اس درجہ کو پانے کے لیے اس مصیبت کو وسیلہ بنادوں۔ ابوسلیمان دارانی جب اس حدیث کا ذکر کرتے تو کہتے: اس ذات کے لیے تمام پاکیزگیاں ہیں جو اس پر قادر ہے کہ آزمائش کے بغیر اسے اس درجہ پر پہنچادے لیکن وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: معنی میں اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ (النساء:123) اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ مومنین کے حق میں ہے جہاں تک کافر کا تعلق ہے اس کی سزا آخرت تک موخر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ کفار کو خطاب ہے جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو کہتے: یہ حضرت محمد ﷺ کی نحوست کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا بلکہ فرمایا: یہ ان کے کفر کی نحوست کی وجہ سے ہے جبکہ پہلی تعبیر زیادہ علماء نے کی، یہ زیادہ ظاہر اور زیادہ مشہور ہے۔

ثابت بنانی نے کہا: یہ بات کہی جاتی تھی کہ تکلیف کی ساعتیں خطاؤں کی ساعتوں کو ختم کردیتی ہیں (2) پھر اس میں دو قول ہیں: (1) یہ بالغوں کے بارے میں خاص ہے کہ ان کے حق میں عقوبت ہو اور بچوں کے حق میں یہ اجر کا ذریعہ ہو۔ (2) یہ عقوبت عام ہے بالغوں کے حق میں انکی ذاتوں کے حوالہ سے اور بچوں کے حق میں ان کی والدہ اور والد کے حوالہ سے ہے۔

وَ يَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ۝ یعنی بہت سے ایسے گناہوں کو بخش دیتا ہے جن پر حدود نہیں ہوتیں (3)؛ یہی حضرت بصری کے قول کا مقتضا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بہت سے گناہگاروں کو نہیں بخشتا یعنی ان پر جلدی عذاب نہیں دیتا۔

وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کو فوت نہیں پاؤ گے یعنی تم بھی اسے عاجز نہیں پاؤ گے اور نہ ہی تم اسے ناپید پاؤ گے۔

وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ۝ اس کی بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

وَ مِنۡ اٰيٰتِهِ الۡجَوَارِ فِى الۡبَحۡرِ كَالۡاَعۡلَامِ ۝ اِنۡ يَّشَاۡ يُسۡكِنِ الرِّيۡحَ فَيَظۡلَلۡنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهۡرِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ۝

''اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے وہ سمندر میں تیرنے والے جہاز ہیں جو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے پس وہ رکے رہیں سمندر کی پشت پر، بے شک اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے، شکر بجالانے والے کے لیے''۔

---

1۔ صاوی علی الجلالین، جلد 4، صفحہ 34
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 204
3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 425

وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ ان کی ان علامات میں سے جو اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے وہ سمندر میں چلنے والی کشتیاں ہیں گویا وہ بڑے ہونے میں پہاڑ ہیں۔ اعلام کا معنی پہاڑ ہے جوار ی کی واحد جاریة ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ (الحاقہ) اسے جاریہ نام اس لے دیا گیا کیونکہ وہ پانی میں چلتی ہے۔ جاریہ کا معنی نوجوان لڑکی بھی ہے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اس میں نوجوانی کا پانی چلتا ہے۔ مجاہد نے کہا: اعلام کا معنی محلات ہیں اس کا واحد علم ہے (1)، یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے ان سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد پہاڑ ہیں (2)۔ خلیل نے کہا: عربوں کے ہاں ہر بلند شے کو علم کہتے ہیں۔ خنساء اپنے بھائی صخر کا مرثیہ کہتے ہوئے کہتی ہے:

وإنّ صخرًا لتأتم الهُداة به كأنّه علَمٌ في رأسه نار(3)

بے شک صخر کا راہنما بھی قصد کرتے ہیں گویا وہ ایسا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر آگ ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ اہل مدینہ نے اسی طرح جمع کا صیغہ پڑھا ہے فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ کشتیاں سطح سمندر پر ساکن رہتی ہیں وہ چلتی نہیں ہیں رَكَدَ الماءُ رُكُودًا یعنی پانی ٹھہر گیا، اسی طرح ہوا اور کشتی ہے۔ سورج جب دوپہر کو ٹھہر جائے تو اس کے لیے بھی راکد کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ہر وہ چیز جو کسی جگہ ثابت ہو اسے راکد کہتے ہیں راکد المیزان جب وہ جھکنے سے رک جائے، مراکد ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں انسان اور دوسری چیزیں ٹھہرتی ہیں۔ قتادہ نے اسے فيظلِلن پہلے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے جس طرح ضَلِلْتُ، اَضِلُّ ہے اور لام کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے؛ یہ قراءت مشہور ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ آیات سے مراد دلالات اور علامات ہیں یعنی جو آزمائش پر صبر کرتا ہے اور نعمتوں پر شکر بجالاتا ہے۔ قطرب نے کہا: صابر و شاکر بندہ کتنا اچھا ہے جب اسے عطا کیا جائے تو شکر کرتا ہے اور جب اسے آزمائش میں ڈالا جائے تو صبر کرتا ہے (4)۔ عون بن عبداللہ نے کہا: کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن پر انعام کیا جاتا ہے تو شکر نہیں کرتے اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کو امتحان میں ڈالا جاتا تو صبر نہیں کرتے۔

**اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ يَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾**

''یا اگر وہ چاہے تو تباہ کر دے انہیں لوگوں کے اعمال بد کی وجہ سے اور درگذر فرمادیا کرتا ہے بہت سے گناہوں سے۔ اور اس وقت جان لیں گے جو جھگڑا کرتے رہتے ہیں ہماری آیتوں میں کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں''۔

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا اگر چاہے تو ہواؤں کو آندھیاں بنادے اور کشتیوں کو تباہ کر دے یعنی ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے انہیں ہلاک کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کشتیوں والے افراد کو ہلاک کر دے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 86 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 205 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَ یَعْفُ عَنْ كَثِیْرٍ۝ ان کشتیوں والے بہت سے افراد کو معاف فرما دیتا ہے اور ان کشتیوں کے ساتھ انہیں غرق نہیں کرتا؛ یہ ماوردی نے حکایت بیان کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور انہیں ہلاکت سے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرماتا ہے۔ قشیری نے کہا: عام قراءت وَ یَعْفُ ہے اس میں اشکال ہے کیونکہ معنی ہے اگر چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے اور وہ کشتیاں ایک ہی جگہ ٹھہری رہیں اور ان کے سواروں کے گناہوں کے سبب انہیں تباہ کر دے اس صورت میں عطف کرنا اچھا نہیں کیونکہ اس صورت میں معنی بن جاتا ہے اگر چاہے تو معاف کر دے معنی یہ نہیں بلکہ معنی ہے بغیر مشیئت کی شرط کے انہیں معاف کرنے کی خبر دینا ہے اس صورت میں مجزوم پر عطف لفظ کے اعتبار سے ہوگا معنی کے اعتبار سے نہیں ہوگا۔

وَّ یَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ۝ اس کا مصداق کفار ہیں یعنی جب وہ سمندر کے بیچ میں ہوتے ہیں اور ہوائیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں یا کشتیاں کھڑی رہتی ہیں تو انہیں علم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں اور نہ ہی انہیں بچانے والا ہے، اگر اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرے پس وہ اللہ تعالیٰ کی اخلاص سے عبادت کریں۔ یہ بحث بھی کئی مقامات پر گذر چکی ہے۔ سمندر میں سفر کرنے کے بارے میں بحث سورۂ بقرہ اور دوسرے مقامات پر گذر چکی ہے اس لیے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ نافع اور ابن عامر نے ویعلم رفع کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ شرط و جزا کے بعد رفع استئناف کے طریقہ پر ہوگا جس طرح سورۂ توبہ میں ہے وَ یُخْزِهِمْ وَ یَنْصُرْكُمْ عَلَیْهِمْ (14) پھر فرمایا: وَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ (التوبۃ:15) رفع کے طور پر فرمایا، اس کی مثل کلام عربی میں ہے ان تأتنی آتك وینطلق عبد الله یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور نصب محض کلام پھیرنے کے اعتبار سے ہوگی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ۝ (آل عمران) جزم کی حالت سے نصب کی حالت کی طرف اسے پھیرا ہے مقصد تخفیف پیدا کرنا ہے کیونکہ پے در پے جزم ناپسندیدہ ہے جس طرح نابغہ کا قول ہے:

فإن یَهْلِكْ أبو قابوسَ یهلِكْ　　ربیعُ النّاسِ والشهرُ الحرامُ
ویُنْسِكْ بعده بذِناب عَیْشٍ　　أَجَبِّ الظَّهرِ لیس له سنام

اگر ابو قابوس ہلاک ہو گیا ہے تو لوگوں کا موسم بہار اور شہر حرام فوت ہو گیا ہے اس کے فوت ہونے کے بعد وہ زندگی کی دنب کو ہی پکڑے گا جس کی کہان کٹی ہوئی ہے۔

یہ فراء کے قول کا معنی ہے۔ اگر یعلم کو جزم دی جائے تو یہ بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا: أن کے مضمر ہونے کی بنا پر اسے نصب دی جائے گی (1) کیونکہ اس سے قبل جزم ہے تو کہتا ہے: تصنعْ أصنعْ مثله وأكرمَك۔ اگر تو چاہے تو تو کہہ سکتا ہے وأكرمْك بعض مصاحف میں ولیعلمَ ہے یہ اس امر پر دال ہے کہ نصب معنی کی وجہ سے ہے کہ پہلا مصدر کے حکم میں ہے ویكون منه عفو وأن یعلم۔ جب اسے اسم پر محمول کیا تو ان کو مضمر کیا جس طرح تو کہتا ہے: ان تأتنی وتعطینی اكرمك اور تو تو تعطینی کو نصب دیتا ہے تقدیر کلام یہ بنے گی ان یكن منكم إتیان وأن تعطینی۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 227

مِّنْ مَّحِيْصٍ۝ کا معنی فرار اور بھاگنے کی جگہ ہے(1)؛ یہ قطرب نے کہا۔ سدی نے کہا: معنی ہے پناہ گاہ۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے(2)؛ حاص به البعير حيصة جب اونٹ نے اسے پھینک دیا اسی معنی میں ان کا قول ہے: فلان يحيص عن الحق فلاں حق سے مائل ہوتا ہے۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝

''پس جو کچھ تمہیں دیا گیا یہ دنیوی سامان ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں''۔

مِّنْ شَيْءٍ سے مراد دنیا میں غنا اور خوشحالی ہے فَمَتَاعُ یہ چند دنوں کا سامان ہے جو دن ختم ہو جائیں گے اس لیے مناسب نہیں کہ کوئی اس پر فخر کرے، خطاب مشرکوں کو ہے۔ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى سے مراد اطاعت پر ثواب ہے لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جنہوں نے تصدیق کی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کیا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنا تمام مال اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کر دیا تو لوگوں نے آپ کو ملامت کی۔ حدیث طیبہ میں آیا ہے ''انہوں نے اسی ہزار خرچ کیا''۔

وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝

''اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے گناہوں اور بدکاریوں سے اور جب وہ غضبناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ اسم موصول محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ گناہ کبیرہ کے بارے میں بحث سورۃ النساء میں گذر چکی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے کبیر الاثم پڑھا ہے اضافت کے وقت واحد سے بھی جمع کا ارادہ کیا جاتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) جس طرح حدیث طیبہ میں ہے مَنَعَتِ العِرَاقُ درهمها و قفيزها(3) محل استدلال درهمها اور قفيزها ہے۔ باقی قراء نے یہاں اور سورۂ نجم میں جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَ الْفَوَاحِشَ سدی نے کہا: اس سے مراد زنا ہے(4)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کہا: كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ سے مراد شرک ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: یہاں كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ سے مراد گناہ ہیں کہ جب کوئی ان سے اجتناب کرتا ہے تو چھوٹے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ فواحش بھی کبائر میں داخل ہوتے ہیں لیکن یہ زیادہ فحش اور زیادہ شنیع ہو جاتے ہیں جس طرح قتل، زخمی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 205　2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، باب لا تقوم الساعۃ، جلد 2، صفحہ 391　4۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 21

کرنے کی بنسبت اور بدکاری گناہ کی ترغیب دینے کی بنسبت زیادہ قبیح ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فواحش اور کبائر دونوں کا معنی ایک ہے لفظ متعدد ہونے کی وجہ سے اسے مکرر ذکر کیا یعنی وہ نافرمانیوں سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ وہ کبائر اور فواحش ہیں۔ مقاتل نے کہا: فواحش سے مراد حدود کو واجب کرنے والے امور ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ۝ یعنی وہ درگذر سے کام لیتے ہیں اور جس نے ان پر ظلم کیا ہوتا ہے ان سے حلم کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت عمر کے حق میں نازل ہوئی جب انہیں مکہ مکرمہ میں گالیاں دی گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب تمام مال خرچ کرنے پر لوگوں نے ان کی ملامت کی اور جب انہیں گالیاں دی گئیں تو انہوں نے حلم کا مظاہرہ کیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس مال جمع ہوا تو آپ نے اللہ کی راہ میں تمام مال صدقہ کر دیا مسلمانوں نے انہیں ملامت کی اور کافروں نے ان پر غلط عمل کرنے کا الزام لگایا تو فَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۝ وَ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ۝ تک آیات نازل ہوئیں (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مشرکوں میں سے ایک آدمی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیں تو آپ نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ محاسن اخلاق میں سے ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے پر شفقت کرتے ہیں اور جو جاہل ہوتا ہے اس سے درگذر کرتے ہیں، وہ عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ثواب اور عفو کا سوال کرتے ہیں کیونکہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: 134) وہ یہ ہے کہ کوئی آدمی تیری عزت سے کھیلے اور تو اس سے غصہ پر قابو پائے، کسی نے یہ شعر کہا:

إني عفوتُ بظالمي ظلمي ووهبت ذاك له على علمي

مازال يظلمني وأرحمه حتى بكيت له من الظلم

میں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کر دیا میں نے سب کچھ جانتے ہوئے اسے یہ چیز ہبہ کی۔ وہ لگاتار مجھ پر ظلم کرتا رہا اور میں اس پر رحم کرتا رہا یہاں تک کہ اس کے ظلم کی وجہ سے میں اس کے حق میں رویا۔

وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۝

''اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بدکاریوں سے اور جب وہ غضبناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ عبدالرحمن بن زید نے کہا: اس سے مراد مدینہ طیبہ کے

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 121 2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 228

انصار ہیں (1)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر ایمان لانے کی جب انہیں دعوت دی گئی تو انہوں نے اس پر لبیک کہی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے قبل انہیں میں سے بارہ نقیب ان کی طرف روانہ کیے تھے۔

وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ یعنی انہوں نے نماز کو اس کے اوقات میں شروط اور ہیئتوں کے ساتھ ادا کیا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وہ امور میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ شوری، شاورتہ کا مصدر ہے جس طرح بشری اور ذکری وغیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انصار مدینہ کے پاس آنے سے پہلے انصار کا یہ معمول تھا کہ جب وہ کسی امر کا ارادہ کرتے تو وہ آپس میں مشورہ کرتے پھر اس پر عمل کرتے اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مدح کی (2)؛ یہ نقاش کا قول ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: وہ امور میں رائے کی اتباع کرتے ہیں اس لیے وہ اتفاق کرتے ہیں وہ اختلاف نہیں کرتے تو ان کے اتفاق کی وجہ سے ان کی مدح کی گئی (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کسی قوم نے کبھی بھی مشورہ نہیں کیا مگر انہیں بہترین امر کی طرف ہدایت دی گئی (4)۔ ضحاک نے کہا: جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے بارے میں سنا تو آپس میں مشورہ کیا وہ مراد ہے اور ان کے نقیب ان کے پاس آئے یہاں تک کہ ان کی رائے حضرت ایوب کے گھر میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کی مدد کرنے پر متفق ہوگئی (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب بھی ان پر کوئی امر ظاہر ہوتا تو وہ آپس میں مشورہ کرتے ان میں سے بعض بعض کی خبر کو ترجیح نہ دیتے۔ ابن عربی نے کہا: مشورہ جماعت میں محبت پیدا کرتا ہے، عقلوں کو پرکھنے کا آلہ ہے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا سبب ہے کسی قوم نے جب بھی مشورہ کیا وہ ہدایت پا گئے (6) ایک دانا نے کہا:

إذا بلغ الرأی المشورة فاستعن برأی لبیب او مشورة حازم

ولا تجعل الشوری علیك غضاضة فإن الخوافی قوة للقوادم

جب رائے مشورہ تک جا پہنچے تو دانشمند کی رائے اور محتاط کے مشورہ سے مدد لے تو مشورہ اپنے لیے نقص نہ سمجھ بے شک چھوٹے پر، بڑے پروں کی قوت ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے امور میں مشورہ کی مدح کی ہے اس قوم کی مدح کے ساتھ جو اس کی پیروی کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگوں کے متعلق امر میں اپنے صحابہ سے مشورہ طلب کیا کرتے تھے یہ آراء میں بہت زیادہ ہوتا ہے آپ احکام میں صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوتے وہ فرض ہوتے، مستحب ہوتے، مکروہ ہوتے، مباح ہوتے یا حرام ہوتے، جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہم پر ترجیح دی ہے وہ احکام میں بھی مشورہ کیا کرتے تھے اور کتاب وسنت سے ان کو مستنبط کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام نے سب سے پہلے جس معاملہ میں مشورہ کیا وہ خلافت کا معاملہ تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے میں واضح ارشاد فرمایا تھا یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور انصار کے درمیان معاملہ ہوا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم اپنی دنیا کے لیے اسی پر راضی ہیں جس پر نبی کریم

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 206
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 4، صفحہ 426
4۔ ایضاً
5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 206
6۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1668

ﷺ ہمارے دین کے بارے میں راضی تھے۔ مرتدوں کے بارے میں صحابہ نے مشورہ کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر سب کا اتفاق ہوگیا، صحابہ نے دادا اور اس کی میراث میں مشورہ کیا، شراب اور ان کی حد کے بارے میں مشورہ کیا، رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد انہوں نے جنگوں کے بارے میں مشورہ کیا یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہرمزان سے بھی جنگوں کے بارے میں مشورہ کیا جب وہ مسلمان کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہرمزان نے آپ سے عرض کی: اس جنگ اور اس جنگ میں مسلمانوں کے جو دشمن شریک ہیں ان کی مثال اس پرندے جیسی ہے جس کا ایک سر ہے اس کے دو بازو ہیں اور دو پاؤں ہیں اگر ایک بازو ٹوٹ جائے تو دونوں ٹانگیں، ایک بازو اور سر کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اگر دوسرا بازو بھی ٹوٹ جائے تو دونوں ٹانگیں اور سر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اگر سر کچل دیا جائے تو دونوں پاؤں اور دونوں بازو بھی ختم ہو جاتے ہیں، سر کسریٰ ہے، ایک بازو قیصر اور دوسرا بازو فارس ہے مسلمانوں کو حکم دو کسریٰ کی طرف نکلیں۔

ایک دانشمند نے کہا: میں نے کبھی بھی غلطی نہیں کی جب مجھے کوئی امر لاحق ہوتا تو میں اپنی قوم سے مشورہ کرتا میں وہی کرتا جو وہ رائے دیتے اگر میں صحیح نتیجہ تک جا پہنچتا تو وہ بھی صحیح نتیجہ تک پہنچتے اگر میں غلطی کرتا تو وہ بھی غلطی کرتے۔

**مسئلہ نمبر3**۔ سورۂ آل عمران آیت 159 میں شوریٰ کے احکام: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ میں گذر چکے ہیں۔ مشورہ برکت ہے مشورہ سے مراد شوریٰ ہے اسی طرح مشورہ ہے تو کہتا ہے: شاورتہ فی الأمر و استشرتہ کا معنی ایک ہی ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے امراء تم میں سے بہترین لوگ ہوں، تمہارے اغنیاء تم میں سے سخی لوگ ہوں اور تمہارے امور باہم مشورہ سے ہوں تو تمہارے لیے سطح زمین، زمین کے بطن سے بہتر ہے جب تم میں سے امراء تم میں سے شریر ترین ہوں۔ تمہارے اغنیاء تم میں سے بخیل ترین لوگ ہوں اور تمہارے امور تمہاری عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے حق میں زمین کا بطن اس کی سطح سے بہتر ہے(1)'' یہ حدیث غریب ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ یعنی جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے صدقہ کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی النھی عن سب الریاح، جلد 2، صفحہ 51۔ ایضاً، حدیث نمبر 2192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا مناسب بدلہ دیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پس جو معاف کر دے اور اصلاح کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں، بے شک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور فساد کرتے ہیں زمین میں ناحق یہی ہیں، جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور جو شخص ان مظالم پر صبر کرے اور طاقت کے باوجود معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔

ان میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ یعنی مشرکوں کی جانب سے ان پر زیادتی کی جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کی وجہ یہ بنی کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر بغاوت کی انہیں اذیتیں دیں اور انہیں مکہ مکرمہ سے نکالا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نکلنے کی اجازت دی، زمین میں انہیں اختیار دیا اور جنہوں نے بغاوت کی تھی ان کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا (الحج) کا یہی مصداق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہر باغی میں عام ہے خواہ وہ کافر ہو یا مومن یعنی جب انہیں ظالم کی جانب سے ظلم پہنچتا ہے تو وہ اس کے ظلم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے اس میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اقامت حدود کی طرف اشارہ ہے۔

ابن عربی نے ذکر کیا۔ ہے: اللہ تعالیٰ نے ظلم کی صورت میں مدد کا ذکر مدح کے انداز میں کیا ہے، ایک اور موقع پر جرم سے معافی کا ذکر مدح کے انداز میں کیا ہے تو یہ احتمال موجود ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کو ختم کرنے والا ہے(1) اور یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ دو حالتوں کی طرف راجع ہو ان دونوں حالتوں میں سے ایک حالت یہ ہے کہ باغی اعلانیہ فجور کرنے والا ہے عام لوگوں میں بے حیائی کا ارتکاب کرنے والا ہو اور چھوٹے بڑے کو اذیتیں دینے والا ہو تو ایسے شخص سے انتقام لینا افضل ہے اس کی مثل میں حضرت ابراہیم نخعی نے فرمایا: وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفوس کو ذلیل کریں کہ فاسق ان پر جری ہو جائیں۔

2۔ وہ امر جلد بازی میں ہو جائے یا اس سے واقع ہو جو لغزش کا اعتراف کرتا ہے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طالب ہوتا ہے تو یہاں معاف کرنا افضل ہے اسی کی مثل میں یہ آیات نازل ہوئیں وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (البقرۃ:237) اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ (المائدۃ:45) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (النور:22)

میں کہتا ہوں: یہ تعبیر بہت اچھی ہے۔ کہا: طبری نے احکام میں یہی ذکر کیا ہے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَالَّذِيْنَ اِذَآ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1669

اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۔ اس کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ اس موقع پر انتقام لینا افضل ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو قبول کرنے اور نماز قائم کرنے کے ذکر کے ساتھ اسے ملایا ہے یہ اسی معنی پر محمول ہے (1) جو ابراہیم نخعی نے ذکر کیا ہے وہ مومنوں کے لیے اس امر کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کردیں، فساق ان پر جری ہو جائیں یہ اس آدمی کے بارے میں ہے جو حد سے تجاوز کرے اور اس پر اصرار کرے۔ وہ موقع جس میں معافی کا حکم دیا گیا ہے وہ اس وقت ہوگا جب جنایت کرنے والا شرمندہ ہو اور غلطی کا ازالہ کرنے والا ہو اس آیت کے بعد ارشاد فرمایا: وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ یہ انتقام لینے کے مباح ہونے کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا حکم دیتا ہے اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا: وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ یہ غیر مصر کے لیے بخشش پر محمول ہے جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو بغی اور ظلم پر مصر ہوتا ہے تو اس سے انتقام لینا افضل ہوتا ہے کیونکہ اس سے ماقبل آیت اس پر دلالت کرتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف باہم مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ ظلم اپنے آپ سے دور کر لیتے ہیں (2)؛ اور اس کو دور کرتے ہیں یہ ابن بحر نے کہا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے یہ عموم کی طرف لوٹتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی دو قسمیں بنائی ہیں ایک قسم ہے جو ظالموں کو معاف کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ ان کے ذکر کا آغاز کیا وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ایک قسم ایسی ہے جو ظالم سے انتقام لیتے ہیں پھر اس ارشاد وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا کے ساتھ انتقام کی حد بیان کی۔ جو آدمی ان پر ظلم کرتا ہے وہ ظالم سے انتقام لیتے ہیں مگر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرتے۔ مقاتل اور ہشام بن حجیر نے کہا: یہ حکم اس آدمی کے بارے میں ہے جس کو زخمی کیا گیا ہو زخمی کرنے والے سے قصاص لے کر انتقام لیا جائے گا (3)، جس نے سب وشتم کی ہے اس سے انتقام نہیں لیا جائے گا یہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور سفیان کا مذہب ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: ابن شبرمہ کہا کرتے تھے مکہ مکرمہ میں ہشام کی مثل کوئی نہیں۔ امام شافعی نے اس آیت میں یہ تاویل کی ہے کہ انسان کو حق حاصل ہے کہ خائن کے مال سے اتنا مال لے لے جتنی خائن نے اس کے مال میں خیانت کی تھی جبکہ اسے بتانے کی ضرورت نہیں اس بارے میں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو سفیان کی بیوی ہندہ سے فرمایا تھا: ''تو اس کے مال سے اتنا لے لے جو تیرے اور تیرے بچے کے لیے کافی ہو'' (4)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت کے بغیر اسے مال لینے کی اجازت دی۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

ابن ابی نجیح نے فرمایا: یہ زخم لگانے میں مقابلہ پر محمول ہے (5) جب کہے: اللہ تعالیٰ اسے ذلیل ورسوا کرے یا اس پر لعنت کرے جب وہ اس کی مثل کہے تو وہ تہمت کا مقابلہ تہمت سے اور جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ سے نہ کرے۔

سدی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کی مدح کی جو ظلم کرنے والے سے اس قدر بدلہ لیتا ہے جبکہ وہ حد سے تجاوز نہیں

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 206 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 207
4۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، باب قضیة ھند، جلد 2، صفحہ 75 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 207

کرتا اور جتنا اس پر ظلم کیا گیا ہے اتنا ہی ظلم کرتا ہے جس طرح عرب کیا کرتے تھے جزا کو سیئۃ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بدلہ اس عمل (ظلم) کے مقابلہ میں ہے پہلے نے مال اور بدن میں زیادتی کی اور یہ قصاص اسی کی مثل برا ہے (1)۔ یہ بحث سورۂ بقرۃ میں مفصل گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے قصاص کو ترک کیا اور اپنے اور ظالم کے درمیان معافی کے ساتھ مصالحت کی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس پر اجر دے گا۔ مقاتل نے کہا: عفو اعمال صالحہ میں سے ہے۔ سورۂ آل عمران میں اتنی بحث گذر چکی ہے جو اس میں کفایت کر جاتی ہے۔ الحمد اللہ۔

ابو نعیم حافظ نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی ہے: ''جب قیامت کا روز ہوگا تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: تم میں سے فضیلت والے کون ہیں؟ کچھ لوگ کھڑے ہوں گے انہیں کہا جائے گا: جنت کی طرف چلے جاؤ، فرشتے انہیں ملیں گے وہ پوچھیں گے: کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف جا رہے ہیں، فرشتے پوچھیں گے: حساب سے بھی پہلے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں۔ فرشتے پوچھیں گے: تم کون ہو؟ وہ جواب دیں گے: فضیلت والے۔ فرشتے پوچھیں گے: تمہاری فضیلت کیا ہے؟ وہ فرمائیں گے: جب ہمارے ساتھ جہالت کا رویہ اپنایا جاتا تو ہم حلم کا مظاہرہ کرتے اور جب ہم پر ظلم کیا جاتا، تو ہم صبر کرتے جب ہم پر زیادتی کی جاتی تو ہم معاف کر دیتے۔ فرشتے کہیں گے: جنت میں داخل ہو جاؤ عمل کرنے والوں کا اجر کتنا ہی اچھا ہے'' اور حدیث کا ذکر کیا۔

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۝ جو ظلم کا آغاز کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا (2)؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو آدمی قصاص میں حد سے تجاوز کرتا ہے اور ظلم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ جو مسلمان کافر سے بدلہ لے تو اس مسلمان پر ملامت کرنے کی کوئی صورت نہیں بلکہ مسلمان کی اس وجہ سے تعریف کی جائے گی، اگر کوئی مسلمان مسلمان ظالم سے بدلہ لے تو پھر بھی اس پر کوئی ملامت نہیں۔ کافر سے انتقام لینا حتمی بات ہے اور مسلمان سے بدلہ لینا مباح ہے اور معاف کر دینا مستحب ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ۝ اس امر پر دلیل ہے کہ وہ اپنا پورا پورا بدلہ لے۔ یہ تین قسموں میں منقسم ہے (1) وہ بدن میں قصاص ہو جس کا ایک آدمی مستحق ہوتا ہے اگر وہ زیادتی کے بغیر پورا پورا حق لیتا ہے اور حکام کے نزدیک اس کا حق ثابت ہوتا ہے تو اس پر کوئی حرج نہ ہوگا لیکن امام اسے جھڑکے کیونکہ اس پر خون بہانے پر جرأت کا اظہار کرنا ہے اگر اس کا حق حاکم کے نزدیک ثابت نہ ہو تو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو معاملہ ہے اس میں اس پر کوئی حرج نہ ہوگا وہ ظاہر میں مطالبہ کرنے والا ہے اور اپنے فعل کے ساتھ مواخذہ کرنے والا ہے اور سزا دینے والا ہے۔ 2۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حد ہو کسی آدمی کا اس میں کوئی حق نہ ہو جس طرح حد زنا، چوری کی وجہ سے ہاتھ کاٹنا اگر یہ حاکم کے نزدیک ثابت نہ ہو تو اس کا مواخذہ کیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی اگر حاکم کے نزدیک وہ ثابت ہو تو انتظار کیا جائے گا اگر چوری میں کاٹنا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1669	2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 207	3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 208

ہی سزا ہو تو حد ساقط ہو جائیگی کیونکہ جس عضو کا کاٹنا لازم ہوا تھا وہ عضو زائل ہو چکا ہے اس پر اس بارے میں کوئی حق ثابت نہیں ہوا کیونکہ تعزیر ادب سکھانے کے لیے ہے، اگر اس آدمی کی سزا کوڑے مارنا ثابت ہو تو اس سے حد ساقط نہ ہوگی کیونکہ اس نے تعدی کی ہے جبکہ اس کا محل باقی ہے تو وہ اس میں ماخوذ ہوگا۔ 3۔ مال میں اس کا حق ثابت ہو تو مالک کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے حق پر غلبہ حاصل کرے یہاں تک کہ اگر وہ جانتا ہے تو اس مال تک رسائی حاصل کرے اگر وہ نہیں جانتا تو مہلت دی جائے اگر مطالبہ کی صورت میں مال تک پہنچنا ممکن ہو تو خفیہ طریقہ سے لینا جائز نہیں اگر مطالبہ کے ساتھ پہنچنا ممکن نہیں کیونکہ جس پر حق لازم ہوتا ہے وہ انکاری ہے کوئی گواہ بھی نہیں جو گواہی دے تو خفیہ طریقہ سے مال لینے میں دو مذہب ہیں: (1) یہ جائز ہے؛ یہ امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے (2) اس طرح لینا منع ہے؛ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 5۔** اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ ان لوگوں پر ملامت ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں یعنی ان پر اپنی جانب سے حد سے تجاوز کرتے ہیں؛ یہ اکثر علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ابن جریج نے کہا: وہ ان پر شرک کے ذریعے ظلم کرتے ہیں جو ان کے دین کے مخالف ہے (2)۔

وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وہ زمین میں ناحق نفوس اور اموال کے معاملہ میں فساد برپا کرتے ہیں؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: بغیہم سے مراد نافرمانیوں کے اعمال کرنا ہے (3)۔ ابو مالک نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے قریش کے کفار جس کی امید رکھتے تھے یعنی مکہ میں اسلام کے علاوہ کوئی اور دین ہو (4)۔ اس تعبیر کی بنا پر ابن زید نے کہا: یہ سب جہاد کے ساتھ منسوخ ہے، یہ مشرکین کے ساتھ خاص ہے۔ قتادہ کا قول ہے: یہ عام ہے کلام کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے۔ ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ الحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 7۔** ابن عربی نے کہا: یہ آیت سورۂ براءۃ میں آیت کے مقابل ہے (5) وہ آیت یہ ہے مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ (التوبۃ: 91) جس طرح اللہ تعالیٰ نے احسان کرنے والے پر ملامت کی نفی کی اسی طرح مظلوم جب بدلہ لے تو اس پر سے ملامت کی نفی کر دی دونوں قسموں کو مکمل کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 8۔** علماء نے ایسے حاکم کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایک بستی کے لوگوں پر معین مال لازم کرتا ہے جو مال ان سے لے گا وہ لوگ اپنے اموال کی مقدار کے مطابق اسے دیں گے کیا وہ آدمی جو اس مال کی ادائیگی سے چھٹکارا پا سکتا ہے اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے جب وہ اس سے چھٹکارا پاتا ہے تو حاکم باقی مکینوں سے پورا مال لیتا ہے جو اس نے ان پر لازم کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس آدمی کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، یہ ہمارے علماء میں سے سحنون کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہاں ایسا کر سکتا ہے اگر وہ چھٹکارا حاصل کرنے پر قادر ہو؛ اسی طرف ابوجعفر احمد بن نصر داودی، مالکی گئے ہیں۔ امام مالک کا قول جو زکوٰۃ کا مال وصول کرنے والے کے بارے میں ہے اس کی تائید کرتا ہے: جو شریک افراد میں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 208 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 209 5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1670

سے ایک کے ریوڑ میں سے ایک بکری لیتا ہے سب میں نصاب نہیں تھا جس سے بکری لی گئی وہ اس پر ظلم ہے وہ اپنے ساتھیوں سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ کہا: سحنون سے جو روایت مروی ہے میں اسے اپنانے والا نہیں کیونکہ ظلم میں کوئی برابری نہیں کسی آدمی پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے آپ کو محض اس خوف سے ظلم میں داخل کر لے کہ کسی اور پر ظلم دوگنا ہو جائے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ۔

**مسئلہ نمبر 9۔** علماء نے تحلیل (کسی کے لیے کوئی چیز حلال قرار دینا، کسی کے لیے کوئی چیز جائز قرار دینا) میں اختلاف کیا ہے۔ ابن مسیب سامان اور مال میں سے کوئی چیز کسی کے لیے حلال نہیں کرتے تھے سلیمان بن یسار اور محمد بن سیرین سامان تجارت اور مال میں سے ہر چیز جائز قرار دے دیتے تھے۔ امام مالک مال کو جائز قرار دے دیتے تھے سامان تجارت کو جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ ابن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے آپ سے سعید بن مسیب کے قول لا احلل احدا کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ میں نے عرض کی: اے ابا عبداللہ! ایک آدمی دوسرے کو مال قرض دیتا ہے اور وہ مال ہلاک ہو جاتا ہے اب وہ اس کو ادا بھی نہیں کر سکتا؟ فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ مال دینے والا مال لینے والے کے لیے مال حلال کر دے یہ میرے نزدیک افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ (الزمر: 18)

آپ کی خدمت میں عرض کی گئی: ایک آدمی دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ فرمایا: میں اس کے لیے تحلیل کی رائے نہیں رکھتا یہ میرے نزدیک پہلے قول سے مختلف ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ مِنۡ سَبِيۡلٍ میری رائے نہیں کہ اس نے جو ظلم اس پر کیا ہے اسے اس پر حلال کر دے۔

ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں تین قول ہیں: (1) کسی حال میں بھی اس کے لیے حلال نہ کرے، یہ سعید بن مسیب کا قول ہے (2) وہ اس کے لیے حلال کر دے؛ یہ محمد بن سیرین کا قول ہے (3) اگر مال ہو تو حلال کر دے، اگر ظلم ہو تو حلال نہ کرے؛ یہ امام مالک کا قول ہے۔

پہلے قول کی دلیل یہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو حرام کیا اسے حلال نہ کرے یہ صورت ایسی ہو گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو تبدیل کرنے کی طرح ہو گا، دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ یہ اس کا حق ہے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے ساقط کر دے جس طرح وہ قصاص اور سامان تجارت کا حق ساقط کر دیتا ہے۔

تیسرے قول کی دلیل جسے امام مالک نے پسند کیا ہے ایک آدمی تیرا حق ادا کرنے میں مغلوب ہو گیا ہے تو اس کے ساتھ نرمی کی صورت یہ ہے کہ وہ مال اس کے لیے حلال کر دے اگر وہ ظالم ہو تو پھر مناسب یہ ہے کہ تو اسے نہ چھوڑے تاکہ ظالم لوگ دھوکہ میں مبتلا نہ ہوں ورا پنے قبیح افعال میں آزاد نہ ہو جائیں۔

صحیح مسلم میں ابو یسر طویل کی حدیث ہے اس میں ہے کہ آپ نے اپنے مقروض سے کہا: باہر آجاؤ میں جانتا ہوں تو کہاں چھپا ہوا ہے؟ مقروض باہر آ گیا آپ نے پوچھا: کس چیز نے تجھے اس امر پر برانگیختہ کیا کہ تو مجھ سے چھپے؟ جواب دیا: اللہ کی

قسم! میں تجھ سے ذکر کروں گا اور تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، الله کی قسم! میں ڈرتا ہوں کہ تجھ سے بات کروں اور جھوٹ بولوں اور میں تجھ سے وعدہ کروں اور تیرے ساتھ اسکی خلاف ورزی کروں تو صحابی رسول ہے، الله کی قسم! میں تنگ دست ہوں۔ پوچھا: تو نے الله کے نام کی قسم اٹھائی ہے؟ عرض کی: الله کی قسم! وہ صحیفہ لائے اور اس قرض کی تحریر کو مٹا دیا فرمایا: اگر تو قرض ادا کرنے کی صورت پائے تو ادا کر دینا بصورت دیگر تو آزاد ہے۔

ابن عربی نے کہا: یہ تو اس زندہ آدمی کے بارے میں ہے جس سے ادائیگی کی امید ہوتی ہے کیونکہ ذمہ سلامت ہے اور حیلہ سے طلب کرنے کی امید موجود ہے تو اس میت کا کیا عالم ہوگا جس سے حیلہ سے طلب کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی ذمہ ہے (1)؟

**مسئلہ نمبر 10**۔ بعض علماء نے کہا: جس پر ظلم کیا گیا اور اس کا مال لے لیا گیا تو اس کا جو مال روکا گیا ہے اس کی موت تک اس کا ثواب ہے پھر ثواب اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گا یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہے گا کیونکہ وفات کے بعد مال وارثوں کا ہو جاتا ہے۔ ابو جعفر داودی مالکی نے کہا: یہ نظر و فکر کے اعتبار سے صحیح ہے، اسی معنی میں یہ بھی ہے اگر ظالم مظلوم سے پہلے مر گیا اور اس نے کوئی چیز نہ چھوڑی جس کو وارث نہیں جانتا تھا تو مظلوم کا بوجھ ظالم کے وارثوں کی طرف منتقل نہیں ہوگا کیونکہ ظالم کی کوئی ایسی چیز باقی نہیں مظلوم کے ورثا جس کے مستحق بنتے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ **وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ** یعنی جس نے تکلیف پر صبر کیا اور الله تعالیٰ کی رضا کی خاطر بدلہ نہ لیا۔ یہ اس صورت میں ہے جب مسلمان نے اس پر ظلم کیا ہو۔ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ الله تعالیٰ علیہ کی مجلس میں ایک آدمی نے دوسرے کو گالیاں دیں جس آدمی کو گالیاں دی گئیں وہ غصہ پی جاتا تھا اور اسے پسینہ آ رہا تھا وہ اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا پھر وہ اٹھا اور اس آیت کی تلاوت کی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الله کی قسم! اس نے اس آیت کو جانا اور سمجھا، جب جاہل لوگوں نے اسے ضائع کیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ معاف کرنا مستحب ہے بعض صورتوں میں معاملہ الٹ ہو جاتا ہے تو معافی کو ترک کرنا مستحب ہو جاتا ہے جس طرح بحث پہلے گزر چکی ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سرکشی کی زیادتی کو روکنا اور تکلیف کے مادہ کو ختم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک روایت ایسی مروی ہے جو اسی معنی پر دال ہے روایت یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اسے روکا کرتے تو وہ نہ رکتیں (2)۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''اس سے بدلہ لو''۔ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ معاصی سے صبر کرے اور برائیوں پر پردہ ڈالے۔

**اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝** یعنی یہ وہ امور ہیں جس کا الله تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان درست

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 71-1670

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء، جلد 1، صفحہ 143

امور میں سے ہیں جن کی الله تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ کلبی اور فراء نے ذکر کیا ہے: یہ آیت اور اس سے قبل کی تین آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئیں (1) کسی انصاری نے انہیں برا بھلا کہا تو آپ نے اسے جواب دیا پھر خاموشی اختیار کر لی۔ یہ آیات اس سورت کی مدنی آیات ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیات مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئیں یہ جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی تھیں پھر جہاد والی آیات نے انہیں منسوخ کر دیا۔ یہ ابن زید کا قول ہے جو پہلے گذر چکا ہے۔ تفسیر ابن عباس میں ہے: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ سے مراد حضرت حمزہ بن عبد المطلب، حضرت عبیدہ، حضرت علی اور تمام مہاجرین ہیں فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ سے مراد حضرت حمزہ، حضرت عبیدہ اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم ہیں۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ سے مراد عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، ابوجہل اور اسود اور تمام وہ مشرک ہیں جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔

وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ اس سے مراد ظلم اور کفر ہے اَلِيْمٌ سے مراد دردناک عذاب ہے وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اس سے مراد حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت مصعب بن عمیر اور تمام بدری صحابہ ہیں اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ کیونکہ انہوں نے فدیہ کو قبول کیا اور تکلیفوں پر صبر کیا۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝

''اور جس کو الله تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کا کوئی کارساز نہیں اس کے بعد، اور آپ ملاحظہ کریں گے ظالموں کو جب دیکھیں گے عذاب تو پوچھیں گے: کیا واپس لوٹنے کا بھی کوئی راستہ ہے''۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ جسے الله تعالیٰ بے یار و مددگار چھوڑ دے فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان امور میں اعراض کیا جن امور کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت دی تھی یعنی الله تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور قربیٰ میں محبت اور ان لوگوں نے دوبارہ اٹھائے جانے اور دنیا کے سامان کے قلیل ہونے میں آپ کی تصدیق نہیں کی۔ الله تعالیٰ جسے ان چیزوں سے گمراہ کر دے تو کوئی ہدایت دینے والا اسے ہدایت نہیں دیتا۔

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ یہاں ظالمین سے مراد کفار ہیں لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ عذاب سے مراد جہنم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے موت کے وقت عذاب کو دیکھا يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے تاکہ وہ الله تعالیٰ کی اطاعت کریں تو ان کی عرضداشت قبول نہیں کی جائے گی۔

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 209

الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ ۝

''اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ پیش کیے جا رہے ہوں گے دوزخ پر اس حال میں کہ عاجز و درماندہ ہوں گے ذلت کے باعث دیکھتے ہوں گے کنکھیوں سے چوری چوری، اور کہیں گے اہل ایمان کہ حقیقی گھاٹے میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے گھاٹے میں ڈالا اپنے گھر والوں کو قیامت کے روز، سن لو! ظالم لوگ ضرور ابدی عذاب میں ہوں گے''۔

وَتَرٰىهُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا ھا ضمیر سے مراد آگ ہے کیونکہ یہی ان کا عذاب ہے اگر تو چاہے تو جہنم مراد لے لے اگر لفظ کی رعایت کی جاتی تو علیہ ہوتا پھر یہ کہا گیا: اس سے مراد سب مشرک ہیں جنہیں جہنم پر پیش کیا جائے گا(1) جب وہ اس کی طرف جائیں گے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد آل فرعون ہیں ان کی روحوں کو سیاہ پرندوں میں محبوس کیا جاتا ہے(2) جو صبح کے وقت جہنم پر آتے ہیں اور شام کو واپس پلٹتے ہیں یہی جہنم پر انکی پیشی ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عام مشرک ہیں ان کی قبروں میں ان کے گناہ پیش کیے جاتے ہیں اور وہ قبروں میں عذاب پر پیش کیے جاتے ہیں؛ ابوحجاج کے قول کا یہی معنی ہے(3)۔

خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ بعض قراء نے خٰشِعِیْنَ پر وقف کیا اور مِنَ الذُّلِّ، یَنْظُرُوْنَ کے متعلق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خٰشِعِیْنَ کے متعلق ہے۔ خشوع کا معنی تواضع و عاجزی ہے۔

یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ کا معنی ہے وہ اپنی نظروں کو پورا نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے ہوتے ہیں۔ عرب ذلیل کی صفت غض الطرف سے کرتے ہیں جس طرح اس کے مقابل کے لیے حدید النظر سے صفت بیان کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ سے مراد ہے ذلیل(4)۔ وہ اپنے دلوں سے دیکھیں گے کیونکہ وہ اندھے اٹھائے جائیں گے یعنی قلب سے مراد طرف خفی ہے۔

قتادہ، سدی، قرظی اور سعید بن جبیر نے کہا: وہ خوف کی شدت کی وجہ سے نظریں چراتے ہیں(5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ کمزور نظر سے دیکھتے ہیں۔ یونس نے کہا: من کا معنی باء ہے(6) تقدیر کلام یہ ہوگی ینظرون بطرف خفی یعنی ذلت اور خوف کی وجہ سے کمزور نظر سے دیکھتے ہیں اسی کی مثل اعمش سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ کملائی ہوئی کمزور نظر سے دیکھتے ہیں(7)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ عذاب کی اصناف کو دیکھتے ہیں تو پوری آنکھ سے دیکھنے سے ڈرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مومن جب اس چیز کا مشاہدہ کریں گے جو کفار پر واقع ہوا تو جنت میں یہ کہیں گے: حقیقت میں خسارہ تو وہ ہے جس کی طرف یہ لوگ پہنچے ہیں انہوں نے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 209 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 246
5۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 123 6۔ ایضاً 7۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 210

اپنے آپ کو خسارہ میں ڈالا ہے کیونکہ یہ دائمی عذاب میں ہیں اور انہوں نے اپنے اہل میں بھی خسارہ اٹھایا ہے کیونکہ ان کے گھر والے اگر آگ میں ہوں گے تو ان کی وجہ سے انہیں کوئی نفع نہ ہوگا اگر اہل جنت میں ہوں گے تو اس کے اور ان کے درمیان رکاوٹ موجود ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اہل کے خسران سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ ایمان لاتے تو جنت میں ان کے اہل حورعین میں سے ہوتے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ہے اور ایک گھر دوزخ میں ہے جب وہ مرتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے تو جنتی اس کے گھر کا وارث بن جاتا ہے (1) اللہ تعالیٰ کے فرمان: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ (المومنون) کا یہی مطلب ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسند دارمی میں حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی آدمی جسے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بہتر (72) بیویاں حورعین میں سے اور ستر (70) جہنمیوں کی میراث کے طور پر عطا فرماتا ہے ان میں سے ہر ایک کی شرمگاہ دل پسند ہوگی اور اس کا آلہ تناسل دہرہ نہیں ہوگا'' (2)۔

ہشام بن خالد نے کہا: من میراثه من اهل النار سے مراد ایسے مرد ہیں جنہیں جہنم میں داخل کیا گیا تو جنتی ان کی عورتوں کے وارث ہو گئے جس طرح فرعون کی بیوی کے وارث ہو جائیں گے (3)۔

اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ ۝ یعنی ایسا عذاب جو ختم نہ ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مومنوں کا قول ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ کلام ہو۔

وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِیَآءَ یَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ۝۴۶

''اور نہیں ہوں گے اس روز اس کے لیے مددگار جو مدد کر سکیں ان کی اللہ کے بغیر، اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو اس کے لیے بچنے کی کوئی راہ نہیں''۔

اَوْلِیَآءَ سے مراد مددگار ہیں مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی اس کے عذاب سے انہیں بچائیں وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِیْلٍ ۝ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راہ نہیں جس کے ذریعے وہ دنیا میں حق تک اور آخرت میں جنت تک پہنچ سکے کیونکہ ان پر نجات کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَىِٕذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ۝۴۷

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب فی الزهد، صفة الجنة، جلد 332　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، باب فی صفة الجنة، حدیث 4327، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''(لوگو!) مان لو اپنے رب کا حکم اس سے پیشتر کہ آ جائے وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹلنے والا نہیں، نہ ہوگی تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ اس روز اور نہ تمہاری طرف سے کوئی روک ٹوک کرنے والا ہوگا''۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ اس نے تمہیں ایمان اور اطاعت کی طرف جو دعوت دی ہے اس پر لبیک کہو: استجاب اور اجاب دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ کوئی ایسی پناہ گاہ نہیں ہوگی جو تمہیں عذاب سے نجات دے۔

وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۞ کوئی مددگار نہیں جو تمہاری مدد کرے(1)؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نکیر منکر کے معنی میں ہے جس طرح الیم، مؤلم کے معنی میں ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرمائے گا تو اس روز تم کسی انکار کرنے والے کو نہ پاؤ گے؛ یہ ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے(2)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ان گناہوں کے انکار پر قادر نہ ہوں گے جن سے وہ آگاہ ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِّنْ نَّكِيْرٍ سے مراد ہے تم پر جو عذاب نازل ہوگا اس کو تبدیل کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ نکیر اور انکار کا معنی ہے ناپسندیدہ چیز کو تبدیل کرنا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۞

''پس اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا آپ کا فرض تو صرف احکام کا پہنچا دینا ہے اور ہم جب مزا چکھا دیتے ہیں انسان کو اپنی رحمت کا تو خوش ہو جاتا ہے اس سے اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے اپنے کرتوتوں کے باعث تو شور مچانے لگتا ہے بے شک انسان بڑا ناشکر گزار ہے''۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا اگر انہوں نے ایمان سے اعراض کیا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا یعنی ہم نے آپ کو ان کے اعمال کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا یہاں تک کہ آپ ان کا اعمال پر محاسبہ کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ کو ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ جب تک وہ ایمان نہ لائیں آپ ان سے جدا نہ ہوں یعنی انہیں ایمان پر مجبور کرنا جو آپ کی ذمہ داری نہیں اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ آپ کے ذمہ پیغام حق پہنچانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیت قتال سے یہ آیت منسوخ ہے وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ یہاں انسان سے مراد کافر ہے مِنَّا رَحْمَةً رحمت سے مراد خوشحالی اور صحت ہے فَرِحَ بِهَا اس کی وجہ سے وہ اترانے لگتا ہے وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ اگر انہیں آزمائش اور سختی آتی ہے بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۞ یہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہے جو نعمتیں اس پر پہلے ہو چکی ہیں ان کی ناشکری کرنے والا ہے وہ مصائب کو شمار کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 246
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 210

لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿٤٩﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿٥٠﴾

''اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے، بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے بچیاں اور عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے فرزند اور ملا جلا کر دیتا ہے انہیں بیٹے اور بیٹیاں اور بنا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بانجھ، بے شک وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ مبتدا اور خبر ہیں يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ یعنی مخلوقات میں سے جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿٤٩﴾ ابو عبیدہ، ابو مالک، مجاہد، حسن اور ضحاک نے کہا(1): جن کے بارے میں چاہتا ہے انہیں مونث عطا کرتا ہے ان کے ساتھ مذکر نہیں ہوتے اور جن کے بارے میں چاہتا ہے مذکر عطا فرماتا ہے ان کے ساتھ مونث نہیں ہوتے ذکور پر الف لام داخل کیا اناث پر الف لام داخل نہیں کیا کیونکہ مذکر شرف والے ہیں پس الف لام تعریف کے ساتھ مذکروں کو ممتاز کیا۔

واثلہ بن اسقع نے کہا: عورت کی برکت میں سے یہ ہے(2) کہ اس کا ذکر مردوں سے پہلے کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ عورتوں سے ذکر شروع کیا اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا مجاہد نے کہا: عورت پہلے بچہ اور پھر بچی جنے، پھر وہ بچہ اور پھر بچی جنے(3)۔ محمد بن حنفیہ نے کہا: وہ جڑواں بچے اور بچی کو جنے یا انہیں مذکر اور مونث کی حیثیت میں جمع کر دے(4)۔ قتبی نے کہا: یہاں تزویج سے مراد بیٹوں اور بیٹیوں کو جمع کرنا ہے(5)، عرب کہتے ہیں: زوجت ابلی۔ جب تو بڑوں اور چھوٹوں کو جمع کرے۔

وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا یعنی اس کی اولاد ہی نہیں ہوتی یوں کہا جاتا ہے: رجل عقیم، امرأۃ عقیم۔ عقمت المرأۃ تعقم عقما یہ باب اسی طرح ہے جس طرح حمد یحمد ہے عقُمت تعقم جس طرح عظُم یعظُم ہے اس کا اصل معنی کاٹنا ہے اسی سے الملک العقیم ہے یعنی ایسا ملک جس میں رشتہ داریوں کو قتل اور نافرمانی کے ذریعے کاٹ دیا جاتا ہے کیونکہ ملک چھن جانے کا خوف ہوتا ہے ریح عقیم یعنی ایسی ہوا جو بادلوں اور درختوں میں ملاقحہ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتی۔ یوم قیامت یوم عقیم ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی دن نہیں، یہ کہا جاتا ہے: نساء عُقْم و عُقُم۔ شاعر نے کہا:

عُقِمَ النساء فما یلدن شبیهه ان النساء بمثله عُقُمُ

عورتیں بانجھ ہو گئیں وہ اس کی مثل نہیں جنتیں عورتیں اس کی مثل لانے سے بانجھ ہیں۔

نقاش نے بیان کیا ہے: یہ آیت انبیاء کے بارے میں نازل ہوئی اگرچہ اس کا حکم عام ہے(6)۔ حضرت لوط علیہ السلام کو

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 211 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 43 3۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 246
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 211 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

صرف بیٹیاں عطا کی گئیں ان کے ساتھ بیٹے نہ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اور بیٹیاں عطا کیں، حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو کوئی اولاد نہ دی، اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسحاق بن بشر سے مروی ہے۔ اسحاق نے کہا: یہ آیت انبیاء کے بارے میں نازل ہوئی پھر یہ حکم عام رکھتی ہے یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا یعنی حضرت لوط علیہ السلام، ان کا کوئی بچہ نہ تھا ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّكُوۡرَ ۝ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی کوئی بچی نہ تھی بلکہ ان کے آٹھ بیٹے تھے اَوۡ یُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّ اِنَاثًا اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے آپ کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں وَ یَجۡعَلُ مَنۡ یَّشَآءُ عَقِیۡمًا یعنی حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ذکر نہ کیا۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے کہا یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا کا مصداق حضرت لوط علیہ السلام ہیں انکی صرف بیٹیاں تھیں ان کا کوئی بیٹا نہ تھا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّكُوۡرَ ۝ کا مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں ان کے بیٹے تھے ان کی کوئی بیٹی نہ تھی اَوۡ یُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّ اِنَاثًا اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں حضرت حواء ہر بطن سے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی جنا کرتی تھیں اس بطن کے مذکر کی دوسرے بطن کی مونث سے شادی کر دی جاتی تھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں حرمت کے حکم کو قطعی طور پر نافذ کر دیا اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے بھی تھے اور بیٹیاں بھی تھیں قاسم، طیب، طاہر اور عبد اللہ، زینب، ام کلثوم، رقیہ اور فاطمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سب حضرت خدیجہ کے بطن سے تھے حضرت ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ اس تقدیر پر جو اس کی حکمت بالغہ اور مشیت نافذہ کے ساتھ متعلق ہے نظام چل رہا ہے تاکہ نسل باقی رہے مخلوقات بڑھتی رہے وعدہ پورا ہوتا رہے امر ثابت ہوتا رہے دنیا آباد ہوتی رہے جنت اور جہنم میں سے ہر ایک اپنا حصہ لے جو اس کو بھر دے اور کچھ حصہ باقی رہے حدیث طیبہ میں ہے کہ ''جہنم نہیں بھرے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھے گا تو وہ کہے گی: قَطِ قَطِ۔ مجھے کافی ہے، مجھے کافی ہے جہاں تک جنت کا معاملہ ہے تو اسکا کچھ حصہ باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک اور مخلوق پیدا فرمائے گا''۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی قدرت عامہ اور قوت شدیدہ کی وجہ سے مخلوق کو ابتداءً بغیر کسی چیز کے پیدا فرماتا ہے وہ اپنی عظیم مہربانی اور حکمت بالغہ کے ساتھ ایک چیز سے دوسری چیز پیدا فرماتا ہے یہ کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں ہوتا کیونکہ وہ حاجات سے پاک ہے اور آفات سے سلامت ہے (1)۔ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین سے پیدا فرمایا اور حضرت حواء کو آدم سے پیدا فرمایا اور دونوں سے مخلوق کو وطی کے طور پر پیدا فرمایا: ''وہ حمل ہوتا ہے وہ جنین ہوتا ہے اس میں وضع حمل ہوتا ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت لے جاتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت لے جاتا ہے تو بچی پیدا ہوتی ہے'' صحیح میں اسی طرح ہے ''جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آ جاتا ہے تو بچا اپنے چچاؤں کے مشابہ ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی کے غالب ہوتا ہے تو بچا اپنے ماموؤں کے مشابہ ہوتا ہے''۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1672

میں کہتا ہوں: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا معنی ہے (1) اس کے الفاظ نہیں امام مسلم نے حضرت عروہ بن زبیر کے واسطہ سے ان سے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: جب عورت کو احتلام ہو اور وہ پانی دیکھے تو کیا وہ غسل کرے گی؟ فرمایا: ''ہاں'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس عورت سے فرمایا: تَرِبَتْ یداك وأُلَّت کلمہ تعجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''اسے چھوڑ دے مشابہت تو اسی وجہ سے ہوتی ہے جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ اپنے ماموں کے مشابہ ہوتا ہے اور جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب ہوتا ہے تو وہ اپنے چچاؤں کے مشابہ ہوتا ہے''۔

ہمارے علماء نے کہا: اس حدیث کے مقتضا کے مطابق غلبہ مشابہت کا تقاضا کرتا ہے، حضرت ثوبان کی حدیث میں ہے (2) جسے امام مسلم نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودی سے فرمایا: ''مرد کا پانی سفید اور عورت کا پانی زرد ہوتا ہے جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو اللہ کے حکم سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آتا ہے تو اللہ کے حکم سے بچی پیدا ہوتی ہے''۔

اس حدیث میں بھی یہی ذکر ہوا کہ غلبہ مذکر اور مونث کا تقاضا کرتا ہے۔ دونوں حدیثوں کے مطابق یہ لازم آتا ہے کہ چچاؤں کے ساتھ مشابہت کے ساتھ اور مذکر ہونا اس صورت میں ہوگا جب مرد کا پانی غالب آجائے اسی طرح جب عورت کا پانی غالب آجائے تو ماموں کے ساتھ مشابہت اور مونث ہونا لازم آئیگا کیونکہ دونوں چیزیں ایک علت کا معلول ہیں معاملہ اسی طرح نہیں بلکہ اس کے خلاف بھی صورت موجود ہوتی ہے کیونکہ ہم یہ پاتے ہیں کہ مشابہت ماموں کے ساتھ ہوتی ہے اور بچہ ہوتا ہے اور چچاؤں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جبکہ بچی ہوتی ہے پس دونوں حدیثوں میں سے ایک کی تاویل متعین ہوگئی حدیث ثوبان کا جو معنی متعین ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غلبہ ہو تو یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے سابقنی فلان فسبقته فلاں نے میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کیا تو میں اس پر سبقت لے گیا اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ** ۞ (الواقعة) یعنی ہم مغلوب نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غلبہ کا معنی ہے علا علیہ اس قول کی تائید حدیث کرتی ہے ''جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت لے جائے تو وہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت لے جائے تو بچی پیدا ہوتی ہے'' (3)۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے ان احادیث کی بنا پر قاعدہ بنایا ہے کہا: ان دونوں پانیوں کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں: (1) مرد کا پانی پہلے نکلے۔ (2) عورت کا پانی پہلے نکلے۔ (3) مرد کا پانی پہلے نکلے اور وہ زیادہ ہو۔ (4) عورت کا پانی پہلے نکلے اور زیادہ ہو۔ تقسیم اسی طرح مکمل ہوتی ہے کہ مرد کا پانی پہلے نکلے پھر اس کے بعد عورت کا پانی نکلے اور عورت کا پانی زیادہ ہو یا اس کے برعکس ہو جب مرد کا پانی پہلے نکلے اور وہ زیادہ ہو تو سبقت کی وجہ سے بچہ ہوگا اور کثرت کی وجہ سے بچہ چچاؤں کے مشابہ ہوگا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی امرأة بخروج المنی منہا، جلد 1، صفحہ 146

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب بیان صفة منی الرجل والمرأة، جلد 1، صفحہ 146

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1672

جب عورت کا پانی پہلے نکلے اور وہ زیادہ ہو تو سبقت کی وجہ سے بچی ہوگی اور غلبہ کی وجہ سے مشابہت ماموں کے ساتھ ہوگی اگر مرد کا پانی پہلے نکلے لیکن جب عورت کا پانی نکلا تو وہ زیادہ تھا تو سبقت کی وجہ سے بچہ مذکر ہوگا اور ماں کے پانی کی مشابہت سے بچہ ماموں کے مشابہ ہوگا، اگر عورت کا پانی پہلے نکلے لیکن جب مرد کا پانی نکلا تو وہ عورت کے پانی پر غالب آگیا تو بچی ہوگی کیونکہ عورت کا پانی پہلے نکلا تھا اور مشابہت چچاؤں کے ساتھ ہوئی کیونکہ مرد کا پانی غالب تھا کہا: اقسام کو اس طرح ترتیب دینے سے کلام درست ہو جاتی ہے، احادیث کے درمیان تعارض ختم ہو جاتا ہے۔ تمام تر پاکیزگیاں خالق علیم کے لیے ہیں۔

**مسئلہ نمبر3**۔ ہمارے علماء نے کہا: نسل انسانی مذکر اور مونث کی حیثیت سے رواں دواں رہی یہاں تک کہ دور جاہلیت میں پہلا خنثی واقع ہوا اسے علم میراث کے ماہر اور ان کے معمر آدمی عامر بن ظرب کے سامنے پیش کیا گیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں کیا کہے اس نے ان سے مہلت مانگی۔ جب اس پر رات تاریک ہوگئی تو وہ بے کل ہو گیا وہ پہلو بدلتا رہا اس کے پاس ایک سوچ آتی اور ایک جاتی یہاں تک کہ اس کی خادمہ نے اس کی کیفیت کو عجیب جانا، پوچھا: کیا بات ہے؟ عامر نے اسے کہا: ایک معاملہ میرے پاس پیش کیا گیا ہے جس کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ کیا کہوں اس وجہ سے جاگ رہا ہوں؟ خادمہ نے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ عامر نے اسے کہا: ایک آدمی ہے جس کا ذکر اور فرج دونوں ہیں اس کا میراث میں کیا حال ہوگا؟ لونڈی نے اسے کہا: جہاں سے اسے پیشاب آتا ہے اسی مناسبت سے اسے وراثت دے دو، عامر اسے سمجھ گیا اس نے صبح کی اور عامر نے اس کا حل پیش کر دیا وہ خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ یہی صورتحال تھی کہ اسلام آگیا حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے اس بارے میں فیصلہ کیا۔ کلبی نے ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ سے ایک بچے کے بارے میں پوچھا گیا جس کا ذکر اور فرج تھی تو کس اعتبار سے اسے ورثہ دیا جائے گا؟ فرمایا: ''جہاں سے اسے پیشاب آتا ہے'' روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ کی خدمت میں انصار کا ایک خنثی پیش کیا گیا تو فرمایا: جہاں سے اسے پہلے پیشاب آتا ہے اس اعتبار سے اسے وارث بناؤ'' محمد بن حنیفہ نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے، ابن مسیب، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مزنی نے کہا: امام شافعی سے اسی طرح مروی ہے۔

ایک قوم کا نقطہ نظر یہ ہے: پیشاب کا کوئی اعتبار نہیں اگر دونوں سے پیشاب آئے تو امام ابو یوسف کا قول ہے اکثر پر حکم لگایا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ نے اس کا انکار کیا ہے، فرمایا: کیا تو اس کا کیل کرے گا؟ امام شافعی کے مقلدین نے اکثریت پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ حضرت علی اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: ان کی پسلیاں شمار کی جائیں گی (1) کیونکہ عورت کی پسلی مرد کی نسبت ایک زائد ہوتی ہے۔ میراث والی آیت میں علماء نے جو کچھ کہا ہے مفصل گذر چکا ہے۔ الحمد اللہ۔

**مسئلہ نمبر4**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: ایک قوم نے خنثی کے وجود کا انکار کیا (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے مونث، مذکر۔ ہم کہتے ہیں: یہ لغت سے ناواقفیت، فصاحت سے کند ذہنی اور قدرت کی وسعت کی پہچان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1674 2۔ ایضاً

سے کوتاہی کی بنا پر ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق ہے کیونکہ وہ وسعت والا اور علیم ہے جہاں تک قرآن کے ظاہر کا تعلق ہے وہ خنثی کے وجود کی نفی نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ یہ عموم مدح ہے اس میں تخصیص جائز نہیں کیونکہ قدرت اس کا تقاضا کرتی ہے جہاں تک اس آیت يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا کا تعلق ہے تو یہ موجودات میں غالب کی خبر دیتا ہے نادر کے ذکر سے سکوت فرمایا کیونکہ وہ کلام اول کے عموم کے تحت داخل ہے وجود اس کی گواہی دیتا ہے اور مشاہدہ منکر کی تکذیب کرتا ہے۔ رباط میں ہمارے ساتھ ابوسعید خنثی، امام شہید کے پاس پڑھتا تھا جو بلاد مغرب سے تعلق رکھتا تھا نہ اس کی داڑھی تھی اور نہ ہی پستان تھے اس کے پاس ایک لونڈی تھی تیرا رب اس کے بارے میں خوب آگاہ ہے طویل سنگت کے باوجود حیاء اس سے سوال کرنے سے مانع رہا، آج میرے دل میں خواہش پیدا ہو رہی ہے کاش میں اس کے حال سے آگاہ ہو جاتا۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱

''اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اس کا سبب یہ ہے(1) کہ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اگر آپ نبی ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ سے کلام کیوں نہیں کرتے اور اس کی طرف کیوں نہیں دیکھتے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا اور اسکو دیکھا ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اس طرح کریں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام ہرگز اس کو نہیں دیکھیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ نقاش، واحدی اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

وَحْيًا مجاہد نے کہا: یہ پھونکنا ہے اس کے دل میں پھونکا جاتا ہے(2) تو وہ الہام ہوتا ہے؛ اسی معنی میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: إنّ روح القُدُس نفث في رُوعي إنّ نَفْسًا لن تموت حتى تستكمل رزقها وأجلها فاتقوا الله وأجملوا في الطلب روح القدس نے میرے دل میں الہام کیا کہ ایک نفس ہرگز نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ اپنا مکمل رزق پائے گا اور اپنی مدت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور طلب اچھی کرو۔

اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ یا حجاب کے پیچھے سے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کلام کی۔ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا جس طرح حضرت جبریل امین کو بھیجا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا وَحْيًا کا معنی ہے(3) ایسے خواب جنہیں وہ اپنی نیند میں دیکھتا

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 195    2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 212    3۔ ایضاً

ہے: یہ محمد بن زبیر کا قول ہے اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا زہیر نے کہا: رسول سے مراد حضرت جبریل امین علیہ السلام ہیں (1) فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ یہ وحی جو رسل کی جانب سے ہوتی ہے یہ رسل یعنی فرشتوں کی جانب سے انبیاء کو خطاب ہوتا ہے جس کو انبیاء سنتے ہیں اور آنکھوں سے جسے دیکھتے ہیں، حضرت جبریل امین کی بھی یہی حالت تھی جب وہ وحی لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت جبریل امین ہر نبی کے پاس آتے رہے مگر حضرت جبریل امین کو حضرت محمد علیہ الصلاۃ والسلام، حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور حضرت ذکریا علیہم السلام کے سوا کسی نے بھی نہیں دیکھا جہاں تک دوسرے انبیاء کا تعلق ہے تو ان کی طرف وحی نیند کی حالت میں الہام ہوا کرتا تھا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اِلَّا وَحْیًا سے مراد ہے جبریل امین کو بھیج کر اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا جس طرح تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

زہری، شیبہ اور نافع نے اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ دونوں فعلوں کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے۔ رفع جملہ مستانفہ کے طور پر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی ھو یرسل ایک قول یہ کیا گیا ہے یرسل فعل حال ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے تقدیر کلام یہ ہوگی الا آحیا أو مرسلا جنہوں نے اسے نصب دی ہے انہوں نے فعل کو محل وحی پر معطوف کیا ہے تو اس کا معنی ہوگا کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہو مگر یہ اس کی طرف وحی کرے یا رسول بھیجے۔ یہ بھی جائز ہے کہ نصب حرف جار کے حذف کی وجہ سے ہو جو ان مضمرہ سے پہلے ہے اور وہ حال کے محل میں ہو تقدیر کلام یہ ہوگی أو بأن یرسل رسولا یہ جائز نہیں کہ أو یرسل منصوب فعل کا عطف اَنْ یُّكَلِّمَهُ پر ہو کیونکہ معنی میں فساد واقع ہوتا ہے کیونکہ معنی یہ بنتا ہے کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اسے بھیجے یا اس کی طرف رسول بھیجے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں رسول بنا کر بھیجے ہیں اور انسانوں کی طرف بھیجے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت سے اس آدمی نے استدلال کیا ہے جس کی رائے یہ ہے: جس نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ فلاں آدمی سے کلام نہیں کرے گا تو اس نے اس آدمی کی طرف قاصد بھیجا تو وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ آدمی بھیجنے والے کو بھی بعض اوقات اس آدمی کے ساتھ کلام کرنے والا ہی سمجھا جاتا ہے جس طرف اس نے آدمی بھیجا تھا مگر یہ صورت مختلف ہوگی کہ اس نے بالمشافہ گفتگو کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ابن منذر نے کہا: اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو یہ قسم اٹھاتا ہے کہ وہ فلاں سے کلام نہیں کرے گا تو اس نے اس کی طرف خط لکھا یا اس کی طرف کوئی آدمی بھیجا تو ثوری نے کہا: رسول کلام نہیں ہے، امام شافعی نے کہا: اس کا حانث ہونا واضح نہیں ہوگا۔ امام نخعی نے کہا: خط کی صورت میں حکم یہ ہے کہ وہ حانث ہو جائے گا۔ امام مالک نے کہا: وہ خط اور قاصد دونوں کی صورت میں حانث ہو جائے گا۔ ایک دفعہ کہا قاصد، خط سے آسان ہے۔ ابو عبید نے کہا: کلام، خط اور اشارہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 212 2۔ ایضاً

سے مختلف ہے۔ ابو ثور نے کہا: وہ خط کی صورت میں حانث نہیں ہوگا۔ ابن منذر نے کہا: وہ خط اور قاصد میں حانث نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں اور یہی امام مالک کا قول ہے ابو عمر نے کہا: جس نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ کسی آدمی سے کلام نہیں کرے گا اس نے اسے جان بوجھ کر یا بھول کر سلام کیا یا ایک جماعت کو سلام کیا جبکہ وہ بھی ان میں موجود تھا امام مالک کے نزدیک تمام صورتوں میں حانث ہو جائے گا۔ اگر اس نے اس کی طرف قاصد بھیجا یا اسے سلام کیا جبکہ وہ حالت نماز میں تھا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں: قاصد بھیجا تب بھی حانث ہو جائے گا مگر وہ بالمشافہ کی نیت کرے؛ یہ امام مالک اور ابن ماجشون کا قول ہے سورۂ مریم کے آغاز میں یہ ہمارے علماء کی مفصل بحث گزر چکی ہے الحمد اللہ۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک (جانفزا) کلام اپنے حکم سے، نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے لیکن اے حبیب! ہم نے بنا دیا اس کتاب کو سراپا نور، ہم ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعہ جن کو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے، اور بلاشبہ آپ راہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف جو اللہ تعالیٰ کی راہ ہے وہ اللہ جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے خوب سن لو! سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ یعنی جس طرح ہم نے آپ سے قبل انبیاء کی طرف وحی کی اسی طرح آپ کی طرف وحی کی رُوْحًا یعنی نبوت؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے (1)۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے (2): اپنی جناب سے رحمت۔ سدی نے کہا: وحی (3)۔ کلبی نے کہا: کتاب (4)۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد جبریل امین ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد قرآن ہے (5)؛ یہ مالک بن دینار کا قول ہے۔ اسے روح کا نام دیا کیونکہ اس میں جہالت کی موت سے زندگی ہے روح کو اپنے امر کا حصہ بنانا اس معنی میں ہے اسے نازل کیا جس طرح چاہا اور جس پر چاہا یعنی جو نظم معجز ہے اور تالیف معجب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (الاسراء: 85) تو قرآن پر محمول کیا جائے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء: 85) وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ یہ قرآن آپ پر کہاں سے آتا ہے؟ کہہ دیجئے: یہ اللہ کا امر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے اس حال میں کہ یہ معجز ہے؛ قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مالک بن دینار کہا کرتے تھے: اے اہل قرآن!

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 90　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 212　3۔ ایضاً
4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 90　5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 213

تمہارے دلوں میں قرآن نے کیا بویا ہے؟ بے شک قرآن دلوں کا موسم بہار ہے جس طرح بارش زمین کا موسم بہار ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ یعنی تم ایمان کی طرف جانے والے راستہ کو نہیں پہچانتے تھے۔ اس کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وحی سے پہلے آپ ایمان سے متصف نہیں تھے۔ قشیری نے کہا: یہ امر عقول کے مجوزات میں سے ہے اکثر علماء جس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا مگر وہ بعثت سے پہلے اس پر ایمان لانے والا تھا یہ بھی عقل سے حکم لگاتا ہے مگر یہ کہ قطعی دلیل سے امر ثابت ہو۔ قاضی ابوالفضل عیاض نے کہا: نبوت سے قبل ان کی عصمت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے وہ نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے جاہل ہونے اور اس میں کسی قسم کی تشکیک سے پاک تھے انبیاء سے اخبار و آثار اس امر کی مؤید ہیں کیونکہ جب سے وہ پیدا ہوئے وہ اس نقص سے پاک ہی رہے بلکہ ان کی پیدائش توحید و ایمان پر ہی ہوئی بلکہ معارف کے انوار کے اشراق اور الطاف سعادت کے نفحات پر ہوئی۔ جو آدمی ان کی ولادت سے لے کر ان کی بعثت تک کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس کو تسلیم کرتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے احوال سے معروف ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ (مریم)

مفسرین نے کہا: حضرت یحییٰ علیہ السلام کو کتاب اللہ کا علم ان کے بچپنے میں دے دیا گیا تھا۔ معمر نے کہا: اس وقت ان کی عمر دو سال یا تین سال تھی، بچوں نے ان سے کہا: تو کھیلتا کیوں نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا میں کھیل کے لیے پیدا کیا گیا ہوں مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: 39) کے بارے میں کہا: حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی جبکہ ان کی عمر تین سال تھی حضرت یحییٰ نے گواہی دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی جبکہ وہ ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے حضرت یحییٰ کی والدہ حضرت مریم کو کہا کرتی تھی: میرے بطن میں جو ہے وہ تیرے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے سلام کی غرض سے سجدہ کرتے ہوئے پاتی ہوں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو انہوں نے اپنی والدہ سے گفتگو کی اس پر اللہ تعالیٰ کا کلام واضح ہے اَلَّا تَحْزَنِيْ (مریم: 24) اس کی قراءت کے مطابق جس نے من تحتھا کی قراءت کی ہے، اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ندا کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور پنگھوڑے میں ان کی کلام پر یہ نص بیان کی، فرمایا: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ (مریم) اور فرمایا: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا (الانبیاء: 79) حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کے بارے میں کہا گیا جبکہ وہ بچے تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے یہ فیصلہ انہوں نے رجم کی جانے والی عورت اور بچے کے بارے میں کیا تھا جس کی پیروی ان کے والد حضرت داؤد نے کی تھی۔

طبری نے یہ حکایت بیان کی ہے: جب ان کو حکومت ملی اس وقت ان کی عمر بارہ سال تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ جو واقعہ ہے وہ بھی اسی طرح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی داڑھی پکڑی جبکہ ابھی وہ بچے تھے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (الانبیاء: 51) کے بارے میں فرمایا: ہم نے

اسے ہدایت دی جبکہ اس کی عمر چھوٹی تھی؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطا نے کہا: اس کی پیدائش سے قبل ہی اس کو چن لیا گیا۔ بعض نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی پہچان کرے اور زبان سے اس کا ذکر کرے تو حضرت ابراہیم نے جواب دیا میں نے ایسا کر لیا ہے یہ نہیں کہا میں ایسا کروں گا یہ ان کی ہدایت تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں پھینکا گیا اور ان کا امتحان ہوا اس وقت ان کی عمر سولہ سال تھی، حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبح کی صورت میں امتحان سات سال کی عمر میں ہوا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں، چاند اور سورج سے جب استدلال کیا اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو کنوئیں میں پھینکنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت آپ بچے تھے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا (یوسف: 15) اس کے علاوہ بھی اخبار موجود ہیں۔

سیرت نگاروں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی جب ولادت ہوئی تو آپ اپنے ہاتھ زمین پر پھیلائے ہوئے تھے اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب میں بڑا ہوا تو میرے دل میں بتوں کا بغض پیدا ہو گیا، شعر سے بغض پیدا ہو گیا دور جاہلیت کے لوگ جس قسم کے کام کرتے میں نے ان سے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر صرف دو دفعہ ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے دونوں دفعہ مجھے اس سے محفوظ رکھا پھر میں نے اس کا اعادہ نہ کیا'' (1)۔

پھر ان کے لیے امر پختہ ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی نوازشات پے در پے ان پر واقع ہوتی ہیں، معارف کے انوار ان میں روشن ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ انتہا تک جا پہنچتے ہیں یہ کسی تجربہ اور مشق کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤی اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (القصص: 14)

قاضی نے کہا: تاریخ دانوں میں سے کسی نے یہ نقل نہیں کیا کہ کسی ایسے شخص کو نبوت عطا کی گئی ہو یا اسے منتخب کیا گیا ہو جس کے بارے میں یہ معروف ہو کہ اس نے اس سے قبل کفر اور شرک کیا ہو اس بارے میں جس پر انحصار کیا جا سکتا ہے وہ اخبار منقولہ ہیں بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس آدمی کا یہ طریقہ رہا ہو دل اس سے نفرت کرتے ہیں۔

قاضی نے کہا میں کہتا ہوں: قریش نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر ایسی بات کے ساتھ اعتراض کیا جس کو انہوں نے اپنی جانب سے گھڑا، امتوں کے کفار نے اپنے انبیاء کو ہر اس چیز سے عار دلائی جو ان کے لیے ممکن تھا اور جس کو انہوں نے گھڑا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا یا راویوں نے ہمارے لیے اسے نقل کیا لیکن ہم یہ نہیں پاتے کہ ان میں سے کسی نے کسی نبی کو اس بات پر شرمندہ کیا ہو جس امر میں وہ اس کے ساتھ متفق تھا اب اس کو ترک کر دیا ہے اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ اعتراض کرنے میں جلدی کرتے اپنے معبود کو تبدیل کرنے پر اس کے خلاف استدلال کرتے وہ نبی انہیں جس چیز سے منع کرتا ہے جبکہ وہ خود

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التوبة والانابة، باب عصمة النبی عن عمل الجاهلية قبل النبوة، جلد 4، صفحہ 273

پہلے اس کی عبادت کرتے تھے اس معاملہ میں ان کا اسے شرمندہ کرنا یہ دلیل میں زیادہ خوفناک اور استدلال میں قطعی ہوتا اس کی بنسبت کہ اس نے ان کے معبودوں کو چھوڑ دیا ہے اور ان معبودوں کو چھوڑ دیا جن کی ان کے آباء پرستش کیا کرتے تھے ان لوگوں کا اس نبی سے اعراض پر اتفاق اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے ایسی کوئی راہ نہیں پائی تھی کیونکہ اگر کوئی بات ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی اور وہ خاموش نہ رہتے جس طرح وہ تحویل قبلہ کے بارے میں خاموش نہ رہے انہوں نے کہا: مَاوَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (البقرہ: 142) جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں حکایت بیان کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو کی کیا وحی سے قبل کسی دین کے پیروکار تھے یا نہیں تھے؟ کچھ نے تو مطلق اس کا انکار کیا اور از روئے عقل کے اسے محال جانا انہوں نے کہا: جس کے بارے میں یہ معروف ہو کہ وہ تابع ہے اس کے لیے متبوع ہونا بعید ہے انہوں نے اس کی بنیاد حسن وقبح پر رکھی ہے۔

دوسری جماعت نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں توقف کیا جاتا ہے اور کسی کا قطعی حکم نہ لگایا کیونکہ عقل ان دونوں میں سے کسی صورت کو محال قرار نہیں دیتی اور نہ ہی بطریق نقل ان میں سے کوئی صورت واضح ہے؛ یہ ابو معالی کا مذہب ہے۔

تیسری جماعت کا نقطۂ نظر ہے: آپ پہلی شریعت کے پیروکار تھے اور اسی پر عامل تھے، پھر ان علماء نے تعیین میں اختلاف کیا ہے۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ آپ کا دین تمام سابقہ ادیان اور ملل کے لیے ناسخ تھا کیونکہ یہ جائز نہیں کہ نبی منسوخ دین پر عمل پیرا ہو۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اولاد تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو الانبیاء تھے۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ وہ دینوں میں سے سب سے قدیمی دین ہے۔

معتزلہ کا کہنا ہے: لازماً آپ کسی دین کے پیروکار تھے مگر کون سا دین تھا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہمارے ائمہ نے ان تمام اقوال کو باطل قرار دیا ہے کیونکہ یہ ایسے اقوال ہیں جو متعارض ہیں ان میں کوئی قطعی دلیل نہیں اگرچہ عقل ان سب کو جائز قرار دیتی ہے جو بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک نبی کی طرف اس طرح منسوب نہیں تھے کہ وہ نسبت یہ تقاضا کرتی ہو کہ آپ اس کے امتی ہیں اور اس کی شریعت کے مخاطب ہیں بلکہ ان کی شریعت بذات خود مستقل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا آغاز ہوا آپ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بت کو سجدہ نہ کیا نہ بارش والی قسم میں حاضر ہوئے اور نہ خوشبو لگا کر قسم اٹھانے والوں میں حاضر ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے محفوظ و مامون رکھا۔

اگر یہ سوال کیا جائے: عثمان بن ابی شیبہ نے یہ حدیث بیان کی ہے(1) کہ حضرت جابر نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے ساتھ ان کے مشاہد میں حاضر ہوتے آپ نے اپنے پیچھے دو فرشتوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا: جاؤ یہاں تک کہ ان کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ، تو دوسرے نے کہا: میں اس کے پیچھے کیسے کھڑا ہو سکتا ہوں جبکہ اس کا وقت بت کو سلام کرنے کا ہے؟ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی ان کے ساتھ ان کی جگہوں پر حاضر نہ ہوئے۔

---

1۔ کتاب الشفاء، صفحہ 470

اس کا جواب یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اس روایت پر سخت جرح قدح کی ہے کہا: یہ موضوع ہے یا موضوع کے مشابہ ہے۔ دار قطنی نے کہا: عثمان کو سند میں وہم ہوا ہے، حدیث منکر ہے اس کی سند پر اتفاق نہیں اس وجہ سے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

علماء کے نزدیک اس کے برعکس ثابت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: بُغِضَتْ إِلَيَّ الأصنام اور بحیرہ راہب کے قصہ میں آپ کا ارشاد: لا تسألني بهما فوالله ما أبغضت شيأ قطّ بُغْضَهُمَا اس پر دلیل ہے بحیرہ راہب نے جب شام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی جبکہ اس سفر میں آپ اپنے چچا کے ساتھ تھے اور ابھی بچے تھے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نبوت کی علامات دیکھیں تو بطور امتحان کہا کہ لات اور عزیٰ کی قسم اٹھاؤ تو آپ نے یہ جواب دیا تھا: ''مجھ سے ان کے بارے میں قسم کا سوال نہ کرو جتنا میں ان دونوں سے بغض رکھتا ہوں ایسا بغض میں کسی سے نہیں رکھتا''۔ بحیرا نے آپ سے کہا: اللہ کی قسم! جو میں تجھ سے پوچھوں گا تم ضرور اسکا جواب دو گے۔ فرمایا: ''جو چاہو سوال کرو''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں یہی معروف ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی کہ آپ نبوت کے اعلان سے قبل حج کے موقع پر مشرکین کی مخالفت کرتے وہ مزدلفہ میں ہی ٹھہر جاتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفات میں وقوف کرتے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ٹھہرنے کی یہی جگہ ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ (البقرۃ:135) فرمایا: اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (نحل:123) فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ (الشوریٰ:13) یہ امر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ شریعت کے پیروکار تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جن میں شریعتوں میں اختلاف نہیں ہوتا جیسے توحید، اقامت دین۔ جس کی وضاحت کئی مواقع پر ہو چکی ہے۔ اس سورت میں شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ میں گذر چکی ہے۔ الحمد اللہ۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب یہ بات واضح ہوگئی تو یہ بات جان لو کہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ کی تعبیر کیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس آیت میں ایمان کا معنی ایمان کے شرائع اور معالم ہیں؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس شرع کی تفاصیل مراد ہیں یعنی ان کی تفاصیل نہیں جانتے تھے۔ ایمان کے الفاظ کا اطلاق شرع کی تفاصیل پر کرنا بھی جائز ہے؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وحی سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ آپ کیسے مخلوق کو ایمان کی طرف دعوت دیں؛ اسی کی مثل ابو العالیہ سے مروی ہے۔

ابو بکر قاضی نے کہا: یہاں ایمان سے مراد فرائض اور احکام ہیں، کہا: اس سے پہلے آپ توحید پر ایمان رکھنے والے تھے پھر فرائض نازل ہوئے جن سے پہلے آپ آگاہ نہ تھے احکام کے مکلف بنائے جانے کے ساتھ ایمان میں اضافہ ہوا۔ یہ چاروں اقوال قریب قریب ہیں۔

ابن خزیمہ نے کہا: ایمان سے مراد نماز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (البقرۃ:143)

مراد یہ ہے تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے جو نماز پڑھی ہے اس کو ضائع کرنے والا کوئی نہیں، لفظ عام ہے اور مراد خاص ہے۔ حسین بن فضل نے کہا: آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی اہل ایمان کا جانتے تھے یہ کلام اس قبیل سے ہوگی جس میں مضاف حذف ہوتا ہے یعنی کون ایمان لائے گا، ابو طالب، حضرت عباس یا کوئی اور؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آپ پنگھوڑے میں تھے اور بلوغت سے قبل آپ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔

ماوردی نے علی بن عیسیٰ سے اسی کی مثل روایت بیان کی ہے۔ اگر رسالت نہ ہوتی تو آپ نہ جانتے کہ کتاب کیا ہے اور اگر بلوغت نہ ہوتی تو آپ نہ جانتے کہ ایمان کیا ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہمارا تم پر انعام نہ ہوتا تو آپ نہ جانتے کہ کتاب کیا ہے اور اگر ہم آپ کو ہدایت نہ دیتے تو آپ نہ جانتے کہ ایمان کیا ہے، اس میں احتمال موجود ہے۔

اس ایمان میں دو وجوہ ہیں: (1) اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان، اسے آپ بلوغت کے بعد اور نبوت سے پہلے جانتے تھے (2) دین اسلام، اسے آپ نبوت کے بعد جانتے تھے۔

میں کہتا ہوں: صحیح بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے تھے پیدائش سے لے کر بالغ ہونے تک جس طرح یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ یعنی آپ امی قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ نہ کتاب کو جانتے اور نہ ہی ایمان کو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (العنکبوت) یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا: ضمیر غائب سے مراد ایمان ہے (2)۔ سدی نے کہا: مراد قرآن ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وحی ہے یعنی ہم نے اس وحی کو بنایا نور۔

نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ، مَنْ نَّشَآءُ یعنی جسے ہم نبوت کے لیے پسند کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ: 105) ضمیر واحد ذکر کی کیونکہ کثرت اسماء میں فعل اس فعل کے قائم مقام ہوتا ہے جو اسم واحد میں ہو کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کہتا ہے: إقبالك وإدبارك يعجبني تو ضمیر غائب واحد کی لاتا ہے جبکہ اقبال اور ادبار دو چیزیں ہیں۔

وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تو راہنمائی کرتا ہے اور دعوت دیتا ہے ایسے دین کی طرف جو سیدھا ہے اس میں کوئی کجی نہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کتاب مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے (4)۔

عاصم اور جحدری وَاِنَّكَ لَتُهْدٰى مجہول کا صیغہ پڑھا ہے یعنی فعل مجہول ہے باقی قراء نے اسے معروف کا صیغہ پڑھا ہے حضرت ابی کی قراءت میں وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قراءت نہ کی جائیگی کیونکہ یہ مصاحف کے خلاف ہے اس قسم کے قول کو قائل کی جانب سے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ یہ تفسیر کے طور پر ہے جس طرح کہا: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ یعنی آپ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 212 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 213 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 212 4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 213

دعوت دیتے ہیں۔

معمر نے قتادہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۲﴾ کی تفسیر میں یہ آیت ذکر کی وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۰﴾ (الرعد)

صِرَاطِ اللّٰهِ یہ پہلے صراط سے بدل ہے جس طرح معرفہ نکرہ سے بدل ہوتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ حضرت نواس بن سمعان نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ یعنی ملک، بندہ اور مخلوق ہونے کے اعتبار سے سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ دوبارہ اٹھانے اور جزا دینے کی وعید ہے۔ سہیل بن ابی جعد نے کہا: ایک مصحف جل گیا اس میں سے صرف اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ باقی بچا۔ ایک مصحف غرق ہوا اس میں سے سب مٹ گیا صرف اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ باقی بچا۔ والحمد للہ وحدہ۔

# سورة الزخرف

آیاتہا ۸۹ ۔ ۴۳ سورۃ الزخرف مکیۃ ۶۳ ۔ رکوعاتہا ۷

بالاتفاق یہ سورت مکی ہے مقاتل نے کہا مگر یہ آیت مدنی ہے وَ سْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ۔ اس کی نواسی آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حٰمٓ ۚ۝ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۚ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ۝

''حا۔ میم۔ قسم ہے اس کتاب مبین کی ہم نے اتارا ہے اسے قرآن، عربی زبان میں تا کہ تم اس کے مطالب کو سمجھو''۔

حٰمٓ ۚ۝ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اس کے بارے میں گفتگو گذر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حٰمٓ قسم ہے وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ دوسری قسم ہے، اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ جس کی چاہے قسم اٹھائے اس کا جواب قسم اِنَّا جَعَلْنٰهُ ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے وَ الْكِتٰبِ کا جواب حٰمٓ کو بنایا جس طرح تو کہتا ہے نزل واللہ، وجب واللہ تو اس نے الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ پر وقف کیا ہے، جس نے جواب قسم اِنَّا جَعَلْنٰهُ کو بنایا ہے اس نے وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ پر وقف نہیں کیا۔ جَعَلْنٰهُ کا معنی ہے ہم نے اس کا نام رکھا اور ہم نے اس کی صفت بیان کی۔ اسی وجہ سے یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح اس ارشاد میں ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ (المائدہ:103) سدی نے کہا: ہم نے اسے نازل کیا ہے جو قرآن ہے(1)۔ مجاہد نے کہا: ہم نے یہ کہا۔ زجاج اور سفیان ثوری نے کہا: ہم نے اسے بیان کیا۔

عَرَبِیًّا ہم نے اسے عربوں کی زبان میں نازل کیا کیونکہ ہر نبی کی کتاب اس کی قوم کی زبان میں نازل کی گئی(2)؛ یہ سفیان ثوری اور دوسرے علماء نے کہا: مقاتل نے کہا: آسمان والوں کی زبان عربی ہے(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کتاب سے مراد وہ تمام کتابیں ہیں جو انبیاء پر نازل کی گئیں کیونکہ کتاب اسم جنس ہے گویا جتنی بھی کتابیں نازل کی گئیں ان کی قسم اٹھائی کہ اس نے قرآن کو عربی بنایا جَعَلْنٰهُ میں ضمیر قرآن کے لیے ہے اگرچہ اس سورت میں اس کا پہلے ذکر نہیں ہوا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ تا کہ تم اس کے احکام اور اس کے معانی کو سمجھو۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ عربوں کے لیے خاص ہوگا عجمیوں کے لیے نہیں ہوگا(4)؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: معنی ہے تا کہ تم سوچ و بچار کرو۔ اس تعبیر کی بنا پر عربیوں اور عجمیوں سب کے لیے عام ہوگا۔ کتاب کی صفت مبین سے لگائی ہے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 215 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے احکام اور فرائض کو بیان فرمایا ہے جس طرح کئی مواقع پر یہ بحث گذر چکی ہے۔

وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝

''اور بے شک یہ قرآن ہمارے ہاں لوح محفوظ میں ثبت ہے اونچی شان والا حکمت سے لبریز''۔

وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ ضمیر سے مراد قرآن ہے یعنی قرآن لوح محفوظ میں ہے لَدَیْنَا یعنی ہمارے پاس لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝ یعنی بلند اور محکم۔ اس میں اختلاف اور تناقض نہیں پایا جاتا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ (الواقعہ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ۝ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ (البروج) ابن جریج نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اِنَّهٗ سے مراد مخلوق کے اعمال یعنی ایمان، کفر، اطاعت اور معصیت لَعَلِیٌّ وہ اس سے بلند ہے کہ اسے پایا جاسکے اور اس میں تبدیلی کی جاسکے حَكِیْمٌ وہ نقص اور تغیر سے پاک ہے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اسے حکم دیا کہ جس کو پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے لکھے کتاب اس کے پاس ہے پھر اس آیت کی تلاوت کی (2)۔ حمزہ اور کسائی نے اُمِّ الْكِتٰبِ کے ہمزہ کو کسرہ دیا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے ضمہ دیا ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ ۝

''کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو ناراض ہو کر اس وجہ سے کہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو''۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ ذکر سے مراد قرآن ہے؛ یہ ضحاک اور دیگر سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذکر سے مراد عذاب ہو یعنی کیا ہم تم سے عذاب کو روک لیں گے اور تمہارے اسراف اور کفر پر تمہیں سزا نہ دیں گے؛ یہ مجاہد، ابو صالح اور سدی کا قول ہے (3)۔ عوفی نے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم تم سے عذاب کو روک لیں گے جبکہ تم نے وہ کچھ نہیں کیا جس کا تمہیں حکم دیا گیا تھا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی ہے کیا تم قرآن کو جھٹلاتے ہو اور تمہیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ سدی نے یہ بھی کہا: معنی ہے کیا ہم تمہیں فضول چھوڑ دیں گے اور ہم تمہیں حکم نہیں دیں گے اور ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے کیا ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے اور تمہیں حکم نہیں دیں گے اور تمہیں نہیں روکیں گے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ کیا ہم قرآن نازل کرنے سے رک جائیں گے قبل اس کے کہ تم اس پر ایمان نہیں لائے ہو گے اور تم پر اسے نازل کریں گے؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔

قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اس قرآن کو اٹھا لیا جاتا جب اس امت کے لوگوں نے اس کا رد کیا تھا تو وہ ہلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے ساتھ اسے لوٹایا اور بار بار نازل کیا۔ کسائی نے کہا: ہم تم سے ذکر کو لپیٹ دیں گے نہ تمہیں نصیحت کی جائے گی اور نہ ہی تمہیں حکم دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ذکر سے مراد تذکیر ہے گویا فرمایا: کیا تمہیں نصیحت کرنا چھوڑ دیں گے کیونکہ تم فضول خرچ قوم ہو۔ یہ تعبیر اس کے نزدیک ہے جس نے ان کے ہمزہ کو فتحہ دیا ہے، جس نے اسے کسرہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 215
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 91
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 216

دیا ہے اس نے اسے شرط کے لیے بنایا ہے اور اس کا ماقبل اس کا جواب ہے کیونکہ یہ لفظوں میں عمل نہیں کرتا اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرۃ) ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب محذوف ہے اس پر ماقبل کلام دلالت کرتی ہے جس طرح تو کہتا ہے: أنت ظالم إن فعلت زجاج کے نزدیک ہمزہ کے کسرہ کی صورت میں حال کا معنی ہوگا کیونکہ کلام میں تقریر اور توبیخ کا معنی پایا جا رہا ہے صَفْحًا کا معنی اعراض کرنا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے صفحتُ عن فلان جب تو نے اس کے گناہ سے درگذر کیا قد ضربت عنه صفحا جب تو نے اس سے اعراض کیا اور اس کو ترک کر دیا۔ اس کا اصل معنی گردن کا پہلو ہے یہ کہا جاتا ہے: اعرضت عنه یعنی میں نے اس سے اپنی گردن کا پہلو پھیر لیا۔ شاعر نے کہا:

صُفوحًا فما تلقاك إلّا بخيلَةً　　فمن مَلَّ منها ذلك الوصلَ مَلّت (1)

وہ گردن کا پہلو پھیرنے والی ہے وہ تجھے بخیل کی حیثیت سے ہی ملے گی جو اس وصل سے اس سے اکتا جائے وہ اکتا جاتی ہے۔

صَفْحًا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ اَفَنَضْرِبُ کا معنی ہے افنصفح ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یوں ہے أفنضرب عنكم الذكر صافحين جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: جاء فلان مشياً۔

مُّسْرِفِيْنَ کا معنی ہے مشرکین۔ ابو عبیدہ نے ان میں ہمزہ کے فتحہ کو اختیار کیا ہے؛ یہ ابن کثیر، ابو عمرو، عاصم اور ابن عامر کی قراءت ہے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں اس امر پر عتاب کیا جو ان سے واقع ہوا اور ان کے عمل سے پہلے اسے جان لیا۔

وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

''اور ہم نے بکثرت بھیجے ہیں نبی پہلے لوگوں میں اور نہیں آیا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ (کفار) اس کا مذاق اڑایا کرتے پس ہم نے ہلاک کر ڈالا جو ان سے زیادہ طاقتور تھے اور گزر چکا ہے حال پہلے لوگوں کا''۔

وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ یہاں کم خبر یہ ہے، یہاں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے معنی ہے ہم نے جو انبیاء بھیجے ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہے جس طرح فرمایا: كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ (الدخان) انہوں نے کتنے ہی زیادہ باغات اور چشمے چھوڑے۔

وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ یعنی ان کے پاس کوئی نبی نہیں آیا مگر وہ لوگ اس کے ساتھ مذاق اڑایا کرتے تھے جس طرح آپ کی قوم آپ کا مذاق اڑاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے۔ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا یعنی ایسی قوم کو ہلاک کیا جو قوت میں ان سے بڑھ کر تھی مِنْهُمْ میں ضمیر مشرکین کی طرف لوٹ رہی ہے جو اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا کے مخاطب ہے پہلے خطاب کیا اس کے بعد ضمیر ذکر کی اَشَدَّ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے؛ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مفعول ہے یعنی وہ لوگ جو بدن اور پیروکاروں کے اعتبار سے ان سے قوی تھے انہیں ہلاک کر دیا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ یہاں مثل سے مراد عقوبت ہے؛ یہ قتادہ سے مروی ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صفحة الاولين سے مراد ہے ان کی خبر کہ انہیں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 216　　2۔ ایضاً

ان کے کفر کے باعث ہلاک کر دیا گیا؛ یہ نقاش اور مہدوی نے ذکر کیا ہے(1)۔ مثل کا معنی وصف اور خبر ہے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹

''اور آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے: پیدا کیا ہے انہیں بڑے زبردست سب کچھ جاننے والے نے''۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ ضمیر سے مراد مشرکین ہیں مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹ خلق اور ایجاد کا اس کے لیے اقرار کیا پھر اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کی یہ ان کی طرف سے جہالت ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰

''جس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ اور بنا دیے ہیں تمہارے لیے اس میں راستے تا کہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو''۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا الله تعالیٰ نے کمال قدرت کے ساتھ اپنی صفت بیان کی یہ کلام نئی شروع ہو رہی ہے اپنے بارے میں خبر دی اگر یہ کفار کے قول کی خبر ہوتی تو کلام یوں ہوتی الذی جعل لنا الارض۔

مَهْدًا یعنی بستر اور بچھونا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ کوفیوں نے اسے مَهْدًا پڑھا ہے وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا یعنی زندگی کو اسباب۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سُبُلًا کا معنی ہے راستے تا کہ جہاں تم جانا چاہتے ہو ان میں چلو۔

لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تا کہ تم اس کی مقدورات سے اس کی قدرت پر استدلال کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ تم اپنے سفروں میں ہدایت پاؤ، یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ تم الله تعالیٰ کی اپنے اوپر نعمتوں کو پہچانوں؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تا کہ تم اپنی زندگی کے اسباب کی طرف راہنمائی پاؤ۔

وَ الَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۱

''اور جس نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پس ہم نے زندہ کر دیا اس سے ایک مردہ شہر کو یونہی تمہیں بھی قبروں سے نکالا جائے گا''۔

وَ الَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس طرح نہیں جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر بغیر اندازہ کے نازل کیا گیا یہاں تک کہ انہیں غرق کر دیا بلکہ وہ اندازے سے نازل کیا گیا غرق کرنے والے طوفان کی صورت میں نہیں اور نہ ہی ضرورت سے کم یہاں تک کہ وہ تمہارے لیے اور تمہارے چوپاؤں کے لیے زندگی کا سبب بن گیا(4)۔

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا یعنی ہم نے پانی کے ذریعے چٹیل بستی کو زندہ کر دیا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 216　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 217　3۔ ایضاً　4۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 129

كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ۝ اسی طرح تمہیں قبور سے اٹھایا جائیگا کیونکہ جو ذات بے آباد بستی کو آباد کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ بحث مفصل گذر چکی ہے۔ یحییٰ بن وثاب، اعمش، حمزہ، کسائی اور ابن ذکوان نے ابن عامر سے یَخْرُجُوْنَ قراءت نقل کی ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مجہول نقل کیا ہے۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ۝ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۝

''اور جس نے ہر قسم کی مخلوق پیدا فرمائی اور بنادیں تمہارے لیے کشتیاں اور مویشی جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر پھر (دلوں میں) یاد کرو اپنے رب کی نعمت کو جب تم خوب جم کر بیٹھ جاؤ ان پر اور (زبان سے) یہ کہو: پاک ہے وہ ذات جس نے فرمانبردار بنادیا ہے اسے ہمارے لیے اور ہم اس پر قابو پانے کی قدرت نہ رکھتے تھے اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ یعنی اللہ تعالیٰ نے جوڑے پیدا کیے۔ سعید بن جبیر نے کہا: تمام قسم کی اصناف پیدا کیں (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جس نے موسم سرما، موسم گرما، رات، دن، آسمان، زمین، سورج، چاند، جنت اور جہنم کو پیدا کیا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: حیوانوں میں سے مذکر اور مؤنث پیدا کیے (3)؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نباتات کے جوڑے مراد ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ۝ (ق) مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ۝ (لقمان: 10) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایمان و کفر، نفع و نقصان، فقر و غنا اور صحت و بیماری ہیں جو انسان میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول تمام اقوال کو عام ہے اپنے عموم کی وجہ سے تمام کو جامع ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ فلک سے مراد کشتیاں ہیں وَالْاَنْعَامِ سے مراد اونٹ ہیں مَا تَرْكَبُوْنَ۝ جن پر تم خشکی اور تری میں سواری کرتے ہو۔ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ یہاں ضمیر ذکر کی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا تَرْكَبُوْنَ کی طرف لوٹ رہا ہے: یہ ابو عبید کا قول ہے۔ فراء نے کہا: ظُهُوْرِهٖ کو واحد ضمیر کی طرف مضاف کیا ہے (4)، کیونکہ اس سے مراد جنس ہے ایک جمع کے معنی میں ہوگا جس طرح جیش اور جند واحد ہونے کے باوجود جمع کے معنی میں ہوتے ہیں اسی وجہ سے ضمیر مذکر ذکر کی اور ظہور کو جمع ذکر کیا تقدیر کلام یہ ہوگی علی ظهور هذا الجنس۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہاں انعام سے مراد اونٹ اور گائے ہے (5)۔ ابو معاذ نے کہا: صرف اونٹ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 217
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 4
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 217
4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 218
5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 217

ہیں (1)؛ یہی صحیح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''اسی اثنا میں کہ ایک آدمی گائے پر سوار تھا کہ گائے نے اس سے کہا: مجھے اس مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا گیا مجھے تو ہل چلانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے (2) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں، ابو بکر، اور عمر اس پر ایمان لائے'' جبکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت حاضر نہ تھے۔ سورۃ النحل کے آغاز میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ اس سے مراد خاص طور پر اونٹ ہیں اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے اور کشتیوں کے اندر بیٹھا جاتا ہے ان کشتیوں پر سوار نہیں ہوا جاتا لیکن سورت کے آغاز میں ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطف کیا جاتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ کشتی کے ظاہر کو اس کا باطن بنا دیا جائے کیونکہ پانی کشتی کو ڈھانپے اور چھپائے ہوئے ہوتا ہے اس کا بطن ہی ظاہر بنا دیا جائے گا، کیونکہ یہ باطن لوگوں کے لیے منکشف ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے یہی پشت ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ یعنی جس پر سواری کرتے ہو۔ نعمت کے ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا ہے کہ اس نے اس چیز کو ہمارے لیے خشکی اور تری میں مسخر کر دیا ہے وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا یعنی اس نے ہمارے لیے سواری کو مسخر کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے سبحان من سخر لنا هذا۔

وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ یعنی ہم اس کی طاقت نہ رکھتے تھے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کلبی کا قول ہے (3)۔ اخفش اور ابو عبیدہ کا نقطہ نظر ہے کہ مُقْرِنِیْنَ کا معنی ہے ضابطین ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے قوت میں مماثل۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: قرن فلان جب وہ قوت میں اس کی مماثل ہو، یہ جملہ کہا جاتا ہے: فلان مقرن لفلان یعنی فلاں، فلاں کو قابو کرنے والا ہے، اسی معنی میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں اقرنت کذا۔ اقرن له وہ اس پر قوی ہو گیا گویا وہ اس کا ہم مقابل ہو گیا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ یعنی ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ قطرب نے عمرو بن معدیکرب کا شعر پڑھا:

لقد علم القبائل ما عُقَیلٌ لنا فی النائبات بمقرنینا

قبائل جان گئے ہیں عقیل حادثات زمانہ میں ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

رکبتم صَعْبَتی اَشَرًا وَ حَیْفًا ولستم للصعاب بمقرنینا

نیز مقرن اسے کہتے ہیں جس پر ضیاع غالب آجائے اس کے اونٹ ہوں یا بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور ان پر اس کا کوئی معاون نہ ہو یا وہ اونٹوں کو پانی پلائے اور انہیں کوئی ہنکانے والا نہ ہو۔ سکیت نے کہا: اس کی اصل میں دو قول ہیں: (1) یہ اقران سے ماخوذ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 217
2۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب ابی بکر و عمر، جلد 2، صفحہ 209
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 218

ہے یہ باب چلایا جاتا ہے اقرن یقرن اقرانا جب وہ طاقت رکھے أقرنت کذا جب تو اسے محکم بنائے گویا اسے پہاڑ میں بنایا، قرن سے مراد پہاڑ ہے اسے پختہ بنایا اور مضبوط کیا (2) یہ مقارنہ سے ماخوذ ہے اس سے مراد وہ چال میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یہ جملہ کہا جاتا ہے: قرنت کذا بکذا جب تو اسے اس کے ساتھ باندھ دے اور تو اسے اس کا ساتھی بنا دے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ جب ہم سواریوں پر سوار ہوں تو ہم کیا کہیں اور جب ہم کشتی پر سوار ہوں تو حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے ایک اور آیت میں اس کو بھی پہچان لیا ہے وہ یہ ارشاد ہے: وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ہود) کتنے ہی جانوروں پر سوار لوگ ہیں کہ سواری سوار کے ساتھ لڑکھڑا گئی یا سرگرداں ہوگئی یا اس نے سوار کو نیچے گرا دیا یا سوار اس کی پشت سے نیچے گر گیا اور ہلاک ہوگیا، کتنے ہی کشتی میں سوار ہونے والے ہیں کشتی ان کے ساتھ ٹوٹ گئی تو سب غرق ہو گئے۔ جب سوار ہو یا ایک ممنوع امر کے ساتھ ملا ہوا ہے اور تلف کے اسباب میں سے چند اسباب کے ساتھ ملا ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والا ہے وہ اس کی قضا سے بچنے والا نہیں وہ اپنے دل اور زبان سے اس کے ذکر کو نہ چھوڑے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ملاقات کے لیے اس طرح تیار ہو جائے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح کرنے والا ہو اور اس احتیاط کو بھی پیش نظر رکھے کہ اس کی یہ سواری اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کے موت کے اسباب میں سے ہو اور وہ خود اس سے غافل ہو۔

سلیمان بن یسار نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ لوگ سفر میں تھے جب وہ سوار ہوئے تو کہتے: سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ ان میں سے ایک آدمی تھا جو انتہائی کمزور سواری پر سوار تھا اونٹ میں سے رازم اسے کہتے ہیں جو زمین پر کھڑا رہتا ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرکت نہیں کرتا یا یوں جملہ بولا جاتا ہے قد رزمت الناقۃ ترزم وترزم رزوما و رزاما وہ تھکاوٹ اور کمزوری کی وجہ سے کھڑی ہوگئی وہ حرکت نہیں کرتی۔ صحاح میں جوہری نے یہ بات کہی ہے۔ اس آدمی نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اس پر غالب ہوں اس اونٹنی نے اسے گرا دیا اور اسکی گردن ٹوٹ گئی۔

روایت بیان کی جاتی ہے: ایک بدو اپنے قعود اونٹ (چرواہا ہر ضرورت کے لیے جس اونٹ کو استعمال کرتا ہو) پر سوار ہوا اس نے کہا: اسے قابو کرنے والا ہوں، وہ قعود اونٹ اسے لے کر دوڑ پڑا یہاں تک کہ اسے گرا دیا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی؛ پہلا واقعہ ماوردی اور دوسرا ابن علی نے ذکر کیا ہے۔ کہا: کسی بندے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس دعا کو چھوڑے زبان سے اس کا ذکر واجب نہیں جب وہ سوار ہو تو یہ کہے اور سفر میں جب اسے یاد آجائے سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ اے اللہ! تو ہی سفر میں ساتھی ہے اہل اور مال میں تو ہی خلیفہ ہے، اے اللہ! میں سفر کی مشقت سے واپس پلٹنے کے غم، کور کے بعد جور اور اہل و مال میں برے منظر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ الجور بعد الکور سے مراد ہے امور کے مجتمع ہونے کے بعد ان کا بکھر جانا۔

عمرو بن دینار نے کہا: میں ابو جعفر کے ساتھ ان کی زمین کی طرف نکلا جو باغ کی مثل تھی جسے مدرکہ کہتے وہ ایک تندخو اونٹ پر سوار ہوئے میں نے ان سے عرض کی: اے ابو جعفر! کیا تجھے ڈر نہیں کہ یہ تجھے گرا دے گا تو فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا: ''ہر اونٹ کی کوہان پر ایک شیطان ہوتا ہے جب تم اس پر سوار ہو تو اللہ تعالیٰ کا نام یاد کیا کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے پھر اس سے خدمت لو'' (1)۔ حضرت علی بن ربیعہ نے کہا: میں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ ایک روز سوار ہوئے جب آپ نے اپنا قدم رکاب میں رکھا تو کہا: بسم اللہ جب سواری پر بیٹھ گئے تو کہا: الحمد للہ پھر کہا: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ پھر تین بار کہا: الحمد للہ واللہ اکبر اللّٰھم لا إله إلا أنت ظلمتُ نفسی فاغفرلی إنه لا یغفر الذنوب إلا أنت پھر آپ ہنسے۔ میں نے ان سے پوچھا کس چیز نے تجھے ہنسایا ہے؟ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اسی طرح کہا جس طرح میں نے کہا ہے پھر آپ ہنسے میں نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے فرمایا: اس بندے کے قول پر تعجب کی وجہ سے جو کہتا ہے: اللّٰھم لا إله إلا أنت ظلمتُ نفسی فاغفرلی فإنه لا یغفر الذنوب إلا أنت (2) وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی گناہ نہیں بخشتا۔ ابوداؤد طیالسی نے اسے اپنی مسند میں اور ابو عبد اللہ محمد بن خویز منداد نے احکام میں ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے اسی کی مثل حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مختصر نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا قدم رکاب میں رکھتے تو فرماتے بسم اللہ جب اوپر بیٹھ جاتے تو فرماتے (3): الحمد للہ علی کل حال سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ جب تم کشتی اور چوپائے سے نیچے اترو تو کہو اللّٰھم أنزلنا مُنزلًا مبارکًا وأنت خیرُ المنزلین۔

ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے کہ جو آدمی سوار ہوا اور سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ نہ کہا شیطان اسے کہتا ہے: تو اس کے لیے نغمہ گا (4)۔ اگر وہ اچھی طرح نہ گا سکتا ہو تو اسے کہتا ہے: اپنی طرف سے بنا لے: یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

جو آدمی اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: آج ہم گھوڑوں پر سیر کریں یا کشتی میں سیر کریں وہ سوار ہوتے ہیں جبکہ وہ اپنے ساتھ شراب کے برتن اور آلات لہو ولعب اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں وہ لگاتار اسے پیتے رہتے ہیں یہاں تک شراب سے اکتاہٹ ہو جاتی ہے جبکہ وہ جانوروں کی پشتوں پر ہوتے ہیں یا کشتیوں کے اندر ہوتے ہیں جبکہ کشتیاں انہیں لے کر چل رہی ہوتی ہیں وہ صرف شیطان کا ذکر کرتے ہیں، وہ صرف اس کے حکم کو ہی مانتے ہیں، وہ ایسے لوگوں کے پاس کھڑا ہونے سے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

زمخشری نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک حاکم سوار ہوا جبکہ وہ شراب پیتا تھا ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان ایک ماہ کی مسافت تھی اسے ہوش نہ آیا مگر جب وہ اپنے گھر پہنچ چکا تھا اسے سفر کا احساس تک نہ ہوا ایسے سواروں کے عمل اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو حکم دیا ہے ان کے درمیان کتنا بعد ہے (5)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1677

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا رکب الناقۃ، جلد 2، صفحہ 182

3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 239

4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 48

5۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 249

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؈

''اور بنادی ہے مشرکوں نے اس کے لیے اس کے بندوں سے اولاد، بے شک انسان کھلا ہوا ناشکر گزار ہے''۔

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا یہاں جزء، عدل کے معنی میں ہے یعنی مثل (1)۔ قتادہ سے مروی ہے: اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ زجاج اور مبرد نے کہا: یہاں جزء سے مراد بیٹیاں ہیں۔ مومن ان کی جہالت پر متعجب ہوئے جب انہوں نے یہ اقرار کیا کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک اور بچہ بنایا انہیں علم نہیں تھا کہ جو آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر قادر ہے وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہوسکتا جس کے ساتھ قوت حاصل کرے یا اس سے انس حاصل کرے کیونکہ یہ نقص کی صفات میں سے ہے۔

ماوردی نے کہا: عربوں کے نزدیک جزء سے مراد بیٹیاں ہیں (2)۔ جب عورت بیٹیاں جنے تو عرب کہتے ہیں اجزأت المرأۃ شاعر نے کہا:

إن أجزأت حرة يوما فلا عجب　　وقد تجزئ الحُرَّةُ المِذكار أحيانا (3)

اگر شریف عورت نے کسی روز بچی جنی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کئی مواقع پر وہ بچے بھی جن دیتی ہے۔

زمخشری نے کہا: عجیب وغریب تفاسیر میں سے یہ ہے کہ جزء کی تفسیر عورتوں سے کی جائے اور یہ دعویٰ کیا جائے کہ جزء کا لفظ لغت عرب میں عورتوں کے لیے آتا ہے (4) یہ عربوں پر جھوٹ ہے اور نئی وضع ہے انہوں نے اسی پر قناعت نہ کی یہاں تک کہ انہوں نے اس سے یہ فعل مشتق کر لیا اجزأت المرأۃ پھر شعر بنا دیے:

إن اجزأت حرة يوما فلا عجب　　زُوِّجْتُها من بنات الأوسِ مُجزِئة (5)

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ کے ساتھ متصل ہے اگر تو ان سے آسمانوں اور زمین کے خالق کے بارے میں پوچھے تو وہ اس کا اعتراف کریں گے اس اعتراف کے باوجود انہوں نے اس کے بندوں میں سے اسکا جز بنا دیا ہے اور مخلوقات کی صفات سے اس کا وصف بیان کیا ہے مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا کا معنی ہے انہوں نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، انہوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کا جز بنا دیا جس طرح اولاد والد کا جز ہوا کرتی ہے۔ اسے جُزُءًا دو قسموں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؈ انسان سے مراد کافر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ مصائب کو شمار کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے مُّبِيْنٌ کا معنی ہے وہ کفر کو ظاہر کرتا ہے (6)۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ؈

''کیا اللہ تعالیٰ نے پسند کر لی ہیں اپنے لیے اپنی مخلوق سے بیٹیاں اور مخصوص کر دیا ہے تمہیں بیٹوں کے ساتھ''۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 219　　2۔ ایضاً　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 48
4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 241　　5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 219　　6۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 4

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ ام میں میم زائدہ ہے تقدیر کلام یہ ہے کیا اس نے جو پیدا کیا ہے اس کو بیٹیاں بنالیا ہے جس طرح تمہارا گمان ہے فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں لفظ استفہام کا ہے معنی توبیخ ہے وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِیْنَ ﴿۱۶﴾ تمہیں بیٹوں کے لیے خاص کیا، یہ جملہ کہا جاتا ہے: اصفیتہ بکذا یعنی میں نے اس کو اس کے پیچھے لگایا۔ أصفیتہ الوّد میں نے اس کے لیے محبت کو خالص کیا۔ صافیتہ و تصافینا ہم نے خالص کیا۔ اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس امر کو منسوب کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کو منتخب کیا جبکہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو پسند کیا جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو اگرچہ جاہل یہ وہم کرے کہ اس نے اپنے لیے بیٹا منتخب کیا ہے۔ اس کافر نے اللہ تعالیٰ کی طرف دو جنسوں میں ارفع جنس کو کیوں منسوب نہیں کیا انہوں نے اپنے لیے معزز جنس کو کیوں بنایا اور اللہ تعالیٰ کے لیے ادنیٰ درجے کی جنس کو منتخب کیا یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰى ﴿۲۲﴾ (النجم)

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِیْمٌ ﴿۱۷﴾

''اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو اس کی جس کی نسبت اس نے رحمٰن کی طرف کی ہے تو اس کا چہرہ (فرط رنج سے) سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل غم سے بھر جاتا ہے''۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا یعنی اس کی بیٹی پیدا ہوئی تو اسکا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی یہ صورت حال اس لیے ہوتی ہے کہ اس نے جو مثال بیان کی تھی وہ باطل ہو چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے بچی کی جو بشارت دی گئی ہے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے اس کی دلیل سورۂ نحل میں موجود ہے وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان میں سے ایک کو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی بچی پیدا ہوئی ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ غصے اور افسوس سے سیاہ ہو جاتا ہے جبکہ وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔ ایک عرب کے بارے میں یہ مروی ہے کہ اس کی عورت نے بچی جنی تو اس نے اس گھر کو چھوڑ دیا جس میں اس کی بیوی تھی تو اس عورت نے کہا:

ما لأبی حمزہ لا یأتینا یَظَلُّ فی البیت الذی یلینا
غضبان ألا نلد البنینا وإنما نأخذ ما أعطینا(1)

ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے وہ ہمارے پاس نہیں آتا اور اس گھر میں رہتا ہے جو ہمارے پڑوس میں ہے۔ وہ ناراض ہے کہ ہم بیٹوں کو کیوں نہیں جنتیں ہم تو وہی کچھ لیتی ہیں جو کچھ ہمیں عطا کیا گیا ہے۔

اسے مسودٌ اور مسوادٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ جماعت کی قراءت کے مطابق وَجْهُهٗ یہ ظَلَّ کا اسم ہے اور مُسْوَدًّا اس کی خبر ہے (☆☆)۔ یہ بھی جائز ہے کہ وَجْهُهٗ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو اور مسودا کو رفع اس لیے دیا جائے کہ یہ اس کی خبر ہو، ظَلَّ میں اس کا اسم ہو اور جملہ اس کی خبر ہو كَظِیْمٌ کا معنی ہے غمگین (2)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 243 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 219

☆☆ یہ بھی جائز ہے کہ ظل میں ایک ضمیر ہو جو احد کی طرف لوٹے جو اس کا اسم ہو اور وجھہ اس کا بدل ہو اور مسودا، ظل کی خبر ہو۔

معنی مکروب ہے؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ خاموش ہے؛ یہ ابن ابی حاتم کا قول ہے (1)، یہ سب کچھ اس کی مثل کے باطل ہونے اور دلیل کے باطل ہونے کی وجہ سے ہے۔ جس نے اس امر کو جائز قرار دیا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں تو اس نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کا مشابہ قرار دیا ہے کیونکہ بچہ اپنے والد کی جنس اور اسکے مشابہ ہوا کرتا ہے جس آدمی کا چہرہ اس لیے سیاہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف اسے منسوب کیا جائے جو اس سے بھی جلیل الشان ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو منسوب کرنا کیسا ہوگا؟ اس آیت کی وضاحت میں سورۂ نحل میں ایسی بحث گذر چکی ہے جو کافی وشافی ہے۔

اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝

''کیا وہ ایسی اولاد جنے گا جو پروان چڑھتی ہے زیوروں میں اور وہ مباحثہ کے وقت اپنا مدعا واضح نہیں کر سکتی۔ اور انہوں نے ٹھہرالیا ہے فرشتوں کو جو خداوند رحمٰن کے بندے ہیں عورتیں، کیا یہ موجود تھے ان کی پیدائش کے وقت، لکھ دی جائیگی ان کی گواہی اور ان سے باز پرس ہوگی''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔ اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا** جس کی تربیت کی جاتی ہے اور وہ جوان ہوتی ہے۔ نشوء کا معنی تربیت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: نشأت فی بنی فلاں نشأ ونشوءا۔ جب تو ان میں جوان ہو۔ نشئ اور أنشئ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک، ابن وثاب، حفص، حمزہ، کسائی اور خلف نے یُنَشَّأُ پڑھا ہے جس کی تربیت کی جاتی ہے اور وہ بڑی ہوتی ہے زیورات میں؛ ابوعبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اس صورت میں اسناد اعلیٰ ہے باقی قراء نے اسے یَنشأُ یاء کے فتح اور نون کو ساکن کرنے کے ساتھ پڑھا ہے؛ اسے ابو حاتم نے پسند کیا ہے وہ راسخ ہوتا ہے اور بڑھتا ہے۔ نشأ میں اصل معنی بلند ہونا ہے، یہ ہروی نے کہا ہے یُنشأُ متعدی ہے اور یَنشأُ لازم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔ فِي الْحِلْيَةِ** یعنی زینت میں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: وہ بچیاں ہیں ان کا لباس مردوں کے لباس سے مختلف ہے (2)۔ مجاہد نے کہا: عورتوں کو سونے اور ریشم کے استعمال کی اجازت دی گئی اور اس آیت کو پڑھا (3)۔ الکیا نے کہا: اس میں یہ دلالت موجود ہے کہ عورتوں کے لیے زیورات استعمال کرنا جائز ہے اس پر اجماع منعقد ہے اس میں احادیث شمار سے باہر ہیں۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو کہا کرتے تھے: اے بیٹی! سونے کے زیورات پہننے سے بچو کیونکہ مجھے تیرے بارے میں آگ کا خوف آتا ہے۔

**وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝** جھگڑا میں اور حجت ودلیل پیش کرنے میں واضح کلام نہیں کر سکتی۔ قتادہ نے کہا: کسی عورت نے گفتگو کی جبکہ اس کے پاس دلیل بھی موجود ہو تو وہ اسے اپنے خلاف ہی استعمال کر لیتی ہے (4)۔ حضرت عبداللہ بن

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 219 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 167 4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 130

مسعود کے مصحف میں ہے دھوفی الکلام غیر مبین آیت کا معنی ہے کیا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے جس کا یہ وصف ہو؟ یعنی ایسا کرنا جائز نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: زیورات میں آراستہ ان کے وہ بت ہیں جن کو انہوں نے سونے اور چاندی سے ڈھالا اور انہیں زیور پہنائے (1)، یہ ابن زید اور ضحاک کا قول ہے۔ اس قول کی بنا پر اس کا معنی ہوگا وہ جواب سے خاموش ہیں من محل نصب میں ہے یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس چیز کو بنایا جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا کی حیثیت میں مرفوع ہو اور خبر مضمر ہو؛ یہ فراء کا قول ہے تقدیر کلام یہ ہوگی کیا وہ چیز جو اس حالت پر ہو عبادت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اگر تو چاہے تو یہ کہہ لے کہ من محل جر میں ہے اسے کلام کے ابتدائی حصہ کی طرف پھیرا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان بِمَا ضَرَبَ یا ما ہے جو اس آیت میں ہے مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ ان دونوں مواقع پر بدل بنانا ضعیف ہے کیونکہ ہمزہ استفہام بدل اور مبدل منہ کے درمیان حائل ہے۔

وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا کوفیوں نے عباد کو جمع پڑھا ہے، ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اس میں اسناد اعلیٰ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول میں انہیں جھٹلایا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں وہ اس کی بیٹیاں نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے عباد الرحمٰن پڑھا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: میرے مصحف میں عبد الرحمٰن تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے مٹا دے اور اسے عباد الرحمٰن لکھ اس قراءت کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ (الانبیاء) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (الاعراف: 194) باقی قراء نے اسے عند الرحمٰن نون ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے اس قراءت کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ (الاعراف: 206) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَنْ عِنْدَهٗ (الانبیاء: 19) مقصود ان کے جھوٹ کو واضح کرنا اور ان کی جہالت کو بیان کرنا ہے کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ حکم لگاتے ہیں کہ فرشتے مؤنث ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ عباد کے لفظ کا ذکر کر کے ان کی مدح ہے یعنی انہوں نے اس کی کیسے عبادت کی جو عبادت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے پھر انہوں نے کیسے حکم لگا دیا کہ وہ مونث ہیں جبکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ یہاں جعل قول اور حکم کے معنی میں ہے تو کہتا ہے: جعلت زیدا أعلم الناس یعنی میں نے اس پر سب سے بڑا عالم ہونے کا حکم لگا دیا۔

اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے یہاں تک کہ انہوں نے ان پر مؤنث ہونے کا حکم لگا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا اور کہا: تجھے کیسے علم ہوا کہ وہ مؤنث ہیں (2)؟ انہوں نے جواب دیا: ہم نے اپنے آباء سے سنا اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے اس قول میں جھوٹ نہیں بولا کہ وہ عورتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَتُكْتَبُ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 220 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 131

شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ۝ یعنی آخرت میں ان سے سوال کیا جائے گا۔ نافع نے اسے اوشھدوا پڑھا ہے یعنی ہمزہ استفہام ہمزہ مضموم پر داخل ہوا اس کو مد کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا مگر مسیبی سے ایک روایت مروی ہے کہ وہ اسے مد کے ساتھ پڑھتے تھے مفضل نے عاصم سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے اور دونوں ہمزوں کے محقق ہونے کی روایت کی ہے باقی قراء نے اسے ہمزہ کے ساتھ جو استفہامیہ ہے قراءت کی ہے اَشَهِدُ وا زہری نے اُشْهِدُ واخلقهم قراءت نقل کی ہے یعنی یہ جملہ خبر یہ ہے ستکتب عام قراءت ہے فعل مجہول ہے اور تاء مضموم ہے اور شَهَادَتُهُمْ مرفوع ہے۔ سلمی، ابن سمیقع اور ہبیرہ نے حفص سے سنکتب اور شھادتھم کو منصوب نقل کیا ہے کیونکہ فعل معروف ہے۔ ابو رجاء سے سَتُکتب شھاداتُھم جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۝

''اور کفار کہتے ہیں کہ اگر چاہتا خداوند رحمٰن تو ہم انہیں نہ پوجتے انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض قیاس آرائیاں کر رہے ہیں''۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مشرکوں نے مذاق کے انداز میں کہا: تمہارے گمان کے مطابق اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم ان کی پوجا نہ کرتے۔ یہ ان کی طرف سے قول تو صحیح تھا مگر باطل تھا ہر شے اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوا کرتی ہے اس کا ارادہ ثابت ہے اسی طرح اس کا علم بھی ثابت ہے اس کے ارادہ کے ساتھ استدلال کرنا ممکن نہیں اسی طرح معلوم کے خلاف بھی ممکن نہیں۔ مراد تحت القدرت ہے اگر چہ واقع نہ ہوا اگر وہ بتوں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تو ہم جان جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی چیز کا ارادہ کیا جو ان سے حاصل ہوا۔ سورہ انعام میں یہ بحث گزر چکی ہے سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا (انعام: 148) سورۂ یٰس میں اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ (47)

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ یہ کلام وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا کی طرف لوٹائی جائے گی یعنی وہ یہ جو کہتے ہیں الملائکة بنات الله کا انہیں کچھ علم نہیں (1)؛ یہ قتادہ، مقاتل اور کلبی کا قول ہے۔ مجاہد اور ابن جریج نے کہا: اس سے مراد بت ہیں یعنی بتوں کی جو عبادت کرتے ہیں اس کا انہیں کچھ علم نہیں (2)۔ مِنْ زائدہ ہے۔

اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۝ وہ اندازہ لگاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں غیر اللہ کی عبادت کرنے میں ان کے پاس کوئی عذر نہیں ان کے کلام کا بین السطور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا، ہم سے اس بات پر راضی ہوا، ہمیں اس چیز سے منع نہ کیا اور ہمیں جلدی سزا نہ دی۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ۝

''کیا ہم نے دی انہیں کوئی کتاب اس سے پہلے پس وہ اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں''۔

یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ کا معادل ہے معنی ہے کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے یا ہم نے قرآن

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 131 2۔ ایضاً

سے پہلے کوئی کتاب انہیں عطا کی تھی جس نے انہیں اس امر کی دعوت دی تھی وہ اس کو پکڑے ہوئے ہیں وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝

''بلکہ وہ خود کہتے ہیں: ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نقوش پر چل رہے تھے۔ اور اسی طرح جب بھی ہم نے بھیجا آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا تو کہا وہاں کے عیش پرستوں نے: ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نشانات قدم کی پیروی کرنے والے ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ عَلٰٓى اُمَّةٍ مراد طریقہ اور مذہب ہے؛ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے(1)۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، مجاہد اور قتادہ اسے اِمّة پڑھا کرتے تھے اور اِمّة کا معنی طریقہ ہے۔ جوہری نے کہا: اِمّة کا معنی نعمت ہے اور اِمة، اُمّة کی بھی ایک لغت ہے اس سے مراد طریقہ اور دین ہے؛ یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔ عدی بن زید نے نعمة کا معنی لیتے ہوئے کہا:

ثم بعد الفَلَاحِ والمُلْكِ والأَمّة وارتهُمُ هناك القبور کامیابی، بادشاہت اور نعمت کے بعد وہاں قبروں نے انہیں چھپا لیا۔

یہ جوہری کے علاوہ سے مروی ہے۔ قتادہ اور عطیہ نے کہا: علی امة کا معنی ہے دین پر(2)۔ قیس بن خطیم کا قول اسی معنی میں مروی ہے:

كنا على أمة آبائنا ويقتدي الآخر بالاول

ہم اپنے آباء کے دین پر ہیں اور بعد والا پہلے کی اقتداء کر رہا ہے۔

جوہری نے کہا: امة کا معنی طریقہ اور دین ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: فلاں لا أمة له فلاں کا کوئی دین نہیں، شاعر نے کہا:

وهل يستوي ذو امة وكفور

کیا دین والا اور کافر برابر ہو سکتے ہیں۔

مجاہد اور قطرب نے کہا علی دین، علی ملة(3)۔ دین اور ملت پر۔ بعض مصاحف میں ہے قالوا إنا وجدنا آباءنا علی ملة یہ تمام اقوال قریب قریب ہیں(4)۔ فراء سے مروی ہے: ملت پر، قبلہ پر۔ اخفش نے کہا: استقامت پر۔ اور نابغہ کا شعر پڑھا:

حَلَفْتُ فلم أترك لنفسك رِيبةً وهل تأثَمَن ذوأمَّة وهو طائع

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 221 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

میں نے قسم اٹھا دی ہے اور میں نے تیرے نفس کے لیے کوئی شک نہیں چھوڑا کیا استقامت پر کاربند گناہگار ہو سکتا ہے جبکہ خوشی سے کام کر رہا ہو۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۝ یعنی ہم ان سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ ایک اور آیت میں مقتدون کے الفاظ ہیں یعنی ہم ان کی اقتدا کرتے ہیں معنی ایک ہی ہے۔ قتادہ نے کہا: ہم اقتدا کرتے ہیں (1)، ہم پیروی کرتے ہیں۔ اس میں تقلید کے ابطال پر دلیل ہے کیونکہ ان کی اپنے آباء کی تقلید پر مذمت کی گئی ہے اور اس پر مذمت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جس امر کی دعوت دی اس میں غور وفکر کو انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرۃ میں گذر چکی ہے۔

مقاتل نے بیان کیا کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ، ابوسفیان، ابوجہل، عتبہ، شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے وہی بات کی جو ان سے قبل لوگوں نے بات کی تھی۔ مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (حم السجدہ: 43) مترف سے مراد خوشحال آدمی ہے یہاں اس سے مراد بادشاہ اور جابر لوگ ہیں۔

قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝

''اس نبی نے فرمایا کہ اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو تب بھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے''۔

قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى اے محمد! اپنی قوم سے کہہ دیجئے: کیا میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس لایا ہوں وہ زیادہ درست اور ہدایت والی نہیں۔

مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝ یعنی جس چیز کے ساتھ رسولوں کو مبعوث کیا گیا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لفظ جمع کا ہے کیونکہ ایک رسول کو جھٹلانا باقی رسولوں کو جھٹلانا ہے اسے قل وجئتکم اور قال وجئناکم پڑھا گیا ہے یعنی کیا تم اپنے آباء کی پیروی کرتے ہو اگرچہ میں تمہارے پاس ایسا دین لایا ہوں جو تمہارے آباء کے دین سے زیادہ درست ہے؟ انہوں نے کہا: ہم اپنے آباء کے دین پر ثابت قدم ہیں ہم اس سے جدا نہ ہوں گے اگرچہ تم ہمارے پاس وہ لاتے جو زیادہ صحیح ہو۔ تقلید کے بارے میں بحث سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ۝

''پس ہم نے ان سے انتقام لیا ذرا دیکھو کیسا المناک انجام ہوا جھٹلانے والوں کا''۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ہم نے قحط، قتل اور قیدی بنانے کے ساتھ ان سے انتقام لیا قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ ہے ابن عامر اور حفص نے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 221

قال اولو پڑھا ہے یہ نذیر کی طرف سے خبر ہوگی یعنی اس نے ان لوگوں سے کہا تھا۔ ابو جعفر نے اسے قل اولو جئنا کم نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے تو خطاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام رسولوں کی جانب سے کیا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ ﴿۲۷﴾

''اور یاد کیجئے جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہ میں بے زار ہوں ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو بجز اس کے جس نے مجھے پیدا فرمایا بے شک وہی میری راہنمائی کرے گا''۔

وَ اِذْ قَالَ انہیں یاد دلایئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان سے بری ہوں۔ براء کا لفظ واحد اور اس سے اوپر کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کا نہ تثنیہ بنایا جا سکتا ہے نہ جمع اور نہ ہی اس کا مونث بنایا جاتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور صفت کی جگہ اسے رکھا گیا ہے یہ نہیں کہا جاتا: البراءان، البراءون، کیونکہ معنی ذو البراء اور ذو البراء ہے۔ جوہری نے کہا: تبرأتُ من كذا، أنا منه براء و خلاء منه اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے جس طرح سمع سماعا جب تو کہے: أنا بری منه و خلی۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مونث بنائی جائیگی اور تو جمع میں کہے گا: نحن منه برآء، جس طرح فقیہ کی جمع فقہاء آتی ہے اور براء بھی آتی ہے جس طرح کریم کی جمع کرام آتی ہے ابراء بھی جمع آتی ہے جس طرح شریف کی جمع اشراف آتی ہے اس کی جمع ابریاء بھی آتی ہے جس طرح نصیب کی جمع انصباء اور برئیون آتی ہے یوں کہا جاتا ہے: امراة برئية، هما برئيتان، هن برئيات، برایا اسی طرح یہ استعمال ہوتا ہے رجل بری و براء۔ جس طرح عجیب اور عجاب ہے البراء جب فتحہ کے ساتھ استعمال ہو تو یہ مہینے کی پہلی رات ہوتی ہے اسے یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ چاند سورج سے بری ہوتا ہے اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ یہ مستثنیٰ متصل ہے کیونکہ انہوں نے اپنے معبودوں کے ساتھ الله تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ قتادہ نے کہا: وہ کہا کرتے تھے الله ربنا الله تعالیٰ ہمارا رب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہو یعنی لیکن جس نے مجھے پیدا کیا وہ مجھے ہدایت دے گا۔ یہ اس لیے کہا کہ الله تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور اپنی قوم کو تنبیہ کرنے کی غرض سے تھا کہ ہدایت اسکے رب کی جانب سے ہوتی ہے۔

وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور آپ نے بنا دیا کلمہ توحید کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً جعلها میں ضمیر الله تعالیٰ کے فرمان: اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ کی طرف لوٹ رہی ہے اور جَعَلَهَا میں ضمیر فاعل سے مراد الله تعالیٰ کی ذات ہے مراد ہوگا الله تعالیٰ نے اس کلمہ اور گفتگو کو آپ کے خاندان میں باقی رہنے والا بنا دیا تو وہ آپ کی اولاد اور اولاد کی اولاد ہے یعنی وہ ورثہ در ورثہ غیر الله کی عبادت سے براءت کا اظہار کرتے رہے اور انہوں نے اس معاملہ میں ایک دوسرے کو وصیت کی۔ عقب اسے کہتے ہیں جو بعد میں آتا ہے۔ سدی نے کہا: اس

سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فِیْ عَقِبِهٖ سے مراد ہے فی خلفه کے بعد آنے والوں میں کلام میں (1)۔ تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فانّه سیھدین لعلھم یرجعون وجعلھا کلمة باقیة فی عقبه یعنی انہیں بات کہی ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پلٹ آتے۔

مجاہد اور قتادہ نے کہا: کلمہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے (2)۔ قتادہ نے کہا: یہ ان کی اولاد میں ہمیشہ ایسے افراد ہوں گے جو قیامت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں گے (3)۔ ضحاک نے کہا: کلمہ سے مراد ہے لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (ہود: 26) (4) عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اسلام ہے (5) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ (الحج: 78) قرطبی نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو جو وصیت کی جو یہ تھی یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ (بقرۃ: 132) اسے ان کی اولاد میں باقی رہنے والا کلمہ بنا دیا ہے۔ ابن زید نے کہا: کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرۃ) ہے اور یوں پڑھا هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ (الحج: 78) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلمہ سے مراد نبوت ہے۔ ابن عربی نے کہا: نبوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں باقی رہے گی۔ توحید ان میں اصل ہے اور غیر اس کی تبع میں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ابن عربی نے کہا: نسلوں میں وہ کلمہ باقی رہا جو کئی زبانوں تک قائم رہا آپ کی دو دعائیں تھیں جو قبول ہوئیں: (1) اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرۃ) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: ٹھیک ہے مگر ان میں سے جو ظالم ہوا اس کے لیے کوئی عہد نہیں (2) وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (ابراہیم) ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلی دعا یہ تھی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ (الشعراء) ہر امت نے آپ کی تعظیم کی وہ آپ کی اولاد میں سے تھے یا غیروں میں سے تھے جو ان لوگوں میں سے تھے جو حضرت سام یا حضرت نوح علیہ السلام میں آپ کے ساتھ جمع ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** ابن عربی نے کہا: یہاں عقب کا ذکر معنی میں ملا ہوا ہے یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو احکام میں داخل ہیں اور ان پر عمریٰ (عمر بھر کے لیے کسی کو کوئی چیز نفع اٹھانے کے لیے دینا) مجبوس کرنے کے احکام مرتب ہوتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أیما رجلٍ أُعمِرعمری له ولعقبه یعنی وہ چیز اسی کی ہوگی جسے وہ چیز عطا کی گئی جس نے وہ چیز دی ہے اس کی طرف وہ نہ لوٹے گی کیونکہ اس نے ایسے انداز میں چیز دی ہے جس میں میراث جاری ہوتی ہے یہ گیارہ الفاظ میں وارد ہوتا ہے۔

1۔ ولد، جب اسے مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہے جو مرد اور اس کی بیوی سے پایا جائے وہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں لغت اور شرع کے اعتبار سے صرف مذکر کی اولاد مراد ہوگی اسی وجہ سے میراث معین بچے پر واقع ہوتی ہے اور معین کی مذکر اولاد پر واقع ہوتی ہے عورتوں کی اولاد پر واقع نہیں ہوتی کیونکہ وہ دوسری قوم سے بھی ہو سکتے ہیں اسی وجہ سے وہ اس لفظ کے

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 222　　2۔ ایضاً　　3۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 168
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 222　　5۔ ایضاً

ساتھ قید میں داخل نہ ہونگے امام مالک کے مجموعہ اور اس کے علاوہ کتابوں میں موجود ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کا مذہب ہے اور آپ کے تمام متقدمین ساتھیوں کا بھی یہی نقطہ نظر ہے اس اجماع پر ان کی دلیل یہ ہے کہ بچیوں کی اولاد کے لیے کوئی ورثہ نہیں جبکہ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (النسا: 11)

علماء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ بچیوں کی اولاد بھی اولاد کے لفظ اور اعقاب میں داخل ہے وہ بھی احباس میں داخل ہوگی محبس کہتا ہے: جست علی ولدی او علی عقبی؛ ☆ یہ ابوعمر بن عبدالبر اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے انہوں نے الله تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ (النساء: 23) انہوں نے کہا: جب الله تعالیٰ نے بیٹیوں کو حرام کیا تو اجماع سے بیٹی کی بیٹی بھی حرام کردی گئی تو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ بیٹی ہے اس لیے ضروری ہوگیا کہ یہ نواسی بھی اس کے باپ کے حبس میں داخل ہو جب وہ اپنی اولاد اور عقب پر کوئی چیز محبوس کرتا ہے۔ یہ بحث سورۃ الانعام میں مفصل گذر چکی ہے۔

2۔ دوسرا لفظ بنون ہے اگر کوئی آدمی یہ کہتا ہے: یہ میرے بیٹے کے لیے وقف ہے، تو یہ حکم معین بچے سے تجاوز نہ کرے گا اور نہ ہی اس سے متعدد افراد مراد لیے جائیں گے اگر اس نے ولدی کا لفظ استعمال کیا تو وہ اس سے متجاوز ہوگا اور اولاد میں سے ہر فرد کے لیے حکم ثابت ہوگا اگر اس نے بنی کا لفظ ذکر کیا تو اس میں مذکر اور مونث سب شامل ہونگے، امام مالک نے فرمایا: جس نے اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں پر صدقہ کیا تو اس کی اپنی بیٹیاں اور پوتیاں سب اس میں شامل ہوں گی۔ عیسیٰ بن قاسم سے روایت نقل کی ہے اس آدمی کے بارے کہ جس نے اپنی بیٹیوں کے لیے کوئی چیز خاص کی تو اس کی نواسیاں بھی اس کی صلبی بیٹیوں کے ساتھ ہونگی جس پر امام مالک کے ساتھیوں کی ایک جماعت متفق ہے کہ بیٹیوں کی اولاد بنین (بیٹوں) میں داخل نہ ہوگی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ تھا: "میرا یہ بیٹا سید ہے ممکن ہے الله تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان مصالحت کرائے" ہم نے کہا: اس میں مجاز کا قاعدہ جاری ہوا ہے، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرافت اور عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ نواسے کے بیٹا ہونے سے نفی کرنا بھی جائز ہے۔ ایک آدمی نواسے کے بارے میں کہہ سکتا ہے لیس بابنی۔ میرا بیٹا نہیں۔ اگر یہاں حقیقی معنی مراد ہوتا تو اس کی نفی کرنا جائز نہ ہوتا، کیونکہ حقائق کی مسمیات سے نفی کرنا جائز نہیں ہوتی (1)۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بچوں کو باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ماں کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، اسی وجہ سے حضرت عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا: وہ ہاشمی ہیں ہلالی نہیں۔ اگرچہ ان کی ماں ہلالی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ استدلال صحیح نہیں بلکہ لغت کے اعتبار سے وہ ولد (بچہ) ہے اور حقیقی معنی مراد ہے کیونکہ اس میں ولادت کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ اہل علم نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ نواسی بھی حرام ہے الله تعالیٰ کا فرمان ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ (النساء: 23) الله تعالیٰ کا فرمان: وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 79-1678

☆ میں نے اسے اپنے بچے یا اپنے عقب پر روک دیا ہے۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ (الانعام) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوان کی ذریت میں شامل کیا جبکہ وہ ان کی بیٹی کی اولاد میں سے تھے جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے اگر یہ سوال کیا جائے کہ شاعر نے کہا:

بنونا بنو أبنائنا وبناتنا بنوهن أبناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں اور ہماری بیٹیوں کے بیٹے بعیدی مردوں کے بیٹے ہیں۔

انہیں کہا جائے گا: اس میں ان کے لیے کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس کے قول کا معنی ہے اس کے بیٹوں کی مذکر اولاد وہ افراد ہیں جن کا حکم وراثت اور نسب میں اس کے اپنے بیٹوں جیسا ہے اس کے نواسوں کا حکم اس معاملہ میں بیٹیوں کے حکم جیسا نہیں کیونکہ وہ غیر منسوب ہوتے ہیں تو یہ بتایا کہ حکم میں مختلف ہیں جبکہ نام میں اکٹھے ہیں۔ بچیوں کی اولاد سے ولد کے اسم کی نفی نہیں کی جائیگی کیونکہ وہ ابن ہے بعض اوقات ایک آدمی اولاد کے بارے میں کہتا ہے: لیس ھو بابنی وہ میرا بیٹا نہیں کیونکہ وہ میری اطاعت نہیں کرتا اور نہ ہی میرے حق کا خیال کرتا ہے وہ اس کے لیے ولد کے اسم کی نفی نہیں کرتا وہ اس سے حکم کی نفی کا ارادہ کرتا ہے۔

جس نے اس شعر سے یہ استدلال کیا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو ولد نہیں کہتے تو اس نے معنی کو فاسد کر دیا اور اس کے فائدہ کو باطل کر دیا اور قائل کے قول کی ایسی تاویل کی جو درست نہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ عربی زبان میں بیٹے کی اولاد کو ابن کہا جائے اور بیٹی کی اولاد کو ابن نہ کہا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ولادت کا معنی جس سے ولد کا اسم مشتق ہے اس میں واضح اور قوی ہے کیونکہ بیٹی کی اولاد ولادت کے حقیقی معنی کی وجہ سے اس کی اولاد ہے اور بیٹے کی اولاد اس کی اولاد ہے کیونکہ یہ ولادت کا سبب بنا ہے۔ امام مالک نے بیٹیوں کی اولاد کو اس حصہ سے خارج نہیں کیا جب وہ کوئی چیز اپنی اولاد کے لیے مختص کرتا ہے کہ ولد کا اسم لغت میں ان پر واقع نہیں ہوتا آپ نے ان کو وراثت کے احکام پر قیاس کرتے ہوئے خارج کیا ہے۔ یہ بحث سورۃ انعام میں گذر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

3۔ ذریۃ۔ یہ لفظ ذرأ اللہ الخلق سے ماخوذ ہے اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى (الانعام) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کی جانب سے ان کی اولاد میں سے تھے ذریۃ کے لفظ کی تحقیق سورۃ بقرہ اور سورۃ انعام میں گذر چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

4۔ عقب۔ لغت میں اس کا معنی ہے کوئی شے جب کسی شے کے بعد ہو وہ اس کی جنس سے ہو یا اس کی جنس سے نہ ہو (1)۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: أعقب اللہ بخیر یعنی اللہ تعالیٰ نے سختی کے بعد خوشحالی دی۔ اعقب الشیب لسواد۔ سیاہ بالوں کے بعد سفید بال آئے۔ عَقَبَ يَعْقِبُ عقوبا و عَقْبًا اسی وجہ سے انسان کی اولاد کو اسکی عقب کہتے ہیں معقاب من النساء۔ وہ عورت جو مؤنث کے بعد مذکر جنے اسی طرح ہمیشہ سلسلہ رہے۔ عقب الرجل۔ اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد جو اس کے بعد

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1679

رہے۔ عاقبۃ سے مراد اولاد ہوتی ہے۔ یعقوب نے کہا: قرآن حکیم میں ہے وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ تمام وارث عقب ہیں۔ عاقبہ سے مراد اولاد ہے اسی وجہ سے مجاہد نے یہاں تفسیر بیان کی ہے۔ ابن زید نے کہا: یہاں اس سے مراد ذریت ہے۔ ابن شہاب نے کہا: اس سے مراد بچے اور بچے کی اولاد ہے۔ دوسرے علماء نے وہ کہا جو سدی سے مروی ہے صحاح میں ہے: عقب ایڑی کو کہتے ہیں یہ مؤنث ہے عقب الرجل سے مراد اولاد اور اولاد کی اولاد ہے۔ اس میں دو لغتیں ہیں عَقِب اور عَقْب۔ یہ بھی مؤنث ہے۔ اخفش سے مروی ہے: عقب فلاں مکان أبیہ عاقبۃ یعنی فلاں اپنے باپ کا نائب بنا یہ اسم ہے جو مصدر کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ (الواقعہ) علماء کے نزدیک عقب اور ولد کے لفظ میں کوئی فرق نہیں۔ ذریۃ اور نسل میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں ولد اور عقب کے قائم مقام ہیں۔ امام مالک کے مذہب کے مطابق بیٹیوں کی اولاد اس میں داخل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ سب ان دونوں میں داخل ہیں۔ ذریۃ کے بارے میں گفتگو یہاں اور سورۃ الانعام میں گذر چکی ہے۔

5۔ نسلی۔ ہمارے علماء کے نزدیک یہ ولدی اور ولد ولدی کے قول کی طرح ہے (1) اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل ہے ان کا داخل ہونا ضروری ہے کیونکہ نسل کا معنی نکلنا ہے بچیوں کی اولاد ایک اعتبار سے نکلی ہے ولم یقترن بہ مایخصہ کما اقترن بقولہ عقبی ماتناسلوا۔ اس کے ساتھ وہ مقترن نہیں ہوگا جو اسے خاص کرے جس طرح نسل عقبی کے ساتھ مقترن ہے۔

ہمارے بعض علماء نے کہا: نسل، ولد اور عقب کے معنی میں ہے اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں مگر اس صورت میں کہ صدقہ وقف کرنے والا یہ کہے نسلی و نسل نسلی جس طرح وہ یہ کہے: عقبی و عقب عقبی مگر جب وہ یہ کہے ولدی یا کہے عقبی تو اس میں بیٹیاں داخل نہ ہونگی۔

6۔ آل۔ وہی اہل ہیں۔ یہ ساتواں لفظ ہے ابن قاسم نے کہا: یہ دونوں (آل اور اہل) برابر ہیں اس سے مراد عصبات، بھائی، بیٹیاں اور پھوپھیاں ہیں اس میں خالائیں داخل نہیں اس کا اصل معنی اجتماع ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: مکان آھل جب اس میں جماعت ہو یہ عصبہ کے ساتھ ہوتا ہے اور جو عورتوں کی جانب سے قرابت میں داخل ہوتا ہے عصبہ اس سے مشتق ہوتا ہے یہ اہل سے خاص ہے حدیث افک میں ہے یا رسول اللہ أھلك ولا نعلم إلا خیرا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کے اہل کے بارے میں بھلائی کا ہی علم رکھتے ہیں مراد حضرت عائشہ ہیں لیکن زوجہ آل میں داخل نہیں اس پر اجماع ہے اگرچہ یہی تاھل کی اصل ہے کیونکہ اس کا ثبوت یقینی نہیں کیونکہ اس کا ربط بعض اوقات تبدیل ہوجاتا ہے اور طلاق کے ذریعے ختم ہوجاتا ہے۔ امام مالک نے کہا: آل محمد سے مراد ہر متقی ہے۔ یہ تعبیر اس باب سے متعلق ہے آپ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ایمان قرابت سے خاص ہے اس پر دعوت مشتمل ہوتی ہے اور آپ نے رحمت کا ارادہ کیا ہے۔ ابو اسحاق تونسی نے کہا: اہل میں ہر وہ فرد داخل ہوتا ہے جو والدین کی جانب سے ہو۔ اس نے اشتقاق کو پورا حق دیا اور عرف اور استعمال سے غفلت کا اظہار کیا۔ یہ معانی حقیقت پر مبنی ہیں یا ایسے عرف پر جو اطلاق کے وقت مستعمل ہونے پر مبنی ہیں یہ دو لفظ ہیں۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1679

8۔ قرابة۔ اس میں چار اقوال ہیں: (1) امام مالک نے محمد بن عبدوس کی کتاب میں کہا: اس سے مراد قریب ترین پھر قریب ترین ہیں، یہ اجتہاد کے قاعدہ کی بنا پر ہے اس میں بیٹیوں اور خالاؤں کی اولاد شامل نہیں (2) باپ اور ماں کی جانب سے قریبی اس میں داخل ہیں، یہ علی بن زیاد نے کہا (3) اشہب نے کہا: مردوں اور عورتوں کی جانب سے ہر ذی رحم اس میں شامل ہے۔ (4) ابن کنانہ نے کہا: اس میں چچے، پھوپھیاں، خالو، خالائیں اور بھانجیاں داخل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى (الشوریٰ: 23) کی تفسیر میں کہا: مگر یہ کہ تم اس رشتہ کو جوڑو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ کہا: قریش کا کوئی خانوادہ نہیں تھا مگر اس کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رشتہ داری تھی۔ یہ قول اسے جامع ہے۔

9۔ العشیرة۔ اسے حدیث صحیح جامع ہے اللہ تعالیٰ نے جب وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ۟ (الشعراء) کو نازل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے خاندانوں کو دعوت دی جس طرح اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے وہ قریبی خاندان تھے۔ باقی مطلق عشیرہ کا قول پہلے گذر چکا ہے۔

10۔ قوم۔ اسے عصبات میں خصوصا مردوں پر بولا جاتا ہے عورتیں اس میں شامل نہیں قوم مردوں اور عورتوں دونوں کو جامع ہے اگرچہ شاعر نے کہا:

وما ادری وسوف إخال أدری    أقوم آل حِصن أم نساء

لیکن یہ ارادہ کیا کہ جب آدمی مدد کے لیے اپنی قوم کو بلاتا ہے تو مرد مراد لیتا ہے اور جب حرمت کے لیے انہیں بلاتا ہے تو اس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوتی ہیں صفت اسے عام کرتی ہے اور قرینہ اسے خاص کرتا ہے۔

11۔ موالی۔ امام مالک نے کہا: اس میں اس کے اپنے موالی کے ساتھ اس کے باپ اور بیٹے کے موالی بھی داخل ہوتے ہیں۔ ابن وہب نے کہا: اس میں موالی کی اولاد بھی شامل ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: خلاصہ کلام یہ ہے اس میں ہر وہ فرد داخل ہوگا جو ولاء کی وجہ سے وارث بنتا ہے۔ کہا: یہ کلام کی فصول اور اصول ہیں جو قرآن کے ظاہر اور اس سنت کے ساتھ مرتبط ہیں جو قرآن کی وضاحت کرنے والی ہے، اس کی جزئیات کتاب المسائل میں ہیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ۟ وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۟ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۟ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۟

”بلکہ میں نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں اور ان کے آباء کو یہاں تک کہ آ گیا ان کے پاس حق اور کھول

کر بیان کرنے والا رسول۔ اور جب آ گیا ان کے پاس حق تو وہ کہنے لگے: یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں اور کہنے لگے: کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو ان دو شہروں میں بڑا ہے کیا وہ بانٹا کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو؟ ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا ہے بعض پر مراتب میں تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں، اور آپ کے رب کی رحمت (خاص) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں''۔

بَلْ مَتَّعْتُ اسے بل متعنا بھی پڑھا گیا ہے هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ انہیں اور ان کے آباء کو دنیا میں حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم توحید اور اسلام ان کے پاس لے آئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل ہے یہی وہ کلمہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندان میں باقی رکھا وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وہ رسول ان کے لیے ایسی چیزوں کی وضاحت کرتا ہے جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ حق سے مراد قرآن حکیم ہے قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ یعنی انکار کرنے والے ہیں وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ یہاں لولا، هلا کے معنی میں ہے هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ اسے علی رَجل بھی پڑھا گیا ہے مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ دونوں بستیوں میں سے ایک میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ (الرحمٰن) دو سمندروں میں سے ایک سے یہ دونوں نکلتے ہیں یا دونوں بستیوں میں سے ایک آدمی پر۔ قریتین سے مراد مکہ اور طائف ہے۔ رجلان سے مراد ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم یہ ابوجہل کا چچا تھا، طائف سے ابو مسعود عروہ بن مسعود ثقفی (1)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عمیر بن عبد یالیل ثقفی جو طائف سے تعلق رکھتا تھا(2)، عتبہ بن ربیعہ جو مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتا تھا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: طائف کے عظیم آدمی سے مراد حبیب بن عمرو ثقفی ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد کنانہ بن عبد بن عمرو ہے(3)۔ ایک روایت کی گئی ہے: اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے اسے ریحانہ قریش کا نام دیا جاتا وہ کہا کرتا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اگر حق ہے تو وہ مجھ پر یا ابو مسعود پر نازل ہوتا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ اس سے مراد نبوت ہے وہ اسے جہاں چاہتے رکھتے نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی ایک قوم کو فقیر کر دیا اور ایک قوم کو غنی کر دیا جب دنیا کا معاملہ ان کے سپرد نہیں تو نبوت کا امر ان کے سپرد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ قتادہ نے کہا: تو ایک انسان کو کمزور، کم حیلے والا، اپنا نقطہ نظر واضح نہ کر سکنے والا پاتا ہے جبکہ مال و متاع اس کے پاس بہت زیادہ ہے، تو ایک انسان کو پاتا ہے کہ وہ سخت محنت کرتا ہے، بڑا فرمان بردار ہے مگر مال و متاع اس کے پاس کچھ نہیں (4)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ابن محیصن نے ایک روایت معایشھم نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے دو بستیوں کے عظیم افراد کو عطا کیا جو عطا کیا اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہم پر معزز ہیں جبکہ میں ان سے نعمت کو چھیننے والا ہوں تو ان کے لیے فضیلت اور شان کہاں سے آ گئی؟

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 223 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

**وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ** یعنی ہم نے ان میں باہم فضیلت رکھی کچھ صاحب فضل ہیں اور کچھ پر فضیلت حاصل ہے کچھ رئیس ہیں اور کچھ محکوم ہیں (1)، یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آزادی اور غلامی میں باہم فضیلت دی بعض مالک ہیں اور بعض مملوک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غنا اور فقر میں باہم فضیلت دی ان میں سے بعض غنی اور بعض فقیر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اعتبار سے فضیلت دی۔

**لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا** سدی اور ابن زید نے کہا: غلام اور خدام کے اعتبار سے باہم فضیلت دی (2)، اغنیاء فقراء کا تمسخر اڑاتے ہیں ان میں سے بعض بعض کے معاش کا سبب ہیں۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: یعنی ان میں سے بعض کے مالک بن جائیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس سخریہ سے ماخوذ ہے جو استہزاء کے معنی میں ہے اور ھزئت منه ربه۔ ہر ایک جملہ کہا جاتا ہے اسم سخریہ ہے اسی طرح سُخری اور سِخری ہے تمام علماء نے سُخریا میں سین کو ضمہ دیا ہے مگر ابن محصین اور مجاہد نے ضمہ نہیں دیا دونوں نے سخریا پڑھا ہے **وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** ﴿۳۲﴾ یعنی دنیا میں سے جو وہ جمع کرتے ہیں تیرے رب کی رحمت اس سے افضل ہے پھر یہ کہا گیا ہے۔ رحمت سے مراد نبوت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد جنت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرائض کو مکمل ادا کرنا نوافل کی زیادتی سے بہتر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس چیز کے ساتھ ان پر فضل و احسان کیا جاتا ہے یہ اس سے بہتر ہے جو ان کو ان کے اعمال پر جزا دی جاتی ہے۔

**وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ** ﴿۳۳﴾

''اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لیے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لیے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی)''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ علماء نے کہا: دنیا کی حقارت اور کم مرتبہ کا ذکر کیا وہ اس کی بارگاہ میں اتنی ذلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے گھروں اور انکی زینوں کو سونے اور چاندی کا بنا دیتا اگر دنیا کی محبت دونوں پر غالب نہ آجاتی اور یہ چیز کفر پر برانگیختہ نہ کرتی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے اگر سارے لوگ اس وجہ سے کافر نہ ہو جاتے کہ وہ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور آخرت کو ترک کرتے ہیں تو ہم دنیا میں انہیں وہ عطا کرتے جو ہم نے بیان کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا ذلیل ورسوا ہے (4)؛ اکثر مفسرین کا یہی نقطہ نظر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ابن زید نے کہا: معنی ہے اگر سارے لوگ دنیا کی طلب اور اسے آخرت پر ترجیح دینے کے اعتبار سے بس ایک جیسے نہ ہو جاتے تو جو رحمٰن کا انکار کرتے ہیں تو ہم ان کے گھروں کے چھت چاندی کے بنا دیتے (5)۔ کسائی نے کہا: معنی ہے اگر کفار میں غنی اور فقیر نہ ہوتے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 223 | 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 224 | 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 5 | 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 224

اور مسلمانوں میں اسی کی مثل نہ ہوتے تو ہم کفار کو دنیا دے دیتے، یہ اس کی ذلت و حقارت کی وجہ سے ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے سَقْفًا پڑھا ہے یعنی سین کو مفتوح اور قاف کو ساکن پڑھا ہے یہ واحد کا صیغہ ہے اور اس کا معنی جمع کا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر قیاس کرتے ہیں: فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26) باقی قراء نے سین اور قاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور صیغہ جمع کا ہے جس طرح رَهْن اور رُهُن ہے۔ ابو عبید نے کہا: ان میں تیسرا وزن نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ سقیف کی جمع ہے جس طرح کَثِيب کی جمع كُثُب ہے رَغِيف کی جمع رُغُف ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سقوف کی جمع ہے پس یہ جمع کی جمع ہوئی سقف و سقوف، جس طرح فلس، فُلُوس۔ پھر انہوں نے فعولا بنایا گویا یہ اسم واحد ہے تو انہوں نے فُعُل کے وزن پر جمع بنا دیا۔

مجاہد سے مروی ہے: یہ سَقْفًا ہے یعنی قاف کو ساکن کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لِبُيُوْتِهِمْ میں لام، علی کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بدل ہے جس طرح تو کہتا ہے: فعلت هذا للزيد لكرامته اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ (النساء: 11) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ مَعَارِجَ اس سے مراد زینے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے؛ یہ جمہور کا قول ہے اس کا واحد معراج ہے معراج کا معنی سیڑھی ہے اسی سے لیلۃ المعراج ہے اس کی جمع معارج اور معاریج ہے جس طرح مفاتح اور مفاتیح دو لغتیں ہیں معاریج یہ ابو رجاء عطاردی اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے اس سے مراد سیڑھیاں ہیں۔ اخفش نے کہا: اگر تو چاہے تو اس کا واحد مِعْرَج اور مَعْرَج ہے جس طرح مِرقاۃ ہے۔

عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ ھا ضمیر سے مراد معارج ہیں جن پر وہ چڑھتے ہیں یہ جملہ کہا جاتا ہے: ظهرت على البيت یعنی میں اس کی چھت پر چڑھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی کسی چیز پر بلند ہوتا ہے تو وہ لوگوں کے لیے نمایاں ہو جاتا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: ظهرت على الشئ میں نے اسے جانا۔ ظهرت على العدو۔ میں دشمن پر غالب آ گیا۔ نابغہ بن جعدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شعر پڑھا:

عَلَوْنَا السماء عزّةً ومهابةً وأنا لنرجو فوق ذلك مظهرا(1)

ہم عزت اور ہیبت کے اعتبار سے آسمان پر چڑھ گئے بے شک ہم اس سے اوپر چڑھنے کی امید رکھتے ہیں۔

مظہر کا معنی مصعد ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے (2) فرمایا: ''کہاں؟'' عرض کی: جنت کی طرف۔ فرمایا: ''ہاں انشاء اللہ''۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اللہ کی قسم! دنیا نے اپنے مکینوں میں سے اکثر کو مائل کر لیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا بھی نہیں اگر اللہ تعالیٰ اس طرح کر دیتا تو کیا حال ہوتا (3)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ چھت پر بالائی منزل والے کا کوئی حق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چھت کو کمرے کا حصہ قرار دیا ہے جس طرح دروازوں کو اسکا حصہ قرار دیا ہے؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے۔ ابن

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 224 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 225 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 5

عربی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ بیت سے مراد صحن، دیوار، چھت اور دروازہ ہے جس کا وہ کمرہ ہوتا ہے اس کے لیے یہ اجزاء بھی ہونگے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کا علو آسمان تک ہے (1)۔ سفل میں اختلاف ہے کچھ علماء نے کہا: سفل اسی کا ہوگا جس کا وہ کمرہ ہے اور ان میں سے بعض نے کہا: زمین کے بطن میں سے کوئی چیز اس کے لیے نہ ہوگی۔

ہمارے مذہب میں دو قول ہیں: اسرائیلی کی حدیث صحیح پہلے بیان کی جائیگی کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے ہاتھ گھر بیچا اس کی تعمیر کی اس میں سونے کا ایک گھڑا پایا وہ اس گھڑے کو بیچنے والے کے پاس لایا اس نے کہا: میں نے گھر خریدا تھا گھڑا نہیں خریدا تھا بیچنے والے نے کہا: گھر میں جو کچھ تھا اس کے ساتھ میں نے گھر بیچا تھا ان میں سے ہر ایک نے گھڑے کو لینے سے انکار کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا، ان میں سے ہر ایک اپنے بچے کی شادی دوسرے کی بچی سے کر دے اور یہ مال ان دونوں کو دے دیا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اوپر والا حصہ اور نچلے والا حصہ اسی کمرے والے کا ہے مگر اس صورت میں کہ وہ بیع کرتے وقت اسے خارج کر دیں جب ان دونوں میں سے ایک نے دونوں جگہوں میں سے ایک کو بیچا تو اس سے جو نفع اٹھایا جاتا ہے وہ اس کے لیے ہوگا اور باقی خریدنے والے کے لیے ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ بالائی منزل اور زیریں حصہ کے احکام:۔ جب بالائی حصہ اور نچلے والا حصہ دو افراد کی ملکیت میں ہوں نچلی منزل خراب ہو جائے یا اسکا مالک اس کے گرانے کا ارادہ کرے سحنون نے اشہب سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: جب زیریں منزل والا اسے گرانا چاہے یا بالائی منزل والا اس پر مسجد بنانا چاہے تو مجبوری کے بغیر زیریں منزل والا اسے نہ گرائے اس کا گرانا بالائی منزل والے کے مناسب ہونا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ زیریں منزل کے گرانے سے بالائی منزل گر جائے بالائی منزل والے کو حق حاصل نہیں کہ بالائی منزل والا اوپر منزل بنائے جو اس سے پہلے نہ ہو مگر معمولی سی چیز جو زیریں منزل والے کو نقصان نہ دے۔

اگر بالائی منزل کی چھت میں سے ایک لکڑی ٹوٹ جائے تو وہ اس کی جگہ دوسری لکڑی رکھ لے جبکہ وہ پہلی لکڑی سے بھاری نہ ہو اور زیریں منزل پر ضرر کا خوف نہ ہو۔

اشہب نے کہا: گھر کا دروازہ زیریں منزل والے کا ذمہ ہے اگر زیریں منزل گر جائے تو اس کے مالک کو اس کے بنانے پر مجبور کیا جائے گا بالائی منزل والے پر لازم نہیں کہ وہ زیریں منزل تعمیر کرے اگر زیریں منزل والا تعمیر سے انکار کر دے تو اسے کہا جائے گا: اس کے ہاتھ بیچ دے جو اس کو بنائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ زیریں منزل ایک آدمی کی ہے اور بالائی منزل دوسرے آدمی کی ہے زیریں منزل خراب ہو جاتی ہے تو اس کو درست کرنا زیریں منزل والے کے ذمہ ہے اس کے ذمہ یہ بھی ہے کہ بالائی منزل کو سہارا دے یہاں تک کہ وہ زیریں منزل کو درست کر لے۔

حضرت نعمان بن بشیر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے فرمایا: '' حدود اللہ پر قائم رہنے والا اور ان میں واقع

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1682

ہونے والا ان لوگوں کی مثل ہے جو ایک کشتی میں قرعہ اندازی کرتے ہیں ان میں سے بعض کو بالائی حصہ ملتا ہے اور ان میں سے بعض اس کا زیریں حصہ پاتے ہیں جو نچلے حصہ میں ہیں جب پانی لیتے ہیں تو اوپر والے لوگوں کے پاس سے گذرتے ہیں انہوں نے کہا: اگر ہم اپنے حصہ میں سے ایک سوراخ کرلیں اور اوپر والوں کو اذیت نہ دیں اگر اوپر والے انہیں چھوڑے رہیں اور جو وہ ارادہ کریں تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں اگر اوپر والوں نے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا تو سب کے سب نجات پا جائیں گے (1)'' یہ اس باب میں اصل ہے یہ امام مالک اور اشہب کی دلیل ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ نچلے حصہ والے کو حق حاصل نہیں کہ وہ کوئی ایسا نیا کام کرے جو اوپر والے کو نقصان پہنچاتا ہو اگر اس نے کوئی ایسا نیا کام کیا جس سے نقصان ہوا تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے درست کرے بالائی منزل والے پر درست کرنے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی اوپر والے کو حق حاصل ہوگا کہ وہ نقصان پہنچانے والی چیز سے اسے روک دے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر انہوں نے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا تو سب کے سب نجات پا جائیں گے'' ظالم کے علاوہ کسی کا ہاتھ پکڑنا جائز نہیں یا وہ امر ممنوع ہو کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو جائز ہی نہ ہو اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ جو آدمی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک کرتا ہے وہ سزا کا مستحق ہے سورۃ الانفال میں یہ بات گذر چکی ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ قرعہ جائز اور اس کا استعمال بھی جائز ہے سورۂ آل عمران میں یہ بحث گذر چکی ہے، اس کے تمام مواقع پر غور کر تو اسے واضح انداز میں پائے گا۔ الحمدللہ۔

وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ۭ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں وہ بھی چاندی اور سونے کے اور یہ سب (سنہری اور چیلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں، اور آخرت کی عزت و کامیابی آپ کے نزدیک پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔

وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا یعنی ہم نے ان کے گھروں کے دروازے بنا دیئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لِبُيُوْتِهِمْ، لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ سے بدل اشتمال ہے یعنی چاندی کے دروازے۔ وَّ سُرُرًا اسی طرح پلنگ بھی چاندی کے سرد یہ سریر کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ أسرۃ کی جمع ہے اور أسرۃ، سریر کی جمع ہے پس سرر جمع کی جمع ہے۔

عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ اتکاء اور توکؤ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا سہارا لینا، اسی سے اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (طٰہٰ:18) یعنی میں اس پر سہارا لیتا ہوں رجل تُكَأة جس طرح هُمَزة ہے بہت زیادہ سہارا لینے والا۔ اس سے اسم فاعل متکی ہے اسم ظرف متکا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: طعنه حتی اتکأه اس نے اسے نیزہ مارا یہاں تک کہ اسے سہارا لینے پر مجبور کر دیا یعنی اسے سہارا لینے والے کی طرح گرا دیا اسی طرح توکأت علی العصا میں نے ڈنڈے کا سہارا لیا۔ تمام میں تاء کی اصل واؤ ہے اس کے ساتھ وہی کچھ کیا گیا جو اتزن اور اتعد کے ساتھ کیا گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب فی الشرکۃ، باب هل یقرع فی القسمۃ والاستھام فیه، جلد 1، صفحہ 339

وَ زُخْرُفًا یہاں زخرف سے مراد سونا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے أو یکون لك بیت من زخرف یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ سامان ہے جو لوگ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں (2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد نقوش ہیں(3)، اس کا اصل معنی زینت ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: زخرفت الدار۔ میں نے گھر کو مزین کیا تزخرف فلان۔ فلاں مزین ہوا۔ زُخْرُفًا کو نصب اس لیے دی گئی کہ اسکی تعبیر یوں ہے وجعلنا لھم مع ذلك زخرفا اس کے ساتھ ساتھ ہم نے ان کے لیے زینت بنادی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے معنی ہے ہم نے ان کے لیے چھت، دروازے، سونے اور چاندی کے پلنگ بنائے جب من کو حذف کیا تو کہا وَ زُخْرُفًا تو اسے نصب دی گئی۔

وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا عاصم، حمزہ اور ہشام نے ابن عامر سے انّ تشدید کے ساتھ پڑھا جبکہ باقی قراء نے اسے مخفف پڑھا ہے یہ بحث بھی ذکر کی جاچکی ہے۔ ابو رجاء سے لمّا کے لام کو مکسور نقل کیا گیا ہے اس کے نزدیک ما، الذی کے معنی میں ہے اس کی ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہے انّ کل ذلك الذی ھو متاع الحیاۃ الدنیا یہاں سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح اسے حذف کیا گیا ہے اس کی قراءت کے مطابق جس نے قراءت کی مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرۃ:26) تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ (الانعام:154) ابو الفتح نے کہا کہ اس قراءت کی بنا پر کل منصوب ہے کیونکہ اِن مثقلہ سے مخففہ ہے جب اسے مخفف کر دیا جائے اور اس کا عمل باطل ہو جائے تو کلام کے آخر میں لام لازم ہوتا ہے تاکہ اس کے اور ان نافیہ میں فرق ہو جائے جو ما کے معنی میں ہوتا ہے جس طرح انّ زید لقائم یہاں لام جارہ کے سوا کوئی لام نہیں۔

وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ۠ یعنی جو متقی بنتا ہے اور خوف کھاتا ہے اس کے لیے جنت ہے۔ کعب نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی نازل کتب میں سے بعض میں پاتا ہوں لولا أنْ یَحْزَنَ عبدی المؤمن لکللت رأس عبدی الکافر بالاکلیل ولا یتصدع ولا ینبض منہ عرق بوجع اگر یہ نہ ہوتا کہ میرا مومن بندہ غمگین ہوگا تو میں اپنے کافر بندے کے سر پر تاج پہنا تا اس کو سر درد نہ ہوتا اور نہ ہی درد کی وجہ سے اس کا پسینہ پھوٹتا۔

صحیح ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الدنیا سجن المؤمن و جنۃ الکافر "دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے" (4)۔

سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو صنت الدنیا تعدل عند اللہ جناح بعوض ما سقی کافرا منھا شربۃ ماء "اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیتا" (5)۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 225　　2۔ ایضاً　　3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 5

4۔ صحیح مسلم، کتاب فی الزھد والرقائق، باب الدنیا سجن المؤمن، جلد 2، صفحہ 407

5۔ جامع ترمذی، کتاب فی الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ، جلد 2، صفحہ 56

لوگوں نے یہ اشعار پڑھے:

فلوکانت الدنیا جزاء لمحسن	إذالم یکن فیھا معاش لظالم

لقد جاع فیھا الأنبیاء کرامةً	وقد شبِعت فیھا بطون البھائم

اگر دنیا محسن کی جزا ہوتی تو اس میں ظلم کی زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا اس میں انبیاء کرامت کے باوجود بھوکے رہے اور چوپاؤں کے پیٹ سیر ہوئے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تمتع من الآیام إن کنت حازما	فإنك فیھا بین ناہٍ وآمِر

تو اگر محتاط ہے تو ان ایام سے تھوڑا سا لطف اٹھا لے بے شک تو اس میں روکنے والے اور حکم دینے والے کے درمیان ہے۔

إذا أبقت الدنیا علی المرء دینه	فما فاته فیھا فلیس بضائر

جب دنیا انسان پر اسکا دین باقی رکھے تو جو چیز اس سے فوت ہوئی وہ اس کو نقصان دینے والی نہیں۔

فلاتَزِنُ الدنیا جناح بعوضة	ولا وزن زَق من جناح لطائر

دنیا کا وزن مچھر کے پر سے نہ کر اور نہ ہی پرندے کے بازو کے ایک پر سے۔

فلم یرض بالدنیا ثوابا لمحسن	ولا رضی الدنیا عقا بالکافر

وہ محسن کو دنیا کے ساتھ بدلہ دینے پر راضی نہیں اور نہ ہی کافر کو سزا دینے پر دنیا سے راضی ہے۔

وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ ﴿۳۸﴾

''اور جو شخص دانستہ اندھا بنتا ہے رحمان کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کیلئے ایک شیطان پس ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے۔ اور شیاطین روکتے ہیں ان اندھوں کو راہ ہدایت سے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں یہاں تک کہ جب وہ اندھا ہمارے پاس آئے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی کہے گا: کاش! میرے درمیان اور اے شیطان! تیرے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہوتی تو تو بہت برا ساتھی ہے''۔

وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ﴿۳۶﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ نے ومن یَعْشَ پڑھا ہے (1) اس کا معنی اندھا ہونا ہے اسی معنی میں ہے عشی یعشی عشا جب وہ اندھا ہو، رجل اعشی، امراۃ عشواء جب وہ دیکھتا نہ ہو اس معنی میں اعشی کا قول ہے:

رأت رجلًا غائب الوافِدَین	مختلفَ الخلق أعشَی ضریرا

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 135

اس نے ایک ایسا آدمی دیکھا جس کے ساتھی جا چکے تھے شکل وصورت بڑی عجیب اور وہ اندھا تھا۔

باقی قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ عشا یعشو سے مشتق ہے جب اسے ایسا عارضہ لاحق ہو جو اندھے کو لاحق ہوتا ہے خلیل نے کہا: عشو سے مراد کمزور نظر دیکھنا (1)؛ اور یہ شعر پڑھا:

مَتٰی تأتِہِ تَعْشُو إلی ضوْ نارہ　　تَجِد خیرَ نارٍ عندھا خَیرُ مُوقِد (2)

ایک اور شاعر نے کہا:

لنعم الفتی یعشو إلی ضوْ نارہ　　إذا الریح ھبّت والمکان جدیب

وہ کتنا اچھا نوجوان ہے جو اپنی آگ کی روشنی کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے جاتا ہے جب کہ ہوا چل رہی ہے اور مکان چٹیل ہے۔

جوہری نے کہا: عشیٰ الف مقصورہ کے ساتھ اعشی کا مصدر ہے یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو رات کو نہیں دیکھ سکتا وہ صرف دن کو دیکھتا ہے اس کے یہ صیغے استعمال ہوتے ہیں امراۃ عشواء، امرأتان عشواوان۔ أعشاہ اللہ فعشی یعشی عشی۔ ھما یعشیان وہ یہ نہیں کہتے یشھوان۔ کیونکہ واؤ جب واحد کے صیغہ میں ماقبل کے کسرہ کی وجہ سے یاء ہو جائے تو تثنیہ کے صیغہ میں اپنی حالت پر رہتی ہے تعاشی۔ جب وہ اپنے بارے میں یہ ظاہر کرے کہ وہ اندھا ہے اعشی کا اسم منسوب اعشوی آتا ہے اور عشیہ کا اسم منسوب عشوی آتا ہے عشواء اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سامنے نہ دیکھ سکے تو وہ بے ہنگم اپنے پاؤں ہر چیز پر مارتی ہے رکب فلان العشواء۔ جب وہ اپنے معاملہ میں سوچے سمجھے بغیر شروع ہو گیا۔ فلان خابط خبط عشواء فلاں آدمی اندھی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔

یہ آیت سورت کے آغاز اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا کے ساتھ متصل ہے یعنی ہم تمہارے لیے پے در پے ذکر کرتے ہیں جو آدمی اس ذکر سے اندھا بنا رہتا ہے کہ اس سے اعراض کرتا ہے اور گمراہوں اور باطل لوگوں کے اقوال کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے کفر کی جزا کے طور پر ہم ایک شیطان اس پر مسلط کر دیتے ہیں فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے جو حلال چیز سے اسے روکتا ہے اور حرام چیز پر اسے برانگیختہ کرتا ہے اسے اطاعت سے منع کرتا ہے اور اسے معصیت کا حکم دیتا ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا یہی معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آخرت میں ہوگا جب وہ اپنی قبر سے اٹھے گا؛ یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے حدیث طیبہ میں ہے" کافر جب اپنی قبر سے نکلتا ہے تو ایک شیطان اس کے ساتھ ہو لیتا ہے وہ اسکے ساتھ ہی رہتا ہے یہاں تک کہ وہ دونوں جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں اور مومن کا ساتھی فرشتہ بنا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرما دے گا" یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

قشیری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ وہ شیطان دنیا اور آخرت میں اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ ابوہیثم اور ازہری نے کہا: عشوت إلی کذا۔ میں نے اس کا قصد کیا۔ عشوت عن کذا۔ میں نے اس سے اعراض کیا إلی اور عن صلہ کی وجہ سے معنی میں فرق ہوگا جس

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 99　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 225

طرح مِلۡتُ إلیہ اور مِلۡتُ عنہ میں فرق ہے۔قتادہ نے بھی اسی طرح کہا ہے یعش یعنی وہ اعراض کرتا ہے؛ یہ فراء کا قول ہے نحاس نے کہا: یہ لغت میں معروف نہیں۔قرطبی نے کہا: وہ اپنی کمر کو دہرا کرتا ہے۔معنی ایک ہی ہے۔ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا: اس کی آنکھ تاریک ہوجاتی ہے۔عتبی نے اس کا انکار کیا ہے کہ عشوت، أعرضت کے معنی میں ہے کہا درست تعاشیت ہے یہ قول، ابوہیثم اور ازہری کا ہے تمام اہل علم نے یہی کہا ہے: سلمی، ابن اسحاق، یعقوب اور عصمہ نے عاصم اور اعمش سے یقیض پڑھا ہے کیونکہ الرَّحۡمٰنِ کا ذکر ہے معنی ہو گا رحمٰن اس کے لیے شیطان مسلط کر دیتا ہے باقی قراء نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ ۝ قرین کا معنی ساتھ رہنے والا اور ساتھی ہے۔ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ شیطان سے کنایہ ہے جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اعراض عن القرآن سے کنایہ ہے یعنی وہ شیطان کا قرین ہے وَ اِنَّهُمۡ لَيَصُدُّوۡنَهُمۡ عَنِ السَّبِيۡلِ شیاطین انہیں ہدایت کے راستہ سے روکتے ہیں یہاں جمع کا صیغہ ذکر کیا کیونکہ وَ مَنۡ يَّعۡشُ میں مَنۡ جمع کے معنی میں ہے وَيَحۡسَبُوۡنَ واؤ ضمیر سے مراد کفار ہیں یعنی کفار گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ کفار یہ گمان کرتے ہیں کہ شیاطین ہدایت یافتہ ہیں پس کفار ان کی اطاعت کرتے ہیں حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا فعل کا صیغہ واحد ہے۔ابوعمرو، حمزہ، کسائی اور حفص نے یہ پڑھا ہے یعنی جب کافر قیامت کے روز ہمارے پاس آئے گا، باقی قراء نے اسے جَآءَنَا تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے یعنی کافر اور اس کا ساتھی جب ہمارے پاس آئے گا دونوں کو ایک سلسلہ میں رکھا گیا ہے تو کافر کہے گا: يٰلَيۡتَ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكَ بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَيۡنِ یعنی موسم سرما اور موسم گرما کا مشرق، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: رَبُّ الۡمَشۡرِقَيۡنِ وَرَبُّ الۡمَغۡرِبَيۡنِ ۝ (الرحمٰن) اسی کی مثل مقاتل کا قول ہے۔واحد کے صیغہ کی قراءت اگرچہ اس کا ظاہر تو افراد کے معنی پر ہے تاہم معنی دونوں کے لیے ہے کیونکہ مابعد کلام سے اسے پہچان لیا گیا ہے جس طرح شاعر نے کہا:

وعَيۡن لها حَدۡرَةٌ بَدۡرَةٌ شُقَّت مآقيها من أخَرُ

محل استدلال عین ہے لفظ میں واحد ہے اور معنی میں تثنیہ کیونکہ مآقیھا اس پر دلالت کر رہا ہے۔

مقاتل نے کہا: کافر تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کے ساتھی کے درمیان اتنی دوری ہوتی جو سال کے طویل ترین اور مختصر ترین دن کے درمیان ہوتی ہے اسی وجہ سے فرمایا: بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَيۡنِ۔فراء نے کہا: مراد مشرق و مغرب ہے ان دونوں ہی سے ایک کے اسم کو غلبہ دیا جس طرح کہا جاتا ہے قمران، مراد سورج اور چاند ہوا کرتا ہے۔عمران سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں بصرتان کوفہ اور بصرہ کے لیے۔عصران، صبح اور عصر کے لیے ذکر کرتے ہیں۔شاعر نے کہا:

أخذنا بآفاق السماء عليكم لنا قمراها و النجوم الطوالع(1)

ہم نے تمہارے خلاف آسمان کے آفاق کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے ہمارے پاس اس کا سورج اور چاند روشن ستارے ہیں۔

1۔تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 226

ابوعبیدہ نے جریر کا شعر پڑھا:

ما كان يرضى رسول الله فعلهم والعُمَران أبوبكر ولا عمر

ان کے عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عمران یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما راضی نہیں۔

سیبویہ نے یہ شعر پڑھا: قَدْنِیَ من نَصْرِ الخُبَیْبَین قَدِی

خبیبین سے مراد عبد اللہ اور مصعب ہے جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے وہ ابو خبیب عبد اللہ تھے۔

فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ تو کتنا برا ساتھی ہے کیونکہ وہ اسے آگ پر لے جائے گا۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: جب کافر کو اٹھایا جائے گا تو شیطان میں سے اس کے ساتھی کو ساتھ ملا دیا جائیگا وہ اس سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس کے ساتھ جہنم میں چلا جائے گا(1)۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝۳۹

''اور (یہ شور و فغاں) تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا آج جبکہ تم دنیا میں ظلم کر رہے ہو تم سب اس عذاب میں حصہ دار ہو''۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اذ، یوم سے بدل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کافر سے فرمائے گا: جب تم نے دنیا میں شرک کیا تو اس وقت تمہاری یہ گفتگو تمہیں کوئی نفع نہ دے گی۔ وہ کافر کا قول ہے يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ یعنی آج تمہیں ندامت نفع نہ دے گی اَنَّكُمْ میں ہمزہ مکسور ہے فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝۳۹ یہ ابن عامر کی قراءت ہے جبکہ باقی قراء نے ان کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام یہ بنے گی لن ینفعکم الیوم اشتراککم فی العذاب کیونکہ ہر ایک کے لیے اس کا وافر حصہ ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ جہنمیوں کو منع کر دیا گیا ہے کہ وہ غم کا اظہار کریں جس طرح مصیبت زدہ لوگ دنیا میں غم کا اظہار کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ غم کے اظہار سے اہل دنیا راحت حاصل کرتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے لی فی البلاء والمصيبة أسوة۔ آزمائش اور مصیبت میں میں ایک نمونہ ہوں۔ اس طرح وہ غم سے سکون حاصل کرتا ہے جس طرح خنساء نے کہا:

فلولا كثرة الباكين حولي على إخوانهم لقتلت نفسي

ومايبكون مثل أخي ولكن أعزي النفس عنه بالتأسي(2)

اگر میرے اردگرد اپنے بھائیوں پر رونے والوں کی کثرت نہ ہوتی تو میں اپنے نفس کو قتل کر دیتا وہ میرے بھائی جیسے بھائیوں پر نہیں روتے مگر اپنے نفس کو اس غم کے اظہار پر تسلی دیتی ہوں۔

جب آخرت میں غم کا اظہار انہیں کوئی نفع نہ دے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مشغول کر دے گا۔ مقاتل نے کہا: آج معذرت اور شرمندگی تمہیں کوئی نفع نہ دے گی (3)، کیونکہ تمہارے ساتھی اور تم عذاب میں باہم شریک ہو جس طرح تم

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 100 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 137 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 100

کفر میں شریک ہو۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ مَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

''کیا آپ سنانا چاہتے ہیں بہروں کو یا راہ دکھانا چاہتے ہیں اندھوں کو اور انہیں جو کھلی گمراہی میں ہیں''۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ خطاب سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے وَ مَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ یعنی یہ آپ کے لیے نہیں اس لیے اگر وہ کفر کرتے ہیں تو آپ کا سینہ تنگ نہ پڑے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اس میں قدریہ اور دوسرے افراد کے لیے رد ہے دل میں ہدایت، رشد اور گمراہی یہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں جس کے حق میں چاہتا ہے گمراہی تخلیق فرما دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے ہدایت مقدر کر دیتا ہے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝

''پس اگر ہم لے جائیں آپ کو اس دار فانی سے تو پھر بھی ہم ان سے بدلہ لیں گے یا ہم آپ کو دکھا دیں گے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے پس ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں''۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ اس سے مراد یہ لی ہم آپ کو مکہ مکرمہ سے قریش کی اذیت سے نکال کر لے جائیں فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ اس سے مراد تیری زندگی میں ان سے انتقام لینا ہے فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ منظر بدر کے روز دکھایا؛ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: یہ مسلمانوں میں ہے اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فتنے ہیں (1) نَذْهَبَنَّ بِكَ اس پر ہم تجھے موت عطا کر دیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شدید انتقام واقع ہوا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت بخشی اللہ تعالیٰ آپ کو لے گیا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت میں نہیں دکھایا مگر وہی کچھ جس سے آنکھ ٹھنڈی ہوئی اور انتقام کو اس کے بعد رکھا کوئی نبی نہیں گزرا مگر اس کی امت میں انتقام اسے دکھایا گیا۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت جب آزمائش کو پانے والی تھی وہ آپ کو دکھائی گئی تو آپ ہمیشہ منقبض ہی رہے آپ کھل کر نہ ہنسے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی (2)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی امت کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے پہلے اس کے نبی کو قبض کر لیتا ہے اور اس نبی کو اس امت کے لیے فرط اور سلف بنا لیتا ہے اور جب کسی امت کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے عذاب دیتا ہے جبکہ اس کا نبی زندہ رہتا ہے تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو جب انہوں نے نبی کی تکذیب کی اور اس کے حکم کی نافرمانی کی''۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 6
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 227

وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝

”پس مضبوطی سے پکڑے رہیے اس قرآن کو جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے بے شک آپ سیدھی راہ پر ہیں۔ اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے اور (اے فرزندان اسلام) تم سے جواب طلبی ہوگی“۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ۔ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ سے مراد قرآن حکیم ہے اگرچہ اس کو جھٹلایا جس نے جھٹلایا اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ یہ تمہیں اللہ تعالیٰ اس کی رضا اور ثواب تک پہنچا دے گا وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ یعنی قرآن تیرے لیے اور تیری قوم قریش کے لیے شرف ہے کیونکہ یہ انکی لغت اور انہیں میں سے ایک فرد پر نازل ہوا اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (الانبیاء:10) یعنی تمہارے لیے شرف ہے قرآن حکیم قریش کی زبان میں نازل ہوا اور انہیں کو خطاب کیا پس تمام لغتوں والے اس امر کے محتاج ہیں جو بھی ایمان لایا وہ ان کے خوشہ چین ہوئے کیونکہ تمام لغتوں والے اس امر کے محتاج ہیں کہ ان کی لغت کو اپنائیں یہاں تک کہ اس معنی پر آگاہی حاصل کریں جس کا امر، نہی اور خبر سے ارادہ کیا گیا ہے اس اعتبار سے قریش تمام اہل لغات پر شرف والے ہو گئے اسی وجہ سے انہیں عربی کہا گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تیرے لیے اور تیری امت کے لیے بیان ہے جس کے تم محتاج ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تذکرہ ہے جس کی مدد سے تم دین کا معاملہ سمجھتے ہو اور اس پر عمل کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ اس سے مراد خلافت ہے یہ قریش میں ہے غیروں میں نہ ہوگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اس مسئلہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں لوگوں کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے تابع ہوں گے اور ان کے کافر ان کے کافروں کے تابع ہوں گے“ (1)۔

امام مالک نے کہا: اس سے مراد آدمی کا یہ قول ہے: مجھے میرے والد نے میرے باپ سے وہ ابن ابی مسلمہ سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت مالک بن انس سے روایت نقل کرتے ہیں؛ یہ ماوردی، ثعلبی اور دوسرے علماء نے ذکر کیا (2)۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اسلام میں ایسا مرتبہ کسی کے لیے نہیں پایا مگر بغداد میں ایسا پایا (3) کیونکہ بنی تمیم وہاں یہ کہا کرتے تھے: مجھے میرے باپ نے بیان کیا کہا اور سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک چلائی اس طرح ان کی اقدار شرف والی ہو گئیں لوگوں نے ان کی شان کو عظیم خیال کیا اور خلافت نے انہیں تلاش کیا۔

میں نے مدینۃ السلام میں ابو محمد رزق اللہ بن عبدالوھاب ابوفرج بن عبدالعزیز بن حارث بن اسد بن لیث بن سلیمان بن اسود بن سفیان بن یزید بن اکینہ بن عبداللہ تمیمی کے دو بیٹوں کو دیکھا دونوں کہہ رہے تھے: ہم نے اپنے باپ رزق اللہ کو کہتے ہوئے سنا کہا: میں نے اپنے باپ کو کہتے ہوئے سنا یہ صیغہ ادا آخر تک چلتا رہا اور آخر میں کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا جبکہ ان سے حنان ومنان کے بارے میں سوال کیا گیا تھا فرمایا: حنان اسے کہتے ہیں جو اس کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب فی الامارۃ، الناس تبع لقریش والخلافۃ فی قریش، جلد 2، صفحہ 119

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 227

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 84-1683

طرف توجہ کرے جو اس سے اعراض کرے اور منان اسے کہتے ہیں جو سوال سے پہلے عطا کرے۔ جس نے یہ کہا تھا میں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: وہ اکینہ بن عبداللہ ہے جو ان کا جد اعلیٰ تھا۔ زیادہ قوی یہ ہے وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ سے مراد قرآن حکیم ہو کلام کا انحصار اسی پر ہے اور اس کی طرف رجوع ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ماوردی نے کہا: وَ لِقَوْمِكَ میں دو قول ہیں (1) آپ کی امت میں سے جو آپ کی اتباع کرے (1)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ثعلبی نے حضرت حسن بصری سے اسے ذکر کیا ہے (2) مراد قریش ہیں (2)، کہا جاتا ہے: وہ کن سے ہے؟ تو جواب دیا جاتا ہے: عربوں میں سے۔ پوچھا جاتا ہے: کون سے عرب؟ تو جواب دیا جاتا ہے: قریش سے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ شرف عمل کرنے والے کے لیے ہے وہ قریش سے ہو یا غیر قریش سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سریہ یا غزوہ سے واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا فرمایا: ''اے فاطمہ! اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دے میں اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں تجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا، اپنی ازواج سے بھی اسی کی مثل فرمایا، اپنی اولاد کو بھی اسی کی مثل فرمایا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں سے بنو ہاشم لوگوں میں سے اولیٰ نہیں میری امت میں سے بہترین نہیں میری امت میں سے بہترین متقین ہیں، موالی (جو غلام تھے یا جن کے ساتھ معاہدہ ہوا یا جو کسی قبیلہ کے سردار کے ہاتھ پر اسلام لائے) میری امت سے بہترین متقین ہیں تم ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہو تم صاع کے کناروں سے بھرے پیمانے زائد ماپ کی طرح ہو کسی ایک کو دوسرے پر تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت نہیں''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو اس امر سے رک جانا چاہیے کہ وہ جہنم کے کوئلہ میں سے ایک کوئلہ پر فخر کرتے ہیں یا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سیاہ بھونرے سے بھی زیادہ شریر ہوں جو اپنی ناک سے بدبو پھینکتا ہے تم سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں اللہ تعالیٰ نے تم سے دور جاہلیت کا عیب اور آباء پر فخر کو ختم کر دیا ہے، مومن متقی ہے اور فاجر شقی ہے'' دونوں روایات طبری نے ذکر کی ہیں۔ سورۂ حجرات میں اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ۝ تم سے ان نعمتوں پر شکر بجالانے کے بارے میں پوچھا جائے گا (3)؛ یہ مقاتل اور فراء کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو عطا کیا ہے اس کے بارے میں آپ سے اور آپ کے ساتھیوں سے باز پرس ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم نے اس بارے میں جو عمل کیا اس کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا: معنی قریب قریب ہے۔

وَ سْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ۝

''اور آپ پوچھیے ان سے جنہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں سے کیا ہم نے بنائے ہیں خداوند کے علاوہ اور خدا تا کہ انکی پوجا کی جائے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن زید نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام میں مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی گئی، مسجد اقصیٰ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 227 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سے مراد مسجد بیت المقدس ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور آپ کی اولاد میں سے مرسلین کو بھیجا جبکہ جبریل امین نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے حضرت جبریل امین نے آذان کہی پھر نماز کے لیے اقامت کہی پھر کہا: اے محمد! ﷺ آگے بڑھو اور انہیں نماز پڑھاؤ، جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوئے جبریل امین نے کہا: اے محمد! آپ سے قبل جن رسولوں کو بھیجا گیا ہے ان سے پوچھیے: کیا اللہ تعالیٰ نے رحمٰن کے علاوہ اور الٰہ بنائے ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نہیں پوچھوں گا تو ہی کافی ہے'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ستر نبی تھے جن میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تھے آپ نے ان سے سوال نہ کیا کیونکہ آپ ان کی بنسبت اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری روایت میں ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سات صفیں بنا کر نماز پڑھی مرسلین کی تین صفیں تھیں اور انبیاء کی چار صفیں تھیں رسول اللہ ﷺ کے متصل پیچھے حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے ان کی دائیں جانب حضرت اسماعیل اور ان کی بائیں جانب حضرت اسحاق پھر حضرت موسیٰ علیہم السلام تھے پھر باقی ماندہ مرسلین تھے رسول اللہ ﷺ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے اور کہا: ''میرے رب نے میری طرف وحی کی کہ میں تم سے سوال کروں کیا تم میں سے کوئی ایسا رسول بھی بھیجا گیا ہے جو غیر اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہو؟'' انہوں نے کہا: اے محمد! ﷺ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی دعوت کے ساتھ بھیجے گئے ہیں وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر جن کی وہ عبادت کیا کرتے ہیں وہ سب باطل ہے آپ خاتم النبیین اور سید المرسلین ہیں آپ نے ہمیں جو امامت کرائی ہے اس سے یہ امر ہمارے لیے ظاہر ہو چکا ہے تیرے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے نقش قدم کی پیروی کریں''(1)۔

سعید بن جبیر نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ کے بارے میں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ لیلۃ المعراج کو رسولوں سے ملے۔ ولید بن مسلم نے اس ارشاد کی وضاحت میں کہا: میں نے اس بارے میں خلید بن دعلج سے پوچھا تو انہوں نے کہا مجھے قتادہ نے بیان کیا کہا: معراج کی رات ان سے سوال کیا آپ انبیاء سے ملے حضرت آدم سے ملے اور جہنم کے خازن سے ملاقات کی۔

میں کہتا ہوں: اس آیت کی تفسیر میں یہی صحیح ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر رُّسُلِنَآ سے پہلے من زائد نہیں۔ مبرد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: اس کا معنی ہے تم سے قبل جو رسول بھیجے گئے ان کی امتوں سے پوچھو۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے واسأل الذی ارسلنا الیهم قبلك رسلنا یہ قراءت تفسیر کی بنا پر ہے اس تعبیر کی بنا پر من زائد ہے؛ یہ مجاہد، سدی، ضحاک، قتادہ، حسن بصری اور حضرت ابن عباس کا قول ہے(2) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھیے جو دو کتابوں یعنی تورات وانجیل والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے محمد! ﷺ ہم سے ان انبیاء کے بارے میں پوچھیں جو آپ سے قبل مبعوث کیے گئے عن کو حذف کر دیا گیا اور رُّسُلِنَآ پر وقف تام ہے پھر انکار کے طریقہ پر

1۔ صاوی علی الجلالین، جلد 4، صفحہ 45 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 228

استفہام سے ابتدا کی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ ان رسولوں کے پیروکاروں سے پوچھیں جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا، تو یہاں سے مضاف محذوف ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد ساری امت ہے۔

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ۝ آلھۃ کی خبر اس صیغہ کے ساتھ لگائی گئی جس صیغہ کے ساتھ ذوالعقول کی خبر لگائی جاتی ہے فرمایا یُعْبَدُوْنَ ۝، تعبد اور یعبدن نہیں فرمایا کیونکہ ان کے نزدیک آلھۃ ذوالعقول کے قائم مقام ہیں تو ان کی خبر اسی طریقہ پر لگائی گئی جیسے ذوالعقول کی خبر لگائی جاتی ہے۔

سوال کے امر کا سبب یہ تھا کہ یہودیوں اور مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: جو آپ لاتے ہیں وہ اس کے مخالف ہے جو آپ سے قبل انبیاء لائے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ انبیاء سے سوال کریں (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا تو رسولوں نے جواب دیا ہمیں توحید کا اعلان کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا؛ یہ واقدی کا قول ہے۔

(2) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال نہیں کیا تھا کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں یقین تھا یہاں تک کہ یہ حکایت بیان کی گئی کہ حضرت میکائیل نے حضرت جبریل امین سے پوچھا: کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں سوال کیا ہے؟ حضرت جبریل امین نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان اور یقین اس سے عظیم ہے کہ وہ اس کے بارے میں سوال کریں (1)، یہ بحث دونوں روایات میں گذر چکی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَ مَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا٘ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ۝ وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ۬ وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝

''اور ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پس آپ نے انہیں کہا: بے شک میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔ پس جب آپ آئے ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر تو اس وقت وہ ان سے ہنسنے لگے۔ اور ہم نہیں دکھاتے تھے انہیں کوئی نشانی مگر وہ بڑی ہوتی پہلی سے اور ہم نے مبتلا کر دیا انہیں عذاب میں تاکہ وہ باز آ جائیں۔ اور وہ بولے: اے جادوگر! دعا مانگیے ہمارے لئے اپنے رب سے بسبب اس عہد کے جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے ہم ضرور ہدایت قبول کریں گے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 228

پس جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب تو فوراً وہ عہد شکنی کرنے لگے۔ اور پکارا فرعون اپنی قوم میں اور کہنے لگا: اے میری قوم! کیا میں مصر کا فرمانروا نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم انہیں دیکھ نہیں رہے؟ کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا''۔

**وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ** جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ آپ کے دشمن سے انتقام لینے والا ہے اور انبیاء کی شہادت اور تمام کے اتفاق سے توحید پر دلیل قائم کر دی تو اس امر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصہ سے مؤکد کیا، فرعون نے جو تکذیب کی اور اس پر اور اس کی قوم پر غرق کی صورت میں جو عذاب آیا یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات کے ساتھ بھیجا وہ نو معجزات تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا گیا اور اچھا انجام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں مقرر کیا گیا یہی صورتحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

**يَضْحَكُوْنَ**۝ کا معنی ہے وہ استہزاء کرتے ہیں وہ اپنے پیروکاروں کو وہم دلاتے ہیں کہ وہ معجزات جادو اور وہم ہیں اور وہ بھی ان پر قادر ہیں۔

**وَ مَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا** حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بڑے معجزات میں سے تھے ان میں سے ہر ایک پہلے سے بڑا معجزہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلا معجزہ علم کا تقاضا کرتا تھا اور دوسرا بھی علم کا تقاضا کرتا تھا تو دوسرے کو پہلے کے ساتھ ملایا جاتا تو وضاحت میں اضافہ ہو جاتا۔ اخوت کا معنی مشاکلت اور مناسبت ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے: هذه صاحبة هذه۔ یعنی دونوں معنی میں قریب ہیں۔

**وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ** انہوں نے معجزات کو جو جھٹلایا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہیں **وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ** (اعراف: 130) عذاب سے مراد طوفان، ٹڈیاں، جوئیں اور مینڈک ہیں۔ یہ آخری آیات ان کے لیے عذاب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ**۝ شائد وہ کفر سے لوٹ آئیں۔

**وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ** جب انہوں نے عذاب کو دیکھا تو انہوں نے کہا: اے جادوگر! انہوں نے اس طرح ندا کی جس طرح وہ پہلے عادت کے مطابق ندا کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ علماء کو سحرہ کا نام دیتے انہوں نے بطور تعظیم آپ کو اسی نام سے پکارا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: **يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ**، اے عالم! ساحر ان کے نزدیک عظیم ہوا کرتا وہ اس کی تعظیم بجالایا کرتے تھے سحر صفت ذم نہیں تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اے وہ شخص جو اپنے سحر کی وجہ سے ہم پر غالب آگیا ہے، یہ جملہ کہا جاتا ہے: ساحرته فسحرته یعنی میں سحر کی وجہ سے اس پر غالب آگیا جس طرح عربوں کا قول ہے: خاصمته فخصمته یعنی میں خصومت کے ساتھ اس پر غالب آگیا اسی طرح فاضلته فضلته ہے۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ انہوں نے ساحر کا حقیقی معنی مراد لیا ہو اور گفتگو استفہام کے انداز میں کی ہو۔ آپ نے انہیں ملامت نہ کی ہو کیونکہ آپ ان کے ایمان لانے کی امید رکھتے تھے۔ ابن عامر، ابو حیوہ اور یحییٰ بن وثاب نے الف کو بغیر ہاء مضموم کے ساتھ اسے پڑھا ہے، اس کی علت یہ ہے کہ ھا کو ماقبل کے ساتھ ملا دیا گیا اور یاء کو وہ ضمہ لازم ہو گیا جو ندائے مفرد کی وجہ سے واجب تھا فراء نے یہ شعر پڑھا:

يأ ايهُ القلبُ اللّجُوجُ النفسِ أفق عن البيضِ الحسانِ اللُّعسِ

محل استدلال یا ایہُ ہے۔

ھا کا ضمہ یاء کے ضمہ پر محمول کرنے کی وجہ سے ہے۔ سورۂ نور میں اس کی وضاحت گذر چکی ہے۔ ابو عمرو، ابن ابی اسحاق، یحییٰ اور کسائی نے ایھا الف کے ساتھ اصل پر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے الف کے بغیر پڑھا ہے کیونکہ مصحف میں اسی طرح واقع ہوا ہے۔

اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ یعنی جس عہد کی تم نے ہمیں خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے وعدہ کیا کہ اگر ہم ایمان لائیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اسے دور کردے گا تو اللہ تعالیٰ سے سوال کیجئے تو وہ ہم سے اس تکلیف کو دور کردے اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ کہ ہم آنے والے وقت میں ہدایت پا جائیں گے فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ہم سے تکلیف کو رفع کر دیا اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝ یعنی وہ عہد جو انہوں نے اس بارے میں کیا تھا اس کو انہوں نے توڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا قول اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ انہوں نے اپنے بارے میں ایمان کی خبر دی جب ان سے عذاب دور ہو گیا تو وہ مرتد ہو گئے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب فرعون نے ان معجزات کو دیکھا تو اسے خوف ہوا کہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل ہو جائیگی تو اس نے کہا: نَادٰى، قال کے معنی میں ہے(1)؛ یہ ابو مالک کا نقطہ نظر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کے پاس قبطیوں کے سردار لوگ ہوں تو ان کے درمیان آواز کو بلند کیا پھر وہ تمام قبطیوں میں اس بات کو عام کر دیں گویا اس طریقہ سے ان میں ندا کی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس نے کسی کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم میں ندا کرے، یہ ابن جریج کا نقطہ نظر ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ یعنی اس بارے میں مجھ سے کوئی جھگڑا نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ مصر کے چالیس فرسخ کا ملک تھا، یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہاں ملک سے مراد اسکندریہ ہے وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ یعنی نیل کی نہریں۔ ان کی چار بڑی نہریں تھیں نہر ملک، نہر طولان، نہر دمیاط اور نہر تنیس۔ قتادہ نے کہا: وہاں باغات اور نہریں تھیں جو اس کے محل کے نیچے سے بہتی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے تخت کے نیچے سے بہتی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِنْ تَحْتِيْ سے مراد ہے میرا تصرف ان میں نافذ ہے ان میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ اس کی لگام کھینچتا تو نیل چلنے سے رک جاتا۔ قشیری نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ ربوبیت کے مدعی کے ہاتھ پر خارق للعادۃ امور کا ظہور مراد ہے کیونکہ الٰہ کو غیر سے تمیز کے لیے خارق للعادۃ امر کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ سے مراد قائدین، رؤساء اور جابرہ ہیں جو اس کے جھنڈے کے نیچے چلا کرتے تھے؛ یہ ضحاک کا قول ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہار سے مراد اموال ہیں ان کی کثرت اور ظہور کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 229		2۔ ایضاً

بنا پر انہیں انہار سے تعبیر کیا ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ میں انہیں ان افراد پر تقسیم کر دیتا ہوں جو میری اتباع کرتے ہیں کیونکہ ترغیب اور قدرت اموال میں ہوتی ہے انہار میں نہیں ہوتی۔

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝ کیا تم میری عظمت، قوت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کمزوری کو نہیں دیکھتے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم اپنے وسائل رزق پر میری قدرت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عجز کو نہیں دیکھتے وَ هٰذِهِ میں واؤ اس میں جائز ہو کہ عاطفہ ہو اور الْاَنْهٰرُ کا عطف مُلْكُ مِصْرَ پر ہو اور تَجْرِیْ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور اسم اشارہ ہو اور الْاَنْهٰرُ اسم اشارہ کی صفت ہو اور تَجْرِیْ مبتدا کی خبر ہو تَحْتِیْ کی یاء کو اہل مدینہ، بزی اور ابو عمرو نے فتحہ دیا ہے باقی قراء نے اسے ساکن قرار دیا ہے۔ رشید سے مروی ہے جب اس نے اس آیت کی تلاوت کی تو کہا: میں یہ اپنے غلاموں میں سے سب سے خوبصورت کو دوں گا تو اس نے وہ خصیب کو دے دیا وہ اُسے وضو کرایا کرتا تھا، عبد اللہ بن طاہر سے مروی ہے کہ وہ اس کا والی بنا اور اس کی طرف نکلا جب اس نے اس شہر کو دیکھا اور اس پر اس کی نظر پڑی کہا: کیا یہ وہ بستی ہے جس پر فرعون نے فخر کیا تھا یہاں تک کہ اس نے کہا تھا اَلَيْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ اللہ کی قسم! یہ تو اس سے کم درجہ کا ہے کہ میں اس میں داخل ہوں تو اس نے اپنی لگام موڑ لی۔

پھر اس کی حالت کی وضاحت کی اور کہا: اَمْ اَنَا خَيْرٌ ابو عبیدہ اور سدی نے کہا: ام یہاں بل کے معنی میں ہے (2)۔ یہ حرف عطف نہیں، اکثر مفسرین کا یہی قول ہے معنی ہے فرعون نے اپنی قوم سے کہا: بلکہ میں اس سے بہتر ہوں مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ یعنی اس کے لیے کوئی عزت نہیں وہ اپنی حقارت اور ضعف کے باعث اپنی حاجات کے لیے اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے۔

وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ۝ یہ بات اس نے اس لیے کی کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی جس طرح سورۂ طٰہٰ میں گذر چکا ہے۔ فراء نے کہا: ام میں دو وجوہ ہیں: اگر چاہے تو اسے استفہامیہ بنا دے کیونکہ یہ ماقبل کلام کے ساتھ متصل ہے اگر چاہے تو اسے عاطفہ بنا دے معطوف علیہ یہ کلام ہے اَلَيْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ زائدہ ہے ابو زید نے عربوں سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ام کو زائدہ قرار دیتے ہیں معنی ہوگا میں اس سے بہتر ہوں جو حقیر ذلیل ہے۔ اخفش نے کہا: کلام میں حذف ہے معنی ہوگا افلا تبصرون ام تبصرون۔

جس طرح شاعر نے کہا:

اَیَا ظَبْیَۃَ الْوَعْسَاءِ بَیْنَ جُلَاجِلٍ　　وَبَیْنَ النَّقَا آاَنْتِ اَمْ اُمُّ سَالِمٍ

مراد ہے کیا تو اچھا ہے یا ام سالم اچھی ہے۔

پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا فرمایا: اَنَا خَيْرٌ خلیل اور سیبویہ نے کہا: اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝ کا معنی ہے کیا تم دیکھنے والے ہو تو ام کے ساتھ تُبْصِرُوْنَ پر عطف کیا کیونکہ اَمْ اَنَا خَيْرٌ کا معنی ہے یا تم دیکھتے ہو کہ میں اس سے بہتر ہوں، اس کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 230　　2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 258

وجہ یہ ہے جب انہوں نے اسے کہا: انت خیر منہ فرعون کے نزدیک وہ دیکھنے والے اور بصیرت والے تھے۔
عیسیٰ ثقفی اور یعقوب حضرمی سے مروی ہے کہ وہ ام پر وقف کرتے تو اس بنا پر تقدیر کلام یہ ہوگی افلا تبصرون ام تبصرون تو دوسرا تبصرون حذف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے ام پر وقف کیا اس نے اسے زائدہ بنایا گویا اس نے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ پر وقف کیا۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک تبصرون پر کلام مکمل نہیں ہوتی کیونکہ ام ماقبل سے اتصال کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ پر وقف ہے پھر اَمْ اَنَا خَيْرٌ سے نیا کلام ہے اس کا معنی ہے بل انا بلکہ میں اس سے بہتر ہوں۔ فراء نے یہ شعر پڑھا:

بدت مثل قَرْنِ الشمس فی رَوْنَقِ الضحی صورتِها أم أنتِ فی العین أمْلَحُ(1)

اس میں بھی معنی ہے بل انت املح فراء نے ذکر کیا: ایک قاری نے پڑھا اما انا خیر اس کا معنی ہوگا کیا میں بہتر نہیں۔
مجاہد کے بارے میں مروی ہے وہ ام پر وقف کرتے پھر نئے سرے سے پڑھتے اَنَا خَيْرٌ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝

''اگر یہ سچا نبی ہے تو کیوں نہ اتارے گئے اس پر سونے کے کنگن یا کیوں نہ آئے اس کے ساتھ فرشتے قطار در قطار''۔

فَلَوْلَآ یہ ھلا کے معنی میں ہے اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اس نے یہ بات اس لیے کی تھی کیونکہ اس وقت یہی معمول تھا اور معززین کا لباس تھا۔ حفص نے اسے اسورۃ پڑھا ہے جو سوار کی جمع ہے جس طرح خمار کی جمع اخمرۃ آتی ہے باقی قراء نے اساورۃ پڑھا ہے جو اسورۃ کی جمع ہے حضرت ابن مسعود نے اسے اساویر پڑھا ہے باقی قراء نے اساورۃ پڑھا ہے جو اسورۃ کی جمع ہے یہ جمع کی جمع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اساورۃ، اسوار کی جمع ہو جمع میں ھاء، یاء کے عوض میں لاحق کی گئی ہے؛ جس طرح زنادیق، زنادقہ، بطاریق بطارقہ کی جمع ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اساورہ، اساورا اور اساویر کی واحد اسوار ہے یہ سوار میں ایک لغت ہے۔ مجاہد نے کہا: جب وہ کسی کو سردار بناتے تو اسے دو کنگن پہناتے اور گلے میں سونے کا ایک طوق ڈالتے۔ یہ اس کے سردار ہونے کی علامت ہوتی فرعون نے کہا: اگر یہ سچا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب نے اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں پھینکے؟

اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ یعنی پے در پے؛ یہ قتادہ کا قول ہے(2)۔ مجاہد نے کہا: وہ اکٹھے چلتے ہیں(3)؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو ان کی مخالفت کرتا اس کے خلاف انکی مدد کرتے معنی ہے اس کے ساتھ ملائکہ کیوں نہ ملائے گئے جن کے بارے میں وہ گمان کرتا ہے کہ وہ اس کے رب کے پاس ہوتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ ملکر وہ تعداد میں زیادہ ہو جاتا اور اپنے امر و نہی میں انہیں کام میں لاتا یہ امر دلوں میں زیادہ ہیبت کا باعث ہوتا اس نے اپنی قوم کو وہم دلایا کہ اللہ کے رسل کے بارے میں مناسب یہی ہے کہ وہ جنگوں میں بادشاہوں کے رسول کی طرح ہوں اسے علم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے

1۔ التفسیر الکبیر، جلد 8، صفحہ 22 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 231 3۔ ایضاً

رسولوں کی آسمانی لشکروں سے مدد کی جاتی ہے ہر دانشمند آدمی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کی جب کہ وہ یکہ وتنہا تھے اور فرعون کے پاس لشکروں کی تعداد بے شمار تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو مدد عصا اور ید بیضاء کے ساتھ کی ہے وہ اس سے زیادہ مؤثر تھی اس کی بنسبت کہ ان کے کنگن ہوتے یا ان کے مددگار فرشتے ہوتے؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ یہ ان کی سچائی پر دلیل ہوگی، یہ کلبی کا قول ہے یہ لازم نہیں آتا کیونکہ معجزہ کافی ہوتا ہے یہ جائز تھا کہ فرشتوں کے آنے کے ساتھ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی جاتی جس طرح معجزات کے ظہور کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی جاتی فرعون نے ملائکہ کا ذکر اس لیے کیا تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کا ذکر کرتے تھے کیونکہ جو آدمی فرشتوں کے خالق کو نہیں پہچانتا وہ ملائکہ پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔

**فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝۵۴**

''یوں اس نے احمق بنادیا اپنی قوم کو سو وہ اس کی پیروی کرنے لگے درحقیقت یہ نافرمان لوگ تھے''۔

**فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ** ابن اعرابی نے کہا: معنی ہے اس نے اپنی قوم کو جاہل جانا **فَاَطَاعُوْهُ** تو انہوں نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کی اطاعت کی یہ جملہ کہا جاتا ہے: استخفه یعنی اسے جہالت پر برانگیختہ کیا اسی معنی میں ہے ولا یستخفنك الذین لایوقنون ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے انہیں گفتگو کے ساتھ دھمکایا تو قوم نے جھٹلانے میں اس کی اطاعت کی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: استخف قومه۔ یعنی اس نے انہیں کم عقل پایا۔ یہ امر اس چیز پر دلالت نہیں کرتا کہ ان پر اطاعت کرنا واجب تھا تو اس صورت میں اضمار کی ضرورت ہوگی اس کی تقدیر کلام یہ ہے وجدھم خفاف العقول فدعاھم الی الغوایة فاطاعوہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے اپنی قوم کو دھمکایا اور ان پر جبر کیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کی اتباع کی یہ کہا جاتا ہے: استخفه یہ استثقله کے برعکس ہے۔ استخف به اس کو ذلیل کیا۔

**اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝** وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے خارج تھے۔

**فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۵۵**

''پس جب انہوں نے ہمیں ناراض کردیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پھر ہم نے ان سب کو غرق کردیا''۔

**فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ** ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: وہ ہم پر غصے ہوا اور ہم پر غضبناک ہوا (2)۔ علی بن ابی طلحہ نے ان سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ہم سے ناراض ہوگیا۔ ماوردی نے کہا: دونوں کا معنی مختلف ہے دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ سخط سے مراد ناپسندیدگی کا اظہار ہے اور غضب سے مراد انتقام کا ارادہ ہے قشیری نے کہا: یہاں اسف سے مراد غضب ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت کی جاتی ہے یا تو اس سے مراد سزا دینا ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ صفات ذات میں سے ایک صفت ہوگی یا عین سزا ہوگی تو اس صورت میں یہ صفات فعل میں سے ہوگی؛

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 231 2۔ ایضاً

ماوردی کے قول کا یہی معنی ہے۔ عمر بن ذر نے کہا: اے اللہ کی نافرمانی کرنے والو! اللہ تعالیٰ جو تم سے طویل وقت تک حلم کیے ہوئے ہے اس سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو اس کی پکڑ سے ڈرو، کیونکہ اس نے ارشاد فرمایا: فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے اٰسَفُوْنَا وہ ہمارے رسولوں اور ہمارے مومن اولیاء پر غضبناک ہوئے جس طرح علماء اور بنی اسرائیل یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ (احزاب: 57) یحاربون الله مراد اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور اس کے رسول ہیں۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾

''اور بنا دیا انہیں پیش رو اور کہاوت پچھلوں کے لیے''۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا ہم نے قوم فرعون کو پیش رو بنایا۔ ابو مجلز نے کہا: یعنی جوان جیسا عمل کرے ان کا پیش رو بنا دیا اور جوان جیسا عمل کرے اس کے لیے نمونہ بنا دیا (1)۔ مجاہد نے کہا: سَلَفًا یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو خبر دینے والا اور مَثَلًا یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے عبرت بنا دیا (2)۔ ان سے یہ بھی قول مروی ہے آپ کی قوم کے کفار کے لیے قیادت کرنے والا بنا دیا وہ جہنم کی طرف ان کے آگے آگے چل رہے ہوں گے۔ قتادہ نے کہا: جہنم کی طرف آگے جانے والا اور بعد میں آنے والوں کے لیے نصیحت۔ سلف کا معنی آگے جانے والا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: سَلَفَ یَسْلُفُ سَلَفًا، جس طرح طلب یطلب طلبا ہے جس کا معنی آگے جانا اور گذرنا۔ سلف له عمل صالح یعنی آگے چلا گیا القوم السلاف۔ آگے جانے والے لوگ۔ سلف الرجل۔ آگے جانے والے آباء اس کی جمع اسلاف اور سلاف ہے عام قراءت سَلَفًا ہے یہ سالف کی جمع ہے جس طرح خادم کی جمع خدم ہے، راصد کی رصد ہے، حارس کی جمع حرس ہے۔

حمزہ اور کسائی کی قراءت سُلُفًا فراء نے کہا یہ سلیف کی جمع ہے جس طرح سریر کی جمع سرر آتی ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ سلف کی جمع ہے جس طرح خشب کی جمع خُشُب ۔ ثمر کی جمع ثُمُر آتی ہے دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن مسعود، حضرت علقمہ، حضرت ابووائل، نخعی اور حمید بن قیس نے اسے سلفا پڑھا ہے یہ اسفلة کی جمع ہے یعنی گذر جانے والی جماعت۔ مورج اور نضر بن شمیل نے کہا: سُلفا یہ سُلفة کی جمع ہے جس طرح غرفته کی جمع غرف اور طرفه کی جمع طرف ظلمته کی جمع ظلم آتی ہے۔

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ یَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور جب بیان کیا جاتا ہے مریم کے فرزند (عیسیٰ) کا حال تو آپ کی قوم اس سے شور و غل مچا دیتی ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ تو مشرکوں نے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امر کے ساتھ جوڑا اور کہا: (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ ہم اسے اپنا الٰہ بنالیں جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو الٰہ بنالیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے اسی کی مثل مجاہد کا قول ہے قریش نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت کریں جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 232 2۔ ایضاً

کی قوم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کی تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ مناظرہ ہے جو عبدالله بن زبعری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا تھا یہ مثال دینے والا عبدالله بن زبعری تھا جو اس نے حالت کفر میں مثال دی تھی جب قریش نے اس سے کہا: بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تلاوت کرتے ہیں اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء:98) اس نے کہا: اگر میں ان کے پاس حاضر ہوتا تو میں جواب دیتا۔ انہوں نے اس سے پوچھا: تو انہیں کیا کہتا؟ اس نے کہا: میں انہیں کہتا: یہ حضرت مسیح علیہ السلام ہیں جن کی نصاریٰ عبادت کرتے ہیں اور یہ یہودی ہیں جو حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں کیا وہ دونوں جہنم کا ایندھن ہیں؟ قریش اس کی گفتگو سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے خیال کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سامنے لاجواب ہو جائیں گے الله تعالیٰ کے فرمان: يَصِدُّوْنَ کا بھی یہی معنی ہے تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (انبیاء) اگر ابن زبعری آیت پر غور کرتا تو اس پر اعتراض نہ کرتا کیونکہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا تَعْبُدُوْنَ یہ ارشاد نہیں فرمایا و من تعبدون الله تعالیٰ نے اس سے مراد بت اور غیر ذوی العقول چیزیں لی ہیں۔ الله تعالیٰ نے اس سے حضرت مسیح اور فرشتے مراد نہیں لیے اگرچہ ان کی عبادت کی جاتی ہے۔ سورۂ انبیاء کے آخر میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش سے فرمایا: ''اے قریش کی جماعت! اس میں کوئی بھلائی نہیں جس کی الله تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہو؟'' انہوں نے سوال کیا: کیا تو یہ گمان نہیں کرتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بندے اور نبی تھے اور عبد صالح تھے اگر بات اس طرح ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو تو ان کی بھی الله تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وہ یوں آواز نکالتے ہیں جس طرح وہ اونٹ آواز نکالتا ہے جس پر بوجھ لادا جائے۔

نافع، ابن عامر اور کسائی نے يَصُدون صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی اعرض کرنا ہے، یہ نخعی کا قول ہے باقی قراء نے اسے کسرہ دیا ہے۔ کسائی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح يَعْرِشُون اور يَعْرُشُون۔ يَنِمون اور ينمون۔ اس کا معنی شور و غل ہے۔ جوہری نے کہا: صدّ اور يَصِدّ صديدا، شور و غل کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضمہ کے ساتھ صدود سے مشتق ہے جس کا معنی اعراض کرنا ہے اور کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی شور و غل کرنا ہے؛ یہ قطرب کا قول ہے۔ ابوعبید نے کہا: اگر یہ حق سے اعراض کرنے کے معنی میں ہو تو مطلب ہوگا آپ کی قوم حق سے اعراض کرتی ہے۔ فراء نے کہا: دونوں برابر ہیں صلہ من ہو یا عن ہو۔ ابن مسیب نے کہا: يصدون کا معنی شور و غل کرنا ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ آوازیں بلند کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ہنستے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: جس نے صاد کو ضمہ دیا ہے تو اس کا معنی ہوگا وہ اعراض کرتے ہیں تو معنی ہوگا وہ میلان کی وجہ سے اعراض کرتے ہیں يصدون کو من کے ساتھ متعدی نہیں کرتے جس نے صاد کو کسرہ دیا تو اس کا معنی ہے وہ شور و غل کرتے ہیں مِن، يصدون کے ساتھ متصل ہے معنی ہے وہ اسے سن کر شور و غل کرتے ہیں۔

وَ قَالُوْۤا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝۵۸

''اور کہتے ہیں: کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ، وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لیے درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں''۔

وَ قَالُوْۤا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ یعنی کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا حضرت عیسیٰ؟ یہ سدی کا قول ہے کہا: انہوں نے نبی کریم ﷺ سے جھگڑا کیا اور کہا: اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی بھی عبادت کی جاتی ہے وہ جہنم میں ہوگا تو ہم اس بات پر راضی ہیں کہ ہمارے معبود حضرت عیسیٰ علیہ السلام، فرشتوں اور حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ ہوں (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝۱۰۱ (انبیاء) قتادہ نے کہا: وہ اَمْ هُوَ سے حضرت محمد ﷺ مراد لیا کرتے تھے (2)۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے آلھتنا خیرام ھذا یہ قتادہ کے قول کی تائید کرتا ہے یہ استفہام تقریری ہے کہ ان کے معبود بہتر ہیں۔ کوفیوں اور یعقوب نے جدلا پڑھا ہے یہ حال ہے جدلین کا معنی دے رہا ہے یعنی انہوں نے آپ کے لیے یہ مثال بیان نہیں کی مگر جھگڑا مقصود تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) سے مراد وہ چیزیں ہیں جن بے جان چیزوں کو انہوں نے معبود بنا لیا تھا۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝۵۸ بلکہ وہ باطل کے ساتھ جھگڑا کرنے والے ہیں۔ صحیح ترمذی میں حضرت ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی قوم ہدایت کے بعد گمراہ نہیں ہوئی مگر انہوں نے جھگڑا کیا (3)'' پھر رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝۵۹ وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝۶۰

''نہیں ہے عیسیٰ مگر ایک بندہ ہم نے انعام فرمایا ہے ان پر اور ہم نے بنادیا ہے انہیں ایک نمونہ بنی اسرائیل کے لیے۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم بنادیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے''۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک بندہ ہیں اللہ تعالیٰ نے جس پر نبوت کا انعام کیا ہے اور بنی اسرائیل کے لیے مثال بنادیا ہے یعنی ایک آیت اور عبرت بنادیا ہے جس کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کیا جاتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہ تھا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ معجزات عطا کیے وہ مردوں کو زندہ کرتے، مادرزاد اندھوں، برص کے مریضوں اور تمام قسم کی امراض سے تندرست کردیتے جبکہ ان کے زمانہ میں اس قسم کی شان کسی اور کو نہ دی گئی جبکہ اس زمانہ میں بنی اسرائیل بہترین مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے سب سے محبوب بندے تھے جبکہ لوگ ان سے درجہ میں کم تھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منعم علیہ سے مراد حضرت محمد ﷺ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 61

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 234

3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، من سورۃ زخرف، جلد 2، صفحہ 157

ذات ہے جبکہ پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔

**وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ** اگر ہم چاہتے تو تمہارے بدلے بناتے **مَّلٰٓىِٕكَةً** جو تمہارے خلیفہ ہوتے؛ یہ سدی کا قول ہے اسی کی مثل مجاہد سے مروی ہے کہا: فرشتے جو تمہاری بجائے زمین کو آباد کرتے (1)۔ ازہری نے کہا: مِنْ بعض اوقات بدل کے لیے آتا ہے اس کی دلیل یہ آیت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی سورۂ براءت اور دوسری سورتوں میں بھی گذر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ہم چاہتے تو انسانوں میں سے فرشتے بنا دیتے اگرچہ یہ عادت نہیں ہے، جواہر سب ایک ہی جنس ہیں، اختلاف اوصاف کی بنا پر ہے معنی ہے اگر ہم چاہتے تو ہم زمین میں فرشتے بنا دیتے انہیں آسمانوں میں ٹھہرانا یہ ان کا شرف نہیں کہ ان کی عبادت کی جانے لگے اور انہیں کہا جانے لگے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں **يَخْلُفُوْنَ** کا معنی ہے وہ ایک دوسرے کی نیابت کرتے (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

**وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝**

"اور بے شک وہ ایک نشانی ہیں قیامت کے لیے پس ہرگز شک نہ کرو اس میں اور میری پیروی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔ کہیں روک نہ دے تمہیں شیطان اس راہ سے بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

**وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا** حضرت حسن بصری، قتادہ اور سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ یہ قیامت کے قریب ہونے پر دلالت ہے یا اس کے ذریعے قیامت، اس کی ہولناکیوں اور احوال کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، سدی اور قتادہ نے یہی کہا ہے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظاہر ہونا ہے یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے وقوع سے تھوڑا پہلے انہیں آسمان سے نازل فرمائے گا جس طرح دجال کا ظاہر ہونا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، قتادہ، مالک بن دینار اور ضحاک نے اسے وانه لعلم الساعة عین اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی نشانی ہے۔ عکرمہ سے دو لاموں کے ساتھ للعلم مروی ہے۔ یہ مصاحف کے خلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملے تو سب نے قیامت کا ذکر کیا انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کو شروع کیا اور انہوں نے حضرت ابراہیم سے پوچھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اس بارے میں کوئی علم نہ تھا پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تو ان کے پاس بھی کوئی علم نہ تھا تو گفتگو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹائی گئی تو انہوں نے کہا: مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ وجبہ کے بعد ہے جہاں تک وجبہ کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا اور دجال کے ظاہر ہونے کا ذکر کیا کہا: میں اتروں گا اور اسے قتل

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 249		2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 61		3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 234

کردوں گا اور حدیث کا ذکر کیا (1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے: اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم کو مبعوث کرے گا دمشق کے مشرق میں سفید مینارہ کے پاس اتریں گے وہ حلہ زیب تن کیے ہونگے اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے سروں پر رکھے ہونگے جب اپنا سر نیچے جھکائیں گے تو اس سے پانی کے قطرے گریں گے اور جب سر اوپر اٹھائیں گے تو اس سے موتی گریں گے جو لولو کی طرح ہونگے کافر کے لیے حلال نہیں ہوگا کہ وہ آپ کے سانس کی ہوا پائے مگر جو پائے ہوگا وہ مرجائے گا اس کی سانس وہاں تک پہنچے گی جہاں تک نظر پہنچے گی آپ دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ آپ اسے لُدّ کے دروازے پر پائیں گے اور اسے قتل کردیں گے (2)۔

ثعلبی، زمخشری اور دوسرے مفسرین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارض مقدس کے ایک ٹیلہ پر آسمان سے اتریں گے جس ٹیلہ کو افیق کہتے ہیں دو کپڑے زیب تن کیے ہونگے جو ہلکے سے زرد ہونگے ان کے سر کے بالوں کو تیل لگا ہوگا، ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ ہوگا امام ان کی امامت کروا رہا ہوگا امام پیچھے ہٹے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے آگے کریں گے اور اسی امام کے پیچھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق نماز پڑھیں گے پھر آپ خنزیروں کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، کنیسوں اور گرجوں کو برباد کردیں گے، نصاریٰ کو قتل کریں گے مگر جو ایمان لے آیا'' (3)۔

خالد نے حضرت حسن بصری سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''انبیاء علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں (شریعتیں) مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے قریبی ہوں اس کے اور میرے درمیان کوئی نبی نہیں وہ سب سے پہلے آسمان سے اتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور اسلام کے حق میں لوگوں سے جنگ کریں گے'' (4)۔

ماوردی نے کہا: ابن عیسیٰ نے ایک قوم سے یہ بیان کیا انہوں نے کہا: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے تو لوگوں کو مکلف بنانے کا معاملہ اٹھالیا جائیگا تاکہ وہ اس زمانہ کی طرف رسول نہ ہوں جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیں اور انہیں روکیں۔ یہ قول تین وجوہ سے مردود ہے: ان میں سے ایک حدیث بھی ہے، دوسری وجہ یہ ہے دنیا کی بقا امور کا مکلف ہونے کا تقاضا کرتی ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے کی حیثیت میں اتریں گے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے امر صرف اسلام کی تائید اسلام کا حکم دینے اور اس کی طرف دعوت دینے تک محدود ہو۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت عیسیٰ بن مریم عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے وہ صلیب کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائیگا اس پر تیز رفتاری سے سفر نہیں کیا جائیگا دشمنی، باہمی بغض اور حسد ختم ہوجائے گا ایک آدمی مال لینے کو دعوت دے گا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، فتنۃ الدجال و خروج عیسیٰ ابن مریم، صفحہ 309

2۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، ذکر الدجال، جلد 2، صفحہ 399　　3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 235　　4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 235

تو اسے کوئی قبول نہیں کرے گا(1)'' ان سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارا کیا حال ہوگا جب حضرت ابن مریم اتریں گے اور تمہارا امام تم سے ہوگا'' ایک روایت میں ہے ''تمہاری امامت تم میں سے ایک آدمی کرے گا(2)'' ابن ابی ذئب نے کہا: تو جانتا ہے امکم منکم سے کیا مراد ہے؟ میں نے کہا: تو مجھے بتائے گا۔ کہا: ''وہ تمہاری امامت تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کے مطابق کرائے گا'' ہمارے علماء نے کہا: یہ روایت اس امر میں نص ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے دین کے مجدد کے طور پر اتریں گے جو دین انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سیکھا ہوگا وہ کسی نئی شرع کے ساتھ نہیں اتریں گے جبکہ احکام کے مکلف ہونے کا سلسلہ باقی ہوگا جس طرح ہم نے یہاں اور کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا قیامت اور مردوں کو دوبارہ اٹھانے پر دلیل ہے؛ یہ ابن اسحاق نے کہا۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال موجود ہے کہ معنی ہو کہ حضرت محمد ﷺ قیامت کی نشانی ہوں اس کی دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں اور قیامت یوں مبعوث کیے گئے ہیں(3)'' اور آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملایا اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی حضرت محمد ﷺ ہیں(4)۔

فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا تم قیامت میں شک نہ کرو؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ سدی نے کہا: تم اس کو نہ جھٹلاؤ اور تم اس میں جھگڑا نہ کرو کیونکہ یہ لازماً ہو کر رہنے والی ہے(5) وَاتَّبِعُوْنِ تم توحید کے عقیدہ میں میری اتباع کرو اور جو میں تمہیں تبلیغ کرتا ہوں اس میں میری اتباع کرو۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب جانے والا سیدھا راستہ ہے یعنی اس کی جنت کی طرف جانے والا سیدھا راستہ ہے۔ یعقوب نے وَاتَّبِعُوْنِ میں دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے اسی طرح اطیعون میں قائم رکھا ہے۔ ابو عمرو اور اسماعیل نے نافع سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وصل میں قائم رکھا اور وقف میں حذف کر دیا باقی قراء نے دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اس کے وساوس سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ جھگڑا کرنے والے کفار کو شیطان سے تشبیہ دی گئی کیونکہ انبیاء کی شریعتیں توحید میں مختلف نہیں اور قیامت کے بارے میں انہوں نے جو خبریں دی ہیں اسی طرح جنت یا دوزخ کے بارے میں انہوں نے جو خبریں دی ہیں اس میں وہ مختلف نہیں۔

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، جلد 1، صفحہ 17۔ سنن ابن ماجہ، باب فتنة الدجال و خروج عیسیٰ بن مریم، حدیث 4067
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، جلد 1، صفحہ 87 3۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، قرب الساعة، جلد 2، صفحہ 406
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 9 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 236

تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾

''اور جب آئے (عیسیٰ علیہ السلام) روشن نشانیاں لے کر تو فرمایا: میں آیا ہوں تمہارے پاس حکمت لے کر اور میں بیان کروں گا تم سے کچھ وہ بات جس میں تم اختلاف کرتے ہو پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور میری فرمانبرداری کیا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ وہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اس کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے''۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بینات سے مراد مردوں کو زندہ کرنا، مریضوں کو صحت مند کرنا، پرندوں کو بنانا، دسترخوانوں کا نزول وغیرہ اور بہت سی غیب کی خبریں دینا۔ قتادہ نے کہا: یہاں بینات سے مراد انجیل ہے۔

قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ حکمت سے مراد نبوت ہے، یہ سدی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد ایسا علم ہے جو نیکی کی طرف لے جائے اور برائی سے روک دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد انجیل ہے؛ یہ قشیری اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ مجاہد نے کہا: مراد ہے جو تورات میں تبدیلی کی گئی (1)۔ زجاج نے کہا: میں انجیل میں بعض ایسی چیزیں تمہارے لیے بیان کردوں گا تورات میں تبدیلی کے متعلق تم جن میں باہم اختلاف کرتے ہو۔ مجاہد نے کہا: جن چیزوں کے وہ محتاج ہیں انجیل کے علاوہ ان کے لیے واضح کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تورات کے احکام کے بارے میں انہوں نے جو اختلاف کیا جس قدر انہوں نے سوال کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے واضح کیا۔ یہ بھی جائز ہے انہوں نے اس کے علاوہ میں اختلاف کیا جس کے بارے میں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال نہ کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد بنی اسرائیل نے دین کے امور میں کچھ چیزوں میں اختلاف کیا اور دنیاوی امور میں سے چند چیزوں کے بارے میں اختلاف کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے دینی امر کے بارے میں واضح کر دیا۔

ابوعبیدہ کا مذہب یہ ہے کہ یہاں بعض، کل کے معنی میں ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ (غافر: 28) اخفش نے لبید کا شعر پڑھا:

تراك أمكنة إذا لم أرضها　　أو تعتلق بعض النفوس حمامها (2)

موت بعض نفوس کے متعلق نہیں ہوتی موت کو علوق اور علاقہ کہتے ہیں۔ مفضل بکری نے کہا:

وسائلة بثَعْلَبَة بن سَيْر　　وقد عَلِقت بثعلبة العَلُوق

ثعلبہ بن سیر کو کتنے پوچھنے والے ہیں جبکہ موت ثعلبہ کے ساتھ متعلق ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 236　　2۔ احکام القرآن للطبری، جز 26-25، صفحہ 109

مقاتل نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی طرح ہے: وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (آل عمران:50) یعنی انجیل میں وہ چیزیں حلال کرنے والا ہوں جن کو تورات میں حرام کر دیا گیا تھا جس طرح اونٹ کا گوشت، ہر حیوان کی چربی، ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار کرنا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ شرک سے بچو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جب؛ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ الٰہ ہو یا ابن الٰہ ہو۔

وَاَطِيْعُوْنِ یعنی توحید اور دوسرے امور کی طرف دعوت دیتا ہوں اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ اللہ تعالیٰ کی عبادت صراط مستقیم ہے اس کے سوا ٹیڑھا راستہ ہے اس پر چلنے والا حق تک پہنچنے والا ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

”پھر اختلاف کرنے لگے (ان کے) گروہ آپس میں پس ہلاکت ہے ظالموں کے لیے دردناک عذاب کے دن سے۔ کیا یہ لوگ قیامت برپا ہونے کے منتظر ہیں کہ آ جائے ان پر اچانک اور انہیں خبر تک نہ ہو“۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ قتادہ نے کہا: یہاں من، ما کے معنی میں ہے ان کے بارے میں دو قول ہیں (1) اس سے مراد یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب ہیں انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی (1)؛ یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے (2) نصاریٰ کی مختلف جماعتیں ہیں نسطوریہ، ملکیہ، یعاقبہ، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا نسطوریہ نے کہا: وہ ابن اللہ ہیں۔ یعاقبہ نے کہا: وہ اللہ ہے۔ ملکیہ نے کہا: وہ تین میں سے تیسرا ہے، ان میں سے ایک اللہ ہے؛ یہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے۔ سورۂ مریم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا انہوں نے کفر اور شرک کیا جس طرح سورۂ مریم میں ہے مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ یعنی جس کا عذاب دردناک ہے اسی کی مثل لیل نائم ہے اس رات میں سویا جاتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ واؤ ضمیر سے مراد احزاب ہیں یعنی وہ انتظار نہیں کرتے اِلَّا السَّاعَةَ سے مراد قیامت ہے اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً، بغتة یعنی اچانک۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ کئی اور مواقع پر یہ بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے عرب کے مشرک صرف قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اس تعبیر کی بنا پر اضراب سے مراد وہ قبائل ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے خلاف اکٹھ کیا تھا اور مشرکین میں سے جنہوں نے آپ کو جھٹلایا یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا کے ساتھ متصل ہے۔

اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 237

’’گہرے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہونگے بجز ان کے جو متقی اور پرہیز گار ہیں‘‘۔

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ یوم سے مراد یوم قیامت ہے بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ یعنی وہ دشمن ہیں جو ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۷﴾ کیونکہ وہی دنیا وآخرت میں دوست ہیں؛ یہ معنی حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ نقاش نے حکایت بیان کی ہے کہ یہ آیت امیہ بن خلف جمحی، عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی وہ دونوں دوست تھے (1) عقبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا تھا قریش نے کہا: عقبہ بن ابی معیط صابی ہو گیا۔ امیہ نے اس سے کہا: اگر تو محمد سے ملا اور تو نے اس کے منہ پر نہ تھوکا تو میرا تجھ سے ملنا حرام ہوگا۔ عقبہ نے ایسا ہی کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کی نذر مانی اور اسے غزوہ بدر کے موقع پر قتل کر دیا۔ امیہ معرکہ میں قتل ہو گیا انہیں کے متعلق آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ثعلبی نے اس آیت کے بارے میں ذکر کیا ہے دو مومن دوست تھے اور دو کافر دوست تھے دو مومنوں میں سے ایک مر گیا اس نے عرض کی: اے میرے رب! فلاں آدمی مجھے تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا تھا وہ مجھے بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکا کرتا تھا اور وہ مجھے خبر دیتا تھا کہ میں تجھ سے ملاقات کرنے والا ہوں، اے میرے رب! اسے میرے بعد گمراہ نہ کرنا اسے اس طرح ہدایت دینا جس طرح اس نے مجھے ہدایت دی، اسے عزت بخشنا جس طرح اس نے مجھے عزت بخشی۔ جب اس کا مومن دوست فوت ہوگا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو جمع کرے گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم میں سے ہر ایک دوست اپنے ساتھی کی تعریف کرے گا ایک عرض کرے گا: اے میرے رب! یہ مجھے تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا تھا وہ مجھے بھلائی کو حکم دیتا اور مجھے برائی سے روکا کرتا تھا اور مجھے بتاتا تھا کہ میں تجھ سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: وہ کتنا اچھا دوست ہے کتنا اچھا بھائی اور کتنا اچھا ساتھی ہے۔ کہا: کافروں میں سے ایک مرے گا اور کہے گا: اے میرے رب! فلاں آدمی مجھے تیری اطاعت سے اور تیرے رسول کی اطاعت سے روکتا تھا وہ مجھے برائی کا حکم دیتا تھا اور مجھے نیکی سے روکتا تھا اور مجھے بتاتا تھا کہ میں تجھ سے ملاقات کرنے والا نہیں ہوں۔ اے میرے رب! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اسے میرے بعد ہدایت نہ دینا۔ اور اسے اسی طرح گمراہ کرنا جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اور اسے ذلیل ورسوا کرنا جس طرح تو نے مجھے ذلیل ورسوا کیا ہے جب اس کا کافر دوست مرتا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں سے فرماتا ہے: تم دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی تعریف کرے وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! مجھے تیری نافرمانی اور تیرے رسول کی نافرمانی کا حکم دیتا تھا وہ مجھے برائی کا حکم دیتا تھا خیر سے منع کرتا تھا اور مجھے بتایا کرتا تھا کہ میں تجھ سے ملاقات کرنے والا نہیں ہوں میں تیری بارگاہ میں سوال کرتا ہوں کہ تو اس پر عذاب دوگنا کر دے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو کتنا برا ساتھی، بھائی اور دوست ہوگا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک ساتھی پر لعنت کرے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت ہر مومن، متقی، کافر اور گمراہ کے بارے میں عام ہے۔

یٰعِبَادِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡكُمُ الۡیَوۡمَ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۸﴾

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 238

''اے میرے (پیارے) بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم آج غمزدہ ہوگے''۔

مقاتل نے کہا اور اسے معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے: منادی کرنے والا کھلی جگہ اعلان کرے گا اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں۔ کھلے میدان والے اپنے سروں کو اوپر اٹھائیں گے تو منادی کرنے والا کہے گا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ تو مسلمانوں کے علاوہ تمام ادیان والے اپنے سروں کو جھکالیں گے۔ محاسبی نے رعایہ میں ذکر کیا ہے: اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن منادی کرنے والا ندا کرے گا: يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ مخلوقات اپنے سروں کو اوپر اٹھائے گی وہ کہیں گے: ہم الله کے بندے ہیں (1)۔ پھر دوبارہ وہ ندا کرے گا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ کفار اپنے سروں کو جھکالیں گے اور موحد اپنے سروں کو اٹھائے رکھیں گے پھر وہ تیسری دفعہ اعلان کرے گا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ (یونس) تو گناہ کبیرہ کرنے والے اپنا سر جھکائیں گے اور تقویٰ اختیار کرنے والے اپنے سر اٹھائے رکھیں گے جبکہ الله تعالیٰ نے ان سے خوف اور حزن کو زائل کر دیا ہوگا جس طرح الله تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہوگا کیونکہ وہ معززین میں سے سب سے معزز ہے وہ اپنے ولی کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا اور ہلاکت کے وقت اسے کسی کے سپرد نہیں کرتا۔ اسے يٰعِبَادِ پڑھا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''یعنی وہ بندے جو ایمان لے آئے تھے ہماری آیتوں پر اور فرمانبردار تھے۔ (حکم ہوگا) داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں خوش خوش''۔

زجاج نے کہا: اَلَّذِيْنَ۔ عبادی کی صفت کے طور پر محل نصب میں ہے کیونکہ عبادی منادی مضاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے ھم الذین آمنوا یا ہے الذین آمنوا یقال لھم ادخلوا الجنۃ۔

ابو بکر اور زر بن حبیش نے یاعبادیَ پڑھا ہے یاء مفتوح ہے اور دونوں حالتوں میں ثابت ہے اسی وجہ سے نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور رویس نے دونوں حالتوں میں یاء ساکنہ کو ثابت رکھا ہے باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے کیونکہ اہل شام اور اہل مدینہ کے مصاحف میں یاء ثابت ہے کسی اور مصحف میں یاء نہیں ہے۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی انہیں کہا جائے گا: تم جنت میں داخل ہو جاؤ یا کہا جائے گا: اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو جنت میں داخل ہو جاؤ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ یعنی جو دنیا میں مسلمان تھیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومنوں میں سے جو تمہارے ساتھی ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حور عین میں سے جو تمہاری ازواج ہیں۔

تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ تمہاری عزت کی جائیگی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے یعنی مقام و منزل کے اعتبار سے تم معزز

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 143
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 238

ہوگے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: تمہیں خوش کیا جائیگا اس سے مراد دل میں خوشی ہے۔ قتادہ نے کہا: تم پر انعام کیا جائے گا اس سے مراد بدن میں نعمت ہے۔ مجاہد نے کہا: تمہیں خوش کیا جائے گا اس سے مراد آنکھ میں خوشی ہے۔ ابن ابی نجیح نے کہا: تمہیں خوش کیا جائے گا یہاں عجب سے مراد اس چیز کا پانا ہے جو پسند ہو۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: اس سے مراد سماع کے ذریعے لذت حاصل کرنا ہے۔ سورۂ روم میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَہَبٍ وَّ اَکۡوَابٍ ۚ وَ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ وَ اَنۡتُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۱﴾

''گردش میں ہونگے ان پر سونے کے تھال اور جام اور وہاں ہر چیز موجود ہوگی جسے دل پسند کریں اور آنکھوں کو لذت ملے (مزید برآں) تم وہاں ہمیشہ رہو گے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَہَبٍ وَّ اَکۡوَابٍ یعنی ان کے لیے جنت میں کھانے اور مشروبات ہونگے جنہیں سونے اور چاندی کے تھالوں میں ان پر گھمایا جائے گا، یہاں کھانوں اور مشروبات کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ تھالوں اور پیالوں کے گھمانے کا کوئی مطلب نہیں جب ان میں کھانے اور مشروبات نہ ہوں۔ صحاف میں سونے کا ذکر کیا جبکہ اکواب میں اس کے ذکر سے استغنا برتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ الذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّالذّٰکِرٰتِ (احزاب:35)

صحیحین میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: لا تلبسوا الحریر ولا الدیباج ولا تشربوا فی آنیۃ الذھب والفضۃ ولا تأکلوا فی صحافھا فانھا لھم فی الدنیا ولکم فی الآخرۃ(1)۔ ریشم اور دیباج کا لباس نہ پہنو اور سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو ان کے پیالوں میں نہ کھاؤ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے دنیا میں ہیں اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔ سورۂ الحج میں یہ گذر چکا ہے جس نے ان دونوں میں دنیا میں کھایا یا دنیا میں ریشم کا لباس پہنا اور توبہ نہ کی آخرت میں ہمیشہ کے لیے اس پر یہ چیزیں حرام کردی جائیں گی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مفسرین نے کہا: جنت میں سب سے کم مرتبہ جنتی پر ستر ہزار غلام سونے کے پیالوں کے ساتھ گھومیں گے دن کا کھانا اسے پیش کیا جائیگا ہر ایک برتن میں ایسی قسم کا کھانا ہوگا جو دوسرے میں نہ ہوگا۔ وہ اس کے آخر سے اسی طرح کھائے گا جس طرح پہلے سے کھاتا ہے آخری کو اسی طرح لذیذ پائے گا جس طرح پہلے کو لذیذ پاتا ہے اسکا بعض بعض کے مشابہ نہ ہوگا۔

وَّ اَکۡوَابٍ یعنی اس پر پیالے گھمائے جائیں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِاٰنِیَۃٍ مِّنۡ فِضَّۃٍ وَّ اَکۡوَابٍ (الدہر:15) ابن مبارک نے ذکر کیا ہے ہمیں معمر نے بیان کیا وہ ایک آدمی سے وہ ابوقلابہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: اس کے پاس کھانا اور مشروب لایا جائے گا جب وہ ان کے آخر تک پہنچیں گے تو ان کے پاس شراب طہور لایا جائے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأطعمۃ، باب الأکل فی انا مفضض، جلد 2، صفحہ 816

گا اس کے لیے ان کے پیٹ ضامر ہو جائیں گے ان کے جسموں سے مشک سے پاکیزہ خوشبو نکلے گی پھر یہ پڑھا شَرَابًا طَهُورًا (دہر)

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جنتی اس میں کھائیں گے، اس میں پئیں گے وہ تھوکیں گے نہیں وہ پیشاب نہیں کریں گے وہ براز نہیں کریں گے وہ ریشہ نہیں پھینکیں گے'' (1)۔ پوچھا: کھانے کا کیا بنے گا؟ کہا ''ڈکار اور مہک جس طرح کستوری کی مہک ہوتی ہے انہیں تسبیح، تحمید اور تکبیر کا الہام کیا جائے گا'' ایک روایت میں یلھمون التسبیح کی جگہ یلھمون النفس کے الفاظ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ آئمہ نے حضرت ام سلمہ کی حدیث نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے فرمایا: ''وہ آدمی جو سونے اور چاندی کے برتن سے پانی پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ غٹ غٹ پیتا ہے (2)'' اور کہا: ''سونے اور چاندی کے برتن میں نہ پیو اور اس کے پیالوں (برتنوں) میں نہ کھاؤ (3)'' یہ روایات حرمت کا تقاضا کرتی ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

علماء نے اور مقاصد کے لیے ان کے استعمال کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ مردوں کے لیے کسی مقصد کے لیے انہیں استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کا سونے اور ریشم کے بارے میں ارشاد ہے: ''یہ دونوں چیزیں میری امت کے مذکر افراد کے لیے حرام ہیں اور مؤنث افراد کے لیے حلال ہیں'' (4) ان میں کھانے پینے سے نہی ان کے استعمال کی حرمت پر دال ہے کیونکہ یہ بھی سامان کی ایک صورت ہے جو جائز نہیں اس کا اصل کھانا اور پینا ہے اس کی علت آخرت کے امر کو جلدی چاہنا ہے اس اعتبار سے اس میں کھانا پینا اور باقی ماندہ انتفاع کی جو صورتیں ہیں سب مراد ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ ان کے لیے دنیا میں ہیں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمارے لیے دنیا میں حصہ نہیں بنایا''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب برتن پر ان سے قلعی کی گئی ہو یا برتن میں ان دونوں میں سے حلقہ ہو۔ امام مالک نے کہا: مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس برتن میں پیا جائے، اسی طرح آئینہ ہو جس میں چاندی کا حلقہ ہو مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا برتن تھا جس پر چاندی کی قلعی کی گئی تھی اور کہا: میں نے نبی کریم ﷺ کو اس برتن میں مشروب پلایا تھا۔ ابن سیرین نے کہا: اس میں لوہے کا حلقہ تھا تو حضرت انس نے ارادہ کیا کہ اس میں چاندی کا حلقہ لگوائیں تو حضرت ابو طلحہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے جو عمل کیا ہے میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا تو حضرت انس نے اسے ترک کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب ان چیزوں کا استعمال جائز نہیں تو ان کو جمع کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ جس چیز کا استعمال جائز نہیں اس کو ذخیرہ کرنا بھی جائز نہیں ہوتا جس طرح بت اور طنبور (آلہ لہو) ہمارے علماء کی کتابوں میں ہے: جو آدمی کسی کا ایسا برتن

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الأشربة، انیة الفضة، جلد 2، صفحہ 379 2۔ صحیح بخاری، کتاب الأشربة، انیة الفضة، جلد 2، صفحہ 842

3۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، تحریم الأستعمال الأناء الذهب والفضة، جلد 2، صفحہ 189

4۔ سنن ابن ماجہ، باب لبس الحریر والذهب للنساء، حدیث نمبر 3584، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

توڑے گا اس پر بازاری قیمت چٹی لازم ہوگی۔ یہ فاسد معنی ہے کیونکہ اس کا توڑنا واجب ہے تو اس وجہ سے اس قیمت کی کوئی ثمن (جو باہم بائع اور مشتری لگاتے ہیں) نہ ہوگی زکوۃ میں کسی حال میں اس کی قیمت جائز نہ ہوگی اس کے علاوہ میں اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جائیگی۔

بِصِحَافٍ جوہری نے کہا صحفه، قصعه کی طرح ہے اس کی جمع صحاف آتی ہے۔ کسائی نے کہا: پیالوں میں سے سب سے بڑا جفنه ہے پھر قصعه ہے جو دس افراد کو سیر کر دیتا ہے پھر صحفه ہے جو پانچ آدمیوں کو سیر کو دیتا ہے پھر مئکله ہے جو دو یا تین افراد کو سیر کر دیتا ہے پھر صحیفه ہے جو ایک آدمی کو سیر کر دیتا ہے صحیفہ کا معنی کتاب بھی ہے اس کی جمع صحف اور صحائف ہے۔

وَّ اَكْوَابٍ جوہری نے کہا: کوب ایسے لوٹے کو کہتے ہیں جس کا دستہ نہ ہو اس کی جمع اکواب ہے۔ شاعر نے کہا:

مُتَّكِئًا تَصْفِقُ أبوابُه يسعىٰ عليه العَبْدُ بالكوب

وہ ٹیک لگائے ہوئے ہے اس کے دروازے کھلے ہیں اس پر غلام پیالے کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔

قتادہ نے کہا: کوب ایسے پیالے کو کہتے ہیں جس کا سرا چھوٹا اور دستہ بھی چھوٹا ہو اور ابریق اس پیالے کو کہتے ہیں جس کا سرا لمبا اور دستہ بھی لمبا ہو (1)۔ اخفش نے کہا: اکواب سے مراد ایسے لوٹے ہیں جس کی سنت نہیں ہوتی۔ قطرب نے کہا: اس سے مراد لوٹے ہیں جن کی سنت نہیں ہوتی (2)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ایسے برتن ہیں جن کے منہ گول ہوں۔ سدی نے کہا: اس سے مراد ایسے برتن ہیں جن کی سنت نہیں ہوتی۔ ابن عزیز نے کہا: اکواب سے مراد ایسے لوٹے ہیں جن کا دستہ اور سنت نہیں ہوتی۔ اس کا واحد کوب ہے۔

میں کہتا ہوں: مجاہد اور سدی کے قول کا یہی معنی ہے، یہی اہل لغت کا مذہب ہے کہ جس کی سنت اور دستہ نہ ہو۔

وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ترمذی نے سلیمان بن بریدہ سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنت میں گھوڑے ہیں (3)؟ فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے تو کیا تو نہیں چاہے گا کہ تو اس میں سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو وہ جنت میں تجھے لے کر اڑتا رہے جہاں تو چاہے'' کہا: ایک آدمی نے پوچھا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا جنت میں اونٹ ہیں (4)؟ کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کی مثل جواب نہ دیا جو آپ نے پہلے فرد کو جواب دیا تھا فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے گا تو وہاں تیرے لیے وہ کچھ ہوگا جو تیرا نفس چاہے گا اور تیری آنکھ پسند کرے گی''۔

اہل مدینہ، ابن عامر اور اہل شام نے اسے فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ پڑھا ہے باقی قراء نے تشتهي الانفس اصل میں یہ تشتهيه الانفس ہے تو کہتا ہے: الذی ضربت زيد اصل میں یہ الذی ضربته زيد تھا وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ تو کہتا ہے: لذ الشئ يلذ لذا ذا ولذاذة، لذذت بالشئ الذ یعنی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے مصدر لذاذا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 239 — 2۔ ایضاً

[illegible] باب صفة الجنة، ما جاء في صفة خيل الجنة، جلد 2، صفحہ 77 — 4۔ ایضاً

ولذاذة۔ یعنی میں نے اسے لذیذ پایا۔ التذ ذت به وتلذ ذت به، دونوں کا معنی ایک ہے یعنی جنت میں وہ کچھ ہوگا جس سے آنکھیں لذت حاصل کریں گی تو وہ خوبصورت منظر والا ہوگا۔ سعید بن جبیر نے کہا: آنکھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار کر کے لذت حاصل کریں گی جس طرح حدیث طیبہ میں ہے: أسألك لذة النظر الى وجهك۔

وَ اَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ باقی رہیں گے، ہمیشہ رہیں گے کیونکہ یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو یہ رنج دیتا ہے۔

وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۷۲

''اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ہو ان اعمال کے باعث جو تم کیا کرتے تھے''۔

وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ انہیں یہ بات کہی جائے گی یہ وہ جنت ہے جس کی صفت دنیا میں تمہارے لیے بیان کی جاتی تھی۔ ابن خالویہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنت کی طرف اشارہ تلك سے اور جہنم کی طرف هذا سے کیا ہے تا کہ جہنم سے ڈرائے اور اسم اشارہ قریب کے ساتھ اشارہ کر کے اس کو موکد ذکر کیا اسم اشارہ قریب کے ساتھ اسے یوں بیان کر دیا گیا جس طرح وہ چیز حاضر ہو جس کی طرف دیکھا جاتا ہے۔

الَّتِیْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر نفس کے لیے جنت اور دوزخ پیدا کی ہے۔ کافر مسلمان کی جہنم کا وارث بنے گا اور مسلم کافر کی جنت کا وارث بنے گا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ (المومنون) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اور سورۃ الاعراف میں بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔

لَكُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ كَثِیْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ۝۷۳

''تمہارے لیے بکثرت پھل ہیں ان میں سے کھاؤ گے (جو جی چاہے)''۔

فَاكِهَةٌ کا لفظ معروف ہے اس کی جمع فواکہ ہے فاکھانی اسے کہتے ہیں جو پھل بیچتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد تمام پھل ہیں تر بھی اور خشک بھی، یعنی جنت میں کھانے اور پینے کے علاوہ کثیر پھل جن کو جنتی کھائیں گے۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝۷۴ لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ۝۷۵ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِیْنَ۝۷۶

''بے شک مجرم عذاب جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ہلکا کیا جائیگا ان سے عذاب (یہ عذاب) اور وہ اس میں آس توڑے بیٹھیں ہوں گے۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ (اپنی جانوں پر) ظلم ڈھانے والے تھے''۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝ جب اہل جنت کے احوال کا ذکر کیا تو اہل جہنم کے احوال کا ذکر کیا تا کہ اطاعت شعار کی نافرمان پر فضیلت کو بیان کرے۔ لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی وَ هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ۝ وہ رحمت سے مایوس ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ خاموش ہونگے سکوت کا معنی ناامیدی ہے۔ سورۂ انعام

میں یہ بحث گذر چکی ہے وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ ہم نے عذاب میں مبتلا کر کے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر شرک کا ارتکاب کر کے ظلم کرنے والے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ الظالمون کو مرفوع پڑھا جائے یہ مبتدا اور خبر ہو اور جملہ کان کی خبر ہو۔

وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝

''اور وہ پکاریں گے: اے مالک! بہتر ہے کہ تمہارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر ڈالے وہ جواب دے گا کہ تمہیں تو یہاں ہمیشہ جلتے رہنا ہے''۔

وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ مالک جہنم کا خازن ہے اپنے غضب کے اظہار کے لیے اسے پیدا کیا جب وہ جہنم کو جھڑکے گا تو اس کا بعض بعض کو کھا جائے گا۔ حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے یوں قراءت بیان کی ہے ونادوا یامال یہ مصحف کے خلاف ہے۔ حضرت ابو درداء اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ونادوا یامال قراءت کی یعنی خاص طور پر لام کے ساتھ، یعنی اسم میں ترخیم کا قاعدہ جاری کیا اور کاف کو حذف کر دیا۔ ترخیم کا معنی حذف ہے اسی سے ندا میں اسم میں ترخیم ہوتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے آخر سے ایک یا زیادہ حرف حذف کر دیے جائیں تو مالک میں کہے گا: یامال۔ حارث میں کہے گا: یاحار فاطمہ میں کہے گا: یافاطم، عائشہ میں کہے گا: یاعائش، مروان میں کہے گا: یامرو اسی طرح باقی کے اندر بھی یہی صورتحال ہوگی۔ کئی اشعار میں اسی طرح آیا ہے۔ حدیث طیبہ میں ای فُلُ اور هلمّ موجود ہے اسم مرخم کے آخر میں تیرے لیے دو صورتیں موجود ہیں (1) حذف سے پہلے آخری حرف کی جو حالت تھی اس پر اسے باقی رکھے (2) اسے مبنی بر ضمہ بنا دے جس طرح یازید گویا تو نے اسے کامل اسم کے قائم مقام رکھا ہے اور اس میں حذف کی رعایت نہیں کی۔ ابو بکر انباری نے ذکر کیا کہا محمد بن مروزی، محمد سے جو ابن سعدان ہے وہ حجاج سے وہ شعبہ سے وہ حکم بن عیینہ سے وہ مجاہد سے روایت نقل کرتے ہیں: کہا ہم نہیں جانتے تھے کے زخرف کیا ہے یہاں تک کہ ہم نے حضرت عبداللہ کی قراءت میں بیت من ذھب کے الفاظ پائے اور ہم وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ کے بارے میں نہیں جانتے تھے اور يٰمٰلِكُ کے بارے میں نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں پایا یامال یعنی ترخیم کے طریقہ پر پایا۔ ابو بکر نے کہا اس حدیث پر عمل نہیں ہوگا کیونکہ اس کی سند مقطوع ہے اس کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت مقبول نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کی کتاب اس امر کی زیادہ حقدار ہے کہ اس میں احتیاط کی جائے اور باطل کی اس سے نفی کی جائے۔

میں کہتا ہوں: صحیح بخاری میں صفوان بن یعلی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر پڑھتے ہوئے سنا: وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ یعنی کاف کو ثابت رکھا (1)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے یا میرے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جہنمیوں نے خزان سے مدد چاہی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ (غافر) تو ان کی عرضداشت رد کر دی گئی اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ (غافر) جب وہ خازنوں سے مایوس

1۔ صحیح بخاری، باب قولہ ونادوا یا مالک لیقض علینا ربک سورۃ حم زخرف، جلد 2، صفحہ 713

ہو چکے تو انہوں نے مالک کو ندا کی وہ ان پر سردار تھا اور اس کی مجلس خازنوں کے وسط میں ہے اور پل ہیں جن کے اوپر عذاب کے فرشتے گذرتے ہیں وہ جہنم کے بعید ترین حصہ کو یوں ہی دیکھتا ہے جس طرح اس کے قریب ترین حصہ کو دیکھتا ہے ان جہنمیوں نے عرض کی: یٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ انہوں نے موت کا سوال کیا کہا مالک ان سے خاموش رہے گا انہیں اسی سال تک کوئی جواب نہ دے گا کہا: سال تین سو ساٹھ دن کا ہوگا مہینہ تیس دن کا ہوگا اور دن ان ہزار سالوں کے برابر ہوگا جسے تم شمار کرتے ہو پھر اسی (80) سال کے بعد ان کی طرف متوجہ ہوگا اور کہے گا: اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ۝ اور حدیث کا ذکر کیا۔ ابن مبارک نے اس کا ذکر کیا ہے۔

حضرت ابو درداء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ''وہ کہیں گے مالک کو بلاؤ وہ عرض کریں گے: اے مالک! تمہارا رب ہمیں موت ہی عطا کر دے تو اس نے جواب دیا تم اسی طرح رہو گے (1)'' اعمش نے کہا: مجھے یہ بتایا گیا ہے ان کے بلانے اور مالک کے جواب کے درمیان ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ عرض کریں گے تو مالک ایک ہزار سال تک انہیں جواب نہیں دے گا پھر وہ کہے گا: تم ہمیشہ اسی طرح رہو گے (2)۔ مجاہد اور نوف بکالی نے کہا: ان کی ندا اور اس کے جواب کے درمیان سو سال کا عرصہ ہوگا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے کہا: چالیس سال کا عرصہ ہوگا؛ یہ ابن مبارک نے ذکر کیا۔

## لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۝

''بے شک ہم لے آئے تمہارے پاس دین حق لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے تھے''۔

یہ احتمال موجود ہے کہ یہ مالک کا قول ہے یعنی تم جہنم میں ہی رہو گے کیونکہ دنیا میں تمہارے پاس حق لائے تو تم نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ یہ آج ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کلام ہو یعنی ہم نے تمہارے لیے دلائل کو واضح کیا اور تمہاری جانب رسول بھیجے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں اکثر کل کے معنی میں ہے یہاں کثرت سے مراد رؤساء اور قائدین ہیں جہاں تک پیروکاروں کا تعلق ہے تو ان کا کوئی اثر نہ ہوگا لِلْحَقِّ اسلام کو اور اللہ تعالیٰ کے دین کو كٰرِهُوْنَ ناپسند کرتے تھے۔

## اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ۝

''اور اگر انہوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی اپنا قطعی فیصلہ کرنے والے ہیں''۔

مقاتل نے کہا: یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی جب کفار نے دار الندوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تدبیر کی جب ان کا مشورہ اس بات پر اختتام کو پہنچا جو ابو جہل نے رائے پیش کی کہ ہر قبیلہ سے ایک آدمی سامنے آئے تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل میں شریک ہو تو اس طرح قصاص کا مطالبہ کمزور ہو جائے گا تو یہ آیت نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان سب

1۔ جامع ترمذی، باب صفة الجهنم، ما جاء فی صفة طعام اهل النار، جلد 2، صفحہ 82

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 239

سرداروں کو بدر کے واقعہ میں قتل کر دیا اَبۡرَمُوۡۤا کا معنی ہے انہوں نے پختہ فیصلہ کرلیا(1)۔ ابرام کا معنی پختہ کرنا ہے ابرمت الشئ میں نے اسے پختہ کیا۔ ابرام الفتال، جب اسے بانٹنے والا اچھی طرح بانٹے اس سے مراد دوسری دفعہ باٹنا ہوتا ہے پہلے کو سحیل کہتے ہیں جس طرح من سحیل و مبرم ہے آیت کا معنی ہے انہوں نے تدبیر کو پختہ کیا(2) ہم بھی ان کے لیے تدبیر کو پختہ کرنے والے ہیں، یہ ابن زید، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے یا انہوں نے تکذیب پر اتفاق کرلیا تو ہم دوبارہ اٹھانے کے ساتھ جزا پر پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ کلبی نے کہا: یا انہوں نے معاملہ کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم بھی ان کے خلاف عذاب کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ ام، بل کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا کا عطف اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ۝ پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تحقیق ہم تمہارے پاس حق لائے تو تم نے نہ سنا یا سنا تو سہی مگر اعراض کیا کیونکہ انہوں نے اپنے دل میں ایسے امر کا فیصلہ کرلیا تھا جس کے ذریعے وہ عقاب سے امن میں ہو جاتے۔

اَمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ۝۸۰

''کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نہیں سنتے ان کے رازوں اور سرگوشی کو؟ ہاں ہم سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس بیٹھے لکھتے بھی رہتے ہیں''۔

اَمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ یعنی جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں بَلٰى کیوں نہیں ہم سنتے اور جانتے ہیں وَرُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ۝ ہمارے فرشتے ان کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہوں گے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ یہ آیت ان تین افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو بیت اللہ شریف اور اس کے پردوں کے درمیان تھے(3) ان میں سے ایک نے کہا: بتاؤ کیا اللہ تعالیٰ ہماری گفتگو سن رہا ہے؟ دوسرے نے کہا: جب تم بلند آواز سے باتیں کرو تو وہ سنتا ہے اور جب تم رازداری سے باتیں کرو تو نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا: اگر وہ تمہاری اعلانیہ گفتگو سنتا ہے تو پھر جب تم رازداری سے بات کرو تب بھی سنتا ہے؛ یہ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے۔ سورۂ فصلت میں یہی چیز حضرت ابن مسعود کی روایت میں گذر چکی ہے۔

قُلۡ اِنۡ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِيۡنَ۝۸۱ سُبۡحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ۝۸۲ فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَيَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ۝۸۳

''آپ فرمائیے: (بفرض محال) اگر رحمن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا پجاری ہوتا۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور عرش کا رب ہر اس عیب سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ پس (اے حبیب) آپ رہنے دیں انہیں کہ بے ہودہ باتیں بناتے رہیں اور کھیل تماشہ کرتے رہیں حتیٰ کہ ملاقات ہو جائے ان

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 240
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 65
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 241

کی اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝ اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور سدی نے یہ کہا: معنی ہے، رحمن کا کوئی بیٹا نہیں۔ یہاں ان، ما کے معنی میں ہے۔ اس اعتبار سے کلام مکمل ہوگی پھر تو نئے سرے سے کلام شروع کرے گا فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ میں اہل مکہ میں سے پہلا موحد ہوں کیونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں۔ الْعٰبِدِيْنَ پر وقف تام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے محمد! کہہ دو اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں ان میں سے سب سے پہلا ہوتا جو اس کی عبادت کرتا، لیکن یہ امر محال ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو یہ اسی طرح ہے جس طرح تو اسے کہتا ہے جس سے تو مناظرہ کرتا ہے: جو کچھ تو نے کہا ہے اگر یہ دلیل سے ثابت ہو گیا تو میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو اس کا اعتقاد رکھے گا۔ یہ امر کو بعید جاننے میں مبالغہ کا اظہار ہے یعنی اس کے اعتقاد کی کوئی صورت نہیں یہ کلام میں نرمی کرنا ہے جس طرح یہ ارشاد ہے: وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سبا) اس تعبیر میں یہ معنی ہوگا میں اس بچے کا سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔ کیونکہ بچے کی تعظیم اس کے والد کی تعظیم ہوتی ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے اگر رحمن کا بچہ ہوتا تو میں پہلا شخص ہوتا جو صرف اسی وحدہ لاشریک کی عبادت کرتا کیونکہ اس کا کوئی بچہ نہیں۔ سدی نے یہ بھی کہا ہے: اس کا معنی ہے اگر اسکا کوئی بیٹا ہوتا تو میں پہلا وہ شخص ہوتا جو اس کی عبادت کرتا اس وجہ سے کہ اس کا بیٹا ہے لیکن یہ مناسب نہیں۔ مہدوی نے کہا: ان تمام اقوال کی بنا پر شرط کے لیے ہے یہ سب سے مناسب ہے، یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے، کیونکہ یہ جس کلام کے ساتھ متصل ہو اس بارے میں وہم ہوتا ہے کہ زمانہ گذشتہ میں یہ متحقق نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ الْعٰبِدِيْنَ، الآنفین کے معنی میں ہے، میں ناپسند کرنے والوں میں سے پہلا ہوتا۔ بعض علماء نے کہا: اگر معنی یہ ہے تو قراءت یوں ہوگی العبدین ابوعبدالرحمن اور یمانی نے اسی طرح قراءت کی ہے فانا اول العبدین یوں باب ذکر کیا جاتا ہے عبد یعبد عبدا جب وہ ناپسند کرلے اور غضبناک ہو اس سے اسم فاعل عَبِد آئے گا۔ اسم عبد ہ، انفہ کی طرح ہے؛ یہ ابو زید سے مروی ہے۔ فرزدق نے کہا:

أولئك أحلاسي فجئني بمثلهم　　وأعْبُدُ أن أهْجُو كُلَيْبًا بدارِمِ

وہ میرے ساتھی ہیں میرے پاس ان کی مثل لے آؤ اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ دارم کے مقابلہ میں کلیب کی ہجو کرد۔ وہ یہ شعر بھی کہتا ہے:

أولئك ناس إن هَجَوْنِي هجوتهم　　وأَعْبُدُ أن يهجى كُلَيْبٌ بدارِمِ

وہ ایسے لوگ ہیں اگر وہ میری ہجو کریں تو میں ان کی ہجو کروں گا۔ اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ دارم کے بدلہ میں کلیب کی ہجو کی جائے۔

جوہری نے کہا: ابوعمرو نے کہا اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ میں عابدین کا معنی ناپسند کرنا اور ناراض ہونا ہے(1)؛ یہ نسائی اور قتبی کا قول ہے۔ ماوردی نے اسے ان دونوں سے روایت کیا۔ مہدوی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَاَنَا اَوَّلُ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 241

الْعٰبِدِیْنَ۔ یہ عَبِدَ یَعْبَدَ سے مشتق ہے یعنی ناپسند کرنے والوں میں سے میں پہلا ہوں گا۔ ابن عرفہ نے کہا: عبد یعبد کا اسم فاعل عَبِدٌ آتا ہے بہت ہی کم اسے عابد کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم لغت میں قلیل استعمال ہونے والے اور شاذ استعمال ہونے والے مادہ کو ذکر نہیں کرتا بلکہ معنی ہے میں وہ پہلا شخص ہوتا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا کہ وہ واحد ہے اس کی کوئی اولاد نہیں۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک عورت اپنے خاوند کے حرم میں داخل ہوئی اس عورت نے چھ ماہ میں بچہ جن دیا اس کا ذکر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تو آپ نے اس عورت کو رجم کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (احقاف: 15) ایک اور آیت میں فرمایا: وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ (لقمان: 14) اللہ کی قسم! حضرت عثمان نے کوئی ناپسند نہ کیا کہ اس امر کی طرف لوٹیں (1)۔ عبداللہ بن وہب نے کہا: معنی ہے انہوں نے اسے ناپسند نہ کیا۔ ابن اعرابی نے کہا: فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ کا معنی ہے میں سب سے پہلا غضبناک ہونے والوں اور ناپسند کرنے والوں میں سے ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے میں تمہارے برعکس سب سے پہلا شخص ہوتا جو اس کی وحدانیت پر اس کی عبادت کرتا۔ ابوعبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے میں سب سے پہلے انکار کرنے والا ہوتا۔ اور یہ حکایت کی عبدنی حقی۔ اس نے میرے حق کا انکار کیا۔ اہل کوفہ نے عاصم کے علاوہ وُلْد پڑھا ہے باقی قراء اور عاصم نے وَلَد پڑھا ہے۔ یہ گفتگو پہلے گذر چکی ہے: سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے ہر اس امر سے اپنی پاکی بیان کی ہے جو حادث ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کلام بھی تقدیس و تنزیہ کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پاکی بیان کرنے کا حکم دیا ان تمام چیزوں سے جو وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَ یَلْعَبُوْا مراد کفار مکہ ہیں جب انہوں نے عذاب آخرت کو جھٹلایا یعنی وہ اپنے باطل میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور اپنی دنیا میں کھیلتے رہیں۔

حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ۝ یا تو اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے یا آخرت کا عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم جہاد والی آیت سے منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت محکم ہے اسے دھمکی دینے کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے۔ ابن محیصن، مجاہد، حمید، ابن قعقاع اور ابن سمیقع نے اسے حَتّٰی یَلْقُوْا پڑھا ہے (2) یعنی الف نہیں، یہاں، سورۂ طور اور سورۂ معارج میں قاف کو فتحہ دیا ہے جبکہ باقی قراء نے یلاقوا پڑھا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ۝

''اور وہی ایک، آسمان میں خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہی بہت دانا، سب کچھ جاننے والا ہے''۔

ان کو جھٹلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی آسمان و زمین میں مستحق عبادت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے کہا: معنی ہے وہی ذات آسمان اور زمین میں معبود ہے یعنی دونوں میں اسی کی عبادت کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 65		2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 66

جاتی ہے۔ یہ روایت کی جاتی ہے کہ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور دوسرے صحابہ نے یوں قراءت کی ہے وھو الذی فی السماء للہ وفی الأرض للہ یہ مصحف کے خلاف ہے (1) اِلٰهٌ کو رفع دیا گیا ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی وہ ذات جو آسمان میں ہے وہ معبود ہے؛ یہ ابو علی کا قول ہے۔ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے ضمیر کا حذف کرنا اچھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فی، علی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (طٰہٰ: 71) اس میں فی علی کے معنی میں ہے یعنی وہ آسمان اور زمین پر قادر ہے۔ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

تَبٰرَكَ یہ برکت سے تفاعل کے وزن پر ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ اس کے قیام کا وقت اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے اسے والیہ یرجعون پڑھا ہے باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا۔ ابن محیصن، حمید، یعقوب اور ابن ابی اسحاق اپنے اصول کے مطابق علامت مضارع کو فتحہ اور باقی ضمہ دیتے ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور نہیں اختیار رکھتے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں شفاعت کرنے کا، ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ من محل جر میں ہے الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ سے مراد حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور ملائکہ علیہم السلام ہیں، یعنی یہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے مگر اس کے حق میں جو حق کی گواہی دے اور علم وبصیرت پر ایمان لائے؛ یہ سعید بن جبیر اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ کہا: حق کی شہادت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: من محل رفع میں ہے، یعنی جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے۔ مراد معبودان باطلہ ہیں۔ قتادہ کے قول میں ہے: معبود اپنے عبادت گذاروں کے حق میں شفاعت نہیں کر سکتے مگر وہ معبود جو حق کی گواہی دیں جیسے حضرت عزیر علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کیونکہ وہ حق اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں (2)۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ جو انہوں نے گواہی دی اس کی حقیقت کو جانتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ نضر بن حارث اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اگر (حضرت) محمد جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے تو ہم تو فرشتوں کے دوست ہوئے وہ فرشتے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 66
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 67

کی بجائے ہمارے حق میں شفاعت کے زیادہ حق دار ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا یعنی وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ملائکہ، بت، جن یا شیاطین ان کے حق میں شفاعت کریں گے، قیامت کے روز کسی کے حق میں کوئی شفاعت نہیں۔

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ یعنی مومنوں کے حق میں شفاعت کریں گے جب انہیں اجازت دی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ سے کیا مراد ہے یعنی وہ یہ گواہی دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر یہ عبادت کرنے والے اس کے حق دار نہیں کہ کوئی ان کی شفاعت کرے مگر جو حق کی گواہی دے کیونکہ جو حق کی گواہی دے گا اس کے حق میں شفاعت کی جائے گی اور مشرک کے حق میں شفاعت نہیں کی جائے گی۔ الا یہ لیکن کے معنی میں ہے۔ مشرک شفاعت نہیں پائیں گے مگر شفاعت وہ پائے گا جو حق کی گواہی دے گا۔ پس یہ استثناء منقطع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو، کیونکہ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ میں ملائکہ بھی شامل ہیں یوں کہا جاتا ہے: شفعته، شفعت له، جس طرح کلته، کلت له۔ سورۂ بقرہ میں شفاعت کا معنی اور اس کا اشتقاق گذر چکا ہے تو اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ سے مراد ہے جس کے حق میں فرشتے گواہی دیں کہ وہ دنیا میں حق پر تھا جبکہ وہ اس بارے میں جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی ہے یا انہوں نے اسے ایمان کی حالت میں دیکھا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ یہ کلام دو معنوں پر دلالت کرتی ہے: (1) حق کے بارے میں سفارش نفع نہیں دیتی مگر جب علم ہو اور تقلید بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی جب تک مقالہ کے صحیح ہونے کا علم نہ ہو۔ (2) حقوق اور دوسرے امور میں تمام شہادات کے لیے شرط یہ ہے کہ شاہد اس کے بارے میں آگاہ ہو، اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: إذا رأيت مثل الشمس فاشهد وإلا فدع (1) جب تو سورج کی طرح کسی امر کو دیکھے تو گواہی دے بصورت دیگر اسے چھوڑ دے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے: اللہ نے، پھر کدھر یہ الٹے پھر رہے ہیں''۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ وہ ضرور اقرار کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے جبکہ پہلے وہ کچھ بھی نہ تھے۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ کیسے اس کی عبادت سے پلٹتے ہیں اور اس سے پھرتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اس کے ساتھ اوروں کو شریک کر لیا، وہ محض ان کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کی امید رکھتے ہیں۔ اَفَكَ يَاْفِكُ اَفْكًا اسے الٹ دیا اور اسے کسی چیز سے پھیر دیا، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا (احقاف: 22) ایک قول یہ کیا گیا: اگر آپ فرشتوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں کس نے انہیں پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے۔ فَاَنّٰى

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 388

يُؤْفَكُوْنَ ۝ تو یہ لوگ جو انہیں معبود قرار دیتے ہیں اس میں کہاں بھٹک رہے ہیں۔

وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''اور قسم ہے میرے رسول کے اس قول کی اے میرے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے''۔

قِيْلِهٖ میں تین قراءتیں ہیں: نصب، جر اور رفع (1)۔ جہاں تک جر کا تعلق ہے یہ عاصم اور حمزہ کی قراءت ہے جس نے اسے جر دی ہے اس نے اسے معنی پر محمول کیا ہے تقدیر کلام یوں ہوئی وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وعلم قيله جس نے اسے نصب دی ہے اس نے اسے معنی پر محمول کیا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وعنده علم الساعة ويعلم قيله یہ زجاج کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے فراء اور اخفش نے کہا یہ جائز ہے کہ قِيْلِهٖ کا عطف انا لانسمع سرهم و نجواهم پر ہو۔ ابن انباری نے کہا: میں نے ابو العباس محمد بن یزید مبرد سے پوچھا قیل کو تو کس چیز کے ساتھ نصب دیتا ہے؟ کہا: میں اسے ہوئی وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ و يعلم قيله کے ساتھ نصب دیتا ہوں۔ اس توجیہ کی صورت میں تُرْجَعُوْنَ اور يَعْلَمُوْنَ پر عطف اچھا نہیں اور يَكْتُبُوْنَ پر عطف اچھا ہوگا۔ فراء اور اخفش نے قیل کو اس معنی کی بناء پر نصب دی۔ لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وقيله جس طرح ہم نے ان سے ذکر کیا ہے۔ اس توجیہ کی بنا پر يَكْتُبُوْنَ پر وقف کرنا اچھا نہیں۔ فراء اور اخفش نے یہ بھی جائز قرار دیا ہے کہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت میں نصب دی جائے۔ گویا یوں کلام کی: وقال قيله و شكا شكواه إلى الله عزوجل۔ جس طرح کعب بن زہیر نے کہا:

تمشي الوُشاةُ جَنابَيها وقيلَهُمُ    إنك يابْنَ أبي سُلْمَى لَمَقْتُولُ

چغل خور اس کی دونوں جانب چلتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے: اے ابن ابی سلمیٰ! تو مقتول ہے۔

شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے ويقولون قيلهم۔ جس نے قيله کو رفع دیا ہے تو تقدیر کلام یہ ہوگی وعنده قيله يا قيله مسموع یا قيله هذا القول۔ زمخشری نے کہا: جو انہوں نے کہا یہ معنی کے اعتبار سے قوی نہیں ساتھ ہی ساتھ معطوف اور معطوف علیہ میں فاصلہ ہے جبکہ یہ جملہ معترضہ بھی نہیں بن سکتا اور نظم میں تنافر پایا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ قوی اور مناسب یہ ہے کہ جر اور نصب حرف قسم کے اضمار اور حذف کی بنا پر ہو۔ اور رفع ان کے اس قول کی بنا پر ہو أيمن الله، أمانة الله، يمين الله، لعمرك۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ جواب قسم ہوگا۔ گویا فرمایا: وأقسم بقيله يا رب يا قيله يا رب قسمي ان هولاء قوم لايؤمنون۔ ابن انباری نے کہا: عربی زبان میں وقيله رفع کے ساتھ بھی جائز ہے اس شرط پر کہ تو اسے اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ کے ساتھ رفع دے۔ مہدوی نے کہا: یا تقدیر کلام یہ ہے وقيله قيله يا رب۔ دوسرے قيله کو حذف کر دیا گیا جو خبر ہے اور یا رب کا محل خبر مضمر کی وجہ سے نصب ہے یہ ممتنع نہیں جبکہ موصول کے بعض کو حذف کرنا اور بعض کو باقی رکھنا ممتنع ہے کیونکہ قول کا حذف بہت زیادہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ مذکور کے حکم میں ہوگیا ہے۔ قيله میں ها

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 242

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے جبکہ آپ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ۔ ابوقلابہ نے پڑھا یا رب، قیل، قول کی طرح مصدر ہے اسی معنی میں حدیث ہے نھی عن قیل وقال، قیل وقال سے منع کیا۔ یوں بھی جملہ کہا جاتا ہے: قلت قولہ و قیلا و قالا سورۂ نساء میں موجود ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

**فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾**

''پس (اے حبیب) رخ انور پھیر لیجئے ان سے اور فرمایئے: تم سلامت رہو وہ (اس کا انجام) ضرور جان لیں گے''۔

قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر کرنے کا حکم دیا پھر ان کو قتل کرنے کا حکم کیا پس صفح کا حکم تلوار والے حکم کے ساتھ منسوخ ہو گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل مروی ہے فَاصْفَحْ عَنْهُمْ ان سے اعراض کیجئے وَقُلْ سَلٰمٌ یعنی انہیں اچھی بات کہیں یعنی مکہ کے مشرکوں کو کہو فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ پھر اسے سورۂ براءۃ میں منسوخ کر دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (آیت: 5) ایک قول یہ کہ گیا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں عام قراءت فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی کو دھمکی کی خبر ہے۔ نافع اور ابن عامر نے تعلمون پڑھا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مشرکین کو دھمکی کا خطاب ہے۔ سَلٰمٌ یہ علیکم کے مضمر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے؛ یہ فراء کا قول ہے اس کا معنی ہے انہیں لفظ سلام کہہ کر الوداع کر دیں یہ ان کے لیے سلام نہیں یہ نقاش نے بیان کیا ہے؛ شعیب بن حجاب نے روایت کی ہے کہ انہوں نے اس ذریعے یہ پہچانا کہ انہیں سلام کیسے کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

# سورۃ الدخان

﴿ آیاتہا ۵۹ ﴾ ﴿ ۴۴ سورۃ الدخان مکیۃ ۶۴ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ۳ ﴾

علماء کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مکی ہے مگر یہ آیت اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا یہ ستاون آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انسٹھ آیات ہیں۔ مسند داری میں حضرت ابو رافع سے مروی ہے جس نے جمعہ کی رات سورۃ الدخان پڑھی وہ صبح بخشے ہوئے کرے گا اور حور عین سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ ثعلبی نے حضرت ابو ہریرہ کے واسطہ سے اسے مرفوع نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے جمعہ کی شب سورۂ دخان پڑھی تو وہ صبح بخشے ہوئے کرے گا''۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ نے یہ الفاظ نقل کیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے رات کے وقت سورۂ دخان پڑھی تو وہ صبح یوں کرے گا کہ ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں بخشش طلب کر رہے ہوں گے (1)''۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن سورۂ دخان پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا'' (2)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝

''حا۔ میم۔ حق کو واضح کرنے والی کتاب کی قسم بے شک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں ہماری یہ شان ہے کہ ہم بروقت خبردار کر دیا کرتے ہیں''۔

اگر تو میم کو جواب قسم بنائے تو کلام الْمُبِيْنِ پر مکمل ہو جائے گی پھر تو نئے سرے سے کلام کو شروع کرے گا اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ اگر تو اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ کو اس قسم کا جواب بنائے جو قسم الْكِتٰبِ ہے تو تو مُنْذِرِيْنَ پر وقف کرے گا اور فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ سے نئی کلام شروع کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ ہے۔ بعض نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ یہ مقسم بہ کی صفت ہے تو مقسم بہ کی صفت جواب قسم نہ ہوگی اور اَنْزَلْنٰهُ ھاء قرآن کے لیے ہے۔ جس نے کہا: باقی کتابوں کی قسم اٹھائی تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر سے مراد غیر قرآن ہے جس کا بیان سورۂ احزاب کی ابتدائی حصہ میں ہو چکا ہے لیلۃ۔ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ ایک قول یہ بھی کیا جاتا ہے: اس سے مراد شعبان کے نصف کی رات ہے (3)۔ اس کے چار نام ہیں 1۔ لیلۃ مبارکہ، 2۔ لیلۃ البراءۃ، 3۔ لیلۃ الصک، 4۔ لیلۃ القدر (4)۔ اس کی صفت برکت سے لگائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس میں برکات، خیرات اور ثواب اپنے بندوں پر نازل فرماتا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی حم الدخان، جلد 2، صفحہ 112

2۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 581، حدیث نمبر 2634　　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 244　　4۔ ایضاً

قتادہ نے حضرت واثلہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صحف ابراہیم رمضان شریف کی پہلی رات میں نازل کیے گئے۔ تورات نازل ہوئی جبکہ رمضان شریف کے چھ دن گذر چکے تھے۔ زبور اس وقت نازل ہوئی جب رمضان شریف کے بارہ دن گذر چکے تھے۔ انجیل اس وقت نازل ہوئی جب رمضان کے اٹھارہ دن گذر چکے تھے اور قرآن حکیم اس وقت نازل ہوا جب رمضان کے چوبیس دن گذر چکے تھے''۔ پھر یہ قول کیا گیا ہے کہ پھر قرآن اس رات کو آسمان دنیا پر نازل ہوا پھر تھوڑا تھوڑا باقی دنوں میں اسباب کے موافق نازل ہوتا رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہر لیلۃ القدر کو اتنا نازل ہوتا جتنا پورے سال میں نازل ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کے نزول کا آغاز اس رات میں ہوا۔ عکرمہ نے کہا: لیلۃ مبارکہ سے مراد شعبان کے نصف کی رات ہے جبکہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے(1) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (القدر) قتادہ اور ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن لیلۃ القدر میں ام الکتاب سے بیت العزۃ کی طرف جو آسمان دنیا میں ہے نازل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر راتوں اور دنوں میں تیئس سالوں میں نازل کیا۔ یہ بحث سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (185) میں گذر چکی ہے۔ ان شاء اللہ ابھی یہ بحث آئے گی۔

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝

''اسی رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر اہم کام کا''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ دنیا کے امور کا اگلی لیلۃ القدر تک فیصلہ فرما دیتا ہے وہ چیز زندگی سے متعلق ہو، موت سے متعلق ہو یا رزق سے متعلق ہو(2)؛ یہ قتادہ، مجاہد، حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مگر بدبختی اور سعادت مندی، کیونکہ یہ دونوں چیزیں تبدیل نہیں ہوتیں؛ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے(3)۔ مہدوی نے کہا: اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے جو کچھ اس سال میں ہوگا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ شعبان کی نصف کی رات ہے جس میں سال بھر کے امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مردوں سے زندوں کو لکھ لیا جاتا ہے حاجیوں کے کام لکھ لیے جاتے ہیں، اس میں نہ کسی کا اضافہ ہوتا ہے اور نہ اس میں سے کوئی فرد کم کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان بن مغیرہ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک کے مرنے والوں کا قطعی فیصلہ کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک آدمی نکاح کرتا ہے، اس کا بچہ پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کا نام مردوں میں شامل ہو چکا ہوتا ہے''(4)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے ''جب نصف شعبان کی رات ہو تو اس کی رات میں قیام کیا کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ غروب شمس کے ساتھ آسمان دنیا کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے ارشاد فرماتا ہے: کیا کوئی بخشش طلب کرنے والا ہے کہ میں اس کی بخشش کروں کیا کوئی مصیبت کا شکار ہے کہ میں اس کی مصیبت کو دور کروں کیا کوئی رزق طلب

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 245 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 694، حدیث نمبر 42780

کرنے والا ہے کہ میں اسے رزق دوں کیا کوئی ایسا ہے کیا کوئی ایسا ہے؟ یہاں تک کہ فجر صادق طلوع ہو جاتی ہے"(1)۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

امام ترمذی نے اس کی ہم معنی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے تو بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ افراد کو بخشش دیتا ہے"(2)۔ اس باب میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی روایت مروی ہے ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت عائشہ سے مروی حدیث ہم صرف حجاج بن ارطاہ سے وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے وہ عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مرفوع جانتے ہیں میں نے محمد کو سنا وہ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے تھے کہا: یحییٰ بن ابی کثیر نے عروہ سے اور حجاج بن ارطاہ نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں: حضرت عائشہ کی طویل حدیث صاحب کتاب العروس نے ذکر کی ہے اور اس کو اختیار کیا ہے کہ وہ رات جس میں ہر عظیم امر کا فیصلہ کیا جاتا ہے وہ شعبان کی نصف رات ہے اسے لیلۃ البراءۃ کہتے ہیں ہم نے اس کا قول اور اس کا رد کسی اور موقع پر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ لیلۃ القدر ہے جس طرح ہم نے وضاحت کی ہے۔

حماد بن سلمہ، ربیعہ بن کلثوم سے روایت نقل کرتے ہیں: ایک آدمی نے حضرت حسن بصری سے پوچھا جب کہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا: اے ابا سعید! بتایئے کیا لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوا کرتی ہے؟ فرمایا: ہاں اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر رمضان میں ہوتی ہے یہ وہی رات ہے جس میں ہر عظیم امر کا فیصلہ کیا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ ہر مخلوق، موت، رزق اور عمل کا اس کی مثل تک فیصلہ فرماتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا: لیلۃ القدر کو ام الکتاب میں سے جو کچھ لکھا جاتا ہے جو کچھ سال میں ہوا ہوتا ہے وہ موت ہو زندگی ہو رزق ہو اور بارش ہو حتیٰ کہ حج (3)۔ یہ کہا جاتا ہے: فلاں حج کرے گا فلاں حج کرے گا اور اس آیت کے بارے میں فرمایا: تو ایک آدمی کو بازاروں میں چلتا ہوا دیکھے گا جب کہ اس کا نام مردوں میں لکھا جا چکا ہوگا۔ یہ وضاحت اس طبقہ کو پختہ کرنے کے لئے ہے یہ ان فرشتوں کے لئے ہے جو اسباب خلق پر معین ہیں۔ ہم نے اس کی وضاحت ابھی ابھی کی ہے۔

قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: جمہور علماء نے کہا اس رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ ان میں سے کچھ نے کہا: وہ نصف شعبان کی رات ہے(4)۔ یہ قول باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ** (البقرہ:185) اس امر پر وضاحت کی کہ نزول کا وقت رمضان ہے پھر یہاں اس کا زمانہ رات کو معین کیا ارشاد فرمایا **فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ** جس نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ رمضان شریف کے علاوہ میں ہے اس نے اللہ تعالیٰ پر عظیم بہتان بنایا ہے نصف شعبان کی رات کے متعلق کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے نہ تو اس کی فضیلت میں کوئی حدیث ہے اور نہ

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ، ما جاء فی لیلۃ نصف من شعبان، صفحہ 100۔ ایضاً حدیث نمبر 1377، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ، ما جاء فی لیلۃ نصف من شعبان، صفحہ 100۔ ایضاً حدیث نمبر 1378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 245     4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 246

ہی اوقات کے منسوخ کرنے کے بارے میں کوئی حدیث ہے تم اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔

زمخشری نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے لیلۃ برائۃ میں لوح محفوظ سے لکھنے کا عمل شروع ہوگا اور لیلۃ القدر میں اس سے فراغت ہوگی (1)۔ رزقوں کا نسخہ حضرت میکائیل کے حوالے کیا جائے گا حروب کا نسخہ حضرت جبریل کے حوالے کیا جائے گا اور اسی طرح زلزلوں صاعقوں اور دھنسانے کا معاملہ سپرد ہوگا اعمال کا نسخہ حضرت اسماعیل جو آسمان دنیا کے ذمہ دار ہیں ان کے سپرد ہوگا جو عظیم فرشتہ ہے۔ مصائب والا نسخہ (مسودہ) ملک الموت کے حوالے کیا جائے گا۔ بعض سے یہ مروی ہے: ہر عامل کو اس کے اعمال کی برکات عطا کی جائیں گی مخلوق کی زبانوں پر اس کی مدح ڈال دی جائے گی اور ان کے دلوں پر ہیبت ڈال دی جائے گی۔ اسے یُفَرِّق اور یَفرُق بھی پڑھا گیا ہے ہر ایک میں صیغہ معروف ہوتا ہے اور کل کو نصب دی جائے گی جدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نَفرُق پڑھا ہے۔

كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ۝ یہ امر حکمت والا ہے ہر عمل کرنے والا ہے حکمت جس کا تقاضا کرتی ہے۔

اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝

''ہر حکم ہماری جناب سے صادر ہوتا ہے ہم ہی (کتاب و رسول بھیجنے والے ہیں سراپا رحمت آپ کے رب کی طرف سے، بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا نقاش نے کہا: امر سے مراد قرآن ہے، اللہ تعالیٰ نے جسے اپنی جناب سے نازل کیا ہے (2)۔ ابن عیسیٰ نے کہا: اس سے مراد یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے احوال میں سے فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ مصدر ہے اور حال کے محل میں ہے۔ اسی طرح رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ہے اخفش کے نزدیک دونوں حال ہیں ان کی تقدیر ہے انزلناہ آمرین بہ و راحمین۔ مبرد نے کہا: اَمْرًا مصدر کے محل میں ہے تقدیر کلام ہے اَنزلناہ اِنزالا فراء اور زجاج نے کہا: اَمْرًا، یُفْرَقُ کی وجہ سے منصوب ہے۔ جس طرح تیرا قول ہے: یُفرق فرقا پس امر، فرق کے معنی میں ہوگا یہ مصدر ہے جس طرح تیرا قول یضرب ضربا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یُفْرَقُ، یومر پر دلالت کرتا ہے یہ اس عمل کا مصدر ہے جو اس سے قبل ہے۔ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ فراء نے کہا رَحْمَةً، مُرْسِلِيْنَ کا مفعول بہ ہے۔ رحمۃ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ زجاج نے کہا: رحمۃ مفعول بہ ہے تقدیر کلام ہے ارسلناہ للرحمۃ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر اس سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر ہے۔ زمخشری نے کہا: اَمْرًا اختصاص کے طور پر منصوب ہے۔ ہر امر کو عظیم بنایا کہ اس کی صفت حکیم سے بنائی پھر اس کی عظمت میں اضافہ کیا اور فخامت عطا کی کہ یہ کہا اس امر سے میری مراد یہ ہے کہ یہ ایسا امر ہے جو ہماری جناب سے حاصل ہے، یعنی ہماری جناب سے واقع ہوگا اور جس طرح ہمارے علم اور ہماری تدبیر نے تقاضا کیا۔ زید بن علی کی قراءت میں ہے امر من عندنا تقدیر کلام یہ ہوگی ھو امر یہ اس کے اختصاص کی بنا پر منصوب ہونے پر دال ہے۔ حضرت حسن بصری نے رحمۃ پڑھا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ھی رحمۃ یہ اس کے مفعول لہ کے طور پر منصوب ہونے کی مددگار ہے۔

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 271　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 246

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۞ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۞ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۞

''وہ جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی رب ہے، بلکہ وہ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں''۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کوفیوں نے رب جر کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ کی طرف لوٹے گا، چاہے تو اس سے کلام کو شروع کرے جز لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، تقدیر کلام ہو ھو رب السموات والارض۔

جر یہ مِّنْ رَّبِّكَ سے بدل ہونے کی وجہ سے ہوگی، اسی طرح رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۞ دونوں میں جر کی صورت ہوگی؛ شیزری نے نسائی سے یہ روایت نقل کی ہے۔ باقی قراء نے استیناف کے طریقہ پر مرفوع پڑھا ہے۔ پھر یہ احتمال موجود ہے کہ یہ خطاب اس معترف کو ہو جو تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے یعنی اگر تم اس کا یقین رکھتے ہو تو جان لو کہ اس کا حق ہے کہ رسولوں کو بھیجے اور کتابوں کو نازل کرے۔

یہ بھی جائز ہے کہ خطاب اس کو ہو جو اس کے خالق ہونے کا اعتراف نہیں کرتا یعنی انہیں چاہیے کہ اس کے خالق ہونے کا اعتراف کریں اور یہ اعتراف کریں کہ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں موقف سے مراد وہ ہے جو یقین کا ارادہ کرتا ہے اور اس کو طلب کرتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: فلان ینجد، وہ نجد کا ارادہ کرتا ہے، فلان یتھم وہ تہامہ کا ارادہ کرتا ہے۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وہ عالم کا خالق ہے اس لیے جائز نہیں کہ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے جو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور زندوں کو مارتا ہے۔ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۞ یعنی تمہارا مالک ہے اور تم سے پہلوں کا مالک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے سے بچو تاکہ تم پر عذاب نازل نہ ہو بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۞ یعنی جس ایمان اور اقرار کا اظہار کرتے ہیں اس میں یقین پر نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے وہ یہ بات علم کے بغیر اپنے آباء کی تقلید میں کہتے ہیں پس وہ شک میں مبتلا ہیں اگر وہ یہ وہم کرتے ہیں کہ وہ مومن ہیں تو وہ اپنے دین میں اس چیز کے ساتھ کھیلتے ہیں جو ان کے لیے بغیر حجت کے ظاہر ہوگا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ يَلْعَبُوْنَ کا معنی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف استہزاء کے طور پر جھوٹ منسوب کرتے ہیں۔ جو آدمی مواعظ سے اعراض کرتا ہے اسے لاعب کہتے ہیں، وہ اس بچے کی مانند ہوتا ہے جو کھیلتا ہے اور وہ کرتا ہے جس کے انجام سے آگاہ نہیں ہوتا۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۞ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞

''پس آپ انتظار کریں اس دن کا جب ظاہر ہوگا آسمان پر صاف نظر آنے والا دھواں جو چھا جائے گا لوگوں

پر، یہ دردناک عذاب ہوگا''۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ۝ ارتقب کا معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کفار کے ساتھ انتظار کریں جس آسمان پر واضح دھواں ہوگا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے ان کی بات کو یاد رکھیے تا کہ جس روز آسمان پر واضح دھواں ہوگا اس روز آپ ان پر گواہی دیں، اسی وجہ سے نگہبان کو رقیب کہتے ہیں۔ دخان کے بارے میں تین اقوال ہیں:

1۔ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے یہ ابھی ظاہر نہیں ہوا یہ زمین میں چالیس روز تک رہے گا جو زمین و آسمان کے درمیانی حصہ کو بھر دے گا۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اسے اس قدر تکلیف ہوگی جس قدر زکام ہوتا ہے جہاں تک کافر اور فاجر کا تعلق ہے تو وہ دھواں ان کے ناکوں میں داخل ہوگا اور ان کے کانوں میں سراخ کر دے گا اور ان کی سانسیں تنگ پڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز یہ جہنم کے آثار میں سے ہوگا۔ جس نے کہا: یہ دھواں ابھی ظاہر نہیں ہوا وہ حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، زید بن علی، حضرت حسن بصری، ابن ابی ملیکہ اور دوسرے علماء ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے مرفوع روایت نقل کی ہے: ''وہ ایسا دھواں ہوگا جو قیامت کے روز لوگوں پر سختی سے گردش کر رہا ہوگا (1)۔ مومن اس سے زکام جیسی تکلیف محسوس کرے گا اور کافر پھونکے مارے گا یہاں تک کہ اس کے کانوں سے وہ دھواں نکلے گا'' ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔

صحیح مسلم میں ابو الطفیل سے وہ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اچانک تشریف لائے جبکہ ہم گفتگو کر رہے تھے۔ پوچھا: ''تم کیا باتیں کر رہے تھے؟ (2)'' ہم نے عرض کی: ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ فرمایا: ''قیامت ہرگز برپا نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم اس سے قبل دس نشانیاں دیکھو گے اور ان کا ذکر کیا دھواں، دجال، دابہ، مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، حضرت عیسیٰ بن مریم کا آسمان سے اترنا، یاجوج ماجوج کا نکلنا، تین دفعہ دھنسنا، ایک دھنسنا مشرق میں، ایک دھنسنا مغرب میں اور ایک دھنسنا جزیرہ عرب میں ہوگا ان کے آخر میں آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان محشر کی طرف ہانک کرلے جائے گی''۔

ایک روایت میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''قیامت برپا نہیں ہوگی یہاں تک کہ دس نشانیاں ظاہر ہوں گی مشرق میں دھنسنا، مغرب میں دھنسنا، جزیرہ عرب میں ایک دفعہ دھنسنا، دھواں، دجال، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب سے نکلنا، عدن کے نشیبی علاقہ سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانک کرلے جائے گی''۔ اسے ثعلبی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان نشانیوں میں سے پہلی نشانی دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ بن مریم کا نکلنا، عدن کے نشیبی علاقہ سے آگ کا نکلنا (3) جو لوگوں کو میدان محشر کی طرف ہانک کرلے جائے گی جہاں لوگ رات گذاریں گے وہ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 247　　2۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب العلامات بین یدی الساعۃ و ذکر الدجال، صفحہ 472

3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 272

آگ بھی ان کے ساتھ ٹھہر جائے گی اور جہاں وہ قیلولہ کریں گے یہ آگ بھی قیلولہ کرے گی، جہاں وہ صبح کریں گے یہ آگ بھی صبح کرے گی، جہاں لوگ شام کریں گے یہ آگ بھی شام کرے گی''۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! یہ دھواں کیا ہے؟ تو آپ نے اس آیت کی تلاوت کی: فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ جو مغرب و مشرق کو بھر دے گا یہ دھواں چالیس دن اور راتیں رہے گا، جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اسے زکام جیسی تکلیف لاحق ہوگی، جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ نشے والے آدمی کی حالت کی طرح ہوگا، دھواں اس کے منہ، اس کے نتھنوں، اس کی آنکھوں، اس کے کانوں اور اس کی دبر سے نکلے گا'' یہ ایک قول ہے۔

(2) دوسرا قول یہ ہے کہ دھویں سے مراد وہ بھوک ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قریش کو پہنچی تھی یہاں تک کہ ایک آدمی آسمان اور زمین کے درمیان دھواں دیکھتا؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے اس مصیبت کو دور کر دیا اگر یہ قیامت کے دن ہوتا ان سے اس دھویں کو دور نہ کیا جاتا۔ ان سے یہ حدیث، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ترمذی میں موجود ہے۔ امام بخاری نے کہا: یحییٰ، ابو معاویہ سے، وہ اعمش سے وہ مسلم سے وہ مسروق سے روایت نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ نے کہا: یہ قحط اس لیے آیا تھا کیونکہ قریش نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خشک سالی کے مسلط ہونے کی دعا کی انہیں قحط اور مشقت نے آلیا یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھائیں ایک آدمی آسمان کی طرف دیکھتا تو وہ اپنے اور آسمان کے درمیان دھویں جیسی چیز کو دیکھتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو نازل کیا کہا: لوگ حضرت محمد مصطفیٰ علی التحیۃ والثناء کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے مضر کے لیے بارش کو طلب کیجئے کیونکہ وہ تو ہلاک ہوا جاتے ہیں (1)۔ فرمایا: ''مضر کے لیے تو تو بہت جری ہے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی، تو ان پر بارش ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝ جب ان کے پاس خوشحالی آتی تو وہ پھر اس حالت کی طرف لوٹ آتے۔ یہ خوشحالی کی حالت میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ کہا: اس سے مراد غزوہ بدر ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: دخان کا معنی خشک سال ہے۔ قتبی نے کہا: زمین کے خشک ہونے کی وجہ سے اسے دھواں کا نام دیا جب وہ زمین سے اٹھتی ہے جس طرح دھواں۔

3۔ اس سے مراد فتح مکہ ہے جب غبار نے آسمان کو چھپا دیا؛ یہ عبدالرحمٰن اعرج کا قول ہے۔

يَّغْشَى النَّاسَ یہ دخان کی صفت ہے۔ اگر مراد وہ ہے جو ابھی گذرا ہے جس طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا تو یہ اہل مکہ کے مشرکوں کے ساتھ خاص ہے۔ اگر یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے تو یہ عام ہے جس طرح پہلے گذرا ہے۔ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں یہ ارشاد فرمائے گا۔ جس نے کہا: دخان (دھواں) گذر چکا ہے تو هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ حال ماضیہ کی حکایت ہے، جس نے اسے آنے والے واقعات میں شمار کیا ہے تو وہ آنے والے حالات کی حکایت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: هذا یہ ذلك کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگ اس دھویں کے بارے میں کہیں گے: یہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قولہ یغشی الناس هذا عذاب الیم، جلد 2، صفحہ 714

دردناک عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر کے قریب آنے کی خبر ہے جس طرح تو کہتا ہے: هذا الشتاء فاعدله یہ موسم سرما ہے اس کے لیے تیاری کرو۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

''(اس وقت کہیں گے) اے ہمارے رب دور کردے ہم سے یہ عذاب ہم (ابھی) ایمان لاتے ہیں''۔

وہ عرض کریں گے: ہم سے عذاب کو دور کردے ہم ایمان لانے والے ہیں یعنی اگر تو ہم سے اس عذاب کو دور کردے تو ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: اگر اللہ تعالیٰ ہم سے اس عذاب کو دور کردے تو ہم اسلام لے آئیں گے پھر انہوں نے وعدہ خلافی کی۔ قتادہ نے کہا: یہاں عذاب سے مراد دھواں ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد بھوک ہے؛ نقاش نے اس کی حکایت بیان کی۔

میں کہتا ہوں: کوئی تناقض نہیں کیونکہ دھواں اس بھوک کی وجہ سے تھا جو انہیں لاحق ہوئی جس طرح یہ بحث گذری ہے بعض اوقات بھوک اور قحط کو بھی دخان کہتے ہیں کیونکہ خشک سالی کی وجہ سے زمین خشک ہوتی ہے اور بارشوں کے کم ہونے کی وجہ سے غبار بلند ہوتا ہے اسی وجہ سے خشک سالی کو غبراء کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہاں عذاب سے مراد برف ہے۔ ماوردی نے کہا: اس کی کوئی توجیہ نہیں کیونکہ یہ آخرت میں ہوگا یا اہل مکہ کے لیے ہوگا جبکہ مکہ برف باری کا علاقہ نہیں مگر یہ بات کی گئی تو ہم نے اس کا ذکر کردیا (2)۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾

''ان کے نصیحت قبول کرنے کی امید کہاں حالانکہ ان کے پاس تشریف لے آیا روشن رسول پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تھا اس سے اور کہا: سکھایا ہوا ہے دیوانہ ہے''۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى یعنی ان کے لیے عذاب کے نازل ہونے کے وقت کہاں سے نصیحت ہوگی۔ وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ یعنی ایسا رسول جو ان کے لیے حق کو واضح کرتا ہے۔ ذکریٰ اور ذکر ایک ہی چیز ہیں؛ یہ امام بخاری کا قول ہے (3)۔ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ یعنی انہوں نے اعراض کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کیا اور آپ کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت حاصل کرنے سے دور کردیا تو اب وہ کیسے نصیحت حاصل کرسکتے ہیں؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عذاب کے ظاہر ہونے کے بعد اور قیامت کی نشانیوں کے ظہور کے بعد ان کا قول اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ انہیں کیسے نفع دے گا جبکہ علامات علم بدیہی بن چکی ہیں۔ یہ تعبیر اس وقت ہوگی جب تو دخان کو ایسی علامت بنائے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ یعنی اسے کسی انسان نے تعلیم دی یا اسے کاہنوں اور شیاطین نے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 247 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قولہ تعالیٰ انی لھم الذکری وقد جاء کم رسول مبین، جلد 2، صفحہ 714

تعلیم دی ہے اس سے بڑھ کر یہ مجنون ہے رسول نہیں ہے۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ۝

''ہم دور کرنے والے ہیں عذاب کو قلیل عرصہ کے لیے تم پھر کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے''۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا یعنی وقتا قلیلا۔ وعدہ کیا کہ ان سے وہ عذاب تھوڑے عرصہ کے لیے دور کر لیا جائے گا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والے نہیں، بلکہ اس عذاب کے دور ہونے کے بعد وہ کفر کی طرف لوٹ جائیں گے؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارش کی دعا کرنے کے بعد عذاب دور ہو گیا تو وہ جھٹلانے والے طریقہ کی طرف لوٹ گئے (1)۔ جس نے یہ کہا تھا: دھویں کا انتظار کیا جا رہا ہے کہا اس کے ساتھ اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قیامت کی نشانیوں کے درمیان کچھ نہ کچھ سہولت و رخصت ہو گی پھر جس پر کفر کا فیصلہ ہو چکا ہو گا تو وہ اپنے کفر پر قائم رہے گا۔ جس نے کہا: یہ قیامت کے روز ہو گا اگر ہم تم سے عذاب کو دور کر دیں تو تم کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تم ہماری طرف لوٹنے والے ہو، یعنی تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تم ایمان نہ لائے تو تم جہنم کی آگ کی طرف لوٹنے والے ہو (2)۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝

''جس روز ہم انہیں شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدلہ لے لیں گے''۔

يَوْمَ یہ لفظ اس پر محمول ہے جس پر مُنْتَقِمُوْنَ ۝ دلالت کرتا ہے یعنی ہم ان سے انتقام لیں گے۔ بعض نحویوں نے اسے بعید از حقیقت خیال کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مابعد ماقبل کی تفسیر بیان نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں مُنْتَقِمُوْنَ ہے یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ انا پنے سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا اسے عَآىِٕدُوْنَ کے متعلق کرنا بھی اچھا نہیں اور اسی طرح اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ کے متعلق کرنا بھی صحیح نہیں کیونکہ معنی کا اس پر انحصار نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے مضمر ہونے کے ساتھ اسے نصب دی جائے گویا فرمایا: ذکرھم یا اذکر۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ تم لوٹنے والے ہو۔ جب تم لوٹو گے تو تم سے اس روز انتقام لیا جائے گا جس روز ہم بڑی پکڑ سے پکڑیں گے۔ اس وجہ سے یہ فرعون کے قصہ کے ساتھ کلام ملی ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان سے عذاب دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے پھر وہ ایمان نہ لائے یہاں تک کہ غرق کر دیئے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ۝ یہ مکمل کلام ہے۔ پھر يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ نئی کلام ہے یعنی ہم تمام کفار سے انتقام لیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے دھویں کا انتظار کرو اور ان کا انتظار کرو جس روز ہم پکڑیں گے تو واؤ عطف کو حذف کیا گیا جس طرح تو کہتا ہے: اتق النار اتق العذاب۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 247　2۔ ایضاً

الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس سے مراد یوم بدر ہے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابی بن کعب، مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول کیا گیا: قیامت کے روز عذاب جہنم مراد ہے (2)؛ یہ حضرت حسن بصری، عکرمہ اور حضرت ابن عباس کا قول ہے؛ اسے زجاج نے پسند کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ دھواں ہے جو دنیا میں واقع ہوگا یا بھوک یا قحط جو قیامت سے پہلے واقع ہوگی۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے اس سے مراد قیامت کا برپا ہونا ہے کیونکہ دنیا میں یہ پکڑوں میں سے آخری پکڑ ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نقمہ اور عقبہ میں فرق ہے عقوبت، معصیت کے بعد ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی عاقبہ میں سے ہے نقمہ بعض اوقات پہلے ہوا کرتی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عقوبت اسے کہتے ہیں جو اندازہ سے ہو اور انتقام جو اندازہ سے نہیں ہوتا۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿17﴾

''اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قوم فرعون کو اور آیا تھا ان کے پاس معزز رسول''۔

یعنی ہم نے انہیں آزمایا (3)۔ اس فتنہ اور ابتلا کا معنی ہے طاعت کا امر، یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کر کے ممتحن کا سا معاملہ کیا تو انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ ایمان نہ لائے تو ہم تیرے دشمنوں کے ساتھ اسی قوم کا معاملہ کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کو فتنہ میں ڈالنے کا مطلب ہے ہم نے انہیں غرق کرنے کے ساتھ عذاب میں ڈالا۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی آل فرعون کے پاس رسول کریم آئے تو ہم نے انہیں غرق کر دیا کیونکہ فتنہ رسول کے آنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔ كَرِيْمٌ کا معنی ہے وہ اپنی قوم میں معزز تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اخلاق میں کریم تھے یعنی درگذر سے کام لیتے تھے (4)۔ فراء نے کہا: وہ اپنے رب کی بارگاہ میں معزز تھے کیونکہ آپ کو نبوت اور کلام سنانے کے لیے مختص کیا گیا۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿18﴾ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿19﴾

''اس نے فرمایا تھا کہ میرے حوالے کر دو اللہ کے بندوں کو میں تمہارے لیے معتبر رسول ہوں اور نہ سرکشی کرو اللہ کے مقابلہ میں، میں لے آیا ہوں تمہارے پاس اپنی رسالت کی روشن دلیل''۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے وہ ان کے پاس آیا اس نے کہا میری اتباع کرو عِبَادَ اللّٰهِ یہ منادی ہے۔ مجاہد نے کہا: اللہ کے بندوں کو میرے ساتھ بھیج دو اور انہیں عذاب سے آزاد کر دو۔ اس تعبیر کی بنا پر عباد اللہ مفعول بہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے مجھے اپنی قوت سماعت دو یعنی میری بات سنو یہاں تک کہ میں تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، انی لهم الذکری، جلد 5، صفحہ 15
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 248
3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 2249
4۔ ایضاً

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ یعنی میں وحی پر امین ہوں پس میری نصیحتوں کو قبول کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو میں تم سے لیتا ہوں اس میں امین ہوں میں اس میں کوئی خیانت نہیں کرتا۔

وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ تم اس پر تکبر نہ کرو اور اس کی طاعت سے اپنے آپ کو بلند نہ جانو۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ پر بغاوت نہ کرو(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنے میں سستی نہ کرو۔ بغی اور افتراء میں فرق ہے بغی فعل کے ساتھ ہوتی ہے اور افتراء قول کے ساتھ ہوتا ہے(2)۔ ابن جریج نے کہا: اللہ تعالیٰ پر عظیم نہ بنو(3)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہ کرو(4)۔ تعظیم اور استکبار میں فرق ہے تعظیم سے مراد مقتدر فرد کا بڑا جاننا اور استکبار کا معنی ہے ذلیل کم مرتبہ آدمی کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ قتادہ نے کہا: واضح عذر۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: واضح دلیل، معنی ایک ہی ہے، یعنی واضح دلیل۔

وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝

''اور میں نے پناہ لے لی ہے اپنے رب کی اور تمہارے رب کی کہ تم مجھ پر پتھراؤ کر سکو''۔

گویا انہوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی۔ قتادہ نے کہا: تم پتھروں سے رجم کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم مجھے گالیاں دو تو تم کہو جادوگر جھوٹا ہے۔ نافع، ابن کثیر، ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے عُذْتُ کی ذال کو ظاہر کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ادغام کیا ہے۔ ادغام تخفیف کو طلب کرنے کے لیے ہے اور اظہار اصل قاعدہ کے مطابق ہے۔ پھر یہ قول یہ کیا گیا ہے: زمانہ گذشتہ میں، میں نے تجھ سے پناہ چاہی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا اور فرمایا: فلا یصلون الیکما۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ انی اعوذ کے معنی میں ہے، جس طرح تو کہتا ہے: نشدتك بالله، اقسمت علیك بالله۔ یعنی میں قسم کھاتا ہوں۔

وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝

''اور اگر تم ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تو پھر مجھ سے کنارہ کش ہو جاؤ''۔

وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ اگر تم میری تصدیق نہ کرو اور میری دلیل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لاؤ لی میں لام اجلیہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے یہاں لام، باء کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (عنکبوت: 26) یہاں بھی لام، باء کے معنی میں ہے۔

فَاعْتَزِلُوْنِ ۝ مجھے چھوڑ دو نہ میری طرف داری کرو اور نہ میرے خلاف کسی کی مدد کرو؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم مجھ سے الگ تھلگ ہو جاؤ میں تم سے الگ تھلگ ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میرا راستہ چھوڑ دو اور مجھ سے اپنی اذیت کو روک دو(5)۔ معنی قریب قریب ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 249 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 71

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''پس پکارا موسیٰ نے اپنے رب کو (الٰہی) بلاشبہ یہ مجرم لوگ ہیں''۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اس میں حذف ہے تقدیر کلام یوں ہے فکفروا فدعا ربہ۔ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ یہاں ان کا ہمزہ مفتوح ہے کیونکہ اصل میں یہ بان تھا۔ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وہ مشرک قوم ہیں، انہوں نے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے اور ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

''(حکم ملا) لے چلو میرے بندوں کو راتوں رات تمہارا تعاقب کیا جائے گا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا ہم نے اس کی دعا کو قبول کیا اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو رات کے وقت لے چلو یعنی بنی اسرائیل میں سے جو ایمان لائے ہیں، لَیْلًا صبح سے پہلے۔

اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ اہل حجاز نے فاسر ہمزہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے، ابن کثیر نے بھی اسی طرح پڑھا ہے یہ سری سے مشتق ہے باقی قراء نے اسے فاسر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے یہ سری سے مشتق ہے۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ سورۂ بقرہ، اعراف، طٰہٰ، شعراء اور یونس میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات عطا فرمائی۔ اس لیے دوبارہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رات کے وقت نکلنے کا حکم دیا تھا (1)، رات کا سفر عموماً خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خوف دو وجہ سے ہوتا ہے۔ 1۔ دشمن کا خوف ہوتا ہے تو رات کو پردہ بنایا جاتا ہے۔ یہ رات اللہ تعالیٰ کے پردوں میں سے ایک پردہ ہے۔ 2۔ جانوروں اور جسموں پر مشقت اور تکلیف سے خوف کی وجہ سے رات کو سفر کیا جاتا ہے۔ وجہ گرمی ہو یا خشک سالی ہو۔ تو مصلحت کی غرض سے رات کو سفر کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو سفر کرتے، رات کے پہلے پہر سفر کرتے کبھی آہستہ چلتے اور کبھی جلدی کرتے، جس طرح ضرورت ہوتی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا۔ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: إذا سافرتم في الخصب فأعطوا الإبل حظها في الأرض وإذا سافرتم في السنة فبادروا بها نِقيها (2) جب تم سرسبز و شادابی کے دور میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین میں سے اس کا حصہ دو (اپنے چرنے کا موقع دو) جب تم خشک سالی کے دور میں سفر کرو تو جلدی چلو تاکہ مقصد کو پالو جبکہ اونٹ میں قوت باقی ہو۔ سورۂ نحل کے آغاز میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور رہنے دو سمندر کو تھما ہوا، بے شک وہ ایسا لشکر ہے جو غرق ہو کر رہے گا''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رَهْوًا کا معنی راستہ ہے؛ یہ قول کعب اور حضرت حسن بصری کا بھی ہے۔ حضرت ابن

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1691

2۔ جامع ترمذی، کتاب الأدب، ما جاء في الفصاحة والبيان، جلد 2، صفحہ 108

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے راستہ۔ ضحاک اور ربیع نے کہا: اس کا معنی آسان ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس کا معنی خشک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (طٰہٰ: 77) ایک قول یہ کیا گیا ہے: جدا جدا۔ مجاہد نے کہا: کھلا، ان سے یہ قول بھی مروی ہے: خشک، ان سے یہ قول بھی مروی ہے: ساکن، لغت میں یہی معروف ہے، یہ قتادہ اور ہروی کا قول ہے۔ دوسروں نے کہا: کھلا۔ ابن عرفہ نے کہا: یہ دونوں ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں کیونکہ جب اس کا چلنا ساکن ہو جاتا ہے تو وہ کھل جاتا ہے، اسی طرح سمندر اس کا چلنا ساکن ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کھل گیا۔ عربوں کے نزدیک رھو سے مراد ساکن ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: جاءت الخیل رھوا۔ گھوڑے پر سکون آئے۔ شاعر نے کہا:

والخیل تَمْزَعُ رَهْوًا فی أعنتها کالطیر تنجو من الشُّؤبُوب ذی البرد

گھوڑے تیزی سے گذرتے ہیں جبکہ ان کی لگامیں پر سکون ہیں، جس طرح پرندے ایسے بادل سے نجات پاتے ہیں جو موٹے قطرات والی بارش اور سردی والا ہو۔

جوہری نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے افعل ذلك رھوا یعنی سکون و وقار سے یہ کام کر۔ عیشٌ راھٍ، پر سکون خوشحال زندگی، رھا البحر، سمندر پر سکون ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا: رَهَا بین رجلیه یَرْهُو رَهْوًا۔ یعنی اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو کھلا کیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا رھو سے مراد نرم چال ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: جاءت الخیل رھوا۔ ابن اعرابی نے کہا: رَهَا یَرْهُو فی السیر یعنی اس نے نرمی کی۔ قطامی نے سواری کے اونٹوں کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

یَمْشِین رَهْوًا فلا الأعجازُ خاذِلَةٌ ولا الصدورُ علی الأعجاز تَتَّكِلُ

وہ نرمی سے چلتے ہیں ان کے پچھلے حصے کمزور نہیں اور نہ ہی ان کے سینے ان کے پچھلے حصوں کا سہارا لیتے ہیں۔ رھو اور رھوۃ سے مراد بلند جگہ ہے اور پست جگہ کو کہہ دیتے ہیں جس میں پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ ابو عبید نے کہا: رھو سے مراد وہ گڑھا ہے جو ایک قوم کے محلہ میں ہو جس میں بارش اور دوسرا پانی بہتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "یہ فیصلہ ہو چکا ہے گھر کے صحن، راستہ، منقبہ (دو گھروں کے درمیان راستہ) رکح (پیچھے کی جانب سے کمرے کا کنارہ) اور پانی کے رستے میں کوئی شفعہ نہیں"۔ اس کی جمع رھاء آتی ہے الرھو المرأۃ الواسعۃ الھن۔ وسیع خصلتوں والی عورت، اسے نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے۔ رھو سے مراد پرندے کی ایک قسم۔ اسے کرکی کہتے ہیں۔ مہدوی نے کہا: یہ جائز ہے کہ رھو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفت ہو؛ یہ قشیری کا قول ہے یعنی اپنی حالت پر پر سکون رہو۔ اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی صفت ہے، یہ سمندر کی صفت نہیں۔ پہلی تعبیر کی صورت میں یہ سمندر کی صفت ہے یعنی جس طرح وہ تھا اسی طرح اسے ساکن رہنے دو جس طرح وہ جدا جدا تھا اسے ملنے کا حکم نہ دو یہاں تک کہ فرعون اور اس کی قوم داخل ہو جائے۔ قتادہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا تھا کہ جب انہوں نے اپنے عصا کے ساتھ اسے الگ الگ کیا تھا (1) تو عصا مار کر سمندر کو ملا دیں یہ بھی خوف تھا کہ فرعون

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 72

ان کے پیچھے بھی نہ آ جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہا گیا: ایک قول یہ کیا گیا ہے: رھو کا معنی سکون نہیں بلکہ اس سے مراد دو چیزوں کے درمیان کشادگی ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: رھا مابین الرجلین اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو کھلا کیا۔ عیشٌ راہٍ خوشحال زندگی، افعل ذلك سھوا رھوا اس امر کو نرمی سے سختی کے بغیر کرو۔ ہم نے اس کا ذکر ابھی کیا ہے اِنَّهُمْ یعنی فرعون اور اس کی قوم جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ وہ غرق ہونے والے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دی گئی تا کہ ان کا دل پر سکون رہے۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾

''وہ چھوڑ گئے بہت سے باغات اور چشمے (سرسبز) کھیتیاں اور شاندار مقامات اور بہت سارا ساز و سامان جس میں وہ عیش کیا کرتے تھے''۔

كَمْ کثرت بیان کرنے کے لیے ہے۔ سورۂ شعراء میں اس آیت کے معنی کے متعلق گفتگو گذر چکی ہے۔ نَعْمَةٍ نون کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کا معنی تنعیم ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: نانعمه الله و ناعمه فتنعم اللہ تعالیٰ نے اس پر انعام کیا تو وہ اچھی وخوشحال زندگی گذارنے لگا۔ نعمة۔ کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی احسان ہے جو تجویز کیا جاتا ہے، اسی طرح نعمی ہے۔ اگر تو نون کو فتح دے گا تو اسے مدہ پڑھے گا تو کہے گا: نعماء۔ نعم اس کی مثل ہے۔ فلان واسع النعمة۔ اس کے پاس وسیع مال ہے؛ یہ سب اقوال جوہری کی صحاح سے منقول ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: نَعْمَةٍ سے مراد دریائے نیل ہے(1)۔ ابن لہیعہ نے کہا: فیوم ہے۔ ابن زیاد نے کہا: مصر کی سرزمین ہے جس میں بہت زیادہ منافع ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد خوشحالی ہے۔ اسے نَعمة اور نِعمة دونوں طرح پڑھا جاتا ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے(2)۔ کہا: دونوں میں فرق کی دو وجوہ ہیں: 1۔ نون کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا اطلاق ملک میں ہوتا ہے اور فتحہ کے ساتھ ہو تو بدن اور دین میں ہوتا ہے؛ یہ نضر بن شمیل نے کہا ہے۔ 2۔ یہ کسرہ کے ساتھ ہے جس کا معنی فضل و احسان کرنا اور عطیہ دینا ہے۔ فتحہ کے ساتھ ہو تو معنی تنعیم ہے جس سے مراد خوشحال زندگی اور راحت ہے؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ فرق صحاح میں موجود ہے، ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ ابو رجاء، حضرت حسن بصری، ابو اشہب، شرج، ابو جعفر اور شیبہ نے فکھین پڑھا ہے۔ یہ الف کے بغیر ہے اس کا معنی اترانے والے ہیں۔ جوہری نے کہا: فکه الرجل اس سے اسم فاعل فکِه ہے جب وہ اچھے مزاح کا مزاح کرنے والا ہو۔ فكه کا معنی بھی اترانے والا ہے۔ اسے ونعمة كانوا فيها فکھین اس میں اترانے والے ہیں۔ فٰكِهِيْنَ لطف اندوز ہونے والے خوشحال۔ قشیری نے کہا: اس کا معنی ہے مزاح کرنے والے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: انه لفاكه۔ وہ مزاح کرنے والا ہے۔ فيه فكاهة اس میں مزاح کی حس موجود ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں، جس طرح حاذر اور حذر، فارکا اور فرکا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فاکہ اسے کہتے ہیں جو لذت کی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 251
2۔ ایضاً

باتیں سنتا ہے جس طرح کھانے والا مختلف قسم کے پھل کھاتا ہے (1)۔ فاکھہ اسے کہتے ہیں جو اس خوراک سے زائد ہو جس کے بغیر چارہ کار نہیں ہوگا۔

**كَذٰلِكَ ۗ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝**

''یونہی ہم نے وارث بنا دیا تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو''۔

زجاج نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے الأمر کذلك (2)۔ تو کذلك پر وقف کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کاف محل نصب میں ہے، معنی یہ بنے گا جس کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں ہم اس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرتے ہیں۔ کلبی نے کہا: جو آدمی میری نافرمانی کرتا ہے میں اس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معاملہ اس طرح تھا تو پس انہیں ہلاک کیا گیا۔

**وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝** - **قَوْمًا اٰخَرِيْنَ** سے مراد بنو اسرائیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر کے علاقہ کا مالک بنا دیا جبکہ وہ پہلے جس طرح غلام تھے تو وہ اس کے وارث بن گئے کیونکہ یہ چیزیں ان تک اس طرح پہنچیں جس طرح میراث کا مال پہنچتا ہے، اس کی مثل وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا ہے۔ (الاعراف: 137)

**فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝**

''پس نہ رویا ان (کی بربادی) پر آسمان اور نہ زمین اور نہ انہیں مزید مہلت دی گئی''۔

**فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ** ان پر آسمان اور زمین ان کے کفر کے باعث نہ روئے **وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ** اور انہیں غرق ہونے میں مہلت نہ دی گئی۔ عرب اپنے سردار کی موت کے وقت کہا کرتے تھے: بکت له السماء والأرض اس کی مصیبت تمام اشیاء کو عام ہوگئی یہاں تک کہ آسمان، زمین، ہوا اور بجلی بھی روئے۔ بکته اللیالی الشاتیات۔ اس کے لیے موسم سرما کی راتیں روئیں۔ شاعر نے کہا:

فالریح تبکی شجوَهَا والبرق یلمع فی الغمامة

ہوا اپنے غم کو روتی ہے اور بجلی بادل میں چمکتی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

والشمسُ طالعةٌ لیست بکاسفة تُبکی علیك نجوم اللیل والقمرا

سورج طلوع ہے وہ گرہن میں نہیں تجھ پر رات کے ستارے اور چاند رو رہے ہیں۔

خارجیہ نے کہا:

أیا شجر الخابور مالك مُورِقًا کأنك لم تجزع علی ابن طَرِیف

اے خابور کے درخت! کیا وجہ ہے تو پتے نکالے ہوئے ہے گویا تو ابن طریف پر غمگین نہیں۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 252
2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 73

یہ تمثیل اور تخییل کا طریقہ جزع کرنے اور رونے میں مبالغہ کے لیے ہے اس کا معنی ہے وہ ہلاک ہوئے نہ ان کہ مصیبت عظیم ہوئی اور نہ ان کی گمشدگی کو محسوس کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں اضمار ہے معنی ہے ان پر آسمان اور زمین والے یعنی فرشتے نہیں روئے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف :82) بلکہ وہ اس کی ہلاکت سے خوش ہوئے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ یزید رقاشی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی مومن نہیں مگر اس کے لیے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے اور ایک دروازہ ہے جس سے اس کا کلام اور عمل داخل ہوتا ہے۔ جب وہ فوت ہو جاتا ہے تو وہ اس کی کمی محسوس کرتے ہیں اور اس پر روتے ہیں'' (1)۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ یعنی انہوں نے زمین پر کوئی عمل صالح نہیں کیا جس کی وجہ سے ان پر رویا جائے۔ اور آسمان کی طرف بھی ان کا کوئی عمل صالح نہیں چڑھا کہ آسمان اس کے مفقود ہونے پر روئے۔ مجاہد نے کہا: آسمان اور زمین مومن پر چالیس دن تک روتے ہیں۔ ابو یحییٰ نے کہا: میں ان کے قول پر متعجب ہوا۔ مجاہد نے کہا: کیا تو تعجب کا اظہار کرتا ہے زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس بندے پر نہ روئے جو اسے رکوع و سجود کے ساتھ آباد کرتا تھا اور آسمان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس بندے پر نہ روئے جس کی تسبیح اور تکبیر کی وجہ سے ایسی آواز ہوتی تھی جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔

حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس پر زمین میں سے اس کے نماز پڑھنے کی جگہ اور آسمان میں سے اس کے عمل کے بلند ہونے کی جگہ روتی ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر آیت کی تقدیر یہ ہو گی آسمان میں سے اس کے اعمال کے بلند ہونے کی جگہ اور زمین میں سے اس کی عبادات کی جگہ اس پر روئیں؛ یہ حضرت سعید بن جبیر کے قول کا معنی ہے۔ آسمان اور زمین کے رونے کی تین وجوہ ہیں: 1۔ وہ معروف طریقہ ہے جس طرح حیوان روتا ہے؛ یہ مجاہد کے قول کے مشابہ ہے۔ شریح حضرمی نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسلام شروع ہوا تو بھی تنہا تنہا لوگ اسلام لائے اور جس طرح شروع ہوا تھا اسی حالت کی طرف یہ لوٹ جائے گا۔ قیامت کے روز ان تھوڑے سے افراد کے لیے مبارک ہے'' (2)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ''وہ وہ لوگ ہیں جب لوگ فساد کا شکار ہو جائیں گے تو وہ صالحیت کو اپنائیں گے'' پھر فرمایا: ''خبردار! اب مومن پر کوئی تنہائی نہیں کوئی مومن تنہائی میں نہیں مرتا جب اس پر رونے والے اس سے غائب ہوتے ہیں تو آسمان اور زمین اس پر روتے ہیں'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ پھر فرمایا: ''بے شک یہ دونوں کافر پر نہیں روتے''۔

میں کہتا ہوں: ابو نعیم محمد بن معمر نے کہا ابو شعیب حرانی، یحییٰ بن عبد اللہ سے وہ اوزاعی سے وہ حضرت عطا خراسانی سے روایت نقل کرتے ہیں ''کوئی بندہ بھی زمین کے کسی حصہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہے تو وہ بقعہ زمین قیامت کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ دخان، جلد 2، صفحہ 158۔ ایضاً، حدیث نمبر 3177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان الاسلام بدأ غریباً وسیعود غریباً، جلد 1، صفحہ 84

روز اس کے حق میں گواہی دیگا اور جس روز وہ مرتا ہے وہ بقعہ زمین اس پر روتا ہے"۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے رونے سے مراد اس کے اطراف کا سرخ ہو جاتا ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا، عطا، سدی، ترمذی محمد بن علی کا قول ہے۔ اسے حضرت حسن بصری نے روایت کیا ہے۔ سدی نے کہا: جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو آپ پر آسمان رویا اور اس کا رونا اس کا سرخ ہونا تھا (1)۔

جریر نے یزید بن ابی زیاد سے روایت کی ہے: جب حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کو شہید کیا گیا تو آسمان کے افق چار ماہ تک آپ کے لیے سرخ رہے۔ یزید نے کہا: اس کا سرخ ہونا ہی اس کا رونا ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا: لوگوں نے ہمیں بتایا وہ سرخی جو شفق کے ساتھ ہوتی ہے وہ نہ ہوا کرتی یہاں تک کہ امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا۔ سلیمان قاضی نے کہا: جس روز امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا ہم پر خون کی بارش کی گئی۔

میں کہتا ہوں: دار قطنی نے امام مالک بن انس سے وہ نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "شفق سے مراد سرخی ہے" (2)۔ حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت شداد بن اوس دونوں نے کہا: شفق کی دو صورتیں ہیں۔ سرخ اور سفید (3)۔ جب سرخی غائب ہو جاتی ہے تو عشاء کی نماز حلال ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شفق سے مراد سرخی ہے (4)۔ یہ قول اس قول کو رد کر دیتا ہے ابن سیرین نے جس کی حکایت بیان کی ہے۔ سبحان (سورۂ اسراء) میں قرہ بن خالد سے روایت گذر چکی ہے۔ "آسمان کسی پر نہیں رویا مگر حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام پر اور حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر۔ اس کا سرخ ہونا ہی اس کا رونا ہے"۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا: رونے سے مراد کسی شے کو تیزی سے حرکت دینا جب آنکھ اپنے پانی کو حرکت دے تو کہا جاتا ہے آنکھ روئی، جب آسمان اپنی سرخی کو حرکت دے تو کہتے ہیں آسمان رویا، جب زمین اپنے غبار کو حرکت دے تو کہتے ہیں زمین روئی، کیونکہ مومن نور ہے اس کے ساتھ اللہ کا نور ہے زمین اس کے نور سے روشن ہے اگرچہ تیری آنکھوں سے غائب ہے۔ اگر وہ مومن کے نور کو نہیں پاتی تو وہ غبار آلود ہوتی ہے اور اس کا غبار زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہ زمین مشرکوں کی خطاؤں کی وجہ سے غبار آلود ہے یہ مومن کے نور سے روشن ہوتی ہے جب اس سے مومن کو قبض کیا جاتا ہے تو اس کا غبار زیادہ ہو جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: جس روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ہر شے روشن ہوگی، جس روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو ہر شے تاریک ہوگئی۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین میں مصروف تھے ہم نے اس سے اپنے ہاتھوں کو نہ جھاڑا یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کو اجنبی اجنبی پایا۔ جہاں تک آسمان کے رونے کا تعلق ہے وہ اس کا سرخ ہونا ہے جس طرح حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا۔

نصر بن عاصم نے کہا: نشانیوں میں سے پہلی سرخی ہوگی جو ظاہر ہوگی یہ قیامت کے قریب ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ وہ

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 253　　2۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، باب فی صفۃ المغرب والصبح، جلد 1، صفحہ 269

3۔ ایضاً　　4۔ ایضاً

شدت سے روئے گی کیونکہ وہ مومنوں کے انوار سے خالی ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا رونا ایسی نشانی ہے جو اس سے ظاہر ہوتی ہے جو افسوس اور غم پر دلالت کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ مناسب و موزوں ہے کیونکہ اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ جب آسمان اور زمین تسبیح کرتے ہیں سنتے ہیں اور کلام کرتے ہیں، جس طرح ہم نے سبحان (سورۂ اسراء)، مریم اور حم فصلت میں بیان کیا ہے، اسی طرح زمین روتی ہے جبکہ اس کے بارے میں روایات بھی آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اقوال کے صحیح ہونے کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔

## وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور بے شک ہم نے نجات دی بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے (یعنی) فرعون (کی غلامی) سے بلاشبہ وہ بڑا متکبر (اور) حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا''۔

یعنی ان تمام مظالم سے جو قبطی فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کے ساتھ روا رکھتے تھے جس طرح انبیاء کو قتل کرنا، عورتوں سے خدمت لینا، مردوں کو غلام بنا لینا اور مشکل امور ان پر لازم کرنا۔

مِنْ فِرْعَوْنَ یہ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ سے بدل ہے مِنْ فِرْعَوْنَ یہ مِنَ الْعَذَابِ کے متعلق نہیں ہوگا کیونکہ اس کی صفت نہیں لگائی گئی ہے وہ وصف کے بعد فعل کا سا عمل نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے انہیں عذاب اور فرعون سے نجات دی۔

اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وہ مشرکوں میں سے جابر تھا۔ یہ مدح میں زیادتی نہیں بلکہ اسراف میں زیادتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ (قصص: 4) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس بلندی سے مراد اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بلندی ہے۔

## وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾

''اور ہم نے چنا تھا بنی اسرائیل کو جان بوجھ کر جہان والوں پر''۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ ھم ضمیر سے مراد بنی اسرائیل ہیں عَلٰى عِلْمٍ ہمیں ان کے بارے میں علم تھا کہ ان میں سے کثیر انبیاء ہوں گے۔ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ ان کے زمانہ کے لوگوں پر۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ (آل عمران: 110) یہ قتادہ اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام عالموں پر کیونکہ ان میں انبیاء بنائے۔ یہ ان کے لیے خاص ہے یہ غیر کے لیے نہیں؛ یہ قول ابن عیسیٰ، زمخشری اور دوسرے علماء نے کیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ یہ بنی اسرائیل کے بعد کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پسندیدگی، اس بنا پر تھی کہ انہیں غرق ہونے سے چھٹکارا دلادیا اور فرعون کے بعد انہیں زمین کا مالک بنا دیا۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ۝۳۳

''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی''۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ آیات سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ۝ قتادہ نے کہا: آیات سے مراد انہیں فرعون کے ظلم سے نجات دینا، ان کے لیے سمندر کو پھاڑنا، ان پر بادل سے سایہ کرنا اور من وسلوی کو نازل کرنا ہے (1)۔ یہ خطاب بنی اسرائیل کی طرف متوجہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عصا اور ید بیضا کا معجزہ ہے۔ یہ فراء کے قول کے مشابہ ہے اور خطاب قوم فرعون کی طرف متوجہ ہوگا۔ ایک تیسرا قول یہ ہے: اس سے مراد وہ برائی ہے جس سے آپ نے ان کو روکا اور وہ بھلائی ہے جس کا آپ نے انہیں حکم دیا تھا؛ یہ عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے۔ خطاب ایک ہی ہے دونوں فریقوں کی طرف متوجہ ہوگا یعنی قوم فرعون اور بنی اسرائیل۔ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ میں چار قول ہیں: 1۔ ظاہر نعمت، یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (انفال: 17)

زہیر نے کہا:

فأبلاهما خيرَ البلاء الذي يَبْلُو

وہ نعمت جو وہ کرتا ہے اس میں سے بہترین نعمت ان دونوں پر کی۔ 2۔ شدید عذاب، یہ فراء کا قول ہے۔ 3۔ اس آزمائش جس کے ساتھ مومن کافر سے ممتاز ہو جاتا ہے؛ یہ عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی قول مروی ہے: خوشحالی اور تنگ دستی کے ساتھ آزمایا، پھر یہ آیت پڑھی: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (انبیاء: 35)

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝۳۴ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝۳۵ فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۶

''بے شک یہ (کفار مکہ) بھی کہتے ہیں: نہیں ہے (ہمارے لیے) مگر ہماری (یہی) پہلی موت اور نہ ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا بھلا ہمارے باپ دادوں کو تو زندہ کر کے لے آؤ اگر تم سچے ہو''۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ واؤ ضمیر سے مراد قریش کے کفار ہیں اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى یہ مبتدا اور خبر ہے، جس طرح یہ کلام ہے اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (اعراف: 155) اور یہ کلام ہے اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا (انعام: 29) وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝ ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اٹھایا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ منشورون کا معنی مبعوثون ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفار قریش میں سے یہ بات کرنے والا ابوجہل تھا، اس نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارے آباء میں سے دو آدمی اٹھاؤ! ان

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 254

میں سے ایک قصی بن کلاب ہے کیونکہ وہ ایک سچا شخص تھا تا کہ ہم اس سے پوچھ سکیں کہ موت کے بعد کیا ہوا۔ یہ قول ابوجہل کی جانب سے کمزور ترین شبہ ہے، کیونکہ دوبارہ اٹھانا جزا کے لیے ہے احکام کا مکلف بنانے کے لیے نہیں گویا اس نے کہا: اگر آپ اس قول میں سچے ہیں کہ دوبارہ اٹھانا جزا کے لیے ہے تو انہیں دوبارہ مکلف بنانے کے لیے اٹھائیں۔ یہ قائل کے اس قول کی طرح ہے اگر وہ یہ کہتا ہے: اگر ہمارے بعد ابناء میں سے افراد کو اٹھایا جانا ہے تو آباء میں سے جو گذر چکے ہیں وہ کیوں نہیں لوٹتے۔ یہ ماوردی نے حکایت بیان کی ہے۔ پھر یہ قول کیا گیا: فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے جس طرح ارشاد ہے ٹرَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ (المومنون) یہ فراء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آپ کو اور آپ کے پیروکاروں کو خطاب ہے۔

اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۳۷ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝۳۸ مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۹

''(اے لوگو! ذرا سوچو) کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو لوگ ان سے پہلے گذرے ہیں ہم نے انہیں (بہمہ شوکت وحشمت) ہلاک کر دیا ہے، بے شک وہ مجرم تھے۔ اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر۔ نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان و زمین کو مگر حق کے ساتھ لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ یہ استفہام انکاری ہے۔ وہ ایسی بات کر کے عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، کیونکہ وہ قوم تبع اور ہلاک ہونے والی قوموں سے بہتر نہیں۔ جب ہم نے ان کو ہلاک کر دیا ہے تو اسی طرح ان کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا یہ زیادہ نعمتوں والے ہیں اور زیادہ اموال والے ہیں یا تبع کی قوم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا یہ زیادہ عزت والے، طاقت ور اور محفوظ ہیں یا تبع کی قوم۔ تبع سے مراد ایک فرد نہیں بلکہ اس سے مراد یمن کے بادشاہ ہیں۔ یمن والے اپنے بادشاہوں کو تبابع کہتے تھے۔ تبع بادشاہ کا لقب تھا جس طرح مسلمانوں کے لیے خلیفہ ہوتا ہے۔ کسریٰ ایرانیوں کا حاکم ہوتا ہے اور قیصر رومیوں کے بادشاہ کو کہتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: ان میں سے ہر ایک کو تبع کہتے کیونکہ وہ اپنے ساتھی کی اتباع کرتا۔ جوہری نے کہا: تبابع یمن کے بادشاہوں کو کہتے ہیں۔ ان کا واحد تبع ہے تبع کا معنی سایہ بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

یرد المیاہ حضیرۃً و نَفیضۃً　　وِرْدَ القطاۃ إذا اسْمَأَل التُّبَّعُ

''وہ چشموں پر حضیرہ، نفیضۃ (جماعتوں کی صورت) میں وارد ہوتے ہیں جس طرح کونج وارد ہوتی ہیں جب سایہ چھوٹا ہو جائے''۔ تبع پرندوں کی ایک قسم کو بھی کہتے ہیں۔ سہیلی نے کہا: تبع اس بادشاہ کو کہتے جو یمن، شحر اور حضرموت کا مالک ہوتا وہ صرف یمن کا مالک ہوتا تو اسے تبع نہ کہتے؛ یہ مسعودی کا قول ہے۔ تبابع میں سے حارث رائش تھا جو ابن ہمال ذی سدد تھا، ابرہہ ذو منار، عمرو ذوالاذعار، شمر بن مالک جس کی طرف سمرقند منسوب ہے۔ افریقیس بن قیس، جس نے بربروں کو کنعان سے افریقہ کی طرف نکالا اسی وجہ سے انہیں افریقی کہتے ہیں۔

آیات سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کا ارادہ کیا ہے عرب اسے اس نام سے زیادہ جانتے تھے بنسبت کسی دوسرے آدمی کے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نہیں جانتا کیا تبع لعین ہے یا نہیں ہے''(1)۔ پھر نبی کریم ﷺ سے یہ بھی مروی ہے'' تبع کو گالیاں نہ دیا کرو کیونکہ وہ مومن تھا''(2)۔ یہ تیری راہنمائی کرتا ہے کہ وہ ایک معین فرد تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ وہ ابوکرب تھا جس نے بیت اللہ شریف پر لحاف چڑھایا تھا بعد اس کے کہ اس نے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ پر حملہ کا ارادہ کیا تھا اور اس کو برباد کرنے کا ارادہ کیا تھا، پھر جب اسے یہ بتایا گیا کہ یہ ایک نبی کی ہجرت کی جگہ ہے جس کا نام احمد ہوگا، تو وہ واپس چلا گیا تھا۔ اس نے ایک شعر کہا جسے وہ اس کے مکینوں کے پاس چھوڑ گیا تھا وہ یکے بعد دیگرے اس کے وارث بنتے رہے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف ہجرت کی تو انہوں نے وہ اشعار حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: وہ مکتوب اور شعر حضرت ابوایوب خالد بن زید کے پاس تھے۔ ان اشعار میں ہے:

شهدت علی أحمد أنه　رسول من الله باری النَسَمْ

فلو مُدّ عمری إلی عمره　لکنت وزیرًا له وابنَ عَمْ

میں حضرت احمد پر گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ جو خالق کائنات ہے کے رسول ہیں۔ اگر میری عمر ان کی عمر تک طویل ہوئی تو میں ان کا وزیر اور ان کا چچازاد ہوں گا یعنی مددگار، اور دست و بازو۔

زجاج، ابن ابی دنیا، زمخشری اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے دور اسلام میں اس کی صنعاء میں ایک قول کے مطابق حمیر کی اطراف میں، قبر کھودی گئی اس میں دو عورتوں کے وجود پائے گئے ان کے سروں کے پاس چاندی کی تختی پائی گئی جس پر سونے سے لکھا گیا تھا: یہ حبی اور لمیس کی قبر ہے، یہ روایت بھی کی جاتی ہے: یہ حبی اور تماضر کی قبر ہے، یہ روایت بھی کی جاتی ہے: یہ رضوی کی قبر ہے(3) اور حبی کی قبر ہے جو دونوں تبع کی بیٹیاں تھیں وہ دونوں فوت ہوئیں جبکہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دیتی تھیں وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتی تھیں اسی پر اس سے قبل صالح لوگ فوت ہوئے۔

میں کہتا ہوں: ابن اسحاق اور دوسرے علماء نے روایت کی ہے جو مکتوب اس نے لکھا تھا اس میں تھا امابعد میں تجھ پر اور تجھ پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لایا، میں تیرے دین اور تیری سنت پر ہوں، میں تیرے رب اور ہر شے کے رب پر ایمان لایا اور میں اس پر ایمان لایا جو تیرے رب کی جانب سے احکام آئے اگر میں نے تجھے پالیا تو بہت بہتر، اگر میں نے تجھے نہ پایا تو میری شفاعت کرنا اور قیامت کے روز مجھے نہ بھولنا۔ میں تیری اس امت میں سے ہوں جو پہلے گذر چکے ہیں۔ اور میں نے تیرے آنے سے قبل تیرے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے میں تیری ملت اور تیرے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہوں۔ پھر مکتوب پر مہر لگائی اور اس پر یہ نقش بنایا لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ (الروم: 4) اور اس کے سرنامے پر لکھا

1۔ سنن أبی داؤد، کتاب السنة، فی التخییر بین الأنبیاء، جلد 2، صفحہ 286۔ ایضاً، حدیث نمبر 4054، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 80، حدیث نمبر 34085　　3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 280

الی محمد بن عبد الله نبی الله و رسوله خاتم النبیین محمد رسول رب العالمین ﷺ من تبع الأول ہم نے اس کے باقی ماندہ حالات اور اس کا ابتدائی حصہ اللمع اللؤلؤیة شرح العشر بینات النبویہ'' جو فارابی کی کتاب ہے میں ذکر کیا ہے۔ وہ دن جس میں تبع فوت ہوا اس دن سے لے کر اس دن تک جس میں نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی ایک ہزار سال کا عرصہ تھا نہ زائد اور نہ کم۔

اس امر میں اختلاف کیا گیا ہے کیا وہ نبی تھا یا بادشاہ؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تبع نبی تھا(1)۔ کعب نے کہا: تبع بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اس کی قوم کاہنوں میں سے تھی اور ان کے ساتھ ایک اہل کتاب کی ایک قوم تھی۔ اس نے دونوں فریقوں کو حکم دیا کہ ہر فریق قربانی پیش کرے تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اہل کتاب کی قربانی قبول ہوئی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تبع کو گالیاں نہ دیا کرو وہ ایک صالح آدمی تھا۔ قتادہ نے بیان کیا ہے: تبع حمیر قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ وہ لشکر لے کر چلا یہاں تک کہ اس نے حیرہ کو عبور کیا اور سمرقند آیا اس نے اس شہر کو گرا دیا؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے (2)۔ ثعلبی نے قتادہ سے روایت کیا ہے: وہ لشکر لے کر چلا یہاں تک کہ حیرہ کو عبور کیا اس نے سمرقند شہر بنایا اس نے لوگوں کو قتل کیا اور شہروں کو برباد کیا۔ کلبی نے کہا: تبع ابو کرب اسعد بن ملکیکرب ہے، اس کو تبع اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس نے پہلوں کی پیروی کی۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہی وہ شخص ہے جس نے بیت اللہ شریف پر یمن کی دھاری دار چادروں کا غلاف چڑھایا تھا۔ کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کی مذمت کی اس کی مذمت نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کے لیے اس کی مثال بیان فرمائی کیونکہ قریش ان کے قریب رہتے تھے اور ان کی عظمت دلوں میں رکھتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان سے قبل کے لوگوں کو ہلاک کر دیا کیونکہ وہ لوگ مجرم تھے تو وہ آدمی جو مجرم ہو جبکہ اس کی طاقت تھوڑی اور تعداد کم ہو تو وہ ہلاک ہونے کے زیادہ لائق ہے۔ اہل یمن اس آیت پر فخر کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تبع کی قوم کو قریش سے بہتر قرار دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے پہلے حاکم کو تبع اس لیے کہتے کیونکہ اس نے سورج کی ٹکیا کی پیروی کی اور مشرق کی جانب لشکروں کے ساتھ سفر کیا۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ، الذین محل رفع میں ہے اس کا عطف قَوْمُ تُبَّعٍ پر ہے اَهْلَكْنٰهُمْ اس کا صلہ ہے مِنْ قَبْلِهِمْ اس کے متعلق یہ بھی جائز ہے کہ مِنْ قَبْلِهِمْ، الَّذِيْنَ کا صلہ ہو ظرف میں ضمیر ہو گی جو اسم موصول کی طرف لوٹے گی۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو اَهْلَكْنٰهُمْ دو وجوہ کی وجہ سے ایک وجہ سے ہو گا۔ یا تو اس کے ساتھ قد کو مضمر مانا جائے گا تو یہ حال کے محل میں ہو گا یا موصوف کے حذف کو مقدر کیا جائے گا۔ گویا کہا: قوم اَهْلَكْنٰهُمْ تقدیر کلام یہ ہو گی کیا تم عبرت حاصل نہیں کرتے جب ہم ان مذکورہ افراد کو ہلاک کرنے پر قادر ہیں تو ہم مشرکوں کے ہلاک کرنے پر قادر ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مبتدا ہے اور خبر اهلكناهم ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِيْنَ محل جر میں ہو اس کا عطف تبع پر ہو گویا فرمایا تبع کی قوم جو ان سے قبل ہلاک کی گئی۔ یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِيْنَ محل نصب میں ہو اس کا فعل مضمر ہو جس پر اَهْلَكْنٰهُمْ دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 75     2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 255

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۞ لاعبین کا معنی غافلین ہے؛ یہ مقاتل کا قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لاھین، یہ کلبی قول ہے مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ الحق سے پہلے الامر محذوف ہے؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ باء، لام کے معنی میں ہے؛ یہ کلبی اور حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حق قائم کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی توحید کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس کی طاعت کو لازم پکڑنے کے لیے۔ سورۃ الانبیاء میں یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ لوگوں میں سے اکثر اسے نہیں جانتے۔

## اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞

''یقیناً فیصلہ کا دن ان سب کو (دوبارہ زندہ کرنے کے لیے) مقررہ وقت ہے''۔

يَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد یوم قیامت ہے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دن میں لوگوں کے درمیان فیصلہ فرما دے گا، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ (الممتحنہ: 3) اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۞ (الروم) یوم الفصل سب کے لیے میقات ہے جس طرح ارشاد فرمایا: اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۞ (النباء) یعنی وہ وقت جسے گناہ گار اور نیکو کار کے درمیان تمیز دینے اور فیصلہ کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، ایک جماعت جنت میں ہوگی اور ایک جماعت جہنم میں ہوگی۔ یہ حد درجہ کی تحذیر اور وعید ہے۔ قراء کے درمیان مِيْقَاتُهُمْ کو رفع دینے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ اِنّ کی خبر ہے اور اس کا اسم یوم الفصل ہے۔ نسائی اور فراء نے میقاتھم کو ان کی وجہ سے نصب کو جائز قرار دیا ہے اور یوم الفصل ظرف ہے جو ان کی خبر کی جگہ واقع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِنّ میقاتھم یوم الفصل۔

## يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۞

''جس روز کوئی دوست کسی دوست کے ذرا کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہے، بے شک وہ سب پر غالب ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا یوم پہلے یوم سے بدل ہے۔ مولی سے مراد ولی ہے جس سے مراد چچازاد بھائی اور مددگار ہے یعنی چچازاد بھائی چچازاد بھائی کا دفاع نہیں کرے گا۔ کوئی قریبی کسی قریبی کا اور کوئی دوست کسی دوست کا دفاع نہیں کرے گا۔ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞ یعنی مومن کافر کا قربت کی وجہ سے دفاع نہیں کرے گا۔ اس آیت کی مثل یہ آیت ہے وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (بقرہ: 48)

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 256

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ من محل رفع میں ہے یہ یُنۡصَرُوۡنَ۝ کی خبر سے بدل ہے گویا تو نے کہا لایقوم احدٌ الا فلان یا یہ مبتدا ہے اور خبر مضمر ہے گویا فرمایا: الا من رحم الله نمغفور له یا اس کو فائدہ دے اور شفاعت کرے اور مدد کرے یا پھر پہلے مولی سے بدل ہے گویا کہا: کوئی فائدہ نہیں دے گا مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ نسائی اور فراء کے نزدیک یہ مستثنیٰ منقطع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، لیکن جس پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے جس چیز کے وہ محتاج ہوں گے وہ اس دن انہیں ملے گی یہاں تک کہ وہ مخلوق کو فائدہ پہنچائیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو یعنی کوئی قریبی کسی قریبی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا مگر مومن فائدہ پہنچائیں گے کیونکہ انہیں اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شفاعت کریں۔

اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ۝ یعنی وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے اور اپنے دوستوں پر رحم فرمانے والا ہے، جس طرح ارشاد فرمایا: شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ۙ ذِى الطَّوۡلِ (غافر: 3) وعدے کو وعید کے ساتھ ملایا ہے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ۝ كَالۡمُهۡلِ ۚ يَغۡلِىۡ فِى الۡبُطُوۡنِ ۝ كَغَلۡىِ الۡحَمِيۡمِ ۝

''بلاشبہ زقوم کا درخت گناہگار کی خوراک ہوگا، پگھلے تانبے کی مانند پیٹوں میں جوش مارے گا جیسے کھولتا پانی جوش مارتا ہے''۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ کتاب اللہ میں جہاں بھی شجرہ کا ذکر آیا ہے تو اس میں ھاء پر وقف ہوا ہے مگر سورۂ دخان میں ایک حرف ہے اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ۝ یہ ابن انباری نے کہا الۡاَثِيۡمِ یعنی فاجر۔ حضرت ابوذر نے کہا: حضرت ابودرداء اور حضرت ابن مسعود نے اسے اسی طرح پڑھا ہے۔ ہمام بن حارث نے کہا: حضرت ابودرداء ایک آدمی کو پڑھاتے اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ۝ جبکہ وہ آدمی پڑھتا طعام الیتیم جب اس نے اس کو نہ سمجھا تو حضرت ابودرداء نے کہا: طعام الفاجر۔

ابوبکر انباری نے کہا: مجھے میرے باپ نے بیان کیا کہا ہمیں نصر نے وہ ابوعبید سے وہ نعیم بن حماد سے وہ عبدالعزیز بن محمد سے وہ ابن عجلان سے وہ عون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کو اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ۝ پڑھایا تو اس آدمی نے پڑھا طعام الیتیم حضرت عبداللہ نے اسے صحیح دہرایا اس آدمی نے غلط دہرایا۔ جب حضرت عبداللہ نے دیکھا کہ اس آدمی کی زبان صحیح الفاظ کو ادا نہیں کرسکتی تو اسے کہا: کیا تو طعام الفاجر اچھی طرح نہیں کہہ سکتا؟ عرض کی: کیوں نہیں؟ فرمایا: تو اسی طرح کر۔ بے دین لوگوں میں سے جاہلوں کے لیے اس میں کوئی حجت نہیں کہ قرآن کا کوئی حرف کسی دوسرے حرف سے بدلنا جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی جانب سے یہ طرز عمل متعلم کو قریب کرنے اور اسے اس قابل بنانے کے لیے تھا کہ وہ صحیح نقطہ نظر کی طرف لوٹ آئے وہ حق کو استعمال کرسکے اور اللہ تعالیٰ نے جیسے نازل کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے حکایت بیان کی ہے اسی طرح وہ تعلم کرے۔

زمخشری نے کہا: اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ استعمال کرنا جائز ہے جبکہ وہ کلمہ دوسرے کلمہ کا

معنی دیتا ہو(1)، اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فارسی زبان میں قراءت کو جائز قرار دیا ہے شرط یہ ہے کہ قاری پورے کے پورے معانی ادا کرے جبکہ ان میں سے کسی چیز کی قطع وبرید نہ کرے۔

علماء نے کہا: یہ شرط گواہی دیتی ہے کہ یہ اجازت ایسے ہے جیسے کوئی اجازت نہیں کیونکہ کلام عرب خصوصاً قرآن جو اپنی وضاحت، غرابت نظم اور اسالیب میں معجز ہے اس میں معانی اور اغراض کے لیے لطائف ہیں جن کی فارسی وغیرہ زبان ادائیگی میں مستقل نہیں۔ امام ابوحنیفہ فارسی زبان کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے یہ قول آپ سے تحقیق و تبصر کی بنا پر ثابت نہیں۔

علی بن جعد، ابو یوسف سے وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ سے صاحبین کے قول کے موافق روایت کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں قراءت جائز نہیں۔

**شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ** وہ درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جہنم میں پیدا کیا ہے اور اسے شجرہ ملعونہ کا نام دیا ہے۔ جب جہنمیوں کو بھوک لگے گی تو اس کی پناہ لیں گے اور اس سے کھائیں گے تو وہ ان کے پیٹوں میں یوں جوش مارنے لگے گا جس طرح گرم پانی جوش مارتا ہے۔ ان کے پیٹوں میں زقوم سے جو چیز بنے گی اسے مہل سے تشبیہ دی وہ پگھلا ہوا تانبا ہے۔ عام قراء کی قراءت تغلی تاء کے ساتھ ہے، اسے شجرہ پر محمول کیا۔

ابن کثیر، حفص، ابن محیص اور رویس نے یعقوب سے **یَغْلِیْ** پڑھا ہے یہ کھانے پر محمول ہوگا۔ وہ شجرہ کے معنی میں ہے۔ اسے مہل پر محمول نہ کیا جائے گا کیونکہ اس کا ذکر تشبیہ کے لیے ہے **الْاَثِیْمِ** سے مراد آثم ہے یہ اثم یاثم اثما سے مشتق ہے؛ یہ قشیری اور ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسا شرک ہے جو گناہ کرنے والا ہو(2)؛ یہ یحییٰ بن سلام نے کہا۔ صحاح میں ہے أثم الرجل إثما ومأثما یعنی وہ گناہ میں پڑ گیا، اس کے لیے اسم فاعل کا صیغہ آثم، اثام اور أثوم استعمال ہوتا ہے۔ **طَعَامُ الْاَثِیْمِ** کا معنی ہوگا یہ گناہ گار فاجر کا کھانا ہے وہ ابوجہل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے کہا تھا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں دھمکی دیتے ہیں کہ جہنم میں زقوم ہے اس سے مراد وہ ثرید ہے جس میں مکھن اور کھجور ہو۔ اس نے جو کہا اللہ تعالیٰ نے اسکے خلاف وضاحت کی۔ نقاش نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے کہ شجرہ زقوم سے مراد ابوجہل ہے(3)۔

میں کہتا ہوں: مجاہد سے اس قول کی نسبت صحیح نہیں ہم نے سورۂ صافات اور سبحان (سورۂ اسراء) میں جو ذکر کیا ہے اس کے ساتھ رد ہو جاتا ہے۔

**خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۸﴾**

”(حکم ہوگا) اس (نابکار) کو پکڑلو پھر اسے گھسیٹ کرلے جاؤ جہنم کے وسط میں، پھر انڈیلو اس کے سر کے اوپر کھولتا پانی اسے عذاب دینے کے لیے“۔

**خُذُوْهُ** زبانیہ سے کہا جائے گا: اسے پکڑلو یعنی گناہ گار کو پکڑلو۔ **فَاعْتِلُوْهُ** اسے کھینچو اور اسے ہانکو۔ عتل سے مراد ... [illegible]

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 281 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 257 3 [illegible]

آدمی کا گریبان پکڑے اور اسے اپنی طرف کھینچے تا کہ تو اسے قید خانہ اور یا کسی اور امتحان کی طرف لے جائے۔ عتلت الرجل أعتله، اعتله عتلا۔ جب تو اسے سختی کے ساتھ کھینچے رجل معتل۔ شاعر نے گھوڑے کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

نَفْرَعُه فَرْعًا ولسنا نَعْتِله

ہم اس گھوڑے کو لگام کھینچ کر روک لیتے ہیں ہم اسے گھسیٹتے نہیں۔ اس میں دو لغتیں ہیں عَتَله، عَتَنَهٗ۔ یہ ابن سکیت نے کہا: کوفیوں اور ابو عمرو نے کہا: فَاعْتِلُوْهُ یعنی تاء کے نیچے کسرہ پڑھا اور باقی قراء نے اسے ضمہ دیا ہے۔ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ یعنی جحیم کے وسط میں ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ۔ مقاتل نے کہا: مالک فرشتہ جو جہنم کا خازن ہے وہ ابو جہل کے سر پر لوہے کا ایک ہنٹر مارے گا تو ابو جہل کا سر دماغ والی جگہ سے لیٹ جائے گا تو اس کا دماغ اس کے جسم پر بہہ جائے گا۔ پھر مالک فرشتہ اس میں کھولتا ہوا پانی انڈیلے گا جس کی گرمی انتہاء کو پہنچی ہوگی تو وہ پانی اس کے پیٹ میں جا پہنچے گا تو فرشتہ کہے گا: عذاب کا مزا چکھو اس کی مثل ہے: يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ (الحج)

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝

"لو چکھو تم بڑے معزز (ومکرم) ہو۔ بے شک یہ وہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے"۔

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ ابن انباری نے کہا: عوام نے اِنَّ کے کسرہ پر اتفاق کیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اَنَّ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ نسائی نے اسی طرح پڑھا ہے جس نے ہمزہ کو کسرہ دیا ہے اس نے ذُقْ پر وقف کیا ہے۔ جس نے ہمزہ کو فتحہ دیا ہے اس نے ذُقْ پر وقف نہیں کیا کیونکہ معنی ہے تم چکھو کیونکہ تو عزیز وکریم ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ ابو جہل کے حق میں آیت نازل ہوئی (1)، اس نے کہا تھا: اس وادی میں مجھ سے بڑھ کر قوت والا اور معزز نہیں اسی وجہ سے اسے کہا گیا: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ عکرمہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے کہوں اولی لك فاولی ابو جہل نے کہا: تو کس چیز کے ساتھ مجھے دھمکی دیتا ہے۔ اللہ کی قسم! تو اور تیرا رب طاقت نہیں رکھتے کہ تم میرے ساتھ کچھ معاملہ کرو، میں اس وادی کا غالب ترین شخص ہوں اور اپنی قوم کا معزز ترین فرد ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بدر کے دن قتل کر دیا اور اسے ذلیل ورسوا کر دیا اور یہ آیت نازل ہوئی یعنی اسے فرشتہ کہے گا: چکھو تم اپنے گمان کے مطابق معزز ومکرم ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ استخفاف، توبیخ، استہزاء، اہانت اور تنقیص کے معنی میں ہے، یعنی اسے کہا: تو ذلیل ورسوا ہے، یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب کو کہا تھا: اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝ (ہود) ایک تاویل کے مطابق وہ اس سے سفیہ وجاہل مراد لیتے؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝ یعنی فرشتے انہیں کہیں گے: یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق تم دنیا میں شک کیا کرتے تھے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 77

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾

''یقیناً پرہیز گار امن کی جگہ میں ہوں گے باغات میں اور (بہتے ہوئے) چشموں میں پہنے ہوئے ہوں گے لباس باریک اور دبیز ریشم کا آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے''۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے مستقر اور عذاب کا ذکر کیا تو مومنوں کی مہمانی اور نعمتوں کا ذکر کیا۔ نافع اور ابن عامر نے فی مُقام پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسائی نے کہا: مقام سے مراد مکان ہے اور مقام سے مراد اقامت بھی ہے جس طرح شاعر نے کہا

عفت الديارُ مَحَلُّهَا فَمُقَامُه

گھر یعنی اترنے کی جگہیں اور اقامت کی جگہیں ناپید ہو گئے۔

جوہری نے کہا: مَقام اور مُقام دونوں میں سے ہر ایک اقامت کے معنی میں ہوتے ہیں، بعض اوقات یہ قیام کی جگہ کے لیے بھی لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ جب تو اسے قام یقوم سے مشتق مانے تو یہ مَقام ہوگا اور اگر تو اسے اقام یقیم سے مشتق مانے تو مُقام ہوگا کیونکہ جب فعل غیر ثلاثی ہو تو اسم ظرف کے صیغہ میں میم مضموم ہوگا، کیونکہ ایسا فعل رباعی کے مشابہ ہوتا ہے جس طرح دحرجہ سے مدحرج۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَقام کا معنی حاضر ہونے کی جگہ اور مجلس ہے اور مُقام اس سے مکان مراد لینا ممکن ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مصدر ہو اس میں مضاف مقدر ہو یعنی ٹھہرنے کی جگہ۔

اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ اس میں آفات سے امن ہوتا ہے فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ یہ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ سے بدل ہے۔

يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ وہ ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کیے ہوں گے ان کی مجلس گردش کرے گی جہاں وہ گردش کریں گے۔ سندس سے مراد وہ ریشم ہے جو باریک ہو، استبرق سے مراد وہ ریشم ہے جو موٹا ہو۔ سورۂ کہف میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

كَذٰلِكَ ۟ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾

''ہاں یونہی ہوگا اور ہم بیاہ دیں گے انہیں گوری گوری آہو چشم عورتوں سے''۔

كَذٰلِكَ امر اسی طرح ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ كَذٰلِكَ پر وقف ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جس طرح ہم نے انہیں جنت میں داخل کیا اور ان کے ساتھ معاملہ کیا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے اسی طرح ہم نے انہیں عزت دی کہ ان کی شادی حور عین سے کر دی۔ عین کے بارے میں گفتگو سورۂ صافات میں گذر چکی ہے۔ حور کا معنی سفید ہے (1)، یہ قتادہ اور عام علماء کا قول ہے۔ یہ حوراء کی جمع ہے۔ حوراء کا معنی سفید ہے، جس کی پنڈلی اس کے کپڑے کے باہر سے دکھائی دے گی اور

1۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 188

دیکھنے والا اپنا چہرہ اس کے پستان سے دیکھ لے گا جس طرح آئینہ سے دیکھتا ہے کیونکہ اس کی جلد بڑی باریک چہرہ تروتازہ اور رنگ صاف ہوگا۔ اس تاویل کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں بعِیس عِین ہے۔ ابوبکر انباری نے احمد بن حسین سے وہ حسین سے وہ عمار بن محمد سے روایت کرتے ہیں کہا: میں نے منصور بن معتمر کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے حم الدخان میں بعیس عین لایذوقون طعم الموت إلا الموتة الاولی پڑھا۔ عیس کا معنی سفید ہے اسی وجہ سے سفید اونٹوں کو عیس کہتے ہیں اس کا واحد بعیر اعیس ہے اور ناقة عیساء ہے۔ امرؤالقیس نے کہا

یَرُعْنَ إلی صوتی إذا ماسمعنه کما تَرْعَوِی عِیطٌ إلی صوت أَعْیَسا

وہ میری آواز کی طرف لوٹ آتی ہیں جب وہ اسے سنتی ہیں جس طرح جوان اونٹنی اونٹ کی آواز کی طرف لوٹ آتی ہے۔ یہاں حور کا معنی ہے خوبصورت، روشن، سفید۔ ابن مبارک نے ذکر کیا معمر ابو اسحاق سے وہ عمرو بن میمون اُودی سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: حور عین میں سے عورت ایسی ہوگی جس کی پنڈلی کا گودا گوشت اور ہڈی اور ستر حلوں کے نیچے سے دکھائی دے گا جس طرح سرخ شراب سفید شیشے میں دکھائی دیتا ہے۔ مجاہد نے کہا: حور کو حور اس لیے کہتے ہیں کیونکہ آنکھ ان کے حسن، سفیدی اور رنگ کی صفائی میں حیران ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں حور اس لیے کہتے ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں حور ہوگا۔ حور سے مراد آنکھوں میں شدید سیاہی میں انتہائی سفیدی ہے۔ امراۃ حوراء اسے کہتے ہیں جس کی حور واضح ہو یہ جملہ کہا جاتا ہے: أحورت عینه إحورارا، أحور الشئ یعنی وہ شے سفید ہوگئی۔ اصمعی نے کہا: میں نہیں جانتا آنکھوں میں حور کیا ہوتی ہے؟ ابوعمرو نے کہا: حور یہ ہے کہ ساری آنکھ سیاہ ہو جائے جس طرح ہرنوں اور گائیوں کی آنکھیں ہوتی ہیں کہا: انسانوں میں حور نہیں ہوتا عورتوں کو حورالعین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہرنوں اور گائیوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ عجاج نے کہا۔

بأعْیُنٍ مُحَوَّراتٍ حُورِ

یعنی ایسی آنکھیں جو صاف سفید ہوں جس کی ڈھیری سخت سیاہ ہو۔ عِین، عَیناء کی جمع ہے اس سے مراد کھلی بڑی آنکھوں والی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حور عین کا مہر کھجور کی مٹھ اور روٹی کا ٹکڑا ہوگا'' (1)۔

حضرت ابوقرصافہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''مسجدوں سے کوڑا کرکٹ کا نکالنا حور عین کا مہر ہے'' (2)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ''مساجد میں جھاڑو دینا یہ حور عین کا مہر ہے'' (3)۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے ہم نے کتاب التذکرہ میں اس بارے میں ایک الگ باب باندھا ہے۔ الحمد للہ۔

---

1۔ کتاب التذکرہ، ماجاء ان الأعمال الصالحة محصور الحصور العین، جلد 2، صفحہ 203 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الدعاء للمیت فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 311

اس میں اختلاف ہے کہ جنت میں افضل کون ہے انسانوں میں سے عورتیں یا حوریں؟ ابن مبارک نے یہ ذکر کیا ہے: رشدین، ابن انعم سے وہ حبان بن ابی جبلہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انسانوں میں سے عورتیں جو جنت میں داخل ہوں گی انہیں دنیا میں اعمال کی وجہ سے حورعین پر فضیلت دی جائے گی۔

مرفوع روایت ہے کہ ''انسانوں میں سے عورتیں، حورعین میں سے ستر ہزار گنا فضیلت والی ہوں گی''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حورعین افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں کہا: وأبدله زوجا خيرا من زوجه (1) اسے بیوی عطا فرما جو اس کی اس بیوی سے بہتر ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: بِحُوْرٍ عِيْنٍ یہ مضاف، مضاف الیہ ہے بِحُوْرٍ عِيْنٍ میں اضافت اور تنوین برابر ہیں۔

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝

''وہ منگوالیا کریں گے وہیں ہر قسم کا پھل اطمینان سے''۔

قتادہ نے کہا: اٰمِنِيْنَ ۝ وہ موت سے، بیماری سے اور شیطان سے محفوظ ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں جو نعمتیں ہیں ان کے انقطاع سے امن میں ہوں گے یا اس چیز سے امن میں ہوں گے کہ ان چیزوں کے کھانے سے انہیں کوئی تکلیف یا ناپسندیدہ چیز لاحق ہوسکتی ہے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''نہ چکھیں گے وہاں موت کا ذائقہ بجز اس پہلی موت کے اور اللہ نے بچالیا انہیں عذاب جہنم سے محض آپ کے رب کی مہربانی سے یہی وہ بڑی کامیابی ہے (جس کی انہیں آرزو تھی)''۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ لیکن پہلی موت کا ذائقہ انہوں نے دنیا میں چکھ لیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ الا، بعد کے معنی میں ہے جس طرح تو کہتا ہے: ماکلمت رجلا الیوم الا رجلا عندك۔ اس میں الا رجلا بعد رجل عندك کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: الا، سوی کے معنی میں ہے یعنی سوائے اس موت کے جس کا ذائقہ دنیا میں انہوں نے چکھ لیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 22) یہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: ماذقت الیوم طعاما سوی ما اکلت امس میں نے آج کوئی کھانا نہیں کھایا سوائے اس کے جو میں نے کل کھایا تھا۔

قتبی نے کہا: اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى اس کا معنی ہے مومن جب موت کے قریب جاتا ہے تو رحمت کے فرشتے اس کا استقبال کرتے ہیں اور وہ روح و ریحان سے ملاقات کرتا ہے جنت میں اس کی موت اس کے اسباب کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر ہوگی۔ استثناء صحیح ہے موت ایک عرض ہے اس کو چکھا نہیں جاتا لیکن اسے کھانے کی طرح بنادیا گیا ہے جس کا چکھنا ناپسند کیا جاتا

1۔ کتاب التذکرہ، ماجاء ان الأعمال الصالحة مهور الحور العين، جلد 2، صفحہ 203

ہے تو ذوق کا لفظ بطور مجاز ذکر کیا جاتا ہے۔

وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر فضل واحسان ہے فَضْلًا یہ مصدر ہے جس کا یدعون عامل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں عامل وَ وَقٰهُمْ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ فعل مضمر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عامل اس کلام کا معنی ہے جو اس سے قبل ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر فضل واحسان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں ایسے اعمال کی توفیق دی جن کے باعث وہ جنت میں داخل ہوتے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۵۷﴾ یعنی سعادت، عظیم نفع اور عظیم نجات۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے فاز بکذا یعنی اسے پایا اور اس کے ساتھ کامیاب ہوا۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

''پس ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں سو آپ بھی انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں''۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ یعنی قرآن، ہم نے اسے آپ کی زبان پر نازل کر کے آپ پر اور جو بھی اسے پڑھے اس پر آسان کر دیا ہے۔ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کریں اور اپنے برے اعمال سے رک جائیں اسکی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ (القمر) اس سورت کا اختتام قرآن کی اتباع پر برانگیختہ کرنے پر کیا ہے اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہوا جس طرح سورت کے آغاز میں ہوا اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اور اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ (القدر) جس طرح پہلے گذر چکا۔ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ میں نے آپ سے ان کے خلاف جو وعدہ کیا ہے اس کا انتظار کیجئے جس طرح وہ آپ کی موت کا انتظار کر رہے ہیں، نقاش نے اسے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے رب کی جانب سے فتح کا انتظار کیجئے جس طرح وہ اپنے گمان کے مطابق تجھ پر غلبہ پانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا جس طرح وہ تیرے بارے میں حادثات کا انتظار کر رہے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں نے تجھ سے ثواب کا جو وعدہ کیا ہے اس کا انتظار کرو وہ اس طرح ہیں گویا میں نے ان سے جو عقاب کا وعدہ کیا ہے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یوم قیامت کا انتظار کرو کیونکہ وہ فیصلہ کا دن ہے اگرچہ وہ اس کے وقوع کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ انہیں انتظار کرنے والا بنا دیا گیا ہے کیونکہ ان کا انجام یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

# سورۃ الجاثیہ

آیاتہا ۳۷ ۔ سورۃ الجاثیۃ مکیۃ ۶۵ ۔ رکوعاتہا ۴

یہ تمام سورت مکی ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، حضرت جابر اور عکرمہ کا قول ہے(1)۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: صرف ایک آیت مدنی ہے وہ ہے قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ حضرت عمر بن خطاب کے متعلق مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔ مہدوی اور نحاس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی(3)۔ ہجرت سے قبل مشرکوں میں سے ایک آدمی نے آپ کو گالیاں دی تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس مذکورہ آیت کو نازل فرمایا پھر یہ آیت اس آیت کے ساتھ منسوخ کردی گئی۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) اس تعبیر کی بنا پر یہ ساری سورت مکی ہے۔ اس کی سینتیس آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی چھتیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝

”حا۔میم۔ اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست اور حکمت والا ہے“۔

حٰمٓ ۝ یہ مبتدا ہے تَنْزِيْلُ یہ خبر ہے بعض نے کہا: حٰمٓ سورت کا نام ہے تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مبتدا ہے اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ ہے کتاب سے مراد قرآن ہے الْعَزِيْزِ کا معنی زبردست محفوظ الْحَكِيْمِ اپنے افعال میں حکمت والا۔ ان تمام کلمات کے بارے میں بحث گذر چکی ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

”بے شک آسمانوں اور زمین میں (اس کی یکتائی) (قدرت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لیے۔ اور (خود) تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو وہ پھیلا رہا ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں نیز گردش لیل ونہار میں اور جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے رزق (کا سبب مینہ) پھر زندہ کردیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے ادھر ادھر چلنے میں نشانیاں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 260	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 262

ہیں ان کے لیے جو عقل مند ہیں''۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی ان دونوں کی تخلیق میں۔ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ رزق سے مراد بارش ہے فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تمام بحث سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں گذر چکی ہے۔ عام قراءت وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ، وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ دونوں میں آیات رفع کے ساتھ ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے دونوں میں تاء کے نیچے کسرہ دیا ہے۔ پہلے میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ منصوب ہے وہ ان کا اسم ہے اور اس کی خبر فِي السَّمٰوٰتِ ہے دوسرے لفظ آیات میں کسرہ اس پر عطف کی وجہ سے ہے جو اس میں عامل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ان فی خلقکم و ما یبث من دابۃ آیات جہاں تک تیسرے کا تعلق ہے تو ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں نصب لفظ آیات کے تکرار کی وجہ سے ہے جب کلام لمبا ہو گیا جس طرح تو کہتا ہے: ضربت زیدا زیدا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے اس پر محمول کریں گے جس میں ان عامل ہے اس میں فی کو محذوف مقدر مانیں گے، تقدیر کلام یہ ہے فی اختلاف اللیل والنہار آیات، فی حذف ہو گیا کیونکہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا۔ سیبویہ نے اس کے حذف میں یہ شعر پڑھا ہے:

أَكُلَّ امرئ تَحْسِبِيْنَ اِمرأ ونارٍ تَوَقَّدُ بالليل نارا(1)

''کیا ہر آدمی کو تو آدمی خیال کرتی ہے اور ہر آگ جو رات کو روشن کی جاتی ہے اسے ضیافت کی آگ شمار کرتی ہے''۔ لفظ کل حذف کر دیا گیا جو نار کی طرف مضاف ہے جو مجرور ہے حذف کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ دو عاملوں پر عطف کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔ سیبویہ نے اسے جائز قرار نہیں دیا۔ اخفش اور کوفیوں کی جماعت نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ وَ اخْتِلَافِ کا عطف وَ فِيْ خَلْقِكُمْ پر ہے پھر فرمایا: وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ تو یہ دو عاملوں پر عطف کا محتاج ہے اور دو عاملوں پر عطف قبیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حروف عطف عامل کے قائم مقام ہوتے ہیں پس یہ اس کی قوت نہ رکھیں گے کہ دو مختلف عاملوں کے قائم مقام ہو جائیں کیونکہ اگر یہ ناصب اور رافع کے قائم مقام ہو تو یہ ایک ہی حال میں رفع اور نصب دینے والا ہوگا۔ جہاں تک رفع کی قراءت کا تعلق ہے تو یہ ان اور جس میں ان عامل ہے اس کے محل پر محمول ہوگا جبکہ نحویوں نے اس صورت میں بھی دو عاملوں پر عطف کو لازم کیا ہے، کیونکہ اس نے وَ اخْتِلَافِ کا عطف وَ فِيْ خَلْقِكُمْ پر کیا ہے اور اٰيٰتٌ کا عطف پہلے لفظ اٰيٰتٌ کے محل پر کیا ہے لیکن لفظ فی کو مکرر مقدر کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ماقبل کلام سے اسے قطع کر کے اسے رفع دیا جائے تو اسے مبتدا ہونے کی حیثیت میں اسے رفع دیا جائے گا اور ماقبل اس کی خبر ہوگی اور جملہ کا عطف جملہ پر ہوگا۔ فراء نے اخْتِلَافِ اور اٰيٰتٌ دونوں کے منع کا ذکر کیا ہے اور اختلاف ہی کو آیات بنایا ہے۔

## تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

''یہ سب نشانیاں ہیں الله کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ پس وہ کون سی ایسی بات ہے جس پر وہ الله اور اس کی آیتوں کے بعد ایمان لائیں گے''۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 80

تِلْكَ اٰيٰتُ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں یعنی ایسے دلائل اور براہین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ حق سے مراد صدق ہے، یعنی یہ ایسی آیات ہیں جو باطل نہیں اور جن میں جھوٹ نہیں۔ اسے یتلوھا پڑھا گیا ہے۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام کے بعد۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے قرآن کے بعد۔ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۝ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے۔ ابن محیصن اور ابوبکر نے عاصم سے، حمزہ اور کسائی نے تومنون تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍۙ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝

"ہلاکت ہے ہر جھوٹے بدکار کے لیے جو سنتا ہے اللہ کی آیتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے پھر بھی وہ (کفر پر) اڑا رہتا ہے غرور کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں پس آپ اسے دردناک عذاب کا مژدہ سنا دیں"۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۝ وَيْلٌ جہنم میں ایک وادی ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کی آیات سے استدلال کو ترک کرتا ہے اس کے لیے دھمکی ہے اَفَّاكٍ کا معنی کذاب ہے۔ افك کا معنی جھوٹ ہے اَثِيْمٍ گناہ کا ارتکاب کرنے والا مراد ہے نضر بن حارث۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مراد حارث بن کلدہ ہے۔ ثعلبی نے حکایت بیان کی ہے: مراد ابوجہل اور اس کے ساتھی ہیں۔

يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ آیات اللہ سے مراد قرآن کی آیات ہیں ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا وہ اپنے کفر میں بہت دور نکل گیا ہے اور اطاعت کرنے سے اپنے آپ کو عظیم خیال کرتا ہے یہ صَرّ الصُّرّۃ سے ماخوذ ہے جب وہ تھیلی کو باندھے؛ یہ معنی حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اصل میں یہ اصر الحمار علی العانۃ ہے وہ اپنے کان کھڑے کر کے اس کی طرف مڑتا ہے۔ کأن میں أن مثقلہ سے مخففہ ہے گویا اس نے اس کو سنا ہی نہیں ضمیر ضمیر شان ہے جس طرح اس مصرعہ میں اسم ضمیر شان محذوف ہے:

كَأنْ ظَبْيَةً تَعْطُو اِلٰى نَاضِرِ السَّلَمْ  گویا ہرن تر و تازہ سلم کے درخت سے کھاتا ہے۔

جملہ کا محل نصب ہے یعنی کان اس طرح کھڑے کرتا ہے جس طرح نہ سننے والا کان کھڑے کرتا ہے۔ سورۂ لقمان کے آغاز میں اس آیت کا معنی گزر چکا ہے۔ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ کا معنی بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْــًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝ؕ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْــًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ؕ

''اور جب وہ آگاہ ہوتا ہے ہماری آیتوں میں سے کسی پر تو ان کا مذاق اڑانے لگتا ہے، یہی وہ (بدقماش) ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ ان کے آگے جہنم ہے اور ان کے ذرا کام نہ آئے گا جو انہوں نے (عمر بھر) کمایا اور نہ وہ کسی کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مددگار بنایا تھا اور ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا''۔

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا جس طرح وہ زقوم کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ مکھن اور کھجور کا مجموعہ ہے جہنم کے داروغوں کے بارے میں کہتا: اگر وہ انیس ہیں تو میں اکیلا انہیں کافی ہو جاؤں گا۔ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹﴾ مُّهِیْنٌ سے مراد ذلیل و رسوا کرنے والا ہے۔ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ دنیا میں جس غلبہ میں تھے اور حق سے تکبر کیا کرتے تھے اب ان کے آگے جہنم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ان کے آگے جہنم ہے۔ اس کی مثل مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ (ابراہیم) یعنی ان کے آگے جہنم ہے۔ شاعر نے کہا:

أليس ورائي إن تراخت منيتي أدبّ مع الولدان أزحف كالنسر

اگر میری موت موخر ہو جائے تو کیا میرے آگے ایسا وقت نہیں کہ میں بچوں کے ساتھ رینگوں گا اور گدھ کی طرح گھسٹوں گا۔

وَ لَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْـًٔا یعنی مال اور اولاد میں سے کوئی چیز انہیں نفع نہ دے گی۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا (آل عمران: 10) یہاں بھی مراد مال اور اولاد ہے۔ وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ مراد بت ہیں وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰﴾ یعنی ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا اور تکلیف دہ عذاب ہوگا۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾

''یہ قرآن سراپا ہدایت ہے، اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا ان کے لیے دردناک عذاب ہے سخت ترین عذاب میں سے''۔

هٰذَا هُدًى یہ مبتدا خبر ہے یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دلائل کا انکار کیا لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ رجز سے مراد عذاب ہے، یعنی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (بقرہ: 59) رجز سے مراد عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجز سے مراد ناپاک شے ہے جس طرح رجس ہوا کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَ یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾ (ابراہیم) یعنی گندہ مشروب پینے کی صورت میں ان کے لیے عذاب ہے۔ یہ لفظ جہاں بھی واقع ہوا ہے ابن محیصن نے راء کو ضمہ دیا ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصن اور حفص نے اَلِیْمٌ کو مرفوع پڑھا ہے معنی ہے ان کے لیے دردناک عذاب ہے جو رجز ہے۔ باقی قراء نے اَلِیْمٍ کو مجرور پڑھا ہے، یہ رجز کی صفت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٣﴾

”اللہ وہ ہے جس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے سمندر کو تاکہ رواں رہیں اس میں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ (تم بحری تجارت سے) تلاش کرو اس کا فضل اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کیا کرو اور مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے، بے شک اس (نظام) میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں“۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت اور اپنے بندوں پر تمام نعمت کا ذکر کیا اور اس امر کی وضاحت کی کہ جو کچھ پیدا کیا وہ لوگوں کے منافع کے لیے پیدا کیا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا فعل، اس کی تخلیق اس کا احسان اور انعام ہے۔ حضرت ابن عباس، جحدری اور دوسرے علماء نے جَمِيْعًا مِّنَّةً پڑھا ہے یعنی میم مکسور، نون مشدد اور ھاء پر تنوین ہے۔ یہ مفعول مطلق کے طریقہ پر منصوب ہے۔ ابو عمرو نے کہا: میں نے مسلمہ سے اسی طرح سنا کہ انہوں نے اسے مِنَّه پڑھا، یعنی فضل و کرم کے طریقہ پر۔

مسلم بن محارب نے اسے جَمِيْعًا مِّنَّهٗ پڑھا ہے کہ من کا لفظ ھاء کنایہ کی طرف منسوب ہے۔ ابو حاتم کے نزدیک یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ذلك وھو منه۔ جماعت کی قراءت ظاہر ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾

”(اے حبیب) فرمائیے اہل ایمان کو کہ درگزر کرتے رہیں ان لوگوں سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ اللہ خود بدلہ دے ہر قوم کو جو وہ کیا کرتے تھے“۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا قل کے جواب کی وجہ سے يَغْفِرُوْا مجزوم ہے اسے شرط و جزا کے ساتھ تشبیہ دی، جس طرح تیرا قول ہے: قُمْ تُصِبْ خیرا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: يَغْفِرُوْا لام کے حذف کی وجہ سے مجزوم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس معنی کی بنا پر یہ مجزوم ہے قل لھم اغفروا یغفروا یہ امر محذوف کا جواب ہے جس امر پر کلام دلالت کرتی ہے۔ یہ علی بن عیسیٰ نے قول کیا ہے، ابن عربی نے اسے پسند کیا ہے۔ یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی (1) کہ قریش کے ایک آدمی نے حضرت عمر بن خطاب کو گالیاں دیں تو آپ نے اسے پکڑنے کا ارادہ کیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ قول صحیح نہیں۔ واحدی، قشیری اور دوسرے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 262

علما۔ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں نازل ہوئی جوان کا معاملہ غزوہ بنی مصطلق میں عبداللہ بن ابی کے ساتھ ہوا تھا(1) یہ سب لوگ ایک چشمہ پر فروکش ہوئے جسے مریسیع کہا جاتا۔ عبداللہ نے اپنا غلام پانی لانے کے لیے بھیجا اس نے واپس آنے میں دیری کی۔ عبداللہ بن ابی نے پوچھا: کس چیز نے تجھے روکے رکھا؟ اس نے کہا: حضرت عمر بن خطاب کے غلام نے وہ کنویں کے منہ پر بیٹھ گیا اس نے کسی کو بھی پانی بھرنے کی اجازت نہ دی یہاں تک کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور اپنے آقا کا مشکیزہ بھرا۔ عبداللہ بن ابی نے کہا: ہماری اور ان کی مثال ایسے ہی ہے جس طرح کہا گیا سمن کلبك یا کلك اپنے کتے کو موٹا کرو کہ وہ تمہیں کھا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی بات پہنچ گئی آپ نے تلوار لی آپ اس کی طرف جانا چاہتے تھے کہ اسے قتل کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرما دیا؛ یہ عطا کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا۔ مدینہ کا یہودی جس کو فنحاص کہا جاتا اس نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رب محتاج ہو گیا ہے۔ کہا: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سنی تو آپ نے تلوار لی اس کی تلاش میں نکلے جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، فرمایا: ان ربك یقول لك قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ حضرت جبریل امین نے بتایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار لی ہے اور یہودی کی تلاش میں نکلے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کی تلاش میں آدمی بھیجا جب حضرت عمر آ گئے فرمایا: ''اے عمر! اپنی تلوار رکھ لو'' عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے سچ فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیرا رب کہتا ہے قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ'' عرض کی: کوئی حرج نہیں جس ذات نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے آپ میرے چہرے پر غضب نہ دیکھیں گے۔

میں کہتا ہوں: مہدوی اور نحاس نے جو ذکر کیا ہے وہ ضحاک کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے؛ یہ قرظی اور سدی کا قول ہے۔ اسی قول کی بنا پر آیت میں نسخ کی طرف توجیہ کی جاتی ہے اور یہ کہنا کہ آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے یا غزوہ بنی مصطلق میں نازل ہوئی ہے تو یہ منسوخ نہیں۔ يَغْفِرُوْا کا معنی معاف کرنا اور درگزر کرنا ہے۔ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ کا معنی ہے وہ اس کے ثواب کی امید نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور انتقام سے خوف نہیں کھاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجاء کا معنی خوف ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ (نوح) تم اس کی عظمت سے کیوں نہیں ڈرتے؟ تم سابقہ امتوں کے عذاب کی مثل سے نہیں ڈرتے۔ ایام سے مراد بڑے واقعات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کی امید نہیں رکھتے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا اور اپنے دشمنوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بعث (دوبارہ اٹھائے جانے) سے نہیں ڈرتے۔

لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ عام قراءت لِيَجْزِيَ ہے معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جزا دے۔ حمزہ، نسائی اور ابن

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 196

عامر نے لنجزی پڑھا ہے۔ جمع متکلم کا صیغہ تعظیم کے طریقہ پر ہے۔
ابو جعفر، اعرج اور شیبہ نے لیُجزی پڑھا ہے، فعل مجہول ہے۔ قَوْمًا یہ منصوب ہے۔ ابو عمرو نے کہا: وہ واضح غلطی ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے لیجزی الجزاء قوما قوم کو جزا دی جاتی۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ (الانبیاء) یہ ابن عامر اور ابو بکر کی سورۃ الانبیاء میں قرائت ہے۔ شاعر نے کہا:

ولو وَلَدَتْ قُفَيْرَةُ جَرْوَ كلبٍ لَسُبَّ بذلك الجَرْوِ الكلابا

اگر قفیرہ کتے کے پلے کو جنم دیتی تو اس پلے کی وجہ سے کتوں کو گالیاں دی جاتیں۔
تو اس کی تعبیر یہ ہے لَسُبَّ السَّبُّ۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۞ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۞ وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۞

”جو نیک عمل کرتا ہے پس وہ اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جو برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا۔ پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا اور بے شک ہم نے عطا فرمائی بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت اور نبوت اور ہم نے ان کو پاکیزہ رزق دیا اور انہیں بزرگی دی (اپنے زمانے کے) اہل جہاں پر اور ہم نے انہیں دین کے معاملہ میں واضح دلائل دیئے پس آپس میں انہوں نے جھگڑنا شروع نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ انہیں (حقائق) کا صحیح علم آ گیا محض باہم حسد و عناد کے باعث، یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے“۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا... اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد تورات ہے وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ حکم سے مراد کتاب کا فہم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حکم سے مراد لوگوں پر حکم چلانا اور فیصلہ کرنا ہے۔ النُّبُوَّةَ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک انبیاء ہیں۔

وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ طیبات سے مراد غذاؤں، پھلوں اور کھانوں میں سے حلال چیزیں جو ملک شام میں تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تیہ کے ریگستان میں من وسلویٰ ہے۔ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۞ یعنی ان کے زمانہ کے عالم۔ جس طرح اس کی وضاحت سورۂ دخان میں گزر چکی ہے۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امر اور آپ

کی نبوت کے شواہد ہیں (1) کہ آپ تہامہ سے یثرب کی طرف ہجرت کریں گے اہل یثرب آپ کی مدد کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے مراد شرعی احکام ہیں جو حلال وحرام میں واضح ہیں اور معجزات ہیں۔

فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ اس سے مراد حضرت یوشع بن نون ہے ان میں سے بعض ایمان لائے اور ان میں سے بعض نے کفر کیا (2)؛ یہ نقاش نے بیان کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد کرنے کی بنا پر (3)؛ یہ معنی ضحاک نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بَغْيًا کا معنی ہے بعض بعض پر بغاوت کرتے ہیں اور فضل و سرداری کو طلب کرتے ہیں اور انہوں نے انبیاء کو قتل کیا، اسی طرح تیرے زمانے کے مشرک ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بینات آگئیں لیکن انہوں نے بینات سے اعراض کیا کیونکہ وہ ریاست میں باہم مقابلہ کرتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ تیرا رب ان کو حکم دیتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ فرماتا ہے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۝ وہ دنیا میں اختلاف کیا کرتے تھے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۱۸

"پھر ہم نے پختہ کر دیا آپ کو صحیح راہ پر دین کے معاملہ میں پس آپ اس کی پیروی کرتے رہیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو بے علم ہیں"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ لغت میں شریعت سے مراد مذہب اور ملت ہے۔ پانی کے گھاٹ کو شریعہ کہتے ہیں اسی سے لفظ شارع ہے کیونکہ یہ مقصد کی طرف جانے کا راستہ ہے شریعت اسے کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے دین شروع کیا ہوتا ہے۔ اس کی جمع شرائع ہے۔ دین میں شرائع سے مراد وہ مذاہب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے مشروع کیے ہوتے ہیں۔ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ کا معنی ہے یعنی دین کے معاملہ میں واضح منہاج جو تجھے حق کی طرف لے جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عَلٰى شَرِيْعَةٍ کا معنی ہے دین کے معاملہ میں ہدایت پر۔ قتادہ نے کہا: شریعت سے مراد امر، نہی، حدود اور فرائض ہیں۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی بینہ ہے کیونکہ یہ حق کی طرف واضح راستہ ہے۔ کلبی نے کہا: مراد السنۃ ہے کیونکہ اس کے ذریعے ماقبل انبیاء کے راستہ پر چلا جاتا ہے (4)۔ ابن زید نے کہا: مراد دین ہے کیونکہ وہ نجات کا راستہ ہے (5)۔ ابن عربی نے کہا: امر کا لفظ لغت میں دو معنوں میں وارد ہوتا ہے۔ 1۔ یہ شان کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ۝ (ہود) 2۔ کلام کی وہ قسم ہے نہی جس کے مقابل ہوتی ہے دونوں معانی کو یہاں مراد بنانا صحیح ہے تقدیر کلام یہ ہوگی پھر ہم نے تجھے دین کے طریقہ پر

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 263 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 264 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

چلایا یہ ملت اسلام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (النحل)

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے توحید، مکارم اخلاق اور مصالح میں شرائع میں کوئی فرق نہیں رکھا فرعی مسائل میں فرق کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا علم محیط تقاضا کرتا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ابن عربی نے کہا: جو لوگ علوم میں گفتگو کرتے ہیں ان میں سے بعض کا گمان یہ ہے کہ یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ ہم سے قبل کی شریعتیں ہماری شریعتیں نہیں کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی امت کو شریعت میں خاص کیا ہے۔ ہم اس بات کا تو انکار نہیں کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت شریعت میں منفرد ہے اختلاف اس امر میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماقبل شریعتوں کے بارے میں مدح اور ثنا کے انداز میں خبر دی ہے کیا اس کی اتباع لازم ہے یا نہیں؟۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی مشرکوں کی خواہشات کی اتباع نہ کریں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد بنی قریظہ اور بنی نضیر ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی قول مروی ہے: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب قریش نے آپ کو اپنے آباء کے دین کی طرف دعوت دی۔

اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝

''یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں آپ کو قطعاً کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں گے، بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا دوست ہے''۔

اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اگر آپ ان کی خواہشات کی اتباع کریں تو وہ تجھ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کسی چیز کو دور نہیں کریں گے۔

وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ظالم ایک دوسرے کے دوست، مددگار اور احباب ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد ہے منافق یہودیوں کے دوست ہیں۔

وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ اللہ متقین کا مددگار ہے۔ یہاں متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور معاصی سے بچتے ہیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝

''یہ بصیرت افروز باتیں ہیں سب لوگوں کے لیے اور (باعث) ہدایت و رحمت ہے ان کے لیے جو یقین رکھتے ہیں''۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ یہ کلام مبتدا اور خبر ہے یعنی یہ چیز جو تم پر نازل کی گئی ہے یہ حدود و احکام میں لوگوں کے لیے براہین،

دلائل اور علم کے محل ہیں۔ اسے هٰذَا بَصَآئِرُ پڑھا گیا ہے یعنی یہ آیات بصائر ہیں۔ وَهُدًى یعنی راہنمائی اور طریقہ ہیں جو اس آدمی کو جنت کی طرف لے جاتا ہے جو بھی اسے اپناتا ہے وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اور جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے لیے آخرت میں رحمت ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۲۱

''کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ یکساں ہو جائے ان (دونوں) کا جینا اور مرنا، بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ یعنی جنہوں نے برائیاں کیں۔ اجتراح کا معنی کمانا ہے، اسی سے جو جوارح کا لفظ ہے اس کی وضاحت سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کلبی نے کہا: الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا سے مراد عتبہ، شیبہ جو ربیع کے بیٹے تھے (1) اور ولید بن عتبہ ہے كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث ہیں جب انہوں نے ان کو بدر کے روز دعوت مبارزت دی اور انہیں قتل کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مشرکوں کی ایک جماعت کے بارے میں آیت نازل ہوئی انہوں نے کہا تھا: آخرت میں انہیں مومنوں کے مقابلہ میں بہتر دیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کے بارے میں بتایا۔

وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى (فصلت:50) اَمْ حَسِبَ یہ استفہام ہے یہ کلام معطوف ہے اس کا معنی انکار ہے اہل عربیہ عطف کے بغیر بھی اسے جائز سمجھتے ہیں جب وہ خطاب کے وسط میں ہو۔ ایک قوم کہتی ہے: اس میں اضمار ہے یعنی اللہ تعالیٰ متقین کا ولی ہے کیا مشرک یہ جانتے ہیں یا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے درمیان برابری کریں گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ام منقطعہ ہے اس میں ہمزہ کا معنی حسبان کا انکار ہے عام قراء کی قراءت سَوَآءٌ رفع کے ساتھ ہے کہ یہ مبتدا کی خبر مقدم ہے تقدیر کلام یہ ہے محیاھم و مماتھم سواء۔ مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ میں ضمیر کفار کی طرف لوٹے گی، یعنی ان کی زندگی بری زندگی ہے اور ان کی موت بھی اسی طرح ہے۔ حمزہ، کسائی اور اعمش نے سَوَآءً نصب کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابوعبید نے اسے پسند کیا ہے اس کا معنی ہے ہم اسے برابر بنا دیں گے۔ اعمش اور عیسیٰ بن عمر نے مَمَاتَهُمْ نصب کے ساتھ پڑھا ہے، معنی ہوگا وہ اپنی زندگی اور موت میں برابر ہیں جب حرف جار فی محیاھم و مماتھم میں سے ساقط کر دیا تو وہ منصوب ہو گیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ یہ نَّجْعَلَهُمْ کی ھم ضمیر سے بدل ہوں، معنی ہوگا کیا ہم ان کی زندگی اور موت کو برابر کر دیں گے جس طرح مومنوں کی زندگی اور موت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ کی ضمیر کفار اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 264

مومنین سب کے لیے ہو۔ مجاہد نے کہا: مومن مومن کی حیثیت سے مرتا ہے، مومن کی حیثیت سے اٹھایا جاتا ہے، کافر کافر کی حیثیت سے مرتا ہے اور کافر کی حیثیت سے اٹھایا جاتا ہے (1)۔ ابن مبارک نے ذکر کیا شعبہ، عمرو بن مرہ سے وہ ابوضحا سے وہ مسروق سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اہل مکہ کے آدمی نے کہا: یہ تمیم داری کا مقام ہے میں نے اسے ایک رات دیکھا یہاں تک کہ اس نے صبح کی یا صبح کے قریب تھا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے ایک آیت کو پڑھتا، رکوع کرتا، سجدہ کرتا اور روتا اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

بشیر نے کہا: میں ایک رات ربیع بن خیثمہ کے پاس گزرا وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے وہ اس آیت کے پاس سے گذرے ساری رات اسی پر ٹھہرے رہے یہاں تک کہ صبح کر دی شدید رونے کی وجہ سے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ابراہیم بن اشعث نے کہا: میں فضیل بن عیاض کو اکثر دیکھا کرتا وہ رات کے پہلے حصہ سے آخر رات تک اس آیت کو دہراتے رہتے اور اس کی مثل آیات پڑھتے رہتے، پھر کہتے: کاش! تو جانتا تو کس جماعت میں سے ہے؟ اس آیت کو عابدین کو رلانے والی آیت کہا جاتا ہے کیونکہ یہ محکم ہے۔

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝۲۲

”اور پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ تا کہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر (قطعاً) ظلم نہیں کیا جائے گا“۔

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ الحق سے پہلے الامر کا لفظ محذوف ہے وَ لِتُجْزٰی اصل میں لکی تجزی تھا كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ہر نفس نے جو کیا ہوگا اسے آخرت میں جزا دی جائے گی وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝۲۲ ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳

”ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگادی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ، پس کون ہدایت دے سکتا ہے اسے اللہ کے بعد (لوگو!) کیا تم غور نہیں کرتے“۔

حضرت ابن عباس، قتادہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس کافر نے اپنا دین اسی کو بنالیا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے وہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا مگر اس پر سوار ہو جاتا ہے (2)۔ عکرمہ نے کہا: ذرا اسے تو دیکھو جس نے اپنا معبود اسے بنالیا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے یا جسے وہ اچھا جانتا ہے جب وہ کسی چیز کو اچھا خیال کرتا ہے اور اس کی خواہش کرتا ہے تو اسے اپنا الہ بنالیتا ہے (3)۔ سعید بن جبیر نے کہا: ان میں سے کوئی پتھر کی پوجا کرتا جب اس پتھر سے خوبصورت پتھر دیکھتا

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 253　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 264　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 265

تو پہلے پتھر کو پھینک دیتا اور دوسرے کی عبادت شروع کر دیتا۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت حارث بن قیس سہمی کے بارے میں نازل ہوئی جو مذاق اڑانے والوں میں سے ایک تھا کیونکہ وہ اس کی پوجا کرتا جس کی خواہش کرتا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: انہوں نے پتھر کی عبادت کی کیونکہ بیت اللہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے کیا تو نے اسے دیکھا ہے جو اپنی خواہش اور اپنے معبود کی پیروی کرتا ہے۔ اس کلام سے مقصود ذوی العقول کی اس جہالت پر تعجب کا اظہار کرنا ہے۔ حسن بن فضل نے کہا: اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے کیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ شعبی نے کہا: خواہش کو ھوی کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ خواہش کرنے والے کو آگ میں پھینک دیتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ھوی کا ذکر نہیں کیا مگر اس کی مذمت کی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ (اعراف: 176) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (کہف) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (الروم: 29) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (قصص: 50) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص: 26)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: "تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش اس کے تابع نہ ہو جس پیغام حق کو میں لایا ہوں" (1)۔

حضرت ابو امامہ نے کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "آسمان کے نیچے کسی معبود کی عبادت نہیں کی گئی جو خواہش نفس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ہو"۔ حضرت شداد بن اوس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والفاجر من اتبع نفسه هواها وتمنى على الله (2)۔ دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع کیا اور موت کے بعد کے لیے عمل کیا اور فاجر وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنی خواہش کے تابع کیا اور اللہ تعالیٰ پر تمنا کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب تو ایسا بخل رکھے جس کی اتباع کی جاتی ہو، خواہش کی پیروی کی جاتی ہو، دنیا کو ترجیح دی جاتی ہو ہر رائے والا اپنی رائے پر خوش ہوتا ہے تو تجھے اپنی ذات کی فکر کرنی چاہیے اور تجھے عام لوگوں کے معاملات کو چھوڑ دینا چاہیے (3)" نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثلاث مهلكات وثلاث منجيات فالمهلكات شح مطاع وهوى متبع واعجاب المرء بنفسه والمنجيات خشية الله في السر والعلانية والقصد في الغناء والفقر والعدل في الرضا والغضب (4) تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں اور تین چیزیں نجات دینے والی ہیں ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں۔ ایسا بخل

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان، صفحہ 30
2۔ سنن ابن ماجہ، باب ذکر الموت والاستعداد لہ، جلد 2، صفحہ 324
3۔ سنن ابن ماجہ، باب قولہ تعالیٰ یایھا الذین آمنوا، جلد 2، صفحہ 299
4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 45، حدیث نمبر 43866

جس کی اطاعت کی جائے، ایسی خواہش جس کی پیروی کی جائے اور آدمی کا اپنے آپ پر خوش ہونا۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں مخفی اور علانیہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، غنا اور فقر میں میانہ روی اختیار کرنا اور رضامندی اور ناراضگی میں عدل کرنا۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: جب ایک آدمی صبح کرتا ہے تو اس کی خواہش، اس کا عمل اور اس کا علم اکٹھے ہوتے ہیں اگر اس کا عمل اس کی خواہش کے تابع ہو تو اس کا دن برا دن ہوتا ہے۔ اگر اس کا عمل اس کے علم کے تابع ہوتا ہے تو اس کا دن صالح دن ہوتا ہے۔ اصمعی نے کہا میں نے ایک آدمی کو کہتے ہوئے سنا:

إن الهوان هو الهوى قُلِب اسمه　　فإذا هويت فقد لقيت هوانا

ذلت ہی خواہش ہے اس کا نام الٹ دیا گیا ہے جب تو خواہش کرے تو تو نے ذلت کو پالیا

ابن مقفع سے ھوی کے بارے میں پوچھا گیا اس نے کہا: ھوان کا نون چرالیا گیا شاعر نے اسے لیا اور اسے اشعار میں نظم کیا اور کہا

نُونُ الهوان من الهَوىٰ مسروقةٌ　　فإذا هَوِيت فقد لقيت هوانا

ھوان کا نون ھوی سے چرالیا گیا ہے جب تو خواہش کرے گا تو تو نے ذلت کو پالیا۔ اور ایک شاعر نے کہا:

ان الهوى لهو الهوان بعينه　　فإذا هوِيت كَسَبت هوانا

وإذا هويت فقد تعبدك الهوى　　فاخضع لحبك كائنا من كانا

بے شک ھواء بعینہٖ ہی ھوان ہے جب تو نے خواہش کی تو تو نے ذلت کو کما لیا۔

جب تو نے خواہش کی تو خواہش نے تجھے اپنا غلام بنالیا اپنی محبت کو پست رکھ وہ جس سے بھی ہو۔

عبد اللہ بن مبارک کے اشعار ہیں:

ومن البلايا للبلاء علامة　　ألا يُرىٰ لك عن هواك نزوع

العبد عبدالنفس فى شهواتها　　والحر يشبع تارة ويجوع

آزمائشیں آزمائشوں کی علامت ہوتی ہیں کیا تیرے لیے تیری خواہش سے میلان دکھائی نہیں دیتا۔ بندہ اپنی خواہشات میں نفس کا غلام ہوتا ہے، شریف آدمی کبھی سیر ہوتا ہے اور کبھی بھوکا رہتا ہے۔

ابن درید کے اشعار ہیں:

إذا طالبتك النفس يوما بشهوة　　وكان إليها للخلاف طريق

فَدَعْها وخالف ما هَوِيت فإنما　　هواك عدو والخلاف صديق

جب نفس کسی روز تجھ سے کسی خواہش کا مطالبہ کرے جبکہ اس سے اختلاف کا طریقہ ہو اسے چھوڑ دو اور جو تو نے خواہش کی ہے اس کی مخالفت کر بے شک تیری خواہش دشمن ہے اور اس سے اختلاف کرنا درست ہے۔

ابو عبید طوسی کا شعر ہے۔

والنفس إن أعطيتها مناها فاغرة نحو هواها فاها

اگر تو نفس کو اس کی آرزو عطا کرے نفس اپنی خواہش کی طرف اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔

احمد بن ابی حواری نے کہا: میں ایک راہب کے پاس سے گذرا تو میں نے اسے نحیف و نزار پایا، میں نے اسے کہا: تو کمزور ہے۔ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: کتنے عرصہ سے؟ اس نے کہا: جب سے میں نے اپنے نفس کو پہچانا ہے، میں نے کہا: تو اس کی دوا کرتا ہے؟ اس نے کہا: دوا نے مجھے تھکا دیا ہے اور میں نے کی کا عزم کیا ہے۔ میں نے کہا: کی کیا ہے؟ اس نے کہا: خواہش نفس کی مخالفت۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: تیری خواہش تیری بیماری ہے اگر تو اس کی مخالفت کرے تو تیری دوائی ہے۔ وہب نے کہا: جب تجھے دو امور میں شک ہو اور تو ان میں سے بہترین کو نہ جانتا ہو تو ان دونوں میں سے تیری خواہش سے جو زیادہ دور ہے اس کو دیکھو اور اس پر عمل کرو۔

اس باب یعنی خواہش نفس کی مخالفت اور اس کی مذمت میں مستقل کتابیں اور کتابوں کے ابواب ہیں ان میں سے جن چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہی کافی ہے: وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ۝ (نازعات)

وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ یعنی علم جو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں رکھتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ثواب سے محروم رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کے بارے میں علم تھا کہ وہ اس کا مستحق نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ وہ گمراہ ہوگا (1)۔ مقاتل نے کہا: اللہ تعالیٰ کو اس کے بارے میں علم تھا کہ وہ گمراہ ہے (2)۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ بت پرست کے بارے میں اسے علم تھا کہ یہ عمل اسے نہ نفع دے گا اور نہ نقصان پہنچائے گا۔ پھر کہا گیا: عَلٰى عِلْمٍ کے بارے میں جائز ہے کہ فاعل سے حال ہو معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول سے حال ہو معنی ہوگا اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا اس حال میں کہ کافر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ گمراہ ہے۔

وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ اس کے کان پر مہر لگا دی یہاں تک کہ وہ وعظ کو نہیں سنتا (3)، اس کے دل پر مہر لگا دی یہاں تک کہ وہ ہدایت کو نہیں سمجھتا۔

وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً یعنی ایسا پردہ یہاں تک کہ وہ ہدایت کو نہیں دیکھتا۔ حمزہ اور کسائی نے کہا: غشوة الف کے بغیر غین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ شاعر نے کہا:

أما والذی أنا عبدٌله يَمِينًا و مالك أبدی اليمينا

لئن كنت ألبستنی غشوة لقد كنت أصفيتك الوُدّ حينا

محل استدلال أَلبستنی غَشْوۃ ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 265 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ جب اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کر دیا ہے تو کون اسے ہدایت دے گا۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کہا: تم نصیحت حاصل نہیں کرتے اور تم نہیں پہچانتے کہ وہ ہر چاہت پر قادر ہے۔

یہ آیت قدر یہ اور امامیہ کے اور جو بھی ان کی راہ چلا اس کا رد کرتی ہے، کیونکہ یہ اس بارے میں صریح ہے کہ انہیں ہدایت سے روک دیا گیا ہے۔ پھر یہ قول کیا گیا ہے: وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ یہ ان کے احوال کے بارے میں خبر کے طریقہ پر کلام چلائی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان کے خلاف دعا کے طریقہ پر کلام ذکر کی گئی ہے جس طرح سورۂ بقرہ کے آغاز میں کلام گذری ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حارث بن قیس غیاطلہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ نقاش نے کہا: یہ آیت حارث بن نوفل بن عبد مناف کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے اس نے ایک روز بیت اللہ شریف کا طواف کیا جبکہ اس کے ساتھ ولید بن مغیرہ تھا دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو کی ابوجہل نے کہا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ وہ سچا ہے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا: رہنے دو کس چیز نے تجھے اس پر آگاہ کیا؟ اس نے کہا: اے ابوعبد شمس! ہم بچپن میں اسے صادق وامین کہتے تھے جب اس کی عقل مکمل ہوگئی اور دانش کمال کو پہنچ گئی تو ہم اسے کذاب وخائن کہتے ہیں، اللہ کی قسم! میں خوب جانتا ہوں کہ وہ صادق ہیں۔ ولید نے پوچھا: تجھے کونسی چیز روکتی ہے کہ تو اس کی تصدیق کرے اور اس پر ایمان لائے؟ ابوجہل نے کہا: میرے بارے میں قریش کی بچیاں باتیں کریں گی کہ میں نے ابوطالب کے ہاں پرورش پانے والے یتیم کی پیروی کی ہے وجہ مقابلہ نہ کرسکنا ہے، لات وعزیٰ کی قسم! میں کبھی بھی اس کی پیروی نہیں کروں گا۔

وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ۝

”اور وہ کہتے ہیں: نہیں (کوئی دوسری) زندگی بجز ہماری دنیا کی زندگی کے (یہیں) ہم نے مرنا اور زندہ رہنا ہے اور نہیں فنا کرتا ہمیں مگر زمانہ حالانکہ انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض ظن (وتخمین) سے کام لے رہے ہیں“۔

وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا یہ ان کی جانب سے انکار، دوبارہ اٹھائے جانے کو جھٹلانا اور جزا کا ابطال ہے نَمُوْتُ وَنَحْیَا کا معنی ہے ہم مریں گے اور ہماری اولادیں زندہ رہیں گی (1)؛ یہ کلبی کا قول ہے اسے نُحیا بھی پڑھا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم میں سے بعض مریں گے اور ہم میں سے بعض زندہ ہوں گے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی ہم زندہ ہوں گے اور ہم مریں گے؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔

وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ مجاہد نے کہا: اس سے مراد سال اور دن ہیں (3)۔ قتادہ نے کہا: عمر ہے (4)؛ معنی ایک ہی

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 266 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہے۔ اسے الادھر بسر بھی پڑھا گیا ہے۔ ابن عیینہ نے کہا: دور جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے زمانہ ہی ہمیں ہلاک کرتا ہے اور وہی زندہ کرتا ہے اور ہمیں مارتا ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ قطرب نے کہا: معنی ہے ہمیں موت ہی ہلاک کرتی ہے اور ابوذؤیب کا قول پڑھا۔

أمِنَ المَنُونِ وريبها تتوجّعُ ... والدّهرُ ليس بمعتبٍ مَنْ يَجْزَعُ

کیا تم موتوں اور ان کے حادثات سے دکھی ہوتے ہو جو آدمی جزع فزع کرتا ہے زمانہ اس پر عتاب نہیں کرتا۔

عکرمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ہی ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے۔ ''دور جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر رات اور دن اور وہی ہمیں ہلاک کرتا ہے، ہمیں موت دیتا ہے اور ہمیں زندہ کرتا ہے پس وہ زمانہ کو گالیاں دیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يؤذيني ابن آدم يسب الدّهر وأنا الدّهر بيدي الأمر أقلب الليل والنهار (1)۔ ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے وہ زمانہ کو گالیاں دیتا ہے میں دھر ہوں اور میرے قبضہ قدرت میں امر ہے، میں رات اور دن کو گھماتا ہوں۔

میں کہتا ہوں: اس کا قول قال اللہ إلی آخرہ بخاری کی نص اور اس کے الفاظ ہیں۔ امام مسلم نے بھی اسے نقل کیا ہے سنن ابوداؤد میں بھی یہ روایت ہے۔ موطا میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لايقولن أحدكم يا خيبة الدّهر فإن الله هو الدّهر (2)۔ تم میں سے کوئی ایک یہ نہ کہے: ہائے زمانہ کی بربادی، بے شک اللہ ہی زمانہ ہے۔ جس نے یہ کہا کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اس نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور کہا: علماء میں سے جنہوں نے اسے اللہ تعالیٰ کا اسم قرار نہیں دیا اس نے اسے دور جاہلیت میں عربوں کا جو انداز کلام تھا اس کا رد بنایا ہے کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دہر ہی حقیقت میں فاعل ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے آیت میں ان کے بارے میں بتایا ہے جب انہیں کوئی مصیبت، ظلم یا ناپسندیدہ چیز پہنچتی تو اسے دہر کی طرف منسوب کرتے تو انہیں یہ کہا گیا: تم زمانہ کو گالیاں نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی دہر ہے (3)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان امور کو بجالانے والا ہے جن کو تم زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہو، تو گالی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آتی ہے تو انہیں اس امر سے روک دیا گیا۔ اس نے جو ذکر کیا ہے اس کی صحت پر حضرت ابوہریرہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے (4)''

جس نے کہا بہت اچھا کہا وہ ابوعلی ثقفی ہے:

يا عاتب الدّهرِ إذا نابَهُ ... لاتَلُمُ الدهر على غَدْرِهِ

الدّهرُ مأمورٌ له آمرٌ ... و ينتهي الدّهرُ إلى أمره

كم كافرٍ أموالُه جَمّةٌ ... تزداد أضعافًا على كفره

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قولہ تعالیٰ وما یهلکنا إلا الدهر، جلد 2، صفحہ 715

2۔ صحیح مسلم، کتاب الالفاظ من الأدب وغیرها، باب النهی سب الدهر، جلد 2، صفحہ 237		3۔ ایضاً		4۔ ایضاً

ومؤمنٍ ليس له درهمٌ يزداد إيمانًا على فقرِهٖ

اے زمانہ کو عتاب کرنے والے جب اسے کوئی مصیبت پہنچتی ہے زمانہ کی جانب سے وعدہ پورا نہ کرنے پر اسے ملامت نہ کر، زمانہ تو مامور ہے اس کا ایک آمر ہے زمانہ اس کے امر پر منتہی ہو جائے گا۔ کتنے ہی کافر ہیں جن کے اموال بے شمار ہیں ان کے کفر کے باوجود ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک مومن ہے اس کے پاس کوئی درہم نہیں اس کے فقر کے باوجود اس کے ایمان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اکثر زمانہ کا ذکر کرتے تو ان کے والد نے انہیں اس بات سے جھڑ کا فرمایا: اے بیٹے! زمانہ کے ذکر سے بچ اور یہ شعر پڑھا:

فما الدهر بالجانی لشیٔ لحَينةٍ ولا جالبَ البَلْوٰى فلاتشتم الدّهْرَا

ولكن متى مايبعث الله باعثا على معشرٍ يَجْعَلْ مياسيرهم عُسْرَا

زمانہ کسی شے پر آزمائش کے ساتھ جنایت کرنے والا نہیں اور نہ ہی مصیبت لانے والا ہے پس تو زمانہ کو گالیاں نہ دے مگر جب اللہ تعالیٰ کسی قبیلہ پر کوئی مصیبت بھیجتا ہے تو ان کی خوشحالیوں کو تنگدستی بنا دیتا ہے۔

ابو عبید نے کہا: میں نے ایک ملحد سے مناظرہ کیا اس نے کہا: کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کہتا ہے: فإنّ الله هو الدّهر۔ میں نے کہا: کیا کوئی ایسا بھی ہے جو زمانہ کی ہلاکتوں میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیتا ہو بلکہ وہ کہتے جس طرح اعشیٰ نے کہا:

إن محلا وإن مُرتحَلا وإنّ فی السَّفْرِ إذ مَضَوا مَهَلَا

أستأثر الله بالوفاء وبالعدل وولیّ الملامةَ الرَّجُلَا

بے شک سفر پڑاؤ ڈالنے کا ایک محل ہے اور کوچ کرنے کی جگہ ہے اور اس میں آرام و فرصت ہے جب وہ چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے وفا اور عدل کو چن لیا ہے اور ملامت کو انسان کی طرف پھیر دیا ہے۔

ابو عبید نے کہا: اور حادثات کو اس کی طرف منسوب کیا۔ عمرو بن قمیہ نے کہا:

رمتنی بنات الدهر من حيث لا أرى فكيف بمن يُرْمَى و ليس برام

فلو أنها نَبْل إذا لأتقيتها ولكنّى أُرْمَى بغير سهام

على الراحتين مرّة وعلى العصا أنوءُ ثلاثًا بعدهن قيامی

مجھے حادثات زمانہ تیر مارتے ہیں جہاں سے میں دیکھتا نہیں اس آدمی کا کیا حال ہوگا جس پر تیر مارا جائے اور وہ خود تیر نہ مار سکے اگر وہ تیر ہوتا تو میں اس سے بچ جاتا، لیکن مجھے تو تیر اس کے بغیر مارا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دونوں ہتھیلیوں پر اور تیسری دفعہ عصا کے سہارے اٹھتا ہوں ان کے بعد میرا کھڑا ہونا ہوتا ہے۔

اس کی مثل اشعار میں بہت زیادہ ذکر ہے شعراء اسے زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ہی فاعل حقیقی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں۔

وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ یہاں من زائدہ ہے یعنی انہوں نے جو کچھ کہا شک کرتے ہوئے کہا۔

اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ۝ یعنی وہ ظن کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جو بعث میں شک کرتے ہیں اور قطعی طور پر انکار نہیں کرتے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں مسلمانوں کے خوف کی وجہ سے ان کے لیے قیامت کا انکار تو ممکن نہیں وہ تاویل کرتے ہیں اور قیامت سے مراد بدن کی موت لیتے ہیں اور ثواب وعقاب اسے خیالات دیکھتے ہیں جو ان کے گمان کے مطابق روحوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا شر تمام کفار کے شر سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ لوگ حق پر ملمع سازی کرتے ہیں اور ان کی ظاہری تلبیس سے دھوکہ کھایا جاتا ہے۔ وہ مشرک جو اعلانیہ شرک کرتا ہے مسلمان اس سے احتیاط کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم مرتے ہیں اور ہمارے آثار زندہ رہتے ہیں۔ یہ اچھے ذکر کے ساتھ زندگی ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے تناسخ کی طرف اشارہ کیا یعنی ایک آدمی فوت ہوتا ہے تو اس کی روح مردوں میں رکھ دی جاتی ہے تو وہ اس کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۲۵ قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۲۶

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تو (ان کے جواب میں) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ لے آؤ ہمارے باپ دادا اگر تم سچے ہو۔ فرمائیے: اللہ نے زندہ فرما دیا ہے تمہیں پھر وہ مارے گا تمہیں پھر جمع کرے گا تمہیں اور قیامت جس میں ذرا شک نہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ جب ان مشرکوں پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں جو بعث کے جواز میں نازل ہوئی ہیں تو ان کے پاس رد کرنے کے کوئی دلائل نہیں۔

مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ، حُجَّتَهُمْ یہ کان کی خبر ہے اور اسم اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ ہے یعنی ہمارے مردہ آباء کو لے آؤ جن سے ہم اس بارے میں سوال کریں گے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سچ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول رد کر دیا قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ بعد اس کے کہ تم مردہ نطفہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندہ کر دیا ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں قیامت کے روز جمع کرے گا جس طرح اس نے تمہیں دنیا میں زندہ کیا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا جس طرح اس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

زمخشری نے کہا: اگر تو کہے ان کے قول کو کیوں حجت قرار دیا گیا جبکہ وہ حجت نہیں؟ میں کہوں گا: انہوں نے اس کے ساتھ اسی طرح دلیل پکڑی جس طرح استدلال کرنے والا اپنی دلیل سے استدلال کرتا ہے(1)۔ انہوں نے اسے دلیل کے انداز میں

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 291

ذکر کیا تو بطور استہزاء اسے حجت کا نام دیا گیا یا ان کے گمان اور انداز ے کے مطابق وہ حجت تھی یا یہ اس اسلوب میں کلام ہے

تَحِيَّةُ بَيْنِهِم ضَرْبٌ وَجِيعٌ ان کا اہم سلام تکلیف دہ وار ہے۔

گویا کہا گیا: ان کی حجت نہیں تھی مگر جو حجت نہیں تھی۔ مراد یہ ہے اس امر کی نفی کی جائے کہ ان کی کوئی حجت ہو۔

اگر تو یہ کہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ کیسے ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ کا جواب ہے۔ میں اس کا جواب دوں گا: جب انہوں نے بعث کا انکار کیا، رسولوں کی تکذیب کی اور انہوں نے گمان کیا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے یہ خاموش کرنے والا قول ہے تو ان پر بطریق دلیل الزامی اس چیز کو لازم کیا جائے گا جس کے وہ اقرار کرنے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پھر وہی انہیں مارے گا۔ اس دلیل الزامی کے ساتھ اس دلیل الزامی کو ملا دیا جائے گا جو اس اقرار کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے وہ قیامت کے روز انہیں جمع کرنا ہے۔ اگر وہ انصاف سے کام لیں اور حق کے داعی کی طرف توجہ کریں جو ذات اس امر پر قادر ہے وہ ان کے آباء کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے یہ امر اس پر زیادہ آسان ہے۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ۝

''اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جس روز برپا ہوگی قیامت اس روز سخت نقصان اٹھائیں گے باطل پرست''۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خلقت اور ملک کے اعتبار سے یہ اللہ کے لیے ہیں۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ۝ پہلا یوم يَّخْسَرُ کی وجہ سے منصوب ہے اور يَوْمَىِٕذٍ تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا گیا ہے یا یہ بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تقدیر کلام یہ ہے ولله الملك يوم تقوم الساعة، یومئذ میں عامل یخسر ہے۔ یخسر کا مفعول محذوف ہے، معنی ہے وہ جنت میں اپنی منازل کے بارے میں خسارے میں ہوں گے۔

وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝

''اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے''۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً اس دن کی ہولناکی کے باعث تو یہ گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا دیکھے گا۔ یہاں امت سے مراد ہر ملت والے ہیں۔ جاثیہ میں پانچ تاویلیں ہیں:

1۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی مستوفزہ ہے(1)۔ سفیان نے کہا: مستوفزا اسے کہتے ہیں جس کے زمین پر اس کے دونوں

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 267

گھٹنے اور اس کے پوروں کے اطراف لگتے ہیں۔ ضحاک نے کہا: یہ حساب کے موقع پر ہوتا ہے۔ 2۔ مجتمع، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول کیا ہے۔ فراء نے کہا: معنی ہے تو ہر دین والے کو مجتمع دیکھے گا۔ 3۔ متمیزہ، الگ الگ؛ یہ عکرمہ نے قول کیا ہے۔ 4۔ جھکا ہوا یہ قریش کی لغت ہے؛ یہ مورج کا قول ہے۔ 5۔ گھٹنوں پر بیٹھنے والا؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ جثا سے مراد گھٹنوں پر بیٹھنا ہے۔ جثا علی رکبتہ یجثو ویجثی جُثُوًّا وجُثِیًّا۔ دونوں میں فعول کا وزن ہے۔ سورۂ مریم میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ جثوۃ کا اصل معنی ہر شے کی جماعت ہے۔ طرفہ دو قبروں کی صفت بیان کرتا ہے:

ترى جُثْوَتَيْن من تراب عليهما صفائحُ صُمٌّ من صفيحٍ مُنَضَّدِ

تو مٹی کی دو قبریں دیکھے گا جن پر پتلے مضبوط پتھر ہیں جو ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔

پھر یہ کہا گیا ہے: یہ کفار کے ساتھ خاص ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کافر اور مومن دونوں کو عام ہے وجہ حساب کا انتظار ہے۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو سے وہ عبداللہ بن باباہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: "گویا میں تمہیں اونچی جگہوں پر جہنم سے پہلے گھٹنوں کے بل گرا ہوا دیکھتا ہوں"۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا: قیامت کے دن ایک گھڑی ہے جو دس سال کے برابر ہوگی لوگ اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے: آج میں تجھے اپنی ذات کے سوا کسی کے لیے سوال نہیں کرتا۔

كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا یحییٰ بن سلام نے کہا: کتاب سے مراد حساب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ کتاب ہے جس میں اس کے اچھے اور برے اعمال لکھے جاتے تھے؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ یہ مجاہد کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کِتَابِهَا سے مراد وہ کتاب ہے جس پر فرشتے لکھتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کِتَابِهَا سے مراد وہ کتاب ہے جو اس امت پر نازل کی گئی تا کہ یہ دیکھا جائے کہ کیا انہوں نے اس کے مطابق عمل کیا یا نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے(2)۔ یعقوب حضرمی نے کہا: كُلُّ أُمَّةٍ منصوب ہے کیونکہ یہ پہلے کل سے بدل ہے کیونکہ دوسرے کل میں وضاحت ہے جو پہلے میں نہیں ہے، کیونکہ پہلے جثو میں جثو کی حالت کی کوئی وضاحت نہیں جس طرح دوسرے جثو میں اس سبب کا ذکر ہے جو اس کا داعی ہے وہ اس امت کو اس کی کتاب کی طرف دعوت دینا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ منصوب ہے اس میں عامل تَرٰی ہے جو مضمر ہے اور رفع مبتدا ہونے کی بنا پر ہے۔

الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۸﴾ جو اچھا یا برا عمل کرتے تھے۔ اس کی آج تمہیں جزا دی جائے گی۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۹﴾

"یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ، ہم لکھ لیا کرتے تھے جو تم (دنیا میں) عمل کیا کرتے تھے"۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 267
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 268

هٰذَا كِتٰبُنَا ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ فرشتوں کا قول ہے۔
يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ یعنی وہ گواہی دیتا ہے۔ یہ استعارہ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: نطق الکتاب بکذا یعنی کتاب نے اس کی وضاحت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس کتاب کو پڑھیں گے تو کتاب انہیں ان کے اعمال یاد دلائے گی، گویا وہ ان سے کلام کرے گی، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا (کہف: 49) مومن کے بارے میں ہے: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ (مومنون: 62) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔
يَنْطِقُ یہ الکتاب سے حال ہے یا ذا سے حال ہے یا ذا کی دوسری خبر ہے یا كِتٰبُنَا، هٰذَا سے بدل ہے اور يَنْطِقُ خبر ہے۔
اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ یعنی تم جو عمل کرتے تھے اس کے لکھنے کا حکم دیتے تھے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں وہ ہر روز کسی چیز کے ساتھ نازل ہوتے ہیں جس میں وہ انسانوں کے اعمال لکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ لکھنے کا عمل کتاب سے ہوگا(1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حفظہ فرشتوں نے جو لکھا ہوگا ہم اسے لکھ لیا کرتے تھے کیونکہ حفظہ فرشتے اعمال کے صحیفے خازنوں کی طرف بلند کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حفظہ بندوں کے جو اعمال لکھتے ہیں ہر روز انہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں پھر جب وہ اپنے مکان کی طرف لوٹتے ہیں تو اس سے نیکیاں اور برائیاں لکھ لی جاتی ہیں۔ مباحات کو دوسرے نسخہ کی طرف منتقل نہیں کیا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتے جب بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں تو وہ حکم دیتا ہے جن اعمال پر ثواب و عقاب ہے انہیں اس کے ہاں لکھ لیا جائے اور جن پر ثواب و عقاب نہیں ہوتا وہ ان سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۝۳۰ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۝۳۱

”پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، یہی وہ روشن کامیابی ہے۔ اور جو لوگ کفر کرتے رہے (ان سے پوچھا جائے گا) کیا میری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں پھر تم (سن کر) تکبر کیا کرتے تھے اور تم لوگ (عادی) مجرم تھے“۔

فِيْ رَحْمَتِهٖ رحمت سے مراد جنت ہے اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ یعنی انہیں یہ بات کہی جائے گی یہ استفہام توبیخ کے لیے ہے۔ فَاسْتَكْبَرْتُمْ تم نے اس کو قبول کرنے سے تکبر کیا۔ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۝ تم مشرک قوم ہو تم نافرمانیاں کرتے ہو۔ یہ جملہ

1۔ تفسیر طبری، جز 25، صفحہ 182

کہا جاتا ہے: فلان جریمة أهله جب وہ اس جرم کا ارتکاب کرنیوالا ہو۔ مجرم اسے کہتے ہیں جو اپنے آپ کو نافرمانیوں پر برانگیختہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ (القلم) مجرم مسلم کی ضد ہے پس وہ کفر کے گناہ کا ارتکاب کرنے والا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲

"اور جب (تمہیں) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں تو تم (بڑے غرور سے) کہتے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہمیں تو یونہی ایک گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں اس پر (قطعاً) یقین نہیں"۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یعنی دوبارہ اٹھانا ہو کر رہے گا۔ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا حمزہ نے الساعة نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف وَعْدَ پر ہے باقی قراء نے مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے یا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ کے محل پر اس کا عطف ہے۔ مصدر میں جو ضمیر ہے اس پر عطف کرنا اچھا ہے، کیونکہ اس کی تاکید نہیں لگائی گئی۔ ضمیر مرفوع پر شعر میں تاکید کے بغیر عطف کیا جاتا ہے۔

قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ یعنی کیا قیامت حق ہے یا باطل ہے۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا مبرد کے نزدیک اس کی تقدیر یہ ہے اِنْ نحن اِلّا نظنّ ظنا ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر یہ ہے ان نظن اِلّا انکم تظنّون ظنا ایک قول یہ کیا گیا ہے: قلتم اِن نظنّ اِلّا ظنا۔

وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝۳۲ یعنی ہم یقین کرنے والے نہیں تھے کہ قیامت ہو کر رہنے والی ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳

"اور ظاہر ہو گئے ان کے لیے برے نتائج ان کے کرتوتوں کے اور (ہر طرف سے) گھیر لیا انہیں اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا انہوں نے جو برے اعمال کیے تھے ان کی جزا ان کے لیے ظاہر ہوگی۔ وَحَاقَ بِهِمْ ان پر نازل ہوئی یا انہیں گھیر لیا مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳ یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر نازل ہو گیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۴

"اور (انہیں) کہہ دیا گیا آج ہم تمہیں فراموش کریں گے جس طرح تم نے فراموش کیے رکھا اپنے اس دن کی ملاقات کو اور تمہارا ٹھکانہ آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا"۔

وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ ہم تمہیں آگ میں چھوڑ جائیں گے جس طرح تم نے اس دن کی ملاقات کو چھوڑ دیا تھا یعنی اس کے لیے عمل کرترک کر دیا تھا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ تمہارا مسکن اور تمہارا ٹھکانہ آگ ہے وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۝ یعنی تمہارے لیے کوئی ایسا آدمی نہیں جو تمہاری مدد کرے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ۝

''یہ اس لیے کہ تم نے بنا رکھا تھا اللہ کی آیتوں کو مذاق اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا تمہیں دنیوی زندگی نے پس آج وہ نہیں نکالے جائیں گے آگ سے اور نہ انہیں توبہ کر کے اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا''۔

اٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد قرآن حکیم ہے هُزُوًا کھیل۔ وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا دنیاوی زندگی نے اپنی باطل چیزوں اور زیب وزینت سے تمہیں دھوکہ میں مبتلا کیا تو تم نے یہ گمان کیا کہ اس کے سوا کوئی چیز نہیں اور دوبارہ اٹھانا بھی نہیں لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا ھا ضمیر سے مراد آگ ہے وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ اور نہ انہیں توبہ کر کے راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے فالیوم لایَخْرُجُوْن یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (الحج: 22) باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا (مومنون: 107) اس کی مثل دوسری آیات ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۪ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝

''پس اللہ کے لیے ہیں سب تعریفیں جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا (اور وہی) سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور فقط اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا اور حکمت والا ہے''۔

مجاہد، حمید اور ابن محیصن نے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝ سب میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اصل میں ھو ربٌّ ہے وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ کبریاء سے مراد عظمت، جلال، بقا، حکومت، قدرت اور کمال ہے۔

# سورۃ الاحقاف

آیاتها ۳۵ ۴۶ سورۃ الاحقاف مکیۃ ٦٦ رکوعاتها ۴

تمام کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے اس کی چونتیس آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی پینتیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

حٰمٓ ۞ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۞ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَ مَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ ۞

''حا۔ میم۔ اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب بہت دانا ہے۔ نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور مدت مقررہ تک، اور کفار اس چیز سے جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے روگردانی کرنے والے ہیں''۔

اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد قیامت ہے(1)؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے یہ وہ موت ہے جس پر آسمان اور زمین ختم ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ وقت ہے(2) جو ہر مخلوق کے لیے مقدر ہے۔ عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا جس سے انہیں ڈرایا گیا۔ مُعۡرِضُوۡنَ وہ اس سے اعراض کرنے والے ہیں، غفلت کا اظہار کرنے والے ہیں وہ اس کے لیے تیاری کرنے والے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما مصدر یہ ہو معنی ہوگا انہیں اس دن کے ڈرانے سے۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيۡتُوۡنِىۡ بِكِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞

''فرمایئے: اے کفار! کبھی تم نے (غور سے) دیکھا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو (بھلا) مجھے بھی تو دکھاؤ جو پیدا کیا ہے انہوں نے زمین سے یا ان کا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ حصہ ہے، لاؤ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے اتری ہو یا کوئی (دوسرا) علمی ثبوت اگر تم سچے ہو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ بتوں اور اللہ تعالیٰ کے جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو۔ مَاذَا خَلَقُوۡا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 271
2۔ ایضاً

مِنَ الْاَرْضِ کیا انہوں نے زمین میں سے کوئی چیز پیدا کی ہے۔ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ کیا ان کے لیے کوئی حصہ ہے فِي السَّمٰوٰتِ اللہ تعالیٰ کے ساتھ آسمانوں کی تخلیق میں۔ مِنْ قَبْلِ هٰذَا یعنی اس قرآن سے قبل۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ عام قراءت اَوْ اَثٰرَةٍ ہے یعنی ثاء کے بعد الف ہے۔ حضرت ابن عباس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے" یہ وہ خط تھا جو عرب زمین میں لگاتے تھے"(1)۔ اسے مہدوی اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ درست نہیں۔ مشہور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:'' انبیاء میں سے ایک خط لگایا کرتا تھا جس نے ان کے خط کی موافقت کی تو وہ صحیح نتیجہ تک پہنچ گیا''(2)۔ یہ بھی روایت صحیح نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ معاویہ بن حکم سلمی کی حدیث سے ثابت ہے: اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے نحاس نے اس کی سند بیان کی محمد بن احمد جرابجی، محمد بن بندار سے وہ یحییٰ بن سعید سے وہ سفیان ثوری سے وہ صفوان بن سلیم سے وہ ابو سلمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں (3) کہ آپ نے فرمایا:'' وْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ سے مراد خط ہے'' یہ بھی صحیح ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کی تاویل میں علماء نے اختلاف کیا ان میں سے کچھ نے کہا: یہ خط لگانے کی اباحت کو بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ کچھ انبیاء اس طرح کیا کرتے تھے، ان میں سے بعض نے کہا: یہ نہی بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' جس کا خط نبی کے خط کے موافق ہو گیا تو وہ اس امر کو جان گیا'' کیونکہ پہلے نبی کے طریقہ کی پہچان کا کوئی طریقہ نہیں کہ اس پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ شاعر نے کہا:

لعمرك ما تدری الضوارب بالحصا ولا زاجراتُ الطير ما الله صانع

تیری زندگی کی قسم انکریاں پھینکنے والیاں نہیں جانتی اور نہ پرندے کو جھڑکنے والیاں جانتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیا کرنے والا ہے۔

اس کی حقیقت اس علم کو جاننے والوں کے ہاں اسی طرح ہے جس طرح ستاروں کی صورتیں ہوا کرتی ہیں ایسا آدمی اس چیز کے بارے میں راہنمائی کرتا ہے جس پر ستارے دلالت کرتے ہیں کہ سعادت یا نحوست ان میں واقع ہوئی پس یہ گمان پر مبنی ہوگا اور امر غائب کے متعلق ہوگا، جس کا طریقہ ناپید ہو چکا ہے اور اس کی تحقیق فوت ہو چکی ہے اور شریعت نے اس بارے میں منع کیا ہے اور اس امر کی خبر دی ہے کہ یہ وہ امر ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور مخلوق سے اس امر کو قطع کر دیا ہے اگرچہ ان کے لیے اس سے قبل ایسے اسباب تھے کہ وہ غائب اشیاء کو جاننے کے لیے ان اسباب سے وابستہ ہوا کرتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اسباب کو اٹھا دیا ہے، ان دروازوں کو مٹا دیا ہے اور علم غیب کے لیے اپنی ذات کو خاص کر دیا ہے۔ اس میں اس ذات کے ساتھ مزاحمت جائز نہیں، اس کا دعویٰ کرنا کسی کے لیے حلال نہیں اس میں اگر نہی نہ بھی ہو تو اس کی طلب صرف تھکاوٹ ہی تھکاوٹ ہے۔ جب اس میں نہی وارد ہو چکی ہے تو اس کی طلب معصیت ہوگی یا کفر ہوگا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 271
2۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکھانۃ واتیان الکھانۃ، جلد 2، صفحہ 232
3۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، جلد 7، صفحہ 233، حدیث نمبر 11335

جیسا طالب کا ارادہ ہوگا (1)۔

میں کہتا ہوں: جو قول اس نے اختیار کیا ہے وہ خطابی کا قول ہے خطابی نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: فمن وافق خطه فذاك یہ زجر کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ یہ نبوت کا علم تھا جو منقطع ہو چکا ہے، ہمیں اس کے حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ قاضی عیاض نے کہا: لفظ کا ظاہر اس کے خلاف ہے اور جس کا خط نبی کے خط کے موافق ہو اس کی تصویب کی گئی ہے لیکن موافقت کہاں سے معلوم ہو جبکہ شرع نے گمان اور غیب کا دعویٰ کرنے سے منع کیا ہے۔ اس حدیث کا معنی ہے جس نے اس کے خط کی موافقت کی یہی وہ چیز ہے جس کی درستگی کو وہ پاتے تھے اس سے یہ مراد نہیں کہ ایسا عمل کرنے والے کے لیے اباحت ثابت ہوتی ہے جس طرح بعض لوگوں نے معنی کیا ہے۔

مکی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول: کان نبی من الانبیاء یخط (2) کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ وہ اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے ریت میں خط لگاتے پھر وہ فال لیتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول ومنا رجال یخطون کی یہ وضاحت کی اس سے مراد وہ خط ہے جو کاہن لگایا کرتا اور اسے عطیہ دیا جاتا اور کہتا: بیٹھو یہاں تک کہ میں تیرے لیے خط لگاؤں، کاہن کے سامنے ایک بچہ ہوتا جس کے پاس سرمچو ہوتا پھر وہ نرم زمین پر آتا استاذ جلدی جلدی خط لگاتا تاکہ اسے ساتھ ساتھ گنا نہ جا سکے پھر وہ پلٹتا اور آہستہ آہستہ دو دو خط مٹاتا اگر دو خط باقی رہ جاتے تو یہ کامیابی کی علامت ہوتی اگر ایک خط باقی رہ جاتا تو یہ ناکامی کی علامت ہوتا۔ عرب اسے اسحم کا نام دیتے، یہ ان کے نزدیک منحوس ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب نہیں چھوڑے جو غیب پر دلالت کرتے ہوں جن کے ساتھ تعلق کی اجازت دی گئی تھی اور جن کے ساتھ استدلال کی اجازت دی گئی تھی صرف خواب باقی ہیں اور یہ بتایا کہ یہ نبوت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے اسی طرح فال ہے جہاں تک طیرہ اور زجر کا تعلق ہے ان دونوں سے منع کیا گیا ہے (3)۔

فال سے مراد ہے جو کلام سنی جائے اس سے اس امر پر استدلال کرنا جس کا ارادہ ہو جب وہ آواز اچھی ہو جب مکروہ کو سنے تو یہ تطیر ہے۔ شرع نے یہ حکم دیا ہے کہ فال سے خوش ہو اور خوشی خوشی اپنے امر کو کر گزرے اور جب وہ مکروہ آواز سنے تو اس سے اعراض کرے اور اس کی وجہ سے نہ لوٹے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللّٰھم لا طیر الا طیرك ولا خیر الا خیرك ولا إله غیرك اے اللہ کوئی فال نہیں مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں مگر تیری خیر تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ ایک ادیب نے اس کا ذکر کیا ہے:

الفأل والزجر والكهان كلهم مضلّلون ودون الغيب أقفال

فال، پرندوں کو جھڑکنا سب گمراہ کرنے والے ہیں، علم غیب کے سامنے تالے لگے ہوئے ہیں۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1696

2۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکھانۃ واتیان الکھانۃ، جلد 2، صفحہ 232

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1697

یہ کلام صحیح ہے مگر فال میں درست نہیں کیونکہ شرع نے اسے مستثنٰی قرار دیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ شاعر نے جو کچھ اس میں کہا ہے اسے قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ اس نے جہالت کی بات کی ہے اور صاحب شرع زیادہ سچا، زیادہ علم رکھنے والا اور زیادہ حکیم ہے۔

میں کہتا ہوں: طیرہ، فال اور ان دونوں میں فرق کے بارے میں بحث سورۂ مائدہ اور دوسری سورتوں میں گذر چکی ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب میں منفرد ہے۔ کوئی اسے نہیں جان سکتا مگر اللہ تعالیٰ اسے جو علم عطا کرے یا اس پر دلالت عادیہ بنا دے اس کی مدد سے اسے جانا جا سکے جو عام معمول ہو۔ بعض اوقات اس میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے جب وہ کھجور کا ایک درخت دیکھے جس پر گابھے نکلے ہوں تو وہ جان لے گا یہ پھل دے گا اور جب وہ درخت کو دیکھے گا کہ اس کا گابھا گر چکا ہے تو اسے علم ہو جائے گا کہ وہ پھل دار نہیں ہوگا۔ یہ جائز ہے کہ اس پر کوئی آفت آجائے جو اس کے پھل کو ہلاک کر دے تو وہ پھل نہ دے، جس طرح یہ جائز ہے کہ اس کا گابھا گر جائے اللہ تعالیٰ اس میں دوبارہ گابھا پیدا کر دے تو وہ پھلدار ہو جائے، جس طرح یہ جائز ہے کہ اس کے مہینہ کے بعد کوئی مہینہ نہ ہو اور اس دن کے بعد کوئی دن نہ ہو جب اللہ تعالیٰ اس عالم کو فنا کرنے کا ارادہ کرے۔ اس کے علاوہ بھی کئی امثلہ ہیں جن کی وضاحت سورۃ الانعام میں گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابن خویز منداد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ سے مراد خط ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خط (تحریر) دیکھ کر فیصلہ فرمایا کرتے تھے جب گواہ خط پہچان لیتا، جب حاکم اس کی تحریر پہچان لیتا اور جس کی طرف وہ خط لکھا جاتا اسے پہچان لیتا تو اس کے مطابق وہ فیصلہ کر دیا کرتا تھا۔ پھر جب لوگوں میں دھوکہ اور فریب ظاہر ہونے لگا تو آپ نے اس سے رجوع کر لیا۔ امام مالک سے یہ مروی ہے فرمایا: لوگ فسق و فجور کرتے ہیں تو ان کے لیے فیصلے بھی نئے ہو جاتے ہیں۔ جب گواہ اس تحریر پر گواہی دے دیں جس کے مطابق میں فیصلہ کیا گیا ہو، مثلاً وہ یہ گواہی دیں کہ یہ حاکم کا خط ہے یا اس کی تحریر ہے اس میں جو کچھ ہے ہم اس پر گواہی دیتے ہیں اگرچہ اس تحریر میں جو کچھ ہے اسے نہ جانتے ہوں۔ اسی طرح وصیت ہے یا کسی آدمی کے اعتراف کی تحریر ہے کہ اس نے کسی کا مال دینا ہے گواہ یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ اس کا خط ہے اور اسی قسم کی گواہی دیں۔ ان کے مذہب میں اختلاف نہیں کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ کا معنی ہے علم میں سے باقی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کلبی، ابوبکر بن عیاش اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔ صحاح میں ہے اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اس علم میں سے باقی، اسی طرح الاثرہ کا لفظ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: سمنت الابل علی اثارة اس میں بھی یہ لفظ باقی ماندہ چربی ہے جو اس سے پہلے تھی۔ ماوردی اور ثعلبی نے ایک چرواہے کا قول ذکر کیا ہے جس میں یہ لفظ اسی معنی میں ہے:

وذاتِ اثارة أكلتْ عليها نباتا فی أكِنّته قفارا

ہروی نے کہا: اثارہ اور اثرہ دونوں کا معنی باقی ماندہ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: ماثَمّ عین ولا أثر نہ وہاں چشمہ ہے اور نہ باقی

ماندہ چیز۔ میمون بن مہران، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور قتادہ نے کہا: اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ علم میں سے کوئی خاص چیز (1)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ایسی روایت ہے جو تم متقدمین سے بیان کرتے ہو۔ عکرمہ اور مقاتل نے کہا: انبیاء سے مروی (2)۔ قرظی نے کہا: اس سے مراد اسناد ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے ایسی چیز جو بیان کی جائے یا جو استخراج کی جائے (3)۔ زجاج نے کہا: اَوْ اَثٰرَةٍ کا معنی ہے یا علامت۔ اثارہ مصدر ہے جس طرح سماحہ اور شجاعہ۔ کلمہ کا اصل اثر ہے جس کا معنی روایت ہے، یہ جملہ کہا جاتا ہے: أثرت الحدیث آثرہ أثرا وأثارۃ وأثرۃ فانا آثر یہ اس وقت کہتے ہیں جب تو اسے غیر سے بیان کرے اسی معنی میں یہ قول ہے: حدیث ماثور، یعنی اسے بعد والوں نے پہلے والوں سے نقل کیا۔ اعشیٰ نے کہا:

إن الذی فیہ تماریتما بُیِّنَ للسامع والآثر

جس میں تم نے شک کیا ہے وہ سننے والے اور روایت کرنے والے کے لیے واضح ہے۔

اس شعر کو بیّن اور اَوْ اَثْرَۃٍ بھی روایت کیا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی باقی ماندہ علم ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ایسی چیز ہو جو پہلے لوگوں کی کتابوں سے بیان کی گئی ہو۔ ماثور اسے کہتے ہیں جسے بیان کیا جائے اور جس سے اسے بیان کیا جائے اسی سے اس کی سند صحیح ہو۔ سلمی، حسن بصری اور ابورجاء نے ہمزہ اور ثاء کو الف کے بغیر مفتوح پڑھا ہے معنی ہوگا خاص علم جو تمہیں عطا کیا گیا یا جس کے ساتھ تمہیں غیر پر ترجیح دی گئی۔ حضرت حسن بصری اور ایک طائفہ سے اثرۃ بھی منقول ہے یعنی ہمزہ مفتوح اور ثاء ساکن ہے۔ پہلا قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ دوسرا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے عکرمہ سے بیان کیا ہے: معنی ہے علم کی میراث (4)۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اس میں ادلہ کے تمام مسالک کا بیان ہے ان میں سے پہلا درجہ معقول کا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ یہ دلیل عقلی سے استدلال ہے کہ جامد چیز اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقابل اس کی عبادت کی جائے کیونکہ وہ چیز نہ نقصان دیتی ہے اور نہ نفع پہنچاتی ہے، پھر فرمایا: اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَاۤ اس میں ادلہ سمعیہ کا بیان ہے۔

## وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝

''اور کون زیادہ گمراہ ہوگا اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا اور وہ اس کے پکارنے سے ہی غافل ہیں''۔

وَ مَنْ اَضَلُّ یعنی اس سے بڑھ کر نہ کوئی گمراہ ہے اور نہ ہی جاہل ہے۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ یعنی نہ وہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں، یہ بت جامد چیزیں ہیں انہیں انسانوں سے مذکر افراد کے قائم مقام رکھ کر

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 271 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ذکر کیا ہے کیونکہ ان کے عبادت کرنے والے بتوں کو بادشاہوں اور امراء کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے جن کی خدمت کی جاتی تھی۔

**وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝**

''اور جب جمع کیے جائیں گے لوگ (روز محشر) تو وہ معبود ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے''۔

وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ اس سے مراد یوم قیامت ہے كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً یعنی یہ معبود قیامت کے روز کفار کے دشمن ہوں گے، ملائکہ کفار کے دشمن ہوں گے جن اور شیاطین قیامت کے روز اپنے عبادت گذاروں سے براءت کا اظہار کریں گے۔ وہ ایک دوسرے کو لعن طعن کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کفار کے بت جن کی یہ لوگ عبادت کرتے رہے وہ دشمن ہوں اس تقدیر کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے زندگی پیدا فرما دے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝ (القصص)

ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے اپنے معبودوں سے دشمنی کا اظہار کیا کیونکہ یہ معبود ان کفار کی ہلاکت کا سبب بنے اور معبودوں نے ان کی عبادت کا انکار کر دیا، اسی پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝

**وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝**

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں جو روشن ہیں تو کہتے ہیں کفار حق کے بارے میں جب ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا جادو ہے''۔

اٰيٰتُنَا سے مراد قرآن ہے۔

**اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝**

''کیا وہ کہتے ہیں کہ نبی نے اس کو خود گھڑ لیا ہے، فرمایئے: اگر میں نے اس کو خود گھڑا ہے تو تم اس طاقت کے مالک نہیں کہ مجھے اللہ سے چھڑا لو وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم مشغول ہو، وہ کافی ہے بطور گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ام میں میم زائد ہے تقدیر کلام یہ ہے أیقولون افتراہ۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے بات کی ہے۔ وہ آیات کو جو جادو کا نام دیتے تھے اس سے اضراب کیا گیا ہے۔ ام میں ہمزہ انکار اور تعجب کے لیے ہے گویا فرمایا: اسے چھوڑ دو ان کا عجیب و غریب قول سنو جس سے تعجب عیاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر نہیں یہاں تک کہ وہ یہ کہیں اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھیں اگر آپ اس پر قادر ہوں عرب قوم اس پر قادر نہ ہو تو عادت کے

خلاف ہونے کی وجہ سے آپ کی قدرت معجزہ ہوگی، جب معجزہ ہوگی تو یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کی تصدیق ہوگی۔ حکیم جھوٹے کی تو تصدیق نہیں کرتا تو آپ مفتری تو نہ ہوئے۔ اور ضمیر حق کے لیے ہے اور مراد آیات ہیں۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ کہہ دیجئے: اگر بفرض محال میں اس پر افتراء باندھوں فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا تو تم اس بات پر قادر نہ ہو گے کہ تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب دور کر سکو تو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ پر کیسے افتراء باندھوں گا۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ جو تم کہتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے؛ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔ الافاضہ فی الشی سے مراد ہوتا ہے اس میں داخل ہونا اور اس میں شروع ہو جانا۔ أفاضوا فی الحدیث وہ گفتگو میں شروع ہو گئے۔ أفاض البعیر یعنی اونٹ نے جگالی کو اوجھ سے دھکیلا اور اسے نکالا۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

وأفضن بعد كظو مهن بجرة

انہوں نے اوجھ کی خشکی کے بعد جگالی کو باہر نکالا۔

أفاض الناس من عرفات إلى منًى یعنی تیزی سے چلے۔ پس ہر وہ چیز جس میں دفعہ کا معنی پایا جاتا ہو اس کو افاضہ کہتے ہیں۔ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا یہ تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ میری سچائی کو جانتا ہے جبکہ تم باطل پر ہو۔ وَهُوَ الْغَفُوْرُ جو توبہ کرے اس کو بخشنے والا ہے الرَّحِيْمُ ۝ اپنے مومن بندوں پر رحیم ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"آپ کہیے: میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں اور میں (ازخود) نہیں جان سکتا کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ، میں تو پیروی کرتا ہوں جو وحی میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں نہیں ہوں مگر صاف صاف ڈرانے والا"۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ یعنی میں کوئی پہلا رسول تو نہیں ہوں مجھ سے قبل بھی تو رسول تھے؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ البدع یعنی پہلا۔ عکرمہ اور دوسرے علماء نے اسے بدعا پڑھا ہے یعنی دال مفتوح ہے اس بنا پر کہ مضاف مقدر ہے معنی ہے میں رسالت والا پہلا تو نہیں ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بدع اور بدیع ایک معنی میں ہیں جس طرح نصف اور نصیف ہے۔ ابدع الشاعر یعنی وہ بدیع لایا۔ شیٔ بدع یعنی نئی چیز۔ فلان بدع فی هذا الأمر۔ فلاں اس معاملہ میں بدیع ہے۔ قوم ابداع؛ یہ اخفش سے مروی ہے۔ قطرب نے عدی بن زید کا شعر پڑھا:

فلا أنا بدع من حوادث تعترى (1)

میں کوئی پہلا شخص نہیں جسے حوادثات لاحق ہوئے ہیں

وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ یعنی قیامت کے روز میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا میں اسے نہیں

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 10

جاننا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرک، یہودی اور منافق بڑے خوش ہوئے انہوں نے کہا: ہم اس نبی کی کیسے پیروی کریں جو جانتا ہی نہیں کہ اس کے ساتھ اور ہمارے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے، اسے ہمارے اوپر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اگر یہ اپنی جانب سے نہ کہتے تو جس ذات نے اسے مبعوث کیا ہے وہ اسے ضرور بتا دیتا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) تو یہ آیت منسوخ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے کفار کو ذلیل و رسوا کر دیا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو بیان کر دیا ہے جو وہ تیرے ساتھ معاملہ کرنے والا ہے کاش! ہم بھی جان لیتے وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الفتح:5) اور یہ آیت نازل ہوئی وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۝ (احزاب) یہ حضرت انس، حضرت ابن عباس، قتادہ، حضرت حسن بصری، عکرمہ اور ضحاک نے کہا، حضرت ام العلاء جو انصار کی ایک عورت تھی نے کہا: ہم نے مہاجرین کو تقسیم کیا تو ہمارے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون بن حذافہ بن جمح آئے ہم نے انہیں اپنے گھروں میں ٹھہرایا تو وہ فوت ہوگئے۔ میں نے کہا: اے ابا سائب! اللہ تعالیٰ کی رحمت تجھ پر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے عزت دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تجھے کیسے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت دی ہے“ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان تو پھر کون؟ فرمایا: ”جہاں تک اس کا تعلق ہے اسے موت آئی ہے ہم نے بھلائی ہی دیکھی ہے، اللہ کی قسم! میں اس کے لیے جنت کی امید رکھتا ہوں اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے“۔ اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس کے بعد کسی کا کبھی بھی تذکیہ نہیں کروں گی۔ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے اور کہا: یہ اس وقت فرمایا تھا جب آپ اپنی خطاؤں کی بخشش کو نہ جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے وصال سے چار سال قبل صلح حدیبیہ کے موقع پر بخشش کی نوید سنائی تھی۔

میں کہتا ہوں: حضرت ام العلاء کی حدیث کو امام بخاری نے نقل کیا ہے اس میں میری روایت یہ ہے وما ادری مایفعل به اس میں بی و بکم نہیں ہے(1) انشاء اللہ یہ صحیح ہے جس کی وضاحت آگے آئے گی۔ آیت منسوخ نہیں کیونکہ یہ خبر ہے نحاس نے کہا: یہ محال ہے کہ اس میں ناسخ و منسوخ ہو اس کی دو وجوہ ہیں: 1۔ یہ خبر ہے۔ 2۔ سورت کے آغاز سے لے کر اس جملہ تک مشرکوں سے خطاب ہے ان کے خلاف استدلال ہے اور انہیں شرمندہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ یہ بھی مشرکوں سے خطاب ہو جس طرح اس سے پہلے اور اس کے بعد مشرکوں سے خطاب ہے اور یہ امر محال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں کو کہیں: وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ یعنی آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے میں نہیں جانتا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آغاز سے لے کر وصال تک یہی خبر دیتے کہ ”جو آدمی حالت کفر پر مرا ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جو حالت ایمان پر مرا اتباع اور اطاعت کی وہ جنت میں ہوگا“۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ منظر دیکھا تھا کہ آخرت میں اس کے ساتھ اور ان کے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے تو وہ کہیں گے: ہم تیری اتباع کیسے کریں جبکہ تو جانتا ہی نہیں کہ کیا تو خوشحالی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، الدخول علی المیت بعد الموت، جلد 1، صفحہ 166

کی طرف لوٹے گا یا عذاب وعقاب کی طرف (لوٹے) گا۔

آیت کے بارے میں صحیح قول حضرت حسن بصری کا ہے جس طرح علی بن محمد بن جعفر بن حفص، یوسف بن موسیٰ سے وہ وکیع سے وہ ابوبکر ہذلی سے وہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے۔ ابوجعفر نے کہا: یہ سب سے صحیح اور اچھا قول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے کہ آپ کو اور ان لوگوں کو مرض، صحت، نرمی، سختی، غنا اور فقر میں سے کیا کچھ لاحق ہونے والا ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (اعراف: 188)

واحدی اور دوسرے علماء نے کلبی سے وہ ابوصالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر آزمائشیں بڑھ گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ ایسے علاقہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جہاں کھجوریں، درخت اور پانی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے صحابہ پر بیان کیا تو صحابہ خوش ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ مشرکوں کی جانب سے جس اذیت میں مبتلا ہیں اس سے آسودگی پا جائیں گے۔ پھر وہ تھوڑا عرصہ رکے رہے جس میں انہوں نے ہجرت کا منظر نہ دیکھا انہوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کب اس علاقہ کی طرف ہجرت کریں گے جو آپ نے دیکھا تھا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ۔ یعنی میں نہیں جانتا کہ جس جگہ کو میں نے خواب میں دیکھا اس کی طرف میں نکلوں گا یا نہیں۔ پھر کہا: یہ تو وہ چیز تھی جو میں نے خواب میں دیکھی میں تو اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے (1)، یعنی جس امر کی میں نے تمہیں خبر دی ہے وہ میری طرف وحی نہیں کی گئی۔ قشیری نے کہا: اس اعتبار سے اس آیت میں کوئی نسخ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے جو فرائض مجھ پر، تم پر لازم کیے گئے ہیں میں انہیں نہیں جانتا۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے میں نہیں جانتا کہ دنیا میں میرا اور تمہارا انجام کیا ہوگا، کیا تم ایمان لاؤ گے یا کفر کرو گے، تمہیں جلدی عذاب آئے گا یا تم کو مہلت دی جائے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ حضرت حسن بصری، سدی اور دوسرے علماء کے قول کا معنی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: میں نہیں جانتا کہ دنیا میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا جہاں تک آخرت کا تعلق ہے تو اللہ کی پناہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ آپ جنت میں ہیں (2)۔ جب آپ نے رسولوں سے میثاق لیا تھا، لیکن فرمایا: میں نہیں جانتا کہ دنیا میں میرے ساتھ کیا کیا جائے گا کیا مجھے میری بستی سے نکال دیا جائے گا جس طرح انہیں ان کی بستیوں سے نکالا گیا تھا یا مجھے قتل کر دیا جائے گا جس طرح انہیں قتل کر دیا گیا تھا اور میں تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا کیا میری امت تصدیق کرنے والی ہوگی یا جھٹلانے والی ہوگی یا میری امت پر آسمان سے پتھروں کی بارش کی جائے گی یا انہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا، پھر یہ آیت نازل ہوئی هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ: 33) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اس کا دین تمام ادیان پر غالب آئے گا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 170 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 24

امت کے بارے میں فرمایا: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ (الانفال:33) اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دے دی کہ وہ آپ کے ساتھ اور آپ کی امت کے ساتھ کیا کچھ کرنے والے ہیں۔ ان تمام تعبیروں کی بنا پر کوئی نسخ نہیں۔ الحمدللہ۔

ضحاک نے یہ بھی کہا ہے: وَ مَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ کا معنی ہے میں نہیں جانتا کہ تمہیں کس چیز کا حکم دیا جائے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ مومنوں کو یہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا کہ قیامت کے روز میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں وضاحت فرما دی: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) اس کے بعد مومنوں کی حالت کو بیان فرمایا پھر کافروں کی حالت کو بیان فرمایا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول اول کا معنی ہے مگر اس میں نسخ کا ذکر بیان کے معنی میں کیا اور یہ حکم دیا کہ یہ مومنوں کو کہہ دیں۔ صحیح وہ ہے جو ہم نے حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء سے بیان کیا ہے۔ مَا يُفْعَلُ میں ما کے بارے میں جائز ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ موصولہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے استفہامیہ بنایا جائے اور یہ مرفوع ہو اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اسے یوحی بھی پڑھا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے۔ اس کے بارے میں بحث کئی دفعہ پہلے گذر چکی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"فرمائیے: کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو تم اس کا انکار کردو (تو اس کا کیا انجام ہوگا) حالانکہ گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل سے اس کی مثل پر اور وہ ایمان بھی لے آیا اور تم نے تکبر کیا بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو"۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کان میں ھو ضمیر سے مراد قرآن ہے وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ ضمیر غائب سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے؛ یہ امام شعبی کا قول ہے(1)۔

وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، عکرمہ، قتادہ اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں(2)، آپ نے یہودیوں کے خلاف گواہی دی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تورات میں ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی ہیں۔ ترمذی میں ان سے روایت ہے کہا: میرے بارے میں کتاب اللہ کی آیات نازل ہوئیں میرے بارے میں یہ آیت وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ نازل ہوئی۔ سورۂ رعد کے آخر میں بھی گذر چکا ہے۔

مسروق نے کہا: اس آیت کا مصداق حضرت موسیٰ اور تورات ہے حضرت ابن سلام نہیں، کیونکہ آپ مدینہ طیبہ میں اسلام لائے جبکہ سورت مکی ہے۔ کہا: وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ یہ قریش سے خطاب ہے۔ شعبی نے کہا: اس سے مراد بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان لائے کیونکہ ابن سلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو سال قبل اسلام قبول کیا تھا، جبکہ سورت مکی ہے۔ قشیری نے کہا: جس نے کہا شاہد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اس نے کہا سورت مکی

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 273
2۔ ایضاً

ہے اور حضرت ابن سلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے دو سال قبل اسلام لائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ آیت مدنی ہو اور اسے مکی سورت میں رکھا گیا ہو، کیونکہ آیت نازل ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے: ''اسے فلاں سورت میں رکھو''۔ آیت مشرکین سے دلیل کے ساتھ مدعا ثابت کرنے کے بارے میں ہے۔ دلیل کے ساتھ مقابلہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت سے معاملات میں یہودیوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے ان کی شہادت مومنوں کے بارے میں ان کے نبی کی شہادت میرے بارے میں واضح ترین دلائل میں سے تھی۔ یہ بھی بعید نہیں کہ سورت یہودیوں کے ساتھ مناظرہ کی صورت میں ہو جب حضرت عبداللہ بن سلام مسلمان کی حیثیت میں آئے جبکہ یہودیوں کو ان کے اسلام کا علم نہ تھا عرض کی: یا رسول اللہ! اپنے درمیان اور یہودیوں کے درمیان مجھے حکم بنائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں پوچھا: ''عبداللہ بن سلام تم میں کیسا آدمی ہے؟'' یہودیوں نے کہا: وہ ہمارا سردار اور ہمارا عالم ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ تو مجھ پر ایمان لا چکا ہے'' تو یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام کی برائیاں کیں۔ یہ بھی بات پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہودی حضرت عبداللہ بن سلام کے فیصلہ پر راضی ہو گئے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اگر اس نے آپ کے حق میں گواہی دی تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت عبداللہ بن سلام سے پوچھا گیا: تو انہوں نے گواہی دے دی پھر اسلام قبول کر لیا۔

عَلٰی مِثْلِهٖ جو میں تمہارے پاس لایا ہوں اس کی مثل، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پر گواہی دی۔ جرجانی نے کہا: مثل کا لفظ زائد ہے پھر کلام اس طرح ہوگی شَهِدَ شَاهِدٌ علیہ أنه مِنْ عِنْدِ اللّٰه۔

فَاٰمَنَ وہ گواہ ایمان لے آیا وَاسْتَكْبَرْتُمْ تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا۔ اِنْ كَانَ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فآمن اتؤمنون یہ زجاج کا قول ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ کیا تم نے ظلم نہیں کیا اللہ تعالیٰ اس کی وضاحت فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ، أفتؤمنون عذاب اللّٰه۔

اَرَءَيْتُمْ یہ ایسا لفظ ہے جو سوال اور استفہام کے لیے وضع کیا گیا ہے، اسی وجہ سے یہ مفعول کا تقاضا نہیں کرتا۔ نقاش اور دوسرے علماء نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے (2)، تقدیر کلام یہ ہوگی قل أرأيتم إن كان من عند الله و شهد شاهد من بني إسرائيل فآمن هو و كفرتم إن الله لا يهدي القوم الظالمين۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۞

''اور کفار اہل ایمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ (اسلام) کوئی بہتر چیز ہوتی تو یہ ہم سے سبقت نہ لے جاتے اس کی طرف اور کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوتی قرآن سے تو یہ اب ضرور کہیں گے کہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 274 2۔ ایضاً

(اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے''۔

اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے اور چھ اقوال ہیں:

1۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں حضرت ابوذر غفاری کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے دعوت قبول کر لی ان کی قوم نے ان سے پناہ چاہی تو ان کا سردار آیا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا پھر سردار نے قوم کو اسلام کی دعوت دی تو وہ بھی مسلمان ہو گئے یہ خبر قریش کو پہنچی انہوں نے کہا: بنو غفار تو حلیف لوگ ہیں اگر یہ دعوت خیر ہوتی تو بنو غفار ہم سے سبقت نہ لے جاتے تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ابو متوکل کا قول ہے۔

2۔ حضرت زنیرہ نے اسلام قبول کیا تو ان کی نظر خراب ہو گئی لوگوں نے کہا: لات و عزیٰ نے تیری نظر خراب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی قریش کے سرداروں نے کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لائے ہیں اگر وہ بہتر ہوتا تو زنیرہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ لے جاتی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا؛ یہ عروہ بن زبیر کا قول ہے۔

3۔ بنو عامر، بنو غطفان، بنو تمیم، بنو اسد، بنو حنظلہ اور بنو اشجع میں سے کافروں نے کہا: جو لوگ بنی غفار، بنی اسلم، بنی جہینہ، بنی مزینہ اور بنی خزاعہ سے اسلام لائے تو انہوں نے کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ لائے ہیں اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو گائے، بھیڑ، بکری کے بچوں کو چرانے والے ہم پر سبقت نہ لے جاتے کیونکہ ہم ان سے بہتر ہیں، یہ کلبی اور زجاج کا قول ہے؛ قشیری نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ آیت قریش کے مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس امر کی ہمیں دعوت دیتے ہیں اگر وہ بہتر ہوتا تو بلال، صہیب، عمار، فلاں اور فلاں ہم پر سبقت نہ لے جاتے؛ یہ چوتھا قول ہے۔

5۔ یہودیوں میں سے کافروں نے اپنے میں سے مومنوں یعنی حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب کو کہا: اگر (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین حق ہوتا تو وہ ہم پر اس کی طرف سبقت نہ لے جاتے؛ یہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ ثعلبی نے بھی یہ حکایت بیان کی ہے۔ مسروق نے کہا: کفار نے کہا اگر یہ بہتر ہوتا تو یہودی اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے؛ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

کفار کی جانب سے یہ معارضہ جو ان کے قول میں ہوتا: ''اگر یہ خیر ہوتا وہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ لے جاتے'' یہ بڑے معارضات میں سے ایک تھا کیونکہ یہ اس پر منطبق ہو جاتا جو ان سے مخالفت کرتا یہاں تک کہ یہ انہیں کہا جاتا: جس پر تم ہو اگر یہ بہتر ہوتا تو ہم اس سے نہ پھرتے اگر رسولوں کی تکذیب بہتر ہوتی تو تم ہم پر سبقت نہ لے جاتے (1)؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ پھر یہ کہا گیا: یہ قول مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ اس کے بارے میں یہ جائز ہے کہ یہ کفار کا بعض مومنوں کے لیے قول ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب کے صیغہ سے غیبت کے صیغہ کی طرف خطاب ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ (یونس: 22)

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 275

وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ ہ ضمیر سے مراد ایمان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد قرآن حکیم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (1)۔

فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ ﴿۱۱﴾ جب انہوں نے قرآن سے ہدایت حاصل نہ کی اور نہ اس سے جو اس قرآن کو لایا تو اس سے دشمنی کی اور اسے جھوٹ کی طرف منسوب کیا اور کہا: یہ پرانا جھوٹ ہے جس طرح انہوں نے اس کے بارے میں کہا: اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۵﴾ (الانعام) کسی سے پوچھا گیا: کیا قرآن میں بھی ہے جو آدمی کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے وہ اس سے دشمنی کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ ﴿۱۱﴾ اس کی مثل ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ (یونس: 39)

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲﴾

''حالانکہ اس سے پہلے کتاب موسیٰ رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے، اور یہ کتاب (قرآن) تو اس کی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں ہے تاکہ بروقت خبردار کردے ظالموں کو، اور خوشخبری ہے نیکو کاروں کے لیے''۔

وَ مِنْ قَبْلِهٖ یعنی قرآن سے پہلے كِتٰبُ مُوْسٰۤى یعنی تورات اِمَامًا اس میں جو کچھ ہے اس کی اقتدا کی جاتی ہے وَّ رَحْمَةً اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے۔ کلام میں حذف ہے یعنی تم اس سے ہدایت نہ پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور آپ پر ایمان لانے کا ذکر ہے تو انہوں نے اسے ترک کیا۔ اِمَامًا حال کی حیثیت سے منصوب ہو گا، کیونکہ معنی ہے اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بطور امام گزر چکی ہے وَّ رَحْمَةً اس اِمَامًا پر معطوف ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی أنزلناه إماما و رحمة۔ اخفش نے کہا: ماقبل سے الگ ہونے کی بنا پر منصوب ہے کیونکہ کتاب موسیٰ اضافت کی وجہ سے معرفہ ہے، کیونکہ نکرہ کو جب دوبارہ ذکر کیا جائے یا اسے مضاف کیا جائے یا اس پر الف لام داخل کر دیا جائے تو وہ معرفہ ہو جاتا ہے۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ مراد قرآن ہے مُّصَدِّقٌ یہ تورات اور اس سے قبل کی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والی ہے۔ لِّسَانًا عَرَبِیًّا یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی عربی ہوتے ہوئے سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ لِّسَانًا یہ حال کی تمہید کے لیے ہے یعنی تاکید ہے جس طرح تیرا قول ہے: جاءنی زیدٌ رجلًا صالحًا تو تو رجلًا کو تاکید کے طور پر ذکر کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فعل کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوئی: ھذا کتاب مصدق اعنی لسانا عربیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حرف جار کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے تقدیر کلام یہ ہے بلسان عربی۔ ایک قول یہ کیا گیا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 275

ہے کہ لفظ لسان مفعول بہ ہے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات ہے تقدیر کلام یہ ہے ھذا کتاب مصدق للنبی ﷺ۔ یہ کتاب نبی ﷺ کی تصدیق کرنے والی ہے کیونکہ یہ آپ کا معجزہ ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یہ عربی زبان والے کی تصدیق کرنے والی ہے۔ لفظ لسان مصدق کی وجہ سے منصوب ہے وہ نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔ یہ قول بعید ہوگا کہ لسان سے مراد قرآن لیا جائے کیونکہ اس صورت میں معنی ہوگا وہ اپنی ذات کی تصدیق کرتا ہے۔

لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عام قراءت لِيُنْذِرَ ہے یہ کتاب کے بارے میں خبر دے رہی ہے یعنی جن لوگوں نے کفر اور معصیت کے ساتھ اپنی جانوں پر ظلم کیا انہیں یہ کتاب خبردار کرنے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں خبر دے رہی ہے۔ نافع، ابن عامر اور بزی نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ (النازعات: 45)

وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ۝ بشری محل رفع میں ہے یعنی ھو بشری۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا عطف کتاب پر ہے یعنی ھذا کتاب مصدق و بشری یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف کی وجہ سے منصوب ہو تقدیر کلام یہ ہوگی لینذر الذین ظلموا وللبشری جب حرف جار کو حذف کیا تو اسے نصب دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے تقدیر کلام یہ ہوگی تبشر المحسنین بشری جب اسے وتبشر بشری أو بشارۃ کی جگہ رکھا تو اسے نصب دی، جس طرح تو کہتا ہے: اتیتك لأزورك و کرامۃ لك وقضاء لحقك معنی ہوگا میں تیری ملاقات کروں گا میں تیری عزت کروں گا اور تیرا حق ادا کروں گا۔ کرامۃ کے لفظ کو فعل مضمر کی وجہ سے نصب دی گئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝۱۳
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۴

”بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے پس کوئی خوف نہیں انہیں اور نہ غمگین ہوں گے، یہی لوگ جنتی ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں، یہ جزاء ہے ان نیکیوں کی جو وہ کیا کرتے تھے“۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی (1)۔ آیت عام ہے جَزَآءً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚؕ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 275

''اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، (اپنے شکم میں) اٹھائے رکھا اس کو اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اور جنا اس کو بڑی تکلیف سے، اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے تک تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی: اے میرے رب! مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے اور صلاح (ورشد) کو میرے لیے میری اولاد میں راسخ فرما دے بیشک میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں تیرے حکم کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے ہوں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسٰنًا انسان کی اپنے والدین کے ساتھ حالت کے اختلاف کو بیان کیا کبھی وہ ان دونوں کی اطاعت کرتا ہے اور کبھی ان کی مخالفت کرتا ہے اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم میں بعید نہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض آپ کی دعوت کو قبول کریں اور بعض انکار کریں یہ کلام کے بعض سے اتصال کی صورت ہے؛ یہ قشیری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ حسنا عام قراءت حُسنا ہے۔ اہل حرمین، اہل بصرہ، اور اہل شام کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس اور کوفیوں نے اسے اِحْسٰنًا پڑھا ہے ان کی حجت سورۃ الانعام اور بنی اسرائیل میں ہے۔ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بقرہ: 83) کوفہ کے مصاحف میں اسی طرح ہے (1)۔ پہلی قراءت کی حجت اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان ہے جو سورۂ عنکبوت میں ہے وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا۔ اس میں قراء نے اختلاف نہیں کیا۔ حسن، قبح کا خلاف ہے احسان، اساءۃ کے خلاف ہے توصیۃ کا معنی حکم دینا ہے اس بارے میں اور جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی گفتگو گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا یہاں باء حرف جار حذف ہے اصل میں بکرۃ و مشقۃ تھا عام قرات کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے، ابو عبید نے اسے پسند کیا، کہا: اسی طرح لفظ کرہ پورے قرآن میں فتحہ کے ساتھ ہے مگر وہ جو سورۂ بقرہ میں ہے كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ کیونکہ وہ اسم ہے اور یہ تمام مصادر ہیں۔ کوفیوں نے كُرْهًا ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں، جس طرح ضُعف، ضَعف اور شُہد، شَہد ہے۔ یہ کسائی کا قول ہے تمام بصریوں کے نزدیک یہ اسی طرح ہے۔ کسائی نے بھی یہ کہا ہے۔ فراء نے دونوں میں فرق کیا ہے کہ کرہا جب ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ تکلیف ہوتی ہے جو انسان اپنی ذات پر برداشت کرتا ہے اور فتحہ کے ساتھ وہ ہوتی ہے جو غیر پر لازم کرتا ہے۔ اس سے مراد قہر اور غضب ہے، اسی وجہ سے بعض عربوں نے کہا: کرھا یہ غلط ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب وہ نو ماہ تک حاملہ رہے تو وہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 275

اکیس ماہ تک دودھ پلائے اگر وہ چھ ماہ تک حاملہ رہے تو چوبیس ماہ تک دودھ پلائے (1)۔ یہ روایت کی گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عورت لائی گئی جس نے چھ ماہ میں بچہ جن دیا تھا۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس پر حد جاری کریں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اس پر لازم نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (بقرہ:233)۔ دودھ پلانے کی مدت چوبیس ماہ اور حاملہ کی مدت چھ ماہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا اور اس پر حد جاری نہ کی۔ سورۂ بقرہ میں بھی یہ بحث گذر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے حمل کے ابتدائی تین ماہ کو شمار نہیں کیا کیونکہ ان تین مہینوں میں وہ نطفہ، علقہ اور مضغہ ہوتا ہے اس کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا جس کو محسوس کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ (اعراف:189) فصال کا معنی دودھ چھڑانا ہے۔ سورۂ لقمان میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حضرت حسن بصری یعقوب اور دوسرے علماء نے وفصلہ پڑھا ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ان کا حمل اور دودھ چھڑانے کا عرصہ تین سال تھا ان کی ماں نے انہیں نو ماہ تک رحم میں اٹھایا اور اکیس ماہ تک دودھ پلایا، کلام میں اضمار ہے یعنی مدۃ حملہ ومدۃ فصالہ ثلاثون شھرا ان کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ تھی۔ اگر یہ اضمار نہ ہوتا تو ثلاثین کی ظرف کی وجہ سے نصب دی جاتی اور معنی بدل جاتا۔

**مسئلہ نمبر5۔** حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ مدت اٹھارہ سال ہے عطا نے ان سے جو روایت کی وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست بنے جبکہ ان کی عمر اٹھارہ سال تھی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بیس سال تھی، یہ لوگ تجارت کے لیے شام کا ارادہ رکھتے تھے وہ ایک جگہ اترے جس میں بیری کا درخت تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق ایک راہب کے پاس گئے تاکہ اس سے دین کے بارے میں کوئی بات پوچھیں۔ راہب نے کہا: اس درخت کے سائے میں کون ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق نے کہا: وہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ اس راہب نے کہا: اللہ کی قسم! وہ نبی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی آدمی اس درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے نہیں بیٹھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے دل میں یقین اور تصدیق بیٹھ گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق سفر و حضر میں جدا نہیں رہتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا جبکہ آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی تصدیق کی جبکہ آپ کی عمر مبارک اڑتیس سال تھی۔ جب چالیس سال کے ہوئے تو دعا کی رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ (نمل:19) امام شعبی اور ابن زید نے کہا: الاشد سے مراد حلم ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد چالیس سال کی عمر کو پہنچنا ہے۔ اسی سے اس امر پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ سورۃ الانعام میں اس بارے میں گفتگو گذر چکی ہے۔ سدی اور ضحاک نے کہا: یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ عام ہے اور عمومی حکم لے کر آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 276

**مسئلہ نمبر 6**۔ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ یعنی مجھے الہام کیجئے۔ اَنْ اَشْكُرَ یہ محل نصب میں ہے جو مفعول مطلق کے قائم مقام ہے تقدیر کلام یہ ہوگی أوزعنی شكر نعمتك۔ عَلَیَّ جو تو نے ہدایت کی صورت میں مجھ پر انعام فرمایا ہے عَلٰی وَالِدَیَّ یعنی میرے والدین پر شفقت فرمائی یہاں تک کہ انہوں نے میری چھوٹی عمر میں تربیت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تو نے مجھ پر صحت و عافیت کے ساتھ انعام فرمایا اور میرے والدین پر غنا اور ثروت کے ساتھ انعام فرمایا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی ان کے دونوں والدین مسلمان ہوئے۔ مہاجرین میں سے آپ کے علاوہ کسی کو یہ شرف حاصل نہ ہوا کہ اس کے والدین مسلمان ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان دونوں کے بارے میں تاکیدی حکم دیا اور آپ کے بعد ہر کسی کے لیے یہ حکم لازم ہوگیا۔ ان کے والد حضرت ابوقحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم تھے۔ ان کی والدہ ام الخیر تھی اس کا نام سلمٰی بنت صخر بن عامر بن کعب بن سعد تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کی دادی کا نام قیلہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کی بیوی کا نام قتیلہ تھا جو عبدالعزی کی بیٹی تھی۔

وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی تو آپ نے ان نو غلاموں کو آزاد کیا جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے عذاب دیا جارہا تھا، ان میں حضرت بلال، حضرت عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ آپ نے بھلائی میں سے کسی چیز کی دعا نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مدد کی۔

صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟'' (1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں۔ پوچھا: ''آج تم میں سے کس نے نماز جنازہ پڑھی؟'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں نے۔ فرمایا: ''آج تم میں سے کس نے مسکین کو کھانا کھلایا؟'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں نے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ امور کسی انسان میں جمع نہیں ہوتے مگر وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے''۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ یعنی میری ذریت کو صالحین میں سے بنادے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد اور والدین میں سے کوئی بھی نہ رہا مگر وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک پر ایمان لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیق کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو خود، اس کے والدین، اس کے بچے اور بچیاں صحابی ہوں۔

سہل بن عبداللہ نے کہا: معنی ہے انہیں میرا اچھا نائب اور تیرا سچا بندہ بنادے (2)۔ ابوعثمان نے کہا: انہیں میرے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اور اپنا اطاعت گذار بنادے۔

ابن عطا نے کہا: انہیں ایسے اعمال صالح کی توفیق دے جن کے ساتھ تو ان پر راضی ہو جائے۔ محمد بن علی نے کہا: شیطان، نفس اور خواہش کو تو ان پر غلبہ نہ دے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، فضل من ضم الی صدقۃ غیرھا من انواع البر، جلد 1، صفحہ 330

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 278

مالک بن مغول نے کہا: ابو معشر نے اپنے بیٹے کی شکایت حضرت طلحہ بن مصرف سے کی۔ فرمایا: اس آیت کے ذریعے اس کے خلاف مدد طلب کر۔ اور یہ آیت پڑھی رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ؕۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝ ۔ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ یعنی میں نے اس امر سے رجوع کر لیا جس پر میں تھا۔ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝ یعنی میں توحید میں مخلص ہوں۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ۝

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں قبول کرتے ہیں ہم جن کے بہترین اعمال کو اور درگذر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے یہ جنتیوں میں سے ہوں گے، یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اہل ایمان سے) کیا گیا ہے“۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ عام قراء کی قراءت یتقبل ہے اسے یتقبل اور یتجاوز یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے دونوں میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے نتقبل اور نتجاوز دونوں میں نون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہم انہیں بخش دیتے اور درگذر سے کام لیتے ہیں۔ تجاوز کا اصل معنی ہے جزت الشیء یہ اس وقت کہتے ہیں جب تو اس چیز پر سے گذر گئے۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس سے پہلے آیت وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ آخر تک کسی کے ساتھ مقید نہیں بلکہ عموم کے لیے نازل ہوئی ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ معنی ہے ہم ان کی نیکیاں قبول کرتے ہیں اور ان کی سیئات سے درگذر کرتے ہیں۔

زید بن اسلم نے کہا: وہ اسے مرفوع نقل کرتے ہیں: جب وہ اسلام لائیں گے تو ان کی نیکیاں قبول ہوں گی اور برائیاں بخش دی جائیں گے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: احسن سے مراد طاعات میں سے وہ اعمال ہیں جو ثواب کا تقاضا کرتے ہیں۔ حسن مباح میں نہ ثواب ہے اور نہ عقاب ہے؛ یہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے (2)۔

فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ۔ فی، مع کے معنی میں ہے یعنی جنتیوں کے ساتھ، تو کہتا ہے: أکرمك وأحسن إليك في جميع أهل البلد یہاں بھی فی، مع کے معنی میں ہے۔

وَعْدَ الصِّدْقِ یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول مطلق ہے اور ماقبل کی تاکید کے لیے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے وعدہ کیا ہے کہ محسن کی نیکیاں قبول کرے اور گناہ گار سے درگذر کرے، یہ سچا وعدہ ہے۔ یہ اضافة الشيء إلى نفسه کے باب سے ہے، کیونکہ صدق وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: حَقُّ الْیَقِیْنِ۝ (الواقعہ) کی طرح ہے۔ یہ کوفیوں کی رائے ہے، جہاں تک بصریوں کا تعلق ہے اس کی تقدیر یہ ہے۔ وعد الكلام الصدق او الكتاب الصدق تو موصوف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔

الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ۝ یعنی دنیا میں رسولوں کی زبانوں پر ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ اس سے مراد جنت ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 279 2۔ ایضاً

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَآ أَتَعِدَانِنِيْٓ أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ ۞ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۞

''اور جس نے کہا اپنے والدین کو: افسوس ہے تمہارے حال پر کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو اس کی کہ میں (قبر سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ گذر چکی ہیں کئی صدیاں مجھ سے پہلے (ان میں سے تو کوئی اب تک زندہ نہ ہوا) اور اس کے والدین بارگاہ الٰہی میں فریاد کرتے ہیں (اور اسے کہتے ہیں) تیرا خانہ خراب ہو ایمان لے آ یقینا اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ ''جوابا'' کہتا ہے: نہیں ہیں یہ دھمکیاں مگر پہلے لوگوں کی فرسودہ کہانیاں، یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے، بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے''۔

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَآ أَتَعِدَانِنِيْٓ أَنْ أُخْرَجَ، أن أخرج یعنی مجھے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ نافع، حفص اور دوسرے قراء نے اف مکسور اور منون پڑھا ہے ابن کثیر، ابن محیصن، ابن عامر اور مفضل نے عاصم سے اف تنوین کے بغیر مفتوح منقول ہے باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ بات گذر چکی ہے عام قراءت أَتَعِدَانِنِيْٓ مخففہ نونوں کے ساتھ ہے۔ اہل مدینہ اور اہل مکہ نے اس کی یاء کو فتحہ دیا ہے، باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

ابوحیوہ، مغیرہ اور ہشام نے أتعدانّی نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے اہل شام کے مصاحف میں اسی طرح ہے عام قراءت ان کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے أَنْ أُخْرَجَ حضرت حسن بصری، نصر، ابو عالیہ، اعمش اور ابو معمر نے الف کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی، ابو العالیہ اور مجاہد نے کہا: یہ آیت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ عبد اللہ کے والدین اسے اسلام کی طرف دعوت دیتے تو وہ اپنے والدین کو وہ جواب دیتا جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی۔ قتادہ اور سدی نے یہ بھی کہا ہے: وہ عبد الرحمٰن بن ابی بکر تھے وہ ان کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ عبد الرحمٰن کے والد، اس کی والدہ حضرت ام روحان اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے اور دوبارہ اسے اٹھانے کی دعوت دیتے تھے تو وہ اپنے والدین کو وہ جواب دیتا جس کی اللہ تعالیٰ نے وصیت بیان کی ہے، یہ اس کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس امر کا انکار کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبد الرحمٰن کے بارے میں نازل ہو۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے بھی یہ کہا: یہ ایک ایسے بندے کی صفت ہے جو کافر تھا اور اپنے والدین کا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 279

نافرمان تھا۔ زجاج نے کہا: یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے بارے میں اسلام لانے سے قبل نازل ہوئی جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ قول سے مراد عذاب ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ایمان نہ ہو جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر مومنوں میں سے بڑی فضیلت کے حامل تھے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ایسے کافر بندے کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے والدین کا نافرمان تھا۔

محمد بن زیاد نے کہا: حضرت معاویہ بنی اللہ نے مروان بن حکم کی طرف خط لکھا کہ لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لیں تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے کہا: تم نے ہرقل والا کام کیا ہے کیا تم اپنے بیٹوں کے لیے بیعت لیتے ہو؛ مروان نے کہا: یہ عبدالرحمٰن وہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ کہا: اللہ کی قسم! وہ عبدالرحمٰن نہیں اگر میں چاہوں تو میں اس کا نام بھی لے دوں لیکن اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ پر لعنت کی جبکہ تو اس کی پشت میں تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ایک حصہ ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے یہ کہا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس نے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ سے یہ مراد لیا ہے کہ یہ اس کے متعلق ہے جو وہ اعتقاد رکھتا ہو جس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا۔ آیت کا ابتدائی حصہ خاص ہے اور آخری حصہ عام ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے جب یہ کہا: وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا تھا تو پھر عبداللہ بن جدعان، عثمان بن عمرو، عامر بن کعب اور قریش کے مشائخ کہاں ہیں یہاں تک کہ میں ان سے پوچھوں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ تو اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ان لوگوں کی طرف لوٹتا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بارے میں واقعہ سورۂ انعام کی آیت: لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى (انعام: 71) میں گذر چکا ہے جو اس آیت کے حضرت عبدالرحمٰن کے بارے میں نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ کافر تھے اور اسلام لانے اور اپنی فضیلت کے باعث وہ اس کلام اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ کا مصداق نہ رہے۔

وَهُمَا یعنی اس کے والدین يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لیے ہدایت کی التجا کرتے ہیں یا کفر سے چھٹکارا کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ جب حرف جار کو حذف کر دیا اور مفعول فعل کے ساتھ مل گیا تو اسے نصب دے دی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: استغاثہ سے مراد دعا ہے تو باء کی ضرورت ہی نہیں۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبول کیا۔ وَيْلَكَ اٰمِنْ تو ہلاک ہو ایمان لے آ اور دوبارہ اٹھائے جانے کی تصدیق کر۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اس میں خلاف ورزی کی کوئی صورت نہیں۔ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ وہ کہتا ہے جو اس کے والدین کہتے ہیں: نہیں ہیں یہ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں اور جن کو انہوں نے لکھا ہے جبکہ ان کی کوئی اصل نہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ یعنی وہ لوگ جن کی طرف ابن ابی بکر نے اپنے قول میں اشارہ کیا تھا میرے لیے قریش کے مشائخ کو زندہ کرو وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ یہاں بھی وہی مراد ہیں جہاں تک حضرت ابوبکر صدیق کے بیٹے عبداللہ یا عبدالرحمٰن کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں ان کے باپ کی دعا قبول کر لی وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ جس طرح

پہلے گذر چکا ہے۔

حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ کا معنی ہے ان پر عذاب لازم ہو چکا یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ہولاء فی الجنۃ ولا أبالی وھولاء فی النار ولا أبالی یہ لوگ جنت میں ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں اور یہ لوگ جہنم میں ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

فِيْٓ اُمَمٍ یہاں فی مع کے معنی میں ہے قَدْ خَلَتْ یعنی گذر چکے ہیں۔ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یعنی کافر جن وانس میں سے۔ اِنَّهُمْ وہ کافر تھیں كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے خسارہ پانے والوں میں سے تھے؛ یعنی ان کی سعی ضائع ہوگئی اور جنت کو حاصل نہ کر سکے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

''اور ہر ایک کے لیے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ جنوں اور انسانوں میں سے مومنوں اور کافروں کی دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک کے قیامت کے روز اعمال کے مطابق مراتب ہوں گے۔ ابن زید نے کہا: اس آیت میں جہنمیوں کے درجات نچلی جانب اور جنتیوں کے درجات اوپر کی جانب جاتے ہیں (1)۔ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ ابن کثیر، ابن محیصن، عاصم، ابو بکر اور یعقوب نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے، باقی قراء نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ کی طرف لوٹایا ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ مسلک ہے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ یعنی گناہ گار پر عذاب میں زیادتی اور نیکوکار کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝

''اور جس روز لا کر کھڑا کر دیا جائے گا کفار کو آگ کے سامنے (تو انہیں کہا جائے گا) تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھایا تھا تم نے ان سے آج تمہیں رسوائی کا عذاب دیا جائے گا بوجہ اس گھمنڈ کے جو تم زمین میں ناحق کیا کرتے تھے اور بوجہ تمہاری نافرمانیوں کے''۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یاد دلایئے جس روز انہیں پیش کیا جائے گا۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ یعنی جہنم سے پردہ ہٹا دیا جائے گا انہیں آگ کے قریب کیا جائے گا اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے۔

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 26

**اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ** یعنی انہیں کہا جائے گا **اَذۡهَبۡتُمۡ** قول مضمر ہے۔ حضرت حسن بصری، نصر ابو العالیہ، یعقوب اور ابن کثیر نے أأذهبتم دو ہمزہ مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ بغیر مد کے جملہ خبر یہ کی صورت میں پڑھا ہے۔ یہ سب فصیح لغتیں ہیں۔ اس کا معنی شرمندہ ہونا ہے عرب استفہام کے ساتھ اور استفہام کے بغیر شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

ابوعبید نے استفہام کے ترک کو اختیار کیا ہے کیونکہ ائمہ سبعہ میں سے یہ اکثر کی قراءت ہے یعنی نافع، عاصم، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی ساتھ ہی ساتھ ان کے ساتھ شیبہ، زہری، ابن محیصن، مغیرہ بن ابی شہاب، یحییٰ بن حارث، اعمش، یحییٰ بن وثاب اور دوسرے قراء ہیں یہی وہ قراء ہیں جن کی قراءت پر اکثر لوگوں کا اتفاق ہے۔ استفہام کا ترک کرنا احسن ہے کیونکہ ہمزہ کا اثبات اس امر کا وہم دلاتا ہے کہ انہوں نے یہ عمل نہیں کیا تھا، جس طرح تو کہتا ہے: أنا ظلمتك؟ تو اس سے تو یہ ارادہ کرتا ہے کہ میں نے تجھ پر ظلم نہیں کیا۔ ہمزہ کو ثابت رکھنا بھی اچھا ہے ایک کہنے والا کہتا ہے: ذهبت فعلت كذا وہ توبیخ کرتا ہے اور کہتا ہے: اذهبت فعلت یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ **اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ** تم دنیا میں پاکیزہ چیزوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور تم نے شہوات اور لذات کی پیروی کی، مراد نافرمانیاں ہیں۔

**فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ** یعنی ذلت ورسوائی کا عذاب۔ مجاہد نے کہا: هون سے مراد هوان ہے(1)۔ قتادہ نے کہا: یہ قریش کی لغت کے مطابق ہے۔

**بِمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ** یعنی اس کے باعث تم اہل زمین پر ناحق بلند مرتبہ چاہتے تھے **وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ۠** اس کے باعث کہ تم اپنے افعال میں بغاوت اور ظلم کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ** یعنی تم نے اپنی جوانی کفر اور معاصی میں فنا کر دی۔ ابن بحر نے کہا: طیبات سے مراد جوانی اور قوت ہے(2)؛ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ذهب أطيباه؛ یعنی اس کی جوانی اور قوت ختم ہوگئی۔ ماوردی نے کہا: میں نے ضحاک کو پایا کہ اس نے بھی یہی معنی کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت حسن بصری نے آحنف بن قیس سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: میں عیش ونشاط کی زندگی کو سمجھتا ہوں اگر میں چاہتا تو کلیجی، بھنا ہوا گوشت، باریک روٹی اور چٹنی بناتا لیکن میں اپنی نیکیوں کو باقی رکھنا چاہتا ہوں بے شک اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی یہ صفت بیان کی ہے اور کہا ہے(3): **اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا**۔

ابوعبید نے حضرت عمر کی حدیث میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں: لو شئت لدعوت بصلائق وصناب وكراكر وأسنمة(4) ایک حدیث میں ہے وأفلاذ۔ ابوعمرو اور دوسرے علماء نے کہا: الصلاء مد اور کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی بھنا ہوا گوشت ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اسے آگ پر بھونا جاتا ہے الصلاء کا معنی صلاء النار بھی ہے اگر تو صاد کو فتحہ دے

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 28 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 281 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 305

گا تو آخر میں الف مقصورہ ہوگا اور تو کہے گا: صَلَى النارِ۔ صناب وہ چٹنی جو رائی اور کشمش سے بنائی جاتی ہے۔ اور عمرو نے کہا: اسی وجہ سے برذون کو صنابی کہتے ہیں کیونکہ اس کا رنگ اس کے مشابہ ہوتا ہے کہا: سلائق جب سین کے ساتھ ہو تو اس سے مراد سبزی وغیرہ میں سے ابلی ہوئی چیز ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ لفظ صاد کے ساتھ ہے؛ جریر نے کہا:

تُكَلِّفُنِي معيشةَ آلِ زيدٍ　ومَن لي بالصَّلائق والصِّناب

تو مجھے آل زید کی زندگی کا مکلف بناتا ہے تو کون میرے لیے پتلی روٹی اور بھنے گوشت کا اہتمام کرے گا۔

الصلائق سے مراد پتلی چوڑی روٹی ہے۔ یہ بحث سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے جہاں تک کراکر کا تعلق ہے تو اس سے مراد کرا کر ابل ہے اس کا واحد کرکرۃ ہے جو معروف ہے یعنی سینہ؛ یہ ابوعبید کا قول ہے۔ صحاح میں ہے الکرکرۃ رحی زور البعیر یعنی اونٹ کے سینے کی چکی ہے۔ یہ پانچ ثفنات (☆) میں سے ایک ہے۔ کِرکِرہ کا معنی لوگوں کی جماعت ہے۔ ابو مالک عمرو بن کرکرہ علماء لغت میں سے ایک ہے۔ ابوعبید نے کہا جہاں تک افلاذ کا تعلق ہے اس کا واحد فلذ ہے یہ جگر کا ایک ٹکڑا ہے۔ اعشی نے کہا:

تَكْفِيهِ حُزَّةُ فِلْذٍ إن ألَمَّ بها　من الشِّواء ويُرْوِي شُرْبَه الغُمَرُ

اگر وہ اس کے ہاں اترے گا تو بھنے ہوئے جگر کا ایک ٹکڑا اس کے لیے کافی ہوگا اور چھوٹے پیالے کا مشروب اسے سیراب کر دے گا۔

قتادہ نے کہا: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر میں چاہتا تو میں تم سے سب سے اچھے کھانے والا ہوتا اور سب سے نرم لباس پہننے والا ہوتا، لیکن میں اپنی نیکیاں آخرت کے لیے باقی رکھنے والا ہوں (1)۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے تو آپ کے لیے کھانا تیار کیا گیا جس کھانے جیسا آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا فرمایا: یہ ہمارے لیے ہے، تو ان مسلمان فقراء کا کیا ہوگا جو فوت ہو گئے اور جو کی روٹی سے بھی کبھی سیر نہ ہوتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید نے عرض کی: ان کے لیے جنت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں فرمایا: اگر ہمارے حصہ میں دنیا میں سے یہ ٹکڑے ہیں اور وہ اپنے حصہ کی جنت میں چلے گئے ہیں تو وہ تو ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں۔

صحیح مسلم اور دوسری احادیث کی کتب میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالائی منزل کے ایک کمرہ میں تشریف فرما تھے یہ اس دور کا واقعہ ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ متوجہ ہوئے تو کوئی چیز نہ دیکھی جو نظر کو لوٹاتی مگر چمڑے تھے جن پر نمک لگایا گیا تھا جن کی بو سی پھیل رہی تھی (2)۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اللہ کے رسول اور اللہ کے منتخب ہیں۔ یہ کسریٰ اور قیصر ہیں جو دیباج و حریر میں ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدھے بیٹھ گئے فرمایا: ''اے ابن خطاب! تو شک میں

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 305　2۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، بیان ان تخییرہ امراتہ لایکون طلاقاً الا بالنیۃ، جلد 1، صفحہ 482

☆ ثفنہ کی جمع ہے ثفنہ سے مراد اونٹ کے بدن کا وہ حصہ ہوتا ہے جو بیٹھتے وقت زمین پر لگے۔

بتلا ہے؟ وہ ایسے لوگ ہیں جن کی عمدہ چیزیں دنیا میں ہی جلدی ان تک پہنچ گئی ہیں''۔ میں نے عرض کی: میرے لیے بخشش طلب کیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا کی: اے اللہ! اسے بخش دے۔

حضرت حفص بن ابی العاص نے کہا: میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا کھایا کرتا جو کہ روٹی اور زیتون، روٹی اور سرکہ، روٹی اور دودھ، روٹی اور گوشت کے خشک ٹکڑے ہوتے بہت ہی کم ایسا ہوتا کہ تازہ گوشت ہوا کرتا۔ آپ فرمایا کرتے: آٹے کو چھانا نہ کرو کیونکہ یہ سارے کا سارا کھانا ہے۔ آپ کی خدمت میں روٹی کے ٹکڑے لائے گئے جو موٹے تھے آپ اسے کھانے لگے اور فرمانے لگے: کھاؤ، ہم نے اسے نہ کھایا، پوچھا: تمہیں کیا ہوگیا ہے تم کھاتے نہیں؟ ہم نے عرض کی: اے امیر المومنین! ہم آپ کے اس کھانے سے نرم کھانے کی طرف لوٹیں گے۔ فرمایا: اے ابن عاص! کیا تجھے خبر نہیں کہ میں جانتا ہوں اگر میں بکری کے موٹے تازے بچے کے بارے میں حکم دوں اس کے بال اتارے جائیں پھر اسے اس طرح اس طرح بھونا ہوا نکالا جائے کیا تو نہیں جانتا کہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں ایک صاع یا دو صاع کشمش کے بارے میں حکم دوں میں اسے مشکیزے میں رکھوں پھر اس پر پانی انڈیلوں تو وہ صبح تک یوں ہو جائے جس طرح ہرن کا خون ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی: اے امیر المومنین! ہاں، جس عیش ونشاط کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ قیامت کے روز میری نیکیاں کم ہو جائیں گی تو ہم بھی تمہارے ساتھ اس عیش ونشاط میں شریک ہو جاتے لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کو کچھ اقوام کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: **اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا**۔

**فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ**، **الْهُوْنِ** سے مراد ھوان (ذلت) ہے **بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** یعنی اس کی وجہ سے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنے سے بڑے بنتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر بڑائی کا اظہار کرتے ہو۔ **وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ** اس وجہ سے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکل جاتے ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے گھر والوں نے گوشت کی خواہش کی میں نے ان کے لیے گوشت خریدا میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس سے گذرا پوچھا: اے جابر! یہ کیا ہے؟ میں نے آپ کو بتایا، پوچھا: کیا تم میں سے جب بھی کوئی کسی چیز کی خواہش کرتا ہے (1) اسے اپنے پیٹ میں رکھ لیتا ہے کیا وہ نہیں ڈرتا کہ وہ اس آیت کا مصداق بن جائے گا **اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ**۔

ابن عربی نے کہا: یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عتاب تھا کہ وہ گوشت خریدنے کی وسعت رکھتے ہیں اور خشک روٹی اور پانی کے معمول سے نکل چکے ہیں (2) کیونکہ حلال چیز میں سے پاکیزہ چیزوں کے حصول کی طبیعتیں حریص ہوتی ہیں اور دل انکو پسند کرتا ہے جب وہ انہیں پائیں تو وہ شبہات کے ساتھ ان کے حصول کو سہل بنانے کی کوشش کرتی ہیں یہاں تک کہ عادت کے غلبے اور خواہش کے اس کے نفس پر غلبہ پانے کی وجہ سے جو نفس برائی کا حکم دیتا ہے خالص حرام میں جا واقع ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاملہ کو اس کے ابتدا سے ہی پکڑ لیا اور ابتدا سے اسے بچا لیا جس طرح آپ کا معمول تھا اور جو اس دروازہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 140 2۔ تفسیر احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1698

کی حفاظت کرتا ہے اور قانون کی پاسداری کرتا ہے تو اس آدمی پر لازم ہے کہ جو پائے اسے کھالے وہ پاکیزہ یا سالن کے بغیر روٹی وہ عمدہ کھانے کا تکلف نہ کرے اور نہ ہی اسے عادت بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا جو پاتے تو سیر ہو کر کھا لیتے، جب نہ پاتے تو صبر کرتے، آپ حلوہ کھا لیتے جب اس پر قادر ہوتے جب اتفاق ہوتا تو شہد بھی پی لیتے جب میسر ہوتا تو گوشت بھی کھا لیتے کسی چیز پر کبھی بھی انحصار نہ کرتے اور نہ ہی اسے عادت بناتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا معمول معروف و مشہور تھا صحابہ کا طریقہ منقول تھا جہاں تک آج کا تعلق ہے حرام اور لقمہ کا فساد غالب آچکا ہے اس سے خلاصی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ خلاصی عطا فرماتا ہے اور چھٹکارا پانے میں اپنی رحمت سے مدد فرماتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: توبیخ شکر ترک کرنے پر واقع ہے پاکیزہ اور حلال چیزوں کے حصول پر واقع نہیں یہ تعبیر اچھی ہے کیونکہ پاکیزہ حلال چیز کا حاصل کرنا جائز ہے جب وہ اس پر شکر کرنا چھوڑ دے اور اس کے خلاف ایسی چیز سے مدد لے جو حلال ہی نہ ہو تو اس نے نعمت کو ختم کیا۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾

"(اے حبیب!) ذکر سنایئے انہیں قوم عاد کے بھائی (ثمود) کا جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گذر چکے تھے ڈرانے والے ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو (ورنہ) مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے"۔

**وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ** وہ ہود بن عبداللہ بن رباح علیہ السلام ہیں وہ ان کے نبی بھائی تھے دینی بھائی نہ تھے **اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ** ان مشرکوں کو عاد کا قصہ یاد دلائیں تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا: آپ کو حکم دیا اپنے دل میں حضرت ہود علیہ السلام کا واقعہ یاد کریں تاکہ اس کی اقتدا کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم آپ کو جھٹلاتی ہے اس کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ معاملہ آسان ہو جائے گا۔ احقاف سے مراد عاد کا علاقہ ہے۔ احقاف سے مراد ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں (1)؛ یہ خلیل اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے وہ لوگ اپنی قوت کے باعث اہل زمین پر غالب آگئے تھے، اَحقاف، حِقف کی جمع ہے اس سے مراد ریت کا لمبا ٹیلہ ہے جو ٹیڑھا ہو اور پہاڑ تک نہ پہنچا ہو اس کی جمع حقاف، احقاف اور حقوف ہے۔ احقوقف الرمل و الھلال یعنی ریت کا ٹیلا اور چاند ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حِقف حِقاف کی جمع ہے اور اَحقاف جمع کی جمع ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: حِقفٌ اَحقفُ۔ اعشیٰ نے کہا:

بات الی أرطاۃ حِقف أحْقفا

یعنی ایسی ریت جو لمبی ہو اور جس کا کنارہ آگے کو جھکا ہوا ہو۔ اس سے فعل احقوقف ہے۔ عجاج نے کہا:

طیُّ اللیالی زُلَفا فزلفا سَمَاوَۃَ الھلال حتّی احقوقفا

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 177

احقوقف یعنی مڑ گیا اور گول ہو گیا۔

یہاں احقاف سے جو مراد ہے اس کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد ریت کے ایسے ٹیلے ہیں جو ابھرے ہوئے لمبے ہوں جس طرح پہاڑوں کی حالت ہوتی ہے اور پہاڑوں تک نہ پہنچے ہوئے ہوں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اسی امر کا شاہد ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ایسے پہاڑ ہیں جو شحر پر جھکے ہوئے ہوں۔ شحر عدن کے قریب ہے کہا جاتا ہے: شِحْرُ عمان، شَحْرُ عمان۔ یہ عمان اور عدن کے درمیان سمندر کا ساحل ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے (2) کہ عاد یمن میں قبائل تھے ریتلے علاقے میں بستے سمندر کے قریبی علاقے میں رہتے جسے شحر کہا جاتا۔ مجاہد نے کہا: یہ حسمی کا علاقہ ہے (3) جسے احقاف کہتے حسمی ایسا صحرائی علاقہ جس میں اونچے پہاڑ ہوں جن کی اطراف ملائم ہوں اور گرمیاں اس علاقہ کو نہیں چھوڑتیں۔ نابغہ نے اسی حوالے سے کہا:

فَاَصبحَ عاقِلاً بجبالِ حِسْمَی　دُقاقَ التُّرْبِ مُحْتَزِمَ القتام

یہ جوہری کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے کہا: احقاف سے مراد شام میں پہاڑ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: عمان اور مہرہ کے درمیان وادی ہے۔ مقاتل نے کہا: عاد کے گھر یمن کے ملک حضرموت کے علاقہ میں ایک وادی میں تھے جسے مہرہ کہا جاتا تھا اسی طرح مہری اونٹ منسوب ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے: ابل مہریہ، ابل مہاری۔

یہ قبیلہ ارم سے تعلق رکھتے تھے۔ کلبی نے کہا: احقاف الجبل سے مراد وہ پہاڑ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں جب ہر کوئی غرق ہوا تھا اس پہاڑ سے پانی جاری ہوا تھا زمین سے پانی جاری ہوتا تھا اور اس کا اثر باقی رہتا تھا۔

طفیل نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ فرمایا: لوگوں میں دو وادیاں بہترین ہیں (4) ایک وادی مکہ میں اور ایک وادی جہاں حضرت آدم علیہ السلام اترے جو ہند کے علاقہ میں ہے لوگوں میں سب سے بری دو وادیاں ہیں ایک وادی احقاف میں ہے اور ایک وادی حضرموت میں ہے جسے برہوت کہتے ہیں جس میں کفار کی روحیں آپس میں ملیں گی۔ لوگوں میں بہترین کنواں بئر زمزم ہے اور لوگوں میں سے برا کنواں بئر برہوت ہے۔ وہ حضرموت کی اسی وادی میں ہے۔

وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ نذر سے مراد رسل ہیں۔ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ یعنی حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اور حضرت ہود علیہ السلام کے بعد؛ یہ فراء کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں من بین یدیہ ومن بعدہ ہے اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ یہ رسل کی جانب سے قول ہے، یہ جملہ معترضہ ہے پھر حضرت ہود علیہ السلام نے کہا: اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ یہ حضرت ہود علیہ السلام کا کلام ہے۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۝ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ۝ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 282　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 141　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 282　4۔ ایضاً

اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

''وہ (برافروختہ ہوکر) بولے (اے ہود) کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے برگشتہ کردو، لے آؤ (وہ عذاب) جس کی تم دھمکیاں دیتے رہے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود نے فرمایا کہ نزول عذاب کا علم تو اللہ کے پاس ہے اور میں (برابر) پہنچا رہا ہوں تمہیں وہ پیغام جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہل قوم ہو۔ پس جب انہوں نے دیکھا عذاب کو بادل کی صورت میں کہ وہ ان وادیوں کی طرف آرہا ہے تو بولے یہ بادل ہے ہم پر برسنے والا ہے (نہیں نہیں) بلکہ یہ تو وہ عذاب ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے (یہ تند) ہوا ہے اس میں دردناک عذاب ہے تہس نہس کرکے رکھ دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پس جب ان پر صبح ہوئی تو نہ دکھائی دی کوئی چیز بجز ان کے (ویران) مکانوں کے، اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرموں کو''۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا اس میں دو وجوہ ہیں: (1) بہتان لگا کر ہمیں ہمارے معبودوں سے دور کرنا چاہتے ہیں (1)۔ (2) منع کرنے کے ساتھ ہمیں ہمارے معبودوں سے دور کرنا چاہتے ہیں، یہ ضحاک کا قول ہے۔ عروہ بن اذینہ نے کہا:

إن تَكُ عن أحسن الصنيعة مأ فُوكًا ففي آخرين قد أفِكوا

شاعر کہتا ہے: اگر تجھے احسان کی توفیق نہیں دی گئی تو تو ایسی قوم میں ہے جنہیں پھیر دیا گیا ہے فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وعدہ کا لفظ کبھی کبھی وعید کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ اگر اس بات میں سچے ہو کہ تم نبی ہو۔ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی عذاب کے آنے کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے میرے پاس نہیں وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ جو پیغام مجھے دے کر بھیجا گیا ہے میں تمہارے رب کی جانب سے تم تک پہنچانے والا ہوں وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ یعنی تم جو جلدی عذاب کے آنے کا مطالبہ کررہے ہو اس میں تمہیں جاہل خیال کرتا ہوں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مبرد نے کہا: رَاَوْهُ میں ضمیر اس چیز کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔ اس کی وضاحت عَارِضًا کا لفظ بیان کررہا ہے۔ ضمیر، سحاب کی طرف لوٹ رہی ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی فلما رأوا السحاب عارضا۔ عارضا کا لفظ تکریر کے طور پر منصوب ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ آسمان کی چوڑائی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جب انہوں نے بادل کو دیکھا تو انہوں نے اسے ایسا بادل خیال کیا جو ان پر بارش برسائے گا۔ بارش ہوئے کافی عرصہ ہوچکا تھا، جب انہوں نے بادل کو اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ خوش ہوئے۔ وہ بادل اس وادی کی جانب سے آیا تھا جس میں عام طریقہ یہ تھا کہ اس وادی سے جو بادل آتا اس میں بارش ہوتی؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 283

جوہری نے کہا: عارض سے مراد وہ بادل ہے جو افق میں چوڑائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا یعنی ہم پر بارش برسائے گا کیونکہ یہ معرفہ ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ عارض کی صفت بنے کیونکہ وہ نکرہ ہے عرب یہ افعال سے اسماء مشتقہ میں کرتے ہیں کسی اور میں ایسا نہیں کرتے۔

یہ کہنا جائز نہیں: هذا رجل غلامنا۔ اعرابی نے روزہ افطار کرنے کے بعد کہا: رب صائمة لن تصومه وقائمة لن تقومه۔ تو اس نے اسے نکرہ کی صفت بنایا اور اسے معرفہ کی طرف مضاف کیا۔

میں کہتا ہوں: اس کا قول لا یجوز ان یکون صفة لعارض نحویوں کے قول کے خلاف نہیں۔ اضافت، انفصال کی تقدیر میں ہے یہ اضافت لفظیہ ہے حقیقیہ نہیں کیونکہ یہ پہلے اسم کو تعریف کا فائدہ نہیں دیتی، بلکہ اسم اپنی جگہ نکرہ ہی رہتا ہے اسی وجہ سے نکرہ کی حیثیت سے صفت آتی ہے۔ آیت میں یہ نحویوں کا قول ہے۔ نکرہ کی صفت نکرہ ہوتی ہے۔ رب کا لفظ نکرہ پر داخل نہیں ہوتا۔

بَلْ هُوَ ہود نے انہیں کہا اس پر دلیل اس کی قراءت ہے جس نے پڑھا قال هود بل هو اسے قل بل ما استعجلتم به هي ريح بھی پڑھا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہہ دیجئے: بلکہ تم نے اس کی جلدی مچائی ہے۔ اس سے مراد ان کا قول ہے فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا پھر اس کی وضاحت کی اور کہا: رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وہ ہوا جس کے ساتھ انہیں عذاب دیا گیا تھا وہ اس بادل سے پیدا ہوئی تھی جس کو انہوں نے دیکھا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام ان کے درمیان سے نکل گئے وہ ہوا خیموں کو اٹھاتی ہودجوں کو اٹھاتی، انہیں بلند کرتی گویا وہ ٹڈیاں ہوں پھر انہیں چٹانوں پر دے مارتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پہلی دفعہ جب انہوں نے بادل کو دیکھا تو وہ اٹھے انہوں نے ہاتھ پھیلائے سب سے پہلے جنہوں نے پہچانا کہ یہ عذاب ہے وہ وہ لوگ تھے جو گھروں سے باہر تھے، انہوں نے لوگوں اور مواشی کو دیکھا، ہوا انہیں زمین و آسمان کے درمیان یوں اڑا رہی تھی جس طرح پر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ گھروں میں داخل ہو گئے دروازوں کو بند کر دیا ہوا نے دروازوں کو اکھیڑ دیا اور انہیں پچھاڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا اس نے ان پر ریت ڈال دی۔ وہ سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ریت کے نیچے پڑے رہے جبکہ ان کے رونے کی آواز آتی رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو اس نے ان سے ریت کو دور کر دیا ہوا نے انہیں اٹھایا اور سمندر میں جا پھینکا۔ یہ وہی ہوا ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا یعنی ہر وہ شے جس پر ہوا گزری وہ عاد کے لوگ تھے یا اموال تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہر وہ شے جس کی طرف ہوا بھیجی گئی۔ تدمیر کا معنی ہلاکت ہے اسی طرح دمار ہے۔ اسے يدمر كل شيء بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ دمر دمارا سے مشتق ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: دمره تدميرا و دمارا اور دمر عليه کا معنی ایک ہی ہے۔ دَمَرَ يَدْمُرُ دُمورا بغیر اجازت کے داخل ہو گیا۔ حدیث میں ہے من سبق طَرْفه استئذانه فقد دَمَرَ جس کی نظر اجازت طلب کرنے سے سبقت لے گئی تو وہ اندر داخل ہو گیا۔ تَدْمُر۔ شام میں ایک شہر ہے يربوع تدمری۔ جب وہ چوہا چھوٹا ہو۔

بِأَمْرِ رَبِّهَا اس کے رب کے اذن سے۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہا: میں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا یہاں تک کہ میں ان کا کوا دیکھتی۔ آپ تبسم فرمایا کرتے تھے۔ جب آپ بادل یا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بارش کی امید ہوتی ہے۔ جب آپ اسے دیکھتے ہیں تو میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا: ''اے عائشہ! مجھے خوف آتا ہے کہ اس میں عذاب نہ ہو۔ ایک قوم کو ہوا کے ساتھ عذاب دیا گیا، ایک قوم نے عذاب دیکھا تو انہوں نے کہا: یہ بادل ہے ہم پر بارش برسائے گا'' (1)۔ اسے امام مسلم اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری مدد باد صبا سے کی گئی اور قوم عاد کو دبور ہوا سے ہلاک کیا گیا'' (2)۔ ماوردی نے ذکر کیا: هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا کا قائل قوم عاد میں سے ایک تھا۔ وہ بکر بن معاویہ تھا۔ جب اس نے بادل دیکھا تو اس نے کہا: میں تباہ و برباد کرنے والا بادل دیکھتا ہوں وہ عاد میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ عمرو بن میمون نے کہا: وہ ہوا ان میں سے غائب آدمی کو لاتی اور ان کی مجلس میں اسے پھینک دیتی۔

ابن اسحاق نے کہا: حضرت ہود اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے تھے وہ ایک باڑہ میں الگ ہو گئے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھ جو لوگ تھے انہیں ہوا نہیں پہنچتی تھی مگر وہ ان کے اوپر والے کپڑوں کو ہلاتی اور اس کے ساتھ ان کے نفوس کو لذت حاصل ہوتی اور قوم عاد میں سے ہودج میں بیٹھی کسی عورت کے پاس سے گذرتی انہیں زمین و آسمان کے درمیان اٹھاتی اور انہیں پتھروں پر پٹخ دیتی یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے۔ کلبی نے حکایت بیان کی ہے کہ ایک شاعر نے کہا:

فدعا هود عليهم دعوةً أضحَوْا همودا (3)

عصفت ريح عليهم تركت عادًا خمودا

سخرت سبع ليال لم تدع في الأرض عودا

حضرت ہود علیہ السلام نے ان پر ایسی بددعا کی تو وہ مر کر ٹھنڈے ہو گئے۔ ہوا ان پر چلی جس نے عاد کو ٹھنڈی آگ بنا دیا وہ سات راتوں تک ان پر مسلط کی گئی اس نے زمین میں قوم عاد کا کوئی فرد نہ چھوڑا۔

حضرت ہود علیہ السلام ان کے ہلاک ہونے کے بعد ڈیڑھ سو سال تک اپنی قوم میں زندہ رہے۔

فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ عاصم اور حمزہ نے لا یُرٰی اِلا مساکنُهم پڑھا ہے یعنی فعل مجہول ہے۔ اسی طرح حماد بن سلمہ نے ابن کثیر سے روایت کیا ہے مگر اس نے تری پڑھا ہے یہ ابو بکر سے مروی ہے انہوں نے اسے عاصم سے روایت کیا ہے باقی قراء نے تری تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور مساکنهم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نہیں دیکھیں گے مگر ان کے مسکن۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، فلما راوہ عارضا، جلد 2، صفحہ 715

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ الاستسقاء، قول النبی ... ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، جلد 1، صفحہ 295

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 283

مہدوی نے کہا: جس نے تاء کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے تو مساکن جو مونث ہے اس کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے یہ بہت ہی قلیل ہے صرف شعروں میں استعمال ہوتا ہے اور حاتم نے کہا: یہ لغت میں درست نہیں ہوتا مگر جس میں اضمار ہو جس طرح تو کہتا ہے: الاتری النساء إلا زینب۔ لاتری الا زینب جائز نہیں۔ سیبویہ نے کہا: اس کا معنی ہے تو ان کے اشخاص نہیں دیکھتا مگر ان کے مساکن۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے عاصم اور حمزہ کی قراءت پسند کی ہے۔ کسائی نے کہا: معنی ہے ان کے مساکن کے علاوہ کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ معنی پر محمول ہے جس طرح تو نے کہا ہے: ماقام الا ھند۔ معنی ہے کوئی کھڑا نہیں ہوا مگر ہند۔ فراء نے کہا: لوگ نہیں دکھائی دیتے تھے کیونکہ وہ ریت کے نیچے تھے، ان کے گھر دکھائی دیتے تھے کیونکہ وہ کھڑے تھے۔

**كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ** ۝ یعنی مشرکوں کو اس جیسا عذاب دیتے ہیں۔

## وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''اور ہم نے ان کو وہ قوت و طاقت بخشی تھی جو ہم نے تمہیں نہیں دی اور ہم نے عطا کیے تھے انہیں کان، آنکھیں اور دل لیکن ان کے کسی کام نہ آئے ان کے کان، نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کیونکہ وہ انکار کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور احاطہ کر لیا ان کا اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے''۔

**وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ** ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان زائدہ ہے اس کی تقدیر کلام ہے مکنا کم فیما مکنا کم فیه یہ قتبی کا قول ہے۔ اخفش نے یہ شعر پڑھا:

يرجّي المرءُ ما إن لايراه وتعرِض دون أدناه الخطوب (1)

انسان امید رکھتا ہے کہ وہ اسے نہیں دیکھے گا جبکہ اس کے قریب سے مصائب اسے آ پہنچتے ہیں۔

پہلے مصرعہ میں ان زائدہ ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ما، الذی کے معنی میں ہے اور ان، ما کے معنی میں ہے (2)، تقدیر کلام یہ ہے ولقد مکناھم فی الذی مامکنا کم فیه یہ مبرد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ شرطیہ ہے اور اس کا جواب مضمر محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہو گی: لقد مکناھم فی ما إن مکنا کم فیه کان بغیکم اکثر وعناد کم اشد یہاں پر کلام مکمل ہو گئی پھر نئی کلام کی اور فرمایا: **وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً** ۔ افئدۃ سے مراد دل ہیں جو اسے سمجھتے ہیں۔ **مِّنْ شَيْءٍ** سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے۔ **اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ** کیونکہ وہ انکار کرتے تھے وَحَاقَ بِهِمْ ان کا احاطہ کر لیا (اس نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے)۔

## وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 309 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 142

''اور ہم نے برباد کردیئے وہ گاؤں جو تمہارے اردگرد (آباد) تھے اور ہم نے مختلف انداز میں اپنی نشانیاں پیش کیں شائد وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں''۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰی اس سے مراد قوم ثمود کے دیہات، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں اور اسی طرح کی دوسری بستیاں جو بلاد حجاز کے قریب قریب تھیں۔ ان کی خبریں ان کے پاس متواتر آتی رہتی تھیں۔ وَ صَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ آیات سے مراد حجج اور دلائل، بینات اور مواعظ کی انواع، یعنی ہم نے انہیں ان بستیوں والوں کے لیے بیان کیا۔ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝ تو وہ نہ لوٹے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے قرآن کی آیات وعدہ، وعید، قصص اور اعجاز کی صورت میں پھیر پھیر کر بیان کیں۔ ممکن ہے یہ مشرک لوٹ آئیں۔

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۝۲۸

''پس کیوں مدد نہ کی ان کی معبودوں نے جنہیں الله تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب کے لیے (اپنے) خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ تو ان سے روپوش ہو گئے اور یہ محض ان کا ڈھونگ تھا اور بہتان جو وہ باندھتے تھے''۔

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ، لولا، ھلا کے معنی میں ہے یعنی ان کے معبودوں نے ان کی کیوں مدد نہ کی جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان کا گمان یہ تھا کہ یہ معبود ان کے حق میں الله تعالیٰ کے حضور شفاعت کریں گے، کیونکہ انہوں نے کہا تھا: هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:18) اور جو ہلاکت ان پر واقع ہوگی اس سے یہ معبود انہیں محفوظ رکھیں گے۔ کسائی نے کہا: قربان سے مراد ہر طاعت اور قربانی ہے جن کے ذریعے الله تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے۔ اس کی جمع قرابین ہے، جس طرح رھبان کی جمع رھابین ہے۔ اتخذ کے دو مفعولوں میں سے ایک الذین محذوف کی طرف لوٹ رہا ہے۔ دوسرا مفعول آلھۃ ہے(1) اور قُرْبَانًا حال بن رہا ہے۔ قُرْبَانًا کو دوسرا مفعول بنانا صحیح نہیں۔ اٰلِهَةً اس سے بدل ہے کیونکہ معنی میں فساد پیدا ہوجاتا ہے۔ زمخشری کا قول ہے: اسے قربانا راء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ یعنی وہ ان سے ہلاک ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ یعنی ان سے ان کے معبود گم ہو گئے کیونکہ انہیں وہ مصیبت نہیں پہنچی تھی جو انہیں پہنچی ہے کیونکہ وہ تو جمادات تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ضَلُّوْا عَنْهُمْ انہوں نے بتوں کو ترک کر دیا اور ان سے براءت کا اظہار کیا۔

وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ یعنی وہ بت جو ان سے گم ہو گئے تھے یہ ان کا اپنے قول میں جھوٹ تھا انھا تقربھم الی الله زلفی یہ بت انہیں الله تعالیٰ کا قرب عطا کردیں گے۔ عام قراءت اِفْكُهُمْ ہے ہمزہ مکسور ہے اور فاء ساکن ہے یعنی ان کا جھوٹ تھا اسی طرح افیکہ ہے جمع افائک ہے۔ رجل افاک یعنی جھوٹا آدمی۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور حضرت ابن زبیر نے پڑھا وذلک افکھم یعنی ہمزہ، فاء اور کاف مفتوح ہے کیونکہ یہ فعل ہے یعنی اس قول نے انہیں توحید سے پھیر دیا۔ عکرمہ نے اسے افکھم فاء کی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 310

تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ تاکید اور تکثیر کے لیے ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یعنی وہ جن نعمتوں پر تھے ان سے ان کو پھیر دیا۔

مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آفکہم مد اور کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی انہیں پھیرنے والا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے ان سے اختلاف کے ساتھ آفکہم مد کے ساتھ نقل کیا ہے تو یہ جائز ہوگا کہ وہ افعل کا صیغہ ہو، یعنی انہیں افک کی طرف پھیر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ فاعلہم کے وزن پر ہو جس طرح خادعہم ہے عام قراءت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ جو وہ جھوٹ بولتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اُفکہم، اَفکہم کی طرح ہے اِفک اور اَفک یہ حِذر اور حَذر کی طرح ہیں؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝۲۹

''اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں تو جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو بولے خاموش ہو کر سنو، پھر جب تلاوت ہو چکی تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے''۔

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یہ قریش کے مشرکوں کو توبیخ ہے یعنی جنوں نے قرآن کو سنا وہ آپ پر ایمان لائے اور انہیں علم ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے جبکہ تم اعراض کرنے والے اور کفر پر اصرار کرنے والے ہو۔ صَرَفْنَاۤ کا معنی ہے ہم نے انہیں آپ کی طرف متوجہ کیا اور ہم نے بھیجا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ انہیں آسمان سے چوری چھپے سننے سے شہاب مارنے کے ساتھ پھیر دیا گیا تھا جس طرح اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انہیں اس امر سے نہیں روکا گیا تھا مگر جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی۔

مفسرین حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، مجاہد وغیرہ نے کہا: جب ابو طالب فوت ہو گئے تو نبی کریم ﷺ تنہا ثقیف سے مدد لینے کے لیے طائف کی طرف نکلے آپ نے عبد یالیل، مسعود اور حبیب کے پاس جانے کا ارادہ کیا جو بھائی تھے ان کا تعلق بنو عمرو بن عمیر سے تھا، ان کے ہاں بنی جمح کے خاندان کی ایک قریشی عورت بیاہی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت دی اور ان سے سوال کیا کہ وہ قوم کے خلاف آپ کی مدد کریں تو ان میں سے ایک نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ کعبہ کا غلاف اتار دے گا۔ دوسرے نے کہا: اللہ تعالیٰ کو تیرے سوا کوئی نہیں ملا تھا کہ اسے رسول بنا کر بھیجتا۔ تیسرے نے کہا: اللہ کی قسم! میں تجھ سے کوئی کلام نہیں کروں گا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بھیجا ہے جس طرح تو کہتا ہے تو تو اس سے عظیم شان رکھتا ہے کہ میں تجھ پر تیرا کلام لوٹاؤں اور اگر تو جھوٹ بولتا ہے تو تجھ سے کلام کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کے بے وقوف لوگوں اور اپنے غلاموں کو بھڑکایا کہ وہ آپ ﷺ کو گالیاں دیں اور آپ پر قہقہے لگائیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور آپ کو عتبہ اور شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے کے باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تو آپ نے جمحیہ عورت سے کہا: ہم نے تیرے سسرال سے کیا پایا؟ پھر آپ نے یوں دعا کی: اللّٰھم إنی أشکو

إلیك ضعف قوتی وقلة حیلتی وھوانی علی الناس یا أرحم الراحمین أنت رب المستضعفین وأنت ربی لمن تکلنی إلی عبد یتجھمنی أو إلی عدو ملکته امری! إن لم کن بك غضب علی فلا أبالی ولکن عافیتك ھی أوسع لی. أعوذ بنور وجھك من أن ینزل بی غضبك. أو یحل علی سخطك لك العُتبیٰ حتی ترضی. ولاحول ولا قوۃ إلا بك

اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اپنی قوت کی کمزوری، حیلہ کی کمی، لوگوں پر ہلکا ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے تو میرا رب ہے تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے اس بندے کے جو میرے ساتھ ترش روی سے پیش آئے یا ایسے دشمن کے جس کو تو میرے معاملہ کا مالک بنا دے، اگر تو مجھ پر ناراض نہیں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا مجھ پر تیری ناراضگی نازل ہو تجھے عتاب کا حق ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ کسی مصیبت کو دور کرنا اور کسی امر پر طاقت ہونا تیرے ذریعے ہی ہے۔

ربیعہ کے دونوں بیٹوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم آ گیا دونوں نے اپنے غلام سے کہا جو ایک نصرانی تھا جسے عداس کہا جاتا انگور کا یہ گچھا لو اسے اس طبق پر رکھو پھر اسے اس آدمی کے سامنے رکھ آؤ۔ جب اس نے وہ برتن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''باسم اللہ'' پھر اسے کھایا، عداس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھا پھر کہا: اللہ کی قسم! یہ کلام اس شہر والے نہیں کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''تو کس شہر سے تعلق رکھتا ہے؟ اے عداس اور تیرا دین کیا ہے؟'' کہا میں نصرانی ہوں، اہل نینوی سے میرا تعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''کیا صالح انسان حضرت یونس بن متی کی بستی سے؟'' عداس نے پوچھا: آپ کو کس نے بتایا کہ یونس بن متی کون ہے؟ فرمایا: ''وہ میرا بھائی ہے وہ نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں''۔ عداس آپ پر جھکا یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر، ہاتھ اور پاؤں چومے۔ ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے اسے کہا: تو نے اس طرح کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: اے میرے آقا! زمین میں ان سے بہتر کوئی فرد نہیں انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ثقیف کی جانب سے کسی بھلائی سے مایوس ہو گئے تو آپ واپس لوٹے یہاں تک کہ جب آپ نخلہ وادی میں تھے تو آپ رات کے وقت نماز پڑھنے لگے تو اہل نصیبین کے جنوں کی ایک جماعت آپ کے پاس سے گزری۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جن چوری چھپے سنا کرتے تھے جب آسمان کی حفاظت کی جانے لگی اور انہیں شہابیوں سے مارا گیا تو ابلیس نے کہا: آسمان میں جو یہ حادثہ رونما ہوا ہے وہ زمین میں کسی حادثہ کی وجہ سے ہے۔ اس نے اپنے لشکر بھیجے تاکہ حقیقت حال کو جانیں۔ ان میں سے پہلا قافلہ نصیبین والوں کا تھا وہ معزز جنوں پر مشتمل تھا یہ تہامہ کی طرف آئے، جب وہ نخلہ وادی میں پہنچے تو انہوں نخلہ وادی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے سنا جبکہ آپ قرآن پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کان لگائے اور کہا: خاموش ہو جاؤ۔ ایک جماعت نے کہا: بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ جنوں کو ڈرائیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں اور انہیں قرآن پڑھ کر سنائیں۔ اللہ تعالیٰ نے نینوی کے جنوں کی ایک جماعت آپ کی طرف

بھیجی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں آج کی رات جنوں کو قرآن پڑھانے کا ارادہ رکھتا ہوں تم میں سے کون میری اتباع کرے گا؟“ تو صحابہ نے اپنے سر جھکا لیے۔ دوسری دفعہ ارشاد فرمایا تو انہوں نے سر جھکا لیے۔ تیسری دفعہ فرمایا تو انہوں نے سر جھکا لیے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: یارسول اللہ! میں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے سوا آپ کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ ہم چلے یہاں تک کہ ہم مکہ مکرمہ کے بالائی علاقہ میں تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھاٹی میں داخل ہوئے جسے ”شعب حجون“ کہا جاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے ایک خط لگا دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس میں بیٹھوں۔ فرمایا: ”اس سے باہر نہ نکلنا یہاں تک کہ میں تیری طرف واپس آؤں“۔ پھر آپ چلے یہاں تک کہ کھڑے ہو گئے اور قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں گدھوں جیسی چیزیں دیکھتا جو نیچے گرتیں اور وہ آواز پیدا کرتے ہوئے چلتیں۔ میں غیر واضح سی گفتگو سنتا یہاں تک کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خوف ہونے لگا۔ آپ کو کثیر جماعتوں نے ڈھانپ لیا جو میرے اور آپ کے درمیان حائل ہو گئیں یہاں تک کہ میں ان کی آواز نہیں سنتا تھا۔ پھر وہ یوں چھٹنے لگے جس طرح بادل کا ٹکڑے ٹکڑے ہوتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کے وقت اس سے فارغ ہوئے (1)۔ پوچھا: ”کیا تو سویا ہے؟“ میں نے عرض کی: نہیں اللہ کی قسم! میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ لوگوں سے مدد طلب کروں یہاں تک کہ میں آپ کو سنتا کہ آپ اپنے عصا کو کھٹکھٹا کر انہیں تنبیہ کرتے اور کہتے: بیٹھ جاؤ۔ فرمایا: ”اگر تو اس دائرہ سے باہر نکلتا تو مجھے تیرے بارے میں خوف ہوتا کہ ان میں سے کوئی تجھے اچک ہی نہ لے“۔ پھر پوچھا: ”کیا تو نے کوئی چیز دیکھی ہے؟“ میں نے عرض کی: ہاں یارسول اللہ! میں نے سیاہ رنگ کے لوگوں کو دیکھا جو سفید رنگوں کی دھوتیاں رانوں سے لپیٹے ہوئے ہیں۔ فرمایا: ”وہ نصیبین کے جن تھے، انہوں نے مجھ سے متاع اور زاد کے بارے میں سوال کیا تو میں نے انہیں ہر بوسیدہ ہڈی اور گوبر و مینگنی وغیرہ کو ان کے لیے خوراک بنا دیا ہے“۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! لوگ انہیں ہمارے لیے گدلا کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا کہ ہڈی اور گوبر سے استنجا کیا جائے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! وہ چیز انہیں کیا فائدہ دے گی؟ فرمایا: ”وہ کسی ہڈی کو نہیں پائیں گے مگر وہ اس پر ایسا گوشت پائیں گے جس روز اسے کھایا گیا تھا اور وہ کسی گوبر کو نہیں پائیں گے مگر وہ اس میں ایسا دانہ پائیں گے جس طرح اسے کھایا گیا تھا“۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں نے بہت زیادہ غیر واضح سی گفتگو سنی؟ فرمایا: ”جنوں نے ایک مقتول کے بارے میں باہم اختلاف کیا اور میرے سامنے معاملہ پیش کیا تو میں نے ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا“۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے اور میرے پاس تشریف لائے۔ پوچھا: ”کیا تیرے پاس پانی ہے؟“ میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میرے پاس برتن ہے جس میں کچھ نبیذ تمر ہے۔ میں نے اسے آپ کے ہاتھوں پر انڈیلا تو آپ نے وضو کیا۔ فرمایا: ”پاکیزہ کھجور اور طہارت عطا کرنے والا پانی“۔ معمر نے قتادہ سے اور شعبہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ معمر کی حدیث میں نبیذ تمر کا ذکر نہیں۔

ابو عثمان نہدی نے روایت بیان کی ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے زطیوں (ہند کے ایک علاقہ کے رہائشی) کو دیکھا، پوچھا:

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 312

یہ لوگ کون ہیں؟ جواب دیا: یہ زطی ہیں۔ فرمایا: میں نے ان کی مثل نہیں دیکھا مگر جنوں والی رات میں جنوں کو ان کی مثل دیکھا تھا، وہ لنگوٹ مارے ہوئے تھے ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔

دارقطنی، عبداللہ بن لہیعہ سے وہ قیس بن حجاج سے وہ حنش سے وہ حضرت ابن عباس سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنوں والی رات نبیذ سے وضو کروایا تو آپ نے اس کے ساتھ وضو کیا۔ فرمایا: شراب و طھور۔ ابن لہیعہ ایسا راوی ہے جس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

اس سند سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ وہ جنوں والی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے رسول اللہ نے آپ کو فرمایا: ''اے ابن مسعود! کیا تیرے پاس پانی ہے؟'' عرض کی: میرے پاس برتن میں نبیذ ہے۔ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: ''اس سے مجھ پر انڈیلو'' تو آپ نے وضو کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: هو شراب وطھور۔ ابن لہیعہ اس روایت کو نقل کرنے میں اکیلا ہے اور حدیث میں ضعیف ہے۔ دارقطنی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جنوں والی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھے۔ علقمہ بن قیس اور ابوعبیدہ بن عبداللہ وغیرہ نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: میں جنوں والی رات آپ کے ساتھ نہیں تھا۔

ابو محمد بن صاعد، ابواشعث سے وہ مبشر بن فضل وہ داؤد بن ابی ہند سے وہ عامر سے وہ علقمہ بن قیس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا تم میں سے کوئی ایک لیلۃ الجن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا؟ جواب دیا: نہیں۔ دارقطنی نے کہا: یہ اسناد صحیح ہے اس کے راویوں کی عدالت میں کوئی اختلاف نہیں۔

عمرو بن مرہ نے کہا: میں نے ابوعبیدہ سے پوچھا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جنوں والی رات حاضر تھے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جن، نصیبین کے جنوں میں سے سات افراد تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی قوم کی طرف قاصد بنایا۔ زر بن حبیش نے کہا: وہ کل نو تھے ان میں سے ایک زوبعہ تھا (2)۔ قتادہ نے کہا: وہ اہل نینوی تھے۔ مجاہد نے کہا: وہ اہل حران تھے۔ عکرمہ نے کہا: وہ موصل کے جزیرہ سے تھے (3)۔

ایک قول یہ کیا گیا: وہ سات تھے، تین اہل نجران سے اور چار اہل نصیبین سے تھے۔ ابن ابی دنیا نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کہا اور اس میں نصیبین کا ذکر کیا، فرمایا: اسے میری طرف اٹھایا گیا یہاں تک کہ میں نے اسے دیکھ لیا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس کی بارش زیادہ ہو، اس کے درخت سرسبز و شاداب ہوں اور دریاؤں میں پانی زیادہ ہو۔ سہیلی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے وہ سات تھے، وہ یہودی تھے اور اسلام لائے، اسی وجہ سے کہا: **اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى** ان کے ناموں کے بارے میں کہا گیا: شاصر، ماصر، منشی، ماشی، احقب؛ ان پانچ کا ذکر ابن درید نے کیا ہے۔ ان میں سے عمرو بن جابر بھی ہے۔ ابن اسلام نے اس کا ذکر ابواسحاق سبیعی کی سند سے اپنے اشیاخ سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر

---

1۔ سنن دارقطنی، جلد 1، صفحہ 76 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 286 3۔ ایضاً

کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں چل رہے تھے تو ان کے لیے ایک بگولہ بلند ہوا پھر اس سے بڑا بگولہ آیا تو کیا دیکھتے ہیں ایک مردہ سانپ ہے ہم میں سے ایک آدمی نے اپنی چادر کا قصد کیا اسے پھاڑا اس کے کچھ حصہ سے سانپ کو کفن دیا اور اسے دفن کر دیا۔ جب رات تاریک ہوگئی تو دو عورتیں پوچھ رہی تھیں: عمرو بن جابر کو کس نے دفن کیا؟ ہم نے کہا: ہم نہیں جانتے عمرو بن جابر کون ہے؟ دونوں نے کہا: اگر تم نے اجر کی نیت کی ہے تو تم نے اسے پایا ہے فاسق جنوں نے مومن جنوں کے ساتھ جنگ کی تو عمرو کو قتل کر دیا گیا۔ وہ سانپ تھا جسے تم نے دیکھا تھا۔ وہ اس جماعت سے تھا جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا، پھر وہ اپنی قوم کی طرف خبردار کرنے والے ہو کر واپس لوٹ گئے۔ ابن سلام نے ایک اور روایت کا ذکر کیا جس نے اسے کفن دیا تھا وہ صفوان بن معطل تھا۔

میں کہتا ہوں: ثعلبی نے اس کی مثل خبر ذکر کی ہے، اس نے کہا: ثابت بن قطبہ نے کہا کچھ لوگ حضرت ابن مسعود کی خدمت میں آئے انہوں نے کہا: ہم ایک سفر میں تھے ہم نے ایک سانپ دیکھا جو اپنے خون میں لت پت تھا۔ ہم میں سے ایک آدمی نے اسے لیا اور ہم نے اسے مٹی میں دبا دیا، کچھ لوگ آئے انہوں نے کہا: عمرو کو کس نے دفن کیا ہے؟ ہم نے کہا: کون عمرو؟ انہوں نے کہا: وہ سانپ جسے تم نے فلاں جگہ دفن کیا، خبردار! وہ اس جماعت میں سے تھا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا مسلمان جنوں اور کافر جنوں میں جنگ ہوئی تو وہ شہید ہو گئے۔

اس روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نہ تو سفر میں تھے اور نہ دفن میں حاضر تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ابن ابی دنیا نے ایک تابعی کا ذکر کیا اس کا نام بھی لیا، ایک سانپ اس کے خیمہ میں داخل ہوا وہ پیاس کی وجہ سے ہانپ رہا تھا اس نے اسے پانی پلایا پھر وہ سانپ مر گیا تو اس تابعی نے اسے دفن کر دیا۔ رات کے وقت کوئی اس کے پاس آیا اسے سلام کیا اور اس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا وہ نصیبین کے جنوں میں سے تھا اس کا نام زوبعہ تھا۔

سہیلی نے کہا: حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فضائل میں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے جس کو ابوبکر بن طاہر اشبیلی نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے کہ اچانک آپ نے ایک مردہ سانپ دیکھا آپ نے اپنی زائد چادر سے اسے کفن دیا اور اسے دفن کر دیا تو کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا: اے سرق! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''تو بیابان میں مرے گا اور تجھے ایک صالح آدمی کفن دے گا''۔ پوچھا: اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے تو کون ہے؟ اس نے کہا: ان جنوں میں سے ایک جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا ان میں سے میں اور سرق باقی رہ گئے تھے یہ سرق فوت ہو چکا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک سانپ کو قتل کر دیا جسے آپ نے اپنے حجرہ میں قرآن سنتے ہوئے دیکھا جبکہ حضرت عائشہ قرآن حکیم پڑھ رہی تھیں۔ خواب میں ان کے پاس کوئی آیا اور ان سے کہا: آپ نے جنوں میں سے ایک مومن کو قتل کر دیا، وہ جن جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: اگر وہ مومن ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں داخل نہ ہوتا۔ آپ سے عرض کی گئی: وہ آپ کے پاس حاضر نہیں ہوا تھا مگر آپ نے نقاب اوڑھا ہوا تھا و

تو قرآن سننے کے لیے آیا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ گھبرا گئیں آپ نے غلام خرید ے اور انہیں آزاد کیا۔ سہیلی نے کہا: ہمارے پاس جو جنوں کے نام تھے ہم نے ان کا ذکر کر دیا، اگر وہ سات تھے تو احقب ان میں سے کسی کا وصف ہوگا۔ یہ اسم علم نہیں ہے بے شک وہ اسماء جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے وہ احقب کے ساتھ مل کر آٹھ بنتے ہیں۔

میں نے کہا: حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہامہ بن ہیم بن اقیس بن ابلیس۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مومن جنوں میں سے تھا یہ ان جنوں میں سے تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، سورۂ عم یتساءلون، سورۂ اذا الشمس کورت، سورۃ الحمد اور معوذتین پڑھائیں۔ اور یہ ذکر کیا وہ ہابیل کے قتل کے وقت حاضر تھا اور اس کے خون میں شریک ہوا تھا وہ غلام بن اعوام ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام سے ملا اور ان کے ہاتھ پر توبہ کی وہ حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت الیاس، حضرت موسیٰ بن عمران اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام سے ملا۔ ماوردی نے ان کے اسماء مجاہد سے ذکر کیے ہیں اور کہا: حسی، مسی، منشی، شاصر، ماصر، اُرد، اُنیان اور اُحقم۔ ان کا ذکر ابو عمرو عثمان بن احمد جو ابن سماک کے نام سے معروف ہیں نے کیا ہے کہا: محمد بن براء، زبیر بن بکار سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حمزہ بن عتبہ بن ابی لہب نصیبین والے ان جنوں کے نام ذکر کیا کرتے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کہتے: حسی، مسی، شاصر، ماصر، افخر، اُرد اور انیال۔

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ التفات (1) کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ قرآن اور اس کے سماعت کے لیے حاضر ہوئے۔ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ان میں سے بعض نے کہا: قرآن حکیم کو سننے کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (2) جبکہ آپ بطن نخلہ میں قرآن حکیم پڑھ رہے تھے جب انہوں نے آپ کی آواز کو سنا تو کہا: خاموش ہو جاؤ، وہ سات تھے ان میں سے ایک زوبعہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ کو نازل فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ معنی قریب قریب ہے۔

فَلَمَّا قُضِیَ لاحق بن حمید اور حبیب بن عبد اللہ بن زبیر نے اسے فلما قضی پڑھا یعنی فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے جب آسمان کو چوری چھپے سننے سے محفوظ کر دیا گیا تو وہ نکلے تاکہ اس کا جو سبب بنا وہ اس سے آگاہی حاصل کریں، وہ وادی نخلہ میں آئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ رہے تھے وہ کل سات تھے، انہوں نے اسے سنا اور

1۔ علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کلام کو غیب سے خطاب اور خطاب سے تکلم کی طرف پھیر دیا جائے یہاں کلام خطاب سے غیب کی طرف پھیری گئی ہے۔ مترجم

2۔ [illegible] 315

اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر گئے اور نبی کریم ﷺ کو اس کا علم نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ جنوں کو ڈرائیں اور ان کو قرآن پڑھ کر سنائیں اللہ تعالیٰ نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی بارگاہ میں بھیجا تا کہ وہ آپ سے قرآن سنیں اور اپنی قوموں کو ڈرائیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان پر قرآن کو پڑھا اور آپ اس سے فارغ ہوئے تو آپ کے حکم سے واپس گئے وہ اپنی قوم کے جنوں کا قصد کر رہے تھے، انہیں قرآن کی مخالفت سے خبردار کرنے والے تھے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے انہیں خبردار کرنے والے تھے اگر وہ ایمان نہ لائیں۔ یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں باقی ماندہ جنوں کو ڈرانے کے لیے بھیجا اس کے اوپر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: **یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ** اگر ایسا واقعہ نہ ہوتا تو وہ اپنی قوم کو نہ ڈراتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بات مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف قاصد بنا کر بھیجا تھا (1)۔ اسی تاویل کی بنا پر جنوں والی دو راتیں ہیں۔ یہ بحث پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں وہ روایت ہے جو اسی چیز پر دلالت کرتی ہے جس کی وضاحت **قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ** (الجن: 1) میں آئے گی صحیح مسلم میں حضرت معن سے مروی ہے کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہا میں نے مسروق سے پوچھا: کس نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ جنوں نے اس رات قرآن حکیم سنا (2)؟ تو مسروق نے کہا: تیرے باپ یعنی حضرت ابن مسعود نے بتایا کہ درخت نے آپ کو ان کے متعلق بتایا تھا۔

**قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝**

"انہوں نے (جا کر) کہا: اے میری قوم ہم نے (آج) ایک کتاب سنی ہے جو اتاری گئی ہے موسیٰ علیہ السلام کے بعد تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم! قبول کر لو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو اور اس پر ایمان لے آؤ بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو اور بچا لے گا تمہیں دردناک عذاب سے"۔

**قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى** کتاب سے مراد قرآن ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے۔ عطا نے کہا: وہ پہلے یہودی تھے تو اسلام لے آئے، اسی وجہ سے کہا: **اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں نہیں سنا تھا (3)، اسی وجہ سے انہوں نے **اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى** کہا۔

**مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ** یعنی وہ تورات کی تصدیق کرنے والے تھے۔ **یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ** وہ دین حق کی طرف دعوت

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 36
2۔ صحیح بخاری، کتاب بنیان الکعبہ، ذکر الجن قول اللہ قل أوحی إلی، جلد 1، صفحہ 544
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 312

دینے والے تھے وَ اِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین قدیم کی طرف۔

یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ داعی سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کی ذات جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث تھی۔ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے قبل کوئی نبی جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا۔

میں کہتا ہوں: اس امر پر وہ حدیث جو صحیح مسلم میں ہے دلالت کرتی ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی کو عطا نہیں کی گئیں، ہر نبی صرف اپنی قوم کے لیے مبعوث کیا جاتا تھا اور میں احمر و اسود کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں یا میرے لیے غنیمت حلال کی گئیں وہ مجھ سے قبل کسی کے لیے حلال نہیں کی گئیں، زمین میرے لیے پاکیزہ طہارت عطا کرنے والی اور مسجد بنادی گئی ہے، جس نماز کا وقت ہو جائے تو وہ جہاں ہو نماز پڑھ لے، مجھے ایک ماہ کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے اور مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے''(1)۔

مجاہد نے کہا: احمر و اسود سے مراد جن اور انسان ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے: ''مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور مجھ پر انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے''(2)۔

وَ اٰمِنُوْا بِهٖ ہ ضمیر سے مراد داعی ہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی قوم سے ستر افراد ایمان لائے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹے اور آپ کو بطحاء میں ملے ان پر قرآن حکیم کو پڑھا انہیں حکم دیا اور نہی کی۔

**مسئلہ:** یہ آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ امر، نہی، ثواب اور عقاب میں جن، انسانوں کی طرح ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مومن جنوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی ثواب نہیں کہ انہیں جہنم سے نجات دے دی جائے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ امام اعظم ابو حنیفہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے، فرمایا: جنوں کے لیے اس کے سوا کوئی ثواب نہیں کہ انہیں آگ سے پناہ دی جاتی ہے، پھر انہیں کہا جاتا ہے: تم مٹی ہو جاؤ جس طرح چوپاؤں کو کہا جائے گا: تم مٹی ہو جاؤ۔ دوسروں نے کہا: انہیں گناہوں پر سزا دی جائے گی اور احسان کی صورت میں ثواب دیا جائے گا جس طرح انسان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ امام مالک، امام شافعی اور ابن ابی لیلیٰ کا یہی نقطہ نظر ہے۔ ضحاک نے کہا: جن جنت میں داخل ہوں گے، وہ کھائیں گے اور پئیں گے۔ قشیری نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں ثواب دیا جائے گا اور وہ جنت میں داخل ہوں گے کیونکہ سورت کے آغاز میں فرمایا: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 199
2۔ ایضاً

عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ (انعام:130) آخر میں فرمایا: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں اس بارے میں مزید گفتگو ہوگی۔ انشاءاللہ۔

وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۳۲

’’اور جو قبول نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں زمین میں (کہ اس سے بچ کر بھاگ نکلے) اور نہیں اس کے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار یہ (منکر لوگ) کھلی گمراہی میں ہیں‘‘۔

فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کو ناپید پائے گا اور نہ اس پر سبقت لے جاسکے گا اَوْلِیَآءُ اس کے ایسے مددگار نہیں ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رکھیں۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۳۳

’’کیا انہوں نے نہ جانا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذرا تھکن محسوس نہ کی ان کے بنانے میں وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کردے بلکہ وہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے‘‘۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ یہاں رویۃ علم کے معنی میں ہے ان، اس کا اسم اور اس کی خبر رویۃ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔

وَ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى منکرین بعث کے خلاف استدلال ہے۔ لَمْ یَعْیَ کا معنی ہے وہ انہیں پیدا کرنے میں عاجز اور کمزور نہیں، یہ جملہ کہا جاتا ہے: عَیِیَ بأمرہ وعَیِیَ جب وہ ہدایت نہ پائے۔ اس میں ادغام اکثر ہوتا ہے جمع میں تو عیوا المخفف کہے گا۔ اس کو تشدید کے ساتھ عیوا بھی کہتے ہیں۔ کہا:

عَیُّوا　بأمرهم　كما　عَیَّتْ　ببیضتها　الحمامة

وہ اپنے معاملے میں یوں عاجز آگئے جس طرح کبوتری اپنے انڈے کے بارے میں عاجز آگئی۔

عَیِیتُ بأمری جب تو اس کی صحیح صورت کی طرف ہدایت نہ پائے أعیانی ھو اس نے مجھے عاجز کردیا۔ حضرت حسن بصری نے ولم یَعْیِ عین کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قلیل شاذ ہے کیونکہ عین کلمہ میں اعلال اور لام کلمہ میں تصحیح واقع نہیں ہوتی مگر چند اسماء میں ایسا ہوتا ہے، جس طرح غایۃ اور آیۃ ہے شعر کے علاوہ فعل میں ایسا نہیں ہوتا۔ فراء نے اس شعر کو پڑھا ہے، وہ شاعر کا قول ہے:

فكأنها　بين　النساء　سَبِيكَةٌ　تمشي　بِسُدَّة　بَيْتِها　فتُعْيِي

محل استدلال فتحی ہے۔ بقادر ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا: باء زائدہ ہے تاکید کے لیے آئی ہے، جس طرح اس ارشاد میں باء زائدہ ہے: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (النساء) تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ (المومنون:20) نسائی، فراء اور زجاج نے کہا: باء استفہام کا نائب ہے اور کلام کے آغاز میں نفی کا معنی ہے۔ زجاج نے کہا: عرب اسے نفی کے ساتھ داخل کرتے ہیں تو کہتا ہے: ماظننت إن زیدا بقائم (1) تو یہ نہیں کہتا: ظننت أن زیدا بقائم۔ اس باء کے داخل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ما داخل ہوا ہے اور ان داخل ہوا ہے جو تاکید کے لیے ہے، تقدیر کلام یہ ہے الیس اللہ بقادر جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ (یٰس:81) حضرت ابن مسعود، اعرج، جحدری، ابن اسحاق اور یعقوب نے اسے یقدر پڑھا ہے؛ ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ ان کی خبر میں باء کا داخل کرنا قبیح ہے۔ ابوعبید نے عام قراءت کو پسند کیا کیونکہ حضرت عبداللہ کی قراءت میں ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ (بنی اسرائیل:99) باء کے بغیر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

''اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا یہ حق نہیں۔ کہیں گے: ہمارے رب کی قسم! یہ حق ہے۔ اللہ فرمائے گا: اچھا اب چکھو عذاب کا مزا اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے''۔

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ انہیں وہ دن یاد دلا یا جس روز انہیں پیش کیا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا: اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا تو انہیں بیان کرنے والا کہے گا: فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ ما مصدریہ ہے یعنی اپنے کفر کے باعث عذاب چکھو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''پس (اے محبوب) آپ صبر کیجئے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا اور ان کے لیے (بددعا کرنے میں) جلدی نہ کیجئے جس روز وہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو خیال کریں گے کہ وہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر دن کی فقط ایک گھڑی، یہ پیغام حق ہے پس کیا نافرمانوں کے علاوہ بھی کسی کو ہلاک کیا جائے گا''۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حزم و صبر والے۔ مجاہد نے کہا: وہ پانچ ہیں

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 313

حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ یہ سب شریعتوں والے ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا: اولوا العزم رسول یہ ہیں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام (1)۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ وہ چوتھے ہو جائیں۔ سدی نے کہا: وہ چھ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ یہ سب سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں مذکور ہیں۔ مقاتل نے کہا: یہ چھ ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک اپنی قوم کی اذیتوں پر صبر کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگ پر صبر کیا، حضرت اسحاق علیہ السلام نے ذبح پر صبر کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچے کے گم ہونے اور نظر کے چلے جانے پر صبر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں میں گرنے اور قید خانے میں گرنے پر صبر کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیماری پر صبر کیا (2)۔ ابن جریج نے کہا: ان میں حضرت اسماعیل، حضرت یعقوب اور حضرت ایوب ہیں ان میں حضرت یونس، حضرت سلیمان اور حضرت آدم علیہ السلام نہیں۔

شعبی، کلبی اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ رسل ہیں جن کو جہاد کا حکم دیا گیا انہوں نے مکاشفہ کو ظاہر کیا اور کافروں سے جہاد کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ عظیم رسول ہیں جو سورۂ انعام میں مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یسع علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام، حسن بن فضل نے اس قول کو پسند کیا ہے کیونکہ اس کے بعد میں ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: 90)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تمام رسول اولوا العزم تھے؛ اسے علی بن مہدی طبری نے پسند کیا ہے۔ کہا: اس میں من جنس کو ظاہر کرنے کے لیے ہے بعضیت کو بیان کرنے کے لیے نہیں، جس طرح تو کہتا ہے: اشتریت أردیة من البز وأكسية من الخز میں نے بز کی بنی چادریں اور خز کی بنی کساءیں خریدیں، یعنی آپ صبر کریں جس طرح رسولوں نے صبر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام انبیاء اولوا العزم ہیں مگر حضرت یونس بن متی کیا تو نہیں دیکھتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر سے منع کیا گیا کہ آپ ان کی مثل ہو جائیں اس کی وجہ ان کا ہلکا پن اور جلد بازی ہے جو ان سے اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے تین امور کے ساتھ انہیں آزمایا۔ اللہ تعالیٰ نے عمالقہ کو ان پر مسلط کر دیا یہاں تک کہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 288 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 289

انہوں نے آپ کے اہل اور مال پر غارت گری مچائی۔ اللہ تعالیٰ نے بھیڑیے کو ان کے بیٹے پر مسلط کر دیا تو وہ اسے کھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو ان پر مسلط کر دیا تو اس نے آپ کو نگل لیا، یہ بات ابوالقاسم حکیم نے کہی ہے۔

بعض علماء نے کہا: اولوا العزم نبی بارہ ہیں جنہیں بنی اسرائیل کی طرف شام کے علاقہ میں بھیجا گیا۔ تو بنی اسرائیل نے ان کی نافرمانی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی طرف وحی کی کہ میں اپنا عذاب بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف بھیجنے والا ہوں۔ یہ امر رسولوں پر شاق گذرا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: اپنے لیے پسند کر لو اگر چاہو تو میں تم پر عذاب کو نازل کر دوں اور بنو اسرائیل کو نجات دے دوں اور اگر چاہو تو تمہیں نجات دے دوں اور عذاب بنی اسرائیل پر نازل کر دوں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا تو ان کی رائے اس بات پر متفق ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان پر عذاب کو نازل کر دے اور بنی اسرائیل کو نجات عطا فرما دے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دے دی اور ان پر عذاب کو نازل کر دیا اس کی صورت یہ بنی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زمین کے بادشاہوں کو مسلط کر دیا ان میں سے کسی کو آری سے چیر دیا گیا، کسی کے چہرے اور سر کی جلد اتار لی گئی، کسی کو سولی پر لٹکا دیا گیا یہاں تک کہ وہ مر گیا، کسی کو آگ میں جلا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: اولوا العزم چار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام (1)۔ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہیں کہا گیا: اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (بقرہ) پھر ان سے ان کے مال، ان کی اولاد، وطن اور ذات کے بارے میں امتحان لیا گیا تو جن جن امور میں ان کا امتحان لیا گیا ان میں آپ کو پورا اور سچا پایا گیا۔ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہوں نے عزم کا اظہار کیا جب ان کی قوم نے ان کو کہا: اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ (الشعراء) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۶۲﴾ (الشعراء) جہاں تک حضرت داؤد علیہ السلام کا تعلق ہے تو ان سے خطا ہوئی تو اس خطا پر انہیں متنبہ کیا گیا، آپ چالیس سال روتے رہے یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے درخت اُگ آئے تو آپ اس کے سائے میں بیٹھے۔ جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہوں نے یہ عزم کیا کہ وہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ نہ رکھیں گے۔ انہوں نے فرمایا: انها معبرة فاعبروها ولا تعمروها یہ ایک راستہ ہے اسے عبور کرو اسے آباد نہ کرو۔

گویا اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے ارشاد فرماتا ہے: صبر کیجئے یعنی جن امور میں آپ کو آزمایا گیا ہے ان میں سچے ہو جائیے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سچ کا اظہار کیا اپنے مولیٰ کی مدد پر اس طرح اعتماد کرتے ہوئے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اعتماد تھا، اپنی لغزشوں پر ایسے غم کا اظہار کیجئے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے غم کا اظہار کیا تھا اور دنیا میں ایسا زہد اختیار کیجئے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زہد اختیار کیا تھا۔ پھر یہ کہا گیا: یہ آیت آیت سیف سے منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت محکم ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے کیونکہ سورت مکی ہے؛ مقاتل نے یہ ذکر کیا ہے۔ یہ آیت غزوہ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جو مصیبت آپ کو پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 32

جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔ مقصود اس امر کو آپ پر آسان کرنا اور اس پر ثابت قدم کرنا تھا۔ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ مقاتل نے کہا: ان کے حق میں بددعا کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر عذاب کے نازل ہونے کے بارے میں جلدی نہ کیجئے کیونکہ قیامت کے روز یہ ان کے مقاصد میں سے سب سے بعیدی مقصد ہوگا۔ استعجال فعل کا مفعول محذوف ہے اور وہ عذاب ہے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ یحییٰ نے کہا: مَا يُوْعَدُوْنَ سے مراد عذاب ہے (1)۔ نقاش نے کہا: مراد آخرت ہے (2)۔ لَمْ يَلْبَثُوْٓا وہ دنیا میں نہ رہے یہاں تک کہ انہیں عذاب نے آلیا (3)؛ یہ یحییٰ کے قول کا مقتضا ہے۔ نقاش نے کہا: وہ اپنی قبروں میں رہیں گے یہاں تک کہ انہیں حساب کے لیے اٹھالیا جائے گا۔ اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ یعنی یوم قیامت کا ایک حصہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے جو عذاب دیکھا اس کی ہولناکی نے انہیں دنیا میں طویل عرصہ تک رہنے کے عمل کو بھلا دیا۔ پھر کہا: بَلٰغٌ کو رفع مبتدا کے مضمر ہونے کی بنا پر ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ (ابراہیم: 52) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء) بلاغ تبلیغ کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ٹھہرنا ہی بلاغ ہے (4)؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ اس تعبیر کی صورت میں وقف بَلٰغٌ اور نَّهَارٍ پر ہوگا۔

ابو حاتم نے ذکر کیا ان میں سے بعض نے وَ لَا تَسْتَعْجِلْ پر وقف کیا پھر لھم سے کلام کا آغاز کیا کلام یوں ہوگی لھم بلاغ۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ تو نے البلاغ اور لام میں فاصلہ کر دیا ہے۔ عربی زبان میں بلاغا اور بلاغ دونوں طرح جائز ہے نصب اس اعتبار سے کہ تقدیر کلام یہ ہوگی الا ساعة بلاغا کہ یہ مفعول مطلق ہے یا یہ ساعة کی صفت ہے، جر اس اعتبار سے کہ کلام ہے من نهار بلاغ۔ نصب کے ساتھ عیسیٰ بن عمر اور حضرت حسن بصری نے پڑھا ہے۔ بعض قراء سے یہ مروی ہے بلغ یہ امر کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں وقف مِّنْ نَّهَارٍ پر ہے پھر بَلٰغٌ سے کلام شروع ہوگی۔

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ یعنی اللہ کے حکم سے خارج۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ابن محیصن نے پڑھا فَهَلْ يُهْلِكُ اِلَّا الْقَوْمُ فعل قوم کی طرف منسوب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب عورت پر بچے کی پیدائش مشکل ہو جائے تو یہ دو آیتیں اور دو کلمے ایک کاغذ پر لکھے جائیں پھر انہیں دھویا جائے اور اسے پلایا جائے۔ وہ یہ ہیں: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ العظيم الحليم الكريم سبحان رب السموات و رب الأرض و رب العرش العظيم كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ اللہ تعالیٰ جو عظیم شان والا ہے اس نے سچ بولا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ہلاک نہیں کرتا مگر مشرک کو (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امید میں سب سے قوی آیت ہے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 289　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً　5۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 46

# سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

آیاتہا ۳۸ ۔ ۴۷ سورۃ محمد مدنیۃ ۹۵ ۔ رکوعاتہا ۴

سورۂ قتال یہ سورت محمد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی ہے؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا۔ ماوردی نے کہا: تمام کا قول یہی ہے (1) مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا یہ قول ہے: مگر ایک آیت جو حجۃ الوداع کے بعد نازل ہوئی جب آپ مکہ مکرمہ سے نکلے آپ بیت اللہ شریف کی طرف دیکھ رہے تھے اور غم کی وجہ سے رو رہے تھے تو آپ پر یہ آیت نازل ہوئی: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ ثعلبی نے کہا: یہ مکی ہے؛ ابن ہبۃ اللہ نے ضحاک اور سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے: یہ انتالیس آیات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اڑتیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ①

''جنہوں نے (خود بھی) حق کا انکار کیا اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے رہے''۔

حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد اہل مکہ ہیں (2) جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کیا انہوں نے اپنے آپ کو اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکا وہ دین اسلام ہے وہ مومنوں کو اس دین میں داخل ہونے سے روکا کرتے تھے؛ (3) یہ سدی کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد عن بیت اللہ جو بیت اللہ شریف کا قصد کرتے وہ انہیں روکتے۔ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے ان مکر و فریب کو باطل کر دیا (4) جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا کرتے تھے اور ان کا وبال ان پر ڈال دیا؛ یہ ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے حالت کفر میں جو اعمال کیے جنہیں وہ مکارم کا نام دیتے تھے جیسے صلہ رحمی، قیدیوں کو آزاد کرانا، مہمانوں کی خدمت کرنا، پڑوسیوں کی حفاظت کرنا ان سب کو باطل کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت بدر میں کھانا کھلانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی (5) وہ کل بارہ افراد تھے ابو جہل، حارث بن ہشام، عتبہ، شیبہ جو دونوں ربیعہ کے بیٹے تھے ابی، امیہ جو خلف کے بیٹے تھے منبہ، نبیہ جو حجاج کے بیٹے تھے، ابو البختری بن ہشام، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام اور حارث بن نوفل۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ②

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 290　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 47　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 290

4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 314　5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 151

”اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایمان لے آئے جو اتارا گیا (رسول معظم) محمد ﷺ پر اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دور کردیں ان سے ان کی برائیاں اور سنوار دیا ان کے حالات کو“۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد انصار ہیں مقاتل نے کہا: یہ قریش کے چند افراد کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں مومنوں اور کافروں کے بارے میں عام ہیں۔ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ کا معنی ہے ان کو باطل کردیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں ہدایت پانے سے گمراہ کردیا اس کی صورت یہ تھی کہ انہیں توفیق دینے سے پھیر دیا۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جس نے کہا: اس کا مصداق انصار ہیں اس نے صالحات سے مراد ان کو گھر دینے اور مال دینے میں ان کے ساتھ ہمدردی کرنا لیا ہے۔ جس نے کہا: مراد قریش ہیں تو عمل صالح سے مراد ہجرت ہے۔ جس نے کہا: یہاں عام مراد ہے تو صالحات سے مراد تمام وہ اعمال ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ یعنی حضرت محمد ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیا اس کے ساتھ کسی چیز میں مخالفت نہیں کی؛ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت محمد ﷺ جو لائے اس کے بارے میں آپ کی تصدیق کی۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ اس سے مراد ہے کہ ان کا ایمان ہی ان کے رب کی جانب سے حق تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ قرآن ان کے رب کی جانب سے حق ہے جو اس سے قبل وحی آئی تھی اسے منسوخ کردیا۔ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ مراد وہ سیآت ہیں جو ایمان لانے سے پہلے انہوں نے کی تھیں ان کو اس نے معاف کردیا وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ان کے عمل کو درست کردیا؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ قتادہ نے کہا: ان کے حال کو درست کردیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کے امور کو درست کردیا تینوں کا معنی قریب قریب ہے۔ اس کی یہ تاویل بھی کی گئی ہے جو امور ان کی دنیا سے متعلق ہیں ان کو درست کردیا نقاش نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ معنی ہے ان کی نیتوں کو درست کردیا۔ شاعر نے کہا:

فإن تُقبلي بالودّ أقبل بمثله　　وإن تدبري أذهب إلى حال باليا(1)

یہ اس تاویل کی بنا پر ان کے دین کی اصلاح پر محمول ہوگا۔ بال مصدر کی طرح ہے اس کا فعل معروف نہیں ضرورت شعری کے سوا عرب اس سے جمع کا صیغہ نہیں لاتے مگر ضرورت شعری میں ایسا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: بالات۔ مبرد نے کہا: بعض اوقات بال کسی اور جگہ قلب کے معنی میں ہوتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما یخطر فلان علی بالی فلاں میرے دل پر نہیں کھٹکتا۔ جوہری نے کہا: بال کا معنی نفس کی فارغ البالی ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: فلاں رخی البال فلاں فارغ البال ہے۔ بال کا معنی حال ہے، یہ جملہ کہا جاتا ہے: ما بالک تیرا کیا حال ہے۔ ان کا قول ہے: لیس ھذا من بالی یہ وہ چیز نہیں جس کی میں پرواہ کرتا ہوں۔ بال سے مراد سمندر کی مچھلیوں میں سے بڑی مچھلی ہے۔ یہ عربی لفظ نہیں۔ بالہ خوشبو والے برتن کو کہتے ہیں۔ یہ فارسی سے معرب ہے فارسی زبان میں یہ اصل میں بیلہ تھا۔ ابوذ ؤیب نے کہا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 291

كأن عليها بالةً لطيةً لها من خلال الدأيتين أريجُ

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝

''(یوں) اس لیے کہ جنہوں نے کفر کیا وہ باطل کی پیروی کرتے تھے اور جو ایمان لائے تھے وہ حق کی پیروی کرتے تھے جو ان کے رب کی طرف سے تھا اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے ان کے حالات''۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ذلك اسم اشارہ یہ محل رفع میں ہے۔ یعنی الامر کذلك۔ معاملہ اسی طرح ہے یا تقدیر کلام یہ ہوگی ذلك الاضلال والھدی جن دونوں کا ذکر گذر چکا ہے اس کا سبب یہ ہے کافر نے باطل کی پیروی کی اور مومن نے حق کی پیروی کی۔ باطل سے مراد شرک اور حق سے مراد توحید وایمان ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝ یعنی اس بیان کی طرح جس کی وضاحت کی گئی ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے نیکیوں اور برائیوں کے معاملہ کی وضاحت کرتا ہے اَمْثَالَهُمْ میں جو ضمیر ہے وہ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اور الَّذِيْنَ اٰمَنُوا کی طرف لوٹ رہی ہے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۟ ذٰلِكَ ۛؕ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝

''پھر جب (میدان جنگ میں) تمہارا کفار سے آمنا سامنا ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر لو تو پھر کس کر باندھو رسیاں بعد ازاں یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے، یہی حکم ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن وہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں بعض کو بعض سے، اور جو مار ڈالے گئے اللہ کی راہ میں پس اللہ ان کے اعمال ضائع نہیں ہونے دے گا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ جب دونوں فریقوں کو الگ الگ کر لیا تو کفار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کفار سے مراد مشرک ہیں جو بتوں کے پجاری تھے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 293

ہے: اس سے مراد ہر وہ فرد ہے جو دین کا مخالف ہے وہ مشرک ہو یا کتابی ہو جبکہ اس کا کوئی عہد و پیمان نہ ہو؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا اور ابن عربی نے اسے پسند کیا ہے اور کہا: عموم آیت کی وجہ سے یہی صحیح ہے(1)۔ فَضَرْبَ الرِّقَابِ مفعول مطلق ہے۔ زجاج نے کہا: فاضربوا الرقاب ضرب الرقاب کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ قتل عموماً اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اغراء کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ کلام اس طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: یا نفس صبرا ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام اقصدوا ضرب الرقاب ہے ارشاد فرمایا: فَضَرْبَ الرِّقَابِ۔ یہ نہیں کہا ماقتلوھم کیونکہ قتل کے لفظ کی بجائے ضرب رقاب میں سختی کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں خوفناک ترین صورت میں اس کے قتل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ اس کی گردن کا کاٹنا اور ایسے عضو کو اڑانا ہے جو بدن کا سردار، اس کا بلند حصہ اور وجیہ ترین عضو ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ یعنی جب تم قتل کا عمل زیادہ کر چکو۔ سورۂ انفال میں یہ بحث حَتّٰى یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ میں گزر چکی ہے۔ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یعنی جب تم قیدی بنا چکو۔ وثاق یہ ایثاق کا اسم ہے بعض اوقات یہ مصدر ہوتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: أوثقته ایثاقا و وثاقا جہاں تک وثاق کا تعلق ہے تو یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کو باندھا جاتا ہے، جس طرح رباط یہ قشیری کا نقطہ نظر ہے۔ جوہری نے کہا: اوثقه فی الوثاق یعنی اسے باندھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، وثاق واؤ کے کسرہ کے ساتھ، اس میں یہ لغت ہے۔ باندھنے کا حکم اس لیے دیا تا کہ وہ کھسک ہی نہ جائیں۔

فَاِمَّا مَنًّۢا یعنی یا تو بغیر فدیہ کے مطلق ان پر احسان کیا جائے وَ اِمَّا فِدَآءً یا فدیہ لے کر انہیں آزاد کیا جائے۔ ان دونوں کو فعل مضمر کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔ اسے فدی الف مقصورہ کی صورت میں فاء کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فإما أن تمنوا علیهم منا وإما أن تفادوهم فداء۔ بعض علماء سے یہ مروی ہے کہ میں حجاج کے پاس کھڑا تھا جب عبدالرحمٰن بن اشعث کے ساتھی اس کے پاس لائے گئے ان کی تعداد چار ہزار آٹھ سو تھی اس نے تین ہزار کے قریب افراد کو قتل کر دیا یہاں تک کہ کندہ قبیلہ کا ایک آدمی اس کے پاس آیا اس نے کہا: اے حجاج! تو سنت اور کرم سے اعراض کرے گا تو اللہ تعالیٰ تجھے بھلائی کے ساتھ بدلہ نہیں دے گا۔ اس نے پوچھا: یہ کیوں؟ اس آدمی نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے کفر کیا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! نہ تو نے احسان کیا اور نہ ہی فدیہ لیا۔ تمہارے شاعر نے کہا جبکہ وہ تمہارے مکارم، صدق کا وصف بیان کرتا ہے:

ولانقتل الأسری ولانفکھم     إذا أثقل الأعناق حِملُ المغارم

نہ ہم قیدیوں کو قتل کرتے ہیں اور نہ ہی ہم انہیں چھڑاتے ہیں جب چٹیوں کے بوجھ گردنوں کو بوجھل کر دیں۔

حجاج نے کہا: ان مردہ لاشوں پر افسوس! کیا ان میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو اس قسم کی کلام اچھے انداز میں کرتا۔ جو لوگ بچ گئے ہیں ان کو آزاد کر دو۔ اس روز باقی قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ اس آدمی کے بقول وہ دو ہزار تھے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے اور پانچ اقوال ذکر کیے ہیں:

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1700

1۔ یہ منسوخ ہے، یہ بتوں کے پجاریوں کے بارے میں ہے ان سے فدیہ لینا اور ان پر احسان کرنا جائز نہیں ان کے نزدیک اس کا ناسخ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ:5) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (الانفال:57) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (التوبہ:36) یہ قتادہ، ضحاک، سدی، ابن جریج اور عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے؛ کوفہ کے بہت سے علماء نے یہی بات کی ہے۔ عبدالکریم جوزی نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف ایک کے بارے میں خط لکھا گیا جو قید کیا گیا تھا(1)۔ انہوں نے یہ ذکر کیا کہ اس نے اتنے اتنے فدیہ کے بدلے میں جان بخشی کی التماس کی ہے۔ فرمایا: اسے قتل کر دو ایک مشرک آدمی کا قتل مجھے اتنے اتنے مال کی بنسبت زیادہ محبوب ہے۔

2۔ یہ تمام کفار کے بارے میں ہے علماء اور اہل نظر کی ایک جماعت کے قول کے مطابق یہ منسوخ ہے ان میں قتادہ اور مجاہد بھی ہیں۔ انہوں نے کہا: جب مشرک کو قید کیا جائے تو اس پر احسان کرنا جائز نہیں اور نہ اس سے شرط پر فدیہ لینا جائز ہے کہ اسے واپس مشرکوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک صرف عورت کا فدیہ لینا جائز ہے کیونکہ اس کو قتل نہیں کیا جا سکتا، اس آیت کی ناسخ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ:5) ہے کیونکہ سورۂ براءت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ ضروری ہے کہ مشرک کو قتل کر دیا جائے مگر جس کے قتل کو ترک کرنے میں دلیل قائم ہو جس طرح عورتیں، بچے اور جن سے فدیہ لیا جاتا ہے؛ امام ابوحنیفہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ وجہ یہ خوف ہے کہ دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں۔

عبدالرزاق، معمر سے وہ قتادہ سے روایت نقل کرتے ہیں فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً اسے فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (الانفال:57) نے منسوخ کر دیا۔ مجاہد نے کہا: اسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ:5) نے منسوخ کیا ہے؛ یہ حکم کا قول ہے۔

3۔ یہ آیت ناسخ ہے؛ یہ ضحاک اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ثوری نے جویبر سے وہ ضحاک سے روایت نقل کرتے ہیں فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ:5) کو فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً نے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن مبارک نے ابن جریج سے وہ عطا سے روایت نقل کرتے ہیں فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً مشرک کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر احسان کیا جائے گا اور اس سے جذیہ لیا جائے گا(2)، جس طرح الله تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اشعث نے کہا: حضرت حسن بصری قیدی کو قتل کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور یہ آیت پڑھا کرتے فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حضرت حسن بصری نے یہ بھی کہا آیت میں تقدیم و تاخیر ہے گویا فرمایا: فضرب الرقاب حتی تضع الحرب اوزارھا پھر فرمایا: حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ اور اس نے یہ گمان کیا کہ امام کو حق حاصل نہیں کہ جب قیدی اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اسے قتل کرے لیکن اسے تین چیزوں میں اختیار ہے۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 50　　2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 34

1۔ اس پر احسان کرے۔ 2۔ اس سے فدیہ لے۔ 3۔ اس کو غلام بنالے۔

4۔ سعید بن جبیر کا قول ہے: فدیہ اور قید کرنا نہیں مگر جب تلوار سے بہت زیادہ افراد کو قتل کیا جا چکا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (الانفال: 67) جب اس کے بعد قیدی بنائے جائیں تو امام کو حق حاصل ہے کہ جو اس کی رائے ہو اس پر عمل کرے خواہ وہ قتل کرے یا کوئی اور معاملہ کرے۔

5۔ آیت محکم ہے امام کو ہر حال میں اختیار ہے؛ اسے علی بن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے؛ یہ قول کثیر علماء نے کیا ہے ان میں حضرت ابن عمر، حضرت حسن بصری، عطا ہیں یہی امام مالک، امام شافعی، ثوری، اوزاعی، ابو عبید وغیرہ کا قول ہے۔ یہی پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے یہ کہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کو غزوہ بدر کے موقع پر انتقام کے طور پر قتل کیا تھا اور باقی بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا تھا۔ ثمامہ بن اثال حنفی جبکہ وہ آپ کے پاس قیدی تھا پر احسان کیا تھا، سلمہ بن اکوع سے لونڈی لی تھی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے بہت سے لوگوں کا فدیہ دیا تھا۔ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکڑ لیا تھا اور ان پر احسان کیا تھا، آپ نے ہوازن کے قیدیوں پر احسان کیا تھا۔ یہ سب صحیح میں ثابت ہے اور یہ سب باتیں سورۃ الانفال میں گذر چکی ہیں۔ نحاس نے کہا: یہ تعبیر اس شرط پر ہے کہ یہ دونوں آیتیں محکم ہیں ان دونوں پر عمل کیا جاتا ہے وہ حضرت حسن بصری کا قول ہے کیونکہ نسخ قطعی امر کے لیے ہوتا ہے جب دونوں آیتوں پر عمل کرنا ممکن ہو تو نسخ کے قول کا کوئی معنی نہیں جب یہ جائز ہے کہ اس حکم پر عمل کیا جائے جب کافروں سے ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہم ان کو قتل کریں جب قیدی بنایا جائے گا تو قتل کرنا، غلام بنانا، فدیہ دینا اور احسان کرنا بھی جائز ہوگا جس میں مسلمانوں کے لیے خیر کا پہلو موجود ہو؛ یہ قول اہل مدینہ، امام شافعی اور ابو عبید سے مروی ہے۔ امام طحاوی نے ایک رائے امام اعظم ابو حنیفہ سے بھی یہی بیان کی ہے، مشہور وہ ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا مجاہد اور ابن جبیر نے کہا: اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تشریف لانا ہے(1)۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: معنی ہے کوئی دین نہیں ہے مگر دین اسلام۔ ہر یہودی، ہر نصرانی اور ہر ملت والا اسلام قبول کرے اور بکری بھیڑیے سے بے خوف ہو جائے، اسی کی مثل حضرت حسن بصری، فراء اور کسائی سے قول مروی ہے۔ کسائی نے کہا: یہاں تک کہ مخلوق مسلمان ہو جائے۔ فراء نے کہا: یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور کفر ناپید ہو جائے۔ کلبی نے کہا: یہاں تک کہ اسلام تمام ادیان پر غالب آ جائے (2)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اوزار کا معنی اسلحہ ہے، معنی ہے رسیاں باندھ دو یہاں تک کہ تم امن میں ہو جاؤ اور تم اسلحہ رکھ دو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے یعنی وہ دشمن جو برسرپیکار تھے وہ اپنے اوزار رکھ دیں۔ اوزار سے مراد ان کا اسلحہ ہے یعنی شکست کھا جائیں یا جنگ کو ترک کر دیں، اور خچروں کو بھی اوزار

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 51　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 294　3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 36

کہتے ہیں، اعشیٰ نے کہا:

وأعددت للحرب أوزارها رماحا طوالا وخيلا ذكورا(1)

میں نے جنگ کے لیے خچروں کو تیار کیا ہے لمبے نیزے اور مذکر گھوڑے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا کا معنی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے بوجھ رکھ دے، اوزار کا معنی بوجھ ہے، اسی معنی میں وزیر الملک ہے کیونکہ وہ بادشاہ کی جانب سے بوجھ اٹھاتا ہے۔ اثقالها سے مراد اسلحہ ہے کیونکہ اس کا بوجھ بڑا وزنی ہوتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: حضرت حسن بصری اور عطا نے کہا آیت میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی ہے گردنیں اڑاؤ یہاں تک کہ جنگ اپنا بوجھ اتار دے جب تم ان کو کثرت سے قتل کر چکو تو رسیوں کو مضبوطی سے باندھو۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسیر کو قتل کرے۔ حجاج سے مروی ہے کہ اس نے ایک قیدی حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالے کیا تا کہ آپ اسے قتل کریں تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم نہیں دیا اور یہ آیت پڑھی حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ہم نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا اور اس پر عمل بھی کیا احسان کرنے اور فدیہ لینے کی وضاحت میں کسی غیر چیز کے منع کا ذکر نہیں اللہ تعالیٰ نے زنا کے بارے میں کوڑے مارنے کا حکم دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم دیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے شائد حجاج کے ہاتھ سے قیدی لے کر قتل کرنے کو مکروہ جانا اور اس نے جو کہا تھا اس سے معذرت کر لی۔ تیرا رب خوب جانتا ہے۔

ذٰلِكَ ۛ وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ذلك محل رفع میں ہے جس طرح پہلے گذر چکا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی الأمر ذلك الذی ذکرت و بینت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس معنی کی بنا پر منصوب ہے افعلوا ذلك یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو، معنی ہے یہ کفار کا حکم ہے یہ ایسا کلمہ ہے جسے فصیح اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ ایک کلام سے دوسری کلام کی طرف نکلتا ہے، وہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هٰذَا ۛ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۝ (ص) یعنی یہ حق ہے اور میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ ظالموں کے لیے یہ انجام ہے لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ کا معنی ہے انہیں جنگ کے بغیر ہلاک کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں فرشتوں کے لشکروں کے ساتھ ہلاک کر دے گا۔

وَ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ یعنی تمہیں جنگ کا حکم دیا تا کہ وہ آزمائے اور تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ امتحان میں ڈالے تو وہ مجاہدین اور صبر کرنے والوں سے آگاہ ہو جائے، جس طرح اس سورت میں ہے۔

وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اس سے مراد غزوہ احد میں شہید ہونے والے مومن ہیں فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ عام قراءت قاتلوا ہے؛ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ ابو عمرو اور حفص نے قُتِلُوْا قاف کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت حسن بصری کی قراءت اس طرح ہے مگر انہوں نے تاء کو مشدد پڑھا ہے تا کہ کثرت کے معنی پر دلالت کرے۔ جحدری، عیسیٰ بن عمر اور ابو حیوہ نے قتلوا الف کے بغیر پڑھا ہے۔ مراد ہے جنہوں نے مشرکوں کو قتل کیا۔ قتادہ نے لکھا

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 36

ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت غزوہ احد کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ ﷺ ایک گھاٹی میں موجود تھے۔ صحابہ کرام میں زخم اور شہادت کا عمل بہت ہو چکا تھا مشرکوں نے اعلان کیا: اعل ھبل مسلمانوں نے نعرہ لگایا: اللہ اعلی واجل۔ مشرکوں نے کہا: یہ دن بعد کے دن کے مقابل ہے اور جنگ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے مومنو! تم کہو کوئی برابری نہیں، ہمارے مقتول اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہارے مقتول آگ میں ہیں انہیں عذاب دیا جاتا ہے''۔ مشرکوں نے کہا: ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں (1)۔ مسلمانوں نے کہا: اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ اس کا ذکر سورۂ آل عمران میں گذر چکا ہے۔

## سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝

''وہ پہنچا دے گا انہیں بلند مدارج پر اور سنوار دے گا ان کے حالات کو''۔

قشیری نے کہا: ابو عمرو کی قراءت قتلوا بڑی بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ مقتول کی یہ صفت نہیں ذکر کی جاتی۔ دوسرے علماء نے کہا: معنی ہے عنقریب وہ انہیں جنت کی طرف لے جائے گا ان میں جو باقی ہیں انہیں ہدایت عطا فرما دے گا۔ ابن زیاد نے کہا: وہ قبر میں منکر و نکیر کے ساتھ دلیل قائم کرنے میں ان کی رہنمائی کرے گا (2)۔ ابو المعالی نے کہا: بعض اوقات ہدایت کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد مومنوں کو جنت کے راستوں کی طرف راہنمائی کرنا اور ایسے راستوں کی طرف راہنمائی کرنا ہے جو جنت کی طرف جاتے ہیں۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو مجاہدین کی صفت میں ہے: فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ (فالصافات: 23) اس کا معنی ہے انہیں اس کی طرف تم لے جاؤ۔

## وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝

''اور داخل کرے گا انہیں بہشت میں جس کی پہچان اس نے انہیں کرا دی تھی''۔

جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو انہیں کہا جائے گا: اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ تو وہ اپنے گھروں کو ان جمعہ پڑھنے والوں سے زیادہ جانتے ہوں گے جب وہ اپنے گھروں کی طرف لوٹتے ہیں؛ یہ معنی مجاہد اور اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بخاری شریف میں ایسی حدیث موجود ہے جو اس قول کی صحت پر دلالت کرتی ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مومنوں کو جہنم سے چھٹکارا دیا جائے گا تو انہیں جنت اور جہنم کے درمیان پل پر روک لیا جائے گا تو ان میں سے بعض کے بعض پر مظالم کو بیان کیا جائے گا جو ان کے درمیان ہوئے تھے یہاں تک کہ جب انہیں پاک صاف کر دیا جائے گا تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی (3)۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے! ان میں سے ایک جنت میں اپنے گھر کے بارے میں دنیا میں اپنے گھر سے زیادہ آگاہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 53 — 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 294

3۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 967

گیا ہے: عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾ الله تعالیٰ ان کے لیے بیان کرے گا یہاں تک کہ وہ بغیر راہنمائی طلب کیے اس کو پہچان لیں گے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: الله تعالیٰ نے ان کے لیے دنیا میں جنت کی صفت بیان کی جب وہ اس میں داخل ہوئے تو وہ اس کی صفت سے اسے پہچان گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں حذف ہے، تقدیر کلام یہ ہے عرف طرقها ومساكنها وبيوتها لهم تو مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ ایک پہچان راہنمائی کی صورت میں ہوئی یعنی وہ فرشتہ جو بندے کے عمل پر مقرر تھا وہ اس بندے کے سامنے چلے گا اور بندہ اس کے پیچھے پیچھے چلے گا یہاں تک کہ بندہ اپنے مکان تک پہنچ جائے گا۔ فرشتہ ان تمام چیزوں کا اسے تعارف کروائے گا جو اس کے لیے جنت میں تیار کی گئیں۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی روایت اس کا رد کرتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جنتیوں کے لیے مختلف قسم کی لذتوں کے ساتھ انہیں خوشبودار بنا دے گا۔ یہ عرف سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد پاکیزہ خوشبو ہے۔ طعام معرف خوشبودار کھانا۔ عرب کہتے ہیں: عرفت القدر یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس میں نمک اور مصالحہ جات ڈال کر مزے دار بنا دے۔ شاعر ایک آدمی سے خطاب کرتا ہے اور اس کی مدح بیان کرتا ہے:

عَرُفْتَ كإتْبٍ عرفته اللَّطائم

وہ اسے کہتا ہے: کما عَرُف الإتب اس سے مراد بقیرا اور بقیرة ہے یہ ایسی قمیص ہوتی ہے جس کی آستین نہیں ہوتی جسے عورتیں پہنتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے کھانے کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے ایک دوسرے کے اوپر رکھنا۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: حریر معرف یعنی اس کا بعض بعض پر ہے۔ یہ عرف متتابع سے مشتق ہے جس طرح گھوڑے کی گردن پر بال ہوتے ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾ یعنی طاعت کی توفیق دی یہاں تک وہ جنت کے مستحق بن گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اہل آسمان کو بتایا کہ یہ جنت ان کے لیے ہے مقصد ان کی کرامت کا اظہار تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اطاعت شعاروں کو پہچان کرائی کہ یہ جنت ان کے لیے ہے۔

## يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴿۷﴾

''اے ایمان والو! اگر تم الله (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور (میدان جہاد میں) تمہیں ثابت قدم رکھے گا''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ اگر تم الله تعالیٰ کے دین کی مدد کرو گے تو کفار کے خلاف الله تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا، اس کی مثل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج: 40) یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ قطرب نے کہا: اگر تم الله کے نبی کی مدد کرو گے تو الله تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ معنی ایک ہی ہے۔

وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴿۷﴾ یعنی جنگ کے وقت تمہیں ثابت قدم رکھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسلام پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پل صراط پر تمہیں ثابت قدم رکھتا ہے۔ ایک قول کیا گیا مراد ہے: امن دے کر دلوں کو ثابت رکھتا ہے تو ثابت قدمی سے مراد جنگ کے وقت مدد کرنا ہے۔ سورۃ الانفال میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ وہاں ہی فرمایا: اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى

الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الانفال:12) وہاں واسطہ کو ثابت رکھا اور یہاں اس کی نفی کر دی جس طرح اس آیت میں ملائکہ کو ثابت رکھا قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (السجدۃ:11) پھر اس قول میں اس کی نفی کر دی اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ (الروم:40) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ (الملک:2) اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

## وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝

''اور جنہوں نے (حق کا) انکار کیا (خدا کرے) وہ منہ کے بل اوندھے گریں اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے''۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مبتدا ہونے کی حیثیت میں رفع کا تقاضا کرتا ہے اور نصب اس وجہ سے جو اس کی تفسیر کر رہا ہے یعنی فَتَعْسًا لَّهُمْ گویا فرمایا: اتعس الذین کفروا۔ فَتَعْسًا لَّهُمْ یہ بددعا کے طریقہ پر مفعول مطلق کی حیثیت سے منسوب ہے: یہ فراء کا قول ہے، جس طرح سَقْیًا لہ و رَعْیًا۔ یہ کلام لعالہ کی ضد ہے کیونکہ لعالہ دعائیہ کلمہ ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

فالتَّعْسُ أَدْنٰی لھا من أن اقول لَعَا (1)۔　میرا اس کے حق لعا کہنا اولیٰ تعس کہنے سے بہتر ہے۔

اس میں دس اقوال ہیں: 1۔ اس کا معنی ہے بعدالھم (2)؛ یہ حضرت ابن عباس اور ابن جریج کا قول ہے۔ 2۔ خُزْنًا لھم (3)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ 3۔ شقاء لھم (4)؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ 4۔ شتمالھم من اللہ (5)؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ 5۔ ھلاکالھم (6)؛ یہ ثعلب کا قول ہے۔ 6۔ خیبة لھم (7)؛ یہ ضحاک اور ابن زید کا قول ہے۔ 7۔ قبحالھم (8)؛ یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔ 8۔ رغمالھم (9)؛ یہ بھی ضحاک کا قول ہے۔ 9۔ شرالھم؛ یہ بھی ثعلب کا قول ہے۔ 10۔ شقوة لھم؛ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔ سب میں بددعا کا معنی پایا جاتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تعس سے مراد انحطاط (10) (گرنا) اور لغزش کھانا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: تعس کا معنی ہے منہ کے بل گرنا۔ نکس کا معنی ہے سر کے بل گرنا (11)۔ کہا: تعس کا معنی ہلاک ہونا ہے۔ جوہری نے کہا: اس کا اصل معنی منہ کے بل گرنا۔ یہ انتعاش (گرنے کے بعد اٹھنا) کی ضد ہے۔ قد تَعَس یَتْعَس تَعْسًا۔ أتعسه الله۔ مجمع بن ہلال نے کہا:

تقول وقد أفردتُها من خَلِیلها　تَعِسْتَ کما أتْعَسْتَنِي یامُجَمِّعُ

یہ جملہ کہا جاتا ہے: تعسا لفلان۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت کو لازم کر دیا۔ قشیری نے کہا: ایک قوم نے تعس کو جائز قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی معنی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دینار، درہم، دثار

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 318　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 295　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً
5۔ ایضاً　6۔ ایضاً　7۔ ایضاً　8۔ ایضاً
9۔ ایضاً　10۔ ایضاً　11۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 112

(بڑی چادر جو پورے جسم کو ڈھانپ لے) اور سیاہ مربع چادر کا غلام ہلاک ہو گیا، اگر اسے عطا کیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے اور اگر اسے نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے''(1)۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے اس حدیث کی بعض اسناد میں یوں مروی ہے تعس وانتکس واذا شیك فلا انتقش (2) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے سب میں بددعا کا معنی پایا جاتا ہے۔

وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ان کے اعمال کو باطل کر دیا کیونکہ وہ شیطان کی طاعت میں تھے فَتَعْسًا میں فاء داخل ہوتی ہے اس ابہام کی وجہ سے جو اَلَّذِيْنَ میں ہے۔ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ جملہ خبر یہ ہے اَلَّذِيْنَ کے لفظ پر محمول ہے، کیونکہ یہ لفظ کے اعتبار سے خبر ہے فاء کا دخول معنی کے اعتبار سے ہے اور اَضَلَّ لفظ پر محمول کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝

''یہ اس لیے کہ انہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا پس اس نے ضائع کر دیے ان کے اعمال''۔

ذٰلِكَ کا مشار الیہ الاضلال والاتعاس ہے۔ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد کتب اور شرائع ہیں۔ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝ ان کے لیے بھلائی کی جو صورتیں موجود تھیں، جس طرح بیت اللہ شریف کی آبادی، مہمان نوازی، قربانی کی مختلف صورتیں۔ اللہ تعالیٰ مومن کے علاوہ کسی کا عمل قبول نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال یعنی بتوں کی عبادت کو برباد کر دیا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؗ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝

''تو کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تا کہ وہ خود دیکھ لیتے کہ کیسے انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان سے پہلے گزرے اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی نازل کر دی اور کفار کے لیے اسی قسم کی سزائیں ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے احوال کو بیان کیا تا کہ ایمان کے وجوب پر آگاہی ہو پھر اس امر کو نظر و فکر کے ساتھ ملایا۔ کیا یہ لوگ عاد، ثمود، قوم لوط وغیرہ کے علاقوں میں نہیں گھومے پھرے تا کہ ان سے عبرت حاصل کریں اور اپنے دلوں سے غور و فکر کریں کہ ان سے قبل جو کافر ہوئے ہیں ان کا انجام کیسے ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کو جڑ سے اکھیڑ دیا، یہ جملہ کہا جاتا ہے: دمرہ تدمیرا اور دمر علیہ، دونوں کا معنی ایک ہی ہے پھر مشرکین مکہ کو دھمکی دی فرمایا: کافروں کے لیے اسی کی مثل ہے یعنی ان کے لیے بھی اسی کی مثل بربادی ہو گی۔ زجاج اور طبری نے کہا: ھاء ضمیر عاقبۃ کی طرف لوٹ رہی ہے قریش کے کافروں کے لیے ایسا ہی انجام ہو گا جیسا انجام ان لوگوں کا ہوا جو سابقہ امتوں میں سے تھے جنہوں نے جھٹلایا اگر یہ کفار قریش ایمان نہ لائے (3)۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝

''یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کفار کا کوئی مددگار نہیں''۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب الحراسۃ فی الغدو فی ... ل اللہ، جلد 1، صفحہ 404

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 315

3۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 56

یعنی اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور مددگار ہوگا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت وہی ہے ذلك بأن الله ولي الذين آمنوا مولیٰ سے یہاں مراد مددگار ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ شاعر نے کہا:

فَغَدَتْ كِلَا الفَرْجَيْنِ تحسبُ أنه ۔۔۔ مَوْلَى المخافة خَلْفُها وأمامُها

وہ گائے دونوں کھلے میدانوں کو گمان کرتی ہے کہ وہ آگے سے اور پیچھے سے خوف کی جگہ ہے۔

قتادہ نے کہا: یہ آیت غزوہ احد کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھاٹی میں تھے جب مشرکوں نے یہ نعرہ لگایا تھا دن دن کے مقابلہ میں ہے لنا العزى ولا عزى لكم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قولوا الله مولانا ولا مولى لكم ''تم کہو اللہ ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں'' (1)۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔

وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ۝ اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کی مدد کرے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ داخل فرمائے گا جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے (سدا بہار) باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں، اور جنہوں نے کفر کیا وہ عیش اڑا رہے ہیں اور محض کھانے (پینے) میں مصروف ہیں ڈنگروں کی طرح حالانکہ آتش جہنم ان کا ٹھکانہ ہے''۔

اس آیت کی وضاحت کئی مواقع پر گذر چکی ہے۔ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ جنہوں نے کفر کیا وہ دنیا میں لطف اندوز ہوں گے یا وہ چوپائے ہیں، ان کے لیے کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی مگر ان کے پیٹ اور ان کی شرمگاہیں، وہ آنے والے دن میں جو کچھ ہونے والا ہے اس سے غافل ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومن دنیا میں زادراہ پر اکتفا کرتا ہے، منافق زیب و زینت کرتا ہے اور کافر لطف اندوز ہوتا ہے وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۝ آگ ہی ان کا ٹھکانہ اور منزل ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ۝

''اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہم نے ان بستیوں کے مکینوں کو ہلاک کر دیا پس کوئی ان کا مددگار نہ تھا''۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ کاین کے بارے میں گفتگو آل عمران میں گذر چکی ہے، یہاں یہ کم کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وکم من قریۃ اخفش نے لبید کا شعر پڑھا۔

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 293

كأين رأينا من ملوك وسوقة و مفتاح قيد للأسير المكبل(1)

کتنے ہی بادشاہوں اور رعیتوں کو دیکھا۔ اس کا معنی ہے کتنے ہی بستیوں والے ہیں۔ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيٓ اَخْرَجَتْكَ یعنی جنہوں نے آپ کو بستی سے نکالا ان سے وہ زیادہ طاقتور تھے اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ قتادہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے غار ثور کی طرف نکلے تو مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ''اللھم اے مکہ تو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور مجھے سب شہروں سے زیادہ محبوب ہے اور مشرک جو تیرے اندر رہنے والے ہیں اگر مجھے نہ نکالتے تو میں تجھ سے نہ نکلتا'' تو یہ آیت نازل ہوئی (2)؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا یہ حدیث صحیح ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝

''کیا وہ شخص جس کے پاس روشن دلائل ہیں اپنے رب کے پاس سے اس (بدبخت) کی مانند ہے آراستہ کر دیے گئے جس کے لیے اس کے برے اعمال اور وہ پیروی کرتے رہے اپنی خواہشوں کی''۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ یہاں ہمزہ استفہام تقریری ہے۔ عَلٰى بَيِّنَةٍ کا معنی ہے ثبات و یقین پر؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (3) بَيِّنَةٍ سے مراد وحی ہے 'كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ سوء عمل سے مراد بتوں کی عبادت ہے من سے مراد ابو جہل اور کفار ہیں۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝ یعنی جو خواہش کی اس کی پیروی کی۔ یہ تزیین، خلق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دعوت اور وسوسہ کے اعتبار سے شیطان کی جانب سے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کافر کی جانب سے ہو، یعنی اس نے اپنے لیے اپنا برا عمل مزین کر کے پیش کیا اور کفر پر اصرار کیا اور سُوْٓءُ، من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اور اتَّبَعُوْٓا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے کہا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝

''احوال اس جنت کے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا اور نہریں ہیں دودھ کی جس کا ذائقہ نہیں بدلتا اور نہریں ہیں شراب کی جو لذت بخشتی ہے پینے والوں کے لیے اور نہریں ہیں شہد کی جو صاف ستھرا ہے اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 296
2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل مكة، حدیث نمبر 3861، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 296

(مزید برآں ان کے لیے) بخشش ہوگی اپنے رب کی طرف سے (سوچو!) کیا یہ ان کی مانند ہوں گے جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو۔

**مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ** جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ اللہ تعالیٰ نے ان جنتوں کی صفت بیان کی یعنی اس جنت کی صفت جو متقین کے لیے تیار کی گئی۔ سورۂ رعد میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب بنٹھ نے مثال الجنة التی وعد المتقون قراءت کی ہے۔

**فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ** ایسا پانی جس کی بو تبدیل نہیں ہوتی۔ پانی میں آسن، آجن کی مثل ہے قد أسن الماء یاسُن ویاسِن أسناو آسونا جب اس کی بو تبدیل ہو جائے، اسی طرح أجن الماء یاجُن، یاجِن أجنا وأجونا ہے۔ دونوں میں کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ أجِن أسِن یاسَن ویاجَن إسناواجنا۔ یہ یزیدی نے کہا: اسن الرجل یاسن جب کسرہ کے ساتھ ہو جب وہ آدمی کنویں میں داخل ہو تو اسے کنویں کی بدبودار ہوا پہنچے یا اس کے علاوہ تو اس پر غشی طاری ہو جائے یا اس کا سر چکرا جائے۔ اس میں الوَسن بھی مروی ہے۔ تاسن الماءُ جب پانی متغیر ہو جائے ابوزید نے کہا تاسن علیّ تاسناوہ بیمار ہو جائے اور سستی کرے۔ ابوعمرو نے کہا: تاسن الرجل اباہ۔ اس نے اپنے باپ کے اخلاق کو اپنایا۔ لحیانی نے کہا: جب اس نے اپنے باپ کی مشابہت اختیار کی۔ عام قراءت آسن، مد کے ساتھ ہے۔ ابن کثیر اور حمید نے أسن، ہمزہ مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح حاذر اور حذر۔ اخفش نے کہا: أسن یہ حال کا معنی دیتا ہے اور آسن سے مراد استقبال ہے۔

**وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ** وہ زیادہ عرصہ رہنے کی وجہ سے کھٹے نہیں ہوں گے جس طرح دنیا کے دودھ زیادہ عرصہ رہنے کی وجہ سے کھٹے ہو جاتے ہیں۔ **وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ** اسے پاؤں آلودہ نہیں کریں گے اور ہاتھ انہیں گدلا نہیں کریں گے جس طرح دنیا کی شراب ہوا کرتی ہے اس کا ذائقہ لذیذ اور مشروب عمدہ ہوگا پینے والے اسے ناپسند نہیں کریں گے یہ کہا جاتا ہے: مشروب لذّ ولذیذ۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ استلذہ، اسے لذیذ شمار کیا۔

**وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى** عسل جو شہد کی مکھی کے لعاب سے بہتا ہے، مصفّٰی جو گوند اور آلودگی سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح پیدا کیا اسے نہ آگ پر پکایا گیا اور نہ شہد کی مکھی نے اسے آلودہ کیا۔ ترمذی میں حکیم بن معاویہ نے اپنے باپ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''جنت میں پانی کا سمندر، شہد کا سمندر، دودھ کا سمندر اور شراب کا سمندر ہے پھر اس سے نہریں جاری ہوتی ہیں'' (1)۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سیحان، جیحان، نیل اور فرات سب جنت کے دریا ہیں'' (2)۔ کعب نے کہا: دریائے دجلہ جنتیوں کے پانی کا دریا ہے۔ دریائے فرات ان کے دودھ کا دریا

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء فی صفة انہار الجنة، جلد 2، صفحہ 80

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة اہلہا، ماجاء فی صفة أنہار الجنة، جلد 2، صفحہ 380

ہے، مصر کا دریا ان کے مشروب کا دریا ہے اور دریائے سیحان ان کے شہد کا دریا ہے۔ یہ چاروں دریا کوثر سے نکلتے ہیں۔ عسل مذکر و مونث ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ' یہ شہد کی مکھیوں کے پیٹوں سے نہیں نکلا۔

وَ لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ من زائدہ ہے اور تاکید کے لیے ہے وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ان کے رب کی جانب سے ان کے گناہوں کی بخشش ہے كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ فراء نے کہا: معنی ہے کیا وہ جو ان نعمتوں میں ہمیشہ رہے گا وہ اس کی طرح ہوگا جو جہنم میں ہمیشہ رہتا ہے۔ زجاج نے کہا: کیا وہ جو اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل پر ہے اور اسے یہ اشیاء عطا کی گئی ہیں اس آدمی کی طرح ہوگا جس کے اعمال اس کے لیے مزین کیے گئے جبکہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہنے والا ہو۔ تو اس کا قول کمن، كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ کا بدل ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ جنت جس میں پھل اور نہریں ہیں ان کی مثال اس جہنم جیسی ہے جس میں کھولتا ہوا پانی اور زقوم ہوگا۔ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں میں جنتیوں کی مثال ہمیشہ رہنے والی جہنم میں جہنمیوں کی مثل ہے۔

وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا انہیں ایسا پانی پلایا جائے گا جو بہت زیادہ جوش مار رہا ہوگا۔ جب اس پانی کو ان کے قریب کیا جائے گا تو ان کے چہرے بھون دیئے جائیں گے اور ان کے سروں کی جلد اتر جائے گی۔ جب وہ اسے پئیں گے تو وہ ان کی آنتوں کو کاٹ دے گا اور ان کی دبر سے انہیں نکال دے گا امعاء یہ معی کی جمع ہے اس کا تثنیہ معیان ہے پیٹ میں جو انتڑیاں ہیں ان کو امعاء کہتے ہیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ۝١٦ وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝١٧

''اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کان لگائے رکھتے ہیں آپ کی طرف حتی کہ جب نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو کہتے ہیں اہل علم سے (کہ ذرا فرمایئے) یہ صاحب ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے، یہی وہ (بدبخت) ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور وہ پیروی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کی۔ اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو اور انہیں تقوی کی توفیق بخشتا ہے''۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ یعنی وہ لوگ جو لطف اندوز ہوتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں ان کے اعمال ان کے لیے مزین کیے گئے ہیں وہ آپ کی بات کو سنتے ہیں وہ منافق ہیں عبد اللہ بن ابی بن سلول، رفاعہ بن تابوت، زید بن صلیت، حارث بن عمرو اور مالک بن دخشم، وہ جمعہ کے روز خطبہ میں حاضر ہوتے جب اس میں منافقوں کا ذکر سنتے تو اس سے اعراض کرتے، جب وہ باہر نکلتے تو اس کے بارے میں سوال کرتے (1)؛ یہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مومنوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے، آپ جو ارشاد فرماتے اسے سنتے مومن اسے یاد کر لیتے اور کافر اسے یاد نہ رکھتے۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 297

حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ جب وہ تیری مجلس سے جدا ہوتے قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ عکرمہ نے کہا: اس کا مصداق حضرت عبداللہ بن عباس ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں وہ تھا جس سے پوچھا جاتا تھا یعنی میں اہل علم میں سے تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں مروی ہے کہ مراد حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں (2)۔ عبداللہ بن بریدہ نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ مراد حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ قاسم بن عبدالرحمن نے کہا: مراد حضرت ابودرداء ہیں۔ ابن زید نے کہا: مراد صحابہ کرام ہیں۔

مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ابھی ابھی۔ وہ یہ بات استہزاء کے طور پر کرتے تھے یعنی میں نے ان کے قول کی طرف توجہ نہیں کی۔ اٰنِفًا سے مراد وہ گھڑی ہے جو اوقات میں سے سب سے زیادہ تیرے قریب ہو، یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: استأنفت الشئ۔ جب تو اس کی ابتدا کرے۔ اس سے امر أنف و روضة أنف ہے یعنی اسے کسی نے نہیں چرا۔ کأس انف۔ جب اس سے کوئی چیز نہ پی گئی ہو گویا اس کے پینے کو شروع کیا گیا، جس طرح روضة أنف۔ شاعر نے کہا:

ویحْرُم　سِرُّ جارتهم　علیهم　ویأکل　جارهم　أنفَ　القصاع

ان کی پڑوسن کا راز ان پر حرام ہوتا ہے اور ان کا پڑوسی ایسے پیالے سے کھاتا ہے جس کو پہلے نہیں کھایا گیا ہوتا۔

امرؤالقیس نے کہا: قد غدا یحملنی فی أنفه وہ مجھے آغاز میں ہی اٹھالیتا ہے۔

أنفُ کلِّ شئٍ أولہ۔ ہر شے کا انف اس کا اول ہوا کرتا ہے۔ قتادہ نے ان منافقین کے بارے میں کہا: لوگ دو قسم کے ہیں ایسا آدمی جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ نصیب ہو تو اس نے جو سنا اس سے فائدہ اٹھایا، دوسرا وہ آدمی ہے جو سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو اور اس نے جو سنا اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ بات بھی کی جاتی تھی: لوگ تین طرح کے ہیں۔ سننے والا عمل کرنے والا۔ سننے والا سمجھنے والا، سننے والا، غافل اور ترک کرنے والا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پس وہ ایمان نہ لائے وَاتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ۝ کفر اختیار کرنے میں اپنی خواہشات کی پیروی کی وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا جنہوں نے ایمان کی طرف ہدایت پائی اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قرآن سے جو وہ سنتے ہیں جو قرآن سراپا ہدایت ہے یعنی ان کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: منافقوں کے اعراض اور ان کے استہزاء نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ناسخ کے نزول نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ وہ ہدایت جو ان میں زیادہ ہوئی اس میں چار قول ہیں: 1۔ ان کے علم میں اضافہ ہوا (4)؛ یہ ربیع بن انس کا قول ہے۔ 2۔ جو سنا اس کو جانا اور جو جانا اس پر عمل کیا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ 3۔ دین کے بارے میں ان کی بصیرت میں اضافہ کیا اور اپنے نبی کی تصدیق میں اضافہ کیا؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ 4۔ جس ایمان پر وہ پہلے سے موجود تھے اس کے بارے میں انہیں شرح صدر عطا فرمایا۔

وَاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۝ یعنی ان میں تقویٰ کا الہام کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں پانچ وجوہ ہیں: 1۔ انہیں خشیت و

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 297　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 298　4۔ ایضاً

خوف عطا فرمایا، یہ ربیع کا قول ہے۔ 2۔ آخرت میں انہیں تقویٰ کا ثواب عطا فرمایا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ 3۔ جو امور ان پر فرض کیے گئے ان پر عمل کی انہیں توفیق عطا فرمائی؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ 4۔ جن چیزوں سے انہیں بچنا تھا وہ ان کے لیے بیان کر دیں؛ یہ ابن زید کا قول ہے اور سدی نے بھی یہ کہا ہے۔ 5۔ منسوخ کو ترک کرنا اور ناسخ پر عمل کرنا؛ یہ عطیہ کا قول ہے۔ ماوردی نے کہا: چھٹے کا بھی احتمال ہے رخصت کو ترک کرنا اور عزیمت کو اپنانا۔ وَاٰتٰهُمْ کی بجائے واعطاھم بھی پڑھا گیا ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ آیت ان افراد کے بارے میں نازل ہوئی اہل کتاب میں سے جو ایمان لائے تھے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ⑱

"پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں قیامت کا کہ آجائے ان پر اچانک بے شک اس کی نشانیاں تو آہی گئی ہیں (تو جب قیامت ان پر آ گئی) تو اس وقت ان کو سمجھنا کب نصیب ہوگا"۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً۔ بغتة یعنی اچانک۔ یہ کفار کے لیے وعید ہے فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا أشراطها سے مراد اس کی علامات ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں یہ پڑھا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس کی نشانیوں اور دلیلوں میں سے ایک ہے؛ یہ ضحاک اور حسن بصری کا نقطہ نظر ہے۔ صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح مبعوث ہوئے ہیں" اور انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملایا (1)۔ الفاظ مسلم کے ہیں اسے امام بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ روایت کی جاتی ہے: "میں اور قیامت گھڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح یعنی مساوی ہیں"۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اشراط الساعة سے مراد اس کے اسباب ہیں جو بڑی نشانیوں سے کم ہیں، اسی وجہ سے لوگوں میں سے کم مرتبہ لوگوں کو الشرط کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کی نشانیوں سے مراد چاند کا پھٹنا اور دھواں ہے؛ یہ حضرت بصری کا بھی قول ہے۔ کلبی سے مروی ہے: مال کی کثرت، تجارت، جھوٹی گواہی، قطع رحمی، شریف لوگوں کی کمی اور کمینے لوگوں کی کثرت ہے (2)۔ ہم نے کتاب "التذکرہ" میں اسے مفصل ذکر کیا ہے۔ اشراط کا واحد شرط ہے اس کا اصل معنی علامات ہیں اسی معنی میں شرط کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے لیے ایک علامت بنائی ہوئی ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ پہچانے جاتے ہیں، اسی معنی میں بیع وغیرہ میں شرط ہے۔ ابوالاسود نے کہا:

فإن كنتِ قد أزْمَعتِ بالصرم بيننا فقد جعلت أشراط أوّله تبدو (3)

اگر تو نے ہمارے درمیان قطع تعلقی کا عزم کرلیا ہے تو اس کی ابتدائی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے: أشرط فلان نفسه فی عمل كذا فلاں نے اپنے نفس کو فلاں عمل سے آگاہ کیا اور نفس کو اس عمل کے لیے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب قرب الساعة، جلد 2، صفحہ 406۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 43-4028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 223

3۔ ایضاً

خاص کر دیا۔ اوس بن حجر ایک آدمی کی تعریف کرتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے ایک رسی کی مدد سے نبعہ (پہاڑی درخت جس سے توسیں بنائی جاتی ہیں) کاٹنے کے لیے نیچے لٹکا تا کہ اس سے کمان بنائے:

فاشرط نفسہ فیہا وھو معصم　وألقی بأسباب لہ وتوکلا (1)

اس نے اپنے آپ کو اس کام میں لگا دیا جبکہ وہ اس کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا اس نے رسیوں کے ساتھ اپنے آپ کو لٹکایا اور توکل کیا۔

اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً۔ ان، الساعة سے بدل اشتمال ہے جس طرح ان تطؤھم، رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ (الفتح: 25) سے بدل ہے اسے بغتة، جزیة کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ کلمہ غریب ہے مصادر میں اس کی مثل واقع نہیں ہوا؛ یہ ابی عمرو سے مروی ہے۔ زمخشری نے کہا: مجھے خوف لاحق ہے کہ راوی نے ابو عمرو سے روایت کرنے میں غلطی کی ہو اور صحیح بغتة ہو جس طرح حضرت بصری کی قراءت ہے۔ ابو جعفر رواسی اور دوسرے علماء نے اہل مکہ سے اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً روایت کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً پڑھا تو وقف السَّاعَةَ پر ہوگا۔ پھر شرط سے نئی کلام شروع ہوگی۔ کلام شک میں سے جس کا احتمال رکھتی ہے اسے خلق کی طرف پھیر دیا جائے گا گویا فرمایا: اگر اس کے آنے میں انہوں نے شک کیا ہے تو اس کی علامات تو آ گئی ہیں۔

فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ۝ ۔ ذِكْرٰىهُمْ مبتدا ہے اور فَاَنّٰى لَهُمْ خبر ہے۔ جَآءَتْهُمْ میں ضمیر مرفوع السَّاعَةَ کے لیے ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی فمن این لهم التذکر اذا جاءتهم الساعة یہ معنی قتادہ اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں نجات کیسے ملے گی جب قیامت کے آنے پر ان کے پاس ذکریٰ آ جائے گی؛ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ ذکریٰ میں دو وجوہ ہیں: 1۔ انہوں نے اچھے یا برے جو عمل کیے وہ انہیں یاد دلائے جائیں گے۔ 2۔ بشارت دینے یا خوف دلانے کے لیے انہیں ان کے ناموں سے بلانا (2)۔ ابان نے حضرت انس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''اپنے نام اچھے رکھا کرو تمہیں قیامت کے روز ان کے ساتھ بلایا جائے گا، اے فلاں! اپنے نور کی طرف اٹھ، اے فلاں! اٹھ تیرے لیے کوئی نور نہیں''۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے (3)۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ۠۝

''پس آپ جان لیں کہ نہیں کوئی معبود بجز اللہ کے اور دعا مانگا کریں کہ اللہ آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے نیز مغفرت طلب کریں مومن مردوں اور عورتوں کے لیے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے اور آرام کرنے کی جگہوں کو''۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ماوردی نے کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بارے میں جانتے تھے تو اس میں تین

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 63　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 299　3۔ ایضاً

وجہ ہوں گی۔ 1۔ جان لو کہ الله تعالیٰ نے تجھے باخبر کیا ہے کہ الله تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں۔ 2۔ جس کو استدلال سے جانا ہے اسے خبر یقین کے ساتھ جان لو۔ 3۔ یاد کرو کہ الله تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ذکر کو علم سے تعبیر کیا کیونکہ ذکر علم سے ہی ہوتا ہے۔ سفیان بن عیینہ سے مروی ہے کہ ان سے علم کی فضیلت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کیا تو نے الله تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا جب اس کا آغاز اس سے فرمایا فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ عمل کا حکم علم کے بعد دیا۔ فرمایا: اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ـــــ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الحدید: 21-20) فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال: 28) بعد میں فرمایا: فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال: 41) بعد میں عمل کا حکم دیا۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ یہ دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے: 1۔ الله تعالیٰ سے بخشش طلب کرو کہ آپ سے گناہ واقع ہو۔ 2۔ الله تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو کہ تجھے گناہوں سے محفوظ رکھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آپ کے لیے کافروں اور مومنوں کی حالت کا ذکر کیا تو ایمان پر ثابت قدمی کا حکم دیا یعنی توحید و اخلاص میں سے جس حالت پر آپ ہیں اس پر ثابت قدم رہیں اور ان چیزوں سے احتیاط کرتے رہیں کہ جن کو بجالانے کی صورت میں استغفار کی ضرورت ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے۔ اس قول کی بنا پر آیت اس امر کو واجب کرتی ہے کہ انسان تمام مسلمانوں کے لیے استغفار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کفار کے کفر اور منافقین کے نفاق سے تنگ پڑتا تو یہ آیت نازل ہوئی، یعنی یہ بات جان لو کہ جو تکلیف آپ کو ہے الله تعالیٰ کی ذات کے سوا اس کو دور کرنے والا کوئی نہیں۔ الله تعالیٰ کی ذات کے سوا تیرا دل کسی کے ساتھ متعلق نہیں ہونا چاہیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کو استغفار کا حکم اس لیے دیا تاکہ امت آپ کی اقتداء کرے۔

وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یعنی ان کے گناہوں کے لیے بخشش طلب کیجئے۔ یہ شفاعت کا امر ہے(1) مسلم، عاصم احول سے وہ عبدالله بن سرجس مخزومی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا، میں نے عرض کی: یا رسول الله! الله تعالیٰ آپ کو بخش دے۔ تو ان کے ساتھی نے ان سے پوچھا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے بخشش طلب کی ہے؟ فرمایا: ہاں اور تیرے لیے بھی۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی: وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ پھر میں پھرا اور آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان نبوت کی مہر کو دیکھا۔ جُمْعًا علیه خِیلان کانه الثآلیل۔ وہ بند مٹھی نما چیز تھی جس پر تل تھے گویا وہ مسہ ہو۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ۝ اس میں پانچ اقوال ہیں: 1۔ وہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے خواہ تو حالت سفر میں ہو یا حالت اقامت میں ہو۔ 2۔ مُتَقَلَّبَكُمْ یعنی دن کے وقت جو تمہارے اعمال ہیں۔ وَ مَثْوٰىكُمْ رات کے وقت جو تم سوتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد دنیا اور آخرت میں جو کچھ تم کرتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات ختم النبوۃ، جلد 2، صفحہ 260

ہو۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ عکرمہ نے کہا: مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد آباء کی پشتوں سے لے کر ماؤں کے رحموں تک (1)۔ مَثْوٰىكُمْ زمین میں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ۔ ابن کیسان نے کہا: مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد پشت سے بطن اور بطن سے دنیا۔ اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد قبریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: عموم ان تمام صورتوں میں آتا ہے۔ انسان کی حرکات وسکنات میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخفی نہیں، اسی طرح اس کی تمام مخلوق مخفی نہیں، وہ ان تمام کو جانتا ہے قبل اس کے کہ وہ اکٹھے ہوں یا الگ الگ، پہلا ہو یا آخری ہو سبحانہ لا الٰہ الا ھو۔

**وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝**

''اور اہل ایمان کہتے ہیں کیوں نہ اتری کوئی نئی سورت (جہاد کے بارے میں)۔ پس جب اتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے کہ وہ تکتے ہیں آپ کی طرف جیسے تکتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو، پس ان کے لیے بہتر یہ تھا کہ اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے پھر جب حکم ناطق ہو چکا تو اگر وہ سچے رہتے اللہ تعالیٰ سے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا''۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی مخلص مومن کہتے ہیں۔ لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ان کا کہنا وحی کے اشتیاق، جہاد اور اس کے ثواب کے حرص کی بنا پر ہے۔ لَوْلَا کا معنی ھلا ہے۔ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ سورۂ محکم سے مراد جس میں نسخ نہ ہو۔ قتادہ نے کہا: ہر وہ سورت جس میں جہاد کا ذکر ہو اس کو محکم کہتے ہیں (2)۔ منافقین پر قرآن میں سے یہ شدید ترین ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت میں فاذا انزلت سورۃ محدثۃ ہے، یعنی جس کا نزول ابھی ابھی ہوا ہو۔ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ جس میں جہاد فرض ہو۔ اسے وذکر فیھا القتال بھی پڑھا گیا ہے کہ فعل معروف ہے اور قتال منصوب ہے۔ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد شک اور نفاق ہے۔ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ایسے آدمی کی نظر جس کی آنکھ میں کیچڑ ہو اور غیظ و غضب کا شکار ہو جس طرح ایک آدمی کی نظر موت کے وقت کھل جاتی ہے۔ یہ صورت حال جنگ سے بزدلی کی بنا پر ہوتی ہے جبکہ وہ جزع فزع کر رہے ہوتے ہیں اور دل سے کفار کی طرف میلان رکھتے ہیں۔

فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ جوہری نے کہا ان کا قول اولی لك یہ دھمکی اور وعید ہے۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 191
2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 65

فأوْلَى ثم أوْلَى ثم أوْلَى وهل لِلدَّرِّ يُحْلَبُ من مَرَدّ

اصمعی نے کہا: اس کا معنی ہے جو چیز اس کو ہلاک کرتی ہے وہ اس کے قریب آ پہنچی ہے یعنی اس پر نازل ہو چکی ہے اور یہ شعر پڑھا:

فعادَى بين هادِيَتَيْنِ منها وأوْلَى أن يزيد على الثلاث

یعنی وہ زائد ہونے کے قریب ہے۔

ثعلب نے کہا: اصمعی نے اولی کے بارے میں جو کہا ہے اس سے بہتر کسی نے گفتگو نہیں کی۔ مبرد نے کہا: جو ہلاک کرنے کا ارادہ کرے پھر چھوٹ جائے۔ اولی لك یعنی تو ہلاکت کے قریب پہنچ گیا تھا، جس طرح یہ روایت کی گئی ہے کہ ایک بدو لگاتار شکار پر تیر چلا رہا تھا تو وہ تیر چوک جاتا وہ کہتا اولی لك پھر اس نے شکار کو تیر مارا تو وہ اس کے قریب ہوا پھر اس سے چوک گیا تو بدو نے کہا:

فلوكان أوْلَى يُطعِمِ القومَ صِدْتُهم ولكن أوْلَى يَتْرُكُ القومَ جُوَّعَا

اگر اولی قوم کو کھلا تا تو میں انہیں شکار کر لیتا لیکن اولی قوم کو بھوکا چھوڑتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آدمی کے اس قول کی طرح ہے جو وہ اپنے ساتھی کو کہتا ہے: یا محروم أي شئ فاتك! اے محروم! کون سی چیز تجھ سے فوت ہوئی۔ جرجانی نے کہا: یہ ویل سے مشتق ہے، یہ افعل کا وزن ہے لیکن اس میں قلب کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ فعل کا عین کلمہ لام کلمہ کی جگہ واقع ہوا ہے۔ فاولی لهم پر کلام مکمل ہو چکی ہے۔

قتادہ نے کہا: گویا یہ کہا عقاب ان کے قریب وموزوں ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے انہیں مصیبت نے آلیا۔

پھر فرمایا: طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ یعنی طاعت اور اچھی بات بہت بہتر ہیں؛ یہ سیبویہ اور خلیل کا مذہب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے أمرنا طاعة وقول معروف۔ مبتدا کو حذف کر دیا گیا اور اولی لهم پر وقف تام کیا گیا، اس طرح جس نے یہ مقدر کیا ہے۔ يقولون منا طاعة۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: دوسری آیت پہلی آیت کے ساتھ متصل ہے۔ لهم میں لام باء کے معنی میں ہے، یعنی الطاعة اولی وأليق لهم وأحق لهم من ترك إمتثال أمر الله یعنی الله تعالیٰ کے امر کو ترک کرنے کی بجائے طاعت زیادہ مناسب، موزوں اور لازم ہے؛ یہ حضرت ابی کی قراءت ہے۔ يقولون طاعة ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ طاعة، سورة کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فاذا انزلت سورة ذات طاعة اس صورت میں فاولی لهم پر عطف نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کا قول طاعة یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے منافقین کے بارے میں خبر ہے۔ معنی ہوگا لَهُمْ ۚ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ایک قول یہ کیا گیا: فرائض کا وجوب ان پر ہے۔ جب فرائض نازل ہوتے ہیں تو ان کا نزول ان پر شاق گذرتا ہے اس صورت میں فاولی پر وقف ہوگا۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 65

فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ جب جہاد لازم ہو جائے یا قتال کی فرضیت ثابت ہو جائے تو وہ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ علماء نے اسے اذا کا جواب مکروہ جانا ہے۔ وہ محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جب اصحاب امر عزم کر لیں۔

فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ اگر وہ ایمان اور جہاد میں اللہ تعالیٰ سے سچ بولتے تو وہ معصیت اور مخالفت کی بنسبت ان کے حق میں بہتر ہوتی۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝

''پھر تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم فساد برپا کرو گے زمین میں اور قطع کر دو گے اپنی قرابتوں کو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کی پھر (حق سننے سے) انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ۔ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ولایۃ سے مشتق ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: معنی ہے تم سے یہی توقع ہے اگر تم حکومت کے والی بن جاؤ تو تم ایسے حکام بن جاؤ گے کہ رشوت لینے کے ساتھ زمین پر فساد برپا کرو گے (1)۔ کلبی نے کہا: تم سے یہی توقع ہے اگر تم امت کے امور کے ذمہ دار بن جاؤ تو تم زمین میں ظلم کے ذریعے فساد برپا کرو گے۔

ابن جریج نے کہا: معنی ہے تم سے یہ توقع ہے اگر تم طاعت سے رخ پھیرو گے تو تم زمین میں نافرمانیوں اور قطع رحمی کے ساتھ فساد برپا کرو گے (2)۔ کعب نے کہا: معنی ہے تم سے یہ توقع ہے اگر تم امر کے والی بن جاؤ تو تم ایک دوسرے کو قتل کرو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے کسی شے سے اعراض کرو۔ قتادہ نے کہا: تم سے یہی توقع ہے اگر تم کتاب اللہ سے اعراض کرو تو تم زمین میں حرام خون بہا کر فساد برپا کرو اور رشتہ داری کو ختم کرو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَهَلْ عَسَيْتُمْ کا معنی ہے ممکن ہے اگر تم قرآن سے اعراض کرو اور اس کے احکام سے دور ہو تو تم زمین میں فساد برپا کرو اور اپنی جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ۔ اسے سین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے۔ بکر مزنی نے کہا: یہ آیت حروریہ اور خوارج کے بارے میں نازل ہوئی (3)۔ یہ قول حقیقت سے بعید ہے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ ابن حبان نے کہا: مراد قریش ہیں۔ اسی کی مثل مسیب بن شریک اور فراء نے کہا ہے دونوں نے کہا: یہ آیت بنی امیہ اور بنی ہاشم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس تاویل کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت عبد اللہ بن مغفل نے روایت کیا ہے۔ کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اس سے مراد قریش کا یہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 302	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

قبیلہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا اگر یہ لوگوں پر والی بنیں تو وہ زمین میں فساد برپا نہ کریں اور رشتہ داری کو ختم نہ کریں''۔

حضرت علی بن ابی طالب نے یوں قراءت کی إن تولیتم أن تفسدوا فی الأرض تاء، واو کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ، یہ ابن ابی اسحاق کی قراءت ہے اسے رویس نے یعقوب سے روایت کیا ہے وہ کہتے: اگر تم پر ظالم حکمران بن گئے تو تم ان کے ساتھ فتنہ میں نکلو گے اور تم ان کے ساتھ جنگ کرو گے۔ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ۝ تم بغاوت، ظلم اور قتل کے ذریعے اپنی رشتہ داری کو ختم کرو گے۔ یعقوب، سلام، عیسیٰ اور ابو حاتم نے وتقطعوا تاء کے فتحہ اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے: یہ قطع سے مشتق ہے وہ اس آیت پر استدلال کرتے وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ (البقرۃ: 27) ہارون نے ابوعمرو سے اس قراءت کو روایت کیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے وتقطعوا حروف کو مفتوح اور مشدد پڑھا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (الانبیاء: 93) پر قیاس کیا ہے باقی قراء نے وتقطعوا تاء کے ضمہ اور طاء کو مشدد پڑھا ہے۔ یہ تقطیع سے مشتق ہے جو کثرت کے معنی کو بیان کرتی ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ سورۂ بقرہ میں عسیتم کی بحث گذر چکی ہے۔ زجاج نے نافع کی قراءت میں کہا: اگر یہ جائز ہے تو عَسِیَ بھی جائز ہے۔ جوہری نے کہا: یہ کہا جاتا ہے عسیت أن افعل ذلك وعسیت اسے فھل عَسِیتم کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کے بارے میں گفتگو گذر چکی ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ انہیں دھتکار دیا اور اپنی رحمت سے انہیں دور کر دیا۔ فَاَصَمَّهُمْ انہیں حق سے بہرہ کر دیا وَ اَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ۝ ان کے دلوں کو خیر سے اندھا کر دیا۔ ان خبروں کو اس کے پیچھے ذکر کیا کہ جس نے ایسا کیا اس پر اس کی لعنت ثابت ہو گئی اسکے کان اور آنکھ سے نفع حاصل کرنے کو سلب کرنا ثابت ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ حق کی اطاعت نہیں کرے گا اگرچہ اس کو سنے تو اسے اس چوپائے کی مانند کر دیا جو عقل نہیں رکھتا، فرمایا: فَهَلْ عَسَيْتُمْ پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ تو عربوں کی عادت کے مطابق خطاب سے غیب کی طرف رجوع کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ یعنی کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ جان جاتے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کر دیا ہے جو اسلام سے نہیں پھرے اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ بلکہ دلوں پر قفل ہیں اللہ تعالیٰ نے جنہیں ان کے دلوں پر لگا یا ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔ یہ آیت قدریہ اور امامیہ کے مذہب کو رد کرتی ہے۔ حدیث مرفوع میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان پر ایسے تالے ہیں جس طرح لوہے کے تالے ہوتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں کھولے گا''۔ قفل کا اصل معنی خشکی اور سختی ہے۔ جب درخت خشک ہو جائے تو اسے قفل کہتے ہیں، قفیل بھی اسی کی مثل ہے۔ قفیل کا معنی نباتات ہے۔ قفیل کا معنی آواز ہے۔ اقفله الصوم۔ روزے نے اسے خشک کر دیا؛ یہ قشیری اور جوہری کا قول ہے یہاں اقفال سے اشارہ دل کے بند ہونے اور ایمان سے خالی ہونے کی طرف ہے یعنی ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوگا اور ان سے کفر باہر نہیں نکلے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ یہاں عَلٰى قُلُوْبٍ فرمایا کیونکہ اگر علی قلوبهم ہوتا تو دوسروں کا دل اس میں داخل نہ ہوتا۔ مراد ہے ان کے دلوں پر اور جو دل ان کی صفت پر ہوں گے سب پر تالے لگے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا یہاں تک کہ جب وہ ان کی تخلیق سے فارغ ہوا تو رحم اٹھ کھڑی ہوئی اس نے عرض کی یہ قطع رحمی سے پناہ چاہنے والے کا مقام ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں، کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ جو تجھے جوڑے میں اسے جوڑوں اور جو تجھے قطع کرے میں اسے قطع کروں۔ رحم نے عرض کی: کیوں نہیں تو فرمایا: پس یہ تیرے لیے ہے''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''چاہو تو یہ پڑھو فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۝ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ ''(1) آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام کفار کو خطاب ہے۔ قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: آیت کا معنی ہے امید ہے یا تمہارے بارے میں خوف ہے اگر تم ایمان سے اعراض کرو تو زمین میں خون بہانے کے ساتھ تم فساد کی طرف لوٹو (2)۔ قتادہ نے کہا: تم نے قوم کو کیسا دیکھا جب انہوں نے کتاب اللہ سے اعراض کیا کیا انہوں نے حرام خون کو نہیں بہایا، رحموں کو قطع نہیں کیا اور رحمن کی نافرمانی نہیں کی؟''۔

اس تعبیر کی بنا پر رحم سے مراد دین اسلام اور ایمان کی رحم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں اخوۃ کا نام دیا ہے: انما المومنون اخوۃ۔ فراء کے قول کے مطابق آیت بنی ہاشم اور بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان میں نفاق کو چھپایا اور قطع رحم سے اس امر کی طرف اشارہ کیا جو ان کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رشتہ داری تھی انہوں نے آپ کو جھٹلا کر اس کو توڑا۔ یہ قتال کو واجب کرتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے رحم کی دو صورتیں ہیں۔ عام، خاص۔ عام دین کا رحم ہے اس کو جوڑنا واجب ہے ایمان کو لازم پکڑنے کے ساتھ، ایمان داروں سے محبت اور ان کی مدد کرنے کے ساتھ، ان کے لیے اخلاص کا اظہار کرنا، ان کو نقصان نہ دینا، ان کے درمیان عدل کرنا، ان کے معاملہ میں انصاف کرنا، ان کے حقوق کو بجالانا جس طرح مریضوں کی تیمارداری کرنا، مردوں کے حقوق بجالانا، جیسے انہیں غسل دینا، ان کی نماز جنازہ پڑھنا، انہیں دفن کرنا اور اس کے علاوہ ان کے جو حقوق ہیں۔

جہاں تک رحم خاص کا تعلق ہے وہ ماں باپ کی جانب سے قرابت کی رحم ہے۔ ان کے لیے خاص حقوق اور زائد حقوق ثابت ہوتے ہیں، جس طرح نفقہ دینا، احوال کی خبر لینا، ضرورت کے وقت ان کے معاملات میں غفلت کو چھوڑ دینا، ان کے حق میں رحم عامہ کے حقوق موکد ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جب حقوق متزاحم ہوں تو زیادہ قریبی پھر اس کے بعد والے سے حقوق کی ادائیگی کو شروع کیا جائے گا۔

بعض علماء نے کہا: وہ رحم جس کی صلہ رحمی واجب ہے وہ یہ ذی رحم محرم کی رشتہ داری ہے چچازاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں میں یہ واجب نہ ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ یہ ہر اس رشتہ داری میں ہے جو ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں وہ محرم ہو یا غیر محرم ہوں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ماں کی رشتہ داری جس کی وجہ سے باہم وراثت جاری نہیں ہوتی ان کے ساتھ صلہ رحمی واجب نہ ہو اور ان کے ساتھ قطع رحمی حرام ہو۔ یہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جسے رحم عام ہو ہر حال میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطعیھا، جلد 2، صفحہ 315

2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 67

ان کے ساتھ صلہ رحمی واجب ہے وہ خونی رشتہ ہو یا دینی رشتہ ہو، جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے کہ شعبہ، محمد بن عبدالجبار سے وہ محمد بن کعب قرظی سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''قیامت کے روز رحم کی زبان ہوگی۔ وہ عرض کرے گی: اے میرے رب! مجھے قطع کیا گیا، اے میرے رب! مجھ پر ظلم کیا گیا، اے میرے رب! میرے ساتھ برا سلوک کیا گیا تو اس کا رب اسے جواب دے گا: کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ جو تیرے ساتھ رشتہ جوڑے میں اس کے ساتھ تعلق جوڑوں اور جو تیرے ساتھ تعلق توڑے میں اس کے ساتھ تعلق کو منقطع کروں''۔

صحیح مسلم میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''رشتہ داری کو قطع کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا'' (1)۔ ابن ابی عربی نے کہا سفیان نے کہا: یعنی قطع رحمی کرنے والا؛ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: إن الله تعالى خلق الخلق حتى إذا فرغ منه (2) یہاں خلق، اختراع کے معنی میں ہے اس کا اصل معنی اندازہ لگانا ہے جس طرح پہلے گذرا ہے۔ یہاں خلق مخلوق کے معنی میں ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ (لقمان: 11) یعنی یہ اس کی مخلوق ہے۔ فرغ منهم سے مراد ان کی خلقت کو مکمل کیا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کو پیدا کرنے میں مشغول ہوا پھر ان کی پیدائش سے فارغ ہو گیا، کیونکہ اس کا فعل مباشرہ، مناولہ کی صورت میں نہیں ہوا۔ اس کی تخلیق آلہ اور حیلہ سے نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: قالت الرحم فقالت یہ کلام دو وجہوں میں سے ایک کا احتمال رکھتی ہے۔ 1۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے کسی کو کھڑا کر دے گا جو رحم کی جانب سے گفتگو کرے گا اور وہ یہ کہے گا، گویا اس عبادت پر کسی فرشتے کو معین کر دیا ہے، جو رحم کی جانب سے اس ذمہ داری کو ادا کرے گا، جو صلہ رحمی کرتا ہے اس کے ثواب کو لکھتا ہے اور جو اسے قطع کرتا ہے اس کا بوجھ لکھتا ہے جس طرح اس نے باقی ماندہ اعمال کے لیے کراما کاتبین معین کیے ہیں اور نمازوں کے اوقات کے مشاہدہ کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے معین کیے ہیں۔

2۔ یہ کلام تقدیر و تمثیل کی صورت میں ہے جو اس کے محفوظ کرنے اور بہت زیادہ اہتمام کرنے کا فہم عطا کرتی ہے، گویا کلام یوں کی اگر رحم ان چیزوں میں سے ہوتی جو سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور گفتگو کر سکتی ہیں تو وہ یہ گفتگو کرتیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (الحشر: 21) پھر فرمایا: وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الحشر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: فقالت هذا مقام العائذ بك من القطيعة اس کلام کا مقصود یہ ہے کہ یہ خبر دی جائے کہ صلہ رحمی

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب باب اثم قاطع، جلد 2، صفحہ 885

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب صلة الرحم وتحريم قطعها، جلد 2، صفحہ 315

کا امر موکد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ حیثیت دی ہے جو اس آدمی کو حیثیت دی جاتی ہے کہ جو اس سے پناہ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پناہ دیتا ہے اور اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو اللہ تعالیٰ کا پڑوس اپنانے والا رسوا نہیں ہوتا اور اس کا وعدہ توڑا نہیں جاتا، اسی وجہ سے رحم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: أما ترضين أن أصل من وصلك وأقطع من قطعك یہ اسی طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ومن صلی الصبح فهو فی ذمة الله تعالیٰ فلا يطلبنكم الله من ذمته شئ فانه من يطلبه بذمته شئ يدركه ثم يكبه فی النار علی وجهه (1) جو آدمی صبح کی نماز پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہو جاتا ہے پس تم میں سے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں آئی ہوئی چیز میں سے کسی شے کا مطالبہ نہ کرے کیونکہ جو اس کے ذمہ میں موجود چیز کا مطالبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لیتا ہے پھر اسے منہ کے بل آگ میں گرا دیتا ہے۔

**اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ۝**

”بے شک جو لوگ پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے باوجودیکہ ان پر ہدایت (کی راہ) ظاہر ہو چکی تھی شیطان نے انہیں فریب دیا اور انہیں لمبی زندگی کی آس دلائی“۔

قتادہ نے کہا: وہ اہل کتاب کے کفار ہیں۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا جبکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت سے بخوبی آشنا تھے، یہ ابن جریج کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور سدی نے کہا: وہ منافق ہیں۔ قرآن حکیم میں جہاد کے حکم سے آگاہی کے بعد وہ جہاد کرنے کی بجائے گھروں میں بیٹھ گئے۔

**اَلشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ** شیطان نے ان کی خطاؤں کو مزین کیا؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ **اَمْلٰى لَهُمْ** نے انہیں طویل آرزو دلائی اور لمبی عمر کا وعدہ کیا۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے۔ وہ ذات جس نے انہیں لمبی آرزوئیں دلائیں اور ان کی عمروں کو لمبا کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ فراء اور مفضل کا قول ہے۔ کلبی اور مقاتل نے کہا **اَمْلٰى لَهُمْ** کا معنی ہے انہیں مہلت دی۔ اس تعبیر کی بنا پر اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مہلت دینے والا ہے۔

ابو عمرو، ابن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمرو، ابو جعفر اور شیبہ نے **وَ اَمْلٰى لَهُمْ ۝** ہمزہ کے ضمہ، لام کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ ابن ہرمز، مجاہد جحدری اور یعقوب نے اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق خبر دے رہا ہے کہ وہ یہ معاملہ ان کے ساتھ کرے گا گویا فرمایا: میں انہیں مہلت دیتا ہوں؛ ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے، کہا: ہمزہ کا فتحہ وہم دلاتا ہے شیطان انہیں آرزوئیں دلاتا ہے جبکہ معاملہ اس طرح نہیں، اسی وجہ سے ضمہ کی طرف عدول کیا۔ مہدوی نے کہا: جس نے پڑھا و املی لهم تو فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد شیطان ہے۔ ابو عبید نے عام قراءت کو پسند کیا ہے، کہا: کیونکہ معنی معلوم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **لِتُؤْمِنُوْا**

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 233

بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ (الفتح:9) تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر غائب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی اور توقیر وتعزیر کے فعل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم کی طرف پھیرا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝٢٦

''یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا ان لوگوں کو جنہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے اتارا کہ ہم تمہاری ایک بات میں اطاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے پوشیدہ مشوروں کو جانتا ہے''۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا یعنی انہیں یہ مہلت دی تا کہ وہ کفر میں دور چلے جائیں کیونکہ قَالُوْا میں واؤ ضمیر سے مراد منافقین اور یہودی ہیں۔

لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا سے مراد مشرک ہیں۔ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ، بعض الامر سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنا، آپ کے دشمن میں باہم مدد کرنا، آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی بجائے گھر میں بیٹھ رہنا اور رازداری کے عالم میں آپ کی توہین کرنا۔ انہوں نے یہ بات رازداری کے عالم میں کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو آگاہ کر دیا۔ عام قراءت اَسْرَارَهُمْ ہے یہ سر کی جمع ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ کوفہ کے قراء، ابن وثاب، اعمش، حمزہ، کسائی اور حفص نے عاصم سے اسرارھم نقل کیا ہے کہ یہ مصدر ہے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝٩ (نوح) یہاں جمع کا صیغہ ذکر کیا کیونکہ راز کی کئی صورتیں ہیں۔

فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۝٢٧

''پس ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کریں گے اور چوٹیں لگائیں گے ان کے چہروں اور پشتوں پر''۔

فَكَیْفَ یعنی ان کا حال کیسا ہوگا اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ۔ یضربون، ضاربین کے معنی میں ہے۔ یہ حال کی جگہ واقع ہے۔ کلام کا معنی خوف دلانا اور دھمکانا ہے، یعنی اگر عذاب ان سے موخر ہو گیا تو عمر کے اختتام تک یہ سلسلہ ہوگا۔ سورۃ الانفال اور سورۃ النحل میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کوئی آدمی معصیت پر فوت نہیں ہوتا مگر اس کے چہرے اور اس کی گدی پر شدید ضرب لگائی جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جنگ کے وقت ہوتا ہے مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد ہوتی ہے۔ فرشتے ان کے مونہوں پر مارتے ہیں جب وہ جنگ کا سامنا کرتے ہیں اور جب وہ بھاگتے ہیں تو ان کی پشتوں پر مارتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قیامت کے روز ہوگا جب انہیں جہنم کی طرف ہانکا جا رہا ہوگا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝٢٨

''یہ (سختیاں) اس لیے ہونگی کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ کی ناراضگی کا باعث تھا اور ناپسند کیا اس کی

خوشنودی کو پس اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے''۔

ذٰلِكَ تقدیر کلام یہ ہوگی ذلك جزاء هم۔ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نعت تورات میں تھی اسے انہوں نے چھپایا، اس سے مراد ان کا یہ عمل ہے۔ اگر اسے منافقین پر محمول کیا جائے تو مراد وہ کفر ہوگا جو انہوں نے اپنے سینہ میں چھپا رکھا ہے۔ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ رضوان سے مراد ایمان ہے فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ۝ اعمال سے مراد صدقہ اور صلہ رحمی وغیرہ کے اعمال ہیں، جس طرح یہ گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ۝۲۹ وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ۝

''کیا خیال کرتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں کرے گا ان کے دلی کھوٹوں کو۔ اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ، سو آپ پہچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرہ سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے، اور اللہ جانتا ہے تمہارے اعمال کو''۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد نفاق اور شک ہے مراد منافقین ہیں اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ۝۲۹ اضغان سے مراد وہ چیز ہے جو ناپسندیدہ چیز چھپائے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: اس کا معنی ان کا کھوٹ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد ان کا حسد ہے۔ قطرب نے کہا: مراد ان کی عداوت ہے اور شاعر کا قول ذکر کیا:

قل لابن هند ما أردت بمنطق ساء الصديق وشيد الأضغانا(1)

ابن ہند سے کہو میں نے ایسی گفتگو کا ارادہ نہیں کیا جو دوست کو بری لگے اور عداوت کو پختہ کرے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے مراد ان کے کینے ہیں۔ اس کا واحد ضغن ہے کہا:

وذی ضغن كففت النفس عنه میں نے کینہ والے سے اپنے نفس کو روکا۔

یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ عمرو بن کلثوم نے کہا

وان الضغن بعد الضغن يفشو عليك ويُخرِج الداء الدفينا

کینہ کے بعد کینہ تجھ پر ظاہر ہو جاتا ہے اور مخفی مرض کو باہر نکال دیتا ہے۔

جوہری نے کہا: ضغن اور ضغینہ سے مراد کینہ ہے قد ضغِن علیه ضِغنًا اس نے فلاں پر کینہ کیا۔

تضاغن القومُ واضْطَغَنُوا انہوں نے کینوں کو چھپایا۔ اضْطَغَنْت الصبيَّ جب تو نے بچے کو اپنی گود میں لیا۔ احمر نے یہ شعر پڑھا: كأنه مُضْطَغِنٌ صبِيًّا گویا وہ بچے کو گود میں لیے ہوئے ہے۔

فرس ضاغن ایسا گھوڑا جو مار کے بغیر نہیں چلتا۔ معنی ہے کیا انہوں نے یہ گمان کیا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی عداوت اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 304

کینے کو اہل اسلام کے لیے ظاہر نہیں کرے گا۔

وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ یعنی اگر ہم چاہتے تو ہم تیری ان کو پہچان کرادیتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی ان کو سورۂ براءت میں پہچان کرادی تھی۔ عرب کہتے ہیں: سأریك أصنع یعنی جو کچھ میں کرنے والا ہوں تجھے اس کی پہچان کرادوں گا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء:105) اس کے مطابق جو دکھادیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے۔

فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ یعنی آپ ان کی ان کی علامتوں سے پہچان کرلیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: اس آیت کے بعد منافقوں میں سے کوئی بھی آپ کی ذات پر مخفی نہ رہا، آپ انہیں ان کی نشانیوں سے پہچانتے تھے۔ ہم ایک غزوہ میں تھے اس میں سات منافق تھے جن کے بارے میں لوگوں کو شک تھا ایک رات انہوں نے صبح کی تو ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا: هذا منافق یہ منافق ہیں (1)۔ یہ ان کی نشانی تھی۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کے اظہار کو مقدر کیا انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مسجد سے نکلیں تو انہوں نے انکار کردیا مگر یہ کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ چمٹے رہیں تو ان کے خون محفوظ ہو گئے انہوں نے نکاح کیا اور ان کے ساتھ نکاح کیا گیا۔

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ اور آپ انہیں ضرور پہچان لیں گے ان کی گفتگو کے معنی سے، اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

وخیر الکلام ما کان لَحنًا (2) بہترین کلام وہ ہوا کرتی ہے جو معنی سے پہچانی جائے اور اس کی تصریح نہ کی جائے۔

یہ اللحن فی الإعراب سے ماخوذ ہے اس کا مطلب صحیح بات سے نکل جاتا ہے، اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انكم تختصمون إلیّ ولعل بعضكم أن یكون اَلْحَنَ بحجته من بعض (3) تم میرے سامنے اپنے جھگڑے پیش کرتے ہو ممکن ہے تم میں سے کوئی دلیل بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ قوت والا ہو یعنی وہ جواب میں دلیل کو لے جانے والا ہو کیونکہ وہ کلام کو پھیرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ابوزید نے کہا: لَحَنْتُ له أَلْحَنُ لَحْنًا جب تو اسے ایسی بات کرے وہ تجھ سے اس کا معنی سمجھ لے اور دوسرے پر وہ مخفی رہ جائے۔ لَحِنَه هو عَنّی یلحنه لَحْنًا یعنی اسے سمجھا۔ ألحنته أنا إیاه میں نے اسے یہ سمجھایا۔ لاحنت الناس میں ان کو سمجھ گیا۔ فزاری نے کہا:

وحدیثٍ اَلَذُّهُ هو مما یَنْعَت النَّاعِتُون یُوزَن وزنًا
منطقٌ رائعٌ وتَلْحَن أحیا نًا وخیر الحدیث ماکان لحنًا

کتنی ہی باتیں ہیں جن سے میں لذت حاصل کرتا ہوں جو ان میں سے ہیں جن کی نعت بیان کرنے والے نعت بیان کرتے ہیں۔ اس کا وزن بیان کیا جاتا ہے خوبصورت گفتگو ہوتی ہے بعض اوقات اس میں لحن ہوتا ہے اور بہترین گفتگو وہ ہوتی ہے جو بامعنی ہو۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 328 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 121

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، موعظة الأمام للخصوم، جلد 2، صفحہ 1062

وہ مراد یہ لیتا ہے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور ارادہ کسی اور چیز کا کرتی ہے وہ اپنی گفتگو میں تعریض کرتی ہے اور اپنی ذہانت وفطانت سے اسے اصل جہت سے پھیر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ۔

کلبی نے کہا: اس آیت کے نزول کے بعد کسی منافق نے آپ سے گفتگو نہ کی مگر آپ نے اسے پہچان لیا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منافق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی گفتگو کرتے تھے جس میں آپ کے سامنے تواضع سے کام لیا کرتے تھے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سن رہے ہوتے تھے اور ظاہر ومعتاد معنی لیتے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا بعد میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کلام سنتے تو انہیں پہچان لیتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کوئی منافق آپ پر مخفی نہ رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی وحی یا کسی علامت کے ساتھ ذریعے پہچان کرادی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علامت کو پہچان لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پہچان کرادی تھی۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ ۝ یعنی اس پر ان میں سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

## وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ أَخْبَارَكُمْ ۝

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پرکھیں گے تمہارے حالات کو''۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ہم تم پر شرعی احکام لازم کریں گے اگرچہ ہم امور کے عواقب کو اچھی طرح جانتے ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے ہم تمہارے ساتھ ممتحن کا سا معاملہ کریں گے۔

حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حَتّٰى نَعْلَمَ کا معنی ہے ہم جدا جدا کر دیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ عام قراءت نون کے ساتھ ہے نَبْلُونکم، نَعْلَم، نَبْلُوا۔

ابوبکر نے عاصم سے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور رویس نے یعقوب سے واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی نبلو۔ کیونکہ یہ ماقبل سے الگ ہے۔ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کا تعلق حَتّٰى نَعْلَم کے ساتھ ہے، یہ علم وہ ہے جس کے ساتھ جزا واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا علم قدیم کی بنا پر نہیں دے گا بلکہ ان کے اعمال پر جزا دے گا۔ اس کی تاویل یہ ہے یہاں تک ہم مجاہدین کو علم شہادت سے جان لیں کیونکہ انہیں عمل کا حکم دیا گیا انہوں نے جو کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتا ہے ثواب وعقاب کی جزا علم شہادت پر ہوگی۔

وَنَبْلُوَا۟ أَخْبَارَكُمْ ۝ ہم ان کو آزمائیں اور ہم انہیں ظاہر کریں۔ ابراہیم بن اشعث نے کہا: جب حضرت فضیل بن عیاض اس آیت کو پڑھا کرتے تھے تو رویا کرتے اور دعا کرتے: اے اللہ! ہمیں نہ آزما کیونکہ جب تو ہمیں آزمائے گا تو تو ہمیں رسوا کر دے گا اور ہمارے پردوں کو چاک کر دے گا(2)۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 305　2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 328

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴿٣٢﴾

''بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور لوگوں کو بھی روکتے رہے اللہ کی راہ سے اور مخالفت کرتے رہے رسول (کریم) کی باوجود یکہ ظاہر ہو چکی تھی ان کے لیے راہ ہدایت وہ قطعاً اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا''۔

یہ آیت منافقوں یا یہودیوں کی طرف لوٹتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو غزوہ بدر کے موقع پر کھانا کھلایا کرتے تھے، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ (الانفال: 36)

وَشَاقُّوا الرَّسُولَ یعنی رسول سے دشمنی کی اور اس کی مخالفت کی۔ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ یعنی وہ دلائل اور آیات سے جانتے تھے کہ آپ نبی ہیں۔ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وہ اپنے کفر کے باعث اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴿٣٢﴾ انہوں نے جو عمل کیا اس کا ثواب برباد کر دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی اور نہ ضائع کرو اپنے عملوں کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ جب کفار کی حالت کو بیان کیا تو مومنوں کو حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کے اور رسول اللہ کی سنن میں طاعت کو لازم پکڑو۔

وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾ یعنی اپنی نیکیوں کو معاصی کے ساتھ باطل نہ کرو(1)، یہ حضرت حسن بصری کا نقطہ نظر ہے۔ زہری نے کہا: کبیرہ گناہ کر کے اپنے اعمال کو باطل نہ کرو(2)۔ ابن جریج نے کہا: ریاکاری اور شہرت کی خواہش کر کے اپنے اعمال باطل نہ کرو(3)۔ مقاتل اور ثمالی نے کہا: احسان جتلا کر اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ یہ اسے خطاب ہے جو اسلام قبول کرنے کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان جتلایا کرتا تھا۔ سب معانی قریب قریب ہیں۔ حضرت حسن بصری کا قول سب کو جامع ہے۔ اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ کبیرہ گناہ طاعات کو برباد کر دیتا ہے اور نافرمانیاں ایمان سے خارج کر دیتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہمارے دوسرے علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نفل نماز ہو یا روزہ اس کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں عمل کا ابطال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ جس نے اس کی اجازت دی یعنی امام شافعی وغیرہ انہوں نے کہا: اس سے مراد فرض عمل کا ثواب ہے تو ایسے آدمی کو اپنے عمل کے ثواب کو باطل کرنے سے منع

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 306 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کیا گیا۔ جہاں تک نفل عمل کا تعلق ہے اسکے شروع کرنے کے بعد توڑنا کوئی منع نہیں، کیونکہ یہ اس پر واجب نہیں تھا۔ اگر وہ یہ گمان کریں کہ لفظ عام ہے تو عام کی تخصیص جائز ہے۔ اس کی تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ نفل زائد عمل ہوتا ہے اور زائد عمل اختیار کا تقاضا کرتا ہے۔

ابو العالیہ سے مروی ہے: لوگوں کا خیال تھا اسلام لانے کے بعد کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو لوگ اعمال کی بربادی کے ڈر سے گناہ کبیرہ سے ڈرنے لگے۔ مقاتل نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب تم نے رسول کی نافرمانی کی تو تم نے اپنے اعمال کو باطل کر دیا۔

**اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝۳۴**

”بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی حق سے روکتے رہے پھر وہ مر گئے کفر کی حال میں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا“۔

اس امر کو واضح کیا کہ کفر کی صورت میں موت یہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنے کو واجب کر دیتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ وضاحت گذر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آیت کا مصداق غزوہ بدر کے گڑھے میں ڈالے جانے والے لوگ ہیں (1)۔ اس آیت کے احکام عام ہیں۔

**فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۵**

”(اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال اور (کوششوں) کو ضائع نہیں ہونے دے گا“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَلَا تَهِنُوْا تم قتال سے ضعف کا اظہار نہ کرو۔ وھن کا معنی ضعف ہے۔ وقد وَهَنَ الإنسان وَوَهَنَهُ غیرہ یہ کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی غیر متعدی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا: إنني لست بموهونٍ فَقِرْ وھن کسرہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس کا معنی بھی کمزور ہونا ہے۔ اسے فما وهنوا بھی پڑھا گیا ہے یعنی ھاء پر ضمہ اور کسرہ ہے۔ سورۂ آل عمران میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ السلم کا معنی صلح ہے وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تم ان کی بنسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بہتر جانتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم دلیل دینے میں غالب ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم غالب ہو

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 329

کیونکہ تم مومن ہو اگرچہ بعض احوال میں وہ تم پر غالب آجائیں گے۔ قتادہ نے کہا: تم پہلا ایسا طائفہ نہ بنو جو اپنے مدمقابل کے سامنے مغلوب ہو گیا(1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ علماء نے اس کے حکم میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ الله تعالیٰ کے فرمان: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال: 61) کے لیے ناسخ ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے صلح کی طرف میلان کرنے سے منع کیا ہے جب مسلمانوں کو صلح کی ضرورت نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ محکم ہے۔ دونوں آیات دو مختلف الحال وقتوں میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا یہ مخصوص افراد کے بارے میں ہے، جبکہ دوسری عام ہے۔ کفار کے ساتھ صلح ضرورت کے وقت ہی ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے جب مسلمانوں کے ضعف کی وجہ سے ہم ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں۔ یہ بحث مفصل گذر چکی ہے۔

وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ الله تعالیٰ نصرت اور مدد کرنے میں تمہارے ساتھ ہے جس طرح ارشاد ہے: وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (العنکبوت)

وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ یعنی وہ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کرے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے یہ قول مروی ہے اسی سے ایک لفظ موتور ہے جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے تو اس کا قصاص نہ لیا جا سکے۔ اس کا باب یوں چلے گا وَتَرَهٗ يَتِرَهٗ وَتْرًا وَتِرَةً۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من فاتته صلاة العصر فكأنما وتر أهله وماله (2) جس آدمی کی عصر کی نماز فوت ہو جائے گویا اس کے اہل اور مال میں نقصان ہو گیا، اسی طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: وترہ حقہ اس نے اسکے حق میں کمی کی۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ الله تعالیٰ تیرے اعمال میں کمی نہیں کرتا۔ جس طرح تو کہتا ہے: دخلت البيت، أنت تريد في البيوت یعنی ایک جملہ میں فی' صلہ موجود ہے اور دوسرے میں نہیں ہے؛ یہ جوہری کا نقطہ نظر ہے۔ فراء نے کہا: وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ یہ وتر سے مشتق ہے جس کا معنی فرد ہے معنی ہوگا، یعنی تمہیں ثواب کے بغیر تنہا نہیں چھوڑے گا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾

''یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگار بن جاؤ تو وہ تمہیں تمہارے اجر عطا کرے گا اور وہ طلب نہ کرے گا تمہارے مال۔ اگر وہ طلب کرے تم سے تمہارے مال اور اس پر اصرار کرے تو تم بخل کرنے لگو اور (یوں) ظاہر کر دے گا تمہاری ناگواریوں کو''۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ سورۃ الانعام میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ یہ کلام شرط اور جواب ہے۔ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ یعنی وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم زکوۃ میں سارا مال ہی دے دو بلکہ اس نے بعض

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 329
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، التغليظ في تفويت العصر، جلد 1، صفحہ 226

مال نکالنے کا حکم دیا ہے؛ یہ ابن عیینہ اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ تمہارے اموال اپنی ذات کے لیے یا اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں مانگتا وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ اس کا ثواب تمہاری طرف لوٹے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے وہ تم سے اپنے اموال کا سوال کرتا ہے کیونکہ اموال کا وہی مالک ہے اور وہ عطا فرما کر احسان کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء رسالت کی تبلیغ پر تم سے کسی اجر کا سوال کرنے والے نہیں اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (الفرقان: 57)

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ یعنی وہ تم سے اصرار کرتا، یہ کہا جاتا ہے: أحفی بالمسئالۃ، الحف اور الحب کا ایک ہی معنی ہے۔ حفی اسے کہتے ہیں جو سوال کرنے میں انتہا تک جائے، اسی طرح احفاء کا لفظ گفتگو اور منازعہ میں بہت دور تک جانا ہے۔ اسی معنی میں أحفی شاربہ ہے، یعنی اس نے مونچھیں کاٹنے میں بہت سختی کی۔

تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝۳۷ یعنی بخل تمہاری ناگواری کو ظاہر کر دے گا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ مال کا سوال کرنے میں ناگواری کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابن محیصن اور حمید نے وتخرج پڑھا اور أضغانکم کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وہ فاعل ہے۔

ولید نے یعقوب حضری سے ونخرج نقل کیا ہے۔ ابو معمر، عبد الوارث سے وہ ابو عمرو سے ویخرج جیم میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہاں گفتگو ختم ہوتی ہے اور پھر نئی کلام شروع ہوتی ہے، ان سے مشہور ویخرج ہے جس طرح باقی قراء کی قراءت ہے اس کا عطف ماقبل کلام پر ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝۳۸

''ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنے مال) خرچ کرو اللہ کی راہ میں پس تم میں سے کچھ بخل کرنے لگتے ہیں اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے تو وہ اپنی ذات سے بخل کر رہا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے (کسی کا محتاج نہیں) بلکہ تم (اس کے) محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے''۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ اے مومنو! تم ہی وہ ہو جن کو دعوت دی جاتی ہے۔

لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی تم جہاد اور بھلائی کے راستہ میں خرچ کرو۔ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ یہاں عن، علی کے معنی میں ہے، یعنی اجر و ثواب اسے روکتا ہے وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ یعنی وہ تمہارے اموال کا محتاج نہیں وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ تم اموال کے محتاج ہو وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ یعنی ایسی قوم لے آئے گا جو تمہاری بنسبت اللہ

تعالیٰ کے زیادہ محتاج ہوں گے۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ صحابہ نے پوچھا: ہماری جگہ کن لوگوں کو بدل دیا جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ مارا پھر فرمایا: ''یہ اور اس کی قوم، یہ اور اس کی قوم'' (1)۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس میں سند میں اعتراض کی گنجائش ہے۔

عبداللہ بن جعفر بن نجیح جو علی بن مدینی کے والد تھے نے یہ حدیث علاء بن عبدالرحمٰن سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں (2) جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا اگر ہم روگردانی کریں تو ان کو ہماری جگہ لے آیا جائے گا پھر وہ ہماری مثل نہ ہوں گے؟ کہا: حضرت سلمان فارسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسی کی ران پر ہاتھ مارا فرمایا: ''یہ اور اس کے ساتھی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر ایمان ثریا کے ساتھ لٹک رہا ہوگا تو فارس کے لوگ اس کو حاصل کرلیں گے'' حضرت حسن بصری نے کہا: وہ عجمی لوگ ہیں (3)۔ عکرمہ نے کہا: وہ فارس اور روم کے لوگ ہیں۔ محاسبی نے کہا: عربوں کے بعد تمام عجمی لوگوں میں سے ایرانیوں سے بڑھ کر کون دین میں اچھا ہوگا اور ان میں سے ہی علماء ہوں گے۔

ایک قول کیا گیا ہے: وہ یمنی ہیں اور وہی انصار ہیں؛ یہ شریح بن عبید نے کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے: وہ انصار ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ملائکہ ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: وہ تابعی ہیں۔ مجاہد نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرنے میں وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے خوش ہوئے اور فرمایا: ''یہ دنیا سے زیادہ مجھے محبوب ہے''۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد 2، صفحہ 158　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 331

# سورۃ الفتح

آیاتہا ۲۹　۴۸ سورۃ الفتح مدنیۃ ۱۱۱　رکوعاتہا ۴

سب کا اتفاق ہے کہ یہ مدنی ہے اس کی انتیس آیات ہیں، یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان حدیبیہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ محمد بن اسحاق نے زہری سے وہ عروہ سے وہ مسعود بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت نقل کرتے ہیں دونوں نے کہا: سورۂ فتح مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان حدیبیہ کے متعلق ابتدا سے آخر تک نازل ہوئی۔ صحیحین میں زید بن اسلم سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک سفر میں چل رہے تھے جبکہ حضرت عمر بن خطاب ان کے ساتھ رات کے وقت ساتھ ساتھ چل رہے تھے، حضرت عمر بن خطاب نے آپ سے کوئی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی جواب نہ دیا، حضرت عمر نے پھر عرض کی تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا، انہوں نے عرض کی تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا حضرت عمر نے کہا: عمر کی ماں روئے تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار سوال کرنے میں مبالغہ سے کام لیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے جواب نہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی پھر میں سب لوگوں سے آگے نکل گیا اور مجھے ڈر ہونے لگا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوگا میں تھوڑا وقت بھی نہیں ٹھہرا تھا کہ میں نے ایک آواز دینے والے کو آواز دیتے ہوئے سنا، میں نے کہا: مجھے ڈر تھا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوگا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آج مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے جو مجھ پر ہر چیز سے محبوب ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے پھر اس آیت کی تلاوت کی اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

صحیح مسلم میں قتادہ سے مروی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا: جب یہ آیات نازل ہوئیں اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْۤا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس لوٹ رہے تھے صحابہ کرام بڑے غمگین تھے جبکہ آپ نے حدیبیہ کے مقام پر قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا تھا فرمایا: ''ابھی مجھ پر ایک ایسی آیت نازل ہوئی ہے جو مجھ پر تمام دنیا سے بڑھ کر زیادہ محبوب ہے'' (2)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، سورۂ فتح، جلد 2، صفحہ 749

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر صلح حدیبیہ، جلد 2، صفحہ 106

عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (الاحقاف:9) انہوں نے کہا: ہم ایک ایسے آدمی کی کس طرح پیروی کریں جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے؟ یہ امر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بڑا شاق گذرا تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ مقاتل بن سلیمان نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (الاحقاف:9) نازل کی تو مشرک اور منافق خوش ہوئے اور کہا: ہم ایسے آدمی کی کیسے اتباع کریں جو یہ نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے؟ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب آپ حدیبیہ سے واپس آرہے تھے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ یعنی ہم نے آپ کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے۔ اس آیت نے اس آیت کو منسوخ کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جس کے بدلے میں سرخ اونٹ مجھے خوش نہیں کرتے'' مسعودی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے جس نے رمضان شریف کی پہلی رات میں نفلی نماز میں سورۂ فتح پڑھی اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ رکھے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ ۙ

''یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی''۔

اس فتح کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ بخاری شریف میں ہے محمد بن بشار، غندر سے، وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے(1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم فتح سے مراد یوم حدیبیہ ہی شمار کیا کرتے تھے۔ فراء نے کہا: فتح سے مراد فتح مکہ لیا کرتے تھے(2) جبکہ فتح مکہ تو فتح ہے اور ہم فتح سے مراد بیعت رضوان لیتے جو حدیبیہ کے موقع پر ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہماری تعداد چودہ سو تھی اور حدیبیہ ایک کنواں ہے۔ ضحاک نے کہا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ یہ قتال کے بغیر فتح ہوئی، صلح بھی فتح کی صورت ہے(3)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد حدیبیہ کے مقام پر جانور قربان کرنا اور اپنے سر کا حلق کرانا تھا(4) حدیبیہ کی فتح عظیم نشانی تھی اس کا پانی نکالا گیا تو آپ نے اس میں کلی کی تو اس میں پانی زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ جو افراد بھی آپ کے ساتھ تھے سب نے اس پانی کو پیا۔ موسیٰ بن عقبہ نے کہا: جب صحابہ حدیبیہ سے واپس آ گئے(5) تو ایک آدمی نے کہا: یہ فتح نہیں، انہوں نے ہمیں بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلکہ یہ سب سے بڑی فتح ہے مشرک اس بات پر

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، انا فتحنا لك فتحاً مبیناً، جلد 2، صفحہ 716

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 310

3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 166

4۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 258

5۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 332

راضی ہو گئے ہیں کہ وہ تمہیں اپنے شہروں سے نرمی سے جانے دیں، تم سے فیصلہ کا سوال کریں، امان میں تم سے رغبت کریں جبکہ انہوں نے تم سے وہ کچھ دیکھ لیا ہے جس کو وہ ناپسند کریں'' (1)۔

امام شعبی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ کے بارے میں فرمایا: اس سے مراد فتح حدیبیہ ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کے ذریعے وہ کچھ حاصل کیا جو آپ نے کسی غزوہ میں حاصل نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی خطاؤں کو معاف کر دیا، آپ کے ہاتھ پر بیعت رضوان ہوئی، صحابہ کو خیبر کی کھجوریں کھلائی گئیں، ہدی اپنے مقام کو پہنچی، رومی ایرانیوں پر غالب آئے، مومن اہل کتاب کے مجوسیوں پر غالب آنے سے خوش ہوئے۔

زہری نے کہا: حدیبیہ عظیم فتح تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ چودہ سو صحابہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف آئے تھے جب صلح ہو گئی تو لوگ ایک دوسرے سے ملے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے متعلق جانا اور اس کے کلام کو سنا جس نے بھی اسلام کا ارادہ کیا اس کو قبول کرنے کی اس میں آسانی پائی دو سال بھی نہ گذرے تھے مگر مسلمان دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ مکرمہ آئے۔

مجاہد نے یہ بھی کہا اور عوفی کا یہ قول ہے: اس سے مراد فتح خیبر ہے؛ پہلا قول اکثر کا قول ہے جبکہ خیبر ایک وعدہ تھا جو ان سے کیا گیا جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ۔ حضرت مجمع بن جاریہ جو ان قراء میں سے ایک ہیں جنہوں نے قرآن پڑھا کہا: ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں حاضر تھے جب ہم اس سے واپس آئے تو لوگ جو اونٹوں کو تیز چلا رہے تھے (2) بعض لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے بتایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر وحی کی ہے کہا: ہم تیزی سے نکلے تو ہم نے نبی کریم ﷺ کو کراع غمیم میں پایا جب لوگ جمع ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے ان آیات کو پڑھا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا: ''ہاں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ فتح ہے'' خیبر کے اموال صلح حدیبیہ میں شریک لوگوں میں تقسیم کئے گئے ان میں وہی فرد شامل تھا جو حدیبیہ میں موجود تھا (3)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان فَتْحًا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مکہ مکرمہ زبردستی فتح کیا گیا کیونکہ فتح کا لفظ نہیں بولا جاتا مگر جسے سختی کے ساتھ فتح کیا گیا ہو یہ اس اسم کی حقیقت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فتح البلد صلحا صلح کا معنی سمجھ نہیں آتا مگر جب وہ فتح کے ساتھ ملا ہوا ہو پس فتح صلح میں مجازی معنی میں ہوگا۔ روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ زبردستی فتح ہوا۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 166 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 420

3۔ ابوداؤد، باب فی من اسهم سهما، حدیث 2359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

"تا کہ دور فرمادے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے اور تکمیل فرمادے اپنے انعام کو آپ پر اور چلائے آپ کو سیدھی راہ پر اور تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمادے جو زبردست ہے"۔

ابن انباری نے کہا: فَتْحًا مُّبِيْنًا پر کلام مکمل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ یہ فتح سے متعلق ہے گویا فرمایا: ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے فتح کے ساتھ مغفرت کو جمع کر دے اور اللہ تعالیٰ آپ کے لیے وہ چیز جمع کر دے جس سے دنیا و آخرت میں آپ کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ ابو حاتم سجستانی نے کہا: یہ لام قسم ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ لام مکسور نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے ساتھ نصب دی جاتی ہے اگر یہ جائز ہے تو یہ بھی جائز ہوتا لیقوم زید اس کی تاویل لیقومن زید ہے۔

زمخشری نے کہا: اگر تو یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کو مغفرت کی علت کیسے بنایا ہے؟ میں کہوں گا: اللہ تعالیٰ نے اسے مغفرت کی علت نہیں بنایا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں چار امور کو جمع کیا گیا ہے وہ مغفرت، اتمام نعمت، صراط مستقیم کی ہدایت اور غالب مدد۔ گویا فرمایا: ہم نے تیرے لیے فتح مکہ کو آسان بنا دیا تیرے دشمن کے خلاف تیری مدد کی تا کہ آپ کے لیے دونوں جہانوں کی عزتوں اور دنیا و آخرت کے غلبہ کو جمع کر دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مراد فتح مکہ ہو اس حیثیت سے کہ یہ دشمن کے ساتھ جہاد ہے، مغفرت اور ثواب کا سبب ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت انس سے مروی ہے کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس آرہے تھے(1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ پر ایک ایسی آیت نازل کی گئی ہے جو روئے زمین پر جو بھی چیز ہے اس سے یہ مجھے زیادہ محبوب ہے" پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اس آیت کو پڑھا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو بیان کر دیا ہے جو آپ کے ساتھ معاملہ کرنے والا ہے وہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے، اس بارے میں حضرت مجمع بن جاریہ سے بھی ایک روایت مروی ہے۔

علماء نے لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے مراد ہے کہ اعلان نبوت سے قبل جو آپ سے ایسے اعمال ہوئے جن کو آپ اپنی شان کے خلاف خیال کرتے ہیں اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد جو اعلان نبوت کے بعد جو اعمال ہوئے؛ یہ مجاہد کا قول ہے، اسی کی مثل طبری اور سفیان ثوری نے کہا۔ طبری نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (نصر) کی طرف راجع ہے یعنی اعلان نبوت سے پہلے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ فتح، جلد 2، صفحہ 159

اعلان نبوت کے بعد اس آیت کے نزول تک۔

سفیان ثوری نے کہا: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جو وحی کے نزول سے پہلے آپ نے دور جاہلیت میں کیے اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جو بعد آپ نے نہ کیے، یہ واحدی کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ انبیاء سے گناہ صغیرہ صادر ہو سکتے ہیں؛ یہ ایک قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا تَقَدَّمَ سے مراد فتح سے پہلے اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد فتح کے بعد کے اعمال ہیں۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے: مَا تَقَدَّمَ سے مراد اس آیت کے نزول سے پہلے اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد جو اس کے بعد ہیں۔

عطا خراسانی نے کہا: مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کی خطا ہے اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد آپ کی امت کے گناہ ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف اولی اعمال اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد انبیاء کے خلاف اولی اعمال ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا تَقَدَّمَ سے مراد غزوہ بدر کے دن کی خطا اور وَ مَا تَاَخَّرَ سے مراد غزوہ حنین کے موقع کی خطا ہے۔ غزوہ بدر کے موقع پر جو خطا ہوئی وہ یہ تھی کہ آپ نے یہ دعا کی: اے اللہ اگر تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا (2) تو زمین میں کبھی تیری عبادت نہیں کی جائے گی (3) آپ نے اس قول کو کئی دفعہ دہرایا اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی آپ کو کیسے علم ہوا کہ اگر میں نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو میری کبھی بھی عبادت نہیں کی جائے گی؟ تو یہ وہ پہلی خطا تھی۔ جہاں تک دوسری خطا کا تعلق ہے تو وہ غزوہ حنین کا موقع ہے جب لوگ شکست کھا گئے تو آپ نے اپنے چچا حضرت عباس اور چچا زاد بھائی ابوسفیان سے کہا: مجھے وادی سے سنگریزوں کی ایک مٹھی اٹھا کر دو تو دونوں نے سنگریزے اٹھا کر دیئے آپ نے انہیں ہاتھ میں لیا اور مشرکوں کے منہ پر مارا اور فرمایا: شاهت الوجوه۔ حم۔ لا ينصرون۔ تو مشرک سارے کے سارے شکست کھا گئے کوئی آدمی نہ بچا مگر اس کی آنکھیں ریت اور سنگریزوں سے بھر گئیں پھر آپ نے اپنے ساتھیوں کو ندا کی تو وہ پلٹ آئے جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں فرمایا: ''اگر میں انہیں وہ مٹھی بھر سنگریزے نہ مارتا تو وہ شکست نہ کھاتے'' تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: 17) یہ دوسری خطا تھی۔ ابو علی روزباری نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اگر آپ کی کوئی پرانی یا نئی خطا ہوگی تو ہم آپ کے لیے اسے بخش دیں گے۔

وَ یُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نعمت سے مراد جنت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نبوت وحکمت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد مکہ مکرمہ، طائف اور خیبر کی فتح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے تکبر کیا تھا اس نے خشوع وخضوع اپنا لیا اور جو جابر بنا ہوا تھا اس نے طاقت اختیار کر لی وَ یَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۝ یعنی آپ کو

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 167 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 126

3۔ صوفیاء نے اس کی کیا ہی خوبصورت تعبیر کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی زندگی تو مقام نیاز کے حوالے سے گذری تا ہم یہ مرحلہ اور اس جیسے دوسرے مقامات مقام ناز سے تعلق رکھتے ہیں، لوٹنے کی جا ہے۔ مترجم۔

ہدایت پر ثابت قدم کرے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے پاس بلا لے گا۔

وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ یعنی ایسی مدد کرے گا جو غالب ہوگی جس کے بعد کوئی ذلت و عاجزی نہ ہوگی۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْۤا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

''وہی ہے جس نے اتارا اطمینان کو اہل ایمان کے دلوں میں تاکہ وہ اور بڑھ جائیں (قوت) ایمان میں اپنے پہلے ایمان کے ساتھ، اور اللہ کے زیر فرمان ہیں سارے لشکر آسمانوں اور زمین کے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بہت دانا ہے''۔

السَّكِيْنَةَ سے مراد سکون وطمانینت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی سکینہ کا لفظ ہے اس سے مراد طمانینت ہے مگر جو سورۂ بقرہ میں ہے، ایمان کی زیادتی کا معنی سورۂ آل عمران میں گذر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت کے ساتھ مبعوث کیا گیا(1) جب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بارے میں تصدیق کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نماز کو زائد کر دیا جب انہوں نے اس حکم میں آپ کی تصدیق کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ کو زائد کیا، جب انہوں نے اس امر میں آپ کی تصدیق کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر روزوں کو زائد کر دیا، جب انہوں نے اس مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حج کا اضافہ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دین کو مکمل کیا اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِيَزْدَادُوْۤا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ کا یہی مصداق ہے یعنی ایمان سے مراد خشیت ہے۔ ضحاک نے کہا: یہاں اس سے مراد یقین ہے(2)۔

وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جنود سے مراد ملائکہ، جن، شیاطین اور انسان ہیں۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے احوال سے باخبر ہے حَكِيْمًا جس کا ارادہ کرتا ہے اس میں حکیم ہے۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

''تاکہ داخل کر دے ایمان والوں اور ایمان والیوں کو باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور دور فرمادے ان سے ان کی برائیوں کو اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے سکینہ کو نازل فرمایا تاکہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو پھر یہ زیادتی انہیں جنت میں داخل کرنے کے سبب سے ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لِّيُدْخِلَ میں لام اسی کے متعلق ہے جس کے متعلق لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ کا لام ہے۔

وَ كَانَ ذٰلِكَ اسم اشارہ سے مراد مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا وعدہ اور گناہوں کی بخشش ہے عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ یہ غم

1۔ [illegible] ج 26، صفحہ 84 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 187

سے نجات اور ہر مطلب میں کامیابی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ پر اس آیت کو پڑھا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کو مبارک ہو تو ہمارے لیے کیا ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ جب یہ حصہ پڑھا وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ انہوں نے عرض کی: آپ کو مبارک ہو تو یہ آیت نازل ہوئی: وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (المائدہ: 3) جب پڑھا: وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ تو امت کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا جب پڑھا: وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ تو یہ آیت وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الروم) نازل ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (الاحزاب) پھر فرمایا: هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ (الاحزاب: 43) قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۖ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

''اور تاکہ عذاب میں مبتلا کر دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور عورتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں برے گمان رکھتے ہیں انہیں ہی پر ہے گردش اور ناراض ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان پر اور (اپنی رحمت سے) انہیں دور کر دیا ہے اور تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جہنم اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان ہیں سارے لشکر آسمانوں اور زمین کے اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے''۔

الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ یعنی انہوں نے گمان کیا کہ نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ کی طرف نہیں لوٹیں گے اور نہ ہی آپ کے صحابہ میں سے کوئی واپس لوٹے گا یہ اس وقت ان کا گمان تھا جب آپ حدیبیہ کے لیے نکلے تھے اور ان کا یہ گمان تھا کہ مشرک تباہ و برباد کر دیں گے جس طرح کہا: بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا خلیل اور سیبویہ نے کہا: اس سے یہاں مراد فساد ہے۔

عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ دنیا میں ان پر بری گردش ہوگی انہیں قتل کیا جائیگا اور انہیں قیدی بنا لیا جائیگا اور آخرت میں جہنم ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے پڑھا دائرۃ السُّوْ یعنی ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جبکہ باقی قراء نے فتحہ دیا۔ جوہری نے کہا: ساءہ یسوءہ سَوْءًا، مَسَاءۃ، مَسَایۃ یہ سر کی ضد ہے اس کا اسم السُّو ہے اسے علیہم دائرۃ السُّوء بھی پڑھا گیا ہے یعنی شکست اور تکلیف، جس نے اسے فتحہ دیا اس نے اسے مساءۃ سے مشتق مانا ہے۔

وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ اس کے بارے میں گفتگو کئی دفعہ گزر چکی ہے الحمد اللہ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب صلح حدیبیہ ہوئی تو ابن ابی نے کہا: کیا حضرت محمد ﷺ یہ گمان کرتے ہیں کہ جب اہل مکہ سے صلح کریں گے یا مکہ کو فتح کرلیں گے تو اس کا کوئی دشمن نہیں رہے گا ایرانی اور رومی کہاں ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس امر کو بیان کیا کہ آسمانوں اور زمین کے لشکر ایرانیوں اور رومیوں سے زیادہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تمام مخلوقات داخل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ سے مراد فرشتے ہیں اور زمین کے لشکر مومن ہیں۔ اس کو دوبارہ ذکر کیا کیونکہ جس کا ذکر پہلے ہوا تھا وہ قریش میں سے مشرکوں کے ذکر کے بعد تھا اور یہ منافقوں اور باقی ماندہ مشرکوں کے ذکر کے بعد ہے دونوں مقامات پر مراد خوفزدہ کرنا اور ڈرانا ہے اگر اللہ تعالیٰ منافقوں اور مشرکوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرے تو یہ چیز اسے عاجز نہ کر سکتی لیکن اللہ تعالیٰ ایک معین عرصہ تک انہیں مہلت دیتا ہے۔

**اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ﴿۸﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۹﴾**

”بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر (اپنی رحمت کی) خوشخبری سنانے (عذاب سے) بروقت ڈرانے والا تا کہ اے لوگو! تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور تا کہ تم ان کی مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم کرو اور پاکی بیان کرو اللہ کی صبح اور شام“۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا قتادہ نے کہا: ہم نے آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے کہ انہوں نے حق کی تبلیغ کی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر گواہ بنا کر بھیجا کہ انہوں نے اطاعت یا معصیت میں سے جو اعمال کیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ کو انکے لیے ان امور کو بیان کرنے والا بنا کر بھیجا جن کے ساتھ ہم نے آپ کو ان کی طرف بھیجا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے روز ان پر گواہی دیں گے۔ سورۃ النساء میں حضرت سعید بن جبیر کی روایت سے یہ معنی واضح طور پر گزر چکا ہے۔

مُبَشِّرًا جو اطاعت کرے اس کو جنت کی بشارت دینے والا بنا کر بھیجا گیا وَّ نَذِيْرًا اور آگ سے خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا گیا اسے جو نافرمانی کرے؛ یہ قتادہ اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں بشارت اور نذارت کا اشتقاق اور دونوں کا معنی گزر چکا ہے۔ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۸﴾ تینوں کو حال مقدرہ کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے سیبویہ نے یہ مثال بیان کی ہے مررت برجل معه صقر صائدا غدا معنی ہے بے شک ہم نے آپ کو بھیجا اس حال میں کہ ہم آپ کی شہادت کو قیامت کے روز مقدر کرنے والے ہیں اسی بنا پر تو کہتا ہے: رایت عمرًا قائما غدا۔

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ابن کثیر، ابن محیصن اور ابو عمرو نے لیؤمنوا پڑھا ہے اسی طرح یعزروہ ویوقروہ ویسبحوہ سب کو یاء کے ساتھ خبر کے طور پر پڑھا ہے؛ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ مومنوں کا اس سے پہلے اور اس کے بعد میں ذکر موجود ہے جہاں تک اس سے ماقبل کا تعلق ہے تو وہ لِّيُدْخِلَ اور جہاں تک اس کے بعد کا تعلق ہے تو وہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ ہے باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے؛ اسے ابو حاتم نے پسند کیا وَ تُعَزِّرُوْهُ تم اس کی عظمت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 312

بجالاؤ اور تفخیم شان کا اہتمام کرو؛ یہ حضرت حسن بصری اور کلبی کا نقطہ نظر ہے۔ تعزیر کا معنی تعظیم و توقیر ہے۔ قتادہ نے کہا: تم اس کی مدد کرو اور اس کا دفاع کرو اسی سے حد میں تعزیر ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی انسان کو برے اعمال سے روکتی ہے۔ قشیری نے کہا:

أَلا بَكَرَتْ مَيٌّ بغير سَفَاهَةٍ تُعَاتِبُ والمَوْدُودُ ينفعه العَزْرُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تقاتلون معه بالسيف تم آپ کی معیت میں تلوار کے ساتھ قتال کرتے ہو۔ بعض اہل لغت نے کہا: تم آپ کی اطاعت کرتے ہو(1) وَتُوَقِّرُوْهُ یعنی تم آپ کو سردار بناتے ہو(2)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم اس کی عظمت بجالاتے ہو۔ توقیر کا معنی تعظیم کرنا ہے۔ دونوں میں ھاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے یہاں وقف تام ہے پھر تو کلام کو شروع کرے گا وَتُسَبِّحُوْهُ تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو گے بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ صبح و شام۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غائب کی ضمیریں تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اس صورت میں ہوگا تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ یعنی تم اس کے لیے ربوبیت کی صحت کو ثابت کرو اور اس کے لیے اس امر کی نفی کرو کہ اس کا کوئی بچہ ہو یا شریک ہو؛ قشیری نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ پہلا قول ضحاک کا ہے اس تعبیر کی صورت میں کلام کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہوگا وہ وَتُسَبِّحُوْهُ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں بعض حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹے گا وہ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ہے یعنی تم آپ کو رسالت اور نبوت کے لقب سے بلایا کرو نام اور کنیت سے نہ بلایا کرو۔

وَتُسَبِّحُوْهُ کی دو صورتیں ہیں: (1) تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہر قبیح امر سے پاکی بیان کرنا ہے یا اس سے مراد نماز کا فعل ہے جس میں تسبیح ہوا کرتی ہے بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ صبح و شام۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گذر چکی ہے، شاعر نے اس لفظ سے یہ معنی لیا ہے:

لَعَمْرِی لأنت البيتُ أُكْرِمُ أهْلَه وأجلس في أَفْيَائه بالأصائل(3)

میری زندگی کی قسم! تو ایسا گھر ہے جس کے مکینوں کی میں عزت کرتا ہوں اور شام کے وقت میں اس کے صحن میں بیٹھتا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"(اے جان عالم) بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پس جس نے توڑ دیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہوگا اور جس نے ایفاء کیا اس عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو وہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا"۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ حدیبیہ میں آپ کی اطاعت کرتے ہیں اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ اس امر کی وضاحت کی کہ ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت یہ اللہ تعالیٰ کی بیعت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80) یہ بیعت، بیعت رضوان ہے جس کی وضاحت اس سورت میں ان شاء اللہ آجائے گی۔

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 88 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 313 3۔ ایضاً

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب دینے میں ہاتھ ان کی وفا میں ہاتھ سے بڑھ کر ہے جس قدر وہ اطاعت کرتے ہیں ان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہدایت دینے میں بڑھ کر ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا احسان اس سے بڑھ کر ہے جو انہوں نے بیعت کی ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قوت اور نصرت ان کی قوت اور نصرت سے بڑھ کر ہے فَمَنْ نَّكَثَ جس نے بیعت کے بعد معاہدہ توڑا فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ تو وعدہ توڑنے کا ضرر اسی پر لوٹے گا کیونکہ اس نے اپنی ذات کے لیے ثواب کو حرام کر دیا ہے اور اپنے اوپر عقاب کو لازم کر دیا ہے وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ یعنی بیعت کرتے وقت اس نے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کیا ایک قول یہ کیا گیا ہے ایمان لاتے وقت جو اس نے وعدہ کیا تھا فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ یعنی جنت میں۔ حفص اور زہری نے علیهُ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے جر دی ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابن عامر نے اسے فسنؤتیه نون کے ساتھ پڑھا ہے؛ فراء اور ابو معاذ نے اسے پسند کیا ہے باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطۂ نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اسم قریب ہے۔

سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝۱۱

''عنقریب آپ سے عرض کریں گے وہ دیہاتی جو پیچھے چھوڑے گئے تھے: ہمیں بہت مشغول رکھا ہمارے مالوں اور اہل وعیال نے پس ہمارے لیے معافی طلب کریں (اے حبیب) یہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں، آپ انہیں فرمائیے: کون ہے جو اختیار رکھتا ہے تمہارے لیے اللہ کے مقابلہ میں کسی چیز کا' ارادہ فرمائے تمہارے لیے کسی ضرر کا یا ارادہ فرمائے تمہارے لیے کسی نفع کا' بلکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے''۔

سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ مجاہد اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد غفار، مزینہ، جہینہ، اشجع اور دیل کے بدو ہیں (1) یہ وہ بدو قبائل تھے جو مدینہ طیبہ کے قریب رہا کرتے تھے جب صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو یہ لوگ گھروں میں بیٹھ رہے تھے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت دی تھی کہ وہ آپ کے ساتھ چلیں وہ قریش سے ڈر کی وجہ سے گھروں میں بیٹھے رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا، قربانی کے جانور ساتھ لیے تا کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ آپ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے انہوں نے گرانی محسوس کی اور کام کاج کا بہانا بنایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ انہیں مخلفون کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت سے پیچھے رکھا تھا مخلف کا معنی متروک ہے۔ سورۃ البراۃ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا یعنی کوئی ایسا آدمی نہیں جو ان امور کو سرانجام دے سکے فَاسْتَغْفِرْ لَنَا وہ مغفرت طلب کرتے

1۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 258

ہوئے آئے جبکہ ان کا اعتقاد ان کے ظاہر کے خلاف تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا ارشاد فرمایا: يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ یہ ان کا خالص نفاق تھا۔ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا حمزہ اور کسائی نے صرف یہاں ضُرًّا پڑھا ہے یعنی ایسا امر جو تمہیں نقصان پہنچائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد شکست ہے باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ ضر رتہ ضرا کا مصدر ہے۔ جب ضاد پر ضمہ ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو برا حال لاحق ہوتا ہے مصدر ایک دفعہ اور زیادہ دفعہ فعل کے وقوع کے معنی پر دلالت کرتا ہے؛ اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا ہے دونوں نے کہا: یہ نفع کے بالمقابل ہے جو ضر کی ضد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں لغتوں کا ایک ہی معنی ہے جس طرح فَقْر اور فُقْر، ضَعْف اور ضُعْف۔ اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا نفع سے مراد مدد اور غنیمت ہے۔ یہ ان کا رد ہے جب انہوں نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہیں گے تو یہ ان سے تکلیف کو دور کر دے گا اور ان کے لیے جلدی نفع لائے گا۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝

"حقیقت یہ ہے کہ تم نے خیال کر لیا تھا کہ اب ہرگز لوٹ کر نہیں آئیگا یہ پیغمبر اور ایمان والے اپنے اہل خانہ کی طرف کبھی اور بڑا خوش نما لگتا تھا یہ ظن (فاسد) تمہارے دلوں کو اور تم طرح طرح کے برے خیالوں میں مگن رہے اس وجہ سے تم برباد ہونے والی قوم بن گئے"۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا یہ گمان اس لیے تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی بہت تھوڑے ہیں وہ واپس نہیں پلٹیں گے وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ اسم اشارہ سے مراد نفاق ہے فِيْ قُلُوْبِكُمْ یہ تزیین شیطان کی طرف سے تھی یا اللہ نے ان کے دلوں میں یہ چیز پیدا کر دی تھی وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ظن سوء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ بورا سے مراد ہلاک ہونے والے؛ یہ مجاہد کا قول ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: وہ فسادی لوگ ہیں وہ بھلائی میں سے کسی چیز کے قابل نہیں (2)۔ جوہری نے کہا: بور سے مراد ایسا آدمی ہے جو فسادی ہے، ہلاک ہونے والا ہے جس میں کوئی بھلائی نہیں۔ عبداللہ بن زبعری سہمی نے کہا:

يا رسول المليك إن لساني راتق ما فتقتُ إذ أنا بور(3)

اے اللہ کے رسول! جب سے میں گمراہ اور تباہ حال تھا اس وقت میری زبان نے جو چاق کیے اب میری زبان انہیں سینے والی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے: امرۃ بور۔ ابو عبید نے اس کو بیان کیا ہے قوم بور، یعنی ہلاک ہونے والی قوم۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ بور یہ بائر کی جمع ہے جس طرح حائل کی جمع حُول آتی ہے۔ قد بار فلان، یعنی فلاں ہلاک ہو گیا۔ ابارہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بُوْرًا کا معنی شریر لوگ، یہ ابن بحر نے کہا: حضرت حسان

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 92 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 314 3۔ ایضاً

بن ثابت نے کہا:

لاینفع الطُول من نُوکِ الرجال وقد یھدی الإلٰہ سبیل المَعْشَر البور(1)

اس میں البور کا معنی ہلاک ہونے والا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝

''اور جو نہ ایمان لے آئے اللہ اور اس کے رسول پر تو بے شک ہم نے ان تمام کافروں کے لیے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے''۔

یہ ان کے لیے وعید ہے اور اس امر کی وضاحت ہے کہ انہوں نے نفاق اپنا کر کفر کیا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، بخش دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

وہ اپنے بندوں سے غنی ہے، اللہ تعالیٰ نے احکام کا مکلف بنا کر انہیں آزمایا تا کہ جو ایمان لائے اس کو ثواب دیں اور جو کفر و نافرمانی کرے اسے سزا دے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

''کہیں گے (پہلے سفر جہاد سے) پیچھے چھوڑے جانے والے جب تم روانہ ہوئے اموال کی طرف تا کہ تم ان پر قبضہ کر لو ہمیں بھی اجازت دو کہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کو بدل دیں۔ فرمائیے: تم قطعاً ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے یونہی فرما دیا اللہ تعالیٰ نے پہلے سے پھر وہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو (ان کا یہ خیال غلط ہے) درحقیقت وہ احکام الٰہی کے اسرار کو بہت کم سمجھتے ہیں''۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا مراد خیبر کی غنیمتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل حدیبیہ سے فتح خیبر کا وعدہ کیا تھا یہ حکم ان کے لیے ہی خاص تھا وہ غزوہ خیبر میں حاضر تھے یا غائب تھے اور اہل حدیبیہ میں سے حضرت جابر کے علاوہ کوئی غائب نہیں تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اسی طرح حصہ رکھا جس طرح ان لوگوں کا حصہ رکھا تھا جو غزوہ خیبر میں موجود تھے خیبر کی تقسیم کے ذمہ دار حضرت جبار بن صخر انصاری جو بنی سلمہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت زید بن ثابت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 314

جو بنی نجار سے تعلق رکھتے تھے دونوں حساب کو سمجھنے والے اور تقسیم کرنے والے تھے۔

**ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ** ہمیں چھوڑ دو تو کہتا ہے: ذرہ یعنی تو اسے چھوڑ دے ھو یذرہ، وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی اصل وذر یذر ہے جس طرح وسعہ یسعہ ہے اس کا پہلا حرف حذف کر دیا گیا ہے اسے وذرہ کہتے ہیں اور واذر نہیں کہتے لیکن کہتے ہیں: ترکہ وھو تارک۔

مجاہد نے کہا: وہ مکہ کی طرف نکلنے کی بجائے گھروں میں بیٹھے رہے۔ جب نبی کریم ﷺ نکلے اور لوگوں کو ساتھ لیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے کہا: ہمیں چھوڑ دو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں اور تمہارے ساتھ مل کر جنگ کرتے ہیں۔

**يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ** یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی کلام کو تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے **فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا** (التوبہ: 83) طبری اور دوسرے علماء نے اس قول کا انکار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوہ تبوک فتح خیبر اور فتح مکہ کے بعد ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں (1) جو اللہ تعالیٰ نے اہل حدیبیہ سے کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے عوض خیبر کی غنیمتیں ان کے لیے خاص کر دی تھیں کیونکہ وہ حدیبیہ سے صلح پر واپس آ گئے تھے؛ یہ مجاہد اور طبری کا قول ہے اسے ہی طبری نے پسند کیا ہے؛ عام علماء کی یہی رائے ہے حمزہ اور کسائی نے كَلِمَ پڑھا ہے یعنی الف کو ساقط کیا ہے اور لام کو کسرہ دیا ہے یہ کلمہ کی جمع ہے جس طرح سمہ اور سلم ہے باقی قراء نے اسے کلام پڑھا ہے جو مصدر ہے اسے ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا وہ اس ارشاد: **اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ** (الاعراف: 144) پر قیاس کیا ہے۔ کلام اس جملہ کو کہتے ہیں جو معنی دینے میں مستقل ہو۔ جوہری نے کہا: کلام اسم جنس ہے جو قلیل و کثیر دونوں پر واقع ہوتی ہے اور کلم تین کلمات سے کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ کلمہ کی جمع ہے جس طرح نبقہ اور نبق ہے اسی وجہ سے سیبویہ نے کہا: ھذا باب علم ما الکلم من العربیۃ یہاں اس نے الکلام کا لفظ ذکر نہیں کیا کیونکہ اس نے تین چیزوں کا ارادہ کیا تھا اسم، فعل، حرف۔ تو کلم کا لفظ صرف جمع کے لیے ہی بولا جاتا ہے جہاں ایک اور جماعت پر واقع ہوا سے ترک کر دیا جاتا ہے۔ تمیم کہتا ہے: یہ كِلْمہ ہے یعنی کاف مکسور ہے۔ سورۂ براء میں یہ بحث گذر چکی ہے۔

**كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ** یعنی حدیبیہ سے ہمارے لوٹنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرما دیا تھا کہ خیبر کی غنیمتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو حدیبیہ میں حاضر تھے۔

**فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا** یعنی ہم تمہارے ساتھ غنیمت لیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان خرجتم لم أمنعکم الا أنہ لا سھم لکم اگر تم نکلو گے تو میں تمہیں روکوں گا مگر تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا، تو انہوں نے کہا: یہ تو حسد ہوا۔ مسلمانوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ میں ہمیں وہ بتا دیا تھا جو وہ کہنے والے تھے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا** اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا** ۝ یعنی وہ صرف دنیا کے امور کو ہی

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 93

جانتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دین کے معاملہ کو تھوڑا ہی سمجھتے ہیں وہ جہاد کو ترک کرنا ہے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

''فرمادیجئے ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں کو کہ عنقریب تمہیں دعوت دی جائیگی ایک ایسی قوم سے جہاد کی جو بڑی سخت جنگ جو ہے تم ان سے لڑائی کرو گے یا وہ ہتھیار ڈال دیں گے، پس اگر تم نے اس وقت اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے اس وقت بھی منہ موڑا جیسے پہلے تم نے منہ موڑا تھا تو تمہیں اللہ تعالیٰ دردناک عذاب دے گا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ یعنی ان سے کہیں جو صلح حدیبیہ کے موقع پیچھے چھوڑے گئے تھے (1) سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطا بن ابی رباح، مجاہد، ابن ابی لیلی اور عطا خراسانی نے کہا: وہ ایرانی لوگ ہیں۔ کعب، حضرت حسن بصری اور عبدالرحمن بن ابی لیلی نے کہا: وہ رومی ہیں۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے: وہ ایرانی اور رومی لوگ ہیں۔ ابن جبیر نے کہا: مراد ہوازن ثقیف ہیں۔ عکرمہ نے کہا: مراد ہوازن ہیں۔ قتادہ نے کہا: مراد غزوہ حنین کے موقع پر ہوازن اور غطفان ہیں (2)۔ زہری اور مقاتل نے کہا: مراد بنو حنیفہ ہیں جو اہل یمامہ تھے (3) جو مسیلمہ کذاب کے ساتھی تھے۔ رافع بن خدیج نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس آیت سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ پڑھا کرتے تھے ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ کون لوگ ہیں یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں بنو حنیفہ سے قتال کی دعوت دی تو ہمیں علم ہو گیا کہ وہ لوگ بنو حنیفہ ہی ہیں (4)۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اس آیت کا مصداق ابھی ظاہر نہیں ہوا، جبکہ آیت کا ظاہر اس کا رد کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت کی صحت پر دلیل ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بنو حنیفہ سے جنگ کرنے کی دعوت دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایرانیوں اور رومیوں سے جنگ کرنے کی دعوت دی۔ جہاں تک عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے کہ مراد ہوازن اور غطفان ہیں جن سے غزوہ حنین میں مقابلہ ہوا تو اس میں یہ دلیل نہیں کیونکہ یہ امر ممتنع ہے کہ ان کے لیے داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا (التوبہ: 83) تو یہ اس امر پر دال ہے کہ داعی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے علاوہ کوئی اور ذات ہے۔ یہ بات بھی معلوم و مشہور ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس قوم کو دعوت نہیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1705　　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 96
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 316　　4۔ ایضاً

دی مگر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق نے انہیں دعوت دی۔ زمخشری نے کہا: اگر یہ قتادہ سے ثابت ہو تو معنی ہوگا تم اس وقت تک میرے ساتھ نہیں نکل سکو گے جب تک تم میں دل کا مرض اور دین میں اضطراب موجود ہے یا یہ مجاہد کے قول کے مطابق ہے تو ان کے ساتھ معاہدہ یہ ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کریں گے مگر بطور نفل ان کا غنیمت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** **تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ** یہ ان لوگوں کے لیے حکم ہے جس سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔ **يُسْلِمُوْنَ** کا عطف **تُقَاتِلُوْنَهُمْ** پر ہے یعنی دو امروں میں سے ایک امر ہوگا یعنی جنگ یا اسلام۔ ان کی تیسری صورت نہیں۔ حضرت ابی کی قرات میں اویسلموا یہ حتی یسلموا کے معنی میں ہے جس طرح تو کہتا ہے: كُلْ أو تشبع یعنی حتی تشبع شاعر نے کہا:

فقلت له لا تَبْكِ عَيْنُكَ إنما نحاول مُلْكًا أو نموت فَنُعْذَرا(1)

میں نے اسے کہا: تیری آنکھ نہ روئے بے شک ملک حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ہمیں موت آجائے تو ہم معذور ہو جائیں۔

زجاج نے کہا فرمایا: **اَوْ يُسْلِمُوْنَ** کیونکہ معنی ہے أو يسلمون من غير قتال یعنی جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لیں۔ یہ حکم مشرکوں سے جنگ کرنے کے بارے میں ہے اہل کتاب کے بارے میں نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** **فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا** اجر حسن سے مراد دنیا میں غنیمت اور مدد ہے اور آخرت میں جنت ہے **وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ** قبل سے مراد حدیبیہ کے موقع پر سفر ہے **يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝** عذاب الیم سے مراد آگ کا عذاب ہے۔

**لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۷**

''نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ ہی مریض پر کوئی گناہ ہے اگر یہ شریک جہاد نہ ہوسکیں، اور جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا اسے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں اور جو شخص روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب دے گا''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی **وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝** تو اپاہج لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا کیا حال ہوگا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی **لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ** یعنی وہ لوگ جو نابینا ہونے، اپاہج ہونے اور کمزور ہونے کی بنا پر جہاد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 132

سے پیچھے رہتے ہیں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ سورۂ براءۃ اور دوسری سورتوں میں اس بارے میں گفتگو مفصل گذر چکی ہے۔ عرج اس بیماری کو کہتے ہیں جو ایک ٹانگ کو لاحق ہوتی ہے جب ایک میں تکلیف موثر ہے تو دونوں ٹانگوں میں مرض بدرجہ اولی موثر ہوگی۔ مقاتل نے کہا: مراد اپاہج لوگ ہیں جو حدیبیہ کی مہم میں شریک نہیں ہو سکے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معذور قرار دیا تھا یعنی ان میں سے جو تمہارے ساتھ خیبر جانا چاہتا ہے تو وہ ایسا کرے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ان امور میں اطاعت کی جس کا اسے حکم دیا گیا يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ نافع ابن عامر نے اسے ندخلہ پڑھا ہے مقصود تعظیم ہے باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے؛ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ پہلے اللہ تعالیٰ کا نام ہے وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

''یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ سے اس درخت کے نیچے پس جان لیا اس نے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا پس اتارا اس نے اطمینان کو ان پر اور بطور انعام انہیں یہ قریبی فتح بخشی اور بہت سی غنیمتیں بھی عطا کیں جن کو وہ عنقریب حاصل کریں گے، اور اللہ سب سے زبردست بڑا دانا ہے''۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ یہ بیعت رضوان ہے یہ حدیبیہ میں ہوئی۔ اختصار کے ساتھ حدیبیہ کا واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ مصطلق سے واپسی پر شوال میں مدینہ طیبہ میں مقیم رہے اور ذی قعدہ میں عمرہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلے آپ نے مدینہ طیبہ کے پڑوس میں رہنے والے بدووں کو بھی اس سفر میں شریک ہونے کی دعوت دی تو ان میں سے اکثر اس میں شریک نہ ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین، انصار اور عربوں میں سے جو آپ کے ساتھ شریک ہوئے انہیں لے کر روانہ ہوئے مجموعی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا: تعداد پندرہ سو تھی۔ اس کے علاوہ بھی قول کیا گیا ہے جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔ آپ نے قربانی کے جانور بھی ساتھ لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تا کہ لوگوں کو بتائیں کہ آپ جنگ کے لیے نہیں نکلے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی خبر قریش کو ہوئی تو ان کی جمعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسجد حرام اور مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے نکلی اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جنگ کریں گے تو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کریں گے انہوں نے خالد بن ولید کو گھڑ سوار دستہ کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف روانہ کر دیا یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی جبکہ آپ عسفان میں تھے آپ کا مخبر مبشر بن سفیان کعبی تھا آپ نے ایک راستہ اختیار کیا جو آپ کو ان کے پیچھے پہنچانے والا تھا اور آپ مکہ مکرمہ کے زیریں علاقہ کی جانب سے حدیبیہ تک جا پہنچے اس بارے میں آپ کی راہنمائی کرنے والا بنو اسلم کا ایک آدمی تھا۔ جب یہ خبر ان قریش کو پہنچی جو خالد بن ولید کے ساتھ تھے تو وہ

قریش کی طرف چلے تاکہ انہیں اس خبر سے آگاہ کریں جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ تک پہنچے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی لوگوں نے کہا: یہ بغیر کسی وجہ کے بیٹھ گئی ہے اور یہ اڑی کر گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس نے اڑی نہیں کی نہ اس کا یہ طریقہ ہے لیکن اسے اس ذات نے روک دیا ہے جس نے ہاتھیوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا، آج قریش جس معاہدہ کی طرف مجھے دعوت دیں گے جس میں صلہ رحمی ہو تو میں انہیں وہ تحریر دے دوں گا'' پھر رسول اللہ ﷺ وہاں فروکش ہوئے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ اس وادی میں پانی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور اپنے صحابہ میں سے ایک ساتھی کو عطا فرمایا تو وہ اس وادی کے ایک بے آباد کنواں میں سے ایک کنوئیں میں اترا اس کے وسط میں اسے گاڑھا تو کثیر پانی سے وہ جوش مارنے لگا یہاں تک کہ وہ پانی سب لشکر کو کافی ہو گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو آدمی تیر کے ساتھ اس کنوئیں میں اترا تھا وہ حضرت ناجیہ بن جندب بن عمیر اسلمی تھے وہ اس دن نبی کریم ﷺ کے قربانی کے جانوروں کو ہانکنے والے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کنوئیں میں تیر لے کر جانے والے حضرت براء بن عازب تھے اس کے بعد نبی کریم ﷺ اور قریش کے کفار کے درمیان سفارت کا سلسلہ جاری ہوا سفراء کی آمد و رفت اور باہم نزاع لمبا ہوتا گیا یہاں تک کہ سہیل بن عمرو عامری آیا تو اس نے آپ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ آپ ﷺ اس سال واپس چلے جائیں گے جب اگلا سال آئے گا تو عمرہ کے ارادہ سے آئیں گے، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ مکہ مکرمہ میں بغیر اسلحہ داخل ہونگے صرف ان کے پاس تلواریں ہونگی وہ بھی نیاموں میں ہونگی سرور دو عالم ﷺ اور قریش کے درمیان صلح رہے گی، لوگ ان سالوں میں ایک دوسرے سے ملیں گے وہ ایک دوسرے سے امن میں ہوں گے، کفار میں سے جو مرد یا عورت مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس آئے گا اسے کفار کی طرف لوٹا دیا جائیگا اور مسلمانوں میں سے جو مرتد ہو کر کفار کے پاس چلا جائے گا تو اسے مسلمانوں کے سپرد نہیں کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ مسلمانوں پر بڑا شاق گذرا یہاں تک کہ بعض نے اس بارے میں گفتگو بھی کی۔ رسول اللہ ﷺ بخوبی آگاہ تھے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا تھا۔ حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''تم صبر کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس صلح کو اپنے دین کے غلبہ کا سبب بنا دے گا'' پہلے صحابہ کے دلوں میں کچھ دوری پیدا ہو چکی تھی کہ اس گفتگو کے بعد ان میں انس پیدا ہو گیا۔ سہیل بن عمرو نے اس بات سے انکار کر دیا کہ صلح نامہ کے سرنامہ پر محمد رسول اللہ ﷺ لکھے قریش نے آپ سے کہا: اگر ہم آپ کی تصدیق کر دیں تو ہم آپ کو اس بات سے کیوں روکیں جس کا آپ ارادہ کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ آپ لکھیں باسمك اللهم حضرت علی شیر خدا نے اپنے ہاتھ سے محمد رسول کے لفظ کو مٹانے سے انکار کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے مجھ پر پیش کرو'' تو رسول اللہ ﷺ نے وہ الفاظ اپنے ہاتھوں سے مٹا دیے اور حکم دیا کہ وہ لکھیں محمد بن عبد اللہ صلعم کی تحریر کے بعد اسی روز حضرت ابو جندل بن سہیل آئے جبکہ وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان کے والد کے حوالے کر دیا۔ یہ عمل مسلمانوں پر بڑا شاق گذرا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا اور ابو جندل کو بھی بتایا کہ ''اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی نہ کوئی راہ پیدا فرما دے گا''۔

رسول اللہ ﷺ نے صلح سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کی طرف قاصد بنا کر بھیجا تھا رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی کہ اہل مکہ نے آپ کو قتل کر دیا ہے اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو دعوت دی کہ وہ اہل مکہ سے جنگ کرنے کی بیعت کریں۔ ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے موت پر بیعت لی۔ ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ آپ نے ان سے یہ بیعت لی کہ وہ نہیں بھاگیں گے۔ یہ ایک درخت کے نیچے بیعت رضوان تھی رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ بتایا کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور یہ بتایا کہ وہ آگ میں داخل نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا تا کہ یہ حضرت عثمان کی جانب سے بیعت ہو جائے تو گویا وہ ایسے ہو گئے جیسے وہ حاضر ہیں۔ وکیع نے اسماعیل بن ابی خالد سے وہ شعبی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے روز سب سے پہلے جس نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ حضرت ابو سفیان اسدی تھے۔

صحیح مسلم میں ابو زبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم حدیبیہ کے روز چودہ سو تھے (1) ہم نے آپ کی بیعت کی جبکہ حضرت عمر آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے وہ سمرہ کا درخت تھا، کہا: ہم نے آپ کی اس امر پر بیعت کی کہ ہم نہیں بھاگیں گے، ہم نے موت پر آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے یہ سنا کہ حضرت جابر سے سوال کیا تھا کہ وہ حدیبیہ کے روز کتنے تھے؟ کہا: ہماری تعداد چودہ سو تھی، ہم نے آپ کی بیعت کی جبکہ حضرت عمر درخت کے نیچے آپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے وہ سمرہ کا درخت تھا ہم نے آپ کی بیعت کی۔ صرف جد بن قیس انصاری نے بیعت نہ کی وہ اپنے اونٹ کے پیٹ کے نیچے چھپ گیا تھا۔

سالم بن ابی جعد سے مروی ہے کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے اصحاب شجرہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: اگر وہ ایک لاکھ ہوتے تب بھی وہ ہمیں کفایت کر جاتی، ہماری تعداد پندرہ سو تھی۔ ایک روایت میں ہے: ہماری تعداد پندرہ سو تھی۔ عبد اللہ بن ابی اوفی سے مروی ہے کہ بیعت کرنے والے تیرہ سو تھے، بنو اسلم مہاجرین کا آٹھواں حصہ تھے۔ یزید بن ابی عبید سے مروی ہے کہ میں نے سلمہ سے کہا: حدیبیہ کے روز تم نے کس چیز پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی؟ جواب دیا: موت پر۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا: صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی شیر خدا نے نبی کریم ﷺ اور مشرکین کے درمیان صلح نامہ لکھا یہ وہ تحریر ہے (2) جس پر رسول اللہ ﷺ نے معاہدہ کیا ہے مشرکوں نے کہا: تم محمد رسول اللہ ﷺ نہ لکھو اگر ہم جانتے کہ آپ رسول اللہ ﷺ ہیں تو ہم آپ سے نہ لڑتے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: ''اسے مٹا دو'' تو حضرت علی نے عرض کی: مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں اسے مٹا دوں تو نبی کریم ﷺ نے اسے خود مٹا دیا۔ انہوں نے یہ شرط لگائی کہ وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے اور تین دن قیام کریں گے وہ مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوں گے مگر جلبان

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الأمارۃ، مبایعۃ الأمام الجیش عند ارادۃ القتال، جلد 2، صفحہ 129

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، صلح الحدیبیۃ، جلد 2، صفحہ 105

السلاحہ۔ میں نے ابو اسحاق سے پوچھا: یہ جلبان السلاح سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: تھیلا اور اس میں جو کچھ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قریش نے نبی کریم ﷺ سے صلح کی جن میں سہیل بن عمرو بھی تھا نبی کریم ﷺ نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سہیل بن عمرو نے کہا: جہاں تک باسم اللہ کا تعلق ہے ہم اسے جانتے ہیں ہم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو نہیں جانتے بلکہ وہ لکھو جو ہم جانتے ہیں یعنی باسمك اللھم فرمایا: ''لکھو محمد رسول کی جانب سے'' انہوں نے کہا: اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، تو ہم آپ کی پیروی کرتے بلکہ اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھو۔ نبی کریم ﷺ فرمایا: ''لکھو محمد بن عبداللہ کی جانب سے'' انہوں نے نبی کریم ﷺ پر یہ شرط لگائی کہ جو آدمی آپ کی جانب سے ہمارے پاس آئیگا ہم اسے آپ کی طرف نہیں لوٹائیں گے اور ہم میں سے جو شخص آپ کے پاس آئے گا آپ اسے واپس کردیں گے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم یہ شرط لکھیں گے، فرمایا: ''ہاں! ہم میں سے جو ان کی طرف جائے گا اللہ تعالیٰ نے اسے دور کردیا اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ پیدا فرمادے گا''۔

ابو وائل سے مروی ہے حضرت سہیل بن حنیف نے صفین کی جنگ کے دن کہا: اے لوگو! اپنی ذاتوں پر تہمت لگاؤ ہم حدیبیہ کے روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اگر ہم جنگ کی رائے رکھتے تو ضرور قتال کرتے (1) وہ صلح رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے درمیان تھی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر نہیں اور وہ باطل پر نہیں؟ فرمایا: ''کیوں نہیں'' عرض کی: کیا ہمارے مقتول جنت میں نہیں اور ان کے مقتول دوزخ میں نہیں؟ فرمایا: ''کیوں نہیں'' عرض کی: ہم اپنے دین میں کیوں کمزوری دکھا رہے ہیں اور ہم واپس جارہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا؟ فرمایا: ''اے خطاب کے بیٹے! میں اللہ کا رسول ہوں اللہ تعالیٰ مجھے کبھی بھی ضائع نہیں کرے گا'' کہا: حضرت عمر چلے گئے اور غصہ کی وجہ سے صبر نہ کر سکے وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہا: اے ابو بکر! کیا ہم حق پر نہیں اور وہ باطل پر نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں پوچھا: کیا ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ کہا: ہم اپنے دین میں کیوں کمزوری دکھا رہے ہیں ہم واپس جارہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ابھی تک فیصلہ نہیں کیا؟ فرمایا: اے ابن الخطاب! وہ اللہ کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ اسے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ پر سورۂ فتح نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کی طرف پیغام بھیجا اور اسے یہ سورت سنائی۔ حضرت عمر نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا: ''ہاں'' تو حضرت عمر کا نفس مطمئن ہوگیا اور واپس آگئے۔

**فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ** صحابہ کے دلوں میں جو صدق اور وفا موجود تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے جان لیا (2)؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ابن جریج اور قتادہ نے کہا: معنی ہے بیعت کے حکم پر ان کے راضی ہونے کو جان لیا کہ وہ نہیں بھاگیں گے۔ مقاتل نے کہا: بیعت کی ناپسندیدگی کو جان لیا کہ وہ موت تک آپ کی معیت میں جنگ کرتے رہیں گے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، صلح الحدیبیة، جلد 2، صفحہ 105    2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 316

فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینہ کو نازل کیا یہاں تک کہ انہوں نے بیعت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مشرکوں نے انہیں جو روکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب پورا نہ ہوا اس پر مومنوں کے دل میں جو دکھ تھا اسے جان لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تھا کہ آپ کعبہ شریف میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ حالت نیند کا خواب تھا'' حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ارشاد میں اس سال داخل ہونے کا تو کوئی تذکرہ نہ تھا۔ سکینہ سے مراد طمانینت اور وعدہ کی صداقت پر سکون ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اس سے صبر ہے۔

وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا۞ قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا: مراد خیبر کی فتح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فتح مکہ ہے (1)۔ ایک قراءت یہ کی گئی ہے وآتاھم۔

وَّمَغَانِمَ كَثِيۡرَةً يَّاۡخُذُوۡنَهَا مراد خیبر کے اموال ہیں۔ خیبر جائیداد اور اموال والا تھا یہ حدیبیہ اور مکہ کے درمیان ہے مَغَانِمَ اس تعبیر کی بنا پر فَتۡحًا قَرِيۡبًا سے بدل ہے اور واؤ زائدہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّمَغَانِمَ سے مراد فارس اور روم ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيۡرَةً تَاۡخُذُوۡنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمۡ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَلِتَكُوۡنَ اٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَيَهۡدِيَكُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۞

''(اے غلامان مصطفیٰ!) اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم اپنے اپنے وقت پر حاصل کرو گے پس جلدی دے دی ہے تمہیں یہ صلح اور روک دیا ہے اس نے لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے اور تاکہ ہو جائے یہ ہماری نصرت کی نشانی اہل ایمان کے لیے اور تاکہ ثابت قدمی سے گامزن رکھے تمہیں صراط مستقیم پر''۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيۡرَةً تَاۡخُذُوۡنَهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: مراد قیامت کے دن تک غنیمتیں ہیں۔ ابن زید نے کہا: مراد خیبر کی غنیمتیں ہیں (2) فَعَجَّلَ لَكُمۡ هٰذِهٖ سے مراد خیبر ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد صلح حدیبیہ ہے۔

وَكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ النا س سے مراد اہل مکہ ہیں یعنی صلح کے ساتھ تم سے ان کے ہاتھوں کو روک لیا۔ قتادہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ اور خیبر کی طرف نکلے تو مدینہ کے یہودیوں کو تم سے روک لیا؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے (3) کیونکہ حدیبیہ کے موقع پر مشرکوں کے ہاتھوں کے روکنے کا ذکر وَهُوَ الَّذِىۡ كَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ میں موجود ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وَكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ سے مراد عیینہ بن حصن فزاری، عوف بن مالک اور ان کے ساتھی ہیں کیونکہ وہ آئے تھے تاکہ اہل خیبر کی مدد کریں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور مسلمانوں سے انہیں روک دیا۔

وَلِتَكُوۡنَ اٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ان کی شکست اور تمہاری سلامتی مومنوں کے لیے نشانی ہو جائے اور اس سے وہ جان جائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی موجودگی میں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی حفاظت فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے ہاتھوں کو تم

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 316 2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 103 3۔ ایضاً، جز 26، صفحہ 105

سے روک دینا مومنوں کے لیے نشانی ہو جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں جلدی عطا فرمائی ہے وہ مومنوں کے لیے اس بارے میں نشانی ہو جائے کہ آپ اس وعدہ میں سچے ہیں کہ وہ اس نعمت کو ضرور پائیں گے وَلِتَكُونَ میں واؤ کوفیوں کے نزدیک زائد ہے۔ بصریوں نے کہا: یہ عاطفہ ہے اس کا عطف کلام مضمر پر ہے تقدیر کلام یہ ہے کف أیدی الناس عنکم لتشکروہ ولتکون آیة للمومنین۔

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ یعنی تمہیں مزید ہدایت سے نوازے گا یا تمہیں ہدایت پر ثابت قدم کرے گا۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

''اور کئی مزید فتوحات بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اللہ کے احاطہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

وَأُخْرَىٰ یہ هذه پر معطوف ہے تقدیر کلام یہ بنے گا فعجل لکم هذه المغانم ومغانم اخری۔

لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ فتوحات ہیں (1) جو مسلمانوں کو نصیب ہوئیں جس طرح فارس اور روم کا علاقہ اور اسی طرح کی دوسری فتوحات جو مسلمانوں کو نصیب ہوئیں؛ یہ حضرت حسن بصری، مقاتل اور ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے، ضحاک، ابن زید اور ابن اسحاق کا بھی یہ قول ہے: مراد خیبر ہے اللہ تعالیٰ نے فتح سے پہلے اپنے نبی سے اس کا وعدہ کیا مسلمان اس کی امید تک نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتح کی صحابہ کو خبر دی۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے اور قتادہ کا قول ہے مراد فتح مکہ ہے (2)؛ عکرمہ نے کہا: مراد حنین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا یہ اس امر پر دال ہے کہ اس کے لیے کوشش پہلے کی گئی اور فی الحال مطلوب کا حصول فوت ہو چکا تھا جس طرح مکہ مکرمہ کے بارے میں تھا؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: قیامت تک کے لیے فتوحات مراد ہیں اور قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے تیار کر رکھا ہے یہ اس چیز کی طرح ہے جس کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہو یہ چیز محصور ہے اب اس کے فوت ہونے کا امکان نہیں تم اگرچہ اس وقت اس پر قادر نہیں ہو مگر یہ تمہارے لیے محبوس کی جا چکی ہے وہ تم سے فوت نہ ہوئی یعنی تمہارے ہاتھ سے نہ جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا سے مراد ہے وہ جانتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہے؛ جس طرح ارشاد فرمایا: وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (الطلاق) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے محفوظ کر دیا ہے تاکہ اس کی فتح تمہارے لیے ہو۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

''اور اگر جنگ کرتے تم سے یہ کفار تو پیٹھ دے کر بھاگ جاتے پھر نہ پاتے دنیا بھر میں اپنا دوست اور

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 318 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 47

مددگار، یہ الله کا دستور ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور الله کے دستور میں تو ہرگز تبدیلی نہیں پائے گا"۔

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ قتادہ نے کہا: مراد قریش کے کفار ہیں (1) جو حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بنو غطفان، بنو اسد اور کفار ہیں جنہوں نے اہل خیبر کی مدد کا ارادہ کیا تھا وبال انہیں پر جا پڑا۔

ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۞ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ سنة سے مراد طریقہ اور عادت ہے جو اس نے اپنے دوستوں کی دشمنوں کے خلاف مدد کی۔ سنة کا لفظ مفعول مطلق کے طور پر منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سُنَّةَ اللّٰهِ سے مراد کسنة الله، ہے سنة کا معنی طریقہ اور سیرت ہے، شاعر کہتا ہے:

فلا تجزعن من سِيرة أنت سِرتَها فأوَّلُ راضٍ سُنَّةً من يَسيرها

جس طریقہ پر تو چلا ہے اس سے نہ گھبرا جو آدمی کسی راستہ پر چلتا ہے وہی اس پر راضی ہوتا ہے۔

سنة کا معنی یہ بھی ہے یہ مدینہ کی کھجوروں کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۞

"اور الله وہی ہے جس نے روک دیا تھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکہ میں باوجودیکہ تمہیں ان پر غلبہ دے دیا تھا اور الله تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا"۔

وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ اس سے مراد حدیبیہ ہے۔ یزید بن ہارون نے روایت نقل کی ہے کہ حماد بن سلمہ، ثابت سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کے اسی افراد مسلح ہو کر تنعیم پہاڑ سے اترے وہ بے خبری کے عالم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے ہم نے انہیں جھگڑے کے بغیر پکڑ لیا اور انہیں زندہ رہنے کا موقع دیا الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت عبدالله بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جس درخت کا ذکر الله تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے اسی اثنا میں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ تیس نوجوان ہمارے سامنے آ گئے جو مسلح تھے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا هل جئتم فی عهد أحد أو هل جعل لكم أحد أمانا کیا تم کسی فرد کے عہد و پیمان میں یہاں آئے ہو یا کسی نے تمہیں امان دی ہے۔ انہوں نے کہا: الله کی قسم! نہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جانے دیا تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ابن ہشام نے وکیع سے ذکر کیا ہے: قریش کے ستر یا اسی افراد مسلمانوں پر غارت گری مچانے اور ان کے اطراف میں کوئی موقع تلاش کرنے کے لیے آئے مسلمان ان کا ارادہ بھانپ گئے تو مسلمانوں نے انہیں قیدی بنا لیا یہ اس وقت ہوا جب

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 108

صلح کے بارے میں گفتگو کے لیے سفراء آ جا رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چھوڑ دیا۔ ان افراد کو عتقاء کہا جاتا ان میں حضرت معاویہ اور ان کے والد بھی تھے۔

مجاہد نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے نکلے کہ بے خبری کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے حرم سے کچھ افراد کو پکڑ لیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چھوڑ دیا یہ کامیابی مکہ کی وادی میں ہوئی تھی (1)۔ قتادہ نے کہا: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صحابی تھا جسے زنیم کہا جاتا وہ حدیبیہ کے ایک ٹیلہ پر چڑھا تو مشرکوں نے اسے تیر مارا اور اسے قتل کر دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھڑ سوار دستہ بھیجا تو وہ کفار کے بارہ شاہسوار پکڑ کر لے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: ''کیا تمہارے حق میں میرے اوپر کوئی عہد و پیمان ہے (2)؟'' انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابزی اور کلبی نے کہا: مراد اہل حدیبیہ ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ مسلمانوں سے روک لیے یہاں تک کہ صلح ہو گئی سب نکل کھڑے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا قصد کیا تھا اور مسلمانوں کے ہاتھوں کو بھی ان سے روک لیا تھا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت خالد بن ولید مشرکوں کے گھڑ سوار دستہ میں موجود تھے۔ قشیری نے کہا: یہ ایک روایت ہے، صحیح بات یہ ہے کہ وہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

حضرت سلمہ بن اکوع نے کہا: صلح کی بات چل رہی تھی کہ ابوسفیان آئے جبکہ وادی میں لوگوں اور اسلحہ کی ریل پیل تھی، کہا: میں چھ مشرکوں کو ہانکتا ہوا لایا جو مسلح تھے وہ اپنی ذاتوں کے لیے نفع اور نقصان کے کوئی مالک نہ تھے میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا حضرت عمر راستہ میں تھے انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم جنگ جو لوگوں کے پاس آ رہے ہیں نہ ہمارے پاس کوئی اسلحہ ہے اور نہ ہی سواری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ میں سے ہی مدینہ کی طرف بھیجا تو صحابہ ہر قسم کا اسلحہ اور ہر قسم کے جانور لے آئے جو اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ عکرمہ بن ابی جہل پانچ سو سواروں کے ساتھ آپ کے مقابلہ کے لیے نکلا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید سے کہا: ''یہ تیرا چچا زاد ہے جو پانچ سو سواروں کے ساتھ آ رہا ہے'' حضرت خالد نے عرض کی: میں اللہ تعالیٰ کی تلوار ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ہوں۔ اسی دن سے انہیں سیف اللہ کا لقب دیا گیا ان کے ساتھ گھڑ سوار دستہ تھا انہوں نے کفار کو بھگا دیا اور مکہ کی دیواروں تک دھکیل دیا۔ یہ روایت زیادہ صحیح ہے ان کے درمیان لڑائی پتھروں کے ساتھ ہوئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تیروں اور تیر کمانوں کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کف الید سے مراد معاہدہ میں یہ شرط تھی کہ کفار میں سے جو ہمارے پاس آئے گا تو وہ ان پر لوٹا دیا جائے گا۔ مکہ مکرمہ سے کچھ مسلمان نکلے انہیں خوف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مشرکوں کی طرف لوٹا دیں گے وہ ساحل سمندر پر اکٹھے ہو گئے ان میں حضرت ابوبصیر بھی تھے وہ کفار پر غارت گری مچاتے اور ان کے قافلے لوٹ لیتے یہاں

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 109
2۔ ایضاً، جز 26، صفحہ 110

تک کہ قریش کے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: انہیں اپنے پاس بلا لیجئے تا کہ ہم امن میں ہو جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: بنو غطفان اور بنو اسد نے خیبر کے یہودیوں کا مسلمانوں سے دفاع کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ یہودیوں کے حلیف تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس چیز سے روک دیا یہی کف الید ہے۔

بِبَطْنِ مَكَّةَ اس میں دو قول ہیں: (1) مراد مکہ مکرمہ ہے (2) مراد حدیبیہ ہے، کیونکہ اس کا کچھ حصہ حرم کا حصہ ہے۔۔ ماوردی نے کہا: مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ سے مراد فتح مکہ ہے۔ یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ مکہ صلح کے ساتھ فتح ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت صلح حدیبیہ کے متعلق فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی جس طرح ہم نے صحابہ اور تابعین میں سے علماء سے روایت نقل کی ہے امام ترمذی نے روایت نقل کی ہے کہ عبد بن حمید، سلیمان بن حرب سے وہ حماد بن سلمہ سے وہ ثابت سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اسی افراد تنعیم پہاڑ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر اترے جبکہ نماز صبح کا وقت تھا وہ ارادہ رکھتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیں انہیں پکڑ لیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ جہاں تک فتح مکہ کا تعلق ہے جس پر اخبار دلالت کرتی ہیں کہ وہ زبردستی فتح ہوا اس بارے میں گفتگو سورۂ حجر میں اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

''یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں بھی روک دیا گیا مسجد حرام میں (داخل ہونے) سے اور قربانی کے جانوروں کو بھی وہ بندھے رہیں اور اپنی جگہ تک نہ پہنچ سکیں، اور اگر نہ ہوتے (مکہ میں) چند مسلمان مرد اور چند مسلمان عورتیں جن کو تم نہیں جانتے (اور یہ اندیشہ نہ ہوتا) کہ تم روند ڈالو گے انہیں سو تمہیں پہنچے گی انکی طرف سے عار بے علمی کے باعث (نیز) تا کہ داخل کر دے اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے اگر (یہ کلمہ گو) الگ ہو جاتے تو (اس وقت) جنہوں نے کفر کیا ان میں سے تو ہم انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتے''۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ فتح، جلد 2، صفحہ 159

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا امراد قریش ہیں جنہوں نے حدیبیہ کے سال تمہیں مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھا انہوں نے قربانی کے جانوروں کو روک دیا اور انہیں اپنی جگہ تک نہ پہنچنے دیا وہ اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے لیکن خودسری نے انہیں اس امر پر برانگیختہ کیا اور دور جاہلیت کی حمیت نے انہیں دعوت دی کہ وہ وہ کام کریں جس کا وہ بطور دین اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر پر انہیں شرمندہ کیا اور اس پر انہیں دھمکی دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انس فرمایا کہ اس امر کی وضاحت کی اور آپ سے وعدہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا معکوف کا معنی محبوس ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی موقوف ہے۔ ابن علاء نے کہا: اس کا معنی مجموع ہے۔ جوہری نے کہا: عكفه أي حبسه ووقفه، يعكِفه ويعكُفه عَكْفًا۔ اسے قید رکھنا، روکے رکھنا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا یہ جملہ کہا جاتا ہے: ماعكفك عن كذا کس چیز نے تجھے اس چیز سے روکا؟ اسی معنی میں الاعتكاف في المسجد ہے، یعنی مسجد میں رکنا۔

اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ محل سے مراد قربان کرنے کی جگہ ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: مراد حرم ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: جس آدمی کو بیت اللہ کی زیارت سے روک دیا گیا ہو اس کی ہدی کا محل حرم ہے، محل کسی شے کی غایت کو کہتے ہیں جب محل ہو تو مراد وہ جگہ ہے جہاں لوگ جا کر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ ہدی کے جانور ستر اونٹ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان کے ساتھ اس جگہ کو ان کا محل بنا دیا۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے جس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ کے تحت گزر چکی ہے صحیح وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

صحیح مسلم میں ابو زبیر سے مروی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا کہ ہم نے حدیبیہ کے سال اونٹ سات افراد کی جانب سے اور گائے سات افراد کی جانب سے ذبح کی (2)۔ ان سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ ہم حج اور عمرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے ہر سات افراد ایک اونٹ میں شریک ہوتے۔ ایک آدمی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا بدنہ میں اتنے لوگ شریک ہو سکتے ہیں جتنے جزور میں شریک ہو سکتے ہیں؟ فرمایا: وہ بدن ہی تو ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حدیبیہ میں موجود تھے کہا: ہم نے اس روز ستر اونٹ ذبح کیے تھے ہم آپس میں شریک ہوئے سات افراد ایک اونٹ میں ساتھی بنے۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم عمرہ کے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو قریش کے کفار بیت اللہ شریف کی زیارت سے مانع بن گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کو ذبح کیا اور اپنے سر کا حلق کرایا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس روز جس صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کیا تھا وہ خراش بن امیہ بن ابی العیص خزاعی تھا۔ رسول

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 319

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز الاشتراك في الهدى واجزاء البدنه والبقرة، جلد 1، صفحہ 424

3۔ صحیح بخاری، ابوب العمرة، اذا احصر المعتمر، جلد 1، صفحہ 243

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قربانی ذبح کر یں اور احرام اتار دیں، صحابہ نے توقف کے بعد یہ کام کیا جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ناراض ہوئے۔ حضرت ام سلمہ نے عرض کی: اگر آپ جانور کو ذبح کریں تو وہ بھی ذبح کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانور ذبح کیا تو صحابہ نے بھی اپنے جانور ذبح کر دیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کا حلق کرایا اور حلق کرانے والوں کے حق میں تین دفعہ دعا کی اور قصر کرانے والوں کے حق میں ایک دفعہ دعا کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن عجرہ کو دیکھا کہ جوئیں ان کے چہرے سے گر رہی تھیں فرمایا: ''کیا تجھے یہ جوئیں تکلیف دیتی ہیں (1)؟'' عرض کی: جی ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حلق کرانے کا حکم دیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں تھے۔ اسے امام بخاری اور دار قطنی نے نقل کیا ہے، یہ روایت سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَ الْهَدْیَ، الهدْی اور الهدِیّ دونوں لغتیں ہیں اسے حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدِیّ مَحِلَّه پڑھا گیا ہے یعنی تخفیف و تشدید دونوں طرح یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا واحد هدِیَّة ہے سورۂ بقرہ میں بھی یہ بحث گذر چکی ہے۔ اس کا عطف صَدُّوْكُمْ کی ضمیر مخاطب کم پر ہے مَعْكُوْفًا یہ حال ہے اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ میں ان کا محل حرف جار کے حذف کرنے کے ساتھ نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی صدوا کم وصدوا الهدی عن ان یبلغ یہ جائز ہے کہ یہ مفعول لہ ہو، گویا یہ فرمایا: وصدوا الهدی کراهیة ان یبلغ ابوعلی نے کہا: اس کا عکف پر حمل کرنا درست نہیں کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ عکف فعل متعدی میں آتا ہے آیت میں مَعْكُوْفًا آنا یہ اس امر کے جواز پر دال ہوگا کہ یہ معنی پر محمول ہو گویا جب یہ حبس (روکنا) ہے تو معنی کو اس پر محمول کیا جائے گا جس طرح رفث کو افضاء کے معنی پر محمول کیا جاتا ہے تو اسے الی کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے مگر اسے اس پر محمول کیا جائے تو اس کا محل نصب ہوگا۔ اگر سیبویہ کے قول پر قیاس کریں گے اور خلیل کے قول کے مطابق محل جر ہوگا یا مفعول ہوگا گویا کہا: اسے محبوس کیا گیا ہے یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ اپنے محل تک پہنچے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ میں جر کی تقدیر عن کے ساتھ ہو جو گذر چکا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وصدوکم عن المسجد الحرام وصدوا الهدی عن أن یبلغ محله اس کی مثل وہ روایت ہے جو سیبویہ نے یونس سے بیان کی ہے مررت برجل إنْ زید وإنْ عمرو۔ حرف جار کو مضمر کیا گیا ہے کیونکہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِیْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ مراد مکہ مکرمہ میں مومنوں میں سے کمزور لوگ ہیں جو کفار کے درمیان رہتے تھے، جس طرح حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت عیاش بن ابی ربیعہ، حضرت ابوجندل بن سہیل اور ان کی مثل لوگ ہیں۔

لَمْ تَعْلَمُوْهُمْ تم انہیں پہنچانتے نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم نہیں جانتے کہ وہ مومن ہیں۔ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ تم انہیں قتل کرکے اور ان پر ٹوٹ پڑنے کے ساتھ انہیں روند دو۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: وطئت القوم یعنی ان پر ٹوٹ پڑا۔ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ اس کے بارے میں جائز ہے کہ یہ رجال ونساء سے بدل کے طور پر مرفوع ہو گویا تقدیر کلام یہ ہوگی لولا وطئکم رجالا

1۔ صحیح بخاری، ابواب العمرة، قول اللہ تعالیٰ او صدقة وهی اطعام ستة مساكين، جلد 1، صفحہ 244

مؤمنین و نساء مومنات۔ یہ بھی جائز ہے کہ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ کی ضمیر غائب ھم سے بدل ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو تو تقدیر کلام یہ ہوگی لم تعلموھم و طاھم دونوں صورتوں میں یہ بدل اشتمال ہے لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ یہ رجال اور نساء کی صفت ہوگی اور لولا کا جواب محذوف ہے ولو أن تطؤرجالا مؤمنین و نساء مؤمنات لم تعلموھم لا ذن اللہ لکم فی دخول مکۃ و لسلطکم علیھم لیکن وہ لوگ جو اپنے ایمانوں کو مخفی رکھے ہوئے ہیں ہم نے ان کی حفاظت کی ہے۔

ضحاک نے کہا: اگر کفار کی پشتوں اور ان کی عورتوں کے رحموں میں مومن مرد اور عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم نہیں جانتے کہ تم ان کے آباء کو روندڈالو گے تو ان کے بیٹے بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ معرۃ سے مراد عیب ہے یہ عر سے مفعلہ کا وزن ہے جس کا معنی جرب (خارش) ہے یعنی مشرک کہتے: انہوں نے اپنے دینی بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان کے قتل کی وجہ سے تمہیں وہ چیز پہنچتی جو اس وجہ سے تم کو لازم ہوتی ہے یعنی قتل خطا کا کفارہ (1)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دار الحرب میں مومن کے قاتل پر کفارہ لازم کیا ہے دیت لازم نہیں کی جب کہ اس نے ہجرت نہ کی ہو اور اس کے ایمان کا علم بھی نہ ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء: 92) یہ کلبی، مقاتل اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ النساء میں گذر چکی ہے۔ ابن زید نے کہا: معرۃ کا معنی گناہ ہے۔ جوہری اور ابن اسحاق نے کہا: معنی ہے دیت کی چٹی۔ قطرب نے کہا: سختی اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: غم۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ صحابہ کی فضیلت کا ذکر ہے اور ان کی صفت کریمہ کی خبر دی جا رہی ہے کہ وہ معصیت سے دور اور تعدی سے محفوظ رہتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ اس میں سے کوئی چیز پائیں تو بغیر ارادہ کے وہ چیز ان سے صادر ہوتی ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح چیونٹی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی صفت بیان کی لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ (النمل)

لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لِيُدْخِلَ میں لام محذوف کے متعلق ہے معنی یہ بنے گا اگر تم انہیں قتل کرو گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایمان کے متعلق ہو۔ مومنات کے علاوہ اسے صرف مومنین پر محمول نہیں کیا جائیگا اور نہ ہی مومنین کو چھوڑ کر اسے مومنات پر محمول کیا جائیگا کیونکہ سارے رحمت میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مشرکین سے قتال کی اجازت نہیں دی تا کہ اہل مکہ میں سے جن کے بارے میں مسلمان ہونے کا فیصلہ ہوا ہے وہ صلح کے بعد مسلمان ہو جائیں اور اسی طرح ان میں سے بے شمار لوگ مسلمان ہوئے اور ان کا اسلام بہت اچھا ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہوئے۔

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 320

**مسئلہ نمبر 2**۔ لَوۡ تَزَیَّلُوۡا تزیلوا کا معنی تمیزوا ہے یعنی ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جدا جدا ہو جائیں؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر مومن کفار کی پشتوں سے جدا ہو جاتے تو کفار کو تلوار کے ساتھ عذاب دیا جاتا؛ یہ ضحاک کا قول ہے لیکن الله تعالیٰ مومنوں کی وجہ سے کفار کا دفاع کرتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اس آیت لَوۡ تَزَیَّلُوۡا کے بارے میں پوچھا، فرمایا: مراد وہ مشرک ہیں جو نبی الله کے اجداد(1) میں سے تھے جو ان کے بعد ہوئے اور جو ان کے زمانہ میں ہوئے جن کی پشتوں میں مومن تھے اگر مومن کفار کی پشتوں سے جدا ہو جاتے تو الله تعالیٰ کفار کو عذاب الیم دیتا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ مومن حرمت کی وجہ سے کافر کے ساتھ رعایت کی جائیگی کیونکہ کافر کو اذیت مومن کو اذیت دینے کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ ابو زید نے کہا: میں نے ابن قاسم سے کہا بتایئے کہ مشرکوں کی ایک جماعت اپنے قلعوں میں سے ایک قلعہ میں ہو مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا ہو مشرکوں کے پاس مسلمانوں کے کچھ قیدی ہوں کیا اس قلعہ کو جلا دیا جائیگا یا نہیں؟ کہا: میں نے امام مالک سے سنا آپ سے ان مشرکوں کے بارے میں پوچھا گیا تھا جو اپنی کشتیوں میں سوار ہیں کیا ہم ان پر آگ برسا سکتے ہیں جبکہ ان کشتیوں میں قیدی بھی ہیں؟ کہا: امام مالک نے فرمایا میں اسے جائز نہیں سمجھتا کیونکہ الله تعالیٰ کا اہل مکہ کے لیے فرمان ہے: لَوۡ تَزَیَّلُوۡا لَعَذَّبۡنَا اسی طرح اگر کوئی کافر کسی مسلمان کو ڈھال بنا لے تو اس کو تیر مارنا جائز نہیں اگر کسی نے ایسا کیا تیر مارا اور کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا تو اس پر دیت اور کفارہ ہوگا اگر علم نہ ہو تو نہ دیت ہوگی اور نہ کفارہ ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہیں علم ہو تو انہیں تیر مارنا جائز نہیں اگر وہ اس کے باوجود ایسا کریں تو وہ خطا قتل کرنے والے ہونگے اور دیت ان کی عاقلہ پر ہوگی اگر وہ نہ جانتے تو ان کو تیر مارنا جائز ہو جاتا جب فعل جائز ہو گیا تو یہ جائز نہیں کہ ان پر کسی قسم کا بوجھ ہو۔ ابن عربی نے کہا: ایک جماعت کا کہنا ہے اس کا معنی ہے اگر وہ عورتوں کی رحموں اور مردوں کی پشتوں سے جدا ہو جاتے (2)۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ جو پشت میں ہے یا پیٹ میں ہے اسے نہیں روندا جاتا اور اس کی وجہ سے کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی جبکہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوۡ لَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤۡمِنٰتٌ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡهُمۡ اَنۡ تَطَـُٔوۡهُمۡ اس کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا جو عورت کے بطن میں ہو اور مرد کی پشت میں ہو اس کا اطلاق حضرت ولید بن ولید، حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت عیاش بن ربیعہ اور حضرت ابو جندل بن سہیل پر ہوتا ہے؛ امام مالک نے اسی طرح کہا ہے۔ ہم نے ایک رومی شہر کا محاصرہ کیا پانی ان سے روک لیا گیا وہ قیدیوں کو نیچے اتارتے جو ان کے لیے پانی لے جاتے تو انہیں تیر مارنے پر کوئی قدرت نہ رکھتا تو ہماری پسند کے بغیر پانی مل جاتا۔ امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور امام ثوری نے مشرکوں کے قلعوں پر پتھر پھینکنے کی اجازت دی اگرچہ ان میں مسلمان قیدی اور ان کے بچے ہوں اگر کوئی مشرک مسلمان کے بچے کو ڈھال بناتا ہے تو مشرک پر تیر برسایا جائیگا اگر کسی مسلمان کو وہ لگ جاتا ہے تو اس میں دیت اور کفارہ نہیں ہوگا۔ ثوری نے کہا: اس میں

---

1۔ علامہ آلوسی اور امام رازی وغیرہ نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کو موحد ثابت کیا ہے۔

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1708

کفارہ ہوگا دیت نہ ہوگی۔ امام شافعی ہمارے قول کی موافقت کرتے ہیں کیونکہ ممنوع کے ہوتے ہوئے مباح چیز کا حصول جائز نہیں خصوصاً جب مسلمان کی زندگی کا سوال ہو۔ اس لیے قول وہی درست ہے جو امام مالک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ڈھال بنائے گئے فرد کو قتل کرنا جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ان شاء اللہ۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب مصلحت ضروریہ کلیہ قطعیہ ہو۔ اس کے ضروری ہونے کا معنی یہ ہے کہ کفار تک تمام امت کا اس میں فائدہ ہو یہاں تک کہ اس ڈھال بنائے گئے فرد کو قتل نہ کیا جائے، کلیہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ تمام امت کا اس میں فائدہ ہو یہاں تک کہ ڈھال کو قتل کرنے میں تمام مسلمانوں کی مصلحت ہو اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو کفار اس ڈھال کو قتل کر دیں گے اور تمام امت پر غالب آجائیں گے قطعیہ کا معنی یہ ہے کہ اس ڈھال کو قتل کرنے سے وہ مصلحت قطعی طور پر حاصل ہو جائیگی ہمارے علماء کا کہنا ہے: ان قیود کے ساتھ اس مصلحت کو بنیاد بنانے میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ فرض کیجئے کہ ڈھال بنایا گیا فرد قطعی طور پر قتل ہو جاتا ہے تو وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا تو عظیم فساد ظاہر ہو جائے گا وہ دشمنوں کا مسلمانوں پر غلبہ ہے یا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائیگا تو دشمن ہوگا اور تمام مسلمان نجات پا جائیں گے۔

کسی دانشمند کے لیے مناسب نہیں کہ وہ کہے: اس صورت میں کسی وجہ سے بھی ڈھال کو قتل نہ کیا جائیگا کیونکہ اس طریقہ کی ڈھال سے اسلام اور مسلمان سب برباد ہو جائیں گے لیکن جب یہ مصلحت فساد سے خالی نہیں تو وہ آدمی جو اس میں دقت نظر سے کام نہیں لیتا اس کا نفس اس سے نفرت کرتا ہے کیونکہ وہ فساد اس حاصل ہونے والے نفع کے مقابلہ میں معدوم ہے یا معدوم کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ عام قراءت لَوْ تَزَيَّلُوْا ہے مگر ابو حیوہ نے اسے لوتزایلوا پڑھا ہے معنی میں یہ بھی تزیلوا کی طرح ہے تزایل کا معنی جدا ہونا ہے تزیلوا یہ تفعلوا کا وزن ہے یہ زِلتُ سے مشتق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ تفعیلوا کا وزن ہے۔

**لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** ایک قول یہ کیا گیا ہے: لام یہاں سے یہ دو کلاموں کا جواب ہے: (1) لَوْ لَا رِجَالٌ (2) لَوْ تَزَيَّلُوْا ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ لولا کا جواب محذوف ہے جبکہ وہ پہلے گذر چکا ہے اور لَوْ تَزَيَّلُوْا سے نئی کلام شروع ہو رہی ہے۔

**اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٢٦﴾**

''جب جگہ دی کفار نے اپنے دلوں میں ضد کو وہی (زمانہ) جاہلیت کی ضد تو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین کو اپنے رسول مکرم پر اور اہل ایمان پر اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حقدار بھی تھے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

**اِذْ** میں عامل **لَعَذَّبْنَا** ہے تقدیر کلام یہ ہوگی لعذبناھم إذ جعلوا ھذا یا یہ فعل مضمر ہے تقدیر کلام اذ کروا ہے **الْحَمِيَّةَ** یہ

فعلیة کا وزن ہے جس کا معنی ضد ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: حَمِیت عن کذا حَمِیّة و مَحْمِیة۔ جب تو اس سے خوداری کا اظہار کرے اور تجھے شرمندگی لاحق ہو کہ تو اس امر کو کرے۔ اسی معنی میں متلمس کا قول ہے:

اَلَا اِنَّنِی منهم وعِرْضِی عِرْضُهم کذِی الأنفِ یحمی أنفَه أنْ یَکْشَمَا

خبردار! میں ان میں سے ہوں اور میری عزت انکی عزت ہے جس طرح خوددار آدمی ہوتا ہے وہ اس امر سے حمیت کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ناک توڑ دی جائے۔

زہری نے کہا: ان کی حمیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار سے ضد کا اظہار کرنا (1) اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ کلام شروع کرنے سے ضد کا اظہار تھا اور صحابہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا جو آدمی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے سے رک گیا تھا وہ سہیل بن عمرو تھا جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔

ابن بحر نے کہا: ان کی حمیت سے مراد ان کا اپنے معبودوں کے بارے میں عصبیت کا اظہار ہے (2) وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اور اس کے بارے میں ضد تھی کہ وہ کسی اور کی عبادت کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ یہ ہے کہ انہوں نے کہا: انہوں نے ہمارے بیٹوں اور ہمارے بھائیوں کو قتل کیا پھر وہ ہمارے گھروں میں داخل ہوتے ہیں لات و عزیٰ کی قسم! وہ اس شہر میں کبھی داخل نہیں ہو سکتے۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سکینہ سے مراد طمانیت اور وقار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں تسلیم و رضا کے اوپر پختہ کرنا ہے کفار کے دلوں میں جو ضد داخل کی وہ ان کے دلوں میں داخل نہیں کی۔

وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰی ایک قول یہ کیا گیا ہے: كَلِمَةَ التَّقْوٰی سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے ایک مرفوع حدیث ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے (3) یہی حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، عمرو بن میمون، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک، سلمہ بن کہیل، عبید بن عمیر، طلحہ بن مصرف، ربیع، سدی اور ابن زید کا قول ہے یہی قول عطا خراسانی کا ہے انہوں نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اضافہ کیا۔

حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ واللہ اکبر ہے۔ عطا بن ابی رباح اور مجاہد نے یہ بھی کہا اس سے مراد لا إله إلا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كلّ شئ قدير (4) ہے۔ زہری نے کہا: مراد بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے یعنی مشرکوں نے اس کلمہ کا اقرار نہ کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس کے لیے خاص کیا۔ كَلِمَةَ التَّقْوٰی سے مراد وہ کلمہ ہے جس کے ساتھ شرک سے بچا جاتا ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: كَلِمَةَ التَّقْوٰی سے مراد اخلاص ہے (5) وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا وہ کفار مکہ کی بنسبت اس کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 320 2۔ ایضاً

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ فتح، جلد 2، صفحہ 159۔ ایضاً، حدیث نمبر 3558، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 122 5۔ تفسیر مجاہد، سورۂ فتح، صفحہ 259

اپنے دین اور اپنے نبی کی صحبت کے لیے انہیں پسند کر لیا۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجد حرام میں جب اللہ نے چاہا امن وامان سے منڈواتے ہوئے اپنے سروں کو یا ترشواتے ہوئے تمہیں کسی کا خوف نہ ہوگا، پس جو تم نہیں جانتے تو اس نے عطا فرمادی تمہیں اس سے پہلے ایسی فتح جو قریب ہے''۔

قتادہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں اس حالت میں داخل ہوں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے صلح کر لی تو منافقوں کو شک ہوا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ مکہ مکرمہ میں ضرور داخل ہونگے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمایا کہ وہ اس سال کے علاوہ اور کسی سال میں مکہ مکرمہ داخل ہونگے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت ابو بکر صدیق نے ہی یہ بات کی تھی کہ خواب کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہوتا آپ ضرور اس میں داخل ہوں گے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ خواب حدیبیہ کے متعلق ہی تھا اور انبیاء کے خواب حق ہوتے ہیں اور خواب انبیاء کو وحی کرنے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہوا کرتی ہے۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ یعنی آنے والے سال تم اس میں داخل ہو گے۔ ابن کیسان نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں جو کچھ کہا گیا یہ اس کی حکایت ہے۔ نیند میں آپ کو خطاب کیا گیا جس طرح معمول تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خبر دی کہ اس نے یہ بات کی ہے اسی وجہ سے استثناء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح تعلیم دی اسی پر عمل کیا جب ارشاد فرمایا:

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (الکہف)

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ایسے امر میں استثناء کی جو معلوم ہے تا کہ مخلوق اس چیز میں استثناء کرے جس کا وہ علم نہیں رکھتے؛ یہ حسین بن فضل کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: استثناء اٰمِنِیْنَ سے ہے یہ کلام بندوں کے خطاب کی طرف لوٹے گی جس طرح معمول ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ تمہیں داخل ہونے کا حکم دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ تجھے سہولت دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان شاء اللہ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ چاہے۔ ابو عبید نے کہا: ان یہ اذ کے معنی میں ہے(2) یعنی جب اللہ تعالیٰ چاہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (البقرۃ) یہ بھی اذ کنتم کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر حقیقت سے بعید ہے کیونکہ اذ زمانہ ماضی اور اذا زمانہ مستقبل میں فعل کو خاص کرنے کے لیے آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں داخل ہونے کا وعدہ کیا اور مشیت

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 345 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 189

کی شرط کے ساتھ اسے متعلق کر دیا یہ حدیبیہ کے سال ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو خبر دی تو صحابہ اس سے بہت خوش ہوئے پھر یہ اس سال سے مؤخر ہو گیا جس میں انہوں نے طمع کی تو اس نے انہیں دکھ دیا یہ معاملہ ان پر شدید ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے صلح کی اور واپس لوٹ گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آنے والے سال میں اجازت دی تو یہ آیت نازل فرمائی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ خواب میں آپ کو کہا گیا تھا: لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ آپ کو خواب میں جو کچھ کہا گیا تھا قرآن حکیم میں اس کی حکایت بیان کی گئی ہے یہاں کوئی شک وغیرہ کا معاملہ نہیں جس طرح بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ استثناء شک پر دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کو کوئی شک نہیں۔ لَتَدْخُلُنَّ یہ تو تحقیق ہے تو شک کیسے ہوگا ان، اذا کے معنی میں ہے اٰمِنِيْنَ یعنی دشمنوں سے امن میں ہونگے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ حلق اور قصر سب مردوں کے لیے ہے اسی وجہ سے مردوں کو عورتوں پر غلبہ دیا۔ حلق کرنا افضل ہے، عورتوں کے لیے صرف بال چھوٹے کرانے کا حکم ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مروہ پر چوڑے پھل والے تیر سے کاٹے تھے۔ یہ عمرہ میں ہوا تھا حج میں نہیں ہوا تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں حلق کروایا تھا(1)۔

لَا تَخَافُوْنَ یہ محلقین اور مقصرین سے حال ہے تقدیر کلام یوں ہے غیر خائفین۔

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا یعنی مکہ مکرمہ میں داخل ہونے میں تاخیر میں جو بھلائی اور بہتری ہے تم اسے نہیں جانتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جونہی آپ حدیبیہ سے واپس آئے تو خیبر کی طرف چل دیئے اور اسے فتح کر دیا آپ خیبر کے اموال کے ساتھ واپس لوٹے اس سال میں جو قوت اور سامان پہلے تھا اس سے کئی گنا حاصل کیا اور اس سے کئی گنا سامان اور قوت کے ساتھ مکہ کی فتح کے لیے گئے۔ کلبی نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے(2) کہ ان کا مکہ مکرمہ میں داخلہ ایک سال تک ہوگا تم اسے نہیں جانتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جانتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں مومن مرد اور مومن عورتیں ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔

فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۝ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب کے علاوہ کی فتح مقرر کر دی؛ یہ ابن زید اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فتح مکہ ہے۔ مجاہد نے کہا: مراد صلح حدیبیہ ہے؛ یہ اکثر مفسرین کا نقطہ نظر ہے۔ زہری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے دور اسلام میں جو فتوحات نصیب فرمائیں صلح حدیبیہ سے بڑھ کر ان میں سے کوئی فتح نہیں تھی کیونکہ جب لوگ ملتے ہیں تو باہم جنگ ہوتی ہے(3) جب صلح ہوئی تو جنگ ختم ہو گئی لوگ ایک دوسرے سے امن میں ہو گئے وہ آپس میں ملے گفتگو کی کوئی آدمی اسلام کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا جبکہ وہ کچھ سمجھ بوجھ رکھتا ہو تو وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے ان دو سالوں میں اسلام میں اتنے افراد داخل ہوئے جتنے اس سے پہلے شامل ہوئے تھے یا اس سے زیادہ داخل ہوئے تھے۔ اس امر پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے حدیبیہ جو چھ ہجری کا سال ہے صحابہ کرام کی تعداد چودہ سو تھی حدیبیہ کے سال کے بعد آٹھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1709 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 322 3۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 124

ہجری کو تعداد دس ہزار تھی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

''وہ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو کتاب ہدایت اور دین حق دے کرتا کہ غالب کردے اسے تمام دینوں پر اور رسول کی صداقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے''۔

رَسُوْلَهٗ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ یعنی تمام ادیان پر غالب کردے۔ دین کے معنی میں مصدر ہے اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اپنے رسول کو تمام دین پر غالب کردے یعنی جو دین مشروع کیا ہے دلیل کے ساتھ اس پر غالب کردے یعنی ہاتھ اور تلوار، باقی ماندہ کو منسوخ کردیا۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ شهيدا تفسیر کے طور پر منصوب ہے باء زائدہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے لیے شہید کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے نبی کے حق میں شہادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت کو معجزات کے ساتھ واضح کرتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس چیز کے ساتھ آپ کو بھیجا اس پر گواہ ہے کیونکہ کفار نے اس امر کا انکار کیا کہ وہ یہ لکھیں یہ وہ چیز ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَــظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (29)

''(جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور (وہ سعادت مند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقتور ہیں آپس میں بڑے رحم دل ہیں تو دیکھتا ہے انہیں کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے طلب گار ہیں اللہ کے فضل اور رضا کے ان کے (ایمان وعبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے، یہ ان کے اوصاف تورات میں مذکور ہیں نیز ان کی صفات انجیل میں بھی مرقوم ہیں (یہ صحابہ) ایک کھیت کی مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا پھر تقویت دی اس کو پھر وہ مضبوط ہوگیا پھر سیدھا کھڑا ہوگیا تنے پر اس کا جوبن خوش کررہا ہے بونے والوں کو تاکہ آتش غیظ میں جلتے رہیں انہیں دیکھ کر کفار، اللہ نے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے مغفرت کا اور اجر عظیم کا''۔

**اس میں پانچ مسائل ہیں:**

**مسئلہ نمبر 1**۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ محمد مبتدا اور رسول اس کی خبر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لفظ محمد مبتدا ہے اور رسول اللہ اس کی صفت ہے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کا عطف مبتدا پر ہے اور ان کی خبر بعد میں ہے۔ اس تعبیر کی صورت میں رسول اللہ پر وقف نہیں ہوگا پہلی تعبیر کی صورت میں رسول اللہ پر وقف ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات آپ کے صحابہ کی صفات سے بڑھ کر ہیں پس لفظ محمد مبتدا رسول اللہ اس کی خبر ہوگی وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ دوسرا مبتدا اور شهداء اس کی خبر ہوگی، اور رحماء دوسری خبر ہوگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ میں ان صفات کا ہونا زیادہ مناسب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اہل حدیبیہ کفار پر شدید ترین تھے یعنی بہت زیادہ سخت تھے جس طرح شیر اپنے شکار پر سختی کرنے والا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ سے مراد تمام مومن ہیں۔

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ باہم شفقت کرتے ہیں اور باہم محبت کرتے ہیں: حضرت حسن بصری نے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کو حال ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے، گویا کہا: الذین معه فی حال شدتهم علی الکفار وتراحمهم بینهم یعنی حضور کے صحابہ کفار پر حالت شدت میں اور آپس میں رحم کرنے کی حالت میں ہیں۔

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ان کے بارے میں یہ خبر دینا ہے کہ وہ بہت زیادہ نماز پڑھتے ہیں يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وہ اللہ تعالیٰ سے جنت اور رضا کے طلب گار ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ سیما سے مراد علامت ہے اس میں دو لغتیں ہیں یعنی مد اور قصر، یعنی ان پر رات کے وقت بیدار ہونے اور جاگنے کی علامات روشن ہیں۔ سنن ابن ماجہ میں ہے اسماعیل بن طلحی، ثابت بن موسیٰ ابو یزید سے وہ شریک سے وہ اعمش سے وہ ابوسفیان سے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کثرت صلاته باللیل حسن وجهه بالنهار (1) جس کی رات کے وقت نماز زیادہ ہوجاتی ہے دن کے وقت اس کا چہرہ حسین ہوجاتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلط طریقہ سے حدیث کے معنی کو چھپانے کی کوشش کی اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز مروی نہیں (2)۔ ابن وہب نے امام مالک سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس نشانی سے مراد وہ نشانی ہے جو زمین پر سجدہ کرنے کی وجہ سے پیشانی پر پڑ جاتی ہے؛ سعید بن جبیر نے بھی یہی کہا ہے۔

حدیث صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیس رمضان کی صبح کو نماز پڑھی جبکہ مسجد کا چھت بارش کی وجہ سے ٹپکا تھا وہ چھپر نما تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے جبکہ آپ کی پیشانی اور ناک کے بانسے پر پانی اور مٹی کا نشان تھا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد وہ سفیدی ہے جو قیامت کے روز چہرے پر ہوگی (3)؛ یہ قول سعید

1۔ سنن ابن ماجہ، اقامة الصلوٰة والسنة فیها، باب ما جاء فی قیام اللیل، صفحہ 95۔ ایضاً حدیث نمبر 1322، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1719　　3۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 127

بن جبیر نے بھی کیا ہے اسے عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے؛ یہ زہری کا قول ہے۔ صحیح میں ہے حضرت ابو ہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے "جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ سے فارغ ہو جائے گا اور اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے گا کہ اسے جہنم سے نکالے تو وہ فرشتوں کو حکم دے گا جو آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا تھا اسے جہنم سے نکالو اللہ تعالیٰ جس پر رحم کرنے کا ارادہ کرے گا(1) وہ وہ ہوں گے جو یہ کہتے تھے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ فرشتے انہیں سجدہ کے نشان سے پہچان لیں گے، آگ انسان کو کھا جائے گی مگر سجدہ کا اثر باقی رہے گا اللہ تعالیٰ اسے آگ پر حرام کر دے گا کہ وہ آگ کا نشان کھا جائے"۔

شہر بن حوشب نے کہا: ان کے چہروں میں سے سجدوں کی جگہیں یوں ہوں گی جس طرح چودھویں رات کا چاند ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یہ سیما دنیا میں ہوگی وہ اچھی تعریف ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: مراد خشوع اور تواضع ہے۔ منصور نے کہا: میں نے مجاہد سے **سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ** کے بارے میں پوچھا کیا اس سے مراد وہ نشان ہے جو آنکھوں کے درمیان ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں بعض اوقات انسان کی آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے کی طرح چیز ہو جاتی ہے جبکہ اس کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد خشوع کی وجہ سے ان کے چہروں پر نور ہے۔ ابن جریج نے کہا: مراد وقار اور رونق ہے۔ شمر بن عطیہ نے کہا: مراد رات کی عبادت کی وجہ سے چہرے کی زردی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جب تو انہیں دیکھے گا جبکہ وہ مریض نہیں۔ ضحاک نے کہا: یہ ان کے چہروں میں زخم کا اثر نہیں بلکہ مراد زردی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: وہ رات کو نماز پڑھتے ہیں جب صبح کرتے ہیں تو اس کا اثر ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے: "جو رات کو زیادہ نماز پڑھتا ہے دن کے وقت اس کا چہرہ حسین ہو جاتا ہے(2)" اس بارے میں گفتگو پہلے گذر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ** فراء نے کہا: اس کی دو وجوہ ہیں: اگر تو چاہے تو کہے: معنی ہے جس طرح ان کے اوصاف قرآن میں ہیں اسی طرح ان کے اوصاف تورات وانجیل میں ہیں تو وقف **الْاِنْجِيْلِ** پر ہوگا اگر تو چاہے تو کہے: کلام کا اختتام **مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ** پر ہے پھر تو نئے سرے سے کلام کو شروع کرے اور کہے: **وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ** اس صورت میں وقف **التَّوْرٰىةِ** پر ہوگا۔ مجاہد نے کہا: ھو مثل واحد(3) یعنی یہ تورات اور انجیل میں ان کی صفت ہے اس صورت میں **التَّوْرٰىةِ** پر وقف نہیں ہوگا۔ وقف **الْاِنْجِيْلِ** پر ہوگا اور پھر کلام نئے سرے سے شروع کرے گا۔ **كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ** معنی ہوگا: وھم کذرع، **شَطْئَهٗ** سے مراد اولاد ہے؛ یہ ابن زید اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد ایک پودا ہے جب اس کے بعد کوئی چیز نکلے تو یہ اس کے لیے کہیں گے: فقد شطاہ۔ اخفش نے **اَخْرَجَ شَطْئَهٗ** کے بارے میں کہا: یعنی وہ اپنی طرف نکالتا ہے، ثعلبی نے اسے کسائی سے روایت نقل کیا ہے۔ فراء نے کہا: اشطاہ الزرع فھو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرد علی الجھمیۃ وغیرھم، جلد 2، صفحہ 1106

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، ماجاء فی قیام اللیل، صفحہ 95

3۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 259

مشطی۔ جب وہ نکلے۔

شاعر نے کہا:

أخرج الشطأ علی وجه الثری		ومن الأشجار أفنان الثمر

اس نے روئے زمین پر کونپل نکالی اور درختوں سے مختلف قسم کے پھل حاصل ہوتے ہیں۔

زجاج نے کہا: اَخْرَجَ شَطْئَهٗ یعنی اس نے نباتات کو نکالا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شَطْئَهٗ سے مراد بالی کا کانٹا ہے عرب اسے سنا بھی کہتے ہیں یہ بھی ہے (ایک جڑی بوٹی سبز ہو تو اس سے بھیڑ بکریوں کو شدید درد ہو جاتا ہے)؛ یہ قطرب کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بالی ہے ایک دانہ سے دس، نو اور آٹھ بالیاں نکلتی ہیں؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے۔ ابن کثیر اور ابن ذکوان نے شطأہ طاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ حضرت انس، نصر بن عاصم اور ابن وثاب نے شطاہ پڑھا ہے جس طرح عصاہ ہوتا ہے۔ جحدری اور ابن ابی اسحاق نے ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے۔ یہ سب لغتیں ہیں۔

یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی بیان فرمائی ہے یعنی وہ تھوڑے ہونگے پھر زیادہ ہونگے اور پھر کثیر ہو جائیں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی دعوت کا آغاز کیا تو آپ کمزور تھے ایک کے بعد ایک نے دعوت کو قبول کیا یہاں تک کہ آپ کا معاملہ قوی ہو گیا جس طرح ایک دانہ ہوتا ہے پہلے وہ کمزور ظاہر ہوتا ہے پھر ایک حال کے بعد دوسرے حال میں قوی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا پودا اور شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ یہ صحیح ترین اور قوی ترین مثال ہے۔ قتادہ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ آپ ایک ایسی قوم سے ظاہر ہونگے جو کھیتی باڑی کریں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے (1)۔

فَاٰزَرَهٗ اسے قوی کیا یا اس کی مدد کی اور اسے مضبوط کیا یعنی اس کونپل نے کھیتی کو مضبوط کیا۔ ایک قول اس کے برعکس ہے۔ یعنی کھیتی نے کونپل کو مضبوط کیا۔ عام قراءت فَاٰزَرَهٗ ہے یعنی مد کے ساتھ ہے۔ ابن ذکوان، ابو حیوہ اور حمید بن قیس نے فأزرہ قصر کی صورت میں پڑھا ہے جس طرح فَعَلَه ہے معروف مد ہی ہے؛ امراء القیس نے کہا:

بِمَحْنِيَةٍ قد آزر الضال نَبْتُها		مَجَرّ جيوش غانمين وخُيَّبِ(2)

محل استدلال قد آزر ہے۔

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ سوق سے مراد عدد (لکڑی) ہے جس پر وہ کھڑا ہوتا ہے پس وہی اس کے لیے پنڈلی ہے۔ سوق یہ ساق کی جمع ہے يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ یہ کھیتی کاشتکاروں کو خوش کرتی ہے۔ یہ ضرب المثل ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے کھیتی سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور شطأ سے مراد صحابہ کرام ہیں وہ تھوڑے تھے پھر زیادہ ہو گئے، کمزور تھے قوی ہو گئے؛ یہ ضحاک اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ لام حرف جار محذوف کے متعلق ہے تقدیر کلام یہ ہو سکتی ہے فعل

1۔ ... یل، جلد 5، صفحہ 191		2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 142

الله هذا المحمد صلى الله عليه وسلم وأصحابه ليغيظ بهم الكفار۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے وہ مومن ہیں جن کے اعمال صالح ہیں مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ یعنی ایسا ثواب جو ختم نہ ہوگا وہ جنت ہے منهم میں من بعضیہ نہیں یعنی بعض صحابہ کو بعض سے خاص کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ عام ہے یعنی بیانیہ ہے جسطرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج:30) اس میں تبعیض کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ یہ جنس کو بیان کرنے لیے ہے یعنی اس ناپاکی سے بچو جو اوثان کی جنس سے ہے کیونکہ ناپاکی کئی اجناس سے واقع ہوسکتی ہے ان میں زنا، سود، شراب نوشی اور جھوٹ ہے من داخل کیا گیا ہے جو جنس کا فائدہ دیتا ہے اسی طرح منهم ہے یعنی اس جنس سے یعنی صحابہ کی جنس سے، جس طرح یہ کہا جاتا ہے: أنفق نفقتك مِنَ الدراهم یعنی اپنا خرچ اس جنس سے بنادے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو مغفرت کے وعدہ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے مقصد ان کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے ساتھ مغفرت کا وعدہ کیا ہے۔

آیت میں ایک اور جواب بھی ہے وہ یہ ہے کہ مِنْ کلام کی تاکید کے لیے ہے معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمام کے ساتھ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے یہ بھی عربی کے قول کے قائم مقام ہے قطعت من الثوب قميصا مراد ہے تمام کپڑے کو قمیص بنادیا۔ من یہاں بعضیت کو ثابت کرنے کے لیے ہے قرآن میں سے اس کا شاہد وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ (الاسراء:82) ہے۔

اس کا معنی ہم قرآن کو شفا دینے کے لیے نازل کرتے ہیں اس کا ہر حرف شفا دیتا ہے شفاء اس میں سے بعض کے ساتھ خاص نہیں۔ لغویوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو من کو جنسیہ کہتے ہیں تقدیر کلام یہ ہوگی منزل الشفاء من جنس القرآن و من جهة القرآن و من ناحية القرآن زہیر نے کہا:

أمن أم أوْفَى دِمْنَةٌ لم تَكَلَّمَ کیا تو ام اوفی دمنہ سے بات نہیں کرے گا۔ یہاں بھی من جنسیہ ہے ایک اور شاعر نے کہا:

أخو رَغائبَ يعطيها ويسألها　　يأبى الظُّلامة منه النَّوْفَلُ الزُّفَرُ

اس شعر میں بھی من کسی چیز کی تقسیم کو بیان نہیں کرتا کیونکہ مقصود یابی الظلامة ہے کیونکہ وہ نوفل زفر ہے۔ نوفل سے مراد کثیر عطیہ ہے، زفر سے مراد لوگوں کی جانب سے بوجھ اور مشقت اٹھانے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابو عروہ زبیری حضرت زبیر کے بیٹے سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم امام مالک بن انس کے پاس بیٹھے تھے لوگوں نے ایک آدمی کا ذکر کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شان میں تنقیص کیا کرتا تھا امام مالک نے اس آیت کو پڑھا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ امام مالک نے کہا: لوگوں میں سے جس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی ایک کے بارے میں بغض ہو تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا(1)؛ خطیب

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 193

ابو بکر نے اس کا ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک نے بہت اچھی بات کی اور درست تاویل بیان کی ہے جس آدمی نے ان صحابہ میں سے کسی ایک کی شان میں تنقیص کی یا اپنی روایت میں کسی ایک پر بھی طعن کیا تو اس نے اللہ رب العالمین کا رد کیا اور مسلمانوں کے شرعی احکام کو باطل کیا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ اس کے علاوہ دوسری آیات ہیں جو ان کی تعریف کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں اور ان کے صدق اور فلاح کی شہادت کو ضمن میں لیے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ (الاحزاب: 23) ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحشر) ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۫ؕ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الحشر)۔ یہ سب کچھ اس لیے ارشاد فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے حال اور مال کو جانتا تھا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خیرُ الناس قرنی ثم الذین یلونھم (1) لوگوں میں سے اچھے میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر وہ جو ان کے بعد ہوں گے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لا تسبوا أصحابی فلو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذھبا لم یدرك مُدّ أحدھم ولا نصیفه (2) تم میرے صحابہ کو گالیاں نہ دینا اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو وہ صحابہ کے صدقہ کے ایک مد (ایک پیمانہ) اور اس کے نصف مد تک نہیں پہنچتا۔ دونوں حدیثوں کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ ایک اور حدیث میں فلو أن أحدکم أنفق ما فی الأرض لم یدرك مُدّ أحدھم ولا نصیفه ہے۔ اگر تم میں سے کوئی زمین میں جو کچھ ہے اس کے برابر خرچ کرے تو وہ ان کے صدقہ کے ایک مد اور نصف مد تک بھی نہیں پہنچتا۔

ابوعبید نے کہا: اس کا معنی ان کے ایک مد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی ان کے نصف مد تک پہنچتا ہے۔ نصیف سے یہاں نصف مراد ہے اسی طرح عشر کو عشیر، خمس کو خمیس، تسع کو تسیع، ثمن کو ثمین، سدس کو سدیس، ربع کو ربیع کہتے ہیں، عرب ثلث کو ثلیث نہیں کہتے۔

مسند بزار میں حضرت جابر سے ایک صحیح مرفوع حدیث مروی ہے: إن اللہ إختار أصحابی علی العالمین سوی النبیین والمرسلین وأختار لی من أصحابی أربعة یعنی أبابکر وعمر وعثمان وعلیا فجعلھم أصحابی (3)۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور مرسلین کے علاوہ میرے صحابہ کو چن لیا ہے اور میرے صحابہ میں سے میرے لیے چار کو چنا ہے یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم۔ فرمایا: فی اصحابی کلھم خیر میرے تمام صحابہ میں بھلائی ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، فضائل اصحاب النبی ﷺ، جلد 1، صفحہ 515

2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، قول النبی ﷺ سدو الابواب الا باب ابی بکر، جلد 1، صفحہ 518

3۔ کنز العمال، جلد 13، حدیث نمبر 36708

عویم بن ساعدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے چنا، میرے لیے میرے صحابہ کو منتخب کیا ان میں سے میرے لیے وزراء، داماد اور سسرال بنائے، جو ان کو گالیوں دے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ ان سے توبہ قبول کرے گا اور نہ ہی فدیہ قبول کرے گا'' (1)۔

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں، ان صحابہ میں سے کسی کے بارے میں نازیبا بات کرنے سے بچو جس طرح ان لوگوں نے کیا جنہوں نے دین میں طعن کیا انہوں نے یہ بھی کہا کہ معوذتین ''سورۂ فلق اور سورۂ ناس'' قرآن میں سے نہیں ان دونوں سورتوں کے قرآن حکیم میں سے ہونے کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں مگر عقبہ بن عامر کی ایک روایت ہے اور عقبہ بن عامر ضعیف (2) ہے کسی اور نے اس مسئلہ میں ان کی موافقت نہیں کی پس اس کی روایت چھوڑ دی جائیگی کتاب وسنت میں سے جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یہ اس قول کا رد ہے اور دین کی جو باتیں صحابہ نے نقل کی ہیں اس کا ابطال ہے کیونکہ حضرت عقبہ بن عامر ان لوگوں میں سے ہیں جن سے ہمارے لیے شرعی احکام نقل کیے گئے ہیں ان سے مروی روایات بخاری، مسلم اور دوسری احادیث میں ہیں یہ بھی ان میں سے ہوئی جن کی اللہ تعالیٰ نے مدح بیان کی ان کی صفت کا ذکر کیا ان کی تعریف کی ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا ذکر کیا۔ جو آدمی آپ کی یا صحابہ میں سے کسی ایک کی جھوٹ کی طرف نسبت کرے تو وہ شریعت سے خارج ہے، قرآن کا ابطال کرنے والا ہے اور رسول اللہ ﷺ پر طعن کرنے والا ہے ان میں سے۔ کسی ایک کی یہ نسبت کرنا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے تو اس کو گالی دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے انکار کے بعد جھوٹ سے بڑھ کر کوئی عار اور عیب نہیں جس نے صحابہ کو گالیاں دیں رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعنت کی ان میں سے بہت سے جھوٹے مرتبہ والے کو جھٹلانا (جبکہ ان میں سے کوئی بھی جھوٹا نہیں) اللہ تعالیٰ کی لعنت میں داخل ہے جس کی شہادت رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور ہر اس فرد پر اس کو لازم کیا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کو گالی دی یا اس پر طعن کیا۔

عمر بن حبیب سے مروی ہے کہ میں ہارون رشید کی مجلس میں تھا کہ ایک بحث چھڑ گئی جس میں حاضرین نے جھگڑا کیا اور ان کی آوازیں بلند ہو گئیں ان میں سے ایک نے اس حدیث سے استدلال کیا جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے تھے ان میں سے بعض نے ایک حدیث کو مرفوع ذکر کیا باہم نزاع اور جھگڑا بڑھ گیا یہاں تک کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا: اس حدیث کو قبول نہیں کیا جائیگا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو مروی روایات ہیں ان میں ان پر تہمت لگائی جاتی ہے اور انہوں نے آپ کے جھوٹ کی تصریح کی۔ میں نے ہارون رشید کو دیکھا کہ اس نے ان کی طرف داری کی اور ان کے قول کی مدد کی، میں نے کہا: حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت نقل کرنے میں صحیح ہیں اور جو وہ نبی کریم ﷺ اور دوسرے لوگوں سے روایت کرتے ہیں اس میں صحیح ہیں۔ رشید نے مجھے

---

1۔ کنز العمال، جلد 11 حدیث نمبر 32466

2۔ اس امر کو واضح کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ صحابہ پر طعن کرتے ہیں وہی لوگ معوذتین کے قرآن کا جز ہونے کا انکار کرتے ہیں اور وہی لوگ حضرت عقبہ بن عامر کو ضعیف قرار دیتے ہیں جبکہ حضرت عقبہ بن عامر سے بے شمار روایات مروی ہیں۔ مترجم۔

غضبناک نظروں سے دیکھا میں مجلس سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا کچھ وقت نہ گذرا تھا کہ ڈاکیا دروازے پر آیا وہ داخل ہوا اور مجھے کہا: مقتول کی حیثیت سے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کرو خوشبو اور کفن کا انتظام کر لیجئے۔ میں نے کہا: اے میرے الله! تو جانتا ہے میں نے تیرے نبی کے صحابی کا دفاع کیا ہے اور اس بارے میں تیرے نبی کی تعظیم کی ہے کہ آپ کے صحابہ پر طعن کیا جائے، مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ۔ میں ہارون رشید کے پاس گیا وہ سونے سے بنی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس نے اپنی آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور اس کے سامنے چمڑے کی چٹائی پڑی ہوئی تھی جب اس نے مجھے دیکھا تو اس نے مجھے کہا: اے عمر بن حبیب! میری بات کا ایسا جواب مجھے کسی نے نہیں دیا جیسا جواب تو نے مجھے دیا ہے۔ میں نے کہا: اے امیر المومنین! جو کچھ آپ نے کہا اور جو جھگڑا کیا اس میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے اور جو پیغام حق آپ لائے ہیں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہے جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جھوٹے ہیں تو شریعت باطل ہے روزوں، نماز، طلاق، نکاح اور حدود میں تمام احکام مردود غیر مقبول ہوں گے۔ اس نے اپنی طرف توجہ کی پھر کہا: اے عمر بن حبیب! تو نے مجھے نئی زندگی دی الله تعالیٰ تجھے زندگی عطا کرے اور مجھے دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

میں کہتا ہوں: صحابہ سب کے سب عادل ہیں الله تعالیٰ کے اولیاء اور اصفیاء ہیں انبیاء کرام اور رسل کے بعد وہ اس کی بہترین مخلوق ہیں؛ یہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ اس امت کے ائمہ کی جماعت کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ ایک چھوٹے سے گروہ کی رائے یہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں کہ صحابہ کا حال دوسروں کے حال کی طرح ہے اس وجہ سے ان کی عدالت کے بارے میں بحث ضروری ہے ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو انکے احوال کے درمیان بداءۃ امر کے حوالے سے فرق کرتے ہیں کہا: پہلے پہل وہ عادل تھے پھر ان کے احوال بدل گئے ان میں جنگیں اور خون خرابہ ہوا اس لیے بحث ضروری ہے۔ ان کا یہ قول مردود ہے کیونکہ صحابہ کرام میں سے بہترین اور جلیل القدر ہستیاں جیسے حضرت علی شیر خدا، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جو ان ہستیوں میں سے ہیں جن کی الله تعالیٰ نے تعریف کی، ان کا تذکرہ کیا۔ الله تعالیٰ ان سے راضی ہوا انہیں راضی کیا اور اس ارشاد کے ساتھ ان کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا: مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا خصوصاً دس عشرہ مبشرہ جن کی جنت کی بشارت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے دی وہ سردار ہیں جبکہ ان کے بارے میں کثیر آزمائشیں اور امتحانات آتے رہے یہ سب کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوا جس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دے گئے تھے ایسے امور ان کے مرتبہ اور فضیلت کو ساقط کرنے والے نہیں کیونکہ یہ امور اجتہاد پر مبنی ہیں ہر مجتہد ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ سورۂ حجرات میں اس موضوع پر گفتگو ہو گی انشاء الله۔

# سورة الحجرات

(آیاتها ۱۸) (۴۹ سورة الحجرات مدنية ۱۰۶) (رکوعاتها ۲)

یہ سورت مدنی ہے اس پر اجماع ہے۔ اس کی اٹھارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

"اے ایمان والو آگے نہ بڑھا کرو اللہ تعالیٰ کے رسول سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ علماء نے کہا: عربوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب میں سختی اور سوءادبی تھی اسی طرح وہ لوگوں کو القاب دینے میں بھی یہی رویہ اپناتے تھے یہ سورت مکارم اخلاق اور آداب کی رعایت کے حکم کے متعلق ہے۔ ضحاک اور یعقوب نے لا تقدموا تاء اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ تقدم سے مشتق ہے باقی قراء نے تُقَدِّمُوْا تاء کے ضمہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ تقدیم سے مشتق ہے دونوں کا معنی ظاہر ہے یعنی تم کوئی ایسا قول نہ کرو اور نہ ایسا فعل کرو جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے متجاوز ہو اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے آگے نہ بڑھو جس کا حصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ہو خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیاوی ہو۔ جو اپنے قول اور فعل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھا تو وہ اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی حکم دیتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کا سبب نزول کیا ہے اس بارے میں چھ اقوال ہیں:

(1) ابن جریج کی حدیث سے واحدی نے اسے ذکر کیا ہے: کہا حضرت ابن ملیکہ نے حضرت عبد اللہ بن زبیر سے روایت نقل کی ہے (1) کہ بنو تمیم کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: قعقاع بن معبد کو امیر مقرر کیجئے، حضرت عمر نے عرض کی: اقرع بن حابس کو امیر مقرر کیجئے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے کہا: تو نے محض میری مخالفت کی وجہ سے یہ بات کی ہے۔ حضرت عمر نے جواب دیا: میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا۔ دونوں نے گفتگو لمبی کی یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اس بارے میں یہ آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ حجرات، جلد 2، صفحہ 718

رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ نازل ہوئیں۔ اسے امام بخاری نے حسن بن عمر بن صباح سے نقل کیا اور مہدوی نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔ (2) روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارادہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ طیبہ پر نائب بنائیں جب آپ خیبر کی طرف تشریف لے گئے حضرت عمر نے ایک اور آدمی کے بارے میں مشورہ دیا تو یہ آیات نازل ہوئیں؛ اسے بھی مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ (3) ماوردی نے ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں (1) کہ نبی کریم ﷺ نے چوبیس صحابہ کو بنی عامر کی طرف بھیجا بنی عامر نے انہیں قتل کر دیا مگر تین آدمی پیچھے رہ گئے وہ سلامت رہے اور مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے وہ بنو سلیم کے دو آدمیوں سے ملے انہوں نے ان دو افراد سے ان کے نسب کے بارے میں پوچھا دونوں نے کہا: بنی عامر سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ بنی عامر، بنو سالم سے زیادہ معزز شمار ہوتے تھے۔ ان صحابہ نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ بنی سلیم کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے عرض کی: ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہے اور ہم میں سے آدمی قتل کر دیئے گئے ہیں نبی کریم ﷺ نے ان کی دیت سو اونٹ عطا فرمائی؛ ان دو آدمیوں کے قتل کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (4) قتادہ نے کہا: کچھ لوگ کہا کرتے تھے کاش! میرے بارے میں ایسی آیت نازل ہوتی، کاش! میرے بارے میں ایسی آیت نازل ہوتی تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ (5) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں منع کیا گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کلام کریں۔ مجاہد نے کہا: تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے پہلے ہی حکم نہ دے دیا کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان پر حکم دے؛ اسے امام بخاری نے بھی ذکر کیا ہے۔ (6) حضرت حسن بصری نے کہا: یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں (3) جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے نماز ادا کرنے سے قبل ہی قربانیاں کر دی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ دوبارہ ذبح کریں۔ ابن جریج نے کہا: وہ وقت جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اس سے قبل تم طاعات کے اعمال نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: یہ آخری پانچ اقوال انہیں قاضی ابو بکر بن عربی نے ذکر کیا اور اس سے قبل ماوردی نے اچھی طرح وضاحت کی قاضی نے کہا: یہ سب صحیح ہیں (4) عموم کے تحت داخل ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے جو ان آیات کے نزول کا سبب ہے ممکن ہے بغیر سبب کے نازل ہوئیں ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ قاضی نے کہا: جب ہم یہ کہیں کہ یہ طاعات کو ان کے اوقات سے پہلے لانے میں نازل ہوئی ہے تو وہ بھی صحیح ہے کیونکہ ہر وہ عبادت جس کا ایک خاص وقت ہو تو وقت سے پہلے اسے ادا کرنا جائز نہیں ہوتا جس طرح نماز، روزہ، حج یہ سب واضح ہیں مگر علماء نے زکوۃ پر اختلاف کیا ہے جو عبادت مالیہ ہے

---

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 326
2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 134
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 53
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1713

اور معنی مفہوم کے لیے مطلوب ہے وہ فقیر کی حاجت کو پورا کرنا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عباس سے دو سال کا صدقہ جلدی لیا جب ایسی روایات آئی ہیں کہ صدقہ فطر کو عید الفطر سے پہلے جمع کیا جاتا تا کہ عید الفطر کے روز مستحق لوگوں کو وہ چیز دے دی جائے تو یہ امر سال یا دو سال پہلے زکوۃ کی ادائیگی کے جواز کو ثابت کرتا ہے اگر سال کا اختتام نہ ہوا اور نصاب اپنی حالت پر تھا تو زکوۃ کی ادائیگی ہوگئی اگر سال کا اختتام ہوا جبکہ نصاب تبدیل ہو چکا تھا تو واضح ہو گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ ہے۔

اشہب نے کہا: سال مکمل ہونے سے ایک گھڑی بھی پہلے دینا جائز نہیں (1) جس طرح نماز ہے گویا عبادت میں اس قاعدہ کو عام رکھا ہے ان کی رائے ہے کہ یہ اسلام کے ستونوں میں سے ایک ہے تو نظام اور حسن ترتیب میں اس کا پورا حق ادا کیا۔ باقی ہمارے علماء کی رائے ہے کہ تھوڑی سی تقدیم جائز ہے کیونکہ اتنی چیز معاف ہے مگر کثیر معاف نہیں۔ اشہب نے جو بات کہی وہ زیادہ واضح ہے کیونکہ تھوڑی چیز کا زیادہ سے الگ کرنا اصول شریعت میں صحیح ہے لیکن چند مقاصد جو تھوڑی چیز کے ساتھ خاص ہوں زیادہ کے ساتھ خاص نہ ہوں مگر ہمارے مسئلہ میں دن مہینہ کی طرح ہے مہینہ سال کی طرح ہے یا کلی تقدیم درست ہوگی جس طرح امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما نے کہا، جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو وہ اپنے اوقات پر ہی ادا کی جائے گی جس طرح اشہب نے کہا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ نبی کریم ﷺ کے اقوال کے تعرض کو ترک کرنے میں یہ اصل ہے آپ کی اتباع اور آپ کی اقتدا کے وجوب میں بھی اصل ہے نبی کریم ﷺ نے اپنی بیماری میں ارشاد فرمایا: مروا أبابكر فليصل بالناس (2) ابو بکر صدیق کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حفصہ سے کہا: آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کرو بے شک ابو بکر صدیق جلد رونے والے ہیں جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو رونے کی وجہ سے لوگوں کو اپنی آواز نہ سنا سکیں گے، حضرت عمر کو حکم دیں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم یوسف والیاں ہو، ابو بکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے'' تو صواحب یوسف کا معنی ہے وہ فتنہ جو جائز کو ناجائز کی طرف لوٹانے سے پیدا ہوتا ہے (3)۔ قیاس کے خلاف بغاوت کرنے والوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے یہ ان کی جانب سے باطل ہے کیونکہ جس امر پر دلیل قائم ہو تو اس کے بجالانے میں اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھنا نہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اس آگے بڑھنے سے بچو جس سے منع کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو سننے والا اور تمہارے افعال کو جاننے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! نہ بلند کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی کریم کی آواز سے اور نہ زور سے آپ کے ساتھ بات

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1713

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب استخلاف الامام اذا عرض، جلد 1، صفحہ 178

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1714

کیا کرو جس طرح زور سے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو اس بے ادبی سے کہیں ضائع نہ ہو جائیں تمہارے اعمال اور تمہیں خبر تک نہ ہو"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ امام بخاری اور امام ترمذی نے حضرت ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے بیان کیا: اقرع بن حابس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اسے اس کی قوم پر عامل بنا دیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (1) اسے عامل نہ بنائیں دونوں صحابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں گفتگو کی یہاں تک کہ ان دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: تو نے محض میری مخالفت کا ارادہ کیا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اس کے بعد جب حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بات کرتے تو ان کی گفتگو سنی نہ جاسکتی یہاں تک کہ ان سے سوال کیا جاتا۔ حضرت ابن زبیر نے اپنے نانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حدیث غریب حسن ہے۔ بعض علماء نے اسے حضرت ابن ابی ملیکہ سے مرسل نقل کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن زبیر کا ذکر نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں: وہ امام بخاری ہیں، کہا: یہ روایت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے (2) دو بہترین آدمی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق قریب تھا کہ وہ ہلاک ہو جاتے ان دونوں کی آوازیں اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بلند ہو گئیں جب بنو تمیم کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ان میں سے ایک نے اقرع بن حابس جو بنی مجاشع سے تعلق رکھتا تھا کا مشورہ دیا دوسرے نے ایک اور کا مشورہ دیا۔ نافع نے کہا: مجھے اسکا نام یاد نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت عمر سے کہا: تو نے محض میرے ساتھ مخالفت کا ارادہ کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا، اس بارے میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت ابن زبیر نے کہا: اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمر اپنی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں سناتے تھے یہاں تک کہ ان سے پوچھا جاتا، انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر نہیں کیا۔ مہدوی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی جب میری، حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ کی آواز بلند ہو گئی ہم حضرت حمزہ کی بیٹی کے بارے میں جھگڑ رہے تھے جب زید اسے مکہ مکرمہ سے لائے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر کے حق میں اس کا فیصلہ کر دیا کیونکہ اس بچی کی خالہ ان کے عقد میں تھی۔ یہ حدیث آل عمران میں گذر چکی ہے۔

صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کے بارے میں خبر لاتا ہوں، وہ حضرت ثابت کے پاس آئے

1۔ اس سے قبل مختلف روایات مروی ہیں۔

2۔ صحیح بخاری، باب قولہ لا ترفعوا اصواتکم، جلد 2، صفحہ 718

انہیں اپنے گھر میں سر جھکائے ہوئے پایا پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ جواب دیا: بہت برا حال ہے۔ اس کی آواز نبی کریم ﷺ پر بلند ہو جاتی تھی اس کے عمل رائیگاں گئے جبکہ وہ جہنمی ہو چکا ہے، وہ آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سب کچھ بتایا تو موسیٰ جو اس سند کے راوی ہیں نے کہا: وہ آدمی ان کی طرف ایک عظیم بشارت لے کر گیا فرمایا: ''اس کے پاس جاؤ اس کو کہو تو جہنمی نہیں تو تو جنتی ہے (1)'' یہ بخاری کے الفاظ ہیں یہ ثابت' ثابت بن قیس بن شماس خزرجی ہے جن کی کنیت ابو محمد تھی یہ کنیت ان کے بیٹے محمد کی وجہ سے تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ابو عبدالرحمٰن ہے یوم حرہ کو انہیں شہید کیا گیا اس کے تین بیٹے تھے محمد، یحییٰ، عبداللہ۔ وہ بہت اچھے خطیب اور بلیغ تھے وہ اسی وجہ سے معروف تھے انہیں رسول اللہ ﷺ کا خطیب کہا جاتا جس طرح حضرت حسان کو رسول اللہ ﷺ کا شاعر کہا جاتا جب بنو تمیم کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مفاخرہ کو طلب کیا ان کا خطیب کھڑا ہوا اور اظہار فخر کیا پھر ثابت بن قیس کھڑے ہوئے ایک عظیم و بلیغ خطبہ دیا اور ان پر غالب آگئے ان کا شاعر کھڑا ہوا وہ اقرع بن حابس تھا اس نے یہ شعر پڑھے:

أتيناك كيما يعرف الناس　　إذا خالفونا عند ذكر المكارم

ہم آپ کے پاس آئے جس طرح لوگ جانتے ہیں جب لوگ مکارم کے ذکر کے وقت ہماری مخالفت کریں

وانا رؤس الناس من كل مَعْشَرٍ　　وأن ليس فى أرض الحجاز كدارِمِ

ہم ہر قبیلہ کے لوگوں کے سردار ہیں جبکہ حجاز کی زمین میں دارم جیسا کوئی نہیں۔

وانّ لنا المِرْباع فى كل غارة　　تكون بنجد أو بأرض التهائم

ہمارے لیے ہر جنگ کے مال میں چوتھا حصہ ہوتا ہے وہ جنگ نجد میں ہو یا تہامہ کے علاقہ میں ہو۔

حضرت حسان نے کہا:

بَنى دارمٍ لا تَفْخَرُوا إنّ فَخْرَكُمْ　　يعودُ وَ بَالًا عند ذكر المكارم

هَبِلتم علينا تفخرون وأنتم　　لنا خَوَلٌ من بين ظِئر وخادِمِ

''اے بنی دارم! تم فخر نہ کرو بے شک تمہارا فخر مکارم کے ذکر کے وقت وبال بن جائے گا۔ تم ہلاک ہو! تم ہم پر فخر کرتے ہو جبکہ تم ہمارے خادم ہو یا دایا اور خادم کے درمیان''۔ انہوں نے کہا: ان کا خطیب ہمارے خطیب سے اچھا ہے، ان کا شاعر ہمارے شاعر سے اچھا شاعر ہے ان کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

عطا خراسانی نے کہا: مجھے ثابت بن قیس کی بیٹی نے بتایا جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کا والد اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنا دروازہ بند کر لیا نبی کریم ﷺ نے اسے نہ پایا تو اسے بلا بھیجا تا کہ پوچھیں کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے عرض کی: میری آواز سخت ہے مجھے ڈر ہے کہ میرا عمل ضائع ہی نہ ہو جائے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو ان لوگوں میں سے نہیں تو

1۔ صحیح بخاری، سورۂ حجرات، قولہ لاترفعوا اصواتکم، جلد 2، صفحہ 718

بھلائی کے ساتھ جئے گا اور بھلائی کے ساتھ مرے گا(1)'' پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾ (النساء) کو نازل فرمایا، انہوں نے اپنے دروازے کو بند کرلیا اور رونے لگے نبی کریم ﷺ نے نہ پایا تو بلا بھیجا اور خبر دی عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں جمال کو پسند کرتا ہوں اور میں اپنی قوم کا سردار بننا پسند کرتا ہوں فرمایا: ''تو ان میں سے نہیں بلکہ تو تعریف کی گئی زندگی گزارے گا، شہید کی حیثیت سے قتل ہوگا اور جنت میں داخل ہوگا(2)'' اس بچی نے کہا: جب یمامہ کی جنگ کا مرحلہ آیا تو مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کے لیے حضرت خالد بن ولید کے ساتھ نکلے جب صحابہ کی ان سے مڈ بھیڑ ہوئی تو صحابہ بکھر گئے۔ حضرت ثابت اور حضرت سالم جو حضرت ابو حذیفہ کے غلام تھے نے کہا: رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اس طرح تو جنگ نہیں کرتے تھے پھر دونوں نے اپنے لیے ایک گڑھا کھودا اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے اس روز حضرت ثابت کے جسم پر عمدہ زرہ تھی مسلمانوں میں سے ایک آدمی ان کے پاس سے گذرا اور اسے اتار لیا اسی اثنا میں ایک مسلمان سویا ہوا تھا تو حضرت ثابت اسے خواب میں آئے تو فرمایا: میں تجھے ایک وصیت کرتا ہوں یہ کہنے سے بچنا کہ یہ خواب ہے کہ تو اسے ضائع کردے میں جب کل شہید ہوا تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی میرے پاس سے گذرا اس نے میری زرہ لے لی جبکہ اس کا پڑاؤ لوگوں کے ایک جانب ہے اس کے خیمہ کے پاس گھوڑا ہے جو لمبی رسی سے باندھا ہوا ہے اس نے زرہ پر توبرہ الٹا کیا ہوا ہے اس توبرہ پر کجاوا ہے، حضرت خالد کے پاس جاؤ اسے کہو کہ میری زرہ لینے کے لیے آدمی بھیجے جو زرہ لے آئے جب تو مدینہ طیبہ میں خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق کے پاس پہنچے تو ان سے عرض کرو۔ مجھ پر فلاں فلاں قرض ہے، میرے غلاموں میں سے فلاں فلاں آزاد ہے وہ آدمی حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کو بتایا حضرت خالد بن ولید نے زرہ لینے کے لیے آدمی کو بھیجا جو زرہ لے آیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی وصیت کے بارے میں بات کی تو آپ نے وصیت کو نافذ کردیا۔ ہم کسی کے بارے میں نہیں جانتے کہ حضرت ثابت کے بعد کسی کی وصیت نافذ کی گئی ہو، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ اسے ابو عمرو نے استیعاب میں ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ یعنی ان سے خطاب نہ کرو۔ اے محمد! اے احمد! بلکہ یوں خطاب کرو: یا نبی اللہ! یا رسول اللہ! مقصود آپ کی عزت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منافق اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کے پاس بلند کیا کرتے تھے تاکہ کمزور مسلمان بھی ان کی اقتدا کریں تو مسلمانوں کو اس سے منع کردیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ میں لام، ب کے معنی میں ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے سقط لفیہ یہ بھی علی کے معنی میں ہے، سقط علی فیہ۔

كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ کاف، کاف تشبیہ ہے جو محل نصب میں ہے یعنی تم اس طرح آپ سے خطاب نہ کرو جس طرح ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہو اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ انہیں مطلق جہر سے منع نہیں کیا گیا یہاں تک کہ ان کے لیے جائز ہی نہ ہو مگر یہ کہ وہ اشارہ اور مخفی طریقہ سے آپ سے ہم کلام ہوں انہیں مخصوص جہر سے منع کیا گیا ہے جو صفت سے مقید ہو وہ جہر ہے جو اس مماثلت کے ساتھ موصوف ہے جس کے وہ باہم عادی تھے وہ ایسا جہر تھا جس میں نبوت کی قدر و منزلت کا

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 353　　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 326

خیال نہ ہو اور باقی ماندہ مراتب کا انحطاط ہو اگرچہ نبوت و رسالت تمام سے بڑھ کر مرتبہ ہے۔

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝ اس وجہ سے کہ تمہارے اعمال باطل ہو جائیں، یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: تاکہ تمہارے اعمال رائیگاں نہ چلے جائیں(1)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم اور توقیر اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی اور آپ سے گفتگو کے وقت آواز کو پست رکھنے کا حکم ہے جب آپ بولیں اور تم بولو تو تم پر لازم ہے کہ تم اپنی آوازوں کو اس حد تک بلند نہ کرو جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پہنچتی ہے اور اپنی آوازوں کو پست رکھو اس طرح کہ آپ کی کلام تمہاری کلاموں پر غالب رہے اور آپ کی بلند آواز کی گفتگو تمہاری بلند آواز کی گفتگو پر غالب ہو یہاں تک کہ آپ کی فضلیت تم پر نمایاں ہو۔ آپ کی سبقت ظاہر ہو اور آپ کا امتیاز تمہاری بلند آواز سے عیاں ہو ایسا نہ ہو کہ تم اپنے شور وغل سے آپ کی آواز کو دبا دو اور اپنے شور وغل سے آپ کی گفتگو پر غالب آ جاؤ۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے لاترفعوا باصواتکم بعض علماء نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر مبارک کے نزدیک بھی آواز بلند کرنے کو ناپسند کیا، بعض علماء کی مجلس میں بھی آواز بلند کرنے کو ناپسند کیا۔ مقصد ان کی تعظیم ہے کیونکہ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جہاں سے پردہ فرمانے کے بعد حرمت ایسے ہی ہے جس طرح ظاہری حیات میں آپ کی حرمت تھی(2) آپ کے وصال کے بعد آپ کا کلام اسی طرح ذی شان ہے جس طرح اس کی عظمت اس وقت تھی جب آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنا جائے جب آپ کا ارشاد پڑھا جا رہا ہو تو کسی کو زیب نہیں کہ وہ اپنی آواز بلند کرے اور نہ ہی اس کا یہ حق ہے کہ وہ اس کلام سے اعراض کرے جس طرح یہ اس وقت لازم تھا جب آپ کی مجلس میں آپ کی زبان سے اسے سنا جائے اللہ تعالیٰ نے مرور زمانہ کے باوجود اس مذکورہ دائمی حرمت پر یوں متنبہ کیا ہے وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام بھی وحی ہے اس میں قرآن کی حکمت کی مثل حکمت ہے مگر چند معانی مستثنیٰ ہیں جن کی وضاحت کتب فقہ میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ آواز بلند کرنے اور عامیانہ انداز میں گفتگو سے مراد استخفاف اور تحقیر نہیں(3) کیونکہ ایسا امر تو کفر ہے جبکہ مخاطب مومن ہیں بلکہ مقصود محض آواز ہے جو اس کے مناسب نہ ہو جسکے ساتھ عظماء اور بڑے لوگوں کی عزت و توقیر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے وہ اس کے پست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی سطح کی طرف لوٹانے کی سعی کرتا ہے جس سے عزت و توقیر عیاں ہو یہ نہی اس کی آواز کو بلند کرنے کو شامل نہ ہوگی جو صحابہ سے حالت جنگ، معاند سے مجادلہ، دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہوتی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راحت نہ دیتی ہو حدیث طیبہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس بن عبد المطلب سے فرمایا جب لوگ غزوہ حنین کے موقع پر تتر بتر ہو گئے تھے: ''لوگوں کو آواز دو''۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی آواز بڑی بلند تھی۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ ایک روز شب خون مارا گیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے یوں آواز لگائی یا صباحاہ۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 327	2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4 صفحہ 1714	3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 352

آپ کی آواز کی سختی کی وجہ سے حاملہ عورتوں نے حمل گرا دیئے اسی بارے میں نابغہ نے کہا:

زَجْرُ أبي عُرْوَةَ السباعَ إذا أشفق أن يختلطن بالغنم(1)

ابو عروہ کا درندوں کو جھڑکنا ہے جب اسے ڈر ہوتا کہ وہ ریوڑ سے خلط ملط ہو جائیں گے۔

راویوں نے یہ گمان کیا ہے کہ وہ ریوڑ سے درندوں کو جھڑکتا تھا تو درندہ کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ زجاج نے کہا: اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ تقدیر کلام یوں ہے لان تحبط اعمالکم یعنی تمہارے اعمال ضائع چلے جائیں گے لام مقدرہ لام صیرورت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اس امر کو ثابت نہیں کرتا کہ انسان کفر کر بیٹھے جبکہ وہ علم نہ رکھتا ہو جس طرح کافر مومن نہیں ہو سکتا مگر اس وقت جب وہ ایمان کو کفر پر ترجیح دے اسی طرح مومن کافر نہیں ہو سکتا جب تک وہ کفر کا قصد نہ کرے اور بالا جماع اسے پسند نہ کرے اسی طرح کافر کافر نہیں ہو سکتا کہ وہ جانتا ہی نہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

''بے شک جو پست رکھتے ہیں اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول کے سامنے یہی وہ لوگ ہیں مختص کر لیا اللہ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے لیے، انہی کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی پر کسی اور سے بات کرتے ہیں تو آپ کی تعظیم کی خاطر اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (2): جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیق نے کہا: اللہ کی قسم! میں آواز کو بلند نہیں کروں گا مگر راز داری کرنے والے کی طرح۔ سعید نے ذکر کیا: عباد بن عوام، محمد بن عمرو سے وہ ابو سلمہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! میں آپ سے کلام نہیں کروں گا مگر جس طرح راز داری کرنے والا کلام کرتا ہے (3)۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ حضرت عمر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بعد کوئی گفتگو نہ کی، آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنتے یہاں تک کہ جو پست آواز سے گفتگو ہوتی اسکو سمجھنے کے لیے کسی سے سوال کرتے تو یہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ نازل ہوئی۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے ان کے دلوں کو خالص کر دیا (4)۔ اخفش نے کہا: تقویٰ کے لیے خاص کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ہر قبیح امر سے پاک کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور تقویٰ رکھ دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے شہوات کو ختم کر دیا۔ امتحان یہ مَحَنْتُ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 353
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 197
3۔ جامع اسباب النزول، صفحہ 323
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 327

الأدِیمَ مَخْنًا سے باب انفعال کا مصدر ہے یعنی میں نے چمڑے کو وسیع کیا۔ اِمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے لیے وسیع کر دیا، پہلے قول کی بنا پر امتحن قلوبھم کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو خالص کر دیا جس طرح تیرا قول ہے اِمتحنتُ الفِضةَ۔ میں نے اسے پرکھا یہاں تک کہ میں نے اسے خالص پایا، کلام میں حذف ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے وہ الاخلاص ہے ابوعمرو نے کہا: کل شئ جَهَدتہ فقد محنتہ۔ ہر وہ جسے تو مشقت میں ڈالے تو نے اسے امتحان میں ڈالا۔ شاعر نے کہا:

أتت رذایا بادِیًا کَلالها قد محنت واضطربت آطالها(1)

کمزور اونٹنیاں آئیں جن کی تھکاوٹیں ظاہر تھیں اور ان کی ڈھاکیں مشقت میں تھیں اور مضطرب تھیں۔

## اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۝

''بے شک جو لوگ پکارتے ہیں آپ کو حجروں کے باہر سے ان میں سے اکثر نا سمجھ ہیں''۔

مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: یہ آیت بنی تمیم کے بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی ان کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ مسجد میں داخل ہوئے اور حجرہ کے باہر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دی کہ ہمارے پاس باہر آئیں کیونکہ ہماری مدح زینت ہے اور ہماری مذمت عیب ہے، وہ ستر افراد تھے انہوں نے اپنے بچوں کا فدیہ پیش کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیلولہ کرنے کے لیے سوئے ہوئے تھے۔

روایت کی گئی ہے کہ جس نے ندا کی تھی وہ اقرع بن حابس تھا اسی نے یہ بات کہی تھی: اِن مَدحِی زَیْنٌ واِنّ ذَمِّی شَیْنٌ میری مدح زینت اور میری مذمت عیب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذاك الله (2) وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ امام ترمذی نے اسے حضرت براء بن عازب سے بھی اسے ذکر کیا ہے۔

حضرت زید بن ارقم نے روایت کیا ہے: کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: ہمیں اس آدمی کے پاس لے چلو اگر وہ نبی ہوا تو ہم اس کی اتباع کریں گے لوگوں میں سے سب سے زیادہ سعادت مند ہو جائیں گے اور اگر وہ بادشاہ ہوا تو ہم اس کے پہلو میں رہیں گے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آوازیں دینے لگے جبکہ آپ حجرہ میں موجود تھے: یا محمد! یا محمد! تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بنو تمیم تھے۔ مقاتل نے کہا: وہ انیس تھے قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر، اقرع بن حابس، سوید بن ہاشم، خالد بن مالک، عطا بن حابس، قعقاع بن معبد، وکیع بن وکیع، عیینہ بن حصن، یہ احمق آدمی تھا اس کی اطاعت کی جاتی تھی یہ سرداروں میں سے تھا جس کے پیچھے دس ہزار نیزے بردار ہوتے تھے اس کا نام حذیفہ تھا اسے عیینہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اس کی ایک پلک دہری ہوئی تھی عبدالرزاق نے اسی عیینہ کے بارے میں کہا: یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف: 28) سورۂ اعراف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول گذر چکا ہے جو کافی وشافی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 356 2۔ جامع ترمذی تفسیر سورۂ حجرات، جلد 2، صفحہ 159

ہے؛ بخاری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ روایت بیان کی ہے کہ وہ دوپہر کے وقت حاضر ہوئے جبکہ رسول اللہ ﷺ سوئے ہوئے تھے وہ بلانے لگے: یا محمد! یا محمد! ہماری طرف نکلیے رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور باہر تشریف لائے اور یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تو فرمایا: ''یہ بنی تمیم کے سخت دل لوگ ہیں اگر کانے دجال سے سب سے سخت لڑائی کرنے والے نہ ہوتے تو میں ان کی ہلاکت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے''(1)۔

حجرات، حجر کی جمع ہے اور حُجَر یہ حُجرۃ کی جمع ہے پس حجرات جمع کی جمع ہے اس میں دو لغتیں ہیں جیم پر ضمہ اور اس پر فتحہ۔

حجرہ سے مراد زمین کا وہ حصہ ہے جسے ایسی دیوار سے لوگوں کو روک دیا گیا ہو جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ اونٹ کے باڑے کو بھی حجرہ کہتے ہیں یہ فُعلۃ کا وزن ہے جو مفعولہ کے معنی میں ہے۔ ابو جعفر بن قعقاع نے پڑھا الحُجرات یعنی جیم مفتوح ہے کیونکہ دونوں پے در پے ضمے ثقیل تھے اسے الحُجرات بھی پڑھا گیا ہے یعنی جیم ساکن ہے تخفیف کے لیے ہے اس کا معنی روکنا ہے جس چیز تک پہنچنے سے تو نے منع کر دیا تو تو نے اس پر حجر کر دیا پھر احتمال موجود ہے کہ منادی کل میں سے بعض ہو اسی وجہ سے فرمایا: اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ یعنی جو آپ کو آواز دیتے ہیں وہ ایسی قوم سے ہیں جن میں سے اکثر پر جہالت غالب ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لاتے ان کے پاس تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

یعنی اگر وہ آپ ﷺ کے باہر آنے کا انتظار کرتے تو یہ ان کی دنیا کے لیے موزوں ہوتا۔ نبی کریم ﷺ لوگوں سے حجاب نہ کرتے مگر چند اوقات میں جن میں ضروریات میں مصروف ہوتے ان اوقات میں آپ کو پریشان کرنا سوء ادبی ہوتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بنو عنبر کے قیدیوں کی سفارش کے لیے آئے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے نصف کو آزاد کر دیا اگر وہ صبر کرتے تو بغیر فدیہ کے آپ سب کو آزاد کر دیتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی قوم کو بے علمی میں پھر تم اپنے کیے پر پچھتانے لگو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے حق میں نازل ہوئی اس کا سبب وہ ہے جسے قتادہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ولید بن عقبہ کو بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے والا بنا کر بھیجا جب بنی مصطلق نے اسے دیکھا تو استقبال کے لیے آگے بڑھے تو یہ ان سے خوفزدہ ہو

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 358

گیا۔ ایک روایت میں ہے: یہ اس کینہ کی وجہ سے تھا جو ان کے اور بنی مصطلق کے درمیان تھا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ آیا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ "وہ چھان بین کرے حملہ میں جلدی نہ کرے" حضرت خالد چلے یہاں تک کہ رات کے وقت ان کے پاس پہنچے آپ نے ان کی طرف اپنے جاسوس بھیجے جب جاسوس واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ اسلام کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ ہیں انہوں نے ان کی آذان سنی اور انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، جب انہوں نے صبح کی تو حضرت خالد ان کے پاس آئے اور جاسوسوں نے جو کچھ ذکر کیا تھا وہ سب کچھ صحیح پایا حضرت خالد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ آئے اور سب کچھ بتایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا کرتے تھے: "آہستہ روی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور تیزی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے"(1)۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بنی مصطلق کی طرف بھیجا جبکہ وہ اسلام قبول کر چکے تھے جب انہوں نے اس کے بارے میں سنا تو وہ اس کے استقبال کے لیے سواریوں پر نکلے تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ آیا اس نے بتایا کہ لوگوں نے اس کے قتل کا پروگرام بنایا ہے اور اپنے صدقات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر حملہ کا ارادہ کیا اسی اثنا میں ان کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپ کے قاصد کے بارے میں سنا ہم نکلے تاکہ اس کی تعظیم بجا لائیں اور ہمارے ذمہ جو صدقات ہیں وہ اسے ادا کریں تو وہ واپس چلا گیا اور ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اسے قتل کرنے کے لیے نکلے ہیں اللہ کی قسم! ہم اس کے لیے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو ولید کو جھوٹا نام دیا گیا۔ ابن زید، مقاتل اور سہیل بن عبد اللہ نے کہا: فاسق سے مراد کذاب ہے۔ ابو الحسن وراق نے کہا: جو علانیہ گناہ کرتا ہو۔ ابن طاہر نے کہا: جو اللہ تعالیٰ سے حیا نہ کرتا ہو۔ حمزہ اور کسائی نے پڑھا۔ فتثبتوا یہ تثبت سے مشتق ہے باقی قراء نے فَتَبَيَّنُوْا پڑھا ہے جو تبین سے مشتق ہے ان تصیبوا یہ اصل میں لئلا تصیبوا تھا ان محل نصب میں ہے کیونکہ حرف جار حذف ہے بِجَهَالَةٍ یعنی خطا کے ساتھ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ یعنی جلدی کرنے اور آہستہ روی اختیار نہ کرنے پر تم شرمندہ ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ جب راوی عادل ہو تو ایک راوی کی خبر قبول ہوگی کیونکہ فاسق کی خبر پر چھان بین کا حکم ہے جس کا فسق ثابت ہو اس کا قول بالا جماع باطل ہوگا کیونکہ خبر امانت ہے اور فسق ایسا قرینہ ہے جو اسے باطل کر دیتا ہے اجماع نے اس میں اسے مستثنیٰ کیا ہے جو دعویٰ اور انکار سے متعلق ہو اور غیر پر حق ثابت کرنا ہو جیسے کوئی کہتا ہے: ھذا عبدی اس کا قول قبول کیا جائے گا جب کوئی یہ کہے: فلاں نے یہ امر نافذ کیا ہے کہ تیرے لیے ہدیہ ہے تو اسے قبول کیا جائے گا، اسی طرح اس کی مثل میں کافر کی خبر قبول کی جائے گی جہاں تک کہ اس بات کا تعلق ہے کہ کسی غیر میں کسی نئی چیز کو لازم کیا جائے تو امام شافعی اور دوسرے علماء کی رائے ہے: وہ نکاح میں ولی نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک نے کہا: وہ ولی

---

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی التانی والعجلۃ، جلد 2، صفحہ 160

ہوگا کیونکہ اس کا جو کچھ ہے اسکا ولی ہے تو اس کے وضع کا بھی ولی ہوگا جس طرح عادل ہوتا ہے اگرچہ وہ دین کے معاملہ میں فاسق ہے مگر اس کی غیرت وافر ہے اسی کے ساتھ وہ اپنے حرم کی حفاظت کرتا ہے، وہ مال خرچ کرتا ہے اور حرمت کی حفاظت کرتا ہے جب مال کا ولی ہے تو نکاح کا بدرجہ اولی ولی ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: تعجب کی بات یہ ہے (1) کہ امام شافعی اور ان کی مثل لوگ فاسق کی امامت جائز قرار دیتے ہیں جو آدمی مال کے حبہ (معمولی مال) پر امانت دار نہیں بنایا جاسکتا وہ دین کے قنطار (بڑا خزانہ) پر امانت دار کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ یہ اس کے لیے ہے کہ آپ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ والی جو لوگوں کو نماز پڑھاتے ہیں جب ان کے دین فاسد ہو جائیں اور ان کے پیچھے نماز کا ترک کرنا ممکن نہ ہو اور ان کو ہٹانے کی طاقت بھی نہ ہو تو ان کے ساتھ اور ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی جس طرح عثمان نے کہا: لوگ جو عمل کرتے ہیں نماز ان میں سے بہترین ہے جب وہ اچھا عمل کریں تو تو بھی اچھا عمل کر اور جب وہ برا عمل کرتے ہیں ان کی برائی سے اجتناب کر۔ پھر لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جب کوئی آدمی ان کے ساتھ پاک صاف ہو کر نماز پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے نماز کا اعادہ کرتے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اسے اپنی نماز بنا لیتے ہیں نماز کے اعادہ کے وجوب کے بارے میں کہتا ہوں: کسی کے لیے مناسب نہیں کہ ائمہ میں سے جس سے وہ راضی نہ ہو اس کے ساتھ نماز پڑھنے کو ترک کردے بلکہ وہ خاموشی سے نماز کا اعادہ کرے کسی اور کے سامنے اس کا ذکر نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جہاں تک اس کے احکام کا تعلق ہے اگر وہ والی ہو تو اس کے وہ احکام جو حق کے موافق ہوں تو وہ نافذ ہو جائیں گے اور جو اس کے مخالف ہوں گے ان کو رد کر دیا جائے گا جو اس نے اسی وقت نافذ کر دیا ہو تو اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، اس قول کے علاوہ جو روایت بیان کی جاتی ہو یا قول جس کی حکایت بیان کی جاتی ہو کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کیونکہ کلام بہت زیادہ ہے اور حق ظاہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کا کسی غیر کا قاصد ہونا کہ وہ کسی قول کو پہنچائے یا کسی شے کو پہنچائے یا اسے آگاہ کرے جب وہ بھیجنے والے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے اس کے حق سے باہر نہ رکھے اگر اس کے ساتھ کسی اور کا حق متعلق ہو تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا (2)۔ یہ اس ضرورت کی وجہ سے جائز ہے جو اس کا سبب بنتی ہے۔ اگر لوگوں کے درمیان صرف عادل آدمی ہی ان امور کو سرانجام دیں تو کوئی امر حاصل ہی نہ ہو سکے کیونکہ وہ اس وصف سے خالی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اس میں اس آدمی کے قول کا فاسد ہونا ظاہر ہو جاتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ تمام مسلمان عادل ہیں یہاں تک کہ ان کا جرم ثابت ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبول کرنے سے قبل چھان بین کا حکم دیا ہے، حکم کے نافذ کرنے کے بعد چھان بین کرنے کا کوئی مطلب نہیں اگر حاکم چھان بین سے پہلے فیصلہ کردے تو اس نے محکوم علیہ پر جہالت کے ساتھ معاملہ کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ اگر وہ ظن غالب کی بنا پر فیصلہ کرے تو یہ جہالت پر عمل نہ ہوگا جس طرح دو عادل گواہوں کی بنا پر فیصلہ

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1715
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1716

کیا جاتا ہے اور مجتہد کے قول کو قبول کیا جاتا ہے جہالت پر عمل اس وقت ہوگا جب اس آدمی کا قول قبول کیا جائے جب اس کا قول قبول کرنے سے ظن غالب حاصل نہ ہو۔

اس مسئلہ کو قشیری نے اور اس سے قبل کے مسئلہ کو مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

''خوب جان لو تمہارے درمیان رسول اللہ تشریف فرما ہیں، اور اگر مان لیا کریں تمہاری بات اکثر معاملات میں تو تم مشقت میں پڑ جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور آراستہ کر دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں اور قابل نفرت بنا دیا ہے تمہارے کفر، فسق اور نافرمانی کو، یہی لوگ راہ حق پر ثابت قدم ہیں (یہ سب کچھ) محض اللہ کا فضل اور انعام ہے اور سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے تو تم اس کو نہ جھٹلا وَاللہ تعالیٰ اسے تمہاری خبریں بتادے گا کہ تم ذلیل و رسوا ہو جاؤ گے۔

لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ اگر معاملہ ظاہر ہونے سے پہلے اس امر کی طرف جلدی کرے جس کا تم ارادہ کرو تو تمہارے لیے اس میں مشقت اور گناہ ہوگا کیونکہ اگر آپ اس قوم کو قتل کریں جس کی چغلی ولید بن عقبہ نے کھائی ہے تو وہ خطا ہوگی اور جو آدمی باہمی دشمنی کی وجہ سے انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ گناہگار ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کی اطاعت سے مراد یہ ہے کہ آپ ان کی وہ بات مان لیں جو وہ لوگوں کے بارے میں آپ کو پہنچاتے ہیں یا ان سے سنتے ہیں عنت کا معنی گناہ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: عنت الرجل آدمی نے گناہ کیا عنت کا معنی فجور اور زنا بھی ہے جس طرح سورۂ نساء میں ہے۔ عنت کا معنی مشکل امر میں جا پڑنا ہے۔ سورۂ براءۃ میں عنتم کے ضمن میں اس بارے میں زیادہ گفتگو گذر چکی ہے۔

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ یہ مخلص مومنوں کو خطاب ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جھوٹ نہیں بولتے اور باطل خبریں نہیں دیتے یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ان کا پسندیدہ ترین امر بنا دیا ہے۔

وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے یہاں تک کہ تم نے اسے پسند کیا۔ اس آیت میں قدریہ اور امامیہ وغیرہ کا رد ہے جس طرح پہلے کئی دفعہ گذر چکا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات تمام مخلوقات کی ذاتوں، ان کے افعال، صفات، زبانوں اور رنگوں کی تخلیق میں منفرد و یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس (فسوق) سے مراد خاص طور پر جھوٹ ہے (1)، یہ ابن زید کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہر وہ عمل ہے جس میں اطاعت کا پہلو نہ ہو یہ فسقت

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 329

الوطبة سے مشتق ہے جو اپنے چھلکے سے باہر آجائے اور چوہیا بل سے باہر آجائے۔ سورۂ بقرۃ میں اس بارے میں گفتگو مفصل گذر چکی ہے۔ عصیان یہ معاصی کی جمع ہے پھر کلام خطاب سے خبر کی طرف منتقل ہو گیا فرمایا: اُولٰٓئِكَ یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اللہ تعالیٰ نے ان میں ایمان کی محبت رکھ دی اور کفر کو ان کے لیے ناپسندیدہ بنایا یعنی اسے ان کے ہاں قبیح بنا دیا۔ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ (الروم)

نابغہ نے کہا:

یا دارَمِیّةَ بالعَلْیاء فالسَّنَدِ	أقْوَت و طال علیها سالفُ الأمَدِ

الرشد سے مراد سختی کے ساتھ حق کے راستہ پر استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے یہ رشاد سے مشتق ہے جس کا معنی چٹان ہے۔

ابو وازع نے کہا: ہر چٹان رشاد ہے شاعر نے اس سے چٹان مراد لی ہے۔

وغیر	مُقلَّد	ومُوَشَّمات	صَلِینَ الضَّوءَ من صُمّ الرشاد(1)

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے ساتھ فضل و احسان کے طور پر کیا ہے مراد فضل و نعمت ہے یہ آپ کے لیے کر دیا گیا ہے وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۸﴾ جو تمہارے حق میں بہتر ہے اسے جانتا ہے اور تمہاری تدبیر کے بارے میں حکمت والا ہے۔

وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۹﴾

''اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو اور اگر زیادتی کرے ایک گروہ دوسرے گروہ پر تو پھر سب مل کر لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف پس اگر لوٹ آئے تو صلح کرادو ان کے درمیان عدل و انصاف سے اور انصاف کرو، بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں سے''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا معتمر بن سلیمان، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں (2) انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! کاش آپ عبداللہ بن ابی کے ہاں جاتے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے آپ گدھے پر سوار ہوئے اور مسلمان ساتھ چل رہے تھے یہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 363	2۔ جامع اسباب النزول، جلد 325

شوریدہ زمین تھی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے تو اس نے کہا: مجھ سے دور ہی رہیے اللہ کی قسم! آپ کے گدھے کی بو مجھے اذیت دیتی ہے تو ایک انصاری نے کہا: اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گدھا خوشبو میں تجھ سے بڑھ کر ہے۔ عبد اللہ کے لیے اس کی قوم کا ایک فرد غصے میں آ گیا ہر ایک کے لیے اس کے ساتھی غصے میں آ گئے ان کے درمیان شاخوں، ہاتھوں اور جوتوں سے لڑائی شروع ہو گئی ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد نے کہا: اوس اور خزرج کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا: انصار کے دو قبیلے ڈنڈوں اور جوتوں سے باہم لڑے تو یہ آیت نازل ہوئی اس کی مثل سعید بن جبیر سے روایت مروی ہے کہ اوس و خزرج کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لڑائی ہوئی جو کھجور کی شاخوں، جوتوں وغیرہ کے ساتھ ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔

قتادہ نے کہا: یہ انصار کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ان دونوں کا کسی حق کے بارے میں باہم جھگڑا تھا (1) ان میں سے ایک نے کہا: میں اپنا حق سختی سے لوں گا کیونکہ اس کے خاندان کے افراد زیادہ تھے دوسرے نے اسے دعوت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مسئلہ پیش کرتے ہیں تو پہلے ساتھی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا معاملہ ان کے درمیان ہی رہا یہاں تک کہ وہ لڑ پڑے اور ان میں سے بعض نے بعض کو ہاتھوں، جوتوں اور تلواروں سے مارا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

کلبی نے کہا: یہ سمیر اور حاطب کی لڑائی کے بارے میں آیت نازل ہوئی، سمیر نے حاطب کو قتل کیا تھا تو اوس اور خزرج آپس میں لڑ پڑے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم اور مومنوں کو حکم ارشاد فرمایا کہ دونوں کے درمیان صلح کرائیں (2)۔ سدی نے کہا: انصار کی ایک عورت تھی جسے ام زید صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا وہ ایک غیر انصاری کے عقد میں تھی وہ اپنے خاوند سے الجھی اس عورت نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے افراد کے پاس چلی جائے اس کے خاوند نے اسے محبوس کر دیا اسے دوسری منزل میں رکھا جس میں اس کے خاندان کا کوئی فرد نہ تھا عورت نے اپنی قوم کے افراد کو پیغام بھیجا اس کی قوم کے لوگ آئے انہوں نے اسے نیچے اتارا تا کہ اسے لے جائیں۔ وہ آدمی نکلا اس نے اپنے خاندان کے لوگوں سے مدد طلب کی اس کے چچا زاد نکلے تا کہ عورت اور اس کے گھر والوں کے درمیان حائل ہو جائیں انہوں نے ایک دوسرے کو دھکے دیئے اور جوتوں سے ایک دوسرے کو مارا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ طائفہ کا لفظ ایک آدمی، جمع اور دو کو شامل ہوتا ہے یہ معنی پر محمول ہوتا ہے لفظ پر محمول نہیں ہوتا کیونکہ دونوں طائفے قوم اور الناس کے معنی میں ہیں۔

حضرت عبد اللہ کی قراءت میں حتی لیفیئوا إلی أمر اللہ فان فاء وا فخذوا بینھم بالقسط ہے۔ ابن ابی عبلہ نے **اقتتلتا** پڑھا ہے کیونکہ طائفے دو ہیں اس کے بارے میں گفتگو سورۂ براءۃ میں گذر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: **وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** ۝ (النور) کے بارے میں کہا: مراد ایک اور اس سے اوپر ہے۔ اور **طائفة من الشئ** سے مراد اس کا ٹکڑا ہے۔

**فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا** انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف دعوت دے کر ان کے درمیان صلح کراؤ خواہ ان کے حق میں ہو یا

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1 صفحہ 58

ان کے خلاف ہو۔

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى یعنی ایک حد سے تجاوز کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور کتاب کو نہ مانے یعنی اس سے مراد بات کو طول دینا اور فساد برپا کرنا ہے۔

حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف لوٹے فَاِنْ فَآءَتْ اگر وہ گروہ لوٹے فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ یعنی ان دونوں کو انصاف پر برانگیختہ کرو وَ اَقْسِطُوْا اے لوگو! انصاف سے کام لو تم باہم نہ لڑو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَقْسِطُوْا یعنی عدل سے کام لو۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۞ یعنی اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں اور حق پرستوں کو پسند کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے کہا: مسلمانوں میں دو جماعتیں قتال کرنے میں دو حالتوں سے خالی نہ ہونگی یا تو وہ دونوں میں سرکشی کے راستہ پر باہم قتال کریں گی یا ایسا نہیں ہوگا اگر پہلی صورت ہو تو اس میں یہ ضروری ہوگا کہ دونوں کے درمیان ایسے آدمی کو لایا جائے جو دوری کو ختم کرے اور ایک دوسرے سے ہاتھ روک لیں اور الگ الگ ہو جائیں اگر وہ نہیں رکتے، صلح بھی نہیں کرتے اور سرکشی پر ہی کمربستہ رہتے ہیں تو ان دونوں سے جنگ کی جائے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرتی ہو تو ضروری ہوگا کہ باغی گروہ سے جنگ کی جائے یہاں تک کہ وہ رک جائے اور توبہ کرلے، اگر وہ ایسا کرے تو اس کے درمیان اور جس کے ساتھ زیادتی کی گئی اس کے درمیان عدل وانصاف سے مصالحت کروائی جائے اگر کسی شبہ کی بنا پر دونوں میں جنگ چھڑ جائے دونوں فریق اپنی جگہ حق پر ہوں تو ضروری ہے کہ دلائل اور براہین کے ساتھ شبہ کو زائل کیا جائے اگر وہ لڑائی جھگڑے پر گامزن رہیں اور جس امر کی طرف ان کی راہنمائی کی گئی اور حق کے واضح ہونے کے بعد جو انہیں اتباع حق کی نصیحت کی گئی اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو دونوں باغی گروہ بن جائیں گے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اس باغی گروہ کے ساتھ قتال واجب ہے جس کی بغاوت امام یا کسی مسلمان کے خلاف معلوم ہو اور جو آدمی مومنوں کے ساتھ جنگ کرنے سے منع کرتا ہے اس کے قول کو فاسد کرنے پر تگ ودو کرتا ہو اس کے خلاف بھی جنگ کرنا لازم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے: قتالُ المؤمن کفر(1) مومن سے جنگ کرنا (علامت) کفر ہے اگر مومن باغی سے قتال کرنا کفر ہے تو اللہ تعالیٰ نے کفر کا حکم دیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے بالا ہے۔ حضرت صدیق اکبر نے ان لوگوں کے ساتھ جہاد کیا جو اسلام سے وابستہ رہے اور زکوۃ دینے سے رک گئے۔ آپ نے حکم دیا: پیٹھ پھیر جانے والوں کا پیچھا نہ کیا جائے کسی زخمی کو نہ مارا جائے ان کے اموال لینا حلال نہیں جبکہ کافر میں یہ چیزیں واجب ہیں۔ طبری نے کہا: اگر ہر وہ اختلاف جو دو فریقوں کے درمیان ہوتا اس میں واجب بھاگ جانا اور گھروں میں بیٹھ رہنا ہوتا تو کوئی حد قائم نہ ہوتی اور نہ باطل کو باطل کہا جاتا تو اہل نفاق اور فسق وفجور کا ارتکاب کرنے والے ہر چیز کو حلال کرنے کی راہ اپنا لیتے جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کیا تھا جس طرح مسلمانوں کے اموال لینا، ان کی عورتوں کو قیدی بنالینا اور ان کے خون بہانا۔ وہ ان مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کریں اور مسلمان ان سے اپنے ہاتھوں کو روک لیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 1، صفحہ 58

خلاف ہے: خذوا على أيدى سفهائكم (1) اپنے بے وقوف لوگوں کے ہاتھوں کو روکو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: یہ آیت مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اصل ہے اور غلط تاویل کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنے میں بنیاد ہے صحابہ نے اسی پر بھروسہ کیا اور ملت کے بڑے لوگوں نے اسی کی پناہ لی (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں یہی آیت مراد لی: تَقْتُل عَمَّارًا الفئة الباغية عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ خارجیوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: يخرجون على خير فرقة أوعلى حين فرقة وہ بہترین جماعت پر خروج کریں گے۔ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''دو جماعتوں میں سے ایسی جماعت انہیں قتل کرے گی جو حق کے زیادہ قریب ہے'' جس ہستی نے ان سے جنگ کی وہ حضرت علی شیر خدا اور جو لوگ آپ کے ساتھ تھے مسلمان علماء کے نزدیک یہ ثابت ہے اور دینی دلیل سے یہ امر ثابت ہے کہ حضرت علی شیر خدا امام تھے اور جس نے بھی ان پر خروج کیا وہ باغی تھا اس کے ساتھ تو قتال واجب تھا یہاں تک کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئے اور صلح پر راضی ہو جائے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا جبکہ صحابہ ان کے خون سے بری تھے کیونکہ جن لوگوں نے آپ کے خلاف شورش کی تھی ان کے ساتھ جنگ کرنے سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا تھا فرمایا: میں وہ پہلا شخص نہیں بننا چاہتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں قتل کے ساتھ نیابت کرے۔ آپ نے آزمائش پر صبر کیا، امتحان کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور امت کو اپنی جان کا نذرانہ دے دیا پھر یہ ممکن نہ تھا کہ لوگوں کو بے مقصد چھوڑ دیا جاتا۔ حضرت عمر نے شوریٰ میں جن افراد کا ذکر کیا تھا خلافت کو ان پر پیش کیا گیا اور انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ حضرت علی شیر خدا اس کے زیادہ حقدار اور اہل تھے تو آپ نے امت پر احتیاط کی غرض سے اسے لے لیا کہ ان کے خون باطل طریقہ سے نہ بہتے رہیں اور بے مقصد ان کا معاملہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو جائے بعض اوقات دین میں تبدیلی رونما ہوگئی اور اسلام کے ستون ٹوٹ گئے جب آپ کی بیعت کی گئی تو اہل شام نے مطالبہ کر دیا کہ وہ تب بیعت کریں گے کہ جن لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا ہے ان کو پکڑیں اور ان سے قصاص لیں حضرت علی شیر خدا نے انہیں فرمایا: بیعت میں داخل ہو جاؤ اور حق کا مطالبہ کرو تم اس تک پہنچ جاؤ گے۔ انہوں نے کہا: آپ بیعت کے مستحق نہیں جبکہ حضرت عثمان کے قاتل صبح و شام آپ کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی رائے اس بارے میں درست تھی کیونکہ حضرت علی شیر خدا اگر ان سے فوراً قصاص لیتے تو قبائل ان کی عصبیت میں کھڑے ہو جاتے تو تیسری جنگ شروع ہو جاتی آپ نے انتظار کیا تاکہ خلافت کا معاملہ مضبوط ہو جائے اور بیعت منعقد ہو جائے اور مجلس حکم میں اولیاء کی جانب سے مطالبہ ہو اور حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو جائے۔

امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ امام کے لیے یہ جائز ہے کہ قصاص میں تاخیر کرے خصوصاً جب قصاص فتنہ بھڑکانے اور جمعیت کو منتشر کرنے کا باعث ہو۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے لیے بھی ایسا ہی ہوا وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ولایت کے مسئلہ پر الگ نہ ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے دیانت کے اعتبار سے ان پر اعتراض کیا تھا ان کی رائے

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 81 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1717

یہ تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین سے بدلہ لینا یعنی انہیں پہلے قتل کرنا ضروری ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: ان کے درمیان جو جنگ واقع ہوئی اس کا سبب بھی یہی قول تھا جلیل القدر علماء کہتے ہیں کہ بصرہ میں ان کے درمیان جو واقع ہوا وہ جنگ کے ارادہ سے نہ ہوا تھا بلکہ اچانک ہوا تھا ہر ایک فریق نے اپنا دفاع کیا کیونکہ اس کا گمان یہ تھا کہ دوسرے فریق نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے کیونکہ معاملہ ان کے درمیان منظم ہو چکا تھا صلح مکمل ہو چکی تھی باہم رضامندی سے وہ الگ الگ ہونے والے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو خوف ہوا کہ انہیں پکڑ لیا جائے گا اور انکو گھیر لیا جائے گا وہ اکٹھے ہوئے، باہم مشاورت کی اور اختلاف کیا پھر ان کا اس رائے پر اتفاق ہوا کہ وہ دو فریقوں میں بٹ جائیں اور دونوں لشکروں میں سحری کے وقت جنگ شروع کر دیں تیران کے درمیان چلے وہ فریق جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھا اس نے شور مچایا کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے دھوکہ کیا اور جو فریق حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے لشکر میں تھا اس نے شور مچایا کہ حضرت علی نے دھوکہ کیا اس طرح وہ امر تکمیل پذیر ہوا جس کی انہوں نے تدبیر کی تھی اور جنگ نے ان میں اپنی جگہ بنالی ہر فریق اپنے کیے کا اپنے ہاں دفاع کر رہا تھا اور خون بہائے جانے سے مانع تھا۔ یہ دونوں فریقوں کی جانب سے درست عمل تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت تھی کیونکہ باہم جنگ اور دفاع اس طریقہ سے ہوا تھا؛ یہی قول صحیح اور مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ یہ قتال کا حکم ہے اور یہ فرض کفایہ ہے جب کچھ لوگ اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو باقی ماندہ افراد سے یہ حکم ساقط ہو گیا یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں سے ایک جماعت اسی وجہ سے گھروں میں بیٹھی رہی جس طرح حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ان کی رائے کو درست قرار دیا، ان میں سے ہر ایک نے اپنا عذر پیش کیا جسے آپ نے قبول کیا۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچا تو انہوں نے حضرت سعد کو ان کے کیے پر عتاب کیا اور انہیں کہا: نہ تو آپ ان میں سے ہوئے جنہوں نے دو ایسے گروہوں کے درمیان صلح کرائی جو آپس میں لڑ رہے تھے اور نہ ہی باغی جماعت سے جنگ کی۔ حضرت سعد نے کہا: میں نے باغی گروہ سے جو جنگ نہیں کی میں اس پر شرمندہ ہوں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر ایک نے جو کیا اس کا وہ کامل طور پر ادراک نہیں رکھتا تھا یہ سب کچھ اجتہاد کے نتیجہ اور شرع کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے تھا (2)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ان کی صلح میں عدل یہ ہے (3) کہ ان کے درمیان جو خون خرابہ ہوا اور جو مال کا ضیاع ہوا اس کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ جو کچھ نقصان ہوا وہ کسی تاویل کی بنا پر ہوا اور ان کے مطالبہ کی صورت میں حقیقت میں یہ صلح سے بھاگنا اور بغاوت میں دور تک جانا ہے۔ مصالحت میں یہی اصل و قانون ہے لسان الامت ☆ نے کہا: صحابہ کے درمیان جنگ میں حکمت یہ ہے کہ اہل اجتہاد کے قتال کے احکام کو جانا جا سکے کیونکہ اہل شرک

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1718 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1719 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1720

☆ اس سے مراد ابو بکر بن طیب باقلانی ہے انہیں یہ لقب قاضی عیاض نے دیا۔

کے ساتھ قتال کے احکام رسول اللہ ﷺ کی زبان اور آپ کے عمل سے معلوم ہو چکے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جب کوئی باغی خروج کرنے والا عادل امام پر خروج کرے جبکہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو امام تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر قتال کرے جو اسے کفایت کریں جنگ سے پہلے وہ انہیں اطاعت اور جماعت میں داخل ہونے کی دعوت دے اگر وہ اطاعت کی طرف لوٹنے اور صلح سے انکار کر دیں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے، ان کے قیدیوں کو قتل کیا جائے، ان کے بھاگ جانے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، ان کے زخمی کو قتل کرنے میں جلدی نہ کی جائے، ان کے بچوں کو قیدی نہ بنایا جائے اور ان کے اموال پر قبضہ نہ کیا جائے جب عادل (امیر کا وفادار) باغی کو قتل کرے یا باغی عادل کو قتل کرے جبکہ وہ ایک دوسرے کے ولی ہوں تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے جان بوجھ کر قتل کرنے والا کسی صورت میں وارث نہیں بنے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عادل باغی کا وارث بنے گا۔ قصاص پر قیاس کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ باغیوں اور خارجیوں نے جو خون یا مال برباد کیا پھر وہ تائب ہوئے تو اس کی وجہ سے ان کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: وہ ضامن ہوں گے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں، امام ابوحنیفہ کے قول کی یہ دلیل ہے کہ یہ ظلم و زیادتی کے ساتھ اتلاف ہے تو ضمانت لازم ہوگی ہمارے نزدیک قابل اعتماد بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی باہم جنگوں میں بھاگ جانے والے کا پیچھا نہیں کرتے تھے اور زخمی کو قتل نہیں کرتے تھے، قیدی کو قتل نہیں کرتے تھے جان کے اتلاف اور مال ضائع ہونے کی صورت میں وہ ضمانت نہیں لیتے تھے وہی مقتداء ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عبداللہ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کیا حکم دیا ہے جو اس امت میں سے بغاوت کرتا ہے (1)؟'' عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، فرمایا: ''اس کے زخمی کو قتل نہ کیا جائے گا، اس کے قیدی کو قتل نہیں کیا جائے گا، بھاگ جانے والے کی تلاش نہیں کی جائے گی اور ان کا مال تقسیم نہیں کیا جائے گا'' جو مال اصل حالت میں ہو اس کو واپس کر دیا جائے گا یہ سب کچھ اس آدمی کے بارے میں ہے جو کسی تاویل کی بنا پر خروج کرتا ہے جو تاویل اس خروج کو جائز قرار دیتی تھی۔

زمخشری نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے: اگر باغیوں کی تعداد تھوڑی ہو اس حیثیت میں کہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکیں تو اس نے جو جنایت کی تھی تو لوٹ آنے کے بعد جماعت ضامن ہوگی اگر ان کی تعداد زیادہ ہو وہ قوت و شوکت والے ہوں تو وہ ضامن نہ ہوگی مگر محمد بن حسن شیبانی کا نقطہ نظر ہے آپ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ ضمانت اس پر لازم ہوگی جب وہ رجوع کرے مگر جمع ہونے اور لشکر کشی کرنے سے قبل یا جنگ ختم ہونے کے وقت اوزار رکھنے کے وقت کا معاملہ ہے تو اس نے جنایت کی تو وہ سب کے نزدیک ضامن ہوگا۔

عدل کے ساتھ اصلاح پر برانگیختہ کرنا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ میں امام محمد کے نزدیک واضح ہے آیت کریمہ کے لفظ پر منطبق ہے (2)۔ دوسرے علماء کے قول کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہے کہ باغی جماعت کو قلیل تعداد

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 365　2۔ ایضاً

پر محمول کیا جائے جس امر کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ غرض کینوں کو ختم کرنا ہے جنایات کی ضمانت دینا نہیں ہے یہ اس عدل حکم کے ساتھ حسن مطابقت نہیں رکھتا۔ زمخشری نے کہا: اگر تو سوال کرے۔ دوسرے فَاَصْلِحُوْا کے ساتھ عدل کو ملایا گیا ہے پہلے فَاَصْلِحُوْا کے ساتھ نہیں ملایا گیا؟

میں اس کا جواب دوں گا: آیت کے شروع میں قتال سے مراد ہے کہ وہ دونوں باغی کی حیثیت میں قتال کریں یا ان میں شبہ پایا جائے کوئی بھی صورت ہو مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ حق کا ارادہ کرتے ہوئے شافی مواعظ کے ساتھ اور شبہ کی نفی کرنے کا اہتمام کرتے ہوئے جو جدائی واقع ہو چکی ہے اس میں اصلاح احوال کریں آگ کو ٹھنڈا کریں مگر جب وہ دونوں اصرار کریں تو ان سے جنگ ضروری ہے جہاں تک ضمانت کا تعلق ہے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جب ان میں سے ایک باغی ہو تو معاملہ اس طرح نہ ہوگا کیونکہ مذکورہ دونوں صورتوں میں ضمانت قابل توجہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اگر وہ کسی علاقہ پر غلبہ پالیں اور صدقات وصول کر لیں، حدود قائم کریں اور ان میں فیصلہ کریں ان پر نہ تو دوبارہ صدقات لازم کیے جائیں گے اور نہ حدود قائم کی جائیں گی اور انہوں نے جو فیصلے کیے ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا مگر جو کتاب، سنت اور اجماع کے خلاف ہو جس طرح جو باغی ہو تو اس کے فیصلے کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جاتا؛ یہ مطرف اور ابن ماجشون کا قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: کسی حال میں بھی یہ جائز نہیں (1)۔ اصبغ سے مروی ہے: یہ جائز ہے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ جائز نہیں جس طرح ابن قاسم کا قول ہے؛ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے کیونکہ اس نے ناحق ان لوگوں کے بارے میں عمل کیا ہے جس پر اس کی تولیت جائز نہ تھی تو یہ جائز نہ ہوگا جس طرح وہ اگر باغی نہ ہوتے تو بھی جائز نہ ہوتا۔ ہمارے لیے قابل اعتماد وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جب فتنہ فرو ہو گیا اور صلح کی وجہ سے اختلاف کیا گیا تو صحابہ نے کسی کے حکم میں کوئی معارضہ نہ کیا۔ ابن عربی نے کہا: جو چیز میرے پاس پسندیدہ ہے کہ یہ درست نہیں کیونکہ فتنہ جب ختم ہو گیا تو امام وہی باغی تھا تو وہاں کون تھا جو معترض بنتا؟ (2)

**مسئلہ نمبر 10**۔ یہ جائز نہیں کہ صحابہ میں سے کسی صحابی کی طرف قطعی طور پر خطا کو منسوب کیا جائے کیونکہ ہر ایک نے جو بھی عمل کیا اس میں وہ مجتہد تھا وہ سب اللہ تعالیٰ کی رضا کا ہی ارادہ کرتے تھے وہ سب ہمارے آئمہ ہیں ان کے درمیان جو اختلاف ہوا ہم اس سے باز رہنے کے پابند ہیں ہم ان کا ذکر احسن انداز میں ہی کریں گے کیونکہ صحابہ احترام کے مستحق ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں برا بھلا کہنے سے منع کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت کا ذکر کیا ہے اور ان سے راضی ہونے کی خبر دی ہے۔ یہ چیز مختلف سندوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت طلحہ شہید ہیں جو روئے زمین پر چل پھر رہے ہیں جس جنگ کے لیے وہ نکلے تھے وہ نافرمانی ہوتی (3) تو اس میں قتل ہونے والا شہید نہ ہوتا اسی طرح اگر جس جنگ میں وہ

1۔ جامع ترمذی، صفة القیامہ، جلد 2، صفحہ 73

2۔ حضرت مفسر کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ دوسرے فریق کے زیر تصرف بھی علاقے تھے جب ان علاقوں میں فیصلوں کو تبدیل نہ کیا گیا تو قاعدہ کلیہ تو واضح ہو گیا۔

3۔ ابن ماجہ، باب فضل طلحة بن عبید اللہ، حدیث نمبر 121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکلے تھے تو تاویل میں غلطی کرتے اور واجب میں کوتاہی کرتے کیونکہ شہادت تو اسی وقت ہوتی ہے جب اطاعت کی صورت میں قتل ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے معاملہ کو اس امر پر محمول کیا جائے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اس امر پر جو چیز دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی شیر خدا کی روایات میں سے صحیح اور عام یہ روایت ہے کہ حضرت زبیر کو قتل کرنے والا جہنم میں جائے گا اور ان کا یہ قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''ابن صفیہ کے قاتل کو جہنم کی بشارت دے دو''۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نافرمانی کرنے والے اور قتال کے ذریعے گناہ گار نہ تھے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا یعنی وہ عاصی اور گناہگار ہوتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت طلحہ کے بارے میں یہ نہ کہتے کہ وہ شہید ہے اور یہ خبر نہ دیتے کہ حضرت زبیر کا قاتل آگ میں ہے اسی طرح جو گھر میں بیٹھ گیا وہ تاویل میں غلطی کرنے والا نہیں بلکہ وہ درست ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اجتہاد کی راہ دکھائی جب معاملہ اس طرح ہے تو یہ امر انہیں لعن طعن کرنے ان سے براءت کا اظہار کرنے اور ان کو فاسق قرار دینے کو ثابت نہیں کرتا، ان کے فضائل اور ان کے جہاد کو باطل نہیں کرتا اور دین میں جو ان کا عظیم مقام ہے اس کو ختم نہیں کرتا۔ رضی اللہ عنہم۔

بعض سے اس خون ریزی کے بارے میں پوچھا گیا جو ان کے درمیان واقع ہوئی تو یہ آیت پڑھی: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ)

بعض سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ ایسی خونریزی تھی اللہ تعالیٰ نے میرا ہاتھ اس سے پاک رکھا، میں اپنی زبان کو اس سے آلودہ نہیں کروں گا یعنی خطا میں واقع ہونے اور بعض پر ایسا حکم لگانے سے جو درست نہ ہو اس سے بچوں گا۔ ابن فورک نے کہا: ہمارے دونوں میں سے کچھ نے کہا کہ صحابہ کے درمیان جو تنازعات ہوئے ان کے بارے میں وہی رویہ اپناؤ جو حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے درمیان تنازعہ ہوا اس میں اپناتے ہو اس کے باوجود وہ ولایت اور نبوت کے دائرہ سے باہر نہ نکلے صحابہ کے درمیان جو معاملہ ہوا وہ بھی اسی طرح ہے۔

محاسبی نے کہا: جہاں تک خونریزی کا تعلق ہے ان کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے لیے قول کرنا بہت مشکل ہے۔

حضرت حسن بصری سے ان کے قتال کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ حاضر ہوئے جبکہ ہم غائب تھے، وہ عالم تھے ہم جاہل ہیں، وہ اکٹھے ہوگئے تو ہم نے ان کی اتباع کی اور انہوں نے اختلاف کیا تو ہم نے توقف کیا(1)۔

محاسبی نے کہا: ہم وہی بات کرتے ہیں جس طرح حضرت حسن بصری نے کی ہے، ہم جانتے ہیں جو اس میں داخل ہوئے تھے وہ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے جس امر پر انہوں نے اتفاق کیا ہم اس کی پیروی کریں گے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہم اس کے متعلق توقف کریں گے اور ہم اپنی جانب سے کسی رائے کو پیش نہیں کریں گے ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے اجتہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سے توفیق کے طالب ہیں۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 322

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝١٠

”بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں پس صلح کروادو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ یعنی دین وحرمت میں بھائی بھائی ہیں، یہ رشتہ نسب میں نہیں اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے: دینی اخوت نسبی اخوت سے زیادہ قوی ہے کیونکہ نسبی اخوت دینی مخالفت کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے اور دینی اخوت نسبی مخالفت کے باوجود ختم نہیں ہوتی۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لاتحاسدوا ولا تباغضوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا وکونوا عباد الله إخوانا(1) باہم حسد نہ کرو، باہم بغض نہ کرو، جاسوسی نہ کرو، خبر معلوم کرنے کی کوشش نہ کیا کرو باہم بھاؤ پر بھاؤ نہ کیا کرو بھائی بھائی بنتے ہوئے اللہ کے بندے بن جاؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ ”باہم حسد نہ کیا کرو، بھاؤ پر بھاؤ نہ لگایا کرو، باہم بغض نہ کیا کرو، آپس میں دشمنی نہ رکھا کرو، تم میں سے کوئی کسی کی خرید وفروخت کے معاہدہ پر معاہدہ نہ کرے بھائی بھائی بنتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بندے بن جاؤ“۔ ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو بے یار ومددگار چھوڑتا ہے اور نہ ہی اسے حقیر جانتا ہے، تقویٰ یہاں ہے“ آپ نے تین دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کیا ”ایک انسان کے لیے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت حرام ہے“ الفاظ مسلم کے ہیں۔

صحیحین کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس پر عیب لگاتا ہے، نہ اسے بے یار ومددگار چھوڑتا ہے اور نہ گھر بنانے میں اس کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے کہ اس پر ہوا کو روک دے مگر اس کی اجازت سے ایسا کرتا ہے، وہ ہنڈیا کی خوشبو سے اسے اذیت نہیں دیتا مگر اس کے لیے چمچہ بھر سالن بھیجتا ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے پھل نہ خریدے کہ وہ اسے لے کر پڑوسی کے بچوں کے پاس جائیں اور اس میں سے انہیں کوئی چیز نہ دیں“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”یاد کرلو تم میں سے بہت ہی تھوڑے افراد اسے یاد رکھیں گے“۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ یعنی جن دو مسلمان افراد کے درمیان جھگڑا ہے ان میں صلح کرواؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اوس وخزرج مراد ہیں جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ ابو علی نے کہا: اخوین سے مراد دو طائفے ہیں کیونکہ تثنیہ کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے اور مراد کثرت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (المائدہ: 64) ابو عبیدہ نے کہا: یعنی دو بھائیوں کے درمیان مصالحت کراؤ۔ اس کا صدق تمام افراد پر آتا ہے۔ ابن سیرین، نصر بن عاصم، ابو العالیہ، جحدری اور یعقوب نے بین اخوتکم پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری نے اخوانکم پڑھا ہے

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 317

باقی قراء نے اخویکم یاء کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت اور اس سے قبل والی آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ بغاوت ایمان کے اسم کو زائل نہیں کرتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سرکشی کرنے کے باوجود انہیں اخوۃ اور مومنین کا نام دیا ہے۔ حارث اعور نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے جنگ جمل اور جنگ صفین میں شریک افراد کے بارے میں پوچھا گیا جبکہ ان کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے متعدی تھے کیا وہ مشرک ہیں؟ فرمایا: نہیں وہ تو شرک سے بھاگے تھے، پوچھا گیا: وہ منافق تھے؟ فرمایا: نہیں کیونکہ منافق اللہ کا بہت کم ذکر کرتے ہیں، پوچھا گیا: ان کا کیا حال ہے؟ فرمایا: وہ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہم پر بغاوت کی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

”اے ایمان والو نہ تمسخر اڑایا کرو مردوں کی ایک جماعت کا شاید وہ ان مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں مذاق اڑایا کریں دوسری عورتوں کا شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر اور نہ برے القاب سے کسی کو بلاؤ، کتنا ہی برا نام ہے مسلمان ہو کر فاسق کہلانا، اور جو لوگ باز نہیں آئیں گے اس روش سے تو وہی بے انصاف ہیں“۔

**يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ** اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے بہتر ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اعتقاد اور باطنی طور پر اطاعت شعار ہونے میں بہتر ہوں۔ سخریہ کا معنی استہزاء ہے اس کا باب سخِرت منه أسخر سُخْرا مَسْخرا و سَخَرا ہے' ابوزید نے یہ بیان کیا ہے سَخِرت به۔ یہ سب سے ردی لغت ہے۔ اخفش نے کہا: سخرت منه سخرت، ضحکت منه و ضحکت به اور هزئت منه و هزئت به سب نے کہا: یہ کہا جاتا ہے اس کا اسم سخریہ اور سخری ہے دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا** (الزخرف: 32) فلاں سخرۃ۔ وہ عمل میں مذاق کرتا ہے یہ کہا جاتا ہے: خادم سُخرۃ، رجل سُخرۃ، یعنی اس کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے۔ سُخَرۃ، لوگ اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حق میں نازل ہوئی ان کے کان میں گرانی تھی جب صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کی طرف سبقت کرتے جب وہ مجلس میں آتے تو صحابہ ان کی جگہ کھلی کر دیتے یہاں تک کہ وہ آپ کے پہلو میں بیٹھ جاتے تاکہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمائیں اس کو سن لیں، ایک دن وہ آئے جبکہ نماز فجر کی ایک رکعت ہو چکی تھی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے ہر ایک آدمی نے اپنے آپ کو اپنی جگہ روک لیا اور اسی کے ساتھ چمٹ گئے

کوئی کسی کے لیے جگہ نہیں چھوڑ رہا تھا یہاں تک کہ جو آدمی جگہ نہ پاتا وہ کھڑا ہو جاتا، جب حضرت ثابت نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے لوگوں کی گردنوں کو پھلانگا اور کہتے: کھل جاؤ۔ لوگوں نے آپ کے لیے جگہ کھلی کر دی یہاں تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچے جبکہ ان کے درمیان اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک آدمی تھا۔ حضرت ثابت نے کہا: جگہ دو۔ اس آدمی نے آپ سے کہا: آپ نے جگہ پالی ہے یہیں بیٹھ جایئے۔ حضرت ثابت اس کے پیچھے غصہ کی حالت میں بیٹھ گئے پھر کہا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: فلاں ہے۔ حضرت ثابت نے کہا کہ فلانہ کا بیٹا، اسے عار دلانا چاہتے تھے یعنی دور جاہلیت کی جو اس کی ماں تھی۔ اس آدمی کو بڑی حیا آئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ضحاک نے کہا: یہ بنو تمیم کے وفد کے بارے میں آیت نازل ہوئی جن کا ذکر سورۂ کے آغاز میں گزر چکا ہے انہوں نے فقراء صحابہ کا مذاق اڑایا جس طرح حضرت عمار، حضرت خباب، حضرت ابن فہیرہ، حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت سلیمان اور حضرت سالم جو ابوحذیفہ کے غلام تھے رضی اللہ عنہم۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کی جب انہوں نے ان کے برے حال کو دیکھا تو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

مجاہد نے کہا: مراد غنی کا فقیر سے مذاق کرنا۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس کے گناہ پوشیدہ رکھے وہ اس آدمی کا مذاق نہ اڑائے جس کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا ہو ممکن ہے کہ اس کے گناہوں کا دنیا میں ظاہر ہونا آخرت میں اس کے لیے بہتر ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت عکرمہ بن ابی جہل کے حق میں نازل ہوئی جب وہ مدینہ طیبہ میں مسلمان کی حیثیت سے آیا مسلمانوں نے جب اسے دیکھا تو کہا: اس امت کے فرعون کا بیٹا۔ عکرمہ نے اس کی شکایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کوئی آدمی اس پر مذاق کی جراءت نہ کرے جو اس کے سامنے آئے جبکہ اس کا حال پراگندہ ہو، اس کے بدن میں کوئی عیب ہو یا وہ اچھی طرح گفتگو نہ کر سکتا ہو ممکن ہے ضمیر کے اعتبار سے زیادہ مخلص اور دل کے اعتبار سے زیادہ صاف ہو اس آدمی کی بنسبت جو اس کی صفت کے مخالف ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرے گا کہ وہ اس آدمی کو حقیر سمجھ رہا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے اور اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عظیم قرار دیا ہے۔ سلف صالحین نے اس امر سے بچنے میں حد درجہ مبالغہ سے کام لیا، ان میں عمرو بن شرحبیل کا قول ہے: اگر میں کسی آدمی کو دیکھوں کہ وہ بکری کے بچے کو بکری کا دودھ پلا رہا ہے تو میں اس پر ہنس پڑوں تو مجھے ڈر ہے کہ میں وہ کام کروں گا جو اس نے کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آزمائش بات پر ہی منحصر ہے اگر میں کتے کا مذاق اڑاؤں تو مجھے ڈر ہے کہ میں کتا بنا دیا جاؤں۔ قوم کا لفظ مذکرین کے لیے خاص ہے۔ زہیر نے کہا:

وما أدری وسوف إخال أدری     أقوم آل حصن أم نساء(2)

میں نہیں جانتا ممکن ہے میں جان جاؤں کیا آل حصن مرد ہیں یا عورتیں ہیں۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 202
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 332

انہیں قوم کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ مصائب میں داعی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قائم کی جمع ہے پھر ہر جماعت میں اس کو استعمال کیا جانے لگا اگرچہ وہ کھڑے نہ ہوں۔ قوم میں عورتیں مجازاً داخل ہو جاتی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ عورتوں کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ ان سے مذاق اکثر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ (نوح:1) یہ سب کو شامل ہے۔ مفسرین نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیویوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے استہزاء کیا تھا آپ نے اپنی دونوں ڈھاکوں کو ایک سفید کپڑے سے باندھ رکھا تھا اور اس کی دونوں طرفوں کو پیچھے لٹکا دیا تھا وہ اسے گھسیٹ رہی تھیں۔ حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ سے فرمایا: اسے دیکھو یہ اپنے پیچھے کیا گھسیٹ رہی ہے گویا وہ کتے کی زبان ہے۔ یہ ان دونوں کا مذاق تھا۔ حضرت انس اور ابن زید نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہی کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت ام سلمہ کو چھوٹے قد کا ہونے کی وجہ سے عار دلائی تھی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت صدیقہ کے حق میں نازل ہوئی انہوں نے اپنے ہاتھ سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اے اللہ کے نبی! وہ چھوٹے قد کی ہے۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں عرض کی: رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم عورتیں مجھے عار دلاتی ہیں وہ مجھے کہتی ہیں: اے یہودن جو دو یہودیوں کی بیٹی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے یہ کیوں نہیں کہا: میرا جد حضرت ہارون علیہ السلام اور میرے چچا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور میرے خاوند حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں''۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** صحیح ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک آدمی کی نقل کی فرمایا: ''مجھے یہ بات خوش نہیں کرتی کہ میں کسی کی نقل کروں جبکہ میرے لیے یہ یہ ہے'' کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کہ حضرت صفیہ چھوٹے قد کی عورت ہے، ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا فرمایا: ''تو نے ایسی بات کی ہے اگر اسے سمندر میں ملایا جائے تو وہ متغیر ہو جائے'' (2)۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن زمعہ سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک اونٹ کو مارنے کی طرح کیوں اپنی بیوی کو مارتا ہے پھر اسے گلے لگاتا ہے'' صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں اور تمہارے احوال کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دل اور اعمال دیکھتا ہے'' (3)۔

یہ عظیم حدیث ہے اس پر یہ حکم مرتب ہوتا ہے کہ کسی کے عیب کی وجہ سے وہ قطع تعلق نہ کرے وہ اس کی اطاعت کے اعمال

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 4، صفحہ 202 2۔ ابوداؤد، باب فی الغیبۃ، حدیث نمبر 4232، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تحریم ظلم المسلم الخ، جلد 2، صفحہ 317

دیکھے ممکن ہے جو اعمال ظاہرہ کی محافظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک مذموم وصف کو جانتا ہو جس کے ساتھ وہ اعمال صحیح نہ رہتے ہوں ممکن ہے جس میں ہم کوئی نافرمانی اور کوتاہی دیکھیں اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایسا وصف محمود جانتا ہو جس کے باعث اس کے گناہ بخش دے۔ اعمال ظنی نشانیاں ہیں یہ قطعی ادلہ نہیں جس کے اعمال صالح دیکھیں اس کی تعظیم میں غلو نہ کریں جس کے برے اعمال دیکھیں اس کی تحقیر میں نہ جایا جائے اس میں غور و فکر کیجئے کیونکہ دقیق نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لمز کا معنی عیب ہے۔ سورۂ براءۃ میں ارشاد باری تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (توبہ: 58) میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ طبری نے کہا: لمز ہاتھ، آنکھ، زبان اور اشارہ سے ہوسکتا ہے اور ھمز صرف زبان سے ہوتا ہے یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) کی مثل ہے یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل نہ کریں کیونکہ مومنین ایک نفس کی طرح ہیں گویا بھائی کو قتل کرنے والا اپنے آپ کو قتل کرنے والا ہے جس طرح مومنین ایک نفس کی طرح ہیں گویا بھائی کو قتل کرنے والا اپنے آپ کو قتل کرے والا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) یعنی تم میں سے بعض بعض کو سلام کرتے ہیں معنی ہے تم میں سے بعض بعض کو عیب نہ لگائیں۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سعید بن جبیر نے کہا: تم میں سے بعض بعض پر طعن نہ کریں۔ ضحاک نے کہا: تم میں سے بعض بعض پر طعن نہ کریں (1)۔ اسے لا تلمزون بھی پڑھا گیا ہے اَنْفُسَكُمْ کے قول میں یہ تنبیہ موجود ہے کہ دانش مند آدمی اپنے آپ پر عیب نہیں لگاتا اس لیے کسی غیر پر بھی عیب نہیں لگانا چاہیے کیونکہ غیر بھی اس کی ذات کی طرح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: المؤمنون کجسد واحد إن إشتکی عضو منه تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی (2) سب مومن ایک جسم کی مانند ہیں اگر اس میں سے ایک عضو کو بیماری لگتی ہے تو سارا جسم اس کے لیے بیداری اور بخار کے ساتھ ایک دوسرے کو بلالیتا ہے۔

بکر بن عبد اللہ مزنی نے کہا: اگر تو یہ ارادہ کرتا ہے کہ تو ہمت سے عیوب کو دیکھے تو بہت زیادہ عیب لگانے والے، غور کر کیونکہ لوگوں پر وہی عیب لگاتا ہے جو اس کے عیوب سے زائد ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یبصر أحدکم القذاۃ فی عین أخیه ویدع الجذع فی عینه تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی میں تنکا دیکھ لیتا ہے اور اپنی آنکھ میں شہتیر کو چھوڑ دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انسان کی سعادت مندی اس میں ہے کہ دوسروں کے عیوب میں مشغول ہونے کی بجائے اپنے عیوب میں مشغول ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

المرء إن کان عاقلاً ورعًا أشغله عن عیوبه ورعه
کما السقیم المریض یشغله عن وجع الناس کلهم وجعه

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 332 2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، تراحیم المومنین، جلد 2، صفحہ 321

انسان اگر عقلمند ہو تو اس کا تقویٰ اسے لوگوں کے عیوب سے غافل کر دے گا۔ جس طرح ایک مریض ہوتا ہے اس کا درد اسے تمام لوگوں کے درد سے غافل کر دیتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لا تکشفن مساوی الناس ما ستروا فیتهك الله سترا عن مساویكا

واذکر محاسن مافیهم إذا ذکروا ولا تعب أحدا منهم بما فیك

جن عیوب کو لوگوں نے چھپا رکھا ہے تو انہیں ظاہر نہ کر ورنہ اللہ تعالیٰ تیرے عیوب کو ظاہر کر دے گا۔ جب ان کا ذکر ہو تو ان کی اچھائیوں کا ذکر کر اور جو عیب تجھ میں ہے وہ عیب کسی پر نہ لگا۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ، نبز کا معنی لقب ہے اس کی جمع انباز ہے نبز مصدر ہے، تو اس کا باب یوں ظاہر کرتا ہے: نَبَزَہٗ یَنْبِزُہٗ نَبْزًا، یعنی اسے لقب دیا: فلان ینبزبالصبیاں فلاں بچوں کو لقب دیتا ہے کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے اسے مشدد پڑھا جاتا ہے: یہ بھی جائز ہے نبز اور نزب برے لقب کو کہتے ہیں تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ان میں سے بعض نے بعض کو لقب دیا۔

ترمذی میں ابو جبیرہ بن ضحاک سے مروی ہے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے دو یا تین نام ہوا کرتے تھے ان میں سے کسی ایک نام سے اسے پکارا جاتا (1) تو ممکن تھا کہ وہ ناپسند کرے تو یہ آیت نازل ہوئی وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

ابو جبیرہ نے کہا: وہی اخو ثابت بن ضحاک بن خلیفہ انصاری ہے، ابو زید بن سعید بن ربیع صاحب ہروی ثقہ ہے۔ مصنف ابی داؤد میں ان سے یہ روایت مروی ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہم میں سے کوئی ایسا آدمی نہ تھا مگر اس کے دو یا تین نام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرمایا کرتے: ''اے فلاں!'' وہ عرض کرتے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم رک جایئے وہ اس نام سے ناراض ہو جاتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی (2)؛ یہ ایک قول ہے۔

دوسرا قول ہے: حضرت حسن بصری اور مجاہد نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد آدمی کو کفر کے ساتھ عار دلائی جاتی کہا جاتا: اے یہودی! اے نصرانی! ۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قتادہ، ابو العالیہ اور عکرمہ سے مروی ہے قتادہ نے کہا: اس سے مراد ہے اے فاسق! اے منافق! یہ مجاہد اور حضرت حسن بصری کا قول ہے (3)۔

---

1۔ جامع ترمذی، سورۂ حجرات، جلد 2، صفحہ 159

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الالقاب، حدیث 3730۔ سنن ابی داؤد، باب فی الالقاب، حدیث 4311، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 152

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ یعنی یہ کتنی بری بات ہے کہ آدمی کا یہ نام ذکر کیا جائے اے زانی!، اے کافر!، جبکہ وہ اسلام قبول کر چکا ہے اور توبہ کر چکا ہے؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے اپنے بھائی کا لقب ذکر کیا یا اس کے ساتھ مذاق کیا تو ایسا کرنے والا فاسق ہوتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے ''کہ جس نے اپنے بھائی کے بارے میں کہا: اے کافر! تو یہ قول کسی ایک کی طرف لوٹے گا اگر اسی طرح ہوا جس طرح اس نے ذکر کیا ہے تو ٹھیک ورنہ وہ قول کہنے والے کی طرف لوٹ آئے گا'' جس نے وہ عمل کیا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا تھا یعنی مذاق عیب لگانا تو ایسا کرنے والا فاسق ہوگا یہ جائز نہیں۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوذر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے ایک آدمی نے ان سے جھگڑا کیا تو حضرت ابوذر نے اسے کہا: اے یہودیہ کے بیٹے!۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو یہاں سرخ اور سیاہ نہیں دیکھتا تو اس سے افضل نہیں'' یعنی تو تقویٰ کے ساتھ اس سے افضل نہیں تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔(1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ کا مطلب ہے کہ آدمی نے برے اعمال کیے ہوں پھر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ نے اسے سابقہ گناہوں پر عار دلانے سے منع کیا ہے اس پر یہ امر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی مومن کو اس گناہ کی وجہ سے عار دلائی جس سے اس نے توبہ کی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے کہ اسے آزمائش میں ڈالے اور اسے دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا کرے''۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس کا استعمال غالب ہوتا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے جس طرح کانا، کبڑا جس میں اس کا اپنا کوئی عمل دخل نہ ہو امت نے ایسا قول کرنے کی اجازت دی ہے اور اہل ملت نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ کی قسم! یہ چیز ان کی کتب میں ہے جس سے میں راضی نہیں وہ گفتگو صالح جزرہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس نے خرزہ میں تصحیف کی تھی۔ تو اسی کے ساتھ اس کا لقب رکھ دیا گیا، اسی طرح ان کا محمد بن سلیمان حضرمی کے بارے میں قول ہے مطین کیونکہ وہ مٹی میں گر پڑے تھے اسی کی مثل اور بھی اقوال ہیں جو متاخرین میں غالب آئے۔ میں دین کے معاملہ میں اسے جائز نہیں سمجھتا۔ موسیٰ بن علی بن رباح مصری کہا کرتے تھے: میں کسی آدمی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرے باپ کا نام اسم مصغر کی صورت میں بنائے ان کے نام میں غالب عین کلمہ کا ضمہ تھا۔ جو قاعدہ اس تمام بحث کو ضبط کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ قول جسے انسان ناپسند کرے جب اسے اس کے ساتھ ندا کی جائے تو اذیت دینے کی وجہ سے اس کا استعمال جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی معنی میں بخاری نے جامع صحیح میں کتاب الادب کا ایک باب باندھا ہے باب مایجوز من ذکر الناس نحو قولهم الطويل والقصير لايراد به شين الرجل کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مایقول ذوالیدین ابو عبد اللہ بن خویز منداد نے کہا: یہ آیت اس چیز کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے کہ انسان کو ایسا لقب نہ دیا جائے جسے وہ ناپسند کرتا ہے اور جسے وہ پسند کرتا ہے وہ لقب اسے دینا جائز ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فاروق، حضرت ابوبکر کو صدیق، حضرت عثمان کو ذوالنورین، حضرت خزیمہ کو ذوشہادتین، کسی کو ذوشمالین اور کسی کو ذوالیدین وغیرہ کا لقب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1723

دیا۔ زمخشری نے کہا: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے من حق المؤمنین أن یسمیه بأحب أسمائه إلیه(1) ایک مومن کا دوسرے مومن پر یہ حق ہے کہ اسے وہ نام دے جو اسے سب سے زیادہ محبوب ہو، اسی وجہ سے کنیت سنت اور ادب حسن میں سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کنیتیں عام کرو کیونکہ یہ آگاہ کرنے والی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق کا لقب عتیق اور صدیق تھا، حضرت عمر کا لقب فاروق تھا، حضرت حمزہ کا لقب اسد اللہ، حضرت خالد کا لقب سیف اللہ۔ دور جاہلیت اور دور اسلام میں کم ہی ایسا مشہور شخص ہوگا جس کا کوئی لقب نہ ہو عرب وعجم کی تمام قوموں میں ہمیشہ سے اچھے لقب ان کی گفتگوؤں اور مکاتیب میں جاری ہیں کسی نے انکار نہیں کیا۔

ماوردی نے کہا: جہاں تک مستحب اور مستحسن القاب کا تعلق ہے(2) تو وہ مکروہ نہیں رسول اللہ ﷺ نے کئی صحابہ کے ایسے اوصاف بیان کیے ہیں جو ان کے نمایاں لقب بن گئے۔

میں کہتا ہوں: جس کا ظاہر ناپسندیدہ ہو جب اس کے ساتھ صفت بیان کرنے کا ارادہ کیا ہو عیب کا ارادہ نہ ہو تو یہ اکثر ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مالک سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کہہ رہا تھا: حمید طویل، سلیمان اعمش، حمید اعرج، مروان اصغر۔ فرمایا: جب تو اس کی صفت کا ارادہ کرے اس کے عیب کا ارادہ نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن سرجس سے مروی ہے کہا: رأیت الأصلع یعنی عمر یقبل الحجر۔ میں نے گنجے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا جو حجر اسود کا بوسہ لے رہے تھے۔ ایک روایت میں الاصیلع کے الفاظ ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ یعنی جو ایسے القاب ذکر کرنے سے توبہ تائب نہ ہوا جس سے مسلمان اذیت محسوس کرتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ وہ ان منع کی گئی چیزوں کو اپنا کر اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ۝۱۲

"اے ایمان والو! دور رہا کرو بکثرت بدگمانیوں سے بے شک بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور نہ جاسوسی کیا کرو اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو، کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی شخص کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم اسے تو مکروہ سمجھتے ہو اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ان دو مرد صحابہ۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 369 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 333

بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے ساتھی کی غیبت کی تھی اس کی وجہ یہ بنی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا جب آپ سفر کرتے تو ایک محتاج آدمی کو دو خوشحال آدمیوں کے ساتھ ملا دیتے وہ ان کی خدمت کرتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان کو دو آدمیوں کے ساتھ ملا یا، حضرت سلمان اپنے پڑاؤ کی طرف نکلے اور نیند غالب آ گئی وہ سو گئے اور ان دونوں کے لیے کوئی چیز تیار نہ کی وہ دونوں آئے تو کھانا اور سالن نہ پایا دونوں نے کہا: جاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے لیے کھانا اور سالن طلب کرو۔ وہ گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''اسامہ بن زید کے پاس جاؤ اسے کہو: اگر تیرے پاس زائد کھانا ہے تو تجھے دے دے'' حضرت اسامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خازن تھے حضرت سلمان فارسی اس کے پاس گئے حضرت اسامہ نے کہا: میرے پاس تو کچھ بھی نہیں حضرت سلمان واپس آئے اور ان دونوں کو یہ سب صورتحال بتائی دونوں نے کہا: اس کے پاس کھانا تو تھا لیکن اس نے بخل کیا ہے پھر دونوں نے حضرت سلمان فارسی کو صحابہ کی ایک جماعت کی طرف بھیجا تو انہوں نے ان کے ہاں بھی کوئی کھانا نہ پایا دونوں نے کہا: اگر ہم اسے سمیحہ کے کنویں کی طرف بھیجیں گے تو اس کا پانی بھی خشک ہو جائے گا پھر وہ چلے تا کہ دیکھیں کیا حضرت اسامہ کے پاس کچھ ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ لیا اور فرمایا: ''کیا وجہ ہے میں تمہارے مونہوں میں گوشت کی سبزی دیکھتا ہوں'' دونوں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! اللہ کی قسم آج ہم نے نہ گوشت کھایا ہے نہ کوئی اور چیز کھائی ہے۔ فرمایا: ''لیکن تم دونوں نے ظلم کیا تم سلمان فارسی اور اسامہ کا گوشت کھاتے ہو'' تو یہ آیت نازل ہوئی (1)؛ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے، یعنی تم اہل خیبر کے بارے میں برا گمان نہ کرو اگر ان کے ظاہر امر کے بارے میں خیر جانتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 2۔** صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ إخوانا ظن سے بچو بے شک ظن سب سے جھوٹی بات ہے ٹوہ میں نہ رہا کرو، جاسوسی نہ کیا کرو، باہم ایک دوسرے کے بھاؤ پر بھاؤ نہ لگایا کرو، باہم حسد نہ کیا کرو، باہم بغض نہ رکھا کرو، آپس میں دشمنی نہ رکھا کرو، اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا: یہاں اور آیت میں ظن سے مراد تہمت ہے۔ تحذیر اور نہی کا محل وہ تہمت ہے اس کا وہ عیب نہیں جو اسے ثابت کرتا ہے مثلاً کسی پر فاحشہ اور شراب نوشی کی تہمت لگائی جا سکتی ہے جو چیز اس کا تقاضا کرتی ہے وہ اس پر ظاہر نہیں ہوتی اس امر کی دلیل کہ یہاں ظن کا معنی تہمت ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَّلَا تَجَسَّسُوْا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں اس کے دل میں تہمت کا خیال آتا ہے وہ اس خبر کے لیے جاسوسی کرتا ہے اور بحث و تمحیص کرتا ہے وہ توجہ سے دیکھتا ہے اور توجہ سے سنتا ہے تا کہ وہ امر ثابت ہو جائے جو اس تہمت میں سے واقع ہوا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا۔ اگر تو چاہے تو یہ کہہ دے جو چیز گمانات کو ممتاز کرتی ہے کہ ان سے اجتناب ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس کی توضیح علامت اور ظاہری سبب نہ پاتا ہو تو وہ حرام ہے اور اجتناب ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس آدمی کے بارے میں یہ گمان کیا جا رہا ہے اس سے پردہ پوشی اور صالحیت دیکھی گئی ہو اور ظاہر میں امانت ہی دکھائی دیتی ہو تو اس کے بارے میں فساد اور

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 204

خیانت کا گمان حرام ہے اس آدمی کا معاملہ مختلف ہے جو لوگوں میں اس انداز میں مشہور ہو کہ شک وشبہ والے کام کرتا ہو اور اعلانیہ خبیث اعمال کا ارتکاب کرتا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے خون اور اس کی عزت کو حرام قرار دیا ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں برا گمان کرے''(1)۔ حسن سے مروی ہے: ہم ایسے زمانے میں تھے جس میں لوگوں کے بارے میں (برا) گمان حرام ہے اور تو آج ایسے زمانے میں ہے کہ تو عمل کر اور خاموش رہ اور لوگوں کے بارے میں جو چاہے گمان رکھ۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ظن کی دو حالتیں ہیں ایک حالت ایسی ہے جو جانی پہچانی ہے اور دلائل کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ساتھ قوی ہو جاتی ہے تو اس کے موافق حکم دینا جائز ہے شریعت کے اکثر احکام غلبہ ظن پر مبنی ہیں جس طرح قیاس اور خبر واحد وغیرہ۔

دوسری حالت یہ ہے کہ دلالت کے بغیر نفس میں کوئی چیز واقع ہو جائے تو وہ اپنی ضد سے اولیٰ نہ ہو یہی شک ہے اس کے مطابق حکم دینا جائز نہیں اس سے نہی کی گئی ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی ابھی بیان کیا ہے۔

بدعتیوں کی ایک جماعت نے ظن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنے اور اس پر عمل کرنے کے جواز کا انکار کیا ہے وہ دین میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتے ہیں اور معقولات میں اپنا دعویٰ کرتے ہیں اس میں کوئی قاعدہ نہیں جس پر انحصار کیا جا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کی مذمت نہیں کی بعض کی مذمت کی ہے بعض اوقات وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں: إياكم والظن ظن سے بچو۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ شریعت میں ظن کی دو قسمیں ہیں۔ اس میں سے محمود وہ ہے جس کے ساتھ ظن کرنے والے کا دین اور جس کے بارے میں گمان کیا جا رہا ہے جب اس تک پہنچے اس کا دین محفوظ رہتا ہے مذموم اس کے مد مقابل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (النور: 12) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ (الفتح)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کسی بھائی کی تعریف کرے تو وہ کہے: میں یہ گمان کرتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی پاکی بیان نہیں کرتا'' فرمایا: ''جب تو یہ گمان کرے تو تحقیق کر لے، جب حسد کرے تو تجاوز نہ کر اور جب تو فال پکڑے تو کام کو جاری رکھ' اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جس آدمی کا ظاہر اچھا ہو اس کے بارے میں برا گمان جائز نہیں، جس کا ظاہر قبیح ہو اس کے بارے میں برا گمان رکھنے میں کوئی حرج نہیں؛ یہ مہدوی نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا ابو رجاء اور حضرت حسن بصری نے اسے اختلاف کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے علماء نے اسے ولا تحسسوا پڑھا ہے اس میں اختلاف ہے کیا دونوں کا معنی ایک ہے یا ان کے دو معنی ہیں؟ اخفش نے کہا: ان میں

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 372۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب حرمة دم المؤمن وماله، حدیث نمبر 3921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے ایک دوسرے سے بعید نہیں کیونکہ تحسس کا معنی ایسی چیز کے بارے میں بحث کرنا ہے جو تجھ سے پوشیدہ ہو اور تجسس سے مراد خبروں کو طلب کرنا اور ان کے بارے میں بحث کرنا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تجسس کا معنی بحث کرنا۔ اسی سے یہ لفظ ذکر کیا جاتا ہے رجل جاسوس۔ جب وہ امور کی کرید کرتا ہو۔ اور تحسس سے مراد انسان کا کسی حاسہ سے اس چیز کا ادراک کرنا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان میں فرق ہے تحسس کا معنی اپنے لیے تلاش کرنا اور اور اور تجسس کا معنی ہے کہ کسی اور کا بھیجا ہوا ہو؛ یہ ثعلب کا قول ہے پہلا قول زیادہ معروف ہے۔ جسست الأخبار وتجسستھا۔ جب تو ان کو چھان بین کرے اسی معنی میں جاسوس ہے آیت کا معنی ہے جو امر ظاہر ہوا سے لے لو اور مسلمانوں کے پوشیدہ امور کا تجسس نہ کرو، یعنی تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا عیب تلاش نہ کرے یہاں تک کہ اس پر مطلع ہو جائے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مخفی رکھا ہے۔

ابو داؤد کی کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اگر تو لوگوں کے پوشیدہ امور کا پیچھا کرے گا تو تو انہیں فاسد کر دے گا (1)'' حضرت ابو درداء نے کہا: یہ ایسا کلمہ ہے جو حضرت معاویہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے اسے نفع دیا۔

مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے وہ حضرت ابو امامہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا: ''امیر جب لوگوں میں شک کی تلاش کرے تو اس نے انہیں خراب کر دیا'' (2) زید بن وہب سے مروی ہے کہ کوئی آدمی حضرت ابن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: یہ فلاں ہے، اس کی داڑھی شراب ٹپکاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: ہمیں تجسس سے روک دیا گیا ہے لیکن اگر ہمارے لیے کوئی چیز ظاہر ہوگی تو ہم اس کو اپنائیں گے (3)۔

ابو برزہ اسلمی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو اور ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کی پوشیدہ باتوں کا پیچھا نہ کیا کرو جو انسان ان کی پوشیدہ باتوں کا پیچھا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ بات کا پیچھا کرے گا اور اللہ تعالیٰ جس کی پوشیدہ بات کا پیچھا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر میں رسوا کر دے گا'' (4)۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے کہا: ایک رات میں نے حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ ملکر پہرہ دیا کہ ایک گھر میں ہمارے لیے چراغ ظاہر ہوا۔ دروازہ لوگوں پر کھلا ہوا تھا جنکی آوازیں بلند تھیں اور وہ فضول بات کر رہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ گھر ربیعہ بن امیہ بن خلف کا ہے وہ اس وقت شراب پی رہے ہیں تیری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: میری رائے ہے ہم نے وہ کام کیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَجَسَّسُوْا ہم نے تجسس کیا ہے۔ حضرت

1۔ سنن ابی داؤد، باب النھی عن التجسس، جلد 2، صفحہ 314 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 4245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 4246، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، کتاب الأدب، جلد 2، صفحہ 313۔ ایضاً، باب فی الغیبۃ، حدیث نمبر 4236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمر واپس ہو گئے اور انہیں چھوڑ دیا۔

ابو قلابہ نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیان کیا گیا کہ ابو محجن ثقفی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے گھر میں شراب پیتا ہے حضرت عمر وہاں تشریف لے گئے یہاں تک کہ اس کے گھر میں داخل ہوئے اس کے پاس صرف ایک آدمی تھا، ابو محجن نے کہا: یہ تیرے لیے حلال نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے تجسس سے تجھے منع کیا ہے۔ حضرت عمر وہاں سے نکلے اور اسے چھوڑ دیا۔

زید بن اسلم نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پہرہ دینے کے لیے نکلے دونوں کے لیے آگ ظاہر ہوئی دونوں نے اجازت طلب کی دروازہ کھولا گیا تو وہاں ایک مرد اور عورت تھی، عورت گانا گا رہی تھی اور مرد کے ہاتھ پر پیالہ تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے فلاں! تو یہ کام کر رہا ہے؟ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! آپ نے یہ کیا کیا ہے؟ حضرت عمر نے پوچھا: یہ تیری کیا لگتی ہے؟ عرض کی: میری بیوی ہے، فرمایا: اس پیالے میں کیا ہے؟ جواب دیا: میٹھا پانی۔ حضرت عمر نے پوچھا: تو کیا گا رہی تھی؟ اس نے عرض کی:

تطاول هذا الليل وأسود جانبه		وأرقني أن لاخليل الاعبه

فوالله لولا الله إني أراقبه		لزعزع من هذا السرير جوانبه

ولكن عقلي والحياء يكفني		وأكرم بعلي أن تنال مراكبه

پھر اس آدمی نے کہا: اے امیر المومنین! ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَجَسَّسُوْا حضرت عمر نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔

میں کہتا ہوں: اس خبر سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ عورت مرد کی بیوی نہیں تھی کیونکہ حضرت عمر زنا کی اجازت دینے والے نہیں تھے اس عورت نے ایسے اشعار پڑھے جن میں خاوند کا ذکر تھا اس نے یہ اشعار اس کی عدم موجودگی میں کہے تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

عمر بن دینار نے کہا: اہل مدینہ کے ایک آدمی کی بہن تھی وہ بیمار ہو گئی وہ اس کی عیادت کرتا تھا وہ فوت ہو گئی اور اس نے اپنی بہن کو دفن کیا وہ خود اس کی قبر میں اترا اس کی آستین سے ایک تھیلا گر گیا جس میں دینار تھے اس نے اپنے خاندان کے کچھ افراد سے مدد لی انہوں نے اس کی قبر کو کھودا اور تھیلہ لے لیا پھر اس نے کہا: میں اسے کھولوں گا یہاں تک کہ میں دیکھوں کہ میری بہن کا انجام کیا ہوا اس نے اسے کھولا تو قبر آگ سے بھڑک رہی تھی وہ اپنی ماں کے پاس آیا عرض کی: مجھے بتاؤ میری بہن کا عمل کیسا تھا؟ ماں نے کہا: تیری بہن مر چکی ہے اب اس کے عمل کے بارے میں سوال کا فائدہ؟ وہ لگاتار سوال کرتا رہا یہاں تک کہ ماں نے کہا: اس کا عمل یہ تھا کہ وہ نماز کو تاخیر سے پڑھتی جب لوگ سو جاتے تو وہ لوگوں کے گھروں کی طرف اٹھتی اور اپنے کان ان کے دروازوں کے ساتھ لگاتی اور ان کے معاملات کے بارے میں تجسس کرتی اور ان کے راز ظاہر کر دیتی۔ اس مرد نے کہا: اس وجہ سے وہ ہلاک ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اللہ تعالیٰ نے غیبت سے منع کیا، اس کا معنی یہ ہے کہ تو کسی انسان کا ان

عیوب کے ساتھ ذکر کرے جو اس میں ہیں اگر وہ کسی ایسے عیب کا ذکر کرتا ہے جو اس میں نہیں تو یہ بہتان ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں اسی معنی کی حدیث موجود ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟(1)'' جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''تیرا اپنے بھائی کا ایسی چیز کے ساتھ ذکر کرنا جسے وہ ناپسند کرے'' عرض کی گئی: بتایئے اگر وہ عیب میرے بھائی میں موجود ہو جو میں کہتا ہوں؟ فرمایا: اگر اس میں وہ ہے جو کچھ تم کہتے ہو تو تو نے اس کی غیبت کی اگر وہ عیب اس میں نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا'' جملہ کہا جاتا ہے: اغتابہ إغتیابا۔ جب اس میں واقع ہو اس کا اسم غیبۃ ہے اس سے مراد عدم موجودگی میں عیب کا ذکر کرنا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: غیبت کی تین صورتیں ہیں سب کتاب اللہ میں ہیں غیبت، افک، بہتان (2)۔ جہاں تک غیبت کا تعلق ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے بارے میں وہ بات کرے جو اس میں ہو۔ افک سے مراد ہے تو اس کے بارے میں وہ کہے جو تجھ تک پہنچی ہو جہاں تک بہتان کا تعلق ہے تو اسکا مطلب ہے تو وہ بات کرے جو اس میں نہ ہو۔

شعبہ سے مروی ہے کہ مجھے معاویہ بن قرہ نے کہا: اگر تیرے پاس سے کوئی ایسا آدمی گذرے جس کا ہاتھ کٹا ہوا ہو تو تو کہے: اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہے تو یہ غیبت ہوگی۔ شعبہ نے کہا: میں نے اس کا ذکر ابو اسحاق سے کیا تو اس نے کہا: اس نے سچ بولا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسلمی ماعز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اپنے بارے میں زنا کی گواہی دی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دو صحابہ کو سنا ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا: اسے دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس کا عمل پردہ میں رکھا تھا اس نے اپنے آپ کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اسے رجم کر دیا گیا جس طرح کتے کو رجم کیا جاتا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو کوئی جواب نہ دیا پھر آپ لمحہ بھر چلے یہاں تک کہ ایک مردہ گدھے کے پاس سے گذرے جس کے پاؤں سے رسی باندھی گئی تھی فرمایا: ''اے فلاں! اے فلاں!''۔ دونوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم حاضر ہیں۔ فرمایا: ''اترو اور اس گدھے کا گوشت کھاؤ؟'' عرض کی: اے اللہ کے نبی! کون اسے کھاتا ہے؟ فرمایا: ''تم نے اپنے بھائی کی عزت سے جو حاصل کیا ہے وہ اس کے کھانے سے زیادہ سخت ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ اس وقت جنت کی نہروں میں غوطہ لگا رہا ہے'' (3)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا اللہ تعالیٰ نے غیبت کو مردار کھانے سے تشبیہ دی ہے کیونکہ میت نہیں جانتا کہ اس کا گوشت کس نے کھایا ہے جس طرح زندہ نہیں جانتا کہ کس نے اس کی غیبت کی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مثال غیبت کی بیان کی ہے کیونکہ مردار کا گوشت حرام اور ناپسندیدہ ہوتا ہے اسی طرح غیبت دین میں حرام اور نفوس میں قبیح ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: جس طرح تم میں سے کوئی ایک اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے رک جاتا ہے اسی طرح ضروری ہے کہ وہ زندہ کی غیبت سے رکے۔ غیبت کی جگہ گوشت کھانے کا لفظ استعمال کیا گیا کیونکہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، تحریم الظلم، جلد 2، صفحہ 322　　2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 60

3۔ سنن ابی داؤد، باب رجم ماعز بن مالک، حدیث نمبر 3843، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عربوں کی یہ عادت عام تھی۔ شاعر نے کہا:

فإن أكلوا لحمي وفرت لحومهم وإن هدموا مجدي بنيت لهم مجدا

اگر وہ میرا گوشت کھائیں تو میں ان کے گوشت کو بڑھا دوں گا اگر وہ میری بزرگی کو ختم کرنا چاہیں تو میں ان کے لیے بزرگی بنا دوں گا۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو لوگوں کے گوشت کھاتا رہا (غیبت کرتا رہا) اس نے روزہ نہیں رکھا لوگوں کی غیبت کرنے کو ان کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے جس نے کسی مسلمان کا نقص بیان کیا یا اس کی عزت کو پامال کیا تو وہ اس کے زندہ حالت میں گوشت کھانے والے کی طرح ہے جس نے اس کی غیبت کی وہ اس کے مردہ ہونے کی حالت میں گوشت کھانے کی طرح ہے''۔

ابوداؤد کی کتاب میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب مجھے معراج کرائی گئی میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گذرا جن کے تانبے کے ناخن تھے وہ اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟'' عرض کی: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے اور ان کی عزتوں سے کھیلا کرتے تھے (1)۔

مستورد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کا ایک لقمہ کھایا (غیبت کی) اللہ تعالیٰ جہنم میں اسی کی مثل اسے کھلائے گا اور جسے کسی مسلمان کا کپڑا پہنایا گیا اللہ تعالیٰ جہنم سے اس کی مثل اسے لباس عطا کرے گا اور جو شہرت اور ریاکاری کے مقام پر کھڑا ہوا اللہ قیامت کے روز اسے شہرت اور ریاکاری کے مقام پر کھڑا کرے گا'' (2)۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد پہلے گذر چکا ہے: یامعشر من آمن بلسانه ولم يدخل الإيمان قلبه لا تغتابوا المسلمين اے وہ جماعت جو اپنی زبان سے ایمان لائی ہے اور ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو حضور ﷺ کا دو آدمیوں کو فرمانا: مالی أری خضرة اللّحم في أفواهكما کیا وجہ ہے میں تمہارے مونہوں میں گوشت کی سبزی دیکھتا ہوں، ابوقلابہ رقاشی نے کہا: میں نے ابوعاصم کو یہ کہتے ہوئے سنا جب سے میں نے غیبت میں جو وبال ہے اسے پہچانا ہے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی۔

میمون بن سیاہ کسی کی غیبت نہیں کیا کرتے تھے اور نہ کسی کو چھوڑتے کہ ان کے ہاں کسی کی غیبت کرے آپ اسے منع کرتے اگر وہ رک جاتا تو ٹھیک ورنہ آپ اٹھ کھڑے ہوتے۔

ثعلبی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس سے اٹھا تو صحابہ نے اس کے اٹھنے میں ضعف دیکھا انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ فلاں کتنا عاجز ہے۔ فرمایا: ''تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ، جلد 2، صفحہ 313۔ ایضاً، حدیث نمبر 4235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب فی الغیبۃ، حدیث نمبر 4237، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور تم نے اس کی غیبت کی ہے'' (1)۔

سفیان ثوری سے مروی ہے کہ کم سے کم غیبت یہ ہے کہ تو کہے: فلاں جعد قطط ہے یعنی وہ چھوٹا، بخیل اور سخت گھنگریالے بالوں والا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگوں کے ذکر سے بچو کیونکہ یہ ایک بیماری ہے تم پر اللہ تعالیٰ کا ذکر لازمی ہے کیونکہ وہ شفا ہے۔

علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو دوسرے آدمی کی غیبت کرتے ہوئے سنا فرمایا: غیبت سے بچو کیونکہ یہ لوگوں کے کتوں کا سالن ہے۔

عمرو بن عبید سے کہا گیا: فلاں نے آپ کی غیبت کی یہاں تک کہ ہم نے آپ پر رحم کیا اس پر رحم کرو۔

ایک آدمی نے حضرت حسن بصری سے کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ میری غیبت کرتے ہیں؟ فرمایا: تیرا مقام و مرتبہ میرے ہاں اتنا نہیں کہ میں اپنی نیکیوں کا فیصلہ تیرے حق میں کر دوں۔

**مسئلہ نمبر** 7۔ ایک قوم کی یہ رائے ہے کہ غیبت صرف دیانتداری کے اعتبار سے ہوتی ہے یہ شکل وصورت اور حسب (اخلاق) میں نہیں ہوتی انہوں نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا عمل ہے۔ دوسرے علماء نے اسکے برعکس قول کیا ہے انہوں نے کہا: غیبت شکل وصورت، اخلاق اور حسب میں ہوا کرتی ہے شکل وصورت میں سب سے سخت ہوتی ہے کیونکہ جو کسی صنعت میں عیب لگاتا ہے تو وہ صانع میں عیب لگاتا ہے۔ یہ سب اقوال مردود ہیں جہاں تک پہلے قول کا تعلق ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اسے رد کرتی ہے جب آپ نے حضرت صفیہ کے بارے میں کہا: وہ چھوٹے قد کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا لقد قلت كلمة لو مزج بها البحر لمزجته تو نے ایسی بات کہی ہے اگر اسے سمندر میں ملایا جائے تو اس کی حالت بدل جائے۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ اور جو روایت اس معنی میں ہوگی وہ پہلی روایات کے موافق ہوگی۔ قدیمی علماء کی یہ رائے ہے کہ جب اس سے عیب کا ارادہ کیا جائے تو یہ غیبت ہوگی جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے سب علماء کے نزدیک وہ بھی مردود ہے کیونکہ پہلے زمانہ کے علماء جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ اور ان کے بعد تابعین میں سے تھے ان کے نزدیک دین (دیانت) میں غیبت سے بڑھ کر کوئی بڑی غیبت نہ تھی کیونکہ دیانت میں عیب سب سے بڑا عیب ہے کیونکہ ہر مومن اس بات کو زیادہ ناپسند کرتا ہے کہ اس کے دین کے بارے میں کوئی بات ذکر کی جائے بنسبت اس کے جو اس کے بدن کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ جس نے بھی یہ بات کی ہے اس کے رد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: اذا قلت فی اخيك ما يكره فقد اغتبته جب تو اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہے تو تو نے اس کی غیبت کی۔ الحدیث۔ جو آدمی

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 157

2۔ جامع ترمذی، صفة القيامة، جلد 2، صفحہ 73۔ سنن ابی داؤد، باب فی الغيبة، حدیث نمبر 4232، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ گمان کرے کہ یہ غیبت نہیں تو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو رد کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمومی ارشاد کافی ہے: دماؤکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم (میں ایک دوسرے) پر حرام ہیں۔ یہ حکم دین و دنیا سب کو عام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من کانت عندہ لاخیہ مظلمۃ فی عرضہ أو مالہ فلیتحللہ منہ۔ جس آدمی نے اپنے بھائی کے ساتھ اس کی عزت یا مال میں ظلم کیا ہو تو اس سے اس امر کو اپنے لیے حلال کرا لے یعنی ازالہ کر لے خواہ معافی کی صورت میں ہو یا حق کی ادائیگی کے ساتھ ہو۔ یہ تو امر کو عام ہے جس نے اس میں سے کسی چیز کو خاص کیا ہے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ غیبت گناہ کبیرہ میں سے ہے جس نے غیبت کی اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے کیا غیبت کرنے والے سے بدلہ لینا حلال ہو جاتا ہے؟ اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے: اس سے بدلہ لینا حلال نہیں یہ ایسی خطا ہے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہے۔ انہوں نے یہ استدلال کیا ہے اس نے دوسرے فرد کا مال نہیں لیا اور نہ ہی اس کے بدن کو ایسی تکلیف پہنچائی ہے جس وجہ سے بدن میں کوئی نقص واقع ہوا ہو، یہ کوئی ایسا ظلم نہیں ہے جس کے باعث وہ اس کے لیے حلال ہو جائے وہ ظلم جس کے باعث بدل اور ظلم لازم ہوتا ہے وہ مال اور بدن کا نقصان ہے۔

ایک جماعت کا نقطہ نظر ہے: یہ ظلم ہے اسکا کفارہ یہ ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے وہ اس کے لیے بخشش طلب کرے انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہا: غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے اس کے لیے بخشش کا طلب گار ہو۔ ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ ہے: جس کی غیبت کی گئی اس کے لیے غیبت کرنے والے سے بدلہ لینا حلال ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا ہے: ''جس کسی کی بھائی کے ہاں زیادتی ہو خواہ مال ہو یا عزت میں تو اس کو اس دن سے پہلے معاف کرا لے جہاں کوئی درہم اور دینار نہیں ہوتا اس روز اس کی نیکیاں لی جائیں گی اگر اس کی نیکیاں نہ ہونگی تو جس کی غیبت کی گئی اس کی برائیاں لی جائیں گی اور غیبت کرنے والے کی برائیوں میں اضافہ کر دیا جائے گا''۔ امام بخاری نے اسے نقل کیا ہے یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کانت لہ مظلمۃ لاخیہ من عرضہ أو شیء فلیتحللہ منہ الیوم قبل ألا یکون دینار لا درھم إن کان لہ عمل صالح أخذ منہ بقدر مظلمتہ وإن لم یکن لہ حسنات أخذ من سیئات صاحبہ فحمل علیہ جس آدمی پر کسی بھائی نے عزت یا کسی اور چیز میں ظلم کیا ہو تو وہ آج ہی اس سے حلال کرا لے اس دن سے پہلے جس روز کوئی دینار اور کوئی درہم نہ ہوگا اگر اس کا کوئی عمل صالح ہوگا تو ظلم کی مقدار کے مطابق اس سے عمل لے لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں تو جس پر ظلم کیا گیا تھا اس کی برائیاں لے لی جائیں گی اور ظلم کرنے والے پر ڈال دی جائیں گی''۔ یہ احادیث سورۂ آل عمران آیت 109 میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ میں گذر چکی ہیں۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک عورت حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر

ہوئی جب وہ اٹھی تو ایک عورت نے کہا: اسکا دامن کتنا لمبا ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: تو نے اس کی غیبت کی ہے تو اس سے معافی مانگ۔ نبی کریم ﷺ سے مروی آثار دلالت کرتے ہیں کہ یہ ظلم ہے جس نے غیبت کی ہے اس پر لازم ہے کہ انہیں معاف کرائے۔

جس نے یہ کہا کہ غیبت مال اور بدن میں ہوتی ہے علماء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جو آدمی کسی پر تہمت لگاتا ہے تو اس کا اس آدمی پر ظلم ہے جس پر تہمت لگائی گئی، وہ اس کے بارے میں حد کا مطالبہ کرے گا یہاں تک کہ اس پر حد جاری ہو جائے۔ یہ بدن اور مال میں نہیں اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ظلم عزت، بدن اور مال میں ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے تہمت لگانے والے کے بارے میں فرمایا: فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ (النور: 13)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس آدمی نے کسی مومن پر ایسا بہتان لگایا جو اس میں نہ تھا اللہ تعالیٰ اسے طینۃ خبال (دوزخیوں کے زخموں کی پیپ) میں قید کر دے گا'' (1)۔ یہ سب چیزیں مال اور بدن کے علاوہ میں ہیں۔ جس نے یہ کہا: یہ ظلم ہے اور ظلم کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس آدمی کے لیے بخشش طلب کرے جس کی اس نے غیبت کی تو اس نے الٹ بات کی کیونکہ اس نے اسکا نام ظلم رکھا، پھر کہا: اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے بخشش طلب کرے کیونکہ **مظلمہ** کا لفظ مظلوم کے ساتھ بے انصافی کو ثابت کرتا ہے جب بے انصافی ثابت ہو گئی تو ظالم سے اس وقت تک زائل نہ ہو گی مگر یہ کہ مظلوم اس کے لیے اسے حلال نہ کر دے۔

جہاں تک حضرت حسن بصری کے قول کا تعلق ہے تو وہ حجت نہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من كانت له عند اخيه مظلمة في عرض او مال فليتحللها منه** (2) جس آدمی کو کسی بھائی کے ہاں عزت اور مال میں ظلم ہو تو وہ اس سے اسکے بارے میں معافی لے لے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے: جو آدمی معافی چاہے اور وہ اسے معاف نہ کرے اس کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو چیز حرام کر دی ہے وہ اسے حلال نہ کرے، ان میں سے ایک سعید بن مسیب ہیں کہا: جس نے مجھ پر ظلم کیا میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ ابن سیرین سے کہا گیا: اے ابا بکر! یہ ایسا آدمی ہے جو تجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ تو اس کی وہ غلطی معاف کر دے جو اس نے تیرے ساتھ کی ہے۔ آپ نے کہا: میں نے یہ چیز اس پر حرام نہ کی تھی کہ میں اسے اس پر حلال کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر غیبت کو حرام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیز اس پر حرام کی ہے میں اسے کبھی بھی حلال نہیں کروں گا یعنی معاف نہیں کروں گا جبکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد معاف کرنے پر دلالت کرتا ہے یہی دلیل ہے، معاف کر دینا رحمت پر دلالت کرتا ہے یہ معافی کی صورت میں ہی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ: 40)

**مسئلہ نمبر 9**۔ ایسا فاسق جو اعلانیہ فسق کرتا ہے اس کے بارے میں غیبت کا یہ حکم نہیں کیونکہ حدیث طیبہ میں ہے: **من القى جلباب الحياء فلا غيبة له** (3) جو حیاء کی چادر اتار پھینکے اسکی کوئی غیبت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

---

1۔ الترغیب والترہیب، کتاب الترهیب من الغیبة والبهت وبیانها، جلد 3، صفحہ 516

2۔ فتح الباری، جلد 10، صفحہ 173

3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الشہادات، جلد 10، صفحہ 210

اذکروا الفاجر مافیه کی یحذرہ الناس فاجر میں جو برائی ہے اس کا ذکر کرو تا کہ لوگ اس سے احتیاط کریں۔ غیبت تو اس آدمی کے بارے میں ہے جو اپنی پردہ پوشی کرتا ہے حضرت حسن بصری سے مروی ہے: ثلاث لیست لھن حرمة تین افراد ایسے ہیں جن کی کوئی حرمت نہیں (1) خواہش نفس کی غلامی کرنے والا (2) فاسق معلن (3) ظالم حاکم۔ جب حجاج مر گیا تو حضرت حسن بصری نے کہا: اے الله! تو نے اسے موت عطا کی ہے ہم سے اس کی سنت کو ختم کر دے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے عیب کو ختم کر دے کیونکہ وہ ہمارے پاس آیا جبکہ وہ رتوند کی بیماری والا اور کمزور نظر والا تھا، وہ اپنا ہاتھ چھوٹے پوروں کے ساتھ بڑھاتا الله کی قسم! الله کی راہ میں اسے پسینہ نہیں آیا اور نہ اسے غبار پہنچا وہ اپنے بالوں کو کنگھی کرتا اور چال میں تکبر کا اظہار کرتا وہ منبر پر چڑھتا اور نیچے تب اترتا جب نماز کا وقت فوت ہو چکا ہوتا، نہ الله تعالیٰ سے ڈرتا اور نہ لوگوں سے حیاء کرتا اس کے اوپر الله اور اس کے زیر کمان ایک لاکھ یا زیادہ افراد تھے اسے یہ نہ کہتا: اے انسان نماز!۔ پھر حسن بصری کہتے: هیهات حال دون ذلك السیف والسوط۔

ربیع بن صبیح نے حضرت حسن بصری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ بدعتی کی برائی کرنا کوئی غیبت نہیں۔ اس طرح تیرا قاضی کو یہ کہنا: جس سے تو اپنے حق کے بارے میں مدد لیتا ہے کہ تو اس سے اپنا حق لے لے جس نے تجھ پر ظلم کیا تو کہتا ہے: فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے یا مجھ پر غضبناک ہوا ہے یا مجھ سے خیانت کی ہے یا مجھے مارا ہے یا مجھ پر تہمت لگائی ہے یا میرے ساتھ زیادتی کی ہے یہ کوئی غیبت نہیں۔ امت کے علماء اس پر متفق ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں مجھے کہا: لصاحب الحق مقال (1) صاحب حق کو گفتگو کا حق ہے اور کہا: غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے کہا: لی الواجد یحل عرضه وعقوبته (2)۔

جو آدمی قرضہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کو سزا دینے کو حلال کر دیتا ہے اس کے بارے میں استفتاء بھی ہے جس طرح حضرت ہند نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ حضرت ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہے مجھے اتنا مال نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچے کے لیے کافی ہو میں اس کے بتائے بغیر مال لے سکتی ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں تو لے لے''۔ اس نے بخل اور ظلم کا ذکر کیا جو اس کے اور اس کے بچے کے لیے ہو۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے غیبت کرنے والا شمار نہیں کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اس کی گفتگو کو تبدیل نہ کیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فتویٰ کا جواب ارشاد فرمایا، اسی طرح اگر اس کی برائی کے ذکر میں فائدہ ہو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أما معاوية فصعلوك لا مال له وأما أبو جهم فلا يضع عصاه عن عاتقه (3) جہاں تک معاویہ کا تعلق ہے وہ کنگال ہے اس کے پاس کوئی مال نہیں اور جہاں تک ابوجہم کا تعلق ہے تو وہ بیوی پر سختی کرتا ہے یا لگاتار سفر پر رہتا ہے۔ یہ جائز ہے مقصد یہ تھا کہ فاطمہ بنت قیس ان کے بارے میں کسی دھوکہ میں نہ رہے۔ محاسبی نے یہ سب اقوال ذکر کیے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ مَيْتًا اسے مَيِّتًا بھی پڑھا گیا ہے یہ لَحْمَ سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اخ سے حال ہو اور منصوب ہو۔ جب الله تعالیٰ نے اس امر کو بیان کیا کہ ان سب سے کوئی یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے اس

1۔ صحیح بخاری، باب استقراض الإبل، جلد 1، صفحہ 322 2۔ ایضاً 3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 412

کے پیچھے اس ارشاد کا ذکر کیا فَكَرِهْتُمُوْهُ اس میں دو توجیہیں ہیں (1) تم مردار کو کھانا ناپسند کرتے ہو اسی طرح غیبت کرنا بھی تمہارے لیے مکروہ کر دیا گیا ہے؛ مجاہد سے بھی یہی معنی مروی ہے۔

(2) تم یہ ناپسند کرو کہ لوگ تمہاری غیبت کریں تو لوگوں کی غیبت کو تم بھی ناپسند کرو۔ فراء نے کہا: یعنی جب تم اسے ناپسند کرتے ہو تو ایسا نہ کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لفظ تو خبر کا ہے معنی امر کا ہے یعنی تم اسے ناپسند کرو وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس پر اس کا عطف ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا عطف اجْتَنِبُوْا اور لَا تَجَسَّسُوْا پر ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

''اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان تا کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم سے زیادہ متقی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور خبیر ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء ہے (1)۔ یہ آیت ابی ہند کے بارے میں نازل ہوئی، ابو داؤد نے اسے مرسل میں ذکر کیا ہے۔ عمرو بن عثمان اور کثیر بن عبید، بقیہ بن ولید وہ زہری سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی بیاضہ کو حکم دیا کہ وہ ابو ہند کی شادی اپنی کسی عورت سے کر دیں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: ہم اپنی بیٹیوں کی شادیاں اپنے غلاموں سے کریں، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

زہری نے کہا: یہ آیت خاص کر ابو ہند کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حق میں نازل ہوئی (2) جو انہوں نے اس آدمی کے بارے میں کہا تھا جس نے جگہ نہ دی: اے فلاں کے بیٹے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: فلانہ کا ذکر کرنے والا کون تھا؟ ثابت نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قوم کے چہرے دیکھو'' اس نے لوگوں کی طرف دیکھا فرمایا: تو نے کیا دیکھا؟'' اس نے عرض کی: میں نے سفید، سیاہ اور سرخ رنگ کے چہرے دیکھے ہیں فرمایا: ''تو ان سے تقویٰ کے بغیر فضیلت حاصل نہیں کر سکتا'' تو یہ آیت نازل ہوئی: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ (المجادلہ: 11)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا یہاں تک کہ وہ بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھے اور آذان دی تو عتاب بن اسید بن ابی العیص نے کہا: اس اللہ تعالیٰ کے لیے تمام تر حمد یں ہیں جس نے میرے والد کی روح کو قبض کر لیا یہاں تک کہ اس نے یہ دن نہ دیکھا۔

1۔ تفسیر کشاف، سورۃ الذاریات، جلد 4، صفحہ 374 2۔ جامع اسباب النزول، صفحہ 326

حارث بن ہشام نے کہا: محمد کو اس کالے کوے کے سوا کوئی مؤذن نہ ملا تھا۔ سہیل بن عمرو نے کہا: اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے تبدیل کر دیتا ہے۔

ابوسفیان نے کہا: میں تو کچھ نہیں کہتا میں تو ڈرتا ہوں اللہ تعالیٰ اسے سب کچھ بتا دے گا۔ جبریل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے جو کہا تھا وہ بتا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا انہوں نے جو کہا تھا اس کے بارے میں پوچھا سب نے اس کا اقرار کر لیا اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا، انہیں نسبوں پر فخر کرنے، مال کی کثرت میں مقابلہ کرنے اور فقراء کو ذلیل کرنے سے جھڑکا کیونکہ دارومدار تقویٰ پر ہے یعنی سب حضرت آدم اور حضرت حواء کی اولاد میں سے ہیں بے شک فضیلت تقویٰ کی بنا پر ہے۔

ترمذی میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے(1) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں خطبہ دیا فرمایا: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت اور آباء پر فخر کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے'' لوگ دو قسم کے ہیں (1) ایسا آدمی جو نیک، متقی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں محترم ہے (2) دوسرا فاجر، شقی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کمزور۔ لوگ حضرت آدمی علیہ السلام کی اولاد ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور یہ آیت: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۝ پڑھی اسے عبداللہ بن جعفر جو علی بن مدینی کے والد ہیں سے نقل کیا وہ ضعیف ہے اسے یحییٰ بن معین اور دوسرے علماء نے ضعیف قرار دیا ہے طبری نے اسے کتاب آداب النفوس میں نقل کیا ہے۔

یعقوب بن ابراہیم، اسماعیل سے وہ سعید جریری سے وہ ابونضرہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: مجھے اس نے بتایا جو اس وقت حاضر تھا جب رسول باللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ پر سوار ہو کر ایام تشریق کے درمیانی دن خطبہ ارشاد فرمایا تھا فرمایا: ''اے لوگو! خبردار تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں اور سرخ کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔ کیا میں نے تمہیں پیغام دیا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''حاضر غائب کو پہنچا دے''۔

اس بارے میں مالک اشعری سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے حسب کو دیکھتا ہے وہ تمہارے نسب کو نہیں دیکھتا، وہ تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا تمہارے دلوں دیکھتا ہے جس کا صالح دل ہو اللہ تعالیٰ اس پر شفقت فرماتا ہے تم حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور تم میں سے سب سے محبوب وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے''(2)۔

حضرت علی شیر خدا سے اس معنی میں شعر مشہور ہیں:

النّاس من جهة التمثيل أكفاء	أبوهم آدمُ والأمّ حوّاء

لوگ ڈھانچے کے اعتبار سے برابر ہیں ان کے باپ حضرت آدم اور ماں حواء ہیں۔

1۔ جامع ترمذی، باب التفسیر، سورۂ حجرات، جلد 2، صفحہ 159

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، جلد 2، صفحہ 317

نفس کنفس وأرواحٌ مشاکلۃٌ		وأعظمٌ خُلقت فیھم وأعضاء

نفس نفس کی طرح ہے اور روحیں ایک جیسی ہیں ان میں ہڈیاں اور اعضاء بنائے گئے ہیں۔

فان یکن لھم من أصلھم حسبٌ		یفاخرون بہ فالطین والماء

اگر ان کی اصل میں کوئی ذی شان چیز ہے جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں تو وہ مٹی اور پانی ہے۔

ما الفضل إلا لأھل العلم إنھم		علی الھدیٰ لمن استھدی أدلاء

فضیلت اہل علم کے لیے ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہے ان کے لیے یہ ہدایت پر راہنما ہیں۔

وقدرُ کلِ امرئ ما کان یحسنہ		وللرجال علی الأفعال سیماء

ہر انسان کی اتنی قدر و منزلت ہے جس قدر وہ اچھا کام کرتا ہے اور افعال پر لوگوں کے نشانات ہوتے ہیں۔

وضدُّ کلّ امرئ ماکان یجھلہ		والجاھلون لأھل العلم أعداء

انسان کی دشمن وہ چیز ہے جس سے وہ جاہل ہوتا ہے اور جاہل اہل علم کے دشمن ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وضاحت کی ہے کہ اس نے مخلوقات کو مذکر اور مونث سے پیدا کیا۔ سورۃ النساء کے آغاز میں یہی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان دونوں کے بغیر پیدا کر دیتا جس طرح اس نے حضرت آدم کو پیدا کیا یا مذکر کے بغیر پیدا کرتا جس طرح اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا ہے یا مونث کے بغیر پیدا کرتا جس طرح حضرت حواء کو پیدا کیا یعنی دو جہتوں میں سے ایک جہت موجود تھی یہ قدرت میں جائز ہے وجود اس کے مطابق نہیں۔ یہ خبر آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو حضرت آدم کی ایک پسلی سے پیدا کیا؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ نے مذکر اور مونث میں انساب، اصہار، قبائل اور شعوب (چھوٹے قبائل) بنائے (1) اور ان سے انکی پہچان کو ظاہر کیا اور ان کے ذریعے ان میں تعلق جوڑا اس حکمت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر کی اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں خوب آگاہ ہے ہر ایک ان کے نسب کو جامع ہے جب کوئی آدمی اس نسب کی نفی کرتا ہے تو تہمت لگانے کی وجہ سے وہ حد کا مستحق ہوتا ہے جس طرح اس کی جماعت اور اس کے حسب سے نفی کرے۔

وہ عربی کو کہتا ہے: اے عجمی! اور عجمی کو کہتا ہے: اے عربی! وغیرہ جس سے حقیقت میں نفی واقع ہو۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ متقدمین علماء اس طرف گئے ہیں کہ جنین صرف مرد کے پانی سے ہوتا ہے اور ماں کے رحم میں پرورش پاتا رہتا ہے اور اس خون سے مدد لیتا ہے جو اس میں ہوتا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: **اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾** (المرسلات) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۸﴾** (السجدہ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾** (القیامۃ: 35) یہ آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ پیدائش ایک پانی سے ہے جبکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش مرد اور عورت کے پانی سے ہوتی ہے وہ اس آیت سے ثابت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1725

ہے کیونکہ یہ ایسی نص ہے جو تاویل کا احتمال نہیں رکھتی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (الطارق) اس سے مراد مردوں کی پشتیں اور عورت کی سینے کی ہڈیاں ہیں جس کی وضاحت بعد میں آئی گی۔

جس چیز سے انہوں نے استدلال کیا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ماء، سلالہ اور نطفہ سے پیدا کیا ہے اسے والدین میں سے کسی کی طرف منسوب نہیں کیا اس نے اس چیز پر دلالت کی کہ ماء (پانی) اور سلالہ (نکلنے والی چیز) دونوں کا ہے اور نطفہ بھی دونوں کا ہے کیونکہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ اسی پر دلیل ہے۔ عورت سے مادہ منویہ خارج ہوتا ہے جس طرح مرد سے مادہ منویہ خارج ہوتا ہے اسی وجہ سے مشابہت ہوتی ہے جس کی وضاحت سورۂ شوریٰ میں گذر چکی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں کہا: فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (القمر) مراد آسمان کا پانی اور زمین کا پانی ہے کیونکہ ملنا دو پانیوں سے ہی ہو سکتا ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا: ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (السجدۃ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (المرسلات)

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا شعوب سے مراد قبائل کے رءوس (رأس کی جمع) ہیں جس طرح ربیعہ، مضر، اوس، خزرج اس کا واحد شعب ہے انہیں یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ بکھرتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں جس طرح درخت کی ٹہنیاں بکھرتی ہیں۔ شعب اضداد میں سے ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: شعبته۔ میں نے اسے جمع کیا اسی سے مشعب کا لفظ ہے برما، کیونکہ اس کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فکاب علی حر الجبین ومتق بمدریة کانہ ذلق مشعب

شعر میں مشعب کا معنی برما ہے۔

و شعبته۔ جب تو اسے جدا کرے، اسی وجہ سے موت کو شعوب کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ جدا کرنے والی ہوتی ہے۔ جہاں تک الشعب کا تعلق ہے تو پہاڑ میں جو راستہ ہوتا ہے اسے شِعب کہتے ہیں اس کی جمع شعاب آتی ہے۔ جوہری نے کہا: الشِعب سے مراد جس سے عرب اور عجم کے قبائل جدا ہوتے ہیں اس کی جمع شعوب ہے الشعوبیۃ۔ ایسا فرقہ جو عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں دیتا جہاں تک اس لفظ کا تعلق ہے جو حدیث میں ہے ان رجلا من الشعوب أسلم۔ مراد عجمی ہے یعنی عجمیوں میں سے ایک آدمی اسلام لایا۔ شَعب سے مراد عظیم قبیلہ ہے؛ وہ ابو القبائل ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتے ہیں یعنی وہ انہیں جمع کرتا ہے اور انہیں اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الشعوب سے مراد جمہور ہے جس طرح مضر (1)۔ قبائل سے افخاذ ہیں چھوٹا قبیلہ۔ مجاہد نے کہا: الشعوب جو نسب میں دور ہیں قبائل اس سے چھوٹے ہوتے ہیں (2)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ شعوب سے مراد قریبی نسب ہے۔ قتادہ کا قول ہے: مہدوی نے پہلا قول اس سے نقل کیا ہے، دوسرا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

رأیت سعودا من شعوب کثیرۃ فلم أر سعدا مثل سعد بن مالک

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 160 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 336

میں نے کثیر قبائل سے سعد دیکھے اور ان میں سے سعد بن مالک جیسا کوئی سعد نہیں دیکھا۔ ایک اور نے کہا:

قبائل من شعوب لیس فیهم کریم قد یُعَدّ ولا نجیب

کئی قبائل ایسے ہیں جن میں کریم اور نجیب نہیں جسے شمار کیا جا سکے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: شعوب سے مراد یمن کے عرب ہیں جو قحطانی ہیں اور قبائل سے مراد ربیعہ، مضر اور عدنانی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شعوب سے مراد عجم کے قبائل ہیں اور قبائل سے مراد عرب ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں کہا کہ شعوب سے مراد موالی اور قبائل سے مراد عرب ہیں۔ قشیری نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر شعوب وہ ہوں گے جن کی اصل معروف نہ ہو جس طرح ہندی، حبشی اور ترک ہیں اور قبائل سے مراد عرب ہے جو تعلق رکھتے ہوں۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ شعوب سے مراد وہ ہو جو اطراف اور گھاٹیوں کی طرف منسوب ہو اور قبائل انہیں کہیں جو نسب میں شریک ہوں۔ شاعر نے کہا:

تفرّقوا شُعَبًا فکل جزیرة فیها أمیر المؤمنین ومنبر

وہ گھاٹیوں میں بکھر گئے تو ہر جزیرہ میں امیر المومنین اور منبر تھا۔

ابو عبید نے ابن کلبی سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں: شعب یہ قبیلہ سے بڑا ہوتا ہے، قبیلہ کے بعد فصیلہ، فصیلہ کے بعد عمارہ، عمارہ کے بعد بطن اور بطن کے بعد فخذ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شعب پھر قبیلہ پھر عمارہ پھر بطن پھر فخذ پھر فصیلہ اور پھر عشیرہ ہوتا ہے۔ ایک ادیب نے یوں منظم کیا ہے، کہا:

إقصد الشّعب فهو أکثر حَیّ عددًا فی الحواء ثم القبیلة

ثم تتلوها العمارة ثم ال بطن والفخذ بعد ها والفصیلة

ثم من بعدها العشیرة لکن هی فی جنب ماذکرناه قلیلة

اور ایک شاعر نے کہا:

قبیلة قبلها شَعْب وبعدها عِمارة ثم بَطْنٌ تِلْوُهٗ فَخِذٌ

ولیس یؤوی الفتیٰ إلا فصیلة ولا سداد لِسَهْم مالد قُذَذُ

قبیلہ سے پہلے شعب ہے اور اس کے بعد عمارہ ہے اس کے بعد بطن ہے اس کے پیچھے فخذ ہے نوجوان کو پناہ فصیلہ دیتا ہے، جس تیر کے پرنہ ہوں وہ سیدھا نہیں جاتا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ سورۂ زخرف میں یہ بحث وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ کے تحت گذر چکی ہے۔ اس آیت میں یہ چیز موجود ہے جو تیری اس امر پر راہنمائی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ہاں تقویٰ کی ہی رعایت کی جاتی ہے حسب اور نسب کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اسے اَنَّ پڑھا گیا ہے گویا کہا گیا: وہ انساب پر کیوں فخر کرتے ہیں؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے ہاں تم میں سے سب سے معزز تم میں سے سب سے متقی ہیں تم میں نسب والے معزز نہیں۔

ترمذی میں حضرت سمرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے (1)'' کہا: یہ حدیث غریب صحیح ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف ہی راجع ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نص آئی ہے: من سرہ ان یکون أکرم الناس فلیتق اللہ جو یہ پسند کرے کہ وہ لوگوں میں سے زیادہ محترم ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ تقویٰ سے مراد ہے امر و نہی میں اللہ تعالیٰ کی حدود کی رعایت کرنا اور اس چیز سے متصف ہونا جس سے متصف ہونے کا حکم دیا اور اس سے بچنا جس سے تجھے منع کیا۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إن اللہ تعالی یقول یوم القیمۃ إنی جعلت نسبًا و جعلتم نسبا فجعلت أکرمکم أتقاکم فأبیتم إلا أن تقولوا فلان بن فلان وأنا الیوم أرفع نسبی وأضع أنسابکم أین المتقون أین المتقون (2)۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں نے نسب بنایا اور تم نے بھی نسب بنایا، میں نے نسب بنایا تم میں سے سب سے معزز وہ ہوگا جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہوگا اور تم نے انکار کر دیا مگر یہ کہ تم کہو: فلاں بن فلاں، میں آج اپنے بنائے گئے نسب کو بلند کروں گا اور تمہارے نسبوں کو پست کروں گا متقی کہاں ہیں؟ متقی کہاں ہیں؟۔

طبری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز میرے اولیاء متقین ہوں گے اگرچہ کوئی نسب میرے نسب کے زیادہ قریبی ہو لوگ اعمال لائیں گے اور تم دنیا لاؤ گے جو تم اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے ہو گے تم کہو گے: اے محمد! میں اس طرح اس طرح کروں گا'' اور اپنی دونوں جانب اعراض کیا۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث ہے کہ میں نے رازداری کے عالم میں نہیں بلکہ بلند آواز سے آپکو کہتے ہوئے سنا: إن آل أبی لیسوا لی بأولیاء إنما ولیی اللہ و صالح المومنین (3)۔ میرے والد کی آل میرے اولیاء نہیں بے شک میرا ولی اللہ اور نیک مومن ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: من أکرم الناس لوگوں میں سے سب سے معزز کون ہے؟ فرمایا: ''یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم'' عرض کی: ہم نے اس بارے میں آپ سے نہیں پوچھا فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے معزز ان میں سے متقی ہیں'' عرض کی: ہم یہ بھی آپ سے نہیں پوچھ رہے فرمایا: ''تم عرب کے معادن کے بارے میں پوچھتے ہو؟ ان میں سے دور جاہلیت میں جو بہترین تھے وہ دور اسلام میں بہتر ہیں جب وہ دین سمجھ جائیں'' علماء نے یہ اشعار پڑھے:

ما یصنع العبد بعز الغنی والعز کل العز للمتقی

من عرف اللہ فلم تغنہ معرفۃ اللہ فذاک الشقی

بندہ مال و دولت کی عزت کو کیا کرے گا عزت تو سب کی سب متقی کے لیے ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اسے کوئی فائدہ نہ دے تو وہ بد بخت ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 160 2۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 93 3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 886

**مسئلہ نمبر 7**۔ طبری نے یہ ذکر کیا ہے کہ عمر بن محمد، عبید بن اسحاق، عطار سے وہ مندل بن علی سے وہ ثور بن یزید سے وہ سالم بن ابی جعد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک انصاری نے ایک عورت سے شادی کی تو اس عورت پر اس کے حسب میں طعن کیا گیا اس آدمی نے کہا: میں نے اس کے حسب کی وجہ سے اس سے شادی نہیں کی میں نے اس سے شادی اس کے دین اور خلق کی وجہ سے کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تجھے یہ چیز کوئی تکلیف نہیں دیتی کہ وہ حاجب بن زرارہ کی آل میں سے نہ ہو'' پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اسلام لے آیا ہے اس کے ذریعے اس نے خسیسہ کو بلند کر دیا، ناقصہ کو مکمل کر دیا ہے اس کے ذریعے ملامت کو دور کر دیا مسلمان پر کوئی ملامت نہیں ملامت تو جاہلیت کی علامت ہے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إني لأرجو أن أكون أخشاكم وأعلمكم بما أتقي (1) میں امید کرتا ہوں کہ میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور جس چیز سے میں بچتا ہوں اس کے بارے میں تم سے زیادہ آگاہ ہوں۔ اسی وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ معزز تھے۔ ابن عربی نے کہا: یہی وہ چیز ہے جسے امام مالک نے نکاح میں کفو کے طور پر معتبر جانا ہے۔ عبداللہ نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ غلام عربی عورت سے شادی کر سکتا ہے اور اس آیت سے استدلال کیا۔

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: حسب اور مال کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ جو ان صحابہ میں سے تھے جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے نے حضرت سالم کو اپنا متبنی بنایا اور اس کی شادی اپنی بھتیجی یعنی ہند بنت ولید جو ان کے بھائی ولید بن عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی تھی سے کر دی یہ ایک انصاری عورت کے غلام تھے حضرت ضباعہ بنت زبیر یہ حضرت مقداد بن اسود کے عقد میں تھیں۔

میں کہتا ہوں: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی بہن حضرت بلال کے عقد میں تھیں۔ حضرت زینب بنت جحش حضرت زید بن حارثہ کے عقد میں تھیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کا عقد نکاح عربی عورت سے جائز ہے دین میں کفو کا اعتبار کیا جائے گا اس پر دلیل وہ روایت ہے جو سہل بن سعد سے صحیح بخاری میں مروی ہے (2) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی گذرا پوچھا: ''تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' صحابہ نے عرض کی: یہ اس لائق ہے کہ اگر دعوت نکاح دی تو اس کے ساتھ نکاح کیا جائے، اگر سفارش کرے تو مانی جائے، اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے تو آپ کے پاس سے مسلمان فقراء میں سے ایک آدمی گذرا پوچھا: ''تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' صحابہ نے عرض کی: یہ اس لائق ہے اگر دعوت نکاح دے تو اس کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے، اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش نہ مانی جائے، اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ آدمی دوسرے کی بنسبت زمین بھر کے لوگوں سے بہتر ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عورت سے نکاح اس کے مال، جمال اور دین کی وجہ سے کیا جاتا ہے (3)'' ایک روایت میں ہے اس کے حسب کی وجہ سے کیا جاتا ہے تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں تو دیندار کو لازم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1726 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، الاکفاء فی الدین، جلد 2، صفحہ 762

پکڑ۔ حضرت سلمان فارسی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی بیٹی کے لیے دعوت نکاح دی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ حضرت عمر کو ان کی بیٹی کے لیے دعوت نکاح دی تو آپ نے توجہ نہ کی پھر حضرت عمر نے حضرت سلمان فارسی سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں تو حضرت سلمان فارسی نے ایسا نہ کیا۔ حضرت بلال نے بکیر کی بیٹی کو دعوت نکاح بھیجی تو اس کے بھائیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت بلال نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بنی بکیر سے کیا پایا ہے میں نے انہیں انکی بہن کے بارے میں دعوت نکاح دی تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مجھے اذیت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کی وجہ سے ناراض ہو گئے۔ بنی بکیر کو یہ خبر پہنچی وہ اپنی بہن کے پاس آئے انہوں نے کہا: ہمیں تیری وجہ سے کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے؟ ان کی بہن نے کہا: اس کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے تو بھائیوں نے بہن کی شادی حضرت بلال سے کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حجامت جب ابو ہند نے کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابو ہند کی شادی کر دو، ان کی شادی کر دو'' یہ بنو بیاضہ کا غلام تھا (1)۔

دار قطنی میں زہری کی حدیث عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ بنی بیاضہ کا غلام ابو ہند حجام تھا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حجامت کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسے یہ بات خوش کرے کہ اسے دیکھے کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو نقش کر دیا ہے تو وہ ابو ہند کو دیکھے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس کا نکاح کر دو، اس کا نکاح کر دو'' (2)۔

قشیری ابو نصر نے کہا: نکاح کرتے وقت کفو میں نسب کا اعتبار کیا جاتا ہے جبکہ نکاح شجر نبوت کے ساتھ اتصال ہے یا علماء کے ساتھ جو انبیاء کے وارث ہیں یا جو زہد اور صالحیت میں قابل قدر ہیں متقی مومن فاجر اعلیٰ نسب والے سے بہتر ہے۔ اگر دونوں متقی ہیں تو اس وقت اعلیٰ نسب والے کو مقدم کیا جائے گا جس طرح نماز کی امامت کے لیے نوجوان کو بوڑھے پر مقدم کیا جاتا ہے جب تقویٰ میں برابر ہوں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''اعراب کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے، آپ فرمایئے: تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا، اور اگر تم (سچے دل سے) اطاعت کرو گے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ ذرا کمی نہیں کرے گا تمہارے اعمال میں، بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

یہ آیت بنی اسد بن خزیمہ کے بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی (3) وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خشک سالی کے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الاکفاء، حدیث نمبر 1798، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 300
3۔ جامع اسباب النزول، صفحہ 327

دور میں آئے انہوں نے ایمان لانے کا اظہار کیا وہ مخفی طور پر مومن نہ تھے انہوں نے مدینہ طیبہ کے راستے غلاظتوں میں بھر دیئے اور بھاؤ کو بڑھا دیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کرتے تھے، ہم سامان اور عیال کے ساتھ آئے ہیں ہم تمہارے ساتھ جنگ نہیں کریں گے جس طرح بنوفلاں نے آپ سے جنگ کی ہمیں صدقہ دیجئے وہ آپ پر احسان جتلانے لگے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ان بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی کہ ہجرت سے قبل ہی انہیں مہاجر کا نام دیا جائے اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا کہ ان کا نام بدو ہے وہ مہاجر نہیں (1)۔ سدی نے کہا: یہ آیت ان بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی جن کا ذکر سورۂ فتح میں ہے یعنی مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار، دیل اور اشجع (2)۔ انہوں نے کہا: ہم ایمان لائے، تاکہ ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں جب انہیں مدینہ طیبہ کی طرف آنے کو کہا گیا تو وہ نہ آئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

خلاصہ کلام یہ ہے: آیت بعض عربوں کے لیے خاص ہے کیونکہ ان میں سے کچھ اللہ اور یوم آخرت پر اسی طرح ایمان لائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔

**وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا** کا معنی ہے ہم نے قتل اور قیدی بنائے جانے کے خوف سے تابعداری کی۔ یہ منافقوں کی صفت ہے کیونکہ وہ ظاہری طور پر ایمان لائے تھے ان کے دل ایمان نہیں لائے تھے جبکہ ایمان کی حقیقت تصدیق قلبی ہے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ظاہر میں اس چیز کو قبول کرنا جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں یہ جان کی حفاظت عطا کرتا ہے۔

**وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ** یعنی اگر تم ایمان میں اخلاص کا مظاہرہ کرتے **لَا یَلِتْكُمْ** تو تمہیں کوئی نقصان نہ دیتا یہ باب اس طرح ہے لاته يَليته ويلوته، اس میں کمی کرنا۔ ابو عمرو نے اسے لا يألتكم پڑھا ہے یعنی ہمزہ ہے اس وقت یہ ألت يألت ألتا سے مشتق ہے؛ یہ ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے وہ اس قول پر اعتبار کرتے ہیں: **وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ** (الطور: 21)

شاعر نے کہا:

أبلِغْ بنى ثُعلٍ عنى مُغَلْغَلَةً　　جَهْدَ الرِّسَالة لا أَلْتًا ولا كَذِبَا

میری جانب سے بنی ثعل کو سختی سے پیغام پہنچا دو نہ اس میں کمی ہو اور نہ ہی کوئی جھوٹ ملا ہو۔

پہلا قول ابو عبید نے پسند کیا ہے۔ رؤبہ نے کہا:

وليلةٍ ذاتِ نَدًى سَرَيْتُ　　ولم يَلِتْنِى عن سُرَاها لَيْتُ (3)

یعنی ان راتوں میں چلنے سے مجھے کسی مانع نے نہیں روکا؛ اسی طرح الاته عن وجهه ہے فعل اور أفعل دونوں ایک معنی میں ہیں یہ جملہ بھی کہا جاتا ہے: ما ألاته من عمله شيأ، یعنی میں نے اس میں کمی نہیں کی، یہ التهكى مثل ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ یہ شعر پڑھا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 337　　2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 230　　3۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 338

ویاکلن ما اغنی الولیُ فلم یَلِث　　کأن بحافات النِهاء المَدَارعا

اس میں اغنی، انبت کے معنی میں ہے اور فلم یلت لم ینقص منه شیأ کے معنی میں ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما اَغنَت الارض شیأ زمین نے کوئی چیز نہیں اگائی۔ الولی سے مراد وسمی (موسم بہار کی پہلی بارش) کے بعد جو بارش ہوتی ہے۔ اسے ولی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ وسمی کے بعد ہوتی ہے یہ نہیں فرمایا: لا یألتاکم کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

"(کامل) ایماندار تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اللہ اور اس کے رسول پر (اس میں) کبھی شک نہیں کیا اور جہاد کرتے رہے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں، یہی لوگ راست باز ہیں۔ آپ فرمایئے: کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ کو اپنے دین سے، حالانکہ اللہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے"۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا یعنی انہوں نے تصدیق کی اور انہوں نے شک نہ کیا اور اسے جہاد اور اعمال صالحہ کے ساتھ سچ کر دکھایا۔

اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وہ ایمان میں سچے ہیں وہ وہ نہیں جو قتل کے ڈر اور مال کی امید کی وجہ سے مسلمان ہوئے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بدوؤں نے قسم اٹھائی کہ وہ مخفی اور اعلانیہ ایمان دار ہیں اور جھوٹ بولا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ یعنی جس دین پر تم ہو تم اللہ تعالیٰ کو اس بارے میں بتاتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسے جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔

یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

"وہ احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ وہ اسلام لے آئے، فرمایئے: مجھ پر مت احسان جتلاؤ اپنے اسلام کا بلکہ اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا تم پر کہ تمہیں ایمان کی ہدایت بخشی اگر تم ایمان کے دعویٰ میں سچے ہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے سب چھپے بھیدوں کو خوب جانتا ہے، اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو"۔

یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا یہ ان کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: جئناک بالاثقال والعیال ہم آپ کی خدمت میں

کل ساز وسامان اور بال بچے لے کر آ گئے ہیں اَنْ محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہے لأن اسلموا، قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ یہاں علی، باء کے معنی میں ہے بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ، اَنْ محل نصب میں ہے تقدیر کلام بان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام لأن ہے حضرت عبداللہ کے مصحف میں اذھداکم ہے اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یعنی اگر تم اس امر میں سچے ہو کہ تم ایماندار ہو۔ عاصم نے اسے اِن ھداکم پڑھا ہے یہ قول اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کی وجہ سے حقیقت سے بعید ہے یہ نہیں کہا جاتا: یمن علیکم ان یھدیکم ان صدقتم ظاہر قراءت اَنْ هَدٰىکُمْ ہے یہ امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مومن تھے کیونکہ تقدیر کلام یہ ہے ان آمنتم فذلك منّة الله علیکم اگر تم ایمان لائے ہو تو یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ابن کثیر، ابن محیصن اور ابو عمرو نے یاء کے ساتھ خبر کے طور پر پڑھا ہے یعنی یعلمون۔ یہ ان کے قول کا رد ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علی سید المرسلین

اس جلد کے ترجمہ کا اختتام بروز منگل 18 ستمبر 2007 بعد از نماز ظہر کو ہوا الحمد للہ اولاً و آخراً۔

محمد بوستان

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد نہم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مُترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیرِ اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد نہم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیر اہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، بار اول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# سورۂ ق

﴿ آیاتہا ۴۵ ﴾ ﴿ ۵۰ سورۃ ق مکیۃ ۳۴ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ۳ ﴾

یہ سورت تمام کی تمام مکی ہے۔ اس کی پینتالیس آیات ہیں۔

حضرت حسن بصری، عطا، عکرمہ اور حضرت جابر کے نزدیک تمام سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: صرف ایک آیت مکی نہیں، وہ یہ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ صحیح مسلم میں ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان سے مروی ہے کہا: ہمارا تنور اور رسول الله صلى الله عليه وسلم کا تنور ایک ہی تھا یہ سلسلہ دو سال تک رہا یا ایک سال اور اس کا کچھ حصہ۔ میں نے قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ سورت نبی کریم صلى الله عليه وسلم کی زبان سے سیکھی آپ اسے ہر جمعہ کو منبر پر بیٹھ کر خطبہ میں پڑھا کرتے تھے، جب آپ لوگوں کو خطاب فرمایا کرتے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابو واقد لیثی سے پوچھا: رسول اللہ صلى الله عليه وسلم عید قربان اور عید الفطر میں کیا تلاوت کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا: آپ صلى الله عليه وسلم ان میں قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) تلاوت کیا کرتے تھے۔ بعد میں آپ کی نماز مختصر ہوگئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝

"قاف، قسم ہے قرآن مجید کی (کہ میرا رسول سچا ہے) مگر یہ (نادان) حیران ہیں اس بات پر کہ آیا ہے ان کے پاس ڈرانے والا ان میں سے، تو کہنے لگے کفار یہ تو بڑی عجیب وغریب بات ہے۔ (وہ کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ کیے جائیں گے) یہ واپسی تو (عقل سے) بعید ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں جو زمین ان کے جسموں سے گھٹاتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے، بلکہ انہوں نے جھٹلایا (دین) حق کو جب وہ ان کے پاس آیا پس اس وجہ سے وہ بڑی الجھن میں پھنس گئے ہیں"۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ عام قرأت قاف میں جزم کے ساتھ ہے۔ حضرت حسن بصری، ابن ابی اسحاق اور نصیر بن عاصم

نے قافِ پڑھا ہے کیونکہ کسرہ، جزم کا بھائی ہے جب اس کا آخر ساکن ہوا تو کسرہ کے ساتھ اسے حرکت دی۔ عیسیٰ ثقفی نے فاء کو فتحہ دیا ہے اسے خفیف ترین حرکت دی ہے۔ ہارون اور محمد بن سمیقع نے قافُ ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ عموماً یہ مبنی کی حرکت ہوتی ہے جس طرح منذ، قط، قبل اور بعد ہے۔ ق کے معنی میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟

ابن زید، عکرمہ اور ضحاک نے کہا: یہ ایسا پہاڑ ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے جو سبز زمرد کا ہے اس کی وجہ سے آسمان سبز ہے۔ آسمان کے دونوں کنارے اس پر ہیں۔ آسمان اس پر قبہ کی صورت میں ہے لوگوں کو جو زمرد ملتا ہے وہ اسی پہاڑ سے گرا ہے☆۔ ابو جوزاء نے اسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فراء نے کہا: اس تعبیر کی صورت میں ق پر اعراب کو ظاہر کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ اسم ہے حروف تہجی میں سے نہیں ہے شاید اس کے اسم میں سے صرف قاف کو ذکر کیا گیا ہے جس طرح شاعر کا قول ہے:

قلتُ لہا قفی فقالتْ قافْ (1) میں نے اسے کہا: تو ٹھہر جا، تو اس نے کہا: قاف یعنی میں ٹھہر گئی۔

یہ اچھی تعبیر ہے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ وہیب نے کہا: ذوالقرنین نے جبل قاف سے جھانکا اس نے اس کے نیچے چھوٹے پہاڑ دیکھے۔ ذوالقرنین نے کہا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں قاف ہوں۔ پوچھا: یہ تیرے اردگرد کون سے پہاڑ ہیں؟ اس نے جواب دیا: یہ میری رگیں ہیں کوئی شہر نہیں مگر اس میں میری رگوں میں سے ایک رگ ہے جب اللہ تعالیٰ کسی شہر میں زلزلہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مجھے حکم دیتا ہے تو میں اس رگ کو حرکت دیتا ہوں تو اس علاقہ میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ ذوالقرنین نے کہا: اے قاف! تو مجھے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں کچھ بتا۔ اس نے کہا: میرے رب کی شان عظیم ہے، میرے پیچھے زمین ہے، جس کی مسافت پانچ سو سال ضرب پانچ سو سال کی مسافت ہے، یہ پہاڑ برف کے ہیں وہ ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو جہنم کی آگ اس زمین کو جلا کر رکھ دیتی۔ یہ تعبیر اس امر پر دال ہے کہ جہنم روئے زمین پر ہے اس کی جگہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ زمین کے کس کونہ میں ہے۔ ذوالقرنین نے کہا: میرے لیے اور کچھ بیان کرو۔ کہا: جبریل امین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہے وہ سخت گھبرایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہر دفعہ کی کپکپی سے ایک لاکھ فرشتہ پیدا فرماتا ہے، وہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہیں اپنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں کلام کا اذن دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ صَفًّا ۚ لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ۝ (النباء) سے یہی مراد ہے یعنی وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: ق کا معنی ہے فیصلہ ہو چکا جس طرح حم کا معنی ہے معاملہ گرم ہو چکا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ق اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس کے ساتھ قسم اٹھائی ہے۔ ان سے یہ بھی منقول ہے: یہ قرآن کے ناموں مس سے نام ہے (2)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ قرظی نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں قدیر،

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 170 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 339

☆ سب سے بہتر تعبیر وہ ہے جو قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں بیان کی ہے کہ یہ حروف تہجی کے اسماء ہیں اور اس پر ایک لطیف بحث فرمائی ہے۔

قاھر، قریب، قاضی اور قابض کا آغاز ہے(1)۔ شعبی نے کہا: یہ سورت کا آغاز ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا: اس کا معنی ہے ہمارے امر اور ہماری نہی پر رک جا اور ان سے تجاوز نہ کر۔ محمد بن عاصم انطا کی نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے قرب ہے۔ اس کی وضاحت اس آیت میں بھی ہے وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝ ابن عطا نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی قسم اٹھائی ہے کیونکہ اس دل نے خطاب کا بوجھ اٹھایا یعنی حامل قرآن بنا۔ اور آپ کے دل کی حالت کی بلندی کی وجہ سے اس میں کسی گرانی کا اثر نہ چھوڑا۔

وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بلند شان والا۔ ایک قول یہ کیا ہے: الْمَجِيْدِ کا معنی الکریم ہے(2)؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی کثیر ہے، یہ قدر و منزلت کی کثرت سے ماخوذ ہے(3)، یہ کثرت تعداد سے ماخوذ نہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: کثیر فلان فی النفوس اس ضمن میں مشہور ضرب المثل ہے فی کل شجر نار و استمجد المرخ والعفار یعنی ہر درخت میں آگ ہے اور مرخ اور عفار تمام درختوں پر بڑھ گئیں؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ اس کے جواب قسم کے بارے میں یہ قول کیا گیا ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ یعنی لام مقدر کا ارادہ کیا اصل کلام یوں تھی لقد علمنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب قسم اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى ہے؛ یہ ترمذی محمد بن علی کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کہا: قٓ ایسے اسم کے ساتھ قسم ہے جو عظیم اسماء میں سے ہے جو بندوں کے لیے ظاہر ہوئے وہ قدرت ہے نیز قرآن مجید کی قسم اٹھائی، پھر اسے بیان کیا جو قدرت سے ظاہر ہوا یعنی آسمانوں، زمین، بندوں کے رزقوں، انسانوں کو پیدا کرنا، یوم قیامت کی صفت، جنت اور دوزخ سب قدرت کے کرشمے ہیں۔ پھر فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ تو قسم اس کلمہ پر واقع ہوئی گویا فرمایا: ق یعنی قدرت اور قرآن مجید کی میں نے قسم اٹھائی ہے کہ اس سورت میں جو میں نے بیان کیا ہے یہ نصیحت ہے اس کے لیے جس کا دل بینا ہو یا وہ توجہ سے سنے اور حاضر دماغ بھی ہو۔ ابن کیسان نے کہا: اس کا جواب مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ ہے۔

اہل کوفہ نے کہا: اس کا جواب قسم بَلْ عَجِبُوْٓا ہے۔ اخفش نے کہا: اس کا جواب محذوف ہے گویا فرمایا قٓ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ لتبعثن اس جواب پر یہ قول دلالت کرتا ہے: ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ، اَنْ محل نصب میں ہے تقدیر کلام یہ ہے لان جاءھم، مُّنْذِرٌ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے ھم ضمیر کفار کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومنین اور کفار سب کے لیے ہے۔ پھر اس ارشاد کے ساتھ انہیں الگ الگ کیا۔ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ، قالو انہیں فرمایا بلکہ ان کے حال، فعل کی قباحت کو بیان کیا اور کفر کے ساتھ ان کا وصف ذکر کیا جس طرح تو کہتا ہے: جاءنی فلان فاسمعنی المکروہ وقال لی الفاسق أنت کذا و کذا۔ میرے پاس فلاں آیا اس نے مجھے ناپسندیدہ باتیں سنائیں اور مجھے فاسق نے کہا: تو ایسا، ایسا ہے۔

هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ۝ عجیب امر وہ ہوتا ہے جس سے تعجب کیا جائے اسی طرح عجاب ہے عجاب تشدید کے ساتھ اس سے زیادہ عجیب ہوتا ہے اسی طرح أعجوبہ ہے۔ قتادہ نے کہا: ان کا تعجب اس بارے میں تھا کہ انہیں ایک معبود کی طرف

1۔ زاد المسیر، صفحہ 233	2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 62	3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 340

دعوت دی گئی(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہیں دوبارہ اٹھائے جانے کی جو خبر دی گئی اس پر انہوں نے عجب کا اظہار کیا۔ قرآن حکیم نے جس کی تصریح کی ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا یعنی ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا اس میں اضمار ہے ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ، رجع کا معنی لوٹانا ہے یعنی وہ لوٹانا محال ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجعتُه ارجعه رَجعا، رجع یرجِع رُجوعا۔ اس میں ایک اور اضمار ہے یعنی انہوں نے کہا: کیا ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا جب ہم مر جائیں گے بعث کا ذکر اگرچہ یہاں نہیں ہوا۔ اس کا ذکر کئی مواقع پر ہو چکا ہے قرآن ایک سورت کی طرح ہے نیز بعث کا ذکر اللہ تعالیٰ کے فرمان: بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ کے تحت موجود ہے کیونکہ وہ آخرت میں عقاب اور حساب سے خبر دار کرتا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ یعنی زمین جو ان کے جسموں کو کھاتی ہے ہم سے کوئی چیز گم نہیں ہوتی یہاں تک کہ دوبارہ لوٹانا ہم پر مشکل ہو۔ قرآن حکیم میں ہے قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۞ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۞ (طٰہٰ) صحیح میں ہے ''انسان کے ہر حصہ کو مٹی کھا جاتی ہے مگر دم گزا اسی سے اس کی تخلیق ہوئی اور اس سے ترکیب دیا جائے گا'' یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء، اولیاء اور شہداء کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جسموں کے کھانے کو زمین پر حرام کر دیا ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کتاب التذکرہ میں کر دی ہے۔ اور اس کتاب میں بھی یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

سدی نے کہا: نقص سے یہاں مراد موت ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ان میں سے جو مریں گے اور جو باقی رہیں گے ان کو ہم نے جان لیا۔ کیونکہ جو مرتا ہے اسے دفن کیا جاتا ہے گویا زمین لوگوں کو کم کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مراد مشرکوں میں سے جو اسلام میں داخل ہوتا ہے۔

وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۞ وہ کتاب ان کی تعداد اور ناموں کو یاد کرنے والی ہے یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے یعنی وہ شیاطین سے محفوظ ہے یا اس میں ہر شے محفوظ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کتاب کا معنی علم اور شمار کرنا ہے جس طرح تو کہتا ہے: کتبت علیك هذا یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا۔ یہ ضرورت کے بغیر ظاہر معنی کو ترک کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو انسانوں کے اعمال کی حفاظت کرتی ہے تاکہ ان اعمال پر ان کا محاسبہ کریں۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ تمام کے قول میں حق سے مراد قرآن ہے؛ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے(2)۔ ثعلبی نے کہا: حق سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اسلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔

فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۞، مَّرِيْجٍ کا معنی خلط ملط ہے(3)۔ ایک دفعہ وہ کہتے ہیں: جادوگر ہے۔ کبھی کہتے ہیں: شاعر ہے۔ کبھی کہتے ہیں: کاہن ہے؛ یہ ضحاک اور ابن زید کا نقطہ نظر ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 340 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 341 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 62

قتادہ نے کہا: اس کا معنی مختلف ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ملتبس ہے۔ سب معانی قریب قریب ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کا معنی، فاسد ہے اسی معنی میں یہ جملہ ہے مرجتْ اماناتُ الناس۔ لوگوں کی امانتیں فاسد ہو گئیں۔ مرجَ الدینُ والامرُ یعنی دین اور امر خلط ملط ہو گیا۔ ابو داؤد نے کہا:

مَرِجَ　الدِّيْنُ　فَأَعْدَدْتُ　لَهٗ　مُشْرِفَ　الْحَارِكِ　مَحْبُوْكَ　الْكَتَدْ

دین خلط ملط ہو گیا تو میں نے اس کے لیے مضبوط کندھوں اور اٹھی ہوئی پیٹھ والا تیار کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مریج سے مراد عجیب و غریب امر ہے۔ عمران بن ابی عطاء نے اس سے یہ نقل کیا ہے: **مَّرِيْجٍ** کا معنی خلط ملط ہے اور یہ شعر پڑھا:

فجَالتْ　فالتمستُ　به　حَشَاهَا　فخَرَّ　كأنه　خُوطٌ　مَرِيجُ

وہ گھومی میں نے اس کے پیٹ میں تیر تلاش کیا وہ گرا گویا خلط ملط ٹہنیاں ہیں۔

عوفی نے ان سے یہ نقل کیا ہے: گمراہی کے امر۔ وہ ان کا یہ قول تھا کہ وہ ساحر، شاعر، مجنون اور کاہن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی متغیر ہے۔ مرج کا اصل معنی اضطراب اور قلق ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: مرج امر الناس، مرج امر الدین و مرج الخاتم فی أصبعی۔ جب کمزوری کی وجہ سے انگوٹھی مضطرب ہوئی۔

حدیث میں ہے: ''اے عبداللہ! تیرا کیا حال ہوگا جب تو اس قوم میں ہوگا جن کے وعدے اور امانتیں خلط ملط ہو گئیں وہ اختلاف کا شکار ہو گئے تو وہ اس طرح اس طرح تھے۔ اور اپنی انگلیوں کا جال بنایا''۔ اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب التذکرہ میں کیا ہے۔

**اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝**

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور اسے کیسے آراستہ کیا ہے اور اس میں کوئی شگاف نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور جما دیے اس پر بڑے بڑے پہاڑ اور اگا دی ہیں اس میں ہر قسم کی رونق افزا چیزیں۔ یہ (آثار قدرت) بصیرت افروز اور یاد دہانی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو اپنے رب کی طرف مائل ہے اور ہم نے اتارا آسمان سے برکت والا پانی پس ہم نے اگائے اس سے باغات اور اناج جس کا کھیت کاٹا جاتا ہے اور کھجور کے لمبے لمبے درخت جس کے گچھے (پھل سے) گندھے

ہوتے ہیں، بندوں کی روزی کیلئے اور ہم نے زندہ کر دیا اس پانی سے مردہ شہر، یونہی (روز محشر ان کا) نکلنا ہوگا''۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ عبرت اور تفکر کی نظر سے نہیں دیکھتے اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ ذات جو انہیں پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

كَيْفَ بَنَيْنٰهَا ہم نے انہیں بغیر ستونوں کے بلند کر دیا ہے۔ وَ زَیَّنّٰهَا اور ہم نے انہیں ستاروں سے مزین کیا ہے۔ وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ فُرُوْجٍ، فرج کی جمع ہے جس کا معنی شق ہے۔

امرء القیس کے شعر میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں ہے:

تَسُدُّ بِهٖ فَرْجَهَا مِنْ دُبُرٍ

کسائی نے کہا: اس میں کوئی تفاوت، اختلاف اور پھٹن نہیں۔ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ۔ سورۂ رعد میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ یعنی نباتات کی تمام انواع سے۔ بَهِیْجٍ ۝ حسین جو دیکھنے والوں کو خوش کر دے۔ سورۂ حج میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ تَبْصِرَةً یعنی ہم نے اسے تبصرہ بنایا ہے تاکہ اس کے ذریعے کمال قدرت پر دلالت کریں۔ وَّ ذِكْرٰى اس کا عطف تَبْصِرَةً پر ہے۔ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا اور اس کی قدرت میں غور و فکر کرنے والا۔

وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ، السَّمَآءِ سے مراد بادل ہے۔ مَآءً مُّبٰرَكًا زیادہ برکت والا پانی۔ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ ۝ تقدیر کلام یہ ہے وحبّ النبت الحصید مراد ہر وہ چیز ہے جس کو کاٹا جاتا ہے؛ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہ شی کو اپنی ہی ذات کی طرف منسوب کرنا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: مسجد الجامع، ربیع الاول، حق الیقین، حبل الورید وغیرہ؛ یہ فراء کا قول ہے اصل میں الحب الحصید تھا الف، لام کو حذف کر دیا گیا اور منعوت کو نعت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ ضحاک نے کہا: حب الحصید سے مراد گندم اور جو ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وہ دانہ جسے کاٹا جاتا ہے، ذخیرہ کیا جاتا ہے اور روزی بنایا جاتا ہے۔

وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یہ وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ بٰسِقٰتٍ حال ہے۔ بٰسِقٰتٍ سے مراد طویل ہے؛ یہ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے۔ قتادہ اور عبداللہ بن شداد نے کہا: ان کے بسوق سے مراد طوالت میں مستقیم ہونا ہے (1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی مستویات ہے (2)۔

حضرت حسن بصری، عکرمہ اور فراء نے کہا: معنی ہے بھاری، حاملہ بکری کو کہا جاتا ہے (3) بسقت جب وہ بچہ جن دے؛ شاعر نے کہا:

فَلَمَّا تَرَكْنَا الدَّارَ ظَلَّتْ مُنِیفَةً بِقُرَّانَ فیه الباسقات المواقر (4)

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 177
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 212
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 1، صفحہ 63
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 343

جب ہم نے گھر کو چھوڑا تو وہ قرآن میں نمایاں ہو گیا اس میں لمبی پھل دار کھجوریں تھیں۔

پہلا معنی لغت میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور مشہور ہے یہ کہا جاتا ہے: بسق النخل جب وہ لمبی ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

لنا خمرٌ وليست خمرَ كَرْمٍ ولكنْ من نِتاجِ الباسِقاتِ

ہمارے پاس شراب ہے یہ انگور کی نہیں یہ لمبی کھجوروں کے پھل سے بنائی گئی ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: بسق فلان على أصحابه فلاں اپنے ساتھیوں پر بلند ہو گیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أبسقتِ الناقة جب بچہ جننے سے پہلے اونٹنی کی کھیری میں دودھ آ گیا۔ اس سے اسم فاعل مبسق آتا ہے نوق مباسيق دودھ والی اونٹنیاں۔

حضرت قطبہ بن مالک نے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ کو باصقات یعنی صاد کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت قطبہ بن مالک سے روایت مروی ہے کہ میں نے نماز پڑھی اور ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی (1) اور یہ قرأت کی قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۚ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۙ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ میں اسے دہرانے لگا میں نہیں جانتا جو اس نے قول کیا ہے مگر قاف کی وجہ سے سین کو صاد سے بدلنا جائز نہیں۔

لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝، طَلْعٌ اسے کہتے ہیں جو کھجور کا پہلا پھل نکلتا ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے طلع الطلع طلوعا واطلعت النخلة اس کے طلع سے مراد اس کا غلاف ہے جو ابھی پھٹا نہ ہو۔ نَّضِيْدٌ پھل جب تک غلاف میں ہوں۔ اس کا معنی ہے ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جب وہ اپنے غلاف سے نکل آئے تو وہ نَّضِيْدٌ نہیں کہلاتا۔

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ یعنی ہم نے بندوں کو رزق دیا۔ رِزْقًا مفعول مطلق ہے یا اس کا معنی ہے أنبتنا رزقا ہم نے اسے بطور رزق اُگایا۔ کیونکہ انبات، رزق کے معنی میں ہے یا رزقا مفعول لہ ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی أنبتنا ها لرزقهم۔ رزق اسے کہتے ہیں جو انتفاع کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ یعنی قبروں سے نکلنا ہوگا یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مردہ زمین کو زندہ کیا اسی طرح تمہیں موت دینے کے بعد زندہ کرے گا۔ كَذٰلِكَ کاف محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔ مَيْتًا فرمایا کیونکہ مقصود مکان ہے اور ميتة ہوتا تو بھی جائز تھا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القرأۃ فی الصبح، جلد 1، صفحہ 186

وَّ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾

''(حق کو) جھٹلایا تھا ان (اہل مکہ) سے پہلے قوم نوح، اہل فارس اور ثمود نے اور (جھٹلایا تھا) عاد، فرعون اور قوم لوط نے نیز ایکہ کے باشندوں اور تبع کی قوم نے، ان سب نے جھٹلایا تھا رسولوں کو پس پورا ہو گیا (ہمارا) عذاب کا وعدہ تو کیا ہم تھک گئے ہیں پہلی مرتبہ مخلوق کو پیدا کر کے، (ایسا نہیں) بلکہ یہ (کفار) از سر نو پیدا ہونے کے بارے میں شک میں ہیں''۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ یعنی جس طرح انہوں نے جھٹلایا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ ان کے سامنے ان جھٹلانے والوں کا ذکر کیا اور جس عذاب نے انہیں اپنی گرفت میں لیا تھا اس سے انہیں ڈرایا۔ ہم نے ان کے واقعات کئی مواقع پر ذکر کیے ہیں، جہاں بھی ان کا تذکرہ ہوا۔ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ یعنی ان جھٹلانے والی قوموں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ فَحَقَّ وَعِیْدِ تو ان پر میری وعید اور میرا عقاب ثابت ہو گیا۔

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے کہ ہم دوبارہ اٹھانے سے تھک جائیں گے۔ یہ بعث کے منکروں کو شرمندہ کرنے کے لیے ہے اور ان کے قول ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ کا جواب ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے عییتُ بالأمر جب تو اس کی صحیح توجیہہ نہ جانے۔

بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں حیرت میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے کچھ تصدیق کرنے والے اور کچھ تکذیب کرنے والے ہیں۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے لبس علیہ الأمر یلبسہ لبسا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ ﴿۱۹﴾

''اور بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم (خوب) جانتے ہیں اس کا نفس جو وسوسے ڈالتا ہے اور ہم اس سے شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ جب (اس کے اعمال کو) لے لیتے ہیں دو لینے والے (ان میں سے) ایک دائیں جانب اور (دوسرا) بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے وہ نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لیے) تیار ہوتا ہے۔ اور آپہنچی ہے موت کی بے ہوشی سچ مچ (اے نادان!) یہ ہے وہ جس سے تو دور بھاگا کرتا تھا''۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ، الْاِنْسَانَ سے مراد لوگ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وَ نَعْلَمُ مَا

تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ یعنی اس کے سر، اس کے دل اور ضمیر میں جو کھٹکتا ہے۔ اس میں ان نافرمانیوں پر جھڑکا جا رہا ہے جن کو انسان چھپاتا ہے۔ جس نے کہا: انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے تو نفس نے جو وسوسہ ڈالا تھا وہ درخت سے کھانا تھا۔ پھر ان کی اولاد کے لیے عام ہے۔ وسوسہ سے مراد حدیث نفس ہے جو خفی کلام کے قائم مقام ہوتی ہے۔

اعمش نے کہا: تسمع للحلی وسواسا إذا انصرفت جب وہ واپس جاتی ہے تو تو زیورات کی خفی آواز سنتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں معنی گزر چکا ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝ یہ کندھے کی رگ ہے یہ اس کے حلق کے کنارے سے اس کے کندھے تک پھیلی ہوئی ہے وہ دائیں اور بائیں جانب سے دو رگیں ہیں۔ اس کا یہ معنی حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے اور یہی لغت میں معروف ہے۔ حَبْل سے مراد ورید ہی ہے اسے اپنی ہی ذات کی طرف مضاف کیا ہے کیونکہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ورید سے مراد دل کی رگ ہے یہ ایسی رگ ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے یہ قرب کی تمثیل ہے یعنی شہ رگ جتنی اس کے قریب ہے اور ہم اس کے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ یہ قرب مسافت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی شہ رگ کو اس پر جو غلبہ ہوتا ہے ہم اس پر اس سے بھی زیادہ ملکیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ ایسی رگ ہے جو دل کے ساتھ ملی ہوتی ہے یہ قرب علم اور قدرت کا قرب ہے۔ انسان کے اجزاء ایک دوسرے سے چھپے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ۝ یعنی جب دونوں فرشتے اس کے عمل کو لیتے ہیں تو ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ دو فرشتے ہیں جو اس پر مقرر ہیں یعنی ہم اس کے احوال سے آگاہ ہیں ہم کسی فرشتے کے محتاج نہیں جو اسے خبر کرے لیکن دونوں فرشتوں کو ذمہ داری سونپی گئی ہے مقصد دلیل قائم کرنا اور امر کو موکد کرنا ہے؛ حضرت حسن بصری، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے۔

الْمُتَلَقِّيٰنِ دو ایسے فرشتے جو تیرے عمل کو لیتے ہیں ان میں سے ایک تیری دائیں جانب ہے جو تیری نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا بائیں جانب ہے جو تیری برائیاں لکھتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہاں تک کہ جب تو مرے گا تو تیرا نامہ اعمال لپیٹ دیا جائے گا اور تجھے قیامت کے روز کہا جائے گا: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۝ (اسراء) اللہ کی قسم اس ذات نے تیرے ساتھ عدل کیا جس نے تیرا محاسب تیری ذات کو بنایا ہے۔

مجاہد نے کہا: اللہ نے انسان کے احوال جاننے کے باوجود دو فرشتے رات کے لیے اور دو فرشتے دن کے لیے مقرر کیے جو اس کے اعمال یاد رکھتے ہیں اور اس کے اعمال لکھتے رہتے ہیں: مقصد حجت قائم کرنا ہے ان میں سے ایک اس کی دائیں جانب ہے جو نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا بائیں جانب ہے جو برائیاں لکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ۝ سے یہی مراد ہے۔ سفیان نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ نیکیاں لکھنے والا، برائیاں لکھنے والے پر امین ہے جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو وہ دوسرے کو کہتا ہے: جلدی نہ کر ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ

سے بخشش طلب کرے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہی معنی مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نیکیاں لکھنے والا آدمی کی دائیں جانب اور برائیاں لکھنے والا اس کی بائیں جانب ہوتا ہے اور نیکیاں لکھنے والا برائیاں لکھنے والے پر امین ہوتا ہے جب بندہ کوئی نیکی کرتا ہے تو دائیں سمت والا دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب وہ برائی کرتا ہے تو دائیں سمت والا فرشتہ بائیں جانب والے فرشتے کو کہتا ہے: سات ساعتوں تک نہ لکھو ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرے یا استغفار کرلے'' (1)۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیرے دونوں فرشتوں کے بیٹھنے کی جگہ تیرے سامنے کے دانت ہیں تیری زبان ان کا قلم ہے، تیری تھوک ان کی روشنائی ہے جب کہ تو بے مقصد کاموں میں شروع رہتا ہے اور تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں سے حیاء نہیں کرتا''۔ ضحاک نے کہا: ان دونوں کے بیٹھنے کی جگہ سامنے کے دانتوں کے نیچے نچلے جبڑے پر ہے؛ اسے عوف نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن بصری کو یہ بات خوش کرتی تھی کہ اپنی داڑھی کو صاف کریں۔ یہاں آیت میں قَعِيْدٌ فرمایا ہے قعیدان نہیں فرمایا جب کہ دانت دو ہیں کیونکہ یمین سے مراد ایک قَعِيْدٌ اور شمال سے مراد بھی ایک قَعِيْدٌ ہے پہلے کو حذف کر دیا گیا کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کرتا ہے؛ یہ سیبویہ کا قول ہے؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا وأَنْتَ بِمَا عِنْدَكَ رَاضٍ والرَّأْيُ مُخْتَلِفُ (2)

ہم اس پر راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تم اس پر راضی ہو جو تمہارے پاس ہے جب کہ رائے مختلف ہے۔

محل استدلال راض ہے، یہاں راضیان نہیں فرمایا۔

اس طرح فرزدق کے شعر میں غدورین کی جگہ غدور مذکور ہے۔

إِنِّي ضَمِنْتُ لِمَنْ أَتَانِي مَاجَنَى وأَبِي فَكَانَ وكُنْتُ غَيْرَ غَدُورِ

مبرد کا مذہب ہے تلاوت میں پہلا ہے بطور مجاز اسے دوسرا بنا لیا گیا ہے دوسرے کو حذف کر دیا گیا کیونکہ پہلا اس پر دلالت کرتا ہے۔ اخفش اور فراء کا مذہب ہے کہ تلاوت میں جو لفظ ہے یہ دو اور جمع کو اداء کرتا ہے کلام میں کوئی حذف نہیں۔ قعید، قاعد کے معنی میں ہے جس طرح سمیع، علیم، قدیر اور شہید۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قعید، مُقاعد کے معنی میں ہے جس طرح اکیل اور ندیم یہ مواکل اور منادم کے معنی میں ہے۔

جوہری نے کہا: فعیل اور فعول میں واحد، تثنیہ اور جمع سب برابر ہیں؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ (شعراء) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾ (تحریم) دونوں آیات میں محل استدلال رسول اور ظہیر ہے۔ شاعر نے جمع کے بارے میں کہا ثعلبی نے اسے پڑھا ہے:

أَلِكْنِي إِلَيْهَا وَخَيْرُ الرَّسُوْلِ أَعْلَمُهُمْ بِنَوَاحِي الْخَبَرِ

مجھے اس کی طرف بھیج اور بہترین قاصد وہ ہوتا ہے جو ان میں سے خبر کی اطراف کو ہر اعتبار سے جانتا ہو۔ یہاں قعید سے

1۔ زاد المسیر، جلد 7، صفحہ 237　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 183

مراد ملازم اور ثابت ہے یہ قائم کی ضد نہیں۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ وہ کوئی بات نہیں کرتا مگر اسے اس کے حق میں لکھ لیا جاتا ہے۔ یہ لفظ الطعام سے ماخوذ ہے اس کا معنی منہ سے باہر نکلنا ہے۔ رقیب میں تین وجوہ ہیں(1) (۱) امور کی نگہبانی کرنے والا (۲) حفاظت کرنے والا، یہ سدی کا قول ہے (۳) مراد شاہد ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے عَتِيْدٌ میں دو وجوہ ہیں۔ (۱) ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حاضر ہو غائب نہ ہو (۲) حفاظت کرنے والا جسے حفاظت کے لیے یا شہادت کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ جوہری نے کہا: عَتِيْدٌ سے مراد ایسی شے ہے جو حاضر ہو اور تیار کی گئی ہو۔ یوں کہا جاتا ہے: عتدہ تعتیدا و اعتدہ اعتادا اسے دن کے لیے تیار کیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً (یوسف: 31) اسی طرح فرس عَتَدٌ اور عتِدٌ ہے۔ یعنی تاء پر فتحہ اور کسرہ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا معنی حضور ہے؛ اسی معنی میں شاعر کا شعر ہے:

لِئِنْ كُنْتَ مِنِّي فِي العِيَانِ مُغَيَّباً　　فذكرك عندى فى الفؤادِ عَتِيدُ

اگر تو ظاہر میں مجھ سے غائب ہے، تیرا ذکر میرے دل میں موجود ہے۔

ابو جوزاء اور مجاہد نے کہا: انسان پر ہر چیز لکھی جارہی ہے یہاں تک کہ اس کی مرض میں اس سے جو آواز نکلتی ہے وہ بھی لکھی جاتی ہے۔ عکرمہ نے کہا: صرف وہی چیز لکھی جاتی ہے جس پر اجر دیا جاتا ہے یا جس پر گناہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو کچھ وہ کلام کرتا ہے وہ اس پر لکھا جاتا ہے جب دن کا آخری پہر ہوتا ہے تو جو مباح تھا وہ مٹا لیا جاتا ہے جس طرح یہ الفاظ ہیں اِنْطَلِقْ، اُقْعُدْ اور كُلْ۔ جس کے ساتھ کوئی اجر اور گناہ متعلق نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دونوں محافظ فرشتے ان اعمال کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحیفہ کے آغاز میں نیکی اور ان کے آخر میں بھی نیکی پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے: گواہ رہو میں نے اپنے بندے کو اس وجہ سے بخش دیا ہے جو صحیفہ کے دونوں طرفوں میں ہے''۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جن کے پاس سفید صحیفے ہیں ان فرشتوں نے ان کے آغاز اور آخر میں نیکی لکھی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے بخش دیتا ہے۔

ابو نعیم حافظ نے نقل کیا ہے کہ ابو طاہر محمد بن فضل بن محمد بن اسحاق بن خذیمہ، ابو نعیم حافظ سے وہ ابو طاہر محمد بن فضل بن محمد بن اسحاق بن خذیمہ سے وہ محمد بن اسحاق سے وہ محمد بن موسیٰ حرشی سے، وہ سہیل بن عبد اللہ سے وہ اعمش سے وہ زید بن وہب سے وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب دونوں محافظ فرشتے بندے یا امت پر نازل ہوتے ہیں تو ان کے پاس مہر لگی کتاب ہوتی ہے بندہ یا امت جو منہ سے کلمہ نکالتی ہے وہ اسے لکھ لیتے ہیں جب وہ دونوں اٹھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے: مہر لگی کتاب کو کھولو جو تیرے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 347

پاس ہے، تو وہ اسے کھولتا ہے تو اس نے جو کچھ لکھا ہوتا ہے اس کتاب میں اس کے برابر ہوتا ہے" اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ یہ اعمش کی حدیث جو زید سے مروی ہے غریب ہے ان سے صرف سہیل نے روایت کی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے لیے دو فرشتے مقرر فرمائے ہیں جو اس کا عمل لکھتے ہیں۔ جب وہ آدمی مرتا ہے دونوں کہتے ہیں: اے ہمارے رب! فلاں آدمی مر گیا ہمیں اجازت دے کہ ہم آسمان کی طرف چڑھ آئیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میرے آسمان میرے فرشتوں سے بھرے ہوئے ہیں جو میری تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ دونوں عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم زمین میں قیام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میری زمین میری مخلوق سے بھری ہوئی ہے وہ میری تسبیح کر رہی ہے۔ وہ دونوں عرض کرتے ہیں: پھر ہم کہاں رہیں؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم دونوں میرے بندے کی قبر پر رہو دونوں تکبیر کہو، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو اور میری تسبیح بیان کرو اور یہ عمل میرے بندے کے لیے لکھتے رہو یہ سلسلہ قیامت تک جاری رکھو"۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ، سَكْرَةُ سے مراد سختی ہے انسان جب تک زندہ رہتا ہے تو اس کے اقوال اور افعال اس پر لکھے جاتے ہیں تا کہ ان اعمال پر اس کا محاسبہ کیا جائے پھر موت آ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے جو وعدہ اور وعید کیا ہوتا ہے وہ اسے سب کچھ عیاں دیکھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حق سے مراد موت ہے اسے حق کا نام دیا ہے کیونکہ وہ یقینی ہے یا وہ دار حق کی طرف منتقل کر دیتی ہے (1)۔ اس تعبیر کی بنا پر کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وجاءت سکرۃ الحق بالموت؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ جس نے قرآن پر طعن کیا ہے اس نے گمان کیا اور کہا: میں مصحف کی اسی طرح مخالفت کرتا ہوں جس طرح حضرت ابو بکر صدیق نے مخالفت کی اور پڑھا وجاءت سکرۃ الحق بالموت۔

اس کے خلاف یوں استدلال کیا جائے گا کہ حضرت ابو بکر صدیق سے اس بارے میں دو روایات مروی ہیں ان میں سے ایک مصحف کے موافق ہے اسی پر عمل ہوگا اور دوسری ترک کر دی گئی ہے وہ بھلا دیئے جانے کے قائم مقام ہے اگر آپ نے کہا بھی ہو یا یہ ان لوگوں کی غلطی ہے جنہوں نے اسے نقل کیا ہے۔

ابو بکر انباری نے کہا اسماعیل بن اسحاق قاضی، علی بن عبد سے وہ جریر سے وہ منصور سے وہ ابو وائل سے وہ مسروق سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر صدیق کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام بھیجا جب حضرت عائشہ صدیقہ ان کے پاس حاضر ہوئیں تو عرض کی یہ تو معاملہ اسی طرح ہے جس طرح شاعر نے کہا:

إذا حَشْرَجَتْ یوماً وضاقَ بها الصَّدْرُ (2)

جب کسی روز گھنگھرو بولنے لگا اور سینہ تنگ ہو گیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے وہ کیوں نہیں کہا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ اور حدیث ذکر کی۔ سَكْرَةُ یہ سکرات کی واحد ہے۔ صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 348　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 185

کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے چھاگل یا کوئی چمڑے کا برتن تھا جس میں پانی تھا آپ اپنا ہاتھ پانی میں داخل کرتے اور اپنے چہرے پر پھیرتے اور یوں کہتے: ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، إن للموت سکرات اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں ہے بے شک موت کی سختیاں ہیں''۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ کھڑے کیے اور یوں کہنے لگے: ''فی الرفیق الاعلیٰ'' یہاں تک کہ آپ کی روح قبض کر لی گئی اور آپ کا ہاتھ مڑ گیا؛ اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''نیک بندہ موت اور اس کی سختیوں کو برداشت کرتا ہے اور اس کے جوڑ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: السلام علیک میں قیامت کے روز تک تجھے اور تو مجھے چھوڑ رہا ہے''(1)۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے کہا: اے حواریوں کی جماعت! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تم پر جنت کی سختی آسان کر دے۔ روایت بیان کی گئی ہے موت تلوار کے وار، آری کے چیرنے اور قینچی کے ساتھ کاٹنے سے زیادہ سخت ہے۔

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ جس پر موت کی سختی طاری ہوا سے یہ کلمات کہنے جانے چاہئیں یعنی یہ وہ چیز ہے جس سے تو نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ تو ایک طرف ہو سکتا ہے۔ یوں اس کا باب چلایا جاتا ہے حاد عن الشیء یحید حیودا وحیدۃ وحیدودۃ اس سے اعراض کیا اور اس سے مائل ہوا۔ اس کی اصل حَیَدودہ ہے یعنی یاء متحرک ہے اسے ساکن کر دیا گیا کیونکہ صعفوق کے علاوہ کلام میں کوئی فعلول کا وزن نہیں۔ تو اپنے بارے میں خبر دیتے ہوئے کہتا ہے: حدت عن الشیء وأحید حیدا و محیدا۔ جب تو اس سے اعراض کرے۔ طرفہ نے کہا:

أبا منذِرٍ رُمْتَ الوفاءَ فَهِبتَه　　وحِدْتَ کما جار البعیرُ عن الدَّحْض

اے ابو منذر! تو نے وفا کا قصد کیا تو تو اس سے ڈر گیا اور تو نے اعراض کیا جس طرح اونٹ پھسلنے کی جگہ سے اعراض کرتا ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾
لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

''اور صور پھونکا جائے گا یہی وعید کا دن ہوگا اور حاضر ہوگا ہر شخص اس طرح کہ اس کے ہمراہ ایک (اسے) ہانکنے والا اور ایک گواہ ہوگا۔ تو عمر بھر غافل رہا اس دن سے پس ہم نے اٹھا دیا ہے تیری آنکھوں سے تیرا پردہ سو تیری بینائی بڑی تیز ہے''۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ اس نفخہ سے مراد دوسرا نفخہ ہے جو دوبارہ اٹھانے کے لیے ہوگا۔ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ یعنی وہ دن جس کی اللہ تعالیٰ نے کفار کو دھمکی دی ہے کہ اس دن میں اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ صور پھونکنے کے بارے میں گفتگو پہلے مفصل گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾، سَآئِقٌ اور شَهِيْدٌ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سائق فرشتوں سے اور شہید ان کی ذاتوں میں سے ہاتھ اور پاؤں ہیں (2)؛ اسے عوفی نے حضرت ابن عباس سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 924　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 215

روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: سائق سے مراد فرشتہ اور شہید سے مراد عمل ہے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: سائق سے مراد جو اسے ہانک کرلے جائے گا اور شاہد اس سے مراد جو اس کے عمل کے بارے میں گواہی دے گا۔ ابن مسلم نے کہا: سائق سے مراد شیاطین میں سے اس کا قرین ہے۔ اسے سائق اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ اس کے پیچھے رہتا ہے اگرچہ اسے برانگیختہ نہ کرے۔

مجاہد نے کہا: سائق اور شہید دو فرشتے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے منبر پر بیٹھ کر یہ ارشاد فرمایا: سائق سے مراد فرشتہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف ہانک کرلے جاتا ہے اور شہید سے مراد وہ ہے جو اس کے عمل کے بارے میں اس پر گواہی دے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ترین ہے کیونکہ حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے بندے کے حق میں جو کچھ پیدا کیا ہے انسان اس کے بارے میں غفلت میں ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں جب اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتے سے فرماتا ہے اس کا رزق، اس کا عمل، موت کا وقت لکھو اور یہ بھی لکھ کہ وہ شقی ہے یا سعید ہے۔ پھر وہ فرشتہ چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ دوسرا فرشتہ بھیج دیتا ہے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ دو فرشتے بھیج دیتا ہے جو اس کی نیکیاں اور برائیاں لکھتے ہیں جب موت اس کے پاس آتی ہے تو وہ دونوں فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں پھر اس پر موت کا فرشتہ آتا ہے پھر اس کے پاس قبر والے دو فرشتے آتے ہیں وہ اس کا امتحان لیتے ہیں پھر وہ اوپر چلے جاتے ہیں جب قیامت برپا ہوتی ہے تو نیکیوں اور برائیوں والا فرشتہ اترتا ہے تو وہ کتاب جو اس کے گلے میں باندھی گئی ہوتی ہے اسے کھولتے ہیں پھر وہ دونوں اس کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں ان میں سے ایک ہانکنے والا اور دوسرا گواہ ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾۔ فرمایا تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں ضرور چڑھ جاؤ گے'' یہاں طبق سے مراد رحال ہے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے سامنے عظیم امر ہے اللہ تعالیٰ جو عظیم ہے اس سے مدد لو''۔ اسے ابو نعیم حافظ نے روایت کیا ہے یہ جعفر بن محمد بن علی کی حضرت جابر سے مروی حدیث ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: یہ جعفر کی حدیث غریب ہے اور حضرت جابر کی حدیث کو جابر جعفی نے ان سے تنہا نقل کیا ہے اور ان سے مفضل نے تنہا نقل کیا ہے۔

آیت میں دو قول ہیں (۱) یہ کافر اور مسلمان کے بارے میں عام ہے (1)؛ یہ جمہور کا قول ہے (۲) یہ کافر کے بارے میں خاص ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ ابن زید نے کہا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (2) یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ دور جاہلیت میں قریش میں رسالت کے بارے میں ناواقف تھے۔

حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا: مراد مشرک ہیں وہ امور کے انجام کے بارے میں غفلت میں تھے۔ اکثر مفسرین

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 349 2۔ ایضاً

نے کہا: مراد نیک اور فاجر ہے؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے انسان! تو اس بارے میں غفلت کا شکار تھا کہ ہر نفس کے ساتھ ایک سائق اور شہید ہے کیونکہ اس کا علم نصوص الٰہیہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

**فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ** ہم نے تیرے اندھے پن کو ختم کر دیا۔ اس میں چار وجوہ ہیں (۱) وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھا تو اس کی پیدائش ہوئی؛ یہ سدی کا قول ہے (۲) جب وہ قبر میں تھا تو اسے اٹھایا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس کے قول کا معنی ہے (۳) قیامت میں پیشی کے وقت؛ یہ مجاہد کا قول ہے (۴) یہ وحی کا نزول اور رسالت کی ذمہ داری اٹھانا ہے؛ یہ ابن زید کے قول کا معنی ہے(1)۔

**فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ** اس سے مراد دل کی نظر ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے: وہ فقہ میں بصیرت رکھتا ہے۔ دل کی آنکھ اور بصیرت سے مراد یہ ہے کہ اس کا افکار کے شواہد اور عبرت کے نتائج کا دیکھنا ہے جس طرح آنکھ اشخاص اور اجسام میں سے جو سامنے آتے ہیں ان کو دیکھتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد آنکھ کا دیکھنا ہے۔ یہ معنی ظاہر ہے یعنی آج تیری آنکھ کی نظر تیز ہے، یعنی قوی ہے اور جو چیز تجھ سے حجاب میں تھی اس کو دیکھنے والی ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد جب تیری برائیاں اور نیکیاں وزن کی جا رہی ہوں گی اس وقت تیری نظر ترازو کی زبان کی طرف ہوگی؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ثواب و عقاب کو دیکھ رہا ہوگا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافر کو اٹھایا جائے گا اس کی نظر تیز ہوگی وہ آنکھ نیلی ہو جائے گی اور وہ اندھا ہو جائے گا اسے لقد کنتِ، عنكِ اور فبصركِ پڑھا گیا ہے۔ خطاب نفس کو ہے۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿٢٥﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾

''اور کہے گا اس کا (عمر بھر کا) ساتھی: یہ نامہ اعمال جو میرے پاس تھا بالکل تیار ہے جہنم میں جھونک دو ہر کافر سرکش کو جو سختی سے روکنے والا تھا نیکی سے، حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا تھا جس نے بنا رکھے تھے اللہ کے ساتھ کئی اور خدا پس جھونک دو اس بدبخت کو عذاب شدید میں۔ اس کا ساتھی شیطان بولے گا: اے ہمارے پروردگار! میں نے تو اسے سرکش نہیں بنایا تھا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں دور تک چلا گیا تھا (اللہ) فرمائے گا: مت جھگڑو میرے روبرو میں تو پہلے ہی تم کو وعید سنا چکا ہوں میرے ہاں حکم بدلا نہیں جاتا اور نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہوں''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 349 2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 190

وَ قَالَ قَرِيْنُهٗ، قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جس کو اس پر مقرر کیا جاتا ہے (2)؛ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ یعنی اس کے اعمال جو لکھے گئے ہیں وہ میرے پاس محفوظ اور تیار ہیں۔ مجاہد نے کہا: وہ کہے گا یہ وہ چیز ہے جس کی تو نے مجھے بنی آدم کے متعلق ذمہ داری سونپی تھی میں نے اس انسان اور اس کے نامہ اعمال کو حاضر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے میرے پاس جو عذاب ہے حاضر ہے۔ مجاہد نے یہ قول بھی کیا ہے: اس کے قرین سے مراد وہ شیطان ہے جو اس پر مسلط کیا گیا (1)۔

ابن زید نے کہا: ابن وہب نے اسے روایت نقل کی ہے مراد انسانوں میں سے اس کا دوست ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھی سے فرمائے گا: اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ۔ خلیل اور اخفش نے کہا: یہ عربوں کا فصیح کلام ہے کہ تو ایک کو تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ خطاب کرے تو کہے: ویلک ارحلاھا وازجراھا وخذاہ واطلقاہ۔ یہ سب واحد کے لیے ہیں۔

فراء نے کہا: تو ایک آدمی کو کہتا ہے قوما عنا اس اسلوب کی اصل یہ ہے کہ انسان کے اعوان (مددگار) میں سے اس کے سفر میں اونٹوں، بھیڑ بکریوں اور ساتھیوں میں سے دو فرد ہوتے ہیں تو انسان کی کلام اس کے دو ساتھیوں کے متعلق ہوتی ہے اس معنی میں شعر میں ان کا قول ایک فرد کے لیے یوں ہوتا ہے خلیلی۔ اے میرے دو دوستو! پھر وہ کہتا ہے: یا صاح۔ اے میرے ساتھی! امراء القیس نے کہا:

خَلِيلِي مُرَّابِي على أُمِّ جُنْدَبِ

اے میرے دو دوستو! مجھے ام جندب کے پاس سے گزارو۔

اس میں محل استدلال خلیلی ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:

قِفَانَبْكِ مِنْ ذِكْرٰى حَبِيبٍ وَ مَنْزِلٍ   بِسَقْطِ اللِّوٰى بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

تم دونوں ٹھہرو ہم حبیب اور اس کی رہائش جو دخول اور حومل کے درمیان سقط اللوی میں ہے کو یاد کر کے رو لیں۔ محل استدلال قفا ہے۔

ایک اور نے کہا:

فإن تَزْجُرانِي يابْنَ عَفَّانَ أَنْزَجِرْ(2)   اے ابن عفان! اگر تم مجھے روکو گے تو میں رک جاؤں گا۔

یہاں بھی محل استدلال تزجرانی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اسی طرح آیا ہے کیونکہ قرین جماعت اور دو افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مازنی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان اَلْقِيَا، اَلْقِ اَلْقِ پر دلالت کرتا ہے۔ مبرد نے کہا: یہ تثنیہ کا صیغہ ہے جو تاکید کے لیے ہے معنی ہے الق الق، القیا تکرار کے قائم مقام ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ القیا تثنیہ کا صیغہ ہو اور حقیقی معنی پر ہو اللہ تعالیٰ دو فرشتوں سے خطاب کر رہا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سائق اور حافظ فرشتوں کو خطاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اصل میں یہ القین تھا نون خفیفہ ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 350    2۔ ایضاً

وقف میں الف سے بدل دیا گیا وصل کو وقف پر محمول کیا گیا۔ حضرت حسن بصری نے القین نون خفیفہ کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح ہے وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ (یوسف) اور الله تعالیٰ کا فرمان ہے: لَنَسْفَعًا (العلق: 15)

كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ عَنِيْدٍ کا معنی معاند ہے؛ یہ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے۔ بعض نے کہا: عَنِيْدٍ سے مراد حق سے اعراض کرنے والا ہے یوں کہا جاتا ہے: عند، یعند، عنودا یعنی حق کی مخالفت کی اور اس کو رد کیا جب کہ وہ حق کو پہچانتا ہے پس وہ عنید اور عاند ہے عنید کی جمع عُنُد ہے جس طرح رغیف کی جمع رُغُف آتی ہے۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ خیر سے مراد فرض زکوٰۃ اور ہر واجب حق ہے۔ مُعْتَدٍ گفتگو، سیرت اور اپنے معاملہ میں ظالم ہے۔ مُّرِيْبٍ توحید کے بارے میں شک کرنے والا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے(1)۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اراب الرجل فھو مریب جب وہ شک کرے۔ وہ مشرک ہے جس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اور مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے بھتیجوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتا تھا۔ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝ یہ پہلے امر کی تاکید ہے۔ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ قرین سے مراد شیطان ہے جو اس سرکش کافر کے لیے معین کیا گیا تھا وہ اس کافر سے براءت کا اظہار کرے گا اور اس کو جھٹلائے گا۔ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وہ حق سے بہت دور تھا وہ اپنے اختیار کے ساتھ سرکشی کرنے والا تھا میں نے تو صرف اسے دعوت دی تو اس نے میری دعوت کو قبول کر لیا۔ یہاں قرین سے مراد اس کا شیطان ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا حضرت ابن عباس اور مقاتل نے کہا: قرین سے مراد فرشتہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اس فرشتے کے بارے میں کہے گا جو اس کی برائیاں لکھا کرتا تھا: اے میرے رب! اس نے جلدی کی ہے۔ فرشتہ عرض کرے گا: اے ہمارے رب! میں نے اس کے بارے میں کوئی جلدی نہیں کی۔ سعید بن جبیر نے کہا: کافر عرض کرے گا اے ہمارے رب! اس نے میرے بارے میں زیادہ اعمال لکھے ہیں۔ فرشتہ عرض کرے گا: اے ہمارے رب! میں نے اس کا کوئی زائد عمل نہیں لکھا۔ اس موقع پر الله تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ یعنی کفار اور شیاطین میں سے ان کے ساتھی میرے ہاں جھگڑا نہ کرو۔ قشیری نے کہا: یہ توجیہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قرین سے مراد شیطان ہے۔

وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝ میں نے رسولوں کو بھیجا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب ہر جھگڑا کرنے والے کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب دو افراد کو ہے اور صیغہ جمع کا آیا ہے۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قول سے مراد الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا (الانعام: 160) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (ہود) معنی ہے فراء نے کہا ہے: میرے پاس جھوٹ نہیں بولا جا سکتا، یعنی قول میں اضافہ نہیں ہو سکتا اور غیب کا علم ہونے کی وجہ سے اس میں کمی نہیں کی جا سکتی۔ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ یعنی جو جرم نہیں کرتا اس کو میں

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 66
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 352

عذاب نہیں دیتا؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (2)۔ اس کے بارے میں گفتگو سورۂ حج اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

''(یاد کرو) وہ دن جب ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو پر ہوگئی ہے وہ (جواباً) کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔ اور قریب کر دی جائے گی جنت پرہیز گاروں کے لیے وہ (ان سے) دور نہیں ہوگی۔ یہی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا، اپنی توبہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔ جو ڈرتا تھا رحمن سے بن دیکھے اور ایسا دل لیے ہوئے آیا جو یاد الٰہی کی طرف متوجہ تھا داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے یہ ہمیشگی کا دن ہے، انہیں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ وہاں خواہش کریں گے اور ہمارے پاس تو (ان کے لیے) اس سے بھی زیادہ ہے''۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ نافع اور ابو بکر نے یوم یقول یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے وہ اسے لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ پر قیاس کرتے ہیں باقی نے نون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہے یہ عظمت کا نون ہے۔ حضرت حسن بصری نے یوم اقول پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء نے اسے یوم یقال پڑھا ہے یوم کو نصب دی ہے کیونکہ اس کا معنی یہ بنتا ہے میرے ہاں اس روز قول نہیں بدلا جائے گا جس روز ہم جہنم سے کہیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں عامل فعل مقدر ہے وہ منذرھم ہے کیونکہ پہلے وعدہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بھرے گا۔ اس استفہام کا یہ مدعا ہے کہ خبر کی تصدیق کی جائے، وعدہ کو ثابت کیا جائے، دشمنوں کو خبردار کیا جائے اور تمام بندوں کو متنبہ کیا جائے۔ جہنم کہے گی: کیا کوئی اور بھی ہے میرے اندر تو کوئی جگہ باقی نہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ یا گھر چھوڑا ہے'' یعنی کچھ نہیں چھوڑا۔ کلام کا معنی انکار ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ استفہام، استہزاء کے معنی میں ہو، یعنی کیا کوئی اور ہے کہ میں زیادہ ہو جاؤں؟ یہ دونوں وجوہ کے لیے مناسب ہے کیونکہ استفہام میں انکار کی کوئی صورت موجود ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہاں کوئی قول نہیں ہوگا یہ ضرب المثل کے طریقہ پر کلام ہے یعنی اس کی جو حالت ظاہر ہوگی وہ اس کے ناطق ہونے کے قائم مقام ہوگی؛ جس طرح شاعر نے کہا:

امتلأ الحوضُ وقال قَطْنِي مَهْلًا رُوَيْدًا قَدْ مَلَأْتَ بَطْنِي (1)

حوض بھر گیا اور کہا: میرے لیے کافی ہے مہلت دو تحقیق تو نے میرے پیٹ کو بھر دیا ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 353

یہ مجاہد اور دوسروں کی تفسیر ہے یعنی کیا مجھ میں کوئی راستہ ہے میں بھر چکی ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ آگ کو قوت گویائی عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ بولے گی جس طرح اعضاء بولیں گے۔

یہ صحیح ترین قول ہے جس طرح ہم نے سورۂ فرقان میں بیان کیا ہے۔ صحیح مسلم، صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں ہے کہ حضرت انس بن مالک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے فرمایا: ''جہنم میں لگا تار پھینکا جاتا رہے گا اور وہ کہتی رہے گی کیا کوئی اور ہے یہاں تک کہ اللہ رب العزت اپنا قدم اس میں رکھے گا تو اس کا بعض بعض کی طرف لپٹ جائے گا اور وہ کہے گی تیری عزت اور کرم کی قسم بس بس۔ جنت میں لگا تار اضافہ ہوتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مخلوق پیدا فرمائے گا اور جنت کے زائد حصے میں انہیں سکونت عطا فرمائے گا'' (1)۔ الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔

ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے: ''جہاں تک جہنم کا تعلق ہے وہ نہیں بھرے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا رجل رکھے گا تو وہ عرض کرے گی بس بس۔ اس موقع پر وہ بھر جائے گی اور اس کا بعض بعض کی طرف سمٹ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مخلوق میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں فرمائے گا۔ جہاں تک جنت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مخلوق پیدا فرمائے گا'' (2)۔ ہمارے علماء نے کہا: جہاں تک یہاں قدم کا تعلق ہے اس سے مراد وہ قوم ہے جنہیں اللہ تعالیٰ آگ کی طرف پہلے بھیجے گا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہے کہ جہنمی ہیں۔ اسی طرح رجل ہے اس سے مراد لوگوں اور دوسروں کی کثیر تعداد ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے:

رأیت رجلا من الناس و رجلًا من جراد

میں نے لوگوں کی کثیر تعداد اور ٹڈی دل کی کثیر تعداد دیکھی۔

شاعر نے کہا:

فمرّنا رِجْلٌ من النّاس و انزَوَی إلیهم من الحیّ الیمانینَ أَرْجُلُ

ہمارے پاس سے لوگوں کی کثیر تعداد گزری اور ان کے ساتھ یمنی قبائل کی کثیر تعداد شامل ہوگئی۔

اس معنی کی وضاحت وہ روایت کرتی ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جہنم میں کوئی گھر، زنجیر، ہنٹر اور تابوت نہیں مگر اس پر جہنمی نام لکھا ہوا ہے۔ ہر داروغہ اس جہنمی کا انتظار کرتا ہے جس کا نام اور اس کی صفت اس نے پہچان رکھی ہے۔ جب ان میں سے ہر کوئی اس کو پورا پورا لے لیتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا اور جس کا وہ انتظار کر رہا تھا اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہا تو داروغوں نے کہا: بس بس ہمیں کافی ہے، ہمیں کافی ہے۔ اس وقت جہنم ان پر سمٹ جائے گی جو اس میں ہوں گے اور جس کا انتظار کیا جا رہا تھا جب ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا تو وہ سکڑ جائے گی۔ وہ جماعت جس کا انتظار کیا جا رہا تھا اسے قدم اور رجل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تاویل کی تائید حدیث بھی کرتی ہے ''جنت میں لگا تار اضافہ ہوتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مخلوق پیدا فرمائے گا اور جنت کے زائد حصہ میں انہیں سکونت عطا کرے گا'' (3)۔ ہم نے اس کی اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب النار یدخلون فیھا الجبارون، جلد 2، صفحہ 382 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

وضاحت کی ہے اور کتاب الاسماء والصفات میں اس کو بیان کیا ہے جو الکتاب الاسنی کا حصہ ہے۔ الحمد للہ۔

نضر بن شمیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: حتی یضع الجبار فیھا قدمہ کا یہ معنی کیا ہے جس کے بارے میں پہلے سے علم ہے کہ وہ جہنمی ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ یعنی جنت ان کے قریب کر دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے دنیا میں ہی جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت ان کے قریب کر دی جائے گی، یعنی ان کے دلوں کے اسے قریب رکھا گیا ہے جب انہیں کہا جائے گا: معاصی سے اجتناب کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنت میں داخل ہونے کے بعد اس کے مواضع اس کے قریب کر دیئے جائیں گے وہ دور نہ ہوں گے۔ غَيْرَ بَعِيْدٍ وہ ان سے دور نہ ہوں گے۔ یہ کلام تاکید ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ یعنی انہیں کہا جائے گا: یہ وہ جزا ہے جس کا تم سے دنیا میں رسولوں کی زبانوں سے وعدہ کیا گیا تھا عام قرأت تُوْعَدُوْنَ ہے۔ تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ ہے، ابن کثیر نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ غائب کا صیغہ ہے کیونکہ اس کا ذکر متقین کے بعد آیا ہے۔

لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾، اَوَّابٍ سے مراد معاصی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں (وہ پھر لوٹتا ہے) اور گناہ کرتا ہے اور پھر گناہ سے توبہ کرتا ہے؛ ضحاک اور دوسرے علماء نے یہی قول کیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور عطا نے کہا: اَوَّابٍ سے مراد تسبیح کرنے والا ہے (1)۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ (سبا: 10) حکیم بن عتبہ نے کہا: اس سے مراد تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے۔ شعبی اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ سے عفو کا طالب ہوتا ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے۔ عبید بن عمیر نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی مجلس میں نہیں بیٹھتا یہاں تک کہ وہ اس مجلس میں اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہوتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے ہم یہ بات چیت کیا کرتے تھے کہ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ سے مراد وہ ہے جب وہ اپنی مجلس سے اٹھتا ہے تو وہ سبحان اللہ و بحمدہ کہتا ہے اور یوں دعا کرتا ہے اے اللہ! میں تجھ سے اس گناہ پر بخشش کا طالب ہوں جو میں نے اس مجلس میں کیے ہیں۔ حدیث میں ہے "جب کوئی آدمی اپنی مجلس سے اٹھتے وقت کہے: سبحانك اللھم و بحمدك لا إله إلا أنت أستغفرك و أتوب إليك تو اس مجلس میں اس سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے" (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی دعا کیا کرتے تھے۔ ایک عالم نے کہا: میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں کہوں أستغفرك و أسالك التوبة اور میں یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ میں کہوں: و أتوب إليك مگر میں جب حقیقی توبہ کروں۔

میں کہتا ہوں: یہ بہت اچھا ہے اور اس میں حدیث کی اتباع ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا: اواب سے مراد خوشحالی اور تنگدستی میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا ہے۔ قاسم نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی میں دل نہیں لگاتا۔

حَفِيْظٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جس نے اپنے گناہ یاد رکھے یہاں تک کہ ان سے

---

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 199 2۔ جامع ترمذی کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا قام من المجلس، حدیث 3355 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رجوع کیا(1)۔ قتادہ نے کہا: حَفِيْظٍ سے مراد یہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اور نعمت عطا کی اور اسے اس پر امین بنایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے مراد اللہ تعالیٰ کے امر کی حفاظت کرنے والا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے حق کی حفاظت کرتا ہے اس کا اعتراف کر کے اور شکر کر کے اس کی نعمت کو یاد کرتا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وصیت کو قبول کر کے وصیت کو یاد رکھنے والا ہے۔ مکحول نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے دن کے پہلے پہر میں چار رکعت نماز (نفل) پر مواظبت اختیار کی تو وہ اواب و حفیظ ہے''(2) یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ، مَنْ محل جر میں ہے کیونکہ یہ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ سے بدل ہے یا یہ اواب سے صفت ہے۔ نئے جملہ کے طریقہ پر یہ محل رفع میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی خبر ادْخُلُوْهَا ہے۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوگی کہ جواب شرط حذف ہو گا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: فیقال لھم ادخلوھا۔

خشیۃ بالغیب سے مراد ہے کہ تو اس سے ڈرے جب کہ تو نے اسے دیکھا نہ ہو۔ ضحاک اور سدی نے کہا: یعنی وہ خلوت میں ڈرے جب کہ اسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جب وہ پردہ لٹکا دے اور دروازہ بند کر دے(3)۔

وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِۨ ، مُّنِيْبٍ سے مراد طاعت پر توجہ کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مخلص ہے۔ ابو بکر وراق نے کہا: منیب کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کو جاننے والا ہو، اس سے دوستی رکھنے والا ہو، اس کے جلال کے سامنے تواضع کرنے والا ہو اور اپنی خواہش نفس کو ترک کرنے والا ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال بھی موجود ہو کہ قلب منیب سے مراد قلب سلیم ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (شعراء) جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ادْخُلُوْهَا اس صفت کے حامل افراد کو کہا جائے گا: ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ یعنی عذاب سے سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی جانب سے ان پر سلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نعمت کے زوال سے سلامتی ہے فرمایا: ادْخُلُوْهَا۔ کلام کے شروع میں ہے مَنْ خَشِيَ کیونکہ مَنْ جمع کے معنی میں ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا یعنی ان کے نفوس جو چاہیں گے اور اس کی آنکھیں جس سے لذت حاصل کریں گے۔ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ یعنی ان کے لیے زائد نعمتیں ہوں گی جو ان کے دل میں کھٹکی تک نہیں۔ حضرت انس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''مَزِيْدٌ سے مراد اللہ تعالیٰ کا بغیر کیفیت کے دیدار کرنا ہے''۔ احادیث مرفوع میں بھی اس کی یہی تعبیر آئی ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے؛ ابن مبارک اور یحییٰ بن سلام دونوں نے ذکر کیا ہے۔ مسعودی، منہال بن عمرو سے وہ ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''جمعہ کی طرف جلدی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر جمعہ کو اہل جنت کے لیے سفید کافور کے ٹیلہ میں ظہور فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے نوازے جاتے ہیں''۔ ابن مبارک

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 200 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 354-353 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 67

نے کہا: اس کا قرب اس قدر ہوگا جس قدر وہ دنیا میں جمعہ کی طرف جلدی کرتے تھے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ دنیا میں جمعہ کے لیے جس قدر تیزی کیا کرتے تھے۔ اور یہ زائد ذکر کیا۔ الله تعالیٰ کرامت میں سے ان کے لیے ایسی چیز پیدا فرمائے گا جو انہوں نے اس سے قبل نہیں دیکھی ہوگی۔ یحییٰ نے کہا: میں نے مسعودی کے علاوہ سے سنا کہ وہ اپنی روایت میں الله تعالیٰ کے اس فرمان کا اضافہ کرتے وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ۔

میں کہتا ہوں: روایت میں فی کثیب سے مراد ہے کہ جنتی کافور کے سفید ٹیلے پر ہوں گے، جس طرح حضرت حسن بصری سے ایک مرسل روایت میں ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کا دیدار کریں گے جب کہ وہ کافور کے ٹیلہ پر ہوں گے'' (1)۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب التذکرہ میں کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ''مَزِيْدٌ سے مراد ہے کہ ان کی شادیاں حورعین سے کر دی جائیں گی'' اسے حضرت ابوسعید خدری نے مرفوع نقل کیا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝٣٦ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝٣٧ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ڰ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝٣٨

''اور قریش مکہ سے پہلے ہم نے برباد کر دیا بہت سی قوموں کو جو شوکت و قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں وہ گھومتے رہتے شہروں میں، کیا انہیں عذاب الٰہی سے کوئی پناہ ملی۔ بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل (بینا) رکھتا ہو یا (کلام الٰہی) کان لگا کر سنے متوجہ ہو کر۔ اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں''۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی قوم سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا جب کہ وہ ان سے زیادہ طاقت اور قوت والے تھے۔ فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ وہ شہروں میں چلے تا کہ بھاگ جانے کی کوئی جگہ تلاش کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے شہروں میں اثرات چھوڑے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے سفر کیا اور چکر لگایا۔ نضر بن شمیل نے کہا: انہوں نے چکر لگایا۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے طواف کیا۔ مؤرج نے کہا: وہ دور تک چلے گئے؛ اسی معنی میں امراء القیس کا شعر ہے:

وقد نَقَّبْتُ فی الآفاق حَتَّی رَضِیتُ من الغنیمۃِ بالإیابِ (2)

میں آفاق میں دور تک گیا یہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہو گیا۔

پھر یہ کہا گیا: انہوں نے تجارت کی غرض سے دور دراز شہروں میں چکر لگایا، کیا انہوں نے موت سے بچنے کی کوئی جگہ پائی۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے شہروں میں چکر لگایا وہ موت سے بچنے کی کوئی پناہ چاہتے تھے۔ حارث بن حلزہ نے کہا:

نَقَّبُوا فی البلادِ من حَذَرِ الموتِ وجَالُوا فی الأرضِ كُلَّ مَجَالِ (3)

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 67
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 355
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 390

وہ موت کے ڈر سے شہروں میں گھومے پھرے اور زمین میں ہر جگہ چکر لگایا۔

حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ نے فنقبوا پڑھا ہے۔ نقب کا معنی پھاڑنا اور کسی شے میں داخل ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نقب کا معنی پہاڑ میں راستہ ہے؛ اسی سے منقب اور منقبہ ہے۔ یہ ابن سکیت سے مروی ہے نقب الجدار نقبا اس نے دیوار کو پھاڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نقبہ کا نام نقب بھی ہے نقب کی جمع نقوب بھی ہے۔ سلمٰی اور یحییٰ بن یعمر نے فنقبوا پڑھا ہے صیغہ امر کا ہے اور دھمکی کے لیے ہے یعنی شہروں میں گھومو پھرو اور اس میں چلو اور دیکھو۔

**هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ** ۝ کیا موت سے بھاگ جانے کی کوئی جگہ ہے؛ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ قشیری نے اسے فنقِبوا قاف کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ اس میں زیادہ چلے یہاں تک کہ ان کی سواریوں کے پاؤں گھس گئے۔ جوہری نے کہا: نقب البعير جب اس کے پاؤں گھس جائیں۔ انقب الرجل جب آدمی کے اونٹ کے پاؤں گھس جائیں۔ نقب الخف الملبوس جب پہنا ہوا موزہ پھٹ گیا۔ محیص یہ حاص یحیص کا مصدر ہے اس کا مصدر حیصا، حیوصا، محیاصا، محاصا اور حیصانا بھی آتا ہے معنی پھر جانا، بھٹک جانا۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: ما عنه محيص یعنی کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں۔ انحیاص بھی اس کی مثل ہے حمایتیوں کے لیے کہا جاتا ہے: حاصوا عن العدو اور دشمنوں کے لیے کہا جاتا ہے: انهزموا دونوں کا معنی بھاگ گئے۔

**اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى** یعنی اس صورت میں جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ نصیحت ہے۔ **لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ** یعنی جس کی عقل ہو جس کے ساتھ وہ سوچ و بچار کرے۔ قلب، عقل سے کنایہ ہے کہ دل عقل کی جگہ ہے؛ یہ معنی مجاہد اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کی زندگی اور امتیاز کرنے والا نفس ہو۔ زندہ نفس کو دل سے تعبیر کیا ہے کیونکہ دل نفس کا وطن اور زندگی کا معدن ہے؛ جس طرح امرء القیس نے کہا:

أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قاتِلِي وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ(1)

تجھے میرے بارے میں اس چیز نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ تیری محبت مجھے قتل کرنے والی ہے اور تو دل کو جو حکم دے گی وہ کر گزرے گا۔

قرآن حکیم میں ہے: **لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا** (یٰسین: 60) یحییٰ بن معاذ نے کہا: دل دو قسم کے ہیں (۱) جو دنیا کے مشاغل سے بھرا ہوتا ہے یہاں تک کہ جب امور آخرت میں سے کوئی امر اسے لاحق ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے (۲) اور دوسرا ایسا دل ہے جو آخرت کی ہولناکیوں سے بھرا ہوتا ہے جب امور دنیا میں سے کوئی اسے لاحق ہوتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے کیونکہ اس کا دل آخرت میں گم ہوتا ہے۔

**اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ** یعنی وہ قرآن سنے عرب کہتے ہیں اَلْقِ الی سمعك یعنی میری بات سنو۔ سورۂ طٰہٰ میں سننے کی کیفیت اور اس کا ثمرہ گزر چکا ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 356

وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ یعنی دل حاضر ہو۔ زجاج نے کہا: جو سن رہا ہے اس میں دل حاضر ہو۔ سفیان نے کہا: ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خود حاضر ہو اور دل غائب ہو۔ پھر یہ کہا گیا ہے: آیت اہل کتاب کے لیے ہے؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں خاص ہے (1)۔ محمد بن کعب اور ابو صالح نے کہا: یہ اہل قرآن کے بارے میں خاص ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ سورۂ اعراف اور دوسری سورتوں میں بحث گزر چکی ہے۔ لُغُوْبٍ کا معنی تھکاوٹ ہے۔ تو اسی معنی میں کہتا ہے: لَغَب يلغُب لغوبا اور لغِب يلغَب لغوبا۔ اس میں ضعیف لغت ہے الغبته انا یعنی میں نے اسے تھکا دیا۔ قتادہ اور کلبی نے کہا: یہ آیت مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی (2) جنہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ان میں سے پہلا دن اتوار اور آخری جمعہ تھا اور ہفتہ کے روز آرام کیا تو انہوں نے اسے راحت بنا دیا اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بارے میں جھٹلایا۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝

"پس آپ صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانے والی) باتوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت بھی اس کی پاکی بیان کیجئے اور نمازوں کے بعد بھی"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے مشرک جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرنے کا حکم دیا، یعنی ان کے امر کو اپنے اوپر آسان کر دیجئے۔ یہ جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی یہ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے ثابت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے یہودی جو کہتے ہیں ان کے قول پر صبر کیجئے کہ ان کا قول یہ تھا: اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے روز آرام کیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ ابو صالح نے کہا: طلوع شمس سے پہلے صبح کی نماز ہے، غروب سے پہلے عصر کی نماز ہے۔ حضرت جریر بن عبد اللہ نے اسے مرفوع نقل کیا ہے کہا ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جب کہ آپ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھا فرمایا: "خبردار! تم اپنے رب کا دیدار یوں کرو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھتے ہو تم اس کے دیدار کے لیے باہم بھیڑ نہیں کرو گے۔ اگر تم طاقت رکھو کہ سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے کی نماز پر تم مغلوب نہ ہو۔ یعنی عصر اور فجر کی نماز" (3)۔ پھر جریر نے اس آیت کی تلاوت کی۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابن عباس

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 68
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 356
3۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ العصر، جلد 1 صفحہ 78

رضی اللہ عنہما نے کہا: قَبْلَ الْغُرُوْبِ سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے اور وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تسبیح بالقول سے مراد سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے(1)؛ یہ عطا خراسانی اور ابو الاحوص کا نقطہ نظر ہے۔ بعض علماء نے کہا: قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں اور قَبْلَ الْغُرُوْبِ سے مراد مغرب کی نماز سے قبل دو رکعتیں ہیں۔ ثمامہ سے روایت مروی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ہم مدینہ طیبہ میں تھے جب موذن مغرب کی اذان دیتا تو صحابہ ستونوں کی طرف جلدی کرتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے یہاں تک کہ اجنبی آدمی جب مسجد میں داخل ہوتا تو وہ گمان کرتا کہ نماز پڑھی جا چکی ہے کیونکہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ قتادہ نے کہا: میں نے حضرت انس اور حضرت ابو برزہ اسلمی کے سوا کسی کو یہ دو رکعتیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۝ اس میں چار قول ہیں (۱) رات کے وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنا؛ یہ ابو الاحوص کا قول ہے (۲) یہ تمام رات کی نماز ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے (۳) یہ صبح کی دو رکعتیں ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (۴) یہ عشاء کی نماز ہے؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: جس نے کہا اس سے مراد رات کے وقت تسبیح ہے تو اس کی تائید صحیح روایت کرتی ہے "جو رات کو جاگا اور کہا: لا الٰه الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير سبحان الله والحمد لله ولا الٰه إلا الله والله أكبر ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم "(2) جس نے کہا: یہ رات کی نماز ہے نماز کو تسبیح کہتے ہیں کیونکہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح ہوتی ہے اس معنی میں سبحة الضحى (چاشت کے نوافل) ہے۔ جس نے کہا: اس سے مراد فجر یا عشاء کی نماز ہے کیونکہ دونوں رات کی نمازیں ہیں اور عشاء ان میں سے واضح ترین ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۝ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم، حضرت حسن بصری، امام نخعی، امام شعبی، امام اوزاعی اور زہری نے کہا: اَدْبَارَ السُّجُوْدِ سے مراد مغرب کے بعد دو رکعتیں ہیں اور ادبار النجوم سے مراد فجر سے پہلے دو رکعتیں ہیں؛ اسے عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، حضرت ابن عباس نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نماز مغرب کے بعد دو رکعتیں اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ہے"۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے اور ماوردی کے الفاظ ہیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک رات گزاری تو آپ نے فجر کے فرائض سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی پھر مسجد کی طرف نکلے فرمایا: "اے ابن عباس! فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ادبار النجوم ہیں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ہیں" (3)۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 356 2۔ صحیح بخاری، کتاب التهجد باب فضل من تعار من الليل، جلد 1، صفحہ 155
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 357

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے مغرب کی نماز کے بعد گفتگو سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کی نماز علیین میں لکھ لی گئی''۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: پہلی رکعت میں قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ اور دوسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ پڑھی۔ مقاتل نے کہا: اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک شفق احمر غائب نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: مراد نماز وتر ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ فرائض کے بعد نوافل ہیں یعنی ہر فرض نماز کے بعد دو رکعات ہیں۔ نحاس نے کہا: ظاہر اس قول پر دلالت کرتا ہے مگر زیادہ موزوں اکثر کی اتباع ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے یہی صحیح ثابت ہے۔ ابوالاحوص نے کہا: اس سے مراد نماز کے بعد تسبیح ہے۔ ابن عربی نے کہا: جو نظر و فکر میں قوی ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے بعد یہ پڑھا کرتے تھے: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر اللّٰھمّ لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منك الجد (1)۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے اس کے لیے بادشاہی ہے، وہی حمد کے لائق ہے، وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اے اللہ! جو تو عطا کرے اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور جو تو روک لے اس کو عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی صاحب مال کو مال نفع دینے والا نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم فرائض کے ساتھ منسوخ ہو گیا ہے پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی نماز فرض نہیں، اسے ایک جماعت نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ نافع، ابن کثیر اور حمزہ نے اِدْبَارَ السُّجُوْدِ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ ادبر الشیء سے مصدر ہے جب وہ پھرے۔ باقی نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دبر کی جمع ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس کی قرأت ہے۔ اس کی مثل طنب اور اطناب ہے یا یہ دُبُر کی جمع ہے جس طرح قفل اور اقفال آتی ہے۔ علماء نے اسے ظرف کے طور پر استعمال کیا ہے جس طرح تو کہتا ہے: جئتك فی دبر الصلوۃ وفی أدبار الصلوۃ سورۂ طٰہ کے آخر میں جو وادبار النجوم ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اس سے مراد اس کی روشنی کا چلے جانا ہے جب فجر ثانی طلوع ہو۔ فجر ثانی سے مراد وہ سفیدی ہے جو رات کی سیاہی سے پھوٹتی ہے۔

وَ اسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ ۝۴۱ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ ۝۴۲ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ۝۴۳ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ۝۴۴ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ۝۴۵

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء بعد الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 937

''اور کان کھول کر سنو اس دن کے بارے میں جب پکارنے والا قریب سے پکارے گا جس دن سنیں گے سب لوگ ایک گرج دار آواز بالیقین وہی دن (قبروں سے) نکلنے کا دن ہوگا۔ بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے جس روز زمین پھٹ جائے گی ان کے اوپر سے جلدی سے نکل پڑیں گے یہی حشر ہے، یہ ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں پس آپ نصیحت کرتے رہیے اس قرآن سے ہر اس شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے''۔

**وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ** ۝ ، **اسْتَمِعْ** کا مفعول محذوف ہے مراد ہے ندا اور آواز کو سنو یا صیحہ کو سنو۔ اس سے مراد صیحہ قیامت ہے اور وہ نفخہ ثانیہ ہے ندا کرنے والے جبریل امین ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت اسرافیل ہیں۔ زمخشری نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے اور حضرت جبریل امین منادی کریں گے، وہ حشر بپا ہونے کا اعلان کریں گے، وہ کہیں گے: حساب کے لیے آؤ۔ اس تعبیر کی بنا پر ندا میدان حشر میں ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **اسْتَمِعْ** کا مفعول یہ نداء الکفار ہے وہ ویل اور ہلاکت کی ندا کریں گے یعنی قریب سے اس ندا کو سنو، یعنی سب اس آواز کو سنیں گے کوئی بھی اس نداء سے دور نہیں ہوگا۔ عکرمہ نے کہا: رحمن کا منادی ندا کرے گا گویا وہ ان کے کانوں میں ندا کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مکان قریب سے مراد بیت المقدس کا صخرہ ہے۔

ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہی زمین کا وسط ہے اور زمین کا یہ حصہ آسمان سے دوسری جگہ کی بنسبت بارہ میل قریب ہے۔ کعب نے کہا: اٹھارہ میل قریب ہے۔ پہلا قول زمخشری اور قشیری نے نقل کیا ہے۔ دوسرا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت جبرئیل امین یا حضرت اسرافیل صخرہ پر کھڑے ہوں گے وہ حشر بپا ہونے کا اعلان کریں گے: اے بوسیدہ ہڈیو! اور ٹوٹے ہوئے جوڑو! اے فنا ہونے والے کفنو! اے خالی دلو! اے فاسد بدنو! اے بہنے والی آنکھ! رب العالمین کے حضور پیشی کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد حضرت اسرافیل ہیں جو صور والے ہیں۔

**يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ**، **الصَّيْحَةَ** سے مراد دوبارہ اٹھائے جانے کا صیحہ ہے خروج کا معنی حساب کے لیے جمع ہونا ہے۔ **ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ** ۝ یعنی یہ قبروں سے نکلنے کا دن ہے۔ **اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ** یعنی ہم زندوں کو موت دیتے ہیں اور مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ یہاں حقیقت کو ثابت کیا۔ **يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا** یعنی وہ منادی جو صور پھونکنے والا ہے وہ اس کی آواز پر جلدی سے بیت المقدس کی طرف جائیں گے۔

**ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ** ۝ یعنی آسان ہے۔ کوفیوں نے پڑھا تشقق یعنی شین تخفیف کے ساتھ ہے اور پہلی تاء محذوف ہے باقی قراء نے تاء کو شین میں مدغم کیا ہے۔ ابن محیصن، ابن کثیر اور یعقوب نے المنادی کی یاء کو اصل پر دونوں حالتوں میں ثابت رکھا ہے نافع اور ابو عمرو نے فصل میں ثابت رکھا ہے کسی اور صورت میں ثابت نہیں رکھا۔ باقی قراء نے

دونوں حالتوں میں اسے حذف کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: سنت نے اس آیت کی مزید وضاحت کر دی ہے امام ترمذی نے حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا فرمایا: ''یہاں سے لے کر وہاں تک تمہیں جمع کیا جائے گا تم سوار اور پیدل ہو گے، قیامت کے روز تمہیں منہ کے بل گھسیٹا جائے گا، تمہارے مونہوں پر فدام (وہ چیز جو جانوروں کے منہ پر چڑھادی جاتی ہے تا کہ وہ چرنہ سکے) ہو گا تم ستر امتوں کو پورا کرو گے اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بہترین اور معزز ہو گے تمہاری جانب سے سب سے پہلے جو چیز حقیقت حال کا اظہار کرے گی وہ تمہاری ران ہو گی''۔ ایک دوسری روایت میں ہے ''تمہاری ران اور تمہاری ہتھیلی ہو گی''۔

علی بن سعید نے حضرت ابو ہریرہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اس میں ہے: ''اللہ تعالیٰ حضرت اسرافیل سے فرمائے گا دوبارہ اٹھانے کا نفخہ پھونکو وہ صور پھونکیں گے تو روحیں شہد کی مکھیوں کی طرح نکل پڑیں گی وہ زمین و آسمان کو بھر دیں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میری عزت وجلال کی قسم! ہر روح اپنے جسم میں لوٹ جائے تو روحیں زمین میں اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں گی پھر وہ ناک کے بانسوں میں داخل ہوں گی تو وہ روحیں جسموں میں یوں سرائیت کر جائیں گی جس طرح زہر اس ذات میں سرایت کرتی ہے جس کو ڈسا گیا ہو پھر زمین پھاڑ دی جائے گی میں وہ پہلا شخص ہوں گا جس سے زمین پھٹے گی تم زمین سے نوجوانوں کی طرح اٹھو گے سب کی عمریں تیئس 23 سال کی ہوں گی اس روز زبان سریانی ہو گی'' اور حدیث بیان کی میں نے ان کا اور دوسرے لوگوں کا ذکر اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں مفصل کیا ہے۔ الحمدللہ۔

**نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ** وہ جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آپ کو گالیاں دیتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جانتا ہے۔ **وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ** یعنی آپ ان پر مسلط نہیں کہ آپ انہیں اسلام کی طرف زبردستی لے آئیں یہ آیت جہاد والی آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ جبار جبریہ سے مشتق ہے۔ جبار کو مجبر کے معنی میں نہیں لایا جاتا۔

جس طرح خراج مخرج کے معنی میں نہیں ہوتا؛ قشیری نے اسے بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا: معنی ہے آپ انہیں مجبور کرنے والے نہیں یہ سراسر غلطی ہے کہ افعل سے مفعل کے معنی میں نہیں ہوتا۔ ثعلبی نے حکایت بیان کی ہے فعال کا صیغہ مفعل کے معنی میں آتا ہے جب کہ یہ شاذ ہے جبار، مجبر کے معنی میں دراك، مدرك کے معنی میں، سراع، مسرع کے معنی میں بکاء، مبك کے معنی میں اور عداء، معد کے معنی میں ہے۔ رشاد، مرشد کے معنی میں ہے اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اسی طرح **اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ** (الکہف: 79) پڑھا گیا ہے جو مسکین کے معنی میں ہے۔ ابو حامد خارزنجی نے کہا: عرب کہتے ہیں سیف سقاط یہاں سقاط، مسقط کے معنی میں ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبار کا معنی مسیطر ہے، جس طرح سورۂ غاشیہ میں ہے **لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝** ۔ فراء نے کہا: میں نے

ایک عرب سے سنا جو کہہ رہا تھا جبرہ علی الأمر یعنی اس پر سختی سے لازم کیا۔ اس لغت کی بنا پر جبار کو قہر کے معنی میں لینا صحیح ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبار یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے جبرہ علی الامرفلاں نے اسے مجبور کیا۔ یہ لغت کنانیہ ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جوہری نے کہا: اجبرتہ علی الامر یعنی میں نے اسے امر پر مجبور کیا۔ اجبرتہ کا معنی ہے میں نے اسے جبر کی طرف منسوب کیا جس طرح تو کہتا ہے: اکفرتہ یعنی تو نے اسے کفر کی طرف منسوب کیا۔

**فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! کاش آپ ہمیں ڈراتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی جو میری نافرمانی کرے گا میں نے اس کے لیے عذاب تیار کر رکھا ہے (1)۔ وعید سے مراد عذاب اور وعد سے مراد ثواب ہے۔ شاعر نے کہا:

وانّی وانْ أوْعَدْتُهٗ أو وَعَدْتُهٗ لَمُخْلِفُ إيعَادِی و مُنْجِزُ مَوْعِدِی

اگر میں اسے دھمکی دوں یا اس سے وعدہ کروں میں اپنی دھمکی کی خلاف ورزی کرنے والا اور اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہوں۔

قتادہ یوں دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو تیری دھمکی سے ڈرتے ہیں اور تیرے وعدہ کی امید رکھتے ہیں۔ یعقوب نے دونوں حالوں میں وعیدی کی یاء کو ثابت رکھا ہے۔ ورش نے وصل میں ثابت رکھا ہے اور وقف میں گرا دیا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اسے حذف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 359

# سورۂ ذاریات

آیاتھا ٦٠ ﴿٥١ سُوْرَۃُ الذّٰرِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ ٦٧﴾ رکوعاتھا ٣

تمام علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے، اس کی ساٹھ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو اڑا کر بکھیرنے والی ہیں پھر ان بادلوں کی جو (بارش کا) بوجھ اٹھانے والے ہیں پھر کشتیوں کی جو آہستہ چلنے والی ہیں پھر فرشتوں کی جو حکم (الٰہی) سے بانٹنے والے ہیں بے شک جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ سچا ہے اور یقیناً جزاء وسزا کا دن ضرور آئے گا"۔

وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ﴿۱﴾ ابوبکر انباری نے کہا عبداللہ بن ناجیہ، یعقوب بن ابراہیم سے وہ مکی بن ابراہیم سے وہ جعید بن عبدالرحمن سے وہ یزید بن خصیفہ سے وہ سائب بن یزید سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کی: میں ایک آدمی کے پاس سے گزرا وہ مشکل القرآن کی تفسیر کے بارے میں پوچھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی: اے اللہ! مجھے اس پر قدرت دے۔ ایک روز وہ آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ وہ لباس اور عمامہ زیب تن کیے ہوئے تھا جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے جب آپ قرآن پڑھنے سے فارغ ہوئے تو وہ آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا کیا ہے؟ حضرت عمر اٹھے اپنی آستینیں چڑھائیں اور اسے کوڑے مارنے لگے پھر فرمایا: اسے کپڑے پہناؤ، اسے سواری پر سوار کراؤ اور اسے اس کے قبیلہ تک پہنچا دو پھر ایک خطیب کو چاہیے وہ اٹھے اور کہے کہ صبغ نے علم کی طلب کی اور علم اسے نصیب نہ ہوا یہ اپنی قوم میں سردار تھا تو وہ اپنی قوم میں ذلیل ورسوا ہو گیا۔

عامر بن واثلہ سے مروی ہے کہ ابن کواء نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے پوچھا عرض کی: اے امیر المومنین! وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا کیا چیز ہے؟ فرمایا: تجھ پر افسوس سمجھنے کے لیے پوچھو سرکشی کے طور پر نہ پوچھو۔ وَ الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا سے مراد ہوائیں ہیں۔ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴿۲﴾ سے مراد بادل ہیں۔ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴿۳﴾ سے مراد کشتیاں ہیں۔ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا سے مراد فرشتے ہیں۔

حرث نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا سے مراد ہوائیں ہیں (1)۔ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا۝ سے مراد بادل ہیں جو پانی اٹھاتے ہیں جس طرح چوپائے بوجھ اٹھاتے ہیں (2)۔ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا۝ سے مراد کشتیاں ہیں جو بوجھ اٹھاتی ہیں۔ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا سے مراد فرشتے ہیں جو مختلف امور بجا لاتے ہیں۔ حضرت جبرئیل امین سختیاں لاتے ہیں، حضرت میکائل رحمت کے حامل ہیں اور ملک الموت موت لاتے ہیں۔ فراء نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مختلف امر لاتے ہیں اس سے مراد خوشحالی، خشک سالی، بارش، موت اور حوادثات ہیں۔ اس کا باب یوں ذکر کیا جاتا ہے ذَرَتِ الرِّیحُ تَذْرُوْهُ ذَرْوا و تَذْرِیَةُ ذریا۔

پھر یہ کہا گیا ہے: وَالذّٰرِیٰتِ اور مابعد قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم اٹھاتا ہے تو اس کے لیے شرف کو ثابت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ذاریات کے رب کی قسم! اس کا جواب اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ ہے یعنی جس خیر، شر، ثواب اور عقاب کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ لَصَادِقٌ۝ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ لَصَادِقٌ کا معنی صدق ہے اسم مصدر کی جگہ واقع ہے ۔ وَّ اِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ۝ یعنی جزا تم پر واقع ہو رہی ہے۔ پھر دوسری قسم اٹھائی اور فرمایا: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۝ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذاریات سے مراد بچے جننے والی عورتیں ہیں (3) کیونکہ ان کے جننے سے ہی مخلوق پھیلتی ہے کیونکہ وہ اولاد کو بکھیرتی ہیں تو وہ ذاریات ہوگئیں ان کی قسم اٹھائی کیونکہ ان کے سینے کی ہڈیوں میں اس کے صالح بندوں میں سے بہترین لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے عورتوں کو خاص کیا مردوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ اولاد دونوں کی ہوتی ہے اس کی دو وجہیں ہیں (۱) کیونکہ وہ ہی ان کی حفاظت کے برتن ہیں جب کہ مردوں کی یہ صورت نہیں کیونکہ دونوں کے نطفے ان عورتوں کے رحم میں جمع ہوتے ہیں اس لیے ان کا خصوصاً ذکر کیا (۲) ان میں نطفہ طویل وقت تک رہا اور مباشرت میں ان کا زمانہ قریب ہے۔ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا۝ اس سے مراد بادل ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حاملات سے مراد عورتیں ہیں جب وہ حاملہ ہوتی ہیں (4)۔ وقر واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد کسی وزنی چیز کو پیٹھ یا پیٹ میں اٹھانا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: جاء یحمل وقرہ۔ وہ بوجھ اٹھائے ہوئے آیا۔ قد أوقر بعیرہٗ اس نے اپنے اونٹ پر بوجھ لادا۔ وقر کا لفظ عموماً خچر اور گدھے کے سامان اور وسق کا لفظ اونٹ کے سامان کے لیے بولا جاتا ہے۔ هذه امراءة موقرة جب اس عورت نے بھاری بوجھ اٹھایا ہوا ہو۔

اوقرت النخلة یہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کا پھل زیادہ ہو۔ یہ کہا جاتا ہے: نخلة موقرة و موقر و موقرة۔ موقر بھی ذکر کیا گیا ہے یہ خلاف قیاس ہے کیونکہ فعل نخلہ کے لیے ہے۔ اسے موقر کہا گیا ہے یہ قیاس کے مطابق ہے جس طرح تیرا قول امراۃ حامل ہے کیونکہ درخت کا پھل عورتوں کے حمل کے مشابہ ہے۔ جہاں تک موقر کا تعلق ہے یہ خلاف قیاس ہے۔ لبید کے قول میں یہی روایت کیا گیا ہے وہ کھجور کی تعریف کرتا ہے:

1۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 217
2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 395
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 360
4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 361

عَصَبٌ كَوَارِعُ فِي خَلِيجٍ مُحَلِّمٍ حَمَلَتْ فَمِنْهَا مُوقَرٌ مَكْمُومُ

محل استدلال موقر ہے۔ اس کی جمع مواقر ہے۔ جہاں تک وقر کا تعلق ہے تو اس سے مراد کان کا بوجھل ہونا ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے قد وَقِرَت أُذُنُه تَوقَر وقرا، یعنی وہ بہرا ہو گیا۔ اس کے مصدر میں قیاس تو یہ ہے کہ قاف متحرک ہوتا مگر وہ سکون کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے بارے میں بحث سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ مراد کشتیاں ہیں جو ہوا کے ساتھ آسانی سے چلتی ہیں جہاں بھی انہیں چلایا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بادل ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر اس کے آسانی سے چلنے کی دو صورتیں ہیں (۱) اللہ تعالیٰ انہیں جہاں بھی چلائے وہ شہر ہوں یا قطعہ زمین (۲) ان کا آسانی سے چلنا عربوں کے ہاں یہی معروف ہے جس طرح اعشیٰ نے کہا:

كَأَنَّ مِشْيَتَهَا مِنْ بَيْتِ جَارَتِهَا مَشْيُ السَّحَابَةِ لَا رَيْثٌ وَلَا عَجَلُ(1)

گویا اس کا اپنی پڑوسن کے گھر سے چلنا بادل کا چلنا ہے نہ سست روی سے اور نہ تیزی سے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝ يَسْــَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

"قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں بے شک تم مختلف (بے ربط) باتوں میں پڑے ہو منہ پھیرے ہے اس (قرآن) سے جس کا منہ ازل سے ہی پھیر دیا گیا ہے۔ ستیاناس ہو اٹکل پچو باتیں بنانے والوں کا جو غفلت کے نشہ میں بے سدھ پڑے ہیں وہ پوچھتے ہیں روز جزا کب آئے گا۔ یہ اس دن ہوگا جب وہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ اپنی سزا کا مزہ چکھو یہی ہے وہ جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے"۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں السَّمَآءِ سے مراد بادل ہیں جو زمین کو سایہ کیے ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بلند آسمان ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد ساتواں آسمان ہے(2)؛ اسے مہدوی، ثعلبی، ماوردی اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے۔ الْحُبُكِ میں سات قول ہیں (۱) یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور ربیع کا قول ہے(3)۔ یعنی خوبصورت و کامل تخلیق والا؛ یہ عکرمہ کا قول ہے کہا: کیا تو کپڑا بننے والے کو نہیں دیکھتا جب وہ کپڑا بنتا ہے اور اس کو اچھی طرح بنتا ہے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: حبك الثوب يحبكه جس نے اس کی اچھی طرح بنائی کی۔ ابن اعرابی نے کہا: ہر وہ چیز جس کو تو مضبوط بنائے اور اس کے عمل کو اچھا کرے تو اس کے لیے کہیں گے احتبكته۔ (۲) خوبصورت؛ یہ حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے: مراد ستاروں والا(4)۔ یہ تیسرا قول ہے (۴) ضحاک نے کہا: راستوں والا۔ پانی اور ریت پر جب ہوا چلے تو اس میں تو جو دیکھتا ہے اسے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 361
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 362
3۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 220
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 70

حبک کہتے ہیں۔ اس کی مثل فراء کا قول ہے، کہا: حبك ہر شے کی شکن کو کہتے ہیں جس طرح ریت جس پر پرسکون ہوا چلے، کھڑا پانی جس پر ہوا چلے، لوہے کی زرہ کی شکنوں کو حبك کہتے ہیں۔ دجال کے متعلق حدیث میں ہے ان شعرہ حبك اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ زہیر نے کہا:

مُكَلَّلٌ بأصولِ النَّجْمِ تَنْسِجُه　رِيحٌ خَرِيقٌ لِضاحِي مائِهِ حُبُكٌ

لیکن وہ بندوں سے دور ہوتا ہے وہ اسے نہیں دیکھتے۔

(۵) مضبوط: یہ ابن زید کا قول ہے اور اس آیت کو پڑھا وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ⑫ (النباء) محبوك سے مراد وہ چیز ہے جو مضبوط جسم والی ہو جس طرح گھوڑا وغیرہ۔ امراء القیس نے کہا:

قد غَدَا يَحْمِلُنِی فی أَنْفِهِ　لَاحِقُ الإِطْلَيْنِ مَحْبُوكٌ مُمَرّ

ایک اور شاعر نے کہا:

مَرِجَ الدِّيْنَ فأعددتُ لَهُ　مُشْرِفَ الحارِكِ مَحْبُوكَ الْكَتَدْ

دونوں شعروں میں محبوك کا لفظ مضبوط و محکم کے معنی میں ہے۔

حدیث طیبہ میں ہے ان عائشة رضی الله تعالیٰ عنها كانت تحتبك تحت الدرع فی الصلاة۔(1)

یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نماز میں تہبند کو مضبوطی سے باندھا کرتی تھیں۔

(٦) مضبوط بنائی والا: یہ خصیف کا قول ہے اس سے ثوب صفيق اور وجه صفيق ہے۔

(۷) طرق سے مراد آسمان میں کہکشاں ہے اسے یہ نام دیا گیا کیونکہ گویا یہ کھینچنے کا نشان ہے۔ حبك، حباك کی جمع ہے۔ راجز نے کہا:

كأنَّما جَلَّلَها الْحُوَّاكُ　طنفسة فی وَشْيِها حِبَاكُ(2)

حباك اور حبيكه سے مراد ریت وغیرہ میں راستہ ہے۔ حباك کی جمع حبك ہے اور حبيكه کی جمع حبائك آتی ہے جب کہ یہ عبکه کی طرح ہے یہ ستو کا دانا ہے؛ یہ جوہری سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: ذات الحُبُك، الحُبْك، الحِبك الحِبْك، الحِبَك، الحِبُك اور انہوں نے اسے الحُبُك پڑھا ہے۔ عکرمہ اور ابومجلز سے الحُبُك مروی ہے الحُبُك اس کا واحد حبيكه ہے اور الحُبْك اسی سے مخفف ہے۔ الحِبَك اس کا واحد حِبْكه ہے جس نے اسے الحُبَك پڑھا ہے اس کا واحد حُبْكه ہے جس طرح برقه کی جمع برَق ہے یا یہ حُبْكه کی جمع ہے جس طرح ظُلْمَة کی جمع ظلم آتی ہے۔ جس نے اسے الحِبك پڑھا ہے تو یہ ابل اور اطل کی طرح ہے الحِبْك یہ مخفف ہے جس نے اسے الحِبُك پڑھا تو یہ شاذ ہے کیونکہ کلام عرب میں فِعُل کا وزن نہیں یہ داخل لغات پر محمول ہے گویا حاء کو کسرہ دیا گیا تا کہ باء کو کسرہ دیا جائے پھر الحُبُك کا تصور کیا تو باء کو ضمہ دیا؛ یہ سب تعبیریں مہدوی نے ذکر کی ہیں۔

1۔ سنن بیہقی، جلد 2، صفحہ 235　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 220

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ یہ قسم کا جواب ہے جو والسماء ہے یعنی اے اہل مکہ! تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں مختلف رائے رکھنے والے ہو کچھ تصدیق کرنے والے اور کچھ تکذیب کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ باہم مال تقسیم کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ آپ جادوگر ہیں نہیں بلکہ شاطر ہیں نہیں بلکہ بہتان لگانے والے ہیں نہیں بلکہ مجنون ہیں نہیں بلکہ کاہن ہیں نہیں بلکہ پہلے لوگوں کے یہ قصے کہانیاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ان میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حشر کی نفی کی، ان میں سے کچھ نے شک کا اظہار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ مراد بتوں کے پجاری ہیں جو یہ اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق ہے جب کہ عبادت غیروں کی کرتے ہیں (1)۔

يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ۝ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان سے اسے پھیر دیا جاتا ہے جسے پھیر دیا جاتا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس نے ان کے قول کا یہ ارادہ کیا کہ یہ جادو ہے، کہانت ہے اور پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ان کو ایمان سے پھیر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے اللہ تعالیٰ نے جسے محفوظ رکھا اسے اس اختلاف سے پھیر لیا گیا۔ افکہ، یأفِکه افکا۔ یعنی اسے کسی شے سے پھیر دینا۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا (الاحقاف: 22) مجاہد نے کہا: يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ۝ کا معنی ہے يُؤفَنُ عنه من أُفِنَ، أفن سے مراد عقل کا فاسد ہونا ہے یعنی جس کا عقل فاسد ہو جاتا ہے اسے اس سے پھیر دیا جاتا ہے۔ زمخشری نے کہا: اسے يُوفَنَ عنه من اُفِن پڑھا گیا ہے یعنی اسے محروم رکھا جاتا ہے جسے محروم رکھا گیا۔ یہ اَفَنَ الضَّرعَ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے کھیری کا تمام دودھ دوہ لیا۔ قطرب نے کہا: معنی ہے اسے دھوکہ میں رکھا جاتا ہے جسے دھوکہ دیا گیا (2)۔ یزیدی نے کہا: اس سے دور رکھا جاتا ہے جسے دور رکھا گیا۔ معنی ایک ہی ہے سب معانی پھیرنے کے معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝ تفسیر میں ہے کذابوں پر لعنت ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: شک کرنے والے قتل ہوں۔ مراد کاہن ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا (3)۔ قُتِلَ کا معنی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بددعا کرنا واجب ہو چکی ہے۔ فراء نے کہا: قتل کا معنی ہے اس پر لعنت ہو۔ کہا: الْخَرّٰصُوْنَ سے مراد جھوٹے ہیں جو اس چیز کے بارے میں گمان کرتے ہیں جس کو جانتے نہیں وہ کہتے ہیں: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون، کذاب، جادوگر اور شاعر ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) یہ ان کے بارے میں بددعا ہے کیونکہ جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے وہ مقتول اور ہلاک ہونے والے کے معنی میں ہے۔ ابن الانباری نے کہا: ہم نے ان کے لیے بددعا کی تعلیم دی یعنی یہ کہو قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ۔ یہ خارص کی جمع ہے خرص کا معنی جھوٹ ہے اور خراص سے مراد کذاب ہے اس کا باب یوں چلتا ہے خَرَصَ يَخْرُصُ خرصا۔ یعنی اس نے جھوٹ بولا۔

کہا جاتا ہے: خَرَصَ، اِخْتَرَصَ، خَلَقَ، اِخْتَلَقَ، بَشَكَ، اِبْتَشَكَ اور مَانَ سب کا معنی جھوٹ بولنا ہے؛ یہ نحاس نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 363 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 71

بیان کیا ہے۔ خرص کا معنی یہ بھی ہے کہ کھجور کے درخت پر جو تر کھجوریں ہیں ان کو خشک کھجوروں کے ساتھ اندازہ سے بیچنا۔ اس کے لیے یہ جملہ بولتے ہیں: وقد خرصت النخل اس کا اسم خرص ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کم خرص نخلك خراص اسے کہتے ہیں جو اس کا اندازہ لگاتا ہے یہ لفظ مشترک ہے۔ خرص کا اصل معنی قطع کرنا ہے جس کی وضاحت سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے؛ اسی سے ایک خریص ہے جو خلیج کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ اس کی طرف پانی الگ ہو جاتا ہے۔ خِرص اور خُرص بال کے ایک دانہ کو کہتے ہیں جب وہ الگ ہو کیونکہ وہ دوسروں سے منقطع ہوتا ہے خرص کا معنی عود ہے کیونکہ وہ اپنی عمدہ خوشبو کی وجہ سے اپنی مثل سے ممتاز ہوتا ہے۔ خرص اسے بھی کہتے ہیں جسے بھوک اور سردی لگی ہو کیونکہ اس کے ساتھ وہ الگ تھلگ ہو جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: خرص الرجل فهو خرِص یعنی وہ بھوک اور ٹھنڈک کا شکار ہے بھوک ہو سردی نہ ہو اسے خرص نہیں کہتے سردی ہو بھوک نہ ہو اسے خرص کہتے ہیں۔ خرص جب خاء کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد سونے یا چاندی کا حلقہ ہے اس کی جمع خُرصان ہے۔ خرص میں نجومیوں کا قول بھی داخل ہوتا ہے اور ہر اس آدمی کا قول بھی داخل ہوتا ہے جو حدس اور تخمینہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکہ کی گھاٹیوں کو باہم تقسیم کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مختلف باتیں کی تھیں مقصود یہ تھا کہ لوگوں کو ایمان سے پھیر دیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝ غَمْرَةٍ اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو ڈھانپ دے اسی سے نہر غمر ہے یعنی جو بھی اس میں داخل ہوتا ہے وہ نہر اسے ڈھانپ لیتی ہے؛ اسی سے موت کی سختیاں ہیں۔ سَاهُوْنَ وہ آخرت کے معاملہ میں لاپرواہی کرنے والے اور غافل ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ وہ سوال کرتے ہیں یوم حساب کب ہوگا؟ وہ یہ بات استہزاء اور قیامت میں شک کے طور پر کرتے ہیں۔ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝ لفظ یوم کو نصب الجزاء کے مقدر ہونے کے اعتبار سے ہے تقدیر کلام یہ ہوگی هذا الجزاء يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝ یعنی انہیں جلد بلایا جائے گا۔

یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: فتنت الذهب میں نے سونے کو جلایا تا کہ تو اسے آزمائے۔ فتنہ کا اصل معنی اختبار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مبنی ہے کیونکہ یہ مبنی کی طرف مضاف ہے اس پر نصب سابقہ تقدیر کی بنا پر ہے یا یہ يَوْمُ الدِّيْنِ سے بدل کے طور پر منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: وہ کہتا ہے يعجبني يوم أنت قائم ويوم أنت تقوم۔ اگر تو چاہے تو تو یوم کو نصب بھی دے سکتا ہے یہ محل رفع میں ہے یہ منصوب ہوگا اگرچہ معنی کے اعتبار سے مرفوع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: يُفْتَنُوْنَ کا معنی ہے انہیں عذاب دیا جائے گا (1)؛ اس معنی میں شاعر کا شعر ہے:

كلُّ امرئٍ من عبادِ الله مُضْطَهدٌ　بِبطنِ مكةَ مقهورٌ و مفتونٌ

مکہ کی وادی میں اللہ تعالیٰ کا ہر بندہ مظلوم، مغلوب اور عذاب دیا جا رہا ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ انہیں کہا جائے گا: اپنا عذاب چکھو (2)؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: اپنی آگ کا مزا چکھو۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 346　2۔ ایضاً

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی جو تم جھٹلاتے رہے ہو اس کا مزا چکھو۔ فراء نے کہا: اپنا عذاب چکھو۔

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ یعنی تم دنیا میں جس کی جلدی مچاتے رہے ہو۔ مذکر کی ضمیر ذکر کی مونث کی ضمیر ذکر نہیں کی کیونکہ یہاں فتنہ عذاب کے معنی میں ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ۝

''البتہ اللہ سے ڈرنے والے (اس روز) باغات اور چشموں میں ہوں گے (بصد شکر) لے رہے ہوں گے جو ان کا رب انہیں بخشے گا، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نیکوکار تھے''۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے انجام کا ذکر کیا تو مومنوں کے انجام کا بھی ذکر کیا یعنی مومن ایسے باغوں میں ہوں گے جن میں جاری چشمے ہوں گے یعنی انتہائی پاکیزہ ہوں گے۔ اٰخِذِیْنَ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔

مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ان کے رب نے انہیں جو ثواب اور مختلف قسم کی عزتیں عطا فرمائیں، یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر نے کہا: معنی ہے وہ فرائض پر عمل کرنے والے ہیں۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ۝ یعنی جنت میں داخل ہونے سے قبل دنیا میں وہ فرائض بجالانے والے تھے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے فرائض کے لازم ہونے سے قبل وہ اپنے اعمال میں احسان کرنے والے تھے۔

كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ۝ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝

''یہ لوگ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے اور سحری کے وقت (اپنی خطاؤں) کی بخشش طلب کرتے تھے اور ان کے اموال میں حق تھا سائل کے لیے اور محروم کے لیے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ۝ یَهْجَعُوْنَ کا معنی ہے وہ سوتے ہیں۔ ھجوع کا معنی رات کو سونا ہے۔ تھجاع سے مراد ہلکی نیند ہے؛ ابوقیس بن اسلت نے کہا:

قد حصّتِ البیضةُ رأسی فما أطعَمُ نومًا غیرَ تَهجاعِ

خود نے میرے سر کے بال مونڈ دیئے ہیں۔ میں تھجاع (ہلکی نیند) کے علاوہ کوئی نیند نہیں کرتا۔

عمرو بن معدیکرب اپنی بہن کے لیے شوق کا اظہار کرتا ہے جسے صمہ ابودرید بن صمہ نے گرفتار کرلیا تھا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 365

أَمِنْ رَيْحَانَةَ الدَّاعِي السَّمِيعُ يُؤَرِّقُنِي وأصحابي هُجوعُ

کیا ریحانہ کی جانب سے سنانے والا داعی (شوق) مجھے بیدار رکھتا ہے اور میرے ساتھی سوئے ہوئے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے: هَجَعَ يهجع هجوعا، هبغ، يهبغ هبوغا۔ جب وہ سو جائے؛ یہ جوہری نے کہا۔ ما کی تعبیر میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ زائد ہے؛ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے تقدیر کلام یہ ہے کانوا قليلا من الليل يهجعون یعنی وہ رات کا تھوڑا حصہ سوتے ہیں اور اس کا اکثر حصہ نماز پڑھتے رہتے ہیں۔

عطا نے کہا: یہ اس وقت ہوا جب انہیں رات کے قیام کا حکم ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کمر کس لیتے تھے، عصا پکڑ لیتے تھے اس پر سہارا لیتے یہاں تک کہ رخصت نازل ہوئی قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (مزمل) ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما زائدہ نہیں بلکہ قليلا پر وقف ہے پھر مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ سے کلام کا آغاز ہوگا۔ تو ما نافیہ ہوگا ان سے نیند کی مطلقاً نفی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ رات کے وقت بہت ہی تھوڑا سویا کرتے تھے بعض اوقات ان کی طبیعتوں میں نشاط ہوتی تو وہ سحری تک ذکر اذکار میں مشغول رہتے (1)۔ یعقوب حضری سے مروی ہے انہوں نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: كَانُوْا قَلِيْلًا اس کا معنی ہے ان کی تعداد تھوڑی تھی، پھر کلام کی ابتدا کی اور فرمایا: مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ یعنی وہ رات سے سوئے ہوئے ہیں۔ ابن الانباری نے کہا: یہ تعبیر فاسد ہے کیونکہ آیت ان کی نیند کی کمی پر دلالت کرتی ہے ان کی تعداد کی کمی پر دلالت نہیں کرتی اس کے بعد اگر ہم مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ سے آغاز کریں جس کا معنی ہے وہ رات سے بیدار رہتے ہیں اس میں ان کے لیے مدح نہیں کیونکہ تمام لوگ رات سوتے رہتے ہیں مگر اس صورت میں ما نافیہ ہو۔

میں کہتا ہوں: بعض لوگوں نے جو تاویل کی ہے یہ ضحاک کا قول ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی تھی تو کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہوگی جو ماقبل کلام یہ ہے اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ یعنی وہ محسن تھوڑے تھے۔ پھر کلام کو شروع کیا فرمایا: مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ پہلی اور دوسری تاویل کی بنا پر كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ نیا خطاب ہوگا جب کہ پہلا خطاب مکمل ہو چکا تھا اور وقف مَا يَهْجَعُوْنَ پر ہوگا۔ اسی طرح جب تو قَلِيْلًا کو کان کی خبر بنائے اور ما قلیل کی وجہ سے محل رفع میں ہو، گویا فرمایا: رات کے وقت ان کی نیند تھوڑی ہوتی ہے۔ ما کے بارے میں جائز ہے کہ وہ نافیہ ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے ساتھ مل کر مصدر کے حکم میں ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ کان کے اسم سے بدل ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی کان هجوعهم قليلا من الليل اگر تو ما کو زائدہ تسلیم کیا جائے قَلِيْلًا کو نصب يهجعون کے ساتھ ہوگی، تقدیر کلام یہ ہوگی کانوا وقتا قليلا او هجوعا قليلا يهجعون۔ اگر ما کو زائدہ نہ مانا جائے تو قَلِيْلًا کان کی خبر ہوگی اور اسے يَهْجَعُوْنَ کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ جب اس کی نصب يَهْجَعُوْنَ کے ساتھ ما کو مصدر یہ مقدر ماننے سے ہو تو صلہ موصول سے پہلے آتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور قتادہ نے آیت کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا: وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا: وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نہیں سوتے؛ یہ ابن وہب کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت انصار کے بارے

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 72

میں نازل ہوئی۔ وہ مغرب اور عشاء کی نمازیں مسجد نبوی میں پڑھتے پھر وہ قبا چلے جاتے۔ حضرت محمد بن علی بن حسین نے کہا: وہ عشاء کی نماز پڑھنے سے قبل نہیں سوتے تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: گویا ان کی نیند کو نماز کے لیے ان کی بیداری کے مقابلہ میں قلیل شمار کیا۔ حضرت ابن عباس اور مطرف نے کہا: کوئی رات کم ہی ایسی ہوگی جو ان پر آتی ہو جس میں وہ نماز نہ پڑھتے ہوں وہ اس کے ابتدائی حصہ میں نماز پڑھتے ہیں یا آخری حصہ میں نماز پڑھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ رات کے وقت نماز پڑھنے والوں میں ایک سے یہ روایت مروی ہے کہ حالت نیند میں ان کے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے یہ شعر پڑھا:

وکیف تنامُ اللیلَ عینٌ قریرۃٌ ولم تدرِ فی أیِّ المجالِسِ تنزِلُ

مراد پانے کی خواہش رکھنے والی آنکھ کیسے رات کو سو سکتی ہے وہ نہیں جانتی کہ کون سی مجلس میں جا اترے گی۔

بنو ازد کے ایک بندے سے مروی ہے اس نے کہا: میں رات کو نہیں سوتا تھا میں رات کے آخری پہر سویا تو اچانک میں دو نوجوانوں کے پاس تھا جو میں نے لوگ دیکھے تھے ان میں سے وہ حسین ترین تھے ان کے پاس حلے تھے وہ ہر نمازی کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے ایک حلہ پہنایا پھر وہ سونے والوں کے پاس پہنچے اور انہیں حلہ نہ پہنایا۔ میں نے ان دونوں سے کہا: ان حلوں (کپڑوں کا جوڑا) میں سے ایک حلہ مجھے بھی پہنا دو۔ انہوں نے مجھے کہا: یہ لباس کا حلہ نہیں یہ الله تعالیٰ کی رضا کا حلہ ہے جو ہر نمازی پر اترتا ہے۔

ابو خلاد سے مروی ہے اس نے کہا: میرے ایک ساتھی نے مجھے بتایا ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ میرے لیے قیامت کا منظر پیش کیا گیا میں نے اپنے بھائیوں میں سے کچھ کو دیکھا ان کے چہرے روشن تھے، ان کے رنگ چمک رہے تھے اور ان پر حلے تھے جو عام مخلوق کے لباس نہیں تھے میں نے کہا: کیا وجہ ہے یہ لوگ لباس پہنے ہوئے ہیں جب کہ لوگ ننگے ہیں، ان کے چہرے روشن ہیں جب کہ لوگوں کے چہرے غبار آلود ہیں؟ تو مجھے کسی کہنے والے نے کہا: جن کو تو نے لباس میں دیکھا ہے وہ اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھتے تھے، جن کے چہرے روشن ہیں وہ بیداری اختیار کرنے والے اور تہجد پڑھنے والے ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کو عمدہ سواریوں پر دیکھا میں نے پوچھا ان لوگوں کو کیا ہوا کہ یہ سوار ہیں جب کہ لوگ پیدل اور ننگے پاؤں ہیں؟ تو ایک کہنے والے نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو الله تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے اپنے قدموں پر کھڑے رہے اس کے بدلے الله تعالیٰ نے انہیں بہترین بدلہ دیا تو میں نے نیند میں چیخ ماری۔ عبادت گزاروں کے لیے مبارک ہو ان کا مقام کتنا معزز ہے پھر میں نیند سے بیدار ہوا تو میں خوفزدہ تھا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ یہ دوسری مدح ہے وہ اپنے گناہوں کی استغفار کرتے ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(1)۔ سحری کا وقت ایسا وقت ہے جس میں دعا کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورہ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عمر اور مجاہد نے کہا: وہ سحری کے وقت نماز پڑھتے ہیں تو اس نماز کو

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 73

استغفار کا نام دیا گیا(1)۔ حضرت حسن بصری نے الله تعالیٰ کے فرمان كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ کے بارے میں کہا: انہوں نے رات کے پہلے پہر سے سحری تک نماز کو لمبا کیا پھر سحری کے وقت الله تعالیٰ سے مغفرت طلب کی۔ ابن وہب نے کہا: یہ آیت انصار کے حق میں نازل ہوئی وہ قبا سے آتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھتے۔

ابن وہب، ابن لہیعہ سے وہ یزید بن ابی حبیب سے روایت نقل کرتے ہیں: مراد وہ لوگ ہیں جو پھل کی شرط پر ڈولوں کی مدد سے کچھ انصاریوں کے باغوں کو پانی دیتے پھر تھوڑا سو جاتے اور رات کے آخری پہر نماز پڑھا کرتے تھے۔

ضحاک نے کہا: مراد صبح کی نماز ہے۔ احنف بن قیس نے کہا: میں نے اپنے عمل کو جنتیوں کے اعمال پر پیش کیا تو وہ ایسی قوم تھے جو ہم سے بہت ہی دور تھے ہم ان کے اعمال تک نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ راتوں کو کم سوتے تھے۔ میں نے اپنے عمل کو جہنمیوں کے اعمال پر پیش کیا تو وہ ایسی قوم تھے جن میں کوئی بھلائی نہیں وہ الله تعالیٰ کی کتاب، اس کے رسول اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو جھٹلاتے ہیں ہم نے اپنے میں سے بہترین افراد کو ایسی قوم پایا جنہوں نے اچھے اور برے عمل کو خلط ملط کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ یہ تیسری مدح ہے۔ محمد بن سیرین اور قتادہ نے کہا: حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں حق سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ ہے جس کے ساتھ وہ صلہ رحمی کرتا ہے، مہمان کی ضیافت کرتا ہے، بے کس کا بوجھ اٹھاتا ہے یا محروم کو غنی کرتا ہے(2)، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی۔ ابن عربی نے کہا: اس آیت کے بارے میں قوی قول زکوٰۃ ہے کیونکہ سورۂ سأل سائل میں ہے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ حق معلوم سے مراد زکوٰۃ ہی ہے شرع نے جس کی مقدار، اس کی جنس اور اس کے وقت کو بیان کیا ہے۔ جہاں تک اس قول کا تعلق ہے جو اس کو کہتا ہے وہ معلوم نہیں کیونکہ اس کی مقدار، اس کی جنس اور وقت معلوم نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ سائل اسے کہتے ہیں جو اپنے فاقہ کی وجہ سے لوگوں سے سوال کرتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، سعید بن مسیب اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ محروم سے مراد وہ ہے جسے مال سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، سعید بن مسیب اور دوسرے علماء نے کہا: محروم سے مراد وہ مجبور آدمی ہے جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہ ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: محروم سے مراد وہ محنت مزدوری کرنے والا ہے جس کو اس کی کمائی کفایت نہ کرتی ہو یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل محارَف محدود مسائل والا محروم، یہ تیرے اس قول کی ضد ہے؛ مبارک یہ جملہ بولا جاتا ہے: وقد حُورِف کسب فلان۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کی روزی میں تنگی کر دی گئی ہو، گویا اس کا رزق اس سے پھیر دیا گیا ہے۔

قتادہ اور زہری نے کہا: محروم سے مراد وہ ہے جو لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کرتا اور اپنی حاجت سے آگاہ بھی نہیں

2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 234 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 366

کرتا۔ حضرت حسن بصری اور محمد بن حنفیہ نے کہا: محروم وہ آدمی ہے جو غنیمت کے حاصل ہونے کے بعد کرتا ہے اور اس مال غنیمت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا (1)۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹا لشکر بھیجا انہوں نے دشمن کو پالیا اور مال غنیمت حاصل کیا جب یہ مہم سے فارغ ہو گئے تو کچھ لوگ آئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عکرمہ نے کہا: محروم اسے کہتے ہیں جس کے پاس مال باقی نہ ہو۔ زید بن اسلم نے کہا: محروم اسے کہتے ہیں جس کے پھل، کھیتی یا جانوروں کی نسل میں کوئی آفت واقع ہو گئی ہو۔ قرظی نے کہا: محروم اسے کہتے ہیں جسے مصیبت پہنچی پھر اس نے یہ کلمات تلاوت کیے اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾ (الواقعہ) اسی کی مثل اصحاب جنت کے قصہ میں ہے جب انہوں نے کہا تھا: بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾ (الواقعہ)

ابو قلابہ نے کہا: اہل یمامہ کا ایک آدمی تھا جس کا مال تھا سیلاب آیا تو اس کا مال برباد کر دیا تو اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: یہ محروم ہے اس کے لیے حصہ مقرر کرو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو دنیا طلب کرتا ہے اور وہ اس سے اعراض کرتی ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ عبدالرحمن بن حمید نے کہا: محروم سے مراد مملوک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کتا ہے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز مکہ مکرمہ کے راستہ میں تھے ایک کتا آیا حضرت عمر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بکری کا ایک بازو نکالا اور اس کتے کی طرف پھینک دیا فرمایا: لوگ کہتے ہیں یہ محروم ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: محروم وہ ہے جس کے فقر کی وجہ سے اس کا نفقہ اس کے رشتہ داروں پر لازم کر دیا گیا ہو کیونکہ اس کو اس کی ذات کی کمائی سے محروم کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا نفقہ غیر کے مال میں سے لازم ہو جاتا ہے۔

ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد وہ ہے جسے رزق سے محروم کر دیا گیا ہو۔ یہ اچھا قول ہے کیونکہ یہ تمام اقوال کو جامع ہے۔

امام شعبی نے کہا: جب سے میں بالغ ہوا ہوں آج مجھے ستر سال ہو چکے ہیں میں محروم کے بارے میں سوال کرتا رہا ہوں آج میں اس دن سے زیادہ عالم نہیں ہوں۔ شعبہ نے عاصم احول سے وہ امام شعبی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ لغت میں اس کا اصل معنی ممنوع ہے جس کو روک دیا گیا ہو۔ یہ حرمان سے مشتق ہے جس کا معنی روکنا ہے۔ علقمہ نے کہا:

ومُطْعَمُ الغُنْمِ يومَ الغُنْمِ مُطْعَمُهُ أَنَّى تَوَجَّهَ والمحرومُ محرومُ

جس کو غنیمت کا مال کھلایا جاتا ہو غنیمت والے دن اسے غنیمت کا مال کھلایا جاتا ہے وہ جہاں بھی جائے جب کہ جسے روک دیا جائے وہ محروم ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فقراء کی جانب سے اغنیاء کے لیے ہلاکت ہے فقراء کھڑے ہوں گے وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! انہوں نے ہمارے ان حقوق کو روک لیا جو تو نے ہمارے حق

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 366

میں ان پر فرض کیے تھے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میری عزت و جلال کی قسم! میں تمہیں قریب کروں گا اور انہیں دور کروں گا'' (1)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کیا:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝

''اور زمین میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اہل یقین کے لیے اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتا۔ اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور ہر وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ حق ہے (بعینہ اسی طرح) جس طرح تم باتیں کر رہے ہو''۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ جب دونوں فریقوں کے معاملہ کا ذکر کیا تو اس امر کو بیان فرمایا کہ زمین میں ایسی علامات ہیں جو بعث اور نشور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہر چیز ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے تو پھر وہاں نباتات اگ آتی ہے، ان میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں رزق کو مقدر کیا جو حیوانات کے لیے سہارا ہے، ان میں سے یہ بھی ہے وہ مختلف علاقوں میں جاتے ہیں جن میں ہلاکت کے آثار کو دیکھتے ہیں جو جھٹلانے والی قوموں پر ہلاکت واقع ہوتی تھی۔ موقنین ہی حقیقت میں رب العالمین کی وحدانیت اور اپنے نبی کی نبوت کی صداقت کو پہچاننے والے اور ثابت کرنے والے ہیں ان کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ یہی ان آیات اور ان کے نتائج سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے وفی الأرض وفی أنفسکم آیات للموقنین۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے جو آدمی زمین میں گھومتا پھرتا ہے تو وہ آیات اور عبرت کی چیزوں کو دیکھتا ہے اور جو اپنی ذات میں غور و فکر کرتا ہے تو اسے علم ہو جاتا ہے کہ اسے اس لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ ابن زبیر اور مجاہد نے کہا: مراد بڑی، چھوٹی حاجت کا راستہ ہے (2)۔

سائب بن شریک نے کہا: انسان کھاتا پیتا ایک جگہ سے ہے اور یہ چیزیں دو جگہ سے نکلتی ہیں جو آدمی خالص دودھ پیتا ہے تو اسی سے پانی اور اسی سے براز نکلتا ہے۔ یہ نفس آیت ہے۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل بنا دیے ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ (الروم)

سدی نے کہا: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ سے مراد ہے تمہاری زندگی اور تمہاری موت میں اور جو کچھ تم میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ تم سے نکلتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: شباب کے بعد بڑھاپے میں، قوت کے بعد ضعف میں، سیاہ بالوں کے بعد سفید بالوں میں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے تمہیں پیدا کرنے میں یعنی نطفہ، جما ہوا خون، گوشت کا لوتھڑا اور ہڈی یہاں

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 310 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 367 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 74

تک کہ اس میں روح پھونکی، زبانیں، رنگ اور صورتیں مختلف بنائی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ظاہری اور باطنی نشانیاں ہیں تیرے لیے دل، ان میں جو عقول رکھ دیئے گئے ہیں، ان میں معانی اور فنون کی جو انواع خاص کر دی گئی ہیں، زبانیں، قوت گویائی، حروف کے مخارج، آنکھیں اور باقی ماندہ تمام اعضاء، ان امور کو بجالانا جن کے لیے انہیں پیدا کیا گیا، جوڑوں سے اعضاء میں جو یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک طرف مڑ جاتے ہیں اور دوہرے ہو جاتے ہیں جب ان میں سامنے کوئی چیز خشک ہو جائے تو ان میں عجز واقع ہو جاتا ہے اور جب وہ ڈھیلے ہو جائیں تو بے بسی ڈیرا لگا لیتی ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (المومنون)

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ کیا تمہارے دلوں میں بصیرت نہیں کہ تم اس کی کمال قدرت کو پہچان لو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے کیا تم عاجز کی کامیابی اور محتاط کی محرومی نہیں دیکھتے۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ عبرت حاصل کرنے میں مراد ہے ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت توحید میں یہ بحث ذکر کر دی ہے کہ بدن انسانی جو عالم صغیر ہے اس میں جو کچھ ہے عالم کبیر میں اس کی مثال موجود ہے ہم نے وہاں قیام کرنے اور عبرت حاصل کرنے کے حوالے سے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ کافی ہے اور جو آدمی غور و فکر کرتا ہے وہ اسے دوسری بحث سے بے نیاز کر دے گا۔

وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: یہاں رزق سے مراد وہ چیز ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے جیسے بارش اور برف جس کے ذریعے کھیتی اگتی ہے اور مخلوق زندگی پاتی ہے(1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد ہر جاری چشمہ ہے کیونکہ یہ برف سے پیدا ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے جب آپ بادل دیکھتے تو اپنے ساتھیوں سے فرماتے: اللہ کی قسم! اس میں تمہارے لیے رزق ہے مگر تم اپنی غلطیوں کی وجہ سے محروم کر دیئے جاتے ہو۔

علماء معانی نے کہا: وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ کا معنی ہے بارش میں تمہارے لیے رزق ہے۔ بارش کو سماء کا نام دیا کیونکہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

إذا سقط السماءُ بأرضِ قومٍ　رعيناه وإنْ كانوا غِضَابَا

جب کسی قوم کی سرزمین میں بارش نازل ہوتی ہے تو ہم اس کی گھاس کو چرتے ہیں اگرچہ وہ لوگ بہت ہی غصیلے ہوں۔

ابن کیسان نے کہا: معنی ہے آسمان کے ذمہ تمہارا رزق ہے اس کی مثل یہ ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6) سفیان ثوری نے کہا: اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں آسمان میں تمہارا رزق ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے آسمان میں تمہارے رزق کی تقدیر ہے اور تمہارے لیے جو کچھ ہے وہ ام الکتاب میں لکھا ہوا ہے۔ سفیان ثوری سے مروی ہے(2) کہ واصل احدب نے ان کلمات وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ کو پڑھا کہنے لگے: خبردار! میں اپنے رزق کو آسمان میں پاتا ہوں اور اسے تلاش زمین میں کرتا ہوں۔ وہ ایک کھنڈر میں داخل ہوئے وہ تین دن تک وہاں

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 367　2۔ تفسیر طبری، جز 26، صفحہ 240

رہے کسی چیز کو نہ پایا تیسرے دن انہوں نے تر کھجوروں کی ایک ٹوکری پائی اس کا ایک بھائی اچھی نیت والا تھا وہ اس کے ساتھ داخل ہوا تو وہ دو ٹوکریاں ہو گئیں ان کا یہی طریقہ رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے موت کے ساتھ ان دونوں کے درمیان جدائی پیدا کی۔ ابن محیصن اور مجاہد نے اسے پڑھا وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ اسی طرح اس کے آخر میں پڑھا ان اللہ ھو الرزاق۔

وَمَا تُوْعَدُوْنَ مجاہد نے کہا: مراد خیر اور شر جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ دوسروں نے کہا: یہاں اس سے مراد صرف خیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد صرف شر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد جنت ہے یہ سفیان بن عیینہ سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: وَمَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد جنت اور دوزخ ہے(1)۔ ابن سیرین نے کہا: وَمَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد قیامت ہے؛ یہ ربیع کا بھی قول ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ

اللہ تعالیٰ نے انہیں بعث بعد الموت اور آسمان میں جس رزق کی تخلیق فرمائی ہے اس کی جو خبر دی تھی اس کو موکد کیا اس پر یہ قسم اٹھائی کہ یہ حق ہے اور پھر اس فرمان مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝ کو موکد کیا اور حواس میں سے نطق کو خاص کیا کیونکہ اس کے علاوہ جو حواس ہیں ان میں مثل (شبہ) محقق ہو سکتی ہے جس طرح آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے جب صفراء کا غلبہ ہو تو چکھنا محال ہو جاتا ہے، اسی طرح کانوں میں دوی اور طنین (جھنجھناہٹ) واقع ہو سکتی ہے، قوت گویائی اس سے محفوظ ہوتی ہے۔ صدائے بازگزشت سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا حصول اس وقت ہوتا ہے جب گفتگو کرنے والا کلام کر لے اس میں ایسی چیز کی آمیزش نہیں ہوتی جو اس پر معاملہ کو مشتبہ کر دے۔

ایک حکیم نے کہا: جس طرح ہر انسان خود بات کرتا ہے اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ غیر کی زبان سے بات کرے اسی طرح ہر انسان اپنا رزق کھاتا ہے اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ غیر کا رزق کھائے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قاتل اللہ أقواما اقسم لھم ربھم بنفسه ثم لم یصدقوہ، قال اللہ تعالیٰ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (2) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہلاک کرے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنی ذات کی قسم اٹھائی پھر بھی انہوں نے اس کی تصدیق نہ کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔

اصمعی (3) نے کہا: ایک دفعہ میں بصرہ کی مسجد سے آیا کہ ایک بدو جو اکھڑ مزاج، ترش رو اپنی سواری پر موجود تھا اس نے تلوار گلے میں لٹکائی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں کمان تھی وہ قریب ہوا اور سلام کیا اس نے پوچھا: تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ میں نے کہا: میں بنی اصمع سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس نے پوچھا: تو اصمعی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: تو کہاں سے آیا ہے؟ میں نے جواب دیا: اس جگہ سے آیا ہوں جہاں رحمن کے کلام کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس نے کہا: رحمن کا کلام ہے جسے لوگ پڑھتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: اس میں سے کچھ مجھ پر پڑھو تو میں نے اس پر اس سورت کو وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ تک پڑھا اس نے کہا: اے اصمعی! کافی ہے۔ پھر اپنی اونٹنی کی طرف اٹھا اسے ذبح کیا اس کی جلد اتاری اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 368	2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 75	3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 400

کہا: اس کے تقسیم کرنے میں میری مدد کرو۔ ہم نے اس کا گوشت آنے جانے والے پر تقسیم کر دیا پھر اس نے تلوار اور کمان کا قصد کیا ان دونوں کو توڑ دیا اور ان دونوں کو کجاوے کے نیچے رکھ دیا اور جنگل کی طرف چل دیا وہ کہہ رہا تھا: وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۞ میں نے اپنے آپ پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو ملامت کی۔ پھر میں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اسی اثنا میں کہ میں طواف کر رہا تھا تو میں ایک کمزور سی آواز کے پاس تھا میں متوجہ ہوا تو میں اسی بدو کے پاس تھا وہ انتہائی کمزور اور زرد رنگ والا ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: مجھ پر رحمن کا کلام پڑھو اور مقام ابراہیم کے پاس مجھے بٹھا لیا، تو میں نے سورۃ الذاریات پڑھی یہاں تک کہ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۞ تک پہنچا اس بدو نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہم نے اسے حق پایا ہے۔ اس نے کہا: اس کے علاوہ بھی کلام ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۞ بدو نے چیخ ماری کہا: سبحان اللہ! کس نے رب جلیل کو غضبناک کیا ہے یہاں تک کہ اس نے قسم اٹھائی کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تصدیق نہ کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو قسم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے یہ بات تین دفعہ کہی تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

یزید بن مرثد نے کہا: ایک آدمی کو ایسی جگہ بھوک لگ گئی جہاں کوئی چیز نہ تھی اس نے عرض کی: اے اللہ! جس رزق کا تو نے وعدہ کیا ہے تو وہ مجھے عطا کر تو وہ اسی وقت سیر ہو گیا۔ کھانے اور پینے کے بغیر اس کا پیٹ بھر گیا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو أن أحدكم فرّ من رزقه لتبعه كما يتبعه الموت اگر تم میں سے کوئی اپنے رزق سے بھاگتا ہے تو رزق اس کا پیچھا کرتا ہے جس طرح موت اس کا پیچھا کرتی ہے: اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حبہ اور سواء جو خالد کے بیٹے ہیں سے مروی ہے، دونوں نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کوئی کام کر رہے تھے ہم نے اس کام میں آپ کی مدد کی آپ نے فرمایا: لا تيأسا من الرزق ما تهززت رؤوسكما فإن الإنسان تلده أمه أحمر ليس عليه قشر ثم يرزقه الله (1) جب تک تمہارے سر حرکت کرتے ہیں (یعنی تم زندہ ہو) تم رزق سے مایوس نہ ہو کیونکہ انسان کو اس کی ماں گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں جنتی ہے اس پر لباس بھی نہیں ہوتا، پھر اللہ تعالیٰ اسے رزق باہم پہنچاتا ہے۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ بدو لوگوں میں سے ایک قوم نے کھیتی کاشت کی اسے ایک آفت نے آلیا وہ اس وجہ سے غمگین ہوئے ایک بدوی عورت ان کے پاس آئی اس نے کہا: کیا وجہ ہے تم نے اپنے سر جھکائے ہوئے ہیں، تمہارے سینے تنگ ہو چکے ہیں جب کہ وہ ہمارا رب ہے اور ہمارے بارے میں علم رکھتا ہے، ہمارا رزق اس کے ذمہ ہے وہ ہمیں عطا فرماتا ہے جہاں سے چاہتا ہے پھر وہ یہ شعر پڑھنے لگی:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب التوكل واليقين، حدیث نمبر 4154، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لوکان فی صخرۃ فی البحر راسیۃ صُمًّا مُلَمْلِمَۃ مَلْسًا نَواحیھا
رِزْقٌ لنفسٍ بَرَاھَا لانفلقتْ حتی تؤدی إلیھا کُلَّ مافیھا
أوکان بین طِباقِ السبع مسلکھا لَسَھَّلَ اللہ فی المرقیٰ مَرَاقیھا
حتّٰی تنال الذی فی اللوح خُطَّ لھا إنْ لم تنلہ وإلّا سوف یأتیھا

اگر ایسی چٹان جو سمندر میں گڑھی ہوئی ہو اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوں اس کے اطراف بڑے چکنے ہوں اس میں کسی نفس کا رزق ہو جس نفس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہو تو وہ پھٹ جائے گی یہاں تک کہ وہ نفس کو تمام کچھ دے گی جو اس میں ہوگا یا وہ رزق وہاں ہو جس تک پہنچنے کے لیے نفس کو سات آسمان چڑھنا پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نفس کے لیے وہاں چڑھنا آسان بنا دے گا یہاں تک کہ وہ وہ پالے گا جو لوح محفوظ میں اس کے لیے لکھا ہوگا اگر اس نے ابھی تک اسے نہیں پایا تو عنقریب وہ رزق خود اس کو تلاش کرے گا۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں اشعریوں کا قصہ بھی ہے جب انہوں نے اپنا قاصد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا اس نے اللہ تعالیٰ کا فرمان سنا وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ہود:6) وہ لوٹ آیا اور نبی کریم ﷺ سے گفتگو نہ کی اور کہا: اشعری اللہ تعالیٰ کے چوپاؤں سے زیادہ ذلیل نہیں۔ ہم نے اس کا ذکر سورۂ ہود میں کیا ہے۔ لقمان نے کہا: یٰبُنَیَّ اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ (لقمان:16) یہ بحث سورۂ لقمان میں گزر چکی ہے ہم نے یہ بحث کتاب قمع الحرص بالزھد والقناعۃ میں مفصل بیان کی ہے۔ الحمدللہ۔

یہی وہ حقیقی توکل ہے جس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں، یہی رب العالمین کے ساتھ لو لگا کر غیر سے دل کو فارغ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے اور اپنے احسان اور کرم کے ساتھ اپنے سوا کسی اور کے حوالے نہ کرے۔

مِّثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ۝ عام قرأت مثل کے نصب کے ساتھ ہے یہ کاف حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے یعنی کمثل نطقکم اس میں ما زائدہ ہے؛ یہ بعض کوفیوں کا نقطہ نظر ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا: یہ بھی جائز ہے تاکید کے طور پر منصوب ہو، تقدیر کلام یہ ہو لحق حقا مثل نطقك گویا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔

سیبویہ کا قول ہے: یہ مبنی ہے کیونکہ یہ مبنی کی طرف مضاف ہے اور ما زائدہ ہے جو تاکید کے لیے ہے۔

مازنی نے کہا: مثل، مع کے ساتھ مل کر ایک شے کے حکم میں ہے، اسی وجہ سے یہ مبنی برفتحہ ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ کہا: کیونکہ عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو مثل کو ہمیشہ منصوب بناتے ہیں تو کہتا ہے: قال لی رجلٌ مثلك، مررت برجلٍ مثلَك۔

ابو بکر، حمزہ، کسائی اور اعمش نے مثل کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ حق کی صفت ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے اگرچہ معرفہ کی طرف مضاف ہے کیونکہ مثل کے لفظ میں اضافت کے باوجود اختصاص پیدا نہیں ہوتا۔

مثل کا لفظ اَنَّکُمْ کی طرف مضاف ہے اور ما زائدہ ہے اس کا مابعد مصدر کے حکم میں نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ساتھ

کوئی ایسا فعل نہیں جس کے ساتھ مل کر وہ مصدر ہو جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لَحَقٌّ سے بدل ہو۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾

''اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور ہر وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے پس قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ حق ہے (بعینہ اسی طرح) جس طرح تم باتیں کر رہے ہو۔ اے حبیب! کیا پہنچی ہے آپ کو خبر ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی جب وہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے سلام عرض کیا آپ نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو (دل ہی دل میں سوچا) بالکل انجان لوگ ہیں پس چپکے سے اپنے اہل خانہ کی طرف گئے اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آئے لا کر ان کے قریب رکھ دیا فرمایا: کھاتے کیوں نہیں؟ پس دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے وہ بولے ڈریئے نہیں اور انہوں نے بشارت دی آپ کو ایک صاحب علم بیٹے کی''۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا تا کہ اس کے ساتھ اس امر کی وضاحت کرے کہ وہ آیات کو جھٹلانے والے کو ہلاک کر دے گا جس طرح اس نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کیا۔

هَلْ اَتٰىكَ یہ الم یأتك کے معنی میں ہے یعنی کیا تیرے پاس یہ خبر نہیں آئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: هَلْ۔ قد کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الانسان: 1) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے بارے میں گفتگو سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں گزر چکی ہے۔

الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ (الانبیاء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد حضرت جبریل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل ہیں۔ عثمان بن حصین نے یہ زائد ذکر کیا ہے اور حضرت رفائیل علیہم السلام۔

محمد بن کعب نے کہا: حضرت جبریل امین اور ان کے نو ساتھی مراد ہیں۔ عطا اور ایک جماعت نے کہا: یہ تین فرشتے تھے حضرت جبریل، حضرت میکائل اور ان دونوں کے ساتھ ایک اور فرشتہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں مکرمین اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ خوف زدہ نہیں تھے۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں مکرمین اس لیے کہا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ان کی خدمت کی تھی۔ عبدالوہاب نے کہا: علی بن عیاض نے مجھے کہا میرے ہاں ہریسہ (ایک کھانا جو گندم اور گوشت کو کوٹ کر بنایا جاتا ہے) ہے آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: میری اس بارے میں بہت اچھی رائے ہے۔ کہا: ہمارے ساتھ چلو، میں گھر میں داخل ہوا آپ نے غلام کو بلایا تو وہ غائب تھا مجھے کسی امر نے مضطرب نہ کیا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے پانی والا برتن اور تھال اٹھایا ہوا تھا اور ان کے کندھے پر رومال تھا میں نے بے ساختہ کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، کاش! میں جانتا اے ابا الحسن کہ معاملہ اس طرح ہے۔ فرمایا:

اپنے اوپر آسانی لاؤ آپ ہمارے ہاں بڑے معزز ہیں۔ مکرم اسے کہتے ہیں جس کی ذاتی طور پر خدمت کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کو دیکھیے: هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا سورۂ حجر میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

قَالَ سَلٰمٌ یعنی کہا: تم پر سلام ہو، یہ تقدیر بھی جائز ہے أمری سلام یا ردی لکم سلام۔ عاصم کے علاوہ کوفہ کے قراء نے اسے سِلْم پڑھا ہے یعنی سین مکسور ہے۔

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ تقدیر کلام یہ ہے انتم قوم منکرون یعنی تم اجنبی لوگ ہو ہم تمہیں نہیں پہچانتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ آپ نے انہیں انسانی شکل میں نہیں دیکھا تھا اور یا انہیں ان فرشتوں کے علاوہ صورت میں دیکھا تھا جنہیں آپ پہچانتے تھے تو آپ نے اجنبی خیال کیا کہا: قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے انہیں اجنبی اس لیے خیال کیا کیونکہ وہ اجازت کے بغیر داخل ہوئے تھے۔ ابو العالیہ نے کہا: اس زمانہ اور اس علاقہ میں ان کے سلام کو عجیب خیال کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: آپ ان سے ڈر گئے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: انکرته۔ میں اس سے ڈر گیا۔ شاعر نے کہا:

فَأَنْكَرَتْنِي وما كان الذي نَكِرَتْ مِنَ الحوادِثِ إِلَّا الشَّيْبَ الصَّلَعَا(1)

اس نے مجھے ڈرادیا جب کہ وہ بڑھاپے اور گنجے پن کے علاوہ کسی چیز سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

فَرَاغَ إِلٰى أَهْلِهٖ زجاج نے کہا: آپ اپنے اہل کی طرف گئے۔ سورۃ الصافات میں یہ بحث گزر چکی ہے یہ کہا جاتا ہے: اراغ اور ارتاغ دونوں کا معنی طلب کرنا ہے۔ ماذا ترید تو کیا ارادہ کرتا ہے اور تو کیا طلب کرتا ہے۔ اراغ الی کذا وہ راز داری سے اس کی طرف مائل ہوا اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ اس تعبیر کی بنا پر راغ اور اراغ دو لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہے۔

فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ آپ مہمانوں کے پاس ایسا بچھڑا لائے جس کو ان کے لیے بھونا تھا جس طرح سورۂ ہود میں ہے۔ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (ہود) یہ کہا جاتا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر کی طرف گئے جس طرح مہمان سے چوری چھپے کام کرنا چاہ رہے ہوں تا کہ ان کے لیے جو کھانا بنانا چاہتے ہیں وہ ان پر ظاہر نہ ہو۔

فَقَرَّبَهٗٓ إِلَيْهِمْ بھونا ہوا بچھڑا انہیں پیش کیا۔ قَالَ أَلَا تَأْكُلُوْنَ قتادہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمومی مال گائے کی نسل سے تھا آپ نے ان کی زیادہ تعظیم بجالانے کے لیے ایک موٹا بچھڑا لیا(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایک لغت میں عجل کا معنی بکری ہے، قشیری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ صحاح میں ہے: عجل، گائے کے بچے کو کہتے ہیں عجول اسی کی مثل ہے جمع عجاجیل ہے، مونث عجلہ ہے۔ ابو جراح سے مروی ہے: بقرہ معجل یعنی بچھڑے والی گائے۔ عجل، ربیعہ کا ایک قبیلہ ہے۔

فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ان سے دل میں خوف محسوس کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب انہوں نے کھانا نہ کھایا تو دل میں خوف ہوا۔ لوگوں کا طریقہ یہ تھا جو انسان کسی کا کھانا کھالیتا تو اس کی جانب سے امن خیال کیا جاتا۔ عمرو بن دینار نے کہا: فرشتوں نے کہا ہم قیمت دے کر ہی کھاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے کہا: کھانا کھاؤ اور اس کی قیمت ادا کر دینا۔ انہوں نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 370
2۔ ایضاً

پوچھا: اس کی کیا قیمت ہے؟ فرمایا: جب تم اسے کھاؤ تو اللہ کا نام لو اور جب تم فارغ ہو تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرو۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنا خلیل بنایا ہے۔ سورۂ ہود میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابراہیم میں خوف کے آثار دیکھے تو کہا: لَا تَخَفْ اور آپ کو بتا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور قاصد ہیں۔

وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ آپ کو ایسے بچے کی بشارت دی جو آپ کی زوجہ حضرت سارہ سے پیدا ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب انہوں نے یہ بتایا کہ وہ فرشتے ہیں تو آپ نے ان کی تصدیق نہ کی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس بچھڑے کو زندہ کر دیا جو آپ نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ عون بن ابی شداد نے روایت کی ہے کہ حضرت جبریل امین نے بچھڑے کو اپنا پر مارا وہ چلنے لگا یہاں تک کہ اپنی ماں تک جا پہنچا اور بچھڑے کی ماں گھر میں تھی۔ عَلِيْمٍ کا معنی ہے وہ بالغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا عالم ہوگا۔ جمہور علماء کی رائے ہے کہ جس بچے کی بشارت دی گئی وہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا: وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ (سورۂ ہود: 71) یہ نص ہے۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

"پس آئی آپ کی بیوی چیں بجبیں ہو کر اور (فرط حیرت) سے طمانچہ دے مارا اپنے چہرے پر اور بولی (میں) بوڑھی (میں) بانجھ (کیا میرے ہاں بچہ ہوگا) انہوں نے کہا: ایسا ہی تیرے رب نے فرمایا ہے، بے شک وہی بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ۔ صَرَّةٍ کا معنی چیخ اور شور ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے اسی سے صریر الباب ہے، جس سے مراد دروازے کی آواز ہے عکرمہ۔ اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد اوہ کا کلمہ کہنا ہے۔ یہاں اقبال سے مراد ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا نہیں۔ فراء نے کہا: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے اقبل یشتمنی وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عورتوں کی ایک جماعت میں آئیں تاکہ فرشتوں کی گفتگو سنیں۔ جوہری نے کہا: صرہ کا معنی شور و غل کرنا اور چیخنا ہے اور صرۃ کا معنی جماعت ہے اور صرۃ کا معنی سخت مصیبت ہے۔ امرء القیس نے کہا:

فَاَلْحَقَهٗ بِالْهَادِيَاتِ وَدُوْنَهٗ جَوَاحِرُهَا فِيْ صَرَّةٍ لَمْ تَزَيَّلِ (1)

یہ گھوڑا جب جنگلی گائیوں کے ابتدائی حصہ تک پہنچا اس کے پیچھے والی گائیاں جماعت میں تھیں جو بکھری نہیں۔

یہ شعر تینوں مذکورہ وجوہ کا احتمال رکھتا ہے۔ صرۃ القیظ سے مراد اس کی گرمی کی شدت ہے۔ جب حضرت سارہ نے بشارت کو سنا تو اپنے چہرے پر ضرب لگائی یعنی جس طرح عورتوں کی عادت ہوتی ہے وہ تعجب کے وقت اپنے چہرے پر ہاتھ مارتی ہیں؛ یہ سفیان ثوری اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فَصَكَّتْ وَجْهَهَا اس نے اپنے

1 تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 371

منہ پر طمانچہ مارا۔ صک کا اصل معنی مارنا ہے۔ صکہ اس نے اسے مارا۔ راجز نے کہا:

یا کروانا صُكَّ فَاكْبَأَنَّا

کروان بھورے رنگ کا پرندہ جو رات کو نہیں سوتا۔

اموی نے کہا: کَبَنَ الظبی یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب ہرن زمین سے چمٹ جائے۔ اِکْبَأَنَّ کا معنی بھی یہی ہے۔

وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ یعنی کیا بوڑھی بانجھ عورت بچہ جنے گی؟ زجاج نے کہا: معنی ہے میں بوڑھی اور بانجھ ہوں میں کیسے بچہ جنوں گی؟ جس طرح کہا: يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ (ہود: 72)

قَالُوْا كَذٰلِكِ یعنی بات اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تجھے کہا ہے اور ہم نے تجھے خبر دی ہے۔ قَالَ رَبُّكِ تیرے رب کا فرمان ہے تو اس میں شک نہ کر۔

بشارت اور ولادت کے درمیان ایک سال کا طویل عرصہ تھا حضرت سارہ کی اس سے پہلے اولاد نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے اس وقت بچا جنا جب ان کی عمر نواسی سال تھی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت سو سال تھی۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾ جو کچھ وہ عمل کرتا ہے اس میں حکیم ہے اور مخلوق کی مصلحتوں سے آگاہ ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾
لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾
فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

”آپ نے پوچھا: تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے اے فرشتو! وہ بولے ہم بھیجے گئے ہیں ایک قوم کی طرف جو جرائم پیشہ ہے تا کہ ہم برسائیں ان پر گارے کے بنے ہوئے پتھر (کنکر) جن پر نشان لگے ہیں آپ کے رب کی طرف سے حد سے بڑھنے والوں کے لیے (نزول عذاب سے پہلے) ہم نے نکال دیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو۔ پس نہ پایا ہم نے اس (ساری) بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے اور ہم نے باقی رہنے دی ایک نشانی ان لوگوں (کی عبرت پذیری) کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں“۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ وہ فرشتے ہیں کیونکہ انہوں نے بچھڑے کو زندہ کر دیا تھا اور بچے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: فَمَا خَطْبُكُمْ تمہارا کیا معاملہ اور کیا قصہ ہے اے بھیجے گئے فرشتو!؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ قوم سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں مجرم

قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ یعنی ہم ان پر مٹی کے بنے پتھر برسائیں۔ مُسَوَّمَةً جن پر نشان لگے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر سیاہ اور سرخ خط لگے ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ اس میں معروف تھے کہ یہ عذاب کے پتھر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر پتھر پر اس کا نام لکھا ہوا تھا جس نے اس کے ساتھ ہلاک ہونا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر مہریں سی لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب بحث سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ پتھر ان کے مسافروں اور بکھرے ہوئے الگ تھلگ لوگوں کا پیچھا کرتے تو ان میں سے کوئی مخبر بھی نہ بچا۔

عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے رجم کا فیصلہ کیا تھا اس کو رجم کرنے کے لیے انہیں تیار کیا۔ پھر کہا گیا: وہ اس طرح پکے ہوئے تھے جس طرح اینٹ پکائی جاتی ہے، یہ ابن زید کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿﴾ (الحجر) کا یہی معنی ہے۔ جس کی وضاحت سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ پتھر ہے جسے ہم دیکھتے ہیں جس کی اصل مٹی ہوتی ہے۔ یہ پتھر اس طرح بنتا ہے کہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ سورج اسے جلا دیتا ہے۔ اسے طین کہا گیا تا کہ یہ علم ہو یہ پانی سے بنا ہوا پتھر نہیں جو اولہ ہوتا ہے؛ قشیری نے یہ بیان کیا ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ جب ہم نے قوم لوط کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ان میں سے جو مومن تھے ان کو ہم نے نکال لیا تا کہ مومن ہلاک نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ (الحجر:65) سے یہی مراد ہے۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ الْمُسْلِمِيْنَ سے مراد حضرت لوط علیہ السلام اور اس کی بیٹیاں ہیں۔ اس میں اضمار ہے تقدیر کلام یہ ہے فما وجدنا فیھا غیر اھل بیت کبھی یہ کہا جاتا ہے بیت شریف اس سے مراد اہل ہوتا ہے۔ فیھا یہ قریہ سے کنایہ ہے اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا کیونکہ معنی ذہن میں موجود ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ قریہ پر دال ہے، کیونکہ وہ قوم قریہ میں ہی رہائش پذیر تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھاء کی ضمیر جماعت کے لیے ہے۔ مومنون اور مسلمون یہاں برابر ہیں جنس کا ذکر کیا تا کہ تکرار کی ضرورت نہ پڑے، جس طرح فرمایا:

اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (یوسف:86)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایمان سے مراد تصدیق قلبی ہے اور اسلام سے مراد ظاہری اطاعت ہے۔ ہر مومن مسلمان ہے اور ہر مسلمان مومن نہیں۔ پہلی آیت میں مومنین کہا کیونکہ ہر مومن مسلمان ہوتا ہے اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (الحجرات:14)

یہ ایمان اور اسلام میں فرق پر دلالت کرتا ہے۔ صحیح مسلم اور دوسری کتب میں مذکورہ حدیث جبریل کا مقتضا بھی یہی ہے ہم نے اس کی وضاحت کئی مقامات پر کی ہے۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَاۤ اٰيَةً ہم نے اس زمانہ اور ان کے بعد کے زمانہ کے لوگوں کے لیے عبرت اور علامت رکھ دی ہے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ (العنکبوت) ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیۃ

متروکہ سے مراد برباد بستی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ڈھیر لگے پتھر جن کے ساتھ انہیں رجم کیا گیا وہی آیت ہے۔

لِلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ خوف کرنے والوں کو اس لیے خاص کیا کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

**وَ فِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ۝**

''اور (داستان) موسیٰ میں بھی نشانی ہے جب ہم نے انہیں بھیجا فرعون کی طرف ایک روشن دلیل دے کر پس اس نے روگردانی کی اپنی قوت کے بل بوتے پر اور کہنے لگا: یہ شخص جادوگر ہے یا دیوانہ تو ہم نے اس کو اس کے لشکر سمیت پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا اور وہ قابل ملامت بن گیا''۔

وَ فِيْ مُوْسٰۤى یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نشانی چھوڑی ہے۔ فراء نے کہا: اس کا عطف وفی الارض آیات پر ہے۔

اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ سلطان مبین سے مراد واضح حجت ہے وہ عصا کا معجزہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد معجزات ہیں جو عصا اور دوسرے معجزات ہیں۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ ضمیر فاعل سے مراد فرعون ہے اس نے ایمان سے اعراض کیا۔ بِرُكْنِهٖ یعنی اپنی جمعیت اور اپنے لشکروں کے ساتھ، یہ ابن زید کا قول ہے۔ مجاہد کے قول کا بھی یہی معنی ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (ہود) یہاں رکن سے مراد قوت اور قبیلہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: اپنی قوت کے بل بوتے پر اس معنی میں عنترہ کا قول ہے۔

فما أوهى مِرَاسُ الحَرْبِ رُكْنِيَ (1)	جنگ کی شدت نے میری قوت کو کمزور نہیں کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: بِرُكْنِهٖ سے مراد اس کی ذات ہے۔ اخفش نے کہا: مراد اس کی جانب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ (فصلت: 51) یہ مورخ کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: کسی شے کا رکن اس کی اقوی جانب ہوتی ہے۔

اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (ہود) معنی وہ طاقت وسہارا کی پناہ لیتا ہے۔ قشیری نے کہا: رکن سے مراد بدن کی جانب ہے۔ یہ کسی شے سے اعراض کرنے میں مبالغہ کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔

وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ یہاں او، واؤ کے معنی میں ہے کیونکہ انہوں نے یہ دونوں باتیں کیں؛ یہ مورج اور فراء کا نقطہ نظر ہے اور جریر کا یہ شعر پڑھا:

أَثَعْلَبَةَ الفَوَارِسَ أَوْ رِيَاحًا عَدَلْتَ بِهِم طُهَيَّةَ وَالْخِشَابَا(2)

اس شعر میں او، واؤ کے معنی میں ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 372	2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 7

او کو واؤ کے معنی میں رکھا جاتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ (الانسان) اس میں او، واؤ کے معنی میں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (النساء:3) یہ سب گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ ان کے کفر اور ایمان سے اعراض کے باعث ہم نے انہیں اور ان کے لشکروں کو پکڑ لیا۔

فَنَبَذْنٰهُمْ یعنی ہم نے انہیں پھینک دیا۔ فِی الْیَمِّ وَ هُوَ مُلِیْمٌ ﴿۴۰﴾ یعنی فرعون ملامت کیا گیا کیونکہ اس نے وہ اعمال کیے جن پر ملامت کی جاتی ہے۔

وَ فِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ ﴿۴۲﴾

''اور (قصہ) عاد میں نشان عبرت ہے جب ہم نے ان پر آندھی بھیجی جو خیر و برکت سے خالی تھی نہیں چھوڑتی تھی کسی چیز کو جس پر گزرتی مگر اس کو ریزہ ریزہ کر دیتی''۔

وَ فِیْ عَادٍ ہم نے عاد میں ان لوگوں کے لیے نشانی چھوڑی جو غور و فکر کریں۔

اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴿۴۱﴾ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ سے مراد وہ ہوا ہے جو نہ بادلوں کے بننے کا باعث بنتی ہے نہ درختوں میں ملاقح کا عمل کرتی ہے نہ اس میں رحمت، برکت اور منفعت ہوتی ہے اسی سے امرأۃ عقیم ہے جو نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے۔ پھر یہ کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ ہوا ہے جسے جنوب کہتے ہیں۔ ابن ابی ذئب نے حرث بن عبدالرحمن سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''ریح عقیم سے مراد جنوب (۱) ہے''(1)۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد دبور ہے، جس طرح صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے ''میری مدد صبا سے کی گئی اور قوم عاد دبور (۲) سے ہلاک کی گئی''(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد نکباء (۳) ہے، عبید بن عمیر نے کہا: اس ہوا کا مسکن چوتھی زمین ہے عاد پر صرف اس قدر اسی کو کھولا گیا جس طرح بیل کا نتھنا ہوا کرتا ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول بھی نقل کیا ہے: اس سے مراد صبا ہے(3)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ ﴿۴۲﴾ یعنی ایسی چیز کی طرح جسے ریزہ ریزہ کر دیا گیا ہو۔ جب نباتات خشک ہو جائے اور ریزہ ریزہ ہو جائے تو اسے کہتے ہیں: رمیم، ھشیم۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایسی چیز کی طرح جو ہلاک ہونے والی ہو اور بوسیدہ ہو؛ یہ مجاہد کا قول ہے؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تَرَكْتَنِی حِینَ كَفَّ الدَّهْرُ مِنْ بَصَرِی ... وَإِذْ بَقِیتُ كَعَظْمِ الرِّمَّةِ الْبَالِی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 373

2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، ماجاء فی قولہ تعالیٰ ھو الذی ارسل الریاح، جلد 1، صفحہ 455

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 373

(۱) جنوب کی جانب سے چلنے والی ہوا (۲) پچھوائی ہوا (۳) ٹیڑھی چلنے والی ہوا

تو نے مجھے چھوڑا جب زمانہ نے میری نظر کو روک لیا۔ اور جس میں بوسیدہ ہڈی کی طرح باقی تھا۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جسے خشک نباتات سے ریزہ ریزہ کیا جائے۔ ابو العالیہ اور سدی نے کہا: باریک مٹی کی طرح۔ قطرب نے کہا: رمیم سے مراد راکھ ہے۔ یمان نے کہا: مراد ہے چوپائے جس گھاس کو پھینک دیتے ہیں۔ ہونٹ کو مرمۃ اور مقمہ کہتے ہیں۔ مرمہ بھی اس میں لغت ہے کلمہ کی اصل رم العظم ہے جب وہ بوسیدہ ہو جائے۔ تو اسی سے یہ باب ذکر کرتا ہے رم العظم یرم رمۃ فھو رمیم۔ شاعر نے کہا:

وَرَأَى عَوَاقِبَ خُلْفِ ذَاتَ مَذَمَّةً تَبْقَى عليهِ والعِظَامُ رَمِيمُ

اس نے اس وعدہ کے توڑنے کے انجام میں مذمت دیکھی جو اس پر باقی رہنے والی تھی جب کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔

رمۃ جب راء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد بوسیدہ ہڈیاں ہیں اس کی جمع رِمَم اور رمائم ہے اس کی مثل یہ آیت ہے تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ (الاحقاف:25) جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

وَ فِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝

''اور واقعہ ثمود میں بھی نشانی ہے جب انہیں کہہ دیا گیا کہ لطف اٹھا لو ایک وقت تک پس انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے تو پکڑ لیا انہیں ایک خوفناک کڑک نے دراں حالیکہ وہ دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں نہ اٹھنے کی طاقت رہی اور نہ (ہم سے) انتقام لے سکے''۔

وَ فِيْ ثَمُوْدَ یعنی ثمود میں بھی عبرت اور نشانی ہے جب انہیں کہا گیا: تم دنیا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زندگی گزارو۔ حَتّٰى حِيْنٍ ہلاکت کے وقت تک۔ یہ تین دن ہیں۔ جس طرح سورۂ ہود آیت 65 میں ہے تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تَمَتَّعُوْا کا معنی ہے اسلام لے آؤ اور اپنی اجل کے پورا ہونے تک لطف اندوز ہو لو۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کی اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ صاعقہ سے مراد موت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہر قسم کا مہلک عذاب ہے۔ حسین بن واقد نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی صاعقہ کا لفظ ہے اس سے مراد عذاب ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حمید، ابن محیصن، مجاہد اور کسائی نے الصَّعْقَه پڑھا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: صعق الرجل صعقة و تصعاقا اس پر غشی چھا گئی۔ صعقتهم السماء جب آسمان ان پر عذاب نازل کرے۔ صاعقہ کا معنی عذاب کی چیخ ہے۔ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وہ دن کے وقت اسے دیکھ رہے تھے۔ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیام کا معنی اٹھنا ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ طاقت نہیں رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اٹھا سکیں اور اس کے ساتھ اٹھ سکیں اور اپنی ذاتوں سے اسے دور کر سکیں۔

1۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 240

تو کہتا ہے: لا أقوم لھذا الأمر میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کے جسم ختم ہو جائیں گے اور ان کی روحیں عذاب میں باقی رہیں گی۔

وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ جب انہیں ہلاک کیا جائے گا تو وہ عذاب سے محفوظ نہیں ہوں گے یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

## وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور قوم نوح کا اس سے پہلے (یہی حشر ہوا) بے شک وہ لوگ بھی (پرلے درجے کے) نافرمان تھے''۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ حمزہ، کسائی اور ابو عمرو نے اسے وقومِ نوح پڑھا ہے یعنی قوم کے لفظ کو جر دی ہے یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں بھی نشانی ہے۔ باقی قراء نے اس پر نصب پڑھی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وأھلکنا قوم نوح یا اس کا عطف أخذتھم کی ھم ضمیر پر ہے یا أخذناہ کی ہ ضمیر پر ہے۔ معنی یہ بنے گا انہیں صاعقہ نے پکڑ لیا اور اس نے قوم نوح کو پکڑ لیا یا ہم نے انہیں سمندر میں پھینک دیا اور قوم نوح کو پھینک دیا یا یہ اذکر کے معنی میں ہے۔

## وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور ہم نے آسمان کو (قدرت کے) ہاتھوں سے بنایا اور ہم نے ہی اس کو وسیع کر دیا اور زمین کا ہم نے فرش بچھا دیا پس ہم کتنے اچھے فرش بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تا کہ تم غور وفکر کرو''۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ جب ان آیات کو بیان کیا تو فرمایا: آسمان میں آیات اور عبرتیں ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ صانع کمال پر قادر ہے۔ سماء کے امر کو قوم نوح کے قصہ پر عطف کیا کیونکہ یہ دونوں آیات ہیں۔ بِاَيْىدٍ کا معنی ہے قوت اور قدرت کے ساتھ؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔

وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم قادر ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم وسعت والے ہیں انہیں اور غیر کو پیدا کرنا ہم پر کوئی مشکل نہیں ہوتا جس کو پیدا کرنے کا ہم ارادہ کر لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم اپنی مخلوق پر اپنا رزق وسیع کرنے والے ہیں؛ یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: ہم اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: ہم بارش کے ذریعے رزق کو وسیع کرنے والے ہیں (2)۔ ضحاک نے کہا: ہم نے تمہیں غنی کر دیا ہے؛ اس پر دلیل عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ (البقرہ: 236) ہے۔ قتبی نے کہا: ہم اپنی مخلوق پر وسعت والے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم نے آسمان اور زمین کے درمیان وسعت رکھ دی ہے۔ جوہری نے کہا: أوسع الرجل سے مراد ہے وہ وسعت اور غنا والا ہوگا؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ (الذاریات) یعنی ہم غنی اور قادر ہیں؛ تو یہ تمام اقوال کو شامل ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 181　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 229

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا یعنی ہم نے زمین کو پانی پر بچھا دیا جس طرح بستر بچھایا جاتا ہے اور ہم نے اسے پھیلا دیا۔ فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ یعنی ہم اس کو کتنا اچھا بچھانے والے ہیں۔ سب میں تعظیم کا معنی پایا جاتا ہے۔ مهدت الفراش مهدا میں نے بستر کو بچھا دیا۔ تمہید الامور سے مراد ان کو درست کرنا ہے۔

وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ یعنی دو مختلف صنفیں اور نوعیں بنائیں۔ ابن زید نے کہا: یعنی مذکر اور مونث، میٹھا اور کھٹا اور اسی کی مثل بنایا(1)۔ مجاہد نے کہا: مذکر اور مونث، آسمان اور زمین، سورج اور چاند، رات اور دن، نور اور ظلمت، میدان اور پہاڑ، جن اور انسان، خیر اور شر، صبح اور شام اور ایسی اشیاء جو مختلف ہیں ذائقوں، خوشبوؤں اور رنگوں میں یعنی ہم نے اسے اسی طرح بنایا ہے یہ ہماری قدرت پر دال ہیں۔ جو اس پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ جوڑوں کا خالق فرد ہے اس کی صفت میں حرکت و سکون، ضیاء و ظلمت، قعود و قیام، ابتدا و انتہا کو مقدر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ الله تعالیٰ وتر (طاق) ہے اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ۚ۵۰ وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ۚ۵۱ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ۚ۵۲ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ۚ۵۳ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝۫۵۴ وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۵

"پس دوڑو الله کی طرف (اور اس کی پناہ لے لو) بے شک میں تمہیں (اس کے غضب) سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور نہ بناؤ الله کے ساتھ کوئی اور معبود، بے شک میں تمہیں اس (کے غضب) سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح نہیں آیا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا کہ یہ ساحر ہے یا دیوانہ۔ کیا پہلوں نے پچھلوں کو یہی وصیت کی تھی (نہیں) بلکہ یہ لوگ سرکش ہیں پس آپ ان سے رخ انور پھیر لیجئے آپ پر کوئی الزام نہیں اور آپ سمجھاتے رہیے یقیناً سمجھانا اہل ایمان کے لیے فائدہ بخش ہے"۔

فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ امتوں نے انبیاء کی جو تکذیب کی اور ان امتوں کو ہلاک کیا گیا اس کا ذکر ہو چکا اسی وجہ سے الله تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا: اے محمد! انہیں کہو یعنی اپنی قوم سے کہو الله تعالیٰ کی طرف بھاگو میں تمہیں واضح خبردار کرنے والا ہوں۔ یعنی اس کے معاصی سے اس کی طاعت کی طرف بھاگو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے الله تعالیٰ کی طرف بھاگو۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے: اس سے اس کی طرف بھاگو اور اس کی اطاعت کرو۔ محمد بن عبدالله بن عمرو بن عثمان بن عفان نے کہا: فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ سے مراد ہے مکہ مکرمہ کی طرف نکلو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 181

حسین بن فضل نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بچو جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور کی طرف بھاگا تو وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔

ابوبکر وراق نے کہا: شیطان کی طاعت سے رحمن کی طاعت کی طرف بھاگو۔ حضرت جنید بغدادی نے کہا: شیطان باطل کی طرف دعوت دیتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو وہ تمہیں شیطان سے بچالے گا۔ ذوالنون مصری نے کہا: جہالت سے علم کی طرف، کفر سے شکر کی طرف بھاگو۔ عمرو بن عثمان نے کہا: اپنے نفوس سے اپنے رب کی طرف بھاگو۔ یہ بھی کہا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہارے حق میں جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کی طرف بھاگو اپنی حرکتوں پر اعتماد نہ کرو۔ سہل بن عبداللہ نے کہا: غیر اللہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو(1)۔

اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ کفر اور معصیت پر میں تمہیں اس کے عقاب سے ڈراتا ہوں۔

وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ یہ لوگوں سے کہیں جب کہ آپ نذیر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کو خطاب ہے۔ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ یعنی میں (اللہ) تمہیں محمد ﷺ اور اس کی تلواروں سے نَذِیْرٌ یعنی میں تمہیں اس کی پکڑ اور تلوار سے خبردار کرنے والا ہوں اگر تم میرے ساتھ شرک کرو؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔

كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ یہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے یعنی جس طرح تیری قوم نے تجھے جھٹلایا اور کہا: آپ ساحر و مجنون ہیں ان سے قبل لوگوں نے بھی جھٹلایا اور اسی کی مثل قول کیا۔ كَذٰلِكَ میں جو کاف ہے اس کو نصب اس تقدیر کی بنا پر ہو أنذركم إنذارا كإنذار من تقدمني من الرسل الذين أنذروا اقوامهم یا یہ مرفوع ہو تقدیر کلام ہو الامر كذلك۔

پہلی صورت میں ان لوگوں کو ڈرانا ہے جنہوں نے موحد ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ دوسری صورت میں ملحدین میں سے جنہوں نے شرک کیا۔ كذلك کے بارے میں گفتگو یعقوب وغیرہ سے مروی ہے۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ یعنی پہلوں نے بعد والوں کو جھٹلانے کی وصیت کی (2) اور اس پر موافقت کی یہاں ہمزہ استفہام توبیخ اور تعجب کے اظہار کے لیے ہے۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو وصیت نہیں کی بلکہ طغیان نے سب کو جمع کر دیا۔ یہ کفر میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ان سے اعراض کیجئے اور ان سے درگزر کیجئے۔ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں ملامت کیے گئے نہیں کیونکہ رسالت کی تبلیغ کا جو فریضہ آپ پر لازم تھا اس کو آپ نے ادا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ یہ منسوخ ہے وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔

پہلا قول ضحاک کا ہے کیونکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ نصیحت کرنے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ مجاہد نے کہا: فَتَوَلَّ

---

1۔ تفسیر سلمی، جلد 2، صفحہ 276، دار الکتب العلمیہ

2۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 241

عَنْهُمْ ان سے درگزر کیجئے۔ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ آپ کا رب آپ پر کسی کوتاہی کی وجہ سے ملامت نہیں کرے گا جو آپ سے صادر ہوئی۔ وَّذَكِّرْ نصیحت انہیں یاد دلایئے کیونکہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔ قتادہ نے کہا: قرآن ان کے سامنے پڑھیے کیونکہ قرآن پڑھنا مومنوں کو نفع دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں عذاب اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ یاد دلایئے۔ یہاں مومنوں کا خاص طور پر ذکر کیا کیونکہ مومن ہی اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں طلب کرتا ہوں ان سے رزق اور نہ یہ طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی (سب کو) روزی دینے والا، قوت والا اور زور والا ہے۔ پس ان ظالموں کے لیے عذاب کا ویسا ہی حصہ ہے جیسا ان کے ہم مشربوں کو حصہ ملا تھا پس یہ جلد بازی نہ کریں۔ پس تباہی ہے ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا اس دن سے جس کا (ان سے) وعدہ کیا گیا ہے''۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارشاد ان کو خاص ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔ لفظ عام ذکر کیا اور مراد خاص ہے۔ معنی ہے میں نے جن وانس میں سے اہل سعادت کو پیدا نہیں کیا مگر اسی لیے کہ وہ میری توحید کا اقرار کریں۔ قشیری نے کہا: آیت میں تخصیص قطعی طور پر داخل ہے کیونکہ مجنوں اور بچوں کو عبادت کا حکم نہیں دیا گیا یہاں تک کہ یہ بات کہی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عبادت کا ارادہ کیا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (الاعراف: 179) جو لوگ جہنم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ عبادت کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ پس مذکورہ آیت ان میں سے مومنین پر محمول ہوگی، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس فرمان کی طرح ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (الحجرات: 14) یہ بات بدوؤں میں سے ایک جماعت نے کہی تھی؛ اس کا ذکر ضحاک، کلبی، فراء اور قتبی نے کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت میں وما خلقت الجن والانس من المومنین إلّا لیعبدون ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: معنی ہے میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ میں انہیں عبادت کا حکم دوں (1)؛ زجاج نے اس قول پر اعتماد کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 230

اِلٰهًا وَّاحِدًا (توبہ: 31) اگر یہ سوال کیا جائے۔ انہوں نے کفر کیسے کیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی ربوبیت کا اقرار اور اس کے امر اور مشیت کے سامنے عاجزی کرنے کے لیے پیدا کیا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا: اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف جو قضا کا فیصلہ کیا اس کے سامنے وہ سرافگندہ ہوئے کیونکہ اس کی قضا تو ان پر جاری ہے وہ اس سے بچنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جس نے کفر کیا اس نے ان کی اس عمل میں مخالفت کی جس کے بجالانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا جہاں تک اس کی قضا کے سامنے عجز کا اظہار ہے اس کی جانب سے غیر ممتنع ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کا معنی ہے مگر وہ میرے لیے خوشی سے یا مجبوراً عبادت کا اقرار کریں (1)؛ اسے علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کرہ سے مراد ہے جو ان میں اس کی صنعت کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے اس لیے تا کہ وہ میری پہچان کریں (2)۔ ثعلبی نے کہا: یہ بہت اچھا قول ہے کیونکہ اگر وہ انہیں پیدا نہ کرتا تو اس کے وجود اور اس کی توحید کی پہچان نہ ہوتی۔ اس تاویل کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۹﴾ (الزخرف) اور اسی طرح کی دوسری آیات ہیں۔

مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: مگر اس لیے کہ میں انہیں حکم دوں اور انہیں نہی کروں۔ زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد ہے جس شقاوت اور سعادت پر انہیں پیدا کیا گیا جنوں اور انسانوں میں سے سعادت مند عبادت کے لیے پیدا کیے گئے اور ان میں سے بدبخت معصیت کے لیے پیدا کیے گئے (3)۔ کلبی سے یہ بھی مروی ہے: معنی ہے مگر اس لیے کہ وہ میری وحدانیت کو بیان کریں۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو وہ تنگ دستی اور خوشحالی میں اس کی توحید کا بیان کرتا ہے جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ صرف سختی اور مصیبت میں اس کی توحید کا بیان کرتا ہے انعام اور خوشحالی کے زمانہ میں اس کی توحید بیان نہیں کرتا، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (لقمان: 32)

عکرمہ نے کہا: معنی ہے مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں اور اطاعت کریں پس میں عبادت گزار کو بدلہ دوں گا اور منکر کو عذاب دوں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے مگر اس لیے کہ میں انہیں اپنا بندہ بنالوں۔ معنی قریب ہے۔

عبودیت کا اصل معنی عاجزی ہے اور تعبیر کا معنی کسی کو مطیع بنانا ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے: طریق معبد وہ راستہ جس پر عام چلا جائے۔ شاعر نے کہا:

وَظِيفًا وَظِيفًا فوقَ مَوْرٍ مُعَبَّدِ اس نے ہموار راستہ پر قدم پر قدم رکھا۔

تعبید کا معنی استعباد بھی ہے جس سے مراد اسے بندہ بنالینا ہے اسی طرح اعتباد ہے عبادت کا معنی طاعت ہے اور تعبد کا

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 17 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 230 3۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 16

معنی عبادت کرتا ہے لیعبدون کا معنی ہے کہ وہ عاجزی کریں اور عبادت کریں۔

مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ، مِّنْ زائدہ ہے میں ان سے رزق کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ میں رازق اور عطا کرنے والا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابوالجوزاء نے کہا: معنی ہے میں یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے آپ کو رزق دیں اور نہ میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو کھلائیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے میں یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ میرے بندوں کو رزق دیں اور نہ میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ وہ انہیں کھلائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ابن محیصن اور دوسرے قراء نے اسے الرازق پڑھا ہے۔

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ یعنی شدید اور قوی۔ اعمش، یحییٰ بن وثاب اور نخعی نے المتین کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ قوت کی صفت ہے۔ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ رزاق یا ذو کی صفت ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ ان کے اسم کی صفت ہے اس کے محل کے اعتبار سے یا یہ خبر کے بعد خبر ہے۔ فراء نے کہا: حق تو یہ تھا کہ لفظ المتینہ ہوتا اسے مذکر ذکر کیا کیونکہ یہ مضبوط و محکم شی کی طرف لے جاتا ہے یہ کہا جاتا ہے: حبل متین۔ فراء نے یہ شعر پڑھا:

لِكُلِّ دَهْرٍ قَدْ لَبِسْتُ أَثْوُبَا حَتَّى اكْتَسَى الرَّأْسُ قِنَاعًا أَشْيَبَا

مِن ريطةٍ وَالْيُمْنَةَ الْمُعَصَّبَا (2)

یہاں المعصب کو مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ یمنۃ کپڑے کی ایک قسم ہے اسی باب میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ (بقرہ: 275) مَوْعِظَةٌ سے مراد وعظ ہے وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) الصَّيْحَةُ سے مراد صیاح اور خوبصورت (آواز) ہے۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اہل مکہ میں سے جنہوں نے کفر کیا۔ ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ عذاب کا حصہ جس طرح سابقہ امتوں میں سے کفار کا حصہ ہوتا تھا۔ ابن اعرابی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے یوم ذنوب ایسا دن جس کا شر طویل ہو جو ختم نہ ہو۔ لغت میں ذَنُوْبِ کا اصل معنی عظیم ڈول ہے۔ وہ پانی نکالتے اور اسے حصہ پر تقسیم کر دیتے پس ذنوب سے مراد حصہ لیا گیا؛ راجز نے کہا:

لَنَا ذَنُوبٌ وَلَكُمْ ذَنُوبٌ فإنْ أَبَيْتُمْ فلنا الْقَلِيبُ (3)

ہمارے لیے حصہ ہے اور تمہارے لیے حصہ ہے اگر تم انکار کرو تو ہمارے لیے کنواں ہے۔

جوہری نے کہا: ذنوب سے مراد ایسا گھوڑا ہے جس کی دم لمبی ہو۔ ذنوب کا معنی حصہ ہے اور ذنوب سے مراد پشت کے نیچے والے حصہ کا گوشت ہے۔ ذنوب سے مراد ایسا ڈول ہے جو پانی سے بھرا ہوا ہو۔ ابن سکیت نے کہا: ایسا ڈول جس میں پانی ہو بھرنے کے قریب ہو۔ یہ مونث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جب وہ پانی سے خالی ہو تو اسے ذنوب نہیں کہتے۔ اس کی جمع قلت أذنبة اور جمع کثرت ذنائب آتی ہے جس طرح قلوص اور قلائص ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 17 2۔ ایضاً، جز 27، صفحہ 18 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 183

فَلَا یَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ وہ اپنے اوپر عذاب کے نازل ہونے کی جلدی نہ کریں، کیونکہ انہوں نے کہا تھا: اے محمد! فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿﴾ (الاعراف) غزوۂ بدر کے موقع پر ان پر وہ چیز نازل ہوئی جس نے ان کے وعدہ کو سچ کر دکھایا اور ان سے جلدی انتقام لے لیا۔ پھر ان کے لیے آخرت میں دائمی عذاب اور ہمیشہ رہنے والی رسوائی ہے جو ختم نہ ہوگی اور جس کی نہ کوئی انتہا ہے۔

# سورة الطور

﴿ ایاتہا ۴۹ ﴾ ﴿ ۵۲ سورۃ الطور مکیۃ ۷۶ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ۲ ﴾

تمام علماء کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے اس کی انچاس آیات ہیں۔ ائمہ نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا(1)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالطُّوۡرِ ۙ۝ وَ كِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ۝ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ۝ وَّ الۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ۝ وَ السَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ۝ وَ الۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ۝ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ۝

''قسم ہے (کوہ) طور کی اور کتاب کی جو لکھی گئی ہے کھلے ورق پر اور قسم ہے بیت معمور کی اور بلند چھت کی اور سمندر کی جو لبالب بھرا ہے یقیناً آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا اسے کوئی ٹالنے والا نہیں''۔

وَالطُّوۡرِ ۝ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اٹھائی اس کی شرافت کو ظاہر کرنے کے لیے، اس کی کرامت کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس میں جو آیات ہیں انہیں یاد دلانے کے لیے۔ یہ جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔

اسماعیل بن اسحاق، اسماعیل بن ابی رویس سے وہ کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف سے وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''چار پہاڑ جنت کے پہاڑوں میں سے ہیں، چار دریا جنت کے دریاؤں میں سے ہیں، چار میدان جنگ جنت کے میدانوں میں سے ہیں''(2)۔ پوچھا گیا: پہاڑ کون سے ہیں؟ فرمایا: ''جبل احد جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، طور جنت کے پہاڑوں میں سے ایک ہے، لبنان جنت کے پہاڑ میں سے ایک پہاڑ ہے، جودی جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے''۔ حدیث کا ذکر کیا ہے ہم نے اسے کتاب التذکرہ میں بیان کر دیا ہے۔

مجاہد نے کہا: سریانی زبان میں طور سے مراد پہاڑ ہے اس سے مراد طور سینا ہے(3)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: دو طور ہیں ان میں سے ایک کو طور سینا اور دوسرے کو طور زینا کہتے ہیں(4)۔ کیونکہ یہ دونوں پہاڑ انجیر اور

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجهر فی المغرب، جلد 1، صفحہ 105

2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 311، حدیث 35121۔ (زائد الفاظ کے ساتھ)

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 376

4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 185

زیتون کو اگاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مدین میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام زبیر ہے۔ زبیر وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی۔

میں کہتا ہوں: مدین ارض مقدسہ میں ہے یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا گاؤں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طور سے مراد ہر وہ پہاڑ ہے جو کسی چیز کو اُگائے اور جو کسی چیز کو نہ اگائے طور نہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ مسطور کا معنی مکتوب ہے (1) یعنی قرآن جسے مومن مصاحف سے پڑھتے ہیں اور ملائکہ لوح محفوظ سے پڑھتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ (الواقعہ) ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تمام سماوی کتب ہیں جو انبیاء پر نازل ہوئیں۔ ہر کتاب کاغذ میں لکھی ہوتی جسے پڑھنے کے لیے کتاب والے کھولتے۔ کلبی نے کہا: مراد وہ تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اپنے دست قدرت سے لکھا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قلم چلنے کی آواز سن رہے تھے (2)۔ فراء نے کہا: مراد اعمال کے صحیفے ہیں کچھ اپنی کتاب دائیں ہاتھ میں پکڑیں گے اور کچھ اپنی کتاب بائیں ہاتھ میں پکڑیں گے (3)؛ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ (الاسراء) اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ (التکویر) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لیے آسمان میں لکھا وہ اس میں پڑھتے ہیں جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے: مراد ہے اللہ تعالیٰ نے مومنوں میں سے اولیاء کے دل میں جو کچھ لکھا اس کی وضاحت اس ارشاد میں ہے: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (المجادلہ:22)

میں کہتا ہوں: اس قول میں حجازی قاعدہ جاری ہو رہا ہے کیونکہ قلوب کو رق سے تعبیر کیا۔ مبرد نے کہا: رق سے مراد وہ جلد ہے جسے باریک کیا جاتا ہے تا کہ اس پر لکھا جائے۔ منشور کا معنی ہے جس کو پھیلایا جائے۔ جوہری نے صحاح میں اسی طرح کہا ہے کہا: رق جب فتحہ کے ساتھ ہو اسے کہتے ہیں جس میں لکھا جائے یہ باریک چمڑا ہوتا ہے؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ (الطور) الرق کا معنی بڑا کچھوا بھی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: اس کی جمع رقوق آتی ہے معنی وہی مراد ہے جو فراء نے کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ہر صحیفہ رق ہوتا ہے کیونکہ اس کے حواشی رقیق ہوتے ہیں۔ اسی سے متلمس کا قول ہے:

فكانَّمَا هي من تَقَادُم عَهْدِها رَقٌّ أُتيح كتابها مَسطور

جہاں تک رَق کا تعلق ہے اس سے مراد ملک ہے کہا جاتا ہے: عبد مرقوق۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رَق فتحہ کے ساتھ ہو تو اس سے مشرق و مغرب کا درمیان ہے (4)۔

---

1۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 242 — 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 232

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 377 — 4۔ ایضاً

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ۝ حضرت علی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور دوسرے علماء نے کہا: یہ آسمان میں بیت اللہ شریف کے بالمقابل ایک گھر ہے جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، پھر اس سے نکلتے ہیں اور دوبارہ نہیں آتے (1)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ چھٹے آسمان میں گھر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ چوتھے آسمان میں ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے چوتھے آسمان میں لایا گیا تو ہمارے لیے بیت معمور کو اٹھایا گیا یہ کعبہ شریف کے بالمقابل ہے اگر گرے تو کعبہ شریف پر گرے ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ جب اس سے نکلتے ہیں تو واپس نہیں آتے'' (2)۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت بیان کی ہے: یہ آسمان دنیا میں ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: ابن کواء نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے پوچھا: بیت معمور کیا ہے؟ فرمایا: سات آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے بیت ہے جسے ضراح کہتے ہیں؛ صحاح میں اسی طرح ہے۔ ضراخ ضمہ کے ساتھ آسمان میں ایک کمرہ ہے جسے بیت معمور کہتے ہیں (3)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس کے مکین فرشتے ہیں۔

مہدوی نے ان سے روایت نقل کی ہے؛ یہ عرش کے بالمقابل ہے۔

حدیث اسراء میں صحیح مسلم میں حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''پھر مجھے بیت معمور کی طرف بلند کیا گیا، میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ بیت معمور ہے، ہر روز اس سے ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جب اس سے نکلتے ہیں تو آخر وقت تک اس کی طرف نہیں لوٹتے'' (4)۔ اور حدیث ذکر کی۔

حضرت ثابت کی حدیث جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا'' اس میں ہے'' ہمیں ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا حضرت جبریل امین نے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کیا تو پوچھا گیا: کون ہے؟ جواب دیا: جبریل۔ پوچھا گیا: تیرے ساتھ کون ہے؟ جواب دیا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پوچھا گیا: ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے۔ ہمارے لیے دروازہ کھولا گیا تو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھا وہ بیت معمور سے ٹیک لگائے ہوئے تھے اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں وہ دوبارہ اس کی طرف لوٹ کر نہیں آتے'' (5)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے پندرہ گھر ہیں سات آسمانوں میں اور سات زمینوں میں ہیں اور ایک کعبہ ہے وہ سب گھر کعبہ کے بالمقابل ہیں۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 23　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 377　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 186

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ الی السموات، جلد 1، صفحہ 94　　5۔ ایضاً

حضرت حسن بصری نے کہا: بیت معمور سے مراد کعبہ ہی ہے بیت معمور وہی ہے جسے لوگ آباد کرتے ہیں ہر سال ساٹھ ہزار افراد اس کی زیارت کرتے ہیں اگر لوگ یہ تعداد پوری کرنے سے عاجز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ ان کی تعداد کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ پہلا گھر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں عبادت کے لیے معین فرمایا ہے(1)۔

ربیع بن انس نے کہا: بیت معمور حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں زمین میں کعبہ مشرفہ کی جگہ پر تھا جب حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آیا حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بیت معمور کا حج کریں تو لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپ کی نافرمانی کی جب پانی سرکش ہو گیا تو بیت معمور کو اٹھا لیا گیا تو اسے اسی کے بالمقابل آسمان دنیا میں رکھ دیا گیا ہر روز ستر ہزار فرشتے اس کی زیارت کرتے ہیں پھر صور پھونکنے تک اس کی طرف نہیں لوٹتے۔ جہاں یہ بیت تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہاں ہی ٹھکانہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ (الحج)

وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ۝ آسمان کو سقف کا نام دیا کیونکہ یہ زمین کے لیے اسی طرح ہے جس طرح کمرہ کے لیے چھت ہوتی ہے(2) اس کی وضاحت اس ارشاد میں ہے: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء:32) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد عرش ہے جو جنت کی چھت ہے۔

وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ۝ مجاہد نے کہا: مراد روشن کیا گیا ہے(3)۔ حدیث میں آیا ''سمندر کو قیامت کے روز گرم کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ آگ ہو جائے گا''(4)۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی بھرا ہوا ہے۔ نحویوں نے نمر بن ثواب کا شعر پڑھا:

إذا شاء طالعَ مَسْجُورةً تَرَى حَولَها النَّبْعَ والسَّاسَمَا(5)

جب وہ چاہتا ہے وہ بھرے ہوئے چشمے پر جا پہنچتا ہے تو اس چشمہ کے گرد نبع اور ساسم کے درخت اگے ہوئے دیکھے گا۔

شاعر پہاڑی بکرے کا ارادہ کرتا ہے جو ایسے چشمے پر وارد ہوتا ہے جو پانی سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ آگ سے بھرا ہوا ہو۔ تو یہ پہلے قول کی طرح ہو گا۔ ضحاک، شمر بن عطیہ، محمد بن کعب اور اخفش نے اسی طرح کہا ہے کہ وہ گرم چولہا ہو گا جس طرح روشن تنور ہوتا ہے اس معنی میں یہ قول کیا جاتا ہے کہ مسعر، مسجر ہے اس تاویل کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۝ (التکویر) جب سمندروں کو روشن کیا جائے گا۔ یہ جملہ بولتے ہیں: سجرت النور أسجره سجرا میں نے تنور کو گرم کیا۔

سعید بن مسیب نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی سے فرمایا جہنم کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: سمندر میں (6)۔ فرمایا: میں تجھے سچا خیال کرتا ہوں اور یہ آیت تلاوت کی وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ۝، وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۝ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سمندر سے وضو نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ جہنم کا ایک طبق ہے۔ کعب نے کہا: قیامت کے روز

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 79
2۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 243
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 186
4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 408
5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 186
6۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 408

سمندر کو گرم کیا جائے گا تو جہنم کی آگ میں اضافہ ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مسجور اس سمندر کو کہتے ہیں جس کا پانی ختم ہو چکا ہو؛ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ عطیہ اور ذو رمہ شاعر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک لونڈی پانی لانے کے لیے نکلی اس نے کہا: ان الحوض مسجور حوض خالی ہے۔ ابن ابی داؤد نے کہا: ذی رمہ کی کوئی روایت نہیں مگر یہی روایت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مسجور کا معنی ہے جس کو کھول دیا گیا ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (الانفطار) زمین اس کا پانی چوس لے گی تو اس میں پانی نہیں رہے گا۔ ایک تیسرا قول ہے جو حضرت علی شیر خدا اور عکرمہ سے مروی ہے ابو مکین نے کہا: میں نے عکرمہ سے بحر مسجور کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا عرش کے نیچے سمندر ہے۔ حضرت علی شیر خدا نے کہا: یہ عرش کے نیچے ہے جس میں گاڑھا پانی ہے (1)۔ اس کو بحر حیوان کہتے ہیں جس سے بندے نفخہ اولی کے بعد چالیس دن تک نیچے اترتے رہیں گے تو وہ اپنی قبروں میں جنم لیں گے۔ ربیع بن انس نے کہا: مسجور سے مراد ہے جس میں میٹھا نمک کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

میں کہتا ہوں: فُجِّرَتْ کا معنی دونوں تاویلوں میں سے ایک میں اس طرف لوٹتا ہے یعنی اس کا میٹھا اس کے نمکین میں ملا یا جائے گا (2)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مسجور کا معنی محبوس ہے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ یہ جواب قسم ہے یعنی عذاب مشرکوں میں واقع ہونے والا ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کہا میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا تا کہ میں بدر کے قیدیوں کے بارے میں گفتگو کروں تو میں نے آپ کو مغرب کی نماز میں سورۂ طور کی تلاوت کرتے ہوئے پایا یہاں تک کہ آپ نے یہ آیت تلاوت کی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ گویا میرا دل پھٹ گیا تو میں عذاب کے نزول کے ڈر سے مسلمان ہو گیا مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ میں یہاں سے اٹھ سکوں گا یہاں تک کہ مجھ پر عذاب نازل ہو جائے گا (3)۔

ہشام بن حسان نے کہا: میں اور مالک بن دینار، حضرت حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے پاس ایک آدمی سورۂ طور کی تلاوت کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت تک پہنچا اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ تو حضرت حسن بصری رونے لگے اور آپ کے ساتھی بھی رونے لگے (4)۔ مالک بن دینار بے چین ہو گئے یہاں تک کہ ان پر غشی طاری ہو گئی۔ جب بکار کو منصب قضا دیا گیا تو دو آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک پر قسم آتی تھی بکار دونوں میں صلح کی رغبت رکھتے تھے آپ اپنی جانب سے قسم کے بدلے اس کے خصم کو عوض دینا چاہتے تھے تو اس نے قسم کے سوا کسی چیز پر بھی انکار کر دیا تو آپ نے سورۂ طور کی ابتدائی آیات کے ساتھ اس سے قسم اٹھوائی یہاں تک کہ اسے فرمایا:

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 232
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 186
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 233
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 79

کہا اگر میں جھوٹا ہوں تو تیرے رب کا عذاب واقع ہو اس آدمی نے یہ کلمات کہے وہ باہر نکلا تو اسی لمحہ اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''جس روز آسمان بری طرح تھرتھرا رہا ہوگا اور پہاڑ (اپنی جگہ چھوڑ کر) تیزی سے چلنے لگیں گے۔ پس بربادی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو محض تفریح طبع کے لیے فضول باتوں میں لگے رہتے ہیں اور اس روز انہیں دھکے دے کر آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (انہیں کہا جائے گا) یہی وہ آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا یہ (آگ) جادو (کا کرشمہ) ہے یا تمہیں یہ نظر ہی نہیں آ رہی اس میں (تشریف لے) چلو اب چاہے صبر کرو یا نہ کرو دونوں برابر ہیں تمہارے لیے تمہیں اس کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو تم کیا کرتے تھے''۔

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿۹﴾ یوم میں عامل ''واقع'' ہے یعنی قیامت کے روز ان پر عذاب واقع ہوگا یہ وہ دن ہے جس میں آسمان تھرتھرائے گا۔ اہل لغت نے کہا: مار الشئ یمور مورا اس نے حرکت کی وہ آیا اور وہ گیا۔ جس طرح کھجور کا لمبا درخت حرکت کرتا ہے تموّر اس کی مثل ہے۔ ضحاک نے کہا: ان میں سے بعض بعض میں موجیں مار رہے ہوں گے(1)۔ مجاہد نے کہا: وہ چکر لگا رہے ہوں گے(2)۔ ابو عبیدہ اور اخفش نے کہا: وہ جھول رہے ہوں گے اور اعشیٰ کا شعر ذکر کیا:

كَأَنَّ مِشْيَتَها من بيتِ جارتِهَا مَوْرُ السَّحابةِ لا رَيْثٌ ولا عَجَلُ(3)

اس کی چال اس کے پڑوس کے گھر سے بادل کے جھولنے کی طرح ہوتی ہے نہ بہت سست اور نہ بہت تیز۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ تیزی سے چلتے ہیں؛ اس معنی میں جریر کا قول ہے:

وما زالتِ القَتْلَى تَمُور دِماؤُهَا بِدجلةَ حتَّى ماءُ دجلةَ أَشْكَلُ(4)

مقتولوں کے خون دجلہ میں تیزی سے بہتے ہیں یہاں تک کہ دجلہ کا پانی رنگین ہوگیا'۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس روز آسمان حرکت کریں گے اور مضطرب ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں اس کے اہل گردش کریں گے اور ایک دوسرے میں موجزن ہوں گے۔ مور کا معنی راستہ ہے اس معنی میں طرفہ کا قول ہے: ناقة موّراة الید ایسی اونٹنی جو تیز رفتار ہو۔ البعیر یمور عضدا ہ ایسا اونٹ جس کے دونوں بازو متردد ہو جائیں۔ عربوں کا قول ہے: لا أدري أغار أم مار میں نہیں جانتا کہ وہ گہرائی کی طرف گیا ہے یا گھوم گیا اور بلند جگہ کی طرف لوٹ گیا۔ مور جب میم کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد ہوا کے ساتھ غبار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں السماء سے مراد فلک ہے(5) اس

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 28
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 379
3۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 27
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 379
5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 380

کے مور سے مراد اس کے نظم کا مضطرب ہونا ہے اور خیال میں اختلاف واقع ہونا ہے؛ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا۝ مقاتل نے کہا: وہ اپنی جگہوں سے چلتے ہیں یہاں تک کہ زمین کے ساتھ برابر ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ آج اس طرح چلتے ہیں جس طرح بادل دنیا میں چلتے ہیں؛ اس کی وضاحت ہے وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل:88) یہ بحث سورۂ کہف میں گزر چکی ہے۔

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝ ویل ایسا کلمہ ہے جو ہلاک ہونے والے کے لیے کہا جاتا ہے اس پر فاء داخل ہوئی کیونکہ کلام میں مجازات کے معنی پائے جاتے ہیں۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ۝ وہ باطل میں گھوم پھر رہے ہیں وہ ان کا حضرت محمد مصطفی علیہ التحیۃ والثناء کی تکذیب میں ہی لگے رہنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اسباب دنیا میں ہی لگے رہتے ہیں وہ حساب و جزا کا ذکر نہیں کرتے۔ سورۂ براءت میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ، یہ يَوْمَئِذٍ سے بدل ہے ویدعون اس کا معنی ہے انہیں شدت اور سختی کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جاتا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: دععته أدعه دعا میں نے اسے دھکیلا؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ۝ (الماعون) تفسیر میں ہے جہنم کے داروغے ان کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ جکڑ دیں گے ان کی پیشانیوں کو ان کے قدموں کے ساتھ جمع کر دیں گے، پھر انہیں منہ کے بل جہنم میں پھینک دیں گے یہاں تک کہ وہ آگ میں جا پہنچیں گے۔ ابو رجا عطاردی اور ابن سمیقع نے اسے تخفیف کے ساتھ يَوْمَ يُدْعَوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا۝ پڑھا ہے یہ دعا سے مشتق ہے جب وہ آگ کے قریب ہوں گے تو داروغے انہیں یہ کہیں گے: هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ ہمزہ استفہامیہ ہے اس کا معنی توبیخ و انکار ہے یعنی انہیں کہا جائے گا: جسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کیا یہ جادو ہے؟ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ام، بل کے معنی میں ہے یعنی بلکہ تم دنیا میں نہیں دیکھتے تھے اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔

اِصْلَوْهَا انہیں جہنم کے داروغے کہتے ہیں: اس میں داخل ہو کر اس کی گرمی کو چکھو۔ فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اس میں تمہارا صبر ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ سواء کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی سواء علیکم الجزع والصبر فلا ینفعکم شیء یعنی جزع اور صبر تمہارے لیے برابر ہے کوئی چیز تمہیں نفع نہ دے گی، جس طرح ان کے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ کہیں گے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا (ابراہیم:21)

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ تمہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ تم عمل کرتے رہے ہو۔

**اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ۙ۝ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۙ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝**

''بے شک پرہیزگار (اس روز) باغوں میں نعمتوں میں ہوں گے شاد و مسرور ان نعمتوں پر جو انہیں ان کے

رب نے دی ہوں گی اور بچالیا ان کے رب نے انہیں دوزخ کے عذاب سے۔ (حکم ملے گا) کھاؤ پیو خوب مزے لے لے کر ان (نیکیوں) کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بچھے ہوئے پلنگوں پر اور ہم انہیں بیاہ دیں گے گوری گوری آہو چشموں سے''۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ﴿١٧﴾ جب کفار کا حال ذکر کیا تو مومنین کا حال بھی ذکر کیا۔ فٰكِهِيْنَ کثیر پھلوں والے۔ یہ کہا جاتا ہے: رجل فاکه یعنی پھل والا جس طرح لابن اور تامر کہا جاتا ہے دودھ والا اور کھجور والا، یعنی یہ نسبت کا معنی دیتا ہے۔ شاعر نے کہا:

و غَرَرْتَنِي وزعمتَ أنّك لابِنٌ بالصَّيفِ و تَامِرُ(1)

تو نے مجھے دھوکہ دیا اور تو نے گمان کیا کہ تو موسم گرما میں دودھ والا اور کھجور والا ہے۔

یہاں بھی لابن اور تامر، ذولبن اور ذو تمر کے معنی میں ہے۔ حضرت حسن بصری اور دوسرے قراء نے فکھین الف کے بغیر پڑھا ہے اس کا معنی ہے خوش و خرم (2)۔ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کے قول میں ہے: کہا جاتا ہے فکه الرجلُ فهوفَكِه جب اس کی طبیعت اچھی اور مزاح کی حالت ہو۔ فکه کا معنی انتہائی حریص اور متکبر بھی ہے۔ سورۃ الدخان میں اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ بِمَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿١٨﴾ یعنی ان کے رب نے انہیں جو عطا کیا۔ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا انہیں یہ بات کہی جائے گی: کھاؤ پیو۔ هَنِيْٓـًٔا مبارک ہو جس میں محروی اور کدورت نہیں۔ زجاج نے کہا: جس طرف تم جارہے ہو وہ تمہیں مبارک ہے۔ هَنِيْٓـًٔا کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے متعتم بنعیم الجنة أمتاعا هنیأ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلوا واشربوا هنئتم هنیأ یہ مفعول مطلق ہے اور مصدر کی صفت بن رہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: هَنِيْٓـًٔا کا معنی ہے حلال۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں کوئی اذیت اور سر درد نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مبارک ہو تم کو موت نہیں آئے گی کیونکہ وہ چیز جو باقی نہ رہے یا انسان جس کے ساتھ باقی نہ رہے وہ طبیعت کو منقبض کرنے والی اور غیر مبارک ہوتی ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ، سُرُرٍ، سریر کی جمع ہے کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے متکئین علی نمارق سرر، مصفوفة ابن اعرابی نے کہا: معنی ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک صف بن گئے ہیں۔ احادیث میں آیا ہے ''وہ آسمان میں اتنے اتنے طویل صف در صف ہیں جب بندہ ان پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ نیچے ہو جاتے ہیں جب وہ اس پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ اپنی حالت میں ہو جاتے ہیں''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ سونے کے پلنگ ہیں جن پر زبرجد، موتیوں اور یاقوت کے تاج ہیں اور ایک پلنگ مکہ مکرمہ اور ایلہ کے درمیان مسافت کے برابر ہے۔

وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٢٠﴾ یعنی ہم نے جنتیوں کو ان حوروں کا ساتھی بنا دیا ہے۔ یونس بن حبیب نے کہا: عرب کہتے ہیں زوجت امرأة وتزوجت امرأة۔ کلام عرب میں یہ نہیں تزوجت بأمرة۔ کہا: اللہ تعالیٰ کا جو یہ فرمان وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 31
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 80

یعنی ہم نے انہیں حورعین کا ساتھی بنا دیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے تعلق رکھتا ہے: اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) یہاں ازواج سے مراد ان کے ساتھی ہیں۔

فراء نے کہا: تزوجت بامراۃ یہ ازد شنوءۃ میں ایک لغت ہے۔ حورعین کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَ لَا تَاْثِيْمٌ ۝ وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ۝

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ہم ملائیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو اور ہم کمی نہیں کریں گے ان کے عملوں (کی جزاء) میں ذرہ بھر، ہر شخص اپنے اپنے اعمال میں اسیر ہوگا۔ اور ہم مسلسل دیتے رہیں گے انہیں ایسے میوے اور گوشت جو وہ پسند کریں گے۔ وہ چھینا جھپٹی کریں گے وہاں جام شراب پر (لیکن) اس میں نہ لغویت ہوگی اور نہ گناہ۔ اور (خدمت بجا لانے کے لیے) چکر لگاتے ہوں گے ان کے گرد ان کے غلام (اپنے حسن کی باعث) یوں معلوم ہوگا گویا وہ چھپے موتی ہیں''۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ عام قرأت واتبعتهم ہے ہمزہ وصلی، تاء مشدد، عین مفتوحہ اور تاء ساکن۔ ابوعمرو نے وَاَتْبَعْنٰهُمْ پڑھا ہے ہمزہ قطعی تاء اور عین ساکن اور نون۔ وہ اسے الحقنابھم پر قیاس کرتے ہیں تا کہ کلام ایک ہی طریقہ پر رہے۔ جہاں تک پہلے ذُرِّيَّتُهُمْ کا تعلق ہے تو ابن عامر، ابوعمرو اور یعقوب نے جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نافع سے پڑھا ہے مگر ابوعمرو نے تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یونکہ مفعول ہے باقی نے اسے ضمہ دیا ہے باقی قراء نے اسے واحد کا صیغہ اور تاء کو ضمہ دیا ہے نافع سے بھی یہی مشہور ہے جہاں تک دوسرے لفظ ذریۃ کا تعلق ہے تو نافع، ابن عامر، ابوعمرو اور یعقوب نے تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ باقی نے اسے واحد کا صیغہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے چار روایات مروی ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ مومن کی اولاد کو جنت میں اس کے درجہ میں بلند فرمائے گا اگرچہ اولاد درجہ میں اس سے کم ہو تا کہ ان کے ساتھ ان کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس آیت کی تلاوت کی (1)۔ نحاس نے ناسخ و منسوخ میں اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مومن کی اولاد کو جنت میں اس کے درجہ میں بلند فرما دے گا اگرچہ وہ اپنے عمل کے ساتھ اس درجہ تک نہیں پہنچیں گے تا کہ ان کے ساتھ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو'' (2)۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 234، (روایت بالمعنی) 2۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، جلد 7، صفحہ 246، حدیث 11370

ابو جعفر نے کہا: حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرفوع ہو گئی اس طرح ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود اپنی جانب سے یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اس امر کی خبر دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا ہے۔

زمخشری نے کہا: اللہ تعالیٰ ان کے لیے مختلف قسم کے سرور جمع فرما دے گا ان کی ذاتوں میں سعادت رکھ دے گا، حورعین کے ساتھ ان کو جمع کرے گا، مومن بھائیوں کے ساتھ موانست پیدا کر دے گا اور ان کی اولاد اور ان کی نسل کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کے ساتھ اس کی چھوٹی اولاد کو لاحق کر دے گا جو ایمان لانے کی حد کو نہیں پہنچیں ہو گی (2)؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔ ذریۃ کا لفظ چھوٹوں اور بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ اگر تو یہاں ذریۃ سے مراد چھوٹی اولاد لے تو بِاِیۡمَانٍ کا قول دونوں مفعولوں سے حال ہو گا تو تقدیر کلام یہ ہو گی بایمان من الآباء اگر ذریۃ سے مراد بڑی اولاد لے تو بِاِیۡمَانٍ کا لفظ دونوں فاعلوں سے حال ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک تیسرا قول بھی ہے کہ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد مہاجرین و انصار ہیں اور ذریۃ سے مراد تابعین ہیں۔ آپ سے ایک روایت یہ بھی ہے: اگر آباء درجہ میں بلند ہوئے تو اللہ تعالیٰ بیٹوں کو بھی آباء تک بلند کر دے گا، اگر بیٹے بلند درجہ کے حامل ہوئے تو اللہ تعالیٰ آباء کو بیٹوں کی طرف بلند فرما دے گا (3)۔ آباء ذریۃ کے اسم میں داخل ہوں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاٰیَۃٌ لَّہُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَہُمۡ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۴۱﴾ (یٰسین)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: وہ اس روایت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ "جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو ان میں سے کوئی اپنے والدین، اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے بارے میں پوچھے گا تو انہیں کہا جائے گا: انہوں نے وہ رتبہ نہیں پایا جو تو نے رتبہ پایا ہے۔ تو عرض کرے گا: اے میرے رب! میں نے اپنے لیے اور ان کے لیے عمل کیا تو ان کو اس کے ساتھ لاحق کرنے کا حکم دے دیا جائے گا" (4)۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے والدین کے بارے پوچھا جو دور جاہلیت میں فوت ہو گئے تھے تو آپ نے مجھے فرمایا: "وہ دونوں آگ میں ہیں"۔ جب آپ نے میرے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے فرمایا: "اگر تو ان کے مکان کو دیکھے تو تو ان سے بغض رکھنے لگے"۔ پوچھا: یا رسول اللہ! میرا وہ بچہ جو آپ سے ہوا؟ فرمایا: "وہ جنت میں ہے" پھر فرمایا: "مومن اور ان کی اولادیں جنت میں ہوں گی اور مشرک اور ان کی اولادیں آگ میں ہوں گی"۔ پھر اس آیت وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا...... کی تلاوت کی۔

وَمَاۤ اَلَتۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَمَلِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ یعنی ہم نے بیٹوں کے اعمال کے ثواب میں ان کی عمروں کے کم ہونے کی وجہ سے

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 411 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 189 3۔ ایضاً

4۔ مجمع الزوائد، کتاب الجہاد والسیر، فداء المشرکین، جلد 7، صفحہ 246، حدیث 11369

کوئی کمی نہیں کی اور بیٹوں کو ان کے آباء کے ساتھ لاحق کرنے کی وجہ سے ان کے آباء کے اعمال کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس تاویل کی صورت میں ھم ضمیر ذریۃ کے لیے ہوگا۔ ابن کثیر نے اسے وما التناھم پڑھا ہے باقی قراء نے الام کو فتحہ دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: آلتناھم لا کے ساتھ ہے۔ ابن اعرابی نے کہا: التہ، یالتہ ألتا آلتہ یؤلتہ ایلاتا، لاتہ یلیتہ لیتا سب کا معنی ہے جب اس میں کمی کرے۔

صحاح میں ہے: ولاتہ عن وجھہ یلوتہ ویلیتہ اس کو سامنے سے روک دیا اور اسے پھیر دیا اسی طرح الاتہ عن وجھہ مجرد اور مزید دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: ما الاتہ من عملہ شیئا میں نے اس کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہ کی۔ یہ بھی الله کی طرح ہے سورۂ حجرات میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ۝** ایک قول یہ کیا گیا: وہ جہنمیوں کی طرف لوٹے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جہنمی اپنے اعمال کے بدلے میں رکھ دیئے گئے ہیں اور جنتی اپنی جنت کی طرف لوٹ جائیں گے؛ اسی وجہ سے فرمایا: **كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ۝ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ۝** (المدثر) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہر انسان کو عام ہے اسے اپنے عمل کے بدلے میں رہن رکھا گیا ہے۔ کسی کے عمل کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی جہاں تک عمل پر زیادتی کا مسئلہ ہے تو یہ الله تعالیٰ کی جانب سے فضل واحسان ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ حکم اس ذریت کے بارے میں ہو جو ایمان نہ لائی ہو وہ اپنے مومن آباء کے ساتھ لاحق نہیں کیے جائیں گے بلکہ وہ اپنے کفر کے بدلے میں محبوس ہوں گے۔

**وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۝** یعنی ہم ان کے اعمال سے بڑھ کر انہیں یہ کثیر چیزیں دیں گے یہ الله تعالیٰ کی جانب سے زیادتی ہوگی یعنی الله تعالیٰ انہیں وہ وہ چیزیں عطا فرمائے گا جس کے وہ مستحق نہ تھے۔

**يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا** وہ جام ایک دوسرے سے لیں گے وہ جنت میں مومن، اس کی بیویاں اور ان کے خادم ہوں گے۔ کاس شراب کا برتن ہے ہر وہ برتن جو شراب وغیرہ سے بھرا ہوا ہو، جب وہ خالی ہو تو اسے کاس نہیں کہتے۔ لغت میں تنازع اور کاس کی تائید اخطل کا شعر کرتا ہے:

وشَارِبٍ مُرْبِحٍ بالكَاسِ نَادَمَنِي　لا بالحَصُورِ ولافيها بِسَوَّارِ(1)

نَازَعْتُه طَيِّبَ الرَّاحِ الشَّمُولِ وَقَدْ　صَاحَ الدَّجَاجُ وحَانَتْ وَقْعَةُ السَّارِي

بھرے ہوئے جام پینے والا میرا ندیم ہے تنگ دل بخیل میرا ندیم نہیں اور نہ شراب کو برتن میں چھوڑنے والا۔ میں نے عمدہ خوشبو والی شراب اس سے لی جب کہ مرغ اذان دے رہا تھا اور رات کے وقت چلنے والے کے گرنے کا وقت ہو چکا تھا۔

امراء القیس نے کہا۔

**فَلَمَّا تَنَازَعْنَا الحديث**

''جب ہم نے باہم گفتگو کی''۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 382

سورۂ صافات میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

لَّا لَغْوٌ فِيهَا، ھاضمیر سے مراد کاس ہے یعنی ان میں کوئی لغوبات نہیں ہوگی۔

وَلَا تَأْثِيمٌ ۝ نہ اس میں کوئی گناہ ہوگا۔ تَأْثِيمٌ یہ اثم سے تفعیل کا وزن ہے یعنی وہ جام انہیں گناہ گار نہیں بنائے گا کیونکہ یہ ان کے لیے مباح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فِيهَا میں ھاضمیر جنت کے لیے ہے۔ ابن عطاء نے کہا: اس مجلس میں کون سی بات ہوسکتی ہے جس کا محل جنت عدن ہو(1)، اس کے ساقی فرشتے ہوں، ان کا مشروب الله کے ذکر پر ہو، ان کی خوشبو اور سلام الله تعالیٰ کی جانب سے ہو اور قوم الله تعالیٰ کی مہمان ہو۔ وَلَا تَأْثِيمٌ یعنی کوئی جھوٹ نہیں (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

ضحاک نے کہا: وہ ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ابن کثیر، ابن محیصن اور ابوعمرو نے کہا: لَا لَغْوَ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمَ یعنی آخر کو فتحہ دیا ہے باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ یہ بحث سورۂ بقرہ آیت 254 میں وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ میں گزر چکی ہے۔ الحمدلله

وَ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ ان کے غلام پھلوں، تحفوں، کھانوں اور مشروبات کے ساتھ گردش کناں ہوں گے اس کی دلیل ہے يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ (الزخرف: 71) يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝ (الصافات) کہا گیا: یہ غلمان ان کی وہ اولادیں ہوں گی جو ان سے پہلے فوت ہوگئے تھے۔ الله تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ خادم ہیں جو دوسروں کی اولادوں میں سے الله تعالیٰ نے ان کا خادم بنایا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ غلمان ہیں جو جنت میں پیدا کیے گئے۔ کلبی نے کہا: وہ کبھی بھی بڑی عمر کے نہیں ہوں گے۔

كَأَنَّهُمْ وہ حسن اور سفیدی میں۔ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ۝ صدف میں چھپے موتی ہیں۔ مکنون کا معنی محفوظ ہے۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۝ (الواقعہ) ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد مشرکوں کی اولاد ہے وہ جنتیوں کے خادم ہوں گے، جنت میں کوئی تھکاوٹ اور ان کو خدمت کی کوئی حاجت نہ ہوگی لیکن یہ خبر دی کہ وہ حد درجہ کی نعمت میں ہوں گے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان أدنى أهل الجنة منزلة من ينادي الخادم من خدمه فيجيبه الف كلهم لبيك لبيك (3) جنتیوں میں کم درجہ کا جنتی جب اپنے خادموں میں سے کسی خادم کو بلائے گا تو ایک ہزار اس کو جواب دے گا سب کہیں گے: لبیک لبیک۔

حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مامن أحد من أهل الجنة إلا يسعى عليه ألف غلام كل غلام على عمل ليس عليه صاحب (4) ہر جنتی کے لیے ایک ہزار غلام بھاگ دوڑ کر رہا ہوگا ہر غلام ایسے کام میں مصروف ہوگا جس میں دوسرا مصروف نہیں ہوگا۔

---

1۔ تفسیر سلمی، جلد 2، صفحہ 281
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 383
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 412
4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 236

حضرت حسن بصری سے مروی ہے صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب خادم موتی کی طرح ہیں تو مخدوم کی حالت کیا ہوگی (1)؟ فرمایا: ما بینهما کما بین القمر لیلة البدر وبین أصغر الکواکب دونوں کے درمیان اتنا فرق ہوگا جتنا فرق چودہویں کے چاند اور سب سے چھوٹے ستارے کے درمیان ہوتا ہے۔

کسائی نے کہا: کننت الشیء کا معنی ہے میں نے اس پر پردہ ڈالا اور سورج سے اسے محفوظ کر دیا۔ آکننته فی نفسی میں نے اسے چھپا دیا۔ ابوزید نے کہا: کننته و اکننته دونوں کا معنی ایک ہے خواہ کسی پردہ میں چھپائیں یا اپنی ذات میں چھپائیں، تو کہتا ہے: کَنَنْتُ العِلمَ و اکننته هو مَکنون و مُکَن۔ کننتُ الجاریةَ و اکننتُها فهی مکنونة و مُکَنَّة۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ ﴿۲۸﴾

''اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے کہیں گے ہم بھی اس سے پہلے اپنے اہل خانہ میں (اپنے انجام کے بارے میں) سہمے رہتے تھے۔ سو بڑا احسان فرمایا اللہ نے ہم پر اور بچا لیا ہے ہمیں گرم لو کے عذاب سے۔ بے شک ہم پہلے بھی (دنیا میں) اس سے دعا کیا کرتے تھے، یقیناً وہ بہت احسان کرنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا تو وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جنت میں اس تھکاوٹ اور عاقبت کے اس خوف کا ذکر کریں گے جو دنیا میں انہیں لاحق ہوتی تھی اور خوف کے ختم ہونے پر وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کریں گے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایک دوسرے کو کہیں گے تو اس بلند مقام پر کیسے پہنچا۔

قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ ہر مسؤل اپنے سائل سے یہی بات کرے گا یعنی ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرا کرتے تھے۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اللہ تعالیٰ نے جنت اور مغفرت عطا فرما کر ہم پر احسان کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: توفیق اور ہدایت دے کر ہم پر احسان کیا گیا۔ وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ حضرت حسن بصری نے کہا: سموم جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور جہنم کے طبقوں میں سے ایک طبقہ ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد جہنم ہے جس طرح تو اسے جہنم کہتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے نار عذاب السموم، سموم سے مراد گرم ہوا ہے یہ لفظ مونث استعمال ہوتا ہے یہ جملہ ذکر کیا جاتا ہے سم یومنا فهو مسموم اس کی جمع سمائم آتی ہے۔ ابوعبید نے کہا: سموم ہوا دن کے وقت ہوتی ہے اور کبھی رات کے وقت بھی

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 80
2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 38
3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 236
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 80

ہوتی ہے۔ حرور ہوارات کے وقت ہوتی ہے اور کبھی دن کے وقت ہوتی ہے سموم کا لفظ کبھی سردی کی لپک کے لیے بولا جاتا ہے جب کہ اصل میں یہ گرمی اور سورج کی لپک کے لیے اکثر بولا جاتا ہے۔ راجز نے کہا:

الیوم یومٌ باردٌ سمومُہٗ مَنْ جَزِعِ الیومَ فلا ألومہٗ(1)☆

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ہم اس سے قبل دنیا میں اس سے دعا کیا کرتے تھے کہ وہ ہمارے گناہوں کی بخشش فرما کر ہم پر احسان فرمائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَدْعُوْهُ کا معنی نعبدہ ہے اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ نافع اور کسائی نے اسے انہ پڑھا ہے اصل میں لانہ تھا۔ باقی قراء نے اسے اِنّہ پڑھا ہے کیونکہ یہاں سے کلام شروع ہو رہی ہے۔ البر کا معنی لطیف ہے(2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس نے جو وعدہ کیا وہ اس میں سچا ہے(3)؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾

''پس آپ سمجھاتے رہیے آپ اپنے رب کی مہربانی سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔ کیا یہ (نابکار) کہتے ہیں کہ آپ شاعر ہیں (اور) ہم انتظار کر رہے ہیں ان کے متعلق گردش زمانہ کا۔ فرمایئے (ہاں ضرور) انتظار کرو پس میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں۔ کیا حکم دیتی ہیں انہیں ان کی عقلیں ان (مہمل) باتوں کا یا یہ لوگ ہی سرکش ہیں۔ کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی (قرآن) گھڑ لیا ہے درحقیقت یہ بے ایمان ہیں۔ پس گھڑ کر لے آئیں وہ بھی اس جیسی کوئی (روح پرور) بات اگر وہ سچے ہیں''۔

فَذَكِّرْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی قوم کو قرآن کے ذریعے سمجھاتے رہیے۔ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ یعنی اپنے رب کی رسالت کا فریضہ سرانجام دینے کی وجہ سے کاہن نہیں کہ آپ خود ہی اپنی طرف سے قول گھڑتے ہیں اور وحی کے بغیر اگلے روز خبر دے دیتے ہوں۔ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اس میں ان کے قول کا رد کیا گیا ہے جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں کیا کرتے تھے۔

عقبہ بن ابی معیط نے کہا تھا: وہ مجنون ہیں۔ شیبہ بن ربیعہ نے کہا تھا: وہ جادوگر ہیں۔ دوسرے نے کہا تھا: کاہن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جھٹلایا اور ان کا رد کیا، پھر یہ کہا گیا: فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ قسم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قسم آپ کاہن اور مجنون نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قسم نہیں یہ کلام اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: بحمد اللہ آپ جاہل نہیں یعنی

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 383 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

☆ آج ایسا دن ہے جس کی سموم ٹھنڈی ہے جو آج گھبرا گیا میں اسے ملامت نہیں کروں گا۔

الله تعالیٰ نے تجھے اس امر سے بری کیا ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ بلکہ وہ کہتے ہیں: حضرت محمد ﷺ شاعر ہیں۔ سیبویہ نے کہا: لوگوں سے اس کے ساتھ خطاب کیا گیا جو ان میں کلام جاری رہتی تھی۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: یہ اچھی کلام ہے مگر غیر واضح ہے۔ سیبویہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ کلام عرب میں اَمْ کا کلمہ ایک بات سے دوسری بات کی طرف نکلنے کے لیے ہے، جس طرح کہا:

أَتَهْجُرُ غَانِيَةً أَمْ تُلِمْ

یہاں کلام مکمل ہوگئی پھر ایک دوسری بات کی طرف نکل گیا تو کہا

أَمِ الْحَبْلُ وَاهٍ بِهَا مُنْجَذِمُ

کتاب الله میں جو اس طرح کی کلام ہوتی ہے اس سے مراد تقریر، توبیخ اور ایک بات سے دوسری بات کی طرف نکلنا مقصود ہوتا ہے۔ نحوی اس (ام) کو بل کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔

نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قتادہ نے کہا: کفار میں سے ایک قوم نے کہا تم حضرت محمد ﷺ کی موت کا انتظار کرو وہ تمہاری جانب سے اسے کافی ہو جائے گی، جس طرح موت فلاں قوم کے شاعر کو کافی ہوگئی تھی (1)۔ ضحاک نے کہا: وہ بنو عبدالدار تھے انہوں نے آپ کی طرف اس امر کو منسوب کیا تھا آپ شاعر ہیں، یعنی قریب ہی ہلاک ہو جائیں گے جس طرح ان سے پہلے شعراء ہلاک ہوئے ان کے والد جوانی میں فوت ہو گئے جس طرح ان کے والد فوت ہوئے ممکن ہے یہ بھی فوت ہو جائیں۔ اخفش نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے نتربص بہ الی ریب المنون تو حرف جار کو حذف کر دیا گیا؛ جس طرح تو کہتا ہے: **قصدت زیدا و قصدت الی زید**۔ منون سے مراد حضرت ابن عباس کے قول میں موت ہے (2)۔ ابوالغول طہوی نے کہا:

هُمْ مَنَعُوا حِمَى الْوَقَبَى بِضَرْبٍ　يُؤَلِّفُ بين أَشْتَاتِ الْمَنُونِ(3)

منون سے مراد موتیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے: بے شک ضرب (جنگ) ایسی قوموں کو جمع کر دیتی ہے جن کے علاقے الگ الگ ہوتے ہیں اگر ان کی موتیں ان کے اپنے اپنے علاقوں میں آتیں تو انہیں متفرق آتیں وہ ایک جگہ جمع ہو گئے تو موتیں انہیں اکٹھے آگئیں۔

سدی نے ابو مالک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں: لفظ رَیْبَ قرآن حکیم میں جہاں کہیں ہے اس کا معنی شک ہے مگر سورۂ طور میں ایک جگہ شک کے معنی میں نہیں ہے: یعنی رَیْبَ الْمَنُوْنِ سے مراد حادثات زمانہ ہیں۔ شاعر نے کہا:

تَرَبَّصْ بها رَيْبَ الْمَنُونِ لَعَلَّها　تُطَلَّقُ يومًا أو يَمُوتُ حَلِيلُها(4)

یہاں بھی رَیْبَ الْمَنُوْنِ سے مراد حادثات زمانہ ہیں۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 384　2۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 828
3۔ ایضاً　4۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 40 (حاشیہ میں مکمل شعر ہے)

مجاہد نے کہا: رَيْبَ الْمَنُوْنِ سے مراد حادثات زمانہ ہیں(1)، منون سے مراد زمانہ ہی ہے؛ ابوذ وہیب نے کہا:

أَمِنَ الْمَنُوْنِ وَرَيْبِهِ تَتَوَجَّعُ وَالدَّهْرُ لَيسَ بِمُعْتِبٍ مَنْ يَجْزَعُ(2)

کیا تو حادثات زمانہ سے دکھی ہوتا ہے اور جو جزع فزع کرتا ہے زمانہ اس پر عتاب نہیں کرتا۔

اصمعی نے کہا: منون سے مراد رات اور دن ہے۔ ان دونوں کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں عمر کو کم کرتے ہیں اور اجل کو ختم کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ دہر (زمانہ) کو منون کہتے ہیں؛ کیونکہ زمانہ حیوان کی قوت کو ختم کر دیتا ہے؛ اسی طرح منية ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: دھر کو منون کہتے ہیں کیونکہ یہ قوت کو کمزور کرنے والا ہے۔ عربوں کا قول ہے: حبل منين کمزور رسی۔ منین سے مراد کمزور غبار ہے۔ فراء نے کہا: منون مؤنث ہے یہ واحد اور جمع ہے۔

اصمعی نے کہا: منون واحد ہے اس کی جمع نہیں آتی۔ اخفش نے کہا: یہ جمع ہے اس کا واحد نہیں۔ منون مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جس نے اسے مذکر قرار دیا ہے اس نے اس سے مراد دھر اور موت لی ہے جس نے اسے مؤنث قرار دیا ہے اس نے اسے معنی پر محمول کیا ہے گویا اس نے منية مراد لی ہے۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو تم انتظار کرو فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝ میں بھی تمہارے بارے میں عذاب کا انتظار کرنے والا ہوں۔ انہیں غزوۂ بدر کے موقع پر تلوار سے عذاب دیا گیا۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ، احلام سے مراد ان کے عقول ہیں۔ ھذا سے مراد آپ کی ذات پر جھوٹ بولنا ہے۔

اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ یا بغیر عقل کے وہ سرکشی کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ام، بل کے معنی میں ہے۔ بلکہ انہوں نے سرکشی کرتے ہوئے کفر کیا اگرچہ ان کے لیے حق ظاہر ہوا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: کیا وجہ ہے کہ آپ کی قوم ایمان نہیں لائی۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت دانشمند ہونے سے بیان کی ہے؟ فرمایا: وہ ایسی عقلیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق نصیب نہیں فرمائی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَحْلَامُهُمْ سے مراد ان کے اذہان ہیں کیونکہ عقل کافر کو نہیں دی جاتی اگر اس کے پاس عقل ہوتی تو وہ ایمان لے آتا، کافر کو ذہن دیا جاتا ہے تو پس یہ ذہن اس پر حجت ہوتی ہے، ذہن عموماً علم کو قبول کرتا ہے، عقل علم میں تمیز پیدا کرتا ہے اور امر و نہی کی حدود کی مقادیر کا اندازہ لگاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! فلاں نصرانی کتنا دانشمند ہے؟ فرمایا: ایسا کہنے سے رک جا کافر کے ہاں عقل نہیں ہوتی کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (الملک) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مروی حدیث میں ہے ''ایسا کہنے سے رک جا کیونکہ عقل مند وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتا ہے'' اسے ترمذی حکیم ابوعبداللہ نے اپنی سند سے بیان کیا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ وہ کہتے ہیں اس نے خود اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے مراد قرآن حکیم ہے۔ تقول سے مراد ایسا قول

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 384 2۔ ایضا

ہے جس میں تکلف سے کام لیا گیا ہو۔ عموماً یہ لفظ جھوٹ میں استعمال کیا جاتا ہے یوں جملہ بولا جاتا ہے: قولتنی مالم اقل واقولتنی مالم أقل یعنی تو نے مجھ پر دعویٰ کیا۔ تقول علیہ یعنی اس پر جھوٹ بولا۔ اقتال علیہ اپنی مرضی سے تصرف کرنا۔ شاعر نے کہا:

وَمَنْزِلَةٌ فِی دَارِ صِدْقٍ وَ غِبْطَةٍ ۔۔۔ وَمَا اقْتَالَ مِن حُکْمٍ عَلَیَّ طَبِیبُ

صدق اور رشک کے گھر میں مقام و مرتبہ ہے طبیب نے میرے بارے میں اپنی مرضی سے حکم نہیں لگایا۔

پہلا ام انکار کے لیے اور دوسرا ام ایجاب کے لیے ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح وہ کہتے ہیں بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۞ بلکہ وہ انکار کرتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے ایمان نہیں لاتے۔

**فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ** انہیں چاہیے کہ اپنی جانب سے ایسا کلام لے آئیں جو قرآن کے مشابہ ہو۔

**اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ** ۞ اگر وہ اس بات میں سچے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر پیش کی ہے۔ حجدری نے اسے فلیأتوا بحدیث مثلہ پڑھا ہے یعنی حدیث کا لفظ مضاف ہے مثلہ میں ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے وہ حدیث جس سے مراد قرآن ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا ہے کیونکہ اسی کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا ہے۔ ایک جماعت کی قرأت کے مطابق ھاء قرآن کے لیے ہے

**اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۞ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ۞ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜیْطِرُوْنَ ۞ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ ۚ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۞ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَ لَكُمُ الْبَنُوْنَ ۞ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۞ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ۞ اَمْ یُرِیْدُوْنَ كَیْدًا ؕ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِیْدُوْنَ ۞ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۞**

”کیا وہ پیدا ہو گئے بغیر کسی (خالق) کے یا خود ہی (اپنے) خالق ہیں؟ کیا انہوں نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ یقین سے محروم ہیں۔ کیا ان کے قبضہ میں ہیں آپ کے رب کے خزانے یا انہوں نے ہر چیز پر تسلط جما لیا ہے۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس پر چڑھ کر) وہ (خفیہ باتیں) سن لیا کرتے تھے (اگر ایسا ہے) تو لے آئے ان میں سے سننے والا روشن دلیل۔ (ظالمو!) کیا الله تعالیٰ کے لیے نری بیٹیاں اور تمہارے لیے نرے بیٹے (اے حبیب!) کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں پس وہ چٹی کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے پس وہ لکھتے جاتے ہیں کیا وہ (رسول خدا سے) کوئی فریب کرنا چاہتے ہیں تو وہ کافر خود ہی اپنے فریب کا شکار ہو جائیں گے۔ کیا ان کا کوئی اور خدا ہے الله کے سوا، پاک

ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں''۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ، اَمْ میں میم زائد ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اخلقوا من غیر شی ءحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا ان کے رب کے علاوہ نے انہیں پیدا کیا اور انہیں مقدر کیا؟ ایک قول یہ کیا گیا: کیا ماں اور باپ کے علاوہ میں انہیں پیدا کیا گیا تو وہ جماد کی طرح ہیں جو عقل نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ کی ان کے خلاف کوئی دلیل قائم نہیں وہ ایسے نہیں کیا انہیں نطفہ، علقہ اور مضغہ سے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور انہیں بے مقصد چھوڑ دیا گیا ہے مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ کا معنی ہے کسی شے کے لیے بھی نہیں۔ یہاں من، لام کے معنی میں ہے۔

اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ۞ یا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں مانیں گے جب کہ وہ یہ نہیں کہتے۔ جب وہ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کا ان کے علاوہ کوئی خالق نہیں تو کون سی ایسی چیز ہے جو انہیں روکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے انکار کریں اور بتوں کی عبادت کا اقرار کریں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کریں تو ان کا اقرار یہ بھی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے۔

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ معاملہ اس طرح نہیں کیونکہ انہوں نے کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کیا۔ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ۞ بلکہ وہ حق کا یقین نہیں رکھتے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ یعنی ان کے پاس ان کے رب کے خزانے ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہیں اور اس کے امر سے اعراض کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خزائن سے مراد بارش اور رزق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رحمت کی چابیاں۔ عکرمہ نے کہا: مراد رسالت ہے جہاں وہ چاہتے ہیں اسے رکھتے ہیں (1)۔ خزائن سے مثال بیان فرمائی ہے کیونکہ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جسے اس لیے تیار کیا جاتا ہے تاکہ مختلف قسم کے ذخائر کو جمع کیا جائے۔ سب کی مقدورات ان خزائن کی طرح ہیں جن میں ہر قسم کی جنسیں ہوتی ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

اَمْ هُمُ الْمُصَۜیْطِرُوْنَ۞ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی تسلط جمانے والے اور جبار ہیں (2)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی باطل پرست ہیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی قبضہ کرنے والے ہیں (3)۔ عطا نے کہا: وہ غالب ہیں۔ عطا نے کہا: یہ جملہ کہا جاتا ہے تسیطرت علی یعنی تو نے مجھے اپنا خادم بنالیا؛ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ صحاح میں ہے مسیطر اور مصیطر کا معنی ہے کسی شی پر تسلط جمانے والا تاکہ اس کی نگرانی کرے، اس کے احوال کو نگاہ میں رکھے اور اس کے عمل کو لکھتا رہے۔ اس کی اصل سطر ہے کیونکہ کتاب کو سطروں میں لکھا جاتا ہے جو آدمی یہ کام کرتا ہے وہ مسطر اور مسیطر ہوتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے سیطرت علینا۔ ابن بحر نے کہا: ام ھم المسیطرون وہ نگہبان ہیں یہ تسیطر الکتاب سے ماخوذ ہے یعنی جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے اسے یاد رکھتا ہے تو یہاں مسیطر وہ ہوگا جو اس کو یاد رکھتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اس میں تین لغتیں ہیں، صاد یہ عام قرأت

1۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 238 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 385 3۔ ایضاً

ہے، سین یہ ابن محیصن، حمید، مجاہد، قنبل، ہشام اور ابوحیوہ کی قرأت ہے، صاد کو زاء کا اشمام یہ حمزہ کی قرأت ہے جس طرح سورۂ فاتحہ میں الصراط میں یہ گزر چکا ہے۔

**اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ** کیا وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کیا آسمان تک بلند ہونے کے لیے ان کے پاس کوئی سیڑھی یا رسی ہے۔ **يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ** جس پر چڑھ کر وہ خبروں کو سنتے ہیں اور اس کی مدد سے علم غیب تک رسائی حاصل کرتے ہیں: جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ وہاں تک جا پہنچتے ہیں۔

**فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ** ۝ تو سننے والا واضح دلیل لے آئے کہ جس پر وہ ہیں وہ حق ہے۔ سُلَّم یہ سلالم کا واحد ہے جس پر چڑھا جاتا ہے بعض اوقات غرز کو بھی یہ نام دیا جاتا ہے؛ زہیر نے کہا:

وَمَنْ هَابَ أسبابَ المَنِيَّةِ يَلْقَها ولَوْ رَامَ أسبابَ السَّماءِ بِسُلَّمِ

جو آدمی موت کے اسباب سے ڈرتا ہے وہ انہیں مل ہی جاتا ہے اگرچہ وہ سیڑھی کے ذریعے آسمان تک کا قصد کرے۔

ابن مقبل نے کہا:

لا تُحْرِزُ المرءَ أَحْجاءُ البِلَادِ وَلَا يُبْنَى له في السَّمواتِ السَّلالِيمُ(1)

شہروں کے اطراف اس آدمی کی حفاظت نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے لیے آسمانوں میں سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں۔

احجاء کا معنی اطراف ہے جس طرح ارجاء ہے ان دونوں کا واحد حجا اور رجا ہے۔ جو الف مقصورہ کے ساتھ ہے اس شعر کو اعناء البلاد کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اعناء کا معنی بھی جوانب ہیں اس کا واحد عنو ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا: اس کا واحد عنا ہے یہ بھی الف مقصورہ کے ساتھ ہے جاءنا أعناء من النّاس ہمارے پاس لوگوں کی جماعتیں آئیں اس کا واحد عِنْوٌ ہے۔

**يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ** اس میں فی، علی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ** (طٰہٰ:71) یہاں بھی فی، علی کے معنی میں ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہاں فی، باء کے معنی میں ہے۔ زجاج نے کہا: کیا ان کے لیے بھی حضرت جبرئیل کی طرح کوئی فرشتہ ہے جو حضرت جبرئیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لاتے ہیں۔

**اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ** ۝ انہیں شرمندہ کرنے اور تنبیہ کرنے کے لیے ان کی عقلوں کو بے وقوف قرار دیا، یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہو جب کہ خود ان کے بارے میں غیرت کا مظاہرہ کرتے ہو جس کی دانش اس جیسی ہو تو اس کے بارے میں کوئی بعید نہیں کہ وہ بعث کا انکار کرے۔

**اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا** کیا آپ ان سے رسالت کی تبلیغ پر اجر طلب کرتے ہیں **فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ** ۝ تو وہ چٹی جس کا آپ ان سے مطالبہ کرتے ہیں اس کے باعث وہ مشقت میں مبتلا ہیں۔

**اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ** ۝ وہ لوگوں کے لیے غیب میں سے وہ کچھ لکھتے ہیں جس کا وہ ارادہ کرتے ہیں۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 385

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان کے پاس ایسا علم ہے جو لوگوں سے غائب ہے یہاں تک کہ انہیں علم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت، جنت، جہنم اور بعث کے بارے میں جو کچھ خبر دی ہے وہ سب باطل ہے۔ قتادہ نے کہا: جب انہوں نے کہا نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ہم اس کے بارے میں حادثات زمانہ کا انتظار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ یہاں تک کہ انہیں علم ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا وصال کب ہوگا اور ان کے معاملہ کا انجام کیا ہوگا (1)؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا ان کے پاس لوح محفوظ ہے تو اس میں جو کچھ ہے اسے وہ لکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ ہے اس کی لوگوں کو خبر دیتے ہیں (2)؟ قتبی نے کہا: یَكْتُبُوْنَ کا معنی ہے وہ حکم دیتے ہیں (3)۔ کتاب کا معنی حکم (فیصلہ) ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام: 54) یعنی تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: والذی نفسی بیدہ لأحکمن بینکم بکتاب اللہ (4) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

اَمْ یُرِیْدُوْنَ كَیْدًا یعنی وہ دار الندوہ میں تیرے بارے میں خفیہ تدبیر کا ارادہ کرتے ہیں۔

فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِیْدُوْنَ ۝ یعنی جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھ خفیہ تدبیر کی جائے گی؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: 43) اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بدر کے میدان میں قتل کیا گیا۔ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یعنی وہ الٰہ پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ کی اس امر سے پاکی بیان کیجئے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔ خلیل نے کہا: سورۂ طور میں جہاں بھی ام کا لفظ ذکر کیا گیا ہے وہ کلمہ استفہام ہے صرف عطف نہیں (5)۔

وَ اِنْ یَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝ فَذَرْهُمْ حَتّٰى یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ فِیْهِ یُصْعَقُوْنَ ۝ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ كَیْدُهُمْ شَیْئًا وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝

''اور اگر وہ دیکھ لیں آسمان کے کسی ٹکڑے کو گرتا ہوا تو یہ (احمق) کہیں گے: یہ تو بادل ہے تہ در تہ۔ پس انہیں (یونہی) چھوڑ دیجئے یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو پالیں جس میں وہ غش کھا کر گر پڑیں گے، جس روز ان کی فریب کاری ان کے کسی کام نہ آئے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی''۔

وَ اِنْ یَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا اللہ تعالیٰ نے یہ ان کے قول کے جواب میں ارشاد فرمایا: فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (الشعراء: 187) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا (الاسراء: 92) اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ سلوک کرتا تو وہ ضرور کہتے۔ سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝ یہ ایسا بادل ہے جو تہ در تہ ہے جو ہم پر آ گرا ہے یہ آسمان نہیں یہ معاند کا عمل ہے یا اس کا فعل ہے جس کو تقلید نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہو۔ مشرکوں کی دو قسمیں ہیں۔ کسف یہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 239　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 193　3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 239
4۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، حد الزنا، جلد 2، صفحہ 69　5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 239

کسفہ کی جمع ہے جس کا معنی کسی شی کا ٹکڑا ہے۔ اخفش نے کہا: جس نے کِسْفًا پڑھا ہے اس نے اسے واحد بنایا ہے جس نے اسے کِسَفًا پڑھا ہے اس نے اسے جمع کا صیغہ قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو سبحان وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

فَذَرْهُمْ یہ آیت سیف سے منسوخ ہے۔ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝ یاء کے فتحہ کے ساتھ عام قرأت ہے۔ ابن عامر اور عاصم نے یاء کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: دو لغتیں ہیں صَعِق، صَعُق جس طرح سَعِد، سَعُد ہے۔ قتادہ نے کہا: جس روز وہ مریں گے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یوم بدر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نفخہ اولی ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یوم قیامت ہے جس میں ایسا عذاب آئے گا جو ان کی عقلوں کو زائل کر دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ أصعقه الله سے یاء کے ضمہ کے ساتھ یصعقون ہے۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا یعنی دنیا میں جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خفیہ تدبیر کرتے رہے۔ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ اور نہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی مدد کی جائے گی۔ يَوْمَ کا لفظ يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝ سے بدل ہے۔

وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٤٧ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝٤٨ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝٤٩

"اور بے شک ظالموں کے لیے (ایک) عذاب (دنیا میں) اس سے پہلے بھی ہے لیکن ان میں سے اکثر (اس سے) بے خبر ہیں۔ اور آپ صبر فرمایئے اپنے رب کے حکم سے پس آپ بلاشبہ ہماری نظروں میں ہیں اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے جب کہ آپ اٹھتے ہیں اور رات کے کسی حصہ میں اس کی تسبیح کیجئے اور اس وقت بھی جب ستارے ڈوب رہے ہوتے ہیں"۔

وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یعنی جنہوں نے کفر کیا۔ عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی موت سے قبل انہیں عذاب ہوگا۔ ابن زید نے کہا: مراد دنیا کے مصائب ہیں یعنی درد، بیماریاں، آزمائشیں، مال اور اولاد کا چلا جانا۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد بھوک اور سات سال تک خشک سالی ہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد قتل ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: مراد عذاب قبر ہے؛ یہ حضرت براء بن عازب اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ دون کا معنی غیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ایسا عذاب ہے جو آخرت کے عذاب سے خفیف ہوگا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لیکن اکثر یہ نہیں جانتے کہ ان پر عذاب نازل ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے اکثر نہیں جانتے کہ ان کا ٹھکانہ کیا ہوگا۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 386    2۔ ایضاً

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کیجئے جو اس نے آپ پر رسالت کی ذمہ داریاں ڈالیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس آزمائش پر صبر کیجئے جو اس نے آپ کی قوم کی جانب سے آپ کو آزمائش میں ڈالا۔ پھر آیت سیف کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ہماری آنکھوں کے سامنے جو تم کہتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو ہم اسے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ ہم تجھے دیکھتے ہیں، تیری حفاظت کرتے ہیں۔ سب کا معنی ایک ہی ہے: اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝۳۹ (طٰہٰ) مراد میری حفاظت اور میری نگہبانی میں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝۴۸ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝۴۹

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝۴۸ حِيْنَ تَقُوْمُ کی تاویل میں اختلاف ہے۔ عون بن مالک، حضرت ابن مسعود، عطا، سعید بن جبیر، سفیان ثوری اور ابو احوص نے کہا: جب وہ اپنی مجلس سے اٹھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: سبحان الله وبحمده یا سبحانك اللهم وبحمدك۔(1) اگر مجلس اچھی ہو تو اچھی تعریف میں اضافہ کرتے ہیں اگر کوئی اور معاملہ ہو تو یہ کلمات اس کے لیے کفارہ بن جاتے ہیں، اس تاویل کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من جلس فی مجلس فکثر فیه لغطه فقال قبل أن یقوم من مجلسه سبحانك اللّهمّ وبحمدك أشهد ان لا إله إلّا أنت أستغفرك وأتوب إليكِ لاغفر له ما كان فی مجلسه ذلك۔(2) جو آدمی کسی مجلس میں بیٹھا اس میں اس کی غلطیاں بہت زیادہ ہوئیں اس نے مجلس سے اٹھنے سے قبل یہ کہا: سبحانك اللهم وبحمدك ...... وأتوب إليك تو اس مجلس میں سے اس سے جو غلطیاں ہوئیں یہ الفاظ اس کا کفارہ بن جائیں گے۔ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(3)۔ اسی بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: ہم ایک مجلس میں اٹھنے سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تسبیح سو دفعہ گنا کرتے تھے رب اغفرلی وتبْ علیّ إنك أنت التوّاب الغفور اے میرے رب! مجھے بخش دے میری توبہ قبول فرما تو تواب اور غفور ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(4)۔ محمد بن کعب، ضحاک اور ربیع نے کہا: معنی ہے جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ ضحاک نے کہا: آپ کہتے الله اکبر کبیرا والحمد لله کثیرا وسبحان الله بکرة وأصیلا۔ طبری نے کہا: یہ تعبیر حقیقت سے بہت ہی بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: حِيْنَ تَقُوْمُ تکبیر کے بعد تسبیح پر دلالت نہیں کیونکہ تکبیر قیام کے بعد ہوتی ہے اور تسبیح اس کے بعد ہوتی ہے۔ پس یہ

1۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 247
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 240
3۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، مایقول اذا قام من مجلسه، جلد 2، صفحہ 181
4۔ ایضاً

امر اس بات پر دال ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تو جس مکان سے بھی اٹھے؛ جس طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ ابو جوزاء اور حسان بن عطیہ نے کہا: معنی ہے جب تو اپنی نیند سے اٹھے۔ حسان نے کہا: تا کہ وہ اپنے عمل کا آغاز اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کرنے والا ہو۔ کلبی نے کہا: جب تو اپنے بستر سے اٹھے تو زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر یہاں تک کہ تو نماز میں داخل ہو جائے اور وہ نماز، نماز فجر ہے اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من تعارّ فی اللّیل فقال لا إله إلا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كلّ شىء قدير والحمد لله وسبحان الله والله اكبر ولا حول ولا قوة إلّا بالله۔ (1) جو رات کو اٹھا اور اس نے یہ کلمات پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ...... الا باللہ پھر کہا: اے اللہ! مجھے بخش یا کوئی دعا کی تو اس کی دعا قبول کی جائے گی۔ اگر اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔ اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تعار الرجل من اللّیل سے مراد ہے وہ آواز نکالتے ہوئے نیند سے اٹھا اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے عارّ الظلیم یعار عرارا البعض کہتے ہیں: عَرَّ الظلیم یعرعرارا مظلوم نے آواز لگائی، جس طرح وہ کہتے ہیں: زَمِر النعام یزمر زمارا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وسط میں نماز کے لیے اٹھتے تو کہتے: اللّهمّ لك الحمد أنت نور السّموات والأرض ومن فيهن ولك الحمد أنت قيّوم السّموات والأرض ومن فيهن ولك الحمد أنت ربّ السموات والأرض ومن فيهنّ أنت الحقّ وعدك الحقّ وقولك الحق ولقاءك الحقّ والجنّة حقٌّ والنارُ حقٌّ والساعة حقٌّ والنبيّون حقٌّ ومحمّد حقٌّ اللّهمّ لك أسلمت وعليك توكّلتُ وبك آمنتُ وإليك أنبت وبك خاصمت وإليك حاكمت فاغفرلى ما قدّمت وما أخّرت وأسررت وأعلنت أنت المقدّم وأنت المؤخّر لا إله إلّا أنت ولا إله غيرك۔ (2) متفق علیہ

اے اللہ! تیرے لیے حمد ہے تو آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کا نور ہے تیرے لیے حمد ہے تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کو قائم رکھنے والا ہے تیرے لیے حمد ہے تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا رب ہے تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیرا قول حق ہے، تیری ملاقات حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، قیامت حق ہے، انبیاء حق ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں اے اللہ! میری اگلی، پچھلی، مخفی اور اعلانیہ خطائیں معاف فرما دے تو ہی معبود برحق ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: جب آپ رات کے وقت اٹھتے تو اپنے چہرے سے نیند کے آثار کو دور کرتے؛ پھر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کرتے (3)۔

زید بن اسلم نے کہا: معنی ہے جب آپ ظہر کی نماز کے لیے قیلولہ کی نیند سے اٹھتے۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک قیلولہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التهجد، فضل من تعار من اللیل وصلى، جلد 1، صفحہ 155 — 2۔ ایضاً، التهجد باللیل، جلد 1، صفحہ 151

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، ربنا انك من تدخل النار، جلد 2، صفحہ 657

کی نیند کا تعلق ہے اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا یہ تو صرف رات کی نیند کے ساتھ ملحق ہوتا ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد نماز میں تسبیح ہے جب نماز کے لیے آپ اٹھتے۔ ماوردی نے کہا: اس تسبیح کے بارے میں دو قول ہیں (۱) مراد سبحان ربی العظیم ہے جو رکوع میں پڑھی جاتی ہے اور سجدہ میں سبحان ربی الأعلی کہنا ہے (۲) نماز میں یہ کلمات توجہ ہے سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا إله غيرك۔

ابن عربی نے کہا: جس نے کہا اس سے مراد نماز کی تسبیح ہے تو یہ افضل ہے۔ اس میں آثار بہت زیادہ ہیں۔ سب سے عظیم وہ ہے جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کہتے: وجهت وجهي (2) ہم نے اس کا اور اس کے غیر کا ذکر سورۃ الانعام میں کیا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے ایسی دعا سکھائیں جو میں نماز میں مانگا کروں فرمایا: کہو اللّٰھمّ إنّي ظلمت نفسي ظلما كثيرا ولا يغفر الذّنوب إلّا أنت فاغفر لي مغفرة من عندك وارحمني إنّك أنت الغفور الرحيم (3)

اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بے شمار ظلم کیے ہیں تیرے سوا کوئی گناہ بخشنے والا نہیں مجھے اپنی بارگاہ سے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما تو غفور رحیم ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ اس کے بارے میں گفتگو سورۂ ق میں مکمل گزر چکی ہے۔ جہاں تک اِدْبَارَ النُّجُوْمِ کا تعلق ہے تو حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت کو اس قول پر بطور ندا محمول کیا ہے اور اسے پانچ نمازوں کے ساتھ منسوخ قرار دیا ہے۔ ضحاک اور ابن زید سے مروی ہے وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ سے مراد صبح کی نماز ہے؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: مراد نمازوں کے آخر میں تسبیحات ہیں۔ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ کے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ساتوں قراء نے مصدر پڑھا ہے جس طرح ہم نے سورۂ ق میں بیان کیا ہے۔ سالم بن ابی جعد اور محمد بن سمیقع نے أدبار فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی کی مثل یعقوب، سلام اور ایوب سے مروی ہے یہ دُبُر اور دُبُر کی جمع ہے۔ دُبُر الامر اور دُبُر سے مراد امر کا آخر ہے۔

امام ترمذی نے محمد بن فضیل کی حدیث وہ رشدین بن کریب سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت ابن عباس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ سے مراد فجر سے پہلے دو رکعتیں اور ادبار السجود سے مراد مغرب کے بعد دو رکعتیں ہیں (4)۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے مرفوع صرف اس سند سے پہچانتے ہیں وہ سند محمد بن

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1733

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، صلوٰۃ النبی ودعاءہ باللیل، جلد 1، صفحہ 263

3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، الدعاء فی الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 936

4۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ والطور، جلد 2، صفحہ 160

فضیل، رشدین بن کریب سے، میں نے محمد بن اسماعیل سے پوچھا کہ محمد بن فضیل اور رشدین بن کریب میں سے کون زیادہ ثقہ ہے؟ فرمایا: میں ان دونوں میں سے کسی کے بارے میں یہ اقرار نہیں کرتا تاہم میرے نزدیک محمد ارجح ہے۔ کہا: میں نے اس کے بارے میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے سوال کیا؟ فرمایا: میں ان دونوں کے بارے میں امر کے ثبوت کا اقرار نہیں کرتا ان دونوں میں رشدین بن کریب زیادہ راجح ہے۔ ترمذی نے کہا: جو ابو محمد قول کرے قول تو وہی ہے میرے نزدیک رشدین بن کریب، محمد سے زیادہ راجح اور مقدم ہے۔ رشدین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ پایا اور آپ کو دیکھا۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے فرائض سے قبل دو رکعتوں کا جس قدر اہتمام کرتے اتنا اہتمام کسی نفل کا نہ کرتے تھے (1)۔ آپ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: رکعتا الفجر خیر من الدنیا و ما فیہا (2) فجر کی دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔ سورۂ طور کی تفسیر مکمل ہوئی۔ الحمدللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، استحباب رکعتی سنۃ الفجر، جلد 1، صفحہ 251

2۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰت، ما جاء فی رکعتی الفجر فی الفضل، جلد 1، صفحہ 56

# سورۃ النجم

(آیاتہا ۶۲) (۵۳ سورۃ النجم مکیۃ ۲۳) (رکوعاتہا ۳)

یہ مکی ہے، اس کی باسٹھ آیات ہیں۔

حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے نزدیک یہ تمام کی تمام مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: مگر ایک آیت مدنی ہے وہ ہے اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی آیات باسٹھ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ تمام سورت مدنی ہے جب کہ صحیح یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ یہ وہ پہلی سورت ہے جس کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں کیا۔ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا(1)۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔ حضرت عبداللہ سے یہ روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ نجم پڑھی اور اس کے لیے سجدہ کیا قوم میں سے کوئی آدمی نہ بچا مگر سب نے سجدہ کیا(2)۔ لوگوں میں سے ایک نے کنکریوں کی ایک مٹھی لی یا مٹی کی مٹھی لی اور اسے اپنے چہرے کی طرف اٹھایا اور کہا: ''مجھے یہی کافی ہے''۔ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اسے بعد میں دیکھا اسے کافر کی حیثیت میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ جس آدمی نے یہ کیا تھا اسے امیہ بن خلف کہتے۔

صحیحین میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سورۃ النجم سنائی تو آپ نے سجدہ نہ کیا(3)۔ اس بارے میں بحث سورۂ اعراف کے آخر میں گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۗ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۭ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ﴿۹﴾ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۭ﴿۱۰﴾

''قسم ہے اس (تابندہ) ستارے کی جب وہ نیچے اترا تمہارا (زندگی بھر کا) ساتھی نہ راہ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے، انہیں سکھایا ہے زبردست

1۔ صحیح بخاری، باب سجود القرآن، سجود المسلمین مع المشرکین، جلد 1، صفحہ 146

2۔ ایضاً، سجدۃ النجم، جلد 1، صفحہ 146

3۔ ایضاً، باب سجود القرآن، من قرأ السجدۃ ولم یسجد، جلد 1، صفحہ 146

قوتوں والے نے بڑے دانا نے پھر اس نے (بلندیوں کا) قصد کیا اور وہ سب سے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور قریب ہوا یہاں تک کہ صرف دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف جو وحی کی''۔

**وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: **وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى** سے مراد ہے ثریا جب فجر کے ساتھ غروب ہو جائے۔ عرب ثریا کو نجم کہتے ہیں اگرچہ تعداد میں یہ نجوم ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سات ستارے ہیں ان میں سے چھ ظاہر ہیں اور ایک مخفی ہے جس کے ساتھ لوگ اپنی نظروں کا امتحان کرتے ہیں۔ قاضی عیاض کی ''الشفا'' میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ثریا میں گیارہ ستارے دیکھا کرتے تھے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: معنی ہے قسم ہے قرآن کی جب وہ نازل ہو(1)۔ کیونکہ وہ آیات در آیات نازل ہوتا تھا؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: مراد تمام ستارے ہیں جب وہ غروب ہوں؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی قسم اٹھائی جب وہ غائب ہوں۔ لفظ واحد کے ساتھ تعبیر کرنا ممتنع نہیں اس کا معنی جمع کا ہے۔ ایک چرواہے نے کہا:

فَبَاتَتْ تَعُدُّ النَّجْمَ فِی مُسْتَحِیرَۃٍ(2)

اس نے حیرت کے عالم میں ستارے گنتے ہوئے رات گزاری۔

عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

أَحْسَنُ النَّجْمِ فِی السَّمَاءِ الثُّرَیَّا وَالثُّرَیَّا فِی الْأَرْضِ زَیْنُ النِّسَاءِ

آسمان میں سب سے خوبصورت ستارہ ثریا ہے، زمین میں ثریا، عورتوں کی زینت ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: نجم سے مراد ستارے ہیں جب قیامت کے روز وہ گریں گے(3)۔ سدی نے کہا: یہاں نجم سے مراد زہرہ ہے کیونکہ عربوں میں سے کچھ لوگ اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جن کے ساتھ شیاطین کو رجم کیا جاتا ہے اس کا سبب ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کی ولادت سے قبل ستارے ٹوٹ کر گرے اس وجہ سے بہت سے عرب ڈر گئے وہ اپنے کاہن کے پاس گئے جو نابینا تھے وہ انہیں حادثات کی خبر دیتا تھا لوگوں نے اس سے ستاروں کے ٹوٹنے کے بارے میں پوچھا: اس نے کہا: بارہ برجوں کی طرف دیکھو اگر ان میں سے کوئی ایک ٹوٹ گرے تو یہ دنیا کی تباہی کی علامت ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ٹوٹے تو دنیا میں کوئی عظیم حادثہ رونما ہوگا اس کا علم حاصل کرو۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی یہی وہ عظیم امر تھا جس کا انہیں احساس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے **وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى** کو نازل فرمایا وہ ستارہ جو گرا وہ اس نبوت کی وجہ سے تھا جو اس وقت رونما ہونے والی تھی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اس سے ایسی نباتات ہے جس کا تنا نہ ہو۔ **هَوٰى** یعنی وہ زمین پر گر گئی۔ جعفر بن محمد علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے کہا: **النَّجْمِ** سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ **اِذَا هَوٰى** جب معراج کی رات آپ آسمان سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 195 2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 51 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 82

اترے۔ حضرت عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ عتبہ بن ابی لہب جس کے عقد میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی تھی (1)۔ اس نے شام کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اس نے کہا: میں (حضرت) محمد ﷺ کے پاس جاؤں گا اور ضرور انہیں اذیت دوں گا وہ آپ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد! وہ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى اور الذی دنا فتدلی کا انکار کرنے والا ہے پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر لعاب پھینکا العیاذ باللہ۔ آپ ﷺ کی بیٹی آپ ﷺ کی طرف لوٹا دی اور اسے طلاق دے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: ''اے اللہ! اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس پر مسلط کر دے''۔ ابو طالب موجود تھے غم کی زیادتی کی وجہ سے سر جھکا لیا اور کہا: اے بھتیجے! اس دعوت نے تجھے کیا فائدہ دیا؟ عتبہ اپنے باپ کے پاس آیا اور اسے سارا واقعہ بتایا پھر وہ قافلہ شام کی طرف چلا۔ انہوں نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ایک راہب اپنے کلیسا سے ان پر جھانکا اس نے کہا: یہ علاقہ درندوں کا ہے۔ ابولہب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اے جماعت قریش! اس رات ہماری مدد کرنا۔ میں (حضرت) محمد (ﷺ) کی دعا کی وجہ سے اپنے بیٹے کے بارے میں ڈرتا ہوں۔ انہوں نے اپنے اونٹوں کو جمع کیا اور اپنے گرد بٹھا لیا اور عتبہ کا محاصرہ کر لیا۔ شیر ان کے منہ سونگھتا ہوا آیا یہاں تک کہ عتبہ پر وار کیا اور اسے قتل کر دیا؛ حضرت حسان نے یہ شعر کہا:

مَنْ يَرْجِعُ العام إلى أَهْلِهِ فَمَا أَكِيلُ السَّبْعِ بِالرَّاجِعِ

اس سال کون اپنے گھر کی طرف لوٹے گا، درندے کا کھایا ہوا واپس نہیں لوٹتا۔

نجم کا اصل معنی طلوع کرنا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: نجم السن دانت نکل آیا۔ نجم فلان ببلاد کذا فلاں نے فلاں علاقہ میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کی۔ الھوی کا معنی نازل ہونا اور گرنا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: ھوی یھوی ھویا جس طرح مضی یمضی مضیا ہے؛ شاعر نے کہا:

بَيْنَمَا نَحْنُ بِالبَلَاكِثِ فَالقَا عِ سِرَاعًا والعِيسُ تَهْوِي هُوِيًّا

اسی اثنا میں کہ ہم بلاکث اور قاع میں تیزی سے گزر رہے تھے جب کہ عمدہ اونٹ اتر رہے تھے۔

اصمعی نے کہا: ھوی، یھوی هُوِيًّا جب بلندی سے پستی کی طرف گرے اسی طرح انھوی فی السیر ہے جب وہ گزر جائے۔ ھوی اور انھوی دو لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہے، شاعر نے دونوں کو اس شعر میں جمع کر دیا ہے:

وكَمْ مَنْزِلٍ لولاىَ طِحْتَ كما هَوَى بأجرامِهِ مِنْ قُلَّةِ النِّيقِ مُنْهَوِى

کتنی ہی منزلیں ہیں اگر میں نہ ہوتا تو تو سرگرداں رہتا جس طرح پہاڑ کی چوٹی سے گرنے والی چیز نیچے گرتی ہے۔

محبت میں کہا جاتا ہے: ھوی يَهْوَى هَوًى جب وہ محبت کرے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ یہ جواب قسم ہے معنی ہے حضرت محمد ﷺ حق سے گمراہ نہ ہوئے اور نہ اس سے پھرے۔ وَمَا غَوٰى ۝ غی اشد کی ضد ہے معنی ہے گمراہ نہ ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے باطل گفتگو نہ کی۔ ایک قول یہ کیا گیا: جو طلب کیا اس میں خائب دخاسر مراد ہے۔ غی کا معنی خسارہ ہے۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 417

شاعر نے کہا:

فمن يَلْقَ خَيْرًا يَحْمَدِ النَّاسُ أَمْرَهُ ... وَمَنْ يَغْوَ لايَعْدَمْ على الغَيِّ لائِمَا(1)

جو مال پاتا ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور جو خسارہ اٹھاتا ہے تو وہ ملامت کرنے والے سے خالی نہیں ہوتا۔

مراد ہے جو اپنی طلب میں ناکام رہتا ہے لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی جائز ہے کہ آپ کو خبر دی جا رہی ہو جو وحی کے بعد ہوتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ عمومی طور پر آپ کے احوال کی خبر دی جا رہی ہو یعنی آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر کاربند رہے ہیں سورۂ شوریٰ آیت 52 میں ہم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ کے ضمن میں جو بیان کیا ہے اس اعتبار سے یہی صحیح ہے۔

**وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝**

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ قتادہ نے کہا: آپ قرآن اپنی خواہش سے بیان نہیں کرتے (2) ''یہ تو وحی ہے جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے''۔ ایک قول یہ کیا گیا: عَنِ الْهَوٰى، بالھویٰ کے معنی میں ہے؛ یہ ابو عبیدہ نے قول کیا ہے؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ (الفرقان) یہاں بھی به، عنه کے معنی میں ہے۔ نحاس نے کہا: قتادہ کا قول اولیٰ ہے اور عن اپنے معنی میں ہے یعنی آپ کا نطق (بولنا) اپنی رائے سے نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد ہے اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جو علماء امور میں رسول اللہ ﷺ سے اجتہاد کو جائز نہیں سمجھتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اس آیت میں یہ دلالت بھی موجود ہے کہ سنت عمل میں نازل شدہ وحی کی طرح ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں اس کے بارے میں حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔ سجستانی نے کہا: اگر تو چاہے تو اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ کو مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ سے بدل دو۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ ان خفیفہ ما کا بدل نہیں ہوتا اس پر دلیل یہ ہے کہ تو یہ نہیں کہتا: واللہ ما قمت إن أنا لقاعد۔

**عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝** حضرت حسن بصری کے علاوہ تمام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ شَدِيْدُ الْقُوٰى سے مراد حضرت جبریل امین ہیں (3) کیونکہ ان کی رائے ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے (4)۔ حضرت حسن بصری کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے فرمان ذُوْ مِرَّةٍ پر کلام مکمل ہو جائے گی۔ اس کا معنی ہے قوت والا اور قوت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اس کا اصل معنی اس کو مضبوطی سے بٹنا ہے گویا اسے لگاتار بٹا گیا یہاں تک کہ اس کا کھولنا مشکل ہو گیا۔ پھر فرمایا فَاسْتَوٰى اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی عرش پر متمکن ہوا؛ یہ معنی حضرت حسن بصری سے مروی ہے۔ ربیع بن انس اور فراء نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 390
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 391
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 196
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 82

فَاسْتَوٰی ﴿۶﴾ وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ﴿۷﴾ یعنی حضرت جبریل اور حضرت محمد ﷺ متمکن ہوئے۔ یہ اس صورت کے بعد ہوگا جب ضمیر مرفوع پر ھو سے عطف کیا جائے اکثر عرب جب اس قسم کے عطف کا ارادہ کرتے ہیں تو معطوف علیہ کی ضمیر کو ظاہر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: استوی ھو و فلان وہ بہت کم ہی یہ کہتے ہیں استوی و فلان؛ فراء نے یہ شعر پڑھا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ النَّبْعَ يَصْلُبُ عُودُهُ ولا يَسْتَوِي و الخِرْوَعُ المتقَصِّفُ(1)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ نبع کے درخت کی لکڑی سخت ہوتی ہے وہ اور ٹوٹی ہوئی خروع (جڑی بوٹی) برابر نہیں ہوتی۔

اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ (النمل: 67) معنی ہے کیا اس وقت جب ہم اور ہمارے آباء مٹی ہو جائیں گے۔ آیت کا معنی ہے حضرت جبریل امین اور حضرت محمد ﷺ معراج کی رات افق اعلی میں متمکن ہوئے۔ اس نے ضمیر پر عطف کو جائز قرار دیا ہے تا کہ تکرار نہ ہو۔ زجاج نے اس کا انکار کیا ہے مگر ضرورت شعری میں جائز کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جبریل امین افق اعلی پر متمکن ہوئے۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔ جب استواء کرنے والے حضرت جبریل امین ہیں تو ذُوْ مِرَّةٍ کا معنی ہوگا وہ اچھی گفتگو کرنے والے ہیں (2)؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اچھی طویل صورت والے ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے صحیح جسم والے روز آفات سے محفوظ ہیں، اسی معنی میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مِرَّةٍ سَوِيٍّ۔ (4)

غنی اور صحیح اعضاء والے قوی آدمی کے لیے صدقہ لینا حلال نہیں۔ امراء القیس نے کہا:

كُنتُ فيهم أبدًا ذاحِيلة مُحْكَمَ المِرَّةِ مأمُونَ العُقَد

میں ان میں ہمیشہ تدبیر والا رہا ہوں مضبوط اعضاء والا اور محفوظ وعدوں والا۔

یہ قول کیا گیا ہے: ذُوْ مِرَّةٍ قوت والا۔ کلبی نے کہا: حضرت جبریل امین کی قوت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے قوم لوط کے شہر کو پست ترین زمین سے اکھیڑا اسے اپنے ایک پر، پر اٹھایا یہاں تک آسمان تک لے گئے یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے کتوں کی آواز اور مرغوں کی چیخ کو سنا پھر انہیں الٹا دیا، ان کی قوت کا مظہر یہ بھی ہے کہ انہوں نے ابلیس کو ارض مقدسہ کی ایک گھاٹی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اپنے ایک پر سے اسے ہوا دی اور اسے ہند کے دور دراز پہاڑ میں پھینک دیا، ان کی قوت کا انداز یہ بھی ہے قوم ثمود میں چیخ ماری جن کی تعداد بہت زیادہ تھی تو صبح کے وقت وہ سب اوندھے منہ گرے، مرے، پڑے تھے، ان کی قوت کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ وہ انبیاء پر آسمان سے اترتے پھر اس کی طرف چڑھتے اور پلک جھپکنے کی دیر نہ لگتی۔ قطرب نے کہا: عرب ہر ایسے شخص کے بارے میں ذُوْ مِرَّةٍ کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو عظیم رائے اور اعلی عقل رکھتا ہو۔ شاعر نے کہا:

قد كنتُ قبلَ لِقائِكُمْ ذَامِرَّةٍ عندی لِكُلِّ مُخاصِمٍ مِيزَانُهُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 197 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 242 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، من یعطی من الصدقة وحد الغنی، جلد 1، صفحہ 231

تمہاری ملاقات سے پہلے میں دانشمند تھا میرے پاس ہر جھگڑا کرنے والے کے لیے ترازو تھا۔

اس کی عظیم رائے اور اعلیٰ دانش سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کی طرف وحی پر انہیں امین بنایا۔ جوہری نے کہا: مرۃ چار طبائع میں سے ایک ہے۔ مرۃ کا معنی قوت اور عقل کی پختگی ہے رجل مریر ایسا آدمی جو قوی ہو اور دانشمند ہو۔ شاعر نے کہا:

تَرَی الرَّجُلَ النَّحِیفَ فتزدریہ　وَحَشْوُ ثِیَابِہٖ اَسَدٌ مَرِیْرٌ

تو کمزور آدمی کو دیکھتا ہے تو تو اسے بے عزت کر دیتا ہے جب کہ اس کے کپڑوں کے اندر قوی شیر ہے۔

مجاہد اور قتادہ نے کہا: ذُوْ مِرَّۃٍ کا معنی ہے قوت والا (1)؛ اس معنی میں خفاف بن ندبہ کا قول ہے:

اِنِّی امرؤٌ ذو مِرَّۃٍ فاستبقِنِی (2)

میں ایسا آدمی ہوں جو بڑا قوی ہے تو مجھے باقی رکھ۔

قوت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور مخلوق کی صفات میں سے بھی ہے۔ فَاسْتَوٰی اس کا فاعل حضرت جبریل امین ہیں جس طرح ہم نے بیان کیا ہے یعنی آسمان میں وہ مکان کی طرف بلند ہوئے بعد اس کے کہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم پہنچایا؛ یہ سعید بن مسیب اور ابن جبیر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ اس صورت میں کھڑے ہوئے جس صورت پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا، کیونکہ وہ نبی کریم کے پاس انسانوں کی صورت میں آتے تھے جس طرح انبیاء کے پاس انسانی صورت میں آتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے سوال کیا کہ وہ اپنی وہ صورت دکھائیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے تو حضرت جبریل امین نے دو دفعہ آپ کو اپنی صورت دکھائی ایک دفعہ زمین میں اور ایک دفعہ آسمان میں۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے وہ افق اعلیٰ میں صورت دکھائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں تھے جبرئیل امین نے مشرق سے طلوع کیا تو مغرب تک زمین کو بھر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہے تو حضرت جبرئیل امین انسانوں کی صورت میں آپ کے پاس آئے انہیں سینہ سے لگایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ سے غبار صاف کرنے لگے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو افاقہ ہوا، فرمایا: ''اے جبرئیل امین! میں یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس صورت پر پیدا کیا ہے'' (3)۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اپنے پروں میں سے صرف دو پر پھیلائے ہیں میرے چھ سو پر ہیں ہر ایک پر کی وسعت مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔ فرمایا: ''یہ تو بہت بڑی چیز ہے''۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق پیدا کی ہے میری حیثیت اس کے مقابلہ میں بڑی چھوٹی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل کو پیدا فرمایا ہے اس کے چھ سو پر ہیں اس کا ہر ایک پر اتنا بڑا ہے جتنے بڑے میرے سب پر ہیں۔ بعض اوقات وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ چھوٹی چڑیا کے برابر ہو جاتا ہے؛ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝ (التکویر) جہاں تک آسمان میں دیکھنے کا تعلق ہے تو آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اس صورت پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 391　2۔ ایضاً　3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 242

کے علاوہ کسی نبی نے نہیں دیکھا۔

ایک تیسرا قول بھی ہے کہ قرآن آپ کے سینہ میں قرار پکڑ گیا۔ اس تعبیر کی دو صورتیں ہیں (۱) حضرت جبرئیل امین کے سینہ میں وہ قرار پکڑ گیا جب وہ اسے لے کر اترے (۲) حضرت محمد ﷺ کے سینہ میں ثبت ہو گیا جب یہ آپ ﷺ پر نازل ہوا۔

ایک چوتھا قول بھی ہے: معنی ہے حضرت محمد ﷺ نے اعتدال کی راہ اپنائی۔ اس تعبیر کی دو صورتیں ہیں (۱) اپنی قوت میں معتدل ہوئے (۲) اپنی رسالت میں کامل ہوئے؛ ماوردی نے ان دونوں کا ذکر کیا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: پہلی صورت میں کلام کی تکمیل ذُوْ مِرَّةٍ پر ہوگی اور دوسری صورت میں شَدِیْدُ الْقُوٰی پر تکمیل ہوگی۔

ایک پانچواں قول بھی ہے: اس کا معنی ہے بلند ہونا۔ اس تعبیر کی صورت میں دو وجہیں ہیں۔

(۱) جبرئیل امین اپنے مکان کی طرف بلند ہوئے جس طرح ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ معراج کے ساتھ بلند ہوئے۔

چھٹا قول ہے: اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہوا؛ یہ حضرت حسن بصری کے قول کے مطابق ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؀** یہ جملہ حال ہے معنی ہے فاستوی عالیا یعنی حضرت جبرئیل امین اپنی صورت پر بلند ہوتے ہوئے کھڑے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اس سے قبل انہیں نہیں دیکھا تھا نبی کریم ﷺ نے اس کا مطالبہ کیا تھا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ افق سے مراد آسمان کی جانب ہے اس کی جمع آفاق ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے سورج آتا ہے (2)؛ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے کہا جاتا ہے اُفُق و اُفْق مثل عُسُر و عُسْر۔ حم سجدہ میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ فرس افق عمدہ گھوڑا۔ مونث بھی اسی طرح ہے؛ شاعر نے کہا:

أرجّلُ لِمَّتِي وَ أجُرُّ ذَيْلِي وتَحْمِلُ شِكَّتِي أُفُقٌ كُمَيْتُ

میں اپنی مینڈھیوں میں کنگھی کرتا ہوں اور اپنے دامن کو گھسیٹتا ہوں اور میرے اسلحہ کو عمدہ بھورا گھوڑا اٹھائے ہوئے ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: ھو ضمیر سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں یعنی لیلۃ المعراج کو آپ افق مبین پر تھے۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے استوی ھو و فلان، یہ نہیں کہا جاتا: استوی و فلان۔ مگر ضرورت شعری میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بلند ہوئے اور جبرئیل امین اپنی اصل صورت میں افق اعلی پر تھے کیونکہ جب وہ وحی لے کر اترتے تو نبی کریم ﷺ کے لیے انسانی صورت اختیار کرتے نبی کریم ﷺ نے یہ پسند کیا کہ اسے حقیقی صورت میں دیکھیں تو جبرئیل امین افق مشرق سے ظاہر ہوئے اور افق کو بھر دیا۔

**ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ؀** یعنی افق اعلی میں ظاہر ہونے کے بعد حضرت جبرئیل امین زمین کے قریب ہوئے **فَتَدَلّٰی** یعنی وحی کے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 392
2۔ ایضاً

ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے مطلب یہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت کو دیکھا جو دیکھا اور اس وجہ سے آپ خوفزدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو آدمی کی صورت میں لوٹا دیا جب وہ وحی کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے یہی اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ کا مقصود ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کی طرف وحی کی اور جبرئیل امین قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ کے مقام پر فائز تھے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، قتادہ اور ربیع وغیرہ کا نقطہ نظر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ کا مفہوم یہ ہے اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا۔ حضرت انس بن مالک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل روایت نقل کی ہے۔ معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم قریب ہوا۔ التدلی کا اصل معنی ہے کسی چیز کی طرف اترنا یہاں تک کہ اس کے قریب ہو جائے تو اسے قرب کی جگہ رکھا گیا ہے؛ لبید نے کہا

فَتَدَلَّيْتُ عليه قافِلًا　　میں لوٹتے ہوئے اس پر اترا۔

فراء اس طرف گیا ہے کہ فَتَدَلّٰى میں فاء واؤ کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہے پھر جبرئیل امین علیہ السلام نیچے اترے اور قریب ہوئے لیکن یہ جائز ہوتا ہے جب دو فعلوں کا معنی ایک ہو یا ایک کی طرح ہو تو جس کو چاہو اسے پہلے رکھ لو۔ تو کہہ سکتا ہے: فدنا فقرب اور قرب فدنا۔ شتمنی فاساء اور اساء فشتمنی کیونکہ گالی دینا اور برا سلوک کرنا ایک ہی معنی میں ہے؛ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے معنی ہے چاند پھٹ گیا اور قیامت قریب آ گئی۔ جرجانی نے کہا: کلام میں تقدیر و تاخیر ہے یعنی تدلی فدنا کیونکہ نیچے اترنا قریب ہونے کا سبب ہے۔ ابن انباری نے کہا: یعنی پھر جبرئیل امین آسمان سے اترے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معراج کی رات رفرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اترا آپ اس پر بیٹھے پھر اسے بلند کیا گیا تو آپ اپنے رب کے قریب ہو گئے۔ اس کا ذکر ابھی آئے گا۔

جس نے یہ کہا معنی ہے جبرئیل امین بلند ہوئے جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم افق اعلیٰ پر تھے وہ ضرور کہے گا پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے قریب ہوئے (2)۔ یہ کرامت کا قرب ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ ریز ہو گئے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ قشیری نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے تدلی اصل میں تدلل تھا جس طرح تیرا یہ قول ہے تظنی اصل میں تظنن ہے یہ بعید ہے کیونکہ دلال عبودیت کی صفت میں پسندیدہ نہیں۔

**فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝** یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے یا جبرئیل امین سے دو عربی کمانوں کے مقدار پر تھے؛ یہ حضرت ابن عباس، عطا اور فراء کا نقطہ نظر ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تو یہ سوال کرے فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ کی تقدیر کیسے درست ہوگی (3)؟ میں کہوں گا: اس کی تقدیر یہ ہوگی فکان مقدار مسافة قربه مثل قاب قوسین درمیان سے ان

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 84　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 243　　3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 420

مضافوں کو حذف کر دیا گیا ہے؛ جس طرح ابو علی نے اپنے قول میں کہا:

وَقَدْ جَعَلَتْنِي مِن حَذِيمَةَ إِصْبَعَا

اس نے مجھے حذیمہ سے ایک انگلی برابر مسافت پر کر چھوڑا۔ یہ بھی اصل میں ذا مقدار مسافة اصبع تھا۔

أو ادنیٰ یعنی تمہارے اندازے کے مطابق؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے أو یزیدون۔ صحاح میں ہے: تو کہتا ہے بینهما قاب قوسین، قیب قوس، قاد قوس، قید قوس یعنی کمان کے برابر۔ زید بن علی نے اسے قاد پڑھا ہے اسے قید اور قد بھی پڑھا گیا ہے؛ یہ زمخشری نے ذکر کیا ہے۔

قاب سے مراد کمان کے قبضہ سے اس کے ایک سرے تک کا فاصلہ ہے ہر قوس کے دوسرے ہوتے ہیں۔ بعض نے اللہ تعالیٰ کے فرمان قَابَ قَوْسَیْنِ کے بارے میں فرمایا: اصل میں ارادہ کیا تھا قابی قوس تو اس میں قلب کا قاعدہ جاری کر دیا۔ حدیث طیبہ میں ہے ولَقابُ قوسِ أحدِکم من الجنة و موضع قِدّہ خیرٌ من الدنیا و ما فیها(1) تم میں سے کسی ایک کے لیے جنت میں سے قوس کے قبضہ سے کنارے تک کی جگہ اور چھڑی کے برابر کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ قد کا معنی سوط ہے۔

صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں کمان کے قبضہ سے اس کے کنارے تک کی جگہ دنیا و فیہا سے بہتر ہے(2)'' یہاں کمان کے ساتھ اسے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ یہ مختلف نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

قاضی عیاض نے کہا: یہ بات ذہن نشین کر لو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے رب سے جو قرب ہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی سے جو قرب ہے یہ کوئی مکان کا قرب اور مسافت کا قرب نہیں اس سے مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت، مرتبہ کی بلندی، انوار معرفت کے اشراق، اس کے غیب اور قدرت کے اسرار کا مشاہدہ کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کریم کے قرب کا مطلب ہے احسان کرنا، انس عطا کرنا، معاملات کو وسیع کر دینا اور عزتیں عطا کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: ینزل ربنا إلی سماءِ الدنیا(3) کی تاویل ایک صورت میں یہ ہوگی۔ وہ عرضداشت کو قبول فرماتا ہے اور احسان فرماتا ہے۔ قاضی عیاض نے کہا: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى جس نے ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا ہے حضرت جبرئیل امین کی طرف نہیں لوٹایا تو یہ انتہائی قرب، لطف محل، ایضاح معرفت، حقیقت محمد یہ پر نگاہ رکھنا، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رغبت کو پورا کرنا، مقاصد کو شرف قبولیت سے نوازنا، شفقت کا اظہار کرنا اور اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرنا ہے۔ اس بارے میں وہی تاویل کی جاسکتی ہے جو تاویل سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں کی جاسکتی ہے: من تقرب مني شبرًا تقربتُ منه ذراعا و من أتاني یمشي أتیته مهرولة(4) یہاں اجابت و قبول کا قرب ہے احسان اور آرزو کو جلدی پورا کرنا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، الغدوة و الروحة فی سبیل الله، جلد 1، صفحہ 392

2۔ صحیح ترمذی، لفضائل الجهاد، ماجاء فی فضل الغدو و الرواح فی سبیل الله، جلد 1، صفحہ 198

3۔ صحیح بخاری، کتاب التهجد، الدعاء و الصلوٰة من آخر اللیل، جلد 1، صفحہ 153

4۔ تاریخ دمشق الکبیر، جلد 4، صفحہ 288

ایک قول یہ کیا گیا ہے: پھر جبرئیل امین اپنے رب کے قریب ہوئے اور وہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے مقام پر تھے؛ یہ مجاہد کا قول ہے؛ اس پر ایک حدیث بھی دلالت کرتی ہے: إنّ أقرب الملائكة من الله جبريل عليه السلام فرشتوں میں سے جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب رکھتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: او، واؤ کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی قاب قوسين و ادنی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: او، بل کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی قاب قوسين بل أدنی۔

سعید بن مسیب نے کہا: قاب سے مراد عربی کمان کا سرا ہے جس پر دھاگا باندھا جاتا ہے اور کمان اٹھانے والا جس کے ذریعے اپنے کندھے پر لٹکاتا ہے ہر قوس کا ایک قاب ہوتا ہے یہ خبر دی ہے کہ حضرت جبرئیل امین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے قریب ہوئے جتنا قاب قوسین کا قرب ہوا کرتا ہے۔

سعید بن جبیر، عطا، ابواسحاق، ابووائل، شقیق بن سلمہ نے کہا: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ سے مراد ہے دو ہاتھ کا فاصلہ تھا (1)۔ قوس سے مراد ہاتھ ہوا کرتا ہے جس کے ساتھ ہر شے کی پیمائش کی جاتی ہے؛ یہ بعض حجازیوں کی لغت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ازد شنوءہ کی لغت ہے۔ کسائی نے کہا: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی کا معنی ہے ایک قوس جس طرح شاعر کے قول میں تثنیہ واحد کے معنی میں ہے۔

ومَهْمَهَيْنِ　قَذَفَيْنِ　مَرْتَيْنِ　قَطَعْتُهُ بِالسَّمْتِ لا بِالسَّمْتَيْنِ

یہاں مهمهین سے مراد ایک مهمہا ہے۔ قوس کا لفظ مؤنث و مذکر دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے جس نے اس کو مؤنث قرار دیا ہے اس نے اس کی تصغیر قویسہ کہی ہے جس نے اسے مذکر قرار دیا ہے اس نے اس کی تصغیر قویس کہی ہے۔ مثال اس کی یہ ہے ھو من خیرِ قُوَیْسٍ سَهْمًا اس کی جمع قِسِی، قُسِیّ، أقواس اور قِیاس آتی ہے؛ ابوعبیدہ نے یہ شعر پڑھا:

ووَتَّرَ الأَسَاوِرُ القِيَاسَا

''محل استدلال القیاسا ہے''۔

قوس سے مراد برتن میں باقی ماندہ کھجوریں ہیں۔ قوس سے مراد آسمان کا برج بھی ہے۔ جہاں تک قوس کا تعلق ہے اس سے مراد راہب کی عبادت گاہ ہے؛ شاعر نے ایک عورت کا ذکر کیا:

لا تَسْتَفْتِنَنِّي وذَا المِسْحَيْنِ في القَوْسِ

محل استدلال القَوْس ہے۔

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ جو وحی بندے کی طرف کی گئی اس کی عظمت شان کا اظہار ہے۔ وحی کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے مراد جلدی سے کوئی چیز پھینکنا اور عطا کرنا ہے؛ اسی سے الوَحَاء، الوَحَاء ہے معنی ہے جلدی کرو، جلدی کرو۔ معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 244

جبرئیل امین کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جبرئیل امین نے الله تعالیٰ کے بندے حضرت محمد ﷺ کی طرف وحی کی جو اس کے رب نے اس کی طرف وحی کی تھی (1)؛ یہ قول ربیع، حسن بصری، ابن زید اور قتادہ نے کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: الله تعالیٰ نے جبرئیل امین کی طرف وحی کی اور جبرئیل امین نے حضرت محمد ﷺ کی طرف وحی کی (2)۔ پھر کہا گیا: یہ معنی کیا مبہم ہے؟ ہم اس پر مطلع نہیں ہو سکتے اجمالی طور پر اس پر ایمان لانے کے ہم پابند ہیں یا یہ معلوم اور مفسر ہے اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ دوسرا قول سعید بن جبیر کا ہے کہا: الله تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی طرف وحی کی ''کیا میں نے تجھے یتیم نہیں پایا تو میں نے تجھے پناہ دی، کیا میں نے تجھے اپنی محبت میں وارفتہ نہیں پایا تو اپنے عرفان سے نوازا، کیا تجھے عیال دار نہیں پایا تو میں نے تجھے غنی کر دیا''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الله تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اے محمد! جب تک تو جنت میں داخل نہ ہو جنت انبیاء پر حرام ہے اور جب تک تیری امت جنت میں داخل نہ ہو جنت امتوں پر حرام ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿١١﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

''نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ نے) کیا تم جھگڑتے ہو ان سے اس پر جو انہوں نے دیکھا اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کے پاس ہی جنت الماوی ہے جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا نہ درماندہ ہوئی چشم (مصطفیٰ) اور نہ (حد ادب سے) آگے بڑھی یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿١١﴾ یعنی حضرت محمد ﷺ کے دل نے معراج کی رات نہیں جھٹلایا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ الله تعالیٰ نے آپ کی بصر آپ کے دل میں رکھی (3) یہاں تک کہ آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا اور الله تعالیٰ نے اسے رؤیت بنا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آنکھ سے حقیقی رؤیت تھی۔ پہلا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دل سے اپنے رب کا دیدار کیا (4)؛ یہ حضرت ابوذر اور صحابہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ دوسرا قول حضرت انس اور جماعت کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے فرمایا: کیا تم تعجب کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام اور حضرت محمد ﷺ کے لیے دیدار ہو (5)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے انہوں نے کہا: جہاں تک ہم بنی ہاشم کا تعلق ہے تو ہم کہتے ہیں حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کا دیدار دو دفعہ کیا ہے۔ یہ گفتگو سورۂ انعام میں الله تعالیٰ کے فرمان لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (انعام: 103) کے معنی میں گزر چکی ہے۔ محمد بن کعب سے مروی ہے کہ ہم نے کہا: یا رسول الله ﷺ کیا آپ نے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 84 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 393 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 244
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، معنی قول الله تعالیٰ ولقد راٰہ نزلۃ اخرٰی، جلد 1، صفحہ 98 5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 245

اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ فرمایا: میں نے اپنے دل سے دو دفعہ دیکھا ہے پھر پڑھا مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝

ایک تیسرا قول بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کو دیکھا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے۔ ابو العالیہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھا گیا: کیا آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ فرمایا: ''میں نے ایک دریا دیکھا اور دریا کے آگے ایک حجاب دیکھا اور حجاب کے پیچھے ایک نور دیکھا اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں دیکھا'' (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا تھا (2)'' معنی ہے نور مجھ پر غالب آ گیا اور مجھ پر اس میں سے ایسی چیز غالب آ گئی جس نے مجھے اس کے دیدار سے روک دیا۔ اس پر ایک روایت بھی دلالت کرتی ہے۔ رایت نورا (3) میں نے نور دیکھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین کو ان کی صورت میں دو دفعہ دیکھا (4)۔

ہشام نے ابن عامر سے اور اہل شام نے ما کذب تشدید کی صورت میں پڑھا ہے۔ معنی ہے حضرت محمد ﷺ کے دل نے اس چیز کو نہ جھٹلایا جسے اس رات آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس کی تصدیق کی۔ ما اس کا مفعول ہے کوئی حرف مقدر نہیں کیونکہ جب یہ فعل مشدد ہو تو حرف کے بغیر متعدی ہوتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما، الذی کے معنی میں ہو ضمیر عائد محذوف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے ساتھ مل کر یہ معبود کے معنی میں ہو ضمیر عائد محذوف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے ساتھ مل کر یہ مصدر کے حکم میں ہو۔ باقی قراء نے اسے مخفف پڑھا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی ما کذب فؤاد محمد فیما رأی تو حرف صفت کو گرا دیا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

لوكنتِ صادقة الذی حدثتِنی لنجوتِ مَنْجَا الحارثِ بنِ هِشامِ

اگر تو اس بات میں سچی ہوتی جو تو نے مجھ سے بات کی تو تو حارث بن ہشام کے نجات پانے کی طرح نجات پا جاتی۔

یہ اصل میں فی الذی حدثتنی تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے ساتھ مل کر مصدر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ الذی کے معنی میں ہو، یعنی حضرت محمد ﷺ نے جو دیکھا آپ کے دل نے اس کو نہ جھٹلایا۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ حمزہ اور کسائی نے أفتمرونہ تاء کے فتحہ اور الف کے بغیر پڑھا ہے معنی ہے کیا تم انکار کرتے ہو۔ ابو عبید نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: لم یماروہ وانما حجدوہ یہ جملہ کہا جاتا ہے: مراہ حقہ یعنی اس کے حق کا انکار کر دیا (5)۔ مریتہ أنا؛ شاعر نے کہا:

لئن هجرت أخا صدقٍ و مَكْرُمَةٍ لقد مَرَيْتَ اخا ما كان يَمْرِيكَا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 394
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، قولہ علیہ السلام نور انی اراہ، جلد 1، صفحہ 99
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ والنجم، جلد 2، صفحہ 720
5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 246

تو نے سچے اور عزت والے شخص کو چھوڑ دیا ہے تو تو نے اس بھائی کا انکار کیا ہے جو تیرا انکار نہیں کرتا تھا۔

یعنی تو نے اس کا انکار کیا۔ مبرد نے کہا: مراہ عن حقه وعلی حقه جب اس کا حق اس سے روک لے اور اس کو اس سے دور کر دے۔ علی، عن کے معنی میں ہے اس کی مثال بنی کعب بن ربیعہ کا قول ہے:۔ رضی الله علیك یعنی رضی عنك اعرج اور مجاہد نے پڑھا افتمرونه تاء مضموم ہے اور الف نہیں یہ أمریت سے مشتق ہے یعنی تم شک کرتے ہو۔ باقی قراء نے أفتمارونه پڑھا ہے یعنی کیا تم جھگڑا کرتے ہو کہ رسول الله نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے۔ دونوں معنی ایک دوسرے میں داخل ہیں کیونکہ ان کا مجادلہ انکار کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جحود (انکار) تو ان کی جانب سے دائمی تھا یہ تازہ جھگڑا تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لیے بیت المقدس کی کیفیت بیان کرو اور ہمارے اس قافلے کے بارے میں بتاؤ جو شام کے راستہ میں ہے۔ جس طرح پہلے بات گزری ہے۔

وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ نَزْلَةً یہ مصدر ہے حال کی جگہ واقع ہے گویا فرمایا: لقد راہ نازلا نزلة أخری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے دل سے اپنے رب کو دیکھا۔ امام مسلم نے ابو العالیہ سے روایت نقل کی ہے۔ فرمایا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾، وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ فرمایا: اپنے دل سے دو دفعہ دیکھا(1)۔ الله تعالیٰ کا فرمان نَزْلَةً اُخْرٰى حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کئی دفعہ اوپر اور نیچے آنا ہوا جس طرح نمازیں فرض ہوئیں۔ ہر دفعہ کے عروج کے ساتھ نزول بھی ہوا۔ اس تعبیر کی بنا پر الله تعالیٰ کا فرمان عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ سے مراد ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ اور ان میں سے بعض اترنے کی جگہوں میں تھے۔

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے کہا: الله تعالیٰ کے فرمان وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ سے مراد حضرت جبرئیل امین ہیں (2)۔ یہ صحیح مسلم میں بھی ثابت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے افق اعلیٰ میں جبریل امین کو دیکھا جس کے سو پر تھے جس کے پروں سے موتی اور یاقوت گر رہے تھے'' اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾، عِنْدَ یہ راہ کا صلہ ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ سدرۃ بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہ چھٹے آسمان میں ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ ساتویں آسمان میں ہے۔ اس بارے میں حدیث صحیح مسلم میں ہے۔ پہلی روایت وہ ہے جسے مرہ نے حضرت عبد الله سے نقل کیا ہے کہ جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے یہ چھٹے آسمان میں ہے۔ زمین سے جو چیز بلندی کی طرف جاتی ہے اس پر اس کی انتہاء ہو جاتی ہے تو اس سے قبض کر لیا جاتا ہے جو اوپر سے چیز نیچے آتی ہے اس کا اترنا یہاں تک ہوتا ہے پھر اسے قبض کر لیا جاتا ہے۔

اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى ﴿۱۶﴾ کہا: یہ سونے کا ایک بستر ہے۔ کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔ پانچ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، معنی قول الله تعالی ولقد راہ نزلة أخری، جلد 1 صفحہ 98

2۔ تفسیر مجاہد، صفحہ 273، حدیث 1676

نمازیں، سورۂ بقرہ کی آخری آیات دی گئیں، حضور ﷺ کی امت میں سے جس نے شرک نہیں کیا اسکے گناہ بخش دیئے گئے۔

دوسری حدیث وہ ہے جسے قتادہ نے حضرت انس سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب ساتویں آسمان میں سدرۃ المنتہیٰ تک مجھے بلند کیا گیا جس کے بیر ہجر کے مٹکوں کی طرح ہیں اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے اس کی جڑ سے دو ظاہر دریا نکلتے ہیں اور دو مخفی دریا، میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ جواب دیا: جہاں تک پوشیدہ کا تعلق ہے وہ تو جنت میں ہوں گے جہاں تک ظاہر دریاؤں کا تعلق ہے تو وہ نیل اور فرات ہیں (1)'' الفاظ دار قطنی کے ہیں۔

نبق باء کے کسرہ کے ساتھ ہے اس کا واحد نبقه ہے۔ یہ کہا جاتا ہے نبق نون کے فتحہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ یعقوب نے ''الاصلاح'' میں دونوں قول ذکر کیے۔ یہ مصریوں کی لغت ہے پہلی زیادہ فصیح ہے یہی وہ ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ امام ترمذی نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب کہ آپ کے سامنے سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر کیا گیا (2)۔ فرمایا: ''ایک سوار اس کی ایک ٹہنی کے سائے میں سو سال تک چلتا ہے یا اس کے سائے سے سو سال سوار سایہ حاصل کرتے ہیں'' یحییٰ کو شک ہوا ہے۔ ''اس میں سونے کے پتنگ ہوں گے گویا اس کا پھل مٹکے ہیں''۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح مسلم کے الفاظ ہیں جو ثابت کی حدیث میں ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے اوراق ہاتھی کے کانوں جیسے ہیں (3)، اس کے پھل مٹکوں جیسے ہیں جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم اس پر غالب آجاتا ہے تو اس میں تغیر آجاتا ہے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی چیز یہ طاقت نہیں رکھتی کہ اس کے حسن کی تعریف کرے''۔

اس میں اختلاف کیا گیا ہے کہ اس کا نام سدرۃ المنتہیٰ کیوں ہے؟

(۱) جس طرح پہلے گزرا ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ اوپر سے جو چیز نیچے آتی ہے اور نیچے سے جو چیز اوپر جاتی ہے وہ یہاں آکر رک جاتی ہے۔

(۲) انبیاء کا علم یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے اور ماوراء کا علم ان سے غائب ہو جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

(۳) اعمال یہاں تک پہنچتے ہیں اور انہیں لے لیا جاتا ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔

(۴) ملائکہ اور انبیاء یہاں پہنچتے ہیں اور اس کے پاس رک جاتے ہیں؛ یہ کعب کا قول ہے۔

(۵) اسے سدرۃ المنتہیٰ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ مومنوں کی روحیں یہاں آکر رک جاتی ہیں؛ یہ ربیع بن انس کا قول ہے۔

(۶) یہاں مومنوں کی روحیں پہنچتی ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، معنی قول اللہ تعالی ولقد رآہ نزلۃ أخری، جلد 1، صفحہ 97

2۔ جامع ترمذی، باب فی صفۃ الجنۃ، ما جاء فی صفۃ ثمار أهل الجنۃ، جلد 2، صفحہ 77

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، الإسراء برسول اللہ الی السموات، جلد 1، صفحہ 91

(۷) جو آدمی حضرت محمد ﷺ کی سنت اور منہاج پر ہوتا ہے وہ یہاں تک پہنچتا ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا اور ربیع بن انس کا بھی قول ہے۔

(۸) یہ حاملین عرش کے سروں پر ایک درخت ہے یہاں تک مخلوقات کا علم پہنچتا ہے؛ یہ کعب کا قول ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ ارادہ کیا کہ اس کی بلندی اور شاخوں کی چوٹی حاملین عرش کے سروں سے بلند ہے اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے اور اس کی شاخوں کی بلندی ساتویں آسمان میں ہے پھر وہ اس سے بلند ہوئیں تو وہ حاملین عرش کے سروں سے بڑھ گئیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

(۹) اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ جسے اس کی طرف بلند کیا گیا تو وہ کرامت میں اپنی انتہا تک جا پہنچا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (2) جب رسول اللہ ﷺ کو معراج کرائی گئی تو آپ سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے تو آپ سے عرض کی گئی: ''ہر کوئی یہاں آ کر رک جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو آپ ﷺ کی امت میں سے آپ ﷺ کی سنت پر ہوں گے۔ یہ ایسا درخت ہے جس کی جڑ سے ایسے پانی کی نہریں نکلیں گی جو بدبودار نہیں ہوگا، ایسے دودھ کی نہریں جاری ہوں گی جن کا ذائقہ نہیں بدلے گا، شراب کی ایسی نہریں جاری ہوں گی جو پینے والوں کے لیے لذت کا باعث ہوں گی اور مصفّٰی شہد کی نہریں جاری ہوں گی۔ یہ ایسا درخت ہے کہ ایک تیز رفتار سوار ایک سو سال تک اس کے سائے میں چلتا رہے گا اور اس کو طے نہ کر سکے گا اس کا ایک پتہ پوری امت کو سایہ دے گا''۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى ۞ جنت ماوی کی جگہ کی تعریف ہے یہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے حضرت علی شیر خدا، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس، ابوسبرہ جہنی، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مجاہد نے عندھا جنۃ الماوی پڑھا ہے مراد ہے جنۃ المبیت رات گزارنے کی جنت۔ مجاہد نے کہا: مراد لیا ہے أجنه ھاء ضمیر نبی کریم ﷺ کے لیے ہے۔ اخفش نے کہا: معنی ہے اس نے اسے پالیا؛ جس طرح تو کہتا ہے جنه اللیل اسے ڈھانپ لیا اور اسے پالیا۔ عام قرأت جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: یہ وہ جگہ ہے جہاں تک متقین پہنچتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہاں تک شہداء کی روحیں پہنچتی ہیں (3)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ عرش کی دائیں جانب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وہ جنت ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے یہاں تک کہ آپ کو اسی سے نکالا گیا۔ یہ ساتویں آسمان میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام مومنوں کی روحیں جنۃ ماوی میں ہیں۔ اسے جنۃ ماوی اس لیے نام دیا گیا ہے کیونکہ مومنوں کی روحیں یہاں پناہ لیتی ہیں۔ یہ عرش کے نیچے ہے۔ اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور اس کی عمدہ خوشبو سے مشام جان کو معطر کرتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت جبریل امین اور حضرت میکائیل علیہما السلام یہاں پناہ لیتے ہیں۔

اِذۡ يَغۡشَى السِّدۡرَةَ مَا يَغۡشٰى ۞ حضرت ابن عباس، ضحاک، حضرت ابن مسعود اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ سونے کے

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 246 2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 65 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 199

پلنگ ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بھی نقل کی ہے صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کا قول پہلے گزر چکا ہے (1)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اسے رب العالمین نے ڈھانپ لیا تو وہ روشن ہوگیا۔ قشیری نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اسے کس چیز نے ڈھانپ رکھا ہے؟ فرمایا: ''سونے کے پتنگوں نے''۔ دوسری روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ کے نور نے اسے ڈھانپ رکھا ہے یہاں تک کہ کوئی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اسے دیکھے''۔ ربیع بن انس نے کہا: اسے رب کے نور نے ڈھانپ رکھا ہے فرشتے اس پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح کوے درخت پر گرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت مروی ہے ''میں نے سدرہ کو دیکھا جسے سونے کے پتنگوں (تتلیاں وغیرہ) نے ڈھانپ رکھا ہے میں نے اس کے ہر پتے پر ایک فرشتے کو دیکھا جو کھڑے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہا تھا (2)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ کا یہی معنی ومفہوم ہے'' اسے مہدوی اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت انس بن مالک نے کہا: اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ کا معنی ہے سونے کی چڑیا۔ اسے مرفوع بھی روایت کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ سبز رفرف ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے ''اسے رفرف یعنی سبز پرندوں نے ڈھانپا ہوا ہے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اسے رب العزت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ یہاں رب العزت سے مراد اس کا حکم ہے جس طرح صحیح مسلم میں مرفوع روایت ہے: ''جب اللہ تعالیٰ کے امر نے اسے ڈھانپ لیا جو ڈھانپ لیا'' (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے گویا فرمایا: جب سدرہ کو ڈھانپ لیا ملکوت کے ان دلائل نے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿۱۰﴾۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ اسی کی مثل اَلْحَآقَّةُ ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ﴿۲﴾ (الحاقہ: 2-1) ہے ماوردی نے اپنی کتاب معانی القرآن میں کہا: اگر یہ سوال کیا جائے اس امر کے لیے سدرہ (بیری کے درخت) کو کیوں منتخب کیا گیا ہے کسی اور درخت کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا؟ اسے جواب دیا جائے گا: سدرۃ تین اوصاف کے ساتھ خاص ہے لمبا سایہ، عمدہ ذائقہ، اچھی خوشبو۔ یہ اس ایمان کے مشابہ ہے جو قول، عمل اور نیت کو جامع ہے۔ سدرہ کا سایہ ایمان کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو عمل کی ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ ایمان پر زائد ہوتا ہے، سدرہ کا ذائقہ نیت کے قائم مقام ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کی خوشبو قول کے قائم مقام ہے کیونکہ وہ ظاہر ہوتا ہے۔

ابوداؤد نے اپنی سنن میں یہ روایت نقل کی ہے کہ نصر بن علی، ابواسامہ سے وہ ابن جریج سے وہ عثمان بن ابی سلیمان سے وہ سعید بن محمد بن جبیر بن مطعم سے وہ عبداللہ بن حبشی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من قطع سدرۃ صوب اللہ رأسہ فی النار (4)۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب معنی قول اللہ عزوجل لقد رأٰہ نزلۃ اخرٰی، جلد 1، صفحہ 97

2۔ الصاوی علی الجلالین، جلد 1، صفحہ 117　　3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، الاسراء برسول اللہ الی السموات، جلد 1، صفحہ 91

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، فی قطع السدر، جلد 2، صفحہ 355

ابوداؤد سے اس حدیث کے معنی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ حدیث مختصر ہے اس سے مراد ہے جس نے جنگل سے بے مقصد اور ظلماً ایسا درخت کاٹا مسافر اور چوپائے جس کا سایہ حاصل کرتے تھے اس کاٹنے والے کا اس درخت میں کوئی حق نہیں تھا اللہ تعالیٰ اس کا سر جہنم میں جھکائے گا۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آنکھ دائیں پھری نہ بائیں پھری اور نہ ہی اس حد سے تجاوز کیا جس حد کو اس نے دیکھا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے جو حکم دیا گیا اس سے اس نے تجاوز نہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آنکھ نے جو آیات دیکھیں ان سے وہ غیر کی طرف نہ اٹھی۔ اس مقام پر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ادب ہے یہ اس کا بیان ہے کیونکہ وہ دائیں اور بائیں متوجہ نہ ہوئی۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رفرف دیکھا جس نے افق کو بند کر دیا تھا (2)۔ بیہقی نے حضرت عبداللہ سے روایت نقل کی ہے حضرت عبداللہ نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سبز رفرف دیکھا جس نے آسمان کے افق کو بند کر دیا تھا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت جبرئیل امین کو سبز رفرف کے حلہ میں دیکھا جنہوں نے آسمان اور زمین کے درمیان کو بھر دیا تھا۔ بیہقی نے کہا: اس کا حدیث میں قول رأی رفرفا اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو رفرف میں اپنی صورت میں تھے۔ رفرف سے مراد قالین ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: مراد ستر ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: بلکہ وہ ایک کپڑا تھا جو ان کا لباس تھا۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت جبریل کو رفرف کے حلہ میں دیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں: اسے ترمذی نے حضرت عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جبریل امین کو رفرف کے حلہ میں دیکھا جس نے آسمان اور زمین کو بھر دیا تھا (3)۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دَنَا فَتَدَلّٰی کے بارے میں یہ قول مروی ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی لیلۃ المعراج کو رفرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے نیچے آیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس پر بیٹھے پھر اسے بلندی کی طرف لے جایا گیا تو آپ اپنے رب کے قریب ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جبرئیل امین مجھ سے الگ ہو گئے، آوازیں مجھ سے منقطع ہو گئیں اور میں نے اپنے رب کا کلام سنا''۔ اس روایت کی وجہ سے رفرف وہ چیز ہو گی جس پر بیٹھا جاتا ہے جس طرح قالین وغیرہ۔ پہلے معنی کی صورت میں مراد حضرت جبریل امین ہیں۔

عبدالرحمن بن زید اور مقاتل بن حیان نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا جس صورت میں وہ آسمان میں ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ سے روایت مروی ہے کہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝ سے مراد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت جبریل امین کو اس صورت میں دیکھا جس کے چھ سو پر ہوتے ہیں (4)۔ اس تاویل

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 247
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ والنجم، جلد 2، صفحہ 161
3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، فی ذکر سدرۃ المنتہیٰ، جلد 1، صفحہ 98

کے باوجود یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ رفرف کے حلہ میں ہوں یا رفرف پر ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ضحاک نے کہا: سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: سونے کے پتنگوں نے سدرہ کو جو ڈھانپ رکھا تھا اسے دیکھا؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معراج (سیڑھی) کو دیکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے جو اس سفر میں لوٹتے وقت اور شروع کرتے وقت دیکھا۔ یہ تعبیر بہت اچھی ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (الاسراء:1) یہ جائز ہے کہ من تبعیضیہ ہو۔ اور الکبری، رای کا مفعول ہو۔ اصل میں یہ آیات کی صفت ہے آیات کے سروں کی وجہ سے اسے واحد ذکر کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جماعت کی صفت، مؤنث کی صفت کے ساتھ لگائی جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ (طٰہٰ) ایک قول یہ کیا گیا ہے: الکبری یہ محذوف کی صفت ہے یعنی رای من آیات ربہ الکبری۔ یہ بھی جائز ہے کہ من زائدہ ہو تقدیر کلام یہ ہو گی رای آیات ربہ الکبری۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر کلام یہ ہے رای الکبری من آیات ربہ۔

## اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾

”(اے کفار!) کبھی تم نے غور کیا لات و عزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے نری بیٹیاں۔ یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے“۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جانے والی وحی کا ذکر کیا اور اپنی قدرت کے آثار کا ذکر کیا تو مشرکین سے دلیل کے ساتھ گفتگو کی کیونکہ وہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے تھے جو عقل نہیں رکھتی تھی فرمایا: بتاؤ تو سہی یہ بت جن کی تم عبادت کرتے ہو اس کے بارے میں تمہاری طرف کوئی وحی کی گئی ہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی ہے۔ لات بنو ثقیف کا بت تھا، عزی قریش اور بنو کنانہ کا بت تھا، منات بنو ہلال کا بت تھا، ہشام نے کہا: منات ہذیل اور خزاعہ کا بت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو انہوں نے فتح مکہ کے سال اسے گرا دیا۔ پھر انہوں نے طائف میں لات کا بت بنالیا یہ منات کی بنسبت قریب کے دور کا تھا یہ ایک مربع چٹان تھی اس کے خدام میں بنو ثقیف کے لوگ تھے۔ بنو ثقیف نے اس پر ایک عمارت بنادی قریش اور تمام عرب اس کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عرب یہ نام رکھتے زید اللات اور تیم اللات۔ یہ بت اس جگہ تھا جہاں طائف کی مسجد کا بائیاں مینار ہے۔ وہ بت اسی طرح رہا یہاں تک کہ بنو ثقیف اسلام لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا حضرت مغیرہ نے اسے گرا دیا اور آگ کے ساتھ جلا دیا۔ پھر عربوں نے عزی کو معبود بنالیا یہ لات کی بنسبت قریب کے زمانہ کا تھا اسے ظالم بن اسعد نے معبود بنایا یہ ذات عرق کے اوپر نخلہ شامیہ کی وادی میں تھا لوگوں نے اس پر ایک کمرہ بنادیا وہ اس سے آواز سنا کرتے تھے۔

ابن ہشام نے کہا: مجھے میرے باپ نے ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ عزی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 397

شیطانہ تھی وہ بطن نخلہ میں ببول کے تین درختوں کے پاس آیا کرتی تھی جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا تو حضرت خالد بن ولید کو بھیجا فرمایا: "نخلہ وادی کے بطن میں جاؤ وہاں تو تین ببول کے درخت پائے گا تو پہلے کو کاٹ دینا"۔ حضرت خالد بن ولید وہاں گئے اور اس درخت کو کاٹ دیا جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تو نے کوئی چیز دیکھی تھی؟ عرض کی: نہیں۔ فرمایا: دوسرا درخت کاٹ دو"۔ حضرت خالد آئے اور دوسرے درخت کو کاٹ دیا پھر حضرت خالد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے پوچھا: کیا تو نے کوئی چیز دیکھی ہے؟ عرض کی: نہیں۔ فرمایا: "تیسرے درخت کو کاٹ دو"۔ حضرت خالد آئے تو ایک حبشی عورت دیکھتے ہیں اس نے اپنے بال بکھیرے ہوئے ہیں اس نے اپنے ہاتھ اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہیں وہ اپنے دانت پیس رہی ہے اس کے پیچھے دبیہ سلمی ہے وہ اس کا خادم تھا۔ اور یہ شعر پڑھا:

يَا عُزَّ كُفْرَانَكِ لَا سُبْحَانَكِ إِنِّي رَأَيْتُ اللّٰهَ قَدْ أَهَانَكِ

اے عز میں تیرا انکار کرتا ہوں تیری پاکی بیان نہیں کرتا میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے اس نے تجھے ذلیل ورسوا کر دیا ہے۔

پھر اس پر وار کیا اور اس کا سر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو وہ کوئلہ ہو گئی پھر آپ نے درخت کو کاٹ دیا اور دبیہ جو خادم تھا اس کو قتل کر دیا۔ پھر حضرت خالد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب کچھ بتایا۔ فرمایا: "وہی عزیٰ تھی اب اس کی کبھی عبادت نہ کی جائے گی"۔

ابن جبیر نے کہا: عزیٰ سفید پتھر تھا لوگ اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ قتادہ نے کہا: وہ نخلہ وادی کے بطن میں ایک جڑی بوٹی (1) تھی۔ منات بنوخزاعہ کا بت تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بعض مفسرین نے کہا لات یہ مشرکوں نے لفظ اللہ سے اخذ کیا تھا عزیٰ لفظ عزیز سے لیا تھا منات یہ منی اللہ الشئ سے ماخوذ ہے یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اسے مقدر کرے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، مجاہد، حمید اور ابو صالح نے اللات کو تاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے کہا: ایک آدمی تھا جو حاجیوں کے لیے ستو کو گھی میں تلا کرتا تھا۔ امام بخاری نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: جب وہ آدمی فوت ہوا تو لوگ اس کی قبر پر بیٹھے اور اس کی عبادت کی (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ایک چٹان کے پاس ستو اور گھی بیچا کرتے تھا اور اس چٹان پر انڈیلا کرتا تھا۔ جب وہ آدمی فوت ہو گیا تو بنوثقیف نے اس ستو والے کی تعظیم کے لیے اس چٹان کی عبادت کی۔ ابو صالحہ نے کہا: طائف میں ایک آدمی تھا وہ بتوں کی خدمت کرتا اور ان کے لیے ستو کو تلا کرتا جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی عبادت کی۔ مجاہد نے کہا: پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک آدمی رہتا جس کا ریوڑ تھا وہ ان کا گھی جمع کرتا، اس کے دودھ سے پنیر بناتا اور اس کا دودھ جمع کرتا پھر وہ حلوہ بناتا اور حاجیوں کو کھلاتا وہ نخلہ وادی کے بطن میں رہتا جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی عبادت کی یہی لات بت تھا۔ کلبی نے کہا: بنوثقیف کا ایک آدمی تھی جسے صرمہ بن غنم کہتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عامر بن ظرب عدوانی تھا۔ شاعر نے کہا:

لَا تَنْصُرُوا اللَّاتَ إِنَّ اللّٰهَ مُهْلِكُهَا وَكَيْفَ يَنْصُرُكُمْ مَنْ لَيْسَ يَنْتَصِرُ (3)

1۔ بعض نسخوں میں نبت کی جگہ بیت کا لفظ ہے یعنی ایک کمرہ تھا۔

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، أفرأيتم اللات والعزى، جلد 2، صفحہ 720

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 398

تم لات کی مدد نہ کرو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرنے والا ہے۔

صحیح قرأت اللات تخفیف کے ساتھ ہے یہ بت کا نام ہے اس پر وقف تاء کے ساتھ ہے؛ یہ فراء کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ فراء نے کہا: میں نے کسائی کو دیکھا اس نے ابو فقعس اسدی سے سوال کیا اس نے ذات کے لیے ذاہ اور لات کے لیے لاہ کہا اور افرائیتم اللاہ پڑھا اسی طرح دوری نے کسائی سے اور بزی نے ابن کثیر سے اللاہ نقل کیا ہے یعنی ہاء پر وقف کیا ہے جس نے یہ کہا اللات یہ لفظ اللہ سے ماخوذ ہے اس نے بھی ہاء پر وقف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اصل میں لاہۃ تھا جس طرح شاہۃ تھا یہ لاہت سے مشتق ہے یعنی وہ چھپ گیا۔ شاعر نے کہا

لَاهَتْ فما عُرِفت يومًا بخارجةٍ    ياليتها خَرجتْ حتى رأينا ها

وہ چھپ گئی وہ کسی روز بھی باہر نکلنے والی کی حیثیت سے معروف نہ ہوئی ہائے کاش! وہ باہر نکلتی تو ہم اسے دیکھ لیتے۔

صحاح میں ہے: لات ایک بت کا نام ہے جو بنو ثقیف کا تھا اور طائف کے مقام پر تھا۔ بعض عرب تاء پر وقف کرتے ہیں اور بعض ہاء پر وقف کرتے ہیں۔ اخفش نے کہا: ہم نے بعض عربوں سے سنا جو لات وعزیٰ کہتا۔ وہ کہتا ہے: ھی اللات اسے وقف میں تاء بنا دیتا ہے ھی اللات یہ بات ذہن نشین کر لو کہ رفع کی جگہ اسے جر دی گئی ہے یہ اس کی مثل ہے جو ہر حال میں مکسور ہے۔ یہ بہت اچھی تعبیر ہے کیونکہ الف اور لام جو اللات میں ہیں ساقط نہیں ہوتے اگرچہ یہ دونوں زائد ہیں رہی وہ صورت جو ہم وقف کی صورت اللات کو اللاہ سنا ہے کیونکہ یہ ھاء ہے جو وصل میں تاء ہو گئی ہے یہ اس لغت میں کان من الامر ذیت و کیت کی مثل ہے اسی طرح ھیھات ہے یہ اس کی لغت میں ہے جس نے اسے کسرہ دیا ہے مگر ھیھات میں یہ جائز ہے کہ وہ جمع ہو مگر اللات میں یہ جائز نہیں کیونکہ جمع میں تاء الف کے بغیر جائز نہیں ہوتی اگر اللات اور تاء دونوں کو زائد مان لیا جائے تو اسم صرف ایک حرفی رہ جائے گا۔

**وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝** ابن کثیر، ابن محیصن، حمید، مجاہد، سلمی اور اعشیٰ نے ابو بکر سے و مناءۃ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے ہمزہ کو ترک کیا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ اس بت کے پاس جانور ذبح کیا کرتے تھے اور اس عمل کے ذریعے اس کا قرب حاصل کیا کرتے تھے۔ منیٰ کو منیٰ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس میں بہت زیادہ جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ کسائی، ابن کثیر اور ابن محیصن ھاء پر وقف کرتے جس طرح اصل قاعدہ ہے باقی تاء پر وقف کرتے وہ مصحف کے خط کا اتباع کرتے۔ صحاح میں ہے: مناۃ بت کا نام ہے جو بنو ہذیل اور بنو خزاعہ کا تھا یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان تھا۔ ھاء تانیث کے لیے ہے تاء پر وقف کیا جاتا ہے یہ بھی ایک لغت ہے اس سے اسم منسوب منوی ہے۔

**مَنٰوةَ** کا لفظ کبھی الف مقصورہ کے ساتھ ہوتا ہے جیسے عبد مناۃ ابن اذ بن طانجہ۔ زید مناۃ ابن تمیم بن مر۔ اور کبھی الف ممدودہ کے ساتھ ہوتا ہے جیسے الاھل اتی التیم بن عبد مناءۃ۔ محل استدلال مناءۃ ہے۔

**الْاُخْرٰى** عرب تیسرے کے لیے اخری کا لفظ استعمال نہیں کرتے الْاُخْرٰى یہ ثانیہ کی صفت ہے اس کی توجیہ میں علماء

نے اختلاف کیا ہے۔ خلیل نے کہا: یہ اس لیے کہا تا کہ آیات کے سرے موافق ہو جائیں (1) جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مآرب اخری، اخیر نہیں کہا۔ حسین بن فضل نے کہا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ بنتی ہے أفرأیتم اللات والعزی الاخری و مناۃ الثالثۃ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرمایا وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کیونکہ مشرکوں کے نزدیک تعظیم میں اس کا مرتبہ لات وعزیٰ کے بعد تھا کلام اسی ترتیب پر ہے ہم نے ابن ہشام سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مناۃ تقدیم میں پہلے تھا اسی وجہ سے وہ ان کے نزدیک سب سے معزز تھا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ آیت میں حذف ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی أفرأیتم ھذہ الآلھۃ ھل نفعت أو ضرت حتی تکون شرکاء للہ پھر شرمندگی دلانے کے انداز میں فرمایا: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ۝ یہ کلام ان کے قول ”فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بت اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں“ کا رد کرنے کے لیے ہے۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ یہ تقسیم عدل کے خلاف اور غلط ہے اور حق سے دور ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ضاز فی الحکم اس نے فیصلہ میں ظلم کیا۔ اس کا باب یوں ذکر کیا جاتا ہے ضاز حقہ یضیزہ ضیزا یعنی اس نے حق میں کمی کی۔ بعض اوقات اسے مہموز کے انداز میں ذکر کیا جاتا ہے ضأزہ یضأزہ ضأزا اور یہ شعر پڑھا:

فَقِسْمَتُكَ مَضْئُوزٌ وأَنْفُكَ رَاغِمُ

تیری تقسیم میں نقص ہے اور تیری ناک خاک آلود ہے۔

کسائی نے یوں باب ذکر کیا ہے ضَازَ يَضِيزُ ضَيْزًا وضازَ يَضُوزُ ضَوْزًا وضَأَزَ يَضْأَزُ ضأزًا جب وہ ظلم کرے، حد سے تجاوز کرے اور کمی کرے؛ شاعر نے کہا:

ضَازَتْ بنو أَسَدٍ بِحُكْمِهِمْ إِذ يجعلون الرأسَ كالذَّنَبِ (2)

بنو اسد نے اپنے فیصلہ میں ظلم کیا کیونکہ وہ سر کو دم کی طرح بناتے ہیں۔

قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ یہ ناحق تقسیم ہے یہ فُعلی کا وزن ہے جس طرح طوبیٰ اور حبلیٰ ہے یاء کی مناسبت کی وجہ سے ضاد کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ کلام عرب میں فِعلی کے وزن پر صفت کا صیغہ نہیں آتا اسماء کے اوزان میں یہ وزن ہے جس طرح شعری اور دفلی ہے۔ فراء نے کہا: بعض عرب کہتے ہیں ضوزی اور ضئزی۔

ابو حاتم نے ابو زید سے حکایت بیان کی ہے کہ انہوں نے عربوں کو ضئزی ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے علاوہ علماء نے کہا: ابن کثیر نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اسے مصدر بنایا ہے جس طرح ذکری مصدر ہے یہ صفت نہیں کیونکہ صفات میں فِعلی کا وزن نہیں اس کی اصل فُعلی نہیں کیونکہ یہاں کوئی ایسا سبب موجود نہیں جو قلب کا تقاضا کرے یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: ضأزتہ یعنی میں نے اس پر ظلم کیا۔ معنی ہوگا یہ ایسی تقسیم ہے جس میں ظلم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں ان دونوں لغتوں کے علاوہ ضیزی، ضأزی، ضوزی، ضوزی بھی بیان کیا گیا ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 249 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 399

مورج نے کہا: انہوں نے ضیزی میں ضاد کے ضمہ کو مکروہ جانا ہے اور یاء کے واؤ سے بدل جانے کا انہیں خوف ہوا اس وجہ سے انہوں نے ضاد کو کسرہ دیا، جس طرح انہوں نے کہا: ابیض کی جمع بِیض ہے جب کہ اصل میں اسے بوض ہونا تھا جس طرح حُمر، صُفر اور خُضر ہے جس نے ضاز یضوز کہا تو اس سے اسم ضوزی ہوگا جس طرح شوری ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ؕ﴿۲۳﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿ۖ۲۴﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ﴿۲۶﴾

”نہیں ہیں یہ مگر محض نام جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہیں نازل کی اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی سند، نہیں پیروی کرر ہے یہ لوگ مگر گمان کی اور جسے ان کے نفس چاہتے ہیں حالانکہ آ گئی ہے ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت۔ کیا انسان کو ہر وہ چیز مل جاتی ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ پس اللہ کے دست قدرت میں ہے آخرت اور دنیا۔ اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آسکتی مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ اذن دے جس کے لیے چاہے اور پسند فرمائے“۔

اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ یعنی یہ بت نہیں مگر ایسے نام جن کو تم نے خود تراش لیا ہے اور ان کے نام معبود رکھ لیے ہیں۔ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ تم نے اس مسئلہ میں اپنے آباء کی تقلید کی ہے۔ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ خطاب سے غائب کی طرف رجوع کیا ہے، یعنی یہ لوگ ظن کی پیروی کرتے ہیں۔ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ اور جس کی طرف نفوس مائل ہوتے ہیں عام قراء کی قرأت یتبعون ہے۔ عیسیٰ بن عمر، ایوب اور ابن سمیقع نے تتبعون پڑھا ہے؛ یہی حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس کی قرأت ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے وضاحت آ گئی ہے کہ وہ معبود برحق نہیں۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ یعنی جو وہ خواہش کرے یعنی اس کے لیے یہ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس کے لیے بیٹے ہیں یعنی بیٹیوں کے سوا اس کے لیے بیٹے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے بغیر جزا کی جو وہ خواہش کرے معاملہ اس طرح نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کہ وہ نبوت کی خواہش کرے تو نبوت اس میں ہو کسی اور میں نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے انسان کی خواہش پر بت ان کی شفاعت کریں۔ یہ آیت نضر بن حرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تمام کفار کے بارے میں نازل ہوئی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ جس کے بارے میں چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اس سے روک لیتا ہے نہ کہ جس کی انسان آرزو کرے۔

وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ﴿۲۶﴾ جو لوگ

فرشتوں اور بتوں کی پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں شرمندہ کیا گیا ہے۔ اس نے یہ گمان کیا کہ اس کا یہ عمل اسے اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے گا۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ فرشتے عبادت کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہونے کے باوجود وہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے مگر جس کے حق میں انہیں اجازت ملے گی۔ اخفش نے کہا: ملك واحد ہے اس کا معنی جمع ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ (الحاقۃ) (1)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک فرشتہ کا ذکر کیا کیونکہ لفظ کَمْ جمع پر دلالت کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۝ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝

''بے شک جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں حالانکہ انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن حق کے مقابلہ میں کسی کام نہیں آ سکتا۔ پس آپ رخ انور پھیر لیجئے اس (بدنصیب) سے جس نے ہمارے ذکر سے روگردانی کی اور نہیں خواہش رکھتا مگر دنیوی زندگی کی۔ یہ ہے ان کا مبلغ علم، بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے جو بھٹک گیا اس کی راہ سے اور وہی بہتر جانتا ہے جس نے راہ راست پائی''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مراد کفار ہیں جنہوں نے کہا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بت اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ یہاں تسمیہ سے پہلے کاف محذوف ہے یعنی وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے، مؤنث ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ یعنی انہوں نے اس امر کا مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا ہے انہوں نے جو کچھ کہا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا اور کسی کتاب میں اسے نہیں دیکھا۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ یہاں ان نافیہ ہے اِلَّا الظَّنَّ وہ جو یہ کہتے ہیں کہ فرشتے مؤنث ہیں اس قول میں وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا ذکر سے مراد قرآن اور ایمان ہے۔ یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ یہ آیت نضر کے بارے نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ولید کے بارے میں نازل ہوئی۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ یعنی وہ اپنی دنیا کے معاملات کو دیکھتے ہیں اور اپنے دین کے معاملہ میں جاہل رہتے ہیں۔ فراء نے کہا: ان کی حقارت بیان کی یعنی یہ ان کی عقلوں کا معیار ہے اور علم کی انتہا ہے کہ انہوں نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے کہ انہوں نے فرشتوں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 251

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی جو اس کے دین سے بھٹک گیا۔

وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ⑩ پس وہ ہر کسی کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ ۩ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۚ ۩

''اور اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تا کہ وہ بدلہ دے بدکاروں کو ان کے اعمال کا اور بدلہ دے نیکو کاروں کو ان کی نیکیوں کا۔ جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے مگر شاذ و نادر، بلاشبہ آپ کا رب وسیع بخشش والا ہے، وہ (اس وقت سے) خوب جانتا ہے تمہیں جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم حمل تھے اپنی ماؤں کے شکموں میں، پس اپنی خود ستائی نہ کیا کرو وہ خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے''۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ⑩

لِيَجْزِيَ کا لام اس معنی کے متعلق ہے جس پر لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ دلالت کرتا ہے گویا فرمایا: وہ اس کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تا کہ محسن کو اس کے احسان کا بدلہ دے اور گناہگار کو اس کے گناہ کا بدلہ دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ جملہ معترضہ ہے۔ معنی ہوگا تیرا رب گمراہ کو خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ کو بھی خوب جانتا ہے تا کہ اسے بدلہ دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لام عاقبہ ہے معنی بنے گا خلق کے امر کا انجام یہ ہے کہ ان میں گناہگار اور محسن ہوں گناہگار کے لیے جہنم ہے اور محسن کے لیے جنت ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ یہ محسنین کی صفت ہے یعنی وہ بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے جو شرک ہے کیونکہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے کبیر پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد شرک ہے۔ الفواحش سے مراد زنا ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ نساء میں گزر چکی ہے، پھر اس سے مستثنیٰ منقطع کی صورت میں استثناء کی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فرمایا: اِلَّا اللَّمَمَ اس سے مراد گناہ صغیرہ ہیں ایسے افعال سے کوئی بھی محفوظ نہیں مگر اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت فرمائے۔ اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس اور امام شعبی نے کہا: اَللَّمَمَ سے مراد

زنا سے کم درجہ کے اعمال مراد ہیں (1)۔ مقاتل بن سلیمان نے کہا: یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جسے نبہان تمار کہا جاتا (2)۔ اس کی ایک دکان تھی جس میں وہ خشک کھجوریں بیچا کرتا اس کے پاس ایک عورت آئی وہ اس سے کھجوریں لینا چاہتی اس مرد نے اس عورت سے کہا: دکان کے اندر اس سے بہتر کھجوریں ہیں جب وہ دکان میں داخل ہوئی تو اس نے عورت کو بہلانا چاہا تو اس عورت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور وہ عورت واپس چلی گئی نبہان شرمندہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: یا رسول اللہ! جماع کے علاوہ آدمی جو کرتا ہے میں نے وہ کچھ کیا ہے؟ کہا: شاید اس کا خاوند مجاہد ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ واقعہ سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابو سعید خدری، حضرت حذیفہ اور مسروق نے اسی طرح کا قول کیا ہے کہ لمم سے مراد وطی سے کم درجہ کا فعل ہے جس طرح بوسہ لینا، غمزہ کرنا، دیکھنا اور لیٹنا (3)۔ مسروق نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں کا زنا چلنا ہے، شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا اس کی تکذیب کرتی ہے۔ اگر وہ آگے بڑھے تو زنا ہے اگر پیچھے ہٹ جائے تو لمم ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو کہا میں نے اس سے زیادہ لمم کے کسی شی کو زیادہ مشابہ نہیں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے انسان پر زنا کا حصہ لکھ دیا ہے وہ لامحالہ اس کو پائے گا۔ آنکھوں کا زنا دیکھنا، زبان کا زنا بولنا ہے، نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے، شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا اس کو جھٹلاتی ہے''۔ مراد یہ ہے عظیم فاحشہ اور مکمل زنا جو دنیا میں حد اور آخرت میں عذاب کو ثابت کرتا ہے وہ شرمگاہ میں بدکاری کرنا ہے اس کے علاوہ گناہ میں ایک حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابو صالح کی روایت جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان پر زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے وہ اسے ضرور پانے والا ہے آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا کلام ہے، ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے، دل خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا اسے جھٹلاتی ہے'' (4) امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔

ثعلبی نے طاؤس کی روایت نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اس میں کان، ہاتھ اور پاؤں کا ذکر ہے آنکھوں اور زبان کے بعد یہ زیادہ کہا: ''ہونٹوں کا زنا بوسہ لینا ہے''۔ یہ ایک قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا: آدمی گناہ کا ارادہ کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے۔ کہا: کیا تو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا:

إِنْ يَغْفِرِ اللهُ يَغْفِرْ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا أَلَمَّا (5)

اگر اللہ تعالیٰ بخشنے کا ارادہ کرے تو سب گناہ بخش دیتا ہے تیرا کون سا بندہ ہے جس سے لغزش نہیں ہوئی۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 204	2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 401

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، زنا الجوارح دون الفرج، جلد 2، صفحہ 922

4۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر سورۂ والنجم، جلد 7، صفحہ 249، حدیث 11378	5۔ ایضاً

عمرو بن دینار نے عطا سے اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسے نقل کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح ترین ہے اور از روئے اسناد کے سب سے عظیم ہے۔ شعبہ نے منصور سے اس نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِلَّا اللَّمَمَ کے بارے میں یہ کہا کہ بندہ ایک دفعہ گناہ کر بیٹھتا ہے پھر دوبارہ اس طرح نہیں کرتا؛ شاعر نے کہا:

إن تَغفِرِ اللهُ تغفر جَمًّا وأيُّ عبدٍ لكَ لا أَلَمَّا(1)

اے اللہ! اگر تو بخشے تو سب گناہ بخش دے تیرا کون سا بندہ ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔

مجاہد اور حسن بصری نے یہی کہا ہے کہ وہ کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے پھر دوبارہ ایسا گناہ نہیں کرتا(2)۔ اسی کی مثل زہری سے مروی ہے، کہا: لمم یہ ہے کہ وہ بدکاری کرے پھر توبہ کرے اور دوبارہ ایسا عمل نہ کرے۔ وہ چوری کرے یا شراب پیئے پھر توبہ کرے اور دوبارہ ایسا نہ کرے اس تاویل کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (آل عمران: 135) پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (آل عمران: 136) ان کے لیے مغفرت کی ضمانت دی جس طرح اللَّمَمَ کے بعد فرمایا۔

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ اس تاویل کی صورت میں اِلَّا اللَّمَمَ مستثنیٰ متصل ہے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: اللَّمَمَ سے مراد جو شرک کے علاوہ ہو(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللَّمَمَ سے مراد ایسا گناہ ہے جو دو حدوں کے درمیان ہو جو دنیا میں اس پر حد کو جاری نہیں کرتا اور نہ ہی آخرت میں عذاب کو لازم کرتا ہے پانچوں نمازیں اس کا کفارہ بن جاتی ہیں؛ یہ ابن زید، عکرمہ، ضحاک اور قتادہ نے کہا ہے؛ یہی عوفی اور حکم بن عتیبہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے کہا: اللَّمَمَ کی دو صورتیں ہیں۔ ہر وہ گناہ اللہ تعالیٰ نے جس پر دنیا میں حد کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی آخرت میں عذاب کا ذکر کیا(4)۔ یہی وجہ ہے پانچ نمازیں ان کو مٹا دیتی ہیں جب تک وہ کبائر اور فواحش تک نہ پہنچیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے وہ عظیم گناہ ہے جسے انسان یکے بعد دیگرے کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن ثابت سے یہ بھی مروی ہے: مراد دور جاہلیت میں جو گناہ ہوئے اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکوں نے مسلمانوں سے کہا: تم کل ہمارے ساتھ یہ عمل کیا کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ زید بن اسلم اور ان کے بیٹے نے قول کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء: 23) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللَّمَمَ سے مراد ہے کہ وہ کوئی گناہ کرے جو اس کی عادت نہ ہو؛ یہ نفطویہ نے قول کیا ہے۔ کہا: عرب کہتے ہیں ما یاتینا إلا لماما یعنی وہ کبھی کبھی ہمارے پاس آتا تھا۔ کہا: اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ ارادہ تو کرے اور عمل نہ کرے کیونکہ عرب یہ نہ کہتے تھے الم بنا مگر اسی وقت کہتے جب کوئی انسان عمل کرتا نہ کہ اس صورت میں

---

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر سورۃ والنجم، جلد 7، صفحہ 249، حدیث 11378
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 88
3۔ المعالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 252
4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 253

کہ وہ قصد کرے اور عمل نہ کرے۔ صحاح میں ہے: ألمّ الرجل یہ لمم سے مشتق ہے اس سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔ کہا جاتا ہے: وہ معصیت کے قریب ہے مگر اس میں واقع نہیں ہوا۔ جوہری کے علاوہ نے یہ شعر پڑھا:

بزینبَ أَلْمِمْ قَبْلَ أَنْ يَرْحَلَ الرَّكْبُ

زینب کے قریب ہو جا قبل اس کے کہ قافلہ کوچ کر جائے۔

عطاء بن ابی رباح نے کہا: لمم سے مراد نفس کی عادت ہے جو وقفہ وقفہ سے ہوتی ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: جو دل میں کھٹکے۔ محمد بن حنفیہ نے کہا: بھلائی یا برائی میں سے جس کا تو قصد کرے تو وہ لمم ہوگا۔ اس تاویل کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ان للشیطان لِمّة ولِلملك لمّة بے شک شیطان کی طرف سے ایک خیال آتا ہے اور فرشتے کی جانب سے خیال آتا ہے۔ یہ روایت سورۂ بقرہ آیت 268 میں اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ کے تحت گزر چکی ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: لمم اور الالمام کا اصل معنی ہے انسان جب یکے بعد دیگرے کرتا ہے اس میں تعمق نہیں کرتا اور نہ ہی اس پر قائم رہتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: المت بہ۔ جب تو اس کی زیارت کرے اور اس سے پھر جائے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: **مافعلته إلا لمما والِماما** یعنی میں نے اسے وقفے وقفے سے کیا۔

إنما زيارتك الماما تیری ملاقات وقفے وقفے سے ہوتی ہے؛ اسی سے خیال کا آنا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

أَلَمَّ خَيَالٌ مِنْ قُتَيْلَةَ بَعْدَمَا قتیلہ کی جانب سے خیال وقفے وقفے سے آیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: الا، واؤ کے معنی میں ہے فراء نے اس کا انکار کیا ہے کہا: معنی ہے چھوٹے گناہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لمم سے مراد ایسی نظر ہے جو اچانک ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حقیقت سے بعید ہے یہ تو ابتداءً معاف ہے اس پر مواخذہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ قصد اور اختیار کے بغیر واقع ہوتی ہے۔ سورۂ نور میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ لمم کا معنی جنون کی ایک قسم ہے رجل ملموم جسے جنون ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: أصابت فلانا لمة من الجن کا معنی مس کرنا اور تھوڑی چیز ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ جو اپنے گناہ سے توبہ کرے اور بخشش کا طالب ہو اس کے لیے وسیع مغفرت والا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل نے کہا جو حضرت ابن مسعود کے فاضل اصحاب میں سے تھا: میں نے خواب میں دیکھا گویا میں جنت میں داخل ہوا ہوں کیا دیکھتا ہوں وہاں خیمے لگے ہوئے ہیں میں نے پوچھا: یہ کن کے لیے ہیں؟ لوگوں نے بتایا: یہ ذی کلدع اور حوشب کے لیے ہیں، یہ دونوں ان افراد میں سے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا تھا۔ میں نے کہا: یہ کیسے؟ لوگوں نے بتایا: دونوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تو اسے وسیع مغفرت والا پایا۔ ابو خالد نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ذی کلدع نے بارہ ہزار بچیوں کو آزاد کیا تھا۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ وہ تمہیں تمہاری ذاتوں سے بڑھ کر جانتا ہے اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ مراد ہے تمہارے جد اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور ضمیر جمع کی ذکر کی۔ ترمذی ابو عبداللہ نے کہا: ہمارے نزدیک یہ تعبیر نہیں بلکہ یہ پیدائش اس

مٹی پر ہوئی جو زمین سے ابھری ہوئی تھی۔ ہم سب اس مٹی اور اسی کیچڑ پر ہیں پھر اس کیچڑ سے پانی پشتوں کی طرف نکلے ساتھ ہی ان میں نفوس پیدا کیے گئے جب کہ ان کی ہیئتیں مختلف تھیں پھر مختلف ہیئتوں کو ان کی پشتوں سے نکالا ان میں سے کچھ موتیوں کی طرح چمک رہے تھے کچھ ایک دوسرے سے زیادہ روشن تھے ان میں سے بعض کوئلے کی طرح سیاہ تھے بعض ایک دوسرے سے زیادہ سیاہ تھے تو یہ انشاء (پیدائش) ہم پر اور اس پر واقع ہوئی۔

عیسیٰ بن حماد عسقلانی نے بشر بن بکر سے وہ اوزاعی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس رات میرے اس حجرہ کے سامنے مجھ پر اولین و آخرین (اگلے پچھلے) پیش کیے گئے'' کسی کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ مخلوقات میں سے جو گزر چکے ہیں وہ بھی؟ فرمایا: ''ہاں، مجھ پر حضرت آدم اور ان کے علاوہ''۔ کہا: ان کے علاوہ (1) بھی کسی کو پیدا کیا گیا؟ لوگوں نے پوچھا: جو مردوں کی پشتوں اور ماؤں کے رحموں میں ہیں؟ فرمایا: ''ہاں مٹی میں ان کی مثالی شکلیں بنائی گئیں تو میں نے انہیں پہچان لیا جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے تمام نام جان لیے تھے''۔

میں نے کہا: سورۃ الانعام کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ ہر انسان کو اس قطعہ زمین کی مٹی سے پیدا کیا جاتا ہے جس میں اسے دفن کیا جاتا ہے۔ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ یہ جنین کی جمع ہے اس سے مراد وہ بچہ ہے جب تک پیٹ میں ہوتا ہے۔ اسے جنین اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مکحول نے کہا: ہم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین تھے تو ہم میں سے گر گیا جو گر گیا اور ہم باقی رہنے والوں میں سے ہیں پھر ہم دودھ پینے والے بچے ہو گئے تو ہم میں سے ہلاک ہو گیا جو ہلاک ہو گیا اور ہم باقی رہنے والوں میں سے ہو گئے پھر ہم قریب البلوغ ہوئے تو ہلاک ہوا جو ہلاک ہوا تو ہم باقی رہنے والوں میں سے ہوئے پھر ہم جوان ہو گئے تو ہلاک ہوا جو ہلاک ہوا اور ہم باقی رہنے والوں سے ہوئے پھر ہم بوڑھے ہو گئے تیرا باپ نہ رہے اس کے بعد ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟

ابن لہیعہ نے حرث بن یزید سے وہ ثابت بن حرث انصاری سے روایت نقل کرتے ہیں: جب یہودیوں کا کوئی چھوٹا بچہ فوت ہوتا تو وہ کہتے: وہ صدیق ہے۔ یہ قول نبی کریم ﷺ تک پہنچا فرمایا: ''یہودیوں نے جھوٹ بولا ہے جس بچے کو اللہ تعالیٰ اس کی ماں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے تو وہ شقی ہوتا ہے یا سعید ہوتا ہے'' (2)۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ان کی مدح نہ کرو اس کی ثنا نہ کرو کیونکہ یہ طریقہ ریا سے دور اور خشوع کے زیادہ قریب ہے۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ یہ عمل کو زیادہ خالص کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچانے والا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر نفس کے بارے میں آگاہ تھا کہ وہ کیا عمل کرنے والا ہے اور کس طرف جانے والا ہے (3)؟ سورۂ نساء میں اس آیت کے معنی کے بارے میں کلام گزر چکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ (النساء: 49) اسے وہاں پڑھ لیں۔ حضرت ابن عباس

1۔ بعض نسخوں میں هل كان خلق احد کی جگہ كان احد ہے اور بعض میں هل كان قبله احد کیا ان سے پہلے بھی کسی انسان کو تخلیق کیا گیا۔

2۔ اسباب النزول للواحدی، سورۂ والنجم، صفحہ 332　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 402

رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ اس امت کے کسی فرد کا میں تزکیہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝

''کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا جس نے روگردانی کی اور تھوڑا سا مال دیا پھر کنجوس بن گیا۔ کیا اس کے پاس علم غیب ہے اور وہ دیکھ رہا ہے''۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝ جب اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کرنے میں مشرکین کی جہالت کو بیان کیا تو ان میں سے ایک معین شخص کو اس کے برے فعل کے ساتھ ذکر کیا۔ مجاہد، ابن زید اور مقاتل نے کہا: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی (1) اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی اتباع کی تو بعض مشرکوں نے اسے عار دلائی اور کہا: تو نے اپنے آباء کے دین کو کیوں چھوڑ دیا، انہیں گمراہ قرار دیا اور تو نے گمان کیا کہ وہ جہنم میں ہیں؟ اس نے کہا میں اللہ کے عذاب سے ڈر گیا ہوں۔ تو اس مشرک نے کہا: اگر وہ اپنے مال میں سے کچھ اسے دے دے اور شرک کی طرف واپس لوٹ آئے تو وہ وحید کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اٹھا لے گا۔ ولی نے اپنے مال میں سے کچھ اسے دیا جس نے ضمانت اٹھائی پھر بخل سے کام لیا اور مال کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

مقاتل نے کہا: ولید نے قرآن کی تعریف کی پھر تعریف کرنے سے رک گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا وَاَعْطٰى قَلِيْلًا یعنی اپنی زبان سے کچھ بھلائی کی (2)۔ وَّاَكْدٰى یعنی اسے قطع کر دیا اور اس سے رک گیا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایمان کا عہد دیا پھر منہ پھیر لیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى۔

حضرت ابن عباس، سدی، کلبی اور مسیب بن شریک نے کہا: یہ آیت حضرت عثمان بن عفان کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ بھلائی کے کاموں میں مال صدقہ کرتے اور خرچ کیا کرتے تھے آپ کو ان کے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح نے کہا: یہ تم کیا کرتے ہو؟ ممکن ہے کوئی چیز آپ کے لیے باقی نہ بچے۔ حضرت عثمان غنی نے کہا: میرے گناہ اور خطائیں ہیں جو کچھ میں کرتا ہوں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتا ہوں اور اس کی معافی کی امید رکھتا ہوں۔

حضرت عبداللہ نے انہیں کہا: اپنی اونٹنی اس کے کجاوے کے ساتھ مجھے دے دو میں تیری جانب سے تمام گناہ اٹھا لوں گا۔ حضرت عثمان نے اسے وہ اونٹنی عطا کر دی اور اس پر گواہ بنا لیا اور جو صدقہ کیا کرتے تھے اس میں سے بعض سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہی فضل واحسان دوبارہ شروع کر دیا؛ واحدی اور ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے (3)۔ سدی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت عاص بن وائل سہمی کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ وہ کبھی کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موافقت کیا کرتا تھا (4)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: یہ آیت ابوجہل بن ہشام کے بارے میں نازل ہوئی اس نے کہا: اللہ کی قسم! (حضرت) محمد مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى کا یہی مفہوم ہے۔ ضحاک نے

---

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 333
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 254
3۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 206
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 402

کہا: مراد نضر بن حرث ہے (1) جب وہ اپنے دین سے مرتد ہوا تو اس نے مہاجرین میں سے ایک فقیر کو پانچ اونٹنیاں دیں اور اس سے ضمانت لی کہ دین چھوڑنے کا بوجھ وہ مہاجر اٹھائے گا۔ اَکْدٰی کا اصل کدیۃ ہے یہ اس کے لیے بولا جاتا ہے جو ایک کنواں کھودنے لگے پھر ایسے پتھر تک جا پہنچے جس کا کھودنا اس کے لیے ممکن نہ ہو قد اکدی پھر عرب اس لفظ کو اس آدمی کے لیے استعمال کرنے لگے جو عطا کرے اور پورا نہ کرے اور جو کسی شے کو طلب کرے اور اس کے آخر تک نہ پہنچے؛ حطیہ نے کہا:

فأعطى قليلًا ثم أكدى عطاءه　　ومن يبذلِ المعروفَ في النّاسِ يُحمَد

اس نے تھوڑا دیا پھر اپنے عطیہ کو روک لیا جو مال خرچ کرتا ہے لوگوں میں اس کی تعریف کی جاتی ہے۔

کسائی اور دوسرے علماء نے کہا: اکدی الحافر و أجبل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ کھودنے میں پتھر یا پہاڑ تک جا پہنچے اب اس کو کھودنا ممکن نہ ہو۔ یہ جملہ بولتے ہیں: حفر و اکدی جب وہ سخت جگہ تک جا پہنچے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کدیت أصابعه جب وہ کھودنے سے تھک جائیں۔ و کدیت یدہ جب اس کا ہاتھ تھک جائے اور کچھ کام نہ کرے۔ اکدی النبت بڑھوتری کم ہو جائے۔ کدت الأرض تکدو کدوا و کُدوا فھی کادیۃ جب وہ دیر سے نباتات اگائے۔ ابوزید سے مروی ہے: أکدیت الرجل عن الشئ میں نے اسے اس چیز سے لوٹا دیا۔ أکدی الرجل جب اس کی بھلائی کم ہو جائے۔

**وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى ﴿۳۴﴾** یعنی تھوڑا دینا بھی ختم کر دیا۔

**اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾** کیا اس کم کرنے والے کے پاس اس چیز کا علم ہے جو عذاب اس سے غائب ہے **فَهُوَ يَرٰى** یعنی آخرت کا امر جو اس سے غائب ہے اسے وہ جانتا ہے کہ وہ غیر کے عذاب کو اٹھانے کا ضامن بن رہا ہے اتنی جہالت اور حماقت ہی کافی ہے یہ فعل رؤیت دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے جب کہ دونوں مفعول محذوف ہیں گویا فرمایا: وہ غیب کو شہادت کی طرح دیکھتا ہے۔

**اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾**

”کیا وہ آگاہ نہیں ہوا جو موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں جو پوری طرح احکام بجالائے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش کا نتیجہ جلد نظر آ جائے گا پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ سب کو آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے“۔

**اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴿۳۷﴾** لفظ ابراہیم سے پہلے صحف کا لفظ محذوف ہے جس طرح سورۂ اعلیٰ میں ہے **صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾** یعنی کسی نفس کو دوسرے نفس کے بدلہ میں نہیں پکڑا جائے گا جس طرح فرمایا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 402

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان آدمی کو اپنے بھائی، اپنے بیٹے اور اپنے باپ کے بدلے میں پکڑ لیا جاتا تھا؛ یہ ہذیل بن شرحبیل نے کہا ہے۔ ان یہ مثقلہ سے مخففہ ہے اس کا محل جر ہے کیونکہ یہ ما کا بدل ہے یا یہ محل رفع میں ہے کیونکہ ھو ضمیر مضمر ہے۔

سعید بن جبیر اور قتادہ نے وفی پڑھا یعنی شد کے بغیر پڑھا۔ اس کا معنی ہے وہ اپنے قول اور عمل میں سچا ہے۔ یہ جماعت کی قرأت کی طرف راجع ہے جو وفی ہے یعنی اس پر جو فرض کیا گیا اس نے ان سب کو ادا کیا اس نے ان میں سے کسی چیز کو نہ چھوڑا۔ یہ سورۂ بقرہ آیت 124 میں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ میں گزر چکی ہے۔ توفیہ کا معنی مکمل کرنا ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا: جس امر کا دعوی کیا اس کی شرط کو ادا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (بقرہ) اللہ تعالیٰ نے ان سے اس کے دعوی کی صحت کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے مال، اولاد، ذات میں آزمایا تو انہیں پورا کرنے والا پایا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى ﴿۳۷﴾ کا یہی مفہوم ہے یعنی اسلام کا دعوی کیا پھر اپنے دعویٰ کو سچ کر دکھایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے ہر روز دن کے شروع میں چار رکعات ادا کر کے اپنے عمل کو پورا کیا (1)۔ ہثیم نے اسے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے۔

سہل بن سعد ساعدی نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے: کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم کو اس صفت کے ساتھ کیوں ذکر کیا الَّذِیْ وَفّٰۤى کیونکہ وہ صبح اور شام کو کہا کرتے تھے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ (الروم) سہیل بن معاذ نے یہ حضرت انس سے وہ اپنے باپ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَفّٰۤى سے مراد ہے جس کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا ہے اس کو پورا کیا۔ وہ یہ فرمان ہے: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ایک آدمی کو غیر کے گناہ کے بدلے میں پکڑ لیا کرتے تھے قتل اور زخم لگانے کی صورت میں وہ ولی کو ولی کے بدلے میں پکڑ لیتے تھے (2)۔ ایک آدمی کو اس کے باپ، اس کے بیٹے، اس کے بھائی، اس کے چچا، اس کے ماموں، اس کے چچا زاد بھائی، اس کے قریبی رشتہ دار، اس کی بیوی، اس کے خاوند اور اس کے غلام کے بدلے میں پکڑ لیا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾

حضرت حسن بصری، قتادہ اور سعید بن جبیر نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَفّٰۤى کے بارے میں کہا: جو آپ کو حکم دیا گیا اس پر عمل کیا اور اپنے رب کے پیغامات کو پہنچایا (3)۔ یہ تعبیر بہت اچھی ہے کیونکہ یہ عام ہے: مجاہد نے بھی اسی طرح کہا ہے: جو آپ پر

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 427 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 205 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 88

فرض کیا گیا اس کو پورا پورا ادا کیا (1)۔ ابو مالک غفاری نے کہا: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ سے لے کر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ تک حضرت ابرہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں ہے۔ سورۂ انعام آیت 164 کے آخر میں وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے (2) کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الطور: 21) کے ساتھ منسوخ ہے قیامت کے روز چھوٹا بچہ اپنے میزان کے پاس موجود ہوگا اللہ تعالیٰ آباء کو بیٹوں کے حق میں اور بیٹوں کو آباء کے حق میں شفیع بنا لے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (النساء: 11)

اکثر علماء تاویل نے کہا: یہ آیت محکم ہے کسی کو دوسرے کا عمل نفع نہ دے گا۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے نماز نہیں پڑھے گا۔ امام مالک نے روزہ، حج اور صدقہ میت کی جانب سے جائز قرار نہیں دیا مگر آپ نے کہا: اگر اس نے حج کی وصیت کی اور فوت ہوگیا تو اس کی جانب سے حج کرنا جائز ہے۔ امام شافعی اور دوسرے علماء نے میت کی جانب سے نفلی حج کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بھائی حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی جانب سے اعتکاف کیا اور ان کی طرف سے غلام آزاد کیا۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: میری ماں فوت ہوگئی ہے کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ عرض کی: کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: ''پانی پلانا'' (3) یہ تمام بحث سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ اعراف میں مفصل گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یہاں لام مجرور ہے عربی زبان میں اس کا معنی ملکیت اور ثابت کرنا ہے انسان کے لیے وہی ثابت ہوتا ہے جو وہ کوشش کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ بچوں کو عمل کے بغیر جنت میں داخل فرماتا ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یہ حکم کافر کے لیے ہے (4) جہاں تک مومن کا تعلق ہے اس کے لیے اس کا اپنا عمل اور غیر کا اس کے لیے عمل ہے۔

میں کہتا ہوں: بے شمار احادیث اس قول پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو غیر کی جانب سے عمل صالح کا ثواب پہنچتا ہے جو آدمی غور و فکر کرتا ہے اس کے لیے ان میں سے کثیر روایات گزر چکی ہیں۔ صدقہ میں کوئی اختلاف نہیں جس طرح حضرت عبداللہ بن مبارک سے مسلم شریف نے شروع میں روایت گزری ہے۔ صحیح میں ہے: ''جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے صرف تین عمل باقی رہتے ہیں (5) اس میں ایک یہ ہے یا نیک بچہ جو اس کے حق میں دعا کرتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل و احسان ہے، جس طرح کئی گنا بدلہ دینا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اللہ تعالیٰ ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 205
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، فضل الصدقة عن الميت، ذكر الاختلاف على سفيان، جلد 2، صفحہ 133
4۔ المحرر الوجیز جلد 5، صفحہ 206
5۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیة، ما یلحق الانسان من الثواب، جلد 2، صفحہ 41

لے کر سات سو گنا اور دس لاکھ تک اجر لکھتا ہے، جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر دس لاکھ نیکیوں کا اجر عطا فرماتا ہے؟ فرمایا: میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیوں کا اجر عطا فرماتا ہے''۔ یہ فضل و احسان ہے اور عدل کا اسلوب وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال موجود ہے وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یہ صرف برائی کے ساتھ خاص ہو کیونکہ مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو میں اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لیتا ہوں اگر وہ اس پر عمل کرے تو میں اس کے حق میں دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک لکھ لیتا ہوں اور جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں لکھتا اگر وہ اس پر عمل کرے تو میں صرف ایک برائی لکھتا ہوں'' (1)۔ ابوبکر وراق نے کہا: اِلَّا مَا سَعٰى کا معنی ہے مگر جس کی وہ نیت کرے۔ اس کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں ہے: يبعث الناس يوم القيامة على نياتهم لوگوں کو قیامت کے روز ان کی نیتوں پر اٹھایا جائے گا۔

وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز اس کی جزا دکھائے گا۔

ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝ پھر اسے پورا پورا بدلہ دے گا۔ اخفش نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے جزيته الجزاء و جزيته بالجزاء دونوں جملے ایک جیسے ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

إن أجزِ عَلْقَمَة بنَ سعْدٍ سَعْيَه لم أَجْزِهِ بِبَلاءِ يَوْمٍ وَاحِدٍ(2)

اگر میں علقمہ بن سعد کو اس کے عمل کی جزا دوں تو میں ایک دن کے امتحان کا بدلہ اسے نہ دے سکوں گا۔

اس شعر میں دونوں لغتوں کو جمع کر دیا ہے۔

وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ منتهى سے مرجع، مرد اور مصدر مراد ہے یعنی لوٹنے کی جگہ پس وہ سزا دے گا یا بدلہ دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسی کی جانب سے احسان کا آغاز ہے اور اسی کے ہاں امان کی انتہا ہے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى کے بارے میں فرمایا: ''رب العالمین کی ذات میں کوئی سوچ و بچار نہیں ہو سکتی'' (3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو رک جا'' (4)۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے وہ کہتا ہے فلاں کو کس نے پیدا کیا فلاں کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ اس مقام تک پہنچ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، اذاهم العبد بحسنة، جلد 1، صفحہ 78
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 255
3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 255
4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 207

جائے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو اور رک جاؤ'' (1)۔ سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ جس نے کہا کتنا اچھا کہا:

ولا تُفکِرنَ فی ذِی العُلَا عَزَّ وجھُہٗ فانّکَ تُردَی اِنْ فعلتَ و تُخْذَلُ

ودونَك مصنوعاتِہ فاعتَبِربِھا وقُلْ مِثلَ ما قال الخلِیلُ المبَجَّلُ

صاحب عظمت جس کی ذات غالب ہے اس میں غور وفکر نہ کر اگر تو نے ایسا کیا تو تجھے ہلاک کر دیا جائے گا اور رسوا کر دیا جائے گا اس کی مصنوعات کو لو اور اس کے ساتھ عبرت حاصل کرو اسی طرح کہو جس طرح ذی شان خلیل نے کہا۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ۙ﴿۴۳﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْیَا ۙ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ۙ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾

''اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور رلاتا ہے اور یہ کہ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے اور یہ کہ اس نے پیدا فرمائیں دونوں قسمیں نر اور مادہ وہ بھی ایک بوند سے جب ٹپکتی ہے''۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ﴿۴۳﴾ واسطے ختم ہو گئے اور حقائق اللہ تعالیٰ کے لیے باقی رہ گئے اس کے سوا کوئی فاعل نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: نہیں اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میت کو کسی کے رونے سے عذاب ہوتا ہے (2) بلکہ فرمایا: اللہ تعالیٰ کافر کے حق میں اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی رلاتا ہے اور ہنساتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے جو ہنس رہے تھے۔ فرمایا: ''اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے'' (3)۔ حضرت جبرئیل امین آپ کے پاس آئے پھر کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو فرماتا ہے: وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان صحابہ کے پاس واپس تشریف لائے فرمایا: ''میں چالیس قدم بھی نہیں چلا تھا یہاں تک کہ جبرئیل امین میرے پاس حاضر ہوئے اور کہا ان کے پاس جایئے انہیں کہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے'' یعنی ہنسنے اور رونے کے اسباب کا فیصلہ کر دیا۔

عطا بن ابی مسلم نے کہا: اسی نے خوشی عطا کی اور اسی نے غمگین کیا کیونکہ خوشی ہنسنے کا باعث ہوتی ہے اور غم رونے کو لاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہنسا کرتے تھے؟ فرمایا: ہاں۔ اللہ کی قسم! ایمان ان کے دلوں کو مضبوط پہاڑوں سے زیادہ راسخ کر دیتا تھا (4)۔

سورۂ نمل اور سورۂ براءت میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کو جنت میں ہنسایا اور جہنمیوں کو جہنم میں رلایا (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جسے چاہا دنیا میں اسے ہنسایا یعنی اسے خوش کیا اور جس کو چاہا اسے رلایا یعنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، الوسوسۃ فی الایمان، جلد 1، صفحہ 79

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، المیت یعذب ببکاء اھلہ، جلد 1، صفحہ 303

3۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 334

4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 256

5۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 89

اسے غم دیا۔ ضحاک نے کہا: زمین کو نباتات کے ذریعے ہنسایا اور آسمان کو بارش کے ذریعے رلایا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: درختوں کو کلیوں کے ساتھ ہنسایا اور بادلوں کو بارش کے ساتھ رلایا۔ حضرت ذوالنون نے کہا: مومنوں اور عارفین کے دلوں کو اپنی معرفت کے سورج کے ساتھ ہنسایا اور نافرمانوں کو ناراضگی کے ساتھ رلایا۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا: مومن کو آخرت میں ہنسایا اور اسے دنیا میں رلایا۔ بسام بن عبداللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کے دانتوں کو ہنسایا اور ان کے دلوں کو رلایا اور یہ شعر پڑھا:

السِّنُّ تَضْحَكُ والأحشاءُ تَحْتَرِقُ وانما ضِحْكُها زُورٌ و مُخْتَلَقُ

يا رُبَّ باكٍ بِعَيْنٍ لا دموع لها ورُبَّ ضاحِكِ سنٍّ مابِهِ رَمَقُ

دانت ہنستے ہیں اور انتڑیاں جلتی ہیں بے شک ہنسا جھوٹ و بناوٹی ہے۔ کتنے ہی ایسی آنکھ سے روتے ہیں جن کے آنسو نہیں ہوتے کتنے ہی دانتوں سے ہنستے ہیں جن میں زندگی کی رمق نہیں ہوتی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانوں سے انسان کو ہنسنے اور رونے کے ساتھ خاص کیا ہے انسان کے علاوہ کوئی ہنستا اور روتا نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صرف بندر ہنستا ہے روتا نہیں اور صرف اونٹ روتا ہے ہنستا نہیں۔ یوسف بن حسین نے کہا: طاہر مقدسی سے پوچھا گیا کیا فرشتے ہنستے ہیں؟ جواب دیا: وہ اور عرش کے نیچے جو کچھ ہے جب سے جہنم کو پیدا کیا گیا ہے وہ نہیں ہنسے۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْيَا ﴿۴۴﴾ اس نے موت اور حیات کے اسباب کا فیصلہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: موت و حیات کو پیدا کیا جس طرح فرمایا الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ (ملک: 2) یہ ابن بحر کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافر کو کفر کے ساتھ موت دی اور مومن کو ایمان کے ساتھ زندہ کی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام: 122) فرمایا: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (الانعام: 36) جس طرح پہلے گزر چکا ہے؛ عطا کا قول بھی اسی طرف لوٹتا ہے، اپنے عدل کے ساتھ مارا اور اپنے فضل کے ساتھ زندہ کیا۔ اور اس کا قول بھی اسی طرف لوٹتا ہے مال روکنے اور بخل کرنے کے ساتھ موت دی اور سخاوت اور مال خرچ کرنے کے ساتھ زندہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نطفہ کو موت دی اور روح کو زندہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: آباء کو موت دی اور بیٹوں کو زندہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: حیات سے مراد سرسبزی اور موت سے مراد خشک سالی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نیند دی اور بیدار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: دنیا میں موت دی اور دوبارہ اٹھانے کے لیے زندہ کیا۔

وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے یہاں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء مراد نہیں کیونکہ مذکر و مؤنث نطفہ سے پیدا کیے گئے ہیں (جب کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی تخلیق نطفہ سے نہیں ہوئی) نطفہ سے مراد قلیل پانی ہے یہ نطف الماء سے مشتق ہے جب وہ قطرہ بن کر گرے۔ تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ جسے رحم میں ٹپکایا جاتا ہے اور بہایا جاتا ہے۔ کلبی، ضحاک اور عطا بن ابی رباح نے کہا یہ جملہ کہا جاتا ہے: منی الرجل و أمنی (3)۔ مَنِيّ سے مشتق

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 256 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 404 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 405

ہے منی کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں خونوں کو بہایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمنی کا معنی ہے (1) اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے؛ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مَنَیتُ الشیء جب تو اس کا اندازہ لگائے منی لہ اسے مقدر کیا گیا؛ شاعر نے کہا:

حَتّٰی تُلَاقِیْ مایَمْنِی لَكَ الْمَانِي

یہاں تک کہ تو اسے ملے جسے قادر نے تیرے لیے مقدر کیا ہے۔

وَ اَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ﴿۴۷﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَ اَقْنٰی ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰی ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰی ﴿۵۱﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰی ﴿۵۲﴾ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی ﴿۵۵﴾

"اور یہ کہ اسی (اللہ تعالیٰ) کے ذمہ ہے دوسری بار پیدا فرمانا اور یہ کہ وہی غنی کرتا ہے اور مفلس بناتا ہے اور یہ کہ وہی شعری (ستارے) کا رب ہے اور یہ کہ اسی نے ہلاک کیا عاد اول (قوم ہود) اور ثمود کو بھی پھر کسی کو نہ چھوڑا اور (ہلاک کیا) قوم نوح کو ان سب سے پہلے وہ بڑے ظالم اور سرکش تھے اور (لوط کی) اوندھی بستی کو بھی پٹخ دیا پس ان پر چھا گیا جو چھا گیا پس (اے سننے والے بتا) تو اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائے گا"۔

وَ اَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ﴿۴۷﴾ جب روحوں کو جسموں میں لوٹایا جائے گا تاکہ انہیں اٹھایا جائے۔ ابن کثیر اور ابوعمرو نے النَّشَاءَةَ شین کے فتحہ اور الف ممدودہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے یہ وعدہ کیا اور اس کا وعدہ سچا ہے۔ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَ اَقْنٰی ﴿۴۸﴾ ابن زید نے کہا: جس کو چاہا غنی کر دیا اور جس کو چاہا فقیر بنا دیا (2)، پھر اس آیت کو پڑھا یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ (سبا: 39) اور اس آیت کی تلاوت کی یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ (البقرہ: 245) طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ ابن زید سے یہ بھی مروی ہے اور مجاہد، قتادہ اور حسن بصری نے یہ کہا ہے: اَغْنٰی یعنی اسے مالدار بنا دیا (3)، اقنی اسے خادم بنا دیا (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَقْنٰی تمہارے لیے مال بنایا ہے جسے تم کماتے ہو اس کا معنی خادم بنانا بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جو عطا کیا اس پر راضی کیا یعنی اسے غنی کیا پھر جو عطا کیا اس کے ساتھ راضی کیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: قَنِی الرجل یَقْنِی قنی جس طرح غَنِیَ یَغْنِی غنی ہے۔ اقناہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا کیا جسے ذخیرہ کیا جاتا ہے یعنی مال اور چاندی۔ اقناہ اللہ یعنی اسے راضی کیا۔ قنی کا معنی رضا ہے، یہ ابوزید سے مروی ہے عرب کہتے ہیں جسے سو بکریاں عطا کی گئیں تو اسے قنی عطا کیا گیا؛ جسے سو بھیڑیں دی گئیں اسے غنا دی گئی، جسے سو اونٹ دیئے گئے تو اسے منی دیا گیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اغناہ اللہ و اقناہ اسے وہ چیز عطا کی گئی جس سے وہ سکون حاصل کرتا ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 257　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 405　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 89

ایک قول یہ کیا گیا: اَغْنٰی وَ اَقْنٰی اس کی ذات کو غنی کیا اور اپنی مخلوق کو اس کا محتاج بنا دیا (1)؛ یہ سلیمان تیمی نے کہا۔ سفیان نے کہا: قناعت کے ساتھ غنی کیا اور رضا کے ساتھ سکون عطا کیا (2)۔ اخفش نے کہا: اقنی یعنی محتاج کیا۔ ابن کیسان نے کہا: اسے اولاد دی۔ یہ قول تمام پہلے اقوال کی طرف راجع ہے۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ شعری ایسا روشن ستارہ ہے جو جوزاء کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اس کا طلوع سخت گرمی میں ہوتا ہے۔ دونوں شعری ہیں عبور جو جوزاء میں ہوتا ہے شعری غمیصاء جو ذراع میں ہوتا ہے۔ عرب گمان کرتے ہیں کہ یہ دونوں سہیل کی بہنیں ہیں۔ یہ ذکر کیا کہ وہ شعری کا رب ہے اگرچہ وہ دوسروں کا بھی رب ہے کیونکہ عرب شعری کی تعظیم بجالاتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ شعری رب نہیں مربوب ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ کون اس کی عبادت کرتا تھا؟ سدی نے کہا: حمیر اور خزاعہ قبیلہ اس کی عبادت کرتا تھا۔ دوسرے علماء نے کہا: سب سے پہلے جس نے اس کی عبادت کی وہ ابو کبشہ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امہات کی جانب سے اجداد میں شامل تھا اس وجہ سے قریش کے مشرکوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن ابی کبشہ کا نام دیا جب آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور ان کے دینوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا: ہم نے ابن ابی کبشہ سے کیا پایا ہے؟ ابوسفیان نے فتح مکہ کے روز کہا تھا جب کہ وہ ایک تنگ راستہ میں کھڑا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر اس کے پاس سے گزر رہے تھے: لقد أمر أمر ابن ابی کبشہ ابن ابی کبشہ کا امر قوی ہوگیا۔ جو عرب شعری کی پوجا نہ کرتے تھے وہ اس کی تعظیم کرتے اور عالم میں اس کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے تھے؛ شاعر نے کہا:

مضَى أَيْلُولُ وارتفعَ الحَرُورُ وأَخْبَتْ نارَها الشِّعرى العَبُورُ (3)

ماہ ستمبر گزر گیا اور گرمی ختم ہوگئی اور شعری عبور نے اس کی آگ کو بجھا دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عرب اپنی خرافات میں کہتے ہیں کہ سہیل اور شعری میاں بیوی تھے۔ سہیل نیچے اترا تو وہ یمانی ہو گیا شعری عبور نے اس کا پیچھا کیا اور کہکشاں کو عبور کیا تو اس کا نام عبور ہوگیا۔ غمیصاء کھڑی ہوئی اور سہیل کے گم ہونے پر وہ روئی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں کیچڑ بہانے لگیں تو اس کا نام غمیصاء ہوگیا کیونکہ یہ دوسرے سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔ وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ࣙالْاُوْلٰى ۝ اس کا نام اولی رکھا کیونکہ یہ ثمود سے پہلے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ثمود، ثماد سے پہلے تھے۔ ابن زید نے کہا: اسے عاد اولی کہا گیا کیونکہ یہ پہلی امت تھی جو حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہلاک ہوگئی۔ ابن اسحاق نے کہا: وہ دونوں عاد تھیں پہلی قوم عاد کو ریح صرصر (شدید ہوا) سے ہلاک کیا گیا پھر دوسری قوم عاد تھی اسے چیخ کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: عاد اولی وہ عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح تھی اور دوسری عاد، عاد اولی کی اولاد میں سے تھی۔ معنی قریب قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: دوسری قوم عاد جبارون تھے وہی قوم ہود تھی۔ عام قرأت عادا اولی ہے یعنی تنوین اور ہمزہ کو واضح کیا گیا ہے۔ نافع، ابن محیصن اور ابوعمرو نے عادا الاولی پڑھا ہے یعنی ہمزہ کی حرکت لام کو دی اور نون تنوین کو اس میں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 405 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مدغم کر دیا مگر قانون اور سوسی دونوں ساکن ہمزہ کو ظاہر کرتے تھے باقی قراء نے قاعدہ کے مطابق واؤ سے بدل دیا تب عرب اس قلب کو الٹ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: قُم لَانَ عَنّا وصم لثنین اصل میں قُم الآن وَصُم الاثنین ہے۔

**وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى** ان کے ثمود، قوم صالح تھی انہیں چیخ کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ اسے ثمودًا اور ثمودَ پڑھا گیا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ عاد پر عطف کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا گیا ہے۔ **وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ** یعنی عاد و ثمود سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا۔ **اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى** اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام طویل عرصہ تک ان کے درمیان رہے یہاں تک کہ ایک آدمی اپنے بیٹے کے ہاتھ کو پکڑتا اور حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاتا اور بیٹے کو کہتا: اس سے محتاط رہنا کیونکہ یہ جھوٹا ہے کیونکہ میرا باپ مجھے اس کے پاس لے گیا تھا اور اس نے مجھے وہی بات کی تھی جو میں نے تجھے کہی ہے تو بڑا کفر پر مرجاتا، چھوٹا اپنے باپ کی وصیت پر پروان چڑھتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضمیر عاد، ثمود اور قوم نوح میں سے جس کا ذکر کیا گیا ہے اس کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی وہ عربوں کے مشرکوں سے زیادہ کافر اور سرکش تھے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے گویا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تو بھی صبر کر اچھا انجام آپ کے لیے ہے۔

**وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى** حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے شہر ان پر الٹ گئے ان کا اوپر والا حصہ نیچے والا حصہ بن گیا۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: اَفَكْتَهٗ تو نے اسے الٹ دیا اور تو نے اسے پھیر دیا۔ اھوی ان بستیوں کو آسمان کی طرف اٹھانے کے بعد انہیں دھنسا دیا۔ حضرت جبریل امین نے انہیں اٹھایا پھر انہیں زمین کی طرف گرا دیا۔ مبرد نے کہا: انہیں گرنے والا بنا دیا۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: ھوی یھوی ھویا یعنی وہ گر گیا۔ اَھوی یعنی اسے گرا دیا۔

**فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى** انہیں پتھروں سے چھپا دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ** (ہود: 82) ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر تمام امتوں کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی انہیں عذاب نے ڈھانپ لیا۔ یہاں عذاب کو مبہم ذکر کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو ایسے عذاب سے ہلاک کیا گیا جو اس عذاب سے مختلف تھا جس عذاب سے دوسری قوم کو ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ انداز امر کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے۔

**فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى** تم اپنے رب کی کون سی نعمتوں میں شک کرتے ہو۔ خطاب جھٹلانے والے انسان کو ہے۔ اٰلَآء سے مراد نعمتیں ہیں اس کا واحد اَلًی، اِلًی اور اِلْیٌ ہے یعقوب نے تماری پڑھا ہے دو تاؤں میں سے ایک کو دوسری میں ادغام کیا اور اسے مشدد پڑھا۔

**هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ۝ وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ۝**

"یہ ڈرانے والا (رسول عربی) بھی پہلے ڈرانے والوں کی طرح ہے۔ قریب آنے والی قریب آگئی۔ اللہ کے سوا اس کو کوئی ظاہر کرنے والا نہیں۔ بھلا کیا تم اس بات سے تعجب کر رہے ہو اور (بے شرموں کی طرح)

ہنس رہے ہو اور روتے نہیں اور تم نے کھیل مزاق بنا رکھا ہے۔ پس سجدہ کرو اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کی عبادت کیا کرو"۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ ابن جریج اور محمد بن کعب نے کہا: اس سے یہ ارادہ کیا ہے (1) کہ حضرت محمد ﷺ حق کے ساتھ خبردار کرنے والے ہیں جس کے ساتھ آپ سے پہلے انبیاء نے ڈرایا۔ اگر تم نے آپ کی اطاعت کی تو تم کامیاب ہو جاؤ گے بصورت دیگر تم پر وہی عذاب نازل ہوگا جو تم سے قبل رسولوں کو جھٹلانے والوں پر نازل ہوا۔ قتادہ نے کہا: مراد قرآن ہے یہ اس چیز کے ساتھ خبردار کرنے والا ہے جس کے ساتھ سابقہ کتابوں نے خبردار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے سابقہ امتوں کی جو خبریں دی ہیں کہ وہ ہلاک ہوئے یہ اس امت کو ڈرانا ہے کہ ان پر بھی وہی عذاب نازل ہو سکتا ہے جو ان قوموں پر عذاب نازل ہوا۔ نذر قوم عرب میں انذار کے معنی میں ہے جس طرح نکیر، انکار کے معنی میں ہے یعنی یہ تمہیں ڈرانا ہے۔ ابو مالک نے کہا: یہ سابقہ امتوں کے واقعات جن کے ساتھ تمہیں خبردار کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہیں۔ سدی نے کہا: مجھے ابو صالح نے خبر دی ہے یہ کلمات جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَ اِبْرٰهِيْمَ سے لے کر هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى تک سب حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ قیامت قریب ہوگئی۔ اسے آزفۃ کا نام دیا کیونکہ اس کے نزدیک یہ قریب ہی واقع ہوگی جس طرح فرمایا: يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ (المعارج) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے آزفہ کا نام دیا گیا کیونکہ یہ لوگوں کے قریب ہے اسے لوگوں کے قریب کیا تاکہ وہ اس کی تیاری کریں کیونکہ وہ امر جو واقع ہو کر رہنے والا ہوتا ہے وہ قریب ہوتا ہے جس طرح کہا: ازف الترحل کوچ قریب آگیا۔

صحاح میں ہے: أزف الترحل یأزف أزفا یعنی کوچ قریب آ گیا۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ قیامت قریب آ گئی۔ أزف الرجل فھو آزف، آزف یہ فاعل کا وزن ہے۔ متآزف القصیر وہی جو قریب ہو۔ ابو زید نے کہا: میں نے ایک بدو سے پوچھا: ما المحبنطئ؟ اس نے جواب دیا: المتکأکئ۔ میں نے پوچھا: ما المتکأکئ؟ اس نے جواب دیا: المتآزف میں نے پوچھا: ما المتآزف؟ اس نے جواب دیا: تو احمق ہے اور چلا گیا۔

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اسے پیچھے یا آگے کرنے والا نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: كَاشِفَةٌ کا معنی انکشاف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اسے ظاہر کرنے والا نہیں۔ كَاشِفَةٌ اسم ہے جو مصدر کے معنی میں ہے اس میں ھاء اسی طرح ہے جس طرح عاقبہ، عافیہ، داھیہ اور باقیہ میں ہے جس طرح عربوں کا قول ہے: مالفلان من باقیۃ یہاں باقیۃ بقاء کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کوئی بھی اسے نہیں لوٹائے گا، یعنی جب قیامت برپا ہوگی تو ان کے معبودوں میں سے کوئی اسے دور نہیں کرے گا اور اس کے سوا کوئی انہیں نجات نہیں دے گا۔ قیامت کو غاشیہ کا نام دیا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 406

ہے جب یہ غاشیہ ہے تو اس کا رد کرنا کشف ہوگا۔ اس تعبیر کی بنا پر کاشفہ مونث محذوف کی صفت ہوگی تقدیر کلام یہ ہوگی نفس کاشفة، فرقة کاشفة، حال کاشفة۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کاشفہ، کاشف کے معنی میں ہے۔ ھاء مبالغہ کے لیے ہے جس طرح راویة اور داھیة ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ اس سے مراد قرآن ہے۔ یہ استفہام توبیخ کے لیے ہے۔ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اس کو جھٹلاتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے، استہزاء کرتے ہوئے، ہنستے ہوئے اور وعید سے ڈرتے ہوئے روتے نہیں۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا بلکہ صرف آپ تبسم کرتے (1)۔

حضرت ابو ہریرہ نے کہا: جب اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ آیت نازل ہوئی تو اہل صفہ نے کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پھر وہ رونے لگے یہاں تک کہ ان کے آنسوان کے رخساروں پر بہہ پڑے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رونے کو سنا تو آپ کے ساتھ روتے اور ہم آپ کے رونے کی وجہ سے روئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یلج النار من بکی من خشیة الله ولا یدخل الجنة مصر علی معصیة الله ولولم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیغفر لهم ویرحمهم إنه هو الغفور الرحیم (2) جو آدمی اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے رویا وہ جہنم میں داخل نہیں ہوگا اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مصر رہا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے گا اور ایک ایسی قوم لے آئے گا جو گناہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا بے شک وہ غفور رحیم ہے۔

ابو حازم نے کہا: حضرت جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جب کہ ان کے پاس ایک آدمی رو رہا تھا۔ جبریل امین نے پوچھا: یہ کون ہے؟ فرمایا: "یہ فلاں ہے"۔ حضرت جبریل امین نے کہا: ہم انسان کے تمام اعمال کا وزن کرتے ہیں صرف رونے کا وزن نہیں کرتے بے شک اللہ تعالیٰ ایک آنسو سے جہنم کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔

وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ تم لاپرواہی کرنے والے اور اعراض کرنے والے ہو (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جیسے والبی اور عوفی نے آپ سے روایت کیا ہے عکرمہ نے ان سے روایت کیا حمیر کی لغت میں اس کا معنی گانا گانا ہے (4)؛ یہ جملہ کہا جاتا ہے: سَمِّدْ لنا ہمارے لیے گانا گاؤ جب وہ قرآن پڑھتے ہوئے سنتے تو وہ گانا گانا شروع کر دیتے اور کھیل کود میں شروع ہو جاتے تاکہ وہ اسے نہ سن سکیں۔ ضحاک نے کہا: سامدون کا معنی متکبر نہیں۔ صحاح میں ہے سمد سمودا اس نے تکبر کی وجہ سے اپنا سر اٹھایا۔ ہر سر اٹھانے والا سامد ہوتا ہے؛ شاعر نے کہا: سَوَامِدُ اللَّیْلِ خِفَافُ الْاَزْوَادْ

اس مصرعہ میں سوامد کا معنی سر اٹھانے والے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ان کے پیٹوں میں چارہ نہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: سمدتْ سمودا یعنی میں بلند ہوا۔ سمدتْ الابل فی سیرها اس نے تیزی دکھائی۔ السمود کا معنی لہو ولعب ہے السامد لہو ولعب کرنے والا۔ لونڈی کو کہا جاتا ہے: اَسْمِدِیْنَا نغمہ کے ساتھ ہمارا دل بہلاؤ۔ تسمیه الارض سے مراد ہے کہ اس میں کھاد

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 430 2۔ شعب الایمان، باب فی الخوف من الله تعالیٰ، جلد 1، صفحہ 489، حدیث 798

3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 258 4۔ ایضاً

ڈالی جائے۔ تسمید الرأس سے مراد ہے اس کے بالوں کو جڑ سے اکھیڑ دینا۔ یہ تسبید میں ایک لغت ہے۔ اسماد الرجل اسمئداداغصہ کی وجہ سے اس کا جسم سوج گیا۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سٰمِدُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ نماز پڑھے بغیر بیٹھتے ہیں اور نماز کا انتظار بھی نہیں کرتے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ امام کے کھڑا ہونے سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں(1)۔ ان سے ہی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپ نکلے تو لوگ کھڑے ہو کر انتظار کر رہے تھے فرمایا: مالی أراکم سامدین کیا وجہ ہے میں تمہیں کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے(2)۔ مہدوی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نماز کے لیے نکلے تو لوگوں کو کھڑے ہوئے انتظار کرتے ہوئے دیکھا فرمایا: مالکم سامدون؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔ لغت میں معروف یہ ہے سَمَدَ یَسْمُدُ سُمُوْدًا جب وہ لا پرواہی اور اعراض کرے۔ مبرد نے کہا: سامدون کا معنی ہے خامدون یعنی ٹھنڈے۔

صالح ابو خلیل نے کہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ کو پڑھا تو وصال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا گیا آپ صرف تبسم فرماتے تھے؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد سجدہ تلاوت ہے(3)؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے۔ سورت کے آغاز میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث گزر چکی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی ساتھ ہی سجدہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس لیے سجدہ کیا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ کی قرأت کی تو مشرکوں نے اس موقع پر شیاطین کی آوازوں کو سنا کہ آپ نے کہا: تلك الغرانیق العلی و شفاعتهن ترتجی۔ سعید بن جبیر کی روایت میں اسی طرح ترتجی ہے۔ ابو العالیہ کی روایت میں ہے و شفاعتهن ترتضی و مثلهن لا ینسی ہے مشرک اس سے خوش ہوئے انہوں نے گمان کیا کہ یہ بھی (حضرت) محمد کا قول ہے جس کی وضاحت سورۂ حج میں گزر چکی ہے۔ جب یہ خبر حبشہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو پہنچی تو وہ لوٹ آئے کیونکہ انہوں نے گمان کیا تھا کہ اہل مکہ ایمان لے آئے ہیں اہل مکہ نے ان پر سختی کی اور انہیں سخت اذیتیں دیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مصائب سے چھٹکارا دلایا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نماز میں فرض سجدہ ہے؛ یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے آپ اسے لازم سجدہ (سجدۂ تلاوت) خیال نہیں کرتے تھے؛ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا کہ آپ نے مفصل سورتوں میں سجدہ کرنے کو ترک کر دیا تھا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس کے بارے میں گفتگو سورۂ اعراف کے آخر میں مفصل گزر چکی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 407	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

# سورۃ القمر

آیاتہا ۵۵ ۔ سورۃ القمر مکیۃ ۳۷ ۔ رکوعاتہا ۳

جمہور کے قول کے مطابق تمام سورت مکی ہے۔ مقاتل نے کہا: مگر تین آیات مکی نہیں (1) اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ۝ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ۝ یہ قول صحیح نہیں جس طرح اس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ۝ وَ اِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَ یَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۝ وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ۝ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ۝ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَیْءٍ نُّكُرٍ۝ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ۝ مُّهْطِعِیْنَ اِلَى الدَّاعِ یَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا یَوْمٌ عَسِرٌ۝

”قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہوگیا۔ اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں یہ بڑا زبردست جادو ہے۔ اور انہوں نے جھٹلایا (رسول خدا کو) اور پیروی کرتے رہے اپنی خواہشات کی اور ہر کام کے لیے ایک انجام ہے۔ اور پہنچ چکی ہیں ان کے پاس (پہلی قوموں کی بربادی کی) اتنی خبریں جن میں بڑی عبرت ہے (وہ خبریں) سراسر حکمت ہیں پس ڈرانے والے نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا، پس آپ رخ انور پھیر لیجئے ان سے۔ ایک روز بلائے گا (انہیں) بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف، خوف سے ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی قبروں سے یوں نکلیں گے جیسے وہ پراگندہ ٹڈیاں ہیں، ڈرتے ڈرتے بھاگے جارہے ہوں گے بلانے والے کی طرف، کافر کہتے ہوں گے یہ بڑا سخت دن ہے“۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ۝ اِقْتَرَبَتْ یعنی قریب آگئی یہ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ۝ (النجم) کی مثل ہے جس طرح ہم نے اسے بیان کیا ہے جو وقت گزر گیا ہے اس کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر یہ قریب ہے کیونکہ دنیا کا اکثر وقت گزر چکا ہے جس طرح قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جب کہ سورج غروب ہوا چاہتا تھا (2) فرمایا: ”دنیا میں سے جو باقی ہے اس کی گزرے ہوئے وقت کے ساتھ وہی نسبت ہے جس طرح اس دن کے باقی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 408　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 211

ماندہ وقت کی گزرے ہوئے وقت کے ساتھ جو نسبت ہے''۔ ہم سورج کو تھوڑا ہی دیکھ رہے تھے۔ کعب اور وہب نے کہا: دنیا کا زمانہ چھ ہزار سال ہے۔ وہب نے کہا: ان میں سے پانچ ہزار چھ سو سال گزر چکے ہیں؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ یعنی قد انشق القمر چاند پھٹ چکا ہے۔ حضرت حذیفہ نے اسی طرح اقتربت الساعة وقد انشق القمر پڑھا ہے یعنی قد کو زائد کہا ہے جمہور علماء اسی پر ہیں۔ صحیح بخاری اور دوسری کتب میں حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت انس، حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت انس سے روایت مروی ہے: اہل مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ کا مطالبہ کیا تو مکہ مکرمہ میں چاند دو دفعہ پھٹا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَ اِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَ یَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (1) ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ بخاری کے ہاں حضرت انس سے یہ الفاظ مروی ہیں: چاند دو حصوں میں تقسیم ہو گیا (2)۔ ایک قوم نے کہا: ابھی تک چاند پھٹا نہیں بلکہ اس کے پھٹنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یعنی قیام قیامت اور چاند کا پھٹنا قریب ہے اور قیامت جب قائم ہو گی تو آسمان اور اس میں جو کچھ ہے سب پھٹ جائیں گے؛ قشیری نے یہی کہا ہے۔

ماوردی نے یہ ذکر کیا ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور کہا: جب وہ پھٹے گا تو ہر کوئی اسے دیکھ لے گا کیونکہ یہ ایک نشانی ہے اور لوگ نشانیوں میں برابر ہیں (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: قیامت قریب آ گئی جب وہ آ جائے گی تو چاند دوسرے نفخہ کے بعد پھٹ جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ کا معنی ہے امر واضح اور ظاہر ہو جائے گا۔ عرب اظہار امر کے لیے چاند کے ساتھ ضرب المثل بیان کرتے تھے؛ شاعر نے کہا:

أقیمُوا بَنی أمِّي صُدُورَ مَطِیِّکُمْ فإنّي إلی حَيٍّ سواکم لأمْیَلُ
فقد حُمَّتِ الحاجاتُ واللّیلُ مُقْمِرٌ وشُدَّت لِطِیَّاتٍ مَطایا وأرْحُلُ

اے میری ماں کے بیٹو! اپنی سواریوں کے سینے سیدھے کرو میں تمہارے سوا کسی اور قبیلہ کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہوں حاجات گرم ہیں اور رات روشن ہے اور سواریاں و کجاوے سفروں کے لیے تیار ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انْشَقَّ الْقَمَرُ سے مراد چاند سے تاریکی کا چھٹ جانا ہے جب وہ تاریکی کے دوران طلوع ہو جس طرح صبح کو فلق کہتے ہیں، کیونکہ اس سے تاریکی پھٹ جاتی ہے۔ بعض اوقات انفلاق کو انشقاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ نابغہ نے کہا:

فَلَمَّا أَدْبَرُوا وَلَهُمْ دَوِيٌّ دعانا عِند شَقِّ الصُّبْحِ داعِ

جب انہوں نے پیٹھ پھیر لی اور ان کی آواز آ رہی تھی تو صبح پھوٹنے کے وقت ایک بلانے والے نے ہمیں بلایا۔

میں کہتا ہوں: اخبار احاد جو عادل راویوں سے مروی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہے کہ چاند مکہ مکرمہ میں پھٹا۔ یہی اس

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 161 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قولہ وانشق القمر، جلد 2، صفحہ 722
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 409

آیت کا ظاہر معنی ہے یہ لازم نہیں آتا کہ لوگ اس میں برابر ہوں، کیونکہ یہ ایسا معجزہ ہے جو رات کو ظاہر ہوا تھا۔ یہ امر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ظاہر ہوا تھا جب چیلنج کیا گیا تھا۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حمزہ بن مطلب رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے کیونکہ ابوجہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی تھیں اس پر حضرت حمزہ غضب ناک ہوئے تھے تو انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا معجزہ دکھائیں جس کے ساتھ ان کے ایمان و یقین کا اضافہ ہو۔

صحیح میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چاند کو دو حصوں میں دکھایا (1)، جس طرح حضرت ابن مسعود اور دوسرے راویوں کی حدیث میں ہے۔

حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مدائن میں خطبہ دیا فرمایا: خبردار! قیامت قریب آ چکی ہے اور چاند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پھٹ چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی۔ انشق القمر واقتربت الساعۃ؛ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ فراء کا یہ قول گزر چکا ہے جب دو فعل معنی میں قریب قریب ہوں تو تجھے ان میں تقدیم و تاخیر کا حق ہوتا ہے یہی قاعدہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں جاری ہوتا ہے: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ (النجم)

وَ اِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے چاند کو پھٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے انہوں نے کہا اگر آپ سچے ہیں تو چاند کو دو حصوں میں پھاڑ دو۔ اس کا نصف ابی قبیس پر ہو اور نصف قعیقعان پر ہو (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''اگر میں ایسا کر دوں تو تم ایمان لے آؤ گے''۔ انہوں نے کہا: ہاں۔ چودھویں کی رات تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے سوال کیا کہ انہوں نے جو مطالبہ کیا وہ عطا فرما دے تو چاند دو حصوں میں پھٹ گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں کو ندا دے رہے تھے: ''اے فلاں! اے فلاں! گواہ رہنا''۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند پھٹ گیا (3)۔ قریش نے کہا: یہ ابن ابی کبشہ کا جادو ہے اس نے تم پر جادو کر دیا ہے اپنے قافلوں سے پوچھو۔ انہوں نے قافلہ والوں سے پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا: ہم نے چاند کو پھٹا ہوا دیکھا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مراد ہے اگر وہ کوئی ایسی آیت دیکھیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر دلیل ہو تو وہ ایمان لانے سے اعراض کر لیتے ہیں۔

وَ یَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وہ کہتے ہیں: یہ ایسا جادو ہے جو ختم ہو جانے والا ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے مر الشئ واستمر جب وہ ختم ہو جائے؛ یہ حضرت انس، قتادہ، مجاہد، فراء، کسائی اور ابو عبیدہ کا قول ہے؛ نحاس نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو العالیہ اور ضحاک نے کہا: وہ محکم، قوی اور شدید ہے۔ یہ مرۃ سے مشتق ہے جس کا معنی قوت ہے۔

اخفش نے کہا: یہ امرار الحبل سے ماخوذ ہے جس کا معنی سختی سے باٹنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے کڑوا۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر قولہ وانشق القمر، جلد 2، صفحہ 722 (معناً)

2۔ زاد المسیر، جلد 7، صفحہ 290

3۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 100

یہ مرارة سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے أمر الشیء صار مرا(1) اسی طرح یہ ہے مرا الشئ یمر مرارة فھو مرامرة غیرة و مرزة۔ ربیع نے کہا: مُّسْتَمِرٌّ کا معنی ہے نافذ۔ یمان نے کہا: معنی ہے گزر جانے والا۔ ابو عبیدہ نے کہا: معنی ہے باطل۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے ہمیشہ رہنے والا؛ اسی معنی میں مصرعہ میں یہ لفظ ہے

ولیس علی شیء قویم بمستمر

یعنی کوئی چیز دائمی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان میں سے بعض بعض کے مشابہ ہے یعنی (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اسی طریقہ پر جاری و ساری ہیں۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں لاتے جس کی کوئی حقیقت ہو بلکہ سب تخیلات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ زمین سے آسمان تک جا پہنچا ہے۔

وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ انہوں نے ہمارے نبی کو جھٹلایا اور اپنی گمراہیوں اور پسندیدہ چیزوں کی اتباع کی۔ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ یعنی ہر عامل کے ساتھ اس کا عمل برقرار ہوگا بھلائی، بھلائی کرنے والے کے ساتھ جنت میں ثابت ہوگی اور شر شر کرنے والے کے ساتھ جہنم میں قائم ہوگی۔

شیبہ نے قاف کے فتحہ کے ساتھ مستقر پڑھا ہے یعنی ہر شی کا وقت ہے جس میں بغیر تقدیم و تاخیر کے واقع ہوگا۔ ابو جعفر قعقاع سے مروی ہے۔ وکل أمر مستقر یعنی قاف اور راء مکسور ہے۔ اسے امر کی نعت بنایا ہے اس تعبیر کی بنا پر کل مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع اور خبر محذوف ہو۔ گویا فرمایا: ہر امر جوام الکتاب میں مثبت ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ الساعة پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہو۔ معنی ہوگا قیامت اور ہر ثابت شدہ امر قریب آ گیا ہے یعنی قیامت کے روز امور کا استقرار قریب آ گیا ہے۔ جس نے اسے رفع دیا ہے اس نے اسے کل کی خبر بنایا ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ یہاں مِّنَ بعضیہ ہے اللہ تعالیٰ نے خبروں میں سے ان کا ذکر کیا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ اس کے محتاج ہوں گے اور ان کے لیے اس میں شفاء ہے وہاں اس سے بھی زیادہ امور تھے۔ ہمارے اوپر ان کو ہی بیان کیا گیا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ہمیں اس کی حاجت ہے اور باقی سے خاموشی اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مقصود ہے۔ یعنی ان کفار تک سابقہ امتوں کی خبریں پہنچیں۔ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ جو انہیں کفر سے جھڑ کنے والی ہے اگر وہ اس کو قبول کریں۔ یہ اصل میں مزتجر تھا اس کی تاء کو دال سے بدل دیا۔ کیونکہ تاء حرف مھموس ہے اور زاء حرف مجہور ہے تاء کو دال سے بدل دیا کیونکہ یہ مخرج میں اس کے موافق ہے اور جہر میں زاء کے موافق ہے مُزْدَجَرٌ یہ زجر سے مشتق ہے جس کا معنی رک جانا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: زجرة أز دجرة فانزجر و أز دجر، زجرته أنا فانزجر یعنی میں نے اسے روکا تو وہ رک گیا۔ جس طرح شاعر نے کہا اور یہ لفظ سابقہ معنی میں مستعمل ہے:

فأصبح ما یطلبُ الغانیا ث مُزْدَجَر عن هواه ازدجارا

اسے مزدجرٌ پڑھا گیا ہے تاء افتعال کو زاء سے بدلا اور زاء کو اس میں ادغام کر دیا؛ یہ زمخشری نے بیان کیا ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 410

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ مراد قرآن حکیم ہے یہ فاء سے بدل ہے جو مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ میں منقول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، یعنی هو حكمة۔ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ جب انہوں نے جھٹلایا اور مخالفت کی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس) ما نافیہ ہے یعنی انہیں نذر کچھ نفع نہ دیں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما استفہامیہ ہو اور یہ توبیخ کے لیے ہو، یعنی انہیں نذر کیا نفع دے گی جب کہ وہ اعراض کرنے والے ہوں۔ النُّذُرُ کے بارے میں یہ جائز ہے کہ وہ انذار کے معنی میں ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ نذیر کی جمع ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ان سے اعراض کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام کا تتمہ ہے پھر فرمایا: يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ یوم میں عامل یخرجون یا خشعا ہے یا ایسا فعل ہے جو مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہے واذکر یوم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں حرف فاء محذوف ہے اور وہ بھی جس میں اس نے عمل کیا یعنی جواب امر۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فتول عنهم فإن لهم يوم يدعو الداعي۔ ایک قول یہ کیا گیا: اے محمد! ان سے اعراض کیجئے آپ نے حجت قائم کر دی اور جس دن داعی بلائے گا اس دن انہیں دیکھو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے روز ان سے اعراض کیجئے ان کے بارے اور ان کے احوال کے بارے میں سوال نہ کیجئے کیونکہ انہیں شدید عذاب کی طرف دعوت دی گئی ہے معاملہ اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: لا تسأل عما جرى على فلان إذا أخبرته بأمر عظيم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر امر قرار پذیر ہوگا جب دعوت دینے والا دعوت دے گا۔

اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝ ابن کثیر نے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی نے کاف کو ضمہ دیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح عُسُر اور عُسْر، شُغُل اور شُغْل۔ اس کا معنی ہے ایسا امر جو خوفناک اور عظیم ہوگا مراد یوم قیامت ہے داعی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہے۔ مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ دونوں نے پڑھا الی شئ نکر یعنی کاف کو کسرہ اور راء کو فتحہ دیا یعنی فعل مجہول ہے۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ بصر میں خشوع سے مراد عاجزی اور ذلت ہے خشوع کو ابصار کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ عزت اور ذلت کا اثر انسان کی آنکھ سے ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ (النازعات) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (الشوری:45)

یہ کہا جاتا ہے: خشع و اختشع جب وہ ذلیل ہو جائے، خشع ببصرہ جب وہ آنکھ کو بند کر دے۔ حمزہ، کسائی اور ابو عمرو نے خاشعا پڑھا ہے اسم فاعل میں یہ جائز ہے کہ جب فاعل جماعت ہو اور اسم فاعل اس سے پہلے ہو تو اسے واحد ذکر کیا جائے جس طرح خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ہے اس کو مؤنث بھی لا سکتے ہیں جس طرح خاشعة أبصارهم اسم فاعل کے صیغہ کو جمع ذکر کرنا بھی جائز ہے جس طرح خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ہے۔ شاعر نے کہا:

وَشَبابٍ　حَسَنٍ　أوجُهُهم　مِنْ إيادِ بنِ نِزارِ بنِ مَعَد(1)

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 261

یہاں محل استدلال حسن أدجههم ہے خشعا یہ خاشع کی جمع ہے۔ اس کو نصب حال ہونے کی وجہ سے دی گئی ہے کیونکہ یہ عنهم کی ضمیر سے حال ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر عنهم پر عطف قبیح ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ یخرجون کی ضمیر سے حال ہو تو اس صورت میں عنهم پر وقف کیا جاسکتا ہے۔ اسے خشع أبصارهم بھی پڑھا اس وقت یہ مبتدا اور خبر ہوں گے جملہ حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا جس طرح یہ جملہ ہے:

وجدته حاضراه الجود والكرم

میں نے اسے اس حال میں پایا کہ جود و کرم دونوں اس کے پاس حاضر تھے۔ محل استدلال حاضراه الجود والكرم ہے۔

یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ، اجداث سے مراد قبریں ہیں اس کا واحد جدث ہے كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ایک دوسرے موقع پر فرمایا: يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ (القارعہ) یہ دونوں مختلف اوقات میں اس کی صفات ہیں (۱) قبروں سے نکلتے وقت وہ گھبرا کر نکلیں گے انہیں کچھ پتہ نہ ہوگا کہ کدھر جائیں ان میں سے بعض بعض میں داخل ہوں گے اس وقت وہ بکھری ہوئی پتنگوں کی طرح ہوں گے بعض بعض میں ہوں گے ان کی کوئی جہت نہ ہوگی جس کا وہ قصد کریں (۲) جب وہ منادی کو سنیں گے تو وہ منتشر ٹڈی دل کی طرح ہوں گے کیونکہ ٹڈی کی کوئی جہت نہیں ہوتی جس کا وہ قصد کرے۔ مُهْطِعِيْنَ کا معنی ہے وہ جلدی کر رہے ہوں گے؛ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے؛ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

بِدِجْلَةَ دَارُهُمْ ولقد أراهم بدِجلة مُهْطِعِيْنَ إلى السَّماعِ(1)

دجلہ میں ان کا گھر ہے میں انہیں دجلہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ آواز کی طرف جلدی کر رہے ہیں۔

ضحاک نے کہا: معنی ہے وہ متوجہ ہوں گے۔ قتادہ نے کہا: وہ قصد کر رہے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ دیکھ رہے ہوں گے۔ عکرمہ نے کہا: وہ اپنے کانوں کو آواز کی طرف کھولے ہوں گے۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے هطع الرجل يهطع هطوعا جب وہ اپنی آنکھ کے ساتھ کسی چیز کی طرف متوجہ ہو اس سے توجہ نہ ہٹائے اهطع جب اپنی گردن لمبی کرے اور سر کو نیچے کیا۔ شاعر نے کہا:

دِنَمْرُبْنُ سَعْدٍ لِى مُطِيْعٌ و مُهْطِعُ

نمر بن سعد میرا مطیع ہے اور سر جھکائے ہوئے ہے۔

بعیر مُهْطِع اس کی گردن میں پیدائشی جھکاؤ ہے۔ أهطع فی عَدْوِہ اس نے دوڑ میں تیزی کی۔ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝ مراد یوم قیامت ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ۝ تَجْرِيْ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 411

بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۝ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

''جھٹلایا ان سے پہلے قوم نوح نے یعنی انہوں نے جھٹلایا ہمارے بندے کو اور کہا یہ دیوانہ ہے اور اسے جھڑکا بھی گیا ہے۔ آخر کار آپ نے دعا مانگی اپنے رب سے کہ میں عاجز آ گیا ہوں پس تو (ان سے) بدلہ لے۔ پھر ہم نے کھول دیئے آسمان کے دروازے موسلادھار بارش کے ساتھ اور جاری کر دیا ہم نے زمین سے چشموں کو پھر دونوں پانی مل گئے ایک مقصد کے لیے جو پہلے مقرر ہو چکا تھا، اور ہم نے سوار کر دیا نوح کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر وہ بھی جاری تھی ہماری آنکھوں کے سامنے (یہ طوفان) بدلہ تھا اس (نبی) کا جس کا انکار کیا گیا تھا۔ اور ہم نے باقی رکھا اس (قصہ) کو بطور (نشانی) پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔ سو کیسا (خوفناک) تھا میرا عذاب اور (کتنے سچے تھے) میرے ڈراوے۔ اور بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت پذیری کے لیے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''۔

**كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ** سابقہ قوموں کے کچھ واقعات کا ذکر کیا مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مانوس کرنا اور تسلی دینا تھا۔ **قَبْلَهُمْ** سے مراد آپ کی قوم سے پہلے۔

**فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا**، عبد سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ زمخشری نے کہا: اگر تو سوال کرے کہ کذبت کے بعد کذبوا کا کیا معنی ہے؟ تو میں اس کا جواب دوں گا: اس کا معنی ہے کذبوا فکذبوا عبدنا انہوں نے جھٹلانے کے بعد جھٹلایا۔ جب کبھی بھی جھٹلانے والی ایک قوم گزری اس کے بعد دوسری قوم آ گئی یا معنی ہے قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہمارے بندے کو بھی جھٹلایا یعنی جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ وہ سرے سے نبوت کا انکار کرتے تھے تو انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی جھٹلایا کیونکہ وہ بھی رسولوں میں سے تھے۔

**وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ** تقدیر کلام یہ ہے ھو مجنون۔ **وَّ ازْدُجِرَ** انہیں نبوت کا دعوی کرنے سے جھڑکا گیا کبھی گالیاں دی گئیں اور کبھی قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے اُزْدُجِر پڑھا گیا ہے یعنی یہ مجہول کا صیغہ ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے۔

**فَدَعَا رَبَّهٗۤ** حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے خلاف بددعا کی اور عرض کی: **اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ** وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے مجھ پر غالب آ گئے ہیں۔ **فَانْتَصِرْ** ۝ میری مدد فرما۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انبیاء اپنی قوموں کے خلاف ہلاکت کی بددعا نہیں کیا کرتے تھے مگر اس وقت جب اللہ تعالیٰ انہیں اجازت دیتا۔ **فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ** یعنی ہم نے ان کی دعا کو قبول کر لیا، ہم نے کشتی بنانے کا حکم دیا اور آسمان کے دروازے کھول دیئے اور ماء منھمر سے مراد زیادہ پانی ہے۔ شاعر نے کہا:

أعینَیَّ جُودَا بالدُّموعِ الهَوَامِرِ　　علی خیرِ بادٍ من مَعَدٍّ و حاضِرِ (1)

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 412

اے میری دونوں آنکھو! کثیر آنسو بہاؤ معد میں سے ہلاک ہونے والوں اور ان میں سے موجود افراد میں سے بہترین پر۔
ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی بہنے والا، اچھلنے والا ہے۔ اس معنی میں امرءالقیس کا شعر ہے وہ بارش کی صفت بیان کرتا ہے:

رَاحَ تَمْرِیهِ الصِّبَا ثم انتحَی　فیه شُؤْبُوبُ جَنُوبٍ مُنْهَمِرٌ(1)

محل استدلال جنوب منہمر ہے۔

الھمر کا معنی بہانا ہے یہ جملہ بولتے ہیں: قد ھمر الماء والدمع یھمر ھمرا اس نے پانی اور آنسو بہائے۔ ھمر کا یہ معنی بھی ہے جب وہ زیادہ گفتگو کرے اور تیز گفتگو کرے ھمر له من ماله جب وہ اسے عطا کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے ہم نے بادل کے بغیر آسمان کے دروازے تیز بہنے والے پانی سے کھول دیئے پھر چالیس دن تک بارش ختم نہ ہوئی۔ ابن عامر اور یعقوب نے ففتّحنا پڑھا ہے یعنی تاء مشدد ہے یہ معنی کی کثرت پر دال ہے۔ باقی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر یہ قول کیا گیا ہے: اس نے آسمان کے پھاٹک اور کھلے راستوں کو کھول دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کہکشاں ہے یہ آسمان کا کھلا راستہ ہے اسی جگہ سے اسے کثیر بہنے والے پانی کے ساتھ کھولا گیا(2)؛ یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا عبید بن عمیر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف وحی کی کہ وہ پانی نکالے تو وہ چشموں کے ساتھ کھل گئی ایک چشمہ نے تاخیر کی تو اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوا تو اس کا پانی قیامت تک شدید کڑوا بنا دیا گیا۔

فَالْتَقَى الْمَآءُ یعنی آسمان کا پانی اور زمین کا پانی مل گئے۔ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ ایک مقدار پر ان میں سے ایک دوسرے پر زائد نہیں(3)؛ اسے ابن قتیبہ نے بیان کیا ہے یعنی آسمان و زمین کا پانی برابر تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قدر کا معنی ہے ان پر فیصلہ کر دیا گیا۔ قتادہ نے کہا: جب انہوں نے کفر کیا تو ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں غرق کر دیا جائے۔ محمد بن کعب نے کہا روزی جسموں سے پہلے تھی اور فیصلہ آزمائش سے پہلے تھا اور یہ آیت تلاوت کی کہا فَالْتَقَى الْمَآءُ، التقاء دو یا زائد چیزوں میں ہوتا ہے کیونکہ پانی جمع بھی ہوتا ہے اور واحد بھی ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ جب وہ دونوں جمع ہوئے تو ایک پانی بن گیا۔ جحدری نے کہا: دونوں پانی جمع ہوئے۔ حضرت حسن بصری نے پڑھا فالتقی الماوان۔ یہ عام طریقہ کے خلاف ہے۔ قشیری نے کہا: بعض مصاحف میں فالتقی الماوان ہے یہ بنوطی کی لغت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: آسمان کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور زمین کا پانی گرم تھا جس طرح کھولتا ہوا پانی ہوتا ہے۔

وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ یعنی ایسی کشتی پر جو تختوں والی تھی۔

وَّ دُسُرٍ ۝ قتادہ نے کہا: مراد ایسے کیل ہیں جن کے ساتھ کشتی کو باندھا گیا؛ یہ قول قرظی، ابن زید اور ابن جبیر نے کیا، والبی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ حسن بصری، شہر بن حوشب اور عکرمہ نے کہا: یہ کشتی کا اگلا حصہ ہوتا ہے جس کے ساتھ موج ٹکراتی ہے۔ اسے دسر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ پانی کو دھکیلتی ہے۔ دسر کا معنی دھکیلنا ہے۔ عوفی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دسر سے مراد کشتی کا سینہ ہے۔ لیث نے کہا: دسار چھال کا ایسا رسا ہے جس کے ساتھ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 412　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

کشتی کے تختوں کو باندھا جاتا ہے۔ صحاح میں ہے: دسار یہ دسر کا واحد ہے۔ یہ ایسی رسیاں ہیں جن کے ساتھ کشتی کے تختوں کو باندھا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس سے مراد کیل ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ، دُسُر بھی عُسُر عُسُر کی طرح ہے دسر کا معنی دھکیلنا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عنبر کے بارے میں کہا: انما ھو شیٔ یدسرہ البحر دسرا وہ ایسی چیز ہے جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے۔ دسرہ بالرمح نیزے کے ساتھ پرے دھکیلا۔ رجل مدسر۔ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ ہمارے حکم سے چلتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہماری حفاظت میں چلتی ہے۔ سورۂ ہود میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اس معنی میں لوگوں کا قول ہے اس آدمی کے بارے میں جس کو الوداع کہا گیا ہو: عین اللہ علیك اللہ تیری حفاظت فرمائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہماری مرضی کے مطابق چلتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان چشموں کے ساتھ چلتی ہے جو زمین سے پھوٹتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتوں میں سے ہمارے اولیاء کی نگرانی میں چلتی ہے جو اس کی حفاظت پر مامور ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بھی پیدا کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کرنا ممکن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہمارے اولیاء کے ذریعے چلتی ہے جس طرح حدیث میں ہے: مرض عینٌ من عیوننا فلم تعدہ ہمارے دوستوں میں سے ایک بیمار ہو گیا تو تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے صبر کی جزا بنا دیا جو انہوں نے اپنی قوم کی اذیتوں پر کیا تھا۔ لِمَنْ میں لام مفعول لہ کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: كُفِرَ کا معنی ہے انکار کیا گیا۔ من یہ حضرت نوح علیہ السلام سے کنایہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے کنایہ ہے اور جزا عقاب کے معنی میں ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کا جو انکار کیا ہے اس کی جزا ہے۔ یزید بن رومان، قتادہ، مجاہد اور حمید نے کہا: جزاء لمن کان کَفَرَ یعنی کاف اور فاء مفتوح ہیں معنی ہے غرق اللہ تعالیٰ کے انکار کی جزا اور عقاب تھی۔ عوج بن عنق کے علاوہ کوئی بھی غرق ہونے سے نجات پانے والا نہ ہوا۔ پانی اس کے نیفہ تک تھا اس کی نجات کا سبب یہ بنا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کے لیے ساگوان کی لکڑی کی ضرورت تھی مگر اس کو اٹھا کر لانا ممکن نہ تھا عوج وہ لکڑی شام سے اٹھا کر لایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل کو قبول کیا اور اسے غرق ہونے سے نجات دی۔

وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً اس عمل سے عبرت دلانا مقصود تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کشتی کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد بطور نشانی چھوڑیں جس سے وہ عبرت حاصل کریں تو وہ رسولوں کو نہ جھٹلائیں۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے جزیرہ کے علاقہ میں باقردی کے مقام پر عبرت اور نشانی کے طور پر چھوڑا یہاں تک کہ اس وقت کے اولین لوگوں نے اسے دیکھا (2)۔ کتنی ہی کشتیاں اس کے بعد ہوئیں جو راکھ ہو گئیں (3)۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا اور ڈرنے والا۔ یہ اصل میں مذتکر تھا جو ذکر سے مفتعل کے وزن پر ہے یہ لفظ زبانوں پر ثقیل تھا اس کی تاء کو دال سے بدل دیا کیونکہ جہری میں یہ ذال کے موافق ہے اور ذال کو اس میں مدغم کر دیا گیا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۝ یعنی میرا ڈرانا کیسا تھا۔ فراء نے کہا: انذار اور نذر دونوں مصدر ہیں (4)۔ ایک قول یہ کیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 413
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 415
4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 263

گیا ہے: نذر، نذیر کی جمع ہے اور نذیر، انذار کے معنی میں ہے جس طرح نکیر، انکار کے معنی میں ہے۔

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ یعنی ہم نے اسے سہل کر دیا ہے اور جس نے بھی اس کے حفظ کا ارادہ کیا ہم نے اس کی مدد کی کیا کوئی اس کے حفظ کا خواہش مند ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ معنی ہو ہم نے اسے یاد کرنے کے لیے تیار کیا۔ یہ ماخوذ ہے یسر ناقتہ للسفر جب وہ سفر کرے اور اپنا گھوڑا جنگ کے لیے تیار کرے جب وہ اس پر زین ڈالے اور اسے لگام پہنائے، کہا:

قُمْتُ إِلَيهِ بِاللِّجَامِ مُيَسِّرًا

میں اس کی طرف لگام کے ساتھ اٹھا اس کو تیار کرتے ہوئے۔

سعید بن جبیر نے کہا: قرآن کے سوا اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے کوئی بھی ایسی کتاب نہیں جس کو مکمل پڑھا جاتا ہو(1)۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بنی اسرائیل کے لیے نہیں وہ تورات کو صرف دیکھ کر پڑھا کرتے تھے صرف حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت یوشع بن نون اور حضرت عزیر علیہم السلام۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل حضرت عزیر کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے جب تورات کے جل جانے کے بعد انہوں نے حافظہ سے کتاب لکھی تھی جس کی وضاحت سورۂ براءت میں گزر چکی ہے اللہ تعالیٰ نے اس امت پر اس کتاب (قرآن) کو یاد کرنا آسان کر دیا تاکہ وہ یاد کریں۔ اس میں افتعال یہ ہے کہ یہ ان میں داخل ہو کر اثر کرے یہاں تک کہ وہ چیز ذات کی طرح ہو جائے اور ان میں مل جانے کی طرح ہو جائے۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ کیا کوئی ایسا قاری ہے جو اسے پڑھے۔ ابو بکر وراق اور ابن شوذب نے کہا: کیا کوئی خیر اور علم کا طالب ہے کہ اس کی مدد کی جائے؟ اس صورت میں تنبیہ اور افہام کے لیے اسے مکرر ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں اس امت پر امتوں کی خبریں اور مرسلین کے قصے اور ان کی امتوں نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا اور ان کے امور اور مرسلین کے امور کا جو انجام ہوا اسے بیان کیا۔ ہر قصہ اور خبر میں سننے والے کے لیے نصیحت ہے اگر وہ نصیحت حاصل کرے۔ ہر قصہ کے ذکر کے وقت اسی آیت فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ کو مکرر ذکر کیا، کیونکہ ھل کلمہ استفہام ہے ھل میں لام استعراض کے لیے اور ھا استخراج کے لیے ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾

''عاد نے بھی جھٹلایا تھا پھر کیسا (خوفناک) تھا میرا عذاب اور میرے ڈراوے۔ ہم نے ان پر تند و تیز آندھی بھیجی ایک دائمی نحوست کے دن میں وہ اکھاڑ کر پھینک دیتی لوگوں کو گویا وہ منڈھ ہیں کھڑی ہوئی کھجور کے۔ پس کیسا (سخت) تھا میرا عذاب اور (کتنے سچے تھے) میرے ڈراوے۔ بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 263

نصیحت پذیری کے لیے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''۔

**كَذَّبَتْ عَادٌ** عاد حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے۔ **فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَ نُذُرِ** اس صورت میں نذر کا لفظ چھ مقامات پر آیا ہے تمام مصاحف میں اس کا یاء محذوف ہے۔ یعقوب نے اسے دونوں حالتوں میں ثابت کر کے پڑھا ہے ورش نے وصل میں ثابت رکھا ہے دوسری صورت میں ثابت نہیں رکھا، باقی قراء نے اسے حذف کیا ہے **فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ** میں راء کے حذف میں کوئی اختلاف نہیں اسی طرح یدع کی واؤ کے حذف میں کوئی اختلاف نہیں۔ جہاں تک پہلے الداع میں یاء ہے ابن محیصن، یعقوب، حمید اور بزی نے دونوں حالتوں میں ثابت رکھا ہے، ابو عمرو اور نافع نے وصل میں اسے ثابت رکھا ہے اور باقی قراء نے اسے حذف کیا ہے۔

**اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا**، صَرْصَرًا سے مراد سخت ٹھنڈی (1)؛ یہ قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سخت آواز۔ حم سجدہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

**فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ** یعنی ایسے دن میں جو ان پر منحوس تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ مہینے کے آخری بدھ کو عذاب آیا جس نے ان کے چھوٹے اور بڑے کو فنا کر دیا۔ ہارون اعور نے کہا: نَحِسٍ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اس بارے میں قول حم سجدہ آیت 16 **فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ** گزر چکا ہے۔

**فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ** یعنی دائمی نحوست والا جو اپنی نحوست کی وجہ سے ان پر کڑوا ہو گیا اس میں ان پر عذاب ہلاکت تک جاری رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: نار جہنم تک ان پر جاری رہا۔ ضحاک نے کہا: وہ عذاب ان پر کڑوا تھا (2)؛ اسی طرح کسائی نے حکایت بیان کی ہے کہ ایک قوم نے کہا: یہ مرارہ سے مشتق ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے مرّ الشیء وأمر یعنی وہ کڑوی شی کی طرح ہو گیا جسے لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ تحقیق فرمایا: فذوقوا جسے چکھا جاتا ہے وہ کبھی کڑوا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مرۃ سے مشتق ہے جس کا معنی قوت ہے یعنی ایسے دن میں جو منحوس ہے جس کی نحوست بڑی مستحکم ہے جس طرح وہ چیز ہو جس کی بٹائی بڑی مضبوط ہو جس کے کھولنے کی کسی کو طاقت نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے: جب بدھ کا دن منحوس دن تھا جس کی نحوست بڑی مضبوط تھی تو اس میں دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ جب کہ یہ روایت آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا اس دن میں ظہر اور عصر کے درمیان قبول ہوئی (3)۔ حضرت جابر کی حدیث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس کا جواب وہ ہے جو اس خبر میں آیا ہے جسے مسروق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جبرئیل امین میرے پاس آئے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ قسم کے ساتھ ایک گواہ کے ہوتے ہوئے فیصلہ کر دیں اور کہا: بدھ کا دن منحوس دن ہے جس کی نحوست بڑی مضبوط ہے'' یہ بات تو معلوم ہے کہ اس سے یہ ارادہ نہیں کیا کہ یہ صالحین پر منحوس ہے بلکہ یہ ارادہ کیا ہے کہ فجار اور مفسدین پر منحوس ہے جس طرح قرآن میں منحوس ایام کا ذکر ہے وہ قوم عاد کے کفار پر منحوس تھے ان کے نبی اور مومنوں پر منحوس نہیں تھے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو یہ کوئی بعید نہیں کہ ظالموں کو بدھ کے پہلے سے لے کر سورج ڈھلنے تک مہلت دی جائے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 414 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 93 3۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 684، حدیث 5901

جب پچھلا پہر ہو جائے اور اس کی جانب سے رجوع ثابت نہ ہو تو مظلوم کی اس کے بارے میں بددعا قبول ہو جاتی ہے تو وہ دن ظالم پر منحوس ہو جاتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی کفار کے بارے میں ہوتی تھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول لم ینزل بی أمر عظیم (1) جو ان کی حدیث میں ہے اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تَنۡزِعُ النَّاسَ یہ ریح کی صفت کے محل میں ہے یعنی وہ ہوا انہیں ان کی جگہوں سے اٹھا لیتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہوا نے انہیں ان کے قدموں کے نیچے سے اس طرح اٹھا لیا جس طرح کھجور کو اس کی جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ ہوا انہیں زمین سے اٹھاتی انہیں سر کے بل گراتی ان کی گردنیں پس جاتیں اور ان کے سر ان کے جسموں سے الگ ہو جاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہوا لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالتی۔ محمد بن کعب نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہوا نے لوگوں کو ان کی قبروں سے نکال لیا''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے گڑھے کھودے اور ان میں داخل ہو گئے ہوا انہیں وہاں سے نکالتی اور ریزہ ریزہ کر دیتی تو وہ گڑھایوں رہ جاتا گویا وہ کھجوروں کے مڈھ ہیں کہ ان میں جو کچھ تھا ہلاک ہو گیا ہے اور ان کی جگہیں خالی باقی رہ گئی ہیں۔

یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ ان میں سے سات افراد نے گڑھے کھودے اور ان میں کھڑے ہو گئے تاکہ ہوا کا مقابلہ کر سکیں۔ ابن اسحاق نے کہا: جب ہوا نے شدت اختیار کی تو عاد کے سات افراد اٹھے ان میں سے چھ کے نام ہمارے سامنے ذکر کیے گئے جو قوم عاد کے سب سے قوی اور جسیم تھے ان میں عمرو بن علی، حرث بن شداد، ہلقام، تقن کے دو بیٹے اور خلجان بن سعد انہوں نے اپنے خاندانوں کو دو پہاڑوں کی گھاٹی میں داخل کر دیا پھر گھاٹی کے دروازے پر صف بنائی تاکہ ہوا کو ان سے روک لیں جو گھاٹی میں ان کے بال بچے موجود ہیں ہوا نے ان میں سے ایک ایک کو گرانا شروع کر دیا تو عاد کی ایک عورت نے ان کے بارے میں یہ کہا:

ذھبَ الدھرُ بعمرِو بن حلیٍّ والھنیّات (2)

ثم بالحرث والهِلْقامِ طَلّاعِ الثَّنِیّات

والذی سدّ مھبّ الریح أیامَ البلیّات

زمانہ نے عمرو بن حلی، ہنیات پھر حرث اور ہلقام کو ہلاک کر دیا جو ثنیات پر کھڑے تھے اور جس نے آزمائش کے دنوں میں ہوا کی گزرگاہ کو بند کر دیا تھا۔

طبری نے کہا: کلام میں حذف ہے معنی ہے وہ لوگوں کو اٹھاتی ہے اور انہیں یوں چھوڑتی ہے گویا وہ کھجور کے ایسے تنے ہیں جنہیں ان کی جڑوں سے اکھیڑ لیا گیا ہے کاف محذوف عامل کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: کاف محل نصب میں ہے اور حال ہے معنی ہے وہ لوگوں کو اٹھاتی ہے جو کھجور کے تنوں کے مشابہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تشبیہ ان گڑھوں کی وجہ سے تھی جس میں وہ تھے۔ اعجاز یہ عجز کی جمع ہے۔ اس سے مراد شی کا آخری حصہ ہے قوم عاد کے لوگ طویل قد ہونے کے ساتھ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 684، حدیث 5901
2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 115

موصوف تھے، انہیں ان کھجور کے درختوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی جو اپنے منہ کے بل گر پڑتے ہیں فرمایا: اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ ۝ لفظ نخل کا اعتبار کرتے ہوئے مُّنۡقَعِرٍ کہا گیا یہ ایسی جمع سے تعلق رکھتا ہے جو مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مُّنۡقَعِرٍ سے مراد ہے جس کو اس کی جڑ سے اکھیڑ لیا گیا ہو۔ قعرت الشجرة قعرا میں نے اسے جڑ سے اکھیڑا تو وہ اکھڑ گیا۔ کسائی نے کہا: قعرت البئر یعنی میں اس میں اترا یہاں تک کہ میں اس کی گہرائی تک جا پہنچا؛ اسی سے قعرت الاناء یعنی اس برتن میں جو کچھ تھا میں نے اسے پیا یہاں تک کہ میں اس کی گہرائی تک پہنچ گیا۔ اقعرت البئر میں نے اسے گہرا کیا۔ ابوبکر بن انبار نے کہا: مبرد سے اسماعیل قاضی کی موجودگی میں جن ہزار مسئلوں کے بارے میں پوچھا گیا یہ بھی ان میں سے تھا، انہیں کہا گیا:

اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَةً (الانبیاء: 81) اور جَآءَتۡهَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ (یونس: 22) میں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَةٍ ۝ (الحاقہ) اور اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ ۝ میں کیا فرق ہے؟ مبرد نے جواب دیا: اس باب سے جب بھی تجھ پر کوئی چیز وارد ہو اگر تو چاہے تو لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مذکر ضمیر لوٹا دے یا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے مونث ضمیر لوٹا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نخل اور نخیل ایک ہی معنی میں ہیں مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔

فَكَیۡفَ كَانَ عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ ۝ وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ۝ اس کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔

**كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝ ءَاُلۡقِیَ الذِّكۡرُ عَلَیۡهِ مِنۡۢ بَیۡنِنَا بَلۡ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَیَعۡلَمُوۡنَ غَدًا مَّنِ الۡكَذَّابُ الۡاَشِرُ ۝**

"ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ پھر وہ کہنے لگے کیا ایک انسان جو ہم میں سے ہے اور (اکیلا) ہے ہم اس کی پیروی کریں پھر تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ کیا اتاری گئی ہے وحی اس پر ہم سب میں سے (یہ کیونکر ممکن ہے) بلکہ وہ بڑا جھوٹا شیخی باز ہے۔ کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون بڑا جھوٹا شیخی باز ہے"۔

كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِالنُّذُرِ ۝ سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے جنہوں نے رسولوں اور اپنے نبی کو جھٹلایا یا آیات کو جھٹلایا جو نذر ہیں۔ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ کیا ہم اپنے میں سے ایک فرد کی اتباع کریں اور جماعت کو ترک کریں۔ ابو اشہب، ابن سمیقع اور ابو سمال عدوی نے اسے ابشر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح واحد کو مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اس کی خبر نَّتَّبِعُهٗ ہے باقی نے نصب دی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی انتبع بشرا منا واحدا نتبعہ ابو سمال نے ابشر، منا واحد اپڑھا ہے بشر کو رفع فعل مضمر کی وجہ سے دیا ہے جس فعل پر القی دلالت کرتا ہے۔ گویا کہا: اینبا بشر منا اور واحدا میں یہ جائز ہے کہ یہ منا کی ضمیر سے حال ہو اس کو نصب دینے والی ظرف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اینبا بشر کائن منا منفردا یہ بھی جائز ہے کہ یہ نتبعہ کی ضمیر سے حال ہو، یعنی اس حال میں کہ وہ منفرد ہو اس کا کوئی مددگار نہ ہو اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ یعنی صحیح بات سے دور ہوں گے وَّ سُعُرٍ ۝ اس کا معنی جنون ہے عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ناقة مسعورة

گویا زیادہ چستی کی وجہ سے مجنون ہے؛ ابن عباس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ شاعر اپنی اونٹنی کی تعریف کرتا ہے:

تَخَالُ بها سُعُرًا إذا السَّفْرُ هَزَّهَا ذَمِيلٌ وايقاعٌ من السَّيْرِ مُتْعِبُ

ذمیل اونٹ کی چال کی ایک صورت ہے۔ ابو عبید نے کہا: جب چال عنق سے بڑھ جائے تو اسے تزید کہتے ہیں جب وہ اس سے بڑھ جائے تو وہ ذمیل ہوتی ہے پھر رسیم ہے۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے: ذمل یذمُل ویذمِل ذمیلا اصمعی نے کہا: لا یذمل بعیر یوما ولیلة الا مھری۔ مہری اونٹ کے سوا کوئی اونٹ رات اور دن لگاتار ذمیل چال نہیں چل سکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: السعر کا معنی عذاب ہے(1)؛ یہ فراء کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: حق سے دور۔ سدی نے کہا: اس کا معنی ہے جلنا(2)؛

شاعر نے کہا:

وَمِنَ الْحُبِّ جُنُوْنٌ مُسْتَعِرٌ

محبت کی وجہ سے ایسا جنون لاحق ہوتا ہے جو بھڑکتا ہے۔

ابو عبید نے کہا: یہ سعیر کی جمع ہے جس کا معنی آگ کی لپک ہے مجنون اونٹ یہاں وہاں جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گرمی کی وجہ سے وہ جل رہا ہوتا ہے۔ آیت کا معنی ہے بے شک ہم بدبختی اور تھکاوٹ میں ہیں جو ہمیں لازم ہو چکی ہے۔

ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا کیا آل ثمود میں سے اسے رسالت کے لیے خاص کیا گیا ہے جب کہ آل ثمود میں اس سے بڑھ کر مالدار ہیں اور اچھے حال والے ہیں۔ یہاں ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور معنی انکار کا دے رہا ہے۔

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ یعنی بات اس طرح نہیں جس طرح وہ دعوی کرتا ہے بلکہ وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ بڑا بنے اور وہ بغیر استحقاق ہم پر بڑائی تلاش کرتا ہے الشر کا معنی تکبر، تجبر اور نشاط ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فرس اَشِر جب وہ سرکش اور چست ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اشر کا معنی سرکش ہے اَشِر، بطر کے معنی میں آتا ہے؛ شاعر نے کہا:

أَشِرْتُمْ بِلُبْسِ الخَزِّ لمّا لَبِسْتُمُ وَمِن قَبْلُ مَاتَدْرُونَ مَنْ فَتَحَ الْقُرَى(3)

جب تم نے ریشم پہنا تو اسے پہننے کی وجہ سے تم نے تکبر کیا اس سے پہلے تم نہیں جانتے کہ بستیاں کس نے فتح کیں۔

اس کا باب یوں ذکر کیا جاتا ہے قد اَشِر یأشَر أَشَرًا فھو أَشِر واَشْرَان وقوم أُشَارَی جس طرح سَکْرَان اور سُکَارَی؛ شاعر نے کہا:

وَخَلَتْ وُعُولًا أُشَارَی بِهَا

وہ ان پہاڑی بکروں سے خالی ہو گئی جو اس پر فخر کرتے تھے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس مقام کی طرف تجاوز کرنے والا ہے جس کا وہ مستحق نہیں۔ معنی ایک ہی ہے۔ ابن زید اور

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 264 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 415 3۔ ایضاً

عبدالرحمن بن حماد نے کہا: الاشر اسے کہتے ہیں جس کو جو بات کہی جائے اس کی پرواہ نہ کرے۔ ابو جعفر اور ابو قلابہ نے کہا: اَشَرّ شین کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی اس کی وجہ سے ہم شریر ہوئے اور خبیث ہوئے۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا وہ قیامت کے روز عذاب کو ضرور دیکھیں گے یا معنی ہے دنیا میں ہی جب ان پر عذاب نازل ہوگا تو وہ اسے دیکھیں گے۔ ابن عامر اور حمزہ نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ حضرت صالح انہیں خطاب کریں گے باقی یاء کے ساتھ پڑھیں گے۔ الله تعالیٰ کی جانب سے حضرت صالح کو ان کے بارے میں خبر دی جارہی ہے۔ الله تعالیٰ کا فرمان: غدًا لوگوں کی عادت کے طور پر ہے کہ وہ انجام کے قریب ہی وقوع پذیر ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں: إن مع اليوم غدا۔

شاعر نے کہا:

لِلموتِ فیھا سِھامٌ غیر مُخْطِئَةٍ　　مَنْ لم یکن مَیِّتًا فی الیوم ماتَ غَدَا

اس میں موت کے ایسے تیر ہیں جو خطا نہیں جاتے جو آج نہیں مرے گا کل مر جائے گا۔

مَنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ ابو قلابہ نے الاشر پڑھا ہے یعنی شین پر فتحہ اور راء مشدد ہے یہ اپنے اصل پر ہے۔ ابو حاتم نے کہا: عرب اشر اور أخیر ضرورت شعری کے سوا نہیں بولتے جس طرح رؤبہ کا قول ہے:

بِلَالُ خَيْرُ النَّاسِ وابنُ الأَخْيَرِ

بلال لوگوں میں سے بہترین ہے اور بہترین کا بیٹا ہے۔

وہ کہتے ہیں: ھو خیر قومہ، ھو شر الناس الله تعالیٰ کا فرمان ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110)

فرمایا فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا (مریم: 75)

ابو حیوہ سے شین کے فتحہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے شین کے ضمہ کے ساتھ یہ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بھی الاشر کے معنی میں ہے اس کی مثل رجل حذِر اور رجل حذُر ہے۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَ اصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

''ہم بھیج رہے ہیں ایک اونٹنی ان کی آزمائش کے لیے پس (اے صالح) ان کے انجام کا انتظار کرو اور صبر کرو۔ اور انہیں آگاہ کر دیجئے کہ پانی تقسیم کر دیا گیا ہے ان کے درمیان، سب اپنی اپنی باری پر حاضر ہوں۔ پس ثمودیوں نے بلایا اپنے ایک ساتھی (قذار) کو پس اس نے وار کیا اور (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں۔ پھر (معلوم ہے) کیسا تھا میرا عذاب اور میرے ڈراوے۔ ہم نے بھیجی ان پر چنگھاڑ پھر وہ اس طرح ہو کر رہ گئے جیسے روندی ہوئی خار دار باڑ۔ بے شک ہم نے آسان کر دیا قرآن کو نصیحت پذیری کے لیے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ ہم اس اونٹنی کو اس پہاڑ سے نکالنے والے ہیں جس سے نکلنے کا انہوں نے سوال کیا تھا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی تو جس چٹان کو انہوں نے معین کیا تھا وہ اس اونٹنی کی کہان سے پھٹ گئی تو دس ماہ کی گابھن اونٹنی نکل آئی۔ فِتْنَةً لَّهُمْ ان کی آزمائش کے لیے۔ یہ مفعول لہ ہے فَارْتَقِبْهُمْ یعنی جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا انتظار کیجئے وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ ان کی اذیتوں پر صبر کیجئے اصْطَبِرْ میں طاء کی اصل تاء ہے تو یہ طاء سے بدل گئی تاکہ اطباق میں طاء کے موافق ہو جائے۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ انہیں بتا دیں کہ پانی آل ثمود اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہے اونٹنی کے لیے ایک دن ہے اور ان کے لیے ایک دن ہے جس طرح الله تعالیٰ نے فرمایا: لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ (الشعراء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس دن آل ثمود کی باری ہوتی تو اس دن اونٹنی کچھ پانی بھی نہ پیتی لوگوں کو دودھ دیتی اور وہ نعمتوں میں ہوتے اور جس روز اونٹنی کی باری ہوتی تو سارا پانی پی جاتی ان کے لیے کچھ چیز نہ چھوڑتی۔ بَيْنَهُمْ ارشاد فرمایا کیونکہ عرب میں چوپاؤں کے ساتھ انسانوں کے بارے میں خبر دیتے تو انسانوں کو غلبہ دیتے۔ ابوزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ہم حجر کی وادی میں اترے (1) جب کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک کے سفر میں تھے فرمایا: ''اے لوگو! ان آیات کے بارے میں سوال نہ کرو یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہیں انہوں نے اپنے نبی سے سوال کیا کہ الله تعالیٰ ان کے لیے ایک اونٹنی بھیجے الله تعالیٰ نے ان کی طرف ایک اونٹنی بھیج دی وہ اس راستہ سے آتی جس دن اس کی باری ہوتی ان کا سارا پانی پی جاتی اور جس دن باری نہ ہوتی وہ اس اونٹنی سے اتنا ہی دودھ دوہتے الله تعالیٰ کے فرمان: وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ کا یہی معنی ہے''۔

كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ شِرْبٍ جب کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی پانی کا حصہ ہے ضرب المثل میں ہے آخرها أقلها شربا اس کا اصل معنی اونٹوں کو پانی پلانا ہے کیونکہ ان کا آخری اونٹ پانی پر وارد ہوتا تو حوض کا پانی ختم ہو چکا ہوتا۔ مُّحْتَضَرٌ کا معنی ہے اس کے پاس وہی حاضر ہوتا جس کا حق ہوتا۔ اونٹنی اپنی باری کے دن پانی پر حاضر ہوتی اور جس دن آل ثمود کی باری ہوتی اس دن غائب ہو جاتی؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: ثمود پانی پر حاضر ہوتے جس روز اونٹنی کی باری نہ ہوتی تو وہ پانی پیتے اور جس دن اس کی باری ہوتی وہ دودھ پر حاضر ہوتے اور اس کا دودھ دوہتے (2)۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ انہوں نے اپنے ساتھی کو بلایا تاکہ اسے اس کی کونچیں کاٹنے پر برانگیختہ کریں۔ فَتَعَاطٰى اس نے اس کی کونچیں کاٹنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ تعاطی کا معنی ہے اس فعل کو اپنے ذمہ میں لے لیا۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے عطوت یعنی میں نے اسے لے لیا۔

محمد بن اسحاق نے کہا: وہ اس اونٹنی کے لیے اس کے راستے میں ایک درخت کی جڑ میں چھپ گیا اور اسے تیر مارا اور اس تیر کے ساتھ اس کی پنڈلی کے پٹھے کو چھید دیا پھر تلوار سے اس پر حملہ کیا اور اس کی کونچ کو ظاہر کر دیا وہ اونٹنی گری اور ایک ہی دفعہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 415

2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 265

بلبلائی اس کا نوزائدہ بچہ اس کے بطن سے گر گیا پھر اس نے اس کی گردن کو کاٹ دیا۔ اس کا نوزائدہ بچہ چلا یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک چٹان پر آیا بلبلایا پھر چٹان کی پناہ لے لی۔ حضرت صالح علیہ السلام قوم کے پاس آئے جب آپ نے اونٹنی کو دیکھا کہ اس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہیں تو آپ رونے لگے فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کی حرمت کو پامال کیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی بشارت ہو۔ سورۂ اعراف میں اس معنی کا بیان گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس آدمی نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اس کا رنگ سرخ، آنکھیں نیلی، زردی مائل، سر سے گنجا اور گدی پر بال تھے (1)۔ اس کے نام کے بارے میں کہا جاتا ہے: قدار بن سالف۔ افوہ اودی نے کہا:

أو قَبْلَه كَقُدَارِ حين تَابَعَهُ علی الغِوَايَةِ أقوامٌ فقد بادُوا

یا اس سے پہلے جس طرح قدار جب سرکشی پر اس کی پیروی کی مختلف قوموں نے تو وہ ہلاک ہو گئے۔

عرب قصاب کو قدار کا نام دیتے ہیں وہ اسے قدار بن سالف سے تشبیہ دیتے ہیں جو آل ثمود کا منحوس آدمی تھا۔ مہلہل نے کہا:

إنَّا لَنَضْرِبُ بالسُّيُوفِ رُءوسَهُمْ ضَرْبَ القُدَارِ نَقِيعةَ القُدَّامِ (2)

ہم تلواروں کے ساتھ ان کے سروں پر ضرب لگاتے ہیں جس طرح قدار نے ضرب لگائی مقصد آنے والوں کی ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔

**اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً** اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آواز ہے۔ سورۂ ہود میں یہ بحث گزر چکی ہے: **فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ** ۞ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابو العالیہ نے المحتظر پڑھا (3) یعنی ظاء پر فتحہ ہے اس سے انہوں نے باڑہ کا ارادہ کیا ہے باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے باڑے والے کا ارادہ کیا ہے۔ صحاح میں ہے المحتظر اسے کہتے ہیں جو باڑہ بناتا ہے اسے کھشیم المحتظر پڑھا گیا ہے جس نے اسے کسرہ دیا ہے اس نے اسے فاعل بنایا ہے جس نے اسے فتحہ دیا ہے اس نے اسے مفعول بہ بنایا ہے۔ وہ آدمی جو کم بھلائی والا ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: انه لنکد الخطیرۃ۔ ابو عبید نے کہا: میرا خیال ہے اس کے اموال کو حظیر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس نے ان اموال کو اپنے پاس محفوظ کیا ہے یہ فعیلۃ کا وزن ہے جو مفعولہ کے معنی میں ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے محتظر کی ظاء کو فتحہ دیا تو اس کے نزدیک یہ مصدر ہے معنی ہوگا کھشیم الاحتظار۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَلْمُحْتَظِرِ سے مراد وہ درخت ہو جس سے باڑا بنایا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اَلْمُحْتَظِرِ اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے ریوڑ کے لیے درخت اور کانٹوں سے باڑا بناتا ہے اس سے جو گرتا ہے اور ریوڑ جسے پیس دیتا ہے اسے ھشیم کہتے ہیں۔

ان سے یہ بھی مروی ہے: اس گھاس کی مانند جسے ریوڑ کھا جاتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: بوسیدہ اور جلی ہوئی ہڈیوں کی مانند، یہ قتادہ کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد ایسی مٹی ہے جو ہوا والے دن دیواروں سے گرتی ہے۔ سفیان

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 416 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 218 3۔ ایضاً

ثوری نے کہا: جب تو باڑے کو ڈنڈا مارے تو باڑے سے جو چیز گرتی ہے اسے ھشیم کہتے ہیں، یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ ابن زید نے کہا: عرب ہر اس چیز کو ھشیم کہتے ہیں جو پہلے تر ہو پھر خشک ہو جائے۔ حظر کا معنی روکنا اور محفوظ کرنا ہے محتظر یہ فعتحل کا وزن ہے اس معنی میں کہا جاتا ہے: احتظر علی ابلہ وحظر یعنی اس نے درخت جمع کیے اور بعض کو بعض پر رکھا تاکہ وہ اپنے اونٹوں کو ہوا کی ٹھنڈک اور درندوں سے محفوظ رکھے؛ شاعر نے کہا:

تَرَی جِیَفَ المَطِیِّ بجانبیه کأنّ عظامَها خَشَبُ الهَشِیم(1)

تو سواری کے ڈھانچہ کو اس کی دونوں جانب دیکھے گویا اس کی ہڈیاں بوسیدہ لکڑیاں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: گویا وہ اس گندم کی طرح ہیں جسے گاہیا گیا ہو۔ اس تعبیر کی صورت میں محتظر سے مراد کھیتی کی باڑ ہے ھشیم سے مراد بالی اور بھوسہ کے ریزے ہیں۔

وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّیْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْیُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾

''قوم لوط نے بھی جھٹلایا تھا پیغمبروں کو۔ ہم نے بھیجی ان پر پتھر برسانے والی ہوا سوائے لوط کے گھرانے کے، ہم نے ان کو بچا لیا سحری کے وقت، یہ (خاص) مہربانی تھی ہماری طرف سے، اسی طرح ہم جزا دیتے ہیں جو شکر کرتے ہیں۔ اور بے شک ڈرایا تھا انہیں لوط (علیہ السلام) نے ہماری پکڑ سے پس جھگڑنے لگے ان کے ڈرانے کے بارے میں۔ اور انہوں نے پھسلانا چاہا لوط کو اپنے مہمانوں سے تو ہم نے میٹ دیا ان کی آنکھوں کو لو اب چکھو (اے بے حیاؤ!) میرے عذاب اور میرے ڈرانے کا مزہ۔ پس صبح سویرے ان پر ٹھہرنے والا عذاب نازل ہوا۔ تو اب چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کا مزہ۔ اور بے شک ہم نے آسان کر دیا قرآن کو نصیحت پذیری کے لیے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ قوم لوط کے بارے میں خبر دی جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو جھٹلایا اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا یعنی ایسی ہوا بھیجی جو ان پر کنکر پھینکتی تھی۔ حصباء سے مراد حصی ہے۔ نضر نے کہا: حاصب سے مراد ہوا میں سنگریزے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: حاصب سے مراد پتھر ہیں۔ صحاح میں ہے: حاصب سے مراد ایسی شدید ہوا ہے جو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 417

سنگریزہ کو اڑاتی ہے اسی طرح حصبہ ہے۔ عصفت الریح یعنی ہوا تیز ہوئی۔ ھی ریح عاصف و عصوف۔

اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ اس سے مراد وہ افراد ہیں جنہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے دین کی اتباع کی وہ صرف آپ کی دو بیٹیاں تھیں۔ نَّجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝ اخفش نے کہا: اسے منصرف ذکر کیا ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے۔ اگر معین دن کی سحری کا ارادہ ہوتا تو پھر اسے منصرف ذکر نہ کیا جاتا اس کی مثل اِهْبِطُوْا مِصْرًا (بقرہ: 61) جب اسے نکرہ ذکر کیا جب اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کو معرفہ ذکر کیا اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ (یوسف: 99) اسے غیر منصرف ذکر کیا۔ زجاج نے بھی یہی کہا ہے: سحر جب نکرہ ہو تو اس سے سحریوں میں سے ایک سحری مراد ہوگی اور اسے منصرف شمار کیا جائے گا تو کہے گا: أتیته سحرا جب تو اپنے دن کی سحری مراد لے گا تو تو اسے غیر منصرف بنائے گا تو کہے گا: اتیته سحر اور أتیته بسحر۔

سحر سے مرادرات کے آخری حصہ میں اور طلوع فجر کے درمیان کا وقت ہے۔ لغت عرب میں اس سے مرادرات کی سیاہی کا دن کے پہلے حصہ کی سفیدی کے ساتھ مل جانا کیونکہ اس وقت رات اور دن کے آثار ہوتے ہیں۔

نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ہماری جانب سے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیوں پر انعامات ہیں۔ نعمۃ مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝ مَنْ شَكَرَ سے مراد ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور اس کی اطاعت کی۔ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ یعنی حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں ڈرایا۔ بَطْشَتَنَا اس سے مراد ہماری سزا ہے اور ہم انہیں عذاب سے جو پکڑ سکتے ہیں۔ فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝ رسول نے انہیں جس چیز سے ڈرایا تھا اس میں انہوں نے شک کیا اور اس کی تصدیق نہ کی (1)۔ یہ مریۃ سے تفاعل کا وزن ہے۔ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ قوم کے افراد نے آپ سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ انہیں فرشتوں پر قدرت دے دیں جوان کے پاس مہمان کی حیثیت سے آئے ہیں وہ بے حیائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ باب ذکر کیا جاتا ہے راودته علی کذا مراودۃ و روادا میں نے اس کا ارادہ کیا۔ راد الکلأ یرودہ رودا و ریادا، ارتادہ ارتیادا سب کا ایک ہی معنی ہے یعنی گھاس کو تلاش کیا۔ حدیث طیبہ میں ہے اذا بال أحد کم فلیرتد لبوله (2) یعنی جب تم میں سے کوئی قضائے حاجت کا ارادہ کرے تو نرم جگہ یا پست جگہ کو تلاش کرے۔

فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت جبرئیل امین نے ان کو پر مارا تو وہ اندھے ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کی آنکھیں چہرے کی طرح ہو گئیں ان کا شگاف بھی دکھائی نہیں دیتا تھا جس طرح ہوا آثار کو مٹا دیتی کہ ان پر مٹی ڈال دیتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اندھا کر دیا جب کہ ان کی آنکھیں درست تھیں تو وہ ان کو دیکھ نہیں رہے تھے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا وہ فرشتوں کو دیکھ نہیں رہے تھے۔ انہوں نے کہا: جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ہم نے انہیں دیکھا تھا وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ واپس پلٹ آئے اور انہیں نہ دیکھا (3)۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ ہم نے انہیں کہا: میرا عذاب چکھو۔ اس امر سے مراد خبر ہے، یعنی میں نے انہیں اپنا وہ عذاب

---

1۔ تفسیر عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 261　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، الرجل یتبوأ لبوله، جلد 1، صفحہ 2

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 4، صفحہ 418

چکھایا جس کے بارے میں انہیں لوط علیہ السلام نے خبردار کیا تھا۔ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ یعنی دائمی اور عام عذاب وہ ان میں رہا یہاں تک کہ یہ عذاب انہیں عذات آخرت کی طرف لے گیا۔ وہ عذاب یہ تھا کہ ان کی بستی ان پر الٹ دی گئی اور ان کے اوپر والے حصہ کو نیچے والا حصہ بنا دیا۔ بُكْرَةً یہاں یہ نکرہ ہے اسی لیے منصرف ہے۔ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾ یہاں عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو ان پر آنکھوں کے بےنور ہونے کی صورت میں واقع ہوا یہ اس عذاب سے مختلف تھا جس کے ساتھ انہیں ہلاک کیا گیا اس وجہ سے مکرر ذکر کرنا اچھا ہے۔

وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ اس کے بارے میں تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

''اور آئے آل فرعون کے پاس ڈرانے والے، انہوں نے جھٹلایا ہماری ساری آیتوں کو پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا جیسے کوئی زبردست قوت والا پکڑتا ہے''۔

وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ آل فرعون سے مراد قبطی ہیں۔ نذر سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ بعض اوقات جمع کا صیغہ دو افراد پر بھی آتا ہے۔ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا آیات سے مراد معجزات ہیں جو ہماری توحید اور ہمارے انبیاء کی نبوت پر دال ہیں وہ عصا، ید بیضا، قحط، آنکھوں کا بےنور ہونا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک اور خون ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: النُّذُرُ سے مراد الرسل ہیں ان کے پاس حضرت یوسف علیہم السلام، ان کے بیٹے یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نذر سے مراد انذار ہے۔

فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ، عَزِیْزٍ کا معنی ہے جو انتقام لینے میں غالب ہو۔ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اس پر قادر ہو جس کا ارادہ کرے۔

اَكُفَّارُكُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِی الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ﴿۴۶﴾

''کیا تمہاری قوم کے کفار بہتر ہیں ان سے یا تمہارے لیے معافی لکھ دی گئی ہے آسمانی نوشتوں میں یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں جو غالب ہی رہے گی۔ عنقریب پسپا ہو گی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، بلکہ ان کے وعدہ کا وقت (روز) قیامت ہے اور قیامت بڑی خوفناک اور تلخ ہے''۔

اَكُفَّارُكُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ عربوں سے خطاب کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے کفار ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہمزہ استفہامیہ ہے اور استفہام انکار کے معنی میں ہے اس کا معنی نفی ہے مراد ہے تمہارے کفار ان کفار سے بہتر نہیں جو سابقہ امتوں میں تھے جنہیں ان کے کفر کے باعث ہلاک کیا گیا۔

اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِی الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ یعنی کیا وہ کتابیں جو انبیاء پر نازل ہوئیں ان میں یہ مذکور ہے کہ تمہیں عذاب سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا لوح محفوظ میں تمہارے لیے عذاب سے براءت لکھی ہوئی ہے؟

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ۝ یعنی ہم ایسی جماعت ہیں جن کی تعداد کی کثرت اور قوت کی وجہ سے اس پر غلبہ نہیں پایا جاسکتا۔ آیات کے سروں کی اتباع کرتے ہوئے منتصرین نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ یعنی کفار مکہ کو شکست دی جائے گی۔ یہ غزوہ بدر اور دوسرے مواقع پر ہوا۔ عام قراءت سیھزم ہے یاء کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے اور الجمع نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ رویس نے یعقوب سے سَنَهْزِمُ نون کے فتحہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے اور الجمع کو منصوب پڑھا ہے۔

وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ عام قراءت یاء کے ساتھ ہے ان کے بارے میں خبر دی جارہی ہے۔ عیسیٰ، ابن اسحاق اور رویس نے یعقوب سے وتولون تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ الدُّبُرَ اسم جنس ہے جس طرح الدرھم اور الدینار ہے اسے واحد ذکر کیا مراد جمع ہے تاکہ آیات کے سرے موافق رہیں۔ مقاتل نے کہا: ابوجہل نے بدر کے روز اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ صف سے آگے نکلا اور کہا: آج ہم (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے بدلہ لیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ کو نازل کیا۔

سعید بن جبیر نے کہا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ نازل ہوا تو میں نہیں جانتا تھا کہ کون سی جماعت شکست کھائے گی جب بدر کا دن تھا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زرہ میں تیزی سے چلتے ہوئے دیکھا آپ کہہ رہے تھے: اے میرے اللہ! بے شک قریش تیرے پاس فخر کرتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے آئے ہیں وہ تجھ سے دشمنی رکھتے ہیں اور تیرے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں کل انہیں ہلاک کر دے پھر ان کلمات کو اپنی زبان سے ادا کیا سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ تو میں اس کا معنی سمجھ گیا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کے بارے میں خبر دی تو اسی طرح واقع ہوا جس طرح خبر دی أخنی علیہ الدھر اس پر آیا اور اسے ہلاک کر دیا؛ اس معنی میں نابغہ کا قول ہے:

أَخْنَى عليه الذی أَخْنَى علی لُبَدِ

اسے اسی نے ہلاک کیا جس نے لبد کو ہلاک کیا۔

أخنیت علیہ میں نے اس پر فاسد کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت کے نزول اور واقعہ بدر کے درمیان سات سال کا عرصہ حائل تھا اس تعبیر کی بنا پر آیت مکی ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ۝ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جب کہ میں بچی تھی اور کھیلا کرتی تھی (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے روز قبہ میں موجود تھے: أنشدك عهدك و وعدك اللهم إن شئت لم تعبد بعد اليوم أبدا (2) میں تجھے تیرے عہد اور وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں اگر تو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، بل الساعۃ موعدھم، جلد 2، صفحہ 722 2۔ ایضاً، کتاب الجہاد، ما قیل فی درع النبی، جلد 1، صفحہ 408

(مومنوں کی ہلاکت) چاہتا ہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے گی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا عرض کی: کافی ہے یا رسول اللہ! آپ نے اپنے رب سے اصرار کر لیا۔ آپ زرہ میں تھے آپ نکلے جب کہ آپ کہہ رہے تھے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ مراد قیامت ہے۔

وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ۝ جو انہیں بدر کے روز لاحق ہوا قیامت اس سے زیادہ سخت ہوگی۔ أدهى، داهية سے مشتق ہے اس سے مراد عظیم امر ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: دهاه أمر كذا یعنی اسے مصیبت پہنچی۔ ابن سکیت نے کہا: دهته داهية دهواء و دهياء یہ اس کے لیے تاکید ہے۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ۝ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝

''بے شک مجرم گمراہی اور پاگل پن کا شکار ہیں۔ اس روز انہیں گھسیٹا جائے گا آگ میں منہ کے بل (انہیں کہا جائے گا) چکھو اب آگ میں جلنے کا مزہ۔ ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازے سے''۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فِي ضَلَالٍ یعنی حق سے دور اور سُعُرٍ یعنی جلنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سعر سے مراد جنون ہے جس طرح اس سورت میں پہلے گزرا ہے۔ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ۝ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے قریش کے مشرک آئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں جھگڑ رہے تھے، تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اسے امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام مسلم نے طاؤس سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے چند لوگوں کو یہ کہتے ہوئے پایا، وہ کہہ رہے تھے: كل شيء بقدر (1) ہر شی تقدیر کے مطابق ہے میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كل شيء قدر حتى العجز والكيس او الكيس والعجز (2) ہر شی تقدیر کے مطابق ہے یہاں تک کہ ضعف اور دانش۔ اس میں قدریہ کے مذہب کا بطلان ہے۔

ذُوقُوا یہ مقولہ ہے یعنی انہیں کہا جائے گا: چکھو اس کے مَسَّ سے مراد ہے جو اس کے واقع ہونے کے وقت وہ دکھ محسوس کریں گے۔ سَقَرَ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے جو منصرف نہیں کیونکہ یہ ایسا اسم ہے جو مؤنث اور معرفہ ہے اسی طرح لظی اور جہنم ہے۔ عطا نے کہا: سقر جہنم کا چھٹا درجہ ہے۔ قطرب نے کہا: سقر یہ سقرته الشمس سے ماخوذ ہے صقرته اسے سیاہ کر دیا۔ يوم مسمقر و مصمقر سخت گرم۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ عام قراءت میں کل نصب کے ساتھ ہے ابو سمال نے کل رفع کے ساتھ پڑھا ہے یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، كل شيء بقدر، جلد 2، صفحہ 336
2۔ ایضاً

مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے جس نے اسے نصب دی ہے تو نصب فعل کے مضمر ہونے کی بناء پر ہے، یہ کوفیوں کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ ان فعل کو طلب کرتا ہے تو اس وجہ سے یہ صورت اولی ہے نصب اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں عموم پر دال ہے کیونکہ اگر خَلَقْنٰهُ جو محذوف فعل کا مفسر بن رہا ہے اس کو تو حذف کرتا اور پہلے فعل خلقنا کو ظاہر کرتا تو کلام یوں ہوتی انا خلقنا كلّ شىء بقدر تو خلقناه کو شَيْءٍ کی صفت بنانا صحیح نہ ہوتا کیونکہ صفت ایسی چیز میں عمل نہیں کرتی جو موصوف سے پہلے ہو اور جو ماقبل میں عامل ہو اس کی تفسیر نہ ہوتی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس نقطہ نظر پر اہل سنت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو مقدر کیا مراد ہے اس کی مقداروں، احوال اور ازمان کو ان کے ایجاد کرنے سے پہلے جانتا ہے پھر ان میں سے ان چیزوں کو ایجاد کیا کہ وہ اسے اس طریقہ پر ایجاد کرے گا جو اس کے علم میں پہلے سے موجود تھا عالم بالا اور عالم سفلی پر کوئی امر وقوع پذیر نہیں ہوتا مگر وہ اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور اس کے ارادہ سے واقع ہوتا ہے مخلوق اس میں موثر حقیقی نہیں مخلوقات اس میں صرف کسب، کاوش، نسبت اور اضافت ہوا کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کو اس لیے حاصل ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آسانی پیدا کرنے، اس کی قدرت، اس کی توفیق اور الہام کی وجہ سے حاصل ہوا۔ وہ پاک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی اس کے سوا کوئی خالق ہے جس طرح قرآن وسنت کی نصوص اس بارے میں وارد ہیں بات اس طرح نہیں جس طرح قدریہ اور دوسرے علماء نے کہا کہ اعمال ہمارے قبضہ میں ہیں اور آجال کسی اور کے قبضہ میں ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: نجران کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے عرض کی: اعمال ہماری قدرت میں ہیں اور موتیں کسی اور کے قبضہ میں ہیں، تو یہ آیات خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ تک نازل ہوئیں۔ انہوں نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہمارے خلاف ہمارے گناہ لکھتا ہے اور ہمیں عذاب دے گا؟ فرمایا: ''تم قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنے والے ہو گے''۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ابوزبیر نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس امت کے مجوسی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو جھٹلانے والے ہیں اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی تیمارداری نہ کرو، اگر وہ مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو، وہ تمہیں ملیں تو انہیں سلام نہ کرو''۔ ابن ماجہ نے اسے سنن میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے دونوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں سے دو قسم کے افراد ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں وہ مرجئہ اور قدریہ ہیں''۔ نحاس نے سند بیان کی ہے ابراہیم بن شریک کوفی، عقبہ بن مکرم ضبی سے وہ یونس بن بکیر سے وہ سعید بن میسرہ سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ قدریہ جو یہ کہتے ہیں کہ خیر وشر ہمارے ہاتھوں میں ہے میری شفاعت میں ان کا کوئی حصہ نہیں نہ میں ان میں سے ہوں اور نہ وہ مجھ سے ہیں''۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے براءت کا اظہار کیا اور براءت کا اظہار کافر سے ہی کیا جا سکتا ہے پھر اس قول کے ساتھ اسے موکد کیا حضرت عبد اللہ بن عمر اس کے ساتھ قسم اٹھاتے اگر ان میں سے کسی کا احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور وہ

اسے خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے صدقہ قبول نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ تقدیر پر ایمان لائے یہ ایسے ہی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا منافقین کے بارے میں ارشاد ہے: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ (التوبہ: 54) یہ واضح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تقدیر پر ایمان غم اور حزن کو دور کر دیتا ہے''۔

وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝۵۰ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۵۱ وَ كُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ۝۵۲ وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝۵۴ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵

''اور نہیں ہوتا ہمارا حکم مگر ایک بار جو آنکھ جھپکنے میں واقع ہو جاتا ہے۔ اور بے شک ہم نے ہلاک کر دیا جو (کفر میں) تمہارے ہم مشرب تھے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے ان کے نامہ اعمال میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔ بے شک پرہیز گار باغوں اور نہروں میں ہوں گے بڑی پسندیدہ جگہ میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے پاس (بیٹھے) ہوں گے''۔

وَ مَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ یعنی ہمارا امر ایک ہی دفعہ ہوتا ہے كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝۵۰ یعنی میرا فیصلہ میری مخلوق میں آنکھ جھپکنے سے بھی تیز ہوتا ہے۔ لمح کا معنی تیزی سے دیکھنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے لمح البرق ببصرہ بجلی آنکھ جھپکنے برابر چمکی۔ صحاح میں ہے: لمحہ، المحہ جب اسے ہلکی نظر سے دیکھا۔ اسم لمحہ ہے لمح البرق والنجم لمحا یعنی بجلی چمکی۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْيَاعَكُمْ یعنی ہم نے سابقہ امتوں میں سے ایسے لوگوں کو قتل کیا جو کفر میں تمہارے مشابہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تمہارے پیروکاروں اور تمہارے مددگاروں۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۵۱ ہے کوئی ایسا جو نصیحت حاصل کرے۔ وَ كُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ۝۵۲ یعنی ان سے قبل امتوں نے بھلائی یا برائی میں سے جو بھی اعمال کیے وہ لکھے ہوتے ہیں یہ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹ کا بیان ہے۔

فِی الزُّبُرِ ۝۵۲ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کراما کاتبین کی کتابیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ام الکتاب میں لکھا ہوا ہے وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳ یعنی ہر گناہ جو چھوٹا ہو یا بڑا ہو وہ عامل کے حق میں لکھا ہوتا ہے قبل اس کے کہ وہ اس کو کرے تا کہ اسے جزا دی جائے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے اس وقت اسے لکھا جاتا ہے۔ سَطَرَ يَسْطُرُ سَطْرًا کا معنی لکھنا ہے، استطر بھی اس کی مثل ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝۵۴ جب کفار کی صفت بیان کی تو مومنین کی بھی صفت بیان کی وَّ نَهَرٍ یعنی پانی، شراب، شہد اور دودھ کی نہریں (1)؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ اسے واحد ذکر کیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے، پھر واحد کا صیغہ کبھی تمام کی خبر دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَهَرٍ یعنی وہ روشنی اور وسعت میں ہے۔ اس سے نہار کا لفظ ہے کیونکہ وہ روشن ہوتا ہے اسی معنی میں انہرت الجرح میں نے زخم کو کھلا کیا؛ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 420

مَلَكْتُ بِهَا كَفِّي فَأَنهرْتُ فَتقَها (1)

اس کے ساتھ میں نے اپنی ہتھیلی کو قوی کیا اور اس کے سوراخ کو کھلا کیا۔

ابو مجلز، ابو نہیک، اعرج، طلحہ بن مصرف اور قتادہ نے ونھر پڑھا گویا یہ نہار کی جمع ہے ان پر رات نہیں آئے گی، جس طرح سحاب اور سحب ہے۔ فراء نے کہا: ایک عرب نے مجھے یہ شعر سنایا:

إنْ تَكُ لَيلِيًا فَإنّي نَهِرُ مَتَى أرَى الصُّبحَ فلا أنتَظِرُ

اگر تو رات والا ہے تو میں دن والا ہوں۔ میں کب صبح دیکھوں گا پس میں انتظار نہیں کرتا۔ ایک اور نے کہا:

لَوْلَا الثَّرِيدَانِ هَلَكْنَا بِالضُّمُرْ ثَرِيدُ لَيلٍ و ثَرِيدٌ بِالنُّهُرِ(2)

اگر یہ دو ثریدیں نہ ہوتیں تو ہم پتلی کمر کے ساتھ ہلاک ہو جاتے رات کی ثرید اور دن کی ثرید۔

**فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ** حق کی مجلس میں جس میں کوئی چیز لغو نہ ہو اور اس میں کوئی گناہ بھی نہ ہو وہ جنت ہے۔ **عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ** ﴿۵۵﴾ جو چاہے اس پر قادر ہے۔ یہاں عِنْدَ سے مراد قربت، مکان، رتبہ، کرامت اور منزلت کی عندیہ ہے، صادق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مکان صدق کی مدح بیان کی اس میں اہل صدق ہی بیٹھتے ہیں۔ عثمان بتی نے پڑھا فی مقاعد صدق یعنی جمع کا صیغہ پڑھا مقاعد لوگوں کے بیٹھنے کی جگہیں ہیں وہ بازاروں میں ہوں یا کسی اور جگہ۔ عبد اللہ بن بریدہ نے کہا: جنتی ہر روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے وہ اس کی بارگاہ میں قرآن کی تلاوت کریں گے۔ ہر انسان اپنے بیٹھنے کی جگہ بیٹھے گا جب کہ وہ یاقوت، زبرجد، سونے اور چاندی کے منبروں پر ہوں گے سب اپنے اپنے اعمال کے مطابق ہوں گے، ان کی آنکھیں کسی چیز سے اتنی ٹھنڈی نہ ہوں گی جیسی اس طریقہ سے ٹھنڈی ہوں گی۔ انہوں نے اس سے عظیم اور اس سے بڑھ کر کسی حسین چیز کے بارے میں نہیں سنا ہو گا پھر وہ اپنی منازل کی طرف چلے جائیں گے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی کل تک معاملہ اسی طرح رہے گا۔

ثور بن یزید نے خالد بن معدان سے روایت نقل کی ہے ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ فرشتے قیامت کے روز مومنوں کے پاس آئیں گے، وہ کہیں گے: اے اللہ کے دوستو! چلو۔ وہ پوچھیں گے: کہاں؟ فرشتے کہیں گے جنت کی طرف۔ مومن کہیں گے: تم ہمیں ایسی جگہ لے جا رہے ہو جو ہمارا مقصود نہیں۔ فرشتے پوچھیں گے: تمہارا مقصود کیا ہے؟ مومن کہیں گے: مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ یہ خبر خصوصی طور پر اس معنی میں مروی ہے خبر میں ہے "ایسا طائفہ جو اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتا ہو گا اسے فرشتے جنت کی طرف لے جائیں گے جب کہ لوگوں کا ابھی حساب ہو رہا ہو گا۔ وہ لوگ فرشتوں سے کہیں گے کہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ فرشتے کہیں گے: جنت کی طرف۔ لوگ کہیں گے: تم ہمیں اسی چیز کی طرف لے جا رہے ہو جو ہمارا مقصود نہیں۔ فرشتے پوچھیں گے: تمہارا مقصود کیا ہے؟ فرشتے کہیں گے: حبیب کے ساتھ مَقْعَدِ صِدْقٍ جس طرح بتایا فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 222 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 420

# سورۃ الرحمٰن

(آیاتہا ۷۸) (۵۵ سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۷) (رکوعاتہا ۳)

حضرت حسن بصری، عروہ بن زبیر، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے نزدیک ساری سورت مکی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مگر ایک آیت، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ اس کی چھہتر آیات ہیں۔ حضرت ابن مسعود اور مقاتل نے کہا: یہ تمام کی تمام مدنی ہے۔ پہلا قول اصح ہے(2) کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس نے مکہ مکرمہ میں بلند آواز سے قرآن پڑھا وہ حضرت ابن مسعود تھے اس کی وجہ یہ بنی کہ صحابہ کرام نے کہا: قریش نے اس قرآن کو بلند آواز سے کسی کو پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ کوئی ایسا آدمی ہے جو ان کو قرآن سنائے گا؟ حضرت ابن مسعود نے کہا: میں۔ صحابہ نے کہا: ہمیں تمہارے بارے میں ڈر لگتا ہے۔ ہم تو کسی ایسے آدمی کا ارادہ کرتے ہیں جس کا قبیلہ ہو جو اس کا دفاع کرے۔ حضرت ابن مسعود نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر آپ مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو گئے کہا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ پھر اپنی آواز کو بلند کیا جب کہ قریش اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے غور کیا اور کہا: ابن ام عبد کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ وہی کہتا ہے جس کے بارے میں (حضرت) محمد گمان کرتے ہیں کہ یہ اس پر نازل کیا گیا ہے، پھر انہوں نے حضرت ابن مسعود کو مارا یہاں تک کہ ان کے چہرے پر نشانات چھوڑے ☆۔

یہ بات صحیح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نخلہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سورۃ الرحمٰن پڑھی تو جنوں کی ایک جماعت گزری اور آپ پر ایمان لے آئی۔

ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(3) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے پاس تشریف لائے تو ابتدا سے لے کر آخر تک سورۂ رحمٰن پڑھی تو صحابہ خاموش ہو گئے فرمایا: ''میں نے اسے جنوں والی رات میں جنوں پر پڑھا تھا وہ تم سے اچھا جواب دینے والے تھے۔ میں جب بھی اس آیت پر پہنچا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ وہ کہتے: ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے اے ہمارے رب! تیرے لیے حمد ہے''۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ یہ مکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ قاسم بن عاصم منقری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: جو آپ پر نازل ہوا ہے اسے مجھ پر پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر سورۂ رحمٰن پڑھی۔ اس نے عرض کی: اسے دوبارہ پڑھیے تو آپ نے تین دفعہ اسے پڑھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! اس پر ظاہری حسن ہے، اس میں مٹھاس ہے، اس کا نیچے والا حصہ بہت گہرا ہے اور اس کا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 422
2۔ المعجم الکبیر، جلد 24، صفحہ 86، حدیث 231
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 161، کتاب التفسیر
☆ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن باب ومن سورۃ الرحمٰن، حدیث نمبر 3213، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اوپر والا حصہ پھل دار ہے یہ کوئی انسان نہیں کہہ سکتا میں اس امر کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں اور تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر شی کی دلہن ہوتی ہے اور قرآن کی دلہن سورۂ رحمٰن ہے'' (1)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۪﴿۵﴾ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾ وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾ وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۪ۙ وَّ النَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۪ۖ﴿۱۱﴾ وَ الْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ ۚ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

''رحمٰن نے (اپنے حبیب کو) سکھایا ہے قرآن۔ پیدا فرمایا انسان (کامل) کو (نیز) اسے قرآن کا بیان سکھایا۔ سورج اور چاند حساب کے پابند ہیں اور (آسمان کے) تارے اور (زمین کے) درخت اسی کو سجدہ کناں ہیں۔ اور آسمان اسی نے بلند کیا اور میزان (عدل) قائم کی تاکہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو اور وزن کو ٹھیک رکھو انصاف کے ساتھ اور تول کو کم نہ کرو۔ اور اس نے زمین کو پیدا کیا ہے مخلوق کے لیے اس میں گوناگوں پھل ہیں اور کھجوریں غلافوں والی اور اناج بھی بھوسہ والا اور خوشبودار پھول۔ پس (اے انس و جان) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ سعید بن جبیر اور عامر شعبی نے کہا: الرحمٰن تین سورتوں کا آغاز ہے جب سب کو جمع کیا جائے تو وہ مل کر اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام بن جاتا ہے الر، حم اور ن۔ ان تینوں کا مجموعہ اَلرَّحْمٰنُ بنتا ہے۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن کی تعلیم دی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تمام انسانوں تک پہنچایا۔ یہ اس وقت آیات نازل ہوئیں جب انہوں نے یہ کہا: اَلرَّحْمٰنُ؟ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اہل مکہ کے جواب میں نازل ہوئیں جب انہوں نے یہ کہا تھا: اسے ایک انسان سکھاتا ہے وہ یمامہ کا رحمان ہے۔ وہ اس سے مسیلمہ کذاب مراد لیتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔ زجاج نے کہا: عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کا معنی ہے قرآن کو یاد کرنا اور اس کو پڑھنا آسان بنا دیا جس طرح فرمایا: وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے علامت بنا دیا ہے جس کی لوگ عبادت کرتے ہیں۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ حضرت ابن عباس،

1۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 582، حدیث 2638

قتادہ اور حضرت حسن بصری نے کہا: الْاِنْسَانَ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں (1)۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝ یعنی تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہیں تمام لغات سکھائیں۔ حضرت ابن عباس اور ابن کیسان سے یہ مروی ہے: یہاں انسان سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (2)، بیان سے مراد حرام سے حلال کی اور گمراہی سے ہدایت کی وضاحت ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا: جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہوگا وہ مراد ہے کیونکہ آپ نے اولین، آخرین اور یوم دین کے بارے میں واضح کیا۔ ضحاک نے کہا: بیان سے مراد خیر و شر ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: جو اسے نفع دیتی ہے اور جو اسے نقصان دیتی ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے تمام لوگ مراد ہیں، یہ اسم جنس ہے۔ اس تاویل کی صورت میں بیان سے مراد کلام اور فہم ہے یہ ایسا وصف ہے جس کے ساتھ انسان باقی تمام حیوانوں پر فضیلت رکھتا ہے (4)۔ سدی نے کہا تمام قوموں کو ان کی زبان کی تعلیم دی جس کے ساتھ وہ کلام کرتے ہیں۔ یمان نے کہا: مراد قلم کے ساتھ خط و کتابت ہے؛ اس کی مثل یہ ارشاد ہے: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۝ (العلق) اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۝ وہ معلوم حساب سے چلتے ہیں۔ تقدیر کلام یہ ہے الشمس والقمر یجریان بحسبان۔ خبر کو مضمر کیا گیا ہے وہ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور نہ ایک طرف جھکتے ہیں۔ ابن زید اور ابن کیسان نے کہا: ان دونوں کی مدد سے اوقات، آجال اور عمروں کا حساب لگایا جاتا ہے۔ اگر دن، رات، سورج اور چاند نہ ہوتے کوئی یہ نہ جانتا کہ وہ کیسے حساب کرے اگر سارے کا سارا زمانہ رات یا دن ہی ہوتا۔

سدی نے کہا: بِحُسْبَانٍ سے مراد ہے ان کی اجل کی تقدیر ہے جس طرح لوگوں کی زندگی کے اوقات مقرر ہیں اسی طرح ان کے اوقات مقرر ہیں جب ان کی اجل آجاتی ہے تو یہ دونوں ہلاک ہو جاتے ہیں؛ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (الرعد: 2) ضحاک نے حسبان کا معنی قصد کیا ہے۔ مجاہد نے کہا: حسبان سے مراد ہے چکی کی میخ وہ یوں گردش کرتے ہیں جس طرح چکی میخ کے گرد گھومتی ہے (5)۔ حسبان بعض اوقات حسبتہ، أحسبه کا مصدر ہوتا ہے جس طرح غفران، کذبان اور رجحان ہے اور حسابۃً بھی اس کا مصدر آتا ہے یعنی میں نے اسے شمار کیا۔ اخفش نے کہا: یہ حساب کی جمع ہے جس طرح شھاب کی جمع شھبان آتی ہے۔ حسبان جب ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عذاب اور چھوٹے تیر ہوتے ہیں سورۂ کہف میں گزرا ہے اس کی واحد حسبانہ ہے۔ حسبانہ کا معنی چھوٹا تکیہ بھی ہوتا ہے اس معنی میں تو کہتا ہے: حسبتہ جب تو اسے تکیہ بنائے کہا:

لَثَوَيْتَ غيرَ مُحَسَّب

یعنی تکیہ کے بغیر نہ اس میں تکریم تھی اور نہ ہی اس میں کفن دیا گیا تھا۔

وَّالنَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۝ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا: نجم اسے کہتے ہیں جس کا تنا نہ ہو اور درخت اسے کہتے ہیں جس کا تنا ہو (6)۔ نجم یہ نجم الشیٔ ینجم نجوما سے مشتق ہے جب وہ ظاہر و طلوع ہو۔ اس کے سجود سے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 423 | 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 223 | 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 423

4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 223 | 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 424 | 6۔ ایضاً

مراد ان کے سایہ کا سجدہ کرنا ہے (1)؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ فراء نے کہا: دونوں کے سجدہ سے مراد یہ ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو یہ سورج کے بالمقابل ہوتے ہیں پھر اس کے ساتھ مائل ہوتے ہیں یہاں تک کہ سایہ چھوٹا ہو جاتا ہے (2)۔ زجاج نے کہا: ان دونوں کے سجود سے مراد ان کے سایہ کا ان کے ساتھ گھومنا ہے (3) جس طرح فرمایا: یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ (النحل: 48) حضرت حسن بصری اور مجاہد نے کہا: نجم سے مراد آسمان کا ستارہ ہے اور مجاہد کے قول کے مطابق اس کے سایہ کا گردش کرنا ہے؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے؛ یہ مہدوی نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے سجود سے مراد اس کا غروب ہونا ہے اور درخت کے سجدہ سے مراد اس کے پھل کے چننے کا ممکن ہونا ہے؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سب اللہ تعالیٰ کے سامنے مسخر ہیں تم ستارے کی پوجا نہ کرو جس طرح صابیوں میں سے ایک قوم نے ستاروں کی پرستش کی اور عجمیوں سے کثیر لوگوں نے درخت کی پوجا کی۔ سجود کا معنی خضوع ہے اس سے مقصود حادث ہونے کے آثار ہیں؛ قشیری نے اسے بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا: لغت میں سجود کی اصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری ہے۔ تمام جامد چیزوں سے سجود اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ حیوانات سے بھی یہ اسی طرح ہے اس سے مراد نماز کا سجدہ بھی ہو سکتا ہے۔ محمد بن یزید نے نجم کو نجوم کے معنی میں لیا ہے۔ فَبَاتَتْ تَعُدُّ النَّجْمَ اس نے رات ستارے گنتے ہوئے گزاری۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا ابو سمال نے السماء پڑھا یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے (5) اسے اس لیے پسند کیا کیونکہ اس کا عطف اس جملہ پر ہے وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۞ معطوف کو مبتدا اور خبر سے مرکب کیا ہے جس طرح معطوف علیہ مبتدا اور خبر سے مرکب ہے باقی قراء نے السَّمَآءَ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہاں فعل مضمر ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے۔

وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ میزان کا معنی عدل ہے؛ یہ مجاہد، قتادہ اور سدی سے عبارت ہے یعنی زمین میں اس عدل کو رکھا جس کا حکم دیا یہ جملہ بولا جاتا ہے: وضع اللہ الشریعۃ، وضع فلان کذا فلاں نے اسے پھینکا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میزان سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس میں اس چیز کا بیان ہے جس کے وہ محتاج ہیں؛ یہ حضرت حسین بن فضل کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری، ضحاک اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد ترازو ہے (6) جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس کے ساتھ نصف نصف کریں۔ یہ جملہ خبریہ ہے امر کے معنی میں ہے یعنی عدل کا حکم دیا؛ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان دلالت کرتا ہے: وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ۔ قسط کا معنی عدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی حکم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آخرت میں میزان رکھنے کا ارادہ کیا تاکہ اعمال کا وزن کیا جائے۔ میزان کی اصل موزان ہے اس بارے میں گفتگو سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۞ ان کا محل نصب ہو سکتا ہے اس صورت میں کہ حرف جار حذف ہے گویا فرمایا: لئلا تطغوا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) یہ بھی جائز ہے کہ ان کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو بلکہ یہ ای کے معنی میں ہو اس تقدیر کی بنا پر تطغوا مجزوم ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 424 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 224 6۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 424

س: 6) طغیان کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ جس نے کہا: میزان کا معنی عدل کرنا ہے (1) تو اس نے کہا طغیان کا معنی ظلم ہے۔ جس نے کہا: میزان سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا: طغیان کا معنی کمی کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس کے لیے تم وزن کرو اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ ان سے یہ بھی مروی ہے جس نے کہا: اس کا معنی حکم ہے اس نے کہا: اس کے طغیان سے مراد تحریف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں اضمار ہے یعنی اس نے میزان اتارا اور تمہیں حکم دیا کہ تم اس میں سرکشی نہ کرو۔

وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ یعنی عدل کے ساتھ اسے سیدھا رکھو۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا: ترازو کی ڈنڈی انصاف کے ساتھ سیدھا رکھو۔ ابن عیینہ نے کہا: اقامت کا تعلق ہاتھ سے اور قسط کا تعلق دل سے ہے۔ مجاہد نے کہا: قسط رومی زبان میں عدل کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے اقام الصلوٰۃ یعنی اسے اپنے وقت میں ادا کیا۔ أقام الناس سوقھم وہ بازار میں اس کے وقت میں آئے۔ یعنی تم وزن میں عدل کے ساتھ جو باہم معاملہ کرتے ہو اسے ترک نہ کرو۔

وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝ میزان میں کمی نہ کرو، کیل اور وزن میں کمی نہ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود: 84) قتادہ نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ابن آدم کے ساتھ عدل کرو جس طرح تو پسند کرتا ہے کہ تیرے ساتھ عدل کیا جائے اور پورا پورا حق دو جس طرح تو پسند کرتا ہے کہ تجھے پورا پورا حق دیا جائے، کیونکہ عدل میں یہی لوگوں کا بھلا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے قیامت کے روز اپنی نیکیوں کے میزان میں کمی نہ کرو کہ یہ چیز تمہارے لیے حسرت بن جائے۔ آیات کے سروں کی رعایت کرتے ہوئے میزان کا لفظ مکرر ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تکرار وزن کو پورا کرنے اور عدل کی رعایت کے امر کے لیے ہے۔ عام قرأت تخسروا ہے۔ بلال بن ابی بردہ اور ابان بن عثمان نے تَخْسِرُوا قرأت کی ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أخسرت المیزان و خسرته۔ یہ أجبرته و جبرته کی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تَخْسَرُوا تاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے حرف جر کے حذف پر محمول ہے۔ معنی ہے لا تخسروا فی المیزان میزان میں کمی نہ کرو۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ انام سے مراد لوگ ہیں (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جن اور انسان مراد ہیں (3)۔ ضحاک نے کہا: روئے زمین پر جو چیز چلتی ہے۔ یہ عام ہے فِیْهَا فَاكِهَةٌ مختلف رنگ کے پھلوں سے انسان جو لطف اندوز ہوتا ہے۔

وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ اکمام، کم کی جمع ہے۔ جوہری نے کہا: کمہ اور کمامہ کا معنی گابھے کا غلاف اور کلی کا پردہ اس کی جمع کمام، اکمہ، اکمام اور أکامیم آتی ہے کم الفصیل جب اس پر شفقت کی گئی اسے ڈھانپا گیا یہاں تک کہ وہ طاقتور ہو گیا؛ عجاج نے کہا:

بَلْ لَوْ شَهِدْتَ النَّاسَ إِذْ تُكُمُّوا بِغُمَّةٍ لَوْ لَمْ تُفَرَّجْ غُمُّوا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 425 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تُکُنُّوا یعنی ان پر غشی طاری ہوگئی اور انہیں ڈھانپ لیا گیا۔ اکمت النخلة و کممت یعنی اس نے گابھے کے پردے نکالے۔ کمام اور کمامه کا معنی یہ بھی ہے جس کے ساتھ اونٹ کا منہ باندھا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کو نہ کاٹے۔ اس معنی میں تو کہتا ہے بعیر مکموم۔ کممت الشیٔ میں نے اس شے کو ڈھانپ لیا انکم جو کسی چیز کو چھپا لے اور اسے ڈھانپ لے، اسی معنی میں کہ القمیص ہے اس کی جمع اکمام اور کِمَمَه ہے جس طرح حب کی جمع حَبَبَه ہے کمۃ کا معنی گول ٹوپی ہے کیونکہ وہ سر کو ڈھانپ لیتی ہے: شاعر نے کہا:

فقلتُ لَهُمْ کِیلو بکُمّةِ بعضِکُمْ دَرَاهِمَکُمْ اِنِّی کذلك أَکِیلُ

میں نے انہیں کہا: تم اپنے میں سے کسی کی ٹوپی کے ساتھ اپنے دراہم کا کیل کرلو میں اسی طرح کیل کیا کرتا ہوں۔

حضرت حسن بصری نے کہا: ذات الاکمام کا معنی ہے چھال والا کیونکہ کھجوروں کو چھال سے چھپایا جاتا ہے: کمامها سے مراد اس کی وہ چھال ہے جو اس کی گردن میں ہوتی ہے۔ ابن زید نے کہا: وہ گابھے والا ہے قبل اس کے کہ وہ اوپر سے چھٹ جائے۔ عکرمہ نے کہا: وہ احمال والا ہے۔

**وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ** ۝ حب سے مراد گندم، جو وغیرہ ہیں۔ عصف کا معنی بھوسہ ہے۔ حضرت حسن بصری وغیرہ سے مروی ہے مجاہد نے کہا: درخت اور کھیتی کا پتہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: کھیتی کا تنکا اور پتہ جسے ہوائیں اڑاتی رہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: کھیتی میں سے جو سب سے پہلے اگتا ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ عرب کہتے ہیں: خرجنا لعصف الزرع پکنے سے پہلے جب اسے کاٹ لیں۔ صحاح میں اسی طرح ہے عصفت الزرع جب تو اس کو پکنے سے پہلے کاٹ لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عصف سے مراد سبز کھیتی کا پتہ ہے جب اس کا سرا کاٹ دیا جائے اور وہ خشک ہو جائے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ** ۝ (الفیل) جوہری نے کہا: قد اعصف الزرع، مکان معصف ایسا مکان جو زیادہ کھیتی والا ہو۔ ابو قیس بن اسلت انصاری نے کہا:

إذا جُمَادَی مَنَعَتْ قَطْرَهَا زَانَ جَنَابِی عَطَنٌ مُعْصِفُ

جب جمادی نے اپنی بارش کو روک لیا تو کثیر کھیتی والے باڑے نے میرے صحن کو مزین کیا۔

عصف کا معنی کمائی بھی ہے؛ اسی معنی میں راجز کا قول ہے

**بغیرِ ما عَصْفٍ ولا اصْطِرَابِ** بغیر محنت اور کسب معاش کے۔

اسی طرح الاعتصاف ہے عصیفه سے مراد مجتمع پتے ہیں جن میں بالی ہو۔ ہروی نے کہا: عصف اور عصیفه سے مراد بالی کا پتہ ہے۔ ثعلبی نے کہا: ابن سکیت نے کہا عرب کھیتی کے پتہ کو عصف اور عصیفه کہتے ہیں جل جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صحاح میں ہے جل کھیتی کا تنا جب اسے کاٹ جائے۔ ریحان سے مراد رزق ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ حمیر کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور قتادہ نے کہا: مراد وہ ریحان ہے جسے سونگھا جاتا ہے؛ یہ ابن

زید کا قول ہے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد کھیتی کی سبزی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد وہ کھیتی ہے جو تنے پر کھڑی ہو۔ فراء نے کہا: عصف سے مراد کھیتی میں سے جسے کھایا گیا ہو(2)، ریحان اسے کہتے ہیں جسے نہ کھایا جائے۔ کلبی نے کہا: عصف اس پتے کو کہتے ہیں جس کو کھایا نہیں جاتا(3)، ریحان اس دانے کو کہتے ہیں جس کو کھایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایسی سبزی جس کی خوشبو اچھی ہو اسے ریحان کہتے ہیں کیونکہ انسان اس کی اچھی خوشبو سونگھتا ہے۔ یہ فعلان کا وزن ہے روحان رائحہ سے ماخوذ ہے کلمہ میں یاء کا اصل واؤ تھا اس کے اور روحانی کے درمیان فرق کرنے کے لیے واؤ کو یاء سے بدل دیا۔ روحانی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی روح ہو۔ ابن اعرابی نے کہا: یہ کہا جاتا ہے شئ روحانی و ریحانی یعنی اس کی روح ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعیلان کے وزن پر ہو اس کی اصل ریوحان ہے واؤ کو یاء سے بدل دیا اور پھر ادغام کیا جس طرح ھین اور لین، پھر طوالت اور الف نون زائدہ کے لاحق ہونے کی وجہ سے تخفیف کو لازم کر دیا گیا۔ حوراء، واؤ اور حاء سے مرکب ہو اس میں اصل جھومنا اور حرکت کرنا ہے۔ صحاح میں ہے: ریحان سے مراد معروف جڑی بوٹی ہے۔ ریحان سے مراد: رزق ہے تو کہتا ہے خرجت أبتغی ریحان میں اللہ تعالیٰ کا رزق تلاش کرنے کے لیے نکلا۔ نمر بن تولب نے کہا:

سلامُ الالٰہِ و رَیْحَانُہٗ اللہ تعالیٰ کا سلام اور اس کا رزق (4)۔

حدیث میں ہے: الولد من ریحان اللہ (5) اولاد اللہ تعالیٰ کا رزق ہے۔ اور لوگوں کا یہ قول سبحان اللہ و ریحانہ دونوں کو مفعول مطلق کے طریقہ پر نصب دی ہے۔ وہ یہ قول کر کے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا چاہتے ہیں اور اس سے رزق کے طالب ہوتے ہیں، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ الْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّیْحَانُ ﴿۱۲﴾ کا تعلق ہے تو عصف سے مراد کھیتی کا تنا اور ریحان سے مراد اس کا پتہ ہے؛ یہ فراء سے مروی ہے۔ عام قرأت وَ الْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّیْحَانُ ﴿۱۲﴾ دونوں پر رفع ہے کیونکہ ان کا عطف الفاکھۃ پر ہے۔ ابن عامر، ابوحیوہ اور مغیرہ نے الارض پر عطف کرتے ہوئے انہیں منصوب پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فعل مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہے خلق الحبّ ذا العصف و الریحان اس صورت میں ذات الاکمام پر عطف کرنا اچھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الریحان کو جر دی ہے اس کا عطف العصف پر ہے، تقدیر کلام یہ ہو گی الحب ذو العصف و الریحان جس نے ریحان کو رزق بنایا ہے یہ اس پر ممتنع نہیں، گویا یوں کہا: والحب ذو الرزق۔ رزق اس حیثیت میں کہ عصف رزق ہے کیونکہ عصف بہائم کا رزق ہے اور ریحان لوگوں کا رزق ہے (6)۔ جس نے یہ کہا کہ یہ ریحان مشموم ہے اس کے قول میں کوئی شبہ نہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ یہ جن و انس کو خطاب ہے کیونکہ انام کا لفظ دونوں پر صادق آتا ہے (7)؛ یہ جمہور کا قول

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 426 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 225 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 426 4۔ ایضاً

5۔ نوادر الاصول، الاصل العاشر و المائۃ فی صفحہ 146۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی حب الولد، حدیث 1833، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 225 7۔ ایضاً

ہے۔ اس پر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے جس کا ذکر سورت کے آغاز میں ہوا ہے؛ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اس میں ہے للجن احسن منکم ردا(1) جنوں نے تم سے بہتر جواب دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جب فرمایا خَلَقَ الْاِنْسَانَ اور فرمایا: خَلَقَ الْجَآنَّ اس چیز نے اس امر پر دلالت کی کہ جس کا ذکر پہلے ہوا یا بعد میں ہوا اس پر یہ دال ہے نیز یہ بھی فرمایا: سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ یہ خطاب انسانوں اور جنوں کو ہے اس صورت میں فرمایا: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ۔ جرجانی نے جنوں کو انسان کے ساتھ خطاب کیا اگرچہ جنوں کا پہلے ذکر نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ (ص) جنوں کا ذکر وہاں ہو چکا تھا جو پہلے نازل ہوا قرآن ایک سورت کی طرح ہے جب یہ ثابت ہے کہ وہ انسانوں کی طرح مکلف ہیں تو ان آیات میں دونوں جنسوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب صرف انسانوں کو ہے جس طرح عربوں کی عادت ہے کہ ایک کو خطاب تثنیہ کے لفظ کے ساتھ کرتے ہیں جس طرح اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ (ق:24) میں گفتگو گزر چکی ہے اسی طرح قفانبك اور خليلی مرّابی میں گزر چکا ہے، جہاں تک خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ اور خَلَقَ الْجَآنَّ کے بعد جو خطاب ہے وہ انسانوں اور جنوں دونوں کو ہے۔ صحیح جمہور کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ، آلاء سے مراد نعمتیں ہیں (2)؛ یہ تمام مفسرین کا قول ہے اس کا واحد الٰی اور اِنًی ہے جس طرح معًی اور عصا ہے اِلًی اور اَلًی اس میں چار لغتیں ہیں جن کا ذکر نحاس نے کیا ہے کہا: اناء اللیل کے واحد میں تین لغتیں ہیں ان میں سے الف مفتوح اور لام ساکن والی لغت ساقط ہے۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ النجم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

ابن زید نے کہا اس سے مراد قدرت ہے تقدیر کلام یہ ہے فبأی قدرۃ ربکما تکذبان یہ کلبی کا قول ہے۔ امام ترمذی محمد بن علی نے اسے ہی اختیار کیا ہے کہا: یہ سورت قرآن کی سورتوں کا جھنڈا ہے جھنڈا لشکر کا امام ہوتا ہے اور لشکر اس کی پیروی کرتا ہے: یہ علم (جھنڈا) بنا کیونکہ یہ ملک و قدرت کی صفت ہے فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ سورت کا آغاز دوسرے اسماء کی بجائے رحمن کے اسم سے کیا تاکہ بندوں کو علم ہو جائے کہ اس کے بعد تمام وہ چیزیں جن کے ساتھ صفت بیان کی ہے وہ اس کے افعال، اس کے ملک اور اس کی قدرت میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی رحمانیت میں سے رحمت عظمیٰ ان کی طرف نکلی ہے۔ فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ پھر انسان کا ذکر کیا فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ پھر ان چیزوں کا ذکر کیا جو انسان پر احسانات کیے پھر سورج و چاند کے احسان اور اشیاء یعنی نجم و شجر کے سجود کا ذکر کیا پھر آسمان کے بلند کرنے اور میزان یعنی عدل قائم کرنے اور زمین کو انام کے لیے بچھانے کا ذکر کیا، پھر جن و انس کو خطاب کیا جب انہوں نے ان چیزوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کی وجہ سے قدرت و ملک میں سے ظاہر ہوئیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی منفعت اور حاجت کے بغیر کیں، تو لوگوں نے اس کے ساتھ بتوں کو شریک کر لیا اور ہر معبود کو اس کے سوا اپنا معبود بنا لیا اور اس رحمت کا انکار کر دیا جس کے ساتھ یہ اشیاء ان کی طرف نکلیں۔ سوال کرتے ہوئے انہیں فرمایا: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ یعنی تم اپنے رب کی کس قدرت کا انکار کرتے ہو؟ ان کی تکذیب یہ تھی کہ وہ چیزیں جو اس کے ملک اور قدرت سے ظاہر ہوئی تھیں ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہوں نے شریک

1۔ المستدرک علی الصحیحین، جلد 2، صفحہ 515، سورۂ رحمن
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 226

ٹھہرالیا جواس کے ساتھ مالک ہے اوراس کے ساتھ قادر ہے یہی ان کی تکذیب ہے۔ پھر یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلصال سے پیدا کیا۔ پھر یہ ذکر کیا کہ جنوں کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔ پھر ان سے پوچھا تو فرمایا: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ یعنی تم اپنے رب کی کس قدرت کا انکار کرتے ہو کیونکہ ہر مخلوق میں اس کی قدرت کے بعد قدرت شامل ہے۔ ان آیات میں تکرار تاکید کے لیے اور وضاحت میں مبالغہ کے لیے ہے اوران کے خلاف دلیل قائم کرنے کے لیے ہے کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کیا۔ قتبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں اپنی نعمتوں کا شمار کیا اپنی مخلوق کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں۔ پھر اس کے پیچھے ہر اس کجی کا ذکر کیا جس سے وہ متصف تھا اور ہر اس نعمت کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے باوجود اس پر کی اور یہ دو نعمتوں کے درمیان اسے فاصلہ کے طور پر رکھا تاکہ انہیں نعمتوں پر متنبہ کرے اور انہیں وہ نعمتیں یاد دلائے جس طرح تو اس آدمی کو کہتا ہے جس پر تو لگا تار احسان کرتا ہے جب کہ وہ اللہ کی ناشکری کرتا ہے اور اس کا انکار کرتا ہے۔ کیا تو فقیر نہیں تھا تو میں نے تجھے غنی کر دیا۔ کیا تو اس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو گمنام نہ تھا تو میں نے تجھے عزت دار بنا دیا کیا تو اس کا انکار کر سکتا ہے؟ اس قسم کی صورت حال میں تکرار اچھا ہے، جس طرح کہا:

كَمْ نِعْمَةٍ كَانَتْ لَكُمْ كَمْ كَمْ وَكَمْ

تمہارے لیے کتنی ہی نعمتیں ہیں۔

اسی طرح کہا:

لَا تَقْتُلِي مُسْلِمًا اِنْ كُنتِ مُسْلِمَةً اِيَّاكِ مِنْ دَمِهِ اِيَّاكِ اِيَّاكِ

اگر تو مسلمان عورت ہے تو کسی مسلمان کو قتل نہ کر اس کے خون سے بچ۔

ایک اور شاعر نے کہا۔

ولا تملّنّ من زيارته زُرْهُ وزُرْهُ وزُرْ وزُرْ وزُرْ

اپنے دوست کی ملاقات سے نہ اکتا تو اس کی ملاقات کر۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾

''پیدا فرمایا انسان کو بجنے والی مٹی سے ٹھیکری کی مانند اور پیدا کیا جان کو آگ کے خالص شعلے سے۔ پس (اے جن و انس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہی دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ہے۔ پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ جب اللہ تعالیٰ نے عالم کبیر کی تخلیق یعنی آسمان، زمین اوران کے درمیان اس کی وحدانیت اوراس کی قدرت پر موجود دلائل کا ذکر کیا تو عالم صغیر کی تخلیق کا ذکر کیا فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ علماء تاویل کا اتفاق ہے کہ الْاِنْسَانَ سے مراد

حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ صَلْصَالٍ سے مراد خشک مٹی ہے جس کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ اس کو فخار کے ساتھ تشبیہ دی جسے پکایا گیا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسی مٹی ہے جس میں ریت کی آمیزش ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بدبودار مٹی ہے(1) یہ صل اللحم واصل سے مشتق ہے جب وہ بدبودار ہو۔ سورۂ حجر میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ یہاں کہا: مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ ایک اور جگہ فرمایا: مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر) ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ (الصافات) فرمایا: كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران: 59) سب کا معنی ایک ہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین سے مٹی لی اسے گوندھا تو وہ طین بن گئی پھر وہ منتقل ہوئی تو وہ حما مسنون کی طرح ہو گئی پھر منتقل ہوئی تو وہ فخار کی طرح صَلْصَالٍ ہو گئی۔

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ حضرت حسن بصری نے کہا: جان سے مراد ابلیس ہے یہ جنوں کا باپ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الْجَآنَّ جن کا واحد ہے مَّارِجٍ سے مراد خالص شعلہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنوں کو خالص جان سے پیدا کیا۔ لیث نے کہا: مَّارِجٍ سے مراد ایسا شعلہ ہے جو پھیلنے والا ہو جو شدید لپک والا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے(2): اس سے مراد وہ شعلہ ہے جو آگ پر بلند ہوتا ہے اور اس کا بعض بعض سے ملا ہوتا ہے یعنی کوئی سرخ کوئی زرد اور کوئی سبز ہوتا ہے۔ اس کی مثل مبرد کا قول ہے مبرد نے کہا: مَّارِجٍ سے مراد ایسی آگ ہے جسے روکی نہ جا سکے۔ ابو عبیدہ اور حسن بصری نے کہا: مَّارِجٍ سے مراد خلط ملط آگ ہے۔ اس کی اصل مرج ہے جب وہ مضطرب ہو اور خلط ملط ہو۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو آگوں کو پیدا کیا ان میں سے ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیا تو ان میں سے ایک دوسری کو کھا گئی وہ نار سموم تھی، اس سے ابلیس کو پیدا کیا۔ قشیری نے کہا: لغت میں مَّارِجٍ سے مراد ہے جسے چھوڑ دیا گیا ہو یا جو خلط ملط ہو گیا ہو۔ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ (الطارق) عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ (الحاقہ) معنی ہے مرج والی۔ جوہری نے صحاح میں کہا: ماھرج من نار یعنی ایسی آگ جس میں دھواں نہ ہو اس سے جنوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ تقدیر کلام یوں ہے ھو رب المشرقین سورۃ صافات میں ہے رَبُّ الْمَشَارِقِ ۝ اس کے بارے میں وہاں گفتگو گزر چکی ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

''اس نے رواں کیا ہے دونوں دریاؤں کو جو آپس میں مل رہے ہیں، ان کے درمیان آڑ ہے آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ نکلتے ہیں ان سے موتی اور مرجان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 226 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 428

پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾ مَرَجَ کا معنی چھوڑ دینا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مرج السلطان الناس جب بادشاہ نے لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا۔ مَرَجَ کا اصل معنی مہمل چھوڑنا ہے جس طرح جانوروں کو چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: مرج یعنی خلط ملط کر دیا۔ اخفش نے کہا: ایک قوم کہتی ہے أمرج البحرین یہ مرج کی طرح ہے فعل اور افعل ایک معنی میں ہے۔ البحرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر (1)؛ یہ مجاہد اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ يَلْتَقِيٰنِ وہ ہر سال میں ملتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں کے کنارے ملتے ہیں (2)۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: فارس اور روم کا سمندر (3)۔ ابن جریج نے کہا: مراد نمکین سمندر اور میٹھے دریا (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرق و مغرب کے سمندر جن کے کنارے ملتے ہیں (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لؤلؤ اور مرجان کا سمندر (6)۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ دونوں کے درمیان آڑ ہے۔ پہلے قول کے مطابق جو زمین و آسمان کے درمیان ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ دوسرے قول کے مطابق وہ زمین ہے جو دونوں کے درمیان ہے وہ حجاز ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے۔ ان دونوں کے علاوہ جو اقوال ہیں ان میں حاجز سے مراد قدرت الٰہیہ ہے جس طرح سورۂ فرقان میں گزرا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مغربی کنارہ سے کلام فرمایا فرمایا: میں تجھ میں ایسے بندے بنانے والا ہوں جو تسبیح کریں گے، تکبیر کہیں گے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہیں گے اور میری حمد کریں گے تو ان کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟ اس نے عرض کی: اے میرے رب! میں انہیں غرق کر دوں گا۔ فرمایا: میں انہیں اپنے ہاتھ میں اٹھالوں گا اور تیری قوت کو تیری اطراف میں رکھ دوں گا۔ پھر مشرقی کنارہ سے گفتگو کی۔ فرمایا: میں تجھ میں اپنے ایسے بندے پیدا کرنے والا ہوں جو میری تسبیح کریں گے، میری کبریائی بیان کریں گے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھیں گے، میری بزرگی بیان کریں گے تو ان کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟

عرض کی: میں ان کے ساتھ تیری تسبیح بیان کروں گا جب وہ تیری تسبیح بیان کریں گے، میں تیری کبریائی بیان کروں گا جب وہ تیری کبریائی بیان کریں گے، جب وہ تیری الوہیت بیان کریں گے تو میں تیری الوہیت بیان کروں گا، میں ان کے ساتھ تیری بزرگی بیان کروں گا جب وہ تیری بزرگی بیان کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زیور عطا فرمایا اور دونوں کے درمیان رکاوٹ پیدا کر دی۔ ان میں سے ایک سخت کھاری ہو گیا اور دوسرا اپنی اصلی حالت پر میٹھا رہا''۔ ترمذی حکیم ابو عبد اللہ نے اس خبر کا ذکر کیا۔ کہا: صالح بن عبد اللہ نے قاسم عمری سے وہ سہیل سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ لَّا يَبْغِيٰنِ۔ قتادہ نے کہا: وہ لوگوں پر بغاوت نہیں کرتے کہ انہیں غرق کر دیں (7)۔ ان دونوں اور لوگوں کے درمیان اس نے خشکی بنا دی ہے۔ ان سے اور مجاہد سے یہ مروی ہے ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر بغاوت نہیں کرتا کہ اس پر غالب آجائے۔ ابن زید نے کہا کہ لَّا يَبْغِيٰنِ کا معنی ہے وہ بغاوت نہیں کرتے کہ ایک دوسرے کو ملیں (8)۔ تقدیر کلام یہ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 429 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 227 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 430-429 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 430 8۔ ایضاً

ہے مرج البحرین یلتقیان اگر ان کے درمیان رکاوٹ نہ بھی ہوتی تو وہ ملاقات کرنے کے لیے بغاوت نہ کرتے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: دنیا اور آخرت میں جو آڑ ہے یعنی ان کے درمیان ایک موت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے۔ یہ دنیا کی موت ہے وہ ایک دوسرے پر بغاوت نہیں کریں گے۔ جب اللہ تعالیٰ دنیا کے ختم ہونے کا اذن دے گا تو دونوں سمندر ایک ہو جائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (الانفطار) سہل بن عبداللہ نے کہا: دو سمندروں سے مراد خیر اور شر کا راستہ ہے، برزخ سے مراد توفیق اور عصمت ہے (1)۔

**يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ ۝** یعنی تمہارے لیے پانی سے لؤلؤ اور مرجان نکالتا ہے جس طرح مٹی سے دانا، بھوسہ اور ریحان نکالتا ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے یخرج یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) یعنی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے باقی قراء نے يَخْرُجُ یعنی یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ لؤلؤ اس کا فاعل ہوگا۔ مِنْهُمَا کے بارے میں کہا: وہ نمکین سے نکلتا ہے میٹھے سمندر سے نہیں نکلتا، کیونکہ عرب دو جنسوں کو جمع کرتے ہیں پھر ان میں سے ایک کے بارے میں خبر دیتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یامعشر الجن و الانس الم یاتکم رسل منکم (الزمر: 41) رسل انسانوں میں سے ہوتے ہیں جنوں میں سے نہیں ہوتے؛ یہ کلبی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذکر کیا جب ان دونوں میں سے کوئی چیز نکلتی ہے تو گویا وہ دونوں سے نکلتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا (نوح) چاند آسمان دنیا میں ہے لیکن سات آسمانوں کا ذکر اجمالا کیا گویا ان میں سے کسی ایک میں ہے تو سب میں ہے۔ ابوعلی فارسی نے کہا: یہ مضاف کے حذف کے باب سے تعلق رکھتا ہے تقدیر کلام یہ ہے من احدهما جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف) یہ اصل میں من احدی القریتین تھا۔ اخفش سعید نے کہا: ایک قوم کا گمان ہے کہ وہ لؤلؤ میٹھے سمندر سے نکلتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دونوں سمندر ہیں ان دونوں میں سے ایک سے لؤلؤ اور دوسرے سے مرجان نکلتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ دونوں آسمان اور زمین کے سمندر ہیں جب آسمان کا پانی سمندر کی سیپی میں گرتا ہے تو موتی بنتا ہے پس وہ دونوں سے نکلنے والا ہوا (3)؛ یہ طبری نے کہا: ثعلبی نے کہا: میرے سامنے ذکر کیا گیا ہے ایک گٹھلی سیپی کے پیٹ میں ہوتی ہے بارش کا قطرہ اس گٹھلی کے بعض تک پہنچتا ہے اور بعض تک نہیں پہنچتا، قطرہ گٹھلی کے جس حصہ تک پہنچتا ہے وہ موتی ہوتا ہے اور باقی ماندہ گٹھلی ہی رہتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میٹھا اور نمکین بعض اوقات مل جاتے ہیں تو میٹھا نمکین کو ثمر بار کرنے کا سبب بن جاتا ہے تو موتی کو ان دونوں کی طرف منسوب کیا جس طرح بچے کو مذکر و مؤنث کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اگرچہ مونث نے اسے جنا ہوتا ہے؛ اس وجہ سے یہ قول کیا جاتا ہے کہ موتی نہیں نکلتا مگر ایسی جگہ سے جہاں میٹھا اور نمکین پانی ملتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مرجان سے مراد بڑے موتی ہیں؛ یہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور لؤلؤ چھوٹے موتیوں کو کہتے ہیں؛ ان دونوں سے اس کے برعکس بھی مروی ہے یعنی کہ لؤلؤ بڑے موتیوں کو اور مرجان چھوٹے موتیوں کو کہتے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 430 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 229 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 431

ہیں؛ یہ ضحاک اور قتادہ کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن مسعود اور ابو مالک نے کہا: مرجان سرخ گھونگا ہے۔

وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

''اور اس کے زیر فرمان ہیں وہ جہاز جو سمندروں میں پہاڑوں کی مانند بلند نظر آتے ہیں۔ پس (اے جن و انس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

وَ لَهُ الْجَوَارِ جوار سے مراد کشتیاں ہیں (1)۔ الْمُنْشَتُ عام قرأت المنشآت ہے یعنی شین پر زبر ہے۔ قتادہ نے کہا: ایسی مخلوق جو چلنے کے لیے ہو (2)۔ یہ انشا سے ماخوذ ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ایسی کشتیاں ہیں جن کے بادبان اٹھا دیئے گئے ہوں۔ جب ان کے بادبان نہ اٹھائے جائیں تو وہ منشآت نہیں۔ اخفش نے کہا: اس سے مراد چلنے والی ہیں (3)۔ حدیث میں ہے: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ایسی کشتیوں کو دیکھا جن کے بادبان اٹھا دیئے گئے تھے (4) فرمایا: ان کشتیوں کے رب کی قسم! نہ میں نے حضرت عثمان کو قتل کیا اور نہ میں نے ان کے قتل میں مدد کی۔

حمزہ، ابوبکر نے عاصم سے اس سے مختلف روایت نقل کی ہے (5) المنشآت یعنی شین کے کسرہ کے ساتھ ہے مراد المنشآت السیر ہے فعل کی نسبت جو اس طرف کی گئی ہے وہ بطور مجاز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کے بادبان اٹھا دیئے گئے ہوں جس نے شین کو فتحہ دیا اس نے کہا: مراد ہے المرفوعات الشرع۔ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ پہاڑوں کی مانند۔ علم سے مراد طویل پہاڑ ہے۔ کہا: اذا قطعن علما بدا اعلم انہوں نے جب ایک طویل پہاڑ طے کیا تو دوسرا پہاڑ ظاہر ہو گیا۔ سمندر میں کشتیاں اس طرح ہیں جس طرح خشکی میں پہاڑ ہوتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ یعقوب نے الجواری وقف میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ باقی قراء نے یاء کو حذف کیا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾

''جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت و احسان والی ہے۔ پس (اے جن و انس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ عَلَيْهَا میں ضمیر الارض کے لیے ہے۔ سورت کے آغاز میں اس کا ذکر ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ (الرحمٰن) ایک جملہ یہ بولا جاتا ہے: ھو اکرم من علیھا یہاں علیھا میں ضمیر سے مراد زمین لیتے ہیں اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی فرشتوں نے کہا: اہل زمین ہلاک ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: 88) ملائکہ کو ہلاکت کا یقین ہو گیا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ مخلوق کے فنا ہونے میں نعمت یہ ہے کہ موت میں سب کو برابر کر دیا اور موت کے ساتھ تمام قدم برابر ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نعمت کی صورت یہ ہے کہ موت دار جزا اور دار ثواب کی طرف منتقل ہونے کا سبب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 228 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 431 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ یعنی اللہ تعالیٰ باقی رہے گا۔ وجہ سے مراد اس کا وجود اور اس کی ذات ہے؛ شاعر نے کہا:

قضی علی خلقه المنایا فکلُّ شیءٍ سواه فانی

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر موتوں کا فیصلہ کر دیا تو اس کے سوا ہر شے فانی ہے۔

یہ وہ تعبیر ہے جسے ہمارے محقق علماء یعنی ابن فورک، ابو معالی اور دوسروں نے اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وجہ سے مراد اس کی ذات ہے جس طرح فرمایا: وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن)

ابو معالی نے کہا: وجہ سے مراد ہمارے ائمہ کے نزدیک وجود باری تعالیٰ ہے۔ ہمارے مشائخ نے اسے ہی پسند کیا ہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ جب مخلوق کو فنا پر پیش کیا جائے تو بقا سے موصوف اللہ تعالیٰ کا وجود ہو گا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: 115) میں گزر چکی ہے۔ ہم نے اسے کتاب الاسنیٰ میں مفصل ذکر کر دیا ہے۔ قشیری نے کہا: ایک قوم کا نقطہ نظر ہے یہ ذات پر زائد صفت ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ جسے اکرام سے نوازنے کا ارادہ کرتا ہے اس پر توجہ اسی صفت سے حاصل ہوتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وَجْهُ سے مراد اس کا وجود اور اس کی ذات ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: هذا وجه الامر وجه الصواب وعین الصواب ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا ظہور اس کے ادلہ کے ساتھ باقی رہے گا جس طرح انسان کا ظہور اس کے چہرے کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جہت باقی رہے گی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے گا۔ ذُو الْجَلٰلِ جلال سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی کبریائی ہے اور صفات مدح کا مستحق ہونا ہے یہ کہا جاتا ہے: جل الشیٔ یعنی چیز عظیم ہوگئی أجللته میں نے اس کی عظمت کو بیان کیا۔ اجلال یہ جل کا اسم ہے۔ وَ الْاِكْرَامِ وہ اس کا اہل ہے کہ اس کی ان چیزوں سے عظمت بیان کی جائے جو اس کے مناسب نہ ہو جیسے شرک جس طرح تو کہتا ہے: أنا أكرمك عن هذا اس معنی میں اکرام الانبیاء والاولیاء کا لفظ ہے۔ ہم نے ان دونوں اسماء کے بارے میں کتاب الاسنیٰ میں مفصل بحث کی ہے۔

حضرت انس نے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلِظُّوا بیا ذا الجلال والاکرام یا ذا الجلال والاکرام کے ساتھ دعا کو لازم پکڑو (1)۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے معنی ہے دعا میں اسے لازم پکڑو۔ ابو عبید نے کہا: الظاظ کا معنی شے کو لازم پکڑنا ہے اور اس پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: الظاظ کا معنی اصرار کرنا ہے۔ سعید بن مقبری سے مروی ہے: ایک آدمی نے اصرار کیا وہ کہنے لگا اللّٰھم یا ذا الجلال والاکرام اللّٰھم یا ذا الجلال والاکرام نور سے ندا کی گئی میں نے سن لیا ہے تیری کیا حاجت ہے؟

یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب الادعاء والتکبیر والتھلیل، جلد 1، صفحہ 676، حدیث 1836

جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی جامع الدعوات عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث نمبر 3447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''مانگ رہے ہیں اس سے (اپنی حاجتیں) سب آسمان والے اور زمین والے ہر روز وہ ایک نئی شان سے تجلی فرماتا ہے۔ پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آسمانوں میں جو ہے وہ رحمت کا سوال کرتا ہے اور زمین میں جو کوئی ہے وہ رزق کا سوال کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابو صالح نے کہا: اہل آسمان مغفرت کا سوال کرتے ہیں وہ رزق کا سوال نہیں کرتے اور اہل زمین دونوں چیزوں کا سوال کرتے ہیں۔ ابن جریج نے کہا: ملائکہ اہل زمین کے لیے رزق کا سوال کرتے ہیں۔ دونوں سوال اہل زمین کے لیے ہیں وہ سوال آسمان والوں کی جانب سے ہو یا اہل زمین کی جانب سے ہو۔ حدیث میں ہے: ''فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کے چار چہرے ہیں ایک چہرہ انسان کے چہرہ کی طرح ہے وہ اللہ تعالیٰ سے انسانوں کے لیے رزق کا سوال کرتا ہے، ایک چہرہ شیر کے چہرے جیسا ہے وہ درندوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے رزق کا سوال کرتا ہے، ایک چہرہ بیل کے چہرے جیسا ہے جو چوپاؤں کے لیے رزق کا سوال کرتا ہے ایک چہرہ گدھ کے چہرے جیسا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے پرندوں کے لیے رزق کا سوال کرتا ہے''۔ ابن عطا نے کہا: انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عبادت پر قوت کا سوال کیا۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝۲۹ یہ نئی کلام ہے كُلَّ يَوْمٍ کو فِيْ شَاْنٍ یا سوال کی ظرف کے طور پر منصوب ہے پھر نئی کلام کی هُوَ فِيْ شَاْنٍ۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ سے مراد ہے اس کی یہ شان ہے کہ وہ گناہ بخش دیتا ہے، تکلیفوں کا دور کرتا ہے، ایک قوم کو عزت سے نوازتا ہے اور دوسروں کو پست کرتا ہے'' (1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ کا یہ معنی نقل کیا ہے ''وہ گناہ بخش دیتا ہے، وہ مصیبت کو دور کرتا ہے اور دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہے'' (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی شان یہ ہے کہ وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، وہ عزت دیتا ہے اور ذلت دیتا ہے، وہ رزق دیتا ہے اور رزق روک لیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: دنیا و آخرت میں اس کی شان کا ارادہ کیا۔ ابن بحر نے کہا: تمام زمانہ دو دن ہیں ان دونوں میں سے ایک دنیا کے ایام کی مدت ہے اور دوسرا یوم قیامت ہے (3)، دنیا کے دنوں میں اس کی شان (اس کا عمل) یہ ہے آزمانا، امر و نہی کے ساتھ امتحان لینا، زندہ کرنا، موت دینا، عطا کرنا اور روک لینا، قیامت کے دن اس کا یہ کام ہوگا جزا دینا، حساب کرنا، ثواب دینا اور عذاب دینا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے دنیا کے دنوں میں سے ہر دن میں اپنے عمل کے بارے میں خبر دینا۔ یہ تو ظاہر ہے۔ لغت میں شان سے مراد عظیم کام ہے۔ اس کی جمع شئون ہے یہاں شَاْنٍ سے مراد جمع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (غافر: 67) کلبی نے کہا: اس کا عمل یہ ہے مقادیر کو ان کے اوقات کی طرف لے جاتا ہے۔ عمرو بن

1۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 36، سورۂ رحمٰن، کل یوم هو فی شان، حدیث 1102۔
ایضاً سنن ابن ماجہ، باب فی ما انکرت الجهمية، حدیث 197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 157 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 432

میمون نے اللہ تعالیٰ کے فرمان كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے بارے میں فرمایا: اس کا عمل یہ ہے وہ زندہ کو موت دیتا ہے، رحموں میں جو چاہتا ہے اسے قرار دیتا ہے، ذلیل کو عزت دیتا ہے اور عزیز کو ذلت دیتا ہے۔ ایک امیر نے وزیر سے اللہ تعالیٰ کے فرمان كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے بارے میں سوال کیا تو وہ اس کا معنی نہیں پہچانتا وزیر نے کل تک مہلت مانگی پریشان ہو کر گھر کی طرف چلا گیا۔ اس کے حبشی غلام نے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ وزیر نے اسے بتایا۔ غلام نے اسے کہا: امیر کے پاس واپس جائیے میں اس کے سامنے اس کی وضاحت کروں گا۔ بادشاہ نے اسے بلا لیا عرض کی: اے امیر! اس کا عمل یہ ہے وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، بیمار کو شفا دیتا ہے اور صحت مند کو مریض کر دیتا ہے، آسودہ کو آزماتا ہے اور مصیبت زدہ کو عافیت عطا کرتا ہے، ذلیل کو عزت دیتا ہے اور عزیز کو ذلت دیتا ہے، غنی کو فقیر کرتا ہے اور فقیر کو غنی کرتا ہے۔ امیر نے اس سے کہا: تو نے میری تکلیف کو رفع کیا اللہ تعالیٰ تیری تکلیف کو رفع فرمائے۔ پھر امیر نے وزیر کی خلعت اتارنے کا حکم دیا اور غلام کو پہنادی۔ اس نے عرض کی: اے میرے آقا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔

حضرت عبداللہ بن طاہر سے مروی ہے اس نے حسین بن فضل کو بلایا اسے کہا: تین آیات ایسی ہیں جنہوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے میں نے تجھے بلایا ہے تاکہ تو میرے لیے ان کی وضاحت کر دے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَأَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۞ (المائدہ) یہ بات ثابت ہے کہ ندم توبہ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن: 29) یہ صحیح ہے کہ قلم اس بارے میں خشک ہو چکا ہے جو قیامت تک ہونا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۞ (النجم) یہ کئی گنا کا کیا مفہوم ہے؟ حسین بن فضل نے جواب دیا: یہ جائز ہے کہ اس امت میں شرمندگی توبہ نہ ہو اور اس امت میں شرمندگی توبہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایسے خصائص کے ساتھ خاص کیا ہے جن میں دوسری امتیں شریک نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قابیل کا شرمندہ ہونا ہابیل کے قتل پر نہ تھا بلکہ اس کے اٹھانے پر شرمندہ ہوا تھا۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کا تعلق ہے وہ ایسے امور ہیں جن کو وہ ظاہر فرماتا ہے وہ ایسے امور نہیں جن کا وہ آغاز کرتا ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا تعلق ہے وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۞ اس کا معنی ہے عدل کے اعتبار سے تو اس کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرے اور میری یہ شان ہے کہ میں ایک کے بدلہ میں بطور فضل ہزار دوں۔ عبداللہ اٹھا اس کے سر کو چوما اور اس کے لیے خراج میں سے وظیفہ جائز قرار دیا۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۞

''ہم عنقریب توجہ فرمائیں گے تمہاری طرف اے جن و انس! پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اے گروہ جن وانس! اگر تم میں طاقت ہے کہ تم نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے تو نکل کر بھاگ جاؤ (سنو) تم نہیں نکل سکتے بجز سلطان کے (اور وہ تم میں مفقود ہے)۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ بھیجا جائے گا تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں پھر تم اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکو گے۔ پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝ یوں کہا جاتا ہے: فرغتُ من الشغل أفرغ فروغا وفرغا تفرغت لكذا واستفرغت مجهودی فی كذا میں نے اپنی کوششیں خرچ کیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا کام نہیں جس سے فارغ ہو۔ اس کا معنی ہے ہم تمہیں جزا دینے اور تمہارا حساب لینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یہ ان کے لیے دھمکی ہے جس طرح جب کوئی دھمکی کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے: اذا أتفرغ لك یعنی میں تیرا قصد کرتا ہوں۔ فرغ قصد کے معنی میں ہے۔ ابن انباری نے اس کی مثل معاملہ میں پڑھا:

ألآن وقَدْ فَرَغْتُ إلى نُمَيْرٍ (1)

خبردار! اب میں نے نمیر کا قصد کیا۔

نحاس نے کہا: فَرَغْتُ إلى العَبْدِ المُقَيَّدِ فی الحِجْلِ

میں نے بیڑی میں قید غلام کا قصد کیا۔

حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لیلۃ العقبہ کو انصار سے بیعت لی شیطان نے چیخ ماری: یاهل الحجاجب! هذا مذمم يبايع بنی قيلة على حربكم اے منیٰ میں مقیم لوگو! یہ مذمم (نعوذ باللہ) تمہارے خلاف جنگ کرنے کے لیے بنی قیلہ سے بیعت لے رہا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ عقبہ کا شیطان ہے خبردار! اللہ کی قسم! اے اللہ کے دشمن! لاتفرغن لك میں تیرے معاملہ کو باطل کرنے کا قصد کرتا ہوں'' (2)۔ یہ قتبی، کسائی اور دوسرے علماء کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے پر وعدہ کیا اور فجور پر دھمکی دی، پھر فرمایا: سَنَفْرُغُ لَكُمْ ہم نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اس کا قصد کریں گے اور جس سے ہم نے جو وعدہ کیا ہوگا ہر ایک تک وہ پہنچائیں گے یعنی میں اسے تقسیم کرتا ہوں اور اس سے فارغ ہوتا ہوں؛ یہ حسن بصری، مقاتل اور ابن زید کا قول ہے۔ حضرت عبداللہ اور حضرت ابی نے سنفرغ اليكم پڑھا ہے۔ اعمش اور ابراہیم نے اسے سیفرغ لکم پڑھا ہے یاء پر ضمہ اور راء پر فتحہ ہے یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ ابن شہاب اور اعرج نے سنفرغ لکم پڑھا ہے یعنی نون اور راء مفتوح ہے۔ کسائی نے کہا: یہ تمیم کی لغت ہے وہ کہتے فرغ یفرَغ اور فرغ یفرُغ بھی حکایت کیا ہے دونوں کو ہبیرہ نے حفص سے انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے۔ جعفی نے ابو عمرو سے سیفرغ یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ہرمز سے بھی روایت کی گئی ہے۔ عیسیٰ ثقفی سے سنفرغ لکم یعنی نون کے کسرہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے سیفرغ لکم یاء کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تہامہ کی لغت ہے۔ ثقلان سے مراد جن وانس ہے۔ ان دونوں کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ زمین میں جو بھی مخلوق

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 434
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 229

ہے ان کی بنسبت ان دونوں کو عظمت شان حاصل ہے کیونکہ انہیں احکام کا مکلف بنایا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہ زندہ اور مردہ حالت میں زمین پر بوجھ ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ (الزلزال) اس معنی میں ان کا قول ہے أعطه ثقلہ ثقل کا معنی وزن ہے۔ بعض اہل معانی نے کہا: ہر شی جس کی قدر اور وزن ہو جس میں مقابلہ کیا جاتا ہو تو وہ ثقل ہوتا ہے اس وجہ سے شتر مرغ کے انڈے کو ثقل کہتے ہیں کیونکہ اس کو پانے والا اور اس کو شکار کرنے والا جب اسے حاصل کر لیتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق نے کہا: دونوں کو ثقلین کہا گیا کیونکہ دونوں گناہوں کی وجہ سے بوجھل ہوتے ہیں (1) فرمایا: سنفرغ لکم، کم ضمیر کو جمع ذکر کیا پھر فرمایا: اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ کیونکہ دونوں فریق ہیں اور ہر فریق جمع ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ، ان استطعتما نہیں فرمایا کیونکہ یہ دونوں ایسے فریق ہیں جو جمع کی حالت میں ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ (النمل) اور ارشاد ہے: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ (الحج: 19) اگر ارشاد ہوتا سنفرغ لکما اور استطعتما تو یہ بھی جائز ہوتا۔ اہل شام نے پڑھا أیة الثقلان ہاء کو ضمہ دیا باقی قراء نے اسے فتحہ دیا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ**: یہ سورت، احقاف اور قل اوحی اس امر پر دلیل ہیں کہ جن مخاطب ہیں مکلف ہیں، مامور ہیں، منہی ہیں انہیں ثواب دیا جائے گا، انہیں سزا دی جائے گی، وہ انسانوں کے برابر ہیں، ان کا مومن انسانوں کے مومن کی طرح ہے، ان کا کافر انسانوں کے کافر کی طرح ہے، ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں جویبر نے ضحاک سے ذکر کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کو حکم دے گا تو وہ اپنے مکینوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اس کے فرشتے اس کی اطراف میں چلے جائیں گے یہاں تک کہ ان کا رب انہیں حکم دے گا تو وہ زمین کی طرف اتریں گے وہ زمین اور اہل زمین کو گھیر لیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کے قریبی آسمان کو حکم دے گا وہ اتریں گے تو پہلی صف کے پیچھے صف میں کھڑے ہو جائیں گے پھر تیسرے آسمان پھر چوتھے پھر پانچویں پھر چھٹے پھر ساتویں آسمان کو حکم دے گا، پھر بلند ترین مرتبہ والا فرشتہ اترے گا جو بڑے جاہ و جلال میں ہوگا اس کی بائیں جانب جہنم ہوگی لوگ اس کی خوفناک آواز کو سنیں گے وہ زمین کی کسی طرف میں نہیں آئیں گے مگر وہاں فرشتوں کی صفیں پائیں گے اللہ تعالیٰ کے فرمان: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ کا یہی مطلب ہے۔ سلطان کا معنی عذر ہے۔ ضحاک نے بھی یہ کہا: اس اثناء میں کہ لوگ بازاروں میں ہوں گے آسمان کھل جائے گا، فرشتے اتریں گے جن اور انسان بھاگیں گے فرشتے انہیں گھیر لیں گے اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ سے یہی مراد ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل کی بنا پر یہ اس دنیا میں ہوگا۔ ابن مبارک نے جو ذکر کیا ہے وہ آخرت میں ہوگا۔ ضحاک سے یہ

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 230

بھی مروی ہے: اگر تم طاقت رکھتے ہو تو موت سے بھاگ کو تو بھاگ جاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے جانو تو اسے جان لو(1)۔ تم ہرگز نہیں جان سکو گے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بینہ کے ساتھ۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ کا معنی ہے مجھے تم پر جو غلبہ اور قدرت ہے اس وجہ سے تم نہ نکل سکو گے۔ قتادہ نے کہا: تم ملک کے بغیر نہیں نکل سکو گے جب کہ تمہارے لیے کوئی ملک نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے لا تنفذون إلا إلى سلطان اس میں باء، الی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ (یوسف: 100) یہاں بِ، الی کے معنی میں ہے؛ شاعر نے کہا:

أسِيئى بنا أو أحسِنِى لا ملومة اس میں بنا، إلينا کے معنی میں ہے۔ ہمارے ساتھ برا سلوک کر یا اچھا سلوک کر کوئی ملامت نہ ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فانفذوا عجز بیان کرنے کے لیے امر کا صیغہ ذکر کیا گیا(2)۔

یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ﴙ وَّ نُحَاسٌ اگر تم نکلتے تو تم پر آگ کا شعلہ بھیجا جاتا اور تمہیں ایسا عذاب اپنی گرفت میں لے لیتا جو باہر نکلنے سے مانع ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کلام کا تعلق باہر نکلنے سے نہیں بلکہ یہ خبر دی کہ وہ نافرمانوں کو آگ کے ساتھ عذاب دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے تم نے اپنے رب کی نعمتوں کو جھٹلایا تو وہ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دے گا یہ اس تکذیب کی سزا ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مخلوقات کو فرشتوں کے ساتھ اور آگ کی زبان کے ساتھ گھیر لیا جائے گا پھر انہیں ندا کی جائے گی: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وہ آگ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کے نزدیک شواظ سے مراد ایسا شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔ نحاس سے مراد ایسا دھواں جس میں شعلہ نہ ہو۔ اس معنی میں امیہ بن ابی صلت کا قول ہے وہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ہجو کرتا ہے تفسیر ثعلبی اور ماوردی بن ابی صلت میں ہے صحاح میں ہے اور ابن انباری کی الوقف والابتداء میں ہے امیہ بن خلف نے کہا:

ویَنْفُخُ دَائِبًا لَهَبَ الشُّوَاظِ

وہ ہمیشہ شعلوں کو پھونکے مارتا تھا۔

حضرت حسان بن ثابت نے اسے جواب دیا۔

هَجَوْتكَ فَاخْتَضَعْتَ لها بِذُلٍّ بِقافِيةٍ تَأَجَّجُ كالشُّوَاظِ(3)

میں نے تیری ایسے اشعار سے ہجو کی جو شعلہ کی طرح بھڑک رہا ہے اور تو اس کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا گیا۔

مجاہد نے کہا: شواظ سے مراد سبز شعلہ ہے جو آگ سے منقطع ہو جاتا ہے(4)۔ ضحاک نے کہا: ایسا دھواں جو شعلہ سے نکلتا ہے یہ لکڑی کا دھواں نہیں(5)؛ یہ سعید بن جبیر نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شُوَاظٌ سے مراد آگ اور دھواں ہے؛ یہ ابو عمرو کا قول ہے۔ اخفش نے اسے بعض عربوں سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن کثیر نے شِواظ پڑھا ہے(6) باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح صِوار اور صُوار گائیوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 434 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 230 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 231 6۔ ایضاً

وَّنُحَاسٌ عام قرأت وَّنُحَاسٌ ہے اس کا عطف شُوَاظٌ پر ہے۔ ابن کثیر، ابن محیصین، مجاہد اور ابو عمرو نے ونحاسٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف النار پر ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے شُوَاظٌ کا معنی ایسا شعلہ لیا ہے جس میں دھواں نہیں ہوتا تو وہ بہت ہی بعید ہے یہ اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک موصوف کو حذف نہ کیا جائے، گویا کہا: یرسل علیکما شواظ من نار و شیء من نحاس پس شیء کا لفظ شواظ پر معطوف ہے یہ ایسا جملہ ہے جو شیء کی صفت ہے اور شیء کو حذف کر دیا گیا اور من کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ اس کا ذکر فی نار میں گزر چکا ہے جس طرح علی ان کے قول میں محذوف ہے من تنزل انزل علیہ اس تعبیر کی بنا پر نحاس من محذوف کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ مجاہد، حمید، عکرمہ اور ابو عالیہ نے ونحاس پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح شِواظ اور شُواظ۔ نحاس کا معنی طبیعت اور اصل بھی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان کریم النحاس اسی طرح نُحاس بھی ہے یعنی وہ اچھے حسب والا ہے۔

مسلم بن جندب نے ونَحْسٌ پڑھا ہے(1)۔ حنظلہ بن مرہ بن نعمان انصاری نے ونحسٍ، نار پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ نحاس کسرہ کے ساتھ ہو یہ نَحِس کی جمع ہے جس طرح صَعب و صِعاب ہے ونحسٌ رفع کے ساتھ شواظ پر معطوف ہے۔ حضرت حسن بصری سے ونُحُس ہے یہ نَحس کی جمع ہے۔ یہ بھی جائز ہے اس کی اصل ونحوس ہو اس کی واؤ کو حذف کر کے قصر کا قاعدہ جاری کیا گیا جس طرح پہلے گزر چکا ہے وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ⑯ (النحل)

عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ نے ونَحُسّ پڑھا ہے نون مفتوح ہے حاء مضموم ہے اور سین مشدد ہے یہ حس یحس حسا سے مشتق ہے جب وہ اسے جڑ سے اکھیڑ دے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران: 152) ہم عذاب کے ساتھ قتل کریں گے۔ پہلی قرأت کی بنا پر ونحاس وہ پگھلا ہوا تانبا ہے جو ان کے سروں پر بہایا جائے گا؛ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ نحاس سے مراد ایسا دھواں ہے جس میں شعلہ نہیں ہوتا۔ خلیل کے قول کا یہی معنی ہے کلام عرب میں یہ اسی معنی کے ساتھ معروف ہے۔ نابغہ بن جعدہ نے کہا:

يُضِيءُ كَضَوءِ سِرَاجِ السَّلِيطِ　　يَجْعَلِ اللهُ فيه نُحَاسَا(2)

وہ تلوں کے تیل کے چراغ کی روشنی کی طرح روشنی دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں دھواں نہیں بنایا۔

اصمعی نے کہا: میں نے ایک بدو کو کہتے ہوئے سنا سلیط شام میں تلوں کے تیل کو کہتے ہیں اس میں دھواں نہیں ہوتا۔ مقاتل نے کہا: یہ پگھلے ہوئے تانبے کے پانچ دریا ہوں گے جو عرش کے نیچے سے جہنمیوں کے سروں پر بہہ رہے ہوں گے تین دریا رات کے برابر اور دو دریا دن کے برابر ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: نحاس سے مراد سفید تانبا ہے۔ ضحاک نے کہا: ابالے گئے تیل کی تلچھٹ ہے۔

کسائی نے کہا: مراد ایسی آگ ہے جس پر سخت ہوا چل رہی ہوگی۔ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ⑮ یعنی وہ ایک دوسرے کی مدد نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 231　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 435

کریں گے مراد جن وانس ہیں۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ﴿۳۷﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾
فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۚ﴿۳۹﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

''پھر جب پھٹ جائے گا آسمان تو سرخ ہو جائے گا جیسے رنگا ہوا سرخ چمڑا۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ قیامت کے روز جب آسمان پھٹ جائے گا۔ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ الدھان سے مراد تیل ہے، یہ مجاہد، ضحاک اور دوسرے علماء سے مروی ہے معنی ہوگا وہ صاف تیل کی طرح ہو جائے گا۔ اس تعبیر کی بنا پر دھان، دھن کی جمع ہوگا۔ سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا: معنی ہے وہ سرخ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ گلاب کی طرح سرخ اور تیل کی طرح جاری ہوگا، یعنی پھٹنے کے ساتھ پگھل جائے گا یہاں تک کہ جہنم کی آگ کی گرمی سے سرخ ہو جائے گا اور اپنی نرمی اور پگھلنے کی وجہ سے تیل کی طرح ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الدھان سے مراد سرخ جلد ہے(1)؛ ابو عبید اور فراء نے یہ ذکر کیا ہے یعنی آسمان آگ کی گرمی کی شدت کی وجہ سے چمڑے کی طرح سرخ ہو جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: وہ سرخ گھوڑے کی طرح ہو جائے گا۔ کمیت گھوڑے کو ورد کہتے ہیں جب وہ مختلف رنگ اختیار کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرس ورد موسم بہار میں کمیت أصفر (زرد) ہوتا ہے(2) موسم سرما کے آغاز میں کمیت احمر (سرخ) ہوتا ہے جب موسم سرما سخت ہو جائے تو وہ کمیت اغبر (مٹیالا) ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: فرس وردیہ کا ارادہ کیا۔ یہ گھوڑا موسم بہار میں زردی مائل سرخ ہوتا ہے جب سردی سخت ہوتی ہے تو گلابی سرخ ہوتا ہے اور جب اس کے بعد کا موسم ہوتا ہے تو وہ مٹیالا گلابی ہوتا ہے۔ آسمان کے مختلف رنگوں کے اپنانے کو گلابی گھوڑے کو رنگ بدلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: كَالدِّهَانِ کا معنی ہے وہ تیل انڈیلنے کی طرح ہوگا کیونکہ جب تو اسے انڈیلتا ہے تو تو اس میں مختلف رنگ دیکھتا ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: معنی ہے وہ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ گزرے گا اور آئے گا۔ زجاج نے کہا: واء، راء اور دال یعنی ''ورد'' کا اصل معنی آنا ہے یہ اس کے قریب ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ وردہ گھوڑے کے رنگ بدلتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: آج وہ سبز ہے عنقریب اس کا رنگ سرخ ہوگا؛ یہ ثعلبی نے حکایت بیان کی ہے۔ ماوردی نے کہا: متقدمین نے گمان کیا ہے آسمان کا اصل رنگ سرخ ہے زیادہ رکاوٹوں اور مسافت کی دوری کی وجہ سے اس کا رنگ نیلا دکھائی دیتا ہے(3)۔ لوگوں نے اسے بدن کی رگوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے یہ خون کی سرخی کی طرح سرخ ہوتی ہیں رکاوٹ کی وجہ سے نیلی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہو تو آسمان قیامت کے روز دیکھنے والوں کے قریب ہونے اور رکاوٹوں کے اٹھ جانے کی وجہ سے سرخ دکھائی دے گا کیونکہ یہی اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 231 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 438

اصل رنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۞ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۞ (القصص) قیامت کے کئی مقامات ہیں کیونکہ وہ دن لمبا ہوگا بعض مقامات پر اس سے سوال کیا جائے گا اور بعض مواقع پر سوال نہیں کیا جائے گا؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جب وہ جہنم میں قرار پذیر ہو جائیں گے تو ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: ان سے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کو ان پر محفوظ کر رکھا ہے اور فرشتوں نے انہیں لکھ رکھا ہے؛ عوفی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت حسن بصری اور مجاہد سے بھی یہ نقل کیا ہے (1): معنی ہے فرشتے ان کے بارے میں نہیں پوچھیں گے کیونکہ وہ انہیں ان کے چہروں سے پہچانتے ہیں اس کی دلیل مابعد کلام ہے؛ یہ قول مجاہد کے ذریعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ان سے اس آیت فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ (الحجر) اس آیت فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۞ کی تفسیر میں بھی مروی ہے وہ ان سے نہیں پوچھے گا تا کہ انہیں پہچانے کیونکہ وہ ان کے بارے میں ان کی بنسبت زیادہ جانتا ہے بلکہ وہ ان سے سوال کرے گا: تم نے یہ عمل کیوں کیا؟ یہ سوال شرمندہ کرنے کے لیے ہوگا۔

ابو العالیہ نے کہا: غیر مجرم سے مجرم کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: پہلے سوال ہوگا پھر لوگوں کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضاء ان کے اوپر گواہ کے طور پر کلام کریں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس میں ہے رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندے سے ملاقات کرے گا اور فرمائے گا: اے فلاں! کیا میں نے تجھے معزز نہیں بنایا، تجھے سردار نہیں بنایا، میں نے تیری شادی نہیں کی، میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا کہ تو سردار بنے اور اپنی قوم سے چوتھا حصہ وصول کرے۔ بندہ عرض کرے گا: کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو گمان رکھتا تھا کہ تو مجھ سے ملاقات کرنے والا ہے؟ وہ عرض کرے گا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو میں تجھ کو بھلاتا ہوں جس طرح تو نے مجھے بھلا دیا ہے۔ پھر دوسرے سے ملاقات کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مثل ارشاد فرمائے گا، پھر تیسرے سے ملاقات کرے گا تو اسے اسی طرح ارشاد فرمائے گا۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا تھا، میں نے نمازیں پڑھیں، میں نے روزے رکھے، میں نے صدقہ کیا اور جس قدر وہ طاقت رکھے گا اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے گا۔ وہ کہے گا: ھاھنا اذا پھر اسے کہا جائے گا: اب ہم اپنا گواہ تجھ پر بھیجتے ہیں۔ وہ دل میں سوچے گا وہ کون ہے جو مجھ پر گواہی دے گا؟ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ اس کی ران، اس کے گوشت اور اس کی ہڈیوں کو کہا جائے گا: تو بول۔ تو اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے عمل کے بارے میں بولیں گی۔ یہ اس لیے ہوگا کہ وہ جان لے کہ وہ خود گناہوں کی وجہ سے اس کا مستحق بنا ہے وہی منافق ہے یہ وہی شخص ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے'' (2)۔ یہ حدیث حم السجدہ وغیرہ میں گزر چکی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 232 2۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، فصل فی بیان أن الاعضاء منطقۃ شاھدۃ بیوم القیمۃ، جلد 5، صفحہ 436

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

''پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے تو انہیں پکڑ لیا جائے گا پیشانی کے بالوں اور ٹانگوں سے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہی وہ جہنم ہے جسے جھٹلایا کرتے تھے مجرم۔ وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جو ازحد گرم ہوگا۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ حضرت حسن بصری نے کہا: چہرے کی سیاہی اور آنکھوں کی زردی (1)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ (طٰہٰ) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران: 106)

فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ یعنی فرشتے ان کی پیشانیوں کو پکڑ لیں گے یعنی ان کے سروں کے اگلے حصہ کے بالوں اور ان کے قدموں سے پکڑ لیں گے اور انہیں جہنم میں پھینک دیں گے۔ نواصی، ناصیہ کی جمع ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کی پیشانی اور اس کے قدموں کو اس کی پشت کے پیچھے ایک زنجیر میں جمع کر دیا جائے گا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: آدمی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑا جائے گا اور ان دونوں اور اس کی پیشانی کو جمع کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی کمر ٹوٹ جائے گی، پھر اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ معاملہ اس کے ساتھ اس لیے کیا جائے گا تاکہ وہ اس کے عذاب کے لیے شدید ہو اور اس کے بھوننے میں زیادہ کردار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتے انہیں منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے کبھی اس کی پیشانی پکڑیں گے اور اسے منہ کے بل گھسیٹیں گے اور کبھی ان کے قدم پکڑیں گے اور اسے سر کے بل گھسیٹیں گے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ انہیں کہا جائے گا: یہ وہ آگ ہے جس کے بارے میں تمہیں خبر دی گئی اور تم نے اس کو جھٹلایا۔ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ قتادہ نے کہا: وہ گردش کر رہے ہوں گے کبھی حمیم اور کبھی جحیم کے درمیان۔ جحیم کا معنی آگ ہے اور حَمِیْمٍ کا معنی شراب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: آن میں تین توجیہیں ہیں (۱) جس کی گرمائش انتہا کو پہنچی ہوئی ہو؛ یہ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر اور سدی کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اٰنٍ سے مراد ہے اسے پکایا گیا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ وہ ارشاد فرماتا ہے: جب وہ آگ سے پناہ طلب کریں گے تو ان کی مدد اس سے کی جائے گی۔ کعب نے کہا: اٰنٍ جہنم کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ جمع ہو جائے گی وہ اپنے طوقوں کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ ان کے جوڑ الگ الگ ہو جائیں گے پھر وہ اس سے نکلیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جدید صورت بنائی ہوگی تو انہیں آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کا یہی معنی ہے۔ کعب سے یہ بھی مروی ہے: وہ حاضر ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کے پینے کا وقت آ گیا ہے اور وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے (2)۔ قیامت کی ہولناکی اور مجرمین کے عتاب کے ذکر میں جو نعمت ہے وہ یہ ہے کہ اس میں معاصی سے جھڑک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 232
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 437

اور طاعات میں ترغیب ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ رات کے وقت آپ ایک نوجوان کے پاس آئے جو پڑھ رہا تھا فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ نوجوان اسی پر رک گیا اور آنسوؤں نے اس کا گلا گھونٹ دیا وہ کہنے لگا: میرا اس دن پر افسوس ہے جس میں آسمان پھٹ جائے گا میرا افسوس! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ویحک یافتی مثلها (1) اے نوجوان! تجھ پر اس کی مثل افسوس۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! آسمان کے فرشتے بھی تیرے رونے سے رو پڑے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

”اور جو ڈرتا ہے اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے تو اس کو دو باغ ملیں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ جب جہنمیوں کے احوال کا ذکر کیا تو نیکو کاروں کے لیے جو تیار کیا اس کا بھی ذکر کیا معنی ہے وہ اپنے رب کے حضور حساب کے لیے کھڑا ہونے سے ڈرا تو اس نے معصیت کو ترک کیا۔ مقام مصدر ہے قیام کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے رب کے اپنے اوپر کھڑا ہونے سے ڈرا، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو جھانک رہا ہے اور اس پر مطلع ہے اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (الرعد: 33) مجاہد اور ابراہیم نخعی نے کہا: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو معصیت کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اس کی پکڑ کے خوف سے معصیت کو ترک کر دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ جس نے اپنی بیوی سے کہا: اگر میں جنتی نہیں تو تجھے طلاق۔ کہ وہ حانث نہیں ہوگا اگر اس نے معصیت کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرتے ہوئے اور اس کا حیاء کرتے ہوئے اس کو ترک کر دے؛ یہی قول سفیان ثوری کا ہے اور اس پر فتویٰ دیا۔

محمد بن علی ترمذی نے کہا: ایک جنت اپنے رب سے خوف کی وجہ سے ہے اور ایک جنت اپنی شہوت کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جو فرائض کی ادائیگی کے بعد اپنے رب سے ڈرا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مقام سے مراد موضع ہے یعنی وہ اپنے رب کے سامنے حساب کے لیے کھڑا ہونے کی جگہ سے ڈرے جس طرح بات پہلے گزر چکی ہے (2)۔ یہ بھی جائز ہے کہ مقام بندے کے لیے ہو پھر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کر دیا جائے یہ اس طرح ہے جس طرح اس ارشاد میں اجل کا لفظ ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ (الاعراف: 34) ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ (نوح: 4)

جَنَّتٰنِ یعنی جو ڈرا اس کے لیے علیحدہ دو جنتیں ہیں پس ہر ڈرنے والے کے لیے دو جنتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دو جنتیں تمام ڈرنے والوں کے لیے ہیں۔ پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ سے

1۔ تفسیر درمنثور، جلد 6، صفحہ 200
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 437

روایت نقل کی ہے فرمایا: ''جنتان سے مراد جنت کے عوض میں دو باغ ہیں ہر باغ سو سال کی مسافت جتنا ہے ہر باغ کے وسط میں نور کا ایک گھر ہے اس گھر میں سے ہر ایک چیز تروتازگی کے عالم میں جھوم رہی ہے اس کا قرار ثابت ہے اور اس کے درخت ثابت ہیں''۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے اور ثعلبی نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دو جنتوں سے مراد ہے ایک جنت تو وہ ہے جو اس کے لیے پیدا کی گئی اور ایک جنت وہ ہے جس کا وہ وارث بنا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک جنت اس کی منزل ہوگی اور دوسری اس کی بیویوں کی منزل ہوگی جس طرح دنیا کے رؤسا کا معمول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دو جنتوں میں سے ایک اس کا مسکن اور دوسرا اس کا باغ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دو جنتوں میں سے ایک اس کے نچلے محل اور دوسری اس کے بالائی محلات ہیں۔ مقاتل نے کہا: وہ دونوں جنت عدن اور جنت نعیم ہوگی۔ فراء نے کہا: یہ ایک جنت ہے آیات کے سروں کی وجہ سے اسے تثنیہ ذکر کیا۔

قتبی نے اس کا انکار کیا اور کہا: یہ کہنا جائز نہیں کہ آیات کے سروں کی رعایت سے جہنم کے داروغے بیس ہیں فرمایا: وہ انیس ہیں، نیز یہ فرمایا: ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ ابو جعفر نحاس نے کہا: فراء نے کہا بعض اوقات جنت ایک ہوتی ہے اور شعر میں اسے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کے کلام کے بارے میں بڑا غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جنتان اور اس ارشاد کے ساتھ اس کی صفت بیان کرتا ہے فیهما یہ قول کرنے والا ظاہر کو چھوڑتا ہے اور کہتا ہے: یہ جائز ہے ایک جنت ہو اور شعر سے استدلال کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنتیں دو ہیں تاکہ ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف منتقل ہونے کے ساتھ اس کے سرور میں اضافہ ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت خصوصی طور پر حضرت ابو بکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی جب ایک روز جنت کا ذکر کیا حین أزلفت اور آگ کا ذکر کیا حین برزت، یہ عطا اور ابن شوذب کا قول ہے۔

ضحاک نے کہا: ایک روز آپ نے پیاس کی حالت میں دودھ پیا تو وہ اچھا لگا آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ حلال نہ تھا تو آپ نے قے کردی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو دیکھ رہے تھے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے تیرے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے'' اور اس آیت کو آپ پر تلاوت کیا۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

''دونوں باغ (پھل دار) ٹہنیوں والے ہوں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دونوں باغوں میں دو چشمے جاری ہوں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

**ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝** حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہا: وہ پھل کی مختلف اقسام والے ہوں گے۔ **اَفْنَانٍ** کا واحد فن ہے۔ مجاہد نے کہا: اَفْنَانٍ سے مراد ٹہنیاں ہیں اس کا واحد فنن ہے؛ نابغہ نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 438

بکاء حمامۃ تدعو ھدیلا مفجعۃ علی فنن تغنی

اس کبوتر کا رونا جو بچے کو بلا رہی ہے جو دکھی ہے شاخوں پر نغمے گا رہی ہے۔

محل استدلال لفظ فنن ہے۔ ایک اور شاعر دو پرندوں کی صفت بیان کرتا ہے:

باتا علی غُصنِ بَانِ فِی ذُرَی فَنَنِ

دونوں پرندوں نے بان درخت کی ٹہنیوں کی چوٹیوں پر رات گزاری۔

اور ایک شاعر نے کہا:

تَدْعُو علی فَنَنِ الغُصونِ حَمامًا

کبوتری ٹہنیوں پر بیٹھ کر کبوتر کو بلا رہی ہے۔

فنن کی جمع أفنان اور اس کی جمع أفانین ہے۔ ایک آدمی چکی کی صفت بیان کرتا ہے:

لھازِ مائم مِنْ أفانِینِ الشَّجَرْ اس کی ایسی لگام ہے جو درخت کی شاخوں سے ہے۔

شجرۃ فنناء ایسا درخت جو شاخوں والا ہے فنواء بھی خلاف قیاس ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: إن أھل الجنۃ مرد مکحلون أولو أفانین (1) جنتی بے ریش، آنکھوں میں سرمہ لگائے اور ان کے سروں پر بالوں کا گچھا ہوگا۔ حدیث میں مراد أولو فنن ہے۔ یہ أَفْنَانٍ کی جمع ہے أَفْنَانٍ، فنن کی جمع ہے اس سے مراد بالوں کا گچھا ہے اسے ٹہنی کے ساتھ تشبیہ دی ہے؛ اسے ہروی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ وہ دوسروں کی بنسبت زیادہ فضیلت والے ہوں گے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مجاہد اور عکرمہ سے یہ اسی طرح مروی ہے کہ افنان سے مراد دیواروں پر شاخوں کا سایہ ہے۔

**فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۝** یعنی ان دونوں باغوں میں جاری چشمے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنتیوں پر زیادتی اور کرامت کے ساتھ پانی جاری کیے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری سے یہ قول مروی ہے: وہ میٹھا پانی جاری کیے ہوں گے دونوں چشموں میں سے ایک تسنیم اور دوسرا سلسبیل ہوگا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: دو چشمے ہوں گے جس طرح دنیا میں ہوتے ہیں ان کا پانی کئی گناہ زیادہ ہوگا، ان کے سنگریزے سرخ یاقوت اور سبز زبرجد کے ہوں گے، ان کی مٹی کافور کی ہوگی، ان کا کیچڑ خوشبودار کستوری کا ہوگا، اس کے کنارے زعفران کے ہوں گے۔ عطیہ نے کہا: ان میں سے ایک ایسے پانی کا ہوگا جو بدبودار نہیں ہوگا اور دوسرا شراب کا ہوگا جو پینے والوں کے لیے لذت کا باعث ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دونوں چشمے کستوری کے پہاڑ سے نکلیں گے۔ ابوبکر وراق نے کہا: دونوں جنتوں میں دو چشمے ہوں گے جو دونوں ان کے لیے جاری ہوں گے جن کی دونوں آنکھیں اللہ تعالیٰ کے خوف سے جاری رہتی تھیں۔

**فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُتَّكِـیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝**

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ ثیاب اھل الجنۃ، حدیث نمبر 2462، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

"ان دونوں باغوں میں ہر طرح کے میوں کی دو دو قسمیں ہوں گے۔ پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استر قناویز کے ہوں گے اور دونوں باغوں کا پھل نیچے جھکا ہوگا۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ زَوْجٰنِ کا معنی ہے دو قسم کے۔ دونوں بیٹھے ہوں گے جن سے لذت حاصل کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس نے کہا: دنیا میں کوئی میٹھا یا کڑوا درخت نہیں ہوگا مگر وہ جنت میں میٹھا ہوگا یہاں تک کہ تنبہ بھی میٹھا ہو گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دو قسم کے پھل تر اور خشک ہوں گے فضیلت اور خوشبو میں یہ دوسرے سے کم درجہ کا نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ یہ دو جنتیں ان دو جنتوں سے فضیلت والی ہیں جو ان سے مرتبہ میں کم ہیں کیونکہ یہاں عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ کا ذکر کیا جو جاری ہیں وہاں عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ کا ذکر کیا جو پانی بہا رہے ہوں گے۔ نضخ کی صورت میں جری کی بنسبت پانی کم نکلتا ہے گویا فرمایا: ان دونوں جنتوں میں ہر پھل کی ایک قسم ہے اور اس جنت میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ، مُتَّكِـِٕيْنَ حال ہونے کی حیثیت سے منسوب ہے۔ فُرُشٍۭ یہ فراش کی جمع ہے۔ ابو حیوہ نے فرش راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بَطَآئِنُهَا یہ بطانہ کی جمع ہے اس کا معنی نچلے والا حصہ ہے۔ استبرق سے مراد موٹا اور کھردرا ریشم ہے۔ جب اس کا نیچے والا حصہ جو زمین کے ساتھ لگا ہوتا ہے وہ اس طرح ہے تو اس کے اوپر والے حصہ کا کیا عالم ہوگا؛ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے۔ سعید بن جبیر سے پوچھا گیا: جب اس کے نیچے والا حصہ موٹے ریشم کا ہے تو اس کے اوپر والا حصہ کیسا ہوگا؟ فرمایا: یہی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ: 17)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تمہارے لیے اس کے نچلے حصہ کو بیان کیا تا کہ تمہارے دل اس کی طرف مائل ہوں جہاں تک اس کے ظواہر کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔ حدیث طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "ان کا ظاہر ایسا نور ہوگا جو چمک رہا ہوگا" (1)۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: اس کا نیچے والا حصہ استبرق کا ہوگا اور اس کا ظاہر جامد نور کا ہوگا۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: بطائن ہی اس کا ظاہر ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ سے مروی ہے: عرب ظہر کو بطن کہتے ہیں وہ کہتے ہیں ھذا ظھر السماء، ھذا بطن السماء جسے ہم دیکھتے ہیں کیونکہ وہ ظاہر ہے۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا مگر دو متساوی چہروں میں جائز ہے جب ان میں سے ہر ایک قوم کی طرف پشت کرے جس طرح ایک دیوار تیرے اور ایک قوم کے درمیان حائل ہو اسی طرح آسمان کا معاملہ ہے۔ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ جنی اسے کہتے ہیں جو درخت سے کاٹا جاتا ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے: ثمر جنی یہ فعیل کا وزن ہے جب اسے کاٹا جائے۔

شاعر نے کہا:

هٰذَا جَنَايَ وَخِيَارُهُ فِيهِ (2)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 233

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 439

یہ میرا چنا ہوا پھل ہے اور اس کا بہترین اس میں ہے۔

اسے جنی بھی پڑھا گیا ہے۔ دَانٍ اس کا معنی قریب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: درخت قریب ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ولی اسے چن لے گا چاہے کھڑا ہوا ہو، چاہے بیٹھا ہوا ہو، چاہے لیٹا ہوا ہو کوئی دوری اور کوئی کانٹا اس کے ہاتھ کو واپس نہیں کرے گا۔

فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾

''ان میں نیچی نگاہوں والی حوریں ہوں گی جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر1**۔ فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھن ضمیر سے مراد دو مذکور باغات ہیں۔ زجاج نے کہا: فِيهِنَّ فرمایا فیھما نہیں کہا کیونکہ دونوں جنتیں اور جو نعمتیں ان کے لیے تیار کی گئی ہیں وہ مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھن ضمیر فرش کی طرف لوٹ رہی ہے جن کے بطائن استبرق کے ہیں، یعنی ان فرش میں قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ہوں گی یعنی ایسی عورتیں ہوں گی جو نظریں جھکائے ہوئے ہوں گی جنہوں نے اپنی نظروں کو اپنے خاوندوں تک محدود رکھا ہوگا وہ کسی اور کو نہ دیکھیں گی۔ سورۃ الصافات میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ طرف کو واحد ذکر کیا جب کہ یہ جمع کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے۔ یہ طرفت عینہ تطرف طرفا سے مشتق ہے پھر آنکھ کو یہ نام دیا تو واحد و جمع کو اس سے ادا کیا گیا جس طرح ان کا قول ہے: قوم عدل و صوم۔

**مسئلہ نمبر2**۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ ان خاوندوں سے پہلے کسی نے ان کے ساتھ جماع نہیں کیا۔ فراء نے کہا: طمث سے مراد اختضاض ہے اختضاض سے مراد خون بہاتے ہوئے وطی کرنا ہے۔ طمثها يطمثها ويطمتها طمثا کا معنی ہے جب وہ پہلی دفعہ وطی کرے اور اس کا پردہ بکارت زائل کرے؛ اس معنی میں یہ قول کیا گیا ہے: امرأة طامث حائضہ عورت۔ فراء کے علاوہ دوسرے علماء نے اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے وہ کہتا ہے: طمثها اس کا معنی ہے جس صورت میں بھی اس نے وطی کی مگر فراء کا قول زیادہ مشہور اور معروف ہے۔ کسائی نے کہا: لم يَطْمُثْهُنَّ میم کے ضمہ کے ساتھ ہے(1) یہ جملہ بولا جاتا ہے: طمثت المرأة تطمث جب حائضہ ہوئی طمثت اس میں ایک لغت ہے اس سے اسم فاعل طامث آتا ہے؛ فرزدق نے کہا:

وَقَعْنَ اِلَیَّ لم يُطْمَثْن قَبْلِي وهنّ أَصَحُّ مِنْ بَيْضِ النَّعَامِ(2)

وہ میرے ہاں واقع ہوئیں مجھ سے قبل ان سے کسی نے جماع نہ کیا تھا وہ شتر مرغ کے انڈے سے زیادہ صحت مند تھیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ انہیں کسی نے نہیں چھوا تھا(3)۔ ابو عمرو نے کہا: الطمث سے مراد چھونا ہے۔ یہ ہر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 233 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 440 3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 439

اس چیز میں بولا جاتا ہے جس کو چھوا جاتا ہے۔ چراگاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے: ماطمث ذلك المرتع قبلنا أحد ہم سے قبل اس چراگاہ کو کسی نے نہیں چھوا۔ وما طمث هذه الناقة حبل اس اونٹنی کو کسی ڈھنگے نے مس نہیں کیا۔ مبرد نے کہا: ان سے قبل کسی انسان اور جن نے انہیں مسخر نہیں کیا (1)۔ طمث کا معنی مسخر کرنا اور کام لینا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جان ہمزہ کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ جن انسان کی طرح جماع کرتا ہے اور جنت میں داخل ہوگا جنت میں ان کے لیے جن عورتیں ہوں گی (2)۔ ضمرہ نے کہا: ان میں سے دو مومنوں کے لیے حورعین میں سے بیویاں ہوں گی انسان عورتیں انسانوں کے لیے اور جن عورتیں جنوں کے لیے ہوں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے جنت میں مومن جنوں کو جنیات میں سے جو حورعین عطا فرمائے گا انہیں کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا اور جنت میں انسانوں میں سے مومنوں کو انسیات میں سے جو حورعین عطا فرمائے گا اسے کسی انسان نے نہیں چھوا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے عورتوں سے جماع نہیں کرتا؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: سورۂ نمل میں یہ قول گزر چکا ہے اور سُبْحٰنَ (الاسراء) میں یہ قول گزر چکا ہے کہ یہ جائز ہے کہ وہ انسانوں میں سے عورتوں سے شادی کریں۔ مجاہد نے کہا: جب کوئی جماع کرے اور بسم اللہ نہ پڑھے تو جن اس کے ذکر کے ساتھ لپٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ جماع کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ کا یہی معنی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حورعین کی صفت بیان کی ہے کہ ان سے پہلے ان سے کسی انسان اور کسی جن نے جماع نہیں کیا یہ تجھے آگاہ کرتا ہے کہ انسانوں میں سے عورتوں سے جن جماع کرتے ہیں اور حورعین اس عیب سے بری ہوتی ہیں اور پاک ہوتی ہیں۔ طمث کا معنی جماع ہے۔ ترمذی حکیم نے اسے مکمل ذکر کیا ہے؛ اسے مہدوی، ثعلبی اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

"یہ تو گویا یاقوت و مرجان ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ کیا احسان کا بدلہ بجز احسان کے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ امام ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: "اہل جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت کی پنڈلی کی سفیدی ستر حلوں سے دکھائی دے گی یہاں تک کہ اس کا گودا بھی دکھائی دے گا" (3)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ جہاں تک

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 439 2۔ ایضاً جلد 5، صفحہ 440

3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفة نساء اهل الجنة، جلد 2، صفحہ 76

یاقوت کا تعلق ہے وہ پتھر ہے اگر تو اس میں دھاگہ ڈالے پھر اسے صاف کرے تو وہ تجھے اس لڑی کو دکھا دے گا۔ اسے موقوف روایت کیا گیا ہے۔ عمرو بن میمون نے کہا: حورعین میں سے ایک عورت ستر حلے پہنے گی اس کی پنڈلی کا مغز ان کے باہر سے دکھائی دے گا جس طرح سفید جام میں سرخ شراب دکھائی دیتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ یاقوت جیسی شفاف اور مرجان جیسی سفید ہوں گی (1)۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۝ هَلْ کلام میں چار صورتوں میں آتا ہے کبھی قد کے معنی میں ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1) استفہام کے معنی میں آتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا (الاعراف: 44) امر کے معنی میں آتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ) نفی و انکار کے معنی میں آتا ہے فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (النحل: 35) هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۝ عکرمہ نے کہا: جس نے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جنت کے علاوہ اس کی کوئی جزا نہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جس نے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام حق لائے اس پر عمل کیا تو اس کی جزا جنت ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے دنیا میں احسان کیا آخرت میں اس کی جزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛ یہ ابن زید کا قول ہے (2)۔ حضرت انس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۝ پھر فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جس پر توحید کے ساتھ انعام کیا گیا اس کا بدلہ صرف جنت ہے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جس پر میں نے اپنی معرفت اور اپنی توحید کا انعام کیا اس کی جزا نہیں مگر یہ کہ میں اسے اپنی جنت اور اپنی رحمت کے ساتھ اپنی خاص بارگاہ میں رہائش دوں''۔ صادق نے کہا: جس پر میں نے ازل میں احسان کیا اس کی جزا نہیں مگر یہ کہ میں ابد میں اس پر احسان کو یاد رکھوں۔ حضرت محمد بن حنفیہ اور حضرت حسن بصری نے کہا: یہ فاجر پر دنیا میں جاری کی گئی ہے اور نیک کے لیے آخرت میں جاری کی گئی ہے۔

## وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝ مُدْهَآمَّتٰنِ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝

''ان دو کے علاوہ دو اور باغ بھی ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دونوں نہایت سرسبز و شاداب۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ۝ یعنی اس کے لیے ان پہلی دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں بھی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان دونوں سے درجہ میں کم ہوں گی۔ ابن زید نے کہا: فضیلت میں کم ہوں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ تمام جنتیں اس کے لیے ہیں جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا۔ پہلی دو جنتوں میں کھجور کے اور دوسرے درخت ہوں گے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 106
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 440

اور دوسری دو میں کھیتیاں اور نباتات ہوں گی اور جو اسے خوش کریں گی۔ ماوردی نے کہا: یہ بھی احتمال موجود ہے(1) کہ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ سے مراد ایسی جنتیں ہیں جوان کے پیروکاروں کے لیے ہوں کیونکہ پیروکاروں کا مرتبہ اس سے کم ہوتا ہے ان میں سے ایک جنت (باغ) حور عین کے لیے اور دوسرا باغ ایسے بچوں کے لیے ہوگا جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے تا کہ مذکر مونثوں سے الگ رہیں۔ ابن جریج نے کہا: وہ باغ کل چار ہوں گے دو باغ سابقین مقربین کے لیے ہوں گے جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝، عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۝ اور دو باغ اصحاب یمین کے لیے ہیں جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝، فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝ ابن زید نے کہا: پہلے دونوں باغ سونے کے ہوں گے جو مقربین کے لیے ہوں گے اور دوسرے دو چاندی کے ہوں گے جو اصحاب یمین کے لیے ہوں گے(2)۔

میں کہتا ہوں: حلیمی ابو عبداللہ حسن بن حسین اپنی کتاب منہاج الدین میں اسی طرف گئے ہیں اس نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ دونوں باغ مقربین کے لیے ہیں اور یہ دونوں اصحاب یمین کے لیے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اس کی مثل مروی ہے "جب اللہ تعالیٰ نے دونوں باغوں کی صفت بیان کی تو دونوں میں فرق کی طرف اشارہ کیا پہلے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۝ اور دوسرے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝ یعنی دونوں فوارہ کی صورت میں جاری ہیں لیکن وہ جاری کی طرح نہیں کیونکہ نضخ، جری سے کم ہے۔ پہلے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ اس کو عام ذکر کیا خاص ذکر نہیں کیا دوسرے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝ اس میں من کل فاکھۃ نہیں کہا ہے دو باغوں کے بارے میں کہا: مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ، اِسْتَبْرَقٍ سے مراد ریشم ہے۔ دوسرے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝ عَبْقَرِيٍّ سے مراد جس میں نقش ونگار ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ دیباج وشی سے اعلیٰ، رفرف، خیمہ کا ایک حصہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فرش جو ٹیک لگانے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں وہ خیمہ کے زائد حصہ سے افضل ہوتے ہیں۔ پہلے دو باغوں میں حوروں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا: كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ۝ اور دوسرے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝ یہ حسن یاقوت و مرجان کے حسن جیسا نہیں ہوتا۔ پہلے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ ۝ اور دوسرے دو باغوں کے بارے میں فرمایا مُدْهَآمَّتٰنِ ۝ یعنی دونوں سبز ہیں گویا وہ دونوں زیادہ سبز ہونے میں سیاہ ہیں۔ پہلے دونوں باغوں کے بارے میں فرمایا: ان میں ٹہنیاں زیادہ ہوں گی اور دوسرے دو کے بارے میں صرف یہ فرمایا: وہ سبز ہیں۔ اس تمام بحث میں وہ معنی متحقق ہو جاتا ہے جس کا ہم نے قصد کیا ہے کہ یہ دو باغ ان دو باغوں سے درجہ میں کم ہوں گے۔ ممکن ہے جس تفاوت کا ذکر نہیں کیا گیا وہ اس سے بڑھ کر ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: ان دو باغ والوں کا اس طرح ذکر نہیں کیا گیا جس طرح پہلے دو باغوں والوں کا ذکر کیا گیا؟ تو اسے کہا جائے گا: چاروں باغ اس آدمی کے لیے ہیں جو اپنے رب سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 440 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 441

ڈرتا ہے مگر جو ڈرنے والے ہیں ان کے کئی مراتب ہیں پہلے دو باغ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور دوسرے دو باغ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے خوف کھانے میں ان میں سے کم مرتبہ ہیں۔

ضحاک کا مذہب یہ ہے کہ پہلے دو باغ سونے اور چاندی سے بنے ہیں اور دوسرے دو یاقوت اور زمرد کے ہیں وہ دونوں پہلوں سے افضل ہیں۔ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ یعنی ان دونوں کے سامنے؛ اس قول کی طرف ابو عبداللہ ترمذی حکیم نوادر الاصول میں گئے ہیں۔ کہا: وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ کا معنی ہے عرش سے قریب۔ اور ان دونوں باغوں کو پہلے دو باغوں پر فضیلت دی ہے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ مقاتل نے کہا: پہلے دو باغ جنت عدن اور جنت نعیم ہے اور دوسرے دو باغوں سے مراد جنت فردوس اور جنت ماویٰ ہے۔

مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ دونوں سیراب ہونے کی وجہ سے سرسبز ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ مجاہد نے کہا: دونوں سیاہ ہیں (1)۔ لغت میں دہمہ سے مراد سیاہ ہے (2)، یہ جملہ بولا جاتا ہے: فرس أدهم، بعير أدهم، ناقة دهماء یعنی اس میں آسانی رنگ گہرا ہو گیا یہاں تک کہ اس میں سے وہ سفیدی بالکل ختم ہو گئی جو اس میں موجود تھی جب وہ اس سے بھی زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ سیاہی سخت ہو گئی تو وہ جون ہو گئی۔ ادهم الفرس إدهاما گھوڑا سیاہ ہو گیا۔ إدهام الشئ إدهاما وہ سیاہ ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ وہ سبز رنگ میں شدت کی وجہ سے سیاہ ہو گئے۔ عرب ہر سبز چیز کو اسود کہتے ہیں۔

عراق کے دیہاتی علاقوں کو سواد کہتے ہیں کیونکہ وہ بڑے سرسبز و شاداب ہوتے ہیں تاریک رات کو اخضر کہتے ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: أباد الله خضراءهم اللہ تعالیٰ ان کی جمعیت کو ہلاک کر دے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾

''ان میں دو چشمے جوش سے ابل رہے ہوں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ پانی سے جوش مار رہے ہوں گے (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خاء کے ساتھ جو نضخ ہے اس میں حاء کے ساتھ جو نضح ہے سے جوش زیادہ ہوتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی ہے وہ خیر و برکت سے جوش مار رہے ہوں گے یہی قول حضرت حسن بصری اور مجاہد نے کہا: حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے یہ مروی ہے: وہ چشمے اولیاء پر ان کے جنت کے گھروں میں کستوری، عنبر اور کافور کا چھڑکاؤ کر رہے ہوں گے جس طرح بارش کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: وہ مختلف قسم کے پھل اور پانی کا چھڑکاؤ کریں گے۔ ترمذی نے کہا: علماء نے کہا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 441　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

مختلف قسم کے پھل، مختلف قسم کی نعمتوں، مزین عورتوں، زین ڈالے گئے گھوڑوں اور رنگ دار کپڑوں کا چھڑکاؤ کر رہے ہوں گے۔ ترمذی نے کہا: یہ کلام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نضخ میں جری کی نسبت پانی کا بہاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلے چشمے پھوٹیں گے پھر رواں دواں ہو جائیں گے۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ایک عالم نے کہا: نخل (کھجور) اور رمان (انار) فاکھہ میں سے نہیں کیونکہ کسی چیز کا عطف اس کی اپنی ذات پر نہیں ہوتا۔ چیز کا عطف اس کے غیر پر ہوتا ہے۔ یہ کلام کا ظاہر معنی ہے جمہور نے کہا: یہ دونوں فاکھہ کی قسم میں سے ہیں نخل اور رمان کا دوبارہ ذکر ان دونوں کی فضیلت کے لیے کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (البقرہ:238) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ (البقرہ:98) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان دونوں کو مکرر اس لیے ذکر کیا کیونکہ کھجور اور انار اس وقت میں ان کے نزدیک اس حیثیت میں تھے جس طرح اس دور میں ہمارے نزدیک گندم ہے کیونکہ کھجور ان کی عام خوراک تھی اور انار پھل کی حیثیت رکھتا تھا ان دونوں کی ضرورت کی بنا پر ان کو کثرت سے لگایا جاتا تھا ان کے نزدیک فواکہ مختلف پھلوں کو کہتے جن کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے۔ پہلے فَاكِهَةٌ کا ذکر کیا پھر نخل اور رمان کا ذکر کیا کیونکہ مدینہ طیبہ سے لے کر مکہ مکرمہ کے قریبی ممالک یعنی یمن کے علاقہ میں یہ کثرت سے ہوتے ان دونوں کو فواکہ سے نکال دیا اور فواکہ کا علیحدہ ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں کو الگ ذکر کیا کیونکہ کھجور کا پھل فَاكِهَةٌ اور کھانا ہے اور رمان فاکھہ اور دوا ہے تفکہ کے لیے انہیں خالص نہیں کیا گیا؛ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جب کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فاکھہ نہیں کھائے گا اس نے انار یا تر کھجور کھائی وہ حانث نہیں ہوگا۔ صاحبین اور لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جنت میں انار پالان ڈالے گئے اونٹ کی طرح ہو گا۔ ابن مبارک نے کہا: سفیان، حماد سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جنت کی کھجوروں کے تنے سبز زمرد کے، شاخوں کے کاٹ دینے کے بعد ان کے تنے سرخ سونے کے، اس کی شاخیں جنتیوں کی چادریں ہوں گی انہیں سے ان کے چھوٹے کپڑے اور حلے ہوں گے ان کے پھل مٹکوں اور ڈولوں جیسے ہوں گے۔ وہ دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھے، مکھن سے زیادہ نرم ان میں کوئی گٹھلی نہ ہوگی۔ مسعودی نے عمرو بن مرہ سے وہ ابوعبیدہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جنت کی کھجور جڑ سے لے کر شاخ تک پھل سے بھری ہوگی، اس کے پھل مٹکوں کی مثل ہوں گے جب کبھی اس کا پھل توڑا جائے گا اس کی جگہ دوسرا آ جائے گا؛ اس کا پانی کھائی کے بغیر جاری ہوگا گچھا بارہ ہاتھ ہوگا۔

فِيهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾

''ان میں اچھی سیرت والیاں اچھی صورت والیاں ہوں گی۔ پس (اے جن و انس!) تم اپنے رب کی کن کن

نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ خَيْرَاتٌ سے مراد عورتیں ہیں۔ اس کی واحد خیرۃ ہے معنی ہے ذوات خیر۔ خیر والیاں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لفظ خیرات ہے خیرات کے معنی میں ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی جس طرح ھین اور لین ہے۔ ابن مبارک نے کہا: اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے وہ سعید بن عامر سے روایت نقل کرتے ہیں اگر خَيْرَاتٌ حِسَانٌ میں سے ایک خیرۃ آسمان کے سامنے آئے تو ہر چیز کو روشن کردے اور اس کے چہرے کی روشنی، سورج اور چاند پر غالب آجائے وہ اوڑھنی جو اسے پہنائی جاتی ہے وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ حِسَانٌ وہ شکل و صورت میں بہتر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حِسَانٌ تو وہ کون ہوگا جو ان کے حسن کا اندازہ لگائے: زہری اور قتادہ نے کہا: وہ اچھے اخلاق والی اور خوبصورت چہروں والی ہوں گی؛ یہی چیز حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے (1)۔ ابو صالح نے کہا: کیونکہ وہ کنواری اور باکرہ ہوں گی۔

قتادہ، ابن سمیقع، ابو رجاء، عطاردی اور بکر بن حبیب سہمی نے خیرات شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خیرات یہ خیر کی جمع ہے معنی ہے خیر والیاں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے مختارات۔ ترمذی نے کہا: خیرات وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار کے ساتھ ان کی صورتوں کو حسین و جمیل بنایا۔ جب حسن کا خالق کسی شی کی حسن کے ساتھ تعریف کرے تو غور کر وہاں حسن کا کیا عالم ہوگا۔ پہلی دو جنتوں میں موجود حوروں کے بارے میں فرمایا: قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ، كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۝ تو غور کر خیرۃ جو اللہ تعالیٰ کی چنی ہوئی ہے اور قاصرات الطرف میں کیا فرق ہوگا؟ حدیث طیبہ میں ہے: حورعین میں سے بعض بعض کے ہاتھ پکڑیں گی وہ ایسی آوازوں سے گائیں گی مخلوق نے ان سے اچھی آواز نہ سنی ہوگی اور نہ اس کی مثل آواز سنی ہوگی۔ ہم راضی ہیں ہم کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ ہم ہمیشہ مقیم رہیں گے ہم کبھی بھی کوچ نہ کریں گے ہم ہمیشہ زندہ رہیں گی ہم کبھی بھی نہیں مریں گی۔ ہم ہمیشہ نرم اندام رہیں گی کبھی سخت رویہ اختیار نہ کریں گی۔ ہم خیرات وحسان میں اپنے خاوندوں کے ہاں محبوب ہیں"۔ امام ترمذی نے حضرت علی سے اسی کی ہم معنی روایت نقل کی ہے (3)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حورعین جب یہ بات کریں گی تو دنیا میں ان کی مومن بیویاں انہیں جواب دیں گی: ہم نمازیں پڑھتی تھیں جب کہ تم نے نمازیں نہیں پڑھیں، ہم نے روزے رکھے اور تم نے روزے نہیں رکھے، ہم نے وضو کیے اور تم نے وضو نہ کیے، ہم نے صدقے کیے اور تم نے صدقے نہ کیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کی قسم دنیا میں ان کی مومن بیویاں ان پر غالب آجائیں گی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس میں اختلاف ہے کہ حسن و جمال میں کون بڑھ کر ہوگا حوریں یا انسانوں کی نسل سے ان کی بیویاں؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حوریں، کیونکہ قرآن و سنت میں ان کی صفت بیان کی گئی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میت پر جنازہ پڑھتے ہوئے ایک دعا میں کہا: وأبدله زوجا خيرا من زوجه۔ اس کی بیوی سے بہتر اسے بیوی عطا فرما۔ ایک قول یہ کیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 442 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، حور مقصورات فی الخیام، جلد 3، صفحہ 272

گیا ہے: انسان کی نسل سے عورتیں حوروں سے ستر گنا زیادہ حسین ہوں گی۔ ایک مرفوع روایت اس بارے میں مروی ہے ابن مبارک نے یہ ذکر کیا ہے۔ رشدین، ابن انعم سے وہ حبان بن ابی جبلہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''دنیا کی عورتوں میں سے جو جنت میں داخل ہوں گی وہ دنیا میں اعمال کرنے کی وجہ سے حورعین پر فضیلت والی ہوں گی''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حورعین جن کا ذکر قرآن میں ہے وہ انبیاء اور مومنین کی مومن بیویاں ہیں جنہیں آخرت میں دوبارہ اس سے بھی زیادہ حسین صورت میں پیدا کیا جائے گا؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ مشہور یہ ہے کہ حورعین دنیا کی عورتیں نہیں ہیں انہیں جنت میں ہی پیدا کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ جب کہ دنیا کی اکثر عورتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے گئے ہوں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت کے رہائشیوں میں سے بہت کم عورتیں ہوں گی''۔ ان میں سے ہر ایک عورت کو نہیں پائے گا جب کہ حورعین کا وعدہ تمام کے لیے ہے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دنیا کی عورتوں کے علاوہ ہیں۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

''یہ حوریں پردہ دار خیموں میں۔ پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ان کو ابھی تک نہ کسی انسان نے چھوا ہو گا اور نہ کسی جن نے۔ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ حور یہ حوراء کی جمع ہے اس سے مراد ہے جس کی آنکھ کی سفیدی انتہا کی ہو ساتھ ہی ساتھ سیاہی بھی شدید ہو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مَقْصُوْرٰتٌ وہ محبوس ہوں گی اور خیموں میں پوشیدہ ہوں گی وہ گلیوں میں گھومتی پھرتی نہیں ہوں گی، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: خیمہ ایسا موتی ہو گا جو اندر سے خالی ہو گا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہا: یہ ایک فرسخ چوڑا ایک فرسخ لمبا ہو گا اس کے دروازے کے پٹ سونے کے ہوں گے۔

ترمذی حکیم ابو عبداللہ نے حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ کے بارے میں کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک بادل نے عرش سے بارش برسائی تو حوریں رحمت کے قطرات سے پیدا کی گئیں پھر ان میں سے ہر ایک پر نہروں کے کنارے خیمہ لگا دیا گیا جن کی وسعت چالیس میل ہو گی اس کا کوئی دروازہ نہ ہو گا یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کا ولی جنت میں داخل ہو گا تو دروازہ سے خیمہ پھٹ جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ کے ولی کو علم ہو جائے کہ فرشتوں اور خدام کی نظریں اس تک نہیں پہنچیں، یہ خیموں میں بند ہیں انہیں مخلوقات کی نظروں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

پہلی دو جنتوں میں موجود حوروں کے بارے میں فرمایا: فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ یعنی انہوں نے اپنی نظروں کو اپنے خاوندوں تک محدود کر رکھا ہے ان کے بارے میں یہ ذکر نہیں کہ وہ مقصور ہیں یہ اس امر پر دال ہے کہ خیموں میں بند اعلیٰ وافضل ہیں۔ مجاہد نے کہا: مَقْصُوْرٰتٌ سے مراد یہ ہے انہیں اپنے خاوند تک محدود کر دیا گیا ہے وہ ان کے علاوہ کا ارادہ نہیں کرتیں۔ صحاح میں ہے: قصرت الشئی أقصرہ قصرا میں نے اسے محبوس کر دیا، اسی سے لفظ مقصورۃ الجامع ہے۔ قصرت الشئی

علی کذا یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اسے اسی چیز تک محدود کر دے غیر کی طرف تو اسے متجاوز نہ کرے۔ امرأۃ قصیرۃ وقصورۃ مراد ہے وہ عورت جو کمرے میں بند ہو اسے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں جنت میں ایک نہر کے پاس سے گزرا جس کے کناروں پر مرجان کے قبے تھے اس سے مجھے ندا کی گئی: السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کون ہیں؟ حضرت جبرئیل امین نے جواب دیا: یہ حورعین میں سے نوجوان عورتیں ہیں، انہوں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ آپ کو سلام کہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت دے دی۔ انہوں نے کہا: ہم ہمیشہ رہیں گی، ہم کبھی بھی نہیں مریں گی، ہم نرم اندام ہیں، ہم سخت گیر نہیں، ہم راضی رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی ناراض نہ ہوں گی، ہم معزز خاوندوں کی بیویاں ہیں'' پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ یعنی ہم محبوس ہیں یہ جس حفاظت اور کرامت کے لیے ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید اشہلیہ سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی عرض کی: یا رسول اللہ! ہم عورتیں ہیں محصور رہتی ہیں تمہارے گھروں کا سہارا ہیں، تمہاری اولادوں کو اپنے پیٹوں میں اٹھانے والی ہیں کیا ہم اجر میں تمہارے ساتھ شریک ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم اپنے خاوندوں کے ساتھ حسن معاملہ کرو اور ان کی رضا کی طالب ہو''۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ انہیں چھوا تک نہ ہوگا جس طرح پہلے گزرا ہے۔ عام قرآت یطمِثھن ہے۔ ابوحیوہ شامی، طلحہ بن مصرف، اعرج اور شیرازی نے کسائی سے دونوں حرفوں میں میم کو مضموم پڑھا ہے۔ کسائی ایک کو کسرہ دیتے اور دوسرے کو ضمہ دیتے اور اس میں اختیار دیتے جب پہلے کو رفع دیتے تو دوسرے کو کسرہ دیتے اور جب پہلے کو کسرہ دیتے تو دوسرے کو رفع دیتے: یہ ابو اسحاق سبیعی کی قرآت ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کے پیچھے نماز پڑھتا تو وہ میم کو رفع دیتے، میں حضرت عبداللہ کے شاگردوں کے پیچھے نماز پڑھتا تو وہ میم کو کسرہ دیتے۔ کسائی نے دونوں روایات پر عمل کیا یہ دونوں لغتیں ہیں طمُث، طمِث جس طرح یعرِشون اور یعکفُون ہے۔ جس نے ضمہ دیا اس نے دونوں لغتوں کو جمع کر دیا جس نے کسرہ دیا تو یہ عام لغت ہے۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ کے قول کا اعادہ نہیں کیا تا کہ اس امر کی وضاحت ہو جائے کہ خیموں میں حور مقصورات کی صفت ایسے ہی ہے جس طرح ان حوروں کی صفت ہے جو قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ کی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب وہ اپنی نظروں کو جھکانے والی ہیں تو خیموں میں بھی ان کا یہی حال ہوگا۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۝

''وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسند پر جو از حد نفیس بہت خوبصورت ہوگی۔ (پس اے انسانو! اور جنو!) تم

دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ (اے حبیب!) بڑا بابرکت ہے آپ کے رب کا نام، بڑی عظمت والا، احسان فرمانے والا"۔

**مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ،** رَفْرَفٍ سے مراد وہ چادر ہے جو اس بستر پر بچھائی جاتی ہے جس کو سونے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رَفْرَفٍ سے مراد بستروں اور قالینوں سے زائد چیز ہے(1)، ان سے یہ بھی مروی ہے: رَفْرَفٍ سے مراد وہ چادریں ہیں(2) جن کے زائد حصہ پر وہ ٹیک لگاتے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری اور قرظی نے کہا: اس سے مراد قالینیں ہیں۔ ابن عیینہ نے کہا: اس سے مراد تکیے ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: اس سے مراد چھوٹے تکیے ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری کا بھی قول ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ کپڑے کی ایک طرف ہے۔ لیث نے کہا: اس سے مراد سب کپڑوں کی ایک قسم ہے جسے بچھایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بلند بستر ہیں(3)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عربوں کے ہاں کپڑے کے جوڑے کو رفارف کہتے ہیں۔ یہ تمام اقوال قریب ہیں۔ صحاح میں ہے: رفرف سے مراد سبز کپڑے ہیں جن سے چادریں بنائی جاتی ہیں اس کا واحد رفارفہ ہے۔ سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباس نے کہا: رفرف سے مراد جنت کے باغات ہیں(4)۔ رفرف یہ أن یرف سے مشتق ہے وہ بلند ہوا اسی سے رفافة الطیر ہے کیونکہ وہ ہوا میں اپنے دونوں پروں کو حرکت دیتا ہے بعض اوقات نر شتر مرغ کو اسی وجہ سے رفرف کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے پھر بھاگ جاتا ہے۔ رفارف الطائر جب وہ کسی چیز کے ارگرد اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے تاکہ وہ اس پر گرے۔ رفرف سے مراد خیمہ کا نچلا حصہ قمیص کی جانب اور اس میں سے جو چیز لٹک رہی ہو، اس کا واحد رفرفہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بارے حدیث میں ہے: فرفع الرفارف فرأینا وجھه کأنه ورقة یعنی خیمہ کی ایک جانب اٹھائی گئی تو ہم نے آپ کا چہرہ دیکھا گویا وہ چاندی تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: رفرف کا اصل رف النبت یرف ہے جب وہ تروتازہ ہو؛ یہ ثعلبی نے حکایت بیان کی ہے۔ قتبی نے کہا: یہ لفظ کسی شی کے لیے اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب اس کا پانی زیادہ ہو یہاں تک کہ وہ جھومنے لگے۔ رف یرف رفیفا یہ مہدوی نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رفرف ایسی چیز کو کہتے ہیں جب اس کا مالک اس پر بیٹھے تو وہ دائیں بائیں اوپر نیچے حرکت کرے وہ اس کے ساتھ لذت حاصل کرے جس طرح جھولا جھولتا ہے، یہ قول ترمذی حکیم نے نوادر الاصول میں بیان کیا ہے ہم نے اس کا ذکر تذکرہ میں کیا ہے۔ ترمذی حکیم نے کہا: رفرف فرش سے مرتبہ میں بلند ہے پہلے دو باغوں کے بارے میں فرمایا: **مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ** جب کہ یہاں فرمایا: **مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ،** رَفْرَفٍ ایسی شی ہے جب ولی اس پر متمکن ہوتا ہے تو وہ اس کے ساتھ حرکت کرتی ہے، یعنی اسے یہاں اڑا کر لے جاتا ہے اور یہاں اڑا لے جاتا ہے جہاں اس کا ارادہ ہوتا ہے جس طرح جھولا ہوتا ہے اس کی اصل رفارف بین یدی اللہ عزوجل ہے۔

حدیث معراج میں ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو رفرف آپ کے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 443 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

پاس آیا آپ نے اسے جبرئیل امین سے لیا اور اس کے ساتھ مسند عرش کی طرف اڑ گئے۔ اس میں آپ نے ذکر کیا کہ ''وہ مجھے لے کر اڑا کبھی مجھے نیچے لے جاتا اور کبھی اوپر لے جاتا یہاں تک کہ مجھے میرے رب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر جب واپسی کا وقت ہوا آپ نے اسے پکڑا تو وہ آپ کو لے کر اڑا کبھی نیچے ہوتا اور کبھی اوپر جاتا یہاں تک کہ اس نے آپ کو جبرئیل امین تک پہنچا دیا جب کہ جبرئیل امین رو رہے تھے اور حمد کے ساتھ اپنی آواز بلند کر رہے تھے'' رفرف ایک خادم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہتا ہے دنو اور قرب کے محل میں اس کے خاص امور ہیں جس طرح براق ایک جانور ہے جس پر انبیاء سواری کرتے ہیں وہ اس کی زمین میں خاص ہے یہ رفرف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دو جنت والوں کے لیے مسخر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا قرب رکھتی ہیں یہ رفرف ان کا تکیہ اور بستر ہے وہ ولی کو ان نہروں کے کناروں پر لے کر اڑتا رہتا ہے جہاں وہ جنتی چاہتا ہے جہاں ان کی بیویاں خیرات حسان کے خیمے میں ہوتی ہیں پھر فرمایا: وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ۝ عَبْقَرِيٍّ ان کپڑوں کو کہتے ہیں جن پر نقش و نگار ہوتے ہیں جن کو پھیلایا جاتا ہے جب ان نقوش کا خالق کہے کہ یہ حسان ہیں تو ان عباقر کے بارے میں تیرا کیا گمان ہوگا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جحدری، حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے متکئین علی رفارف پڑھا ہے یہ جمع ہے غیر منصرف ہے، اسی طرح وعباقری حسان بھی ہے یہ رَفْرَفٍ اور عَبْقَرِيٍّ کی جمع ہے رَفْرَفٍ اسم جمع ہے عبقری واحد ہے جو جمع پر دلالت کرتی ہے جو عَبْقَرِيٍّ کی طرف منسوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رَفْرَفٍ اور عَبْقَرِيٍّ کا واحد رفرفہ اور عبقریہ ہے رفارف اور عباقر جمع الجمع ہے۔

عَبْقَرِيٍّ سے مراد موٹی چٹائی ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تکیے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد قالین ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ریشم ہے۔ قتبی نے کہا: ہر ایسا کپڑا جس پر نقش و نگار ہوں عرب اسے عقبری کہتے ہیں۔ ابوعبید نے کہا: یہ ایسی زمین کی طرف منسوب ہے جس میں کپڑے پر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں، اس کی طرف ہر اس نقش کو منسوب کیا جاتا ہے جس کو مضبوط نقش کہا جاتا۔

یہ کہا جاتا ہے: عبقر یمن کی ایک جانب ایسی بستی ہے جس میں منقش قالین بنے جاتے۔ ابن انباری نے کہا: اس میں اصل یہ ہے کہ عبقر ایک بستی ہے جس میں جن رہتے اس کی طرف ہر عمدہ چیز منسوب کی جاتی ہے۔ خلیل نے کہا: مردوں، عورتوں اور اس کے علاوہ جو بھی عمدہ چیز ہو عربوں کے ہاں اسے عقبری کہتے ہیں؛ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمان ہے: فلم أر عبقریا من الناس يَفْرِی فَرِيَّة (1) ابوعمرو نے کہا جب کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو فرمایا: عقبری سے مراد قوم کا رئیس اور بزرگ ہے۔

جوہری نے کہا: عقبری ایسی جگہ ہے عرب یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ جنوں کا علاقہ ہے۔ لبید نے کہا:

كُهُولٌ وشُبَّان كَجِنَّةِ عَبْقَرِ

عبقر کے جنوں کی طرح ادھیڑ عمر اور جوان ہیں۔ پھر عربوں نے اس کی طرف ہر ایسی چیز کو منسوب کیا جس کی قوت اور عمدہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام، دارالحدیث، جلد 1، صفحہ 513

صنعت سے وہ متعجب ہوتے انہوں نے کہا: عبقری۔ یہ واحد اور جمع ہے حدیث میں ہے: إنه كان يسجد على عبقري (1) وہ عبقری پر سجدہ کرتا ہے۔ اس سے مراد ایسی قالین ہے جس میں رنگ ہوں اور نقوش ہوں یہاں تک کہ انہوں نے کہا ظلم عبقری، هذا عبقري قوم۔ یہ جملہ اس آدمی کے لیے بولتے جو قوم میں سے قوی ہوتا۔ حدیث طیبہ میں ہے: فلم أر عبقريا يفري فريه میں نے قوم کے سردار کو نہیں دیکھا جو جھوٹ بولتا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسی چیز کے ساتھ خطاب کیا جس سے وہ متعارف تھے اور فرمایا: عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ۔ بعض قاریوں نے اسے عباقری پڑھا ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اسم منصوب کے جمع یاء نسبت کو باقی رکھتے ہوئے نہیں بنائی جاتی۔ قطرب نے کہا: یہ منسوب نہیں یہ کرسی کراسی، بختی اور بخاتی کی طرح ہے۔ ابوبکر نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یوں پڑھا متكئين على رفارف خضر وعباقر حسان ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے (2) خضر کے ضاء کو مضموم پڑھنا بہت ہی قلیل ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ تَبٰرَكَ یہ برکة سے تفاعل کا وزن ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ذِي الْجَلٰلِ عظمت والا۔ یہ بحث بھی پہلے گزر چکی ہے۔ عامر نے ذو الجلال پڑھا ہے اور اسے اسم کی صفت بنایا ہے یہ اس امر کو قوت بہم پہنچاتا ہے کہ اسم میں مسمی ہے باقی قراء نے ذی الجلال پڑھا ہے انہوں نے ذی کو ربك کی صفت بنایا ہے گویا اس کے ساتھ اس اسم کا ارادہ کیا ہے جس کے ساتھ سورت کا آغاز کیا فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ اس اسم کے ساتھ آغاز کیا اور انسان اور جنوں کی تخلیق کا ذکر کیا، آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر کیا، ان میں اپنی تدبیر کا ذکر کیا اور فرمایا: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ پھر قیامت، اس کی ہولناکیوں اور جہنم کی صفت کا ذکر کیا پھر جنتوں کی صفت کا بیان کیا پھر سورت کے آخر میں بیان کیا تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ یعنی وہ اسم جس کے ساتھ سورت کا آغاز کیا۔ گویا انہیں آگاہ کیا کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے میری رحمت سے پیدا ہوا ہے میں نے اپنی رحمت سے تمہیں پیدا کیا، تمہارے لیے آسمان، زمین، جنت اور دوزخ بنائے یہ سب کچھ تمہارے لیے رحمٰن کے اسم سے وقوع پذیر ہوا تو اس اسم کی مدح کی پھر کہا: ذِي الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ یعنی وہ ذات کے اعتبار سے جلیل ہے، افعال میں کریم ہے۔ قراء نے اس میں اختلاف نہیں کیا کہ سورت کے آغاز (3) میں وجہ کی صفت بنائیں جب کہ حالت رفعی میں ہو۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مومن جس کو ملیں گے جب وہ اس کا دیدار کریں گے، حسن جزا، خوبصورت ملاقات اور اچھی عطا سے خوش ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، جلد 1، صفحہ 520

2۔ درمنثور، جلد 6، صفحہ 214 3۔ مراد آیت نمبر 27 ہے۔

# سورۃ الواقعہ

آیاتہا ۹۶ ۵۶ سورۃ الواقعۃ مکیۃ ۴۶ رکوعاتہا ۳

یہ سورت مکی ہے، اس کی چھیانوے آیات ہیں۔

حضرت حسن بصری، عکرمہ، جابر اور عطا کے قول میں یہ مکی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: ایک آیت مدنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۝ کلبی نے کہا: یہ سورت مکی ہے مگر چار آیات مدنی ہیں ان میں سے دو آیات یہ ہیں: اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۝ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۝ یہ مکہ مکرمہ کی طرف سفر میں نازل ہوئیں اور ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ۝ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۝ یہ مدینہ کی طرف سفر کے موقع پر نازل ہوئیں۔

مسروق نے کہا: جو آدمی یہ چاہتا ہے کہ وہ اولین و آخرین کی خبر، اہل جنت کی خبر، اہل جہنم کی خبر، ہر اہل دنیا کی خبر اور اہل اُخری کی خبر کو جانے تو وہ سورۂ واقعہ کو پڑھے۔ ابوعمر بن عبدالبر نے التمہید، التعلیق اور ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی، حضرت ابن مسعود کے پاس عیادت کے لیے گئے جس مرض میں وہ فوت ہو گئے تھے پوچھا: کیا تکلیف ہے؟ کہا: اپنے گناہوں کی شکایت کرتا ہوں پوچھا: کیا خواہش رکھتے ہو؟ کہا: اپنے رب کی رحمت کی خواہش کرتا ہوں۔ پوچھا: کیا تیرے لیے طبیب کو نہ بلاؤں؟ جواب دیا: طبیب نے ہی تو مجھے مریض کیا ہے۔ کہا: کیا ہم تیرے لیے عطیہ کا حکم نہ دیں؟ جواب دیا: مجھے اس کی ضرورت نہیں میری زندگی میں آپ نے اسے روکے رکھا اور میری موت کے وقت مجھے دیتے ہو؟ فرمایا: یہ تیری بیٹیوں کو تیرے بعد فائدہ دے گا۔ جواب دیا: کیا آپ کو میرے بعد میری بیٹیوں کے بارے میں فاقہ کا ڈر ہے؟ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ کی تلاوت کیا کریں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے ہر روز سورۃ واقعہ کو پڑھا اسے کبھی بھی فاقہ نہیں آئے گا''(2)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝۴ وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝۵ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝۶

''جب قیامت برپا ہو جائے گی نہیں ہوگا جب یہ برپا ہوگی (اسے) کوئی جھٹلانے والا، کسی کو پست کرنے والی کسی کو بلند کرنے والی، جب زمین تھر تھر کانپے گی اور ٹوٹ پھوٹ کر پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے پھر غبار بن کر بکھر جائیں گے''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 445
2۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 582، حدیث 2640

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ جب قیامت برپا ہوگی۔ مراد دوسرا نفخہ ہے اسے واقعہ کا نام دیا کیونکہ یہ قریب ہی وقت میں واقع ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بہت سی مشکلات واقع ہوں گی۔ اس میں اضمار ہے یعنی یاد کرو اس وقت کو جب واقعہ ہونے والی واقع ہوگی۔ جرجانی نے کہا: اذا زائد ہے مراد ہے قیامت برپا ہوگی جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (القمر:1) اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ (النحل:1) جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: قد جاء الصوم یعنی روزے قریب آ گئے پہلی تعبیر کی صورت میں اذا وقت کے لیے ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ (الواقعہ)

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ كَاذِبَةٌ مصدر ہے یہ کذب کے معنی میں ہے عرب بعض اوقات اسم فاعل اور اسم مفعول کے صیغے کو مصدر کی جگہ رکھتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ (الغاشیہ) لاغیۃ لغو کے معنی میں ہے۔ یعنی اس میں کوئی جھوٹ سنائی نہیں دے گا؛ یہ کسائی کا قول ہے اس معنی میں عام لوگوں کا قول ہے عائذ باللہ۔ یہ معاذ اللہ کے معنی میں ہے۔

قم قائما، قم قیاما کے معنی میں ہے ایک عربی عورت بچے سے دل لگی کرتی ہے۔

قم قائما قم قائما

اٹھ کھڑے ہو اٹھ کھڑے ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: كَاذِبَةٌ صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی لیس لوقعتھا حال کاذبۃ او نفس کاذبۃ یعنی جو بھی اس کے واقعہ ہونے کے بارے میں خبر دے رہا ہے وہ سچا ہے۔ زجاج نے کہا: لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ کا معنی ہے اسے کوئی چیز رد نہیں کرتی، اس کی مثل حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے۔ ثوری نے کہا: اس کے واقع ہونے کے وقت کوئی بھی اس کو نہیں جھٹلائے گا۔ کسائی نے کہا: مراد ہے مناسب یہ ہے کوئی بھی اس کو نہ جھٹلائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا قیام یقینی ہے یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ عکرمہ، مقاتل اور سدی نے کہا: مفہوم یہ بنا ہے خفضت الصوت فاسمعت من دنا و رفعت فاسمعت من نأی یعنی اس نے قریب اور بعید کو آواز سنائی (1)۔ سدی نے کہا: اس نے متکبرین کو پست کیا اور کمزوروں کو بلند کیا۔ قتادہ نے کہا: اس نے کچھ قوموں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں پست کیا اور کچھ قوموں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف بلند کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اس نے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو جہنم میں پست کیا اور اولیاء اللہ کو جنت میں بلند کیا (2)۔ محمد بن کعب نے کہا: اس نے ان لوگوں کو پست کیا جو دنیا میں بلند تھے اور اس نے ایسی قوموں کو بلند کیا جو دنیا میں پست تھے۔ ابن عطا نے کہا: اس نے کچھ لوگوں کو عدل کے ذریعے پست کیا اور دوسروں کو فضل کے ذریعے بلند کیا۔ خفض رفع کا لفظ عربوں کے ہاں مکان، مرتبہ، عزت اور ذلت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خفض اور رفع کی نسبت قیامت کی طرف کی ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 446 2۔ ایضاً

یہ بطور مجاز ہے جس طرح عربوں کی عادت ہے کہ وہ فعل کی نسبت محل زمان اور دوسری چیزوں کی طرف کر دیتے ہیں جن سے فعل حقیقت میں واقع نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں لیل نائم، نھار صائم۔ قرآن کریم میں ہے بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (سبا:33) حقیقت میں بلند کرنے والا اور پست کرنے والا اللہ وحدہ لاشریک ہے اس نے اپنے اولیاء کو اعلیٰ درجات میں بلند کیا اور اس نے اپنے دشمنوں کو سب سے نچلے درجے میں پست کیا۔ حضرت حسن بصری اور عیسیٰ ثقفی نے پڑھا خافضةً رافعةً یعنی منصوب پڑھا ہے(1) باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں مبتدا محذوف ہوگا۔ جس نے اسے نصب دی ہے تو حال ہونے کی حیثیت میں نصب دی۔ فراء کے نزدیک یہاں فعل مضمر ہوگا، معنی ہوگا وقعت خافضةً رافعةً قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں یہ بعض لوگوں کو بلند کرے گی اور بعض کو پست کرے گی جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ جب زمین میں زلزلہ برپا ہوگا اور اس میں حرکت ہوگی؛ مجاہد اور دوسرے علماء سے یہی مروی ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: رجه يرجه رجا اسے حرکت دی اور اس میں زلزلہ برپا کیا۔ ناقة رجاء ایسی اونٹنی جس کی کہان بڑی ہو۔ حدیث طیبہ میں ہے ”جو آدمی سمندر پر اس وقت سوار ہوا جب وہ موجزن تھا تو اس کی کوئی ضمانت نہ ہوگی“ (2)۔ کلبی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہوگی جب اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی کرے گا تو اللہ تعالیٰ سے خوف کی وجہ سے وہ مضطرب ہوگی۔ مفسرین نے کہا: وہ اس طرح مضطرب ہوگی جس طرح بچہ پنگھوڑے میں مضطرب ہوتا ہے یہاں تک کہ جو کچھ اس کے اوپر ہوگا وہ گر جائے گا اور پہاڑ وغیرہ جو اس کے اوپر ہوگا وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رجه سے مراد شدید حرکت ہے جس کی آواز سنی جائے گی۔ اذا، اذا وقعت کا بدل ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ کی وجہ سے منصوب ہو، یعنی جب زمین میں زلزلہ برپا ہوگا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو اس وقت یہ کچھ کو پست کرے گی اور کچھ کو بلند کرے گی کیونکہ اس موقع پر جو بلند ہوگا وہ پست ہو جائے گا اور جو پست ہوگا وہ بلند ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب زمین میں زلزلہ برپا ہوگا تو قیامت برپا ہو جائے گی یہ زجاج اور جرجانی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے أذكر إذا رجّت الأرض رجا، رجا مصدر ہے یہ اس امر پر دلیل ہے کہ زلزلہ دوبارہ واقع ہوگا۔

وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ یعنی پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: جس طرح آٹے کو گھی سے لت پت کیا جاتا ہے۔ بسیسہ سے مراد ستو یا آٹا ہے جسے گھی یا تیل سے لت پت کیا جاتا ہے پھر اسے کھایا جاتا ہے اسے پکایا نہیں جاتا۔ بعض اوقات اسے زادراہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ راجز نے کہا:

لَا تَخْبِزَا خُبْزًا وَبُسَّا بَسًّا

تم دونوں روٹی نہ پکاؤ اسے گھی سے لت پت کر دو۔ ابو عبید نے یہ ذکر کیا ہے یہ غطفان کا ایک چور تھا اس نے روٹی پکانے کا ارادہ کیا اسے خوف ہوا کہ وقت کم ہے تو اس نے آٹا ہی کھا لیا۔ مطلب یہ ہے انہیں خلط ملط کیا گیا تو وہ اس آٹے کی طرح ہو گئے

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 239　2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 582، حدیث 41371

جسے پانی کے ساتھ ملایا گیا ہو یعنی پہاڑ مٹی ہو جائیں گے اور بعض کو بعض سے ملا دیا جائے گا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: بست کا معنی ہے انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا جائے گا تو وہ ختم ہو جائیں گے؛ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يَنۡسِفُهَا رَبِّىۡ نَسۡفًا (طہ) عطیہ نے کہا: انہیں پھیلا دیا جائے گا جس طرح ریت اور مٹی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ابتس سے مراد چلانا ہے یعنی پہاڑوں کو چلایا جائے گا۔ ابوزید نے کہا: سب سے مراد ہانکنا ہے قد بسست الابل أبسها بسامیں نے اونٹوں کو ہانکا۔ ابو عبید نے کہا: بسست الابل، ابسست یہ دونوں لغتیں ہیں جب تو ان کو جھڑ کے اور تو انہیں کہے بس بس حدیث طیبہ میں ہے یخرج قوم من المدینة الی الیمن والشام والعراق یبسون والمدینة خیرلهم لوکانوا یعلمون (1)۔

اس معنی میں ایک اور حدیث ہے جاء کم اهل الیمن یبسون عیالهم (2) اہل یمن تمہارے پاس آئے جب کہ وہ اپنے عیال کو ہانک رہے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: جئ به من حسك وبسك ابوزید نے دونوں کو کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ من حسك کا معنی ہے جہاں سے تو نے اس کا احساس کیا۔ من بسك جہاں سے اسے تیرا چلنا پہنچا۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے وہ بہہ پڑے۔ عکرمہ نے کہا: انہیں گرایا گیا۔ محمد بن کعب نے کہا: انہیں چلایا گیا؛ اسی معنی میں اغلب عجلی کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انہیں کاٹ دیا گیا۔ معنی قریب قریب ہے۔

فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: هباء منبث سے مراد وہ غبار ہے جو چوپاؤں کے کھروں سے پھیلتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو اس طرح بنایا ہے (3)۔ مجاہد نے کہا: هباء سے مراد وہ شعاع ہے جو روشن دان میں ہوتی ہے جس طرح غبار کی کیفیت ہوتی ہے (4)؛ اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: جب آگ میں حرکت ہوتی ہے تو اس سے جو شرارے اڑتے ہیں جب وہ کسی جگہ واقع ہوتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتے (5)؛ یہ عطیہ کا قول ہے۔ سورۂ فرقان میں وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ۝ میں گزر چکا ہے۔ عام قرآت منبثا ثا مثلثہ کے ساتھ ہے۔ مراد ہے متفرق۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ (البقرہ: 164) یعنی اسے بکھیر دیا۔ مسروق، نخعی اور ابوحیوہ نے منبتا پڑھا ہے (6) جس کا معنی منقطع ہے یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: بتہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قطع کر دیا۔ اس معنی میں بتات ہے۔

وَّكُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ فَاَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ۝ وَاَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ۝ وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۝ اُولٰٓـئِكَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۝ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۝

''اور تم لوگ تین گروہوں میں بانٹ دیئے جاؤ گے۔ پس (ایک گروہ) دائیں ہاتھ والوں کا ہوگا کیا شان ہوگی

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، ما جاء فی سکنی المدینة والخروج منها، صفحہ 696
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 447
4۔ ایضاً
5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 239
6۔ ایضاً

دائیں ہاتھ والوں کی۔ اور (دوسرا گروہ) بائیں ہاتھ والوں کا ہوگا کیا (خستہ) حال ہوگا بائیں ہاتھ والوں کا۔
اور (تیسرا گروہ ہر کار خیر میں) آگے رہنے والوں کا وہ (اس روز بھی) آگے آگے ہوں گے وہی مقرب بارگاہ ہیں، عیش و سرور کے باغوں میں''۔

وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ یعنی تین قسمیں۔ ہر قسم اس کے ہم مثل ہوگی جو اس میں سے ہے جس طرح زوج زوجہ کے ہم مثل ہوتا ہے پھر وضاحت کی کہ وہ کون ہیں تو فرمایا فاصحاب الیمین، اصحاب المشئمۃ، سابقون۔ اصحاب میمنہ وہ ہیں جن کو دائیں جانب سے پکڑ کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا، اصحاب مشئمہ وہ ہیں جن کو بائیں جانب سے پکڑ کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا؛ یہ سدی کا قول ہے(1)۔ مشأمہ کا معنی بایاں اسی طرح شأمہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے قعد فلان شأمة فلاں بائیں جانب بیٹھا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: یا فلاں شائم با صحابك یعنی ان کی بائیں جانب بیٹھو۔ عرب بائیں ہاتھ کو شومی کہتے اور بائیں جانب کو شمال کہتے۔ اسی طرح جو چیز دائیں جانب سے آتی ہے اسے یمن اور جو بائیں جانب سے آئی شومی کہتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد وہ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب تھے جب آپ کی اولاد آپ کی پشت سے نکالی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: یہ جنت میں ہیں مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ زید بن اسلم نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس روز حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب سے نکالے گئے اور اصحاب مشئمہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب سے نکالے گئے۔ عطاء اور محمد بن کعب نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد وہ ہیں جن کو کتاب ان کے دائیں ہاتھ میں دی گئی اور اصحاب مشئمہ سے مراد وہ ہیں جن کو کتاب ان کے بائیں ہاتھ میں دی گئی(2)۔ ابن جریج نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد نیکیوں والے ہیں اور اصحاب مشئمہ سے مراد برائیوں والے ہیں(3)۔ حسن اور ربیع نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد وہ ہیں جو اعمال صالحہ کرنے کی وجہ سے اپنی ذاتوں کے لیے مبارک ہوئے اور اصحاب مشئمہ سے مراد وہ ہیں جو قبیح اعمال کے ساتھ اپنے لیے منحوس ہوئے۔
صحیح مسلم میں حضرت ابوذر سے حدیث اسراء میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب ہم آسمان دنیا پر بلند ہوئے تو وہاں ایک شخصیت تھی جس کی دائیں جانب خلقت تھی اور اس کی بائیں جانب خلقت تھی۔ جب اپنی دائیں جانب دیکھتی تو ہنستی اور جب اپنی بائیں جانب دیکھتی تو رو دیتی۔ اس نے کہا: نبی صالح اور ابن صالح کو خوش آمدید۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون ہے؟ اس نے کہا: یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں ان کی دائیں جانب اور ان کی بائیں جانب یہ سائے ان کی اولاد کی روحیں ہیں دائیں جانب والے جنتی اور بائیں جانب والے جہنمی ہیں''(4)۔ حدیث کو ذکر کیا۔

مبرد نے کہا: اصحاب میمنہ سے مراد آگے بڑھنے والے ہیں اور اصحاب مشئمہ سے مراد پیچھے رہ جانے والے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: اجعلنی فی یمینك ولا تجعلنی فی شمالك مجھے آگے والوں میں سے بنا اور مجھے پیچھے رہ جانے والوں میں نہ بنا۔ مَآ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 448 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السموات، جلد 1، صفحہ 93-92

اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ۝ اور مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ۝ میں تکرار، تفخیم اور تعجب کے اظہار کے لیے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلۡحَآقَّۃُ ۝ۙ مَا الۡحَآقَّۃُ ۝ (الحاقہ) اَلۡقَارِعَۃُ ۝ۙ مَا الۡقَارِعَۃُ ۝ (القارعۃ) جس طرح کہا جاتا ہے: زید ما زید، ام زرع رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: مالک وما مالک مقصود اصحاب میمنہ کے لیے ثواب کی کثرت کا اظہار ہے اور اصحاب مشئمہ کے لیے عقاب کی کثرت کا اظہار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اصحاب مبتدا اور خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ۝ گویا یوں کلام کی ما اصحاب المینہ ماھم معنی ہے وہ کیا ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جائز ہے کہ ما تاکید کے لیے ہو۔ معنی ہے وہ لوگ جن کو ان کی کتاب ان کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی وہ آگے بڑھنے والے اور بلند مرتبہ والے ہیں۔

وَ السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۝ۙ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ”سابقون وہ ہیں جب انہیں حق دیا گیا تو انہوں نے اسے قبول کیا جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کو خرچ کیا اور انہوں نے لوگوں کے لیے وہی فیصلہ کیا جو انہوں نے اپنے لیے فیصلہ کیا“ (1) یہ مہدوی نے ذکر کیا۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: وہ انبیاء ہیں (2)۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: مراد ہر امت میں سے ایمان کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں؛ اس کی مثل عکرمہ سے مروی ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا: مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی (3) اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِیۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ (التوبہ: 100) مجاہد وغیرہ نے کہا ہے: مراد جہاد کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں اور نماز کی طرف سب سے پہلے جانے والے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: مراد پانچوں نمازوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ ضحاک نے کہا: جہاد کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: توبہ اور نیکی کے اعمال کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (آل عمران: 133) پھر ان کی تعریف کی اور فرمایا: اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ هُمۡ لَهَا سٰبِقُوۡنَ ۝ (المومنون) ایک قول یہ کیا گیا: وہ چار ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے سبقت لے جانے والا۔ وہ حضرت حزقیل ہیں جو آل فرعون میں سے مومن تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے سبقت لے جانے والا۔ وہ حبیب نجار ہے وہ صاحب انطاکیہ تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ السلام کی امت میں سے سبقت لے جانے والے یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اسے ماوردی نے بیان کیا ہے (4)۔ شمیط بن عجلان نے کہا: وہ تین قسم کے لوگ ہیں (۱) جس نے اپنی ابتدائی عمر میں ہی بھلائی کی طرف جلدی کی اس پر دوام اختیار کیا یہاں تک کہ دنیا سے چلا گیا یہی سابق مقرب ہے (۲) ایسا آدمی جس نے ابتداء میں گناہ کیے پھر طویل غفلت میں رہا پھر توبہ کی یہاں تک کہ اس پر اس کا خاتمہ ہوا یہ اصحاب یمین میں سے ہے (۳) ایسا آدمی جس نے ابتدائی عمر میں گناہ شروع کر دیئے پھر اسی پر کاربند رہا یہاں تک کہ اس پر اس کا خاتمہ ہوا یہ اصحاب شمال میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تمام وہ لوگ ہیں جنہوں نے کسی صحیح امر کی طرف جلدی کی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: السّٰبِقُوۡنَ یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے دوسرا سابقون اس کی تائید ہے اس کی خبر

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 240	2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 448	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ ہے۔ زجاج نے کہا: السّٰبِقُوْنَ مبتدا ہے دوسرا السابقون اس کی خبر ہے معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ ان کی صفت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب سابقین مقربین میں سے کوئی جنت میں اپنی منزل سے نکلے گا تو اس کی اتنی روشنی ہوگی جسے اس سے کم مرتبہ کے لوگ پہچان لیں گے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾

''ایک بڑی جماعت پہلوں سے اور قلیل تعداد پچھلوں سے۔ ان پلنگوں پر جو سونے کی تاروں سے بنے ہوں گے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان پر آمنے سامنے''۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ گزری ہوئی امتوں میں سے ایک جماعت (1) وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ یعنی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ایک جماعت ان میں سے جو اس امت سے قبل گزر چکے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھوڑے (2)۔ اے اللہ! ہمیں اپنے کرم کے ساتھ ان میں سے بنا دے۔ انہیں قلیل ماقبل کی طرف نسبت کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ کیونکہ پہلے انبیاء بہت زیادہ ہیں تو ان میں سے ایمان کی طرف سبقت لے جانے والے بھی زیادہ ہیں۔ ہماری امت میں سے جنہوں نے تصدیق کی طرف سبقت کی ان پر ان کی تعداد بہت زیادہ ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر یہ امر شاق گزرا تو یہ آیت نازل ہوئی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں امید کرتا ہوں کہ تم جنتیوں کا چوتھائی، بلکہ ایک تہائی بلکہ جنتیوں کا نصف ہو گے وہ باقی نصف میں باہم تقسیم ہوں گے''۔ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے ماوردی اور دوسرے علماء نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا معنی حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں صحیح مسلم میں ثابت ہے۔ گویا آپ نے ارادہ فرمایا کہ یہ منسوخ ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ محکم ہے کیونکہ وہ خبر ہے اور یہ دو مختلف جماعتوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جو امتیں گزر چکی ہیں ان میں سے سابقین ہمارے سابقین سے زیادہ ہیں اسی وجہ سے فرمایا: وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ اصحاب یمین جو سابقین کے علاوہ ہیں کے بارے میں فرمایا: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں امید کرتا ہوں کہ میری امت جنتیوں کا نصف ہوگی'' (3) پھر اس آیت کی تلاوت کی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

مجاہد نے کہا: یہ سب اس امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سفیان، ابان سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں الثلتان جميعا من امتی (4) یعنی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 241　2۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 3، صفحہ 279
3۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 223　4۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 458

الْاٰخِرِيْنَ۝ یہ قول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: دونوں جماعتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس امت کے اوّل سے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اس امت کے آخر میں سے ہیں (1) وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (فاطر: 32)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ۝ ایک جماعت اس امت کے اوّل سے تعلق رکھتی ہے۔ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۝ وہ طاعت میں جلدی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اولین کے درجہ تک جا پہنچتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے سب سے بہتر میرے زمانہ کے لوگ ہیں'' (2) پھر اصحاب یمین میں اولین و آخرین کو برابر قرار دیا ثلۃ یہ ثللتُ الشئی سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اسے کاٹا۔ ثلۃ کا معنی فرقہ ہے؛ زجاج کا قول ہے۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ۝ سبقت لے جانے والے جنت میں پلنگوں پر ہوں گے۔ سرر، سریر کی جمع ہے موضونة حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ سونے سے بنے ہوں گے۔ عکرمہ نے کہا: ان میں موتی اور یاقوت جڑیں ہوں گے۔ حضرت ابن عباس نے یہ بھی فرمایا: مَّوْضُوْنَةٍ وہ صف در صف ہوں گے جس طرح ایک اور موقع پر فرمایا: عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ان سے اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: وہ سونے سے بنے ہوں گے۔ تفاسیر میں ہے وہ سونے کی تاروں سے بنے ہوں گے جن میں موتی، یاقوت اور زبرجد جڑیں ہوں گے۔ وضن کا معنی بنا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: وضن فلان الحجر والآجر بعضه فوق بعض فهو موضون فلاں نے پتھر اور اینٹ کو ایک دوسرے پر رکھا پس انہیں پیوست کر دیا گیا۔ درع موضونة ایسی زرہ جو بنائی میں محکم ہو جس طرح مصفوفة ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

ومن نسج داؤد موضونة

حضرت داؤد علیہ السلام کی بنائی بڑی مضبوط تھی۔ السریر الموضون سے مراد ہے وہ چارپائی جس کی سطح بنی ہوئی چیز کی طرح ہو اس سے وضین ہے بطان من سیور ینسج فیدخل بعضه فی بعض تنگ بے تسموں سے بنائے گئے تھے جن کے بعض بعض میں داخل کر دیئے گئے تھے؛ اس معنی میں اس کا یہ قول ہے:

اليك تَعْدُو قَلِقًا وَضِينُها (3)

مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا، ھا ضمیر سے مراد پلنگ ہیں۔ مُتَقٰبِلِيْنَ۝ وہ ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے بلکہ پلنگ ان پر گھومیں گے۔ یہ مومن، اس کی زوجہ اور اس کے اہل کے بارے میں ہے یعنی وہ بالمقابل تکیہ لگائے ہوں گے؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: ہر پلنگ کی لمبائی تین سو ہاتھ ہوگی ☆۔ جب بندہ اس پر بیٹھنے کا ارادہ کرے گا تو وہ نیچے ہو جائے گا اور جب اس پر بیٹھ جائے گا تو وہ اوپر اٹھ جائے گا۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 449
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل الصحابة ثم الذین یلونهم، جلد 2، صفحہ 309
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 241
☆ الفاظ یہی ہیں مگر سیاق سے پتہ چلتا ہے اس کی اونچائی اتنی ہوگی۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا
يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا
يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

”گردش کرتے ہوں گے ان کے اردگرد نوخیز لڑکے جو ہمیشہ ایک جیسے رہیں گے (ہاتھوں میں) پیالے، آفتابے اور شراب طہور سے چھلکتے جام لیے ہوئے، نہ سردرد محسوس کریں گے اس سے اور نہ مدہوش ہوں گے اور میوے بھی (پیش کریں گے) جو وہ جنتی پسند کریں گے اور پرندوں کا گوشت بھی جس کی وہ رغبت کریں گے اور حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں، (سچے) موتیوں کی مانند جو چھپا رکھے ہوں۔ یہ اجر ہوگا ان نیکیوں کا جو وہ کرتے رہے تھے۔ نہ سنیں گے وہاں لغو باتیں اور نہ گناہ والی باتیں، بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آواز آئے گی“۔

**يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿﴾** یعنی ایسے لڑکے جو نہیں مریں گے؛ یہ مجاہد، حسن اور کلبی کا قول ہے۔ نہ وہ بوڑھے ہوں گے اور نہ ان میں کوئی تبدیلی ہوں گی۔ سعید بن جبیر نے کہا: **مُّخَلَّدُوْنَ** کا معنی ہے انہیں بالیاں پہنائی گئی ہوں گی (1)۔ بالی کو خلدہ کہتے ہیں زیورات کے مجموعہ کو خلدہ کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں کنگن پہنائے گئے ہوں گے اس کی مثل فراء سے مروی ہے؛ شاعر نے کہا:

ومخلّداتٌ باللُّجينِ (2)

انہوں نے چاندی کے کنگن پہنے ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں بالیاں پہنائی گئی ہوں گی۔ عکرمہ نے کہا: **مُّخَلَّدُوْنَ** ان پر انعام کیا گیا ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ سب ہم عمر ہوں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں جنتیوں کے لیے پیدا کیا، ان پر گردش کرتے ہوں گے جس طرح اللہ تعالیٰ نے چاہا ان میں ولادت کا سلسلہ نہیں ہوگا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت حسن بصری نے کہا: یہاں ولدان سے مراد مسلمانوں کے بچے ہیں جو چھوٹی عمر میں مرجاتے ہیں نہ ان کی نیکی ہوتی ہے اور نہ ہی برائی ہوتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا: یہ مشرکوں کے بچے ہوں گے یہ جنتیوں کے خادم ہوں گے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: نہ ان کی نیکیاں ہوں گی کہ ان پر انہیں بدلہ دیا جاتا اور نہ ان کی برائیاں ہوں گی کہ ان پر انہیں عذاب دیا جاتا تو انہیں اس مقام پر رکھا جائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ جنتی کامل سرور و نعمت میں ہوں گے اور خوشی و انبساط اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب خدام اور بچے انسان کے اردگرد ہوں۔

**بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ**، اکواب، کوب کی جمع ہے سورۂ زخرف میں یہ گزر چکا ہے۔ یہ ایسے برتن ہوتے ہیں جن کی سنت اور دستہ نہیں ہوتا۔ **اَبَارِيْقَ** ایسے برتن کو کہتے ہیں جس کا دستہ اور سنت ہوتی ہے اس کا واحد ابریق ہے۔ اسے یہ نام دیا گیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 450 2۔ ایضاً

کیونکہ صفائی کی وجہ سے اس کا رنگ چمکے گا۔

وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ۝ سورۃ الصافات میں اس کے بارے میں قول گزر چکا ہے۔ معین سے مراد جو پانی یا شراب سے جاری ہو۔ یہاں اس سے مراد ایسی شراب ہے جو چشموں سے جاری ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا: آنکھوں کے لیے ظاہر ہوگی اس صورت میں معین، معاینہ سے مفعول کا صیغہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ معن سے فعیل کا وزن ہے جس کا معنی کثرت ہے یہ واضح کیا کہ یہ دنیا کی شراب جیسی نہیں جسے نچوڑنے، تکلف کرنے اور مشقت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔

لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا اس کے پینے سے ان کے سروں میں درد نہیں ہوگا۔ معنی اس میں لذت تو ہوگی اس میں کوئی اذیت نہیں ہوگی جب کہ دنیا کی شراب کا معاملہ مختلف ہوگا۔ وَ لَا یُنْزِفُوْنَ ۝ سورۃ الصافات میں یہ گزر چکا ہے انہیں نشہ نہیں آئے گا کہ ان کی عقلیں ضائع ہو جائیں۔ مجاہد نے کہا: لَّا یُصَدَّعُوْنَ کا معنی ہے وہ نہیں پھٹیں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَوْمَىِٕذٍ یَّصَّدَّعُوْنَ ۝ (الروم) اہل کوفہ نے اسے ینزفون زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ان کی شراب ختم نہ ہوگی؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

لَعَمْرِی لَئِنْ أَنْزَفْتُم أو صَحَوْتُمُ لَبِئْسَ النَّدَامی كُنْتُم آل أَبْجَرَا(1)

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ شراب میں چار خصلتیں ہیں نشہ، سرور، قے اور پیشاب (2)۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب کا ذکر کیا اور اسے ان خصلتوں سے پاک کر دیا۔

وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ ۝ جو چاہتے ہیں اسے لے لیتے ہیں کیونکہ ان پھلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایسا پھل جو پسندیدہ ہے۔ تخیر کا معنی اختیار ہے۔

وَ لَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ ۝ امام ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوثر کے بارے میں پوچھا گیا؟ فرمایا: "وہ ایسی نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے یعنی جنت میں جو دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھی ہے، اس میں ایسے پرندے ہیں ان کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں جیسی ہیں" (3)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: وہ تو بڑی موٹی تازی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اس کا کھانا اس گردن کے کھانے سے زیادہ اچھا ہوگا"۔ کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ اُسے ثعلبی نے حضرت ابو درداء کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جنت میں پرندے ہوں گے جس طرح بختی اونٹوں کی گردنیں ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ولی کے ہاتھ پر صف در صف ہوں گے ان میں سے ایک کہے گا: اے اللہ کے ولی! میں عرش کے نیچے چراگاہوں میں چرا ہوں، میں نے تسنیم کا پانی پیا ہے، مجھ سے کھاؤ وہ اس کے سامنے اٹھکیلیاں کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ولی اللہ کے دل میں ان میں سے کسی کو کھانے کا خیال آئے گا تو وہ اس کے سامنے گر پڑے گا۔ ولی اللہ اس سے کھائے گا جتنا ارادہ کرے گا جب وہ سیر ہو جائے گا تو پرندے کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 242 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 451

3۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ما جاء فی صفة طیر الجنة، جلد 2، صفحہ 77

ہڈیاں جمع ہو جائیں گی تو وہ اڑ جائے گا اور جہاں چاہے گا جنت میں چرے گا'' (1)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: وہ بڑا لذیذ ہوگا۔ فرمایا: اس کو کھانے والا اس سے افضل ہوگا''۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں پرندہ ہوگا پرندے میں ستر ہزار پر ہوں گے وہ جنت کے پیالے میں آگرے گا پھر وہ پھٹ جائے گا تو ہر پر سے ایک مقیم کا کھانا نکلے گا جو برف سے زیادہ سفید، مکھن سے زیادہ ٹھنڈا اور ملائم اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔ اس میں سے کوئی کھانا دوسرے کی مثل نہیں ہوگا۔ اس سے اتنا کھائے گا جتنا ارادہ کرے گا، پھر وہ چلا جائے گا اور اڑے گا'' (2)۔

وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۝ اسے رفع، نصب اور جر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ جس نے اسے جر دی وہ حمزہ، کسائی اور دوسرے قراء ہیں۔ یہ جائز ہے کہ اس کا عطف باکواب پر ہو۔ یہ معنی پر محمول ہوگا کیونکہ معنی ہے وہ جاموں، پھلوں، گوشت اور حوروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف جنات پر ہو یعنی وہ جناب النعیم میں ہوں گے اور حوروں کی معاشرت میں ہوں گے اس صورت میں حور سے پہلے معاشرہ کا لفظ ہوگا۔ فراء نے کہا: جر لفظ کی اتباع میں ہوگی اگرچہ معنی میں مختلف ہیں کیونکہ حوریں ان پر طواف نہیں کریں گی؛ ایک شاعر نے کہا:

ورأيتُ زَوْجَكِ في الوَغَى　مُتَقَلِّدًا　سَيْفًا　وَرُمحًا

سب نے تیرے خاوند کو جنگ میں دیکھا جو تلوار اور نیزے سے آراستہ تھا۔

تلوار کو گلے میں لٹکایا جاتا ہے نیزے کو نہیں لٹکایا جاتا۔

قطرب نے کہا: یہ اکواب اور اباریق پر معطوف ہیں معنی پر ان کا حمل نہیں۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پر حوریں طواف کریں اور ان کے لیے اس میں لذت ہو۔ جس نے اسے نصب دی ہے وہ اشہب عقیلی، نخعی اور عیسیٰ بن عمر ثقفی ہے۔ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ اس صورت میں فعل مضمر ہوگا۔ گویا ارشاد فرمایا: ديزوّجون حورا عينا نصب کی صورت اسی معنی پر حمل بھی اچھا ہے کیونکہ يطاف عليهم بهکا معنی ہے انہیں وہ عطا کر دی جائے گی۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے جب کہ وہ جمہور ہیں؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ تو اس صورت میں اس کا معنی ہے وعندهم حور عين کیونکہ حوریں ان پر گردش نہیں کریں گی۔ کسائی نے کہا: جس نے کہا وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۝ اسے رفع دیا ہے۔ اور علت یہ بیان کی ہے کہ وہ ان پر چکر نہیں لگائیں گی یہی چیز فاکھه اور لحم میں بھی لازم آئے گی کیونکہ یہ چیز بھی اس پر گردش کناں نہیں ہوگی۔ اس پر صرف شراب گردش کناں ہوگی۔ اخفش نے کہا: یہ جائز ہے کہ وہ معنی پر محمول ہو کیونکہ اس کا معنی ہے لهم اکواب ولهم حور عين ان کے لیے جام اور حور عین ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف ثلة پر ہو اور ثلة مبتدا ہو اور اس کی خبر عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۝ ہو اسی طرح وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۝ ہے نکرہ کے باوجود اسے مبتدا بنایا کیونکہ صفت کی وجہ سے یہ خاص ہو گیا۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ، ما جاء فی صفۃ طیر الجنۃ، جلد 2، صفحہ 77

2۔ کنز العمال فی ذکر اشراط الساعۃ الکبری، جلد 14، صفحہ 462-463

كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۞ ، امثال، مثل کی جمع ہے لؤلؤ مکنون جسے ہاتھوں نے نہ چھوا ہو اور اس پر غبار نہ پڑا ہو۔ یہ موتی صفائی اور چمک میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے یعنی وہ تمام اطراف سے حسن میں ایک جیسی ہیں۔

كَاَنَّمَا خُلِقَتْ فِىْ قِشْرِ لُؤْلُؤَةٍ

گویا اسے موتی کی سیپی میں پیدا کیا گیا ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ جَزَآءً کا معنی ثواب ہے یہ مفعول لہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہو کیونکہ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۞ کا معنی ہے۔ انہیں جزا دی جائے گی ایسے بچوں کے ساتھ جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔

حور عین کے بارے میں گفتگو سورۂ طور وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حور عین کو زعفران سے پیدا کیا ہے''۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''ایک جنتی جنت کے سیپوں میں سے ایک پکڑے گا وہ اس کے ہاتھ میں پھٹ جائے گا تو اس سے حور نکلے گی اگر وہ سورج کو دیکھے تو سورج اس کے حسن سے شرما جائے جب کہ اس سیپ میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا''۔ ایک آدمی نے عرض کی: اے ابوسلیمان! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سیپ میں کچھ نقص نہ ہوگا؟ فرمایا: ہاں جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلایا جاتا ہے یا کئی چراغ جلائے جاتے ہیں تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اس پر قادر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حور عین کو اس کے پاؤں کی انگلیوں سے اس کے گھٹنوں تک زعفران سے، اس کے گھٹنوں سے اس کے پستانوں تک اذفر کستوری سے، پستانوں سے گردن تک عنبر اشہب سے، گردن سے سر تک کافور ابیض سے پیدا کیا ہے اس پر ستر ہزار حلے ہوں گے جس طرح شقائقِ (1) نعمان ہوتے ہیں جب وہ متوجہ ہوگی تو اس کا چہرہ روشن نور کے ساتھ چمک رہا ہوگا جس طرح سورج اہل دنیا کے لیے چمکتا ہے، جب وہ پیٹھ پھیرے گی تو اس کا جگر کپڑوں اور جلد کی باریکی کی وجہ سے دکھائی دے گا۔ اس کے سر میں اذفر کستوری کی ستر ہزار مینڈھیاں ہوں گی ہر مینڈھی کے لیے ایک خادمہ ہوگی جو اس کے دامن کو اٹھائے ہوگی جب کہ وہ ندا دے رہی ہوگی۔ یہ اولیاء کا ثواب ہے

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۞ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ باطل اور جھوٹ نہ سنیں گے (2)۔ لغو اسے کہتے ہیں جو کلام میں سے لہو ہو۔ تاثیم یہ اثمتہ کا مصدر ہے یعنی میں نے اسے کہا: تو نے گناہ کیا۔ محمد بن کعب نے کہا و لا تاثیما وہ ایک دوسرے کو گناہگار نہیں کہیں گے۔ مجاہد نے کہا: وہ اس میں گالی گلوچ نہیں سنیں گے (3)۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا، قیلا اور یہ يَسْمَعُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے یا یہ استثناء منقطع ہے لیکن وہ قیل کہتے ہیں یا سلام سلام کہتے ہیں یہ قول کی وجہ سے منصوب ہے یعنی مگر وہ خیر کہتے ہیں یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ مگر یہ وہ ایک دوسرے کو سلام کہتے ہیں یا یہ

1۔ ایسی بوٹی ہے جس کی کلیاں سرخ ہوتی ہیں۔ 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 452 3۔ ایضاً

قیلا کی صفت ہے دوسرا سلام پہلے کا بدل ہے معنی ہوگا ایسی بات جو لغو سے سلامت ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مرفوع ہو تقدیر کلام یہ ہوگی ''سلام علیکم'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فرشتے انہیں سلام کریں گے یا ان کا رب انہیں سلام کرے گا۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

''اور دائیں ہاتھ والے، کیا شان ہوگی دائیں ہاتھ والوں کی۔ بے خار بیریوں میں اور کیلے کے گچھوں میں اور لمبے لمبے سایوں میں اور پانی کی آبشاروں میں اور پھلوں کی بہتات میں نہ وہ ختم ہوں گے اور نہ ان سے روکا جائے گا اور بستر بھی بچھے ہوں گے اونچے اونچے پلنگوں پر۔ ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے پس ہم نے بنالیا انہیں کنواریاں (دل و جان سے) پیار کرنے والیاں ہم عمر (یہ سب نعمتیں) اصحاب یمین کے لیے مخصوص ہوں گی۔ ایک بڑی جماعت اگلوں سے اور ایک بڑی جماعت پچھلوں میں سے ہوگی''۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾، اصحاب میمنہ کی منازل کے ذکر کی طرف رجوع کیا وہ سابقون ہیں جس طرح پہلے گزرا ہے۔ یہ تکرار ان نعمتوں کی عظمت شان کو بیان کرنے کے لیے ہے جس میں وہ ہیں۔

فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ ایسے بیری کے درختوں کے سایوں میں جس کے کانٹے کاٹ دیئے گئے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء کا قول ہے؛ ابن مبارک نے یہ ذکر کیا ہے۔ صفوان نے سلیم بن عامر سے حدیث نقل کی ہے (1) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کہا کرتے تھے کہ بدو اور ان کے سوالات ہمیں نفع دیا کرتے تھے کہا: ایک روز ایک بدو آیا اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تکلیف دہ درخت کا ذکر کیا ہے میرا خیال نہیں کہ جنت میں کوئی ایسا درخت ہوگا جو جنتی کو اذیت دے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ کون سا درخت ہے''؟ عرض کی بیری کا درخت اس کا کانٹا اذیت دینے والا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ یہ ارشاد نہیں فرماتا فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کے کانٹے کو ختم کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر کانٹے کی جگہ اس کا پھل بنا دیا ہے وہ ایسا پھل نکالے گا کہ اس پھل سے بہتر قسم کے کھانے نکلیں گے ان میں سے ہر ایک کھانا دوسرے سے مختلف ہوگا''۔ ابو العالیہ اور ضحاک نے کہا: مسلمانوں نے وج وادی کو دیکھا تو اس کی بیری کے درختوں نے انہیں خوش کیا انہوں نے کہا: کاش! ہمارے لیے بھی ایسے درخت ہوتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ امیہ بن صلت جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

1۔ در منثور، جلد 6، صفحہ 222

إنَّ الحَدَائِقَ فی الجِنانِ ظلیلۃٌ　فیھا الکَواعِبُ سِدْرُھا مَخْضُودُ(1)

جنت میں باغ سایہ دار ہیں ان میں نوخیز عورتیں ہیں جس کے بیری کے درخت کانٹوں والے نہیں۔

ضحاک، مجاہد اور مقاتل بن حیان نے کہا: فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ایسی بیری جو پھل سے بوجھل ہو(2)۔ یہ اس معنی کے قریب قریب ہے جو ہم نے حدیث میں بیان کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا پھل مٹکے سے بڑا ہوگا۔ سورۂ نجم میں یہ بحث گزر چکی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی اس کے پھل ہجر کے مٹکوں جیسے ہوں گے۔ یہ حدیث حضرت انس سے مروی ہے جس کو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں(3)۔

وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ طَلۡحٍ کیلے کا درخت ہے اس کا واحد طلحہ ہے؛ یہ قول اکثر مفسرین نے کیا ہے ان میں حضرت علی، حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ کیلے کا درخت نہیں بلکہ ایسا درخت ہے جس کا ٹھنڈا اور تر سایہ ہوتا ہے۔ فراء اور ابوعبیدہ نے کہا: مراد بڑا درخت ہے جس کا کانٹا ہوتا ہے؛ جعدی نے کہا:

بَشَّرَھا　دَلیلُھا　وقَالاَ　غدًا　تَرَیْنَ　الطَّلْحُ　والاَحْبالاَ

اس کی رہنمائی کرنے والے نے اسے بشارت دی اور دونوں نے کہا: کل تم طلح اور بیری کے درخت دیکھوگی۔

طَلۡحٍ سے مراد ہرا ایسا بڑا درخت ہے جس کے بہت زیادہ کانٹے ہوتے ہیں۔ زجاج نے کہا: یہ جائز ہے کہ وہ جنت میں ہو اور اس کے کانٹے زائل کر دیئے گئے ہوں۔ زجاج نے کہا: جس طرح کیکر کا درخت ہوتا ہے اس کی بہت سی عمدہ کلیاں ہوں گی۔ انہیں ایسی چیز کے ساتھ خطاب کیا گیا اور اس چیز کا وعدہ کیا گیا جس کی مثل کو وہ پسند کرتے تھے مگر اس کی دنیا کی چیزوں پر فضیلت ایسی ہوگی جس طرح جنت میں جنتی چیزیں ہیں ان کی فضیلت دنیاوی چیزوں پر ہوتی ہے۔ سدی نے کہا: جنت کا کیلا اس طرح ہوگا جس طرح دنیا کا کیلا ہوگا مگر اس کا پھل شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے و طلع منضود پڑھا ہے یعنی حاء کی جگہ عین پڑھی ہے اور اس آیت کی تلاوت کی وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُہَا ہَضِیۡمٌ (اشعراء) یہ مصحف کے برعکس ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ان کے سامنے وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ پڑھا گیا ہے تو انہوں نے کہا: یہ طلح کیا ہے؟ وہ طلع منضود ہے پھر کہا: لھا طلح نضید انہیں کہا گیا: کیا ہم اسے بدل نہ دیں؟ تو انہوں نے کہا: یہ مناسب نہیں کہ قرآن کے بارے میں جلد بازی کی جائے اور نہ اسے بدلنا مناسب ہے۔ انہوں نے اس قرأت کو پسند کیا مگر اسے مصحف میں لکھنے پر اتفاق نہ کیا کیونکہ یہ اس کے خلاف ہے جس پر سب کا اتفاق ہے؛ یہ قشیری کا قول ہے۔

ابوبکر انباری نے اس کی سند ذکر کی کہا: میرے والد نے حسن بن عرفہ سے وہ عیسیٰ بن یونس سے وہ مجالد سے وہ حسن بن سعید سے وہ قیس بن عبادہ سے روایت نقل کرتے ہیں قرأت عند علی أو قرئت عند علی مجاہد کو شک ہے یعنی میں نے حضرت علی کے ہاں اسے پڑھا یا حضرت علی شیر خدا کے ہاں اسے پڑھا گیا: و طلح منضود حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ طلح کیا ہے؟ کیا تو اسے و طلع نہیں پڑھتا پھر کہا: لھا طلع نضید اس آدمی نے عرض کی: اے امیر المومنین! کیا ہم مصحف میں اسے مٹا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 243　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 453　3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 395

دیں؟ فرمایا: آج قرآن پر جلدی نہ کی جائے۔ ابوبکر نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس امر کی طرف رجوع کر لیا جو مصحف میں ہے اور انہیں پتہ چل گیا کہ یہ درست ہے اور جس نے آپ کے قول سے تفریط اپنانا چاہی تھی اس کو باطل کر دیا۔ منضود سے مراد ہے جس کے آغاز سے لے کر آخرت تک حصہ پھل سے جڑا ہوا ہو، اس کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو بلکہ اس کا پھل ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ نضد کا معنی جوڑنا اور منتضد کا معنی جڑا ہوا پیوست۔

مسروق نے کہا: جنت کے درخت ابتدا سے لے کر آخر تک پھلوں سے لدے ہوں گے جب بھی اس کا پھل کھایا جائے گا اس کی جگہ اس سے بہتر پھل آ جائے گا۔

**وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ** وہ دائمی ہوگا وہ ختم نہ ہوگا اور سورج اسے ختم نہیں کرے گا(1)؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا** (الفرقان: 45) یہ صبح کے وقت ہوتا ہے یہ صبح کے روشن ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک ہوتا ہے جس طرح اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ جنت میں سایہ ہی سایہ ہے اس کے ساتھ کوئی سورج نہیں ہوگا۔ ربیع بن انس نے کہا: مراد عرش کا سایہ ہے۔ عمرو بن میمون نے کہا: اس کی لمبائی ستر ہزار سال کے برابر ہوگی۔ ابوعبیدہ نے کہا: عرب طویل زمانہ، طویل عمر اور جو چیز ختم نہ ہو اسے **مَّمْدُوْدٍ** کہتے ہیں۔ لبید نے کہا:

دھر طویل، دائم ممدود

صحیح ترمذی اور دوسری کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کیا ہے: وفی الجنۃ شجرۃ یسیر الراکب فی ظلھا مأۃ عام لا یقطعھا واقرء وا إن شئتم وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٌ جنت میں ایک ایسا درخت ہے ایک سوار اس کے سائے میں سو سال تک چلتا رہے گا وہ اسے طے نہ کر سکے گا۔ چاہو تو پڑھو۔ وظِلٍّ مَّمْدُوْدٌ(2)۔

**وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ** یعنی جاری پانی ہوگا جو ختم نہیں ہوگا۔ سکب کا اصل معنی بہانا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سکبہ سکبا، سکوب کا معنی اس کا بہنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سکب سکوبا، انسکب انسکابا یعنی بہایا گیا پانی رات، دن بغیر کھائی کے جاری رہے گا وہ ان سے ختم نہ ہوگا۔ عرب بادیہ نشین اور گرم علاقوں کے رہائشی تھے ان کے علاقوں میں نہریں نادر و نایاب تھیں وہ ڈولوں کے ذریعے ہی پانی تک پہنچ پاتے تو اس کے برعکس ان سے نہروں کا وعدہ کیا گیا۔ ان کے لیے سیر و سیاحت کے اسباب کا ذکر کیا گیا جو دنیا میں معروف ہیں جیسے درخت، ان کے سائے، پانی، نہریں اور ان کا عام ہونا۔

**وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ** وہ تھوڑے اور نادر و نایاب پھل نہیں ہوں گے جس طرح ان کے علاقے میں ہوتے ہیں **لَّا مَقْطُوْعَةٍ** وہ کسی وقت ختم نہ ہوں گے جس طرح موسم گرما کے پھل موسم سرما میں ختم ہو جاتے ہیں۔ **وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ** یعنی دنیا کے پھلوں کی طرح انہیں ممنوع قرار نہیں دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ** کا معنی ہے جو ان کا ارادہ کرے اسے کانٹے، دوری اور دیوار کے ساتھ نہیں روکا جائے گا بلکہ جب بندہ اس کی خواہش کرے گا پھل اس کے قریب آ جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے لے لے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا** (الانسان) ایک قول یہ کیا گیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 454 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 161۔ ایضاً، حدیث نمبر 3214، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: نہ وہ کسی زمانہ میں ختم ہوں گے اور نہ قیمت کی وجہ سے ممنوع ہوں گے۔

وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ امام ترمذی نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''ان کی بلندی اتنی ہوگی جتنا زمین و آسمان کے درمیان دوری ہے یعنی پانچ سو سال'' (1)۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں پہچانتے مگر رشدین بن سعد کی سند سے۔ بعض علماء نے اس حدیث کی وضاحت میں کہا: فرش درجہ بدرجہ ہوں گے اور درجات میں یوں فاصلہ ہوگا جس طرح زمین و آسمان میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں فرش سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جنت میں ہیں ان کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔ معنی ہے وہ عورتیں، اپنے حسن اپنے کمال میں بلندشان والی ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ہم نے انہیں پیدا کیا اور حسین و جمیل بنایا۔ عرب عورتوں کو فرش، لباس اور ازار کا نام دیتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ (البقرہ: 186) پھر یہ قول کیا گیا وہ حورعین ہیں یعنی ہم نے انہیں ولادت کے عمل کے بغیر پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد انسانوں کی عورتیں ہیں، یعنی ہم نے انہیں نئے سرے سے پیدا کیا یہ انہیں لوٹانا ہے۔ یعنی ہم نے انہیں جوانی کی حالت اور جمال کے کمال کے ساتھ پیدا کیا۔ معنی ہے ہم نے بوڑھی اور بچی کو ایک ہی دفعہ پیدا کر دیا ان کے لیے ضمیر ذکر کی گئی اور ان کا ذکر پہلے نہ ہوا کیونکہ وہ اصحاب یمین میں داخل ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرش، النساء سے کنایہ ہے جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً کے ضمن میں روایت گزری ہے فرمایا: منهن البکر والثیب (2) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا کے بارے میں سوال کیا فرمایا: ''اے ام سلمہ! اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جنہیں دنیا میں اس حیثیت سے موت دی گئی تھی جب کہ وہ بوڑھی، ان کے بال سفید، آنکھیں کمزور چندھیائی ہوئی اور میل بہہ رہی ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑھاپے کے بعد ہم عمر، برابر ایک ہی وقت کی پیدائش پر بنا دیا'' (3)۔ نحاس نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا احمد بن عمر نے عمرو بن علی سے وہ ابو عاصم سے وہ موسیٰ بن عبیدہ سے وہ یزید رقاشی سے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کرتے ہیں کہ ''مراد وہ بوڑھیاں ہیں جن کی آنکھیں دنیا میں چندھیائی ہوئی اور آنکھوں سے میل بہہ رہی ہوتی تھی''۔ مسیب بن شریک نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مراد دنیا کی بوڑھی عورتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں نئے انداز میں پیدا کیا جب بھی ان کے خاوند ان کے پاس آئیں گے انہیں باکرہ پائیں گے'' (4)۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے سنا تو کہا: ''ہائے درد! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہاں کوئی درد نہیں ہوگا''۔

عُرُبًا یہ عروب کی جمع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: عرب سے مراد ہے وہ عورتیں جو اپنے

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء فی صفة ثیاب اهل الجنة، جلد 2، صفحہ 77۔ ایضاً، حدیث نمبر 3261، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 217

3۔ ایضاً، جز 27، صفحہ 218

4۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 162

خاوندوں سے عشق کرتی ہیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: عرب سے مراد ملقه (1) ہے عکرمہ نے کہا: غنجه (2) ہے ابن زید نے کہا: یہ اہل مدینہ کی لغت میں ہے اسی معنی میں لبید کا قول ہے:

وفی الخِبَاءِ عَرُوبٌ غیرُ فاحِشَةٍ

خیمہ میں ناز و ادا والی ہے فاحشہ نہیں۔ زید بن اسلم نے کہا: مراد اچھی گفتگو کرنے والی۔ عکرمہ اور قتادہ سے مروی ہے: عرب ان عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے خاوندوں سے محبت کرنے والیاں ہوں۔ یہ اعراب سے مشتق ہے۔ جب وہ وضاحت کرے۔ عرب ایسی عورت کو کہتے ہیں جو اپنے خاوند کے لیے ناز و ادا، نخرے اور حسن کلام کے ساتھ اپنی محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ عورت ہے جو اپنے خاوند سے محبت کی وجہ سے اس کی اطاعت کرے تا کہ لطف اندوز ہونے میں زیادہ لذت کا باعث ہو۔ جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عربا سے مراد ہے ان کی کلام عربی زبان میں ہوگی۔ حمزہ اور ابوبکر نے عاصم سے عربا قرأت نقل کی ہے باقی قراء نے اسے ضمہ دیا ہے۔ یہ دونوں قرأتیں جائز ہیں یہ فعول کی جمع ہے۔

**اَتْرَابًا** ۝ وہ ہم عمر ہوں گی ان کی عمر تینتیس سال ہوگی (3)۔ ہم عمر عورتوں میں اتراب اور ہم عمر مردوں میں اقران کا لفظ بولتے ہیں۔ عرب اس عورت میں دلچسپی کا اظہار کرتے جو بچپنے کی حد سے گزر چکی ہو اور بڑھاپے سے ابھی کم ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اترابا کا معنی ہے ہم مثل ہم شکل (4)؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا: وہ اخلاق میں ہم مثل ہوں گی ان کے درمیان کوئی بغض اور کوئی حسد نہ ہوگا (5)۔ **لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ** ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **حُوْرٌ عِیْنٌ** ۝ سابقین کے لیے ہے اور اتراب عربا اصحاب یمین کے لیے ہے۔

**ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ** ۝ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے فرمان **وَ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ** ۝ کی طرف راجع ہے یعنی ہم ثلة من الاولین وثلة من الآخرین اس کے متعلق گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ابو العالیہ، مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک نے کہا: **ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ** ۝ یعنی اس امت کے سابقین میں سے جماعت **وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ** ۝ اس امت کے آخرین میں سے جماعت ہوگی۔ اس آیت کی تفسیر پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ سب میری امت سے تعلق رکھتے ہیں'' (6)۔ واحدی نے کہا: اصحاب جنت نصف نصف ہوں گے نصف سابقہ امتوں میں سے اور نصف اس امت سے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں حضرت بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی ان میں سے اسی صفیں اس امت کی اور چالیس باقی امتوں کی ہوں گی'' (7)۔ ابو عیسیٰ امام ترمذی نے کہا: یہ

---

1۔ خوشامد کرنے والی۔	2۔ ناز و نخرے کرنے والی۔	3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 456

4۔ ایضاً	5۔ ایضاً	6۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 245

7۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء فی صف اهل الجنة، جلد 2، صفحہ 77۔ ایضاً، حدیث نمبر 2469، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب صفة امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 4278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدیث حسن ہے۔ ثُلَّةٌ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے معنی یہ بنے گا لاصحاب الیمین ثلتان، ثلة من هولاء وثلة من هولاء یعنی ایک جماعت ان سے اور ایک جماعت ان سے۔ پہلے سابقہ امتوں میں سے ہوں گے اور دوسرے اس امت کے ہوں گے۔ یہ دوسرے قول کی بنا پر ہے۔

وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾ وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۬ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّہَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡہَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡہِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡہِیۡمِ ﴿۵۵﴾ ہٰذَا نُزُلُہُمۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۵۶﴾

''اور بائیں ہاتھ والے، کیسی خستہ حالت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی۔ یہ (بدنصیب) جھلستی لو اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھویں کے سایہ میں ہوں گے نہ یہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ یہ آرام دہ۔ بے شک یہ لوگ پہلے بڑے خوشحال تھے اور اصرار کیا کرتے تھے بڑے بھاری گناہ پر اور کہا کرتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا کو بھی (یہ ناممکن ہے) آپ فرما دیجئے: بے شک اگلوں کو بھی اور پچھلوں کو بھی سب کو جمع کیا جائے گا ایک مقررہ وقت پر ایک جانے ہوئے دن میں پھر تمہیں اے گمراہ ہونے والو! اے جھٹلانے والو! حکما کھانا پڑے گا زقوم کے درخت سے پس تم بھرو گے اس سے (اپنے) پیٹوں کو پھر پینا پڑے گا اس پر کھولتا پانی اس طرح پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے۔ یہ ان کی ضیافت ہوگی قیامت کے دن''۔

وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ اہل نار کی منازل کا ذکر کیا اور انہیں اصحاب شمال کا نام دیا کیونکہ وہ اپنی کتابیں اپنے بائیں ہاتھ میں لیں گے۔ پھر بلاء اور عذاب میں ان کے ذکر کو بڑھ کر بیان کیا۔ فرمایا: فِیۡ سَمُوۡمٍ، سَمُوۡمٍ سے مراد گرم ہوا ہے جو بدن کے مساموں میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں اس سے مراد آگ کی گرمی اور اس کی لپک ہے۔ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ گرم پانی جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ جب آگ ان کے جگر اور ان کے جسم کو جلا دے گی تو وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف جلدی سے جائیں گے جس طرح ایک آدمی آگ سے بھاگ کر پانی کی طرف جاتا ہے تاکہ اس کے ساتھ آگ کو بجھائے تو وہ اسے سخت گرم پاتا ہے جو گرمائش اور جوش مارنے میں انتہا کو پہنچا ہوتا ہے۔ یہ بحث وَ سُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَہُمۡ ﴿۱۵﴾ (محمد) میں گزر چکی ہے۔

وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ﴿۴۳﴾ وہ بادسموم سے بچنے کے لیے سایہ کی طرف جائیں گے جس طرح دنیا والے کرتے ہیں تو وہ سیاہ دھویں کا سایہ ہوگا یعنی وہ جہنم کا دھواں ہوگا جو سخت سیاہ ہوگا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے؛ اسی طرح لغت میں یحموم ہے سخت سیاہ۔ یہ حم سے یفعول کا وزن ہے اس سے مراد سیاہ چربی ہے جو آگ سے جلی ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حمم سے ماخوذ ہے جس کا معنی کوئلہ ہے۔ ضحاک نے کہا: آگ سیاہ ہوگی اس کے مکین سیاہ ہوں گے اس میں جو کوئی ہوگا وہ سیاہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: آگ سیاہ ہوگی (1)۔ ابن زید نے کہا: یحموم جہنم میں ایک پہاڑ ہے جہنمی جس کے سایہ میں پناہ چاہیں گے۔

لَّا بَارِدٍ ٹھنڈا نہیں ہوگا بلکہ گرم ہوگا کیونکہ وہ جہنم کا دھواں ہوگا۔ وَّ لَا كَرِيْمٍ نہ آرام دہ ہوگا؛ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا منظر حسین نہیں ہوگا۔ جس میں خیر نہ ہو وہ کریم نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ سے مراد ہے وہ اس آگ کا سایہ ہوگا جس کے ساتھ انہیں عذاب دیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ (الزمر: 16)

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وہ اس عذاب کے مستحق اس لیے بنے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں حرام چیز سے لطف اندوز ہوتے رہے مترف یعنی خوشحال؛ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ سدی نے کہا: مترفین یعنی شرک کرنے والے وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وہ شرک پر قائم تھے (2)؛ یہ حضرت حسن بصری، ضحاک اور ابن زید کا نقطہ نظر ہے۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: مراد وہ بڑا گناہ ہے جس سے وہ توبہ نہیں کرتے تھے۔ شعبی نے کہا: اس سے مراد یمین غموس ہے یہ گناہ کبیرہ میں سے ہے (3) یہ جملہ بولا جاتا ہے: حنث فی یمینہ اس نے قسم کو پورا نہ کیا اس نے رجوع کرلیا۔ وہ قسم اٹھایا کرتے تھے کہ دوبارہ اٹھانے کا کوئی تصور نہیں اور وہ یہ قسم اٹھاتے تھے کہ بت اللہ تعالیٰ کا مدمقابل ہیں۔ یہی ان کا قسم توڑنا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے کہا: وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (النحل: 38) حدیث میں ہے: آپ غار حرا میں تحنث کیا کرتے تھے، یعنی آپ ایسا عمل کیا کرتے تھے جس کے ساتھ آپ سے حنث ساقط ہو جائے۔ اس سے مراد گناہ ہے۔

وَ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا یہ ان کی جانب سے بعث کے امر کو حقیقت سے بعید خیال کرنا اور اس کو جھٹلانا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قل اے محمد! انہیں کہو اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ۙ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ اولین سے مراد تمہارے آباء، آخرین سے مراد تمہاری ذاتیں ہیں۔ مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ مراد یوم قیامت ہے۔ کلام کا معنی قسم ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لَمَجْمُوْعُوْنَ میں لام کا دخول قسم کے معنی پر دال ہے یعنی تم ضرور جمع ہوگے یہ حقیقی قسم ہے جو تمہاری باطل قسم کے خلاف ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہو الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ بعث کو جھٹلانے والے ہو۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 456　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 457　3۔ ایضاً

زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ زَقُّوْمٍ سے مراد ایسا درخت ہے جس کا منظر بڑا کریہہ ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ بھی بڑا ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جس کا ذکر سورہ صافات میں گزرا ہے۔

فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ ھا ضمیر سے مراد شجرہ ہے کیونکہ شجر سے مقصود شجرہ ہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ پہلا من زائدہ ہو یہ بھی جائز ہے کہ مفعول محذوف ہو گویا فرمایا: لا کلون من شجر من زقوم طعاما من زقوم شجر کی صفت ہے جب تو نے جار کو زائد مقدر کیا تو صفت کو معنی کے اعتبار سے نصب دے گا یا لفظ کے اعتبار سے جر دے گا۔ اگر تو مفعول کو محذوف مقدر کرے تو صفت محل جر میں ہوگی۔

فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ، ہ ضمیر سے مرد زقوم، اکل یا شجر ہے کیونکہ یہ مذکر و مونث استعمال ہوتے ہیں مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ اس سے مراد ابلا ہوا پانی ہے جس کا جوش سخت ہو۔ یہ جہنمیوں کی پیپ ہے یعنی بھوک کے ساتھ جو وہ زقوم کھائیں گے وہ پیاس کا باعث ہوگی۔ وہ پانی پئیں گے وہ گمان یہ کریں گے کہ یہ ان کی پیاس کو زائل کر دے گی تو وہ اسے جوش مارتا ہوا پانی پائیں گے۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ یہ نافع، عاصم اور حمزہ کی قرأت ہے باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں عمدہ لغتیں ہیں عرب کہتے ہیں: شَرِبت شُربا وشَربا وشِربا وشُربا یعنی شین اور راء پر ضمہ ہے۔ ابو زید نے کہا: میں نے عربوں کو شین کے ضمہ، فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا ہے فتحہ یہی صحیح مصدر ہے کیونکہ ثلاثی سے ہر مصدر فعل کے وزن پر ہوتا ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ تو اسے ایک دفعہ کے عمل کی طرف پھیر دیتا ہے تو کہتا ہے: فَعلة جس طرح شَربة اور ضمہ کے ساتھ یہ اس سے اسم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مفتوح اور مضموم دونوں مصدر ہیں شَرب جس طرح اکل، شُرب جیسے ذُکر اور شِرب جو کسرہ کے ساتھ ہو اس سے مراد مشروب ہے جس طرح طِحن مطحون کے معنی میں ہے هيم سے مراد پیاسے اونٹ ہیں جو بیماری کی وجہ سے سیراب نہیں ہوتے؛ حضرت ابن عباس، عکرمہ، قتادہ، سدی اور دوسرے علماء نے یہی کہا: عکرمہ نے یہ بھی کہا ہے: اس سے مراد مریض اونٹ ہیں۔ ضحاک نے کہا: ھیم سے مراد ایسے اونٹ ہیں جنہیں کوئی بیماری لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے انہیں شدید پیاس لاحق ہوتی ہے اس کا واحد أهيم ہے اس کی مونث هيماء ہے اس بیماری کو هيام کہتے ہیں۔ قیس بن ملوح نے کہا:

يقال به داء الهُيَام أصابه وقد علِمت نفسی مكانَ شِفائِها(1)

یہ کہا جاتا ہے: اسے ہیام کی بیماری ہے جب کہ میرا نفس اس کی شفاء کے مکان سے آگاہ ہے۔

قوم هيم پیاسے لوگ۔ هاموا هياما وہ پیاسے ہو گئے عربوں میں سے کچھ اونٹوں کے بارے میں کہتے ہیں: هائم، هائمة اس کی جمع هيم ہے۔

ضحاک، اخفش، ابن عیینہ اور ابن کیسان نے کہا: ھیم سے مراد نرم ہموار زمین ہے جس میں ریت ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ ریت کی طرح پیتے ہیں وہ پانی سے سیراب نہیں ہوتے۔ یہ کہا جاتا ہے جو سیراب نہ ہو وہ اونٹ ہو یا ریت ہو اسے ھیم اور ھیماء کہتے ہیں: صحاح میں ہے: ھیام سے مراد شدید پیاس ہے ھیام سے مراد ایسا عشق جو جنون کی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 457

طرح ہو۔ ھیام ایسی بیماری ہے جو اونٹ کو لگتی ہے تو وہ زمین میں سرگرداں رہتا ہے چرنا نہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: ناقۃ ھیماء۔ ھیماء سے مراد ایسا جنگل ہے جس میں پانی نہ ہو۔ ھیام سے مراد ایسی ریت ہے جو ہاتھ سے بہنے سے نہیں رکتی اس کی جمع ھیم ہے جس طرح قذال اور قذل ہے۔ ھیام سے مراد پیاسے اونٹ ہیں اس کا واحد ھیمان ہے ناقۃ ھیماء جس طرح عطشان کی جمع عطاش آتی ہے۔

ھٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾ یہ وہ رزق ہے جو ان کے لیے تیار کیا جاتا ہے جس طرح وہ کھانا جو مہمانوں کے لیے بطور تکریم تیار کیا جاتا ہے اس میں استہزاء ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فبشرھم بعذاب الیم۔

ابوسعد ضبی کا قول ہے: جعلنا القنا والمرھفاتِ لہ نُزُلًا ہم نے نیزے اور باریک تلواروں کو اس کے لیے ضیافت کے طور پر تیار کیا۔

یونس بن حبیب اور عباس نے ابوعمرو سے یہ قرأت نقل کی ہے ھٰذَا نُزْلُهُمْ یعنی زاء ساکن ہے سورۂ آل عمران کے آخر میں گفتگو اس کے بارے میں گزر چکی ہے يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾ سے مراد یوم جزا یعنی جہنم ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿٥٧﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿٥٨﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٥٩﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٦٠﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾

"(آج غور کرو) ہم نے ہی تم کو پیدا کیا ہے پس تم قیامت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے بھلا دیکھو تو جو منی تم ٹپکاتے ہو (اور سچ بتاؤ) کیا تم اس کو (انسان بنا کر) پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم ہی نے مقرر کیا ہے تمہارے درمیان موت اور ہم (اس سے) عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور لوگ پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اور تمہیں اچھی طرح علم ہے اپنی پہلی پیدائش کا پس تم (اس میں) کیوں غور وخوض نہیں کرتے"۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿٥٧﴾ تم دوبارہ اٹھائے جانے کی تصدیق کیوں نہیں کرتے (1)؟ کیونکہ دوبارہ اٹھانا پہلی دفعہ پیدا کرنے کی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ہم نے تمہارے رزق کو پیدا کیا تو تم کیوں اس کی تصدیق نہیں کرتے کہ یہ تمہارا کھانا ہے اگر تم ایمان نہیں بھی لاتے؟

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿٥٨﴾ مراد ہے منی میں سے جو تم عورتوں کی رحموں میں ٹپکاتے ہو۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ کیا تم اس سے انسان کی تصویر کشی کرتے ہو۔ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٥٩﴾ یا ہم مقدر کرنے والے اور تصویر کشی کرنے والے ہیں یہ ان کے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 458

خلاف استدلال اور پہلی آیت کا بیان ہے یعنی جب تم نے اقرار کرلیا ہے کہ ہم اس کو پیدا کرنے والے ہیں کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں تو تم دوبارہ اٹھائے جانے کا اعتراف کرلو۔ ابوسمال، محمد بن سمیقع اور اشہب عقیلی نے پڑھا ہے تَمنون یعنی تاء پر فتحہ ہے امنی اور منی دونوں لغتیں ہیں، جس طرح أمذی، مذی، یُمنی، یَمنی، یُمذی، یَمذی؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ میرے نزدیک دونوں کے معنی مختلف ہوں تو امنی کا معنی ہو جب جماع سے انزال ہو اور منی سے مراد ہے جب احتلام سے انزال ہو۔ منی کو منی کہنے کی دو وجہیں ہیں۔ (۱) ایک تو اس کے امناء کی وجہ سے ہے کہ اس کو بہایا جاتا ہے (۲) اس کا اندازہ لگانے کی وجہ سے۔ اس سے لفظ منا ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اس کی مقدار ہوتی ہے اسی طرح منی ہے مخلوق کی تصویر کشی کے لیے صحیح تعداد ہے۔

نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ یہ بھی استدلال ہے یعنی وہ ذات جو موت دینے پر قادر ہے وہ پیدا کرنے پر قادر ہے جب وہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے۔ مجاہد، حمید، ابن محیصن اور ابن کثیر نے قدرنا دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضحاک نے کہا: معنی ہے ہم نے اہل آسمان اور اہل زمین کے درمیان برابری کر دی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے فیصلہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے ہم نے لکھ دیا۔ معنی قریب قریب ہے۔ اس ذات کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہے گا۔

وَ مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ اگر ہم ارادہ کریں کہ تمہاری جگہ اور پیدا کریں تو کوئی ہم پر غالب نہیں آسکتا۔ گویا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ کا معنی ہے ہم مغلوب نہیں۔ طبری نے کہا: معنی ہے ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے تاکہ ہم تمہاری موت کے بعد تمہاری جنس میں سے دوسروں کو لے آئیں اور تمہاری آجال میں ہم مغلوب نہیں نہ کوئی متاخر آگے ہوسکتا ہے اور نہ متقدم پیچھے ہوسکتا ہے (2)۔

وَ نُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ یعنی جن صورتوں اور ہیئتوں کو تم نہیں جانتے ہم تمہیں ان میں پیدا کر دیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ہم تم کو بندر اور خنزیر بنا دیں جس طرح ہم نے تم سے قبل قوموں کے ساتھ کیا ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ہم تمہیں دوبارہ اٹھاتے وقت ایسی صورت میں پیدا کریں جو ان صورتوں سے مختلف ہوں جو تمہاری دنیا میں تھیں مومن اپنے چہرے کی سفیدی کی وجہ سے خوبصورت ہوگا اور کافر اپنے چہرے کی سیاہی کی وجہ سے بدصورت ہوگا۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے یعنی سیاہ پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گے جو برہوت وادی میں ہوتے ہیں برہوت یمن میں ایک وادی ہے گویا وہ آنکھیں ہیں۔ مجاہد نے کہا: فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کا معنی ہے ہم نے جس صورت میں چاہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ہم تمہیں ایسے عالم میں پیدا کریں گے جسے تم نہیں جانتے ہو گے اور ایسے مکان میں پیدا کریں گے جس کو تم نہیں جانتے۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی کیونکہ تم کو نطفہ سے پھر علقہ سے پھر مضغہ سے پیدا کیا جب کہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: مراد حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 459 2۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 230 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 248

فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ تم سوچ و بچار کیوں نہیں کرتے؟ حدیث میں ہے ''دوبارہ پیدا کرنے کے جھٹلانے والے پر بڑا تعجب ہے جب کہ وہ پہلی پیدائش کو دیکھتا ہے اس پر بھی تعجب ہے اور جو دوبارہ پیدا کرنے کا اقرار تو کرتا ہے مگر دار قرار کے لیے تگ و دو نہیں کرتا''۔ عام قرأت النشأۃ ہے۔ مجاہد، حضرت حسن بصری، ابن کثیر اور ابو عمرو نے النشاءۃ الف ممدودہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾

''کیا تم نے غور سے دیکھا ہے جو تم بوتے ہو۔ (سچ سچ بتاؤ) کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہی اس کو اگانے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا بنا دیں پھر تم کف افسوس ملتے رہ جاؤ۔ (ہائے!) ہم تو قرضوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے بلکہ ہم تو ہیں ہی بڑے بدنصیب''۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ یہ دوسری دلیل ہے مجھے اس چیز کے بارے میں بتاؤ: جو تم اپنی زمین میں کاشت کرتے ہو تم اس میں بیج ڈالتے ہو تم اسے کاشت کرتے ہو اور اس سے کھیتی حاصل کرتے ہو تو اس میں بالی اور دانہ بن جاتا ہے یا ہم یہ سب کچھ کرنے والے ہیں تمہارا کام بیج ڈالنا اور زمین پھاڑنا ہے جب تم اس کا اقرار کرتے ہو کہ دانے سے بالی کا نکالنا تمہارے بس میں نہیں تو تم زمین سے مردوں کو نکالنے اور انہیں دوبارہ اٹھانے سے انکار کرتے ہو۔ حرث کی نسبت ان کی طرف کی اور زرع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی کیونکہ حرث ان کا فعل ہے اور ان کے اختیار پر جاری ہوتا ہے اور زرع اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ اپنے اختیار سے اگاتا ہے ان کے اختیار سے نہیں اگاتا؛ اس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ''تم میں سے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے زرعت بلکہ وہ کہے: حرثت کیونکہ زارع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنتے: ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ (واقعہ) جو آدمی بھی زمین میں بیج ڈالتا ہے اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنے کے بعد یہ پڑھے اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ پھر وہ کہے: بل اللہ الزارع والمنبت والمبلغ اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رحمتیں نازل فرما ہمیں اس کا پھل عطا فرما، اس کے ضرر سے ہمیں دور رکھ ہمیں اپنی نعمتوں پر شکر بجا لانے والا بنا دے، اپنی نوازشات کا ذکر کرنے والا بنا دے اور اس میں ہمارے لیے برکت رکھ دے یا رب العالمین!۔

یہ کہا جاتا ہے: یہ قول اس کھیتی کے لیے تمام آفات سے امان ہوگا، وہ کیڑا ہو، ٹڈی دل ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ ہم نے ثقہ لوگوں سے اسے سنا ہے اس کا تجربہ کیا گیا ہے تو اسی طرح پایا گیا۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ یعنی تم اسے کھیتی بناتے ہو۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے: فلان زارع جس طرح کہا جاتا ہے حراث یعنی وہ ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کھیتی ہو جو کاشتکاروں کو خوش کرے۔ بعض اوقات بطور مجاز زرع کا لفظ زمین میں بیج ڈالنے اور ہل چلانے پر بھی بولا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ نہی راہنمائی کے لیے ہے یہ نہی روکنے اور واجب کرنے کے لیے نہیں اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

ارشاد ہے: لا یقولون أحد کم عبدی و أمتی ولیقل غلامی و جاریتی و فتای و فتاتی تم میں سے کوئی آدمی یہ نہ کہے عبدی وامتی بلکہ وہ کہے غلامی، جاریتی، فتای، فتاتی۔ سورۂ یوسف میں اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ بعض علماء نے اس میں مبالغہ سے کام لیا اور کہا: وہ یہ نہ کہے حرثت فاصبت بلکہ کہے أعاننی الله فحرثت و أعطانی بفضله ما أصبت اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی تو میں نے کھیتی باڑی کی اس نے مجھے اپنے فضل سے نوازا تو میں نے اسے پالیا۔

ماوردی نے کہا: یہ آیت دو امور کو متضمن ہے (۱) ان پر احسان جتلایا کہ اس نے ان کی کھیتی کو اگایا یہاں تک کہ اس کے ذریعے وہ زندہ رہے تا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعام کیا ہے اس پر وہ اس کا شکر بجالائیں (۲) ایسی دلیل جو عبرت حاصل کرنے کو لازم کرتی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی کھیتی کو اگایا جب کہ بیج ناپید ہو چکا تھا اور انتہائی بری حالت میں منتقل ہو چکا تھا کہ وہ مٹی میں مل چکا تھا یہاں تک کہ وہ سر سبز و شاداب کھیتی بن گیا پھر اسے اس سے کئی گناہ قوی بنا دیا جس پر وہ پہلے تھا تو جو انسان فوت ہو چکا ہے اس کو دوبارہ زندہ کرنا اس کے لیے بہت ہی آسان ہے اور وہ اس پر زیادہ قادر ہے یہ دلیل فطرت سلیمہ کے لیے کافی وشافی ہے پھر فرمایا: لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا اگر ہم چاہتے تو اس کھیتی کو ریزہ ریزہ بنا دیتے (1)۔ حطام ایسی ریزہ ریزہ چیز کو کہتے ہیں جس سے کھانے اور غذا کے طور پر کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ دو امور پر متنبہ کیا۔ (۱) اللہ تعالیٰ نے ان کی کھیتی میں جو نعمتیں عطا کیں کہ اسے ریزہ ریزہ نہیں کیا تا کہ وہ اس کا شکر بجالائیں (۲) اس کے ذریعے وہ اپنی ذات کے بارے میں عبرت حاصل کریں جس طرح جب وہ چاہتا ہے کھیتی کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے جس طرح جب وہ چاہے گا انہیں ہلاک کر دے گا تا کہ اس سے نصیحت حاصل کریں اور ایسا کرنے سے رک جائیں۔

فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ۝ اس کے ضائع ہو جانے پر تم تعجب کا اظہار کرتے ہو اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے اس پر شرمندہ ہوتے ہو (2)؛ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ اور دوسرے علماء کا نقطۂ نظر ہے۔ صحاح میں ہے: تفکہ کا معنی ہے اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: وہ شرمندہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ۝ یعنی تم شرمندہ ہوتے ہو۔ تفکهت بالشئ یعنی میں اس سے لطف اندوز ہوا۔ یمان نے کہا: تم اپنے خرچوں پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہو اس کی دلیل فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا (کہف: 42)

عکرمہ نے کہا: وہ معصیت جو تم سے ہو چکی اور تمہاری سزا کا موجب ہوئی یہاں تک کہ تمہاری کھیتیوں میں جا پہنچی اس پر تم ملامت کا اظہار کرتے ہو اور شرمندہ ہوتے ہو (3)۔ ابن کیسان نے کہا: تم غمگین ہوتے ہو (4)۔ معنی قریب ہے اس میں دو لغتیں ہیں تفکھون، تفکنون۔ فراء نے کہا: نون عکل کی لغت ہے۔ صحاح میں ہے: تفکن سے مراد جو چیز فوت ہوئی اس پر شرمندگی کا اظہار کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تفکہ کا معنی ہے بے مقصد گفتگو کرنا؛ اسی معنی میں فکاھة کا لفظ ہے جو مزاح کے لیے بولا جاتا ہے جہاں تک فکاھة کا تعلق ہے تو یہ فکه الرجل فهو فکه کا مصدر ہے۔ جب وہ اچھی طبیعت کا اور مزاح کرنے والا ہو۔ عام قرأت فظلتم ہے (5)۔ عبداللہ نے اسے فِظلتم پڑھا ہے۔ ہارون نے حسین سے وہ ابو بکر سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 460 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 249

روایت نقل کرتے ہیں جس نے اسے فتحہ دیا وہ اصل پر ہے اصل میں ظللتم تھا پہلا لام تخفیف کے طور پر حذف کر دیا گیا جس نے ظاء کو کسرہ دیا ہے اس نے پہلے لام کے کسرہ کو ظاء کی طرف منتقل کیا پھر پہلے لام کو حذف کر دیا۔

اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ ابوبکر اور مفضل نے اَئنا دو ہمزہ کے ساتھ استفہام کی صورت میں پڑھا ہے عاصم نے اسے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ خبر کی صورت میں پڑھا ہے یعنی وہ کہتے ہیں: ہم عذاب میں ہیں (1)۔

حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: غرام سے مراد عذاب ہے؛ اس معنی میں ابن محلم کا قول ہے:

وثقت بأن الحفظ منی سجیۃٌ وأن فؤادی مُتبَلٌ بك مغرمُ(2)

مجھے اعتماد ہے کہ میری طرف سے یاد رکھنا خصلت ہے اور میرا دل تیری وجہ سے پریشان اور عذاب میں ہے۔

مجاہد اور عکرمہ نے کہا: ہمیں شوق اور جوش دلایا گیا تھا؛ اس معنی میں نمر بن تولب کا قول ہے:

کان رَھِینابھا مُغْرَمَا

وہ اس کے بدلہ میں رہن رکھا گیا ہے اور اسے جوش دلایا گیا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اغرم فلان بفلانۃ فلاں فلاں سے بہت محبت کرتا ہے؛ اسی سے غرام ہے یہ ایسی شر ہے جو لازم ہے۔ مجاہد نے یہ بھی کہا ہے: وہ شر کو پانے والے ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وہ ہلاک ہونے والے ہیں۔ نحاس نے کہا: اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ یہ لفظ غرام سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہلاکت ہے جس طرح شاعر نے کہا۔

یوم النسار ویوم الجفا ر کانا عذابا، کانا غراما(3)

یوم نسار (چشمہ کا نام) اور یوم جفار (جگہ کا نام) دونوں عذاب اور ہلاکت تھے۔

ضحاک اور ابن کیسان نے کہا: یہ غرم سے مشتق ہے مغرم اسے کہتے ہیں جس کا مال بغیر عوض کے چلا جائے یعنی ہمارا وہ دانہ بھی ضائع ہو گیا جو ہم نے بویا تھا۔ مرہ ہمدانی نے کہا: ہمارا محاسبہ کیا جائے گا۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ یعنی ہم نے جس شادابی کا مطالبہ کیا تھا اس سے ہمیں محروم کر دیا گیا۔ محروم اسے کہتے ہیں جس کو رزق سے روک دیا گیا ہو محروم، مرزوق کی ضد ہے۔ قتادہ کے قول میں یہی محارف ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی زمین کے پاس سے گزرے پوچھا: ''کس چیز نے تمہیں کھیت کو کاشت کرنے سے روکا''۔ انہوں نے عرض کی: زمین کے بنجر ہونے نے۔ فرمایا: ''ایسا نہ کہا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے انا الزارع میں کھیتوں کو اگانے والا ہوں، میں چاہوں تو میں پانی کے ساتھ کھیتی کو اگاؤں، چاہوں تو ہوا کے ساتھ اگاؤں اور چاہوں تو بیج کے ساتھ اگاؤں''۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی: اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ (الواقعہ)

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اور اس سے قبل کی حدیث میں وہ دلیل موجود ہے جو اس کے قول کی صحت کو ثابت کرتی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 461 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہے جس نے زارع کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں داخل کیا ہے۔ اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے ہم نے اس کی وضاحت الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں کر دی ہے۔

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾

''کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے پانی جو تم پیتے ہو (سچ سچ بتاؤ) کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اتارنے والے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو کھاری بنا دیتے پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے۔ کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے آگ کو جو تم سلگاتے ہو (سچ سچ بتاؤ) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے ہی بنایا ہے اس کو نصیحت اور فائدہ مند مسافروں کے لیے تو (اے حبیب!) تسبیح کیجئے اپنے رب عظیم کے نام کی''۔

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ تاکہ اس کے ساتھ تم اپنے آپ کو زندہ رکھو اور اس کے ساتھ اپنی پیاس کو سکون بہم پہنچاؤ کیونکہ مشروب کھانے کے تابع ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے آیت میں کھانے کا ذکر پہلے ہوتا ہے کیا تو دیکھتا نہیں کہ تو مہمان کو کھانا کھلانے کے بعد اسے پلاتا ہے۔

ایک عرب کو مشروب پلایا گیا تو اس نے کہا: أنا لا اشرب إلا علی ثمیلة میں نہیں پیتا مگر ہلکے پیٹ والا ہو کر۔

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ، مزن سے مراد بادل ہے اس کا واحد مزنہ ہے؛ شاعر نے کہا:

فنحنُ کماءِ الْمُزنِ مانی نِصابِنَا كَهامٌ ولا فینا یُعَدُّ بَخِیلُ(1)

ہم بادل کے پانی کی طرح ہیں نہ ہماری اصل میں کوئی مال سے خالی ہے اور نہ ہی ہم میں کوئی بخیل شمار ہوتا ہے۔

یہ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہما کا قول ہے کہ مزن سے مراد بادل ہے۔ حضرت ابن عباس اور ثوری سے یہ مروی ہے کہ مزن سے مراد آسمان اور بادل ہے۔ صحاح میں ہے ابو زید نے کہا: مزنہ سے مراد سفید بادل ہے اس کی جمع مزن ہے مزنہ سے مراد بارش ہے شاعر نے کہا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ أَنْزَلَ مُزْنَةً

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بارش کو نازل کیا۔

اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ جب تم نے پہچان لیا کہ میں نے اسے نازل کیا ہے تو تم میرے لیے عبادت کو خاص کر کے شکر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 249

کیوں نہیں بجالاتے اورتم دوبارہ پیدا کرنے کی میری قدرت کا کیوں انکار کرتے ہو؟

لَوْنَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا یعنی ایسا نمکین جو حد درجہ نمکین ہو؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سخت کڑوا تم پینے، کاشت وغیرہ میں اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کرتے۔ فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ۝ تو کیا تم اس کا شکر بجا نہیں لاؤ گے جس نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ۝ مجھے اس آگ کے بارے میں تو بتاؤ جسے تم تر درخت سے رگڑنے کے ساتھ نکالتے ہو۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ جس درخت سے آگ جلائی جاتی ہے وہ مرخ اور عفار ہے؛ اسی معنی میں ان کا قول ہے: ہر درخت میں آگ ہے مرخ اور عفار میں زیادہ ہے گویا ان دونوں نے اس سے وہ حصہ لیا جو انہیں کافی ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: کیونکہ یہ دونوں آگ کو جلدی پھیلاتے ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: أوریتُ النار جب تو اسے جلائے۔ وَرِی الزَّنْدُ یَرِی جب اس سے آگ نکلے اس میں ایک اور لغت بھی ہے وَرِی الزَّنْدُ یَرِی یعنی ماضی اور مضارع کے عین کلمہ میں کسرہ ہے۔ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ۝ یا ہم پیدا کرنے والے ہیں یعنی جب تم میری قدرت کو پہچان چکے تو میرا شکر بجالاؤ اور دوبارہ اٹھانے پر میری قدرت کا انکار نہ کرو۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً یعنی دنیا کی آگ بڑی آگ کے لیے نصیحت ہے(1)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ لوگوں کے لیے تاریکی سے بصیرت ہے۔ نبی کریم ﷺ سے یہ صحیح روایت مروی ہے ''تمہاری یہ آگ جسے انسان روشن کرتے ہیں یہ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے''۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ تو کافی ہے فرمایا: ''جہنم کی آگ انہتر گنا زائد ہے ان میں سے ہر جز دنیا کی آگ کی گرمی کی مثل ہے''۔

وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ۝ ضحاک نے کہا: یہ مسافروں کے لیے نفع کا باعث ہے(2)۔ اسے یہ نام اس لیے دیا کیونکہ وہ چٹیل میدان میں اترتے جسے قوی کہتے۔ فراء نے کہا: مسافروں کو مقوین کہا جاتا جب وہ چٹیل جگہ پر ڈیرہ ڈالتے جہاں کوئی چیز نہ ہوتی؛ اسی طرح قوی اور قواء ہے منزل قواء ایسی جگہ کو کہا جاتا جہاں کوئی انس کرنے والا نہ ہوتا۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: اقوت الدار، قویت الدار جب وہ اپنے مکینوں سے خالی ہو جائے۔

عنترہ نے کہا:

حُیِّیتَ مِنْ طَلَلٍ تَقَادَمَ عَهْدُهُ أَقوىٰ وَأَقْفَرَ بَعد أُمِّ الْهَیْثَمِ(3)

تجھے طلل کی جانب سے سلام پہنچے جس کا زمانہ پہلے گزر چکا ہے جو ام ہیثم کے بعد بے آباد ہو چکا ہے۔

یہ جملہ کہا جاتا ہے: أَقْوىٰ أصحابه وقَوِی أصحابه۔

أقوىٰ إذا سافر یعنی وہ قواء اور قی میں فروکش ہوا۔ مجاہد نے کہا: لِّلْمُقْوِیْنَ کا معنی ہے تمام لوگ سالن پکانے، روٹی پکانے، گرمائش حاصل کرنے اور روشنی حاصل کرنے میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے ساتھ جہنم کی آگ کو یاد دلایا جاتا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 461 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 250

ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بھوکوں کے لیے ان کے کھانے کے بنانے میں فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنا دیا ہے(1) یہ جملہ کہا جاتا ہے: اقویت منذ کذا و کذا یعنی میں نے اتنے عرصہ سے کوئی چیز نہیں کھائی بات فلان القواء و بات القفر جب اس نے کوئی چیز کھائے بغیر بھوکے رات گزاری۔

شاعر نے کہا:

وِاِنّی لَاَختارُ القَویٰ طاوِیَ الحَشٰی

میں بھوکا رہنے کو پسند کرتا ہوں۔

ربیع اور سدی نے کہا: المقوین سے مراد ایسے فروکش ہونے والے ہیں جن کے پاس آگ نہیں ہوتی جس کو وہ جلائیں اور اس کے ساتھ کھانا پکائیں؛ اسے عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ قطرب نے کہا: مقوی اضداد میں سے ہے یہ فقیر اور غنی کے معنی میں ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اقوی الرجل جب اس کے پاس زاد راہ نہ ہو اقوی جب اس کے پاس بہت زیادہ چوپائے ہوں اور مال بہت زیادہ ہو۔

مہدوی نے کہا: یہ آیت تمام لوگوں کے لیے مناسب ہے کیونکہ آگ ایسی چیز ہے جس کے مسافر، مقیم، غنی اور فقیر ضرورت مند ہوتے ہیں؛ ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ اکثر مفسرین پہلے قول کی طرف گئے ہیں۔ قشیری نے کہا: اس سے انتفاع کے اعتبار سے مسافر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ مسافر مقیم کی بنسبت اس سے زیادہ نفع حاصل کرتا ہے کیونکہ جنگل و صحرا میں رہنے والوں کو رات کے وقت آگ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تاکہ درندے اس سے دور رہیں اس کے علاوہ بھی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔

**فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ** ﴿٧٤﴾ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف جو شریکوں کی اور دوبارہ اٹھانے سے عجز کی نسبت کی ہے اس سے اس کی پاکی بیان کر۔

**فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾**

''پس میں قسم کھاتا ہوں ان جگہوں کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے بے شک یہ قرآن ہے بڑی عزت والا ایک کتاب میں جو محفوظ ہے اس کو نہیں چھوتے مگر وہی جو پاک ہیں۔ یہ اتارا گیا ہے رب العالمین کی طرف سے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَلَآ اُقْسِمُ اکثر مفسرین کے نزدیک لا زائدہ ہے(2) معنی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں اس کی دلیل وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ ہے فراء نے کہا: یہ نفی ہے۔ معنی ہے معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا۔ اقسم میں قسم اٹھاتا ہوں۔ بعض اوقات ایک آدمی کہتا ہے: لا واللہ، کان کذا اس سے وہ قسم کی نفی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ پہلی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 461
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 462

کلام کی نفی کا ارادہ کرتا ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تو نے ذکر کیا بلکہ معاملہ اس طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لا، اِلّا کے معنی میں ہے جو تنبیہ کے لیے ہے۔

اس کے ساتھ قرآن کی فضیلت پر متنبہ کیا تا کہ وہ اس میں غور و فکر کریں یہ شعر نہیں، جادو نہیں اور کہانت بھی نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا ہے۔ حضرت حسن بصری، حمید اور عیسیٰ بن عمر نے فلا قسم لام کے بعد الف کے بغیر پڑھا یہ تحقیق کے معنی پر دال ہے۔ یہ فعل حال ہے اس کا مبتدا محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فلانا أقسم بذلك اگر اس سے مستقبل کا زمانہ مرادلیا جاتا تو نون لازم ہوتی۔ جب فعل سے استقبال مراد لیا جائے تو بعض اوقات نون کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہ شاذ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** **بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝** قتادہ اور دوسرے علماء کے نزدیک **مواقع النجوم** سے مراد ان کے گرنے اور غروب ہونے کی جگہیں ہیں۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا: مراد ان کی منازل ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: قیامت کے روز ان کا بے نور ہونا اور بکھر کر گر جانا ہے (1)۔ ضحاک نے کہا: مراد وہ ستارے ہیں جن کے بارے میں دور جاہلیت میں لوگ کہا کرتے تھے جب ان پر بارش ہوتی (2): ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی۔ ماوردی نے کہا: **فَلَآ اُقْسِمُ** یہ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوتا ہے نفی کا معنی دیتا ہے (3)۔ قشیری نے کہا: یہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ جس چیز کا ارادہ کرے اس کی قسم اٹھاوے جب کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات قدیمہ کے سوا کسی چیز کی قسم اٹھادیں۔

میں کہتا ہوں: اس امر پر حضرت حسن بصری کی قرأت فلا قسم دلالت کرتی ہے (4) اور اسی طرح وہ قسمیں بھی دلالت کرتی ہیں کہ مخلوقات میں سے جن چیزوں کی قرآن حکیم میں مختلف مواقع پر قسم اٹھائی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: **مواقع النجوم** سے مراد قرآن حکیم کا آیت در آیت نازل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بالا آسمان سے لوح محفوظ سے سفرہ کاتبین پر نازل کیا سفرہ نے جبریل امین پر بیس راتوں میں نازل کیا اور جبرئیل امین بیس (5) سالوں تک تھوڑا تھوڑا کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ حضرت جبرئیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی مناسبت سے اسے نازل کرتے تھے: اسے ماوردی نے حضرت ابن عباس اور سدی سے روایت کیا ہے (6)۔

ابو بکر انباری نے کہا اسماعیل بن ابی اسحاق، قاضی حجاج بن منہال سے وہ ہمام سے وہ کلبی سے وہ ابو صالح سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ قرآن حکیم آسمان دنیا میں پر ایک ہی دفعہ نازل ہوا۔ پھر زمین کی طرف تھوڑا تھوڑا نازل ہوا اس کے بعد اسے پانچ پانچ اور کم و بیش کی صورت میں الگ الگ نازل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان **فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝** کا یہی مفہوم ہے۔ فراء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ **مواقع النجوم** سے مراد محکم القرآن ہے (7)۔ حمزہ اور کسائی نے بموقع کا لفظ پڑھا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 463 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 463 5۔ وحی کا عرصہ بائیس سال سے کچھ اوپر ہے۔

6۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 463 7۔ ایضاً

ہے؛ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود، نخعی، اعمش، ابن محیصن اور رویس نے یعقوب سے یہ روایت نقل کی ہے۔ باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ جس نے اسے مفرد پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسم جنس ہے جس میں واحد کو جمع کے قائم مقام رکھا جاتا ہے جس نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا ہے تو اس کی انواع کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھاء ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے کہ قرآن عظیم قسم ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا قول ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے جس کی قسم اٹھائی ہے وہ عظیم ہے (2)۔ وہ قرآن کریم ہے۔ مقسم علیہ کا ذکر کیا یعنی نجوم کے مواقع کی قسم اٹھائی کہ بے شک یہ قرآن، قرآن کریم ہے (3)، یہ سحر اور کہانت نہیں، اس میں کوئی افتراء نہیں بلکہ یہ قرآن کریم اور محمود ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے نبی کے لیے معجزہ بنایا ہے۔ یہ مومنوں کے لیے بڑا معزز ہے کیونکہ یہ ان کے رب کا کلام ہے، ان کے سینوں کے لیے شفاء ہے۔ آسمان والوں کے لیے بڑا معزز ہے کیونکہ یہ ان کے رب کا کلام ہے، ان کے سینوں کے لیے شفا ہے آسمان والوں کے لیے بڑا معزز ہے کیونکہ یہ ان کے رب کا نازل کردہ اور وحی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کریم سے مراد ہے وہ غیر مخلوق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کریم اس لیے ہے کیونکہ اس میں اخلاق اور امور کے عظیم معانی کا ذکر ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے حافظ کی عزت کی جاتی ہے اور اس کے قاری کی تعظیم بجالائی جاتی ہے (5)۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ یہ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ مَّكْنُوْنٍ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے (6)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ باطل سے محفوظ ہے (7)۔ یہاں کتاب سے مراد آسمان میں کتاب ہے (8)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ جابر بن زید اور حضرت ابن عباس نے کہا: مراد لوح محفوظ ہے (9)۔ عکرمہ نے کہا: مراد تورات و انجیل ہے (10) ان دونوں میں قرآن کا ذکر ہے اور اس کا بھی ذکر ہے جس پر قرآن نازل ہوگا۔ سدی نے کہا: مراد زبور ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: مراد وہ صحف ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ لَا یَمَسُّهٗ کے معنی میں اختلاف ہے کیا یہ اعضاء سے مس کرنے کے معنی میں ہے (11) یا اس کے معنی کو چھونا مراد ہے؟ اس طرح الْمُطَهَّرُوْنَ میں اختلاف ہے کہ وہ کون لوگ ہیں؟ حضرت انس اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ اس کتاب کو مس نہیں کرتے مگر وہ جو گناہوں سے پاک ہوتے ہیں وہ فرشتے ہیں۔ ابو العالیہ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو گناہوں سے پاک ہیں جس طرح ملائکہ میں سے رسل اور انسانوں میں سے رسل۔ جبرئیل امین جو اس کو لاتے رہے وہ مطہر ہیں اور وہ رسول جن کے پاس وہ لاتے رہے وہ بھی مطہر ہیں۔ کلبی نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 463 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً | 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً | 6۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 464 | 7۔ ایضاً | 8۔ ایضاً
9۔ ایضاً | 10۔ ایضاً | 11۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1737

مراد سفرہ، کرام براہ ہیں۔ یہ سب ایک ہی قول ہے۔ یہ اس کی مثل ہے جو امام مالک نے اختیار کیا ہے آپ نے فرمایا: میں نے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی تفسیر میں جو سب سے بہترین قول سنا وہ یہ ہے کہ یہ اس آیت کے قائم مقام ہے جو سورۂ عبس میں ہے فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ اس سے یہ ارادہ کیا ہے کہ مطہرین سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کی صفت سورۂ عبس میں طہارت سے ذکر کی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَّا یَمَسُّهٗۤ کا معنی ہے اسے لے کر نازل نہیں ہوتے مگر فرشتوں میں سے رسول جو انبیاء میں سے رسولوں پر نازل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لوح محفوظ جو کتاب مکنون ہے اسے نہیں چھوتے مگر پاکیزہ فرشتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت اسرافیل کو یہ ذمہ داری سونپی گئی؛ قشیری نے اس کی حکایت بیان کی۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے کیونکہ فرشتے اسے کسی وقت بھی نہیں پکڑتے اور اس تک کسی وقت بھی رسائی حاصل نہیں کرتے اگر یہ مراد ہو تو اس میں استثناء کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ جس نے یہ کہا کتاب سے مراد وہ مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ زیادہ مناسب ہے۔ امام مالک اور دوسرے علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ عمرو بن حزم کا مکتوب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھا تھا اس میں یہ خط حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شرحبیل بن عبد کلال، حرث بن عبد کلال اور نعیم بن عبد کلال کی طرف ہے جو ذی رعین معاصر اور ہمدان کے بادشاہ ہیں (1)۔ اما بعد، آپ کے مکتوب میں تھا خبردار! قرآن کریم نہ چھوئے مگر پاک آدمی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تو قرآن کو نہ چھوئے مگر اس وقت جب تو پاک ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن نے حضرت عمر کے اسلام لانے کے موقع پر کہا تھا جب کہ وہ ان کے پاس گئے اور صحیفہ منگوایا تو حضرت عمر کی بہن نے کہا: لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ اسے پاک لوگ ہی چھوتے ہیں، حضرت عمر اٹھے، غسل کیا اور اسلام لائے۔ یہ واقعہ سورۂ طٰہٰ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: یہاں مطہرون سے مراد احداث اور انجاس سے پاک لوگ ہیں (2)۔ کلبی نے کہا: وہ شرک سے پاک ہوں (3)۔ ربیع بن انس نے کہا: وہ گناہوں اور خطاؤں سے پاک ہوں (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اسے موحد ہی پڑھیں: یہ محمد بن فضیل اور عبدہ کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس چیز سے منع کیا کرتے تھے کہ یہود و نصاریٰ میں سے کسی کو قرآن پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ فراء نے کہا: اس کا ذائقہ، اس کا نفع اور اس کی برکت قرآن پر ایمان رکھنے والا ہی پا سکتا ہے (5)۔ ابن عربی نے کہا: یہ امام بخاری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذاق طعم الإیمان من رضی باللہ ربا و بالإسلام دینا و بمحمد صلی اللہ علیہ و سلم نبیا (6) جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ حسین بن فضل نے کہا: اس کی تفسیر اور تاویل کو کوئی نہیں پہنچا سکتا مگر جسے اللہ تعالیٰ نے شرک اور نفاق سے پاک کر لیا ہو۔

---

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، الأمر بالوضوء عن مس القرآن، صفحہ 185　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 464
3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً
6۔ جامع ترمذی، ما جاء فی ترک الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 86　7۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 464

ابوبکر وراق نے کہا: اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں دی جاتی مگر سعادت مندوں کو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے ثواب کو مس نہیں کرے گا مگر مومن (7)؛ اسے حضرت معاذ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیت کا ظاہر شرع کی خبر ہے یعنی شرعی طور پر پاکیزہ لوگ ہی اسے چھوتے ہیں اگر ان کے برعکس پایا گیا تو یہ شرع کے خلاف ہوگا؛ یہ قاضی ابوبکر بن عربی کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ اور اس امر کو باطل قرار دیا ہے کہ اس کا لفظ تو خبر کا لفظ ہو اور اس کا معنی امر کا ہو۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ جائز ہے کہ یہ امر ہو اور سین کا ضمہ اعراب کا ضمہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ نہ ہو اور سین کا ضمہ مبنی ہونے کا ضمہ ہو اور فعل مجزوم ہو۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ علماء نے وضو کے بغیر مصحف کے چھونے میں اختلاف کیا ہے جمہور نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ حضرت عمرو بن حزم کی حدیث اس بارے میں مروی ہے؛ یہ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم عطا، زہری، نخعی، حکم، حماد اور فقہاء کی ایک جماعت کا مذہب ہے ان میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ سے مختلف روایات مروی ہیں ان سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ محدث اسے چھو سکتا ہے۔ سلف صالحین کی ایک جماعت سے بھی مروی ہے ان میں حضرت ابن عباس، امام شعبی وغیرہ ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس کے ظاہر، حواشی اور جس میں مکتوب نہ ہو اس کو چھوا جا سکتا ہے جہاں تک مکتوب کا تعلق ہے اسے پاکیزہ آدمی ہی چھو سکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اگر اسے کوئی تسلیم بھی کرے تب بھی یہ ان چیزوں میں سے ہے جس پر حجت غالب ہے کیونکہ ممنوع کا حریم بھی ممنوع ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کو جو خط لکھا اس کے خلاف قوی ترین دلیل ہے۔ امام مالک نے کہا: جو آدمی حالت طہارت میں نہ ہو نہ اسے کسی واسطہ سے اٹھائے اور نہ ہی تکیہ پر رکھ کر اٹھائے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں اور جو آدمی کسی واسطہ سے اسے اٹھاتا ہے یا کسی واسطہ سے چھوتا ہے اسے منع نہیں کیا۔ حکم، حماد اور داؤد بن علی سے مروی ہے کہ مصحف کو اٹھانے اور اس کے چھونے میں کوئی حرج نہیں، وہ مسلمان ہو یا کافر ہو، حالت طہارت میں ہو یا حالت حدث میں ہو مگر داؤد ظاہری نے اس سے اختلاف کیا ہے کہا مشرک کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اسے اٹھائے۔ وہ اس کی اباحت کا استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر کو خط لکھا جب کہ یہ تو مجبوری کا موقع تھا اس میں کوئی دلیل نہیں۔ بچوں کے اسے چھونے میں دو صورتیں ہیں (۱) بالغ پر قیاس کرتے ہوئے اسے منع کیا جائے گا (۲) یہ جائز ہے کیونکہ اگر بچے کو اس سے روک دیا جائے گا تو قرآن کی حفاظت نہ کی جا سکے گی کیونکہ بچے کا سیکھنا صغر سنی کی عمر میں ہی ہوا کرتا ہے بچے کو اگرچہ طہارت حاصل ہوتی ہے مگر وہ کامل نہیں ہوتی، کیونکہ بچے کی جانب سے نیت درست نہیں ہوتی۔ جب اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کامل طہارت کے بغیر اسے اٹھالے تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ حالت حدث میں اسے اٹھالے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ یعنی رب العالمین کی جانب سے نازل کی گئی ہے جس طرح ضرب الامیر اور نسیج الیمن میں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تنزیل اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۝ کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تَنْزِيْلٌ یہ ہو مبتدا کی خبر ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْ لَاۤ
اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَ اَنْتُمْ حِيْنَىٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ
لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْ لَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾

''کیا تم اس قرآن کے بارے میں کوتاہی کرتے ہو اور اس کی بے پایاں برکتوں سے تم نے اپنا یہی نصیب لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلاتے رہو گے۔ پس تم کیوں نہیں لوٹا دیتے جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت (پاس بیٹھے) دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس وقت بھی تم سے زیادہ مرنے والے کے قریب ہوتے ہیں البتہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ پس اگر تم کسی کے پابند حکم نہیں ہو تو پھر کیوں نہیں لوٹا دیتے (مرنے والے کی روح) اگر تم سچے ہو''۔

**اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ**، هذا الحديث سے مراد قرآن ہے **اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ** ﴿۸۱﴾ **مُّدْهِنُوْنَ** کا معنی ہے جھٹلاتے ہو؛ یہ حضرت ابن عباس، عطا اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے (1)۔ مدھن اسے کہتے ہیں جس کا ظاہر اس کے باطن کے خلاف ہو۔ گویا اسے دہن (تیل) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس کے ظاہر میں نرمی اور ملائمت ہوتی ہے۔ مقاتل بن سلیمان اور قتادہ نے کہا: **مُّدْهِنُوْنَ** کا معنی ہے کافرون۔ اس کی مثل **وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ** ﴿۹﴾ (القلم) مورج نے کہا: مدھن سے مراد منافق یا کافر ہے جو خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے تاکہ اپنے کفر کو چھپائے۔ ادھان اور مداھنہ کا معنی جھٹلانا۔ کفر کرنا اور نفاق کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی نرمی کرنا ہے اور جو ظاہر کرے اس کے برعکس کو اپنے اندر چھپانا ہے۔ ابوقیس بن سلت نے کہا:

الحَزْمُ والقُوَّةُ خيرٌ من الإدهان والفَهَّةِ والهَاعِ

احتیاط اور قوت نفاق، عاجزی اور حرص سے بہتر ہے۔

ادھن اور داھن دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ کچھ لوگوں کا نقطہ نظر ہے داھنت کا معنی ہے تو نے چھپایا اور ادھنت کا معنی ہے تو نے دھوکہ کیا۔ ضحاک نے کہا: مدھنون کا معنی ہے تم عرض کرنے والے ہو (2)۔ مجاہد نے کہا: کفر کے باوجود کفار سے دوستی کرنے والے ہیں (3)۔ ابن کیسان نے کہا: مدھن اسے کہتے ہیں جو یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر کیا حق ہے اور حیلے بہانوں سے اسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک لغوی نے کہا: مدھنون کا معنی ہے قرآن کو قبول کرنے میں وہ یقین کو ترک کرنے والے ہیں۔

**وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ** ﴿۸۲﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم نے اپنے شکر کو جھٹلانا بنالیا ہے۔ ہشیم بن عدی نے کہا: یہ از دشنوءہ کی لغت میں سے ہے ما رزق فلان بھرادہ اس کا شکر کیا ہے یہ مناسب ہے کہ رزق کے اسم کو شکر کی جگہ رکھا جائے کیونکہ رزق کا شکر اس میں زیادتی کا تقاضا کرتا ہے تو شکر اس معنی کی وجہ سے رزق ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ** سے اصل مقصود ہے وتجعلون شکر رزقکم تم نے اپنے رزق کا شکر (جو اگر تم سے پایا جاتا تو وہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 464　　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 465　　3۔ ایضاً

تمہارے لیے رزق کی صورت میں لوٹتا) یہ بنالیا ہے کہ تم رزق کو جھٹلاتے ہو، یعنی تم شکر کی جگہ رزق کو رکھتے ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً (الانفال:35) یعنی وہ نماز نہیں پڑھتے بلکہ وہ نماز کی جگہ سیٹیاں بجاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ اس میں اس امر کی وضاحت ہے کہ بندوں کو جو بھی بھلائی پہنچی ہے تو ان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ایسے واسطوں کے جانب سے دیکھیں جس کے بارے میں عام قاعدہ ہے کہ وہ واسطے اسباب ہوں بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے دیکھیں پھر اگر وہ نعمت ہے تو اس کے بالمقابل شکر کریں اور اگر وہ امر ناپسندیدہ ہو تو اس پر صبر کریں مقصود اس کے سامنے اپنی عبودیت اور عاجزی کا اظہار ہو۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا وتجعلون شكركم أنكم تكذبون (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے: اس سے مراد ستاروں سے بارش کو طلب کرنا ہے، یہ عربوں کا قول ہے مطرنا بنوء كذا ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی؛ حضرت علی شیر خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں پر بارش کی گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں میں سے کچھ نے شکر گزار بندے کی حیثیت سے صبح کی اور ان میں سے کچھ نے کافر کی حیثیت سے صبح کی قالوا هذه رحمة الله وقال بعضهم لقد صدق نوء كذا و كذا۔ انہوں نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور بعض نے کہا: فلاں فلاں ستارہ نے سچ کہا(2)، تو یہ آیت نازل ہوئی: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں نکلے وہ پیاسے ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے بتاؤ اگر میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں اور تم پر بارش ہو جائے تو ممکن ہے تم کہو: هذا المطر بنوء كذا یہ بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہے''(3)۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ ان ستاروں کا وقت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھی، اپنے رب سے دعا کی، ہوا چلی پھر بادل آئے تو لوگوں پر بارش ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے ایک آدمی کے پاس سے گزرے جب کہ آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی وہ اپنے پیالے سے پانی بھر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی، اس نے یہ نہ کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو یہ آیت نازل ہوئی وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس پر شکر بجالانے کی بجائے تم نے اپنا حصہ یہ بنالیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جھٹلاتے ہو اور تم یہ کہتے ہو: ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی ہے جس طرح تو کہتا ہے: جعلت إحساني إليك إساءة منك إلي میں نے تجھ پر جو احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو نے میرے ساتھ برائی کرنے کو بنا دیا۔ اور میرا تجھ پر جو انعام تھا اس کا تو نے یہ بدلہ دیا کہ تو نے مجھے اپنا دشمن بنالیا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 162
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان کفر من قال مطرنا بالنوء، جلد 1، صفحہ 59
3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 162

مؤطا میں حضرت زید بن خالد جہنی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھائی جب کہ رات کو بارش ہوئی تھی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، فرمایا: ''جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟'' (1) صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں سے کچھ نے مجھ پر ایمان کی حالت میں صبح کی اور ستارے کے ساتھ کفر کیا۔ جس نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ مجھ پر بارش کی گئی تو وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور ستارے کا انکار کرنے والا ہے جس نے کہا مجھ پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش کی گئی تو وہ ستارے پر ایمان رکھنے والا اور میرے ساتھ کفر کرنے والا ہے''۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی کہے مطرنا بنوء کذا و کذا اگرچہ ہمارے نزدیک نوء ایسا وقت ہے جو مخلوق ہے نہ نقصان دیتا ہے اور نہ نفع دیتا ہے، نہ بارش برساتا ہے اور نہ بارش کو روکتا ہے۔ جو پسند کرے تو یہ کہے: مطرنا وقت کذا کما تقول مطرنا شہر کذا ہم پر فلاں وقت بارش ہوئی جس طرح تو یہ کہتا ہے ہم پر فلاں مہینہ میں بارش کی گئی جس نے یہ کہا: مطرنا بنؤ کذا وہ یہ ارادہ کرتا ہو کہ نوء نے بارش کو نازل کیا ہے جس طرح دور جاہلیت میں بعض مشرک ارادہ کرتے تھے تو وہ کافر ہوگا۔ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کا خون حلال ہوگا۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی حکایت بیان کرتے ہیں أصبح من عبادی مومن بی و کافر (2) میرے نزدیک اس کے معنی کی دو صورتیں ہیں (۱) وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نوء ہی بارش نازل کرنے والا ہے، وہی بادل کو پیدا کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا نہیں کیا وہ صریح کافر ہوگا، اس سے توبہ طلب کرنا ضرور ہوگا اگر وہ انکار کرے تو اسلام کو چھوڑنے اور قرآن کو رد کرنے کی وجہ سے اسے قتل کرنا ضروری ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس ستارے کے ذریعے بارش نازل فرماتا ہے یہ بارش کا سبب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مقدر کیا ہے اور اس کے علم میں پہلے سے موجود ہے۔ اگرچہ یہ مباح صورت ہے پھر بھی اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار ہے اور اس کی لطیف حکمت سے جہالت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے بارش نازل فرماتا ہے کبھی کسی ستارے کے واسطہ سے اور کبھی کسی ستارے کے واسطہ سے۔ بے شمار مواقع پر ستارے ظاہر ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ بارش نہیں ہوتی۔ یہ بارش اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے ستارے کی طرف سے نہیں ہوتی، اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے جب وہ صبح کرتے جب کہ بارش ہو چکی ہوتی: مطرنا بنؤ الفتح پھر وہ اس آیت کی تلاوت کرتے مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا (فاطر: 2) ابو عمر نے کہا: میرے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی طرح ہے مطرنا بفضل اللہ و رحمتہ (3) ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے ساتھ بارش ہوئی۔ اس باب میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو ارشاد ہے جب حضرت عمر نے ان کے واسطہ سے بارش طلب

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الاستسقاء، الاستمطار بالنجوم، صفحہ 180

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان کفر من قال مطرنا بالنوء، جلد 1، صفحہ 59　3۔ ایضاً

کی: اے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا جان! کم بقی من نوء الثریا حضرت عباس نے جواب دیا: علماء گمان کرتے ہیں کہ وہ افق میں عرضاً ظاہر ہو گی سات دنوں کے بعد ابھی ساتواں دن نہیں گزرا تھا کہ ان پر بارش ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: الحمدللہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ہے۔

گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ نوء ثریا ایسا وقت ہے جس میں بارش کی امید کی جاتی ہے تو آپ نے حضرت عباس سے سوال کیا: وہ ظاہر ہو چکا ہے یا اس میں سے کوئی باقی ہے؟

سفیان بن عیینہ نے اسماعیل بن امیہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سفر میں ایک آدمی سے سنا وہ کہہ رہا تھا: مطرنا عثانین الاسد۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے جھوٹ بولا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بارش ہے''۔ سفیان نے کہا: عثانین الاسد سے مراد بازو اور پیشانی ہے۔

عام قرأت تکذبون ہے جو تکذیب سے مشتق ہے، مفضل نے عاصم اور یحییٰ بن وثاب سے تَکْذِبون نقل کیا ہے۔ اس کا معنی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جس نے کہا: مطرنا بنوء کذا حضرت انس بن مالک کی حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں تین چیزیں ہمیشہ رہیں گی حسب ونسب پر فخر، نوحہ اور انواء''۔ اس بارے میں صحیح مسلم کے الفاظ ہیں۔ ''میری امت میں چار امور دور جاہلیت کے ہوں گے جنہیں لوگ نہیں چھوڑیں گے۔ حسب ونسب پر فخر، انساب میں طعن، ستاروں کے ذریعے بارش کو طلب کرنا، نوحہ کرنا''(1)۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ لولا، ھلا کے معنی میں ہے جب نفس اور روح حلقوم تک پہنچ جائے۔ نفس کا پہلے ذکر نہیں ہوا کیونکہ معروف ہے۔

حاتم نے کہا:

اذا حشرجت یوما وضاق بها الصدر

جب گھنگھرو بول جائے گا اور سینہ تنگ ہو جائے گا۔ محل استدلال حشرجت کی ضمیر ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے ''ملک الموت کے مددگار ہیں جو رگوں کو کاٹتے ہیں اور آہستہ آہستہ روح کو جمع کرتے ہیں یہاں تک کہ روح حلقوم تک پہنچ جاتی ہے تو ملک الموت اسے قبض کر لیتا ہے''(2)۔

وَ اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ تَنْظُرُوْنَ کا مفعول بہ أمری اور سلطان ہے۔ یعنی تم میرا اصرار، میری سلطان دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تم میت کو دیکھ رہے ہوتے ہو تم اس کے لیے کسی چیز پر قادر نہیں ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرتا ہے کہ میت کے گھر والے انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ اس کا نفس کب نکلے گا؟ پھر یہ کہا گیا ہے: یہ ان کے اس قول کا رد ہے جو انہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا تھا لَوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی النھی عن الفخر بالأحساب والطعن فی الأنساب والاستسقاء، جلد 1، صفحہ 303

2۔ کنز العمال، تلقین المحتضر، جلد 15، صفحہ 563، حدیث 12185

(آل عمران:156) کیا جب روح حلقوم تک آ پہنچی تھی تو کیا انہوں نے ان میں سے کسی کی روح کو لوٹا یا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے ایسا کیوں نہ ہوا جب تم میں سے کسی کا نفس نزع کے وقت حلقوم تک پہنچا جب کہ تم حاضر تھے تو تم اس کی روح کو اس کے جسم میں روک لیتے جب کہ تم اس کی طویل عمر کے حریص تھے اور اس کی بقا سے محبت رکھتے تھے۔ یہ ان کے قول کا رد ہے: نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیہ:24) ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس آدمی کو خطاب ہے جو حالت نزع میں ہے یعنی تجھے جو مصیبت پہنچی ہے اگر یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے تو تو نے اپنی روح کی حفاظت کیوں نہیں کی؟

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ ہم قدرت، علم اور رؤیت میں تمہاری بنسبت اس کے زیادہ قریب تھے۔ عامر بن عبدالقیس نے کہا: میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی بنسبت اس کے زیادہ قریب دیکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارادہ کیا کہ ہمارے بھیجے ہوئے جو اس کی روح کو قبض کرنے کے ذمہ دار تھے وہ تمہاری بنسبت اس کے زیادہ قریب تھے۔ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۝ یعنی تم انہیں دیکھتے۔

فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ۝ یہاں بھی لولا، ھلا کے معنی میں ہے یعنی اگر تمہارا محاسبہ نہیں ہونا اور تمہیں اپنے اعمال کا بدلہ نہیں دیا جانا۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ۝ (الصافات) یعنی ہمیں جزا دی جائے گی اور ہمارا محاسبہ ہوگا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ کا معنی ہے غیر مملوکین و لا مقهورين غیر مملوک اور غیر مغلوب ہوں۔ فراء اور دوسرے علماء نے کہا: دِنته کا معنی ہے میں اس کا مالک ہوا، حطیہ کا شعر پڑھا:

لقد دُيِّنْتِ أَمْرَ بَنِيكَ حَتَّى تَرَكْتِهِمْ أَدَقَّ مِنَ الطَّحِينِ

تجھے اپنے بیٹوں کے معاملات سپرد کیے گئے یہاں تک کہ تو نے انہیں آٹے سے بھی زیادہ باریک چھوڑا۔

دانه اسے ذلیل کیا اور اسے اپنا غلام بنایا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: دنته فدان میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔ اس بارے میں بحث سورۂ فاتحہ میں يَوْمِ الدِّيْنِ کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

تَرْجِعُوْنَهَاۤ تم روح کو جسم کی طرف لوٹاتے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ اگر تم سچے ہو یعنی تم اسے ہرگز نہیں لوٹاؤ گے تو تمہارا گمان باطل ہو گیا کہ مملوک نہیں اور تمہارا محاسبہ نہیں ہوگا۔ تَرْجِعُوْنَهَاۤ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ۝ اور فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ۝ کا جواب ہے دونوں کا ایک ہی جواب ہے: یہ فراء کا قول ہے۔ بعض اوقات عرب دو حرفوں کا اعادہ کرتے ہیں اور ان کا معنی ایک ہی ہوتا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ (البقرہ) دونوں کا ایک جواب دیا گیا جب کہ یہ دونوں شرطیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایک کو حذف کیا گیا کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فلولا وھلا ان کنتم غیر مَدِینِین تَرجِعونها، تردّون نَفس هذا الميت إلى جسده إذا بلغت الحلقوم۔

فَاَمَّاۤ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّاۤ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ﴿۹۱﴾ وَ اَمَّاۤ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۹۳﴾ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۹۶﴾

''پس وہ (مرنے والا) اگر الله کے مقرب بندوں سے ہوگا تو اس کے لیے راحت، خوشبودار غذائیں اور سرور والی جنت ہوگی۔ اور اگر وہ اصحاب یمین (کے گروہ) سے ہوگا تو (اسے کہا جائے گا) تمہیں سلام ہو اصحاب یمین کی طرف سے۔ اور اگر وہ (مرنے والا) جھٹلانے والے گروہوں سے ہوگا تو اس کی مہمانی کھولتے پانی سے ہوگی اور داخل ہونا پڑے گا اسے بھڑکتے دوزخ میں۔ بےشک (جو بیان ہوا) یہ یقیناً حق ہے۔ پس (اے حبیب!) پاکی بیان کیجئے اپنے رب کے نام کی جو بڑی عظمت والا ہے''۔

فَاَمَّاۤ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۸۸﴾ موت اور بعث کے وقت مخلوق کے طبقات کا ذکر کیا اور ان کے درجات کو بیان کیا اور کہا: اگر یہ فوت ہونے والا مقربین میں سے ہوا جو سابقون ہیں (1) فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ ﴿۸۹﴾ عام قرأت فروح ہے واؤ پر فتحہ ہے۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کے نزدیک اس کا معنی دنیا سے راحت ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: روح سے مراد راحت ہے۔ ضحاک نے کہا: روح سے مراد استراحت ہے (2)۔ قتبی نے کہا: اس کا معنی ہے اس کے لیے قبر میں عمدہ خوشبو ہوگی۔ ابو العباس بن عطاء نے کہا روح سے مراد الله تعالیٰ کے چہرے کی طرف دیکھنا ہے۔ ریحان سے مراد اس کی کلام اور وحی کو سننا ہے وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ اس سے مراد ہے کہ جنت میں وہ الله تعالیٰ سے حجاب میں نہیں ہوگا۔ حضرت حسن بصری، قتادہ، نصر بن عاصم، جحدری، رویس اور زید نے یعقوب سے یہ قرأت نقل کی ہے (3)۔ فَرُوۡحٌ یعنی راء پر ضمہ ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: روح سے مراد رحمت ہے کیونکہ مرحوم کے لیے یہ زندگی کی طرح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا فَرُوۡحٌ یعنی راء پر ضمہ ہے معنی ہے اس کے لیے جنت میں بقا اور زندگی ہے، یہی رحمت ہے۔ وَّرَيۡحَانٌ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد رزق ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد حمیر کی لغت میں رزق ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: خرجت أطلب ريحان الله میں الله تعالیٰ کے رزق کی تلاش میں نکلا۔ نمر بن تولب نے کہا: سلام الإله و ريحانه یہاں بھی ریحان سے مراد رزق ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد جنت ہے۔ ضحاک نے کہا: مراد رحمت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ معروف ریحان ہے جسے سونگا جاتا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا نقطہ نظر ہے۔ ربیع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 466 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 254 3۔ ایضاً

بن خیثم نے کہا: وہ موت کے وقت ہوگا اور جنت دوبارہ اٹھائے جانے تک اس کے لیے چھپا کر رکھی جائے گی۔ ابو جوزاء نے کہا: یہ اس کی روح کے قبض کے وقت ہوگا وہ ریحان کا بنڈل پائے گا۔ ابو العالیہ نے کہا: مقربین میں سے کوئی بھی دنیا میں اپنی روح سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ اسے ریحان کی دو ٹہنیاں دی جائیں گی وہ ان دونوں کو سونگھے گا پھر اس کی روح قبض کی جائے گی۔ ریحان کی اصل اور اس کا اشتقاق سورۂ رحمن کے آغاز میں گزر چکا ہے اس میں غور و فکر کیجئے۔ ثعلبی نے روح و ریحان میں ان اقوال کے علاوہ اقوال ذکر کیے ہیں جو ہم نے ذکر کیے، جو ان کا ارادہ کرے وہاں سے دیکھ لے۔

وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ یعنی اگر فوت ہونے والا اصحاب یمین میں سے ہو فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ تو ان میں سے کسی کو نہیں دیکھے گا مگر یہ کہ جو تو سلامتی سے محبت رکھتا ہے اس لیے ان کے بارے میں تو غمگین نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان کی جانب سے تیرے لیے سلامتی ہے یعنی تو ان کے لیے غمگین ہونے سے سلامت ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اصحاب یمین آپ کے لیے دعا کرتے ہیں اے محمد! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحمتیں نازل فرمائے اور تجھ پر سلام بھیجے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے محمد! وہ تجھ پر سلام بھیجتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اے بندے! تو اس چیز سے سلامت رہے جسے تو ناپسند کرتا ہے، کیونکہ تو اصحاب یمین سے ہے یہاں سے انك محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں سلام کے ساتھ سلام کیا جاتا ہے مقصد تعظیم بجالانا ہے(1)۔ اس تاویل کی بنا پر سلام کے محل میں تین قول ہیں (۱) جب دنیا میں اس کی روح قبض کی جاتی ہے تو ملک الموت اسے سلام کہتا ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے(2)۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: جب ملک الموت آتا ہے تاکہ مومن کی روح قبض کرے تو وہ کہتا ہے تیرا رب تجھے سلام فرماتا ہے۔ یہ بحث سورۂ نحل آیت 32 میں اللہ تعالیٰ کے فرمان الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ کے ضمن میں گزر چکی ہے (۲) قبر میں جب اس سے سوال و جواب ہوتا ہے(3) تو منکر نکیر اس کو سلام کہتے ہیں (۳) قیامت کے روز جب اسے اٹھایا جاتا ہے تو فرشتے اسے سلام کہتے ہیں قبل اس کے کہ وہ پہنچے (4)۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال موجود ہے کہ اسے تینوں مواقع پر سلام کیا جائے۔ یہ اس کے لیے اکرام کے بعد اکرام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مبرد کے نزدیک ان کا جواب محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے مهما يكون من شئ فسلام لك من أصحاب اليمين، إن كان من أصحاب اليمين فسلام لك من أصحاب اليمين جواب شرط کو حذف کر لیا گیا کیونکہ ماقبل کلام اس پر دلالت کرتی ہے؛ جس طرح تیرے اس قول میں جواب محذوف ہے أنت ظالم إن فعلت کہہ کر ماقبل کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اخفش کا مذہب ہے کہ فاء ( کا مابعد ) اما اور ان کا جواب ہے اس کا معنی ہے فاء، اما کا جواب ہے یہ متقدمہ تقدیر کی بنا پر ان کے جواب کے قائم مقام ہے۔ فاء اس تعبیر کی بنا پر دونوں کا جواب ہے۔ زجاج کے نزدیک اما کا معنی ہے ایک شی سے دوسری شی کی طرف نکلنا یعنی جس میں ہم ہیں اس کو چھوڑ دے اور اس کے غیر میں شروع ہو جا۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 447 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ یعنی بعث کا انکار کرنے والے اور ہدایت اور حق کے راستہ سے گمراہ۔

فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ یعنی ان کے لیے کھولتے ہوئے پانی کا رزق ہے، جس طرح فرمایا: ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ جس طرح فرمایا: ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ (الصافات) وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ جہنم میں داخل کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہنم میں رہنا اور مختلف قسم کے عذابوں کو برداشت کرنا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أصلاہ النّار وصلاہ مراد ہے اسے بنادیا کہ وہ اسے تاپے۔ یہاں مصدر، مفعول کی طرف مضاف ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: لفلان أعطاء مال فلاں کو مال دیا جاتا ہے اسے وتصلیة تاء کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی نزل من تصلیة جحیم پھر ابو عمرو نے تاء کو جیم میں مدغم کیا۔ یہ بعید ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ جو ہم نے تم پر بیان کیا ہے یہ محض یقین اور حق ہے۔ حق کی یقین کی طرف اضافت درست ہے جب کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں کیونکہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ مبرد نے کہا: یہ تیرے اس قول کی طرح ہے عین الیقین، محض الیقین۔ کوفیوں کے نزدیک یہ شی کو اپنی ذات کی طرف مضاف کرنے کی طرح ہے۔ بصریوں کے نزدیک مراد ہے: حقّ الأمر الیقین أو الخبر الیقین۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تاکید ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یقین کی اصل یہ ہے کہ یہ حق کی نعت ہو تو مبعوث کو مجازاً نعت کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس طرح ہے وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ (الانعام: 32) قتادہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ اسے اس قرآن کے بارے میں یقین پر کھڑا کرے گا جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اس نے دنیا میں یقین کر لیا تو اس چیز نے اسے قیامت کے روز نفع دیا۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے اسے قیامت کے روز یقین ہو گا تو اسے یقین نفع نہیں دے گا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾ اللہ تعالیٰ کی ہر عیب سے پاکی بیان کرو۔ باء زائدہ ہے یعنی اپنے رب کی پاکی بیان کرو۔ اسم سے مراد مسمّی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اپنے رب کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس کی نماز پڑھیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے عظیم رب کے نام کا ذکر کیجئے اور اس کی تسبیح بیان کیجئے۔

حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے جب فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے اپنے رکوع میں رکھ لو'' اور جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿۱﴾ نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے اپنے سجدہ میں رکھ لو'' (1) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، مایقول الرجل فی رکوعہ و سجودہ، جلد 1، صفحہ 126

# سورۃ الحدید

آیاتہا ۲۹ ۵۷ سورۃ الحدید مدنیۃ ۹۴ رکوعاتہا ۴

تمام کے قول میں یہ سورت مدنی ہے، اس کی انتیس آیات ہیں۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے مسبحات سورتیں پڑھا کرتے تھے (1)، ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیتوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ مسبحات سورتوں سے مراد سورۃ الحدید، سورۃ الحشر، سورۃ الصف، سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

”اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہی ہے ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے اسی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہ زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کی اور ہر عیب سے اس کی پاکی بیان کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آسمانوں میں جو کچھ ہے یعنی فرشتے اور زمین میں جو کچھ ہے جس میں روح ہو یا نہ ہو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کا اظہار کیا اور نماز پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد تسبیح دلالت ہے۔ زجاج نے اس کا انکار کیا اور کہا: اگر مراد تسبیح دلالت اور صنعت کے آثار کا ظہور تھا تو یہ ایسی چیز تھی جس کو عقل میں سمجھنا تھا تو یہ کیوں فرمایا: وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (الاسراء:44) یہ تسبیح قول ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا گیا ہے: وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ (الانبیاء:49) اگر یہ تسبیح دلالت تھی تو حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے کیا تخصیص ہوگی؟

میں کہتا ہوں: انہوں نے جو ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو سبحان میں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الاسراء:44) کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت صرف اس کے لیے ہے۔ ملک سے مراد ملکیت اور امر

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 116

کا نافذ ہونا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ملک، قادر اور غالب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بارش، نبات اور تمام رزق کے خزانے ہیں۔

یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وہ دنیا میں زندوں کو مارتا ہے اور مردوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے زندہ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نطفہ کو زندہ کرتا ہے جب کہ وہ مردہ ہوتا ہے اور زندوں کو موت عطا کرتا ہے۔ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ محل رفع میں ہے تقدیر کلام یہ ہے ھو یحیی و یمیت۔ یہ بھی جائز ہے کہ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے ھو یحیی و یمیت۔ یہ بھی جائز ہے کہ محییا و ممیتا کے معنی میں حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یہ لہ کی ضمیر سے حال ہے اور جار اس میں عامل ہے۔ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

ھُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاھِرُ وَ الۡبَاطِنُ اسماء کے معانی میں اختلاف ہے ہم نے انہیں الکتاب الاسنی میں بیان کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ایسی وضاحت فرمائی ہے جو ہر قول سے غنی کر دیتی ہے (1)۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے۔ ''اے اللہ! تو اول ہے تجھ سے قبل کوئی چیز نہیں، تو آخر ہے تیرے بعد کوئی چیز نہیں، تو ظاہر (غالب) ہے تیرے اوپر کوئی چیز نہیں، تو باطن ہے تجھ سے دور کوئی چیز نہیں ہمارے قرضوں کو ادا کرنے کے اسباب پیدا فرما اور ہمیں فقر سے غنی کر دے''۔ یہاں ظاہر سے مراد غالب ہے اور باطن سے مراد عالم ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَ ھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ یعنی جو کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ بعد میں ہوگا ان میں سے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں۔

**ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡھَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡھَا ؕ وَ ھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَ ھُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝**

''وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا تخت حکومت پر، وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس کی طرف عروج کرتا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہو اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو (اسے) خوب دیکھنے والا ہے اسی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جائیں گے، داخل فرماتا ہے رات (کا کچھ حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کا کچھ حصہ) رات میں اور وہ خوب جانتا ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ، ما یقول عند النوم، جلد 2، صفحہ 348

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں مفصل گزر چکی ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ یعنی بارش وغیرہ(1) جو زمین میں داخل ہوتی ہے وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا مراد نباتات وغیرہ ہے(2)۔ وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ یعنی رزق، بارش اور فرشتے۔ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا جو آسمانوں کی طرف بلند ہوتے ہیں جیسے فرشتے اور بندوں کے اعمال۔ وَ هُوَ مَعَكُمْ یعنی اپنی قدرت، سلطان اور علم کے ذریعے تمہارے ساتھ ہے۔ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۞ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال دیکھتا ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں (3) اس آیت میں اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اور وَ هُوَ مَعَكُمْ کو جمع کر دیا گیا ہے دونوں کے ظاہر کو لیا جائے تو تناقص واقع ہوتا ہے اس لیے تاویل ضروری ہے، تاویل سے اعراض تناقص کو تسلیم کرنا ہے۔ امام ابو المعالی نے کہا: حضرت محمد ﷺ لیلۃ المعراج کو حضرت یونس علیہ السلام کی بنسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب نہ تھے جب کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حقیقت میں معبود ہے۔ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۞ امور سے مراد آخرت میں مخلوقات کے امور ہیں۔ حضرت حسن بصری، اعرج، یعقوب، ابن عامر، ابو حیوہ، ابن محیصن، حمید، اعمش، حمزہ، کسائی اور خلف نے تَرْجِعُ پڑھا ہے(4)، باقی قراء نے تُرْجَعُ پڑھا ہے۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ سورۂ آل عمران میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ وَ هُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۞ اس پر ضمائر مخفی نہیں، جس کی یہ صفت ہو تو جائز نہیں کہ اس کے غیر کی عبادت کی جائے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ۞ وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۞ هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۞

''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو (اس کی راہ میں) ان مالوں سے جن میں اس نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے، پس جو لوگ ایمان لائے تم میں سے اور (راہ خدا میں) خرچ کرتے رہے ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ (اس کا) رسول دعوت دے رہا ہے تمہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ بھی لے چکا ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے (محبوب) بندہ پر روشن آیتیں تاکہ تمہیں نکال لے (کفر کے) اندھیروں سے (ایمان کے) نور کی طرف، اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی شفقت فرمانے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 470 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 258

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ یعنی اس امر کی تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ وَ اَنْفِقُوْا اور صدقہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فرض زکوۃ ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فرض زکوٰۃ کے علاوہ طاعات کی صورتیں ہیں (2) اور وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرتی ہیں۔

مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ یہ دلیل ہے کہ اصل ملک اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بندے کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ اس میں ایسا تصرف کرے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو راضی کرے اور اس پر اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائے۔ جس نے ان اموال میں سے حقوق اللہ میں خرچ کیا اور اس پر ان میں سے انفاق آسان ہوا جس طرح ایک آدمی کے لیے غیر کے مال میں سے مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے جب وہ اسے خرچ کرنے کی اجازت دے تو اس کے لیے بڑا ثواب اور اجر عظیم ہوگا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ سے مراد ہے کہ تمہیں تمہارے پہلوں کے مال کا وارث بنا دیتا ہے۔ یہ چیز اس امر پر دال ہے کہ یہ اموال حقیقت میں تمہارے نہیں تم تو صرف ان میں نائب اور وکیل ہو تو تم اس فرصت کو غنیمت سمجھو کہ قبل اس کے کہ یہ مال تمہارے ہاتھ سے نکل کر تمہارے بعد تک جا پہنچیں تم اس میں حق بجا لاؤ۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ۝ تم میں سے جو ایمان لائے اور جس نے اعمال صالحہ کیے، اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ان کے لیے جنت ہے۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یہ استفہام ہے مراد توبیخ ہے یعنی ایمان نہ لانے کا تمہارے پاس کیا عذر ہے جب کہ تمام رکاوٹیں ختم ہو چکی ہیں وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ اس کے ساتھ یہ واضح کیا کہ شرائع کے وارد ہونے سے پہلے کوئی حکم نہیں۔ ابو عمرو نے اسے پڑھا وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ، اخذ فعل مجہول ہے باقی قراء نے اسے معروف پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سے پختہ وعدہ لیا ہے کہ تم میں عقلیں رکھیں اور تم پر دلائل اور حجتیں قائم کیں جو رسول اللہ ﷺ کی متابعت کی طرف لے جاتی ہیں اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ یہاں اِنْ، اذ کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تم حجتوں اور دلائل پر ایمان رکھتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تم کسی روز حق پر ایمان رکھتے ہو تو آج سب سے مناسب وقت ہے کہ تم ایمان لے آؤ کیونکہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے دلائل قائم ہو چکے ہیں پس اس کے دلائل صحیح ثابت ہو گئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تم اللہ تعالیٰ جو تمہارا خالق ہے اس پر ایمان رکھتے ہو۔ وہ اس چیز کا اعتراف کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ ایسی قوم کو خطاب ہے جو ایمان لائی نبی کریم ﷺ نے ان سے وعدہ لیا بعد میں وہ مرتد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ سے مراد ہے اگر تم ایمان کی شرائط کا اقرار کرتے ہو۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ مراد قرآن حکیم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد معجزات ہیں یعنی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا تم پر لازم ہے کیونکہ اس کے ساتھ معجزات ہیں اور قرآن حکیم ان میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے۔ لِّيُخْرِجَكُمْ تا کہ تمہیں قرآن کے ساتھ نکالے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہیں رسول کے ساتھ نکالے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہیں موت کے ساتھ نکالے۔ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اس سے مراد شرک اور کفر ہے۔ اِلَى النُّوْرِ اس سے مراد ایمان ہے (3)۔ وَ اِنَّ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 471 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 259

اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝

''آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے (اپنے مال) راہ خدا میں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے۔ تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی، ان کا درجہ بہت بڑا ہے ان سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جنگ کی، (ویسے تو) سب کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے بھلائی کا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے بخوبی خبردار ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یعنی وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی ہے اور ایسا کام کرنے سے روکتی ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرے جب کہ تم مر رہے ہو اور اپنے مال پیچھے چھوڑے جا رہے ہو جبکہ یہ مال اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ کلام کا معنی خرچ نہ کرنے پر شرمندہ کرنا ہے۔ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی جب ان دونوں میں رہنے والے ختم ہو جائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں جس طرح میراث اپنے مستحق کی طرف لوٹ جاتی ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2۔** لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ فتح سے مراد فتح مکہ ہے (2)۔ شعبی اور زہری نے کہا: مراد صلح حدیبیہ ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: دونوں قتال تھے ان دونوں میں سے ایک دوسرے سے افضل تھا، دونفقات تھے دونوں میں سے ایک دوسرے سے افضل تھا۔ فتح مکہ سے پہلے قتال اور مال خرچ کرنا اس کے بعد قتال اور مال خرچ کرنے سے افضل تھا۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے لا یستوی منکم من أنفق من قبل الفتح و قاتل و من أنفق من بعد الفتح و قاتل اسے حذف کیا گیا ہے کیونکہ کلام اس محذوف پر دال ہے۔ فتح سے پہلے نفقہ عظیم تھا کیونکہ لوگوں کی ضرورت زیادہ تھی کیونکہ اسلام کمزور تھا اور خرچ کرنے والوں پر یہ عمل زیادہ شاق تھا اور اجر تھکاوٹ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے: مناسب یہ ہے کہ اہل فضل اور اہل عزم کو مقدم رکھا جائے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ۔

کلبی نے کہا: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور تقدیم پر واضح دلیل ہے کیونکہ یہ پہلے وہ شخص ہیں جو اسلام لائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: سب سے پہلے جس

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 471 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

نے اپنی تلوار کے ساتھ اسلام کی مدد کی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے اور حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنا مال خرچ کیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ حضرت ابوبکر صدیق آپ کے پاس حاضر تھے ان پر ٹاٹ کا لباس تھا انہوں نے اپنے سینے پر کانٹوں کے بٹن لگائے ہوئے تھے۔ حضرت جبرئیل امین حاضر ہوئے عرض کی: اے اللہ کے نبی! کیا وجہ ہے میں حضرت ابوبکر صدیق پر ایسی عباء دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اپنے سینے پر اس میں کانٹوں کے بٹن لگائے ہوئے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''انہوں نے فتح سے پہلے اپنا مال مجھ پر خرچ کیا ہے'' (1)۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتا ہے ابوبکر کو سلام کہیں اور اس سے پوچھیں کیا تو اس فقر کے عالم میں راضی ہے یا ناراض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے ابابکر! اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرماتا ہے اور کہتا ہے کیا تو اپنے فقر میں راضی ہے یا ناراض ہے؟'' حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کی: کیا میں اپنے رب پر ناراض ہوسکتا ہوں؟ میں اپنے رب سے راضی ہوں، میں اپنے رب سے راضی ہوں، میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے ارشاد فرماتا ہے میں تجھ سے اسی طرح راضی ہوں جس طرح تو مجھ سے راضی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رونے لگے حضرت جبرئیل امین نے عرض کی: اے محمد! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے حاملین عرش نے بھی اس وقت سے ایسی عبائیں پہنی ہوئی ہیں جن میں کانٹوں کے بٹن ہیں جب سے آپ کے اس دوست نے ایسی عبا پہنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ اپنے آپ پر آپ کو مقدم کرتے اور ان کے لیے تقدم اور سبقت کا اقرار کرتے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم سبقت لے گئے، دوسرا نمبر حضرت ابوبکر صدیق کا ہے اور تیسرا حضرت عمر کا ہے میرے پاس کوئی آدمی نہیں لایا جائے گا جو مجھے حضرت ابوبکر صدیق پر فضیلت دے گا تو میں اس پر افتراء باندھنے والے کی حد جاری کروں گا، اس کو اسی کوڑے ماروں گا، شہادت رد کر دوں گا۔ متقدمین نے متاخرین سے زیادہ مشقتیں اٹھائیں، ان کی بصیرت بھی زیادہ قوی تھیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ تقدم و تاخر دنیا کے احکام میں ہوتا ہے جہاں تک دین کے احکام کا تعلق ہے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم لوگوں کو ان کی منازل میں رکھیں رتبہ کے اعتبار سے سب سے عظیم منزل نماز ہے (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض وصال میں فرمایا: ''ابوبکر کو حکم دو وہ لوگوں کو نماز پڑھائے''۔ فرمایا: لوگوں کی امامت وہ کرائے جو ان میں سے کتاب اللہ کو زیادہ پڑھنے والا ہو (3)۔ فرمایا: ''تم دونوں میں سے بڑا تمہاری امامت کرائے'' (4)۔ یہ حضرت مالک بن حویرث سے مروی ہے اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ امام بخاری اور دوسرے علماء نے یہ سمجھا کہ مراد مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بڑا ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ولاء بڑے کے لیے ہے'' یہاں کبر سے مراد عمر میں بڑا نہیں۔ امام مالک اور دوسرے علماء نے کہا: عمر کا حق ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ''وہ مراعات کا زیادہ حق رکھتا ہے

1۔ اسباب النزول، صفحہ 210، حدیث 785
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 93
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 96
4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 94-95

کیونکہ جب علم اور عمر جمع ہو جائیں تو عالم کو مقدم رکھا جائے گا۔ جہاں تک دنیا کے احکام کا تعلق ہے وہ احکام دین پر مرتب ہیں جسے دین میں مقدم کیا جائے گا اسے دنیا میں مقدم کیا جائے گا۔ آثار میں ہے: ''جو آدمی ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے، ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں'' (1)۔ افراد کے بارے میں جو حدیث ثابت ہے اس میں ہے ''کوئی نوجوان کسی بوڑھے کی اس کی عمر کی وجہ سے تعظیم بجا نہیں لاتا مگر اس کے بڑھاپے کے وقت اللہ تعالیٰ ایسا آدمی مقرر کر دیتا ہے جو اس کی عزت کرتا ہے'' (2)۔ علماء ان اشعار کو پڑھتے ہیں:

أذكر إذا شئتَ أن تُعيِّرَهُمُ　　جَدَّكَ واذكر أباك يا بن أخِ
واعلم بأن الشباب منسلِخٌ　　عنك وما وِزْرُهُ بمنسلِخِ
من لايعزّ الشيوخَ لا بلغتْ　　يومًا به سِنُّه إلى الشَّيَخِ

جب تو بوڑھوں کو عار دلانا چاہے تو اپنے دادا کو یاد کر اور اپنے باپ کو یاد کر، اے بھتیجے! جان لے تجھ سے جوانی جانے والی ہے اور اس کا بوجھ جانے والا نہیں۔ جو آدمی بزرگوں کی عزت نہیں کرتا اس کی عمر ایک روز اسے بڑھاپے کی عمر تک پہنچانے والی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، كُلًّا سے مراد آگے بڑھنے والے رکنے والے، اور سبقت لے جانے، پیچھے آنے والے اور لاحق ہونے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے سب سے وعدہ کیا ہے اگرچہ ان کے درجات مختلف ہیں۔ ابن عامر نے کل کو مرفوع پڑھا ہے اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں یہ مرقوم ہے۔ باقی قراء نے اسے کلا پڑھا ہے جس طرح ان کے مصاحف میں ہے جس نے اسے منصوب پڑھا ہے اس کے نزدیک یہ مفعول بہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کے ساتھ حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے۔ جس نے اسے مرفوع پڑھا ہے تو کیونکہ جب مفعول مقدم ہو تو فعل کا عمل کمزور ہو جاتا ہے تو اس صورت میں ضمیر محذوف ہوگی یعنی وعدہ۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

''کون ہے جو (اپنا مال) اللہ تعالیٰ کو (بطور) قرضہ حسنہ دے اور اللہ تعالیٰ کئی گناہ بڑھا دے اس کے مال کو اس کے لیے (اس کے علاوہ) اسے شاندار اجر بھی ملے گا۔ جس روز آپ دیکھیں گے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو کہ ضوفشانی کر رہا ہوگا ان کا نور ان کے آگے بھی ان کی دائیں جانب بھی (مومنو!) تمہیں مژدہ ہو آج ان باغوں کا، بہہ رہی ہیں جن کے نیچے نہریں تم ہمیشہ وہاں رہوگے، یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے''۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الادب، توقیر الکبیر، جلد 8، صفحہ 33، حدیث 12610

2۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، ما جاء فی الجلال الکبیر، جلد 2، صفحہ 23

بارے میں گفتگو گزر چکی ہے جو آدمی بھی کوئی اچھا عمل کرے عرب اس کے بارے میں کہتے ہیں: قد أقرض؛ شاعر نے کہا:

وإذا جُوزِيتَ قَرْضًا فَأَجزِہِ (1)

جب تیرے ساتھ حسن سلوک کیا جائے تو اس کا بدلہ دے۔

اسے قرض کا نام دیا گیا کیونکہ قرض بدل واپس لینے کے لیے دیا جاتا ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کئی گناہ بدل عطا فرماتا ہے۔ کلبی نے کہا: قرض سے مراد صدقہ ہے، حسنا سے مراد ہے وہ دل سے ثواب کی نیت رکھتا ہو، وہ احسان جتلانے اور اذیت دینے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو۔

فَيُضٰعِفَهٗ یعنی سات گنا سے سات سو گنا تک جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے (2): قرض حسن سے مراد ہے کہ وہ اپنی زبان سے یہ کہے سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إله إلا الله، اللہ اکبر۔ یہ سفیان نے ابوحیان سے روایت نقل کی۔ زید بن اسلم نے کہا: مراد اپنے گھر والوں پر مال خرچ کرنا ہے (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد نفلی عبادت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد عمل خیر ہے (4)؛ عرب کہتے ہیں: لی عند فلان قراض و قراض سوء۔ قشیری نے کہا: قرض حسن سے مراد ہے کہ صدقہ کرنے والا، سچی نیت اور پاکیزہ نفس سے صدقہ کرے وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہو وہ ریا کاری اور شہرت کا خواہش مند نہ ہو، وہ مال حلال کا ہو۔ قرض حسن یہ ہے کہ وہ ردی چیز کا قصد نہ کرے کہ وہ اسے صدقہ کر دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (البقرہ: 267) وہ اس وقت صدقہ کرے جب اسے زندگی کی امید ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہترین صدقہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ''تو صدقہ کرے جب کہ تو صحت مند ہو، بخل موجود ہو، تو زندگی کی امید رکھتا ہو، تو اسے موخر نہ کیے رکھ یہاں تک کہ سانس ہنسلی کی ہڈی تک آ پہنچے تو تو کہے فلاں کے لیے اتنا، فلاں کے لیے اتنا'' (5)۔ وہ اپنے صدقہ کو مخفی رکھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ: 264) وہ جو کچھ دے رہا ہے اسے حقیر جانے کیونکہ تمام دنیا قلیل ہے، جو مال دے وہ اس کا محبوب ترین مال ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: 92) وہ بہت زیادہ ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بہترین غلام وہ ہے جس کی قیمت زیادہ ہو اور مالکوں کے نزدیک زیادہ نفیس ہو'' (6)۔

فَيُضٰعِفَهٗ ابن کثیر اور ابن عامر نے فیضعفه پڑھا ہے یعنی الف کو ساقط کر دیا ہے مگر ابن عامر اور یعقوب نے فاء کو نصب دی ہے۔ نافع اور اہل کوفہ اور اہل بصرہ نے فیضاعفه پڑھا ہے یعنی الف کے ساتھ اور عین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے مگر عاصم نے فاء کو نصب دی ہے باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے یہ یقرض پر معطوف ہے۔ نصب کی صورت میں یہ استفہام کا جواب ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس بارے میں قول مفصل گزر چکا ہے۔ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾ اس سے مراد جنت ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 472 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، فضل صدقة الشحيح الصحيح، جلد 1، صفحہ 191-190

6۔ موطا امام مالک، العتق والولاء، فضل عتق الرقاب وعتق الزانية، صفحہ 542

یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ یوم میں عامل وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ ہے کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہے ولہ أجر کریم فی یوم تری فیہ المؤمنین والمؤمنات یسعی نورھم یعنی وہ پل صراط پر سے گزریں گے۔ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ یعنی ان کے سامنے وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ فراء نے کہا: باء، فی کے معنی میں ہے یا یہ عن کے معنی میں ہے۔ ضحاک نے کہا: نُوۡرُہُمۡ سے مراد ان کی ہدایت ہے وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ سے مراد ان کی کتب ہیں؛ طبری نے اسے پسند کیا ہے، یعنی ان کا ایمان اور عمل صالح ان کے سامنے ہوگا اوروں کے ہاتھوں میں ان کے اعمال کی کتابیں ہوں گی (1)۔ اس تعبیر کی بنا پر ھذا، فی کے معنی میں ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر وقف نہ کیا جائے۔ سہل بن سعد ساعدی اور ابوحیوہ نے بایمانھم الف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا مراد وہ ایمان لیا ہے (2) جو کفر کی ضد ہے اور جو ظرف نہیں اس کا عطف ظرف پر ہے کیونکہ ظرف کا معنی حال ہے یہ محذوف کے متعلق ہے معنی ہوگا یسعی کائنا بین أیدیھم و کائنا بأیمانھم، بین أیدیھم کا قول یسعی کی ذات کے متعلق نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نور سے مراد قرآن ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان کو ان کے اعمال کے مطابق نور عطا کیا جائے گا (3)، ان میں سے کوئی ایسا ہوگا جس کو نور کھجور کے درخت جیسا دیا جائے گا اور ان میں سے کوئی ایسا ہوگا جس کو نور کھڑے آدمی کی طرح دیا جائے گا، ان میں سے سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کے پاؤں کے انگوٹھے میں نور ہوگا جو کسی وقت بھی بجھ جائے گا اور کسی وقت روشن ہو جائے گا۔ قتادہ نے کہا: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومنوں میں سے کچھ مومن ایسے ہوں گے جن کا نور مدینہ اور عدن کے درمیان کا علاقہ روشن کر دے گا یا مدینہ طیبہ اور صنعاء کے درمیان کا علاقہ منور کر دے گا یہاں تک کہ ان میں سے ایک ایسا مومن بھی ہوگا جس کا نور صرف اس کے قدموں کی جگہ کو روشن کرے گا''۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ''تا کہ وہ اس نور کے ساتھ صراط پر روشنی حاصل کریں''۔ جس طرح پہلے بات گزر چکی ہے۔ مقاتل نے کہا: ''تا کہ یہ جنت کی طرف ان کے لیے راہنما بن جائے''۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

بُشۡرٰىکُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ تقدیر کلام یہ ہے یقال لھم بشراکم الیوم یعنی قول محذوف ہے۔ یعنی آج تمہیں جنات میں داخل ہونے کی بشارت ہے۔ مضاف کو حذف کرنا ضروری ہے کیونکہ بشریٰ امر حدثی ہے اور جنت عینی چیز ہے اس لیے بشریٰ تو جنت نہیں ہو سکتی۔ ان کی رہائشوں کے نیچے دودھ، پانی، شراب اور شہد کی نہریں رواں ہوں گی۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا یہ دخول محذوف سے حال ہے، تقدیر کلام یہ ہے بشراکم الیوم دخول جنات تجری من تحتھا الانھار اس میں ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے یہ بُشۡرٰىکُمُ سے حال نہیں کیونکہ صلہ اور موصول کے درمیان فاصلہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بشریٰ جس پر دلالت کر رہا ہے اس سے حال ہو گویا کہا: تبشرون خالدین۔ یہ بھی جائز ہے کہ ظرف جو الیوم ہے یہ بشراکم کی خبر ہو اور جنات یہ بشریٰ سے بدل ہو اور مضاف محذوف ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ خٰلِدِیۡنَ حال ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے جنات پر نصب کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ حال ہے اس شرط پر کہ الۡیَوۡمَ، بُشۡرٰىکُمُ کی خبر ہے جب کہ یہ بعید ہے کیونکہ جنات میں فعل کا معنی موجود نہیں اس امر کو جائز قرار دیا کہ بُشۡرٰىکُمُ منصوب ہو معنی یہ ہے

1۔ تفسیر طبری، جز 27، صفحہ 260　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 261　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 473

یبشرونهم بشرای اور جنات کو نصب بشرای کی وجہ سے ہو اس صورت میں صلہ اور موصول میں فرق ہوگا۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

''اس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے (اے نیک بختو!) ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کر لیں تمہارے نور سے (انہیں) کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور (وہاں) نور تلاش کرو، پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا اس کے باطن میں رحمت اور اس کے ظاہر کی جانب عذاب ہوگا۔ منافق پکاریں گے اہل ایمان کو کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، کہیں گے بے شک! لیکن تم نے اپنے آپ کو خود فتنوں میں ڈال دیا اور (ہماری تباہی کا) انتظار کرتے رہے اور شک میں مبتلا رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی امیدوں نے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان آپہنچا اور دھوکہ دیا تمہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں شیطان (دغاباز) نے۔ پس آج نہ تم سے فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کفار سے، تم (سب کا) ٹھکانا آتش (جہنم) ہے، وہ تمہاری رفیق ہے اور بہت بری جگہ ہے لوٹنے کی''۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ، يَوْمَ میں عامل ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پہلے یوم سے بدل ہے(1)۔ انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ عام قرأت ہمزہ وصلی اور ظاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ نظر سے مشتق ہے۔ نظر، انتظار کے معنی میں ہے یعنی ہمارا انتظار کیجئے۔ اعمش، حمزہ اور یحییٰ بن وثاب نے اَنْظِرُوْنَا الف قطعی اور ظاء کے کسر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ انظار سے مشتق ہے یعنی ہمیں مہلت دو۔ انظرتہ میں نے اسے مہلت دی، استنظرتہ میں نے اس سے مہلت طلب کی۔ فراء نے کہا: عرب کہتے انظرنی انتظرنی اور عمرو بن کلثوم کا شعر پڑھا:

أبا هِندٍ فلا تَعْجَلْ عَلَيْنَا　وأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ اليَقِينَا(2)

اے ابو ہند! ہم پر جلدی نہ کرو، ہمارا انتظار کرو ہم تجھے یقینی خبر دیتے ہیں۔

شعر میں انظرنا، انتظرنا کے معنی میں ہے۔

نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کرتے ہیں(3)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوامامہ نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 261　2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 262　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 474

قیامت کے روز لوگوں پر ظلمت چھا جائے گی۔ ماوردی نے کہا: میں گمان کرتا ہوں۔ یہ فیصلہ کے بعد ہوگا۔ پھر انہیں نور عطا کیا جائے گا جس میں وہ چلیں گے۔ مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مومنوں کو ان کے اعمال کے مناسب نور عطا فرمائے گا جس کی مدد سے وہ صراط پر چلیں گے۔ منافقوں کو نور دیا جائے گا انہیں دھوکہ دینے کے لیے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَ هُوَ خَادِعُهُمْ (النساء:142) ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں نور دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے سب اہل دعوت تھے کافروں کو نور نہیں دیا جائے گا(1)۔

پھر منافق کا نور اس کے نفاق کی وجہ سے سلب کر لیا جائے گا؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت ابوامامہ نے کہا: مومن کو نور دیا جائے گا اور کفار و منافق کو نور کے بغیر چھوڑ دیا جائے گا۔ کلبی نے کہا: منافق مومنوں کے لیے نور سے روشنی حاصل کرنا چاہیں گے انہیں نور نہیں دیا جائے گا اسی اثناء میں کہ وہ چل رہے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان میں ہوا اور تاریکی بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ منافقوں کے نور کو بجھا دے گا؛ اللہ تعالیٰ کے فرمان رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (التحریم:8) کا یہی مصداق ہے۔ یہ مومن عرض کریں گے کیونکہ انہیں ڈر ہوگا کہ کہیں ان کا نور بھی سلب نہ کر لیا جائے جس طرح منافقوں کا نور سلب کیا گیا۔ جب منافق تاریکی میں رہیں گے تو وہ اپنی قدموں کی جگہ کو بھی نہ دیکھیں گے تو وہ مومنوں سے کہیں گے: انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ۔

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فرشتے انہیں کہیں گے: واپس پلٹ جاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بات مومن انہیں کہیں گے کہ اس جگہ کی طرف لوٹ جاؤ جہاں سے ہم نے نور حاصل کیا ہے وہاں سے اپنے لیے نور حاصل کرو کیونکہ تم ہمارے نور سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ جب وہ نور کی تلاش میں واپس پلٹیں گے تو درمیان میں دیوار بنا دی جائے گی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تم نے دنیا سے اپنا نور کیوں طلب نہیں کیا کہ تم ایمان لاتے۔ بِسُوْرٍ یعنی سور میں باء زائدہ ہے، یہ نسائی کا قول ہے۔ سور یہ جنت اور دوزخ کے درمیان آڑ ہوگی۔ ایک روایت یہ کی گئی ہے کہ ''وہ دیوار بیت المقدس میں ہوگی یہ اس جگہ ہوگی جو وادی جہنم کے نام سے معروف ہے''۔

بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ جس جانب مومن ہوں گے وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یعنی جس جانب منافق ہوں گے۔ کعب الاحبار نے کہا: مراد وہ دروازہ ہے جو بیت المقدس میں ہے جو باب رحمت کے نام سے معروف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: یہ بیت المقدس کی مشرقی دیوار ہے جس کی اندر کی جانب رحمت ہے اور باہر کی جانب جہنم ہے؛ اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ زیاد بن ابی سوادہ نے کہا: حضرت عبادہ بن صامت بیت المقدس کی مشرقی دیوار پر کھڑے ہوئے اور رو دیے اور کہا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ آپ نے یہاں سے جہنم کو دیکھا۔ قتادہ نے کہا: یہ جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار ہے۔ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ رحمت سے مراد جنت ہے وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ عذاب سے مراد جہنم ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ حجاب ہے جس طرح سورۂ اعراف میں ہے، اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 474

بے شک رحمت جس کے باطن میں سے مراد مومنین کا نور ہے اور عذاب جس کے ظاہر میں سے مراد منافقین کی تاریکی ہے۔

يُنَادُوْنَهُمْ منافق مومنوں کو ندا دیں گے۔ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ کیا وہ دنیا میں تمہارے ساتھ نہ تھے یعنی ہم نماز پڑھتے تھے جس طرح تم نماز پڑھتے تھے، ہم جہاد کرتے جس طرح تم جہاد کیا کرتے تھے اور ہم وہی کام کیا کرتے تھے جس طرح تم کیا کرتے تھے (1)۔ قَالُوْا بَلٰى مومن کہیں گے: کیوں نہیں تم ظاہراً ہمارے ساتھ تھے وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ یعنی تم نے اپنے آپ کو فتنہ میں مبتلا کیا۔ مجاہد نے کہا: تم نے نفاق کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کیا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: معاصی کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کیا (3)؛ یہ ابوسنان کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شہوات اور لذات کے ساتھ ہلاک کیا (4)، یہ ابونمیر ہمدانی نے روایت کیا ہے۔

وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت اور مومنین کے لیے حادثات زمانہ کا انتظار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم نے توبہ کا انتظار کیا اور توحید و نبوت میں شک کیا (5)۔ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ باطل چیزوں نے تمہیں دھوکہ میں مبتلا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لمبی امیدوں نے تمہیں دھوکہ میں مبتلا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے جو مومنوں کو کمزور ہونے اور اس کے بارے میں مصائب کے نازل ہونے کی آرزو رکھتے تھے۔ قتادہ نے کہا: یہاں أمانی سے مراد شیطان کا دھوکہ ہے (6)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد دنیا ہے؛ یہ حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے۔ ابوسنان نے کہا: مراد ان کا یہ قول ہے (7) سیغفر لنا ہلال بن سعد نے کہا: تیرا اپنی نیکیوں کو یاد کرنا اور اپنی برائیوں کو بھلا دینا یہ دھوکہ ہے۔

حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ مراد موت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اپنے نبی کی مدد ہے۔ قتادہ نے کہا: مراد انہیں جہنم میں پھینکنا ہے۔ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ یعنی شیطان نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد دنیا ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا: باقی کے لیے ماضی میں عبرت ہے بعد والے کے لیے پہلے میں جھڑک ہے۔ سعید وہ ہے جو طمع سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو اور دھوکہ دینے والی چیزوں کی طرف مائل نہ ہو۔ جو موت کو یاد کرتا ہے آرزو کو بھول جاتا ہے، جو امید کو لمبا کرتا ہے عمل کو بھول جاتا ہے اور موت سے غافل ہو جاتا ہے۔ غرور کا لفظ مبالغہ کا وزن ہے مقصود کثرت کا اظہار ہے۔ ابوحیوہ، محمد بن سمیقع اور سماک بن حرب نے غُرور پڑھا ہے یعنی غین پر ضمہ ہے۔ مراد باطل امور ہیں یہ مصدر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے خط لگائے اور ایک ان سے ایک جانب لگایا فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ انسان اور اس کی تمنا کی مثال ہے، وہ خطوط درمیان میں امیدیں ہیں اسی اثناء میں کہ وہ تمنا کرتا ہے تو اسے موت آجاتی ہے'' (8)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط لگایا اس کے درمیان ایک خط لگایا اور اسے مربع سے باہر نکالا، اس کی دائیں بائیں چھوٹے خطوط لگائے فرمایا: ''یہ انسان ہے، یہ اس کی موت ہے جو اس کو ہر طرف

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 476 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً
6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، الأمل والأجل، صفحہ 322

سے گھیرے ہوئے ہے، یہ اس کی آرزو ہے جو اس کی موت سے باہر نکل رہی ہے، یہ چھوٹے خطوط آفتیں ہیں اگر یہ خطا جائے تو دوسری اسے نوچ لیتی ہے اگر دوسری خطا جائے تو یہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے''۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ خطاب منافقوں کو ہے وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا انہیں نجات سے مایوس کر دیا۔ عام قرأت یؤخذ ہے کیونکہ فدیۃ مونث غیر حقیقی ہے کیونکہ اس کے درمیان اور فعل کے درمیان فاصلہ ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے تُؤخذ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیونکہ فدیۃ مونث ہے پہلی قرأت کو ابو عبید نے اختیار کیا ہے یعنی تم سے بدل، عوض اور کوئی اور نفس قبول نہ کیا جائے گا۔

مَاْوٰىكُمُ النَّارُ یعنی تمہارا مقام اور تمہاری منزل جہنم ہے هِيَ مَوْلٰىكُمْ یہی تمہارے حق میں مناسب اور بہترین ہے۔ مولی اسے کہتے ہیں جو انسان کے مصالح کا ذمہ دار ہوتا ہے پھر اس کا استعمال اس شخص کے بارے میں ہونے لگا جو کسی چیز کو لازم ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آگ ان کے امور کی مالک ہوگی، معنی ہے اللہ تعالیٰ اس میں زندگی اور عقل پیدا فرما دے گا وہ کفار پر غصہ کی وجہ سے پھٹ جائے گی، اس وجہ سے اس ارشاد میں اسے خطاب کیا گیا: يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ۝ (ق)

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝ وہ کتنی بری لوٹنے کی جگہ اور کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝

''کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لیے کہ جھک جائیں ان کے دل یاد الٰہی کے لیے اور اس سچے کلام کے لیے جو اترا ہے اور نہ بن جائیں ان لوگوں کی طرح جنہیں کتاب دی گی اس سے پہلے پس لمبی مدت گزر گئی ان پر تو سخت ہو گئے ان کے دل اور ایک کثیر تعداد ان میں سے نافرمان بن گئی۔ جان لو! اللہ تعالیٰ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مرنے کے بعد، ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں تمہارے لیے (اپنی) نشانیاں تا کہ تم سمجھو''۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، يَاْنِ کا معنی ہے قریب ہونا قوت آنا، شاعر نے کہا

أَلَمْ يَأْنِ لِي يَا قَلْبُ أَنْ أَتْرُكَ الْجَهْلَا وأن يُحْدِثَ الشَّيْبُ المبينُ لنا عَقْلَا

اے میرے دل! کیا میرے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ میں جہالت کو ترک کر دوں اور یہ بڑھاپا میرے لیے عقل کو پیدا کر دے۔

اس فعل کا ماضی انی الف مقصورہ کے ساتھ ہے مضارع یانی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے آن لك أن تفعل كذا، يئين أينا يعنی

وہ وقت آ گیا ہے کہ تو اس طرح کرے۔ یہ أنی للک کی مثل ہے یہ اس سے مقلوب ہے۔ ابن سکیت نے یہ شعر پڑھا:

أَلَمَّا يَبِنْ لِي أَنْ تَجَلَّى عَمَايَتِي وَأُقْصِرُ عن لَيْلَى بَلَى قَدْأَنَى لِيَا

کیا میرے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ میری گمراہی عیاں ہو جائے اور میں لیلی سے ہاتھ کھینچ لوں کیوں نہیں میرے لیے وہ وقت آ چکا ہے۔

دونوں لغتوں کو جمع کیا۔ حضرت حسن بصری نے پڑھا أَلَمَّا یأن اس کی اصل أَلَمْ ہے (1) اس میں ما زائدہ ہے۔ یہ قائل کے قول کی نفی ہے جو قد کان کذا ہے اور لم اس کے قول کان کذا کی نفی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے اسلام لانے اور اس آیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں عتاب کیا چار سال کا عرصہ حائل تھا (2)۔ خلیل نے کہا: عتاب سے مراد ناراضگی کا ذکر ہے تو کہتا ہے: عاتبته معاتبة۔

اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ، تَخْشَعَ کا معنی ہے مطیع ہونا اور نرم ہونا۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ مزاح اور ہنسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں بہت زیادہ ہو گیا جب وہ مدینہ طیبہ میں خوشحال ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے خشوع میں آہستگی پاتا ہے'' تو اس موقع پر صحابہ نے کہا: ہم نے خشوع کو اپنایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کے دلوں میں سستی پائی تو نزول قرآن کے تیرہویں سال انہیں عتاب کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہجرت کے ایک سال بعد منافقین کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی؛ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ منافقین نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کیا کہ وہ انہیں تورات کے عجائب بیان کریں۔ تو الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (یوسف) تک آیات نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ یہ غیر سے زیادہ حسین اور زیادہ نفع مند ہے۔ تو وہ حضرت سلمان سے سوال کرنے سے رک گئے۔ انہوں نے پھر پہلے کی طرح آپ سے سوال کیے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس تاویل کی بنا پر ایمان داروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبان سے ایمان لائے۔

سدی وغیرہ نے کہا: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظاہراً ایمان لائے اور کفر کو چھپائے ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مومنین کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت سعد نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ ہمیں کوئی قصہ بیان کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ (یوسف:3) کچھ عرصہ بعد انہوں نے عرض کی: کاش! آپ کچھ بیان کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (الزمر:23) انہوں نے کچھ عرصہ بعد عرض کی: کاش! آپ کچھ ذکر کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ کہا: ہمارے اسلام لانے اور اس آیت کے ذریعے ہمارے عتاب کے درمیان چار سال کا عرصہ حائل ہے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور ہر کوئی یہ کہتا: ہم نے کیا کیا ہے؟ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں سستی پائی جب کہ وہ مخلوقات میں سے وہ سب سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 264
2۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 421

زیادہ اسے محبوب تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے مگر حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر ایمان نہ لائے کیونکہ اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ (الحدید: 19) یعنی وہ لوگ جو تورات اور انجیل پر ایمان لائے ان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل قرآن کے لیے نرم ہوں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے متقدمین کی طرح کیوں نہ ہوئے؟ جب ان لوگوں اور ان کے نبی کے درمیان عرصہ زیادہ ہوا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔

وَلَا يَكُوْنُوْا یہ الایکونوا ہے اس کا عطف اَنْ تَخْشَعَ پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہی ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے اس کا مجاز لا یکونن ہے اس تاویل کی دلیل حضرت رویس کی روایت ہے جو یعقوب سے مروی ہے کہ یہ لا تکونوا ہے۔ یہ عیسیٰ اور ابن اسحاق کی قرأت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یہودیوں اور نصاریٰ کے راستہ پر نہ چلو جنہیں تورات اور انجیل دی گئی تو ان کا زمانہ طویل ہو گیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جب بنی اسرائیل پر طویل زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے، انہوں نے اپنی جانب سے ایک کتاب گھڑلی حق ان کے اور ان کی خواہشوں کے درمیان حائل ہو جاتا یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت پھینک دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں پھر انہوں نے کہا: اس کتاب کو بنی اسرائیل پر پیش کرو اگر وہ تمہاری پیروی کریں تو تم انہیں چھوڑ دو بصورت دیگر انہیں قتل کر دو۔ پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ وہ اسے ان کے علماء میں سے ایک عالم کے پاس بھیجتے ہیں اور کہا: اگر اس نے ہماری موافقت کی تو کوئی بھی ہماری مخالفت نہ کرے گا اگر اس نے انکار کیا تو ہم اسے قتل کر دیں گے تو اس کے بعد کوئی بھی ہماری مخالفت نہیں کرے گا۔ انہوں نے اس عالم کو بلا بھیجا اس نے اللہ کی کتاب ورقہ میں لکھی اسے ایک سینگ میں رکھا اور اسے گلے میں لٹکا لیا، پھر اس پر اپنے کپڑے پہن لیے۔ پھر وہ ان کے پاس آیا انہوں نے اس پر اپنی کتاب پیش کی اور کہا: کیا تو اس کتاب پر ایمان رکھتا ہے؟ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر مارا۔ اس نے کہا: میں اس (یعنی جو سینے پر لٹک رہی ہے) پر ایمان لایا تو بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ ان میں بہترین اس سینگ والے تھے۔

حضرت عبد اللہ نے کہا: تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ برائیاں دیکھے گا جب وہ برائی دیکھے اور وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اس کو تبدیل کر سکے تو اس کے دل کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ جانے کہ وہ اس برائی کو ناپسند کرتا ہے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: مراد اہل کتاب میں سے مومن ہیں جن پر عرصہ طویل ہو گیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں دیری محسوس کی۔

فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے رہبانیت شروع کی یعنی گرجے والوں نے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو فقہ نہیں جانتے جس کو وہ اپنائیں اور جو علم رکھتے ہیں اس کے خلاف عمل کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ایمان دار نہیں۔ ان میں سے ایک طائفہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم رہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو وہ آپ پر ایمان لائے۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین سے پھر گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فاسق قرار دیا۔ محمد بن کعب نے کہا: صحابہ کرام مکہ مکرمہ میں تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے، جب انہوں نے ہجرت کی تو خوشحال ہوئے تو جس حال میں پہلے تھے اس میں سستی ہوئی تو ان کے دل

سخت ہو گئے اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت کی تو انہیں افاقہ ہو گیا۔

ابن مبارک نے ذکر کیا: امام مالک بن انس نے ذکر کیا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ باتیں نہ کیا کرو ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے۔ سخت دل اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے لیکن تم علم نہیں رکھتے لوگوں کے گناہوں کو نہ دیکھو گویا تم مالک ہو انہیں دیکھو یا فرمایا: اپنے گناہ دیکھو گویا تم غلام ہو۔ بے شک لوگوں کی دو قسمیں ہیں جو عافیت میں ہیں یا جنہیں آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ جو لوگ آزمائش میں مبتلا ہیں ان پر رحم کرو اور عافیت پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرو۔ یہ آیت کریمہ حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت عبداللہ بن مبارک کی توبہ کا باعث بنی۔

ابو مطرف عبدالرحمن بن مروان قلانسی سے ذکر کیا کہ محمد بن حسن بن اشیق، علی بن یعقوب زیات سے وہ ابراہیم بن ہشام سے وہ زکریا ابن ابی ابان سے وہ لیث بن حرث سے وہ حسن بن داہر سے روایت کرتے ہیں: ایک روز اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے باغ میں تھا یہ وہ وقت تھا جب باغ میں مختلف قسم کے پھل موجود تھے ہم نے رات تک کھایا پیا پھر سو گئے میں عود و طنبور بجانے کا عادی تھا۔ میں رات کے کسی حصہ میں اٹھا، میں نے ایک راگ گانا چاہا جسے راشین السحر کہتے سنان نے گانے کا ارادہ کیا جب کہ ایک پرندہ میرے سر کے اوپر ایک درخت پر چیخ رہا تھا، عود میرے ہاتھ میں تھا جس کا میں ارادہ کر رہا تھا وہ اس طرح نہیں بج رہا تھا اچانک وہ یوں بولنے لگا جس طرح انسان بولتا ہے: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! میں نے عود کو توڑ دیا اور جو مال میرے پاس تھا اس کو صرف کر دیا یہ میرا زہد اور تگ و دو کا پہلا مرحلہ تھا۔ ہم تک وہ اشعار بھی پہنچے ہیں جو حضرت ابن مبارک نے عود پر بجانا چاہا:

أَلَمْ يَأْنِ لِي مِنكَ أَنْ تَرْحَمَا وتَعْصِ العَواذِلَ واللُّوَّمَا

وتَرْثِي لِصَبٍّ بِكُم مُغْرَمٍ أَقامَ على هَجْرِكُم مَأْتَمَا

يَبِيتُ إذا جَنَّهُ لَيْلُهُ يُراعِي الكَواكِبَ والأَنْجُمَا

وما ذا على الظَّبيِ لَوْ أَنَّهُ أَحَلَّ مِنَ الوَصْلِ ما حَرَّمَا

کیا میرے لیے تیری جانب سے وہ وقت نہیں آیا کہ تو رحم کرے اور ملامت کرنے والوں کی نافرمانی کرے اور اپنے عاشق پر شفقت کرے جو بڑی مصیبت میں ہے وہ تمہارے فراق میں ماتم کر رہا ہے۔ جب رات تاریک ہو جاتی ہے تو وہ کواکب اور انجم شماری کرتا رہتا ہے۔ اس ہرن کو کیا ہوگا اگر وہ اس وصل کو حلال کر دے جس کو اس نے حرام کر رکھا ہے۔

جہاں تک فضیل بن عیاض کا تعلق ہے اس کی توبہ کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک لڑکی پر عاشق تھا اس نے ان سے رات کے وقت کا وعدہ کیا۔ اسی اثنا میں کہ وہ دیواریں چڑھ رہے تھے تو ایک قاری کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو واپس پلٹ آئے اور کہہ رہے تھے: کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! وہ وقت آ چکا ہے۔ وہ رات انہیں ایک کھنڈر تک لے گئی جہاں مسافروں کی ایک جماعت تھی وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے: فضیل ڈاکو ہے۔ فضیل نے کہا: افسوس! میں اپنی رات اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں گزارتا ہوں مسلمانوں میں سے ایک قوم مجھ سے ڈرتی ہے، اے اللہ! میں نے توبہ کر لی ہے اور میں نے اپنی توبہ اس طرح کی ہے کہ

میں تیرے بیت اللہ میں ہی رہوں گا۔

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا بنجر زمین کو بارش کے ساتھ اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ صالح مری نے کہا: دلوں کی سختی کے بعد ان کو نرم کر دیتا ہے۔ جعفر بن محمد نے کہا: ظلم کے بعد عدل کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافر کو ایمان کی طرف ہدایت دے کر زندہ کرتا ہے جب کہ کفر اور گمراہی کے ساتھ اسے مارتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسی طرح اللہ تعالیٰ امتوں میں سے مردوں کو زندہ کرتا ہے ان میں سے جو خشوع والے دل ہیں اور سخت دل ہیں ان میں فرق کرتا ہے۔

قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ زمین کے مردہ ہونے کے بعد انہیں زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے کہ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝

"بے شک صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دیا کئی گنا بڑھا دیا جائے گا ان کے لیے (ان کا مال) اور انہیں فیاضانہ اجر ملے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی (خوش نصیب) اللہ کی جناب میں صدیق اور شہید ہیں، ان کے لیے (خصوصی) اجر اور ان کا (مخصوص) نور ہے، اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ تو دوزخی ہیں"۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ ابن کثیر اور ابو بکر نے عاصم سے دونوں میں صاد کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یہ تصدیق سے مشتق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا اس کی وہ تصدیق کرتے ہیں باقی نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل میں یہ المتصدقین اور المتصدقات تھا تاء کو صاد میں مدغم کیا گیا ہے اسی وجہ سے فرمایا: وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا صدقہ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی قرض حسن کا ذکر ہے اس سے مراد نفل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عمل صالح ہے وہ صدقہ ہو یا کوئی اور صورت ہو جب کہ وہ ثواب کی نیت رکھتا ہو اور اپنی نیت میں سچا ہو۔ فعل کا عطف اسم پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ اسم فعل کے حکم میں ہے مراد ہے ان الذین صدقوا و اقرضوا ہے۔ یُّضٰعَفُ لَهُمْ انہیں اس کا کئی گنا عطا کیا جائے گا۔ عام قرأت عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یہ فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ اعمش نے اسے یُضاعفه پڑھا ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب نے یُضعّفُ پڑھا ہے۔ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝ مراد جنت ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ

الشُّهَدَآءُ کے بارے میں اختلاف ہے کیا یہ ماقبل سے مقطوع ہے یا متصل ہے؟ مجاہد اور زید بن اسلم نے کہا: شہداء اور صدیقین ہی مومنین ہیں اور یہ ماقبل سے متصل ہے اسی کی ہم معنی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ اس اعتبار سے الصِّدِّيقُوْنَ پر وقف نہیں کیا جائے گا؛ آیت کی تاویل میں یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ قشیری نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء:69) صدیقین کا مرتبہ ہی انبیاء کے بعد ہوتا ہے، شہداء ہی وہ لوگ ہیں جو صدیقین کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں اور صالحین کا درجہ شہداء کے بعد ہوتا ہے تو یہ جائز ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں ہو جنہوں نے رسولوں کی تصدیق کی میری مراد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ تو شہداء کا معنی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دیں۔ تو ایک صدیق دوسرے صدیق سے درجات میں بلند ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت اعلیٰ کے مکین اپنے سے کم مرتبہ جنتیوں کو یوں دیکھیں گے جس طرح تم میں سے کوئی ستارے کو آسمان کے افق میں دیکھتا ہے'' حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ان میں سے ہیں اور فضیلت میں بڑھ کر ہیں۔

حضرت ابن مسعود اور مسروق سے روایت مروی ہے کہ شہداء صدیقین کے علاوہ ہیں۔ اس تاویل کی بناء پر شہداء ماقبل سے منفصل ہیں اور وقف اللہ تعالیٰ کے فرمان الصِّدِّيْقُوْنَ پر اچھا ہے۔ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ کا معنی ہے ان کے لیے ان کے انفس کا اجر اور نور ہوگا۔ ان کے بارے میں دو قول ہیں۔

(۱) وہ رسل ہیں وہ اپنی امتوں کے بارے میں تصدیق اور تکذیب کی گواہی دیں گے؛ یہ کلبی کا قول ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء) (۲) وہ رسولوں کی امتیں ہیں وہ قیامت کے روز گواہی دیں گے جس کے بارے میں گواہی دیں گے اس میں دو قول ہیں (۱) وہ اپنے بارے میں گواہی دیں گے جو وہ طاعت و معصیت کا عمل کرتے رہے؛ یہ مجاہد کے قول کا معنی ہے (۲) وہ انبیاء کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی امتوں کو رسالت کی تبلیغ کی؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ مقاتل نے ایک تیسرا قول بھی کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے ہیں، اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے اس سے مراد مومنوں کے شہید لیے ہیں۔ واؤ ابتداء کی واؤ ہے۔ اس قول کی بنا پر صدیقین شہداء سے الگ ہیں ان کی تعیین میں اختلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: وہ آٹھ افراد ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی شیر خدا، حضرت زید، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی موافقت کی جب آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے ساتھ ملا دیا۔ مقاتل بن حیان نے کہا: صدیقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسولوں پر ایمان لائے، آنکھ جھپکنے کے برابر بھی ان کی تکذیب نہ کی جس طرح آل فرعون کا مومن، صاحب آل یاسین، حضرت ابوبکر صدیق اور اصحاب اخدود (خندقوں والے)۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ آیات سے مراد رسل اور معجزات ہیں اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ ان کے لیے نہ اجر ہے اور نہ ہی نور ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ
حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

''خوب جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل، تماشا اور (سامان) آرائش ہے اور آپس میں (حسب ونسب پر) اترانا اور ایک دوسرے سے زیادہ مال اور اولاد حاصل کرنا، اس کی مثال یوں سمجھو جیسے بادل برسے اور نہال کر دے کسانوں کو اس کی (شاداب سرسبز) کھیتی ہو وہ (یکایک) سوکھنے لگے تو تو اسے دیکھے کہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا ہے پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے، اور (دنیا پرستوں کے لیے) آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔ اور (خدا پرستوں کے لیے) الله کی بخشش اور (اس کی) خوشنودی ہوگی، اور نہیں ہے دنیوی زندگی مگر نرا دھوکہ۔ تیزی سے آگے بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے جو تیار کر دی گئی ہے ان کے لیے جو ایمان لے آئے الله پر اور اس کے رسولوں پر، یہ الله کا فضل (وکرم) ہے عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور الله تعالیٰ بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے''۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ اتصال کی صورت یہ ہے کہ انسان بعض اوقات قتل اور موت کے خوف سے جہاد ترک کر دیتا ہے۔ اس امر کو بیان کیا کہ دنیاوی زندگی حقیر چیز ہے اس لیے مناسب نہیں کہ جو چیز باقی رہنے والی نہیں اس کے خوف سے الله تعالیٰ کے امر کو ترک کر دیا جائے۔ ما زائد ہے تقدیر کلام یہ ہے جان لو دنیاوی زندگی باطل، کھیل اور خوشی کا لہو ہے پھر یہ ختم ہو جائے گا۔ قتادہ نے کہا: لعب ولہو کا معنی ہے کھانا اور پینا۔

مجاہد نے کہا: یہ لعب لہو ہے۔ سورۃ الانعام میں یہ معنی گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لعب سے مراد ہے جو دنیا میں رغبت پیدا کرے اور لہو سے مراد ہے جو آخرت سے غافل کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لعب سے مراد مال جمع کرنا اور لہو سے مراد عورتیں ہیں۔ وَّزِيْنَةٌ زینت سے مراد وہ چیز ہے جس سے زینت حاصل کی جاتی ہے۔ کافر دنیا سے زینت حاصل کرتا ہے اور آخرت کے لیے عمل نہیں کرتا اسی طرح وہ شخص جو الله تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز سے زینت حاصل کرتا ہے۔

وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ یعنی تم میں سے بعض بعض پر اس کے ذریعے فخر کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خلقت اور قوت پر فخر کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عربوں کی عادت کے مطابق انساب پر فخر کرتے ہو۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''الله تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم باہم تواضع کرو یہاں تک کہ کوئی دوسرے پر سرکشی نہ کرے اور کوئی

دوسرے پر فخر نہ کرے''۔ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے: ''میری امت میں چار چیزیں جاہلیت سے تعلق رکھتی ہیں انساب پر فخر کرنا''۔ یہ تمام باتیں پہلے گزر چکی ہے۔

وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کیونکہ دور جاہلیت کی عادت تھی کہ بیٹوں اور اموال پر فخر کیا جاتا تھا مومنین کا فخر ایمان اور طاعت پر ہے۔ بعض متاخرین نے کہا: لعب سے مراد بچوں کا کھیلنا ہے اور لہو سے مراد نوجوانوں کا لہو ہے۔ زِيْنَةٌ عورتوں کی زینت ہے، تفاخر سے مراد ساتھیوں کا فخر کرنا ہے، تکاثر سے مراد تاجروں کا مال پر فخر کرنا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: دنیا انہیں چیزوں کی طرح زائل اور فنا ہونے والی ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت عمار سے فرمایا: دنیا کے بارے میں غمگین نہ ہو کیونکہ دنیا چھ چیزیں ہیں ماکول، مشروب، ملبوس، مشموم (جس کو سونگھا جائے) مرکوب، منکوح۔ بہترین کھانا شہد ہے یہ مکھی کا لعاب ہے، اکثر مشروب پانی ہے اس میں تمام حیوانات برابر ہیں، بہترین لباس ریشم ہے یہ کیڑے کا بنا ہوتا ہے، افضل خوشبو کستوری ہے یہ نافہ کا خون ہوتا ہے، بہترین سواری گھوڑا ہے اس پر سوار ہو کر لوگ قتل ہوتے ہیں، بہترین نکاح کی گئی عورتیں ہیں وہ بول کا محل بول کے محل میں ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم! عورت اپنے بہترین حصہ کو مزین کرتی ہے جس کے ساتھ اس کے قبیح ترین حصہ کا ارادہ کیا جاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال ایسی کھیتی سے دی جس پر بارش ہوئی ہو، فرمایا: كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ، غَيْثٍ سے مراد بارش ہے یہاں کفار سے مراد کاشتکار ہیں کیونکہ وہ بیج کو زمین میں دباتے ہیں۔ معنی ہے دنیاوی زندگی اس کھیتی کی مانند ہے جو زیادہ بارشوں کے باعث اپنی سرسبزی کے ساتھ دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے پھر وہ تھوڑے وقت میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے گویا وہاں کوئی کھیتی تھی ہی نہیں۔ جب وہ کاشتکاروں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت حد درجہ حسین ہوتی ہے۔ اس کی مثل گفتگو سورۂ یونس اور سورۂ کہف میں گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں کفار سے مراد اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والے ہیں کیونکہ مومنین کے مقابلہ میں وہ دنیا کی زینت سے زیادہ خوش ہونے والے ہیں۔ یہ بہت اچھا قول ہے کیونکہ اعجاب (خوش ہونا) اصل میں ان کے لیے اور انہی میں ہوتا ہے اور انہیں سے یہ چیز ظاہر بھی ہوتی ہے وہ دنیا اور مافیہا کی عظمت بجالاتا ہے موحدین میں تو اس کی حیثیت فرع کی سی ہوتی ہے جو ان کی شہوات سے جنم لیتی ہے۔ جب وہ آخرت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے نزدیک یہ کم ہو جاتی ہے۔ یہاں کاف کا محل رفع ہے کیونکہ یہ صفت ہے ثُمَّ يَهِيْجُ یعنی سرسبز و شاداب ہونے کے بعد وہ خشک ہو جاتی ہے۔ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا جو اس پر ترو تازگی تھی وہ متغیر ہو جاتی ہے ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وہ ٹکڑے ٹکڑے اور تنکا ہو جاتی ہے اس کے بعد اس کا حسن جاتا رہتا ہے اسی طرح کافر کی دنیا ہے۔ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ یعنی کافروں کے لیے آخرت میں شدید عذاب ہے۔ اس پر وقف بہت اچھا ہے پھر کلام سے آغاز ہوگا وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ یعنی یہ مومنین کے لیے ہے۔ فراء نے کہا: فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ (الحدید: 28) اس میں تقدیر کلام یہ ہے إما عذاب شديد وإما مغفرة تو لفظ شدید پر کوئی وقف نہیں کیا جائے گا۔

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۝ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے یعنی دنیاوی زندگی کفار کو دھوکہ میں ڈالتی ہے جہاں

تک مومن کا تعلق ہے دنیا اس کے لیے ایسی متاع ہے جو اسے جنت تک پہنچانے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے دنیاوی زندگی کے لیے عمل دھوکے کا بیان ہے یہ دنیا کے لیے عمل کرنے سے روکنا اور آخرت کے لیے عمل میں رغبت دلانا ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اعمال صالحہ کی طرف جلدی کرو جو تمہارے لیے تمہارے رب کی مغفرت کو ثابت کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: توبہ کی طرف جلدی کرو کیونکہ یہ عمل مغفرت کی طرف لے جاتا ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ؛ یہ مکحول کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد پہلی صف ہے۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اگر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جائے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد ہے تمام زمین اور تمام آسمان ایک دوسرے کے ساتھ پھیلا دیئے جائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر ایک آدمی کے لیے اتنی وسیع جنت ہوگی۔ ابن کیسان نے کہا: مراد جنتوں میں سے ایک جنت ہے۔ عرض، طول سے کم ہوتا ہے۔ عربوں کی عادت ہے کہ وہ کسی شی کی وسعت کو عرض سے تعبیر کرتے ہیں اس کی طوالت سے تعبیر نہیں کرتے؛ شاعر نے کہا:

كَاَنَّ بِلَادَ اللّٰهِ وَهِيَ عَرِيْضَةٌ　　عَلَى الْخَائِفِ المطلوبِ كِفَّةُ حَابِلِ

گویا اللہ تعالیٰ کے ملک جب کہ وہ بڑے وسیع وعریض ہیں خوفزدہ اور مطلوب شخص کے لیے شکاری کا پھندہ ہیں۔

یہ سب آل عمران میں بحث گزر چکی ہے۔ طارق بن شہاب نے کہا: اہل حیرہ میں سے ایک جماعت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بتایئے جہنم کہاں ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: بتاؤ جب رات چلی جاتی ہے اور دن آجاتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کی: تو رات میں جو کچھ ہے اسی کو آپ نے اخذ کیا ہے۔

اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ یہاں صرف ایمان کی شرط ہے کوئی اور شرط نہیں اس میں امید کو تقویت دی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ایمان کی شرط ذکر کی اور سورۂ آل عمران میں اضافہ کیا فرمایا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یعنی جنت کو حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اس میں داخل نہیں ہوا جا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کے ساتھ ہی اس میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ یہ بحث سورۂ اعراف وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

''نہیں آئی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی ہے کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں، بے شک یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے (ہم نے تمہیں یہ اس لیے بتا دیا ہے) کہ تم غمزدہ نہ

ہو اس چیز پر جو تمہیں نہ ملے اور نہ اترانے لگو اس چیز پر جو تمہیں مل جائے، اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی مغرور، شیخی باز کو، جو لوگ خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں، اور جو (اللہ کے حکم سے) روگردانی کرے تو بے شک اللہ ہی بے نیاز ہر تعریف کا مستحق ہے''۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ مقاتل نے کہا: مصیبت سے مراد قحط، نباتات اور پھلوں کی قلت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کھیتی میں آفات ہیں۔ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ مراد جو تمہیں بیماریاں لاحق ہوتی ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حدود کا قائم کرنا ہے؛ یہ ابن حبان کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد معاش کی تنگی ہے۔ یہ وہ معنی ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مراد لوح محفوظ ہے۔ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا، ھا ضمیر نفوس، الارض، المصائب یا سب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے قبل اس کے کہ وہ مصیبت کو پیدا کرے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس سے قبل کہ وہ زمین اور نفس کو پیدا کرے۔ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ۞ یعنی ان تمام چیزوں کو پیدا کرنا اور ان کی حفاظت کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ ربیع بن سالم نے کہا: جب حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا گیا تو میں رونے لگا انہوں نے فرمایا: کس چیز نے تجھے رلایا ہے؟ میں نے کہا: میں آپ کے ساتھ جو سلوک دیکھتا ہوں اور جس کی طرف آپ جا رہے ہیں اس کو دیکھ کر رو رہا ہوں۔ فرمایا: نہ رو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ایسا ہو گا کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اس امر کو آسان کر دیا جو انہیں جہاد میں قتل اور زخم کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس امر کی وضاحت کی کہ اموال کی محافظت جو انہیں جہاد سے روکتی ہے اور ان اموال میں جو نقصان ہوا ہے سب مکتوب و مقدر ہے اس کو روکنے والا کوئی نہیں، بندے کے ذمہ امر کی اطاعت ہے۔ پھر انہیں ادب سکھایا تو یہ ارشاد فرمایا: لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ یعنی تم سے جو رزق فوت ہوا ہے اس پر تم غمگین نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے جب وہ جانتے ہیں کہ رزق کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے تو ان کے ہاتھ سے جو چیز نکل چکی ہے اس پر وہ غمگین نہ ہوں گے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے: لایجد أحد کم طعم الایمان حتّی یعلم أنّ ما أصابه لم یکن یخطئه وما أخطأه لم یکن لیصیبه تم میں سے کوئی آدمی ایمان کا ذائقہ نہیں پا سکتا یہاں تک کہ وہ یہ جان لے کہ اسے جو مصیبت پہنچی ہے وہ چھوٹنے والی نہ تھی اور جو نہیں پہنچی وہ پہنچنے والی نہ تھی۔ پھر لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ کی قرآت کی۔ یعنی دنیا میں سے جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے اس پر غمگین نہ ہو کیونکہ یہ تمہارے حق میں مقدر نہ تھی اگر تمہارے حق میں مقدر ہوتی تو وہ تم سے فوت نہ ہوتی۔

وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ یعنی دنیا میں سے جو چیز تمہیں ملتی ہے اس پر خوش نہ ہو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جو تمہیں عافیت اور خوشحالی ملی ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: کوئی آدمی نہیں مگر وہ غمگین بھی ہوتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے۔ لیکن مومن اپنی مصیبت کو صبر اور غنیمت کو شکر بنا دیتا ہے۔ حزن

اور خوشی جن سے منع کیا گیا ہے وہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن میں ایسی چیز کی طرف تجاوز کیا جاتا ہے جو جائز نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿﴾ اسے دنیا میں سے جو عطا کیا گیا ہے اس کے ساتھ تکبر کرنے والا ہے اور اس کے ذریعے لوگوں پر فخر کرتا ہے۔ عام قرأت آتاکم ہے یعنی الف مد کے ساتھ ہے یعنی اس نے تمہیں دنیا میں سے جو چیز عطا کی؛ ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور ابو عمرو نے اتاکم الف کے قصر کے ساتھ اسے پڑھا ہے ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے معنی ہے جو تمہارے پاس آئے۔ یہ اتاکم، فاتکم کا معادل ہے۔ اسی وجہ سے أفاتکم نہیں فرمایا۔

حضرت جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: اے انسان! تجھے کیا ہو گیا ہے تو مفقود چیز پر غمگین ہوتا ہے یہ غم کرنا فوت شدہ چیز کو تیری طرف واپس نہیں لوٹائے گا اور موجود چیز پر خوش نہ ہو کیونکہ موت اسے تیرے ہاتھ میں نہ چھوڑے گی۔ بزرجمہر سے کہا گیا: اے حکیم! تجھے کیا ہو گیا ہے تو فوت ہونے والی چیز پر غمگین نہیں ہوتا اور حاصل ہونے والی چیز پر خوش نہیں ہوتا؟ اس نے جواب دیا: فوت ہونے والی چیز آنسوؤں سے نہیں ملتی اور آنے والی چیز خوشی سے باقی نہیں رہتی۔ حضرت فضیل بن عیاض نے اسی بارے میں کہا: دنیا ہلاک کرنے والی اور فائدہ پہنچانے والی ہے جس کو ہلاک کر دے وہ چیز لوٹنے والی نہیں اور جس کا فائدہ پہنچائے تو اس کے کوچ کا اعلان کرتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مختال اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات کی طرف افتخار کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور فخور اسے کہتے ہیں جو لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دو مشرک خفی ہیں فخور مصراۃ کی طرح ہے جس کے تھنوں کو باندھا جاتا ہے تا کہ ان میں دودھ جمع ہو جائے اور مشتری کو وہم ہو کہ یہی اس کا معمول ہے اسی طرح وہ شخص جو اپنے اندر زینت و جمال دیکھتا ہے اس کے ساتھ وہ اس کا دعویٰ بھی کرتا ہے تو اسے فخور کہتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ یعنی وہ مختال کو پسند نہیں کرتا جو بخل کرتے ہیں۔ الذین محل جر میں ہے اور یہ مختال کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے تقدیر کلام یہ ہے الذين يبخلون فالله غني عنهم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یہودیوں کے رئیس ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی صفات کو بیان کرنے سے بخل کرتے تھے جو صفات ان کی کتابوں میں موجود تھیں تا کہ لوگ آپ کی ذات پر ایمان نہ لے آئیں تا کہ ان کا کھاجہ ختم نہ ہو جائے؛ یہ سدی اور کلبی کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: جو علم کے بارے میں بخل کرتے وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ اور لوگوں کو بھی یہ کہتے کہ وہ لوگوں کو کسی شی کی تعلیم نہ دیں۔

زید بن اسلم نے کہا: مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں بخل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد صدقہ اور حقوق میں بخل ہے؛ یہ عامر بن عبداللہ اشعری کا قول ہے۔ طاؤس نے کہا: مراد ہے ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس میں بخل کرتے ہیں۔ یہ تینوں قول قریب المعنی ہیں۔

اصحاب خواطر نے بخل اور سخاوت میں لوگوں کو دو فریقوں میں تقسیم کیا ہے (۱) بخیل وہ ہے جو مال روکنے کے ساتھ لذت حاصل کرتا ہے اور سخی وہ ہے جو مال عطا کر کے لذت حاصل کرتا ہے (۲) بخیل وہ ہے جو سوال کرنے کی صورت میں عطا کرتا ہے اور سخی وہ ہے جو سوال کے بغیر عطا کرتا ہے۔

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ جو ایمان سے اعراض کرے فَاِنَّ اللّٰهَ تو اللہ تعالیٰ اس سے غنی ہے۔ یہ بھی جائز ہے جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صدقہ کرنے پر برانگیختہ کیا تو لوگوں کو بتایا کہ جو لوگ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے غنی ہے۔ عام قرأت بِالبُخل ہے یعنی باء مضموم اور فاء ساکن ہے۔ حضرت انس، عبید بن عمیر، یحییٰ بن یعمر، مجاہد، حمید، ابن محیصن، حمزہ اور کسائی نے بالبَخَل دو فتحوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ انصار کی لغت ہے۔ ابو العالیہ اور ابن سمیقع نے بالبَخْلِ پڑھا ہے یعنی باء مفتوح اور خاء ساکن ہے۔ یہ انصار کی لغت ہے۔ نصر بن عاصم نے البُخُل دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے۔ سب کی سب مشہور لغتیں ہیں۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں بخل اور شح میں فرق گزر چکا ہے۔

نافع اور ابن عامر نے فإنّ الله الغنيّ الحميد، ھو کے بغیر پڑھا ہے باقی قراء نے ھو الغنی پڑھا ہے یہ ضمیر فصل ہے یہ بھی جائز ہے۔ کہ یہ ضمیر مبتدا ہو اور الغنی اس کی خبر ہو اور جملہ انّ کی خبر ہو۔ جس نے اس کو حذف کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ یہ ضمیر فصل ہو کیونکہ ضمیر فصل کا حذف مبتدا کے حذف سے آسان ہوتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

”یقیناً ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ہے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے اور طرح طرح کے فائدے ہیں لوگوں کے لیے اور (یہ سب اس لیے) تاکہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زورآور، سب پر غالب ہے۔ اور ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے رکھ دی ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب پس ان میں چند تو ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں“۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ، بینات سے مراد واضح معجزات اور ظاہر شرائع ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عبادت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے۔ رسولوں نے اس امر کی دعوت دی یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا۔

وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد کتب ہیں یعنی ہم نے ان کی طرف ان سے پہلوں کی خبریں وحی کیں۔ وَ الْمِيْزَانَ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے اور معاملہ کیا جاتا ہے۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ یعنی معاملات میں عدل کریں۔ اس کا فرمان بِالْقِسْطِ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مراد معروف میزان ہے۔ ایک قوم نے کہا: مراد عدل ہے۔ قشیری نے کہا: جب ہم نے اسے معروف میزان پر محمول کیا تو معنی ہوگا ہم نے کتاب کو نازل کیا اور

میزان رکھا، یعنی الْمِیْزَانَ سے پہلے وضعنا کا لفظ محذوف ہے جس طرح اس جملہ میں ماء بارد اس سے پہلے فعل محذوف ہے:

علفتھا تبنا وماء باردا

اسی قول پر اللہ تعالیٰ کا فرمان وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ⊙ (الرحمٰن) دلالت کرتا ہے پھر فرمایا: وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ (الرحمٰن:9) اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آسمان سے زمین کی طرف چار برکتیں نازل کیں۔ لوہا، آگ، پانی اور نمک''۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: تین چیزیں ایسی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوئیں۔ حجر اسود یہ برف سے بھی زیادہ سفید تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جو جنت کی آس کی لکڑی کا تھا اس کی لمبائی دس ہاتھ تھی جس قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قد مبارک تھا اور لوہا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ تین چیزیں نازل فرمائیں۔ آئرن، لوہار کا زنبور اور ہتھوڑا یہی مطرقہ ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے جب کہ ان کے ساتھ لوہے کی پانچ چیزیں تھیں جو لوہاروں کے آلات میں شمار ہوتی ہیں آہرن، زنبور، بڑا ہتھوڑا، ہتھوڑا اور سوئی۔ ہتھوڑا جس کے ساتھ کوٹا جاتا ہے یوں اس کا باب ذکر کیا جاتا ہے وقعت الحدیدۃ أقعھا یعنی میں نے اسے کوٹا۔ صحاح میں ہے میقعہ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جس جگہ سے باز مانوس ہوتا ہے اور اس پر گرتا ہے اور دھوبی کی لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس پر وہ کپڑے کو مارتا ہے اور لمبی سان۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ لوہا منگل کو نازل کیا گیا۔ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ یعنی خون بہانے کے لیے اس میں بڑی طاقت ہے اسی وجہ سے منگل کے روز فصد کرانے اور پچھنے لگانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسا دن ہے جس میں خون بہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''منگل کے روز ایسی گھڑی ہے جس میں خون نہیں رکتا'' (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا: اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ کا معنی ہے ہم نے اسے پیدا کیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر:6) یہ حضرت بصری کا قول ہے: پس لوہا زمین سے ہے اسے آسمان سے نازل نہیں کیا گیا۔

علماء معانی نے کہا: لوہے کو معدن سے نکالا اور حضرت آدم علیہ السلام کو وحی کے ذریعے صنعت کا علم سکھایا۔ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ یعنی اسلحہ اور ڈھال۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں قتل کے ڈر سے شدید خوف ہے۔

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ڈھال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: لوگ لوہے سے بڑی ضرورت کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس طرح چھری، کلہاڑا، سوئی وغیرہ۔ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ لوہے کو اتارا تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے کون اس کی مدد کرتا ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا عطف لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ پر ہے یعنی ہم نے رسولوں کو بھیجا، ان کے ساتھ کتاب نازل کی اور ان چیزوں کو پیدا کیا تا کہ لوگ حق و انصاف سے معاملہ کریں اور اس لیے تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب باب ما تستحب الحجامة، حدیث نمبر 3364، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کون اس کے دین کی مدد کرتا ہے؟۔ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اور کون اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ان کی مدد کرتے ہیں وہ ان کو جھٹلاتے نہیں اور وہ ان پر ایمان لاتے ہیں جب کہ انہیں دیکھتے نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ۝ وہ پکڑنے میں قوی ہے اور غالب ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بالغیب سے مراد اخلاص ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ پہلے جس کا ذکر اجمالی طور پر ہوا تھا کہ اس نے کتابوں کے ساتھ رسول بھیجے اب تفصیل بیان کی اور یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور نبوت ان کی نسل میں رکھی۔

وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ہم نے ان کی اولاد میں سے بعض کو انبیاء بنایا اور بعض کو امی بنا دیا جو آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں کی تلاوت کرتے ہیں وہ تورات، انجیل زبور اور فرقان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کتاب سے قلم کے ساتھ لکھنا ہے۔ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ یعنی جس نے حضرت ابراہیم اور حضرت نوح علیہ السلام کی اتباع کی وہ ہدایت یافتہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان دونوں کی اولاد میں سے ہدایت یافتہ ہیں۔ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ یعنی کافر طاعت سے خارج ہیں۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝

''پھر ہم نے ان کے پیچھے ان کی راہ پر اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اور انہیں انجیل عطا فرمائی اور ہم نے رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسیٰ کے تابعدار تھے شفقت اور رحمت، اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اسے اختیار کیا تھا پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جیسے اس کے نباہنے کا حق تھا، پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے (ان کے حسن عمل اور حسن نیت) کا اجر اور ان میں سے اکثر فاسق (وفاجر) تھے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ، ھم ضمیر سے مراد ذریۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ہیں۔ بِرُسُلِنَا مراد حضرت موسیٰ، حضرت الیاس، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یونس علیہم السلام ہیں یعنی ان کے پیچھے ان انبیاء و رسل کو بھیجا۔

وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ یہ اپنی ماں کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ، انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو ان پر نازل کی گئی۔ اس کا مادہ اشتقاق سورۂ آل عمران کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ اسم موصول سے مراد حواری اور متبعین ہیں جنہوں نے آپ کے دین کی اتباع کی۔ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً مراد محبت ہے وہ ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں انجیل میں حکم دیا گیا کہ وہ صلح سے رہیں اور لوگوں کو اذیت نہ دیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کے دلوں کو نرم کر دیا۔ یہودیوں کا معاملہ مختلف ہے جن کے دل سخت ہو گئے اور انہوں نے کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیا۔ رَاْفَةً کا معنی نرمی اور رَحْمَةً کا معنی شفقت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رَاْفَةً کا معنی بوجھ میں کمی کرنا اور رحمت کا معنی بوجھ کو اٹھانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رَاْفَةً رحمت کی شدید صورت ہے اور کلام مکمل ہو گئی۔ پھر فرمایا: وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا یعنی انہوں نے اپنی جانب سے رہبانیت کو گھڑ لیا ہے۔ احسن یہ ہے کہ رَهْبَانِيَّةَ کا لفظ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہو۔ ابوعلی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ابتدعوھا رھبانیة ابتدعوھا۔ زجاج نے کہا: ابتدعوھا رھبانیة جس طرح تو کہتا ہے رأیت زیدًا و عمرا کلمت۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا عطف رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً پر ہے اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ چیز عطا کی تو انہوں نے اسے تبدیل کر دیا اور اس میں بدعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ماوردی نے کہا: اس میں دو قرأتیں ہیں ان میں سے ایک راء کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کا معنی خوف ہے۔ یہ رھب سے مشتق ہے۔ دوسری قرأت راء کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ رھبان کی طرف منسوب ہے جس طرح رضوانیہ، رضوان سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو مشقتوں پر برانگیختہ کیا کیونکہ انہوں نے کھانا، پینا، نکاح کرنا چھوڑ دیا اور گرجوں سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بادشاہوں نے دین عیسوی کو تبدیل کر دیا تھا اور ایک چھوٹی سی جماعت رہ گئی تھی تو انہوں نے رہبانیت کو اختیار کر لیا اور اللہ تعالیٰ سے لو لگا لی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہوں نے حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کیا یہ سلسلہ تین سو سال تک چلتا رہا جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریقہ پر قائم تھے انہوں نے بادشاہوں کے طریقہ کار کو پسند نہ کیا تو بادشاہوں نے انہیں قتل کر دیا تو وہ لوگ جوان کے بعد باقی رہ گئے انہوں نے کہا: جب ہم انہیں منع کرتے ہیں تو وہ ہمیں قتل کرتے ہیں اب ان کے ساتھ رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں تو وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو گئے اور انہوں نے گرجے بنا لیے۔ قتادہ نے کہا: وہ رہبانیت جس کو انہوں نے اپنی جانب سے گھڑا تھا وہ عورتوں کو چھوڑنا اور گرجے بنانا تھا۔ مرفوع حدیث میں کہ ''رہبانیت جس کو انہوں نے اپنایا تھا وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جانا ہے''۔

مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ نہ ہم نے ان پر اسے فرض کیا تھا اور نہ ہی ہم نے انہیں اس کا حکم دیا تھا؛ یہ ابن زید کا قول ہے اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ یعنی ہم نے انہیں حکم نہیں دیا مگر اس چیز کا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو؛ یہ ابن سلم کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے ان پر کسی چیز کو لازم نہیں کیا تھا۔ ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ یہ ھا ضمیر سے بدل ہے جو كَتَبْنٰهَا میں موجود ہے معنی ہے ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کو لازم کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا ابْتِغَآءَ مستثنیٰ منقطع ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ما کتبناھا علیھم لکن ابتدعوھا ابتغاء رضوان اللہ۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا یعنی انہوں نے اس کا حق ادا نہ کیا۔ یہ عام کی تخصیص ہے کیونکہ جن لوگوں نے رعایت نہ کی تھی

کون اس کے دین کی مدد کرتا ہے؟ ۔ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اور کون اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ان کی مدد کرتے ہیں وہ ان کو جھٹلاتے نہیں اور وہ ان پر ایمان لاتے ہیں جب کہ انہیں دیکھتے نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ وہ پکڑنے میں قوی ہے اور غالب ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بالغیب سے مراد اخلاص ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ پہلے جس کا ذکر اجمالی طور پر ہوا تھا کہ اس نے کتابوں کے ساتھ رسول بھیجے اب تفصیل بیان کی اور یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور نبوت ان کی نسل میں رکھی۔

وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ ہم نے ان کی اولاد میں سے بعض کو انبیاء بنایا اور بعض کو امی بنادیا جو آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں کی تلاوت کرتے ہیں وہ تورات، انجیل زبور اور فرقان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کتاب سے قلم کے ساتھ لکھنا ہے۔ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ یعنی جس نے حضرت ابراہیم اور حضرت نوح علیہ السلام کی اتباع کی وہ ہدایت یافتہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے ان دونوں کی اولاد میں سے ہدایت یافتہ ہیں۔ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ یعنی کافر طاعت سے خارج ہیں۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

”پھر ہم نے ان کے پیچھے ان کی راہ پر اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اور انہیں انجیل عطا فرمائی اور ہم نے رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسیٰ کے تابعدار تھے شفقت اور رحمت، اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اسے اختیار کیا تھا پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جسے اس کے نباہنے کا حق تھا، پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے (ان کے حسن عمل اور حسن نیت) کا اجر اور ان میں سے اکثر فاسق (وفاجر) تھے“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ، ھم ضمیر سے مراد ذریۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ہیں۔ بِرُسُلِنَا مراد حضرت موسیٰ، حضرت الیاس، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یونس علیہم السلام ہیں یعنی ان کے پیچھے ان انبیاء و رسل کو بھیجا۔

وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ یہ اپنی ماں کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ، انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو ان پر نازل کی گئی۔ اس کا مادہ اشتقاق سورۂ آل عمران کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ اسم موصول سے مراد حواری اور متبعین ہیں جنہوں نے آپ کے دین کی اتباع کی۔ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً مراد محبت ہے، وہ ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں انجیل میں حکم دیا گیا کہ باہم صلح سے رہیں اور لوگوں کو اذیت نہ دیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کے دلوں کو نرم کر دیا۔ یہودیوں کا معاملہ مختلف ہے جن کے دل سخت ہو گئے اور انہوں نے کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیا۔ رَاْفَةً کا معنی نرمی اور رَحْمَةً کا معنی شفقت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رَاْفَةً کا معنی بوجھ میں کمی کرنا اور رحمت کا معنی بوجھ کو اٹھانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رَاْفَةً رحمت کی شدید صورت ہے اور کلام مکمل ہو گئی۔ پھر فرمایا: وَ رَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا یعنی انہوں نے اپنی جانب سے رہبانیت کو گھڑ لیا ہے۔ احسن یہ ہے کہ رَهْبَانِیَّةَ کا لفظ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہو۔ ابوعلی نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے ابتدعوها رهبانية ابتدعوها۔ زجاج نے کہا: ابتدعوها رهبانية جس طرح تو کہتا ہے رأیت زیدًا و عمرا کلمت۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا عطف رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً پر ہے اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ چیز عطا کی تو انہوں نے اسے تبدیل کر دیا اور اس میں بدعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ماوردی نے کہا: اس میں دو قرأتیں ہیں ان میں سے ایک راء کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کا معنی خوف ہے۔ یہ رهب سے مشتق ہے۔ دوسری قرأت راء کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ رهبان کی طرف منسوب ہے جس طرح رضوانیه، رضوان سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو مشقتوں پر برانگیختہ کیا کیونکہ انہوں نے کھانا، پینا، نکاح کرنا چھوڑ دیا اور گرجوں سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بادشاہوں نے دین عیسوی کو تبدیل کر دیا تھا اور ایک چھوٹی سی جماعت رہ گئی تھی تو انہوں نے رہبانیت کو اختیار کر لیا اور اللہ تعالیٰ سے لو لگالی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہوں نے حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کیا یہ سلسلہ تین سو سال تک چلتا رہا جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریقہ پر قائم تھے انہوں نے بادشاہوں کے طریقہ کار کو پسند نہ کیا تو بادشاہوں نے انہیں قتل کر دیا تو وہ لوگ جو ان کے بعد باقی رہ گئے انہوں نے کہا: جب ہم انہیں منع کرتے ہیں تو وہ ہمیں قتل کرتے ہیں اب ان کے ساتھ رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں تو وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو گئے اور انہوں نے گرجے بنا لیے۔ قتادہ نے کہا: وہ رہبانیت جس کو انہوں نے اپنی جانب سے گھڑا تھا وہ عورتوں کو چھوڑنا اور گرجے بنانا تھا۔ مرفوع حدیث میں ہے کہ "رہبانیت جس کو انہوں نے اپنایا تھا وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جانا ہے"۔

مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ نہ ہم نے ان پر اسے فرض کیا تھا اور نہ ہی ہم نے انہیں اس کا حکم دیا تھا؛ یہ ابن زید کا قول ہے اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ یعنی ہم نے انہیں حکم نہیں دیا مگر اس چیز کا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو؛ یہ ابن سلم کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے ان پر کسی چیز کو لازم نہیں کیا تھا۔ ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ یہ ھا ضمیر سے بدل ہے جو كَتَبْنٰهَا میں موجود ہے معنی ہے ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کو لازم کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَّا ابْتِغَآءَ مستثنیٰ منقطع ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ما كتبنا ها عليهم لكن ابتدعوها ابتغاء رضوان الله۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا یعنی انہوں نے اس کا حق ادا نہ کیا۔ یہ عام کی تخصیص ہے کیونکہ جن لوگوں نے رعایت نہ کی تھی

وہ قوم کے کچھ افراد تھے انہوں نے رہبانیت کے ساتھ لوگوں پر حاکمیت چاہی اور ان کے اموال کھانا چاہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (التوبہ: 34) یہ ایسی قوم کے بارے میں ہے جنہیں رہبانیت آخرکار حکومت کی طلب کی طرف لے گئی۔

سفیان ثوری نے عطاء بن سائب سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں روایت کرتے ہیں وَ رَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہوں نے تورات اور انجیل کو بدل دیا تھا ان میں مومن بھی تھے جو تورات اور انجیل کو پڑھا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دیا کرتے تھے تو کچھ لوگوں نے اپنے بادشاہوں سے کہا: کاش! تو اس جماعت کو قتل کر دیتا۔ مومنوں نے کہا: ہم تمہاری جانب سے اپنے نفسوں کو کافی ہیں۔ ایک طائفہ نے کہا: ہمارے لیے مینارہ بنا دو اور ہمیں اس پر چڑھا دو اور ہمیں کوئی ایسی چیز دے دو جس کے ساتھ ہم اپنا کھانا اور اپنا پانی اوپر لے جا سکیں؛ ہم تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔ ایک طائفہ نے کہا: ہمیں چھوڑ دو ہم زمین میں گھومیں پھریں گے ہم اسی طرح پئیں گے جس طرح وحشی جانور پانی پیتے ہیں،۔ جب تمہیں ہمارے اوپر قدرت ہو تو تم ہمیں قتل کر دینا۔ ایک جماعت نے کہا: ہمارے لیے جنگلوں میں گھر بنا دو ہم کنویں کھودیں گے اور سبزیاں کاشت کریں گے تم ہمیں نہیں دیکھو گے ان میں سے کوئی فرد نہیں تھا مگر ان لوگوں میں سے ایک جگری دوست تھا تو انہوں نے اس طرح کیا۔ وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریقہ پر چلتے رہے۔ ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنہوں نے کتاب کو تبدیل کر دیا۔ انہوں نے کہا: ہم سیاحت کریں گے اور ہم اسی طرح عبادت کریں گے جس طرح وہ عبادت کیا کرتے تھے جب کہ وہ شرک پر قائم تھے انہیں ان لوگوں کے ایمان کا کچھ علم نہ تھا جن کی وہ اقتدا کر رہے تھے تو یہی اس ارشاد کا مفہوم ہے وَ رَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اس کا آغاز تو ان صالحین نے کیا تھا تو متاخرین نے اس کی کما حقہ رعایت نہ کی۔

فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ یعنی جنہوں نے اس کا آغاز کیا اور اس کی رعایت کی انہیں ہم نے اجر دیا وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ مراد متاخرین ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو ان لوگوں میں سے تھوڑے افراد ہی رہ گئے تھے تو وہ غاروں اور گرجوں سے نکل کر آئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اس امر پر دال ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے جو آدمی اچھا کام شروع کرے اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ اس پر قائم دائم رہے اس کی ضد کی طرف نہ پھرے کہ وہ اس آیت میں داخل ہو جائے۔ حضرت ابوامامہ باہلی سے مروی ہے جن کا نام صدی بن عجلان تھا انہوں نے کہا: تم نے رمضان شریف کا قیام شروع کیا ہے جب کہ یہ تم پر فرض نہ تھا بے شک تم پر روزے فرض کیے گئے۔ جب تم نے یہ شروع کیا ہے تو اس پر دوام اختیار کرو اسے نہ چھوڑو۔ بے شک بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں نے ایسے امور کو شروع کیا اللہ تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں کو لازم نہیں کیا تھا وہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے تھے تو انہوں نے اس کی کما حقہ رعایت نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ترک کرنے پر ان پر عیب لگایا جس طرح اس ارشاد میں ذکر ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ آیت میں گرجوں اور گھروں میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جانے پر دلیل موجود ہے جب زمانہ میں فساد برپا ہو جائے اور دوست و بھائی بدل جائیں تو یہ امر مندوب ہوگا۔ اس کی وضاحت سورۂ کہف میں مفصل گزر چکی ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم ایک سریہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے کہا: ایک آدمی ایک غار کے پاس سے گزرا اس میں کچھ پانی موجود تھا اس کے دل میں خیال آیا کہ اس غار میں رہے اس میں جو پانی ہے اس سے قوت حاصل کرے اور اس کے اردگرد جو سبزیاں ہیں انہیں حاصل کرے اور دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ کہا: اگر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں آپ سے یہ بات عرض کروں گا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی تو میں ایسا کروں گا۔ بصورت دیگر ایسا نہیں کروں گا۔ وہ آدمی حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں ایک غار کے پاس سے گزرا اس میں پانی اور سبزی تھی جو میری خوراک کے لیے کافی تھی میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس میں رہوں اور دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے یہودیت اور نصرانیت کے ساتھ نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو سیدھے سادے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے تمہارا پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اکیلے ساٹھ سال تک نماز پڑھنے سے بہتر ہے'' (1)۔

کوفیوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تو جانتا ہے کہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے؟'' میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''لوگوں میں سے زیادہ علم رکھنے والا وہ شخص ہے جو حق کے بارے میں لوگوں سے زیادہ بصیرت رکھتا ہو جب لوگ اس میں اختلاف کریں اگرچہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے والا ہو اگرچہ وہ اپنی سرین پر گھسٹتا ہو۔ کیا تو جانتا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہاں سے رہبانیت کو شروع کیا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جابران پر غالب آ گئے وہ نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔ اہل ایمان ان پر ناراض ہوئے تو جابروں نے ان سے جنگ کی اور تین دفعہ اہل ایمان کو شکست دی۔ تو ان میں سے تھوڑے ہی افراد بچے۔ انہوں نے کہا: اگر ان جابر لوگوں نے ہمیں فنا کر دیا تو دین کے لیے کوئی بھی نہ بچے گا جو اس دین کی طرف دعوت دے آؤ ہم زمین میں بکھر جائیں یہاں تک کہ نبی امی مبعوث ہو جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ اس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لیتے۔ وہ پہاڑوں کی غاروں میں بکھر گئے۔ انہوں نے رہبانیت کو شروع کیا ان میں سے کچھ حضرت عیسیٰ کے دین پر کاربند رہے اور کچھ نے کفر کیا اور اس آیت کی تلاوت کی۔ کیا تو جانتا ہے میری امت کے لیے رہبانیت کیا ہے؟ ہجرت، جہاد، روزہ، نماز، حج، عمرہ اور بلند و پست زمین پر تکبیر کہنا۔ اے ابن مسعود! تم میں سے قبل جو یہودی ہو گزرے ہیں وہ اکہتر فرقوں میں بٹے ان میں سے ایک فرقہ نے نجات پائی اور باقی ہلاک ہوئے، تم میں سے قبل جو نصاری ہوئے وہ بہتر فرقوں میں بٹے ان میں تین بچے باقی سب ہلاک ہو گئے۔ بادشاہوں نے ان سے مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ان سے جنگ کی یہاں تک کہ انہیں قتل کر دیا ایک فرقہ ایسا تھا جن میں بادشاہوں سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب الجہاد، باب ما جاء فی فضل الغدو والرواح فی سبیل اللہ، حدیث نمبر 1573، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی وہ اپنی قوم میں ہی رہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی طرف دعوت دی، بادشاہوں نے انہیں پکڑ لیا، انہیں قتل کیا اور انہیں آریوں کے ساتھ چیر دیا ایک جماعت ایسی تھی انہیں بادشاہوں کے ساتھ مقابلہ کی طاقت نہ تھی اور نہ یہ طاقت تھی کہ وہ اپنی قوم کے درمیان رہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی طرف دعوت دیں وہ پہاڑوں میں سیاحت کرنے لگے اور ان میں رہبانیت کو پالیا یہی وہ جماعت ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا جو مجھ پر ایمان لایا، میری پیروی کی اور میری تصدیق کی اس نے اس کی رعایت کی جس طرح رعایت کرنے کا حق تھا اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا تو وہ فاسق ہے یعنی جس نے یہودیت اور نصرانیت کو اپنایا''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ پر ایمان نہ لائے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ یعنی پہلے لوگوں نے کفر پر اصرار کیا اس لیے اپنے زمانہ کے لوگوں پر تعجب نہ کیجئے اگر وہ کفر پر اصرار کریں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

''اے ایمان والو! تم ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور (سچے دل سے) ایمان لے آؤ اس کے رسول (مقبول) پر اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا دو حصے اپنی رحمت سے اور بنا دے گا تمہارے لیے ایک نور جس کی روشنی میں تم چلو گے اور بخش دے گا تمہیں، اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (تم پر یہ خصوصی کرم اس لیے کیا) تاکہ جان لیں اہل کتاب کہ ان کا کوئی قابو نہیں اللہ تعالیٰ کے فضل (وکرم) پر اور یہ کہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، نوازتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے''۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا یعنی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے۔ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ تمہیں دوگنا اجر دیا جائے گا کیونکہ تم حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لائے ہو یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص: 54) اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کفل کا معنی حصہ ہے۔ سورۂ نساء میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اصل میں اس کا معنی ایسا کمبل یا چادر ہے سوار جس کو اونٹ کی کہان لپیٹ لیتا ہے جو اسے گرنے سے بچاتی ہے؛ یہ ابن جریج کا نقطہ نظر ہے۔ کیا اس سے مراد وہ چادر ہے جسے سوار اونٹ کی کہان کے اردگرد لپیٹ لیتا ہے جب وہ اس کی کہان کی پچھلی جانب بیٹھتا ہے تاکہ وہ نہ گرے؟ اس کا معنی ہے وہ تمہیں دو حصے دے گا وہ دونوں حصے تمہیں معاصی کی ہلاکت سے محفوظ رکھیں گے

جس طرح کفل (چادر) سوار کی حفاظت کرتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا: کفلین کا معنی حبشہ کی زبان میں دوگنا ہے۔ حضرت ابن زید سے مروی ہے: کفلین سے مراد دنیا وآخرت کا اجر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہ آیت اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص: 54) نازل ہوئی تو اہل کتاب کے مومنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر فخر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک نیکی کا اجر ایک مثل ہی ہوگا۔ کہا: حسنہ عام اسم ہے اس کا صدق ایمان کی ہر نوع پر آئے گا اور اسے عموم پر ہی بولا جائے گا۔ جب حسنہ کا لفظ ایک نوع پر بولا جائے تو اس پر ثواب بھی ایک مثل ہی ہوگا۔ اگر ایسی نیکی پر بولا جائے جو دونوں پر مشتمل ہو تو اس پر ثواب دو مثل ہوگا؛ اس کی دلیل یہ آیت ہے کیونکہ فرمایا: كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ اور کفل کا معنی نصیب ہے جس طرح مثل ہوتا ہے۔ جو آدمی متقی ہوا اور اس کے رسول پر ایمان لایا اس کے لیے دو حصے ہیں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وجہ سے اور ایک حصہ اس کے رسول پر ایمان کے باعث ہے۔ اس چیز نے اس امر پر دلالت کی کہ وہ نیکی جس کا اجر دس گنا بنایا گیا ہے وہ نیکی کی دس انواع کو جامع ہے وہ ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت میں دس انواع کو جمع کیا ہے؛ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ (الاحزاب: 35) یہ دس انواع جس کا ثواب ان کی مثل ہے تو یہ نوع کے بدلے میں ایک مثل ہوئی۔ یہ تاویل فاسد ہے کیونکہ یہ ظاہر کلام سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (الانعام: 160) عموم کی تخصیص اس کا احتمال نہیں رکھتی، کیونکہ جو دس نیکیوں کو جامع ہو تو ہر نیکی کو اس کی مثل ہی بدلہ دیا جائے گا تو اس سے یہ امر باطل ہو گیا کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہو جب کہ اخبار اس پر دال ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اگر معاملہ اس طرح ہو جس طرح ذکر کیا گیا ہے تو حسنہ اور سیئہ میں کوئی فرق نہ ہو۔

وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا، نور سے مراد بیان اور ھدی ہے؛ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس سے مراد قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ضیاء ہے۔

تَمْشُوْنَ بِهٖ جس کی روشنی میں تم آخرت میں پل صراط پر سے گزرو گے اور قیامت کے روز جنت کی طرف جاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کی روشنی میں تم لوگوں میں چلو پھرو گے۔ انہیں اسلام کی طرف دعوت دو گے تو تم دین اسلام میں لوگوں کے روساء بن جاؤ گے تو تم سے وہ ریاست زائل نہ ہوگی جس میں تم ہو گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ خوف لاحق ہوا تھا کہ اگر وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو ان کی ریاست ختم ہو جائے گی۔ اصل میں ان سے وہ رشوت ختم ہوتی تھی جو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں تحریف کر کے کمزور لوگوں سے حاصل کرتے تھے دین میں حقیقی سرداری ختم نہیں ہوتی تھی۔ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ تا کہ اہل کتاب جان لیں۔ ان لا زائدہ ہے تاکید کا فائدہ دے رہا ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ فراء نے کہا: معنی ہے کہ وہ جان لیں۔ لا ہر اس کلام میں زائد ہوتا ہے جس پر لام جحد داخل ہو۔ قتادہ نے کہا: اہل کتاب نے مسلمانوں سے حسد کیا تو یہ آیت نازل ہوئی لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ معنی ہے تا کہ اہل کتاب جان لیں۔

اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ مجاہد نے کہا: یہودیوں نے کہا قریب ہے کہ ہم میں سے ایک ایسا نبی ظاہر ہو جو ہاتھ پاؤں کاٹے، جب اس نبی کا ظہور عربوں میں ہوا تو انہوں نے اس نبی کا انکار کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی لِّئَلَّا يَعْلَمَ تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ اس پر قادر نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا (طٰہٰ:89) حضرت حسن بصری سے یہ قرأت منقول ہے لِيَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ؛ یہ مجاہد سے روایت مروی ہے۔ قطرب نے لام کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ روایت نقل کی ہے اور جر کو فتحہ دینا یہ عام لغت ہے یاء کو ساکن کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے تو وہ لنلا بن گیا تو نون کو لام میں مدغم کر دیا گیا تو وہ للا بن گیا جب تین لام جمع ہو گئے تو درمیانی لام کو یاء سے بدل دیا گیا مگر مشہور لغت میں لام کو باقی رکھا گیا تو وہ اس توجیہ سے اقوی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: لکیلا یعلم۔ حطان بن عبداللہ سے مروی ہے لأن یعلم۔ عکرمہ سے مروی ہے: لیعلم۔ یہ مصحف میں جو لکھا گیا ہے اس کے خلاف ہے۔

مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ، فَضْلِ اللّٰهِ سے مراد اسلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ثواب ہے۔ کلبی نے کہا: مراد رزق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے ان کے قبضہ قدرت میں نہیں کہ وہ نبوت کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی طرف پھیر دیں جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اسی کا ہے يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہے عطا فرمائے۔ بخاری شریف میں ہے حکم بن نافع، شعیب سے وہ زہری سے وہ سالم بن عبداللہ سے وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب کہ آپ منبر پر کھڑے تھے: ''تم سے قبل جو امتیں گزری ہیں ان کے مقابلہ میں تمہاری بقا اس قدر ہے جس قدر عصر کی نماز سے سورج غروب ہوتا ہے، اہل تورات کو تورات دی گئی انہوں نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ دن نصف تک پہنچ گیا پھر وہ عاجز آ گئے تو انہیں ایک ایک قیراط دیا گیا پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی تو انہوں نے اس پر عصر کی نماز کے وقت تک عمل کیا پھر وہ عاجز آ گئے تو انہیں ایک ایک قیراط دیا گیا پھر تمہیں قرآن دیا گیا تو تم نے اس پر سورج کے غروب ہونے تک عمل کیا تو تمہیں دو دو قیراط دیئے گئے۔ تورات والوں نے کہا: اے اللہ! یہ عمل کے اعتبار سے کم اور اجر کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ فرمایا: کیا میں نے تمہارے اجر میں کوئی کمی کی ہے۔ عرض کی: نہیں تو فرمایا: یہ میرا فضل ہے جسے چاہوں میں دوں''۔ ایک روایت میں ہے: ''یہودی اور نصرانی غضبناک ہو گئے عرض کی: اے ہمارے رب!'' وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔

# سورۃ المجادلہ

آیاتھا ۲۲ ۵۸ سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۵ رکوعاتھا ۳

اس کی بائیس آیات ہیں۔

تمام کے قول میں یہ مدنی ہے مگر عطا کی روایت میں ہے کہ پہلی دس آیات مدنی ہیں اور باقی مکی ہیں۔ کلبی نے کہا: تمام کی تمام سورت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی مگر اللہ تعالیٰ کا فرمان مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ①

"بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لی اس کی بات جو تکرار کر رہی تھی آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں (ساتھ ہی) شکوہ کیے جاتی تھی اللہ تعالیٰ سے (اپنے رنج و غم کا) اور اللہ سن رہا تھا تم دونوں کی گفتگو، بے شک اللہ (سب کی باتیں) سننے والا) (سب کچھ) دیکھنے والا ہے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ جس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کی وہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بنت حکیم تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام جمیلہ تھا۔ اور خولہ نام زیادہ صحیح ہے ان کے خاوند کا نام حضرت اوس بن صامت تھا جو حضرت عبادہ بن صامت کے بھائی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں اس عورت کے پاس سے گزرے جب کہ کچھ لوگ بھی آپ کے ساتھ تھے آپ گدھے پر سوار تھے اس عورت نے طویل وقت تک آپ کو روکے رکھا آپ کو نصیحتیں کیں کہا: اے عمر! کبھی تجھے عمیر کہا جاتا تھا، پھر تمہیں عمر کہا جانے لگا، پھر تمہیں امیر المومنین کہا جانے لگا۔ اے عمر! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ جس کو موت کا یقین ہوتا ہے وہ فوت ہونے سے ڈرتا ہے جسے حساب کا یقین ہوتا ہے وہ عذاب سے ڈرتا ہے جب کہ حضرت عمر کھڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ آپ سے عرض کی گئی: اے امیر المومنین! کیا آپ اس بڑھیا کے لیے اتنا ٹھہرتے ہیں؟ فرمایا: اللہ کی قسم! اگر یہ مجھے دن کے پہلے پہر سے آخری پہر تک روکے رکھے تو میں کھڑا رہوں گا مگر فرض نماز کے لیے جاؤں گا کیا تم جانتے ہو یہ بڑھیا کون ہے؟ یہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ ہیں اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر اس کی بات کو سنا کیا رب العالمین اس کی بات کو سنے اور عمر اس کی بات کو نہ سنے؟

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: بڑی ہی برکتوں والی ہے وہ ذات جس کی قوت سماعت ہر شی کو وسیع ہے۔ میں حضرت

خولہ بنت ثعلبہ کی گفتگو سن رہی تھی اور مجھ پر کچھ گفتگو مخفی تھی جب کہ وہ رسول الله ﷺ کی بارگاہ میں اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: یارسول الله! اس نے میری جوانی کو کھالیا میں نے اپنے پیٹ کو اس کے لیے بکھیر دیا۔ جب میں بوڑھی ہو گئی اور میری جانب سے ولادت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اس نے مجھ سے ظہار کیا۔ اے الله! میں تیری بارگاہ میں شکایت کرتی ہوں۔ وہ وہیں تھی کہ حضرت جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

بخاری شریف میں جو روایت ہے وہ یہ ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تمام تر تعریفیں اس الله کے لیے ہیں جس کی قوت سماعت تمام آوازوں کو جامع ہے۔ ایک جھگڑا کرنے والی رسول الله ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ میں کمرے کے ایک کونے میں موجود تھی میں اس کی بات نہیں سن رہی تھی تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1)۔

ماوردی نے کہا: وہ حضرت خولہ بن ثعلبہ تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد بنت خویلد تھیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ایک ان میں سے باپ اور دوسرا دادا تھا۔ ان دونوں میں ہر ایک کی طرف اسے منسوب کیا گیا۔ ان کے خاوند حضرت اوس بن صامت تھے جو حضرت عبادہ بن صامت کے بھائی تھے۔ ثعلبی نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا مراد حضرت خولہ بنت خویلد خزرجیہ ہیں، یہ حضرت اوس بن صامت کے عقد میں تھیں۔ جو حضرت عبادہ بن صامت کے بھائی تھے یہ بڑے خوبصورت جسم کی مالک تھیں۔ ان کے خاوند نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیا اس کی سرین کو دیکھا تو معاملہ بڑا عجیب لگا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو خاوند نے ان کا ارادہ کیا تو اس نے انکار کر دیا تو خاوند اس پر ناراض ہو گیا۔

حضرت عروہ نے کہا: وہ ایسا آدمی تھا جسے جنون کی کچھ تکلیف تھی اسے یہ عارضہ لاحق ہوا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا: انت علیّ کظھر أمی تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ دور جاہلیت میں ایلاء اور ظہار طلاق تھے۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو اس پر حرام ہو گئی ہے''۔ اس نے عرض کی: الله کی قسم! اس نے طلاق کا ذکر نہیں کیا۔ پھر کہا: میں الله تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے فاقہ، تنہائی، وحشت، اپنے خاوند کے فراق اور چچازاد بھائی کی جدائی کی شکایت کرتی ہوں۔ میں نے اس کے لیے اپنے پیٹ کو بکھیر دیا۔ رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''تو اس پر حرام ہو گئی ہے''۔ وہ لگاتار بات دہراتی رہی اور رسول الله ﷺ اسے جواب دیتے رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس نے عرض کی یارسول الله! الله تعالیٰ نے دور جاہلیت کے طریقوں کو منسوخ کر دیا ہے جب کہ میرے خاوند نے مجھ سے ظہار کیا ہے۔ رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''اس بارے میں مجھ پر کوئی وحی نہیں آئی''۔ اس نے عرض کی: یارسول الله! آپ پر ہر چیز کے بارے میں وحی کی گئی اور آپ سے اس امر کو لپیٹ دیا گیا؟ فرمایا: ''میں نے جو کچھ تجھے کہا ہے وہی کچھ ہے''۔ اس نے کہا: میں الله تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتی ہوں اس کے رسول کی بارگاہ میں شکایت نہیں کرتی، تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔

دارقطنی نے قتادہ کی حدیث سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا کہ حضرت اوس بن

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فیما انکرت الجهمية، حدیث نمبر 183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صامت نے اپنی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ سے ظہار کیا حضرت خولہ نے اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ
میں شکایت کی عرض کی: اس نے اس وقت ظہار کیا جب میری عمر بڑی ہوگئی اور میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے
آیت ظہار کو نازل فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اوس سے کہا: ''غلام کو آزاد کرو'' ۔عرض کی: میرے پاس تو کوئی غلام
نہیں ۔فرمایا: ''دو ماہ کے پے در پے روزے رکھو'' عرض کی: میری حالت یہ ہے کہ میں دن میں تین بار کھانا نہ کھاؤں تو میری
نظر کمزور ہو جاتی ہے۔فرمایا: ''ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ'' عرض کی: میں تو کوئی چیز نہیں پاتا سوائے اس کے کہ آپ صلہ رحمی
اور مدد کے طور پر میری مدد فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پندرہ صاع کے ساتھ مدد کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے
اس کے لیے اس مال کو جمع کر دیا۔

**اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ** ۝ لوگوں کی رائے ہے کہ اس صحابی کے پاس اسی کی مثل مال موجود تھا تو یہ ساٹھ مسکینوں کے لیے
ہو گیا۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت سلمہ بن صخر بیاضی نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''ایک غلام آزاد کرو'' کہا: میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر ہاتھ مارا عرض کی نہیں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے
ساتھ مبعوث کیا ہے میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ۔فرمایا: ''دو ماہ کے روزے رکھو'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے جو
مصیبت پہنچی ہے وہ روزوں کی وجہ سے ہی پہنچی ہے۔فرمایا: ''تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ'' (1)۔ ابن عربی نے احکام میں
ذکر کیا ہے روایت کی گئی ہے کہ حضرت خولہ بنت خدیج سے ان کے خاوند نے ظہار کیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
ہوئی اس نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس پر حرام ہو چکی ہے'' انہوں
نے عرض کی: میں اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتی ہوں ۔ وہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو اس پر حرام ہو چکی ہے'' اس نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرتی ہوں
جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے دائیں حصہ کو دھو رہی تھیں پھر وہ بائیں حصہ کی طرف متوجہ ہوئیں جب کہ وحی ان پر نازل ہو چکی
تھی وہ دوبارہ عرض کرنے لگی۔ حضرت عائشہ نے کہا: خاموش ہو جا! آپ پر وحی نازل ہو چکی ہے جب قرآن نازل ہو گیا تو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خاوند سے فرمایا: ''ایک غلام آزاد کرو'' ۔اس نے عرض کی: میں تو کوئی غلام نہیں پاتا ۔فرمایا: ''دو
ماہ کے پے در پے روزے رکھو'' اس نے عرض کی: اگر میں دن میں تین بار کھانا نہ کھاؤں تو مجھے خوف ہوتا ہے کہ میری
آنکھیں نابینا ہی نہ ہو جائیں ۔فرمایا: ''ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ'' تو اس نے عرض کی: میری مدد کیجئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس کی مدد کی۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: مفسرین کی رائے ہے کہ وہ حضرت خولہ تھیں اور ان کے خاوند کا نام حضرت اوس بن
صامت تھا۔ اس کے نسب میں علماء نے اختلاف کیا ہے بعض نے کہا: وہ ایک انصاری عورت تھی جو ثعلبہ کی بیٹی تھی ۔بعض نے
کہا: وہ خدیج کی بیٹی تھی ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ خویلد کی بیٹی تھی ۔بعض نے کہا: وہ صامت کی بیٹی تھی ۔بعض نے کہا: وہ
ایک لونڈی تھی جو عبداللہ بن ابی کی ملک میں تھی یہی وہ لونڈی تھی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَلَا تُكْرِهُوْا**

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الظہار، حدیث نمبر [illegible]

فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (النور:33) کیونکہ وہ اسے بدکاری پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حکیم کی بیٹی تھی۔ نحاس نے کہا: اس میں کوئی تناقض نہیں؛ یہ جائز ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے باپ کی طرف منسوب ہو، ایک دفعہ اپنی ماں کی طرف منسوب ہو، ایک دفعہ اپنے دادا کی طرف منسوب ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی کی لونڈی ہو تو اسے ولاء کی وجہ سے انصاریہ کہا گیا ہو کیونکہ عبداللہ انصار میں شمار ہوتا تھا اگرچہ منافق تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قَدْ سَمِعَ کو ادغام اور اظہار کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ سماع میں اصل مسموعات کا ادراک ہے؛ یہ شیخ ابوالحسن کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ابن فورک نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ مسموع کا ادراک ہے۔ حاکم ابو عبداللہ نے سمیع کے معنی میں کہا: وہ آوازوں کا ادراک کرتا ہے جن آوازوں کا مخلوقات کانوں سے ادراک کرتی ہے جب کہ اس کے کوئی کان نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آوازیں اس پر مخفی نہیں اگرچہ وہ اس حس سے متصف نہیں جو کانوں میں رکھی گئی ہے جس طرح لوگوں میں سے اصم (بہرہ) ہوتا ہے جب اس میں حاسہ نہیں ہوتا تو وہ آواز کے ادراک کا اہل نہیں ہوتا۔ سمع اور بصر دونوں صفتیں ہیں جس طرح علم، قدرت، حیات اور ارادہ۔ یہ دونوں صفات ذات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ان سے متصف ہے۔ شکی اور اشتکی کا معنی ایک ہے اسے تحاور لک بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ بات کو بار بار لوٹاتی تھی۔ تجادلک یعنی وہ آپ سے سوال کرتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝

''جو لوگ تم میں سے ظہار کرتے ہیں اپنی بیویوں سے وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، نہیں ہیں ان کی مائیں بجز ان کے جنہوں نے انہیں جنا ہے، بے شک یہ لوگ کہتے ہیں بہت بری بات اور جھوٹ، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت درگزر فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے''۔

اس میں تیئیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور خلف نے یاء کے فتحہ، ظاء کی تشدید اور الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے یظهرون یعنی الف کو حذف کرنے، ھاء اور ظاء کی تشدید اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو العالیہ، عاصم اور زر بن حبیش نے یظاهرون یعنی یاء کے ضمہ، ظاء کی تخفیف، الف اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ احزاب میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ ابی کی قرأت میں یتظاهرون ہے؛ یہ ابن عامر اور حمزہ کی قرأت کا معنی ہے۔ ظہر کے لفظ کا ذکر رکوب کے معنی سے کنایہ ہے عورت کے بطن پر سوار ہوا جاتا ہے لیکن ظہر کو اس سے کنایۃً ذکر کیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: نزل عن أمراته اسے طلاق دے دی، گویا وہ سواری سے اتر آیا۔ أنت علی کظهر امی یعنی تو مجھ پر حرام ہے تیرے اوپر سوار ہونا میرے لیے حلال نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ظہار کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ظہر کو دوسری ظہر سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کے حکم کا موجب یہ چیز ہے

کہ حلال پشت کو حرام پشت سے تشبیہ دی جاتی ہے(1)۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے: اگر اس نے اپنی بیوی سے کہا أنت علی کظھر بنتی او أختی وغیرہ جب کہ جس عورت کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے وہ ذوات المحارم میں سے ہو تو وہ مظاہر ہوگا؛ یہ امام مالک، امام ابو حنیفہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ امام شافعی سے اس بارے میں اختلاف مروی ہے۔ ان سے امام مالک کے قول جیسا قول بھی مروی ہے کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو ایسی محرم کی پشت سے تشبیہ دی ہے جو اس پر ہمیشہ کے لیے حرام تھی جیسے ماں۔ ان سے ابوثور نے روایت کی ہے کہ ظہار صرف ماں کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے؛ یہ قتادہ اور شعبی کا مذہب ہے۔ پہلا قول حضرت حسن بصری، نخعی، زہری، اوزاعی اور ثوری کا نقطہ نظر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ظہار کی اصل یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہے: أنت علی کظھر أمی اللہ تعالیٰ نے ظہر کا لفظ بطن سے کنایہ اور پردہ کے طور پر ذکر کیا ہے اگر وہ کہے: أنت علی کأمی اور ظھر کا ذکر نہیں کیا یا کہا أنت علی مثل أمی اگر اس صورت میں ظہار کا ارادہ کیا تو جو اس نے نیت کی وہی حکم ہوگا۔ اگر طلاق کا ارادہ کیا تو امام مالک کے نزدیک اسے طلاق بائنہ ہو جائے گی، اگر طلاق اور ظہار کی نیت نہ ہو تو وہ مظاہر ہوگا صریح ظہار نیت کے ساتھ طلاق کی طرف نہیں پھرے گا۔ جس طرح صریح طلاق اور معروف کنایہ ظہار کی طرف نہیں پھرے گا۔ ظہار کو جب کنایہ کی صورت میں ذکر کیا گیا تو یہ نیت کے ساتھ طلاق بائنہ کی طرف پھر جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ظہار کے الفاظ دو قسم کے ہیں صریح، کنایہ، صریح یہ ہے أنت علی کظھر أمی، أنت عندی و أنت منی و أنت معی کظھر امی، تو مجھ پر، میرے ہاں میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ اس طرح اس کا یہ قول أنت علی کبطن أمی أو کر أسھا أو فرجھا أو نحوہ اسی طرح اس کا یہ قول فرجك، رأسك، ظھرك، بطنك، رجلك علی کظھر أمی تو اس صورت میں بھی وہ مظاہر ہوگا۔ اس کا قول یدك، رجلك، رأسك، فرجك طالق تو اسے طلاق ہو جائے گی۔

امام شافعی کا ایک قول یہ ہے: وہ ظہار کرنے والا نہیں ہوگا۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے ساتھ موافقت کی ہے کہ ان اعضاء کی طرف طلاق کو منسوب کرنا صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس سے اختلاف کیا تو پس اس کی طرف ظہار کی نسبت کرنا بھی صحیح ہے۔ جس نے اپنی بیوی کو اپنی ماں، اپنی دادی خواہ باپ کی جانب سے ہو یا ماں کی جانب سے تو بغیر کسی اختلاف کے وہ ظہار ہوگا۔ اگر اس نے ان کے علاوہ کسی اور ایسی عورت سے اپنی بیوی کو تشبیہ دی جو کسی حال میں بھی اس کے لیے حلال نہیں ہوتی جس طرح بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ تو اکثر فقہاء کے نزدیک وہ مظاہر ہوگا اور امام شافعی کا بھی صحیح مذہب یہی ہے۔ جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کا کنایہ ہے کہ وہ کہے: أنت علی کأمی أو مثل أمی اس میں نیت کا اعتبار ہوگا اگر ظہار کا ارادہ کیا تو ظہار ہوگا اگر ظہار کا ارادہ نہ کیا تو امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک ظہار نہیں ہوگا۔ امام مالک کا مذہب اس کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو ماں کے ساتھ تشبیہ دی ہے تو یہ ظہار ہوگا اس کی اصل یہ ہے کہ وہ ظہر کے لفظ کا ذکر کرے اور یہ قوی ہے کیونکہ لفظ کا معنی اس میں موجود ہے اور لفظ اپنے معنی کے ساتھ ہی ہوتا ہے ظہر کا

1۔ احکام القرآن لابن العربی

حکم اپنے لفظ کی وجہ سے لازم نہیں اسے اس کے معنی کی وجہ سے لازم کیا گیا ہے جو تحریم ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔(1)

**مسئلہ نمبر 5۔** اگر اس نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کے کسی عضو کے ساتھ تشبیہ دی تو وہ ظہار کرنے والا ہوگا جب کہ امام ابوحنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے آپ کا کہنا ہے: اگر خاوند نے اپنی بیوی کو کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دی جس کی طرف دیکھنا اس کے لیے حلال تھا تو وہ مظاہر نہیں ہوگا۔ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ استمتاع کے طریقہ پر اس کی طرف دیکھنا حلال نہیں اس میں تشبیہ واقع ہے اور مظاہر نے اس کا قصد کیا ہے۔ امام شافعی نے ایک قول میں کہا: وہ صرف اس صورت میں مظاہر ہوگا جب وہ لفظ ظہر کا ذکر کرے گا۔ یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ اس کا ہر عضو حرام ہے تو اس عضو کے ساتھ تشبیہ ظہار ہوگا جس طرح ظہر کا لفظ ذکر کیا جائے تو ظہار ہوتا ہے کیونکہ ظہار کرنے والا حلال عورت کو حرام عورت کے ساتھ تشبیہ دینے کا ارادہ کرتا ہے تو حکم ضرور لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اگر اس نے اپنی بیوی کو کسی اجنبی عورت کے ساتھ تشبیہ دی اگر اس نے ظہار کا ذکر کیا تو وہ ظہار ہوگا پہلے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے۔ اگر لفظ ظہر کا ذکر نہ کیا تو اس میں ہمارے علماء نے اختلاف کیا ہے ان علماء میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے کہا: یہ ظہار ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے کہا: یہ طلاق ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: یہ کچھ بھی نہیں۔ ابن عربی نے کہا یہ فاسد ہے(2) کیونکہ حلال عورت کو حرام عورت کے ساتھ تشبیہ دی ہے تو یہ اس کے حکم کے ساتھ مقید ہوگی جس طرح ظہر کا لفظ ہے ہمارے نزدیک اسماء معانی کے ساتھ ہوتے ہیں جب کہ ان کے نزدیک اپنے الفاظ کے ساتھ ہوتے ہیں یہ ان کی جانب سے اصل کے خلاف ہے۔

میں کہتا ہوں: اجنبیہ کے ساتھ جب تشبیہ دی جائے تو امام مالک کے نزدیک ظہار میں اختلاف کیا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے کچھ وہ ہیں جو ظہار صرف اس صورت میں تسلیم کرتے ہیں جب ذوی المحارم کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور باقی ماندہ عورتوں کے ساتھ شبیہ دینے کی صورت میں وہ ظہار تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو اسے کوئی چیز بھی قرار نہیں دیتے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اجنبی میں اسے طلاق قرار دیتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک جب اس نے کہا: کظھر ابنی أو غلامی او کظھر زید او کظھر أجنبیة تو یہ ظہار ہوگا اس عورت کے ساتھ قسم کے ہوتے ہوئے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے جب غیر ذوی المحارم کے ساتھ تشبیہ دی جائے تو یہ کچھ بھی نہیں جس طرح کوفی اور امام شافعی نے کہا: اوزاعی نے کہا: اگر اس خاوند نے کہا: أنت علی کظھر فلان رجل تو یہ قسم ہوگی وہ اس قسم کا کفارہ دے گا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** جب اس نے کہا: انت علی حرام کظھر أمی یہ ظہار ہوگا، طلاق نہیں ہوگی کیونکہ اس کا قول أنت علی حرام یہ طلاق کے ساتھ حرمت کا احتمال رکھتا ہے تو اس عورت کو طلاق ہو جائے گی۔ یہ ظہار کی وجہ سے بھی حرمت کا احتمال رکھتی ہے جب اس نے وضاحت کر دی تو یہ دو احتمالوں میں سے ایک کی تفسیر ہوگی اس میں اس کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔(3)

**مسئلہ نمبر 8۔** ظہار ہر ایسی بیوی کے بارے میں لازم ہو جائے گا وہ مدخولہ ہو یا نہ ہو کسی بھی ایسی حالت میں جس میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اس بیوی کو طلاق جائز ہو اسی طرح امام مالک کے نزدیک اس لونڈی کے ساتھ بھی ظہار کرنا جائز ہے جس کے ساتھ اس کا وطی کرنا جائز ہے۔ جب مرد نے ان کے ساتھ ظہار کیا تو ان کے بارے میں ظہار لازم ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: لازم نہیں ہو گا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ ہمارے لیے بہت مشکل مسئلہ ہے کیونکہ امام مالک کہا کرتے تھے: جب اس نے اپنی لونڈی سے کہا: انت علی حرام تو یہ لازم نہیں آتا۔ اس میں صریح تحریم کیسے باطل ہو گی اور کنایہ صحیح ہو گا۔ مگر لونڈی مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ کے عموم میں داخل ہے کیونکہ اس نے ان کی حلال عورتوں کا ارادہ کیا ہے۔ اس میں علت یہ ہے کہ یہ ایسا لفظ ہے جو بضع کے متعلق ہے عقد ختم کرنے کے متعلق نہیں پس لونڈی میں ظہار صحیح ہے اس کی اصل اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** نکاح سے پہلے بھی ظہار ہو سکتا ہے جب وہ اس عورت سے نکاح کرے جس سے اس نے ظہار کیا ہو؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے۔ جب کہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ظہار لازم نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ جب کہ وہ عورتیں جس سے ابھی شادی نہ ہوئی ہو وہ اس کی عورتوں میں سے نہیں سورۂ برأت میں اس مسئلہ کی اصل آیت وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ (التوبہ:75) میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔** ذمی کا ظہار لازم نہیں ہوتا؛ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی نے کہا: ذمی کا ظہار صحیح ہے ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے مِنْكُمْ یعنی مسلمانوں میں سے۔ یہ کلام ذمی کے خطاب سے نکلنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے: یہ خطاب کی دلیل سے استدلال ہے۔ ہم کہیں گے: یہ اشتقاق اور معنی سے استدلال ہے کیونکہ کفار کے نکاح فاسد اور فسخ کے مستحق ہیں ان کے ساتھ طلاق اور ظہار کا حکم متعلق نہیں ہوتا؛ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق:2) جب نکاح صحت کی شروط سے خالی ہوں تو یہ فاسد ہوں گے نکاح فاسد میں کسی حال میں بھی ظہار نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 11۔** مِنْكُمْ کے الفاظ غلام کے ظہار کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتے ہیں جو اس سے منع کرتے ہیں انہوں نے اس سے اختلاف کیا ہے؛ ثعلبی نے اسے امام مالک سے حکایت کیا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں میں سے ہے اور اس کے حق میں احکام نکاح ثابت ہیں اگرچہ اس پر غلام آزاد کرنا اور کھانا کھلانا متعذر رہے۔ وہ صرف روزوں پر قادر ہے۔

**مسئلہ نمبر 12۔** امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: عورتیں ظہار نہیں کر سکتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ یہ نہیں فرمایا واللائی یظهرن منکم من ... جهن ظہار صرف مردوں کے لیے ہے۔ ابن عربی نے ... ابن قاسم، سالم، یحییٰ بن سعید، ربیعہ اور ابوزناد نے ... روایت کیا ہے معنی کے اعتبار سے یہ صحیح ہے کیونکہ حل، عقد، تحلیل اور تحریم نکاح کے معاملہ میں مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں سے عورتوں کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں یہی اجماع ہے۔ ابو عمر نے کہا: جمہور کے قول کے مطابق عورتوں پر کوئی ظہار نہیں۔ حسن بن زیاد نے کہا: وہ ظہار کر سکتی ہے۔ امام ثوری، امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے کہا: نکاح سے قبل ... اس کے بعد عورت اپنے خاوند سے ظہار نہیں کر سکتی۔ امام شافعی نے کہا: عورت

1۔ احکام القرآن لابن العربی 2۔ ایضاً

اپنے خاوند سے ظہار نہیں کر سکتی۔ امام اوزاعی نے کہا: جب عورت اپنے خاوند سے کہے انت علی کظھر أمی أو کظھر فلانۃ تو یہ عورت کی جانب سے قسم ہو جائے گی وہ اس کا کفارہ دے گی۔ اسحاق نے اسی طرح کہا ہے: ایک عورت خاوند سے ظہار کرنے والی نہیں ہو سکتی لیکن اس پر قسم لازم ہوگی جس کا وہ کفارہ دے گی۔ زہری نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ وہ ظہار کا کفارہ دے اس کا یہ قول اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان حقوق زوجیت کے اعتبار سے حائل نہیں ہوگا۔ یہ روایت ان سے معمر نے نقل کی ہے۔ ابن جریج نے عطا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پر جو امر حلال کیا تھا اس نے اسے حرام کر دیا اس پر کفارہ یمین ہوگا؛ یہ امام ابو یوسف کا قول ہے۔ محمد بن حسن نے کہا: اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ جسے کچھ جنون کا مرض ہو۔ کسی موقع پر اس کے کلام میں نظم پیدا ہو جائے جب وہ ظہار کرے تو اس پر ظہار لازم ہو جائے گا، کیونکہ حدیث طیبہ میں یہ روایت مروی ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ جن کے خاوند کا نام اوس بن صامت تھا اسے جنون کی کچھ شکایت تھی اور اس نے اپنی بیوی سے ظہار کیا۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ جس کو غصہ آئے اور وہ اپنی بیوی سے ظہار کر لے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کا غصہ اس کے حکم کو ساقط نہیں کرے گا۔ ایک حدیث کی سند میں ہے کہ یوسف بن عبداللہ بن سلام نے حضرت خولہ جو حضرت اوس بن صامت کی زوجہ تھیں سے روایت نقل کی ہے حضرت خولہ نے کہا: میرے اور اس کے (خاوند) کے درمیان کچھ ناراضگی ہوئی تو اس نے کہا: أنت علی کظھر أمی تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے پھر وہ اپنی قوم کی مجلس کی طرف چلے گئے۔ حضرت خولہ کا قول کان بینی و بینہ شئ میں دلیل ہے کہ ان میں کوئی جھگڑا ہوا تھا جس نے انہیں مجبور کیا تو ان کے خاوند نے ان سے ظہار کر لیا۔ غضب لغو چیز ہے یہ کسی حکم کو ختم نہیں کرتی اور نہ ہی شرعی حکم میں تبدیلی کرتی ہے، اسی طرح نشہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ جب خاوند نشہ کی حالت میں ہو اور وہ اپنے قول کو سمجھتا ہو اور کلام کو منظم کر سکتا ہو تو ظہار اور طلاق کا حکم اس پر لازم آئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (النساء:43) جس طرح سورۂ نساء میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ مظاہر اپنی بیوی کے قریب نہ آئے، اس سے مباشرت نہ کرے اور کسی بھی حوالے سے اس سے لذت حاصل نہ کرے یہاں تک کہ وہ کفارہ ادا کرے مگر امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں اختلاف کیا ہے کیونکہ خاوند کا یہ قول أنت علی کظھر أمی تقاضا کرتا ہے کہ ہر قسم کا استمتاع حرام ہو وہ لفظ کے ساتھ ہو یا اس کے معنی یعنی عمل کی صورت میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ اگر وہ کفارہ ادا کرنے سے پہلے وطی کرے تو اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہو اور اس سے رک جائے یہاں تک کہ ایک کفارہ ادا کرے۔ مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: اس پر دو کفارے لازم ہیں۔ سعید نے قتادہ سے اور مطرف نے رجاء بن حیوہ سے وہ قبیصہ بن ذویب سے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مظاہر کے بارے میں روایت نقل کرتے ہیں: جب اس نے کفارہ ادا کرنے سے قبل وطی کی تو اس پر دو کفارے ہوں گے۔ معمر نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ قبیصہ بن

ذویب نے کہا: اس پر دو کفارے ہوں گے۔ ائمہ کی جماعت نے روایت کی جب کہ ان میں ابن ماجہ اور نسائی بھی ہیں: ایک آدمی نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تو کفارہ ادا کرنے سے قبل اس سے جماع کیا پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کا آپ کے سامنے ذکر کیا آپ نے پوچھا: ''کس چیز نے تجھے اس امر پر برانگیختہ کیا؟'' اس نے عرض کی: میں نے چاند کی روشنی میں اس کے پازیب کی سفیدی کو دیکھا تو میں اپنے آپ پر قابو نہ کر سکا تو میں نے اس سے جماع کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور اسے حکم دیا کہ ''وہ اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ کفارہ ادا کر لے'' (1)۔ ابن ماجہ اور دارقطنی نے سلیمان بن یسار سے وہ حضرت سلمہ بن صخر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظہار کیا پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جماع کر لیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

**مسئلہ نمبر 18**۔ جب کوئی مرد ایک ہی کلمہ سے چار عورتوں سے ظہار کرے جس طرح وہ کہے أنت علی کظهر امی وہ ان میں سے ہر عورت سے ظہار کرنے والا ہوگا ان میں سے کسی سے بھی وطی کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا اور صرف ایک کفارہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ امام شافعی نے کہا: اسے چار کفارے لازم ہوں گے۔ آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ جمع کا لفظ عام مومنوں کے بارے میں ہے اعتماد معنی پر ہوگا۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کہا کرتے تھے: جب ایک مرد کی چار بیویاں ہوں تو وہ ان سے ظہار کرے تو اسے ایک کفارہ ہی کافی ہوگا۔ اگر وہ ایک کے بعد دوسری سے ظہار کرے تو ہر ایک میں ایک کفارہ لازم آئے گا۔ یہی اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 19**۔ اگر اس نے چار عورتوں سے کہا: اگر میں تم سے شادی کروں تو تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو اس نے ان میں سے ایک عورت سے شادی کی تو وہ ان کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ کفارہ دے پھر سب عورتوں کے بارے میں اس کی قسم ختم ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ باقی عورتوں سے بھی وطی نہیں کر سکتا (شادی کے بعد) یہاں تک کہ وہ کفارہ ادا کرے۔ پہلا قول مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 20**۔ اگر اس نے اپنی بیوی سے کہا: أنت علی کظهر أمی، وانت طالق البتہ (2) تو اسے طلاق اور ظہار دونوں لازم ہو جائیں گے، وہ کفارہ نہیں دے گا یہاں تک کہ اس عورت سے ایک اور خاوند کے بعد نکاح کرے اور جب اس سے نکاح کر لیا تو کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس سے وطی نہ کرے۔ اگر اس نے کہا: أنت طالق البتة وأنت علی کظهر أمی اسے طلاق لازم ہو جائے گی اور اسے ظہار لازم نہیں ہوگا کیونکہ جس کو طلاق بائنہ دی جا چکی ہو اسے ظہار لاحق نہیں ہو سکتا۔

**مسئلہ نمبر 21**۔ بعض علماء نے کہا: جس بیوی سے حقوق زوجیت ادا نہ کیے ہوں اس کے ساتھ ظہار کرنا درست

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الظہار، حدیث 1898۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب المظاہر یجامع قبل ان یکفر، حدیث 2054۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ یہاں البتہ سے مراد طلاقیں ہیں جس طرح عبارت سے اسے سمجھا جا رہا ہے جس طرح ابن عربی نے کہا ہے جب اس نے ظہار کے بعد تین طلاقیں دیں پھر نکاح جدید کے ساتھ وہ عورت اس کی طرف لوٹی تو وہ وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کفارہ ادا کرے۔

نہیں۔ مزنی نے کہا: مطلقہ رجعیہ سے ظہار صحیح نہیں۔ یہ قول کچھ بھی نہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں زوجیت کے احکام باقی ہیں جس طرح ایسی عورت کو طلاق ہو سکتی ہے اسی طرح ظہار بھی ہو سکتا ہے۔ قیاس ونظر یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 22**۔ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں۔ عام قرأت أمهاتهم ہے اہل حجاز کی لغت کے مطابق تاء مسکور ہے۔ جس طرح فرمایا: مَا هٰذَا بَشَرًا (یوسف: 31) فراء نے کہا: اہل نجد اور بنوتمیم کہتے ہیں: ما هذا بشر، ماهن أمهاتهم یہ مرفوع ہے۔ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ان کی مائیں نہیں مگر جنہوں نے انہیں جنا ہے ضرب المثل ہے ولدك مَنْ دَمّٰى عَقِبَيْكَ تیری والدہ وہ ہے جس نے تیرے بعد خون بہایا۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 23**۔ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا، منکر کا معنی ہے ایسی بات جو شروع میں معروف نہ ہو اور زور سے مراد جھوٹ ہے(1) وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وہ عفو وغفور اس اعتبار سے ہے کہ اس نے کفارہ کو اس قول سے خلاصی کے لیے ذریعہ بنادیا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

”جو لوگ ظہار کر بیٹھیں اپنی عورتوں سے پھر وہ پلٹنا چاہیں اس بات سے جو انہوں نے کہی تو (خاوند) غلام آزاد کرے اس سے قبل کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو (اس سے) آگاہ ہے۔ پس جو شخص غلام نہ پائے تو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے اس سے قبل کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو تو کھانا کھلائے ساٹھ مسکینوں کو، یہ اس لیے کہ تم تصدیق کرو اللہ اور اس کے رسول (کے فرمان) کی اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور منکرین کیلئے دردناک عذاب ہے“۔

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے اس لیے اسے حذف کر دیا گیا ہے یعنی فعلهم تحرير رقبة۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: كفارتهم عتق رقبة ظہار کے معاملہ میں جس قول پر تمام علماء کا اجماع ہے وہ ایک آدمی کا اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے: أنت علی کظهر أمی یہ وہ قول منکر اور قول زور ہے جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا ہے: وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا جس نے یہ

1۔ تفسیر بغوی

قول کیا اس پر اپنی بیوی سے وطی کرنا حرام ہے، جس نے یہ بات کہی پھر اس سے رجوع کیا تو اس پر کفارہ ظہار لازم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ یہ کلام اس بات کے رد پر دلالت کرتا ہے کہ کفارہ ظہار صرف قول سے لازم نہیں آتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ رجوع ملا ہوا ہو۔ یہ مشکل حرف ہے اس میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کے بارے میں سات اقوال ہیں: (۱) اس سے مراد وطی پر عزم ہے یہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کا مشہور قول ہے۔ امام مالک سے مروی ہے: اگر اس نے وطی کا عزم کر لیا تو یہ عود تصور ہوگا اگر اس نے وطی کا عزم نہ کیا تو یہ عود نہ ہوگا (۲) اس سے ظہار کرنے کے بعد امساک (اپنے پاس روکنے پر عزم)؛ یہ امام مالک کا قول ہے (۳) دونوں پر اس کا عزم؛ یہ امام مالک کا موطا میں قول منقول ہے۔ امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کے بارے میں کہا: میں نے سنا کہ اس کی تفسیر یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے ظہار کرے پھر وہ اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرے اور اس کو اپنے پاس روکنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر اس نے یہ عزم کر لیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ اگر اس نے اسے طلاق دے دی اور اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کیے اور اسے پاس رکھنے کا ارادہ نہ کیا تو اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے اس سے اس کے بعد شادی کی تو جب تک کفارہ ظہار ادا نہ کرے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا۔ (۴) عود سے مراد وطی کرنا ہے اگر اس نے وطی نہ کی تو یہ عود نہ ہوگا؛ یہ حضرت حسن بصری اور امام مالک کا نقطہ نظر ہے (۵) امام شافعی نے کہا: اس سے مراد ہے کہ ظہار کے بعد طلاق پر قادر ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنی بیوی کی حیثیت سے روکے رکھے کیونکہ جب اس نے ظہار کیا تھا تو اس نے تحریم کا قصد کیا تھا اگر اس نے اس کو طلاق دے دی تو اس نے اس کے برعکس کر دیا جو اس نے حرمت واقع کرنے کا قصد کیا تھا اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا۔ اگر وہ طلاق دینے سے رک گیا تو وہ اس امر کی طرف لوٹ آیا جس پر وہ پہلے سے تھا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا (۶) ظہار حرمت کو ثابت کرتا ہے اسے کفارہ ہی ختم کر سکتا ہے۔ اس قول کے قائلین کے نزدیک عود کا معنی ہے اس کے ساتھ وطی کرنا مباح نہیں مگر اس صورت میں کہ پہلے وہ کفارہ ادا کرے؛ یہ امام ابوحنیفہ آپ کے اصحاب اور لیث بن سعد کا نقطہ نظر ہے۔ (۷) اس سے مراد ظہار کے لفظ کو مکرر ذکر کرنا ہے؛ یہ اہل ظواہر کا قول ہے۔ جو قیاس کی نفی کرتے ہیں انہوں نے کہا: اگر اس نے ظہار کا لفظ مکرر ذکر کیا تو یہی لوٹنا ہے اگر مکرر ذکر نہیں کیا تو یہ لوٹنا نہیں؛ اس قول کو بکیر بن اشج، ابو العالیہ اور امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: آیت کا ظاہر اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا یعنی جو انہوں نے کہا اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو کہتا ہے: أنت علی کظھر أمی جب اس نے اپنی بیوی کو یہ کہا تو وہ اس پر حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کفارہ ظہار ادا کرے (1)۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ اس سے مراد لفظ ظہار کی طرف لوٹنا ہے تو یہ قطعی طور پر باطل ہے، یہ بکیر سے ثابت نہیں یہ اس کے

---

1۔ تفسیر طبری

زیادہ مشابہ ہے کہ یہ داؤد اور اس کے متبعین کی جہالت ہے۔ ظہار کرنے والوں کے قصے روایت کیے گئے ہیں ان پر کفاروں کے واجب ہونے کے ذکر میں ان کے قول کو دوبارہ کرنے کا ذکر نہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ معنی اس کی نفی کر دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قول کی یہ صفت بیان کی ہے کہ یہ قول منکر اور زور ہے تو اسے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے: جب تو نے ایسا قول دوبارہ کیا اور ممنوع سبب دوبارہ کیا تو تجھ پر کفارہ واجب ہو جائے گا؟ یہ قابل فہم بات نہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ ہر وہ سبب جو کفارہ کو واجب کرتا ہے اس میں اعادہ کی کوئی شرط نہیں وہ قتل ہو، روزہ کی حالت میں وطی ہو یا کوئی اور چیز (1)۔

میں کہتا ہوں: اس (ابن عربی) کا قول یہ اس کے مشابہ ہے کہ یہ داؤد اور اس کے پیروکاروں کی جہالت ہو یہ ابن عربی کی جانب سے اس پر ایک بات کو مسلط کرنا ہے اس نے داؤد کا وہ قول کیا جس کو ہم نے اس سے ذکر کیا ہے جہاں تک امام شافعی کے قول کا تعلق ہے کہ یہ طلاق پر قدرت کے باوجود اسے ترک کرتا ہے تو تین اہم امور اس کی نفی کرتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ یہ ظاہر میں تراخی کا تقاضا کرتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ کا فرمان: ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ ایک جہت سے فعل کے وجود کا تقاضا کرتا ہے اور مرور زمانہ اس کی جانب سے فعل نہیں (۳) طلاق رجعی ملک کی بقا کے منافی نہیں تو ظہار کا حکم ساقط نہیں ہوگا جس طرح ایلاء ہے۔ اگر یہ قول کیا جائے: جب اس نے اسے اپنی ماں کی حیثیت میں دیکھا ہے تو اسے اپنے پاس نہ روکے کیونکہ ماں کو نکاح میں روکنا صحیح نہیں۔ ماوراء النہر کے علماء کے قول کا انحصار اسی استدلال پر ہے۔ میں کہتا ہوں: جب اس نے اپنے قول کے خلاف کا عزم کر لیا اور اسے اپنی ماں کے خلاف دیکھا تو کفارہ ادا کر دیا اور اپنے اہل کی طرف لوٹ آیا۔ اس قول کی وضاحت یہ ہے کہ عزم قول نفسی ہے یہ ایسا آدمی ہے جس نے ایسا قول کیا جو تحلیل کا تقاضا کرتا ہے وہ نکاح ہے اور اس نے ایسا قول کیا جو تحریم کا تقاضا کرتا ہے وہ ظہار ہے پھر اس نے اس کی طرف رجوع کیا جو اس نے کہا تھا وہ تحلیل ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ اس کی جانب سے عقد کی ابتداء ہو، کیونکہ عقد باقی ہے تو کوئی چیز باقی نہیں مگر یہ کہ اس نے ایسا عزم کیا جو اس کے اعتقاد کے مخالف تھا اس نے اپنے دل میں ظہار کا قول کیا تھا جس کی خبر اس نے أنت علیّ کظھر أمی کے قول سے دی، جب یہ اس طرح ہے تو اس نے کفارہ ادا کیا اور اپنے اہل کی طرف لوٹ آیا کیونکہ ارشاد ہے مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا یہ بہت عمدہ تفسیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض علماء نے کہا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں جس پر وہ پہلے تھے یعنی جماع کیا تو اس پر غلام کو آزاد کرنا لازم ہے یعنی انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی وجہ سے ان پر غلام آزاد کرنا لازم ہے۔ لِمَا قَالُوْا کا حرف جار اسی محذوف کے متعلق ہے جو مبتدا کی خبر ہے وہ علیہم ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: معنی ہے وہ جماع کے ارادہ کی طرف لوٹتے ہیں اس وجہ سے جو انہوں نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی یہ ہے وہ دور جاہلیت میں اپنی بیویوں سے ظہار کیا کرتے تھے پھر وہ دور اسلام سے اس بات کی طرف لوٹتے ہیں جو انہوں نے دور جاہلیت میں کہی تھی تو جس نے دور اسلام میں ایسی بات کہی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے۔ فراء نے کہا: لام، عن کے معنی میں ہے معنی ہے جو انہوں نے کہا اسی سے وہ رجوع کرتے ہیں اور وطی کا ارادہ کرتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی

ہیں۔ اخفش نے کہا: لِمَا قَالُوْا اور اِلٰی قالوا دونوں ایک ہی ہیں لام اور الٰی ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں الله تعالیٰ کا فرمان: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف: 43)

الله تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۞ (الصافات) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۞ (الزلزلۃ) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاُوْحِیَ اِلٰى نُوْحٍ (ہود: 36)

**مسئلہ نمبر 3۔** فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اس پر غلام کا آزاد کرنا لازم ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: حررتہ یعنی میں نے اسے آزاد کردیا۔ پھر اس غلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ کامل ہو اور ہر عیب سے محفوظ ہو۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اس کے کامل ہونے سے مراد اس کا مسلمان ہونا ہے جس طرح کفارہ قتل میں مسلمان غلام ہی آزاد کیا جا سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک کافر غلام بھی آزاد کیا جا سکتا ہے اسی طرح وہ غلام بھی آزاد کیا جا سکتا ہے جس میں رق کا شائبہ ہو جیسے مکاتبت وغیرہ۔

**مسئلہ نمبر 4۔** اگر اس نے دو غلاموں کا ایک ایک نصف آزاد کیا تو ہمارے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں ہو گا۔ امام شافعی نے کہا: جائز ہے کیونکہ دو غلاموں کا نصف ایک غلام کے معنی میں ہے کیونکہ غلام کی صورت میں کفارہ کا طریقہ مال ہے تو اس میں تبعیض اور تجزیہ جائز ہے جس طرح کھانا کھلانا۔ ہماری دلیل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اس اسم سے مراد ایک شخص ہے۔ رقبہ کا بعض رقبہ نہیں یہ ان چیزوں میں سے نہیں جس میں دو چیزوں کو ملا کر داخل کیا جا سکے کیونکہ وہ عبارت جو ایک رقبہ کے متعلق ہے تو دو رقبہ کا نصف اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب آدمی دو قربانیوں میں شریک ہوں اور اس لیے بھی کہ اگر کسی نے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی طرف سے ایک حج کریں تو ان میں سے کسی کے لیے جائز نہیں ہو گا کہ ان دونوں میں ایک اس کا نصف حج کرے اسی طرح یہ ہے اور اس لیے بھی کہ اگر اس نے وصیت کی کہ ایک غلام خریدا جائے اور اس کی طرف سے اسے آزاد کر دیا جائے تو یہ جائز نہ ہو گا کہ دو غلام کا نصف نصف اس کی طرف سے آزاد کیا جائے اس طرح ہمارے اس مسئلہ میں ہے۔ اس بحث کے ساتھ ان کی دلیل باطل ہو جاتی ہے کھانا کھلانا وغیرہ میں بھی ہمارے نزدیک اس میں تجزی جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5۔** مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے۔ مظاہر کے لیے کفارہ ادا کرنے سے قبل وطی کرنا جائز نہیں (1) اگر اس نے کفارہ ادا کرنے سے قبل جماع کیا تو وہ گناہگار ہو گا، نافرمانی کرے گا اور اس سے کفارہ ساقط نہیں ہو گا۔ مجاہد سے مروی ہے: اگر اس نے کفارہ ادا کرنے میں شروع ہونے سے پہلے ہی وطی کی تو اس پر دوسرا کفارہ لازم ہو جائے گا۔ دوسرے علماء سے یہ مروی ہے: وہ کفارہ جو ظہار کی وجہ سے واجب ہوتا ہے وہ اس سے ساقط ہو جائے گا اس پر اصلاً کوئی چیز لازم نہ ہو گی کیونکہ الله تعالیٰ نے کفارہ واجب کیا ہے اور جماع کرنے سے قبل اسے ادا کرنے کا حکم دیا ہے جب اس نے اسے موخر کیا یہاں تک کہ اس کے ساتھ جماع کر لیا تو اس کا وقت فوت ہو جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ کفارہ ثابت ہو گا کیونکہ وطی کے

1۔ تفسیر بغوی

ساتھ وہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے تو یہ کفارہ کو ساقط کرنے والا نہیں ہوگا اور اس کی قضا دے گا جس طرح اگر وہ نماز کو اس کے وقت سے موخر کرے گا۔

حضرت اوس بن صامت کی حدیث میں ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کیے ہیں تو آپ نے اسے کفارہ کا حکم دیا، یہ اس میں نص ہے خواہ کفارہ عتق کی صورت میں ہو یا روزے کی صورت میں ہو یا کھانا کھلانے کی صورت میں ہو۔

امام ابوحنیفہ نے کہا: کفارہ اطعام کی صورت میں ہو تو یہ جائز ہوگا کہ وہ وطی کرے پھر کھانا کھلائے۔ جہاں تک وطی کے علاوہ بوسہ، معاشرت اور لذت حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اکثر علماء کے نزدیک حرام نہیں؛ یہ حضرت حسن بصری اور سفیان کا قول ہے؛ امام شافعی کا بھی صحیح مذہب یہ ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سب حرام ہیں اور سب کے معانی ہیں؛ یہ امام مالک، امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ اس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ یعنی تم جو کفارہ وغیرہ دیتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ جو نہ غلام پائے اور نہ ہی اس کی قیمت پائے یا مالک تو ہو مگر اس غلام کی اس کو شدید ضرورت ہو یا وہ غلام کی قیمت کا مالک تو ہو مگر اس کو اپنے نفقہ کے لیے اس رقم کی ضرورت ہو یا اس کا مسکن تو ہو اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ ہو اور وہ اس کے علاوہ کوئی چیز نہ پاتا ہو تو اس کے لیے روزے رکھنا جائز ہے؛ یہ امام شافعی کا نقطہ نظر ہے امام ابوحنیفہ نے کہا: وہ روزے نہ رکھے اس پر غلام ہی آزاد کرنا لازم ہے اگرچہ اسے اس کی ضرورت بھی ہو۔ امام مالک نے کہا: جب اس کا گھر ہو اور اس کے پاس خادم بھی ہو تو اس پر غلام آزاد کرنا لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ اگر وہ غلام آزاد کرنے سے عاجز ہو تو اس پر دو ماہ کے پے در پے روزے رکھنا لازم ہوں گے اگر اس نے عذر کے بغیر ان میں افطار کیا تو وہ نئے سرے سے روزے رکھے اگر اس نے سفر یا مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بنا کرے؛ یہ ابن مسیب، حضرت حسن بصری، عطا بن ابی رباح، عمرو بن دینار اور امام شافعی کا نقطہ نظر ہے۔ یہ امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے اور یہ ہی ان کا صحیح مذہب ہے۔ امام مالک نے کہا: جب وہ کفارہ ظہار کے روزوں میں بیمار ہو گیا تو جب صحیح ہو تو پہلے روزوں پر بنا کر لے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ نئے سرے سے روزے رکھے۔ امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ جب اس نے روزے شروع کر دیے پھر غلام پایا تو روزوں کو مکمل کرے؛ یہ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے کیونکہ جب وہ ان میں داخل ہوا تو اسے روزوں کا ہی حکم دیا گیا تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک روزے اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائیں گے اور وہ غلام آزاد کرے گا۔ وہ اسے اس بچی پر قیاس کرتے ہیں جو

---

1۔ تفسیر بغوی

پہلے بالغ تھی جو مہینوں کے اعتبار سے عدت گزار رہی تھی تو وہ عدت کے ختم ہونے سے قبل خون دیکھتی ہے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ وہ نئے سرے سے حیض کے اعتبار سے عدت گزارے گی۔ جب اس نے روزوں کی حالت میں سفر شروع کیا تو اس نے روزہ افطار کر دیا تو وہ نئے سرے سے روزہ رکھے گا؛ یہ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مُتَتَابِعَيْنِ۔ حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے کہ وہ پہلے روزوں پر ہی بنا کر لے کیونکہ یہ عذر ہے اور وہ رمضان پر قیاس کرتے ہیں۔ اگر ان روزوں کے درمیان کوئی زمانہ حائل ہو جائے تو کفارہ میں اس کا روزہ حلال نہیں رہے گا جس طرح عیدین اور رمضان شریف کا مہینہ، اس سے انقطاع واقع ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ ایک ظہار کرنے والے نے دونوں مہینوں کے درمیان دن میں وطی کی تو امام شافعی کے نزدیک اس کا تتابع باطل ہو جائے گا اگر رات کے وقت کی تو تتابع باطل نہیں ہوگا کیونکہ رات روزے کا محل نہیں۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ہر حال میں تتابع باطل ہو جائے اور اس پر ابتداء سے کفارہ واجب ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا یہ شرط دونوں مہینوں اور ان کے بعض کی طرف لوٹ رہی ہے جب اس نے دونوں مہینوں کو ختم ہونے سے پہلے وطی کی تو یہ وہ روزے نہیں ہوں گے جن کا اسے حکم دیا گیا تھا تو نئے سرے سے روزے رکھنے لازم ہوں گے، جس طرح فرمایا: صل قبل أن تكلم زيدا تو اس نے زید سے نماز کی حالت میں کلام کیا یا کہا: صل قبل أن تبصر زيدا تو اس نے نماز کی حالت میں زید کو دیکھا تو اس پر نئے سرے سے نماز پڑھنا لازم ہو جائے گی کیونکہ یہ نماز وہ نماز نہیں جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اسی طرح یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ جس کا مرض لمبا ہو جائے جس سے تندرست ہونے کی امید نہ ہو تو وہ بڑھاپے کی وجہ سے عاجز کے حکم میں ہوگا اور روزوں سے اطعام کی طرف عدول جائز ہوگا۔ اگر مرض ایسا ہو جس سے صحت یاب ہونے کی امید ہو اور اسے اپنی بیوی سے وطی کی حاجت ہو تو اسے اختیار ہوگا کہ صحت مند ہونے کا انتظار کرے یہاں تک کہ روزوں پر قادر ہو جائے۔ اگر اس نے کھانا کھلا کر کفارہ دے دیا اور روزوں پر قادر ہونے کا انتظار نہ کیا تو یہ جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ جس نے ظہار کیا جب کہ وہ تنگدست تھا پھر خوشحال ہو گیا تو اس کے لیے روزے رکھنا جائز نہ ہوں گے۔ جس نے ظہار کیا جب کہ وہ خوشحال تھا پھر وہ تنگدست ہو گیا جب کہ اس نے ابھی کفارہ ادا نہ کیا تھا تو وہ روزے رکھے جس دن اس نے کفارہ دیا اس کی اس دن کی حالت کو دیکھا جائے گا۔ اگر اس نے تنگدستی اور محرومی کی حالت میں جماع کر لیا اور اس نے روزے نہ رکھے یہاں تک کہ خوشحال ہو گیا تو اس پر غلام آزاد کرنا لازم ہو جائے گا۔ اگر اس نے روزے رکھنے شروع کیے پھر وہ خوشحال ہو گیا اگر روزوں میں سے مناسب حصہ گزر چکا تھا جیسے جمعہ یا اس کی مثل (یعنی پورا ہفتہ گزر چکا ہو) تو اس سلسلہ کو جاری رکھے اگر ایک یا دو دن گزرے ہوں تو روزے کو ترک کر دے اور آزادی کی طرف لوٹ آئے یہ اس پر واجب نہیں ہوگا کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس پر نماز ترک کرنا واجب نہیں جس کو پانی میسر ہو جب کہ وہ تیمم کرنے کے بعد نماز میں داخل ہو چکا ہو اور نئے سرے سے وضو کرے؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ اگر اس نے دو کفارہ ظہار کی جانب سے یا قتل اور رمضان کا روزہ توڑنے کی وجہ سے دو غلام آزاد کیے اور ان دونوں کو ہر ایک میں شریک کیا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ یہ اس کے قائم مقام ہوگا کہ اس نے دو کفاروں کی جانب سے ایک غلام کو آزاد کیا ہو۔ اسی طرح اگر اس نے ان دونوں کی جانب سے چار ماہ کے روزے رکھے یہاں تک ان دونوں میں سے ہر ایک جانب سے دو ماہ کے روزے رکھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس کے لیے جائز ہوگا اگر اس نے اپنی دو عورتوں سے ظہار کیا اس نے ایک کی جانب سے ایک غلام آزاد کر دیا مگر کسی عورت کا تعین نہ کیا تو اس کے لیے ان دو میں سے کسی سے بھی وطی کرنا جائز نہیں ہوگا یہاں تک کہ دوسرا کفارہ ادا کرے اگر ان دونوں عورتوں میں سے ایک کا تعین کرے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے ساتھ وطی کرے اور دوسری کی جانب سے بعد میں کفارہ ادا کرے۔ اگر اس نے چار عورتوں سے ظہار کیا تو اس نے ان کی طرف سے تین غلام آزاد کیے اور دو ماہ کے روزے رکھے تو اس کے لیے غلام آزاد کرنا اور روزے رکھنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس نے ہر ایک عورت کی جانب سے پندرہ روزے رکھے ہیں اگر اس نے اس کا کفارہ کھانا کھلانے کی صورت میں دیا تو اس پر دو سو مسکینوں کو کھانا کھلانا جائز ہوگا اگر اکٹھے کھانا کھلانے پر قادر نہ ہو تو الگ الگ کھانا کھلا لے مگر غلام آزاد کرے اور روزہ رکھنے میں تفریق نہیں کر سکتا کیونکہ دو ماہ کے روزوں میں تفریق نہیں کر سکتا اور کھانا کھلانے میں تفریق کر سکتا ہے۔

## فصل

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کا ذکر ترتیب وار کیا ہے روزے رکھنے کی صورت نہ ہوگی یہاں تک غلام آزاد کرنے سے عاجز نہ ہو اسی طرح کھانا اس وقت تک نہیں کھلا سکتا جب تک روزے رکھنے پر قادر ہو جو آدمی روزے نہیں رکھ سکتا اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہوگا ہر مسکین کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب سے دو مد لازم ہوں گے اگر اس نے ہشام کی مد سے کھانا دیا تو 1/2/3 یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب 1/1/2 مد دیا تو بھی جائز ہو جائے گا۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا: افضل، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب سے دو مد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفارہ ظہار میں یہ ارشاد نہیں فرمایا: مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ (المائدہ:89) اس لیے سیر ہو کر کھلانے کا ارادہ واجب ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے ابن قاسم اور ابن عبد الحکم کی روایت میں کہا ایک مد ہشام کے مد کے حساب سے اور اسی سے یہاں سیر ہوا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں طعام کو مطلق ذکر کیا ہے اور وسط کا ذکر نہیں کیا۔ اشہب کی روایت میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب سے دو مد۔ انہیں کہا گیا: کیا تو ہشام کے مد کے حساب سے نہیں کہا کرتا تھا؟ کہا: کیوں نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب سے دو مد مجھے زیادہ محبوب ہیں؛ ابن قاسم نے بھی اس سے اسی طرح نقل کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ ابن وہب اور مطرف کی امام مالک سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مد کے حساب سے دو مد دے؛ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔ امام شافعی وغیرہ علماء کا مذہب یہ ہے کہ ہر مسکین کو ایک مد دے اس پر اس سے زائد لازم نہیں ہوگا کیونکہ وہ کھانا کھلانے کی صورت میں کفارہ ادا کر رہا ہے اس پر ایک مد سے زیادہ دینا لازم نہیں؛

گا۔ اس کی بنیاد روزہ توڑنے اور قسم کا کفارہ ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا اور اطعام جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد سیر ہونا ہے۔ یہ عادت کے مطابق ایک مد سے نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے ہوتا ہے۔

اشہب نے اسی طرح کہا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: کیا ہمارے اور تمہارے درمیان سیر ہونا مختلف ہے؟ فرمایا: ہاں ہمارے نزدیک سیر ہونا نبی کریم ﷺ کے مد کے حساب سے ایک مد سے ہوتا ہے اور تمہارے نزدیک اس سے زیادہ سے ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں برکت کی دعا کی ہے تمہارے بارے میں برکت کی دعا نہیں کی تم ہماری بنسبت زیادہ کھاتے ہو(1)۔ ابوالحسن قابسی نے کہا: اہل مدینہ نے کفارہ ظہار میں ہشام کے مد کا حساب لگایا مقصد ظہار کرنے والوں پر سختی کرنا تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ وہ منکر اور جھوٹ بولتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا(2): یہاں گفتگو ہشام کے مد کے بارے میں ہے جس طرح تم دیکھتے ہو میں پسند کرتا ہوں کہ زمانہ اس کا ذکر مٹا دے اور کتابوں سے اس کا نشان مٹا دے کیونکہ مدینہ طیبہ جہاں وحی نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ وہاں مقیم رہے وہاں ہی ظہار واقع ہوا۔ اس کے بارے میں انہیں حکم دیا فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا انہوں نے اس حکم کو سمجھا اور اس کی مراد کو سمجھا اور یہی سیر ہونا ہے ان کے نزدیک اس کی مقدار معروف تھی۔ اس سیر ہونا کا ذکر روایات میں کثرت سے ہوا اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ شیطان نے ہشام کے کان میں یہ پھونکا اور اس نے یہ رائے قائم کی کہ نبی کریم ﷺ کا مد بندے کو سیر نہیں کرتا شیطان نے اسے وسوسہ ڈالا کہ وہ ایک ایسا مد بنائے جس میں انسان سیر ہو جائے تو اس نے مد کو دو رطل کا بنا دیا اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا جب وہ بیماری سے صحت یاب ہوا تو اس نے مد تین رطل کا بنا دیا؛ اس نے سنت کو تبدیل کر دیا اور برکت کے محل کو ختم کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے جب اپنے رب سے اہل مدینہ کے لیے دعا کی کہ ان کے مد اور صاع میں برکت رکھے جس طرح حضرت ابراہیم کی دعا سے اہل مکہ کے مد میں برکت رکھی نبی کریم ﷺ کی دعا سے ان کے مد میں برکت جاری رہی شیطان نے اس سنت کو تبدیل کرنے اور اس برکت کو ختم کرنے کے لیے کوشش کی ہشام کے علاوہ اس کی کسی نے بات نہیں کی۔ علماء پر لازم ہے کہ وہ اس کے ذکر کو لغو قرار دیں اور اس کے نشان کو مٹا دیں جب وہ اس کے امر کو لغو قرار نہیں دیتے مگر جب وہ احکام میں اس کا ذکر کریں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو ذکر کیا ہے اس کی اسے تفسیر بنائیں جب کہ یہ امر صحابہ پر پہلے ہی منتشر تھا جن پر یہ حکم نازل ہوا تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی؛ اس وجہ سے اشہب کی روایت جس میں نبی کریم ﷺ کے مد کا ذکر ہے میرے نزدیک اس روایت سے زیادہ پسندیدہ ہے جس میں ہشام کے مد کا ذکر ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ امام مالک نے کیسے اس امر پر متنبہ کیا جس قول کا ذکر اشہب نے کیا ہمارے نزدیک سیر ہونا نبی کریم ﷺ کے مد سے ہے اور تمہارے نزدیک سیر ہونا زیادہ سے ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے حق میں برکت کی دعا کی ہے اسی وجہ سے میں یہ قول کرتا ہوں، کیونکہ وہ عبادت جو سنت طریقہ کے مطابق کی جائے اگر وہ بدنی ہو تو جلدی قبول ہو جاتی ہے اگر مالی ہو تو تھوڑی بھی میزان میں بھاری ہوتی ہے پکڑنے والے کے ہاتھ میں زیادہ برکت والی ہوتی ہے، منہ میں زیادہ پاکیزہ اور پیٹ میں کم

1۔ احکام القرآن لابن العربی
2۔ ایضاً

آفت کا باعث اور زیادہ قوت کا باعث ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ ساٹھ سے کم مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر ہر روز ایک ہی مسکین کو نصف صاع دے یہاں تک کہ ساٹھ کا عدد پورا ہو جائے تو یہ اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: عجیب و غریب بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ (☆) نے کہا: آزاد آدمی پر حجر کرنا باطل ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ سے استدلال کیا ہے مگر رشید اور سفیہ میں فرق نہیں کیا۔ یہ کمزور فقہ ہے جو ان کی شان کے مناسب نہیں۔ یہ آیت عام ہے اور اصحاب رسول میں حجر کا فیصلہ عام تھا اور مصالح کو پیش نظر رکھنا اس کا تقاضا کرتا ہے جس پر چھوٹی عمر یا ولایت کی وجہ سے حجر ہو اور وہ سفیہ کی حیثیت میں بالغ ہو مال اسے دینے سے منع کیا ہے تو اس کا عمل اس میں کیسے نافذ ہوگا؟ جب کہ خاص، عام پر غالب آ جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ بعض علماء کے نزدیک ظہار کا حکم اس ظہار کے لیے ناسخ ہے جو ان لوگوں میں طلاق کے طور پر موجود تھا؛ اس کا ہم معنی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوقلابہ اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کفارہ میں جس تغلیظ کا ذکر کیا ہے اس لیے ہے کہ تم اس بات کی تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ کفارہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے جب اس کا ذکر کیا تو اسے واجب کر دیا۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے مطیع ہو جاؤ، اس کی قائم کردہ حدود پر رک جاؤ ان سے تجاوز نہ کرو اسے تکفیر کا نام دیا کیونکہ یہ طاعت ہے اور ایمان کی حیثیت سے حد کی رعایت کرنا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہر وہ چیز جو اس کے مشابہ ہو وہ ایمان ہے اگر یہ سوال کیا جائے: اس کا معنی یہ ہے کہ تم ظہار کی طرف نہ لوٹو جو منکر قول اور جھوٹ ہے۔ اسے کہا جائے گا: یہ جائز ہے کہ یہ مقصود ہو اور پہلا قول بھی مقصود ہو اور معنی یہ ہو کہ یہ اس لیے ہے کہ تم قول منکر اور جھوٹ کی طرف نہ لوٹو بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتے ہوئے ان دونوں کو چھوڑ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو حرام قرار دیا ہے اور جن عورتوں سے ظہار کیا ہے ان سے اجتناب کرو یہاں تک کہ تم کفارہ دے لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں سے حقوق زوجیت ادا کرنے سے منع کیا ہے۔ اور کفارہ ادا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفارہ کا حکم دیا ہے اور اس کی ادائیگی کو لازم کیا ہے اس کے ساتھ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہو جاؤ گے کیونکہ یہ ایسی حدود ہیں جس کی تم حفاظت کر رہے ہو اور ایسی اطاعتیں ہیں جن کو تم ادا کرتے ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی توفیق دینے والی ہے۔

---

☆ امام اعظم کے نزدیک حجر (بیع و شراء کی اجازت نہ ہونا بلکہ اس کا کیا ہوا عقد ولی کی اجازت پر موقوف ہونا) کے تین اسباب ہیں بچپنہ، غلام اور پاگل پن۔ جب بچہ بالغ ہو جائے اور اس میں رشد کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اس کا سارا مال حوالے کرنے سے منع کیا گیا تاہم اسے معاملات کی اجازت دی گئی تا کہ تجربہ اس کی عقل میں اضافہ کا باعث ہو جب وہ پچیس سال کا ہو جائے تو مال اس کے حوالے کرنے کا حکم ہے اس کے بعد کوئی اور فرد اس کے مال کو قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ یہ عین حکمت کی بات ہے اس میں تعجب کے اظہار پر تعجب ہی کیا جا سکتا ہے۔ مترجم

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ اپنی نافرمانی اور اپنی طاعت کو بیان کیا اس کی معصیت ظہار ہے اور اس کی طاعت کفارہ ہے وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تصدیق نہ کرے اس کے لیے عذاب جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝ۚ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝ۧ

''بے شک جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی انہیں ذلیل کیا جائے گا جس طرح ذلیل کیے گئے وہ (مخالفین) جو ان سے پہلے تھے اور بے شک ہم نے اتاری ہیں روشن آیتیں، اور کفار کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ (یاد کرو) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ کرے گا پھر انہیں آگاہ کرے گا جو کچھ انہوں نے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو گن رکھا ہے اور وہ بھلا چکے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ جب مومنین کا ذکر کیا جو اس کی حدود پر رک جاتے ہیں تو اس کی مخالفت کرنے والوں کا بھی ذکر کر دیا۔ محادہ کا معنی دشمنی کرنا اور حدود کی مخالفت کرنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (الحشر: 4) ایک قول یہ کیا گیا ہے: يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح حدیث میں ہے من أهان لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربة جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کیا۔ زجاج نے کہا: محادہ یہ ہے کہ تو ایسی حد میں ہو جو تیرے ساتھی کی حد کی مخالف ہو۔ اس کا اصل معنی ممانعت ہے اسی سے لفظ حدید ہے اسی سے لفظ حداد ہے: یعنی لوہار۔

كُبِتُوْا ابو عبیدہ اور اخفش نے کہا: انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ قتادہ نے کہا: انہیں ذلیل و رسوا کیا گیا جس طرح ان سے قبل لوگوں کو ذلیل و رسوا کیا گیا۔ ابن زید نے کہا: انہیں عذاب دیا تھا۔ سدی نے کہا: ان پر لعنت کی گئی۔ فراء نے کہا: خندق کے روز انہیں غیظ و غضب میں مبتلا کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: بدر کے روز انہیں غیظ و غضب میں مبتلا کیا گیا مراد مشرک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد منافق ہیں۔ كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ كُبِتُوْا سے مراد ہے انہیں ذلیل و رسوا کیا جائے گا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو مدد کی بشارت ہے کلام کو ماضی کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ جس کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے وہ قریب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مذحج کی لغت میں ہے۔

وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ جنہوں نے اللہ، اس کے رسول کی مخالفت کی جو ان لوگوں میں سے تھے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے ساتھ جو ہم نے کیا اس بارے میں ہم نے آیات کو نازل کیا۔ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝

يَوْمَ، پر نصب عذاب مہین کی وجہ سے ہے یا ایسے فعل کے ساتھ ہے جو مضمر ہے اس کی تقدیر ہے اذكر تعظيما لليوم (1)۔

1۔ الکشاف

یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا مردوں اورعورتوں کو ان کی قبروں سے ایک ہی حالت میں اٹھائے گا۔
فَیُنَبِّئُہُمۡ یعنی انہیں خبر دے گا۔ بِمَا عَمِلُوۡا دنیا میں جو عمل کرتے رہے اَحۡصٰىہُ اللّٰہُ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کے صحیفوں کو شمار کر رکھا ہے وَ نَسُوۡہُ وہ اسے بھول چکے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے اعمال کے صحیفوں میں یاد کرایا تا کہ حجت ان پر زیادہ بلیغ ہو جائے۔

وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ۝ اللہ تعالیٰ مطلع ہے اور دیکھ رہا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَ لَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَ لَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ میں مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ میں مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ ہوں پھر وہ انہیں آگاہ کرے گا جو (کرتوت) وہ کرتے رہے قیامت کے دن، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ اس پر کوئی راز مخفی ہے اور نہ ہی اعلانیہ بات۔ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی عام قرأت یاء کے ساتھ ہے کیونکہ فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے۔ ابو جعفر بن قعقاع، اعرج، ابو حیوہ اور عیسیٰ نے ماتکون پڑھا ہے کیونکہ فعل مونث ہے۔ نجوی کا معنی راز داری ہے۔ یہ مصدر ہے اور مصدر کے ساتھ کبھی صفت لگائی جاتی ہے یہ کہا جاتا ہے: قوم نجوی یعنی قوم ذو نجوی اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذۡ ہُمۡ نَجۡوٰۤی (الاسراء: 47)

ثَلٰثَۃٍ یہ مجرور ہے کیونکہ نجوی کا لفظ اس کی طرف مضاف ہے۔ فراء نے کہا: یہ نجوی کی صفت ہے اس وجہ سے مجرور ہے اگر تو چاہے تو نجوی کو اس کی طرف مضاف کر دے اگر تو فعل کو مضمر مانتے ہوئے نصب دے تو یہ جائز ہے؛ یہ ابن ابی عبلہ کی قرأت ہے۔ ثَلٰثَۃٍ اور خَمۡسَۃٍ حال ہونے کی حیثیت سے منسوب ہوں گے جب کہ یتناجون مضمر ہو کیونکہ نجوی اس پر دلالت کرتا ہے؛ یہ زمخشری کا قول ہے۔ ثلاثہ پر رفع پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ نجوی کے محل سے بدل ہے۔ پھر یہ کہا گیا: یہ راز داری نجوی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نجوی تین افراد میں ہوتی ہے وہ کسی امر کو چھپاتے ہیں اور اس کے بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور اسے اسرار کہتے ہیں جو بات دو افراد کے درمیان ہوتی ہے۔

اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وہ جانتا ہے اور ان کی سرگوشی کو سنتا ہے اسی چیز پر آیت کا آغاز اور اختتام دلالت کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نجوی نجوۃ سے مشتق ہے اس سے مراد ابھری ہوئی زمین ہے دو سرگوشیاں کرنے والے سرگوشیاں کرتے ہیں اور راز داری میں تنہائی کا ماحول پیدا کرتے ہیں جس طرح زمین میں سے بلند جگہ متصل جگہوں سے الگ تھلگ ہوتی ہے آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کی قوت سماعت ہر کلام کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس عورت کے مجادلہ کو سن لیا ہے جس

سے اس کے خاوند نے ظہار کیا تھا۔

وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ سلام، یعقوب، ابو العالیہ، نصر اور عیسیٰ نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف مِنْ نَّجْوٰى کے محل پر ہے جب کہ ابھی اس پر مِنْ داخل نہ ہوا کیونکہ اس کی تقدیر مَایَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ (اکثر) یہ اس بنا پر مرفوع ہو کہ اس کا عطف لَآ پر اَدْنٰى کے ساتھ ہو جس طرح تیرا یہ قول ہے: لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے حول پر فتحہ اور قوۃ پر رفع پڑھا جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں مبتدا کی حیثیت میں مرفوع ہوں جس طرح تیرا قول: لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں مفصل گزر چکی ہے۔ زہری اور عکرمہ نے اکبر، باء کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ عام قرأت ثاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کا محل جر ہے۔ فراء نے مَایَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ کے بارے میں کہا: یہاں عدد مقصود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ ہر عدد کی صورت میں سب سے زیادہ آگاہ ہے خواہ عدد کم ہو یا زیادہ ہو۔ وہ راز داری یا بلند آواز سے جو کچھ کہتے ہیں سب کچھ جانتا ہے اس پر کوئی راز یا عدد یا چیز مخفی نہیں اسی وجہ سے بعض اعداد کا ذکر کیا بعض کا ذکر نہیں کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ ان کے ساتھ ہے خواہ وہ جہاں بھی ہوں اس کا علم نہ زائد ہوگا نہ منتقل ہوگا۔ یہ آیت منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ کچھ امور راز داری سے کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا پھر اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اچھے برے عمل کے بارے میں آگاہ کر دے گا۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہیں (اسلام کے خلاف) سرگوشیوں سے روکا گیا پھر دوبارہ وہی کرتے ہیں جس سے انہیں روکا گیا اور سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ، ظلم اور رسول کی نافرمانی کے بارے میں۔ اور جب آپ کی خدمت میں آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام دیتے ہیں جیسے اللہ نے آپ کو سلام نہیں دیا اور وہ کہا کرتے تھے آپس میں کہ (اگر یہ سچے رسول ہیں) تو اللہ تعالیٰ ہماری ان باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ کافی ہے انہیں جہنم اور اس میں داخل ہوں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ یہودیوں اور منافقوں کے بارے میں ہے جیسا پہلے ہم نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مومنوں کے بارے میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت یہودیوں اور منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی وہ مومنوں کو دیکھتے اور آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ مومن کہتے: شاید انہیں ہمارے مہاجر اور انصاری بھائیوں اور رشتہ داروں کے بارے میں شہادت، مصیبت اور ہزیمت کے بارے میں خبر پہنچی ہے۔ یہ امر انہیں پریشان کرتا ان کی شکایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں زیادہ ہوگئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نجوی سے منع کیا تو وہ نہ رکے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہودیوں کے درمیان لاتعلقی سی تھی جب کوئی مومن ان کے پاس سے گزرتا تو وہ آپس میں مشورہ کرتے یہاں تک کہ مومن کسی برائی کا گمان کرتا تو وہ مومن اپنا راستہ چھوڑ دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع کیا تو وہ نہ رکے۔ حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے کہا: کوئی آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنی ضرورت پیش کرتا اور سرگوشی کا انداز اپناتا ان دنوں جنگ کا دور دورہ تھا صحابہ کرام یہ گمان کرتے کہ یہ آدمی آپ سے جنگ، مصیبت یا کسی اہم امر کے بارے میں سرگوشی کررہا ہے تو اس وجہ سے صحابہ کرام گھبرا جاتے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

**مسئلہ نمبر 2** ۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے: ایک روز ہم گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے پوچھا: ''یہ سرگوشیاں کیا ہیں؟ کیا تم سرگوشی سے باز نہیں آؤ گے؟'' ہم نے عرض کی: ہم نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا یا رسول اللہ! ہم دجال کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب کہ ہم ڈر رہے تھے۔ فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس امر کے بارے میں خبر نہ دوں جو میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے''۔ ہم نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: ''شرک خفی، وہ یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی آدمی کے ہاں مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے لیے کوئی کام کرنے لگے''۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حمزہ، خلف اور رویس نے یعقوب سے وینتجون، یفتعلون کے وزن پر پڑھا ہے: یہ حضرت عبداللہ اور ان کے اصحاب کی قرأت ہے باقی قراء نے ویتناجون، یتفاعلون کے وزن پر پڑھا ہے: ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذَا تَنَاجَيْتُمْ اور تَتَنَاجَوْا۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے حکایت بیان کی ہے کہ باب تفاعل اور افتعال ایک ہی معنی میں آتے ہیں جس طرح تخاصموا اور اختصموا، تقاتلوا اور اقتتلوا اسی وجہ سے یتناجون اور ینتجون، ہم معنی ہیں بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ مراد جھوٹ اور ظلم ہے۔ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ رسول اللہ کی مخالفت۔ ضحاک، مجاہد اور حمید نے و معصیات الرسول جمع کے صیغہ کے طور پر پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3** ۔ وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ علماء میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کا مصداق یہودی ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور کہتے: السام علیك وہ ظاہر میں سلام اور باطن میں موت مراد لیتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں کہتے ''علیکم'' یہ ایک روایت میں ہے اور دوسری روایت میں ہے وعلیکم۔ ابن عربی نے کہا: یہ مشکل

1۔ تفسیر طبری

ہے(1)۔ وہ کہا کرتے تھے: اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں گالی دینے اور انہیں حقیر جاننے کے باوجود ہمیں مہلت نہ دیتا اور اس امر سے ناواقف تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حلیم ہے جو اس کو گالی دیتا ہے اس کے بارے میں جلدی نہیں کرتا، تو جو اس کے نبی کو گالی دے گا اس کے بارے میں کیوں جلدی کرے گا؟ یہ بات تو ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر اذیت پر صبر کرنے والا کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لیے بیوی اور بچے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ انہیں عافیت عطا فرماتا ہے اور انہیں رزق عطا فرماتا ہے'' اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو ان کے رازوں کو ظاہر کرنے، ان کے باطن کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے نازل فرمایا تا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے معجزہ ہو جائے۔ قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: السام علیکم نبی کریم ﷺ نے اسے جواب دیا اور پوچھا: ''کیا تم جانتے ہو اس نے کیا کہا؟'' صحابہ نے عرض کی: اللہ و رسوله اعلم۔ فرمایا: ''اس نے یہ کہا، اسے میرے پاس واپس لاؤ''۔ صحابہ اسے واپس لائے فرمایا: ''تو نے کہا السام علیکم'' اس نے کہا: ہاں۔ اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب اہل کتاب تمہیں سلام کہیں تو کہو تجھ پر وہی جو تو نے کہا'' تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

میں نے کہا: امام ترمذی نے اس کی تخریج کی ہے، کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے یہ بات ثابت ہے انہوں نے کہا: کچھ یہودی لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے کہا: السام علیك یا ابا القاسم! تو میں نے کہا: السام علیکم و فعل اللہ بکم و فعل۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! رک جاؤ اللہ تعالیٰ فحش گوئی کو پسند نہیں فرماتا''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ دیکھتے نہیں وہ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا: کیا تو نہیں دیکھتی کہ میں انہیں وہی جواب دیتا ہوں جو وہ کہتے ہیں، میں کہتا ہوں وعلیکم'' تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ آپ پر سلام بھیجتا ہے اور وہ کہتے ہیں: السام علیك اور سام سے مراد موت ہے: اسے امام بخاری نے نقل کیا ہے اور امام مسلم نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالک سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم کہو وعلیکم'' روایت اسی طرح ہے یعنی وعلیکم۔ علماء نے اس بارے میں گفتگو کی ہے کیونکہ واؤ عاطفہ شرکت کا تقاضا کرتی ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انہوں نے ہمارے بارے میں جس موت کی دعا کی ہے وہ ان پر بھی واقع ہو یا یہ سامة سے مشتق ہے جس کا معنی اکتا جانا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: سئم یسئم سامة و ساما بعض نے کہا: واؤ زائدہ ہے جس طرح شاعر کے شعر میں

لَنَا أَجَزْنَا سَاحَةَ الْحَيِ وَانْتَحَى

اصل کلام یہ ہے لنا أجزنا انتحی یہاں واؤ زائدہ ہے۔ بعض نے کہا: واؤ مستانفہ ہے گویا کہا: والسام علیکم۔ بعض نے کہا: یہ واؤ عاطفہ ہے اور ہمیں کوئی تکلیف نہیں دیتی کیونکہ جب ہم ان کے حق میں بددعا کرتے ہیں تو ہماری بددعا قبول کی

1۔ احکام القرآن لابن العربی

جاتی ہے اور ہمارے بارے میں ان کی بددعا قبول نہیں کی جاتی، جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا زبیر نے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کچھ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سلام کیا تو کہا: السام علیك یا ابا القاسم! تو فرمایا: وعلیکم حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: میں غصے ہو گئی عرض کی: ألم تسمع ما قالوا؟ کیا وہ جو کہتے ہیں آپ سنتے نہیں؟ فرمایا: ''کیوں نہیں میں نے اسے سنا ہے میں نے انہیں جواب دے دیا ہے۔ ان کے بارے میں ہماری بددعا قبول کی جاتی ہے اور ان کی بددعا ہمارے بارے میں قبول نہیں کی جاتی''۔ امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے واؤ کی روایت معنی کے اعتبار سے اچھی ہے اس کا ثابت رکھنا زیادہ صحیح ہے اور زیادہ مشہور ہے۔

اہل ذمہ کو سلام کا جواب دینے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ واجب ہے جس طرح مسلمانوں کو جواب دینا واجب ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، شعبی اور قتادہ نے کہا: یہ واجب ہے۔ امام مالک اس طرف گئے ہیں کہ جواب دینا واجب نہیں؛ یہ اشہب نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ اگر تو اسے جواب دے تو تو کہہ علیك۔ ابن طاؤس نے جواب میں یہ کہنا پسند کیا ہے: علاك السلام۔ یعنی سلامتی تجھ سے اٹھ چکی ہے۔ ہمارے بعض اصحاب نے کہا: السلام سین کے کسرہ کے ساتھ ہے مراد پتھر ہے۔ امام مالک نے جو کہا ہے سنت کی اتباع میں یہ اولی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں یہودی آئے انہوں نے کہا: السام علیك یا ابا القاسم! فرمایا: وعلیکم۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: میں نے کہا: بل علیکم السام والذام۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! فحش گفتگو کرنے والی نہ بن''۔ حضرت عائشہ نے کہا: انہوں نے جو کہا اس کو آپ نے نہیں سنا۔ فرمایا: ''انہوں نے جو کچھ کہا کیا میں نے اسے لوٹا نہیں دیا؟ میں نے کہا وعلیکم'' ایک روایت میں ہے۔ حضرت عائشہ انہیں بھانپ گئیں تو انہیں گالیاں دیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! رک جاؤ اللہ تعالیٰ فحش اور تفحش کو پسند نہیں کرتا'' اور کچھ زائد ارشاد فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: الذام میم کی تخفیف کے ساتھ ہے جس کا معنی عیب ہے ضرب المثل میں ہے لا تَعْدَمُ الحسناءُ ذاما۔ حسینہ عیب سے خالی ہوتی۔ کبھی اس میں ہمزہ لایا جاتا ہے اور کبھی نہیں لایا جاتا یہ کہا جاتا ہے: ذَامَهُ یَذْأَمُهُ جس طرح ذأب یذأب اس کا اسم مفعول مذءوم ہے یہ مہموز ہے اس سے مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (الاعراف: 18) ہے یہ کہا جاتا ہے: ذامه یذومه جس طرح رامه، یرومه۔

وَ یَقُوْلُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ انہوں نے کہا: اگر حضرت محمد (ﷺ) نبی ہوتے تو ہم جو کچھ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں ضرور عذاب دیتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کہتے وہ ہمیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے وعلیکم السام اور سام کا معنی موت ہے اگر وہ نبی ہوتا تو ہمارے بارے میں اس کی دعا قبول کی جاتی اور ہم مر جاتے۔ یہ ان کی جانب سے تعجب کا موقع ہے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انبیاء بھی غضب ناک ہوتے ہیں تو جن پر وہ غضب ناک ہوتے ہیں ان کو جلدی عذاب نہیں دیا جاتا۔

**حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ** دار آخرت میں سزا کے طور پر جہنم ان کے لیے کافی ہے **فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ** ۞ یہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! جب تم خفیہ مشورہ کرو تو مت خفیہ مشورہ کرو گناہ، زیادتی اور رسول (کریم) کی نافرمانی کے متعلق بلکہ نیکی اور تقویٰ کے بارے میں مشورہ کیا کرو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کی (بارگاہ) میں تمہیں جمع کیا جائے گا''۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ مومنوں کو اس سے منع کیا کہ وہ منافقوں اور یہودیوں کی طرح باہم سرگوشیاں نہ کریں تو فرمایا: اے مومنو! جب تم رازداری سے بات کرو فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا یہ عام قرأت ہے یحییٰ بن وثاب، عاصم اور رویس نے یعقوب سے فلا تنتجوا، انتجاء سے پڑھا ہے۔ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ بر سے مراد طاعت ہے۔ وَالتَّقْوٰى اللہ تعالیٰ نے جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچنے کی بات کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خطاب منافقوں کو ہے مراد ہوگا اے وہ لوگو! جو اپنے گمان کے مطابق مومن ہیں(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والو! وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ یعنی آخرت میں تمہیں جس کی بارگاہ میں جمع کیا جائے گا اس اللہ سے ڈرو۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

''(کفار کی) سرگوشیاں تو شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ غمزدہ کردے ایمان والوں کو حالانکہ وہ انہیں کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اور اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے اہل ایمان کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ یہ نجویٰ شیطان کی طرف سے مزین کرنے کی وجہ سے ہے لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کیونکہ مومن خیال کرتے تھے سرایا (چھوٹے لشکر) میں مسلمانوں کو کوئی مصیبت واقع ہوگئی ہے یا وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے اجتماع کیا کرتے تھے بعض اوقات وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مناجات کیا کرتے تھے تو مسلمان گمان کرتے تھے کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ان کے نقائص بیان کیا کرتے ہیں۔ وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ یہ سرگوشیاں مومنوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے علم سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس کے امر سے۔ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ یعنی انہیں اپنے امور اللہ کے سپرد کرنے اور تمام لوگ اس کی مدد کے سپرد کرنے چاہئیں اور شیطان اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے کیونکہ اسی ذات نے بندے کے امتحان اور آزمائش کی خاطر شیطان کو وساوس کے ساتھ ان پر مسلط کیا ہے اگر چاہے تو

1۔ زاد المسیر

شیطان کو اس سے دور کر دے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تین افراد ہوں تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشیاں نہ کریں''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم تین ہو تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشیاں نہ کریں یہاں تک کہ تم لوگوں میں گھل مل جاؤ تا کہ وہ اکیلا غمگین نہ ہو''۔ اس حدیث میں اس منع کرنے کی علت بیان کر دی ہے وہ یہ ہے کہ تیسرا آدمی اس کو پائے جس کے ساتھ وہ گفتگو کرے جس طرح حضرت ابن عمر نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک آدمی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے تو ایک اور آدمی آ گیا جو آپ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا تو آپ نے اس سے راز داری سے بات نہ کی یہاں تک کہ چوتھے آدمی کو بلایا تو آپ نے اسے اور پہلے آدمی کو کہا: تم دونوں پیچھے ہو جاؤ اور جو سرگوشیاں کرنا چاہتا تھا اس کے ساتھ سرگوشی کی۔ اسے امام موطا نے نقل کیا ہے۔ اس میں علت پر تنبیہ بھی ہے۔ من اجل ان یحزنہ۔ یعنی اس کے دل میں ایسی بات واقع ہو جو اسے غمگین کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دل میں سوچے کہ یہ بات اس کے متعلق ہے جو اسے ناپسند ہے یا انہوں نے اسے اس کے اہل نہیں سمجھا کہ وہ اسے اپنی بات میں شریک کریں اس کے علاوہ شیطان کے وساوس اور نفس کے توہمات ہو سکتے ہیں یہ سب صورتیں تب ہو سکتی ہیں کہ وہ اکیلا رہ گیا ہو جب اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو تو وہ اس سے امن میں ہوگا اس علت کی بنا پر تمام عدد اس حکم میں برابر ہوں گے۔ چار ایک کو چھوڑ کو سرگوشی نہ کریں اور دس ایک کو چھوڑ کر اسی طرح ایک ہزار کیونکہ یہی وجہ اس عدد میں بھی پائی جا رہی ہے بلکہ کثیر تعداد میں اس کا وجود زیادہ وقیع ہے اس لیے اسے منع کرنا زیادہ مناسب ہے۔ تین کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ یہ پہلا وہ عدد ہے جس میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔ اس حدیث کا ظاہر تمام زمانوں اور احوال کو شامل ہے؛ اسی طرف حضرت ابن عمر، امام مالک اور جمہور گئے ہیں۔ خواہ سرگوشی کسی مستحب امر میں ہو، مباح میں ہو یا واجب میں ہو کیونکہ غم اس میں واقع ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ یہ ابتداء اسلام میں تھا کیونکہ یہ حکم منافقین کے بارے میں تھا منافق مومنوں کو چھوڑ کر آپس میں سرگوشیاں کیا کرتے تھے جب اسلام عام ہو گیا تو یہ حکم ساقط ہو گیا۔ بعض نے کہا: یہ حکم سفر میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جس میں ایک آدمی اپنے ساتھی سے امن میں نہیں ہوتا جہاں تک شہر اور آبادی کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہاں وہ ایسے شخص کو پاتا ہے جو اس کی مدد کر سکتا ہے سفر کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہاں دھوکہ کا امکان ہوتا ہے اور مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪

''اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جائے کہ (آنے والوں کے لیے) جگہ کشادہ کر دو مجلس میں تو کشادہ کر دیا کرو اللہ تمہارے لیے کشادگی فرمائے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو اللہ تعالیٰ ان کے جو

تم میں سے ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند فرمائے گا، اور اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو اس سے خوب آگاہ ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ جب اس امر کی وضاحت کی کہ یہودی آپ کو ایسے انداز میں سلام کرتے ہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اس امر پر ان کی مذمت کی ساتھ ہی انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حسن ادب کا حکم دیا تاکہ وہ آپ پر مجلس کو تنگ نہ کر دیں اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ باہم شفقت اور محبت کا اظہار کریں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے لیے جگہ کھلی کر دیں تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن سکیں اور آپ کا دیدار کر سکیں۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں باہم مقابلہ کیا کرتے تھے تو انہیں حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے جگہ کھلی کر دیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں مراد قتال کی مجالس ہیں جب وہ جنگ کرنے کے لیے صف بندی کیا کرتے تھے (2)۔ حضرت حسن بصری اور یزید بن ابی حبیب نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکوں سے جنگ کرتے تو آپ کے صحابہ پہلی صف میں کھڑا ہونے کو پسند کرتے تھے وہ ایک دوسرے کے لیے جگہ نہ چھوڑتے وہ قتال اور شہادت میں رغبت رکھتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فرمایا: **مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ** (آل عمران: 121) مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفہ میں موجود تھے جمعہ کے روز جگہ میں تنگی ہو جاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بدری مہاجرین و انصاری کی تعظیم کرتے بدری صحابہ آئے ان میں حضرت ثابت بن قیس بن شماس تھے ان سے پہلے ہی لوگ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بدری صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد کھڑے ہو گئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ ان کے لیے جگہ کھلی کر دی جائے گی تو لوگوں نے ان کے لیے جگہ کھلی نہ کی یہ امر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاق گزرا آپ کے اردگرد جو غیر بدری صحابہ موجود تھے آپ نے انہیں فرمایا: ''اے فلاں تو اٹھ، اے فلاں تو اٹھ'' اتنے افراد کا نام لیا جس قدر بدری صحابہ کھڑے تھے جسے اٹھایا گیا اس پر یہ امر شاق گزرا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہروں سے ناگواری کے آثار محسوس کر لیے۔ منافقوں نے آنکھوں سے اشارے کیے اور یہ کہا: ان سے انصاف نہیں ہوا انہوں نے اپنے نبی کے قرب کو پسند کیا اور پہلے آئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: تَفَسَّحُوْا کا معنی ہے کھل جاؤ۔

فسح فلان لأخيه في مجلسه يفسح فسحا یعنی اس کے لیے جگہ کو کھلا کر دیا؛ اسی معنی میں ان کا قول ہے بلد فسیح ولك في كذا فسحة شہر کھلا ہے تیرے لیے اس میں وسعت ہے فسح يفسح کا باب منع يمنع کی طرح ہے معنی ہے بیٹھنے والی جگہ کو کھلا کر دیا۔ فَسُحَ يَفْسُحُ فَسَاحَةً جس طرح كَرُمَ يَكْرُمُ كَرَامَةً یعنی کھلا ہو گیا اسی معنی میں مکان فسیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ سلمی، زر بن حبیش اور عاصم نے في المجالس پڑھا ہے۔ قتادہ، داؤد بن ہند اور حسن بصری نے ان سے اختلاف کیا ہے جب کہ باقی قراء نے تفسحوا في المجلس پڑھا ہے۔ جس نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے تو وہ اس امر کی خ

1۔ تفسیر طبری 2۔ زاد المسیر

دیتا ہے کہ ہر ایک کے لیے ایک مجلس ہے اسی طرح اگر جنگ کا ارادہ کیا جائے اس طرح یہ بھی جائز ہے کہ مسجد نبوی کا ارادہ کیا جائے۔ صیغہ جمع کا ذکر کیا کہ ہر بیٹھنے والے کے لیے ایک مجلس ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اگر مجلس سے مراد نبی کریم ﷺ کی مجلس ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ جنس کے اعتبار سے جمع مراد ہو جس طرح عربوں کا قول ہے: کثر الدینار والدرھم۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ ہر مجلس میں عام ہے جس میں مسلمان خیر اور اجر کے لیے جمع ہوں خواہ جنگ کی مجلس ہو، ذکر کی مجلس ہو یا جمعہ کے دن کی مجلس ہو کیونکہ ہر ایک ایسی جگہ کا زیادہ حق دار ہے جس کی طرف وہ سبقت لے گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو ایسی جگہ کی طرف سبقت لے گیا جس کی طرف پہلے کوئی سبقت نہیں لے گیا تھا تو وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے مگر وہ اپنے بھائی کے لیے جگہ وسیع کر دے جب تک اس سے اذیت میں مبتلا نہ ہو کہ کہیں تنگی اسے اپنی جگہ سے ہی نہ نکال دے''۔

امام مسلم حضرت ابن عمر سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی آدمی کسی آدمی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے پھر اس میں خود بیٹھے'' آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کیا کہ ایک آدمی کو اس کی جگہ سے اٹھایا جائے اور اس میں کوئی آدمی بیٹھے، بلکہ کھل جاؤ اور جگہ کو وسیع کر دو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس امر کو ناپسند کرتے تھے کہ ایک آدمی اپنی جگہ سے اٹھ جائے پھر اس جگہ بیٹھے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جب لوگوں میں سے کوئی مسجد کی ایک جگہ میں بیٹھے تو کسی اور کے لیے جائز نہیں کہ اسے اٹھائے اور اس کی جگہ بیٹھے۔ امام مسلم نے ابو زبیر سے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو جمعہ کے روز اپنی جگہ سے نہ اٹھائے پھر اس کے بیٹھنے کی جگہ کی طرف آئے اور اس میں بیٹھ جائے بلکہ کہے کھل جاؤ''۔

مسئلہ۔ کسی جگہ بیٹھنے والا شخص جب اٹھے یہاں تک کہ کوئی اور اس کی جگہ بیٹھ جائے تو اس میں غور و فکر کیا جائے گا اگر وہ جگہ جس کے لیے وہ اٹھا ہے وہ امام کا کلام سننے میں پہلے کی طرح ہے تو اس کے لیے یہ مکروہ نہیں اگر وہ جگہ امام سے دور ہے تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے کیونکہ اس میں اپنے حصہ کو فوت کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب کوئی انسان دوسرے انسان کو کہے کہ وہ جامع مسجد کی طرف جلدی جائے وہ اس کے لیے ایک جگہ مختص کر دے جہاں وہ آ کر بیٹھے تو یہ مکروہ نہیں جب کہنے والا آئے تو پہلے سے موجود شخص اس کے لیے اٹھ کھڑا ہو کیونکہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابن سیرین کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے غلام کو جمعہ کے روز بھیجتے کہ وہ ان کے لیے جگہ بنائے وہ غلام ان کے لیے ایک جگہ بیٹھ جاتا جب وہ آتے تو وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوتا۔

**مسئلہ**۔ اس صورت میں یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اگر کوئی آدمی قالین یا سجادہ بھیجے تو مسجد کی کسی جگہ اس کے لیے بچھا دیا جائے تو یہ جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذا قام احدکم اور ابو عوانہ کی حدیث میں ہے من قام من مجلس یعنی جو آدمی اپنی جگہ سے اٹھا پھر وہ اسی جگہ کی طرف لوٹا تو وہ

اس جگہ بیٹھنے کا زیادہ حقدار ہے۔

ہمارے علماء نے کہا: یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا قول صحیح ہے جو یہ کہتا ہے کہ بیٹھنے والا اپنی جگہ کے لیے خاص ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ وہاں سے اٹھ جائے کیونکہ وہاں سے اٹھنے کے بعد جب وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے تو اس سے پہلے تو بدرجہ اولی اسی جگہ کا مستحق ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس جگہ کا اس کے لیے خاص ہونا بطور رغبت ہے کیونکہ یہ جگہ کسی کی ملکیت نہیں نہ بیٹھنے سے پہلے اور نہ ہی بیٹھنے کے بعد۔ اس میں اعتراض کی گنجائش ہے وہ یہ ہے کہ کہا جائے: ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں لیکن یہ جگہ اس کے لیے خاص رہے گی یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو وہ جگہ اسی طرح ہو جائے گی گویا وہ اس کی منفعت کا مالک ہے کیونکہ کسی دوسرے فرد کو اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ مزاحمت کرے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری قبروں میں وسعت پیدا کردے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے دلوں میں وسعت پیدا کردے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دنیا و آخرت میں تمہارے لیے وسعت پیدا کردے گا(1)۔

وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا نافع، ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں شین کو مضموم پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے کسرہ دیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح یُعْكُفُون اور یَعْرِشُون ہے اس کا معنی ہے نماز، جہاد اور عمل خیر کے لیے اٹھو؛ یہ اکثر مفسرین نے کہا۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: جب نماز کے لیے اذان کہی جائے تو نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ لوگ نماز سے سستی کیا کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت حسن بصری اور مجاہد نے کہا: جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ ابن زید نے کہا: یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے متعلق ہے ہر ایک آدمی یہ پسند کرتا کہ وہ سب سے آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جب تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کہا جائے اٹھو تو اٹھ جاؤ کیونکہ آپ کی کچھ ضروریات ہیں تو اس لیے رکے نہ رہو۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے جب تم کو معروف امر کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک کہو؛ یہی قول صحیح ہے کیونکہ یہ عام ہے۔ اور نشز کا معنی بلند ہونا ہے یہ نشز الأرض سے ماخوذ ہے اس سے مراد زمین کا بلند ہونا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: نَشَزَ يَنْشُزُ وَ يَنْشِزُ جب وہ اپنی جگہ سے اوپر اٹھ جائے۔ اِمراۃ ناشزۃ یعنی وہ عورت جو اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کرے۔ اس کی اصل نشز ہے نشز کا معنی ہے جو زمین سے اوپر اٹھ جائے؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ یعنی آخر میں ثواب اور دنیا میں کرامت میں درجات بلند فرمائے گا، اللہ تعالیٰ مومن کو غیر مومن پر بلند کرے گا اور عالم کو غیر عالم پر بلند کرے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں علماء کی مدح کی ہے معنی ہے اللہ تعالیٰ علماء کو ان مومنوں پر درجہ میں بلند کرے گا جن کو علم نہیں دیا گیا جب کہ وہ ان امور کو بجا لائیں جن کا انہیں حکم دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غنی لوگ ناپسند کرتے تھے کہ ان کے ساتھ وہ آدمی مل بیٹھے جو اون کا لباس زیب تن کرتا ہے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جلدی جائے تو خطاب ان

---

1۔ الکشاف

کو ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غنی کو دیکھا جو ایک فقیر سے نفرت کی وجہ سے اپنے کپڑے کو سمیٹ رہا تھا جس فقیر نے اس کے پاس بیٹھنے کا ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے فلاں! کیا تجھے ڈر ہوا کہ تیری غنا اس کی طرف متعدی ہو جائے گی یا اس کا فقر تیری طرف متعدی ہو جائے گی''۔

اس آیت میں اس امر کو واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رفعت و بلندی علم و ایمان کے ساتھ ہے مجالس میں آگے بیٹھنے کے ساتھ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کو پڑھا۔ یحییٰ بن یحییٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے: یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ سے مراد صحابہ ہیں۔ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے عالم اور حق کے طالب کو بلند فرماتا ہے۔

میں کہتا ہوں: مسئلہ میں عموم زیادہ وقیع اور آیت کے معنی کے زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ پہلی دفعہ مومن کو اس کے ایمان کے ساتھ اور دوسری دفعہ اس کے علم کے ساتھ بلند فرماتا ہے۔ صحیح میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس کو صحابہ پر مقدم رکھتے تھے صحابہ نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو بلایا اور حضرت عبد اللہ بن عباس کو بھی بلایا صحابہ سے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو صحابہ خاموش ہو گئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت ہے جس بارے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے وہی جانتا ہوں جو آپ جانتے ہیں۔

بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر آئے اور اپنے بھتیجے حسر بن قیس بن حصن کے ہاں ٹھہرے لوگوں میں سے کچھ ایسے تھے جنہیں حضرت عمر اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ قراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصحاب مجلس اور اہل مشورہ ہوا کرتے تھے وہ بڑی عمر کے ہوتے یا جوان ہوتے۔ یہ چیز سورۂ اعراف کے آخر میں واقع ہوئی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نافع بن عبد حرث حضرت عمر سے عسفان میں ملے حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں مکہ مکرمہ کا عامل بنانا چاہتے تھے۔ پوچھا: اہل وادی پر کس کو آپ نے عامل بنایا ہے؟ جواب دیا: ابن ابزی کو۔ پوچھا: ابن ابزی کون ہے؟ جواب دیا: وہ ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا: کیا آپ نے ان پر ایک غلام کو عامل بنایا ہے؟ جواب دیا: وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا قاری ہے، وہ فرائض کا علم رکھنے والا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خبردار! تمہارے نبی نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کئی لوگوں کو رفعت عطا فرماتا ہے اور اس کے ذریعے دوسروں کو پست کرتا ہے''۔ کتاب کے شروع میں بحث گزر چکی ہے۔ علم و علماء کی فضیلت کے حوالے سے گفتگو اسی کتاب میں کئی اور مواقع پر گزر چکی ہے۔ الحمد للہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت مروی ہے کہ فرمایا: ''عالم اور عابد کے درمیان ستر درجے ہیں اور ہر درجے کے درمیان ضامر گھوڑے کی ستر سال کی مسافت حائل ہے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے: ''عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہوتی ہے''۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے: قیامت کے روز تین

قسم کے افراد شفاعت کریں گے انبیاء، علماء اور شہداء۔ اس مقام کی عظمت کو تصور کر جو نبوت اور شہادت کے درمیان واسطہ ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم، مال اور ملک میں اختیار دیا گیا تو آپ نے علم کو پسند کیا تو مال اور ملک آپ کو ساتھ میں دے دیا گیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

”اے ایمان والو! جب تنہائی میں بات کرنا چاہو رسول (مکرم) سے تو سرگوشی سے پہلے صدقہ دیا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور (دلوں کو) کو پاک کرنے والی ہے، اور اگر تم (اس کی سکت) نہ پاؤ تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ، نَاجَيْتُمْ یعنی تم راز داری سے بات کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت اس وجہ سے نازل ہوئی کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بے شمار مسائل پیش کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ آپ کے لیے مشکلات پیدا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پریشانی میں کمی کردے۔ جب یہ کہا تو بہت سے لوگ رک گئے پھر اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت کے ساتھ اس میں تخفیف کردی۔ حضرت حسن بصری نے کہا یہ آیت اس وجہ سے نازل ہوئی کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں ملتے اور آپ سے سرگوشیاں کرتے تو مسلمانوں میں سے ایک قوم نے گمان کیا کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کے نقائص بیان کرتے ہیں تو یہ چیز ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے راز داری سے بات کرنے پر صدقہ کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ خلوت میں بات کرنے سے رک جائیں۔

زید بن اسلم نے کہا: یہ آیت اس وجہ سے نازل ہوئی کہ منافقین اور یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشیاں کرتے اور کہتے: یہ کان کے کچے ہیں جو کچھ انہیں کہا جائے اسے مان لیتے ہیں، وہ کسی کو مناجات سے منع نہیں کرتے۔ یہ امر مسلمانوں پر شاق گزرتا کیونکہ شیطان ان کے نفسوں میں یہ القاء کرتا کہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کی ہے کہ کچھ لشکر مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وہ نہ رکے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو اہل باطل سرگوشی کرنے سے رک گئے کیونکہ انہوں نے سرگوشی سے قبل صدقہ نہ کیا۔ یہ امر اہل ایمان پر شاق گزرا اور وہ بھی سرگوشی کرنے سے رک گئے کیونکہ ان کی کثیر تعداد صدقہ پیش کرنے سے عاجز تھی تو اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت میں ان سے تخفیف فرمادی۔

**مسئلہ نمبر 2۔** ابن عربی نے کہا(1): زید سے مروی اس خبر میں ایسی چیز ہے جو اس بات پر دال ہے کہ احکام مصالح کے اعتبار سے مرتب نہیں ہوتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ پھر اس کے خیر اور پاکیزہ ہونے کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی

باوجود اسے منسوخ کر دیا۔ یہ معتزلہ پر عظیم رد ہے جو وہ یہ کہتے ہیں کہ احکام میں مصالح کا التزام ضروری ہے لیکن اس حدیث کا راوی عبد الرحمن ہے جو زید کا بیٹا ہے علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ یہ معتزلہ کے رد میں نص متواتر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام ترمذی نے علی بن علقمہ انماری سے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً نازل ہوئی تو میں نے آپ سے پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: ''دینار کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟'' میں نے عرض کی: وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ فرمایا: ''نصف دینار؟'' میں نے عرض کی: وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ فرمایا: ''تو کتنا؟'' میں نے عرض کی: جو (کے برابر وزن) فرمایا: ''تو تو بہت ہی زہد اختیار کرنے والا ہے'' تو یہ آیت نازل ہوئی ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ کہا: میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت سے تخفیف فرمائی۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے ہم اسے اسی سند سے ہی پہچانتے ہیں۔ ان کے قول شعیرہ (جو) کا معنی ہے سونے میں سے جو کا وزن۔ ابن عربی نے کہا: یہ امر دو اصولی اچھے مسالوں پر راہنمائی کرتا ہے (۱) عبادت پر عمل سے پہلے ہی منسوخ کرنا (۲) معین مقداروں میں قیاس کے ذریعے غور و فکر کرنا جب کہ امام ابو حنیفہ نے اس میں اختلاف کیا ہے۔

میں نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ نسخ صدقہ کے فعل کے بعد ہوا۔ مجاہد سے مروی ہے کہ اس بارے میں سب سے پہلے صدقہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرگوشی کی۔ ان کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے انگوٹھی کا صدقہ کیا۔ قشیری اور دوسرے علماء نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت ہے جس پر مجھ سے قبل کسی نے عمل نہیں کیا اور میرے بعد اس پر کوئی عمل نہیں کرے گا وہ یہ آیت ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً میرے پاس ایک دینار تھا جس کو میں نے بیچا جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرتا تو میں ایک درہم صدقہ کرتا یہاں تک کہ وہ درہم ختم ہو گئے۔ تو اسے ایک دوسری آیت کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو بعد والی آیت سے منسوخ کر دیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: حضرت علی شیر خدا کے لیے تین خصوصیات ایسی تھیں اگر ان میں سے ایک بھی میرے لیے ہوتی تو وہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی۔ (۱) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح (۲) غزوۂ خیبر کے موقع پر جھنڈے کا عطا کیا جانا (۳) سرگوشی والی آیت۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ روکنے سے یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور نافرمانیوں سے پاکی کے لیے تمہارے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ اے فقراء! اگر تم نہ پاؤ تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

"کیا تم (اس حکم سے) ڈر گئے کہ تمہیں سرگوشی سے پہلے صدقہ دینا چاہیے پس جب تم ایسا نہیں کر سکے تو اللہ نے تم پر نظر کرم فرمائی پس (اب) تم نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو اور زکوۃ دیا کرو اور تابعداری کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کرتے رہتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ ءَاَشْفَقْتُمْ یہ جملہ استفہامیہ ہے اور کلمہ استفہام قد کے معنی میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے تم صدقہ کرنے میں بخل کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم ڈرتے ہو۔ اشفاق سے مراد ناپسندیدہ چیز سے خوف کھانا ہے(1)، یعنی تم ڈر گئے، صدقہ میں بخل کیا اور یہ امر تم پر شاق گزرا۔ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ مقاتل بن حیان نے کہا: یہ حکم دس دن تک رہا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ کلبی نے کہا: یہ حکم صرف ایک دن کے لیے رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ حکم دن کی چند گھڑیوں کے لیے رہا یہاں تک کہ منسوخ ہو گیا؛ قتادہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ یہ خطاب ان کو ہے جس نے ایسا مال پایا جس کو وہ صدقہ کر سکتا تھا۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فرض زکوۃ نے اس صدقہ کو منسوخ کر دیا۔ یہ امر اس پر دال ہے کہ فعل سے پہلے فسخ کرنا جائز ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے جو مروی ہے وہ ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا یہ اس امر پر دال ہے کہ کسی نے بھی کوئی چیز صدقہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اس کے فرائض میں اس کی اطاعت کرو اور سنن میں اس کے رسول کی اتباع کرو۔

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾

"کیا تم نے نہیں دیکھا ان (نادانوں) کی طرف جنہوں نے دوست بنالیا اس قوم کو جن پر خدا کا غضب ہوا، نہ یہ لوگ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے یہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔ تیار کر رکھا ہے اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب، بلاشبہ یہ لوگ بہت برے کام کیا کرتے تھے انہوں نے بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال پس وہ (اسی طرح) روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، سو ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے"۔

1۔ تفسیر طبری

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قتادہ نے کہا: مراد منافق ہیں جنہوں نے یہودیوں سے دوستی کی مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: منافق یہودیوں اور مسلمانوں میں سے نہیں بلکہ وہ ان دونوں طبقات کے درمیان مذبذب ہیں۔ وہ مسلمانوں کی خبریں ان تک پہنچاتے تھے۔ سدی اور مقاتل نے کہا: یہ آیت عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن نبتل منافق کے حق میں نازل ہوئی ان میں سے ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا تھا پھر آپ کی گفتگو یہودیوں تک پہنچاتا تھا۔ اس اثناء میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجروں میں سے ایک حجرہ میں تھے کہ فرمایا: ''ابھی تم پر ایک ایسا آدمی داخل ہوگا جس کا دل جبار کا دل ہے اور وہ شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے''۔ تو عبداللہ بن نبتل داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں نیلی، رنگ گندم گوں، قد چھوٹا اور داڑھی کے بال تھوڑے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں برا بھلا کہتے ہیں؟'' اس نے قسم اٹھائی کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''تو نے ایسا کیا ہے''۔ وہ گیا اور اپنے ساتھیوں کو لے آیا تو انہوں نے اللہ کے نام کی قسم اٹھائی کہ انہوں نے آپ کو گالی نہیں دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس کے ہم معنی قول کیا ہے۔ عکرمہ نے ان سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے سایہ آپ سے سمٹنے والا تھا کہ آپ نے فرمایا: ''تمہارے پاس ابھی ایسا آدمی آئے گا جس کی آنکھیں نیلی ہوں گی وہ تمہیں شیطان کی آنکھ سے دیکھے گا'' ہم اسی طرح تھے کہ ایک آدمی آیا جس کی آنکھیں نیلی تھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا فرمایا: ''تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں برا بھلا کہتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا: مجھے چھوڑ دیں میں انہیں لے آتا ہوں۔ وہ گیا اور انہیں لے آیا، ان سب نے قسم اٹھادی کہ ایسی کوئی بات نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہودیوں کا ذکر قرآن حکیم میں غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے لیے جہنم میں شدید عذاب تیار کر رکھا ہے اور وہ درک اسفل ہے اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ یعنی ان کے اعمال کتنے برے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً وہ قتل سے بچنے کے لیے قسم کو ڈھال بناتے ہیں۔ حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ نے کہا: یہاں ایمانھم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور سورۃ المنافقون میں بھی اسی طرح ہے انہوں نے اپنے اقرار کو ڈھال بنالیا۔ ان کی زبانیں قتل کے خوف سے ایمان لائی ہیں اور ان کے دلوں نے کفر کیا ہے۔

فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝ دنیا میں قتل اور آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ صد سے مراد اسلام سے روکنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عذاب سے مراد کفر کی وجہ سے قتل ہے جب انہوں نے نفاق کو ظاہر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ عذاب خوف پیدا کرنے، مسلمانوں کو جہاد سے روکنے اور ان کو ڈرانے کی وجہ سے ہوگا۔

لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَیْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ

فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۹

"کچھ نفع نہ پہنچائیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد عذاب الٰہی سے بچانے کے لیے، یہ لوگ جہنمی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھالے گا تو وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور خیال کریں گے کہ وہ کس مفید چیز پر تکیہ کیے ہیں، خبردار! یہی وہ جھوٹے لوگ ہیں تسلط جمالیا ہے ان پر شیطان نے اور اس نے، اللہ کا ذکر انہیں فراموش کرادیا ہے، یہ لوگ شیطان کا ٹولہ ہیں، خوب سن لو! شیطان کا ٹولہ ہی یقیناً نقصان اٹھانے والا ہے"۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا یعنی اس کے عذاب سے کچھ نفع نہ دے گا۔ مقاتل نے کہا: منافقوں نے کہا (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گمان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز ان کی مدد کی جائے گی تو اس وقت یقیناً ہم بد بخت ہوں گے اللہ کی قسم! اگر قیامت ہوئی تو قیامت کے روز ہماری مدد کی جائے گی ہماری ذاتوں، ہماری اولادوں اور ہمارے اموال کی وجہ سے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا اللہ تعالیٰ انہیں جس روز دوبارہ اٹھائے گا ان کے لیے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔ فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وہ اس روز اسی طرح اس کے لیے قسم اٹھائیں گے جس طرح آج وہ تمہارے لیے قسم اٹھاتے ہیں۔ یہ عجب امر ہے وہ ان کا قسم کے ساتھ مغالطہ پیدا کرنا ہے، جب کہ تمام معارف عیاں ہو چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ان کا یہ قول ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝۲۳ (الانعام)

وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ یعنی انکار کرنے اور قسم اٹھانے کے ساتھ۔ ابن زید نے کہا: انہوں نے گمان کیا کہ وہ آخرت میں انہیں نفع پہنچائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دنیا میں گمان کریں گے کہ وہ بہت بڑی چیز پر قائم ہیں کیونکہ آخرت میں وہ مجبور ہو کر حق کو جانیں گے، جب کہ پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز ایک منادی کرنے والا اعلان کرے گا: اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرنے والے کہاں ہیں؟ تو قدریہ اٹھیں گے جب کہ ان کے چہرے سیاہ اور آنکھیں نیلی ہوں گی، ان کی باچھیں ایک طرف مائل ہوں گی، ان کا لعاب بہہ رہا ہوگا، تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! ہم نے تیرے سوا کسی سورج، کسی چاند، کسی بت کی عبادت نہیں کی اور ہم نے تیرے سوا کسی کو اپنا الٰہ نہیں بنایا"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کی قسم! انہوں نے سچ کہا، ان تک شرک ایسی جگہ سے پہنچے گا جسے وہ نہیں جانتے ہوں گے۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی۔ اللہ کی قسم! وہ قدریہ ہیں یہ تین دفعہ قسم اٹھائی (1)۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ یعنی شیطان ان پر غالب آ گیا ہے یعنی دنیا میں اپنے وسوسہ کے ساتھ ان پر غالب آ گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ ان پر قوی ہو گیا ہے۔ مفضل نے کہا: اس نے ان کا احاطہ کرلیا ہے۔ یہ چوتھے معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے شیطان نے انہیں جمع کرلیا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: احوذ الشیء اسے جمع کردیا اور اس کے بعض کو بعض سے ملا دیا جب

1۔ المحرر الوجیز

انہیں جمع کر لیا تو وہ ان پر غالب آ گیا، ان پر قوی ہو گیا اور ان کو احاطہ میں لے لیا۔

فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ذکر سے اس کے اوامر مراد ہیں۔ جب انسان طاعت کر رہا ہے تو اوامر کو بھلا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد زواجر ہیں یعنی اس کی معصیت سے جو جھڑکنے والی چیزیں تھیں، انہیں بھلا دیا۔ نسیان کبھی غفلت کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی ترک کی صورت میں ہوتا ہے یہاں دونوں وجوہ کا احتمال ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ حزب سے مراد طائفہ اور رھط ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝ یعنی وہ اپنی تجارت میں خسارے پانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے جہنم کے بدلے جنت کو بیچ دیا ہے اور گمراہی کے بدلے ہدایت کو بیچ دیا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحَآدُّوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الۡاَذَلِّيۡنَ ۝۲۰ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيۡزٌ ۝۲۱

''بے شک جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی وہ ذلیل ترین لوگوں میں شمار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آ کر رہیں گے''۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحَآدُّوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ سورت کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے اُولٰٓئِكَ فِى الۡاَذَلِّيۡنَ ۝ وہ ذلیل لوگوں میں سے ہیں ان سے بڑھ کر کوئی ذلیل نہیں كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ یعنی اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ انہیں ضرور غالب کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے؛ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ فراء نے کہا: كَتَبَ یہ قال کے معنی میں ہے۔ انا یہ ضمیر تاکید کے لیے ہے۔ وَرُسُلِىۡ جس کو جہاد کے حکم کے ساتھ مبعوث کیا گیا وہ جہاد کے ساتھ غالب آئے گا، جس کو حجت کے ساتھ مبعوث کیا گیا وہ حجت کے ساتھ غالب آئے گا۔ مقاتل نے کہا: مومنوں نے کہا اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں مکہ مکرمہ، طائف، خیبر اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر فتح دی تو ہم امید رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فارس اور روم پر بھی فتح دے گا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: کیا تم روم اور فارس کو ان دیہاتوں کی طرح سمجھتے ہو جن پر تم غالب آ گئے ہو؟ اللہ کی قسم! وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور قوت میں اس سے بہت سخت ہیں جتنا تم ان کے بارے میں گمان کرتے ہو تو یہ آیت نازل ہوئی اسی کی مثل وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ۚۖ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ۝ وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ۝ (الصافات) ہے۔

لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِيۡرَتَهُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَاَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ؕ وَيُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝۲۲

''تو ایسی قوم نہیں پائے گا جو ایمان رکھتی ہو اللہ اور قیامت پر پھر وہ محبت کرے ان سے جو مخالفت کرتے ہیں اللہ

اور اس کے رسولوں کی خواہ وہ (مخالفین) ان کے باپ ہوں یا ان کے فرزند ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے کنبہ والے ہوں، یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے الله نے ان کے دلوں میں ایمان اور تقویت بخشی ہے انہیں اپنے فیض خاص سے، اور داخل کرے گا انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں، الله تعالیٰ راضی ہو گیا ان سے اور وہ اس سے راضی ہو گئے یہ، (بلند اقبال) الله کا گروہ ہیں سن لو! الله تعالیٰ کا گروہ ہی دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ، يُوَآدُّوْنَ یعنی وہ محبت کرتے ہوں اور ان سے دوستی رکھتے ہو۔

مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ سدی نے کہا: یہ آیت عبدالله بن عبدالله بن ابی کے حق میں نازل ہوئی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی نوش کیا انہوں نے عرض کی: الله کی قسم! یا رسول الله آپ اپنے پانی میں سے کوئی چیز باقی چھوڑتے جسے میں اپنے باپ کو پلاتا ممکن ہے الله تعالیٰ اس کے ساتھ اس کے دل کو پاکیزہ بنا دیتا؟ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے پانی چھوڑ دیا تو وہ پانی عبدالله بن ابی کے پاس لے آیا۔ عبدالله بن ابی نے کہا: یہ کیا چیز ہے؟ بیٹے نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچا ہوا پانی ہے تاکہ تو اسے پیے ممکن ہے الله تعالیٰ تیرے دل کو پاکیزہ بنائے۔ اس کے باپ نے اسے کہا: تو اپنی ماں کا بول کیوں نہیں لے آیا وہ اس پانی سے پاکیزہ تر تھا۔ بیٹا غضب ناک ہو گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول الله! کیا آپ مجھے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلکہ تو اس کے ساتھ نرمی کر اور اس پر احسان کر''(1)۔

ابن جریج نے کہا: مجھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابو قحافہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا ان کے بیٹے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک تھپڑ مارا اور وہ اپنے منہ کے بل گر گیا۔ پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کا ذکر آپ سے کیا۔ فرمایا: ''کیا تو نے ایسا کیا ہے؟ آئندہ ایسا نہ کرنا''۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! اگر تلوار میرے قریب ہوتی تو میں اسے قتل کر دیتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آیت حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ احد کے موقع پر انہوں نے باپ جراح کو قتل کر دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یوم بدر کو قتل کیا تھا۔ جراح حضرت ابو عبیدہ کے سامنے آتا اور حضرت ابو عبیدہ ایک طرف ہو جاتے۔ جب یہ سلسلہ بار بار ہوا تو حضرت ابو عبیدہ نے اسے قتل کر دیا جب انہوں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تو الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ واقدی نے کہا: اہل شام بھی یہ کہتے ہیں میں نے بنی حرث بن فہر کے لوگوں سے پوچھا انہوں نے کہا: حضرت ابو عبیدہ کے والد تو دور اسلام سے قبل فوت ہو چکے تھے۔

1۔ زاد المسیر

اَوْ اَبْنَآءَهُمْ مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں انہوں نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو دعوت مبارزت دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابو بکر! ہمیں اپنی ذات سے لطف اندوز کر کیا تو نہیں جانتا کہ تو میرے ہاں کان اور آنکھ کی طرح ہے۔'' اَوْ اِخْوَانَهُمْ مراد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے غزوہ بدر کے موقع پر اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ مراد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بدر کے دن قتل کیا تھا اور حضرت علی شیر خدا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما ہیں جنہوں نے بدر کے دن عتبہ، شیبہ اور ولید کو قتل کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے حق میں نازل ہوئی جب فتح مکہ کے سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے متعلق انہوں نے اہل مکہ کو خط لکھا۔ جس کی وضاحت سورۂ ممتحنہ کے شروع میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ اس امر کو واضح کیا کہ کفار کی دوستی کی وجہ سے ایمان میں فساد برپا ہو جاتا ہے اگر چہ وہ قریبی ہوں۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مالک نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قدریہ سے دشمنی کی جائے اور ان کی صحبت کو ترک کر دیا جائے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے: قدریہ کی صحبت میں نہ بیٹھو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ان سے دشمنی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (1)

میں کہتا ہوں: اہل قدر سے مراد تمام ظلم و عدوان والے ہیں۔ ثوری سے مروی ہے انہوں نے کہا: علماء خیال کرتے تھے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو سلطان کے مصاحب ہوتے تھے۔ عبد العزیز بن بن ابی داؤد سے مروی ہے کہ وہ طواف میں منصور سے ملا جب منصور کو پہچانا تو اس سے دور بھاگ گیا اور اس آیت کی تلاوت کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ کہتے: ''اے اللہ! کسی فاجر کے لیے میرے ہاں کوئی نعمت نہ بنا، بے شک تو نے جو وحی میری طرف کی ہے میں نے اس میں پایا ہے لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ''(2) یعنی ان کے دلوں میں تصدیق پیدا کر دی۔ مراد ہے جس نے اس سے دوستی نہ کی جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ کتب کا معنی ثبت کرنا ہے؛ یہ ربیع بن انس کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جعل کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران) یعنی ہمیں شاہدوں کا ساتھی بنا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کتب کا معنی جمع کرنا ہے؛ اسی سے الکتیبہ کا لفظ ہے یعنی وہ ان میں سے نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ عام قرأت کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایمان کا نون منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ابو العالیہ، زر بن حبیش اور مفضل نے عاصم سے کتب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الایمان کو نون کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ زر بن حبیش نے وَ عَشِيْرَاتُهُمْ جمع کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمش نے ابو بکر سے وہ عاصم سے یہی روایت نقل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی
2۔ تفسیر کشاف

کتب علی قلوبھم کے معنی میں ہے جس طرح فرمایا: فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (طٰہٰ: 71) یہ علی جذوع النخل کے معنی میں ہے۔ قلوب کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ یہ ایمان کا محل ہے۔

وَ اَیَّدَهُمْ یعنی انہیں قوت بہم پہنچائی اور ان کی مدد کی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: روح کا معنی نصر ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: قرآن اور دلائل کے ساتھ ان کی مدد کی۔ ابن جریج نے کہا: نور، ایمان، برہان اور ہدایت کے ساتھ ان کی مدد کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ روح سے مراد رحمت ہے۔ بعض نے کہا: حضرت جبریل امین کے ساتھ ان کی مدد کی (1)۔

وَ یُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۭ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ یہاں رَضِیَ سے مراد ہے ان کے اعمال کو قبول کیا۔ وَ رَضُوْا عَنْهُ اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا کیا اس پر وہ خوش ہیں۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ سعید بن ابی سعید جرجانی نے اپنے بعض مشائخ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی: اے میرے اللہ! تیری جماعت کون سی ہے اور تیرے عرش کے اردگرد رہنے والے کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: اے داؤد! جن کی آنکھیں جھکی ہوئی، جن کے دل پاکیزہ، جن کے ہاتھ ظلم سے محفوظ ہیں وہ میری جماعت اور میرے عرش کے اردگرد رہنے والے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی

# سورۃ الحشر

آیاتہا ۲۴ ۵۹ سُورَۃُ الحَشْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۱ رکوعاتہا ۳

تمام علماء کے قول میں یہ سورت مدنی ہے، اس کی چوبیس آیات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے سورۂ حشر پڑھی تو جنت، جہنم، عرش، کرسی، آسمان، زمین، کیڑے مکوڑوں، بادلوں، پرندوں، چوپاؤں، درختوں، پہاڑوں، سورج، چاند، فرشتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچتی مگر اس کے لئے دعا مانگتی ہے اور بخشش طلب کرتی ہے اگر وہ اس روز یا اس رات مر جائے تو وہ شہید کی موت مرتا ہے''۔ اسے ثعلبی نے نقل کیا ہے۔

ثعالبی نے حضرت یزید رقاشی سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۂ حشر کی آخرت آیات کو پڑھا لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا تو جو اسی رات فوت ہو گیا تو وہ شہید کی حیثیت سے فوت ہوا'' (1)۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے صبح کے وقت تین دفعہ أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم اور سورۂ حشر کی آخری تین آیات کو پڑھا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے معین کر دیتا ہے جو اس پر درود پڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے، اگر وہ اسی دن فوت ہو جاتا ہے تو شہید کی حیثیت سے فوت ہوتا ہے اور جو شام کے وقت یہ پڑھتا ہے تو اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جاتا ہے''۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ①

''اللہ کی پاکی بیان کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے''۔

اس کی وضاحت سورۂ حدید کی پہلی آیت میں گزر چکی ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؔ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَ اَیْدِی

1۔ تفسیر درمنثور 2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی من قرء حرفا من القرآن، حدیث نمبر 2846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

''وہی تو ہے جو باہر نکال لایا اس کتاب کے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلی جلا وطنی کے وقت تک تم نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا کہ نکل جائیں گے اور وہ بھی گمان کرتے تھے کہ انہیں ان کے قلعے بچا لیں گے اللہ (کے قہر) سے پس آیا ان پر اللہ کا قہر اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب چنانچہ وہ برباد کر رہے ہیں اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور اہل ایمان کے ہاتھوں سے پس عبرت حاصل کرو اے دیدہ بینا رکھنے والو!''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ هُوَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا: یہ سورۂ حشر ہے؟ فرمایا: کہو سورۂ نضیر یہ؛ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا جب بنو اسرائیل مصائب کا شکار ہوئے تو یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں مدینہ طیبہ آکر رہائش پذیر ہوئے۔ انہوں نے یہ اس لئے کیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام پر اس امر کو بیان کیا تھا (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ حشر کا معنی جمع ہونا ہے۔ اس کی چار صورتیں ہیں: دو حشر دنیا میں اور دو حشر آخرت میں ہوں گے۔ جو دنیا میں ہو گا اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: هُوَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ زہری نے کہا: وہ ایسے خاندان سے تھے انہیں جلا وطنی کی معیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اللہ تعالیٰ نے ان پر جلا وطنی کو فرض کیا اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں دنیا میں عذاب دیتا (2)۔ اوّل حشر سے مراد ہے کہ وہ دنیا میں شام کی طرف جمع کیے گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عکرمہ نے کہا: جسے اس میں شک ہو کہ کیا محشر شام میں ہے تو وہ اس آیت کو پڑھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: ''تم یہاں سے نکل جاؤ''۔ انہوں نے عرض کی: کہاں جائیں؟ فرمایا: ''ارض محشر کی طرف''۔ حضرت قتادہ نے کہا: یہ پہلا حشر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ وہ پہلے اہل کتاب ہیں جنہیں نکالا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملک سے جلاوطن کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں خیبر کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ اور لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کا معنی ہے انہیں ان کے قلعوں سے خیبر کی طرف نکالا گیا۔ اور دوسرا حشر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خیبر سے نجد اور اذرعات کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ ان کو یہ سزا ان کے کفر اور وعدہ توڑنے کی وجہ سے دی گئی۔ جہاں تک دوسرے حشر کا تعلق ہے: یہ قیامت کے قریب ہو گا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آگ ظاہر ہو گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی جہاں لوگ رات گزاریں گے وہ بھی وہاں ہی رات گزارے گی، جہاں وہ قیلولہ کریں گے وہاں آگ بھی قیلولہ کرے گی اور جو پیچھے رہ جائے گا وہ انہیں کھا جائے گی۔ یہ حدیث

1۔ احکام القرآن لابن العربی
2۔ تفسیر بغوی

صحیح ،ثابت ہے ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔اس کی مثل ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے امام مالک سے عرض کی: اس حشر سے مراد ان کو ان کے گھروں سے جلا وطن کرنا ہے؟ آپ نے مجھے فرمایا: قیامت کے روز حشر، یہود کا حشر ہوگا فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو خیبر کی طرف جلاوطن کیا جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اسے چھپایا، اس وجہ سے ان کی جلاوطنی حلال ہوگئی۔ابن عربی نے کہا: حشر تین ہیں پہلا، درمیانی اور آخری۔ پہلا بنونضیر کی جلاوطنی ہے۔درمیانی بنونضیر کی خیبر کی طرف جلاوطنی ہے؛ آخری قیامت کے روز ان کو ہانکنا ہوگا۔حضرت حسن بصری سے مروی ہے: مراد بنو قریظہ ہیں۔باقی مفسرین نے ان کی مخالفت کی ہے۔انہوں نے کہا بنوقریظہ کو جلاوطن نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا؛ ثعلبی نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ الکیا طبری نے کہا: اہل حرب سے آج اس شرط پر صلح کرنا کہ بغیر کسی شرط کے انہیں ان کے گھروں سے جلاوطن کردیا جائے یہ جائز نہیں یہ ابتداء اسلام میں تھا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا آج یا تو انہیں قتل کر دیا جائے گا، انہیں قیدی بنالیا جائے گا یا ان پر جزیہ نافذ کر دیا جائے گا۔

مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا مراد یہ ہے کہ یہودیوں کا معاملہ مسلمانوں کے دلوں میں بڑا عظیم تھا، وہ بڑے محفوظ تھے، قوی تھے اور بڑے متحد تھے اس لیے مسلمان یہ گمان نہیں کرتے تھے۔وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ ایک قول یہ کیا گیا: قلعوں سے مراد وطیح ،نطاہ ،سلالم اور کتیبہ ہے۔مِّنَ اللّٰهِ یعنی الله کے حکم سے۔وہ بڑے اسلحہ اور محفوظ قلعوں والے تھے ان میں سے کوئی چیز بھی محفوظ نہ رکھ سکی۔فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ الله تعالیٰ کا امر اور اس کا عذاب انہیں آ پہنچا۔

مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا جہاں انہیں گمان تک نہ تھا۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہاں سے انہیں علم نہ تھا۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کعب بن اشرف کا قتل ہے؛ یہ قول ابن جریج ،سدی اور ابو صالح نے کیا ہے۔

وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ان کے سردار کعب بن اشرف کے قتل کے ساتھ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔جس صحابی نے اسے قتل کیا تھا وہ حضرت محمد بن مسلمہ حضرت ابو نائلہ سلکان بن سلالہ بن وقش (جو کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے) حضرت عباد بن بشر بن وقش ،حضرت حارث بن اوس بن معاذ اور حضرت ابوعبس بن جبر رضی اللہ عنہم تھے اس کا واقعہ سیرت کی کتاب میں مشہور ہے۔حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک ماہ کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے'' (1)۔تو بنی نضیر کا محلہ جو ایک میل کی مسافت پر تھا وہاں آپ کی مدد کیوں نہ کی جاتی۔یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے یہ شرف کسی اور کو حاصل نہیں۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ عام قراءت تخفیف کے ساتھ ہے۔یہ اخراب سے مشتق ہے یعنی وہ گرا دیتے ہیں۔سلمی، حضرت حسن بصری، نصر بن عاصم، ابو العالیہ، قتادہ اور ابو عمرو نے یخربون قراءت کی ہے۔یہ تخریب سے مشتق ہے۔حضرت ابو عمرو نے کہا: میں نے تشدید کو اس لیے پسند کیا ہے کیونکہ اخراب کا معنی ہوتا ہے کسی شے کو رہائش کے بغیر بے آباد چھوڑنا، جبکہ بنو نضیر نے اسے اس

1۔مشکوۃ المصابیح، باب فضائل سید المرسلین

طرح نہیں چھوڑا تھا انہوں نے اسے گرا کر برباد کیا تھا۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کرتا ہے: یٰاَیْدِیْهِمْ وَ اَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ

دوسرے علماء نے کہا: تخریب اور اخراب کا معنی ایک ہی ہے اور تشدید، تکثیر کے معنی میں ہے۔ سیبویہ نے کہا: فعلت اور افعلت کا معنی ایک جیسا ہے جس طرح اخربتہ اور خربتہ، افرحتہ اور فرحتہ، ابو عبید اور ابو حاتم نے پہلے قول کو پسند کیا ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: مومن باہر سے انہیں اکھیڑ رہے تھے تاکہ اندر داخل ہوں اور یہودی اندر سے اکھیڑ رہے تھے تاکہ ان کے قلعے جو خراب کیے جا رہے ہیں انہیں درست کریں۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر صلح کی تھی کہ وہ نہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد کریں گے اور نہ آپ ﷺ کی مدد کریں گے۔

جب غزوۂ بدر کے روز آپ کو فتح نصیب ہوئی تو انہوں نے کہا: یہی وہ نبی ہیں جن کی تورات میں صفت بیان کی گئی ہے؛ تو اس کے جھنڈے کو لوٹایا نہیں جا سکے گا (یعنی انہیں شکست نہ ہوگی)۔ جب غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انہیں شک پڑ گیا اور انہوں نے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا۔ کعب بن اشرف چالیس سواروں کو لے کر مکہ مکرمہ گیا، کعبہ معظمہ کے پاس ان کے ساتھ معاہدہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کو حکم دیا تو اس نے کعب کو ایک چال کے ذریعے قتل کر دیا پھر صبح کے وقت ان پر لشکروں سے حملہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: ''مدینہ طیبہ سے نکل جاؤ''۔ انہوں نے کہا: اس سے موت ہمیں زیادہ پسندیدہ ہے۔ انہوں نے جنگ کے لئے اپنے حمایتیوں کو دعوت دی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے دس روز کے لئے رسول اللہ ﷺ سے مہلت طلب کی تاکہ وہ یہاں سے نکل جانے کی تیاری کر لیں۔ عبد اللہ بن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں نے انہیں خفیہ پیغام بھجوایا کہ وہ قلعوں سے نہ نکلیں۔ اگر مسلمان تم سے جنگ کریں تو ہم تمہارے ساتھ ہونگے اور تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تمہیں یہاں سے نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے، تو اکیس دنوں تک ان کی گلیوں اور قلعوں میں محبوس رکھا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور یہودی منافقوں کی مدد سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے صلح کا مطالبہ کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے جلاوطنی کے سوا کسی بات پر اتفاق نہ کیا(1)۔ جس کی وضاحت بعد میں آ رہی ہے۔

زہری، ابن زید اور حضرت عروہ بن زبیر نے کہا: جب نبی کریم ﷺ نے ان سے اس بات پر صلح کر لی کہ ان کے لیے وہ کچھ ہوگا جو اونٹ اٹھا کر لے جا سکے، تو وہ جو لکڑیاں اور ستون اچھے خیال کرتے تو اپنے گھروں کو گراتے اور انہیں اپنے اونٹوں پر باندھ لیتے باقی ماندہ کو مومن برباد کر دیتے۔

ابن زید سے یہ بھی مروی ہے، وہ اپنے گھروں کو اس لیے گرا رہے تھے تاکہ بعد میں مومن ان میں نہ رہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مسلمان جب بھی ان کے گھروں میں سے کسی گھر پر غالب آتے تو اسے گرا دیتے تاکہ جنگ کا میدان وسیع ہو جائے جبکہ یہودی اپنے گھروں کی پچھلی جانب سے سوراخ کرتے تاکہ پچھلے گھر میں قلعہ بند ہو جائیں اور جس گھر سے نکالے گئے ہیں اس سے مومنوں پر تیر چلائیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تاکہ ان پر گلیوں کو بند کر دیں۔ عکرمہ نے کہا:

1۔ الکشاف 2۔ تفسیر بغوی

بِاَیۡدِیۡهِمۡ کا مصداق یہ ہے کہ وہ ان گھروں کے داخلی حصہ اور اس میں جو کچھ ہے اس کو برباد کرتے تا کہ مسلمان انہیں اپنے کام میں نہ لا سکیں۔ اور اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سے مراد ہے مومن ان کو باہر سے برباد کر رہے تھے تا کہ اس کے ذریعے وہ یہودیوں تک پہنچ سکیں۔ عکرمہ نے کہا: ان کے مکانات بڑے اعلیٰ تھے تو انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں حسد کیا کہ وہ ان گھروں میں رہائش اختیار کریں انہوں نے اندر کی جانب سے انہیں برباد کیا اور مومنوں نے باہر کی جانب سے انہیں برباد کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ وعدہ کو توڑ کر اپنے گھروں کو برباد کرتے ہیں اور وَ اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سے مراد جنگ کر کے برباد کرتے ہیں؛ یہ زہری کا قول ہے۔ اور عمرو بن علاء نے کہا: بِاَیۡدِیۡهِمۡ سے مراد ہے خود انہیں چھوڑنے کے ساتھ اور وَ اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سے مراد ہے مومنوں نے انہیں جلاوطن کیا۔ ابن عربی نے کہا: جب فساد کے لیے کوئی چیز پکڑی جائے تو اگر ہاتھوں کے ساتھ ہو تو یہ حقیقی معنی میں ہوگا اور جب وعدہ توڑنے کی صورت میں ہو تو یہ مجازی معنی میں ہوگا، مگر مجاز میں زہری کا قول ابو عمرو بن علاء کے قول سے زیادہ اچھا ہے۔

فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ ۝ اے دانشمندو! نصیحت حاصل کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے وہ شخص جو اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتا ہے! یہ بصر کی جمع ہے۔ یہاں عبرت حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے الله تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر قلعوں پر اعتماد کیا تو الله تعالیٰ نے انہیں ان سے نیچے اتار دیا۔ اس کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ تھی کہ الله تعالیٰ نے ان پر ایسی ذات کو مسلط کر دیا جو ان کی مدد کرتی تھی۔ اس کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی تھی انہوں نے اپنے اموال اپنے ہاتھوں سے برباد کیے۔ جو آدمی غیر سے عبرت حاصل نہیں کرتا تو اس کی ذات سے عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ امثال صحیحہ میں سے ہے سعادت مند وہ ہے جو غیر سے نصیحت حاصل کرے۔

**وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا ؕ وَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ ۚ وَ مَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۝**

''اور اگر نہ لکھ دی ہوتی الله نے ان کے حق میں جلاوطنی تو انہیں عذاب دے دیتا اس دنیا میں، اور ان کے لئے آخرت میں تو آگ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سزا اس لیے دی گئی کہ انہوں نے مخالفت کی تھی الله اور اس کے رسول کی، اور جو الله کی مخالفت کرتا ہے تو الله عذاب دینے میں بہت سخت ہے''۔

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمُ الۡجَلَآءَ یعنی اگر الله تعالیٰ نے ان کے حق میں جلاوطنی کا فیصلہ نہ کر دیا ہوتا اور وہ ایک عرصہ وہاں ہی رہتے تو ان میں سے بعض ایمان لاتے اور ان کے ہاں ایسے بچے جنم لیتے جو ایمان لاتے۔

لَعَذَّبَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا تو الله تعالیٰ دنیا میں انہیں قتل اور قید کی صورت میں عذاب دیتا جس طرح اس نے بنی قریظہ کے ساتھ کیا ہے۔ جلاوطنی سے مراد اپنے وطن کو چھوڑنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: جلا بنفسه جلاء۔ أجلاه غيره اجلاء۔

جلاء اور اخراج اگرچہ دونوں کا معنی دور کرنا ہے تاہم دو وجوہ سے فرق ہے۔ (۱) جلاوطنی اہل اور اولاد کے ساتھ ہوتی

ہے۔ اور اخراج کبھی اہل اور اولاد کو وہاں ہی رکھنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ (۲) جلاوطنی صرف جماعت کے لئے ہوتی ہے اور اخراج کبھی ایک کے لیے اور کبھی جماعت کے لیے ہوتا ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔

ذٰلِكَ یعنی وہ جلاوطنی بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ طلحہ بن مصرف اور محمد بن سمیقع نے پڑھا۔ ومن یشاقق اللہ یعنی ہم جنس حروف کو اظہار کی سمت میں پڑھا ہے؛ جس طرح سورۂ انفال میں ہے باقی قراء نے ادغام کیا ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

''جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جن کو تم نے چھوڑ دیا کہ کھڑے رہیں اپنی جڑوں پر تو یہ (دونوں باتیں) اللہ کے اذن سے تھیں تاکہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1** ۔ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ، مَا محل نصب میں ہے اس کو قَطَعْتُمْ نصب دے رہا ہے (1) گویا فرمایا: تم نے کس چیز کو کاٹا؟ اس کی وجہ یہ بنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ وہ بویرہ تھے یہ اس وقت ہوا جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف غزوہ احد کے موقع پر قریش کی مدد کی۔ آپ نے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹنے اور انہیں جلانے کا حکم دیا۔ علماء نے اس کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: صحابہ نے ان کے چھ کھجوروں کے درختوں کو کاٹا اور انہیں جلایا۔ محمد بن اسحاق نے کہا: صحابہ نے ایک درخت کو کاٹا اور اسے جلایا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع نہ کرنے کی وجہ سے تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا تھا۔ مقصود یا تو انہیں کمزور کرنا تھا یا ان درختوں کو کاٹ کر جگہ کو کھلا کرنا تھا۔ یہ امر یہودیوں کے لیے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ انہوں نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم کیا تم یہ گمان نہیں کرتے کہ تم نبی ہو اور اصلاح چاہتے ہو، کیا یہ کھجوروں کے درختوں کو کاٹنا اور درختوں کو جلانا اصلاح احوال میں سے ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے جو آپ پر نازل کیا ہے اس میں زمین میں فساد برپا کرنا مباح ہے؟ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوئی اور مومنوں نے بھی اپنے دلوں میں ایسی ہی بات پائی اور انہوں نے آپس میں اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں مال عطا کیا ہے اسے نہ کاٹو۔ بعض نے کہا: ان درختوں کو کاٹ دو تاکہ ہم ان کو غضب ناک کریں۔ یہ آیت اس لیے نازل ہوئی تاکہ جنہوں نے درخت کاٹنے سے منع کیا تھا ان کی تصدیق کی جائے اور جنہوں نے انہیں کاٹا تھا ان سے گناہ کو ختم کرنے کا اعلان ہو۔ اور اس امر کی خبر دی کہ انہیں کاٹنا اور ان کا ترک کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ ان کے شاعر سماک یہودی نے اس بارے میں یہ اشعار کہے تھے۔

اَلَسْنَا وَرِثْنَا الكتاب الحكيم على عهد موسیٰ و لم نَصْدِفِ

کیا ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کتاب حکیم کے وارث نہیں بنے اور ہم نہیں پھرے۔

1۔ الکشاف

وأنتم رِعاءٌ لشاءٍ عِجَافٍ بسَهْل تِهامة والأُخَيف

تم تہامہ اور اخیف کے میدانی علاقہ میں دبلی بکریاں چرانے والے ہو۔

تَرَوْنَ الرعايةَ مجدًا لكم لدى كلّ دهرٍ لكم مُجْحف

تم ہلاک کرنے والے زمانہ میں بکریاں چرانے کو اپنے لیے بزرگی خیال کرتے ہو۔

فيأايها الشاهدون انتهُوا عن الظلم و المنطق المُؤنِف

اے حاضرین! اس ظلم اور ترش گفتگو سے رک جاؤ۔

لعل الليالى و صَرْفَ الدُّهور يُدِلْنَ من العادل المنصف

ممکن ہے یہ مصائب اور حادثات زمانہ حکومت ایک عادل منصف کو دے دیں۔

بقَتْل النَّضير و إجلاءها و عَقْرِ النخيل و لم تُقْطَف

جو بنو نضیر کو قتل کیا گیا، انہیں جلاوطن کیا گیا اور کھجور کے ان درختوں کو کاٹ دیا گیا جن کا پھل ابھی کاٹا بھی نہیں گیا تھا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ جواب دیا(1):

تفاقد مَعْشَرٌ نصرُوا قريشًا وليس لهم ببلدتهم نَصيرُ

ایک جماعت نے قریش سے معاہدہ کیا کہ وہ ان کے حلیف ہیں جبکہ ان کے شہر میں ان کا کوئی مددگار نہ تھا۔

هُمُو أوتوا الكتاب فضيعوه وهم عُمْىٌ عن التوراة بُورُ

تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں کتاب دی گئی تو انہوں نے اسے ضائع کر دیا وہ تورات سے اندھے اور ہلاک ہونے والے ہیں۔

كفرتم بقرآن ان وقد أبيتم بتصديق الذى قال النذير

تم نے قرآن کا انکار کیا اور نذیر نے جو کہا اس کی تصدیق کرنے سے بھی تم نے انکار کر دیا۔

وهان على سَرَاة بنى لُؤيٍ حريقٌ بالبُوَيْرَة مستطير

بویرہ میں بنی لوئی کے سرداروں پر پھیلنے والی آگ آسان ہو گئی۔

حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے اسے یہ جواب دیا تھا:

أدام الله ذلك صنيعٌ و حرَّق فى نواحيها السَّعِيرُ

اللہ تعالیٰ اس عمل کو دوام بخشے اور ان کی اطراف میں آگ خوب بھڑکائے۔

فلو كان النخيل بها رِكابًا لقالوا لامُقامَ لكم فسيرُوا

اگر کھجوروں کے درخت وہاں اونٹ ہوتے تو وہ بھی کہتے اب تمہارے ٹھہرنے کا وقت ختم ہو گیا پس چلو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر حملہ آور ہونے کے لیے ۴ھ ربیع الاول میں نکلے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچنے

1۔ سیرت ابن ہشام میں تعاهد کا لفظ ہے۔ مترجم

کے لیے قلعہ بند ہو گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے درخت کاٹنے اور انہیں جلانے کا حکم دیا اسی موقع پر شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے منافق ساتھیوں نے بنی نضیر کی طرف خفیہ پیغام بھیجا: ہم تمہارے ساتھ ہیں اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے اگر تمہیں جلاوطن کیا گیا تو ہم تمہارے ساتھ جلاوطن ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے بنو نضیر دھوکہ میں مبتلا ہو گئے۔ جب اصل صورتحال سامنے آئی تو منافقین نے یہودیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو قتل نہ کریں اور انہیں جلاوطن کر دیں اس شرط پر کہ ان کے لیے وہی کچھ ہوگا جو وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں مگر اسلحہ نہیں لے جا سکتے وہ اس طرح خیبر چلے گئے ان میں سے کچھ شام چلے گئے اس میں سے جو خیبر کی طرف گئے وہ ان کے اکابرین تھے جس طرح حی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع سارا خیبر ان کا مطیع ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 3۔** صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کے کھجور کے درختوں کو کاٹنے کا حکم دیا اور انہیں جلایا اس بارے میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

وھان علی سراۃ بنی لؤی حریق بالبویرۃ مستطیر

بنو لوئی کے سرداروں پر بویرہ میں پھیلنے والی آگ آسان ہو گئی۔

اس بارے میں مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ کے الفاظ نازل ہوئے۔

علماء نے دشمنوں کے گھروں کو بے آباد کرنے، ان کو جلانے اور ان کے پھل کاٹنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے (۱) یہ جائز ہے یہ مدونہ میں کہا ہے (۲) اگر مسلمانوں کو علم ہو جائے کہ یہ ان کے قبضہ میں آنے والے ہیں تو وہ ایسا نہ کریں۔ اگر وہ اس سے مایوس ہو جائیں تو ایسا کر گزریں؛ یہ امام مالک نے ''واضحہ'' میں کہا ہے۔ اصحاب امام شافعی اسی کی موافقت کرتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: صحیح پہلا قول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ یہ درخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہی ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا تا کہ یہ ان کے مغلوب ہونے اور ان کی کمزوری کا باعث بنیں یہاں تک کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ بعض مال کو ضائع کرنا تا کہ باقی مال محفوظ رہے یہ ایسی مصلحت ہے جو شرعاً جائز اور عقلاً مقصود ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** ماوردی نے کہا: اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ ہر مجتہد صحیح نتیجہ تک پہنچنے والا ہوتا ہے۔ الکیا طبری نے کہا: اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اجتہاد بعید از حقیقت ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ دیکھا اور خاموشی اختیار فرمائی۔ صحابہ نے اسی خاموشی سے جواز کا حکم اخذ کیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی اجتہاد نہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے امور میں اجتہاد پر دال ہے جن میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ یہ حکم ان آیات سے اخذ کیا جن میں کفار کو اذیت دینے کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں جڑ سے اکھیڑنے اور ہلاکت کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس اجازت میں یہ بھی داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝ میں یہی مقصود ہے۔

**مسئلہ نمبر** 5۔ اللینۃ کی تعبیر میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں دس اقوال ہیں ا۔ عجوہ کے علاوہ تمام قسم کے کھجور کے درخت، یہ قول امام زہری، امام مالک، سعید بن جبیر، عکرمہ اور خلیل رحمہم اللہ کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور حضرت حسن بصری نے کہا: تمام قسم کے کھجور کے درخت ہیں، انہوں نے عجوہ اور کسی دوسری قسم کو مستثنیٰ نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد کھجور کی ایک قسم ہے۔ امام ثوری سے مروی ہے: یہ عمدہ کھجوروں کے درخت ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: عجوہ اور برنی کے علاوہ تمام اقسام کے درخت مراد ہیں۔ جعفر بن محمد نے کہا: اس سے مراد عجوہ ہے۔ یہ ذکر کیا عتیق اور عجوہ دونوں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے۔ عتیق سے مراد فحل ہے۔ عجوہ تمام مونث درختوں کی اصل ہے؛ اس وجہ سے یہودیوں پر یہ امر بڑا شاق گزرا؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے۔ یہ کھجور کی ایک قسم ہے جس کے پھل کو لون کہتے ہیں اس کی خشک کھجور سب سے عمدہ ہوتی ہے۔ یہ سخت زرد ہوتی ہے، اس کی گٹھلی باہر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں داڑھ غائب ہو جاتی ہے، اس کا درخت انہیں غلام سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسا درخت ہے جو زمین سے قریب ہو زیادہ بلند نہ ہو۔

اخفش نے یہ شعر پڑھا:

قد شجانی الحمام حین تَغَنّٰی      بفراق الأحباب من فوق لِینَۃ

فاختہ نے جب لینہ درخت پر محبوبوں کے فراق میں گانا گایا تو اس نے مجھے غمگین کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لینہ سے مراد فسیلہ (قلمی کھجور) ہے کیونکہ یہ سب سے نرم کھجور ہوتی ہے؛ اسی بارے میں شاعر نے کہا:

غَرَسُوا لِینھا بمجری مَعِین      ثم حَفّوا النخیل بالآجام

انہوں نے لینہ کو چشمہ کی گزرگاہ پر لگایا پھر گھنے جنگلوں سے باغ کو چھپا لیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: لینہ سے مراد تمام درخت ہیں کیونکہ اپنی زندگی کی وجہ سے نرم ہوتے ہیں؛ ذورمہ نے کہا:

طِراقُ الخَوَافی واقِعٌ فوق لِینۃ      نَدَی لیلہ فی ریشہ یترقرق

پرندوں کے چھوٹے پر، درختوں پر پڑے ہیں رات کی شبنم کے قطرے اس کے پر سے ہلکے ہلکے بہ رہے ہیں۔

دسواں قول یہ ہے: اس سے مراد ردی کھجور ہے؛ یہ اصمعی کا قول ہے۔ کہا: اہل مدینہ کہتے ہیں: لاتنتفخ الموائد حتی توجد الألوان جب تک ردی چیز نہ ہو قدر و منزلت والی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ یہاں الوان سے ردی کھجور مراد لیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: زہری اور امام مالک نے جو کہا دو وجوہ سے صحیح ہے (۱) وہ دونوں اپنے شہر اور درختوں کو خوب جانتے تھے (۲) اشتقاق بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اہل لغت اس کی تصحیح کرتے ہیں کیونکہ لِیْنَۃ کا وزن لونہ ہے۔ علماء کے اصول کے مطابق اس میں تعلیل کی گئی تو وہ لینہ ہو گیا، یہی لون ہے جب اس کے آخر میں ھاء داخل ہوئی تو اس کے پہلے حرف کو کسرہ دے دیا گیا جس طرح کبرك الصدر یہ باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بر کہ باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ وجہ آخر میں ھاء کا آنا ہے۔ ایک

قول یہ کیا گیا ہے: لینہ اصل میں لونہ تھا، واؤ کو یاء سے بدل دیا کیونکہ اس کا قبل مکسور ہے لینہ کی جمع لین ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کی جمع لیان ہے۔

اخفش نے کہا: اسے لینہ نام دیا گیا یہ لون سے مشتق ہے یہ لین سے مشتق نہیں۔ مہدوی نے کہا: اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ لون سے مشتق ہے اس کی اصل لونہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اصل میں لینہ ہے یہ لان یلین سے مشتق ہے۔ عبد اللہ نے یوں قراءت کی ماقطعتم مِنْ لِينَةٍ ولا تركتم قوما على أصولها یعنی وہ اپنے تنوں پر کھڑے ہیں۔ اعمش نے یوں قراءت کی ماقطعتم من لِينَةٍ اوتر کتموها قُوَّمَاء على اصولها معنی ہے تم انہیں نہ کاٹو اسے قوماء على أصلها بھی پڑھا گیا ہے، اس میں دو وجوہ ہیں (۱) یہ اصل کی جمع ہے جس طرح رَهن اور رُهن ہے (۲) واؤ کی بجائے ضمہ پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ اسے قائما على أصوله بھی پڑھا گیا ہے اس میں لفظ ما کا اعتبار کیا گیا ہے۔

فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ اذن، امر کے معنی میں ہے۔ وَ لِيُخۡزِيَ الۡفٰسِقِيۡنَ۝ تا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اپنی کتب کے ذریعے انہیں ذلیل ورسوا کرے۔

وَ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡهُمۡ فَمَاۤ اَوۡجَفۡتُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ خَيۡلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ‏ ۝ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ كَىۡ لَا يَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ‌ ؕ وَمَاۤ اٰتٰٮكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰٮكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا‌ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ‌ۘ‏ ۝

''اور جو مال پلٹا دیئے اللہ نے اپنے رسول کی طرف ان سے لے کر تو نہ تم نے اس پر گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ بلکہ اللہ تعالیٰ تسلط بخشتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ جو مال پلٹا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف ان گاؤں کے رہنے والوں سے تو وہ اللہ کا ہے، اس کے رسولوں کا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تا کہ وہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

ان دو آیات میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡهُمۡ فَمَاۤ اَوۡجَفۡتُمۡ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر بنونضیر کے اموال لٹا دیے تم نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے۔ ایجاف سے مراد رفتار میں تیزی دکھانا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: وجف الفرس جب گھوڑا تیز دوڑا، أو جفته أنا میں نے اسے حرکت دی، میں نے اسے کسی کے پیچھے لگایا؛ اسی معنی میں تمیم بن مقبل کا قول

ہے: اذا الرکب أوْ جفوا جب اونٹ تیزی سے چل پڑے۔ رکاب کا معنی اونٹ ہے اس کی واحد راحلہ ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم نے وہاں تک پہنچنے میں کوئی لمبا سفر طے نہیں کیا، نہ وہاں جنگ اور کسی مشقت کا سامنا کیا۔ یہ بستی مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلے پر تھی۔ فراء نے کہا: صحابہ کرام پیدل ہی وہاں گئے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار نہ ہوئے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹ پر سوار ہوئے تھے یا ایسے دراز گوش پر سوار ہوئے تھے جس کو چھال کی رسی ڈالی گئی تھی۔ اس بستی کو صلح کے ذریعے فتح کیا۔ انہیں جلاوطن کیا اور ان کے اموال اپنے قبضہ میں لے لیے۔ مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس امر کا سوال کیا کہ یہ اموال بھی ان میں تقسیم کر دیئے جائیں تو یہ آیت نازل ہوئی وَ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر کے اموال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص کر دیئے جہاں آپ چاہیں انہیں صرف کریں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ اموال مہاجرین میں تقسیم کر دیئے۔

علامہ واقدی نے کہا: اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین محتاج انصاریوں کے علاوہ کسی انصاری کو کچھ بھی نہ دیا ان میں حضرت ابو دجانہ، حضرت سماک بن خرشہ، حضرت سہل بن حنیف اور حضرت حارث بن صمہ رضی اللہ عنہم تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف دو انصاری صحابہ کو مال عطا کیا حضرت سہل اور حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہما۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: آپ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ابن ابی حقیق کی تلوار عطا کی۔ اس کی یہ تلوار ایسی تھی جس کا ان کے ہاں بڑا شہرہ تھا۔ بنو نضیر میں سے صرف دو افراد ایمان لائے سفیان بن عمیر اور سعد بن وہب، دونوں نے اس شرط پر اسلام قبول کیا کہ ان کے اموال انہیں کے پاس رہیں گے تو انہوں نے اپنے اموال کو محفوظ کر لیا۔

صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے کہ بنو نضیر کے اموال وہ اموال تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو عطا کر دیئے جن پر مسلمانوں نے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اموال میں سے اپنے گھر والوں کو سال بھر کا خرچہ عطا کرتے اور ان اموال میں سے جو کچھ بچ رہتا اسے جہاد میں استعمال ہونے والے جانوروں اور اسلحہ میں استعمال کرتے تاکہ جہاد کی تیاری رہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے اور حضرت علی کے درمیان ان اموال میں فیصلہ کر دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عطا فرمائے۔ حضرت عمر نے کہا: کیا تم دونوں جانتے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا جو مال ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے''۔ دونوں نے جواب دیا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خاص کیا ہے کسی اور فرد کو ان اموال کے لیے خاص نہیں کیا مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ۔

میں نہیں جانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے والی آیت پڑھی ہے یا نہیں پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر کے اموال تمہارے درمیان تقسیم کر دیئے اللہ کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان اموال کو تمہارے مقابلہ میں اپنے لیے خاص نہیں کیا اور نہ تمہیں چھوڑ کر خود لیا یہاں تک کہ یہ مال باقی رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سال بھر کا روزینہ اس سے لیتے باقی ماندہ کو دوسرے اموال جیسا قرار دیتے۔ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب بنو نضیر نے اپنے گھر اور اپنے اموال چھوڑے تو مسلمانوں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ مال غنیمت کی طرح ان اموال میں بھی ان کا حصہ معین کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا کہ یہ مال فئی ہے وہاں کچھ لڑائی ہوئی تھی کیونکہ انہیں کچھ عرصہ محاصرہ میں رکھا گیا تھا، انہوں نے قتال کیا اور کچھ لوگ قتل ہوئے پھر جلاوطنی کی شرط پر صلح کر لی حقیقت میں کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی بلکہ جنگ کی شروعات ہوئی تھیں اور محاصرہ ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان اموال کو اپنے رسول کے لیے خاص کر دیا تھا۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو آگاہ کیا اور یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد کی اور بغیر لشکر کشی اور سامان حرب کے انہیں غلبہ عطا کیا۔

وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ یعنی دشمنوں میں سے جس پر چاہتا ہے غلبہ عطا فرماتا ہے۔ اس میں اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے، صحابہ کرام کا ان میں کوئی حصہ نہیں تھا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اہل قری سے مراد قریظہ اور بنی نضیر ہیں۔ یہ دونوں قبیلے مدینہ طیبہ اور فدک میں آباد تھے۔ فدک جو مدینہ طیبہ اور خیبر سے تین دن کی مسافت پر واقع تھا۔ عرینہ اور ینبع کی بستیاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھیں۔ اس امر کی وضاحت کی کہ اس مال میں جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص کیا اس میں رسول اللہ کے علاوہ کے لیے بھی حصے ہیں مقصد بندوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا تھا۔ علماء نے اس آیت اور اس سے قبل آیت کے معنی میں گفتگو کی ہے کیا دونوں کا معنی ایک ہے یا مختلف ہے؟ آیت جو سورۂ انفال میں ہے تو علماء میں سے ایک جماعت نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى اس کا حکم اس آیت کے حکم سے منسوخ ہے جو سورۂ انفال میں ہے کہ خمس ان افراد کے لیے ہے جن کا ذکر کیا گیا اور باقی چار حصے جہاد کرنے والوں کے لیے ہے۔ ابتداء اسلام میں غنیمت انہیں اقسام پر تقسیم ہوتی تھی؛ یہ قول یزید بن رومان، قتادہ اور دوسرے علماء کا ہے؛ اس کی مثل امام مالک سے مروی ہے۔ ایک قوم نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال صلح کے ساتھ لیا اس پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تو یہ ان کے لیے ہوگا جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے پہلا مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہوگا جب ضرورت ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے لے لیتے اور باقی ماندہ مسلمانوں کی ضروریات میں خرچ کر دیتے۔ معمر نے کہا: پہلا مال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور دوسرا مال جزیہ اور خراج ہے۔ یہ ان مذکورہ افراد کے لیے جن کا ذکر ہوا ہے۔ تیسرا مال غنیمت ہے جس کا ذکر سورۂ انفال میں ہے یہ مجاہدین کے لیے ہے۔ ایک قوم نے کہا جن میں امام شافعی بھی ہیں: دونوں آیتوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی کفار کے وہ اموال جو جنگ کے بغیر حاصل ہونگے انہیں پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، چار حصے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہونگے اور پانچواں حصہ پانچ حصوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا، ایک حصہ قریبی رشتہ داروں کا ہوگا۔ وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں۔ کیونکہ انہیں زکوٰۃ لینے سے روک دیا گیا تھا۔ تو مال فئی میں ان کا حق رکھ دیا گیا۔ ایک حصہ یتیموں کے لیے ہوگا، ایک حصہ مسکینوں کے لیے ہوگا، ایک حصہ مسافروں کے لیے ہوگا۔ جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد مال فئی میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حصہ تھا۔ امام شافعی کے قول کے

مطابق ان مجاہدین پر صرف کیا جائے گا جو سرحدوں کی نگہبانی کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہیں۔ دوسرے قول میں ہے: اس مال کو مسلمانوں کی ضروریات کے لیے صرف کیا جائے گا جیسے سرحدوں کی حفاظت، نہریں کھودنا، پل بنانا۔ زیادہ اہم کو اہم پر مقدم رکھا جائے گا۔ یہ طریقہ مال فئی کے 4/5 حصہ میں جاری ہوگا یہ حکم مال فئی کے 4/5 حصہ میں ہے۔ جہاں تک مال فئی میں اور مال غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا تعلق ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے مصالح کے لیے استعمال ہوگا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تمہاری غنیمتوں میں سے میرے لیے خمس کے سوا کچھ نہیں اور خمس (پانچوں حصہ) بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا گیا ہے''۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ انفال میں گزر چکی ہے؛ اسی طرح جو مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے چھوڑ جائیں اس میں بھی وراثت جاری نہیں ہوگی بلکہ یہ صدقہ ہے جسے مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے گا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فئی کا مال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ** اللہ تعالیٰ نے اس مال کو اپنے رسول کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مال جمع نہیں کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس قدر مال لیا کرتے تھے جس قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کی ضروریات ہوتیں تھیں باقی ماندہ مسلمانوں کی ضروریات کے لیے خرچ کر دیتے۔

قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اس میں کوئی اشکال نہیں کہ تین آیات میں تین معانی ہیں۔ جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **هُوَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ** پھر فرمایا: **وَ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ**۔ **مِنْهُمْ** سے مراد اہل کتاب ہیں اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔

**فَمَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ** اس سے اسی چیز کا ارادہ کیا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ پس تمہارا اس میں کوئی حق نہیں اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا۔ مراد بنی نضیر اور جوان کی مثل ہیں۔ یہ ایک ہی آیت ہے اور معنی بھی ایک ہی ہے۔

دوسری آیت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ** یہ نئی کلام ہے پہلی سے مختلف ہے پہلی آیت میں موجود مستحقین کے علاوہ کے استحقاق کے لیے ہے۔

تیسری آیت سے مراد آیت غنیمت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا معنی اور ہے، ایک اور مستحق کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے مگر پہلی اور دوسری آیت دونوں اس میں شریک ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسی چیز کو ضمن میں لیے ہوئے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو عطا فرمائی ہے۔ پہلی آیت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ مال جنگ کے بغیر حاصل ہوا ہے۔ آیت انفال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ مال قتال کے ساتھ حاصل ہوا ہے جبکہ تیسری آیت **مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى** اس امر سے خالی ہے کہ وہ مال جنگ سے یا بغیر جنگ کے حاصل ہوا؛ اسی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا۔ ایک

جماعت نے کہا: یہ پہلی آیت کے ساتھ لاحق کی جائیگی، یہ سب کا سب صلح کا مال ہوگا یا اس کی مثل مال ہوگا۔

ایک جماعت کا قول ہے: یہ دوسری آیت جو آیت انفال ہے کے ساتھ لاحق کی جائیگی۔ جنہوں نے کہا: یہ آیت آیت انفال کے ساتھ لاحق کی جائیگی انہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے کیا یہ منسوخ ہے جس طرح پہلے گزرا ہے یا یہ محکم ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ شہادت جو اس سے پہلے ہے اسے اس کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ایک نیا فائدہ اور نیا معنی ہے؛ جبکہ یہ تو معلوم ومشہور ہے کہ آیت کے حرف جو دوسری آیت سے زائد ہوں اسے نئے فائدہ پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے بنسبت اس کے کہ اسے سابقہ فائدہ پر ہی محمول کیا جائے۔

ابن وہب نے امام مالک سے فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد بنو نضیر ہیں اس میں خمس لازم نہیں تھا اور نہ ہی ان اموال کو حاصل کرنے کے لیے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے گئے تھے۔ یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اموال کو مہاجرین اور تین انصاری صحابہ کے درمیان تقسیم فرما دیا جس طرح مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی کی تفسیر میں یہ قول گزر چکا ہے کہ اَهْلِ الْقُرٰی سے مراد قریظہ کا قبیلہ ہے۔ قریظہ اور غزوہ خندق کا واقعہ ایک ہی روز ہوا تھا۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک کا قول کہ دوسری آیت بنو قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا معنی آیت انفال کے معنی کی طرف لوٹ رہا ہے اور اسے نسخ لاحق ہوتا ہے۔ اسے محکم قرار دینے کی بنسبت یہ قول زیادہ قوی ہے۔ ہم کسی قول کو پسند نہیں کرتے مگر اسے ہی جسے ہم نے اس انداز میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ دوسری آیت کا معنی نیا ہے جس طرح ہم نے اس پر دلیل قائم کی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

میں کہتا ہوں: انہوں نے جو پسند کیا ہے، وہ حسن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ سورۂ حشر سورۂ انفال کے بعد نازل ہوئی یہ امر محال ہے کہ متقدم بعد میں نازل ہونے والی آیت کو منسوخ کر دے۔ ابن ابی نجیح نے کہا: مال تین قسم کے ہیں۔ مال غنیمت، مال فئی، صدقہ۔ ان میں سے کوئی درہم نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا محل بیان کر دیا ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ وہ اموال جن میں ائمہ اور والیوں کا عمل دخل ہوتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

ا۔ جو مسلمانوں سے اس طریقہ پر لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو پاک کیا جائے جس طرح صدقات، زکوٰۃ وغیرہ۔

۲۔ مال غنیمت، اس سے مراد وہ مال ہے جو کفار کے اموال میں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے جیسے جنگ وغلبہ کے ذریعے۔

۳۔ مال فئی: اس سے مراد وہ اموال ہیں جو کفار کے اموال میں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگتے ہیں اس میں کوئی جنگ نہیں ہوتی اور نہ گھوڑوں کو دوڑایا جاتا ہے جس طرح صلح، جزیہ، خراج اور کافر تجار سے ٹیکس، اس کی مثل یہ صورت بھی ہے کہ مشرک بھاگ جائیں اور اپنے اموال چھوڑ جائیں یا ان میں سے کوئی دار السلام میں فوت ہو جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو۔ جہاں تک صدقہ کا تعلق ہے اس کا مصرف فقراء، مساکین اور عاملین زکوٰۃ ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔ جس کی وضاحت سورۂ براءت میں گزر چکی ہے۔ جہاں تک مال غنیمت کا تعلق ہے۔ ابتداء اسلام میں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے، جیسے چاہیں

اس میں صرف کریں جس طرح سورۂ انفال میں فرمایا قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (آیت:1) پھر اس حکم کو منسوخ کردیا گیا ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ (انفال:۴۱) سورۂ انفال میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ جہاں تک مال فئی کا تعلق ہے تو اس کی تقسیم اور خمس کی تقسیم برابر ہے۔ امام مالک کے نزدیک دونوں قسم کے اموال کی تقسیم کا انحصار امام کی رائے پر ہے۔ اگر اس کی رائے بنے کہ اسے ان مصائب کے لئے محفوظ کرلے جو مسلمانوں پر واقع ہوتی ہیں تو ایسا کرے اگر وہ دونوں یا ایک کی تقسیم کی رائے بنے تو لوگوں کے درمیان اسے تقسیم کردے اور عربی اور اس کے مولی میں برابری کرے اور مرد و عورت میں سے فقراء سے شروع کرے یہاں تک کہ وہ غنی ہوجائیں۔ مال فئی میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کو وہ حصہ دے جو امام کی رائے بنے ان کے لیے کوئی معلوم حد نہیں ان میں سے غنی کو عطا کرنے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اکثر کی رائے ہے کہ انہیں اس میں سے حصہ دیا جائے کیونکہ یہ ان کا حق ہے۔ امام مالک نے کہا: فقراء کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دیا جائے گا کیونکہ ان کے حق میں یہ صدقہ کا عوض ہے۔

امام شافعی نے کہا: کفار کا جو مال بغیر قتال کے حاصل ہوتا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پچیس حصوں میں تقسیم کردیا جاتا۔ بیس حصے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں جو چاہتے کرتے اور پانچواں حصہ وہاں صرف کیا جاتا جہاں مال غنیمت کا پانچواں حصہ صرف کیا جاتا۔

ابوجعفر بن داؤدی نے کہا: یہ ایسا قول ہے جو پہلے کسی نے نہیں کیا جو کچھ ہم جانتے ہیں بلکہ یہ سارا مال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں ثابت ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا فرمان: خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاحزاب:50) اس پر دلالت کرتا کہ کسی غیر کو ہبہ کرنا جائز ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ (الاعراف:32) اس امر کو جائز کرتا ہے کہ اس میں اور بھی شریک ہیں۔ امام شافعی کا اس بارے میں مفصل قول گزر چکا ہے۔ الحمدللہ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ فئی کے خمس کا طریقہ وہی ہے جو مال غنیمت کے خمس کا طریقہ ہے اور 4/5 حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ مسلمانوں کی مصلحتوں کے لیے ہوگا۔ آپ کا ایک اور قول بھی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ ان لوگوں کے لیے ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے وقف کر رکھا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے علماء نے کہا: جس شہر سے جو مال اکٹھا کیا گیا ہے تمام مال وہاں ہی تقسیم کردیا جائے گا۔ جس شہر سے وہ مال جمع کیا گیا ہے وہاں سے اسے منتقل نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ غنی ہوجائیں۔ پھر وہاں سے قریبی کی طرف منتقل کیا جائے، مگر اس صورت میں کہ جس جگہ سے مال وصول کیا گیا ہے اس کی بجائے کسی اور جگہ سخت فاقہ کی نوبت آجائے تو وہاں سے فاقہ والی جگہ کی طرف مال منتقل کردیا جائے گا جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آفت کے سالوں میں کیا تھا وہ پانچ سال تھے یا چھ سال تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دو سال تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایک سال تھا جس میں طاعون کے ساتھ بھوک شدید ہوگئی تھی۔

اگر ایسی صورتحال نہ ہو جو ہم نے بیان کی اور امام کی یہ رائے ہو کہ مال فئی کو روک لے تو مسلمانوں پر واقع ہونے والی

آفتوں کے لیے اسے روک لے اور اس مال میں سے نوزائیدہ بچے کو دے اور اس کی تقسیم اس فرد سے شروع کرے جس کا باپ فقیر ہو۔ مال فئی اغنیاء کے لیے بھی حلال ہے۔ اس کی تقسیم میں سب لوگوں کو برابر رکھے مگر ضرورت مندوں کو ترجیح دے، جس قدر کسی کی ضرورت ہو اس کی مناسبت سے زیادہ دے۔ اس مال سے مقروضوں کو دے جس کے ذریعے وہ اپنے قرضے ادا کریں اگر کوئی انسان اہل ہو تو اس میں سے انعام اور عطیہ دے۔ قاضیوں، حکام اور ان کو دے جس میں انسان کی منفعت ہو۔ اس میں سے زیادہ حصہ کے مستحق وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے لئے زیادہ نفع کا باعث ہوں۔ جس نے مال فئی میں سے کوئی چیز دیوان میں نام لکھوا کر لی تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ جہاد میں شریک ہو جب جہاد کیا جائے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً عام قراءت یَکُوۡنَ یاء کے ساتھ ہے۔ اور دُوۡلَۃً نصب کے ساتھ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی کی لایکون الفئی دولۃ۔ ابو جعفر، اعرج اور ہشام نے ابن عامر سے اور ابو حیوہ نے تکون تاء کے ساتھ اور دولۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔ یہ کان تامہ ہے۔ دولۃ یہ کان کا اسم ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اس کی خبر نہیں ہے۔ یہ جائز ہے کہ یہ ناقصہ ہو اور اس کی خبر بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ یہ دُوۡلَۃً کا وصف ہو۔ عام قرائت دول۔ دال کے ضم کے ساتھ ہے۔ سلمی اور ابو حیوہ نے اسے نصب کے ساتھ یعنی دولۃ پڑھا ہے۔ عیسیٰ بن عمر، یونس اور اصمعی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ ابو عمرو بن علاء نے کہا: دولۃ سے مراد جنگ وغیرہ میں کامیابی کو کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ اس شے کا نام ہے جو مال ہو اور لوگوں کے درمیان گردش کناں ہو؛ ابو عبید نے یہی کہا ہے: الدولۃ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو گردش کناں رہتی ہے اور دولۃ مصدر ہے آیت کا معنی یہ ہے مال فئی میں یہ اس لئے کہا تا کہ رؤساء، اغنیاء اور قوی لوگ آپس میں تقسیم نہ کر لیں فقراء اور کمزور لوگوں کو کچھ حصہ نہ ملے کہ دور جاہلیت میں جب کوئی قوم مال غنیمت حاصل کرتی تو ان کا رئیس اس کا چوتھا حصہ اپنے لیے لیتا یہی مرباع تھا پھر مرباع کے بعد اپنے لیے جو چاہتا منتخب کر لیتا؛ اس بارے میں شاعر نے کہا:

لک المرباع منہا و الصفایا

اس مال غنیمت میں سے تیرے لیے مرباع اور چنا ہوا مال ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تاکہ اس میں اس طرح کا معاملہ نہ کیا جائے جس طرح کا معاملہ دور جاہلیت میں کیا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص کر دیا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے وہاں صرف کر دیں جہاں صرف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ اس میں خمس نہیں جب خمس لازم ہوگا تو وہ تمام مسلمانوں میں تقسیم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا یعنی مال غنیمت میں سے رسول اللہ جو تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز کو لینے اور خیانت کرنے سے روکیں اس سے رک جاؤ؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ سدی نے کہا: مال فئی میں سے جو رسول اللہ تمہیں عطا کریں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس کا مطالبہ نہ کرو۔ ابن جریج نے کہا: میری طاعت کے بارے میں جو پیغام لائیں اسے بجا لاؤ اور میری معصیت سے روکیں تو اس سے رک

جاؤ۔ ماوردی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا: یہ امر تمام اوامر ونواہی پر محمول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اچھے امر کا حکم دیتے ہیں اور فاسد امر سے روکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: اس سے مراد بھی وہی ہے جو اس سے ماقبل قول کی مراد تھی۔ یہ تین اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ مہدوی نے کہا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یہ ارشاد اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس چیز کا حکم دیا وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر ہے۔ یہ آیت کریمہ اگر چہ غنائم کے بارے میں ہے پھر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوامر اور نواہی اس میں داخل ہیں۔ حضرت حکم بن عمیر نے کہا جو صحابی تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ قرآن اس کے لیے سخت مشکل ہے جو اسے ترک کرے اور جو اس کی اتباع کرے اور اس کی طلب کرے اس کے لیے آسان ہے۔ اور میری حدیث بھی مشکل ہے جس نے میری حدیث کو مضبوطی سے پکڑا اور اسے یاد کیا تو وہ قرآن کے ساتھ نجات پا گیا جس نے قرآن اور میری حدیث کے بارے میں سستی کی تو وہ دنیا و آخرت میں خسارے میں رہا۔ تمہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ میرے قول کو مضبوطی سے پکڑو، میرے حکم کی محافظت کرو اور میری سنت کی اتباع کرو۔ جو میرے قول پر راضی ہوا وہ قرآن پر راضی ہوا جس نے میرے قول کا مذاق اڑایا تو اس نے قرآن کا مذاق اڑایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ عبدالرحمن بن زید نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک محرم سے ملے جس کے جسم پر کپڑے تھے حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: یہ کپڑے اتار دو۔ اس آدمی نے عرض کی: کیا تم اس کی تصدیق کے لیے مجھ پر کتاب اللہ کی کوئی آیت پڑھو گے؟ فرمایا: ہاں وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا عبداللہ بن محمد بن ہارون فریابی نے کہا: میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: جو چاہو تم مجھ سے سوال کرو میں کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے تمہیں آگاہ کروں گا۔ میں نے آپ سے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کے معاملات کو درست کرے، آپ اس محرم کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو بھڑ کو قتل کر دیتا ہے؟ حضرت امام شافعی نے جواب دیا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

سفیان بن عیینہ، عبدالملک بن عمیر سے وہ ربعی بن حراش وہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اقتدوا باللذین من بعدی أبی بکر وعمر میرے بعد تم ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا۔

سفیان بن عیینہ، مسعر بن کدام سے وہ قیس بن مسلم سے وہ طارق بن شہاب سے وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھڑ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے علماء نے کہا: یہ بہت اچھا جواب ہے۔ امام شافعی نے حالت احرام میں بھڑ کو قتل مارنے کا فتویٰ دیا اور امام شافعی نے اس امر کی وضاحت کی کہ وہ اس مسئلہ میں حضرت عمر کی اقتداء کر رہے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کی اقتدا کا حکم دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس امر کو قبول کرنے کا حکم دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرمائیں، تو بھڑ کے قتل کا جواز کتاب وسنت سے مستنبط ہے؛ یہی معنی عکرمہ کے قول میں گزر چکا ہے جب ان سے امہات اولاد کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا: سورۂ نساء میں انہیں آزاد قرار دیا گیا ہے؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

أَطِيعُوا اللهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (آیت:59)

صحیح مسلم اور دوسری کتب میں علقمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لعن الله الواشمات والمستوشمات و المتنمصات و المتفلجات للحسن المغيرات خلق الله اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے والیوں پر، گودجانے والیوں پر، چہرے سے بال نوچنے والیوں پر، خوبصورتی کے لئے دانتوں کو کھلا کرانے والیوں پر اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں تبدیلی کرنے والیوں پر۔

بنی اسد کی ایک عورت تک یہ خبر پہنچی جسے ام یعقوب کہا جاتا وہ عورت آئی اس نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے اس اس عورت پر لعنت کی ہے۔ فرمایا: جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جبکہ وہ کتاب اللہ میں ہے؟ اس عورت نے کہا: دفتین میں جو کچھ ہے میں نے اسے پڑھا ہے میں نے اس میں وہ نہیں پایا جو تم کہتے ہو۔ فرمایا: اگر تو اس کو پڑھتی تو ضرور پاتی، کیا تو نے اسے پڑھا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ اس نے کہا: کیوں نہیں؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ بحث سورۂ نساء میں مفصل گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ یہاں لفظ ایتاء آیا ہے جس کا معنی عطا کرنا ہے تاہم اس کا معنی حکم دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اس کے مقابل نہی کا لفظ ذکر کیا۔ نہی، امر کے سوا کسی کے مقابل نہیں ہوتی۔ جو چیز ہم نے پہلے ذکر کی ہے اس کے فہم پر دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: إذا أمرتكم بأمر فاءتوا منه ما استطعتم وإذا نهيتكم عن شئ فاجتنبوا۔

جب میں تمہیں کسی امر کا حکم دوں تو جتنی طاقت رکھو اس کو بجالاؤ اور جب میں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے اجتناب کرو۔ کلبی نے کہا: یہ آیت مسلمان رؤسا کے بارے میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکوں کے اموال پر غالب آئے تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم پسندیدہ چیز اور چوتھا حصہ لے لیں باقی ہمارے لیے چھوڑ دیں، ہم دور جاہلیت میں اس طرح کیا کرتے تھے اور انہوں نے یہ پڑھا: لك المرباع منها و الصفايا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں سے چوتھا حصہ اور منتخب چیز ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچو جس نے اس کی نافرمانی کی اس کے لیے وہ شدید ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی میں اس سے ڈرو تم اسے ضائع نہ کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۞ اللہ تعالیٰ نے جس کا حکم دیا اس کے بارے میں وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞

"(نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لیے جنہیں (جبرا) نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے اور جائیدادوں سے (یہ نیک بخت) تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور (ہر وقت) مدد کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے

رسول کی، یہی راستباز لوگ ہیں''۔

مال فیٔ اور غنیمتیں مہاجر فقراء کے لیے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اغنیاء میں ہی گردش کناں نہ رہے بلکہ یہ فقراء کے لیے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کا بیان ہے۔ جب ان کی اصناف کا ذکر کیا گیا تو کہا گیا: مال ان لوگوں کے لئے ہے، کیونکہ یہ فقراء، مہاجر ہیں انہیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے، یہ دوسرے لوگوں کی نسبت اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ مہاجر فقراء کے لئے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے تا کہ یہ اموال دنیا داروں میں سے اغنیاء کے درمیان ہی گردش نہ کرتے رہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اللہ تعالیٰ مہاجر فقراء کی وجہ سے کفار کو سخت سزا دینے والا ہے۔ ان فقراء میں وہ فقراء بھی داخل ہو گئے ہیں جن کا ذکر پہلے ہوا وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ اس کا عطف ماقبل پر ہے مگر یہاں واؤ عاطفہ نہیں جس طرح تیرا یہ قول ہے: هذا المال لزيد لبكر لفلان لفلان یہاں مہاجرین سے مراد وہ مہاجر ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ قتادہ نے کہا: یہاں وہ مہاجر مراد ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی وجہ سے اپنے گھر، اپنے اموال، اپنے اہل اور اپنے وطن کو چھوڑا یہاں تک کہ ایک آدمی بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا تا کہ اس کی کمر سیدھی رہے، ایک آدمی موسم سرما میں ایک گڑھا کھودتا موسم سرما میں اس کے لئے اس کے سوا کوئی گرمی پہنچانے والا بستر نہ ہوتا۔

عبدالرحمن بن ابزی اور سعید بن جبیر نے کہا: مہاجروں میں سے ایسے لوگ بھی تھے جن میں سے کسی کے پاس غلام، بیوی، گھر اور سواری نہ تھی جس پر سوار ہو کر وہ حج کرتا یا جہاد کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فقیر قرار دیا اور زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھا۔ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ کا معنی ہے کفار مکہ نے انہیں گھروں سے نکالا یعنی انہیں گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ وہ سو افراد تھے۔

یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا میں غنیمت اور آخرت میں اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں۔ وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ وہ اس فعل میں سچے ہیں۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا فرمایا: جو آدمی قرآن کے بارے میں کوئی سوال کرنا چاہے تو وہ حضرت ابی بن کعب کے پاس جائے، جو فرائض (وراثت) کا مسئلہ سمجھنا چاہے تو وہ حضرت زید بن ثابت کے پاس جائے، جو فقہ کا مسئلہ پوچھنا چاہے تو وہ حضرت معاذ بن جبل کے پاس جائے، جو مال کا سوال کرنا چاہے تو وہ میرے پاس آئے اللہ تعالیٰ نے مجھے مال کا خازن اور قاسم بنایا ہے۔ خبردار! میں مال کی تقسیم کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کرنے والا ہوں، میں انہیں عطا کروں گا پھر مہاجرین اولین کا حق ہے میں اور میرے صحابہ کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا نہ ہمارے گھر رہے اور نہ ہی ہمارے اموال رہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

''اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں مہاجرین (کی آمد) سے پہلے، محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں اور نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی خلش اس چیز کے بارے میں جو مہاجرین کو دے دی جائے اور ترجیح دیتے ہیں (انہیں) اپنے آپ پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو، اور جس کو بچا لیا گیا اپنے نفس کی حرص سے تو وہی لوگ بامراد ہیں''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ سے مراد انصار ہیں جنہوں نے مہاجرین سے قبل مدینہ طیبہ کو اپنا وطن بنایا تھا۔ الْاِيْمَانَ کا لفظ تَبَوَّؤُا کی بجائے کسی اور فعل کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ تبوء کا تعلق مکان سے ہوتا ہے۔ مِنْ قَبْلِهِمْ، من تَبَوَّؤُا کے متعلق ہے معنی ہے جنہوں نے مہاجرین سے پہلے یہاں رہائش اختیار کی، ایمان کا اعتقاد رکھا اور اس کے لئے اخلاص کا مظاہرہ کیا کیونکہ ایمان ایسی چیز نہیں جس کو ٹھکانہ بنایا جائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ (یونس: 71) یہاں بھی تقدیر کلام یہ ہے وادعوا شرکاءکم ابوعلی، زمخشری اور دوسرے علماء نے اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ کلام بھی اس طریقہ پر ہے عَلَفْتُهَا تِبْنًا و ماءً باردا یہاں بھی ایجاز حذف کا قاعدہ ہے۔ اصل میں سقیتها ماءً باردا یہ بھی جائز ہے کہ مضاف کے حذف پر اسے محمول کیا جائے گویا یوں ارشاد فرمایا: تبوؤا الدار و مواضع الایمان یہ بھی جائز ہے کہ اسے اس پر محمول کیا جائے جس پر تبوؤا دلالت کرتا ہے۔ گویا فرمایا: لزموا الدار ولزموا الایمان یہ بھی جائز ہے کہ تبوأ الایمان ضرب المثل کے طریقہ پر ہو جس طرح تو کہتا ہے: تبوأ من بنی فلان الصمیم، التبوأ سے مراد تمکن اور استقرار ہے۔ یہ مراد نہیں کہ انصار مہاجرین سے پہلے ایمان لائے بلکہ یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ایمان لائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کیا اس آیت کا ماقبل آیت سے اعرابی تعلق نہیں یا اس کا ماقبل پر عطف ہے؟ ایک قوم کی یہ رائے ہے: اس کا عطف لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ پر ہے سورۂ حشر میں جتنی بھی آیات ہیں سب ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ پس اگر اس میں وہ غور و فکر کرتے اور انصاف سے کام لیتے تو جو نقطۂ نظر انہوں نے اپنایا ہے اس کے خلاف پاتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۖ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۖ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۞ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ

انجلآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۖ وَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ میں بنی نضیر اور بنی قینقاع کے بارے میں خبر دی ہے، پھر فرمایا: وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ اس میں خبر دی کہ یہ اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہیں کیونکہ جب اموال ان سے چھڑوائے گئے ان پر کوئی گھوڑے نہیں دوڑائے گئے۔ ان کے بارے میں جو گزرا کہ قتال ہوا، ان کے درخت کاٹے گئے۔ صحابہ نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ امر ختم ہو گیا تھا۔ پھر فرمایا: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ اس کا ماقبل کلام پر کوئی عطف نہیں اسی طرح وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ انصار کی مدح اور ان کی ثنا کا آغاز ہو رہا ہے کیونکہ انہوں نے اس مال فئی کو مہاجرین کے سپرد کر دیا تھا گویا فرمایا: مال فئی مہاجر فقراء کے لیے ہے۔ انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور مال فئی جو مہاجرین کے لئے خاص کیا گیا انہوں نے اس سے حسد نہ کیا اسی طرح وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ نئی کلام ہے اس کی خبر يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ہے۔

اسماعیل بن اسحاق نے کہا: وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ اور وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ کا ماقبل پر عطف ہے۔

وہ مال فئی میں شریک ہیں، یعنی یہ مال مہاجرین اور انصار کے لیے ہے۔ مالک بن اوس نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ (التوبۃ: 60) فرمایا: یہ ان کے لیے پھر وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (الانفال: 41) فرمایا: یہ ان کے لیے، پھر مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ ۔ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ، وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ آیات پڑھیں۔ پھر فرمایا: اگر میں زندہ رہا تو ایک چرواہا جو حمیر کے پہاڑوں (جو یمن کا علاقہ ہے) میں ہوگا اس کا حصہ اس کے پاس پہنچے گا، اس کی پیشانی کو پسینہ سے شرابور نہ ہونا پڑے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار و مہاجرین کو بلایا اور اللہ تعالیٰ نے جو فتوحات عطا فرمائی تھیں ان کے بارے میں مشورہ طلب کیا فرمایا: معاملہ میں خوب غور و فکر کرو پھر اگلے روز میرے پاس آؤ، آپ نے رات بھر سوچ و بچار کی تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ آیات اس معاملہ میں نازل ہوئی ہیں۔ جب وہ صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے فرمایا: میں نے گزشتہ رات ان آیات کو پڑھا جو سورۂ حشر میں ہیں اور ان آیات کو تلاوت کیا۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ جب اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ تک پہنچے فرمایا: یہ اموال صرف ان کے لیے نہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کی وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ پھر فرمایا: اہل اسلام میں سے کوئی آدمی نہیں بچا جو اس میں داخل نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام مالک نے زید بن اسلم سے وہ اپنے باپ سے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں: اگر بعد میں آنے والے لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو کوئی بستی فتح نہ کی جاتی مگر میں اسے اس طرح تقسیم کر دیتا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا۔ کثیر سندوں سے اخبار مشہورہ میں یہ موجود ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کا دیہاتی علاقہ، مصر اور ان کی غنیمتوں کو مجاہدین میں تقسیم کیے بغیر باقی رہنے دیا تا کہ ان اموال سے مجاہدین کے عطیات، کمزور لوگوں اور بچوں کو روزینہ کا بندوبست ہو سکے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مفتوحہ علاقوں کو ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی اس رائے کو پسند نہ کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا اس میں اختلاف کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: آپ نے یہ عمل غازیوں کی خوشنودگی سے کیا۔ جس نے اپنا حصہ بغیر قیمت کے چھوڑ دیا تا کہ مسلمانوں کے لئے باقی چھوڑے اور وہ اس پر راضی تھا وہ آپ نے لے لیا اور جس نے ایسا کرنے سے انکار کیا آپ نے اسے اس کے حصہ کی قیمت دے دی۔ کچھ نے کہا: آپ نے لوگوں کی رضامندی کے بعد زمین کو اس طرح رہنے دیا آپ کے اس عمل کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بنا دیا جائے گا کیونکہ آپ نے خیبر کے علاقہ کو تقسیم کیا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خریدا اور جس نے اپنے حصہ کو خوشدلی سے ترک کر دیا یہ اس کی تقسیم کے قائم مقام ہی ہے: ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ آپ نے مجاہدین کو کوئی چیز دیئے بغیر اس علاقہ کو مملکت اسلامیہ کی ملکیت میں باقی رہنے دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۫ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ میں تاویل کر دی تھی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ زمینوں اور جاگیروں کی تقسیم میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ امام مالک نے کہا: امام کو حق حاصل ہے کہ وہ ان زمینوں کو مسلمانوں کے مصالح کے لئے وقف کر دے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: امام کو اختیار حاصل ہے کہ ان زمینوں کو تقسیم کر دے یا مسلمانوں کی ضروریات کے لئے اسے وقف کر دے۔ امام شافعی نے کہا: مجاہدین کی رضا کے بغیر امام کو وہ زمینیں روکنے کا حق نہیں بلکہ دوسرے اموال کی طرح ان زمینوں کو بھی ان میں تقسیم کر دے۔ جس نے خوش دلی سے اپنا حق امام کے حوالے کر دیا کہ وہ لوگوں کے مصالح کے لئے اسے وقف کر دے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا اور جو راضی نہ ہو تو وہ اپنے مال کا زیادہ حقدار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو راضی کیا اور ان سے وہ زمینیں خرید لیں (1)۔

میں کہوں گا: اس تعبیر کی بنا پر وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ماقبل کلام سے لاتعلق ہوگا انہیں پہلوں کے حق میں دعا اور ان

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی

کی تعریف کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن وہب نے کہا: میں نے امام مالک کو مدینہ طیبہ کی دوسرے علاقوں پر فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے سنا: مدینہ کو ایمان اور ہجرت کا ٹھکانہ بنایا گیا جبکہ دوسری بستیاں انہیں بزور شمشیر فتح کیا گیا۔ پھر آپ نے اس آیت وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ کی قراءت کی۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور اسی طرح دونوں مسجدوں مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت کی بحث گزر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا۔ مال فئی اور دوسری چیزوں کو جو مہاجرین کے لئے خاص کیا گیا ہے اس پر انصار کوئی حسد نہیں کرتے؛ اسی طرح لوگوں نے کہا: اس میں دو مضاف مقدر ہونگے تقدیر کلام یہ ہوئی مَسَّ حاجةٍ مِنْ فَقْدِ ما أوتوا انسان اپنے سینہ میں کوئی ایسی چیز پاتا ہے جس کے ازالہ کی اسے ضرورت ہوتی ہے تو اسے حاجت کہتے ہیں مہاجرین، انصار کے گھروں میں رہتے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو نضیر کے اموال حاصل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا انہوں نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا کہ انہیں اپنے گھروں میں ٹھہرایا اور اپنے اموال میں انہیں شریک کیا اس پر ان کا شکریہ ادا کیا پھر فرمایا: ''اگر تم پسند کرو تو اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے جو اموال ہمیں عطا کیے ہیں وہ میں تمہارے اور ان کے درمیان تقسیم کر دوں اور مسلمان اسی طرح تمہارے گھروں اور اموال میں حصہ دار رہیں اور اگر تم پسند کرو تو میں یہ اموال ان کو دے دوں اور وہ تمہارے گھروں سے نکل جائیں''۔

حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کی: نہیں بلکہ ان اموال کو مہاجرین میں تقسیم کر دو اور وہ ہمارے گھروں میں ہی رہیں جس طرح وہ پہلے گھروں میں رہتے تھے۔ سب انصار نے یک زبان ہو کر کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم اس پر راضی ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یوں دعا کی: اللّٰھم الأنصار و أبناء الانصار اے اللہ! انصار اور انصار کی اولادوں پر رحم فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اموال مہاجرین کو دے دیئے اور انصار کے تین افراد کے سوا کسی کو کچھ نہ دیا جن کا ذکر ہم پہلے آیت 10 کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا ہو جب مال تھوڑا ہو تو وہ اس پر قناعت کرتے ہیں اور اسی پر راضی ہوتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری زندگی میں اسی طرح تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد بھی اسی طرح رہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبردار کیا تھا فرمایا: ستروِن بعدی أثَرَةً فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض (1) تم میرے بعد دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیا جاتا دیکھو گے تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم حوض پر مجھے ملو۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ ایک آدمی کے پاس مہمان نے رات گزاری۔ اس کے پاس صرف اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کھانا موجود

1۔ احکام القرآن لابن العربی

تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا: بچوں کو سلا دو، چراغ بجھا دو اور جو کچھ تیرے پاس ہے مہمان کی خدمت میں پیش کر۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: میں بڑی مشقت میں مبتلا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بیوی کے پاس آدمی بھیجا انہوں نے عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ معبوث کیا! میرے پاس تو صرف پانی ہی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری کے پاس آدمی بھیجا انہوں نے بھی اس کی مثل عرض کی یہاں تک کہ تمام ازواج مطہرات نے یہی گزارش کی۔ نہیں اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میرے پاس تو پانی نہیں۔ فرمایا: ''آج رات کو اس کی جو مہمان نوازی کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے''۔ ایک انصاری اٹھا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں (یہ خدمت سرانجام دوں گا) وہ انصاری اس مہمان کو گھر لے گیا اپنی بیوی سے کہا: کیا تیرے پاس کوئی شے ہے۔ اس نے کہا: نہیں مگر بچوں کا کھانا ہے۔ کہا: بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا لینا، جب ہمارا مہمان گھر میں داخل ہو تو چراغ کو بجھا دینا، میں اسے یہ ظاہر کروں گا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔ جب وہ کھانا کھانے کے لئے جھکا تو عورت چراغ کی طرف اٹھی اور اسے گل کر دیا۔ کہا: وہ سب بیٹھ گئے اور مہمان نے کھانا کھا لیا۔ جب صبح ہوئی تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے بہت خوش ہوا ہے''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کھانا کھلائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی کھانا نہیں تھا جو آپ اسے کھلاتے فرمایا: ''کیا کوئی ایسا آدمی نہیں جو اس کی ضیافت کرے، اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے''۔ ایک انصاری اٹھا جسے ابوطلحہ کہتے وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور پہلی حدیث کی مثل حدیث نقل کی۔ اس میں آیت کے نزول کا ذکر کیا۔

مہدوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت ثابت بن قیس اور انصار کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت ثابت اس کے پاس مہمان کے طور پر آئے تھے جسے ابوالمتوکل کہا جاتا۔ حضرت ابوالمتوکل کے پاس اپنے اور اپنے بچوں کے لئے کھانا تھا۔ آپ نے اپنی بیوی سے کہا: چراغ کو گل کر دو اور بچوں کو سلا دو جو کچھ کھانا ہے اسے مہمان کے سامنے پیش کر دو؛ نحاس نے بھی اسی کی مثل ذکر کیا ہے۔ کہا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک انصاری جس کو ابوالمتوکل کہا جاتا کے پاس حضرت ثابت بن قیس مہمان کے طور پر ٹھہرے ان کے پاس اپنے اور بچوں کے کھانے کے سوا کوئی کھانا نہیں تھا۔ آپ نے اپنی بیوی سے کہا: چراغ کو گل کر دو اور اپنے بچوں کو سلا دو۔ تو یہ آیت وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ نازل ہوئی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عمل کرنے والے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے (1)۔ قشیری ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم نے ذکر کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک کو ایک سر تحفہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس نے کہا: میرا

1۔ المحرر الوجیز

فلاں بھائی اور اس کے اہل ہم سے اس کی زیادہ ضرورت رکھتے ہیں۔ اس نے وہ سر اس کی طرف بھیج دیا۔ وہ سر لگا تار ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف بھیجا جاتا رہا یہاں تک کہ وہ سات گھروں تک پہنچا اور پھر انہیں تک واپس آ گیا تو یہ آیت نازل ہوئی؛ ثعلبی نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ صحابہ کرام میں سے ایک کو بکری کا سر تحفہ کے طور پر پیش کیا گیا وہ بڑے تنگدست تھے۔ اس نے وہ سر اپنے پڑوسی کو بھیج دیا۔ وہ سر سات گھروں میں سے سات افراد تک گھومتا رہا، پھر وہ پہلے کی طرف لوٹ آیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نضیر کے ساتھ جنگ کے موقعہ پر انصار سے فرمایا: "اگر تم چاہو تو میں تمہارے گھروں اور اموال کو مہاجرین کے لئے تقسیم کر دوں اور تم بھی اس غنیمت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر تم چاہو تو تمہارے گھر اور تمہارے اموال تمہارے پاس رہیں اور مال غنیمت میں سے کوئی چیز تمہیں نہ دیں"۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ ایک صحابی اپنی زمین میں سے کچھ کھجوروں کے درخت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مختص کرتا یہاں تک کہ بنو نضیر اور بنو قریظہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتح ہوئی۔ اس صحابی نے جو درخت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے واپس کر دیے۔ الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔

انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب مہاجر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آئے، ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ انصار زمینوں اور جائیدادوں والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں یوں تقسیم کی کہ انصار ہر سال اپنے اموال کا نصف مہاجرین کو دیں گے اور مہاجرین کام اور مشقت کے ذمہ دار ہونگے۔ حضرت انس بن مالک کی ماں جسے حضرت ام سلمہ کہتے ہیں جو حضرت عبد اللہ بن ابی طلحہ کی والدہ تھی۔ یہ حضرت انس کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی کھجوروں کے کچھ درخت پیش کیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنی لونڈی حضرت ام ایمن عطا کی جو حضرت اسامہ بن زید کی والدہ تھی۔

ابن شہاب نے کہا: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اہل خیبر کے ساتھ جنگ سے فارغ ہوئے اور مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے مہاجرین نے انصار کو ان کے عطیات واپس کر دیے جو انہوں نے مہاجرین کو عطا فرمائے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری ماں (ام انس بن مالک) کو کھجوریں واپس کر دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام ایمن کو ان کی جگہ اپنے باغ میں سے کھجوریں عطا کیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ ایثار کا معنی ہے کس غیر کو اپنی ذات اور نفس کے دنیاوی فوائد پر مقدم کرنا اور دینی منافع کی خواہش رکھنا۔ یہ چیز اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مضبوط یقین، قوی محبت اور مشقت پر صبر کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: **آثرتہ بکذا** میں نے اسے اس کے ساتھ خاص کیا اور اسے فضیلت دی۔ ایثار کا مفعول یہاں محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوئی **یوثرونھم منازلھم** وہ اپنے اموال اور اپنے گھروں کے بارے میں انہیں اپنی ذاتوں پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ خود غنی

ہیں بلکہ انہیں اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے جس طرح اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ امام مالک کو یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک سائل نے سوال کیا جبکہ وہ روزے سے تھیں، آپ کے گھر میں صرف ایک روٹی موجود تھی۔ آپ نے اپنی لونڈی سے فرمایا: روٹی اسے دے دو۔ اس نے عرض کی: آپ کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ساتھ آپ روزہ افطار کریں گی۔ فرمایا: روٹی اسے دے دو۔ لونڈی نے کہا: میں نے اسی طرح کیا۔ اس نے کہا: جب ہم نے شام کی تو کسی گھر والے یا کسی انسان نے ہمارے لیے وہ ہدیہ بھیجا جو وہ بھیجا کرتا تھا، یعنی بکری کا بھنا ہوا گوشت جسے روٹیوں میں لپیٹا گیا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بلایا فرمایا: اس سے کھاؤ یہ تیری اس روٹی سے بہتر ہے۔

ہمارے علماء نے کہا: یہ نفع مند مال میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑھنے والا فعل ہے، جتنا جاہتا ہے جلدی بدلہ دے دیتا ہے اور اس کے لیے آخرت میں جو ذخیرہ کیا ہوا ہے اس میں سے کوئی کمی نہیں کرتا۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے کسی چیز کو چھوڑتا ہے تو اس کو ناپید ہونے والا نہیں پاتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے اس فعل کی وجہ سے ان لوگوں میں شامل ہو گئی ہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی ہے کہ خود انہیں ایک چیز کی سخت ضرورت ہوتی ہے اس کے باوجود وہ دوسرے لوگوں پر اپنی ذات کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس نے یہ عمل کیا تو اس نے اپنے آپ کو نفس کے بخل سے بچالیا اور کامل کامیابی حاصل کر لی اس کے بعد اس کے لیے کوئی خسارہ نہیں۔

شاۃ و کَفَنَھا کا معنی ہے تمام عرب، بعض عرب یا ان میں سے بعض رؤساء کا یہ کھانا ہوا کرتا تھا۔ وہ بکری یا بکرے کے بچہ کی جلد جب اتار لیتے تو گندم کا آٹا اس پر مل دیتے اور کوئی حصہ خالی نہ چھوڑتے۔ پھر اسے تنور میں لٹکا دیتے اس کی چربی اسی آٹے میں ہی رہتی۔ یہ ان کے نزدیک سب سے عمدہ کھانا شمار ہوتا تھا۔

امام نسائی نے حضرت نافع سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیمار ہوئے اور انگور کی خواہش کی۔ ایک درہم میں ان کے لئے انگور کا گچھا خریدا گیا۔ ایک مسکین آیا اس نے سوال کیا۔ فرمایا: گچھا اسے دے دو۔ ایک آدمی اس کے پیچھے گیا اس نے وہ انگور کا گچھا اس سے ایک درہم میں خریدا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں لایا۔ سائل نے ارادہ کیا کہ وہ لوٹے تو اسے روک دیا گیا۔ اگر حضرت ابن عمر کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ یہ وہی گچھا ہے تو اسے نہ کھاتے کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو آپ اس کی طرف نہ لوٹتے۔

حضرت عبد اللہ ابن مبارک نے ذکر کیا کہ محمد بن مطرف، ابو حازم سے وہ عبد الرحمن بن سعید بن یربوع سے وہ مالک الدار سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار لیے انہیں ایک تھیلی میں رکھا پھر غلام سے کہا: یہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح کے پاس لے جاؤ، پھر کسی بہانے سے وہاں ٹھہر جانا تا کہ دیکھو آپ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ غلام وہ تھیلی لے کر وہاں گیا۔ عرض کی: حضرت امیر المومنین کہتے ہیں انہیں اپنی ضرورت کے لئے خرچ کرو۔ حضرت ابو عبیدہ نے کہا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر رحم کرے پھر فرمایا: اے بچی! یہ سات دینار فلاں کو دے آؤ اور یہ پانچ فلاں کو دے آؤ یہاں تک کہ انہیں خرچ کر دیا۔ غلام حضرت عمر کے پاس واپس آیا تو سب واقعہ عرض کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پایا کہ آپ نے

اسی کی مثل دینار حضرت معاذ کے لئے شمار کر رکھے ہیں۔ فرمایا: یہ دینار حضرت معاذ بن جبل کے پاس لے جاؤ اور وہاں بہانے سے کچھ دیر ٹھہرنا تاکہ دیکھو کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ غلام وہ مال لے کر ان کے پاس گیا۔ عرض کی: امیر المومنین فرماتے ہیں انہیں اپنی کسی ضرورت میں خرچ کرو۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا: اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ فرمایا: اے بچی! اتنے فلاں کے گھر لے جاؤ، اتنے فلاں کے گھر لے جاؤ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بیوی کو اس کی اطلاع ہوئی عرض کی اللہ کی قسم! ہم مساکین ہیں ہمیں بھی کچھ دو اس تھیلی میں صرف دو دینار باقی تھے وہ دونوں آپ نے اسے دے دیے غلام حضرت عمر کی طرف واپس لوٹا اور سب واقعہ بتایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وجہ سے خوش ہوئے۔ فرمایا: وہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اس کی مثل واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ کا بھی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں مال بھیجا جس کی تعداد دس ہزار دینار تھی حضرت منکدر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے......

اگر یہ سوال کیا جائے: انسان جتنے مال کا مالک ہو تمام مال صدقہ کرنے سے نہی وارد ہوئی ہے اور اس کے بارے میں صحیح احادیث ہیں۔ اس کی خدمت میں عرض کی جائے گی: یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جسے فقر کے عالم میں صبر پر اعتماد نہ ہو اور جب ضروریات کے لیے مال نہ پائے تو سوال کرنے کا خوف ہو۔ جہاں تک انصار کا تعلق ہے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے کی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنی ذاتوں پر ترجیح دیتے ہیں تو وہ اس صفت کے حامل نہیں بلکہ وہ اس طرح ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (البقرہ: 177) ان کے بارے میں ایثار مال روکنے سے بہتر ہے اور جو آدمی صبر نہ کرے اور سوال کے لیے ہاتھ پھیلائے تو اس کے لیے ایثار کی بجائے مال روک لینا افضل ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے: ایک آدمی ایک انڈے کے برابر سونا لے کر حاضر ہوا۔ عرض کی: یہ صدقہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینکا فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک وہ تمام مال لے آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے، اسے صدقہ کرتا ہے پھر لوگوں سے سوال کرنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے''(1)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ ذات کی قربانی مال کی قربانی سے بڑھ کر ہے اگرچہ وہ آخر کار نفس کی طرف ہی لوٹ آئے مشہور و معروف ضرب الامثال میں سے یہ ہے: والجودُ بالنفس أقصى غاية الجودِ ذات کی سخاوت سب سے بڑی سخاوت ہے۔ محبت کی تعریف میں صوفیاء کی عمدہ عبارات ہیں وہ یہ کہ یہ بھی ایثار ہے کیا تم نہیں دیکھتے جب عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اپنی قربت پر آپ کو ترجیح دی کہا: أنا راودته عن نفسه میں نے اسے اپنے بارے میں بہلانا چاہا۔ اپنی ذات کی سخاوت میں سے سب سے افضل سخاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سخاوت ہے۔

حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے غزوہ (احد) کے موقع پر اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھال بنایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جھانکتے تھے تاکہ قوم کو دیکھیں تو حضرت ابوطلحہ عرض کرتے: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم نہ جھانکیے کہیں وہ آپ کو تیر ہی نہ ماردیں میری گردن حاضر ہے نہ کہ آپ کی گردن، تیر مجھے لگے نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب عطیۃ من سأل بأنه، حدیث نمبر 1425-1427، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا تو ان کا ہاتھ شل ہو گیا۔

حضرت حذیفہ عدوی نے کہا: میں جنگ یرموک کے موقع پر اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا، میرے پاس کچھ پانی تھا۔ میں کہہ رہا تھا: اگر اس میں زندگی کی رمق ہوئی تو میں اسے پانی پلاؤں گا، اچانک میں اس کے پاس تھا۔ میں نے کہا: میں تجھے پانی پلاؤں؟ اس نے سر سے اشارہ کیا: ہاں، تو اچانک میں ایک ایسے آدمی کو پاتا ہوں جو آہ آہ کہہ رہا ہے۔ میرے چچازاد بھائی نے میری طرف اشارہ کیا کہ اس کی طرف جاؤ (میں اس کی طرف گیا) تو وہ فوت ہو چکا تھا میں واپس ہشام کی طرف آیا تو وہ بھی فوت ہو چکا تھا، میں اپنے چچازاد بھائی کی طرف لوٹا تو وہ بھی فوت ہو چکا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: مجھ پر کبھی کوئی آدمی اس طرح غالب نہیں آیا جس طرح بلخ کا ایک نوجوان مجھ پر غالب آیا۔ وہ حج کے ارادہ سے ہمارے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: اے ابا یزید! تمہارے نزدیک زہد کی کیا تعریف ہے؟ میں نے کہا: اگر ہم کوئی چیز پاتے ہیں تو کھا لیتے ہیں اور اگر نہیں پاتے تو صبر کرتے ہیں۔ اس نے کہا: ہمارے ہاں بلخ کے کتوں کی یہی صورتحال ہے۔ میں نے پوچھا: تمہارے نزدیک زہد کی کیا تعریف ہے؟ اس نے کہا: اگر ہم نہ پائیں تو شکر کرتے ہیں اور اگر ہم کوئی چیز پائیں تو دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں (1)۔ حضرت ذوالنون مصری سے پوچھا گیا: وہ زاہد جسے انشراح صدر حاصل ہوتا ہے اس کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا: تین چیزیں، جمع شدہ چیز کو تقسیم کر دینا، مفقود چیز کی طلب کو ترک کرنا اور روزی کے حصول کے وقت دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا۔ ابوالحسن انطاکی سے مروی ہے: رے کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات میں ان کے پاس تیس سے زائد آدمی جمع ہو گئے۔ ان کے پاس چند روٹیاں تھیں جو سب کو سیر نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کیے، چراغ کو گل کر دیا اور کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ جب کھانے کو اٹھایا گیا تو کھانا اسی طرح تھا۔ اس کھانے میں سے کسی نے بھی کوئی چیز نہ کھائی تھی، مقصد دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا تھا۔

**مسئلہ نمبر 10۔ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔** خَصَاصَةٌ سے مراد ایسی حالت ہے جس کی وجہ سے اموال میں خلل واقع ہو جائے۔ اس کی اصل اختصاص ہے اس سے مراد کسی امر کے لیے خاص ہونا۔ خَصَاصَةٌ کا معنی ہوا حاجت میں منفرد ہونا یعنی اگرچہ انہیں فاقہ اور حاجت لاحق ہو؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

أما الربيع إذا تكون خصاصة

جہاں تک ربیع کا تعلق ہے جب اسے حاجت لاحق ہوتی ہے۔

**وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝** شح اور بخل دونوں برابر ہیں، رجل شحیح جس کا بخل واضح ہو اس کے لیے شُح، شح اور شحاحہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے: عمرو بن کلثوم نے کہا:

ترى اللحز الشحيح توانتہائی بخیل کو دیکھے گا۔

بعض اہل لغت نے شح کو بخل سے بھی زیادہ شدید قرار دیا ہے۔ صحاح میں ہے: شح سے مراد بخل کے ساتھ حرص مراد

1۔ المحرر الوجیز

ہے۔ تو کہتا ہے: شَحِحْتَ، تَشَحُّ، شَحَحْتَ، تَشُحُّ، تَشِحُّ، رَجُلٌ شَحِيحٌ، قومٌ شِحاح، قوم أشِحّة۔

آیت سے مراد ہے زکوٰۃ میں بخل کرنا اور ذوی الارحام کے ساتھ صلہ رحمی اور ضیافت وغیرہ جو فرض نہیں ان میں بخل کرنا۔ جو آدمی ان مصارف پر مال خرچ کرے اور اپنے لیے بھی کچھ روک لے تو وہ شحیح اور بخیل نہیں اور جو آدمی اپنی ذات پر زیادہ خرچ کرے اور ہم نے زکوٰۃ اور طاعات میں سے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں خرچ نہ کرے تو اس نے اپنے آپ کو بخل سے نہیں بچایا۔

اسود نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: مجھے خوف ہے کہ میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ پوچھا: کیا بات ہے؟

اس نے عرض کی: میں نے اللہ تعالیٰ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں ایک بخیل آدمی ہوں، میں اپنے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں نکالتا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ وہ شح نہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کیا ہے۔ بے شک وہ شح جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا مال ظلماً کھائے، لیکن جس چیز کا تو نے ذکر کیا ہے وہ بخل ہے اور بخل بھی کتنی بری چیز ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے شح اور بخل میں فرق کیا ہے؟ طاؤس نے کہا: بخل سے مراد یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں جو کچھ ہے اس میں بخل کرے اور شح یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں جو ہے اس کے بارے میں کنجوسی کرے۔ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے حلال وحرام کے طریقہ سے حاصل کرے، وہ اس میں قناعت نہیں کرتا۔

ابن جبیر نے کہا: شح سے مراد زکوٰۃ روک لینا اور حرام چیز کو ذخیرہ کرنا۔ ابن عیینہ نے کہا: شح سے مراد ظلم ہے۔ لیث نے کہا: فرائض کو ترک کرنا اور حرام کردہ چیزوں کو اپنانا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو اپنی خواہش کی اتباع کرے اور ایمان کو قبول نہ کرے وہ شحیح ہے۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے منع کیا ہو وہ نہ لے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس چیز کا حکم دیا ہے شح اسے اس چیز سے نہ روک سکے تو اللہ تعالیٰ نے اسے شح سے بچا لیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بَرِئَ من الشُحّ من أدّى الزكاة و قَرَى الضيف وأعطى في النائبة وہ آدمی جس نے زکوٰۃ دی، مہمان کی ضیافت کی اور مصیبت کے وقت کسی کو مال دیا تو وہ شح سے بری ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے۔ اللّٰهمّ أن اعوذبك من شحّ نفسى واسرافها و وساوسها۔ اے اللہ! میں اپنے نفس کے شح، اس کے اسراف اور اس کے وساوس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ابو الہیاج اسدی نے کہا: میں نے طواف میں ایک آدمی کو یہ دعا کرتے ہوئے دیکھا: اے اللہ! مجھے میرے نفس کے شح سے بچا۔ وہ اس سے زیادہ کوئی دعا نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا: جب میں نے اپنے نفس کو شح سے بچا لیا تو میں چوری نہیں کروں گا، بدکاری نہیں کروں گا اور اس جیسا کوئی فعل نہیں کروں گا۔ کیا دیکھتا ہوں وہ حضرت عبدالرحمن بن عوف ہیں۔

میں کہتا ہوں اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: اتقوا الظلم فإنّ الظُّلم ظلمات يوم قيامة واتّقوا الشحّ

فإن الشح أهلك من كان قبلكم حملكم على أن سفكوا دماءهم واستحلوا محارمهم ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے روز ظلم تاریکیاں ہوں گے، شح سے بچو کیونکہ شح نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو تم سے پہلے تھے اس نے لوگوں کو برانگیختہ کیا کہ وہ اپنے خونوں کو بہائیں اور اپنی محارم کو حلال جانیں۔ ہم نے اس کی وضاحت سورۂ آل عمران کے آخر میں کی ہے۔ کسری نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: انسان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: فقر و تنگدستی۔ کسری نے کہا: شح فقر سے زیادہ نقصان دینے والی ہے کیونکہ فقیر جب کوئی چیز پاتا ہے تو سیر ہو جاتا ہے اور شحیح جب پاتا ہے تو کبھی بھی سیر نہیں ہوتا۔

وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۠

”اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے اور نہ پیدا کر ہمارے دلوں میں بغض اہل ایمان کے لیے اے ہمارے رب! بے شک تو رؤف رحیم ہے“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مراد تابعین اور قیامت تک اسلام میں داخل ہونے والے ہیں۔ ابن ابی لیلی نے کہا: لوگوں کے تین درجے ہیں (۱) مہاجرین (۲) انصار جن کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ۔ (۳) بعد کے مومنین جو قیامت تک آئیں گے جن کا ذکر وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کے ساتھ کیا گیا ہے، اس لیے کوشش کرو کہ ان سے باہر نہ نکلو۔ کسی نے کہا: سورج بنو، اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو چاند بنو، اگر یہ بھی طاقت نہیں رکھتے تو روشن ستارہ بنو۔ اگر تم یہ بھی طاقت نہیں رکھتے تو چھوٹا ستارہ بن جاؤ اور نور کی جہت ختم نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا معنی ہے مہاجر ہی بن جاؤ۔ اگر تو کہے: میں تو ایسا موقع نہیں پاتا تو انصاری بن جاؤ اگر تم یہ بھی نہ پاؤ تو ان کے اعمال جیسے اعمال کرو، اگر یہ بھی طاقت نہ رکھو تو ان سے محبت کرو اور ان کے حق میں بخشش طلب کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم دیا ہے۔

حضرت مصعب بن سعد نے کہا: لوگوں کی تین منازل ہیں دو منزلیں گزر چکی ہیں اور ایک منزل باقی ہے جس پر تم ہو اس میں بہترین یہ ہے کہ جو منزل باقی ہے تم اسی منزل پر رہو۔

جعفر بن محمد بن علی اپنے باپ سے وہ اپنے دادا حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اس نے عرض کیا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے! آپ حضرت عثمان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ نے اسے فرمایا: اے بھائی! تو اس قوم سے تعلق رکھتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ اس نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: اگر تو اس آیت کا مصداق نہیں تو ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ اس نے عرض کی: نہیں، فرمایا: اللہ کی قسم! اگر تو تیسری آیت کا مصداق بھی نہ بنے تو تم اسلام سے خارج ہو جاؤ گے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا

الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ عراق کے چند لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سب وشتم کیا پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھی برا بھلا کہا اور حد سے تجاوز کیا۔ آپ نے انہیں فرمایا: کیا تم مہاجرین اولین میں سے ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، پوچھا: کیا تم انصار میں سے ہو جنہوں نے دار ہجرت کو پہلے ہی ٹھکانہ بنایا ہوا تھا، انہوں نے کہا: نہیں، فرمایا: تم ان دونوں جماعتوں سے نہ ہونے کا اعلان کر چکے ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے بھی نہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے: وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۝ اٹھ جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل ورسوا کرے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت صحابہ کرام کی محبت کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ ان کے بعد جو لوگ بھی ہونگے مال فئی میں ان کا حصہ اس صورت میں ہے جب تک وہ لوگ صحابہ کی محبت، ان کی حمایت اور بخشش طلب کرنے پر قائم رہیں گے جس نے ان سب کو گالیاں دیں یا ان میں سے ایک کو گالیاں دیں یا ان میں کسی شر کا اعتقاد رکھا تو مال فئی میں ان کا کوئی حق نہیں؛ یہی چیز امام مالک اور دوسرے علماء سے بھی مروی ہے۔ امام مالک نے کہا: جو آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی سے بھی بغض رکھتا ہے یا اس کے دل میں ان کے بارے میں کوئی کینہ ہے تو مسلمانوں کے مال فئی میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں، پھر اس آیت کی تلاوت کی (2)۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علماء کے اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ منقولہ اموال کو تقسیم کر دیا جائے اور جائیداد اور زمین کو تمام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے باقی رکھا جائے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا مگر یہ کہ والی اجتہاد کرے، وہ امر نافذ کرے اور اس کا عمل اس میں جاری وساری ہو جائے کیونکہ لوگوں کا اس میں اختلاف تھا یہ آیت اس بارے میں فیصلہ کرنیوالی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فئی کے بارے میں خبر دی اور اسے تین طائفوں کے لیے بنایا، مہاجرین، انصار یہ تو معلوم ومشہور ہیں، وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ یہ آیت تابعین اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے عام ہے۔

حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان کی طرف تشریف لے گئے، فرمایا: السلام علیکم دار قوم مؤمنین و انا ان شاء اللہ بکم لاحقون وددت أن رأیت إخواننا، اے مومن قوم کے گھر (والو!) تم پر سلام ہو ہم ان شاء اللہ تمہیں لاحق ہونے والے ہیں میں پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ فرمایا: بلکہ تم میرے صحابہ ہو ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے میں حوض پر پہلے جا کر ان کا انتظام کرنے والا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ ان کے بھائی وہ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے (3)۔ بات اس طرح نہیں جس طرح

1۔ المحرر الوجیز 2۔ احکام القرآن لابن العربی 3۔ ایضاً

سدی اور کلبی نے کہی کہ جنہوں نے اس کے بعد ہجرت کی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے مراد ہے جس نے ہجرت کے ختم ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ کا قصد کیا اور مدینہ آیا۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ يَقُوْلُوْنَ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ اس میں دو وجوہ ہیں۔ ا: انہیں حکم دیا گیا کہ اہل کتاب میں سے جو جو مومن اس امت سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے لیے بخشش طلب کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: انہیں حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ ان کے لیے بخشش کے طلب گار ہوں تو انہوں نے ان کو گالیاں دیں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مہاجرین و انصار میں سے اولون ساتھیوں کے لیے بخشش طلب کریں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے صحابہ کے لیے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ انہیں آزمائش میں ڈالا جائیگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تمہیں تو یہ حکم دیا گیا کہ تم حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کے لیے بخشش طلب کرو تو تم نے انہیں گالیاں دیں۔ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''یہ امت ہلاک نہیں ہوگی یہاں تک کہ اس کے بعد والا پہلے والے کو لعنت کرے گا''۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں تو کہو: اللہ تعالیٰ تم میں سے سب سے شریر پر لعنت کرے''۔ عوام بن حوشب نے کہا: میں نے اس امت کے متقدمین کو پایا وہ کہتے: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے محاسن بیان کرو تا کہ تمہارے دل ان سے محبت کرنے لگیں اور ان کے درمیان جو تنازعات پیدا ہوئے ان کا ذکر نہ کرو کہ تم لوگوں کو بھی ایسی باتیں کرنے پر جری بنا دو گے۔ شعبی نے کہا: یہ یہودی اور نصاری، رافضیوں پر ایک خصلت میں فضیلت رکھتے ہیں۔ یہودیوں سے پوچھا جائے: تمہاری ملت میں سے سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ وہ کہتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ۔ نصاری سے پوچھا جائے: تمہاری ملت میں سے سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ وہ جواب دیں گے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ۔ رافضیوں سے پوچھا جائے: تمہاری ملت میں سے سب سے برے کون ہیں؟ وہ کہیں گے: حضرت محمد ﷺ کے صحابہ۔ لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان کے لیے استغفار کریں تو رافضیوں نے انہیں برا بھلا کہا۔ قیامت تک ان پر تلوار سونتی جاتی رہے گی نہ ان کے لیے جھنڈا قائم ہوگا اور نہ ان کے قدم ثابت ہوں گے اور نہ ان کی جمعیت اکٹھی ہو گی۔ جب وہ جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ ان کے خون بہانے اور ان کی حجت کو پست کرنے کے ساتھ اسے بجھا دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں گمراہ کن خواہشات سے محفوظ رکھے۔ غل سے مراد کینہ اور حسد ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَ لَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

''کیا آپ نے منافقوں کی طرف نہیں دیکھا جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں سے جنہوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے کہ اگر تمہیں (یہاں سے) نکالا گیا تو ہم بھی ضرور تمہارے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے اور ہم تمہارے

بارے میں کسی کی بات ہرگز نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے، اور الله گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں''۔

منافقوں نے یہودیوں کے ساتھ مدد کا جو وعدہ کیا اس سے یہودیوں کے دھوکہ کھانے پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ منافق نہ کسی دین پر اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی کتاب پر اعتقاد رکھتے ہیں ان منافقین میں سے عبدالله بن ابی سلول، عبدالله بن نبتل اور رفاعہ بن زید تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رافعہ بن تابوت اور اوس بن قیظی تھے۔ وہ انصار میں سے تھے لیکن انہوں نے منافقت کی اور بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے کہا: لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قول بنو نضیر نے بنو قریظہ سے کیا تھا۔ اور وَ لَا نُطِیْعُ فِیْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا میں احد سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے یعنی ہم تمہارے ساتھ جنگ کرنے میں اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔ اس میں علم غیب کی جہت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت پر دلیل موجود ہے کیونکہ یہودیوں کو نکالا گیا اور منافقین نہ نکلے ان کے ساتھ جنگ کی گئی اور منافقین نے ان کی مدد نہ کی۔ جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ الله تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے قول و فعل میں جھوٹے ہیں۔

لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَ لَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَ لَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''(سن لو) اگر یہودیوں کو نکالا گیا تو یہ نہیں نکلیں گے ان کے ساتھ اور اگر ان کے ساتھ جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر (جی کڑا کر کے) انہوں نے ان کی مدد کی تو یقیناً پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی''۔

یعنی وہ شکست کھا کر پیٹھ پھیر جائیں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ خوشی خوشی ان کی مدد نہ کریں گے۔ اگر وہ مجبوراً مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کی ہمیشہ مدد نہیں کریں گے۔ یہ تعبیر اس وقت ہوگی جب دونوں ضمیروں کا مصداق ایک ہو۔ اگر مصداق مختلف ہو تو اس کا معنی ہے اگر یہودیوں نے منافقین کی مدد کی تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ الله تعالیٰ کے علم میں تھا اگر یہودیوں کو نکالا گیا تو منافق ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ وَ لَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ اور الله تعالیٰ کے علم میں یہ بھی تھا کہ اگر ان سے قتال کیا گیا ہے تو منافق ان کی مدد نہ کریں گے۔ پھر فرمایا: لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ تو یہ گفتگو اس انداز میں ہے جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام:28) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی یہ ہے وَ لَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ یعنی اگر ہم چاہیں کہ وہ ان کی مدد کریں تو یہ امر ہم ان کے لیے مزین کر دیں گے لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ۔

لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اے فرزندان اسلام! ان (یہودیوں) کے دلوں میں الله تعالیٰ سے زیادہ تمہارا ڈر ہے، یہ اس لیے کہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں''۔

لَاَنْتُمْ یعنی اے مسلمانوں کی جماعت! اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ تم بنونضیر کے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی نسبت زیادہ ہیبت والے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منافقین کے سینوں میں تم زیادہ ہیبت والے ہو۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ ھم ضمیر دونوں جماعتوں کے لیے ہو یعنی یہ دونوں طبقات اللہ تعالیٰ کی نسبت تم سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ۝ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کی قدر نہیں سمجھتے۔

لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ۝

"(یہ بڑے بزدل ہیں) کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تم سے جنگ نہیں کریں گے جنگ کریں گے تو قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ لے کر ان کا اختلاف آپس میں بہت سخت ہے تم انہیں متحد خیال کرتے ہو حالانکہ ان کے دل متفرق ہیں یہ اس لیے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔

لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا واؤ ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔ اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ وہ دیواروں اور گھروں کی اوٹوں میں رہتے ہوئے تم سے جنگ کریں گے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں انہیں تم سے محفوظ رکھیں گی۔ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ یا دیواروں کے پیچھے سے وہ بزدلی اور خوف کی وجہ سے ان کے پیچھے چھپے ہیں۔ عام قراءت جُدُرٍ ہے جو جمع کا صیغہ ہے؛ یہ ابو عبیدہ اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ کی طرح ہے۔ اور قری جمع کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابن کثیر، ابن محیصن اور ابو عمرو نے جدار واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ مکہ کے ایک قاری نے اسے جدر پڑھا ہے یہ بھی جدار میں ایک لغت ہے یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو وہ اپنے باغوں اور درختوں کی اوٹ سے لڑیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اجدر النخل جب موسم بہار میں کھجور کی کونپلیں پھوٹیں جدر سے مراد بوٹی ہے اس کی واحد جدرۃ ہے اسے جدر پڑھا گیا ہے۔ جو جدار کی جمع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کے واحد میں الف اس طرح ہو جس طرح کتاب میں الف ہے اور جمع میں الف اس طرح ہے جس طرح ظراف میں الف ہے۔ اس کی نقل ناقة هَجانٌ ونُوقٌ هِجانٌ ہے کیونکہ تثنیہ میں هجانان ہے پھر واحد اور جمع کا لفظ لفظاً ایک دوسرے کے مشابہ اور معنی میں مختلف ہیں؛ یہ ابن جنی نے قول کیا ہے۔

بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ یعنی ان کی ایک دوسرے کے حق میں عداوت شدید ہے۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے وہ سخت گفتگو کرتے ہیں اور یوں دھمکیاں دیتے ہیں: لنفعلن کذا سدی نے کہا: مراد ان کے دلوں کا اختلاف ہے وہ ایک امر پر متفق نہیں ہوتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب دشمن سے ملاقات نہیں ہوتی تو وہ اپنے آپ کو شدت اور باس کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن جب دشمن سے ملاقات ہوتی تو شکست کھا جاتے ہیں۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى مراد یہود و منافقین ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ مراد منافقین ہیں۔ ثوری نے کہا: مراد مشرک اور اہل کتاب ہیں۔ قتادہ نے کہا: تم ان کے بارے میں گمان کرو گے کہ وہ ایک امر اور رائے پر مجتمع ہیں جبکہ ان کے دل مختلف ہیں۔ اہل باطل کی آراء مختلف ہیں ان کی شہادتیں مختلف ہیں، ان کی خواہشات مختلف ہیں اور

وہ اہل حق کی عداوت میں مجتمع ہیں۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: یہ ارادہ کیا کہ منافقین کا دین، یہودیوں کے دین کے خلاف ہے۔ یہ اس لیے واضح کیا تا کہ ان کے خلاف مومنوں کے دل قوی ہو جائیں؛ شاعر نے کہا:

ھی الیوم شتّٰی و ھی أمس جُمّع

وہ آج مختلف ہے اور وہ کل مجتمع تھی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وقلوبھم اشت ہے یعنی ان کے دل اختلاف میں بہت شدید ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ۝ ان میں یہ اختلاف اور کفر اس وجہ سے ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے، اس کی مدد سے اللہ تعالیٰ کے امر کو نہیں سمجھتے۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"یہ ان لوگوں کی مانند ہیں جو ان سے پہلے ابھی ابھی اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد بنو قینقاع ہیں۔ قتادہ نے کہا: مراد بنو نضیر ہیں (1)۔ بنو قریظہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان پر قدرت عطا فرمائی۔ مجاہد نے کہا: غزوہ بدر کے موقع پر قریش کے کفار مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ہر اس قوم کے بارے میں ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بنو نضیر سے قبل اس کے کفر کی وجہ سے انتقام لیا۔ وبال کا معنی ان کے کفر کی جزا ہے۔ جس نے کہا: وہ بنو قریظہ ہیں تو اس نے وَبَالَ اَمْرِهِمْ کی تعبیر ان کے بارے میں حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر اپنے قلعوں سے نیچے آنا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ نے ان کے جنگجو افراد کو قتل کرنے اور ان کے بچوں کو قیدی بنا لینے کا حکم دیا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ جس نے کہا: مراد بنو نضیر ہیں اس نے کہا: وبال سے مراد ان کی جلاوطنی ہے، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے واقعہ کے درمیان دو سال کا عرصہ حائل تھا۔ غزوہ بدر کا واقعہ غزوہ بنو نضیر سے چھ ماہ پہلے ہوا تھا؛ اسی وجہ سے فرمایا: قَرِيْبًا ایک قوم کا کہنا ہے کہ بنو نضیر کا واقعہ غزوہ احد کے بعد ہوا تھا۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝

"منافقین اور یہود کی مثال شیطان کی سی ہے جو (پہلے) انسان کو کہتا ہے: انکار کر دے، اور جب وہ انکار کر دیتا ہے تو شیطان کہتا ہے: میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو رب العالمین ہے۔ پھر ان دونوں

1۔ تفسیر بغوی

(شیطان اور اس کے چیلے) کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے اس میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے اور یہی ظالموں کی جزا ہے''۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ یہ منافقوں اور یہودیوں کے لیے ضرب المثل ہے کہ وہ بے یارو مددگار چھوڑ دیتے ہیں اور مدد کے وعدہ کو پورا نہیں کرتے (1)۔ حرف عطف کو حذف کیا کمثل الشیطان نہیں کہا کیونکہ حرف عطف اکثر حذف ہوتا ہے جس طرح تو کہتا ہے: انت عاقل. انت کریم. انت عالم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ انسان جسے شیطان نے کہا تھا تو کفر کر وہ ایک راہب تھا اس کے ہاں ایک عورت چھوڑ دی گئی جس کو سایہ کا مرض تھا تا کہ وہ اس کے حق میں دعا کرے۔ شیطان نے اس راہب کے لیے اس عمل کو مزین کیا تو راہب نے اس عورت سے وطی کی تو وہ عورت حاملہ ہوگئی پھر شرمندگی سے بچنے کے لیے اس عورت کو قتل کر دیا۔ شیطان نے اس کی قوم کو اس عورت کی میت کی جگہ سے آگاہ کر دیا، وہ لوگ آئے انہوں نے راہب کو نیچے اتارا تا کہ اسے قتل کریں۔ شیطان اس راہب کے پاس آیا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اسے سجدہ کرے تو وہ لوگوں سے اسے بچالے گا۔ اس راہب نے اس کے سامنے سجدہ کیا تو شیطان نے اس سے براءت کا اظہار کر دیا اور اسے ان کے سپرد کر دیا''۔ اس روایت کو اسماعیل اور علی بن مدینی نے سفیان بن عیینہ سے وہ عمرو بن دینار سے وہ عروہ بن عامر سے وہ حضرت عبید بن رفاعہ زرقی سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں اس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور وہب بن منبہ نے تفصیلاً ذکر کیا ہے، الفاظ مختلف ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ راہب فترہ کے دور میں تھا جسے برصیصا کہتے۔ اس نے اپنی عبادت گاہ میں ستر سال تک عبادت کی اس عرصہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی یہاں تک کہ اس نے ابلیس کو بھی بے بس کر دیا۔ ابلیس نے سرکش شیاطین کو جمع کیا اس نے کہا: کیا میں تم میں سے ایک بھی ایسا نہیں پاتا جو برصیصا کے معاملہ میں مجھے کافی ہو؟ ابیض نے کہا: جو انبیاء کو آزمائش میں ڈالنے کی کوشش کرتا یہی وہ شیطان تھا جس نے جبریل امین کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی تا کہ وحی کی صورت میں وسوسہ اندازی کرے۔ حضرت جبریل امین حاضر ہو گئے اور دونوں کے درمیان آ گئے پھر اس شیطان کو ہاتھ سے دھکا دیا یہاں تک کہ وہ ہند کے دور دراز علاقہ میں جا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ (التکویر) میں اسی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ ابیض نے کہا: میں اس راہب کو تیری طرف سے کافی ہوں، وہ گیا راہبوں کا لباس پہنا، سر کے درمیان سے حلق کرایا یہاں تک کہ برصیصاء کی عبادت گاہ کے پاس آیا۔ ابیض نے برصیصاء کو ندا دی تو برصیصاء نے اس ابیض شیطان کو کوئی جواب نہ دیا وہ اپنی عبادت میں وقفہ نہیں کرتا تھا مگر دس دنوں میں سے ایک دن وقفہ کرتا اور دس دنوں میں سے ایک دن روزہ افطار کرتا۔ وہ دس دن، بیس دن اور اس سے زیادہ دن صوم وصال رکھتا۔ جب ابیض نے یہ دیکھا کہ وہ اسے کوئی جواب نہیں دے رہا تو وہ بھی برصیصاء کی عبادت گاہ کے نیچے والے حصہ میں عبادت کرنے لگا جس روز برصیصا نے نماز میں وقفہ کیا تو اس نے ابیض کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر عبادت کر رہا

1۔ تفسیر بغوی

ہے اور راہبوں کی بہت ہی اچھی حالت میں ایسا کر رہا ہے تو اس نے اس امر پر شرمندگی کا اظہار کیا کہ اس نے اسے اس وقت کوئی جواب نہ دیا تھا جب اس نے اسے بلایا تھا۔ برصیصاء نے پوچھا: تیرا کیا کام ہے؟ ابیض نے کہا: میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور تیرے ادب سے ادب سیکھنا چاہتا ہوں اور تیرے عمل سے اقتساب فیض کرنا چاہتا ہوں اور ہم اکٹھے عبادت کریں گے۔ برصیصاء نے کہا: میں تجھ سے اعراض کرنے والا ہوں۔ پھر اپنی عبادت کی طرف متوجہ ہو گیا اور ابیض بھی نماز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جب برصیصاء نے اس کی سخت محنت اور عبادت کو دیکھا تو پوچھا: تیرا کیا کام ہے؟ ابیض نے کہا: تو مجھے اجازت دے کہ میں تیرے پاس اوپر آ جاؤں۔ برصیصاء نے اسے اجازت دے دی۔ ابیض اس کے ساتھ ایک سال تک رہا۔ وہ چالیس دنوں میں صرف ایک روز افطار کیا کرتا تھا اور چالیس دنوں میں عبادت میں ایک دن وقفہ کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ اس عرصہ کو چالیس روز تک بڑھا دیتا۔ جب برصیصاء نے اس کی محنت کو دیکھا تو اسے اس کے مقابلہ میں اپنا عمل تھوڑا محسوس ہوا۔ پھر ابیض نے کہا: میرے پاس ایسی دعائیں ہیں اللہ تعالیٰ جن کے ذریعے بیمار، ابتلاء زدہ اور مجنون کو شفا عطا فرماتا ہے اور وہ دعائیں برصیصاء کو سکھا دیں۔ پھر ابلیس کے پاس آ گیا۔ اس سے کہا: اللہ کی قسم! میں نے اس آدمی کو ہلاک کر دیا ہے۔ پھر ایک آدمی سے آمنا سامنا ہوا، اس کا گلا دبایا پھر اس کے گھر والوں سے کہا جب کہ ان کے پاس ایک انسان کی شکل میں آیا: تمہارے ساتھی کو جنون کا مرض ہے کیا میں اس کا علاج کروں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: جنیہ پر میرا کوئی اختیار نہیں بلکہ تم اسے برصیصاء کے پاس لے جاؤ۔ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے جب اس کے واسطہ سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ عطا کر دیتا ہے اور جب اس کے واسطہ سے دعا کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ وہ دعا قبول کرتا ہے۔ لوگ برصیصاء کے پاس آئے تو شیطان اس آدمی کے پاس سے چلا گیا پھر ابیض لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کرتا اور برصیصاء کی طرف ان کی راہنمائی کرتا اور لوگ اس مصیبت سے نجات پا جاتے۔ پھر وہ بادشاہ کی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی تک جا پہنچا جس کے تین بھائی تھے ان کا باپ بادشاہ تھا، وہ خود مر گیا اور اپنے بھائی کو اپنا نائب بنایا ان کا چچا بنی اسرائیل میں بادشاہ تھا۔ ابیض نے اس بچی کو بڑی تکلیف دی اور اس کا گلہ دبایا پھر ایک معالج کی حیثیت سے ان کے پاس آیا تا کہ اس کا علاج کرے، پھر کہا: اس کا شیطان بہت ہی سرکش ہے وہ قابو آنے والا نہیں بلکہ اسے برصیصاء کی طرف لے جاؤ اور اس کے پاس چھوڑ آؤ۔ جب اس کا شیطان آئے گا، برصیصاء اس کے حق میں دعا کرے گا تو وہ لڑکی ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگوں نے کہا: برصیصاء ہماری اس بات کو تو قبول نہیں کرتا۔ ابیض نے کہا: اس کی عبادت گاہ کے قریب ایک اور مینارہ بنا دو۔ پھر اس میں اس بچی کو رکھ آؤ اور اسے کہہ آؤ: یہ تیرے پاس امانت ہے اس کا خیال رکھنا۔ لوگوں نے برصیصاء سے پوچھا: اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے اس طرح کی عبادت گاہ بنائی اور لڑکی کو وہاں ہی چھوڑ آئے۔ جب وہ اپنی عبادت سے فارغ ہوا اس نے اس لڑکی اور اس کے جمال کو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا وہ نیچے گر گیا۔ شیطان اس بچی کے پاس آیا اور اس کے گلے کو دبایا، اس نے عبادت میں وقفہ کیا، اس کے حق میں دعا کی تو شیطان اس کے پاس سے چلا گیا۔ پھر وہ نماز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شیطان اس کے پاس پھر آیا اور اس کا گلہ دبایا۔ شیطان اس کے ستر سے پردے کو ہٹاتا اور برصیصاء کے سامنے کرتا پھر برصیصا کے پاس

شیطان آیا اور کہا: تو ہلاک ہو، اس سے لطف اٹھا تو اس کی مثل کوئی عورت نہیں پائے گا، پھر توبہ کر لینا۔ شیطان لگا تار اس کے پاس آتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس لڑکی سے بدکاری کی وہ لڑکی حاملہ ہو گئی اور اس کا حمل ظاہر ہو گیا۔ شیطان نے اسے کہا: تو ہلاک ہو! تو تو رسوا ہو گیا۔ کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو اس کو قتل کرے پھر تو توبہ کر لے اور رسوا نہ ہو۔ اگر لوگ تیرے پاس آئیں اور تجھ سے سوال کریں تو کہہ دینا: اس کا شیطان اس کے پاس آیا تھا اور اسے لے گیا ہے۔ برصیصاء نے اسے قتل کر دیا اور رات کے وقت دفن کر دیا۔ شیطان نے اس لڑکی کے کپڑوں کی ایک جانب کو پکڑ لیا یہاں تک کہ مٹی میں سے باہر نکال دیا اور برصیصا اپنی عبادت گاہ کی طرف واپس لوٹ آیا۔ پھر شیطان خواب میں اس کے بھائیوں کے پاس آیا اور کہا: برصیصاء نے تمہاری بہن کے ساتھ یہ عمل کیا ہے پھر اسے قتل کیا اور فلاں فلاں پہاڑ میں اسے دفن کیا ہے۔ انہوں نے اس امر کو عجیب و غریب جانا۔ انہوں نے برصیصاء سے پوچھا: تو نے ہماری بہن کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: اس کا شیطان اسے لے گیا۔ انہوں نے برصیصا کی تصدیق کی اور واپس چلے گئے۔ شیطان پھر ان کے پاس نیند میں آیا، اس نے کہا: وہ تو فلاں فلاں جگہ مدفون ہے اور اس کی چادر کی ایک جانب مٹی سے باہر ہے۔ وہ لوگ اس جگہ گئے اور اسے اس طرح پایا۔ انہوں نے برصیصاء کی عبادت گاہ کو گرا دیا، اسے نیچے اتارا اور اس کا گلا دبا دیا اور اسے بادشاہ کے پاس لے آئے۔ برصیصاء نے اپنے خلاف اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ جب برصیصاء کو سولی پر لٹکایا گیا تو شیطان نے کہا: کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں اللہ کی قسم! کہا: میں وہی تیرا ساتھی ہوں جس نے تجھے دعائیں سکھائی تھیں۔ کہا: تو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرا، کیا تجھے حیا نہ آئی جبکہ تو بنی اسرائیل میں سے سب سے زیادہ عبادت گزار تھا۔ پھر تیرا عمل تجھے کافی نہ ہوا یہاں تک کہ تو نے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کر لیا اور اپنے خلاف اقرار کر لیا اور اپنے جیسے لوگوں کو بھی ذلیل و رسوا کر دیا۔ اگر تو اسی طرح مر گیا تو تیرے بعد تجھ جیسے افراد میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہو گا۔ برصیصا نے پوچھا: میں کیا کروں؟ اس نے کہا: تو میری ایک بات مان میں تمہیں ان سب سے نجات دلا دوں گا اور ان کی آنکھیں سلب کر لوں گا۔ برصیصا نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ ابلیس نے کہا: تو مجھے ایک سجدہ کر۔ اس نے کہا: میں ایسا کرتا ہوں۔ برصیصا نے اللہ تعالیٰ کی بجائے اسے سجدہ کیا۔ ابلیس نے کہا: اے برصیصا! میں نے تجھ سے اسی کا ارادہ کیا تیرا انجام یہ ہوا کہ تو نے اپنے رب کا انکار کر دیا، میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں (1)۔

وہب بن منبہ نے کہا: بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار تھا وہ اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ عبادت گزار تھا اس کے زمانہ میں تین بھائی تھے اور ان کی ایک بہن تھی۔ وہ نوجوان بچی تھی، اس کی کوئی اور بہن نہیں تھی۔ تینوں کو ایک فوجی مہم پر جانا پڑا وہ نہیں جانتے تھے کہ اپنی بہن کو کس کے پاس چھوڑ جائیں؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس کے پاس محفوظ رہے گی اور کس کے پاس سے اسے ضائع کر بیٹھیں گے؟ ان کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ وہ اسے بنی اسرائیل کے ایک عبادت گزار کے پاس چھوڑ جائیں انہیں اس پر اعتماد تھا وہ اس کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ وہ اپنی بہن کو اس کے پاس چھوڑ جائیں، وہ اس کی عبادت گاہ اور پناہ میں رہے گی یہاں تک کہ وہ جنگ سے واپس آ جائیں۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ان سے اور ان

1۔ تفسیر بغوی

کی بہن سے اللہ کی پناہ چاہی وہ لگا تار اس سے مطالبہ کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے ان کی بات مان لی۔ اس نے کہا: میری عبادت گاہ کے سامنے والے کمرے میں اسے ٹھہرا جاؤ۔ انہوں نے اسے اس کمرہ میں ٹھہرا دیا پھر وہ چلے گئے اور اسے وہاں چھوڑ دیا۔ وہ ایک زمانہ تک اس عبادت گزار کی پناہ گاہ میں رہی وہ اپنی عبادت گاہ سے اس کے لیے کھانا لاتا، اسے عبادت گاہ کے دروازہ پر رکھتا پھر دروازہ بند کر دیتا اور اپنی عبادت گاہ پر چلا جاتا، پھر اسے حکم دیتا وہ اپنے کمرے سے نکلتی تو اس کے لیے جو کھانا رکھا ہوتا اسے لے لیتی۔ شیطان نے اس کے ساتھ لطیف حیلہ کیا وہ اسے بھلائی کی رغبت دلاتا اور بچی کے لیے دن کے وقت گھر سے نکلنے کو بہت برا خیال کرتا اور اسے ڈراتا کہ کوئی اسے دیکھ ہی نہ لے اور اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ وہ ایک زمانہ تک اسی خیال میں رہا۔ پھر ابلیس اس کے پاس آیا، اسے بھلائی اور اجر میں رغبت دلائی اسے کہا: اگر تو خود اس کی طرف کھانا لے جائے یہاں تک کہ تو خود کھانا اس کے کمرے میں رکھ آئے تو یہ تیرے لیے بڑے اجر کا باعث ہو گا۔ وہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ کھانا اس کے کمرے تک لے گیا اور کھانا اس کے کمرے میں رکھ آیا۔ وہ کافی عرصہ سے یہی کام کرتا رہا پھر اس کے پاس ابلیس آیا، اسے بھلائی کی طرف رغبت دلائی اور اسے اس پر برانگیختہ کیا اور کہا: اگر تو اس کے ساتھ کلام کرتا اور وہ تیری گفتگو سے مانوس ہوتی کیونکہ اسے سخت تنہائی کا سامنا ہے۔ وہ اس طرح کرتا رہا وہ اپنی عبادت گاہ سے اس پر جھانکتا پھر ابلیس اس کے پاس آیا کاش! تو اس کی طرف اترتا تو اپنی عبادت گاہ کے دروازہ پر بیٹھتا اور تو اس سے بات کرتا اور وہ اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھتی تو یہ اس کے لیے زیادہ انس کا باعث ہوتا۔ وہ اس طرح باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ اسے نیچے اتارا اور اسے اپنی عبادت گاہ کے دروازہ پر لا بٹھایا وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا، وہ لڑکی اپنے کمرے سے نکلتی وہ طویل عرصہ تک اسی طرح باتیں کرتے رہے، پھر ابلیس اس کے پاس آیا، اسے خیر و ثواب کی رغبت دلائی جو وہ اس لڑکی کے ساتھ حسن عمل کر سکتا تھا اور کہا: اگر تو اپنی عبادت گاہ کے دروازہ سے نکلے اور اس لڑکی کے کمرہ کے دروازہ کے قریب بیٹھے تو وہ اس کے لیے زیادہ انس کا باعث ہوگا، وہ اسی طرح راغب کرتا رہا یہاں تک کہ اس عبادت گزار نے یہ عمل بھی کیا۔ وہ طویل عرصہ تک اسی طرح رہے۔ پھر ابلیس اس کے پاس آیا، اسے بھلائی کی رغبت دلائی اور جو وہ احسان اس لڑکی کے ساتھ کر رہا ہے اس کے حسن ثواب کا ذکر کیا اور اس سے کہا: اگر تو اس کے کمرے کے دروازے کے قریب چلا جائے اور وہ اپنے کمرے سے نہ نکلے۔ اس عبادت گزار نے اسی طرح کیا وہ اپنی عبادت گاہ سے نیچے اترتا اس کے کمرے کے دروازے پر بیٹھتا اور اس سے باتیں کرتا۔ وہ دونوں اسی حالت میں رہے اس کے پاس پھر ابلیس آیا کہا: اگر تو اس کے کمرے میں داخل ہو اور اس سے باتیں کرے اور وہ لڑکی کسی کے لیے بھی اپنا چہرہ ظاہر نہ کرے تو یہ تیرے لیے زیادہ بہتر ہے۔ وہ اسی طرح وسوسہ ڈالتا رہا یہاں تک کہ وہ گھر میں داخل ہو گیا، وہ سارا سارا دن اس سے باتیں کرتا رہا، جب شام ہوتی وہ اپنی عبادت گاہ میں چلا جاتا۔ پھر ابلیس اس کے پاس آیا وہ لگا تار اس لڑکی کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتا یہاں تک کہ عبادت گزار نے اس کی ران پر ہاتھ مارا اور اس کا بوسہ لیا۔ ابلیس لگا تار اسے مزین کر کے پیش کرتا رہا اور ورغلاتا رہا یہاں تک کہ اس عبادت گزار نے اس کے ساتھ بدکاری کی اور اس لڑکی کو حمل ہو گیا تو اس کا لڑکا پیدا ہو گیا۔ ابلیس اس کے پاس آیا اسے کہا: بتا اگر اس لڑکی کے بھائی

تیرے پاس آئے جبکہ اس لڑکی نے تجھ سے یہ بچہ جنا ہے تو تو کیا کرے گا؟ مجھے تو خوف ہے کہ تو رسوا ہو جائے گا۔ اس کے بیٹے کی طرف اٹھو اسے ذبح کر دو اور اسے دفن کر دو۔ یہ اپنے بھائیوں کے ڈر سے تیرا راز مخفی رکھے گی کہ جو کچھ تو نے اس کے ساتھ کیا ہے وہ اس پر مطلع ہوں۔ اس نے اسی طرح کیا، پھر اسے کہا: کیا تیرا خیال ہے کہ یہ اس راز کو اپنے بھائیوں سے مخفی رکھے گی جو تو نے اس کے ساتھ کیا اور اس کے بیٹے کو قتل کیا؟ اسے پکڑ لے اسے ذبح کر دے اور اس کے بیٹے کے ساتھ اسے بھی دفن کر دے۔ شیطان لگا تار اسے درغلاتا رہا یہاں تک کہ اسے بھی ذبح کر دیا اور اس کے بیٹے کے ساتھ اسے گڑھے میں پھینک دیا اور اس پر بہت بڑی چٹان ڈال دی اور اپنے گرجے میں عبادت کرنے لگا۔ وہ اس میں اس طرح رہا جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ رہے یہاں تک کہ اس کے بھائی جنگ سے واپس آئے وہ اس کے پاس آئے اور اس کے بارے میں سوال کیا۔ راہب نے اس کی خبر دی اور اس کے لیے دعا کی اور ان کے لیے رویا اور کہا: وہ بہت اچھی بچی تھی، یہ اس کی قبر ہے اسے دیکھ لو۔ بھائی قبر پر آئے اور اس کی قبر پر روئے اور اس کے لیے رحم کی دعا کی، چند روز اس کے قبر پر رہے پھر اپنے گھر چلے گئے۔ جب رات تاریک ہوگئی اور اپنے بستروں پر سوئے تو شیطان ان کے پاس ایک مسافر کی صورت میں آیا۔ ان میں سے بڑے سے ان کی بہن کے بارے میں پوچھا۔ اس نے عابد کے قول، اس کی موت اور دعا کے بارے میں بتایا اور جس طرح اس نے انہیں قبر دکھائی سب کا ذکر کیا۔ شیطان نے اسے جھٹلایا، کہا: اس نے تم سے تمہاری بہن کے بارے میں سچ نہیں بولا۔ اس نے تمہاری بہن کو حاملہ کیا اور اس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس نے بچے اور اس لڑکی کو ذبح کیا اور ایک گڑھے میں پھینک دیا جو اس نے اس دروازہ کے پیچھے بنایا تھا جو آدمی اس دروازہ سے داخل ہوتا ہے اس کی دائیں جانب یہ گڑھا ہے۔ تم چلو اور دروازے سے داخل ہو جاؤ وہ گڑھا اس آدمی کی دائیں جانب ہوگا جو آدمی اس میں داخل ہوتا ہے، میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے تم وہاں سب کچھ پالو گے۔ وہ درمیانے کو خواب میں آیا اور اسے اس طرح بتایا پھر سب سے چھوٹے کے پاس آیا اسے بھی اس کی مثل بتایا۔ جب وہ سارے اٹھے تو ان میں سے ہر ایک نے جو خواب دیکھا تھا اس پر متعجب ہوا وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا تھا: میں نے عجیب وغریب خواب دیکھا ہے اور ہر ایک نے جو خواب دیکھا تھا اس کا ذکر کیا۔ ان میں سے سب سے بڑے نے کہا: یہ خواب پریشان ہے یہ کوئی چیز نہیں چلو اور اس کو چھوڑ دو۔ ان میں سے سب سے چھوٹے نے کہا: میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اس جگہ کو نہ دیکھ لوں۔ وہ سب گئے یہاں تک کہ اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں ان کی بہن رہتی تھی انہوں نے دروازہ کھولا، انہوں نے اس جگہ کو کھودا جو خواب میں ان کے لیے بیان کی گئی تھی انہوں نے اپنی بہن اور اس کے بیٹے کو ذبح شدہ پایا وہ دونوں اس گڑھے میں تھے جس طرح ان کے لیے بیان کیا گیا تھا انہوں نے اس عبادت گزار سے پوچھا تو اس نے ابلیس کے قول کی تصدیق کر دی کہ اس نے ان دونوں کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا۔ انہوں نے اپنے حاکم سے اس عبادت گزار کے خلاف مدد طلب کی اسے اس کے گرجا سے اتارا گیا اور وہ اسے لے گئے تاکہ اسے سولی پر لٹکایا جائے۔ جب انہوں نے اسے سولی پر کھڑا کیا تو شیطان اس کے پاس آیا اور اسے کہا: تو جانتا ہے میں وہی تیرا ساتھی ہوں میں نے تجھے اس عورت کے بارے میں فتنہ میں ڈالا یہاں تک کہ تو نے

اسے حاملہ کر دیا، تو نے اس کو ذبح کیا اور اس کے بیٹے کو ذبح کیا اگر تو آج میری اطاعت کرے اور جس اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے اس کا انکار کر دے تو تو جس مصیبت میں ہے میں تجھے اس سے نجات عطا کر دوں گا۔ اس عبادت گزار نے اللہ تعالیٰ کا انکار کر دیا۔ جب اس نے کفر کر لیا تو شیطان اس کے اور اس کے ساتھیوں کے درمیان سے ہٹ گیا اور انہوں نے اسے سولی پر لٹکا دیا، کہا: اسی بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے منافقین کے یہودیوں کے ساتھ رویہ کی مثال بیان کی ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ بنو نضیر کو مدینہ طیبہ سے جلاوطن کرے گا منافقین نے انہیں پیغام بھیجا کہ تم اپنے گھروں سے نہ نکلو اگر وہ تمہارے ساتھ جنگ کریں گے تو ہم تمہارے ساتھ ہونگے اور اگر وہ تمہیں گھروں سے نکالیں گے تو ہم تمہارے ساتھ ہونگے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کی تو منافقوں نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ منافقوں نے ان سے یوں براءت کا اظہار کر دیا جس طرح شیطان نے برصیصا عابد سے براءت کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد راہب تقیہ اور خفیہ انداز کو اپناتے فاسقوں اور فاجروں نے راہبوں پر تہمتیں لگائیں یہاں تک کہ جریج راہب کا واقعہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے اسے بری کیا۔ اس کے بعد راہب پھیل گئے اور لوگوں کے لیے ظاہر ہوئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے (1): منافقوں کو بنو نضیر کے ساتھ دھوکہ کی مثال اس طرح ہے جس طرح ابلیس کی مثال ہے جب اس نے قریش کے کفار کو کہا۔ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (الانفال: 48) مجاہد نے کہا: یہاں انسان سے مراد تمام لوگ ہیں جن کو شیطان دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ کا معنی ہے یعنی اسے گمراہ کیا یہاں تک کہ اس انسان نے کہہ دیا کہ میں کافر ہوں شیطان کا قول اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ حقیقی معنی پر نہیں یہ صرف انسان سے براءت کے اظہار کے سلیقہ پر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ کی تاکید کے طریقہ پر ہے (2)۔ اِنِّيْ کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتحہ دیا ہے اور باقی نے اسے ساکن قرار دیا ہے۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَاۤ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا شیطان اور اس انسان کی عاقبت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے خَالِدَيْنِ حال ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔ جس نے آیت کو راہب اور شیطان میں خاص کیا ہے اس میں تو تثنیہ ظاہر ہے جس نے اسے جنس کے لیے بنایا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا دونوں فریقوں اور دونوں صنفوں کا انجام عَاقِبَتَهُمَاۤ کی نصب کان کی خبر ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ کان کا اسم اَنَّهُمَا فِي النَّارِ ہے۔ حضرت حسن بصری نے فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَاۤ رفع کے ساتھ پڑھا ہے تو یہ پہلے کی ضد ہے۔ اعمش نے خالدان فیہما رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کا رفع اس صورت میں ہوگا کہ یہ انکی خبر ہے اور ظرف لغو ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 27 2۔ ایضاً

''اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے کل کے لیے اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے، بے شک اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے جو تم کرتے ہو''۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ اس کے اوامر، نواہی، فرائض کی ادائیگی اور معاصی سے اجتناب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ غد سے مراد یوم قیامت ہے۔ عرب زمانہ مستقبل کو غد سے کنایۃً تعبیر کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ غد کا ذکر اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ قیامت قریب ہے؛ جس طرح شاعر نے کہا:

وان غدًا للناظرین قریب دیکھنے والوں کے لیے قیامت قریب ہے۔

حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: قیامت کو قریب کر دیا یہاں تک کہ اسے غد کی طرح بنا دیا (1)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر آنے والی چیز قریب ہے اور موت ہر صورت میں آنے والی ہے۔ مَّا قَدَّمَتْ سے مراد خیر اور شر ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس قول کو تکرار کے لیے دوبارہ ذکر کیا ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے: اعجل، اعجل، ارم، ارم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلا تقوی سابقہ گناہوں سے توبہ ہے اور دوسرے تقوی سے مراد زمانہ آئندہ میں معاصی سے بچنا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ سعید بن جبیر نے کہا: جو عمل تمہاری جانب سے ہوگا اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (2)۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''اور ان (نادانوں) کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے بھلا دیا اللہ تعالیٰ کو پس اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا یہی نافرمان لوگ ہیں''۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو ترک کر دیا (3) فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا آپ بھلا دیا کہ وہ اپنے لیے بھلائی کا عمل کرے؛ یہ ابن حبان کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حق بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نفوس کا حق بھلا دیا؛ یہ سفیان کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے اس کا شکر اور تعظیم ترک کر کے اس کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب دے کر بھلا دیا کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ذکر کریں؛ ابن عیسیٰ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ سہل بن عبد اللہ نے کہا: انہوں نے گناہوں کے وقت اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا اور توبہ کے وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں بھلا دیا۔ فَاَنْسٰىهُمْ میں اللہ تعالیٰ نے فعل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ یہ اس امر اور نہی کی وجہ سے تھا جس کو انہوں نے ترک کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا امر اور نہی کو ترک کرنے والا پایا۔ جس طرح تیرا یہ قول ہے: احمدت الرجل جب تو نے اسے تعریف کیا گیا پایا۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے خوشحالی میں اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے شدائد میں انہیں بھلا دیا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ابن جبیر نے کہا: مراد نافرمان ہیں۔ ابن زید نے کہا: وہ جھوٹے ہیں۔ فسق کا اصل معنی نکلنا ہے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گئے۔

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 510 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 511 3۔ ایضاً

''یکساں نہیں ہو سکتے دوزخی اور اہل جنت، اہل جنت ہی تو کامیاب لوگ ہیں''۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یعنی فضیلت اور رتبہ میں ایک جیسے نہیں۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ یعنی جنتی مقرب و مکرم ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ آگ سے نجات پانے والے ہیں۔ سورۂ مائدہ آیت 100 میں قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ۔ سورۂ سجدہ میں اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ اور سورۂ ص آیت 28 میں اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ کے ضمن میں کلام گزر چکی ہے۔ اس لیے اس کے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

''اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ دیکھتے کہ وہ جھک جاتا (اور) پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور و فکر کریں''۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا قرآن کے مواعظ میں غور و فکر کرنے پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے اور اس امر کو واضح کیا کہ ترک تدبر میں کوئی عذر نہیں کیونکہ اس قرآن کے ساتھ اگر پہاڑوں کو خطاب کیا جاتا جبکہ ان میں عقل بھی ہوتی تو پہاڑ بھی اس کے مواعظ کو سنتے اور آپ انہیں دیکھتے کہ وہ انتہائی مضبوط ہونے کے باوجود عاجزی کا اظہار کرتے اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے پھٹ جاتے۔ خاشع کا معنی ذلیل ہے اور متصدع کا معنی پھٹنے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خَاشِعًا کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے جن امور میں اپنی طاعت کا مکلف بنایا ہے ان میں اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع کرنے والے ہیں۔ مُّتَصَدِّعًا وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے پھٹنے والے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کفار کے لیے مثال کے طریقہ پر ہے۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ یعنی اللہ تعالیٰ اگر اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتا تو وہ پہاڑ اس کے وعدہ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا اور اس کی وعید کے سامنے پھٹ جاتا (1)۔ اے لوگو! جو اس کے اعجاز کے سامنے مغلوب ہو تم اس کے وعدے میں رغبت نہیں رکھتے اور اس کی وعید سے نہیں ڈرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا: خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے (2)، یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ثابت نہ رہتا اور قرآن کے نازل ہونے سے پھٹ جاتا جبکہ ہم نے اسے آپ پر نازل کیا ہے اور ہم نے آپ کو اس کے لیے ثابت کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر احسان ہے کہ آپ اس چیز کے لیے ثابت رہے جس کے لیے پہاڑ ثابت نہیں رہتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خطاب امت کو ہے یعنی اللہ تعالیٰ اگر اس قرآن کے ذریعے پہاڑوں کو ڈراتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے پھٹ جاتے انسان قوت میں کم اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 512 2۔ ایضاً

ثابت قدمی میں بڑھ کر ہے اگر وہ طاقت رکھے تو وہ اس کے حق کو بجالاتا ہے اور اگر نافرمانی کرے تو اس کے اوپر قادر ہے کیونکہ اس کو ثواب کا وعدہ اور عقاب کی وعید دی گئی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾

''اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جاننے والا ہر چھپی ہوئی اور ظاہر چیز کا وہی بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ راز اور علانیہ امور کو جانتا ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ ماکان (جو کچھ ہو چکا) اور مایکون جو کچھ ہونے والا ہے اس کو جانتا ہے۔ سہل نے کہا: وہ آخرت اور دنیا کو جاننے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غیب سے مراد ہے جس کو لوگ نہ جانتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے اسے دیکھا ہوتا ہے اور شہادت سے مراد ہے جس کو لوگ جانتے ہیں اور جسے لوگوں نے دیکھا ہوتا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب کا بادشاہ، نہایت مقدس، سلامتی رکھنے والا، امان بخشنے والا، نگہبان، عزت والا، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والا، متکبر ہے، پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں''۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ ہر نقص سے منزہ اور ہر عیب سے پاک۔ قدس اہل حجاز کی لغت میں سطل (ایک برتن) کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے۔ اس سے قادوس ہے یہ لفظ اس برتن کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ساتھ کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے اور اونٹنی سے مدد لی جاتی ہے۔ سیبویہ کہا کرتے تھے: قدوس اور سبوح دونوں میں پہلا لفظ مفتوح ہے۔ اور ابو حاتم نے یعقوب سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کسائی کے نزدیک ایک فصیح بدو کو سنا جس کو ابودینار کہتے وہ پڑھ رہا تھا۔ القدوس یعنی قاف پر فتحہ پڑھ رہا تھا۔ ثعلب نے کہا: ہر اسم جو فعول کے وزن پر ہو اس کا پہلا حرف مفتوح ہوتا ہے جس طرح سَفود، کَلوب، تَنور، سَمور، سَبوط مگر السبوح اور القدوس کیونکہ ان دونوں میں اکثر ضمہ آتا ہے۔ بعض اوقات ان دونوں پر فتحہ آتا ہے؛ اسی طرح ذروح بعض اوقات اس کو فتحہ دیا جاتا ہے۔

السَّلٰمُ وہ نقائص سے سلامت ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء کا اتفاق ہے کہ لفظ السلام جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں بولا جائے تو یہ نسبت کے معنی میں ہوگا تقدیر ہوگی ذوالسلامۃ پھر اس اسم منسوب کے ترجمہ میں اختلاف ہے۔ وہ ہر عیب سے سلامت اور ہر نقص سے بری ہے۔ ذوالسلام جنت میں اپنے بندوں کو سلام کرنے والا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَلٰمٌ ۟ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ﴿۵۸﴾ (یٰسین) مخلوق اس کے ظلم سے محفوظ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ خطابی کا قول ہے اسے اور اس سے قبل جو اسم ہے اس پر صفات افعال کا اطلاق ہوگا۔ یہ تعبیر کی جائے وہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 512

عیوب ونقائص سے بری ہے تو یہ صفت ذات میں سے ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ السلام کا معنی ہے وہ اپنے بندوں کو سلام کرنے والا ہے۔ الْمُؤْمِنُ وہ اپنے رسولوں کی تصدیق کرنے والا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے معجزات کا ظہور فرماتا ہے۔ مومنوں سے ثواب کا جو وعدہ کیا اس کی تصدیق کرنے والا ہے اور کافرین کو جو عقاب کی دھمکی دی اس کو سچ کر دکھانے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مومن اسے کہتے ہیں جو اپنے اولیاء کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے اور اپنے بندوں کو ظلم سے محفوظ رکھتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: آمنہ یہ امان سے مشتق ہے جو خوف کی ضد ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (القریش) اس سے اسم فاعل مومن ہے۔

مجاہد نے کہا: مومن اسے کہتے ہیں جس نے اپنی وحدانیت کا اظہار اپنے اس ارشاد سے کیا: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران: 18) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب قیامت کا روز ہوگا اللہ تعالیٰ اہل توحید کو آگ سے نکالے گا، سب سے پہلے جہنم سے جو نکلے گا وہ وہ ہوگا جس کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے موافق ہوگا جب جہنم میں کوئی ایسا نہیں رہے گا جس کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو تو اللہ تعالیٰ باقی سے فرمائے گا: تم مسلمان ہو اور میں السلام ہوں تم مومنین ہو اور میں مومن ہوں تو اللہ تعالیٰ ان دو ناموں کی برکت سے انہیں جہنم سے باہر نکالے گا۔

الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ سورۂ مائدہ میں الْمُهَيْمِنُ، اور مواقع پر الْعَزِيْزُ کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ الْجَبَّارُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد عظیم ہے (1)۔ جبروت اللہ سے مراد اس کی عظمت ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ صفت ذات ہے۔ اس معنی میں ان کا قول ہے: نخلة جبارة کھجور کا بڑا درخت۔ یہ اسم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور تقدیس پر دلالت کرتا ہے کہ نقائص اور صفات حادث اس کو لاحق ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جبر سے ماخوذ ہے جس کا معنی اصلاح ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: جبرت العظم فجبر میں نے ہڈی کو درست کیا تو وہ ہڈی درست ہوگئی۔ یہ جبر سے فعال کے وزن پر ہے۔ جب وہ ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کردے اور فقیر کو غنی کردے۔ فراء نے کہا: یہ اجبرہ علی الامر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس پر غلبہ پالیا۔ کہا: لغت میں باب افعال سے فعال کا وزن نہیں آتا مگر جَبَّار یہ أجبر سے اور دَرَّاك یہ أدرك سے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبار اسے کہتے ہیں جس کی سطوت کی طاقت نہ رکھی جائے۔

الْمُتَكَبِّرُ وہ اپنی ربوبیت کی وجہ سے متکبر ہے، اس کی مثل کوئی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہر برائی سے بالا ہے اور ہر نامناسب چیز جیسے حادث اور مذمت کی صفات سے عظیم ہے (2)۔ کبر اور کبریاء کا اصل معنی رکنا اور اطاعت نہ کرنا ہے۔

کبریاء اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے صفات مدح میں شمار ہوتی ہے اور مخلوق کی صفات میں صفات مذمت میں سے ہے۔

صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا فرمان حدیث قدسی کی صورت میں بیان کیا ہے: الكبرياءُ رِدَائِي و العظمةُ إزاري فمن نازَعَنِي في واحد منهما قصمته ثم قذفته في النار (3) کبریائی میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے ان دونوں میں جس نے بھی مجھ سے منازعہ کیا میں اسے توڑ کر رکھ دوں گا پھر اسے آگ میں

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 356	2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 375	3۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 414

چھینک دوں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: متکبر کا معنی بلند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی کبیر ہے کیونکہ وہ اس سے عظیم ہے کہ وہ کبر کا تکلف کرے۔ بعض اوقات تظلم، ظلم کے معنی میں، تشتم، شتم کے معنی میں اور استقر، قر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح متکبر، کبیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس طرح نہیں جس طرح مخلوق کے لیے اس صیغہ کے ساتھ صفت بیان کی جاتی ہے کیونکہ جب کسی مخلوق کی اس صیغہ کے ساتھ صفت بیان کی جائے تو وہ اس میں نہیں پائی جاتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی پاکی بیان فرمائی فرمایا: **سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** اپنی عظمت اور جلالت کی پاکی بیان کی۔

**هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝**

''وہی سب کا خالق، سب کو پیدا کرنے والا، (سب کی مناسب) صورت بنانے والا ہے، سارے خوبصورت نام اسی کے ہیں، اس کی تسبیح کر رہے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہی عزت والا اور حکمت والا ہے''۔

**هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ** یہاں خالق سے مراد مقدر ہے۔ **الْبَارِئُ** سے مراد پیدا کرنے والا اور ایجاد کرنے والا ہے۔ **الْمُصَوِّرُ** صورتیں بنانے والا اور مختلف ہیئتوں میں ترکیب دینے والا۔ تصور، خلق اور برایۃ پر مرتب اور ان دونوں کے تابع ہے۔ تصویر کا معنی خط لگانا اور شکل بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی ماں کے رحم میں تین انداز میں پیدا کیا اسے علقہ بنایا، پھر مضغہ بنایا پھر اس کی صورت بنائی یہی تشکیل ہے جس کے ذریعے صورت اور ہیئت ہوتی ہے، جس کے ساتھ اس کی پہچان ہوتی ہے اور غیر سے اپنی علامت کے ساتھ ممتاز ہوتا ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين اللہ تعالیٰ کی ذات جو احسن الخالقین ہے وہ بڑی برکتوں والی ہے؛ نابغہ نے بھی انہیں اسماء کو اپنے شعر میں ذکر کیا ہے:

الخالق البارى المصور فى الأرحام　　ماء　حتى　يصير　دما (1)

بعض لوگوں نے خلق کو تصویر کے معنی میں کیا ہے جبکہ بات اس طرح نہیں تصویر آخری مرحلہ میں ہوتی ہے۔ تقدیر سب سے پہلے اور برایۃ یہ درمیان میں ہوتی ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ** (المائدہ: 110)

زہیر نے کہا:

ولأنت تفرى ما خلقت و بعض　　القوم　يخلق　ثم　لايفرى

شاعر کہتا ہے: تو اندازہ لگاتا ہے جو لگاتا ہے پھر اپنے اندازہ کے مطابق اسے کر گزرتا ہے۔ تیرے سوا آدمی اندازہ لگاتا ہے جو اس کے لیے مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں اس کی مراد پوری ہوتی ہے یا تو اس کے اندازہ کے تصور میں کوتاہی ہوتی ہے یا وہ اپنی مراد کو مکمل کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق تمام بحث الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں کر دی ہے۔ الحمد للہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 515

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ انہوں نے اَلْبَارِیُٔ الْمُصَوَّرُ پڑھا یعنی وہ ذات جو مختلف ہیئتوں کے ساتھ اس کو ممتاز کرتی ہے جس کی تصویر بناتی ہے (1)؛ زمخشری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اس کے بارے میں گفتگو پہلے (جلد اول) میں گزر چکی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے خلیل ابو القاسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ''اے ابو ہریرہ! سورۂ حشر کے آخری حصہ کو لازم پکڑو اس کو کثرت سے پڑھا کرو''۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں سوال دہرایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی کو مجھ پر دہرایا۔ میں نے پھر آپ کی خدمت میں عرض کی تو آپ نے پھر مجھ پر اسی قول کو دہرایا۔

حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم اس آیت کے مکان کی وجہ سے اللہ ہی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۂ حشر کو پڑھا اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیتا ہے'' (2)۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے رات یا دن کے وقت سورۂ حشر کے آخر کو پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے اس رات یا اس دن اس کی روح کو قبض کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کو واجب کر دیا'' (3)۔

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 510 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 1، صفحہ 583، حدیث 2643

# سورۃ الممتحنہ

آیاتہا ۱۳ ۶۰ سورۃ الممتحنۃ مدنیۃ ۹۱ رکوعاتہا ۲

تمام کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی ہے، اس کی تیرہ آیات ہیں۔

الممتحنہ حاء کے کسرہ کے ساتھ امتحان لینے والی۔ فعل کو مجازاً اس کی طرف منسوب کیا جس طرح سورۂ براءت کو مبشرہ اور فاصحہ نام دیا گیا کیونکہ اس نے منافقوں کے عیوب کو ظاہر کر دیا۔ جس نے اس سورت کے بارے میں الممتحنہ کہا تو اس نے اسے اس عورت کی طرف مضاف کیا جس کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی۔ وہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ۔ یہ حضرت عبد الرحمن بن عوف کی بیوی تھیں ان کے بطن سے ان کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۗ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۗ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

''اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اپنے (جگری) دوست تم تو اظہار محبت کرتے ہو ان سے حالانکہ وہ انکار کرتے ہیں (اس دین) حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے، انہوں نے نکالا ہے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمہیں بھی (مکہ سے) محض اس لیے کہ تم ایمان لائے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے، اگر تم جہاد کرنے نکلے ہو میری راہ میں اور میری رضا جوئی کے لیے (تو انہیں دوست مت بناؤ) تم بڑی راز داری سے ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ میں جانتا ہوں جو تم نے چھپا رکھا ہے، اور جو تم نے ظاہر کیا ہے اور جو ایسا کرے تم میں سے تو وہ بھٹک گیا راہ راست سے''۔

اتخذ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ وہ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ہے عدو یہ عدا سے فعول کا وزن ہے جس طرح عفو، عفا سے ہے کیونکہ اس کا وزن مصدر کا ہے اس طرح یہ جمع پر اس طرح صادق آتا ہے جس طرح واحد پر صادق آتا ہے۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ ائمہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جبکہ الفاظ امام مسلم کے ہیں (1)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے، حضرت زبیر اور حضرت مقداد کو بھیجا۔ فرمایا: ''روضہ خاخ (جگہ کا نام) جاؤ وہاں ایک ہودج میں عورت ہوگی اس کے پاس خط ہے وہ خط اس سے لے لو''۔ ہم چلے ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر دوڑ رہے تھے تو اچانک ہم اس عورت تک جا پہنچتے ہیں ہم نے کہا: خط نکال دو۔ اس نے کہا: میرے پاس تو کوئی خط نہیں۔ ہم نے کہا: خط نکال دو یا تو اپنے کپڑے اتارے گی۔ اس نے اپنے جوڑے سے وہ خط نکال دیا۔ ہم وہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے آئے، تو اس میں یہ تھا۔'' حاطب بن ابی بلتعہ کی جانب سے اہل مکہ کے مشرکوں کی جانب''۔ وہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے حاطب! یہ کیا ہے؟'' عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ پر جلدی نہ کیجئے۔ میں ایسا شخص ہوں جو قریش کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ سفیان نے کہا: وہ ان کے حلیف تھے وہ قریش کے خاندان میں سے نہ تھے۔ آپ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں وہاں ان کے رشتہ دار ہیں جو ان کے اہل کی حفاظت کرتے ہیں جب کہ میرا وہاں کوئی رشتہ نہیں تو میں نے یہ پسند کیا کہ میں ان میں ایک ایسا احسان کروں جس کی وجہ سے وہ میرے رشتہ داروں کی حفاظت کریں۔ میں نے یہ عمل کفر یا دین سے ارتداد اختیار کرتے ہوئے نہیں کیا اور نہ ہی اسلام کے بعد کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس نے سچ کہا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ فرمایا: ''یہ غزوہ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے اعمال پر مطلع تھا اسی لیے ارشاد فرمایا: جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عورت سارہ تھی جو قریش کے غلاموں میں سے تھی (2)۔ خط میں یہ تھا أما بعد فإن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قد توجه إليكم بجيش كالليل يسير كالسيل وأقسم بالله لو لم يسر إليكم إلا وحده لأظفره الله بكم وأنجز له موعده فيكم فإن الله وليه وناصره۔

امابعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے لشکر کے ساتھ روانہ ہونے والے ہیں جو رات کی مانند ہے۔ سیلاب کی طرح چلے گا۔ میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں اگر آپ صرف اکیلے ہی تمہاری طرف چلیں تو اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم پر کامیابی عطا فرمائے گا وہ اپنے وعدہ کو پورا کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ اس کا حمایتی اور مددگار ہے؛ یہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے۔

قشیری اور ثعلبی نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ یمن کے باشندے تھے ان کا مکہ مکرمہ میں بنی اسد بن عبد العزی جو حضرت زبیر بن عوام کا خاندان تھا سے معاہدہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت زبیر بن عوام کے حلیف تھے۔ مکہ مکرمہ سے ابو عمرو بن صیفی بن ہشام بن عبد مناف کی لونڈی سارہ مدینہ طیبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے لشکر کی تیاری میں مصروف تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حدیبیہ کا سال تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، جلد 2، صفحہ 302

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 517

نے ارشاد فرمایا: ''اے سارہ کیا تو ہجرت کر کے آئی ہے؟'' اس نے عرض کی: نہیں۔ پوچھا: ''کیا تو مسلمان ہو کر آئی ہے؟'' اس نے عرض کی: نہیں۔ پوچھا: ''کس وجہ سے آئی ہو؟'' اس نے عرض کی: آپ لوگ ہی میرے اہل، آقا، اصل اور خاندان تھے سب آقا تو چلے گئے یعنی غزوہ بدر میں قتل ہو گئے۔ میں سخت مصیبت کا شکار ہو گئی میں آپ لوگوں کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئی ہوں تا کہ تم مجھے مال اور لباس دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اہل مکہ کے جوانوں کا تیرے ساتھ کیا سلوک ہے؟'' وہ لونڈی مغنیہ تھی۔ اس نے عرض کی: واقعہ غزوہ بدر کے بعد مجھ سے کسی نے گانے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبد المطلب اور بنی مطلب کو رغبت دلائی کہ وہ اسے مال عطا کریں۔ انہوں نے اسے مال عطا کیا، لباس دیا اور اسے سواری دی اور وہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اس کے پاس آئے فرمایا: میں تجھے دس دینار اور دھاری دار چادریں دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ تو میرا یہ خط اہل مکہ تک پہنچا دے۔ خط میں یہ تحریر تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے محتاط رہو۔ سارہ لونڈی وہاں سے نکلی تو حضرت جبریل امین حاضر ہو گئے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں آگاہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت ابو مرثد غنوی کو بھیجا۔ ایک روایت میں ہے: حضرت علی اور حضرت عمار بن یاسر کو بھیجا۔ ایک روایت میں ہے: حضرت علی، حضرت عمار، حضرت عمر، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت مقداد اور حضرت ابو مرثد کو بھیجا۔ یہ سب شاہسوار تھے۔ انہیں فرمایا: ''تم چلو یہاں تک کہ تم روضہ خاخ پہنچو گے۔ وہاں ہودج میں ایک عورت ہوگی اس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ کا مشرکوں کے نام خط ہوگا، وہ اس سے لے لینا اور اسے چھوڑ دینا۔ اگر وہ خط تمہیں نہ دے تو اسے قتل کر دینا''۔ ان صحابہ نے اسے وہاں ہی پایا۔ صحابہ نے پوچھا: خط کہاں ہے؟ اس نے قسم اٹھا دی اس کے پاس کوئی خط نہیں۔ صحابہ نے اس کے سامان میں خط کو تلاش کیا خط اس میں نہ ملا۔ صحابہ نے واپس لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت علی شیر خدا نے کہا: اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی ہم نے آپ کو جھٹلایا ہے۔ اور اپنی تلوار سونت لی۔ فرمایا: خط نکال دو بصورت دیگر میں تیرے کپڑے اتار دوں گا اور تیری گردن اتار دوں گا۔ جب اس نے آپ کے پختہ ارادہ کو دیکھا تو خط اپنی مینڈھیوں سے نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے: جہاں تہہ بند باندھا جاتا ہے وہاں سے نکال دیا۔ انہوں نے اسے جانے دیا اور خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب کو بلا بھیجا پوچھا: ''کیا تو یہ خط پہچانتا ہے''۔ عرض کی: جی ہاں۔ پھر تمام واقعہ بیان کیا۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو امان دے دی مگر چار افراد کو امان نہ دی یہ سارہ لونڈی ان میں سے ایک تھی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ سورت کفار کے ساتھ دوستی سے نہی میں اصل ہے۔ یہ بحث کئی مواقع پر گزر چکی ہے جیسے لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران: 28) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران: 118) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ (المائدہ: 51) اس جیسی کثیر آیات ہیں۔ حضرت حاطب بن بلتعہ کو جب مومن ہونے کی حیثیت میں خطاب کیا گیا تو ان پر غشی طاری ہوگئی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ تم ظاہر سے ان کی طرف محبت کا اظہار کرتے ہو(1) کیونکہ حضرت حاطب کا دل اس سے محفوظ تھا اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: أما صاحبکم فقد صدق جہاں تک تمہارے ساتھی کا تعلق ہے تو اس نے سچ کہا ہے۔ یہ ارشاد اس کے دل کی سلامتی اور اعتقاد کے درست ہونے پر نص ہے۔ بِالْمَوَدَّةِ میں باء زائدہ ہے جس طرح تو کہتا ہے: قرأت السورة، قرأت بالسورة۔ رمیت إلیه مافی نفسی رمیت إلیه بمافی نفسی یہ بھی جائز ہے کہ باء زائدہ نہ ہو اس صورت میں تُلْقُوْنَ کا مفعول محذوف ہوگا۔ اس کا معنی ہوگا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبریں ان کو پہنچاتے ہو کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان محبت موجود ہے(2)؛ اسی طرح تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ میں باء سببیہ ہے۔ فراء نے کہا: تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ میں باء اولیاء سے متعلق ہے اور مودة پر باء داخل کرنا اور داخل نہ کرنا برابر ہے۔ یہ بھی جائز ہے یہ لَا تَتَّخِذُوْا کے ساتھ متعلق ہو اور حال ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا تعلق اولیاء کے ساتھ ہو اور یہ صفت ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ تم مسلمانوں کے راز انہیں بتاتے ہو اور ان کے مخلص بنتے ہو؛ یہ زجاج کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4۔** جو مسلمانوں کے رازوں پر آگاہ ہو اور ان کی خبریں دشمنوں کو بتائے اگر اس کا فعل دنیوی غرض کے لیے ہو تو اس وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا جبکہ اس کا اعتقاد صحیح ہو جس طرح حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ نے ان پر احسان کے رادہ سے ایسا کیا اور دین سے ارتداد کی خاطر ایسا نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 5۔** جب ہم نے یہ کہا کہ وہ اس کی وجہ سے کافر نہیں، کیا وہ اس جرم کی وجہ سے حداً قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ امام مالک، ابن قاسم اور اشہب نے کہا: امام اس میں اجتہاد کرے گا۔ عبدالملک نے کہا: اگر اس کی یہ عادت ہو تو اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ وہ جاسوس ہے۔ امام مالک جاسوس کو قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ اس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے اور اس کی کاوش سے زمین میں فساد برپا ہوا ہے۔ ابن ماجشون نے اس میں تکرار کو بنیاد بنایا ہے کیونکہ حضرت حاطب تو پہلی دفعہ ہی پکڑے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** اگر جاسوس کافر ہو تو اوزاعی نے کہا: اس کو قتل اس لیے کیا جائے گا کیونکہ اس نے اپنے عہد کو توڑا ہے۔ اصبغ نے کہا: حربی جاسوس قتل کیا جائے گا۔ جاسوس مسلمان ہو یا ذمی ہو انہیں سزا دی جائے گی مگر جب وہ اسلام کے خلاف کام کریں تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مشرکوں کا ایک جاسوس پیش کیا گیا جس کا نام فرات بن حیان تھا(3)۔ اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ چلایا اے جماعت انصار! مجھے قتل کیا جائے گا جبکہ میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گواہی دیتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اسے چھوڑ دیا گیا پھر فرمایا: ''تم میں سے جسے میں اس کے ایمان کے سپرد کرتا ہوں۔ ان میں سے

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1783
2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 512
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1784

ایک فرات بن حیان ہے''(1)۔ وَ قَدْ كَفَرُوْا حال ہے یا تو لَا تَتَّخِذُوْا کی ضمیر سے یا تُلْقُوْنَ کی ضمیر سے یعنی تم ان سے دوستی اختیار نہ کرو اور تم ان سے محبت نہ کرو جبکہ اس کی یہ حالت ہو۔ جحدری نے یہ کہا: بِمَا جَآءَكُمْ کا معنی ہے انہوں نے کفر کیا کیونکہ تمہارے پاس حق آیا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ یہ نئی کلام ہے جو ان کے کفر اور سرکشی کی تفسیر بیان کرتی ہے یا یہ کفروا سے حال ہے۔ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ یہ يُخْرِجُوْنَ کی علت ہے معنی ہے وہ رسول اللہ ﷺ اور تمہیں مکہ مکرمہ سے نکالتے ہیں کیونکہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو یعنی تمہارے ایمان لانے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت حاطب بھی ان صحابہ میں سے تھے جنہیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے نکالا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے(2) تقدیر کلام یوں ہے۔ لاتتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء إن کنتم خرجتم مجاهدین فی سبیلی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں حذف ہے معنی ہے اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا حاصل کرنے کے لیے نکلے ہو تو ان کی طرف محبت کا پیغام نہ بھیجو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ شرط ہے اور اس کا جواب مقدم ہے(3)۔ معنی ہے اگر تم میرے راستہ میں جہاد کے لیے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔ جہاد اور ابتغاء مفعول لہ ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ یہ تُلْقُوْنَ کا بدل ہے اور اس کی وضاحت کر رہا ہے۔ افعال، افعال سے بدل ہو سکتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ (الفرقان)

سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

مَتَى تَأْتِنَا تُلْمِم بنا فی دیارنا     تَجِدْ حَطَبًا جَزْلًا و نارًا تأجّجا

جب تم ہمارے پاس آؤ گے ہمارے گھروں میں پڑاؤ ڈالو گے تو تم بڑا ایندھن اور سرکش آگ دیکھو گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یوں ہے أنتم تسرون إلیهم بالمودة تو یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یہ سب حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کو عتاب ہے۔ یہ عتاب حضرت حاطب کے فضل، کرامت اور حضور ﷺ کے لیے مخلص ہونے اور ان کے ایمان کے صدق پر دال ہے کیونکہ عتاب صرف محب کا حبیب کے لیے ہوتا ہے جس طرح شاعر نے کہا:

أعاتب ذا المودّة من صدیق     إذا ما رابنی منه اجتناب

إذا ذهب العِتاب فلیس ودٌّ     ویبقی الودّ مابقی العتاب

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی۔ سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الجاسوس الذمی، حدیث نمبر 2280، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 36     3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 361

میں محبت والے دوست کو عتاب کرتا ہوں۔ جب اس کی طرف سے اجتناب مجھے شک میں ڈالتا ہے۔ جب عتاب چلا جائے تو کوئی محبت نہیں اور جب تک عتاب باقی رہے تو محبت باقی رہتی ہے۔ بِالْمَوَدَّةِ کا معنی ہے انہیں خط لکھنے میں اخلاص کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا باء زائدہ ہے یا ثابت ہے زائدہ نہیں۔

وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَیْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں۔ بما میں باء زائدہ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: علمت كذا و علمت بكذا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں تم سے ہر ایک فرد کی ہر اس بات کو جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو یا جو تم ظاہر کرتے ہو۔ تو من کل احد محذوف ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان أعلم و أفضل من غيرہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو تم اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہو اور جو تم اپنی زبانوں سے اقرار توحید کو ظاہر کرتے ہو سب جانتا ہوں۔ وَ مَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ جو ان کی طرف راز داری سے پیغام بھیجتا ہے اور تم میں سے جو انہیں خط لکھتا ہے۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔

اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ یَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲

”اگر وہ تم پر قابو پالیں تو وہ تمہارے دشمن ہوں گے اور بڑھائیں گے تمہاری طرف اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم (ان کی طرح) کافر بن جاؤ“۔

اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ اگر وہ تمہیں ملیں اور تمہیں اچانک پالیں۔ اس سے ثاقفه ہے جس کا معنی ہے تلوار چلانے وغیرہ کے لیے موقع کی تلاش کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ تم پر کامیابی حاصل کریں (1) اور تم پر قدرت حاصل کریں اَیْدِیَهُمْ وار کرنے اور قتل کرنے اور اَلْسِنَتَهُمْ گالی گلوچ کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ وَ دُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ وہ خواہش کرتے ہیں کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دو پس تم ان کے ساتھ اخلاص کا مظاہرہ نہ کرو وہ تم سے مخلص نہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۳

”نہ نفع پہنچائیں گے تمہیں تمہارے رشتہ دار اور نہ تمہاری اولاد روز قیامت اللہ تعالیٰ جدائی ڈال دے گا تمہارے درمیان اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو خوب دیکھنے والا ہے“۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ جب حضرت حاطب نے معذرت پیش کی کہ ان کی قریش مکہ کے ہاں اولاد اور رشتہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اہل اور اولاد قیامت کے روز کچھ نفع نہ دیں گے اگر اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی۔

یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ وہ مومنوں کو جنت میں اور کافروں کو آگ میں داخل فرمائے گا۔ یَفْصِلُ میں سات قرائتیں ہیں۔ عاصم

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 36

نے يَفْصِلُ قراءت کی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے يُفَصِّلُ پڑھا ہے۔ طلحہ اور نخعی نے نُفَصِّلُ قراءت کی ہے۔ علقمہ سے نَفْصِلُ مروی ہے۔ قتادہ اور ابوحیوہ نے يُفْصِلُ قراءت کی ہے۔ یہ افصل سے مضارع کا صیغہ ہے۔ باقی قراء نے يُفْصَلُ قراءت کی ہے؛ ابوعبیدہ نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ جس نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے وہ ان آیات کی وجہ سے قراءت کرتے ہیں۔ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝ (الانعام) اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ (الدخان:40) جس نے اسے مشدد پڑھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس فعل میں زیادہ واضح ہے جو کثیر، مکرر اور متعدد ہے۔ جس نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فاعل معروف و مشہور ہے۔ اور جو اسے معروف کا صیغہ پڑھتا ہے تو وہ ضمیر کو الله تعالیٰ کی طرف لوٹاتا ہے۔ جو اسے جمع متکلم کا صیغہ پڑھتا ہے تو وہ تعظیم کی بنا پر ایسا کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ جو کچھ تم کرتے ہو الله تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

''بے شک تمہارے لیے خوبصورت نمونہ ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں (کی زندگی) میں جب انہوں نے (برملا) کہہ دیا اپنی قوم سے کہ ہم بیزار ہیں تم سے اور ان معبودوں سے جن کی تم پوجا کرتے ہو الله کے سوا ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض پیدا ہو گیا ہے یہاں تک کہ تم ایمان لاؤ ایک الله پر مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے کہ میں ضرور مغفرت طلب کروں گا تمہارے لیے اور میں مالک نہیں ہوں تمہارے لیے الله کے سامنے کسی نفع کا۔ (پھر کہا) اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسہ کیا اور تیری طرف ہی رجوع کیا اور تیری طرف ہی ہمیں پلٹ کر آنا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں نہ بنا دے فتنہ کافروں کے لیے اور ہمیں بخش دے اے ہمارے رب! بے شک تو ہی عزت والا (اور) حکمت والا ہے''۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ جب الله تعالیٰ نے کفار کے ساتھ دوستی سے منع کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا۔ آپ کی سیرت میں یہ بات تھی کہ آپ نے کفار سے براءت کا اظہار کیا۔ یعنی تم آپ کی اقتدا کرو مگر جو آپ نے اپنے اب آذر کے لیے استغفار کی اس میں اقتدا نہ کرو۔ اُسوۃ اور إسوۃ اسے کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے۔

جس طرح قِدْوَہ اور قُدْوَہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھو اسوتک یعنی وہ تیری اور تو اس کی مثل ہے۔ عاصم نے اسے أُسْوَۃ پڑھا ہے دو لغتیں ہیں۔

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ یعنی مومنین میں سے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحابہ تھے۔ ابن زید نے کہا: مراد انبیاء ہیں (1)۔

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قوم سے مراد کفار ہیں۔ ما سے مراد بت ہیں براء یہ بریٔ کی جمع ہے جس طرح شریک کی جمع شرکاء، ظریف کی جمع ظرفاء عام قراءت فعلاء کے وزن پر ہے۔

عیسیٰ بن عمر اور ابن ابی اسحاق نے براء قراءت کی ہے یہ فعال کا وزن ہے؛ جس طرح قصیر کی جمع قصار، طویل کی جمع طوال، ظریف کی جمع ظراف ہمزہ کو ترک کرنا بھی جائز ہے۔ یہاں تک کہ تو پڑھے گا برا اور تنوین دے گا۔ اسے براء مصدر کی صورت میں صفت پر بھی پڑھا گیا ہے اسے براء کسرہ کو ضمہ سے بدل کر کے بھی پڑھا گیا ہے جس طرح رخال اور رباب ہے۔

یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے افعال میں اقتدا کے بارے میں نص ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم سے قبل کی شریعتیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے خبر دی ہے۔ وہ ہمارے لیے بھی شرعی احکام ہیں۔

كَفَرْنَا بِكُمْ یعنی جن بتوں پر تم ایمان لائے ہو ہم اس مسئلہ میں تمہارا انکار کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم تمہارے افعال کا انکار کرتے ہیں اور ہم تمہارے حق پر ہونے میں تمہیں جھٹلاتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔

وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا جب تک تم کفر کرو گے تمہارے ساتھ ہمارا یہی رویہ ہوگا تو ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ظاہر ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ یہاں تک کہ تم اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ اس وقت دشمنی دوستی میں بدل جائے گی۔

اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ استغفار میں تم آپ کی اقتداء نہ کرو کہ تم مشرکوں کے لیے استغفار کرنے لگو کیونکہ انہوں نے یہ عمل ایک خاص وعدہ کی وجہ سے کیا تھا؛ یہ قول قتادہ، مجاہد اور دوسرے علماء کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: استثناء کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو چھوڑا اور ان سے دوری اختیار کی مگر اپنے اب آذر کے لیے استغفار میں دوری اختیار نہ کی پھر سورت توبہ میں ان کے عذر کو واضح کیا۔

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت کی دلیل ہے کیونکہ ہمیں آپ کی اقتدا کا حکم دیا گیا اور یہ امر مطلق ہے۔ فرمان عالی شان ہے: وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) جب ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا کا حکم دیا گیا تو بعض افعال کی استثناء کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول جو انہوں نے اپنے اب آذر کے حق میں کیا تھا۔ یہ اس لیے انہوں نے کیا کیونکہ انہیں گمان تھا کہ وہ مسلمان ہے جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ مسلمان نہیں تو آپ نے اس سے براءت کا اظہار کر دیا۔ اس تاویل کی بناء پر اس آدمی کے حق میں استغفار کرنا جائز ہے جس کے مسلمان ہونے کا گمان ہو۔ تم جب اس قسم کا ظن نہیں پاتے تو تم کیوں ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہو۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 37

وَ مَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے اب آزر کے لیے قول ہے یعنی اگر تو نے شرک کیا تو میں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کچھ بھی تم سے دور نہیں کر سکوں گا۔ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کی دعا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومنین کو یہ تعلیم دی کہ وہ یہ کہیں یعنی کفار سے براءت کا اظہار کرو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اور کہو: رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا یعنی ہم نے بھروسہ کیا وَ اِلَیْكَ اَنَبْنَا ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ آخرت میں تیری طرف ہی رجوع ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ہمارے دشمنوں کو ہم پر غلبہ نہ دے تو وہ یہ گمان کرنے لگیں کہ وہ حق پر ہیں اور اس وجہ سے فتنہ میں پڑ جائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: توانہیں ہم پر مسلط نہ کر کہ وہ ہمیں فتنہ میں ڈالیں اور ہمیں عذاب دیں (1)۔

وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے تو عزیز و حکیم ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ قَدِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

”بے شک تمہارے لیے ان میں خوبصورت نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ اور روز قیامت کا امیدوار ہے، اور جو روگردانی کرے (اس سے) تو بلاشبہ اللہ ہی بے نیاز ہے سب خوبیوں سراہا، یقیناً اللہ پیدا فرمائے گا تمہارے درمیان اور ان کے درمیان جن سے تم (اس کی رضا کے لیے) دشمنی رکھتے ہو محبت، اور اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے“۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ، ھم ضمیر سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھ انبیاء و اولیاء ہیں۔ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ یعنی کفار سے براءت کا اظہار کرنے میں بہترین اسوہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تاکید کے لیے اسے مکرر ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ ذکر کیا گیا ہے: دوسری آیت پہلی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی، قرآن حکیم میں اکثر تکرار اسی وجہ سے ہے۔

وَ مَنْ یَّتَوَلَّ جو آدمی اسلام اور ان مواعظ کو قبول کرنے سے اعراض کرے فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ اللہ تعالیٰ غنی ہے، اس نے اپنی کسی حاجت کی وجہ سے انہیں اپنا بندہ نہیں بنایا۔ الْحَمِیْدُ ۝ وہ اپنی ذات و صفات میں محمود ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے مشرک رشتہ داروں سے دشمنی شروع کر دی اس وجہ سے مسلمانوں کو جس دکھ کا سامنا کرنا پڑا اللہ تعالیٰ کو علم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وہ اس طرح ہوا کہ کافر مسلمان ہو جائیں گے ان میں سے ایک قوم نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور مسلمانوں سے میل جول رکھا جس طرح حضرت ابوسفیان بن حرب، حضرت حارث بن ہشام، حضرت سہیل بن عمرو، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں مودہ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان سے شادی ہے۔ اس موقع پر ابوسفیان کی نخوت ٹوٹ پھوٹ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 518

کا شکار ہوگئی اور عداوت میں ان کی طبیعت ڈھیلی پڑگئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مودۃ سے مراد فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان سے شادی کرنا ہے۔ وہ حضرت عبداللہ بن جحش کے عقد میں تھیں۔ انہوں نے اور ان کے خاوند نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی ان کے خاوند نصرانی ہوگئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ دین میں اس کی اتباع کریں حضرت ام حبیبہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے دین پر ہی کاربند رہیں اور ان کا خاوند نصرانیت پر ہی فوت ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی طرف پیغام بھیجا اور حضرت ام حبیبہ کو دعوت نکاح دی۔ نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے پوچھا: تم میں سے کون اس کا قریبی رشتہ دار ہے؟ صحابہ نے بتایا: حضرت خالد بن سعید، نجاشی نے کہا: ام حبیبہ کی شادی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کردو۔ اس نے اسی طرح کیا۔ نجاشی نے اپنی جانب سے چار سو دینار بطور مہر پیش کیے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان کی طرف ان کے نکاح کے لیے پیغام بھیجا۔ جب حضرت عثمان نے حضرت ام حبیبہ کا نکاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا تو نجاشی کی طرف ان کے بارے میں پیغام بھیجا نجاشی نے اپنی جانب سے مہر دیا اور حضرت ام حبیبہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھیج دیا۔ ابوسفیان جو ابھی مشرک تھا جب اسے یہ خبر پہنچی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیٹی سے شادی کر لی ہے تو اس وقت کہا: ذٰلِكَ الْفَحْلُ لَا يُقْدَعُ أَنْفُهُ یعنی یہ ایسا نر ہے جس کی ناک پر ضرب نہیں لگائی جاتی (1)۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بہت ہی معزز ہو۔

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو، بےشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

اس آیت میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کی رخصت ہے جو مومنوں سے دشمنی نہیں رکھتے اور ان سے برسرپیکار نہیں رہتے۔ ابن زید نے کہا: یہ ابتداء اسلام میں تھا جب ایک دوسرے کو چھوڑنے اور قتال کے معاملہ کو ترک کرنے کا حکم تھا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا (2)۔ قتادہ نے کہا: اسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ: 5) سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم خاص علت کی بناء پر تھا اور وہ صلح تھی جب فتح مکہ کے ساتھ صلح ختم ہوگئی تو یہ حکم بھی منسوخ کر دیا گیا اور صرف اس کی قراءت و تلاوت باقی رہ گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی عہد و پیمان تھا جس کو انہوں نے نہ توڑا تھا ان کے لیے ہے: یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: وہ بنو خزاعہ اور بنو حارث بن عبد مناف ہیں۔ ابو صالح نے بھی یہی کہا ہے کہ مراد بنو خزاعہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق، کچھ کمی کے ساتھ، حدیث نمبر 1802، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 519

ہیں۔ مجاہد نے کہا: یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایمان لائے اور ہجرت نہ کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد عورتیں اور بچے ہیں کیونکہ یہ قتال نہیں کرتے (1)، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ نیکی کا حکم دیا؛ بعض مفسرین نے یہ قول کیا ہے۔ اکثر علماء تاویل نے کہا: یہ آیت محکم ہے۔ انہوں نے اس واقعہ سے استدلال کیا کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کیا وہ اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہے جبکہ وہ مشرکہ کی حیثیت میں اس کے پاس آئی ہے؟ فرمایا: ''ہاں''۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت انہیں کے حق میں نازل ہوئی۔ عامر بن عبد اللہ بن زبیر نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دور جاہلیت میں اپنی بیوی قتیلہ کو طلاق دی یہی حضرت اسماء بنت ابوبکر کی والدہ تھی (2)۔ یہ اس وقت حضرت اسماء کے پاس آئی تھی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح تھی۔ اس نے حضرت اسماء کو ایک بالی اور کچھ اشیا تحفہ کے طور پر دیں۔ حضرت اسماء نے انہیں قبول کرنے کو ناپسند کیا یہاں تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا؛ اس واقعہ کو ماوردی اور دوسرے علماء نے بیان کیا۔ ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اسے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ، اس محل جر میں ہے اور الَّذِيْنَ سے بدل ہے یعنی وہ افراد جو تم سے جنگ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ صلہ رحمی سے منع نہیں کرتا۔ وہ بنو خزاعہ تھے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ نہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کریں گے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی مدد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ نیکی کرنے اور وقت مقررہ تک اسے پورا کرنے کا حکم دیا؛ یہ فراء نے بیان کیا ہے۔

**وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ** یعنی اپنے اموال میں سے کچھ حصہ صلہ رحمی کے طور پر انہیں دے دو (3)۔ اس سے مراد عدل نہیں کیونکہ عدل تو قتال کرنے والے اور قتال نہ کرنے والے کے درمیان واجب ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ قاضی ابوبکر نے کتاب ''الاحکام'' میں کہا: اس سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان بچے کا نفقہ کافر باپ پر واجب ہے (4)۔ یہ بڑی غلطی اور بھول ہے کیونکہ کسی چیز کے بارے میں اذن اور کسی شی کے بارے میں نہی کا نہ ہونا اس کے واجب ہونے پر دال نہیں۔ یہ انداز تجھے صرف اباحت عطا کر سکتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسماعیل بن اسحاق قاضی کے پاس ایک ذمی آیا آپ نے اس کی تکریم کی تو اس بارے میں حاضرین نے ان کی گرفت کی تو آپ نے اسی آیت کو ان پر تلاوت کیا۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ
ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨

''اللہ تعالیٰ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی اور تمہیں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 519
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 520
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1785
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1786

تمہارے گھروں سے نکالا یا مدد دی تمہارے نکالنے میں کہ تم انہیں دوست بناؤ اور جو انہیں دوست بناتے ہیں تو وہی (اپنے آپ پر) ظلم توڑتے ہیں''۔

قٰتَلُوْكُمْ یعنی دین کے خلاف تمہارے ساتھ جنگ کی۔ اخرجوا میں واؤ ضمیر سے مراد اہل مکہ میں سے سرکش لوگ ہیں۔ وَ ظٰهَرُوْا انہوں نے تمہیں نکالنے میں مدد کی اور وہ اہل مکہ کے مشرک ہیں۔ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ میں ان محل جر میں ہے اور ان تبرّوهم سے بدل ہے۔ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ جو انہیں اولیاء، انصار اور احباب بناتا ہے۔ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یہی لوگ ظالم ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ یَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَ اٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَ سْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَ لْیَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰

''اے ایمان والو! جب آ جائیں تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے تو ان کی جانچ پڑتال کر لو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پس اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف مت واپس کرو، نہ وہ حلال ہیں کفار کے لیے اور نہ وہ (کفار) حلال ہیں مومنات کے لیے، اور دے دو کفار کو جو مہر انہوں نے خرچ کیے، اور تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم ان عورتوں سے نکاح کر لو جب تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو، اور (اس طرح) تم بھی نہ روکے رکھو (اپنے نکاح میں) کافر عورتوں کو اور مانگ لو جو تم نے (ان پر) خرچ کیا اور کفار بھی مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا، یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ فرماتا ہے، اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس آیت میں سولہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ جب اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے ساتھ دوستی کے ترک کرنے کا حکم دیا اس امر نے یہ تقاضا کیا کہ مسلمان مشرکوں کے علاقے چھوڑ کر مسلمانوں کے علاقوں کی طرف ہجرت کر جائیں۔ باہم نکاح، باہم دوستی کا موکدترین سبب تھا تو عورتوں کی ہجرت کے احکام کو بیان کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش کے مشرکوں کے ساتھ حدیبیہ کے سال صلح ہوئی کہ مکہ مکرمہ میں سے جو بھی شخص مدینہ طیبہ آئے گا اسے ان کی طرف واپس کر دیا جائے گا ابھی تحریر سے فراغت ہوئی تھی کہ حارث اسلمیہ کی بیٹی حضرت سعیدہ آ گئی۔ ابھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں ہی تھے اس کا خاوند آ گیا جبکہ وہ کافر تھا اس کا نام صیفی بن راہب تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا نام مسافر مخزومی تھا۔ اس نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میری بیوی مجھے واپس کر دو کیونکہ آپ نے یہ شرط تسلیم کی ابھی تحریر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ

نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط آئی تو اس کے خاندان والے واپس لے جانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے خاوند عمرو بن عاص سے بھاگ آئی اس کے ساتھ اس کے دو بھائی عمارہ اور ولید تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دونوں بھائیوں کو واپس بھیج دیا اور اسے روک لیا۔ قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اسے شرط کی وجہ سے واپس کر دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شرط مردوں کے متعلق تھی عورتوں کے متعلق نہ تھی'' (2)۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

حضرت عروہ سے مروی ہے: سہیل بن عمرو نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شرط لگائی کہ ہم میں سے کوئی آدمی آپ کے پاس نہیں آئے گا اگرچہ وہ آپ کے دین پر ہو تو آپ اسے ہماری طرف واپس کر دیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مومنات کے بارے میں یہ آیت نازل کی (3)۔ یہ قول اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عورتوں کے بارے میں شرط کو اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو عورت آئی تھی وہ امیمہ بنت بشر تھی جو ثابت شمر کے عقد میں تھی (4)۔ وہ ثابت سے بھاگ آئی جبکہ وہ ابھی کافر تھا اور حضرت سہل بن حنیف نے اس سے شادی کر لی تو اس کے بطن سے ان کا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا۔ مہدوی نے کہا: ابن وہب نے خالد سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت امیمہ بنت بشر جو بنی عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد سعیدہ ہے جو صیفی بن راہب کی زوجہ تھی جو اہل مکہ میں سے مشرک تھا۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ وہ عورت ام کلثوم بنت عقبہ تھی۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کیا عورتیں صلح میں لفظاً شامل تھیں یا عموماً شامل تھیں (5)؟ ایک طائفہ کا کہنا ہے: صلح میں واضح اور صراحۃً یہ شرط شامل تھی کہ عورتوں کو واپس کیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے معاہدہ سے ان کے لوٹانے کی شرط کو منسوخ کر دیا اور اس سے منع کر دیا اور مردوں کی شرط کو اسی طرح باقی رکھا جس طرح وہ تھی۔ یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احکام میں اپنی رائے سے اجتہاد فرما سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو خطا پر قائم نہیں رکھتا۔ علماء میں سے ایک طائفہ کا کہنا ہے صراحۃً ان کی واپسی کی کوئی شرط نہ تھی۔ معاہدہ اس پر ہوا تھا کہ جو مسلمان ہوگا اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ عموم کا ظاہر مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عموم سے عورتوں کے نکلنے کو واضح کیا اللہ تعالیٰ نے دو امور کی وجہ سے مردوں اور عورتوں میں فرق بیان کیا ہے۔ (۱) اب ان کی شرمگاہیں کفار پر حرام ہیں۔ (۲) وہ زیادہ رقیق القلب اور مردوں کی نسبت جلدی پھر جانے والی ہیں۔ ان میں سے جو شرک پر قائم رہیں وہ ان پر لوٹا دی جائیں گی۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ایک قول یہ کیا گیا ہے (6): ان میں سے جو اپنے خاوند کو تنگ کرنا چاہتی وہ کہتی: میں عنقریب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر جاؤں گی، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لینے کا حکم دیا۔ جس چیز کے

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 39	2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1786	3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 364
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 521	5۔ ایضاً	6۔ ایضاً

ساتھ ان کا امتحان لیا جائیگا اس کے بارے میں تین قول ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: امتحان یہ ہے کہ ان سے اللہ کے نام کی قسم لی جائیگی (1) کہ وہ خاوند سے ناراض ہو کر اور ایک علاقہ کی بجائے دوسرے علاقہ کی محبت، دنیا کے لالچ اور کسی مرد کی محبت کے لیے نہیں نکلی بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت کی وجہ سے نکلی ہے۔ جب وہ اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھا دیتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خاوند کو اس کا مہر عطا فرما دیتے اور اس نے اس پر جو خرچ کیا ہوتا وہ بھی عطا فرما دیتے اور اسے واپس نہ کرتے اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ...... کا یہی مدعا و مقصود ہے۔ (۲) امتحان یہ ہے کہ وہ یہ گواہی دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ (۳) جس کی وضاحت بعد میں اسی سورت میں کی گئی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا (2): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے ساتھ آزماتے اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ۔ اسے معمر نے زہری سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت اس معاہدہ کے لیے ناسخ ہے جو آپ نے قریش سے کیا تھا کہ جو بھی مسلمان آئے آپ اس کو واپس کر دیں۔ اس کے ساتھ عورتوں کا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ اس کا مذہب ہے جو قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کو جائز سمجھتا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ مردوں اور عورتوں کے بارے میں حکم منسوخ ہے۔ یہ جائز نہیں کہ امام دشمنوں کے ساتھ اس بات پر صلح کرے کہ جو آدمی مسلمان ہو کر آئے وہ اسے واپس کر دے گا کیونکہ کسی مسلمان کو مشرکوں کی سرزمین پر رکھنا جائز نہیں؛ یہ کوفیوں کا نقطہ نظر ہے۔ امام مالک کے نزدیک اس نقطہ پر صلح جائز ہے۔ کوفیوں نے جو نقطہ نظر اپنایا ہے وہ اسے اسماعیل بن ابی خالد کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ قیس بن ابی حازم سے وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بنو خثعم کی طرف بھیجا انہوں نے انہیں سجدہ کی حالت میں پکڑ لیا اور قتل کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نصف دیت دی اور فرمایا: ''میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو دار الحرب میں مشرکوں کے ساتھ مقیم ہو وہ ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھیں'' (3)۔

انہوں نے کہا: یہ روایت اس روایت کے لیے ناسخ ہے جس میں مسلمانوں کو مشرکوں کے حوالے کرنے کا ذکر تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے براءت کا اظہار کیا جو ان کے ساتھ دار الحرب میں مقیم ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں۔ امام شافعی نے کہا: اس قسم کا معاہدہ خلیفہ یا ایسا شخص جو امر کرتا ہے وہی کر سکتا ہے کیونکہ وہ تمام اموال کا والی ہوتا ہے خلیفہ کے علاوہ جس نے یہ عقد کیا تو وہ عقد مردود ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِهِنَّ یہ امتحان تمہارے لیے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے کیونکہ وہ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ　2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 164

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، النهی عن القتل من اعتصم بالسجود، جلد 1، صفحہ 356

رازوں کو خوب جانتا ہے۔ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ ایمان میں سے جو ظاہر ہے اگر تم انہیں مومن جانتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر تم امتحان سے قبل ان کے مومن ہونے کا علم رکھتے ہو۔ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ اللہ تعالیٰ نے کوئی مومنہ کسی کافر کے لیے حلال نہیں کی اور نہ ہی کسی مومن کے لیے کسی مشرکہ سے نکاح کو حلال کیا ہے۔

یہ واضح ترین دلیل ہے کہ جس امر نے مسلمان عورت کی اپنے خاوند سے جدائی کو ثابت کیا وہ اس کا اسلام لانا ہے، اس کا ہجرت کرنا نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جس امر نے ان کے درمیان تفریق کو ثابت کیا وہ دونوں داروں کا مختلف ہونا ہے۔ امام مالک کے مذہب میں اسی کی طرف اشارہ ہے بلکہ وہ اس میں صریح اور عبارۃ النص ہے۔ صحیح قول پہلا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ اس امر کو واضح کیا کہ عدم حل کی علت اسلام ہے داروں کا مختلف ہونا نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابوعمر نے کہا: دار میں کوئی فرق نہیں نہ کتاب اللہ میں ایسی بات ہے نہ سنت میں ہے اور نہ ہی قیاس میں ہے۔ اس میں جس کی رعایت کی گئی ہے وہ دو دین ہیں۔ ان دونوں کے اختلاف اور اجتماع کے ساتھ حکم مرتب ہوگا، دار کی وجہ سے کوئی حکم نہیں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6۔** وَ اٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا جب مسلمان عورت کو اس بات سے روک دیا جائے کہ اسے اس کے خاوند کے پاس واپس بھیجا جائے تو اس کے خاوند نے اس پر جو مال خرچ کیا ہے وہ اسے واپس کر دیا جائے۔ یہ وعدہ کو پورا کرنے کی صورت ہے کیونکہ جب اسلام کی حرمت کی وجہ سے اسے روکا گیا ہے تو اسکے مال کو واپس کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ دونوں صورتوں میں اس پر خسارہ واقع نہ ہو، بیوی اور مال۔

**مسئلہ نمبر 7۔** کوئی چٹی وغیرہ لازم نہ ہوگی مگر اس صورت میں جب کافر خاوند مطالبہ کرے، جب وہ حاضر ہو اور مطالبہ کرے ہم اسے روک لیں گے اور چٹی بھر دیں گے۔ اگر وہ عورت خاوند کے آنے سے پہلے ہی مر جائے تو ہم مہر چٹی کے طور پر نہ دیں گے کیونکہ روکنا متحقق نہیں ہوا۔ اگر مہر شراب یا خنزیر: د تو ہم کسی چیز کے ذمہ دار نہیں ہونگے کیونکہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ (۱) یہ منسوخ ہے۔ امام شافعی نے کہا: جب ایسے افراد کے پاس سے مسلمان عورت آئے جن کے ساتھ صلح ہو جبکہ وہ مسلمان ہو مہاجر ہو دارالحرب سے امام کی طرف دارالاسلام میں یا دارالحرب میں آئے۔ اگر اسکے خاوند کے علاوہ ولی نے مطالبہ کیا تو بغیر عوض کے اسے روک لیا جائے گا اگر خاوند اپنے لیے یا کسی غیر کے لیے اپنی وکالت کے ساتھ مطالبہ کرے تو اس میں دو قول ہیں۔

(۱) وہ عوض دے گا دلیل وہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ (۲) اس میں دوسرا قول بھی ہے: مشرک خاوند کو کوئی عوض نہیں دیا جائیگا جس کی بیوی مسلمان ہو کر آئی اگر امام عورتوں کے واپس کرنے کی شرط لگائے تو یہ شرط باطل ہوگی۔ جس نے یہ قول کیا اس نے کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حدیبیہ کے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ ان میں سے جو بھی آئے گا اسے واپس کر دیا جائیگا۔ عورتوں کے بارے میں ان کی جانب سے شرط، شرط صحیح تھی اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور عوض کو رد کر دیا جب اللہ تعالیٰ

نے فیصلہ کر دیا پھر اس کے رسول نے فیصلہ کر دیا کہ ان عورتوں کو واپس نہ کیا جائے گا تو جس نے بھی عورتوں کے واپس کرنے کی شرط لگائی وہ شرط منسوخ ہوگی اور اس پر کوئی عوض نہ ہوگا کیونکہ منسوخ کو شرط قرار دینا باطل ہے اور باطل چیز کا کوئی عوض نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8۔** خاوندوں نے جس قدر خرچ کیا ہو اس مقدار میں اللہ تعالیٰ نے واپس کرنے کا حکم دیا۔ اس امر کا مخاطب امام ہے اس کے پاس بیت المال میں جو ایسا مال ہے جس کا مصرف متعین نہ ہو اس میں سے وہ خرچ کرے گا۔ مقاتل نے کہا: وہ مہر کافر خاوند کو واپس کرے گا جس مہر پر عورت سے مسلمان مرد شادی کرے گا۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس سے شادی نہ کرے تو کافر خاوند کے لیے کوئی چیز نہ ہوگی۔ قتادہ نے کہا: مہر واپس کرنے کا حکم ان لوگوں کی عورتوں کے بارے میں ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کے عہد و پیمان ہوں۔ جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ نہیں انہیں کوئی مہر وغیرہ نہیں دیا جائیگا۔ معاملہ اسی طرح ہے جس طرح انہوں نے کہا۔

**مسئلہ نمبر 9۔** وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ یعنی جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کی عدت ختم ہوگئی۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ مشرکہ اور معتدہ کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ اگر ایسی عورت حقوق زوجیت سے قبل ہی مسلمان ہو جائے تو اس کا نکاح اسی وقت ثابت ہو جائے گا اور اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرنا بھی جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 10۔** اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مہر کی شرط کے ساتھ ان کے ساتھ نکاح کرنے کو مباح قرار دیا کیونکہ اسلام نے اس کے اور اس کی کافر بیوی کے درمیان جدائی کر دی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11۔** وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ عام قراء کی قراءت تخفیف کے ساتھ ہے یہ امساک سے مشتق ہے؛ یہ ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ: 231) حضرت حسن بصری، ابو العالیہ اور ابو عمرو نے لَا تُمَسِّكُوا پڑھا ہے یہ تمسیک سے مشتق ہو گا یوں کہا جاتا ہے: مَسَّكَ يمسك تمسيكا۔ یہ أمسك يُمْسِك کے معنی میں ہے۔ اسے ولا تمسكوا تاء کے نصب کے بھی ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اصل میں یہ لا تتمسكوا تھا۔ العصم یہ عصمہ کی جمع ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ انسان محفوظ رہتا ہے یہاں عصمہ سے مراد نکاح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس کی مکہ مکرمہ میں کافرہ بیوی ہو وہ اسے بیوی شمار نہ کرے وہ اس کی بیوی نہیں (1)۔ دار کے مختلف ہونے کی وجہ سے نکاح ختم ہو چکا ہے۔

امام نخعی سے مروی ہے: مراد وہ مسلمان عورت ہے جو دار الحرب بھاگ گئی اور کافر ہوگئی۔ کفار مسلمان عورتوں سے شادیاں کیا کرتے تھے اور مسلمان مرد مشرک عورتوں سے شادی کیا کرتے تھے پھر اس آیت میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو ایسی عورتوں کو طلاق دے دی جو مکہ مکرمہ میں تھیں اور مشرک تھیں ان میں سے ایک قریبہ بنت ابی امیہ تھی جس سے بعد میں معاویہ بن ابی سفیان نے شادی کی جو دونوں مکہ مکرمہ میں مشرک کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ اور ام کلثوم بنت عمرو خزاعیہ جو عبد اللہ بن مغیرہ کی والدہ تھی ابو جہم بن حذافہ نے اس سے شادی کی جو دونوں مشرک تھے۔ جب

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 518

حضرت عمر بن خطاب امیر المومنین بنے تو حضرت ابوسفیان نے اپنے بیٹے حضرت معاویہ سے کہا: قریبہ کو طلاق دے تاکہ حضرت عمر بن خطاب یہ خیال نہ کریں اس کا چھینا ہوا مال تیرے گھر میں ہے۔ حضرت معاویہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت طلحہ بن عبد اللہ کے عقد میں اروی بنت ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب تھی اسلام نے دونوں میں تفریق کر دی پھر حالت اسلام میں ان سے حضرت خالد بن سعید بن عاص نے شادی کی۔ یہ بھی کفار کی ان عورتوں میں سے تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک لیا اور حضرت خالد سے ان کی شادی کر دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کی شادی ابوالعاص بن ربیع سے کی تھی۔ عبد الرزاق ابن جریج سے وہ ایک آدمی سے وہ ابن شہاب سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت زینب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہجرت کی ان کا خاوند ابوالعاص بن ربیع عبد العزیٰ مکہ مکرمہ میں مشرک کی حیثیت میں تھا اس کی یہ وضاحت ہے کہ اس نے حضرت زینب کے بعد اسلام قبول کیا۔ شعبی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ شعبی نے کہا: حضرت زینب بنت رسول اللہ ابوالعاص بن ربیع کی زوجہ تھیں وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں چلی گئیں پھر ان کا خاوند مدینہ طیبہ آیا حضرت زینب نے اسے امان دی تو وہ اسلام لے آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو اس کی طرف لوٹا دیا۔

ابوداؤد نے عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ پہلے نکاح کی وجہ سے ہی انہیں واپس کر دیا اور کوئی نیا عمل نہ کیا۔ محمد بن عمر نے اپنی حدیث میں کہا: یہ واقعہ چھ سال بعد ہوا۔ حسین بن علی نے کہا: دو سال بعد ہوا (1)۔ ابو عمر نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو یہ دو وجوہ سے خالی نہیں۔ آپ کو حیض ہی نہ آیا یہاں تک کہ ان کا خاوند مسلمان ہو گیا یا ان کے بارے میں یہ امر منسوخ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (البقرہ: 228) یہ ایسا امر ہے جس بارے میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد عدت ہے۔ ابن شہاب زہری نے حضرت زینب کے اس قصہ میں کہا: یہ فرائض کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ قتادہ نے کہا: یہ سورۂ براءۃ کے نازل ہونے سے پہلے واقع ہوا جس میں مشرکین کے ساتھ تمام معاہدے ختم کرنے کا حکم ہوا۔

**مسئلہ نمبر 12۔ بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ**، کوافر سے یہاں مراد بت پرست ہیں ان کے ساتھ ابتداءً ہی نکاح کرنا جائز نہیں۔ یہ حکم اہل کتاب کے علاوہ کوافر کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عام ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کا حکم اس سے منسوخ ہے۔ اگر آیت کے ظاہر کو دیکھا جائے تو کوئی کافر عورت کسی صورت میں حلال نہیں۔ پہلے قول کی بناء پر جب کوئی بت پرست یا مجوسی مسلمان ہو جائے اور اس کی بیوی مسلمان نہ ہو تو دونوں میں تفریق کر دی جائے گی، یہ قول بعض علماء کا ہے۔ ان میں سے کچھ نے کہا: عدت کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ جس نے یہ کہا: اسی وقت ان میں تفریق کر دی جائے گی اور عورت کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب الی متی ترد الیہ، حدیث نمبر 1913، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی زوجین مشرکین یسلم احدھما، حدیث نمبر 1062، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الزوجین یسلم احدھما قبل الآخر، حدیث نمبر 1998، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عدت کے مکمل ہونے کا انتظار نہ کیا جائیگا جب اس پر اسلام پیش کیا جائے اور وہ اسلام قبول نہ کرے وہ امام مالک بن انس ہیں؛ یہی قول حضرت حسن بصری، طاؤس، مجاہد، عطا، عکرمہ قتادہ اور حکم کا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: وَ لَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ۔ زہری نے کہا: وہ اس کے ساتھ عدت کا انتظار کرتا ہے؛ یہ امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے انہوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب اپنی بیوی ہند بنت عتبہ سے پہلے اسلام لائے انہوں نے مرالظہر ان کے مقام پر اسلام قبول کیا پھر وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹے جبکہ ہند وہاں کافرہ کی حیثیت سے رہ رہی تھی اور اپنے کفر پر قائم تھی۔ اس نے حضرت ابوسفیان کی داڑھی کو پکڑ لیا اور کہا: اس گمراہ شیخ کو قتل کر دو پھر اس کے چند روز بعد وہ مسلمان ہو گئی۔ دونوں اپنے نکاح پر قائم رہے کیونکہ ان کی عدت ختم نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا: اس کی مثل حضرت حکیم بن حزام کا واقعہ ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے پہلے اسلام قبول کیا۔ پھر ان کے بعد ان کی بیوی مسلمان ہوئی۔ دونوں اپنے نکاح پر باقی رہے۔ امام شافعی نے کہا: جس نے وَ لَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ سے استدلال کیا ہے اس کے لیے اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ مسلمان عورتیں کافروں پر حرام ہیں جس طرح مسلمان مرد کافر، بت پرست اور مجوسی عورتوں کے لیے حلال نہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمۡ وَ لَا هُمۡ يَحِلُّوۡنَ لَهُنَّ پھر سنت نے اس کی وضاحت کی کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے حلال نہیں ہوتے مگر اس صورت میں کہ دوسرا فرد عدت میں اسلام قبول کر لے۔ جہاں تک کوفیوں کا تعلق ہے کوفیوں سے مراد حضرت سفیان ثوری، حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب ہیں انہوں نے ذمی کافروں کے بارے میں کہا: جب عورت مسلمان ہو جائے تو خاوند پر اسلام پیش کیا جائے گا اگر وہ اسلام قبول کر لے تو ٹھیک ورنہ دونوں میں تفریق کر دی جائیگی۔ ان علماء نے کہا: اگر دونوں حربی ہوں تو یہ اس کی بیوی رہے گی یہاں تک کہ اس کے تین حیض گزر جائیں۔ جب وہ دونوں دارالحرب میں ہوں یا دارالاسلام میں ہوں۔ اگر ان میں سے ایک دارالاسلام میں ہو اور دوسرا دارالحرب میں ہو تو دونوں میں عصمت ختم ہو جائے گی۔ ان علماء نے دار کا اعتبار کیا ہے جبکہ یہ کچھ بھی نہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ یہ اختلاف مدخول بہا کے بارے میں ہے۔ اگر وہ غیر مدخول بھا ہو تو دونوں کے درمیان نکاح ختم ہو جانے میں کسی اختلاف کو نہیں جانتے کیونکہ اس پر کوئی عدت نہیں۔ امام مالک اس عورت کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں جو خود مرتد ہو جائے اور اس کا خاوند مسلمان ہو: دونوں کے درمیان نکاح ختم ہو جائے گا۔ ان کی دلیل وَ لَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ ہے یہی قول حضرت حسن بصری اور حضرت حسن بن صالح بن حی کا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ وہ عدت کے مکمل ہونے کا انتظار کرے۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ اگر دونوں میاں بیوی نصرانی ہوں اور بیوی مسلمان ہو جائے اس میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ وہ عدت کے مکمل ہونے تک وقوف کرے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس طرح بت پرست ہے اس کی بیوی مسلمان ہو جاتی ہے۔ اگر وہ عورت کی عدت میں مسلمان ہو جائے تو خاوند اس کا زیادہ حقدار ہوگا جس طرح حضرت صفوان بن امیہ اور حضرت عکرمہ بن ابی جہل اپنی بیویوں کے زیادہ مستحق رہے جب وہ دونوں اپنی بیویوں کی

عدت میں مسلمان ہوئے تھے۔ روایت ابن شہاب سے مروی ہے، اسے امام مالک نے موطا میں ذکر کیا ہے۔ ابن شہاب نے کہا: حضرت صفوان اور ان کی بیوی کے اسلام لانے میں ایک ماہ کا عرصہ حائل ہے۔ ابن شہاب نے کہا: ہمیں یہی خبر پہنچی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرے اور اس کا خاوند کافر ہو اور دارالحرب میں مقیم ہو مگر ہجرت اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان تفریق کر دے گی ہاں یہ صورت مختلف ہے کہ اس کا خاوند عدت ختم ہونے سے پہلے آ جائے (1)۔ علماء میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں: دونوں کے درمیان نکاح منسوخ ہو جائے گا۔ یزید بن علقمہ نے کہا: میرا دادا مسلمان ہو گیا اور میری دادی مسلمان نہ ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں میں تفریق کر دی؛ یہ طاؤس کا قول ہے۔ دوسری جماعت جن میں عطا، حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے کہا: دعوت نکاح کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا مفسرین نے کہا: مسلمان عورتوں میں سے جو عورتیں مرتد ہو کر ان کفار کے پاس چلی گئیں جن کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے تھے تو کفار کو کہا جائے گا: ان عورتوں کے مہر دے دو (2)۔ جب کفار کی عورتوں میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آ جائے تو مسلمانوں کو کہا جائے گا: کفار کو ان عورتوں کے مہر واپس کر دو۔ یہ دونوں حالتوں میں عدل کی صورت ہے۔ اجماع امت یہی ہے کہ یہ حکم اس زمانہ میں ایک خاص واقعہ کے ساتھ خاص ہے؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ یعنی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ یہ پہلے کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۝۱۱

"اور اگر بھاگ جائے تم سے کوئی عورت تمہاری بیبیوں سے کفار کی طرف پھر تمہاری باری آ جائے (کہ کوئی کافرہ تمہارے قبضہ میں آ جائے) تو جن کی بیبیاں ان کے قبضہ سے نکل گئیں جتنا انہوں نے خرچ کیا اتنا انہیں دے دو، اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ روایت میں ہے کہ مسلمانوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس پر ہم راضی ہیں اور مسلمانوں نے مشرکوں کو خط لکھے تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو یہ حصہ نازل ہوا۔ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا زہری نے عروہ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا مسلمانوں نے کفار کو خط لکھے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر ہماری کوئی عورت تمہارے پاس آئے تو تم ہمیں مہر دو

1۔ موطا امام مالک، نکاح المشرک، صفحہ 508 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1788

اور اگر تمہاری کوئی عورت ہمارے پاس آئے تو ہم اس کا مہر تمہیں دیں گے۔ جواب میں انہوں نے مسلمانوں کو خط لکھے: جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم نہیں جانتے کہ تمہارا کوئی حق ہم پر ہے اور اگر ہمارا تم پر کوئی حق ہے تو اسے ہماری طرف بھیج دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو نازل کیا: وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یہ ان مسلمانوں اور ان کفار کے بارے میں ہے جو اہل مکہ سے تھے جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے۔ زہری نے کہا: اگر عہد و پیمان نہ ہو تو مسلمان عورتوں کو روک لیا جائے گا اور انہیں مہر واپس نہیں کیا جائے گا (1)۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: انہیں حکم دیا گیا کہ جن کی بیویاں چلی گئی ہیں انہیں اتنا مال، مال فئی اور غنیمت میں سے دے دو جتنا انہوں نے بیویوں پر خرچ کیا تھا۔ دونوں نے کہا: یہ حکم اس کے بارے میں ہے جس کے ساتھ ہمارا اس معاملہ میں کوئی عہد و پیمان ہو جبکہ ہمارا اور ان کے درمیان تو کوئی ایسا معاہدہ نہیں۔ دونوں نے کہا: فَعَاقَبْتُمْ کا معنی ہے تم بدلہ لو۔

فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مراد مہر ہیں۔ یہ تمام کفار میں عام ہے۔ قتادہ نے یہ بھی کہا ہے: اگر تم میں سے کسی کی بیوی ان کفار کے پاس چلی جائے جن کا اور تمہارا عہد و پیمان ہو تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں انہیں اس کے برابر مال دو جتنا انہوں نے خرچ کیا۔ پھر سورۂ براءت میں یہ حکم منسوخ ہے۔ زہری نے کہا: فتح مکہ کے سال یہ حکم منقطع ہو گیا۔ سفیان ثوری نے کہا: آج اس پر عمل نہیں ہوگا۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: یہ حکم آج بھی ثابت ہے؛ قشیری نے یہ بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** فَعَاقَبْتُمْ عام قراءت فَعَاقَبْتُمْ ہے۔ علقمہ، نخعی، حمید اور اعرج نے فعقّبتم مشدد پڑھا ہے۔ مجاہد نے اسے فعاقبتم پڑھا ہے کہا: تم نے اس طرح کیا۔ جس طرح انہوں نے تمہارے ساتھ کیا۔ زہری نے فعَقَبْتم الف کے بغیر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ مسروق اور شقیق بن سلمہ نے فعَقِبْتم قاف کے کسرہ کے ساتھ بغیر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کہا: اس کا معنی ہے تمہیں غنیمت حاصل ہو۔ تمام لغات کا ایک ہی معنی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ عَاقَبَ، عَقَبَ، عَقَّبَ، أعقب، تَعَقَّبَ، أعتقب اور تَعاقب جب غنیمت حاصل ہو۔ قتبی نے کہا فَعَاقَبْتُمْ کا معنی ہے تم یکے بعد دیگرے جنگ میں شریک ہو۔ ابن بحر نے کہا: تم مرتد عورت کو قتل کی سزا دو تو مسلمانوں کی غنیمتوں سے اس کے خاوند کو اس کا مہر واپس کیا جائے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 3۔** فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اگر کوئی مومن عورت اہل مکہ کے کفار تک جا پہنچے، تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو اور اس کا خاوند مسلمان ہو اور تمہیں غنیمت حاصل ہو تو تم اس مسلمان خاوند کو مال غنیمت سے مہر کے برابر مال دے دو اور یہ ادائیگی پانچواں حصہ نکالنے سے پہلے ہو۔ زہری نے کہا: مال فئی سے اسے مہر دیا جائے گا (3)۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: جو ہمارے ساتھ آ ملا ہے اسے مہر دیا جائیگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر کفار اس عورت کے مہر کی چٹی ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں جو ان کے پاس چلی گئی ہے تو ان کے ساتھ معاہدہ ختم کر دو یہاں تک کہ تم فتح پاؤ اور وہ مہر ان سے لے لو۔ اعمش نے کہا: یہ منسوخ ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 366 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 523 3۔ ایضاً

عطا نے کہا: بلکہ اس کا حکم ثابت ہے۔ یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔ قشیری نے کہا: یہ آیت ام حکم بنت ابی سفیان کے حق میں نازل ہوئی وہ مرتد ہوگئی تھی اور اس نے اپنے خاوند عیاض بن غنم قرشی کو چھوڑ دیا۔ قریش میں سے اس کے علاوہ کوئی عورت مرتد نہیں ہوئی تھی پھر اسلام قبول کرلیا۔

ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: وہ کل چھ عورتیں تھیں جنہوں نے اسلام چھوڑا اور مشرکوں کے ساتھ جا ملی تھیں یہ مہاجر مسلمانوں کی بیویاں تھیں (1)۔ (۱) ام الحکم بنت ابی سفیان، یہ حضرت عیاض بن ابی شداد فہری کے عقد میں تھی۔ (۲) فاطمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ جو حضرت ام سلمہ کی بہن تھی۔ یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تو اس نے انکار کیا اور مرتد ہوگئی۔ (۳) بروع بنت عقبہ یہ حضرت شماس بن عثمان کے عقد میں تھی۔ (۴) عبدہ بنت عبد العزیٰ یہ حضرت ہشام بن عاص کے عقد میں تھی۔ (۵) ام کلثوم بنت جرول یہ حضرت عمر بن خطاب کے عقد میں تھی۔ (۶) شہبہ بنت غیلان۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خاوندوں کو ان کے مہر مال غنیمت سے ادا کیے تھے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس چیز سے بچو کہ تم ان امور میں حد سے تجاوز کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫

"اے نبی (مکرم) جب حاضر ہوں آپ کی خدمت میں مومن عورتیں تاکہ آپ سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی اور نہ وہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہیں لگائیں گی جھوٹا الزام جو انہوں نے گھڑ لیا ہو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان اور نہ آپ کی نافرمانی کریں گی کسی نیک کام میں تو (اے میرے محبوب) انہیں بیعت فرما لیا کرو اور اللہ سے ان کے لیے مغفرت مانگا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا تو مکہ مکرمہ کی عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ ان سے عہد لیں کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں نے کہا: مومن عورتیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرتیں تو ان کا امتحان اس آیت کے ساتھ لیا جاتا يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ۔ (2)

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 519
2۔ صحیح مسلم، کتاب الاجارہ، کیفیۃ بیعۃ النساء، جلد 2، صفحہ 131

مومنات میں سے جس نے اقرار کر لیا تو اس نے محنۃ کا اقرار کر لیا۔ جب وہ یہ اقرار کر لیتیں تو رسول اللہ ﷺ انہیں فرماتے: ''جاؤ میں نے تم سے بیعت لے لی ہے''۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کسی عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کیا آپ نے صرف گفتگو کے ذریعے ان سے بیعت لی۔ حضرت عائشہ نے کہا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے کبھی بھی بیعت نہیں لی مگر اسی چیز کی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی بھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ جب رسول اللہ ﷺ ان سے بیعت لیتے تو یہ فرماتے: ''میں نے تم سے زبانی بیعت لے لی ہے۔'' یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی جبکہ آپ ﷺ کے اور ان عورتوں کے درمیان کپڑا تھا آپ ان پر شرط لگاتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: جب آپ مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو آپ صفا پہاڑی پر بیٹھے جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ سے تھوڑا نیچے حضرت عمر تھے۔ رسول اللہ ﷺ عورتوں پر شرط ذکر کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان عورتوں پر اسے دہراتے تھے۔ ایک روایت یہ کی گئی: آپ ﷺ نے ایک عورت کی ذمہ داری لگائی جو صفا پر کھڑی ہوئی تو اس نے عورتوں سے بیعت لی۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے (1)۔ چاہیے کہ اس چیز پر اعتماد کیا جائے جو صحیح میں ہے۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ایک گھر میں انصار کی عورتوں کو جمع کیا پھر حضرت عمر بن خطاب کو ہماری طرف بھیجا حضرت عمر دروازے پر کھڑے ہو گئے انہوں نے عورتوں کو سلام کیا اور عورتوں نے انہیں سلام کا جواب دیا۔ حضرت عمر نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے تمہیں پیغام پہنچانے والا ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گی۔ سب نے کہا: ہاں ٹھیک ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمرے کے باہر سے اور ہم نے کمرے کے اندر سے اپنے ہاتھوں کو بڑھایا۔ پھر حضرت عمر نے کہا: اے اللہ گواہ رہنا۔ عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب عورتوں سے بیعت لیتے تو پانی کا ایک پیالہ لیتے اپنا ہاتھ اس میں رکھتے پھر عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ اپنا ہاتھ اس میں رکھیں تو وہ اپنا ہاتھ اس پیالہ میں رکھتیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب کہا: ''تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گی۔'' ہند بنت عتبہ نے کہا جبکہ وہ نبی کریم ﷺ سے خوف کی وجہ سے نقاب میں تھی کہ کہیں آپ ﷺ اسے پہچان ہی نہ لیں۔ خوف کی وجہ سے اس کا وہ عمل تھا جو اس نے غزوہ احد کے موقع پر حضرت حمزہ کے ساتھ روا رکھا تھا: اللہ کی قسم! آپ ﷺ ہم سے ایسی باتوں کا وعدہ لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر اسلام اور جہاد پر بیعت لی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''وہ چوری نہیں کریں گی'' (3)۔ ہند نے کہا: ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہے میں اس کے مال سے ضرورت کی چیز لے لیتی ہوں۔ ابوسفیان نے کہا: وہ تیرے لیے حلال ہے۔ نبی کریم ﷺ ہنس پڑے اور اسے پہچان لیا۔ فرمایا: ''تو ہند ہے؟'' اس نے عرض کی: جو گزر چکا اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے۔ پھر فرمایا: ''وہ بدکاری نہیں کریں گی''۔ ہند نے عرض کی: کیا آزاد عورت بھی بدکاری کرتی ہے؟ پھر فرمایا: ''وہ اپنی اولادوں کو قتل نہیں کریں گی، وہ بچیوں کو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1791 2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 521 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 368

زندہ درگور نہیں کریں گی اور جنین کو نہیں گرائیں گی"۔ ہند نے کہا: ہم نے ان بچوں کو چھوٹی عمر میں پالا اور جب وہ بڑے ہو گئے تو میدان بدر میں تم نے انہیں قتل کر دیا۔ تم اور وہ زیادہ بصیرت والے ہیں۔ مقاتل نے یہ نقل کیا ہے: ہم نے انہیں چھوٹی عمر میں پالا اور بڑی عمر میں تم نے انہیں قتل کیا تم اور وہ زیادہ جانتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہنس پڑے یہاں تک کہ پشت زمین پر جا لگی۔ حنظلہ بن ابی سفیان یہی ہند کا پہلا بیٹا تھا جو غزوہ بدر میں قتل ہوا تھا۔ پھر فرمایا: **وَ لَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ**۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ** کا معنی یہ ہے زبان سے چغل خوری کرنا۔ اور (بین) **اَرْجُلِهِنَّ** کا معنی ہے شرمگاہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ** سے مراد بوسہ لینا اور ٹٹولنا اور بین ارجلھن سے مراد جماع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے کہ وہ کسی غیر کا بچہ اپنے خاوندوں کے ساتھ لاحق نہیں کریں گی؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ عورت کوئی بچہ پاتی تو اسے اپنے خاوند کے ساتھ لاحق کر دیتی اور کہتی: یہ تجھ سے میرا بچہ ہے (1)۔ یہ بہتان اور افتراء ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مابین یدیھا و رجلیھا یہ بچے سے کنایہ ہے کیونکہ اس کا بطن جس میں وہ بچے کو اٹھاتی ہے وہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ شرمگاہ جس سے وہ بچہ جنتی ہے وہ اس کی ٹانگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ حکم عام ہے اور بچے کو لانے اور اپنے خاوند کے ساتھ اسے لاحق کرنے کو شامل ہے۔ اگرچہ زنا سے نہی پہلے گزر چکی ہے۔

یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب ہند نے یہ سنا تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! بہتان یہ قبیح امر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم نہیں دیتے مگر سب سے بہترین امر اور مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔ پھر فرمایا: **وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ**۔ قتادہ نے کہا: "وہ نوحہ نہیں کریں گی اور ان میں سے کوئی عورت خلوت اختیار نہیں کرے گی مگر ذی رحم محرم رشتہ کے ساتھ ہی"۔ مراد ہے غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں وقت نہیں گزارے گی۔ سعید بن مسیب، محمد بن سائب اور زید بن اسلم نے کہا: "وہ چہرے کو نہیں نوچیں گی، وہ گریبان نہیں پھاڑیں گی، وہ ہائے ہلاکت وغیرہ کا واویلا نہیں کریں گی، وہ شعر نہیں پڑھیں گی، وہ ذی رحم محرم رشتہ دار کے سوا مردوں سے گفتگو نہیں کریں گی"۔

حضرت ام عطیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ حکم نوحہ کے متعلق ہے، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ شہر بن حوشب نے حضرت ام سلمہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: اس سے مراد نوحہ ہے (2)۔

مصعب بن نوح نے کہا: میں ایک ایسی بوڑھی سے ملا جو ان عورتوں میں سے تھی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی اس نے مجھے **وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ** کی تفسیر کے حوالے سے حدیث بیان کی کہ مراد نوحہ ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ** فرمایا: "اس سے مراد نوحہ ہے" (3)۔ کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مگر آل فلاں کیونکہ انہوں نے دور جاہلیت میں

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 43　　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، النھی عن النیاحۃ، صفحہ 114

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، النھی عن النیاحۃ، جلد 1، صفحہ 304

میری مدد کی تھی۔ اس عورت سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے ساتھ ہم سے یہ وعدہ بھی لیا کہ ہم نوحہ نہیں کریں گی۔ ہم میں سے پانچ عورتوں کے سوا کسی نے بھی ان سے وفا نہ کی۔ حضرت ام سلیم، حضرت ام العلاء، حضرت بنت ابی سرہ جو حضرت معاذ کی زوجہ تھیں یا حضرت بنت ابی سرہ، حضرت معاذ کی زوجہ رضوان اللہ علیہن۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں معروف سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے؛ یہ قول میمون بن مہران کا ہے۔ بکر بن عبداللہ مزنی نے کہا: وہ کسی ایسے امر میں آپ ﷺ کی نافرمانی نہیں کریں گی جس میں ان کے لیے ہدایت کا پہلو ہو۔ کلبی نے کہا: یہ ہر معروف میں عام ہے جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے حکم دیا(1)۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ہند نے اس وقت کہا: ہم اس مجلس میں نہ بیٹھتیں اگر ہمارے دلوں میں کوئی ایسی بات ہوتی کہ ہم آپ کے کسی معاملہ میں نافرمانی کریں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بیعت کی صفت میں کئی امور ذکر کیے ہیں ان امور میں دین میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان کی وضاحت کی گئی اور امر کے ارکان ذکر نہیں کیے گئے وہ بھی چھ چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جنابت سے غسل، اس کی وجہ یہ ہے کہ نہی ہر زمانہ اور ہر حال میں قائم رہتی ہے تو دائمی رہنے والی چیزوں پر تنبیہ زیادہ موکد ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جن امور سے منع کیا گیا ہے عورتوں میں یہ بہت زیادہ ہوتی ہیں اور نسب کا شرف انہیں اس سے نہیں روکتا، اس لیے انہیں خصوصی طور پر ذکر کیا گیا؛ اس کی مثل حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو آپ نے عبدالقیس کے وفد سے فرمایا: ''میں تمہیں دباء (کدو سے بنا برتن) حنتم (روغنی گھڑا) نقیر (کھجور کے تنے سے بنا برتن) اور مزفت (تارکول ملا برتن) سے منع کرتا ہوں''(2)۔ نبی کریم ﷺ نے دوسرے گناہوں سے نہی کے بجائے صرف شراب پینے سے منع کیا کیونکہ یہی ان کی پسندیدہ چیز اور عادت تھی۔ جب انسان نافرمانیوں میں سے پسندیدہ امر کو ترک کرتا ہے تو اس کے لیے باقی شہوتوں کو چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب نبی کریم ﷺ نے بیعت میں وَ لَا یَسْرِقْنَ فرمایا: حضرت ہند نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو سفیان بخیل آدمی ہے۔ کیا مجھ پر گناہ ہوگا کہ میں اس کے مال سے اتنا لے لوں جو میرے اور میری اولاد کے لیے کافی ہو؟ فرمایا: ''نہیں مگر معروف طریقہ سے''(3)۔ حضرت ہند کو خوف ہوا کہ اگر اس نے اسی مال پر اکتفاء کیا جتنا حضرت ابوسفیان اسے دیتے ہیں تو وہ تو ضائع ہو جائے گی یا اس سے زیادہ لیا تو وہ چوری کرنے والی اور مذکورہ بیعت کو توڑنے والی ہو جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''تو معروف طریقہ سے جو لے گی اس میں کوئی حرج نہیں'' یعنی جب وہ ضرورت سے زائد نہ لے تو کوئی حرج نہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ اس مال کے بارے میں ہوگا جو خاوند اس سے چھپا کر نہیں رکھتا اور اسے تالے میں نہیں رکھتا۔ جب بیوی اس تالے کو توڑے اور مال اس سے لے تو وہ چوری ہوگی، اس کی وجہ سے وہ گناہ گار ہوگی اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 526
2۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1079
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1795

**مسئلہ نمبر 5۔** حضرت عبادہ بن صامت نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح کا عہد لیا جس طرح عورتوں سے عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، کسی کے ساتھ بدکاری نہیں کرو گے، اپنی اولادوں کو قتل نہیں کرو گے، تم ایک دوسرے کے خلاف جادو نہیں کرو گے اور جو نیکی کا تمہیں حکم دیا جائے گا اس میں تم نافرمانی نہیں کرو گے۔ ابن بحر اور دوسرے علماء نے کہا: وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ سے مراد وہ جادو نہیں کریں گے۔ بہتان سے مراد جادو ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یَفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ بہتان سے مراد وہ بچہ ہے یَفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ جسے وہ لقیط کے طور پر لے وَاَرْجُلِهِنَّ جس کو وہ بدکاری سے جنے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6۔** وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے فرمایا: یہ ایسی شرط ہے جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے مقرر کی ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے (1)۔ صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے اور نبی کریم ﷺ نے جو بھی حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے ان کو جامع ہے اس میں نوحہ، کپڑے پھاڑنا، بال کاٹنا اور غیر محرم کے ساتھ خلوت کرنا شامل ہے۔ یہ سب گناہ کبیرہ اور دور جاہلیت کے افعال ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو مالک اشعری سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میری امت میں چار امور دور جاہلیت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے آپ ﷺ نے نوحہ کا بھی ذکر کیا“ (2)۔ یحییٰ بن ابی کثیر، ابو سلمہ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ان نوحہ کرنے والیوں کی قیامت کے روز دو صفیں بنائی جائیں گی ایک صف دائیں جانب اور ایک صف بائیں جانب ہوگی وہ اس دن میں یوں بھونکیں گی جس طرح کتے بھونکتے ہیں جو دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا پھر انہیں جہنم میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”فرشتے نوحہ کرنے والی اور چیخنے والی کے لیے رحمت طلب نہیں کرتے“۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک عورت کو نوحہ کرتے ہوئے سنا آپ اس کے پاس آئے اس کو درے سے مارا یہاں تک کہ اس کی اوڑھنی اس کے سر سے نیچے گر گئی۔ عرض کی گئی: اے امیر المومنین! عورت، عورت اس کی اوڑھنی گر گئی ہے۔ فرمایا: اس کی کوئی حرمت نہیں۔ ثعلبی نے تمام کی سندیں ذکر کی ہیں۔ جہاں تک فِيْ مَعْرُوْفٍ کا ارشاد ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا يَعْصِيْنَكَ میں قوت ہے اس میں دو قول ہیں۔ (۱) یہ تاکید کے انداز میں معنی کی تفسیر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (الانبیاء: 112) کیونکہ اگر احکم فرماتا تو یہ بھی کافی ہوتا۔ (۲) نبی کریم ﷺ کی بیعت میں معروف کی شرط لگائی تاکہ اس امر پر تنبیہ ہو کہ کوئی اور اس شرط کا زیادہ مستحق ہے، اس پر یہ چیز لازم ہے اور اشکال کی نفی کرنے والی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7۔** امام بخاری نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس موجود تھے۔ فرمایا: ”کیا تم میری اس پر بیعت کرتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، تم بدکاری نہیں کرو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 727 2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، الوعید فی النیاحۃ اذا لم یتب، جلد 1، صفحہ 303

گے اور تم چوری نہیں کرو گے''(1)۔ سورۂ نساء کی آیت کی تلاوت کی۔ آیت کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا: ''جس نے اس عہد کو پورا کیا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور جس نے کوئی غلطی کی تو اسے سزا دی گئی تو وہ اس کا کفارہ بن جائے گی اور جس نے کوئی غلطی کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے بخش دے''۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ میں عید الفطر کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا سب خطبہ سے پہلے نماز پڑھتے تھے پھر خطبہ دیا کرتے تھے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے گویا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے لوگوں کو بٹھا رہے ہیں پھر لوگوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے یہاں تک کہ حضرت بلال کے ساتھ عورتوں تک پہنچے (2) اور یہ آیت تلاوت کی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ یہاں تک کہ آیت سے فارغ ہوئے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: ''تم اس پر ہو؟'' ایک عورت نے جواباً عرض کیا اس کے علاوہ کسی نے بھی جواب نہ دیا: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ حسن بن مسلم راوی نہیں جانتا کہ وہ عورت کون تھی۔ کہا: عورتوں نے صدقہ کیا۔ حضرت بلال نے اپنا کپڑا پھیلا دیا، عورتیں اپنے چھلے اور انگوٹھیاں حضرت بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8**۔ مہدوی نے کہا: تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ امام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عورتوں پر یہ شرط لگائے اس کا حکم دینا مستحب ہے لازم نہیں۔ بعض اہل نظر نے کہا: جب امتحان (جانچ پڑتال) کی ضرورت ہو کیونکہ دار دور ہے تو اس امتحان (جانچ پڑتال) کا قائم کرنا مسلمانوں کے امام پر ضروری ہوگا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَىٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَىٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾

''اے ایمان والو! نہ بناؤ دوست ان لوگوں کو، غضب فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے جن پر یہ آخرت (کے ثواب سے) مایوس ہو گئے ہیں جیسے وہ کفار مایوس ہو چکے ہیں جو قبروں میں ہیں''۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ۔ قَوْمًا سے مراد یہودی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان فقراء میں سے کچھ لوگ یہودیوں کو مومنوں کی خبریں دیتے اور ان کے ساتھ تعلقات قائم کرتے اس طرح ان سے کچھ پھل حاصل کر لیتے تو انہیں اس امر سے منع کیا گیا۔

قَدْ یَىٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ مراد یہودی ہیں: یہ ابن زید کا قول ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ اس سے مراد منافق ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد یہود و نصاریٰ ہیں (3)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہوں نے آخرت

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 727 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 526

کے لیے عمل کو ترک کر دیا اور دنیا کو ترجیح دے دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آخرت کے ثواب سے مایوس ہو گئے (1)؛ یہ مجاہد کا قول ہے: كَمَا يَبِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ۝ یعنی زندہ کافر اصحاب قبور کے بارے میں مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ ان کی طرف پلٹ کر آئیں گے؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا: وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیۃ: 24) ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے جس طرح وہ کفار مایوس ہو گئے جو قبروں میں ہیں کہ وہ دنیا کی طرف لوٹیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورت کا اختتام بھی اسی چیز سے کیا جس سے سورت کو شروع کیا تھا کہ کفار کے ساتھ دوستی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو خطاب ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ قریش کے کفار آخرت کی بھلائی سے یوں مایوس ہو گئے ہیں جس طرح وہ کفار جو قبروں میں دفن ہیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں (2)۔ قاسم بن ابی بزہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: کفار میں سے جو فوت ہو چکا ہے وہ بھلائی سے مایوس ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 370
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 5، صفحہ 526

# سورة الصّف

(آیاتہا ۱۴) (۶۱ سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۹) (رکوعاتہا ۲)

تمام کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی ہے جس طرح ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مکی ہے؛ نحاس نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔اس کی چودہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝

''الله کی تسبیح بیان کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔ اے ایمان والو! تم کیوں ایسی بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ بڑا ناراضگی کا باعث ہے الله کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں ہو''۔

پہلی آیت کی تفسیر سورۂ حدید کی پہلی آیت کے تحت گزر چکی ہے۔

دوسری دو آیات کے ضمن میں پانچ مسائل بیان کئے گئے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ داری ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے کہ محمد بن کثیر، اوزاعی سے وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے وہ ابو سلمہ سے وہ حضرت عبدالله بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں: ہمارے پاس رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت بیٹھی ہم نے آپس میں بات چیت کی ہم نے کہا: اگر ہم جانتے کہ اعمال میں سے کون سا عمل الله تعالیٰ کی بارگاہ میں زیادہ محبوب ہے تو ہم اس پر ضرور عمل کرتے؟ تو الله تعالیٰ نے ان آیات سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کو نازل فرمایا۔ابو سلمہ نے کہا: حضرت ابن سلام نے انہیں ہم پر تلاوت کیا۔یحییٰ نے کہا: ابو سلمہ نے انہیں ہم پر پڑھا، انہیں یحییٰ نے ہم پر پڑھا، اوزاعی نے انہیں ہم پر پڑھا اور محمد نے انہیں ہم پر پڑھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت عبدالله بن رواحہ نے کہا: اگر ہم ایسا عمل جانتے جو الله تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب ہے تو ہم اس پر عمل کرتے؟ جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو صحابہ نے اسے ناپسند کیا(2)۔کلبی نے کہا: مومنوں نے کہا: یا رسول الله! اگر ہم ایسے عمل کو جانتے جو الله تعالیٰ کی بارگاہ میں زیادہ محبوب ہے تو ہم اس عمل کو بجالانے میں جلدی کرتے تو یہ

1۔تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 527 2۔ایضاً

آیت نازل ہوئی هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ صحابہ کرام طویل زمانہ تک رکے رہے وہ کہتے: کاش! ہم جانتے کہ وہ کیا ہے تو ہم انہیں اموال، اپنی جانوں اور اہل کے بدلے خرید لیتے؟ الله تعالیٰ نے انہیں اپنے ارشاد کے ساتھ انہیں آگاہ کیا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ۔

غزوہ احد کے موقع پر آزمایا گیا تو وہ بھاگ گئے اس وعدہ خلافی کرنے پر انہیں عار دلانے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

محمد بن کعب نے کہا: جب الله تعالیٰ نے شہداء بدر کے ثواب کے بارے میں خبر دی تو صحابہ نے کہا: اے الله! گواہ رہنا اگر ہمیں جنگ کا موقع ملا تو ہم اپنی پوری طاقت صرف کر دیں گے، وہ غزوہ احد کے موقع پر بھاگ گئے تو الله تعالیٰ نے انہیں اس پر عار دلائی (1)۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا: یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو یہ کہتے تھے: ہم نے جہاد کیا، ہم نے فلاں کو قتل کیا جبکہ انہوں نے اس طرح نہیں کیا تھا۔ حضرت صہیب رومی نے کہا: ایک آدمی تھا جس نے غزوہ بدر کے موقع پر مسلمانوں کو بڑی مصیبت میں ڈالا اور انہیں زخمی کیا تو میں نے اسے قتل کر دیا۔ ایک آدمی نے کہا: اے الله کے نبی! میں نے فلاں کو قتل کیا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وجہ سے خوش ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبد الرحمن بن عوف نے کہا: اے صہیب! کیا تو نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتایا کہ میں نے فلاں کو قتل کیا ہے؟ فلاں آدمی اس کے قتل کو اپنی طرف منسوب کر رہا تھا۔ حضرت صہیب رومی نے بتایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا! ''اے ابو یحییٰ! کیا بات اسی طرح ہے؟'' عرض کی: جی ہاں، الله کی قسم! یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم! تو جس نے اس قتل کو اپنی طرف منسوب کیا تھا اس کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابن زید نے کہا: یہ آیات منافقین کے حق میں نازل ہوئیں (2)۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو کہا کرتے تھے: اگر تم نکلے اور تم نے جنگ کی تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور جنگ کریں گے۔ جب وہ نکلے تو منافق ان سے پیچھے ہٹ گئے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ جس آدمی نے اپنے اوپر کوئی عمل لازم کیا جس میں طاعت ہو تو وہ اس کو پورا کرے صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے آپ نے اہل بصرہ کے قراء کی طرف پیغام بھیجا تو آپ کی خدمت میں تین سو آدمی حاضر ہوئے جنہوں نے قرآن پڑھ رکھا تھا (3)۔ فرمایا: تم اہل بصرہ کے بہترین لوگ ہو اور ان کے قاری ہو تم اس کی تلاوت کرو تم پر کوئی عرصہ نہ گزرے کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں جس طرح ان کے دل سخت ہو گئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ہم ایک ایسی سورت پڑھتے تھے جو طوالت اور شدت میں سورۂ براءت جیسی تھی، مجھے وہ بھلا دی گئی مگر مجھے اتنی بات یاد ہے کہ اس میں تھا اگر انسان کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو تیسری وادی کی خواہش کرتا ہے مٹی کے سوا کوئی چیز انسان کے پیٹ کو بھر نہیں سکتی۔ ہم ایک سورت پڑھا کرتے تھے جسے ہم مسبحات سورتوں میں سے ایک کے مشابہ خیال کرتے تو وہ مجھے بھلا دی گئی مگر مجھے اس میں سے یہ یاد ہے: اے مومنو! تم وہ کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ تمہاری گردنوں میں بطور شہادت اسے لکھ دیا جائے گا اور قیامت کے روز تم سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 371 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 527

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، کراھیۃ حرص علی الدنیا، جلد 1، صفحہ 335

ابن عربی نے کہا: یہ سب باتیں دین میں ثابت ہیں جہاں تک یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ کا تعلق ہے یہ تو دین میں لفظ اور معنی کے اعتبار سے اس سورت میں ثابت ہے(1)۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ تمہاری گردنوں میں شہادت ہوئی اور قیامت کے روز اس بارے میں تم سے پوچھا جائے گا، یہ معنی کے اعتبار سے دین میں ثابت ہے کیونکہ جو کسی چیز کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے وہ شرعاً اس پر لازم ہو جاتی ہے۔ جو چیز لازم ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ا: نذر، نذر کی بھی دو قسمیں ہیں (ا) جو ابتداء عبادت ہو جس طرح کسی کا یہ قول ہے: بِلّٰهِ عَلَیَّ صلاۃٌ و صومٌ و صدقۃٌ اللہ کے لیے مجھ پر نماز، روزہ اور صدقہ ہے یا اسی طرح کسی عبادت کا ذکر کرے۔ بالاجماع اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ (۲) نذر مباح۔ اس سے مراد ایسی نذر ہے جس کو اس نے پسندیدہ شرط کے ساتھ معلق کیا ہو جس طرح اس کا قول ہے: اگر میرا غائب آیا تو مجھ پر صدقہ لازم ہے۔ یا کسی خوف والی شرط کے ساتھ معلق کرے جیسے: اگر اللہ تعالیٰ میری فلاں تکلیف کے لیے کافی ہو گیا تو مجھ پر صدقہ لازم ہے۔ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے کہا: اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ امام شافعی نے اپنے ایک قول میں کہا: اس کو پورا کرنا لازم نہیں آیت کا عموم ہماری دلیل ہے، کیونکہ آیت کا مطلق ہونا ان آدمیوں کی مذمت کو شامل ہے جو کسی طور پر بھی ایسا نہ کرے خواہ وہ مطلق ہو یا شرط کے ساتھ مقید ہو۔ امام شافعی کے اصحاب نے کہا: بے شک وہ نذر جس سے عبادت کا مقصد ہو۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ عبادت کی جنس سے ہو۔ یہ اگرچہ عبادت کی جنس سے تو ہے مگر اس کے ساتھ عبادت کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ اس سے یہ قصد کیا گیا ہے کہ اپنے نفس کو کسی فعل سے روکنے یا کسی فعل کے کرنے کا قصد کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں: تمام شرعی عبادات حقیقت میں مشقتیں اور مشکل امور ہیں، اگرچہ یہ عبادات ہیں۔ یہ کسی نفع کے حصول یا تکالیف کو دور کرنے کے لیے کسی مشقت کے ساتھ قربت کو لازم کرنا ہے۔ تو یہ امور مکلف بنانے سے خارج نہ ہوں گے۔ ابن عربی نے کہا: اگرچہ جو بات کی گئی ہے وہ وعدہ ہے تب بھی اس سے خالی نہیں کہ یہ کسی سبب پر منحصر ہو جس طرح کوئی کہتا ہے: إنْ تزوجت أعنتك بدينار، اگر میں نے شادی کی تو ایک دینار کے ساتھ تیری مدد کروں گا یا اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تجھے یہ عطا کروں گا۔ یہ لازم ہے فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ اگر صرف وعدہ ہو تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اپنے مطلق ہونے کی وجہ سے لازم ہو گیا۔ انہوں نے آیت کے سبب سے استدلال کیا ہے۔ کیونکہ روایت کی گئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: اگر ہم ایسا عمل جانتے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے افضل ہے یا اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب ہے تو ہم ضرور اس پر عمل کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ ایسی حدیث ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔ مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کو سنا تو کہا: میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے آپ کو روکے رکھوں گا یہاں تک کہ شہید کیا جاؤں۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وعدہ عذر کے بغیر ہر صورت میں پورا کرنا لازم ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک نے کہا جہاں تک وعدہ کا تعلق ہے جس طرح ایک آدمی کسی سے سوال کرتا ہے کہ وہ اسے کوئی چیز ہبہ کرے تو وہ آدمی کہتا ہے: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر اس کے لیے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے تو میں اسے نہیں دیکھتا کہ یہ اس پر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1800-1799

لازم ہوگا۔ ابن قاسم نے کہا: جب اس نے قرض خواہوں سے وعدہ کیا اور کہا: میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے ہبہ کر دیا جو وہ تمہیں دے دے گا۔ یہ اس پر لازم ہو جائے گا، مگر اس کا یہ کہنا: ہاں میں ایسا کروں گا۔ پھر اس کے لیے ظاہر ہوا (کہ وہ اسے نہ دے) تو میں اس پر کوئی چیز لازم نہیں دیکھتا۔

میں کہتا ہوں: اس پر اس چیز کو لازم نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تک مکارم اخلاق اور حسن مروت کا تعلق ہے تو اس حد تک تو ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کی تعریف کی ہے جس نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا اور اپنی نذر کو پورا کیا فرمایا: وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (البقرہ: 177) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ٘ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم: 54) اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3۔** امام نخعی نے کہا: تین آیات ایسی ہیں جنہوں نے مجھے منع کر رکھا ہے کہ میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کروں اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 44) وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ہود: 88) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الصف) ابو نعیم حافظ نے مالک بن دینار سے وہ ثمامہ سے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں ایک قوم کے پاس آیا جن کے منہ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے جب بھی انہیں کاٹا جاتا تو وہ پھر بڑھ جاتے۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ حضرت جبریل امین نے عرض کی: یہ تیری امت کے خطباء ہیں جو کہتے ہیں، عمل نہیں کرتے، وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے''(1)۔ سلف صالحین کے بارے میں مروی ہے: ان سے عرض کی گئی: ہمیں کچھ بیان کیجئے تو وہ خاموش رہے پھر انہیں کہا گیا: ہمیں کچھ بیان کیجئے۔ فرمایا: کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں ایسی بات کروں جو میں خود نہ کروں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا جلدی مستحق ہو جاؤں۔

**مسئلہ نمبر 4۔** لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ کلمہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے کہ انسان بھلائی کا ذکر تو کرے مگر خود اس پر عمل نہ کرے، اگر یہ ماضی سے متعلق ہو تو یہ جھوٹ ہوگا اور مستقبل سے متعلق ہو تو یہ وعدہ خلافی ہوگی۔ دونوں چیزیں مذموم ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی یہ تاویل بیان کی ہے جو معاملہ تمہارے قبضہ میں نہیں تم وہ کیوں کہتے ہو تم نہیں جانتے کہ کیا تم اس کو کر سکو گے یا نہیں کر سکو گے۔ اس صورت میں کلام ظاہر معنی پر محمول ہوگی کہ ایسے قول پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ امام شافعی کے ایک قول کے مطابق غضب کی حالت میں بھی وفا کرنا ضروری ہے۔ ان مابعد سے ملکر مبتدا ہے اور ماقبل اس کی خبر ہے گویا فرمایا: تمہارا ایسی بات کرنا جس پر خود عمل نہ کرو یہ مذموم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ کسائی نے کہا: ان محل رفع میں ہے کیونکہ كَبُرَ ایسا فعل ہے جو بئس رجلا اخوك کے قائم مقام ہے اور مَقْتًا تمیز کے طور پر منصوب ہے۔ معنی یہ بنتا ہے۔ کبر قولهم مالا یفعلون

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 195، حدیث 29026

مقتا ان کا ایسی بات کرنا جس پر وہ عمل پیرا نہ ہوں یہ بڑی ناراضگی کا باعث ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حال ہے مقتا اور مقاتہ یہ دونوں مصدر ہیں یوں کہا جاتا ہے: رجل مقیت و ممقوت جب لوگ اسے پسند نہ کریں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ بہت محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا وہ صف بندی کرتے ہیں۔ مفعول یہ مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہے یصفون أنفسهم صفا۔

كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ فراء نے کہا: وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (1)۔ مبرد نے کہا: یہ رصصت البناء سے مشتق ہے جب تو اسے اس طرح بنا دے کہ وہ ایک ٹکڑے کی طرح ہو جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رصیص سے مشتق ہے اس سے مراد دانتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ جڑنا ہے۔ تراص سے مراد باہم جڑنا ہے۔ اسی سے تراصوا فی الصف ہے آیت کا معنی ہے۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنی جگہ جم جاتا ہے جس طرح دیوار ایک جگہ ثابت رہتی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو تعلیم ہے کہ جب دشمنوں سے جنگ کا مرحلہ ہو تو وہ کیسے رہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ بعض اہل تاویل نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ پیدل کا جہاد شاہسوار کے جہاد سے افضل ہے کیونکہ شاہسوار اس طریقہ سے صف بندی نہیں کرتے۔ مہدوی نے کہا: یہ درست نہیں کیونکہ شہسوار کے اجر اور غنیمت میں فضیلت کا ذکر ہے۔ شاہسوار آیت کے معنی سے خارج نہیں کیونکہ اس کا معنی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ صف سے نکلنا جائز نہیں مگر ایسی ضرورت کی بناء پر جو انسان کو لاحق ہوتی ہے یا ایسے پیغام کی وجہ سے جو امام بھیجتا ہے یا ایسی منفعت میں جو خاص مقام میں ظاہر ہوتی ہے یا فرصت جس کا موقع ملتا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

دعوت مبارزت کے لیے صف سے نکلنے میں دو قول ہیں۔ (۱) اس بارے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ مقصد دشمن کو خوفزدہ کرنا ہے، شہادت کو طلب کرنا ہے اور قتال پر برانگیختہ کرنا ہے۔ ہمارے اصحاب کہتے ہیں: کوئی آدمی دعوت مبارزت کے لیے نہ نکلے کیونکہ اس میں ریا کاری اور اس امر کی طرف نکلنا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ مبارزت اس وقت ہے جب کافر اسے طلب کرے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں غزوہ بدر اور غزوہ خیبر میں ہوا۔ سلف صالحین کا یہی انداز رہا۔ سورۂ بقرہ آیت 195 میں وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کے ضمن میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 528　2۔ ایضاً

''اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم مجھے کیوں ستاتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں، پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا، اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ جب جہاد کے امر کا ذکر کیا تو یہ بیان کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید کا حکم دیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کا حکم دیا اور جن لوگوں نے ان کی مخالفت کی ان پر عقاب نازل ہوا، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی قوم کے سامنے اس قصہ کا ذکر کیجئے۔

یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ یہ اس وقت ہوا جب آپ کی قوم نے آپ پر ادرہ (ایک بیماری جس کی وجہ سے خصیتین پھول جاتے ہیں) کی تہمت لگائی جس طرح سورۂ احزاب میں گزرا ہے۔ اذی سے مراد وہ ہے جس کا ذکر قارون کے واقعہ میں گزر چکا ہے۔ قارون نے ایک عورت کے ساتھ سازش کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فسق و فجور کا دعویٰ کرتی۔ اور اذی سے مراد وہ قول بھی ہے جس کا ذکر اس ارشاد باری میں ہے۔ اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف: 138) فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ (المائدہ: 24) اور ان کا یہ قول کہ تو نے ہارون کو قتل کیا۔ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ رسول کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کی تعظیم بجالائی جاتی ہے۔ تَعْلَمُوْنَ پر قد تاکید کے لیے ہے گویا فرمایا: تم یقینی علم جانتے ہو، تمہارے لیے اس میں کوئی شبہ نہیں۔

فَلَمَّا زَاغُوْۤا جب وہ حق سے مائل ہوئے اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ انہیں ہدایت سے دور کرایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ طاعت سے پھرے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت سے پھیر دیا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان سے پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ثواب سے پھیر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور رب کی طاعت کو ترک کر دیا جن کا انہیں حکم دیا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں گمراہی کو پیدا کر دیا جو ان کے فعلوں پر ان کے لیے عقوبت ہے۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

''اور یاد کرو جب فرمایا عیسیٰ فرزند مریم نے: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہے اور مژدہ دینے والا ہوں ایک رسول کا جو تشریف لائے گا میرے بعد اس کا نام (نامی) احمد ہوگا، پس جب وہ (احمد) آیا ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر تو انہوں نے کہا: یہ تو کھلا جادو ہے''۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 528

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ان کے لیے یہ قصہ بھی بیان کرو فرمایا: اے بنی اسرائیل! اے میری قوم نہیں فرمایا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان میں نسب نہیں تھا کہ وہ ان کی قوم ہوتے۔ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ میں انجیل دے کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں، تورات میں میری صفت موجود ہے، میں تمہارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں لایا جو تورات کے خلاف ہو کہ تم مجھ سے نفرت کرتے۔ اور میں رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں۔ مُبَشِّرًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس میں عامل ارسال کا معنی ہے۔ اِلَيْكُمْ رسول کا صلہ ہے۔

يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے من بعدی میں یاء کو فتحہ دیا ہے(1)۔ یہ سلمی، زر بن حبیش اور ابوبکر کی عاصم سے منقول قراءت ہے؛ ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ اسم ہے، جس طرح بعدك میں کاف اور قمت میں تاء مفتوح ہے۔ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ میں یاء کو لفظوں سے حذف کر دیا ہے۔ احمد یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ یہ ایسا اسم علم ہے جو صفت سے منقول ہے فعل سے منقول نہیں۔ اس صفت سے مراد اسم تفضیل ہے۔ احمد کا معنی حمد کرنے والوں میں سے اپنے رب کی سب سے زیادہ حمد کرنے والا۔ تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے ہیں اور ہمارے نبی ان میں سے سب سے زیادہ حمد کرنے والے ہیں۔ جہاں تک لفظ محمد کا تعلق ہے۔ یہ بھی صفت سے منقول ہے۔ یہ محمد کے معنی میں ہے لیکن اس میں مبالغہ اور تکرار کا معنی پایا جاتا ہے۔ پس محمد اس کو کہیں گے جس کی یکے بعد دیگرے تعریف کی جاتی ہو جس طرح مکرم ہے جس کی بار بار تکریم کی جاتی ہو اسی طرح ممدح وغیرہ ہے۔ اسم محمد اپنے معنی کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس سے قبل رکھا کہ اپنا یہ نام رکھتے یہ نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں محمود ہیں کیونکہ آپ کے علم و حکمت کی طرف رہنمائی کی گئی اور اس سے نفع اٹھایا گیا، وہ آخرت میں شفاعت کی وجہ سے محمود ہیں جس طرح لفظ تقاضا کرتا ہے اس طرح حمد کے معنی میں تکرار ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم محمد نہ ہوتے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احمد ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی حمد کی، اس کی عظمت شان اور شرف کو بیان کیا، اسی وجہ سے احمد کا اسم اس اسم پر مقدم ہوا جو محمد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کا ذکر کیا فرمایا: اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ذکر کیا جب ان کے رب نے انہیں ارشاد فرمایا: وہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ فرمایا: اے اللہ! مجھے احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے بنا دے۔ انہوں نے محمد کے ذکر سے قبل احمد کا ذکر کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی جو حمد کی ہے وہ اس سے قبل واقع ہوا جب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پائی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالفعل محمد ہو گئے۔ شفاعت میں بھی صورت حال اسی طرح ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی ایسے الفاظ کے ساتھ حمد کریں گے جو اللہ تعالیٰ ان پر القا کرے گا، آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر حمد کرنے والے ہوں گے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے تو شفاعت کی وجہ سے

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 47

آپ ﷺ کی تعریف کی جائے گی۔

یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تورات میں میرا نام احید ہے کیونکہ میں اپنی امت کو آگ سے دور کروں گا(1)۔ زبور میں میرا نام ماحی ہے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے بت پرستی کو مٹایا ہے۔ انجیل میں میرا نام احمد ہے اور قرآن میں میرا نام محمد ہے، کیونکہ میں اہل سماء اور اہل زمین میں محمود ہوں''۔ صحیح میں ہے: ''میرے پانچ نام ہیں میں محمد، احمد، ماحی: اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹاتا ہے) حاشر (میرے قدموں پر لوگوں کو اٹھائے گا) اور عاقب ہوں''(2)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ** ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں بینات سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت محمد ﷺ ہیں **قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ** کسائی اور حمزہ نے اسے ساحر پڑھا ہے۔ یہ رجل کی صفت ہے۔ ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے: یہ حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے باقی قراء نے سحر پڑھی ہے۔ یہ اس کی صفت ہے جو رسول اللہ ﷺ لائے۔

**وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝**

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھتا ہے حالانکہ اسے بلایا جارہا ہے اسلام کی طرف، اور اللہ تعالیٰ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

**وَ مَنْ اَظْلَمُ** یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ **مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ** اس کے بارے میں گفتگو پہلے کئی بار گزر چکی ہے۔ **وَ هُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ** اس آدمی پر تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے جس نے معجزات کے ظاہر ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا۔ طلحہ بن مصرف نے وھو یَدّعی قراءت کی ہے، یعنی وہ منسوب ہوتا ہے۔ یَدّعی اور یَنْتَسِبُ دونوں برابر ہیں۔ **وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝** اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں ہے کہ اس پر گمراہی کی مہر لگائی جائے گی۔

**يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝**

''یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے، لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا خواہ سخت ناپسند کریں اس کو کافر''۔

**يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ** اطفاء کا معنی بجھانا ہے(3)۔ دونوں لفظ آگ کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اطفاء اور اخماد ضیاء اور ظہور میں بھی استعمال ہوتے ہیں جو آگ کے قائم مقام ہیں۔ اطفاء اور اخماد میں ایک وجہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 529
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ صف، جلد 2، صفحہ 727
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 5، صفحہ 530

سے فرق ہے۔ اطفاء قلیل اور کثیر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اخماد کثیر میں استعمال ہوتا ہے، قلیل میں استعمال نہیں ہوتا۔ یہ جملہ تو کہا جاتا ہے: اطفات السراج یہ نہیں کہا جاتا: اخمدت السراج۔

نور اللہ کے بارے میں یہاں پانچ قول ہیں۔ (۱) مراد قرآن ہے، وہ قول کے ذریعے اس کو باطل کرنے اور جھٹلانے کا ارادہ کرتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس اور ابن زید کا قول ہے۔ (۲) مراد اسلام ہے۔ وہ کلام کے ذریعے اس کو رد کرنا چاہتے ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے۔ (۳) مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وہ بناوٹی جھوٹی خبروں کے ساتھ آپ کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ (۴) اللہ تعالیٰ کے دلائل ہیں وہ اپنے انکار اور تکذیب کے ساتھ دلائل کا ابطال چاہتے ہیں؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ (۵) یہ ضرب المثل ہے۔ جس نے اپنے منہ سے سورج کے نور کو بجھانا چاہا تو وہ اسے محال اور ممتنع پائے گا اسی طرح جس نے حق کو باطل کرنے کا ارادہ کیا؛ اسے ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے۔ اس آیت کا شان نزول ہے جو عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس روز تک وحی نہیں آئی تو کعب بن اشرف نے کہا: اے یہودیو! خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے اس نور کو بجھا دیا جو ان پر نازل ہوتا تھا ان کا معاملہ مکمل ہونے والا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اور اس کے بعد وحی کا اتصال رہا؛ ماوردی نے ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۞ آفاق میں ظاہر کرنے کے ساتھ۔ ابن کثیر، حمزہ، کسائی اور بعض نے عاصم سے وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ اضافت کے ساتھ قراءت کی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: 185) اور اس جیسی دوسری آیات ہیں جس طرح اس کی وضاحت سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے باقی قراء نے مُتِمٌّ نُوْرَهٗ پڑھا ہے کیونکہ اسم فاعل کا صیغہ مستقبل کے معنی میں ہے تو یہ عمل کرے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۞ تمام قسم کے کافر اسے ناپسند کریں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۞

”وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ غالب کر دے اسے سب دینوں پر خواہ سخت ناپسند کریں اس کو مشرک“۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وہی ذات پاک ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق اور ہدایت کے ساتھ مبعوث کیا۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ یعنی دلائل کے ساتھ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔ ظہور سے مراد جنگ میں طاقت کے ذریعے غلبہ ہے۔ ظہور سے مراد یہ نہیں کہ کوئی دوسرا دین باقی ہی نہ رہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مسلمان غالب اور بلند ہوں گے اور آخر زمانہ میں اسلام کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظاہر ہونے کے ساتھ دین غالب ہوگا اس وقت کوئی کافر باقی نہیں رہے گا مگر سب مسلمان ہو جائیں گے۔ مجاہد نے کہا: یہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے تو زمین میں کوئی دین باقی نہیں رہے گا مگر

صرف دین اسلام ہوگا(1)۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت ابن مریم علیہ السلام عادل ثالث کی حیثیت سے اتریں گے۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، نوجوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائیگا ان پر کوشش نہیں کی جائیگی دشمنی، باہم بغض اور باہم حسد ختم ہو جائے گا، مال کی طرف لوگوں کو بلایا جائیگا تو اسے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا''(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ادیان پر مطلع فرمائے گا یہاں تک کہ آپ ان کے عالم اور ان کی بطلان کی وجوہ سے آگاہ ہو جائیں گے اور انہوں نے جو تحریف اور تبدیلی کی ہے اس پر مطلع ہو جائیں گے۔

عَلَى الدِّيْنِ مراد تمام دین ہیں کیونکہ دین مصدر ہے اس کے ساتھ جمع کو بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچا لے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم حقیقت کو جانتے ہو، اللہ تعالیٰ بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو اور داخل کرے گا تمہیں باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں اور پاکیزہ مکانوں میں جو سدا بہار باغوں میں ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جو تمہیں بڑی پسند ہے (وہ بھی ملے گی) یعنی اللہ کی جانب سے نصرت اور فتح جو بالکل قریب ہے، اور (اے حبیب) مومنوں کو (یہ) بشارت سنا دیجئے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ مقاتل نے کہا: یہ آیت حضرت عثمان بن مظعون کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کاش! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیتے تو میں خولہ کو طلاق دیتا، رہبانیت اختیار کرتا، اپنے آپ کو خصی کر لیتا، گوشت کو اپنے اوپر حرام کر لیتا، رات کو کبھی بھی نہ سوتا اور دن کو کبھی بھی افطار نہ کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری سنت میں سے نکاح بھی ہے، اسلام میں کوئی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 526
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، نزول عیسیٰ بن مریم، جلد 1، صفحہ 87

رہبانیت نہیں میری امت کی رہبانیت اللہ کی راہ میں جہاد ہے، میری امت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم پر حلال کی ہیں انہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو۔ میری سنت یہ بھی ہے کہ میں سوتا ہوں، میں قیام کرتا ہوں، میں روزہ افطار کرتا ہوں اور روزہ رکھتا بھی ہوں۔ جو میری سنت سے اعراض کرے تو وہ مجھ سے نہیں'' (1)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں پسند کرتا ہوں کہ میں یہ جانوں کہ کونسی تجارت اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب ہے؟ تو میں وہ تجارت کروں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے۔ اَدُلُّكُمْ کا معنی ہے میں عنقریب تمہیں بتاؤں گا۔ تجارت سے مراد جہاد ہے؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ (التوبہ: 111) یہ خطاب تمام مومنوں کو ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے: یہ خطاب اہل کتاب کو ہے۔

**مسئلہ نمبر 2۔** تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارہ دلائے۔ اس کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ عام قراءت تُنْجِيْكُمْ ہے۔ حضرت حسن بصری، ابن عامر اور ابوحیوہ نے تُنَجِّيكم مشدد پڑھا ہے یہ تنجیہ سے مشتق ہے پھر تجارت کی وضاحت کی۔

**مسئلہ نمبر 3۔** تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ اموال کا پہلے ذکر کیا کیونکہ خرچ کرنے کا سلسلہ اس سے شروع ہوتا ہے۔ ذٰلِكُمْ، خَيْرٌ لَّكُمْ، تمہارا یہ فعل تمہارے اموال اور تمہاری ذاتوں سے بہتر ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، مبرد اور زجاج کے نزدیک تومنون، امنوا کے معنی میں ہے اسی وجہ سے جواب امر کے طور پر يَغْفِرْ لَكُمْ مجزوم ہے۔ عبداللہ کی قراءت میں امنوا باللہ ہے۔ فراء نے کہا يَغْفِرْ لَكُمْ استفہام کا جواب ہے۔ یہ اس صورت میں صحیح ہوگا جب اسے معنی پر محمول کریں یہ صورت اس وقت ہوگی جب تومنون باللہ و تجاھدون، هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ کا عطف بیان ہو گویا تجارت کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا ہے؟ تو ایمان و جہاد اس کا بیان ہے۔ گویا فرمایا: کیا تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اور جہاد کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے گا۔ زمخشری نے کہا: دلالت کا متعلق تجارت ہے(2) اور تجارت کی تفسیر ایمان و جہاد سے بیان کی گئی ہے گویا فرمایا: کیا تم ایمان و جہاد کے ساتھ تجارت کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے گا۔ مہدوی نے کہا: اگر تو اس کلام کو مقدر نہ کرے تو مسئلہ صحیح نہ ہوگا تقدیر کلام یوں ہوگی: ان دللتم یغفر لکم، غفران کی صفت قبول و ایمان سے لگائی گئی ہے، دلالت کے ساتھ اس کی صفت نہیں لگائی گئی۔ زجاج نے کہا: اس طرح نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں ایسی چیز پر راہنمائی کرے جو انہیں بخش دے بے شک اللہ تعالیٰ انہیں بخشتا جب وہ ایمان لائیں اور جہاد کریں۔ زید بن علی نے تومنوا اور وتجاھدوا قراءت کی ہے یعنی لام امر مضمر ہے؛ جس طرح شاعر کا قول ہے:

مُحَمَّد تَفْدِ نَفْسَكَ كُلُّ نَفْسٍ إذا ما خِفْتَ من شئ تَبَالا(3)

اے محمد! یہ نفس تیرے نفس پر فدا ہو جائے جب تو کسی چیز سے ہلاکت کا خوف کرے۔ مراد لتفد ہے۔ بعض نے ادغام کیا اور کہا: یغفر لکم بہترین ادغام کو ترک کرنا ہے کیونکہ راء حرف متکرر ہے، قوی ہے اس کا ادغام لام میں اچھا نہیں کیونکہ

1۔ سنن دارمی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 58، حدیث 2175 (روایت بالمعنی)
2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 527
3۔ ایضاً

اقوی کو اضعف میں مدغم نہیں کیا جاتا۔

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً ابوالحسین آجری نے حضرت حسن بصری سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً کی تفسیر کے بارے میں پوچھا دونوں نے کہا: باخبر آدمی کے پاس تو پہنچا ہے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا فرمایا: ''جنت میں یہ موتی سے بنا محل ہے جس میں سرخ یاقوت کی ستر حویلیاں ہونگی اور ہر حویلی میں ستر سبز زبرجد کے کمرے ہونگے، ہر کمرے میں ستر پلنگ ہونگے، ہر پلنگ پر مختلف قسم کے ستر بستر ہونگے اور ہر بستر پر ستر حوریں ہونگی، ہر کمرے میں ستر دستر خوان ہونگے، ہر دستر خوان پر ستر قسم کے کھانے ہونگے، ہر کمرے میں ستر خادم اور خادمائیں ہونگی اللہ تعالیٰ ہر مومن کو ایک دن میں اتنی قوت عطا کرے گا جس کے باعث تمام حوروں کے پاس جاسکے گا'' (1)۔

فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ عدن کا معنی ٹھہرنا ہے۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ یہ دائمی اور بڑی سعادت ہے۔ کامیابی کی اصل یہ ہے کہ انسان دائمی چیز حاصل کرے۔

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا فراء اور اخفش نے کہا: اخری کا عطف تجارۃ پر ہے۔ یہ محل جر میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا محل رفع ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی لکم خصلةٌ اخری و تجارةٌ اخری تحبونها۔

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ تقدیر کلام یہ ہے۔ ھو نصر من اللہ۔ اس تعبیر کی صورت میں نصر، اخری کی تفسیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نصر، اخری سے بدل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی۔ ولکم نصرٌ من اللہ و فتح قریب۔ یعنی دنیا میں غنیمت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد فتح مکہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مراد ایران اور روم کی فتح ہے (2)۔

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مومنوں کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! اللہ کے (دین کے) مددگار بن جاؤ جس طرح کہا تھا عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں سے: کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف بلانے میں؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں، پس ایمان لے آیا ایک گروہ بنواسرائیل سے اور کفر کیا دوسرے گروہ نے پھر ہم نے مدد کی جو ایمان لائے دشمنوں کے مقابلے میں بالآخر وہی غالب رہے''۔

جہاد کے امر کو موکد کیا یعنی اپنے نبی کے حواری بنو تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے مخالفین پر غلبہ دے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو ان کے مخالفین پر غلبہ دیا۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور نافع نے أنصاراً للہ تنوین کے ساتھ پڑھا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 153 2۔ زادالمسیر، جلد 4، صفحہ 46

ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اس کا معنی ہے تم ثابت قدم رہو اور تلوار کے ساتھ اس کے دشمنوں کے خلاف اللہ تعالیٰ کے مددگار بنو۔ باقی قراء جو بصرہ، کوفہ اور شام سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اسے اَنْصَارَ اللّٰهِ تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسم سے لام اضافت حذف کر دیا ہے۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ یہاں تنوین نہیں۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار بن جاؤ۔ پھر کہا: کلام میں اضمار ہے یعنی اے محمد! انہیں کہو اللہ تعالیٰ کے مددگار بن جاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب خطاب کا آغاز ہے یعنی تم حمایتی بن جاؤ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نے کیا۔ بحمد اللہ وہ انصار تھے اور وہ حواری تھے اور حواری رسولوں کے خاص لوگ ہوتے ہیں۔ معمر نے کہا: بحمد اللہ انہوں نے مدد کی تو ان کی تعداد ستر تھی انہیں لوگوں نے ہی عقبہ کی رات سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قریش میں سے تھے، قتادہ نے ان کا نام بھی لیا یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن مالک، حضرت ابو عبیدہ بن جراح ان کا نام عامر تھا، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت حمزہ بن مطلب، حضرت سعید کا ذکر نہیں کیا اور حضرت جعفر بن ابی طالب کا ذکر کیا رضی اللہ عنہم۔

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منتخب افراد تھے انکی تعداد بارہ تھی۔ ان کے اسماء آل عمران میں گزر چکے ہیں۔ یہ وہ پہلے افراد ہیں جو بنی اسرائیل میں سے آپ پر ایمان لائے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا: جب تو بستی میں داخل ہو تو اس نہر پر جا جس پر دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں، ان سے مدد طلب کر۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کون میرا مددگار ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم آپ کی مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور آپ کی مدد کی۔ یہاں الی، مع کے معنی میں ہے جس طرح تو کہتا ہے: الذود الی الذود اهل یہاں بھی الی مع کے معنی میں ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے کون میری ان معاملات میں مدد کرے گا جو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کریں گے؟ سورۃ آل عمران میں یہ بات گزر چکی ہے۔

فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد دو طائفوں نے باہم اختلاف کیا جس طرح آل عمران میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ۔ عدوهم، عدد سے مراد وہ ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۠ ○ وہ غالب آ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد اس طرح کی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو کفار کے دین پر غلبہ دیا۔ مجاہد نے کہا: جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانہ میں ہی ان کی کفار کے خلاف مدد کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آج دونوں گمراہ فرقوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی۔ جس نے کہا: وہ اللہ تھا تو وہ خود اوپر چلا گیا۔ جس نے کہا: وہ اللہ کا بیٹا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اوپر اٹھا لیا۔ نعوذ باللہ کیونکہ حضرت عیسیٰ بن مریم نے کسی سے جہاد نہیں کیا اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ میں بھی کوئی جہاد نہ ہوا۔ زید بن علی اور قتادہ نے کہا: فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۠ ○

کا معنی ہے وہ حجت اور برہان کے ساتھ غالب آ گئے کیونکہ جو روایت کی گئی ہے اس میں ہے انہوں نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو یا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نہیں سوتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھانا کھایا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نہیں کھاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قاصدوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن حواریوں اور پیروکاروں کو بھیجا ان میں فطرس اور بولس کو رومیہ کی جانب، اندرائیس اور متی کو اس علاقہ کی جانب جہاں کے لوگ انسانوں کو کھا جاتے تھے توماس کو بابل کی جانب جو مشرق کی جانب تھا۔ فیلبس کو قرطاجنہ کی جانب جو افریقہ ہے۔ یحنس کو دقسوس کی جانب جو اہل کہف کی بستی ہے۔ یعقوبیس کو اوریشلم کی جانب جو بیت المقدس ہے۔ ابن تلما کو عرب کی جانب جو حجاز کا علاقہ ہے۔ سیمن کو بربر کے علاقہ کی جانب۔ یہوداا ور بردس کو اسکندریہ اور اس کے اردگرد کے علاقہ کی جانب۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد دلیل کے ساتھ کی۔ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۝ وہ غالب آ گئے۔ یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: ظهرت على الحائط میں دیوار پر چڑھا۔

اللہ تعالیٰ ہی حقیقت حال کو بہتر جانتا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا اور ٹھکانہ ہے۔

# سورۃ الجمعہ

﴿ اٰیاتھا ۱۱ ﴾ ﴿ ۶۲ سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۰ ﴾ ﴿ رکوعاتھا ۲ ﴾

تمام کے قول میں یہ سورت مدنی ہے، اس کی گیارہ آیات ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے بہتر دن جس پر سورج طلوع ہوتا ہے وہ یوم جمعہ ہے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اس دن آپ کو جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن اسے نکالا گیا اور قیامت بھی اسی روز قائم ہوگی'' (1)۔

آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہم قیامت کے روز آخر بھی ہیں، اول بھی ہیں۔ جو لوگ جنت میں داخل ہونگے ہم ان میں اوّل ہیں اس کے باوجود کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی انہوں نے آپس میں اختلاف کیا انہوں نے جس میں اختلاف کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق کی ہدایت کی۔ یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت عطا کی'' (2)۔ فرمایا: ''جمعہ کا روز آج ہمارے لیے ہے اگلا روز یہود کے لیے ہے اور اس کے بعد والا دن نصاری کے لیے ہے''۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝

''اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے جو بادشاہ ہے نہایت مقدس ہے زبردست ہے حکمت والا ہے''۔

اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ابو العالیہ اور نصر بن عاصم نے اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ قراءت کی ہے۔ یہ سب مرفوع ہیں تقدیر کلام یوں ہے ھو الملكُ۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الامیون سے مراد تمام عرب ہیں خواہ ان

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، فضیلۃ الجمعۃ، جلد 1 صفحہ 282 — 2۔ ایضاً

میں سے کوئی لکھنا جانتا ہو یا لکھنا نہ جانتا ہو کیونکہ وہ اہل کتاب نہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: امی سے مراد وہ ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔ قریش اسی طرح تھے۔ منصور نے ابراہیم سے روایت نقل کی ہے کہا: امی وہ ہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

**رَسُوْلًا مِّنْهُمْ** مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ عربوں میں سے کوئی قبیلہ ایسا نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے رشتہ داری تھی سب کا آپ سے نسبی تعلق ہے۔ حضرت ابن اسحاق نے کہا: مگر بنی تغلب اس میں شامل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نصرانی ہونے کی وجہ سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے پاک رکھا، انہیں آپ کے نسب سے تعلق نہیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے کوئی کتاب نہ پڑھی اور نہ کسی سے سیکھا۔ ماوردی نے کہا: اگر یہ سوال کیا جائے: احسان جتلانے کی وجہ کیا ہے(1)؟ اگر نبی امی کو مبعوث کیا؟ جواب تین طریقوں سے ہوگا۔ (۱) انبیاء نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دی اس کے یہ موافق ہے۔ (۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال امیوں کے حال کے موافق ہے، ان کے ساتھ موافقت میں زیادہ قریب تھے۔ (۳) اس سوئے ظن کی نفی مقصود ہے کہ آپ ان چیزوں کی تعلیم دیتے ہیں جو کتابیں آپ نے پڑھی ہیں اور وہ حکمتیں جن کی آپ نے تعلیم دی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ سب کچھ ان کے معجزہ کی اور نبوت کی صداقت کی دلیل ہے۔

**یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ** آیات سے مراد قرآن ہے۔ **وَ یُزَكِّیْهِمْ** اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ ان کے دلوں کو پاکیزہ بناتا ہے(2)؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ انہیں کفر اور گناہوں کی آلودگیوں سے پاک کرتے ہیں؛ یہ ابن جریج اور مقاتل کا قول ہے۔ سدی نے کہا: آپ ان کے اموال کی زکوٰۃ وصول کرتے ہیں۔ **وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ** کتاب سے مراد قرآن ہے۔ **وَ الْحِكْمَةَ** مراد سنت ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کتاب سے مراد قلم کے ساتھ لکھنا ہے کیونکہ لکھنا عربوں میں شرع کی وجہ سے عام ہوا جب انہیں خط کے ساتھ علوم کو مقید کرنے کا حکم دیا گیا(4)۔ حضرت امام مالک بن انس نے کہا: حِكْمَة سے مراد دین کی سمجھ ہے(5)۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

**وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ** قبل کا مضاف الیہ یا تو ضمیر ہے یا اَن یُرسِل الیهم ہے۔ یعنی آپ سے پہلے یا رسولوں کو مبعوث کرنے سے پہلے وہ حق سے بہت دور تھے۔

**وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝**

''اور دوسرے لوگوں کا بھی ان میں سے (تزکیہ کرتا ہے، تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان سے آ کر نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، حکمت والا ہے''۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 6　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 6، صفحہ 155
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 6　5۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 7

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ اس کا عطف الْاُمِّيّٖنَ پر ہے یعنی امیوں میں اور دوسرے لوگوں میں رسول بھیجا۔ یہ بھی جائز ہے اس کا عطف يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمْ کی ضمیر پر ہو، یعنی انہیں تعلیم دیتا ہے اور دوسرے مومنوں کو تعلیم دیتا ہے کیونکہ تعلیم جب آخر زمانہ تک ترتیب وار ہوگی تو سب اوّل کی طرف منسوب ہوگی تو گویا تعلیم میں سے جو بھی چیز پائی گئی اس کی والی وہ پہلی ذات ہوگی۔

لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وہ ان کے زمانہ میں نہیں وہ ان کے بعد آئیں گے۔ حضرت ابن عمر اور سعید بن جبیر نے کہا: مراد عجمی ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کون لوگ ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ اس آدمی نے ایک، دو یا تین دفعہ سوال دہرایا۔ اس آدمی نے کہا: ہم میں حضرت سلمان فارسی موجود تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ حضرت سلمان فارسی کے اوپر رکھا پھر فرمایا: ''اگر ایمان ثریا پر ہوا تو ان میں سے لوگ اسے پالیں گے'' (1)۔ ایک روایت میں ہے: ''اگر دین ثریا کے پاس ہوا تو فارس کا ایک آدمی یا فارس کے بیٹوں میں سے ایک اس تک جائے گا یہاں تک کہ اسے حاصل کرے گا''۔ الفاظ مسلم کے ہیں (2)۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد تابعین ہیں (3)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد سب لوگ ہیں یعنی عربوں کے بعد جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے؛ یہ ابن زید اور مقاتل بن حیان کا قول ہے (4)۔ دونوں نے کہا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد قیامت تک اسلام میں داخل ہونے والے افراد ہیں۔

سہل بن سعد ساعدی نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی پیٹھوں میں ایسے مرد اور عورتیں ہیں جو جنت میں حساب کے بغیر داخل ہونگے''۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ پہلا قول زیادہ پختہ ہے۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں سیاہ بکریوں کو سیراب کر رہا ہوں، پھر ان کے پیچھے مٹیالی بکریوں کو پانی پلاتا ہوں اے ابو بکر! اس کی تاویل کیجئے''۔ عرض کی: یا رسول اللہ! جہاں تک سیاہ بکریوں کا تعلق ہے اس سے مراد عرب ہیں جہاں تک مٹیالی بکریوں کا تعلق ہے عربوں کے بعد عجمی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فرشتے (جبریل امین) نے بھی یہی تاویل کی ہے''۔ ابن ابی لیلی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کی ہے: اس سے مراد حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ ہیں (5)۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے عطا فرماتا ہے اسے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فضل سے مراد ہے عجم کو قریش کے ساتھ ملا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اسلام ہے (6)،

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ جمعہ، جلد 2، صفحہ 727
2۔ صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، فضائل اہل فارس، جلد 2، صفحہ 312
3۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 51
4۔ معجم الطبرانی، جلد 6، صفحہ 201، حدیث 6005
5۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 7
6۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وحی اور نبوت ہے؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ چوتھا قول ہے: اس سے مراد وہ مال ہے جو طاعت میں خرچ کرتا ہے؛ یہ ابو صالح کے قول کا معنی ہے۔ امام مسلم، ابو صالح سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مہاجر فقراء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: مالدار لوگ بلند درجات اور ہمیشہ رہنے والی نعمتیں لے گئے۔ پوچھا: ''وہ کیا؟'' صحابہ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ روزے رکھتے ہیں جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں، وہ صدقہ کرتے ہیں، ہم صدقہ نہیں کرتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسی چیز کے بارے میں آگاہ نہ کروں جس کے ذریعے تم سبقت لے جانے والوں کو پالو گے اور بعد والوں سے سبقت لے جاؤ گے اور تم سے کوئی افضل نہیں ہوگا مگر اس صورت میں جب وہ اس طرح کا عمل کرے جیسا تم عمل کرتے ہو''۔ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا: ''تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ کہا کرو'' (1)۔

ابو صالح نے کہا: مہاجر فقراء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: ہم نے جو عمل کیا اس کے بارے میں خوشحال لوگوں نے سنا تو انہوں نے بھی اسی کی مثل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے''۔

پانچواں قول لوگوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں اطاعت کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا ہے (2)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''ان کی مثال جنہیں تورات کا حامل بنایا گیا تھا پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا اس گدھے کی سی ہے جس نے بھاری کتابیں اٹھا رکھی ہوں، (اس سے بھی زیادہ) بری حالت ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ (ایسے) ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا''۔

جب یہودیوں نے تورات پر عمل کو ترک کر دیا اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک مثال بیان فرمائی۔

**حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ** انہیں اس پر عمل کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جرجانی نے کہا: یہ حمالہ سے مشتق ہے جس کا معنی کفالت ہے، یعنی انہیں تورات کے احکام کا ضامن بنایا گیا۔ **كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا** یہ سفر کی جمع ہے اس سے مراد بڑی کتاب ہے۔ جب اسے پڑھا جاتا ہے تو یہ معنی سے پردہ کو ہٹا دیتی ہے۔ میمون بن مہران نے کہا: گدھا نہیں جانتا کہ اس کی پشت پر کتابیں ہیں یا گوبر ہے یہودیوں کی بھی یہی حالت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، استحباب الزکر بعد الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 219 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 8

تنبیہ ہے کہ جو کتاب اٹھائے وہ اس کے معانی کو سیکھے، اس میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانے تا کہ اسے بھی وہ مذمت لاحق نہ ہو جو انہیں لاحق ہوئی ہے۔ شاعر نے کہا:

زوامل للأسفار لا علم عندهم بجيدها إلّا كعلم الأباعر

لَعمُرك ما يدري البعيرُ إذا غدَا بأوساقه أو راح ما في الغرائر

کتابیں اٹھانے والے جنہیں ان میں سے عمدہ چیز کا علم نہیں ہوتا ان کا علم ایسا ہے جیسے اونٹوں کا علم ہوتا ہے۔ تیری زندگی کی قسم! اونٹ نہیں جانتا کہ بوریوں میں کیا ہے جب وہ اٹھائے جاتا ہے یا واپس آتا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

إنّ الرواة على جهل بما حَملوا مِثْلُ الجمال عليها يُحْمل الوَدَعُ

لا الوَدْع ينفعه حمل الجمال له ولا الجمال بحمل الوَدْع تنتفعُ

بے شک وہ راوی جو اس چیز سے ناواقف ہیں جس کے وہ حامل ہیں ان اونٹوں کی مانند ہیں جن پر ودیعتیں لادی گئی ہوں اونٹوں کا اس ودیعت کو اٹھانا اس امانت کو کوئی نفع نہیں دیتا اور نہ ہی امانت کا مال اٹھانے سے اونٹوں کو نفع ہوتا ہے۔

منذر بن سعید بلوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا اور خوب کہا:

إنْعِقْ بما شئت تجد أنصارًا وزُمّ أسفارًا تجد حِمارًا

يَحملُ ما وضعت من أسفارِ يحمله كمثل الحمار

يَحملُ أسفارًا له وما دَرَى إن كان ما فيها صوابًا و خطا

إن سُئلوا قالوا كذا رَوَيْنا ما إن كَذَبْنا ولا اعتدَيْنا

كبيرهم يصغر عنه الحَفْلِ لأنه قَلّد أهل الجهل

جو چاہے تو آواز لگا تو مددگار پالے گا تو کتابوں کو کس کر باندھ لے تو گدھا پالے گا تو نے جو کتابیں باندھی ہیں وہ اسے اٹھا لیتا ہے جس طرح ایک گدھا اٹھاتا ہے وہ اسی طرح اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی کتابیں اٹھاتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ ان میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں: ہم نے اسی طرح روایت کیا نہ ہم نے جھوٹ بولا اور نہ ہم نے غلطی کی۔ ان کا بڑا بھی مجمع میں حقیر ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے جاہلوں کو علم کا قلادہ پہنایا ہے۔

ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا انہوں نے اس پر عمل نہ کیا انہیں گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی جبکہ تورات ان کے ہاتھوں میں ہے وہ اس پر عمل نہیں کرتے وہ گھر سے کتابیں اٹھاتے ہیں ان کے لیے بوجھ کے سوا کوئی چیز نہیں اور نہ ہی ان کے لیے کوئی فائدہ ہے۔ یحمل حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صفت ہونے کی حیثیت سے محل جر میں ہو کیونکہ الحمار جو معرف باللام ہونے کے باوجود نکرہ ہے جس طرح اللئیم نکرہ کے حکم میں ہے۔

ولقد أمُرُّ على اللئيم يَسُبّني میں کمینے کے پاس سے گزرتا ہوں جو مجھے گالیاں دیتا ہے۔ یہاں بھی اللئیم نکرہ کے حکم میں ہے۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ مثل القوم یہ فاعل ہے اور مخصوص بالذم مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ہے تو اسم موصول سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اللہ تعالیٰ جس کے علم میں پہلے ہی موجود تھا کہ وہ کافر ہونگے انہیں ہدایت نہیں دیتا۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝

''آپ فرمایئے: اے یہودیو! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو اور لوگ (دوست) نہیں تو ذرا مرنے کی آرزو تو کرو اگر تم سچے ہو۔ اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اس کی تمنا کبھی نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو وہ اپنے ہاتھوں پہلے بھیج چکے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

جب یہودیوں نے فضیلت کا دعویٰ کیا اور کہا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اولیاء کو عظمت وشان حاصل ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ تاکہ تم بھی وہاں پہنچ جاؤ جہاں اولیاء اللہ پہنچے ہیں۔ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ۔ جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رکھی ہے اس لیے وہ موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ اگر وہ آرزو کرتے تو ضرور مرجاتے۔ اس میں ان کے قول کا بطلان ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیارے ہونے کا جو دعویٰ کیا تھا اس کا بطلان ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: والذی نفس محمد بیدہ لو تمنوا الموت ما بقی علی ظهرها یهودی الامات اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر وہ لوگ موت کی تمنا کرتے تو زمین پر کوئی یہودی باقی نہ بچتا وہ مرجاتا۔ اس میں غیب کی خبر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ سورۂ بقرہ آیت 94 قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ میں بحث گزر چکی ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''آپ (انہیں) فرمایئے: یقیناً وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہیں مل کر رہے گی پھر لوٹا دیا جائیگا تمہیں اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر چھپے اور ظاہر کو، پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان (اعمال) سے جو تم کیا کرتے تھے''۔

زجاج نے کہا: یہ نہیں کہا جاتا: ان زیدا فمنطلق یہاں ارشاد فرمایا: فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ کیونکہ الَّذِیْ میں شرط کا معنی موجود ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی اِن فَرَرْتُم منه فانه ملاقیکم ان کا فرار انہیں کوئی نفع نہ دے گا اس پر دلالت میں مبالغہ ہے۔

زہیر نے کہا:

ومن هاب أسباب المنايا يَنَلْنَهُ ولو رام أسباب السماء بسُلَّمِ

جو آدمی موتوں کے اسباب سے ڈرتا ہے تو وہ اسے پالیتی ہیں اگرچہ وہ سیڑھی کے ذریعے آسمان کے اسباب کا قصد کرے۔ میں کہتا ہوں: یہ جائز ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر مکمل ہو جائے:

الَّذِیۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ پھر نئے سرے سے کلام شروع ہو فَاِنَّهٗ مُلٰقِیۡكُمۡ۔ طرفہ نے کہا:

وکفی بالموتِ فاعلم واعظًا لمَن الموتُ علیه قد قُدِرْ

فاذکر الموتَ و حاذر ذکرہ إنّ فی الموت لذی اللُّبِّ عِبَرْ

کلُّ شیئٍ سوف یَلْقَی حَتْفَه فی مقامٍ أوعلی ظَهْرِ سَفَرْ

والمنایا حَوْلَه تَرْصُدُه لیس یُنجیه من الموت الحَذَرْ

تو جان لے موت اس کے لیے نصیحت کرنے والی کافی ہے جس پر موت مقدر کر دی گئی ہے موت کو یاد کر یا اس کے ذکر سے بچ موت میں دانشمند کے لیے عبرتیں ہیں۔ ہر شی کسی قیام گاہ یا سفر میں اپنی موت سے ملاقات کرنے والی ہے۔ موتیں اس کے ارد گرد اسے تاڑنے والی ہیں کوئی احتیاط موت سے اسے نجات نہیں دے سکتی۔

## یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الۡبَیۡعَ ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

''اے ایمان والو! جب (تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن تو دوڑ کر جاؤ اللہ کے ذکر کی طرف اور (فوراً) چھوڑ دو خرید و فروخت یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور اعمش وغیرہ نے الجمعة میم کو ساکن کرتے ہوئے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں، ان دونوں کی جمع جمعہ اور جمعات آتی ہے۔ فراء نے کہا: الجُمْعَة (میم کے سکون کے ساتھ) الجُمُعَة (میم کے ضمہ کے ساتھ) اور الجمعَة میم کے فتحہ کے ساتھ یہ یوم کی صفت ہے، یعنی یہ لوگوں کو جمع کرتا ہے جس طرح ضحکة اسے کہتے ہیں جو لوگوں کو ہنساتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن حکیم تثقیل و تفخیم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اسے جُمُعه پڑھا کرو یعنی میم مضموم ہے۔ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا: تخفیف زیادہ مناسب اور اچھی ہے جس طرح غرفة سے غرف، طرفه سے طرف، حجرة سے حجر جمع آتی ہے۔ میم کا فتحہ بنی عقیل کی لغت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے جمعہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس روز اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کو جمع کیا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ اس میں ہر شی کی تخلیق سے فارغ ہوا تو اس میں مخلوق جمع ہو گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں جماعتیں جمع ہوتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگ اس میں نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ من، فی کے معنی

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 709، حدیث 21039

میں ہے، یعنی ''دن میں''، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (فاطر: 40) یہاں بھی مِن، فی کے معنی میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابوسلمہ نے کہا: جس نے سب سے پہلے اما بعد کے الفاظ کہے وہ کعب بن لوئ تھا یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے جمعہ کو جمعہ کا نام دیا (1)۔ یوم جمعہ کو عروبہ کہا جاتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سب سے پہلے انصار نے اسے جمعہ کا نام دیا۔ ابن سیرین نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے سے قبل اور نماز جمعہ کی ادائیگی کا حکم آنے سے قبل جمعہ پڑھا اس کی وجہ یہ بنی کہ انصار نے کہا: یہودیوں کا بھی ایک دن ہے۔ جس میں وہ سب اکٹھے ہوتے ہیں ہر سات دنوں میں ایک دن ہے اور وہ ہفتے کا دن ہے۔ نصاریٰ کے لیے بھی اسی کی مثل ایک دن ہے۔ وہ اتوار ہے۔ آؤ ہم بھی جمع ہوں تاکہ ہم ایک دن مقرر کریں جس میں ہم اللہ کا ذکر کریں اور اس میں نماز پڑھیں یا جس طرح انہوں نے بات کی۔ انہوں نے کہا: ہفتہ کا دن، یہودیوں کے لیے ہے، اتوار نصاریٰ کے لیے ہے، تم وہ دن عروبہ کا معین کرلو۔ سب صحابہ حضرت اسعد بن زرارہ کے ہاں اکٹھے ہوئے حضرت اسعد بن زرارہ جو حضرت ابوامامہ کے والد تھے نے انہیں دو رکعت نماز پڑھائی اور انہیں نصیحت کی جب وہ جمع ہوئے تو انہوں نے اس کا نام یوم الجمعہ رکھ دیا۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے ایک بکری ذبح کی۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی اسی سے کھایا اور دن کا کھانا بھی اسی سے کھایا۔ اسلام میں یہ پہلا جمعہ تھا۔

میں کہتا ہوں: روایت بیان کی جاتی ہے: وہ کل بارہ افراد تھے جس طرح روایت بیان کی جاتی ہے۔ اس روایت میں یہ بھی آیا ہے: جس صحابی نے سب کو جمع کیا اور انہیں نماز پڑھائی وہ حضرت اسعد بن زرارہ تھے۔ عبدالرحمن بن کعب بن مالک اپنے باپ کعب سے اسی طرح روایت نقل کرتے ہیں جس کا ذکر آنے والا ہے۔ بیہقی نے کہا: ہم نے موسیٰ بن عقبہ سے وہ ابن شہاب زہری سے وہ حضرت مصعب بن عمیر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے مسلمانوں کو مدینہ طیبہ میں جمعہ پڑھایا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ بیہقی نے کہا: یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر نے حضرت اسعد بن زرارہ کی مدد سے انہیں جمع پڑھایا ہے تو حضرت کعب نے اس امر کو حضرت اسعد کی طرف مضاف کیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

پہلا جمعہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھایا اہل سیر اور اہل تاریخ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ قبا میں بنی عمرو بن عوف کے ہاں بروز پیر بارہ ربیع الاول چاشت کے وقت جلوہ افروز ہوئے۔ اسی سال سے تاریخ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں جمعرات تک مقیم رہے اور ان کی مسجد کی بنیاد رکھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز مدینہ طیبہ کے لیے نکلے تو نماز جمعہ کا وقت بنی سالم بن عوف کے ہاں ان کی وادی میں ہو گیا قوم نے اسی جگہ مسجد بنالی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جمعہ کی نماز پڑھائی اور انہیں خطبہ دیا۔ یہ وہ پہلا خطبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دیا۔ اس میں فرمایا: ''تمام تر تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد کا خواستگار ہوں، اس سے بخشش کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 9

طالب ہوں، اس سے ہدایت کا سوال کرتا ہوں، میں اس پر ایمان لاتا ہوں، میں اس کے ساتھ کفر نہیں کرتا، جو اس کا انکار کرتا ہے میں اس کے ساتھ دشمنی رکھتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت اور دین کے ساتھ نور، موعظہ اور حکمت کے ساتھ بھیجا جبکہ رسولوں کی بعثت میں انقطاع ہو چکا تھا علم کی کمی تھی، لوگ گمراہ تھے، زمانے میں انقطاع واقع ہو چکا تھا، قیامت قریب آ چکی ہے اور اجل قریب ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت پا جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ گمراہ ہو جائے گا، تفریط کا شکار ہو گیا اور گمراہی میں دور چلا جائے گا۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ یہ وہ بہترین چیز ہے جس کی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو وصیت کرتا ہے کہ اسے آخرت پر برانگیختہ کرے اور اسے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جن چیزوں سے محتاط رہنے کا حکم دیا ہے ان سے محتاط رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اس آدمی کے لیے، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اعمال کرتا ہے، سچی مدد ہے ان چیزوں کے لیے جو تم آخرت میں چاہتے ہو، جو آدمی پوشیدہ اور ظاہر حالت میں اپنے اور اپنے رب کے معاملات کو درست کرتا ہے وہ صرف اللہ کی رضا کا طالب ہوتا ہے، دنیا میں یہ اس کے لیے ذکر بن جاتا ہے اور موت کے بعد اس کے لیے ذخیرہ بن جاتا ہے۔ جب انسان اس چیز کا محتاج ہوتا ہے جو اس نے آگے بھیجا۔ جو اس کے علاوہ ہے اس کے بارے میں وہ چاہے گا کاش! اس کے اور اس کے عمل کے درمیان بہت ہی دور ہو۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝ (آل عمران) اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی پکڑ سے خبردار کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت فرمانے والا ہے، اس کا قول سچا ہے اور اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا ہے۔ اس کی جانب سے کوئی وعدہ خلافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝ (ق) جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی سیات بخش دیتا ہے اور اسے اجر عظیم عطا فرماتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اس کی ناراضگی سے بچاتا ہے، اس کی سزا سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کی ناراضگی سے بچاتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سے تقویٰ چہروں کو روشن کرتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجات کو بلند کرتا ہے۔ اپنا حصہ لو اور اللہ تعالیٰ کے حصہ میں کمی نہ کرو اس نے تمہیں اپنی کتاب کی تعلیم دی ہے، تمہارے لیے اپنا راستہ واضح کیا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو بھی جان لیں اور جھوٹوں کو بھی جان لے۔ اس طرح اچھے اعمال کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے، اس کے دشمنوں سے دشمنی کرو، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے ہی تمہیں چنا ہے اور تمہارا نام مسلمان رکھا ہے تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے زندہ رہے۔ ولا حول ولا قوۃ...... العظیم اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو موت کے بعد کے لیے عمل کرو کیونکہ جو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملات کو درست کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر غالب ہے۔ لوگ اس پر غالب نہیں وہ لوگوں کا مالک ہے، لوگ اس کے مالک نہیں اللہ اکبر و لا حول

ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اس کے بعد جو پہلا جمعہ کسی دیہات میں پڑھا گیا اسے ''جواثی'' کہتے، یہ بحرین کے دیہاتوں میں سے ایک تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: سب سے پہلے جس نے اسے جمعہ کا نام دیا وہ کعب بن لوی بن غالب تھا کیونکہ اسی روز قریش کعب کے پاس جمع ہوئے تھے جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر3۔** اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے لیے مومنین کو خطاب فرمایا ہے، کافروں کو خطاب نہیں فرمایا: مقصد ان کی تکریم اور شرف کا اظہار ہے۔ فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا پھر ندا کے ساتھ انہیں خاص کیا اگرچہ واذا نادیتم الی الصلاۃ کے عموم کے تحت یہ داخل ہے تاکہ اس کے وجوب اور فرض کی تاکید پر دلالت کرے۔ بعض علماء نے کہا: نماز جمعہ یہاں اجماع سے معلوم ہو رہی ہے۔ لفظ سے معلوم نہیں ہو رہی (1)۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک یہ ایک نکتہ کی وجہ سے نفس لفظ سے معلوم ہو رہی ہے۔ وہ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ کے الفاظ ہیں یہ اسے فائدہ بھی بہم پہنچاتا ہے کیونکہ وہ ندا جو اس دن کے ساتھ خاص ہے وہ اس نماز کے لیے ہی ندا ہے، باقی ندائیں تو تمام دنوں کے لیے ہیں۔ اگر اس سے مراد جمعہ کی ندا نہ ہوتو اس کی تخصیص اور اضافت کا کوئی معنی اور فائدہ نہ ہوتا۔

**مسئلہ نمبر4۔** اذان کا حکم سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آذان اس طرح تھی جس طرح تمام نمازوں کے لیے ہوتی تھی۔ نبی کریم ﷺ جب منبر پر بیٹھتے تو ایک آذان دی جاتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کوفہ میں اسی طرح کرتے تھے۔ جب مدینہ طیبہ میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر پر تیسری آذان کا اضافہ کیا جو ان کے گھر پر دی جاتی۔ جس گھر کو زوراء کہتے۔ جب لوگ یہ آذان سنتے تو آجاتے یہاں تک کہ جب حضرت عثمان منبر پر بیٹھتے تو موذن آذان کہتا پھر حضرت عثمان خطبہ ارشاد فرماتے؛ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں محمد بن اسحاق سے وہ زہری سے وہ حضرت سائب بن یزید سے روایت نقل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک موذن ہوتا جب آپ نیچے اترتے تو وہ اقامت کہتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں یہی معمول تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو بازار میں ایک گھر کے اوپر ایک آذان کا اضافہ کیا جسے زوراء کہتے۔ جب حضرت عثمان باہر آتے تو موذن آذان دیتا اور جب منبر سے نیچے اترتے تو موذن اقامت کہتا۔ امام بخاری نے مختلف طرق سے اس معنی میں روایات نقل کی ہیں (2)۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جمعہ کے روز دوسری آذان کا حکم حضرت عثمان غنی نے دیا جب اہل مسجد کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ جمعہ کے روز آذان اس وقت دی جاتی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا۔ ماوردی نے کہا: جہاں تک پہلی آذان کا تعلق ہے یہ نیا عمل ہے (3)۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے شروع کیا تاکہ لوگ خطبہ سننے کے لیے تیاری کریں۔ جب مدینہ طیبہ کا علاقہ وسیع ہو گیا تھا اور اس کے مکین زیادہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1804
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، اذان یوم الجمعہ، جلد 1 صفحہ 124
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 10

ہو گئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مسجد کی سمت میں بازار میں آذان دی جائے تا کہ لوگ اپنی تجارت کو چھوڑ دیں۔ جب وہ مسجد میں جمع ہو جائیں تو مسجد میں آذان دی جائے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسجد میں ہی دو آذانیں دینے کا معمول بنا دیا؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ حدیث صحیح میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آذان ایک تھی جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو آپ نے زوراء کے مقام پر تیسری آذان دلوا کر اس کا اضافہ کیا۔ حدیث میں اسے تیسری آذان (1) کا نام دیا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بین کل آذانی صلاۃ لمن شاء (2) یعنی آذان اور اقامت کے درمیان نماز کا وقت ہے جو چاہے اسے پڑھے۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ اصلی آذان ہے، پھر انہوں نے تین موذن بنا دیئے۔ یہ وہم ہے پھر انہوں نے ایک وقت میں سب کو جمع کر دیا۔ یہ وہم پر وہم ہے۔ میں نے انہیں مدینۃ السلام میں مینارہ کی آذان کے بعد امام کے سامنے منبر کے نیچے ایک جماعت کی صورت میں آذان دیتے ہوئے دیکھا جس طرح سابقہ حکومتوں میں ہمارے ہاں بھی ایسا ہی کیا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ نیا عمل ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ، سعی کے معنی میں یہاں تین قول ہیں۔ (۱) ارادہ کرنا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! یہ قدموں پر سعی نہیں بلکہ دلوں اور نیت کی سعی ہے۔ (۲) مراد عمل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ (الاسراء: 19) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ (اللیل) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم) یہ جمہور کا قول ہے۔ زہیر نے کہا:

سَعَی بعدھم قومٌ لکَیْ یدرکوھُم

ان کے بعد ایک قوم نے عمل کیا تا کہ ان کو پالیں۔

نیز یہ بھی کہا:

سَعَی سَاعِیَا غَیْظِ بن مُرّہ بعدما تَبَزَّلَ ما بین العَشِیرۃ بِالدَّمِ

غیظ بن مرہ نے اچھی کاوش کی جبکہ قبیلہ میں صلح خون ریزی سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے عمل پیرا رہو اس کے اسباب غسل، وضو اور اس کی طرف توجہ میں مشغول رہو۔

(۳) مراد پیدل جانا ہے۔ یہ فضیلت ہے شرط نہیں۔ بخاری شریف میں ہے (3) حضرت ابوعبس بن جبر رضی اللہ عنہ جو کبار صحابہ میں سے تھے پیدل جمعہ کی نماز کے لیے جاتے تھے۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: من اغبرّت قدماہ فی سبیل اللہ حرّمہ اللہ علی النار جس کے قدم اللہ تعالیٰ کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں اللہ تعالیٰ اسے آگ پر حرام کر دیتا ہے۔

اس کلام کا ظاہر دوڑنے پر دلالت کرتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اجل صحابہ اور متقدمین فقہاء نے اس کا انکار کیا (4)۔

1۔ پہلی آذان جو وقت شروع ہونے کے بعد دی جاتی ہے، دوسری آذان جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے جب امام منبر پر بیٹھ جائے تیسری اقامت ہے۔

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1804-1803

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، مشی الی الجمعہ، جلد 1، صفحہ 124

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1804

حضرت عمر بنی اللہ نے یوں قراءت (1) کی: فامضوا الی ذکر اللہ مقصود یہ بتانا تھا کہ کلام کا ظاہر جس معنی پر دلالت کرتا ہے وہ مراد نہیں۔ حضرت ابن مسعود بنی اللہ نے بھی یہ قراءت کی۔ کہا: اگر میں فاسعوا کی قراءت کروں تو میں دوڑوں گا یہاں تک کہ میری چادر گر جائے گی۔ ابن شہاب نے یوں قراءت کی فامضوا الی ذکر اللہ سالکا تلک السبیل یہ سب ان کی جانب سے اس آیت کی تفسیر ہے۔ یہ قرآن منزل کی قراءت نہیں۔ قرآن کی قراءت تفسیر کے ساتھ تفسیر کے محل میں جائز ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: جس نے مصحف کی مخالفت کی وہ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کی قراءت اور خرشہ بن حر کے قول سے استدلال کرتا ہے۔ کہا: حضرت عمر بنی اللہ نے مجھے دیکھا جبکہ میرے پاس ایک قطعہ تھا اس میں تھا (2)۔ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ حضرت عمر بنی اللہ نے مجھے کہا: تجھے کس نے یہ پڑھایا ہے۔؟ میں نے عرض کی: حضرت ابی نے فرمایا: حضرت ابی ہم میں سے منسوخ کی زیادہ قراءت کرنے والے ہیں۔ پھر حضرت عمر نے پڑھا فامضوا الی ذکر اللہ۔

ادریس، خلف سے وہ ہشیم سے وہ مغیرہ سے وہ ابراہیم سے وہ خرشہ سے اسی طرح روایت نقل کرتے ہیں۔ محمد بن یحییٰ، محمد سے جو ابن سعدان ہے، وہ سفیان بن عینیہ سے وہ زہری سے وہ سالم سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں: میں نے ہمیشہ حضرت عمر کو فامضوا الی ذکر اللہ ہی قراءت کرتے ہوئے سنا ہے۔ ادریس، خلف سے وہ ہشیم سے وہ مغیرہ سے وہ ابراہیم سے روایت نقل کرتے ہیں (3) کہ حضرت عبداللہ بن مسعود بنی اللہ نے فامضوا الی ذکر اللہ قراءت کی ہے کہا: اگر فَاسْعَوْا ہوتا تو میں دوڑتا یہاں تک کہ میری چادر گر جاتی۔ ابوبکر نے کہا: ایسا قول کرنے والے کے خلاف اس چیز سے دلیل قائم کی جائے گی کہ امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول نے فَاسْعَوْا ہی ارشاد فرمایا، جہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن مسعود بنی اللہ کا تعلق ہے تو ان سے فامضوا کی روایت صحیح نہیں کیونکہ سند متصل نہیں کیونکہ ابراہیم نخعی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کچھ بھی نہیں سنا۔ حضرت عمر بنی اللہ سے فامضوا مروی ہے۔ جب کوئی فرد کسی ایسی روایت میں منفرد ہو جو آیت و اجماع کے خلاف ہو تو اس میں اس فرد کا نسیان ثابت ہوگا۔ عربوں کا اس پر اجماع ہے کہ سعی، جانے کے معنی میں ہے تاہم کوشش کے معنی سے خالی نہیں۔ زہیر نے کہا:

سَعَى سَاعِيَا غيظ بن مُرّة بعد ما تَبَزَّلَ ما بين العَشِيرة بالدَّم

یہاں شاعر نے سعی سے مراد کد و کاوش سے امر بجا لانا لیا ہے، اس سے مراد قدموں سے دوڑنا اور تیز چلنا نہیں۔ فراء اور ابو عبید نے کہا: آیت میں سعی سے مراد امر بجا لانا ہے۔ فراء نے عربوں کے اس قول سے استدلال کیا ہے: یسعی فی البلاد یطلب فضل اللہ وہ شہروں میں اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ یہ امر محال ہے کہ یہ معنی حضرت ابن مسعود پر مخفی ہو جبکہ آپ بڑے فصیح اور عربی زبان میں بڑے پختہ تھے۔

میں کہتا ہوں: جو امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں مراد دوڑنا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: اِذَا اُقِیمتْ

---

1۔ اس قسم کی جو قراءتیں صحابہ کرام سے منقول ہیں ان سے مراد تفسیر ہوتی ہے تا کہ معنی سمجھنے میں دقت نہ ہو نہ کہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ متن کے الفاظ یہ ہیں۔

2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 534 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1804

الصلوۃ فلا تأتوھا تسعون ولکن السکینۃ (1) جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ اس کے لیے آؤ جبکہ تمہارے اوپر سکون و وقار ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: خبردار اللہ کی قسم! یہ قدموں پر دوڑ نا نہیں بلکہ انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ نماز کے لیے آئیں مگر اس صورت میں کہ ان پر سکون و وقار ہو بلکہ یہاں مراد ہے کہ وہ دل کی حاضری، خلوص نیت اور خشوع کے ساتھ آئیں۔ قتادہ نے کہا: سعی یہ ہے کہ تو اپنے دل اور عمل کے ساتھ سعی کرے۔ یہ بہت اچھا قول ہے۔ کیونکہ یہ تینوں اقوال کو جامع ہے۔ جمعہ کے روز غسل، خوشبو لگانے اور لباس سے آراستہ ہونے کے بارے میں کئی احادیث آئی ہیں جو کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6۔** یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں خطاب صرف عاقل، بالغ مومنوں کو ہے، اس خطاب سے مریض، اپاہج، مسافر، غلام اور عورتیں خارج ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک نابینا اور ایسا بوڑھا جو راہنما کے بغیر نہ چل سکتا ہو وہ بھی اس سے خارج ہے۔ ابو زبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اس پر جمعہ کے روز جمعہ کی نماز لازم ہے مگر جو مریض ہو، مسافر ہو، عورت ہو، بچہ ہو یا غلام ہو جو آدمی لہو و لعب کی وجہ سے یا تجارت کی وجہ سے اس سے مستغنی ہوا اللہ تعالیٰ اس سے غنی ہے۔ وہ ہی حمد کے لائق ہے'' (2)۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: جس پر جمعہ ادا کرنا لازم ہے وہ جمعہ ادا کرنے سے پیچھے نہ رہے مگر ایسے عذر کی صورت میں جس کی موجودگی میں اس کے لیے بجالانا ممکن نہ ہو جس طرح ایسا مرض جو اسے روک دے، مرض کے بڑھنے کا خوف، سلطان کے ظلم کا خوف خواہ مال میں ہو یا بدن میں ہاں حق لینے کا مسئلہ ہو تو صورت الگ ہے، موسلا دھار بارش، ساتھ کیچڑ بھی ہو یہ عذر شمار ہو گا جبکہ بارش ختم نہ ہو۔ امام مالک نے اسے عذر شمار نہیں کیا؛ یہ مہدوی نے بیان کیا۔ جو آدمی کسی قریبی رشتہ دار کی تیمارداری کی وجہ سے جمعہ ادا نہیں کرتا جس کی موت کا وقت قریب ہو اور اس کے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہ ہو جو اس کے امور بجالائے تو یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کے لیے اس میں گنجائش موجود ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا ہی کیا۔ جو آدمی عذر کے بغیر نماز جمعہ میں شامل نہ ہوا اس نے امام سے قبل نماز پڑھ لی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ اس سے پہلے نماز پڑھے جب نماز جمعہ میں شامل ہو سکتا تھا تو وہ اس میں شامل نہ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ جمعہ کا وجوب اس آدمی کے لیے خاص ہے جو آذان کو سنتا ہے۔ جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جو دور ہے جو آذان کو نہیں سنتا تو وہ اس خطاب کے تحت داخل نہیں ہوگا جو آدمی جمعہ کی نماز کے لیے آتا ہے وہ قریب رہتا ہے یا دور رہتا ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: جمعہ اس پر واجب ہوگا جو شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر ہو۔ ربیعہ نے کہا: جو چار میل کے فاصلہ پر ہو۔ امام مالک اور لیث نے کہا: تین میل کے فاصلہ پر ہو، امام شافعی نے کہا: آذان سننے کا اعتبار ہوگا جبکہ موذن کی آواز بلند ہو اور آوازیں پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، مشی الی الجمعہ، جلد 1، صفحہ 124

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الجمعہ، من تجب علیہ الجمعہ، جلد 2، صفحہ 3

سکون ہوں، ہوا ساکن ہو اور موذن شہر کی دیوار پر کھڑا ہو۔ صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگ اپنے گھروں اور قریبی دیہاتوں سے باری باری آتے وہ گرد و غبار میں آتے ان کے جسموں پر غبار لگ جاتا تو ان سے بو سی پیدا کرتا (1)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کاش! تم اس دن کے لیے غسل کرتے''۔ ہمارے علماء کا کہنا ہے کہ آواز جب خوب بلند ہو، لوگ سکون میں ہوں تو آواز تین میل تک پہنچتی ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریبی دیہات کم سے کم تین میل کے فاصلہ پر ہوتے تھے۔ امام احمد بن حنبل اور اسحاق نے کہا: جس نے جمعہ کی آذان سنی اس پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔ دارقطنی نے عمرو بن شعیب سے وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انما الجمعۃ علی من سمع النداء (2) جو آذان سنے اس پر جمعہ کی نماز فرض ہے۔

امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کہتے ہیں: جو آدمی شہر میں ہے وہ آذان کی آواز سنے یا نہ سنے اس پر جمعہ کی نماز واجب ہے اور جو آدمی شہر سے باہر ہے اگرچہ آذان کی آواز سنے اس پر جمعہ کی نماز واجب نہیں یہاں تک کہ آپ سے سوال کیا گیا: کیا اہل زبارہ پر جمعہ واجب ہے؟ زبارہ اور کوفہ کے درمیان ایک دریا حائل تھا؟ فرمایا: نہیں۔ ربیعہ سے یہ بھی مروی ہے: جو آدمی آذان کی آواز سنے اور پیدل گھر سے نکلے تو وہ نماز کو پالے تو اس پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔ زہری سے یہ مروی ہے کہ جمعہ کی نماز اس پر واجب ہے جو آذان کو سنے۔

**مسئلہ نمبر 8۔** اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ جمعہ آذان سے ہی واجب ہوتا ہے اور آذان وقت کے داخل ہونے سے ہو سکتی ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِذا حَضَرَتِ الصلاۃُ فأذنا ثم أقیما ولیؤمکما أکبرکما (3) جب نماز کا وقت ہو تو تم دونوں میں سے ایک آذان کہے پھر ایک اقامت کہے پھر تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد حضرت مالک بن حویرث اور اس کے ساتھی سے فرمایا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ جب سورج ڈھل جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ ادا فرمایا کرتے تھے (4)۔ ابوبکر الصدیق اور امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ سورج ڈھلنے سے قبل نماز جمعہ پڑھی جائے گی۔ امام احمد بن حنبل نے اس میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے پھر ہم واپس پلٹتے جبکہ دیواروں کے سائے نہیں ہوتے تھے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ہم نماز جمعہ کے بعد ہی قیلولہ اور دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے؛ اسی کی مثل حضرت سہل سے روایت مروی ہے؛ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت سلمہ کی حدیث کو بہت جلد ادائیگی پر محمول کیا جائے گا۔ ہشام بن عبد الملک، یعلی بن حارث سے وہ ایاس بن سلمہ

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، فضل التکبیر الی الجمعہ، جلد 1، صفحہ 280

2۔ سنن دارقطنی، الجمعہ علی من سمع النداء، جلد 2، صفحہ 6

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، من احق بالامامۃ، جلد 1، صفحہ 236

4۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، من احق بالامامۃ، جلد 1، صفحہ 123

بن اکوع سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں وکیع، یعلی سے وہ ایاس سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جب سورج ڈھل جاتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرتے پھر ہم سایہ کی تلاش کرتے ہوئے واپس آتے (1)۔ یہ مقدمین اور متاخرین جمہور اسلاف کا نقطہ نظر ہے اور اسے ظہر کی نماز پر بھی قیاس کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت سہل رضی اللہ عنہ کی روایت اس امر پر دلیل ہے کہ صحابہ کرام دوپہر کے کھانے یا اس سے بھی پہلے نماز جمعہ کے لیے جلدی جایا کرتے تھے۔ وہ دوپہر کا کھانا نماز جمعہ کے بعد ہی کھایا کرتے تھے۔ امام مالک کی رائے ہے کہ جمعہ کو جلدی ادا کرنا اسی طرح ہے کہ زوال کے بالکل قریب ہی ادا کیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اجتہاد کیا ہے: من راح فی الساعۃ الأولی فکأنما قرب بَدَنَۃ (2) جو پہلی ساعت میں گیا گویا اس نے اونٹ کی قربانی دی۔ یہ سب ایک ہی ساعت ہے۔ دوسرے علماء نے اسے دن کی بارہ ساعتوں پر محمول کیا ہے۔ جو برابر ہیں یا مختلف ہیں جس طرح دن میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عمر کی حدیث کی وجہ سے یہ قول زیادہ صحیح ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد قیلولہ کرتے اور کھانا کھاتے کیونکہ وہ بہت جلدی نماز جمعہ کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 9**۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر جمعہ فرض کیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو اسے فرض کفایہ کہتے ہیں۔ بعض شافعیہ سے یہ منقول ہے۔ امام مالک سے یہ منقول ہے جو ثابت نہیں کہ نماز جمعہ سنت ہے۔ جمہور امت اور ائمہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ فرض عین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث ثابت ہے۔ لَيَنْتَهِيَنَّ أقوامٌ عن وَدْعِهِم الجُمُعَات أو لَيَخْتِمَنَّ اللہ علی قلوبھم ثم لیکونُنَّ من الغافلین (3) جو لوگ جمعہ کی نماز کو چھوڑتے ہیں انہیں اس طرز عمل سے رک جانا چاہیے ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔ جمعہ کے وجوب اور اس کے فرض ہونے میں یہ واضح حجت ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابی جعد ضمری سے مروی ہے۔ جبکہ وہ صحابی بھی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثلاث مرات تھاونا بھا طبع اللہ علی قلبہ (4) جس نے سستی کرتے ہوئے تین دفعہ جمعہ ترک کر دیا اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔ اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے بغیر مجبوری کے تین جمعہ ترک کیے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے فرمایا: الرَّواح الی الجمعۃ واجبٌ علی کلِّ مسلم (5) جمعہ کی نماز کے لیے جانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 10**۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے لیے سعی کو بغیر کسی شرط کے واجب قرار دیا ہے۔ تمام نمازوں کے لیے قرآن و سنت سے وضو کا شرط ہونا ثابت ہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ** (المائدہ:6) جب تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، من اغتسل او توضا، جلد 1، صفحہ 283

2۔ ایضاً، کتاب الجمعہ، فضل التبکیر الی الجمعہ، جلد 1، صفحہ 280

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، تغلیظ فی التخلف عن الجماعۃ، صفحہ 58

4۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الجمعہ، صفحہ 121 5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1808

نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھو۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: لایقبل الله صلاة بغیر طهور (1) الله تعالیٰ وضو کے بغیر نماز قبول نہیں فرماتا۔ ایک طائفہ نے عجیب و غریب بات کی ہے کہ جمعہ کا غسل فرض ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے کیونکہ امام نسائی اور ابوداؤد نے اپنی اپنی سنن میں روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: من توضأ یوم الجمعة فبها و نعمت و من اغتسل فالغسل أفضل (2) جس نے جمعہ کے روز وضو کیا اس نے بہت اچھا کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل افضل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جمعہ کے روز وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا پھر جمعہ کے لیے گیا اس نے خطبہ سنا اور خاموش رہا تو الله تعالیٰ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور اس سے تین دن زائد کے گناہ بخش دیتا ہے (3)۔ جو سنگریزوں سے کھیلتا رہا اس نے لغو عمل کیا۔ یہ نص ہے۔ موطا شریف میں ہے: ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ آنے والے نے کہا: میں نے وضو کرنے کے سوا کوئی زائد عمل نہیں کیا۔ حضرت عمر نے فرمایا: صرف وضو؟ جبکہ تم جانتے ہو کہ رسول الله ﷺ غسل کا حکم ارشاد فرماتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کا حکم تو دیا مگر اسے واپس جانے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ یہ بھی اس پر دال ہے کہ غسل کرنا مستحب ہے اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سنت کی طرف لوٹتے جبکہ وہ فرض (جمعہ میں حاضر ہونا اور خطبہ سننا) کی بجا آوری میں شروع ہو چکے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اردگرد اور مسجد نبوی میں جلیل القدر صحابہ اور مہاجرین تشریف فرما تھے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ عید کے روز جمعہ ہو جائے تو نماز جمعہ ساقط نہیں ہوگی جبکہ امام احمد بن حنبل اس سے اختلاف کرتے ہیں انہوں نے کہا: جب عید اور جمعہ اکٹھے ہو جائیں تو جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جائے گی کیونکہ عید کی نماز جمعہ کی نماز سے پہلے ہوتی ہے اور عید کی مشغولیت کی وجہ سے لوگ جمعہ سے غافل ہو جاتے ہیں آپ نے اس میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے عوالی (4) کے باسیوں کو اجازت دی کہ وہ نماز جمعہ کے لیے نہ آئیں صحابہ میں سے ایک کا قول کوئی حجت نہیں جب اس کی مخالفت بھی ہو اور اس پر کوئی اتفاق نہ کیا گیا ہو۔ عید کے روز جمعہ کے لیے سعی کا حکم اسی طرح متوجہ ہوتا ہے جس طرح باقی ایام میں متوجہ ہوتا ہے (5)۔

صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول الله ﷺ عیدین اور جمعہ میں قراءت کیا کرتے تھے (6)۔ **سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى** ۝ (الاعلیٰ) اور **هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ** ۝ (الغاشیہ) جب عید اور جمعہ ایک ہی دن میں جمع ہو جاتے تو دونوں نمازوں میں ان دونوں سورتوں کی قراءت کیا کرتے تھے۔ اسے ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے (☆)۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1808
2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، کراهية مس الحصى، جلد 1، صفحہ 283
4۔ مدینہ طیبہ سے ایک میل کی مسافت پر دیہات تھا۔
5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1809
6۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 288

☆ جامع ترمذی، باب ما جاء فی القراءة فی العیدین، حدیث نمبر 490، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 12**۔ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ ذکر سے مراد نماز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد خطبہ اور وعظ و نصیحت ہے؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ ان تمام چیزوں میں واجب ہے(1)۔ ان میں سے پہلا خطبہ ہے؛ ہمارے علماء نے یہی کہا ہے مگر عبدالملک بن ماجشون نے اختلاف کیا انہوں نے اسے سنت قرار دیا۔ اس کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ یہ بیع کو حرام کر دیتا ہے۔ اگر خطبہ کا سننا واجب نہ ہوتا تو یہ بیع کو حرام قرار نہ دیتا کیونکہ مستحب امر مباح کو حرام قرار نہیں دیتا۔ جب ہم نے کہا: ذکر سے مراد نماز ہے تو خطبہ بھی نماز میں سے ہی ہے۔ بندہ اپنے فعل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہوتا ہے جس طرح وہ اپنے فعل سے تسبیح کرنے والا ہوتا ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر تو سوال کرے ذکر اللہ کی تفسیر خطبہ سے کیسے کی جا سکتی ہے جبکہ خطبہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ بھی کئی چیزیں ہوتی ہیں؟(2)۔

میں اس کا جواب دوں گا: خطبہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو ثنا کی جاتی ہے، خلفاء راشدین کی جو ثنا کی جاتی ہے، مومن متقین کی جو تعریف کی جاتی ہے، اس میں جو نصیحت اور یاد دہانی ہوتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے حکم میں ہوگا، اس کے علاوہ جو کچھ ہے جیسے ظالموں، ان کے القاب کا ذکر، ان کی ثنا اور ان کے لیے دعا وغیرہ جبکہ وہ اس کے برعکس کے مستحق ہیں تو وہ شیطان کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے یہ کئی مراحل پرے ہے۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ وَذَرُوا الْبَيْعَ نماز جمعہ کے وقت بیع و شراء سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور نماز جمعہ کے وقت میں اسے حرام قرار دیا ہے۔ یہ حرمت اس کے لیے ہے جو نماز جمعہ کی فرضیت کا مخاطب ہے۔ بیع، شراء سے خالی نہیں ہوتی اس لیے صرف بیع کا ذکر کر دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (النحل: 81) صرف گرمی کا ذکر کیا حالانکہ یہ پاجامہ سردی سے بھی بچاتا ہے۔ یہاں دوسرے امور کی بجائے صرف بیع (تجارت) کا ذکر کیا کیونکہ بازار والے عموماً اسی میں مصروف ہوتے ہیں۔ جس پر جمعہ کی نماز میں حاضر ہونا واجب نہیں اس کو بیع و شراء سے نہیں روکا جائے گا۔

حرام قرار دینے والے وقت میں دو قول ہیں۔ ا: زوال کے بعد سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک؛ یہ ضحاک، حضرت حسن بصری اور عطا کا قول ہے۔ (۲) خطبہ کی آذان سے لے کر نماز کے وقت تک؛ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب نماز جمعہ کے لیے آذان دی جائے تو بیع و شراء کو ترک کر دیا جائے اس وقت جو بیع و شراء ہوئی وہ فسخ ہوگی، غلام کی آزادی، نکاح، طلاق وغیرہ فسخ نہ ہونگے کیونکہ لوگوں کی عادت نہیں کہ ایسے امور میں مشغول ہوں جس طرح وہ بیع و شراء میں مشغول ہوتے ہیں۔ علماء نے کہا: اسی طرح عقد شرکہ، عقد ہبہ اور عقد صدقہ بھی نادر و نایاب ہی ہوتا ہے اس لیے وہ بھی فسخ نہ ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہی ہے کہ سب کچھ فسخ ہوگا کیونکہ بیع سے اس لیے منع کیا گیا ہے کیونکہ انسان اس میں ہی مشغول ہو جاتا ہے(3)۔ عقود میں سے ہر ایسا امر جو نماز جمعہ سے غافل کر دے سب شرعاً حرام اور جھڑکنے کے لیے فسخ قرار دیا جائے گا۔ مہدوی نے کہا: بعض علماء نے اس وقت میں بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ انہوں نے نہی سے مراد ندب و استحباب لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ سے استدلال کیا ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1805 2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 535 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1806

میں کہتا ہوں: یہ امام شافعی کا مذہب ہے کیونکہ آپ کے نزدیک بیع منعقد ہو جاتی ہے، وہ فسخ نہیں ہوتی۔ زمخشری نے اپنی تفسیر میں کہا: عام علماء کی رائے ہے کہ بیع فسخ نہ ہوگی (1)۔ انہوں نے کہا: بیع بالذات حرام نہیں لیکن اس میں مشغول ہونے سے ایک واجب سے غفلت ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جس طرح مغصوبہ زمین اور مغصوبہ کپڑے میں نماز پڑھی جائے اور مغصوبہ پانی سے وضو کیا جائے۔ بعض علماء سے یہ منقول ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ ایسی بیع فاسد اور فسخ شدہ ہے (2) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کل عمل لیس علیه أمرنا فهو رد ہر ایسا عمل جس بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰

”پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل سے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے رہا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ“۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ امر کا صیغہ اباحت کے لیے ہے جس طرح اس آیت وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (المائدہ: 2) میں امر اباحت کے لیے ہے۔ فرمان ہے: جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو تجارت کے لیے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اس کا رزق تلاش کرو۔ عراک بن مالک کا معمول تھا جب وہ نماز پڑھ چکتے تو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوتے تو عرض کرتے: اے اللہ! میں نے تیری دعوت کو قبول کیا، تیرے عائد کردہ فریضہ کو بجالایا اور زمین میں پھیل گیا جس طرح تو نے مجھے حکم دیا (3)۔ اپنے فضل سے مجھے رزق عطا فرما تو بہترین رزق دینے والا ہے۔ جعفر بن محمد نے وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ کی یہ وضاحت کی: مراد عمل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد طلب علم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نفل نماز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: دنیا کی کسی شی کو طلب کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس سے مراد مریضوں کی عیادت، نماز جنازہ میں حاضر ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بھائی سے ملاقات کرنا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اطاعت کر کے اور زبان سے اس کا شکر بجالاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض کے بجالانے کی توفیق دی اس انعام پر شکر بجالاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ یہاں لعل، کی کے معنی میں ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، جس نے اس کی اطاعت نہ کی وہ ذکر کرنے والا نہیں اگرچہ وہ بہت زیادہ تسبیح کرتا ہو۔ سورۂ بقرہ میں اس بارے میں مرفوع روایت گزر چکی ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 536 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1806 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 10

مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱﴾

''اور (بعض لوگوں نے) جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو بکھر گئے اس کی طرف اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیا (اے حبیب! انہیں) فرمایئے کہ جو نعمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ کہیں بہتر ہیں لہو اور تجارت سے، اور اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1۔** وَ اِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَا ۨانۡفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو شام سے ایک تجارتی قافلہ آ گیا لوگ اس قافلہ کی طرف چلے گئے، یہاں تک کہ صرف بارہ افراد مسجد میں رہ گئے (1)۔ ایک روایت میں ہے: میں بھی ان میں سے ایک تھا، تو یہ آیت جو سورۂ جمعہ میں ہے نازل ہوئی۔ ایک رویت میں ہے: ان بارہ افراد میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق بھی تھے۔ کلبی اور دوسرے علماء نے کہا: جو اس تجارتی قافلہ کو لا یا تھا وہ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی تھے۔ جو شام سے یہ قافلہ لائے جبکہ زمانہ سخت بھوک اور مہنگائی کا تھا۔ ان کے پاس تمام وہ مال و اسباب تھا جس کی لوگوں کو ضرورت تھی جیسے گندم، آٹا وغیرہ۔ وہ مدینہ طیبہ کی منڈی احجار زیت میں اترے اور طبل بجایا تا کہ لوگوں کو اپنے آنے کی خبر دے تو لوگ ان کے پاس چلے گئے صرف بارہ آدمی رہ گئے۔ کلبی نے کہا: وہ خطبہ جمعہ سن رہے تھے سارے چلے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف آٹھ افراد رہ گئے؛ کلبی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔

دار قطنی نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی حدیث سے نقل کی ہے: اسی اثناء میں کہ جمعہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ آیا جس کے پاس کھانے کا سامان تھا وہ بقیع میں اترا۔ لوگ اس قافلہ کی طرف متوجہ ہوئے اس طرف چلے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا آپ کے ساتھ چالیس آدمی رہ گئے میں بھی ان میں سے ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کو نازل فرمایا (2)۔ اس اسناد میں علی بن عاصم جو حصین سے روایت نقل کرتے ہیں نے ہی چالیس افراد کا ذکر کیا ہے۔ حصین کے دوسرے اصحاب نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف بارہ افراد ہی باقی رہ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت مروی ہے: والذی نفسی بیدہ لو خرجوا جمیعا لاضرم اللہ علیہم الوادی نارا (3) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر سب کے سب نکل جاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر اس وادی کو آگ سے بھڑکا دیتا؛ زمخشری نے اسے ذکر کیا۔

ایک حدیث مرسل میں ان بارہ افراد کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔ اسے اسد بن عمرو نے جو اسد بن موسیٰ بن اسد کے والد ہیں نے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 284
2۔ سنن دار قطنی، کتاب الجمعہ، ذکر العدد فی الجمعہ، جلد 2، صفحہ 4، حدیث 5
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 536

عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت سعید بن زید، حضرت بلال رضی اللہ عنہم ایک رویت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسری روایت میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھے۔

میں کہتا ہوں: اس روایت میں حضرت جابر کا ذکر نہیں، امام مسلم نے ذکر کیا ہے کہ وہ ان میں سے تھے۔ دارقطنی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں اس کے سبب کا ذکر کیا ہے(1) جس کے باعث انہوں نے اپنے آپ کو خطبہ سننے کے ترک میں رخصت پائی جبکہ اپنی فضیلت کے باعث وہ اس کے مستحق تھے کہ ایسا کرتے کہ محمود بن خالد، ولید سے وہ ابو معاذ بکر بن معروف سے وہ حضرت مقاتل بن حیان سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے پہلے جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے جس طرح عیدین کا معمول ہے یہاں تک کہ جمعہ کا دن تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے جبکہ جمعہ کی نماز پڑھ لی تھی ایک آدمی آیا، اس نے کہا: حضرت دحیہ کلبی تجارتی سامان لائے ہیں۔ حضرت دحیہ جب تجارتی سامان لاتے تو اس کے اہل دف بجا کر ان کا استقبال کرتے۔ لوگ نکلے انہوں نے گمان کیا کہ خطبہ کو چھوڑ دینے میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کو پہلے کر دیا اور نماز کو موخر کر دیا۔ اس نہی کے بعد کوئی آدمی نکسیر یا حدث کی صورت میں باہر نہ نکلتا مگر وہ اجازت لیتا اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اجازت دیتے پھر اسے ہاتھ سے اشارہ کرتے۔ منافقین میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جن پر خطبہ سننا اور مسجد میں بیٹھنا بوجھل محسوس ہوتا۔ جب مسلمانوں میں سے کوئی اجازت لیتا تو منافق اس کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا۔ اپنے آپ کو اس کے پیچھے چھپا لیتا یہاں تک کہ باہر نکل جاتا تو اللہ تعالیٰ نے قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (النور: 63) کو نازل فرمایا۔ سہیل نے کہا: یہ خبر اگرچہ صحیح سند سے ثابت نہیں تاہم صحابہ کرام کے بارے میں حسن ظن ثابت کرتا ہے کہ یہ صحیح ہو۔ قتادہ نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ صحابہ نے یہ عمل تین دفعہ کیا۔ ہر دفعہ شام سے تجارتی قافلہ آیا تھا اور ہر دفعہ جمعہ کے دن آیا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کا نکلنا صرف دحیہ کلبی کے تجارتی قافلہ کے لیے تھا اور اس قافلہ کو گزرتے ہوئے دیکھنے کے لیے تھا یہ سراسر لہو تھا اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر اس کے علاوہ کے لیے ان کا نکلنا ہوتا تو اس میں کوئی گناہ نہ ہوتا، لیکن جب اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض متصل تھا اور آپ کی بارگاہ سے اٹھ جانا شامل تھا تو اس میں سختی آ گئی اور یہ عمل بڑا ہو گیا اور اس بارے میں قرآن نازل ہوا اور اسے لہو کا نام دے کر اس کی حقارت بیان کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں ارشاد مروی ہے: کل ما یلهو به الرجل باطل إلا رميه بقوسه انسان جس کے ساتھ لہو کرتا ہے وہ عمل باطل ہے سوائے کمان کے ذریعے تیر پھینکنے کے۔ سورۃ الانفال میں یہ گزر چکی ہے۔ تمام تر تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جب عورتوں کے نکاح کیے جاتے تو وہ آلات لہو اور طبل کے ساتھ گزرتیں تو صحابہ ان کی طرف چلے گئے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ کنایہ کو تجارت کی طرف پھیرا کیونکہ تجارت اہم ہے۔ طلحہ بن مصرف نے و

1۔ سنن ابی داود، صحاب فی الخطبة یوم الجمعه، جلد 2، صفحہ 7

اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا نے قراءت کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جب وہ تجارت دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں یا لہو ولعب دیکھتے ہیں تو اس کی طرف نکل جاتے ہیں تو کلام کے دلالت کرنے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا؛ جس طرح شاعر نے کہا:

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راضٍ والرأيُ مُخْتَلِفُ

ہم اس پر راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تو اس پر راضی ہے جو تیرے پاس ہے جبکہ رائے مختلف ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: عربی زبان میں یہ سب سے عمدہ ہے کہ ضمیر کو دونوں اسموں میں سے دوسرے اسم کے لیے بنایا جائے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جتنے افراد کے ساتھ جمعہ ہوتا ہے اس کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے۔ (۱) حضرت حسن بصری نے کہا: دو افراد کے ساتھ جمعہ منعقد ہو جاتا ہے (1)۔ (۲) لیث اور امام ابو یوسف نے کہا: تین افراد کے ساتھ جمعہ ہو جاتا ہے۔ (۳) سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: چار افراد کے ساتھ جمعہ ہوتا ہے (2)۔ (۴) ربیعہ نے کہا: بارہ افراد کے ساتھ جمعہ ہوتا ہے۔ نجاد ابو بکر احمد بن سلیمان نے ذکر کیا ابو خالد یزید بن ہیثم بن طہمان دقاق، صبح بن دینار سے وہ معافی بن عمران سے وہ معقل بن عبید اللہ سے وہ زہری سے وہ اپنی سند کے ساتھ مصعب بن عمیر سے روایت نقل کرتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ کی طرف بھیجا۔ آپ حضرت سعد بن معاذ کے گھر ٹھہرے آپ نے انہیں جمعہ کی نماز پڑھائی جبکہ ان کی تعداد بارہ تھی۔ اس روز ان لوگوں کے لیے ایک بکری ذبح کی گئی۔ (۵) امام شافعی نے کہا: چالیس افراد ہوں۔ ابو اسحاق شیرازی نے ''کتاب التنبیہ علی مذہب الامام شافعی'' میں کہا: ہر وہ دیہات جس میں چالیس عاقل، بالغ، آزاد اور مقیم مرد ہوں وہ موسم سرما اور موسم گرما میں وہاں سے کوچ نہیں کرتے سفر کرتے بھی ہیں تو مجبوری کی وجہ سے اور وہ خطبہ کی ابتدا سے نماز جمعہ کے قیام تک وہاں حاضر رہتے ہیں تو ان پر جمعہ واجب ہو جائے گا۔ امام احمد اور امام اسحاق اسی قول کی طرف مائل ہوئے ہیں اور ان دونوں نے یہ شرطیں نہیں لگائیں۔ امام مالک نے کہا: جب بستی ایسی ہو جس میں بازار اور مسجد ہو تو تعداد کا اعتبار کیے بغیر ان پر نماز جمعہ فرض ہوگی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ فرمان جاری کیا: جس بستی میں تیس گھر ہوں ان پر جمعہ لازم ہوگا۔

امام ابو حنیفہ نے کہا: شہر کی قریبی بستیوں اور دیہاتوں کے مکین لوگوں پر جمعہ واجب نہیں ہوتا ان میں نماز جمعہ پڑھنا بھی جائز نہیں (3)۔ جمعہ کے وجوب اور اس کے انعقاد میں آپ نے یہ شرطیں لگائی ہیں۔ ۱: بڑا شہر، قوی سلطان، بارونق بازار اور جاری نہر۔ انہوں نے حضرت علی شیر خدا کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے: کوئی نماز جمعہ اور تکبیرات تشریق نہیں مگر بڑے شہر میں اور ایسے ساتھی جوان کے معاون ہوں؛ اس قول کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت رد کرتی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے بعد جس مسجد میں سب سے پہلے جمعہ ادا کیا گیا وہ بحرین کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات کی مسجد ہے جسے جواثی کہا جاتا (4)۔ امام شافعی کی چالیس افراد میں دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث ہے جسے دار قطنی نے نقل کیا

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 158
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 380
3۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 381
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الجمعۃ فی القریٰ، جلد 1، صفحہ 153

ہے۔ سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی کی دلائل النبوہ میں عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے مروی ہے کہا: جب میرے والد کی نظر جاتی رہی تو میں اپنے والد کو ساتھ لے کر جاتا جب میں انہیں جمعہ کے لیے لے کر چلا تو انہوں نے آذان کی آواز سنی تو حضرت ابوامامہ کے لیے دعا اور استغفار کی۔ کافی عرصہ تک ان کا یہی معمول رہا(1)۔ وہ جمعہ کی آذان نہیں سنتے تھے مگر وہ یہی عمل کرتے۔ میں نے ان سے عرض کی: اے میرے ابا جان! جب بھی آپ جمعہ کی آذان سنتے ہیں تو آپ حضرت امامہ کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: اے بیٹے! یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حرہ بن بیاضہ(2) جسے نقیع الخضمات کہتے اس کی پست جگہ میں مدینہ طیبہ میں پہلا جمعہ پڑھایا تھا۔ میں نے پوچھا: اس وقت تمہاری تعداد کتنی تھی؟ فرمایا: چالیس۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: طریقہ یہ چلتا آ رہا ہے ہر تین افراد میں ایک امام ہو اور ہر چالیس یا اس سے زائد افراد میں جمعہ، عید قربان اور عید فطر ہو(3)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جماعت ہیں؛ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابوبکر احمد بن سلیمان نجاد نے روایت نقل کی ہے: عبدالملک بن محمد رقاشی پر یہ روایت پڑھی گئی جبکہ میں خود سن رہا تھا کہ مجھے رجاء بن سلمہ نے حدیث بیان کی وہ اپنے باپ سے وہ روح بن غطیب ثقفی سے وہ زہری سے وہ ابو سلمہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کتنے افراد پر جمعہ واجب ہوتا ہے؟ فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد پچاس ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ عبدالملک بن محمد کو یہ روایت سنائی گئی جبکہ میں سن رہا تھا کہ رجاء بن مسلمہ، عباد بن عباد مہلبی سے وہ جعفر بن زبیر سے وہ قاسم سے وہ حضرت ابوامامہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جمعہ پچاس افراد پر واجب ہوتا ہے اس سے کم افراد پر واجب نہیں ہوتا''(4)۔

ابن منذر نے کہا: حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ فرمان جاری کیا جس بستی میں پچاس آدمی جمع ہو جائیں وہ جمعہ کی نماز پڑھیں۔ زہری نے ام عبداللہ دوسیہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جمعہ ہر دیہات والوں پر واجب ہے اگرچہ اس میں چار افراد بھی نہ ہوں''(5)۔ یہاں قری سے مراد شہر ہیں۔ یہ زہری سے ثابت نہیں۔ ایک روایت میں ہے: ''جمعہ ہر بستی والوں پر واجب ہے اگرچہ اس میں تین افراد ہوں اور چوتھا ان کا امام ہو''(6)۔ زہری کا سماع دوسیہ سے ثابت نہیں اس کی سند میں حکم نامی شخص متروک ہے۔

**مسئلہ نمبر3۔** جمعہ امام کی اجازت اور اس کی موجودگی کے بغیر بھی صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: اس کی شرطوں میں سے ایک شرط امام یا خلیفہ کا ہونا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ولید بن عقبہ جو کوفہ کا والی تھا ایک روز اس نے دیر کی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت کے بغیر لوگوں کو نماز جمعہ پڑھا دی۔ یہ بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ جن دنوں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا گیا تھا ان دنوں میں حضرت علی شیر خدا نے نماز جمعہ پڑھائی تھی۔ یہ منقول نہیں کہ حضرت علی نے حضرت

---

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الجمعہ، ذکر العدد فی الجمعہ، جلد 2، صفحہ 6

2۔ مدینہ طیبہ سے ایک میل کی مسافت پر دیہات ہے۔

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الجمعہ، ذکر العدد فی الجمعہ، جلد 2، صفحہ 4

4۔ ایضاً

5۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 723، حدیث 21099

6۔ ایضاً، صفحہ 725، حدیث 21118

عثمان سے اس کی اجازت طلب کی تھی۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ سعید بن عاصی والی مدینہ جب مدینہ طیبہ سے باہر گئے تو حضرت ابو موسیٰ اشعری نے لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائی جبکہ اجازت طلب نہیں کی تھی۔ امام مالک نے کہا: اللہ کی زمین میں اللہ کے فرائض ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ضائع نہیں کرتا والی اس کی ذمہ داری اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے علماء نے کہا: اس کی ادائیگی کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کے لیے چھت والی مسجد ہونی چاہیے۔ ابن عربی نے کہا: میں اس کی وجہ نہیں جانتا (1)۔ میں کہتا ہوں: اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ (الحج: 26) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (النور: 36) بیت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دیواروں اور چھت والا ہو۔ یہی عرف ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا جب خطیب خطبہ دے تو وہ منبر پر کھڑا ہو (2)۔ علقمہ نے کہا: حضرت عبداللہ سے پوچھا گیا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے؟ فرمایا: کیا تو وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا نہیں پڑھتا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن عجرہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ عبدالرحمن بن ام الحکم بیٹھے خطبہ دے رہا تھا۔ فرمایا: اس خبیث کو دیکھو بیٹھ کر خطبہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ (3)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے پھر بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ ارشاد فرماتے۔ جو آدمی آپ کو یہ بتائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تو اس نے جھوٹ بولا۔ اللہ کی قسم! میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو ہزار سے زائد نمازیں پڑھی ہیں (4)۔ جمہور فقہاء اور ائمہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: خطبہ میں قیام شرط نہیں۔ یہ روایت کی جاتی ہے جس نے سب سے پہلے بیٹھ کا خطبہ دیا وہ حضرت امیر معاویہ ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا یہاں تک کہ رقت طاری ہوگئی تو آپ نے بیٹھ کر خطبہ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑھاپے کی وجہ سے بیٹھ کر خطبہ دیتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے پھر بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے اور بیٹھنے کے دوران کوئی گفتگو نہ کرتے۔ حضرت جابر بن سمرہ نے اسے ہی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر سے بھی بخاری میں اسی طرح مروی ہے (5)۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ خطبہ جمعہ کے انعقاد میں شرط ہے، اس کے بغیر نماز جمعہ صحیح نہیں ہوتی؛ جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ مستحب ہے (6)۔ ابن ماجشون نے بھی اسی طرح کہا ہے: یہ سنت ہے فرض نہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ ظہر کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہے۔ جب وہ خطبہ ترک کردے اور نماز جمعہ ادا کرے تو نماز ظہر کی دو رکعتوں کو ترک کیا۔ اس کے وجوب پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا یہ مذمت ہے۔ شرعاً واجب کے ترک کرنے والے کی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1803
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجمعہ، ما جاء فی الخطبۃ یوم الجمعہ، جلد 2، صفحہ 79
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 284
4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 283
5۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، الخطبۃ قائماً، جلد 1، صفحہ 125
6۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 158

ہی مذمت کی جاتی ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے بغیر نماز جمعہ کو ادا نہیں کیا۔

**مسئلہ نمبر 7۔** کمان یا عصا پر ٹیک لگا کر خطبہ دے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے ہشام بن عمار، عبد الرحمن بن سعد سے وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حالت جنگ میں خطبہ ارشاد فرماتے تو کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے اور جمعہ میں خطبہ ارشاد فرماتے تو عصا کے سہارے خطبہ ارشاد فرماتے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8۔** امام جب منبر پر چڑھے تو امام شافعی اور دوسرے علماء کے نزدیک لوگوں کو سلام کہے۔ امام مالک کی یہ رائے نہیں۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر تشریف فرما ہوتے تو سلام فرماتے (2)۔

**مسئلہ نمبر 9۔** جب امام تمام خطبہ یا کچھ حصہ وضو کے بغیر دے تو امام مالک کے نزدیک اس نے غلط کام کیا۔ جب نماز وضو کے ساتھ پڑھی تو اس پر خطبہ کا اعادہ نہیں۔ وضو کے وجوب میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ نئے قول میں آپ نے وضو کو شرط قرار دیا ہے اور قدیمی قول میں اسے شرط قرار نہیں دیا؛ یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10۔** کم سے کم جس کے ساتھ خطبہ جائز ہو جائے گا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے، لوگوں کو تقویٰ کی وصیت کرے اور قرآن حکیم کی ایک آیت پڑھے دوسرے خطبہ میں یہی چار چیزیں واجب ہیں مگر پہلے میں قراءت کی نسبت دوسرے میں دعا کرے؛ یہ اکثر فقہاء کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: اگر اس نے الحمد للہ، سبحان اللہ اور اللہ اکبر پر اکتفاء کیا تو یہ کافی ہو جائے گا (3)۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ منبر پر چڑھے تو الحمد للہ کے الفاظ کہے تو زبان لڑکھڑا گئی فرمایا: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس جگہ کے لیے گفتگو تیار کیا کرتے تھے۔ تمہیں ایسے امام کی زیادہ ضرورت ہے جو گفتگو کی بجائے عمل کرنے والا ہو، تمہارے سامنے خطبے ہوتے رہیں گے پھر آپ نیچے اتر آئے اور نماز پڑھائی۔ یہ واقعہ صحابہ کی موجودگی میں ہوا تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا: اتنا خطبہ دینا ضروری ہے جس کو خطبہ کہا جا سکے؛ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ہے اس میں یہ صحیح ترین ہے۔

**مسئلہ نمبر 11۔** صحیح مسلم میں حضرت یعلی بن امیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ پڑھتے ہوئے سنا: وَ نَادَوْا یٰمٰلِکُ (الزخرف: 77) اس بارے میں حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن کی حدیث ہے جو وہ اپنی بہن سے نقل کرتی ہیں کہ میں نے قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یاد کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہر جمعہ کے موقع پر منبر پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے (4)۔ سورۂ ق کے شروع میں یہ گزر چکی ہے۔ امام ابو داؤد زہری سے مراسیل میں روایت کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجمعہ، ماجاء فی الخطبۃ یوم الجمعہ، صفحہ 79
2۔ ایضاً
3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 380
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، قراۃ القرآن فی الخطبۃ، جلد 1، صفحہ 286

نعوذ به من شرور أنفسنا(1)۔

''تمام تعریفیں الله تعالیٰ کے لیے ہیں، ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں، ہم اس کی مدد چاہتے ہیں، ہم اس سے بخشش طلب کرتے ہیں، ہم اپنے نفوس کی شر سے اس کی پناہ چاہتے ہیں۔ الله تعالیٰ جسے ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کے حق میں وہ گمراہی مقدر کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں الله تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء الله کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ الله تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت سے پہلے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے جو الله تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ہدایت پا جاتا ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ ہم الله تعالیٰ جو ہمارا رب ہے سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی ناراضگی سے اجتناب کرتے ہیں ہم اس کے ساتھ ہیں اور اسی کے لیے ہیں''۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے تو ارشاد فرماتے: ''ہر آنے والی چیز قریب ہے اور جو آنے والی ہے وہ کوئی دور نہیں الله تعالیٰ کسی کی جلد بازی کے لیے اسے جلدی نہیں لاتا اور لوگوں کی وجہ سے تخفیف نہیں کرتا وہ ہوتا ہے جو الله تعالیٰ چاہتا ہے نہ کہ وہ جو لوگ چاہیں ایک امر ہے جس کا الله تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اور ایک امر وہ ہے جس کا لوگ ارادہ کرتے ہیں جو الله تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اگرچہ لوگ ناپسند کریں، الله تعالیٰ جسے قریب کرے اسے دور کرنے والا کوئی نہیں، الله تعالیٰ جسے دور کرے اسے قریب کرنے والا کوئی نہیں، الله تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شی واقع ہونے والی نہیں''(2)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز خطبہ ارشاد فرماتے الله تعالیٰ کی حمد اور انبیاء پر درود پڑھنے کے بعد آپ فرماتے: ''اے لوگو! تمہارے لیے علامتیں ہیں اپنی علامتوں کی طرف چلو تمہارے لیے انتہائیں ہیں اپنی انتہاء کی طرف چلو، بے شک بندہ مومن دو خوفوں کے درمیان ہے۔ ان خوفوں میں سے ایک اجل ہے جو گزر چکی ہے وہ نہیں جانتا کہ الله تعالیٰ اس کے ساتھ کیا فیصلہ فرمانے والا ہے اور ایک اجل ہے جو باقی ہے وہ نہیں جانتا کہ الله تعالیٰ اس میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے پس بندے کو چاہئے کہ اپنی ذات میں سے اپنی ذات کے لیے لے اور اپنی دنیا سے آخرت کے لیے حصہ بنائے، اپنی جوانی سے اپنے بڑھاپے کے لیے اور اپنی زندگی سے اپنی آخرت کے لیے حصہ بنائے۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! موت کے بعد رضا کے طلب کرنے کا موقع نہیں اور دنیا کے بعد کوئی دار نہیں مگر جنت ہے یا جہنم۔ میں یہ کہتا ہوں اور اپنے لیے اور تمہارے لیے بخشش کا طالب ہوں''۔ جب آپ مدنیہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا وہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ جو خطبہ کو سنے اس پر خطبہ کے لیے خاموش رہنا واجب ہے، سنت یہ ہے کہ جو اسے سنے اور جو نہ سن سکے وہ اس کے لیے خاموش رہے انشاء الله دونوں اجر میں برابر ہیں۔ جس نے اس وقت گفتگو کی اس نے لغو عمل کیا اس کے

1۔ سنن ابی داؤد، باب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 157
2۔ ایضاً، صفحہ 7

ساتھ اس کی نماز میں فساد واقع نہیں ہوگا۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب تو نے جمعہ کے روز اپنے ساتھی سے کہا: تو خاموش رہ جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا‘‘ (1)۔ زمحشری نے کہا: جب خاموش کرانے والے نے اپنے ساتھی سے کہا: تو خاموش ہو جا تو اس نے لغو عمل کیا (2)۔ کہا: وہ خطیب جو اس میں غلو کرتا ہے وہ لغو عمل کرنے والا نہیں ہوگا ہم اسلام کی تنہائی اور ایام کے بے نفع ہونے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13**۔ امام جب منبر پر چڑھے تو لوگ اس کی طرف منہ کریں۔ امام ابو داؤد نے ابان بن عبداللہ سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ میں جمعہ کے روز عدی بن ثابت کے ساتھ تھا جب امام نکلا یا کہا: منبر پر چڑھا تو امام کی طرف منہ کر لیا کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بھی اسی طرح کیا کرتے تھے؛ اسے ابن ماجہ نے عدی بن ثابت سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں (3)۔ اسناد میں یہ اضافہ کیا عن ابیہ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر کھڑے ہوتے تو صحابہ کرام اپنے منہ ان کی طرف کر لیتے تھے۔ ابن ماجہ نے کہا: میں امید کرتا ہوں کہ یہ روایت متصل ہوگی۔

میں کہتا ہوں: ابو نعیم حافظ محمد بن معمر نے وہ عبداللہ بن محمد ناجیہ سے وہ عباد بن یعقوب سے وہ محمد بن فضل خراسانی سے وہ منصور سے وہ ابراہیم سے وہ علقمہ سے وہ حضرت عبداللہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم اپنے منہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر لیتے۔ محمد بن فضل بن عطیہ منصور سے روایت کرنے میں متفرد ہیں۔

**مسئلہ نمبر 14**۔ امام خطبہ دے رہا ہو تو جو آدمی مسجد میں داخل ہوتا ہے وہ نماز نہ پڑھے؛ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے؛ یہ ابن شہاب اور دوسرے لوگوں کی رائے ہے۔ موطا میں ان سے مروی ہے: امام کا نکلنا نماز کو قطع کر دیتا ہے اور اس کی گفتگو کلام کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ مرسل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیھا (4)۔

تم میں سے کوئی جب جمعہ کے روز آئے جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت نماز پڑھے اور ان میں اختصار سے کام لے۔ یہ نماز پڑھنے میں نص ہے۔ امام شافعی اور دوسرے علماء یہی کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 15**۔ ابن عون نے ابن سیرین سے روایت نقل کی ہے کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو علماء نیند کو ناپسند کرتے اور اس بارے میں سخت قول کرتے۔ ابن عون نے کہا: اس کے بعد پھر مجھے ملے پوچھا: تو جانتا ہے وہ کیا کہتے تھے؟ کہا: وہ کہتے ان کی مثال اس لشکر کی سی ہے جو اخفقوا کا شکار ہوئے۔ پھر پوچھا: کیا تو جانتا ہے۔ اخفقوا کیا ہے؟ اس نے کچھ بھی غنیمت نہ پائی۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا نَعِسَ أحد کم فلیتحول إلی مقعد صاحبہ و لیتحول صاحبہ إلی مقعدہ (5) تم میں سے جب کسی کو اونگھ آ جائے تو وہ اپنے ساتھی کی جگہ چلا جائے اور اس کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ابواب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 281　2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 535
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 81
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، من دخل المسجد والامام یخطب، جلد 1، صفحہ 287
5۔ السنن الکبریٰ، کتاب الجمعہ، النعاس فی الجمعہ، جلد 3، صفحہ 238

ساتھی اس کی جگہ آ جائے۔

**مسئلہ نمبر 16**۔ ہم اس میں جمعہ کی فضیلت اور فرضیت کا ذکر کریں گے جسے ہم نے ذکر نہیں کیا۔ ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم جمعہ کا ذکر کیا فرمایا: ''اس میں ایک گھڑی ہے جسے بندہ مومن نہیں پاتا مگر وہ نماز پڑھ رہا ہو وہ اس میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے''(1)۔ اپنے ہاتھ سے اس کے تھوڑا ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''یہ امام کے بیٹھنے سے لے کر نماز کے مکمل ہونے تک کا وقت ہے''(2)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے پاس تشریف لانے میں دیر کر دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو ہم نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک لیا گیا؟ فرمایا: ''اس کی وجہ یہ تھی کہ جبرئیل امین میرے پاس سفید آئینہ کی طرح کی چیز لائے جس میں سیاہ نکتہ تھا(3)۔ میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ حضرت جبرئیل امین نے عرض کی: یہ جمعہ ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے بھلائی ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس میں غلطی کی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی ہدایت عطا فرمائی۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ سیاہ نکتہ کیا ہے؟ عرض کی: یہ جمعہ کے دن وہ گھڑی ہے کوئی مسلمان بندہ نہیں پاتا جس میں وہ خیر کا سوال کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے یا اس کی مثل اس کے لیے قیامت کے روز ذخیرہ فرما دیتا ہے یا اس کی مثل برائی اس سے دور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہترین دن ہے۔ اہل جنت اسے یوم مزید کا نام دیتے ہیں''۔ اور حدیث ذکر کی۔ ابن مبارک اور یحییٰ بن سلام نے کہا: مسعودی، منہال بن عمرو سے وہ ابو عبیدہ سے وہ عبد اللہ بن عتبہ سے وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں: ''جمعہ کی طرف جلدی کرو کیونکہ یہ جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ اہل جنت کے لیے سفید کافور کے ٹیلے میں ظہور فرمائے گا''۔ ابن مبارک نے کہا: وہ اس کے اس قدر قریب ہوں گے جس قدر وہ دنیا میں جمعہ کے لیے جلدی کیا کرتے تھے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: جس طرح وہ دنیا میں جمعہ کی طرف جلدی کیا کرتے تھے۔ اور ان الفاظ کا اضافہ کیا۔ وہ ان کے لیے کرامت میں سے ایسی چیز پیدا فرمائے گا جس کو انہوں نے اس سے قبل نہیں دیکھا ہو گا۔ یحییٰ نے کہا: میں نے مسعودی کے علاوہ کسی کو نہیں سنا جس میں وہ اضافہ کرتا ہے وہ آیت کریمہ کا حصہ ہے وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ (ق)

میں کہتا ہوں: فی کثیب نیلے میں سے مراد ہے جنتی یعنی وہ جنتی اس ٹیلہ پر ہونگے جس طرح حضرت حسن بصری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنتی جمعہ کو اپنے رب کا دیدار کریں گے جبکہ وہ کافور کے ٹیلہ پر ہونگے جس کی اطراف کو نہیں دیکھا جا سکے گا، اس میں جاری نہر ہو گی جس کے دونوں کنارے کستوری کے ہونگے اس پر ایسی دوشیزائیں ہونگی وہ سب سے اچھی آواز میں قرآن پڑھ رہی ہونگی جسے پہلوں اور پچھلوں نے سنا ہو گا۔ جب وہ اپنی اپنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، ذکر الساعۃ التی تقبل فیها دعوة العبد، جلد 1، صفحہ 281 2۔ ایضاً

3۔ الترغیب والترہیب، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 489 (روایت بالمعنی)

منازل کی طرف جائیں گے تو ہر ایک جس کا ہاتھ چاہے گا پکڑ کر لے جائے گا پھر وہ موتیوں سے بنی پلوں پر سے گزر کر اپنے گھروں کو جائیں گے (1)۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی ان کے گھروں کی طرف راہنمائی نہ فرمائے تو وہ اپنے گھروں کی راہ نہ پائیں۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہر جمعہ کو ان کے لیے نئی نئی چیزیں پیدا فرمائے گا؛ اسے یحییٰ بن سلام نے ذکر کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں نے عرش کے نیچے ستر شہر دیکھے ان میں سے ہر شہر تمہارے ان شہروں سے ستر گنا بڑا ہے، وہ فرشتوں سے بھرا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں وہ اس کی تسبیح کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے اللہ! اسے بخش دے جو جمعہ کو حاضر ہو، اے اللہ! اسے بخش دے جس نے جمعہ کے روز غسل کیا'' اسے ثعلبی نے ذکر کیا۔

قاضی شریف ابوالحسن علی بن عبداللہ بن ابراہیم ہاشمی عیسوی جو عیسیٰ بن علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تھے۔ یہ صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز دنوں کو ان کی حالت پر اٹھائے گا اور جمعہ کے دن کو روشن و منور اٹھائے گا جمعہ والے اس کو گھیرے ہونگے جس طرح ایک دلہن ہو جسے معزز خاوند کی طرف بھیجا جارہا ہو وہ ان کے لیے روشن ہوتی ہے جس کی روشنی میں وہ لوگ چلتے ہیں ان کے رنگ برف کی طرح سفید اور ان کی ہوا کستوری کی طرح پھیل رہی ہوگی۔ وہ کافور کے پہاڑوں میں داخل ہونگے انہیں جن وانس دیکھیں گے۔ وہ جنت میں داخل ہونگے کوئی ان کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوگا مگر ایسے موذن جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر آذان دیتا ہے''۔

سنن ابن ماجہ میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہے۔ جب تک گناہ کبیرہ چھانہ جائیں'' (2)۔ امام مسلم نے بھی اسی کی ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ اوس بن اوس ثقفی سے مروی ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے جمعہ کے روز غسل کرایا اور خود غسل کیا، جلدی اٹھایا اور خود جلدی اٹھا اور پیدل چلا اور سوار نہ ہوا اور امام کے قریب بیٹھا اور کوئی لغو عمل نہ کیا اس کے لیے ہر قدم کے عوض سال بھر کا عمل ہے۔ جس کے دنوں کے روزے اور راتوں کے قیام کا اجر ہوگا'' (3)۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو قبل اس کے کہ تمہیں موت آئے (4)، مشغول ہونے سے پہلے اعمال حسنہ کی طرف جلدی کرو اپنے اور اپنے رب کے درمیان تعلق اس کا کثرت سے ذکر کرکے اور مخفی و اعلانیہ صدقہ کثرت سے کر کے تعلق مضبوط کرو تو تمہیں رزق دیا جائیگا، تمہاری مدد کی جائے گی اور تمہیں اجر دیا جائیگا۔ یہ جان لو! اللہ تعالیٰ نے تم پر میری اس جگہ، میرے اس شہر اور اس سال جمعہ فرض کیا ہے یہ قیامت تک فرض ہے۔ جس نے میری زندگی یا میرے پردہ کرنے کے بعد اسے ترک کیا جبکہ اس کا عادل امام یا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 156 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصلوۃ، فضل الجمعہ، 77۔ ایضاً حدیث نمبر 1075، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 122 4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصلوۃ، فرض الجمعہ، صفحہ 77۔ ایضاً، حدیث نمبر 1076، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ظالم امام ہو وہ اس کی تحقیر کرتا ہو یا اس کا انکار کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی جمعیت کو قائم نہ رکھے اور اس کے معاملہ میں برکت نہ رکھے خبردار! اس کی کوئی نماز نہیں، اس کی کوئی زکوٰۃ نہیں، اس کا کوئی حج نہیں، اس کا کوئی روزہ نہیں اور اس کی کوئی نیکی نہیں یہاں تک کہ وہ توبہ کرے جو توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت فرماتا ہے۔ خبردار! کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرائے، کوئی بدو کسی مہاجر کی امامت نہ کرائے اور کوئی فاجر کسی مومن کی امامت نہ کرائے مگر یہ کہ حاکم اس پر جبر کرے جس کی تلوار اور ڈنڈے سے وہ آدمی خوف محسوس کرتا ہو"۔

میمون بن ابی شیبہ نے کہا: میں نے حجاج کے ساتھ جمعہ کا ارادہ کیا۔ میں نے جانے کا ارادہ کیا۔ پھر میں نے کہا: میں کہاں جاؤں گا؟ کیا میں اس فاجر کے پیچھے نماز پڑھوں گا؟ ایک دفعہ کہتا: میں جاؤں گا اور ایک دفعہ کہتا: میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے جانے پر پختہ ارادہ کرلیا تو گھر کی جانب سے مجھے ایک ندا کرنے والے نے ندا کی: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ۔

**مسئلہ نمبر 17**۔ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ اس میں دو وجوہ ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہاری نماز کا جو ثواب ہے وہ تمہاری لہو کی لذت اور تمہاری تجارت کے نفع سے زیادہ ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کے ہاں جو تمہارا رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں مقدر کیا ہے یہ اس سے بہتر ہے جو تم نے لہو اور تجارت سے حاصل کیا ہے۔ ابو رجاء عطاردی نے قراءت کی: قل ما عند اللہ خیرٌ من اللھو و من التجارۃ للذین أمنوا۔

وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ جو بھی کسی کو کوئی چیز عطا کرتا ہے ان سب سے اللہ تعالیٰ بہتر ہے، اسی سے طلب کرو اور اس کی طاعت کے ذریعے اس چیز کو حاصل کرنے میں مدد لو جو اس کے پاس ہے جو دنیا و آخرت سے بہتر ہے۔

# سورة المنافقون

﴿ آیاتہا ۱۱ ﴾ ﴿ ۶۳ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۴ ﴾ ﴿ رکوعاتہا ۲ ﴾

تمام کے قول میں یہ مدنی ہے، اس کی گیارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۟

"(اے نبی مکرم) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ آپ بلاشبہ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۟ امام بخاری نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ میں اپنے چچا کے ساتھ تھا تو میں نے عبد اللہ بن ابی بن سلول کو کہتے ہوئے سنا: لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا اور کہا: لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ میں نے اس کا ذکر اپنے چچا سے کیا اور میرے چچا نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلا بھیجا۔ انہوں نے قسم اٹھا دی کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کر دی اور مجھے جھٹلایا۔ مجھے ایسا غم لاحق ہوا جیسا کبھی غم لاحق نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے گھر میں بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۟ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۟ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ؗ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۟ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۟ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۟ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 728-727

يَفْقَهُوْنَ ۝ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ کو نازل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کی ہے''۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(1)، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک غزوہ میں شرکت کی جبکہ ہمارے ساتھ کچھ بدو بھی تھے ہم پانی کی طرف جلدی کرتے تو بدو ہم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے بدو اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جاتا وہ حوض بھرتا اور اس کے گرد پتھر رکھ دیتا اور اس پر چمڑے سے بنی چٹائی ڈال دیتا یہاں تک کہ اس کے ساتھی آ جاتے ایک انصاری ایک بدو کے پاس آیا، اپنی اونٹنی کی لگام ڈھیلی کی تاکہ وہ پانی پی لے اس بدو نے انکار کر دیا کہ پانی اس کے لئے چھوڑے۔ اس انصاری نے ایک پتھر وہاں سے ہٹایا تو پانی کم ہو گیا۔ بدو نے ایک لکڑی اٹھائی اور انصاری کے سر پر ماری اور اسے زخمی کر دیا۔ وہ انصاری عبداللہ بن ابی کے پاس آیا جو منافقوں کا سردار تھا اور اسے بتایا یہ آدمی بھی اس کے ساتھیوں میں سے تھا۔ عبداللہ بن ابی غضبناک ہو گیا۔ پھر اس نے کہا: جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ لوگ آپ کے پاس سے چلے جائیں کھانے کے وقت یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تھے۔ عبداللہ نے کہا: جب وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے جائیں تو اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا لے جاؤ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اور آپ کے صحابہ کھائیں۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اگر تم مدینہ طیبہ کی طرف لوٹو تو عزت والا اس سے ذلیل کو نکال دے۔ زید نے کہا: میں اپنے چچا کا ردیف تھا میں نے عبداللہ بن ابی کی بات کو سنا تو میں نے اپنے چچا کو اس بارے میں خبر دی میرا چچا گیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا بھیجا اس نے قسم اٹھائی اور اس بات کا انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کی اور مجھے جھٹلایا۔ میرا چچا میرے پاس آیا اور کہا: میں نے یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ سے ناراض ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور منافق تجھے جھٹلائیں۔ کہا: مجھ پر ان کی جرأت ایسی واقع ہوئی جیسی کسی پر واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسی اثناء میں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا میں نے غم کی وجہ سے سر جھکایا ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کان کو ملا اور میرے سامنے مسکرائے، اگر اس کے بدلے میرے لئے تمام دنیا ہوتی تو مجھے وہ چیز خوش نہ کرتی پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مجھے آ ملے۔ پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے کیا فرمایا؟ میں نے عرض کی: مجھے تو کچھ نہیں فرمایا، صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کان کو ملا اور میرے سامنے مسکرائے۔ فرمایا: تجھے بشارت ہو۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے ملے۔ میں نے آپ کو اسی طرح کی بات کی جو میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہی تھی۔ جب ہم نے صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ منافقین پڑھی۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منافق کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا: جو اسلام کا وصف بیان کرے اور اس پر عمل نہ کرے۔ وہ آج کے روز ان سے زیادہ شریر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے کیونکہ ان دنوں وہ نفاق چھپایا کرتے تھے آج وہ ظاہر کرتے ہیں۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 165

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''منافق کی تین علامات ہیں۔ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو اسے توڑتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے'' (1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''چار چیزیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے ان میں سے ایک جس میں ہو اس میں نفاق کی خصلت ہے یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اسے توڑے اور جب وہ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ نکالے'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ جو ان خصائل کو جمع کرے تو وہ منافق ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سچی ہے۔ حضرت حسن بصری کے بارے میں مروی ہے کہ ان کے سامنے ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا: بنی یعقوب نے بات کی تو جھوٹ بولا، وعدہ کیا تو اسے توڑا، ان کے پاس امانت رکھی گئی تو انہوں نے خیانت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد خبردار کرنے کے طریقہ پر ہے اور ڈرانے کے انداز میں ہے کہ کہیں وہ ان خصلتوں کے عادی ہی نہ بن جائیں اس خوف کی وجہ سے کہ یہ خصلتیں انہیں نفاق کی طرف لے جائیں گی۔ اس کا یہ معنی نہیں جن سے یہ امور جلدی کی وجہ سے اختیار اور عادت کے بغیر واقع ہوں وہ منافق ہیں۔ اس بارے میں گفتگو مفصل سورۂ براۃ میں گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن جب گفتگو کرتا ہے، سچ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو پوری پوری واپس کرتا ہے''۔ معنی ہے کامل مومن جب گفتگو کرتا ہے تو سچ بولتا ہے۔

**قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ** ایک قول یہ کیا گیا ہے (3): **نَشْهَدُ** کا معنی ہے ہم قسم اٹھاتے ہیں۔ حلف کو شہادت سے تعبیر کیا کیونکہ قسم اور شہادت غائب امر کو ثابت کرتے ہیں؛ اسی معنی میں قیس بن ذریح کا قول ہے۔

وأشهد عند الله أنّ أحِبّها فهذا لها عندی فما عند ھالِیا (4)

میں اللہ تعالیٰ کے ہاں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں یہ میرے ہاں اس کے لئے ہے اس کے ہاں میرے لئے نہیں۔

یہ احتمال موجود ہے کہ یہ کلام ظاہر معنی پر محمول ہو وہ گواہی دیتے ہوں کہ محمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ ایمان کا اعتراف کرتے ہوں اور اپنی ذاتوں سے نفاق کی نفی کرتے ہوں۔ یہ تعبیر زیادہ مناسب ہے۔

**وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ** اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں جس طرح انہوں نے اپنی زبانوں سے کہا: **وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ** ○ اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے اپنی زبانوں سے جو گواہی دی اور قسم اٹھائی ہے اس میں وہ جھوٹے ہیں۔ فراء نے کہا: معنی ہے اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ وہ اندر سے جھوٹے ہیں جتلانا یہ ان کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، علامۃ المنافق، جلد 1، صفحہ 10 2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 13 4۔ ایضاً

ضمائر کی طرف لوٹے گا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایمان سے مراد تصدیق قلبی ہے اور حقیقی کلام دل کی کلام ہوا کرتی ہے۔ جو آدمی کوئی بات کرے اور اس کے برعکس کا اعتقاد رکھے تو وہ جھوٹا ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں یہ بات گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی قسموں میں جھوٹا قرار دے دیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (التوبۃ:56)۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②

''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اس طرح روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، بیشک یہ لوگ بہت برا کرتے ہیں جو یہ کر رہے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً، جُنَّةً کا معنی پردہ ہے (1) یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ کی طرف راجع نہیں یہ آیت کے سبب کی طرف راجع ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس طرح امام بخاری اور امام ترمذی نے ابن ابی کے بارے میں روایت نقل کی۔ اس نے قسم اٹھائی کہ اس نے یہ بات نہیں کی حالانکہ اس نے یہ بات کہی تھی۔ ضحاک نے کہا: اس نے اللہ کے نام کی قسم اٹھائی تھی کہ وہ تمہیں میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی ایمان سے مراد وہ ہے جو ان کے رب نے ان کے بارے میں سورۂ براۃ آیت 74 میں خبر دی ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ جس نے کہا: أقسم باللہ، أشهد باللہ، أعزم باللہ، أحلف باللہ، أقسمت باللہ، أشهدت باللہ، أعزت باللہ، أحلف باللہ۔ سب میں فرمایا: باللہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ قسم ہے۔ اس طرح امام مالک اور آپ کے اصحاب کا نقطہ نظر ہے۔ اگر کوئی کہے: أقسم، أشهد، أعزم، أحلف اور باللہ کے الفاظ نہ کہے اگر وہ ارادہ کرے تو قسم ہوگی اگر وہ باللہ کا ارادہ نہ کرے تو یہ قسم نہ ہوگی۔ الکیا نے امام شافعی سے یہ بیان کیا ہے۔ امام شافعی نے کہا: جب ایک آدمی نے کہا: أشهد باللہ اور قسم کی نیت کی تو وہ قسم ہی ہوگی (2)۔ امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا: اگر اس نے کہا أشهد باللہ لقد كان كذا تو وہ قسم ہوگی (3)۔ اگر اس نے کہا: أشهد لقد كان كذا نیت نہ کی تو اس آیت کی وجہ سے وہ قسم ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کا ذکر کیا پھر فرمایا: اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً امام شافعی کے نزدیک وہ قسم نہ ہوگی اگرچہ وہ قسم کی نیت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان قَالُوْا نَشْهَدُ کی طرف نہیں لوٹ رہا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا جو سورۃ براۃ میں ہے کی طرف لوٹ رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ انہوں نے اعراض کیا۔ یہ صدود سے مشتق ہے یا مومنین کو پھیر دیا کہ وہ منافقوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کریں جیسے قتل کرنا، قیدی بنانا اور مال چھین لینا۔ یہ صد سے مشتق ہے یا انہوں نے لوگوں کو جہاد سے روکا کہ وہ پیچھے رہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کی اقتدا کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے یہودیوں اور مشرکوں کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 727 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 59 (مفہوم) 3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 539

اسلام میں داخل ہونے سے روکا کہ انہوں نے کہا: لو ہم کافر ہیں اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہوتے تو ہم سے اس نفاق کو پہچانتے ہوتے اور ہمیں عبرت کا نشان بناتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو واضح کیا کہ ان کا حال مخفی نہیں لیکن اس کا حکم یہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرے تو ظاہر میں اس پر ایمان کا حکم جاری کیا جائے گا۔

اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ان کے اعمال خبیثہ کتنے ہی برے ہیں، ان کا نفاق، انکی جھوٹی قسمیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳

"(ان کا) یہ (طریقہ کار) اس لئے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لاتے پھر وہ کافر بن گئے پس مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو (اب) وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ خبر دی گئی ہے کہ منافق کافر ہیں یعنی انہوں نے زبان سے اقرار کیا پھر دل سے انکار کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت اسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جو ایمان لاتے پھر انہوں نے ارتداد اختیار کیا۔

فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ان پر کفر کی مہر لگا دی گئی۔ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۝ وہ ایمان و خیر کو نہیں مانتے۔ زید بن علی نے فطبع اللہ علی قلوبھم پڑھا ہے۔

وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ٞ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝

"اور جب آپ انہیں دیکھیں گے تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہونگے اور اگر وہ گفتگو کریں تو توجہ سے آپ ان کی بات سنیں گے۔ (درحقیقت) وہ (بیکار) لکڑیوں کی مانند ہیں جو دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی ہوں، گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے، یہی حقیقی دشمن ہیں پس آپ ان سے ہوشیار رہیے۔ ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ کیسے سرگرداں پھرتے ہیں"۔

وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ان کی ہیئتیں اور ان کے مناظر آپ کو خوش کریں گے۔ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ مراد عبداللہ بن ابی ہے یعنی آپ اس کی بات غور سے سنتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عبداللہ بن ابی خوبصورت جسم صحت مند، روشن چہرے والا اور عمدہ گفتگو کرنے والا تھا (1)۔ جب وہ گفتگو کرتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی گفتگو توجہ سے سنتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت کامل صورت اور اچھی گفتگو سے کی ہے۔ کلبی نے کہا: مراد ابن ابی، جد بن قیس اور معتب بن قشیر ہے۔ سب بڑے جسیم، خوبصورت اور فصیح گفتگو کرنے والے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 59

مُّسَنَّدَةٌ کی تفسیر یوں ہے: وہ سب خوبصورت لوگ تھے گویا ایسی لکڑیاں ہوں جنہیں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو۔ انہیں ایسی لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جنہیں دیوار کے ساتھ کھڑا کیا گیا ہو جو نہ بات توجہ سے سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے جسم ہیں جن میں روحیں نہیں اور ایسے جسم ہیں جن میں عقل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی لکڑیوں سے تشبیہ دی ہے جسے دیمک نے کھالیا ہو اور وہ کسی سہارے کھڑی ہوں۔ ان میں کیا ہے کوئی پتہ نہ ہو؟

قنبل، ابوعمرو اور کسائی نے خُشْبٌ شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ حضرت براء بن عازب کی قراءت ہے۔ ابوعبید نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ اس کا واحد خشبہ ہے جس طرح تو کہتا ہے: بَدَنَہ، بُدْن لغت میں فعلہ کی جمع فُعل کے وزن پر نہیں آتی۔ اس کے ثقل سے یہ لازم آتا ہے کہ تو البدن پڑھے۔ یزیدی نے ذکر کیا ہے کہ یہ خشباء کی جمع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ (عبس) اس کا واحد حدیقۃ غلباء ہے۔ باقی قراء نے تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بزی کی ابن کثیر سے اور عیاش کی ابوعمرو سے روایت ہے۔ اکثر روایات عاصم سے ہیں۔ ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے گویا یہ خِشاب اور خُشُب کی جمع ہے جس طرح ثمرۃ، ثمار اور ثمر ہے اگر تو چاہے تو خشبہ کی جمع خشب بنالے۔ سیبویہ نے کہا: خشبہ کی جمع خشب ہے جس طرح بَدَنہ کی جمع بدن ہے اسی کی مثل ہاء کے بغیر ہے۔ خشبہ کی جمع خشاب اور اس کی جمع خشب ہے جس طرح ثمرۃ کی جمع ثمار اور ثمار کی جمع ثمر ہے اسناد کا معنی امالہ (جھکانا) ہے تو کہتا ہے: اسندت الشئی یعنی تو نے اسے جھکایا۔ مُسنّدۃ کثرت وظاہر کرنے کے لیے ہے یعنی انہوں نے اپنی جانوں کی حفاظت کی خاطر ایمان کا سہارا لیا۔

یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ۔ صَيْحَةٍ سے پہلے اھل کا لفظ محذوف ہے۔ هُمُ الْعَدُوُّ مفعول ثانی کے محل میں ہے۔ اس شرط پر کہ کلام میں ضمیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صفت بزدلی اور ذلت سے بیان کرتا ہے۔ مقاتل اور سدی نے کہا: جب کوئی لشکر میں ندا کرنے والا یہ ندا کرے کہ کوئی جانور چھوٹ گیا ہے یا کسی گمشدہ چیز کا اعلان کیا جائے تو وہ گمان کرتے ہیں کہ مراد وہی ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں رعب ہے جس طرح شاعر اخطل نے کہا:

مازلت تحسب كل شئي بعدهم  خيلا تكرُّ عليهم ورجالا (1)

ان کے بعد تو ہر شی کو گمان کرتا ہے کہ وہ گھڑسوار ہیں یا پیدل جوان پر پے در پے حملہ کرتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ ایسی کلام ہے (2) جس کی ضمیر اس میں ہے جو مابعد کی محتاج نہیں، تقدیر کلام یہ ہے یحسبون کل صیحة علیهم انهم قد فطن بهم وعلم بنفقاتهم کیونکہ جہاں تک ہو خطرہ خوف ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے نئے سرے سے خطاب فرمایا: هُمُ الْعَدُوُّ، یہ ضحاک کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہر آواز کو گمان کرتے ہیں جسے وہ مسجد میں سنتے ہیں کہ وہ آواز انہی کے متعلق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کے بارے میں حکم دیا۔ وہ ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی ایسا امر نہ نازل فرمادے جو ان کے خونوں کو مباح کردے اور ان کے پردوں کو چاک کردے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 54 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 15

فلو أنها عصفورۃٌ لحسبتُها مُسَوَّمَةً تَدعُو عُبَيْدًا وأَزْنَمَا(1)

اگر چہ وہ چڑیا ہو میں اسے نمایاں سردار خیال کرتا ہوں جو غلاموں اور کمینے لوگوں کو بلائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ ان کی صفت بیان کی هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ سے عبد الرحمان بن ابی حاتم نے بیان کیا ہے فَاحْذَرْهُمْ میں دو وجوہ ہیں۔(۱) اس سے احتیاط کیجئے کہ توان کے قول پر اعتماد کرے اور ان کے کلام کی طرف مائل ہو۔ (۲) وہ جو آپ ﷺ کے دشمنوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور آپ کے صحابہ کو چھوڑتے ہیں ان سے احتیاط کیجئے۔

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی؛ یہ حضرت ابن عباس اور ابو مالک کا قول ہے یہ ذم و توبیخ کا قول ہے۔ عرب کہتے ہیں: قاتله الله ما أشعرہ عرب اسے تعجب کی جگہ رکھتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ایسے آدمی کے محل میں رکھا جس کے ساتھ جابر دشمن جنگ کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر معاند پر غالب ہے؛ ابن عیسیٰ نے یہ حکایت بیان کی ہے۔

اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝ کیسے وہ جھوٹ بولتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے (2)۔ قتادہ نے کہا: وہ حق سے کیسے اعراض کرتے ہیں۔ حسن بصری نے کہا: وہ ہدایت سے پھرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دلائل کے واضح ہونے کے باوجود ان کی عقلیں کیسے گمراہ ہوتی ہیں۔ یہ افک سے مشتق ہے جس کا معنی پھرنا ہے۔ انی یہ کیف کے معنی میں ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۝

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت طلب کرے تو (انکار سے) اپنے سروں کو گھماتے ہیں اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ (حاضری سے) رک رہے ہیں تکبر کرتے ہوئے''۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ جب قرآن ان کی صفت کے بارے میں نازل ہوا ان کے قبیلہ کے لوگ ان کے پاس گئے انہوں نے کہا: تم نفاق کی وجہ سے ذلیل و رسوا ہو گئے۔ نفاق سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو اور یہ عرض کرو کہ وہ تمہاری بخشش فرمائے تو انہوں نے اپنے سروں کو جھٹک دیا یعنی انہوں نے استہزاء کے انداز میں اور انکار کرتے ہوئے اسے حرکت دی؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر سبب میں عبد اللہ بن ابی کا ایسا موقف تھا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول کی طاعت پر برانگیختہ کرتا۔ اسے کہا گیا: یہ چیز تجھے کیا نفع دے گی جبکہ رسول اللہ ﷺ تجھ پر ناراض ہیں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہو آپ تیرے لیے بخشش طلب کریں گے۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: میں آپ کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ان آیات کے نزول کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنی مصطلق کے ایک چشمہ پر جنگ کی جسے مریسیع کہتے جو قدید سے ساحل کی جانب تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزدور جسے جہجاہ کہتے، کا عبد اللہ بن ابی

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 59
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 16

کے حلیف کے ساتھ جھگڑا ہو گیا جسے سنان کہتے یہ جھگڑا ایک چشمہ پر ہوا جسے مثلل کہتے۔ جہجاہ نے مہاجرین کو بلایا اور سنان نے انصار کو بلایا۔ جہجاہ نے سنان کو تھپڑ مارا۔ عبداللہ بن ابی نے کہا: کیا انہوں نے ایسا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! ہماری اور ان کی مثال اس کی طرح ہے جس طرح پہلے نے کہا: اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ وہ تجھے کھا جائے۔ اللہ کی قسم! اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹے تو عزت والا ذلیل کو نکال دے گا (عزت والے سے مراد اس نے اپنی ذات اور اذل سے مراد اس نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات لی) پھر اپنی قوم سے کہا: اپنے کھانے کو آپ سے روک لو جو آپ کے پاس ہیں ان پر کھانا خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ بکھر جائیں اور چھوڑ جائیں۔ حضرت زید بن ارقم نے کہا جبکہ وہ عبداللہ کے حمایتیوں میں سے تھا: اللہ کی قسم! تو ذلیل ہے، اپنی قوم میں پست درجہ پر ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمان کی جانب سے عزت سے سرفراز ہیں اور مسلمانوں کی جانب سے محبت سے سرفراز ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اس کے بعد تجھ سے کلام نہیں کروں گا۔ عبداللہ منافق نے کہا: خاموش رہ، میں تو ویسے ہی بات کر رہا تھا۔ حضرت زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی تو عبداللہ بن ابی نے قسم اٹھا دی نہ اس نے یہ عمل کیا اور نہ ہی یہ بات کہی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ حضرت زید نے کہا: مجھے بڑا دکھ ہوا اور لوگوں نے مجھے ملامت کی تو سورۂ منافقین حضرت زید کی تصدیق اور عبداللہ کی تکذیب میں نازل ہوئی۔ عبداللہ بن ابی سے کہا گیا: تیرے بارے میں شدید آیات نازل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا کہ اپنے بارے میں بخشش کا طالب ہو۔ تو اس نے اپنا سر ہلا دیا، تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے اسی معنی کی روایات نقل کی ہیں۔ سورت کے آغاز میں وہ گزر چکی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ** کا معنی ہے نفاق سے توبہ کی دعا کریں گے کیونکہ توبہ کا معنی بھی استغفار ہے۔

**وَ رَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۝** وہ رسول اللہ سے اعراض کرتے ہیں اور تکبر سے اعراض کرتے ہیں۔ نافع نے تخفیف کے ساتھ لودا پڑھا ہے باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ کہا: یہ جماعت کا فعل ہے۔ نحاس نے کہا: یہ درست نہیں کیونکہ یہ عبداللہ بن ابی کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب اسے کہا گیا: آؤ! تیرے لیے رسول اللہ مغفرت طلب کریں تو اس نے استہزاء کے طریقہ پر اپنا سر ہلا دیا۔ اگر یہ کہا جائے: جماعت کے فعل کے ساتھ اس کے بارے میں کیوں خبر دی گئی؟ اسے کہا جائے گا: عرب اسی طرح کرتے ہیں جب وہ کسی انسان کے بارے میں کنایۃً بات کرتے ہیں۔

سیبویہ نے حضرت حسان کا شعر پڑھا:

ظننتم بأن یَخفَى الذى قد صنعتُم ۔۔۔ وفینا رسولٌ عنده الوَحی واضِعُه

تو گمان کرتا ہے کہ جو تو نے کہا ہے وہ مخفی رہے گا جبکہ ہمارے درمیان اللہ کے رسول ہیں ان کے پاس وحی آتی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت نے ابن ابیرق سے خطاب کیا جس نے مکہ مکرمہ میں چوری کی اس کا واقعہ مشہور ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس کے بارے میں خبر دی ہو اور جس نے اس جیسا فعل کیا ہو اس کے بارے میں خبر دی ہو۔ ایک قول یہ

کیا گیا ہے: جب ابن ابی نے اپنے سر کو بلایا تو اس نے کہا: تم نے مجھے حکم دیا کہ میں ایمان لاؤں تو میں ایمان لے آیا تم نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے مال کی زکوۃ دوں تو میں نے زکوۃ دے دی اور میرے لیے کوئی چیز باقی نہیں سوائے اس کے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سجدہ کروں۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

''یکساں ہے ان کے لیے کہ آپ طلب مغفرت کریں ان کے لیے یا طلب مغفرت نہ کریں ان کے لیے، الله تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا انہیں، بے شک الله تعالیٰ فاسقوں کی رہبری نہیں کرتا''۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ یعنی یہ سب برابر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا کچھ نفع نہیں دے گا کیونکہ الله تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا، اس کی مثل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرۃ) الله تعالیٰ کا فرمان ہے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ (الشعراء) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ الله تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود تھا کہ وہ فاسق ہی مرے گا۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

''یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں نہ خرچ کرو ان (درویشوں) پر جو الله کے رسول کے پاس ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ (بھوک سے تنگ آ کر) تتر بتر ہو جائیں اور الله کے لیے ہی ہیں خزانے، آسمانوں اور زمین کے لیکن منافقین (اس حقیقت کو) سمجھتے ہی نہیں''۔

ہم نے سبب نزول کا ذکر کیا۔ ابن ابی نے کہا: جو لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ آپ کے پاس سے بکھر جائیں گے (1)۔ الله تعالیٰ نے انہیں آگاہ کیا کہ زمین و آسمان کے خزانے اسی کے ہیں جیسے وہ چاہتا ہے، خرچ کرتا ہے۔ ایک آدمی نے حاتم اصم سے کہا: تو کہاں سے کھاتا ہے؟ جواب دیا: وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ جنید بغدادی نے کہا: آسمانوں کے خزانے غیوب ہیں اور زمین کے خزانے دل ہیں وہی غیوب کو جاننے والا ہے اور دلوں کو پھیرنے والا ہے (2)۔ شعبی کہا کرتے تھے: وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۱) جب زمین و آسمان کے خزانے الله تعالیٰ کے ہیں تو تم کہاں جاؤ گے؟ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ ۔ (۲) منافق یہ نہیں سمجھتے جب وہ کسی امر کا ارادہ کرے تو اسے آسان بنا دیتا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 60

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 18

وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

''منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر گئے مدینہ میں تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے مگر منافقون کو (اس بات کا) علم ہی نہیں''۔

جس طرح پہلے گزرا ہے یہ بات کرنے والا ابن ابی تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جب ابن ابی نے یہ کہا: لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وہ مدینہ کی طرف لوٹا چند دن ہی رہا تو مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے مغفرت طلب کی، اس کو اپنی قمیص پہنائی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اس کی وضاحت سورۂ براءۃ میں مفصل گزر چکی ہے۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ ابن سلول منافق سے کہا: اللہ کی قسم! تو اس وقت تک مدینہ طیبہ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک تو یہ نہ کہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں اور میں سب سے ذلیل ہوں۔ ابن ابی نے یہ بات کہی (1)۔ لوگوں کا وہم تھا کہ عزت اموال کی کثرت اور پیروکاروں کی کثرت سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس امر کو بیان کر دیا کہ عزت، شان و شوکت اور قوت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کریں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے''۔

مومنوں کو منافقین کے اخلاق سے خبردار کیا یعنی اپنے اموال میں ہی مگن نہ رہو جس طرح منافقوں نے کیا جب انہوں نے مال میں بخل کی وجہ سے کہا: جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں ان پر مال خرچ نہ کرو۔ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ذکر سے مراد حج اور زکوٰۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد قرآن کی قرأت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دائمی ذکر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پانچ نمازیں ہیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے حضرت حسن بصری نے کہا: مراد تمام فرائض ہیں گویا فرمایا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ منافقوں کو خطاب ہے یعنی تم زبان سے ایمان لاتے ہو تم دل سے بھی ایمان لاؤ۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ یعنی جو اپنے رب کی اطاعت کی بجائے مال اور اولاد میں مشغول ہوا وہ خسارے میں ہے۔

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَ لَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ المنافقین، حدیث نمبر 3237، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور خرچ کرلو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آ جائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ یہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لیے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ و خیرات کرلیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ مہلت نہیں دیا کرتا کسی شخص کو جب اس کی موت کا وقت آ جائے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کیا کرتے ہو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ یہ آیت جلدی زکوۃ نکالنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اس کو موخر کرنا اصلاً جائز نہیں اسی طرح باقی عبادات جن کا وقت معین ہو۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ اس سے دنیا کی طرف لوٹنے کا سوال کیا تاکہ عمل صالح کرے۔ امام ترمذی نے ضحاک بن مزاحم سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں۔ فرمایا: جس کے پاس اتنا مال تھا جس کے ساتھ وہ حج بیت اللہ کرسکتا تھا یا اس میں زکوۃ واجب ہوتی تھی اس نے ایسے نہ کیا وہ موت کے وقت رجوع کا سوال کرتا ہے۔ ایک آدمی نے عرض کی: اے ابن عباس! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یہ لوٹنے کا سوال تو کفار نے کیا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں تم پر قرآن کی تلاوت کرتا ہوں اور آیت نمبر 9 تا 11 کی تلاوت کی۔ پوچھا: زکوۃ کو کیا چیز واجب کرتی ہے؟ اس آدمی نے جواب دیا: جب مال دو سو درہم تک پہنچ جائے۔ پوچھا: حج کو کیا چیز واجب کرتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: زادراہ اور سواری (1)۔

میں کہتا ہوں: حلیمی ابو عبد اللہ حسین بن حسن نے کتاب ''منہاج الدین'' میں موضوع روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس مال ہو (2)'' یہ حدیث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کے عموم سے واجب کے انفاق کا استدلال کیا ہے نفل مراد نہیں لیا (3)۔ جہاں تک زکوۃ کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کرنے کا تعلق ہے تو یہ عموم کے اعتبار سے اور دو سو کی تقدیر کے ساتھ صحیح ہے جہاں تک حج کے قول کا تعلق ہے تو اس میں اشکال ہے کیونکہ اگر ہم یہ کہیں: حج کو موخر کرنا یہاں تک کہ حج کی ادائیگی سے قبل موت واقع ہو جائے تو اس کے معصیت ہونے میں علماء میں اختلاف ہے اسے آیت کا مصداق نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر ہم کہیں: حج فوری طور پر ادا کرنا ضروری ہے تو آیت کو عمومی معنی میں رکھنا صحیح ہے کیونکہ جس پر حج واجب ہوا اور اس نے حج ادا نہ کیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت پسند کرے گا کہ وہ لوٹے گا کہ عبادات میں سے جو اس نے ترک کیا ہے اس کو بجا لائے۔ جہاں تک زادراہ اور راحلہ کے مقدر ماننے کا تعلق ہے تو اس میں علماء میں اختلاف مشہور و معروف ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2 صفحہ 165۔ ایضاً، حدیث نمبر 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4 صفحہ 1813-1814

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوٹنے کی خواہش اور وعید ان مسائل میں کوئی عمل دخل نہیں رکھتی جن میں اجتہاد کی گنجائش ہو اور نہ ان میں کوئی عمل دخل ہوتا ہے جن میں اختلاف ہو جن مسائل میں اتفاق ہوتا ہے ان میں اس کا عمل دخل ہوتا ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ واجب نفقہ کو شامل ہوتا ہے کہ اسے کیسے خرچ کیا جائے یہ اجماع سے ثابت ہو یا نص قرآنی سے ثابت ہو کیونکہ واجب نفقہ کے علاوہ میں وعید ثابت نہیں ہوتی۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ لَوْلَاۤ یہ هلا کے معنی میں ہے تو یہ استفہام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لا زائدہ ہے تو کلام تمنی کے معنی میں ہوگی۔ فَاَصَّدَّقَ یہ تمنی کے جواب کے طور پر منصوب ہے اور اس سے پہلے فاء آیا ہے۔ واکون اس کا عطف فاصدق پر ہے؛ یہ ابو عمرو، ابن محیصن اور مجاہد کی قرأت ہے۔ باقی قراء نے وَاَكُنْ کو مجزوم پڑھا ہے اس کا عطف فاء کے محل پر ہے کیونکہ فَاَصَّدَّقَ مجزوم ہوتا اگر یہاں فاء نہ ہوتی۔ اس کی مثل مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ (الاعراف:186) ہے۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوتی جب يَذَرُهُمْ کو جزم دی جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت اہل توحید کے لیے سب سے سخت ہے کیونکہ کوئی بھی ایسا فرد جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں خیر ہو وہ دنیا کی طرف لوٹنے اور اس میں تاخیر کی آرزو نہیں کرتا۔

میں کہتا ہوں: شہید کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ واپس دنیا میں آنے کی آرزو کرے گا یہاں تک کہ اسے پھر شہید کیا جائے۔ وجہ اس کی وہ ہوگی جو وہ کرامت دیکھے گا۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑪ تم جو بھلائی اور برائی میں سے جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ عام قرأت فاء کے ساتھ خطاب کے طریقہ پر ہے۔ ابو بکر نے عاصم سے اور سلمی نے یاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اس صورت میں یہ اس کے بارے میں خبر ہے جو مر گیا ہے اور اس نے یہ قول کیا۔

# سورۃ التغابن

آیاتہا ۱۸ ۶۴ سورۃ التغابن مدنیۃ ۱۰۸ رکوعاتہا ۲

اکثر علماء کے قول میں یہ سورت مدنی ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ مکی ہے(1)۔ کلبی نے کہا: یہ مکی اور مدنی ہے(2)۔ اس کی اٹھارہ آیات ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس وقت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی مگر آخری آیات حضرت عوف بن مالک اشجعی کے حق میں نازل ہوئیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں اپنے اہل اور اولاد کی زیادتی کی شکایت کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ سورت کے آخر تک۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بچہ جنم نہیں لیتا مگر اس کے سر کے جوڑے (بالوں) میں سورۃ تغابن کی پہلی پانچ آیت لکھی ہوتی ہیں''(3)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ ۖ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

''اللہ ہی کی تسبیح کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر چیز جو زمین میں ہے، اس کی حکومت ہے اور اس کے لئے ساری تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تم میں سے بعض کافر ہیں اور تم میں سے بعض مومن ہیں، اور اللہ تعالیٰ، جو تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے''۔

پہلی آیت کی تفسیر پہلے کئی دفعہ گزر چکی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو مومن اور کافر پیدا کیا قیامت کے روز انہیں مومن، کافر کی حیثیت سے دوبارہ اٹھائے گا(4)۔ حضرت ابو سعید خدری سے روایت نقل کی گئی ہے۔ کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچھلے پہر ایک دفعہ خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں آئندہ ہونے والے امور کے بارے میں ذکر کیا(5)۔ فرمایا: ''لوگ مختلف طبقات میں جنم لیتے ہیں ایک آدمی مومن کی حیثیت میں پیدا ہوتا ہے، مومن کی حیثیت میں زندہ رہتا ہے اور مومن کی حیثیت میں مرجاتا ہے۔ ایک آدمی کافر کی حیثیت میں جنم لیتا ہے، کافر کی حیثیت میں زندہ رہتا ہے اور کافر کی حیثیت میں مرجاتا ہے''۔ حضرت ابن

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 20 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 3538

4۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 63 5۔ جامع ترمذی، ابواب الفتن، جلد 2، صفحہ 42

مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اس کی ماں کے پیٹ میں کافر پیدا کیا اور حضرت یحییٰ بن زکریا کو اپنی ماں کے پیٹ میں مومن پیدا کیا'' (1)۔ صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے: ''تم میں سے کوئی جنتیوں کا سا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے درمیان اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ یا باع (دونوں بازوں کو پھیلایا جائے تو ان کے درمیان کا فاصلہ) کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر غالب آ جاتی ہے تو وہ جہنمیوں کا سا عمل کرتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک آدمی جہنمیوں کا سا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ یا باع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آ جاتی ہے تو وہ جنتی کا سا عمل کرتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے☆'' اسے امام بخاری اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اس میں باع کا ذکر نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد ساعدی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک آدمی جنتی کا سا عمل کرتا ہے ان امور میں جو لوگوں کے لئے ظاہر ہوتے ہیں جبکہ وہ جہنمی ہوتا ہے اور ایک آدمی ظاہر میں جہنمی کا سا عمل کرتا ہے جبکہ وہ جنتی ہوتا ہے'' (2)۔ ہمارے علماء نے کہا: ان احادیث کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے معلوم کے ساتھ متعلق ہے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کے علم میں ہوتا ہے، جس کا وہ ارادہ کرے اور جو وہ حکم دے وہ عام احوال میں کبھی ایک شخص کے ایمان کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی معلوم وقت تک ایمان کا ارادہ کرتا ہے۔ یہی حالت کفر کی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے (3): کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یوں ہے فمنکم مؤمن و منکم کافر و منکم فاسق کلام سے حذف اس لئے ہوا کیونکہ کلام میں ایسی چیز موجود ہے جو اس کے حذف پر دلالت کرتی ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس میں کوئی حذف نہیں کیونکہ مقصود دونوں طرفوں کا ذکر ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا پھر انہوں نے کفر کیا اور وہ ایمان لائے۔ انہوں نے کہا: تمام کلام **هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ** ہے پھر ان کی صفت لگائی۔ **فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰى بَطْنِهٖ** (النور: 45) انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا اور چلنا انسانوں کا فعل ہے: اس قول کو حسین بن فضل نے اختیار کیا ہے۔ حسین بن فضل نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں مومن و کافر کی حیثیت سے پیدا کیا ہوتا تو ان کی صفت اس انداز میں نہ بتاتا **فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استنباط کیا ہے: ''ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں، اسے نصرانی بناتے ہیں اور اسے مجوسی بناتے ہیں'' (4)۔ سورۂ روم میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ ضحاک نے کہا: تم میں سے کچھ اندر سے کافر اور باہر سے مومن ہیں جس طرح منافق ہوتے ہیں۔ تم میں سے کچھ اندر سے مومن اور باہر سے کافر ہوتے ہیں جس طرح حضرت عمار (5) وغیرہ۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا: تم میں سے کچھ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے والے اور ستاروں کا انکار کرنے

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 64 — 2۔ صحیح مسلم، کیفیۃ خلق آدم، جلد 2، صفحہ 334 — 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 21

4۔ صحیح مسلم، ابواب القدر، جلد 2، صفحہ 336 — 5۔ حضرت عمار کو مشرکین مکہ نے اذیتیں دیں اور کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا۔

☆ جامع ترمذی، باب ما جاء ان الاعمال بالخواتیم، حدیث نمبر 2063، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والے ہوتے ہیں یعنی یہ انواء (ستاروں) کے بارے میں ہے (1)۔ زجاج نے کہا: یہ بہترین قول ہے؛ جو ائمہ اور جمہور امت کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو پیدا کیا اور اس کا کفر اس کا اپنا فعل اور کسب ہے جبکہ اس کے فعل کفر کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے مومن کو پیدا کیا اس کا ایمان اس کا فعل اور کسب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایمان کا خالق ہے کافر کفر کرتا ہے اور کفر کو پسند کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو پہلے پیدا کیا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو اس پر قدرت دی اور اس سے کفر کے وقوع کو جانتا تھا۔ یہ جائز نہیں کہ ان دونوں سے اس کے علاوہ کوئی چیز پائی جائے جن پر اللہ تعالیٰ نے اسے قادر بنایا تھا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کیونکہ مقدور کے خلاف کا پایا جانا یہ عاجزی ہے اور معلوم کے خلاف کا پایا جانا جہالت ہے۔ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں اس قول میں انسان جبر وقدر کے قول سے محفوظ رہتا ہے؛ جس طرح شاعر نے کہا:

يَا نَاظِرًا فِي الدِّيْنِ مَا الْأَمْرُ　لَا قَدْرٌ صَحَّ وَلَا جَبْرُ

اے دین میں غور و فکر کرنے والے! یہ معاملہ کیا ہے نہ قدر (2) صحیح ہے اور نہ جبر (3) صحیح ہے۔ سیلان نے کہا: ایک بدو بصرہ میں آیا۔ اسے کہا گیا: تو قدر کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا: یہ ایسا امر ہے جس میں گمانات بہت بڑھ گئے ہیں اور اختلاف کرنے والوں نے اس میں اختلاف کیا ہے ضروری ہے کہ ہم پر جو اس کے حکم میں سے معاملہ مشتبہ ہو جائے ہم اسے اس کے علم کی طرف پھیر دیں۔

## خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

''اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور تمہاری صورتوں کو خوبصورت بنایا اور اس کی طرف سب نے اٹھنا ہے''۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اس کی تفسیر کئی مواقع پر گزر چکی ہے یعنی اسی نے انہیں پیدا کیا ہے۔ یہ امر حق ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: باء، لام کے معنی میں ہے، یعنی انہیں حق کے لئے پیدا فرمایا۔ مراد ہوگا جنہوں نے برے اعمال کئے انہیں ان کے عمل کی جزا دے اور جنہوں نے اچھا عمل کیا انہیں اچھائی کا بدلہ عطا فرمائے۔ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں (4) اللہ تعالیٰ نے آپ کی کرامت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ (۲) تمام مخلوق مراد ہے۔ (۳) تصویر کا معنی گزر چکا ہے اس سے مراد خط لگانا اور شکل وصورت بنانا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: ان کی صورتوں کو کیسے اچھا بنایا؟ تو اسے جواب دیا جائے گا: اللہ تعالیٰ نے اسے تمام حیوانوں سے اچھا بنایا اور سب سے زیادہ خوبصورت بنایا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان یہ تمنا نہیں کرتا کہ اس کی صورت اس کے خلاف ہو جو اس نے تمام صورتیں دیکھی ہیں۔ اس کی حسین صورت سے مراد یہ بھی ہے کہ اسے سیدھا پیدا کیا وہ جانوروں کی طرح منہ کے بل گرا ہوا نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین) اس کی وضاحت ان شاء اللہ

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 64　2۔ انسان کا اپنے افعال کا خالق ہونا۔

3۔ انسان کا مجبور محض ہونا۔ جبریہ اور قدریہ دو مکاتب فکر ہو گزرے ہیں　4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 21

آئے گی۔ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ اس کی طرف سب کا اٹھنا ہے وہ ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے نیز وہ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے''۔

اس آیت کی تفسیر کئی مواقع پر گزر چکی ہے وہ عالم غیب و شہادت ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''کیا نہیں آتی تمہارے پاس اس کی خبر جنہوں نے کفر کیا اس سے پہلے پس چکھ لیا انہوں نے اپنے کام (یعنی کفر) کا وبال اور اس کے لئے (آخرت میں) دردناک عذاب ہے''۔

خطاب قریش کو ہے یعنی کیا تمہارے پاس گزری ہوئی امتوں کے کفار کی خبر نہیں پہنچی۔ انہیں دنیا میں بھی ان کے اعمال پر سزا دی گئی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

''اس کی وجہ یہ تھی کہ آتے رہے ان کے پاس ان کے پیغمبر روشن نشانیاں لے کر پس وہ بولے: کیا انسان ہماری رہبری کریں گے، پس انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ تعالیٰ بھی (ان سے) بے نیاز ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور سب خوبیاں سراہا ہے''۔

انہیں یہ عذاب اس وجہ سے آیا کہ انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا جو ان کے پاس واضح دلیل لائے انہوں نے انکار کر دیا کہ رسول بشر بھی ہو سکتا ہے بشر مبتدا ہونے کی حیثیت میں مرفوع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فعل مضمر ہے اور اس میں جمع کا معنی ہے اسی وجہ سے يَّهْدُوْنَنَا ارشاد فرمایا۔ یهدینا نہیں فرمایا۔ بعض اوقات واحد، جمع کے معنی میں ہوتا ہے تو وہ اسم جنس ہوتا ہے اس کا واحد انسان ہے لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں۔ بعض اوقات جمع واحد کے معنی میں آتا ہے جس طرح فرمایا: مَا هٰذَا بَشَرًا (یوسف: 31) انہوں نے اس قول اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا کے ساتھ انکار کیا۔ انہوں نے یہ قول ان کے چھوٹے پن کو ظاہر کرنے کے لئے کیا تھا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہر طرف سے روگردانی کی اور ایمان و موعظت سے اعراض برتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی بادشاہت کی وجہ سے بندوں کی طاعت سے مستغنی ہے اسے بندوں کی طاعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو برہان ظاہر کی ہے اور جس امر کو واضح کیا ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان

سے اس امر کے بارے میں بے نیاز ہو گیا ہے کہ ان پر مزید کوئی کرم نوازی فرمائے جو انہیں ہدایت کی طرف دعوت دے اور ہدایت کی طرف لے جائے (1)۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

''گمان کرتے ہیں کفار کہ انہیں ہرگز دوبارہ زندہ نہ کیا جائے گا فرمائیے: کیوں نہیں، میرے رب کی قسم! تمہیں ضرور زندہ کیا جائے گا پھر تمہیں آگاہ کیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے، اور یہ اللہ تعالیٰ کیلئے بالکل آسان ہے''۔

کافروں نے یہ گمان کیا کہ انہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ زعم سے مراد گمان رکھتے ہوئے کوئی بات کرنا۔ شریح نے کہا: ہر شی کی کنیت ہے اور کذب (جھوٹ) کی کنیت زعموا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عاص بن وائل سہمی اور حضرت خباب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جس کی وضاحت سورۂ مریم کے آخر میں گزر چکی ہے پھر ہر کافر کو شامل ہو گئی۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے: کیوں نہیں، تمہیں ضرور تمہاری قبروں سے زندہ کیا جائے گا پھر تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں آگاہ کیا جائے گا۔ دوبارہ اٹھانا اللہ تعالیٰ کے لئے پہلی دفعہ پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

''پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے''۔

قیامت کی پہچان کرانے کے بعد انہیں ایمان کا حکم دیا۔ نور سے مراد قرآن ہے۔ یہ ایسا نور ہے جس کے ذریعے گمراہی کی تاریکی سے ہدایت دی جاتی ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''جس دن تمہیں اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن یہی گھاٹے کے ظہور کا دن ہے اور جو ایمان لے آیا اللہ پر اور نیک عمل کرتا رہا اللہ دور فرما دے گا اس سے اس کے گناہوں کو اور داخل فرمائے گا اسے باغوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے تا ابد، یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ یوم میں عامل لَتُنَبَّؤُنَّ ہے یا خَبِيْرٌ ہے کیونکہ اس میں وعید کا معنی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 21
2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 22

موجود ہے۔ گویا فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے گا جس دن تمہیں جمع کرے گا یا اذ کہ فعل جو مضمر ہے وہ اس میں عامل ہے۔ غبن کا معنی نقص ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: غبنه غبنا جب کم قیمت کے ساتھ وہ کوئی چیز لے عام قرات یَجۡمَعُكُمۡ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۞ (الحدید) اس کے بارے میں خبر دی اور اللہ تعالیٰ کا نام پہلے ذکر کیا ہے اس لئے خبیر اس کے مناسب ہے۔

نصر، ابن ابی اسحاق، جحدری، یعقوب اور سلام نے نجمعکم پڑھا۔ یہ قراءۃ وَالنُّوۡرِ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلۡنَا کی موافقت کا اعتبار کرتے ہیں۔ یوم الجمع سے مراد وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ اولین، آخرین، انسانوں، جنوں، آسمان والوں اور زمین والوں کو جمع کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس روز اللہ تعالیٰ ہر بندے اور اس کے عمل کو جمع کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یوم الجمع اس لیے فرمایا کیونکہ اس میں وہ ظالم اور مظلوم کو جمع فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ ہر نبی اور اس کے امتی کو جمع فرمائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ اہل طاعت کے ثواب اور اہل معصیت کے عقاب کو جمع فرمائے گا۔

ذٰلِكَ يَوۡمُ التَّغَابُنِ یہ قیامت کا دن ہے (1)۔ جس طرح کہا:

اَلَا اِنَّمَا الراحات یوم التغابن  خبردار! راحتیں قیامت کے دن ہی ہوں گی۔

یوم قیامت کو یوم تغابن کا نام دیا کیونکہ اس میں جنتی، جہنمیوں سے غبن کریں گے یعنی جنتی جنت لے لیں گے اور جہنمی جہنم کو لے لیں گے۔ یہ مبادلہ کے طریقہ پر ہوگا۔ غبن اس لیے واقع ہوگا کیونکہ انہوں نے خیر کو شر، عمدہ کو ردی اور نعیم کو عذاب کے بدلے بدلا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: غبنت فلانا جب تو اس کے ہاتھ بیچے یا اس سے خریدے اور نقص و کمی اس پر واقع ہو اور غلبہ تیرے لیے ہو یہی کیفیت اہل جنت اور اہل نار کی ہوگی جس کی وضاحت بعد میں آئے گی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: غَبَنۡتُ الثوب و خبنتُه جب وہ تیری مقدار اور قد سے لمبا ہو اور اس سے کسی چیز کو سی دے تو یہ بھی نقصان ہے۔ مغابن جوڑ ھانچے اور ہیئت میں سے دہری ہو جائے جس طرح ابطین (بغلیں) اور فخذین (دونوں رانیں) مفسرین نے کہا: مغبون اسے کہتے ہیں جنت میں جس کے اہل اور منازل میں غبن واقع ہو جائے۔ اس روز ایمان کے ترک کرنے کی وجہ سے ہر کافر خسارے میں ہوگا اور ہر مومن کا نقصان احسان میں کوتاہی اور دنوں کو ضائع کرنے کی وجہ سے ظاہر ہوگا۔ زجاج نے کہا: جنت میں جس کی منزل بلند ہوگی وہ کم مرتبہ سے غبن کرنے والا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر یہ کہا جائے: وہ کون سا معاملہ ہے جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوا یہاں تک کہ اس میں غبن واقع ہوا؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بیع و شراء میں غبن میں مجاز کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى (البقرۃ: 16) جب یہ فرمایا کہ کفار نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے حاصل کر لیا اور انہوں نے تجارت میں کوئی نفع حاصل نہ کیا بلکہ انہوں نے نقصان اٹھایا تو یہ بھی ذکر کیا کہ ان کے ساتھ غبن کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 23

ہے کہ جنتیوں نے دنیا ترک کر کے آخرت کو خریدا اور جہنمیوں نے آخرت ترک کر کے دنیا کو خریدا۔ مجازاً یہ بھی مبادلہ کی ایک صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دو اجزاء میں تقسیم کیا۔ ایک فریق جنت میں اور ایک فریق آگ میں، ہر ایک کی منازل جنت اور جہنم میں رکھی گئی ہیں۔ یہ امر حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بے یار و مددگار چھوڑنا بندے پر غالب آ جاتا ہے جس طرح ہم اس سورت اور دوسری سورتوں میں بیان کر چکے ہیں تو وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے توفیق حاصل ہوتی ہے اسے محروم کا مکان بھی دے دیا جاتا ہے اور جس کو توفیق حاصل ہوتی ہے جہنم میں اس کا مکان محروم کو دے دیا جاتا ہے، گویا یوں مبادلہ واقع ہوا اور تغابن حاصل ہوا۔ لغت اور قرآن میں بے شمار امثلہ موجود ہیں۔ نثر آثار میں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے جبکہ اس کتاب میں یہ بکھری ہوئی ہیں۔ بعض اوقات اس تبادلہ کو وراثت سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح ہم نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ (المومنون) میں بیان کیا ہے۔ بعض اوقات تغابن اس دن کے علاوہ میں واقع ہوتا ہے جس کی وضاحت بعد میں آئے گی لیکن یہاں ایسے تغابن کا ارادہ کیا جس کی کمی کو پورا کرنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ تغابن انتہاء درجے کا ہے۔ حسن بصری اور قتادہ نے کہا: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تغابن کی تین قسمیں ہیں۔ ایسا آدمی جس نے علم سیکھا اسے دوسرے لوگوں کو سکھایا اور خود اسے ضائع کر دیا، اس پر عمل نہ کیا تو وہ بد بخت ہو گیا۔ جس نے اس سے سیکھا تھا اس نے اس پر عمل کیا تو وہ نجات پا گیا۔ ایک ایسا آدمی جس نے کئی طریقوں سے مال کمایا اس سے مال کا سوال کیا جاتا ہے اور وہ بخل سے کام لیتا ہے اور وہ اس کے باعث اپنے رب کی اطاعت میں کوتاہی کرتا ہے اور اس مال میں کوئی بھلائی کا کام نہیں کرتا، وہ اس مال کو وارث کے لیے چھوڑ جاتا ہے اس مال میں اس کے لیے کوئی نفع نہیں۔ وہ وارث اس مال میں اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کا ایک غلام تھا، وہ آدمی اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے اور سعادت مند ہو جاتا ہے اور آقا اپنے رب کی معصیت کرتا ہے تو وہ بد بخت ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے انہوں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کو اپنے سامنے کھڑا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو فرمائے گا: تم دونوں کہو جو تم کہنا چاہتے ہو۔ مرد عرض کرے گا: اے میرے رب! تو نے اس کا نفقہ مجھ پر لازم کیا۔ میں نے اسے حلال و حرام سب کھلایا۔ یہ مدعی اس مال کا مطالبہ کرتے ہیں میرے پاس تو کچھ بھی باقی نہیں جو ان کے حقوق پورے کر سکوں۔ عورت عرض کرے گی: اے میرے رب! ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اسے کہا ہو کہ تو حرام مال حاصل کر۔ میں نے اسے حلال سمجھ کر ہی کھایا اور اس نے میری رضا کی خاطر تیری نافرمانی کی۔ میں اس کے لیے اس پر راضی نہیں اسے اپنی رحمتوں سے دور کر دے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو نے سچ کہا۔ اسے جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا اور عورت کو جنت کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ وہ عورت جنت کے درجات سے اس کی طرف جھانکے گی اور اسے کہے گی: غبناك، غبناك جس کے ساتھ تو بد بخت ہوا ہم اس کے ذریعے سعادت مند ہوئے۔ یہی یوم تغابن ہے“۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ دنیاوی معاملات میں بھی غبن جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تغابن کو قیامت کے دن کے ساتھ خاص کیا ہے۔ فرمایا: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ یہ اختصاص اس امر کا فائدہ دیتا ہے کہ دنیا میں کوئی غبن نہیں جب کوئی آدمی بیع میں غبن پر مطلع ہو تو جب وہ ثلث پر زائد ہو تو اسے

رد کر دیا جائے گا؛ بغدادیوں نے اسے اختیار کیا ہے اور کئی وجوہ سے اس پر استدلال کیا۔ ان میں سے ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حبان بن منقذ کے لیے ارشاد ہے: اذا بایعت فقل لا خلابة ولك الخيار ثلاثا جب تو خرید و فروخت کرے تو کہہ دے: کوئی دھوکہ نہیں ہوگا اور تیرے لیے تین دن تک خیار (شرط) ہوگا۔ اس میں طویل سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔ ہم نے اسے اختلافی مسائل میں ذکر کیا ہے۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں غبن بالاجماع ممنوع ہے یہی دین کا حکم ہے کیونکہ غبن دھوکہ کے باب سے تعلق رکھتا ہے جو ہر ملت میں شرعاً حرام ہے لیکن تھوڑے سے غبن سے عموماً بچنا ممکن نہیں۔ شرع میں یہ امر گزر چکا ہے۔ اگر ہم اس کے لوٹانے کا حکم دیں تو بیع کبھی بھی نافذ نہ ہو سکے گی کیونکہ بیع تھوڑے بہت غبن سے خالی نہیں ہوتی۔ ہاں کثیر سے احتراز ممکن ہے تو اسے رد کرنا واجب ہے۔ قلیل اور کثیر میں فرق شریعت میں معلوم و معروف قاعدہ ہے ہمارے علماء نے اس حد کے لیے ثلث کو مقدر کیا ہے کیونکہ وہ ثلث (ایک تہائی) کو وصیت وغیرہ میں پاتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر معنی یہ ہوگا وہ تغابن کا دن ہے جو مطلقاً جائز ہے اس کی کوئی تفصیل نہیں یا وہ ایسے تغابن کا دن ہے جس کا کبھی بھی تدارک نہ کیا جا سکے گا کیونکہ دین کا تغابن دو طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔ بعض اموال میں رد کرنے کے ساتھ یا کسی دوسری بیع یا دوسرے سامان میں نفع حاصل کرنے کے ساتھ مگر جو آدمی جنت کو پانے میں خسارہ میں رہا تو اس کا کبھی بھی تدارک نہیں کیا جا سکتا۔ بعض صوفیاء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر غبن کو لکھ دیا ہے۔ کوئی آدمی بھی اپنے رب سے ملاقات نہیں کرے گا مگر وہ مغبون ہوگا کیونکہ اس کے لیے عمل میں پورا حق ادا کرنا ممکن نہیں یہاں تک کہ اسے پورا ثواب حاصل ہو۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا یلقی اللہ احد الا نادما ان کان مُسیأ ان لم یحسن وان کان محسنا ان لم یزدد (1) کوئی بندہ اللہ سے ملاقات نہیں کرے گا مگر وہ نادم ہوگا۔ اگر گناہگار ہوگا تو وہ کہے گا: اس نے اچھا عمل کیوں نہیں کیا اگر وہ محسن ہوگا تو وہ کہے گا: اس نے زیادہ عمل کیوں نہیں کیا۔ نافع اور ابن عامر نے یکفر اور یدخلہ کو نون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑩

''جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخی ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہی بات بری پلٹنے کی جگہ ہے''۔

آیاتنا سے مراد قرآن ہے۔ جب مومنوں کے لیے جو کچھ ہے اس کا ذکر کیا تو جو کچھ کافروں کے لیے ہے اس کا بھی ذکر کیا جس طرح کئی مواقع پر پہلے گزر چکا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪

''نہیں پہنچتی (کسی کو) کوئی مصیبت بجز اللہ کے اذن کے اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آئے اللہ اس کے دل کو

1۔ احکام القرآن لابن العربی

ہدایت بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ اذن سے مراد ارادہ اور قضا ہے۔ فراء نے کہا: مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ کفار نے کہا: جس پر مسلمان ہیں اگر یہ حق ہوتا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں مصائب سے محفوظ رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو واضح کیا کہ نفس، مال، قول یا فعل میں جب بھی مصیبت واقع ہوتی ہے وہ بے چینی اور غم کا تقاضا کرتی ہے یا ایسے عقاب کا تقاضا کرتی ہے جو جلدی واقع ہونے والا ہوتا ہے یا دیر سے واقع ہونے والا ہوتا ہے تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم اور قضا سے ہوتا ہے۔

وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ جو اس امر کی تصدیق کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ تو صبر و رضا کی طرف اس کے دل کو ہدایت عطا فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے دل کو ایمان پر مضبوط کرتا ہے۔ ابو عثمان جیزی نے کہا: جس کا ایمان صحیح ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اتباع سنت کی ہدایت دیتا ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت عطا فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿ (البقرۃ)؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے (3)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یقین پیدا کرتا ہے تاکہ اسے علم ہو کہ اسے جو مصیبت پہنچی ہے وہ چھوٹنے والی نہ تھی اور جو اسے نہیں پہنچی وہ اسے پہنچنے والی نہ تھی (4)۔ کلبی نے کہا: جب اسے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور جب اس پر انعام کیا جاتا ہے تو وہ شکر بجالاتا ہے اور جب اس پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ بخش دیتا ہے (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ جنت میں ثواب پانے کی طرف اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے۔ عام قرأت یَہۡدِ ہے یاء پر فتحہ اور دال کے نیچے کسرہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا پہلے نام ذکر کیا گیا ہے۔ سُلمی اور قتادہ نے یھد قلبُہ پڑھا ہے۔ یہ مجہول کا صیغہ ہے اور قلبہ کی باء مرفوع ہے کیونکہ یہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے۔

طلحہ بن مصرف اور اعرج نے اسے نھد پڑھا ہے۔ یہاں نون تعظیم کے لیے ہے اور قلبَہ کی باء پر زبر ہے۔ عکرمہ نے یھدا قلبہ پڑھا ہے، یعنی اس کا دل سکون پاتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے۔ اس کی مثل مالک بن دینار کی قرأت ہے مگر اس میں ہمزہ کو ضغطہ کے ساتھ نہیں پڑھا بلکہ ہمزہ کو لینہ پڑھا ہے۔

وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿ جس نے اس کی اطاعت کی اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اس کی اطاعت شعاری اس پر مخفی نہیں اور جس نے اس کو نہ مانا اس کی کراہت بھی اس پر مخفی نہیں۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۲﴾

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۳﴾

''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی پھر اگر تم نے روگردانی کی (تو تمہاری قسمت) ہمارے رسول

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 23 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 66 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 22

4۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 66 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 22

کے ذمہ فقط کھول کر (پیغام) پہنچانا ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں پس اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو"۔

مصائب کو اپنے اوپر ہلکا جانو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے آپ کو مشغول رکھو اور سنت پر عمل کرنے میں اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم اطاعت سے روگردانی کرو گے تو اللہ کے رسول کے ذمہ تو صرف پیغام حق پہچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کوئی خالق نہیں اس پر بھروسہ کرو۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

"اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے دشمن ہیں پس ہوشیار رہو ان سے، اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور بخش دو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت مدینہ طیبہ میں حضرت عوف بن مالک اشجعی کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنی بیوی اور اولاد کی جفا کی شکایت کی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ طبری نے عطا بن یسار سے روایت نقل کی ہے کہ سورۂ تغابن پوری کی پوری مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی مگر یہ آیات حضرت عوف بن مالک اشجعی کے حق میں نازل ہوئیں (1)۔ وہ اہل و اولاد والے تھے۔ جب حضرت مالک جہاد پر جانے کا ارادہ کرتے تو یہ روتے اور انہیں نرم کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ کہتے: آپ ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں؟ تو حضرت مالک بھی ان کے لیے نرم ہو جاتے اور اپنے گھر میں ہی رہ جاتے تو یہ آیت ان کے حق میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ باقی آیات سورت کے آخر تک مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: ایک آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا: یہ کچھ لوگ تھے جو اہل مکہ میں سے تھے، وہ مسلمان ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا تو ان کی بیویوں اور بچوں نے انکار کر دیا کہ وہ انہیں چھوڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں جب وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دین میں کافی تفقہ حاصل کر چکے ہیں تو انہوں نے ارادہ کیا کہ اپنی بیویوں اور اولادوں کو سزا دیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2)۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ عداوت کی وجہ کی د ... ت کرتی ہے کیونکہ دشمن اپنی ذات کی وجہ سے

1۔ تفسیر طبری، جز 28، صفحہ 140

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 165۔ ایضاً، باب ومن سورۃ التغابن، حدیث 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دشمن نہیں ہوتا وہ اپنے فعل کی وجہ سے دشمن ہوتا ہے(1)۔ جب بیوی اور اولاد دشمنوں کا سا عمل کرے تو وہ دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی قبیح فعل نہیں ہو سکتا کہ وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں حائل ہو جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شیطان انسان کے لیے ایمان کے راستہ میں بیٹھتا۔ اسے کہتا: کیا تو ایمان لاتا ہے اور اپنے سابقہ دین اور اپنے آباء کے دین کو چھوڑتا ہے؟ انسان اس کی مخالفت کرتا ہے، ایمان لاتا ہے۔ وہ ہجرت کے راستہ پر بیٹھتا اور اسے کہتا: کیا تو اپنے مال اور اپنے اہل کو چھوڑتا ہے؟ انسان اس کی مخالفت کرتا ہے اور ہجرت کرتا ہے۔ پھر وہ جہاد کے راستہ پر بیٹھتا ہے اسے کہتا ہے کیا تو جہاد کرتا ہے اپنے نفس کو قتل کرتا ہے تو تیری عورتوں سے نکاح کیا جائے گا اور تمہارا مال تقسیم کر دیا جائے گا؟ انسان اس کی مخالفت کرتا ہے، وہ جہاد کرتا ہے اور شہید ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے'' (2)۔ شیطان کے بیٹھنے کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) وسوسہ کے ذریعے۔ (۲) وہ انسان جس کا ارادہ کرتا ہے اس کو روکنے کے لیے خاوند، بچے اور ساتھی کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (فصلت: 25) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکمت کی باتوں میں سے ہے: جس نے اہل، مال اور اولاد کو ہی لازم پکڑ لیا تو وہ دنیا کا بندہ ہے۔ صحیح حدیث میں اس سے ادنیٰ کی حالت کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دینار کا بندہ ہلاک ہو، درہم کا بندہ ہلاک ہو، خمیصہ (سیاہ رنگ کی مربع چادر جس میں دھاریاں ہوں) کا بندہ ہلاک ہو، قطیفہ (بڑی چادر) کا بندہ ہلاک ہو، وہ ہلاک و برباد ہو اور جب اسے کانٹا چبھے تو اس کا کانٹا نہ نکلے'' (3)۔ دینار اور درہم کی عبادت سے بڑھ کر کوئی کمینگی نہیں اور کوئی خواہش اس سے پست خواہش نہیں ہو سکتی جو نئے کپڑے کے ساتھ پوری ہو جاتی ہو۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ جس طرح مرد کے لیے اس کی اولاد اور اس کی بیوی دشمن ہوتی ہے اسی طرح عورت کے لیے اس کا خاوند اور اس کی اولاد اس معنی میں بعینہ اس کی دشمن ہوا کرتی ہے۔ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ کے عموم میں مذکر اور مونث دونوں داخل ہیں کیونکہ یہ دونوں آیت کے عموم میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ فَاحْذَرُوْهُمْ اپنے بارے میں ان سے ہوشیار رہو۔ اپنی ذات کے بارے میں محتاط ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) دین میں ضرر کی وجہ سے۔ (۲) بدن میں ضرر کی وجہ سے۔ جسم کا ضرر دنیا سے متعلق ہے اور دین کا ضرر آخرت سے متعلق ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندے کو اس سے خبردار کیا اور اس سے ڈرایا۔

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ طبری نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ کوئی آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کا ارادہ کرتا تو اس کے گھر والے اسے کہتے: تو کہاں جاتا ہے اور تو ہمیں کہاں چھوڑے جا رہا ہے(4)؟ جب وہ اسلام لے آیا اور اس نے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کر لی تو اس نے کہا: میں ان کی

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1817
2۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، من اسلم وھاجر وجاھد، جلد 2، صفحہ 57
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1819
4۔ تفسیر طبری، جز 28، صفحہ 140

طرف ضرور جاؤں گا جو مجھے اس سے منع کرتے تھے اور میں یہ یہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ مجاہد نے اس آیت کے بارے میں کہا: انہوں نے دنیا میں ان سے کوئی دشمنی نہیں کی لیکن ان کی محبت نے انہیں اس امر پر برانگیختہ کیا کہ وہ ان کے لیے حرام مال حاصل کریں اور انہیں دے دیں۔ آیت ہر معصیت کو عام ہے۔ انسان اپنے دین اور مال کی وجہ سے ان کا ارتکاب کرتا ہے۔ سبب نزول کا خصوص، حکم کے عموم کے مانع نہیں۔

**اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝**

''بے شک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اجر عظیم ہے''۔

اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ فتنہ سے مراد آزمائش اور امتحان ہے جو تمہیں حرام چیز کے کمانے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو روکنے پر برانگیختہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی معصیت کرتے ہوئے ان کی اطاعت نہ کرو۔ حدیث میں ہے یُؤتیٰ برجل یوم القیامة فیقال أکَلَ عِیَالُہ حسناته (1) قیامت کے روز ایک آدمی لایا جائے گا اسے کہا جائے گا: اس کے عیال اس کی نیکیاں کھا گئے ہیں۔ بعض سلف صالحین سے مروی ہے: عیال طاعات کے لیے گھن ہے۔ قتیبی نے کہا: فتنہ کا معنی ہے دلدادہ ہونا یہ جملہ بولا جاتا ہے: فتن الرجل بالمرأۃ مرد عورت کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فتنہ کا معنی امتحان ہے اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

لقد فتن الناس بدینهم ''لوگ اپنے دین میں امتحان میں پڑ گئے''۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: اے اللہ! مجھے فتنہ سے محفوظ رکھ کیونکہ تم میں سے کوئی بھی اپنے دین، مال اور اولاد کی طرف نہیں لوٹتا مگر وہ فتنہ پر مشتمل ہوتا ہے بلکہ وہ یہ کہے: اللّٰھُم إنِّی أعوذبك من مضلات الفتن، اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے فتنوں سے جو گمراہ کرنے والے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: مِنْ اَزْوَاجِكُمْ میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے کیونکہ وہ سارے کے سارے اعداء نہیں (2)۔ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ میں مِنْ ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ دونوں چیزیں فتنہ اور دل کی مشغولیت سے خالی نہیں۔

امام ترمذی وغیرہ نے عبداللہ بن بریدہ سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ آئے جبکہ ان پر سرخ قمیصیں تھیں۔ وہ چل رہے تھے اور لڑکھڑا رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے، ان دونوں کو اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھالیا پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں۔ میں نے ان دونوں بچوں کو چلتے ہوئے اور لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو میں صبر نہ کر سکا یہاں تک کہ میں نے اپنی گفتگو کو قطع کیا اور ان دونوں کو اٹھالیا'' (3)۔ پھر آپ خطبہ میں شروع ہو گئے۔

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 550 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 164

3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب الحسن و الحسین رضی اللہ عنهما، جلد 2، صفحہ 218۔

ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 935، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3589، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝ اجر عظیم سے مراد جنت ہے۔ یہ غایت ہے مفسرین کے قول کے مطابق اس سے بڑھ کر کوئی اجر نہیں۔ صحیحین میں حدیث ہے۔ الفاظ بخاری کے ہیں (1)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا: اے جنتیو! وہ عرض کریں گے: لبیک و سعدیک اے ہمارے رب! اللہ تعالیٰ پوچھے گا: کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے: ہم کیوں راضی نہ ہوں جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کیا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: کیا میں تمہیں اس سے افضل عطا نہ کروں؟ وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اس سے افضل کوئی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں تم پر اپنی رضا نازل کرتا ہوں، اس کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا'' (2)۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رضا آرزوؤں کی غایت ہے۔ صوفیہ نے اس کی تحقیق میں یہ اشعار کہے ہیں:

امتحن الله به خلقه فالنار والجنة في قبضته

فهجره أعظم من نارهِ ووَصْلُهُ أَطْيَبُ من جَنَّتِه

اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنی مخلوق کا امتحان لیا آگ اور جنت اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کا فراق اس کی آگ سے بڑھ کر تکلیف دہ ہے اور اس کا وصل اس کی جنت سے اچھا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ۝

''پس ڈرتے رہو اللہ سے جتنی تمہاری استطاعت ہے اور اللہ کا فرمان سنو اور اسے مانو اور (اس کی راہ میں) خرچ کرو یہ بہتر ہے تمہارے لئے، اور جنہیں بچا لیا گیا ان کے نفس کے بخل سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دو تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا تمہارے لئے اور بخش دے گا تمہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان (اور) بہت حلم والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اہل تاویل کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ آیت اس آیت اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران: 102) کے لئے ناسخ ہے۔ ان میں قتادہ، ربیع بن انس، سدی اور ابن زید ہیں۔ طبری نے ذکر کیا ہے: مجھے یونس بن عبد الاعلیٰ نے اور انہیں ابن وہب نے انہیں ابن زید نے خبر دی کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران: 102) کے ارشاد سے شدید امر آیا صحابہ نے کہا: اس کی قدر کون پہچان سکتا ہے یا کوئی اس تک پہنچ سکتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہچان لیا کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، جلد 2 صفحہ 969

2۔ احکام القرآن لابن العربی

یہ امر ان پر شدید ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان پر منسوخ کر دیا اور اس آیت کے بدلے دوسری آیت لایا، وہ یہ آیت ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ نہیں لیکن حَقَّ تُقٰتِهٖ کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہاد کرے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ملامت کرنے والے کی ملامت انہیں گرفت میں نہیں لیتی، وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے انصاف کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں خواہ انصاف ان کے خلاف ہو ان کے آباء کے خلاف ہو اور ان کے بیٹوں کے خلاف ہو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر یہ کہا جائے: جب یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان جو سورۃ تغابن میں ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کا کیا معنی ہے تو یہ کیسے جائز ہوگا کہ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران: 102) اور فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ جمع ہو جائیں جبکہ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ایسا امر ہے جو بغیر کسی خصوص کے ثابت ہے اور ان میں کوئی شرط بھی نہیں اور فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ایسا امر ہے جو شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ تو اسے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس سے مختلف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کا معنی ہے اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور تارڑ میں رہو ان چیزوں میں جو تمہارے لئے فتنہ بنا دی گئی ہیں وہ تمہارے مالوں میں سے ہو اور تمہاری اولاد سے ہو کہ کہیں وہ فتنہ تم پر غالب ہی نہ آ جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے جو تم پر واجب ہے اس سے تمہیں روک نہ دے جیسے کفر کے علاقہ سے اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کی۔ جس قدر تم طاقت رکھتے ہو تو تم ہجرت کو ترک کر دو، معنی ہے تم ہجرت کی طاقت رکھتے ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کو معذور جانا ہے جو ہجرت کی طاقت نہ رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْھُمْ (النساء: 99)

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ جو آدمی حیلہ نہیں رکھتا اور دار شرک میں رہنے کی وجہ سے کوئی راہ نہیں پاتا تو اسے معافی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ بھی ہجرت کے بارے میں ہے کہ دار شرک سے دار اسلام کی طرف ہجرت کرو تو تم اپنے اموال اور اولاد کے فتنہ کی وجہ سے ترک کرو؛ جو چیز اس کی صحت پر دال ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ جو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ کے بعد آیا ہے۔

قرآن حکیم کی تاویل کرنے والے اہل علم اسلاف میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے دار شرک سے دار اسلام کی طرف ہجرت کرنے میں تاخیر کی کیونکہ ان کی اولادوں نے انہیں روک لیا تھا جس طرح پہلے گزر چکا ہے؛ یہ سب طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے مراد ہے یہ نفلی عبادات اور صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ جب اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران: 102) آیت نازل ہوئی تو یہ حکم قوم

پر بڑا سخت واقع ہوا انہوں نے قیام کیا یہاں تک کہ ان کی پنڈلیاں سوج گئیں، ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں تخفیف کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ تو پہلی آیت منسوخ ہوگئی؛ یہ ابن جبیر نے کہا: ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے اگر یہ قول ثابت نہ ہو کہ جس آدمی کو نافرمانی پر مجبور کیا جائے تو اس کا مواخذہ نہ ہو کیونکہ وہ تقویٰ کی استطاعت نہیں رکھتا تھا (1)۔

**مسئلہ نمبر 3۔** وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا جو تمہیں وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اس کو سنو اور جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے اور جس سے تمہیں روکا جاتا ہے اس کی اطاعت کرو۔ مقاتل نے کہا: اللہ کی کتاب میں سے جو تم پر نازل کی جاتی ہے اسے غور سے سنو، سماع میں یہی اصل ہے اللہ تعالیٰ کا رسول جو تمہیں حکم دے اور جس سے تمہیں منع کرے اس کی اطاعت کرو۔ قتادہ نے کہا: ان دونوں امور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی گئی کہ امر و نہی کو سنا بھی جا سکتا اور طاعت بھی کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسْمَعُوْا کا معنی ہے جو تم سنتے ہو اسے قبول کرو۔ اسے سماع سے تعبیر کیا ہے کیونکہ قبول کرنا سماع کا فائدہ ہے۔

میں کہتا ہوں: حجاج نے اس آیت کی تعبیر میں اپنی جانب سے معنی گھسیڑا جب اس نے اس آیت کی تلاوت کی اور اسے عبدالملک بن مروان پر منطبق کیا کہا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا یہ عبدالملک بن مروان جو امین اللہ اور اس کا خلیفہ ہے کے بارے میں ہے اس میں کوئی استثنا نہیں اللہ کی قسم! اگر میں کسی کو حکم دوں کہ وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکلے تو وہ کسی اور جگہ سے نکلے تو اس کا خون میرے لئے حلال ہو جائے گا (☆)۔ اس نے آیت کی تاویل کرنے میں جھوٹ بولا کیوں نہیں یہ اولاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کے لئے ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: 59)

**مسئلہ نمبر 4۔** وَاَنْفِقُوْا ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد زکوٰۃ ہے (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد جہاد میں نفقہ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انسان کا اپنی ذات کے لئے نفقہ ہے (3)۔ ابن عربی نے کہا: لِّاَنْفُسِكُمْ کے الفاظ نے اس سے یہ قول کروایا ہے اور اس پر یہ امر مخفی رہا کہ نفقہ میں فرض اور نفل سب اپنی ذات کے لئے ہی نفقہ ہوتا ہے (4) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7) انسان بھلائی میں سے جو بھی فعل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حکم عام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میرے پاس ایک دینار ہے۔ فرمایا: ''اسے اپنی ذات پر خرچ کر''۔ اس نے عرض کی: میرے پاس دوسرا ہے۔ فرمایا: ''اسے اپنے گھر والوں پر خرچ کر''۔ عرض کی: میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ فرمایا: ''اسے اپنی اولاد پر خرچ کر''۔ عرض کی میرے پاس ایک اور دینار

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 26
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1822
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 166
4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1822
☆۔ سنن ابی داؤد، باب فی الخلفاء، حدیث نمبر 4025، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ فرمایا: ''اسے صدقہ کر دے'' (☆)۔ پہلے ذات، اہل اور اولاد کا ذکر کیا اور صدقہ کو بعد میں رکھا، شرع میں یہی اصل ہے

**مسئلہ نمبر 5**۔ خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ۔ خیرا سیبویہ کے نزدیک فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اس پر اَنْفِقُوْا دلالت کرتا ہے گویا فرمایا: ایتوا فی الانفاق خیرا لانفسکم یا قدموا خیر الانفسکم۔ کسائی اور فراء کے نزدیک یہ مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہے انفقوا انفاقا خیرء الانفسکم ابوعبیدہ کے نزدیک یہ کان مضمرہ کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یکن خیرا لکم جس نے خیر سے مراد مال لیا ہے تو یہ انفقوا کی وجہ سے منصوب ہے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اس طرح اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ کے بارے میں سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید میں بحث گزر چکی ہے۔ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ شکر کے بارے میں بحث سورۃ البقرۃ میں گزر چکی ہے۔ حلیم اسے کہتے ہیں جو جلد بازی نہیں کرتا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ۱۸ ع

''ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا ہے سب پر غالب بڑا دانا ہے''۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ جو غائب ہے اور جو حاضر ہے اس کو جاننے والا ہے الْعَزِيْزُ وہ غالب و قاہر ہے یہ صفات افعال میں سے ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (الزمر) اس اللہ کی جانب سے جو قادر محکم ہے تمام اشیاء کا خالق ہے۔ خطابی نے کہا: بعض اوقات یہ لفظ نفاست قدر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی میں کہا جاتا ہے۔ عزیعزاس تعبیر کی بنا پر عزیز کا معنی اسے بھی شامل ہوتا ہے کہ اس کے ہم پلہ کوئی چیز نہیں اور اس کی مثل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ الْحَكِيْمُ وہ اپنی مخلوق کی تدبیر میں حکیم ہے۔ ابن انباری نے کہا: حکیم سے مراد اشیا کو پیدا کرنے میں محکم ہے اسے فعیل کی طرف پھیرا گیا ہے، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ (یونس) یہاں بھی اس کا معنی محکم ہے اسے فعیل کی طرف پھیرا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

☆ سنن ابی داؤد، باب فی صلۃ الرحم، حدیث نمبر 1441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ الطلاق

آیاتہا ۱۲　　۶۵ سُوْرَۃُ الطَّلَاقِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۹　　رکوعاتہا ۲

تمام کے قول میں یہ سورت مدنی ہے اس کی گیارہ یا بارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

"اے نبی (مکرم) (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور شمار کرو عدت کو اور ڈرتے رہا کرو الله سے جو تمہارا پروردگار ہے، نہ نکالو انہیں ان کے گھروں سے اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس کے کہ وہ ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا، اور یہ الله کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں، اور جو تجاوز کرتا ہے الله کی حدوں سے تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا، تجھے کیا خبر کہ الله تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے"۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جمع کے لفظ کے ساتھ خطاب تعظیم اور تفخیم کے لئے ہے۔ سنن ابن ماجہ میں سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو طلاق دی تو وہ اپنے اہل میں آ گئیں کہ الله تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: اس سے رجوع کر لیں کیونکہ وہ بڑی عبادت گزار اور روزے رکھنے والی ہے جنت میں بھی یہ آپ کی بیویوں میں سے ہے (1)؛ ماوردی، قشیری اور ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے (2)۔ قشیری نے یہ زائد ذکر کیا ہے ان کے اپنے گھر والوں کی طرف جانے کے بارے میں الله تعالیٰ کا یہ فرمان: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ نازل ہوا۔ کلبی نے کہا: اس آیت کے نزول کا سبب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حفصہ پر ناراض ہونا تھا۔ جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے راز داری کی بات کی تھی تو حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بات کی تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو طلاق دے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، صفحہ 146　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 28

دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

سدی نے کہا: یہ آیت حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں ایک طلاق دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ اس سے رجوع کرے پھر اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے پھر حائضہ ہو اور پھر پاک ہو جائے جب وہ اسے طلاق دینے کا ارادہ کرے تو جب وہ پاک ہو تو جماع سے پہلے اسے طلاق دے دے یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کو طلاق دی جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کچھ لوگوں نے اسی طرح کا عمل کیا جیسا عمل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کیا ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت عمرو بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن غزوان تھے (1) یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن عربی نے کہا: یہ سب اقوال اگرچہ صحیح نہیں تاہم پہلا قول زیادہ اچھا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک نیا حکم شرعی بیان کرنے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مراد آپ کی امت ہے یہ کلام دو لفظوں حاضر اور غائب میں تبدیل ہونے والی ہے۔ یہ فصیح لغت ہے جس طرح فرمایا: **حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ** (یونس: 22) تقدیر کلام یہ ہے: یایھا النبی قل لھم اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن۔ یہ ان کا قول ہے کہ خطاب تو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور معنی آپ کو اور مومنین سب کو شامل ہے جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خطاب کیا تو اس قول کے ساتھ ملاطفت فرمائی **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ** جب خطاب لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا تو فرمایا: **یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ** (المائدہ: 41) میں کہتا ہوں: اس قول کی صحت پر حضرت اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ کے بارے میں عدت کا حکم بھی دلالت کرتا ہے۔ اس کے متعلق ابوداؤد کی کتاب میں ہے (2) کہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طلاق دی گئی جبکہ مطلقہ کے لئے کوئی عدت نہ تھی جب حضرت اسماء کو طلاق دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا حکم نازل فرمایا۔ یہ وہ پہلی عورت ہیں جن کے بارے میں طلاق کی عدت کا حکم نازل ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کی خاطر ندا کی گئی پھر نئے سرے سے کلام کی گئی۔ فرمایا: **اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ** جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ** (المائدہ: 90) مومنین کا ذکر تکریم کے لئے ہے۔ پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا گیا: **اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ** (المائدہ: 90)

**مسئلہ نمبر 2**۔ ثعلبی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنّ من أبغض الحلال إلى الله الطلاق۔ (3) اللہ تعالیٰ کے ہاں حلال چیز میں سب سے مغوض طلاق ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: تزوّجوا ولا تُطلّقوا فإنّ الطّلاق یهتزّ منه العرش تم شادیاں کرو، طلاق نہ دو کیونکہ طلاق سے عرش لرز جاتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1823
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2007، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عورتوں کو طلاق نہ دو مگر تہمت کی وجہ سے بے شک اللہ تعالیٰ مزا چکھنے کے لئے نکاح کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں فرماتا''۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''طلاق کی قسم یا اس کا مطالبہ منافق ہی کرتا ہے'' (1)۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام کی اسناد اپنی کتاب میں ذکر کر دی ہیں۔ دار قطنی نے روایت کی ہے ابو عباس، محمد بن موسیٰ بن علی دولابی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں حسن بن عرفہ سے وہ اسماعیل بن عیاش سے وہ حمید بن مالک لخمی سے وہ مکحول سے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: ''اے معاذ! اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر غلام آزاد کرنے سے بہتر کوئی چیز پیدا نہیں کی اور روئے زمین پر طلاق سے بڑھ کر کوئی ناپسندیدہ چیز پیدا نہیں کی۔ جب کوئی آقا اپنے مملوک کو کہے: أنت حر إن شاء اللہ وہ آزاد ہوگا کوئی استثنا نہ ہوگی جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تو استثناء درست ہوگی اور اسے کوئی طلاق نہ ہوگی''۔

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع سے وہ یزید بن ہارون سے وہ اسماعیل بن عیاش سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں (2)۔ عثمان بن احمد دقاق، اسحاق بن ابراہیم بن سنین سے وہ عمر بن ابراہیم بن خالد سے وہ حمید بن مالک لخمی سے وہ مکحول سے وہ مالک بن مخامر سے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حلال نہیں فرمایا جو طلاق سے بڑھ کر اس کی بارگاہ میں مبغوض ہو جس نے طلاق دی اور استثنا کی تو استثنا کا اعتبار ہوگا''۔ ابن منذر نے کہا: طلاق اور آزادی میں استثنا ذکر کرنے کی صورت میں علماء نے اختلاف کیا ہے ایک طائفہ نے کہا: یہ جائز ہے۔ ہم نے یہ قول طاؤس سے روایت کیا ہے۔ حماد کوفی، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے نے یہی کہا ہے۔ امام مالک اور اوزاعی کے قول میں طلاق میں استثناء جائز نہیں؛ طلاق میں یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول میں کرتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ دار قطنی نے عبد الرزاق کی حدیث نقل کی ہے میرے چچا وہب بن نافع عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ طلاق کی چار صورتیں ہیں دو صورتیں حلال ہیں اور دو صورتیں حرام ہیں (3)۔ جہاں تک حلال کا تعلق ہے کہ خاوند بیوی کو طلاق دے ایسے طہر میں جس میں اس نے جماع نہ کیا ہو اور اسے طلاق دے جبکہ وہ حاملہ ہو اور اس کا حمل ظاہر ہو۔ جہاں تک حرام کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسے طلاق دے جبکہ وہ حائضہ ہو یا جماع کرنے کے بعد اسے طلاق دے عورت کو یہ علم نہ ہو کہ اس کا رحم بچے پر مشتمل ہے یا نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کتاب ابی داؤد میں حضرت اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ سے روایت مروی ہے کہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طلاق دی گئی جبکہ اس وقت مطلقہ کے لیے کوئی عدت لازم نہ تھی جب حضرت اسماء کو طلاق دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا حکم نازل کیا۔ یہ وہ پہلی عورت تھیں جن کے بارے میں طلاق کی عدت کا حکم نازل ہوا (4)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

---

1۔ سنن دار قطنی، باب الطلاق والعتاق، جلد 4، صفحہ 35 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، فی عدۃ المطلقہ، جلد 1، صفحہ 311

**مسئلہ نمبر 5**۔ لِعِدَّتِهِنَّ یہ ارشاد اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ خاوندوں نے حقوق زوجیت ادا کیے کیونکہ غیر مدخول بہا عورتیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ اس امر سے خارج ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب: 49)

**مسئلہ نمبر 6**۔ جس نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے جماع نہ کیا ہو اس کی طلاق نافذ ہو جائے گی اور اس نے سنت کو پالیا۔ اگر اس نے حائضہ عورت کو طلاق دی اس کی طلاق نافذ ہو جائے گی اور اس نے سنت کی خلاف ورزی کی۔ سعید بن مسیب نے کہا: حیض کی حالت میں طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ یہ طلاق سنت کے خلاف ہے۔ شیعہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ صحیحین میں ہے جبکہ الفاظ دار قطنی کے ہیں (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا: میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی جبکہ وہ حالت حیض میں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا: ''پس وہ رجوع کرے پھر اسے اپنے پاس روکے رکھے یہاں تک کہ اسے نیا حیض آئے۔ یہ حیض اس حیض کے علاوہ ہو جس میں اس نے پہلے طلاق دی تھی۔ اگر مناسب سمجھے کہ اسے طلاق دے تو حیض سے پاک ہوتے ہی اسے طلاق دے دے جبکہ ابھی اس سے جماع نہ کیا ہو۔ یہی وہ طلاق ہے جس میں عدت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا''۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اسے ایک طلاق دی تھی۔ اس نے اسے طلاق شمار کیا اور حضرت عبداللہ نے اس سے رجوع کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ایک ہے''۔ یہ نص ہے اور شیعہ کے قول کو رد کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7**۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ طلاق سنت یہ ہے (2) کہ وہ طہر میں ایک طلاق دے جب اس کا آخر ہو تو یہی وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ دار قطنی نے اعمش سے وہ ابو اسحاق سے وہ ابو احوص سے وہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا: طلاق سنت وہ ہے جو سات شرطوں کو جامع ہو (3)۔

(1) وہ ایک طلاق دے، ایسی عورت ہو جس کو حیض آیا ہو، وہ حالت طہر میں ہو، اس طہر میں خاوند نے اس سے حقوق زوجیت ادا نہ کیے ہوں، اس سے پہلے حیض میں طلاق نہ دی گئی ہو، نہ اس کے پیچھے ایسے طہر میں طلاق دی گئی ہو جو اس حیض کے بعد آئے۔ وہ حیض سے خالی ہو۔ یہ سات شرطیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ثابت ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ امام شافعی نے کہا: طلاق سنت یہ ہے کہ ہر طہر میں طلاق دے۔ اگر اس نے ایک طہر میں تین طلاقیں دیں تو وہ بدعت نہ ہوں گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: طلاق سنت یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے۔ امام شعبی نے کہا: اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے اس بیوی سے جماع کیا ہوا ہو۔ ہمارے علماء نے کہا: وہ اپنی بیوی کو ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں اس نے جماع نہ کیا ہو اور نہ ہی عدت میں بعد میں طلاق ہو اور طہر اس حیض کے بعد نہ ہو جس

---

1۔ سنن دار قطنی، باب الطلاق، جلد 4، صفحہ 6
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 5
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1825

خاوند نے بیوی کو طلاق دی ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے(1): ''اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے پھر اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ پھر اسے حیض آئے پھر اس کا طہر شروع ہو۔ پھر چاہے تو اسے روکے رکھے اور چاہے تو اسے طلاق دے۔ یہی وہ عدت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کو طلاق دی جائے''۔ امام شافعی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کے ظاہر سے استدلال کیا ہے۔ یہ ہر طلاق میں عام ہے۔ وہ ایک ہو، دو ہوں یا زیادہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں زمانہ کی رعایت کی ہے اور عدد کا اعتبار نہیں کیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اسی طرح ہے اس میں وقت کی تعلیم دی، عدد کا ذکر نہیں کیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ حدیث صحیح سے غفلت ہے۔ فرمایا: اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرلے۔ یہ تین طلاقوں کے وقوع کا انکار کرتا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: عرض کی: بتائیے اگر وہ اسے تین طلاقیں دے دے؟ فرمایا: ''وہ تجھ پر حرام ہو جائے گی اور تجھ سے معصیت کے ساتھ جدا ہو جائے گی''۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: آیت کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تین طلاقیں اور ایک طلاق برابر ہیں۔ یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ اگر اس کے بعد یہ ارشاد نہ ہوتا: لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا یہ تین طلاقوں کے اس آیت کے ضمن میں داخل ہونے کے مانع ہے، اکثر علماء نے یہی کہا ہے۔ جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے آپ پر آیت کا مطلق ہونا مخفی نہیں جس طرح علماء نے کہا لیکن حدیث نے اس کی تفسیر بیان کی جس طرح ہم نے کہا۔ جہاں تک امام شعبی کے قول کا تعلق ہے آپ ایسے طہر میں طلاق کو جائز قرار دیتے ہیں جس میں اس نے جماع کیا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اپنی نص اور معنی کے ساتھ اس کا رد کرتی ہے جہاں تک نص کا تعلق ہے ہم اس کا پہلے ذکر کر چکے ہیں جہاں تک معنی کا تعلق ہے کیونکہ جب یہ حیض کی حالت میں طلاق کے مانع ہے کیونکہ اس حیض کو عدت میں شمار نہیں کیا جاتا تو وہ طہر جس میں جماع کیا گیا ہو وہ طلاق کے بدرجہ اولیٰ مانع ہوگا کیونکہ اس کو شمار کرنے کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رحم کے مشغول ہونے کا خوف ہوتا ہے اس طرح وہ حیض جو اس کے بعد آتا ہے۔

میں کہتا ہوں: امام شافعی نے تین طلاقوں کو ایک ہی کلمہ سے واقع کرنے کا جو استدلال کیا ہے وہ اس حدیث سے ہے جسے امام دارقطنی نے سلمہ بن ابی سلمہ بن عبدالرحمان سے اور وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں(2) کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے اپنی بیوی کو طلاق دی جس کا نام تماضر بنت اصبغ کلبیہ تھا۔ یہی ام ابی سلمہ تھی۔ آپ نے ایک کلمہ کے ساتھ اسے تین طلاقیں دیں ہمیں ایسی خبر نہیں پہنچی جس میں یہ تذکرہ ہو کہ صحابہ نے ان پر عیب لگایا ہو۔ سلمہ بن ابی سلمہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت حفص بن مغیرہ نے اپنی بیوی حضرت فاطمہ بنت قیس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت حفص سے جدا کر دیا۔ ہمیں یہ خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عیب لگایا ہو۔ اور حضرت عویمر عجلانی کی حدیث سے استدلال کیا جب انہوں نے اپنی بیوی سے لعان کیا۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اسے تین طلاقیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ ہمارے علماء نے اس

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 790 2۔ سنن دارقطنی، باب الطلاق، جلد 4، صفحہ 12

سے الگ رائے قائم کی ہے اور بہت اچھے انداز میں رائے قائم کی ہے، اس کی وضاحت کسی اور جگہ ہے۔ ہم نے اس کا ذکر القبس من شرح مؤطا مالک بن انس میں کیا ہے۔ سعید بن مسیب اور تابعین کی ایک جماعت کا نقطہ نظر ہے جس نے طلاق میں سنت کی خلاف ورزی کی اور اسے حیض میں واقع کیا یا تین طلاقیں اکٹھی دیں تو وہ واقع (1) نہ ہوں گی اور انہوں نے اسے اس آدمی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کو طلاق سنت کا وکیل بنایا گیا اور اس نے مخالفت کی۔

**مسئلہ نمبر 8۔** جرجانی نے کہا: لِعِدَّتِهِنَّ میں لام، فی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (الحشر: 2) لِاَوَّلِ الْحَشْرِ یعنی فی اول الحشر ہے۔ لِعِدَّتِهِنَّ کا قول فی عدتهن کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسے زمانہ میں جو ان کی عدت کے شمار کرنے کے مناسب ہو۔ اس پر اجماع ہے کہ حیض میں طلاق ممنوع ہے اور طہر میں اس کی اجازت ہے اس میں یہ دلیل ہے کہ قرء سے مراد طہر ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کا معنی ہے فی قبل عدتهن یا لقبل عدتهن یعنی اس کے ابتدائی حصہ میں اور یہ حالت طہر میں ہوگا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت ہے جس طرح صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: قبل العدة سے مراد طہر کا آخری حصہ ہے یہاں تک کہ قرء سے مراد حیض ہوگا۔ اسے کہا جائے گا: امام مالک کی یہ واضح دلیل ہے اور جس نے بھی آپ جیسا قول کیا کہ اقراء سے مراد طہر ہیں۔ اگر مراد وہ ہوتی جو ائمہ احناف کہتے ہیں اور جو ان کی پیروی کرتے ہیں تو ضروری تھا کہ یہ قول کہا جاتا: جس نے طہر کے شروع میں طلاق دی تو اس عورت کو حیض سے پہلے طلاق نہ ہوگی کیونکہ ابھی حیض کا آغاز ہونے والا نہیں نیز حیض کا آنا حیض کے داخل ہونے کے ساتھ ہوتا ہے اور طہر کے ختم ہونے کے ساتھ حیض کا آنا متحقق نہیں ہوتا۔ اگر کسی شی کا آنا اس کی ضد کے ادبار کے ساتھ ہو تو روزے دار سورج کے غروب ہونے سے پہلے افطار کرنے والا ہو کیونکہ رات دن کے پلٹنے کے ساتھ آنے والی ہوتی ہے ابھی دن ختم نہیں ہوتا پھر جب اس نے طہر کے آخر میں طلاق دی تو باقی ماندہ طہر قرء ہوگا۔ بعض طہر کو بھی قرء کہتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ: 197) وہ شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کا کچھ حصہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرة: 203) وہ دوسرے دن کے بعض میں کوچ کر آتا ہے۔ یہ بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9۔** وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ یہاں مراد مدخول بہا ہے (2) کیونکہ جس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کیے گئے ہوں اس پر عدت لازم نہیں ہوتی۔ اگر اس نے تین طلاقوں سے کم طلاقیں دی ہیں تو عدت کے ختم ہونے سے قبل رجوع کر سکتا ہے بعد میں وہ ایک دعوت نکاح دینے والے کی طرح ہوگا۔ اگر تین طلاقیں دی گئی ہوں تو کسی اور خاوند کے بعد ہی وہ عورت اس سابقہ خاوند پر حلال ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10۔** وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ اس کا معنی ہے اسے یاد رکھو (3) یعنی اس وقت کو یاد رکھ جس میں طلاق واقع ہوئی

---

1۔ یہ قول قابل توجہ نہیں کیونکہ جب صریح احادیث سے ثابت ہے کہ تین طلاقیں دی گئی تو انہیں تسلیم کیا گیا جس طرح اسی بحث میں روایات گزر چکی ہیں تو اس اجتہاد کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 29

3۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1826

یہاں تک کہ جب یہ جدا ہو جائے اس شرط کی وجہ سے جس کو ذکر کیا گیا وہ تین قرء ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ: 228) اب وہ ان مردوں کے لیے حلال ہے جو اس سے نکاح کرنا چاہیں۔ یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ عدت تین طہر ہیں، حیض عدت نہیں اس کی تاکید اور تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کرتی ہے: لقبل عدتھن کسی شی کا قبل لغت اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا جز ہوتا ہے۔ استقبالہ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ یہ اس چیز کا غیر ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11**۔ احصاء کے امر کا مخاطب کون ہے (1)؟ اس میں تین قول ہیں۔ ا۔ وہ خاوند ہیں۔ ۲۔ بیویاں ہیں۔ ۳۔ مسلمان ہیں۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ اس لفظ کے مخاطب ازواج ہیں کیونکہ طَلَّقْتُمُ، اَحْصُوا اور لَا تُخْرِجُوْهُنَّ کی ضمیریں ایک ہی نظم میں ہیں۔ ازواج کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن بیویاں خاوند کے ساتھ لاحق ہو کر اس میں داخل ہیں کیونکہ خاوند ہی شمار کرتا ہے تا کہ وہ رجوع کرے، اس کو نان ونفقہ دے یا اسے ختم کرے، وہ اسے رہائش دے یا گھر سے نکالے، اس کے نسب کو لاحق کرے یا اسے قطع کرے۔ یہ تمام امور اس کے اور بیوی کے درمیان مشترک ہیں ان کے علاوہ میں عورت مرد سے منفرد ہے اسی طرح حاکم بھی عدت کو شمار کرنے کا محتاج ہوتا ہے تا کہ وہ فتویٰ دے اور اس میں جھگڑا واقع ہو تو وہ فیصلہ کرے یہ اس احصاء کے فوائد ہیں جس کا حکم دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 12**۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ اللہ جو تمہارا رب ہے اس سے ڈرو اس کی نافرمانی نہ کرو۔ خاوند کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب تک عورت عدت میں ہو تو اسے اس گھر سے نکالے جس گھر میں وہ حالت نکاح میں رہ رہی تھی۔ وہ خاوند کے حق کی وجہ سے بھی نہیں نکلے گی ہاں ظاہر ضرورت کی بنا پر وہ نکل سکتی ہے۔ اگر وہ اس گھر سے نکلے گی تو وہ گناہگار ہوگی اور عدت ختم نہ ہوگی۔ اس مسئلہ میں وہ عورت جسے طلاق رجعی دی گئی تھی یا جسے طلاق بائنہ دی گئی تھی، برابر ہیں۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے تا کہ مرد کے پانی کی حفاظت ہو سکے۔ اسی وجہ سے بیوت کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (الاحزاب: 34) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (الاحزاب: 33) یہ رہائش رکھنے کی اضافت ہے، تملیک کی اضافت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ تقاضا کرتا ہے کہ یہ خاوندوں پر لازم ہے اور وَلَا يَخْرُجْنَ یہ بیویوں پر لازم ہے۔ حدیث صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میری خالہ کو طلاق ہو گئی اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی کھجوروں کو کاٹے (2)۔ ایک آدمی نے اسے باہر نکلنے پر جھڑکا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں تو اپنے کھجور کے درخت کاٹ! ممکن ہے تو کوئی صدقہ کرے یا کوئی نیکی کا عمل کرے''۔ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور لیث کے اقوال کی دلیل ہے کہ معتدہ عورت دن کے وقت اپنے کام کاج کے لیے باہر نکل سکتی ہے۔ رات کے وقت اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ امام مالک کے نزدیک خواہ اسے طلاق رجعی دی گئی ہو یا طلاق بائنہ

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1826

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486

دی گئی ہو۔ امام شافعی نے اس عورت کے بارے میں کہا: جسے طلاق رجعی دی گئی تھی وہ نہ دن کے وقت نکلے اور نہ رات کے وقت نکلے جسے طلاق بائنہ دی گئی ہو وہ دن کے وقت نکل سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: یہ حکم اس عورت کے لیے ہے جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو جہاں تک مطلقہ کا تعلق ہے وہ نہ رات کو اور نہ ہی دن کو نکل سکتی ہے جبکہ حدیث ان کا رد کرتی ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت ابو عمرو بن حفص، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن کی طرف نکلے (1)۔ انہوں نے اپنی بیوی حضرت فاطمہ بنت قیس کو طلاق بھیج دی جو باقی تھی اس کے لیے حضرت حارث بن ہشام اور حضرت عیاش بن ربیعہ کو اس کے نفقہ کے بارے میں حکم دیا۔ دونوں نے اس سے کہا: اللہ کی قسم! تیرے لیے کوئی نفقہ نہیں مگر اس صورت میں کہ تو حاملہ ہو۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان کا قول ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیرے لیے کوئی نفقہ نہیں''۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہاں سے منتقل ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔ عرض کی: یارسول اللہ کہاں؟ فرمایا: ''ابن ام مکتوم کے ہاں''۔ وہ نابینا تھے۔ وہ اپنے کپڑے وہاں اتار لیتی اور وہ اسے دیکھ نہ پاتے۔ جب اس کی عدت گزر گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نکاح حضرت اسامہ بن زید سے کر دیا۔ مروان نے قبیصہ بن ذویب کو حضرت فاطمہ کی طرف بھیجا کہ اس سے حدیث پوچھے تو حضرت فاطمہ نے اسے حدیث بیان کی۔ مروان نے کہا: ہم نے یہ حدیث صرف ایک عورت سے سنی ہے۔ ہم اسی میں احتیاط و حفاظت پاتے ہیں جس پر ہم نے لوگوں کو پایا ہے۔ جب مروان کا قول حضرت فاطمہ کو پہنچا تو اس نے کہا: میرے اور تمہارے درمیان قرآن حکم ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِهِنَّ کہا: یہ حکم اس عورت کے بارے میں ہے جس کے بارے میں خاوند کو رجوع کا حق ہو۔ تین طلاقوں کے بعد کیا امر وقوع پذیر ہوگا؟ تم کیسے کہتے ہو: اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں؟ جب وہ حاملہ نہ ہو تو پھر تم اسے کیوں گھروں میں محبوس رکھتے ہو؟ الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ آیت گھر سے نکالنے اور گھر سے نکلنے کی حرمت صرف طلاق رجعی کی صورت میں ہے۔ اسی طرح حضرت فاطمہ نے استدلال کیا ہے کہ وہ آیت جو اس کے بعد ہے وہ مطلقہ رجعیہ کی نہی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے کیونکہ امکان ہے کہ جس نے طلاق دی ہے عدت کے اندر وہ رجوع کے بارے میں رائے بنائے گویا وہ ہر وقت اپنے خاوند کے زیر تصرف ہے جہاں تک اس عورت کا تعلق ہے جس کو طلاق بائنہ دی گئی ہو تو اس کے لیے کوئی امکان موجود نہیں جب اسے کوئی مجبوری ہو کہ وہ اپنے گھر سے باہر نکلے یا اسے اسی گھر میں بے پردگی کا خوف لاحق ہو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت دی۔

مسلم شریف میں ہے حضرت فاطمہ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دی ہیں (2)، مجھے خوف ہے کہ وہ بغیر اجازت مجھ پر داخل ہو جائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا تو حضرت فاطمہ وہاں سے منتقل ہو گئیں۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ ایک الگ تھلگ مکان میں تھیں تو اس کے ایک طرف ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں خوف لاحق تھا اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رخصت دی (3)۔ یہ تمام

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 484 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 485

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قيس، جلد 2، صفحہ 802

روایات احناف کے قول کارد کرتی ہیں۔ حضرت فاطمہ کی حدیث میں ہے: ان کے خاوند نے انہیں ایک طلاق بھیج دی جوان کی طلاق باقی ماندہ تھی۔ یہ امام مالک کے حق میں دلیل ہے اور امام شافعی کے خلاف دلیل ہے۔ یہ سلمہ بن ابی سلمہ کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہ حضرت حفص بن مغیرہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی لفظ میں تین طلاقیں دیں جس طرح پہلے گزر چکا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 13۔ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ** حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت شعبی اور مجاہد نے کہا: بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ سے مراد بدکاری ہے۔ اسے گھر سے نکالا جائے گا اور اس پر حد جاری کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس اور امام شافعی سے مروی ہے: اس سے مراد سسرالی رشتہ داروں پر بدزبانی کرنا ہے۔ پس ان کے لیے حلال ہے کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہ کے بارے میں کہا: وہ ایک ایسی عورت تھی جو اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ بدکلامی کیا کرتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ گھر سے منتقل ہو جائے۔ ابو داؤد کی کتاب میں ہے سعید نے کہا: وہ ایسی عورت تھی جس نے لوگوں کو فتنہ میں ڈال دیا وہ بڑی باتونی تھی (2)۔ اسے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کے ہاں رکھا گیا جو نابینا تھے۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابی کے مصحف میں ہے إلا أن یفحشن علیکم اس کی تائید یہ روایت کرتی ہے کہ محمد بن ابراہیم بن حارث نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاطمہ بنت قیس سے فرمایا: اللہ سے ڈر تو خوب جانتی ہے کہ تجھے کیوں گھر سے نکالا گیا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے: فاحشہ سے مراد ہر معصیت ہے جس طرح بدکاری، چوری اور گھر والوں کے ساتھ بدکلامی؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عمر اور سلامی سے مروی ہے: فاحشہ سے مراد عورت کا گھر سے نکلنا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی إلا أن یاتین بفاحشة مبینة بخروجهن من بیوتهن بغیر حق یعنی اگر وہ نکلے گی تو وہ نافرمانی کرے گی۔ قتادہ نے کہا: فاحشہ سے مراد نشوز و نافرمانی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے نشوز کی وجہ سے خاوند اسے طلاق دے تو وہ اپنے گھر سے نکل جائے۔ ابن عربی نے کہا: جس نے کہا: خروج زنا کی وجہ سے ہے تو اس کی کوئی وجہ و دلیل نہیں کیونکہ اس خروج و نکلنے سے مراد قتل اور اس کو معدوم کرنا ہوتا ہے (3)۔ یہ حلال و حرام میں مستثنیٰ نہیں۔ جس نے کہا: اس سے مراد بدکلامی ہے تو اس کی وضاحت حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں آچکی ہے۔ جس نے کہا: اس سے مراد معصیت ہے تو یہ وہم ہے کیونکہ غائب ہونا اور اس جیسی معصیت نہ نکالنے کو مباح کرتی ہے اور نہ ہی نکلنے کو مباح کرتی ہے۔ جس نے کہا: مراد بغیر حق کے نکلنا ہے تو یہ صحیح ہے، تقدیر کلام یہ ہے لا تخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن شرعا إلا أن یخرجن تعدیا۔

**مسئلہ نمبر 14۔ وَ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ** یہ احکام جن کو واضح کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر احکام ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے تجاوز سے منع کیا ہے۔ جس نے تجاوز کیا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے آپ کو ہلاکت کے گھاٹ پر وارد کیا۔

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 12
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 313
3۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1836

لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا۝ یعنی وہ امر جو اللہ تعالیٰ پیدا فرمادے گا۔ اس سے مراد ہے اس کے دل میں بغض کی بجائے محبت، اعراض کی بجائے رغبت اور طلاق کے پختہ عزم کی بجائے شرمندگی پیدا فرمادے گا تو وہ اس سے رجوع کرے گا۔ تمام مفسرین نے کہا: یہاں امر سے مراد رجوع میں رغبت پیدا کرنا ہے۔ پہلے یہ قول گزر چکا ہے۔ ایک طلاق پر برانگیختہ کا اور تین طلاقوں سے نہی کرنا مقصود ہے کیونکہ جب وہ تین طلاقیں دے چکے گا تو فراق پر شرمندگی کے وقت اور رجوع میں رغبت کے وقت اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا اور رجوع کی کوئی صورت نہیں پائے گا۔ مقاتل نے کہا: بَعۡدَ ذٰلِکَ یعنی ایک طلاق اور دو طلاقوں کے بعد۔ امر یعنی رجوع کرنا اس قول میں کوئی اختلاف نہیں۔

فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّ اَشۡہِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الشَّہَادَۃَ لِلّٰہِ ؕ ذٰلِکُمۡ یُوۡعَظُ بِہٖ مَنۡ کَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۬ؕ وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۙ۝ وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسۡبُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ۝

"تو جب وہ پہنچنے لگیں اپنی معیاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو، ان باتوں سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر اور جو خوش بخت ڈرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ سے، بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کا راستہ اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو (خوش نصیب) اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کرنے والا ہے، مقرر کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ"۔

فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ جب وہ عدت کے ختم ہونے کے قریب پہنچ جائیں (1) جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ (البقرۃ: 231) یعنی عدت کے ختم ہونے کے قریب پہنچ جائیں۔ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ، معروف طریقہ سے مراجعت ہے۔ مقصد تکلیف دینے کے لیے رجوع کرنا نہ ہو کہ عدت کو طویل کیا جائے بلکہ مقصود دلچسپی ہو جس طرح سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اَوۡ فَارِقُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ انہیں چھوڑ دو یہاں تک کہ ان کی عدت ختم ہو جائے تو وہ اپنی ذاتوں کے مالک بن جائیں۔ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ میں ایسی دلیل موجود ہے جو اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ عدت کے ختم ہونے میں قول عورت کا معتبر ہوگا جب وہ اس کا دعویٰ کرے جیسا کہ ہم نے سورۃ بقرہ میں آیت 228، وَلَا یَحِلُّ لَہُنَّ اَنۡ یَّکۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیۡۤ اَرۡحَامِہِنَّ کے ضمن میں بیان کر دیا ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 30

وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ میں چھ مسائل ہیں:

## طلاق پر گواہ بنانا

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَّ اَشْهِدُوْا طلاق پر گواہ بنانے کے بارے میں امر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجوع میں گواہ بنانے کا حکم ہے (1)۔ ظاہر یہی ہے کہ یہاں رجوع سے مراد رجعت کی طرف رجوع ہے، طلاق کی طرف رجوع نہیں۔ اگر اس نے گواہ بنائے بغیر رجوع کیا تو رجعت کے صحیح ہونے میں فقہاء کے دو قول ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجعت اور جدائی دونوں پر گواہ بنانے کا حکم ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک گواہ بنانا مستحب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرۃ: 282)

امام شافعی کے نزدیک رجعت میں واجب ہے اور فرقت میں مستحب ہے۔ گواہ بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں میں باہم انکار کی صورتحال پیدا نہ ہو اور طلاق کے بعد اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے تہمت نہ لگائی جائے اور ایک کے فوت ہو جانے کے بعد دوسرا اس بات کا دعویٰ نہ کرے کہ وہ میت کا وارث ہے کیونکہ عقد نکاح باقی ہے۔

## رجوع کے طریقے

**مسئلہ نمبر 2**۔ اکثر علماء کے نزدیک رجعت پر گواہ بنانا مستحب ہے جب وہ جماع کرے، بوسہ لے یا مباشرت کرے تو اس سے رجعت مراد ہوگی۔ وہ رجعت کا زبانی اظہار کرے اور رجعت کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو امام مالک کے نزدیک رجوع کرنے والا ہوگا۔ اگر وہ اس صورت میں رجوع کا ارادہ نہ کرے تو رجوع کرنے والا نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے فرمایا: جب اس نے شہوت کے ساتھ بوسہ لیا، مباشرت کی یا چھوا تو یہ رجعت ہوگی۔ علماء نے کہا: فرج کو دیکھنا یہ بھی رجعت ہے۔ امام شافعی اور ابوثور نے کہا: جب اس نے زبانی رجوع کیا تو یہ رجعت ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا وطی کرنا ہر حال میں رجوع ہے۔ اس نے رجعت کی نیت کی یا نہ کی۔ امام مالک کے ایک طائفہ سے بھی یہی مروی ہے۔ امام لیث بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالک کہا کرتے تھے: جب اس نے وطی کی اور رجعت کی نیت نہ کی تو یہ وطی فاسد ہوگی، دوبارہ اس وقت تک وطی نہ کرے جب تک ماء فاسد سے رحم پاک نہ ہو جائے۔ پہلی رجعت کے باقی ماندہ حصہ میں اسے رجوع کا حق ہے، اس استبراء میں اس کو رجعت کا حق نہیں۔

## رجعت میں گواہی کی حیثیت

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام احمد کے دو قولوں میں سے ایک میں رجعت میں گواہ بنانا واجب ہے۔ امام شافعی بھی کہتے ہیں: کیونکہ امر کا ظاہر اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام شافعی دوسرے قول میں فرماتے ہیں: رجعت کو قبول کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے گواہ بنانے کی ضرورت نہیں جس طرح دوسرے حقوق ہوتے ہیں خصوصاً جب کفارہ کے ذریعے ظہار کو ختم کیا جائے (3)۔ ابن عربی نے کہا: امام شافعی کے اصحاب نے رجعت میں گواہ بنانے کے وجوب کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 30
2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1835

ذکر کرتے ہوئے کہا: خاوند کا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا جس نے کل رجوع کیا تھا اور آج رجعت کے اقرار پر گواہ بناتا ہوں جس نے رجعت کے لیے گواہ بنانا شرط قرار دیا ہے اس کے نزدیک اس کے بغیر رجعت صحیح نہ ہوگی (1)۔ یہ قول فاسد ہے اور اس امر پر مبنی ہے کہ رجعت میں گواہ بنانا امر تعبدی ہے۔ ہم اس میں اور نکاح میں تسلیم نہیں کرتے کہ ہم یہ کہیں یہ باہم مضبوطی کا محل وقوع ہے یہ اقرار میں موجود ہے جس طرح انشاء میں موجود ہے۔

## عدت گزرنے کے بعد دوران عدت رجوع کے بارے میں بتانا

**مسئلہ نمبر** 4۔ جس نے عدت گزرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ اس نے عدت میں رجوع کر لیا تھا اگر عورت نے اس کی تصدیق کر دی تو رجوع جائز ہو جائے گا اور اگر وہ انکار کر دے تو وہ قسم اٹھائے گی۔ اگر مرد نے گواہ پیش کر دیئے کہ خاوند نے عدت میں رجوع کر لیا تھا اور عورت کو علم نہ ہوا تو عورت کی جہالت اس میں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ اس خاوند کی بیوی ہی رہے گی۔ اگر اس عورت نے کسی اور مرد سے شادی کر لی اور ابھی تک نئے خاوند نے اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کیے تھے تو پہلا خاوند رجوع پر گواہیاں پیش کر دے تو اس بارے میں امام مالک سے دو روایتیں ہیں۔ ا۔ پہلا خاوند اس کا زیادہ حقدار ہے۔ ۲۔ دوسرا خاوند اس عورت کا زیادہ حقدار ہے۔ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کر لیے تھے تو پہلے خاوند کے لیے کوئی صورت نہ رہے گی۔

## گواہ مرد ہوں گے

**مسئلہ نمبر** 5۔ ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ حضرت حسن بصری نے کہا: مراد مسلمان ہیں (2)۔ قتادہ سے مروی ہے: تم میں سے جو آزاد ہیں یہ اس امر کو واجب کرتی ہے کہ گواہی جو رجوع کے بارے میں ہو وہ مردوں کے ساتھ خاص ہے، عورتیں گواہ نہیں بن سکتیں کیونکہ ذوی کا لفظ مذکر ہے اسی وجہ سے ہمارے علماء نے کہا: اموال کے علاوہ میں عورتوں کی گواہی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

## گواہی میں تبدیلی جائز نہیں

**مسئلہ نمبر** 6۔ وَاَقِیۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے گواہی صحیح طریقہ سے دو جب گواہی کی ضرورت ہو اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ کے تحت گزر چکی ہے۔

ذٰلِكُمۡ یُوۡعَظُ بِهٖ یہاں یوعظ، یرضی کے معنی میں ہے مَنۡ كَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ جہاں تک غیر مومن کا تعلق ہے تو وہ ان نصیحتوں سے نفع حاصل نہیں کرتا۔

وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: جو آدمی تین یا ہزار طلاق دیتا ہے کیا اس کے لیے کوئی راہ ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام شعبی اور ضحاک نے کہا: یہ

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1835 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 169 3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 555

طلاق میں خاص ہے یعنی جس نے اس طریقہ سے طلاق دی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا تو عدت کے اندر اس کے لیے خلاصی کی کوئی صورت ہوگی اور عدت کے بعد اس کی حیثیت ایک دعوت نکاح دینے والے کی حیثیت ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا سے مراد ہے دنیا و آخرت میں اسے وہ کرب سے نجات عطا فرمائے گا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مخرج سے مراد ہے اللہ تعالیٰ نے اسے جو رزق دیا ہوگا اس پر اسے قناعت عطا کرے گا: یہ علی بن صالح کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: جو مصیبت کے وقت صبر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا آگ سے جنت کی طرف جانے کا کوئی راہ بنا دے گا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس سے اسے منع کیا ہے اس سے نکلنے کی کوئی راہ بنا دے گا۔ ابو العالیہ نے کہا: ہر شدت سے نکلنے کی کوئی راہ بنا دے گا (2)۔ ربیع بن خثیم نے کہا: یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ہر ایسی شی سے نکلنے کی راہ بنا دے گا جو لوگوں کے لیے تنگی کا باعث ہو۔ حسین بن فضل نے کہا: جو فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا اللہ تعالیٰ عقوبت سے بچنے کی کوئی راہ بنا دے گا۔

وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ اللہ تعالیٰ اسے ثواب عطا کرے گا جہاں سے اسے گمان تک نہ تھا یعنی جو اسے دیا ہے اس میں برکت رکھ دے گا۔ سہل بن عبد اللہ نے کہا: جو اتباع سنت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا اللہ تعالیٰ بدعتیوں کی عقوبت سے اسے محفوظ رکھے گا اور ایسے طریقہ سے جنت عطا فرما دے گا جہاں سے اس کا گمان تک نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو رزق میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا اللہ تعالیٰ کفایت کے ساتھ اس کے لیے کوئی راہ پیدا فرما دے گا۔ عمر بن عثمان صوفی نے کہا: جو حدود پر رک گیا، معاصی سے اجتناب کرتا رہا، اللہ تعالیٰ اسے حرام سے حلال کی طرف، تنگی سے وسعت کی طرف اور جہنم سے جنت کی طرف نکالے گا اور اسے وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے اسے امید ہی نہ تھی۔ ابن عیینہ نے کہا: اس سے مراد رزق میں برکت ہے۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: جو آدمی اپنے ارد گرد اور اپنی قوت سے برات کا اظہار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے ساتھ اس کے لیے ان چیزوں سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر دیتا ہے جن کا اس نے اسے مکلف بنایا تھا۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت مسروق نے آیت کی تاویل عموم کے ساتھ کی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں اگر لوگ اسے پکڑ لیں تو وہ انہیں کافی ہو جائے'' (3) پھر اس آیت کی تلاوت کی۔ آپ لگاتار اسے پڑھتے رہے اور اس کا اعادہ کرتے رہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا، فرمایا: ''دنیا کے شبہات، موت کی سختیوں اور یوم قیامت کی شدائد سے کوئی راہ پیدا فرما دے گا''۔

اکثر مفسرین نے کہا: جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عوف بن مالک اشجعی کے حق میں نازل ہوئی۔ کلبی نے ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عوف بن مالک اشجعی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 402 2۔ ایضاً

3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 556۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الورع والتقوی، حدیث نمبر 4209، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں حاضر ہوئے، عرض کی: یارسول اللہ! میرے بیٹے کو دشمنوں نے قید کر لیا ہے اور اس کی ماں جزع فزع کر رہی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: یہ آیت حضرت عوف بن مالک اشجعی کے حق میں نازل ہوئی (1)۔ مشرکوں نے ان کے بیٹے کو قید کر لیا جسے سلام کہتے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فاقہ کی شکایت کی۔ عرض کی: دشمن نے میرے بیٹے کو قید کر لیا ہے اور اس کی ماں جزع فزع کرتی ہے، آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صبر کرو۔ میں تجھے اور اسے حکم دیتا ہوں کہ تم دونوں کثرت سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرو''۔ حضرت عوف اپنے گھر کی طرف لوٹے اور اپنی بیوی سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اور تجھے یہ حکم دیا ہے کہ کثرت سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کریں۔ ان کی بیوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کتنی اچھی بات کا حکم دیا ہے۔ وہ دونوں پڑھنے لگے۔ دشمن ان کے بیٹے سے غافل ہوا، اس نے ان کے ریوڑ کو ہانکا اور اسے اپنے باپ کے پاس لے آیا۔ یہ چار ہزار بکریاں تھیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تمام بکریاں انہیں دے دیں (2)۔ ایک روایت میں ہے: وہ آیا اور اس نے دشمنوں کے اونٹ پائے جبکہ وہ فقیر تھا۔ کلبی نے کہا: اس نے پچاس اونٹ پائے تھے۔ ایک روایت میں ہے: اس کا بیٹا قید سے نکل آیا اور قوم کی اونٹنی پر سوار ہوا، راستہ میں ان کے جانوروں کے پاس سے گزرا جو چر رہے تھے تو ان سب کو ہانک لیا۔ مقاتل نے کہا: اس نے ریوڑ اور سامان پایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: میرا بیٹا جو مال لایا ہے کیا میں اسے کھا سکتا ہوں۔ فرمایا: ''ہاں'' تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت حسن بصری نے عمران بن حصین سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تمام تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ سے ناطہ جوڑ لیا، اللہ تعالیٰ اس کی ہر حاجت کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور اسے وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو دنیا کی طرف اپنی تمام توجہات کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دنیا کے سپرد کر دیتا ہے'' (3)۔ زجاج نے کہا: جب وہ تقویٰ اختیار کرتا ہے، حلال کو ترجیح دیتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اگر وہ تنگ دست ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق بہم پہنچاتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کثرت سے استغفار کی۔ اللہ تعالیٰ ہر غم سے اس کے لیے کشادگی پیدا فرما دیتا ہے۔ ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ عطا فرما دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہ تھا'' (4)۔

**وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ** جس نے اپنے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اللہ تعالیٰ اس کی تمام مشکلات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرے، معاصی سے اجتناب کرے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے، اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے ایسا اجر عطا فرمائے گا جو اس کے لیے کافی ہوگا۔ یہاں دنیا کا ارادہ نہیں کیا کیونکہ توکل

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 225 2۔ تفسیر طبری 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 170

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی الاستغفار، حدیث نمبر 1297۔ سنن ابن ماجہ، باب الاستغفار، حدیث نمبر 3808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنے والا کبھی دنیا میں پکڑ لیا جاتا ہے اور اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ مسروق نے کہا: اس کے ہر امر کو پورا کرنے والا ہے جس میں اس نے توکل کیا تھا اور جس میں توکل نہیں کیا تھا مگر جس میں اس نے توکل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے اور اس کو اجر عظیم سے نوازتا ہے (1)۔ عام قرأت بالغٌ ہے۔ امرہ منصوب ہے عاصم کی قرأت بالغُ امرہ ہے یعنی مضاف مضاف الیہ ہے۔ مفضل نے بالغاً امرہ قرأت کی ہے، اس طریقہ پر قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ، ان کی خبر ہے اور بالغاً حال ہے۔ داؤد بن ابی نے بالغٌ کی وجہ سے امرہ مرفوع پڑھا ہے اور مفعول بہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی بالغٌ امرہ ما اراد۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۝ تنگی اور خوشحالی میں سے ہر ایک کے لیے وقت مقرر کر دیا ہے جہاں پہنچ کر وہ ختم ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قَدْرًا یہ تقدیرا کے معنی میں ہے۔ سدی نے کہا: اجل اور عدت میں حیض کو مقدر کیا (2)۔ عبداللہ بن رافع نے کہا: جب وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے فرمایا: ہم جب اس پر توکل کرتے ہیں تو جو کچھ ہمارا ہوتا ہے ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں، ہم اس کی حفاظت نہیں کرتے تو یہ آیت نازل ہوتی اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ یعنی تمہارے بارے میں اور تم پر۔ ربیع بن خثیم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ جو اس پر بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو جائے گا جو اس پر ایمان لائے گا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے گا، جو اسے قرض دے گا اللہ تعالیٰ اسے بدلہ دے گا، جو اس پر اعتماد کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نجات عطا فرمائے گا، جو دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا، اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے: وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ (التغابن: 11) وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق: 3) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ (التغابن: 17) وَ مَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (آل عمران) وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ: 186)

وَ الّٰٓیِٴْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓیِٴْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا ۝ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝

''اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اسی طرح ان کی بھی جنہیں ابھی حیض آیا ہی نہیں، اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے تو وہ اس کے کام میں آسانی پیدا فرما دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے اس کی برائیوں کو اور (روز

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 32-31
2۔ تفسیر طبری، جزء 28، صفحہ 157

قیامت) اس کے اجر کو بڑا کر دے گا"۔

وَالّٰٓـِٔیْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ

اس میں سات مسائل ہیں:

## جن کو حیض کا خون نہیں آتا ان کی عدت

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَالّٰٓـِٔیْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ جب طلاق اور رجعت کا امر ان عورتوں کے بارے میں واضح فرما دیا جن کو حیض آتا ہے تو انہوں نے حیض والی عورتوں کی عدت کو پہچان لیا اس میں ان عورتوں کی عدت کو بیان کیا جو خون نہیں دیکھتیں۔ ابوعثمان عمر بن سالم نے کہا: جب سورۂ بقرہ میں ان عورتوں کی عدت کا حکم نازل ہوا جن کو طلاق دی گئی اور جن کا خاوند فوت ہو گیا تھا تو حضرت ابی نے عرض کی: یارسول اللہ! کچھ لوگ کہتے ہیں: عورتوں میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں کچھ ذکر نہیں ہوا، وہ چھوٹی عمر کی اور حاملہ عورتیں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَالّٰٓـِٔیْ یَىٕسْنَ۔ مقاتل نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ:228) کا ذکر ہوا تو خلاد بن نعمان نے عرض کی: یارسول اللہ! اس عورت کی عدت کیا ہے جس کو حیض نہیں آتا؟ اس عورت کی عدت کیا ہے جس کا حیض آنا منقطع ہو چکا ہو اور حاملہ کی عدت کیا ہے؟ تو یہ آیت وَالّٰٓـِٔیْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ نازل ہوئی یعنی جو عورتیں حیض کے آنے سے مایوس ہو گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت معاذ بن جبل نے ایسی بوڑھی عورت کی عدت کے بارے میں پوچھا جو حیض سے مایوس ہو چکی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت مستحاضہ کے بارے میں وارد ہوئی جو نہیں جانتی کہ یہ حیض کا خون ہے یا بیماری کا خون ہے (1)۔

## ارتیاب کا معنی

**مسئلہ نمبر 2**۔ اِنِ ارْتَبْتُمْ یعنی تمہیں شک ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہیں یقین ہو۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ وہ (ارتیاب) شک و یقین ہو جس طرح ظن ہوتا ہے۔ طبری کا اختیار ہے کہ معنی یہ ہوا اگر تمہیں شک ہو کہ تم نہیں جانتے کہ ان کے بارے کیا حکم ہے (2)۔ زجاج نے کہا: اگر تم اس کے حیض میں شک کرو جبکہ اس کا حیض ختم ہو چکا ہے اور وہ ان عورتوں میں سے ہے جن کو حیض آتا ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں غور و فکر کی گنجائش ہے کیونکہ جب ہم شک کریں گے کیا اس کی عمر مایوسی کو پہنچ چکی ہے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اس کی عدت تین ماہ ہے۔ ایک قول کے مطابق مایوسی کی عمر میں معتبر دنیا میں عورت کی عادت کی سب سے لمبی عدت ہے۔ ایک قول ہے: اس عورت کے خاندان کی عورتوں کا عمومی معمول ہے۔ مجاہد نے کہا: خطاب دعوت نکاح دینے والوں کو ہے یعنی اگر تمہیں علم نہ ہو کہ مایوس عورت اور جسے حیض نہیں آتا اس کی عدت کتنی ہے تو اس کی عدت یہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اگر تمہیں شک ہو کہ یہ خون جو ظاہر ہوا ہے وہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے، معروف حیض کا ہے یا استحاضہ کا ہے تو عدت تین ماہ ہوگی۔ عکرمہ اور قتادہ نے کہا: مراد وہ عورت ہے جس کا حیض معین

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1837

2۔ ایضاً

دنوں میں نہیں آتا کبھی مہینے کے شروع میں آتا ہے اور کبھی کئی مہینوں میں ایک دفعہ آتا ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سورت کے اول حصہ سے متعلق ہے۔ معنی ہے تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اگر تمہیں عدت کے ختم ہونے میں شک ہو۔ اس بارے میں جو قول کیے گئے ہیں ان میں سے یہ سب سے صحیح ہے۔

## شک والی عورت کو کتنا رکنا چاہیے

**مسئلہ نمبر 3**۔ وہ عورت جس کو شک ہو وہ عقد نکاح نہ کرے یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کو شک سے پاک کر لے۔ وہ عورت عدت سے خارج نہ ہوگی مگر اس شک کے ختم ہونے کے بعد ہی خارج ہوگی۔ مرتابہ عورت کے بارے میں ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کا حیض آنا بند ہو گیا ہو وہ نہیں جانتی کہ وہ خون آنا کب ختم ہوا تھا وہ ایک سال اس وقت سے انتظار کرے گی جس وقت سے اس کے خاوند نے اسے طلاق دی تھی۔ سال میں سے نو ماہ استبراء رحم کے ہوں گے اور تین ماہ عدت کے ہوں گے۔ اگر خاوند نے اسے طلاق دی تو اسے ایک حیض آیا یا دو حیض آنے پر ناامیدی کی وجہ سے حیض آنا بند ہو گیا تو وہ نو ماہ انتظار کرے گی پھر تین ماہ اس وقت سے انتظار کرے گی جس دن وہ حیض سے پاک ہوئی تھی۔ پھر وہ نکاح کے خواہش مند افراد کے لیے حلال ہو جائے گی۔ امام شافعی نے یہ قول عراق میں کیا۔ اس قول پر قیاس کرتے ہوئے ایسی عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو وہ استبراء رحم کے لیے نو ماہ کے بعد چار ماہ دس دن اور لونڈی نو ماہ کے بعد دو ماہ پانچ دن عدت گزارے گی۔

امام شافعی سے یہ قول بھی مروی ہے: اس کی عدت اقراء ہی ہوں گے یہاں تک کہ سن ایاس کو پہنچ جائے؛ یہ امام نخعی، ثوری اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابو عبید نے اہل عراق سے اسے حکایت کیا ہے۔ اگر عورت جوان ہو تو یہ چوتھا مسئلہ ہے جس کا ذکر آ رہا ہے۔

## جوان عورت کو حیض کا خون نہ آنے کی صورت میں حکم

**مسئلہ نمبر 4**۔ اس کے بارے میں انتظار کیا جائے گا۔ یہ حاملہ ہے یا حاملہ نہیں اگر اس کا حمل ظاہر ہو جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہوگی۔ اگر حمل ظاہر نہ ہو تو امام مالک نے کہا: وہ عورت جس کو حیض نہ آتا ہو جبکہ وہ جوان ہو اس کی عدت ایک سال ہے: یہی قول امام احمد اور اسحاق کا ہے۔ انہوں نے یہ حضرت عمر بن خطاب اور دوسروں سے روایت کیا ہے۔ اہل عراق کی رائے ہے: اس کی عدت تین حیض ہے جبکہ زندگی میں اسے ایک دفعہ خون آیا ہو اگرچہ وہ بیس سال رکی رہے مگر جب وہ بڑھاپے میں اس عمر تک جا پہنچے جس میں وہ حیض سے مایوس ہو جائے تو مایوسی کے وقت کے بعد اس کی عدت تین ماہ ہوگی۔ ثعلبی نے کہا: یہ امام شافعی کے مذہب سے زیادہ صحیح ہے۔ اس پر جمہور علماء کا نقطہ نظر ہے۔ یہی قول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب سے مروی ہے۔ الکیا نے کہا: یہی حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آئسہ کی عدت تین ماہ بنائی ہے جبکہ جس کے بارے میں شک ہو وہ آئسہ نہیں۔

## مرض کی وجہ سے حیض نہ آنے کی صورت میں حکم

**مسئلہ نمبر 5**۔ جس کا حیض مرض کی وجہ سے متاخر ہو گیا ہو تو امام مالک، ابن قاسم اور عبد اللہ بن اصبغ نے کہا: وہ نو ماہ

1۔ تفسیر طبری، جز 28، صفحہ 159

عدت گزارے گی پھر تین ماہ عدت گزارے گی۔ اشہب نے کہا: وہ دودھ پلانے والی کی طرح ہے۔ وہ دودھ چھڑانے کے بعد حیض کی صورت میں یا سال بھر عدت گزارے گی۔ حبان بن منقذ نے اپنی بیوی کو طلاق دی جبکہ وہ دودھ پلا رہی تھی۔ وہ ایک سال تک رکی رہی۔ اسے دودھ پلانے کی وجہ سے حیض نہ آتا، پھر حضرت حبان بیمار ہوئے تو انہیں خوف ہوا کہ وہ اس کی وارث بن جائے گی تو حضرت حبان نے جھگڑا حضرت عثمان کی خدمت میں پیش کیا جبکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت علی شیر خدا اور حضرت زید موجود تھے۔ دونوں نے کہا: ہماری رائے ہے کہ وہ وارث بنے گی کیونکہ وہ حیض سے مایوس نہیں اور نہ ہی بچی ہے۔ حضرت حبان فوت ہو گئے تو ان کی بیوی ان کی وارث بنی اور پھر وفات کی عدت گزاری۔

## مرض و دودھ کے علاوہ حیض نہ آنے کی صورت میں حکم

**مسئلہ نمبر 6**۔ اگر مرض یا دودھ پلانے کے علاوہ کسی اور سبب سے متاخر ہوا وہ ایک سال انتظار کرے گی جس میں حیض نہ ہو، پہلے نو ماہ پھر تین ماہ جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ اگر اسے حمل کا شک نہ ہو تو وہ حلال ہو جائے گی۔ اگر اسے حمل کا شک ہو تو وہ چار سال، پانچ سال یا سات سال انتظار کرے گی جس طرح ہمارے علماء کی مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے مشہور پانچ سال ہیں۔ اگر وہ ان کو گزارے تو وہ عورت حلال ہو جائے گی۔ اشہب نے کہا: وہ کبھی بھی حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ اس سے شک منقطع ہو جائے (1)۔ ابن عربی نے کہا: یہ قول صحیح ہے کیونکہ جب یہ جائز ہے کہ بچہ پانچ سال تک ماں کے پیٹ میں رہے تو یہ بھی جائز ہے کہ وہ دس سال یا اس سے زیادہ عرصہ رہے۔ امام مالک سے اسی کی مثل مروی ہے (☆)۔

## مستحاضہ کی عدت

**مسئلہ نمبر 7**۔ وہ عورت جس کا حیض استحاضہ کی وجہ سے مجہول ہو گیا اس کے بارے میں تین قول ہیں۔ ابن مسیب نے کہا: وہ ایک سال عدت گزارے گی؛ یہ لیث کا قول ہے۔ لیث نے کہا: مطلقہ کی عدت اور جس کا خاوند فوت ہو جائے جب وہ مستحاضہ ہو تو اس عورت کی عدت ایک سال ہے۔ یہ ہمارے علماء کا مشہور قول ہے خواہ اسے اپنے استحاضہ کے خون سے حیض کے خون کا علم ہو، اسے امتیاز ہو یا نہ ہو۔ امام مالک کے نزدیک اس کی عدت تمام صورتوں میں ایک سال ہے۔ نو ماہ رحم کو پاک کرنے کے اور تین ماہ عدت کے۔ امام شافعی کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے: اس کی عدت تین ماہ ہے؛ یہ تابعین اور متاخرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک یہ صحیح ہے۔ ابو عمر نے کہا: مستحاضہ عورت کا خون ختم ہو جاتا ہو، اس کو حیض کے آنے اور اس کے ختم ہونے کا علم ہو تو وہ تین حیض عدت گزارے گی۔ یہ نظر و فکر کے اعتبار سے صحیح ہے اور قیاس و اثر میں سب سے مضبوط ہے۔

وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ مراد چھوٹی عمر کی بیوی ہے۔ ایسی بیویوں کی عدت تین ماہ ہے۔ خبر مضمر ہے کیونکہ انہیں عادۃً حیض نہیں آتا اس لیے ان کی عدت مہینے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے احکام کو عادات پر جاری کیا ہے (2)، وہ مہینوں کے اعتبار سے عدت گزارے

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1838 2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1838-1837

☆ ائمہ احناف کے نزدیک ایک بچہ زیادہ سے زیادہ دو سال تک رحم میں رہ سکتا ہے جب کہ جدید طب کے ماہرین نو ماہ اور کچھ دن کے قائل ہیں۔

گی۔ جب وہ خون دیکھے ایسے عرصہ میں جس میں عورتیں حیض کا احتمال رکھتی ہیں تو اصل پائے جانے کی وجہ سے عدت حیض کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ جب اصل پایا جائے تو بدل کے لیے کوئی حکم باقی نہیں رہے گا جس طرح عمر رسیدہ عورت کو جب حیض کی صورت میں عدت گزار رہی تھی، پھر اس کا خون ختم ہو گیا تو عدت مہینوں کی طرف لوٹ جائے گی۔ اس پر اجماع ہے۔

وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اس میں دو مسئلے ہیں:

مطلقہ حاملہ اور متوفی عنہا زوجہا حاملہ کی عدت

**مسئلہ نمبر** 1۔ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ ان کی عدت وضع حمل (بچہ کی پیدائش) ہے، اگرچہ یہ حکم مطلقہ میں ظاہر ہے کیونکہ اس کلام کا عطف اسی پر ہے اور کلام اسی طرف راجع ہے تاہم جس کا خاوند فوت ہو جائے اس میں بھی حکم اسی طرح ہے کیونکہ آیت عام ہے اور حضرت سبیعہ کی حدیث بھی اسی کے موافق ہے اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ آیت 174 میں گزر چکی ہے۔

وضع حمل سے مراد کیا ولد ہے یا جما خون اور لوتھڑا بھی

**مسئلہ نمبر** 2۔ جب عورت کا وضع حمل ہو جائے وہ جما ہوا خون ہو یا گوشت کا لوتھڑا ہو، وہ عورت حلال ہو جائے گی (یعنی وہ عقد نکاح کر سکتی ہے) امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے کہا: وہ حلال نہیں ہو گی مگر جب وہ رحم سے نکلنے والی چیز ولد ہو(1)۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ اور سورۂ رعد میں گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا۝ ضحاک نے کہا: جو طلاق سنت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا، اللہ تعالیٰ رجوع میں اس کے لیے آسانی پیدا فرما دے گا(2)۔ مقاتل نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے اجتناب میں ڈرتا رہا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی طاعت کی توفیق دے کر معاملہ کو آسان کر دے گا۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ یعنی جو احکام ذکر کیے گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف نازل کیے ہیں اور تمہارے لیے واضح کیے ہیں۔

وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ جو اس کی طاعت بجالاتا ہے یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وہ ایک نماز سے دوسری نماز اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کی غلطیوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ وَ یُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا۝ اور آخرت میں اس کو عظیم اجر سے نوازے گا۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ ؕ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰى یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَ اْتَمِرُوْا بَیْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى۝

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1838
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 33

''انہیں ٹھہراؤ جہاں تم خود سکونت پذیر ہو، اپنی حیثیت کے مطابق انہیں ضرر نہ پہنچاؤ تا کہ تم انہیں تنگ کرو اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں۔ پھر اگر وہ (بچے کو) دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو تم انہیں ان کی اجرت دو اور (اجرت کے بارے میں) آپس میں مشورہ کر لیا کرو دستور کے مطابق اور اگر تم آپس میں طے نہ کر سکو تو اسے کوئی دوسری دودھ پلائے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

## عدت کے دوران عورت کی رہائش، نفقہ اور کسوہ کے احکام

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے: وہ خاوند خود وہاں سے نکل جائے اور اسے اس گھر میں چھوڑ دے (1) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ اگر مرد نے اس کے ساتھ رہنا ہوتا تو یہ ارشاد نہ فرماتا۔ اَسْكِنُوْهُنَّ ابن نافع نے کہا: امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ کے بارے میں کہا: مراد وہ مطلقہ عورتیں ہیں جو اپنے خاوندوں سے جدا ہو گئیں اب خاوندوں کو ان سے رجوع کا حق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ حاملہ ہوں۔ انہیں رہائش کا حق ہے، نفقہ اور کسوہ کا حق نہیں کیونکہ وہ اپنے خاوند سے جدا ہو چکی ہے۔ وہ باہم وارث نہیں بنیں گے اور نہ ہی مرد کو اس کے ساتھ رجوع کا حق ہوگا۔ اگر وہ حاملہ ہو تو اسے رہائش، نفقہ اور کسوہ (لباس) کا حق بھی ہوگا یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے۔ وہ عورت جسے طلاق بائنہ نہ ہو، وہ ان مردوں کی بیویاں ہوں گی وہ ایک دوسرے کے وارث بھی بنیں گے (اگر عدت کے دوران کوئی فوت ہو جائے) جب تک وہ عدت میں ہوں گی وہ خاوندوں کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جائیں گی۔ مردوں کو ان کو رہائش دینے کا حکم نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ ان کے خاوندوں پر لازم ہے، ساتھ ہی ساتھ نفقہ اور لباس بھی لازم ہوگا، وہ حاملہ ہوں یا حاملہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے رہائش کا حکم ان عورتوں کے بارے میں دیا ہے جو اپنے خاوندوں سے جدا ہو چکی ہیں (یعنی جنہیں طلاق بائنہ ہو چکی ہے) ساتھ ہی ساتھ ان کا نفقہ بھی لازم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اللہ تعالیٰ نے حاملہ عورتوں کے لیے رہائش اور نفقہ کا حکم دیا ہے جن کو خاوندوں سے طلاق بائنہ ہو چکی۔ ابن عربی نے کہا: اس کی وضاحت اور تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سکنی کا ذکر کیا اسے ہر مطلقہ کے لیے مطلق ذکر فرمایا۔ جب نفقہ کا ذکر کیا تو اسے حمل کے ساتھ مقید کیا تو یہ اس امر پر دال ہے کہ وہ عورت جسے طلاق بائنہ حاصل ہے، اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں۔ یہ عظیم مسئلہ ہے۔ ہم نے قرآن و سنت اور حکمت و معنی کے اعتبار سے اختلافی مسائل کے جو اصول بیان کیے ہیں، قرآن حکیم میں سے یہی آیت اس کا ماخذ ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ عورت جس کو تین طلاقیں دی گئیں ہوں اس میں علماء کے تین قول ہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کا مذہب ہے: اس کے لیے رہائش تو ہے، نفقہ نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کا نقطہ نظر ہے: اس کے لیے رہائش اور نفقہ دونوں ہیں۔ امام احمد، اسحاق اور ابوثور کا مذہب ہے: اس کے لیے کوئی نفقہ اور رہائش نہیں۔ وہ حضرت فاطمہ بنت قیس کی

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1839

حدیث سے استدلال کرتے ہیں (1)۔ حضرت فاطمہ بنت قیس نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جبکہ میرے ساتھ میرے خاوند کا بھائی تھا۔ میں نے کہا: میرے خاوند نے مجھے طلاق دی ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ میرے لیے رہائش اور نفقہ نہیں؟ فرمایا: ''بلکہ تیرے لیے رہائش اور نفقہ ہے''۔ خاوند کے بھائی نے عرض کی: اس کے خاوند نے اسے تین طلاقیں دی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رہائش اور نفقہ اس پر ہے جس کو رجوع کا حق ہو''۔ جب میں کوفہ آیا تو اسود بن یزید نے مجھے طلب کیا تاکہ مجھ سے اس بارے میں پوچھے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد کہا کرتے تھے: ایسی عورت کے لیے رہائش اور نفقہ ہے۔ اسے دار قطنی نے تخریج کیا ہے۔ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں (2)۔ اس کے خاوند نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسے طلاق دی تو اسکے خاوند نے اس کی جانب حقیر سا نفقہ بھیجا جب حضرت فاطمہ بنت قیس نے یہ دیکھا تو کہا: اللہ کی قسم! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور اس بارے میں آگاہ کروں گی۔ اگر میرے لیے نفقہ ہے تو میں وہ نفقہ لوں گی جو میرے لیے مناسب ہوگا۔ اگر میرے لیے نفقہ نہ ہوا تو میں کچھ بھی نہ لوں گی۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے نہ نفقہ ہے اور نہ رہائش ہے'' (3)۔ دار قطنی نے اسے اسود سے نقل کیا ہے۔ کہا: جب حضرت فاطمہ بنت قیس کا قول حضرت عمر تک پہنچا: فرمایا: ہم مسلمانوں میں ایک عورت کے قول کو حتمی شمار نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی عورت کو رہائش اور نفقہ لازم کیا کرتے جس کو تین طلاقیں دی گئی ہوتیں۔ امام شعبی سے مروی ہے، کہا: مجھے اسود بن یزید ملے۔ فرمایا: اے شعبی! اللہ تعالیٰ سے ڈر اور حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے رجوع کر لے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے لیے رہائش اور نفقہ کا فیصلہ کیا کرتے تھے (4)۔ میں نے کہا: میں ایسی چیز سے رجوع نہیں کر سکتا جسے حضرت فاطمہ بنت قیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول کتنا اچھا ہے۔ جبکہ قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا: طلاق رجعیہ کے سوا کسی کے لیے کوئی رہائش نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۝ (الطلاق) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ یہ بھی ماقبل کلام کی طرف راجع ہے جس میں مطلقہ رجعیہ کا ذکر ہے (5)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ رہائش، نفقہ کے تابع ہوتی ہے اور اس کے قائم مقام ہوتی ہے جب ایسی عورت کے لیے نفقہ واجب ہی نہیں جس کو طلاق بائنہ دی جا چکی ہے تو ایسی عورت کے لیے سکنی واجب نہیں ہوگا۔ امام اعظم ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ وہ عورت جس کو طلاق بائنہ دی گئی ہو، اس کے لیے نفقہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ (الطلاق: 6) نفقہ کو ترک کرنا سب سے بڑھ کر تکلیف دینا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ بنت قیس کے قول کا جو رد کیا ہے وہ بھی اسی امر کی وضاحت کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے: وہ طلاق کی عدت گزار رہی ہے۔ وہ رہائش کی مستحق ہے۔ اس کے لیے نفقہ ہوگا جس طرح اس عورت کے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 23
2۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، المطلقۃ البائن لا نفقۃ لہا، جلد 1، صفحہ 484
3۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 23
4۔ ایضاً
5۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1840

لیے ہوتا ہے جس کو طلاق رجعی دی گئی ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے: وہ خاوند کے حق کی وجہ سے محبوس ہے۔ وہ نفقہ کی مستحق ہے جس طرح بیوی نفقہ کی مستحق ہوتی ہے۔ امام مالک کی دلیل یہ ہے: وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے مطلقہ رجعیہ اور اس کے احکام کا سورت کے شروع سے ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ تک ذکر کیا۔ پھر اس کے بعد ایسے حکم کا ذکر کیا جو تمام قسم کی مطلقہ عورتوں کو عام ہے جیسے مہینوں وغیرہ کا شمار، یہ پھر مطلقہ میں عام ہے۔ اس کے بعد جو احکام ہیں، ہر مطلقہ عورت کی طرف راجع ہیں۔

وجد کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 2**۔ مِّنْ وُّجْدِكُمْ اپنی وسعت کے مطابق یہ جملہ بولا جاتا ہے(1): وجدت فی المال أجِدُ و جدا، وَجْدًا و وِجدۃً، وِجْد کا معنی غنا اور قدرت ہے۔ عام قرأت واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اعرج اور زہری نے واؤ کے فتحہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ یعقوب نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تمام اس میں لغات ہیں۔

عورت کو نقصان دینے سے مراد

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ مجاہد نے مسکن مقدر مانا ہے۔ مقاتل نے نفقہ مقدر مانا ہے(2)؛ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابوضحیٰ سے مروی ہے: اس سے مراد ہے وہ اسے طلاق دے جب عدت میں سے دو دن رہ جائیں تو اس سے رجوع کرے، پھر اسے طلاق دے۔

حاملہ کا نفقہ اور سکنیٰ

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اس میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ عورت جو حاملہ ہو اسے تین طلاقیں دی جائیں یا اس سے کم طلاقیں دی جائیں اس کے لیے نفقہ اور رہائش واجب ہے یہاں تک کہ اس کا وضع حمل ہو جائے۔ جہاں تک اس حاملہ کا تعلق ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے تو حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین، شریح، امام نخعی، امام شعبی، حماد، ابن ابی لیلیٰ، سفیان اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا: تمام مال میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا حمل وضع ہو جائے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم، امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا نقطہ نظر ہے: وراثت میں سے جو اس کا حصہ بنتا ہے اس میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا۔ سورۂ بقرۃ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ میں چار مسائل ہیں:

مطلقہ عورت کا دودھ پلانا

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ مراد مطلقہ عورتیں ہیں۔ اگر مطلقہ عورتوں میں سے کوئی تمہارے بچوں کو دودھ

1۔ معالم التنزیل، جلد 6، صفحہ 404 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 34

پلائے تو آباء پر لازم ہے کہ ان کو دودھ پلانے کی اجرت دیں۔ مرد کو حق حاصل ہے کہ دودھ پلانے پر اپنی بیوی کو اجرت پر رکھے جس طرح وہ اجنبی عورت کو اجرت پر رکھتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک جب اولاد اس عورت سے ہو اور جب تک طلاق بائنہ نہ ہو جائے تو اس عورت کو اجرت پر رکھنا جائز نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے۔
سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں رضاعت کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔ الحمد اللہ۔

## معروف سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر2۔** وَ اْتَمِرُوْا بَیْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ یہ خاوندوں اور بیویوں کو خطاب ہے یعنی تم میں سے ہر ایک اس بات کو قبول کرے جو دوسرا فرد اچھی بات کرے۔ یہاں عورت کی جانب سے معروف جمیل سے مراد ہے بغیر اجرت کے بچے کو دودھ پلانا اور مرد کی جانب سے جمیل کا مطلب ہے دودھ پلانے پر وافر اجرت دینا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معروف طریقے سے دودھ پلانے کے بارے میں مشورہ کر لیا کرو تا کہ بچے کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد لباس اور بڑی چادر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے والدہ کو بچہ کی وجہ اور والد کو بچے کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے۔

## دودھ پلانے کی اجرت میں تعین نہ ہو سکے تو کیا طریقہ ہوگا؟

**مسئلہ نمبر3۔** وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ اگر دودھ پلانے کی اجرت کے تعین میں مشکل کا شکار ہو جاؤ، خاوند انکار کر دے کہ ماں کو دودھ پلانے کی اجرت دے اور ماں انکار کر دے کہ وہ بچے کو دودھ پلائے تو خاوند کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اسے مجبور کرے۔ وہ ماں کے علاوہ کسی اور کو اجرت پر رکھ لے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر تم باہم تنگی کا شکار ہو جاؤ تو وہ خاوند اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی اور کو معین کر لے۔ یہ امر کے معنی میں خبر ہے۔ ضحاک نے کہا: اگر ماں انکار کر دے کہ وہ بچے کو دودھ پلائے تو وہ اپنے بچے کے لیے کسی اور کو اجرت پر لے۔ اگر وہ بچہ کو قبول نہ کرے تو اس کی ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ اجرت پر دودھ پلائے۔ بچے کو دودھ پلانا کس پر واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے اور اس بارے میں تین قول ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا: جب تک زوجیت کا رشتہ قائم ہے تو بچے کو دودھ پلانا اس کی ماں پر لازم ہے مگر وہ اپنے شرف اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے ایسا نہ کرے تو باپ پر لازم ہے کہ اپنے مال میں سے اس پر خرچ کرے۔ (۲) امام ابوحنیفہ نے کہا: ماں پر کسی حال میں بھی واجب نہیں (1)۔ (۳) ہر حال میں ماں پر واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر4۔** اگر خاوند اس عورت کو طلاق دے دے تو دودھ پلانا اس عورت پر لازم نہیں مگر اس صورت میں کہ بچہ اس کے سوا کسی کا پستان قبول نہ کرے، اس وقت اس عورت پر دودھ پلانا واجب ہو جائے گا (2)۔ اگر اجرت میں اختلاف ہو جائے۔ اگر وہ عورت اجرت مثلی کا مطالبہ کرے اور خاوند صرف تبرع چاہتا ہے تو ماں اجرت مثلی پر دودھ پلانے کی زیادہ مستحق ہوگی، جب باپ کوئی ایسی عورت نہ پائے جو اس کو بطور تبرع (احسان) دودھ پلائے۔ اگر باپ اجرت مثلی پر اس عورت کو رکھنا

1۔ احکام القرآن، جلد 5، صفحہ 1840
2۔ ایضاً

چاہے اور ماں ایسا کرنے سے رک جائے تا کہ زیادہ مال کا مطالبہ کرے تو پھر باپ زیادہ حقدار ہوگا۔ اگر باپ اجرت دینے سے قاصر ہے تو بچے کو دودھ پلانے کے لیے جبراً پکڑ لیا جائے گا۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝

''خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق، اور وہ تنگ کر دیا گیا ہے جس پر اس کا رزق تو وہ خرچ کرے اس سے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اور تکلیف نہیں دیتا اللہ تعالیٰ کسی کو مگر اس قدر جتنا اسے دیا ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد فراوانی دے دے گا''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

## نفقہ میں وسعت کا خیال رکھنا

**مسئلہ نمبر** 1۔ لِيُنْفِقْ یعنی خاوند اپنی بیوی اور چھوٹی اولاد پر اپنی وسعت کے مطابق یہاں تک کہ جب اس کے پاس فراوانی ہو تو ان پر وافر خرچ کرے۔ جو آدمی فقیر ہو وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔ نفقہ کا اندازہ لگایا جائے گا جیسی خرچ کرنے والے کی حالت ہوگی اور جس قدر اس بیوی اور بچے کی ضرورت ہوگی ان کی زندگی کے معمول کے مطابق قیاس کر لیا جائے گا۔ مفتی بیوی اور بچے کی ضرورت کو ملاحظہ کرے گا، پھر خاوند اور والد کی حالت کو دیکھے گا، اگر اس کی حالت اسے برداشت کرتی ہو تو وہ اسے نافذ کر دے گا۔ اگر خرچ کرنے والے کی حالت جس پر خرچ کیا جاتا ہے، اس کی حاجت سے کم ہو تو اسے اسکی برداشت کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ امام شافعی اور اس کے اصحاب نے فرمایا: نفقہ معین ہے اس میں حاکم اور مفتی کے اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں صرف خاوند کی حالت کا اعتبار ہے۔ وہ خوشحال ہو یا تنگ دست ہو، عورت کی حالت اور ضرورت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ علماء نے کہا: خلیفہ کی بیٹی کی وہی ضرورت ہے جو چوکیدار کی بیٹی کی ضرورت ہے۔ اگر خاوند خوشحال ہوگا تو اس پر دو مد لازم ہوں گے، اگر وہ درمیانہ ہو تو ایک مد اور اس کا نصف لازم ہوگا، اگر تنگ دست ہو تو صرف ایک مد لازم ہوگا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ۔

اعتبار خاوند کا کیا گیا ہے خوشحالی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی عورت کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ عورت کی ضرورت کا اعتبار کرنا اس لیے ممکن نہیں کیونکہ حاکم یا کوئی اور اسے نہیں جان سکتا تو یہ چیز خصوصیت کی طرف لے جا سکتی ہے۔ ان کے نزدیک اصل اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (البقرہ: 236) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس سے بڑھ کر کوئی چیز عطا نہیں کرتی کہ غنی اور فقیر کے نفقہ میں فرق کیا جائے اور یہ کہ نفقہ خاوند کی تنگ دستی اور خوشحالی کی بنا پر مختلف ہوگا، یہ تو مسلم ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بیوی کی حالت کا اعتبار نہ کیا جائے اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: 233) یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ معروف ان دونوں سے متعلق ہے، ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں۔

یہ معروف میں سے نہیں کہ غنی عورت کی ضرورت، فقیر عورت کے نفقہ جیسی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ہند سے فرمایا تھا: ”تو اتنا لے جو تیرے اور تیری اولاد کے لیے معروف انداز میں کافی ہو“(1)۔ نفقہ کو کفایہ پر پھیر دیا جبکہ آپ حضرت ابوسفیان کی خوشحالی کو جانتے تھے جو ہند کے مطالبہ کی وجہ سے ان پر نفقہ لازم ہوتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا: تیری ضرورت کا کوئی اعتبار نہیں، تیرے لیے صرف معین شی ثابت ہے بلکہ نفقہ کو پھیر دیا جس مقدار کو آپ اس کی ضرورت میں سے جانتے تھے اسے معین مقدار کے ساتھ معلق نہیں کیا۔ پھر انہوں نے جس تحدید کا ذکر کیا ہے وہ بھی توقیف کی محتاج ہے۔ آیت توقیف کا تقاضا نہیں کرتی۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفقہ کی تعین کرنا

**مسئلہ نمبر 2**۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچے کے لیے سو درہم معین کیے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پچاس درہم معین کیے(2)۔ ابن عربی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ یہ اختلاف سالوں کے مختلف ہونے یا خوراک اور لباس کے بھاؤ کے مختلف ہونے کی بنا پر ہو۔ محمد بن ہلالی مزنی نے کہا: میرے والد اور میری دادی نے بیان کیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے میری دادی کو نہ پایا تو آپ نے اپنے گھر والوں سے پوچھا: کیا وجہ ہے میں فلانہ کو نہیں دیکھتا؟ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بیوی نے عرض کی: اے امیر المومنین! ان کے ہاں آج رات بچہ پیدا ہوا ہے۔ آپ نے اس کی طرف پچاس درہم بھیجے اور سنبلانیہ کپڑے بھیجے۔ پھر فرمایا: یہ تیرے بیٹے کا عطیہ ہے اور یہ اس کا لباس ہے۔ جب اس کی عمر ایک سال ہو جائے گی تو ہم اسے ایک سو تک بڑھا دیں گے۔ حضرت علی شیر خدا کی بارگاہ میں ایک لقیط پیش کیا گیا ہے تو آپ نے اس کے لیے ایک سو درہم وظیفہ معین فرما دیا۔ ابن عربی نے کہا: علماء نے جس میں اختلاف کیا وہ یہ ہے کہ یہ وظیفہ دودھ چھڑانے سے پہلے کا ہے(3)۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اسے مستحب جانا ہے کیونکہ یہ آیت کے حکم میں داخل ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اسے واجب قرار دیا ہے کیونکہ حاجت نئی پیدا ہوتی رہتی ہے اور ضروریات پیش آتی رہتی ہیں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں: جب وہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب اس کا دودھ چھڑایا جاتا ہے اس کی ضرورت مختلف ہوتی ہے۔ سفیان بن وہب نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مد ایک ہاتھ میں، ایک قسط ایک ہاتھ میں لیا۔ فرمایا: میں نے ہر مسلمان نفس کے لیے ہر ماہ میں دو مد گندم، دو قسط سرکے اور دو قسط تیل کے مقرر کیے ہیں۔ ایک روای نے اضافہ کیا ہے۔ کہا: ہم نے تمہارے لیے ہر ماہ میں تمہارے عطیات اور رزق جاری کر دیئے ہیں جس نے ان میں کمی کی، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ معاملہ فرمائے گا۔ ایسے آدمی کے حق میں بددعا فرمائی۔

حضرت ابو درداء نے کہا: کتنی ہی اچھی ہدایت والی سنتیں ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی امت میں جاری فرمائی ہیں۔ مد اور قسط کھانے اور سالن میں دو شامی کیل ہیں۔ اس میں ہمارے نزدیک اندازہ یہ ہے کہ طعام میں چوتھائی اور ادام دو آٹھویں حصے۔ جہاں تک لباس کا تعلق ہے تو یہ عادت کے مطابق ہے۔ قمیص، پاجامہ، موسم سرما میں جبہ،

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 808　2۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1842　3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1843

بڑی چادر، تہبند اور چٹائی۔ یہ اصل ہے احوال اور عادت کے مطابق اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

نفقہ کا والد پر وجوب

**مسئلہ نمبر 3**۔ یہ آیت نفقہ کے وجوب میں اصل ہے کہ بچے کے لیے یہ والد کے ذمہ ہے، والدہ کے ذمہ نہیں (1)۔ محمد بن مواز نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے: یہ میراث کے مطابق والدین پر ہے۔ ابن عربی نے کہا: شاید محمد مواز نے ارادہ کیا ہے جب باپ نہ ہو تو یہ ماں پر ہوگا۔ بخاری شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''تیری بیوی تجھے کہتی ہے: مجھ پر خرچہ کرو ورنہ مجھے طلاق دے دے، غلام تجھے کہتا ہے: مجھ پر خرچ کرو اور مجھ سے کام لے اور تیری اولاد تجھے کہتی ہے: تو مجھ پر اس وقت تک خرچ کرتا رہ یہاں تک تو مجھے سپرد کر دے''۔ قرآن وسنت ایک دوسرے کو قوت عطا کرتی ہیں اور ایک ہی طریقہ پر وارد ہیں (2)۔

اللہ تعالیٰ کا بندے کو اس کی حیثیت کے مطابق مکلف بنانا

**مسئلہ نمبر 4**۔ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا یعنی فقیر کو اس کی مثل مکلف نہیں بناتا جس کی مثل غنی کو مکلف بناتا ہے۔ سَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا۝ یعنی تنگی کے بعد غنا اور سختی کے بعد وسعت پیدا فرماتا ہے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا١ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا١ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ١ۛۚ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا١ۛ۫ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًاۙ۝ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ١ؕ وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا١ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا۝

''کتنی بستیاں تھیں جنہوں نے سرتابی کی اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں (کے فرمان) سے تو ہم نے بڑی سختی سے ان کا محاسبہ کیا اور ہم نے انہیں بھاری سزا دی۔ پس انہوں نے اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام نرا خسارہ تھا۔ تیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب، پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اے دانشمندو! جو ایمان لائے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تمہاری طرف ذکر، ایک ایسا رسول جو پڑھ کر سناتا ہے تمہیں اللہ کی روشن آیتیں تاکہ نکال لے جائے انہیں جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اندھیروں سے نور کی طرف، اور جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور نیک عمل کرتا ہے تو وہ اس کو داخل فرمائے گا باغات میں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں جن میں وہ لوگ تا ابد رہیں گے، بلاشبہ اللہ نے اس (مومن)

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1843
2۔ احکام القرآن لابن العربی

کو بہترین رزق عطا فرمایا''۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ جب احکام کا ذکر کیا تو امر کی مخالفت سے خبردار کیا اور قوم کی سرکشی اور ان پر عذاب کے نزول کا ذکر کیا۔ سورۂ آل عمران میں کاین کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا یعنی انہوں نے نافرمانی کی۔ ذکر قریہ کا کیا مراد اس کے مکین ہیں۔ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا یعنی دنیا میں ہم نے انہیں عذاب دے کر بدلہ دیا۔ وَ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا۝ یعنی آخرت میں بھاری سزا دی۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے(1)؛ دنیا میں ہم نے انہیں بھوک، قحط، تلوار، زمین میں دھنسانا، صورتیں مسخ کرنا اور باقی ماندہ مصائب میں مبتلا کیا اور آخرت میں شدید ترین حساب لیا۔ نکرا سے مراد منکر ہے۔ اسے مخفف اور مثقل دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ سورۂ کہف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا یعنی اپنے کفر کا انجام چکھا۔ وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا۝ یعنی دنیا میں ہلاکت ہوگی اس کے ساتھ جو ہم نے ذکر کیا اور آخرت میں جہنم کے ساتھ ہلاکت ہوگی۔ یہاں ماضی کا لفظ ذکر کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ (الاعراف: 44) اس کی مثل دوسری آیات میں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں سے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس سے ضرور ملاقات ہوگی جو ہو کر رہنے والا ہے اسے قد کے ساتھ تعبیر کرنا درست ہے۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اس خسر کو بیان کیا اور وہ آخرت میں عذاب جہنم ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ اے دانشمندو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ اولی الالباب سے بدل ہے یا اس کی نعت ہے۔ مراد ہے اے دانشمندو! جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو اس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس نے تم پر قرآن حکیم نازل کیا ہے یعنی اس سے ڈرو، اس کی طاعت کرو اور اس کی نافرمانیوں سے بچو۔ یہ بحث پہلے سے گزر چکی ہے۔

رَّسُوْلًا زجاج نے کہا: ذکر کا نازل کرنا ارسل کے اضمار پر دلیل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے أنزل إليكم قرآنا وأرسل رسلا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا ہے جو ذکر والا ہے۔ رَّسُوْلًا یہ ذکر کی صفت ہے یہاں مضاف محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسلا یہ ذکر کا معمول ہے کیونکہ ذکر مصدر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی قد أنزل إليكم أن ذكر رسولا۔ ذکر سے بدل ہو اس صورت میں رَّسُوْلًا رسالت کے معنی میں ہوگا یا یہ اپنے باب پر ہے تو یہ معنی پر محمول ہوگا۔ گویا فرمایا: قد أظهر الله لكم ذكرا رسولا یہ بدل الشئی من الشئی سے ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ رسولا، اغراء کے طریقہ پر منصوب ہو۔ گویا فرمایا: اتبعوا رسولا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ذکر سے مراد شرف ہے(2) جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (الانبیاء: 10) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف: 44) پھر اس شرف کو بیان فرمایا، فرمایا: رَّسُوْلًا اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہاں رسول سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد جبریل امین ہے(3)۔ دونوں نازل کیے گئے ہیں۔ يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ رَّسُوْلًا کی صفت ہے۔ اٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد قرآن ہے۔ مُبَيِّنٰتٍ عام قراءت یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی

1۔ معالم التنزیل، جلد 6، صفحہ 407　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 36

اسے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا۔ ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے اسے یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جن احکام کے تم محتاج ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے انہیں بیان کرتا ہے۔ پہلی صورت حضرت ابن عباس کی قرأت ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ (آل عمران: 118) لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے موجود تھا مِنَ الظُّلُمٰتِ یعنی کفر سے اِلَى النُّوْرِ نور سے مراد ہدایت اور ایمان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت اہل کتاب کے معنوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اخراج فعل کی نسبت رسول کی طرف کی کیونکہ ایمان رسول کی طاعت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ نافع اور ابن عامر نے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے لیے وسیع رزق بنا دیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین کو بھی انہی کی مانند، نازل ہوتا رہتا ہے حکم ان کے درمیان تا کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے''۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت ہے وہ دوبارہ اٹھانے اور محاسبہ کرنے پر قادر ہے۔ آسمانوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں وہ سات ہیں ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں۔ اس پر معراج کا واقعہ اور دوسری چیزیں دال ہیں۔ پھر فرمایا: وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی سات زمین (1)۔ ان کے بارے میں اختلاف ہے اور دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے اور یہی جمہور کا قول ہے (2) کہ زمینیں سات ہیں ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں۔ ہر دو زمینوں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی مسافت دو آسمانوں کے درمیان ہے اور ہر زمین میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ ضحاک نے کہا: وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی سات زمینیں۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں ان میں کوئی مسافت نہیں لیکن آسمانوں کا معاملہ مختلف ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ترمذی اور نسائی میں ایسی روایات ہیں جو اس قول پر دلالت کرتی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔ ابو نعیم، محمد بن علی بن حبیش سے وہ اسماعیل بن اسحاق سراج التحویل (دوسری سند) ابو محمد بن حیان سے وہ عبد اللہ بن محمد بن ناجیہ وہ سوید بن سعید سے وہ حفص بن میسرہ سے وہ موسیٰ بن عقبہ سے وہ عطا بن ابی مروان سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں (3) کہ کعب نے ان کے سامنے قسم اٹھائی، اس ذات کی قسم! جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر کو پھاڑا کہ حضرت صہیب نے اسے حدیث بیان کی کہ حضرت محمد

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 36 2۔ ایضاً 3۔ المستدرک للحاکم، جلد 1، صفحہ 446

ﷺ کوئی بستی نہ دیکھتے جس میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے مگر جب دیکھتے تو یہ کہتے: اللّٰھم ربّ السّمٰوات وما أظْلَلْنَ وربّ الأرضين السبع وما أقْلَلْنَ وربّ الشیاطین وما أضْلَلْنَ وربّ الریاح وما أذْرَیْنَ إنا نسألك خیرَ ھذہ القریۃ وخیر أھلھا ونعوذبك من شرّھا وشرّ أھلھا وشرّ ما فیھا۔ اے اللہ! اے آسمانوں اور جن کو یہ سایہ کیے ہوتے ہیں ان کے رب! اور سات زمینوں اور جن کو یہ اٹھائے ہوئے ہیں ان کے رب! اور اے شیاطین اور جن کو یہ گمراہ کیے ہوئے ہیں ان کے رب! اے ہواؤں اور جن کو یہ بکھیرتی ہیں ان کے رب! ہم تجھ سے اس بستی کی خیر اور ان کے اہل کی خیر کا سوال کرتے ہیں اور اس بستی کے شر، ان کے اہل کے شر اور اس میں موجود چیزوں کے شر کی پناہ چاہتے ہیں۔

ابونعیم نے کہا: یہ حدیث ثابت ہے جو موسیٰ بن عقبہ سے مروی ہے اور عطا سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ ابن ابی زناد اور دوسرے علماء نے ان سے یہ روایت کی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت سعید بن زید سے مروی ہے(1) کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: من أخذ شبرًا من الأرض ظُلمًا فإنه یُطَوَّقه یوم القیامة من سبع أرضین جس نے بالشت بھر زمین ظلماً لی قیامت کے روز سات زمینوں سے اس کے برابر اس کے گلے میں طوق کے طور پر ڈالا جائے گا۔ ماوردی نے کہا: اس تعبیر کی بنا پر کہ یہ سات زمینیں ہیں ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں (2)، اہل اسلام کی دعوت اوپر والی زمین کے مکینوں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسری زمینوں پر جو ہیں ان کو دعوت دینا ان پر لازم نہیں اگرچہ ان زمینوں میں ایسی مخلوق بھی ہو جو عقل رکھتی ہو اور ممتاز مخلوق سے اس کا تعلق ہو۔ ان کا آسمان کا مشاہدہ کرنا اور ان سے روشنی حاصل کرنا، اس میں دو قول ہیں۔ (۱) وہ اپنی زمین کی ہر جانب سے آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور آسمانوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں؛ یہ اس کا قول ہے جس نے زمین کو مسبوط قرار دیا ہے۔ (۲) دوسرا قول ہے: وہ آسمان کا مشاہدہ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روشنی کو پیدا کر دیا ہے جس سے وہ فائدہ حاصل کرتے ہیں؛ یہ ان کا قول ہے جو زمین کو گول قرار دیتے ہیں۔ آیت میں تیسرا قول بھی ہے: کلبی نے جسے ابو صالح سے وہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ سات زمینیں ہیں جو پھیلی ہوئی ہیں، وہ ایک دوسرے کے اوپر نہیں، ان کے درمیان سمندر حائل ہیں۔ آسمان ان سب پر سایہ فگن ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر اگر ایک زمین کے لوگ دوسری زمین تک نہ پہنچ سکیں تو اسلام کی دعوت اسی زمین کے لوگوں کے لیے خاص ہوگی۔ اگر اس زمین کے لوگ دوسری زمین کے لوگوں تک پہنچ سکیں تو یہ احتمال ہے کہ جہاں تک پہنچنا ممکن ہے ان تک اسلام کی دعوت پہنچانا لازم ہے کیونکہ سمندروں کا حائل ہونا جب انہیں پانا ممکن ہے تو دعوت کے لزوم سے کوئی چیز مانع نہیں جس کا حکم عام ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ انہیں اسلام کی دعوت لازم نہ ہو کیونکہ اگر یہ دعوت لازم ہوتی تو اس کے بارے میں کوئی نص بھی وارد ہوتی اور نبی کریم ﷺ کو اس کے بارے میں حکم ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے علم کو اپنی ذات کے ساتھ خاص کیا ہے وہ اس کے بارے میں بہتر جانتا ہے اور مخلوق پر جو مشتبہ ہو چکا ہے اس میں جو درست ہے اسے بھی وہی بہتر جانتا ہے۔ پھر فرمایا: یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ مجاہد نے کہا: امر

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، جلد 2، صفحہ 33
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 36

سات آسمانوں سے سات زمینوں کی طرف نازل ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: دو آسمانوں کے درمیان زمین اور امر ہے (1)۔ یہاں امر سے مراد وحی ہے: یہ مقاتل اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ تو بَیْنَهُنَّ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے بالا زمین جو ادنیٰ ہے اور ساتویں آسمان جو سب سے بلند ہے، کے درمیان امر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ بعض کی زندگی اور بعض کی موت، ایک قوم کی غنا اور ایک قوم کے فقر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے وہ ان میں عجیب و غریب تدبیر فرماتا ہے، بارش نازل فرماتا ہے، نباتات کو نکالتا ہے، رات اور دن کو لاتا ہے، موسم گرما اور سرما کو لاتا ہے اور حیوانات کو مختلف انواع و ہیئتوں میں پیدا کرتا ہے، انہیں ایک حال سے دوسرے حال میں پھیرتا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ لغت کا میدان اور اس کی وسعت ہے جس طرح موت کو کہا جاتا ہے: امر اللہ، اسی طرح ہوا، بادل وغیرہ کو بھی لفظ امر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ جو اس ملک عظیم کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ چیزیں جو ان کے درمیان ہیں، ان پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے (2)۔ عفو و انتقام پر زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ عِلْمًا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ اَحَاطَ علم کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ احاطة علما۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 172　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 37

# سورۃ التحریم

آیاتہا ۱۲ ﴿۶۶ سُوْرَۃُ التَّحْرِیْمِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۷﴾ رکوعاتہا ۲

تمام کے قول میں یہ سورت مدنی ہے، اس کی بارہ آیات ہیں۔ اسے سورۃ النبی بھی کہتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''اے نبی (مکرم) آپ کیوں حرام کرتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے، (کیا یوں) آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

## آیت کریمہ کے نزول کا سبب

**مسئلہ نمبر 1۔** یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب بنت جحش کے ہاں رکتے وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہد نوش فرماتے (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں اور حضرت حفصہ نے آپس میں اتفاق کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو وہ کہے: میں آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغافیر کھائے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک کے پاس تشریف لے گئے تو اس زوجہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کی۔ فرمایا: ''میں نے تو حضرت زینب بنت جحش کے پاس شہد پیا ہے، میں دوبارہ ایسے نہ کروں گا'' تو یہ آیات اِنْ تَتُوْبَاۤ تک نازل ہوئیں۔ اِنْ تَتُوْبَاۤ میں مراد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ سے مراد ہے: میں نے شہد پیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ اور شہد پسند فرمایا کرتے تھے (2)۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز ادا فرما لیتے تو اپنی ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ ان کے قریب ہوتے۔ آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ اس سے زیادہ رک گئے جتنا آپ رکا کرتے تھے۔ میں نے آپ سے اس بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا: ان کی قوم کی ایک عورت نے شہد کی ایک کپی پیش کی ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد پلایا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم ضرور حیلہ کریں گی۔ میں نے اس کا ذکر حضرت سودہ سے کیا اور میں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 478

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 479

کہا: جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے پاس تشریف لائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور تیرے قریب تشریف لائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کرنا یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغافیر کھائے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے: نہیں۔ تو عرض کرنا: یہ بو کیسی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بو سے سخت نفرت کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے: حفصہ نے مجھے شہد کا شربت پلایا ہے۔ تو عرض کرنا: شہد کی مکھی نے عرفط کو چوسا ہوگا۔ میں بھی یہی بات عرض کروں گی، اے صفیہ! تو بھی یہ بات کرنا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سودہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! جو بات تو نے مجھے کہی تھی میں اسے اس وقت ہی کرنے والی تھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دروازے پر تھے۔ یہ صرف تیری ملامت کے ڈر کی وجہ سے تھا (مگر میں نے نہ کی) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب تشریف لائے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغافیر کھائے ہیں؟ فرمایا: ''نہیں''۔ عرض کی: یہ بو کیسی ہے؟ فرمایا: ''حفصہ نے مجھے شہد کا شربت پلایا ہے''۔ عرض کی: اس کی مکھی نے عرفط کو چوسا ہوگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے بھی اسی کی مثل عرض کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے بھی اسی کی مثل بات کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہد نہ پلاؤں؟ فرمایا: ''مجھے حاجت نہیں''۔ کہا: حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کہا کرتیں: سبحان اللہ! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے روک دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے حضرت سودہ کو کہا: چپ رہ۔ اس روایت میں ہے جس کے ہاں شہد پیا گیا وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ پہلی روایت میں ہے وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ابن ابی ملیکہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں؛ اسے اسباط نے سدی سے روایت نقل کی ہے۔ یہ عطا بن ابی مسلم نے روایت کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ سب جہالت ہے اور علم کے بغیر تصورات ہیں (2)۔ باقی عورتوں نے اس زوجہ سے حسد اور غیرت کی بنا پر کہا: ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مغافیر کی بو پاتے ہیں۔ مغافیر سبزی ہے یا گوند ہے جس کی خوشبو بدل چکی ہو، اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ اس کی واحد مغفور ہے جرست یعنی اس نے کھایا۔ عرفط یہ ایک ایسی بوٹی ہے جس کی بو شراب کی بو جیسی ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ پسند کرتے تھے کہ آپ سے عمدہ خوشبو پائی جائے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے پائیں اور فرشتہ سے کلام کرنے کی وجہ سے بو کو ناپسند کرتے تھے؛ یہ ایک قول ہے۔

ایک دوسرا قول بھی ہے: مراد وہ عورت ہے جس نے اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کیا (3)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا؛ یہ حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا قول ہے۔

تیسرا قول ہے: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کیا تھا جو مقوقس، شاہ سکندریہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجی تھی۔ ابن اسحاق نے کہا: یہ انصنا ضلع کے ایک ایسے شہر سے تھی جسے حفن کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں ان کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے تھے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 39 2۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1845 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 38

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ام ولد حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل کیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پاس پایا جبکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کے گھر جانے کی وجہ سے اپنے گھر میں موجود نہ تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ولد کو میرے گھر میں داخل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں میں سے صرف میرے ساتھ یہ سلوک اس لیے کیا ہے کیونکہ میں آپ پر کم مرتبہ محسوس ہوتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر نہ کرنا اگر میں اس حضرت ماریہ کے قریب جاؤں تو وہ مجھ پر حرام ہے''۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے اوپر کیسے حرام کرتے ہیں جبکہ وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم اٹھائی کہ وہ حضرت ماریہ کے قریب نہ جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا''۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اٹھا دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک اپنی ازواج کے ہاں تشریف نہیں لے جائیں گے۔ آپ ازواج مطہرات سے انتیس دن تک الگ تھلگ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

## آیت کریمہ کے نزول کے اسباب میں سے قوی اور صحیح سبب

**مسئلہ نمبر 2**۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح پہلا قول ہے۔ سب سے کمزور درمیانہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: سند میں ضعف اس لیے ہے کیونکہ اس کے راوی عادل نہیں (2)۔ معنی میں ضعف اس لیے ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موہوبہ چیز کا رد کرنا یہ اسے حرام قرار دینا نہیں کیونکہ جو چیز کسی کو ہبہ کی جائے اس کو رد کرنے سے وہ چیز اس پر حرام نہیں ہو جاتی۔ بے شک حقیقی حرمت تو حلت کے بعد ہوتی ہے۔ جہاں تک جو یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کیا تو یہ روایت سند کے اعتبار سے سب سے اچھی ہے اور معنی کے اعتبار سے واقعہ کے زیادہ قریب ہے لیکن صحیح میں مذکور نہیں۔ اسے مرسل روایت کیا گیا ہے۔

ابن وہب نے روایت کی ہے (3)، وہ امام مالک سے وہ حضرت زید بن اسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حضرت ابراہیم کی والدہ حضرت ماریہ کو اپنے اوپر حرام قرار دیا۔ فرمایا: ''تو مجھ پر حرام ہے۔ اللہ کی قسم! میں تیرے پاس نہیں آؤں گا''۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اس کی مثل ابن قاسم نے روایت نقل کی ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کی ہے کہ انصار سے تعلق رکھنے والی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی نے آپ سے تکرار کیا تو حضرت عمر اس سے کانپ گئے (4)۔ فرمایا: بیویاں تو اس طرح نہیں ہوتی تھیں۔ بیوی نے کہا: کیوں نہیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کرتی ہیں آپ نے اپنا کپڑا لیا اور حضرت حفصہ کی طرف نکلے پوچھا: کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کرتی ہے؟ عرض کی: ہاں۔ اگر میں جانتی کہ آپ اسے ناپسند کرتے ہیں تو میں ایسا نہ کرتی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ فرمایا: حفصہ کی ناک خاک آلود ہو۔ صحیح

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 41 2۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1845 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

یہ ہے کہ یہ واقعہ شہد کے بارے میں ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں پیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس مسئلہ میں ایک دوسرے کی مدد کی تو واقعہ ہوا جو ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم اٹھا دی کہ اسے نہ پئیں گے اور اسے مخفی رکھا۔ یہ آیت ان تمام کے بارے میں نازل ہوئی۔

## مرد مطلقاً حرمت کا قول کرے تو اس کا اطلاق کس پر ہوگا؟

**مسئلہ نمبر 3۔** لِمَ تُحَرِّمُ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام کیا اور قسم نہ اٹھائی تو ہمارے نزدیک یہ قسم نہیں (1) مرد کا یہ قول: ھذا علی حرام بیوی کے سوا کسی چیز کو حرام نہیں کرتا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جب اس نے اسے مطلق ذکر کیا تو اس کا اطلاق کھانے اور پینے والی چیزوں پر ہوگا، لباس پر نہیں ہوگا۔ یہ قسم ہوئی اور کفارہ کو واجب کرے گی۔ امام زفر نے کہا: یہ تمام چیزوں میں قسم ہوگی یہاں تک کہ حرکت وغیرہ میں بھی قسم ہوگی (2)۔

مخالف نے یہ استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہد کو حرام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کفارہ لازم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (التحریم: 2) اللہ تعالیٰ نے اسے قسم قرار دیا ہے، ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا (المائدہ: 87) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ (یونس) اللہ تعالیٰ نے حلال چیز کو حرام قرار دینے پر مذمت کی ہے اس پر کفارہ کو واجب قرار نہیں دیا۔ زجاج نے کہا: کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس چیز کو حرام قرار دے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ شان نہیں کہ کسی چیز کو حرام قرار دیں مگر اسے ہی حرام قرار دے سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہے جس نے اپنی بیوی یا لونڈی سے کہا: تو مجھ پر حرام ہے اور طلاق وظہار کی نیت نہ کی۔ یہ لفظ کفارہ یمین کو واجب کرے گا۔ اگر اس نے اس لفظ کے ساتھ بیویوں اور لونڈیوں کی ایک جماعت کو خطاب کیا تو اس پر ایک کفارہ ہوگا۔ اگر اس نے اپنی ذات پر کھانا یا کوئی اور چیز حرام کی تو امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، امام ثوری اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ واجب ہوگا۔

## مرد کا اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام قرار دینا

**مسئلہ نمبر 4۔** علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی کو کہتا ہے: تو مجھ پر حرام ہے۔ اس بارے میں اٹھارہ اقوال ہیں۔

### اس پر کچھ بھی لازم نہیں

(۱) اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا (3): امام شعبی، مسروق، ربیعہ، ابو مسلم اور اصبغ نے یہی کہا ہے۔ یہ ان کے نزدیک پانی اور کھانے کو حرام کرنے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1846 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1848

سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا (المائدہ: 87) بیوی پاکیزہ چیزوں میں تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ (النحل: 116) جسے اللہ تعالیٰ حرام قرار نہ دے کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ اسے حرام قرار دے، نہ اس بندے کے حرام قرار دینے سے وہ حرام ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے فرمایا ہو ما أحله الله هو علی حرام اللہ تعالیٰ نے جو چیز مجھ پر حلال کی ہے وہ مجھ پر حرام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ماریہ سے رک گئے اس قسم کی وجہ سے جو آپ سے واقع ہوئی۔ وہ یہ تھی واللہ لا أقربها بعد اليوم آج کے بعد میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔ آپ سے فرمایا گیا: اللہ تعالیٰ نے جو چیز آپ کے لیے حلال کی ہے اس سے قسم کی وجہ سے کیوں رکتے ہیں۔ یعنی اس کے پاس جائیے اور کفارہ ادا کیجئے۔

(۲) یہ قسم ہے وہ کفارہ ادا کرے؛ یہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اور امام اوزاعی کا نقطہ نظر ہے۔ آیت کا مقتضا بھی یہی ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: جب کوئی آدمی اپنی بیوی اپنے اوپر حرام کرے تو یہ قسم ہوگی وہ کفارہ ادا کرے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: 21) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی کو اپنے اوپر حرام کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۚ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ آپ نے اپنی قسم کا کفارہ دیا اور حرام کو قسم بنا دیا۔ دارقطنی نے اس کی تخریج کی ہے۔

## اس میں کفارہ واجب ہوگا، یہ قسم نہیں

(۳) اس میں کفارہ واجب ہوگا (2)؛ یہ قسم نہ ہوگی؛ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ دو روایتوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک یہ ہے۔ اس قول میں نظر و فکر کی گنجائش ہے۔ آیت اس کا رد کرتی ہے۔

## یہ ظہار ہے اس میں کفارہ نہیں

(۴) یہ ظہار ہے اس میں کفارہ ظہار ہے (3)؛ یہ حضرت عثمان غنی، امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نقطہ نظر ہے۔

## مرد کی نیت کو دیکھا جائے گا

(۵) اگر اس نے یہ قول کر کے ظہار کی نیت کی (4)، وہ یہ نیت کرتا ہے وہ حرام ہے جس طرح اس کی ماں کی پیٹھ حرام ہے تو یہ ظہار ہوگا۔ اگر طلاق کے بغیر اس کی ذات کو اپنے اوپر حرام مطلق کیا تو کفارہ یمین واجب ہوگا۔ اگر کسی چیز کی نیت نہ کی تو اس پر کفارہ یمین ہوگا؛ یہ امام شافعی کا قول ہے۔

---

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 41
2۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1847-1848
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

یہ طلاق رجعی ہے

(٦) یہ طلاق رجعی ہے(1)؛ یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، زہری، عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور ابن ماجشون کا قول ہے۔

یہ طلاق بائنہ ہے

(٧) یہ طلاق بائنہ ہے(2)؛ یہ حماد بن ابی سلیمان اور حضرت زید بن ثابت کا قول ہے۔ اسے ابن خویز منداد نے امام مالک سے نقل کیا ہے۔

یہ طلاق مغلظہ ہے

(٨) یہ تین طلاقیں ہیں(3)؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کے بارے میں حکم مختلف ہے

(٩) جس بیوی کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے ہوتے ہوں اس کو تین طلاقیں ہو جائیں گی(4) اور جس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہیں کیے۔ اس میں نیت کرے گا؛ یہ حضرت حسن بصری، علی بن زید اور حکم کا قول ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔

ہر حال میں یہ طلاق مغلظہ ہے

(١٠) یہ تین طلاقیں ہوں گی کسی حال میں بھی نیت نہ کرے اور کسی محل میں نیت نہ کرے(5)۔ اگرچہ اس نے حقوق زوجیت ادا نہ کیے ہوں؛ یہ عبدالمالک کا قول ہے جو مبسوط میں ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے یہی کہا ہے۔

مدخول بہا کو تین جب کہ غیر مدخول بہا کو ایک طلاق ہوگی

(١١) جس سے دخول نہیں کیا اس میں ایک طلاق ہے(6) اور جس کے ساتھ دخول کیا ہوا ہے اس کو تین طلاقیں ہیں؛ یہ ابو مصعب اور محمد بن عبدالحکم کا قول ہے۔

احناف کا نقطہ نظر

(١٢) اگر اس نے طلاق کی نیت کی یا ظہار کی نیت کی تو وہ واقع ہوگا جو اس نے نیت کی(7)۔ اگر طلاق کی نیت کی تو ایک بائنہ ہوگی مگر اس صورت میں تین واقع ہو جائیں گی جب وہ تین کی نیت کرے۔ اگر دو کی نیت کرے تو ایک واقع ہوگی۔ اگر کوئی نیت نہ کی تو وہ قسم ہوگی۔ مرد اپنی بیوی سے ایلاء کرنے والا ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب کا نقطہ نظر ہے۔ اس کی مثل امام زفر کا قول ہے مگر فرمایا: جب وہ دو کی نیت کرے تو ہم اسے لازم کر دیں گے۔

ابن قاسم کا نقطہ نظر

(١٣) ظہار کی نیت اسے کوئی نفع نہ دے گی(8)۔ یہ طلاق ہوگی؛ یہ ابن قاسم کا قول ہے۔

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1848-1847 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

### یحییٰ بن عمر کا نقطہ نظر

(۱۴) یحییٰ بن عمر نے کہا: یہ طلاق ہوگی (1)۔ اگر اس نے بیوی کی طرف رجوع کیا تو اس کے لیے وطی کرنا جائز نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ کفارہ ظہار ادا کرے۔

### امام شافعی کا نقطہ نظر

(۱۵) اگر طلاق کی نیت کرے تو جتنی تعداد کا ارادہ کیا (2)، اگر ایک کی نیت کی تو ایک طلاق رجعی ہوگی؛ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس کی مثل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ و تابعین کا قول ہے۔

### سفیان ثوری کا نقطہ نظر

(۱۶) اگر یہ لفظ بولا تین کی نیت کی تو تین ہو جائیں گی، اگر ایک کی نیت کی تو ایک ہو جائے گی، اگر قسم کی نیت کی تو یہ قسم ہوگی، اگر کسی چیز کی نیت نہ کی تو کوئی چیز لازم نہ ہوگی؛ یہ سفیان کا قول ہے۔ اسی کی مثل امام اوزاعی اور ابوثور کا قول ہے مگر دونوں نے کہا: اگر کچھ بھی نیت نہ کی تو ایک طلاق ہوگی۔

### ابن شہاب اور ابن عربی کا نقطہ نظر

(۱۷) اس کی نیت کا اعتبار ہوگا (3)۔ ایک سے کم نہیں ہو سکتی؛ یہ ابن شہاب کا قول ہے۔ اگر کچھ بھی نیت نہ کی تو کوئی چیز لازم نہ ہوگی؛ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ میں نے سعید بن جبیر کا بھی یہی قول دیکھا ہے۔

### اس پر غلام کو آزاد کرنا لازم ہے

(۱۸) اس پر ایک غلام آزاد کرنا لازم ہے اگرچہ وہ اسے ظہار نہ بنائے۔ میں اس کی کوئی توجیہ نہیں جانتا۔ میرے پاس جو مقالات ہیں ان میں یہ متعدد نہ ہوں گے۔

میں کہتا ہوں: دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی (4) کہ حسین بن اسماعیل، محمد بن منصور سے وہ روح سے وہ سفیان ثوری سے وہ سالم افطس سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا۔ عرض کی: میں نے اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ فرمایا: تو نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ تجھ پر حرام نہیں۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی۔ تجھ پر سب سے بھاری کفارہ ہے، وہ غلام آزاد کرنا ہے۔ مفسرین میں سے ایک جماعت نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قسم کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کر کے ادا کیا اور حضرت ماریہ کی طرف لوٹے؛ یہ زید بن اسلم اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔

### اس مسئلہ میں پائے جانے والے اختلاف کی وجہ

**مسئلہ نمبر 5**۔ ہمارے علماء نے کہا: اس باب میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نہ کتاب اللہ میں اور نہ سنت رسول اللہ

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1848-1847　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 43

میں کوئی نص یا ظاہر، صحیح ہے جس پر اس مسئلہ میں اعتماد کیا جا سکے۔ اس وجہ سے علماء نے اس بارے میں اپنی اپنی رائے قائم کی۔ جس نے برأت اصلیہ سے تمسک کیا، اس نے کہا: کوئی حکم نہیں، اس سے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ جس نے کہا: یہ قسم ہے! اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے قسم کا نام دیا ہے۔ جس نے کہا: اس میں کفارہ واجب ہوگا اور یہ قسم نہیں اس کی بنیاد دو امروں میں سے ایک امر ہے۔ (۱) اس نے گمان کیا: اللہ تعالیٰ نے اس میں کفارہ واجب کیا ہے، اگرچہ یہ قسم نہیں۔ (۲) ان کے نزدیک یمین کا معنی حرام کرنا ہے تو کفارہ معنی کے اعتبار سے واقع ہوا۔ جس نے کہا: یہ طلاق رجعی ہے اس نے لفظ کو اقل وجوہ پر محمول کیا ہے۔ طلاق رجعی بھی وطی کو حرام کرتی ہے تو لفظ کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ یہ امام مالک کو لازم ہوگا کیونکہ آپ فرماتے ہیں: طلاق رجعی وطی کو حرام کر دیتی ہے۔ اسی طرح جس نے کہا: یہ تین طلاقیں ہیں اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس نے اسے سب سے غلیظ صورت پر محمول کیا۔ وہ تین طلاقیں ہیں۔ جس نے کہا: یہ ظہار ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تحریم کے درجات میں سے سب سے کم درجہ کی تحریم ہے کیونکہ یہ ایسی تحریم ہے جو نکاح کو ختم نہیں کرتی۔ جس نے کہا: یہ طلاق بائنہ ہے، اس نے اس پر اعتماد کیا کہ طلاق رجعی مطلقہ کو حرام نہیں کرتی اور طلاق بائنہ اسے حرام کرتی ہے۔ جہاں تک یحییٰ بن عمر کے قول کا تعلق ہے انہوں نے اس میں احتیاط کی ہے کہ اسے طلاق بنائیں جب وہ اس سے رجوع کرے تو اس میں احتیاط کی کہ کفارہ لازم کریں۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ تو دو متضاد چیزوں کو جمع کرنا ہے کیونکہ ایک لفظ کے معنی میں ظہار اور طلاق جمع نہیں ہو سکتے تو جس کا اجتماع دلیل میں صحیح نہیں اس میں احتیاط کی کوئی وجہ نہیں۔

جس نے کہا: جس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہیں کیے گئے اس میں نیت کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ ایک طلاق اسے جدا کر دیتی ہے اور شرعاً اسے حرام کر دیتی ہے؛ یہی اجماع ہے۔ اسی طرح کہا: جس نے نیت کا اعتبار کرتے ہوئے کوئی حکم نہ لگایا۔ دخول سے پہلے ایک طلاق بھی حرمت ثابت کرتی ہے یہی اجماع ہے کہ اقل، جس پر سب کا اتفاق ہے اس کو اپنا لینا کافی ہے۔ جس نے کہا: دونوں میں یہ تین طلاقیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حکم اعظم کو لیا ہے کیونکہ اگر وہ تین کی تصریح کر دیتا تو جس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہیں کیے گئے اس میں بھی یہ تینوں نافذ ہو جاتیں جس طرح اس میں نافذ ہو جاتی ہیں جس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے ہیں۔ ضروری ہے کہ معنی اسی کی مثل ہو، وہ تحریم ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ سب بیوی کے بارے میں ہے۔ جہاں تک لونڈی کا تعلق ہے تو ان میں سے کوئی چیز لازم نہ ہوگی مگر امام مالک کے نزدیک جب وہ آزادی کی نیت کرے۔ عام علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس پر کفارہ یمین ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ ایک طلاق ہے کیونکہ اگر وہ طلاق کا ذکر کرتا تو یہ کم سے کم ہی واقع ہوتی وہ ایک ہی ہے مگر اس صورت میں کہ اسے متعدد ذکر کرے (1)۔ اسی طرح جب تحریم کا ذکر کیا تو کم سے کم واقع ہوگی مگر جب وہ اکثر کا ذکر کرے، جس طرح وہ کہے: أنتِ علیّ حرام الا بعد زوج یہ مراد پر نص ہے۔

میں کہتا ہوں: اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت حضرت حفصہ کے بارے میں نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1850

نے اپنی لونڈی کے ساتھ خلوت کی؛ ثعلبی نے اس کا ذکر کیا۔ اس تعبیر کی بنا پر گویا فرمایا: جو آپ نے اپنی ذات پر حرام کیا ہے وہ آپ پر حرام نہیں بلکہ آپ پر اس کا کفارہ ہے اگرچہ یہ شہد اور لونڈی کی حرمت کے بارے میں بھی ہے۔ گویا فرمایا: جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے وہ آپ پر حرام نہیں بلکہ آپ نے تحریم کو یمین کے ساتھ ملا دیا ہے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کیجئے؛ یہ قول صحیح ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حرام کیا، پھر قسم اٹھائی۔ جس طرح دارقطنی نے ذکر کیا (1)۔ امام بخاری نے اس کا معنی شہد کے قصہ میں بیان کیا (2) جو عبید بن عمیر سے مروی ہے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب بنت جحش کے ہاں شہد نوش فرماتے اور ان کے ہاں ٹھہرتے۔ میں نے اور حضرت حفصہ نے آپس میں مشاورت کی کہ ہم میں سے جس کے ہاں بھی رسول اللہ تشریف لائیں تو وہ کہے: آپ نے مغافیر کھائے ہیں؟ میں آپ سے مغافیر کی بو سی محسوس کرتی ہوں۔ فرمایا: ''نہیں میں نے تو شہد پیا ہے میں دوبارہ ایسا نہ کروں گا۔ میں نے قسم اٹھا دی ہے اس بارے میں کسی کو بھی نہ بتانا''۔ مقصد اپنی ازواج کی خوشنودی تھی۔ ولن اعود لہ یہ تحریم کی صورت میں تھا اور حلفت مراد باللہ ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر عتاب کا حکم نازل کیا اور اپنے ارشاد: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ سے کفارہ یمین لازم کیا۔

تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ آپ یہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ ازواج کی رضا حاصل کریں۔ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ جس امر نے معاتبہ کو واجب کیا اس کو بخشنے والا ہے اور مواخذہ کو ختم کر کے رحم فرمانے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ گناہ صغیرہ ہے۔ صحیح یہ ہے یہ ترک اولیٰ پر معاتبہ ہے اور آپ کا صغیرہ اور کبیرہ گناہ نہیں۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے تمہارے لیے تمہاری قسموں کی گرہ کھولنے کا طریقہ (یعنی کفارہ) اور اللہ تعالیٰ ہی تمہارا کارساز ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بہت بڑا دانا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## قسم کی تحلیل کفارہ ہے

**مسئلہ نمبر 1۔** قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ یمین کی تحلیل کفارہ ہے یعنی جب تم نے جس امر کے بارے میں قسم اٹھائی ہے اس کو مباح کرنے کو پسند کرو تو کفارہ ہی اس کی تحلیل (ختم کرنے والا) بن سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیْنَ (المائدہ:89) اس سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے جس نے ماکول یا مشروب میں سے کسی چیز کو حرام کیا۔ ہمارے نزدیک وہ چیز اس پر حرام نہ ہوگی کیونکہ کفارہ، قسم کے لیے ہوتا ہے تحریم کے لیے نہیں ہوتا جیسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ امام ابوحنیفہ ہر حال میں اسے قسم خیال کرتے ہیں اور اس میں مقصود، انتفاع کا اعتبار کرتے ہیں جس کو وہ حرام قرار دیتے ہیں۔ جب اس نے کھانے کو حرام قرار دیا تو اس نے اس کے کھانے کے بارے میں قسم اٹھائی۔ جب لونڈی کو

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 41
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 729

حرام کیا تو اس نے اس کے ساتھ وطی کے بارے میں قسم اٹھائی، بیوی کو حرام کیا تو اس سے ایلاء کیا جب اس کی کوئی نیت نہ ہو۔ اگر ظہار کی نیت کی تو ظہار ہوگا۔ اگر طلاق کی نیت کی تو طلاق بائنہ ہوگی۔ اس طرح اگر اس نے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی۔ اگر اس نے کہا: میں نے جھوٹ کی نیت کی ہے، تو دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی۔ قضاءً اس کی تصدیق نہ کی جائے گی کہ ایلاء کو باطل کیا جائے۔ اگر اس نے کہا: ہر حلال چیز اس پر حرام ہے تو مراد کھانا اور مشروب ہوگا جب وہ نیت نہ کرے بصورت دیگر جس کی وہ نیت کرے۔ امام شافعی اسے قسم شمار نہیں کرتے لیکن عورتوں میں صرف ایک کفارہ کا سبب مانتے ہیں۔ اگر طلاق کی نیت کی تو یہ ان کے نزدیک طلاق رجعی ہوگی جس طرح پہلے وضاحت گزر چکی ہے۔ اگر قسم اٹھائی کہ وہ اسے نہیں کھائے گا، وہ حانث ہو جائے گا اور کفارہ ادا کرنے سے قسم سے فارغ ہو جائے گا۔

## لونڈی یا بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کی صورت میں کفارہ کا لزوم

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر اس نے اپنی لونڈی یا اپنی بیوی کو حرام کیا تو اس پر کفارہ یمین لازم ہوگا جس طرح صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جب ایک آدمی نے اپنے اوپر اپنی بیوی کو حرام کر لیا تو یہ قسم ہے اس کا کفارہ ادا کرے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:21)

## نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کفارہ کی ادائیگی میں پایا جانے والا اختلاف

**مسئلہ نمبر 3**۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفارہ ادا نہیں کیا (2) کیونکہ آپ کی شان ہے: قد غفر له ما تقدم من ذنبه و ما تاخر اس سورت میں کفارہ یمین کا حکم امت کو دیا گیا ہے جبکہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے پھر امت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا کرتی ہے۔ ہم پہلے حضرت زید بن اسلم سے روایت نقل کر چکے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلام آزاد کر کے کفارہ ادا کیا۔ مقاتل سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماریہ کو جو اپنے اوپر حرام کیا تھا، اس سلسلہ میں ایک غلام کو آزاد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے لونڈی کو تم پر حلال کیا ہے اس کی وضاحت اس ارشاد میں ہے: مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (الاحزاب:38) یعنی حلال عورتوں میں سے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مشروع کیں یعنی تمہارے لیے ملک یمین (لونڈی) کو حلال کیا تو تم ماریہ کو اپنی ذات پر کیوں حرام کرتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر حلال کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تحلة اليمين سے مراد استثناء کرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے استثناء کو مقدر کیا ہے جس کو یمین سے خارج کر دیا گیا ہے۔ پھر ایک قوم کے نزدیک قسم سے استثناء جائز ہے جب وہ چاہے اگرچہ ایک عدت درمیان میں حائل ہو چکی ہو۔ اکثر علماء کے نزدیک متصل ہی جائز ہے۔ گویا فرمایا: جن امور کے بارے میں قسم اٹھائی ہے اس میں استثناء کر لو۔ قسم کو کفارہ کے ساتھ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ اصل میں تحللة ہے اس میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ تفعلة یہ باب تفعیل کا مصدر ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، وجوب الکفارۃ علی من حرم امراته، جلد 1، صفحہ 478

2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 174

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تحلۃ یہ کفارہ ہے۔ قسم اٹھانے والے نے جسے اپنے اوپر حرام کیا تھا کفارہ اسے قسم اٹھانے والے پر حلال کر دے گا۔ جب اس نے کفارہ ادا کر دیا تو وہ اس طرح ہو جائے گا گویا اس نے قسم اٹھائی ہی نہیں تھی۔ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے جس چیز کو تم اپنے اوپر حرام کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے ممنوعیت کو زائل فرماتا ہے اور کفارہ کے ذریعے قسموں کو ختم کر کے تمہارے لیے رخصت پیدا فرماتا ہے اور جو تم کفارہ ادا کرتے ہو اس پر تمہیں ثواب عطا فرماتا ہے۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝

"اور (یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رازداری سے اپنی ایک بیوی کو ایک بات بتائی پھر جب اس نے (دوسری) کو راز بتایا (تو) اللہ نے آپ کو اس پر آگاہ کر دیا، آپ نے (اس بیوی کو) کچھ بتا دیا اور کچھ سے چشم پوشی فرمائی، پس جب آپ نے اس کو اس پر آگاہ کیا تو اس نے پوچھا: کس نے آپ کو اس کی خبر دی ہے؟ فرمایا: مجھے اس نے آگاہ کیا جو علیم وخبیر ہے"۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا یاد کیجئے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو راز کی ایک بات بتائی یعنی یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ کو اپنے اوپر حرام کیا اور حضرت حفصہ سے مطالبہ کیا کہ اس بات کو راز میں رکھے۔ کلبی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے یہ سرگوشی کی تھی (1) کہ "تیرا والد اور عائشہ کا والد میرے بعد میری امت پر میرے خلیفہ ہوں گے"۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد خلافت کا ذکر حضرت حفصہ سے کیا تو حضرت حفصہ نے اس کا ذکر کیا (2)۔ دارقطنی اپنی سنن میں کلبی سے وہ ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ کی تفسیر میں روایت نقل کرتے ہیں، حضرت حفصہ اچانک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ام ابراہیم حضرت ماریہ کے پاس موجود تھے۔ فرمایا: "عائشہ کو نہ بتانا"۔ اسے فرمایا: "تیرا والد اور اس کا والد عنقریب میرے بعد حاکم بنیں گے یا والی بنیں گے۔ عائشہ کو یہ نہ بتانا"۔ حضرت حفصہ گئیں اور حضرت عائشہ کو بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا۔ بعض باتوں کو واضح کر دیا اور بعض سے اعراض کیا۔ اس قول سے اعراض کیا: "تیرا باپ اور اس کا باپ میرے بعد والی ہوں گے"۔ لوگوں میں اس بات کے عام ہونے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند کیا۔ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ جب حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو بتایا کیونکہ ان میں دوستی تھی اور دوسری ازواج مطہرات کے خلاف ایک دوسری کی مددگار تھیں۔ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع فرما دی (3) کہ حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو بتا دیا ہے۔ طلحہ بن مصرف نے پڑھا ہے فَلَمَّا نَبَّاَتْ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ انبأ، نبأ۔ عَرَّفَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 6، صفحہ 410 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے حضرت حفصہ کو کچھ وہ باتیں بتادیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی تھیں اور کچھ سے چشم پوشی کی، مقصد اپنی کرامت وشرافت کا اظہار تھا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کریم آدمی کبھی بھی انتہا کو نہیں پہنچتا (1)۔ الله تعالیٰ کا فرمان ہے: عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ۔ مقاتل نے کہا: حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے جو باتیں کیں ان میں سے بعض کا ذکر کیا۔ وہ ام ولد کی بات تھی اور بعض کے بارے میں نہ بتایا۔ وہ حضرت حفصہ کا حضرت عائشہ کے لیے یہ قول تھا: حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد والی بنیں گے۔ عام قرأت عرّف ہے۔ اس کا معنی وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ اس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ یعنی اسے بعض چیزوں کے بارے میں آگاہ نہ کیا۔ اگر یہ مخفف ہوتا تو اس کے ضد میں فرماتا وانکر بعضا حضرت علی، حضرت طلحہ بن مصرف، حضرت ابو عبدالرحمن سلمی، حضرت حسن بصری، قتادہ، کلبی، کسائی اور اعمش نے ابوبکر سے یہ قول نقل کیا ہے عرف بعض جب تخفیف کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہوگا اس بارے میں ناراض ہوئے اور اس کو سزا دی۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے جو تو اس آدمی کو کہتا ہے جو تیرے ساتھ بد معاملگی کرتا ہے: لاعرفن لك ما فعلت یعنی جو تو نے کیا ہے میں اس پر تجھے سزا دوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو یہ سزا دی کہ اسے ایک طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر آل خطاب میں کوئی بھلائی ہوتی تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تجھے طلاق نہ دیتے۔ حضرت جبرئیل امین نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حفصہ سے رجوع کرنے کو کہا اور سفارش بھی کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک ازواج سے الگ تھلگ رہے اور حضرت ماریہ جو حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں ان کے بالا خانے میں مقیم رہے یہاں تک کہ آیت تحریم نازل ہوئی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو جبرئیل امین نے عرض کی: اسے طلاق نہ دیجئے کیونکہ وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والی اور قیام کرنے والی ہے۔ جنت میں یہ آپ کی بیویوں میں سے ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق نہ دی۔

فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو اس چیز سے آگاہ کیا جو الله تعالیٰ نے آپ پر ظاہر کیا تھا۔ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا یارسول الله! کس نے آپ کو اس بارے میں آگاہ کیا؟ حضرت حفصہ نے گمان کیا تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے آپ کو خبر دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ مجھے اس علیم وخبیر نے بتایا ہے جس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ هٰذَا، اَنْۢبَاَ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ پہلا نبأ یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور دوسرا انبأ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے کیونکہ نبا اور انبأ جب مبتدا اور خبر پر داخل نہ ہوں تو یہ جائز ہوگا کہ ایک مفعول اور دو مفعول کافی ہوں۔ جب یہ مبتدا اور خبر پر داخل ہوں تو ان میں سے ہر ایک تین مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا۔ دو مفعولوں پر اکتفا تیسرے کو چھوڑ کر کافی نہ ہوگا کیونکہ تیسرا مفعول حقیقت میں مبتدا کی خبر ہوتا ہے اس کے بغیر اقتصار درست نہیں جس طرح خبر کے بغیر مبتدا پر اقتصار کرنا درست نہیں۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 174

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَ
جِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ۝

''اگر تم دونوں اللہ کے حضور توبہ کرو اور تمہارے دل بھی (توبہ کی طرف) مائل ہو چکے ہیں (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) اگر تم نے ایکا کر لیا آپ کے مقابلہ میں تو (خوب جان لو) کہ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہے، جبرئیل اور نیک بخت مومنین بھی آپ کے مددگار ہیں اور ان کے علاوہ سارے فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں''۔

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ مراد حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ صدیقہ ہیں۔ ان دونوں کو توبہ پر برانگیختہ کیا کیونکہ ان سے ایسا امر واقع ہوا جو رسول اللہ ﷺ کی محبت کے خلاف میلان رکھتا تھا۔ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا یعنی تمہارے دل حق سے پھر گئے (1)۔ یہ امر تھا کہ دونوں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ چیز پسند کریں جسے نبی کریم ﷺ نے ناپسند کیا تھا جیسے لونڈی سے اجتناب کرنا اور شہد سے اجتناب کرنا جبکہ نبی کریم ﷺ شہد اور عورتوں سے محبت رکھتے تھے۔ ابن زید نے کہا: دونوں کے دل اس طرف مائل ہوئے کہ انہیں اس چیز نے خوش کیا کہ آپ ﷺ ام ولد سے رک جائیں تو انہیں اس چیز نے خوش کیا جسے نبی کریم ﷺ نے پسند کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان دونوں کے دل توبہ کی طرف مائل ہوئے۔ فرمایا: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا یہ نہیں فرمایا فقد صغی قلباکما۔ عربوں کا معمول ہے جب وہ تثنیہ ذکر کرتے ہیں تو ایک کو جمع لاتے ہیں کیونکہ یہ اشکال کا باعث نہیں ہوتا۔ یہ بحث سورۂ مائدہ آیت 38 میں اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا میں گزر چکی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب بھی تثنیہ کے ساتھ اضافت واقع ہو تو وہاں جمع کے ساتھ وضاحت کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ زیادہ باوقار اور تخفیف کا باعث ہے۔ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا یہ جزائے شرط نہیں کیونکہ صغو (میلان) پہلے ہو چکا تھا۔ جواب شرط محذوف ہے۔ حذف کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر کسی کو معلوم ہے یعنی اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے یہ بہتر ہوتا کیونکہ تمہارے دل حق سے مائل ہو چکے تھے۔

وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ یعنی تم معصیت اور ایذا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے خلاف باہم معاونت کرو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2): میں ایک سال تک رکا رہا جبکہ میں ارادہ رکھتا تھا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک آیت کے بارے پوچھوں۔ آپ کی ہیبت کی وجہ سے نہ پوچھ سکا یہاں تک کہ آپ حج کے لیے روانہ ہوئے تو میں بھی حج کے لیے روانہ ہوا۔ جب آپ واپس لوٹے تو ہم ایک راستہ پر تھے آپ اپنی ضرورت کے لیے ایک درخت کی طرف ہو لیے۔ میں رک گیا یہاں تک کہ آپ فارغ ہو گئے۔ پھر میں آپ کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے عرض کی: اے امیر المومنین! وہ دو بیویاں کون سی تھیں جنہوں نے رسول اللہ کے معاملہ میں باہم ایک دوسرے کی مدد کی تھی؟ فرمایا: وہ حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ تھیں۔ میں نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں ایک سال سے آپ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا آپ کی ہیبت کی وجہ سے پوچھ نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 6، صفحہ 411

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، بیان ان تخییر امرأتہ لایکون طلاقاً الا بالنیۃ، جلد 1، صفحہ 481

سکا۔ فرمایا: ایسا نہ کیا کر، تجھے جو گمان ہو کہ میرے پاس علم ہے تو مجھ سے پوچھ لے۔ اگر مجھے علم ہوا تو میں تجھے بتا دوں گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ اللہ آپ کا ولی اور مددگار ہے ان کا باہمی تعاون آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ عکرمہ اور سعید بن جبیر نے کہا: صالح المومنین سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق تھے کیونکہ حضرت ابوبکر حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمر حضرت حفصہ کے والد تھے۔ دونوں ان دونوں کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار رہتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد نیک مومن ہیں۔ صالح اسم جنس ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (العصر)؛ یہ طبری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ سے مراد انبیاء ہیں؛ یہ علاء بن زید، قتادہ اور سفیان کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: مراد ملائکہ ہیں۔ سدی نے کہا: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ اصل میں واحد کا صیغہ نہیں۔ اصل میں صالحوا الْمُؤْمِنِيْنَ تھا۔ صالحین کو مومنین کی طرف مضاف کیا اسے واؤ جمع کے بغیر لکھا گیا کیونکہ اس صورت میں واحد اور جمع کا صیغہ ایک ہے جس طرح مصحف میں ایسی اشیاء آتی ہیں جن میں لفظ کا حکم متنوع ہوتا ہے، خط کی وضع متنوع نہیں ہوتی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے بیان کیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں سے علیحدگی اختیار کی (1)۔ حضرت عمر نے کہا: میں مسجد میں داخل ہو گیا تو لوگ زمین پر کنکریاں مار رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ یہ حکم حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ میں نے کہا: آج میں ضرور جانوں گا۔ میں حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس گیا، میں نے کہا: اے ابوبکر کی بیٹی! کیا تجھے اپنے عمل کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتی ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا: اے ابن خطاب! تیرا مجھ سے کیا واسطہ! تجھے اپنی بیٹی کی خبر لینی چاہیے۔ حضرت عمر نے کہا: میں حضرت حفصہ کے پاس گیا۔ میں نے اس سے کہا: اے حفصہ! کیا تجھے اپنے عمل کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتی ہے۔ اللہ کی قسم! تو خوب جانتی ہے کہ رسول اللہ تجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے طلاق دے دیتے۔ حضرت حفصہ بڑی شدت سے روئیں۔ میں نے اس سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ حضرت حفصہ نے کہا: وہ اپنے چوبارہ میں ہیں۔ میں داخل ہوا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رباح کے پاس تھا جو چوبارہ کی دہلیز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں اس لکڑی پر لٹکائے ہوئے تھا جس میں سوراخ کیا گیا تھا۔ یہ ایسی لکڑی تھی جس کے سہارے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر چڑھتے اور نیچے اترتے تھے۔ میں نے آواز دی: اے رباح! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی مجھے اجازت لے دو۔ رباح نے کمرہ کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھا اور کچھ بھی نہ کہا۔ پھر میں نے کہا: اے رباح! میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کرو۔ رباح نے کمرے کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھا اور کچھ بھی نہ کہا۔ پھر میں نے بلند آواز سے کہا: اے رباح! میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کرو۔ میں گمان کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، بیان ان تخییر امرأتہ لا یکون طلاقاً الا بالنیۃ، جلد 1، صفحہ 480-481

خیال فرمایا: میں حضرت حفصہ کے مسئلہ میں بات کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اللہ کی قسم! اگر رسول اللہ مجھے حفصہ کی گردن اڑانے کا حکم دیتے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔ میں نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ رباح نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اوپر آ جاؤں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا جبکہ آپ چٹائی پر پہلو کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تہبند کو درست کیا جبکہ آپ کے جسم پر کوئی اور کپڑا نہ تھا جبکہ چٹائی آپ کے پہلو پر نشان چھوڑ گئی تھی۔ میں نے رسول اللہ کے کمرے میں نظر دوڑائی تو وہاں صاع بھر جو پڑے تھے اور کمرہ کی ایک جانب اتنے ہی قرظ درخت کے پتے تھے اور ایسا چمڑہ لٹکا ہوا تھا جس کی دباغت مکمل نہ ہو۔ حضرت عمر نے کہا: میری آنکھوں سے جلدی آنسو رواں ہو گئے۔ فرمایا: ''اے ابن خطاب! تجھے کیا چیز رلاتی ہے؟'' میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نشان چھوڑے ہیں اور یہ کمرہ، میں اس میں دیکھتا ہوں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ قیصر و کسریٰ پھلوں اور نہروں میں رہتے ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس کے چنے ہوئے ہیں اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کل جمع پونجی ہے۔ فرمایا: ''اے ابن خطاب! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ ہمارے لیے آخرت ہو اور ان کے لیے دنیا ہو''۔ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ کہا: جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ میں غصہ و غضب کے آثار دیکھے تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! عورتوں کے معاملہ میں کیا چیز آپ کو پریشان کرتی ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق دے دی ہے تو اللہ تعالیٰ، فرشتے، جبریل، میکائیل، میں، ابوبکر اور مومنین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں میں نے بہت ہی کم گفتگو کی مگر میں امید رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے قول کی تصدیق فرمائے گا تو یہ آیت اور آیت تخییر نازل ہوئی: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ (التحریم: 5) وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ۝ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ دوسری ازواج مطہرات کے خلاف باہم تعاون کیا کرتی تھیں۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ فرمایا: ''نہیں''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں مسجد میں داخل ہوا جبکہ لوگ کنکریاں زمین پر مار رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ کیا میں نیچے اتروں اور انہیں خبر دوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق نہیں دی؟ فرمایا: ''ہاں اگر تو چاہے''۔ میں لگا تار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ غصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے دور ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک ظاہر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک سب سے حسین تھے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے اور میں بھی نیچے اترا۔ میں نیچے اترا جبکہ اس لکڑی کا سہارا لے رہا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اترے گویا آپ زمین پر چل رہے ہوں۔ آپ اس کے ساتھ ہاتھ کا سہارا نہیں لے رہے تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمرہ میں انتیس دن رہے۔ فرمایا: مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔ میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو گیا تو میں نے بلند آواز سے ندا دی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی اور یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ

الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النساء: 83) میں وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے اس امر کا استنباط کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آیت تخییر کو نازل فرمایا۔

وَ جِبْرِيْلُ اس میں کئی لغتیں ہیں جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف مَوْلٰىهُ پر ہو معنی ہوگا اللہ تعالیٰ اس کا ولی ہے اور جبریل اس کا ولی ہے۔ مَوْلٰىهُ پر وقف نہیں کیا جائے گا جِبْرِيْلُ پر وقف ہوگا۔ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ مبتدا ہے اور الْمَلٰٓئِكَةُ کا اس پر عطف ہے اور ظَهِيْرٌ اس کی خبر ہے اور جمع کے معنی میں ہے۔ صالح المومنین سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں؛ یہ مسیب بن شریک کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: مراد حضرت عمر ہیں۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ہیں۔ شقیق نے حضرت عبداللہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آیت میں صالح المومنین سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ مراد حضرت علی شیر خدا ہیں۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''صالح المومنین سے مراد حضرت علی شیر خدا ہیں''۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ جِبْرِيْلُ مبتدا ہو مابعد اس کا معطوف ہو اور خبر ظَهِيْرٌ ہو۔ یہ جمع کے معنی میں ہو۔ اس تعبیر کی بنا پر مَوْلٰىهُ پر وقف ہوگا اور وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ مبتدا اور خبر ہو اور ظَهِيْرٌ کا معنی مددگار ہو، یہ ظھراء کے معنی میں ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء) ابوعلی نے کہا: فعیل کا وزن کثرت کے لیے استعمال ہوا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۞ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ (المعارج) ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں ازواج کا باہمی تعاون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفقہ کے مطالبہ میں تھا، اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک الگ رہنے کی قسم اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم الگ رہے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (1)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے۔ آپ رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو پایا کہ وہ دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں مل رہی۔ حضرت ابوبکر صدیق کو اجازت ملی تو وہ داخل ہو گئے، پھر حضرت عمر حاضر ہوئے۔ انہوں نے اجازت لی تو آپ کو بھی اجازت دے دی گئی۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا کہ آپ کی ازواج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد خاموش بیٹھی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ضرور ایسی بات کروں گا جس کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسا دوں گا۔ عرض کی: یا رسول اللہ! اگر بنت خارجہ مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کرتی تو میں اس کی طرف اٹھتا تو میں اس کی گردن دبوچ لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے۔ فرمایا: ''یہ میرے ارد گرد جمع ہیں جس طرح تم دیکھتے ہو یہ مجھ سے نفقہ کا سوال کرتی ہیں''۔ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہ کی طرف اٹھے تاکہ اس کی گردن دبا دیں۔ حضرت عمر حضرت حفصہ کی گردن دبانے کے لیے اٹھے۔ دونوں کہہ رہے تھے: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کا مطالبہ کرتی ہو جو ان کے پاس نہیں۔ سب نے عرض کی: اللہ کی قسم! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بھی کسی ایسی چیز کا سوال نہیں کریں گی جو ان کے پاس نہ ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتیس دن تک ان سے الگ تھلگ رہے، پھر یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، بیان ان تخییرہ امرتہ لا یکون طلاقاً الا بالنیۃ، جلد 1، صفحہ 480

آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا۝ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۝ (الاحزاب) میں اس کا ذکر ہے۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا۝

''کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیویاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں گی پکی مسلمان، ایمان والیاں، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، کچھ پہلے بیاہیاں اور کچھ کنواریاں''۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی جیسی گزارش حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کی تھی۔ پھر یہ کہا گیا: عَسٰى کا لفظ قرآن حکیم میں جہاں بھی واقع ہوا ہے اس کا معنی ہے واجب ہے۔ مگر ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی بھی واجب ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے شرط کے ساتھ معلق کیا ہے جو طلاق دینا ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق نہ دی۔

اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ کیونکہ اگر تم ان سے بہتر ہوتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں طلاق نہ دیتے؛ یہ سدی نے معنی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ کے لیے وعدہ ہے۔ اگر آپ انہیں دنیا میں طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے رسول کی شادی ان سے بہتر عورتوں سے کر دے گا۔ اَنْ یُّبْدِلَهٗ کو تشدید اور تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ تبدیل اور ابدال کا معنی ایک ہے جس طرح تنزیل اور انزال کا معنی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دیں گے لیکن اپنی قدرت کے بارے میں خبر دی کہ رسول اللہ نے طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے بہتر بیویاں دے دے گا۔ مقصد انہیں ڈرانا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (محمد: 38) اس آیت میں بھی قدرت کے بارے میں خبر دی اور انہیں ڈرایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے افضل ہیں۔

مُسْلِمٰتٍ یعنی مخلص، یہ سعید بن جبیر نے کہا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے امر کو تسلیم کرنے والیاں ہیں (2)۔ مُّؤْمِنٰتٍ انہیں جو حکم دیا جائے یا جس امر سے نہی کی جائے اس کی تصدیق کرنے والیاں ہیں۔ قٰنِتٰتٍ اطاعت کرنے والیاں ہیں۔ قنوت کا معنی اطاعت ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ تٰٓىِٕبٰتٍ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والیاں ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی طرف رجوع کرنے والیاں اور اپنی پسند کی چیزوں کو چھوڑنے والیاں۔ عٰبِدٰتٍ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ عبادت کرنے والیاں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 41
2۔ ایضاً

نے کہا: قرآن میں جہاں بھی لفظ عبادت کا ذکر ہے اس سے مراد توحید ہے۔ سٰٓىِٕحٰتٍ روزے دار؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری اور ابن جبیر کا قول ہے۔ زید بن اسلم، ان کے بیٹے عبدالرحمن اور یمان نے کہا: مراد ہے ہجرت کرنے والیاں۔ زید نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سیاحت ہجرت ہی ہے۔ سیاحۃ سے مراد زمین میں گھومنا پھرنا ہے۔ فراء، قتبی اور دوسرے علماء نے کہا: روزے دار کو سائح کہتے کیونکہ سائح کا زادِ راہ نہیں ہوتا جہاں سے وہ کھانا پاتا ہے کھالیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں دور تک جانے والیاں ہیں۔ یہ ساح الماء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے پانی چلا گیا۔ سورۂ برأت میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ

ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا۝ ان میں سے کچھ ثیبہ ہوں گی اور کچھ باکرہ ہوں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شادی شدہ کو ثیبہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کی طرف لوٹنے والی ہے (1)۔ اگر وہ اس کے پاس رہتی یا دوسرے خاوند کی طرف لوٹنے والی ہے اگر وہ اس سے جدا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ وہ اپنے والدین کے گھر کی طرف لوٹنے والی ہے یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ہر شادی شدہ خاوند کی طرف لوٹنے والی نہیں ہوتی۔ جہاں تک بکر کا تعلق ہے وہ کنواری ہے۔ اسے بکر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ پہلی والی حالت پر ہوتی ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہوتا ہے۔ کلبی نے کہا: ثیب سے مراد حضرت آسیہ ہے جو فرعون کی بیوی تھی اور بکر سے مراد حضرت مریم ہے جو عمران کی بیٹی تھی (2)۔

میں کہتا ہوں: یہ اس آدمی کے قول پر تعبیر ہو گی جو یہ کہتا ہے: بے شک تبدیلی اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کے لیے وعدہ ہے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان بیویوں کو دنیا میں طلاق دے دیتے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں آپ کی زوجیت میں ان سے بہتر عورتیں دے دے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝

"اے ایمان والو! تم بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے تند خو سخت مزاج ہیں نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجالاتے ہیں جو ارشاد انہیں فرمایا جاتا ہے"۔

## انسان کا اپنی ذات اور اپنے اہل کو آگ سے بچانا

اس میں ایک ہی مسئلہ ہے۔ وہ انسان کا اپنی ذات اور اپنے اہل کو آگ سے بچانا۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے اپنے نفسوں کو بچاؤ جبکہ تمہارے اہل اپنے نفوس کو آگ سے بچائیں (3)۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: اپنے نفسوں کو بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو ذکر اور دعا کا حکم دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے انہیں بچائے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 42　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 44

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا اور مجاہد و قتادہ نے کہا: اپنے نفوس کو اپنے افعال اور اپنے اہل کو وصیت کے ذریعے بچاؤ۔ ابن عربی نے کہا: یہی قول صحیح ہے (1)۔ وہ معنی جو عطف عطا کرتا ہے جو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان اشتراک کا تقاضا کرتا ہے وہ فعل کے معنی میں ہے جس طرح یہ قول ہے: علفتُها تبنا و ماءً بارداً یہ اصل میں علفتها تبنا واشربتُها ماءً باردا جس طرح یہ قول ہے: ورأیت زوجك فی الوغی متقلدا سیفًا ورمحًا (☆) آدمی پر ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح طاعت کے ساتھ کرے اور اپنے اہل کی اصلاح اس طرح کرے جس طرح حاکم اپنی رعیت کی اصلاح کرتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کُلُّکم راعٍ و کُلُّکم مسئولٌ عن رعیته فالامام الذی علی النّاس راعٍ وھو مسئول عنھم والرجل راعٍ علی أھل بیته وھو مسئول عنھم تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا حاکم جو لوگوں پر امیر ہے وہ ان کا نگہبان ہے اس سے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اس سے گھر والوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حضرت حسن بصری نے اس آیت کی تعبیر یوں کی: وہ انہیں اچھائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اس میں اولاد بھی داخل ہے کیونکہ اولاد اس کا بعض ہوا کرتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے: وَلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ (النور: 61) باقی رشتہ داروں کی طرح ان کا الگ ذکر نہیں کیا۔ وہ انہیں حلال و حرام کی تعلیم دے، معاصی اور گناہوں سے بچائے، اس کے علاوہ جو دوسرے احکام ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بچے کا باپ پر یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اسے لکھنا سکھائے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''والد اپنی اولاد کو اچھے آداب سے بہتر کوئی چیز نہیں دیتا'' (2)۔

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ دادا سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں، فرمایا: ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب ان کی عمر سات سال کی ہو جائے، انہیں مارو جب ان کی عمر دس سال کی ہو جائے ان کے بستر الگ کر دو''۔ اس روایت کو محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں۔ حضرت سمرہ بن جندب سے بھی یہ روایت مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''بچے کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کا ہو جائے، جب دس سال کا ہو جائے تو نماز میں کوتاہی کرنے پر اسے مارو''۔ اسی طرح وہ اپنے گھر والوں کو نماز کے وقت، روزوں کے واجب ہونے اور روزہ کے افطار کے وجوب کے بارے میں بتائے جب وہ امر ثابت ہو جائے جبکہ یہ رؤیت ہلال کی طرف منسوب ہے۔

امام مسلم نے روایت کی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کی نماز ادا فرماتے تو ارشاد فرماتے: ''یا عائشہ! تم نماز پڑھو'' (3)۔ روایت بیان کی گئی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھا، اس نے نماز پڑھی

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1852　2۔ المستدرک للحاکم، کتاب الادب، فصل تأدیب الاولاد، جلد 4، صفحہ 263

3۔ صحیح مسلم، کتاب المسافرین، صلوۃ اللیل و عدد رکعات النبی فی اللیل، جلد 1، صفحہ 255

☆ میں نے تیرے خاوند کو جنگ میں تلوار اور نیزے سے آراستہ دیکھا۔

اور اس نے اپنے اہل کو جگایا اگر وہ نہ جاگے تو اس نے اس کے چہرے پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھی، نماز پڑھی اور اپنے خاوند کو جگایا جب وہ نہ اٹھے تو اس نے خاوند کے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "گھر والوں کو بیدار کرو"(1)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى (المائدہ:2) کے عموم کے تحت یہ داخل ہے۔ قشیری نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم اپنے نفوس کو بچاتے ہیں تو ہم اپنے گھر والوں کو کیسے بچائیں؟ فرمایا: "تم انہیں ایسی چیزوں سے منع کرو جن سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں منع کیا ہے اور تم انہیں ایسی باتوں کا حکم دو جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ مقاتل نے کہا: یہ اس پر اس کی ذات، اولاد، اہل، غلاموں اور باندیوں کے بارے میں اس کا حق ہے۔ الکیا نے کہا: ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اپنی اولادوں اور اپنے اہل کو دینی اور خیر کی تعلیم دیں اور ایسے آداب کی تعلیم دیں جس سے اعراض کی کوئی صورت نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ:132) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا: وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (الشعراء) حدیث طیبہ میں ہے: مُرُوهم بالصلوة وهم أبناء سبع بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوں۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اس بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ یعنی فرشتے جو زبانیہ ہیں وہ سخت دل ہیں جب ان سے رحم طلب کیا جائے تو وہ رحم نہیں کرتے۔ وہ غضب سے پیدا کیے گئے ہیں۔ مخلوق کو عذاب دینا ان کو محبوب ہے جس طرح انسانوں کے لیے کھانا، کھانا اور مشروب پینا محبوب ہے۔ شِدَادٌ وہ بدن کے سخت ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: گفتگو میں سخت اور افعال میں شدید ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ جہنمیوں کو پکڑتے ہیں تو اس وقت سخت اور ان پر شدید ہوتے ہیں، یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان شديد على فلان وہ اس پر قوی ہے۔ مختلف قسم کے عذاب میں انہیں عذاب دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غلاظ سے مراد جسموں کا بھاری بھر کم ہونا ہے اور شدۃ سے مراد قوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے ایک کے دو کندھوں کے درمیان ایک سال کی مسافت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک ہنٹر مارے گا تو اس ایک ضرب سے ستر ہزار انسانوں کو جہنم کی گہرائی میں پھینک دے گا۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے ہمیں عبدالرحمان بن زید نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کے داروغوں کے بارے میں کہا: ان میں سے ایک کے دو کندھوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے(2)۔ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وہ اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت نہیں کرتے نہ اس میں زیادتی کرتی ہیں اور نہ کمی کرتے ہیں۔ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ وہ اسی وقت اس کو بجالاتے ہیں جس میں انہیں حکم دیا جاتا ہے نہ اس میں تاخیر کرتے ہیں اور نہ ہی اس میں تقدیم کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے میں انہیں لذت حاصل ہوتی ہے جس طرح جنتی کو سرور جنت میں رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بعض معتزلہ نے اس کا ذکر کیا ہے ان کے نزدیک یہ ہے کہ قیامت میں کسی امر کا مکلف بنانا محال ہے۔ اہل حق کا اعتقاد مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ آج (دنیا) اور کل (آخرت) میں مکلف بنا سکتا ہے اور فرشتوں

---

1۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1853

2۔ کتاب التذکرہ، ما جاء فی عظم جهنم، جلد 2، صفحہ 520

کے حق میں مکلف بنانے کا انکار نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے کرے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۠

''اے کفار! آج بہانہ نہ بناؤ تمہیں اسی کا بدلہ ملے گا جو (کرتوت) تم کیا کرتے تھے''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ تمہاری معذرت کوئی نفع نہیں دیتی۔ یہ نہی مایوسی کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۠ تم دنیا میں جو کچھ عمل کرتے رہے ہو اس کا تمہیں بدلہ دیا جائے گا؛ اس کی مثل فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ۠ (الروم)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۠

''اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں سچے دل سے توبہ کرو۔ امید ہے تمہارا رب دور کردے گا تم سے تمہاری برائیاں اور تمہیں داخل کردے گا ایسے باغات میں جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے (اس روز) ان کا نور ایمان دوڑتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! مکمل فرمادے ہمارے لیے ہمارا نور اور بخش دے ہمیں، بے شک تو اس چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

## توبۂ نصوحاً سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ توبہ کا حکم ہے یہ ہر حال اور ہر زمانہ میں اہل ایمان پر فرض ہے اس کا بیان اور اس کے بارے میں گفتگو سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔

تَوْبَةً نَّصُوْحًا علماء اور اصحاب قلوب نے توبہ نصوح میں اختلاف کیا ہے۔ اس کے بارے میں تیئیس قول ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسی توبہ ہے (1) جس کے بعد گناہ کی طرف رجوع نہیں ہوتا جس طرح دودھ کھیری میں دوبارہ نہیں لوٹتا۔ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: نصوح سے مراد سچی اور خالص توبہ ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد خالص توبہ ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: نصح یعنی اس کے لیے قول کو خالص کیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: نصوح یہ ہے وہ گناہ جسے وہ پسند کرتا تھا اس سے

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 416 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 45

بغض کرے اور جب اسے یاد آ جائے تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسی توبہ ہے جس کے قبول ہونے کا اسے اعتماد نہ ہو اور وہ ڈرتا ہی رہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایسی توبہ ہے جس کے ساتھ وہ توبہ کا محتاج نہیں رہتا۔ کلبی نے کہا: توبہ نصوح یہ ہے وہ دل سے شرمندگی کا اظہار کرے، وہ زبان سے استغفار کرے اور گناہ کا قلع قمع کرے اور اسے اطمینان ہو کہ وہ دوبارہ اس طرح نہیں کرے گا۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد مقبول توبہ ہے اور توبہ اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک اس میں تین شرطیں نہ ہوں۔ (۱) یہ خوف کہ توبہ قبول نہ ہوگی۔ (۲) یہ امید کہ توبہ قبول ہو جائے گی۔ (۳) طاعات پر مواظبت اختیار کرنا۔ حضرت سعید بن مسیب نے کہا: ایسی توبہ جس کے ساتھ تم اپنے نفوس کو نصیحت کرتے ہو(2)۔ قرطبی نے کہا: چار چیزیں ان کو جامع ہیں۔ (۱) زبان سے استغفار، (۲) بدن کے ساتھ قلع قمع کرنا۔ (۳) دل میں یہ چیز رکھنا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ (۴) برے دوستوں کو چھوڑنا۔ سفیان ثوری نے کہا: توبۂ نصوح کی علامتیں چار ہیں۔ قلت، علت، ذلت اور غربت۔ فضیل بن عیاض نے کہا: یہ توبہ ایسی ہے کہ گناہ آنکھوں کے سامنے ہو وہ ہمیشہ اسے دیکھتا ہی رہے، اسی کی مثل ابن سماک سے مروی ہے توبہ نصوح یہ ہے کہ تو اس گناہ کو اپنے سامنے رکھے جس میں تو نے حیا میں کمی کی اور اپنی آخرت کے لیے تیاری کرے۔ ابوبکر وراق نے کہا: اس سے مراد ہے وہ زمین جو وسیع وعریض ہے وہ تجھ پر تنگ ہو جائے اور تیرا نفس بھی تجھ پر تنگ ہو جائے جس طرح وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ ابوبکر واسطی نے کہا: یہ ایسی توبہ ہے جو کسی عرض کے فوت ہونے کی وجہ سے نہیں کیونکہ جو دنیا میں اپنی ذاتی منفعت کے لیے گناہ کرتا ہے پھر آخرت میں ذاتی منفعت کے لیے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ اپنی ذات کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے تو نہیں۔ ابوبکر دقاق مصری نے کہا: توبہ نصوح سے مراد جو حق کسی کا دینا ہو اسے واپس کرنا، کسی کا دعویٰ ہو اسے معاف کرنا اور ہمیشہ طاعات کرنا۔ رویم نے کہا: وہ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے روبرو رہے، اس کی طرف پشت نہ کرے جس طرح معصیت کے وقت تو اس کی طرف پشت کیے ہوئے تھا اس کی طرف منہ کرنے والا نہیں تھا۔ ذوالنون مصری نے کہا: توبۂ نصوح کی علامتیں تین ہیں۔ کم گفتگو، کم کھانا اور کم سونا۔ شقیق نے کہا: وہ اپنے نفس کو بہت زیادہ ملامت کرے اور شرمندگی سے جدا نہ ہوتا کہ آفات سے سلامتی کے ساتھ نجات پا جائے۔ سری سقطی نے کہا: توبہ نصوح اس وقت تک درست نہیں ہوتی جب تک وہ نفس اور مومنوں کے لیے مخلص نہیں ہوتا کیونکہ جو توبہ کو اپنا ساتھی بناتا ہے وہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی مثل ہو جائیں۔ جنید نے کہا: توبہ نصوح یہ ہے کہ وہ گناہ بھول جائے وہ اسے کبھی بھی یاد نہ کرے کیونکہ جس کی توبہ صحیح ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کو بھول جاتا ہے۔ ذوالاذنین نے کہا: جس کے آنسو لگاتار بہتے رہیں اور سرکشیوں سے اس کا دل دور بھاگتا ہو۔ فتح موصلی نے کہا: اس کی علامتیں تین ہیں۔ خواہش نفس کی مخالفت، زیادہ رونا، بھوک اور پیاس برداشت کرنا۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: یہ اہل سنت وجماعت کی توبہ ہے کیونکہ بدعتی کی کوئی توبہ نہیں۔ اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ توبہ کرے''۔ حذیفہ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 45 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 416

سے مروی ہے: کسی بندے کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ گناہ سے توبہ کرے پھر اس میں جا واقع ہو۔ توبہ نصوح کا اصل معنی خالص ہونا ہے۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: ھذا عسل ناصح جب شہد گوند سے خالص ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نصاحہ سے ماخوذ ہے(1) جس کا معنی سینا ہے۔ اس سے اخذ کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ ا۔ یہ ایسی توبہ ہے جو توبہ کرنے والی کی طاعت کو پختہ کر دیتی ہے جس طرح درزی سینے کے ساتھ کپڑے کو پختہ کرتا ہے اور مضبوط بناتا ہے۔ (۲) اس توبہ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء کو جمع کر دیا اور ان کو باہم وابستہ کر دیا ہے جس طرح درزی کپڑے کو جمع کرتا ہے اور بعض کو بعض سے جوڑ دیتا ہے۔ عام قرأت **نَصُوْحًا** ہے کہ یہ توبہ کی صفت ہے جس طرح امراۃ صبور ہے بہت زیادہ صبر کرنے والی عورت۔ یہ ایسی توبہ ہے جو خالص ہونے میں انتہا تک پہنچنے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جائز ہے کہ نصوحا، نصح کی جمع ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مصدر ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: نصح نصاحۃ و نصوحا بعض اوقات فعالۃ اور فعول ایک ہی فعل کے مصدر میں جمع ہو جاتے ہیں جس طرح ذھاب اور ذھوب ہے۔ مبرد نے کہا: ایسی توبہ مراد ہے جو نصح والی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: نصحتُ نصحًا و نصاحۃً و نصوحًا۔

## گناہوں سے توبہ کیسے ہوگی؟

**مسئلہ نمبر 2**۔ وہ اشیاء جن سے توبہ کی جاتی ہے اور ان سے کیسے توبہ کی جاتی ہے؟ علماء نے کہا: وہ عمل جس سے توبہ ہوتی ہے وہ اس حالت سے خالی نہ ہوگی یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا بندوں کا حق ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حق ہو جس طرح نماز کو ترک کرنا اس سے توبہ اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک شرمندگی کے ساتھ اس شے کی قضا ملی ہوئی نہ ہو جو عمل فوت ہوا۔ یہی صورتحال ہوگی جب روزہ ترک کیا جائے یا زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کی جائے۔ اگر وہ ناحق کسی انسان کا قتل ہو۔ اگر قصاص اس پر لازم آتا ہے اور وہ قصاص میں مطلوب ہے تو وہ قصاص لینے کا موقع دے۔ اگر وہ جھوٹی تہمت ہے جو حد کو واجب کرتی ہے تو وہ اپنی پیٹھ کوڑوں کے لیے پیش کرے، اگر وہ مطلوب ہو۔ اگر اسے معاف کرا لیا جائے تو شرمندگی اور اخلاص کے ساتھ دوبارہ ایسا کام نہ کرنے کا پختہ عزم کافی ہوگا، اسی طرح اگر قتل کی صورت میں مال کے ذریعے معاف کیا جائے تو اس پر مال لازم ہوگا۔ اگر وہ مال پاتا ہے تو مال ادا کر دے؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ** (البقرۃ: 178) اگر وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ہو، کوئی بھی ہو جب وہ صحیح شرمندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے گا تو وہ اس بندے کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کے بارے میں واضح حکم دیا کہ ڈاکو جب پکڑے جانے سے قبل توبہ کر لیں تو ان سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ اگر وہ پکڑے جانے کے بعد توبہ کریں تو ان سے حد ساقط نہ ہوگی، جس طرح اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ اسی طرح شراب نوشی کرنے والے، چور اور زانی ہیں جب وہ اپنی اصلاح کر لیں، توبہ کریں اور ان سے یہ معروف بھی ہو، پھر انہیں امام کے سامنے پیش کیا جائے تو امام کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان پر حد جاری کرے۔ اگر انہیں امام کے سامنے پیش کیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 45

جائے تو وہ کہیں: ہم نے توبہ کرلی ہے۔ تو انہیں چھوڑا جائے گا۔ اس وقت ان کی حالت ان ڈاکوؤں جیسی ہوگی جن پر غلبہ پائے گا؛ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

اگر گناہ ایسا ہے جو بندوں پر ظلم کرنے سے تعلق رکھتا ہے تو اس سے توبہ اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک وہ چیز مالک کو نہ لوٹا دے اور خود اس سے الگ تھلگ ہو جائے، وہ عینی چیز ہو یا کوئی اور چیز ہو اگر وہ اس کو واپس کرنے پر قادر ہو۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اس کا پختہ عزم ہو کہ جب وہ قادر ہوگا تو قریب ترین وقت میں اسے واپس کر دے گا۔ اگر وہ کسی مسلمان کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس آدمی کو شعور نہیں یا نہیں جانتا کہ یہ مصیبت کہاں سے اس کے پاس آتی ہے تو اس آدمی سے اس ضرر کو دور کرے۔ پھر اس سے معافی کا سوال کرے اور یہ مطالبہ کرے کہ وہ آدمی اس کے حق میں بخشش کا طالب ہو۔ جب وہ آدمی اس کو معاف کر دے گا تو اس سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسے آدمی کو بھیجے جو اس آدمی سے اس امر کا سوال کرے وہ مظلوم اس ظالم کو معاف کر دے وہ اسے ذاتی طور پر جانتا ہو یا نہ جانتا ہو تو پھر صحیح ہے۔ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ زیادتی کرے اس طرح کہ ناحق اسے ڈرائے، تکلیف دے، اسے طمانچہ مارے، ناحق تھپڑ مارے، چھری مارے اور اسے درد پہنچائے پھر جو اس سے غلطی ہوئی تھی اس پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے معافی کا طلبگار ہو اور یہ پختہ عزم ہو کہ وہ دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ لگاتار اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرے یہاں تک اس مظلوم کا دل خوش ہو جائے کہ وہ اسے معاف کر دے تو اس سے یہ گناہ ساقط ہو جائے گا۔ یہی صورتحال ہوگی جب وہ ایسی گالی گلوچ نکالے جس پر کوئی حد نہ ہو۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ، عسی فعل کی نسبت جب الله تعالیٰ کی ذات کی طرف ہو تو یہ وجوب کے معنی میں ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ(1) گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی کی طرح ہے جس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔

وَ يُدْخِلَكُمْ اس کا عطف يُكَفِّرَ پر ہے۔ ابن ابی عبلہ نے ویدخلکم مجزوم پڑھا ہے یہ عسی ان یکفر کے محل پر معطوف ہے، گویا کلام یوں فرمائی: تم توبہ کر دیہ تمہاری سیئات کو مٹانے کا باعث ہوگی اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گی جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔

يَوْمَ لَا يُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ یوم میں عامل يُدْخِلَكُمْ ہے یا فعل مضمر ہے۔ یہاں یخزی کا معنی یعذب ہے یعنی نہ نبی کو عذاب دے گا اور نہ ہی انہیں عذاب دے گا جو اس پر ایمان لائے۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ سورۃ الحدید میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: یہ مومنوں کی اس وقت دعا ہوگی جب الله تعالیٰ منافقوں کے نور کو بجھا دے گا جس کی وضاحت سورۂ حدید میں گزر چکی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ

---

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبۃ، صفحہ 323

وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

"اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد جاری رکھو اور ان پر سختی کرو اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور لوٹ کر آنے کی بری جگہ ہے"۔

اس میں ایک ہی مسئلہ ہے:

## وہ یہ کہ اللہ کے دین کے معاملہ میں سختی کی جائے

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ کفار کے ساتھ تلوار، وعظ و نصیحت اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے میں جہاد کریں اور منافقین کے ساتھ سختی کرنے اور حجت قائم کرنے میں جہاد کریں، ان پر آخرت کے احوال واضح کریں اور انہیں یہ بتائیں کہ ان کے لیے کوئی نور نہیں ہوگا جس کے ساتھ وہ پل صراط کو عبور کریں گے جبکہ مومنوں کے پاس نور ہوگا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ان پر حدود قائم کرنے میں جہاد کریں کیونکہ وہ ایسے کام کرتے تھے جو ان پر حدود کو واجب کرتے تھے اور حدود ان پر قائم کی جاتی تھیں (1)۔ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ضمیر دونوں قسموں یعنی کفار اور منافقین کی طرف لوٹ رہی ہے۔

وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ مصیر کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝

"بیان فرمائی ہے اللہ نے کفار کیلئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال، وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر ان دونوں نے ان دونوں سے خیانت کی پس وہ دونوں (نبی ان کے شوہر) اللہ کے مقابلہ میں انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے اور انہیں حکم ملا: تم دونوں داخل ہونے والوں کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان فرمائی ہے اس امر پر آگاہ کرنے کے لیے کہ جب دو افراد دین میں مختلف ہوں گے تو کوئی قریبی رشتہ دار اپنے قریبی رشتہ دار کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام والہہ تھا (2) اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا نام والعہ تھا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ضحاک نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جبرائیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام واغلہ تھا اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا نام والہہ تھا۔

فَخَانَتٰهُمَا عکرمہ اور ضحاک نے کہا: یہاں خیانت سے مراد کفر ہے۔ سلیمان بن رقیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کہا کرتی تھی کہ حضرت نوح مجنون ہیں (3)۔ حضرت لوط علیہ السلام کی

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 177 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 47 3۔ تفسیر طبری، جز 28، صفحہ 190

بیوی لوگوں کو آپ علیہ السلام کے مہمانوں کے بارے میں بتاتی تھی۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: کسی نبی کی بیوی نے کبھی بھی بدکاری نہیں کی۔ قشیری نے ذکر کیا ہے: اس پر مفسرین کا اجماع ہے، ان کی خیانت دین کے معاملہ میں تھی۔ وہ دونوں مشرک تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ دونوں منافق تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان دونوں کی خیانت چغل خوری تھی۔ جب الله تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں انبیاء کی طرف وحی کی جاتی تو یہ دونوں مشرکوں پر اسے ظاہر کر دیتیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا طریقہ یہ تھا جب کوئی مہمان آتا تو وہ دھواں دکھاتی تا کہ اس کی قوم کو معلوم ہو جائے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں مہمان آیا ہے کیونکہ مرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللهِ شَيْـًٔا حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام جو الله تعالیٰ کے حضور بڑے محترم تھے اس کے باوجود ان کی بیویوں نے جب الله تعالیٰ کی نافرمانی کی تو یہ الله تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لیے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے (1)۔ یہاں اس بات پر آگاہ کرنا مقصود ہے کہ عذاب کو طاقت کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے کسی اور ذریعہ سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفار مکہ نے استہزا کیا اور کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری سفارش کریں گے تو الله تعالیٰ نے اس امر کو واضح کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کفار مکہ کو کچھ نفع نہ دے گی اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی شفاعت ان کی بیوی کو کوئی نفع نہ دے گی اور حضرت لوط علیہ السلام کی شفاعت ان کی بیوی کو کوئی نفع نہ دے گی جبکہ وہ دونوں ان انبیاء کے قریبی تھیں۔ وہ ان دونوں کا کفر ہوگا۔ ان دونوں بیویوں کو کہا جائے گا کہ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ جس طرح کفار مکہ مکرمہ اور دوسرے کفار کو کہا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: یہ بھی جائز ہے کہ امْرَاَتَ نُوْحٍ یہ مثلا سے بدل ہو اور مضاف محذوف ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی، ضرب الله مثلاً مثل إمراءة نوح یہ بھی جائز ہے کہ دونوں مفعول ہوں۔

وَضَرَبَ اللهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور اسی طرح الله نے اہل ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال پیش فرمائی جبکہ اس نے دعا مانگی: اے میرے رب! بنا دے میرے لیے اپنے پاس ایک گھر جنت میں اور بچا لے مجھے فرعون اور اس کے کافرانہ عمل سے اور مجھے اس ستم پیشہ قوم سے نجات دے''۔

وَضَرَبَ اللهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ فرعون کی بیوی کا نام حضرت آسیہ بنت مزاحم تھا (2)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: یہ ارشاد ایک مثال ہے جو الله تعالیٰ نے اس لیے بیان فرمائی جس کے ساتھ وہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ کو خبردار کرنا چاہتا ہے جب انہوں نے ایک معاملہ میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے خلاف باہم تعاون کیا تھا۔ پھر ان دونوں کے لیے فرعون کی بیوی اور حضرت مریم بنت عمران کی مثال بیان فرمائی۔ مقصود یہ تھا کہ دونوں ازواج مطہرات کو طاعت میں تمسک

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 47 2۔ ایضا

اور دین پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دی جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں مومنوں کو سختی میں صبر کرنے پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے یعنی تم شدت کے وقت صبر میں فرعون کی بیوی سے کمزور نہ ہو جاؤ جب اس نے فرعون کی اذیت پر صبر کیا تھا۔ حضرت آسیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پھوپھی تھی جو آپ پر ایمان لے آئی تھی۔ ابو العالیہ نے کہا: فرعون اپنی بیوی کے ایمان پر مطلع ہوا تو وہ اپنے سرداروں کے پاس آیا(1)۔ اس نے ان سے کہا: تم آسیہ بنت مزاحم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ سب نے اس کی تعریف کی۔ فرعون نے ان سے کہا: وہ تو میرے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتی ہے۔ سب نے فرعون کو رائے دی: اسے قتل کردو۔ فرعون نے اس کے لیے میخیں گاڑھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تو حضرت آسیہ نے یہ دعا کی: رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ اسی وقت فرعون آیا۔ جب حضرت آسیہ نے جنت میں اپنے گھر کو دیکھا تو وہ ہنس پڑیں تو فرعون نے کہا: کیا تم اس کے جنون سے متعجب نہیں ہوتے۔ ہم اسے سزا دے رہے ہیں جبکہ یہ ہنس رہی ہے تو اسی حالت میں اس کی روح قبض کرلی گئی۔ عثمان نہدی نے حضرت سلمان فارسی سے روایت نقل کی ہے: حضرت آسیہ کو سورج کی دھوپ میں اذیت دی جاتی تھی جب سورج کی دھوپ حضرت آسیہ کو اذیت دیتی تو فرشتے انہیں اپنے پروں سے سایہ کر لیتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دھوپ میں اس نے حضرت آسیہ کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں گاڑھ دیں اور ان کی پشت پر چکی رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اوپر اٹھایا یہاں تک کہ حضرت آسیہ نے جنت میں اپنے مکان کو دیکھ لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت آسیہ نے یہ دعا کی تو حضرت آسیہ کو وہ گھر دکھایا گیا جو جنت میں ان کے لیے بنایا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ موتی کا بنا ہوا ہے، یہ قول حضرت حسن بصری کا ہے۔ جب حضرت آسیہ نے التجا کی وَ نَجِّنِيْ تو اللہ تعالیٰ نے اسے عمدہ نجات عطا فرمائی(2)، اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کی طرف اٹھالیا۔ وہ کھاتی ہے، پیتی ہے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ عمل سے مراد کفر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عمل سے مراد عذاب، ظلم اور اس کا تکلیف پر خوش ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عمل سے مراد جماع ہے(3)۔ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝ کلبی نے کہا: قوم سے مراد اہل مصر ہیں۔ مقاتل نے کہا: مراد قبطی ہیں۔ حضرت حسن بصری اور کیسان نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اسے عزت والی نجات دی، اسے جنت کی طرف اٹھالیا، وہ وہاں کھاتی ہے اور پیتی ہے۔

**وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ۝**

''اور (دوسری مثال) مریم دختر عمران کی ہے جس نے اپنے گوہر عصمت کو محفوظ رکھا تو ہم نے پھونک دی اس کے اندر اپنی طرف سے روح اور مریم نے تصدیق کی اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ اللہ کے فرمانبرداروں میں سے تھے''۔

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ اذکر فعل محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا عطف امراۃ فرعون پر ہے معنی ہے اللہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 47
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 177
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 48

تعالیٰ نے حضرت مریم بنت عمران کی مثال بیان کی اور یہودیوں کی اذیتوں پر انہیں صبر عطا کیا۔ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا یعنی جنہیں فحش اعمال سے محفوظ رکھا۔ مفسرین نے کہا: یہاں فرج سے مراد گریبان ہے(1) کیونکہ ارشاد فرمایا: فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا حضرت جبریل امین نے ان کے گریبان میں پھونک ماری ان کی شرمگاہ میں پھونک نہیں ماری۔ یہ حضرت اُبی کی قرأت ہے فَنَفَخْنَا فِيْ جَيْبِهَا مِنْ رُّوْحِنَا کپڑے میں جو بھی پھٹن ہو اس کو جیب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ (ق)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت مریم نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا اور حضرت مریم کے گریبان میں حضرت جبریل نے پھونک ماری۔ فَنَفَخْنَا کا معنی ہے ہم نے جبریل امین کو بھیجا تو حضرت جبریل امین نے ان کے گریبان میں پھونک ماری۔ مِنْ رُّوْحِنَا یعنی اپنی ارواح میں سے ایک روح۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح ہے اس کی وضاحت سورۂ نساء کے آخر میں گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا عام قرأت صدقت تشدید کے ساتھ ہے حمید اور اموی نے و صدقت تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا سے مراد ہے کہ حضرت جبریل امین نے حضرت مریم سے کہا: اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ (مریم:19) میں تیرے رب کا رسول ہوں۔ مقاتل نے کہا: کلمات سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یہ کہ وہ نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں یہ بحث بھی پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ نے کہا: بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ ابو عمرو اور حفص نے عاصم سے وَ كُتُبِهٖ جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو رجاء سے وَ كُتْبِهٖ تاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے(2) باقی قراء نے اسے واحد کتابہ پڑھا ہے مراد جنس ہے معنی ہوگا یہ کتاب جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا۔

وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ یہ اطاعت گزاروں میں سے تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ان نمازیوں میں سے تھی جو مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ قانتات نہیں فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ قوم قانتین میں سے تھی۔ یہ جائز ہے کہ الْقٰنِتِيْنَ سے مراد ان کے ''اہل بیت'' ہوں کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے تھے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے فرمایا جبکہ ان کی روح پرواز کر رہی تھی ''کیا تو اس بات کو ناپسند کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں نازل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدگی میں خیر رکھ دی ہے جب تو اپنی سوکنوں کے پاس جائے تو میری طرف سے انہیں سلام کہنا وہ حضرت مریم بنت عمران، حضرت آسیہ بنت مزاحم، حضرت کلیمہ یا حضرت حکیمہ بنت عمران جو حضرت موسیٰ بن عمران کی بہن ہیں''۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: یا رسول اللہ! تمہارا جوڑا املار ہے بیٹے پیدا ہوں۔ قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تیرے لئے جہاں بھر کی عورتوں میں سے چار کافی ہیں حضرت مریم بنت عمران، حضرت خدیجہ بنت خویلد، حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا''(3)۔ اس بارے میں مفصل گفتگو سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 48 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 336

3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 418۔ جامع ترمذی، باب فضل خدیجہ رضی اللہ عنہا، حدیث نمبر 3813، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ الملک

آیاتہا ۳۰ ﴿۶۷ سورۃ الملک مکیۃ ۷۷﴾ رکوعاتہا ۲

تمام علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے، اسے واقیہ اور منجیہ بھی کہتے ہیں، اس کی تیس آیات ہیں۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے ایک قبر پر خیمہ لگایا وہ یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ یہ قبر ہے یہ ایسے انسان کی قبر تھی جو سورۂ ملک پڑھتا یہاں تک کہ اسے ختم کرتا (1)۔ خیمہ لگانے والا صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی: یارسول اللہ! میں نے قبر پر اپنا خیمہ لگایا میں یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ یہ قبر ہے کیا دیکھتا ہوں کہ یہ انسان کی قبر ہے جو سورۂ ملک کی قرات کر رہا ہے یہاں تک کہ اس نے اسے ختم کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ مانعہ ہے، یہ منجیہ ہے جو عذاب قبر سے نجات دینے والی ہے''۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں پسند کرتا ہوں کہ سورۂ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ہر مومن کے دل میں ہو''۔ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کتاب اللہ میں سے ایک سورت ہے وہ صرف تیس آیات ہیں وہ انسان کی شفاعت کرتی ہے یہاں تک کہ قیامت کے روز اسے جہنم سے نکال دے گی اور جنت میں اسے داخل کرے گی یہ سورۂ تَبٰرَكَ الَّذِيْ ہے (2)'' امام ترمذی نے اس کی ہم معنی حدیث نقل کی ہے اس بارے میں کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: جب میت کو اس کی قبر میں رکھا جائے گا تو اس کے قدموں کی جانب سے آیا جائے گا اور کہا جائے گا: تمہیں اس پر کوئی اختیار نہیں کیونکہ یہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر سورۂ ملک پڑھا کرتا تھا، پھر اس کے سر کی جانب سے آیا جائے گا تو اس کی زبان کہے گی: اس پر کوئی اختیار نہیں وہ مجھ سے سورۂ ملک کی تلاوت کیا کرتا تھا، پھر فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مانع ہے یہ سورت تورات میں بھی سورۂ ملک ہے جس نے رات میں اسے پڑھا تو اس نے بہت زیادہ عمل کیا اور بہت اچھا عمل کیا۔ یہ روایت کی گئی ہے: جس نے اسے ہر رات پڑھا فتان اسے کوئی نقصان نہیں دے سکے گا (3)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ۝

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی سورۃ الملک، جلد 2، صفحہ 580

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی عدد الآیۃ، حدیث نمبر 1192۔ سنن ابن ماجہ، باب ثواب القرآن، حدیث نمبر 3775، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المستدرک، کتاب التفسیر، جلد 1، صفحہ 211

''منزہ و برتر ہے وہ جس کے قبضہ میں (سب جہانوں کی) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

تَبٰرَكَ یہ برکت سے تفاعل کے وزن پر ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی تقدس ہے یعنی وہ پاک ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہمیشہ رہنے والا ہے پس وہ ایسا دائم ہے جس کے وجود کا اول نہیں اور اس کے دوام کا آخر نہیں۔ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ دنیا و آخرت میں زمین و آسمان کی بادشاہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کے قبضہ قدرت میں بادشاہی ہے، جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت عطا فرماتا ہے، وہ زندگی عطا کرتا ہے، وہ موت عطا کرتا ہے، وہ غنی کرتا ہے، وہی فقر دیتا ہے، وہ عطا فرماتا ہے، وہی روک لیتا ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: اسی کے قبضہ قدرت میں نبوت کی بادشاہی ہے جس کے ساتھ اتباع کرنے والوں کو عزت عطا فرماتا ہے اور مخالفت کرنے والوں کو ذلت دیتا ہے (2)۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۟ وہ انعام کرنے اور انتقام لینے پر قادر ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۟

''جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے، اور وہی دائمی عزت والا بہت بخشنے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## موت اور حیات کی تخلیق کا معنی

**مسئلہ نمبر 1**۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تمہیں موت اور زندگی کے لئے پیدا کیا، یعنی دنیا میں موت کے لئے اور آخرت میں زندگی کے لئے پیدا کیا (3)۔ موت کو زندگی پر مقدم کیا کیونکہ موت صفت قہر کے زیادہ قریب ہے جس طرح بنات کو بنین پر مقدم کیا فرمایا: یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا (الشوریٰ: 49) ایک قول یہ کیا گیا ہے: موت کو اس لئے مقدم کیا کیونکہ یہ زندگی سے پہلے ہے کیونکہ اشیاء ابتدا میں موت کے حکم میں تھیں جس طرح نطفہ، مٹی وغیرہ۔

قتادہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو موت کے ساتھ ذلیل کیا، دنیا کو زندگی کا گھر بنایا پھر موت کا گھر بنایا اور آخرت کو جزاء کا گھر پھر بقاء کا گھر بنایا'' (4)۔ حضرت ابو داؤد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لولا ثلاث ما طأطا ابن آدم رأسه الفقر و المرض و الموت وانه مع ذلك لوثاب اگر تین چیزیں نہ ہوں تو انسان اپنا سر نہ جھکائے فقر، مرض اور موت اس کے باوجود وہ اچھلنے کودنے والا اور جلد باز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2**۔ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ موت کو حیات پر مقدم کیا کیونکہ جو انسان موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اسے عمل کی طرف دعوت میں یہ سب سے قوی داعی (سبب) ہے اسے مقدم کیا کیونکہ جس غرض کے لئے آیت چلائی گئی ہے وہ زیادہ اہم ہے۔ علماء نے کہا: موت سے مراد عدم محض اور خالص فنا نہیں جبکہ موت سے مراد روح کا بدن سے جو تعلق ہے اس کا انقطاع اور اس کی مفارقت ہے، دونوں میں کسی چیز کا حائل ہونا، ایک حال سے دوسرے حال میں بدل جانا اور ایک دار سے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 6، صفحہ 49 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 49 3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 50-49 4۔ ایضاً، جلد 50

دوسرے دار میں منتقل ہوتا ہے، جبکہ زندگی اس کے برعکس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کلبی اور مقاتل نے کہا: موت اور حیات دو جسم ہیں موت کو مینڈھے کی ایسی ہیئت میں بنایا گیا ہے جو کسی انسان کے پاس سے نہیں گزرتا اور کوئی اس کی ہوا نہیں پاتا مگر مر جاتا ہے، حیات کو ایسے گھوڑی کی صورت پر بنایا گیا ہے جو سیاہ و سفید رنگ والی ہے یہ وہی گھوڑی ہے جس پر حضرت جبریل امین اور انبیاء علیہم السلام سواری کیا کرتے تھے، اس کا ایک قدم حد نگاہ تک ہوتا ہے، جو گدھے سے بڑی اور خچر سے چھوٹی ہوتی ہے، یہ کسی چیز کے پاس سے نہیں گزرتی جو چیز اس کی ہوا پاتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتی ہے، وہ کسی چیز کو نہیں روندتی مگر وہ ہر چیز زندہ ہو جاتی ہے، یہ وہی گھوڑی تھی جس کے قدم کے نشان سے سامری نے کوئی چیز لی اسے بچھڑے پر ڈالا تو وہ زندہ ہو گیا؛ ثعلبی اور قشیری نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ماوردی نے اسی کا معنی مقاتل اور کلبی سے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: قرآن حکیم میں ہے قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدہ: 11) وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ (الانفال: 50) تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (الانعام: 61) فرمایا اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: 42) واسطے فرشتے ہیں جو مکرم ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر ہوں۔ حقیقت میں موت عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آخرت میں موت کو مینڈھے کی مثالی شکل دی جائے گی اور پل صراط پر اسے ذبح کر دیا جائے گا جس طرح خبر صحیح میں واقع ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ اس خبر صحیح کا محتاج ہے جو عذر کو ختم کر دے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مقاتل سے یہ بھی مروی ہے: خَلَقَ الْمَوْتَ سے مراد ہے نطفہ، علقہ اور مضغہ کو پیدا کیا اور خلق الحیوۃ سے مراد ہے انسان کو پیدا فرمایا، اس میں روح پھونکی تو وہ انسان بن گیا۔

میں کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا دلالت کرتا ہے۔ سورۂ کہف میں اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ سدی نے اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا معنی یہ ذکر کیا ہے أكثركم للموت ذكرا و أحسن استعدادا تم میں سے کون موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور کون اس کے لئے زیادہ تیاری کرتا ہے؟ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی ہے کون زیادہ خوف رکھتا ہے اور کون زیادہ احتیاط برتتا ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورت کے شروع اَحْسَنُ عَمَلًا تک آیات پڑھیں فرمایا: ''کون اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچتا ہے (1) اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جلدی کرتا ہے''۔ لیکن ایک قول یہ کیا گیا ہے: لِيَبْلُوَكُمْ کا معنی ہے تمہارے ساتھ ممتحن کا سا معاملہ کرے یعنی موت دے کر بندے کو آزماتا ہے تا کہ اس کے صبر کو واضح کرے اور حیات دے کر آزماتا ہے تا کہ اس کے شکر کو واضح کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے بعث اور جزا کے لئے موت کو پیدا کیا اور زندگی کو آزمانے کے لئے پیدا کیا۔ لِيَبْلُوَكُمْ میں لام خلق حیات کے متعلق ہے خلق موت کے متعلق نہیں؛ زجاج نے اسے ذکر کیا ہے۔ فراء اور زجاج نے یہ بھی کہا: بلوی، اسی پر واقع نہیں ہوتا کیونکہ بلوی اور ای کے درمیان فعل مضمر ہے جس طرح تو کہتا ہے: بلوتكم لانظر أيكم أطوع اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۝ (القلم) ان سے پوچھیں پھر دیکھیں۔ اَيُّكُمْ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 50

ہے اَحْسَنُ اس کی خبر ہے معنی ہے تاکہ جانے یا دیکھے تم میں سے ازروئے عمل کے کون سب سے اچھا ہے؟ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۝ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اس سے انتقام لینے میں غالب ہے اور جو توبہ کرے اس کو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳

''جس نے بنائے ہیں سات آسمان اوپر نیچے تمہیں نظر نہیں آئے گا (خداوند) رحمن کی آفرینش میں کوئی خلل ذرہ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا تجھے کوئی رخنہ دکھائی دیتا ہے؟''۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں ان کی اطراف ملے ہوئے ہیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ طِبَاقًا یہ نعت کی صفت ہے مصدر کے ساتھ اس کی صفت لگائی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر ہے مطابقہ کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ و طَبَّقَها تطبِيقًا او مُطَابَقَةً یا تقدیر کلام یوں ہوگی طُوبقت طِباقًا۔ سیبویہ نے کہا: طباقا منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول ثانی ہے۔ میں کہتا ہوں: خَلَقَ، جعل اور صیّر کے معنی میں ہوگا۔ طباق، طبق کی جمع ہے جس طرح جمل کی جمع جمال ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ طبقہ کی جمع ہے۔ ابان بن تغلب نے کہا: میں نے ایک بدو کو سنا جو کسی آدمی کی مذمت کر رہا تھا تو اس نے کہا: شرّہ طباق و خیرہ غیر باقٍ اس کا شر تہہ در تہہ ہے اور اس کی خیر باقی رہنے والی نہیں (1)۔ قرآن کے علاوہ میں سبع سموات طباقٍ پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ سَمٰوٰتٍ کی صفت ہوئی اس کی مثل قرآن حکیم میں بھی ہے وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ (یوسف: 43)

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ حمزہ اور کسائی کی قرات مِنْ تَفَوُّتٍ ہے الف نہیں واؤ مشدد ہے (2)؛ یہ حضرت ابن مسعود اور اس کے اصحاب کی قرات ہے باقی قراء نے من تفاوت پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح تعاھد اور تعھُّد، تَحَمُّل اور تَحَامُل، تَظَهُّر اور تَظَاهُر، تَصَغُّر اور تَصَاغُر، تَضَعُّف اور تَضَاعُف، تَبَعُّد اور تَبَاعُد ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عبید نے مِنْ تَفٰوُتٍ کی قرات کو اختیار کیا ہے اور حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر کی حدیث سے استدلال کیا: أمثلي يُتَفَوَّتُ عليه في بَنَاتِه کیا مجھ جیسے آدمی کی عدم موجودگی میں اس کی بیٹیوں میں اس کی اجازت کے بغیر معاملہ کیا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ امر ابو عبید پر رد کر دیا جائے گا کیونکہ یتفوت کا معنی ہوتا ہے مشورہ کے بغیر کام کرنا۔ آیت میں تَفٰوُتٍ کا لفظ مناسب ہے جس طرح تباین کہا جاتا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: تَفَاوَتَ الْاَمْرُ جب اس میں جدائی اور بعد میں پیدا ہو جائے یعنی ان میں سے بعض، بعض سے فوت ہو جائے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا معنی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمن کی تخلیق میں کوئی کجی، نقص اور تباین نہیں دیکھیں گے بلکہ یہ مستقیم ہیں، مستوی ہیں اور اس کے خالق ہونے پر دال ہیں اگرچہ ان کی صورتیں اور صفات مختلف ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد صرف آسمان ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی تخلیق میں کوئی عیب نہیں دیکھیں گے۔ اس کی اصل فوت ہے مراد ہے کوئی چیز کسی چیز کو نہ پائے تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 338
2۔ ایضاً

برابری میں کمی کی وجہ سے خلل واقع ہو جائے۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلالت کرتا ہے فرمایا: معنی ہے من تفرق ابو عبید نے کہا: تفوت الشیٔ کا معنی ہے جب وہ چیز ناپید ہو جائے پھر حکم دیا کہ اس کی تخلیق میں تم غور و فکر کرو تا کہ تم اس سے عبرت حاصل کرو اور اس کی قدرت میں غور و فکر کرو تو فرمایا: فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۞ اپنی نظر کو آسمان کی طرف اٹھاؤ یہ جملہ بولا جاتا ہے: قلب البصر فی السماء اس نے آسمان کی طرف نظر کو اٹھایا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اجھذ بالنظر الی السماء۔ معنی قریب قریب ہے۔ فَارْجِعِ ارشاد فرمایا اور فاء کا ذکر کیا اس سے پہلے فعل مذکور نہیں کیونکہ فرمایا: مَا تَرٰى معنی ہے دیکھیے پھر نظر کو لوٹایئے کیا آپ ﷺ کوئی کجی دیکھتے ہیں؟ یہ قتادہ کا قول ہے۔ فطور کا معنی پھٹن ہے؛ یہ مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: معنی ہے خلل یعنی نقص (2)۔ سدی نے کہا: معنی ہے کوئی شگاف (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: معنی ہے کمزوری۔ یہ تفطر اور انفطار سے ماخوذ ہے جس کا معنی انشقاق ہے۔ شاعر نے کہا:

بَنَی لکُم بِلا عَمَدٍ سماءً وَ زیّنَھا فما فیھا فطورُ

بغیر ستونوں کے تمہارے لئے آسمان بنایا اور اسے مزین کیا اس میں پھٹن نہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

شَقَقْتِ القلب ثم ذَرَرْتِ فیہ ھَواكِ فَلِیم فالتأم الفُطُورُ

تو نے دل کو پھاڑا پھر تو نے اس میں اپنی محبت کا بیج بویا پھر اسے جوڑ دیا گیا تو شگاف مندمل ہو گیا۔

## ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۞

"جس نے بنائے ہیں سات آسمان اوپر نیچے تمہیں نظر نہیں آئے گا (خداوند) رحمن کی آفرینش میں کوئی خلل ذرا پھر نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا تجھے کوئی رخنہ دکھائی دیتا ہے"۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ، کرتین مفعول مطلق ہے کیونکہ اس کا معنی دو بار لوٹنا ہے۔ معنی یکے بعد دیگرے۔ دو دفعہ دیکھنے کا حکم دیا کیونکہ انسان جب کسی چیز کو ایک دفعہ دیکھتا ہے تو اس کا عیب نہیں پاتا جب تک دوسری دفعہ اسے نہ دیکھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی اگرچہ دو دفعہ دیکھا تب بھی کوئی عیب نہ پایا بلکہ دیکھنے کے ساتھ متحیر ہو گئے اسی وجہ سے فرمایا: يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا یعنی آنکھ لوٹے گی جھکی ہوئی درماندہ اور کوئی عیب پانے سے دور۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: خسأت القلب تو نے اسے دور کر دیا اور و خسا الکلبُ بنفسہ کتا خود دور ہو گیا۔ یہ متعدی اور غیر متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے انخسأ الکلب یہ جملہ بھی بولا جاتا ہے: خسا البصرُ خسأ و خسوءًا اس کی آنکھ نہیں دیکھتی؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خاسی اسے کہتے ہیں جو ایسی چیز نہ دیکھے جس کی وہ خواہش کرتا تھا۔ وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۞ وہ تھکاوٹ میں انتہا کو پہنچ گئی۔ حَسِيْرٌ اسم فاعل کے معنی میں ہے یہ حسور سے مشتق ہے جس کا معنی نکلنا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حسرہ، بُعْدُ الشیٔ سے اسم مفعول کے معنی میں ہو۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا معنی ہے: اسی معنی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 51 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں شاعر کا قول ہے:

مَن مَدّ طرفًا إلى ما فوق غايته ۔ إرتد خسآن منه الطرف قد حسرا

جو آدمی اپنی حد سے اوپر نظر کرتا ہے اس کی آنکھ نا کام لوٹتی ہے جبکہ وہ سخت تھکی ہوتی ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: قد حسر بصرہ یحسر حسورا یعنی وہ تھک گئی اور زیادہ عرصہ دیکھنے کی وجہ سے اس کی نظر میں انقطاع آ گیا اور جو اس کے مشابہ ہو۔ اس سے صفت کے صیغے حسیر اور محسور استعمال ہوتے ہیں شاعر نے کہا:

نظرت إليها بالمُحَصَّبِ من مِنىً ۔ فعاد إلى الطَّرف وهو حسير

میں نے اس کی طرف محصب سے دیکھا جو منٹی سے ہے، نظر میری طرف لوٹی جبکہ وہ تھکی ماندی تھی۔

ایک اور اونٹنی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: فشطرها نظرُ العينين محسور اس اونٹنی کی جانب آنکھوں کی نظر تھکی ماندی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی نادم ہے۔ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

ما أنا اليومُ على شيْءٍ خَلَا ۔ يا بنة القين تَوَلَّى بِحَسِرِ

اے بنت قین! میں آج ہاتھ سے نکل جانے والی چیز پر شرمندہ ہو کر پلٹنے والا نہیں

کَرَّتَیۡنِ سے مراد یہاں کثرت ہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ۝ بار بار دیکھنے پر دلیل ہے۔

وَ لَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَ جَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ۝ وَلِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ۝

''اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ اور ہم نے تیار کر رکھا ہے ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب۔ اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کا ان کے لئے عذاب جہنم ہے''۔

وَ لَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ، مصابیح، مصباح کی جمع ہے جس کا معنی چراغ ہے۔ ستاروں کو مصابیح کا نام دیا کیونکہ یہ بھی روشن ہوتے ہیں۔ وَ جَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا ھا ضمیر سے پہلے شہب کا لفظ محذوف ہے اس کی دلیل اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ۝ (الصافات) ہے۔ اس تاویل کی بنا پر مصابیح نہ زائل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضمیر مصابیح کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس تاویل کی بنا پر رجم نفس کوا کب سے ہوگا اور کوکب (ستارہ) خود ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس سے ایک حصہ جدا ہوتا ہے جس کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے نہ اس کی روشنی میں کمی آتی ہے اور نہ ہی اس کی صورت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ابو علی نے یہ بات اس کے قول کے جواب میں کہی جو یہ کہتا ہے: یہ زینت کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے جو باقی ہی نہیں رہتے؟ مہدوی نے کہا: یہ اس صورت میں ہوگا کہ اس کا اخذ

کرتا کواکب کے موضع سے ہو تقدیر اول اس صورت میں ہوگی جب اخذ کرنا اس سے ہو جو کواکب کے موضع سے نیچے ہے۔ قشیری نے کہا: ابو علی کے قول سے زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ ہم یہ کہیں: یہ آسمانوں کی زینت ہیں جبکہ ان کے ساتھ بھی شیاطین کو رجم نہ کیا جائے۔ رجوم، رجم کی جمع ہے یہ مصدر ہے اس کے ساتھ نام رکھا جاتا ہے اس چیز کا جس کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نجوم کے تین فائدے بنائے ہیں۔ (۱) یہ آسمان کی زینت ہیں۔ (۲) شیاطین کے لئے رجم ہیں۔ (۳) ایسی علامات ہیں جن کے ساتھ خشکی، سمندر اور اوقات میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ جس نے ان تین مقاصد کے علاوہ کی تاویل کی ہے اس نے اس چیز کا تکلف کیا ہے جس کے بارے میں کوئی علم نہ ہو، اس نے حد سے تجاوز کیا اور ظلم کیا۔ محمد بن کعب نے کہا: اللہ کی قسم! اہل زمین میں سے کسی کے لئے بھی آسمان میں کوئی ستارہ نہیں لیکن اہل زمین نے کہانت کو اس کی راہ بنا دیا اور انہوں نے ستارہ کو علت بنا دیا ہے۔

وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۝ ہم نے شیاطین کے لئے شدید آگ تیار کر رکھی ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: سعرت النار فھی مَسْعُوْرَۃٌ و سَعِیْرٌ جس طرح مقتولۃ اور قتیل کا لفظ ہے

## اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّ هِیَ تَفُوْرُ ۝

''جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اس کی زوردار گرج سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی''۔

اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا اذ ضمیر سے مراد کفار ہیں۔ سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا شہیق سے مراد آواز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب کفار کو جہنم میں پھینکا جائے گا اس وقت جہنم کی یہ آواز ہوگی (1)، وہ ان کے لئے یوں آواز نکالے گی کہ ہر کوئی خوفزدہ ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب کفار کو جہنم میں پھینکا جائے گا اس وقت کفار کی یہ آواز ہوگی؛ یہ عطا کا قول ہے۔ شہیق سینے کی آواز کو کہتے ہیں اور زفیر حلق کی آواز کو کہتے ہیں۔ سورۂ ہود میں یہ بحث گزر چکی ہے وَّ هِیَ تَفُوْرُ وہ جوش مارے گی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

ترکتم قِدْرَکم لاشیَٔ فیها و قِدْرُ القوم حامیۃٌ تفورُ

تم نے اپنی ہنڈیا کو یوں چھوڑا کہ اس میں کچھ بھی نہیں جبکہ قوم کی ہنڈیا گرم ہے، جوش مار رہی ہے۔

مجاہد نے کہا: وہ ان کے ساتھ جوش مار رہی ہوگی جس طرح کثیر پانی میں تھوڑے دانے جوش مارتے ہیں (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ہنڈیا ان پر جوش مار رہی ہوگی جس میں وہ ہوں گے۔ یہ سخت غصہ کی وجہ سے آگ کے شعلہ کی شدت کا اظہار ہے جس طرح تو کہتا ہے: فلان یفور غیظا وہ غصہ کی وجہ سے جوش مار رہا ہے۔

## تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ؕ كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 53 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 420

ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

''(ایسا معلوم ہوتا ہے) گویا مارے غضب کے پھٹا چاہتی ہے جب بھی اس میں کوئی جتھا جھونکا جائے گا تو ان سے دوزخ کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں، بے شک ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا، پس ہم نے اس کو جھٹلایا اور ہم نے اس کو (صاف صاف) کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی چیز نہیں اتاری، تم لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم (ان کی نصیحت کو) سنتے اور سمجھتے تو آج ہم دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔ پس (اس روز) اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے تو پھٹکار ہو اہل جہنم پر''۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ وہ ٹکڑے ہو جائے گی اور اس کا بعض، بعض سے جدا ہو جائے گا؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور ابن زید نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر شدت غیظ کی وجہ سے پھٹ جائے گی(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِنَ الْغَيْظِ کا معنی جوش مارنا ہے۔ تَمَيَّزُ کی اصل تتميز ہے كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ فوج سے مراد کفار کی جماعت ہے۔ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ جہنم کے دراوغے توبیخ اور تقریع کے انداز میں ان سے سوال کریں گے۔ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ کیا تمہارے پاس دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا جو تمہیں اس دن سے ڈراتا یہاں تک کہ تم احتیاط برتتے؟ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ یعنی ہمارے پاس ڈرانے والا آیا، اس نے ہمیں ڈرایا اور خبردار کیا۔ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری زبانوں پر کچھ نازل نہیں کیا۔ اِنْ اَنْتُمْ ضمیر سے مراد رسولوں کی جماعت ہے۔ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ انہوں نے رسولوں کو جھٹلانے کا اعتراف کیا، پھر انہوں نے جہالت کا اعتراف کیا جبکہ وہ جہنم میں ہوں گے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ کاش ہم رسولوں کی باتوں کو سنتے جو رسول لاتے تھے اَوْ نَعْقِلُ یا ان سے حکمت کی باتوں کو سمجھتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کاش! ہم ہدایت کی بات کو سنتے یا اسے سمجھتے یا ہم اس آدمی کے سننے کی طرح سنتے جو یاد رکھتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے یا ہم اس آدمی کی طرح سمجھتے جو امتیاز رکھتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے(3)۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ کافر کو کچھ بھی عقل نہیں دیا گیا۔ سورۂ طور میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ یعنی ہم جہنمی نہ ہوتے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز تاجر شرمندہ ہوں گے۔ کہیں گے: کاش! ہم سنتے یا سمجھ بوجھ رکھتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا''۔ یعنی انہوں نے رسولوں کو جھٹلانے کے لیے جرم کا اعتراف کر لیا۔ یہاں ذنبا جمع کے معنی میں ہے کیونکہ اس میں فعل کا معنی پایا جا رہا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: خرج عطاء

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 53 | 2۔ ایضاً | 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 420

الناس یعنی ان کے عطیات نکل گئے۔

فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انہیں دور کر دیا گیا ہے۔ سعید بن جبیر اور ابو صالح نے کہا: یہ جہنم میں وادی ہے جسے سحق کہتے ہیں (1)۔ کسائی اور ابو جعفر نے اسے فَسُحُقًا حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)؛ یہ حضرت علی شیر خدا سے بھی مروی ہے۔ باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح سُحُتٌ اور رُعُبٌ۔ زجاج نے کہا: یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منسوب ہے، تقدیر کلام یہ ہے اسحقھم الله سحقا یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کر دیا۔ امراء القیس نے کہا:

وتَسْحَقُه رِیحُ الصَّبَا کُلَّ مَسْحَقِ  بادصبا اسے دور کرتی ہے۔

ابو علی نے کہا: قیاس تو یہ تھا کہ مصدر اسحاقا ہوتا تو مصدر حروف زائدہ کے حذف کے ساتھ آیا ہے جس طرح کہا گیا: وان اھلک فذالك كان قدری اگر میں ہلاک کیا جاؤں تو یہی میری تقدیر ہوگی۔ محل استدلال قدری ہے جو اصل میں تقدیری تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝ یہ جہنم کے داروغوں کا قول ہے جو وہ جہنمیوں کو کہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝

''بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے (اللہ کی) مغفرت اور اجر عظیم ہے''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (ق:33) اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں جو غیب ہے۔ یہ قیامت کے دن کا عذاب ہے۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ ان کے لیے ان گناہوں کی بخشش ہے اور وَّ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝ اجر کبیر ہے۔ اجر کبیر سے مراد جنت ہے۔

وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝

''تم اپنی بات آہستہ کہو یا بلند آواز سے (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)، بے شک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔ (نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا، وہ بڑا باریک بین ہر چیز سے باخبر ہے''۔

وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ لفظ تو امر کا ہے معنی خبر کا دے رہا ہے یعنی اگر تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملہ میں اپنی کلام مخفی رکھو یا اسے ظاہر کرو۔ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وہ ذات پاک تو دلوں میں موجود خیر و شر کو بھی جانتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت مشرکین کے حق میں نازل ہوئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں باتیں کرتے تھے تو حضرت جبرئیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بارے میں بتا دیتے تھے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: آہستہ بات کرو تا کہ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رب سن ہی نہ لے تو یہ آیت نازل ہوئی وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 53  2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 420

معاملہ میں آہستہ بات کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام اقوال آہستہ سے کیا کرو یا اعلانیہ کیا کرو۔ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ دلوں میں جو کچھ ہے اسے وہ جانتا ہے۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ سے مراد مافی الصدور ہے جس طرح عورت کا بچہ جب جنین ہو تو اسے ذا بطنہا کہتے ہیں۔ پھر فرمایا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وہ ذات پاک جس نے سر کو پیدا کیا۔ وہ سر کو نہیں جانتی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے دل میں راز کو پیدا کیا ہے، کیا بندوں کے دلوں میں جو کچھ ہے میں اسے نہیں جانتا۔ علماء معانی نے کہا: اگر تو چاہے تو مَنْ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لے لے تو معنی یہ ہوگا کیا خالق اپنی مخلوق کو نہیں جانتا اگر چاہے تو تو اس سے مراد مخلوق لے لے یعنی اسے مفعول بہ بنا لے تو معنی ہوگا کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو نہیں جانتا۔ ضروری ہے کہ خالق اسے جانتا ہو جس کو اس نے پیدا کیا ہے اور جسے پیدا کرے گا۔ ابن مسیب نے کہا: اس اثنا میں کہ ایک آدمی رات کے وقت گھنے درختوں میں بیٹھا ہوا تھا، تیز ہوا چلی تو انسان کے دل میں خیال پیدا ہوا: بتاؤ کیا اللہ تعالیٰ ان گرنے والے پتوں کو جانتا ہے؟ تو گھنے درخت جانب سے بڑی عظیم آواز آئی: کیا وہ ذات اپنی مخلوق کو نہیں جانتی جبکہ وہ لطیف و خبیر ہے۔

استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: صفات ذات کے اسماء میں سے جو علم کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک علیم ہے اس کا معنی ہے جمیع معلومات کو عام ہے۔ ان میں سے ایک خبیر ہے۔ یہ خاص ہے کہ جو چیز وقوع پذیر ہونے والی ہے اس کے واقع ہونے سے پہلے وہ باخبر ہے۔ ان میں سے ایک حکیم ہے۔ اس سے مراد ہے وہ اوصاف کے حقائق کو جانتا ہے۔ ان میں سے ایک شھید ہے۔ یہ اس کے ساتھ خاص ہے کہ وہ غائب و حاضر کو جانتا ہے۔ اس کا معنی ہے اس سے کوئی شی غائب نہیں۔ ان میں سے ایک حافظ ہے۔ یہ اس کے ساتھ خاص ہے کہ وہ بھولتا نہیں۔ ان میں سے ایک محصی ہے۔ یہ اس کے ساتھ خاص ہے کہ کثرت اسے علم سے غافل نہیں کرتی جس طرح نور کی روشنی، ہوا کا سخت ہونا، پتوں کا گرنا، اس اعتبار سے ہر پتے کی حرکت کے اجزاء کو بھی جانتا ہے۔ وہ کیسے نہ جانے جبکہ اسی نے پیدا کیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝۱۵

”وہی تو ہے جس نے نرم کر دیا ہے تمہارے لیے زمین کو پس (اطمینان سے) چلو اس کے راستوں پر اور کھاؤ اس کے (دیئے ہوئے) رزق سے اور اسی کی طرف تم کو (قبروں سے) اٹھ کر جانا ہے“۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا یعنی نرم جس پر تم قرار پذیر ہوتے ہو۔ ذلول ایسے مطیع کو کہتے ہیں جو تیرے لیے نرمی کرتا ہے اس کا مصدر ذُل ہے جس کا معنی نرمی اور اطاعت کرنا ہے یعنی زمین کو ایسا نہیں بنایا کہ اس کی سختی کی وجہ سے اس میں چلنا ممکن نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے پہاڑوں کے ساتھ مضبوط کر دیا تا کہ وہ اپنے مکینوں کے ساتھ جھک ہی نہ جائے۔ اگر یہ ایک طرف جھکنے والی ہوتی تو یہ ہمارے لیے مطیع نہ ہوتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں کھیتی اگانا، درخت لگانا، چشموں کا پھوٹ پڑنا، نہریں نکالنا اور کنویں کھودنا ممکن ہے۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا امر اباحت کے لیے ہے اس میں احسان کرنے کا اظہار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خبر ہے جو امر کے لفظ کی صورت میں ہے یعنی تا کہ تم اس کی اطراف، اس کے چھوٹے پہاڑوں اور اس کے بڑے پہاڑوں پر چلو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور بشیر بن کعب نے کہا: فِیْ مَنَاكِبِهَا سے مراد اس کے پہاڑ ہیں (1)۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت بشیر بن کعب کی ایک لونڈی تھی۔ آپ نے اسے فرمایا: اگر تو مجھے بتادے کہ زمین کے مناکب کیا ہیں تو تو آزاد ہے؟ اس نے جواب دیا: زمین کے مناکب سے مراد اس کے پہاڑ ہیں تو وہ آزاد ہوگئی۔ حضرت بشیر بن کعب نے اس سے نکاح کا ارادہ کیا اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ نے فرمایا: جو تجھے شک میں ڈالے اسے چھوڑ دے اور اسے اپنا جو تجھے شک میں نہ ڈالے (☆)۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے اس کے اطراف، منکبا الرجل سے مراد بندے کی دونوں اطراف ہیں۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: اس کے راستوں اور تنگ راستوں میں؛ یہی سدی اور حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: مراد اس کی اطراف ہیں (2)۔ منکب کا اصل معنی جانب ہے اسی سے منکب الرجل ہے۔ انسان کا کندھا، اس سے ایک لفظ ریح نکباء ٹیڑھی چلنے والی ہوا ہے۔ تَنَكَّبَ فلانٌ عن فلان فلاں فلاں سے ایک طرف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جہاں تم چاہو تم چلو میں نے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، اب یہ تمہارے مانع نہیں۔ قتادہ نے ابو جلد سے روایت نقل کی ہے زمین چوبیس ہزار فرسخ ہے۔ حبشیوں کے لیے بارہ ہزار فرسخ، رومیوں کے لیے آٹھ ہزار فرسخ، ایرانیوں کے لیے تین ہزار فرسخ اور عربوں کے لیے ایک ہزار فرسخ (3)۔ وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جسے حلال کیا ہے اسے کھاؤ؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں سے کھاؤ جو میں نے تمہیں دیا ہے۔ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝ اس کی طرف لوٹنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ ذات جس نے آسمان کو کجی کے بغیر پیدا کیا اور زمین کو مطیع بنایا وہ تمہیں دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں غرق کر دے اور وہ زمین تھر تھر کانپنے لگے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم اس کے عذاب سے امن میں ہو جو آسمان میں ہے اگر تم اس کی نافرمانی کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے أمنتم من فی السماء قدرتہ و سلطانہ و عرشہ و مملکتہ یعنی کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے جس کی قدرت، سلطان، عرش اور مملکت آسمان میں ہے۔ یہاں آسمان کو خاص کیا ہے جبکہ اس کی مملکت عام ہے۔ اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ الہ وہ ہے جس کی قدرت آسمانوں میں نافذ ہے نہ کہ وہ الہ ہے جس کی تم زمین میں عظمت بیان کرتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جبرائیل امین کی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 54 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 179

☆ جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث نمبر 2442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرف اشارہ ہے کیونکہ حضرت جبرائیل امین وہ فرشتہ ہے جس کے ذمہ عذاب دینا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال موجود ہے کہ معنی ہو کیا تم بے خوف ہو گئے اس خالق سے جس نے پیدا کیا ہے ان چیزوں کو جو آسمان میں ہیں کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے جس طرح اس نے قارون کو زمین میں دھنسایا تھا۔

فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ یعنی وہ جائے گی اور آئے گی۔ مور کا معنی آنے اور جانے میں اضطراب ہے۔

شاعر نے کہا:

رَمَیْنَ فأقصَدْنَ القلوبَ ولن تری دمًا مائرًا إلّا جَرَی فی الحَیَازِمِ

انہوں نے تیر مارے اور انہوں نے دلوں کا قصد کیا تو ہرگز پھیلنے والے خون کو نہیں دیکھے گا مگر یہ کہ وہ سینے کے وسط میں چلتا ہے۔

حیازم یہ حیزوم کی جمع ہے۔ وہ سینہ کا وسط ہے جب انسان کو دھنسایا جاتا ہے تو زمین اس پر گھوم جاتی ہے۔ یہی مور ہے۔ محققین کہتے ہیں: کیا تم بے خوف ہو اس سے جو آسمانوں سے بھی اوپر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ (التوبہ:2) یعنی جو آسمان سے اوپر ہے اس کا خوف مس کرنے سے نہیں اور نہ ہی اسے مکان بنانے سے ہے بلکہ وہ اس پر غلبہ رکھتا ہے اور تدبیر فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے امنتم من علی السماء جس طرح وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (طٰہٰ:71) فی، علی کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہوگا اس کا مدبر اور اس کا مالک ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلانٌ علی العراق والحجاز یعنی فلاں عراق اور حجاز کا والی اور اس کا امیر ہے۔ اس باب میں اخبار بہت زیادہ ہیں، صحیح ہیں، مشہور و معروف ہیں، بلندی کی طرف اشارہ کرنے والیاں ہیں، ان کا انکار صرف ملحد یا معاند جاہل ہی کرسکتا ہے۔ ان سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور پستی سے اس کی پاکی بیان کرنا ہے۔ اس کی علو اور عظمت کے ساتھ صفت یہ اماکن، جہات اور حدود کے اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ اجسام کی صفات ہیں۔ دعا کے موقع پر ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا جاتا ہے کیونکہ آسمان وحی کا مہبط ہے، بارش وہاں سے نازل ہوتی ہے، پاکیزگی کا محل ہے اور پاکیزہ فرشتوں کا معدن ہے، بندوں کے اعمال اس کی طرف بلند کیے جاتے ہیں۔ آسمانوں سے اوپر اس کا عرش اور اس کی جنت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو دعا اور نماز کا قبلہ بنا دیا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے امکنہ کو پیدا کیا ہے، وہ امکنہ کا محتاج نہیں، وہ مکان اور زمان کے پیدا کرنے سے پہلے ازل میں تھا، اس کا کوئی مکان اور زمان نہیں تھا، وہ اب بھی اسی طرح ہے جس طرح وہ پہلے تھا۔ قنبل نے ابن کثیر سے النشورُ وامنتم پڑھا ہے۔ پہلے ہمزہ کو واؤ اور دوسرے میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کوفیوں، بصریوں اور اہل شام نے ابو عمرو اور ہشام کے علاوہ دونوں ہمزوں میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ بھیج دے تم پر پتھر برسانے والی ہوا، تب تمہیں پتہ چلے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہوتا ہے''۔

حَاصِبًا یعنی آسمان سے پتھر برسائے جس طرح اس نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اور اصحاب فیل پر پتھر برسائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایسی ہوا بھیجے جس میں پتھر اور سنگریزے ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایسا بادل بھیجے جس میں پتھر ہوں۔ نَذِیْرِ، انداز ی کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نذیر، منذر کے معنی میں ہے۔ مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے تو تم عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور جھٹلانے کا انجام دیکھ لو گے۔

وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ⑱

''اور جو لوگ ان سے پہلے گزرے انہوں نے بھی جھٹلایا (خود دیکھ لو) کہ (ان پر) میرا عذاب کتنا سخت تھا''۔

اسم موصول سے مراد امتوں کے کفار ہیں جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، قوم عاد، قوم ثمود، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم، اصحاب مدین، اصحاب رس اور قوم فرعون۔

نَكِيْرِ بھی انکاری کے معنی میں ہے یعنی یائے متکلم محذوف ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ورش نے نذیری اور نکیری میں یاء کو وصل میں ثابت رکھا ہے۔ یعقوب نے دونوں حالتوں میں ثابت رکھا ہے باقی قراء نے مصحف کی اتباع میں حذف کر دیا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ؕۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ⑲

''کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلائے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں، نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمن کے، بے شک وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اس طرح پرندوں کے لیے ہوا کو مسخر کیا ہے صٰٓفّٰتٍ کا معنی باسطات ہے یعنی وہ اڑنے کے وقت فضا میں اپنے پروں کو پھیلا لیتے ہیں کیونکہ جب وہ انہیں پھیلاتے تو، تو ادم (بڑے پر) کو صف در صف کر لیتے ہیں وَّ يَقْبِضْنَ انہیں اپنے پہلوؤں سے مارتے ہیں۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: پرندہ جب اپنے پروں کو پھیلائے تو اسے صاف کہتے ہیں اور جب انہیں ملالے تو اسے قابض کہتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ پروں کو قبض کر لیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے پروں کو پھیلانے کے بعد قبض کر لیتے ہیں جب وہ اڑنے سے وقفہ کرتے ہیں۔ اس کا عطف صٰٓفّٰتٍ پر ہے۔ فعل مضارع کا عطف اسم فاعل پر ہے جس طرح اسم فاعل کا عطف فعل مضارع پر ہے۔ یقصد فی اسوقھا وجائر یہاں جائر کا عطف یقصد پر ہے۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ⑲ پرندہ جب فضا میں اڑ رہا ہو تو فضا میں اسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں روکتا۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ

غُرُوْرٍ ۝

''(اے منکرو!) کیا تمہارے پاس کوئی ایسا لشکر ہے جو تمہاری مدد کرے (خداوند) رحمن کے علاوہ، بے شک منکرین دھوکہ میں مبتلا ہیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جُنْدٌ کا معنی حزب اور منعة کیا ہے (1)، یعنی ایسی جماعت جو تمہارا دفاع کرے گی۔ اللہ تعالیٰ جس کا تمہارے بارے میں ارادہ کرے گا۔ اگر تم اس کی نافرمانی کرو۔ لفظ جند واحد ہے اسی وجہ سے فرمایا: هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یہ استفہام انکاری ہے یعنی تمہارے پاس کوئی لشکر نہیں جو تمہارا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دفاع کرے۔ دون، سوا کے معنی میں ہے۔ کافر شیطان کی جانب سے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔ وہ انسان کو دھوکہ دیتا ہے کہ کوئی عذاب نہیں کوئی حساب نہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ ۝

''کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو تمہیں رزق پہنچا سکے اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق بند کر لے لیکن یہ لوگ سرکشی اور حق سے نفرت میں بہت دور نکل گئے ہیں''۔

کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو تمہیں دنیا کے منافع عطا کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے معبودوں میں سے کوئی ایسا ہے جو تم پر بارش نازل فرمائے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق روک لے بلکہ انہوں نے سرکشی کی اور سرکشی میں اور حق سے دور بھاگنے میں اصرار کیا۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

''کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہے وہ راہ راست پر ہے یا جو سیدھا ہو کر صراط مستقیم پر گامزن ہے''۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کی مثال بیان فرمائی ہے مُكِبًّا وہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے ہے وہ اپنے سامنے نہیں دیکھ سکتا نہ دائیں دیکھ سکتا ہے اور نہ بائیں دیکھ سکتا ہے۔ وہ لڑکھڑانے اور منہ کے بل گرنے سے امن میں نہیں ہوتا جس طرح وہ آدمی جو سیدھا اعتدال سے چلتا ہے جبکہ وہ سامنے، اپنی دائیں جانب اور اپنی بائیں جانب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ دنیا میں ہے۔ یہ جائز ہے کہ مراد اندھا ہو جو راستہ کی طرف ہدایت نہیں پاتا تو وہ بھٹک جاتا ہے وہ ہمیشہ منہ کے بل گرتا رہتا ہے۔ وہ اس آدمی کی طرح نہیں جو سیدھے قد والا، صحیح، دیکھنے والا ہے اور راستہ میں چلتا ہے اور ہدایت پاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: مراد کافر ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر منہ کے بل گرا رہتا ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل ہی گرائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کلبی نے کہا: اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ سے مراد ابوجہل ہے اور الذی یمشی سویا سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت حمزہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت عمار بن یاسر ہیں؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کافر و مومن کو عام ہے یعنی کافر

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 422

نہیں جانتا کہ کیا وہ حق پر ہے یا باطل پر ہے یعنی کیا یہ کافر زیادہ حق پر ہے یا مسلمان حق پر ہے جو سیدھا اور اعتدال کے ساتھ چلتا ہے جبکہ وہ راستہ بھی دیکھ رہا ہوتا ہے۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ اس سے مراد اسلام ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکب باب افعال ہو تو لازم استعمال ہوتا ہے اور کب مجرد ہو تو متعدی استعمال ہوتا ہے جیسے کبہ اللہ لوجھہ۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

”آپ فرمایئے: وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، (لیکن) تم بہت کم شکر کیا کرتے ہو“۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو شرک کی قباحت سے آگاہ کریں جبکہ وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں پیدا کیا ہے۔ الْاَفْـِٕدَةَ سے مراد دل ہیں۔ قَلِيْلًا مَّا یہ لا کے معنی میں ہے یعنی تم ان نعمتوں کا شکر بجا نہیں لاتے اور تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان نہیں کرتے تو کہتا ہے: قلما افعل کذا یعنی میں اسے نہیں کرتا۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

”آپ فرمایئے: اسی نے تم کو پھیلا دیا ہے زمین میں اور (روز حشر) تم اسی کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔ (کفار ازراہ مذاق) پوچھتے ہیں کہ (بتاؤ) یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو“۔

ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تمہیں زمین میں پیدا کیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہیں اس میں پھیلا دیا اور اس پر تمہیں بکھیر دیا(2)؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے۔ تمہیں اس کی بارگاہ میں جمع کیا جائے گا تاکہ ہر کسی کو اس کے عمل کا بدلہ دے دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں: یہ قیامت کب آئے گی؟ یہ عذاب کب آئے گا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو؟ یہ بات بطور استہزاء کہا کرتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾

”آپ فرمایئے: (اس کا) علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو محض واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں“۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بتا دیجئے قیامت کے قائم ہونے کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ (الاعراف: 187) نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾ تمہیں ڈرانے والا اور تمہیں تعلیم دینے والا ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 56　2۔ ایضاً

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾

''پھر جس وقت اسے قریب آتے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ یہ ہے جس کا تم بار بار مطالبہ کرتے ہو''۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً۔ زُلْفَةً مصدر ہے جو مزدلفا کے معنی میں ہے جس کا معنی قریب ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی عیاں ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا: معنی ہے جب وہ عذاب کو قریب دیکھیں گے۔ اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ مجاہد نے کہا: مراد بدر کا عذاب ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس حشر کا ان سے وعدہ کیا گیا اس کو قریب دیکھیں گے۔ اس پر تحشرون دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب وہ اپنے برے عمل کو قریب دیکھیں گے۔

سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کفار کے ساتھ برا معاملہ کیا جائے گا۔ زجاج نے کہا: ان کے چہروں میں سوء کو ظاہر کر دے گا اور ان کے چہروں پر ایسی نشانی ظاہر ہو گی جو ان کے کفر پر دلالت کرے گی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران: 106)

نافع، ابن محیصن، ابن عامر اور کسائی نے ضمہ کے اشمام کے ساتھ سیئت پڑھا ہے باقی قراء نے اشمام کے بغیر خفت کو طلب کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ جس نے ضمہ پڑھا اس نے اصل کو پیش نظر رکھا۔

وَ قِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فراء نے کہا: تَدَّعُوْنَ یہ دعا سے تفتعلون کا وزن ہے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے یعنی تم تمنا کرتے ہو اور سوال کرتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس کی تاویل ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تم اباطیل کا دعویٰ کیا کرتے تھے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ عام قرأت تَدَّعُوْنَ ہے۔ اس کی تاویل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ قتادہ، ابن ابی اسحاق، ضحاک اور یعقوب نے تَدَّعُوْنَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ ان کا یہ قول ہے رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا (ص: 16) ضحاک نے کہا: وہ ان کا یہ قول ہے اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) حضرت ابو العباس نے کہا: تدعون کا معنی ہے تم جلدی مچاتے ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: دعوت بکذا۔ جب تو اسے طلب کرے۔ أدعیت یہ اسی سے باب افتعال ہے۔ نحاس نے کہا: تدّعون اور تدعون دونوں کا ایک ہی معنی ہے جس طرح کہا جاتا ہے: قدر اور اقتدر، عدی اور اعتدی، مگر افتعل میں ایسا معنی ہے کہ ایک شی دوسری شی کے بعد واضح ہوتی ہے اور فعل، قلیل و کثیر پر واقع ہوتی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

''آپ فرمائیے: (اے منکرو!) ذرا غور تو کرو اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں، کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرمادے تو کون بچالے گا کافروں کو دردناک عذاب سے''۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! انہیں کہہ دیجئے۔ مراد مشرکین مکہ ہیں۔ وہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی موت کا انتظار کرتے تھے

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 423

جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝ (الطور) بتاؤ اگر ہمیں موت آ جائے یا ہم پر رحم کیا جائے اور ہماری موت کے وقت کو موخر کر دیا جائے تو تمہیں عذاب الیم سے کون پناہ دے گا تو تمہیں ہماری موت کے انتظار کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی قیامت کے وقوع کی جلدی کی ضرورت ہے۔ ابن محیصن، مسیب، شیبہ، اعمش اور حمزہ نے اھلکنی کی یاء کو ساکن کیا ہے، باقی قرء نے اسے فتحہ دیا ہے۔ تمام قراء نے کہا: ومن معی کی یاء کو فتحہ دیا ہے مگر اہل کوفہ نے اسے ساکن قرار دیا ہے۔ حفص نے اسے دوسرے قراء کی طرح فتحہ دیا ہے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

"فرمائیے: وہ (میرا خالق) بڑا ہی مہربان ہے ہم اسی پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے۔ پس عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے"۔

کسائی نے تعلمون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور اسے علی سے روایت کیا ہے باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے طور پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ان کو دھمکانا ہے۔ یہ سوال کیا جاتا ہے: اٰمَنَّا کے مفعول بہ کو موخر کیوں کیا گیا اور تَوَكَّلْنَا کے مفعول کو مقدم کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب دیا جائے گا: کافروں کے ذکر کے بعد جب اس کو ذکر کیا تو کفار سے اشارۃ بات کی گئی گویا کہا گیا ہم ایمان لائے اور ہم نے کفر نہیں کیا جس طرح تم نے کفر کیا۔ پھر فرمایا: وَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا خصوصاً ہم ان چیزوں پر بھروسہ نہیں رکھتے جن پر تم بھروسہ رکھتے ہو جیسے اپنے مردوں اور اپنے اموال پر؛ یہ زمخشری کا قول ہے (2)۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ۝

"آپ پوچھیے: اگر کسی صبح تمہارا پانی زمین کی تہہ میں اتر جائے تو تمہیں میٹھا صاف پانی کون لا دے گا"۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اے قریش کی جماعت! اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا زمین میں دور چلا جائے ڈول اس تک نہ پہنچ سکیں۔ ان کا پانی دو چشموں سے حاصل ہوتا تھا۔ بئر زمزم اور بئر میمون۔ فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ۝ معین کا معنی جاری ہے؛ یہ قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ کہیں: اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی لانے والا نہیں، تو فرمائیے: تم اس کے ساتھ ایسے کیوں شریک ٹھہراتے ہو جو تمہارے لیے پانی لانے والا بھی نہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: غار الماء یغور غورا پانی کا دور چلا جانا، غور، غائر کے معنی میں ہے۔ مبالغہ کے لیے مصدر کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے جس طرح تو کہتا ہے: رجل عدل و رضا سورۂ کہف میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ سورۂ مومنون میں بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ماء معین کا معنی ہے ظاہر پانی جسے آنکھیں دیکھ سکیں (3)۔ یہ مفعول کا وزن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ معن الماء سے مشتق ہے یعنی زیادہ ہو جانا اس وقت فعیل کا وزن ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: معنی ہے کون میٹھا پانی لائے گا؟ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 423 2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 583 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 423

# سورۃ ن والقلم

آیاتہا ۵۲ | ۶۸ سورۃ القلم مکیۃ ۲ | رکوعاتہا ۲

حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ سورت مکی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: اوّل سے لے کر سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ تک مکی ہے اور اس کے بعد سے لے کر اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ تک مدنی ہے۔ اس کے بعد سے يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ تک مکی ہے اور اس سے لے کر مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ تک مدنی ہے اور باقی ماندہ مکی ہے؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿۳﴾

''ن قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں، اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا''۔

نٓ وَالْقَلَمِ ابوبکر، مفضل،، ہبیرہ، ورش، ابن محیصن، ابن عامر، کسائی اور یعقوب نے دوسری نون کو واؤ میں مدغم کیا ہے باقی قراء نے اظہار کیا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے اس کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، گویا فعل کو مضمر مانا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، نصر اور ابن ابی اسحاق نے حرف قسم کو مضمر ماننے کے ساتھ اسے مکسور پڑھا ہے۔ ہارون، محمد بن سمیقع اور معاویہ بن قرہ نے مبنی ہونے کی وجہ سے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اپنے باپ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں کہ فرمایا: ''نٓ نور کی ایک لوح ہے'' (2)۔ ثابت بنانی نے روایت کیا ہے کہ نٓ سے مراد دوات ہے (3)؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے۔ ولید بن مسلم نے روایت کی ہے کہ مالک بن انس، سمی سے جو ابوبکر کے غلام ہیں (4)، وہ ابو صالح سمان سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پھر نون کو پیدا کیا، یہ دوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: نٓ وَالْقَلَمِ سے یہی مراد ہے پھر اسے فرمایا: لکھ! اس نے عرض کی: میں کیا لکھوں؟ فرمایا: جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب لکھو، خواہ وہ عمل ہو، اجل ہو، رزق ہو یا اثر ہو۔ قیامت تک جو ہونے والا تھا، حکم اس میں جاری ہو گیا۔ پھر قلم کے منہ پر لہر لگا دی گئی پھر اس نے نہ کچھ لکھا اور نہ قیامت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 59
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 345
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 181
4۔ احکام القرآن، جلد 4، صفحہ 1855

تک لکھے گا۔ پھر عقل کو پیدا کیا گیا۔ جبار نے ارشاد فرمایا: میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تجھ سے بڑھ کر مجھے پسند ہو۔ میری عزت وجلال کی قسم! میں جس سے محبت کرتا ہوں گا اس میں تجھے مکمل کروں گا اور جس سے ناراض ہوں گا۔ اس میں تجھے ناقص رکھوں گا''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أکمل الناس عقلاً أطوعهم لله وأعملهم بطاعته (1) لوگوں میں سے ازروئے عقل کے سب سے کامل وہ ہیں جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں اور اس کی طاعت میں زیادہ عمل کرنے والے ہیں۔

مجاہد نے کہا: نٓ سے مراد وہ مچھلی ہے جو ساتویں زمین کے نیچے ہے اور قلم سے مراد وہ قلم ہے جس کے ساتھ ذکر لکھا گیا ہے؛ اسی طرح مقاتل، مرہ ہمدانی، عطا خراسانی، سدی اور کلبی نے کہا: نون سے مراد وہ مچھلی ہے جس پر سات زمینیں قائم ہیں۔ ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے (2): سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا تو جو کچھ ہونے والا تھا اس نے وہ لکھ دیا، پھر پانی کے بخار کو اٹھایا تو اس سے آسمان کو بنایا پھر مچھلی کو پیدا کیا تو اس کی پشت پر زمین کو بچھا دیا۔ زمین جھک گئی تو اسے پہاڑوں کے ساتھ مضبوط کر دیا، بے شک پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نٓ وَ الْقَلَمِ کی قرات کی۔ کلبی اور مقاتل نے کہا: اس مچھلی کا نام بہموت ہے۔ راجز نے کہا:

مالی أراکم کلکم سکوتا　　و الله ربی خلق البهموت

کیا وجہ ہے میں تم سب کو خاموش دیکھتا ہوں اللہ تعالیٰ میرا رب ہے اس نے بہموت کو پیدا کیا ہے۔

ابوظبیان اور واقدی نے اس کا نام لیوث لیا ہے (3)۔ کعب نے کہا: اس کا نام لوثوث ہے۔ کہا: اس کا کام بلہموث ہے۔ کعب نے کہا: ابلیس مچھلی میں داخل ہو گیا جس مچھلی پر زمینیں ہیں اس نے مچھلی کے دل میں وسوسہ اندازی کی۔ کہا: اے لوثوث! کیا تو جانتی ہے تیری پشت پر چوپاؤں، درختوں اور زمینوں وغیرہ میں سے کیا کچھ ہے اگر تو انہیں پھینکنا چاہے تو تو ان سب کو اپنی پشت سے نیچے پھینک دے۔ لثوث نے اس طرح کرنے کا ارادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف ایک جانور بھیجا وہ اس مچھلی کے نتھنے میں داخل ہوا اور اس کے دماغ تک جا پہنچا۔ مچھلی نے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور آہ وزاری کی اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو اجازت دے دی تو وہ جانور نکل گیا۔ کعب نے کہا: اللہ کی قسم! بے شک اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھتا اور مچھلی اس کی طرف دیکھتی اگر اللہ اس میں سے کسی چیز کا ارادہ کرتا تو جس طرح وہ پہلے تھی اسی طرح ہو جاتی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نٓ لفظ رحمن کا آخری حرف ہے فرمایا: الٓرٰ، حٰمٓ، نٓ مجموعہ رحمن ہے ان حروف کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ قسم ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قسم اٹھائی ہے (4)۔ ابن کیسان نے کہا: سورت کا آغاز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سورت کا نام ہے۔ عطا اور ابو العالیہ نے کہا: یہ اس کے اسماء نصیر، نور اور ناصر کا آغاز ہے (5)۔ محمد بن کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی کہ وہ مومنوں کی مدد فرمائے گا۔ یہ حق ہے۔ اس کی وضاحت

1۔ تفسیر طبری، جز 29، صفحہ 20　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 424　　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً جلد 5، صفحہ 425　　5۔ تفسیر طبری، جز 29، صفحہ 21

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ (الروم)۔ امام جعفر صادق نے کہا: یہ جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے جسے نون کہتے ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا: یہ حروف معجم میں سے ایک ہے کیونکہ اگر یہ کوئی اور چیز ہوتی تو یہ معرب ہوتا۔ ابونصر عبدالرحیم قشیری نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: نٓ حرف ہے اس پر اعراب نہیں۔ اگر یہ مکمل قلم ہوتا تو اس پر اسی طرح اعراب ہوتا جس طرح قلم پر اعراب دیا جاتا ہے یہ حرف تہجی ہے جس طرح باقی ستونوں کے آغاز میں ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: یہ سورت کا نام ہے یعنی یہ سورۂ نون ہے پھر فرمایا: وَالْقَلَمِ۔ قلم کی قسم اٹھائی کیونکہ اس کے ذریعے ہی وضاحت کی جاتی ہے جس طرح زبان کے ساتھ وضاحت کی جاتی ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس حکم پر ہوتا ہے جس کے ساتھ لکھا جاتا ہے وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو۔ اسی معنی میں ابوالفتح بستی کا قول ہے:

كفى قلم الكُتَّابِ عزًّا و رفعةً مَدَى الدهرِ أن الله أقسم بالقلَمِ

کاتبوں کے قلم کے لیے طویل زمانہ تک یہ عزت و رفعت میں کافی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم اٹھائی ہے۔

شعراء کے بے شمار ایسے الفاظ ہیں جن میں قلم کو تلوار پر فضیلت دی گئی ہے۔ جس کو ہم نے ذکر کیا ہے وہ ان سب سے اعلیٰ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ اس قلم کی قسم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا اس نے وہ لکھ دیا۔ کہا: یہ قلم نور کا ہے اس کی لمبائی اتنی ہے جتنی آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے (2)۔ یہ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا پھر اس کی طرف دیکھا تو اس میں شق پیدا ہو گیا فرمایا: چل پڑ۔ قلم نے عرض کی: اے میرے رب! میں کس کے ساتھ جاری ہوں؟ فرمایا: قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس کو لکھنے کے ساتھ چل پڑ۔ تو وہ لوح محفوظ پر جاری ہو گیا۔ ولید بن عبادہ بن صامت نے کہا: میرے والد نے اپنے وصال کے موقع پر وصیت کی اور کہا: اے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جان لو! تو کبھی بھی متقی نہیں بنے گا اور علم تک نہیں پہنچ سکے گا یہاں تک کہ تو اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لائے، اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے (3)۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا ہے اسے فرمایا: لکھ۔ اس نے عرض کی: میں کیا لکھوں؟ فرمایا: تقدیر لکھ، قلم اس لمحہ لکھنے لگی جو کچھ ہو چکا تھا اور ہمیشہ کے لئے جو کچھ ہونے والا تھا''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم پیدا کیا اور اسے حکم دیا جو کچھ ہونے والا ہے اسے لکھتا جائے اس نے جو کچھ لکھا اس میں یہ بھی لکھا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ۔ قتادہ نے کہا: قلم بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اوّل قلم کو پیدا کیا جو کچھ ہونے والا تھا اس نے لکھ دیا (4) اسے اپنے عرش پر اپنے پاس رکھ دیا، پھر دوسرے قلم کو پیدا کیا تاکہ اس کے ساتھ زمین میں لکھے جس کی وضاحت سورۂ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں آ رہی ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 93 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 425

3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 5، صفحہ 166 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1855

وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ۝ اور جو وہ لکھتے ہیں، مراد فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال لکھتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جسے لوگ لکھتے ہیں اور جس کے ذریعے ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ۝ کا معنی ہے جو وہ جانتے ہیں ما موصولہ ہے یا مصدر یہ ہے مراد مسطور ہے یا سطر ہے، مراد ہوگا جو کوئی لکھتا ہے یا جسے حفظہ فرشتے لکھتے ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ یہ جواب قسم ہے اور جملہ منفیہ ہے۔ مشرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے: یہ مجنوں ہے، اس کا ایک شیطان ہے نعوذ باللہ(2)۔ وہ ان کا یہ قول تھا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (الحجر) اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے اور ان کے قول کی تکذیب کرتے ہوئے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہاں نعمت رحمت کے معنی میں ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی رحمت کے ساتھ مجنون نہیں۔ دوسری تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں نعمت قسم کے معنی میں ہو تقدیر کلام یہ ہوگی تیرے رب کی نعمت کی قسم! آپ مجنون نہیں کیونکہ واؤ اور باء حروف قسم میں سے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: ما انت بمجنون و الحمد للہ(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام کا یہ معنی ہے ما أنت بمجنون و النعمة لربك جس طرح ان کا قول ہے: سبحانك اللهم وبحمدك یعنی والحمد للہ۔ اسی معنی میں لبید کا یہ شعر ہے:

وأفردتُ في الدنيا بفقد عشيرتي ۔۔۔ وفارقني جارٌ بأربَدَ نافعُ

اس شعر میں بأربد، وهو أربد کے معنی میں ہے۔ نابغہ کا شعر ہے:

لم يُحْرَمُوا حُسْنَ الغِذاء وأُمُّهم ۔۔۔ طَفَحَتْ عليك بناتق مِذْكارِ

اس میں بھی بناتق، هو ناتق کے معنی میں ہے۔ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ مجنون کے متعلق ہے جس کی نفی کی گئی ہے جس طرح کلام مثبت میں غافل کے متعلق ہے۔ تیرا قول ہے: أنت بنعمة ربك غافل اس کا محل نصب ہے۔ یہ حال ہے گویا فرمایا: ما أنت بمجنون منعما عليك بذلك۔ وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا آپ کے لیے ثواب ہے کیونکہ آپ نبوت کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وہ نہ ختم ہوگا اور نہ اس میں کمی کی جائے گی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: مننت الحبل جب تو رسی کو کاٹ دے حبل منین جب وہ مضبوط نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

غُبْسًا كواسِبَ لا يُمَنّ طعامُها

یہاں بھی لا یمن، لا یقطع کے معنی میں ہے۔ ان کا کھانا ختم نہیں ہوتا۔ مجاہد نے کہا: غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ کا معنی ہے اس کا کوئی حساب نہ ہوگا(4)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اسے احسان جتلا کر گدلا نہ کیا جائے گا۔ ضحاک نے کہا: بغیر عمل کے اجر ہوگا(5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بغیر اندازہ کے ہوگا(6)۔ یہ فضل و احسان ہے کیونکہ جزا اندازے سے ہوتی ہے اور فضل و احسان اندازے کے بغیر ہوتا ہے؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے؛ یہ مجاہد کے قول کا معنی ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 60 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 426
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 61 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

''بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## خلق سے مراد

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: علی خلق سے مراد ہے دینوں میں سے عظیم دین پر۔ اللہ تعالیٰ کو اس دین سے بڑھ کر کوئی دین محبوب اور پسندیدہ نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے: آپ کا خلق قرآن ہے (1)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور عطیہ نے کہا: اس سے مراد ادب قرآن ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لیے نرم دل ہونا اور ان کو اکرام سے نوازنا ہے۔ قتادہ نے کہا: مراد ہے اللہ تعالیٰ جس کا حکم دے اس کو بجالاتا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے اس سے رک جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم طبع کریم پر ہیں۔ ماوردی نے کہا: یہی معنی ظاہر ہے (3)۔ لغت میں خلق کا حقیقی معنی یہ ہے **ھو ما یأ خذبه الإنسان نفسه من الأدب** انسان اپنے نفس کے لیے جو ادب اپناتا ہے اسے خلق کہتے ہیں کیونکہ یہ چیز اس میں خلقت کی طرح ہو جاتی ہے۔ جس ادب پر اسے پیدا کیا جاتا ہے اسے خیم کہتے ہیں جس کا معنی سجیة اور طبیعة ہے۔ لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں۔ خیم پہاڑ کا نام ہے۔ خلق ایسی فطرت ہے جس میں تکلف ہو اور خیم ایسی فطرت ہے جو پیدائشی ہو۔ اعشیٰ نے اسے اپنے شعر میں واضح کیا ہے:

وإذا ذُو الفضول ضَنَّ على المَو لَى و عادت لخِيمِها الأخلاقُ

جب مالدار غلام پر بخل کرنے لگیں تو اخلاق اپنی طبع کی طرف لوٹ آئے۔

میں کہتا ہوں: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جو قول، ذکر کیا ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے وہ تمام اقوال سے اصح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝** سے دس آیات کو پڑھا۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اخلاق میں کوئی اچھا نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور گھر والوں میں سے کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ بلایا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کہا: لبیک۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝** کوئی خلق محمود ذکر نہیں کیا گیا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں وافر حصہ ہوتا۔ جنید بغدادی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کو عظیم کہا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ کہنے کی کسی کی ہمت نہ تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کو عظیم نام دیا گیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں مکارم اخلاق جمع ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا، اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝** (الاعراف) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے میرے رب نے اچھا ادب سکھایا کیونکہ ارشاد فرمایا: **خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ**

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 256　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 426　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 61

بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (الاعراف) جب میں نے اسے قبول کرلیا تو فرمایا: وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ ۔''

## خلق سے مراد اخلاق ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔امام ترمذی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اتق الله حیثما کنت واتبع السیئة الحسنة تمحها و خالق الناس بخلق حسن جہاں کہیں ہو اللہ سے ڈرو، برائی کے بعد اچھائی کرو جو برائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ خلق حسن کے ساتھ معاملہ کرو (1)۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز مومن کے میزان میں اچھے اخلاق سے بڑھ کر کوئی وزنی چیز نہ ہوگی، بے شک اللہ تعالیٰ فحش یا وہ گوئی کرنے والے کو ناپسند کرتا ہے (2)۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ما من شیء یوضع فی المیزان أثقل من حسن الخلق وإن صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصلاة والصوم جو چیز میزان میں رکھی جاتی ہے حسن خلق سے بڑھ کر کوئی وزنی چیز نہ ہوگی۔ اچھے اخلاق والا نماز پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے کے درجہ تک جا پہنچتا ہے۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے، اسی سند سے مروی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ کونسی چیز لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی؟ فرمایا: ''اللہ سے تقویٰ اور حسن خلق'' (3)۔ پوچھا گیا: کونسی چیز سب سے زیادہ لوگوں کو جہنم میں داخل کرے گی؟ فرمایا: ''منہ اور شرمگاہ''۔ کہا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک سے مروی ہے: آپ نے حسن خلق کے بارے میں فرمایا: ترش روئی نہ کرنا، نیکی کرنا اور اذیت کو دور کرنا (4)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز مجھے سب سے محبوب اور میرے سب سے قریب وہ ہوگا جو تم میں سے اخلاق میں سب سے اچھا ہوگا'' (5)۔ فرمایا: ''قیامت کے روز تم میں سے سب سے زیادہ مبغوض اور مجلس میں سب سے دور وہ ہوگا جو ثرثارون (زیادہ باتیں کرنے والے) متشدقون (زبان دراز) اور متفیھقون ہیں''۔ صحابہ نے عرض کی: ہم ثرثارون اور متشدقون کو تو جانتے ہیں، یہ متفیھقون کون ہیں؟ فرمایا: ''متکبر''۔ اس بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۵﴾ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۪ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۷﴾

''عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے (واقعی) مجنون کون ہے؟ بے شک آپ کا

1۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلہ، ماجاء فی معاشرۃ الناس، جلد 2، صفحہ 20۔ ایضاً، حدیث نمبر 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، ماجاء فی حسن الخلق، جلد 2، صفحہ 21۔ ایضاً، حدیث نمبر 1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ ایضاً، باب ماجاء فی معالی الاخلاق، جلد 2، صفحہ 22

رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کی راہ سے بہک گئے ہیں اور انہیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں''۔

فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے آپ عنقریب جان لیں گے اور وہ بھی قیامت کے روز جان لیں گے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ عنقریب دیکھ لیں گے اور وہ بھی قیامت کے روز دیکھ لیں گے جب حق اور باطل واضح ہو جائے گا(2)۔ بِاَىیِّكُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ ۝ باء زائدہ ہے، تقدیر کلام یہ ہے فستبصر ویبصرون أیکم المفتون یعنی جسے جنون کے ساتھ آزمائش میں ڈالا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ (المومنون: 20) یشرب بھا عباد اللہ دونوں میں باء زائدہ ہے؛ یہ قتادہ، ابوعبیدہ اور اخفش کا قول ہے۔ راجز نے کہا:

نحن بنو جَعْدَة أصحاب الفَلَج نضرب بالسيف ونرجو بالفَرَج

ہم بنو جعدہ ہیں جو فلج شہر والے ہیں۔ ہم تلوار مارتے ہیں اور کشادگی کی امید رکھتے ہیں۔

بالسیف اور بالفرج میں باء زائدہ ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: باء زائدہ نہیں۔ معنی ہے تم میں سے کسے فتنہ لاحق ہے(3)؟ یہاں مفتون مصدر ہے اور مفعول کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی فتون ہے جس طرح انہوں نے کہا: مالفلان مجلود ولا معقول یعنی اس کے ہاں عقل اور سختی نہیں؛ یہ قول حضرت حسن بصری، ضحاک اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ راعی نے کہا:

حتى إذا لم يتركوا لعظامه لحمًا ولا لفؤاده معقولا

یہاں تک کہ انہوں نے اس کی ہڈیوں کے لیے گوشت اور دل کے لیے عقل نہ چھوڑی۔

یہاں معقول، عقل کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں مضاف حذف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی بأیکم فتنۃ المفتون۔ فراء نے کہا: باء، فی کے معنی میں ہے۔ آپ عنقریب دیکھیں گے اور وہ بھی دیکھیں گے دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت مجنون ہے؟ کیا وہ جماعت جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی مومن یا دوسری جماعت۔ مفتون سے مراد مجنون ہے جسے شیطان فتنہ میں ڈال دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مفتون سے مراد وہ ہے جسے عذاب دیا جائے۔ عربوں کا قول ہے: فتنت الذھب بالنار (4) جب تو اسے آگ پر گرم کرے؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَوۡمَ هُمۡ عَلَى النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ ۝ (الذاریات) یُفۡتَنُوۡنَ یہاں یعذبون کے معنی میں ہے۔

اس سورت کا اکثر حصہ ولید بن مغیرہ اور ابو جہل کے بارے میں نازل ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مفتون سے مراد شیطان ہے کیونکہ اسے اس کے دین میں فتنہ میں ڈالا گیا(5)، وہ کہا کرتے تھے: إنّ به شيطان مراد مجنون ہی لیتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وہ کل جان لیں گے ان میں سے کون مجنون ہے یعنی وہ شیطان جس کے مس کرنے سے جنون اور عقل میں خلل واقع ہوتا تھا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ جو آدمی اس کے دین سے بھٹکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ وَهُوَ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 62 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 182

4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 62 5۔ ایضاً

اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۞ جو ہدایت پر ہیں انہیں بھی خوب جانتا ہے، تو قیامت کے روز وہ ہر کسی کو اسی کے عمل کا بدلہ دے گا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِیْنَ ۞

''پس آپ بات نہ مانیں (ان) جھٹلانے والوں کی''۔

مشرکین کے ساتھ دوستی اور میلان سے منع کیا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوت دیتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بارے میں کچھ نہ کہیں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے کچھ نہ کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ان کے ساتھ دوستی اور ان کی طرف میلان کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْــٴًـا قَلِیْلًا ۞ (الاسراء)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھٹلانے والوں کی ان باتوں میں اطاعت نہ کریں جن باتوں میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے خبیث دین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ آیت مشرکین قریش کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنے آباء کے دین کی طرف دعوت دی۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ ۞

''وہ تو تمنا کرتے ہیں کہ کہیں آپ نرمی اختیار کریں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطیہ، ضحاک اور سدی نے کہا: انہوں نے پسند کیا کاش! تم کفر کرتے تو وہ اپنے کفر میں مزید آگے بڑھ جاتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا: انہوں نے پسند کیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں رخصت دیں تو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رخصت دیں گے (1)۔ فراء اور کلبی نے کہا: اگر آپ نرمی کریں تو وہ بھی نرمی کریں گے۔ ادھان سے مراد اس کے لیے نرمی کرنا ہے جس کے لیے نرمی کرنا مناسب نہ ہو؛ یہ فراء کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے انہوں نے چاہا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف مائل ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق کو چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مائل ہوں گے۔ ربیع بن انس نے کہا: انہوں نے چاہا اگر آپ جھوٹ بولیں تو وہ بھی جھوٹ بولیں گے (2)۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے چاہا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر سے کنارہ کش ہو جائیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں گے (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: انہوں نے پسند کیا اگر آپ اپنے دین میں ان کے ساتھ کوئی نرمی کریں تو وہ اپنے دین میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نرمی کریں گے (4)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: انہوں نے پسند کیا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعض امور کو ترک کر دیں تو وہ اپنے بعض امور کو ترک کر دیں گے (5)۔ زید بن اسلم نے کہا: اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقت کریں اور ریا کاری کریں (نعوذ باللہ) تو وہ بھی منافقت کریں گے اور ریا کاری کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے پسند کیا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزوری دکھائیں تو وہ بھی کمزوری دکھائیں گے (6)؛ یہ ابو جعفر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہوں نے پسند کیا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین میں مداہنت دکھائیں تو وہ اپنے ادیان میں مداہنت دکھائیں گے (7)؛ یہ قول قتبی کا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عرصہ ان کے معبودوں کی عبادت کریں تو وہ ایک عرصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معبودوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 62 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 182
5۔ ایضاً 6۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 62 7۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 95

کی عبادت کریں گے۔ یہ بارہ اقوال ہیں۔ ابن عربی نے کہا: مفسرین نے اس میں دس کے قریب اقوال ذکر کیے ہیں۔ سب لغت اور معنی پر جھوٹے دعوے ہیں (1)۔ ان میں سے ان کا یہ قول ہے: ودوا لوتکذب فیکفرون، ودوا لوتکفر فیکفرون۔

میں کہتا ہوں: سب انشاء اللہ صحیح ہیں لغت اور معنی کے موافق ہیں کیونکہ ادھان کا معنی نرمی کرنا اور نرم رویہ اپنانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ادھان کا معنی دشمن سے حسن سلوک کرنا اور اس سے دوستی کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں قرب ظاہر کرنا اور قول میں نرمی کرنا۔

مفضل نے کہا: اس سے مراد نفاق اور باہم نصیحت کو ترک کرنا ہے (2)۔ اس توجیہ کی صورت میں یہ مذموم ہے اور پہلی توجیہ کی صورت میں مذموم نہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ مبرد نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے ادھن فی دینه وداھن فی أمرہ یعنی اس نے اس میں خیانت کی اور جو چیز چھپائے ہوئے تھا اس کے خلاف ظاہر کیا۔ ایک قوم نے کہا: فَيُدْهِنُوْنَ کو عطف کے طریقہ پر چلایا ہے (3)۔ اگر نہی کے جواب کے طریقہ پر آتا تو اسے فیدھنوا ارشاد فرماتا۔ بے شک یہ ارادہ کیا انہوں نے تمنا کی اگر آپ ایسا کریں تو وہ بھی آپ کی مثل کریں گے۔ یہ عطف کے طور پر ہے۔ جزا اور مکافات کے طریقہ پر نہیں، یہ تمثیل و تنظیر ہے۔

وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾

''اور بات نہ مانئے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی جو بہت نکتہ چینی، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، سخت منع کرنے والا بھلائی سے، حد سے بڑھا ہوا بڑا بدکار ہے، اکھڑ مزاج ہے اس کے علاوہ وہ بد اصل ہے''۔

امام شعبی، سدی اور ابن اسحاق کے قول میں اخنس بن شریق مراد ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد اسود بن عبد یغوث یا عبد الرحمن بن اسود ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ولید بن مغیرہ ہے (5)۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مال کی پیشکش کی اور اس نے قسم اٹھائی کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین سے رجوع کرلیں تو وہ یہ مال انہیں دے دے گا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد ابوجہل بن ہشام ہے۔ حلاف سے مراد بہت زیادہ قسمیں اٹھانے والا۔ مہین سے مراد جس کا دل کمزور ہو؛ یہ مجاہد سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد سخت جھوٹا اور جھوٹ بولنے والا ذلیل ہوتا ہے (6)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شر میں بہت زیادہ آگے بڑھنے والا؛ یہ قول حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کیا ہے۔ کلبی نے کہا: مراد حقیر، فاجر اور عاجز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیر۔ ابن شجرہ نے کہا: وہ ذلیل ہے۔ امانی نے کہا: حقیر و پست کیونکہ وہ بہت زیادہ قبیح عمل کرتا ہے۔ یہ مھانہ سے فعیل کا وزن ہے جس کا

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1855
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 63
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1856
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 63
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً

معنی قلت ہے۔ یہاں رائے اور تمیز میں قلت ہے یا یہ فعیل، مفعول کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی مھان (ذلیل کیا گیا) ہے۔
**هَمَّازٍ** ابن زید نے کہا: ھماز سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے ہاتھ سے لوگوں کی چٹکی لیتا ہے اور انہیں مارتا ہے اور لماز جو زبان سے دوسرے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جو مجلس میں لوگوں کے عیب ذکر کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **هُمَزَةٍ** (الهمزہ: 1) (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھماز سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے سامنے ان کی برائی ذکر کرتا ہے اور لماز اسے کہتے ہیں جو ان کی عدم موجودگی میں ان کی برائی ذکر کرتا ہے؛ یہ ابو العالیہ، عطا بن ابی رباح اور حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ مقاتل نے اس کلام کی ضد میں کلام کی ہے: ھمزہ اسے کہتے ہیں جو عدم موجودگی میں غیبت کرتا ہے اور لمزہ اسے کہتے ہیں جو سامنے برائی کرتا ہے۔ مرہ نے کہا: دونوں برابر ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو عدم موجودگی میں عیب جوئی کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ سے اسی کی مثل مروی ہے۔ شاعر نے کہا:

تُدْلِي بودٍ إذا لاقيتني كذبًا    وإنْ أغِبْ فأنت الهامز اللُّمَزَهْ (2)

جب تو ملتا ہے تو جھوٹ موٹ کی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اگر میں غائب ہوں تو تو عیب جوئی کرنے والا ہے۔
**مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ** لوگوں میں چغل خوری کرتا ہے تا کہ ان میں فساد برپا کر دے۔ یہ بولا جاتا ہے: نَمَّ يَنِمُّ نَمًّا و نَمِيمًا و نميمة جب وہ چغل خوری کرے اور فساد برپا کر دے۔ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہیں یہ خبر پہنچی کہ فلاں آدمی چغل خوری کرتا ہے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "جنت میں کوئی چغل خور داخل نہیں ہوگا" (3)۔ شاعر نے کہا:

ومولًى كبيت النمل لا خير عنده    لمولاه إلّا سَعْيُهُ بنميم (4)

غلام چیونٹی کے گھر کی طرح ہے۔ اس کے ہاں آقا کے لیے کوئی خیر نہیں سوائے اس کے کہ وہ چغل خوری کرتا ہے۔
**مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ** وہ مال کو روکنے والا ہے کہ اسے بھلائی کے راستوں میں خرچ کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنی اولاد اور قبیلہ کو اسلام سے روکتا ہے (5)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ انہیں کہتا ہے تم میں سے جو بھی (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہوا میں اسے کبھی بھی کسی چیز کا فائدہ نہیں دوں گا (6)۔ **مُعْتَدٍ** وہ لوگوں پر ظلم کرنے والا ہے، حد سے تجاوز کرنے والا ہے، باطل کا ساتھی ہے۔ **اَثِيْمٍ** گناہگار ہے اس کا معنی اثوم ہے۔ یہ فعیل کا وزن ہے اور فعول کے معنی میں ہے۔ **عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝** عتل، یعنی وہ کفر میں بہت سخت ہے۔ کلبی اور فراء نے کہا: وہ باطل میں سخت خصومت کرنے والا ہے (7)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لوگوں سے خصومت کرتا ہے اور انہیں قید یا عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ عتل سے ماخوذ ہے جس کا معنی کھینچنا ہے: اسی معنی میں یہ ارشاد ہے **خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ** (الدخان: 47) صحاح میں ہے عتلت

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 183
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 63
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 70
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 64
5۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 96
6۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 84
7۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 430

الرجل، أعِتله وأعُتُله جب تو اسے سختی سے کھینچے۔ رجل مِعْتَل۔ وہ گھوڑے کی تعریف کرتا ہے:

نَقْرعه قرعًا ولسنا نَعْتِله ہم اسے سختی سے روکتے ہیں اور ہم اسے کھینچتے نہیں۔

ابن سکیت نے کہا: عتله وعتنه دونوں طرح یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عُتُلٍّ کا معنی سخت دل۔ عُتُلٍّ کا معنی یہ بھی ہے موٹا نیزہ۔ رجل عتل ایسا آدمی جو برائی کی طرف جلدی جانے والا ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: لا أنعتل معك یعنی میں اپنی جگہ سے نہ ہلوں گا۔ عبید بن عمیر نے کہا: العتل سے مراد بہت زیادہ کھانے والا، بہت زیادہ پینے والا، قوی اور شدید۔ اسے میزان میں رکھا جائے تو ایک جو کا وزن بھی نہ ہو۔ فرشتہ ایک دھکے سے ایسے ستر ہزار آدمیوں کو جہنم میں دھکیل دے گا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت حسن بصری نے کہا: عُتُلٍّ سے مراد فحش گوئی کرنے والا اور برے اخلاق والا۔ معمر نے کہا: اس سے مراد فحش گوئی کرنے والا اور کمینہ ہے (1)۔ شاعر نے کہا:

بِعُتُلٍّ من الرجال زَنِيم غير ذی نجدة وغير كريم(2)

لوگوں میں سے ترش اور بد اصل وہ بلند مقام مرتبے والا نہیں اور نہ ہی معزز ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت حارث بن وہب سے روایت مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''کیا میں تمہیں اہل جنت کے بارے میں باخبر نہ کروں؟'' (3) صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں؟ فرمایا: ''ہر کمزور جسے لوگ کمزور جانیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر کسی امر کے بارے میں قسم اٹھا دے تو وہ اس قسم کو پورا کر دے۔ کیا میں تمہیں جہنمیوں کے بارے میں باخبر نہ کروں؟'' صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں؟ فرمایا: ''ہر ترش رو، سخت دل، مال جمع کرنے والا اور متکبر''۔ ایک روایت میں ہے۔ ''ہر مال جمع کرنے والا، بد اصل اور متکبر'' (4)۔

جواظ سے مراد مال جمع کرنے والا اور خرچ کرنے سے رکنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زیادہ گوشت والا اور چال میں تکبر کرنے والا۔ ماوردی نے شہر بن حوشب سے وہ عبد الرحمن بن غنم سے روایت نقل کرتے ہیں (5)، اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا يدخل الجنةَ جَوّاظٌ ولا جَعْظَرِیٌّ ولا العُتُلُّ الزَّنِيم ایک آدمی نے عرض کی: جواظ اور جعظری کیا ہوتا ہے اور عتل زنیم سے کیا مراد ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جواظ اسے کہتے ہیں جو مال جمع کرتا ہے اور اسے روک لیتا ہے، جعظری سے مراد سخت دل اور عتل زنیم سے مراد مضبوط جسم والا، بڑے پیٹ والا، صحت مند، خوب کھانے پینے والا، کھانے کو پانے والا اور لوگوں پر ظلم کرنے والا''۔ ثعلبی نے اسے شداد بن اوس سے نقل کیا ہے: ''جنت میں جواظ، جعظری اور عتل زنیم داخل نہیں ہوگا''۔ میں نے یہ باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں۔ میں نے عرض کی: جواظ کون ہے؟ فرمایا: ''مال جمع کرنے والا اور اسے روکنے والا''۔ میں نے پوچھا: جعظری کیا ہے؟ فرمایا: ''ترش رو سخت دل''، میں نے عرض کی: عتل زنیم کیا ہے؟ فرمایا: ''بڑے پیٹ والا''۔ بھرے گوشت والا، خوب

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 430 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 64

3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفته، جهنم اعاذنا الله منها، جلد 2، صفحہ 382 4۔ ایضاً 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 65

کھانے پینے والا اور ظالم''۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر نبی کریم ﷺ سے عتل کے بارے میں ہے جو مفسرین کے اقوال پر فوقیت رکھتی ہے۔ ابوداؤد کی کتاب میں جواظ کی تفسیر میں ہے، اس سے مراد ترش رو اور سخت دل ہے۔ یہ حارث بن وہب خزاعی کی حدیث میں وارد ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا یدخل الجنۃ الجَوّاظ ولا الجَعْظَرِی(1)، جواظ اور جعظری جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ کہا: جواظ سے مراد ترش رو اور سخت دل ہے۔ اس بارے میں دو اور تفسیریں ہیں جو مرفوع روایت میں بیان ہوئیں جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد سخت دل ہے۔ حضرت زید بن اسلم اللہ تعالیٰ کے فرمان: عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ کی تفسیر میں کہتے ہیں(2)، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آسمان اس آدمی کی حرکتوں سے روتا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کے جسم کو درست کیا، اس کے پیٹ کو بڑا کیا اور دنیا میں سے بعض دیا تو وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے، پس وہی عتل زنیم ہے اور آسمان اس بدکار بوڑھے کی وجہ سے روتا ہے جس کو زمین اٹھائے ہوئے ہے''۔

زنیم اسے کہتے ہیں جو کسی قوم کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے اور جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ شاعر نے کہا:

زَنِیْمٌ تداعاہ الرجال زیادۃ

وہ زنیم ہے جسے لوگ بطور زیادہ چیز کے دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ قریش کا ایک فرد تھا اس کا ایسا زخم تھا جس طرح بکری (کے کانوں یا گردن) میں الگ تھلگ گوشت لٹک رہا ہوتا ہے(3)۔ ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی کی ہے کہ وہ شر میں یوں معروف تھا جس طرح بکری اس گوشت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے(4)۔ عکرمہ نے کہا: مراد ایسا کمینہ فرد ہے جو اپنی کمینگی کی وجہ سے معروف ہو جس طرح بکری اس گوشت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ انبہ (عیب) کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد مظلوم ہے۔ یہ چھ اقوال ہیں۔ مجاہد نے کہا: زنیم جس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں اور ہر انگوٹھے میں ایک انگلی زائد تھی۔ ان میں سے بھی اور سعید بن مسیب اور عکرمہ سے بھی یہ مروی ہے: اس سے مراد ولد زنا ہے جو نسب میں کسی قوم کے ساتھ لاحق کر دیا گیا ہو۔ ولید قریش میں دعی (جس کا دعویٰ کیا گیا ہو) تھا وہ ان کی اصل سے نہ تھا۔ اس کے والد نے اس کی پیدائش کے اٹھارہ سال بعد اس کے بیٹے ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ شاعر نے کہا:

زَنِیْمٌ لیس یُعرف مَن أبوہ بغِیّ الأمِّ ذو حسب لئیم

وہ بد اصل ہے، اس کا باپ معروف نہیں، اس کی ماں بدکار تھی وہ کمینے حسب والا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بعینہ پہلا قول ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جس کی اصل نہ ہو۔ معنی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، فی حسن الخلق، جلد 2، صفحہ 305
2۔ تفسیر طبری، جز 29، صفحہ 31
3۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 895
4۔ ایضاً

ایک ہی ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں ولدزنا، اس کا بچہ اور اس کے بچے کا بچہ داخل نہیں ہوگا'' (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ولدزنا قیامت کے روز بندوں اور خنزیروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے''۔ حضرت میمونہ نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''میری امت بھلائی میں رہے گی جب تک اس میں ولدزنا عام نہ ہوں گے اور جب اس میں ولدزنا عام ہو جائیں گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عتاب کو عام کردے''۔ عکرمہ نے کہا: جب ولدزنا کی کثرت ہو جاتی ہے تو بارش کم ہو جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں: جہاں تک پہلی اور دوسری حدیث کا تعلق ہے میں ان کی ایسی سند گمان نہیں کرتا جو صحیح ہو جہاں تک حضرت میمونہ کی حدیث کا تعلق ہے اور عکرمہ نے جو کہا ہے وہ صحیح مسلم میں حضرت زینب بنت جحش جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں، سے مروی ہے۔ کہا: ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھبراتے ہوئے نکلے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے تھے: لا إله إلا الله ويلٌ للعرب من شرّ قد اقترب۔ فُتح اليوم من ردم يأجوج ومأجوج مثلُ هذا (2) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عربوں کے لیے اس شر کی وجہ سے ہلاکت ہے جو قریب آچکی ہے۔ آج یاجوج و ماجوج کی آڑ اس قدر کھول دی گئی ہے۔ آپ نے اپنے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی سے حلقہ بنایا۔ حضرت زینب بنت جحش نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے جبکہ ہم میں صالح لوگ بھی ہیں۔ فرمایا: ''ہاں، جب بدکاری عام ہو جائے گی''۔ امام بخاری نے اسے نقل کیا ہے۔ کثرۃ خبث سے مراد زنا کا عام ہونا اور زنا کی اولاد کا عام ہونا ہے۔ علماء نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ عکرمہ کا قول قحط المطر اس امر کی وضاحت ہے جس کے ساتھ ہلاکت ہوگی۔ یہ امر قیاسی نہیں توقیفی (جیسی خبر دی) ہے وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کس وجہ سے انہوں نے یہ بات کہی۔

اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی وہ منیٰ میں مقیم لوگوں کو تین دن حلوہ کھلاتا تھا اور اعلان کرتا: خبردار! کوئی آدمی ہنڈیا کے نیچے آگ نہ جلائے، کوئی آدمی کھروں (کو پکانے کے لئے) ان کے نیچے دھواں نہ ڈالے۔ خبردار! جو حیس (حلوہ) کی خواہش رکھتا ہے وہ ولید بن مغیرہ کے پاس آئے وہ ایک حج کے موقع پر بیس ہزار یا اس سے زیادہ خرچ کیا کرتا تھا اور مسکین کو ایک درہم بھی نہ دیتا، تو کہا گیا: مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ (فصلت) محمد بن اسحاق نے کہا: یہ آیت اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ وہ حلیف تھا اور بنو زہرہ کے ساتھ لاحق کیا گیا تھا؛ اسی وجہ سے اسے زنیم کہا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت میں اس کی یہ صفت بیان کی گئی اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہ تھا یہاں تک کہ وہ قتل ہوا تو اس کا پتہ چلا۔ اس کی گردن میں گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جو لٹک رہا تھا۔ مرہ ہمدانی نے کہا: اس کے والد نے اس کی پیدائش کے اٹھارہ سال بعد اس کے بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

''(یہ غرور و سرکشی) اس لئے کہ وہ مالدار اور صاحب اولاد ہے۔ جب ہماری آیت اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو

1۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 333، حدیث 13095
2۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، یاجوج ماجوج، جلد 2، صفحہ 1056

کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں''۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ ابو جعفر، ابن عامر، ابو حیوہ، مغیرہ اور اعرج نے اَنْ كَانَ ایک ہمزہ ممدودہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ کلام استفہامیہ ہے۔ مفضل، ابو بکر اور حمزہ نے ءَاَنْ كَانَ دو ہمزوں کے ساتھ جو اپنی جگہ پر ثابت ہیں کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ کلام استفہامیہ نہیں۔ جس نے ایک ہمزہ ممدودہ یا دو ہمزہ محققہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں کلام استفہامیہ ہوگی۔ اس سے مراد توبیخ ہے اس کے لئے اچھا ہوگا کہ وہ زنیم پر وقف کرے اور اَنْ كَانَ سے کلام کا آغاز کرے معنی یہ بنے گا کیا اس لئے کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ تقدیر کلام بھی جائز ہے ألأن كان ذا مال و بنين يقول إذا تُتلى عليه آياتنا أساطير الأولين کیا اس لئے کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو ألأن كان ذا مال و بنين يكفر و يستكبر کیا اس لئے کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے وہ کفر کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے۔ ماقبل کلام اس پر دلالت کرتی ہے تو یہ استفہام کے بعد مذکور کی طرح ہے۔ جس نے اَنْ كَانَ استفہام کے بغیر پڑھا تو وہ مفعول لاجلہ ہوگا اس میں عامل فعل مضمر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یکفر لأن كان ذا مال و بنين اس فعل پر اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ دلالت کرتا ہے۔ اَنْ میں تُتْلٰى فعل عامل نہیں ہوگا اور نہ ہی قَالَ فعل عامل ہوگا کیونکہ اِذَا کا مابعد اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا کیونکہ اذا، مابعد جملہ کی طرف مضاف ہوکر استعمال ہوتا ہے اور مضاف الیہ، مضاف کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا اور قَالَ جزاء کا جواب ہے یہ جزا کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا کیونکہ عامل کا حکم یہ ہے کہ وہ معمول سے پہلے ہو اور جواب کا حکم یہ ہے کہ وہ شرط کے بعد ہو وہ ایک ہی میں حال میں مقدم و موخر ہوگا۔ یہ جائز ہے کہ معنی ہو اس کی اطاعت نہ کر اس لئے کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے۔ ابن انباری نے کہا: جس نے استفہام کے بغیر پڑھا اس کے لئے زنیم پر وقف کرنا اچھا نہیں کیونکہ معنی ہے اَنْ كَانَ بان کان۔ ان ماقبل سے متعلق ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ مَشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ کے متعلق ہو تقدیر کلام یہ ہوگی يمشي بنميم لأن كان ذا مال و بنين وہ چغل خوری اس لئے کرتا ہے کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے۔ ابو علی نے یہ بھی جائز قرار دیا ہے کہ یہ عتل کے متعلق ہو اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ سے مراد ان کی باطل باتیں، جھوٹی آرزوئیں اور خرافات ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝

''ہم بہت جلد اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## سنسمہ کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 1**۔ سَنَسِمُهٗ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سَنَسِمُهٗ کا معنی ہے ہم تلوار کے ساتھ اسے نکیل ڈالیں گے(1)،

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 432

کہا: جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی غزوہ بدر کے دن تلوار کے ساتھ اس کی ناک پر زخم لگایا گیا، وہ مرنے تک اسی طرح رہا۔ قتادہ نے کہا: قیامت کے روز ہم اس کی ناک پر نشان لگائیں گے جس کے ساتھ وہ پہچان لیا جائے گا یہ جملہ بولا جاتا ہے: و سمته و سَما و سمةً جب اس میں سمہ اور کاویہ کے ساتھ اثر چھوڑا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران: 106) یہ ظاہر علامت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىٕذٍ زُرْقًا ۝ (طٰہٰ)

یہ ایک اور ظاہر علامت ہے اس آیت نے تیسرا فائدہ اٹھایا، وہ ناک پر آگ سے نشان لگاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (الرحمن: 41)؛ یہ کلبی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابو العالیہ اور مجاہد نے کہا: سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝ کا معنی ہے ہم اس کے ناک پر نشان لگائیں گے اور آخرت میں اس کے چہرے کو سیاہ کر دیں گے تو وہ اپنے چہرے کی سیاہی کی وجہ سے پہچانا جائے گا۔ خرطوم سے مراد انسان کی ناک ہے، درندوں سے اس کے ہونٹ کی جگہ ہے، قوم کے خراطیم سے مراد ان کے سردار ہیں۔ فراء نے کہا: اگر خرطوم کو سمہ کے ساتھ خاص کیا گیا ہو تو اس وقت یہ وجہ کے معنی میں ہوگا کیونکہ کسی چیز کے بعض کے ساتھ اس کے کل کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ طبری نے کہا: ہم اس کے امر کو واضح کریں گے یہاں تک لوگ اسے پہچان لیں گے وہ ان پر مخفی نہیں رہے گا جس طرح ناک پر نشان مخفی نہیں رہتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم اسے عار لاحق کریں گے یہاں تک کہ وہ اس کے لئے اس طرح ہو جائے گا جس طرح اس کی ناک پر نشان ہو۔ قتبی نے کہا: عرب اس آدمی کے بارے میں کہتے ہیں جس کو کوئی قبیح الزام دیا گیا ہو جو باقی رہنے والا ہو: قد وَسَمَ مَيْسَمَ سُوءٍ معنی اسے ایسی عار لاحق ہوگئی ہے جو اس سے جدا نہیں ہوگی، جس طرح نشان کا اثر نہیں مٹایا جا سکتا۔ جریر نے کہا:

لمّا وضعتُ على الفَرَزْدَق مِيسَمِي و على البَعِيث جَدَعْتُ أنفَ الأخْطَلِ (1)

جب میں نے اپنی ہجو فرزدق اور بعیث (خداش بن بشر) پر رکھی تو میں نے اخطل کی ناک کو کاٹ دیا۔

یہاں میسم سے مراد ہجو ہے۔ کہا: یہ سب آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے اتنے عیوب کا ذکر کیا ہو جتنے عیوب اس کے ذکر کئے۔ اسے ایسی عار لاحق کی جو دنیا و آخرت میں اس سے جدا نہ ہوئی جس طرح ناک پہ نشان زخم جدا نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ آزمائش ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں اس کی ذات، مال اور اہل میں مبتلا کیا اسے ذلت و پستی میں رہنا پڑا (2)؛ یہ ابن بحر نے کہا جس طرح اعشیٰ نے کہا: و اغلب أنف من أنت و اسم جس پر نشان لگانا چاہتا ہے اس کی ناک پر نشان لگا۔ نضر بن شمیل نے کہا: معنی ہے ہم شراب پینے پر اس پر حد جاری کریں گے خرطوم سے مراد شراب ہے اس کی جمع خراطیم آتی ہے۔

شاعر نے کہا:

تَظَلّ يومك فی لَهْوٍ و فی طَرَب و أنت بالليل شَرّاب الخراطيم

تو دن کے وقت لہو اور نشاط میں رہتا ہے اور رات کے وقت شراب پیتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 349
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 66

ایک اور نے کہا: و من یشرب الخمر طوم یصبح مسکہا جو شراب پیتا ہے، وہ نشہ کی حالت میں صبح کرتا ہے۔

## چہرے پر نشان کے ساتھ مثال بیان کرنے کی وجہ

**مسئلہ نمبر 2۔** ابن عربی نے کہا: معصیت کا ارتکاب کرنے والے کے چہرے پر نشان لگانا لوگوں کے ہاں قدیمی معمول ہے(1)۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ یہ روایت کی گئی ہے: جب یہودیوں نے زانی کو رجم کرنے میں ڈھیل دی تو اس کے عوض انہوں نے مارنے اور چہرے کو سیاہ کرنے کی سزا دی۔ یہ بات الگ توجیہ ہے۔ چہرے پر نشان لگانے کے اعتبار سے صحیح توجیہ یہ ہے جو علماء نے رائے قائم کی کہ جھوٹی گواہی دینے والے کے چہرے کو سیاہ کیا جائے۔ یہ اس کی معصیت کی قباحت پر علامت کے طور پر ہے اور اس آدمی پر سختی کرنے کے لئے ہے جو جھوٹی گواہی کسی اور کے لئے دیتا ہے یہ ان لوگوں میں سے ہے جس کے بارے میں اس عمل سے اجتناب کرنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ وہ حق بات کہہ کر معزز ہو سکتا تھا جبکہ وہ معصیت کا ارتکاب کر کے حقیر ہو گیا ہے سب سے بڑی اہانت چہرے کی اہانت ہے اسی طرح اس کا اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے آپ کو پست کرنا یہ دائمی بھلائی اور آگ پر حرمت کا سبب ہے اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام کیا ہے کہ وہ انسان کے سجدہ کے اثر کو کھائے جس طرح حدیث صحیح میں ثابت ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ وَ لَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ۝

"ہم نے ان (مکہ والوں) کو بھی آزمایا جیسے ہم نے آزمایا تھا باغ والوں کو جب انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور توڑ لیں گے اس کا پھل صبح سویرے اور انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہ کہا۔ پس چکر لگایا اس باغ پر ایک چکر لگانے والے نے آپ کے رب کی طرف سے دراں حالیکہ وہ سوئے ہوئے تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## باغ والوں کا ابتلا اور ان کا قصہ

**مسئلہ نمبر 1۔** اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ مراد اہل مکہ ہیں۔ ابتلاء سے مراد آزمانا ہے۔ اس کا معنی ہے ہم نے انہیں مال عطا کئے تا کہ وہ شکر بجا لائیں نہ کہ وہ تکبر کریں۔ جب انہوں نے تکبر کیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی تو ہم نے بھوک اور قحط کے ساتھ آزمایا جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا جن کی خبر ان کے ہاں معروف و مشہور تھی۔ وہ باغ یمن کے علاقہ میں صنعاء سے چند فرسخ دور تھا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: وہ دو فرسخ دور تھا وہ باغ ایک ایسے آدمی کا تھا جو اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا کرتا تھا جب وہ فوت ہو گیا تو باغ بیٹوں کی ملکیت میں آ گیا انہوں نے لوگوں کو اس کے مال سے روک دیا اور اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے میں بخل سے کام لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس باغ کو ایسے طریقہ سے ہلاک کر دیا جس کو دور کرنا ان کے لئے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1857

ممکن نہ تھا۔ کلبی نے کہا: ان کے اور صنعاء کے درمیان دو فرسخ کا فاصلہ تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں ڈالا کہ ان کے باغ کو جلا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ باغ ضوران میں تھا اور ضوران، صنعاء سے دو فرسخ کے مقام پر تھا۔ اس باغ والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے تھوڑا عرصہ بعد ہوئے وہ سب بخیل تھے وہ مساکین سے بچنے کے لئے رات کے وقت کھجوروں سے پھل اتارتے تھے۔ انہوں نے فصل کاٹنے کا ارادہ کیا اور کہا: آج تم پر کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے وہ صبح صبح اس کی طرف گئے تو وہ باغ اپنی جڑوں سے اکھیڑا جا چکا تھا تو وہ رات کی طرح ہو چکا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دن کو بھی صریم کہتے ہیں۔ اگر رات مراد لی جائے تو اس جگہ کے سیاہ ہونے کی وجہ سے اسے صریم کیا گیا گویا انہوں نے اس کی جگہ کو سیاہ کیچڑ کو کلہ پایا اگر صریم سے مراد دن ہو تو اس کے درختوں اور کھیتیوں کے ختم ہونے اور زمین کے اندر سے صاف ہونے کی وجہ سے اسے صریم کہا گیا۔ طائف سے مراد حضرت جبریل امین ہیں انہوں نے اس باغ کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: اس باغ کو بیت اللہ شریف کے گرد چکر لگایا اور پھر اسے وہاں رکھ دیا جہاں آج کل طائف شہر ہے۔ اسی وجہ سے اس شہر کو طائف کہتے ہیں۔ حجاز کے علاقہ میں کوئی ایسا شہر نہیں جہاں درخت، انگور اور پانی ہو۔ بکری نے معجم میں کہا: طائف کو یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ صدف کا ایک آدمی جسے دمون کہا جاتا اس نے ایک دیوار بنائی اور کہا: میں نے تمہارے شہر کے اردگرد ایک طائف بنائی ہے اس وجہ سے اس شہر کا نام طائف پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

## کھیتی کاٹنے کا وقت اور اس وقت کیا کرنا چاہیے

**مسئلہ نمبر2**۔ بعض علماء نے کہا: جو آدمی اپنی کھیتی کاٹے یا پھل کاٹے تو جو آدمی وہاں حاضر ہو اس کے ساتھ غم گساری کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام:141) کا یہی مقصود ہے، یہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے جس طرح سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: کاٹنے والوں نے جسے چھوڑ دیا ہے مالک پر لازم ہے کہ اسے چھوڑ دے کیونکہ بعض لوگ اس سے اپنی روزی تلاش کرتے ہیں۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ رات کے وقت فصل کاٹنے سے منع کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ اس طریقہ سے مساکین کے ساتھ نرمی کرنے کا حکم ہے وہ منقطع ہو جاتا ہے جس نے یہ کہا اس نے سورۂ نٓ وَالْقَلَمِ کی اس آیت کی یہ تاویل کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رات کے وقت اس لئے کاٹنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ سانپوں اور دوسرے حشرات الارض کا خوف ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ دوسرا احسن ہے۔ ہم نے کہا ہے: پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ سزا انہیں اسی لئے ملی جو انہوں نے مساکین کو محروم رکھنے کا ارادہ کیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ اسباط نے سدی سے روایت کی ہے کہ ایک قوم یمن میں آباد تھی ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا جب ان کے پھل پک جاتے تو مساکین اس کے پاس آ جاتے وہ باغ میں داخل ہونے سے انہیں منع نہ کرتا، اس سے کھانے سے منع نہ کرتا اور زادراہ لینے سے منع نہ کرتا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے ایک دوسرے سے کہا: ہم اپنے اموال مساکین کو کیوں دیں۔ آؤ۔ ہم رات کے وقت اس میں داخل ہوں اور مساکین کو علم ہونے سے پہلے ہی کاٹ لیں۔ انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا۔ وہ پہلے ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے رازداری

سے بات کرو آج تم پر کوئی مسکین داخل نہ ہو اسی وجہ سے فرمایا: اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِیۡنَ ۝ انہوں نے باہم قسم اٹھائی کہ مساکین کے گھروں سے نکلنے سے پہلے ہم صبح صبح اسے کاٹ لیں اور انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ باغ صنعاء سے دو فرسخ کے مقام پر تھا اسے ایک صالح آدمی نے لگایا تھا اس کے تین بیٹے تھے وہ تمام پھل مساکین کے لئے ہوتا جو درانتی سے رہ جاتا اور انگور میں سے اس نے نہ کاٹا ہوتا جب اسے چادر پر ڈالا جاتا تو جو پھل اس چادر سے گر جاتا وہ بھی مساکین کے لئے ہوتا جب وہ اپنی کھیتی کاٹتے تو جو چیز درانتی سے رہ جاتی وہ مساکین کے لئے ہوتی جب وہ اس فصل کو صاف کرتے تو جو چیز ادھر ادھر بکھر جاتی وہ بھی مساکین کے لئے ہوتی ان کا باپ اس میں سے صدقہ کرتا ان کے باپ کی زندگی میں یتامیٰ، بیوائیں اور مساکین اس سے وقت گزارتے جب ان کا باپ فوت ہو گیا تو بیٹوں نے وہ کچھ کیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ذکر کیا۔ انہوں نے کہا: مال کم ہو گیا ہے اور اہل وعیال زیادہ ہو گئے ہیں، انہوں نے باہم قسم اٹھائی کہ لوگوں کے نکلنے سے پہلے وہ باغ کی طرف جائیں گے پھر اسے کاٹیں گے اور مساکین کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّهَا کا یہی معنی ہے انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنی کھجوروں کا پھل اس وقت کاٹیں گے جب ابھی رات کی کچھ تاریکی ہوگی تاکہ مساکین بیدار نہ ہوں۔ صرم کا معنی کاٹنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: صرم العذق من النخل اس نے کھجور کا خوشہ کاٹا۔ أصرم النخل کھجور کے کاٹنے کا وقت آ گیا جس طرح أرکب المهر اور أحصد الزرع یعنی بچھیرے پر سواری کرنے کا وقت آ گیا اور کھیتی کے کاٹنے کا وقت آ گیا۔

وَ لَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ ۝ انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا: فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِیۡنَ وہ ایک دوسرے کو ندا کرتے ہیں: اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰی حَرۡثِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰرِمِیۡنَ ۝ کھیتی کو کاٹنے کا عزم رکھتے ہو۔ قتادہ نے کہا: اگر تم کھیتی کاٹنے والے ہو۔ کلبی نے کہا: ان کے باغ میں جو کھیتی اور کھجوریں ہیں انہیں کاٹنے والے ہو۔ مجاہد نے کہا: ان کی کھیتی انگور کی تھی۔ انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہا (1)۔ ابو صالح نے کہا: ان کی استثناء ان کا یہ قول تھا: سبحان اللہ ربنا ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ کا معنی ہے وہ مساکین کا حق نہیں نکالتے؛ یہ علماء کا قول ہے وہ اپنے باغ میں رات کے وقت آئے انہوں نے باغ کو سیاہ پایا تیرے رب کی جانب سے ان پر ایک مصیبت آئی جبکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طائف سے مراد حضرت جبریل امین ہیں جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد ہے تیرے رب کی جانب سے امر (2)۔ قتادہ نے کہا: تیرے رب کی جانب سے عذاب۔ ابن جریج نے کہا: آگ کی گردن جو جہنم کی وادی سے نکلی تھی۔ طائف اس مصیبت کو کہتے ہیں جو رات کے وقت آئے؛ یہ فراء کا قول ہے (3)۔

## انسان کے عزم پر بھی سزا ہوتی ہے

**مسئلہ نمبر 3۔** میں کہتا ہوں: اس آیت میں ایسی دلیل ہے کہ عزم پر بھی انسان کا مواخذہ ہوگا کیونکہ انہوں نے عزم کیا تھا کہ وہ ایسا کریں گے تو ان کے فعل سے پہلے انہیں سزا دی گئی۔ اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡهِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 67 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

بِالْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (الحج) صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''جو دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ باہم مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہونگے'' (1)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو قاتل ہے تو مقتول کس وجہ سے؟ فرمایا: ''وہ اپنے ساتھی کے قتل کا حریص تھا''۔ سورۂ آل عمران آیت 135 میں وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا کے ضمن میں بحث گزر چکی ہے۔

فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِیْمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ۝

''پس چکر لگا گیا اس باغ پر چکر لگانے والا آپ کے رب کی طرف سے دراں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ندا دی صبح سویرے کہ سویرے سویرے اپنے کھیت کی طرف چلو تم اگر پھل توڑنا چاہتے ہو''۔

فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِیْمِ ۝ وہ ہو گیا تاریک رات کی طرح (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، فراء اور دوسرے علماء نے کہا: یعنی وہ باغ جل گیا اور سیاہ رات کی طرح ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: سیاہ رات کی طرح ہو گیا (3)۔ کہا: حزیمہ کی لغت میں وہ سیاہ راکھ کی طرح ہو گیا۔ ثوری نے کہا: کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا۔ صریم، مصروم کے معنی میں ہے اس میں جو کچھ تھا اس کو کاٹ دیا گیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: بھلائی اس سے ختم کر دی گئی۔ صریم، اسم مفعول کا وزن ہے۔ مورج نے کہا: ایسی ریت جو زیادہ ریت سے الگ ہو گئی۔ یہ کہا جاتا ہے: صریمة، صرائم ریت کوئی ایسی چیز نہیں اگاتی جس سے نفع حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اخفش نے کہا: وہ صبح کی طرح ہو گیا جو رات سے کٹ چکی ہو۔ مبرد نے کہا: وہ دن کی طرح ہو گیا، پس اس میں کوئی چیز باقی نہ بچی۔ شمر نے کہا: صریم سے مراد رات ہے، صریم سے مراد دن ہے، یعنی رات دن سے کٹتی ہے اور دن رات سے کٹتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رات کو صریمہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ اپنی تاریکی کی وجہ سے تصرف سے روک دیتی ہے؛ اسی وجہ سے فعیل، فاعل کے معنی میں ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ دن کو بھی صریم کہتے ہیں جبکہ وہ انسان کو تصرف سے نہیں روکتا۔

فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّهَا الْیَوْمَ عَلَیْكُمْ مِّسْكِیْنٌ ۝ وَّ غَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ۝

''سو وہ چل پڑے اور ایک دوسرے کو چپکے چپکے کہتے جاتے کہ (خبردار!) اس باغ میں ہرگز داخل نہ ہو آج تم پر کوئی مسکین اور تڑکے چلے (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر قادر ہیں''۔

فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ۝ یعنی وہ رازداری سے باتیں کر رہے تھے اپنی کلام کو وہ پست رکھ رہے تھے اور رازداری سے کام لے رہے تھے تا کہ کسی کو ان کے بارے میں علم نہ ہو؛ یہ عطا اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ خَفَتَ یَخْفِتُ سے مشتق ہے جب وہ ساکن ہو جائے اور کسی بات کو ظاہر نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے آپ کو لوگوں سے چھپاتے ہیں تا کہ لوگ انہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، اذا التقی المسلمان، جلد 2، صفحہ 389 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 68 3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 67

دیکھ نہ لیں۔ ان کا باپ فقراء اور مساکین کو خبر دیتا تو وہ کاٹنے کے وقت حاضر ہو جاتے۔

وَّ غَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ۝ حرد کا معنی قصد ہے اور اپنے حساب سے وہ قادر تھے۔ وہ گمان کرتے تھے وہ اپنی مراد پر قدرت رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے یہی معنی کیا ہے۔ حرد کا معنی قصد کرنا ہے۔ حَرَدَ، یَحْرِدُ، حَرْدًا قصد کیا۔ تو کہتا ہے: حَرَدْتُ حردت۔ تو نے قصد کیا۔ اس معنی میں راجز کا قول ہے:

أقبل سَیْلٌ جاء من عند الله    یَحْرِدُ حَرْدَ الجنة المُغِلَّة (1)

سیلاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آیا وہ گھنے پھلدار باغ کا قصد کر رہا تھا۔ نحاس نے یہ شعر پڑھا:

قد جاء سیل جاء من أمر الله    یحرد حرد الجنة المغلة (2)

اللہ تعالیٰ کے حکم سے سیلاب آیا، وہ گھنے پھلدار باغ کا قصد کر رہا تھا۔

مبرد نے کہا: مغلہ سے مراد غلہ والا۔ دوسرے علماء نے کہا: مغلہ سے مراد وہ باغ ہے جس کی جڑوں میں پانی بہتا ہے؛ اسی سے تغللت بالغالیة ہے اسی سے تغلیت ہے، لام کو یاء سے بدل دیا گیا۔ جس نے تغلفت کہا: اس کے نزدیک اس کا معنی ہے میں نے اسے غلاف بنایا۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: علی حرد کوشش کرتے ہوئے (3)۔ حضرت حسن بصری نے اس کا معنی کیا ہے: ضرورت اور فاقہ کی صورت میں۔ ابو عبیدہ اور قتیبی نے کہا: اس کا معنی روکنا ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے لیا گیا ہے: حَارَدَتِ الإبلُ حِرَادًا جب اس کا دودھ کم ہو گیا۔ حرود اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا دودھ کم ہو۔ حارَدَتِ السَّنَةُ جس سال بارش اور فصل کم ہو۔ سدی اور سفیان نے کہا: حرد کا معنی غضب ہے۔ ابو نصیر احمد بن حاتم اصمعی کے صاحب نے کہا: اس میں تخفیف کی گئی ہے اور یہ شعر پڑھا:

إذا جیاد الخیلِ جائت تَرْدِی    مملوءةً من غَضَبٍ و حَرَدِ

عمدہ گھوڑے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے آئے اس حال میں کہ وہ غصہ اور غضب سے بھرے ہوئے تھے۔

ابن سکیت نے کہا: بعض اوقات اسے حرکت دی جاتی ہے تو کہتا ہے: حَرِدَ، حَرْدًا فھو حارِدٌ و حَرْدَان اسی معنی میں کہا جاتا ہے: أسد حارِدٌ، ولیوث حوارد، غصیلے شیر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: علی حرد، الگ تھلگ۔ یہ کہا جاتا ہے: حرد یحرد حردا وہ اپنی قوم سے الگ ہو گیا اور الگ تھلگ اترا اور ان سے میل جول نہ رکھا۔ ابو زید نے کہا: رجل حرید من قوم حرداء قد حرد یحرد حرودا جب وہ اپنی قوم کو ترک کر دے اور ان سے الگ تھلگ ہو جائے کوکب حرید جو دوسرے ستاروں سے الگ تھلگ ہو۔ اصمعی نے کہا: رجل حرید یگانہ اور الگ تھلگ۔ ہزیل کی لغت میں منحرد، منفرد کو کہتے ہیں۔ ابوذویب کا یہ شعر پڑھا:

کأنہ کوکب فی الجوِّ مُنْحَرِد گویا وہ فضا میں الگ تھلگ ستارہ ہے۔

ابو عمرو نے اسے جیم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی تفسیر منفرد سے کی ہے۔ کہا: وہ سہیل ستارہ ہے۔ ازہری نے کہا: حرد، ان کی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 68    2۔ تفسیر طبری، جز 29، صفحہ 42    3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 68

بستی کا نام تھا۔ سدی نے کہا: یہ ان کے باغ کا نام تھا۔ اس میں دو لغتیں ہیں۔ حَرْدٌ و حَرَدٌ عام قرأت سکون کے ساتھ ہے۔ ابو العالیہ اور ابن سمیقع نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دو لغتیں ہیں قٰدِرِیْنَ کا معنی ہے انہوں نے اندازہ لگایا اور اس پر عمل کیا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اپنے ہاں وہ اپنے باغ پر قادر تھے (1)۔ شعبی نے کہا: وہ مساکین پر قادر تھے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی پانا ہے یعنی انہوں نے روکا جبکہ وہ پانے والے تھے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾

''پھر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے (غالباً) ہم راستہ بھول گئے، نہیں نہیں ہماری تو قسمت پھوٹ گئی''۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ جب انہوں نے اسے جلا ہوا دیکھا اس میں کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ سیاہ رات کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے گویا وہ راکھ ہو۔ انہوں نے اس کو عجیب و غریب جانا اور اس میں شک کیا۔ بعض نے بعض سے کہا: اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ہم اپنے باغ کا راستہ بھول گئے ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم صحیح راہ سے بھٹک گئے ہیں کیونکہ ہم نے مساکین کو محروم رکھنے کا ارادہ کیا تھا اسی وجہ سے ہمیں سزا دی گئی۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ بلکہ ہم نے جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے ہمیں اپنے باغ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اسباط نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِیاکم والمعاصی اِنّ العبد لَیُذْنِبُ الذَّنْبَ فیُحْرَمُ بہ رزقًا کان هُیِّیءَ لَهٗ (3) معاصی سے بچو، بے شک بندہ گناہ کرتا ہے تو اسے اس رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اس کے لیے تیار ہوتا ہے۔ پھر ان آیات کی تلاوت کی فَطَافَ عَلَیْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾

''ان میں سے جو زیرک تھا بول اٹھا کہ کیا میں تمہیں کہتا نہ تھا کہ تم (اس کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے: پاک ہے ہمارا رب بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ پھر ایک اور کی طرف منہ کر کے ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ کہنے لگے: تف ہے ہم پر ہم ہی سرکش تھے۔ امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس کا بدلہ دے گا جو بہتر ہوگا اس سے ہم (اب) اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے ہیں''۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ سب سے اچھے، سب سے عادل (4) اور سب سے دانشمند نے کہا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟ ان کی استثناء تسبیح ہوا کرتی؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ اوسط نے انہیں استثناء کا حکم دیا تھا۔ دوسرے بھائیوں نے اس کی اطاعت نہ کی۔ ابو صالح نے کہا: ان کی استثناء سبحان اللہ تھی (5)۔ اس نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 69
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 68
4۔ ایضاً
5۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 433

ان سے کہا تھا تم سبحان الله کیوں نہیں کہتے اور الله تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس پر شکر کیوں نہیں بجالاتے؟ نحاس نے کہا: تسبیح کا اصل معنی الله تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے۔ مجاہد نے تسبیح کو انشاء الله کی جگہ رکھا ہے کیونکہ تنزیہ کا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی چیز الله تعالیٰ کی مشیت کے بغیر واقع نہیں ہوتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم اپنے فعل سے استغفار کیوں نہیں کرتے اور اپنی نیت کی خیانت سے توبہ کیوں نہیں کرتے۔ ان میں سے درمیانے نے انہیں یہ بات اس وقت کہی جب انہوں نے پختہ ارادہ کیا تھا، اس نے انہیں مجرموں سے انتقام لیے جانے کا ذکر کیا تھا۔ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ انہوں نے معصیت کا اعتراف کیا اور الله تعالیٰ کی پاکی بیان کی کہ وہ اپنے کسی عمل میں ظالم ہو(1)۔ حضرت ابن عباس نے یہ تعبیر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم اپنے گناہ سے الله تعالیٰ کے حضور بخشش کے طالب ہیں۔ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۞ ہم نے مساکین کو جو مال عطا نہیں کیا اس میں ہم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں(2)۔ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ۞ یعنی ایک دوسرے کو قسم اٹھانے پر اور مساکین کو روکنے پر ملامت کرنے لگے۔ ایک کہتا: بلکہ تو نے ہمیں اس کا مشورہ دیا۔ قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ ۞ فقراء کے حق کو روک کر اور استثناء ترک کر کے ہم نے نافرمانی کی۔ ابن کیسان نے کہا: ہم نے الله تعالیٰ کی نعمتوں پر سرکشی کی، ہم نے ان کا شکر یہ ادا نہ کیا جس طرح ہمارے آباء نے اس سے پہلے نعمتوں پر شکر ادا کیا تھا(3)۔

عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ انہوں نے معاہدہ کیا اور کہا: اگر الله تعالیٰ نے ہمیں اس سے بہتر عطا فرمایا تو ہم وہ کچھ کریں گے جس طرح ہمارے آباء نے کیا۔ انہوں نے الله تعالیٰ کے حضور دعا کی اور آہ وزاری کی تو الله تعالیٰ نے اسی رات اس باغ سے بہتر عطا فرمادیا اور جبرائیل امین کو حکم دیا کہ اس جلے ہوئے باغ کو اکھاڑے اور شام کے علاقہ میں زغر کے مقام پر لگا دے اور شام کے علاقہ سے ایک باغ لے اور اس جلے ہوئے باغ کی جگہ لگا دے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قوم نے اخلاص کا مظاہرہ کیا(4)، الله تعالیٰ نے ان کی سچائی کو پہچان لیا اور بدلے میں ایک باغ عطا فرمادیا جسے حیوان کہتے۔ اس میں انگور تھے، خچر اس کے ایک گچھے کو اٹھاتا تھا۔ یمانی ابو خالد نے کہا: میں اس باغ میں داخل ہوا تو میں نے اس میں ہر گچھا ایسے دیکھا جس طرح ایک حبشی مرد کھڑا ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: باغ والوں کا یہ قول اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۞ میں نہیں جانتا کہ یہ ان کی جانب سے ایمان تھا یا مشرکین کا وہ قول تھا جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی تو وہ یہ قول کرتے(5)۔ ان کے ایمان دار ہونے میں توقف کیا جائے گا۔

قتادہ سے باغ والوں کے بارے میں پوچھا گیا: کیا وہ جنتی ہیں یا دوزخی؟ فرمایا: تو نے مجھے تھکا دیا ہے، اکثر لوگ یہ کہتے ہیں: انہوں نے توبہ کی اور اخلاص کا مظاہرہ کیا؛ قشیری نے اسے بیان کیا ہے عام قرات یبدلنا ہے اہل مدینہ اور ابو عمرو نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تبدیل سے مراد شی کو تبدیل کرنا یا اس کی حالت کو بدل دینا جبکہ شئی کی ذات اپنی جگہ پر قائم رہے اور ابدال سے مراد ہے کسی شی کو اٹھانا اور کسی دوسری چیز کو اس کی جگہ رکھنا۔ سورۂ نساء

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 433 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 434 5۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 434

میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۳

"(دیکھ لیا) ایسا ہوتا ہے عذاب، اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے، کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے"۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ یعنی دنیا کا عذاب اور اموال کی ہلاکت؛ یہ ابن زید سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اہل مکہ کو نصیحت ہے کہ وہ الله تعالیٰ کی طرف رجوع کریں جب الله تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے خشک سالی میں مبتلا کیا تھا یعنی ہم ان کے ساتھ دنیا میں اسی قسم کا معاملہ کریں گے جو بھی ہماری حدود کو پامال کرے گا(1)۔ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ اہل مکہ کے لئے مثال ہے جب وہ بدر کی طرف نکلے اور انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو قتل کریں گے اور مکہ کی طرف لوٹیں گے یہاں تک کہ بیت الله شریف کا طواف کریں گے، شراب پئیں گے اور لونڈیاں ان کے پاس نغمے گائیں گی۔

الله تعالیٰ نے ان کے گمان کو الگ کر دیا، انہیں گرفتار کر لیا گیا، انہیں قتل کر دیا گیا اور ان باغ والوں کی طرح انہیں شکست کھانا پڑی جب باغ والے فصل کاٹنے کے لئے نکلے تھے اور خائب و خاسر ہوئے۔ پھر یہ قول کیا گیا ہے: وہ حق جسے باغ والوں نے مساکین سے روکا تھا، اس بارے میں احتمال ہے کہ ان پر واجب ہو اور یہ احتمال ہے کہ وہ نفل ہو۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سورت مکی ہے تو آیت کو اہل مکہ پر جو قحط آیا یا غزوہ بدر میں جو انہیں قتل کیا گیا اس پر محمول کرنا ممکن نہیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۳۴ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝۳۵ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۶ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝۳۷ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝۳۸ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝۳۹

"بے شک پرہیزگاروں کے لئے اپنے رب کے پاس نعمتوں بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کریں گے۔ تمہیں کیا ہو گیا تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لئے اس میں ایسی چیزیں ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو؟ کیا تمہارے لئے قسمیں ہم پر (لازم) ہیں جو باقی رہنے والی ہیں قیامت تک کہ تمہیں وہی ملے گا جو تم حکم کرو گے؟"۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ اس بارے میں قول پہلے گزر چکا ہے یعنی متقین کے لئے آخرت میں ایسی جنتیں ہیں جن میں خالص نعمتیں ہیں، ان میں کسی ایسی چیز کی آمیزش نہ ہو گی جو ان نعمتوں کو بدمزہ کرے جس طرح وہ دنیا کی نعمتوں کو بدمزہ کرتی تھی۔ قریش کے سردار دنیا میں اپنا حصہ دیکھتے تھے اور مسلمانوں کا حصہ کم دیکھتے تھے جب وہ آخرت کی کوئی بات سنتے اور الله تعالیٰ نے مومنین سے جو وعدے کئے ان کو سنتے تو کہتے: اگر یہ بات درست ہو گی کہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 434

جائے گا جس طرح حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی گمان کرتے ہیں تو ہمارا اور ان کا حال نہ ہوگا مگر اسی طرح جس طرح دنیا میں حال ہے ورنہ وہ ہم پر زائد نہ ہوں اور نہ انہیں ہم پر فضیلت ہوگی۔ آخری حد یہی ہوگی کہ وہ ہمارے برابر ہوں گے۔ فرمایا: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے کہا: کفار مکہ نے کہا: آخرت میں ہمیں اس سے بہتر دیا جائے گا(1) جو تمہیں دیا جائے گا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ پھر انہیں شرمندہ کیا اور فرمایا: مَا لَكُمْ ۫ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کس طرح کا ٹیڑھا حکم لگاتے ہو۔ جزا کا معاملہ تمہارے سپرد ہے یہاں تک کہ تم اس میں فیصلہ کرتے ہو جو تم چاہتے ہو کہ تمہارے لئے اس میں بھلائی ہے جیسی مسلمانوں کے لئے ہے۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ کیا تمہارے لئے کتاب ہے جس میں تم مطیع کو عاصی کی طرح پاتے ہو اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ۝ تم پسند کرتے ہو اور تم اسے چاہتے ہو۔ اصل میں ان فتح کے ساتھ تھا لیکن خبر پر لام مفتوح آنے کی وجہ سے اسے کسرہ دیا، تو کہتا ہے: علمتُ أنك عاقل اور علمتُ أنك لعاقل۔ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ۝ میں عامل تَدْرُسُوْنَ ہے۔ لام ان کے ہمزہ کے فتح کے مانع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تَدْرُسُوْنَ پر کلام مکمل ہوگئی پھر نئی کلام شروع کی اور کہا: اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ۝ کتاب میں تمہارے لئے وہ ہو جو تم پسند کرتے ہو یعنی تمہارے لئے ایسا نہیں دونوں فِیْهِ میں ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے پھر توبیخ میں یہ اضافہ کیا اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ یعنی پختہ وعدے ہیں۔ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ ہم پر پختہ ہیں بالغہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے موکد ہیں، یعنی تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ پر پختہ وعدے ہیں جن کی وجہ سے تم نے یقین کر لیا ہے کہ وہ تمہیں جنت میں داخل کرے گا۔

اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ خبر پر لام آنے کی وجہ سے اِنَّ کے ہمزہ کو کسرہ دیا۔ اس کلام کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے محل نصب کا ہے لیکن لام کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ تو کہتا ہے: حلفت أن لك كذا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ پر مکمل ہوگی، پھر فرمایا: اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ یعنی معاملہ ایسا نہیں۔ ابن یزید نے اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ۝ اور اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ دونوں میں استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت حسن بصری نے بالغۃ نصب کے ساتھ حال پڑھا ہے یا تو یہ لَكُمْ کی ضمیر سے حال ہے کیونکہ یہ ایمان کی خبر ہے کیونکہ اس میں ایک ضمیر ہے جو اس کے مناسب ہے یا یہ علینا کی ضمیر سے حال ہے اگر آپ علینا کو ایمان کی صفت بنائیں ایمان کی ذات کے متعلق نہ کریں، کیونکہ اس میں ایک ضمیر ہے جو اس کے مناسب ہے جس طرح جب یہ خبر بنے تو اس وقت اس میں ضمیر تھی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایمان سے حال ہو اگرچہ ایمان نکرہ ہے جس طرح انہوں نے حقا کو نصب دی جو متاع سے حال ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ۝ (البقرۃ) عام قرات بالغۃ رفع کے ساتھ ہے یہ ایمان کی صفت ہے۔

سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ۚۛ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚۛ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۝

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 101

''ان سے پوچھیے: ان میں سے کون ان (بے سروپا) باتوں کا ضامن ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی گواہ ہیں، اگر ہیں تو پھر پیش کریں اپنے گواہوں کو اگر وہ سچے ہیں''۔

سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ۝ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے پوچھئے جو میرے بارے میں خود ساختہ باتیں کرتے ہیں جس بات کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اس کا کوئی ضامن ہے کہ کفار کے لئے بھی وہ بھلائی ہے جو مسلمانوں کے لئے ہے۔ زعیم سے مراد کفیل اور ضامن ہے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہاں زعیم سے مراد حجت قائم کرنے والا اور دعویٰ کرنے والا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: زعیم سے مراد رسول ہے (2)۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ اصل کلام یہ ہے الهم شرکاء یہاں میم زائد ہے، شرکاء کا معنی شہداء ہے۔ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ جو انہوں نے گمان کیا ہے اس پر گواہی دیں ایسے گواہ لے آؤ۔ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۝ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر ان کے لئے ممکن ہو تو وہ اپنے شریک لے آئیں۔ یہ ایسا امر ہے جس کا معنی عجز کا اظہار ہے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَ هُمْ سٰلِمُوْنَ ۝

''جس روز پردہ اٹھایا جائے گا ایک ساق سے تو ان (نابکاروں) کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی تو اس وقت وہ سجدہ نہ کر سکیں گے، ندامت سے جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں ان پر ذلت چھا رہی ہوگی حالانکہ انہیں (دنیا میں) بلایا جاتا تھا سجدہ کی طرف جبکہ وہ صحیح سلامت تھے''۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ یہ جائز ہے کہ يَوْمَ میں عامل فَلْیَاْتُوْا ہو۔ انہیں چاہیے کہ اپنے شریک بلا لیں جس روز پنڈلی سے کپڑا اٹھایا جائے گا تاکہ شرکاء ان کے حق میں سفارش کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایک فعل مضمر کے ساتھ یوم کو نصب دی جائے تقدیر کلام یہ ہوگی اذکر یوم یکشف عن ساق اس صورت میں صٰدِقِیْنَ پر عطف ہوگا پہلی تقدیر کی صورت میں اس پر وقف نہیں ہوگا، است یوم نکشف بھی پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوم تکشف عن ساق پڑھا ہے اس صورت میں فعل معروف ہوگا۔ تکشف الشدة أو القیامة عن ساقها جس طرح عربوں کا قول ہے شَمَّرَتِ الحربُ عن ساقها جنگ نے پنڈلی سے پردہ ہٹا لیا یعنی جنگ سخت ہوگئی۔

شاعر نے کہا:

فتی الحرب إن عضّت به الحربُ عضَّها　　و إن شَمَّرت عن ساقها الْحَرْبُ شَمّرا (3)

وہ جنگجو ہے اگر جنگ اسے کاٹے تو وہ اسے کاٹتا ہے اور اگر جنگ پنڈلی سے پردہ ہٹالے تو وہ بھی پنڈلی سے پردہ ہٹا دیتا ہے۔

راجز نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 70　　2۔ ایضاً

3۔ التذکرہ، اذا کان یوم القیامة تتبع کل امة، جلد 2، صفحہ 22

قد كشفت عن ساقها فشُدُّوا و جَدّت الحربُ بكم فَجِدُّوا (1)

جنگ سخت ہوگئی پس تم بھی سخت ہو جاؤ جنگ نے تمہارے ساتھ سختی کی پس تم بھی سختی کرو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

كشفت لهم عن ساقها و بدا من الشر الصُّراحُ (2)

اس نے ان کے لئے پنڈلی کو ظاہر کر دیا اور واضح شر ظاہر ہوگئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری اور ابوالعالیہ نے یکشف مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ قرات یکشف کے معنی کی طرف راجع ہے گویا فرمایا: یوم تکشف القیامة عن شدة ا سے یوم تکشف بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ اکشف سے مشتق ہوگا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ کشف میں داخل ہو۔ اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اکشف الرجل فھو مکشف جب اس کا اوپر والا ہونٹ الٹ جائے۔ ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ اسامہ بن زید نے عکرمہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جس روز کرب اور شدت عیاں ہو جائے گی (3)۔ ابن جریج نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: شدت امر۔ مجاہد نے کہا: قیامت کے روز یہ سب سے مشکل ساعت ہو گی (4)۔ ابوعبیدہ نے کہا: جب جنگ اور امر شدید ہوگا (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: امر اپنی اصل سے ظاہر ہوگا۔ اس میں اصل یہ ہے جو آدمی کسی ایسے امر میں واقع ہو جس میں اسے محنت و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنی پنڈلی سے کپڑا اٹھا لیتا ہے۔ ساق اور کشف کا لفظ اس کے لئے بطور مجاز استعمال ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ساق الشئ سے مراد اس کی اصل ہے جس پر اس کا انحصار ہوتا ہے جس طرح ساق شجر اور ساق انسان۔ مراد ہوگا جس روز معاملہ کی حقیقت کو ظاہر کر دیا جائے گا تو امور کے حقائق اور ان کی اصل ظاہر ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہنم کی اصلیت ظاہر کر دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عرش کی اصلیت کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد موت کے وقت کا قریب آنا اور بدن کا کمزور ہونا یعنی مریض اپنی پنڈلی ننگی کرے گا تا کہ اپنا ضعف دیکھے، موذن اس کو نماز کی دعوت دے گا تو اس کے لئے کھڑا ہونا اور نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی سے پردہ ہٹائے گا" اللہ تعالیٰ اعضاء، ابعاض، پردہ ہٹانے اور پردہ ڈالنے سے برتر ہے اس صورت میں اس کا معنی ہوگا وہ عظیم امر کو ظاہر کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے نور سے پردہ ہٹائے گا۔ حضرت ابوموسیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ عَنْ سَاقٍ سے مراد ہے وہ عظیم نور سے پردہ ہٹائے گا تو لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے (6)۔ ابولیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں روایت نقل کی ہے کہ خلیل بن احمد، ابن منیع سے وہ ہدبہ سے وہ حماد بن سلمہ سے وہ عدی بن زید سے وہ عمارہ قرشی سے وہ ابوبردہ سے وہ ابوموسیٰ سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا (7): "جب قیامت کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 71 2۔ ایضاً 3۔ المتذکرہ، اذا کان یوم القیامة تتبع کل امة ما کانت تعبد، جلد 2، صفحہ 22
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً، صفحہ 24 7۔ ایضاً

دن ہوگا تو یہ قوم کے لئے اس چیز کا مثالی جسم بنایا جائے گا جس کی وہ دنیا میں عبادت کرتے تھے ہر قوم اس کے پیچھے چلی جائے گی جس کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اہل توحید وہیں رہ جائیں گے ان سے کہا جائے گا: تم کس کا انتظار کر رہے ہو جبکہ لوگ جا چکے ہیں؟ وہ کہیں گے: ہمارا ایک رب تھا جس کی دنیا میں ہم عبادت کرتے تھے ہم نے اسے دیکھا نہیں تھا فرمایا: جب تم اسے دیکھو گے تو اسے پہچان لو گے؟ وہ عرض کریں گے: ہاں۔ انہیں کہا جائے گا: تم کیسے اسے پہچان لو گے جبکہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں؟ وہ عرض کریں گے: اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان کے سامنے سے حجاب ہٹا دیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ کچھ لوگ رہ جائیں گے ان کی پشتیں گائے کے سینگوں کی طرح ہونگی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے وہ سجدہ کا ارادہ کریں گے تو اس کی طاقت نہ رکھیں گے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: **یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ یُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ** ﴿۴۲﴾ کا یہی معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میرے بندو! اپنے سروں کو اٹھا لو میں نے تمہارے ہر آدمی کے بدلے یہود و نصاریٰ میں ایک آدمی جہنم کے لئے بنا دیا ہے"۔

ابو بردہ نے کہا: میں نے یہ حدیث حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بیان فرمائی حضرت عمر نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! کیا تیرے باپ نے تجھے یہ حدیث بیان کی ہے؟ ابو بردہ نے تین دفعہ قسم اٹھائی۔ حضرت عمر نے فرمایا: میں نے اہل توحید کے بارے میں کوئی حدیث نہیں سنی جو مجھے اس حدیث سے زیادہ محبوب ہو۔

قیس بن سکن نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس یہ بیان کیا: جب قیامت کا دن ہوگا تو لوگ چالیس سال تک رب العالمین کے لئے کھڑے رہیں گے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوں گی جو آسمان کی طرف اٹھی ہوں گی، وہ ننگے پاؤں ہوں گے، ننگے بدن ہوں گے، پسینہ ان کے منہ تک پہنچ رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سے نہ کلام کرے گا اور نہ نظر رحمت فرمائے گا پھر ایک منادی کرنے والا منادی کرے گا: اے لوگو! کیا تمہارے اس رب کی جانب سے یہ عدل نہیں ہو گا جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہاری تصویر بنائی، تمہیں موت عطا کی، تمہیں زندہ کیا پھر تم نے کسی اور چیز کی عبادت کی کہ ہر قوم کو اسی طرف جانے دے جس طرف وہ خود پھرے ہیں؟ لوگ عرض کریں گے: ہاں۔ فرمایا: ہر قوم کے لئے اسے بلند کیا جائے گا جس کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کیا کرتے تھے وہ اس کی اتباع کریں گے یہاں تک کہ انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ مسلمان اور منافق وہاں ہی کھڑے رہیں گے۔ انہیں کہا جائے گا: کیا تم نہیں جاؤ گے جبکہ لوگ تو جا چکے ہیں؟ وہ کہیں گے: یہاں تک کہ ہمارا رب آئے۔ انہیں کہا جائے گا: کیا تم اسے پہچانتے ہو؟ وہ کہیں گے: اگر اس نے ہمیں پہچان کرائی تو ہم پہچان لیں گے۔ اس موقع پر ساق (عظیم نور) سے پردہ ہٹایا جائے گا تو جو بھی اخلاص کے ساتھ عبادت کیا کرتا تھا تو وہ سجدہ ریز ہو جائے گا منافق اسی طرح رہیں گے وہ اس کی طاقت نہ رکھیں گے گویا ان کی پشتوں میں ایسی سلاخیں ہیں جن پر گوشت بھونا جاتا ہے، انہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور سجدہ کرنے والے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: **وَّ یُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ** ﴿۴۲﴾ سے یہی مراد ہے۔

**خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ** ان کی آنکھیں ذلیل اور جھکی ہوں گی۔ اسے حال ہونے کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ **تَرْهَقُهُمْ**

ذِلَّةٌ ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین اپنے سر اوپر اٹھائیں گے جبکہ ان کے چہرے برف سے بھی زیادہ سفید ہوں گے منافقوں اور کافروں کے چہرے سیاہ ہونگے یہاں تک کہ وہ تارکول سے زیادہ سیاہ ہوں گے (1)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوموسیٰ اور حضرت ابن مسعود کی احادیث کے معنی صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری کی حدیث اور دوسری احادیث سے ثابت ہیں۔ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۞ انہیں دنیا میں سجدہ کی دعوت دی جاتی تھی جبکہ وہ صحت مند تھے۔ ابراہیم تیمی نے کہا: اذان اور اقامت کے ساتھ انہیں دعوت دی جاتی تھی تو وہ اس کا انکار کر دیتے تھے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حی علی الفلاح کی ندا سنتے تھے تو وہ اس کا جواب نہ دیتے تھے (2)۔ کعب الاحبار نے کہا: اللہ کی قسم! یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو جماعت سے پیچھے رہ جاتے ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ہے شرع میں جس امر کا انہیں مکلف بنایا گیا ہے اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ سورۂ بقرۃ میں نماز باجماعت کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ربیع بن خیثمہ کو فالج کی تکلیف ہوئی تو دو آدمیوں کے سہارے انہیں مسجد کی طرف لے جایا جاتا تھا کہا گیا: اے بایزید! کاش آپ گھر میں ہی نماز پڑھ لیتے آپ کے لئے رخصت تھی۔ فرمایا: جس نے حی علی الفلاح کی آواز سنی تو اس پر لازم ہے کہ وہ لبیک کہے اگرچہ گھٹنوں کے بل چل کر جانا پڑے۔ حضرت سعید بن مسیب سے کہا گیا: طارق تجھے قتل کرنا چاہتا ہے اس لئے چھپ جا فرمایا: کیا ایسی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ مجھ پر قدرت نہیں رکھے گا؟ ان سے کہا گیا: اپنے گھر میں بیٹھ رہو۔ فرمایا: میں حی علی الفلاح کی آواز سنوں اور اس پر لبیک نہ کہوں؟

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۞

"پس اے حبیب! آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور اسے جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے، ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہو اور میں نے (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے، میری خفیہ تدبیر بڑی پختہ ہے"۔

فَذَرْنِيْ مجھے چھوڑ دیجئے وَمَنْ يُّكَذِّبُ من مفعول معہ ہے یا ضمیر متکلم پر معطوف ہے بِهٰذَا الْحَدِيْثِ مراد قرآن حکیم ہے؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یوم قیامت ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے یعنی میں انہیں اجازت دیتا ہوں اور ان سے انتقام لیتا ہوں۔ پھر فرمایا: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ اس کا معنی ہے ہم اس کی غفلت میں اسے پکڑ لیں گے جبکہ وہ پہچانتے تک نہ ہوں گے پس انہیں بدر کے دن عذاب میں مبتلا کیا گیا (4)۔ حضرت سفیان ثوری نے کہا: ہم ان پر نعمتیں بہائیں گے اور شکر کرنا انہیں بھلا دیں گے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: کتنے ہی لوگ ہیں جن پر احسان کرنے کے ساتھ ان کے ساتھ استدراج کیا جاتا ہے (5)؟ کتنے ہی لوگ ہیں جن کی تعریف کر کے انہیں آزمائش میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 438 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 72 5۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 188

ڈالا جاتا ہے؟ کتنے ہی افراد ہیں جن کے عیبوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے تو وہ دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ ابوروق نے کہا: جب بھی وہ غلطی کرتے ہیں ہم ان پر ایک نئی نعمت کرتے ہیں اور استغفار ان سے بھلا دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم ان کے ساتھ مکر کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم ان کو تھوڑا پکڑ کریں گے اور اچانک ان کو اپنی گرفت میں نہیں لیں گے۔ ایک حدیث میں ہے ''بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے عرض کی: اے میرے رب! میں نے تیری کتنی ہی نافرمانیاں کیں تو نے مجھے سزا نہ دی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانہ کے نبی کی طرف وحی کی اس آدمی سے کہو: میری کتنی ہی تیرے لئے سزائیں ہیں جن کا تو شعور تک نہیں رکھتا، بے شک تیری آنکھوں کا (خوف الٰہی میں رونے سے) خشک ہو جانا اور تیرے دل کی سختی میری جانب سے استدراج ہے اور سزا ہے اگر تو سمجھے''۔ استدراج کا معنی جلدی کو ترک کرنا ہے، اس کا اصل معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے جس طرح تدرج ہوتا ہے اسی سے درجة ہے یہ ایک منزل کے بعد دوسری منزل ہے۔ استدرج فلان فلانا فلاں نے فلاں سے چیز آہستہ آہستہ نکالی۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: درجه إلى كذا، إستدرجه دونوں کا معنی ایک ہے۔ اس نے تدریجا اسے اپنے قریب کیا تو وہ قریب ہو گیا۔

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ میں انہیں مہلت دوں گا اور مدت کو ان کے لئے لمبا کر دوں گا۔ ملاوۃ زمانے کی ایک مدت کو کہتے ہیں۔ أملى الله له اس کو لمبا کر دیا۔ فلوان سے مرادرات اور دن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: و املی لهم میں جلدی انہیں موت نہیں دوں گا۔ معنی ایک ہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۴۵﴾ میرا عذاب قوی اور شدید ہے کوئی مجھ پر غالب نہیں آ سکتا۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

''آیا آپ ان سے کچھ اجرت مانگتے ہیں پس وہ اس تاوان (کے بوجھ) سے دبے جاتے ہیں''۔

کلام اسی طرف راجع ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ کیا تم ان سے ثواب کے طالب ہو اس بات پر جو آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہو۔ وہ اس چٹی میں پڑے ہوئے ہیں وہ اس بوجھ کے نیچے دبے چلے جا رہے ہیں جو انہیں مال خرچ کرنا پڑتا ہے یعنی ان پر کوئی مشقت نہیں بلکہ وہ آپ کی متابعت کے ذریعے زمین کے خزانوں کے مالک بن جائیں گے اور جنات نعیم تک پہنچ جائیں گے۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

''کیا ان کے پاس غیب کی خبر آتی ہے اور وہ اس کو لکھ لیتے ہیں''۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ جو چیز ان سے غائب ہے اس کا علم ان کے پاس ہے فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو وہ کہتے ہیں کیا اس کے باعث ان پر وحی نازل کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں غیب سے مراد لوح محفوظ ہے کیا وہ لوح محفوظ سے لکھتے ہیں جس کے بارے وہ آپ سے مخاصمت کرتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں کہ وہ آپ سے افضل ہیں اور انہیں سزا نہ دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یَكْتُبُوْنَ کا معنی ہے وہ اپنے بارے میں وہ فیصلہ کرتے ہیں جس کا وہ

ارادہ کرتے ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝

''پس انتظار فرمایئے اپنے رب کے حکم کا اور نہ ہو جایئے مچھلی والے کی مانند جب اس نے پکارا اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا''۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کیجئے (1)۔ یہاں حکم، قضا کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو رسالت کی تبلیغ کا حکم دیا ہے اس پر صبر کیجئے۔ ابن بحر نے کہا: اپنے رب کی نصرت (میں تاخیر) پر صبر کیجئے۔ قتادہ نے کہا: جلدی نہ کیجئے اور ناراض نہ ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد ضرور کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت، آیت سیف سے منسوخ ہے۔

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں یعنی غضب، اندرونی پریشانی اور جلد بازی میں حضرت یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جایئے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرتا ہے اور صبر کا حکم دیتا ہے جس طرح صاحب حوت نے جلدی کی اللہ کا رسول جلدی نہیں کرتا (2)۔ اس کی وضاحت سورۂ یونس، سورۂ انبیاء اور سورۂ صافات میں گزر چکی ہے۔ ذی اور صاحب کی اضافت کے بارے میں گفتگو سورۂ یونس میں گزر چکی ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اِذْ نَادٰى جب حضرت یونس نے مچھلی کے پیٹ میں دعا کی لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (3)۔

وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ وہ غم سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ کرب سے بھرے ہوئے تھے۔ پہلا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرا مجاہد کا ہے۔ دوسرا قول عطا اور ابو مالک کا ہے۔ ماوردی نے کہا: دونوں میں فرق یہ ہے کہ غم دل میں ہوتا ہے اور کرب انفاس میں ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مکظوم کا معنی محبوس ہے۔ کظم کا معنی حبس ہے یعنی روکنا۔ اسی معنی میں یہ قول ہے: فلانٌ كَظَمَ غيظه فلان نے اپنا غصہ روک لیا؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کظمہ سے ماخوذ ہے اس سے مراد نفس کی نالی ہے؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ یہ اور دوسری چیزیں سورۂ یوسف میں گزر چکی ہیں۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

''اگر اس کی چارہ سازی نہ کرتا اس کے رب کا لطف تو ڈال دیا جاتا اسے چٹیل میدان میں دراں حالیکہ اس کی مذمت کی جاتی۔ پھر چن لیا اس کو اس کے رب نے اور بنا دیا اس کو اپنے نیک بندوں سے''۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ عام قرات تَدٰرَكَهٗ ہے۔ ابن ہرمز اور حضرت حسن بصری نے تدارکہ پڑھا ہے۔ یہ مضارع کا صیغہ ہے اس کی تاء کو دال میں ادغام کیا گیا ہے یہ حال کی حکایت کی تقدیر پر ہے۔ گویا فرمایا: لولا ان کان یقال

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 73　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

فیہ تتدارکہ نعمۃ۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے تدارکتہ پڑھا ہے یہ متن کی کتابت کے خلاف ہے تدارکہ فعل ماضی ہے مذکر ہے نعمۃ کے معنی پر محمول ہے کیونکہ نعمۃ کی تانیث غیر حقیقی ہے تدارکہ نعمۃ کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ نعمۃ کے معنی میں یہاں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی نبوت ہے، یہ ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ عبارت ہے جو پہلے گزر چکی؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد آپ کی یہ دعا ہے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ یہ ابن زید کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نعمت سے مراد مچھلی کے پیٹ سے باہر نکالنا ہے؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد رب کی رحمت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور ان پر نظر شفقت فرمائی۔

لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ تو انہیں پھینکا جاتا جبکہ وہ مذموم ہوتے لیکن انہیں پھینکا گیا جبکہ وہ بیمار تھے اور مذموم نہیں تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں مذموم کا معنی ملیم (ملامت کیا گیا) ہے۔ بکر بن عبد اللہ نے کہا: اس کا معنی گناہگار ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مذموم کا معنی ہر بھلائی سے دور کیے گئے۔ العراء سے مراد ایسی وسیع زمین ہے جس میں پہاڑ اور درخت نہ ہوں جو اس زمین کو ڈھانپ سکیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو قیامت تک وہ مچھلی کے پیٹ میں ہوتے پھر انہیں قیامت کے میدان میں مذموم پھینک دیا جاتا اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: فَلَوْ لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۝ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ (الصافات)۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ اسے پسند کیا اور اسے اختیار کیا۔ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ نے ان کی طرف وحی لوٹا دی آپ کی ذات اور ان کی قوم کے بارے میں آپ کی سفارش کو قبول فرمایا اور ان کی توبہ کو قبول کیا فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ سے مراد ہے آپ کو ایک لاکھ لوگوں سے زائد افراد کی طرف نبی بنا کر مبعوث کیا۔

## وَ اِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ یَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝

''اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کفار پھسلا دیں گے آپ کو اپنی (بد) نظروں سے جب وہ سنتے ہیں قرآن اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے''۔

وَ اِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا، ان یہ مثقلہ سے مخففہ ہے لَیُزْلِقُوْنَكَ یعنی وہ آپ کو نظر لگائیں۔ بِاَبْصَارِهِمْ اس امر کی خبر دی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عداوت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ آپ کو نظر لگائیں (4) تو قریش میں سے چند لوگوں نے آپ کو دیکھا اور انہوں نے کہا: ہم نے آپ کی مثل نہیں دیکھا اور ان کے جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بنی اسد میں نظر لگانے کا عام رواج تھا یہاں تک کہ موٹی گائے یا موٹی اونٹنی ان میں سے کسی کے پاس سے گزرتی تو وہ اس کو نظر لگاتے پھر وہ کہتے: اے لونڈی! ٹوکرا اور درہم لو اور اس اونٹنی کا گوشت لے آؤ۔ وہ اسی حال میں ہوتی کہ موت کے لیے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 73 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 74 4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 438

گر پڑتی تو اسے نحر کر دیا جاتا۔ کلبی نے کہا: عربوں میں سے ایک آدمی تھا جو دو یا تین دن کھانا نہ کھاتا پھر خیمہ کا پردہ اٹھاتا اس کے پاس اونٹ یا بکری گزرتی تو وہ کہتا: میں نے اس سے بہتر اونٹ اور بکری نہیں دیکھی (1)۔ تھوڑی دور ہی وہ چیز جاتی یہاں تک کہ وہ چیز گر جاتی۔ کفار نے اس آدمی سے سوال کیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر لگائیں اس نے ان کی بات مان لی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو اس نے یہ شعر پڑھا:

قد كان قومك يحسبونك سيدًا و إخال أنك سيدٌ معيُونُ

تیری قوم تجھے سردار گمان کرتی ہے جبکہ میرا خیال ہے کہ تو ایسا سردار ہے جس کو نظر لگی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے محفوظ رکھا، تو یہ آیت نازل ہوئی وَ اِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ؛ اسی کی مثل ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ عربوں میں یہ معمول تھا جب ان میں سے کوئی نظر لگانا چاہتا وہ اس کی ذات میں ہو یا مال میں وہ تین دن تک بھوکا رہتا (2) پھر وہ اس کے مال اور نفس کا سامنا کرتا تو وہ کہتا: اللہ کی قسم! میں نے اس سے زیادہ قوی، اس سے زیادہ بہادر، اس سے زیادہ مالدار اور اس سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا تو اسے نظر لگ جاتی تو وہ اس کا مال ہلاک ہو جاتا اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کو نازل فرمایا۔ قشیری نے کہا: اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ نظر اس وقت لگتی ہے جب کسی چیز کو اچھا خیال کیا جائے اور اس پر تعجب کا اظہار کیا جائے ناپسندیدگی اور بغض کی وجہ سے نظر نہیں لگتی؛ اسی وجہ سے فرمایا: یَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ یعنی وہ آپ کی نسبت جنون کی طرف کرتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: مفسرین اور لغت کے علماء کے اقوال اس پر دلالت کرتے ہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے نظر سے ان کی مراد سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا تھا۔ کسی شی کو ناپسند کرنا اس امر کے مانع نہیں کہ دشمنی کی وجہ سے کسی کو نظر لگائی جائے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، اعمش، ابو سلام اور مجاہد نے لیزهقونك پڑھا ہے (3) یعنی تاکہ وہ آپ کو ہلاک کریں۔ یہ قرات تفسیر کے طریقہ پر ہے یہ زهقت نفسه أزهقها سے مشتق ہے اہل مدینہ نے لیزلقونك کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: زَلَقَه، یَزْلِقُه، أَزْلَقَه یُزْلِقُه إِزْلَاقًا جب اسے ایک طرف کر دیا اور اسے دور کر دیا۔ زلق رأسه یزلقه زلقا۔ جب اس کا حلق کیا، اسی طرح ازلقه اور زلقه تزلیقا ہے رجل زلق و زُمَلِق جس کی مثل هُدَبِه ہے اس کی جمع زمالق اور زُمَلِق ہے اس سے مراد وہ مرد ہے جس کو جماع سے قبل انزال ہو جائے۔ اسے جوہری اور دوسرے علماء نے حکایت کیا ہے۔ کلمہ کا معنی ہوگا ایک طرف کرنا اور زائل کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ چیز نہیں ہوگی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی صورت میں واقع ہوگی۔

ہروی نے کہا: ارادہ کیا کہ وہ اپنی نظروں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر لگائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام سے زائل کر دیں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کیا ہے وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اپنی

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 439 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 255 3۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 56

نظروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کر دیں (1) یہ جملہ بولا جاتا ہے: زلق السهم وزهق جب تیر آر پار ہو جائے؛ یہ مجاہد کا قول ہے: وہ اپنی نظر کی شدت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کر دیں (2)۔ کلبی نے کہا: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھاڑ دیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے نیز سدی اور سعید بن جبیر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھیر دیں۔ عوفی نے کہا: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیر ماریں۔ مورج نے کہا: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھسلا دیں۔ نضر بن شمیل اور اخفش نے کہا: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتنہ میں ڈال دیں۔

عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مس کریں۔ امام جعفر صادق نے کہا: تاکہ وہ آپ کو کھا جائیں۔ حضرت حسن بصری اور ابن کیسان نے کہا: تاکہ وہ آپ کو قتل کر دیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے: صرعني بطرفه، قتلني بعينه اس نے مجھے اپنی نظر سے پچھاڑ دیا اور اس نے مجھے اپنی نظر سے قتل کر دیا۔

شاعر نے کہا:

يتقارضون إذا التقَوْا في مجلس نَظَرًا يُزِل مواطئ الأقدام(3)

جب وہ کسی مجلس میں ملتے ہیں وہ گھور کر ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جو قدموں کو اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وہ تیری طرف عداوت سے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ قریب ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرا دیں۔ یہ سب اسی طرف راجع ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ جامع معنی یہ ہے وہ تجھے نظر لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝**

حالانکہ وہ نہیں مگر سارے جہانوں کے لیے وجہ عز و شرف یعنی قرآن نہیں ہے مگر جہانوں کے لیے نصیحت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں مگر جہانوں کے لیے نصیحت جس سے وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی شرف ہے یعنی قرآن شرف ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ** (الزخرف: 44) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جہانوں کے لیے نصیحت ہیں (4)۔ جہان کے لوگ آپ کی اتباع کر کے اور آپ پر ایمان لا کر شرف والے ہو گئے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 439
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 74
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 354
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 74

# سورة الحاقة

(آیاتھا ۵۲) (۶۹ سورۃ الحاقۃ مکیۃ ۷۸) (رکوعاتھا ۲)

تمام کے قول میں یہ سورت مکی ہے، اس کی اکاون آیات ہیں۔

ابوزاہریہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے سورۂ حاقہ کی گیارہ آیات کی تلاوت کی اسے دجال کے فتنہ سے پناہ دے دی گئی جس نے اس سورت کو پڑھا قیامت کے روز سر کے اوپر سے قدموں تک اس کے لیے نور ہوگا''۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳

''وہ ہو کر رہنے والی، کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی اور اے مخاطب! تم کیا سمجھو وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے''۔

اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ مراد قیامت ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا کیونکہ اس میں امور کو واقع کیا جائے گا؛ یہ طبری کا قول ہے گویا اسے لیل نائم کے باب سے بنایا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے حاقہ نام اس لیے دیا کیونکہ یہ بغیر کسی شک و شبہ کے واقع ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اس نے بعض اقوام کے لیے جنت کو ثابت کیا اور کچھ اقوام کے لیے جہنم کو ثابت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر انسان اپنے عمل کی جزا کا حقدار ہو جائے گا۔ ازہری نے کہا: حاققته فحققته أحقه میں نے اس پر غلبہ پانے کی کوشش کی تو میں اس پر غالب آ گیا۔ قیامت غالب آنے والی ہے کیونکہ یہ ہر اس فرد پر غالب آنے والی ہے جو باطل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین میں جھگڑا کرتا ہے۔ صحاح میں ہے: حاقہ اس سے جھگڑا کیا اور ان میں سے ہر ایک نے حق کا دعویٰ کیا جب اس پر غالب آ گیا تو کہا گیا۔ حقه وہ آدمی جو حقیر چیزوں کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے: إنه لَنَزِقُ الحقاق اور یہ کہا جاتا ہے: ما له فيه حقٌّ و حقاقٌ اس کا اس میں نہ کوئی حق ہے اور نہ ہی کوئی جھگڑا ہے۔ تحاق کا معنی باہم جھگڑا کرنا ہے۔ احتقاق کا معنی جھگڑنا ہے۔ حاقه، حقه اور حق تینوں لغتیں ایک معنی میں ہیں۔ کسائی اور مورج نے کہا: حاقہ سے مراد یوم حق ہے (1)۔ عرب کہتے ہیں: لَمَّا عَرَفَ الحَقَّةَ مني هرب جب اس نے میرا حق پہچانا تو بھاگ گیا۔ پہلے الحاقہ کو مبتدا ہونے کی حیثیت سے رفع دیا اور خبر دوسرا الحاقہ اور اس کی خبر ہے وہ مَا الْحَآقَّةُ ہے کیونکہ اس کا معنی ماھی ہے لفظ استفہام کا ہے اس کا معنی تعظیم اور تفخیم شان ہے جس طرح تو کہتا ہے: زید ما زید یہاں بھی مقصود عظمت شان کا اظہار ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 441

وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ یہ بھی جملہ استفہامیہ ہے یعنی کس چیز نے تجھے بتایا کہ وہ دن کیا چیز ہے؟ نبی کریم ﷺ قیامت کے بارے میں آگاہ تھے مگر صفت کے اعتبار سے، اس کی تفخیم شان کے لیے کہا گیا۔ وما ادراك ما هي گویا جب آپ ﷺ نے اس کا معائنہ کیا تو تو اس کو جانتا ہی نہیں۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس سے آگاہ کر دیا اور علم عطا فرما دیا اور جہاں بھی وما يدريك ہے اس کے بارے میں علم عطا نہیں فرمایا (1)۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: ہر وہ چیز جس کے بارے میں فرمایا: وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ اس کے بارے میں خبر دی اور ہر وہ چیز جس کے بارے میں فرمایا: وما يدريك اس کے بارے میں خبر نہیں دی گئی۔

## كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝

''جھٹلایا ثمود اور عاد نے ٹکرا کر پاش پاش کرنے والی کو''۔

جنہوں نے قیامت کو جھٹلایا اس کا ذکر فرمایا۔ قارعہ سے مراد قیامت ہے (2)۔ اسے یہ نام اس لیے دیا کیونکہ یہ لوگوں کو اپنی ہولناکیوں سے کھٹکھٹاتی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اصابتهم قوارع الدهر انہیں حادثات زمانہ پہنچے۔ نعوذ بالله من قوارع فلان ولواذعه و قوارص لسانه ہم فلاں کی طرف سے دی جانے والی مصیبتوں، آفتوں اور بدکلامیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ قوارص یہ قارصہ کی جمع ہے جس کا معنی تکلیف دہ کلمہ ہے۔ قوارع القرآن، اس سے مراد وہ آیات ہیں جو انسان، جنوں یا انسانوں سے خوفزدہ ہو کر پڑھتا ہے جس طرح آیت الکرسی، گویا یہ شیطان کو کھٹکھٹاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے قارعہ یہ قرعہ سے ماخوذ ہے (3) یعنی وہ بعض لوگوں کو بلند اور بعض کو پست کر دیتی ہے؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قارعہ سے مراد ایسا عذاب ہے جو دنیا میں ان پر نازل ہوا۔ ان کا نبی انہیں اس بارے میں خبردار کرتا تھا تو وہ اس نبی کی تکذیب کرتے تھے۔ قوم ثمود جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی (4)، ان کی بستیاں شام اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھیں۔ محمد بن اسحاق نے کہا: یہ وادی قریٰ ہے۔ یہ عرب تھے، جہاں تک عاد کا تعلق ہے وہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی۔ ان کی بستیاں احقاف کے علاقہ میں تھیں۔ احقاف سے مراد عمان سے لے کر حضرموت تک کا ریتلا علاقہ ہے اور پورا یمن مراد ہے۔ یہ عربی تھے، بڑے مضبوط جسم والے تھے؛ محمد بن اسحاق نے اس کا ذکر کیا۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

## فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝

''پس ثمود تو انہیں ہلاک کر دیا گیا، سخت چنگھاڑ سے''۔

اس میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے بالفعلة الطاغية۔ قتادہ نے کہا: تقدیر کلام یہ ہے بالصيحة الطاغية جو حد سے تجاوز کرنے والی تھی یعنی ہولناکی میں چیخوں کی حد سے تجاوز کرنے والی تھی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ (القمر) طغیان سے مراد حد سے تجاوز کرنا ہے؛ اس سے یہ ہے اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) یعنی اس نے حد سے تجاوز کیا۔ کلبی نے کہا: الطاغية سے م[illegible] الصاعقہ ہے (5)۔ مجاہد نے کہا: گناہوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 76 2۔ زاد المسیر، جلد 5، صفحہ 106 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 76 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

کے بدلے میں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سرکشی کے باعث۔ یہ مصدر ہے جس طرح کاذبہ، عاقبہ اور عافیہ مصدر ہے یعنی انہیں طغیان اور کفر کے باعث ہلاک کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: طاغیۃ سے مراد اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا ہے (1)؛ یہ ابن زید کا قول ہے یعنی انہیں ہلاک کیا گیا اس کے باعث جوان کے طاغیہ نے کہا کہ اونٹنی کی کونچیں کاٹیں۔ وہ ایک تھا۔ ان سب کو ہلاک کیا گیا کیونکہ وہ اس کے فعل پر راضی تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ اسے طاغیہ کا نام دیا جس طرح کہا جاتا ہے: فلان راویۃ الشعر فلاں شعر روایت کرنے والا ہے اس طرح داھیۃ، علامہ اور نسابہ ہے۔

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝

”رہے عاد تو انہیں برباد کر دیا گیا آندھی سے جو سخت سرد بے حد تند تھی، اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی تو تو دیکھتا قوم عاد کو ان دنوں کہ وہ گرے پڑے ہیں گویا وہ ٹنڈ ہیں کھوکھلی کھجور کے“۔

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ، صرصر یعنی ٹھنڈی جو اپنی ٹھنڈک کے ساتھ جلا دیتی ہے جس طرح آگ جلاتی ہے؛ یہ صِرّ سے ماخوذ ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد سخت آواز ہے۔ مجاہد نے کہا: سخت زہریلی۔ عَاتِيَةٍ ۝ وہ اپنے خازنوں پر سرکش ہوگئی اور اس نے ان کی اطاعت نہ کی اور اس ہوا کے تیز چلنے کی وجہ سے اس پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ ہوا اللہ تعالیٰ کے غضب کی وجہ سے غضب ناک ہوئی۔

عَاتِيَةٍ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قوم عاد پر سرکش ہوگئی اور ان پر غالب آ گئی۔ سفیان ثوری نے موسیٰ بن مسیب سے وہ شہر بن حوشب وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ہوا کا جھونکا نہیں بھیجتا مگر ایک پیمانہ سے اور پانی کا قطرہ نہیں بھیجتا مگر اندازہ سے مگر قوم عاد اور قوم نوح کے دن کیونکہ پانی حضرت نوح علیہ السلام کے دن خازنوں پر سرکش ہو گیا خازنوں کو اس پر گرفت کی کوئی صورت نہ رہی“ پھر اس آیت کی تلاوت کی اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ (الحاقۃ) اور ہوا جب قوم عاد کا دن آیا تو وہ اپنے خازنوں پر سرکش ہوگئی تو ان خازنوں کو ہوا پر کوئی غلبہ نہ رہا“ پھر اس آیت بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ کی تلاوت کی سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا اور اسے ان پر مسلط کیا (3)۔ تسخیر کا معنی ہے کسی شی سے قدرت کے ساتھ کام لینا۔

سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا پے در پے ان میں کوئی انقطاع نہیں؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ فراء نے کہا: حسوم سے مراد پے در پے کسی عمل کو کرنا ہے (4)۔ یہ حسم الداء سے مشتق ہے جب مریض کو کا دیہ سے پے در پے داغا جائے۔ عبدالعزیز بن زرارہ نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 76
2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 61
3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 441
4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 63

ففرق بینهم زمان تتابع فیه أعوامٌ حسومُ(☆)

مبرد نے کہا: یہ تیرے قول حسمت الشیئ سے ماخوذ ہے جب تو اسے کاٹے اور دوسرے حصے سے جدا کرے۔ اور ایک قول یہ ہے: حسم سے مراد استئصال ہے اور تلوار کو حسام کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دشمن کو دشمنی کی شدت کی وجہ سے وہاں سے کاٹ دیتی ہے جہاں سے دشمن چاہے۔ شاعر نے کہا:

حُسَامٌ إذا قمتُ مُعْتَضِدًا به كَفَى الْعَوْدَ منه البَدْءَ ليس بِمِعْضَدِ

وہ ایسی تلوار ہے جو میں اسے بغل میں لے کر کھڑا ہوتا ہوں تو اسی کا پہلا وار دوسرے کو کافی ہو جاتا ہے یہ درانتی نہیں۔

اس کا معنی ہے ہوا نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ یہ جڑ سے اکھاڑ دینے والے عذاب کے ساتھ قطع کرنے والی ہے۔ ابن زید نے کہا: ہوا نے انہیں ہلاک کر دیا ان میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑا(1)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: ہوا راتوں اور دنوں میں پے در پے آئی یہاں تک کہ انہیں ہر طرف سے گھیر لیا(2) کیونکہ پہلے دن یہ ہوا سورج کے طلوع ہونے کے وقت شروع ہوئی اور آخری دن سورج کے غروب ہونے کے وقت ختم ہوئی۔ لیث نے کہا: حسوم سے مراد نحوست ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: یہ نحوست کی راتیں ہیں، یعنی بھلائی کو ان کے اہل سے ختم کرنے والیاں ہیں؛ صحاح میں یہ قول کیا ہے۔ عکرمہ اور ربیع بن انس نے کہا: مراد نحوست والے(3)؛ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (فصلت: 16)۔ عطیہ عوفی نے کہا: حُسُوْمًا سے مراد ہے جنہوں نے بھلائی کو ان کے اہل سے ختم کر دیا(4)۔ اس کے پہلے دن کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اتوار کی صبح؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جمعہ کے دن کی صبح؛ یہ ربیع بن انس کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بدھ کی صبح؛ یہی یحییٰ بن سلام اور وہب بن منبہ نے کہا۔ وہب نے کہا: وہ دن جنہیں عرب ایام عجوز کہتے ہیں وہ ٹھنڈے اور شدید ہوا والے تھے۔ اس کا پہلا دن بدھ تھا اور آخری دن بھی بدھ تھا۔ انہیں ایک بوڑھی کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ قوم عاد کی ایک بوڑھی درندے کی ایک بل میں داخل ہوئی، ہوا نے اس کا پیچھا کیا اور آٹھویں دن اس کو قتل کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں ایام عجوز اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ موسم سرما کے آخر میں واقع ہوئے۔ سریانیوں کے زبان میں یہ آزار (مارچ) کے مہینہ میں ہوا ہے۔

حُسُوْمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: تحسمهم حسوما انہیں فنا کر دے گی۔ یہ مفعول مطلق ہے تاکید کے لیے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول لہ ہو یعنی ان کی جڑ ختم کرنے کے لیے ہوا کو اتنی مدت ان پر مسلط کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حاسم کی جمع ہو۔ سدی نے حُسُوْمًا پڑھا ہے۔ یہ ریح سے حال ہے یعنی ہوا کو ان پر مسلط کیا، اس حال میں کہ وہ ان کی جڑ ختم کرنے والی تھی۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 78 2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 77 4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 442

☆۔ ان کے درمیان ایسے زمانے نے جدائی ڈال دی جس میں دائمی والے سال پے در پے آئے۔

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا ھا ضمیر سے مراد راتیں اور دن ہیں (1)۔ صَرْعٰى یہ صریع کی جمع ہے یعنی مردہ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھا ضمیر سے مراد ہوا ہے كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ اعجاز کا معنی تنے ہیں۔ خاوية بوسیدہ؛ یہ ابو طفیل کا قول ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اندر سے خالی، ان میں کچھ بھی نہ تھا۔ نخل مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر فرمایا: كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝ (القمر) یہ احتمال موجود ہے کہ انہیں ایسی کھوروں سے تشبیہ دی گئی جو اپنی جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دی گئیں۔ یہ اس امر کی خبر ہے کہ ان کو ختم کرنا بڑا عظیم امر تھا۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد جڑیں ہوں تنے نہ ہوں یعنی ہوا نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا یہاں تک کہ وہ یوں ہو گئے جس طرح کھجور کی ایسی جڑیں ہوں جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ہوا ان کے پیٹوں میں داخل ہوتی تو انہیں ہلاک کر کے رکھ دیتی جس طرح وہ کھجور ہو جو اندر سے کھوکھلی ہو۔ ابن شجرہ نے کہا: ہوا ان کے مونہوں میں داخل ہوتی اور ان کے پیٹوں میں جو انتڑیاں وغیرہ تھیں، ان کو باہر نکال دیتی تو وہ اس کھجور کی طرح ہو گئے جو اندر سے کھوکھلی تھی (3)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: خاویہ کہا کیوں کہ ان کے بدن روحوں سے خالی ہو گئے تھے جس طرح کھوکھلا تنا ہوتا ہے (4)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ معنی ہو گویا کھجور کے ایسے تنے ہیں جو اپنی جڑوں سے خالی ہو چکے تھے جو زمین میں گڑھی ہوتی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً (النمل:52) یعنی وہ کھنڈر ہے ان میں کوئی رہائش نہیں۔ خاویہ کا معنی بوسیدہ بھی ہوسکتا ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا کیونکہ جب وہ بوسیدہ ہو جاتا ہے تو اس کا پیٹ خالی ہو جاتا ہے۔ جب وہ ہلاک کیے جا چکے تو انہیں کھجور کے کھوکھلے تنوں کے ساتھ تشبیہ دی۔

## فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝

''کیا تمہیں نظر آتا ہے ان کا کوئی باقی ماندہ فرد''۔

یہاں بَاقِيَةٍ سے پہلے فرقة یا نفس محذوف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں بَاقِيَةٍ، بقیہ کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بقاء کے معنی میں ہے، یہ فاعلة کا وزن ہے۔ مصدر کے معنی میں ہے جس طرح عاقبہ اور عافیہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اسم ہو کیا تم ان میں سے کسی کو باقی پاتے ہو۔ ابن جریج نے کہا: وہ سات راتیں اور آٹھ دن تھے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا کی صورت میں جو عذاب آیا اس میں وہ زندہ رہے جب آٹھویں دن کی صبح کی تو وہ مر گئے۔ ہوا نے انہیں اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝ اور فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ (الاحقاف:25) کا یہی معنی ہے۔

## وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝

''اور فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور الٹائی جانے والی بستیوں کے باشندوں نے غلطی کا ارتکاب کیا''۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قِبَلَهٗ ابو عمرو اور کسائی نے وَمَنْ قِبَلَهٗ پڑھا ہے، یعنی قاف کے نیچے کسرہ اور باء پر زبر۔ معنی ہوگا جو اس کے ساتھ تھے اور لشکروں میں سے جو اس کے پیروکار تھے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے حضرت عبد اللہ اور حضرت ابی کی

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 442 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 78 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

قرأت ومن معه پر اعتبار کرتے ہوئے اسے پسند کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اسے ومن تلقاء کی قرأت کی باقی قراء نے قبله قرأت کی مراد ہے جو سابقہ قومیں گزر چکی تھیں (1)۔

وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ اس سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کے لوگ ہیں۔ عام قرأت الف کے ساتھ ہے۔ حضرت حسن بصری اور جحدری نے والمؤتفكة قرأت کی ہے۔ قتادہ نے کہا: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیوں کو موتفکات کا نام دیا کیونکہ انہیں ان لوگوں کے ساتھ الٹایا گیا تھا۔ طبری نے محمد بن کعب قرظی سے یہ ذکر کیا ہے: وہ پانچ بستیاں تھیں صبعہ، صعرہ، عمرہ، دوما اور سدوم۔ یہ بڑی بستی تھی۔ بِالْخَاطِئَةِ ۝ اس سے پہلے الفعلة کا لفظ محذوف ہے۔ اس سے مراد معصیت اور کفر ہے۔ مجاہد نے کہا: مراد وہ خطائیں ہیں جو وہ کیا کرتے تھے۔ جرجانی نے کہا: مراد بڑی خطا ہے خاطئة مصدر ہے۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰

''پس انہوں نے نافرمانی کی اپنے رب کے رسولوں کی تو اللہ نے پکڑ لیا انہیں بڑی سختی سے''۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ کلبی نے کہا: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول سے مراد حضرت لوط علیہ السلام ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: مراد حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہ السلام ہیں جس طرح فرمایا: فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ (الشعراء) ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول سے مراد رسالت ہے؛ بعض اوقات رسالت کو رسول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس قول فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰ رابیہ ایسی پکڑ جو پکڑوں پر بلند اور زائد ہو اور امتوں کے عذاب پر بلند ہو؛ اسی سے ربا کا لفظ ہے جب سونے اور چاندی میں اس سے زیادہ چیز لی گئی جو دی گئی تھی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ربا الشئ یربو جب وہ زائد ہو جائے اور کئی گنا ہو جائے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی سخت ہے گویا یہ ارادہ کیا وہ شدت میں بڑھ کر ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲

''ہم نے جب سیلاب حد سے گزر گیا تو تمہیں کشتیوں میں سوار کر دیا تاکہ ہم بنا دیں اس واقعہ کو تمہارے لیے یادگار اور محفوظ رکھیں اسے یاد رکھنے والے کان''۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ جب پانی بلند ہو گیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: پانی اللہ تعالیٰ کے لیے غضب کی وجہ سے فرشتوں میں سے خازنوں پر سرکش ہو گیا (2)۔ وہ خزان اسے قابو رکھنے پر قادر نہ ہوئے۔ قتادہ نے کہا: ہر چیز پر پندرہ ہاتھ بلند ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پانی اپنے خازنوں پر سرکش ہو گیا، وہ ان پر بہت زیادہ ہو گیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کتنا پانی نکلا۔ اس سے قبل اور اس کے بعد کوئی قطرہ نازل نہیں ہوتا مگر معلوم پیمانہ کے ساتھ نازل ہوتا صرف اس دن ایسی صورت نہ تھی۔ سورت کے آغاز میں مرفوع حدیث گزر چکی ہے۔ ان امتوں کے واقعات کے ذکر کرنے کا مقصود اور جو عذاب ان پر آئے، ان کے ذکر کا مقصود یہ ہے کہ اس امت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں ان کفار کی اقتدا سے روکا جائے۔ پھر ان پر یہ احسان جتلایا کہ انہیں ان لوگوں میں سے بنایا جو اس غرق ہونے سے نجات پانے والے تھے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 78 2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 79

فرمایا: حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں اٹھا لیا جبکہ تم ان کی پشتوں میں تھے۔ اس کشتی میں جن کو اٹھایا گیا تھا وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد تھی۔ روئے زمین پر جو بھی انسان ہیں انہیں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً، ھا ضمیر سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت کے لیے نصیحت بنا لیا یہاں تک کہ اس کے اوائل نے اس کشتی کو پایا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس کے تختے جودی پہاڑ پر تھے (2)۔ معنی یہ ہے میں نے تمہارے لیے ان لکڑیوں کو باقی رکھا تاکہ تم اس کو یاد کرو جو قوم نوح پر واقع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے آباء کو جو نجات دی اسے یاد کرو۔ کتنی کشتیاں ہیں جو ہلاک ہوئیں اور مٹی ہو گئیں اور ان میں سے کوئی چیز باقی نہ رہی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تاکہ ہم اس فعل ''یعنی قوم نوح کو غرق کرنا اور جو ایمان لایا تھا اسے نجات دینا'' کو تمہارے لیے نصیحت بنا دیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝ یعنی اسے یاد رکھیں اور اسے کان سنیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ آیا ہے اسے یاد رکھیں۔ سفینہ کی صفت اس کے ساتھ نہیں لگائی جا سکتی۔ زجاج نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے وعیت کذا اعیه وعیا اسے میں نے اپنے دل میں یاد کیا۔ وَعیتُ العلم، وعیت ما قلت، سب کا ایک ہی معنی ہے۔ أدعیت المتاع فی الوعا میں نے برتن میں سامان کو محفوظ کیا۔ زجاج نے کہا: ہر وہ چیز جس کو تو اپنی ذات کے علاوہ کسی اور چیز میں محفوظ رکھے، اس کے لیے أوعیته کا لفظ بولا جاتا ہے جسے تو اپنی ذات میں محفوظ رکھے اس کے لیے وعیته کا لفظ بولا جاتا ہے (3)۔ طلحہ، حمید اور اعرج نے وتعیھا عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اسے ارنا کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ عاصم اور ابن کثیر سے اس بارے میں اختلاف مروی ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: 37) قتادہ نے کہا: اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ سے مراد ایسے کان ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ سے سمجھ بوجھ نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے جو کچھ سنا اس سے فائدہ اٹھایا (4)۔ مکحول نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بھی کوئی چیز نہیں سنی جسے میں بھول گیا ہوں بلکہ میں نے اسے یاد رکھا؛ ماوردی نے اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن بصری سے بھی اسی طرح مروی ہے؛ ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ کہا: جب وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! میں نے اپنے رب سے سوال کیا ہے کہ اسے تیرے کان بنا دے'' (5)۔ حضرت علی شیر خدا نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس کے بعد کوئی چیز نہیں بھولا اور میرے لیے زیبا نہیں کہ میں کسی چیز کو بھولوں۔ ابو برزہ اسلمی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: ''اے علی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے قریب کروں اور تجھے دور نہ کروں، میں تجھے تعلیم دوں اور تو اسے یاد رکھے'' (6)۔ در منثور میں الفاظ اس طرح ہیں ''تجھ پر لازم ہے تو اسے یاد رکھے، اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ تجھے یاد رکھے''۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 80 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً
5۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 189 6۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 67

''پھر جب پھونک ماردی جائے گی صور میں ایک بار''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت پہلا نفخہ ہے(1)۔ اس وقت ہر کوئی مرجائے گا۔ نفخ کو مذکر لانا بھی جائز ہے کیونکہ نفخہ کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نفخہ سے مراد دوسرا نفخہ ہے۔ فرمایا: نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ یعنی اس کو دوبارہ نہیں پھونکا جائے گا۔ اخفش نے کہا: فعل، نفخہ پر واقع ہوا کیونکہ اس سے پہلے کوئی اسم مرفوع نہیں تو اسے نفخۃ کہا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو۔ ابوسمال نے اسے یوں ہی پڑھا ہے یا کہا جاتا ہے: صرف فعل کے ساتھ خبر دینے پر اقتصار کیا گیا ہے جس طرح تو کہتا ہے: ضرب ضربا زجاج نے کہا: فی الصور نائب فاعل کے قائم مقام ہے۔

وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾

''اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی دفعہ چور چور کر دیا جائے گا''۔

وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ عام قرات میم کی تخفیف کے ساتھ ہے یعنی انہیں اپنی جگہوں سے اٹھا لیا جائے گا(2)۔ فَدُكَّتَا انہیں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا دَكَّةً وَّاحِدَةً۔ دکۃ میں نصب ہی جائز ہے کیونکہ فَدُكَّتَا میں ضمیر مرفوع ہے فراء نے کہا: فدککن نہیں کہا کیونکہ تمام پہاڑوں کو ایک پہاڑ کی طرح بنا دیا گیا اور زمین کو ایک بنا دیا گیا(3)۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا (الانبیاء: 30) یہاں بھی کن نہیں فرمایا یہ دلنزلہ کی طرح ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۱﴾ (الزلزلہ) ایک قول یہ کیا گیا ہے دکتا کا معنی ہے دونوں کو ایک ہی دفعہ پھیلا دیا جائے گا اسی سے اندک سنام البعیر ہے جب اس کی کہان اس کی پشت میں پھیل جائے۔ سورۃ الاعراف میں اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ عبدالحمید نے ابن عامر سے یہ قرات نقل کی ہے وحُمِّلَتِ الأرض و الجبال یعنی تشدید کے ساتھ اسے پڑھا ہے کیونکہ فعل دوسرے فعلوں کی طرف متعدی ہے گویا اصل کلام یوں ہے وحملت قدرتنا أو مَلَكًا من ملائکتنا الأرض و الجبال پھر فعل کو دوسرے فعلوں کی طرف منسوب کیا گیا تو اس کے لئے یہ صیغہ بنایا گیا۔ اگر پہلا مفعول لایا جائے تو فعل کو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ گویا فرمایا: وحملت قدرتنا الأرض کبھی قلب کے طریقہ پر دوسرے مفعول کے لئے اسے مجہول کا ذکر کرنا بھی جائز ہے تو کہا جائے گا: حملت الأرض الملك جس طرح تیرا قول ہے: أُلبِسَ زيدٌ الجبة اور أُلبِسَتْ الجبةُ زيدا۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّ الْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾

''تو اس روز ہونے والا واقعہ ہو جائے اور آسمان پھٹ پڑے گا تو وہ اس دن بالکل جدا ہوگا اور فرشتے اس کے کناروں پر مقرر کر دیئے جائیں گے اور آپ کے رب کے عرش کو اس روز اپنے اوپر آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا''۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 442 2۔ ایضاً 3۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 109

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ جس روز قیامت قائم ہوگی (1) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ آسمان پھٹ جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ پھٹ جائے گا کہ جو فرشتے اس میں ہیں وہ نیچے اتر آئیں گے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ (الفرقان) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ وہ اس دن کمزور ہو گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: وھی البناء یَھِی وَھْیًا فھو واہٍ جب وہ بہت کمزور ہو جائے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کلام واہٍ ضعیف کلام۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنی سختی کے بعد کمزوری میں اون کی طرح ہو جائیں گے۔ یہ فرشتوں کے نازل ہونے کے لئے ہوگا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے ایسا ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّاهِيَةٌ کا معنی ہے اس میں سوراخ ہو جائیں گے؛ یہ ابن شجرہ نے کہا ہے (2)۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: وھی السقاء جب اس میں سوراخ ہو جائیں۔ ان کی امثال میں سے ہے:

خَلِّ سبیلَ من وَهَى سِقاءه و من هُرِيق بالفلاة ماءه

اس آدمی کا راستہ چھوڑ دے جس کا مشکیزہ پھٹ گیا ہو اور جس کا پانی جنگل میں بہہ گیا ہو۔ یعنی جو کمزور عقل والا ہو وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ وَّالْمَلَكُ اس سے مراد فرشتے ہیں یہ اسم جنس ہے عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا جب آسمان پھٹ جائے گا تو فرشتے اس کی اطراف میں ہوں گے کیونکہ آسمان میں ان کا مکان تھا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ماوردی نے کہا: شاید یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ ثعلبی نے اسے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ کہا: اس کے ان اطراف پر جو پھٹی نہیں۔ یہ ارادہ کیا کہ آسمان فرشتوں کا مکان ہے جب وہ پھٹ گیا تو وہ اس کی اطراف میں چلے گئے۔ سعید بن جبیر نے کہا: معنی ہے فرشتے دنیا کی اطراف میں ہونگے یعنی زمین کی طرف اتریں گے اور اس کی اطراف کی نگہبانی کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا تو فرشتے ان ٹکڑوں پر کھڑے ہو جائیں گے جو خود نہیں پھٹے ہونگے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگ جب جہنم دیکھیں گے تو جہنم ان کو خوفزدہ کر دے گی تو وہ یوں بھاگ کھڑے ہونگے جس طرح اونٹ بھاگتا ہے وہ زمین کے کسی کونے میں نہیں آئیں گے مگر وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو جہاں سے آئے تھے واپس چلے جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس کی اطراف میں انتظار کر رہے ہونگے کہ جہنمیوں کے بارے میں انہیں جو حکم دیا جاتا ہے کہ انہیں جہنم میں ہانک دیا جائے اور اہل جنت کے بارے میں سلام اور کرامت کا حکم دیا جائے۔ یہ سب ابن جبیر کے قول کے معنی کی طرف راجع ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ (الفرقان) اور يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الرحمن: 33) اس پر دلالت کرتا ہے جس طرح ہم نے وہاں بیان کیا ہے۔ ارجاء کا معنی اطراف ہے، یہ ہذیل کی لغت ہے اس کا واحد رجا ہے اس کی تثنیہ رجوان ہے جس طرح عصا اور عصوان ہے۔ شاعر نے کہا:

فلا يُرْمَى بِىَ الرَّجَوَان أنّى أقلُّ القومِ من يُغني مكاني

مجھے دونوں طرفوں میں نہیں پھینکا جا سکتا میں قوم میں سب سے قلیل ہوں میرے مکان سے کون بے نیاز ہو سکتا ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 443 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 81

یہ لفظ کنویں اور قبر کے کنارے کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔

وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرشتوں کی آٹھ صفیں ہوں گی (1) جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ آٹھ فرشتے ہیں (2)۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آٹھ ہیں یا آٹھ ہزار ہیں (3)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''آج عرش کو اٹھانے والے چار ہیں جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ چار اور سے ان کی مدد کرے گا وہ آٹھ ہو جائیں گے''۔ ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یحمله الیوم أربعة و هم یوم القیامة ثمانیة آج چار اسے اٹھائے ہوئے ہیں قیامت کے روز وہ آٹھ ہونگے۔ عباس بن عبدالملک نے کہا: وہ پہاڑی بکروں کی شکل میں آٹھ فرشتے ہیں، اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''ان فرشتوں میں سے ہر ایک کے چار منہ ہیں انسان کا چہرہ، شیر کا چہرہ، بیل کا چہرہ اور گدھ کا چہرہ۔ ہر چہرہ اپنی جنس کے لئے رزق طلب کرتا ہے'' (4) جب امیہ بن ابی صلت کے اشعار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھے گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے سچ کہا''۔

رَجُلٌ و ثَوْرٌ تحت رِجل یمینه و النَّسْرُ للأخریٰ و لَیْثٌ مُرْصَدُ

و الشمس تطلع كلّ آخر لیلة حمراء یُصبح لَوْنُها یَتَوَرَّدُ

لیست بطالعة لهم فی رِسْلِها إلّا مُعَذَّبَةً و إلّا تُجْلَدُ

حدیث طیبہ میں ہے: ''ساتویں آسمان کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں ان کے کھروں کے گھٹنوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا فاصلہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے ان کی پشتوں پر عرش ہے'' (5)۔ قشیری نے یہ ذکر کیا ہے۔ امام ترمذی نے حضرت عباس بن عبدالمطلب کی حدیث تخریج کی ہے: سورۂ بقرۃ میں وہ مکمل گزر چکی ہے۔ ثعلبی نے اسی کی مثل اور اس کے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ حدیث مرفوع میں ہے: ''عرش کو اٹھانے والے آٹھ فرشتے ہیں جو پہاڑی بکروں کی شکل پر ہیں ان کے کھروں اور گھٹنوں کے درمیان تیز رفتار پرندے کے لئے ستر سال کی مسافت ہے''۔ کلبی کی تفسیر میں یہ الفاظ ہیں ثمانیة أجزا من تسعة أجزاء من الملائكة ان سے یہ بھی مروی ہے ثمانیة أجزاء من عشرة أجزاء من الملائكة پھر ملائکہ کی تعداد کا ذکر کیا جس کا ذکر طویل ہے۔ پہلا قول ثعلبی نے ان سے نقل کیا اور دوسرا قول قشیری نے نقل کیا ہے۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: ثمانیة أجزاء من تسعة یہی مقرب فرشتے ہیں (6)۔ عرش کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اسی طرح ہے جس طرح بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، بیت رہائش کے لیے نہیں یہی کیفیت عرش کی ہے۔ فَوْقَهُمْ کا معنی ہے ان کے سروں کے اوپر۔ سدی نے کہا: عرش کو حاملین عرش اپنے اوپر اٹھائے

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 443
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 190
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 82
4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 443
5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ حاقہ، جلد 2، صفحہ 167
6۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 82

ہوئے ہونگے جبکہ عرش کو اٹھانے والوں پر رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَوْقَهُمْ سے مراد ہے عرش کو اٹھانے والے فرشتے ان فرشتوں کے اوپر ہوں گے (1) جو آسمان میں اس کی اطراف میں ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَوْقَهُمْ سے مراد فوق أهل القيامة ہے۔

## يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ⑱

''وہ دن جب تم پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہ رہے گا''۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ جس روز تمہیں اللہ تعالیٰ پر پیش کیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا (الکہف: 48) یہ وہ پیشی نہیں جس کے ذریعے اس چیز کو جانا جائے جس سے پہلے آگاہ نہ ہو، بلکہ اس کا معنی حساب ہے اور جزا کے لئے ان پر اعمال واضح کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز لوگوں کی تین پیشیاں ہونگی جہاں تک دو پیشیوں کا تعلق ہے وہ جھگڑا اور معذرت ہے، جہاں تک تیسری پیشی کا تعلق ہے اس موقع پر صحیفے ہاتھوں میں اڑ کر پہنچیں گے کوئی اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے گا اور کوئی اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے گا'' (2)۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ حضرت حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل نہیں کی۔

لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ⑱ وہ تمہارے اعمال میں سے ہر عمل کو جانتا ہے اس تعبیر کی بنا پر خَافِيَةٌ خفیہ کے معنی میں ہے وہ اپنے اعمال چھپایا کرتے تھے؛ یہ ابن شجرہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کوئی انسان اس پر مخفی نہیں رہے گا یعنی کوئی انسان باقی نہیں رہے گا جس کا محاسبہ نہ ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: مومن کافر سے اور نیک فاجر سے مخفی نہیں رہے گا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہاری شرمگاہیں پردہ میں نہ ہونگی۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگ ننگے پاؤں اور ننگے بدن اٹھائے جائیں گے'' (4)۔ عاصم کے علاوہ کوفیوں نے لا یخفی پڑھا ہے کیونکہ خافیۃ کی تانیث غیر حقیقی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود: 67) ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ فعل اور اسم مونث کے درمیان جار اور مجرور حائل ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے اسے خافیۃ کی تانیث کی وجہ سے اسے اختیار کیا ہے۔

## فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ⑲ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ⑳ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ㉑ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ㉒ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ㉓ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ㉔ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 82　　2۔ جامع ترمذی، کتاب صفة القيامة، ما جاء في العرض، جلد 2، صفحہ 65

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 82　　4۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها، فناء الدنيا بيان الحشر يوم القيامة، جلد 2، صفحہ 384

فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَاۤ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۝ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

''پس جس کو دیا گیا اس کا نامہ عمل دائیں ہاتھ میں تو وہ (فرط مسرت سے) کہے گا: لو پڑھو میرا نامہ عمل۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا۔ پس یہ (خوش نصیب) پسندیدہ زندگی بسر کرے گا عالیشان جنت میں، جس کے خوشے جھکے ہوں گے (اذن ملے گا) کھاؤ اور پیو مزے اڑاؤ۔ یہ ان اعمال کا اجر ہے جو تم نے آگے بھیج دیے گذشتہ دنوں میں اور جس کو دیا جائے گا اس کا نامہ عمل بائیں ہاتھ میں وہ کہے گا: اے کاش! مجھے نہ دیا جاتا میرا نامہ عمل اور میں نہ جانتا میرا حساب کیا ہے، اے کاش! موت نے ہی (میرا) قصہ پاک کر دیا ہوتا۔ آج میرا مال کسی کام نہ آیا۔ میری بادشاہی بھی فنا ہوگئی (فرشتوں کو حکم ہوگا) پکڑلو اس کو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو پھر اسے دوزخ میں جھونک دو پھر ستر گز لمبے زنجیر میں اس کو جکڑ دو۔ بے شک یہ بد بخت ایمان نہیں لایا تھا اللہ پر جو بزرگ (و برتر) ہے اور نہ ترغیب دیتا تھا مسکین کو کھانا کھلانے کی''۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ دائیں ہاتھ میں کتاب دینا یہ نجات کی دلیل ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس امت میں سب سے پہلے جسے دائیں ہاتھ میں کتاب دی جائے گی وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہونگے، اس کی شعاع یوں ہوگی جس طرح سورج کی شعاع ہوتی ہے۔ ان سے پوچھا جائے گا: ابو بکر کہاں ہیں؟ حضرت عمر کہیں گے: بہت دور، بہت دور! فرشتے اسے گھیرے میں لے کر جنت کی طرف لے گئے ہیں؛ ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے ہم نے ''تذکرہ'' کتاب میں حضرت زید بن ثابت سے مرفوع حدیث انہیں الفاظ اور معنی کے ساتھ نقل کی ہے۔ الحمدللہ

فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝ وہ اسلام پر اعتماد کرتے ہوئے اور اپنی نجات پر خوش ہوتے ہوئے یہ کہے گا کیونکہ یمین عربوں کے اس خوشی کے دلائل اور شمال غم کی نشانیوں میں سے ہے(2)۔ شاعر نے کہا:

أَبِينِي أَ فِي يُمْنَى يَدَيْكِ جَعَلْتِنِي فَأَفْرَحَ أَمْ صَيَّرْتِنِي فِي شِمَالِكِ (3)

مجھ پر واضح کرو کیا تو نے مجھے اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا ہے تو خوش ہوں یا تو نے مجھے بائیں ہاتھ میں رکھا ہے۔

هَآؤُمُ کا معنی ہے آؤ؛ یہ ابن زید کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے لو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یعنی پکڑو۔ اس معنی میں ربا کے بارے میں ایک روایت ہے اور ھاء و ھاء ہر ایک اپنے ساتھی کے بارے میں کہے گا پکڑلو۔ ابن سکیت اور کسائی نے کہا: عرب کہتے ہیں ھاء یا رجل اقرا۔ دو کو کہتے ہیں: ھاء ما یا رجلان۔ ھاؤم یا رجالا۔ عورت کے لئے کہتے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 83 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہیں: ھاءِ، ھاؤما، ھاؤن أصل میں یہ ھاکم تھا۔ کاف کو ہمزہ کی صورت میں بدل دیا ہے؛ یہ قتیبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھاءِ ایسا کلمہ ہے جو نشاط اور فرحت کے وقت بلانے والے کو جواب دینے کے بولا جاتا ہے(1)۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک بدو نے بلند آواز سے بلایا تو نبی کریم ﷺ نے اسے ھاءِ کے ساتھ جواب دیا اور آواز کو لمبا کیا(2) اور کتابیہ یہ کوفیوں کے نزدیک یہ ھاؤم سے منصوب ہے بصریوں کے نزدیک اقرأوا کے ساتھ منصوب ہے کیونکہ دونوں عاملوں میں سے یہ قریبی عامل ہے اصل کتابی ہے ھاء کو داخل کیا گیا ہے تاکہ یاء کے فتحہ کو واضح کیا جائے۔ ھاء وقف کے لئے ہے اسی طرح اس کے أخوات حسابیه، مالیه اور سلطانیه میں ہے سورۂ قارعہ میں ماھیه ہے عام قرات وقف اور وصل دونوں صورتوں میں ھاء کے ساتھ ہے کیونکہ مصحف میں یہ ھاء کے ساتھ ہے اسے ترک نہ کیا جائے گا۔ ابوعبید نے یہ پسند کیا ہے کہ ان پر وقف کیا جائے تاکہ سکتہ میں ھاء کے لاحق کرنے میں لغت کے موافق ہو جائے اور خط کے بھی موافق ہو جائے۔ ابن محیصن، مجاہد، حمید اور یعقوب نے وصل میں ھاء کے حذف اور وقف میں ھاء کو سب میں ثابت رکھا ہے حمزہ نے مالیه اور سلطانیه میں اور سورۂ قارعہ میں ماھیه ان کی موافقت کی ہے مجموعی طور پر یہ سات حروف ہیں۔ ابو حاتم نے یعقوب اور اس کے ساتھیوں کی قرات کو اختیار کیا ہے کیونکہ وہ لغت کی اتباع کرتے ہیں۔ جنہوں نے وصل میں ھاء کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ بھی وقف کی نیت پر ہوگا۔

**اِنِّیْ ظَنَنْتُ** مجھے یقین اور علم ہے(3)؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء سے یہ مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مجھے یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ میرا میرے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ کرے گا۔ اس نے مجھے معاف کرنے کے ساتھ مجھ پر فضل و احسان فرمایا اور میرا مواخذہ نہ کیا۔ ضحاک نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی لفظ ظن استعمال ہوا ہے اس کی نسبت مومن کی طرف ہے(4) تو وہ یقین کے معنی میں ہے اور کافر کی طرف نسبت ہو تو وہ شک کے معنی میں ہے۔ مجاہد نے کہا: آخرت کا ظن یقین ہے اور دنیا کا ظن شک ہے۔ حضرت حسن بصری نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: مومن اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اچھا عمل کرتا ہے اور منافق اپنے رب کے بارے میں برا گمان رکھتا ہے تو وہ برا عمل کرتا ہے۔(5)

**اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۞** میں آخرت میں اپنے حساب کو پانے والا ہوں، میں بعث کا انکار نہیں کرتا یعنی اس نے نجات نہیں پائی مگر اس وجہ سے کہ اسے یوم حساب کا خوف تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ کرے گا تو اس نے آخرت کے لئے عمل کیا۔

**فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۞** وہ ایسی زندگی میں ہوگا جس پر وہ راضی ہوگا اس میں کوئی ناپسندیدہ چیز نہ ہوگی۔ ابوعبیدہ اور فراء نے کہا: راضیة سے مراد مرضیة ہے جس طرح تیرا قول ہے: ماء دافق یہ مدفوق کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ذات رضا کے معنی میں ہے یعنی اس سے اس کا صاحب راضی ہوگا جس طرح لابن اور تامر سے مراد دودھ والا اور کھجور والا ہے۔ صحیح میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: ''وہ زندہ رہیں گے کبھی بھی نہیں مریں گے، وہ صحت مند رہیں گے وہ کبھی بھی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 83 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

بیمار نہیں ہونگے وہ نعمتوں میں ہونگے کبھی تکلیف نہ دیکھیں گے، وہ جوان رہیں گے کبھی بھی بوڑھے نہ ہوں گے'' (1)۔

فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۝ ایسی جنت جونفوس میں عظیم شان والی ہے۔ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ۝ اس کے گچھے قریب ہونگے آسانی سے انہیں حاصل کیا جا سکے گا، کھڑا ہوا، بیٹھا ہوا اور لیٹا ہوا اسے توڑ لے گا۔ اس کی وضاحت سورۃ الدخان میں آئے گی۔ قطوف یہ قطف کی جمع ہے اس سے مراد وہ پھل ہیں جنہیں توڑا جاتا ہے۔ قطف یہ مصدر ہے قطاف یہ توڑنے کا وقت ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا انہیں یہ کہا جائے گا: کھاؤ اور پیو۔ هَنِیْٓـًٔا مبارک ہو اس میں کوئی تکرار اور بدمزگی نہ ہوگی۔ بِمَاۤ اَسْلَفْتُمْ کے بعد كُلُوْا فرمایا کیونکہ پہلے فرمایا: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ، مَنْ اپنے ضمن میں جمع کا معنی لئے ہوئے ہے۔ ضحاک نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ابو سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسد مخزومی کے حق میں نازل ہوئی؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ وہ آیت جو اس کے بعد آرہی ہے وہ اس کے بھائی اسود بن عبد الاسد کے حق میں نازل ہوئی؛ یہ حضرت ابن عباس اور ضحاک کا قول ہے۔ یہ ثعلبی نے کہا ہے: یہ اور اس کا بھائی ان آیات کے نزول کا سبب ہوگا معنی تمام اہل شقاوت اور اہل سعادت کو عام ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان كُلُوْا وَاشْرَبُوْا دلالت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہر وہ آدمی، خیر اور شر میں جس کی پیروی کی جاتی ہے۔ جب کوئی آدمی بھلائی میں سردار ہو، اس کی طرف دعوت دیتا ہو، اس کا حکم دیتا ہو اور اس کے پیروکار زیادہ ہو جائیں اسے اس کے نام اور ان کے باپ کے نام سے بلایا جاتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ قریب ہوتا ہے اس کے لئے سفید کتاب سفید خط سے لکھی ہوئی نکالی جاتی ہے اس کے اندر برائیاں ہوتی ہیں اور اس کے ظاہر میں نیکیاں ہوتی ہیں، وہ برائیوں سے شروع کرتا ہے وہ انہیں پڑھتا ہے وہ ڈرتا ہے، اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے اور اس کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے، جب کتاب کے آخر میں پہنچتا ہے اس میں پاتا ہے: ''یہ تیری برائیاں تھیں میں نے تجھے بخش دیا ہے'' وہ اس پر بہت خوش ہوتا ہے پھر وہ کتاب کو اٹھاتا ہے تو اپنی نیکیوں کو پڑھتا ہے تو اس کی خوشی کے علاوہ کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا یہاں تک کہ جب کتاب کے آخر میں پہنچتا ہے تو اس میں پاتا ہے: ''یہ تیری نیکیاں تھیں تیرے لئے ان میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا ہے'' اس کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے۔ ایک تاج لایا جاتا ہے جو اس کے سر پر رکھا جاتا ہے، اسے دو حلے پہنائے جاتے ہیں ہر جوڑ میں زیورات ڈالے جاتے ہیں، اس کا قد ساٹھ ذراع ہو جاتا ہے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد تھا۔ اسے کہا جاتا: اپنے ساتھیوں کی طرف جاؤ انہیں خبر دو اور بشارت دو کہ ان میں سے ہر انسان کے لئے اس کی مثل ہے۔ جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو کہتا ہے: هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۝ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۝۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ یہاں رَّاضِیَةٍ، مرضیة کے معنی میں ہے جس پر وہ راضی ہوگا۔ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ یعنی باغ آسمان میں ہے قُطُوْفُهَا اس کے پھل اور انگور دَانِیَةٌ ان کے قریب ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہے گا: کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ امت نے تجھے ڈھانپ رکھا ہے تو کون ہے؟ وہ کہے گا: میں فلاں بن فلاں ہوں تم میں سے جو بھی ہے اسے اس کی مثل کی بشارت دے دو كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَاۤ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ تم نے دنیا کے ایام میں آگے بھیجا ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 83

جب ایک آدمی شر میں سردار تھا، اس کی طرف دعوت دیتا تھا، اس کا حکم دیتا تھا اس پر اس کے پیروکار زیادہ ہو گئے اسے اس کے نام اور اس کے باپ کے نام کے ساتھ ندا کی جائے گی وہ اپنے حساب کے لئے آگے بڑھے گا، اس کے لئے ایک سیاہ کتاب سیاہ خط میں نکالی جائے گی اس کے اندر نیکیاں ہونگی اور اس کے باہر برائیاں ہونگی وہ نیکیوں سے شروع کرے گا انہیں پڑھے گا اور وہ گمان کرے گا کہ وہ نجات پا جائے گا جب کتاب کے آخر تک پہنچے گا تو اس میں یہ پائے گا: ''یہ تیری نیکیاں تیرا جو تجھ پر رد کر دی گئی ہیں'' اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا، حزن غالب آ جائے گا اور بھلائی سے مایوس ہو جائے گا۔ وہ اپنی کتاب الٹے گا تو اپنی برائیاں پڑھے گا تو اس کے حزن میں اضافہ ہوگا اس کے چہرے کی سیاہی میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا جب کتاب کے آخر تک پہنچے گا تو اس کے آخر میں پائے گا: ''یہ تیری برائیاں تھیں یہ تجھ پر کئی گنا کر دی جائیں گی'' یعنی عذاب ان پر کئی گنا کر دیا جائے گا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اس نے جو عمل نہیں کیا وہ اس پر زائد کر دیا جائے گا۔ کہا: اسے آگ کے لئے بڑا کر دیا جائے گا، اس کی آنکھیں نیلی ہو جائیں گی اور اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا، اسے تارکول کے پاجامے پہنائے جائیں گے اور اسے کہا جائے گا: اپنے ساتھیوں کی طرف جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ ان میں سے ہر انسان کے لئے اسی کی مثل ہے۔ وہ جائے گا: اور کہے گا ہائے کاش! مجھے کتاب نہ دی جائے اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے، ہائے کاش! یہ موت میرا معاملہ تمام کر دیتی وہ موت کی تمنا کرے گا۔

هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ تفسیر بیان کی ہے: مجھ سے میری محبت ہلاک ہو گئی (1)؛ یہ مجاہد، عکرمہ، سدی اور ضحاک کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: یہاں سلطان سے مراد دنیا میں جو حکومت و بادشاہت تھی۔ یہ آدمی ایسا تھا جس کے ساتھی اطاعت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک لاکھ فرشتے اس کی طرف جلدی کریں گے پھر اس کے ہاتھ کو اس کی گردن کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کے فرمان فَغُلُّوْهُ کا یہی مفہوم ہے اسے طوق کے ساتھ جکڑ دو ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ اسے یوں بنا دو کہ وہ جہنم کی آگ کو تاپتا رہے۔ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہاں کون سا ذراع ہے؟ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرشتوں کے ہاتھ کے برابر ستر ہاتھ (2)۔ نوف نے کہا: ہر ہاتھ ستر باع کا ہوگا اور ہر باع تیرے اور مکہ کے درمیان کا فاصلہ ہے (3)۔ اس وقت وہ کوفہ کے علاقہ میں تھا۔ مقاتل نے کہا: اگر اس کا ایک حلقہ پہاڑ کی چوٹی پر رکھا جائے تو وہ یوں پگھل جائے جس طرح سیسہ پگھل جاتا ہے۔ کعب نے کہا: اس زنجیر کا ایک حلقہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں کیا ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا دنیا کے تمام لوہے کی طرح ہے فَاسْلُكُوْهُ ۝ سفیان نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ اسے اس کی دبر میں داخل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے منہ سے نکالا جائے گا؛ یہ مقاتل کا قول ہے معنی ہے پھر اس میں زنجیر داخل کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی گردن میں وہ زنجیر ڈالی جائے گی پھر اس کے ساتھ اسے کھینچا جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے: ''وہ اس کی دبر سے داخل کی جائے گی اور اس کے نتھنوں سے نکالی جائے گی'' (4) ایک اور روایت میں ہے: ''اس کے منہ سے داخل کی جائے گی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 85
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 191
3۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 76
4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 361

اور اس کی دبر سے نکالی جائے گی' وہ اپنے ساتھیوں کو ندا کرے گا: کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ وہ کہیں گے: نہیں مگر جس ذلت و رسوائی میں تو مبتلا ہے اس کو ہم دیکھ رہے ہیں تو کون ہے؟ وہ اپنے ساتھیوں کو ندا کرے گا: میں فلاں بن فلاں ہوں، تم میں سے ہر انسان کے لئے ایسا ہی عذاب ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ تفسیر صحیح ترین ہے جو اس آیت کے بارے میں کہی گئی ہے اس پر الله تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ (الاسراء: 71) اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے ہم نے اسے سورۃ الاسراء میں بیان کیا ہے، وہاں سے اس میں غور و فکر کر لے۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ یہاں طعام، اطعام کے معنی میں ہے جس طرح عطاء کو اعطاء کی جگہ رکھا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أكُفْرًا بعد رَدِّ الموت عَنِّي و بعد عطائك المائة الرِّتَاعَا

کیا اس کے بعد بھی ناشکری ہو سکتی ہے کہ تو نے موت کو مجھ سے دور کیا اور تو نے سو اونٹ دیئے جو چرنے والے تھے۔

اس شعر میں بھی عطاء، اعطاء کے معنی میں ہے۔ اس امر کو واضح کیا انہیں کھانا کھلانے کے ترک اور بخل کا حکم دینے پر عذاب دیا گیا جس طرح کفر کے سبب سے عذاب دیا گیا۔ حض سے مراد برانگیختہ کرنا ہے۔ لفظ طعام میں اصل تو یہ ہے کہ وہ مصدر مقدر کے ساتھ منصوب ہو طعام سے مراد عینی چیز ہے اسے مسکین کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ مسکین اور طعام میں گہرا تعلق ہے جس طرح اطعام عمل کرتا ہے اسی طرح طعام بھی عمل کرتا ہے پس لفظ مسکین کا محل نصب ہے تقدیر کلام یہ ہوگی علی إطعام المطعم المسکین عامل کو حذف کیا اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخٰطِئُوْنَ ۠

''پس آج یہاں ان کا کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی طعام بجز پیپ کے، جسے کوئی نہیں کھاتا بجز خطا کاروں کے''۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ له، لیس کی خبر ہے ھاھنا اس کی خبر نہیں کیونکہ اسے خبر بنایا جائے تو معنی یہ بنتا ہے وہاں کھانا نہیں مگر غسلین۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ وہاں غسلین کے علاوہ بھی کھانا ہے ھاھنا اس فعل کے متعلق ہے جو لہ کے معنی میں پایا جاتا ہے۔ یہاں حمیم سے مراد قریبی ہے یعنی اس کا کوئی قریبی نہیں جو اس کے لئے نرمی کرے اور اس کا دفاع کرے۔ یہ حمیم سے ماخوذ ہے جس کا معنی گرم پانی ہے کیونکہ دوست وہ ہوتا ہے جو اس کے لئے نرمی کرتا ہے اور اس کا دل اس کے لئے جلتا ہے۔

غِسْلِيْنٍ، یہ غسل سے فعلین کا وزن ہے گویا یہ ان کے بدنوں سے نچڑتا ہے، یہ جہنمیوں کی پیپ ہے جو ان کے زخموں اور شرمگاہوں سے بہتی ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ضحاک اور ربیع بن انس نے کہا: اس سے مراد ایسا درخت ہے جسے جہنمی کھاتے ہیں غسل سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ سر کو دھویا جاتا ہے جس طرح خطمی مٹی وغیرہ (1)۔ اخفش نے کہا: اسی سے غسلین ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو جہنمیوں کے گوشت اور خون سے بہتی ہے اس میں یا، نون کا اضافہ کیا گیا ہے جس طرح عفرین میں اضافہ کیا گیا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد سب سے برا کھانا ہے۔ ابن زید نے کہا: نہ اس کا پتہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 446

ہے اور نہ ہی زقوم کا پتہ ہے کہ وہ کیا ہے؟ ایک اور موقع پر کہا: لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۝ (الغاشیہ)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ضریع بھی غسلین ہی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے آج ان کے لئے وہاں کوئی کھانا نہیں مگر غسلین۔ وہ گرم پانی ہوگا۔

الطعام ان کے لئے ایسا کھانا نہیں ہوگا جس سے وہ نفع اٹھا سکیں۔ لَا یَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ ۝ خاطئون سے مراد گناہ گار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد مشرکین ہیں۔ اسے الخاطیون بھی پڑھا گیا ہے ہمزہ کو یاء سے بدلا گیا ہے اسے حذف کر کے الخاطون بھی پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ خاطون کیا ہے؟ ہم میں سے ہر کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ ابوالاسود نے ان سے روایت نقل کی ہے: یہ خاطون کیا ہے؟ صابون کیا ہے یہ اصل میں صابئون ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مراد وہ لوگ ہوں جو حق سے باطل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝

''پس میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنہیں تم نہیں دیکھتے، بے شک یہ قول ہے عزت والے رسول کا''۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ معنی ہے میں تمام اشیاء کی قسم اٹھاتا ہوں جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنہیں تم نہیں دیکھتے اور لا زائد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے ساتھ سابقہ کلام کا رد کیا گیا ہے (1) یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح مشرک کہتے ہیں: مقاتل نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا: بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جادوگر ہیں (2)۔ ابوجہل نے کہا: وہ شاعر ہیں۔ عقبہ نے کہا: وہ کاہن ہیں۔ نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَاۤ اُقْسِمُ یعنی میں قسم اٹھاتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں لا قسم کی نفی کے لئے ہے کیونکہ حق واضح ہے اس لئے قسم اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر اس کا جواب جواب قسم کی طرح ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ضمیر سے مراد قرآن ہے (3)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد حضرت جبریل امین ہیں (4)؛ یہ حضرت حسن بصری، کلبی اور مقاتل کا قول ہے اس کی دلیل: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ (التکویر) ہے کلبی اور قتبی نے کہا: یہاں رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ (5) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (6) قول کی نسبت رسول کی طرف اس لئے کی کہ آپ اس کی تلاوت کرنے والے، اس کی تبلیغ کرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہیں جس طرح ہمارا قول ہے: یہ امام مالک کا قول ہے۔

وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

''اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ بہت کم توجہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 86　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 191　5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 447　6۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 86

کرتے ہو''۔

وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ یہ شعر کی تمام اقسام سے جدا ہے وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ یہ قرآن شیاطین کو سب وشتم کرتا ہے تو جو انہیں سب وشتم کرے اس پر وہ کوئی چیز کیا نازل کریں گے۔ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ اور قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ میں ما زائدہ ہے معنی ہے تم بہت کم ایمان لاتے ہو اور بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔ ان کے قلیل ایمان سے مراد یہ ہے کہ جب ان سے پوچھا جاتا ہے: انہیں کس نے پیدا کیا؟ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے۔ یہ جائز نہیں کہ ما فعل کے ساتھ مل کر مصدر کے حکم میں ہو اور ما کا مابعد قَلِيْلًا کو نصب دے کیونکہ اس صورت میں صلہ کا موصول پر مقدم ہونا لازم آتا ہے کیونکہ مصدر جس میں عمل کرتا ہے وہ اس کا صلہ ہوتا ہے۔ ابن محیصن، ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب نے مایومنون اور یذ کرون پڑھا ہے(1) باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس سے قبل اور اس سے بعد خطاب کے صیغے ہیں جہاں تک ماقبل کا تعلق ہے وہ تُبْصِرُوْنَ ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾

''بلکہ یہ نازل شدہ ہے رب العالمین کا۔ اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں منسوب کرتے تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور بے شک یہ تو ایک نصیحت ہے پرہیز گاروں کے لئے''۔

تَنْزِيْلٌ یہ اصل میں ھو تنزیل ہے مبتدا محذوف ہے مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ اس کا عطف اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ پر ہے یعنی رسول کریم کا قول ہے اور یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ تقول کا معنی ہے اس نے تکلف سے کام لیا اور اس نے اپنی جانب سے قول کیا۔ اسے مجہول کا صیغہ تُقُوِّلَ بھی پڑھا گیا ہے لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ یمین سے مراد قوت اور قدرت ہے یعنی ہم اسے قوت سے پکڑ لیتے۔ من زائدہ ہے۔ قوت اور قدرت کو یمین سے تعبیر کیا کیونکہ ہر شی کی قوت اس کی دائیں جانب میں ہوتی ہے؛ یہ قتبی کا قول ہے؛ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے؛ اس معنی میں شماخ کا قول ہے:

إذا ما رايةٌ رفعت لِمَجْدٍ　تلقاها عَرابة باليمين (2)

جب کبھی بزرگی کے لئے جھنڈا بلند کیا جائے تو عرابہ اسے قوت کے ساتھ لے لیتا ہے۔

عرابہ انصار میں قبیلہ اوس کا ایک فرد تھا۔ ایک اور شاعر نے کہا:

و لمّا رأيتُ الشمس أشرق نورُها　تناولتُ منها حاجتي بيميني

جب میں نے سورج کو دیکھا اس کا نور روشن تھا میں نے اس سے اپنی حاجت اپنی قوت سے لی۔ سدی اور حکم نے کہا: یمین کا معنی حق ہے؛ دلیل کے طور پر یہ مصرعہ ذکر کیا ہے: تلقاها عرابة باليمين عرابہ نے اسے استحقاق رکھتے ہوئے لیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے ہم اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم اس کے دائیں ہاتھ کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 447　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 86

تصرف سے روک لیتے۔ یہ نفطویہ کا قول ہے۔ ابوجعفر نے کہا: یہ کلام اس طریقہ پر آیا ہے جس طرح لوگوں کی عادت ہے جس کو ذلیل کرنے کا پروگرام ہو اور اس کو سزا دینی ہو تو اس کا دایاں ہاتھ پکڑا جاتا ہے جس طرح سلطان جس کو ذلیل کرنا چاہتا ہے اس کے بارے میں حکم دیتا ہے: اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو۔ یعنی ہم نے اس کے ہاتھ کو پکڑنے کا حکم دیا اور اس کے سزا دینے میں مبالغہ سے کام لیا۔

**ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝** ہم نے اس کی شاہ رگ کاٹ دی یعنی ہم نے اسے ہلاک کر دیا (1)۔ یہ ایسی رگ ہے جس کے ساتھ دل متعلق ہوتا ہے جب وہ رگ کٹ جائے تو وہ آدمی مر جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر لوگوں کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ دل کی وہ ڈوری ہے جو پشت میں ہوتی ہے جو حرام مغز ہے جب یہ ٹوٹ جائے تو قوتیں باطل ہو جاتی ہیں (2) اور وہ آدمی مر جاتا ہے موتون اسے کہتے ہیں جس کی وتین کاٹ دی جائے۔ محمد بن کعب نے کہا: اس سے مراد دل اور اس کے ساتھ والی چیزیں ہیں (3)۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد علباء اور حلقوم کے درمیان رگ ہے۔ علباء سے مراد گردن کا پٹھا ہے، وہاں دو پٹھے ہیں جن دونوں کے درمیان رگ پیدا ہوتی ہے۔ عکرمہ نے کہا: وتین کو جب کاٹا جائے تو اس کے بھوکے ہونے کا پتہ چلتا ہے اور نہ اس کے سیر ہونے کا پتہ چلتا ہے (4)۔

**فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝**

''پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہوتا اور بیشک یہ تو نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے''۔

**فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝** ما نافیہ ہے احد جمع کے معنی میں ہے اس وجہ سے اس کی صفت جمع سے لگائی گئی ہے یعنی تم میں سے کوئی ایسی قوم نہیں جو اس سے روکنے والی ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ:285) یہاں بھی احد جمع پر دال ہے کیونکہ بین کا لفظ دو یا زیادہ افراد پر ہی داخل ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لم تحِلّ الغنائم لأحد سُودِ الرءوس قبلکم تم میں سے کسی سردار کے لئے غنیمت حلال نہیں تھی۔ یہاں بھی لفظ احد ہے اس کا معنی جمع کا ہے اور بین زائد ہے حجز کا معنی روکنا ہے حٰجِزِيْنَ کے بارے میں جائز ہے کہ یہ احد کی صفت ہو معنی کے اعتبار سے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے تو یہ محل جر میں ہوگا۔ خبر منکم ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اور خبر ہو اور منکم ملغا ہو اور حٰجِزِيْنَ کے متعلق ہو اس میں خبر کے منصوب ہونے میں یہ مانع نہیں جس طرح ان فیك زیدًا راغبٌ میں فصل مانع نہیں وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ضمیر سے مراد قرآن ہے قرآن ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کی مثل فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (بقرہ) ہے جس طرح ہم نے سورۂ بقرۃ کے آغاز میں بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت، رحمت اور نجات ہیں (5)۔

**وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ**

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 2، صفحہ 192 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 447 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 86
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 87

الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض جھٹلانے والے ہیں۔ اور یہ باعث حسرت ہوگی کفار کے لئے اور بیشک یہ یقیناً حق ہے۔ پس (اے حبیب!) آپ تسبیح کیا کریں اپنے رب کی جو عظمت والا ہے''۔

وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝ ربیع نے کہا: قرآن کو جھٹلانے والے ہیں (1)۔ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ ضمیر سے مراد تکذیب ہے، حسرت سے مراد ندامت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قیامت کے روز قرآن کافروں کے لئے حسرت ہوگا جب وہ مومنوں کا ثواب دیکھیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دنیا میں ان کے لئے حسرت ہوگی جب وہ معاوضہ پر قادر نہ ہونگے جب انہیں چیلنج کیا گیا کہ وہ قرآن کی مثل کوئی سورت لے آئیں۔

وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہے وہ حق یقین ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امر یقینی اور حق ہے کہ یہ قیامت کے روز ان کے لئے حسرت ہوگی۔ اس تعبیر کی بنا پر حسرۃ، تحسر کے معنی میں ہوگا۔ یہ مصدر ہے جو تحسر کے معنی میں ہے اس کے لئے ضمیر کا مذکر ذکر کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بیشک یہ تیرے اس قول کی طرح ہے لعین الیقین، محض الیقین اگر یقین صفت ہوتو اس کی طرف مضاف کرنا جائز نہ ہو جس طرح تو کہتا ہے: ھذا رجل الظریف۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے (2): لفظوں کے اختلاف کی وجہ سے اپنی ذات کی طرف مضاف کیا۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی سوء اور نقائص سے پاکی بیان کرو۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 87　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 447

# سورۃ المعارج

آیاتہا ۴۴ ۷۰ سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ ۷۹ رکوعاتہا ۲

بالاتفاق یہ سورت مکی ہے۔ اس کی چوالیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ

''مطالبہ کیا ایک سائل نے ایسے عذاب کا جو ہو کر رہے۔ (وہ سن لے یہ تیار ہے) کفار کے لئے اسے کوئی ٹالنے والا نہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبریل اللہ کی بارگاہ میں یہ عذاب اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے''۔

سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ نافع اور ابن عامر نے سَالَ سائل پڑھا ہے (1) یعنی ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس وقت یہ سوال سے مشتق ہوگا۔ باء کے بارے میں جائز ہے کہ یہ زائدہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ عن کے معنی میں ہو۔ سوال، دعا کے معنی میں ہوگا یعنی ایک دعوت دینے والے نے عذاب کو دعوت دی؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: دَعَا عَلٰی فلانٍ بالْوَیْلِ دَعَا عَلَیه بِالعَذَابِ یہ جملہ بولا جاتا ہے: دعوتُ زیدًا یعنی میں نے اس کے حاضر ہونے کی التماس کی۔ مراد ہوگا ایک التماس کرنے والے نے کافروں کے لئے عذاب کی التماس کی۔ قیامت کے روز لامحالہ ان پر واقع ہوگا۔ اس تعبیر کی بنا پر با زائدہ ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تَنۢبُتُ بِالدُّهْنِ (المومنون: ۲۰) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (مریم: ۲۵) یہ تاکید ہے یعنی ایک سائل نے واقع ہونے والے عذاب کے بارے میں سوال کیا۔

لِّلْكٰفِرِيْنَ، لام، عن کے معنی میں ہے۔ سوال کرنے والا نضر بن حارث تھا (2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے سوالوں کا یوں ذکر کیا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الانفال) اس کا سوال پورا ہوا غزوہ بدر کے موقع پر اسے اور عقبہ بن ابی معیط کو انتقام میں قتل کیا گیا اس کے علاوہ کسی کو انتقام میں قتل نہیں کیا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں سائل حارث بن نعمان فہری تھا اس کی

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 448
2۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 502

وجہ یہ بنی کہ جب اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت علی شیر خدا کے بارے میں یہ فرمان پہنچا: مَنْ كُنْتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ (1) وہ اپنی اونٹنی پر سوار ہوا وہ آیا یہاں تک کہ اس نے اپنی سواری ابطح میں بٹھائی پھر کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں حکم دیا کہ ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی وانك رسول الله کی گواہی دیں تو ہم نے وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبول کی، ہم پانچ نمازیں پڑھیں تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ بات قبول کی، ہم اپنے اموال کی زکوٰۃ دیں تو ہم نے وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبول کی ہر سال ہم رمضان شریف کے روزے رکھیں تو ہم نے وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبول کی، ہم حج کریں تو ہم نے وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبول کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر بھی راضی نہ ہوئے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا زاد کو ہم پر فضیلت دی۔ کیا یہ ایسی بات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانب سے کی ہے یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے'' حارث مڑا وہ کہہ رہا تھا: اے اللہ! اگر وہ حق ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب لے آ۔ اللہ کی قسم! وہ اپنی اونٹنی تک نہیں پہنچا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک پتھر مارا جو اس کے دماغ کو لگا تو وہ اس کی دبر سے نکل گیا تو اسے قتل کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ (☆) ایک قول یہ کیا گیا ہے: قریش کے کفار کی جماعت کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں جنہوں نے کافروں کے خلاف عذاب کا سوال کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عذاب کا مطالبہ کیا اور عرض کی کہ اللہ تعالیٰ اسے کفار پر واقع کرے وہ لامحالہ ان پر واقع ہوگا۔ کلام اس ارشاد تک فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ تک ممتد ہے۔ یعنی جلدی نہ کیجئے عذاب بالکل قریب ہے جب باء، عن کے معنی میں ہو؛ یہ قتادہ کا قول ہے تو سائل یہ سوال کرتا ہے کہ عذاب کس کو واقع ہوگا یا کب واقع ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ (الفرقان) اس آیت میں بھی باء، عن کے معنی میں ہے۔ علقمہ نے کہا:

فإن تسألوني بالنساء فإنني بصير بأدواء النساء طبيب (2)

اگر تم مجھ سے عورتوں کے بارے میں پوچھو تو عورتوں کی بیماریوں کو جاننے والا طبیب ہوں۔

یہاں بھی بالنساء، عن النساء کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: خرجنا نسأل عن فلان و بفلان یعنی باء اور عن دونوں صلے استعمال ہوتے ہیں۔ معنی ہوگا انہوں نے سوال کیا کس پر عذاب واقع ہوگا اور کس کے لئے واقع ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِّلْكٰفِرِيْنَ کافروں پر یا کافروں کے لئے۔ ابوعلی اور دوسرے علماء نے کہا: جب یہ سوال سے مشتق ہو تو اس کی اصل یہ ہے کہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا، ایک مفعول پر اقتصار کرنا جائز ہے۔ جب ان دونوں میں سے ایک مفعول پر اقتصار ہو تو جائز ہوگا کہ حرف جار کے ساتھ اس کی طرف متعدی ہو تو تقدیر کلام یہ ہوگی: سائل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، فی مناقب علی بن ابی طالب، جلد 2، صفحہ 213 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 364

☆ علامہ آلوسی فرماتے ہیں آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ فرمان غدیر خم میں واقع ہوا جو مدنی دور کے آخری سالوں میں ہوا جب کہ سورت مکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسلمانوں سے واقع ہونے والے عذاب کے بارے میں سوال کیا۔ جس نے اسے ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے تو اس کے نزدیک دو توجیہیں ہوں گی (ا) یہ سوال کی لغت ہے، یہ قریش کی لغت ہے عرب کہتے ہی سال، یسال۔ جس طرح نال، ینال۔ خاف، یخاف ہے دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ سیلان سے مشتق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات اس کی تائید کرتی ہے سال، سل۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: سال واد من أودية جهنم جسے سائل کہتے ہیں؛ یہ حضرت زید بن ثابت کا قول ہے۔ ثعلبی نے کہا: پہلا قول زیادہ اچھا ہے جس طرح اعشی ہمزہ کی تخفیف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سالتانی الطلاق إذ رأتانی قلّ مالی قد جئتمانی بنُکْر

ان دونوں نے مجھ سے طلاق کا سوال کیا جب ان دونوں نے مجھے دیکھا کہ میرا مال کم ہو گیا ہے تحقیق تم دونوں میرے پاس عجیب و غریب بات لائے ہو۔

صحاح میں ہے اخفش نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے خرجنا نسأل عن فلان و بفلان بعض اوقات اس کے ہمزہ میں تخفیف کر دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے: سال یسال۔ کہا:

و مُرْهِق سال إمتاعا بأصْدَته

محل استدلال سال ہے مرہق اسے کہتے ہیں جس کو قتل کرنے کے لئے پکڑ لیا گیا ہو۔ أُصد ضمہ کے ساتھ ہے ایسی چھوٹی قمیص جسے کپڑے کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے سال پڑھا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ ہمزہ میں تخفیف کرے کہ اسے الف سے بدل دے یہ خلاف قیاس بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ الف واؤ سے بدلا ہوا ہو؛ یہ اس کی لغت کے مطابق ہے جو یہ کہے: سلت اسال، جس طرح خفت، أخاف ہے۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے سلت أسال حکایت کیا ہے جس طرح خفت أخاف ہے یہ سالت کے معنی میں ہے یہ شعر پڑھا:

سالَتْ هُذَيْلٌ رسولَ الله فاحشةً ضَلَّتْ هذيلٌ بما سالتْ و لم تُصِبِ (1)

ہذیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فحش سوال کیا ہذیل سوال کے باعث گمراہ ہو گیا اس نے صحیح راہ نہ پائی۔

یہ کہا جاتا ہے: یہ دونوں برابر ہیں۔ مہدوی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ یاء سے بدلا ہوا ہو یہ سال، یسیل سے مشتق ہے تو سایل جہنم میں ایک وادی ہوئی۔ پہلے قول کے مطابق سائل کا ہمزہ اصلی ہوگا اور دوسرے قول کے مطابق واؤ کا بدل ہوگا اور تیسرے قول کے مطابق یاء کا بدل ہوگا۔ قشیری نے کہا: سائل مہموز ہے کیونکہ جب یہ ہمزہ کے ساتھ ہو تو یہ مہموز ہوگا اگر ہمزہ کے ساتھ نہ ہو تو بھی مہموز ہی ہوگا جس طرح قائل اور خائف ہے کیونکہ جب فعل کے عین کلمہ میں اعلال کا قاعدہ جاری ہو تو اسم فاعل میں بھی اعلال کا قاعدہ جاری ہوتا ہے التباس کے خوف سے حذف کے ساتھ اعلال جاری نہیں ہوگا تو اسے ہمزہ کے ساتھ بدل دیا جائے گا تیرے لئے یہ جائز ہے کہ تو ہمزہ میں تخفیف کرے یہاں تک کہ وہ بین بین ہو جائے۔

وَّاقِعٍ وہ عذاب کفار پر واقع ہوگا۔ یہ امر واضح کیا کہ یہ عذاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا جو معارج والا ہے۔ حضرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 364

حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ پوچھا: کس کے لیے؟ فرمایا: کافروں کے لیے (1)۔ کافرین میں جو لام ہے یہ وَّاقِعٍ کے متعلق ہے۔ فراء نے کہا: تقدیر کلام یوں ہے بعذاب للکافرین واقع اس اعتبار سے واقع، عذاب کی صفت ہوگی۔ لام عذاب کے لیے داخل ہوا واقع کے لیے داخل نہیں ہوا؛ یعنی یہ عذاب آخرت میں کافروں کے لیے ہے۔ کوئی بھی ان سے اس عذاب کو دور نہیں کر سکے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لام، علی کے معنی میں ہے۔ معنی ہے کافروں پر واقع ہوگا۔ روایت بیان کی گئی ہے حضرت اُبی کی قرأت میں یہ اسی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عن کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کافروں سے اس عذاب کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یعنی یہ عذاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے جو معارج والا ہے۔ جو علو، فاضل درجات والا اور نعمتوں والا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کا قول ہے۔ معارج سے مراد مخلوق کے اوپر اس کے انعام کے مراتب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عظمت و علا والا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد آسمان کے معارج ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ملائکہ کے معارج ہیں کیونکہ ملائکہ آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں تو اپنی صفت اس سے بیان کی (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معارج سے مراد بالا خانے ہیں یعنی وہ بالا خانوں کا مالک ہے یعنی اس نے اپنے اولیاء کے لیے جنت میں بالا خانے بنائے ہیں۔ عبداللہ نے ذی المعاریج پڑھا ہے۔ یوں کہا جاتا ہے: مَعْرَج، مِعرَاج، معارج اور معاریج۔ جس طرح مفتاح اور مفاتیح ہے۔ معارج سے مراد درجات ہیں اسی سے مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ (زخرف) ہے۔ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ وہ معارج میں بلند ہوتے ہیں (3) جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بنائے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان کے اصحاب، سلمی اور کسائی نے یعرج قرأت کی ہے ارادہ جمع کا کیا ہے کیونکہ ان کا قول ہے ملائکہ کو مذکر ذکر کرو، انہیں مونث نہ گردانو۔ باقی قراء نے جماعت کا ارادہ کرتے ہوئے تاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔ الروح سے مراد حضرت جبرائیل امین ہے (4)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ (الشعراء) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایک فرشتہ ہے جو بہت ہی عظیم مخلوق ہے۔ ابو صالح نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، لوگوں کی شکل و صورت پر ہے مگر وہ انسان نہیں۔ قبیصہ بن ذویب نے کہا: یہ میت کی روح ہے جب اسے قبض کیا جائے۔

اِلَيْهِ اس مکان کی طرف جو ان کا محل ہے، وہ آسمان میں ہے کیونکہ وہ اس کی نیکی اور کرامت کا محل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کی طرح ہے اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ (الصافات: 99) یعنی اس جگہ کی طرف جانے والا ہوں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِلَيْهِ کی ضمیر سے مراد اس کا عرش ہے۔

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ وہب، کلبی اور محمد بن اسحاق نے کہا: ملائکہ کا عروج اس مکان کی طرف ہوگا جو ان کا محل ہے۔ اتنے وقت میں ہوگا کہ اگر کوئی اور اوپر چڑھے تو اس کو ایک ہزار سال کا عرصہ لگتا۔ وہب نے یہ بھی کہا: زمین کے پست ترین حصہ سے عرش تک پچاس ہزار سال کی مسافت ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس آیت اور سورۂ سجدہ کی آیت

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 449 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 90 4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 449

فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ (السجدہ:5) میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں زمین کی پست ترین جگہ سے اس کے امر کی انتہا اور آسمانوں سے اوپر اس کے امر کی انتہا میں پچاس ہزار سال کا عرصہ حائل ہے اور الٓمّٓ تَنۡزِیۡلُ میں فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ میں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر کا نزول آسمان دنیا سے زمین تک اور زمین سے آسمان تک ایک دن میں ہوتا ہے۔ وہ مقدار ایک ہزار سال ہے کیونکہ زمین اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

مجاہد، حکم اور عکرمہ سے مروی ہے: یہ دنیا کی عمر کی مدت ہے جب سے اسے پیدا کیا گیا ہے اس وقت سے لے کر جب تک یہ باقی رہے گی وہ پچاس ہزار سال ہیں (1)۔ کوئی نہیں جانتا کہ کتنا عرصہ گزر چکا ہے اور کتنا باقی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات جانتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد یوم قیامت ہے یعنی جس میں وہ فیصلہ فرمائے گا۔ اگر مخلوق اس کی ذمہ دار ہوتی تو پچاس ہزار سال لگ جاتے؛ یہ قول عکرمہ، کلبی اور محمد بن کعب نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں اسی ساعت فارغ ہو جاتا ہوں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد یوم قیامت ہے لیکن یوم قیامت ختم نہ ہوگا (2)۔ مراد حساب کے لیے ان کا کھڑا ہونا ہے۔ وہ دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ پھر جنتی اور جہنمی اپنے اپنے ٹھکانوں میں قرار پا جائیں گے۔ یمان نے کہا: اس سے مراد یوم قیامت ہے (3)۔ اس میں پچاس موطن ہیں۔ ہر موطن ہزار سال کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد یوم قیامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں پر اسے پچاس ہزار سال کے برابر کر دیا ہے، پھر انہیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: اس آیت کی تعبیر میں جو اقوال کیے گئے ہیں ان میں سے سب سے اچھا قول ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے قاسم بن اصبغ نے حضرت ابوسعید خدری سے بیان کیا ہے (4)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ میں نے پوچھا: یہ کتنا لمبا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ دن مومن پر خفیف ہوگا یہاں تک کہ دنیا میں جتنے وقت میں وہ فرض نماز پڑھا کرتا تھا اس سے زیادہ خفیف ہوگا''۔ نحاس نے اس قول کی صحت پر اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے سہیل نے اپنے باپ سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں: ''ہر وہ شخص جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ نہ دی اللہ تعالیٰ اسے جہنم کا سانپ بنا دے گا جس کے ساتھ اس کی پیشانی، اس کی پشت اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔ ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے سے فارغ ہو جائے گا'' (5)۔ کہا: یہ اس امر پر دال ہے کہ مراد یوم قیامت ہے۔ ابراہیم تیمی نے کہا: مومن کے اوپر یہ دن اتنا ہی طویل ہوگا جس قدر ظہر اور عصر کا فاصلہ ہے۔ یہی معنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ تمہارا محاسبہ اتنے وقت میں کرے گا جتنا وقت دو نمازوں کے درمیان ہوتا ہے'' (6)۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنا نام سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۝

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 90 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 450
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 91 5۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 365 6۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 91

(البقرہ) اور اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ﴿۶۲﴾ (الانعام) رکھا ہے؛ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ فراغت نصف دن میں ہوگی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ﴿۲۴﴾ (الفرقان) یہ مخلوقات کے فہم کے حساب سے ہے ورنہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کو کسی کام سے غافل نہیں کرتا جس طرح وہ ایک ساعت میں رزق عطا فرماتا ہے اسی طرح ایک ساعت میں حساب بھی کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان:28)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں اور فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ (السجدہ) کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا: یہ ایسے دن ہیں اللہ تعالیٰ نے جن کا نام رکھا ہے وہ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہیں؟ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ میں کوئی ایسی بات کروں جن کے بارے میں آگاہ نہ ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ کے الفاظ بطور تمثیل کے ہیں۔ یہ میدان محشر میں مدت کے لمبا ہونے کی پہچان کرائی گئی ہے جو انسان وہاں مشکلات پائے گا۔ عرب شدت کے ایام کی صفت طول سے بیان کرتے اور خوشی کے دنوں کی صفت قصر سے بیان کرتے۔ شاعر نے کہا:

ویومٍ کظلِّ الرُّمح قصَّرَ طولَه　　دمُ الزّق عنّا واصطفاق المزاهر

کتنے ہی دن ہیں جو نیزے کے سایہ کی طرح ہیں شراب اور بربط کے تاروں کے ملنے نے ہم پر اسکی طوالت کو مختصر کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی ہے سائل نے ایسے عذاب کا سوال کیا جو کافروں پر واقع ہونے والا تھا، اس کو رو کنے والا کوئی نہیں (1)، وہ ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ملائکہ اور روح اس کی طرف عروج کرتے ہیں؛ یہی وہ قول ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی توفیق دینے والی ہے۔

## فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا ﴿۶﴾ وَّ نَرٰىهُ قَرِیْبًا ﴿۷﴾

''ایسا صبر کیجئے جو بہت خوبصورت ہو۔ کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے (لیکن) ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں''۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا ﴿۵﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم جو آپ کو اذیتیں دے رہی ہے اس پر صبر کیجئے۔ صبر جمیل سے مراد یہ ہے ایسا صبر جس میں جزع نہ ہو اور نہ ہی غیر اللہ کے ہاں شکوہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قوم میں مصیبت والا ہو مگر یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کون ہے۔ معنی قریب قریب ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ آیت سیف کے ساتھ منسوخ ہے۔

اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا ﴿۶﴾ مراد اہل مکہ ہیں۔ وہ جہنم کے عذاب کو بعید خیال کرتے ہیں یعنی وہ ہوگا ہی نہیں۔ وَّ نَرٰىهُ قَرِیْبًا ﴿۷﴾ کیونکہ جو عذاب واقع ہونے والا ہوتا ہے وہ قریب ہی ہوتا ہے (2)۔ اعمش نے کہا: وہ بعث کو بعید خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ گویا وہ اسے محال ہونے کے اعتبار سے بعید خیال کرتے ہیں جس طرح تو اس آدمی کو کہتا ہے جس سے بحث کرتا ہے: هذا بعیدٌ لا یکون۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس دن کو بعید خیال کرتے ہیں اور ہم اسے قریب جانتے ہیں کیونکہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 450　2۔ ایضاً

رویۃ، موجود کے متعلق ہے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: الشافعی یری فی ھذہ المسئلۃ کذا و کذا۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ﴿۸﴾ وَ تَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴿۹﴾ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾

"اس روز آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا اور پہاڑ رنگ برنگی اون کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کا حال نہ پوچھے گا"۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ یوم میں عامل واقع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یقع بھم العذاب یوم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا عامل نَرٰىهُ یا يُبَصَّرُوْنَهُمْ ہے یا قریب سے بدل ہوگا۔ مھل سے مراد تیل کی تلچھٹ ہے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسروں کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: سیسہ، تانبا یا چاندی میں سے جسے پگھلایا گیا ہو (2)۔ مجاہد نے کہا: كَالْمُهْلِ سے مراد خالص پیپ ہے جو خون اور کچلہو سے ملی پیپ سے بنی ہو۔ سورۂ دخان اور سورۂ کہف میں اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

وَ تَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ پہاڑ ہو جائیں گے رنگی ہوئی اون کی طرح۔ اون کو عھن اس وقت کہتے ہیں جب وہ رنگی ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: پہاڑ سرخ اون کی طرح ہو جائیں گے۔ یہ اونوں میں سے کمزور ترین اون ہوتی ہے۔ اسی معنی میں زہیر کا قول ہے:

کأن فُتات العھن فی کل منزل

فتات کا معنی ٹکڑے۔ العھن سے مراد سرخ اون۔ اس کی واحد عھنہ ہے، گویا سرخ اون کے ٹکڑے ہر جگہ ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: العھن سے مراد رنگ دار اون ہے۔ پہاڑوں کو اس سے تشبیہ دی جارہی ہے کیونکہ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں معنی ہے پہاڑ سختی کے بعد نرم ہو جائیں گے اور اجتماع کے بعد بکھر جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سب سے پہلے پہاڑ جمع شدہ ریت کی طرح ہو جائیں گے، پھر دھنی ہوئی رنگدار اون کی طرح ہو جائیں گے، پھر بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ کوئی جگری دوست اپنے دوست سے حال نہیں پوچھے گا کیونکہ ہر ایک انسان اپنے ذاتی مسائل میں ہی مصروف ہوگا، یہ قتادہ کا قول ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ (عبس) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام یوں ہے لا یَسْئَالُ حَمِیْمٌ عن حمیم حرف جار کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو مفعول کے ساتھ ملا دیا گیا۔ عام قرأت یسئال یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ شیبہ اور بزی نے عاصم سے ولا یُسْئَال قرأت نقل کی ہے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے یعنی کسی دوست سے اس کے دوست کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا اور کسی قریبی رشتہ دار سے اس کے قریبی رشتہ دار کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ہر ایک انسان سے اس کے اپنے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا؛ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ (المدثر)

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 92
2۔ ایضاً

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۭ بِبَنِيْهِ ⑪ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ⑫ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ ⑬ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ⑭

''دکھائی دیں گے ایک دوسرے کو، مجرم تمنا کرے گا کہ کاش بطور فدیہ دے سکتا آج کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو اپنے خاندان کو جو (ہر مشکل میں) اسے پناہ دیتا تھا اور (بس چلے تو) جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو، پھر یہ فدیہ اس کو بچالے''۔

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ وہ انہیں دکھائی دیں گے قیامت میں کوئی مخلوق نہیں ہوگی مگر وہ اپنے ساتھی کے سامنے ہوگی(1)، وہ جن ہو یا انسان ہو۔ انسان اپنے باپ، اپنے بھائی، اپنے قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ کو دیکھے گا۔ وہ اس کا حال نہیں پوچھے گا اور نہ اس سے بات کرے گا کیونکہ وہ اپنی ہی پریشانیوں میں مگن ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ایک گھڑی کے لیے ایک دوسرے سے متعارف ہوں گے(2)۔ وہ اس گھڑی کے بعد ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوں گے۔ بعض روایات میں ہے: لوگ اپنی جان پہچان والے لوگوں سے بھاگیں گے کیونکہ انہیں خوف ہوگا کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں ان کے بارے میں ان سے مطالبہ ہوگا۔ اس تعبیر کی بنا پر يُّبَصَّرُوْنَهُمْ کی ضمیر کفار کے لیے ہوگی اور ھم ضمیر اقرباء کے لیے ہوگی۔ مجاہد نے کہا: معنی ہے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مومنوں کو کفار دکھائے گا۔ اس اعتبار سے واؤ ضمیر مومنین کے لیے اور ھم ضمیر کفار کے لیے ہوگی۔ ابن زید نے کہا: وہ کفار کو جہنم میں دکھائے گا جنہوں نے انہیں دنیا میں گمراہ کیا تھا۔ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ واؤ ضمیر پیروکاروں کے لیے اور ھم ضمیر قائدین کے لیے ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ مظلوم کو ظالم اور مقتول کو قاتل دکھائے گا(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: يُّبَصَّرُوْنَهُمْ کی ضمیر ملائکہ کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی فرشتے ان کے اقوال پہچانیں گے اور ہر فریق کو اس طرف ہانک کر لے جائیں گے جو ان کے مناسب ہے۔ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ پر کلام مکمل ہوئی، پھر فرمایا: يَوَدُّ الْمُجْرِمُ یعنی کافر تمنا کرے گا(4) لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۭ جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ چیز فدیہ کر دے جو دنیا میں اس کے لیے سب سے عزیز تھی(5)، خواہ وہ اس کے قریبی رشتہ دار ہوں تو وہ اس پر قادر نہیں ہوگا، پھر ان کا ذکر کیا اور فرمایا: بِبَنِيْهِ ⑪ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ⑫ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ ⑬ صَاحِبَتِهٖ سے مراد اس کی بیوی ہے۔ فَصِيْلَتِهِ سے مراد اس کا قبیلہ ہے جو اس کی مدد کرتا تھا؛ یہ مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا: اس سے مراد اس کی ماں ہے جو اس کو پالتی تھی؛ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے(6)؛ اشہب نے اسے اس سے روایت کیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: فصیلہ، قبیلہ سے چھوٹا ہوتا ہے(7)۔ ثعلب نے کہا: وہ اس کے قریبی آباء و اجداد ہیں۔ مبرد نے کہا: فصیلہ سے مراد جسم کے اعضاء کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ قبیلہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ انسان کی نسل کو فصیلہ کہتے ہیں۔ اسے اپنے بعض کے ساتھ تشبیہ دی۔ قبیلہ اور اس کے غیر میں گفتگو سورۂ حجرات میں گزر چکی ہے۔ یہاں ایک مسئلہ ہے: جب اس نے اپنا مال فصیلہ پر وقف کیا یا فصیلہ کے لیے وصیت کی

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 450 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 92
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

جس نے عموم کا دعویٰ کیا اس نے اس لفظ کو عشیرہ پر معمول کیا جس نے اسے خصوص پر محمول کیا (1)۔ اس نے اسے آباء پر محمول کیا، قریبی پھر قریبی۔ پہلی تعبیر نطق میں اکثر مراد لی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ تُـْٔوِیْهِ کا معنی ہے وہ اس سے ملاتا ہے اور اگر خوف ہو تو اسے امن دیتا ہے۔

وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وہ پسند کرتا ہے کہ اگر ان کو بطور فدیہ دینے سے نجات ملے تو وہ فدیہ کے طور پر دے دے ثُمَّ یُنْجِیْهِ ۝ پھر وہ فدیہ اسے خلاصی دے۔ یہاں اضمار ضروری ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الانعام: 121) اصل میں إنّ أكله لفسق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یَوَدُّ الْمُجْرِمُ فاء کے ساتھ جواب کا تقاضا کرتا ہے جس طرح اس ارشاد میں ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ ۝ (القلم) اس میں فَيُدْهنون کا جواب ہے۔ اس آیت میں جواب ثُمَّ یُنْجِیْهِ ۝ ہے کیونکہ یہ حروف عطف میں سے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی يودّ المجرم لويفتدى فينجيه الافتداء ہے۔

كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ۝ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى ۝

”لیکن ہرگز ایسا نہ ہوگا، بے شک آگ بھڑک رہی ہوگی۔ نوچ لے گی گوشت پوست کو، وہ بلائے گی جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری اور منہ موڑا تھا“۔

كَلَّا، کلا کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ یہ حقا کے معنی میں ہوتا ہے اور لا کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ دونوں امور کا احتمال رکھتا ہے۔ جب یہ حقا کے معنی میں ہو تو کلام یُنْجِیْهِ پر مکمل ہوگی اور جب یہ لا کے معنی میں ہو تو کلام اسی پر مکمل ہوگی، یعنی فدیہ دینا اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات نہیں دے گا، پھر فرمایا: اِنَّهَا لَظٰى ۝ یعنی یہ جہنم ہے جس کی آگ بھڑک رہی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝ (اللیل) لَظٰى یہ تلظی سے مشتق ہے اور إلتظاء النار سے مراد آگ کا بھڑکنا ہے اور تلظيها سے مراد بھی اس کا بھڑکنا ہے۔ اس کی اصل لَظَظ ہے یعنی عذاب کے دائمی ہونے کی وجہ سے وہ دائمی ہوگی اس کی ایک ظاء کو یاء سے بدل دیا تو لَظٰى باقی رہ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہنم کے طبقات میں سے یہ دوسرا گڑھا ہے۔ یہ اسم مونث معرفہ ہے، اس لیے یہ غیر منصرف ہوگا۔

نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ ابوجعفر، شیبہ، نافع اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں اعمش، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے نَزَّاعَةٌ کو مرفوع پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے عاصم سے نَزَّاعَةً کو منصوب نقل کیا ہے جس نے اس لفظ کو رفع دیا ہے اس کے نزدیک اس کی پانچ وجوہ ہو سکتی ہیں۔ (۱) لَظٰى کو ان کی خبر بنایا جائے اور نَزَّاعَةٌ سے پہلے ھی ضمیر مبتدا محذوف ہو۔ اس صورت میں لَظٰى پر وقف مستحسن ہوگا۔ (۲) لَظٰى اور نَزَّاعَةٌ دونوں ان کی خبریں ہوں جس طرح تو کہتا ہے: انه خلق مخاصم (۳) نَزَّاعَةٌ، لَظٰى کا بدل ہو اور لَظٰى ان کی خبر ہو۔ (۴) لَظٰى، ان کے اسم سے بدل ہو اور نَزَّاعَةٌ، ان کی خبر ہو۔ (۵) انها کی ضمیر ضمیر قصہ ہو لَظٰى مبتدا ہو اور نَزَّاعَةٌ مبتدا کی خبر ہو اور جملہ ان کی خبر ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی إنّ القصه والخبر لظی، نزاعة للشوی۔ جس نے نَزَّاعَةً کو نصب دی اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ لظی پر وقف کرے اور نَزَّاعَةً کو لظی سے الگ کر کے نصب دے دے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1858

کیونکہ یہ نکرہ ہے جو معرفہ کے ساتھ متصل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حال موکدہ ہونے کی بنا پر منصوب ہو جس طرح فرمایا: وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا (البقرہ: 91) یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس معنی کی بنا منصوب ہو اِنَّها تَتَلَظّٰى نَزَّاعَةً یعنی اس حال میں کہ وہ چمڑے کو ادھیڑنے والی ہے۔ اس میں عامل وہ معنی ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے، وہ تلظی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو اس بنا پر کہ یہ مکذبین کی حالت بیان کر رہا ہو جبکہ ان کے حال کی خبر دی گئی۔ یہ بھی جائز ہے کہ ماقبل سے قطع کرنے کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہو جس طرح تو کہتا ہے: مررت بزید العاقل الفاضل نصب کی بھی یہ پانچ صورتیں ہیں۔ شوی یہ شواۃ کی جمع ہے۔ اس سے مراد سر کی جلد ہے۔ اعشی نے کہا:

قالت قُتَیْلَةُ مالَهُ قد جُلِّلَتْ شَیْبًا شَوَاتُهُ(1)

قتیلہ نے کہا: اسے کیا ہو گیا ہے اس کے سر کی چمڑی سفید بالوں کی وجہ سے معزز ہو گئی ہے۔

صحاح میں ہے: شوی یہ شواۃ کی جمع ہے جس کا معنی سر کی چمڑی ہے(2)۔ شوی سے مراد انسانوں کے دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور سر ہیں اور ہر وہ عضو جس پر زخم لگنے سے قتل واقع نہ ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رماہ فاشواہ اس نے اسے تیر مارا اور ایسی جگہ نہ لگا جو اس کو قتل کر دیتا۔ ہذلی نے کہا:

فإنّ من القول التی لا شَوٰی لھا

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خطا نہیں جاتیں بلکہ ٹارگٹ پر جا لگتی ہیں اور قتل کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اعشی نے کہا:

قالت قُتَیْلَةُ مالَهُ قد جُلِّلَتْ شَیْبًا شَوَاتُهُ(3)

ابوعبید نے کہا: ابوخطاب اخفش نے ابوعمرو بن علاء کے سامنے یہ شعر پڑھا تو ابوعمر نے اسے کہا: تو نے اس میں تصحیف کی ہے۔ یہ شواتہ کی جگہ سراتہ ہے۔ ابوخطاب خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے ہمیں کہا: بلکہ اس نے اس میں تصحیف کی ہے۔ بے شک اصل میں شواتہ ہی ہے۔ شوی الفرس سے مراد اس کے پاؤں ہیں کیونکہ یہ کہا جاتا ہے: عَبْلُ الشوی مضبوط پاؤں والا۔ یہ لفظ سر کے لیے نہیں بولا جاتا کیونکہ انہوں نے گھوڑے کی صفت یوں بیان کی: اسالة الخدین وعِتْقِ الوجہ اس سے مراد اس کی رقت ہے۔ شوی سے مراد ادنیٰ درجے کا مال ہے۔ شوی سے مراد ایسی شی ہے جو کم درجہ کی اور تھوڑی ہو۔ ثابت بنانی اور حضرت حسن بصری نے کہا نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی سے مراد ہے چہرے کی عزت والی جگہوں کو بھون دینے والی(4)۔ ابوالعالیہ نے کہا: شوی سے مراد چہرے کے محاسن ہیں۔ قتادہ نے کہا: خلقت کے مکارم اور اس کی اطراف ہیں۔ ضحاک نے کہا: وہ گوشت اور جلد کو ہڈیوں سے الگ کر دے گی یہاں تک ان میں سے کوئی چیز نہ چھوڑے گی۔ کسائی نے کہا: اس سے مراد جوڑ ہیں۔ ایک امام نے کہا: اس سے مراد چاروں پائے اور چمڑا ہے۔

ابوصالح نے کہا: ہاتھوں اور پاؤں کے اطراف (5)۔ شاعر نے کہا:

إذا نظرتْ عرفتَ الفخرَ منها وعینیھا ولم تعرف شَوَاھا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 93 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 83 5۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 93

جب تو دیکھے گا تو اس سے اور اس کی آنکھوں سے فخر پہچان لے گا اور تو اس کی اطراف کو نہیں پہچانے گا۔

حضرت حسن بصری نے کہا: شوی کا معنی کھوپڑی ہے(1)۔

تَدۡعُوۡا مَنۡ اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰی ۝ دنیا میں جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے روگردانی کی اور ایمان سے پھر لظیٰ اسے اپنی طرف کھینچے گی۔ اس کا بلانا یوں ہوگا: اے مشرک! میری طرف آ۔ اے کافر! میری طرف آ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ فصیح زبان سے کافروں اور منافقوں کو بلائے گی۔ اے کافر! میرے طرف آ۔ اے منافق میری طرف آ۔ پھر وہ انہیں یوں اچک لے گی جس طرح پرندہ دانے کو اچک لیتا ہے۔ ثعلب نے کہا: تدعو کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں: دعاك الله اللہ تعالیٰ تجھے ہلاک کردے۔ خلیل نے کہا: یہ تعالوا کی طرح دعوت نہیں ہوگی بلکہ اس کی انہیں دعوت یہ ہوگی کہ وہ ان کو عذاب دینے پر قادر ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: داعی، جہنم کے داروغے ہوں گے۔ ان کی دعوت کو جہنم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضرب المثل ہے یعنی جس نے پیٹھ پھیری اور اس سے روگردانی کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، گویا جہنم ان کو بلانے والی ہے(2)؛ اسی کی مثل شاعر کا قول ہے:

ولقد هبطنا الوادِيَيْن فواديًا　　يدعو الأنيس به العضيض الأبكمُ

ہم دو وادیوں میں اترے ان میں سے ایک وادی ایسی تھی کہ مکھی اس سے انس رکھنے والے کو دعوت دے رہی تھی۔

الحضیض الابکم سے مراد مکھی ہے، وہ دعوت نہیں دیتی اس کے پروں کی بھنبھناہٹ نے اس پر آگاہ کیا اور اس کی طرف دعوت دی۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول حقیقت پر مبنی ہے جس کی وضاحت آیات قرآنیہ اور اخبار صحیحہ سے گزر چکی ہے۔ قشیری نے کہا: لظیٰ کی دعوت اس طرح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس میں زندگی پیدا کردے گا جب وہ دعوت دے گی قیامت کے روز خارق للعادۃ امور کا وقوع بہت زیادہ ہے۔

وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی ۝ مال کو جمع کیا اور اسے برتن میں محفوظ کیا اور اللہ تعالیٰ کے حق کو روک لیا پس وہ جمع کرنے والے بھی ہیں اور منع کرنے والے بھی ہیں۔ حکم نے کہا: عبداللہ بن حکیم اپنے تھیلے کا منہ نہ باندھتے تھے وہ کہتے میں نے اللہ تعالیٰ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ۝

''بیشک انسان بہت لالچی پیدا ہوا ہے، جب اسے تکلیف پہنچے تو سخت گھبرا جانے والا اور جب اسے دوست ملے تو حد درجہ بخیل''۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۝ یہاں انسان سے مراد کافر ہے(3)؛ یہ ضحاک سے مروی ہے۔ لغت میں هلع سے مراد شدید حرص، بری طرح جزع فزع اور فحش ترین اسلوب(4)، اسی طرح قتادہ، مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے اس کا باب یوں

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 195　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 93　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

چلتا ہے هَدَعَ يَهْدَعُ فهو هَلِعٌ و هَلُوعٌ۔ یہ کثرت کے معنی پر دال ہے اس کا معنی ہے وہ خیر وشر پر صبر نہیں کرتا یہاں تک دونوں صورتوں میں ایسا کام کرتا ہے جو مناسب نہیں ہوتا۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اندرونی تنگی اور غم ہے(1)۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جو سیر نہ ہوتا ہو۔ منوع سے مراد وہ شخص ہے جو مال پائے تو اللہ تعالیٰ کا حق روک لے۔ ابن کیسان نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا وہ اس چیز کو پسند کرتا ہو جو اسے خوش اور راضی کرے اور اس سے دور بھاگتا ہے جو اسے ناپسند ہو اور اس کو ناراض کرے(2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پابند کیا کہ جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے اس کو خرچ کرے اور جس کو ناپسند کرتا ہے اس پر صبر کرے۔ ابو عبید نے کہا: ہلوع وہ شخص ہوتا ہے جب اسے خیر پہنچتی ہے تو وہ شکر بجا نہیں لاتا اور جب تکلیف پہنچتی ہے تو صبر نہیں کرتا؛ یہ ثعلب کا قول ہے۔ ثعلب نے یہ بھی کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ہلوع کی تفسیر بیان کی ہے وہ وہ شخص ہے جب اسے شر پہنچتی ہے تو شدید جزع فزع کا اظہار کرتا ہے اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو وہ بخل سے کام لیتا ہے اور لوگوں سے اسے روک لیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بندے کو جو عطا کیا گیا ہے ان میں سے سب سے برا ایسا بخل ہے جو بے قرار کرنے والا ہو اور ایسی بزدلی ہے جو دل نکالنے والی ہو''(3)۔ عرب کہتے ہیں: ناقةٌ هلواعةٌ و هلواع۔ جب وہ تیز رفتار ہو اور ہلکی ہو۔ شاعر نے کہا:

صكاءَ ذِعْلِبَة إذا استدبرتَها حَرَجٌ إذا استقبلتَها هِلواع

صکاء یہ اونٹنی کا وصف نہیں بلکہ شتر مرغ کا وصف ہے اونٹنی کو شتر مرغ سے تشبیہ دی ذعلب اور ذعلبہ سے مراد تیز رفتار اونٹنی ہے، ہلواع بھی تیز رفتار اونٹنی کے لئے بولا گیا ہے۔

جَزُوْعًا اور مَنُوْعًا دونوں ہلوع کی صفت ہیں اس شرط پر کہ یہ دونوں اذا سے ارادہ میں مقدم ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کان مضمرہ کی خبر ہیں۔

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

''بجز ان نمازیوں کے جو اپنی نماز پر پابندی کرتے ہیں، اور وہ جن کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل کے لئے

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 452 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داود، باب فی الجراءة والجبن، حدیث نمبر 2150، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور محروم کے لئے، اور جو تصدیق کرتے ہیں روز جزا کی، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں۔ اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے تو ان پر کوئی ملامت نہیں البتہ جو خواہش کریں گے ان کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ مکرم (ومحترم) ہوں گے جنتوں میں''۔

اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ یہ اس پر دال ہے کہ اس سے ماقبل کلام کفار کے بارے میں ہے۔ انسان اسم جنس ہے اس کی دلیل استثناء ہے جو اس کے بعد ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (العصر) نخعی نے کہا: مصلین سے مراد فرض نماز ادا کرنے والے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جو نماز کو وقت پر ادا کرتے ہیں جہاں تک اس کو ترک کرنے کا تعلق ہے تو یہ کفر ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد صحابہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد عام مومن ہیں کیونکہ وہ زیادہ جزع فزع پر غالب آ جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے رب پر اعتماد اور یقین ہوتا ہے الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ یعنی اپنے وقت پر نمازوں کو ادا کرتے ہیں۔ عقبہ بن عامر نے کہا: یہی وہ لوگ ہیں جب نماز ادا کرتے ہیں تو دائیں اور بائیں متوجہ نہیں ہوتے۔ دائم کا معنی ساکن ہے اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: نَهَى عن البول في الماء الدائم کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا۔ ابن جریج اور حضرت حسن بصری نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو نفلی نماز زیادہ پڑھتے ہیں(2)۔

وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے؛ یہ قتادہ اور ابن سیرین کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: زکوٰۃ کے علاوہ مراد ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: صلہ رحمی کرنا اور بوجھ اٹھانا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ حق کی صفت معلوم سے لگائی ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ معلوم نہیں، وہ تو ضرورت کے مطابق ہوتا ہے جبکہ اس میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ سورۂ ذاریات میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ یعنی یوم جزا، مراد قیامت کا دن ہے۔ اس بارے میں بحث سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے شرک کیا اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو جھٹلایا وہ اس کے عذاب سے امن میں نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: کوئی بھی عذاب سے امن میں نہیں بلکہ ہر کسی پر واجب ہے کہ اس سے ڈرے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ اس بارے میں گفتگو سورۂ مومن کی آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ میں گزر چکی ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ خواہ وہ گواہی انہیں قریبی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 6، صفحہ 1859
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 95

رشتہ دار یا دور کے رشتہ دار کے خلاف دینی پڑے۔ وہ حاکم کے پاس گواہی دیتے ہیں (1)، وہ اسے چھپاتے نہیں اور نہ ہی اس میں تبدیلی کرتے ہیں۔ شہادت اور اس کے احکام کے بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: گواہیاں یہ ہیں ان اللہ واحد لا شریک لہ وأن محمدا عبدہ و رسولہ، لِاَمٰنٰتِہِمْ واحد کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے؛ یہ ابن کثیر اور ابن محیصن کی قرأت ہے۔ الامانۃ اسم جنس ہے۔ اس میں دین کی امانات داخل ہو جاتی ہیں۔ شرعی احکام بھی امانتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بندوں کو امین بنایا ہے۔ اس میں بندوں کی امانتیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ یہ سب سورۂ نساء میں گزر چکا ہے۔ عباس دوری نے ابو عمر و اور یعقوب سے بشھاداتھم جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بشھادتم واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ مصدر بعض اوقات مفرد کا معنی دیتا ہے اگر چہ جمع کے صیغہ کی طرف مضاف ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۞ (لقمان) فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: 2) بِشَهٰدٰتِهِمْ واحد کے صیغہ پر دال ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۞ قتادہ نے کہا: عَلٰى صَلَاتِهِمْ سے مراد نماز کے وضو، اس کے رکوع اور اس کے سجدہ کی محافظت کرتے ہیں۔ ابن جریج نے کہا: مراد نفلی نماز ہے۔ سورۂ مومنون میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ دوام، محافظت کے خلاف ہے۔ اس پر ان کے دوام کا مطلب ہے کہ وہ اس کی ادائیگی پر محافظت کرتے ہیں اس میں کوئی نقص واقع نہیں کرتے اور اس کی ادائیگی میں غفلت کر کے کسی اور شغل میں مصروف نہیں ہوتے۔ اس پر محافظت کا مطلب ہے اس کا وضو اچھی طرح کرتے ہیں، وقت پر نماز ادا کرتے ہیں، اس کے ارکان کو قائم کرتے ہیں اور اس کی سنتوں اور آداب کو مکمل کرتے ہیں اور اس کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔ ضائع ہونے کی صورت یہ ہے کہ وہ گناہوں کا ارتکاب کریں۔ دوام نفس نماز کی طرف راجع ہے اور محافظت کا تعلق اس کے احوال سے ہے اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۞ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی کرامتوں کے ساتھ انہیں عزت دی ہے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۞ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۞ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۞ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۞

''پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی طرف ٹکٹکی باندھے بھاگتے چلے آرہے ہیں، ایک گروہ دائیں طرف سے اور دوسرا گروہ بائیں طرف سے۔ کیا طمع کرتا ہے ان میں سے ہر شخص کہ (ایمان و عمل کے بغیر) نعمتوں بھری جنت میں اسے داخل کیا جائے۔ ہرگز نہیں ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس (مادہ) سے جس کو وہ بھی جانتے ہیں''۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۞ اخفش نے کہا (2): مُهْطِعِيْنَ کا معنی ہے جلدی جلدی آتے ہیں۔ ایک شاعر نے کہا:

بمكة أهلها ولقد أراهم إليه مهطعين إلى السماع

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 453

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 96

مکہ مکرمہ میں اس کے مکین ہیں، میں انہیں دیکھتا ہوں کہ وہ بات سننے کے لیے جلدی کرتے ہیں۔ معنی ہے انہیں کیا ہو گیا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جلدی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جو حکم دیتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے میں جلدی کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کفار کو کیا ہو گیا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے میں جلدی کرتے ہیں تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیب جوئی کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑائیں۔ عطیہ نے کہا: مُهْطِعِيْنَ کا معنی ہے وہ اعراض کرتے ہیں۔ کلبی نے کہا: وہ تعجب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: وہ قصد کرتے ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جلدی کرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اپنی گردنوں کو لمبا کیے ہوتے ہیں اور لگاتار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ دشمن کی نظر ہوتی ہے۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ آیت استہزاء کرنے والے منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر تو ہوتے مگر ایمان نہ لاتے قِبَلَكَ کا معنی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔

**عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۞** وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں اور بائیں جانب سے حلقے بناتے ہوئے اور جماعت در جماعت۔ عزین کا معنی ہے مختلف جماعتیں؛ یہ ابو عبید کا قول ہے۔ اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے پاس تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مختلف حلقے بناتے ہوئے دیکھا۔ فرمایا: مالی أراكم عِزِين ألا تَصُفُّون كما تَصُفُّ الملائكةُ عند ربها، قالوا وكيف تَصُفُّ الملائكةُ عند ربها؟ قال: يُتِمُّون الصفوف الأُوَل ويتراصُّونَ في الصف (1) امام مسلم اور دوسرے علماء نے اسے روایت کیا ہے۔

فرمایا: کیا وجہ ہے میں تمہیں مختلف حلقے بناتے ہوئے دیکھتا ہوں کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناؤ گے جس طرح فرشتے اپنے رب کے ہاں صفیں بناتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: فرشتے اپنے رب کے ہاں کیسے صفیں بناتے ہیں؟ فرمایا: وہ پہلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف میں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

تَرَانا عنده والليلُ داجٍ على أبوابه حِلَقًا عِزِينا (2)

تو ہمیں اس کے ہاں اس کے دروازوں پر مختلف حلقوں کی صورت میں دیکھتا ہے جبکہ رات انتہائی تاریک ہوتی ہے۔

راعی نے کہا:

أخليفةَ الرحمن إنّ عشيرتي أمسى سَرَاتُهم إليك عزينا

اے رحمٰن کے خلیفہ! بے شک میرا خاندان گروہ در گروہ تیری طرف راتوں کو چلتے ہوئے آتا ہے۔

کمیت نے کہا۔

ونحنُ وجَنْدَلٌ باغٍ تَرَكْنا كَتَائبَ جَنْدَلٍ شَتّىٰ عِزِينا

ہم نے جندل کے لشکروں کو مختلف گروہوں کی صورت میں چھوڑا جبکہ جندل بغاوت کرنے والا تھا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، تسویۃ الصفوف واقامتھا، جلد 1، صفحہ 181 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 97

عزین کا واحد عزۃ ہے۔ واؤ، نون کے ساتھ اس کی جمع بنائی گئی تا کہ اس سے جو حرف حذف ہے اس کا یہ عوض بنا جائے۔ اصل میں یہ عزھۃ تھا۔ اس میں وہی تعلیل جاری ہوگی جو سنۃ میں جاری ہوئی، اس کے نزدیک جس نے اس کی اصل سنھۃ بنائی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اصل عزوۃ ہے۔ یہ عزاہ، یعزوہ سے مشتق ہے۔ جب وہ اسے کسی اور کی طرف منسوب کرے۔ ان جماعتوں میں سے ہر ایک دوسری کی طرف منسوب ہے۔ یہاں جو حرف حذف ہے وہ واو ہے۔ صحاح میں اس طرح ہے عزۃ سے مراد لوگوں کا ایک فرقہ ہے، ھاء، یاء کا عوض ہے۔ اس کی جمع عِزّی، فَعِل کے وزن پر ہے۔ اس کی جمع عِزون اور عُزون کے وزن پر آتی ہے۔ انہوں نے اس کی جمع عِزات نہیں بنائی جس طرح انہوں نے ثُبات کہی۔ اصمعی نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے فی الدار عزون یعنی لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ یہ مُهْطِعِيْنَ کے متعلق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ عِزِيْنَ کے متعلق ہو جس طرح تیرا قول ہے: أخذته عن زید۔

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ مفسرین نے کہا: مشرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد جمع ہو جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سنتے، اس کو جھٹلاتے، آپ پر جھوٹ بولتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے استہزاء کرتے اور کہتے: اگر یہ جنت میں داخل ہوئے تو ہم ان سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اگر انہیں جنت کی کوئی چیز دی گئی تو ہمیں ان سے زیادہ چیز دی جائے گی۔ تو یہ آیت اَيَطْمَعُ نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: استہزاء کرنے والوں کے پانچ گروہ تھے۔

حضرت حسن بصری، حضرت طلحہ بن مصرف اور اعرج نے اَنْ يَّدْخُلَ قرأت کی ہے، یاء پر زبر اور خاء پر پیش ہے۔ یہ معروف کا صیغہ ہے۔ مفضل نے اسے عاصم سے روایت کیا ہے باقی نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

كَلَّا وہ اس میں داخل نہیں ہوں گے پھر نئے سرے سے کلام شروع کی اور فرمایا: اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ یعنی وہ جانتے ہیں کہ انہیں ایک نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کے لوتھڑا سے پیدا کیا گیا ہے جس طرح اس کی ساری جنس کو پیدا کیا گیا۔ انہیں کوئی فضیلت نہیں جس کے باعث وہ جنت کے مستحق بنیں، جنت کا مستحق تو ایمان، عمل صالح اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بنا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ مسلمان فقراء کا مذاق اڑایا کرتے اور ان پر تکبر کرتے تو فرمایا: اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ انہیں تکبر کرنا مناسب نہیں۔ قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اے انسان! تو ایک گندے قطرہ سے پیدا کیا گیا ہے، تو اللہ سے ڈر۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ مطرف بن عبداللہ بن شخیر نے مہلب بن ابی صفرہ کو خز (ریشم) کی چادر اور جبہ میں اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو اسے فرمایا: اے اللہ کے بندے! یہ کیسی چال ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے؟ مہلب نے مطرف سے کہا: کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ فرمایا: ہاں تیرا آغاز گندے نطفہ سے ہے اور تیری انتہاء بدبودار لاشہ ہے، اس کے درمیان تو غلاظت کو اٹھائے ہوئے ہے۔ مہلب چلا گیا اور اس چال کو ترک کر دیا۔ محمود وراق نے اسی مضمون کو اشعار میں بیان کیا ہے:

عَجِبْتُ مِن مُعْجَبٍ بصورته ... وكان فی الأصل نطفةً مَذِرَةْ

وهو غدًا بعد حُسْن صورته ... يصيرُ فی اللحد جيفةً قَذِرَةْ

وهو على تيهه ونَخْوته مابين ثوبيه يحمل العَذِرَة

میں اس آدمی پر متعجب ہوا جس کی صورت پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اصل میں وہ ایک گندا نطفہ ہے۔ وہ کل حسن صورت کے باوجود لحد میں بدبودار لاشہ ہوگا۔ وہ اپنے تکبر اور نخوت کے باوجود اپنے کپڑوں کے درمیان غلاظت اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا:

هل فی ابن آدم غیرَ الراس مَکْرُمَةٌ وهو بِخَمْسٍ من الأوساخ مضروب

أنفٌ يسيل وأذْنٌ ريحها سَهِكٌ والعين مُرْمَصَة والثغر ملهوب

يابن التراب ومأكول التراب غدًا قَصِّرْ فإنك مأكول و مشروب

کیا سر کے علاوہ انسان میں عزت والی شی ہے جبکہ اس میں پانچ میل والی چیزیں ہیں۔ ناک بہتی ہے، کان کی بو ناپسندیدہ ہے، آنکھ میں کیچڑ ہوتا ہے اور دانتوں پر میل ہے۔ اے مٹی سے جنم لینے والے! اور کل جس کو مٹی کھا جائے گی! اپنے آپ کو پست رکھ تجھے کھلایا جاتا ہے اور پلایا جاتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس مقصد کے لیے جسے وہ جانتے ہیں۔ وہ امر، نہی، ثواب اور عقاب ہے جس طرح شاعر کے قول میں من أجلیه ہے؛ یہ اعشی کا قول ہے: أأزْمَعْتُ من آل لَیْلی ابتکارًا کیا تو نے آل لیلی کے لیے جلدی کا قصد کیا ہے۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۟ۙ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝

''پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم پوری قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے بدلے میں ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم ایسا کرنے سے عاجز نہیں''۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ یعنی میں قسم اٹھاتا ہوں۔ یہاں لا زائدہ ہے۔ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ سورج کے مشرقوں اور اس کے مغربوں کے رب کی۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ابوحیوہ، ابن محیصن اور حمید نے بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ واحد کے صیغہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۟ۙ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم ہلاک کرنے، انہیں لے جانے اور فضل، اطاعت اور مال میں بہتر لوگوں کو لانے پر قادر ہیں۔ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝ کوئی چیز ہم سے فوت نہیں ہوسکتی اور ہم جس امر کا ارادہ کرلیں، وہ ہمیں عاجز نہیں کرسکتا۔

فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَ یَلْعَبُوْا حَتّٰى یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ۝

''سو آپ رہنے دیجئے انہیں کہ (خرافات میں) مگن رہیں اور کھیلتے کودتے رہیں حتیٰ کہ ملاقات کریں اپنے اس

دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

انہیں چھوڑ دو کہ اپنے باطل میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور دنیا میں کھیلتے رہیں۔ یہ کلام وعید کے طریقہ پر ہے۔ ابن محصین، مجاہد اور حمید نے اسے حَتّٰی یَلْقَوا یَوْمَھُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ پڑھا ہے۔ یہ آیت، آیت سیف سے منسوخ ہے۔

**یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾**

''اس روز نکلیں گے (اپنی) قبروں سے جلدی جلدی گویا وہ (اپنے بتوں کے) استھانوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں''۔

یَوْمَ اس یوم سے بدل ہے جو اس سے پہلے ہے۔ عام قرأت یَخْرُجُوْنَ ہے یاء پر فتحہ اور راء پر ضمہ ہے کیونکہ یہ معروف کا صیغہ ہے۔ سلمی، مغیرہ اور اعشی نے عاصم سے یُخْرَجُوْنَ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ الأجداث سے مراد قبریں ہیں (1)۔ اس کا واحد جدث ہے۔ سورۂ یاسین میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ سِرَاعًا جب وہ دوسرے نغمہ کو سنیں گے تو بلانے والے کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جلدی جلدی نکلیں گے۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔

كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ عام قرأت نون کے فتحہ اور صاد کے جزم کے ساتھ ہے۔ ابن عامر اور حفص نے نون اور صاد کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ عمرو بن میمون، ابو رجاء اور دوسرے علماء نے نون کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ نَصْب اور نُصْب دونوں لغتیں ہیں جس طرح ضَعْف اور ضُعْف۔ جوہری نے کہا: نَصْب سے مراد وہ چیز ہے جسے کھڑا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اس کی عبادت کی جائے۔ اسی طرح نُصْب ہے، بعض اوقات اسے حرکت دی جاتی ہے۔ اعشی نے کہا:

وذَا النُّصُب المنصوبَ لا تَنْسُكَنَّهُ　　لعافِيَةٍ　واللهِ　رَبَّك　فاعْبُدَاْ

یہاں فاعبدن کا ارادہ کیا اور الف پر وقف کیا جس طرح تو کہتا ہے: رایت زیدا اس کی جمع انصاب آتی ہے۔ شاعر کا قول: وذا النُّصُب یہ اِیَّاك وذا النُّصُب کے معنی میں ہے۔ نصب سے مراد شر اور بلاء ہے۔ شعر کا ترجمہ: نصب کیے ہوئے بت سے بچ کسی عافیت کے حصول کے لیے اس کی عبادت نہ کر، اللہ تعالیٰ تیرا رب ہے تو اسی کی عبادت کر۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿۴۱﴾ (ص) اخفش اور فراء نے کہا: نُصُب یہ نَصَب کی جمع ہے جس طرح رَهَن کی جمع رُهُن ہے۔ أنصاب یہ نُصُب کی جمع ہے، یہ جمع کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نُصُب اور أنصاب دونوں ایک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نصب یہ نصاب کی جمع ہے۔ یہ ایسا پتھر یا بت ہے جس پر جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدہ: 3) ایک قول یہ کیا گیا ہے: نَصْب، نُصْب اور نُصُب سب ایک معنی میں ہیں جس طرح عَمْر، عُمْر اور عُمُر ہے؛ نحاس نے اس کا ذکر کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اِلٰى نُصُبٍ غایت تک۔ اس سے مراد وہ چیز ہے جہاں تک آپ کی نظر پہنچے۔ کلبی نے کہا: مراد ہے کھڑی کی گئی چیز جیسے جھنڈا وغیرہ (2)۔ حضرت حسن بصری

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 97　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 455

نے کہا: جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنے ان بتوں کی طرف جلدی کرتے ہیں جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہیں (1)۔ ان کا پہلا شخص آخری کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔

**یُوْفِضُوْنَ** ۝ وہ جلدی کرتے ہیں۔ ایفاض کا معنی جلدی کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

فوارس ذُبْیانَ تحت الحدید کالجنِّ یُوفضن من عَبْقَرِ

ذبیان کے شاہسوار لوہے کے نیچے جنوں کی طرح ہیں جو عبقر (جنوں کا علاقہ) سے تیزی سے نکلتے ہیں۔

عبقر ایسا علاقہ ہے عرب جس کے بارے میں گمان کرتے ہیں کہ وہ جنوں کی سرزمین ہے۔

لیث نے کہا: وفضت الإبل تَفِض وفضًا اونٹ تیزی سے چلے۔ اوفضھا صاحبھا ان کے مالکوں نے انہیں تیز چلایا۔

ایفاض متعدی ہے آیت میں جو لفظ لازم ہے۔ یہ کہا جاتا ہے: وفض، أوفض اور استوفض کا معنی جلدی کرنا ہے۔

**خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝**

"جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں چھا رہی ہوگی ان پر ذلت، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا"۔

**خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ** آنکھیں جھکی ہوئی اور ذلیل ہیں۔ انہیں کیونکہ عذاب کی توقع ہے اس لیے وہ اپنی نظروں کو اوپر نہیں اٹھاتے۔ **تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ** ان پر ذلت چھا جائے گی (2)۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد چہروں کی سیاہی ہے۔ رھق سے مراد چھا جانا ہے اسی سے غلام مراھق ہے جب احتلام کا وقت قریب ہو جائے اور وہ چھانے والا ہو۔ رَھِقَہ، یَرْھَقُہ، رھقًا اس پر چھا گیا۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ** (یونس: 26) **ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ** ۝ دنیا میں انہیں ڈرایا جاتا تھا کہ ان کے لیے عذاب ہے۔ فعل ماضی کے ساتھ خبر دی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا وہ ضرور ہو کر رہے گا۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 197 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 455

# سورۂ نوح

آیاتہا ۲۸ ۷۱ سورۃ نوح مکیۃ ۷۱ رکوعاتہا ۲

یہ سورت مکی ہے، اس کی اٹھائیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ①

''بے شک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (اور فرمایا: اے نوح!) بروقت خبردار کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ نازل ہو جائے ان پر عذاب الیم''۔

سورۂ اعراف میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام فرد ہیں جنہیں رسول بنا کر مبعوث کیا گیا۔ قتادہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''پہلے رسول جنہیں مبعوث کیا گیا وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور انہیں تمام اہل زمین کی طرف مبعوث کیا گیا''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمام اہل زمین کو ہلاک کر دیا۔ ان کا نسب یہ ہے حضرت نوح بن لامک بن متوشلخ بن اخنوخ یہی حضرت ادریس ہیں بن یرد بن مہلائیل بن انوش بن قینان بن شیث بن آدم علیہ السلام۔

وہب نے کہا: یہ سب مومن تھے۔ انہیں اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا جبکہ ان کی عمر پچاس سال تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی عمر چالیس سال تھی (1)۔ عبداللہ بن شداد نے کہا: انہیں مبعوث کیا گیا جبکہ ان کی عمر ساڑھے تین سو سال تھی۔ سورۂ عنکبوت میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ اصل میں بأن انذر تھا حرف جار کے حذف کی وجہ سے ان محل نصب میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا محل جر ہے کیونکہ ان کے ساتھ یہ عمل کرنے میں قوی ہے۔ یہ جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو۔ اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوگا کیونکہ ارسال میں امر کا معنی پایا جاتا ہے اس لیے باء کو مضمر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت عبداللہ کی قرأت میں أَنْ کے بغیر أَنذِرْ قَوْمَكَ ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا ہم نے اسے کہا: اپنی قوم کو ڈرائیے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں انذار کا معنی گزر چکا ہے۔

مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد آخرت میں آگ کا عذاب ہے (2)۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد ہے جو طوفان کی صورت میں ان پر عذاب آیا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اگر وہ ایمان نہ لائیں تو انہیں دردناک عذاب سے ڈرائیے۔ آپ اپنی قوم کو دعوت دیتے اور انہیں خبردار کرتے اور ان میں سے کسی فرد کو بھی دعوت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 98 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

قبول کرنے والا نہ پاتے۔ لوگ آپ کو مارتے یہاں تک کہ ان پر غشی طاری ہو جاتی تو وہ کہتے: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (1) اے میرے رب! میری قوم کو بخش دے بے شک وہ مجھے نہیں جانتے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''آپ نے فرمایا: اے میری قوم! میں تمہیں صریح طور پر ڈرانے والا ہوں کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس سے ڈرو اور میری پیروی کرو، وہ بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہ اور مہلت دے گا تمہیں ایک مقررہ معیاد تک، بلاشبہ اللہ کا مقررہ وقت جب آجاتا ہے تو اسے موخر نہیں کیا جا سکتا، کاش! تم (حقیقت کو) جان لیتے''۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ یعنی میں تمہیں ڈرانے والا ہوں۔ مُّبِيْنٌ ۝ میں تمہارے سامنے تمہاری اس زبان میں اظہار کرنے والا ہوں جسے تم پہچانتے ہو۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ، ان مفسرہ ہے جس طرح اَنْ اَنْذِرْ میں گزر چکا ہے۔ اعْبُدُوا اس کی وحدانیت کا اظہار کرو۔ وَاتَّقُوْهُ تم ڈرو۔ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ جس چیز کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اس میں میری اطاعت کرو۔ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ جواب امر کی وجہ سے يَغْفِرْ کو جزم دی گئی ہے۔ مِنْ زائد ہے۔ کلام کا معنی ہے وہ تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا زائدہ ہونا صحیح نہیں کیونکہ مِنْ کا واجب میں اضافہ نہیں کیا جاتا (2)۔ یہ یہاں بعضیہ ہے۔ اس سے مراد بعض گناہ ہیں جو مخلوق کے حقوق سے متعلق نہ ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جنس کے بیان کے لیے ہے۔ اس میں بعد ہے کیونکہ اس سے پہلے کوئی جنس نہیں گزری جو اس کے مناسب ہو۔ زید بن اسلم نے کہا: معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے گناہوں سے نکالے (3)۔ ابن شجرہ نے کہا: معنی ہے جن گناہوں پر تم استغفار کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ان گناہوں کو بخش دے (4)۔

وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تمہاری عمروں میں مہلت دے گا۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ اگر وہ ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت ڈال دے گا۔ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ان پر عذاب کو جلدی لے آئے گا۔ مقاتل نے کہا: تمہاری عمر کے آخری حصہ تک صحت و سلامتی کے ساتھ تمہیں مہلت دے گا اور قحط وغیرہ کے ساتھ سزا نہیں دے گا۔ اس تاویل کی بنا پر معنی یہ بنے گا تمہاری عمروں کے اختتام تک تمہیں عقوبات اور شدائد سے محفوظ رکھے گا۔ زجاج نے کہا: عذاب سے تمہیں مہلت دے گا تم کو ایسی موت نہیں مارے گا جو عذاب کے ساتھ جڑ کو ہی ختم کر دے؛ اس وجہ سے فرمایا: اَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی ایسی موت تک جس کو تم پہچانتے ہو۔ وہ تمہیں غرق کر کے، جلانے کے ساتھ اور قتل کر کے نہیں مارے گا؛ فراء نے اس کا ذکر کیا۔ پہلے قول کی بنا وہ مدت اللہ تعالیٰ کے ہاں معروف ہے۔ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ جب موت آجاتی ہے اسے موخر نہیں کیا جاتا وہ موت عذاب کی صورت میں ہو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 98 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

یا عذاب کے بغیر ہو۔ اجل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی کیونکہ اسی ذات نے انہیں ثابت کیا۔ بعض اوقات اس کی نسبت قوم کی طرف کی جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ (الاعراف: 34) کیونکہ یہ اجل ان کے لیے بیان کر دی گئی ہے۔ لو، ان کے معنی میں ہے یعنی اگر تم جانتے ہو۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تم جانتے ہوتے تو اس کو جان لیتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ وقت جب آ جائے تو اس میں تاخیر نہیں کی جاتی (1)۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝

''نوح نے عرض کی: اے میرے رب! میں نے دعوت دی اپنی قوم کو رات کے وقت اور دن کے وقت لیکن میری دعوت کے باعث ان کے فرار (ونفرت) میں ہی اضافہ ہوا''۔

لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝ کا معنی ہے مخفی طریقہ سے اور اعلانیہ طریقہ سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں نے پے در پے دعوت دی۔ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ میری دعوت ایمان سے دور کرتی ہے۔ عام قرأت دعائی میں یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ کوفہ کے قراء، یعقوب اور دوری نے ابو عمر سے اس کے سکون کی روایت نقل کی ہے۔

وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝

''اور جب بھی میں نے انہیں بلایا تا کہ تو ان کو بخش دے (تو ہر بار) انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر لپیٹ لیے اپنے کپڑے اور اڑ گئے کفر پر اور پرلے درجے کے متکبر بن گئے''۔

میں نے جب انہیں سبب مغفرت یعنی تیری ذات پر ایمان اور تیری طاعت کی طرف بلایا انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں تا کہ وہ میری دعوت کو نہ سن سکیں، انہوں نے اپنے چہروں کو اپنے کپڑوں سے ڈھانپ لیا تا کہ وہ مجھے دیکھ ہی نہ سکیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے اپنے کپڑے اپنے سروں پر ڈال لیے تا کہ وہ کلام نہ سن سکیں۔ کپڑوں کے استغشاء کا مطلب ہے کہ کانوں کو بند کرنے میں زیادتی کرنا تا کہ وہ اس آواز کو نہ سنیں یا اپنے آپ کو اجنبی بنانے کے لیے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جائے یا آپ سے اپنے اعراض کو ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عداوت و دشمنی سے کنایہ ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: لَبِسَ لی فلان ثیاب العداوۃ اس نے میرے لیے عداوت کا لباس پہن لیا۔

اَصَرُّوْا انہوں نے کفر پر اصرار کیا اور توبہ نہ کی۔ وَ اسْتَكْبَرُوا انہوں نے قبول حق سے اپنی بڑائی کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے کہا: اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ (الشعراء) کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جبکہ کمینے لوگوں نے آپ کی پیروی کی۔ اسْتِكْبَارًا بہت بڑا تکبر کیا۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 99

''پھر (بھی) میں نے ان کو بلند آواز سے دعوت دی، پھر انہیں کھلے بندوں سمجھایا اور چپکے چپکے بھی انہیں (تلقین) کی''۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ان کے لیے دعوت کو ظاہر کرتے ہوئے دعوت دی۔ جِهَارًا، دَعَوْتُهُمْ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ دعوت کی قسموں میں جِهَارًا بھی ایک قسم ہے تو اس کو نصب اسی طرح دی گئی ہے جس طرح قرفصاء کو تعد کے ساتھ نصب دی گئی کیونکہ یہ بھی تعود کی ایک قسم ہے یا اس لیے کیونکہ دَعَوْتُهُمْ سے مراد جاهرتهم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ دعا فعل کے مصدر کی صفت ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی دعاء جهارا، جِهَارًا۔ یہ مجاهر کے معنی میں ہے۔ یہ مصدر حال کی جگہ پر واقع ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی دعوتهم مجاهرا لهم بالدعوة میں نے انہیں دعوت دی اس حال میں کہ میں انہیں ظاہر دعوت دے رہا تھا۔

ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا میں نے کوئی صورت نہ چھوڑی۔ مجاہد نے کہا: اَعْلَنْتُ کا معنی ہے میں نے چیخ کر دعوت دی اور میں نے اپنی دعوت کو ان میں سے ایک دوسرے سے مخفی رکھا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَسْرَرْتُ لَهُمْ میں ان کے گھروں میں گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے یہ سب کچھ ان کو دعوت دینے میں مبالغہ کے لیے تھا اور دعوت میں نرمی اور مہربانی کے طور پر تھا۔ حرم کے قاریوں اور ابو عمرو نے انی کی یاء کو فتحہ دیا ہے اور باقی قراء نے اسے سکون دیا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا

''پس میں نے کہا: (ابھی وقت ہے) معافی مانگ لو اپنے رب سے، بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ برسائے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش، اور مدد فرمائے گا تمہاری اموال اور فرزندوں سے اور بنا دے گا تمہارے لیے باغات اور بنا دے گا تمہارے لیے نہریں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

### استغفار کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ایمان کے اخلاص کے ساتھ اپنے سابقہ گناہوں سے مغفرت کا سوال کرو۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا یہ اس کی جانب سے توبہ میں ترغیب ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے فرمایا: الاستغفار ممحاة للذنوب (2) استغفار گناہوں کو مٹانے والی ہے۔ فضیل نے کہا: بندہ کہتا ہے: أستغفر الله اس کی تفسیر أقلني ہے یعنی میری غلطیوں سے درگزر فرما۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 101 2۔ ایضاً

## توبہ کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 2۔** یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وہ آسمان کا پانی برساتا ہے۔ اس کلام میں اضمار ہے۔ اصل یہ ہے یرسل ماء السماء۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: السماء، کا معنی ہی بارش ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

إذا سقط السماءُ بأرضِ قوم    رَعَیناہ وإن کانوا غِضابًا

جب بارش کسی قوم کے علاقہ میں ہوتی ہے تو ہم اس کے سبزہ کو چرتے ہیں اگرچہ وہ غضب ناک ہوں۔

مِّدْرَارًا کثیر بارش والی۔ یُّرْسِلِ کو جزم دی گئی ہے کیونکہ یہ جواب امر ہے۔ مقاتل نے کہا: جب انہوں نے طویل عرصہ تک حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا۔ چالیس سال تک ان کی عورتوں کے رحموں کو بانجھ کر دیا، ان کے جانور ہلاک ہو گئے اور کھیتیاں برباد ہو گئیں۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے بارش کے برسنے کی التجا کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: اپنے رب سے بخشش طلب کرو، بے شک وہی بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ یعنی جو بھی اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ اس کے ساتھ ہمیشہ اسی طرح کا سلوک کرتا ہے۔ پھر ایمان میں ترغیب دیتے ہوئے کہا: وہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا، بیٹوں اور اموال کے ساتھ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے لیے باغات بنا دے گا اور تمہارے لیے نہریں بنا دے گا(2)۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نبی کو علم تھا کہ وہ دنیا کے بارے بڑے حریص ہیں تو فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف آؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں دنیا و آخرت ملتی ہے۔

## استغفار پر مرتب ہونے والے نتائج

**مسئلہ نمبر 3۔** اس آیت اور سورۂ ہود کی آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ استغفار کے ذریعے رزق اور بارش کو طلب کیا جاتا ہے۔ امام شعبی نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ استسقاء کے لیے نکلے تو استغفار سے زائد کچھ عمل نہ کیا یہاں تک کہ واپس آ گئے تو لوگوں پر بارش ہو گئی۔ لوگوں نے عرض کی: ہم نے آپ کو استسقاء کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟ فرمایا: میں نے آسمان کے مجادیح سے بارش طلب کی جن کے ساتھ بارش کے برسنے کو طلب کیا جاتا ہے، پھر پڑھا اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۙ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ امام اوزاعی نے کہا: لوگ بارش کو طلب کرنے کے لیے نکلے۔ ان میں بلال بن سعد بھی نکلے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر یوں گویا ہوئے: اے اللہ! ہم نے تجھے یہ کہتے ہوئے سنا مَا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ (التوبہ: 91) ہم نے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ تیری مغفرت نہیں مگر ہماری مثل لوگوں کے لیے۔ اے اللہ! ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما اور ہمیں سیراب کر۔ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیئے تو ان پر بارش کی گئی۔

ابن صبیح نے کہا: ایک آدمی نے حضرت حسن بصری کی خدمت میں خشک سالی کی شکایت کی۔ آپ نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرو۔ ایک اور آدمی نے فقر کی شکایت کی۔ آپ نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کرو۔

---

1۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 907    2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 101

ایک اور آدمی نے عرض کی: اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کیجئے کہ وہ بچہ عطا فرمائے۔ آپ نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حضور بخشش کی التجا کر۔ ایک اور آدمی نے باغ کے خشک ہونے کی شکایت کی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کر۔ ہم نے اس بارے میں ان سے عرض کی؟ فرمایا: میں نے اپنی جانب سے تو کچھ نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نوح میں ارشاد فرماتا ہے: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿﴾ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿﴾ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا ﴿﴾ سورۂ آل عمران میں استغفار کی کیفیت گزر چکی ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ ہو اور گناہوں کو ختم کرنے کی صورت میں ہو۔ قبولیت میں یہی اصل ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿﴾

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم پرواہ نہیں کرتے اللہ کی عظمت وجلال کی حالانکہ اس نے تمہیں کئی مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے"۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجا یہاں خوف کے معنی میں ہے یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے کہ وہ تم میں سے کسی کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف کو ترک کرنے میں تمہارے پاس کیا عذر ہے۔ سعید بن جبیر، ابو العالیہ اور عطاء بن ابی رباح نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب کی امید نہیں رکھتے اور اس کے عقاب سے نہیں ڈرتے (1)۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے عقاب سے نہیں ڈرتے اور اس سے ثواب کی امید رکھتے ہو۔ والبی اور عوفی نے ان سے روایت نقل کی ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نہیں جانتے (2)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال نہیں کرتے۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کی پرواہ نہیں کرتے۔ قطرب نے کہا: یہ مجازی لغت ہے۔ بنو ہذیل، بنو خزاعہ اور بنو مضر کہتے ہیں لم ارج کا معنی ہے: میں پرواہ نہیں کرتا، وقار کا معنی عظمت ہے، توقیر کا معنی تعظیم ہے۔ قتادہ نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے پکڑ کی امید نہیں رکھتے۔ گویا معنی یوں ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اللہ تعالیٰ سے ایمان پر جزا کی امید نہیں رکھتے۔ ابن کیسان نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی طاعت کے بارے میں یہ امید نہیں رکھتے کہ وہ تمہیں اس صورت میں بدلہ دے کہ تمہیں بھلائی عطا کر کے عزت دے۔ ابن زید نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طاعت نہیں کرتے (3)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا حق نہیں پہچانتے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر بجا نہیں لاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا وجہ ہے تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ جو اس کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ اس کی وحدانیت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وقار کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت قدم ہونا (4)۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَقَرْنَ فِيْ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 101
2۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 909
3۔ تفسیر ابن عباس، جلد 2، صفحہ 909
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 101

بُیُوْتِکُنَّ (الاحزاب:33) اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ اس کا معنی ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اثبات نہیں کرتے جبکہ وہ تمہارا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں (1)۔ کہا قول ابن بحر نے کیا ہے، پھر اس پر دلیل قائم کی۔ فرمایا: وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا۝ یعنی تمہاری ذات میں ایسی نشانی بنا دی جو اس کی وحدانیت پر دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اَطْوَارًا یعنی نطفہ، جما ہوا خون اور گوشت کا لوتھڑا (2)، یعنی خلقت کے مکمل ہونے تک مرحلہ بہ مرحلہ جس طرح سورۂ مومنون میں ہے۔ لغت میں طور سے مراد مرۃ (ایک دفعہ) ہے یعنی جس نے یہ عمل کیا اور اس پر قادر رہا، وہ اس امر کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس کی عظمت بیان کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَطْوَارًا سے مراد ہے بچے، جوان پھر بوڑھے اور ضعیف پھر قوی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَطْوَارًا سے مراد انواع ہے، صحیح، مریض، بینا، نابینا، غنی اور فقیر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اطوار سے مراد اخلاق اور افعال میں ان کا مختلف ہونا ہے (3)۔

اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۝ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۝

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہ بہ تہ اور بنایا ہے چاند کو ان میں روشنی اور بنایا سورج کو (درخشاں) چراغ"۔

اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۝ ان کے لیے ایک اور دلیل ذکر کی یعنی کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ذات جو اس پر قادر ہے تو وہی اس امر کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ طِبَاقًا کا معنی ہے ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہو۔ ہر آسمان دوسرے آسمان پر اس طرح ہے جس طرح قبہ ہوتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور سدی کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو سات زمینوں کے اوپر پیدا کیا (4)۔ ہر دو زمینوں اور دو آسمانوں کے درمیان مخلوق اور امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اَلَمْ تَرَوْا اخبار کے طریقہ پر ہے، آنکھوں سے مشاہدہ کے طریقہ پر نہیں جس طرح تو کہتا ہے اَلَمْ تَرَنِیْ کیف صنعت بفلانٍ کیا تو نہیں جانتا میں نے فلاں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ طِبَاقًا سے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی مطابقة طباقا یا یہ حال ہے اور ذات طباق کے معنی میں ہے۔ ذات کے لفظ کو حذف کر دیا گیا اور طباقا کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا چاند کو دنیا کے آسمان میں نور بنا دیا (5) جس طرح کہا جاتا ہے: أتانی بنوتمیم وأتیت بنی تمیم مراد بنو تمیم کا بعض ہیں؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: جب ان آسمانوں میں سے ایک آسمان میں ہو تو وہ ان سب میں ہے۔ قطرب نے کہا: فیھن، معھن کے معنی میں ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے یعنی سورج اور چاند کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ساتھ پیدا کیا۔ اکثر علماء لغت نے امرؤالقیس کے قول میں فی کو مع کے معنی میں لیا ہے: ثلاثین شهرا فی ثلاثة

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 101 | 2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 457 | 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 102
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 200 | 5۔ ایضاً

أحوال تین مہینے تین احوال کے ساتھ۔ نحاس نے کہا: میں نے ابوالحسن بن کیسان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: نحویوں کا جواب تو یہ ہے کہ جب چاند کو ان میں سے ایک میں بنایا تو اسے ان سب میں بنایا جس طرح تو کہتا ہے: أعطني الثياب المُعلمة اگرچہ وہ کپڑا جس میں نشانات ہوں، وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے: یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ چاند کا چہرہ آسمان کی طرف ہے۔ جب وہ آسمان کے اندر کی جانب ہے تو چاند آسمانوں سے متصل ہے۔ نُوۡرًا اہل زمین کے لیے نور بنا دیا (1)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ عطا نے کہا: اہل آسمان اور اہل زمین کے لیے نور بنا دیا (2)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر نے کہا: اس کا چہرہ اہل زمین کو روشنی دیتا ہے اور اس کی پشت آسمان والوں کو روشن کرتی ہے (3)۔

وَّ جَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ۝ یعنی اہل زمین کے لیے مصباح بنا دیا تا کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کے لیے امور سرانجام دے سکیں۔ اہل آسمان کو روشنی دینے کے حوالے سے دو قول ہیں؛ ماوردی نے اسے بیان کیا ہے (4)۔ قشیری نے حضرت ابن عباس بنی‌جہ سے روایت نقل کی ہے کہ سورج کا چہرہ آسمان میں اور اس کی پشت زمین میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کبھی سورج ہمیں بھون کر رکھ دیتا ہے اور کبھی ہم پر ٹھنڈا ہو جاتا ہے (5)؟ فرمایا: یہ چوتھے آسمان میں ہوتا اور موسم سرما میں ساتویں آسمان میں رحمن کے عرش کے پاس ہوتا ہے۔ اگر یہ آسمان دنیا میں ہوتا تو کوئی چیز قائم نہ رہتی (☆)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے، پھر لوٹا دے گا تمہیں اس میں اور (اسی سے) تمہیں (دوبارہ) نکالے گا''۔

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو تمام روئے زمین سے پیدا کیا (6)؛ یہ ابن جریج کا قول ہے۔ سورۂ الانعام اور البقرة میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ خالد بن معدان نے کہا: انسان کو کیچڑ سے پیدا کیا؛ اسی وجہ سے موسم سرما میں دل نرم ہو جاتے ہیں۔ نَبَاتًا یہ مفعول مطلق ہے مگر فعل کا اپنا مصدر نہیں کیونکہ اس کا مصدر یوں آتا ہے: أَنۡبَتَ اِنۡبَاتًا تو اسم جو نبات ہے اسے مصدر کی جگہ رکھا۔ اس کی وضاحت سورۂ آل عمران اور دوسری آیات میں گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر ہے جو معنی پر محمول ہے کیونکہ اَنۡۢبَتَكُمۡ کا معنی ہے تمہیں بنایا کہ تم نباتات اگاتے ہو؛ یہ خلیل اور زجاج نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے لیے زمین سے نبات کو اگایا۔ اس تعبیر کی بنا پر نَبَاتًا مصدر صریح کے طور پر منصوب ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ ابن جریج نے کہا: تمہیں زمین میں چھوٹا ہونے کے بعد بڑا اور لمبا بنایا (7)۔ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا جب تمہیں موت آئے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 102 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً | 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً | 7۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 102 | 8۔ ایضاً

☆ موسم گرما میں کائنات کے اسرار کے بارے میں جو بھی اقوال ذکر کیے جاتے ہیں اگر ان میں کوئی حدیث مرفوع ہو، وہ تیقن سے ثابت ہو اور اس میں مجازی معنی کا احتمال نہ ہو تو اس کو تسلیم کرنا لازم ہے بصورت دیگر اقوال کے سامنے سر تسلیم خم کرنا کوئی لازم نہیں ہے غور و فکر کی دعوت عام ہے۔ مترجم

گی تو دفن کرنے کے ساتھ تمہیں زمین میں لوٹا دے گا۔ وَ یُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ قیامت کے روز حساب و کتاب کے لیے دوبارہ زمین سے نکالے گا۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

''اور اللہ نے ہی زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تا کہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو''۔

بساط کا معنی مبسوط ہے پھیلائی ہوئی (1)۔ السبل کا معنی راستے ہیں۔ فجاج یہ فج کی جمع ہے۔ اس سے مراد کھلا راستہ ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فج سے مراد ایسا راستہ ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو۔ سورۃ الانبیاء اور سورۃ الحج میں بحث گزر چکی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾

''نوح نے عرض کی: اے میرے پروردگار! انہوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کرتے رہے جس کو نہ بڑھایا اس کے مال اور اولاد نے بجز خسارہ کے''۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی شکایت کی کہ ان لوگوں نے ان کی نافرمانی کی اور آپ نے انہیں ایمان کے بارے میں جو حکم دیا اس کی اتباع نہ کی۔ اہل تفسیر نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک انہیں دعوت دیتے رہے جبکہ وہ کفر اور نافرمانی پر قائم رہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام آباء کے بعد بیٹوں سے امید رکھتے رہے، اولاد کے بعد اولاد آتی رہی یہاں تک کہ سات نسلوں تک معاملہ جا پہنچا۔ مایوس ہونے کے بعد ان کے حق میں بددعا کی۔ طوفان کے بعد آپ ساٹھ سال زندہ رہے یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد کثیر ہوگئی اور لوگ عام ہو گئے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام کی قوم مہینہ میں دو دفعہ فصل کاشت کرتی تھی (3)؛ ماوردی نے اس کو ذکر کیا۔

وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ انہوں نے اپنے ان معززین اور اغنیاء کی پیروی کی جن کے کفر، اموال اور اولاد نے اضافہ نہیں کیا مگر دنیا میں گمراہی اور ہلاکت کا۔ اہل مدینہ، اہل شام اور عاصم نے وولدہ واؤ اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ولد میں ایک لغت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ وُلد کی جمع ہو جس طرح فُلک یہ واحد اور جمع ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہو۔

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾

''اور انہوں نے بڑے بڑے مکر وفریب کیے''۔

کُبَّارًا یعنی بہت بڑا۔ یوں کہا جاتا ہے: کبیر، کبار، کبّار جس طرح عجیب، عجاب اور عجّاب سب کا ایک معنی ہے۔ اس کی مثل طویل، طوال اور طوّال ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل حسن، رجل حسان، رجل جمیل، رجل جمال، قرّاء قاری کے لیے بولا جاتا ہے اور وضّاء روشن چہرے والے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ابن سکیت نے یہ شعر پڑھا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 103 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

بَيْضَاء تَصْطَادُ القلوب وتَسْتَبِي بالحسن قَلْبَ المُسْلِمِ القُرَّاء

وہ سفید رنگ والی ہے، دلوں کا شکار کرتی ہے اور حسن کے ساتھ مسلمان قاری کے دل کو قیدی بناتی ہے۔ محل استدلال القراء ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

والمَرْءُ يُلْحِقُهُ بِفِتْيَانِ النَّدىٰ خُلُقُ الكريم وليس بالوضَّاءِ(1)

انسان کے اچھے اخلاق سخی لوگوں کے ساتھ لاحق کر دیتے ہیں جبکہ وہ روشن چہرے والا نہ ہو۔

مبرد نے کہا: کبّار جب تشدید کے ساتھ ہو تو یہ مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ ابن محیصن، حمید اور مجاہد نے کبارا جب تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے مکر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کمینے لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام کے قتل پر برانگیختہ کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ صاحب مال اور صاحب اولاد کی جو عزت کیا کرتے تھے یہاں تک کہ کمزور لوگوں نے کہا: اگر یہ لوگ حق پر نہ ہوتے تو انہیں یہ نعمتیں نہ دی جاتیں۔ کلبی نے کہا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جو بیوی اور بچے بنائے تھے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے مکر سے مراد ان کا کفر ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد ان کے بڑوں کو چھوٹوں کا یہ کہنا تھا: لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ (نوح: 23)

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۝ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝

''اور رئیسوں نے کہا: (اے لوگو! نوح کے کہنے پر) ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو اور (خاص طور پر) ود اور سواع کو مت چھوڑنا اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو اور انہوں نے گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو، (الٰہی) تو بھی ان کی گمراہی میں اضافہ کر دے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے: یہ بت اور تصاویر تھیں۔ پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ان کی عبادت کرتی تھی پھر عربوں نے ان کی پوجا کی؛ یہ جمہور کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عربوں کے بت تھے۔ کسی اور نے ان کی عبادت نہیں کی۔ یہ ان کے بڑے اور عظیم بت تھے، اسی وجہ سے لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ کے بعد ان کا ذکر کیا۔ کلام کا معنی وہی بنتا ہے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اپنے پیروکاروں سے کہا: لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ عربوں نے اپنی قوم، اولاد سے کہا: تم ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے متعلق ہے۔ عروہ بن زبیر اور دوسرے علماء نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام بیمار ہوئے جبکہ آپ کے یہ بیٹے آپ کے پاس موجود تھے (3)۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ ود ان سے بڑا اور سب سے نیک تھا۔

محمد بن کعب نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کے پانچ بیٹے تھے۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ سب بڑے عبادت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 376 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 104 3۔ ایضاً

گزار تھے۔ ان میں سے ایک فوت ہو گیا تو وہ اس پر غمگین ہوئے۔ شیطان نے کہا: میں اس جیسی تمہارے لیے تصویر بنا دیتا ہوں۔ جب تم اسے دیکھو گے تو تم اسے یاد کرو گے۔ انہوں نے کہا: اس طرح بنا دو۔ شیطان نے پیتل اور سکے سے مسجد میں اس کی تصویر بنا دی، پھر دوسرا فوت ہوا تو شیطان نے اس کی تصویر بھی بنا دی یہاں تک کہ وہ سب فوت ہو گئے تو اس نے ان سب کی تصویریں بنا دیں۔ اشیاء میں کمی آتی رہی جس طرح آج اشیاء میں کمی آتی ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ترک کر دیا۔ شیطان نے ان سے کہا: کیا وجہ ہے تم کسی شی کی عبادت نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا: ہم کس کی عبادت کریں؟ اس نے کہا: اپنے معبودوں کی اور اپنے آباء کے معبودوں کی، کیا تم نماز پڑھنے کی جگہ میں نہیں دیکھتے؟ تو ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے کہا: تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور تم ود اور سواع کو نہ چھوڑنا۔

محمد بن کعب اور محمد بن قیس نے کہا: وہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان صالح لوگ تھے۔ ان کے کچھ لوگ پیروکار تھے جو ان کی اقتدا کیا کرتے تھے جب وہ فوت ہو گئے ابلیس نے ان کے لیے اس امر کو مزین کیا کہ وہ ان کی صورتیں بنائیں تاکہ ان تصویروں کی مدد سے ان کی کاوشوں کو یاد کرتے رہیں اور انہیں دیکھ کر تسلی حاصل کرتے رہیں تو شیطان نے ان کی تصویریں بنا دیں۔ جب وہ لوگ مر گئے اور دوسرے لوگ آئے انہوں نے کہا: کاش! ہم جانتے کہ ہمارے آباء ان تصویروں کے ساتھ کیا کچھ کرتے تھے؟ شیطان ان کے پاس آیا اور کہا: ان کے آباء ان کی عبادت کیا کرتے تھے تو یہ ان پر رحم کرتے اور ان پر بارش برساتے۔ ان لوگوں نے ان تصویروں کی عبادت کی تو بتوں کی عبادت اس وقت سے شروع ہوئی۔

میں کہتا ہوں: مسلم شریف میں جو حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ اس معنی کی تفسیر بیان کرتی ہے، حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیسہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا جسے ماریہ کہتے تھے جس میں تصاویر تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب ان میں کوئی صالح آدمی ہوتا تو اس کی قبر پر وہ مسجد بنا دیتے اور اس میں وہ تصویریں بنا دیتے تھے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ تمام مخلوق سے برے لوگ ہوں گے“ (1)۔

ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ بت حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح افراد کے نام ہیں جب یہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کی طرف الہام کیا جب مجلسوں میں وہ بیٹھا کرتے تھے کہ ان مجلسوں میں کوئی نشان کھڑا کر دو اور انہیں ان کے نام دے دو۔ ان کے ذریعے تم انہیں یاد رکھو گے تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی عبادت نہ کی گئی یہاں تک کہ یہ لوگ ہلاک ہو گئے اور علم ناپید ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کی عبادت کی جانے لگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ہند کے ایک پہاڑ پر حضرت آدم علیہ السلام کے جسد اطہر کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، النھی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

حفاظت کرتے تھے اور کافروں کو ان کی قبر کا طواف کرنے سے منع کرتے تھے۔ شیطان نے انہیں کہا: یہ لوگ تم پر فخر کرتے ہیں اور گمان رکھتے ہیں کہ صرف یہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں تم ان کی اولاد نہیں ہو۔ یہ تو صرف جسم ہے۔ میں اسی جیسی تمہارے لیے تصویر بنا دیتا ہوں جس کا تم طواف کر لینا۔ اس نے ان کے لیے ان پانچ بتوں کی تصویر بنا دی اور ان کی عبادت پر انہیں برانگیختہ کیا، جب طوفان کے دن آئے تو کیچڑ، مٹی اور پانی نے انہیں دفن کر دیا۔ یہ دفن ہی رہے یہاں تک کہ شیطان نے انہیں مشرکین عرب کے لیے باہر نکالا۔ ماوردی نے کہا: جہاں تک ود کا تعلق ہے تو وہ پہلا بت ہے جس کی عبادت کی گئی اسے ود کا نام دیا گیا کیوں لوگ اس سے محبت کرتے تھے (1)۔ قوم نوح کے بعد یہ دومۃ الجندل میں بنو کلب کا بت تھا، یہ حضرت ابن عباس، عطا اور مقاتل کا قول ہے؛ اسی کے بارے میں ان کا شاعر کہتا ہے:

حَیَّاكَ وَدٌّ فإنا لا یحلّ لنا　　لَهْوُ النساء وإن الدین قد عَزَمَا (2)

ود تجھے زندہ رکھے ہمارے لیے عورتوں کے ساتھ لہو و لعب حلال نہیں، بے شک دین پختہ ہو چکا ہے۔

جہاں تک سواع کا تعلق تھا تو یہ ساحل سمندر پر بنو ہذیل کا بت تھا (3)۔ یہ ان کا قول ہے۔ جہاں تک یغوث کا تعلق ہے یہ مراد میں سے غطیف کا بت تھا جو سبا کے علاقہ میں جوف کے مقام پر تھا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ پہلے مراد قبیلہ کا بت تھا پھر بنو غطفان کا ہو گیا۔ ثعلبی نے کہا: بنو علی، بنو انعم جو طے سے تعلق رکھتے تھے اور اہل جرش نے مذحج سے یغوث کو لیا اور اسے مراد قبیلہ کی طرف لے گئے اور طویل زمانہ تک اس کی عبادت کرتے رہے۔ پھر بنو ناجیہ نے اعلیٰ اور انعم سے یہ بت چھیننے کا ارادہ کیا اور اسے حصین کی طرف لے گئے جو خزاعہ سے بنی حارث بن کلاب سے تعلق رکھتا تھے۔ ابو عثمان نہدی نے کہا: میں نے یغوث کو دیکھا جو سکے سے بنا ہوا تھا۔ وہ اسے ایسے اونٹ پر لادتے جس میں حرد کی بیماری ہوتی۔ وہ اس کے ساتھ چلتے وہ اسے جھڑکتے نہیں تھے یہاں تک کہ وہ خود ہی بیٹھ جاتا۔ جب وہ بیٹھ جاتا تو وہ ڈیرہ ڈال لیتے اور کہتے اس نے تمہارے لیے منزل کو پسند کر لیا ہے۔ وہ اس پر عمارت بنا لیتے اور خود اس کے اردگرد پڑاؤ ڈال لیتے۔

جہاں تک یعوق کا تعلق ہے تو یہ بلخع کے مقام پر ہمدان کا بت تھا؛ یہ عکرمہ، قتادہ اور عطا کا قول ہے۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے (4)۔ ثعلبی نے کہا: جہاں تک یعوق کا تعلق ہے یہ سبا کے کیلان قبیلہ کا تھا۔ پھر ان کی اولاد اس کی وارث بنتی رہی۔ بڑا پھر بڑا یہاں تک کہ یہ ہمدان تک سلسلہ پہنچا۔

جہاں تک نسر کا تعلق ہے یہ حمیر قبیلہ کی ذی الکلاع شاخ کا بت تھا (5)؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ اسی کی مثل مقاتل سے مروی ہے۔ واقدی نے کہا: ود انسان کی صورت میں تھا، سواع ایک عورت کی صورت میں تھا، یغوث شیر کی صورت پر تھا، یعوق گھوڑے کی صورت پر تھا، نسر یہ گدھ کی صورت پر تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ نافع نے لا تذرن ودا پڑھا ہے یعنی واؤ کو ضمہ دیا ہے باقی نے اسے فتحہ دیا ہے۔ لیث نے کہا: ود (واؤ کے فتحہ کے ساتھ) ایک بت تھا جو قوم نوح کا تھا۔ ود یہ قریش کا ایک بت تھا، اسی کے نام پر عمرو بن ود نام رکھا گیا۔ صحاح میں ہے الود اہل نجد کی لغت میں الوتد تھا گویا انہوں نے تاء کو ساکن کیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 104　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

اور اسے دال میں مدغم کر دیا۔ امراء القیس کے شعر میں الود کا لفظ ہے جس سے مراد الوتد ہے:

تُظْهِرُ الوَدَّ إذا ما أَشْجَذَتْ	وتُوارِيه إذا ما تَعْتَكِرْ

وہ ود کو ظاہر کرتا ہے جب وہ بادل چھٹ جائے اور جب سخت ہو جائے تو اسے چھپا لیتا ہے۔

ابن درید نے کہا: یہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔ ودّ ایک بت تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کی ایک قوم کا تھا۔ پھر یہ بنی کلب کے لیے ہو گیا۔ یہ دومۃ الجندل کے مقام پر نصب تھا۔ اسی مناسبت سے انہوں نے عبد ود نام رکھا۔ اور فرمایا: لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ پھر فرمایا: لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا اس کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7)

وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا یہ حضرت نوح علیہ السلام کا قول ہے یعنی ان میں سے بڑوں نے بہت سے پیرکاروں کو گمراہ کیا۔ اس کا عطف وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، یعنی ان کے سبب سے بہت سے لوگ گمراہ ہو گئے؛ اسی کی مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کا تذکرہ ہے: رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ (ابراہیم: 36) اے میرے رب! انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ ذوی العقول کا وصف ان پر جاری کیا گیا ہے کیونکہ کفار ان کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے تھے۔

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۞ ضلال سے مراد عذاب ہے(1)؛ یہ ابن بحر کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل قائم کی گئی ہے: اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۞ (القمر) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ضلال سے مراد خسارہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مال اور اولاد کا فتنہ ہے۔ اس کا احتمال موجود ہے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۞

"اپنی خطاؤں کے باعث انہیں غرق کر دیا گیا، پھر انہیں آگ میں ڈال دیا گیا، پھر انہوں نے نہ پایا اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار"۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا، ما زائدہ ہے، برائے تاکید ہے اس کا معنی ہے ان کی خطاؤں کے باعث۔ فراء نے کہا: ان کی خطاؤں کی وجہ سے۔ ما نے یہ معنی دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما مجازات پر دال ہے۔ ابو عمرو کی قرأت خطایاھم جمع مکسر کے طور پر ہے۔ اس کا واحد خطیہ ہے۔ جمع میں اصل طریقہ تو یہ تھا کہ وہ خطائی ہوتا جو فعائل کے وزن پر ہے جب دو ہمزے جمع ہو گئے تو دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا کیونکہ اس سے قبل کسرہ ہے پھر اس میں ثقل پیدا ہو گیا اور جمع ثقیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ معتل بھی ہے تو یاء کو ان سے بدل دیا، پھر پہلے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا کیونکہ دو ہمزوں کے درمیان اس میں خفاء ہوتا ہے۔ باقی قراء نے اسے خطیئاتھم جمع سالم کے طریقہ پر پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: یہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہزار سال تک کفر کیا تو ان کی خطاؤں کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ اس سے یہ ارادہ کیا کہ خطایا، خطیات سے زیادہ ہوتی ہیں۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 105

ایک قوم نے کہا: خطایا اور خطیات ایک ہی ہیں۔ دونوں جمع کے صیغے ہیں، کثرت اور قلت میں استعمال ہوتے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان سے استدلال کیا ہے: مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان: 27) شاعر نے کہا:

لنا الجَفَنَاتُ الغُرُّ يلمَعْنَ بِالضُّحَى وأسيافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَجْدَةٍ دَمًا

ہمارے لیے سفید بڑے پیالے ہیں جو چاشت کے وقت چمکتے ہیں اور ہماری تلواریں معزز لوگوں کے خون کے قطرے ٹپکاتی ہیں۔

اسے خطیئاتھم بھی پڑھا گیا ہے اور اسے خطیاتھم بھی پڑھا گیا ہے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا گیا اور ایک یاء کو دوسری یاء میں ادغام کر دیا گیا۔ جحدری، عمرو بن عبید، اعمش، ابو حیرہ اور اشہب عقیلی نے خطیئتھم واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ مراد شرک ہے۔

فَاُدْخِلُوْا نَارًا انہیں غرق کرنے کے بعد آگ میں داخل کر دیا گیا۔ قشیری نے کہا: یہ آیت عذاب قبر پر دلالت کرتی ہے۔ عذاب قبر کے منکرین یہ کہتے ہیں: وہ آگ میں داخل ہونے کے مستحق بن چکے ہیں یا جہنم میں ان کی جو جگہ ہے اسے ان پر پیش کیا گیا جس طرح فرمایا: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا (غافر: 46) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ایک روایت میں ہے: اَلْبَحْرُ نَارٌ فِي نَارٍ۔ سمندر بھی جہنم میں ایک آگ ہے۔ ابو روق نے ضحاک سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے یعنی انہیں آگ کے ساتھ عذاب دیا گیا جبکہ انہیں دنیا میں غرق کیا گیا تھا۔ یہ ایک ہی حالت میں ہیں۔ وہ ایک جانب میں غرق ہوتے تھے اور پانی میں ایک جانب سے جلتے تھے (1)؛ ثعلبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ابو القاسم حبیبی، ابو سعید احمد بن محمد بن رمیح سے وہ ابو بکر بن انباری سے یہ اشعار نقل کرتے ہیں:

الخلق مجتمع طَوْرًا ومفْتَرِق والحادِثَات فُنُونٌ ذاتُ أطوارِ

لاتعجبنَّ لأضدادٍ إنِ اجتمعتْ فاللهُ يجمع بين الماءِ والنارِ

مخلوق کسی مرحلہ میں جمع ہوتی ہے اور کسی مرحلہ میں جدا ہو جاتی ہے۔ حادثات مختلف انداز کے ہیں اور کئی مراحل میں واقع ہوتے ہیں۔ اگر اضداد جمع ہو جائیں تو تو تعجب نہ کر، اللہ تعالیٰ پانی اور آگ کو جمع فرما دیتا ہے۔

فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝ وہ کوئی ایسی ذات نہیں پائیں گے جو ان سے عذاب کو دور کر دے۔

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

"اور نوح نے عرض کی: اے میرے رب! نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا۔ اگر تو نے ان میں کسی کو چھوڑ دیا تو وہ گمراہ کر دیں گے تیرے بندوں کو اور نہ جنیں گے مگر ایسی اولاد جو بڑی بدکار سخت ناشکر گزار ہوگی"۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 459

اس میں چار مسائل ہیں:

## حضرت نوح علیہ السلام نے کب بددعا کی

**مسئلہ نمبر 1**۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے بارے میں اس وقت بددعا کی جب آپ مایوس ہو گئے کہ وہ لوگ آپ کی اتباع کریں گے۔ قتادہ نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے بعد بددعا کی جب اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ھود: 36) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور ان کی امت کو غرق کر دیا۔ یہ بھی اسی طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللّٰھم منزل الکتاب سریع الحساب وھازم الاحزاب اھزمھم وزلزلھم (1) اے اللہ! اے کتاب کو نازل فرمانے والے، اے جلد حساب لینے والے اور لشکروں کو شکست دینے والے! انہیں شکست دے دے اور ان میں زلزلہ برپا کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کی بددعا کا سبب یہ بنا کہ آپ کی قوم کا ایک آدمی اپنے چھوٹے بچے کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا (2)۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس سے گزرا اور اپنے بچے سے کہا: اس سے بچ کر رہنا یہ تجھے گمراہ کر دے گا۔ اس بچے نے کہا: اے میرے ابا! مجھے نیچے اتارنا! اس کے باپ نے اسے نیچے اتارا۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو پتھر مارا اور آپ کو زخمی کر دیا۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام غضب ناک ہوئے اور لوگوں کے خلاف بددعا کی۔

محمد بن کعب، مقاتل، ربیع، عطیہ اور ابن زید نے کہا: اس وقت بددعا کی جب اللہ تعالیٰ نے ہر مومن کو ان کی پشتوں اور ان کی عورتوں کے رحموں سے نکال لیا تھا اور عذاب سے ستر سال پہلے ان کی عورتوں کی رحموں اور مردوں کی پشتوں کو بانجھ کر دیا تھا (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا تھا: چالیس سال پہلے بانجھ کر دیا تھا۔ قتادہ نے کہا: عذاب کے وقت ان میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی ہلاک کر دیتا تو یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب ہوتا اور ان میں عدل ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے بچوں اور ان کی اولادوں کو عذاب کے بغیر ہلاک کر دیا، پھر عذاب کے ساتھ ان کو ہلاک کر دیا (4)۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے **وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ** (الفرقان: 37)

## کن لوگوں کے خلاف دعا جائز ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے کافروں کے خلاف بددعا کی (5) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف بددعا کی جنہوں نے مومنوں کے خلاف اکٹھ کیا تھا۔ فی الجملہ یہ بھی کافروں کے خلاف ہی دعا تھی جہاں تک معین کافر کا تعلق ہے تو اس کا خاتمہ معلوم نہیں ہوتا، اس لیے اس کے خلاف بددعا نہیں کی جاتی کیونکہ اس کا انجام ہمارے نزدیک مجہول

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، الدعاء علی المشرکین بالھزیمۃ، جلد 1، صفحہ 410
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 105
3۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 460
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 201
5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1861

ہے۔ بعض اوقات الله تعالیٰ کے ہاں اس کا خاتمہ سعادت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ، شیبہ اور ان دونوں کے ساتھیوں کے بارے میں بددعا کی کیونکہ ان کے انجام کا آپ کو علم تھا اور ان کے حال کے بارے میں پردے کو ہٹا دیا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں تفصیلی گزر چکا ہے۔ الحمدلله۔

## حضرت نوح علیہ السلام کا بددعا کی وجہ بیان کرنا

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے خلاف دعا کو آخرت میں مخلوق کی شفاعت سے توقف کا سبب کیوں بنایا ہے(1)؟ ہم عرض کریں گے: لوگوں نے اس بارے میں دو وجہیں ذکر کی ہیں۔ (۱) وہ دعا غضب اور سختی کی وجہ سے پیدا ہوئی جبکہ شفاعت تو رضا اور نرمی کی وجہ سے ہوتی ہے تو آپ کو خوف ہوا کہ کہیں اس پر عتاب نہ ہو اور یہ نہ کہا جائے تو نے کل (دنیا میں) کفار کے خلاف بددعا کی اور آج ان کے حق میں شفاعت کرتے ہو۔ (۲) انہوں نے نص اور واضح اجازت کے بغیر ناراضگی کے عالم میں بددعا کی تھی تو قیامت کے روز اس پر وبال کا خوف محسوس ہوا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: إنّي قتلتُ نفسًا لم أومر بقتلها میں نے ایک ایسے نفس کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ کہا: میں بھی یہی قول کرتا ہوں۔

میں کہتا ہوں: اگرچہ بددعا کرنے کا صریح حکم نہیں تھا تاہم آپ کو یہ کہا گیا تھا: اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود:36) اس نے آپ کو ان کے انجام سے آگاہ کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف ہلاکت کی بددعا کی جس طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبہ، عتبہ اور ان جیسے لوگوں کے خلاف بددعا کی اور یہ الفاظ کہے: اللّھمّ علیك بھم جب ان کے انجام کا علم ہوگیا۔ اس تعبیر کی بنا پر اس میں بددعا کرنے کے امر کا معنی موجود ہے۔ الله تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4**۔ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا یَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ یعنی جو گھروں میں رہتا ہے(2)؛ یہ سدی کا قول ہے۔ اصل میں یہ دیوار تھا۔ یہ فیعال کا وزن ہے۔ یہ دار، یدور سے مشتق ہے، واؤ کو یاء سے بدل دیا اور ان میں سے ایک یاء کو دوسری یاء میں ادغام کر دیا جس طرح قیام، اصل میں یہ قیوام تھا۔ اگر یہ فعال کا وزن ہوتا تو یہ دوار ہوتا۔ قتبی نے کہا: اصل میں یہ دار ہے یعنی گھر میں فروکش ہونے والا یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما بالدار دیار یعنی کوئی بھی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الدیار سے مراد گھر والا ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

”میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے والدین کو اور اسے بھی جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہوا اور بخش دے سب مومن مردوں اور عورتوں کو، اور کفار کی کسی چیز میں اضافہ نہ کر بجز ہلاکت و بربادی کے“۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے دعا کی۔ وہ دونوں مومن

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1861　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 105

تھے۔ لمک بن متوشلخ وشمخی بنت انوش؛ قشیری اور ثعلبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے آپ کی والدہ کا نام منجل بتایا ہے(1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: والدیہ سے انہوں نے باپ اور دادا مراد لیا ہے۔ سعید بن جبیر نے لوالدی دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ واحد کا صیغہ ہے۔ کلبی نے کہا: ان کے اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان دس آباء ہیں۔ سب کے سب مومن تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت نوح اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان کسی فرد (والد) نے کفر نہیں کیا۔ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا بیت سے مراد مسجد، مصلیٰ ہے، اس حال میں کہ وہ نماز پڑھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرتا ہو۔ انبیاء کے گھروں میں وہی داخل ہوتا جو ان میں سے مومن ہوتا تو مسجد کو مغفرت کی دعا کا سبب بنا دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الملائكةُ تُصلّي على أحدكم ما دام في مجلسه الذي صلّى فيه ما لم يحدث فيه تقول اللهمّ اغفر له اللهمّ ارحمه (2) فرشتے تم میں سے ہر ایک کے لیے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اس مجلس میں رہے جس میں اس نے نماز پڑھی ہو جب تک اسے حدث لاحق نہ ہو۔ اے اللہ! اسے بخش دے۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بَيْتِيَ سے مراد میری مسجد ہے(3)؛ ثعلبی نے یہی حکایت بیان کی ہے؛ اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: جو میرے دین میں داخل ہوا۔ یہاں بیت، دین کے معنی میں ہے۔ قشیری نے اس کی حکایت بیان کی ہے اور جو یبر نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: میرا وہ دوست جو میرے گھر میں داخل ہو(4)؛ ماوردی نے اس کی حکایت بیان کی ہے(5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بَيْتِيَ سے مراد میرا گھر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد میری کشتی ہے۔

وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ قیامت تک مومنوں اور مومنات کو عام ہے(6)؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مومنین اور مومنات مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کی قوم کے مومنین اور مومنات مراد ہیں جبکہ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ ظالمین سے مراد کافر ہیں (7)۔ اِلَّا تَبَارًا ۝ مگر ہلاکت۔ یہ ہر کافر اور مشرک کو عام ہے(8)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کی قوم کے مشرک مراد ہیں۔ تبار کا معنی ہلاکت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: خسران مراد ہے(9)؛ دونوں معانی سدی نے بیان کیے ہیں؛ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ (اعراف: 139) ایک قول یہ کیا گیا ہے: تبار کا معنی دمار یعنی ہلاک کر دینا ہے۔ معنی ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ وہی صحیح امر کو جاننے کی توفیق دینے والا ہے۔

الحمد لله أوّلًا و آخرًا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 105
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1816
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 106
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً
8۔ ایضاً
9۔ ایضاً

# تفسیر قرطبی مترجم



امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

# الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد دہم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مُترجمین

مولانا ملک محمد بوستان    مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی    مولانا شوکت علی چشتی

زیرِ اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

| | |
|---|---|
| نام کتاب | تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد دہم) |
| مفسر | امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ |
| متن قرآن کا ترجمہ | حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ |
| مترجمین | مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی |
| | مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی |
| | من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف |
| زیراہتمام | ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف |
| ناشر | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور |
| سال اشاعت | اکتوبر 2012ء، باراول |
| کمپیوٹر کوڈ | QT54 |

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350 فیکس 042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-32212011-32630411 فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# فہرست مضامین

# سورۃ الجن

آیاتہا ۲۸ ۔ ۷۲ سورۃ الجن مکیۃ ۴۰ ۔ رکوعاتہا ۲

تمام علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے اس کی اٹھارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝

''آپ فرمائیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ بڑے غور سے سنا ہے (قرآن کو) جنوں کی ایک جماعت نے پس انہوں نے (جا کر دوسرے جنات کو) بتایا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے راہ دکھاتا ہے ہدایت کی پس ہم (دل سے) اس پر ایمان لے آئے اور ہم ہرگز شریک نہیں بنائیں گے کسی کو اپنے رب کا اور بے شک اعلیٰ و ارفع ہے ہمارے رب کی شان، نہ اس نے کسی کو اپنی بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا''۔

اس ارشاد باری تعالیٰ میں پانچ مسائل ہیں:

## کیا وحی سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنوں کے آنے کی خبر تھی

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت سے کہو: اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کی زبان پر میری طرف وحی کی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے میری قراءت کو سنا۔ وحی سے قبل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں آگاہ نہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے علماء نے یہی کہا ہے جیسا کہ ابھی آئے گا۔

ابن ابی عبلہ نے اسے اُحِيَ پڑھا ہے کہا ہے اَوْحىٰ اِلیہ و وَحَی الیہ واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے اسی کے موافق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ (المرسلات) ہر وہ واؤ جو مضموم ہو اس میں قلب کا قاعدہ جاری کرنا جائز ہے مازنی نے واؤ مکسورہ میں بھی جائز قرار دیا ہے جیسے اِشاح، اِسادۃ، وِعَآءِ اَخِيْهِ (یوسف:76) وغیرہ میں ہے۔

## کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کو دیکھا یا نہیں

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف منقول ہے کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کو دیکھا تھا یا نہیں؟ قرآن حکیم کا ظاہر تو اسی امر پر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِسْتَمَعَ اور اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (الاحقاف: 29) صحیح مسلم اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو جنوں پر قرآن کو پڑھا اور نہ ہی انہیں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کی ایک جماعت میں عکاظ کی منڈی کے ارادہ سے چلے جب کہ شیاطین اور آسمان کی خبر میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی تھی، ان شیاطین پر شہاب بچے پھینکے گئے اور شیاطین اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے۔ ان کی قوم کے افراد نے پوچھا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ شیاطین نے کہا: ہمارے اور آسمان کی خبر کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور ہمارے اوپر شہاب بچے پھینکے گئے ہیں۔ قوم کے افراد نے کہا: یہ رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی مگر ایسی چیز سے جو ابھی ابھی واقع ہوئی ہے پس تم مشرق و مغرب میں نکل جاؤ اور دیکھو وہ کیا چیز ہے جو ہمارے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہوئی ہے؟ وہ مشرق و مغرب میں نکل کھڑے ہوئے۔ جنوں کی وہ جماعت جس نے تہامہ کا رخ کیا تھا وہ نخلہ کے مقام پر تھے اور عکاظ کی منڈی کا ارادہ رکھتے تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ جب جنوں نے قرآن کو سنا تو اس کی طرف کان لگائے اور کہا: یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہوئی ہے، پھر وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ آئے انہوں نے کہا: اے ہماری قوم! ہم نے عجیب قرآن سنا ہے وہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اس وحی کو نازل فرمایا، فرما دیجئے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے سنا (1)۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، کہا: جنوں کی اپنی قوم سے یہ گفتگو ہوئی جب اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کی عبادت کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ اس پر تہہ در تہہ جمع ہو گئے۔

کہا: جب جنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز پڑھ رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سجدہ کے ساتھ سجدہ کر رہے تھے تو جن، صحابہ کی اس اطاعت کو دیکھ کر متعجب ہوئے انہوں نے اپنی قوم سے کہا: جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا تو وہ اس پر بھیڑ کر لیتے تھے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنوں کو نہیں دیکھا لیکن جن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کو سنا۔ اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ جن اس وقت شیاطین کے ساتھ تھے جب شیاطین کو شہاب بچے مارے گئے تو انہوں نے حقیقت حال کو جاننے کی جستجو کی۔ جن کو شہاب بچے مارے گئے ان میں جن بھی تھے ان جنوں کو بھی شیاطین کہا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (الانعام: 112) کیونکہ شیطان ہر سرکش اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکلنے والی چیز کو کہتے ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جن آسمانوں کی طرف چڑھتے، وحی سنتے جب وہ ایک کلمہ سنتے تو ان میں نو کلمات بڑھا لیتے وہ ایک کلمہ تو حق ہوتا اور اس میں جو زائد ملاتے وہ باطل ہوتا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو انہیں اپنی جگہوں پر بیٹھنے سے روک دیا گیا۔ اس بات کا ذکر انہوں نے ابلیس سے کیا اس سے قبل انہیں ستاروں سے نہیں مارا

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الجن، حدیث نمبر 3245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جا تا تھا۔ ابلیس نے انہیں کہا: یہ ایسا نہیں ہوا مگر زمین میں کوئی واقعہ رونما ہوا ہے۔ اس نے اپنے لشکر بھیجے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دو پہاڑوں (میرا خیال ہے انہوں نے مکہ کہا تھا) کے درمیان نماز پڑھتے ہوئے پایا وہ ابلیس کے پاس آئے اور اسے خبر دی۔ اس نے کہا: یہی وہ واقعہ رونما ہوا ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جنوں کو شہابیے مارے گئے جس طرح شیاطین کو شہابیے مارے گئے۔

سدی کی روایت میں ہے: انہیں شہابیے مارے گئے، وہ ابلیس کے پاس آئے اور اپنے ساتھ وقوع پذیر ہونے والے معاملہ کی خبر دی اس نے کہا: ہر علاقہ سے مٹھی بھر مٹی میرے پاس لاؤ جسے میں سونگوں گا۔ وہ مٹی اس کے پاس لے آئے اس نے مٹی کو سونگھا اس نے کہا: تمہارے اس معاملہ کا باعث مکہ مکرمہ میں ہے۔ اس نے جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ جن سات تھے۔ ایک قول کیا گیا: وہ نو تھے، ان میں زوبعہ تھا۔ عاصم نے زر سے روایت نقل کی ہے کہ زوبعہ کی جماعت اور اس کے ساتھی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ثمالی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے وہ بنی شیصبان سے تعلق رکھتے تھے یہ تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ اور شوکت کے اعتبار سے سب سے قوی تھے، عام طور پر یہی ابلیس کے لشکر ہوتے تھے۔

عاصم نے زر سے یہ بھی روایت نقل کی ہے: وہ سات افراد تھے تین اہل حران سے اور چار اہل نصیبین سے تعلق رکھتے تھے۔

جویبر نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے: وہ نو تھے جو اہل نصیبین سے تعلق رکھتے تھے (یہ یمن کی ایک بستی ہے جو عراق(2) کی بستی سے مختلف ہے)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو جن مکہ مکرمہ میں آئے وہ نصیبین کے تھے اور جو جن نخلہ کے مقام پر آئے وہ نینویٰ کے تھے۔ اس کا ذکر سورۃ الاحقاف میں گزر چکا ہے۔

عکرمہ نے کہا: وہ سورت جسے رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (العلق: 1) تھی۔ سورۃ الاحقاف میں **نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ** کی وضاحت ہو چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبی کریم ﷺ نے جنوں والی رات میں جنوں کو دیکھا تھا۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ عامر شعبی نے کہا: میں نے علقمہ سے پوچھا: کیا جنوں والی رات میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے؟ علقمہ نے کہا: میں نے حضرت ابن مسعود سے پوچھا، میں نے کہا: کیا تم میں سے کوئی جنوں والی رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، انہوں نے جواب دیا: نہیں، لیکن ایک رات ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ہم نے آپ ﷺ کو گم پایا، ہم نے آپ ﷺ کو وادیوں اور گھاٹیوں میں تلاش کیا۔ ہم نے کہا: آپ ﷺ کو کوئی اڑا کر لے گیا ہے یا آپ کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے وہ رات ایسی بری گزاری جیسی کوئی قوم گزار سکتی ہے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن باب ومن سورۃ الجن، حدیث نمبر 3247، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ نصیبین کا ذکر معجم بکری، یاقوت کی معجم بلدان اور قاموس میں نہیں ہے۔

غار حراء کی جانب سے آرہے تھے ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گم پایا، ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا اور نہ پایا تو ہم نے وہ رات ایسی اذیت میں گزاری جس اذیت میں کوئی قوم گزار سکتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میرے پاس جنوں کا داعی آیا، میں اس کے ساتھ گیا تو ان پر قرآن حکیم کو پڑھا''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان کے آثار اور ان کی آگ کے آثار دکھائے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زادراہ کا سوال کیا جب کہ وہ جزیرہ کے جن تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر وہ ہڈی جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہوگا وہ تمہارے ہاتھ لگے تو تمہارے لیے اس پر بہت زیادہ گوشت ہوگا اور ہر مینگنی تمہارے چوپاؤں کا چارہ ہوگی''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''ان دونوں چیزوں کے ساتھ استنجا نہ کیا کرو کیونکہ یہ تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہیں''۔

ابن عربی نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بنسبت زیادہ جانتے تھے کیونکہ انہوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور حضرت ابن عباس نے اس کے بارے میں سنا اور خبر معائنہ جیسی نہیں ہو سکتی۔

لیکن قول یہ کیا گیا ہے: جن دو دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں آئے، حضرت ابن مسعود نے اسی کا ذکر کیا ہے۔ دوسری دفعہ نخلہ میں آئے جس کا ذکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا ہے۔

امام بیہقی نے کہا: جس واقعہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے یہ پہلی دفعہ تھی جب جنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے آگاہ ہوئے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ارادۃً ان پر قرآن پڑھا اور نہ ہی انہیں دیکھا جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حکایت بیان کی ہے۔ پھر دوسری دفعہ جنوں کا داعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کو قرآن سنایا جس طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حکایت بیان کی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: صحیح احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جنوں والی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اور دوسرے لوگوں کو ساتھ لے گئے تھے تاکہ انہیں جنوں کے آثار اور ان کی آگ کے آثار دکھائیں۔

کئی سندوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اس رات حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے یہ بحث سورۃ الاحقاف میں گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جنوں پر قرآن حکیم پڑھوں تم میں سے میرے ساتھ کون جائے گا؟ صحابہ کرام خاموش رہے پھر دوسری دفعہ فرمایا پھر تیسری دفعہ فرمایا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ حجون کے مقام پر آئے جو شعب ابی دب کے پاس ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اردگرد ایک خط کھینچا فرمایا: ''اس سے باہر نہ نکلنا'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجون کی طرف چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حجلہ عروسی جیسی چیزیں اتریں وہ اپنے قدموں سے نچلی جانب پتھر گرا

رہے تھے وہ چل رہے تھے وہ اپنے دفوں کو بجا رہے تھے جس طرح عورتیں دف بجاتی ہیں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھانپ لیا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تلاوت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز لگاتار بلند ہوتی رہی اور وہ جن زمین کے ساتھ چمٹ گئے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف لوٹے۔ فرمایا: کیا تو نے میرے پاس آنے کا ارادہ کیا تھا؟'' میں نے عرض کی: جی ہاں، یا رسول اللہ! فرمایا: ''یہ تیرے لیے مناسب نہیں تھا یہ جن قرآن سننے آئے تھے پھر وہ اپنی قوم کی طرف اس حال میں لوٹے کہ وہ خبردار کرنے والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے زادراہ کا سوال کیا تو میں نے انہیں ہڈیاں اور لید زادراہ کے طور پر دیئے پس تم میں سے کوئی بھی ہڈی اور لید کے ساتھ استنجا نہ کرے''۔

عکرمہ نے کہا: وہ جزیرہ موصل کے بارہ ہزار تھے۔ ایک روایت میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے لے گئے یہاں تک کہ جب ہم اس مسجد میں آئے جو بنی عوف کے باغ کے پاس ہے تو آپ نے میرے لیے خط کھینچا تو ان میں سے ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ ہمارے ساتھیوں نے کہا: گویا وہ زطی (1) لوگ ہیں گویا ان کے چہرے مکوک (2) ہیں۔ انہوں نے پوچھا: آپ کیا ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اللہ کا نبی ہوں''۔ انہوں نے کہا: اس دعویٰ پر کون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی دے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ درخت''۔ حکم دیا: ''اے درخت!'' وہ درخت جڑیں گھسیٹتا ہوا آیا اس کی شدید آواز آرہی تھی یہاں تک کہ وہ درخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا پوچھا: ''تو کس چیز پر گواہی دیتا ہے؟'' درخت نے عرض کی: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ وہ لوٹ گیا جس طرح آیا تھا جب کہ وہ اپنی جڑوں کے ساتھ پتھر بھی کھینچ کر لے جارہا تھا، اس کی شدید آواز تھی یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں کھڑا ہو گیا جس طرح پہلے تھا(3)۔

پھر روایت کی گئی ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی گود میں رکھا اور سو گئے پھر بیدار ہوئے پوچھا: ''کیا پانی ہے؟'' حضرت ابن مسعود نے عرض کی: نہیں، مگر میرے پاس ایک برتن ہے جس میں نبیذ ہے۔ فرمایا: ''یہ تو کھجور اور پانی ہے'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وضو کیا۔

## کس پانی کے ساتھ استنجا کرنا جائز ہے

**مسئلہ نمبر 3**۔ سورۂ حجر میں پانی کے بارے میں اور سورۂ براءت میں اس چیز کا ذکر گزر چکا ہے جس سے استنجا کیا جاتا ہے تو یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

## جنوں کی حقیقت کے بارے میں علماء کا اختلاف

**مسئلہ نمبر 4**۔ جنوں کی حقیقت کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے، اسماعیل نے حضرت حسن بصری سے روایت نقل کی ہے کہ جن ابلیس کی اولاد ہیں اور انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان میں سے اور ان میں سے مومن

1۔ ہنود کی ایک جنس ہے جن کے رنگ سیاہی مائل ہیں۔

2۔ یہ ایسا برتن ہے جس سے پانی پیا جاتا ہے اس کے اوپر والا حصہ تنگ اور درمیان والا کھلا ہوتا ہے۔

3۔ اخبار مکہ، الفاکہی، 2319

اور کافر ہیں، وہ ثواب اور عقاب میں شریک ہیں، ان میں سے اور ان میں سے جو مومن ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، ان میں سے اور ان میں سے جو کافر ہے وہ شیطان ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: جن، جان کی اولاد ہیں وہ شیاطین نہیں، وہ ایمان لاتے ہیں، ان میں سے کچھ مومن اور کچھ کافر ہوتے ہیں۔ شیاطین، ابلیس کی اولاد ہیں وہ ابلیس کے ساتھ ہی مریں گے جس طرح جنوں کی اصلیت کے بارے میں اختلاف ہے جنوں میں سے مومنوں کے جنت میں داخل ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ وہ جنوں میں سے ہے ابلیس کی نسل سے نہیں اس نے کہا: وہ اپنے ایمان کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا جس نے کہا: وہ ابلیس کی اولاد میں سے ہے اس کے ان کے بارے میں دو قول ہیں (۱) یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے: وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ (۲) یہ مجاہد کی روایت ہے: وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، اگرچہ وہ جہنم سے دور کیے جائیں گے؛ ماوردی نے اسے حکایت کیا ہے۔ یہ قول سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اس میں یہ وضاحت ہے کہ جن جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

### جنوں کے کھانے، پینے کے بارے میں پایا جانے والا اختلاف

**مسئلہ نمبر 5**۔ بیہقی نے اپنی روایت میں ذکر کیا ہے کہ جنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زاد کے بارے میں سوال کیا، وہ جزیرہ کے جن تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے لیے ہر ہڈی زادِ راہ ہے'' یہ ارشاد اس امر پر دلیل ہے کہ وہ کھاتے ہیں۔ اطباء اور فلاسفہ میں سے کافروں کی جماعت نے جنوں کا انکار کیا ہے انہوں نے کہا: جن بسیط ہیں، ان کا کھانا پینا ثابت نہیں۔ حقیقت میں ان کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی ذات پر جرأت اور افتراء ہے، قرآن وسنت ان کا رد کرتے ہیں مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز نہیں جو بسیط، مرکب اور جوڑا بھی ہو۔ واحد تو صرف سبحانہ وتعالیٰ ہے اس کا غیر مرکب ہے وہ واحد نہیں اس کا حال کیسا بھی ہو۔ یہ کوئی ممتنع امر نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ان کی اصلی صورت میں دیکھیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرشتوں کو دیکھا اکثر طور پر وہ ہمارے سامنے سانپوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ موطا امام مالک میں ہے: ایک آدمی کی شادی کو تھوڑا عرصہ گزرا تھا اس نے دوپہر کو اپنے گھر جانے کی اجازت چاہی، اس حدیث میں ہے: وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا سانپ اس کے بستر پر لپٹا ہوا ہے اس صحابی نے نیزہ لے کر وار کیا اور اسے نیزے میں پرو لیا۔ اور حدیث ذکر کی (1)۔

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان گھروں کے عوامر (بڑی عمر والے سانپ) ہیں جب تم ان میں سے کوئی چیز دیکھو تو تین دفعہ ان پر تنگی کرو اگر وہ چلا جائے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دو کیونکہ وہ جن کافر ہوگا''۔ فرمایا: ''جاؤ اپنے ساتھی کو دفن کر دو'' یہی چیز اور ان پر تحریج (تنگ کرو) کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے کہ یہ حکم مدینہ طیبہ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ صحیح میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک فرمان منقول ہے: ''مدینہ طیبہ کے جن مسلمان ہو چکے ہیں'' یہ الفاظ مدینہ طیبہ کے ساتھ خاص ہیں یہ اس کے حکم کے ساتھ بھی خاص ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں: مدینہ طیبہ کے علاوہ کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ یہاں علت مدینہ طیبہ کی حرمت بیان نہیں کی گئی کہ یہ حکم اس کے

1۔ احکام القرآن للطبری

ساتھ مخصوص ہوتا یہاں اس کی علت اسلام قرار دی گئی ہے یہ اس کے غیر میں بھی عام ہے کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد نہیں دیکھتے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جن کی خبر دیتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا، وہ جزیرہ کے جن تھے۔ یہ واضح ہے جس کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے: ونھی عن عوامر البیوت یہ عام ہے اس کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اس لیے دوبارہ گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا۝ میں عَجَبًا سے مراد یہ ہے وہ اپنے کلام کی فصاحت میں عجیب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اپنے مواعظ کی بلاغت میں عجیب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اپنی برکت کی عظمت میں عجیب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: قرآن غالب ہے اس کی مثل نہیں پائی جاتی۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اسے عظیم خیال کرتے ہیں۔ یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ امور کے بہترین پہلوؤں کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور یَهْدِیْ کا فعل ترکیب کلام میں صفت بن گیا یعنی ھادیا کے معنی میں ہے فَاٰمَنَّا بِهٖ یعنی ہم اس کے ذریعے ہدایت یافتہ ہوئے اور ہم نے یہ تصدیق کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا۝ یعنی ہم ابلیس کی طرف نہ لوٹیں گے اور ہم اس کی اطاعت نہیں کریں گے، کیونکہ شیطان نے بھی انہیں بھیجا تھا کہ وہ اس کے پاس خبر لائیں پھر جنوں کو شہابیوں سے مارا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو معبود نہیں بنائیں گے کیونکہ وہ ربوبیت میں یکتا ہے۔ اس میں مومنوں کو اس امر پر تعجب دلایا جارہا ہے کہ قریش میں سے مشرک اس کو نہ سمجھ سکے جس کا ادراک جنوں نے قرآن حکیم میں تدبر کر کے کر لیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ سے مراد یہ ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا اور وہ جان گئے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ رہے ہیں وہ اللہ کا کلام ہے۔ جس کو سنا اس کا ذکر نہ کیا کیونکہ حال اس پر دلالت کرتا ہے۔ نَفَرٌ کا معنی جماعت ہے۔ خلیل نے کہا: تین سے لے کر دس تک کے افراد کو نفر کہتے ہیں۔ عیسیٰ ثقفی نے کہا: رَشد راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا میں علقمہ، یحییٰ، اعمش، حمزہ، کسائی، ابن عامر، خلف اور سلمی نے ان کو سورت میں بارہ مواقع پر ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ مقامات یہ ہیں وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا، وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ، وَّاَنَّا ظَنَنَّآ، وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ، وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا، وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ، وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ، وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ، وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ، وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ، وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى، وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ ان کا عطف اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ پر ہے اس میں ہمزہ پر فتحہ کے سوا کوئی صورت درست نہیں کیونکہ یہ اُوْحِیَ کے نائب فاعل کے محل میں ہے اور اس کا مابعد اس کا معطوف ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہ سب فَاٰمَنَّا بِهٖ میں ھا پر محمول ہے یعنی ان سے پہلے باء حرف جار ہے یہ جائز ہے اور حرف جار کی کثرت کی وجہ سے ان کے ساتھ حرف جار مضمر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے ہم نے یہ تصدیق کی کہ ہمارا رب عظیم ہے۔

باقی قراء نے سب کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہی صحیح ہے؛ ابوعبیدہ اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا اور اسے فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا کا معطوف قرار دیا کیونکہ یہ سب جنوں کا کلام ہے۔ جہاں تک ابوجعفر اور شیبہ کا تعلق ہے ان دونوں نے تین مواقع پر

اَنَ کے ہمزہ کو فتحہ دیا ہے وہ یہ مواقع ہیں وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا، وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ، وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ۔ دونوں نے کہا: یہ وہ جملے ہیں جو اوحی سے متعلق ہیں یعنی وحی سے ہیں اور باقی ماندہ میں ان کے ہمزہ کو کسرہ دیا کیونکہ وہ جنوں کا کلام ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ کا تعلق ہے سب قراء نے اس میں ان کے ہمزہ کو فتحہ دیا ہے مگر نافع، شیبہ، زر بن حبیش، ابوبکر اور مفضل نے عاصم سے یہی روایت نقل کی ہے انہوں نے ہمزہ کو کسرہ ہی دیا ہے کوئی اور حرکت نہیں دی۔ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ، وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا اور وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ اور اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا میں ہمزہ کو فتحہ دینے میں کوئی اختلاف نہیں اسی طرح قول کے بعد اس کے ہمزہ کو کسرہ دینے میں بھی کوئی اختلاف نہیں جس طرح فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا، قُلْ اِنَّمَاۤ اَدْعُوْا رَبِّيْ، قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اور قُلْ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ ان مقامات میں ان کے ہمزہ کو کسرہ دیا جاتا ہے اسی طرح وہ مقامات جہاں ان فا جزائیہ کے بعد آتا ہے اس کے ہمزہ کو کسرہ دینے میں کوئی اختلاف نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ (توبہ: 63) فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ کیونکہ یہ ابتدا کے مواقع ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا لغت میں جد سے مراد عظمت اور جلال ہے اس معنی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: جب ایک آدمی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران یاد کر لیتا ہے تو ہماری آنکھوں میں عظیم ہو جاتا ہے۔ جَدُّ رَبِّنَا کا معنی ہے ہمارے رب کی عظمت اور جلال؛ عکرمہ، مجاہد اور قتادہ نے یہ کہا ہے۔ مجاہد سے یہ معنی بھی منقول ہے: اور اس کا ذکر بلند ہے۔

حضرت انس بن مالک، حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے جَدُّ کا معنی غنا کیا ہے۔ عکرمہ سے یہ قول بھی منقول ہے کہ حظ (حصہ) کو جد کہتے ہیں رجل مجدود یعنی ایسا آدمی جس کا حصہ معین کر دیا گیا ہو۔ حدیث طیبہ میں ہے: لا ینفع ذا الجد منک الجد۔ کسی حصہ والے کو تیرے مقابلہ میں حصہ نفع نہ دے گا۔

ابوعبیدہ اور خلیل نے کہا: حدیث میں جد، غنا کے معنی میں ہے، یعنی کسی مالدار کو مال تیری پکڑ کے مقابلہ میں نفع نہ دے گا بے شک اسے طاعت ہی نفع دے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی قدرت ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی فعل ہے۔ قرظی اور ضحاک نے یہ بھی کہا: اس سے مراد مخلوق پر اس کی نعمتیں اور احسانات ہیں۔ ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا: اس کا معنی اس کی بادشاہت ہے۔ سدی نے کہا: اس کا معنی اس کا امر ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا مطلب ہے ہمارا رب بلند و بالا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے اس جد سے مراد دادا لیا اور یہ جنوں کا قول ہے جنہوں نے ہر بات جہالت کی وجہ سے کی تو اس پر ان کا مواخذہ نہ کیا گیا۔ قشیری نے کہا: لفظ جد کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ذکر کرنا جائز ہے اور جائز نہ ہوتا تو قرآن حکیم میں اس کا ذکر نہ ہوتا مگر یہ لفظ وہم دلاتا ہے اس سے اجتناب بہتر ہے۔ عکرمہ کی قراءت میں یہ جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے جو ہنسی مذاق کی ضد ہے، اسی طرح ابوحیوہ اور محمد بن سمیقع نے پڑھا۔ ابن سمیقع اور ابوالشہب نے جَدًا رَبُّنَا پڑھا ہے جس کا معنی منفعت ہے۔ عکرمہ نے اسے تنوین کے ساتھ جدًا پڑھا ہے ربُّنا کو رفع کے ساتھ مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ تعالیٰ کا فاعل ہے اور جدًا تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ عکرمہ سے جد مرفوع، تنوین کے ساتھ اور تنوین کے بغیر نقل کیا گیا ہے اور رَبُّنَا کو مرفوع نقل کیا گیا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی تعالیٰ جدٌّ جدٌّ ربنا۔ دوسرا جد پہلے جد سے بدل ہے۔ اسے حذف کیا گیا اور

مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔ آیت کا معنی یہ ہے ہمارے رب کا جلال اس سے بالا ہے کہ وہ کسی کو بیوی اور بیٹا بنائے تا کہ ان سے مایوسی ہو اور اسے ان کی حاجت ہے، رب نداور نظیر سے ماوراء ہے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝ وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝

"اور (یہ راز بھی کھل گیا کہ) ہمارے احمق اللہ کے بارے ناروا باتیں کہتے رہے اور ہم تو یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ انسان اور جن اللہ کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے غرور کو اور ان انسانوں نے بھی یہ گمان کیا جیسے تم گمان کرتے ہو کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر مبعوث نہیں کرے گا"۔

اللہ کے فرمان: وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝ میں اَنَّهٗ کی ہ ضمیر امر کے لیے ہے یا حدیث کے لیے اور کان میں ضمیر اس کا اسم ہے اور مابعد كَانَ کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ كَانَ زائدہ ہو۔ مجاہد، ابن جریج اور قتادہ کے قول میں: یہاں سفیہ سے مراد ابلیس ہے۔ حضرت ابو ہریرہ بن ابو موسیٰ نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہی روایت نقل کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنوں میں سے مشرک مراد ہیں۔ قتادہ نے کہا: جنوں کے سفیہ نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جس طرح انسانوں کے سفیہ نے اس کی نافرمانی کی۔ شطط اور اشتطاط سے مراد کفر میں غلو ہے۔ ابو مالک نے کہا: اس سے مراد ظلم ہے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد جھوٹ ہے۔ اس کا اصل معنی دوری ہے، ظلم کو اس کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ وہ عدل سے دور ہوتا ہے۔ جھوٹ کو اس سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سچائی سے دور ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

بأيِّةِ حالٍ حكموا فيكَ فاشتطُّوا وما ذاكَ إلا حيثُ يمّمكَ الوَخطُ

کس حال میں انہوں نے تیرے بارے فیصلہ کیا اور ظلم کیا اور یہ فیصلہ نہیں تھا مگر اس وقت جب بڑھاپے نے تیرا قصد کیا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ کا معنی ہے ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں بولیں گے اسی وجہ سے ہم نے انکی اس بات میں تصدیق کی کہ اللہ تعالیٰ کی بیوی اور بچہ ہے یہاں تک کہ ہم نے قرآن سنا اور اسکے ذریعے حق کو پہچانا۔

یعقوب، جحدری اور ابن ابی اسحاق نے لَنْ تَقَوَّلَ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنوں سے یہاں خبروں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ جس قاری نے ان کے ہمزہ کو فتحہ دیا ہے اس نے اسے اَنَّهُ اسْتَمَعَ کی طرف لوٹایا ہے اور جس نے ہمزہ کسرہ دیا ہے اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی کلام قرار دیا ہے۔ اس سے مراد وہ قول ہے جو ایک آدمی اس وقت کرتا جب وہ کسی وادی میں اترتا أعوذ بسید ھذا الوادی من شر سفھاء قومه میں اس وادی کے سردار کی اس کی قوم کے بے وقوفوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ وہ آدمی اس سردار کی پناہ میں رات گزارتا یہاں تک کہ صبح کرتا؛ یہ تعبیر حضرت حسن بصری، ابن زید اور دوسرے علماء نے کی ہے۔ مقاتل نے کہا: سب سے پہلے اہل

یمن کی ایک جماعت نے جنوں کی پناہ چاہی، پھر بنو حنیفہ نے جنوں کی پناہ چاہی پھر یہ طریقہ عربوں میں عام ہوگیا۔ جب اسلام آگیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی اور جنوں کو ترک کر دیا۔

کردم بن ابی سائب نے کہا: میں اپنے والد کے ساتھ مدینہ طیبہ جانے کے لیے نکلا یہ پہلا موقع تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوا تھا، رات نے ہمیں ایک چرواہے کی پناہ لینے پر مجبور کیا جب نصف رات ہوئی تو بھیڑیا آیا اس نے ایک بکری اٹھائی۔ چرواہے نے کہا: اے وادی میں طویل عرصہ سے رہنے والے! میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ایک منادی نے اعلان کیا: اے سرحان! اسے چھوڑ دے، تو وہ میمنہ دوڑتا ہوا آیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں اپنے رسول پر اس آیت کو نازل کیا تھا: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝ یعنی جنوں نے انسانوں کی گمراہی اور گناہ میں اضافہ کیا؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ رھق کا لفظ عربی زبان میں گناہ اور محرمات پر چھا جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور رجل رھق اس وقت بولتے ہیں جب کوئی اس طرح ہو، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (یونس: 27) ذلت ان پر چھا جاتی ہے۔

اعشٰی نے کہا:

لاشیَ ینفعنی مِنْ دونِ رؤیتھا	هل یَشْتَفِی وامِقٌ مالم یُصِب رَهَقَا

اس کے دیدار کے بغیر کوئی چیز مجھے نفع نہیں دیتی کیا عاشق شفایاب ہوسکتا ہے جب کہ وہ گناہ کو نہ پہنچا ہو۔

یہاں زیادتی کے فعل کو جنوں کی طرف مضاف کیا ہے کیونکہ وہ جن اس کا سبب تھے۔ مجاہد نے بھی یہی کہا ہے کہ انسانوں نے جنوں سے پناہ مانگ کر جنوں کی سرکشی میں اضافہ کیا یہاں تک کہ جنوں نے کہا: ہم انسانوں اور جنوں کے سردار بن گئے۔

قتادہ، ابو عالیہ، ربیع اور ابن زید نے یہ تعبیر کی ہے: اس طرح انسان، جنوں سے زیادہ ڈرنے لگے۔ سعید بن جبیر نے اس کا معنی کفر کیا۔ اس میں کوئی خفا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ چھوڑ کر جنوں کی پناہ لینا کفر و شرک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: رجال کے لفظ کا اطلاق جنوں پر نہیں ہوتا انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں کے شر سے بچنے کے لیے انسانوں میں سے ہی کچھ لوگوں کی پناہ چاہتے مثلاً انسانوں میں سے کوئی یہ کہتا: میں اس وادی کے جن کے شر سے حذیفہ بن بدر کی پناہ چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝ یہ اللہ تعالیٰ کا انسانوں کے لیے کلام ہے کہ جنوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا جس طرح تم نے گمان کیا۔ کلبی نے کہا: معنی ہے جنوں نے گمان کیا جس طرح انسانوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف رسول مبعوث نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اس رسول کے ذریعے ان پر حجت تمام کرے گا۔ یہ سب قریش پر دلیل قائم کرنے کی تاکید ہے یعنی جب یہ جن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے ہیں تو تم ان پر ایمان لانے کے زیادہ مستحق ہو۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا ۝ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ

أُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝

''اور (سنو) ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم تو پہلے بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لیے لیکن اب جو جن سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لیے کسی شہاب کو انتظار میں اور ہم نہیں سمجھتے اس کی کیا وجہ ہے کیا کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے زمین کے مکینوں کے بارے میں یا ان کے رب نے ان کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ یہ جنوں کا قول ہے یعنی ہم نے اس کی خبر جاننا چاہی جس طرح ہماری عادت تھی تو ہم نے اسے پایا کہ وہ فرشتوں سے بھرا ہے۔ حَرَس، حارس کی جمع ہے اور شُهُب، شِهاب کی جمع ہے وہ ستاروں کا ٹوٹنا ہے جو انہیں چوری چھپے باتیں سننے پر جلاتے ہیں اس بارے میں گفتگو سورۂ حجر اور صافات میں گزر چکی ہے۔ وجد کے بارے میں یہ جائز ہے کہ اسے دو مفعولوں کی طرف متعدی مانا جائے ان دو میں سے پہلا مفعول ھا ضمیر ہے اور مُلِئَتْ اس کے دوسرے مفعول کے محل میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہو اور مُلِئَتْ، قد کے مضمر ماننے کے ساتھ حال ہو۔ حرسا، ملئت کا مفعول ثانی ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور شَدِيْدًا، حرس کی صفت ہے یعنی وہ طاقتور فرشتوں سے بھرا ہوا ہے۔ حرس کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے شدید کو واحد ذکر کیا ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے: السلف الصالح، صالحین کے معنی میں ہے سلف کی جمع اسلاف اور حرس کی جمع احراس ہے امرء القیس کا قول ہے:

تجاوزتُ أحراسا و أهوال مَعْشَرٍ

میں نگہبانوں اور جماعت کی خوفناک چیزوں سے آگے گزر گیا۔

یہ بھی جائز ہے کہ حرس مصدر ہو اور یہ حَرِست حراسةً شدیدۃً کے معنی میں ہو۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ میں ھا ضمیر سے مراد السماء ہے اور مقاعد ان جگہوں کو کہتے ہیں جن کی مثل میں اس لیے بیٹھا جاتا ہے تاکہ آسمان کی خبروں کو سنا جائے یعنی سرکش جن یہ کام اس لیے کرتے تھے تاکہ فرشتوں سے آسمان کی خبریں سنیں یہاں تک کہ وہ خبریں کاہنوں کو القاء کریں جیسے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا تو اللہ تعالیٰ نے جلانے والے شہابیوں کے ساتھ ان کی نگہبانی کا اہتمام فرمایا۔ جنوں نے اس وقت کہا: فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا شہاب سے مراد جلانے والا ستارہ ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: ستاروں کا ٹوٹنا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہوا۔ یہ آپ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ سلف صالحین میں اس بارے میں اختلاف ہے کیا شیاطین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی شہابیے مارے جاتے تھے یا ایسا امر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے ہوا؟ کلبی نے کہا: ایک قوم نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیانی عرصہ یعنی فترت کے زمانہ میں جو تقریباً پانچ سو سال پر محیط ہے آسمان کی نگہبانی نہیں کی جاتی تھی جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو تمام آسمانوں کو ممنوعہ قرار دے دیا گیا

اور فرشتوں اور شہابیوں سے ان کی حفاظت کی گئی۔

میں کہتا ہوں: اسے عطیہ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، بیہقی نے اس کا ذکر کیا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کا دن آیا تو شیاطین کو روک دیا گیا اور ان کو شہابیے مارے گئے۔

عبد الملک بن سابور نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیانی عرصہ یعنی فترت کے دور میں آسمان کی نگہبانی نہیں کی جاتی تھی جب حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو مبعوث کیا گیا تو آسمان کی نگہبانی کی گئی اور شیاطین کو شہابیوں سے مارا گیا اور آسمان کے قریب ہونے سے انہیں روک دیا گیا۔

نافع بن جبیر نے کہا: فترت کے دور میں شیاطین سنا کرتے تھے اور انہیں شہابیوں سے نہیں مارا جاتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث ہوئے تو انہیں شہابیوں سے مارا گیا۔ اسی قسم کا قول حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہا: جب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھایا گیا تو کسی کو شہابیے نہیں مارے گئے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو ان شیاطین کو مارا جانے لگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے ساتھ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اضافہ کر دیا گیا اللہ تعالیٰ کے فرمان: مُلِئَتْ کا یہی معنی ہے یعنی اس کی نگہبانی میں اضافہ کر دیا گیا۔ اوس بن حجر نے کہا، جب کہ وہ دور جاہلیت کا شاعر ہے:

فانقض　کالدُّرِّی　یَتْبَعُهٗ　نَقْعٌ　یثورُ　تخالُه　طُنُبًا

یہ اکثر لوگوں کا قول ہے۔ جاحظ نے اس شعر کا انکار کیا اور کہا: ہر وہ شعر جو اس بارے میں روایت کیا گیا ہے وہ من گھڑت ہے اور اس نے اس بات کا بھی انکار کیا کہ بعثت سے قبل شیاطین کو نہیں مارا جاتا تھا جب کہ شیاطین کو مارنے کا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا ۝ یہ جنوں کی جانب سے خبر ہے کہ آسمان کی نگہداشت میں اضافہ کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ آسمان شہابیوں اور ان سے بھر گئے۔ یہ قول اس لیے بھی اصح ہے کہ اس اثنا میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے کہ ستارے سے کسی کو مارا گیا پوچھا: ''تم دور جاہلیت میں اس بارے میں کیا کہتے تھے؟'' صحابہ نے عرض کی: ہم کہا کرتے تھے کوئی عظیم آدمی فوت ہوا ہے یا کسی عظیم شخصیت نے جنم لیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے نہیں پھینکے جاتے بلکہ ہمارا رب سبحانہ وتعالیٰ جب آسمان میں کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، پھر تمام آسمان والے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں یہاں تک کہ تسبیح کا سلسلہ اس آسمان تک آ پہنچتا ہے آسمان والے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں: تمہارے رب نے کیا ارشاد فرمایا، تو حاملین عرش اس آسمان کے فرشتوں کو خبر دیتے ہیں، پھر یہ آسمان والے دوسرے آسمان والوں کو خبر دیتے ہیں آخر کار خبر اس آسمان تک آ پہنچتی ہے جن اس خبر کو اچک لیتے ہیں تو انہیں ان شہابیوں سے مارا جاتا ہے، جو خبر وہ جن لاتے ہیں وہ سچی ہوتی ہے لیکن وہ اس خبر میں زیادتی کر دیتے ہیں'' (1)۔ یہ چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شہابیے مارنے کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاسلام، باب تحریم الکہانۃ

سلسلہ بعثت سے قبل بھی تھا۔

زہری نے اسی کی مثل حضرت علی بن حسین بن علی بن ابی طالب سے وہ حضرت ابن عباس سے روایت نقل کرتے ہیں اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ان سے پوچھا گیا: کیا دور جاہلیت میں انہیں شہابیوں سے مارا جاتا تھا؟ جواب دیا: ہاں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں دیکھا: وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو معاملہ سخت کر دیا گیا؛ اس کی مثل قتبی نے کہا۔

ابن قتیبہ نے کہا: بعثت کے بعد نگہبانی کا معاملہ سخت ہو گیا اس سے قبل وہ چوری چھپے باتیں سن لیا کرتے تھے اور کسی وقت انہیں شہابیوں سے مارا بھی جاتا تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو انہیں سننے سے مطلقاً روک دیا گیا۔ اس کی وضاحت سورۃ الصافات میں وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ آیت میں گزر چکی ہے۔

حافظ نے کہا: اگر کوئی کہنے والا یہ کہے: جب جنوں کو معلوم ہو چکا تھا تو وہ خبر سننے کے لیے کیا اپنے آپ کو جلانے کے لیے پیش کر دیتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے: اللہ تعالیٰ انہیں ہر چیز بھلا دیتا ہے یہاں تک کہ آزمائش بڑی ہو جاتی ہے، جس طرح ابلیس کو ہر لحہ یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ وہ محفوظ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۙ (الحجر) اگر یہ نہ ہو تو احکام کا مکلف ہونا ہی درست نہ ہو۔

رَّصَدًا کے بارے میں یہ کہا گیا: یہ فرشتوں کی طرف سے ہوگا۔ رصد کا معنی ہے کسی شی کی حفاظت کرنے والا۔ اس کی جمع ارصاد ہے اس مقام کے علاوہ میں ممکن ہے کہ وہ جمع ہو جس طرح حَرَس کا صیغہ ہے اس کی واحد راصِد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: رصد شہابیہ ہے یعنی شہابیہ اس کی تاڑ میں ہوتا ہے تاکہ اس کے ساتھ شیطان کو رجم کیا جائے۔ یہ فَعَل کا وزن ہے جو مفعول کے معنی میں ہے جس طرح خَبَط اور نفض ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ کا مفہوم ہے آسمانوں کی ان نگہبانوں سے جو نگہبانی کی گئی ہے کیا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا ہے یا بھلائی کا ارادہ کیا ہے؟ ابن زید نے کہا: ابلیس نے کہا ہم نہیں جانتے کیا اللہ تعالیٰ نے اس حفاظت کے ساتھ اہل زمین پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ کیا ہے یا ان کی طرف رسول بھیجنے کا ارادہ کیا ہے؟ (1) ایک قول یہ کیا گیا: یہ جنوں کی آپس میں اس وقت کی گفتگو ہے جب کہ ابھی انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت نہیں سنی تھی یعنی ہم نہیں جانتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ اہل زمین کے لیے عذاب کا ارادہ کیا گیا ہے کیونکہ اہل زمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہیں اور جھٹلانے کے ساتھ ہلاک ہوتے ہیں جس طرح وہ لوگ ہلاک ہوئے جنہوں نے سابقہ امتوں میں سے انبیاء کو جھٹلایا یا اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور ہدایت پائیں، وہ شر اور رشد اسی کفر و ایمان پر منحصر تھا۔ اس قول کی بنا پر انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم تھا۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کو سنا تو انہیں علم ہو گیا کہ وحی کی حفاظت کی خاطر انہیں آسمان کے

1۔ تفسیر طبری

قریب جانے سے روکا گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہیں بلکہ یہ ایسا قول ہے جو ان جنوں نے اس وقت اپنی قوم سے کہا تھا جب وہ انہیں خبردار کرنے کے لیے واپس گئے تھے یعنی جب وہ ایمان لائے تو انہیں خوف ہوا کہ اکثر اہل زمین ایمان نہیں لائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ جن پر ہم ایمان لاتے ہیں کیا اہل زمین اس کا انکار کریں گے یا وہ ایمان لائیں گے؟

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۟ۙ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۟ۙ

''اور ہم میں سے بعض نیک بھی ہیں اور بعض اور طرح کے، ہم بھی تو کئی راستوں پر گامزن ہیں اور (اب) ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہم زمین میں بھی اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ یہ جنوں کے قول کی حکایت ہے جب جنوں نے اپنے ساتھیوں کو حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر ایمان لانے کی دعوت دی تو اس وقت انہوں نے ایک دوسرے کو یہ کہا کہ قرآن سننے سے پہلے ہم میں سے کچھ صالح تھے اور ہم میں سے کچھ کافر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ کا معنی ہے کہ صالحین سے صالحیت میں کم ہیں۔ یہ کلام اس کے زیادہ مشابہ ہے جس نے اسے ایمان اور شرک پر محمول کیا ہے۔ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا یعنی ہم مختلف جماعتیں تھیں؛ سدی نے یہ تعبیر کی ہے۔ ضحاک نے کہا: مختلف دین رکھنے والے تھے۔ قتادہ نے کہا: متضاد خواہشات رکھنے والے تھے؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

القَابِضُ البَاسِطُ الْهَادِی بِطَاعَتِهِ فی فِتْنَةِ النَّاسِ إِذْ أَهْوَاءُهُمْ قِدَدُ

وہ قابض، باسط اور اس کی اطاعت کرنے والا ہے جب کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہیں کیونکہ ان کی خواہشات مختلف ہیں۔

معنی یہ ہے تمام جن کافر نہیں تھے بلکہ مختلف تھے ان میں سے کچھ کفار تھے اور کچھ صالح مومن اور کچھ غیر صالح مومن تھے۔ مسیب نے کہا: ہم مسلمان، یہودی، نصرانی اور مجوسی تھے۔

سدی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۟ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: جنوں میں بھی تمہاری طرح قدریہ، مرجئہ، خوارج، رافضیہ، شیعہ اور سنی تھے (1)۔ ایک قوم نے یہ تعبیر کی کہ قرآن سننے کے بعد ہم مختلف تھے ہم میں سے کچھ مومن اور ہم میں سے کچھ کافر تھے یعنی ہم میں سے کچھ صالح اور کچھ ایسے مومن تھے جو صالحیت میں انتہاء تک پہنچے تھے یعنی ہم میں سے کچھ صالح اور کچھ ایسے مومن تھے جو صالحیت میں انتہا تک نہیں پہنچے ہوئے تھے۔ پہلی تعبیر اچھی ہے کیونکہ جنوں میں سے کچھ ایسے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی کہ انہوں نے کہا: (ہم نے ایسی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے) یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ تورات پر ایمان رکھتے تھے۔ جن کو انہوں نے ایمان کی دعوت

1۔ تفسیر بغوی، زاد المسیر

دی تھی یہ ان کی طرف سے مبالغہ ہے نیز اس قول میں کوئی فائدہ نہیں کہ ہم اب مومن اور کافر میں منقسم ہوئے ہیں۔

طرائق، طریقہ کی جمع ہے یہ انسان کا مذہب ہے یعنی ہم مختلف جماعتیں تھیں۔ یہ قول کیا جاتا ہے: القوم طرائق یعنی مختلف مذاہب پر ہے۔ قددا سے مراد راستوں کی مثل ہے یہ طرائق کے لیے تاکید ہے اس کا واحد قدۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: بکل طریق قددا اس کی اصل قد السیور ہے جس کا معنی تسموں کا کاٹنا ہے۔ لبید اپنے بھائی اربد کا مرثیہ کہتا ہے:

لم تَبْلُغُ العينُ كلَّ نهمتها ليلة تمسى الجياد كالقدد

آنکھ تمام خواہش کے باوجود اس رات تک نہ پہنچی جس رات گھوڑوں نے تسموں کی طرح رات گزار دی۔

ایک اور نے یہ شعر کہا:

ولَقَدْ قُلْتُ وزَيدٌ حاسِرٌ يومَ وَلَّتْ خيلُ عَمْرٍو قِدَدًا

میں نے کہا جب کہ زید تھکا ماندہ تھا: جس روز عمرو کے گھوڑے ٹکڑے ٹکڑے لوٹے۔

قد جب کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایسا تسمہ ہے جو ایسے چمڑے سے کاٹا جاتا ہے جس کو ابھی رنگا نہ گیا ہو ایک جملہ بولا جاتا ہے: مالہ قدٌ ولا قحف۔

قد چمڑے کا برتن اور قحف لکڑی کے برتن کو کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ میں ظن علم اور یقین کے معنی میں ہے یہ ظن اس ظن کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ اور وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا اس آیت کا معنی یہ ہے ہم نے اللہ تعالیٰ کی آیات میں استدلال اور غور و فکر سے جان لیا کہ ہم اس کے قبضہ اور حکومت میں ہیں ہم بھاگنے یا کسی اور طریقہ سے اس کی قدرت سے باہر نہیں جا سکتے۔ هَرَبًا یہ مصدر ہے جو حال کے معنی میں ہے یعنی ھاربین کا معنی دے رہا ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۙ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ﴿۱۵﴾

”اور اے جن بھائیو! ہم نے جب پیغام ہدایت سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے پس جو شخص اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہوتا ہے اور نہ ظلم کا اور بے شک ہم میں سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم، تو جنہوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے حق کی راہ تلاش کی اور جو حق سے منحرف ہوتے ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں“۔

آیت میں الْهُدٰۤى سے مراد قرآن ہے۔ اٰمَنَّا بِهٖ میں ضمیر مجرور سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں اور جنوں کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو انسانوں اور جنوں کی طرف مبعوث کیا اللہ

تعالیٰ نے جنوں، بادیہ نشینوں اور عورتوں میں سے کبھی کوئی رسول مبعوث نہیں کیا اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف:109) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ صحیح میں ہے: بُعِثتُ إلى الأحمرِ والأسودِ(1) یعنی جنوں اور انسانوں کی طرف مجھے مبعوث کیا گیا ہے (جو اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو وہ جزا میں کمی اور ظلم کا خوف نہیں رکھتا)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اس کی نیکیوں میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی اس بات سے ڈرتا ہے کہ اس کی برائیوں میں اضافہ کیا جائے گا کیونکہ بخس کا معنی کمی اور رھق کا معنی حد سے تجاوز کرنا اور حرام کردہ چیزوں کو بجالانا ہے۔

اعمش نے کہا:

لاشَيْءَ يَنْفَعُنِي من دُونِ رُؤْيَتِها　　هل يَشْتَفِي وَامِقٌ مَالَمْ يُصِبْ رَهَقَا

اس کے دیدار کے سوا مجھے کوئی چیز نفع نہیں دیتی کیا عاشق جب تک محبوب پر رسائی نہیں پائے گا وہ شفایاب ہوگا۔

وامق کا معنی محب ہے: وَمِقَ يَمِقُ کا معنی محبت کرنا ہے۔ یہ جنوں کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کی حکایت بیان کی ہے کہ وہ ایمان کے قوی اور صحیح اسلام والے تھے۔ عام قراء کی قراءت فلا یخاف ہے تقدیر کلام یوں ہے فانه لا یخاف۔ اعمش، یحییٰ اور ابراہیم نے اسے فلا یخف مجزوم پڑھا ہے کیونکہ یہ جواب شرط ہے اور فاء لغو ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ یعنی قرآن کے سننے کے بعد ہم ایک دوسرے سے مختلف تھے ہم میں سے کچھ وہ تھے جو مسلمان ہو گئے اور ہم میں سے کچھ کافر تھے۔ قاسط کا معنی ظالم ہے کیونکہ وہ حق سے روگردانی کرنے والا ہوتا ہے۔ مقسط کا معنی عادل ہے کیونکہ وہ حق کی طرف پھرنے والا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قسط یعنی ظلم کیا اور اقسط یعنی اس نے عدل کیا۔ شاعر نے کہا:

قومٌ هُمُ قتلوا ابن هِنْدٍ عَنْوَةً　　عَمْرًا وهم قَسَطُوا على النُّعْمَانِ

وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ابن ہند یعنی عمرو کو ظلم کے ساتھ قتل کیا اور انہوں نے نعمان پر ظلم کیا۔

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا۝ (جو اسلام لائے انہوں نے ہدایت کا قصد کیا) یعنی حق کے راستہ کا قصد کیا اسی سے تحری القبلة ہے یعنی قبلہ کو تلاش کیا۔ رہے وہ لوگ جو حق اور ایمان کے راستے سے اعراض کرنے والے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا۝ لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا۝

''اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر تو ہم انہیں سیراب کریں گے کثیر پانی سے تاکہ ہم ان کی آزمائش کریں اس فراوانی سے اور جو منہ موڑے گا اپنے رب کے ذکر سے تو وہ داخل کرے گا اسے سخت عذاب میں''۔

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب المساجد و مواضع الصلاۃ

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ یہ فرمان جنوں کے قول کی حکایت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یعنی اگر یہ کفار ایمان لاتے تو دنیا میں ہم انہیں وسعت عطا کرتے اور انہیں فراخ رزق عطا کرتے۔ یہ وحی پر محمول ہوگا یعنی میری طرف وحی کی گئی کہ اگر جن استقامت کا مظاہرہ کرتے۔ ابن بحر نے ذکر کیا اس صورت میں جہاں ان ہے وہ ان جنوں کے قول کی حکایت ہے جنہوں نے قرآن سنا اور اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے لوٹے اور جہاں بھی ان (مفتوحہ مخففہ) ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی ہے یعنی (اس کا تعلق اوحی فعل کے ساتھ ہے) ابن انباری نے کہا: جس نے ماقبل مقامات پر ہمزہ کو کسرہ دیا اور وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا میں ہمزہ کو فتحہ دیا تو اس نے مکمل قسم کو مضمر مانا۔ اس کی تاویل یہ ہے واللہِ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ جس طرح گفتگو میں یہ کہا جاتا ہے: واللہ ان قمت لقمت اور واللہ لو قمت قمت۔ شاعر نے کہا:

اَمَا واللهِ أَنْ لو كُنتُ حُرًّا وما بِالْحُرِّ أنتَ ولا العتيقُ

اللہ کی قسم! کاش تو آزاد ہوتا نہ تو اصلاً آزاد ہے اور نہ ہی بعد میں آزاد کیا گیا ہے۔

جس نے نون مخففہ سے قبل کو فتحہ دیا اس نے اسی کلام کو اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ، وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا اور اٰمَنَّا بِهٖ پر عطف کیا ہے تقدیر کلام یوں ہے بأن لو استقاموا۔

جس نے تمام حروف ان مخففہ تک کو کسرہ دیا تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ مخففہ کو اُوْحِيَ اِلَيَّ اور فَاٰمَنَّا بِهٖ پر عطف کرے اور قسم کو مضمر ماننے سے مستغنی ہو جائے اور عام قراء کی قراءت لَوِ استقاموا ہے کیونکہ دو ساکن جمع ہو گئے ہیں۔ ابن وثاب اور اعمش نے واؤ کو مضموم پڑھا ہے۔

مَآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ یعنی کثیر پانی۔ ان سے سات سال تک بارش روک لی گئی تھی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: غَدِقَتِ العينُ تَغْدَقُ هي غَدِقة۔ جب چشمہ کا پانی بہت زیادہ ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں اس سے مراد تمام مخلوق ہے، اگر ساری مخلوق حق، ایمان اور ہدایت کے راستہ پر استقامت کا مظاہرہ کرتی اور وہ مطیع و مومن ہوتی تو ہم اسے کثیر پانی سے سیراب کرتے تاکہ ہم آزمائیں کہ ان نعمتوں پر ان کا شکر کیسا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: جہاں کہیں ماء کا ذکر ہے اس سے مراد مال ہے اور جہاں کہیں مال کا ذکر ہے اس سے مراد آزمائش ہے لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ کا معنی ہے ہم دنیا میں ان پر وسعت کر دیتے۔ ماء غدق کو مال کثیر کے لیے بطور ضرب المثل ذکر کیا کیونکہ خیر اور رزق سب بارش کی وجہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے بارش کو خیر اور رزق کی جگہ رکھ دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بارش مراد ہے: وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (اعراف: 96) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ: 66)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

سعید بن مسیب، عطا بن ابی رباح، ضحاک، قتادہ، مقاتل، عطیہ، عبید بن عمیر اور حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ احکام کے سننے والے اور اطاعت کرنے والے تھے ان پر کسریٰ، قیصر، مقوقس اور نجاشی کے خزانے کھول

دیئے گئے تو اسی مال کی وجہ سے انہیں آزمائش میں ڈالا گیا تو وہ اپنے امام پر جھپٹ پڑے اور انہیں (حضرت عثمان ذی النورین کو) شہید کر دیا۔

کلبی اور دوسرے علماء نے کہا: وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ کا معنی یہ ہے جس کفر پر وہ پہلے تھے اگر وہ اسی پر استقامت کا مظاہرہ کرتے اور وہ سب کے سب کافر ہوتے تو ہم خفیہ تدبیر کی بنا پر ان سے استدراج کا طریقہ اپناتے ہوئے ان پر رزق فراخ کر دیتے یہاں تک کہ وہ وسیع رزق کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہو جاتے تو ہم انہیں دنیا و آخرت میں عذاب دیتے۔ یہ وہ تعبیر ہے جو ربیع بن انس، زید بن اسلم، ان کے بیٹے، کلبی، ثمالی، یمان بن رباب، ابن کیسان اور ابو مجلز نے کی ہے انہوں نے ان آیات سے استدلال کیا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ (انعام:44) اور وَ لَوْلَاۤ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ (الزخرف:33) پہلی تعبیر زیادہ مناسب و موزوں ہے کیونکہ الطریقہ معرف باللام ہے پس زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کا راستہ ہدایت کا راستہ ہو۔ اور استقامت، ہدایت کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جن چیزوں سے میں تمہارے بارے میں خوف کھاتا ہوں ان میں سے سب سے خوفناک امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر زہرۃ الدنیا نکالے گا'' صحابہ نے پوچھا: یہ زہرۃ الدنیا کیا چیز ہے؟ فرمایا: ''زمین کی برکات''۔ ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تمہارے بارے میں فقر سے نہیں ڈرتا میں تمہارے بارے میں اس چیز سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر فراخ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فراخ کی گئی تھی، تم اس میں باہم مقابلہ کرو گے جس طرح انہوں نے باہم مقابلہ کیا تو وہ تمہیں ہلاک کر دے گی جس طرح اس نے انہیں ہلاک کیا''۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ میں ذکر سے مراد قرآن ہے؛ یہ قول ابن زید کا ہے۔ قرآن سے اس کے اعراض کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) قبول کرنے سے اعراض۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اہل کفر میں تھی (۲) عمل سے اعراض۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مومنوں میں تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر نہ کیا اللہ تعالیٰ اسے چھا جانے والے عذاب میں داخل کرے گا۔

کوفی قراء اور عیاش نے ابو عمرو سے یسلکه (یاء کے ساتھ) پڑھا ہے یہ قراءت ابو عبید اور ابو حاتم کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام پہلے مذکور ہے کہا: وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ۔ جب کہ باقی قراء نے اسے نسلکه پڑھا ہے۔

مسلم بن جندب سے نُسْلِکه مروی ہے۔ طلحہ اور اعرج نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں سَلَكَهٗ اور أَسْلَكَهٗ دونوں (مجرد و مزید فیہ) کا ایک ہی معنی ہے یعنی ہم اسے سخت مشکل عذاب میں داخل کریں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے جب بھی وہ اس پر اپنے ہاتھ رکھیں گے تو ہاتھ پگھل جائیں گے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے: اس کا معنی مشقة من العذاب ہے لغت میں بھی یہ معلوم و مشہور ہے کہ صعدا

معنی مشقت ہے تو کہتا ہے: تصعدنی الأمر۔ یہ جملہ تو اس وقت بولتا ہے جب معاملہ تجھ پر مشکل ہو جائے۔ اس معنی میں حضرت عمر بنائنہ کا قول ہے: ما تصعدنی شیءٌ ما تصعدتنی خطبةُ النکاح۔ یعنی مجھے جتنا مشکل خطبہ نکاح ہے میرے لیے اتنی مشکل کوئی چیز نہیں۔ عذاب صعد کا معنی ہے سخت عذاب۔ صَعَد، صَعِد کا مصدر ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے صَعِدَ صَعَداً و صعوداً۔ اس لفظ کے ساتھ عذاب کی صفت ذکر کی گئی ہے کیونکہ یہ عذاب معذب پر بلند ہو جاتا ہے جس کو برداشت کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ ابوعبیدہ نے کہا: الصعد مصدر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی عذاباً ذا صعدٍ بلندی کی طرف چڑھنے میں مشقت ہوتی ہے۔ صعود سے مراد پیچیدہ گھاٹی ہے۔

عکرمہ نے کہا: جہنم میں ملائم چٹان ہے جس پر چڑھنے کا انہیں مکلف بنایا جائے گا جب وہ اس کی بلندی تک پہنچے گا تو اسے جہنم کی طرف گرا دیا جائے گا۔

کلبی نے کہا: ولید بن مغیرہ کو جہنم میں ایک پہاڑ پر چڑھنے پر مجبور کیا جائے گا جو پہاڑ ملائم چٹان کا ہوگا اسے زنجیروں کے ساتھ سامنے سے کھینچا جائے گا اور پیچھے سے گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا یہاں تک کہ اس کی چوٹی پر پہنچے گا وہ چالیس سال تک اس کی بلندی پر نہیں پہنچے گا جب وہ اس کی بلندی پر پہنچے گا تو اسے اس کی پستی کی طرف گرا دیا جائے گا پھر اسے اس کی چوٹی پر چڑھنے پر مجبور کیا جائے گا ہمیشہ اس کا یہی طریقہ ہوگا۔ الله تعالیٰ کے فرمان: سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ (مدثر) کا یہی معنی ہے۔

وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝

''اور بے شک سب مسجدیں الله کے لیے ہیں پس مت عبادت کرو الله کے ساتھ کسی کی''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مساجد سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ اس آیت کا تعلق قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ کے ساتھ ہے یعنی کہہ دو: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ مساجد الله تعالیٰ کے لیے ہیں۔ خلیل نے یوں تقدیر کلام کی ہے لِانَّ المساجد لله کیونکہ مساجد الله کے لیے ہیں، بیوت سے مراد وہ مقامات ہیں جو ادیان کے حاملین عبادت کے لیے بناتے ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: ہمارے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مساجد میں آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں حاضر ہوں جب کہ ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہوتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی مساجد الله تعالیٰ کے ذکر اور اس کی طاعت بجالانے کے لیے بنائی گئی ہیں (1)۔

حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد تمام جگہیں ہیں کیونکہ ساری زمین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسجد ہے (2) آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تم جہاں بھی ہو نماز پڑھ لو۔ تم جہاں بھی نماز پڑھو گے وہ مسجد ہے''۔ صحیح میں ہے: ''میرے لیے زمین مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنا دی گئی ہے'' (3)۔ سعید بن مسیب اور طلق بن حبیب نے کہا: مساجد سے مراد وہ اعضاء ہیں جن پر بندہ سجدہ کرتا ہے وہ دو قدم، دو گھٹنے، دو ہاتھ اور چہرہ ہے۔ یہ اعضاء ایسے ہیں جن کے ساتھ الله تعالیٰ نے تجھ پر

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 341 2۔ تفسیر بغوی، جز 4، صفحہ 404 3۔ مشکوۃ المصابیح باب فضائل سید المرسلین

انعام کیا ہے تو ان اعضاء کے ساتھ غیر کو سجدہ نہ کر اگر تو ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرے گا۔

عطا نے کہا: مساجد سے مراد تیرے وہ اعضاء ہیں جن کے بارے میں تجھے حکم دیا گیا کہ تو ان پر سجدہ کرے تو انہیں خالق کے سوا کے لیے ذلیل نہ کر۔

صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں، پیشانی اور اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنے اور دونوں کندھوں کی طرف''۔

حضرت عباس نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب بندہ سجدہ کرے تو اس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کریں''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مساجد سے مراد نمازیں ہیں کیونکہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے بھی یہی قول کیا ہے۔ اگر مساجد سے مراد مواضع لیے جائیں تو اس کی واحد مسجد ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی واحد مسجد ہوگی۔ فراء نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔ اگر تو اس سے مراد اعضاء لے تو اس کی واحد مسجد ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مسجد کی جمع ہے جس کا معنی سجود ہے۔ یہ قول کیا جاتا ہے: سجدتُ سجودًا و مسجدًا جس طرح تو کہتا ہے: ضربتُ فی الأرض ضربًا و مضربًا یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو رزق کی تلاش میں جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہاں مساجد سے مراد حکم ہے جو قبلہ ہے مکہ مکرمہ کو مساجد کا نام دیا کیونکہ ہر ایک اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتا ہے۔ پہلا قول ان تمام اقوال سے زیادہ نمایاں ہیں ان شاء اللہ؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

## مسجد حرام اور مسجد نبوی کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 2**۔ لِلّٰهِ میں اضافت شرف اور رتبہ کے اظہار کے لیے ہے، پھر ان مساجد میں سے بیت عتیق کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا: میرے گھر کو پاک کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سواریوں کو تین مساجد کے علاوہ کسی مسجد کے لیے کام میں نہ لایا جائے'' (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری اس مسجد میں پڑھی جانے والی ایک نماز مسجد حرام کے سوا باقی مساجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے'' (2)۔ ابن عربی نے کہا: ایک ایسی سند سے یہ روایت مروی ہے جس میں کوئی کجی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا باقی مساجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے کیونکہ مسجد حرام میں پڑھی جانے والی ایک نماز میری مسجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے بہتر ہے'' اگر یہ صحیح ہو تو مسجد حرام کی فضیلت میں یہ ایک نص ہوگی (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ روایت صحیح ہے جو ایک عادل سے دوسرے عادل سے منقول ہے جس طرح ہم نے سورۂ ابراہیم میں

---

1۔ سنن النسائی، کتاب المساجد، باب ما تشد الرحال

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل المدینۃ، حدیث نمبر 3851، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی

بیان کیا ہے۔

## مساجد کی اضافت غیر کی طرف کرنے کا جواز

**مسئلہ نمبر 3**۔ مساجد اگرچہ ملک اور شرافت کے اظہار کے لیے اللہ کی ہیں تاہم علامت کے طور پر غیر کی طرف بھی منسوب ہوتی ہیں، تو کہا جاتا ہے: مسجد فلاں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضامر گھوڑوں میں حفیاء (1) سے ثنیۃ الوداع تک دوڑ کرائی اور جن گھوڑوں کو ضامر نہیں بنایا جاتا تھا ان کی دوڑ ثنیہ سے مسجد بنی زریق تک کرائی۔ یہ اضافت محلیت کے اعتبار سے ہے گویا وہ محل ان کے قبلہ میں ہے۔ بعض اوقات ان کے وقف کرنے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ پل اور قبرستانوں کے خاص کرنے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں اگرچہ دوسری چیزوں کی تخصیص میں اختلاف ہے۔

## مسجد میں کون سے کام جائز ہیں

**مسئلہ نمبر 4**۔ مساجد اللہ کے لیے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا جاسکتا تاہم ان میں اموال کی تقسیم جائز ہے، ان میں صدقات رکھنا بھی جائز ہے کہ یہ سب مساکین میں مشترک ہے اور ان میں جو آئے وہ اس سے کھالے، اس میں مقروض کو روک لینا بھی جائز ہے، اس میں قیدی کو باندھنا بھی جائز ہے، اس میں سونا جائز ہے، مریض کا رہنا جائز ہے، پڑوسی کا اس میں دروازہ کھولنا جائز ہے، شعر جب باطل سے پاک ہو تو اس کا پڑھنا جائز ہے۔ یہ سب باتیں سورۂ براءت، سورۂ نور اور دوسری سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

## اس آیت کے نزول کا سبب

**مسئلہ نمبر 5**۔ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝ مسجد حرام میں مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اس پر انہیں شرمندہ کرنا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہودی اور نصرانی جب اپنی عبادت گاہوں میں داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مومنوں کو حکم دیا کہ وہ جب مساجد میں داخل ہوں تو عبادت کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے خالص کریں، اسے ہنسی مذاق کی جگہ، تجارتی منڈی، بیٹھنے کی جگہ اور راستہ نہ بنائیں اور ان مساجد میں غیر اللہ کے لیے حصہ نہ بنائیں۔ صحیح میں ہے: ''جو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرے تو تم یہ کہو: اللہ تعالیٰ اسے تم پر نہ لوٹائے، کیونکہ مساجد اس کے لیے نہیں بنائی گئیں''۔ سورۂ نور میں ایسی بحث گزر چکی ہے جو مساجد کے احکام کے لیے کافی ہے۔

## مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے نکلنے کی دعا

**مسئلہ نمبر 6**۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو اپنا دایاں پاؤں آگے رکھتے اور یہ آیت پڑھتے وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝ اور دعا مانگتے: ''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرا زائر ہوں، ہر زیارت کیے جانے والے پر حق ہے اور تو بہترین

1۔ یہ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے سفیان نے کہا: حفیاء سے ثنیہ تک پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ مترجم

زیارت کیے جانے والوں میں سے ہے، میں تیری رحمت کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری گردن کو آگ سے آزاد کر دے'' اور جب مسجد سے نکلتے تو اپنا دایاں پاؤں آگے رکھتے اور یہ دعا کرتے: ''اے اللہ! مجھ پر بھلائی کو انڈیل، جو تو نے مجھے اچھائی عطا کی ہے کبھی بھی مجھ سے نہ چھین، میری زندگی کو مخصوص مشقت نہ بنادے اور زمین میں میرے لیے غنا مقدر کر دے''۔

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾

''اور جب کھڑا ہوتا ہے اللہ کا (خاص) بندہ تا کہ اس کی عبادت کرے تو لوگ اس پر ہجوم کر کے آجاتے ہیں۔ آپ فرمایئے: میں تو اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور شریک نہیں ٹھہراتا اس کا کسی کو۔ آپ فرمایئے: (اللہ کے اذن کے بغیر) نہ تو میں تمہیں نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا''۔

وَّ اَنَّهٗ کے ہمزہ پر فتحہ پڑھنا جائز ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی اور جملہ مستانفہ کے طریقہ پر۔ ہمزہ کے نیچے کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہاں عبداللہ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جب کہ آپ بطن نخلہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور قرآن حکیم پڑھ رہے تھے جیسے سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

یَدْعُوْهُ یعنی اس کی عبادت کرتے ہوئے۔ ابن جریج نے کہا: یَدْعُوْهُ کا معنی ہے اللہ کا بندہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دعوت دینے کے لیے کھڑا ہوا۔

كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ کی تعبیر کرتے ہوئے حضرت زبیر بن عوام نے کہا: اس سے مراد جن ہیں جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا۔ یعنی وہ بھیڑ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر سوار ہونے لگے اور گرنے لگے وجہ قرآن حکیم سننے کی حرص تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حرص کی وجہ سے ایک دوسرے پر سوار ہونے لگے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: وہ ذکر کے سماع میں رغبت کرنے لگے۔ برد نے مکحول سے روایت نقل کی ہے، اس رات جنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی اس وقت ان کی تعداد ستر ہزار تھی اور فجر کے طلوع ہونے کے وقت بیعت سے فارغ ہوئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی قول ہے کہ یہ جنوں کا قول ہے جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو وہ کچھ بتایا جو انہوں نے صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور رکوع وسجود میں اقتدا کرتے ہوئے دیکھا(1)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ناراضگی کی وجہ سے ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں۔

حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابن زید نے یہ کہا: جب حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے دعوت دینا شروع کی تو انسان اور جن سب اس پر امر پر متفق ہو گئے کہ اس نور کو بجھادیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادہ کا انکار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی۔ اور طبری نے یہ معنی اختیار کیا ہے: تمام عرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جمع ہوتے ہیں اور جو نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم لاتے ہیں اس کو بجھانے کے لیے باہم تعاون کرتے ہیں۔

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الجن، حدیث نمبر 3245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجاہد نے کہا: لبد کا معنی جماعتیں ہیں، یہ تَلَبَّدُ الشیء علی الشیء سے مشتق ہے یعنی جمع ہونا اسی سے لبدہ ہے جسے بچھایا جاتا ہے تاکہ اس کی اون جمع ہو جائے ہر وہ چیز جس کو تو ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے ملائے تو تو نے اسے لِبْدہ بنا دیا۔ لبدہ کی جمع لبد ہے جس طرح قربة کی جمع قرب ہے وہ بال جو شیر کی پشت پر ہوتے ہیں اسے لبدہ کہتے ہیں اس کی جمع لبد ہے زہیر نے کہا:

لَدَى أَسَدٍ شاكِي السلاحِ مُقَذَّفٍ لهٗ لِبَدٌ أَظْفارُهٗ لم تقلَّمِ

شیر کے پاس جو مسلح ہے گوشت پھینکنے والا ہے اس کی گردن پر لمبے بال ہیں اس کے ناخن نہیں کاٹے گئے۔

بہت زیادہ ٹڈی کو بھی لبد کہتے ہیں اس میں چار لغات اور قراءتیں ہیں۔ (۱) باء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ؛ یہ عام لوگوں کی قراءت ہے۔ (۲) لام کو ضمہ اور باء کو فتحہ؛ یہ مجاہد، ابن محیصن اور ہشام کی قراءت ہے۔ اس کی واحد لُبدۃ ہے (۳) لام اور باء دونوں مضموم ہوں؛ یہ ابو حیوہ، محمد بن سمیقع، ابی الاشہب عقیلی اور جحدری کا نقطہ نظر ہے۔ اس کی واحد لَبَد ہے جس طرح سَقف کی جمع سُقُفٌ اور رَھن کی جمع رُھُنٌ ہے۔ (۴) لام کو ضمہ اور باء مشددہ مفتوحہ؛ یہ حسن، ابو العالیہ، اعرج اور جحدری کی قراءت ہے۔ اس کی واحد لابد ہے۔ جیسے راکع کی جمع رُکّع، ساجد کی جمع سُجّد ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: لُبَد لام کے ضمہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ یعنی دائمی چیز۔ اس معنی میں یہ قول ہے کہ لقمان کی گدھ کو لُبَد کہتے ہیں کیونکہ اس میں دوام اور بقاء کی خصوصیات تھیں۔

نابغہ نے کہا: أَخْنَى عليها الذی أَخْنَى على لُبَدِ۔

اس کے ساتھ اس نے خیانت کی جس نے لبد کے ساتھ خیانت کی۔

قشیری نے کہا: اسے لُبَد لام اور یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے یہ لبید کی جمع ہے جس کا معنی اون کی چھوٹی گون ہے۔ صحاح میں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۞ (البلد) یعنی میں نے سب کا سب مال خرچ کر دیا۔ یہ بھی جملہ بولا جاتا ہے: الناس لبد لوگ جمع ہیں۔ اور لبد اس آدمی کو بھی کہتے ہیں جو سفر نہیں کرتا اور ہمیشہ اپنے گھر میں رہتا ہے۔

شاعر نے کہا:

من امرئٍ ذِی سَماحٍ لا تَزالُ لَهٗ بَزْلاءُ يَعْيَا بها الجَثّامة اللبَدُ

سخی آدمی کی جانب سے اس کی رائے ہمیشہ عمدہ ہوتی ہے جس کے ساتھ اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا تھک ہار جاتا ہے۔

إِنِّی إِذا شَغَلَتْ قوما فُرُوجُهم رَحْبُ المَسالِكِ نَهّاضٌ بِبَزْلاءِ

جب لوگوں کو ان کے بچے مشغول کر دیتے ہیں تو میں کھلے راستوں والا اور عظیم کام کرنے والا ہوتا ہوں۔

لبد لقمان کی گدھوں میں سے آخری ہے۔ یہ منصرف ہے کیونکہ یہ معدول نہیں۔ عربوں کا گمان ہے کہ لقمان وہ ہے جسے عاد نے اپنے وفد میں حرم کی طرف بھیجا تاکہ وہ ان کے لیے بارش کی دعا کرے۔ جب وفد کے لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا تو لقمان کو اختیار دیا گیا کہ وہ سات سفید ہرنیوں کے درمیان رہے جو مٹیالے ہرنوں میں سے ہوں اور ایسے پہاڑ میں جو پر پیچ ہو،

جہاں بارش نہ ہوئی ہو یا ان سات گدھوں کے درمیان رہے۔ جب بھی ایک گدھ ہلاک ہو تو اس کے بعد ایک گدھ نائب ہوگی۔ تو آپ نے گدھوں کو پسند کیا ان کی آخری گدھ کا نام لبد تھا شعراء نے بھی اس کا ذکر کیا، نابغہ نے کہا:

أَخْنَى عليها الذى أَخْنَى عَلَى لُبَدِ

اس شعر میں لبد سے مراد وہی گدھ ہے۔

لبید سے مراد اون کی چھوٹی گون ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ألبدت القِربة۔ جب تو اسے گون میں رکھ لے۔

لبید، بنی عامر کے شاعر کا نام بھی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا''۔ اکثر قراء نے یہاں قال کی قراءت کی ہے جب کہ حمزہ اور عاصم نے قُلْ امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ قریش کے کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: تم بہت بڑی بات لاتے ہو، ہم نے تمام لوگوں سے دشمنی مول لے لی ہے اس سے باز آ جاؤ ہم تمہیں پناہ دیتے ہیں۔

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ فرما دیجئے: میں اس پر قادر نہیں کہ میں تم سے مصیبت کو دور کروں اور نہ اس پر قادر ہوں کہ تمہارے لیے بھلائی لاؤں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ضَرًّا سے مراد کفر اور رَشَدًا سے مراد ہدایت ہے یعنی میرے ذمہ تبلیغ کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ضر سے مراد عذاب اور رشد سے مراد نعمت ہے۔ یہ بعینہ پہلا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ضر سے مراد موت اور رشد سے مراد زندگی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۲ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝۲۳ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝۲۴ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۝۲۵

''آپ فرمایئے: مجھے اللہ تعالیٰ سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور نہ میں پا سکتا ہوں اس کے بغیر کہیں پناہ، البتہ میرا فرض یہ ہے کہ پہنچا دوں اللہ کے احکام اور اس کے پیغامات پس (اب) جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں (یہ نافرمان) ہمیشہ رہیں گے تا ابد، یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے (وہ عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ کون ہے جس کا مددگار کمزور ہے اور جس کی تعداد کم ہے۔ آپ فرمایئے: میں اپنی سوچ و بچار سے نہیں جانتا کہ وہ دن قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے یا مقرر کر دی ہے اس کے لیے میرے رب نے لمبی مدت''۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ کا معنی یہ ہے اگر میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور سے حفاظت

چاہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو مجھ سے دور کرنے والا نہیں، یہ اس لیے فرمایا کیونکہ انہوں نے کہا تھا: جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو اس کو چھوڑ دو ہم تجھے پناہ دیتے ہیں۔ ابو جوزاء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں جنوں والی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا یہاں تک آپ حجون کے مقام پر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے ایک خط لگایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے جنوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیڑ کر لی جنوں کے سردار جسے وردان کہتے نے کہا: میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں دور بھگا دوں گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے گا''۔ ماوردی نے یہ ذکر کیا ہے۔ یہ کلام دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے (۱) اللہ تعالیٰ کی پناہ جیسی پناہ مجھے کوئی نہیں دے سکتا (۲) اللہ تعالیٰ نے میرے حق میں جو مقدر کیا ہے اس سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

**وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا** ۝ یعنی میں اس کی بارگاہ کے بغیر کوئی ایسی پناہ نہیں پاؤں گا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ قتادہ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ **مُلْتَحَدًا** کا معنی مددگار ہے۔ سدی نے اس کا معنی پناہ گاہ ذکر کیا ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی زمین میں ایسا راستہ جو کھوہ کی مانند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے نہ دوست اور نہ آقا پاؤں گا۔ ایک قول یہ کیا گیا: کوئی راستہ نہیں پاؤں گا۔ ابن شجرہ نے اس کی حکایت بیان کی ہے، معنی ایک ہی ہے؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

يالَهْفَ نفسي ولَهْفِي غيرُ مجدية  عَنّي وما مِنْ قضاءِ الله مُلْتَحَدا

ہائے میرا افسوس! جب کہ میرا افسوس کرنا مجھے کچھ نفع دینے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں۔

**اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِسٰلٰتِهٖ** اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں ہی امان اور نجات ہے؛ یہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کا پیغام حق پہنچانا ہی ایک ایسا عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مالک ہوں۔ جہاں تک کسی کے لیے کفر، ایمان کو پیدا کرنے کا تعلق ہے میں ان کا مالک نہیں، اس تعبیر کی صورت میں اس کلام کا تعلق **قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا** ۝ کے ساتھ ہوگا معنی یہ بنے گا میں اس بات کا مالک ہوں کہ تمہیں پیغام حق پہنچا دوں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ کلام **لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا** ۝ سے مستثنیٰ منقطع ہے تو معنی یہ ہوگا لیکن میں تمہیں وہ پیغام حق پہنچا دوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: یہ **مُلْتَحَدًا** بدل ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی میں اس کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں پاؤں گا مگر یہ کہ جو پیغام حق مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے وہ آگے پہنچا دوں یا یہ معنی ہوگا جن پیغامات کی تبلیغ کا مجھے حکم ہوا وہ پہنچا دوں یا اس کا معنی یہ ہوگا مگر یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے پیغام کو پہنچاؤں، اس کے ارشادات کے مطابق عمل کروں اور غیر کو جس کا حکم دیتا ہوں اس پر اپنے آپ کو پابند کروں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: **بَلٰغًا** مفعول مطلق ہے لا، لو کے معنی میں ہے اور حرف ان شرط کا معنی دے رہا ہے معنی یہ بنے گا اگر میں اس کے پیغام کو نہ پہنچاؤں تو میں اس کے سوا کوئی پناہ نہ چاہوں گا۔

جو توحید اور عبادت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو بے شک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، فان

کے ہمزہ کو کسرہ دیا ہے کیونکہ جزا کا مابعد یہ ابتدا کا محل ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ خٰلِدِیْنَ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ خٰلِدِیْنَ کو جمع ذکر کیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے جس نے بھی یہ کیا ہے۔ پہلے من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر واحد ذکر کی پھر معنی کا اعتبار کرتے ہوئے خٰلِدِیْنَ کو جمع ذکر کیا۔ ابدا کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں عصیان سے مراد شرک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں شرک کے علاوہ معاصی مراد ہیں۔ یہاں ان کے ہمیشہ رہنے سے مراد یہ ہے اگر میں ان کو معاف نہ کروں یا انہیں شفاعت نصیب نہ ہو یہ تو ضروری بات ہے جب وہ دنیا سے ایمان کی حالت میں نکلے ہیں تو انہیں عفو تو ضرور لاحق ہوگی۔ یہ معنی سورۃ النساء اور دوسری صورتوں میں بڑا واضح گزرا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ یہاں تک کہ جب وہ اس آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے جن کی انہیں دھمکی دی گئی ہے یا وہ دنیا کے عذاب کو دیکھیں گے جس کی انہیں دھمکی دی گئی ہے۔ وہ بدر کے میدان میں ان کا قتل ہے۔ اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون مددگاروں کے اعتبار سے کمزور ہے وہ، یا مومن اور کس کی تعداد کم ہے وَ اَقَلُّ عَدَدًا یہ معطوف ہے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اس سے مراد قیامت کا واقع ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے یعنی میں نہیں جانتا کیونکہ ان، لا یا ما کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا عذاب کے نازل ہونے کا وقت اور قیامت کے برپا ہونے کا وقت کوئی نہیں جانتا۔ وہ وقت غیب ہے میں اتنا ہی غیب جانتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھے بتاتا ہے۔ مَا یُوْعَدُوْنَ میں جو مَا ہے اس کے بارے میں یہ جائز ہے کہ وہ اپنے فعل کے ساتھ مل کر مصدر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ الذی کے معنی میں ہو تو ضمیر عائد کو مقدر مانا جائے گا اور اَمَدًا کا معنی انتہا اور مدت ہے عام قراء نے ربی کی یاء کو ساکن پڑھا ہے حرم کے دونوں قاریوں اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

''(اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے) تو مقرر کر دیتا ہے اس رسول کے آگے اور اس کے پیچھے محافظ''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

اللہ تعالیٰ کس پر غیب کو ظاہر فرماتا ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ میں عٰلِمُ کو مرفوع پڑھیں تو یہ ربی کی صفت ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہوگی: ھو عالم الغیب۔ غیب اسے کہتے ہیں جو بندوں سے غائب ہو۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ وہ کسی پر اپنا غیب ظاہر نہیں کرتا مگر رسولوں میں سے جس پر راضی ہوتا ہے کیونکہ اس پر غیب میں سے جو چاہتا ہے ظاہر کرتا

ہے کیونکہ رسولوں کی معجزات کے ساتھ تائید کی جاتی ہے ان معجزات میں سے بعض غیبت کی خبریں بھی ہوتی ہیں قرآن حکیم میں ہے وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران:49) ابن جبیر نے کہا: مِنْ رَّسُوْلٍ سے مراد حضرت جبرئیل امین ہیں۔ یہ تعبیر حقیقت سے بہت ہی بعید ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ وہ اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں کرتا مگر جسے نبوت کے لیے منتخب کر لیتا ہے کیونکہ اسے جس غیب پر چاہتا ہے مطلع کرتا ہے تاکہ یہ چیز اس کی نبوت پر دلیل ہو۔

## نجومیوں سے غیب جاننے کی نفی

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے علم غیب کے واسطہ سے اپنی مدح فرمائی مخلوق کی بجائے اسے اپنی ذات کے ساتھ خاص کیا تو اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا، پھر ان رسولوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جن پر وہ راضی ہے تو انہیں اپنے غیب میں سے جو چاہا وحی کے ذریعے ودیعت کر دیا، ان کے لیے اسے معجزہ بنا دیا اور ان کی نبوت پر سچی دلیل بنا دیا۔ منجم اور جو ان کے مشابہ ہوتے ہیں جو کنکری پھینکتے ہیں، کتابوں میں فال دیکھتے ہیں اور پرندے کو جھڑکتے ہیں ان میں سے نہیں جو مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ کا مصداق ہو کہ انہیں اپنے غیب پر مطلع فرمائے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والا ہے، فکر کی تیزی، ظن، تخمین اور جھوٹ کے ذریعے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے والا ہے۔

ایک عالم نے کہا: کاش! میں جانتا جو منجم ایک کشتی کے بارے میں کہتا ہے اس میں ایک ہزار انسان سوار ہوتے ہیں جن کے احوال مختلف ہیں اور مراتب مختلف ہیں ان میں کوئی بادشاہ، بازاری، عالم، جاہل، غنی، فقیر، بڑا اور چھوٹا ہے ان کے طالع (زائچے) مختلف ہیں، ولادت کا وقت الگ ہے اور ستاروں کے درجات بھی مختلف ہیں سب پر غرق کا حکم ایک وقت میں ہو سکتا ہے۔

اگر نجومی کہے: (اللہ تعالیٰ اسے رسوا کرے) انہیں اس طالع (زائچہ) نے غرق کیا ہے جس میں یہ سوار ہوئے تھے تو اس کا نتیجہ یہ ہے اس طالع (زائچہ) نے تمام طوالع (زائچوں) کے احکام کو باطل کر دیا ہے جب کہ ہر ایک کی ولادت کا وقت مختلف ہے اور اس کے مخصوص طالع (زائچہ) کا تقاضا بھی مختلف ہے تو ولادت کے اوقات کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا اس میں شقی اور سعید پر کوئی دلالت نہ ہوگی، اس میں قرآن عظیم کے ساتھ دشمنی کے سوا کوئی چیز باقی نہ بچے گی اس قسم کا عمل کرنے پر اس کا خون حلال ہو جائے گا۔ جب شاعر نے کہا تو کتنا اچھا کہا:

حَكَمَ الْمُنَجِّمُ أَنَّ طَالِعَ مَوْلِدِي يَقْضِي عَلَيَّ بِمِيتَةِ الْغَرَقِ

منجم نے فیصلہ کیا کہ میری ولادت کا زائچہ میرے بارے میں غرق ہونے کی موت کا فیصلہ کرتا ہے۔

قُلْ لِلْمُنَجِّمِ صَبْحَةَ الطُّوفَانِ هَلْ وُلِدَ الْجَمِيعُ بِكَوْكَبِ الْغَرَقِ

طوفان کی صبح منجم سے پوچھو کیا تمام غرق والے ستاروں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے اس وقت کہا گیا جب آپ نے خارجیوں سے جنگ کا ارادہ کیا تھا: کیا آپ ان سے جنگ کریں گے جب چاند برج عقرب میں ہے؟ تو حضرت علی شیر خدا نے فرمایا: ان کا چاند کہاں ہے؟ وہ وقت مہینے کے اختتام کا تھا حضرت علی شیر خدا نے جو جواب دیا اس کے اس کلمہ کی طرف دیکھو اور ستارہ شناسی کے علم کے حوالے سے جو قول

کرتا ہے اس کو کتنا بلیغ جواب دیا اور جو آدمی ستاروں کی چال کے حوالے سے احکام کو ثابت کرنے کا دعوی کرتا ہے اس کو کس طرح خاموش کر دیا۔

مسافر بن عوف نے آپ سے عرض کی: اے امیر المومنین! اس گھڑی روانہ نہ ہوں، جب دن کے تین پہر گزر جائیں اس وقت روانہ ہوں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: کیوں؟ اس نے عرض کی: اگر آپ اس وقت چلے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بہت بڑی مصیبت پہنچے گی اور اگر آپ اس وقت چلے جس میں چلنے کے لیے میں نے آپ کو کہا ہے تو آپ کامیاب و کامران ہوں گے اور جو آپ کا مطلب ہے اسے پالیں گے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی منجم تھا اور نہ ہمارا کوئی منجم ہے، آپ طویل گفتگو کرتے ہیں جس میں وہ قرآن حکیم کی آیات سے استدلال کرتے ہیں جو اس بارے میں تیری تصدیق کرے میں اس کے بارے میں بے خوف نہیں کہ وہ اس آدمی کی طرح ہو جائے جس نے اللہ تعالیٰ کا مد مقابل بنالیا ہو۔ اے اللہ! کوئی فال نہیں مگر وہ تیرے قبضہ قدرت میں ہے اور تیری خیر کے سوا کوئی خیر نہیں پھر آپ نے متکلم سے فرمایا: ہم تجھے جھٹلاتے ہیں، تیری مخالفت کرتے ہیں اور ہم اسی وقت چلیں گے جس میں چلنے سے تو نے ہمیں منع کیا ہے۔

پھر حضرت علی شیر خدا لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: اے لوگو! علم نجوم حاصل کرنے سے بچو مگر اتنا علم نجوم حاصل کرو جس کے ذریعے تم بحر و بر کی تاریکیوں میں ہدایت حاصل کر سکو۔ بے شک منجم جادوگر کی طرح ہے اور جادوگر کافر کی طرح ہے اور کافر جہنم میں ہے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے خبر پہنچی کہ تو ستاروں کی چال میں نظر رکھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے قید میں ڈال دوں گا، جب تک تو اور میں باقی رہیں، جب تک میری حکومت ہو گی میں تیرا عطیہ روک لوں گا۔ پھر حضرت علی شیر خدا نے اسی وقت میں سفر کیا جس وقت میں سفر کرنے سے اس نے روکا تھا آپ کا دشمنوں سے آمنا سامنا ہوا آپ نے دشمنوں کو قتل کیا یہی نہروان والا واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں ثابت ہے پھر فرمایا: اگر ہم اس گھڑی چلتے جس میں چلنے کا اس منجم نے ہمیں حکم دیا، ہم کامیاب ہو جاتے اور غالب آ جاتے تو کوئی کہنے والا کہتا: حضرت علی اس وقت چلے جب منجم نے حکم دیا۔ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی منجم تھا اور نہ ہی ہمارا کوئی منجم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسریٰ، قیصر اور دوسرے شہروں پر فتح عطا فرمائی۔ پھر فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور اسی پر بھروسہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیروں کے مقابلہ میں کافی ہے۔

بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے تاڑنے والے نگہبان بھیجتا ہے۔ رَصَدًا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو شیطان کو قریب سے روکتے ہیں؛ وحی شیطان کے چوری کرنے سے محفوظ رہتی ہے اور کاہنوں کو القا کرنے سے محفوظ رہتی ہے۔

ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو مبعوث کیا اس کے ساتھ فرشتے تھے وہ شیاطین سے اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ وہ فرشتوں کی صورت بنا سکیں۔ جب شیطان اس کے پاس فرشتے کی صورت میں آئے تو وہ کہے: انھیں یہ شیطان ہے اس سے بچو، اگر فرشتہ آئے تو وہ کہیں: یہ تیرے رب کا رسول ہے۔

حضرت ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہما نے کہا: رَصَدًا کا معنی نگہبان ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اور پیچھے جنوں اور شیاطین سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ قتادہ اور سعید بن مسیب نے کہا: وہ چار فرشتے ہیں۔ فراء نے کہا: اس سے مراد

حضرت جبرئیل امین ہیں جب جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کا پیغام لاتے تو ان کے ساتھ فرشتے بھی آتے جو ان کی حفاظت کرتے کہ جن وحی کو سن نہ لیں اور اپنے کاہنوں کو نہ پہنچا دیں اور وہ رسول پر سبقت نہ لے جائیں۔ سدی نے کہا: رَصَدًا سے مراد محافظ ہیں جو وحی کی حفاظت کریں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہوتی تو کہتے: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جسے شیطان القاء کرتا تو وہ کہتے: یہ شیطان کی جانب سے ہے۔ رَصَدًا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ صحاح میں ہے: رصد ان لوگوں کو کہتے ہیں جو نگہبانی کرتے ہیں جس طرح حَرَس کا لفظ ہے اس میں واحد، جمع، مذکر اور مونث برابر ہوتے ہیں بعض اوقات وہ جمع کے لیے ارصاد کے لفظ ذکر کرتے ہیں اور کسی شی کے راصد سے مراد اس کا نگہبان ہے یوں باب چلایا جاتا ہے۔ رَصَدَہٗ، یَرْصُدُہٗ، رَصَدًا و رَصْدًا اور تَرَصَّد سے مراد تاڑنا ہے، مَرْصَد سے مراد تاڑنے کی جگہ ہے۔

لِّيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

''تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں (درحقیقت پہلے ہی) اللہ ان کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر چیز کا اس نے شمار کر رکھا ہے''۔

لِّيَعْلَمَ سے مراد یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا جان لیں کہ ان سے قبل آنے والے رسولوں نے پیغام حق پہنچایا ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام حق پہنچایا ہے اس کلام میں کچھ کلام محذوف ہے لِّيَعْلَمَ کا جار مجرور جس کے متعلق ہے تقدیر کلام یوں ہوگی أخبرناہ بحفظنا الوحی لیعلم ان الرسل قبلہ کانوا علی مثل حالتہ من التبلیغ بالحق والصدق یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جانب سے وحی کی حفاظت کی خبر دی تاکہ آپ جان لیں کہ ان سے قبل کے رسول بھی حق اور سچائی کی تبلیغ میں آپ کی حالت پر ہی تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے تاکہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا، جان لیں کہ حضرت جبرئیل امین اور ان کے ساتھ جو فرشتے تھے انہوں نے آپ کے رب کا پیغام پہنچا دیا ہے؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے۔ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی نازل نہیں ہوتی تھی مگر اس کے ساتھ چار فرشتے آتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ رسول جان لیں کہ فرشتوں نے پہلے رب کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ رسول جان لے کہ باقی ماندہ رسولوں نے پیغام حق پہنچا دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تاکہ ابلیس جان لے کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات کو کسی آمیزش اور اس میں سے کسی چوری کے بغیر حق پہنچا دیا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا: تاکہ جن جان لیں کہ رسولوں نے وہ پیغام حق پہنچا دیا ہے جو ان پر نازل کیا گیا تھا وہ اس پیغام کو پہنچانے والے نہیں جن میں سے کوئی چیز چوری نہیں کی گئی۔ مجاہد نے کہا: تاکہ وہ لوگ جان لیں جنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے۔ عام قراء کی قراءت تو لِيَعْلَمَ ہے یعنی علامت مضارع مفتوح ہے اس کی تاویل وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، حمید اور یعقوب نے اسے یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ لوگوں کو آگاہ کر دے کہ رسولوں نے یہ پیغام حق پہنچا دیا ہے۔ زجاج نے کہا: تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ اس کے رسولوں نے اس کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿﴾ (آل عمران) معنی یہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ اسے بطور علم مشاہدہ جان لے

جس طرح اسے بطور غیب جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم نے ہر اس چیز کا احاطہ کر رکھا ہے جو رسولوں کے پاس ہے اور جو فرشتوں کے پاس ہے۔ ابن جبیر نے کہا: معنی یہ ہے تاکہ رسول جان لیں کہ ان کے رب کے علم نے ہر اس چیز کا احاطہ کر رکھا ہے جو کچھ ان کے پاس ہے پس وہ اللہ کے پیغام حق کو پہنچائیں۔

وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا

اس نے ہر چیز کے عدد کا احاطہ کر رکھا ہے وہ اسے پہچانتا ہے اور اسے جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ عددا یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اس نے ہر چیز کا عدد کی حالت میں احاطہ کر رکھا ہے چاہے تو مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب قرار دے یعنی اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے تو یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے پس اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہر شے کو شمار کرنے والی، عالم، حافظ ہے ہم نے یہ سب چیزیں الکتاب الاسنیٰ میں جمع کر دی ہیں جو اسماء حسنیٰ کی شرح میں ہے۔

اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہی حمد ہے۔

# سورۃ المزمل

آیاتہا ۲۰ ۷۳ سورۃ المزمل مکیۃ ۳ رکوعاتہا ۲

اس کی بیس آیتیں ہیں۔ حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے نزدیک اس کی سب آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔

حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: دو آیتیں مکی نہیں وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ اور آیت جو اس کے پیچھے ہے؛ ماوردی نے یہی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: آیت رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی سے لے کر آخر تک مدنی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ﴿۴﴾

"اے چادر لپیٹنے والے! رات کو (نماز کے لیے) قیام فرمایا کیجئے مگر تھوڑا یعنی نصف رات یا کم کر لیا کریں اس سے بھی تھوڑا سا یا بڑھا دیا کریں اس پر اور (حسب معمول) خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے قرآن حکیم کو"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

## مزمل کی لغوی تشریح

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ، اخفش سعید نے کہا: اَلْمُزَّمِّلُ اصل میں متزمل تھا تاء کو زاء میں مدغم کیا گیا ہے یہی المدثر ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے اسے اصل پر المتزمل اور المتدثر پڑھا ہے۔ سعید نے اَلْمُزَّمِّلُ پڑھا ہے۔ مزمل کی اصل میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھانے والے ہیں یہ جملہ کہا جاتا ہے: زَمَلَ الشَّیْئَ۔ جب وہ اس چیز کو اٹھائے اس سے الزاملہ ہے کیونکہ وہ گھر کا سامان اٹھاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مزمل سے مراد ہے لپٹنے والا، یہ جملہ بولا جاتا ہے: تزمل و تدثر بثوبہ جب وہ کپڑے کو لپیٹ لے اور یہ جملہ بولا جاتا ہے: زمل غیرہ جب وہ کسی اور چیز کو ڈھانپ دے ہر وہ چیز جسے لپیٹا جائے تو پس اس کے لیے زمل اور دثر سے تعبیر کرنا درست ہوتا ہے۔

امراء القیس نے کہا:

کَبِیْرُ اُنَاسٍ فِیْ بِجَادٍ مُزَمَّلِ

بڑے لوگ دھاری دار چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔

مزمل سے کون سی ذات مراد ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے۔ اس میں تین قول ہیں۔ پہلا عکرمہ کا قول ہے: اے نبوت و رسالت کو لازم پکڑنے والے! انہیں سے ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے: اے وہ ذات جس پر یہ امر لازم کیا گیا پھر اسے رخصت دی گئی! وہ اسے زاء کی تخفیف، میم کے فتحہ اور اسے مشدد پڑھا کرتے تھے جب کہ اس کا مفعول محذوف ہے اس طرح الْمُدَّثِّرُ ہے معنی یہ ہوگا اپنے آپ کو کپڑے سے لپیٹنے والے یا جسے غیر نے کپڑا اوڑھایا۔

دوسرا قول: اے قرآن کو لازم پکڑنے والے! یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

تیسرا قول ہے: اپنے کپڑے کو لپیٹنے والے! یہ قتادہ اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ امام نخعی نے کہا: آپ ایک چادر لپیٹے ہوتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک چادر کو لپیٹے ہوتے تھے جس کی لمبائی چودہ ہاتھ تھی وہ نصف مجھ پر تھی جب کہ میں سوئی ہوئی تھی اور نصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تھی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اللہ کی قسم وہ خز (ریشم جس میں اون ملی ہو) قز (ریشم) مرغزاء (نرم بالوں) ابرایسم (ریشم) اور اون کی نہ تھی اس کا تانا بکری کے بالوں اور پیٹا اونٹ کے بالوں کا تھا؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مدینہ طیبہ میں ہی حرم میں داخل کیا تھا اور جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ضحاک نے کہا: آپ نے سونے کے لیے اپنے کپڑے کو لپیٹا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرکوں کی جانب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناز یبا بات پہنچی تو وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شاق گزری تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اوپر کپڑا لے لیا تو یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ، یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وحی کی ابتدا میں ہوا کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرشتے کی بات سنی اور اسے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اہلیہ کے پاس تشریف لائے تو ارشاد فرمایا: ''مجھے کپڑا اوڑھا دو''۔ یہ معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حکماء نے کہا: آپ کو ابتدا میں الْمُزَّمِّلُ اور الْمُدَّثِّرُ سے خطاب کیا کیونکہ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کی تبلیغ کا فریضہ ادا نہیں کیا تھا۔

ابن عربی نے کہا: یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کی تاویل میں اختلاف کیا گیا ہے (1)۔ کچھ علماء نے تو اسے حقیقی معنی پر محمول کیا ہے۔ اے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹا ہوا ہے! اٹھیے؛ یہ ابراہیم اور قتادہ کا قول ہے۔ کچھ علماء وہ ہیں جنہوں نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے۔ گویا آپ کو کہا گیا: اے وہ ذات جس نے نبوت کا بار اٹھایا! یہ عکرمہ نے کہا ہے۔ یہ تفسیر اس وقت جائز ہوگی اگر میم مفتوح اور مشدد ہو اور صیغہ اسم مفعول کا ہو، جہاں تک اسے اسم فاعل کی صورت میں پڑھنے کا تعلق ہے وہ باطل ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم پہلے اس کے مفعول کے حذف کے اعتبار سے معنی بیان کر چکے ہیں۔ اسے اس صورت میں پڑھا بھی گیا ہے۔ یہ قراءت صحیح المعنی ہے کہا: جس نے یہ کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کو اوڑھنا بچھونا بنایا تو یہ مجازی معنی میں صحیح ہے لیکن ہم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جز 4، صفحہ 1859

پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسے اس کی ضرورت نہیں۔

## مزمل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم نہیں

**مسئلہ نمبر 3۔** سہیلی نے کہا: مزمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء میں سے نہیں اور نہ ہی اس میں یہ معروف ہے جس طرح بعض لوگ اس طرف گئے ہیں اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء میں شمار کیا ہے۔ مزمل اسم مشتق ہے جو اس حالت میں اشتقاق کیا گیا جو خطاب کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ اسی طرح مدثر ہے اس نام کے ساتھ خطاب کرنے میں دو فائدے ہیں: ایک تو شفقت و محبت کا اظہار ہے کیونکہ عرب جب مخاطب کے ساتھ شفقت کرنے اور عتاب کے ترک کرنے کا ارادہ کرتے تو اسے ایسے نام کے ساتھ پکارتے جو اس حالت سے مشتق ہوتا جس حالت پر وہ ہوتا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا کو فرمایا جب وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی شیر خدا کے پاس آئے جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے اور ان کے پہلو پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی شیر خدا سے فرمایا: ''اے ابو تراب! اٹھو'' مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ رسول اللہ ان پر ناراض نہیں اور ان پر شفقت کا اظہار تھا اس طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اے نومان! اٹھو'' جب کہ حضرت حذیفہ سوئے ہوئے تھے مقصود ان پر شفقت و نرمی کا اظہار تھا اور ناراضگی و عتاب کو ترک کرنا مقصود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو یہ ارشاد فرمایا ہے: **یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ** اس میں بھی انس اور شفقت کا اظہار ہے تا کہ یہ شعور دلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض نہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہر وہ آدمی جو چادر لے کر رات کو سویا ہوا ہو اس کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ رات کے وقت عبادت کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے بیدار ہو کیونکہ فعل سے جو اسم مشتق ہوتا ہے اس میں مخاطب کے ساتھ ہر آدمی شریک ہوتا ہے جو ایسا عمل کر رہا ہو اور اس صفت کے ساتھ موصوف ہو۔

## قُمِ کی لغوی تشریح

**مسئلہ نمبر 4۔** قُمِ الَّیْلَ عام قراء کی قراءت میم کے کسرہ کے ساتھ ہے کیونکہ دو ساکن جمع ہوئے اس وجہ سے میم کو نیچے کسرہ دیا ہے۔ ابوسمال نے میم پر ضمہ پڑھا ہے وجہ قاف کے ضمہ کی اتباع ہے اور میم پر فتحہ بھی پڑھا ہے کیونکہ فتحہ خفیف ترین حرکت ہے۔ عثمان بن جنی نے کہا: میم پر حرکت سے غرض دو ساکنوں کے اجتماع سے دور بھاگنا ہے میم پر جو بھی حرکت آئے تو غرض حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ فعل لازم ہے اور مفعول بہ کی طرف متعدی نہیں ہوتا جہاں تک اس کے لیے ظرف زمان اور ظرف مکان لانے کا تعلق ہے تو یہ جائز ہے، جہاں تک ظرف مکان کا تعلق ہے تو فعل کے بعد کسی واسطہ کا لانا ضروری ہوتا ہے تو یہ نہیں کہے گا: قمت الدار بلکہ تو یہ کہے گا: قمت وسط الدار و خارج الدار ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں قم کا معنی ہے صَلِّ یعنی نماز پڑھ۔ صل کو قم سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے صل سے بطور مجاز ذکر کیا گیا ہے یہاں تک کہ کثرت استعمال کی وجہ سے عرف بن گیا ہے (1)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی

## اللیل کی مراد اور رات کی عبادت کن لوگوں پر فرض یا مستحب ہے

**مسئلہ نمبر 5۔** الَّیْلَ۔ رات کی حد سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر کے طلوع ہونے تک ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس میں اختلاف ہے کیا رات کا قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرض تھا یا مستحب تھا؟ دلائل اس نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں کہ رات کا قیام حتمی اور فرض تھا اس کی وجہ یہ ہے مستحب رات کے کچھ حصہ پر واقع نہیں ہوتا اور کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ اس بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے راویوں سے تعیین آئی ہے۔

اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کیا یہ عبادت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء پر فرض تھی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فرض تھی؟ اس بارے میں تین قول ہیں:

۱۔ سعید بن جبیر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ خطاب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ رات کی عبادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے قبل کے انبیاء پر بھی فرض تھی۔

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رائے ہے، یہ حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے اور یہی صحیح ہے جس طرح حضرت زرارہ بن اوفی سے مروی روایت مسلم شریف میں ہے کہ حضرت سعد بن ہشام نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا ارادہ کیا اس میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت سعد بن ہشام نے کہا: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی عبادت کے بارے میں بتایئے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا تو سورۃ المزمل کی قراءت نہیں کرتا؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، میں قراءت کرتا ہوں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سورت کے شروع میں رات کا قیام (عبادت) فرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ایک سال تک قیام کیا اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا اختتام بارہ ماہ تک آسمانوں میں ہی روکے رکھا یہاں تک کہ سورت کے آخر میں تخفیف کو نازل فرمایا اس کے بعد رات کا قیام فرض سے نفل ہوگیا۔

وکیع اور یعلی نے یہ روایت نقل کی ہے ہمیں مسعر نے سماک حنفی سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے ہوئے سنا: جب سورۃ مزمل کا ابتدائی حصہ نازل ہوا تو صحابہ کرام رات کو اتنا قیام کیا کرتے تھے جتنا قیام وہ رمضان شریف کے مہینے میں کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اس میں سورت کا آخری حصہ نازل ہوا اس کے ابتدائی اور آخری حصہ میں سال کا وقفہ ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ دس سال تک راتوں کو قیام کرتے رہے تو دس سال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اس امر کو خفیف کر دیا۔

## قَلِيْلًا سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 6۔** اِلَّا قَلِيْلًا۔ یہ الَّیْلَ سے مستثنیٰ ہے یعنی ساری رات کھڑے ہوں مگر تھوڑا حصہ کیونکہ ساری رات کا قیام ہمیشہ کے لیے ناممکن ہے تھوڑے حصہ کو قیام سے خارج کر دیا تاکہ جسم آرام پائے۔ کسی شی کے قلیل سے مراد نصف سے کم ہے۔ وہب بن منبہ سے یہ منقول ہے کہ قلیل دسویں یا چھٹے حصے سے کم کو کہتے ہیں۔ کلبی اور مقاتل نے کہا: ایک تہائی کو قلیل

کہتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا ۝ یہ تخفیف تھی کیونکہ قیام کا زمانہ محدود نہ تھا لوگوں نے راتوں کا قیام کیا یہاں تک کہ ان کے قدم سوج گئے پھر اسے عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ سے منسوخ کر دیا گیا۔ اخفش نے کہا: نصف سے پہلے او کا لفظ محذوف ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: أعطه درهما درهمين ثلاثة۔ اس سے متکلم یہ ارادہ کرتا ہے اسے ایک درہم یا دو درہم یا تین درہم دے دو۔ زجاج نے کہا: نِّصۡفَهٗۤ یہ الَّیۡلَ سے بدل ہے۔ اِلَّا قَلِیۡلًا۔ یہ نصف سے مستثنیٰ ہے اور منه اور علیه میں جو ضمیر ہے یہ نصف کے لیے ہے معنی یہ ہوگا نصف رات قیام کیجئے یا اس سے تھوڑا کم کر لیجئے یعنی ایک تہائی یا اس سے زیادہ کر لیجئے یعنی دو تہائی۔ گویا یہ حکم ہوا رات کا دو تہائی، نصف یا ایک تہائی قیام کیجئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: نِّصۡفَهٗۤ یہ قَلِیۡلًا سے بدل ہے آپ ﷺ کو تین امور میں اختیار دیا گیا مکمل نصف، اس سے کم اور اس سے زائد۔ گویا تقدیر کلام یہ ہے قم الليل إلا نصفه أو أقل من نصفه او أكثر من نصفه۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب رات کا پہلا ایک تہائی گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں جو مجھ سے دعا کرتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، جو مجھ سے سوال کرتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں، جو مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے میں اسے بخش دیتا ہوں یہ اسی طرح معاملہ رہتا ہے یہاں تک کہ فجر روشن ہو جاتی ہے''۔ اس کی مثل حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہ چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ رات کے دو تہائی کا قیام مرغوب ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رات کا نصف یا دو تہائی جب گزر جاتا ہے'' الخ۔

دو سندوں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح او کے لفظ کے ساتھ روایت مروی ہے۔

سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے تو منادی کرنے والا کہتا ہے: کیا کوئی دعا کرنے والا ہے جس کی دعا قبول کی جائے؟ کیا کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے جس کو بخشا جائے؟ کیا کوئی سائل ہے جس کو عطا کیا جائے؟'' ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

یہ حدیث صحیح ہونے کے ساتھ نزول کے معنی کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ نصف رات کو ہوتا ہے۔

ابن ماجہ نے ابن شہاب کی حدیث سے وہ ابو سلمہ اور ابو عبد اللہ اغر سے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر رات جب رات کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے تو ہمارا رب نزول اجلال فرماتا ہے وہ فرماتا ہے: کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے دعا کرے کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے کہ میں اس کی بخشش کروں؟ یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے''۔ صحابہ کرام رات کے

آخری حصہ میں نماز پڑھنا پسند کرتے تھے (1)۔ ہمارے علماء نے کہا: قرآن وحدیث میں اسی طریقہ پر تطبیق کی جائے گی کیونکہ وہ دونوں ایک ہی مشکاۃ سے دیکھتے ہیں۔ موطا اور دوسری کتب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے: میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ کے ہاں رات گزاری جب رات نصف گزر چکی تھی یا اس سے تھوڑا پہلے یا بعد کا وقت ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے آپ ایک لٹکے ہوئے مشکیزہ کی طرف اٹھے آپ نے ہلکا سا وضو کیا۔

## ساری رات کی عبادت کا ناسخ حکم

**مسئلہ نمبر 7**۔ رات کے قیام (عبادت) کے ناسخ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رات کے قیام کا ناسخ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے فرمان عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى سے منسوخ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ، امام شافعی، مقاتل اور ابن کیسان سے یہ مروی ہے کہ یہ پانچ نمازوں کے ساتھ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس حکم کا ناسخ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ہے۔ ابو عبد الرحمن سلمی نے کہا: جب يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے راتوں کا قیام کیا یہاں تک کہ ان کے قدم اور پنڈلیاں سوج گئیں پھر یہ آیت نازل ہوئی فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (2) بعض علماء نے کہا: یہ ایسا فرض ہے جس کے ساتھ فرض منسوخ ہوگیا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خاص طور پر فرض تھا جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء: 79)

میں کہتا ہوں: پہلا قول ان تمام اقوال کو شامل ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (بقرہ: 110) اس میں اس کا قول بھی داخل ہو جاتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ناسخ پانچ نمازوں کا حکم ہے۔ حضرت حسن بصری اور حضرت ابن سیرین اس طرف گئے ہیں کہ رات کی نماز ہر مسلمان پر فرض تھی اگرچہ بکری دوہنے کے وقت تک ہو۔ حضرت حسن بصری سے اس آیت کے بارے میں قول بھی منقول ہے۔ الحمد للہ یہ فریضہ کے بعد نفلی نماز ہے۔ ان شاء اللہ یہی قول صحیح ہے۔ کیونکہ قرآن وسنت میں رات کے قیام میں ترغیب دلائی گئی ہے اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک چٹائی بچھاتی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت نماز پڑھا کرتے تھے تو لوگوں نے اس بارے میں ایک دوسرے سے سنا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے اجتماع کو دیکھا تو اسے ناپسند کیا اور اس امر سے ڈرے کہ ان پر رات کا قیام فرض ہی نہ کر دیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراضگی کے عالم میں گھر میں داخل ہو گئے۔ صحابہ کرام نے کھانسنا شروع کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف نکلے اور فرمایا: "اے لوگو! اپنے آپ کو اتنے ہی اعمال کا مکلف بناؤ جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بدلہ دینے سے نہیں اکتاتا جب کہ تم عمل سے اکتا جاتے ہو کیونکہ بہترین عمل وہ ہے جو دائمی ہو اگرچہ تھوڑا ہی ہو"۔ تو اس وقت يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ نازل ہوئی تو رات کا

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی ای ساعة اللیل افضل، حدیث نمبر 1355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 362

قیام ان پر فرض کر دیا گیا اور اسے فریضہ کا درجہ دیا گیا یہاں تک کہ صحابہ میں سے ایک آدمی رسی باندھتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا آٹھ ماہ تک صحابہ اسی طرح رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور یہ حکم نازل کیا: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ انہیں فرض نماز کی طرف پھیر دیا اور رات کا قیام ان سے ختم کر دیا مگر جو وہ نفلی نماز کے طور پر پڑھیں (1)۔

میں کہتا ہوں: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے اس کا معنی (رات تک) صحیح میں بھی ثابت ہے اور اس کا باقی ماندہ حصہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی وہ آٹھ ماہ تک قیام کرتے رہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں پہلے گزر چکا ہے کہ وہ ایک سال تک قیام کرتے رہے۔ ماوردی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تیسرا قول بھی ذکر کیا ہے کہ صحابہ سولہ ماہ تک قیام کرتے رہے کسی اور نے حضرت عائشہ سے یہ قول ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۂ مزمل کی ابتدا اور انتہا میں ایک سال کا عرصہ حائل ہے۔ کہا: جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ قیام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا۔ ایک نسخہ میں ان سے دو قول مروی ہیں۔ ایک یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جہان فانی سے پردہ فرمانے تک فرض تھا۔ دوسرا قول یہ ہے: یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ کر دیا گیا ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے منسوخ کر دیا گیا۔ منسوخ ہونے تک اس کے فرض ہونے کی مدت میں دو قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے: امت پر فرض رہنے والی مدت میں دو قول گزر چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے ایک سال ذکر کی ہے اور حضرت عائشہ نے سولہ ماہ ذکر کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے: یہ دس سال کا عرصہ تھا یہاں تک کہ اسے منسوخ کر کے تخفیف کی گئی مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے احکام میں زیادتی تھی تاکہ رسالت کے عمل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ممتاز ہو جائیں؛ ابن جبیر نے یہ بات کہی۔

میں کہتا ہوں: ثعلبی نے سعید بن جبیر سے جو روایت ذکر کی ہے یہ اس کے خلاف ہے پس اس میں غور و فکر کیجئے۔ سورت کے آخر میں زیادہ وضاحت آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

## ترتیل سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 8۔** وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ قرآن کی قراءت میں جلدی نہ کرو بلکہ ٹھہر ٹھہر کر اور معانی میں تدبر کرتے ہوئے پڑھو۔ ضحاک نے کہا: اسے حرف حرف کر کے پڑھو۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ہاں قراءت قرآن میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب ہے جو اسے سب سے زیادہ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ ترتیل سے مراد بڑی خوبصورتی سے منظم و مرتب کرنا اس سے ثغر رتل و رتِل یعنی عین کلمہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں جب کہ دانت خوبصورت اور نمایاں ہوں۔ اس کا بیان کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے۔ حضرت حسن بصری نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو ایک آیت کی تلاوت کر رہا تھا اور رو رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کو نہیں سنا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا یہ ترتیل ہے''۔ علقمہ نے ایک آدمی کو اچھی طرح قراءت کرتے ہوئے سنا تو انہوں نے کہا: اس نے قرآن حکیم ترتیل کے ساتھ پڑھا ہے میرے ماں باپ اس پر قربان ہوں! ابو بکر بن طاہر نے ان الفاظ کی یہ تعبیر بیان

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 359

کی ہے اس کے خطاب کے لطائف میں غور وفکر کیجئے، نفس سے اس کے احکام بجالانے کا مطالبہ کیجئے، اپنے دل سے اس کے معانی کے فہم کا مطالبہ کیجئے اور اس کی طرف توجہ کرنے کا مطالبہ کیجئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز قرآن کے قاری کو لایا جائے گا اسے جنت کے پہلے زینہ پر کھڑا کیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: پڑھتا جا اور اوپر چڑھتا جا اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح تو دنیا میں پڑھا کرتا تھا، بے شک تیرا ٹھکانہ اس آخری آیت کے پڑھنے پر ہوگا جس کو تو پڑھے گا'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے کتاب کے آغاز میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے وقت اپنی آواز کو لمبا کیا کرتے تھے۔

## اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝

''بے شک ہم جلد ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام''۔

اس آیت کا تعلق اس آیت کے ساتھ ہے جس میں رات کا قیام فرض کیا گیا یعنی رات کی نماز فرض کرنے کے ساتھ ہم آپ پر قول ثقیل القا کریں گے جس کا اٹھانا مشکل ہوگا کیونکہ رات سونے کے لیے ہوتی ہے جس کو رات کے اکثر حصہ میں قیام کا حکم دیا گیا ہو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتا مگر اسے نفس پر سختی کرنا پڑتی ہے اور شیطان سے مجاہدہ کرنا پڑھتا ہے یہ چیز بندے پر بڑی بھاری ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم آپ کی طرف قرآن وحی کریں گے۔ وہ قول ثقیل ہے جس کے شرعی احکام پر عمل ثقیل ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! اس کے فرائض اور اس کی حدود ثقیل ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس کا حلال اور حرام ثقیل ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا: وعدہ، وعید اور حلال وحرام کے اعتبار سے ثقیل ہے۔ محمد بن کعب نے کہا: منافقوں پر ثقیل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: کفار پر ثقیل ہے کیونکہ اس میں ان کے خلاف استدلال ہے، ان کی گمراہی کا بیان ہے، ان کے معبودوں کے لیے سب وشتم موجود ہے اور اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں جو تحریف کی اس کی وضاحت موجود ہے۔ سدی نے کہا: ثقیل، کریم کے معنی میں ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: فلاں ثقیل علی یعنی وہ میرے لیے معزز ہے۔ فراء نے کہا: ثقیل بمعنی باوقار ہے یہ خفیف نہیں کیونکہ یہ ہمارے رب کا کلام ہے۔ حسین بن فضل نے کہا: یہ ثقیل ہے اس کا حامل وہی دل ہو سکتا ہے جس کو توفیق کی تائید نصیب ہو، وہی نفس اٹھا سکتا ہے جو توحید سے مزین ہو۔ ابن زید نے کہا: اللہ کی قسم! وہ ثقیل اور بابرکت ہے جس طرح قرآن دنیا میں ثقیل ہے اسی طرح قیامت کے روز میزان میں ثقیل ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ثبت ہے جس طرح بھاری چیز اپنی جگہ میں ثبت ہوتی ہے اس کا معنی ہوگا اس کا اعجاز ثابت ہے اس کا اعجاز کبھی زائل نہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد قرآن ہے جس طرح حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر سوار تھے تو اس اونٹنی نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا وہ حرکت بھی نہ کر سکتی تھی یہاں تک کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ موطا اور دوسری کتب میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کس طرح آتی تھی؟ فرمایا: ''کبھی میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی صورت میں آتی تھی یہ میرے

1۔ مستدرک للحاکم، باب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 739

لیے سب سے شدید ہوا کرتی تھی وہ وحی ختم ہوتی جب کہ میں اسے یاد کر چکا ہوتا، کبھی فرشتہ میرے لیے انسانی شکل میں آتا وہ مجھ سے گفتگو کرتا اور جو وہ کہتا میں اسے یاد کر لیتا'' (1)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید سردی میں دیکھا آپ پر وحی نازل ہوتی وہ وحی ختم ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنپٹی سے پسینہ بہہ رہا ہوتا تھا (2)۔ ابن عربی نے کہا: یہ تعبیر بہتر ہے کیونکہ یہی حقیقت ہے جب کہ قرآن حکیم میں یہ بھی ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بُعِثْتُ بالحنيفية السمحة۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سورت میں قول سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا قول ہے کیونکہ حدیث طیبہ میں آیا ہے ''زبان پر ہلکا اور میزان میں بھاری ہے'' یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝

''بلاشبہ رات کا قیام (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور بات کو درست کرتا ہے۔ یقیناً آپ کو دن میں بڑی مصروفیتیں ہیں''۔

## نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے کیا مراد ہے؟

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ علماء نے کہا: نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے مراد رات کے اوقات اور گھڑیاں ہیں کیونکہ اس کے اوقات یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: نشأ الشيء ينشأ۔ جب وہ ابتدا کرے اور ایک چیز کے بعد دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو۔ ناشئة یہ نشأت سے فاعلة کا وزن ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (الزخرف) مراد یہ ہوگا رات کی گھڑیاں پروان چڑھ رہی ہیں تو اسم کی بجائے وصف پر اکتفا کیا نَاشِئَةَ کو مونث ساعة کے لفظ کی وجہ سے ذکر کیا ہے کیونکہ ہر گھڑی جنم لیتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نَاشِئَةَ مصدر ہے جس کا معنی رات کا قیام ہے جس طرح خاطئة اور کاذبة مصدر ہیں یعنی رات کا قیام روندنے میں سخت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے مراد رات کا قیام ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: حبشی کہتے ہیں نشا یعنی اٹھا شاید انہوں نے یہ ارادہ کیا ہو کہ کلمہ تو عربی ہے مگر حبشی زبان میں عام اور غالب ہے وگرنہ قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جو لغت عرب میں نہ ہو۔ کتاب کے مقدمہ میں اس کی مکمل وضاحت گزر چکی ہے۔

## رات کی نماز دن کی نماز سے افضل ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رات کی نماز کی دن کی نماز پر فضیلت بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ جتنا ممکن ہو رات کی نماز میں زیادہ قراءت کرنی چاہیے کیونکہ یہ عظیم اجر اور زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

1۔ سنن نسائی، باب ما جاء فی القرآن، حدیث نمبر 924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی، حدیث نمبر 2، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے کیا مراد ہے علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک نے کہا: اس سے مراد مغرب اور عشاء کے درمیان کی عبادت ہے وہ اس چیز سے استدلال کرتے ہیں لفظ نشأ ابتدا کا معنی دیتا ہے تو ابتدائی جز زیادہ حق رکھتا ہے۔ اسی بارے میں شاعر کا شعر ہے:

ولولا أنْ يُقالَ صَبَا نُصَيبْ لَقلتُ بنفسِيَ النَّشأُ الصِّغارُ

اگر یہ بات نہ کہی جاتی کہ نصیب بے دین ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کہتا یہ تو نئی اٹھان ہے۔

علی بن حسین مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھتے اور کہتے: یہ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ہے۔ عطا اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد رات کا آغاز ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: اس سے مراد ساری رات ہے کیونکہ یہ دن کے بعد جنم لیتی ہے۔ امام مالک بن انس نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: لفظ یہی معنی دیتا ہے اور لغت اس کا ہی تقاضا کرتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: نَاشِئَةَ سے مراد نیند کے بعد رات کا قیام ہے جس نے نیند سے پہلے رات کے پہلے پہر قیام کیا تو اس نے نَاشِئَةَ کا قیام نہ کیا۔ یمان اور ابن کیسان نے کہا: رات کے آخری حصہ میں قیام ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: ان کی نماز رات کے ابتدائی حصہ میں ہوا کرتی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب سوتا ہے تو وہ نہیں جانتا کب بیدار ہو گا؟ صحاح میں ہے: نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے مراد رات کی ابتدائی گھڑیاں ہیں۔ قتبی نے کہا: یہ رات کی گھڑیاں ہیں کیونکہ یہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی ہیں۔

حسن اور مجاہد سے مروی ہے: یہ عشاء کے بعد سے لے کر صبح تک کا وقت ہے۔

حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے: عشاء کے بعد کا وقت نَاشِئَةَ ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس سے مراد وہ طاعتیں ہیں جو رات کو کی جاتی ہیں؛ یہ جوہری نے بیان کیا ہے۔

## وَطْأً کی لغوی تشریح اور معنی ومفہوم

**مسئلہ نمبر 3**۔ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً ابوالعالیہ، ابوعمرو، ابن ابی اسحاق، مجاہد، حمید، ابن محیصن، ابن عامر، مغیرہ اور ابوحیوہ نے اسے وِطاء واؤ کے کسرہ، طاء کے فتحہ اور الف ممدودہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبیدہ نے اسے ہی پسند کیا ہے جب کہ باقی قراء نے وَطْأً واؤ کے فتحہ، طاء ساکن اور الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوحاتم نے اسے اختیار کیا ہے جس طرح تیرا قول ہے: اشتدت علی القوم وطأة سلطانهم جو چٹیاں ان پر لازم کی گئیں وہ ان پر ثقیل ہو گئیں۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللّٰھم اشدد وطأتك علی مُضَرَ اے اللہ! مضر قبیلہ پر اپنی پکڑ کو سخت کر دے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نمازی پر یہ ساعتیں دن کی ساعتوں سے بھاری ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رات نیند اور کام کاج چھوڑنے کا وقت ہے جو آدمی عبادت میں مشغول ہوا تو اس نے عظیم مشقت اٹھائی۔ جب یہ الف ممدودہ کے ساتھ ہو تو واطأت وطاء و مواطاة کا مصدر ہو گا یعنی میں نے اس کی موافقت کی۔ ابن زید نے کہا: واطأته علی الأمر مواطأة۔ یعنی جب میں نے اس کے ساتھ موافقت کی۔

فلان یواطیٔ إسمه إسمی۔ فلاں! اپنے نام کو میرے نام کے ساتھ موافق کرتا ہے۔

تواطئوا علیہ۔ انہوں نے آپس میں موافقت کی۔ معنی یہ ہوگا یہ عمل دل، نظر، کان اور زبان کو موافق کرنے والا ہے کیونکہ آوازیں اور حرکتیں منقطع ہو چکی ہوتی ہیں؛ یہ قول مجاہد، ابن ابی ملیکہ اور دوسرے علماء نے کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے معنی کے موافق قول کیا، یعنی یہ قوت سماعت کو دل کے موافق کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ (توبہ: 37) تاکہ وہ اس کی موافقت کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے تفکر اور تدبر میں تصرف کے لیے سختی سے موافقت کرنے والا ہے۔

وطاء، غطاء کے خلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَشَدُّ وَطْاً دن کی بنسبت سختی سے ثبت کرنے والا ہے کیونکہ رات ایسا وقت ہوتا ہے جس میں انسان عمل نہیں کرتا تو یہ عمل کو زیادہ مضبوط کرنے والا جو چیز انسان کو غافل کرے اور دل کو مشغول کرے اس سے زیادہ پاک ہوتا ہے۔ الوطء کا معنی ثبات ہے تو کہتا ہے: وطئت الأرض بقدمی۔ میں اپنے قدم کے ساتھ زمین پر ثابت ہوا۔ اخفش نے معنی کیا: اشد قیاما۔ قیام میں شدید ہے۔ فراء نے کہا: اثبت قراءۃ وقیاما۔ قراءت اور قیام میں زیادہ ثبت کا باعث ہے۔ انہیں سے اَشَدُّ وَطْاً کا معنی منقول ہے عمل کو ثبت کرنے والا اور جو زیادہ عبادت کا ارادہ کرے اس کے لیے دوام کا باعث ہے۔ رات کا وقت زندگی کی مصروفیات سے فارغ ہونے کا وقت ہے اس کی عبادت دائمی ہوتی ہے ختم نہیں ہوتی۔ کلبی نے اَشَدُّ وَطْاً کا معنی کیا ہے: نمازی کے لیے زیادہ نشاط کا باعث ہے کیونکہ وہ اپنی راحت کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ عبادہ نے کہا: اَشَدُّ وَطْاً کا معنی ہے نمازی کے لیے نشاط کا باعث ہے، زیادہ خفیف اور قراءت کو درست کرنے والا ہوتا ہے۔

## وَّاَقْوَمُ قِيْلًا کی تشریح

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَّاَقْوَمُ قِيْلًا یعنی رات کے وقت کی قراءت دن کی بنسبت درستگی پر استقامت و دوام میں شدید ہوتی ہے کیونکہ آوازیں پرسکون ہوتی ہیں، دنیا خاموش ہوتی ہے نمازی جو پڑھتا ہے وہ نمازی پر مضطرب نہیں ہوتا۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: قراءت کو درست کرنے والا، قول کو ثبت کرنے والا ہوتا ہے۔ کہا: یہ وقت سمجھنے کا ہوتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: وَّاَقْوَمُ قِيْلًا سے مراد ہے رات کے وقت فارغ البال ہونے کی وجہ سے استقامت کو مضبوط بناتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: دعا کو جلدی قبول کراتا ہے؛ ابن شجرہ نے یہ بیان کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا: رات کی عبادت مکمل نشاط والی، کامل اخلاص والی اور زیادہ برکت والی ہوتی ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: یہ اس کے زیادہ مناسب ہوتی ہے کہ وہ قرآن میں تفقہ حاصل کرے۔ اعمش سے مروی ہے کہ حضرت انس بن مالک نے أصوب قیلا پڑھا تو انہیں کہا گیا: وَّاَقْوَمُ قِيْلًا تو انہوں نے جواب دیا: اقوم، اصوب اور اھیأ سب برابر ہیں۔ ابوبکر انباری نے کہا: ان کج رو لوگوں میں سلسلہ لگا تار جاری رہا یہاں تک کہ انہوں نے یہ کہا: جس نے کسی ایسے حرف کے ساتھ قرآن پڑھا جو قرآن کے حرف کے معنی کے موافق ہو تو وہ درست قراءت کرنے والا ہے، جب کہ اس نے معنی کی مخالفت نہ کی ہو اور اللہ تعالیٰ کا جو قصد و ارادہ تھا اس کا غیر نہ لایا ہو۔ ان لوگوں نے حضرت انس کے قول سے استدلال کیا ہے۔ یہ ایسا قول ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس کے قائل کی طرف التفات نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس نے اگر ایسے الفاظ سے قراءت کی جو قرآن کے الفاظ کے مخالف ہو اور اس کے معانی کے قریب ہو تو اس کے

لیے پھر یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی جگہ الشكر للبارى ملك المخلوقين پڑھ لے۔ اس میں معاملہ بہت وسیع ہو جائے گا یہاں تک کہ تمام قرآن کے الفاظ باطل ہو جائیں گے اور ان الفاظ کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے والا اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولے گا۔ ان کے لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں کوئی دلیل نہیں کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ یہ تمہارے اس قول کی طرح ہے، هلم، تعال اور اقبل کیونکہ یہ حدیث اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سندوں سے منقول قراءتیں جب الفاظ مختلف ہوں اور معانی متفق ہوں تو وہ هلم، تعال اور اقبل کے معنی میں ہیں مگر جس لفظ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین نے نہیں پڑھا تو جو ایسا ایک حرف بھی قرآن میں لایا تو صحیح مذہب سے نکل گیا۔

ابوبکر نے کہا: وہ حدیث جسے انہوں نے اس گمراہی میں بطور قاعدہ پیش کیا ہے وہ ایسی حدیث ہے جو کسی اہل علم سے ثابت نہیں کیونکہ اس کا انحصار اس سند پر منحصر ہے اعمش، انس سے روایت کرتے ہیں یہ سند مقطوع ہے متصل نہیں کہ اس سے استدلال کیا جاسکے کیونکہ اعمش نے حضرت انس کو دیکھا تو ہے ان سے احادیث نہیں سنیں۔

## سَبْحًا طَوِيْلًا کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 5**۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ عام قراءت حاء غیر معجمہ کے ساتھ ہے یہاں آپ کو ضروریات کے لیے آنا جانا پڑتا ہے۔ سبح کا معنی دوڑنا اور چکر لگانا ہے، اسی سے پانی میں تیرنے والا ہے کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور فرس سابح ہے جو گھوڑا بہت تیز دوڑتا ہے۔

امراء القیس نے کہا:

مِسَحٌّ إذا ما السّا بِحاتُ على الوَنَى أَثَرْنَ الغُبارَ بِالكَدِيدِ المُرَكَّلِ

وہ بہت تیز دوڑنے والا ہوتا ہے جب کہ تیز رفتار گھوڑے تھکاوٹ کے وقت سخت جگہ غبار اڑاتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: سبح سے مراد فراغت ہے یعنی دن کے وقت کام کاج کے لیے آپ کے پاس فراغت ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ دن کے وقت آرام کرتے ہیں۔ تسبح کا معنی لمبا ہونا ہے؛ یہ خلیل نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا سے مروی ہے: سَبْحًا طَوِيْلًا یعنی آپ کی نیند اور آپ کے آرام کے لیے طویل فراغت ہوتی ہے۔ پس رات کا وقت عبادت کے لیے بنا لیجئے۔ زجاج نے کہا: اگر رات کے وقت کوئی شے فوت ہو جائے تو دن میں آپ کے لیے آرام کے لیے فراغت ہوتی ہے۔

یحییٰ بن یعمر اور ابو وائل نے سبحا پڑھا ہے۔ مہدوی نے کہا: اس کا معنی نیند ہے اس قراءت کے قاریوں سے یہ مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی خفت، وسعت اور استراحت ہے اسی معنی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے چادر چوری کرنے والے کے لیے بددعا کی تھی: لا تُسَبِّخِي بدعائك عليه۔ یعنی اس کے گناہ کو اس سے ہلکا نہ کرو؛ شاعر نے کہا:

فَسَبِّخْ علیك الْهَمَّ واعلم بِأَنَّهُ إذا قَدَّرَ الرحمٰنُ شَيْئًا فَكَائِنُ

اپنے سے غم کو ہلکا کر دو اور یہ جان لو جب اللہ تعالیٰ کسی شی کو مقدر کرتا ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے۔

اصمعی نے کہا: یہ قول کیا جاتا ہے سَبَّخَ الحر یعنی گرمی ہلکی پڑ گئی۔ تسبیخ سے مراد سخت نیند ہے۔ تسبیخ کا معنی یہ بھی ہے روئی، کتان اور اون کے اجزاء کو الگ الگ کرنا، عورت کو کہا جاتا ہے: سبخی قطنك اور سبیخ من القطن سے مراد یہ ہوتا ہے اسے لپٹا جائے تاکہ عورت اسے کاتے۔ اس کے ایک حصہ کو سبیخه کہتے ہیں، اس طرح بھیڑ بکریوں کی اون اور اونٹ کی اون میں ہوتا ہے۔ روئی کے ان حصوں کو سبائخ کہتے ہیں۔ اخطل شکاریوں اور کتوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

فأَرْسَلُوهُنَّ يُذْرِينَ التراب كما يُذْرِي سَبَائخَ قُطْنٍ نَدْفُ أَوْتَارِ

شکاریوں نے کتوں کو چھوڑا وہ مٹی کو یوں اڑا رہے تھے جس طرح روئی کا دھنکنا روئی کے اجزاء کو اڑاتا ہے۔

ثعلب نے کہا: سبخ کا معنی تردد اور اضطراب ہے۔ سبخ کا معنی سکون بھی ہے اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الحمّٰی من فیح جهنم، فَسبّخوها بالماء بخار جہنم کی لپک ہے اسے پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔ ابو عمرو نے کہا: سبخ سے مراد نیند اور فراغت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس لحاظ سے تو یہ لفظ اضداد میں ہوا، یہ سبح کے معنی میں ہے۔

## وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝

''اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو''۔

اس میں تین مسائل ہے۔

### اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنے سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ۔ یعنی اسے اسمائے حسنیٰ سے یاد کرو تاکہ نماز کے ساتھ اچھا انجام حاصل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے عمل کے ساتھ اپنے رب کی ذات کا قصد کر۔ سہیل نے کہا: اپنی نماز کی ابتدا میں بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ اس کی قراءت کی برکت تجھے تیرے رب تک پہنچا دے گی اور اس کے غیر سے تجھے قطع کر دے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وعدہ اور وعید میں اپنے رب کے نام کا ذکر کیجئے تاکہ تو زیادہ اطاعت کرے اور معصیت سے اعراض کرے۔ کلبی نے کہا: دن کے وقت اپنے رب کی نماز پڑھیے۔ میں کہتا ہوں: یہ بہت اچھی تاویل ہے کیونکہ جب رات کا ذکر کیا تو دن کا بھی ذکر کیا کیونکہ دن رات کا قسیم ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ (فرقان:62)

### تَبَتَّلْ کا معنی ومفہوم

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ تَبَتَّلْ کا معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہو کر رہ جانا۔ یعنی اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: بتلت الشیء یعنی میں نے اس چیز کو کاٹا۔ اس معنی میں ان کا قول

ہے: طلقھا بَتَّۃً بتلۃ اس نے اپنی بیوی کو طلاق بائنہ دی، ھذہ صدقۃ بتۃ بتلۃ یہ صدقہ بائنہ ہے اپنے مالک سے منقطع ہے یعنی مالک کی صدقہ سے ملکیت ختم ہو چکی ہے؛ اس معنی میں مریم بتول ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہو رہی تھیں۔ راہب کو متبتل کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تُضِئُ الظَّلَامَ بِالعِشَاءِ کَاَنَّھَا مَنَارَۃُ مُمْسَی رَاھِبٍ مُتَبَتِّلِ

ان کی چمک عشاء کے وقت تاریکیوں کو دور کر دیتی ہے گویا یہ وہ منارہ ہے جہاں راہب رات گزارتا ہے۔

حدیث طیبہ میں تَبَتُّل سے نہی کی گئی ہے، وہ لوگوں اور جماعتوں سے الگ تھلگ ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عربوں کے ہاں اس کا اصل معنی الگ تھلگ ہونا ہے؛ ابن عرفہ نے یہی کہا ہے جب کہ پہلا معنی ان آثار کی وجہ سے زیادہ قوی ہے جو آثار ہم نے ذکر کیے ہیں۔ یہ سوال کیا جاتا ہے: تَبْتِيْلًا کیوں کہا تبتلا نہیں کہا؟ تو اسے جواب دیا جائے گا: تَبَتَّلْ کا معنی بتل نفسہ ہے یعنی اپنے نفس کو الگ تھلگ کرنا تو آیات کے سروں کی موافقت کی وجہ سے تَبَتُّل کی جگہ تَبْتِيْلًا کا لفظ ذکر کیا۔

رہبانیت اختیار کرنے کی ممانعت

**مسئلہ نمبر 3**۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (86)) کی تفسیر میں یہ بات گزر چکی ہے جو آدمی الگ تھلگ ہوتا ہے اور رہبانیت کی راہ اختیار کرتا ہے وہ مکروہ ہے تو وہ بحث کافی ہے۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک اس دور کا تعلق ہے تو لوگوں کے عہد و پیمان فاسد ہو چکے ہیں، امانت داری کا جذبہ ضعیف ہو چکا ہے اور حرام، دنیاوی اموال پر غالب آ چکا ہے اس لیے تنہائی میل جول سے بہتر ہے اور مجرد زندگی شادی سے افضل ہے لیکن آیت کا معنی ہے بتوں اور غیر اللہ کی عبادت سے دستکش ہو جاؤ؛ مجاہد نے اسی طرح کی بات کی ہے جس کا معنی یہ ہے اس کے لیے عبادت کو خالص کرو۔ تَبَتُّل کا ارادہ نہیں کیا۔ تَبَتُّل کا قرآن حکیم میں حکم دیا گیا، سنت میں اس سے نہی کی گئی امر کا تعلق، نہی کا متعلق نہیں تو یہ دونوں چیزیں آپس میں متناقض نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے مبعوث کیا گیا تا کہ لوگوں کے لیے نازل شدہ احکام کی وضاحت کریں۔ پس وہ تَبَتُّل جس کا قرآن حکیم میں حکم دیا گیا وہ عبادت کو خالص کرتے ہوئے اللہ کے لیے ہو کر رہنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینۃ: 5) جس تَبَتُّل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح کو ترک کرنے اور عبادت گاہوں میں الگ تھلگ رہنے میں نصاریٰ کا طریقہ اپنانا ہے لیکن جب زمانہ فساد کا شکار ہو جائے تو مسلمان کا بہترین مال وہ بھیڑ بکریاں ہیں جنہیں وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کی جگہوں میں چراتا ہے اور اپنے دین کی حفاظت کی خاطر فتنوں سے دور بھاگتا ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝

''مالک ہے مشرق و مغرب کا اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس بنائے رکھیے اس کو اپنا کارساز۔ اور صبر کیجئے ان کی

(دل آزار) باتوں پر اور ان سے الگ ہو جائیے بڑی خوبصورتی سے۔ آپ چھوڑ دیں مجھے اور ان جھٹلانے والے مالداروں کو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں"۔

اہل حرمین، ابن محیصن، مجاہد، ابو عمرو، ابن اسحاق اور حفص نے لفظ رب کو مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اس کی خبر لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے پہلے هُوَ مضمر ہے۔ باقی قراء نے لفظ رَبُّ کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ اور رَبُّ الْمَشْرِقِ کے لفظ رب کی صفت ہے، جو آدمی یہ جان لیتا ہے کہ وہ مشارق اور مغارب کا رب ہے تو اس کا عمل اور آرزو اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا یعنی تو اسے یوں بنا لے کہ وہ تیرے امور کی نگہبانی کرنے والا ہے اور اسی نے تیرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اس پر اسے ضامن بنا لے۔

کفار جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتے ہیں، سب و شتم کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں اس پر صبر کیجئے ان کی باتوں سے نہ گھبرائیں اور ان کو دعوت دینے سے نہ رکیں، انہیں بدلہ دینے میں مشغول نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کو ترک کرنے والے ہوں گے۔ یہ امر جہاد سے قبل کا تھا اس کے بعد کفار کے ساتھ قتال کا حکم نازل ہوا تو جہاد والی آیت نے ماقبل کے ترک کے حکم کو منسوخ کر دیا؛ قتادہ اور دوسرے علماء کا یہی نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابو درداء نے کہا: ہم کچھ لوگوں کے لیے ہنستے ہیں جب کہ ہمارے دل ان پر ناراض ہوتے ہیں اور ان پر لعنت کر رہے ہوتے ہیں۔

وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ یعنی انہیں سزا دینے کے لیے میری سزا پر راضی ہو جائیے۔ یہ قریش کے ان سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی جو استہزاء کیا کرتے تھے۔ مقاتل نے کہا: یہ ان دس افراد کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غزوہ بدر میں مشرک فوج کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری لی تھی۔ ان کا ذکر سورۂ انفال میں ہو چکا ہے۔

یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ بنو مغیرہ ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا: مجھے خبر دی گئی کہ وہ بارہ افراد ہیں۔ اُولِي النَّعْمَةِ وہ مالدار، خوشحال اور دنیا میں لذتوں کے مالک ہیں۔ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا یعنی ان کی وفات کی مدت تک مہلت دیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ واقعہ بدر ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہیں دنیا کی مدت تک مہلت دیجئے۔

## اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾

"ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے اور غذا جو گلے میں پھنس جانے والی ہے اور دردناک عذاب ہے (یہ اس روز) جس دن لرزنے لگیں گے زمین اور پہاڑ اور پہاڑ ریت کے بہتے ٹیلے بن جائیں گے"۔

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ انکال کا معنی بیڑیاں ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ اس کا واحد نکل ہے نکل اسے کہتے ہیں جو انسان کو حرکت سے روک دے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسے نکل اس لیے کہتے ہیں

کیونکہ اس کے ساتھ عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ امام شعبی نے کہا: کیا تمہاری یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے پاؤں میں بیڑیاں اس لیے ڈالی ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں؟ نہیں اللہ کی قسم! لیکن جب انہوں نے اوپر آنے کا ارادہ کیا تو ان بیڑیوں نے انہیں نیچے کر دیا۔ کلبی نے کہا: انکال کا معنی طوق ہے۔ پہلا معنی لغت میں بہت معروف ہے؛ اس معنی میں خنساء کا قول ہے:

دَعَاكَ فَقَطَّعْتَ أَنْكَالَهُ وَقَدْ كُنَّ قَبْلَكَ لَا تُقْطَعُ

اس نے تجھے بلایا تو تو نے اس کی بیڑیاں توڑ دیں، جب کہ تجھ سے قبل انہیں نہیں توڑا جاتا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہ شدید عذاب کی انواع ہیں؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے: إن الله يحب النكل على النكل۔ اللہ تعالیٰ ایسے تجربہ کار بہادر سوار کو پسند کرتا ہے جو زور آور آزمودہ گھوڑے پر سوار ہو۔

جوہری نے کہا: نکل کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پوچھا گیا: نکل کیا ہوتا ہے؟ جواب دیا: طاقتور، تجربہ کار آدمی، طاقتور تجربہ کار گھوڑے پر؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا کہا: اسی وجہ سے بیڑی کو نکل کہتے ہیں کیونکہ وہ قوی ہوتی ہے اسی طرح غُلّ ہے اور ہر سخت عذاب اور جہنم کی آگ۔

**وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ** جو خوشگوار نہ ہو جو حلق کو پکڑ لے نہ نیچے اترے اور نہ ہی باہر نکلے وہ غسلین، زقوم اور ضریع ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ انہیں سے یہ بھی مروی ہے: وہ کانٹا ہے جو حلق میں داخل ہو جاتا ہے نہ وہ نیچے جاتا ہے اور نہ ہی نکلتا ہے۔ زجاج نے کہا: ان کا ٹھکانا ضریع ہوگا جس طرح ارشاد فرمایا: **لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ** ⑥ (غاشیہ) یہ عوسج جیسا کانٹا ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ کھانا زقوم ہے جس طرح ارشاد فرمایا: **اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ** ﴿٤٤﴾ (الدخان) دونوں کا معنی ایک ہے۔ حمران بن اعین نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے **اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا ﴿١٢﴾ وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ** کو پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہو گئے۔ خلید بن حسان نے کہا: حضرت حسن بصری نے ہمارے ہاں روزے کی حالت میں شام کی تو میں کھانا لایا تو ان کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی **اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا ﴿١٢﴾ وَّ طَعَامًا** تو حضرت حسن بصری نے کہا: اپنا کھانا اٹھا لو جب دوسرا دن ہوا تو میں کھانا لایا تو ان پر یہ آیت پیش کی گئی تو آپ نے کہا: اسے اٹھا لو اور تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، ان کا بیٹا ثابت بنانی، یزید جنی اور یحییٰ بکاء کے پاس گیا اور ان سے گفتگو کی وہ ان کے پاس آئے اور ان کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ حضرت حسن بصری نے ستو کا ایک گھونٹ پی لیا۔ غصہ کا معنی شجا (حلق میں اٹک جانے والی ہڈی) ہے یہ وہ چیز ہے جو حلق میں اٹک جاتی ہے وہ ہڈی ہو یا کوئی اور۔ اس کی جمع غُصص آتی ہے **غَصَص** فتح کے ساتھ ہو تو یہ اس باب سے مصدر ہوگا **غَصِصْتَ تَغَصُّ** اسی طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: أنت غاص بالطعام، أنت غصان۔ تیرے گلے میں کھانا اٹک گیا ہے۔ أغصصته أنا (میرے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہے) المنزل غاص بالقوم یعنی منزل لوگوں کے ساتھ بھری ہوئی ہے۔

**يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ** جو کوئی ان پر ہوگا ان کے ساتھ زمین اور پہاڑ مضطرب ہوں گے۔ **يَوْمَ** کا لفظ ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوتا ہے یعنی انہیں عذاب دیا جائے گا جس دن زمین کانپے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یوم سے

پہلے حرف جار تھا اس کے حذف کی وجہ سے یہ منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہوگی هذه العقوبة فی یوم ترجف الأرض والجبال۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا عامل ذرنی ہے معنی یہ ہوگا جس روز زمین اور پہاڑ کانپیں گے اس دن مجھے اور جھٹلانے والوں کو چھوڑ دینا۔

وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ کثیب سے مراد جمع شدہ ریت ہے؛ حضرت حسان نے کہا:

عَرَفْتُ دِيَارَ زَيْنَبَ بِالْكَثِيبِ كَخَطِّ الْوَحْيِ فِي الْوَرَقِ الْقَشِيبِ

میں نے ریت کے ٹیلے پر زینب کے گھروں کو پہچان لیا جس طرح نئے کاغذ پر لکھائی کی لکیریں ہوتی ہیں۔

مہیل اس ریت کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے۔ ضحاک اور کلبی نے کہا: مہیل اسے کہتے ہیں جب اس پر قدم رکھے تو وہ نیچے سے سرک جائے اور جب تو اس کا نیچے والا حصہ پکڑے تو وہ گر پڑے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مہیل سے مراد بہنے اور بکھرنے والی ہے اس کی اصل مهیول ہے یہ تیرے اس قول سے اسم مفعول کا صیغہ ہے: هلت علیه التراب أهیله هیلا۔ جب تو اسے بہائے جس طرح کہا جاتا ہے: مهيل، مهيول، مكيل، مكيول، مدين، مديون، معين، معيون۔

شاعر نے کہا:

قد كان قَوْمُكَ يَحْسَبُونَكَ سَيِّدًا وإخَالُ أَنَّكَ سَيِّدٌ مَعْيُونُ

تیری قوم تجھے سردار گمان کرتی ہے اور میرا خیال ہے تو آنکھوں دیکھا سردار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خشک سالی کی شکایت کی تو فرمایا: اتکیلون أم تهیلون کیا تم کیل کرتے ہو یا انڈیلتے ہو؟ عرض کی ہم انڈیلتے ہیں۔ فرمایا: ''اپنے کھانوں کا کیل کیا کرو اس میں تمہارے لیے برکت رکھ دی جائے گی''۔ هِلتُ میں ایک لغت اَهَلْتُ الدقیق بھی ہے اسی سے مهال اور مهیل آتا ہے واؤ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ یاء پر ضمہ ثقیل ہوتا ہے ضمہ کو حذف کیا گیا تو یاء ساکن ہوگئی پھر یاء اور واؤ ساکن ہو گئے تو اجتماع ساکنین کی وجہ سے واؤ کو حذف کر دیا گیا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۖ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

''(اے اہل مکہ!) ہم نے بھیجا ہے تمہاری طرف ایک (عظیم الشان) رسول تم پر گواہ بنا کر جیسے ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو) رسول بنا کر بھیجا۔ پس نافرمانی کی فرعون نے رسول کی تو ہم نے اس کو بڑی سختی سے پکڑ لیا۔

(ذرا سوچو) کہ تم کیسے بچو گے اگر تم کفر کرتے رہے اس روز جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور آسمان پھٹ جائے گا اس (کے ہول) سے، اور اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر رہے گا۔ یقیناً یہ (قرآن) نصیحت ہے پس اب جس کا جی چاہے اختیار کر لے اپنے رب کی طرف سیدھا راستہ"۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا یہاں رَسُوْلًا سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قریش کی طرف بھیجا۔ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۞ اس میں رَسُوْلًا سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ یعنی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور ایمان نہ لایا۔ مقاتل نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر کیا کہا: کیونکہ اہل مکہ نے حضرت محمد ﷺ کی شان کا لحاظ نہ کیا اور آپ ﷺ کی تحقیر کی کیونکہ آپ ﷺ کی ولادت ان میں ہوئی تھی جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان کا لحاظ نہ کیا کیونکہ فرعون نے آپ علیہ السلام کی پرورش کی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں میں پروان چڑھے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے قول کی حکایت بیان کی ہے: اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا (شعراء: 18) مہدوی نے کہا: الرسول میں الف لام اس لیے آیا ہے کیونکہ رسول کا پہلے ذکر ہو چکا تھا؛ اس وجہ سے خطوط کے آغاز میں سلام علیکم اور ان کے اختتام میں السلام علیکم کو اختیار کیا جاتا ہے۔ وَّبِیْلًا سخت بوجھل؛ اس معنی میں ضرب وبیل اور عذاب وبیل بمعنی شدید بولا جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے۔ اس سے مطر وابل کہتے ہیں یعنی سخت بارش؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ زجاج نے اس کا معنی ثقیلا غلیظا کیا ہے بھاری بھرکم۔ اس معنی میں بارش کے لیے وبیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی مھلکا ہے معنی یہ ہے ہم نے اسے تباہ کن سزا دی۔ شاعر نے کہا:

أَكَلْتِ بَنِيكَ أَكْلَ الضَّبِّ حتى ۔۔۔ وجَدْتِ مَرَارَةَ الْكَلَا الْوَبِيلِ

تو نے اپنی اولاد کو گوہ کے کھانے کی طرح کھا لیا یہاں تک کہ تو نے ہلاک کر دینے والی گھاس کی کڑواہٹ کو پا لیا۔

استوبل فلان کذا اس کے انجام کی تعریف نہ کی، ماء وبیل ایسا پانی جو خوشگوار نہ ہو۔ کلأ مستوبل وطعام وبیل و مستوبل۔ جب وہ گھاس کھانا خوشگوار نہ ہو اور ہضم نہ ہو؛ زہیر نے کہا۔

فَقَضَوْا مَنَايَا بَيْنَهُمْ ثم أَصْدَرُوا ۔۔۔ إِلَى كَلَأٍ مُسْتَوْبَلٍ مُتَوَخِّمِ

انہوں نے آپس میں موتوں کا فیصلہ کیا پھر وہ ایسی گھاس کی طرف گئے جو ناخوشگوار تھی۔

خنساء نے کہا:

لَقَدْ أَكَلَتْ بَجِيلَةُ يومَ لَاقَتْ ۔۔۔ فَوَارِسَ مَالِكٍ أَكْلًا وَبِيلًا

بجیلہ نے اس روز نامناسب کھانا کھایا جس روز وہ مالک کے شہسواروں سے ملی۔

وبیل کا معنی موٹا ڈنڈا بھی ہے؛ شاعر کا شعر ہے:

لو أَصْبَحَ فِي يُمْنَى يَدَيَّ زِمَامُهَا ۔۔۔ وفِي كَفِّي الْأُخْرَى وَبِيلٌ تُحَاذِرُهُ

کاش! میرے دائیں ہاتھ میں اس کی نکیل ہوتی اور دوسرے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا ہوتا جو اسے ڈراتا۔

اسی طرح موبل کا لفظ ہے اور موبلہ بھی اسی طرح ہے اس کا معنی لکڑیوں کا گھٹا ہے اسی طرح وبیل بھی اسی معنی میں ہے جس طرح اس شعر میں ہے، طرفہ نے کہا:

عَقِيلَةُ شَيْخٍ كَالوَبِيلِ يَلَنْدَدُ

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۞ یہ توبیخ اور تقریع کے لیے ہے، یعنی اگر تم نے کفر کیا تو تم کیسے عذاب سے بچو گے۔ اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔ یعنی اگر تم نے کفر کیا تو تم اس دن کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دیتا ہے۔ عبداللہ اور عطیہ کی قراءت اسی طرح ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: تم کون سی نماز کے ساتھ عذاب سے بچو گے؟ کون سے روزے کے ساتھ بچو گے؟ اس میں اضمار ہے یعنی تم کیسے اس دن کے عذاب سے بچو گے۔ قتادہ نے کہا: اللہ کی قسم! جس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اس دن کسی بھی چیز کے ساتھ عذاب سے نہیں بچے گا۔ اور یوما، تتقون کا مفعول بہ ہے، یہ ظرف نہیں ہے۔ اگر کفر کو انکار کے معنی میں مقدر کیا جائے تو یوم کا لفظ كَفَرْتُمْ کا مفعول ہوگا۔

بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان كَفَرْتُمْ پر وقف تام ہے اور يَوْمًا سے ابتدا ہو رہی ہے، تو یہ صورت اس طرف جاتی ہے کہ یوما يَّجْعَلُ کا مفعول ہے اور يَّجْعَلُ فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے گویا یہ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک دن میں بچوں کو بوڑھا کر دیتا ہے۔ ابن انباری نے کہا: یہ درست نہیں کیونکہ دن ہی اپنی ہولناکی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔

مہدوی نے کہا: يَّجْعَلُ کی ضمیر کے بارے میں یہ جائز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ یوم کے لیے ہو جب ضمیر یوم کے لیے ہوگی تو یہ صحیح ہوگا کہ جملہ یوم کی صفت ہو اور جب ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو یہ صفت بننے کی صلاحیت نہ رکھے مگر اس صورت میں کہ کلام میں حذف تسلیم کیا جائے، گویا ارشاد فرمایا: یوم یجعل اللہ الولدان فیہ شیبا۔

ابن انباری نے کہا: علماء میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے يَوْمًا کو كَفَرْتُمْ فعل سے نصب دی ہے۔ یہ بہت ہی قبیح ہے کیونکہ يَوْمًا کو جب كَفَرْتُمْ کے ساتھ متعلق کریں گے تو یہ صفت کا محتاج ہوگا تقدیر کلام یوں ہوگی کفرتم بیوم۔ اگر کوئی استدلال کرنے والا یہ استدلال کرے کہ صفت بعض اوقات حذف ہو جاتی ہے اور فعل مابعد کو نصب دیتا ہے تو ہم اس کے خلاف حضرت عبداللہ کی قراءت سے استدلال کریں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ (حضرت عبداللہ کی) قراءت متواتر نہیں یہ تو تفسیر کے طریقہ پر آئی ہے جب کفر جحود (انکار) کے معنی میں ہو تو یوما بغیر کسی صفت اور اس کے حذف کے صریح مفعول ہوگا یعنی تم کیسے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرو گے اور اس سے ڈرو گے اگر تم قیامت اور جزا کے دن کا انکار کرو گے۔ ابو سمال قعنب نے فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

الْوِلْدَانَ سے مراد بچے ہیں۔ سدی نے کہا: اس سے مراد زنا کی اولاد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد مشرکین کی اولاد ہے جب کہ عمومی معنی مراد لینا زیادہ صحیح ہے یعنی اس دن میں چھوٹے بچے کے بال بڑھاپے کے بغیر سفید ہو جائیں گے۔ یہ اس وقت ہوگا جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا: اے آدم! اٹھیے جہنم کا حصہ نکالیے جس طرح سورۂ حج کے آغاز میں گزر

چکا ہے۔ قشیری نے کہا: پھر اللہ تعالیٰ جس طرح ارادہ فرمائے گا جنتیوں کے احوال اور اوصاف بدل دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اس دن کی شدت کو بیان کرنے والی ضرب المثل ہے۔ یہ مجاز ہے کیونکہ قیامت کے روز کوئی بچہ نہ ہوگا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے اس دن کی ہیبت ایسی حالت میں ہوگی اگر وہاں کوئی بچہ ہوا تو ہیبت کی وجہ سے اس کے سر کے بال سفید ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ نزع کا وقت ہوگا اور صور پھونکے جانے سے قبل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

زمخشری نے کہا: کسی کتاب میں میری نظروں کے سامنے سے یہ حکایت گزری ہے کہ ایک آدمی نے شام کی جب کہ اس کے بال کوے کی طرح سیاہ تھے اس نے صبح کی تو اس کا سر سفید ہو چکا تھا اور داڑھی ثغامہ بوٹی کی طرح سفید ہو چکی تھی اس نے کہا: مجھے خواب میں قیامت، جنت اور دوزخ دکھائی گئی، میں نے لوگوں کو دیکھا کہ انہیں زنجیروں سے جکڑ کر آگ کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو اس کی ہولناکی کی وجہ سے میں اس طرح ہو گیا جس طرح تم مجھے دیکھتے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ دن کی طوالت کے ساتھ صفت بیان کی جائے کہ اس دن میں بچے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں گے۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ اس دن کی شدت کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ بِهٖ میں باء، فی کے معنی میں ہے یعنی اس دن میں اس کی ہولناکی کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ اس کی تعبیر میں جو بھی اقوال ذکر کیے گئے ہیں یہ ان میں سے سب سے اچھا ہے۔ اس کی تاویل میں یہ قول بھی کیا جاتا ہے: اس پر ایسا بوجھ ڈالا جائے گا جو اسے شق ہونے کی طرف لے جائے گا کیونکہ وہ بوجھ اس پر بہت بھاری ہوگا اور آسمان اس بوجھ کے واقع ہونے کی وجہ سے ڈر جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف: 187) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ بِهٖ، له کے معنی میں ہے یعنی اس دن کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فعلت كذا بحرمتك ولحرمتك میں نے اس طرح تیرے احترام کی وجہ سے کیا ہے۔ باء، لام اور فی اس جیسی جگہوں میں قریب المعنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانبیاء: 47) ہم قیامت کے روز انصاف کے میزان رکھیں گے۔ یہاں بھی لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، فی یوم القیامۃ کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بِهٖ کی ضمیر امر کے معنی میں ہے یعنی آسمان اس امر کی وجہ سے پھٹ جائے گا جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آسمان اللہ تعالیٰ کے امر سے پھٹ جائے گا۔

ابو عمرو بن علاء نے کہا: مُنْفَطِرٌ نہیں کہا کیونکہ سماء کا مجازی معنی سقف، چھت ہے تو کہتا ہے: هذا سماء البيت۔ یہ کمرے کی چھت ہے۔

شاعر نے کہا:

فَلَوْ رَفَعَ السَّمَاءُ اِلَيْهِ قومًا لَحِقْنا بالسَّماءِ وبالسَّحَابِ

اگر چھت قوم کو اس کی طرف اٹھاتا تو ہم آسمان اور بادل تک جا پہنچتے۔

قرآن حکیم میں ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء: 32) ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔ فراء نے کہا: السَّمَآءُ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ابو علی نے کہا: اس کا استعمال الجراد المنتشر، الشجر الاخضر اور

اعجاز نخل منقعر کے باب سے ہے۔ ابو علی نے کہا: اس کا معنی ہے آسمان پھٹنے والا ہے جس طرح وہ کہتے ہیں: امراۃ مرضع یعنی دودھ پلانے والی عورت۔ اسم فاعل کا صیغہ نسبت کے معنی میں ہے۔

كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ یعنی قیامت، حساب اور جزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہو کر رہے گا اس میں کوئی شک اور خلاف ورزی نہ ہوگی۔ مقاتل نے کہا: اس کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ، هٰذِهٖ سے مراد سورت ہے، آیات ہیں۔ ایک قول کیا گیا ہے: قرآن کی آیات مراد ہیں کیونکہ وہ سورۂ واحدہ کی طرح ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ جو یہ ارادہ رکھتا ہے کہ وہ ایمان لائے اور اپنے رب کی رضا اور رحمت تک پہنچنے کا راستہ بنائے تو وہ رغبت کرے پس یہ اس کے لیے ممکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دلائل ظاہر کر دیئے ہیں۔ پھر ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت، آیت سیف سے منسوخ ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی طرح ہے: فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ (المدثر) ثعلبی نے کہا: زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ نماز میں قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی نصف رات اور کبھی تہائی رات اور ایک جماعت ان سے جو آپ کے ساتھ ہیں (وہ بھی یونہی قیام کرتے ہیں): اور اللہ تعالیٰ ہی چھوٹا بڑا کرتا رہتا ہے رات اور دن کو، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی پس تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کرتے ہوں گے زمین میں تلاش کر رہے ہوں گے اللہ کے فضل رزق حلال کو اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے تو پڑھ لیا کرو قرآن سے جتنا آسان ہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہا کرو اور جو نیکی تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو اسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے یہی بہتر ہے اور (اس کا) اجر بہت بڑا ہے، اور مغفرت طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

## رات کا ثلث، اس کا نصف اور دو ثلث میں قیام کرنے کی شرعی حیثیت

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان: قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ کی تفسیر ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے یہ رات کے قیام کی فرضیت کے لیے ناسخ ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے تَقُوْمُ کا معنی (آپ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔ اَدْنٰی کا معنی کم ہے۔ ابن سمیقع، ابوحیوہ اور ہشام نے اہل شام سے ثُلُثَيِ لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ کو مجرور پڑھا ہے یہ عام قراء کی قراءت ہے اس کا عطف ثُلُثَيِ پر ہے اس کا معنی یہ ہے آپ رات کے دو تہائی، اس کے نصف اور ایک تہائی سے کم قیام کرتے ہیں؛ ابوعبید اور ابوحاتم نے اسے پسند کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ (المزمل: 20) تو صحابہ کرام اس کا نصف، ایک تہائی کیسے قیام کرتے جب کہ وہ شمار نہ کر سکتے تھے۔ ابن کثیر اور کوفہ کے قراء نے نصفه وثلثه کو منصوب پڑھا ہے انہیں ادنی پر معطوف کیا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی تقوم أدنی من ثلثی اللیل و تقوم نصفه وثلثه۔ آپ رات کے دو تہائی سے کم قیام کرتے ہیں اور اس کا نصف اور ایک تہائی قیام کرتے ہیں۔ فراء نے کہا: یہ درست ہونے کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ دو ثلث سے کم ارشاد فرمایا پھر قلت کا ذکر کیا اور قلت سے کم ذکر نہیں کیا۔ قشیری نے کہا: اس قراءت کی بنا پر یہ احتمال موجود ہے کہ وہ ایک تہائی اور نصف تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ اتنی مقدار کا قیام ان کے لیے خفیف تھا وہ اس میں زیادتی کرتے تھے اور زیادتی میں مقصود کو پا لیتے۔ جہاں تک دو تہائی کا تعلق ہے اس کا قیام ان پر مشکل تھا وہ اسے حاصل نہ کر پاتے اور اس میں کمی کر دیتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہیں نصف رات کے قیام کا حکم دیا گیا اور کمی بیشی میں انہیں رخصت دی گئی زیادتی کی صورت میں وہ دو تہائی کو جا پہنچتے اور کمی کی صورت میں ایک تہائی تک پہنچ جاتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے لیے نصف، اس سے کم یعنی ایک تہائی تک اور زیادتی کی صورت میں دو تہائی مقدر کیا گیا ان میں سے کچھ وہ بھی تھے جو اسے پورا کرتے اور ان میں کچھ وہ بھی تھے جو اس کو ترک کر دیتے یہاں تک کہ حکم ان سے منسوخ ہو گیا۔ ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک چوتھائی کو ان پر لازم کیا اور ایک چوتھائی سے کمی کرتے۔ یہ قول مرضی کا فیصلہ ہے۔

## رات کے پہروں کا صحیح حساب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اللہ تعالیٰ رات اور دن کی مقدار کو حقیقت میں جانتا ہے جب کہ تم تلاش اور اجتہاد سے جانتے ہو جس میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ تم اس کے حقائق کی معرفت اور اسے بجالانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تم رات کے قیام کی طاقت ہرگز نہیں رکھو گے، جب کہ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ رات کا قیام کبھی بھی پورا فرض نہیں کیا گیا۔ مقاتل اور دوسرے علماء نے کہا: جب قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ نازل ہوئی تو ان پر معاملہ مشکل ہو گیا کوئی آدمی نہیں جانتا تھا کہ رات کا نصف اور ایک تہائی کب ہوتا ہے وہ صبح تک قیام کرتے کہ کہیں خطا ہی نہ ہو جائے تو اس کے پاؤں میں سوجن آ جاتی اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم

فرمایا اور حکم میں تخفیف کردی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ اَن مثقلہ سے مخففہ ہے یعنی اسے علم ہے کہ تم اس کا شمار نہ کر سکو گے کیونکہ اگر تم زیادہ قیام کرو گے تو تم پر مشکل ہو جائے گا اور ایسی تکلیف کے تم محتاج ہو گے جو تم پر فرض نہیں اگر تم کی کرو گے تو تم پر معاملہ شاق گزرے گا۔

## اللہ تعالیٰ نے کس کی وجہ سے ان کی توبہ قبول کی

**مسئلہ نمبر3۔** فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف فرما کر تمہاری طرف رجوع فرمایا۔ اس میں اس امر پر دلالت موجود ہے کہ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے بعض ان امور کو ترک کر رکھا تھا جن کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قیام کی فرضیت میں تخفیف فرمائی کیونکہ تم عاجز آ گئے تھے، توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے جس طرح پہلے گزرا ہے معنی یہ ہوگا اس لیے تمہارے لیے سختی سے نرمی کی طرف، مشکل سے آسانی کی طرف رجوع کیا۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ تلاش کی صورت میں اوقات کی حفاظت کریں تو ان سے تلاش کرنے کے حکم میں تخفیف کر دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں کو خاص مقدار میں پیدا فرماتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۝ (فرقان) ابن عربی نے کہا: خلقت کی تقدیر کے ساتھ حکم متعلق نہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس کے ساتھ مکلف بنائے جانے کے فرائض وابستہ کر دیتا ہے۔

## کتنی تلاوت کرنا مقصود ہے اور کیا اس کا مقصد تلاوت قرآن ہے یا نماز؟

**مسئلہ نمبر4۔** فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اس میں دو قول ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اس سے مراد قراءت ہے رات کے بارے میں جس امر میں تم پر تخفیف کر دی گئی اس میں نماز ادا کرتے وقت قرآن حکیم کی تلاوت کرو۔ سدی نے کہا: یہ سو آیات ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جس نے ایک رات میں سو آیات پڑھیں قرآن حکیم اس کے ساتھ جھگڑا نہیں کرے گا۔ کعب نے کہا: جس نے ایک رات میں سو آیات پڑھیں تو وہ عبادت گزاروں میں لکھ لیا جائے گا۔ سعید نے کہا: پچاس آیات پڑھیں۔

میں کہتا ہوں: کعب کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو آدمی دس آیات پڑھے تو وہ غافلوں میں سے نہیں لکھا جاتا، جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا وہ قانتین میں لکھ لیا جاتا ہے اور جو ہزار آیات پڑھے تو مقنطرین (جنہیں خزانہ دیا جائے) میں لکھ لیا جاتا ہے''(1)۔ اسے ابو داؤد اور طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ الحمد للہ۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

دوسرا قول ہے: جتنا آسان ہو اتنی نماز پڑھو (2)۔ نماز کو قرآن کا نام دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (الاسراء: 78) یعنی صبح کی نماز۔ ابن عربی نے کہا: یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس نے نماز کے بارے میں ہی خبر دی اور قول نماز کی طرف ہی راجع ہے۔

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب سجود القرآن باب تحزیب القرآن۔ 2۔ تفسیر بغوی، جز4، صفحہ 412

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کلام کا ظاہر معنی یہی ہے اور دوسرا قول مجاز ہے کیونکہ اس میں کل کو جز کا نام دیا گیا ہے۔

## اس آیت کریمہ نے کون سے حکم کو منسوخ کیا؟

**مسئلہ نمبر 5**۔ بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ نے رات، اس کے نصف، نصف سے کم اور اس سے زیادہ کے قیام کو منسوخ کر دیا ہے پھر فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ دو معنی کا احتمال رکھتا ہے (۱) یہ دوسرا فرض ہو کیونکہ اس کے ذریعے دوسرا فرض زائل کیا گیا ہے (۲) یہ فرض منسوخ ہے جسے دوسرے فرض کے ساتھ منسوخ کیا گیا ہے جس طرح اس کے ساتھ غیر کو زائل کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۞ (الاسراء) تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ یہ احتمال رکھتا ہے وہ نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض نہیں کی گئی اور وہ آسانی سے ادا ہو سکتی ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھ کر ادا کرتے ہیں۔ امام شافعی نے کہا: ضروری یہ تھا کہ دونوں معنوں میں سے ایک پر سنت سے استدلال کرتے تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پایا جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صرف پانچ وقت کی نمازیں ہی فرض ہیں۔

## اس آیت سے رات کا قیام امت سے منسوخ ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں

**مسئلہ نمبر 6**۔ قشیری ابو نصر نے کہا: مشہور یہ ہے کہ رات کا قیام جو منسوخ ہوا ہے وہ صرف امت کے حق میں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرض باقی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مخصوص مقدار کا اندازہ منسوخ ہوا اور اصل وجوب باقی رہا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (بقرہ: 196) تو ہدی ضروری ہے اس طرح رات کی نماز ضروری ہے لیکن اس کی مقدار نمازی کے اختیار کی طرف سپرد کر دی گئی ہے؛ اس وجہ سے ایک قوم نے کہا: رات کا تھوڑا قیام باقی ہے؛ یہ حضرت حسن بصری کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قوم نے کہا: کلی طور پر منسوخ ہے پھر رات کی نماز بالکل ہی فرض نہیں؛ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو فرضیت باقی ہے وہ یہی ہے وہ قیام ہے اس کی مقدار اختیار کے سپرد ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قیام فرض نہیں تو اللہ تعالیٰ کے فرمان: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ کا معنی یہ ہوگا اگر تمہارے لیے آسان ہو تو اسے پڑھو اور اگر چاہو تو نماز پڑھو۔ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ کلی طور پر نسخ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت ہے۔ رات کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب نہیں تھی اللہ تعالیٰ کا فرمان: نَافِلَةً لَّكَ نفل کے حقیقی معنی پر محمول ہے۔ جس نے یہ کہا: مقدار منسوخ ہے اور رات کے قیام کے وجوب کا اصل باقی رہا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا تو یہ نسخ نماز کے اوقات کے بیان کے ساتھ واقع ہوا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (الاسراء: 78) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۞ (الروم) احادیث میں ہے کہ پانچ نمازوں سے زائد نفل ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: نسخ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہوا وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے جس طرح نماز کی فرضیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے ہے جب کہ خطاب صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے ارشاد باری ہے: يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۞ قُمِ الَّيْلَ۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ کا فریضہ ہجرت کے بعد جاری رہا اور یہ

ثم مدینہ طیبہ میں منسوخ ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جہاد تو مدینہ طیبہ میں فرض ہوا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کے اوقات مکہ مکرمہ میں ہی جاری ہو گئے تھے اور رات کا قیام وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ کے ساتھ منسوخ ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ نے رات کے وجوب کو منسوخ کر دیا۔

## رات کا قیام منسوخ کرنے کی علت

**مسئلہ نمبر 7**۔ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے رات کے قیام میں تخفیف کی علت کو بیان کیا ہے کیونکہ مخلوقات میں مریض لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر رات کا قیام شاق گزرتا ہے اور ان کے لیے یہ چیز بھی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ ان کی نماز فوت ہو جائے؛ اسی طرح تجارت کی غرض سے سفر کرنے والا رات کے قیام کی طاقت نہیں رکھتا، مجاہد بھی اسی طرح ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کی وجہ سے سب سے حکم میں تخفیف کر دی ہے۔ اَنْ سَيَكُوْنُ میں ان مثقلہ سے مخففہ ہے یعنی وہ جانتا ہے کہ تم میں سے مریض ہوں گے۔

## رزق حلال کمانا اور اللہ کے رستے میں جہاد کرنا بھی قیام کی طرح ہے

**مسئلہ نمبر 8**۔ اس آیت میں مجاہدین اور اپنی ذات، اپنے عیال کے نفقہ اور فضل و احسان کے لیے حلال مال کمانے والوں کے درجہ میں برابری کی ہے تو یہ اس امر پر دلیل ہوگی کہ مال کمانا جہاد کا درجہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فی سبیل اللہ جہاد کے ساتھ جمع کیا ہے۔ ابراہیم نے علقمہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو غلہ لانے والا ایک شہر سے دوسرے شہر میں غلہ لاتا ہے وہ اس غلہ کو اس دن کے بھاؤ کے مطابق بیچ دیتا ہے، اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں شہداء کے مقام جتنا ہے'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (1)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جو انسان مسلمانوں کے شہروں میں سے ایک شہر کی طرف کوئی چیز صبر کے ساتھ اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے لایا، اسے اس دن کے بھاؤ کے ساتھ بیچ دیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مقام شہداء جیسا ہوگا اور اس آیت کی تلاوت کی وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی موت پیدا نہیں کی جو شہادت کی موت کے بعد میرے لیے اس موت سے زیادہ پسندیدہ ہو جو کجاوے کے دو اجزاء کے درمیان مجھے آئے جب کہ میں اللہ تعالیٰ کا فضل چاہتا ہوئے سفر کر رہا ہوں۔

طاؤس نے کہا: بیواؤں اور مسکینوں کے لیے تگ و دو کرنے والا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح ہے۔ سلف صالحین میں سے ایک سے مروی ہے کہ وہ واسط میں تھے انہوں نے بصرہ کے لیے گندم کی ایک کشتی لے جانے کا ارادہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذہ

کیا اور اپنے وکیل کو خط لکھا: جس روز یہ گندم والی کشتی بصرہ پہنچے اسی روز گندم بیچ دینا اور اگلے روز کے لیے اسے موخر نہ کرنا اور بھاؤ میں سہولت کو پیش نظر رکھنا۔ تاجروں نے وکیل سے کہا: اگر تو گندم کی فروخت کو جمعہ تک موخر کرے تو تو کئی گنا نفع حاصل کرے گا اس نے مال کے مالک کو خط لکھا تو گندم کے مالک نے اسے جواب دیا: اے فلاں! ہم اپنے دین کی سلامتی کے ساتھ تھوڑے نفع پر قناعت کرتے تھے تو نے ہم پر زیادتی کی ہے جب میرا یہ خط پہنچے تو مال لے اور اسے فقراء پر صدقہ کر دے کاش! میں ذخیرہ اندوزی سے بچ جاتا جب کہ مجھے نہ نقصان ہوتا اور نہ مجھے نفع ہوتا۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ اہل مکہ کا ایک نوجوان مسجد میں رہتا ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے نہ پایا تو آپ اس کے گھر کی طرف گئے اس کی والدہ نے کہا: وہ اپنے کھانے پینے کے سامان کو بیچ رہا ہے۔ حضرت ابن عمر اسے ملے اسے فرمایا: اے بیٹے! تجھے اشیاء خوراک کے سامان سے کیا غرض، تو نے اونٹوں کے مال میں تجارت کیوں نہ کی، تو نے گائیوں میں تجارت کیوں نہ کی، تو نے بھیڑ بکریاں کیوں نہ پالیں کیونکہ کھانے کے مال کی تجارت کرنے والا خشک سالی چاہتا ہے اور جانوروں کا مالک بارش چاہتا ہے۔

### فرض نماز پڑھنے کی اہمیت اور چھوڑنے پر سخت وعید

**مسئلہ نمبر 9**۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ جتنا ممکن ہو نماز پڑھو اللہ تعالیٰ نے رات کی نماز اتنی فرض کی ہے جتنی آسان ہو، پھر پانچ نمازوں کے وجوب کے ساتھ اس کو منسوخ کر دیا۔ ابن عربی نے کہا: ایک قوم نے کہا رات کے قیام کی فرضیت اس آیت میں دو رکعتوں میں مسنون ہو گئی ہے؛ یہ امام بخاری اور دوسرے علماء کی رائے ہے۔ انہوں نے ایک باب باندھا ہے جس میں یہ حدیث ذکر کی ہے "شیطان تم میں سے ایک کے سر کے نصف پر تین گرہیں لگاتا ہے ہر گرہ پر یہ کہتا ہے: تجھ پر لمبی رات ہے تو سو جا اگر وہ بیدار ہو اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، اگر وضو کرے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، اگر نماز پڑھے تو اس کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں۔ تو وہ صبح چست و چالاک اور پاکیزہ نفس کے ساتھ کرتا ہے بصورت دیگر وہ خبیث نفس اور سست صبح کرتا ہے۔

حضرت سمرہ بن جندب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب کے بارے میں روایت نقل کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس کا سر پتھر سے کچلا جائے گا وہ، وہ ہے جو قرآن حکیم کو یاد کرتا ہے پھر اسے بھلا دیتا ہے اور فرض نماز پڑھے بغیر سو جاتا ہے" اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا جو تمام رات سوتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وہ ایسا آدمی ہے جس کے کانوں میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے"۔

ابن عربی نے کہا: یہ ایسی احادیث ہیں جو مطلق صلوٰۃ کو فرض نماز پر محمول کرنے کا تقاضا کرتی ہیں تو اس احتمال کی وجہ سے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا اور جس نے اسے رات کے قیام کے ساتھ معین کیا ہے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ صحیح میں ہے جب کہ الفاظ بخاری کے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عبداللہ! فلاں کی مثل نہ ہو جا، وہ رات کو قیام کیا کرتا تھا، پھر اس نے رات کا قیام ترک کر دیا" اگر یہ فرض ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ اس پر یہ ثابت کرتے اور نہ اس قسم کی خبر دیتے بلکہ اس کی حد درجہ مذمت کرتے۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری زندگی میں جب کوئی آدمی خواب دیکھتا تو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیان کرتا میں ایک مجرد نوجوان تھا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مسجد میں ہی سو جایا کرتا تھا میں نے خواب میں دیکھا گویا دو فرشتے ہیں ان دونوں نے مجھے پکڑا اور مجھے جہنم کی طرف لے گئے تو وہ یوں لپیٹی گئی تھی جس طرح کنویں کو لپیٹا جاتا ہے، اس کے دو سینگ تھے جہنم میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں میں پہچانتا تھا میں کہنے لگا: میں آگ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہا: ہمیں ایک اور فرشتہ ملا اس نے مجھ سے کہا: تجھ پر کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ خواب حضرت حفصہ پر بیان کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیان کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عبداللہ کتنا ہی اچھا آدمی ہے کاش! وہ رات کی نماز پڑھا کرتا''۔

## نماز میں کتنی قراءت فرض ہے؟

**مسئلہ نمبر 10**۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رات کا قیام فرض نہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ اپنے ظاہر معنی یعنی نماز میں قراءت میں محمول ہے۔ علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ نماز میں کس قدر قرأت کرنا لازم ہے امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے فرمایا: سورۂ فاتحہ سے عدول اور اس کے بعض پر اکتفا جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک آیت کی قراءت کو فرض قرار دیا ہے وہ قرآن کے کسی حصہ سے بھی ہو۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے کہ تین آیات کی تلاوت فرض ہے۔ پہلا قول علامہ ماوردی نے ذکر کیا اور دوسرا قول ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام مالک اور امام شافعی کا نقطہ نظر ہے جس طرح ہم نے کتاب اللہ کے آغاز میں سورۂ فاتحہ میں بیان کر دیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد نماز کے علاوہ قرآن حکیم کی قراءت ہے ماوردی نے کہا اس وجہ سے مطلق امر وجوب پر محمول ہوگا یا وجوب کی بجائے استحباب پر محمول ہوگا؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے کیونکہ اگر اس پر قراءت واجب ہے تو اس پر اس کا حفظ بھی واجب ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسے وجوب پر محمول کیا جائے تا کہ اس کی قراءت کے ساتھ اس کے اعجاز، اس میں موجود جو دلائل توحید ہیں ان پر اور رسل کی بعثت کا جو ذکر ہے اس پر آگاہ ہو۔ جب وہ اسے پڑھے اور اس کے اعجاز اور دلائل توحید کو پہچانے تو اس پر یاد کرنا لازم نہیں کیونکہ قرآن حکیم کا حفظ مستحب عبادات میں سے ہے واجب عبادات میں سے نہیں یہ امر قراءت کی جتنی مقدار کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اس کے بارے میں پانچ اقوال ہیں:

(۱) تمام قرآن حکیم کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اسے آسان کر دیا ہے؛ یہ ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔

(۲) قرآن کا ایک تہائی؛ یہ جو یبر کا نقطہ نظر ہے۔

(۳) دو سو آیات؛ یہ سدی کا قول ہے۔

(۴) ایک سو آیات؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

(۵) تین آیات جس طرح سب سے چھوٹی سورت ہوتی ہے؛ یہ ابو خالد کنانی نے کہا۔

## نماز کے قیام اور اداء زکوٰۃ کے معانی و مفاہیم

**مسئلہ نمبر** 11۔ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ یعنی فرض نمازیں پڑھو وہ پانچ نمازیں ہیں۔ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ یعنی اپنے اموال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرو، یہ عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ حارث عکلی نے کہا: صدقہ فطر ادا کرو کیونکہ اموال میں زکوٰۃ بعد میں واجب ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: تمام بھلائی کے کام ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے لیے اخلاص۔

## قرض حسن کا معنی و مراد

**مسئلہ نمبر** 12۔ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ قرض حسن سے مراد وہ چیز ہے جس کو صدقہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کیا جائے اور پاکیزہ مال سے اسے دیا جائے۔ سورۂ حدید میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: قرض حسن سے مراد اپنے خاندان پر خرچ کرنا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

## جو صدقہ وزکوٰۃ اور اعمال خیر بندہ کرتا ہے ان کا اجر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پائے گا

**مسئلہ نمبر** 13۔ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کھجور اور دودھ کو ملا کر حلوہ بنایا ایک مسکین آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ لیا اور مسکین کو دے دیا۔ کسی نے عرض کی: یہ مسکین کیا جانے کہ یہ کیا چیز ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسکین کا رب جانتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ گویا انہوں نے اس آیت کا یہ معنی لیا کہ جو تم اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجتے ہو تم اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں پاؤ گے وہ اس سے بہتر ہے جو تم نے پیچھے چھوڑا ہے اور وہ بخل اور کوتاہی سے بھی بہتر ہے۔ وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد جنت ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے اَعْظَمَ اَجْرًا سے مراد یہ ہے کہ وہ نیکی کے بدلے میں دس گنا عطا فرماتا ہے۔ خَيْرًا اور اَعْظَمَ پر نصب تجدون کے مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے ہے۔ ھو ضمیر بصریوں کے نزدیک ضمیر فصل ہے اور کوفیوں کے نزدیک عماد ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ اَجْرًا یہ تمیز ہے وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اس سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ توبہ سے پہلے جو گناہ ہوتے ہیں ان کو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ رَّحِيْمٌ اور توبہ کے بعد تم پر رحم فرمانے والا ہے؛ یہ حضرت سعید بن جبیر کی رائے ہے۔

# سورۃ المدثر

آیاتہا ۵۶ ۷۴ سورۃ المدثر مکیۃ ۴ رکوعاتہا ۲

تمام کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے، اس کی چھپن آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۪ۙ﴿۴﴾

''اے چادر لپیٹنے والے اٹھیے اور (لوگوں کو) ڈرایئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے لباس کو پاک رکھیے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

## مدثر کا معنی اور اس سورت کا نزول

**مسئلہ نمبر 1**۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ اے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو اپنے کپڑے سے ڈھانپ لیا ہے اور نیند کی حالت میں ہے! اس کی اصل المتدثر ہے تاء کو دال میں ادغام کر دیا کیونکہ وہ باہم نسبت رکھتے ہیں۔ اُبی نے اسے اصل پر المتدثر پڑھا ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سورت کا اکثر حصہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فترت وحی کے بارے میں بیان کررہے تھے: ''اسی اثنا میں کہ میں چل رہا تھا تو میں نے آسمان کی جانب سے آواز سنی، میں نے اپنا سر اٹھایا کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آتا تھا وہ آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اس وجہ سے ڈر گیا اور میں لوٹ آیا تو میں نے کہا: مجھے کملی اوڑھا دو، مجھے کملی اوڑھا دو۔ تو انہوں نے مجھے کملی اوڑھا دی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۪ۙ﴿۴﴾ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۪ۙ﴿۵﴾ ''ایک روایت میں ہے: یہ نماز فرض ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ رجز سے مراد بت ہیں کہا: پھر لگاتار وحی آنے لگی۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام مسلم نے کہا: زہیر بن حرب، ولید بن مسلم سے وہ اوزاعی سے وہ یحییٰ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوسلمہ سے پوچھا قرآن حکیم کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا؟ فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ میں نے کہا: کیا اِقْرَاْ تو انہوں نے کہا: میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے پوچھا: قرآن حکیم کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا؟ فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ میں نے کہا: کیا اقرأ تو حضرت جابر نے کہا: میں تمہیں وہ بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان کیا ہے۔ فرمایا: ''میں نے غار حرا

میں ایک ماہ تک اعتکاف کیا جب میں نے اعتکاف کو پورا کر لیا تو میں وہاں سے نیچے اترا میں وادی کے بطن میں پہنچا تو مجھے آواز دی گئی میں نے اپنے سامنے، اپنے پیچھے، اپنے دائیں اور اپنے بائیں دیکھا تو میں نے کسی کو نہ دیکھا مجھے پھر ندا کی گئی میں نے دیکھا تو میں کسی کو نہ دیکھ سکا۔ مجھے پھر ندا کی گئی تو میں نے اپنا سر اٹھایا تو وہ ہوا میں عرش پر متمکن تھا یعنی جبرئیل علیہ السلام۔ مجھے شدید کپکپی نے اپنی گرفت میں لے لیا میں حضرت خدیجہ کے پاس آیا میں نے کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو، انہوں نے مجھ پر پانی انڈیلا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ "(1)۔ امام بخاری نے اس روایت کو نقل کیا ہے اس میں کہا میں حضرت خدیجہ کے پاس آیا میں نے کہا: "مجھے کملی اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی بہا دو۔ انہوں نے مجھ پر کملی ڈال دی اور ٹھنڈا پانی مجھ پر انڈیلا تو یہ آیات نازل ہوئیں یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۙ "۔

علامہ ابن عربی نے کہا: ایک مفسر نے کہا عقبہ بن ربیعہ کی جانب سے بدسلوکی ہوئی آپ ﷺ غمگین ہو کر گھر لوٹ آئے آپ ﷺ مضطرب ہوئے اور لیٹ گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ قول باطل ہے(2)۔ قشیری ابو نصر نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا آپ ﷺ کو کفار مکہ کی یہ بات پہنچی کہ تو جادوگر ہے، اس وجہ سے آپ ﷺ کو دکھ ہوا اور بخار ہوا تو آپ ﷺ نے چادر اپنے اوپر لپیٹ لی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ آپ ﷺ ان کی باتوں میں نہ سوچتے رہیں اور انہیں رسالت کا پیغام پہنچائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: ابولہب، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، نضر بن حرث، امیہ بن خلف، عاص بن وائل اور مطعم بن عدی اکٹھے ہوئے انہوں نے کہا: عرب کے وفود ایام حج میں جمع ہو رہے ہیں وہ ایک دوسرے سے حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے بارے میں باہم پوچھتے ہیں جب کہ تم ان کے بارے میں مختلف باتیں کرتے ہو کوئی کہتا ہے: وہ مجنون ہیں، کوئی کہتا ہے: وہ کاہن ہیں، کوئی کہتا ہے: وہ شاعر ہیں۔ سارے عرب جہاں جائیں گے یہ سب ایک آدمی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں متفق نہیں تم محمد کو ایک نام دو جس پر تم سب متفق ہو اور عرب بھی اسے وہی نام دیں۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا: وہ شاعر ہے، ولید نے کہا: میں نے ابن ابرص اور امیہ بن صلت کا کلام سنا ہے، محمد (مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء) کا کلام ان میں سے کسی کے بھی مناسب نہیں۔ انہوں نے کہا: وہ کاہن ہیں، ولید نے کہا: کاہن کبھی سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ بولتا ہے جب کہ محمد (ﷺ) نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ایک اور اٹھا اس نے کہا: وہ مجنون ہیں۔ ولید نے کہا: جنون تو لوگوں کے گلے دباتا ہے اور محمد (ﷺ) کا تو گلا نہیں دبایا گیا۔ ولید اپنے گھر چلا گیا قریش نے کہا: ولید بن مغیرہ بے دین ہو گیا۔ ابوجہل اس کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبد شمس! کیا بات ہے یہ قریش تجھے مال دینے کے لیے مال جمع کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے تو محتاج ہو گیا ہے اور بے دین ہو گیا ہے۔ ولید نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن میں نے محمد (ﷺ) کے بارے میں سوچا میں نے کہا: جادوگر کی کیا حقیقت ہوتی ہے؟ تو کہا گیا: وہ باپ، بیٹے، بھائی، میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتا ہے تو میں نے کہا: وہ جادوگر ہے یہ بات لوگوں میں عام ہو گئی تو وہ شور مچانے لگے: بے شک محمد جادوگر ہیں (نعوذ

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ، جلد 29 2۔ احکام القرآن لابن العربی

باللہ ) رسول اللہ ﷺ مغموم گھر آئے اور ایک چادر لپیٹ لی تو یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ عکرمہ نے کہا: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کا معنی ہے اے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے والے! علامہ ابن عربی نے کہا: یہ مجاز بعید ہے کیونکہ ابھی آپ ﷺ نے تبلیغ کا سلسلہ شروع نہ کیا تھا جب کہ یہ نزول قرآن کا آغاز تھا رسول اللہ ﷺ نے اس سورت میں موجود احکام پر شدت سے عمل شروع نہ کیا تھا کیونکہ نازل ہونے والی یہ دوسری سورت تھی۔

## صفت کے ساتھ خطاب محبت وشفقت کی دلیل ہے

**مسئلہ نمبر 2۔** یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ کریم ذات کی طرف سے اپنے محبوب کے لیے خطاب میں شفقت ونرمی کا اظہار ہوتا ہے جب وہ ذات اسے اس کی حالت سے ندا کرے اور اس کی صفت کے ساتھ اسے تعبیر کرے یہ نہیں فرمایا: اے محمد! اے فلاں! تاکہ اس کے رب کی جانب سے نرمی اور شفقت کا شعور دلائے جس طرح سورۂ مزمل میں پہلے گزر چکا ہے اس کی مثل حضرت علی شیر خدا کے لیے سرور دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے جب وہ مسجد میں سو رہے تھے: قم ابا تراب، اے ابوتراب! اٹھو۔ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر گھر سے نکلے تھے ان کی چادر گر گئی تھی اور ان کے جسم کو مٹی لگ گئی تھی۔ امام مسلم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اس کی مثل رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہ کے لیے غزوۂ خندق کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا: قم یانومان اے سونے والے! اٹھو۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔

## انداز سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 3۔** قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ اہل مکہ کو ڈرایئے انہیں عذاب سے خبردار کیجئے اگر وہ اسلام نہ لائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں انذار سے مراد اپنی نبوت کا اعلان ہے کیونکہ یہ رسالت کا مقدمہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ انہیں توحید کی طرف دعوت دینا ہے کیونکہ نبوت ورسالت سے یہی مقصود ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: اٹھیے نماز پڑھیے اور نماز کا حکم دیجئے۔

## تکبیر کہنے کا حکم اور اس کے اسباب

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ اپنے سردار، اپنے مالک اور اپنے معاملات کو درست کرنے والے کی عظمت بیان کر اور اس کی یہ صفت بیان کر کہ وہ اس سے برتر ہے کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیوی ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ نے پوچھا: نماز کو کیسے شروع کیا جائے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ یعنی اس کی اس سے صفت بیان کرو کہ وہ سب سے بڑا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا: یہ ارشاد اگرچہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ نماز کی تکبیر کو بھی شامل ہے تاہم اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی کبریائی بیان کرنا اور اس کی پاکی بیان کرنا ہے کہ اس کے سوا تمام شریکوں اور بتوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا جائے اور اس کے سوا کسی کو اپنا دوست نہ بنا، اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کیا کر، اس کی مشیت کے سوا کسی کے لیے فعل کے ثبوت کو نہ دیکھ اور اس کے سوا کسی کی طرف سے نعمت نہ جان۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوسفیان نے غزوۂ احد کے موقع پر کہا تھا: اعل ھبل تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم کہو اللہ اعلی و اجل (اللہ سب سے بلند اور عظیم ہے) عرف شرع میں یہ لفظ تمام عبادات (نماز، آذان اور ذکر) میں اللہ اکبر

کے ساتھ ادا کیا جانے لگا۔ اس پر اس لفظ کو محمول کیا گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے مختلف مواقع پر وارد ہوا جن میں سے ایک یہ ارشاد ہوا: تحریمھا التکبیر و تحلیلھا التسلیم (1) (نماز کا وہ عمل جو تمام دوسرے امور کو حرام کر دیتا ہے وہ تکبیر ہے اور وہ عمل جو دوسرے امور کو حلال کر دیتا ہے وہ سلام ہے) شرع اس کے عرف کا اس طرح تقاضا کرتی ہے جس طرح اس کی عمومیت کا تقاضا کرتی ہے وہ مواقع جہاں تکبیر کہی جاتی ہے ان میں جانور ذبح کرنے کے وقت تکبیر کہنا ہے تا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ کوئی اس کا شریک نہیں، قربانی میں اس کے نام کا اعلان اور خون بہانے کا جو حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اس امر کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرنے کے لیے ہے۔

میں کہتا ہوں: سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ اللہ اکبر کا لفظ ہی وہ لفظ ہے جس کا نماز میں حکم دیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، تفسیر میں ہے جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے کہا: اور کہا اللہ اکبر۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی کہا: اللہ اکبر۔ حضرت خدیجہ کو بھی علم ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہے۔

## کَبِّرْ پر فاء کی لغوی حیثیت

**مسئلہ نمبر 5۔** وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ میں فاء جواب جزا کے معنی پر داخل ہوئی ہے جس طرح فَاَنْذِرْ میں داخل ہوئی ہے تقدیر کلام یوں ہوگی قم فانذر و قم فکبّر ربك؛ یہ زجاج کا نقطہ نظر ہے۔ ابن جنی نے کہا: یہ تیرے قول زیدا فاضرب کی طرح ہے یعنی زیدا اضرب۔ یہاں فاء زائدہ ہے۔

## ثیاب کی طہارت سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 6۔** وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ اس میں آٹھ قول ہیں۔ (۱) ثیاب سے مراد عمل ہے (۲) دل (۳) نفس (۴) جسم (۵) اہل (۶) خلق (۷) دین (۸) ظاہری لباس۔ جو پہلے قول کی طرف گیا ہے اس نے کہا: آیت کی تاویل یہ ہے اپنے عمل کو درست کرو؛ یہ مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ منصور نے ابن رزین سے روایت نقل کی ہے: اپنے عمل کو درست کرو۔ کہا: جب ایک آدمی کا عمل خبیث ہوتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: إنّ فلانا خبيث الثياب۔ جب وہ اچھے عمل والا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: إنّ فلانا طاهر الثياب؛ سدی سے اسی طرح مروی ہے؛ اس معنی میں شاعر کا شعر ہے:

لَاهُمَّ إِنَّ عَامِرَ بن جَهْمِ أَوْذَمَ حَجًا فِي ثِيَابٍ دُسْمِ

اے اللہ! عامر بن جہم نے گناہوں سے لت پت ہو کر حج کیا۔

اس معنی میں وہ روایت بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: يحشر المرء في ثوبيه الذين مات عليهما (2) یہاں ثوبیہ سے مراد اس کے اچھے اور برے اعمال ہیں؛ ماوردی نے یہ ذکر کیا ہے۔ جو دوسرے قول کی طرف مائل ہوئے اس نے کہا: آیت کا معنی ہے اپنے دل کو پاک کیجئے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت سعید بن جبیر کا نقطہ نظر ہے؛ اس کی دلیل امرء

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث نمبر 56۔ سنن ابن ماجہ، باب مفتاح الصلاۃ الطہور، حدیث 270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز باب ما يستحب من تطهير ثياب الميت عند الموت، حدیث نمبر 2707، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

القیس کا شعر ہے:

فَسُلِّیْ ثیابی من ثیابك تَنْسُلِ

یعنی قلبی من قلبك۔ اس میں ثیاب دل کے معنی میں ہے۔ ماوردی نے کہا: اس آیت کی تعبیر میں اس کے دو قول ہیں: ان دو میں سے ایک یہ ہے: اپنے دل کو گناہ اور نافرمانی سے پاک رکھیں؛ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے: اپنے دل کو دھوکہ سے پاک کر یعنی دھوکہ نہ کر ورنہ تو گدلے دل والا ہو جائے گا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی کے قول سے استدلال کیا گیا ہے:

فإنی بحمد الله لا ثوبَ فاجر لبِستُ ولا مِن غَدْرَۃٍ أَتَقَنَّعُ

الحمدللہ میں نے فسق وفجور کا لباس نہیں پہنا اور نہ ہی دھوکہ سے پردہ کیا ہے۔

جو تیسرے قول کی طرف گیا ہے اس نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے اپنے نفس کو گناہوں سے پاک کیجئے۔ عرب نفس کو ثیاب سے تعبیر کرتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے؛ اس معنی میں عنترہ کا قول ہے:

فَشَکَکْتُ بالرُّمحِ الطَّوِیلِ ثیابَہٗ لیس الکریمُ علی القنا بمُحَرَّمِ

میں نے لمبے نیزے سے اسے پھاڑ دیا معزز نیزے پر حرام نہیں۔

امراء القیس نے کہا:

فَسُلِّیْ ثیابی من ثیابك تَنْسُلِ

اس مصرعہ میں بھی ثیاب کا لفظ ذات کے معنی میں ہے۔

شاعر نے کہا:

ثِیابُ بنی عوفٍ طَھارَی نَقِیَّۃٌ وأَوجُھُھُمْ بیضُ المَسافِرِ غُرَّانُ

بنی عوف کے نفس صاف ستھرے ہیں اور ان کے چہرے روشن سفید ہیں۔

یہاں بھی ثیاب سے مراد نفوس ہیں۔

جو چوتھے قول کی طرف گیا ہے اس نے کہا: آیت کا معنی ہے اپنے جسم کو پاک رکھو یعنی ظاہری نافرمانیوں سے پاک رکھو۔ عربوں سے اقوال مروی ہیں جن سے جسم کو ثیاب سے تعبیر کیا گیا ہے ان میں سے ایک لیلی کا قول ہے اس نے اونٹوں کا ذکر کیا:

رموھا بأَثْیابٍ خِفافٍ فلا تَرَی لھا شَبَھًا إلَّا النَّعامَ المُنَفَّرَا

یعنی ان پر وہ سوار ہوئے اور اپنے ہلکے پھلکے جسموں کو ان پر پھینک دیا تو تیز رفتار اونٹوں کے سوا کوئی جسم نہ دیکھے گا۔

جو پانچویں قول کی طرف گئے ہیں اس نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے وعظ وادب کے ذریعے اپنے اہل کو گناہوں سے پاک رکھو۔ عرب گھر والوں کے لیے ثوب (کپڑا) لباس اور ازار (تہبند) کا لفظ استعمال کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ** (بقرہ: 187) ماوردی نے کہا: ان کے ہاں آیت کی تاویل میں دو صورتیں ہیں (۱) اس کا معنی ہے

مومن اور پاک دامن عورتوں کا انتخاب کر کے اپنی بیویوں کو پاک رکھو۔ (۲) ان کی دبر سے لطف اندوز نہ ہو ان کی قبل سے لطف اندوز ہو، ان کے طہر میں ان سے لطف اندوز ہو۔ حیض کے ایام میں ان سے لطف اندوز نہ ہو؛ ابن بحر نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔ جو چھٹے قول کی طرف گیا ہے اس نے کہا: آیت کا معنی ہے اپنے اخلاق کو حسین بناؤ؛ یہ حضرت حسن بصری اور قرظی کا قول ہے کیونکہ انسان کے اخلاق اس کے احوال کو اس طرح جامع ہوتے ہیں جس طرح کپڑے انسان کو احاطہ کیے ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

وَيَحْيَى لا يُلَامُ بسوء خُلْقٍ　وَيَحْيى طَاهِرُ الأَثْوابِ حُرُّ

یحییٰ پر برے اخلاق کی وجہ سے ملامت نہیں کی جاتی اور یحییٰ اچھے اخلاق والا آزاد ہے۔

جو ساتویں قول کی طرف گیا ہے اس نے کہا: آیت کا معنی ہے اپنے دین کو پاک کیجئے۔ صحیحین میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت مروی ہے فرمایا: ”میں نے لوگوں کو دیکھا جب کہ ان پر کپڑے تھے ان میں سے کچھ پستان تک پہنچ رہے تھے اور کچھ اس سے نیچے تک پہنچ رہے تھے، میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا جب کہ اس کے جسم پر چادر ہے جسے وہ گھسیٹ رہے ہیں“۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس کی کیا تاویل کی؟ فرمایا: دین (1)۔ ابن وہب نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے فرمایا: ”مجھے یہی بات خوش کرتی ہے کہ میں قرآن حکیم کو نماز اور مساجد میں پڑھوں نہ کہ راستہ میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ امام مالک نے فرمایا: یہاں ثیاب سے مراد دین ہے۔ حضرت عبد اللہ بن نافع نے ابوبکر بن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب سے وہ حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ سے مراد ہے کہ دھوکہ کو نہ اپناؤ؛ اس معنی میں ابو کبشہ کا قول ہے:

ثِيَابُ بنى عوفٍ طَهَارَى نَقِيَّةٌ　أَوْجُهُهُمْ بيضُ المَسَافِرِ غُرَّانُ

یہاں طھارۃ ثیابھم سے مراد ان کا کمینی عادات سے سلامت رہنا ہے اور غرۃ وجوھھم سے مراد محرمات سے ان کی پاکی ہے یا شکل وصورت میں ان کا جمال ہے یا دونوں صورتوں میں ان کا جمال ہے؛ یہ علامہ ابن عربی کا قول ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا: تو اپنا لباس جھوٹ، ظلم، دھوکہ اور گناہ پر نہ پہن۔ عکرمہ نے کہا: اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

أَوْ دَمَّرَ حَجَابَى ثِيابِ دُنسِم۔ یعنی اس نے نافرمانیوں کے ساتھ اسے آلودہ کر دیا۔

نابغہ نے کہا:

رِقَاقُ النِّعالِ طَيِّبٌ حُجُزَاتُهُمْ　يُحَيَّوْنَ بالرَّيْحَانِ يومَ السَّبَاسِبِ

وہ بادشاہ ہیں پاک دامن ہیں، شعانین کے دن انہیں ریحان کے ساتھ سلام کیا جاتا ہے۔

جو آٹھویں قول کی طرف گیا ہے تو اس نے کہا: یہاں ثیاب سے مراد ملبوسات ہیں، ان کے نزدیک اس معنی کی چار وجوہ ہیں (۱) اس کا معنی ہے اپنے کپڑوں کو پاک رکھو؛ اسی معنی میں امرء القیس کا شعر ہے:

1۔ صحیح بخاری، باب مناقب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

ثیاب بنی عوف طَهارٰی نَقِیَّةٌ

(۲) اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر رکھ، کیونکہ کپڑوں کو سمیٹ کر رکھنا نجاست سے دوری کا باعث ہوتا ہے جب کپڑے زمین پر گھسیٹیں تو وہ نجاست لگنے سے محفوظ نہیں ہوتے؛ زجاج اور طاؤس نے یہی بات کہی ہے۔

(۳) اپنے کپڑوں کو پانی کے ساتھ پاک کرلو؛ یہ محمد بن سیرین، ابن زید اور فقہاء کا نقطہ نظر ہے۔

(۴) حلال کمائی سے ہی کپڑے پہنو تاکہ وہ حرام سے پاکیزہ ہوں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: جو تو لباس پہنتا ہے وہ حرام کمائی کا نہ ہو۔ علامہ ابن عربی نے جو کچھ کہا اور بعض علماء نے جو کچھ کہا جس کا ہم نے ذکر کیا یہ ممتنع نہیں کہ آیت کو عموم مراد پر محمول کیا جائے وہ حقیقت ہو یا مجاز ہو۔ جب ہم اسے پاکیزہ، معروف کپڑوں پر محمول کریں گے تو یہ دونوں معنوں کو شامل ہو گا۔ (۱) دامنوں کو سمیٹنا کیونکہ جب انہیں ڈھیلا چھوڑا جائے تو وہ آلودہ ہو جاتے ہیں؛ اس وجہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انصار کے ایک نوجوان کو فرمایا جب انہوں نے اس کا دامن ڈھیلا دیکھا: اپنا تہبند اونچا کرلو کیونکہ یہ زیادہ تقوی، زیادہ پاکیزگی اور زیادہ عرصہ باقی رہنے کا باعث ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن کا تہبند اس کی نصف پنڈلی تک ہوتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں اگر وہ پنڈلیوں اور ٹخنوں کے درمیان ہو اور جو ٹخنوں سے بھی نیچے ہو وہ آگ میں ہے'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہبند کی انتہا ٹخنہ معین کی ہے اور جو اس سے بھی نیچے ہو اس پر دھمکی دی ہے ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اپنے دامنوں کو نیچے چھوڑے رکھتے ہیں، اپنے کپڑوں کو لمبا کرتے ہیں پھر اپنے ہاتھوں سے انہیں اوپر اٹھاتے ہیں یہ تکبر کی حالت ہے اور عجب (اپنے عمل پر خوشی کا اظہار کرنا) کا طریقہ ہے (اس معاملہ میں سب سے شدید معاملہ یہ ہے کہ وہ نافرمانی کرتے ہیں، کپڑوں کو ناپاک کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ جا ملاتے ہیں) جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے غیر کو نہیں ملایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو لاحق کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جس نے تکبر کرتے ہوئے اپنے کپڑے کو گھسیٹا اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا'' (2)۔ صحیح کے الفاظ یہ ہیں: ''جس نے تکبر کرتے ہوئے اپنے تہبند کو گھسیٹا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے تہبند کا ایک پہلو ڈھیلا رہتا ہے مگر اس صورت میں کہ میں اس کا خیال رکھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی کو عام رکھا اور حضرت صدیق اکبر کو مستثنیٰ قرار دیا تو کمینے لوگوں نے اپنے آپ کو بلند مرتبہ لوگوں کے ساتھ ملانے کا قصد کیا۔ یہ ان کے لیے جائز نہیں۔

(۲) نجاست لگی ہو تو کپڑوں کو دھونا۔ یہ اس کا ظاہر مفہوم ہے اور صحیح ہے۔ مہدوی نے کہا: بعض علماء نے اس آیت کریمہ سے کپڑے کے پاک ہونے کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ ابن سیرین اور ابن زید نے کہا: تو صرف پاک کپڑے میں نماز

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب موضع الازار این هو، حدیث نمبر 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحمام، باب فی قدر موضع الازار، حدیث نمبر 3570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ سے کپڑے کے پاک ہونے کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ امام مالک اور اہل مدینہ کے نزدیک فرض نہیں۔ بدن کی طہارت بھی اسی طرح ہے اس چیز پر یہ اجماع دلالت کرتا ہے جب کوئی آدمی قضائے حاجت کرے تو پتھروں کے ساتھ استنجاء کی صورت میں نماز پڑھنا جائز ہے جب کہ اس نے پانی کے ساتھ استنجانہ کیا ہو۔ سورۂ برأت میں یہ بحث مکمل گزر چکی ہے۔

## وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

''اور بتوں سے (حسب سابق) دور رہیے''۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: یہاں رُجْز سے مراد بت ہیں اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج: 30)؛ حضرت ابن عباس اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی منقول ہے: گناہوں کو چھوڑ دیجئے۔ مغیرہ نے ابراہیم نخعی سے اس طرح روایت کیا ہے کہ رجز سے مراد گناہ ہے۔ قتادہ نے کہا: رجز سے مراد اصاف اور نائلہ دو بت ہیں جو بیت اللہ کے قریب نصب تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عذاب ہے جب کہ مضاف مقدر ہے۔ معنی ہو گا عذاب کے عمل کو چھوڑ دے یا مراد ہے ایسے عمل کو چھوڑ دے جو عذاب کی طرف لے جانے والا ہے۔ رجز کا اصل معنی عذاب ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ (الاعراف: 134) اگر تو ہم سے عذاب کو دور کر دے تو ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (الاعراف: 162) اور ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا۔ بتوں کو رجز کا نام دیا گیا کیونکہ بت عذاب کی طرف لے جاتے ہیں۔ عام قراء رجز کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، عکرمہ، مجاہد، ابن محیصن اور حفص نے عاصم سے رجز کو راء کے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے ذِکرا اور ذُکرا ہے۔ ابو العالیہ، ربیع اور کسائی نے کہا: رُجز کا معنی بت ہے اور رِجز کا معنی نجاست اور معصیت ہے۔ کسائی نے بھی کہا: رُجز کا معنی بت ہے اور رِجز کا معنی عذاب ہے۔ سدی نے کہا: رجز جب راء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وعید ہے۔

## وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝

''اور کسی پر احسان نہ کیجئے زیادہ لینے کی نیت سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

### استکثار کے وصف کے ساتھ احسان نہ کرنے کی صورتیں

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ میں گیارہ تاویلیں ہیں۔

(۱) جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں ان کے بدلے میں اللہ تعالیٰ پر احسان نہ جتلائیے جس طرح وہ آدمی جو غیر کی وجہ سے کوئی چیز اٹھاتا ہے تو اسے کثیر خیال کرتا ہے۔

(۲) غیر کو عطیہ نہ دو کہ اس کے عوض میں زیادہ کے طالب ہو؛ یہ حضرت ابن عباس عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا:

اللہ تعالیٰ نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آداب میں سب سے شرف والے اور اخلاق میں سب سے جلیل کا حکم دیا گیا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے اسے مباح قرار دیا؛ یہ مجاہد کا نقطہ نظر ہے۔

(۳) یہ بھی مجاہد سے مروی ہے: زیادہ بھلائی کرنے سے کمزور نہ ہو جایئے جس طرح تیرا قول ہے: حبل منین یہ ترکیب اس وقت بولتے ہیں جب وہ رسی کمزور ہو اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت ہے: ولا تمنن تستکثرہ من الخیر۔

(۴) مجاہد اور ربیع سے مروی ہے: اپنے عمل کو اپنی آنکھ میں عظیم نہ جانو کہ تو مزید بھلائی کرے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر انعام کیا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: تو اپنے عمل کو زیادہ خیال نہ کر کہ تو اسے اپنی طرف سے دیکھے بے شک تیرا عمل تجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے اپنی عبادت کی راہ بنادی ہے۔

(۵) حضرت حسن بصری نے کہا: اپنے عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر احسان نہ کرو کہ تو اسے زیادہ خیال کرے۔

(۶) نبوت اور قرآن کے ساتھ لوگوں پر احسان نہ جتلاؤ کہ تو ان سے اجر لے جس کے ذریعے تو زیادہ کا خواہش مند ہو۔

(۷) قرظی نے کہا: تو اپنا مال مصانعۃً پر نہ دے۔

(۸) زید بن اسلم نے کہا: جب تو کسی کو عطیہ دے تو وہ اپنے رب کی رضا کے لیے دے۔

(۹) تو یہ نہ کہہ: میں نے دعوت دی تو میری دعوت قبول نہ کی گئی۔

(۱۰) ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تو طاعت کا عمل کرے اور ثواب کا طالب ہو بلکہ صبر کیجئے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر بدلہ دے۔

(۱۱) تو بھلائی کا کام نہ کر کہ تو اس کے ذریعے لوگوں میں ریاکاری کرے۔

## ان مختلف اقوال میں سے صحیح ترین قول اور اس کی وجہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ اگر یہ اقوال مراد ہیں تو ان میں سے نمایاں ترین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ تو مال نہ دے تا کہ اس کے ذریعے لوگوں سے زیادہ مال لے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: مننت فلانا کذا یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ عطیہ کو منہ کہتے ہیں، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطیات صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونے چاہئیں نہ کہ مخلوقات کی طرف سے بدلے کا انتظار ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا جمع نہیں کرتے تھے اسی وجہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں جو کچھ عطا فرماتا ہے اس میں سے میرے لیے خمس کے سوا کچھ بھی نہیں اور خمس (پانچواں حصہ) بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عیال کے نفقہ سے جو مال بچ جاتا اسے مسلمانوں کے مصالح پر صرف کر دیا جاتا اسی وجہ سے کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کا وارث نہ ہوا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حق میں ذخیرہ اور مال جمع کرنے کا حق نہ رکھتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیاوی اشیاء کی رغبت سے محفوظ رکھا تھا؛ اسی وجہ سے صدقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام تھا اور ہدیہ مباح تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ کو قبول فرماتے تھے اور اس پر بدلہ عطا فرماتے تھے۔ ''اگر مجھے پائے کھانے کی دعوت دی گئی تو میں اسے قبول کروں گا اگر مجھے باز و تحفہ کے طور پر دیا گیا تو میں اسے قبول کروں گا''۔

علامہ ابن عربی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ کو سنت کے طریقہ پر قبول کرتے تھے اور شرعی حکم کے طور پر زیادہ کی

خواہش نہیں رکھتے تھے، جب وہ زیادہ کی خواہش میں عطیہ نہیں دیتے تھے تو اغنیاء اس سے اجتناب کرنے کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ یہ ذلت اور رسوائی کے باب میں سے ہے؛ اس طرح اس آدمی کا قول ہے جو یہ کہتا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ عطیہ نہ دیں جس کے ثواب کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم منتظر ہوں کیونکہ انتظار طمع کے ساتھ متعلق ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ممتنع ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ (طٰہٰ) اور مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھیے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب و زینت ہے دنیوی زندگی کی اور (انہیں اس لیے دی ہیں) تا کہ ہم آزمائیں انہیں ان سے اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ یہ باقی مخلوق کے لیے جائز ہے کیونکہ وہ دنیا کے سامان، روزی کی کمائی اور اس کے ذریعے باہم فخر کرنے میں سے ہے۔ رہا وہ شخص جس نے اس کے ساتھ عمل کا ارادہ کیا یعنی اپنے عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر احسان نہ جتلاؤ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ کی خواہش رکھیں تو وہ صحیح ہے کیونکہ انسان اگر زندگی بھر بغیر کسی کوتاہی کے عمل کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر تھوڑے سے شکر کے درجے میں بھی نہیں پہنچے گا۔

### تَمْنُنْ کی قراءت اور معنی

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ لَا تَمْنُنْ۔ عام قراءت دونوں نونوں کے اظہار کے ساتھ ہے؛ ابو سمال عدوی، اشہب عقیلی اور حضرت حسن بصری نے یہ قراءت کی وَ لَا تَمُنَّ ان میں ادغام کیا اور اسے مفتوح پڑھا۔ تستکثر عام قراءت تو رفع کے ساتھ ہے یہ حال کے معنی میں ہے۔ تو کہتا ہے: جاء زید یرکض یعنی زید دوڑتا ہوا آیا۔ یعنی کسی کو کوئی چیز عطا نہ کیجئے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ تو اس کے بدلے میں زیادہ چیز لے گا۔ حضرت حسن بصری نے نہی کے جواب میں مجزوم پڑھا ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ یہ جواب نہیں۔ یہ جائز ہے کہ یہ تمنن سے بدل ہو گویا ارشاد فرمایا: لا تستکثر۔ ابو حاتم نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا: کیونکہ احسان کثرت طلب کرنے کے ساتھ نہیں ہوتا کہ اس سے بدل بنایا جائے، یہ احتمال موجود ہے کہ اس کو ساکن تخفیف کی وجہ سے پڑھا جائے جس طرح عضد پڑھتے ہیں یا وقف کی حالت کا اعتبار کیا جائے۔ اعمش اور یحییٰ نے تَسْتَكْثِرَ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے نزدیک لام کی کے معنی میں ہے گویا فرمایا: لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرَ۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہاں ان مضمر ہے۔ جیسے أَلَا أَيُّهَذَا الزَّاجِرِي أَحْضُرَ الوَغَى۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت اس امر کی تائید کرتی ہے وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ کسائی نے کہا: جب ان کو حذف کیا گیا تو فعل مضارع کو رفع دیا گیا۔ معنی ایک ہی ہے۔ کبھی من سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس پر نعمتیں کی گئیں ان پر نعمتوں کا شمار کرنا یہ بھی دوسرے قول کی طرف لوٹتا ہے اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کرتا ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى (بقرہ: 264) اپنے صدقات احسان جتلانے اور اذیت دینے کے ساتھ باطل نہ کرو۔

وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

''اور اپنے رب (کی رضا) کے لیے صبر کیجئے''۔

اپنے آقا اور اپنے مالک کے لیے اس کے فرائض اور اس کی عبادت پر صبر کیجئے۔ مجاہد نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اذیت دی

گئی اس پر صبر کیجئے۔ ابن زید نے کہا: آپ ﷺ پر عظیم امر ڈالا گیا یعنی عربوں اور عجمیوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبر کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قضا پر صبر کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: آزمائش پر صبر کیجئے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور منتخب افراد کا امتحان لیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اپنے اہل اور وطن کے فراق پر صبر کیجئے۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۙ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۙ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾

''پھر جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا سخت ہوگا کفار پر آسان نہ ہوگا''۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ﴿۸﴾ جب صور پھونکا جائے گا۔ ناقور، نقر سے فاعول کا وزن ہے گویا یہ ایسی چیز ہے جس کی شان یہ ہے کہ آواز پیدا کرنے کے لیے جسے کھٹکھٹایا جائے بلکہ عرب میں نقر کا معنی آواز ہے؛ اس معنی میں امرء القیس کا شعر ہے:

أُخَفِّضُه بِالنَّقرِ لَمَّا عَلَوْتُهُ ... وَيَرْفَعُ طَرْفًا غَيْرَ خَافٍ غَضِيضِ

عرب کہتے ہیں: نقر باسم الرجل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اسے بلائے جب کہ اپنی دعوت کو اس کے لیے خاص کرے۔ مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: یہ بگل جیسی کوئی چیز ہے اس سے مراد دوسرا نفخہ ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے: اس سے پہلا نفخہ مراد ہے کیونکہ یہ پہلی ہولناک سختی ہوگی اس کے بارے میں مفصل گفتگو سورۃ النمل، سورۃ الانعام اور کتاب التذکرہ میں گزر چکی ہے الحمد للہ۔

ابو حبان سے مروی ہے: حضرت زرارہ بن اوفی نے ہمیں امامت کرائی جب وہ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ﴿۸﴾ تک پہنچے تو گر پڑے اور فوت ہو گئے۔

فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿۹﴾ وہ دن بڑا سخت ہے۔ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یہاں الْكٰفِرِيْنَ سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کا انکار کرنے والے ہیں۔

غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ وہ آسان نہیں ہوگا؛ یعنی ان کی گرہیں نہیں کھلیں گی مگر اگلی گرہ پہلے سے بھی شدید ہوگی۔ عقیدہ توحید پر ایمان رکھنے میں گناہگاروں کا معاملہ مختلف ہوگا کیونکہ ان کی شدت کی گرہ کھلے گی تو اگلا مرحلہ آسان ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ يَوْمَئِذٍ اس تقدیر کلام میں فذلك يوم عسير يومئذ کی صورت میں منصوب ہے یعنی عَسِيْرٌ نے اسے نصب دی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حرف جر کے مقدر ماننے کے ساتھ اسے جر دی گئی ہے اس کی تقدیر یہ ہوگی فذلك في يومئذ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ مرفوع ہو مگر یہ کیونکہ غیر منصرف کی طرف مضاف ہے اس لیے مبنی برفتحہ ہے۔

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ﴿۱۳﴾
وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۙ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ؕ﴿۱۶﴾
سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ؕ﴿۱۷﴾

''آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اور دے دیا ہے اس کو مال کثیر اور بیٹے دیئے ہیں جو پاس

رہنے والے ہیں اور مہیا کر دیا ہے اسے ہر قسم کا سامان پھر طمع کرتا ہے کہ میں اسے مزید عطا کروں۔ ہر گز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا سخت دشمن ہے۔ میں اسے مجبور کروں گا کہ وہ کٹھن چڑھائی چڑھے"۔

ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ ذَرۡنِیۡ یعنی مجھے چھوڑ دو، یہ وعید اور دھمکی کا کلمہ ہے یعنی مجھے اور جسے میں نے تنہا پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دے۔ وَحِیۡدًا اس صورت میں ضمیر محذوف سے حال ہے جو ضمیر مفعول بہ ہے یعنی میں نے اسے پیدا کیا تو وہ تنہا تھا اس کے پاس کوئی مال نہ تھا اور نہ ہی اس کی اولاد تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے عطا کیا جو عطا کیا۔ مفسرین کا خیال ہے اس کا مصداق ولید بن مغیرہ ہے اگرچہ تمام لوگ اس کی مثل پیدا کیے گئے اس کا خصوصی طور پر اس لیے ذکر کیا گیا کیونکہ وہ نعمت کی ناشکری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے میں خصوصیت رکھتا تھا وہ اپنی قوم میں وحید کے لقب سے جانا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ولید کہا کرتا تھا میں وحید بن وحید ہوں، عربوں میں میری مثل نہیں نہ ہی میرے باپ مغیرہ کی کوئی مثل ہے اسے وحید کا نام دیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ اسے وحید اس کے گمان کے اعتبار سے کہا گیا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی کہ وہ وحید ہے۔

ایک قوم کی یہ رائے ہے: وَحِیۡدًا کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے اس کے پھر دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) اس کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دے میں اس سے انتقام لینے میں کسی بھی منتقم کی جانب سے تجھے بہتر بدلہ دوں گا (۲) میں نے اسے تنہا پیدا کیا ہے اس کی تخلیق میں میرے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوا، میں اسے ہلاک کروں گا اور اس کے ہلاک کرنے میں کسی مددگار کا محتاج نہیں اس صورت میں وَحِیۡدًا ضمیر فاعل سے حال ہوگا وہ خَلَقۡتُ میں تاء ہے۔ پہلا قول مجاہد کا ہے: میں نے اسے اس کی ماں کے پیٹ میں تنہا پیدا کیا اس کے پاس کوئی مال اور اولاد نہ تھی میں نے اس پر انعام کیا تو اس نے کفر کیا۔ اس صورت میں وَحِیۡدًا ولید کی طرف لوٹے گا۔ یعنی اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا میں نے اسے ہر چیز کا مالک بنایا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے یہ ارادہ کیا ہے کہ اس امر پر دلالت کرے وہ اسے تنہا اٹھائے گا جس طرح اسے تنہا پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وحید سے مراد وہ شخص ہے جس کا باپ معلوم نہ ہو۔ ولید کے بارے معروف یہ تھا کہ وہ بداصل تھا جس طرح ہم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ (القلم) وہ ترش رو ہے اس سے بڑھ کر وہ بداصل ہے۔ یہ بھی ولید کی صفت میں ہے۔

وَّ جَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾ میں نے اسے لمبا چوڑا مال عطا کیا۔ یہ ولید کا مکہ مکرمہ اور طائف میں مال تھا جس میں اونٹ، گھوڑیاں، جانور، باغات، غلام اور لونڈیاں تھیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہی کہا کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا: اس کا نفع ایک ہزار دینار تھا؛ یہ سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: چھ ہزار دینار۔ سفیان ثوری اور قتادہ نے کہا: چار ہزار دینار۔ ثوری نے کہا: دس لاکھ دینار۔ مقاتل نے کہا: اس کا ایک باغ تھا جس کا پھل موسم سرما اور موسم گرما میں ختم نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد ہے مہینہ بمہینہ نفع۔ نعمان بن سالم نے کہا: اس سے مراد ہے ایسی زمین جس میں فصل کاشت کی جاتی۔ قشیری نے کہا: زیادہ ظاہر یہ ہے اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا رزق ختم نہ

ہوگا بلکہ وہ پے در پے جاری رہے گا جس طرح کھیتی، جانور اور تجارت۔

وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا۝ یعنی ایسے بیٹے جو اس کے پاس حاضر رہتے کسی کام کی وجہ سے غائب نہ ہوتے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: وہ دس تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ بارہ تھے؛ یہ سدی اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ ضحاک نے کہا: سات مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور پانچ طائف میں پیدا ہوئے۔ سعید بن جبیر نے کہا: وہ تیرہ تھے۔ مقاتل نے کہا: وہ سات تھے سب کے سب بہادر تھے ان میں سے تین مسلمان ہوئے خالد، ہشام اور ولید بن ولید۔ کہا: ولید اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لگا تار مال اور اولاد کے بارے میں نقصان میں رہا یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہاں شُهُوْدًا سے مراد ہے جب اس کا ذکر کیا جاتا تو ان کا بھی ساتھ ہی ذکر کیا جاتا؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں شُهُوْدًا سے مراد یہ ہے کہ جن مجالس میں وہ حاضر ہوتا یہ بھی اس کی طرح حاضر ہوتے اور جو کام وہ کرتے یہ بھی وہ کرتے۔ پہلا قول سدی کا ہے وہ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے تجارت کے لیے وہ اس کے پاس سے دور نہ جاتے اور نہ ہی غائب ہوتے۔

وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا۝ میں نے اسے زندگی میں فراخی عطا کی یہاں تک کہ وہ اپنے شہر میں ہی مطمئن، خوشحال قیام کرتا ہے، اس کی رائے سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ عربوں کے ہاں تمہید کا معنی ہے تیار کرنا، بچھانا۔ اسی سے بچے کا پنگھوڑہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں نے اسے یمن اور شام میں وسعت عطا کی ہے؛ یہی مجاہد کا قول بھی ہے۔ مجاہد سے یہ بھی قول مروی ہے کہ اس کا مال اوپر نیچے پڑا ہے جس طرح بستر کو نیچے بچھایا جاتا ہے۔

ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ۝ یعنی ولید اس کے بعد بھی طمع کرتا ہے کہ میں اس سے زیادہ اسے مال اور اولاد عطا کروں۔ كَلَّا وہ نعمتوں کا جو انکار کرتا رہا ہے اس کے ساتھ یہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء نے کہا: پھر وہ طمع کرتا ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں۔ ولید کہا کرتا تھا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں تو جنت تو پھر صرف میرے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرنے اور اس کو جھٹلانے کے لیے كَلَّا کا ذکر کیا یعنی میں اس کے مال میں اس کے مال میں اضافہ نہیں کروں گا۔ وہ لگا تار مال اور اولاد میں نقصان دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

ثُمَّ يَطْمَعُ میں ثُمَّ عاطفہ نہیں بلکہ تعجب کا اظہار کرنے کے لیے ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۝ (الانعام) اس نے تاریکیاں اور نور بنایا پھر بھی کافر اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ اس طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: میں نے تجھے عطا کیا پھر بھی تو مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ یہ بات وہ کرتا ہے جو تعجب کا اظہار کرتا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ طمع کرتا تھا کہ میں اس کے وارثوں میں بھی یہ مال اسی طرح چھوڑے رکھوں۔ کیونکہ وہ کہا کرتا تھا: بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسل نہیں، ان کی موت کے ساتھ ہی ان کا ذکر ختم ہو جائے گا۔ وہ گمان رکھتا تھا کہ اسے جو رزق دیا گیا ہے وہ اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کے کفر پر

اس کی مدد کروں گا۔ کَلَّا ہر اس کی امید کو ختم کرنے کے لیے ہے جو وہ زیادہ مال کی طمع کرتا تھا۔ یہ پہلی کلام کے ساتھ متصل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کَلَّا یہ حق کے معنی میں ہے یہاں سے کلام کی ابتداء ہوگی۔

اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ یعنی ولید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جو وہ پیغام حق لائے ہیں اس سے عناد رکھتا تھا۔ جس طرح یہ کہا جاتا تھا: عاند، عنید جیسے جالس، جلیس؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ عَنَدَ یَعْنِدُ کسرہ کے ساتھ ہو اس کا معنی حق کی مخالفت کرنا ہے اور اس کا رد کرنا ہے جب کہ وہ حق کو پہچانتا ہو اس سے اسم فاعل عنید اور عاند استعمال ہوتا ہے۔ عاند اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جو راستہ سے بھٹک جائے اس کی جمع عُنَّد آتی ہے جس طرح راکع کی جمع رُکَّع آتی ہے؛ ابوعبیدہ نے حارثی کا شعر ذکر کیا:

إذا رَكِبْتُ فاجْعَلَانِي وَسَطًا　　إِنِّي كَبِيرٌ لاأُطِيقُ الْعُنَّدَ

جب میں کوچ کرتا ہوں تو وہ دونوں مجھے درمیان میں رکھ لیتے ہیں میں بوڑھا ہو چکا ہوں میں راستہ نہیں بھٹکتا۔

ابوصالح نے کہا: عنید کا معنی مباعد ہے؛ شاعر نے کہا:

أَرَانا على حالٍ تُفَرِّقُ بَيْنَنَا　　نَوَى غَرْبَةٌ إنَّ الفِرَاقَ عَنُود

اس نے ہمیں ایسی حالت میں دکھایا جب کہ دوری ہمارے درمیان جدائی ڈال رہی تھی بے شک فراق بہت دوری کا ہے۔

قتادہ نے کہا: اس کا معنی انکار کرنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے اعراض کرنے والا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: بہت زیادہ انکار کرنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اپنی دشمنی کو ظاہر کرنے والا ہے۔ مجاہد نے بھی یہی کہا ہے: اس کا معنی ہے حق سے پہلوتہی کرنے والا، اس سے دشمنی رکھنے والا اور اس سے اعراض کرنے والا۔ سب کا معنی قریب قریب ہے۔ عرب کہتے ہیں: عند الرجل۔ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ حد سے تجاوز کر جائے۔ اونٹوں میں سے عنود اسے کہتے ہی جو اونٹوں کے ساتھ ملتا جلتا نہ ہو بلکہ وہ ایک طرف میں رہتا ہے۔ رجل عنود اسے کہتے ہیں جب وہ تنہا پڑاؤ ڈالتا ہو اور لوگوں کے ساتھ میل جول نہ رکھتا ہو۔ عنید یہ تجبر (اپنے آپ کو سرکش سمجھنا) کا پیکر ہے۔ عرق عاند اس رگ کو کہتے ہیں جس کا خون نہ رکے۔ یہ سب ایک ہی قیاس ہے۔ سورۂ ابراہیم میں اس کی بحث گزر چکی ہے۔ عنید کی جمع عُنُد ہے جس طرح رغیف کی جمع رُغُف آتی ہے۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ میں اسے صَعُوْدًا پر چڑھنے کا مکلف بناؤں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: میں اسے مجبور کروں گا۔ کلام عرب میں ارھاق سے مراد یہ ہے کہ انسان کو کسی شی پر مجبور کیا جائے۔ صَعُوْدًا جہنم میں ایک پہاڑ ہے جہنمی ستر سال تک اس پر چڑھتا رہے گا پھر اتنا عرصہ نیچے گرتا رہے گا، یہ ہمیشہ اسی طرح ہوگا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اس بارے میں انہوں نے کہا: یہ حدیث غریب ہے (1)۔ عطیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ صعود جہنم میں ایک چٹان ہے جب جہنمی اس پر اپنا ہاتھ رکھیں گے تو ان کے ہاتھ پگھل جائیں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو وہ ہاتھ ٹھیک ہو

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ جہنم، باب ماجاء فی صفۃ قعر جہنم، حدیث نمبر 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائیں گے۔ کہا: جہنمی اس کی بلندی تک چالیس سال تک پہنچے گا اسے سامنے سے زنجیروں سے کھینچا جا رہا ہو گا اور پیچھے سے انہیں گرز مارے جا رہے ہوں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کی بلندی تک پہنچے گا تو اسے اس کی پستی کی طرف پھینک دیا جائے گا ہمیشہ اس کے ساتھ یہی سلوک جاری رہے گا۔ یہی بحث سورۂ قُلْ اُوْحِيَ میں گزر چکی ہے۔ تفسیر میں ہے: یہ ایک ملائم چٹان ہے جس پر چڑھنے کا اسے حکم دیا جائے گا جب وہ اس کی بلندی تک پہنچے گا تو اسے جہنم میں گرا دیا جائے گا تو جہنم کی گہرائی تک پہنچنے تک ہزار سال تک گرتا ہی رہے گا۔ ہر ستر دنوں میں اسے ایک بار جلایا جائے گا پھر اسے نئے سرے سے پیدا کر دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں اسے عذاب کی مشقت میں ڈالوں گا جس میں اس کے لیے کوئی راحت نہ ہو گی؛ اس کی مثل حضرت حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کی روح نکلنے کے لیے بلند ہو گی اگرچہ اسے موت واقع نہ ہو گی اسے جسم کے اندر سے اسی طرح عذاب دیا جائے گا جس طرح اسے خارج سے عذاب دیا جائے گا۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

"اس نے غور کیا اور پھر ایک بات طے کر لی، اس پر پھٹکار اس نے کتنی بری بات طے کی، اس پر پھر پھٹکار کیسی بری بات اس نے طے کی، پھر دیکھا پھر منہ بسورا اور ترش رو ہوا، پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا اور بولا: یہ نہیں ہے مگر جادو جو پہلوں سے چلا آتا ہے یہ نہیں مگر انسان کا کلام"۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ ولید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے متعلق غور و فکر کیا اور اپنے دل میں کلام کو سوچا۔ عرب کہتے ہیں: قدرت الشئی جب تو اسے تیار کرے یہ اس وجہ سے ہوا جب حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ (المومن) تک نازل ہوئی۔ ولید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیات پڑھتے ہوئے سنا اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے ان سے ایسی کلام سنی ہے جو نہ انسانوں کی کلام ہے اور نہ ہی جنوں کی کلام ہے، اس میں مٹھاس ہے، اس کا ظاہر حسین ہے، اس کا اوپر والا حصہ پھل دار ہے، اس کا نیچے والا حصہ گہرا ہے، وہ خود بلند ہے، اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا، کوئی انسان ایسی کلام نہیں کر سکتا۔ قریش نے کہا: ولید بے دین ہو گیا تمام قریش اپنا دین چھوڑ جائیں گے۔ ولید کو ریحانہ قریش کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ابوجہل نے کہا: میں تمہاری جانب سے اسے کافی ہوں۔ وہ اس کے پاس غمگین بن کر گیا۔ ولید نے اس سے کہا: کیا وجہ ہے میں تجھے غمگین دیکھتا ہوں؟ ابوجہل نے ولید سے کہا: میں کیوں غمگین نہ ہوں؟ یہ قریشی تیرے لیے روزینہ جمع کر رہے ہیں وہ تیرے بڑھاپے میں تیری مدد کرنا چاہتے ہیں وہ گمان کرتے ہیں کہ تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو زینت والا قرار دیا ہے اور تو ابن ابی کبشہ اور ابن ابی قحافہ کے پاس جاتا ہے تاکہ تو ان کے بچے ہوئے کھانے کو کھائے۔ ولید غضب ناک ہو گیا اور تکبر کا اظہار کیا اور کہا: میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی کے ٹکڑوں کا محتاج ہوں جب کہ تم تو میرے مال کی قدر و منزلت کو جانتے ہو۔ لات و عزیٰ کی

قسم! مجھے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں تم گمان کرتے ہو کہ محمد مجنون ہیں کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ان کا گلا کبھی بند ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ الله کی قسم! اس نے کہا تم گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے؟ کیا تم نے کبھی اسے دیکھا ہے کہ کبھی اس نے شعر کہا ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں الله کی قسم! اس نے کہا تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ جھوٹا ہے کیا تمہیں اس کے جھوٹ بولنے کا کبھی تجربہ ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں الله کی قسم! اس نے کہا: تم گمان کرتے ہو کہ وہ کاہن ہے کیا تم نے اسے کہانت کرتے ہوئے دیکھا ہے ہم نے تو کاہنوں کو سجع والی گفتگو کرتے ہوئے اور باتوں کو خلط ملط کرتے ہوئے دیکھا ہے کیا تم نے انہیں بھی کبھی ایسے کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں الله کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق امین کے لقب سے یاد کیا جاتا کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ قریش نے ولید سے کہا: بتاؤ وہ کیا ہے؟ اس نے دل میں سوچا پھر غور وفکر کیا پھر چیں بجبیں ہوا اور کہا: وہ صرف جادوگر ہے (نعوذ باللہ) کیا تم نے اسے نہیں دیکھا کہ وہ میاں بیوی، اس کے بچوں اور اس کے غلاموں میں جدائی ڈال دیتا ہے؟ الله تعالیٰ کے فرمان کا بھی یہی معنی ہے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں سوچا، اس نے دل میں اندازہ لگایا جو وہ زیادہ سے زیادہ ان دونوں کے متعلق کہہ سکتا تھا۔ **فَقُتِلَ** اس پر لعنت ہو۔ بعض علماء اس کی تاویل میں کہتے ہیں: اس کا معنی ہے وہ مقہور مغلوب ہو کیونکہ ہر وہ شخص جسے مغلوب و مسخر کر لیا جائے وہ قتل کیا گیا ہی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

وَمَا ذَرَفَتْ عيناكِ إلّا لِتَقْدَحِي بِسَهْمَيْكِ فِي أَعْشَارِ قَلْبٍ مُقَتَّلِ

تیری آنکھیں نہیں بہیں مگر اس لیے کہ تو اپنے دو تیروں سے مغلوب کے دل میں زخم لگا دے۔

زہری نے اس کا معنی کیا ہے: اسے عذاب دیا جائے گا تو یہ بددعا ہوگی۔

**كَيْفَ قَدَّرَ ⑲** لوگوں نے کہا: **كَيْفَ** تعجب کے اظہار کے لیے ہے جس طرح ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جس کے عمل پر تعجب کا اظہار کیا جائے: کیف فعلت هذا تو نے یہ کام کیسے کر لیا؛ اس معنی میں الله تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: **اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ** (فرقان: 9)

دیکھ تو اس نے تیرے بارے میں کیسی مثالیں ذکر کی ہیں **ثُمَّ قُتِلَ** اس پر لعنت کے بعد لعنت ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ایک سزا سے قتل ہو پھر دوسرے عذاب سے قتل ہو۔ **كَيْفَ قَدَّرَ** اس نے کس حال پر اندازہ لگایا۔ **ثُمَّ نَظَرَ ⑳** کس شے کے ساتھ وہ حق کو لوٹاتا ہے۔ **ثُمَّ عَبَسَ** اس نے مومنوں کے سامنے اپنی آنکھوں کے درمیان بل ڈالا اس کی وجہ یہ تھی جب ولید نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قریش کو جس قسم کی گفتگو پر ابھارا کہ وہ جادوگر ہے تو ولید مسلمانوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا انہوں نے ولید کو اسلام کی طرف دعوت دی تو وہ چیں بجبیں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس پر ناراض ہوا اور چہرے پر درشتگی کے آثار لایا۔ **عَبَسَ** کو جب تخفیف کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ عَبَسَ، یَعْبِسُ. عَبْسًا، عُبُوسًا کا مصدر ہوگا یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ ماتھے پر بل لائے۔ **عَبَسَ** اس پیشاب اور گوبر کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ ابو النجم نے کہا:

كَأَنَّ فِي أَذْنَابِهِنَّ الشُّوَّلِ مِن عَبَسِ الصَّيْفِ قُرُونَ الْأَيِّلِ

گویا ان کی اٹھی ہوئی گردنوں میں موسم گرما کی سختی میں بارہ سنگا کے سینگ ہیں۔

**وَبَسَرَ۝** اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور اس کا رنگ بدل گیا؛ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے، اس معنی میں بشر بن ابی حازم کا قول ہے:

صَبَحْنَا تَمِيمًا غَدَاةَ الجِفَارِ بِشَهْبَاءَ مَلْمُومَةٍ بَاسِرَةٍ

ہم نے جفار کی صبح بنوتمیم پر حملہ کیا مسلح جماعتوں والے ترش رو لشکروں کے ساتھ۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وقَدْ رَابَنِي مِنْهَا صُدُودٌ رَأَيْتُهُ وإعراضُها عَنْ حاجتي وبُسُورُهَا

مجھے شک میں ڈال دیا اس کے رکنے نے جو میں نے دیکھا، میری ضرورت کے اعراض نے اور اس کی ترش روئی نے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: چہرہ میں عبوس کا ظہور گفتگو کے بعد ہوتا ہے اور چہرے میں بسور کا ظہور گفتگو سے پہلے ہوتا ہے یعنی عبوس اور بسور چہرے پر درشتگی کے آثار ہیں۔ ایک قوم نے کہا: بسر وہ رک گیا نہ وہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: اس طرح اہل یمن کہتے ہیں قد بسر المرکب۔ سواری رک گئی نہ آتی ہے نہ جاتی ہے۔ ابسر کا معنی بھی رکنا ہے۔ قد ابسر نا ہم رک گئے عرب کہتے ہیں: وجه باسر بین البسور۔ جب وہ متغیر ہو اور سیاہ ہو جائے۔ **ثُمَّ اَدْبَرَ** وہ مڑا اور اپنے گھر جانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ **وَاسْتَكْبَرَ۝** ایمان لانے سے اس نے اپنے آپ کو بڑا جانا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایمان سے اس نے رخ پھیر لیا اور جب اسے ایمان کی طرف دعوت دی گئی تو اس نے تکبر کیا۔ **فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۝** یعنی جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے ہیں یہ نہیں ہے مگر ایسا جادو جو کسی دوسرے سے بیان کرتے ہیں۔ سِحْرٌ کا معنی دھوکہ ہے۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے کہا: سِحْرٌ کا مطلب ہے حق کی صورت میں باطل کو ظاہر کرنا۔ اثرہ یہ تیرے اس قول کا مصدر ہے أثرت الحديث أثرة۔ جب تو اس بات کو غیر سے بیان کرے۔ اس معنی میں حدیث ماثور ہے یعنی جسے بعد میں آنے والا پہلے آنے والوں سے بیان کرتا ہے؛ امراء القیس نے کہا:

لَقُلْتُ مِنَ القولِ ما لَا يَزَا لُ يُؤْثَرُ عَنِّي يَدَ المُسْنَدِ

میں نے ایسی بات کہی جو مجھ سے ہمیشہ بیان کی جاتی رہے گی۔ اعشیٰ نے کہا:

إنّ الذي فيه تمارَيْتُمَا بُيِّنَ لِلسَّامِعِ والآثِرِ

وہ چیز جس میں تم شک کا اظہار کر رہے ہو؛ وہ سامع اور بعد میں آنے والوں کے لیے واضح ہے۔

**اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۝** یہ نہیں ہے مگر مخلوق کا کلام۔ دل اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں جس طرح جادو سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ سدی نے کہا: وہ یہ مراد لیتے کہ یہ یسار کا کلام ہے جو بنی حضرمی کا غلام تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام سے سیکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے اہل باطل سے اسے سیکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مسیلمہ سے اسے سیکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: عدی حضرمی کاہن سے اسے سیکھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اس سے سیکھا ہے جس نے ان سے پہلے دعویٰ نبوت کیا، تو کلام انہیں کے انداز میں کی گئی۔ ابو سعید ضریر نے

کہا: یہ نہیں ہے مگر ایسا امر جو نسل در نسل چلا آرہا ہے۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝۲۶ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷ لَا تُبْقِیْ وَ لَا تَذَرُ ۝۲۸ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝۲۹

''عنقریب میں اسے جہنم میں جھونکوں گا۔ اور تو کیا سمجھے کہ جہنم کیا ہے، نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے، جھلسا دینے والی آدمی کی کھال کو''۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝۲۶ میں اسے سقر میں داخل کروں گا تا کہ اس کی گرمی تاپے، اس کا نام سقر رکھا یہ سقرتہ الشمس سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب سورج اسے پگھلا دے، اس کو سیاہ کر دے اور اس کے چہرے کی جلد کو جلا دے یہ غیر منصرف ہے کیونکہ علمیت اور عجمہ کا سبب موجو ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ جہنم کا چھٹا طبقہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا اے میرے رب! تیرے بندوں میں سے کون سب سے محتاج ہے؟ فرمایا: سقر کا مستحق''۔ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷ یہ اس کے وصف میں مبالغہ کے لیے ہے تجھے کس چیز نے بتایا کہ وہ کیا چیز ہے؟ یہ کلمہ تعظیم ہے پھر اس کی تفسیر بیان کی ارشاد فرمایا: لَا تُبْقِیْ وَ لَا تَذَرُ ۝۲۸ وہ ان کی ہڈی، گوشت اور خون نہیں چھوڑے گا وہ سب کچھ جلا دے گی تا کید کے طور پر اسے مکرر ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے کسی چیز کو نہیں چھوڑے گی پھر انہیں تازہ جسموں کے ساتھ لایا جائے گا وہ انہیں چھوڑے گی یعنی دوبارہ اسی طرح جلا دے گی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ مجاہد نے کہا: ان میں جو زندہ ہو گا انہیں باقی نہ رکھے گی اور نہ اسے مردہ چھوڑے گی جب بھی انہیں نئے جسم عطا کیے جائیں گے آگ انہیں جلاتی رہے گی۔ سدی نے کہا: وہ ان کے گوشت کو باقی نہ رکھے گی اور ان کی ہڈی کو نہ چھوڑے گی۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝۲۹ چمڑے کو بدل دے گی۔ یہ لاحہ سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اسے تبدیل کرے۔ عام قراء کی قراءت لَوَّاحَةٌ رفع کے ساتھ ہے یہ سقر کی صفت ہے جو وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝۲۷ میں ہے۔ عطیہ عوفی، نصر بن عاصم اور عیسیٰ بن عمر نے لواحۃً نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ اختصاص کے طریقہ پر منصوب ہے۔ مقصود ہولنا کی بیان کرنا ہے۔ ابورزین نے کہا: ان کے چہروں پر ایک لپک پڑے گی جو ان کے چہروں کو رات سے بھی زیادہ سیاہ کر کے چھوڑے گی، یہ مجاہد کا قول ہے۔ عرب کہتے ہیں: لاحه البرد والحر والسقم والحزن سردی، گرمی، بیماری اور غم نے اسے سیاہ کر دیا اور اس کے چہرے کو بدل دیا؛ اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

تَقُولُ مَالَاحَكَ یَا مُسَافِرُ یَا بْنَةَ عَمِّی لَاحَنِی الْهَوَاجِرُ

وہ کہتی ہے: اے مسافر! کس چیز نے تیرے چہرے کی رنگت کو بدل دیا ہے اے چچازاد بہن! دوپہر کی لپکوں نے میرے چہرے کو سیاہ کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوح کا معنی سخت پیاس ہے۔ کہا جاتا ہے: لاحه العطش ولوحه۔ پیاس نے اس کے چہرے کے رنگ کو بدل دیا۔ معنی یہ ہو گا وہ انسانوں یا جہنمیوں کے لیے پیاس ہو گی؛ یہ اخفش کا قول ہے؛ اس نے یہ شعر پڑھا:

سَقَتْنِي على لَوْحٍ منَ الماءِ شَرْبَةً    سقاها بها اللهُ الرِّهامَ الغواديا

اس نے مجھے شدید پیاس میں پانی کا ایک گھونٹ پلایا اللہ تعالیٰ اسے ہلکی بارش سے سیراب کرے۔

حضرت ابن عباس نے کہا: لَوَّاحَةٌ یعنی وہ انسان کے لیے پانچ سو سال کی مسافت سے ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت حسن بصری اور ابن کیسان نے کہا: جہنم ان کے لیے ظاہر ہو گی یہاں تک کہ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۝ (الشعراء) جہنم سرکشوں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی۔ بشر کی دو توجیہیں ہیں۔ (۱) اس سے مراد جہنمی انسان ہیں؛ یہ اخفش اور اکثر لوگوں کا خیال ہے۔ (۲) یہ بشرہ کی جمع ہے۔ یہ انسان کی ظاہری جلد ہے، یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ بشرہ کی جمع ابشار ہے۔ پہلی تفسیر کی بنا پر درست ہو سکتا ہے جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کا تعلق ہے اس میں لوگ ہی درست ہو سکتے ہیں جلدیں درست نہیں ہو سکتے۔ یہ لاح الشیء یلوح سے مشتق ہے جس کا معنی چمکنا ہے۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝

''اس پر انیس فرشتے مقرر ہیں اور ہم نے مقرر نہیں کیے آگ کے داروغے مگر فرشتے اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر آزمائش ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا تا کہ یقین کر لیں اہل کتاب اور بڑھ جائے اہل ایمان کا ایمان اور نہ شک میں مبتلا ہوں اہل کتاب اور مومن اور تا کہ کہنے لگیں جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفار: کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے اس بیان سے، یونہی اللہ تعالیٰ (ایک ہی بات سے) گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے، اور نہیں ہے یہ بیان مگر نصیحت لوگوں کے لیے''۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ یعنی سقر پر انیس فرشتے ہیں جو جہنم میں جہنمیوں سے ملاقات کریں گے پھر کہا گیا: مجموعی جہنم پر انیس فرشتے ہیں وہی اس کے خازن ہیں ایک مالک اور باقی اٹھارہ۔ یہ احتمال ہے انیس نقیب ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے انیس فرشتے ہوں۔ اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے۔ ثعلبی نے کہا: اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا جب ایک فرشتہ تمام مخلوق کی ارواح کو قبض کر سکتا ہے تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ انیس فرشتے بعض مخلوق کے عذاب پر متعین ہوں۔ ابن جریج نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کے داروغوں کی صفت بیان کی فرمایا: ''گویا ان کی آنکھیں بجلیاں ہیں، ان کے منہ قلعے ہیں، وہ اپنے بال

کھینچتے ہوں گے، ان میں سے ایک میں اتنی طاقت ہوگی جتنی جن وانس میں طاقت ہے، ان میں سے ایک پوری امت کو ہانک لے گا اس کی گردن پر ایک پہاڑ ہوگا وہ ان سب کو آگ میں پھینک دے گا اور ان پر پہاڑ پھینک دے گا''۔

میں نے کہا: ابن مبارک نے ذکر کیا کہا حماد بن سلمہ، ازرق بن قیس سے وہ بنی تمیم کے ایک آدمی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم ابوعوام کے پاس تھے انہوں نے اس آیت کو پڑھا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ پوچھا: یہ انیس کیا ہے، انیس ہزار فرشتے یا انیس فرشتے؟ میں نے کہا: نہیں بلکہ انیس فرشتے۔ پوچھا: تو نے یہ کہاں سے سیکھا؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کہا: تو نے سچ کہا وہ انیس فرشتے ہیں ان میں سے ہر ایک فرشتے کے پاس ایک گرز ہوگا جس کی آگے دو شاخیں ہوں گی وہ ایک ضرب لگائے گا تو اس کے ساتھ ستر ہزار افراد کو جہنم میں گرادے گا۔ حضرت عمرو بن دینار سے مروی ہے: ان میں سے ہر ایک، ایک ہی دھکے کے ساتھ ربیعہ اور مضر سے زیادہ افراد کو جہنم میں ڈال دے گا۔

امام ترمذی نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ یہودیوں نے کچھ صحابہ کرام سے کہا: کیا تمہارا نبی جہنم کے داروغوں کی تعداد کو جانتا ہے؟ صحابہ نے کہا: جب تک ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ پوچھ لیں ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی مغلوب ہو گئے پوچھا: ''وہ کیسے مغلوب ہوئے؟'' اس نے عرض کی: یہودیوں نے ان سے سوال کیا: کیا تمہارا نبی جہنم کے داروغوں کو جانتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''صحابہ نے کیا جواب دیا؟'' اس نے عرض کی: صحابہ نے کہا ہم کچھ نہیں جانتے یہاں تک کہ ہم اپنے نبی سے سوال کرلیں۔ فرمایا: ''کیا وہ قوم مغلوب ہوگئی جن سے ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ نہ جانتے تھے تو انہوں نے یہ کہا اسے نہیں جانتے جب تک ہم اس کے بارے میں اپنے نبی سے نہ پوچھ لیں؟ جب کہ انہوں نے تو اپنے نبی سے یہ سوال کیا تھا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ عیاں دکھا۔ اللہ کے دشمنوں کو میرے پاس لے آؤ میں ان سے جنت کی مٹی کے بارے میں سوال کرنے والا ہوں جب کہ وہ میدے کی طرح سفید ہے جب وہ آ گئے انہوں نے عرض کی: اے ابا القاسم! جہنم کے داروغوں کی تعداد کتنی ہے؟ فرمایا: اتنی اتنی''۔ ایک دفعہ دس انگلیوں کے ساتھ اشارہ کیا اور دوسری دفعہ نو کے ساتھ۔ انہوں نے کہا: ہاں (اتنی ہی ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''جنت کی مٹی کیسی ہے؟'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہا: اے ابا القاسم! کیا وہ روٹی جیسی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ فرمایا: روٹی میدے کی ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اسی سند سے جانتے ہیں یعنی مجاہد، شعبی سے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں (1) ابن وہب نے ذکر کیا اس نے کہا عبدالرحمن بن زید نے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہنم کے داروغوں کے بارے میں فرمایا: ''ان میں سے ایک کے کندھوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا مشرق و مغرب کے درمیان ہوتا ہے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان میں سے ایک کے کندھوں کے درمیان فاصلہ ایک سال کی مسافت ہوگی، ان میں سے ایک کی

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ المدثر، حدیث نمبر 3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قوت یہ ہوگی کہ وہ ایک گرز مارے گا تو ایک ہی دفعہ ستر ہزار انسانوں کو جہنم میں پھینک دے گا۔

میں کہتا ہوں: انشاء اللہ صحیح یہ ہے کہ یہ انیس سردار اور نقیب ہیں جہاں تک ان کی کل تعداد کا تعلق ہے عبارت اس کے اظہار سے عاجز ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (مدثر: 31) تیرے رب کے لشکروں کو اس ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس دن جہنم کو لایا جائے گا جس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور ضحاک نے کہا: جب عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ آیت نازل ہوئی؛ ابوجہل نے قریش سے کہا: تمہاری مائیں تم پر روئیں میں ابن ابی کبشہ کو سنتا ہوں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جہنم کے انیس دارو غے ہیں جب کہ تمہاری اتنی تعداد اور تم اتنے بہادر ہو کیا تم اس بات سے بھی عاجز ہو کہ تم میں سے دس آدمی ایک کو پکڑ لیں؟ سدی نے کہا: ابو اسود بن کلدہ جمحی نے کہا: انیس تمہیں پریشان نہ کریں میں اپنے دائیں کندھے سے دس فرشتوں اور اپنے بائیں کندھے سے نو کو روک لوں گا، پھر تم جنت میں داخل ہو جانا۔ وہ یہ بات بطور مزاق کے کیا کرتا۔ ایک روایت میں ہے حرث بن کلدہ نے کہا: میں سترہ کو تمہاری جانب سے کافی ہوں، تم میری جانب سے دو کو کافی ہو جانا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ابوجہل نے یہ کہا تھا: کیا تم میں سے سو عاجز ہیں کہ ان میں ایک کو پکڑ لیں پھر تم جہنم سے نکل جاؤ تو یہ آیت نازل ہوئی وَ مَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓىِٕكَةً یعنی ہم نے انہیں انسان نہیں بنایا کہ تم ان پر غلبہ پا سکو۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہیں فرشتے اس لیے بنایا کیونکہ وہ جن وانس کے خلاف ہوں جنہیں عذاب دیا جانے والا ہے تو انہیں وہ چیز اپنی گرفت میں نہ لے گی جو شفقت اور رحمت ہم جنس کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ دارو غے جہنمیوں کے لیے راحت طلب نہیں کریں گے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو بجالانے والے اور اس کے لیے غضب ناک ہونے والی سب سے قوی مخلوق ہے کہ ان کی نرمی فائدہ دے۔ ایک اور وجہ یہ ہے وہ پکڑ اور قوت کے لحاظ سے سب سے قوی مخلوق ہے۔ وَّ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً فتنہ کا معنی آزمائش ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے: ہم نے اس تعداد کو کافروں کے لیے گمراہی بنا دیا ہے، اس سے مراد ابوجہل اور اس کے ساتھی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فتنہ سے مراد عذاب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ اس روز انہیں آگ پر عذاب دیا جائے گا تم اپنے عذاب کو چکھو۔ (الذاریات)

یعنی ہم نے اسے ان کے کفر اور عذاب کا سبب بنا دیا۔

تِسْعَةَ عَشَرَ میں سات قرائتیں ہیں عام قراءت تِسْعَةَ عَشَرَ ہے۔ ابوجعفر بن قعقاع اور طلحہ بن سلیمان نے عین کو ساکن کرتے ہوئے تسعۃَ عْشَرَ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تسعۃُ عشرَ منقول ہے۔ حضرت انس بن مالک سے تسعۃُ وعشرٌ، تسعۃُ وعشرُ، تسعۃُ اعشرَ منقول ہے؛ مہدوی نے اسے ذکر کیا ہے۔ جس نے تسعۃَ عْشَرَ پڑھا ہے اس نے عین کو اس لیے ساکن کیا ہے کیونکہ پے در پے حروف متحرک آرہے ہیں۔ جس نے اسے تسعۃ وعشر پڑھا ہے وہ اسے ترکیب سے قبل اصل پر لایا ہے اور عشر کو تسعۃ پر معطوف کیا ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے تنوین کو حذف کر دیا اور

عشر کی راء کو سکوت کے ارادہ سے ساکن پڑھا ہے جس نے تسعۃ عَشَر پڑھا ہے گویا یہ تداخل سے ہے گویا اس نے عطف کا ارادہ کیا اور ترکیب کو ترک کر دیا۔ تسعۃ اعشر یہ قراءت معروف نہیں۔ ابو حاتم نے اس قراءت کا انکار کیا ہے۔ اسی طرح تسعۃ وعشر ہے کیونکہ یہ بھی تِسْعَةَ عَشَرَ پر محمول ہے واؤ ہمزہ کا بدل ہے۔ نحویوں کے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں۔ زمخشری نے کہا: اسے تسعۃ اعشر پڑھا گیا ہے اعشر، عشیر کی جمع ہے جس طرح یمین کی جمع ایمن آتی ہے۔

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ تا کہ جنہیں تورات اور انجیل دی گئی ہے انہیں یقین ہو جائے کہ جہنم کے داروغوں کی جو تعداد ذکر کی گئی ہے وہ اس کے موافق ہے جو ان کے پاس تعداد مذکور ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور دوسرے لوگوں کا قول ہے۔ پھر یہ احتمال ہے کہ اہل کتاب میں سے مومن مراد ہیں حضرت عبد اللہ بن سلام۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے سب مراد ہیں۔ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا اور اس لیے تا کہ اس پر ایمان رکھنے والوں کے ایمان میں اضافہ ہو کیونکہ جب بھی انہوں نے کتاب اللہ میں موجود چیز کی تصدیق کی وہ ایمان لائے پھر جب انہوں نے جہنم کے داروغوں کی تعداد کی تصدیق کی تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوا۔ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اہل کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس بات میں شک نہیں کرتے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد انیس ہے۔ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی اہل مدینہ کے منافقوں کے سینوں میں شک اور نفاق ہے جو ہجرت کے بعد آئندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والے تھے۔ مکہ مکرمہ میں کوئی نفاق نہیں تھا یہ مدینہ طیبہ میں ظاہر ہوا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تا کہ وہ منافق کہیں جو آئندہ زمانہ میں ہجرت کے بعد ظاہر ہونے والے تھے۔ وَالْكٰفِرُوْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا یعنی جہنم کے داروغوں کی تعداد سے اللہ تعالیٰ نے کیا ارادہ کیا ہے۔

حسین بن فضل نے کہا: سورت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں نفاق نہیں تھا۔ اس آیت میں مرض سے مراد اختلاف ہے اور کفار سے مراد عرب کے مشرک ہیں؛ اکثر مفسرین کی رائے پہلے قول کے موافق ہے۔

یہ بھی جائز ہے مَّرَضٌ سے مراد شک اور ارتیاب ہو، کیونکہ اہل مکہ میں سے اکثر شک کرنے والے تھے۔ بعض قطعی طور پر جھٹلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کے بارے میں خبر دیتا ہے: مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا وہ عدد جو بطور حکایت ذکر کیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے کس چیز کا ارادہ کیا ہے یعنی یہ کیسی حکایت ہے۔ لیث نے کہا: مثل کا معنی حکایت ہے اس معنی میں مثل الجنة التی وعد المتقون ( رعد: 35 )

اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے داروغوں کے بارے میں جس طرح ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کو گمراہ کیا جس کو چاہتا ہے، رسوا کرتا ہے اور اندھا بنا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہدایت عطا فرمائی۔ ایک قول یہ کیا گیا: جسے چاہتا ہے جنت سے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کے بارے میں چاہتا ہے اسے راہنمائی دیتا ہے۔

وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کو عذاب دینے کے لیے جنہیں پیدا کیا اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ ابوجہل کے جواب میں کلام کی گئی جس نے یہ کہا تھا: جہاں تک محمد کے لشکروں کا تعلق ہے وہ انیس ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین کی غنیمتیں تقسیم فرمارہے تھے تو حضرت جبرئیل امین حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے ایک فرشتہ آیا اس نے کہا: تیرا رب تجھے یہ حکم دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف ہوا کہ یہ کہیں شیطان ہی نہ ہو فرمایا: اے جبرئیل! کیا تو اسے پہچانتا ہے؟ حضرت جبرئیل نے عرض کی: یہ فرشتہ ہے، میں تیرے رب کے تمام فرشتوں کو نہیں پہچانتا۔

اوزاعی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! آسمان میں کون ہے؟ فرمایا: میرے فرشتے۔ عرض کی: اے میرے رب! ان کی تعداد کتنی ہے؟ فرمایا: بارہ سبط۔ عرض کی: ہر سبط کی کیا تعداد ہے؟ فرمایا: مٹی کے برابر؛ ثعلبی نے یہ دونوں قول ذکر کیے۔ ترمذی شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''آسمان آواز نکالنے لگا اس کو زیبا یہی ہے کہ وہ آواز نکالے اس میں چار انگلیوں کے برابر بھی جگہ نہیں مگر ایک فرشتہ سجدہ کی حالت میں اپنی پیشانی رکھے ہوئے ہے''۔

وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ ذِكْرٰى سے مراد دلائل، حجتیں اور قرآن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا هِيَ سے مراد وہ آگ جو سقر ہے یعنی وہ آگ مخلوقات کے لیے نصیحت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دنیا کی آگ آخرت کی آگ کو یاد کرانے والی ہے؛ یہ زجاج نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا: یہ تعداد نہیں مگر انسانوں کے لیے نصیحت، یعنی وہ نصیحت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کو جانیں وہ اعوان و انصار کا محتاج نہیں۔ اس صورت میں وَ مَا هِيَ کی ضمیر جنود کی طرف لوٹے گی کیونکہ قریب وہ ہی مذکور ہے۔

كَلَّا وَ الْقَمَرِ ۝ وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَ الصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ۝ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝

''ہاں ہاں چاند کی قسم! اور رات کی قسم! جب وہ پیٹھ پھیرنے لگے اور صبح کی جب روشن ہو جائے یقیناً دوزخ بڑی آفتوں میں سے ایک آفت ہے، ڈراوا ہے لوگوں کے لیے ان کے لیے جو تم سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں یا پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔ ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے سوائے اصحاب یمین کے جو جنتوں میں ہوں گے، اہل جنت پوچھیں گے مجرموں سے کہ کس جرم نے تم کو دوزخ میں داخل کیا۔ وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور

مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے اور ہم ہرزہ سرائی کرنے والوں کے ساتھ ہرزہ سرائی میں لگے رہتے اور ہم جھٹلایا کرتے تھے روز جزا کو یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت''۔

کَلَّا وَ الْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ فراء نے کہا: کَلَّا قسم کا صلہ ہے تقدیر کلام یوں ہوگی ای والقمر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے حقا والقمر۔ ان دونوں تقدیروں کی بنا پر کَلَّا پر وقف نہیں ہوگا۔ طبری نے اس پر وقف کو جائز قرار دیا ہے اور اسے ان لوگوں کا رد بنایا ہے جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ جہنم کے داروغوں کا مقابلہ کرسکیں گے یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح وہ آدمی گمان کرتا ہے کہ وہ جہنم کے داروغوں کا مقابلہ کرلے گا، پھر اس امر کو ثابت کرنے کے لیے چاند اور مابعد مذکور چیزوں کی قسم اٹھائی۔

وَ الَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ یعنی جب رات پھرے اسی طرح دَبر کا معنی بھی یہی ہے۔ نافع، حمزہ اور حفص نے اذ ادبر قراءت کی جب کہ باقی قراء نے اذا دبر قراءت کی یعنی اِذْ الف کے ساتھ اور دَبَرَ الف کے بغیر ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ کہا جاتا ہے: دَبَرَ، ادبر اسی طرح قَبِل اللیل واقبل۔ عربوں نے کہا: امس الدابر والمدبر۔ صخر بن عمرو بن شرید سلمی نے کہا:

وَلَقَدْ قَتَلْنَاكُمْ ثُنَاءَ وَ مُوْحَدًا　　وَتَرَكْتُ مُرَّةَ مِثْلَ أَمْسِ الدَّابِرِ

تحقیق ہم نے تمہیں دو دو اور ایک ایک قتل کیا اور میں نے مرہ کو گزشتہ کل کی طرح چھوڑا۔

شعر میں دابر کی جگہ مدبر بھی روایت کیا گیا ہے؛ یہ فراء اور اخفش کا قول ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا: دَبَرَ اللیل۔ جب وہ گزر جائے اور ادبر یعنی وہ پلٹنے لگی۔ مجاہد نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ الَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ کے بارے میں پوچھا تو آپ خاموش ہوگئے یہاں تک کہ وہ پلٹنے لگی۔ فرمایا: اے مجاہد یہ وہ وقت ہے جب رات پلٹتی ہے۔ محمد بن سمیقع نے واللیل اذا ادبر دونوں الفوں کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب کے صحیفوں میں اسی طرح ہے۔ قطرب نے کہا: جس نے دَبَرَ پڑھا تو وہ اس کا معنی اقبل لے گا۔ یہ عربوں کے قول دبر فلان سے ماخوذ ہے۔ جب وہ تیرے پیچھے سے آئے۔ ابوعمرو نے کہا: یہ قریش کی لغت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے جس میں ہے: صحیح اَدْبَرَ ہے کیونکہ وہ اونٹ کی پشت کو زخمی کرتی ہے۔ ابو عبید نے اِذْ اَدْبَرَ کو پسند کیا ہے کیونکہ یہ مابعد حروف کے زیادہ موافق ہے کیا تو نے اسے یہ کہتے ہوئے نہیں دیکھا وَ الصُّبْحِ اِذَاۤ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے ایک جگہ اِذْ ہو اور دوسری جگہ اِذَا ہو۔ قرآن حکیم میں کوئی ایسی قسم نہیں جس کے بعد اِذْ ہو قسم کے بعد اِذَا ہوتا ہے۔ اَسْفَرَ کا معنی روشن ہونا ہے عام قراءت اَسْفَرَ الف کے ساتھ ہے ابن سمیقع نے سَفَرَ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں یہ کہا جاتا ہے: سفر وجہ فلان واسفر یہ اس وقت بولتے ہیں جب چہرہ روشن ہوجائے۔ حدیث طیبہ میں ہے اسفروا بالفجر کو خوب روشن کرو کیونکہ یہ عظیم اجر کا باعث ہوتا ہے(1) مراد یہ ہے صبح کی نماز خوب روشن کرکے پڑھو۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اسے صبح کے روشن ہونے تک لمبا کرو۔ اسفار کا معنی روشن کرنا ہے اسفر وجھہ حسنا اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے روشن ہوا۔ سفرت المراۃ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی الاسفار بالفجر، حدیث نمبر 142، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی عورت نے اپنے چہرہ سے پردہ ہٹا دیا، اس سے اسم فاعل سافر آتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ سفر الظلام سے ماخوذ ہو، یعنی اس نے تاریکی کو دور کیا جس طرح بولتے ہیں سفر البیت یعنی گھر میں جھاڑو دیا جاتا ہے اسی سے سفیر ہے سفیر اسے کہتے ہیں جو درخت کے پتوں میں سے گرے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اسے سفیر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے۔ مسفرۃ کا معنی جھاڑو ہے۔

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝ یہ جواب قسم ہے یعنی یہ جہنم کی آگ بڑی مصیبتوں میں سے ایک ہے۔ مقاتل کی تفسیر میں ہے الکبر جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلانا گناہ کبیرہ میں سے ایک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: قیامت کا برپا ہونا بڑی مصیبتوں میں سے ایک ہے۔ الْكُبَرِ عذابوں میں سے بڑے عذاب کو کہتے ہیں۔ راجز نے کہا:

يابن المُعَلَّى نَزَلَتْ إحدى الكُبَرْ ، داهيةُ الدهر وصَمَّاءُ الغِيَرْ

اے ابن معلیٰ! ایک بڑی مصیبت نازل ہوئی جو زمانے کی مصیبتوں میں سے بڑی ہے۔

کبر کا واحد کبریٰ ہے جس طرح صغر کا واحد صغریٰ ہے اسی طرح عظم اور عظمیٰ ہے عام قراء نے لاحدی پڑھا ہے یہ ایسا اسم ہے جو ابتداءً تانیث کے لیے وضع کیا گیا ہے یہ مذکر پر مبنی نہیں، جس طرح عقبیٰ اور اخریٰ ہے اس کا الف قطعی ہے یہ وصل کی صورت میں بھی نہیں گرتا۔ جریر بن حازم نے ابن کثیر سے انھا لحدی الکبر روایت کیا ہے یعنی ہمزہ کو حذف کر دیا۔

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ یعنی اس صفت سے موصوف آگ لوگوں کو خبردار کرنے والی ہے۔ نَذِيْرًا، انها کی ضمیر سے حال ہے: یہ زجاج کا قول ہے۔ نَذِيْرًا کو مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ اس کا معنی عذاب ہے یا یہ نسبت کے معنی میں ہے یعنی ذات انذار۔ جس طرح ان امثلہ میں اسم فاعل نسبت کے معنی میں ہے: امرأۃ طالق و طاھر۔

خلیل نے کہا نذیر مصدر ہے جس طرح نکیر مصدر ہے اسی وجہ سے اس کے ساتھ اسم مونث کی صفت ذکر کر دی جاتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس سے زیادہ خوفناک چیز کے ساتھ نہیں ڈرایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نذیر سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا لوگوں کو ڈرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ نَذِيْرًا، ثم میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے جو قُمْ فعل سورت کے آغاز میں ہے۔ ارشاد فرمایا: قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ ابو علی فارسی اور ابن زید نے یہ کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ فراء نے اس کا انکار کیا۔ ابن انباری نے کہا: بعض مفسرین نے کہا: اس کا معنی ہے اے چادر اوڑھنے والے! لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اٹھیے۔ یہ تعبیر پسندیدہ نہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان کلام بہت طویل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ ابو معاویہ ضریر نے روایت کی ہے اسماعیل بن سمیع نے ابو رزین سے روایت نقل کی ہے کہ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں تمہیں اس سے خبردار کرنے والا ہوں اس سے ڈرو۔ اس صورت میں نَذِيْرًا حال ہوگا، یعنی ہم نے جہنم کے داروغے نہیں بنائے مگر فرشتے اس حال میں کہ اس کے ساتھ انسانوں کو خبردار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ھو سے حال ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَ

مَایَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مصدر کی جگہ واقع ہے گویا یہ فرمایا: انذارا للبشر۔ فراء نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ نذیر، انذار کے معنی میں ہو تقدیر کلام یہ ہوگی انذر انذارا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فکیف کان نذیر یعنی میرا ڈرانا کیسا ہے؟ اس صورت میں یہ سورت کے آغاز کی طرف راجع ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قم فانذر انذارا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن ابی عبلہ نے نذیر کو مرفوع پڑھا ہے اس صورت میں ھو ضمیر مضمر ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قرآن انسانوں کو خبردار کرنے والا ہے کیونکہ یہ اپنے اندر وعدہ اور وعید کو لیے ہوئے ہے۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ ۝ لام تعلیل نَذِیْرًا کے ساتھ متعلق ہے یعنی یہ خبردار کرنے والا ہے اسے بھی جو خیر اور طاعت کی طرف آگے بڑھے یا شر اور معصیت کے لیے پیچھے ہٹے۔ اس کی مثل وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ۝ (حجر) ہے۔ تحقیق ہم نے تم میں سے خیر کی طرف آگے بڑھنے والوں کو بھی جان لیا اور تم میں سے جو اس سے پیچھے رہنے والے ہیں انہیں بھی جان لیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ وعید اور دھمکی ہے اگرچہ خبر کے انداز میں ذکر کی گئی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (کہف: 29) جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر اختیار کرے۔ بعض اہل تاویل نے یہ تعبیر کی ہے اس کا معنی ہے جس کے حق میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور پیچھے رہے۔ مشیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ متعلق ہے یہاں تقدیم سے مراد ایمان اور تاخیر سے مراد کفر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: یہ دھمکی اور آگاہی ہے کہ جو آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی طرف بڑھا اسے ایسا بدلہ دیا جائے گا جو ختم نہ ہوگا اور جو طاعت سے پیچھے رہا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اسے ایسا عذاب دیا جائے گا جو ختم نہ ہوگا۔ سدی نے کہا: اس سے مراد ہے جو مذکورہ آگ کی طرف آگے بڑھا یا جنت کی طرف جانے کے لیے اس سے پیچھے ہٹا۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ۝ ہر نفس اپنی کمائی کے بدلہ میں رہن رکھا گیا ہے اور اپنے عمل کے بدلے میں ماخوذ ہے یا تو اس کا عمل اسے چھٹکارا دلائے گا یا اسے ہلاک کرے گا۔ رَهِیْنَةٌ، رھین کی مونث ہے کیونکہ نفس مونث ہے کیونکہ اس کی صفت کا قصد کیا جاتا تو رھین ہوتا۔ کیونکہ فعیل کا وزن جب اسم مفعول کا معنی دے تو اس میں مذکر اور مونث برابر ہوتے ہیں بلکہ یہ رہن کے معنی میں اسم ہے، جس طرح شتیمۃ، شتم کے معنی میں ہے گویا کلام یوں کی گئی ہے کل نفس بما کسبت رھین؛ اسی معنی میں حماسہ کا شعر ہے:

أَبَعْدَ الذِی بِالنَّعْفِ نَعْفِ كُوَيْكِبٍ رَهِينَةُ رَمْسٍ ذِی تُرَابٍ وجَنْدَلِ

گویا رَھْنَ رمس کہا۔ معنی یہ ہوگا: ہر نفس اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے اعمال کے بدلہ میں رہن رکھا گیا ہے اسے آزادی نہیں۔

اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ ۝ وہ اپنے گناہوں کے عوض رہن نہیں رکھے گئے۔ اصحاب الیمین کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد فرشتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا: مسلمان کی اولادیں مراد ہیں جنہوں نے کوئی عمل نہ کیا کہ وہ عمل کے بدلے رہن رکھے جاتے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب

سے جن کے لیے حسنیٰ مقدر ہو چکی ہے۔ اسی کی مثل ابن جریج سے مروی ہے ہر نفس کا اس کے عمل کے بدلے میں محاسبہ ہوگا مگر اصحاب یمین وہ جنتی لوگ ہیں ان کا محاسبہ نہیں ہوگا۔ مقاتل نے بھی اسی طرح کی گفتگو کی ہے: اس سے مراد وہ جنتی ہیں جو یوم میثاق کو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں طرف تھے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: یہ جنت میں ہیں مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ حضرت حسن بصری اور ابن کیسان نے کہا: یہ مخلص مومن ہیں ان کو رہن نہیں رکھا گیا، کیونکہ انہوں نے اپنے فرائض ادا کر دیئے۔ ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اصحاب حق اور اہل ایمان ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو ان کی کتابیں ان کے دائیں ہاتھ میں دی گئیں۔ ابوجعفر باقر نے کہا: ہم اور ہمارے حمایتی اصحاب یمین ہیں اور جس نے بھی ہم اہل بیت سے بغض رکھا وہ رہن رکھے گئے ہیں۔ حکم نے کہا: وہ لوگ اللہ تعالیٰ نے جنہیں اپنی خدمت کے لیے چن لیا وہ رہن میں داخل نہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خادم اور چنے ہوئے ہیں ان کا عمل انہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔ قاسم نے کہا: ہر نفس کا خیر اور شر کے بدلے میں مواخذہ ہوگا مگر جو اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت پر اعتماد کرے نہ کہ اپنے عمل اور خدمت پر اعتماد کرے۔ جس نے بھی اپنے عمل پر اعتماد کیا وہ ہی رہن رکھا گیا ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کیا وہ ماخوذ نہیں ہوگا۔

**فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾** جنّٰت سے مراد باغات ہیں۔ يَتَسَآءَلُوْنَ، یسألون کے معنی میں ہے یعنی جنتی مشرکوں سے سوال کریں گے: کس چیز نے تمہیں جہنم میں داخل کیا ہے؟ جس طرح تو کہتا ہے: سلکت الخیط فی کذا، یعنی میں نے اس میں دھاگہ داخل کر دیا۔ کلبی نے کہا: جنتی جہنمی سے اس کا نام لے کر سوال کرے گا وہ اسے کہے گا: اے فلاں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کی قراءت میں ہے: اے فلاں! تجھے کس چیز نے جہنم میں داخل کیا؟ کلبی سے یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یوں قراءت کی یا فلان ماسلککم فی سقر۔ یہ قرأت آیت کی تفسیر بیان کرنے کے طریقہ پر ہے یہ قرآن حکیم کا حصہ نہیں جس طرح وہ لوگ گمان کرتے ہیں جو قرآن حکیم پر طعن کرتے ہیں؛ یہ ابو بکر بن انباری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مومن فرشتوں سے اپنے قریبی رشتہ داروں کے بارے میں پوچھیں گے اور فرشتے مشرکوں سے پوچھیں گے انہیں کہیں گے: تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا؟ فراء نے کہا: اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ اصحاب یمین سے مراد بچے ہیں کیونکہ وہ گناہوں کو نہیں جانتے۔

**قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾** جہنمیوں نے کہا: ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، ہم صدقہ نہیں کرتے تھے اور ہم اہل باطل کے ساتھ ان کے باطل میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ابن زید نے کہا: ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ میں ہرزہ سرائی کرنے والوں کے ساتھ ہرزہ سرائی کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے۔ وہ یہ کہتے: وہ کاہن، مجنون، شاعر اور جادوگر ہے۔ سدی نے کہا: ہم جھٹلانے والوں کے ساتھ مل کر جھٹلایا کرتے تھے۔ قتادہ نے کہا: جب بھی کوئی گمراہ گمراہوں جیسا عمل کرتا ہم بھی اس کے ساتھ اس عمل میں شریک ہو جاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ہم تو پیروکار تھے ہم پیشوا نہیں تھے۔

وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۞ ہم یوم قیامت یعنی یوم جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہم پر موت واقع ہوگئی اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۞ (الحجر) اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے موت آئے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۞ یہ گناہگاروں کے حق میں شفاعت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل توحید میں سے کچھ لوگوں کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا پھر ان کی شفاعت کی جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے موحد ہونے اور شفاعت کی وجہ سے ان پر رحم فرمائے گا اور انہیں جہنم سے نکال دے گا۔ کفار کا کوئی شفیع نہیں ہوگا جو ان کے بارے میں شفاعت کرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تمہارے نبی چار میں سے چوتھے نمبر پر شفاعت کریں گے۔ حضرت جبرئیل پھر حضرت ابراہیم پھر حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہم السلام پھر تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پھر ملائکہ، پھر انبیاء، پھر صدیق، پھر شہداء۔ ایک قوم جہنم میں رہ جائے گی تو انہیں کہا جائے گا: تمہیں کس چیز نے جہنم میں داخل کیا؟ تو وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: یہی لوگ جہنم میں رہ جائیں گے۔ ہم نے اس کی سند کتاب التذکرہ میں ذکر کی ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۙ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ؕ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۙ﴿۵۲﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ؕ﴿۵۳﴾

''پس انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس نصیحت سے روگرداں ہیں گویا وہ بدکے ہوئے جنگلی گدھے ہیں جو بھاگے جا رہے ہیں شیر سے بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، دراصل وہ آخرت سے ڈرتے ہی نہیں''۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۞ اہل مکہ کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اس چیز سے اعراض کیا اور منہ پھیر لیا جو آپ لائے تھے۔ مقاتل کی تفسیر میں ہے، قرآن حکیم سے اعراض دو طریقوں سے ہوتا ہے (۱) انکار (۲) اس کے حکم پر عمل کو چھوڑ دینا۔ مُعْرِضِيْنَ، لھم میں ھم ضمیر سے حال ہے اور اس کے لام میں فعل کا معنی پایا جاتا ہے حال کو نصب فعل کے معنی کی وجہ سے ہے۔

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۞ گویا یہ کفار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگنے میں بدکے ہوئے گدھے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد وحشی گدھے ہیں۔ نافع اور ابن عامر نے فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے منفرۃ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسی قراءت کو پسند کیا ہے جب کہ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی کافرہ ہے، کہا جاتا ہے: نفرت، استنفرت دونوں ہم معنی ہیں، جس طرح عجبت، استعجبت اور سخرت، استسخرت ہے۔ فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:

أَمْسِكْ حِمَارَكَ إِنَّهُ مُسْتَنْفِرٌ فِي إِثْرِ أَحْمِرَةٍ عَمَدْنَ لِغُرُبِ

اپنے گدھے کو روکو وہ گدھوں کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے جنہوں غرب (جگہ کا نام) کا قصد کیا۔

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۞ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے جا رہے ہیں جو انہیں تیر مارتے ہیں۔ اہل لغت میں سے ایک نے کہا: قَسْوَرَةٍ کا معنی تیر انداز ہے، اس کی جمع قَسْوَرَةٍ ہے۔ سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ضحاک اور ابن کیسان نے کہا: قَسْوَرَةٍ سے مراد تیر انداز اور شکاری ہیں۔ عطا، حضرت ابن عباس اور ابوظبیان (ابوحیان) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں: اس سے مراد شیر ہے؛ یہی قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: قَسْوَرَةٍ کا معنی غلبہ ہے شیر، درندوں پر غالب آ جاتا ہے اور وحشی گدھے درندوں سے دور بھاگتے ہیں۔ ابوحمزہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہا: میں عربوں میں سے کسی کی لغت میں بھی قَسْوَرَةٍ کا معنی شیر نہیں جانتا کہیں یہ لوگوں کی جماعتیں ہیں کہا: قَسْوَرَةٍ سے مراد بہادروں کی جماعتیں ہیں اور یہ شعر پڑھا:

یا بنتُ کُونِی خَیْرَةً لِخَیِّرَة أخوالُها الجنِ راْهلُ القَسْوَرَة

اے بیٹی خیرہ! کے لیے اچھی صفات والی ہو جا اس کے ننہال جن اور بڑی جماعتوں والے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: اس کا معنی لوگوں کی آوازیں ہیں۔ انہیں سے ایک قول یہ بھی مروی ہے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ یعنی وہ شکاریوں کی چالوں سے بھاگے ہوئے ہیں۔ انہیں سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: عربوں کی زبان میں قَسْوَرَةٍ سے مراد شیر اور حبشیوں کی زبان میں تیر انداز، ایرانیوں کی زبان میں شیر اور نبطیوں کی زبان میں اریا ہے۔ ابن اعرابی نے کہا: قَسْوَرَةٍ سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے یعنی وہ رات کی تاریکی سے بھاگے ہوئے ہیں۔ عکرمہ نے بھی یہی قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رات کی سیاہی کا پہلا حصہ قسور کہلاتا ہے اور رات کی سیاہی کے آخری حصہ کو قسورہ اور قسور کہتے ہیں۔ لبید بن ربیعہ نے کہا:

إذا هَتَفْنا هَتْفَةً فی نَدِیِّنا أتانا الرجالُ العائدون القَسَاوِر

جب ہم نے اپنی مجلس میں آواز دی تو ہمارے پاس طاقتور لوگ آ گئے۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۞ یعنی انہیں کھلی کتاب دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! ہم میں سے ہر ایک کے پاس رب العالمین کی جانب سے ایک مکتوب لے آ جس میں یہ لکھا ہو: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہاری طرف بھیجا ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (الاسراء: 93) ہم تیرے آسمان پر جانے کو تسلیم نہیں کریں گے یہاں تک کہ تو ہم پر کتاب نازل کرے جسے ہم پڑھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کہا کرتے تھے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں تو وہ صبح کے وقت ہم میں سے ہر کسی کے پاس ایک صحیفہ لے آئیں جس میں اس کے جہنم سے بری ہونے اور اس سے محفوظ ہونے کا ذکر ہو۔ مطر وراق نے کہا: انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ انہیں بغیر عمل کے یہ چیز دے دی جائے۔ کلبی نے کہا: مشرکوں نے کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے پاس صبح کے وقت اس کے سرہانے اس کا گناہ اور کفارہ لکھا ہوتا تھا ہمارے پاس اسی کی مثل لاؤ۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے ارادہ کیا ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک کتاب ہو جس میں یہ تحریر ہو

یہ فلاں بن فلاں کے نام خط ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ اس کا ذکر جمیل کیا جائے تو صحیفے ذکر کی جگہ مجازاً رکھے گئے انہوں نے کہا: جب انسان کے گناہ اس پر لکھے جاتے ہیں تو کیا وجہ ہے ہم اسے نہیں دیکھتے۔

كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ ایسا ہرگز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی حقا ہے یعنی یقیناً ایسا ہے۔ جب کہ پہلا معنی زیادہ عمدہ ہے کیونکہ اس میں ان کے قول کا رد ہے، یعنی جن کی وہ تمنا کرتے ہیں میں انہیں عطا نہیں کروں گا کیونکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔

سعید بن جبیر نے صُحُفًا مُنْشَرَةً پڑھا ہے جہاں تک حاء کو ساکن پڑھنے کا تعلق ہے تو اس میں تخفیف ہے جہاں تک نون کو ساکن پڑھنے کا تعلق ہے تو یہ شاذ ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: نشرت الثوب و شبهه۔ انشرت کے الفاظ نہیں کہے جاتے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صحیفہ کو میت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہو گویا وہ لپیٹ دینے کی صورت میں مردہ ہے اور جب اسے پھیلایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا۔ یہ جملہ بھی بولا گیا: انشر الله الميت۔ جس طرح میت کو زندہ کرنے کو کپڑا پھیلانے سے تشبیہ دی گئی اس بارے میں یہ جملہ بھی بولا گیا: نشر الله الميت، پس یہ بھی اس میں ایک لغت ہے۔

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

''ہاں ہاں یہ قرآن تو نصیحت ہے۔ پس جس کا جی چاہے نصیحت حاصل کرے۔ وہ اور نصیحت قبول نہیں کریں گے بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے وہی اس کے قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی بخشنے کے لائق ہے''۔

یہ سچی بات ہے کہ قرآن سراپا نصیحت ہے پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے وہ نصیحت حاصل نہیں کرتے اور نہ ہی نصیحت حاصل کرنے پر قادر ہوتے ہیں مگر اس وقت جب اللہ تعالیٰ اسے چاہے۔ عام قراءت يَذْكُرُونَ ہے ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ اس میں بھی صیغہ غائب کا ہے۔ نافع اور یعقوب نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ یہ عام ہے سب اس يَذْكُرُونَ کی تخفیف پر متفق ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اس کا حق رکھتا ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے پس جو مجھ سے ڈرا اور اس نے میرے ساتھ کسی کو الٰہ نہ بنایا تو میں اس کا مستحق ہوں کہ میں اسے بخش دوں (1)۔ الفاظ ترمذی کے ہیں امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا: حدیث حسن غریب۔ ایک تفسیر میں ہے: جو آدمی اس کی بارگاہ میں بڑے بڑے گناہوں سے توبہ تائب ہوا میں اس کے بڑے گناہ بخشنے والا ہوں اور بڑے گناہوں سے اجتناب کے باعث چھوٹے گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔ محمد بن نصر نے کہا: معنی ہے میں اس کا اہل ہوں کہ میرا بندہ مجھ سے ڈرے اگر وہ ایسا نہ کرے تو میں اس کا اہل ہوں کہ میں اسے بخش دوں، میں اس پر رحم کروں میں غفور و رحیم ہوں۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ المدثر، حدیث نمبر 3251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ما یرجی من رحمۃ اللہ، حدیث نمبر 4288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ القیامۃ

آیاتہا ۴۰ ﴿۷۵﴾ سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۳۱ رکوعاتہا ۲

یہ سورت مکی ہے، اور اس کی انتالیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ ۚ﴿۵﴾ یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ ؕ﴿۶﴾

''میں قسم کھاتا ہوں روز قیامت کی اور میں قسم کھاتا ہوں نفس لوامہ کی (کہ حشر ہوگا)۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم ہرگز جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیوں کو۔ کیوں نہیں ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں کے پور پور درست کر دیں، بلکہ انسان کی خواہش تو یہ ہے کہ آئندہ بھی بدکاریاں کرتا رہے۔ (از راہ تمسخر) وہ پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی''۔

**لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ﴿۱﴾** ایک قول یہ کیا گیا کہ لَآ صلہ ہے زائد ہے اور سورت کے آغاز میں اس کا آغاز جائز ہے کیونکہ قرآن حکیم کا بعض، بعض سے متصل ہے۔ یہ کلام واحد کے حکم میں ہے اس وجہ سے کسی چیز کا ذکر ایک سورت میں ہوتا اور اس کا جواب دوسری سورت میں ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ (الحجر) انہوں نے کہا: اے وہ جس پر ذکر نازل کیا گیا ہے! بے شک تو تو مجنون ہے اس کا جواب ایک اور سورت میں ہے مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ (القلم) آپ اپنے رب کی نعمت سے مجنون نہیں۔ کلام کا معنی ہے میں قیامت کے دن کی قسم اٹھاتا ہوں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر اور ابو عبیدہ نے کہا؛ اسی کی مثل شاعر کا قول ہے:

تذكرتُ ليلى فاعترتني صبابةٌ ۔۔۔ فكاد صميمُ القلبِ لا يتقطعُ

میں نے لیلی کو یاد کیا تو مجھے عشق لاحق ہوگیا تو قریب تھا کہ صمیم قلب ٹوٹ جاتا۔

ابو لیث سمرقندی نے بیان کیا ہے کہ مفسرین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ لَآ اُقْسِمُ کا معنی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں انہوں نے لَآ کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے بعض نے کہا: لَآ زینت کے لیے کلام میں زائد ہے کلام عرب میں لَآ زائدہ استعمال ہوتا ہے جس طرح دوسری آیت میں ہے: قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (اعراف: 12) فرمایا: کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا؟ یہاں ان اَلَّا تَسْجُدَ، ان تسجد کے معنی میں ہے بعض نے کہا: لَآ ان کے کلام کا رد کرنے کے لیے ہے کیونکہ

انہوں نے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا فرمایا: جس طرح تم نے گمان کیا ہے معاملہ اس طرح نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ فراء کا قول ہے۔ فراء نے کہا: اکثر نحوی کہتے ہیں لَآ صلہ ہے، یہ جائز نہیں کہ انکار سے شروع کیا جائے پھر اسے صلہ بنا دیا جائے کیونکہ اگر یہ اس طرح ہو تو کوئی ایسی خبر معروف نہیں جس میں کسی اور خبر کا تو انکار ہو اس کا انکار نہ ہو لیکن قرآن حکیم اس اسلوب میں آیا ہے کہ جنہوں نے بعث، جنت اور آگ کا انکار کیا اس کا انکار کرتا ہے قسم ان کے رد کرنے کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ بہت سے مقامات میں اس سے کلام کا آغاز ہوا اور بہت سے مقامات میں اس سے آغاز نہیں ہوا، یہ عربوں کے اس قول کی مانند ہے: لا واللہ لا افعل۔ لَآ کے ساتھ ان کے سابقہ کلام کا رد ہے یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: لا واللہ أنّ القیامۃ حق گویا تو نے ایسی قوم کو جھٹلایا ہے جنہوں نے اس چیز کا انکار کیا تھا۔ فراء کے علاوہ دوسرے علماء نے امراء القیس کا یہ شعر پڑھا ہے:

فلا وأبیك ابنةَ العامِرِیِّ لایدَّعی القومُ أنّی أفِرّ

اے بنت عامری! تیرے باپ کی قسم قوم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھاگ جاؤں گا۔

اس کا فائدہ یہ ہے رد کرنے میں قسم کی تاکید کا باعث بنتا ہے۔ جو اس توجیہ کو نہیں جانتا وہ یوں قراءت کرتا ہے لاقسم گویا لام تاکید أُقْسِمُ فعل پر داخل ہے۔ یہ درست ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں: لاقسم باللہ۔ میں اللہ کے نام کی قسم اٹھاتا ہوں؛ یہ حضرت حسن بصری، ابن کثیر، زہری اور ابن ہرمز کی قراءت ہے۔

بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ یعنی وہ دن جس میں لوگ اپنے رب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ جس چیز کی چاہے قسم اٹھائے۔

وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اس میں قراء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی قسم اٹھائی ہے اس کی تعظیم بیان کرنے کے لیے اور نفس کی قسم نہیں اٹھائی۔ ابن کثیر کی قراءت کے مطابق پہلے کی قسم اٹھائی اور دوسری کی قسم نہیں اٹھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ دوسرا رد ہے اور نفس لوامہ سے قسم کی ابتدا ہے۔ ثعلبی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ اکٹھے قسم اٹھائی۔ نفس لوامہ سے مراد مومن کا نفس ہے تو اسے نہیں دیکھے گا مگر وہ اپنی ذات کو ملامت کر رہا ہوگا۔ وہ کہے گا: میں نے اس سے کس چیز کا ارادہ کیا؟ تو اسے نہیں دیکھے گا مگر وہ اپنے آپ کو عتاب کر رہا ہوگا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت حسن بصری اور دوسرے مفسرین کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! یہ مومن کا نفس ہے مومن کو نہیں دیکھا جاتا مگر وہ اپنے نفس کو ملامت کر رہا ہوتا ہے میں نے اپنی کلام سے کس چیز کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے اپنے کھانے سے کس چیز کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے ہم کلامی سے کس چیز کا ارادہ کیا ہے؟ جب کہ فاجر نفس کا محاسبہ نہیں کرتا۔

مجاہد نے کہا: وہ فوت ہونے والی چیز پر ملامت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے اور برے کام پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اور اچھائی کے بارے میں کہتا ہے: تو نے زیادہ عمل کیوں نہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: لوامہ یہ نسبت کے معنی

میں ہے یعنی ملامت والا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفس کو انہیں چیزوں پر ملامت کرتا ہے جس پر دوسرے نفوس کو ملامت کرتا ہے ان صورتوں میں لوامہ، لائم کے معنی میں ہوگا۔ یہ صفت مدح ہے اسی طریقہ پر یہ قسم اچھی ہو جائے گی۔

بعض تفاسیر میں ہے: حضرت آدم علیہ السلام ہمیشہ اس خطا پر اپنے آپ کو ملامت کرتے رہے تھے جس کی وجہ سے انہیں جنت سے نکالا گیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوامہ سے مراد ملامت کیا گیا؛ مذمت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول مروی ہے: یہ صفت ذامہ ہے یہ اس کا قول ہے جو اس کے قسم ہونے کی نفی کرتا ہے کیونکہ نافرمان کی کوئی عظمت نہیں، جس کی وجہ سے اس کی قسم اٹھائی جائے وہ تو زیادہ ملامت کا مستحق ہوتا ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد کافر کی ذات ہے جو اپنے آپ کو ملامت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں اس سے جو کوتاہی ہوتی ہے آخرت میں اس پر حسرت کا اظہار کرتی ہے۔ فراء نے کہا: کوئی نیک یا بد نفس نہیں مگر وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے نیک اپنے آپ کو اس امر پر ملامت کرتا ہے کہ اس نے زیادہ اعمال کیوں نہیں کیے اور گناہگار اس بنا پر ملامت کرتا ہے کہ وہ برائی کرنے سے کیوں نہیں رکا۔

**اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝** کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے اور اسے نئی صورت میں پیدا کردیں گے جب کہ وہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ زجاج نے کہا: یوم قیامت اور نفس لوامہ کی قسم اٹھائی جواب قسم یہ ہے لیجمعن العظام للبعث۔ وہ دوبارہ اٹھانے کے لیے ہڈیوں کو ضرور جمع کرے گا۔ ضحاک نے کہا: جواب قسم محذوف ہے یعنی تمہیں ضرور دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ یہاں انسان سے مراد کافر ہے جو بعث کا انکار کرتا ہے۔ یہ آیت عدی بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے وہ کب واقع ہوگی اور اس کا کیا معاملہ ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس بارے میں بتایا تو عدی نے کہا: اگر میں اس دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تو اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ میں تیری تصدیق کروں گا اور نہ اس پر ایمان لاؤں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان ہڈیوں کو جمع کرے؟ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کیا کرتے تھے: ''اے اللہ! میرے برے پڑوسی عدی بن ربیعہ اور اخنس بن شریق کے لیے کافی ہو جا''۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ آیت اللہ کے دشمن ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی جب اس نے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا۔ ہڈیوں کا ذکر کیا مراد اس کی پوری ذات ہے کیونکہ ہڈیاں انسان کا ڈھانچہ ہیں۔

**بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝** حضرت حسن بصری نے بَلٰی پر وقف کیا پھر اگلے کلمہ سے ابتدا کی۔ سیبویہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہم انہیں جمع کریں گے اس حال میں کہ قادر ہوں گے۔ قٰدِرِیْنَ یہ فعل میں جو ضمیر مضمر ہے اور فاعل ہے اس سے حال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی یہ ہے کیوں نہیں ہم قادر ہیں۔ فراء نے کہا: قٰدِرِیْنَ کو نصب نقدر اور نقوی فعل دے رہا ہے جو نجمع فعل سے سمجھا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا: تکریر کی وجہ سے نصب دینا بھی مناسب ہے تقدیر کلام یوں ہو گی بلی فلیحسبنا قادرین ایک قول یہ کیا گیا: مضمر فعل کنا ہے معنی یہ ہوگا ہم ابتدا میں ہی قادر تھے مشرکوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

ابن ابی عبلہ اور ابن سمیقع نے قادرون پڑھا ہے اس وقت تقدیر کلام یہ ہوگی نحن قادرون۔ عربوں کے ہاں بنان سے مراد انگلیاں ہیں اس کا احد بنانہ ہے۔ نابغہ نے کہا:

بِمُخَضَّبٍ رَخْصٍ كَأَنَّ بَنَانَهُ عَنَمٌ يَكَادُ مِنَ اللَّطَافَةِ يُعْقَدُ

اس شعر میں شاعر نے بنان سے مراد انگلیاں لی ہیں۔

عنترہ نے کہا:

وأنَّ الموتَ طَوْعَ يدِى إذا ما وَصَلْتُ بَنَانَهَا بِالْهِنْدُوَانِ

اس شعر میں بھی بنان سے مراد انگلیاں ہیں۔

انگلیاں ذکر کر کے باقی اعضاء پر متنبہ کیا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ چھوٹی ہڈیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ قتبی اور زجاج نے کہا: انہوں نے گمان کیا تھا اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا اور ہڈیاں جمع کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیوں نہیں ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ ہم انگلیوں کی ہڈیوں کو دوبارہ درست کر دیں جب کہ وہ بہت ہی چھوٹی ہیں اور انہیں مرکب کر دیں یہاں تک کہ وہ درست ہو جائیں جو ذات اس پر قادر ہے وہ بڑی ہڈیوں کو جمع کرنے پر زیادہ قادر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور تمام مفسرین نے یہ کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ ہم اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں کی ہڈیوں میں ایک چیز بنا دیں جس طرح اونٹ کا پاؤں ہوتا ہے یا گدھے کا کھر یا خنزیر کا کھر، تو اس کے لیے ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ ان کے ساتھ کوئی کام کر سکے لیکن ہم نے اس کی انگلیوں کو الگ الگ کر دیا تا کہ اس کے ساتھ جو چیز چاہے پکڑ لے۔ حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے انگلیاں بنائیں تو ان کو کھولتا ہے اور انہیں بند کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو جمع کر دیتا تو تو صرف اپنی ہتھیلی کے ساتھ زمین سے بچتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم انسان کو چوپاؤں کی صورت میں لوٹائیں تو جس صورت پر وہ ہے ہم کیسے اسے نہیں لوٹا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ﴿۶۰﴾ (الواقعہ) اور ہم مغلوب نہیں۔ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ (الواقعہ) (ہم عاجز نہیں) کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور لوگ پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ میں کہتا ہوں: سیاق کے حوالے سے پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں انسان سے مراد کافر ہے جو آنے والے معاملات یعنی دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب کا انکار کرتا ہے یہی عبدالرحمن بن زید نے کہا اس کی دلیل يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾ ہے یعنی وہ سوال کرتا ہے: وہ کب واقع ہوگی؟ وہ یہ بات انکار اور جھٹلانے کے انداز میں کرتا ہے وہ جھٹلانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی وجہ سے گناہگار بھی ہوتا ہے۔ قتبی اور دوسرے علماء نے جو ذکر کیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ فجور جھٹلانا ہے کہ ایک بدو نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قصد کیا اس نے آپ کی خدمت میں اونٹ کے نقب (پہلو پر زخم)

اور دَبر (جانور کا زخم) کی شکایت کی اور یہ سوال کیا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اونٹ نہ دیا تو اس بدو نے کہا:

أَقْسَمَ بِاللّٰهِ أَبُو حَفْصٍ عُمَرْ مَا مَسَّهَا مِنْ نَقَبٍ وَلَا دَبَرْ

فَاغْفِرْ لَهُ اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ فَجَرْ

ابو حفص عمر رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھا دی کہ اونٹ کو کوئی زخم نہیں۔ اے اللہ! اسے بخش دے اگر اس نے جھٹلایا ہے۔ یعنی جو میں نے کہا ہے اس کی اس نے تکذیب کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس کا معنی ہے وہ نافرمانی کرنے میں جلدی کرتا ہے اور توبہ میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ ایک حدیث میں: "انہوں نے یہ کہا وہ کہتا ہے میں عنقریب توبہ کرلوں گا اور وہ توبہ نہیں کرتا۔ پس اس نے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولا"۔ یہ مجاہد، حسن بصری، عکرمہ، سدی، سعید بن جبیر کا قول ہے وہ کہتا ہے: میں عنقریب توبہ کرلوں گا، میں عنقریب توبہ کرلوں گا یہاں تک کہ انتہائی بری حالت پر اسے موت آ جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ہمیشہ برائی کا ہی عزم کیے رکھتا ہے اگرچہ وہ تھوڑی مدت تک زندہ رہتا ہے۔ ان تمام اقوال کی صورت میں امامہ کی ضمیر کا مرجع انسان ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضمیر قیامت کے لیے ہے معنی یہ ہے بلکہ انسان ارادہ رکھتا ہے کہ وہ قیامت سے پہلے حق کا انکار کرے فجور کا اصل معنی حق سے اعراض کرنا ہے یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝ وہ سوال کرتا ہے قیامت کب برپا ہوگی۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ۝ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ یَوْمَىِٕذِ اِلْمُسْتَقَرُّ ۝ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ۝

"پھر جب آنکھ خیرہ ہو جائے گی اور چاند بے نور ہو جائے گا اور (بے نوری میں) سورج اور چاند یکساں ہو جائیں گے (اس روز) انسان کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، وہاں کوئی پناہ گاہ نہیں صرف آپ کے رب کے پاس ہی اس روز ٹھکانہ ہوگا۔ آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو اثرات اس نے پیچھے چھوڑے"۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ نافع اور ابان نے عاصم سے برق پڑھا ہے اس کا معنی ہے زیادہ کھلنے کی وجہ سے آنکھ کا چمکنا، تو اسے دیکھے گا وہ جھپکتی نہیں۔ مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: یہ موت کا وقت ہوگا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ قیامت کے روز ہوگا اس بارے میں کہا: یہ اس سوال کا جواب ہے جو انسان نے اس سے سوال کیا گویا یہ قیامت کے دن ہوگا۔

جبکہ باقی قراء نے بَرِقَ پڑھا ہے معنی ہے وہ متحیر ہوگئی وہ نہ جھکی؛ یہ ابو عمر، زجاج اور دوسرے علماء نے کہا۔ ذورمہ نے کہا۔ فراء اور خلیل نے کہا بَرِقَ جب کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی گھبرانا، مبہوت ہونا اور حیران ہونا ہے عرب متحیر اور مبہوت انسان کے بارے میں کہتے ہیں: قد برق فھو برق۔ وہ متحیر ہوا اور وہ متحیر ہے۔ فراء نے یہ شعر پڑھا:

فَنَفْسَكَ فانعَ ولا تَنْعَنِی ودَاءِ الكُلُومَ ولا تَبْرِقِ

اپنے نفس کو موت کی خبر دے مجھے موت کی خبر نہ دے زخموں کا علاج کرو اور زخموں سے نہ گھبراؤ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: برق یبرق ماضی عین کلمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اس کا معنی ہے اس نے اپنی آنکھوں کو کھولا۔

ابوعبیدہ نے یہی کہا اور کلابی کا شعر پڑھا:

لَمَا أتانِی ابنُ عُمَیرٍ راغِبًا أعطیتُه عِیسًا صِهابًا فبَرَق

جب ابن عمیر رغبت کرتے ہوئے میرے پاس آیا تو میں نے اسے بھورے رنگ کا اونٹ دیا تو اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: بَرِقَ۔ راء کے کسرہ اور فتحہ دونوں اس کی لغتیں ہیں اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ اس کا نور چلا گیا۔ دنیا میں تو اس کا خسوف (چاند گرہن) اس کی روشنی کے صاف ہونے تک ہوتا ہے جب کہ آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس کی روشنی واپس نہیں آتی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ غائب ہونے کے معنی میں ہو۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص: 81) ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ ابن ابی اسحاق، عیسیٰ اور اعرج نے وخسف القمر پڑھا ہے اس کے اوپر وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ دلالت کرتا ہے۔ ابو حاتم محمد ادریس نے کہا: جب اس کا بعض حصہ غائب ہو جائے تو وہ کسوف ہے اور جب اس کا کل غائب ہو جائے تو وہ خسوف ہے۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ روشنی کے چلے جانے میں ان دونوں کو جمع کر دیا تو سورج کی کوئی روشنی نہ ہوگی جس طرح خسوف (چاند گرہن) کے بعد چاند کی کوئی روشنی نہیں ہوتی؛ یہ فراء اور زجاج کا قول ہے۔ فراء نے کہا: جمع کا صیغہ مونث ذکر نہیں کیا کیونکہ معنی ہے دونوں کو جمع کر دیا گیا۔ ابوعبیدہ نے کہا: مذکر کو غلبہ دینے کی بنا پر اسے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ کسائی نے کہا: یہ معنی پر محمول ہے گویا کہا وجمع الضوءان۔ مبرد نے کہا: الشَّمْسُ مونث غیر حقیقی ہے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی گئی ہے: ان دونوں کو جمع کیا گیا یعنی دونوں کو مغرب سے سیاہ و تاریک طلوع کرنے میں جمع کر دیا گیا، گویا وہ دونوں زخمی بیل ہیں۔ اس معنی کے موافق حدیث سورۃ الانعام کے آخر میں گزر چکی ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت میں وجمع بین الشمس والقمر ہے۔

عطاء بن یسار نے کہا: قیامت کے روز ان دونوں کو جمع کیا جائے گا پھر دونوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا تو وہ دونوں بڑی آگ ہو جائیں گے۔ حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا: دونوں کو حجاب میں کر لیا جائے گا اور ان دونوں کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا کیونکہ دونوں کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی گئی۔ آگ ان دونوں کے لیے عذاب نہ ہوگی کیونکہ وہ دونوں جمادات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کرے گا تاکہ کافروں کو زیادہ شرمندہ

کرے اور انہیں حسرت دلائے۔ مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے یزید رقاشی نے حضرت انس بن مالک بنایتہ سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''سورج اور چاند جہنم میں دو زخمی بیلوں کی طرح ہوں گے''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس جمع سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں جمع ہوں گے اور جدا نہ ہوں گے وہ لوگوں کے قریب قریب ہوں گے تو گرمی کی شدت سے انہیں پسینہ آئے گا گویا معنی یہ ہے ان دونوں کی گرمی ان پر جمع کر دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سورج اور چاند کو جمع کر دیا جائے گا وہاں رات اور دن پے در پے نہیں آئیں گے۔

**يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝** انسان کہے گا: ایک قول یہ کیا گیا ہے ابوجہل کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ شاعر نے کہا:

أين المفرُّ والكِباشُ تَنتَطِحُ وأيُّ كَبْشٍ حاد عنها حين يَفْتَضِحُ

بھاگنے کی جگہ کہاں ہوگی جب کہ مینڈھے سینگ مار رہے ہوں گے اور کون سا مینڈھا اس سے کنارہ کش ہوگا جب وہ ذلیل ہو گیا۔

ماوردی نے کہا: یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ایک احتمال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے کہے گا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ جہنم سے بچنے کے لیے یہ قول کرے گا۔ انسان کے بارے میں بھی دو قول ہیں: (۱) خاص طور پر کافر یہ قول کرے گا جب قیامت کے روز اس کی پیشی کا مرحلہ ہوگا، کیونکہ مومن کو تو اپنے رب کی بشارت پر اعتماد ہوگا۔ (۲) قیامت کے برپا ہونے پر مومن اور کافر دونوں یہ قول کریں گے کیونکہ انہوں نے قیامت کی ہولناکی کو دیکھ لیا ہوگا۔

عام قراءت المفر ہے؛ ابوعبیدہ اور ابوحاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، حضرت حسن بصری اور قتادہ نے فاء کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح مَدَبّ اور مَدِبّ، مَصَحّ اور مَصِحّ۔ زہری نے میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی۔ مہدوی نے کہا: یہ میم اور فاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے یہ مصدر ہے اور فرار کے معنی میں ہے جس نے میم کو فتحہ اور فاء کو کسرہ دیا ہے تو اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف وہ بھاگتا ہے۔ جس نے میم کو کسرہ اور فاء کو فتحہ دیا ہے تو اس سے مراد وہ انسان ہے جو اچھی طرح دوڑتا ہے معنی یہ ہوگا وہ عمدہ دوڑ لگانے والا انسان کہاں ہے اس کے باوجود وہ نجات نہیں پا سکے گا۔ میں کہتا ہوں: اس معنی میں امرءالقیس کا شعر ہے:

مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا

وہ اچھی طرح پلٹ کر حملہ کرنے والا، عمدہ طریقہ سے بھاگ جانے والا، سامنے سے آنے والا، پیچھے سے آنے والا۔

**كَلَّا لَا وَزَرَ ۝** یعنی کوئی جائے فرار نہیں۔ **كَلَّا** کا لفظ رد کرنے کے لیے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انسان کے قول کی حکایت نہیں پھر اس رد کرنے کی وضاحت کی، یعنی جہنم سے بچنے کی کوئی پناہ گاہ نہیں۔ حضرت ابن مسعود بنایتہ کہا کرتے تھے: معنی ہے کوئی قلعہ نہیں۔ حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے: کوئی پہاڑ نہیں۔ حضرت ابن عباس کہا کرتے تھے: کوئی پناہ گاہ نہیں۔ حضرت ابن جبیر کہا کرتے تھے: کوئی پناہ گاہ اور بچنے کی جگہ نہیں۔ سب کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ لغت میں وَزَر

سے مراد وہ چیز ہے جس کی پناہ لی جائے جیسے قلعہ، پہاڑ وغیرہ۔
شاعر نے کہا:

لَعَمْرِیَ ما لِلفتی مِن وَزَرٍ مِنَ الموتِ یُدْرِکُه والکِبَرْ

میری زندگی کی قسم! نوجوان کے لیے موت اور بڑھاپے سے کوئی بچنے کی صورت نہیں وہ ضرور اسے پہنچ کر رہے گی۔

سدی نے کہا: دنیا میں جب وہ خوف زدہ ہوتے تو وہ پہاڑوں میں پناہ لیا کرتے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: کوئی پناہ گاہ نہیں جو اس روز تمہیں مجھ سے بچا سکے۔ طرفہ نے کہا:

وَلَقَدْ تَعْلَمُ بَکْرٌ أَنَّنَا فاضِلُوا الرَّأْیِ وفِی الرَّوْعِ وَزَرٌ

بنوبکر جانتے ہیں کہ ہم اچھی رائے والے اور جنگ میں جائے پناہ ہوتے ہیں۔

اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ ۝ مستقر کا معنی منتہیٰ ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ (النجم) اس کی انتہاء تیرے رب کے پاس ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا معنی ہے تیرے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آخرت میں قرار گاہ وہ ہوگی جہاں اللہ تعالیٰ اسے ٹھہرائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ان کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: كَلَّا یہ انسان کے قول کی حکایت ہے جو وہ اپنے بارے میں کہے گا جب وہ جان لے گا کہ اس کے لیے کوئی فرار کی جگہ نہیں تو وہ اس وقت اپنے آپ سے یہ کہے گا: كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ ۝۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ۝ انسان نیک ہو یا بد اسے بتایا جائے گا جو اس نے برا یا اچھا عمل آگے بھیجا یا اچھی یا بری سنت پیچھے چھوڑی جس پر بعد میں عمل کیا جاتا رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ کہا: منصور نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ اس کے پہلے اور آخری عمل کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا؛ یہ امام نخعی کا نقطہ نظر ہے۔

حضرت ابن عباس نے یہ بھی فرمایا: اس نے معصیت میں سے جو چیز آگے بھیجی اور اطاعت میں سے جو پیچھے چھوڑی؛ یہ قتادہ کا بھی قول ہے۔

ابن زید نے کہا: بِمَا قَدَّمَ سے مراد اس کے وہ اموال ہیں جو اس نے اپنے لیے خرچ کیے اور اَخَّرَ سے مراد وہ مال ہے جو اس نے وارثوں کے لیے پیچھے چھوڑا۔ ضحاک نے کہا: اس نے جو فرائض آگے بھیجے اور جن فرائض کو موخر کیا اس بارے میں اسے آگاہ کیا جائے گا۔ قشیری نے کہا: یہ اطلاع اس وقت دی جائے گی جب قیامت کے روز اس کے اعمال کو لے جائیں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اطلاع موت کے وقت ہو۔

میں کہتا ہوں: پہلی تعبیر زیادہ بہتر ہے کیونکہ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے زہری سے مروی حدیث ذکر کی ہے کہ ابوعبداللہ اغر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن کو اس کی موت کے بعد بھی جو اعمال اور نیکیاں پہنچتی رہتی ہیں وہ ایسا علم ہے جس کی اس نے تعلیم دی اور اسے عام کیا، وہ نیک بچہ جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آیا، ایسا قرآن

حکیم کا نسخہ جسے وہ پیچھے چھوڑ کر آیا، ایسی مسجد جس کو اس نے بنایا، ایسا مسافر خانہ جسے اس نے تعمیر کروایا، ایسی نہر جو اس نے جاری کی، ایسا صدقہ جو اس نے اپنے مال میں سے صحت اور زندگی میں نکالا تھا، یہ اعمال اسے موت کے بعد بھی پہنچتے رہیں گے''۔

ابونعیم نے اس معنی کی حدیث قتادہ سے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سات اعمال ایسے ہیں جس کا اجر بندے کو اس کی موت کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے جب کہ وہ اپنی قبر میں ہوتا ہے جس نے کسی کو علم سکھایا، جس نے کوئی نہر جاری کی، کوئی کنواں کھودا، کوئی کھجور لگائی، کوئی مسجد بنائی، مصحف قرآن کسی کو ورثہ کے طور پر دیا یا ایسا بچہ چھوڑا جو اس کے حق میں مغفرت طلب کرتا ہے''(1)۔

حدیث طیبہ کے الفاظ بعد موتہ وھو فی قبرہ اس کی موت کے بعد جب کہ وہ قبر میں ہوتا ہے یہ اس بارے میں واضح بیان ہے کہ یہ موت کے وقت اطلاع نہیں دی جاتی ان سب کے بارے میں اس وقت اطلاع دی جاتی ہے جب اس کے اعمال کا وزن کیا جا رہا ہوتا ہے، اگرچہ قبر میں اسے ان چیزوں کی بشارت دی جا سکتی ہے؛ اس معنی و مفہوم پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: 13) اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور دوسرے کے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھ کے ساتھ۔ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (النحل: 25) اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے تھے جہالت سے۔ یہ آخرت میں اعمال کا وزن ہونے کے بعد ہوگا۔

صحیح میں ہے: ''جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت قائم کی تو اس کے لیے اپنا اجر اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی ہوگا جب کہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ شروع کیا تو اس پر اس کا اپنا بوجھ ہوگا اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کا بوجھ ہوگا جب کہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ کی جائے گی''(2)۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴿۱۵﴾

''بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے احوال پر نظر رکھتا ہے خواہ وہ (زبان سے ہزار) بہانے بناتا رہے''۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾ اخفش نے کہا: انسان کو خود اپنی ذات پر نظر رکھنے والا بنا دیا جس طرح تو خود کسی کو کہتا ہے: تو اپنی ذات پر دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بَصِیْرَةٌ کا معنی گواہ ہے، اس سے مراد ہے کہ اس کے اعضاء اس پر گواہی دیں گے ہاتھ گواہی دیں گے جس کو اس نے ان ہاتھوں سے پکڑا ہوگا، پاؤں گواہی دیں گے جن کے ساتھ وہ چل کر گیا تھا، آنکھیں گواہی دیں گی جن کے ساتھ اس نے دیکھا تھا۔ بَصِیْرَةٌ کا معنی گواہ ہے۔

فراء نے یہ شعر پڑھا:

كأنّ على ذي العقلِ عَيْنًا بصيرةً بِمَقْعَدِهِ أو مَنْظَرٍ هو ناظِرُهْ
يُحاذِرُ حتى يَحْسِبَ النَّاسَ كلَّهم من الخوفِ لا تَخْفَى عليهم سَرائِرُهْ

1۔ حلیۃ الاولیاء، جز 2، صفحہ 344

2۔ ریاض الصالحین، باب فیمن سنّ سنۃ حسنۃ

گویا دانش مند پر آنکھ گواہ ہے جہاں وہ بیٹھا اور جس منظر کو اس نے دیکھا وہ احتیاط کرتا ہے یہاں تک کہ خوف کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کے بارے میں گمان کرتا ہے کہ ان پر اس کے راز مخفی نہیں۔

اس معنی پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور) جس روز ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے قدم ان پر گواہی دیں گے جو وہ عمل کرتے رہے۔ بَصِيْرَةٌ کا لفظ مونث آیا ہے کیونکہ انسان سے یہاں اعضاء مراد ہیں کیونکہ اعضاء انسان پر گواہ ہیں گویا یہ فرمایا: اعضاء انسان کی ذات پر گواہ ہیں؛ یہی معنی قتبی اور دوسرے علماء نے ذکر کیا۔ کچھ علماء کہتے ہیں: بَصِيْرَةٌ کے آخر میں جو ھاء ہے عرب اسے تانیث کہتے ہیں جس طرح ان کے اس قول میں ھاء مبالغہ کی ہے داھیة، علامة، راویة۔ ابو عبید کا بھی یہی قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: بَصِيْرَةٌ سے مراد وہ دو کاتب ہیں جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں جو اچھا یا برا عمل اس سے واقع ہوتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ اس آدمی کے بارے میں جو معذرت کو پردہ بناتا ہے؛ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے۔ ایک مفسر نے کہا: اس کا معنی ہے بلکہ انسان پر اس کی ذات میں سے ایک گواہ ہے تو الْاِنْسَانُ سے پہلے حرف جار کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بَصِيْرَةٌ کا لفظ اسم مونث کی صفت ہو تو تقدیر کلام یوں ہو گی بل الانسان علی نفسه عین بصيرة؛ فراء نے بھی یہ شعر پڑھا:

كأنّ على ذِي العقلِ عينًا بصيرةً

حضرت حسن بصری نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہ معنی کیا ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب دیکھتا ہے اور اپنے عیوب سے جاہل رہتا ہے۔ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ یعنی اگرچہ اپنے پردے لٹکائے۔ اہل یمن کی لغت میں معذار کا معنی پردہ ہے؛ ضحاک نے یہی کہا ہے۔ شاعر نے کہا:

ولكنها ضَنَّتْ بِمنزِلِ ساعةٍ علينا وأَطَّتْ فَوْقَهَا بالمَعَاذِرِ

لیکن اس نے ہم پر گھڑی بھر قیام سے بخل کیا اور اپنے اوپر پردے لٹکا لیے۔

زجاج نے کہا: معاذر کا معنی پردے ہیں اس کی واحد معذار ہے اگرچہ وہ اپنا پردہ ڈال دے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے عمل کو چھپالے تو اس کا نفس اس پر گواہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے اگرچہ وہ معذرت کرے اور کہے میں نے کچھ بھی نہیں کیا تو اس کے اعضاء اس پر گواہ ہوں گے وہ اگر معذرت کرے اور اپنے بارے میں جھگڑے تو اس پر ایسا گواہ ہو گا جو اس کے عذر کو جھٹلائے گا؛ یہ مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، عبد الرحمن بن زید، ابو العالیہ، عطا، فراء اور سدی کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اگر وہ دلیل یا عذر پیش کرے تو وہ اسے کچھ نفع نہ دے گا، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ (غافر: 52) اس روز ظالمین کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ (المرسلات) انہیں کوئی اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ معذرت پیش کریں اس صورت میں معاذیر، عذر سے ماخوذ ہو گا؛ شاعر کا قول ہے:

وإياكَ والأمرَ الذي إنْ توسّعتْ مَوارِدُهُ ضاقتْ عليكَ المصادِرُ

اس امر سے بچ جس پر وارد ہونے کے راستے تو وسیع ہوں اور اس سے نکلنے کے راستے تنگ ہوں۔

فما حَسَنٌ أن يَعْذِرَ المرءُ نفسَهُ وليس له مِن سائِرِ الناسِ عاذر

یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ انسان اپنے آپ کو معذور سمجھے اور لوگوں میں سے کوئی بھی اسے معذور نہ جانے۔

ایک آدمی نے حضرت ابراہیم نخعی کی خدمت میں معذرت پیش کی تو حضرت ابراہیم نخعی نے اسے فرمایا: میں نے تجھے معذرت پیش کرنے والے کے بغیر ہی معذور جانا، بے شک معذرتوں میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِیْرَهٗ کا معنی ہے اگر چہ وہ کپڑے اتار دے؛ ماوردی نے یہی بیان کیا۔

میں کہتا ہوں: زیادہ نمایاں معنی دلیل پیش کرنا اور گناہ سے معذرت کرنا ہے۔ اس معنی میں نابغہ کا قول ہے۔

ها إنّ ذِي عِذْرَةٌ إلّا تكنْ نَفعتْ فإنّ صاحِبَها مُشارِكُ النَّكَدِ

لو یہ معذرت اگر نفع نہ دے تو معذرت کرنے والا محرومی میں شریک ہے۔

اس پر دلیل کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الانعام) اس اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے! ہم مشرک نہ تھے۔ اور منافقوں کے بارے میں فرمایا: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ (المجادلۃ: 18) جس روز اللہ تعالیٰ سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے اسی طرح قسمیں اٹھائیں گے جس طرح وہ تمہارے سامنے قسمیں اٹھاتے ہیں۔ صحیح میں ہے: ''وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے رسول پر ایمان لایا، میں نے نمازیں پڑھیں، میں نے روزے رکھے اور میں نے صدقہ کیا اور جس قدر ہو سکے گا وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے گا''۔ حم سجدہ اور دوسری سورتوں میں گزر چکا ہے۔ معاذیر اور معاذر، معذرۃ کی جمع ہے اس کا باب اس طرح چلتا ہے عذرتہ، أعذرہ عُذْرا وعُذُرا۔ اس کا اسم معذرۃ اور عزری آتا ہے؛ شاعر نے کہا:

إنّي حُدِدْتُ ولا عُذْرَى لِمَحْدُودِ

مجھے محدود کر دیا گیا ہے جب کہ محدود کے لیے کوئی معذرت نہیں ہوتی، اسی طرح عذرۃ کا لفظ ہے یہ رکبۃ اور جلسۃ کی طرح ہے۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں:

## آدمی کی گواہی اس کے اپنے خلاف قبول کی جائے گی

**مسئلہ نمبر 1**۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِیْرَهٗ ﴿۱۵﴾ میں اس امر پر دلیل ہے کہ آدمی اپنی ذات کے خلاف قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ اس کی جانب سے اپنی ذات پر گواہی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ (النور) اس

روز ان کے خلاف ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ عمل کرتے رہے تھے۔

## ایک فقہی مسئلہ کی وضاحت

**مسئلہ نمبر 2**۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران) یاد کرو اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ لیا جو میں نے تم کو کتاب اور حکمت دی پھر تمہارے پاس ایسا رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی ضرور مدد کرو گے فرمایا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر پختہ وعدہ کر لیا، انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کر لیا فرمایا: گواہ ہو جاؤ، بے شک ہم تمہارے ساتھ گواہ ہیں۔

پھر فرمایا: وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا (توبہ: 102) دوسروں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا انہوں نے اچھے اور برے عمل کو ملا دیا۔ احادیث میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے انیس! اس کی بیوی کی طرف جاؤ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو''۔ جہاں تک ایک آدمی کا دوسرے کے بارے میں وارث ہونے یا قرض کا اقرار کرنے کا تعلق ہے تو امام مالک نے کہا: ہمارے نزدیک جس امر پر اتفاق ہے کہ ایک آدمی فوت ہو جائے اس کے بیٹے ہوں تو ان بیٹوں میں سے ایک کہے کہ میرے باپ نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ فلاں اس کا بیٹا ہے تو نسب ایک آدمی کی گواہی سے ثابت نہیں ہو گا اور جس نے اقرار کیا اس کا اقرار صرف اس کے حصہ میں جاری ہو گا جو حصہ اسے اس کے باپ کے مال میں ملے گا۔ جس کے حق میں اس نے اقرار کیا اسے ہر اقرار کرنے والے کے مال سے جتنا حصہ مل سکتا تھا وہ دے گا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کی وضاحت یہ ہے ایک آدمی فوت ہو جاتا ہے وہ دو بیٹے چھوڑتا ہے اور چھ سو دینار چھوڑتا ہے پھر ان میں سے ایک گواہی دیتا ہے کہ اس کے فوت ہو جانے والے باپ نے اقرار کیا تھا کہ فلاں اس کا بیٹا ہے تو جس کے حق میں اس نے گواہی دی تو اسے ایک سو دینار دے گا یہ اس میراث کا نصف ہے اگر اسے لاحق کر لیا جائے اگر دوسرا بھی اس کا اقرار کرے تو دوسرا سو دینار بھی وہ لے گا اس کا حق مکمل ہو جائے گا اور اس کا نسب ثابت ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ بھی اسی طرح ہے کہ ایک عورت اپنے والد یا اپنے خاوند پر قرض کا اقرار کرتی ہے جبکہ دوسرے وارث اس کا انکار کرتے ہیں تو اس عورت پر اتنا مال لازم ہو جائے گا جتنا مال اس کے ذمہ لازم ہوتا اگر سب وارث اس قرض کا اقرار کرتے اگر بیوی ہو تو وہ آٹھویں حصہ کی وارث ہو گی تو وہ قرض خواہ کو آٹھواں حصہ دے گی، اگر وہ بیٹی ہو تو وہ نصف کی وارث ہو گی تو وہ قرض خواہ کو نصف قرض دے گی۔ اسی حساب سے اسے مال دیا جائے گا جن عورتوں نے بھی اس کے قرض کا اقرار کیا۔

## اقرار کی مختلف صورتیں

**مسئلہ نمبر 3**۔ اقرار مکلف کا ہی ثابت ہو گا لیکن شرط یہ ہے وہ مجبور نہ ہو اگر وہ مجبور اپنے حق کا اقرار کرے تو اس کا قول حجر کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا اگر مجبور غیر کے حق کا اقرار کرتا ہے جیسے مریض۔ ان میں سے کچھ اقرار ساقط ہو جاتے ہیں اور کچھ

جائز ہو جاتے ہیں۔ مسائل فقہ میں اس کی وضاحت یہ ہے: اقرار میں بندے کی دو حالتیں ہیں (۱) ابتدائی، متقدمہ صورت میں کوئی اختلاف نہیں (۲) انتہائی، اس کی صورت یہ ہے کہ اقرار مبہم ہے اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ بنیادی چھ صورتیں ہیں۔

(۱) وہ کہے: میرے پاس اس کی امانت ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگرچہ وہ ایک کھجور یا ایک ٹکڑے سے اس کی تفسیر بیان کر دے تو اسے قبول کیا جائے گا۔ ہمارے اصول جس چیز کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی وضاحت تسلیم نہ کی جائے مگر جس کی قدر و منزلت ہو جب وہ اس کی تفسیر بیان کرے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس سے قسم لی جائے گی۔

(۲) وہ اقرار کی تفسیر شراب اور خنزیر کی صورت میں کرے یا اس چیز کے ساتھ تفسیر بیان کرے جو شریعت میں مال ہی نہ ہو تو بالاتفاق اس کو قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اس کی تائید کرے جس کے حق میں اقرار کیا گیا۔

(۳) ایسی چیز کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کرے جس میں اختلاف کیا گیا ہو جس طرح مردار کی جلد، کھاد، کتا۔ حاکم اس بارے میں فیصلہ کر دے گا جس کو مناسب سمجھے گا رد کرے یا نافذ کر دے۔ اگر وہ حاکم اس کو رد کر دے تو کوئی اور حاکم اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ پہلے حاکم کے پاس باطل کرنے سے حکم نافذ ہو چکا ہے۔ امام شافعی کے بعض اصحاب نے فرمایا: شراب اور خنزیر لازم ہوگا۔ یہ باطل قول ہے۔

امام ابوحنیفہ نے ارشاد فرمایا: جب اس نے کہا مجھ پر کچھ چیز لازم ہے تو اس کی تفسیر کیلی اور وزنی کے بغیر قبول نہ کی جائے گی کیونکہ انسان کے ذمہ میں یہی چیزیں لازم ہوتی ہیں۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ ذمہ میں ان کے علاوہ بھی چیزیں ثابت ہو جاتی ہیں جب وہ واجب کرے اس پر اجماع ہے۔

(۴) جب اس نے کہا: میرے پاس فلاں کی امانت ہے تو اس کی تفسیر اس چیز کے ساتھ بھی قبول کر لی جائے گی جو عادت میں مال نہ ہو جس طرح ایک یا دو درہم، جب تک کوئی ایسا قرینہ نہ پائے جس کی وجہ سے اس کے زیادہ پر حکم لگایا جائے۔

(۵) وہ کہے: میرے پاس فلاں کا کثیر مال ہے یا عظیم مال ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کی تفسیر حبہ کے ساتھ کرے تو اس کی بات مانی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: زکوۃ کے نصاب سے کم میں اس کی تفسیر قبول نہ کی جائے گی۔

ہمارے علماء نے اس بارے میں مختلف قول کیے ہیں۔ ان میں چوری کا نصاب، زکوۃ کا نصاب اور دیت کا نصاب۔ میرے نزدیک سب سے کم چوری کا نصاب ہے کیونکہ مسلمان کا عضو عظیم مال میں ہی جدا کیا جا سکتا ہے۔ احناف میں سے کثیر کی رائے یہی ہے۔ جو تعجب کر سکتا ہے تو وہ لیث بن سعد پر تعجب کا اظہار کرے وہ کہتے ہیں کہ بہتر درہم سے کم میں اس کی تفسیر قبول نہ کی جائے گی۔ ان سے پوچھا گیا: یہ مقدار آپ نے کہاں سے اخذ کی؟ تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ (توبہ: 25) اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہت سے مقامات اور غزوۂ حنین کے موقع پر مدد فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور سرایا کی تعداد بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب) ارشاد فرمایا: لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ (نساء: 114) ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں اور فرمایا: وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (الاحزاب) اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑی لعنت کی۔

(۲) جب اقرار کرنے والا کہے: میرے پاس دس، سو اور ہزار ہیں تو وہ جو چاہے تفسیر بیان کرے اس کا قول قبول کر لیا جائے گا؛ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر مبہم عدد پر کیلی یا وزنی چیز کا عطف کیا تو یہ اس کی تفسیر ہو گا جس طرح وہ کہے: مائة وخمسون درهما۔ ڈیڑھ سو درہم۔ کیونکہ درہم پچاس کی تفسیر ہے اور پچاس سو کی تفسیر ہے۔ ابن خیران اصطخری جو امام شافعی کے اصحاب میں سے ہیں نے کہا: درہم صرف پچاس کی تفسیر ہے اور سو کی جس چیز کے ساتھ چاہے تفسیر بیان کرے۔

## زانی کے زنا کے اقرار کرنے کے بعد معذرت کرنا

**مسئلہ نمبر 4**۔ وَّلَوۡ اَلۡقٰى مَعَاذِيۡرَهٗ۞ اس کا معنی ہے اگر اقرار کے بعد معذرت کرے تو اس کی معذرت قبول نہ کی جائے گی۔ علماء نے اس آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے ایسی حد میں اقرار کے بعد رجوع کیا جو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے اکثر نے کہا جن میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ بھی ہیں: اقرار کے بعد اس کا رجوع قبول کیا جائے گا۔ امام مالک کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے۔ امام مالک کا دوسرا قول ہے: اس کا رجوع قبول نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ رجوع کی صحیح وجہ بیان کرے۔ صحیح یہ ہے کہ رجوع مطلق جائز ہے کیونکہ ائمہ نے روایت نقل کی ہے جن میں امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ بھی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار دفعہ زنا کے اقرار کرنے والے کا رد کیا ہر دفعہ آپ اس سے اعراض کر لیتے تھے جب اس نے چار دفعہ اقرار کر لیا تو آپ نے اسے بلایا فرمایا: ''تو مجنون ہے؟'' عرض کی: نہیں۔ فرمایا: ''کیا تو شادی شدہ ہے؟'' عرض کی: جی ہاں۔ بخاری شریف میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''شاید تو نے بوسہ لیا ہو، اشارہ کیا یا نظر بازی کی ہو؟'' سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پانچویں دفعہ فرمایا: ''کیا تو نے اس عورت سے جماع کیا ہے؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''یہاں تک کہ تیری شرمگاہ اس کی شرمگاہ میں غائب ہو گئی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''جس طرح سرمچو سرمہ دانی میں اور رسی کنوئیں میں غائب ہو جاتی ہے''۔ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ پھر پوچھا: ''کیا تو جانتا ہے زنا کیا ہے؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ میں نے اس کے ساتھ حرام فعل کا ارتکاب کیا جس طرح ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ حلال فعل کرتا ہے۔ پوچھا: ''تو مجھ سے کس چیز کا ارادہ رکھتا ہے؟'' اس نے عرض کی: میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کر دیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تو اسے رجم کر دیا گیا(1)۔

امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے یہ ذکر کیا: جب اسے پتھر لگے تو وہ دوڑ پڑا تو ایک آدمی نے اسے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی ماری تو لوگوں نے اسے پتھر مارے تو وہ مر گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا''(2)۔ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے کہا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوب چھان کر لیتے جہاں تک حد کے ترک کرنے کا معاملہ ہے وہ مقصود نہ تھا(3)۔ یہ سب رجوع کے طریقے اور اس کے رجوع کو قبول کرنے کی وضاحت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد میں: ''شاید

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک، حدیث نمبر 3843، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک، حدیث نمبر 3836، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک، حدیث نمبر 3835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو نے بوسہ لیا ہو یا اشارہ کیا ہو"۔ امام مالک کے قول کی طرف اشارہ ہے کہ وہ رجوع کو قبول کر لیتے جب وہ کوئی وجہ ذکر کرتا۔

## غلام کے اقرار کی صورتحال

**مسئلہ نمبر 5**۔ یہ آزاد اور اپنی ذات کے مالک کا معاملہ ہے جہاں تک غلام کا تعلق ہے تو اس کا اقرار دو قسموں میں سے ایک قسم سے خالی نہیں ہوتا، وہ اس چیز کا اقرار کرے جس کی سزا اس کی ذات پر واقع ہو یا ایسی چیز کا اقرار کرے جس کا اثر اس چیز پر واقع ہو جو اس کے ہاتھ میں ہے یا اس کے ذمہ میں ہے۔ اگر وہ ایسی چیز کا اقرار کرے جس کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہو جس میں اس کا قتل لازم کرتا ہو یا اس سے کم سزا واقع ہوتی ہو تو اس پر نافذ ہو جائے گی۔ امام محمد بن حسن نے کہا: یہ اقرار اس سے قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ اس کا بدن آقا کے حق میں مستغرق ہے اس کے اقرار میں ان کے حقوق کا اتلاف ہے جو آقا کے اس کے بدن میں واقع ہیں۔ ہماری دلیل سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے ان گندی چیزوں میں کوئی چیز پائی تو وہ اس پر پردہ ڈالے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا ہے جس نے ہمارے لیے اس امر کو ظاہر کیا تو ہم اس پر حد قائم کر دیں گے"۔ اس کا معنی یہ ہے عقوبت کا محل انسان کی ذات ہے وہ انسان کے ذمہ ہے آقا کا اس میں کوئی حق نہیں آقا کا حق وصف اور تبع میں ہے وہ مالی حق ہے جو اس پر لازم ہوتا ہے، کیا تو نہیں دیکھتا اگر غلام کسی مال کا اقرار کرتا تو اسے قبول نہ کیا جاتا یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر غلام یہ اقرار کرے میں نے یہ مال چوری کیا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مال وہ آدمی لے لے گا جس کے حق میں غلام نے اقرار کیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: سامان آقا کا ہوگا اور جب غلام آزاد ہوگا تو اس کی قیمت کا مطالبہ غلام سے کیا جائے گا کیونکہ غلام کا مال آقا کا ہوتا ہے اس پر اجماع ہے اس میں غلام کا قول اور اقرار قبول نہ کیا جائے گا خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: غلام کی کوئی ملکیت نہیں اس کا مالک بننا صحیح نہیں وہ مالک نہیں بنے گا۔ ہم اگرچہ یہ کہتے ہیں اس کا مالک بننا صحیح ہے لیکن اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آقا کا ہوتا ہے، دونوں قولوں کے اعتبار سے یہی اجماع ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿16﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿17﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿18﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿19﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿20﴾ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿21﴾

"اے حبیب! آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تا کہ آپ جلدی یاد کر لیں اس کو، ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اتباع کریں اس پڑھنے کا۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا۔ ہرگز نہیں بلکہ حقیقتاً یہ ہے کہ تم محبت کرتے ہو جلدی ملنے والی (نعمت) سے اور چھوڑ رکھا ہے تم نے آخرت کو"۔

**لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿16﴾** امام ترمذی، سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن حکیم نازل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے وقت زبان ہلاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ہوتا

کہ اسے یاد کرلیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے ہونٹوں کو ہلاتے اور سفیان نے بھی اپنے ہونٹ ہلائے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام مسلم، ابن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول قرآن سے مشقت اٹھاتے آپ اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں ہونٹوں کو اس طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونٹوں کو حرکت دیا کرتے تھے۔ سعید بن جبیر نے کہا: میں دونوں ہونٹوں کو اس طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح حضرت ابن عباس حرکت دیا کرتے تھے تو انہوں نے دونوں ہونٹوں کو حرکت دی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع کرنا ہمارے ذمہ کرم پر ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے پڑھیں جب ہم اسے پڑھیں تو اس کو سنیں اور خاموش رہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا جب جبریل علیہ السلام آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنتے جب وہ چلے جاتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اسی طرح پڑھتے جس طرح جبریل امین نے پڑھایا ہوتا۔ اسے امام بخاری نے بھی نقل کیا ہے، اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ: 114) وحی کے مکمل ہونے سے پہلے پڑھنے میں جلدی نہ کریں۔

عامر شعبی نے کہا: جب قرآن حکیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا تو قرآن کی محبت اور زبان میں اس کی مٹھاس پانے کی وجہ سے جلدی کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے منع کر دیا گیا یہاں تک وحی جمع ہو جائے کیونکہ اس کا بعض بعض کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو اس کے بھول جانے کے خوف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زبان کو حرکت دیتے تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ: 114) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿۶﴾ (الاعلیٰ) ہم تمہیں پڑھائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ بھولیں گے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ آپ اس کو پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجئے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے(1)۔ قُرْاٰنَهٗ کا معنی ہے اس کا تجھ پر پڑھنا۔ فراء کے قول میں قراءت اور قرآن دونوں مصدر ہیں۔ قتادہ نے کہا: فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ یعنی اس کے شرائع اور احکام کی پیروی کریں۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ اس میں حدود، حلال و حرام کے احکام کی وضاحت ہمارے ذمہ ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں جو وعدہ وعید ہے اس کو بیان کرنا اور ان کو ثابت کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہمارے ذمہ ہے کہ ہم اسے تیری زبان سے بیان کریں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابوجہل قرآن کی تفسیر اور اس کے بیان پر ایمان نہیں لائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نماز نہیں پڑھیں گے اور زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اس سے مراد کفار مکہ ہیں۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 498

اے اہل مکہ کے کفار! تم دنیاوی زندگی سے محبت کرتے ہو اور تم آخرت کے لیے عمل کرنے کو ترک کرتے ہو۔ ایک تفسیر میں ہے آخرت سے مراد جنت ہے۔ اہل مدینہ اور کوفہ کے قراء نے تُحِبُّوْنَ اور تَذَرُوْنَ کو تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے بھی اسی قراءت کو پسند کیا ہے اور کہا: اگر ان قراء کی مخالفت مکروہ نہ ہوتی تو میں انہیں یاء کے ساتھ پڑھتا کیونکہ اس سے پہلے انسان کا ذکر ہے باقی قراء نے دونوں کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ خبر دی جا رہی ہے؛ یہ ابو حاتم کی پسندیدہ قراءت ہے۔ جس نے اسے ینبأ الانسان پر محمول کرتے ہوئے یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں الانسان لوگوں کے معنی میں ہے۔ جس نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو اس نے اس کلام کو اس امر پر محمول کیا ہے کہ شرمندہ کرنے کے لیے ان سے گفتگو کی کیونکہ یہ مقصود میں زیادہ بلیغ ہے اس کی مثل یہ ارشاد ہے: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝ (دہر) بے شک وہ دنیا کو پسند کرتے ہیں اور قیامت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝

”کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور کئی چہرے اس دن اداس ہوں گے خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا“۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ پہلا نضرہ سے مشتق ہے جس کا معنی حسن اور تر و تازگی ہے۔ دوسرا نظر سے مشتق ہے یعنی مومنوں کے چہرے روشن، خوبصورت اور تر و تازہ ہوں گے۔ یہ باب ذکر کیا جاتا ہے نضرھم اللہ یَنْضُرُھم نَضْرَةً و نَضَارَةً اس سے مراد روشن ہونا، آسودگی ہونا اور غنی ہونا ہے۔ اس معنی میں یہ حدیث طیبہ ہے: نَضَّرَ اللہ امرأ سَمِعَ مقالتی فوعاھا(1) اللہ تعالیٰ اس آدمی کو خوش و خرم رکھے جس نے میری گفتگو سنی اور اسے یاد رکھا۔ رب سے مراد خالق و مالک ہے۔ ناظرۃ یعنی اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے؛ یہی جمہور علماء کا نقطہ نظر ہے۔ اس بارے میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی مروی حدیث ہے جسے امام مسلم نے نقل کیا ہے جو سورۂ یونس میں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (26) میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جنتیوں میں سے سب سے معزز وہ شخص ہوگا جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی (2)۔

یزید نحوی نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔ حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے: ان کے چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں نظر بمعنی انتظار ہے یعنی وہ اس ثواب کا انتظار کر رہے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے ہوگا؛ یہ حضرت ابن عمر اور مجاہد سے مروی ہے، عکرمہ نے کہا: وہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ماوردی نے حضرت ابن عمر اور عکرمہ سے یہی روایت نقل کی ہے؛ یہ صرف مجاہد سے مروی ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَا تُدْرِكُهُ

1۔ اربعین نووی　　2۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، باب تفسیر قوله وجوه یومئذ ناضرة

الْاَبْصَارُ ٘ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام: 103) سے استدلال کیا ہے، یعنی آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ آنکھوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ یہ قول بہت کمزور ہے آیت، احادیث کے ظاہر سے خارج ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنتیوں میں سے سب سے کم مرتبہ جنتی وہ ہوگا جو اپنے باغات، بیویوں، خادموں اور پلنگوں کی طرف ایک ہزار سال کی مسافت سے دیکھ لے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے معزز وہ شخص ہوگا جو صبح وشام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا'' (1)۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جب کہ انہوں نے اسے مرفوع نقل نہیں کیا۔

صحیح مسلم میں ابوبکر بن عبداللہ بن قیس، اپنے باپ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''دو جنتیں ہیں ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ چاندی کے ہوں گے اور دو جنتیں ہیں جن کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے وہ سونے کے ہوں گے۔ جنت عدن میں جنتیوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کبریائی کی رداء کے سوا کوئی چیز حائل نہ ہوگی'' (2)۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودھویں رات کو چاند کی طرف دیکھا فرمایا: ''تم اپنے رب کو یوں عیاں دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھتے ہو تم پر اس کی رؤیت میں ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر تم طاقت رکھو کہ تم سورج کے طلوع اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے والی نماز میں مغلوب نہ ہو تو ایسا کرو'' پھر اس آیت وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ (ق) سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے تم اپنے رب کی نماز پڑھو، تلاوت کی۔ متفق علیہ؛ اسے ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابوداؤد نے رزین عقیلی سے روایت نقل کی ہے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم میں سے ہر ایک اپنے رب کا دیدار کرے گا؟ حضرت ابن معاذ نے کہا: قیامت کے روز تنہا تنہا دیکھے گا؟ فرمایا: ''ہاں اے ابارزین!'' پوچھا: مخلوق میں سے اس کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: ''اے ابارزین! کیا تم میں سے ہر کوئی چاند کو نہیں دیکھتا''۔ حضرت ابن معاذ نے کہا: چودھویں رات کو تنہا تنہا۔ ہم نے عرض کی: کیوں نہیں۔ کہا: ''اللہ تعالیٰ سب سے عظیم ہے''۔ ابن معاذ نے کہا فرمایا: ''چاند تو اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عظیم و برتر ہے'' (4)۔

سنن نسائی میں حضرت صہیب رومی سے مروی ہے: حجاب ہٹا دیا جائے گا جنتی اسے دیکھیں گے اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے انہیں جو کچھ عطا کیا ہوگا دیدار سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے لیے زیادہ محبوب اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث نہ ہوگی۔

ابو اسحاق ثعلبی کی تفسیر میں زبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہمارا رب عزوجل جلوہ افروز ہوگا یہاں تک کہ جنتی اس کا دیدار کریں گے وہ اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ ارشاد

1۔ درمنثور، جلد 6، تحت زیر آیت ہذہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان باب اثبات رؤیة المؤمنین فی الآخرة ربهم سبحانه و تعالى، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی الرویة، حدیث نمبر 4104، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجه، ابواب فی فضائل اصحاب الرسول، باب فیما انکرت الجهمیة، حدیث نمبر 172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرمائے گا: اپنے سر اٹھالو یہ عبادت کا وقت نہیں''۔ ثعلبی نے کہا: مجاہد کا قول کہ وہ اپنے رب کی جانب سے ثواب کے منتظر ہوں گے اور مخلوقات میں سے کوئی اس کا دیدار نہیں کرے گا تو یہ محل نظر تاویل ہے کیونکہ عرب جب نظر کو انتظار کے معنی میں استعمال کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: نظرتہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ (الزخرف: 66) وہ صرف قیامت کا انتظار کرتے ہیں۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ (الاعراف: 53) کافر کس چیز کے منتظر ہیں یہ کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے: مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً (یاسین: 49) وہ ایک ہی چیخ کا انتظار کررہے ہیں۔ جب اس سے تفکر اور تدبر کا ارادہ ہو تو اس وقت وہ کہتے ہیں: نظرت فیہ مگر جب یہ الفاظ الی یا وجہ کے ذکر کے ساتھ ملا ہو تو اس وقت یہ دیکھنے کے معنی میں ہوگا۔ ازہری نے کہا: مجاہد کا قول کہ وہ اپنے رب کے ثواب کا انتظار کرتے ہوں گے غلط ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا نظر الی کذا کہ اس نے اس کا انتظار کیا۔ کسی کا یہ کہنا: نظرت الی فلاں یہ آنکھ سے دیکھنا ہی ہوتا ہے عرب بھی اسی طرح کہتے ہیں جب وہ آنکھ سے دیکھنے کا ارادہ کریں تو وہ کہتے ہیں: نظرت الیہ جب وہ انتظار کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں: نظرتہ؛ شاعر نے کہا:

فإنكُما إنْ تنظُرانِ ساعة مِنَ الدَّهرِ تَنْفَعْنِي لَدَى أُمِّ جُنْدُبِ

اگر تم مجھے ایک ساعت مہلت دیتے تو وہ ساعت مجھے ام جندب کے ہاں نفع دیتی۔

جب اس نے انتظار کا ارادہ کیا تو اس نے تنظران کہا اور تنظران الی نہیں کہا: اگر وہ آنکھ سے دیکھنا مراد لیں تو وہ کہتے ہیں: نظرت الیہ؛ شاعر نے کہا:

نظرتُ إليها والنُّجُومُ كأنّها مَصابيحُ رُهْبانٍ تُشَبُّ لِقُفّالِ

میں نے اسے دیکھا جب کہ ستارے گویا راہبوں کے چراغ ہیں جو پلٹنے والوں کے لیے روشن کیے گئے۔

ایک شاعر نے کہا:

نظرتُ إليها بالمُحصَّبِ مِنْ مِنىً ولِي نَظَرٌ لولا التَّحَرُّجُ عارِمُ

میں نے منیٰ سے اس کی طرف دیکھا جو محصب میں تھی اگر گناہ نہ ہوتا تو میری نظر بدخلق ہوتی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إنِّي إليكَ لِمَا وَعَدْتَ لَنَاظِرٌ نَظَرَ الفَقِيْرِ إلى الغَنِيِّ المُوسِرِ

میں تیرے وعدہ کی طرف اس طرح دیکھنے والا تھا جس طرح محتاج خوشحال کی طرف دیکھتا ہے۔

یعنی میں تیری طرف عاجزی کی نظر سے دیکھ رہا تھا کیونکہ خشوع وخضوع کی نظر مسئول کے دل کو زیادہ نرم کردیتی ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ انہوں نے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام: 103) آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرتیں جبکہ وہ آنکھوں کا احاطہ کرلیتا ہے، یہ دنیا میں ہوگا اس کے بارے میں گفتگو اس کے محل میں مفصل گزر چکی ہے۔ عطیہ عوفی نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اس کی عظمت کی وجہ سے لوگوں کی آنکھیں اس کا احاطہ نہ کرسکیں گی اور اللہ تعالیٰ کی نظر ان کا احاطہ کرلے گی؛ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ دلالت کرتا

ہے۔ قشیری ابونصر نے کہا: الی کی جگہ الآلاء ہے یعنی اس کی نعمتوں کا انتظار ہو گا۔ یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ الآلاءکا واحد الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے یاء کے ساتھ نہیں لکھا جاتا پھر الآلاء اس کی ان نعمتوں کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو دور کرنے والی ہوں جب کہ وہ جنت میں اپنی ذاتوں سے ناراضگی کے دور کرنے کا انتظار نہیں کر رہے ہوں گے۔ جو آدمی کسی چیز کا انتظار کرتا ہے اس کی زندگی پریشان کن ہوتی ہے جنتیوں کی یہ صفت بیان نہیں کی جاتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں نظر کو وجہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرہ:25) اس کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ پانی نہر میں چلتا ہے نہ کہ نہر چلتی ہے۔ بعض اوقات وجہ، آنکھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَلْقُوْهُ عَلٰی وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا (یوسف:93) تم اسے میرے باپ کی آنکھوں پر ڈالنا وہ روشن ہو جائیں گی۔ قیامت کے روز قانون کو بدل دینا کوئی بعید نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کا فعل چہرے میں پیدا کر دے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی (الملک:22) کیا وہ جو منہ کے بل چلتا ہے وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! وہ آگ میں منہ کے بل کیسے چلیں گے؟ فرمایا: ”جو ذات انہیں قدموں پر چلانے پر قادر ہے وہ انہیں منہ کے بل بھی چلانے پر قادر ہے“(1)۔

وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ۙ۝ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ یعنی کفار کے چہرے قیامت کے روز تیوری چڑھے ترش ہوں گے۔ صحاح میں ہے بسر الفحل الناقة وابتسرها یعنی نر اونٹ، اونٹنی کی خواہش کے بغیر اس پر جا پڑا۔ وبسر الرجل وجهه بسورا آدمی نے تیوری چڑھائی۔ کہا جاتا ہے: عَبَسَ وَ بَسَرَ۔ سدی نے کہا: بَاسِرَةٌ یعنی بدلے ہوئے معنی ایک ہی ہے۔ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائے گا۔ فَاقِرَةٌ سے مراد بڑی مصیبت اور عظیم امر ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فقرته الفاقرة مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی؛ مجاہد اور دوسرے علماء نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: فَاقِرَةٌ کا مطلب مصیبت ہے۔ سدی نے کہا: ہلاکت ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابن زید نے کہا: آگ میں داخل ہونا ہے۔ سب معانی قریب قریب ہے۔ اصل اس کا معنی ہے اونٹ کی ناک پر لوہے یا آگ سے ایسا نشان لگانا جو ہڈی تک جا پہنچے؛ یہ اصمعی نے کہا۔ کہا جاتا ہے: فقرت أنف البعير۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو لوہے سے اس کی ناک میں سوراخ کرے پھر سوراخ کی جگہ چمڑے سے بنی رسی ڈالے جس پر کمان کی تان لپٹی ہوئی ہوتا کہ اس کے ساتھ تو اونٹ کو مطیع کرے۔ اسی معنی میں ان کا قول ہے: قد عمل به الفاقرة اس کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا گیا۔

نابغہ نے کہا:

وضَرْبَةُ فَأْسٍ فوقَ رأسِيَ فَاقِرَة

میرے سر پر کلہاڑے کی ایسی ضرب لگائی جو ہڈی توڑنے والی تھی۔

كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۙ۝ وَ قِیْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ۙ۝ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ۝ وَ الْتَفَّتِ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

''ہاں ہاں جب جان پہنچے گی ہنسلی تک اور کہا جائے گا کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا اور (مرنے والا) سمجھ لیتا ہے کہ جدائی کی گھڑی آ پہنچی، اور لپٹ جاتی ہے ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے، اس دن آپ کے رب کی طرف کوچ ہوتا ہے''۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ كَلَّآ جھڑکنے کے لیے ہے، یعنی یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے کہ کافر روز قیامت پر ایمان لائے۔ پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا اور فرمایا: جب نفس یا روح ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے جس نفس کا ذکر جاری نہیں تھا اس کی خبر دی کیونکہ مخاطب کو اس کا علم تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ (ص) یہاں تک کہ وہ حجاب میں چھپ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ (الواقعہ) پس تم کیوں نہیں لوٹا دیتے جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے؟ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: كَلَّآ کا معنی حقا ہے معنی یہ بات ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی جاتا ہے یعنی نفس جب ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: جب کافر کا نفس ہنسلی کی ہڈی تک جا پہنچے۔ تراق، ترقوہ کی جمع ہے ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جو اونٹ ذبح کرنے کی جگہ جمع ہوتی ہیں یہ سینہ سے اوپر اور حلق کے ابتدائی حصہ میں ہوتی ہیں، یہی گھنگرو کی جگہ ہے۔ درید بن صمہ نے کہا:

وَرُبَّ عَظِيمَةٍ دَافَعْتَ عَنْهُمْ وَقَدْ بَلَغَتْ نُفُوسُهُمُ التَّرَاقِي

کتنی ہی عظیم مصیبتیں ہیں جن کو تو نے ان سے دور کیا جب کہ ان کے نفوس ہنسلی کی ہڈی کو پہنچے ہوئے تھے۔

جو آدمی موت کے وقت کو پہنچ چکا ہو اس کے لیے کنایہ کے طور پر نفس کے ہنسلی کی ہڈی تک پہنچنے سے تعبیر کرتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ انہیں موت کے آنے کے وقت سختی کو یاد کرایا جائے۔

وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رقیہ سے مشتق ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ ضحاک نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ من یرقی کا معنی ہے ایسا طبیب جو شفا دے۔ میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے معنی ہے کوئی طبیب ہے جو اس کو شفا دے؛ یہ ابو قلابہ اور قتادہ نے کہا؛ شاعر نے کہا:

هَلْ لِلْفَتٰى مِنْ بَنَاتِ الدَّهْرِ مِنْ وَاقِ أَمْ هَلْ لَهُ مِنْ حِمَامِ الْمَوْتِ مِنْ رَاقِ

کیا نوجوان کو مصائب سے بچانے والی کوئی چیز ہے، کیا اسے موت سے شفا دینے والا کوئی طبیب ہے۔

یہ بات وہ مایوسی کے طور پر کریں گے۔ یعنی وہ کون ہے جو موت سے شفا دے؟ حضرت ابن عباس اور ابو جوزاء سے مروی ہے۔ یہ رقی، یرقی سے مشتق ہے جب وہ بلند ہو معنی ہے کون اس کی روح آسمان کی طرف لے جائے گا؟ کیا رحمت کے فرشتے لے جائیں گے یا عذاب کے فرشتے لے جائیں گے؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ موت کا فرشتہ کہے گا: اس کی روح کو کون لے جائے گا؟ اس کی وجہ یہ ہے کافر کا نفس ملائکہ کے قرب کو ناپسند کرتا ہے تو موت کا فرشتہ کہے گا: اے فلاں! اسے لے جا۔ عاصم

اور ایک جماعت نے من راق میں نون کو اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور بَلْ رَانَ (المطففین: 14) میں لام کو اظہار کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ یہ مراق کے مشابہ نہ ہو جس کا معنی شوربہ بیچنے والا ہے اور بران کے مشابہ نہ ہو جائے جو برکا تثنیہ ہے صحیح اظہار کو چھوڑنا ہے۔ مَنْ رَاقٍ میں قاف کا کسرہ اور بَلْ رَانَ میں نون کا فتحہ التباس کو زائل کرنے کے لیے کافی ہے۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مَنْ اور بَلْ پر وقف کا قصد کرے اور ان میں اظہار کرے؛ یہ قشیری کا قول ہے۔

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ انسان یقین کر لے گا کہ یہ دنیا، اہل، مال اور اولاد کے فراق کا وقت ہے یہ اس وقت ہوگا جب وہ فرشتوں کو دیکھ لے گا؛ شاعر نے کہا:

فِرَاقٌ لیس یُشْبِہُهٗ فِرَاقٌ قد انقطع الرجاءُ عن التَّلَاقِ

ایسا فراق جس کی مثل کوئی فراق نہیں جس میں ملاقات کی امید ختم ہو چکی ہے۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ ایک شدت دوسری شدت کے ساتھ مل چکی ہے یعنی دنیا کے آخر کی شدت، آخرت کے آغاز کی شدت کے ساتھ مل چکی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ امام شعبی اور دوسرے علماء نے فرمایا: موت کے وقت شدت تکلیف سے انسان کی دونوں پنڈلیاں لپٹ گئیں۔ قتادہ نے کہا: کیا تو نے نہیں دیکھا جب وہ موت کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اپنے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر مارتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب اور حضرت حسن بصری نے کہا: یہ انسان کی دو پنڈلیاں ہیں جب انہیں کفن میں لپیٹ دیا جائے۔ زید بن اسلم نے کہا: کفن کی پنڈلی میت کی پنڈلی کے ساتھ لپٹ گئی۔ حضرت حسن بصری نے یہ بھی کہا: اس کے دونوں پاؤں مر گئے، اس کی دونوں پنڈلیاں سوکھ گئیں پس وہ اسے نہیں اٹھاتیں جب کہ وہ ان پر خوب گھومتا تھا۔ نحاس نے کہا: پہلا قول ان میں سے سب سے حسین ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ دنیا کا آخری دن آخرت کے پہلے دن کے ساتھ لپٹ گیا تو ایک شدت دوسری شدت سے مل گئی مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم کرے یعنی موت کی کرب کی شدت مطلع کی ہولناکی کی شدت سے مل گئی اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ مجاہد نے کہا: معنی ہے ایک مصیبت دوسری مصیبت سے مل گئی۔ وہ کہتے: اس پر شدائد پے در پے ہو گئیں۔ ضحاک اور ابن زید نے کہا: اس پر دو شدید امر جمع ہو گئے، لوگ اس کے جسم کو تیار کرتے ہیں اور فرشتے اس کی روح کو تیار کرتے ہیں۔

عرب ساق کا لفظ بڑی مصیبت کے لیے استعمال کرتے ہیں اس معنی میں ان کا قول ہے: قامت الدنیا علی ساق، قامت الحرب علی ساق دنیا بڑی مصیبت پر کھڑی ہے، جنگ بڑی مصیبت پر کھڑی ہے۔ شاعر نے کہا:

قَامَتِ الحربُ بنا علی ساقٍ جنگ نے ہمیں بڑی مصیبت پر کھڑا کر دیا ہے۔

یہی معنی سورۂ قلم کے آخر میں گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے کہا: کافر کو اس وقت عذاب دیا جاتا ہے جب اس کی روح جسم سے نکلتی ہے یہ پہلی مصیبت ہے پھر اس کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی مصیبت ہوگی۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ رب سے مراد خالق ہے۔ يَوْمَئِذٍ سے مراد یوم قیامت ہے۔ مساق سے مراد لوٹنا ہے۔

ایک تفسیر میں ہے: وہ فرشتہ جو اس کی برائیاں لکھا کرتا تھا وہ اسے ہانکے گا۔ مساق یہ ساق، یسوق سے مصدر ہے جس طرح مقال یہ قال، یقول کا مصدر ہے(1)۔

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

''(اتنی فہمائش کے باوجود) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور اس سے منہ پھیر لیا، پھر گیا گھر کی طرف نخرے کرتا ہوا۔ تیری خرابی آ لگی اب آ لگی پھر تیری خرابی آ لگی اب آ لگی''۔

**فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾** ابوجہل نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے جو سورت کے آغاز میں ہے وہ اسم جنس ہے۔ پہلا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے یعنی اس نے رسالت کی تصدیق نہ کی اور نہ اپنے رب سے دعا کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا۔ قتادہ نے کہا: نہ کتاب اللہ کی تصدیق کی اور نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہ اپنے مال کا صدقہ دیا تا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذخیرہ ہو جائے اور نہ ہی وہ نمازیں پڑھیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نہ اپنے دل سے ایمان لایا اور نہ اپنے بدن سے عمل کیا۔ کسائی نے کہا: لَا، لم کے معنی میں ہے لیکن اسے غیر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے عرب کہتے ہیں: لا عبد اللہ خارج ولا فلان، نہ عبد اللہ نکلا نہ کوئی اور، تو یہ نہیں کہہ سکتا: مررت برجل لا محسن یہاں تک کہ تو ساتھ یہ نہ کہے ولا مجمل میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو نہ محسن ہے نہ مجمل۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ (البلد) وہ اس انداز کا نہیں کیونکہ اس کا معنی ہے کیا وہ عقبہ (مشقت) میں داخل نہیں ہوا۔ الف استفہام کو حذف کر دیا گیا۔ اخفش نے کہا: **فَلَا صَدَّقَ** کا معنی ہے اس نے تصدیق نہ کی جس طرح فلا اقتحم ہے وہ داخل نہ ہوا۔ اس میں دوسری شی کو پیچھے لانا شرط نہیں۔ عرب کہتے ہیں: لا ذهب وہ نہ گیا۔ حرف نفی ماضی کی نفی کرتا ہے جس طرح مستقبل کی نفی کرتا ہے؛ اس معنی میں زہیر کا قول ہے:

فَلَا هُوَ أَبْدَاهَا وَلَمْ يَتَقَدَّمِ نہ اس نے اسے ظاہر کیا اور نہ خود آگے بڑھا۔

**وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾** اس نے قرآن کو جھٹلایا اور ایمان سے روگردانی کی۔ پھر وہ اس پر فخر کرتے ہوئے تکبر کے انداز میں اپنے گھر چلا گیا؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد ابوجہل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مطا سے مشتق ہے جس کا معنی پشت ہے معنی ہے وہ اپنی پشت کو دہرا کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اصل یتمطط ہے یعنی سستی کا اظہار کرنا اور بوجھل ہونا ہے وہ حق کی طرف دعوت دینے والے سے بوجھل ہوتے ہیں، اس کی ایک طاء کو یاء سے بدل دیا کیونکہ ایک ہی جنس کے حرف ہونا ناپسندیدہ تھا۔ تمطی یہ پرواہ نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ تمدد سے بھی یہی مراد ہے گویا وہ تکبر کی وجہ سے اپنی پشت کو پھیلاتا ہے اور اسے دہرا کرتا ہے۔ مطیطه، حوض کے نیچے گاڑھے پانی کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: ''جب میری امت کمریں دہری کر کے چلے گی ایرانی اور رومی اس کے خدمت گزار ہو

1۔ تفسیر رازی، معروف تفسیر کبیر، جلد 30، صفحہ 232

جائیں گے تو اس کی آپس میں جنگ شروع ہو جائے گی" (1)۔ مطیطاء سے مراد تکبر کرنا اور چلتے وقت ہاتھوں کو پھیلانا ہے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ دھمکی کے بعد دھمکی ہے، وعید کے بعد وعید ہے۔ یہ چار چیزوں پر چار وعیدیں ہیں۔ جس طرح روایت کی گئی ہے یہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے رب سے جاہل تھا یعنی اس نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق نہ کی، میرے سامنے کھڑا نہ ہوا کہ نماز پڑھتا بلکہ اس نے میرے رسول کی تکذیب کی اور میرے سامنے نماز پڑھنے سے روگردانی کی۔ تصدیق کو چھوڑنا ایک خصلت ہے، جھٹلانا ایک خصلت ہے، نماز چھوڑنا ایک خصلت ہے، اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرنا ایک خصلت ہے چار چیزوں کو چھوڑنے کی وجہ سے چار وعیدیں آئیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

یہ نہ کہا جائے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝ پانچویں خصلت ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ خصلت جھٹلانے اور اعراض کرنے سے پہلے بھی موجود تھی تو اس کے بارے میں خبر دی۔ یہ قتادہ کے قول میں واضح ہے جس طرح ہم [illegible] ائے۔

ایک قول یہ کیا گیا: رسول اللہ ﷺ ایک روز مسجد سے نکلے تو مسجد کے دروازے پر آپ ﷺ کو ابوجہل ملا جو بنی مخزوم کے دروازے کے ساتھ تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑا اسے ایک یا دو دفعہ جھٹکا دیا پھر فرمایا: اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ابوجہل نے آپ ﷺ سے کہا: کیا تو مجھے دھمکاتا ہے؟ اللہ کی قسم! میں اس وادی کے مکینوں میں سے سب سے زیادہ معزز و محترم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح ابوجہل سے فرمایا تھا اس اسلوب میں آیت نازل ہوئی، یہ دھمکی کے کلمات ہیں شاعر نے کہا:

فَأَوْلَى ثم أَوْلَى ثم أَوْلَى هَلْ لِلدَّرِّ يُحْلَبُ من مَرَدْ

ہلاکت ہو، ہلاکت ہو پھر ہلاکت ہو، کیا دودھ کو بار بار دوہا جا سکتا ہے۔

قتادہ نے کہا: ابوجہل تکبر کرتے ہوئے آیا نبی کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑا فرمایا: اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ اس نے کہا: تو اور تیرا رب مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے میں ان دو پہاڑوں کے درمیان سب سے معزز ہوں۔ جب بدر کا دن آیا تو وہ مسلمانوں کے قریب ہوا کہا: آج کے بعد اللہ تعالیٰ کی کبھی بھی عبادت نہ کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا اور وہ برے طریقے سے قتل ہوا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے تیرے لیے ہلاکت ہے؛ اسی بارے میں حضرت خنساء کا شعر ہے:

هَمَمْتُ بنفسيَ كُلَّ الهُمُوم فَأَوْلَى لِنَفْسِيَ أَوْلَى لَهَا
سَأَحْمِلُ نفسي على آلةٍ فإمَّا عليها و إمَّا لَهَا

میں نے اپنے بارے میں ہر قسم کا ارادہ کیا میرے نفس کے لیے ہلاکت ہے اس کے لیے ہلاکت ہے۔ میں اپنے نفس کو ایسی حالت پر مجبور کروں گی، وہ حالت اس کے خلاف ہوگی یا اس کے حق میں ہوگی۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی النهی عن سب الرياح، حدیث نمبر 2187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 525

الآلة کا معنی حالت ہے اور الآلة کا معنی چارپائی بھی ہے جس پر میت کو اٹھایا جاتا ہے۔ اس تاویل کی بنا پر یہ کہا جائے گا کہ ان کلمات میں سے ہے جن میں قلب کا قاعدہ جاری ہوا گویا کہا گیا: اویل پھر حرف علت کو موخر کیا گیا معنی ہے تیرے لیے زندہ ہونے کی صورت میں ہلاکت ہے، تیرے لیے مردہ ہونے کی صورت میں ہلاکت ہے جس روز تو جہنم میں داخل ہو۔ یہ جانے کے وقت ہلاکت ہے اور تیرے لیے اس روز ہلاکت ہے جس روز تو جہنم میں داخل ہو۔ یہ تکرار اسی طرح ہے جس طرح کسی نے کہا:

لَكَ الْوَيْلَاتُ إِنَّكَ مُرْجِلِي تیرے لیے پے در پے ہلاکتیں ہوں تو مجھے آزاد چھوڑنے والا ہے۔

مراد یہ ہے لك الويل ثم الويل ثم الويل۔ یعنی تیرے لیے ہلاکت، پھر ہلاکت اور پھر ہلاکت ہے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے تیری مذمت اس کے ترک کرنے سے بہتر ہے۔ مگر کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اصمعی نے کہا کلام عرب میں اَوْلیٰ کا لفظ ہلاکت کے قریب ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے گویا وہ کہتا ہے: تو ہلاکت کے قریب ہو گیا۔ یہ ولی سے ماخوذ ہے جس کا معنی قرب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ (توبہ: 123) اے ایمان والو! ان کفار سے تم جنگ کرو جو تمہارے قریب رہتے ہیں۔ اصمعی نے یہ مصرعہ پڑھا: وأولى أن يكون له الولاء قریب ہے کہ اس کے لیے حکومت ہو۔ اور اس نے یہ مصرعہ بھی پڑھا: أَوْلَى لمن هاجت له أن يكمد جس کے دل کا مرض جوش مارنے لگا اس کی ہلاکت کا وقت قریب ہو گیا۔ ابو العباس ثعلب، اصمعی کے قول کی تحسین کرتا وہ کہتا: کوئی آدمی اصمعی کی وضاحت جیسی وضاحت نہیں کرتا۔ نحاس نے کہا: عرب کہتے ہیں اَوْلیٰ لَكَ۔ قریب تھا کہ تو ہلاک ہو جاتا پھر تو بچ گیا گویا تقدیر کلام یوں ہے أولى لك وأولى لك الهلاكة۔ مہدوی نے کہا: تقدیر کلام یہ نہ ہو گی ولا تكون أولى۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو گی۔ گویا یہ کہا: الوعيد أولى له من غيره کیونکہ ابو زید نے بیان کیا اولاة الآن۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ دھمکی دیں۔ علامت تانیث کا اس پر داخل کرنا اس امر پر دلیل ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں۔ لَكَ خبر ہے اَوْلیٰ مبتدا ہے اَوْلیٰ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ وعید کا علم (نام) ہو چکا ہے یہ اس طرح ہے جس طرح کسی کا نام احمد ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تکرار اس معنی کی بنا پر ہے میں تجھ پر تیرے پہلے برے عمل، دوسرے، تیسرے اور چوتھے پر لازم کرتا ہوں جس طرح یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ (ابتدا میں) منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا تھا پھر وہ اس سے لوتھڑا بنا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا اور اعضا درست کیے پھر اس سے دو قسمیں بنائیں مرد اور عورت کیا وہ اتنی (قدرت والا) اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر زندہ کرے"۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۞ کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے مہمل چھوڑ دیا جائے گا نہ اسے حکم دیا جائے گا نہ اسے نہی کی جائے گی؛ یہ ابن زید اور مجاہد نے کہا: اسی سے ابل سدی ہے جو اونٹ چرواہے کے بغیر چرتے رہتے ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اسے قبر میں ہمیشہ کے لیے اس طرح چھوڑا جائے گا اسے دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا؛ شاعر نے کہا:

فَأُقْسِمُ بِاللهِ جَهْدَ الْيَمِينِ مَا تَرَكَ اللهُ شَيْأً سُدًى

میں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھاتا ہوں! اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو مہمل نہیں چھوڑا۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۞ پانی کا قطرہ جسے رحم میں ٹپکایا جاتا ہے۔ منی کو منی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہاں جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ نطفہ کا معنی تھوڑا پانی ہے۔ کہتے ہیں: نطف الماء جب وہ قطرہ قطرہ گرے کیا وہ مرد کی پشت اور عورت کی سینے کی ہڈیوں میں قلیل پانی نہ تھا؟ حفص نے اسے مَنِيٍّ يُّمْنٰى پڑھا ہے۔ ابن محیصن، مجاہد، یعقوب اور عیاش نے ابو عمرو سے یہی روایت نقل کی ہے۔ ابو عبید نے لفظ مَنِيٍّ کی وجہ سے یاء کے ساتھ قراءت کو اختیار کیا ہے جب کہ باقی قراء نے لفظ نطفہ کی وجہ سے تمنی پڑھا ہے؛ ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۞ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۞ نطفہ کے بعد وہ خون تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے قدری کو بیان کرنے کے لیے ان چیزوں کا یکے بعد دیگرے ذکر کیا پھر اندازہ لگایا اور اس میں روح رکھ کر مناسب اور موزوں بنا دیا پھر اس انسان سے مرد اور عورت بنائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: منه کی ضمیر سے مراد منی ہے۔ جس نے خنثی کو ساقط کرنے کی رائے قائم کی ہے اس نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہ آیت اور اس جیسی آیات غالب طریقہ کے اعتبار سے ہیں۔ سورۃ النساء میں بھی اس بارے میں قول گزر چکا ہے۔ میراث والی آیت میں اس کا حکم گزر چکا ہے اس کے دوبارہ اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۞ کیا وہ ذات پاک جس نے پانی کے ایک قطرہ سے اس انسان کو پیدا کیا ہے وہ ان اجسام کے بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر قادر نہیں۔ رسول اللہ سے یہ روایت مروی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی تلاوت کرتے تو زبان سے یہ کلمات پڑھتے: سبحانك اللّٰھم بلٰی اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے کیوں نہیں تو ایسا کرنے پر قادر ہے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: جو سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۞ کی قراءت کرے وہ امام ہو یا کوئی اور تو وہ یہ کہے: سبحان ربی الاعلی اور جو سورۃ القیامہ کی تلاوت کرے وہ امام ہو یا کوئی اور تو وہ سبحانك اللھم بلی کہے: ثعلبی نے یہ ابو اسحاق سبیعی سے روایت نقل کی ہے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 528

# سورۃ الانسان

آیاتہا ۳۱ ۷۶ سورۃ الدھر مدنیۃ ۹۸ رکوعاتہا ۲

اس کی اکتیس آیات ہیں۔ حضرت ابن عباس، مقاتل اور قلبی کے قول کے مطابق یہ مکی ہے جب کہ جمہور علماء نے کہا: یہ مدنی ہے۔ ایک قول یہ بھی کیا گیا: اس میں اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝ سے آخر تک مکی ہے اور اس سے پہلے کی آیات مدنی ہیں۔

ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ ابن زید نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ آیت پڑھتے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ یہ آیت آپ پر نازل ہوئی جب کہ آپ ﷺ کے پاس ایک حبشی موجود تھا وہ نبی کریم ﷺ سے سوال کرتا تھا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: نبی کریم ﷺ کو پریشان نہ کر۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو ارشاد فرمایا: ''اے ابن خطاب! اسے چھوڑ دو''۔ کہا: یہ سورت آپ ﷺ پر نازل ہوئی جب کہ وہ آدمی آپ ﷺ کے پاس موجود تھا جب رسول اللہ ﷺ نے اس پر اس سورت کو پڑھا اور جنت کی صفت تک پہنچے تو اس نے لمبی سانس لی تو اس کی روح نکل گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت کے شوق نے تمہارے ساتھی یا تمہارے بھائی کی روح کو نکال دیا ہے'' (1)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس سے مختلف الفاظ کے ساتھ یہ روایت مروی ہے۔ سورت کا مقصود عام ہے۔ اس طرح مختلف اقوال ہیں کہ اس کا سبب نزول یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖۗ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳

''بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جب کہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا فرمایا ایک مخلوط نطفہ سے تاکہ ہم اس کو آزمائیں پس (اس غرض سے) ہم نے بنا دیا ہے اس کو سننے والا، دیکھنے والا۔ ہم نے اسے دکھایا ہے (اپنا) راستہ اب چاہے شکر گزار بنے چاہے احسان فراموش''۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝، هَلْ، قد کے معنی میں ہے: یہ کسائی، فراء اور ابو عبیدہ کا قول ہے۔ سیبویہ سے منقول ہے کہ هَلْ، قد کے معنی میں ہے۔

1۔ الطبرانی، الاوسط، حدیث نمبر 1604۔ الکبیر 13595

فراء نے کہا: هَلْ نافیہ ہوتا ہے اور خبریہ ہوتا ہے یہ هَلْ خبریہ ہے کیونکہ تو کہتا ہے: هل اعطيتك تو اس سے یہ مراد لیتا ہے کہ تو نے اسے عطا کر دیا ہے، نافیہ کی مثال یہ ہے کہ تو کہتا ہے: هل يقدر احد على مثل هذا اس پر کوئی قادر نہیں۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ استفہام کے معنی میں ہے۔ یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں؛ یہ قتادہ، ثوری، عکرمہ اور سدی کا قول ہے؛ حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔

حضرت ابن عباس سے ابو صالح نے روایت نقل کی ہے: حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ کا مطلب ہے ان پر چالیس سال گزر گئے ابھی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی وہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان پڑے رہے۔

حضرت ابن عباس سے ضحاک نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا وہ چالیس سال تک اسی طرح رہے پھر چالیس سال تک لیس دار مٹی کی صورت میں رہے پھر چالیس سال تک بجتی مٹی کی صورت میں رہے ان کی تخلیق ایک سو بیس سال کے بعد مکمل ہوئی، اس کے بعد ان میں روح پھونکی گئی۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہاں جس حِيْنٌ کا ذکر ہے اس کی مقدار کا پتہ نہیں؛ یہ ماوردی نے حضرت ابن عباس سے بیان کیا ہے (1)۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ ان کا آسمان وزمین میں کوئی ذکر نہ تھا۔ یعنی وہ محض ایک جسم تھے جن کی تصویر کشی کی گئی تھی وہ صرف مٹی تھے نہ کوئی ان کا ذکر تھا اور نہ ہی کوئی پہچان تھی، ان کے نام کا کچھ پتہ نہ تھا اور نہ ان کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ کیا ارادہ کیا گیا پھر اس میں روح پھونکی گئی؛ یہ فراء، قطرب اور ثعلب نے بات کہی۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ مخلوقات میں کوئی قابل ذکر چیز نہ تھے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی شان کے حامل تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ذکر اخبار کے معنی میں نہیں کیونکہ کائنات میں رب العالمین کی اخبار قدیمی چیز ہے بلکہ یہ ذکر شرف وقدر ومرتبہ کے معنی میں ہے؛ یہ قول کیا جاتا ہے: فلان مذكور یعنی اس کی قدر ومنزلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف: 44) اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے۔ یعنی انسان پر ایسا وقت ضرور گزرا ہے کہ وہ مخلوق کے نزدیک کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا پھر جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آگاہ کیا کہ اس نے حضرت آدم کو خلیفہ بنایا ہے اور اسے ایسی امانت سے نوازا ہے جس کے اٹھانے سے آسمان، زمین اور پہاڑ عاجز آگئے تھے تو انسان کی تمام پر فضیلت ظاہر ہوگئی تو وہ قابل ذکر چیز بن گیا۔ قشیری نے کہا: خلاصہ کلام یہ ہے وہ مخلوق کے لیے کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل ذکر چیز تھی۔ محمد بن جہیم نے فراء سے اس کی یہ تعبیر نقل کی ہے وہ شی تو تھا مگر اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ایک قوم نے کہا: نفی شی کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی زمانے میں سے کئی مدتیں گزر گئیں۔ حضرت آدم مخلوق میں کوئی قابل ذکر چیز نہ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی اصناف میں سے سب سے آخر میں اسے پیدا کیا تھا۔ معدوم کوئی چیز نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس پر حِيْنٌ واقع ہو۔ معنی اس کا یہ ہے اس پر کئی زمانے گزر گئے حضرت آدم علیہ السلام کوئی چیز نہ تھے، نہ مخلوق اور نہ مخلوقات کے ہاں قابل ذکر؛ یہ قتادہ اور مقاتل کے قول کا مطلب ہے۔ قتادہ نے کہا: انسان کی تخلیق نئی نئی ہوئی ہے ہم انسان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ

1۔ النکت والعیون، ماوردی، جلد 6، صفحہ 161

کی کسی مخلوق کو نہیں جانتے۔

مقاتل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یوں ہے ھل اتی حین من الدھر لم یکن الانسان شیئاً مذکورا کیونکہ انسان کو تمام حیوانات کی تخلیق کے بعد تخلیق کیا گیا اس کے بعد کوئی حیوان پیدا نہیں کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کی خبر ہے اور حِیْنٌ سے مراد نو ماہ ہیں جتنا عرصہ انسان اپنی ماں کے پیٹ میں رہتا ہے کیونکہ اس عرصہ میں وہ جما ہوا خون اور گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے کیونکہ اس حالت میں وہ جماد کی حالت میں ہوتا ہے اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت پڑھی تو کہا: کاش! وہ مدت مکمل ہو جاتی تو ہمیں آزمایا نہ جاتا، اے کاش! جو مدت حضرت آدم علیہ السلام پر واقع ہوئی تھی وہ قابل ذکر چیز نہ ہوتی وہ اس پر مکمل ہو جاتی ان کی اولاد نہ ہوتی اور ان کی اولاد کو آزمایا نہ جاتا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو انہوں نے کہا: کاش! وہ مدت مکمل ہو جاتی۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ بغیر کسی اختلاف کے یہاں انسان سے مراد ابن آدم ہے، نطفہ سے مراد ایسا پانی ہے جس کو ٹپکایا جاتا ہے وہ منی ہے۔ برتن میں جو تھوڑا سا پانی ہو اسے نطفہ کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اپنے نفس کو عتاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مالی أراكِ تكرهينَ الجنّة　　هل أنتِ إلا نُطفةٌ فی شَنّه

کیا وجہ ہے میں تجھے دیکھتا ہوں کہ تو جنت کو ناپسند کرتا ہے تو تو محض مشکیزہ کا ایک قطرہ ہے۔

نُطْفَةٍ کی جمع نطف اور نطاف ہے اَمْشَاجٍ کا معنی اخلاط ہے اس کا واحد مشج اور مشیج ہے جس طرح خدن اور خدین ہے۔

کہتے ہیں: مشجت ھذا بھذا الشی میں نے اس کو اس کے ساتھ ملایا ہے اس کا اسم مفعول کا صیغہ ممشوج اور مشیج آتا ہے جس طرح مخلوط اور خلیط ہے۔ مبرد نے کہا: امشاج کا واحد مشیج ہے کہتے ہیں: مشج یمشج۔ جب وہ ایک چیز کو دوسرے کے ساتھ ملا دے یہاں اس سے مراد نطفہ کا خون کے ساتھ ملنا ہے۔ شماخ نے کہا:

طَوَتْ أحْشَاءَ مُرتجَةٍ لِوَقْتٍ　　علی مَشَجٍ سُلالَتُهُ مَهِينُ

مرتجہ (وہ مادہ جو پانی کو رحم میں داخل ہونے سے روک دے) کا بطن ایک خاص وقت تک نطفہ پر لپٹا رہا جس کی اولاد حقیر تھی۔

فراء نے کہا: اَمْشَاجٍ سے مراد مرد اور عورت کے پانی، خون اور رنگ ہوتے خون کا آمیزہ ہے جب کوئی چیز مل جائے تو اسی وجہ سے مشج کہتے ہیں جس طرح تیرا قول خلط ہے اور ممشوج جس طرح تیرا قول مخلوط ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اَمْشَاجٍ سے مراد سرخی مائل سفیدی اور سفیدی مائل سرخی ہے۔ یہ ایسا قول ہے جسے بہت سے اہل لغت نے پسند کیا ہے؛ ہذلی نے کہا:

كَأَنَّ الرِّيشَ وَالْفُوقَيْنَ مِنْهُ خِلَافَ النَّصْلِ سِيطَ بِهِ مَشِيجُ

گویا پر اور اس کے دونوں سوناروں پر پھل کے برعکس سرخی مائل سفیدی لگی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مرد کا پانی جو سفید گاڑھا ہوتا ہے عورت کے پانی جو زرد نرم ہوتا ہے ملتے ہیں تو ان دونوں سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بچے کے جسم میں پٹھے، ہڈیاں اور جو طاقت ہوتی ہے وہ مرد کے پانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس بچے کے جسم میں خون، گوشت اور بال ہوتے ہیں وہ عورت کے پانی سے ہوتے ہیں، اس بارے میں ایک مرفوع روایت بھی ہے اسے بزار نے ذکر کیا ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اس کے اَمْشَاجٍ سے مراد گوشت کے لوتھڑے کی رگیں ہیں۔ انہیں سے ایک روایت مروی ہے: مرد کا پانی، عورت کا پانی اور دونوں دو رنگ والے ہوتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: مرد کا نطفہ سفید اور سرخ اور عورت کا نطفہ سبز اور زرد ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ رنگوں سے پیدا ہوا ہے، وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے پھر شرمگاہ اور رحم کے پانی سے پیدا ہوا ہے وہ پہلے نطفہ، جما ہوا خون، ہڈیاں اور گوشت ہوتا ہے؛ اسی کی مثل قتادہ نے کہا: یہ پیدائش کے مراحل ہیں نطفے کا مرحلہ، جمے ہوئے خون کا مرحلہ، ہڈیوں کا مرحلہ اور پھر ہڈیوں کو گوشت پہنا دیتا ہے، جس طرح سورۂ مومنون میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (مومنون) اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔

ابن سکیت نے کہا: امشاج سے مراد اخلاط ہیں کیونکہ وہ مختلف انواع سے ملا ہوتا ہے انسان اس سے مختلف طباع والا پیدا کیا گیا۔ اہل معانی نے کہا: اَمْشَاجٍ جمع کا صیغہ نہیں یہ واحد کے معنی میں ہے کیونکہ یہ نطفہ کی صفت ہے جس طرح کہا جاتا ہے: بُرْمَةٌ أَعْشَارٌ، ثَوْبٌ أَخْلَاقٌ۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: یہودیوں کا ایک عالم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: مجھے مرد اور عورت کے پانی کے بارے میں بتایئے؟ فرمایا: ''مرد کا پانی سفید گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد پتلا ہوتا ہے، جب عورت کا پانی غالب ہوتا ہے تو بچی پیدا ہوتی ہے اور جب مرد کا پانی غالب آ جاتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے''۔ اس عالم نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی دیتا ہوں، یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔

نَّبْتَلِيْهِ ہم اسے آزمائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے ہم اس آزمائش کو مقدر کریں گے۔ اس سے مراد امتحان ہے جس کے ذریعے امتحان لیا جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں (۱) ہم خیر اور شر کے ذریعے اسے آزمائیں گے؛ یہ کلبی نے کہا۔ (۲) ہم خوشحالی میں اس کے شکر اور تنگی میں اس کے صبر کو آزمائیں گے؛ یہ حضرت حسن بصری نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے ہم اسے مکلف بنائیں گے۔ اس میں بھی دو صورتیں ہیں (۱) پیدائش کے بعد عمل کے ساتھ؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ (۲) دین کے ساتھ تاکہ اسے طاعت کا حکم دیا جائے اور معاصی سے روکا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے ہم اسے ایک مخلوق سے دوسری مخلوق کی طرف پھیریں گے تاکہ ہم خیر و شر کے ساتھ اسے آزمائیں۔ محمد بن جہیم

نے فراء سے حکایت بیان کی کہا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا۝ ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا ہے تاکہ ہم اسے آزمائیں یہ مقدم ہے اس کا معنی موخر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آزمائش خلقت کے مکمل ہونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے اس کے کان بنائے جس کے ساتھ ہدایت کو سنے اور اس کی آنکھیں بنائیں تاکہ اس کے ساتھ ہدایت کو دیکھے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ ہم نے اس کے لیے واضح کیا اور ہم نے رسول مبعوث کر کے اس کو ہدایت و گمراہی اور خیر و شر کے راستوں کی پہچان کرائی، پس وہ ایمان لایا اور کفر کیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ۝ (البلد) اور ہم نے دونوں راستوں کی طرف اس کی راہنمائی کی۔ ضحاک، ابو صالح اور سدی نے کہا: یہاں سبیل سے مراد اس کا رحم سے نکلنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کے منافع اور مضرتیں ہیں جن کی طرف وہ طبعی اور کمال عقل کی بنا پر ہدایت پاتا ہے۔

اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۝ ان دونوں میں سے جو بھی کرے ہم نے اس کے لیے واضح کر دیا ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہاں ان شرطیہ ہے اور ما زائد ہے یعنی ہم نے اس کے لیے راستہ کو واضح کیا ہے وہ شکر کرے یا کفر کرے۔ فراء نے اسے پسند کیا ہے اور بصریوں نے اس کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ ان جزا کے لیے اسماء پر داخل نہیں ہوتا مگر اس صورت میں کہ اس کے بعد فعل مضمر ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے اس کی رشد کی طرف راہنمائی کی یعنی ہم نے دلائل قائم کر کے اس کے لیے توحید کے راستہ کو واضح کیا پھر اگر ہم اس کے لیے ہدایت کو تخلیق کر دیں تو وہ ہدایت پا جاتے اور ایمان لے آتے اور اگر ہم اس کو بے یارومددگار چھوڑ دیں تو وہ کفر اختیار کرے وہ اس طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: قد نصحت لك إن شئت فاقبل وإن شئت فاترك میں نے تجھے نصیحت کر دی ہے چاہے تو اسے قبول کرے چاہے اسے ترک کر دے۔ یعنی اصل میں فإن شئت تھا تو تاء کو حذف کیا گیا اِمَّا شَاكِرًا بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ قول کیا جاتا ہے: هدیته السبیل وللسبیل والی السبیل۔ یعنی فعل واسطہ کے بغیر، لام اور الی کے واسطہ کے ساتھ دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور دوسری سورتوں میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

شاکر اور کفور کو جمع کیا ہے شکور اور کفور کو جمع نہیں کیا جب کہ دونوں مبالغہ کے معنی میں جمع ہیں مقصود شکر میں مبالغہ کی نفی اور کفر میں اس کا اثبات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا پس اس سے مبالغہ منتفی ہو گیا اور کفر سے مبالغہ منتفی نہیں۔ نعمتوں کی زیادتی کی وجہ سے شکر کم ہے اور کفر زیادہ ہے اگرچہ احسان کے مقابلہ میں کم ہے؛ یہ ماوردی نے حکایت بیان کی ہے۔

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا۝

"بے شک ہم نے بالکل تیار کر رکھی ہیں کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی آگ"۔

دونوں فریقوں (ناشکری کرنے والے، شکر گزار) کی حالت کو بیان کیا اللہ تعالیٰ نے عقلاء سے مطالبہ کیا کہ وہ ان اوامر کو بجالائیں جن کا انہیں حکم دیا گیا، انہیں مکلف بنایا اور انہیں ان امور پر قادر بنایا۔ جو انکار کرے اس کے لیے عتاب ہے اور

جو اس کی وحدانیت کو تسلیم کرے اور شکر بجالائے اس کے لیے ثواب ہے۔ السلاسل سے مراد جہنم کی بیڑیاں ہیں ہر بیڑی کی لمبائی ستر ہزار گز ہے جس طرح سورۃ الحاقہ میں گزر چکا ہے۔ نافع، کسائی اور ابو بکر نے عاصم سے اور ہشام نے ابن عامر سے سلاسلا تنوین کے ساتھ نقل کیا ہے جب کہ باقی قراء نے اسے تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ قنبل، ابن کثیر اور حمزہ نے بغیر الف کے وقف کیا ہے جب کہ باقی قراء نے الف کے ساتھ وقف کیا ہے۔ جہاں تک پہلے قواریر کا تعلق ہے اسے نافع، ابن کثیر، کسائی اور ابو بکر نے عاصم سے تنوین کے ساتھ روایت نقل کیا ہے باقی قراء نے تنوین نہیں پڑھی۔ یعقوب اور حمزہ نے الف کے بغیر اس پر وقف کیا ہے اور باقی قراء نے الف پر وقف کیا ہے۔ جہاں تک دوسرے قواریر کا تعلق ہے اسے نافع، کسائی اور ابو بکر نے تنوین دی ہے، باقی قراء نے اسے تنوین نہیں دی۔ جس نے اسے تنوین دی ہے اسے الف کے ساتھ پڑھا ہے جس نے تنوین نہیں پڑھی اس سے الف کو ساقط کر دیا ہے۔ ابو عبید نے تینوں میں تنوین اور الف پر وقف کو اختیار کیا ہے وہ مصحف عثمانی کی اتباع کرتے ہیں کہا: میں نے مصحف عثمانی، سلاسلا کو الف اور پہلے قواریرا کو الف کے ساتھ دیکھا دوسرا الف کے ساتھ لکھا ہوا تھا تو اسے مٹا دیا گیا۔ میں نے اس کا واضح اثر دیکھا۔ جو اسے منصرف بنائے تو اس کے پاس چار دلیلیں ہیں (۱) جمع الجمع احاد کے مشابہ ہے تو اس کو احاد کی جمع کی طرح جمع بنایا گیا۔ اسے احاد کے حکم میں رکھا گیا تو وہ منصرف ہو گئے (۲) اخفش نے عربوں سے ان تمام اسماء کو منصرف نقل کیا ہے جو منصرف نہیں ہوتے مگر اسم تفضیل کا صیغہ جو من کے ساتھ استعمال نہ رہا ہو: کسائی اور فراء نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی لغت کے مطابق ہے جو تمام اسماء کو جر دیتے ہیں مگر وہ اظرف منك کو جر نہیں دیتے۔ ابن انباری نے اس بارے میں عمرو بن کلثوم کا شعر پڑھا:

كَأَنَّ سُيُوفَنَا فِينَا وَفِيهِمْ مَخَارِيقٌ بِأَيْدِي لَاعِبِينَا

گویا ہماری تلواریں ہم میں اور ان میں دھجیوں سے بٹے ہوئے کوڑے ہیں جو ہمارے کھیلنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

لبید نے کہا:

وَجَزُورِ أَيْسَارٍ دَعَوْتُ لِحَتْفِهَا بِمَغَالِقٍ مُتَشَابِهٍ أَجْسَامُهَا

فَضْلًا وَذِي كَرَمٍ يُعِينُ عَلَى النَّدَى سَمْحٌ كَسُوبُ رَغَائِبٍ غَنَّامُهَا

ان اشعار میں مخاریق، مغالق اور رغائب کو منصرف پڑھا گیا ہے جب کہ اصل قاعدہ یہ ہے کہ یہ منصرف نہ ہوتے۔

(۳) پہلے قواریر کو تنوین دی جائے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور آیات کے سرے تنوین کے ساتھ آتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مذکورا، سمیعا، بصیرا۔ پہلے کو تنوین اس لیے دی گئی کیونکہ وہ آیت کا سرا ہے اور دوسرے کو پہلے کے جوار کی وجہ سے تنوین دی گئی۔

(۴) مصاحف کی اتباع کرتے ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور کوفہ کے مصاحف میں الف کے ساتھ ہیں۔

جو ان کو تنوین نہیں دیتا اس نے اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ ہر جمع جس کے الف کے بعد تین حرف ہوں، دو حرف ہوں یا ایک حرف مشدد ہو۔ وہ معرفہ اور نکرہ میں منصرف نہیں ہوتے جس جمع میں الف کے ساتھ تین حرف ہوتے ہیں جیسے قنادیل، دنانیر اور منادیل۔ جس کے الف کے بعد دو حرف ہوتے ہیں جیسے صوامع، مساجد جس کے الف کے بعد حرف مشدد ہوتا ہے، شواب، دواب۔

خلف نے کہا: میں نے یحییٰ بن آدم کو امام ابن ادریس سے روایت نقل کرتے ہوئے سنا کہ پہلے مصاحف میں پہلا قواریر الف کے ساتھ تھا اور دوسرا الف کے بغیر تھا۔ یہ حمزہ کے مذہب کی دلیل ہے۔ خلف نے کہا: میں نے ایک مصحف میں دیکھا جسے حضرت ابن مسعود کی قراءت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ پہلا الف کے ساتھ اور دوسرا بغیر الف۔ جہاں تک اسم تفضیل جو من کے ساتھ استعمال ہو، عربوں میں سے کوئی بھی شعر یا غیر شعر میں تنوین کے ساتھ نہیں پڑھتا، کیونکہ من اضافت کے قائم مقام ہوتا ہے تو تنوین اور اضافت کو ایک حرف میں جمع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ دونوں اسم کی دلیلیں ہیں دونوں کو جمع نہیں کیا جائے گا: یہ فراء اور دوسرے علماء نے کہا۔

اَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۞ ، اغلال یہ غل کی جمع ہے جس کے ساتھ ان کے ہاتھوں کو ان کی گردن کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ جبیر بن نفیر نے حضرت ابو درداء سے روایت نقل کی ہے وہ کہا کرتے تھے: ان ہاتھوں کو الله تعالیٰ کی بارگاہ میں اٹھاؤ قبل اس کے کہ انہیں گردنوں کے ساتھ جکڑ دیا جائے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جہنمیوں کی گردنوں میں طوق اس لیے نہیں ڈالے جائیں گے کہ انہوں نے اپنے رب کو عاجز کر دیا ہے بلکہ انہیں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے طوق ڈالے جائیں گے (1)۔

سَعِيْرًا کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۞ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۞

"بے شک نیک لوگ پئیں گے شراب کے ایسے جام جن میں آب کافور کی آمیزش ہوگی۔ (کافور) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (وہ) خاص بندے پئیں گے اور جہاں چاہیں گے اسے بہا کر لے جائیں گے"۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ ، ابرار سے مراد اہل صدق ہیں جس کا واحد بر ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا: بر سے مراد موحد ہے۔ ابرار، بار کی جمع ہے جس طرح شاہد کی جمع اشہاد آتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ بر کی جمع ہے جس طرح نہر کی جمع انہار آتی ہے۔ صحاح میں ہے برّ کی جمع ابرار ہے اور بار کی جمع بررہ ہے جملہ بولا جاتا ہے: فلان يبر خالقه ويتبرره یعنی وہ اپنے خالق کی اطاعت کرتا ہے۔

الام برة بولدها ماں اپنے بچے کے ساتھ نیکی کرتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی

1۔ ابن ابی شیبہ، جلد 13، صفحہ 170۔ درمنثور، جلد 4، صفحہ 44

ہے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کا نام ابرار رکھا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے والدین اور بیٹوں کے ساتھ حسن سلوک کیا، جس طرح تیرے والد کا تجھ پر حق ہے اس طرح تیری اولاد کا تجھ پر حق ہے'' (1) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بروہ ہے جو اولاد کو تکلیف نہ دے۔ قتادہ نے کہا: ابرار وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتے ہیں اور نذر پوری کرتے ہیں حدیث طیبہ میں ہے ''ابرار وہ ہیں جو کسی کو اذیت نہیں دیتے''۔

يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ، کأس ایسے برتن کو کہتے ہیں جس میں مشروب ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد شراب ہے۔ لغت میں کأس ایسے برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو جب اس میں شراب نہ ہو تو اسے کأس نہیں کہتے۔ عمرو بن کلثوم نے کہا:

صَبَنْتِ الكَاْسَ عَنَّا أُمَّ عَمْرٍو وكان الْكَاْسُ مَجْرَاها الْيَمِينَا

اے ام عمرو! تو نے ہم سے پیالے کو روک لیا جبکہ پیالے کو دائیں جانب سے چلانا چاہیے۔

اصمعی نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے صَبَنْتَ عنّا الهدية أو ما كان من معروف تو نے ہم سے ہدیہ یا احسان کو روک لیا۔ صبنت تَصْبِنُ صَبْنًا معنی ہے تو نے روک لیا؛ یہ جوہری کا قول ہے۔

كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ مزاج کا معنی ہے اس کی آمیزش۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

كَأَنَّ سَبِيئَةً مِنْ بَيْتِ رَأْسٍ يكونُ مِزَاجُهَا عَسَلٌ وماءُ

گویا بیت رأس (اردن کا ایک مقام) کے شراب میں شہد اور پانی کی آمیزش تھی۔

اس سے بدن کا مزاج ہے اس سے مراد یہ ہے صفراء، سوداء، حرارت اور برودت۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جنت میں ایک چشمہ کا نام ہے جسے کافور کا چشمہ کہتے ہیں یعنی اس میں اس چشمہ کے پانی کی آمیزش ہوگی جسے کافور کہتے ہیں۔ سعید نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے: ان کے لیے شراب میں کافور کی آمیزش کی جائے گی اور اس پر مشک کی مہر ہوگی؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: مزاج سے مراد اس کا ذائقہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافور اس کی خوشبو کے اعتبار سے ہوگا نہ کہ ذائقہ کے اعتبار سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ارادہ کیا ہے وہ سفیدی، عمدہ خوشبو اور ٹھنڈک میں کافور کی طرح ہوگا کیونکہ کافور کو پیا نہیں جاتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (الکہف: 96) آیت میں نَارًا سے مراد آگ کی طرح ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اسے کستوری، کافور اور زنجبیل کے ساتھ عمدہ بنا دیا گیا ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ دنیا کا کافور نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں موجود چیز کو تمہارے ہاں موجود چیز کے ساتھ نام دیا ہے تاکہ تمہارے دل اس تک پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: كَانَ مِزَاجُهَا میں كَانَ زائدہ ہے یعنی ایسا جام جس میں کافور کی آمیزش ہے۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ فراء نے کہا: کافور جنت میں پانی کے ایک چشمہ کا نام ہے عَيْنًا کافور سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کأس کے محل سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مِزَاجُهَا کی ضمیر سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا

---

1۔ الکامل ابن عدی، جلد 4، صفحہ 1630

گیا ہے: یہ بطور مدح منصوب ہے جس طرح ایک آدمی کا ذکر کیا جاتا ہے تو تو کہتا ہے: العاقل اللبیب یعنی تم نے عقل مند دانا آدمی کا ذکر کیا یہ اعنی فعل کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے وہ چشمہ سے پانی پیتے ہیں۔ کافور کو قافور بھی کہتے ہیں کافور سے مراد کھجور کے گابھے کا پردہ ہے اسی طرح کفری ہے یہ اصمعی نے کہا: وہ ہرن جس سے کستوری حاصل کی جاتی ہے وہ پاکیزہ خوشے کھاتا ہے تو یہ چیز اسے کافور بنا دیتی ہے۔ فراء نے کہا: یشرب بھا او یشرف بھا دونوں معنی میں ایک جیسے ہیں گویا یَشْرَبُ بِهَا کا معنی ہے وہ اس سے سیراب ہوتا ہے اور یہ شعر پڑھا:

شَرِبْنَ بماءِ البَحْرِ ثم ترفّعتْ متی لُجَجٍ خُضْرٍ لَهُنَّ نئیج

وہ سمندر کے پانی سے سیراب ہو گئے پھر وہ سبز لہروں میں اوپر اٹھے جو لہریں تیز اور آواز والی تھیں۔

کہا: اس کی مثل ہے فلان یتکلم بکلام حسن اور یتکلم کلا ما حسنا۔ فلاں اچھی گفتگو کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یَشْرَبُ بِهَا میں باء زائدہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: باء، من کا بدل ہے تقدیر کلام یوں ہوگی یشرب منھا؛ یہ قتبی نے کہا۔

**يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝** ایک قول یہ کیا جاتا ہے: ایک آدمی اپنے گھروں میں گھومے پھرے گا اپنے محلات کی طرف اوپر جائے گا اس کے ہاتھ میں ایک ٹہنی ہوگی جس کے ساتھ وہ پانی کی طرف اشارہ کرے گا تو وہ پانی اس کے ساتھ ساتھ چلے گا جہاں جہاں وہ اپنے گھروں میں گھومے گا، وہ سطح زمین پر ہوگا کوئی نالہ، کھالہ نہ ہوگا۔ وہ محلات میں جہاں جہاں جائے گا پانی اس کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝ کا یہی مقصود ہے وہ نہریں نکالیں گے جس طرح ایک آدمی نہر کو یہاں وہاں نکالتا ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اسے لے جائیں گے جہاں چاہیں گے۔ وہ ان کی پیروی کرے گا جہاں سے وہ مڑیں گے وہ نہر بھی مڑ جائے گی۔

ابو مقاتل، ابو صالح سے وہ سعد سے وہ ابو سہیل سے وہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں چار چشمے ہیں، دو چشمے عرش کے نیچے سے نکلتے ہیں ان دو میں سے ایک تو وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور دوسرا زنجبیل ہے وہ عرش کے اوپر سے ابلتے ہیں ان میں سے ایک تو وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سلسبیل کے نام سے کیا ہے اور دوسرا تسنیم ہے''(1) حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں اس کا ذکر کیا ہے کہا: تسنیم مقربین کے لیے خاص ہے وہ اسے خالص پئیں گے، کافور، ابرار کے لیے ہے ابرار کو تسنیم سے آمیزہ ملے گا۔ زنجبیل اور سلسبیل یہ ابرار کے لیے ہے اس کی ان کے مشروب میں آمیزش ہوگی۔ اس کا قرآن حکیم میں ذکر ہے اسے کون پئے گا اس کے ذکر سے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ ابرار کے لیے جو آمیزہ کی صورت میں ہوگا تو وہ مقربین کے لیے خالص ہوگا۔ جو ابرار کے لیے خاص ہے وہ باقی جنتیوں کے لیے آمیزہ کی صورت میں ہوگا۔ ابرار سے مراد الصادقون ہیں اور مقربون سے مراد صدیقین ہیں۔

**يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ**

1۔ الدر المنثور، جز 6، صفحہ 301

جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝

”جو پوری کرتے ہیں اپنی منتیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کا شر ہر سو پھیلا ہوگا۔ اور جو کھانا کھلاتے ہیں الله کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔ (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں کھلاتے ہیں الله کی رضا کے لیے نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریے کے“۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ جب وہ نذر مانتے ہیں تو اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ معمر نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے اس سے مراد الله تعالیٰ کی جانب سے فرض کی گئی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، عمرہ اور دوسرے فرائض ہیں (1)۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: جب وہ الله تعالیٰ کے حق میں نذر مانیں تو وہ اسے پورا کرتے ہیں۔ فراء اور جرجانی نے کہا: کلام میں اضمار ہے یعنی وہ دنیا میں نذر پوری کیا کرتے تھے۔ عرب اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے کبھی کان کا ذکر کرتے اور کبھی حذف کر دیتے۔

نذر۔ اس کی حقیقت یہ ہے مکلف نے اپنے نفس پر کسی چیز کو اس لیے واجب کیا کہ وہ اسے بجالائے گا اگر تو چاہے تو اس کی تعریف میں یہ بھی کہہ سکتا ہے: نذر سے مراد مکلف کا طاعات میں سے کسی چیز کو اپنے اوپر واجب کرنا۔ اگر وہ اسے اپنے اوپر واجب نہ کرتا تو وہ چیز اس پر واجب نہ ہوتی۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں: دونوں کا معنی ایک ہی ہے الله تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ (الحج: 29)

پھر وہ اپنی میل کو دور کریں اور حج کے وہ اعمال جن کو انہوں نے حج کے احرام کی وجہ سے اپنے اوپر لازم کیا ہے ان کو پورا کریں۔ یہ قتادہ کے قول کو تقویت بہم پہنچاتا ہے کہ نذر میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جن کو انسان اپنے ایمان کی وجہ سے لازم کرتا ہے جیسے الله تعالیٰ کے احکام کی اطاعت؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ نذر پوری کرنے سے مراد یہ ہے وہ غلام آزاد کرنے، روزے رکھنے اور نماز پڑھنے کی نذر کو پورا کرتے ہیں۔ ابوبکر بن عبدالعزیز نے ان سے روایت نقل کی ہے کہ امام مالک نے کہا: نذر سے مراد قسم ہے۔

وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝ وہ قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر غالب، چھا جانے والا اور عام ہے۔ لغت میں مُسْتَطِيْرًا کا معنی پھیلا ہوا ہے۔ عرب کہتے ہیں: استطار الصدع فی القارورۃ والزجاجۃ واستطال بوتل اور شیشے میں ٹوٹنے کی لکیر لمبی ہوگئی؛ اعشیٰ نے کہا:

وَبَانَتْ وقد أَسْأَرَتْ فی الفُؤا دِ صَدْعًا علی نَأْيِهَا مُسْتَطِيرًا

وہ جدا ہوئی اس نے اپنی دوری کی وجہ سے دل میں لمبا شق چھوڑا۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: استطار الحریق آگ پھیل گئی۔ استطار الفجر روشنی پھیل گئی؛ حضرت حسان نے کہا:

وهَانَ علی سَرَاةِ بنی لُؤَيٍّ حَرِيقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيرُ

بویرہ کے مقام پر بنولوی کے سرداروں پر پھیل جانے والی آگ آسان ہوگئی۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 23، صفحہ 541-542

قتادہ کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم! اس دن کا شر پھیل جائے گا یہاں تک کہ وہ آسمانوں اور زمین کو بھر دے گا (1)۔ مقاتل نے کہا: اس کا شر آسمانوں میں پھیل گیا تو وہ پھٹ گئے، ستارے ٹوٹ گئے، فرشتے خوفزدہ ہو گئے، زمین میں پہاڑ اڑ گئے اور پانی انتہائی گہرائی میں چلے گئے۔

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: وہ کھانا تھوڑا ہونے، اس کی محبت ہونے اور اس کی چاہت ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ دارانی نے کہا: حُبِّهٖ کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ فضیل بن عیاض نے کہا: کھانا کھلانے کی محبت رکھتے ہوئے کھانا کھلاتے ہیں۔ ربیع بن خثیم کے پاس جب کوئی سائل آتا تو آپ فرماتے: اسے شکر کھلاؤ کیونکہ ربیع شکر پسند کرتے تھے۔

مسکین سے مراد مسکنہ والا ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے: دروازوں پر گردش کرنے والا وہ تجھ سے تیرے مال کا سوال کرتا ہے۔

یتیم سے مراد مسلمانوں کا یتیم ہے۔ منصور نے حضرت حسن بصری سے روایت نقل کی ہے کہ ایک یتیم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تھا ایک روز آپ نے اپنا کھانا منگوایا یتیم کو طلب کیا تو اسے نہ پایا حضرت ابن عمر جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس وقت وہ یتیم آیا تو کھانا نہ پایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے ستو اور شہد منگوایا فرمایا: اسے لے لو اللہ کی قسم! تیرے ساتھ کوئی غبن نہیں کیا گیا۔

اسیر سے مراد وہ شخص ہے جسے قید کر دیا جائے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہا اسیر سے مراد مشرک ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہے؛ یہ قتادہ کا بھی قول ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے: اسیر سے مراد وہ شخص ہے جسے قید کیا گیا ہو۔ سعید بن جبیر اور عطا نے یہی کہا ہے: اس سے مراد وہ مسلمان شخص ہے جسے کسی حق کے بدلہ میں قید کیا گیا ہو۔ سعید بن جبیر نے قتادہ اور حضرت ابن عباس جیسا قول کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے ان کے قیدی ان دنوں میں مشرک ہوا کرتے تھے، تیرا مسلمان بھائی اس چیز کا زیادہ حق دار ہے کہ تو اسے کھلائے۔ عکرمہ نے کہا: اسیر سے مراد غلام ہے۔ ابو حمزہ ثمالی نے کہا: اسیر سے مراد عورت ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: استوصوا بالنساء خيرًا فانهن عوان عندكم (2) عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ وہ تمہاری قید میں ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی فرمایا: "مسکین سے مراد فقیر ہے، یتیم سے مراد جس کا باپ نہ ہو اور اسیر سے مراد قیدی ہے" یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مسکین کو کھانا کھلانے والی آیت کو صدقات والی آیت نے منسوخ کر دیا، قیدی کو کھانا کھلانے والی آیت کو تلوار والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کا حکم ثابت ہے یتیم و مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم نفل کے طور پر ہے، قیدی کو کھانا کھلانے کا حکم اس کی جان کی حفاظت کی خاطر ہے مگر امام اس کے

1۔ تفسیر طبری

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق المرأۃ علی الزوج، حدیث نمبر 1840، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے میں جو پسند کرے۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ اسیر سے مراد ناقص العقل ہو کیونکہ وہ اپنے جنون کی قید میں ہے مشرک کی قید انتقام ہے جو امام کی رائے پر موقوف ہے یہی نیکی اور احسان ہے۔ عطا سے مروی ہے: اسیر اہل قبلہ اور دوسرے لوگوں میں سے بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا: گویا یہ قول عام ہے جو تمام اقوال کو جامع ہے اور مشکوک قیدی کو کھانا کھلانا اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادت ہے مگر یہ نفلی صدقہ ہوگا جہاں تک فرضی صدقات ہیں تو وہ ان پر صرف کرنا جائز نہیں۔ مسکین، یتیم، اسیر اور لغت میں ان کے اشتقاق کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ وہ مسکین، یتیم اور اسیر کو اپنی زبانوں سے یہ کہتے ہیں: ہم تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے ثواب کی امید رکھتے ہوئے کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کسی بدلہ کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم اس بارے میں ہماری تعریف کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دنیا میں جب وہ کھانا کھلاتے تھے تو ان کی یہی نیتیں ہوا کرتی تھیں۔ سالم نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے: انہوں نے اپنی زبانوں سے یہ بات نہیں کی لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کے بارے میں یہ علم تھا اس لیے ان کی ان الفاظ سے تعریف کی تاکہ رغبت کرنے والا اس بارے میں ان سے رغبت کرے۔ سعید بن جبیر نے یہ بات کہی: قشیری نے ان سے یہ نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت مطعم بن ورقاء کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے نذر مانی تھی اور اسے پورا کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ان مہاجرین کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے بدر کے قیدیوں کی کفالت اٹھائی تھی وہ سات افراد تھے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد اور حضرت ابو عبیدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ ایک انصاری کے حق میں نازل ہوئی جس نے ایک دن میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلایا تھا (1)۔

ابوحمزہ ثمالی نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کھانا کھلایئے بے شک میں سخت مشقت میں ہوں۔ فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں جو میں تجھے کھلاؤں لیکن تو کسی کو تلاش کر''۔ ایک انصاری کے پاس آیا جو اپنی بیوی کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہا تھا اس آدمی نے اس انصاری سے سوال کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ذکر کیا بیوی نے کہا: اسے کھلاؤ، اسے پلاؤ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یتیم آیا اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے کچھ کھلایئے۔ فرمایا: ''میرے پاس تو ایسی کوئی چیز نہیں جو تجھے کھلاؤں لیکن تم تلاش و جستجو کرو'' اس یتیم نے اس انصاری سے کھانا طلب کیا اس کی عورت نے کہا: اسے کھلاؤ پلاؤ، تو اس انصاری نے اسے کھلایا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قیدی آیا اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کچھ کھلایئے کیونکہ میں سخت مشقت میں مبتلا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! میرے پاس کچھ بھی نہیں جو میں تجھے کھلاؤں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 428

بلکہ تم طلب کرو' وہ اسی انصاری کے پاس گیا اس نے اس سے مطالبہ کیا اس کی بیوی نے کہا: اسے کھلاؤ اور اسے پلاؤ تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ علماء تفسیر نے کہا: یہ آیت حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی لونڈی فضہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام نیک لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی اور جس نے بھی کوئی اچھا عمل کیا یہ آیت عام ہے۔ نقاش، ثعلبی، قشیری اور دوسرے کئی مفسرین نے حضرت علی شیر خدا، حضرت فاطمہ الزہرا اور ان کی لونڈی کے بارے میں ایک روایت نقل کی ہے جو صحیح اور ثابت نہیں اسے لیث نے مجاہد سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں۔ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما دونوں مریض ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی عیادت کی اور عام لوگوں نے بھی ان کی عیادت کی انہوں نے کہا: اسے ابوالحسن جابر جعفی نے قنبر سے جو حضرت علی شیر خدا کے غلام تھے سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہوئے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ان کی عیادت کی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اباالحسن! پھر حدیث، لیث بن سلیم کی حدیث کی طرف لوٹ جاتی ہے کاش! آپ اپنے بیٹوں کی جانب سے کوئی نذر مانتے ہر نذر جس کو پورا نہ کیا جائے تو وہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میرے دونوں بچے صحت مند ہو جائیں تو میں شکرانہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے تین روزے رکھوں گا۔ ان کی لونڈی نے کہا: اگر میرے دونوں سردار صحت مند ہو گئے تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے تین روزے رکھوں گی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اسی طرح کہا۔ جعفی کی حدیث میں ہے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین نے کہا: ہم پر بھی اسی کی مثل ہے۔ دونوں بچے صحت مند ہو گئے جبکہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آل کے ہاں کچھ بھی نہ تھا۔ حضرت علی شیر خدا شمعون بن حاریا خیبری کے پاس گئے وہ یہودی تھا اس سے تین صاع جو ادھار لیے اور انہیں لے آئے اسے گھر کے ایک کونے میں رکھا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک صاع جو لیے اسے پیسا اور اس کی روٹیاں پکائیں۔ حضرت علی شیر خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی پھر گھر آئے اور کھانا اپنے سامنے رکھا۔ جعفی کی حدیث میں ہے لونڈی نے ایک صاع جو لیے اس سے پانچ روٹیاں پکائیں ہر ایک کے لیے ایک روٹی تھی جب پہلا روزہ مکمل ہوا تو انہوں نے اپنے سامنے روٹی اور نمک رکھا کہ ان کے پاس ایک مسلمان مسکین آیا کہا: اللہ کی قسم! میں بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دستر خوان سے کھلائے حضرت علی شیر خدا نے اسے سنا تو یہ شعر پڑھنے لگے:

فاطمَ ذاتَ الفضلِ والیقینْ يا بنتَ خیرِ النَّاسِ أجمعینْ

اے فاطمہ! اے فضل و یقین والی! اے تمام لوگوں سے بہتر کی بیٹی!۔

أما تَرَیْنَ البائسَ المسکینْ قد قام بالباب له حنینْ

کیا تو محتاج کو نہیں دیکھتی دروازے پر ایک ایسا آدمی کھڑا ہے جس کی دکھ بھری آواز آ رہی ہے۔

یشکو إلی اللہ ویستکینْ یشکو إلینا جائعٌ حزینْ

وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی شکایت کرتا ہے اور ہمارے سامنے ایک بھوکا غمگین شکایت کرتا ہے۔

کل امری بکسبہ رھینٌ وفاعل الخیرات یستبینٌ

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے میں رہن رکھا گیا ہے اور بھلائیاں کرنے والا واضح ہوتا ہے۔

موعِدُنا جَنَّة عِلِّیینْ حرمھا اللہ علی الضَّنِینْ

ہمارے ساتھ اعلیٰ علیین کا وعدہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے بخیل پر اسے حرام کر دیا ہے۔

وللبخیل موقفٌ مھینْ تَھوِی بِہِ النَّار إلی سِجِّینْ

بخیل کے لیے رسوا کرنے والا ٹھکانہ ہے جہنم اسے سجین تک لے جائے گی۔

شرابہ الحمیم والغِسْلِینْ من یفعلِ الخیرَ یقم سمینْ

اس کا مشروب کھولتا ہوا پانی اور جہنمیوں کا نچوڑ ہوگا جو بھلائی کرتا ہے وہ موٹا ہوگا۔

وَیَدْخُل الجَنَّة أیَّ حِیْنْ

وہ جنت میں جس وقت چاہے گا داخل ہو جائے گا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں:

أمرُکَ عندِی یا بن عَمّ طاعۃٌ مابِیَ من لُؤمٍ ولا وَضَاعۃٌ

اے چچازاد! تیرا حکم میرے نزدیک قابل اطاعت ہے میرے نزدیک ملامت کا باعث اور بے وقعت نہیں۔

غَذَیْتُ فی الخبز لہ صناعۃٌ أطعِمہ ولا أُبالی السَّاعۃٌ

میں نے روٹی تیار کرنے میں دن صرف کر دیا ہے اسے کھلاؤ اس وقت مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

أرجو إذا أشبعتُ ذا المَجَاعۃٌ أَنْ ألحقَ الأخیارَ والجَمَاعۃٌ

جب میں بھوکے کو سیر کروں گی تو میں نیک لوگوں اور جماعت کے ساتھ جا ملوں گی۔

وادخلَ الجَنَّة لی شَفَاعۃٌ

میں جنت میں داخل ہو جاؤں گی میرے لیے شفاعت ہے۔

گھر والوں نے اسے کھانا کھلا دیا وہ اس دن اور رات بھوکے رہے اس روز انہوں نے خالص پانی کے سوا کچھ نہ چکھا جب دوسرا دن ہوا انہوں نے دوسرا صاع جو کا لیا اسے پیسا اور اس سے روٹی پکائی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی پھر آپ گھر آئے اور کھانا اپنے سامنے رکھا تو دروازے پر ایک یتیم آ کھڑا ہوا اس نے کہا: السلام علیکم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والو! میں مہاجرین کی اولاد میں سے ایک یتیم ہوں میرا والد یوم عقبہ کو شہید ہو گیا مجھے کھانا کھلاؤ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت کے دستر خوان سے کھانا کھلائے۔ حضرت علی شیر خدا نے اس کی آواز سنی اور یہ شعر پڑھنا شروع کر دیے:

فاطمَ بنتَ السَّیدِ الکریمْ بنتَ نَبِیٍّ لیس بالزَّنِیمْ

اے سید کریم کی بیٹی! اے نبی کی بیٹی! جو بے شان نہ تھے۔

لقد أتی الله بذی الیتیم من یرحم الیوم یکن رحیم

اللہ تعالیٰ ایک یتیم کو لایا، جو آج اس پر رحم کرے گا اس پر رحم کیا جائے گا۔

ویدخل الجنة أی سلیم وقد حرم الخلد علی اللئیم

جنت میں کوئی بھی سلیم الفطرت داخل ہو جائے گا اور جنت کمینے آدمی پر حرام کر دی گئی ہے۔

ألا یجوز الصراط المستقیم یزل فی النار إلی الجحیم

وہ پل صراط پر سے نہیں گزر سکے گا اور وہ جحیم تک آگ میں پھسلتا ہی جائے گا۔

شرابه الصدید والحمیم

اس کا مشروب پیپ اور کھولتا ہوا پانی ہوگا۔

حضرت فاطمہ بنت نبی نے یہ کہنا شروع کر دیا۔

أطعمه الیوم ولا أبالی وأوثر الله علی عیالی

آج اسے کھلاؤ اور مجھے کوئی پرواہ نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے ہماری اولاد پر ترجیح دی ہے۔

أمسوا جیاعا وهم أشبالی أصغرهم یُقتَلُ فی القتالِ

انہوں نے بھوکے شام کی جب کہ وہ میرے شیر ہیں، ان میں سب سے چھوٹا جنگ میں قتل کیا جاتا ہے۔

بکربلا یُقتَلُ باغتیالِ یاویلُ لِلقاتِلِ مَعْ وَبالِ

کربلا میں اسے دھوکہ سے قتل کیا جائے گا ہائے قاتل کے لیے عذاب کے ساتھ ہلاکت ہے۔

تَهوی به النار إلی سِفالِ وفی یدیه الغُلُّ والأغلال

آگ انہیں نیچے تک لے جائے گی اور اس کے ہاتھوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی۔

کبولة زادت علی الأکبال

انہوں نے اسے کھانا کھلایا وہ دو دن اور دو راتیں ٹھہرے رہے انہوں نے خالص پانی کے سوا کوئی چیز نہ چکھی۔ جب تیسرا دن تھا انہوں نے باقی ماندہ صاع لیا اسے پیسا اور اس کی روٹیاں پکائیں۔ حضرت علی شیر خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی پھر وہ گھر آئے کھانا ان کے سامنے رکھا گیا کہ ایک قیدی ان کے پاس آگیا وہ دروازے پر کھڑا ہو گیا اس نے کہا: اے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والو! تم ہمیں قیدی بناتے ہو ہمیں باندھتے ہو اور ہمیں کھانا نہیں کھلاتے، مجھے کھانا کھلاؤ کیونکہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدی ہوں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اس کی بات سنی تو آپ یہ اشعار پڑھنے لگے:

فاطم یا بنتَ النبیِّ أحمدْ بنت نبیٍّ سیدٍ مُسَوَّدْ

اے فاطمہ! اے نبی احمد کی بیٹی! اے سردار نبی کی بیٹی!

وسماہ اللہ فھو محمد قد زانہ اللہ بحسنٍ أغیدْ

اللہ تعالیٰ نے ان کا نام رکھا پس وہ محمد ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت ہی حسین بنایا ہے۔

ھذا أسیرٌ للنبیّ المھتدَ مُثقَلٌ فی غُلّہ مُقیّدْ

یہ ہدایت یافتہ نبی کا قیدی ہے یہ اپنے طوق کے نیچے دبا جا رہا ہے یہ بیڑیوں میں قید ہے۔

یَشکو إلینا الجوعَ قد تمددَ من یُطعِم الیومَ یجدہ فی غدْ

وہ ہمارے سامنے طویل بھوک کی شکایت کرتا ہے جو آدمی آج کھلاتا ہے کل اسے پالے گا۔

عند العلیّ الواحدِ الموحّدْ ما یزرع الزارِعُ سوف یَحصُدْ

اللہ تعالیٰ جو بلند شان والا یکتا ہے، جو اس کے ہاں نیکی کرے عنقریب اسے کاٹے گا۔

أعطیہ لا لا تجعلیہِ أقعد

اسے عطا کیجئے اسے رسوا نہ کیجئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ شعر پڑھنے شروع کر دیئے:

لم یَبْقَ مما جاء غیرُ صاعْ قد ذھبت کَفِّی مع الذِّراعْ

جو وہ کھانا لائے اس میں سے صاع کے سوا کچھ باقی نہیں بچا میری تو ہتھیلی بازو کے ساتھ جاتی رہی۔

ابنایَ واللہ ھم جِیَاعْ یا ربّ لا تترکھما ضیاعْ

اللہ کی قسم! میرے دونوں بیٹے بھوکے ہیں اے میرے رب! ان دونوں کو ضائع نہ ہونے دے۔

أبوھما للخیر ذو اصطناعْ یَصطنِع المعروفَ بابتداعْ

ان دونوں کا والد نیکی کرنے والا ہے وہ شروع سے نیکی کرنے والا ہے۔

عَبْلُ الذّراعین شدید الباعْ وما علی رأسِیَ من قِناعْ

وہ بٹے ہوئے بازوں والا اور ضرورت مند ہے اور میرے سر پر اوڑھنی بھی نہیں۔

إلّا قناعًا نَسْجُہ أنْسَاعْ

مگر ایسی اوڑھنی جو تسمہ کی طرح بن گئی ہو۔

انہوں نے اسے کھانا دیا اور تین دن اور تین راتیں خالص پانی کے سوا انہوں نے کسی چیز کو نہ چکھا جب چوتھا دن تھا جب کہ نذر پوری ہو چکی تھی تو حضرت علی شیر خدا نے اپنے دائیں ہاتھ میں حضرت حسن اور بائیں ہاتھ میں حضرت حسین کو پکڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بھوک کی شدت سے چوزوں کی طرح کانپ رہے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا فرمایا: ''اے ابا الحسن میں تم میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں مجھے کس قدر تکلیف دے رہا ہے۔ ہمیں ہماری بیٹی کے پاس لے چلو'' وہ سب ان کی طرف گئے جبکہ وہ اپنی عبادت کی جگہ میں تھیں ان کا پیٹ ان کی پشت کے ساتھ لگا ہوا تھا جب رسول اللہ

سلیاتیلم نے انہیں دیکھا اور ان کے چہرہ میں بھوک کے آثار کو دیکھا تو آپ رو دیئے: ''فرمایا اے الله! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والے بھوک کی وجہ سے مرے جا رہے ہیں'' حضرت جبریل امین نازل ہوئے اور سورۂ دہر کی آیات تلاوت کیں۔

حکیم ترمذی، ابو عبد الله نے ''نوادر الاصول'' میں کہا (1): یہ حدیث من گھڑت ہے اس حدیث کو گھڑنے والے نے بڑی ذہانت سے کام لیا یہاں تک کہ سننے والوں پر معاملہ مشتبہ ہوگیا اس روایت سے جاہل افسوس کرتے ہوئے ہونٹ کاٹتا ہے کہ وہ اس صفت پر کیوں نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ اس طرح کا عمل کرنے والا قابل مذمت ہے جب کہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: 219)

وہ آپ سے سوال کرتے ہیں وہ کیا خرچ کریں فرمائیے: ضرورت سے زائد۔ فضل سے مراد وہ مال ہے جو تیری اور تیرے خاندان کی ضروریات سے زائد ہو۔ رسول الله سلیاتیلم سے متواتر ایسی روایات آئی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے غنا چھوڑ جائے، اپنی ذات پر خرچ کرنا شروع کرو پھر ان پر خرچ کرو جو تیری زیر کفالت ہیں۔

الله تعالیٰ نے خاوندوں پر اپنے گھر والوں اور اپنی اولاد کا نفقہ فرض کیا ہے۔ رسول الله سلیاتیلم نے ارشاد فرمایا: ''ایک انسان کے لیے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ قوت لایموت کو ضائع کر دے (2) کیا کوئی عقلمند یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت علی شیر خدا اس امر سے ناواقف تھے یہاں تک کہ انہوں نے پانچ یا چھ سال کے بچوں کو تین دن اور تین راتیں بھوکا رکھا یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے پیچ و تاب کھانے لگے، پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئیں یہاں تک کہ ان کی تکلیف نے رسول الله سلیاتیلم کو رلا دیا چلو انہوں نے سائل کو اپنی ذات پر ترجیح دی کیا یہ جائز تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس چیز پر برانگیختہ کرتے۔ چلو یہ بھی مان لیا کہ انہوں نے حضرت علی شیر خدا کی وجہ سے اس سخاوت کا اظہار کیا تو کیا یہ جائز تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تین دن اور راتیں بھوک پر مجبور کرتے؟ اس قسم کی روایات جہال کے ہاں مشہور ہو سکتی ہیں۔ الله تعالیٰ بیدار دلوں کے بارے میں اس چیز کو ناپسند کرتا ہے کہ وہ حضرت علی شیر خدا کے بارے میں اس چیز کا گمان کریں۔ کاش! میں یہ سمجھ سکتا کہ وہ کون تھا جس نے حضرت علی شیر خدا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان اشعار کو یاد رکھا اور دونوں نے جو ایک دوسرے کو جواب دیا اسے یاد رکھا یہاں تک کہ اس نے ان راویوں تک ان کو پہنچایا۔ یہ اور اس قسم کی روایات قیدیوں کی باتیں ہیں میرا یہی خیال ہے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ قید خانوں میں ہمیشہ قید رہتے وہ کسی حیلہ کے بغیر وہاں رہتے وہ قصہ گوئی کے طریقہ پر یہ روایات لکھتے اس قسم کی روایات پر یہ مشق کی گئی جب اس قسم کی روایات ماہرین تک پہنچتیں تو وہ انہیں پھینک دیتے اور انہیں ناکارہ قرار دیتے ہر چیز کی کوئی نہ کوئی آفت ہوتی ہے اور دین کی آفت اور مکر بہت بڑھ کر ہوتا ہے۔

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ۝

''ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے اس دن کے لیے جو بڑا ترش (اور) سخت ہے پس بچا لے گا انہیں الله تعالیٰ اس

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 65
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم، حدیث نمبر 1442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دن کے شر سے اور بخش دے گا انہیں چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور''۔

اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا یَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِیۡرًا○ عَبُوۡسًا یہ یَوۡمًا کی صفت ہے یعنی ایسا دن جس کی ہولنا کی اور شدت کی وجہ سے چہرے ترش رو ہوں گے، معنی ہے ہم ترش رو دن سے ڈرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کافر اس دن ترش رو ہوگا یہاں تک کہ اس سے تارکول جیسا پسینا بہے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: العبوس کا معنی تنگ ہے۔ قمطریر کا معنی طویل ہے؛ شاعر نے کہا:

شدیدًا عبوسًا قمطریرًا سخت، ترش رو اور لمبا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: قمطریر کا معنی شدید ہے عرب کہتے ہیں: یوم قمطریر، قماطر، عصیب سب کا معنی ایک ہی ہے؛ فراء نے یہ شعر پڑھا:

بنی عَمِّنَا هل تَذۡكُرونَ بَلَاءَنَا عليكم إذا ما كان يومٌ قَمَاطِرُ

اے ہمارے چچا زاد بھائیو! کیا تم ہماری اس جنگ کو یاد کرتے ہو جو تمہارے خلاف ہوئی جب دن بہت سخت تھا۔

اقمطر کا معنی ہے جب وہ سخت ہو جائے۔ اخفش نے کہا: قمطریر کا معنی ہے دنوں میں سے جو سب سے سخت اور آزمائش میں طویل ہو؛ شاعر نے کہا:

فَفِرُّوا إذا ما الحرب ثار غُبارُہ ولَجَّ بها اليومُ العَبُوسُ القُمَاطِرُ

جب جنگ نے غبار اڑایا تو وہ بھاگ گئے اور سخت آزمائش والا دن اس کے ساتھ گڈ مڈ ہو گیا۔

کسائی نے کہا: اقمطر الیوم وازمهر، ان کا مصدر اقمطرار اور ازمهرار آتا ہے اسم فاعل قمطریر اور زمهریر ہے یوم مقمطر اس وقت کہتے ہیں جب وہ بہت ہی سخت ہو جائے؛ ہذلی نے کہا:

بَنُو الحَرۡبِ أَرۡضِعۡنَا لهم مُقۡمَطِرَّةٌ ومَنۡ يُلۡقَ مِنَّا ذلكَ اليومَ يَهۡرُبِ

وہ سخت جنگجو ہیں ہمیں ان کے لیے دودھ پلایا گیا ہے جو اس دن ہم سے ملتا ہے بھاگ جاتا ہے۔

مجاہد نے کہا: عبوس اسے کہتے ہیں جو ہونٹوں سے ترشی کا اظہار کرے اور قمطریر وہ ہوتا ہے جو پیشانی اور دونوں ابروؤں سے اس کا اظہار کرے انہوں نے اس دن کی سختیوں کی وجہ سے متغیر چہرے کی صفات میں شمار کیا ہے۔

يَغۡدُو على الصَّيۡدِ يَعُودُ مُنۡكَسِرۡ ويَقۡمَطِرُّ ساعةً ويَكۡفَهِرُّ

وہ شکار پر حملہ آور ہوتا ہے جب کہ وہ ٹوٹ کر لوٹتا ہے وہ ایک لحہ کے لیے سخت ہوتا ہے اور سخت ترش ہو جاتا ہے۔

ابو عبید نے کہا: یہ کہا جاتا ہے رجل قمطریر یعنی دونوں آنکھوں کے درمیانی حصہ کو سمیٹنے والا ہے۔ زجاج نے کہا: اقمطرت الناقة یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اپنی دم کو اٹھائے اور اس کے دونوں کناروں کو جمع کر دے۔ وزمت بانفها اس نے ناک کی تکلیف کی وجہ سے سر اٹھایا ہوا ہے اس نے اسے قطر سے مشتق مانا ہے اور میم کو زائد شمار کیا۔

اسد بن ناعصہ نے کہا:

اصطليتُ الحروبَ فی کلّ یومٍ باسِلِ الشَّرِّ قَمْطَرِيرِ الصَّبَاحِ

میں ہر روز جنگوں میں شامل ہوا جو دن ترش جنگ والے اور ترش صبح والے تھے۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس دن کی شدت اور عذاب کو دور کر دیا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی یعنی اسے دیکھا تو انہیں حسن و سرور عطا کیا۔ حسن اور مجاہد نے کہا: تر و تازگی ان کے چہروں میں اور خوشی ان کے دلوں میں تھی۔ نَضْرَةً میں تین صورتیں ہیں، ان میں سے ایک سفیدی اور صفائی ہے؛ یہ ضحاک نے کہا۔ دوسری حسن و خوبصورتی؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے۔ تیسری یہ نعمت کا اثر ہے؛ یہ ابن زید نے کہا۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

''اور مرحمت فرمائے گا انہیں صبر کے بدلے جنت اور ریشمی لباس، وہاں پلنگوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے نہ نظر آئے گی انہیں وہاں سورج کی تپش اور نہ ٹھرن۔ اور قریب ہوں گے ان سے اس کے درختوں کے سائے اور میووں کے گچھے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے''۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ انہوں نے فقر پر جو صبر کیا اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جنت اور ریشم عطا فرمائے گا۔ قرظی نے کہا: روزوں پر جزا دے گا۔ عطا نے کہا: تین دن بھوکا رہنے پر جزا دے گا۔ یہ نذر کے دن ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنے، اللہ تعالیٰ کی معصیت اور اس کے محارم سے بچنے پر صبر کرنے پر جزا دے گا۔ ما مصدریہ ہے۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوگی کہ یہ آیت تمام نیک لوگوں اور جس نے اچھا کیا اس کے بارے نازل ہوئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صبر کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا: ''صبر کی چار صورتیں ہیں (۱) پہلے صدمہ پر صبر (۲) فرائض کی ادائیگی پر صبر (۳) اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب پر صبر (۴) مصائب پر صبر''۔

اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرے گا اور انہیں ریشم پہنائے گا اسے دنیا کے ریشم کا نام دیا جاتا ہے اسی طرح آخرت میں ہوگا اور اس میں وہ کچھ ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ یہ روایت پہلے گزر چکی ہے: جس نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا وہ آخرت میں ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔ میں جنت میں اسے پہناؤں گا جسے پہناؤں گا یہ حقیقت میں اس کے بدلے میں ہوگا کہ انہوں نے دنیا میں اپنے آپ کو ان ملبوسات سے اپنے آپ کو روکا جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ، ھا ضمیر سے مراد جنت ہے مُّتَّكِـِٕيْنَ کو ھم ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ اس حال میں عامل جزی ہے صَبَرُوْا اس میں عامل نہیں ہے کیونکہ صبر دنیا میں تھا اور الاتکاء آخرت میں ہوگا۔ فراء نے کہا: اگر تو چاہے تو مُّتَّكِـِٕيْنَ کو صفت بنا لے گویا کلام یوں ہوگی: جزاھم جنة متكئين فيها۔

خیموں میں پلنگوں پر، یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ عربوں سے کچھ ایسے اسماء آئے ہیں جو چند صفات پر مشتمل ہیں ان میں سے ایک الاریکہ ہے یہ نہیں بولا جاتا مگر ایسے پردے کے لیے جو چارپائی پر بنایا گیا ہو۔ انہیں میں سے ایک سجل ہے وہ پانی

سے بھرا ہوا ڈول ہے جب وہ پانی سے خالی ہو تو اس کو سجل نہیں کہتے۔ اسی طرح ذنوب ہے انہیں ذنوب نہیں کہتے مگر جب انہیں بھرا جائے، کاس کو کاس نہیں کہتے جب تک وہ شراب سے چھلک نہ رہا ہو، اسی طرح طبق ہے جب اس پر ہدیہ رکھ کر بھیجا جائے تو اسے مھدی کہتے ہیں، جب وہ تحفہ سے فارغ ہو تو اسے طبق اور خوان کہتے ہیں۔ ذورمہ نے کہا:

خُدُودٌ جَفَتْ فِی السَّیْرِ حَتّٰی کَاَنَّمَا يُبَاشِرْنَ بِالْمَعْزَاءِ مَسَّ الْاَرَائِكِ

اس شعر میں الارائك سے مراد ایسے بستر ہیں جو چار پائیوں پر ہیں۔

لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وہ جنت میں سورج کی گرمی جیسی گرمی نہ دیکھیں گے اور نہ ہی سخت ٹھنڈک۔

مُنَعَّمَةٌ طَفْلَةٌ كَالْمَهَا لَمْ تَرَ شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيْرَا

وہ نیل گائے کی طرح آسودہ اور نرم نازک ہے اس نے نہ گرمی اور نہ ٹھنڈک دیکھی ہے۔

ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جہنم نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کی: اے میرے رب! میرا بعض بعض کو کھائے جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دو سانسیں بنا دیں ایک سانس موسم سرما میں اور ایک سانس موسم گرما میں۔ تم جو سخت سردی پاتے ہو یہ جہنم کا زَمْهَرِيْرًا ہے اور موسم گرما میں تم جو سخت گرمی پاتے ہو یہ جہنم کی باد سموم ہے“ (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ”جنت کی آب و ہوا سجسج ہے نہ گرم، نہ سرد“۔ سجسج سے مراد لمبا سایہ ہے جس طرح سورج کے طلوع اور غروب کے وقت ہوتا ہے۔ مرہ ہمدانی نے کہا: زَمْهَرِيْرٌ سے مراد سخت سردی ہے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: یہ سوئی کے ناکے کی مثل کوئی چیز ہے جو آسمان سے سخت سردی کے وقت نازل ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ عذاب کی ایک صورت ہے جو سخت سردی ہے یہاں تک کہ جہنمیوں کو جب اس میں پھینکا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ انہیں آگ میں ایک ہزار سال کا عذاب زَمْهَرِيْر کے ایک دن کے عذاب سے آسان ہے۔

ابو النجم نے کہا: أو كنتُ ريحًا كُنْتُ زَمْهَرِيرا، یا میں ہوا تھا میں زمہریر تھا۔

ثعلب نے کہا: زَمْهَرِيْر سے مراد طے کی لغت میں چاند ہے؛ ان کے شاعر نے کہا:

وليلةٍ ظَلَامُهَا قد اعتَكَرْ قَطَعْتُهَا والزَّمْهَرِيْرُ ما زَهَرْ

کتنی ہی راتیں ہیں جن کی تاریکی بہت زیادہ تھی میں نے انہیں طے کیا جب کہ چاند طلوع نہ ہوا۔

معنی یہ ہے وہ دنیا کے سورج کی طرح اس میں سورج اور دنیا کے چاند کی طرح اس میں چاند نہیں دیکھیں گے۔ یعنی وہ دائمی روشنی میں ہوں گے نہ رات ہوگی اور نہ دن ہوگا کیونکہ دن کی روشنی سورج کے ساتھ اور رات کی روشنی چاند کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بارے میں مفصل گفتگو سورۂ مریم میں وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ (مریم) ان کے لیے اس میں صبح و شام ان کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب فی صفة النار، حدیث نمبر 4309، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، کتاب صفة جهنم باب ما جاء ان للنار نفسين، حدیث نمبر 2517، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رزق ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس اثنا میں کہ جنتی جنت میں ہوں گے کہ وہ نور دیکھیں گے جسے وہ سورج گمان کریں گے اس نور کی وجہ سے جنت روشن ہو جائے گی وہ کہیں گے: ہمارے رب نے تو فرمایا لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا۝ تو یہ نور کیسا ہے؟ رضوان انہیں کہے گا: یہ سورج اور چاند نہیں بلکہ یہ حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما مسکرائے ہیں ان کے ہنسنے کے نور سے جنتیں روشن ہوگئیں انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ اور یہ شعر پڑھا:

أنا مولى لفتى أُنزِلَ فيه هَلْ أتى
ذاك علي المرتضى وابن عم المصطفى

میں ایسے نوجوان کا مولی ہوں جس کے بارے میں هَلْ اَتٰى نازل ہوا۔ وہ علی المرتضیٰ اور مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا زاد ہیں۔

وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا یعنی جنت میں درختوں کے سائے نیک لوگوں کے قریب ہوں گے وہ ان پر سایہ فگن ہوں گے۔ یہ ان کی نعمتوں پر اضافہ کی خاطر ہوگا اگرچہ وہاں کوئی سورج اور چاند نہیں ہوگا جس طرح ان کی کنگیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اگرچہ وہاں نہ کوئی میل ہوگی اور نہ پراگندگی ہوگی۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: جنت میں درختوں کی بلندی سو سال کی مسافت تک ہوگی جب اللہ کا ولی اس کے پھل کی خواہش کرے گا تو وہ جھک جائیں گے یہاں تک کہ وہ انہیں لے لے گا۔ دانیہ حال ہونے اور مُتَّكِـِٕيْنَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح تو کہتا ہے: فی الدار عبد اللہ متکئا و مرسلۃ علیہ الحجال۔ گھر میں عبداللہ ٹیک لگائے ہوئے ہے اور اس پر پردے لٹکائے گئے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جنت کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی جزاھم جنۃ دانیۃ۔ پس یہ محذوف موصوف کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بطور مدح منصوب ہے یعنی دنت دانیۃ؛ یہ فراء کا قول ہے۔ ظِلٰلُهَا یہ دَانِيَةً کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اگر دَانِيَةً کو مرفوع پڑھا جائے کہ ظِلٰلُهَا مبتدا ہو اور دَانِيَةً اس کی خبر ہو تو یہ بھی جائز ہے پھر یہ جملہ جزاھم کی ھم ضمیر سے حال ہوگا اس طرح اس کی قراءت بھی کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت میں ودانیا علیھم ہے، کیونکہ فعل پہلے ہے۔ حضرت ابی کی قراءت میں ودان ہے، جملہ مستانفہ ہونے کی حیثیت میں مرفوع ہے۔

وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا۝ یعنی ان کے پھلوں کو مسخر کر دیا گیا ہے اسے کھڑا، بیٹھا اور لیٹا ہوا لے لے گا۔ دوری اور کانٹا ان کے ہاتھوں کو واپس نہیں کرے گا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

مجاہد نے کہا: اگر کوئی کھڑا ہوگا تو وہ پھل اوپر اٹھ جائیں گے اور اگر وہ بیٹھے گا تو وہ نیچے آجائیں گے اگر وہ پہلو کے بل لیٹے گا تو وہ پھل اس کے قریب ہو جائیں گے تو وہ اس سے کھالے گا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: جنت کی زمین چاندی کی ہے، اس کی مٹی زعفران کی ہے، اس کی خوشبو اذفر کستوری کی ہے، اس کے درختوں کے تنے سونے اور چاندی کے ہیں، ان کی شاخیں لولو، زبرجد اور یاقوت ہیں۔ پھر ہر ایک کے نیچے پھل ہے جس نے اس میں سے کھایا وہ اسے کوئی تکلیف نہ دے گا جس نے اس سے بیٹھے ہوئے کھایا وہ اسے کوئی اذیت نہ دے گا جس نے اسے پہلو کے بل لیٹ کر کھایا وہ اسے کوئی اذیت نہیں دے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب وہ اس کے پھل کھانے کا ارادہ کرے گا تو وہ پھل اس کی طرف لٹک جائیں گے یہاں تک کہ وہ جو چاہے گا ان میں سے لے لے گا۔ تذلیل القطوف سے مراد آسانی سے لے لینا ہے۔ قطوف سے مراد پھل ہیں اس کا واحد قطف ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اسے بار بار کاٹا جاتا ہے جس طرح اسے جَنَی کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اسے چنا جاتا ہے۔ تَذْلِیْلًا یہ اس ذل کی تاکید ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ (الاسراء) ہم نے اسے نازل کیا۔ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (النساء) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ گچھوں کی تذلیل سے مراد ان کا غلاف سے باہر آنا ہو اور گٹھلی سے پاک ہونا ہو۔

میں نے کہا: اس میں حقیقت سے بہت ہی دوری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے روایت نقل کی ہے کہ سفیان نے، حماد سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: جنت کی کھجوریں ان کے تنے سبز زمرد کے ہوں گے، ان کی جڑیں سرخ سونے کی ہوں گی، ان کے پتے اہل جنت کے لباس ہوں گے انہیں سے ان کے حلے ہوں گے، ان کے پھل مٹکوں اور ڈولوں جیسے ہوں گے، دودھ سے زیادہ سفید ہوں گے، شہد سے زیادہ میٹھے ہوں گے، مکھن سے زیادہ نرم ہوں گے اس میں گٹھلی نہیں ہوگی۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: ایک قول یہ کیا جاتا ہے مذلل اسے کہتے ہیں جسے پانی نے سیراب کیا ہو۔ مذلل اسے بھی کہتے ہیں جس کو نرمی کی وجہ سے تھوڑی سے ہوا جھکا دیتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مذلل سے مراد ہے جسے سیدھا کیا جائے کیونکہ اہل حجاز کہتے ہیں: ذلل نخلك۔ اپنی کھجور کو سیدھا کر۔ مذلل ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جو قریب ہوا سے لیا جا سکے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: حائط ذلیل چھوٹی دیوار۔ ابوجعفر نے کہا: یہ اقوال جو ہم نے ذکر کیے انہیں علماء لغت نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے امراء القیس کے اس قول میں ذکر کیے ہیں:

وساقٍ كأنبوبِ السَّقِيِّ المُذَلَّلِ پنڈلی اس بردی (عمدہ کھجور) کی طرح ہے جسے خوب سیراب کیا گیا ہو۔

وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۟ ۝ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝

''اور گردش میں ہوں گے ان کے سامنے چاندی کے ظروف اور شیشہ کے چمکدار گلاس، اور شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے۔ ساقیوں نے انہیں پورے اندازہ سے بھرا ہوگا اور انہیں پلاتے جائیں گے، وہاں (ایسی شراب کے) جام جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ (یہ زنجبیل) جنت میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے''۔

وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ جب وہ مشروب کا ارادہ کریں گے تو ان نیک لوگوں کے اوپر خدام چاندی کے برتن لے کر گھومیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جنت میں جو کچھ ہے دنیا میں تو صرف ان کے نام ہی ہیں۔ جنت میں جو کچھ ہے وہ بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ ہے یہاں سونے کے برتنوں کی نفی نہیں کی گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی چاندی کے

برتنوں میں انہیں پلایا جاتا ہے اور کبھی سونے کے برتنوں میں انہیں پلایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ** (الزخرف: 71) گردش میں ہوں گے ان پر سونے کے تھال اور جام۔

ایک قول یہ کیا گیا: چاندی کا ذکر کر کے سونے پر متنبہ کیا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ** (النحل: 81) اور پاجامے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں، یعنی سردی سے بچاتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک کو ذکر کر کے دوسرے پر آگاہ کیا۔ **اَكْوَابٍ** سے مراد بڑے کوزے ہیں جن کا نہ دستہ ہوتا ہے اور نہ ہی سنت۔ اس کا واحد کوب ہے؛ عدی نے کہا:

مُتَّكِئًا تُقْرَعُ أبوابُهُ يَسْعَى عليهِ العبدُ بِالكُوبِ

دراں حالیکہ وہ ٹیک لگائے ہوئے ہیں اس کے دروازوں کو کھٹکھٹایا جاتا ہے غلام پیالہ لے کر اس پر دوڑتا ہے۔

سورۂ زخرف میں **قَوَارِیْرَاۡ ۙ قَوَارِیْرَاۡ مِنْ فِضَّةٍ** وہ شیشے کی صفائی اور چاندی کی سفیدی والا ہوگا۔ اس کی صفائی شیشے کی صفائی ہوگی جب کہ وہ چاندی سے ہوگا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنت کی زمین چاندی کی ہوگی اور برتن زمین کی مٹی سے بنائے جاتے ہیں جو اس چاندی کے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ذکر کیا ہے فرمایا: جنت میں کوئی ایسی چیز نہیں مگر دنیا میں تمہیں اس کی مثل عطا کیا گیا مگر **قَوَارِیْرَاۡ مِنْ فِضَّةٍ**۔ جو صفائی میں شیشہ اور رنگت میں چاندی جیسے ہوں گے۔ کہا: اگر تو دنیا کی چاندی لے اسے باریک کرے یہاں تک کہ تو اسے مکھی کے پر جیسا باریک کر دے تو اس کے پیچھے سے پانی نہیں دیکھ سکے گا مگر جنت کے **قَوَارِیْرَاۡ** چاندی کی طرح اور شیشے کی طرح شفاف ہوں گے۔

**قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا** ۝ عام قراء کی قراءت قاف اور دال کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی ساقیوں نے ان کا اندازہ لگایا ہے جو انہیں لے کر ان پر گردش کریں گے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: وہ بغیر کسی کمی بیشی کے ان کی طلب کے مطابق لائیں گے۔ کلبی نے کہا: وہ زیادہ لذیذ اور اشتہاء والی ہوگی۔ معنی اس کا یہ ہے وہ فرشتے جو ان پر گردش کریں گے انہوں نے اس کا اندازہ لگایا ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا ہے: ان فرشتوں نے اس کا ہتھیلی بھر اندازہ لگایا ہوگا وہ نہ زیادہ ہوگا نہ کم ہوگا یہاں تک کہ وہ بوجھ اور انتہائی چھوٹا ہونے کی بنا پر انہیں اذیت نہیں دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پینے والوں نے اپنے دلوں میں خواہش کے مطابق اندازہ لگایا ہوگا۔

عبید بن عمر، شعبی اور ابن سیرین نے قُدِّرُوها پڑھا ہے یعنی انہیں ان کے ارادہ کے مطابق بنایا گیا۔ مہدوی نے یہ قراءت حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور کہا: جس نے اسے قُدِّروها پڑھا ہے تو وہ دوسری قراءت کے معنی کی طرف راجع ہے گویا اصل کلام یوں ہے قدروا علیها حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے معنی اس کا یہ ہے ان پر اس کا اندازہ لگایا گیا۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا:

آلَیْتَ حَبَّ العِراقِ الدَّهرَ آكُلُهُ والحَبُّ يأكُلُه في القَرْيةِ السُّوسُ

تو نے عراق کی گندم کے بارے میں قسم اٹھائی ہے تو کسی کو نہیں کھلائے گا زمانہ اس کو کھا رہا ہے جب کہ اسے دیہات میں کیڑا کھا رہا ہے۔

اس کی رائے یہ ہے کہ کلام اصل میں علی حب العراق ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس اندازے کی صورت یہ ہوگی کہ پیالے اڑیں گے وہ پینے والے کی طلب کے مطابق بھر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا کا یہی مطلب ہے یعنی وہ طلب سے زائد نہیں ہوگا اور اس سے کم بھی نہیں ہوگا۔ پیالوں کو پینے والوں کی طلب کے مطابق پیالوں کو الہام کیا جائے گا یہاں تک کہ پیالے اس مقدار کے حساب سے بھر جائیں گے۔ اس قول کو ترمذی حکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے (1)۔

وَ يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ۝ کَاۡسًا سے مراد ایسا پیالہ ہے جس میں شراب ہو اس میں زنجبیل کی آمیزش ہو یا معنی ہے اللہ کے حکم میں وہ زنجبیل تھی عرب اس شراب کو پسند کرتے تھے جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو کیونکہ اس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے کیونکہ وہ زبان کو چھیل دیتی ہے اور کھائی ہوئی چیز کو ہضم کر دیتی ہے تو جو وہ اعتقاد رکھتے تھے اس کے باعث انہیں آخرت میں انتہا درجے کی نعمت اور خوشبو کی طرف راغب کیا گیا۔ مسیب بن علس عورت کے ہونٹ کی صفت بیان کرتا ہے:

كَاَنَّ طَعۡمَ الزنجبِيلِ بِهِ إِذ ذُقۡتَهُ وَسَلَافَةَ الخَمۡرِ

جب میں نے اسے چکھا گویا زنجبیل اور نچڑے ہوئے شراب کا ذائقہ اس میں ہے۔

مجاہد نے کہا: زنجبیل اس چشمہ کا نام ہے جس سے ابرار کی شراب میں آمیزش کی جائے گی۔ قتادہ نے اس طرح کہا: زنجبیل ایسا چشمہ ہے مقرب جس سے خالص پئیں گے اور باقی جنتیوں کی شراب میں اس سے آمیزش کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جنت میں ایک ایسا چشمہ ہے جس میں زنجبیل کا ذائقہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں ایسی شراب ہوگی جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، معنی یہ ہوگا گویا اس میں زنجبیل ہے۔

عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ۝ عَيۡنًا، كَاۡسًا سے بدل ہے، یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہو، تقدیر کلام یوں ہے یسقون عینا۔ یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو، یعنی اصل یہ ہے من عین جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: عَيۡنًا يَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (الانسان: 6) میں یہ گفتگو گزر چکی ہے۔ فِيۡهَا میں ضمیر سے مراد جنت ہے۔ سَلۡسَبِيۡلًا سے مراد لذیذ شراب ہے یہ سلالة سے فعلليل کا وزن ہے عرب کہتے ہیں: هذا شراب سلس، سلسال، سلسل، سلسبيل۔ سب کا معنی ایک ہے۔ یعنی عمدہ، لذیذ ذائقہ والی۔ صحاح میں ہے: تسلسل الماء في الحلق۔ پانی حلق میں سے تیزی سے اتر گیا۔ سلسلته میں نے اسے حلق میں انڈیلا۔ ماء سلسل و سلسال۔ مٹھاس اور صفائی کی وجہ سے حلق میں آسانی سے اتر جاتا ہے۔ سلاسل ضمہ کے ساتھ بھی اسی کی مثل ہے۔ زجاج نے کہا: لغت میں یہ سلسبیل ہے یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں حد درجہ کی سلاست ہو، گویا چشمہ کو اس کی صفت کا نام دیا گیا ہے۔ مجاہد سے مروی

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 339

ہے: سَلۡسَبِیۡلًا اسے کہتے ہیں تیز چلنے والا جوان کے حلقوں میں تیزی سے اتر جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے: وہ تیز چلنے والا ہے؛ ماوردی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

يَسْقُونَ مَنْ وَرَدَ الْبَرِيصَ عليهمُ　　بَرَدَى يُصَفَّقُ بالرَّحِيقِ السَّلْسَلِ

جو آدمی بریص کے مقام پر ان پر وارد ہوتا ہے وہ اسے بردی کا پانی پلاتے ہیں جس کی خالص شراب میں آمیزش کی گئی ہوتی ہے۔

ابو العالیہ اور مقاتل نے کہا: اسے سلسبیل اس لیے نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ راستوں اوران کے گھروں میں بہتا ہے جنت عدن سے عرش کے نیچے سے جنتیوں کی طرف یہ چشمہ بہتا ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ جہاں چاہیں گے اس کا پانی ان کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ عکرمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ قفال نے کہا: وہ معزز چشمہ ہے اس کو پانے کے لیے راستہ اپناؤ؛ یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ تُسَمّٰی کا معنی ہے فرشتوں، ابرار اور جنتیوں کے ہاں اس نام سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سَلۡسَبِیۡلًا کو تنوین دی گئی ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الظنونا اور السبیلا۔

وَ يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا ۝ وَ اِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّ مُلۡكًا كَبِيۡرًا ۝ عٰلِيَهُمۡ ثِيَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّ اِسۡتَبۡرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمۡ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعۡيُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ۝

''اور چکر لگاتے رہیں گے ان کی خدمت میں ایسے بچے جو ایک ہی حالت پر رہیں گے، جب تو انہیں دیکھے تو یوں سمجھے گویا یہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں۔ اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی۔ ان کے اوپر لباس ہوگا باریک سبز ریشم کا (بنا ہوا) اطلس کا اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب۔ (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں''۔

وَ يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ اس میں اس امر کی وضاحت کی کہ کون ان پر برتن لے کر گھومے گا ان کی وہ بچے خدمت کریں گے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے کیونکہ خدمت کرنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مُخَلَّدُوۡنَ سے مراد ہے جس جوانی، حسن و بشاشت پر وہ ہیں اس پر باقی رہیں گے وہ نہ بوڑھے ہوں گے اور نہ ہی ان میں کوئی تبدیلی ہوگی۔ وہ مرور زمانہ کے باوجود ایک ہی عمر پر رہیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گے انہیں کوئی موت نہ آئے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے انہیں کنگن اور بالیاں پہنائی گئی ہوں گی یعنی انہیں زیور پہنایا گیا ہوگا۔ تخلیہ کا معنی زیور پہنانا ہے یہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا ۝ ان کے حسن، کثرت اور ان کے رنگوں کی صفائی کی وجہ سے تو انہیں گمان کرے گا وہ مجلس میں بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ موتیوں کو جب قالین پر بچھایا جائے تو لڑی میں پروئے جانے کی بنسبت زیادہ

خوبصورت لگتے ہیں۔ مامون سے مروی ہے کہ جس رات بوران بنت حسن بن سہیل نے اس کے ساتھ شب زفاف گزاری تو وہ ایک ایسی قالین پر تھا جس کو سونے کی تاروں سے بنا گیا تھا۔ خلیفہ کی گھر کی عورتوں نے اس قالین پر موتیوں کو بکھیر دیا تھا۔ مامون نے قالین پر بکھرے ہوئے موتیوں کو دیکھا تو اس منظر کو بہت ہی حسین خیال کیا اور کہا: ابونواس کا بھلا ہو گویا اس نے یہ منظر دیکھا تھا جب اس نے کہا تھا:

كَأَنَّ صُغْرى و كُبْرى من فَقَاقِعِها　　حَصْبَاءُ دَرٍّ على أرضٍ مِنَ الذَّهَبِ

گویا کہ چھوٹے بڑے بلبلے موتیوں کے سنگریزے ہیں جو سونے کی زمین پر پڑے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں بکھرے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی گئی کیونکہ وہ خدمت میں بہت تیز ہوں گے حورعین کا معاملہ مختلف ہے انہیں لؤلؤ مکنون اور لؤلؤ مخزون سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ ان سے خدمت نہیں لی جاتی۔

وَ اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْکًا کَبِیْرًا ۝ ، ثَمَّ ظرف مکان ہے یعنی جنت میں۔ ثَمَّ میں عامل رَاَیْتَ کا معنی ہے یعنی جب تو اپنی آنکھ سے وہاں دیکھے گا۔ فراء نے کہا: کلام میں ما مضمر ہے تقدیر کلام یوں ہے اذا رأیت ماثم جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَکُمْ (الانعام: 94) تقدیر کلام یہ ہے ما بینکم۔ زجاج نے کہا: ما، ثَمَّ کے ساتھ ملایا گیا ہے جس طرح فراء نے ذکر کیا۔ یہ جائز نہیں کہ اسم موصول کو ساقط کیا جائے اور صلہ ترک کر دیا جائے لیکن رَاَیْتَ معنی میں ثَمَّ کی طرف متعدی ہے معنی ہے جب تو اپنی نظر سے وہاں دیکھے گا اور ثَمَّ سے مراد جنت ہے۔ فراء نے یہ بھی ذکر کیا: نعیم سے مراد تمام وہ چیزیں ہیں جن سے لذت حاصل کی جاتی ہے۔ ملك کبیر سے مراد ہے کہ فرشتے ان سے اجازت طلب کرتے ہیں؛ یہ قول سدی اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ کلبی نے کہا: اس کی تعبیر یہ ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قاصد لباس، کھانا، مشروب اور تحائف اللہ کے ولی کے پاس لائے گا جب کہ اللہ کا ولی اپنے مکان میں ہو گا وہ قاصد اس ولی سے اجازت طلب کرے گا یہی ملک عظیم ہے؛ یہی تعبیر مقاتل بن سلیمان نے بھی کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ملك کبیر یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ستر حاجب ہوں گے ایک حاجب دوسرے کے لیے حاجب ہو گا۔ اللہ کا ولی اس اثناء میں کہ وہ لذت و سرور میں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والا فرشتہ اس سے اجازت طلب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مکتوب، ہدیہ اور ایسے تحفہ کے ساتھ بھیجا ہو گا اس ولی نے ایسا پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہ فرشتہ باہر والے حاجب کو کہے گا: اللہ کے ولی سے اجازت طلب کرو کیونکہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا ہے اس کے پاس مکتوب اور تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ولی کے ہاں حاضر ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ وہ اجازت طلب کرے گا یہاں تک کہ یہ معاملہ اس حاجب تک جا پہنچے گا جو اللہ کے ولی کے بالکل قریب ہو گا وہ دربان اللہ کے ولی سے کہے گا: یہ رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے وہ تیری بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکتوب اور تحفہ ہے کیا اسے اجازت ہے؟ اللہ کا ولی کہے گا: ہاں تم اسے اجازت دو وہ دربان قریبی دربان کو کہے گا ہاں اسے اجازت دو تو وہ دوسرے دربان کو یہی بات کرے گا یہاں تک کہ بات آخری دربان تک جا پہنچے گی۔ وہ اسے کہے گا: ہاں اے فرشتے! تجھے اجازت ہے۔ وہ داخل ہو گا وہ اللہ کے ولی کو

سلام کرے گا اور کہے گا: السلام (اللہ تعالیٰ کا نام) تجھے سلام فرماتا ہے یہ تحفہ ہے یہ اللہ رب العالمین کی جانب سے مکتوب ہے اس مکتوب پر لکھا ہوگا اس حی کی جانب سے جسے موت نہیں آئے گی اس زندہ کی جانب جسے اب موت نہیں آئے گی، اللہ کا ولی اس کو لے گا تو اس میں یہ تحریر ہوگا: میرے بندے، میرے ولی، میری رحمت اور میری برکات پر سلام، اے میرے ولی! کیا اب تجھ میں اپنے رب کی زیارت کا شوق نہیں؟ شوق اسے بے تاب کردے گا وہ براق پر سوار ہوگا۔ براق علام الغیوب کی زیارت کے شوق میں ہوا کے دوش پر اڑے گا اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز عطا کرے گا جسے کسی آنکھ نے دیکھا نہ ہوگا، کسی کان نے سنا نہ ہوگا اور کسی دل میں کھٹکا نہ ہوگا۔

سفیان ثوری نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک کبیر سے مراد یہ ہے کہ فرشتے انہیں سلام کریں گے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ (الرعد) فرشتے ہر دروازے سے ان پر داخل ہوں گے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ (الرعد) تم نے جو صبر کیا اس کی وجہ سے تم پر سلامتی ہو یہ جنت کتنا اچھا ٹھکانہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ملك كبير سے مراد ہے کہ تاج ان کے سروں پر ہوں گے جس طرح بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ ترمذی حکیم نے کہا: اس سے مراد ملک تکوین ہے جب وہ کسی چیز کا ارادہ کریں گے تو وہ کہیں گے: کن تو ہو جا۔ ابوبکر وراق نے کہا: ایسی بادشاہت جو ختم نہ ہو۔ حدیث طیبہ میں ہے: ”ملك كبير سے مراد یہ ہے کہ جنتیوں میں سے ادنیٰ درجے کا جنتی اپنی مملکت کو ایک ہزار سال کی مسافت تک دیکھے گا وہ اس کے سب سے دور والے کونے کو اس طرح دیکھے گا جس طرح اس کے قریب والے کونے کو دیکھے گا“۔ فرمایا: ”جنتیوں میں سے سب سے بلند مرتبہ والا وہ ہوگا جو دن میں دو دفعہ اپنے رب کا دیدار کرے گا“۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ نافع، حمزہ اور ابن محیصن نے عٰلِيْهِمْ یعنی یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ ابو عبید نے حضرت ابن مسعود، ابن وثاب اور دوسرے قراء کی قراءت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: عٰلِيْهِمْ یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اس کی خبر ثِيَابُ سُنْدُسٍ ہے اسم فاعل سے جمع مراد ہے۔ اخفش کے قول میں یہ جائز ہے کہ یہ مفرد اس بنا پر ہو کہ یہ اسم فاعل ہو اور متقدم ہو اور ثِيَابُ اس کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو اور قائم مقام خبر ہو اس میں اضافت انفصال کے حکم میں ہو کیونکہ اس میں تخصیص واقع نہیں ہوئی اس کے ساتھ کلام کی ابتدا کی گئی ہے کیونکہ اضافت کی وجہ سے اختصاص واقع ہو گیا ہے۔ باقی قراء نے اسے عٰلِيَهُمْ یاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: یہ تیرے قول فوقهم کی طرح ہے عرب کہتے ہیں: قومك داخل الدار وہ داخل کے لفظ کو ظرف کی بنا پر نصب دیتے ہیں کیونکہ یہ محل ہے۔ زجاج نے اس کا انکار کیا اور کہا: ہم اسے ظرف میں نہیں جانتے اگر یہ ظرف ہوتا تو یاء کو ساکن کرنا جائز نہ ہوتا لیکن یہ دونوں چیزوں سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور ان میں سے ایک يطوف عليهم میں هم ضمیر ہے یعنی نیک لوگوں کے پاس بچے گردش کر رہے ہوں گے جن لوگوں پر یہ لباس ہوگا۔ دوسری چیز وِلْدَانٌ ہے معنی یہ بنے گا جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتی دیکھے گا جب کہ ان بچوں کے بدنوں پر یہ لباس ہوگا۔ ابو علی نے کہا: حال میں عامل یا تو وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾

ہے یا جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف ہوتو اس کو منصرف بنادیا گیا ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ جائز ہے کہ یہ اسم فاعل کے وزن پر ہو اور ظرف ہو جس طرح تیرا قول ہے: ھو ناحیۃ من الدار اس کی صورت پھر یہ ہوگی کہ عالیلجب فوق کے معنی میں ہے تو اسے بھی اس کے قائم مقام رکھا تو اسے ظرف بنادیا گیا۔ ابن محیصن، ابن کثیر اور ابو بکر نے عاصم سے خضر مجرور نقل کیا ہے کیونکہ یہ سُنْدُسٍ کی صفت ہے ابو عبید اور ابو حاتم نے معنی کی عمدگی کی وجہ سے اسے اپنایا ہے کیونکہ کپڑوں کی صفت میں خضر سب سے خوبصورت ہے پس یہ کلمہ مرفوع ہوگا میرا خیال ہے اِسْتَبْرَقٌ کا سُنْدُسٍ پر جو عطف ہے وہ جنس کا جنس پر عطف ہے معنی یہ ہوگا ان پر سبز کپڑے ہوں گے جو سُنْدُسٍ اور اِسْتَبْرَقٌ کے ہوں گے یعنی ان دونوں ناموں سے ہوں گے۔ نافع اور حفص نے دونوں کو مرفوع پڑھا ہے تو خُضْرٌ، ثِيَابُ کی صفت ہوگی کیونکہ یہ دونوں جمع ہیں۔ اِسْتَبْرَقٌ اس کا عطف ثِيَابُ پر ہے۔ اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور کسائی نے دونوں کو جر کے ساتھ پڑھا ہے پھر خُضْرٌ، سُنْدُسٍ کی صفت ہوگی اور سُنْدُسٍ اسم جنس ہوگا۔ اخفش نے اس امر کو جائز قرار دیا ہے کہ اسم جنس کی صفت جمع سے لگائی جائے اگرچہ اسے قبیح جانا جاتا ہے تو کہتا ہے: أھلك الناس الدینارُ الصُّفْرُ والدرھمُ البِیضُ۔

دونوں مثالوں میں صفر اور بیض جمع کے صیغے ہیں جو الدینار اور الدرھم اسم جنس کی صفتیں ہیں لیکن کلام میں یہ بہت ہی مستبعد ہے اس قراءت کی صورت میں معنی یہ ہوگا ان پر سبز سندسی کپڑے اور اِسْتَبْرِق کے کپڑے ہوں گے۔ ابن محیصن کے صاحب نے استبرق کو منصرف کہا ہے اس نے اسے فتحہ دیا ہے اور منصرف نہیں کہا۔ اسے استبرق پڑھا ہے جر کی جگہ زبر پڑھی ہے اور غیر منصرف قرار دیا ہے کیونکہ یہ عجمی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے اس پر حرف تعریف (الف لام) داخل ہوتا ہے تو الاستبرق کہتا ہے مگر ابن محیصن گمان کرتا ہے کہ کپڑے کی اس قسم کو یہ نام دے دیا گیا ہے اس کو استبرق بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی ہمزہ وصل اور اس کے اوپر زبر۔ یہ بریق سے مشتق ہے اور استفعل کے وزن پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ معرب ہے اس کا معرب ہونا مشہور ہے اصل میں استبرك تھا سندس باریک ریشم کو کہتے ہیں۔ استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَّ حُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ اس کا عطف یطوف پر ہے، سورۂ فاطر میں گزرا ہے يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (33) اس میں انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ سورۂ فاطر میں ہے يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا (33) اس میں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مرد کے زیورات چاندی اور عورت کے زیورات سونے کے ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کبھی وہ سونے کے زیورات پہنیں گے اور کبھی وہ چاندی کے زیورات پہنیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے ایک کے ہاتھ میں دو کنگن سونے کے، دو کنگن چاندی کے اور دو کنگن موتی کے جمع کیے جائیں گے تاکہ جنت کے محاسن ان کے لیے جمع ہو جائیں؛ یہ سعید بن مسیب نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا: ہر قوم کے لیے وہ کچھ ہوگا جس کی طرف ان کے دل مائل ہوں گے۔

وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا: جب جنتی جنت کی

طرف متوجہ ہوں گے وہ ایک ایسے درخت کے پاس سے گزریں گے جس کے تنے کے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے وہ ان میں سے ایک سے پانی پئیں گے تو ان پر نعیم کی تر و تازگی جاری ہو جائے گی ان کی جلد میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی اور ان کے بال کبھی بھی پراگندہ نہ ہوں گے پھر وہ دوسرے چشمہ سے پئیں گے تو ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہوگا وہ نکل جائے گا پھر جنت کے خازن ان کی طرف متوجہ ہوں گے وہ انہیں کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ (زمر) تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ نخعی اور ابو قلابہ نے کہا: کھانا کھانے کے بعد جب وہ اسے پئیں گے تو وہ پانی انہیں پاکیزہ بنا دے گا جو کچھ انہوں نے کھایا پیا ہوگا وہ کستوری کی مہک ہو جائے گا اور ان کے پیٹوں کو ضامر بنا دے گا۔ مقاتل نے کہا: وہ جنت کے دروازے پر چشمے کا پانی ہے جو چشمہ درخت کے تنے سے پھوٹتا ہے جس نے بھی اس سے پی لیا اللہ تعالیٰ اس کے دل سے کینہ، کھوٹ اور حسد خارج کر دے گا اور اسی طرح اس کے پیٹ میں جو غلیظ مادہ ہوگا اسے بھی خارج کر دے گا اسے بھی نکال دے گا۔ حضرت علی شیر خدا نے جو کچھ روایت کیا ہے اس کا بھی یہی معنی ہے مگر مقاتل کے قول کے مطابق وہ چشمہ ایک ہے اس اعتبار سے طَهُوْرًا مبالغہ کا صیغہ ہوگا۔ ائمہ احناف کی اس میں کوئی دلیل نہیں کہ اس کا معنی پاک ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ الفرقان میں گزر چکی ہے۔ الحمد للہ

کہا: اس کا معنی پاکیزہ اور خوبصورت ہے میں نے سہل بن عبداللہ کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی انہوں نے وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ (الانسان) آیت کو پڑھا اور اپنے ہونٹوں اور منہ کو حرکت دینے لگے گویا وہ کسی چیز کو چوس رہے ہوں جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہیں کہا گیا: کیا آپ کسی چیز کو پی رہے تھے یا قراءت کر رہے تھے؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم! اگر میں اس کی قراءت سے ایسی لذت نہ پاتا جو اس کے پینے سے پاتا تو میں اس کی قراءت نہ کرتا۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ انہیں یہ بات کہی جائے گی: یہ تمہارا بدلہ ہے تمہارا عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہے اللہ تعالیٰ کا بندے کے لیے شکر کا معنی ہے وہ اس کی اطاعت کو قبول کرتا ہے، اس پر اس کی ثنا کرتا ہے اور اس عمل پر اسے بدلہ عطا فرماتا ہے۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے ان کو اچھی جزاء دیتا ہے۔ مجاہد نے کہا: مَّشْكُوْرًا کا معنی مقبول ہے اور معنی قریب قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب عمل قبول فرماتا ہے تو اس پر شکر کرتا ہے جب شکر کرتا ہے تو اس پر بڑا ثواب دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ایک حبشی نے عرض کی: یا رسول اللہ! تم لوگوں کو ہم پر شکل و صورت، رنگت اور نبوت میں فضیلت دی گئی ہے بتائیے اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لاؤں جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان لائے ہیں اور میں ویسا ہی عمل کروں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کرتے ہیں کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں داخل ہو سکوں گا؟ فرمایا: ہاں مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! بے شک حبشی کی سفیدی اور اس کی روشنی جنت میں ایک ہزار سال کی مسافت سے دکھائی دے گی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں وعدہ ہے جس نے سبحان اللہ اور الحمد للہ کہا اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک لاکھ چالیس ہزار نیکیاں ہوں گی“۔ اس آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کے بعد ہم

کیسے ہلاک ہوں گے؟ فرمایا: ''قیامت کے روز ایک آدمی عمل لائے گا اگر وہ اس عمل کو پہاڑ پر رکھے تو پہاڑ کو بوجھل کر دے پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت آئے گی قریب ہے کہ وہ ان سب اعمال کو ختم کر دے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ان پر مہربانی کرے'' فرمایا: پھر یہ آیت نازل ہوئی هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ... مُلْكًا كَبِيْرًا ۝ حبشی نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میری آنکھیں وہ کچھ دیکھیں گی جو جنت میں آپ کی آنکھیں دیکھتی ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں''۔ وہ حبشی رویا یہاں تک کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے قبر میں اتار رہے تھے اور زبان سے یہ پڑھ رہے تھے اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (1) ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اللہ تعالیٰ نے اسے کھڑا کیا پھر فرمایا: اے میرے بندے! میں تیرے چہرے کو سفید کروں گا اور جنت میں تجھے وہاں ٹھکانہ دوں گا جہاں تو چاہے گا تو عمل کرنے والوں کا اتنا اچھا اجر ہے''۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝۲۳ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝۲۴ وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝۲۵ وَ مِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝۲۶

''ہم نے ہی (اے حبیب!) آپ پر تھوڑا تھوڑا کر کے کلام نازل کیا اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے اور نہ کہنا مانیے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا۔ اور یاد کرتے رہا کیجئے اپنے رب کے نام کو صبح بھی اور شام بھی۔ اور رات (کی تنہائیوں میں) بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے اور رات کافی وقت اس کی تسبیح کیا کیجئے''۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝ یعنی آپ نے اسے اپنی طرف سے گھڑا ہے اور نہ ہی آپ اسے اپنی طرف سے لائے ہیں جس طرح مشرک دعویٰ کرتے ہیں۔ اس آیت کا ماقبل آیت کے ساتھ تعلق یہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ اور وعید کی کئی صورتوں کا ذکر کیا تو اس امر کو بیان کیا کہ یہ کتاب ان چیزوں کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جن کی انسان کو ضرورت ہے، یہ جادو، کہانت اور شعر نہیں یہ حق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن حکیم تھوڑا تھوڑا آیت در آیت نازل کیا گیا ہے یہ یکبارگی نازل نہیں کیا گیا، اس وجہ سے ارشاد فرمایا: نَزَّلْنَا اس بارے میں گفتگو مفصل گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ حکم سے مراد قضا و فیصلہ ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ معنی ہے مشرکوں کی اذیت پر صبر کرو اس طرح فیصلہ کیا گیا ہے۔ پھر اسے جہاد والی آیت سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ پر جو طاعات لازم کی گئی ہیں ان پر صبر کیجئے یا اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیجئے کیونکہ اس نے تیرے ساتھ مدد کا وعدہ کیا ہے جلدی نہ کیجئے کیونکہ یہ ہر صورت ہو کر رہے گا۔ و آثم سے مراد گناہ والا ہے یعنی گناہ گار اور ناشکرے کی اطاعت نہ کیجئے۔

1۔ طبرانی، الاوسط، حدیث نمبر 1603۔ الکبیر حدیث 13595۔ الحلیۃ، ابونعیم، جلد 3، صفحہ 319

معمر نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: ابو جہل نے کہا اگر میں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ لیا تو میں اس کی گردن روند ڈالوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ آیت عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مال اور شادی کی پیشکش لے کر حاضر ہوئے شرط یہ تھی کہ وہ نبوت کا ذکر چھوڑ دیں۔ ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا: جس نے شادی کی پیشکش کی تھی وہ عتبہ بن ربیعہ تھا، اس نے کہا: میری بیٹیاں قریش کی عورتوں میں سے خوبصورت ترین ہیں میں بغیر مہر کے اپنی بیٹی سے تیری شادی کیے دیتا ہوں، اس امر سے تو لوٹ جا۔ ولید نے کہا: اگر تو نے جو کچھ کیا مال کو حاصل کرنے کے لیے کیا ہے میں تجھے مال دوں گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا جب کہ تو اس امر سے لوٹ جا تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان میں اَوْ کا لفظ ہے یہ و سے زیادہ موکد ہے کیونکہ جب تو کہتا ہے: لا تطع زیدا او عمروا۔ اس نے ان میں سے ایک کی اطاعت کی تو وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہوگا کیونکہ اسے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دو کی اطاعت نہ کرے جب یہ ارشاد فرمایا: لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا، اَوْ کے لفظ سے اس امر پر دلالت کی ان میں سے ہر ایک اس چیز کا اہل تھا کہ اس کی نافرمانی کی جائے جس طرح تو یہ کہے: لا تخالف الحسن او ابن سیرین تو حسن بصری اور ابن سیرین میں سے کسی کی بھی مخالفت نہ کر یا اتبع الحسن او ابن سیرین تو تو نے یہ کہا ہے: یہ دونوں اس بات کے اہل ہیں کہ ان دونوں کی اتباع کی جائے اور ان میں سے ہر ایک بھی اس کا اہل ہے کہ اس کی اتباع کی جائے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔ فراء نے کہا: یہاں اَوْ، لا کے معنی میں ہے گویا یوں فرمایا: لا کفورا نہ ناشکرے کی اطاعت کر۔ شاعر نے کہا:

لَا وَجْدُ ثَكْلَى كما وَجَدْتُ وَلَا وَجْدُ عَجُولٍ أَضَلَّهَا رُبَعُ
أَوْ وَجْدُ شيخٍ أَضَلَّ ناقتَهُ يَوْمَ تَوَافَى الحجيجُ فاندفعُوا

جس کا بچہ فوت ہوا اس کا اتنا دکھ نہیں جتنا دکھ میں نے پایا اور نہ اس اونٹنی نے اتنا دکھ محسوس کیا جس کا موسم بہار میں پیدا ہونے والا بچہ فوت ہوا۔ اور نہ ہی اس شیخ کو اتنا دکھ ہوا جس نے اپنی اونٹنی گم کر دی ہو اس روز حاجی حج کے سامنے مناسک پورے کرے اور واپس چلے جائیں۔

یہاں بھی شاعر نے اَوْ سے مراد لا لیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آثم سے مراد منافق اور کفور سے مراد ایسا کافر ہے جو اپنے کفر کو ظاہر کرتا ہے یعنی ان میں سے آثم کی اور نہ ہی کافر کی اطاعت کریں۔ یہ فراء کے قول کے بالکل قریب ہے۔

**وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا** ۝ دن کے پہلے اور آخری حصہ میں اپنے رب کے حضور نماز پڑھیے۔ اس کے پہلے حصہ میں صبح کی نماز ہے اور آخری حصہ میں ظہر اور عصر کی نماز ہے۔

**وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا** ۝ اس سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے اور رات کے نوافل ہیں؛ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سفیان کا نقطہ نظر ہے: قرآن حکیم میں جہاں بھی تسبیح کا لفظ ہے اس سے

1۔ تفسیر طبری، جز 23، صفحہ 572 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 431

مراد نماز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مطلق ذکر ہے۔ خواہ وہ نماز میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ ابن زید اور دوسرے علماء نے کہا: وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا یہ پنجگانہ نماز کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مستحب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی مثل میں گفتگو سورۃ المزمل میں گزر چکی ہے۔ ابن حبیب کا قول اچھا ہے۔ اصیل کی جمع اصائل اور اصل ہے جس طرح سفائن اور سفن ہے؛ شاعر نے کہا:

ولا بأحسنَ منها إذ دنا الأُصُلُ

جب عصر کا وقت قریب ہوتا ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں ہوتا۔

اصائل کے بارے میں کہا: یہ جمع الجمع ہے؛ شاعر نے کہا:

لَعَمْرِی لَأَنْتَ البیتُ أُكْرِمُ أَهْلَهُ وأَقْعُدُ فی أَفْيَائِهِ بالأَصَائِلِ

میری زندگی کی قسم! تو ایسا گھر ہے جس کے مکینوں کی میں تعظیم کرتا ہوں میں عصر کے وقت اس کے ساتھیوں میں بیٹھتا ہوں۔

سورۂ اعراف کے آخر میں یہ بحث مکمل گزر چکی ہے اور اسم ظرف پر من بعضیت کے لیے داخل ہوا ہے جس طرح اس فرمان میں وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: 31) تا کہ تمہارے بعض گناہوں کو بخش دے۔

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ يَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ أَسْرَهُمْ ۚ وَ إِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾

''بے شک یہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور پس پشت ڈال رکھا ہے انہوں نے بڑے سخت دن کو، ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں اور جب ہم چاہیں تو ان کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں''۔

یہ کلام شرمندہ کرنے اور انہیں جھڑکنے کے لیے ہے۔ هٰٓؤُلَآءِ سے مراد اہل مکہ ہیں۔ الْعَاجِلَةَ سے مراد دنیا ہے۔ يَذَرُوْنَ کا معنی ہے وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ وَرَآءَهُمْ سے مراد ہے اپنے سامنے يَوْمًا ثَقِيْلًا سے مراد ہے بہت ہی سخت جس طرح فرمایا: ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الاعراف: 187) وہ آسمان وزمین میں بہت مشکل ہے، یعنی وہ یوم قیامت پر ایمان کو ترک کر دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَرَآءَهُمْ کا معنی پس پشت یعنی وہ آخرت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ اس کے لیے کچھ عمل نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور نبوت کے ثبوت کو چھپایا تھا ان کا دنیا سے محبت کرنے کا مطلب ہے جو وہ چھپاتے ہیں اس پر وہ رشوت لیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کفر چھپاتے ہیں اور دنیا طلب کرتے ہیں آیت عام ہے۔ یوم ثقیل سے مراد یوم قیامت ہے اپنی سختیوں اور ہولناکیوں کی وجہ سے ثقیل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس دن بندوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اس وجہ سے ثقیل ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ أَسْرَهُمْ ہم نے انہیں مٹی سے پیدا کیا اور ان کی خلقت کو مضبوط کیا؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، مقاتل اور دوسرے علماء نے کہا۔ أَسْرَ کا معنی خلقت ہے۔ ابوعبید نے کہا: کہا جاتا ہے فرس شدید الاسر یعنی گھوڑے

کی خلقت اور جوڑ بڑے مضبوط ہیں، کہا جاتا ہے: اسرہ اللہ جل ثناءہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خلقت اور جوڑوں کو مضبوط کیا۔

اخطل نے کہا:

مِن كلِّ مُجْتَنَبٍ شَدِيدٍ أَسْرُهُ سَلِسِ القِيادِ تَخالُهُ مُخْتالًا

یہ مجتنب (ایسا گھوڑا جس کی لگام پکڑ کر آگے چلا جاتا) مضبوط جوڑوں والا اطاعت شعار ہے تو اسے متکبر خیال کرے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بصری اور ربیع نے کہا: ہم نے ان کے جوڑوں کو رگوں اور پٹھوں کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط کر دیا ہے۔ مجاہد نے أَسْرَ کی تفسیر میں کہا: اس سے مراد شرج ہے یعنی جب پاخانہ اور پیشاب نکلتا ہے تو مخرج بند ہو جاتا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی قوت ہے؛ ابن احمر گھوڑے کی صفت بیان کرتا ہے:

يَمْشِي بِأَوْظِفَةٍ شِدَادٍ أَسْرُهَا

وہ گھوڑا باریک پنڈلی کے ساتھ چلتا ہے جو پنڈلی بہت ہی مضبوط ہے۔

یہ اسار سے مشتق ہے اس سے مراد چمڑے کی رسی ہے جس کے ساتھ سامان باندھا جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أَسَرْتُ القَتَبَ أَسْرًا یعنی میں نے اسے باندھا، کہا جاتا ہے: ما أحسن أَسْرَ قَتَبِه اس کا سامان باندھنا کتنا اچھا ہے۔ عربوں کا قول ہے: خذه بأسره یعنی یہ سب تیرا ہے گویا انہوں نے اس کے باندھنے کا ارادہ کیا نہ وہ کھلے اور نہ ہی اس سے کوئی چیز کم ہو۔ اسی سے ایک لفظ اسیر ہے کیونکہ اسے رسیوں سے باندھا جاتا ہے۔ یہ کلام نعمتوں کے ساتھ احسان کرنے کے اعتبار سے لائی گئی ہے جب انہوں نے ان کا نافرمانی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ میں نے تیری خلقت کو درست کیا اور اسے قوتوں کے ساتھ مضبوط کیا پھر تو میرے ساتھ کفر کرتا ہے۔

وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو ہم انہیں ہلاک کر دیتے اور ان کی جگہ زیادہ اطاعت شعار لوگوں کو لے آتے۔ انہیں سے یہ بھی مروی ہے: ہم ان کے محاسن کو قبیح ترین صورتوں میں بدل دیتے۔ ضحاک نے ان سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پہلی تعبیر ابو صالح نے ان سے روایت کی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

''بے شک یہ ایک نصیحت ہے پس جس کا جی چاہے اختیار کر لے اپنے رب کے قرب کا راستہ۔ اور (اے لوگو) تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ اللہ خود چاہے، بے شک اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے، جس کو چاہتا ہے اپنے (دامن) رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور ظالموں کے لیے تو اس نے تیار کر رکھا ہے دردناک عذاب''۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝، هٰذِهٖ سے مراد سورت ہے۔ تَذْكِرَةٌ سے مراد نصیحت ہے۔ سَبِيْلًا سے مراد ایسا راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی

اطاعت اور اس کی رضا کی طلب تک پہنچا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سَبِيْلًا سے مراد وسیلہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی سمت اور جنت کی طرف جانے والا راستہ ہے معنی ایک ہے۔ تم طاعت، استقامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والا راستہ نہیں چاہ سکتے مگر جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی امر اس کے قبضہ قدرت میں ہے لوگوں کے قبضہ قدرت میں نہیں کسی کی مشیت نافذ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی آگے ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت متقدم ہوتی ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے وما یشاؤن پڑھا ہے کہ یہ ان کے بارے میں خبر ہے۔ باقی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں خطاب کیا جارہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلی آیت دوسری آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا کا جواب ہے پھر انہیں خبر دی امر ان کے ہاتھ میں نہیں ہے یعنی تم یہ راستہ اپنا نہیں سکتے مگر اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں یہ چاہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو جانتا ہے اور تمہیں امر و نہی دینے میں حکیم ہے۔

یہ گفتگو کئی مواقع پر گزر چکی ہے۔

يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿31﴾ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرتے ہوئے جنت میں داخل فرما دیتا ہے۔ ظالمون کو عذاب دیتا ہے ظالمین کو نصب فعل مضمر یعذب سے دی گئی ہے۔ زجاج نے کہا: ظالمین کو نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کا ماقبل منصوب ہے یعنی جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے اور ظالمین یعنی مشرکوں کو عذاب دیتا ہے۔ اَعَدَّ لَهُمْ یہ فعل مضمر کی تفسیر ہے جس طرح شاعر نے کہا:

أَصْبَحْتُ لَا أَحْمِلُ السِّلَاحَ وَلَا أَمْلِكُ رَأْسَ الْبَعِيْرِ إِنْ نَفَرَا

میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں مسلح نہ تھا اور اونٹ کا مالک بھی نہ تھا اگر وہ بھاگ جائے۔

و الذِّئْبَ أَخْشَاهُ إِنْ مَرَرْتُ بِهِ وَحْدِي وَأَخْشَى الرِّيَاحَ وَالْمَطَرَ

میں بھیڑیئے سے ڈرتا ہوں اگر میں اس کے پاس سے تنہا گزروں اور میں ہواؤں اور بارش سے ڈرتا ہوں۔

تقدیر کلام یوں ہے أخشى الذئب أخشاه۔ زجاج نے کہا: پسندیدہ نصب ہی ہے اگرچہ رفع جائز ہے تو کہتا ہے: أعطيت زيدا و عمروا أعددت له برا۔ میں نے زید کو دیا اور عمرو سے نیکی کی۔ تقدیر کلام یوں ہوگی بررت عمروا یا أبر عمروا، حٰمٓ ﴿1﴾ عٓسٓقٓ ﴿2﴾ میں آیت گزری ہے يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ (8)

جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر دیتا ہے اور ظالم۔ یہاں الظّٰلِمُوْنَ کو رفع دیا گیا ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی فعل مذکور نہیں جو اس پر واقع ہو کہ یہ معنوی طور پر منصوب ہوتا۔ اس سے قبل بھی ایسا کوئی اسم منصوب نہیں تھا جس پر اس کا عطف کیا جاتا تو یہ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا، ويعذب فعل پر دلالت کرتا ہے اس وجہ سے نصب جائز ہے۔ ابان بن عثمان نے الظالمون پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اَعَدَّ لَهُمْ ہے۔ اَلِيْمًا سے مراد تکلیف دہ دردناک ہے۔ سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔

# سورۃ المرسلات

آیاتہا ۵۰ ۷۷ سورۃ المرسلت مکیۃ ۳۳ رکوعاتہا ۲

حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: صرف ایک آیت مدنی ہے: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ ⁽⁴⁸⁾ (المرسلات)(1) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا: سورۃ المرسلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لیلۃ الجن میں نازل ہوئی تھی جب کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے یہاں تک کہ ہم نے منیٰ میں ایک غار میں پناہ لی تھی تو یہ سورت نازل ہوئی۔ اسی اثنا میں کہ ہم آپ سے سیکھ رہے تھے آپ کا دہن مبارک اس سے تر تھا کہ اچانک ایک سانپ جھپٹ پڑا ہم اس پر جھپٹے تا کہ ہم اس کو قتل کریں تو وہ چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم اس کے شر سے محفوظ رہے جس طرح وہ تمہارے شر سے محفوظ رہا''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام کریب سے مروی ہے: میں نے سورۃ المرسلات پڑھی تو حضرت عباس کی زوجہ حضرت ام الفضل رو پڑیں فرمایا: اے بیٹے! تو نے اپنی اس قراءت کے ساتھ مجھے یاد دلا دیا کہ یہ آخری سورت تھی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں پڑھتے ہوئے سنی تھی، واللہ اعلم۔ اس کی پچاس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ⁽¹⁾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ⁽²⁾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ⁽³⁾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ⁽⁴⁾
فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ⁽⁵⁾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ⁽⁶⁾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ⁽⁷⁾ فَاِذَا النُّجُوْمُ
طُمِسَتْ ⁽⁸⁾ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ⁽⁹⁾ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ⁽¹⁰⁾ وَ اِذَا الرُّسُلُ
اُقِّتَتْ ⁽¹¹⁾ لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ⁽¹²⁾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ⁽¹³⁾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ
الْفَصْلِ ⁽¹⁴⁾ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ⁽¹⁵⁾

''ان (ہواؤں کی) قسم جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں پھر ان کی (قسم) جو تند و تیز ہیں اور ان کی (قسم) جو بادلوں کو پھیلانے والی ہیں پھر ان کی جو بادلوں کو پارہ پارہ کرنے والی ہیں پھر ان کی قسم جو (دلوں میں) ذکر کا القا کرنے والی ہیں حجت تمام کرنے کے لیے یا ڈرانے کے لیے۔ بے شک جس بات کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ پس اس وقت جب ستارے بے نور کر دیئے جائیں گے اور جب آسمانوں میں شگاف پڑ

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 175

جائیں گے اور جب پہاڑ (خاک بنا کر) اڑا دیئے جائیں گے اور جب رسولوں کو وقت مقررہ پر اکٹھا کیا جائے گا (تمہیں علم ہے) کس دن کے لیے یہ ملتوی کیا گیا ہے فیصلہ کے دن کے لیے۔ (اے مخاطب!) تجھے کیا علم کہ فیصلہ کا دن کیسا ہے؟ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا۝ جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ مرسلات سے مراد ہوائیں ہیں۔ مسروق نے حضرت عبداللہ سے روایت نقل کی ہے فرمایا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں معروف کے ساتھ بھیجا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کی نہی، وحی اور خبر دے کر بھیجا جاتا ہے یہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، مقاتل، ابو صالح اور کلبی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد انبیاء ہیں جنہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا پیغام دے کر بھیجا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابو صالح نے کہا: اس سے مراد رسل ہیں جنہیں معجزات کے ساتھ بھیجا جاتا ہے جن معجزات کے ذریعے ان کی پہچان ہوتی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: اس سے مراد ہوائیں ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ (الحجر: 22) اور ہم نے ہوائیں بھیجیں۔ ارشاد فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (الاعراف: 57) اور وہی ہوائیں بھیجتا ہے۔

عُرْفًا کا معنی ہے ان میں سے بعض، بعض کے پیچھے آتی ہیں جس طرح عرف الفرس۔ گھوڑے کی گردن کے بال۔ عرب کہتے ہیں: الناس إلى فلان عرف واحد۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس آدمی کی طرف متوجہ ہوں اور کثیر ہو جائیں۔ عُرْفًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی ایسی ہوائیں جنہیں پے در پے بھیجا گیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کو نصب حرف جر کے مضمر ہونے کی وجہ سے ہو گویا فرمایا: والمرسلات بالعرف اس سے مراد فرشتے ہیں یا اس سے مراد فرشتے اور رسول ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مرسلات سے مراد بادل ہیں کیونکہ اس میں نعمت اور عذاب ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی پہچان کرانے والے ہوتے ہیں جو ان کی طرف بھیجا گیا اور جن کی طرف بھیجا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد تنبیہات اور مواعظ ہیں اس تاویل پر عُرْفًا کا معنی پے در پے ہے جس طرح اونٹ کی گردن کے بال ہوتے ہیں؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عقول میں جانے پہچانے ہیں۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا۝ بغیر کسی اختلاف کے اس سے مراد ہوائیں ہیں؛ یہ مہدوی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس سے مراد تیز ہوائیں ہیں جو گھاس پھونس لاتی ہیں۔ عصف سے مراد کھیتی کے پتے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا (الاسراء: 69)

ایک قول یہ کیا گیا: عاصفات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہوا پر مقرر ہیں جو انہیں تیزی سے چلاتے ہیں کہا جاتا ہے: عصف بالشئ یعنی اسے ہلاک کر دیا۔ ناقة عصوف جو اپنے سوار کو ہلاک کر دے وہ یوں گزر جاتی ہے گویا تیزی میں ہوا ہے۔ عصفت الحرب بالقوم۔ جنگ نے قوم کو ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ آیات ہیں جو تباہ و برباد کر دیتی ہیں جس طرح زلزلہ اور زمین میں دھنس جانا۔

---

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 175

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا۝ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں پر معین ہیں جو ان بادلوں کو پھیلاتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ بارش سے قبل بھیجتا ہے؛ یہ ابو صالح سے مروی ہے ابو صالح سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد بارشیں ہیں کیونکہ وہ نباتات کو جنم دیتی ہیں یہاں نشر کا معنی زندہ کرنا ہوگا۔ کہا جاتا ہے: نشرہ اللہ المیت۔ اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کر دیا۔ سدی نے ان سے روایت کیا: اس سے مراد فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتب کو پھیلاتے ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد انسانوں کے نامہ اعمال اور ان کے اعمال کو کھولنا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ صحیفے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال کے ساتھ کھولے جاتے ہیں۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد قیامت کے لیے اٹھانا ہے جن میں روحوں کو پھیلایا جائے گا۔ وَّالنّٰشِرٰتِ فرمایا ہے کیونکہ یہ دوسری قسم کا آغاز ہے۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا۝ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو حق و باطل میں فرق کرنے والے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک اور ابو صالح نے کہا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد فرشتے جو روزی، رزق اور موت بانٹتے ہیں۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بادل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد فرقان ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں حق و باطل اور حلال و حرام میں فرق کر دیا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور کیسان کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ رسول ہیں جنہوں نے اوامر و نواہی کو بیان کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد بارش برسانے والے بادل ہیں، انہیں اس اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو حاملہ ہوتی ہے جب اس نے بچہ جننا ہوتا ہے تو وہ نکل پڑتی ہے اور دوڑتی ہے اور یہ بھی لفظ کہا جاتا ہے: نوق فوارق و فرق۔ بعض اوقات وہ ایسے بادل کو جو دوسرے بادلوں سے الگ تھلگ ہوتا ہے اس اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ذو رمہ نے کہا:

أَوْ مُزْنَةٌ فارِقٌ يَجْلو غَوارِبَها　　تَبَوُّجُ الْبَرْقِ والظَّلْماءُ عُلْجُومُ

یا الگ تھلگ بادل جس کے اطراف روشن ہیں اس کی بجلی موجزن ہے اور سیاہی شدید ہے۔

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا۝ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی کتب انبیاء تک پہنچاتے ہیں؛ یہ مہدوی نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں ان کے لیے جمع کا ذکر کیا کیونکہ جبریل امین فرشتوں کے ساتھ اترتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد رسول ہیں اللہ تعالیٰ ان کی طرف جو نازل کرتا ہے وہ اپنی امتوں تک پہنچاتے ہیں؛ یہ قطرب کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے اسے فالملقیات بھی پڑھا ہے یعنی قاف کو مشدد اور مفتوح۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ (نمل: 6) اور بے شک آپ کو سکھایا جاتا ہے قرآن حکیم۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا۝ وہ وحی کو لیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حجت تمام کرنے کے لیے اور مخلوقات کو اس کے عذاب سے

خبردار کرنے کے لیے؛ یہ فراء نے کہا: ابو صالح سے مروی ہے: اس سے مراد رسول ہیں جو حجت تمام کرتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں۔ سعید نے قتادہ سے یہ قراءت نقل کی ہے۔ عُذْرًا اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوقات کے لیے حجت تمام کرنے کے لیے اور مومنوں کو خبردار کرنے کے لیے کیونکہ مومن ہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں اور اسے اپناتے ہیں۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ عُذْرًا سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو جو توبہ القاء کرتا ہے اور نُذْرًا سے مراد ہے وہ اپنے دشمنوں کو ڈراتا ہے۔ ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور حفص نے اَوْ نُذْرًا ذال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ساتوں قراء نے عذرا کو ذال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے صرف جعفی اور اعشیٰ نے ابو بکر سے وہ عاصم سے ذال کے ضمہ کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں یہی چیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ ابراہیم تیمی اور قتادہ نے اسے عذرا ونذرا واوٴ عاطفہ کے ساتھ نقل کیا ہے درمیان میں او کا ذکر نہیں کیا۔ یہ دونوں اعذار اور انذار سے اسم فاعل کے معنی میں ہو کر منصوب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اسم مفعول کے معنی میں ہو کر منصوب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ذکرا سے بدل ہے یعنی وہ عذر اور نذر کو القا کرنے والے ہیں۔ ابو علی نے کہا: عاذر اور ناذر کی جمع کے طور پر عذرا اور نذرا پڑھنا بھی درست ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (النجم) یہ ڈرانے والا (رسول عربی) بھی پہلے ڈرانے والوں کی طرح ہے۔ پھر یہ الملقیات سے حال ہوں گے یعنی وہ ذکر القاء کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ حجت تمام کرتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں یا یہ ذکرا کے مفعول ہیں یعنی وہ ذکر کو القاء کرتے ہیں تا کہ وہ عُذْرًا اور نُذْرًا یاد دلائیں۔ مبرد نے کہا: یہ جمع کا صیغہ ہے اس کی واحد عذیر اور نذیر ہے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ جو قسم پہلے گزری ہے یہ اس کا جواب ہے یعنی قیامت کے امر کا جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ تم پر واقع ہو کر رہے گا پھر اس کے وقوع کا وقت بیان کیا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝ جب ستاروں کی روشنی اور ان کا نور ختم ہو جائے گا جس طرح لکھی ہوئی چیز کو مٹا دیا جائے کہا جاتا ہے: طمس الشئ جب وہ اس چیز کو مٹا دے اس سے طمس آتا ہے اس سے اسم مفعول مطموس ہے۔

جب آسمانوں کو کھول دیا جائے گا اور انہیں پھاڑ دیا جائے گا، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝ (النباء) اور آسمانوں کو کھول دیا جائے گا اور وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: انہیں لپیٹنے کے لیے کھول دیا جائے گا۔

اور جب پہاڑوں کو جلدی سے لے جایا جائے گا۔ کہا جاتا ہے: نسفتُ الشئ أنسفتُه۔ جب تو نے سب کو تیزی سے لے لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کلبی کہا کرتے تھے: سُوِّيَت بالأرض، پہاڑوں کو زمین کے ساتھ برابر کر دیا جائے گا عرب کہتے ہیں: فرس نسوف یہ لفظ اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑا اپنے تنگ کو پیچھے ہٹائے۔ مبشر نے کہا: نَسُوفٌ لِلحزام بمرفقیها وہ اپنی دونوں کہنیوں کے ساتھ تنگ کو پیچھے ہٹاتا ہے عرب کہتے ہیں: نَسَفَتِ الناقةُ الكلأ۔ اونٹنی نے گھاس کو چرا۔

مبرد نے کہا: معنی ہے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ لیا جائے گا۔ جو آدمی اپنے دونوں پاؤں کو زمین سے اٹھالیتا ہے اسے دوسرا آدمی کہتا ہے: آنسفت رجلاک۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نسف کا معنی اجزاء کو بکھیرنا ہے یہاں تک کہ ہوائیں انہیں اڑا دیں اسی سے ایک جملہ بولا جاتا ہے: نسف الطعام وہ کھانے کو حرکت دیتا ہے تاکہ ہوا اس میں موجود تنکے کو ختم کر دے۔

وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ جب رسولوں کو وقت مقررہ یعنی قیامت کے دن اکٹھا کیا جائے گا وقت سے مراد وہ وقت ہے جس تک کسی کام کو موخر کیا جاتا ہے۔ معنی یہ ہوگا رسولوں اور ان کی امتوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے وقت مقرر کر دیا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ (المائدہ: 109) جس روز اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دنیا میں ہوگا یعنی رسولوں کو اس مخصوص وقت میں جمع کیا جائے گا جو کفار کے عذاب کے لیے مقرر کیا گیا ہے جنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار کو مہلت دی گئی قیامت کے روز تمام شکوک زائل کر دیئے جائیں گے پہلی تعبیر سب سے اچھی ہے کیونکہ توقیت کا معنی ہے ایسی چیز جو قیامت کے روز واقع ہوگی جس طرح بے نور کرنا، پہاڑوں کو اڑانا، آسمانوں کو پھاڑنا یہ قیامت کے وقوع سے قبل مناسب نہیں۔ ابوعلی نے کہا: روز جزا اور فیصلہ کے دن کو اس کے لیے معین کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اُقِّتَتْ کا معنی ہے وعدہ کیا گیا اور مہلت دی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا جیسا علم اور ارادہ تھا اسی کے مطابق انہیں معلوم اوقات میں بھیجا گیا۔ اقتت میں ہمزہ واؤ کا بدل ہے؛ یہ فراء اور زجاج نے کہا۔ فراء نے کہا: ہر واؤ جو مضموم ہو اس کا ضمہ لازم ہو اس کو ہمزہ سے بدلنا جائز ہے تو کہتا ہے: صلی القوم احدانا یہ اصل میں وحدانا تھا۔ عرب کہتے ہیں: ھذہ أجوہ حسان اصل میں وجوہ تھا یہ قاعدہ اس لیے جاری کیا گیا کیونکہ واؤ کا ضمہ ثقیل ہے لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ (بقرہ: 237) باہم فضل کرنے کو نہ بھولو۔ یہاں واؤ کو ہمزہ سے بدلنا جائز نہیں کیونکہ ضمہ لازمی نہیں؛ یہ ابوعمرو، حمید، حسن اور نصر کی قراءت ہے۔ عاصم اور مجاہد نے وقِتَتْ پڑھا ہے یہی اس کی اصل ہے۔ ابوعمرو نے کہا: اسے اُقِّتَتْ پڑھے گا جو وجوہ کو اجوہ پڑھتا ہے۔ ابوجعفر، شیبہ اور اعرج نے وُقِتَتْ پڑھا ہے یعنی واؤ اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یہ وقت سے فُعِلت کا وزن ہے۔ اس سے کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النساء) ہے۔ حضرت حسن بصری سے وُوقِتت دو واؤ کے ساتھ ہے یہ وقت سے باب مفاعلہ کا صیغہ ہے جس طرح عوهدت ہے اگر ان دونوں قراءتوں میں واؤ کو الف سے بدل دیا جائے تو یہ جائز ہے۔ یحییٰ، ایوب، خالد بن الیاس اور سلام نے اقتت پڑھا ہے کیونکہ یہ مصحف عثمانی میں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ یعنی اسے مؤخر کیا گیا، یہ اس دن کی عظمت شان کو بیان کرنا یہ تعظیم بیان کرنے کے لیے استفہام کا انداز اپنایا گیا ہے۔

لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۝ فیصلہ کے دن تک اسے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: اللہ تعالیٰ اس روز لوگوں کے درمیان جنت میں بھیجنے یا جہنم میں بھیجنے کا فیصلہ فرمائے گا۔ حدیث طیبہ میں ہے ”جب قیامت کے روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا وہ چالیس سال تک اس طرح کھڑے رہیں گے کہ ان کے سروں پر سورج ہوگا ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوں گی وہ فیصلہ کے انتظار میں ہوں گے“۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾ تعظیم کے بعد تعظیم کا ذکر کیا یعنی آپ کو کس نے بتایا کہ یوم فصل کیا ہے؟

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ جو اللہ تعالیٰ اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور یوم قیامت کو جھٹلائے اس کے لیے عذاب اور رسوائی ہے۔ یہ وعید ہے۔ اس سورت میں ہر آیت میں جھٹلانے والوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کے حساب سے ان کے درمیان عذاب کو تقسیم کر دیا، کیونکہ ایک شی کو جھٹلانے والے کے لیے ایک عذاب ہے جو دوسری چیز کے جھٹلانے والے کے عذاب سے مختلف ہے کیونکہ بعض چیزوں کی تکذیب جرم میں دوسری شے کی تکذیب سے بڑھ کر ہوتی ہیں کیونکہ وہ تکذیب میں بہت ہی قبیح اور اللہ تعالیٰ کا رد کرنے میں بڑھ کر ہوتی ہیں تو ہلاکت اسی حساب سے ان پر تقسیم کی جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ (النباء) موافق جزا۔

حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہا: ویل جہنم میں ایک وادی ہے اس میں کئی قسم کے عذاب ہیں (1) یہی بات حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء نے کہی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب جہنم ٹھنڈی ہو جائے گی تو اس کا ایک انگارہ لیا جائے گا اسے اس جہنم پر پھینکا جائے گا تو اس کا بعض بعض کو کھا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: "مجھ پر جہنم پیش کی گئی تو میں نے ویل سے بڑھ کر کوئی وادی نہیں پائی"۔ ایک روایت یہ کی گئی ہے: یہ جہنمیوں کی پیپ کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ دنیا میں بندے جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بری جگہ وہ ہوتی ہے جہاں مرداروں اور حماموں کے پانیوں میں سے گندگیاں جمع ہوتی ہیں۔ یہ ذکر کیا گیا ہے وہ وادی ایسی ہے جہاں کفار اور مشرکوں کی پیپ جمع ہو جاتی ہے تاکہ دانشمند جان لیں اس سے بڑھ کر کوئی چیز گندی نہیں، اس سے زیادہ کوئی چیز بدبودار نہیں، اس سے بڑھ کر کوئی چیز کڑوی نہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز سیاہ نہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صفت اس عذاب سے بیان کی جس کو یہ وادی متضمن ہے کہ وہاں جہنم میں سب سے بڑی وادی ہے اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس وعید کا ذکر کیا۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾

"کیا ہم نے ہلاک نہیں کر دیا جو ان سے پہلے تھے۔ پھر ہم ان کے پیچھے پیچھے بھیج دیں گے بعد میں آنے والوں کو۔ گناہگاروں کے ساتھ ہم ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک گزشتہ امتوں میں سے جن کفار کو ہلاک کیا گیا اس کی خبر دی جا رہی ہے پھر ہم بعد والوں کو پہلوں کے ساتھ ملا دیں گے، جس طرح ہم نے پہلے لوگوں کے ساتھ کیا ہم قریش کے مشرکوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے یا تو تلوار کا وار کر کے یا ہلاک کر کے۔ عام قراء نے ثم نتبعهم رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اعرج نے نتبعهم جزم کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿﴾ پر معطوف ہے جس طرح تو کہتا ہے: الم تزرنی اکرمک۔ مراد اس سے یہ ہے کہ رسولوں کے اوقات کے مختلف ہونے کے ساتھ اس نے مختلف قوموں کو یکے بعد دیگرے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 418

ہلاک کیا۔ پھر اس کلام سے نیا کلام شروع کیا۔ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ۝ اس سے یہ ارادہ کیا کہ اس کے بعد جنہیں ہلاک کرے گا۔ یہ بھی جائز ہے نُتْبِعُهُمْ میں پے در پے حرکات کی وجہ سے تخفیف کرتے ہوئے ساکن پڑھا ہو۔ تخفیف کے لیے اسکان بھی مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود بنتھ کی قراءت میں ثم سنتبعهم ہے كَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے یعنی اس ہلاکت کی طرح ہم ہر مشرک کے ساتھ کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے دنیا میں ان کی ہلاکت کی ہولناکی بیان کی جارہی ہے۔ تا کہ عبرت دلائی جائے: ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آخرت میں ان کے عذاب کی خبر دی جارہی ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍۙ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍۙ۝ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍۙ۝ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝

''کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا، پھر ہم نے رکھ دیا اسے ایک محفوظ جگہ (رحم مادر) میں ایک معین مدت تک، پھر ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا، پس ہم کتنے بہتر اندازہ ٹھہرانے والے ہیں۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے''۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۝ مَّهِيْنٍ کا معنی کمزور اور حقیر ہے۔ اس سے مراد نطفہ ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ جنین کی پیدائش صرف مرد کے پانی سے ہوتی ہے اس کی دلیل یہی آیت ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۝ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ سے مراد محفوظ جگہ ہے وہ رحم ہے۔

اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۝ اتنے عرصہ تک جس میں ہم اس کی تصویر بنادیں، لیکن قول یہ کیا گیا ہے: ولادت کے عرصہ تک۔

فَقَدَرْنَا نافع اور کسائی نے اسے فقدّرنا مشدد پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مخفف پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ کسائی، فراء اور قتبی نے یہی کہا ہے۔ قتبی نے کہا: قدرنا بھی قدرناہ کے معنی میں ہے جس طرح تو کہتا ہے: قدرت کذا، قدرته۔ اس معنی میں چاند کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا غم علیکم فاقدروا له (1) یعنی اس کی رفتار اور منازل کا اندازہ لگاؤ۔ محمد بن جہیم نے فراء سے روایت نقل کی ہے: فَقَدَرْنَا۔ حضرت علی شیر خدا سے مشدد اور مخفف دونوں طرح مروی ہے۔ کہا: یہ بعید نہیں مشدد اور مخفف ہونے کی صورت میں معنی ایک ہو کیونکہ عرب کہتے ہیں: قدر علیه الموت، قدّر علیه الموت۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (الواقعہ: 60) ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کر دیا۔ اس میں بھی قدرنا کو مشدد اور مخفف دونوں پڑھا گیا ہے۔ اس طرح قدر علیه رزقه وقدّر۔ دونوں طرح ہے۔ جنہوں نے اس کو مخفف پڑھا ہے انہوں نے استدلال کیا ہے اور کہا: اگر یہ مشدد ہوتا تو بعد میں فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ۝ ہوتا۔ فراء نے کہا: عرب دو لغتوں کو جمع کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا۝ (الطارق) کافروں کو مہلت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأیتم الهلال

دیجئے انہیں کچھ مہلت دیجئے۔

اعشی نے کہا:

وأنكرتني وما كان الذى نكرت من الحوادث إلا الشيب والصلعا

انہوں نے مجھے عجیب جانا اور حوادثات میں سے صرف بڑھاپا اور گنجاپن عجیب جانا جاتا۔

عکرمہ سے مروی ہے: فَقَدَرْنَا معنی یہ قدرت سے مخفف ہے؛ یہ ابو عبید، ابو حاتم اور کسائی کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔

فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ جس نے فعل کو مشدد پڑھا ہے وہ قادرون کو تقدیر سے مشتق مانتا ہے یعنی ہم نے شقی اور سعید کو مقدم کیا ہم کتنے اچھے مقدر کرنے والے ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے اسے لمبا اور چھوٹا مقدر کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی ہے ہم اس کے مالک ہیں۔ مہدوی نے کہا: یہ تفسیر تخفیف کی قراءت کے زیادہ مشابہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے کیونکہ عکرمہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یا اس کا معنی ہے ہم اس کے مالک ہوتے تو ہم کتنے اچھے مالک ہیں۔ دونوں کلمات نے مختلف معانی دیئے یعنی ہم نے ولادت اور نطفہ کے احوال کو مقدر کیا جب وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ مکمل انسان بن جاتا ہے یا بدبخت اور سعادت مند بن جاتا ہے یا لمبا اور چھوٹا ہو جاتا ہے۔ یہ سب تشدید کے طریقہ پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

''کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو سمیٹنے والی تمہارے زندوں اور مردوں کو اور ہم نے ہی بنا دیئے اس میں خوب جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ہم نے ہی تمہیں میٹھا پانی پلایا۔ تباہی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لیے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

جسم اور اس کے اعضاء کو زمین میں دفن کرنا واجب ہے

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو جمع کرنے والی زندوں کو روئے زمین پر اور مردوں کو اس کے بطن میں۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ میت کو چھپانا، اسے دفن کرنا، اس کے بالوں کو دفن کرنا اور وہ تمام چیزیں جن کو وہ اپنے جسم سے الگ کرتا ہے دفن کرنا اور اس میں چھپانا واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اپنے ناخن کاٹو اور کٹے ہوئے ناخن زمین میں دفن کر دو'' (1)۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: کفت

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 45

الشئ اکفتہ یعنی میں نے اسے جمع کیا کفت کا معنی جمع کرنا اور ملانا ہے۔ سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

كِرَامٌ حِينَ تَنْكَفِتُ الأَفَاعِي إلى أَحْجَارِهِنَّ مِنَ الصَّقِيعِ

وہ اس وقت بھی سخی ہوتے ہیں جب سانپ سخت ٹھنڈک کی وجہ سے اپنی بلوں میں سمٹ جاتے ہیں۔

ابوعبید نے کہا: کِفَاتًا کا معنی برتن ہیں جس کو کفت اور کفیت کہتے ہیں کیونکہ وہ دودھ کو جمع کرتی ہے۔ کہا:

فأنت اليومَ فوقَ الأرضِ حَيًّا وأنت غدًا تَضُمُّكَ في كِفَات

آج تو زمین پر زندہ ہے اور کل تجھے زمین پہلوؤں میں جمع کرے گی۔

امام شعبی ایک جنازہ میں نکلے آپ نے ایک قبرستان دیکھا فرمایا: یہ مردوں کو جمع کرنے والے برتن ہیں۔ پھر گھروں کی طرف دیکھا فرمایا: یہ زندوں کو جمع کرنے والے برتن ہیں۔

## ان آیات سے مستنبط دیگر احکام و مسائل

**مسئلہ نمبر 2**۔ ایک کفن چور کے بارے میں ربیع سے پوچھا گیا۔ کہا: اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ان سے پوچھا گیا: آپ نے یہ بات کیوں کی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو جمع کرنے والا نہیں بنایا''۔ زمین محفوظ جگہ ہے۔ سورۂ مائدہ میں یہی بات گزر چکی ہے۔ لوگ بقیع غرقد کو کفتہ کہتے تھے کیونکہ یہ قبرستان ہے جو مردوں کو جمع کرتی ہے۔ زمین زندوں کو ان کے گھروں میں جمع کرتی ہے اور مردوں کو ان کی قبروں میں جمع کرتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: لوگ روئے زمین پر قرار پذیر ہوتے ہیں پھر زمین پر پہلو کے بل لیٹتے ہیں ان میں سے کچھ اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ زندوں کے برتن ہیں یعنی انسان سے جو فضلات نکلتے ہیں انہیں زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں کا اس کے اوپر ہونا اس میں ملانے کا کوئی تصور نہیں ضم کا لفظ تمام وجوہ سے احاطہ کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اخفش، ابوعبید اور مجاہد نے اپنے دو قولوں میں سے ایک قول میں کہا: اَحْيَآءً اور اموات کا مرجع ارض ہے یعنی زمین دو قسموں میں منقسم ہے زندہ جو فصل اگاتی ہے، مردہ جو کوئی چیز نہیں اگاتی۔ فراء نے کہا: اَحْيَآءً اور اَمْوَاتًا اس وجہ سے منصوب ہے کہ یہ کفات کے مفعول ہیں معنی ہوگا کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردہ جمع کرنے والا نہیں بنایا جب تو انہیں تنوین دے گا تو تو انہیں نصب دے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿﴾ یَّتِیْمًا (البلد) یا بھوک والے دن یتیم کو کھانا کھلانا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ الْاَرْضَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی زمین میں سے کچھ اس طرح اور کچھ اس طرح۔ اخفش نے کہا: کِفَاتًا یہ کافتتکی جمع ہے الْاَرْضَ سے مراد جمع ہے اس وجہ سے جمع کے ساتھ اس کی لغت بیان کی جاتی ہے خلیل نے کہا: تکفیت کا معنی کسی شی کو الٹ دینا، ظاہر کو باطن بنا دینا اور باطن کو ظاہر بنا دینا یہ جملہ بولا جاتا ہے: انکفت القوم الی منازلھم لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

کفات کا معنی یہ ہوگا وہ زمین کے اوپر تصرف کرتے ہیں اور اس کی طرف پلٹ آتے ہیں اور انہیں اس میں دفن کیا جاتا ہے۔

**وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿﴾** ھا ضمیر سے مراد زمین ہے۔ رَوَاسِيَ سے مراد پہاڑ ہیں۔ رَوَاسِيَ سے مراد ثبت ہیں۔ شٰمِخٰتٍ سے مراد لمبے ہیں اس معنی میں کہا جاتا ہے: شمخ بانفہ جب وہ تکبر کرتے ہوئے اپنے

تا کے واو پر اٹھائے اور ہم نے تمہارے لیے پانی بنا دیا ہے۔ فرات سے مراد میٹھا پانی ہے جس کو پایا جاتا ہے اور اس سے کھیتی سیراب کی جاتی ہے یعنی ہم نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور میٹھا پانی نازل کیا یہ امور دوبارہ اٹھائے جانے سے زیادہ عجیب ہیں (1)۔ ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: زمین میں جنت سے فرات، دجلہ اور نہر اردن ہے۔ صحیح مسلم میں ہے سیحان، جیحان، نیل اور فرات عام جنت کے دریا ہیں (2)۔

اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

''انہیں حکم ملے گا چلو اس (آگ) کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اس سایہ کی طرف جو تین شاخوں والا ہے، نہ وہ سایہ دار ہے اور نہ وہ بچاتا ہے آگ کی لپیٹ سے، وہ جہنم پھینک رہی ہوگی بڑے بڑے انگارے جیسے محل گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ تباہی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لیے''۔

اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ یعنی کفار کو کہا جائے گا: جس عذاب کو تم جھٹلاتے تھے اس کی طرف تم چلو تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ ایسے دھویں کی طرف چلو جو اوپر اٹھتا ہے تو تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عظیم دھویں کی یہی صورتحال ہوتی ہے جب وہ اوپر اٹھتا ہے تو شاخوں والا ہو جاتا ہے پھر سایہ کی صفت بیان کی، یعنی وہ ایسا سایہ نہیں ہوگا جو سورج کی گرمی سے بچائے اور جہنم کی لپک سے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب آگ بھڑکتی ہے تو جو چیز اس پر بلند ہوتی ہے اسے لہب کہتے ہیں وہ سرخ ہو، زرد ہو یا سبز ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا: تین شاخوں سے مراد ضریع، زقوم اور غسلین ہے؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لہب، انگارہ، دھواں، کیونکہ یہی تین حالتیں ہیں جب آگ خوب بھڑکتی ہے تو آگ کے یہی تین وصف ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد وہ ابتدائی دھواں ہے جو آگ سے باہر نکلتا ہے پھر تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جہاں تک نور کا تعلق ہے وہ مومنوں کے سروں پر رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد گرد و غبار ہے وہ آگ کا شعلہ ہے جو انہیں احاطہ میں لیے ہوگا، پھر تین حصوں میں تقسیم ہو جائے گا وہ ان پر سایہ کیے رہے گا یہاں تک کہ حساب سے فراغت ہو جائے گی اور انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ یحموم کا سایہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ۝ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ۝ (الواقعہ)

جیسے پہلے گزر چکا ہے حدیث طیبہ میں ہے: سورج لوگوں کے سروں کے قریب ہوگا اس روز ان پر کوئی لباس اور کفن نہیں ہوں گے سورج ان کو جھلسا دے گا، ان کی سانسوں کو گرفت میں لے لے گا اور اس دن کو لمبا کر دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہے گا اپنی رحمت کے ساتھ اپنے سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا اس وقت وہ کہیں گے: فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 434

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمہا و اہلہا، باب ما فی الدنیا من انہار الجنۃ

عَذَابَ السَّمُوْمِ ۞ (طور) الله تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں عذاب سموم سے بچایا اور جھٹلانے والوں کو کہا جائے گا: تین شاخوں والے سایہ کی طرف چلو الله تعالیٰ کے اولیاء اس کے عرش کے سایہ میں ہوں یا جہاں وہ اپنے سایہ میں جگہ دینا چاہے گا یہاں تک کہ حساب سے فراغت ہو جائے گی پھر ہر فریق کو جنت اور جہنم کے مستقر کی طرف جانے کا حکم دے دیا جائے گا۔ پھر آگ کی صفت بیان کی۔

اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۞ شرر کا واحد شررۃ ہے اور شرار کا واحد شرارۃ ہے۔ اس سے مراد وہ چیز ہے جو آگ کی جانب سے اڑتی ہے اصل میں شررت الثوب سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اسے دھوپ میں پھیلائے تا کہ وہ خشک ہو جائے۔ قصر سے مراد بلند عمارت ہے۔ عام قراءت كَالْقَصْرِ صاد کے سکون کے ساتھ ہے اس سے مراد قلعے اور شہر ہیں اس کی جمع قصور آتی ہے، یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے یہ جنس کے طبقہ پر جمع کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قَصْر یہ قَصْرَۃ کی جمع ہے جس طرح جَمْرَۃ کی جمع جَمْر، تَمْرَۃ کی جمع تَمْر آتی ہے قصر لکڑی کے موٹے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم موسم سرما کے تین تین ہاتھ کی یا اس سے کم لکڑیاں اٹھا کر رکھتے اور اسے قصر کا نام دیتے۔ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد بڑے درخت اور بڑی کھجور کے تنے ہیں جب وہ گر پڑیں اور انہیں کاٹا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، حمید اور سلمی نے اسے كالقصر پڑھا ہے اس سے مراد کھجور کا ابتدائی حصہ ہے۔ قصرۃ کا معنی گردن بھی ہے اس کی جمع قصر اور قصرات آتی ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد اونٹ کی گردن ہے۔ سعید بن جبیر نے قاف کے کسرہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ قصرۃ کی جمع بھی ہو سکتی ہے جیسے بدرۃ کی جمع بدر، قصعہ کی جمع قصع اور حلقہ کی جمع حلق آتی ہے یہ لوہے کے چھلوں کے لیے ہے۔ ابو حاتم نے کہا: شاید یہ بھی ایک لغت ہے جس طرح حاجۃ کی جمع حوج آتی ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: قصر سے مراد پہاڑ ہے شرر کو انگاروں سے مقدار میں قصر سے تشبیہ دی گئی پھر انہیں رنگوں میں سیاہ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی صفر اس سے مراد سیاہ اونٹ ہیں عرب سیاہ اونٹوں کو صفر کہتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

تِلْكَ خَيْلِی منه وتلك رِكَابِی هُنَّ صُفْرٌ أَوْلَادُهَا كَالزَّبِيبِ

وہ اس کی جانب سے میرے گھوڑے اور میرے اونٹ ہیں وہ سیاہ ہیں ان کی اولادیں کشمش کی رنگت والی ہیں۔

سیاہ اونٹوں کو صفر کہا گیا ہے کیونکہ ان کی سیاہی میں زردی کی آمیزش ہوتی ہے جس طرح سفید ہرنوں کو اُدْم کہتے ہیں کیونکہ ان کی سفیدی پر گدلا پن غالب ہوتا ہے۔ انگارہ جب اڑے اور پھر گرے تو اس میں آگ کی رنگت ہوتی ہے جو سیاہ رنگ کے مشابہ ہوتی ہے جس میں زردی کی آمیزش ہوتی ہے۔

عمران بن خطان خارجی نے کہا:

دَعَتْهُمْ بِأَعلَى صَوْتِهَا وَرَمَتْهُمْ بِمِثْلِ الْجِمَالِ الصُّفْرِ نَزَّاعَةُ الشَّوَى

اس نے انہیں بلند آواز سے بلایا اور انہیں زرد اونٹوں کی طرح پھینکا جو چہرے کو جھلسا دینے والی تھی۔

ترمذی نے اس قول کو ضعیف قرار دیا کہا: یہ قول لغت میں محال ہے کہ کوئی چیز ہو جس میں تھوڑی سی چیز کی آمیزش ہو تو تمام کو اس تھوڑی سی ملنے والی چیز کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ جس نے یہ قول کیا ہے اس پر تعجب ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ ہم لغت میں ایسی کوئی چیز نہیں جانتے۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ آگ نور سے پیدا کی گئی وہ روشن آگ ہے جب اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کیا جو آگ کی جگہ ہے وہ جگہ اس آگ سے بھر گئی اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اپنی قوت اور غضب بھیجا تو اس قوت و غلبہ کی وجہ سے وہ سیاہ ہوگئی اور اس کی گہرائی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ آگ سے زیادہ سیاہ ہوگئی اور ہر چیز سے زیادہ سیاہ ہوگی، جب قیامت کا دن ہوگا میدان محشر میں جہنم کو لایا جائے گا تو وہ لوگوں پر شرارے پھینکے گی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی وجہ سے غضبناک ہوگی وہ انگارے بھی سیاہ ہوں گے کیونکہ وہ سیاہ آگ کے ہوں گے۔ جب آگ اپنے انگارے پھینکے گی تو وہ دشمنوں کو مارے گی وہ آگ کے سیاہ ہونے کی وجہ سے سیاہ ہوں گے یہ موحدین تک نہیں پہنچیں گے وہ رحمت کے حجاب میں ہوں گے جنہوں نے مومنین کی موقف کو گھیر رکھا ہوگا۔ یہی وہ بادل ہے جس میں رب العالمین جلوہ افروز ہوگا لیکن وہ شراروں کے پھینکے جانے کے منظر کو دیکھیں گے جب وہ اس منظر کو دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ اس غضب اور ہیبت کو دور فرما دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ سے مراد کشتیوں کی رسیاں ہیں۔ ان رسیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ مردوں کی کمریں محسوس ہوں گی؛ اسے امام بخاری نے ذکر کیا ہے وہ اسے جُمالات پڑھتے؛ اسی طرح مجاہد اور حمید نے جمالات پڑھا ہے اس سے مراد موٹی رسیاں ہیں اس سے مراد کشتی کی رسیاں ہیں قلوس کا واحد قلس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد تانبے کے ٹکڑے ہیں۔ موٹی رسی میں جو لفظ معروف ہے وہ جمل ہے جس طرح سورۃ الاعراف میں پہلے گزر چکا ہے۔ جمالات، جمالۃ کی جمع ہے گویا جمالہ، جمل کی جمع ہے جس طرح حجر کی جمع حجارہ ہے اور ذکر کی جمع ذکارہ ہے۔ یعقوب، ابن ابی اسحاق، عیسیٰ اور جحدری نے جُمالۃ پڑھا ہے یہ واحد کا صیغہ ہے اس سے مراد عظیم شی ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کے ساتھ جمع ہو۔ حفص، کسائی اور حمزہ نے جِمالۃ پڑھا ہے اور سات میں سے باقی قراء نے جمالات پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: یہ جائز ہے کہ جمالات، جمال کی جمع ہو جس طرح کہا جاتا ہے: رجل کی جمع رجال اور رجالات ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کی تیزی کی وجہ سے اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بعض، بعض کی متابعت کرتے ہیں۔ قصر کی جمع قصور ہے قصر الظلام کا معنی تاریکیوں کا آپس میں ملنا ہے کہا جاتا ہے: اتیتہ قصرا میں عشاء کے وقت آیا، یہ مشترک ہے۔

جس طرح کسی نے کہا: کانھم قصرا مصابیح راھب گویا وہ عشاء کے وقت راہب کے چراغ ہیں۔

**مسئلہ**: اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ لکڑیوں اور کوئلہ کو ذخیرہ کرنا جائز ہے اگر چہ یہ غذا میں سے ہے کیونکہ یہ انسان کے مصالح اور ضروریات کو پورا کرنے کا باعث ہے یہ ان چیزوں میں سے ہے جو یہ تقاضا کرتی ہیں کہ انسان ضرورت کے

وقت کے علاوہ کسی چیز کو حاصل کرنے کا خیال رکھے تا کہ یہ چیز سستی مل جائے اور اس کے وجود کی حالت زیادہ ممکن ہو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ آپ اپنے مال اور کمائی سے اس وقت خوراک اکٹھی کر لیتے تھے جب خوراک عام پائی جاتی ہر شے اس پر محمول کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے اس ارشاد میں اس چیز کو بیان کیا ہے ہم لکڑیوں کا ارادہ کرتے ہیں ہم تین تین ہاتھ یا اس سے زائد یا اس سے کم کاٹ لیتے اور موسم سرما کے لیے انہیں ذخیرہ کر لیتے ہم اس عمل کو قصر کا نام دیتے اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ان میں سے یہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

''یہ وہ دن ہوگا جس میں نہ وہ بول سکیں گے اور نہ انہیں اجازت ملے گی کہ وہ کچھ عذر پیش کریں۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے''۔

وہ اس وقت گفتگو نہ کریں گے۔ قیامت کے دن کے کئی مواقع اور محل ہیں یہ ان اوقات میں سے ہے جس میں وہ گفتگو نہ کریں گے اور انہیں معذرت کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابن ازرق نے ان سے هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ اور فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾ (طہ) کے بارے میں پوچھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٥﴾ (الطور) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے تیرے رب کے ہاں ایک دن ان ہزار سالوں کی طرح ہے جنہیں تم شمار کرتے ہو۔ ان دونوں میں سے ہر ایک دن کی مقدار کا انداز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ نفع مند بات نہ کریں گے۔ جو آدمی ایسی گفتگو کرے جو نفع مند نہ ہو وہ اس طرح ہے جیسے اس نے گفتگو کی ہی نہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ دلیل سے گفتگو نہیں کریں گے اگر چہ وہ گفتگو کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ان کے جواب کا وقت ہے ارشاد فرمایا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾ (المومنون)

اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت ابو عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہیبت کو دیکھنے اور گناہوں کے حیاء نے انہیں خاموش کر دیا۔ جنید نے کہا: اس آدمی کے لیے کیا عذر ہو سکتا ہے جو منعم سے اعراض کرے، اس کا انکار کرے اور اس کے احسانات اور نعمتوں کی ناشکری کرے۔ یوم کا لفظ عام لوگوں کی قراءت میں مبتدا اور خبر ہونے کی حیثیت میں مرفوع ہے فرشتے کہیں گے: یہ ایسا دن ہے جس میں وہ گفتگو نہ کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اِنْطَلِقُوْۤا فرشتوں کا قول ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں سے فرمائے گا: یہ ایسا دن ہوگا جس میں کفار گفتگو نہ کریں گے۔ الیوم کا معنی ساعت اور وقت ہے۔

یحییٰ بن سلطان نے ابوبکر سے وہ عاصم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اس میں یوم کا لفظ منصوب ہے۔ ابن ہرمز اور دوسرے علماء سے مروی ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یوم کا لفظ مبنی ہو کیونکہ وہ فعل کی طرف مضاف ہو اور اس کا محل رفع کا ہو؛ یہ کوفیوں کا نقطہ نظر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اشارہ یوم کی طرف نہ ہو؛ یہ بصریوں کا مذہب ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مبنی ہوتا ہے جب اسے مبنی کی طرف مضاف کیا جائے یہاں فعل معرب ہے۔ فراء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ کے

بارے میں کہا: یہاں فاء عاطفہ ہے یعتذرون کا عطف یوذن پر ہے۔ یہ جائز ہے کیونکہ آخر میں نون اعرابی موجود ہے اگر یہ فیعتذروا ہوتا، آیات میں موافقت نہ ہوتی جب کہ یہ ارشاد فرمایا: لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا (فاطر: 36) یہاں فَيَمُوْتُوْا محل نصب میں ہے سب درست ہے اس کی مثل مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ (الحدید: 11) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں کئی گنا اضافہ کردے یہاں فَيُضٰعِفَهٗ کو مرفوع اور منصوب پڑھنا جائز ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾

''(اے کافرو!) یہ فیصلہ کا دن ہے (جس میں) ہم نے تمہیں اور اگلوں کو جمع کر دیا ہے۔ پس اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف استعمال کرو۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے''۔

انہیں کہا جائے گا: یہ وہ دن ہے جس میں مخلوقات کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور حق پرست باطل پرست سے ممتاز ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو جھٹلانے والوں اور آپ سے قبل کے انبیاء کو جھٹلانے والوں کو جمع کرے گا۔ ضحاک نے ان سے یہ روایت نقل کی ہے۔

اگر تمہارے پاس ہلاکت سے خلاصی کی کوئی صورت ہے تو اپنے لیے کوئی حیلہ کرو اور مجھ سے قوت میں مقابلہ کرلو تم ہرگز اس کو نہ پاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اگر تم جنگ پر قادر ہو تو مجھ سے جنگ کرو۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کی ہے تم دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کیا کرتے تھے اور مجھ سے جنگ کیا کرتے تھے آج تم مجھ سے جنگ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا: تم دنیا میں نافرمانیاں کیا کرتے تھے آج تم اس سے عاجز آچکے ہو اور اپنا دفاع کرنے سے بھی عاجز آچکے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حکایت ہے تو یہ حضرت ہود علیہ السلام کے قول کی طرح ہوگا: ''تم میرے ساتھ خفیہ تدبیر کرلو پھر تم مجھے مہلت نہ دینا''۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

''بے شک پرہیزگار (اللہ کی رحمت کے) سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے اور (ان) پھلوں میں ہوں گے جن کو وہ پسند کریں گے۔ (انہیں کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اور ان اعمال کے صلہ میں جو تم کیا کرتے تھے۔ ہم یوں ہی صلہ دیا کرتے تھے نیکوں کاروں کو، تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے''۔

یہاں اس چیز کے بارے میں خبر دی جس کی طرف متقی لوٹیں گے۔ ظِلٰلٍ سے مراد درختوں اور محلات کے سائے ہیں یہ اس سایہ کی جگہ ہوں گے جو تین شاخوں والا ہوگا۔ سورۂ یاسین میں ہے هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ (یاسین) وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں ہوں گی پلنگوں پر ٹیک لگائے ہوئے۔

ان کے لیے وہ پھل ہوں گے جس کی تمنا کریں گے۔ عام قرأت کی قرأت ظلال ہے۔

اعرج، زہری اور طلحہ نے ظُلَلٍ پڑھا ہے جو ظلہ کی جمع ہے یعنی جنت میں وہ سائے میں ہوں گے۔

کھاؤ پیو یعنی متقین کو آخرت میں یہ کہا جائے گا جب کہ مشرکین کو کہا جائے گا: اگر تم کوئی حیلہ کر سکتے ہو تو حیلہ کرو۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا یہ متقین کی ضمیر سے حال ہے جو ضمیر فِیْ ظِلٰلٍ کی ظرف میں ہے یعنی جار مجرور جس شبہ فعل کے متعلق ہے اس میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے جو شبہ فعل مستقرون ہے انہیں یہ کہا جائے گا: ہم انہیں بدلہ دیں گے جنہوں نے دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اپنے اعمال میں احسان سے کام لیا۔

**كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝**

"(اے منکرو!) اب کھالو اور عیش کر لو تھوڑا سا وقت بے شک تم مجرم ہو۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اس کلام کو متقین کے متعلق کلام سے قبل کلام کی طرف پھیرا جائے گا۔ یہ کلام وعید اور دھمکی ہے یہ المکذبین سے حال ہے مطلب یہ ہوگا جس وقت انہیں یہ کہا جائے گا اس وقت ان کے لیے ہلاکت ثابت ہوگی، کیونکہ تم مجرم ہو یعنی کافر ہو تم ایسا عمل (شرک و کفر) کرنے والے ہو جو تمہیں آخرت میں نقصان پہنچائے گا۔

**وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝**

"اور (آج) ان سے کہا جاتا ہے اپنے رب کے سامنے جھکو تو نہیں جھکتے۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔ آخر کس بات پر وہ اس کتاب کے بعد ایمان لائیں گے"۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ جب ان مشرکوں کو یہ کہا جاتا ہے: نماز پڑھو تو وہ نماز نہیں پڑھتے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ بنو ثقیف کے بارے میں نازل ہوئی جو نماز پڑھنے سے رک گئے تھے تو یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا: "اسلام قبول کرلو" اور انہیں نماز کا حکم دیا تو ان کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا۔ انہوں نے کہا: ہم نہیں جھکیں گے کیونکہ یہ ہمارے لیے گالی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ایسے دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں رکوع و سجود نہ ہو"۔ یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نماز عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوئے آپ نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے کو جائز خیال نہ کرتے تھے آپ بیٹھ گئے اور نماز نہ پڑھی ایک بچے نے ان سے کہا: اے شیخ! اٹھیے اور نماز پڑھیے آپ اٹھے اور نماز پڑھی اور اپنے مذہب کے مطابق اس سے کوئی جھگڑا نہ کیا۔ حضرت امام مالک سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا میں ڈر گیا کہ کہیں میں ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں جن کے بارے میں ہے وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بات انہیں آخرت میں کہی جائے گی جب انہیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی تو وہ

اس کی طاقت نہ رکھیں گے۔ قتادہ نے کہا: یہ دنیا میں ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: یہ آیت اس امر پر حجت ہے کہ رکوع واجب ہے اور نماز میں یہ رکن ہے اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ ایک قوم کا گمان ہے: یہ قیامت میں ہوگا وہ تکلیف کا گھر نہیں یعنی وہاں مقصود کسی فعل کا مطالبہ نہیں امر اس کی طرف ویل اور عقاب کی حیثیت سے متوجہ ہوگا۔ انہیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی تاکہ دنیا میں لوگوں کا جو حال تھا وہ عیاں ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا کرتا تھا وہ سجدہ کر سکے گا جو ریا کاری کے طور پر سجدہ کیا کرتا تھا تو اس کی پشت سیدھی ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب انہیں کہا جائے گا حق کے لیے جھکو تو وہ نہ جھک سکیں گے یہ نماز اور دوسرے امور میں عام ہے نماز کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ توحید کے بعد وہ شرائع کی اصل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ نماز ایمان کے بغیر درست نہیں۔

**فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝** یعنی اگر وہ قرآن کی تصدیق نہ کریں جو معجزہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دلیل ہے تو پھر وہ کس چیز کی تصدیق کریں گے؟

**وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝** کو مکرر ذکر کیا گیا ہے تاکہ تحریف اور وعید کا اعادہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تکرار نہیں کیونکہ ہر قول سے ایسی چیز کا ارادہ کیا گیا جو دوسرے قول سے ارادہ نہیں کیا گیا تھا گویا ایک چیز کا ذکر کیا گیا اور فرمایا: جو اس کو جھٹلاتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے پھر ایک چیز کا ذکر کیا اور کہا: جو اس کو جھٹلاتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے پھر ایک اور چیز کا ذکر کیا اور کہا: جو اس کو جھٹلاتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے، پھر آخر تک اسی طرح ہے۔

# سورۂ عم

(آیاتہا ۴۰) (۷۸ سورۃ النبا مکیۃ ۸۰) (رکوعاتہا ۲)

یہ سورت مکی ہے، اسے سورۃ النبا بھی کہتے ہیں۔ اس کی آیات چالیس ہیں یا اکتالیس ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

''وہ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کیا وہ اس بڑی اور اہم خبر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں۔ یقیناً وہ اسے جان لیں گے پھر یقیناً وہ اسے جان لیں گے (کہ قیامت برحق ہے)''۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَمَّ استفہام کا لفظ ہے اس وجہ سے ما کا الف حذف کر دیا گیا تا کہ خبر استفہام سے ممتاز ہو جائے اس طرح فیم اور مم ہے جب ان کے ساتھ سوال کیا جائے معنی ہوگا وہ ایک دوسرے کے بارے میں کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں؟ زجاج نے کہا: عَمَّ اصل میں عن ما تھا نون کو میم میں مدغم کر دیا گیا کیونکہ نون غنہ میں میم کے ساتھ شریک ہے۔ يَتَسَآءَلُوْنَ میں ضمیر قریش کے لیے ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب قرآن حکیم نازل ہوا تو قریش بیٹھا کرتے وہ آپس میں گفتگو کرتے ان میں سے کچھ تصدیق کرنے والے ہوتے اور کچھ جھٹلانے والے، تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَمَّ، فیم کے معنی میں ہے یعنی کس چیز کے بارے میں سختی کرتے ہیں اور جھگڑتے ہیں؟

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ وہ نبا عظیم کے بارے میں سوال و جواب کرتے ہیں۔ عن حرف جار اس يَتَسَآءَلُوْنَ کے متعلق نہیں جو تلاوت میں ہے کیونکہ یہ حرف استفہام کے داخل ہونے کو لازم ہے تو عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ تیرے اس قول کی طرح ہو جائے گا: تیرا کتنا مال ہے کیا تیس یا چالیس؟ جو بات ہم نے ذکر کی ہے اس سے یہ بات لازم ہوگی کہ اسے اس يَتَسَآءَلُوْنَ کے متعلق کرنا ممتنع ہے جو تلاوت میں موجود ہے۔ یہ ایک اور يَتَسَآءَلُوْنَ کے متعلق ہے جو مضمر ہے اسے مضمر ماننا اچھا ہے کیونکہ يَتَسَآءَلُوْنَ پہلے موجود ہے؛ یہ مہدوی نے کہا۔ بعض اہل علم نے یہ ذکر کیا ہے کہ دوبارہ جو عَنِ آیا ہے اس میں استفہام ہے مگر وہ مضمر ہے گویا کلام یوں ہے عم یتساءلون عن النبا العظیم اس بنا پر پہلی آیت کے ساتھ متصل ہے اور النَّبَاِ الْعَظِيْمِ سے مراد بڑی خبر ہے۔

الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ وہ اس کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں ایک تصدیق کرتا ہے اور دوسرا جھٹلاتا ہے۔ ابوصالح نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبا عظیم سے مراد قرآن حکیم ہے اس کی دلیل قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ ۙ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝ (ص) کہہ دیجئے: وہ عظیم خبر ہے جس سے تم اعراض کرتے ہو قرآن حکیم نبا خبر اور قصص ہے وہ عظیم الشان خبر ہے۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ موت کے بعد دوبارہ اٹھانا ہے لوگ اس بارے میں دو حصوں میں بٹ گئے تصدیق کرنے والے اور تکذیب کرنے والے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت ساری چیزوں کے بارے میں سوال کیا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے اختلاف کے بارے میں آگاہ کیا پھر انہیں خبردار کیا، فرمایا: كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ۝ وہ عنقریب قرآن کے انجام کے بارے میں آگاہ ہو جائیں گے کیا وہ حق ہے یا باطل ہے؟ كَلَّا انہوں نے بعث کا جو انکار کیا اور قرآن کی جو تکذیب کی اس کا رد کرنے کے لیے کلام کو ذکر کیا۔ اس پر وقف کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حق کے معنی میں ہو یا اَلَا کے معنی میں ہو۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ ان کا سوال دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں ہو۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا ۝ اس امر پر دلالت کرتا ہے وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں باہم سوال کیا کرتے تھے۔

یعنی یہ بات حق ہے کہ وہ اس بات کو جان لیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قرآن کو لائے ہیں وہ سچ ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے جو یہ بیان کیا ہے کہ موت کے بعد انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا وہ سچ ہے۔

ضحاک نے کہا: اس سے مراد ہے کفار اپنے جھٹلانے کے انجام کو دیکھ لیں گے پھر مومنین اپنی تصدیق کے انجام کو دیکھ لیں گے۔ ایک قول اس کے برعکس بھی کیا گیا ہے کہ پہلے فعل کا فاعل مومن اور دوسرے فعل کا فاعل کافر ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ وعید کے بعد وعید ہے۔ دونوں افعال میں عام قراءت یاء کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَتَسَآءَلُوْنَ، هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ یعنی یہ غائب کے صیغے ہیں۔ حضرت حسن بصری، ابوالعالیہ اور مالک بن دینار نے کہا: دونوں تاء کے ساتھ مخاطب کے صیغے ہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۝ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّ بَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۝ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝

"کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں اور ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں جوڑا جوڑا اور ہم نے بنا دیا تمہاری نیند کو باعث آرام اور ہم نے بنا دیا رات کو پردہ پوشی اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنا دیا اور ہم

نے بنائے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) اور ہم نے ہی ایک نہایت روشن چراغ بنایا اور ہم نے برسایا بادلوں سے موسلا دھار پانی تا کہ ہم اگائیں اس کے ذریعے اناج اور سبزی نیز گھنے باغات''۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ ان کی اس بات پر راہنمائی کی کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے پر قادر ہے یعنی ان امور کو پیدا کرنے پر ہماری قدرت دوبارہ اٹھانے پر ہماری قدرت سے عظیم ہے۔ مہاد کا معنی بستر ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (البقرہ: 22) وہ ذات پاک جس نے زمین کو تمہارے لیے بستر بنا دیا۔ اسے مہدا بھی پڑھا گیا ہے اس کا معنی ہے زمین ان کے لیے ایسی ہے جیسے بچے کے لیے پنگھوڑا ہوتا ہے، مہد اسے کہتے ہیں جسے بچھایا جاتا ہے اور اس پر سویا جاتا ہے۔

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ پہاڑوں کو میخیں بنایا تا کہ وہ پرسکون ہو جائے اور اپنے مکینوں کے ساتھ ایک طرف مائل نہ ہو جائے۔

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝ یعنی اصناف بنایا ان میں سے کچھ مذکر ہیں اور کچھ مونث ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَزْوَاجًا کا معنی رنگ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں ہر جوڑا داخل ہو جاتا ہے یعنی قبیح، حسین اور لمبا، چھوٹا تا کہ احوال مختلف ہو جائیں تو اعتبار واقع ہو سکے فضیلت والا شکر بجالائے اور جس پر فضیلت حاصل کی گئی وہ صبر کرے۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ جَعَلْنَا یہ صیرنا کے معنی میں ہے اس وجہ سے یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے سُبَاتًا یہ دوسرا مفعول ہے یعنی ہم نے نیند کو تمہارے بدنوں کی راحت بنا دیا ہے، اسی سے یوم السبت ہے جس کا معنی آرام کا دن ہے یعنی بنی اسرائیل کو کہا گیا: اس روز آرام کرو اس میں کوئی کام نہ کرو۔ ابن انباری نے اس کا انکار کیا اور کہا: راحت کو سبات نہیں کہا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا اصل معنی لمبا ہونا ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: سبتت المراۃ شعرھا جب عورت اپنے بالوں کو لمبا کرے۔ السبات، لمبا کرنا ہے رجل مسبوت الخلق لمبا آدمی، جب کوئی آدمی آرام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ لمبا ہو جاتا ہے تو آرام کو سبت کہہ دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا اصل معنی کاٹنا ہے، یہ جملہ بولا جاتا ہے: سبت شعرہ سبتا۔ اس نے اپنے بالوں کا حلق کرایا گویا جب وہ سو جاتا ہے تو وہ لوگوں اور مصروفیات سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ سبات موت کے مشابہ ہے مگر اس میں روح جسم سے الگ نہیں ہوتی اسی طرح یہ لفظ بولا جاتا ہے: سیر سبت یعنی چال نرم ہے: شاعر نے کہا:

ومَطْوِيةِ الْاَقْرَاب اَمَّا نهارُهَا  فَسَبْتٌ وأمّا ليلُها فزَمِيلُ

لپٹے ہوئے پہلوؤں والا جہاں تک اس کے دن کا تعلق ہے اس کی چال تیز ہوتی ہے جہاں تک اس کی رات کا تعلق ہے تو اس کی چال نرم ہوتی ہے۔

وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ ہم نے رات کو یوں بنایا کہ رات کی تاریکی تمہیں ڈھانپ لیتی ہے؛ یہ طبری نے کہا ہے۔ ابن جبیر اور سدی نے کہا: اسے تمہارے لیے سکون کا باعث بنا دیا اور دوسرے جملے میں اضمار ہے اصل میں وقت معاش تھا رزق کی تلاش میں آنے جانے کا وقت۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ زندگی گزاری جاتی ہے جیسے کھانے، پینے اور دوسرے امور کی چیزیں اس اعتبار سے مَعَاشًا اسم زمان ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ مصدر ہو اور عیش کے

معنی میں ہو اور مضاف مقدر ہو۔

وَّ بَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ یعنی سات مضبوط آسمان، ان کی خلقت مضبوط اور عمارتیں بڑی پختہ ہیں۔

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وہاج کا معنی روشن ہے جعل فعل یہاں پیدا کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے۔ وہاج اسے کہتے ہیں جس میں وہج (روشنی) پائی جائے اس کا باب یوں چلایا جاتا ہے وَهَجَ، یَهِجُ وَهْجا ودَهَجا ووهجانا۔ جوہر جب چمک رہا ہو تو اسے توہج کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا وَّهَّاجًا یعنی روشن چمکنے والا۔

وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ مجاہد اور قتادہ نے کہا: معصرات سے مراد ہوائیں ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس کی رائے ہے گویا وہ بادلوں کو نچوڑتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا: اس سے مراد بادل ہیں۔ سفیان، ربیع، ابوالعالیہ اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ بادل ہیں جو پانی کی صورت میں نچڑتے ہیں ابھی تک انہوں نے بارش نہیں برسائی ہوتی جس طرح امرأۃ معصرۃ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے حیض کا وقت قریب ہو اور ابھی اسے حیض نہ آئے؛ ابوالنجم نے کہا:

تمشی الهُوَيْنَى مائلا خمارُها قد أعْصَرتْ أو قد دنا إعصارُها

وہ نرمی سے چلتی ہے جبکہ اس کی اوڑھنی ایک طرف جھکی ہوتی ہے اسے حیض آچکا ہے یا حیض آنے کا وقت قریب ہے۔

ہواؤں کو معصرات کہتے ہیں باب یوں چلایا جاتا ہے أعْصَرت الريح تُعْصِر إعصارا جب وہ غبار اڑائے۔ یہی اعصار ہے بادلوں کو معصرات کہتے ہیں کیونکہ وہ بارش برساتے ہیں قتادہ نے کہا الْمُعْصِرٰتِ سے مراد آسمان ہے۔ نحاس نے کہا یہ صحیح اقوال ہیں وہ ہوائیں جو بارش کو لائیں انہیں معصرات کہتے ہیں وہ ہوائیں جو بادلوں سے ملتی ہیں اور بارش ہوتی ہے انہیں معصرات کہتے ہیں بارش ہوا سے اسی طرح نازل ہوتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تمام اقوال کا مفہوم ایک ہی ہو۔ معنی یہ ہے ہم نے ہواؤں سے تیز بہتا ہوا پانی نازل کیا۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ معصرات سے مراد بادل ہے معروف بھی یہی ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے اگر الفاظ بالمعصرات ہوتے تو معنی ہوا کرنا بہتر ہوتا۔ صحاح میں ہے: معصرات سے مراد بادل ہیں جن کو بارش کے ساتھ نچوڑا جاتا ہے۔ أعصر القوم ان پر بارش ہوئی اسی وجہ سے بعض نے یہ قراءت کی وفیه یعصرون۔ المعصر سے مراد وہ بچی ہے جسے پہلی دفعہ حیض آئے یہ جملہ بولا جاتا ہے: قد أعصر گویا وہ جوانی کی عمر میں داخل ہوگئی؛ راجز نے کہا:

جارِيةٌ بِسَفوانَ دارُها تمشی الهُوَيْنَى ساقطا خمارُها

قد أعْصَرتْ أو قد دنا إعصارُها

نوجوان بچی جس کا گھر سفوان کے مقام پر ہے وہ آہستہ آہستہ چلتی ہے جب کہ اس کی اوڑھنی گری ہوئی ہے اسے حیض آچکا ہے یا اس کے حیض کے آنے کا وقت قریب ہو چکا ہے۔

اس کی جمع معاصر آتی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: وہ حیض کے قریب ہیں کیونکہ بچی میں اعصار کی حیثیت وہی ہے جس طرح مراهق (قریب البلوغ) بچے کی ہوتی ہے۔ میں نے ابوغوث اعرابی سے یہ بات سنی۔ دوسرے علماء نے کہا: معصر سے مراد وہ بادل ہیں جو بارش برسانے کے وقت کو پہنچ چکا ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أجن الزرع فهو مجن یعنی کسی کو چھپانے کے

قابل ہو گئی، اسی طرح بادل جب بارش برسانے والا ہو جائے تو اسے کہتے ہیں: أعصر۔ مبرد نے کہا: سحاب معصر۔ پانی کو روکنے والا یعنی اس سے تھوڑی تھوڑی چیز نچوڑی جاتی ہے۔ اسی سے عصر ہے اس پناہ گاہ کو کہتے ہیں جس کی پناہ لی جاتی ہے۔ عصرۃ جب اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اسے بھی پناہ گاہ کہتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں یہی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اسی سے معصر کا لفظ ہے جو اس بچی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بلوغ کی عمر کو پہنچے کیونکہ اسے گھر میں محبوس کر دیا جاتا ہے تو گھر کو عصر کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ کی قراءت میں بالمعصرات ہے۔ مصاحف میں من المعصرات ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حسن بصری، ابن جبیر، زید بن اسلم اور مقاتل بن حیان نے کہا: من المعصرات یعنی آسمانوں سے۔ **مَآءً ثَجَّاجًا** جو پے در پے بہے: حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ثججت دمه فأنا أثجه ثجا میں نے اس کے خون کو بہایا۔ قد ثَجَ الدم یَثِجُ ثُجُوجًا۔ خون بہا۔ اسی طرح پانی ہے یہ فعل لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں ثجاج سے مراد بہنا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی صباب ہے۔ بہت زیادہ بہانے والا۔ یہ متعدی ہے گویا وہ اپنے نفس کو بہاتا ہے۔ عبید بن ابرص نے کہا:

فثَجَّ أعلاه ثم ارتجّ أسفله اس کے اوپر والے حصہ کو بہایا پھر اس کے نیچے والا حصہ میں اضطراب پیدا ہوا۔

حدیث نبوی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حج مبرور کے بارے میں سوال کیا گیا فرمایا: العج والثج، عج کا معنی تلبیہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا اور ثج کا معنی خون بہانا اور قربانیوں کو ذبح کرنا۔ ابن زید نے کہا: ثجاجا کثیرا معنی ایک ہی ہے۔

**لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝** بِهٖ کی ضمیر سے مراد پانی ہے۔ **حَبًّا** سے مراد گندم، جو اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہیں۔ **نَبَاتًا** سے مراد وہ گھاس ہے جسے حیوانات کھاتے ہیں۔ **جَنّٰتٍ** سے مراد باغات ہیں۔ **اَلْفَافًا** سے مراد ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی تاکہ ان کی شاخیں ادھر ادھر پھیلیں اس کی کوئی واحد نہیں جس طرح اوزاع، اضیاف۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی واحد لِفٌ یا لُفٌ ہے کسائی نے یہی ذکر کیا ہے کہا: جنة لف وعيش مغدق۔ گھنا باغ اور خوش حال زندگی۔

ان سے اور ابو عبید سے یہ مروی ہے: یہ لفیف کی جمع ہے جس طرح شریف کی جمع اشراف آتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جمع کی جمع ہے؛ کسائی نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ یہ ترکیب ذکر کی جاتی ہے: جنة لفاء، نبت لف اس کی جمع لف آتی ہے جس طرح حمراء کی جمع حُمر آتی ہے پھر لُف کی جمع الفاف آتی ہے۔ زمخشری نے کہا: اگر یہ کہا جاتا کہ یہ ملتفة کی جمع ہے اس میں حروف زائدہ کو حذف کر دیا گیا ہے تو یہ زیادہ ذیشان ہوتا۔ یہ لفظ بولا جاتا ہے: شجرة لفاء، شجر لف اور امراءة لفاء اس عورت کو کہتے ہیں جس کی پنڈلی موٹی اور بھرے گوشت والی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یہ ہے نخرج به جنات الفافا کلام کیونکہ اس پر دلالت کرتا ہے اس لیے اسے حذف کر دیا گیا۔ اس التفات اور انضمام کا معنی ہے کہ باغوں میں درخت قریب قریب ہیں اور ہر درخت کی ٹہنیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

**اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ ۝ وَّ**
**فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ ۝ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝**

''بے شک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے جس روز صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوج در فوج اور کھول دیا جائے گا آسمان تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور حرکت دی جائے گی پہاڑوں کو تو وہ سراب بن جائیں گے''۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝ میقات کا معنی وقت، جمع ہونے کی جگہ اور اولین وآخرین کے وعدہ کی جگہ ہے۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝ دوبارہ اٹھانے کے لیے جس وقت صور پھونکا جائے گا تو تم پیشی کی جگہ جماعت در جماعت آؤ گے۔ ہر امت اپنے امام کے ساتھ آئے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: افواج کا معنی جماعتیں ہیں اس کا واحد فوج ہے۔ يَوْمَ کا لفظ پہلے يَوْمَ سے بدل کے طور پر منصوب ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے فرمان يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝ کے بارے میں بتایئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے معاذ! تو نے عظیم چیز کے بارے میں سوال کیا ہے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے پھر فرمایا: ''میری امت میں سے دس جماعتیں الگ کی جائیں گی اللہ تعالیٰ انہیں مسلمانوں کی جماعت سے ممتاز کر دے گا، اس کی صورتوں کو بدل دے گا، ان میں سے کچھ بندروں کی صورت میں ہوں گے، بعض خنزیروں کی صورت میں ہوں گے، بعض اوندھے منہ ہوں گے ان کی ٹانگیں اوپر کی طرف ہوں گی اور انہیں چہرے کے بل گھسیٹا جا رہا ہوگا، بعض اندھے ہوں گے وہ ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہوں گے ان میں سے بعض بہرے گونگے ہوں گے وہ کوئی سمجھ بوجھ نہ رکھیں گے، بعض اپنی زبانیں چبا رہے ہوں گے وہ ان کے سینوں پر لٹک رہی ہوں گی، ان کے مونہوں سے پیپ لعاب کے طور پر بہہ رہی ہوگی، محشر میں موجود تمام افراد ان سے نفرت کریں گے، بعض کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے، بعض کو آگ کی سولیوں پر لٹکایا گیا ہوگا، بعض مردار سے بھی زیادہ بدبودار ہوں گے، بعض ایسے جبے پہنائے جائیں گے جن سے تارکول بہہ رہی ہوگی جو جسے ان کے جسموں سے چمٹے ہوئے ہوں گے۔ رہے وہ شخص جو بندروں کی صورت میں ہوں گے وہ لوگوں میں سے چغل خور ہیں، جو خنزیر کی صورت پر ہوں گے جو ناجائز کمائی، حرام چیز اور محصول کھائیں گے، جن کے سر اوندھے ہوں گے وہ سود خور ہیں، اندھے وہ ہوں گے جو حکم میں ظلم کرتے ہیں، صم اور بکم وہ لوگ ہوں گے جو اپنے اعمال پر عجب کا اظہار کرتے ہیں، جو اپنی زبانیں چبا رہے ہوں گے وہ علماء اور قصہ گو ہیں جن کے قول عمل کے خلاف ہوں گے، جن کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے وہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے پڑوسیوں کو اذیت دیتے ہیں، جن کو آگ کی سولیوں پر لٹکایا جائے گا وہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو حاکموں کے پاس لے جاتے ہیں، جو مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے وہ لوگ ہیں جو شہوات اور لذات سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کے حق کو روکتے ہیں، جو جبے پہنیں گے وہ متکبر اور فخر کرنے والے ہوں گے'' (1)۔

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝ فرشتوں کے نازل ہونے کے لیے آسمان کو کھول دیا جائے گا اور وہ دروازے

1۔ در منثور، جلد 6، زیر آیت ہذا

دروازے ہو جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ (الفرقان) جس روز آسمان بادل کی صورت میں پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ٹکڑے ہو جائے گا وہ دروازوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اس تاویل کی بنا پر ابواب کو نصب کاف حرف جار کے حذف کی وجہ سے ہو گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہو گی فکانت ذات ابواب، کیونکہ وہ سارے کے سارے دروازے ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے ابواب اس کے راستے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے اجزاء الگ الگ ہو جائیں گے اور اس کے ٹکڑے گر جائیں گے یہاں تک کہ اس میں دروازے دروازے ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر بندہ کے لیے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک اس کے عمل کا دروازہ اور اس کے رزق کا دروازہ۔ جب قیامت قائم ہو گی تو دروازے کھل جائیں گے۔ اسراء کی حدیث میں ہے: ''پھر مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو جبریل امین نے دروازہ کھلوانا چاہا تو ان سے کہا گیا: تو کون ہے؟ حضرت جبریل امین نے کہا: جبریل، پوچھا گیا: تیرے ساتھ کون ہے؟ جواب دیا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ پوچھا گیا: ان کی طرف پیغام بھیجا گیا تھا؟ حضرت جبریل امین نے جواب دیا: انہیں پیغام بھیجا گیا تھا تو اس دروازے کو ہمارے لیے کھول دیا گیا'' (1)۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ یعنی پہاڑ کوئی چیز نہ ہوں گے جس طرح سراب ہوا کرتا ہے دیکھنے والا اسے پانی گمان کرتا ہے جب کہ وہ پانی نہیں ہوتا: ایک قول یہ کیا گیا ہے: سُيِّرَتِ کا معنی ہے انہیں ان کی جڑوں سے اکھیڑ دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہیں اپنی جگہ سے زائل کر دیا گیا۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۝ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝

''درحقیقت جہنم ایک گھات ہے (یہ) سرکشوں کا ٹھکانہ ہے پڑے رہیں گے اس میں عرصہ دراز وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی چیز اور نہ پانی بجز کھولتے پانی اور گرم پیپ کے (ان کے گناہوں کی) پوری سزا۔ یہ لوگ (روز) حساب کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے ہماری آیتوں کو سختی سے جھٹلایا حالانکہ ہر چیز کو ہم نے گن گن کر لکھ لیا تھا، پس اے منکرو! (اپنے کیے کا) مزا چکھو اب ہم نہیں زیادہ کریں گے تم پر مگر عذاب''۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ مِرْصَادًا، رصد سے فعال کا وزن ہے رصد ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تیرے سامنے ہو۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جہنم پر داروغے ہیں کوئی آدمی جنت میں داخل نہیں ہوتا مگر اس کے پاس سے گزرتا ہے جو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قولہ تعالیٰ کلم اللہ موسیٰ تکلیما۔ صحیح مسلم، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آدمی راہداری لے کر آتا ہے وہ آگے گزر جاتا ہے اور جو راہداری لے کر نہیں آتا اسے روک لیا جاتا ہے۔

حضرت سفیان سے مروی ہے کہ جہنم پر تین پل ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مِرْصَادًا اسم منسوب ہے یعنی جہنم اس کو تاڑنے والی ہوتی ہے جو بھی اس کے پاس سے گزرتا ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے قید خانہ۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے راستہ، گزرگاہ، جہنم تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مگر یہ کہ جہنم کے اوپر سے گزر جائے۔

صحاح میں ہے: مِرْصَادًا کا معنی راستہ ہے۔ قشیری نے ذکر کیا ہے: مِرْصَادًا سے مراد وہ جگہ ہے جس میں کوئی فرد دشمن کی تاڑ میں ہوتا ہے جس طرح مضمار یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں گھوڑوں کو ضامر بنایا جاتا ہے یعنی جہنمیوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ پس مِرْصَادًا محل کے معنی میں ہے۔ فرشتے جہنمیوں کی تاڑ میں ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ جہنم میں جا گرتے ہیں۔ ماوردی نے ابوسنان سے روایت نقل کی ہے کہ مِرْصَادًا، راصدہ کے معنی میں ہے وہ انہیں ان کے افعال کے بدلے جزا دے گا۔ صحاح میں ہے: الراصد الشیٔ۔ اس کو تاڑنے والا اس کا باب یوں چلتا ہے: رَصَدَہٗ یَرْصُدُہٗ رَصَدًا و رَصَدًا۔ ترصد کا معنی بھی تاڑنا ہے مرصد تاڑنے کی جگہ۔ اصمعی نے کہا: رصدتہ، أرصدہ کا معنی ہے میں نے اسے تاڑا۔ میں اسے تاڑتا ہوں أرصدتہ میں نے اسے تیار کیا۔ کسائی نے اس کی مثل کہا۔

میں کہتا ہوں: جہنم تیار کی گئی ہے وہ تاڑ میں ہے۔ مترصد، رصد سے متفعل کے وزن پر اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کا معنی تاڑنا ہے یعنی جو بھی آتا ہے اس پر جھانکنے والا ہے۔ مرصاد مفعول کا وزن ہے جو مبالغہ کے انداز میں سے ہے جس طرح معطار، مغیار گویا جہنم کفار کا بہت زیادہ انتظار کرنے والی ہے۔

لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ یہ مِرْصَادًا سے بدل ہے مآب سے مراد لوٹنے کی جگہ ہے یہ لوٹنے کی جگہ ہے جس کی طرف لوگ لوٹ کر آتے ہیں جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: آبَ یَئُوْبُ أوبۃ جس کا معنی لوٹنا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی پناہ گاہ اور ٹھکانہ ہے۔ طاغین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کر کے اپنے دین میں سرکشی کی یا دنیا میں ظلم اختیار کر کے سرکشی اختیار کی۔

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ جب تک احقاب رہیں گے وہ آگ میں ہی رہیں گے اور احقاب ختم نہ ہوں گے۔ جب ایک حقب ختم ہوگا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔ حقب سے مراد زمانہ ہے اور احقاب سے مراد کئی زمانے ہیں۔ حِقَب کا معنی سال ہے اس کی جمع حِقَب آتی ہے۔ متمم بن نویرہ تمیمی نے کہا:

كنا كنَدْمَانَيْ جَذِيمة حِقْبةً من الدَّهرِ حتى قيل لنْ يتصدَّعَا
فلمّا تفرّقنا كأنّي و مالِكًا لِطولِ اجتماعٍ لم نَبِتْ ليلة معًا

ہم دونوں ایک زمانہ جذیمہ کے دو ساتھیوں کی طرح رہے یہاں تک کہ یہ کہا گیا: وہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے، جب ہم جدا ہوئے گویا میں اور مالک طویل اجتماع کی وجہ سے ایک رات بھی اکٹھے نہ رہے۔

حقب قاف کے ضمہ اور سکون کے ساتھ اسی سال کا عرصہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے کم یا اس سے زیادہ جیسا کہ بعد میں آئے گا۔ اس کی جمع احقاب ہے۔ آیت میں اس کا معنی ہے وہ جہنم میں آخرت کے حقبے رہیں گے جن کی کوئی انتہا

نہیں آخرت کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کلام میں آخرت کا ذکر ہے یہ کلام اس طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے: ایام الآخرۃ یعنی ایام کے بعد ایام جن کی کوئی انتہا نہیں یہ کلام تعیین پر تب دلالت کرتی اگر یہ کہا جاتا پانچ احقاب یا دس احقاب وغیرہ۔

اعقاب کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقب لمبی مدت تھی، اس کے ساتھ اس لیے گفتگو کی گئی جس کی طرف ان کے اوہام جا سکتے تھے اور لوگ اسے پہچانتے تھے، یہ ہیشگی سے کنایہ ہے یعنی وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ایام کی بجائے احقاب کا ذکر کیا کیونکہ احقاب دلوں میں زیادہ ہولناکی پیدا کرتا ہے اور ہیشگی پر دلالت کرتا ہے۔ معنی قریب قریب ہے۔ یہ ہیشگی کا حکم مشرکین کے حق میں ہے۔ آیت کو ان نافرمانوں پر بھی محمول کرنا ممکن ہے جو طویل زمانہ کے بعد جہنم سے نکلیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: احقاب سے مراد وہ وقت ہے جس میں وہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ پئیں گے جب وہ غصہ ختم ہو جائے گا تو ان کے لیے ایک اور عذاب ہو گا اس لیے یہ ارشاد فرمایا: لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ

**اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾**

لٰبِثِيْنَ یہ لبث سے اسم فاعل ہے اس کی تائید یہ قول بھی کرتا ہے کہ اس کا مصدر بعثت ہے جس طرح شراب۔ حمزہ اور کسائی نے لبثین الف کے بغیر پڑھا ہے یہ قراءت ابو حاتم اور ابو عبید کی ہے۔ یہ بھی دونوں لغتیں ہیں جس طرح یہ کہا جاتا ہے: رجل لابث، لَبِث اس طرح طَمِع، طامِع اور فَرِہ، فَارِہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ہو لبث بمکان کذا یعنی ٹھہرنا اس کا عمل رہا۔ اسے تشبیہ دی گئی ہے اس چیز کے ساتھ جس کی انسان میں خلقت ہوتی ہے جس طرح حذِر، فرِق کیونکہ فعل کا باب عموماً اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جن کی کسی شی میں خلقت ہو اسم فاعل میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

حقب سے مراد اسی سال ہے؛ یہ ابن عمر، ابن محیصن اور حضرت ابو ہریرہ کا نقطہ نظر ہے۔ سال تین سو ساٹھ دن کا ایک دن دنیا کے دنوں کے لحاظ سے ایک ہزار کا ہو گا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی مرفوع روایت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: سال تین سو ساٹھ دن کا ہو گا اور ہر دن دنیا کے دنوں جیسا ہو گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: حقب سے مراد چالیس سال ہیں۔ سدی نے کہا: ستر سال۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایک ہزار ماہ۔ ابوامامہ نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ بشیر بن کعب نے کہا: تین سو سال۔ حضرت حسن بصری نے کہا: احقاب کتنے ہیں تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن انہوں نے ذکر کیا کہ اس سے مراد سو حقب ہیں ایک ایک حقب ستر ہزار سال ہیں ان میں سے ایک دن ان ایک ہزار سال کی طرح ہے جس کو تم شمار کرتے ہو۔ ابوامامہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ایک حقب تیس ہزار سال کا ہے؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ پہلا قول ماوردی کا ہے۔ قطرب نے کہا: اس سے مراد طویل غیر محدود زمانہ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! جو جہنم میں داخل ہو گا وہ جہنم میں سے نہیں نکلے گا یہاں تک کہ وہ اس میں کئی زمانے رہے گا''۔ حقب سے مراد اسی سے زیادہ سال ہیں۔ سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور اس کا ہر دن ان ہزار سالوں کی طرح ہے جسے تم شمار کرتے ہو تم میں سے کسی کو بھی اس بات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ جہنم سے نکلے گا؛ یہ

ثعلبی نے ذکر کیا۔ قرطبی نے کہا: احقاب سے مراد تینتالیس حقب ہیں۔ ہر حقب ستر خریف کا ہے اور ہر خریف سات سو سال کے برابر ہے ہر سال تین سو ساٹھ دنوں کے برابر ہوتا ہے اور ہر دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اقوال آپس میں متعارض ہیں آیت میں ہمیشگی کا ذکر ہے جو ایسی خبر کی محتاج ہے جو عذر کو ختم کر دے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کوئی چیز ثابت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ معنی وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا، یعنی وہ اس میں کئی زمانے رہیں گے جب بھی ایک زمانہ گزرے گا اس کے پیچھے ایک اور زمانہ آ جائے گا ایک دہر گزرے گا تو دوسرا اس کے پیچھے آ جائے گا یہ سلسلہ اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہے گا۔

ابن کیسان نے کہا: لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا۝ کا معنی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں گویا ابداً کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابن زید اور مقاتل نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا۝ (النبا) چکھو ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کریں گے، یعنی عدد ختم ہو چکا اور خلود حاصل ہو گیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ تعبیر بعید ہے کیونکہ وہ خبر ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف: 40) وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے نکے میں داخل نہ ہو جائے، جس طرح پہلے گزرا ہے یہ کفار کے حق میں ہے جہاں تک نافرمان موحدوں کا معاملہ ہے تو یہ صحیح ہے تو نسخ، تخصیص کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا۝ میں ھا ضمیر جہنم کے لیے ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: احقاب کا واحد حقب اور حقبۃ ہے۔

کمیت نے کہا:

مَرّلها بعد حِقْبةٍ حِقَبٌ

اس کے لیے ایک حقبہ کے بعد کئی حقب گزر گئے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا۝ ھا ضمیر سے مراد احقاب ہے۔ برد سے مراد نیند ہے؛ یہ ابو عبید اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے؛ شاعر نے کہا:

ولو شِئتُ حَرَّمتُ النساءَ سِواكُمُ      وان شِئت لم أَطْعَمْ نُقَاخًا ولا بَرْدًا

اگر میں چاہتا تو میں تم پر عورتوں کو حرام کر دیتا اور اگر میں چاہتا تو میں نہ ٹھنڈا پانی چکھتا اور نہ نیند کرتا۔

یہی معنی مجاہد، سدی، کسائی، فضل بن خالد اور ابو معاذ نحوی نے کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: منع البرد البرد۔ ٹھنڈک نے نیند کو دور کر دیا۔

میں کہتا ہوں: حدیث طیبہ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کیا جنت میں نیند ہوگی؟ فرمایا: ''نہیں نیند موت کا بھائی ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں'' اسی طرح جہنم ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا (فاطر: 36)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بَرْدًا کا معنی مشروب کی ٹھنڈک ہے۔ انہیں سے یہ بھی مروی ہے: بَرْدًا کا معنی نیند ہے اور شراب کا معنی پانی ہے۔ زجاج نے کہا: اس میں وہ ہوا، سایہ اور نیند کی ٹھنڈک نہیں پائیں گے۔ پس بَرْدًا اس شی کی ٹھنڈک کو قرار دیا جس میں راحت ہوتی ہے یہ ٹھنڈک انہیں نفع دے گی جہاں تک زمہریر کا تعلق ہے اس سے وہ اذیت حاصل کریں گے وہ انہیں نفع نہ دے گی ان کے لیے اس میں عذاب ہوگا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اسے زیادہ نہیں جانتا۔ حضرت حسن بصری، عطا اور ابن زید نے کہا: بَرْدًا سے مراد سکون و راحت ہے؛ شاعر نے کہا:

فلا الظلَّ مِن بردِ الضحی تستطیعهٗ لا الفَیٔ أوقات العَشِی تذوقُ

تو چاشت کی ٹھنڈک کے سایہ کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ بعد دوپہر کے اوقات کے سایہ کو چکھتا ہے۔

یہ جملہ الطاغین سے حال بن رہا ہے یا یہ احقاب کی صفت ہے۔ احقاب ظرف زمان ہے اس میں عامل لٰبِثِیْنَ یا لبثین ہے جبکہ فعل کو متعدی مانا جائے۔

**اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا۝** جس نے بَرْدًا کا معنی نیند لیا ہے اس کے نزدیک یہ مستثنیٰ منقطع ہے جس نے اس کا معنی ٹھنڈک لیا ہے اس نے اسے بدل قرار دیا ہے۔ حمیم سے مراد گرم پانی ہے؛ یہ ابو عبیدہ کا نقطہ نظر ہے۔ ابن زید نے کہا: حَمِیْمًا سے مراد ان کی آنکھوں کے آنسو ہیں جن کو حوضوں میں جمع کیا جائے گا پھر وہ انہیں پلائے جائیں گے۔ نحاس نے کہا: حَمِیْمًا کی اصل گرم پانی ہے اسی سے حمام ہے اسی سے حُمّٰی (بخار) ہے اسی معنی میں ظل من یحموم ہے۔ اس سے مراد انتہائی گرم ہے۔ غساق سے مراد جہنمیوں کی پیپ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد زمہریر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے سین کو مشدد پڑھا ہے۔ سورۂ (ص) میں اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔

**جَزَآءً وِّفَاقًا۝** ایسی جزا جو ان کے اعمال کے موافق ہو۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء نے کہا: وفاق، موافقت کے معنی میں ہے جس طرح قتال، مقاتلہ کے معنی میں ہے۔ جَزَآءً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی ہم نے انہیں ایسی جزا دی جو ان کے اعمال کے موافق تھی؛ یہ فراء اور اخفش نے بات کہی۔ فراء نے یہ بھی کہا: یہ وفق کی جمع ہے وفق اور لفق دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ مقاتل نے کہا: عذاب دنیا کے موافق ہوگا۔ شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اور جہنم سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے کہا: ان کے اعمال برے تھے اللہ تعالیٰ انہیں وہ کچھ دے گا جو ان کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔

**اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا۝** وہ اپنے اعمال کے محاسبہ پر کوئی خوفزدہ نہ ہوتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ حساب کے ثواب کی امید نہیں رکھتے تھے۔ زجاج نے کہا: وہ دوبارہ اٹھائے جانے کی امید نہ رکھتے تھے کہ وہ حساب کی امید رکھتے۔

**وَّ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا۝** آیات سے مراد وہ ہے جو انبیاء لائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو ہم نے کتابیں نازل کیں ان کو جھٹلاتے تھے۔ عام قراء کی قراءت کِذّابا ہے یعنی ذال مشدد اور کاف کے نیچے کسرہ ہے یعنی بہت شدید جھٹلایا۔ فراء نے کہا: یہ یمنی لغت ہے وہ یوں کہتے ہیں: كذبت به كذابا، خرقت القميص خراقا۔ ہر وہ فعل جو فعّل کے وزن پر ہو اس کا

مصدر فعال کے وزن پر ہوتا ہے یہی ان کی لغت ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کِذَابًا تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی مصدر ہے۔ ابو علی نے کہا: تخفیف اور تشدید دونوں طرح ہے اس کا مصدر مکاذبہ ہے جس طرح اعشی کا قول ہے:

فصدقتها و كذبتها والمرءُ ينفعهُ كِذَابه

میں نے نفس سے سچ بولا اور اس سے جھوٹ بھی بولا انسان کو اس کا جھوٹ ہی نفع دیتا ہے۔

ابو الفتح نے کہا: کذب اور کذّب دونوں کا یہ مصدر ہے۔ زمخشری نے کہا: کِذَابًا جب ذال کی تخفیف کے ساتھ ہو تو یہ کذب کا مصدر ہو گا جس طرح مذکورہ شعر میں ہے یہ اس قول کی طرح ہے: انبتکم من الارض نباتا یعنی انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انہوں نے جھوٹ بولا یا كَذَّبُوْا فعل بذات خود اس کو نصب دیتا ہے کیونکہ کِذَّابًا، كَذَّبُوْا کے معنی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے کیونکہ ہر حق کی تکذیب کرنے والا جھوٹا ہوتا ہے کیونکہ جب وہ مسلمانوں کے نزدیک جھوٹے تھے تو مسلمان بھی ان کے نزدیک جھوٹے تھے تو اس طرح ان کے نزدیک مکاذبہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابن عمر نے اسے کُذَّابًا پڑھا جو کاذب کی جمع ہے؛ یہ ابو حاتم کا قول ہے اور وہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے؛ یہ زمخشری کا قول ہے۔ بعض اوقات کذاب سے مراد ایسا شخص ہے جو جھوٹ میں مبالغہ کا کام دے کہا جاتا ہے: رجل کذاب۔ جس طرح تو کہتا ہے: حسان بخال وہ اسے كَذَّبُوْا کے مصدر کی صفت بناتے ہیں تقدیر کلام یوں ہوگی تکذیبا کذابا مفرطا کذبہ صحاح میں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝ یہ مشدد کے مصدر میں سے ایک ہے کیونکہ باب تفعیل کا مصدر کبھی تفعیل جیسے تکلیم، کبھی فعال جیسے کذاب، کبھی تفعلة جیسے توصية اور کبھی مفعل کے وزن پر آتا ہے جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (السبا:19)

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝ لفظ كُلَّ کو نصب فعل مضمر دے رہا ہے جس پر اَحْصَيْنٰهُ دلالت کرتا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وأحصینا کل شئ أحصیناہ۔ ابو سمال نے اسے مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے كِتٰبًا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ أحصینا کا معنی کتبنا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی کتبناہ کتابا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ علم کے معنی میں ہے کیونکہ جس چیز کو لکھا جاتا ہے وہ نسیان سے بہت ہی بعید ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے اسے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے تاکہ ملائکہ اسے پہچان لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو بندوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں تو یہ وہ کتابت ہے جو ان فرشتوں کی طرف سے صادر ہوئی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے افعال کے بارے میں صادر ہوئی، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ (الانفطار) تم پر کراما کاتبین محافظ ہیں۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝ ابو برزہ نے کہا: میں نے قرآن حکیم میں موجود سب سے سخت آیت کے بارے میں پوچھا فرمایا: تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی یعنی جب بھی ان کے چمڑے پک جائیں گے ہم ان کے چمڑے بدل دیں گے اور جب کبھی وہ ٹھنڈی ہوگی ہم اسے مزید بھڑکا دیں گے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾
لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

''بلاشبہ پرہیزگاروں کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے (ان کے لیے) باغات اور انگوروں (کی بیلیں) ہیں اور جواں سال ہم عمر لڑکیاں اور چھلکتا ہوا جام۔ نہ سنیں گے وہ وہاں کوئی بیہودہ بات اور نہ جھوٹ یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام''۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت سے بچتا ہے اس کی جزا کا ذکر کیا مَفَازًا یہ کامیابی، نجات اور جہنمی جس میں داخل ہو چکے ہیں اس سے خلاصی کی جگہ ہے اسی وجہ سے جب پانی کم ہو جاتا ہے تو اسے فلاۃ کو مَفَازًا کہتے ہیں یہ فال لیتے ہوئے کہ اس قحط سالی سے نجات نصیب ہو۔

حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ یہ فوز کی تفسیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ متقین کے لیے باغات ہیں۔ حَدَآئِقَ، حدیقہ کی جمع ہے یہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کا احاطہ کیا گیا ہو جس طرح کہا جاتا ہے: أحدق بہ یعنی اس کا احاطہ کیا۔ اَعْنَابًا، عِنَب کی جمع ہے اس سے مراد انگور کی بیلیں ہیں۔

وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ كَوَاعِبَ، کعب کی جمع ہے اس کا معنی ابھری ہوئی چیز ہے اس کا یوں باب چلایا جاتا ہے كَعَبَتِ الجاریۃ تَكْعَبُ كُعُوبًا، كَعَّبَتْ تُكَعِّبُ تَكْعِيْبًا اور نَهَدَتْ تَنْهَدُ نُهُوْدًا۔ ضحاک نے کہا: ککواعب العذاری۔ دوشیزاؤں کے ابھرے ہوئے سینے۔ اس معنی میں قیس بن عاصم کا شعر ہے:

وَكَمْ مِنْ حَصَانٍ قد حَوَيْنا كَرِيمَةٍ ومِن كاعِبٍ لو تدرِ ما البؤسُ مُعْصِرِ

کتنی ہی پاکدامن معزز عورتوں کو ہم نے جمع کیا اور کتنی ہی ابھرے ہوئے سینوں والی بلوغت کی عمر کو پہنچنے والی بچیوں کو جمع کیا جو نہیں جانتی کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔

اَتْرَابًا کا معنی ہم عمر ہے اس کی وضاحت سورۂ واقعہ میں گزر چکی ہے اس کا واحد ترب ہے۔

وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ حضرت حسن بصری، قتادہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی چھلکتا ہوا، بھرا ہوا جام لیا ہے۔ کہا جاتا ہے: أدهقتُ الكأسَ یعنی میں نے اس کو بھر دیا۔ كأس دهاق یعنی بھرا ہوا جام۔

جس طرح شاعر نے کہا:

مِنْ مائِها بكأسك الدِّهاقِ

اس کے پانی سے اپنے بھرے ہوئے جام سے۔

خداش بن زہیر نے کہا:

فاتْرَعْنالهٗ كأسًا دِهاقًا

ہم نے اس کے لیے چھلکتا ہوا جام بھرا۔

سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا: اس کا معنی پے در پے ہے یعنی ان میں سے ایک دوسرے کے پیچھے ہوگا، اسی سے أدهقت الحجارة ادهاقا یہ ایسی سختی ہوتی ہے جس سے پناہ لی جاتی ہے اس کا بعض، بعض میں داخل ہوتا ہے پس متتابع، متداخل کی طرح ہے۔

عکرمہ سے یہ بھی مروی ہے اور زید بن اسلم نے بھی یہی کہا ہے: اس کا معنی صاف ہے؛ شاعر نے کہا:

لَأَنتِ إلى الفؤاد أحبُّ قربًا من الصادی إلى كأسٍ دِهاقِ

تو قربت کے اعتبار سے دل کے لیے اس پیاسے سے بھی زیادہ محبوب ہے جو صاف جام سے محبت رکھتا ہے۔

یہ دَهَق کی جمع ہے یہ دو ایسی لکڑیاں ہوتی ہیں جن کے ساتھ پنڈلی کو جکڑا جاتا ہے۔ کأس سے مراد شراب ہے تقدیر کلام یہ ہے خمرا ذات دهاق، یعنی اسے نچوڑا گیا اور اسے صاف کیا گیا؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ صحاح میں ہے أدهقتُ الماءَ میں نے اسے تیزی سے انڈیلا۔ ابو عمرو نے کہا: دَهَق یہ عذاب کی ایک قسم ہے فارسی میں اسے شکنجہ کہتے ہیں۔ مبرد نے کہا: مدهوق سے مراد وہ شخص ہے جس کو ہر قسم کا عذاب دیا جائے جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔ ابن اعرابی نے کہا: دهْقْتُ الشئ میں نے اسے توڑ دیا، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اسی سے دَهْدقْتُه ہے؛ شاعر نے کہا:

نُدَهْدِقُ بَضْعَ اللحم لِلباعِ والندیٰ

ہم بیچنے والے کے لیے اور سخاوت کے لیے گوشت کے ٹکڑے کرتے ہیں۔

دهمقته میم کی زیادتی کے ساتھ اس کی مثل معنی رکھتا ہے۔ اصمعی نے کہا: دهمقه کا معنی کھانے کی نرمی، اس کی خوشبو اور رقت ہے، اسی طرح ہر نرم چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولتے ہیں اس معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک قول ہے: لوشئت أن یُدَهْمَقَ لی لفعلت ولکن اللہ عاب قوما اگر میں چاہتا کہ عمدہ عمدہ نرم کھانا میرے لیے تیار کیا جائے تو میں ایسا کر سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم پر عیب لگایا ہے اور فرمایا: اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (الاحقاف: 20)

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا۝ ھا ضمیر سے مراد جنت ہے، لغو سے مراد باطل ہے اس سے مراد لغو کلام ہے اس معنی میں حدیث ہے: ''جب تو نے جمعہ کے روز اپنے ساتھی سے کہا: خاموش ہو جا جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تو نے باطل عمل کیا'' (1) اس کی وجہ یہ ہے جب وہ جام پئیں گے تو ان کی عقلیں متغیر نہ ہوں گی اور وہ باطل کلام نہ کریں گے جبکہ دنیاداروں کا معاملہ مختلف ہے نیز وہ ایک دوسرے کو نہیں جھٹلائیں گے اور نہ ہی وہ جھوٹ سنیں گے۔ کسائی نے کِذابا پڑھا ہے یہ کذبت کذابا ہے یعنی وہ جنت میں باہم جھوٹ نہ بولیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں تکذیب کے مصدر ہیں یہاں اسے غیر مشدد پڑھا گیا ہے کیونکہ یہ کسی ایسے فعل کے ساتھ مقید نہیں جس کا یہ مفعول مطلق بنے۔ اور وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا۝ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، کیونکہ کذبوا فعل کذاب مصدر کو مقید کرتا ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا۝ جَزَآءً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے گویا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجمعة، باب ما جاء فی الانصات یوم الجمعة

اس چیز کا بدلہ دیا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اسی طرح عطاء ہے کیونکہ أعطاهم اور اجزاهم کا معنی ایک ہی ہے۔ حِسَابًا کا معنی کثیر ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أحسبت فلانا یعنی میں نے اسے کثیر مال عطا کیا یہاں تک کہ اس نے کہا: یہ میرے لیے کافی ہے؛ شاعر نے کہا:

وَنُقْفِي وَلِيدَ الحيِّ إِن كان جائعا ونحسبه إن كان ليس بجائع

ہم قبیلہ کے بچے کو ترجیح دیتے ہیں اگر وہ بھوکا ہو اور اگر وہ بھوکا نہ ہو تو ہم اسے کثیر مال دیتے ہیں۔

قتبی نے کہا: ہم اس کا اصل معنی یہ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے کو اتنا دے یہاں تک کہ وہ کہے: یہ میرے لیے کافی ہے۔ زجاج نے کہا: حِسَابًا کا معنی ہے جو ان کے لیے کافی ہو؛ یہی اخفش نے کہا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أحسبني كذا یعنی میرے لیے کافی ہے۔ کلبی نے کہا: ان کا حساب لیا اور انہیں ایک نیکی پر دس گنا عطا کیا۔ مجاہد نے کہا: انہوں نے جو عمل کیے اس کے مناسب انہیں عطا کیا۔ حساب، شمار کرنے کے معنی میں ہے، یعنی انہیں اتنا عطا کیا جس قدر رب تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق اس کے لیے ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک نیکی پر دس گنا عطا کیا، ایک قوم کے لیے سات سو گنا کا وعدہ کیا اور ایک قوم کے لیے اس مقدار کا وعدہ کیا جس کی کوئی انتہا اور مقدار نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝ (الزمر) صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے اجر دیا جائے گا۔ ابو ہاشم نے عطاء حَسَّابا پڑھا ہے یہ فعال کا وزن ہے جس کا معنی کافی ہو جاتا ہے۔ اصمعی نے کہا: عرب کہتے ہیں حسبت الرجل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس کی تعظیم بجالائے؛ شاعر کا مصرعہ ہے:

إذا أتاه ضيفه يُحَسِّبه

جب اس کا مہمان اس کے پاس آتا ہے تو وہ اس کی تعظیم بجالاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے حسانا پڑھا ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا۝ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۗ لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا۝ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا۝ اِنَّاۤ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا ۚۖ یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ وَ یَقُوْلُ الْكٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا۝

''جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے حد مہربان، انہیں طاقت نہ ہوگی کہ (بغیر اجازت) اس سے بات بھی کر سکیں۔ جس روز روح اور فرشتے پرے باندھ کر کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اذن دے اور وہ ٹھیک بات کرے۔ یہ دن برحق ہے، سو جس کا جی چاہے بنالے اپنے رب کے جوار میں اپنا ٹھکانا۔ بے شک ہم نے ڈرا دیا ہے تمہیں جلد آنے والے عذاب سے، اس دن دیکھ لے گا ہر شخص

(ان عملوں کو) جو اس نے آگے بھیجے تھے اور (کافر) بصد حسرت کہے گا: کاش! میں خاک ہوتا"۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ حضرت ابن مسعود، نافع، ابو عمرو، ابن کثیر اور زید نے یعقوب سے، مفضل نے عاصم سے لفظ ربّ پر رفع پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے الرَّحْمٰنِ اس کی خبر ہے یا اس کا معنی ہے ھو رب السموات، یعنی وہ آسمانوں کا رب ہے لفظ الرَّحْمٰنِ دوسرا مبتدا ہوگا۔ ابن عامر، یعقوب اور ابن محیصن نے دونوں کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ کی صفت ہے یعنی تیرے رب کی جزا جو آسمانوں کا رب اور رحمٰن ہے۔ حضرت ابن عباس، عاصم، حمزہ اور کسائی نے ربِّ السموات پڑھا ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ الرَّحْمٰنِ یہ مرفوع ہے تقدیر کلام یوں ہے ھو الرحمٰن۔ ابو عبید نے اسے اختیار کیا ہے کہا: یہ زیادہ مناسب ہے لفظ ربّ کے نیچے کسرہ ہے کیونکہ یہ من ربك کے قریب ہے تو یہ اس کی نعت ہوگا لفظ رحمٰن کو رفع دیں گے کیونکہ یہ اس سے دور ہے اور جملہ مستانفہ ہے اور لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ اس کی خبر ہے یعنی وہ اس امر کے مالک نہیں ہوں گے کہ وہ اس کا سوال کریں مگر اس کے متعلق جس کی انہیں اجازت دی جائے۔ کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے وہ شفاعت کے بارے میں گفتگو کے مالک نہ ہوں مگر اس وقت جب انہیں اجازت دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ خطاب کا معنی کلام کرنا ہے یعنی وہ مالک نہ ہوں گے کہ وہ اپنے رب سبحانہ تعالیٰ سے گفتگو کریں مگر اس کی اجازت کے ساتھ ہی گفتگو کریں گے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (ہود: 105) کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر گفتگو نہیں کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کفار ہیں وہ گفتگو کے مالک نہ ہوں گے جہاں تک مومنوں کا تعلق ہے وہ شفاعت کریں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اجازت ملنے کے بعد وہ گفتگو کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ: 255) کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ (طٰہٰ) اس روز شفاعت نفع نہ دے گی مگر جس کے حق میں رحمٰن اجازت دے اور رحمٰن اس کے حق میں بات پر راضی ہو۔

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ صَفًّا، یَوْمَ ظرف کی حیثیت سے منصوب ہے معنی یہ ہوگا وہ گفتگو کا اختیار نہیں رکھیں گے روح کے بارے میں آٹھ قول ہیں: (۱) یہ بھی فرشتوں میں سے ایک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق تخلیق نہ کی جو عرش کے بعد اس سے بڑی ہو جب قیامت کا روز ہوگا تو وہ تنہا صف باندھ کر کھڑا ہو جائے گا اور تمام فرشتے دوسری صف میں ہوں گے۔ اس کی مخلوق کی عظمت ان کی صفوں کے اعتبار سے ہوگی؛ اس کی مثل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: روح ساتوں آسمانوں سے، ساتوں زمینوں اور پہاڑوں میں سے بڑی مخلوق ہے وہ چوتھے آسمان کے بالمقابل ہو گی وہ ہر روز بارہ ہزار دفعہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرے گی اللہ تعالیٰ ہر تسبیح کے بدلے میں ایک فرشتہ پیدا فرمائے گا قیامت کے روز وہ تنہا صف میں ہوگی اور باقی فرشتے ایک صف میں ہوں گے۔

(۲) روح سے مراد حضرت جبریل امین علیہ السلام ہیں؛ یہ شعبی، ضحاک اور سعید بن جبیر کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس

سے قرظی ہے کہ عرش کی دائیں جانب نور کی ایک نہر ہے جس کی وسعت ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور ساتوں سمندروں کی مانند ہے۔ جبریل امین ہر روز سحری کے وقت اس میں داخل ہوتے ہیں اس سے غسل کرتے ہیں تو وہ نور علی نور ہو جاتے ہیں ان کے جمال میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور عظمتیں بڑھ جاتی ہیں، پھر وہ پر جھاڑتے ہیں تو ہر وہ قطرہ جوان کے پر سے گرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ستر ہزار فرشتے پیدا فرما دیتا ہے ان میں سے ہر روز ستر ہزار بیت معمور میں داخل ہوتے ہیں اور کعبہ میں ستر ہزار داخل ہوتے ہیں تا قیامت وہ فرشتے دوبارہ ان دونوں کی طرف نہیں لوٹتے۔ وہب نے کہا: جبریل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہیں ان کے سینہ کا گوشت کانپ رہا ہے اللہ تعالیٰ ہر کپکپی سے ایک لاکھ فرشتہ پیدا کرتا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے سر جھکائے صف در صف کھڑے ہیں جب اللہ تعالیٰ انہیں کلام کی اجازت دیتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ صَفًّا لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ کا یہی مطلب ہے اور صواب سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ ہے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آیت میں روح سے مراد اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے وہ فرشتے نہیں ان کے سر، ہاتھ اور پاؤں ہیں، وہ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی بے شک یہ بھی لشکر ہے وہ بھی لشکر ہے؛ یہ ابو صالح اور مجاہد کا قول ہے۔ اس تاویل کی بنا پر وہ انسان کی شکل وصورت پر بنائے گئے ہیں وہ لوگوں کی طرح ہیں انسان نہیں ہیں۔

(۴) وہ فرشتوں میں سے معزز فرشتے ہیں؛ یہ مقاتل بن حیان کا قول ہے۔

(۵) وہ ملائکہ پر نگہبان ہیں؛ یہ ابن ابی نجیح کا قول ہے۔

(۶) یہ انسان ہیں؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے۔ اس سے مراد روحوں والے ہیں۔ عوفی اور قرظی نے کہا: یہ وہ بات ہے جو حضرت ابن عباس چھپایا کرتے تھے کہا: روح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جو انسان کی شکل پر بنائی گئی ہے آسمان سے کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ایک روح بھی ہوتی ہے۔

(۷) بنی آدم کی روحیں صف در صف کھڑی ہوں گے، فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے یہ دو نفخوں کے درمیان ہوگا۔ ابھی ان کو جسموں کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا؛ یہ عطیہ کا قول ہے۔

(۸) اس سے مراد قرآن ہے؛ یہ زید بن اسلم کا قول ہے اور اس آیت کی تلاوت کی وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ:52) اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے قرآن کو وحی کیا۔ صفًا یہ مفعول مطلق ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یقومون صفوفا مصدر اپنے اندر واحد اور جمع کا معنی رکھتا ہے جس طرح عدل اور صوم ہے۔ یوم العید کو یوم الصف کہتے ہیں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (الفجر) تیرے رب کا حکم آیا جب کہ فرشتے صف در صف تھے۔ یہ صفوف پر دلالت کرتا ہے یہ سلسلہ پیشی اور حساب کے موقع پر ہوگا؛ یہ قتبی اور دوسرے علماء نے معنی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: روح ایک صف میں کھڑے ہوں اور فرشتے ایک صف میں کھڑے ہوں گے پس وہ دو صفوں میں ہوں گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا۝ وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر جس کو رحمٰن شفاعت کی اجازت دے جبکہ وہ بات بھی سچی کرے؛ یہ ضحاک اور مجاہد کا قول ہے۔ ابوصالح نے کہا: صواب کا معنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے وہ اس کے حق میں شفاعت کریں گے۔ صواب کا اصل معنی درست ہے خواہ وہ قول ہو یا فعل ہو۔ یہ أَصَابَ، یُصِیبُ إِصَابَةً سے مشتق ہے، جس طرح جواب، أَجَابَ یُجِیبُ إِجَابَةً سے مشتق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: معنی ہے وہ فرشتہ اور روح جو صفوں میں کھڑے ہیں وہ کلام نہیں کریں گے وہ ہیبت اور جلال کی وجہ سے کلام نہیں کریں گے مگر جسے رحمٰن شفاعت کے بارے میں اجازت دے جبکہ انہوں نے سچی بات کی، وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: قیامت کے روز روح کہے گی کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر رحمت کے ساتھ اور کوئی آگ میں داخل نہیں ہوگا مگر عمل کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ قَالَ صَوَابًا کا یہی معنی ہے۔

ذٰلِكَ الْیَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا۝ حق کا معنی ہے جو واقع ہونا ہے۔ مَاٰبًا کا معنی مرجعا ہے یعنی جو چاہے عمل صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہاں لوٹنے والی جگہ بنالے۔ گویا جب وہ اچھا عمل کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹاتا ہے اور جب وہ برا عمل کرتا ہے تو اسے اپنے میں سے شمار کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی راہنمائی کرتا ہے ''بھلائی سب کی سب تیرے قبضہ میں ہے اور شر تیری طرف لوٹنے والا نہیں''۔ قتادہ نے کہا: مَاٰبًا کا معنی راستہ ہے۔

اِنَّاۤ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا قریش کے کفار اور عرب کے مشرکوں سے خطاب فرمایا کیونکہ انہوں نے کہا: ہم کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا جبکہ عذاب آخرت کا عذاب ہے ہر وہ چیز جو ہو کر رہنے والی ہو وہ قریب ہوا کرتی ہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا۝ (النازعات) گویا جس روز وہ اسے دیکھیں گے (وہ کہیں گے) وہ اس میں نہیں ٹھہرے مگر ایک رات یا اس کا ایک دن؛ یہ کلبی اور دوسرے علماء نے معنی کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ دنیا کا عذاب ہے کیونکہ دونوں عذابوں میں سے یہ زیادہ قریبی ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد بدر کے دن قریش کا قتل ہے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے، یہی موت اور قیامت ہے کیونکہ جو آدمی مرجاتا ہے اس کے لیے قیامت قائم ہو جاتی ہے اگر وہ جنتی ہوگا تو وہ جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لے گا اگر وہ جہنمی ہوگا تو وہ ذلت اور رسوائی دیکھے گا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ اس میں عذاب کے وقت کو بیان فرمایا یعنی ہم نے تمہیں ایسے عذاب سے خبردار کیا جو اس دن کے قریب ہے، اس سے مراد وہ دن ہے جس میں انسان وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں یَنْظُرُ کے بعد الی حرف جار محذوف ہے۔ حضرت حسن بصری کے قول کے مطابق الْمَرْءُ سے مراد مومن ہے یعنی وہ اپنے لیے عمل پائے گا۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ اپنے لیے کوئی عمل نہیں پائے گا۔ تو وہ یہ آرزو کرے گا کہ وہ مٹی ہو جائے۔ بعد میں جب کافر کا ذکر کیا تو اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اس سے مراد مومن ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں الْمَرْءُ سے مراد ابی بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط ہے، کافر سے مراد ابوجہل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عام ہے اس روز وہ اپنے عمل کی جزا دیکھے گا۔ مقاتل نے کہا: يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کے حق میں نازل ہوئی۔

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۝ یہ اس کے بھائی اسود بن عبدالاسد کے حق میں نازل ہوئی۔ ثعلبی نے کہا: میں نے ابوالقاسم بن حبیب کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہاں کافر سے مراد ابلیس ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام پر عیب لگایا کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور خود فخر کیا کہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے جب وہ قیامت کے روز دیکھے گا جس ثواب، راحت اور رحمت میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور اپنے آپ کو شدت اور عذاب میں دیکھے گا تو وہ یہ تمنا کرے گا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی جگہ ہوتا اور یہ کہے گا: يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۝ کہا میں نے یہ تعبیر ابونصر قشیری کی بعض تفاسیر میں پڑھی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہائے کاش! میں مٹی سے پیدا کیا جاتا اور میں یہ نہ کہتا کہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جب قیامت برپا ہوئی تو زمین کو چمڑے کی طرح بچھا دیا جائے گا جانوروں، چوپاؤں اور وحشیوں کو جمع کیا جائے گا پھر ان کے درمیان قصاص قائم کیا جائے گا یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بے سینگ بکری کا قصاص لیا جائے گا جو اس نے اس بکری کو سینگ مارا تھا۔ جب ان کے قصاص سے فراغت ہو جائے گی تو اسے کہا جائے گا: تو مٹی ہو جا، اس موقع پر کافر کہے گا: يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا اسی کی مثل حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کر دیا ہے جو مردوں اور آخرت کے امور کے متعلق ہے۔ الحمدللہ۔

ابوجعفر نحاس نے ذکر کیا احمد بن نافع، سلمہ بن شبیب سے وہ عبدالرزاق سے وہ معمر سے وہ جعفر بن برقان جزری سے وہ یزید بن اصم سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو دوبارہ اٹھائے گا خواہ وہ جوان ہو، پرندہ ہو یا انسان ہو، پھر چوپاؤں اور پرندوں سے کہا جائے گا: مٹی ہو جاؤ۔ اس موقع پر کافر کہے گا: ہائے کاش! میں مٹی ہو جاتا۔ کچھ لوگوں نے کہا: اس کا معنی ہے مجھے دوبارہ نہ اٹھایا جاتا جس طرح کہا: اے کاش! مجھے کتاب نہ دی جاتی۔ ابوزناد نے کہا: جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا، جنتیوں کو جنت کی طرف جانے کا حکم دے دیا جائے گا اور جہنمیوں کو جہنم کی طرف جانے کا حکم دے دیا جائے گا تو تمام دوسری مخلوقات اور مومن جنوں کو کہا جائے گا مٹی ہو جاؤ تو وہ مٹی ہو جائیں گے اس موقع پر کافر جب انہیں مٹی ہوتا ہوا دیکھے گا تو کہے گا: ہائے کاش! میں مٹی ہوتا (1)۔ لیث بن ابی سلیم نے کہا: مومن جن مٹی ہو جائیں گے (2)۔

عمر بن عبدالعزیز، زہری، کلبی اور مجاہد نے کہا: مومن جن جب جنت کے اردگرد میدانوں میں ہوں گے وہ جنت میں نہیں ہوں گے۔ یہ زیادہ صحیح ہے سورۃ الرحمٰن میں اس کا بیان گزر چکا ہے کہ وہ مکلف ہیں انہیں بدلہ دیا جائے گا اور انہیں سزا دی جائے گی وہ انسانوں کی طرح ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 56
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 441

# سورۃ النازعات

آیاتہا ۴۶ ﴿۷۹ سورۃ النزعت مکیۃ ۸۱﴾ رکوعاتہا ۲

یہ سورت مکی ہے۔ اس کی پینتالیس یا چھیالیس آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾ يَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوۡبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾ يَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِى الۡحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾

''قسم ہے (فرشتوں کی) جو غوطہ لگا کر (جان) کھینچنے والے ہیں اور بند آسانی سے کھولنے والے ہیں اور تیزی سے تیرنے والے ہیں پھر (تعمیل ارشاد میں) جو دوڑ کر سبقت لے جانے والے ہیں پھر (حسب حکم) ہر کام کا انتظار کرنے والے ہیں۔ جس روز تھر تھرائے گی تھر تھرانے والی، اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا ہوگا۔ کتنے دل اس روز (خوف سے) کانپ رہے ہوں گے، ان کی آنکھیں (ڈر سے) جھکی ہوں گی۔ کافر کہتے ہیں: کیا ہم پلٹائے جائیں گے الٹے پاؤں (یعنی) جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے۔ بولے: یہ واپسی تو بڑے گھاٹے کی ہو گی (پس اسی واپسی کے لیے) تو فقط ایک جھڑک کافی ہے پھر وہ فوراً کھلے میدان میں جمع ہو جائیں گے''۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ چیزوں کی قسم اٹھائی کہ قیامت برحق ہے۔ النّٰزِعٰتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی روحوں کو نکالتے ہیں؛ یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مسروق و مجاہد کا یہی قول ہے: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے نفوس نکالتے ہیں (1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد کفار کے نفوس ہیں جنہیں ملک الموت ان کے جسموں سے نکالتا ہے ان کے ہر بال کے نیچے سے، ناخنوں کے نیچے سے اور قدموں کی جڑ سے اس طرح جس طرح گوشت بھوننے والی سیخ تر اون سے نکالی جاتی ہے پھر وہ انہیں جسموں میں داخل کرتے ہیں پھر اسے باہر نکالتے ہیں یہ کفار کے ساتھ اس کا معاملہ ہے (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 57
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 441

سعید بن جبیر نے کہا: ان کی روحیں نکالی گئیں، پھر غرق کی گئیں پھر انہیں جلا یا گیا، پھر انہیں جہنم میں پھینک دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کافر موت کے وقت نفس کو دیکھے گا کہ وہ غرق ہو رہا ہے۔ سدی نے کہا: النّٰزِعٰتِ سے مراد وہ نفوس ہیں جو سینوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد موت ہے جو نفوس کو کھینچتی ہے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: نزع الیه، یعنی اس کی طرف گیا اور عربوں کے اس قول سے لیا گیا ہے: نزعت الخیل گھوڑے دوڑے۔ غَرْقًا یعنی وہ غرق ہو جاتے ہیں، غائب ہو جاتے ہیں وہ ایک افق سے ظاہر ہوتے ہیں اور دوسرے افق میں غائب ہو جاتے ہیں؛ یہ تعبیر ابو عبیدہ، ابن کیسان اور اخفش نے کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد کمانوں کو کھینچنے والے ہیں جو کمانوں پر تیر چڑھا کر انہیں کھینچتے ہیں؛ یہ عطا اور عکرمہ نے کہا ہے۔ غَرْقًا، اغراق کے معنی میں ہے۔ اغراق النازع فی القوس کا مفہوم یہ ہے جہاں تک وہ قوس کو کھینچ سکتا تھا وہاں تک پہنچ گیا یہاں تک کہ وہ پھل تک پہنچ گیا یہ جملہ بولا جاتا ہے: اغرق فی القوس اس نے پورا پورا کھینچا۔ استغراق کا معنی استیعاب ہوتا ہے انڈے کے اندرونی پردے کو غرقی کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسے غازی ہیں جو تیر پھینکنے والے ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ اور مقابل تعبیر برابر ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے قوموں کی قسم اٹھائی تو اس سے مراد قوس کھینچنے والے بھی ہوں گے مقصود قوموں کی عظمت بیان کرنا ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا۝ (العادیات) قسم ہے ان گھوڑوں کی جو دوڑتے ہوئے آواز نکالتے ہیں۔ اغراق سے مراد کھینچنے میں مبالغہ کرنا ہے یہ تمام تاویلات میں جائز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وحشی ہیں جو گھاس سے نکلتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں؛ یہ یحییٰ بن سلام نے بیان کیا ہے۔ غرق کا معنی بہت ہی دور۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کے نفس کو نکالتے ہیں جس طرح اونٹ کے اگلے پاؤں سے ڈھنگا کھولا جاتا ہے؛ فراء نے یہ قول بیان کیا پھر کہا: عربوں سے جو کچھ میں نے سنا وہ یہ کہتے ہیں اُنشِطت کما اُنشِط من عقال یعنی کھولنے کے لیے مجہول کا فعل استعمال کیا جاتا ہے باندھنے کے لیے مجرد کا فعل استعمال کیا جاتا ہے باندھنے والے کو ناشط کہتے ہیں۔ جب تو اونٹ کے بازو میں رسی باندھے تو کہے گا: نشطته اور تو ناشط ہوگا اور جب تو اس رسی کو کھولے تو اس وقت کہے گا: انشطته، انت منشط۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس سے مراد موت کے وقت مومنوں کے نفوس ہیں وہ تیزی سے نکلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے جب بھی کسی مومن پر موت کا وقت آتا ہے تو اس پر جنت پیش کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو کچھ تیار کیا ہوتا ہے یعنی بیویاں اور حور عین تو ان سب کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اپنی طرف دعوت دیتے ہیں وہ ان کی طرف تیزی سے نکلتا ہے اور ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد کفار اور منافقوں کے نفوس ہیں ان کے نفوس کو یوں نکالا جاتا ہے جس طرح عقب کو نکالا جاتا ہے۔ عقب اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ تیر کو لپیٹا جاتا ہے۔ عقب سے مراد وہ پٹھا ہے جس

سے تانت بنائی جاتی ہے اس کا واحد عقبہ ہے اس سے تو کہتا ہے: عقب السھم والقدح والقوس عقبا، جب تو ان چیزوں پر کوئی چیز لپیٹے۔ نشط کا معنی تیزی سے کھینچنا ہے اس سے انشوطه کا لفظ ہے جس کا معنی ایسی گرہ ہے جس کا کھولنا آسان ہو جب تو اسے کھینچے جس طرح ازار بند کی گرہ ہوتی ہے۔ ابوزید نے کہا: اس کا باب یوں چلایا جاتا ہے نَشطتُ الحبل أَنْشِطُه نشطا۔ میں نے اسے ایسی گرہ کے ساتھ باندھا جس کا کھولنا آسان تھا انشطته یعنی میں نے اسے کھول دیا۔ انشطت الحبل یعنی میں نے اسے پھیلایا یہاں تک کہ اس کی گرہ کھل گئی۔ فراء نے کہا: انشط العقال، ڈھنگا کھولا گیا۔ نشط اس کے ہاتھوں میں رسی باندھی گئی۔ لیث نے کہا: انشطته بأنشوطة وأُنشوطتين یعنی میں نے اسے ایک گرہ یا دو گرہوں سے باندھا۔ أنشطت العقال، میں نے اس کے ڈھنگے کو لمبا کیا تو وہ ڈھنگا کھل گیا۔ یہ بھی قول کیا گیا ہے کہ نشط، أنشط کے معنی میں ہے، دونوں لغتیں ایک معنی میں ہیں۔ اس تعبیر پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا پہلا قول صحیح ثابت ہوتا ہے۔ انہیں سے ایک قول یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ناشطات سے مراد فرشتے ہیں جنہیں ان کے نشاط کی وجہ سے ناشطات کہا جاتا ہے وہ جہاں کہیں ہو اللہ تعالیٰ کے امر کے ساتھ جاتے اور آتے ہیں۔ ان سے اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی روحوں کو جلد اور ناخنوں کے درمیان سے نکالتے ہیں یہاں تک ان کے پیٹوں سے اسے بڑی سختی کے ساتھ نکالتے ہیں جب کہ انہیں بڑی تکلیف اور غم لاحق ہوتا ہے جس طرح تو خاردار تار کو اون سے نکالتا ہے۔ اس وقت نشط کھینچنے کے معنی میں ہوگا یہ جملہ بولا جاتا ہے: نشطتُ الدلوَ أنشِطها وانشُطها۔ یعنی میں نے اسے کھینچا۔ اصمعی نے کہا: بئر انشاط۔ ایسا کنواں جس کی گہرائی تھوڑی ہو جس سے ڈول ایک دفعہ کھینچنے سے نکل جاتا ہے۔ بئر نشوط ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس سے ڈول کئی دفعہ کھینچنے سے نکلتا ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ ایسی موت ہے جو انسان کے نفس کو کھینچتی ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد ایسے نفوس ہیں جن کو دونوں قدموں سے کھینچا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: النّٰزِعٰتِ سے مراد نمازیوں کے ہاتھ اور ان کی ذاتیں ہیں جو تیر چڑھا کر کمانوں کو کھینچتے ہیں۔ النّٰزِعٰتِ سے مراد وہ ہاتھ ہیں جو گھوڑوں اور اونٹوں کی رسیوں کو کھولتے ہیں۔

عکرمہ اور عطا نے کہا: اس سے مراد وہ تانتیں ہیں جن کے ساتھ تیروں کو چھوڑا جاتا ہے۔ عطا، قتادہ، حسن بصری اور اخفش سے مروی ہے: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں۔ صحاح میں اسی طرح ہے یعنی وہ ستارے جو ایک برج سے دوسرے برج کی طرف نکلتے ہیں جس طرح بیل ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جاتا ہے اور غم، غم والے کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

ابو عبیدہ اور عطا نے کہا: النّٰشِطٰتِ سے مراد وہ وحشی جانور ہیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جاتے ہیں جس طرح غم انسان کو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لے جاتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: النّٰزِعٰتِ سے مراد کافروں کی روحیں نکالنے والے ہیں اور النّٰشِطٰتِ سے مراد مومنوں کی روحیں نکالنے والے ہیں۔ فرشتے مومن کی روح کو نرمی سے کھینچتے ہیں۔ نزع کا معنی سختی سے کھینچنا ہے اور نشط کا معنی نرمی سے کھینچنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ دونوں آیتیں کفار کے لیے ہیں باقی مومنین کے لیے ہیں جب وہ دنیا سے جدا ہو رہے ہوتے ہیں۔

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا۝ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی روحوں کے ساتھ تیرتے ہیں۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں جس طرح ایک آدمی پانی میں تیرتا ہے کبھی وہ نیچے چلے آتے ہیں اور کبھی وہ اوپر اٹھ آتے ہیں وہ نرمی سے اسے نکالتے ہیں پھر اسے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ آرام کر لیں۔ مجاہد اور ابو صالح نے کہا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ کے حکم سے آسمان سے جلدی آتے ہیں جس طرح تیز رفتار گھوڑے کو سابح کہتے ہیں جب وہ تیز دوڑے۔ مجاہد سے مروی ہے: فرشتے اترنے اور اوپر چڑھنے میں تیزی کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ السّٰبِحٰتِ سے مراد موت ہے جو بنی آدم کے نفسوں میں تیرتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد نمازیوں کے گھوڑے ہیں؛ عنترہ نے کہا:

والخیلُ تَعْلَمُ حین تَسْـ ـبَحُ فی حِیاض الموت سَبْحا

گھوڑے جانتے ہیں جب وہ موت کے حوضوں میں تیرتے ہیں۔

قتادہ اور حسن نے کہا: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو افلاک میں تیرتے ہیں اسی طرح سورج اور چاند ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ۝ (یٰس) ہر ایک اپنے اپنے فلک میں تیر رہا ہے۔ عطا نے کہا: اس سے مراد وہ کشتیاں ہیں جو پانی میں تیرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: السّٰبِحٰتِ سے مراد مومنوں کی روحیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کی رحمت کے شوق میں تیرتے ہیں جب وہ نکلتی ہیں۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا۝ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انبیاء تک وحی پہنچانے میں شیاطین پر سبقت لے جاتے ہیں؛ یہ مسروق اور مجاہد کا بھی قول ہے۔ مجاہد اور ابو روق سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں پر خیر اور عمل صالح میں سبقت لے گئے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بنی آدم پر عمل صالح میں سبقت لے جاتے ہیں تو اسے لکھ لیتے ہیں۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد موت ہے جو انسان پر سبقت لے جاتی ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی روحوں کو جنت کی طرف جلدی لے جاتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اس سے مراد مومنوں کے نفوس ہیں جو ملائکہ کی طرف سبقت لے جاتے ہیں جو ان کی روحوں کو قبض کرتے ہیں جبکہ انہوں نے فرحت و سرور کو دیکھ لیا ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کی رحمت کا شوق رکھتے ہیں۔ ربیع سے بھی اسی طرح مروی ہے کہا: اس سے مراد وہ نفوس ہیں جو موت کے وقت نکلنے میں سبقت لے جاتے ہیں۔ قتادہ، حسن اور معمر نے کہا: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جن میں سے بعض بعض سے چال میں سبقت لے جاتے ہیں۔ عطا نے کہا: اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو جہاد کی طرف سبقت لے جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ روحیں ہیں جو جسموں سے پہلے جنت یا جہنم کی طرف سبقت لے جاتی ہیں؛ یہ ماوردی کا قول ہے۔ جرجانی نے کہا: سابقات کا فاء کے ساتھ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس سے مراد بھی پہلے والے ہیں یعنی جو تیرتے ہیں اور سبقت لے جاتے ہیں۔ تو کہتا ہے: وہ اٹھا اور چلا گیا تو یہ چیز اس امر کو ثابت کرتی ہے کھڑا ہونا جانے کا سبب ہے اگر تو کہتا: قام و ذھب تو کھڑا ہونا جانے کا سبب نہ ہوتا۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۝ قشیری نے کہا: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: اس بارے میں دو قول ہیں: (۱) اس سے مراد ملائکہ ہیں؛ یہ جمہور کا نقطہ نظر ہے۔ (۲) اس سے مراد سات ستارے ہیں؛ یہ خالد بن معدان نے حضرت معاذ بن جبل سے روایت نقل کی ہے۔ ان کے امور کی تدبیر کی دو صورتیں: (۱) ان کے طلوع و غروب کی تدبیر کرنا (۲) اللہ تعالیٰ نے اس میں جو احوال کے بدلنے کا فیصلہ کیا ہے وہ تدبیر ہے؛ قشیری نے بھی اپنی تفسیر میں یہی قول نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم کے بہت سے امور کو نجوم کی حرکات کے ساتھ معلق کیا ہے پس تدبیر کو ان ستاروں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اگرچہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے جس طرح ایک چیز کو اس کے مجاور کی وجہ سے نام دے دیا جاتا ہے۔

اگر مراد فرشتے ہوں تو ان کی تدبیر سے مراد یہ ہوگا کہ وہ حلال و حرام اور اس کی تفصیل کے ساتھ نازل ہوتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: اس میں یہ امر اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے لیکن جب فرشتے اسے لے کر اترے تو انہیں یہ نام دے دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝ (شعراء) اسے روح الامین لے کر نازل ہوئے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (بقرہ: 97) جبریل امین نے اسے تیرے دل پر نازل کیا۔ یعنی جبریل امین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اسے نازل کیا جبکہ نازل کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔

عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مدبرات امر سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں زمین کے احوال کی تدبیر سپرد کی گئی ہے ہواؤں کا معاملہ ہو، بارش کا معاملہ ہو یا کوئی اور۔ عبدالرحمن بن سابط نے کہا: دنیا کے امور کی تدبیر چار فرشتوں کے ذمہ ہے حضرت جبریل، حضرت میکائیل، ملک الموت یعنی حضرت عزرائیل اور حضرت اسرافیل۔ جہاں تک حضرت جبریل کا تعلق ہے اس کے ذمہ ہواؤں اور لشکروں کے معاملات ہیں۔ حضرت میکائیل کے ذمہ بارش اور نباتات ہے۔ ملک الموت کے ذمہ خشکی اور تری میں روحوں کو قبضہ کرنا ہے۔ جہاں تک حضرت اسرافیل کا تعلق ہے وہ ان فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کا امر لاتے ہیں حضرت اسرافیل سے بڑھ کر کوئی فرشتہ اللہ تعالیٰ کے قریب نہیں۔ حضرت اسرافیل اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں ایسے امور کا مکلف بنا دیا گیا ہے انہیں جس کی پہچان اللہ تعالیٰ نے کرا دی ہے۔ سورت کے آغاز سے یہاں تک قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ نے جن کی قسمیں اٹھائی ہیں اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسمیں اٹھائے ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی چیز کی قسم اٹھانا جائز نہیں قسم کا جواب مضمر ہے گویا فرمایا: والنازعات ..... لتبعثن ولتحاسبن۔ جواب قسم اس لیے مضمر کیا گیا کیونکہ سامعین اسے پہچانتے تھے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً۝ (النازعات) کیا اس وقت جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہ ان کے اس قول کے جواب میں ہے: ائذا کنا عظاما نخرۃ نبعث تو صرف ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً پر اکتفا کیا گیا۔

ایک قوم نے کہا: جواب قسم اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى۝ (النازعات) اس میں ڈرانے والے کے لیے عبرت

ہے؛ یہ ترمذی ابن علی کا پسندیدہ مذہب ہے یعنی میں نے جو قیامت کا ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر کیا ہے یہ سب ڈرنے والوں کے لیے نصیحت ہے لیکن جواب قسم اسی چیز کو بنانا جو سورت میں مذکور ہو ظاہر و باہر ہو اس سے زیادہ مناسب ہے کہ کسی ایسی چیز کو جواب قسم بنایا جائے جو کلام میں مذکور نہ ہو؛ یہ انباری کا قول ہے یہ قبیح ہے کیونکہ قسم اور جواب قسم کے درمیان طویل فاصلہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا جواب قسم هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰی۝ ہے کیونکہ معنی تجھ پر واضح ہو چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا جواب یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ۝ ہے یہاں یَوْمَ سے پہلے لام مقدر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہے یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ۝ (النازعات) والنازعات غرقا سجستانی نے کہا: یہ جائز ہے کہ اس میں تقدیر و تاخیر ہو گویا کلام یوں کی گئی فاذاھم بالساھرۃ والنازعات۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ فاء کے ساتھ کلام کو شروع نہیں کیا جاتا۔ پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جواب قسم یہ ہے کہ جہنمیوں کے دل سخت ہو گئے، ان کی آنکھیں جھکی ہیں یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ۝ کو نصب اس وجہ سے ہے لیکن یہ جواب قسم نہیں۔ زجاج نے کہا: تقدیر کلام یوں ہے قلوب واجفة یوم ترجف الراجفة۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اذ کہ کی وجہ سے منصوب ہے اور ترجف کا معنی تضطرب ہے اور راجفہ کا معنی مضطربہ ہے۔ عبد الرحمن بن زید نے یہی کہا ہے کہا: اس سے مراد زمین ہے اور رادفہ سے مراد قیامت ہے۔ مجاہد نے کہا: راجفہ سے مراد زلزلہ ہے۔

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ۝ رادفہ سے مراد چیخ ہے۔ مجاہد، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: دونوں سے مراد چیخیں ہیں یعنی دونوں نفخے۔ جہاں تک پہلے نفخہ کا تعلق ہے وہ اللہ کے حکم سے ہر چیز کو ہلاک کر دے گا۔ جہاں تک دوسرے نفخے کا تعلق ہے وہ اللہ کے حکم سے ہر چیز کو زندہ کر دے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا''۔ مجاہد نے بھی کہا: رادفہ اس وقت ہوگا جب آسمان پھٹ جائے گا، زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے اور انہیں ایک ہی بار ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا یہ سلسلہ زلزلہ کے بعد ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: راجفہ سے مراد زمین کا حرکت کرنا ہے رادفہ سے مراد دوسرا زلزلہ ہے جو زمینوں کو فنا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ سورۃ النمل کے آخر میں ایسی بحث گزر چکی ہے جو صور پھونکنے کی بحث میں کافی و شافی ہے۔ رجفہ کا اصل معنی حرکت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ (المزمل: 14) یہاں رجفہ سے مراد صرف حرکت نہیں بلکہ یہ رَجَفَ الرعدُ یَرْجُفُ رَجْفًا وَرَجِیفًا سے مشتق ہے یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ آواز اور حرکت کو ظاہر کرے اسی سے اراجیف کا لفظ ہے کیونکہ اس میں آوازیں مضطرب ہوتی ہیں اور لوگ اس میں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

أَبِالْأَراجِيفِ يا بنَ اللَّوْمِ تُوعِدُنِي　وفِي الْأَراجِيفِ خِلْتُ اللُّوْمَ الخَوَرَا

کیا تو ایسے قصائد میں (جو رجز یہ بحر میں کہے گئے ہیں) مجھے دھمکی دیتا ہے اے ملامت کرنے والے! جبکہ میرا خیال تھا کہ ایسے قصائد میں ملامت اور ضعف کا طعنہ ہوگا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رات کا ایک چوتھائی گزر جاتا تو آپ اٹھتے پھر فرماتے: اے لوگو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو راجفہ آچکی رادفہ اس کے پیچھے آرہی ہے موت اپنی سختیوں کے ساتھ آگئی (1)۔

قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ﴿۸﴾ اس روز دل خوفزدہ ہوں گے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے۔ سدی نے کہا: وہ اپنی جگہوں سے ہل جائیں گے اس کی مثل اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ (غافر: 18) جب دل زخرہ تک پہنچ جائیں گے۔ مورج نے کہا: جب دل مضطرب خوفزدہ اور پرسکون نہ ہوں گے۔ مبرد نے کہا: جب دل مضطرب ہوں گے۔ معنی سب کا قریب قریب ہے اس سے مراد کفار کے دل ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: وجف القلب یَجِفُ وَجِیفًا جب وہ پھڑ پھڑا رہا ہو جس طرح یہ لفظ بولا جاتا ہے: وَجَبَ یَجِبُ وَجِیبًا اسی سے وجیف الفرس والناقۃ فی العدو ہے ایجاف کا معنی جانور کو تیز چال پر برانگیختہ کرنا ہے۔ قلوب کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دیا گیا اور واجفہ اس کی صفت ہے۔

اَبۡصَارُہَا خَاشِعَۃٌ ۘ﴿۹﴾ یہ سابقہ مبتدا کی ضمیر ہے جس طرح یہ قول وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکٍ (البقرہ: 221) مومن غلام مشرک سے بہتر ہے۔ خَاشِعَۃٌ کا معنی ہے جھکی ہوئی ذلیل و رسوا۔ یہ صورت اس ہولناکی کی وجہ سے ہوگی جسے وہ دیکھ رہی ہوں گی اس کی مثل خَاشِعَۃً اَبۡصَارُہُمۡ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ (المعارج: 44) ہے یعنی یہ بعث کو جھٹلانے والے اور اس کا انکار کرنے والے کہیں گے: جب انہیں کہا جاتا ہے تمہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا تو وہ انکار کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیا ہم اپنی موت کے بعد پہلی حالت کی طرف لوٹ جائیں گے تو جس طرح ہم موت سے پہلے زندہ تھے اسی طرح پھر زندہ ہو جائیں گے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِیۡدًا ﴿۴۹﴾ (الاسراء) کیا ہم کوئی مخلوق کی حیثیت سے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجع فلان فی حافرتہ او علی حافرتہ یعنی وہ آدمی جہاں سے آیا تھا وہاں سے ہی واپس چلا گیا؛ یہ قتادہ کا قول ہے؛ ابن اعرابی نے کہا:

أحافِرَۃً علی صَلَعٍ وشَیۡبٍ    مَعَاذَ اللّٰہِ مِن سَفَہٍ وعارِ

کیا اس گنجے پن اور بالوں کی سفیدی کے بعد میں پہلی حالت کی طرف لوٹ جاؤں گا اس بے وقوفی اور شرمندگی سے اللہ کی پناہ۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجع فلان فی حافرتہ یعنی جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے واپس چلا گیا۔ ان کا ضرب المثل میں قول ہے: النقد عند الحافرۃ۔ نقد سبقت کے وقت ہوتا ہے۔ یعقوب نے کہا: پہلے کلمہ پر۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: التقی القوم فاقتتلوا عند الحافرۃ۔ لوگ آپس میں ملے تو انہوں نے ملاقات پر آغاز پر ہی باہم جھگڑا شروع کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حافرۃ کا معنی دنیا ہے یعنی کیا ہم دنیا کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے تو ہم بطور زندہ اس طرح صبر کریں گے جس طرح ہم پہلے تھے؛ شاعر نے کہا:

آلیتُ لا أنساکُم فاعۡلَمُوا    حَتّٰی یُرَدَّ النّاسُ فی الحافِرَۃ

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث نمبر 2381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں قسم اٹھاتا ہوں! میں تمہیں کبھی بھی نہیں بھولوں گا جان لو یہاں تک کہ لوگوں کو دنیا کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حافرۃ سے مراد وہ زمین ہے جہاں قبروں کو دفن کر دیا گیا ہو، یہ مخصوص کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ (الطارق) عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ (الحاقہ) معنی یہ ہوگا کیا ہمیں اپنی قبروں میں دوبارہ زندہ کر کے لوٹایا جائے گا؛ یہ مجاہد، خلیل اور فراء کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زمین کو حافرہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ قدم لگنے کی جگہ ہے جس طرح قدم کو ارض کا نام دے دیا جاتا ہے کیونکہ قدم زمین پر ہوتا ہے معنی اس کا یہ ہوگا کیا ہم موت کے بعد زمین کی طرف لوٹیں گے اور اپنے قدموں پر چلیں گے۔ ابن زید نے کہا: حافرۃ سے مراد آگ ہے اور پڑھا تِلۡكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ (النازعات) پھر وہ باری تو بڑے خسارے والی ہوگی۔ مقاتل اور زید بن اسلم نے کہا: یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: کلام عرب میں حافرۃ سے مراد دنیا ہے۔ ابوحیوہ نے اسے حفِرۃ پڑھا ہے یہ حافرۃ سے ماخوذ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حفرۃ سے مراد ایسی زمین ہے جو اپنے مردوں کے جسموں کی وجہ سے بدبودار ہو گی یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: حفرت اسنانہ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے دانتوں کے ظاہر اور باطن میں میل چڑھ جائے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فی اسنانہ حفر، وقد حفَرت تَحۡفُرُ حفرا یہ کَسَرَ، یَکۡسِرُ کسرا کے وزن پر ہے جب اس کی جڑیں خراب ہو جائیں۔ بنو اسد کہا کرتے تھے: فی اسنانہ حفر، وقد حفِرت یہ تعِب، تعبا کی مثل ہے یہ دونوں لغتوں میں سے مروی لغت ہے صحاح میں اسی طرح ہے۔

ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ کیا اس وقت جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے: نخر العظم یعنی بوسیدہ ہو جائے اور ٹوٹ پھوٹ جائے کہا جاتا ہے: عِظَامًا نَّخِرَةً اہل مدینہ، اہل مکہ، اہل شام اور اہل بصرہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابوعبید نے اسی کو پسند کیا ہے کیونکہ وہ آثار جن میں ہڈیوں کا ذکر ہوتا ہے ہم نے ان میں غور کیا تو ہم نے نخرہ دیکھا ناخرہ نہ دیکھا۔ ابوعمرو، ان کے بیٹے عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، ابن زبیر، حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے ناخرہ پڑھا۔ فراء، طبری اور ابو معاذ نحوی نے آیات کے سروں کی موافقت کی وجہ سے اسے ہی پسند کیا۔ صحاح میں ہے: ناخرۃ اس ہڈی کو کہتے ہیں جس میں ہوا داخل ہو پھر اس سے نکلے تو اس سے آواز نکلے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما بھا ناخر گھر میں کوئی بھی نہیں؛ یہ قول یعقوب نے باہلی سے نقل کیا ہے۔ ابوعمرو بن علاء نے کہا: ناخِرۃ اسے کہتے ہیں جو ابھی بوسیدہ نہ ہوا ہو تا ہم اس کا بوسیدہ ہونا ضروری ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ناخرۃ سے مراد جو اندر سے خالی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ دونوں لغتیں ایک معنی میں ہیں اسی طرح عرب کہتے ہیں: نخر الشی فھو ناخر ونخر جس طرح اس فعل سے اسم فاعل کا صیغہ ذکر کرتے ہیں طمع فھو طَمِعٌ و طامِعٌ، حذِرٌ وحاذِرٌ، بَخِلٌ و بَاخِلٌ، فَرِہٌ و فارہٌ۔

بعض تفاسیر میں ہے: جب ناخرۃ کا لفظ ہو تو معنی بوسیدہ ہے اور جب نخرۃ ہو تو اس کا معنی ہے ہوا اس میں سے گزرتی ہے۔ یہ پہلے معنی کے برعکس ہے ہمدانی نے قادسیہ کے موقع پر کہا تھا: من بعد ما صرت عظاما نخرۃ اس کے بعد میں بوسیدہ ہڈیاں ہو چکا ہوں گا۔ بعض نے کہا: ناخرۃ اسے کہتے ہیں جس کی اطراف کھائی جا چکی ہوں اور اس کا درمیانی حصہ باقی ہو

نخرۃ اسے کہتے ہیں جو مکمل خراب ہو چکی ہو۔ مجاہد نے کہا: نخرۃ سے مراد ہے جو ریزہ ریزہ ہو چکا ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: عِظَامًا وَّ رُفَاتًا (الاسراء: 49) ریزہ ریزہ ہڈیاں۔ نخرۃ الریح ہوا کا تیز چلنا۔ نُخْرۃ اور نُخَرۃ میں وہی مناسبت ہے جو ہمزہ میں میم کو سکون اور ضمہ دینے کی صورت میں ہے یہ گھوڑے، گدھے اور خنزیر کے ناک کا اگلا حصہ ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: هَشِم نَخِرَتَه یعنی اس کی ناک کو توڑ دیا۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۞ انہوں نے کہا: وہ تو خسارے والا لوٹنا ہوگا یہ محض لوٹنے کی طرح نہیں ہوگا؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کی رائے ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: جس نے اس کو جھٹلایا تھا اس کے لیے نقصان کا باعث ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خسارے کی باری ہوگی معنی یہ ہے اس باری والے خسارہ پانے والے ہوں گے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: تجارۃ رابحۃ یعنی تجارت کرنے والا نفع اٹھانے والا ہوگا۔ اس باری سے بڑھ کر کوئی چیز خسارہ دینے والی نہ ہوگی وہ جہنم کی طرف لے جانے والی ہے۔ قتادہ اور محمد بن کعب نے کہا: اگر ہم موت کے بعد زندہ لوٹے تو ہمیں آگ میں جمع کیا جائے گا انہوں نے یہ بات اس لیے کی تھی کیونکہ انہیں آگ کی دھمکی دی گئی تھی کَرَّ کا معنی لوٹنا ہے یہ کہا جاتا ہے کَرَّۃ اور کَرَّ پہلا فعل متعدی ہے اور دوسرا لازم ہے کرۃ کا معنی ایک بار اور اس کی جمع کرات ہے۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۞ اللہ تعالیٰ نے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ اس پر دوبارہ اٹھانا آسان ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نفخۃ واحدۃ قراءت نقل کی ہے۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۞ سب مخلوق روئے زمین پر ہوگی جبکہ پہلے وہ زمین کے اندر تھی۔ فراء نے کہا: اسے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں حیوان سوتا اور جاگتا ہے عرب کھلے میدان اور اس کی زمین کو ساھرہ کہتے ہیں یہ نسبت کا معنی دے رہا ہے کیونکہ ایسی زمین میں خوف کی وجہ سے جاگا جاتا ہے تو اس زمین کی ایسی صفت بیان کردی جو اس چیز کی صفت تھی جو اس میں ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مفسرین نے امیہ بن ابی صلت کے قول سے استدلال کیا ہے:

وفیها لحمُ ساهِرةٍ وبحرٌ

صحاح میں ہے: یوں قول کیا جاتا ہے ساھور یہ زمین کا سایہ ہے اور ساھرہ سے مراد روئے زمین ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۞ (النازعات) اور کہا جاتا ہے: الساھور جس طرح چاند کا غلاف ہوتا ہے جب اسے گرہن لگتا ہے تو وہ اس غلاف میں داخل ہو جاتا ہے انہوں نے امیہ بن ابی صلت کا شعر پڑھا:

قمرٌ وساهورٌ یُسَلّ ویُغْمَدُ

چاند اور سایہ کبھی اسے سونتا جاتا ہے اور کبھی اس سایہ میں داخل کردیا جاتا ہے۔

ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ ساھرہ سے مراد سفید زمین ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: وہ چاندی کی زمین ہوگی اس پر کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی گئی ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ ایسی زمین ہے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے نئے سرے سے بنائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ساھرہ سے مراد

ساتویں زمین کا نام ہے جسے الله تعالیٰ لائے گا اور اس پر مخلوق کا حساب لے گا۔ یہ اس وقت ہوگا جب زمین کو دوسری زمین سے بدل دیا جائے گا۔ ثوری نے کہا: ساھرۃ سے مراد شام کا علاقہ ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے عثمان بن ابی عاتکہ نے کہا: یہ شام میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے یہ اریحاء اور حسان پہاڑوں کے درمیان کی جگہ ہے الله تعالیٰ جتنا چاہے گا اسے پھیلا دے گا۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد جہنم ہے یعنی اچانک یہ کفار جہنم میں ہوں گے۔ اسے ساھرۃ کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت وہ لوگ اس پر نہ سوئیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ساھرۃ سے مراد جہنم کے کنارے صحراء ہے یعنی وہ قیامت کے دن زمین پر ٹھہریں گے تو اس وقت ہمیشہ کی بیداری ہوگی۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: ساھرۃ سے مراد ہموار زمین ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں سراب چلتا ہے یہ عربوں کے قول: عین ساھرۃ سے ماخوذ ہے ایسا چشمہ جس کا پانی چلتا رہتا ہو اس کی ضد نائم ہے۔

یا اس وجہ سے اسے ساھرۃ کہتے ہیں کیونکہ اس پر چلنے والا ہلاکت کے خوف سے نہیں سوتا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ عَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾

''(اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو موسیٰ کی خبر؟ جب ان کے رب نے انہیں طوی کی مقدس وادی میں پکارا تھا (کہ) جاؤ فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے پس (اس سے) دریافت کرو کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہوجائے اور (کیا تو چاہتا ہے) میں تیری راہبری کروں تیرے رب کی طرف تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے۔ پس آپ نے (جا کر) اسے بڑی نشانی دکھائی، پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی پھر روگرداں ہو کر فتنہ انگیزی میں کوشاں ہوگیا، پھر (لوگوں کو) جمع کیا پس پکارا اور کہا: میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں، آخرکار مبتلا کر دیا اسے الله نے آخرت اور (دنیا کے) دوہرے عذاب میں۔ بے شک اس میں بڑی عبرت ہے اس کے لیے جو الله سے ڈرتا ہے''۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ یعنی آپ تک وہ خبر آ چکی ہے اور پہنچ چکی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا باعث ہے کیونکہ فرعون آپ کے زمانہ کے کفار سے زیادہ قوی تھا پھر ہم نے اسے پکڑ لیا اسی طرح یہ لوگ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: هَلْ بمعنی ما ہے وہ خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں آئی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی ہے: اس میں ڈرنے والوں کے لیے عبرت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا

واقعہ کئی مواقع پر گزر چکا ہے جو کافی وشافی ہے۔ طُوًی میں تین قراتیں ہیں۔ ابن محیصن، ابن عامر اور کوفیوں نے طوی کو تنوین سے پڑھا ہے۔ ابوعبید نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ اس میں تخفیف ہے باقی قراء نے تنوین کے بغیر پڑھا ہے کیونکہ یہ معدول ہے جس طرح عُمر اور قُثم ہے۔ فراء نے کہا: طوی، مدینہ طیبہ اور مصر کے درمیان ایک وادی ہے کہا یہ طاوٍ سے معدول ہے جس طرح عامر سے عمر معدول ہے۔ حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے طاء کے کسرہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے اور ابوعمرو سے بھی یہی مروی ہے معنی یہ ہے کہ وہ وادی یکے بعد دیگرے مقدس بنائی گئی ہے؛ یہ زجاج نے کہا اور شعر پڑھا:

أَعَاذِلَ إِنَّ اللومر فی غیرِ کنهِهِ علیّ طِوًی مِن غَیّكِ المتردّدِ

اے مجھے ملامت کرنے والے! بے شک بغیر وجہ کے میری بار بار ملامت تیری متردد سرکشی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: طاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں اس بارے میں گفتگو سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ⑰ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے رب نے انہیں ندا کی کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو کلام سے ایک جز کو حذف کر دیا گیا کیونکہ ندا بھی ایک قول ہے گویا ان کے رب نے انہیں ارشاد فرمایا: فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی۔ یعنی اس نے نافرمانی میں حد سے تجاوز کیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ فرعون ہمدان کا رہنے والا چھوٹے قد کا مضبوط آدمی تھا۔ مجاہد نے کہا: اصطخر کا رہنے والا تھا۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ اصفہان کا رہنے والا تھا جسے ذوظفر کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی چار بالشت تھی۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ⑱ کیا تو خواہش رکھتا ہے کہ تو اسلام لائے اور گناہوں سے اپنے آپ کو پاک کرے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: کیا تو خواہش رکھتا ہے کہ تو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دے؟

وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ⑲ میں تیری تیرے رب کی اطاعت کی طرف راہنمائی کروں تو تو اس سے ڈرے اور تقویٰ اختیار کرے۔ نافع اور ابن کثیر نے تَزَّكّٰى پڑھا ہے کہ تاء کو زاء میں مدغم کر دیا گیا کیونکہ یہ اصل میں تتزکّٰی تھا۔ باقی قراء نے اسے تزکی پڑھا ہے معنی ہوگا تو پاکیزہ مومن بنے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعا دی کہ وہ پاکیزہ مومن بن جائے۔ کہا: اس وجہ سے ہم نے تخفیف کو اختیار کیا ہے۔ صخر بن جویریہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو حضرت موسیٰ کو فرمایا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں اس کے پاس کیسے جاؤں جبکہ تو جانتا ہے کہ وہ اس طرح نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ تجھے جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کر بے شک آسمان میں بارہ ہزار فرشتے ہیں جو تقدیر کے علم کے خواہش مند ہیں وہ اس تک نہیں پہنچے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکے۔

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ⑳ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بڑی نشانی دکھائی یہ معجزہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے عصا مراد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے ید بیضاء مراد ہے جو سورج کی طرح چمکتا تھا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آیۃ کبری سے مراد عصا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد ید بیضاء اور عصا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد سمندر کا پھٹنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: آیۃ سے مراد تمام نشانیاں اور معجزات ہیں۔

**فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۞ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۞** اس نے الله کے نبی حضرت موسیٰ کو جھٹلایا اور اپنے رب کی نافرمانی کی پھر ایمان سے اعراض کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لی اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سزا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ سانپ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

**فَحَشَرَ فَنَادٰى ۞ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۞** اس نے اپنے ساتھیوں کو بلایا تاکہ وہ اسے سانپ سے بچائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس نے جنگ کرنے کے لیے اپنے لشکروں کو جمع کیا اور مقابلہ کے لیے جادوگروں کو جمع کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس نے لوگوں کو جمع کیا اس نے لوگوں کو بلند آواز سے ندا دی: میں تمہارا بڑا رب ہوں میرے اوپر کوئی تمہارا رب نہیں۔ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ابلیس نے فرعون کے سامنے انسان کی صورت بنائی جب کہ وہ مصر میں ایک حمام میں تھا فرعون نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ابلیس نے اسے کہا: تجھ پر افسوس! کیا تو مجھے نہیں پہچانتا؟ فرعون نے کہا: نہیں۔ شیطان نے کہا: تو کیسے مجھے نہیں پہچانتا جبکہ تو نے مجھے تخلیق کیا ہے؟ کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا: میں تمہارا بڑا رب ہوں۔ ثعلبی نے یہ واقعہ کتاب العرائس میں ذکر کیا۔

عطا نے کہا: فرعون نے ان کے لیے چھوٹے بت بنائے اور ان کی عبادت کا حکم دیا اور کہا: میں تمہارے بتوں کا رب ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے قائدوں اور سرداروں کا ارادہ کیا ہے وہ ان کا مالک تھا اور وہ اپنے ماتحت لوگوں کے مالک تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے فنادی فحشر کیونکہ بلانا جمع کرنے سے پہلے ہوا۔

**فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۞** اس کا پہلا قول **مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ** (القصص: 38) میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں پاتا۔ اس کا دوسرا قول ہے: **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۞** (النازعات) میں تمہارا بڑا رب ہوں؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ کا نقطہ نظر ہے ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ تھا؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے معنی یہ بنا پہلی بات پر مہلت دی اور دوسری پر اسے پکڑ لیا اور دونوں پر عذاب دیا۔ مجاہد نے کہا: یہ اس کی پہلی عمر اور آخری عمر کا عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا دوسرا قول **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** ہے اور پہلا قول اس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانا ہے؛ یہ قتادہ سے بھی مروی ہے۔

**نَكَالَ** زجاج کے قول کے مطابق مفعول مطلق ہے تاکید کے لیے ہے۔ کیونکہ **فَاَخَذَهُ اللّٰهُ** کا معنی ہے نکل اللہ بہ۔ یہاں نکال کا لفظ ذکر کیا کیونکہ یہ مذکورہ فعل کے مصدر کا معنی دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حرف جار کے حذف کی وجہ سے اسے نصب دی اصل کلام یوں تھی فاخذہ اللہ بنکال الآخرۃ۔ جب حرف جار کو حذف کر دیا گیا تو اسے نصب دی گئی۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کو عبرتناک انداز میں پکڑا اور نکال اس کا نام ہے جس کو دوسروں کے لیے عبرت بنایا گیا ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: نکل فلان بفلان۔ جب اسے سزا دے کر عمل سے روک دیا۔ کلمہ میں امتناع کا معنی پایا جاتا ہے اس سے قسم سے انکار کرنا ہے اور بیڑی کو نکل کہتے ہیں۔ سورۂ مزمل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ﴿۲۶﴾ جو آدمی ڈرتا ہے اس کے لیے اس میں عبرت ہے۔

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَ لِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۳﴾

''کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا، اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو خوب اونچا کیا پھر اس کو درست کیا اور تاریک کیا اس کی رات کو اور ظاہر کیا اس کے دن کو اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا۔ نکالا اس نے اس کا پانی اور اس کا سبزہ اور پہاڑ (اس میں) گاڑ دیئے سامان زینت ہے تمہارے لیے اور تمہارے مویشوں کے لیے''۔

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ اس سے مراد اہل مکہ ہیں کیا تمہارے اندازے کے مطابق تمہاری موت کے بعد تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کو پیدا کرنا مشکل ہے پس جو آسمان پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ (غافر: 57) آسمانوں اور زمین کی تخلیق لوگوں کی تخلیق سے بڑھ کر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ (یاسین: 81) کیا وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمانے والی ہے وہ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان کی مثل کو پیدا کرے۔ اس کلام کا مقصود تقریع و توبیخ ہے پھر آسمان کی صفت بیان کی۔

بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡكَهَا آسمان کو تم پر اس طرح بلند کیا جس طرح کوئی عمارت بنائی جاتی ہے اس کی چھت کو فضا میں بلند کر دیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: سمکت الشئ یعنی میں نے اسے ہوا میں بلند کیا اور سمك الشئ سموکا وہ چیز بلند ہوگئی۔ فراء نے کہا: ہر وہ شی جو کسی دوسری چیز کو اگائے وہ عمارت ہو یا کوئی اور چیز تو دوسری چیز کو سمك کہتے ہیں اس طرح یوں کہا جاتا ہے: بناء مسموك اونچی عمارت۔ سنام سامك تامك اونچی کہان۔ مسموکات یعنی آسمان۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اسمك فی الریم سیڑھی اوپر چڑھ۔

فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ اس کی بناوٹ کو برابر کیا اس میں کوئی کجی، کوئی پھٹن اور سوراخ نہیں۔

وَ اَغۡطَشَ لَیۡلَهَا اس کی رات کو تاریک کر دیا جس طرح کہتے ہیں: غطش اللیل رات تاریک ہوگئی أغطشه الله۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تاریک کر دیا، جس طرح تو کہتا ہے: ظلم اللیل و أظلمه الله یوں بھی جملہ بولا جاتا ہے: أغطش اللیل اور أغطشه الله، جس طرح یوں کہا جاتا ہے: أظلم اللیل اور أظلمه الله۔ غَطَش اور غبَش کا معنی تاریکی ہے۔ رجل أغطش۔ اندھا آدمی یا اندھے جیسا، اسی طرح قد غطش بھی کہتے ہیں وہ اندھا ہے۔ المرأة غطشاء عورت اندھی ہے، اسی طرح یہ کہا جاتا ہے: لیلة غطشاء و لیل اغطش۔ تاریک رات۔ فلاة غطشی لا یهتدی لها۔ ایسا بیابان جس کا کوئی راستہ نہ ہو۔ اعشی نے کہا:

دعا مرهم مدلهم غطش

ان کی تاریک رات ان کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ رات کی نسبت آسمان کی طرف کی کیونکہ رات سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہوتی ہے اور سورج کو آسمان کی طرف مضاف کیا جاتا ہے یوں کہا جاتا ہے: نجوم اللیل کیونکہ ان کا ظہور رات کے وقت ہوتا ہے۔

**وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا** ﴿۲۹﴾ اس کے دن کو روشن اور سورج کو ظاہر کیا **ضُحٰهَا** کی نسبت آسمان کی طرف کی جس طرح رات کی نسبت اس کی طرف کی کیونکہ اس میں تاریکی اور روشنی کا سبب ہے، یہ سورج کا غروب وطلوع ہے۔

**وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا** ﴿۳۰﴾ یعنی اسے پھیلا دیا۔ یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق کے بعد ہوئی اس کے بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء کے تحت گزر چکی ہے عرب کہتے ہیں: دحوت الشیٔ أدحوہ دحوًا۔ جب تو اسے پھیلائے، شتر مرغ کے گھونسلے کو ادحی کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین پر پھیلایا گیا ہوتا ہے؛ امیہ بن ابی صلت نے کہا:

وبثَّ الخلقَ فیها إذ دحاها فھُمْ قُطَّانُها حتی التنادِی

جب زمین کو پھیلا دیا تو اس میں مخلوق کو پھیلا دیا پس یہ روز قیامت تک اس کے مکین ہیں۔

مبرد نے یہ شعر پڑھا ہے:

دحاھا فلما رآھا استوت علی الماءِ أرسی علیھا الجبالَ

زمین کو پھیلایا جب اسے دیکھا کہ وہ پانی پر قرار پکڑ گئی ہے تو اس پر پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: **دَحٰىهَا** کا معنی ہے برابر کرنا۔ زید بن عمرو کا قول ہے:

دحاھا فلما استوت شدَّھا بأیدٍ وأرسیٰ علیھا الجبال

اسے ہموار کیا جب وہ ہموار ہوگئی تو اسے ہاتھوں کے ساتھ مضبوط کیا اور اس پر پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے: اللہ تعالیٰ نے دنیا کو تخلیق کرنے سے ایک دو ہزار سال پہلے کعبہ بنایا اور چار ستونوں پر اسے پانی پر رکھا پھر بیت اللہ شریف کے نیچے سے زمین کو پھیلایا۔ بعض علماء نے یہ ذکر کیا ہے کہ بعد کا لفظ مع کے معنی میں ہے گویا فرمایا: اس کے ساتھ ہی زمین کو پھیلا دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ** ﴿۱۳﴾ (القلم) اس آیت میں بھی بعد، مع کے معنی میں ہے اس معنی میں عربوں کا قول ہے: أنت احمق وأنت بعد ھذا سیئ الخلق تو احمق ہے ساتھ ہی ساتھ بداخلاق ہے؛ شاعر نے کہا:

فقلت لھا عَنِّی إلیکِ فإنَّنی حَرَامٌ وإنِّی بعد ذلك لَبِیبُ

میں نے اسے کہا: تو مجھ سے دور ہوجا بے شک میں محروم ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ میں دانشمند ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: **بَعْدَ**، قبل کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ** (الانبیاء: 105) اس آیت میں بعد کا لفظ پہلے کی معنی میں ہے، ابوخراش ہذلی نے کہا:

حَمِدتُ إلٰهِي بعد عروة إذ نجا  خِراشٌ و بعض الشر أهون من بعض

میں نے عروہ سے پہلے اپنے اللہ کی حمد کی کیونکہ خراش نجات پا چکا تھا بعض مصیبتیں دوسروں سے آسان ہوتی ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے: خراش نے عروہ سے پہلے نجات پائی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ دَحٰهَا کا معنی ہے اس میں ہل چلایا اور اس کو پھاڑا؛ یہ ابن زید کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اسے خوراک کے لیے تیار کیا۔ معنی قریب قریب ہے۔ عام قراء کی قراءت نصب کے ساتھ ہے یعنی دحا الأرض۔ حضرت حسن بصری اور عمرو بن میمون نے الأرض کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ ضمیر اس کی طرف لوٹتی ہے۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے دَحَا یَدْحُو دَحْوًا، دَحَی یَدْحِی دَحْیًا جس طرح طَغَی یَطْغَی، یَطْغُو اور طَغَی یَطْغِی ہے اسی طرح مَحَا یَمْحُو، یَمْحَی اسی طرح لَحَی العودُ یَلْحَی دیَلْحُو جس نے مضارع کا صیغہ یدحو کہا وہ دحوتُ کہتا ہے اور جو یدحی کہتا ہے وہ دحیتُ کہتا ہے۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا (۳۱) ھاء ضمیر سے مراد زمین ہے مَآءَهَا سے مراد وہ چشمے ہیں جو پانی سے پھوٹتے ہیں مرعا سے مراد وہ نباتات ہیں جن کو چرا جاتا ہے۔ قتبی نے کہا: ان دو چیزوں کے ساتھ ان تمام چیزوں پر دلالت ہوگی جن کو زمین نکالتی ہے خواہ وہ انسانوں کی خوراک ہو یا چوپاؤں کا چارہ ہو جیسے گھاس، درخت، دانا، کھجور، بھوسہ، ایندھن، لباس، آگ اور نمک کیونکہ آگ لکڑیوں سے ہوتی ہے اور نمک پانی سے ہوتا ہے۔

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۳۲) عام لوگوں کی قراءت والجبال ہے معنی ہوگا پہاڑوں کو گاڑھا اور انہیں زمین میں اس کی میخوں کے طور پر ثبت کیا۔ حضرت حسن بصری، عمرو بن میمون، عمرو بن عبید اور نصر بن عاصم نے والجبال پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ یہ سوال کیا جائے گا: اخرج سے پہلے حرف عطف کیوں نہ داخل کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا: یہ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (النساء: 90) تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے۔ یہاں بھی قد مضمر ہے۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۳) تمہاری منفعت کے لیے اور تمہارے اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں کی منفعت کے لیے۔ مَتَاعًا یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے اور یہ مفعول مطلق ہے جو مذکورہ فعل کے الفاظ پر نہیں کیونکہ اخرجہا کا معنی ہے اس سے تمہیں لطف اندوز کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حرف جار کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (۳۴) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (۳۵) وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۳۶)

''پھر جب آئے گی سب سے بڑی آفت، اس دن انسان یاد کرے گا جو دوڑ دھوپ اس نے کی تھی اور ظاہر کر دی جائے گی جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے''۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (۳۴) طامة کبریٰ سے مراد بڑی مصیبت ہے۔ اس سے مراد دوسرا نفخہ ہے جس کے ساتھ دوبارہ اٹھانا ہوگا؛ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے۔ حضرت حسن بصری کا قول بھی یہی ہے۔

حضرت ابن عباس اور ضحاک سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کہ وہ ہر چیز پر غالب آ جائے گی یہ اپنی ہولناکی کی وجہ سے ہر دوسری مصیبت پر چھا جائے گی عربوں کی امثال میں سے ایک یہ بھی ہے:

جری الوادِی فَطمَّ علی القَرِیِّ وادی بہی یہاں تک کہ اپنی گزرگاہ سے باہر نکل آئی۔

مبرد نے کہا: عربوں کے ہاں طامہ اس مصیبت کو کہتے ہیں جس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی عربوں کی امثلہ میں سے میں نے چند اخذ کی ہیں وہ کہتے ہیں: طم الفرس طمیما یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ دوڑنے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دے۔ طم الماء یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ پوری نہر کو بھر دے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: طم السیل الرکیۃ۔ سیلاب نے کنویں کو دفن کر دیا۔ طم کا معنی دفن کرنا اور غالب آنا ہے قاسم بن ولید ہمدان نے کہا: طامہ کبری سے مراد یہ ہے جب جنتیوں کو جنت اور جہنمیوں کو جہنم کی طرف نہ روکا جائے گا۔ مجاہد کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ سفیان نے کہا: اس سے مراد وہ ساعت ہے جس وقت جہنمیوں کو زبانیہ کے حوالے کیا جائے گا یعنی ایسی مصیبت جو غالب آ جاتی ہے اور بڑی ہو جاتی ہے۔ شاعر نے کہا:

إنّ بعض الحبّ يُعْمِي ويصِمّ وكذلك البغضُ أدْهَى وأطَمّ

بعض محبتیں انسان کو اندھا بہرہ بنا دیتی ہیں اسی طرح بغض ہر چیز پر غالب آ جاتا ہے۔

یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰى ۝ اس نے جو اچھا یا برا عمل کیا ہوگا اسے یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس جہنم سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اسے ہر آنکھ والا بھڑکتا ہوا دیکھے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد کافر ہے کیونکہ وہ جہنم میں عذاب کی انواع کو دیکھے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مومن اسے دیکھے گا تا کہ وہ نعمت کی قدر کو پہچانے اور کافر آگ میں داخل ہو۔ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ کا جواب محذوف ہے یعنی جب بڑی مصیبت آ جائے گی تو جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ مالک بن دینار نے وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ پڑھا ہے عکرمہ اور دوسرے قراء نے ولمن تری پڑھا ہے یعنی جہنم جسے دیکھے گی یا اے محمد! جسے تو دیکھے گا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد لوگ ہیں۔

## فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰى ۝ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ۝

''پس جس نے سرکشی کی ہوگی اور ترجیح دی ہوگی دنیوی زندگی کو تو دوزخ میں اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ جو ڈرتا ہوگا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور اپنے نفس کو روکتا رہا ہوگا ہر بری خواہش سے، جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا''۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ طغیان سے مراد ہے نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت نضر اور اس کے بیٹے حارث کے حق میں نازل ہوئی یہ ہر اس کافر کو عام ہے جس نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔ یحییٰ بن کثیر سے مروی ہے: جس نے ایک کھانے میں تین قسم کے کھانے تیار کیے تو اس نے سرکشی کی۔ جویبر نے ضحاک سے

روایت نقل کی ہے کہ حضرت حذیفہ نے کہا: اس امت کے بارے میں جس چیز سے میں زیادہ خوف محسوس کرتا ہوں کہ وہ دیکھی ہوئی چیز کو جانی گئی، چیز پر ترجیح دیں گے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ کتابوں میں یہ چیز پائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میرا کوئی بندہ اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح نہیں دیتا مگر اس پر اس کے غم اور چیزوں کا ضیاع عام کر دیا جاتا ہے پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کس میں ہلاک ہوا۔

فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ الْمَاْوٰى میں الف لام مضاف الیہ ھاء کے عوض میں ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وہ اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا۔ ربیع نے کہا: مراد ہے قیامت کے روز اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا۔ قتادہ کہا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک ایسا مقام ہے مومن جس سے ڈرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ دنیا میں ذنب کے مواقع پر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور گناہوں کا قلع قمع کرتا ہے، اس کی مثل وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ (الرحمن) جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ جس نے معاصی اور محارم سے اپنے نفس کو روکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خواہش نفس کو ترک کرنا جنت کی چابی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ ''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ایسے زمانہ میں ہو جس میں حق خواہش نفس کی قیادت کرتا ہے اور عنقریب ایسا زمانہ آئے گا جس میں خواہش نفس حق کی قیادت کرے گی، ہم ایسے زمانہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ ماوی سے مراد منزل ہے۔ یہ دونوں آیتیں حضرت مصعب بن عمیر اور ان کے بھائی کے حق میں نازل ہوئیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: جس نے سرکشی کی اس سے مراد حضرت مصعب بن عمیر کا بھائی ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر گرفتار ہوا انصار نے اسے پکڑ لیا۔ انصار نے اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں مصعب بن عمیر کا بھائی ہوں صحابہ نے اس کی مشکیں نہ باندھیں اس کی عزت کی اور اپنے ہاں رات ٹھہرایا جب صبح ہوئی تو صحابہ نے حضرت مصعب بن عمیر سے اس کا ذکر کیا تو حضرت مصعب نے کہا: وہ میرا بھائی نہیں اپنے قیدی سے سختی کرو کیونکہ وادی میں اس کی والدہ کے پاس سب سے زیادہ زیور اور مال ہے۔ صحابہ نے اس کی مشکیں کس دیں یہاں تک کہ اس کی ماں نے اس کا فدیہ بھیج دیا۔ جہاں تک ڈرنے والے کا تعلق ہے تو اس سے مراد حضرت مصعب بن عمیر ہیں جنہوں نے غزوۂ احد کے موقع پر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا جب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور چلے گئے تھے یہاں تک کہ تیر آپ کے پیٹ سے آر پار ہو گئے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خون میں لت پت دیکھا فرمایا: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تیرے لیے اجر کی آرزو رکھتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''میں نے حضرت مصعب کو دیکھا جبکہ ان پر دو چادریں تھیں جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ان کے جوتوں کے تسمے سونے کے ہیں''۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت مصعب نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیت دو آدمیوں ابو جہل بن ہشام مخزومی اور حضرت مصعب بن عمیر

عبدی کے حق میں نازل ہوئی۔ سدی نے کہا: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کا ایک غلام تھا جو کھانا لاتا تھا آپ اس سے پوچھتے تھے: تو اسے کہاں سے لایا ہے؟ ایک روز وہ کھانا لایا حضرت ابوبکر صدیق نے اس سے نہ پوچھا اور کھانا کھالیا۔ غلام نے آپ سے پوچھا: آج آپ نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟ فرمایا: میں بھول گیا تھا تو یہ کھانا کہاں سے لایا تھا؟ غلام نے بتایا: دور جاہلیت میں میں نے کچھ لوگوں سے کہانت کی تھی انہوں نے یہ کھانا مجھے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس وقت قے کر دی۔ ساتھ ہی یہ عرض کی: اے میرے رب! رگوں میں جو کچھ باقی ہے تو نے اسے روک لیا ہے (1)۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ۔

کلبی نے کہا: یہ آیت اس آدمی کے حق میں نازل ہوئی جس نے گناہ کا ارادہ کیا خلوت میں اس پر قادر ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے اسے ترک کر دیا، اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جو نافرمانی کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا (2)۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾

”یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ کے رب تک اس کی انتہا ہے آپ ضرور خبردار کرنے والے ہیں ہر اس شخص کو جو اس سے ڈرتا ہے۔ گویا وہ جس روز اس کو دیکھیں گے (انہیں یوں محسوس ہوگا) کہ وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے تھے مگر ایک شام یا ایک صبح“۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مکہ مکرمہ کے مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاق کے انداز میں سوال کیا: قیامت کب برپا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے اس آیت کی تفسیر میں روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لگاتار قیامت کے بارے میں سوال کرتے رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾۔

مُرْسٰىهَا کا معنی اس کا قائم ہونا ہے۔ فراء نے کہا: رسوها کا معنی اس کا قیام ہے جس طرح کشتی ٹھہرتی ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کا معنی اس کی انتہا ہے کیونکہ مرسی السفينة اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کشتی لنگر انداز ہوتی ہے؛ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ربیع بن انس نے کہا: اس کا کون سا زمانہ ہے؟ معنی قریب قریب ہے۔ سورۃ الاعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قیامت برپا نہیں ہوگی مگر ایک غصہ کے

1۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 31
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 453

ساتھ جو تیرا رب فرمائے گا"۔ اے محمد! (ﷺ) تجھے کیا پڑی کہ آپ ﷺ قیامت کا ذکر کریں یا اس کے بارے میں سوال کریں۔ یعنی آپ ﷺ کو اس کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وہ معنی ہے جو زہری نے حضرت عروہ بن زبیر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ لگاتار قیامت کے بارے میں سوال کرتے رہے یہاں تک کہ یہ آیات نازل ہوئیں۔ یعنی تیرے رب کے پاس اس کی انتہا ہے گویا جب مشرکین نے آپ ﷺ سے اس بارے میں بہت زیادہ سوال کیے تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں سوال کیا تا کہ اسے پہچان لیں، تو آپ ﷺ سے یہ فرمایا گیا کہ آپ ﷺ سوال نہ کریں آپ ﷺ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مشرکوں کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار ہو جو انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تھا، یعنی آپ کو اس سے کیا غرض یہاں تک کہ وہ اس کی وضاحت آپ سے پوچھیں آپ ﷺ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اس کا علم رکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ذکریٰ، ذکر کے معنی میں ہے اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۞ یعنی اس کے علم کی انتہا تیرے رب کے پاس ہے قیامت کے وقوع کا علم کسی اور کے پاس نہیں یہ آیت بھی اسی طرح ہے جس طرح یہ ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ (الاعراف: 187) فرما دیجئے: اس کا علم میرے رب کے پاس ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان: 34) بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی قیامت کا علم ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ۞ مُنْذِرُ کا معنی ڈرانے والا ہے۔ ڈرانے کو ڈرنے والے کے ساتھ خاص کیا کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتا ہے اگرچہ سرور دو عالم ﷺ ہر کسی کو خبردار کرنے والے ہیں، یہ آیت بھی اسی طرح ہے جس طرح یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یاسین: 11) آپ ﷺ اسے خبر کرنے والے ہیں جو ذکر کی اتباع کرے اور بن دیکھے رحمن سے ڈرے۔ عام قراء کی قراءت منذر تنوین کے بغیر اضافت کے ساتھ ہے مقصود تخفیف ہے ورنہ اصل میں تو اس کے آخر میں تنوین ہے، کیونکہ یہ مستقبل کے معنی میں ہے کیونکہ جب یہ ماضی کا معنی دے تو اس پر تنوین نہیں آتی۔ فراء نے کہا: تنوین اور اس کا ترک دونوں طرح جائز ہے جس طرح اس میں دونوں قرائتیں جائز ہیں بالغٌ أمرہ، بالغُ أمرہ، موھنٌ کید الکافرین، موھنُ کید الکافرین تنوین ہی اصل ہے۔ ابو جعفر، شیبہ، اعرج، ابن محیصن، حمید اور عیاش نے ابو عمرو سے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہو گا تیرے خبردار کرنے سے وہ نفع حاصل کرے گا جو قیامت سے ڈرتا ہے۔ ابو علی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ اضافت ماضی کے لیے ہو جس طرح ضارب زید أمس کیونکہ وہ خبردار کر چکا تھا۔ یہ آیت ان افراد کا رد کر رہی ہے جنہوں نے یہ کہا: احوال آخرت غیر محسوس ہیں، یہ صرف روح کی راحت اور اس کا دکھ ہے کسی قسم کا احساس نہیں ہو گا۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۞ گویا کفار جس وقت وہ قیامت کو دیکھیں گے وہ کہیں گے: وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر ایک رات بھر یا دن بھر وہ دن جو اس رات کے ساتھ ملا ہوا ہے مراد قلیل مدت کا اظہار ہے، جس طرح یہ فرمایا: لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ (الاحقاف: 35) وہ نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: گویا جب وہ اسے دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: وہ اس میں نہیں ٹھہرے مگر ایک دن۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ قبروں میں نہیں ٹھہرے مگر ایک رات یا اس کا دن۔ گویا جب وہ اس کی ہولنا کی کو دیکھیں گے تو وہ قبروں میں ٹھہرنے کی مدت کو قلیل جانیں گے۔ فراء نے کہا: کہنے والا کہے گا کیا اس رات کی چاشت بھی ہے؟ ضحا دن کے ابتدائی حصہ کو کہتے ہیں لیکن ضحا کو عشیہ کی طرف مضاف کیا اس سے مراد وہ دن ہوتا ہے جس میں وہ آدمی ہوتا ہے۔ عربوں کی عادت یہی ہوتی ہے وہ یوں کہتے ہیں: آتیك الغداة أو عشيتها، آتيك العشية أو غداتها اس میں عَشِيَّةً کا لفظ دن کا آخری حصہ ہوتا ہے اور غداۃ دن کا پہلا پہر ہوتا ہے۔

بنی عقیل کے ایک آدمی نے مجھے یہ سنایا: عشية الهلال أو سرارها (1) چاند کی شام یا شام کے آخری حصہ میں۔ اس نے یہاں عشية الهلال اور سرار العشية مراد لیا ہے یہ آتيك الغداة أو عشيها سے زیادہ شدید ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 101

# سورۂ عبس

آیاتہا ۴۲ ۸۰ سورۃ عبس مکیۃ ۲۴ رکوعہا ۱

تمام کے نزدیک مکی سورت ہے۔ اس کی بیالیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو انتہائی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾

''چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (اس وجہ سے کہ) ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جاتا یا وہ غور وفکر کرتا تو نفع پہنچاتی اسے یہ نصیحت''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

## ان آیات کا شان نزول

**مسئلہ نمبر 1**۔ عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ﴿۲﴾ اس نے چہرے پر تیوری چڑھائی یہ جملہ بولا جاتا ہے: عَبَسَ وبَسَرَ اس پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے، اس نے چہرے کو دوسری طرف کر لیا اَنۡ جَآءَ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے معنی یہ ہوگا اس لیے کہ اس کے پاس اندھا آیا یعنی جو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ علماء تفسیر نے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش کے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مسلمان ہونے کی خواہش رکھتے تھے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم حاضر ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قطع کلامی کو ناپسند کیا اور ان سے رخ انور پھیر لیا، تو یہ آیات حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ہشام بن عروہ نے حضرت عروہ سے روایت نقل کی کہ یہ آیات حضرت ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے قریب جگہ دیجئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرک رؤسا موجود تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اعراض کرنے لگے اور دوسرے افراد کی طرف توجہ فرمانے لگے اور فرماتے: ''اے فلاں کیا میں جو کچھ کہتا ہوں اس میں تو کوئی حرج پاتا ہے؟'' وہ کہتا بتوں کی قسم! جو آپ کہتے ہیں ان میں کوئی کمی نہیں پاتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ﴿۱﴾ کو نازل فرمایا (1)۔

ترمذی میں مسند روایت ہے کہ سعید بن یحییٰ بن سعید اموی اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہا: یہ روایت ہم نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی

ہشام بن عروہ پر پیش کی وہ اسے اپنے باپ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ یہ آیات حضرت ابن ام مکتوم کے حق میں نازل ہوئیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے وہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! میری راہنمائی کیجئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین کے سرداروں میں سے ایک آدمی موجود تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اعراض کرنے لگے اور سردار کی طرف توجہ کرنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ''جو میں کہتا ہوں کیا تو اس میں کوئی حرج دیکھتا ہے؟'' وہ کہتا: نہیں، اس بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے (1)۔

## سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں قریش کے کون سے سردار موجود تھے؟

**مسئلہ نمبر 2۔** یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عتاب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ام مکتوم سے اعراض کیا اسے عمرو بن ام مکتوم کہتے ام مکتوم کا نام عاتکہ بنت عامر بن مخذوم تھا یہ عمرو ابن قیس بن زائدہ بن اصم ہے یہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ماموں زاد بھائی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں میں سے ایک عظیم آدمی کے ساتھ مصروف گفتگو تھے جسے ولید بن مغیرہ کہا جاتا۔ ہمارے علماء مالکیہ میں سے ابن عربی نے کہا یہ قول کیا گیا ہے جس کی کنیت ابو عبد شمس تھی۔ قتادہ نے کہا: وہ امیہ بن خلف تھا۔ انہیں سے یہ قول مروی ہے: وہ ابی بن خلف تھا۔ مجاہد نے کہا: وہ تین افراد تھے عتبہ، شیبہ جو دونوں ربیع کے بیٹے تھے اور ابی بن خلف۔ عطا نے کہا: وہ عتبہ بن ربیعہ تھا۔ حضرت سفیان ثوری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا عباس کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ زمخشری نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریش کے سردار تھے، عتبہ، شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے، ابوجہل بن ہشام، عباس بن عبدالمطلب، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ امید رکھتے تھے کہ ان کے اسلام لانے سے دوسرے لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔ جہاں تک ہمارے علماء کا تعلق ہے ان کا کہنا ہے: وہ ولید بن مغیرہ ہے۔ دوسروں نے کہا: وہ امیہ بن خلف اور عباس تھے یہ سب باطل ہے اور مفسرین کی ایک جانب سے جہالت ہے جنہوں نے دینی معاملات میں کوئی تحقیق نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے امیہ بن خلف اور ولید دونوں مکہ مکرمہ میں تھے اور ابن ام مکتوم مدینہ طیبہ میں تھے وہ ان دونوں کے ساتھ اکٹھے نہ ہوئے اور نہ وہ دونوں ان کے ساتھ اکٹھے ہوئے وہ دونوں کافر مرے ان میں سے ایک ہجرت سے پہلے اور دوسرا ہجرت کے بعد غزوۂ بدر کے بعد۔ ان میں سے کسی نے بھی مدینہ کا قصد نہ کیا وہ نہ اکیلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور نہ ہی کسی اور کے ساتھ (2)۔

## آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ انور پھیرنے کا سبب

**مسئلہ نمبر 3۔** حضرت ابن ام مکتوم حاضر ہوئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس موجود قریش کے سرداروں سے محو کلام تھے انہیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے ان کے اسلام لانے کی قوی امید تھی اس کے اسلام لانے سے ان کی قوم کے بے شمار

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ عبس، حدیث نمبر 3254، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ حضرت مفسر کی یہ رائے توجہ طلب ہے جب یہ واضح کیا کہ سورت مکی ہے اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ماموں زاد ہیں تو یہ ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی نہ کہ مدینہ طیبہ میں۔

لوگوں کے اسلام لانے کا امکان تھا۔ حضرت ابن مکتوم آئے جبکہ وہ نابینا تھے عرض کی: اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو تعلیم دی ہے اس کی مجھے تعلیم دیں۔ وہ نبی کریم ﷺ کو ندا کرنے لگے اور ندا میں کثرت کرنے لگے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کسی اور کے ساتھ مصروف کلام ہیں یہاں تک کہ قطع کلامی کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہونے لگے آپ ﷺ نے دل میں سوچا یہ لوگ کہیں گے کہ آپ ﷺ کے پیروکار نابینے، کم مرتبہ اور غلام ہیں۔ آپ نے تیوری چڑھائی اور رخ انور پھیر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ثوری نے کہا: اس کے بعد نبی کریم ﷺ جب بھی حضرت ابن ام مکتوم کو دیکھتے اس کے لیے چادر بچھاتے اور کہتے: ''اے خوش آمدید! جن کے متعلق میرے رب نے مجھے عتاب کیا'' آپ فرماتے: ''کیا کوئی کام ہے؟'' آپ ﷺ نے انہیں دو دفعہ دو غزوات کے موقع پر مدینہ طیبہ میں اپنا نائب بنایا۔ حضرت انس نے کہا: میں نے انہیں قادسیہ کے دن سواری پر سوار دیکھا جبکہ انہوں نے زرہ پہنی ہوئی تھی اور ان کے پاس سیاہ جھنڈا تھا۔

### حضرت عبداللہ کا فعل درست نہ ہونے کے باوجود عتاب کیوں؟

**مسئلہ نمبر 4**۔ ہمارے علماء نے کہا: حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے جو کچھ کیا یہ سوء ادبی تھی اگر وہ جانتے ہوتے کہ نبی کریم ﷺ کسی اور کے ساتھ گفتگو میں شریک ہیں اور آپ ﷺ ان کے اسلام لانے کی امید کرتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے آپ ﷺ کو عتاب کیا تا کہ اہل مدینہ کے دل نہ ٹوٹ جائیں یا یہ معلوم ہو جائے کہ مومن فقیر غنی سے بہتر ہے اور مومن کی طرف توجہ کرنا اگرچہ وہ فقیر ہو یہ زیادہ مناسب اور بہتر ہے تا کہ وہ ایمان لے آئیں اگرچہ ایسے آدمی کی طرف توجہ کرنا بھی مصلحت کا تقاضا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى (الانفال: 67) نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے قیدی ہوں۔ جیسے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آدمی کی تالیف کا قصد کیا کیونکہ آپ ﷺ کو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کے دل میں جو ایمان تھا اس پر اعتماد تھا۔ جس طرح حضور ﷺ نے ارشاد میں ہے: ''ایک آدمی سے صلہ رحمی کرتا ہوں جبکہ دوسرا آدمی مجھے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس خوف سے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں منہ کے بل نہ پھینک دے''(1)۔

### سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ کے کس فعل کو ناپسند کرتے ہوئے رخ انور پھیرا

**مسئلہ نمبر 5**۔ ابن زید نے کہا: نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن مکتوم کے ساتھ اس لیے سخت رویہ اپنایا اور ان سے اعراض کیا کیونکہ جو آدمی انہیں لا رہا تھا اسے آپ ﷺ نے اشارہ کیا تھا کہ وہ حضرت ابن مکتوم کو آگے آنے سے روکے۔ حضرت ابن مکتوم نے اسے دھکا دیا اور بات ماننے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ سے کلام کرے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ اسے تعلیم دیں اس میں ان کی طرف سے کچھ جفا کا پہلو تھا اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کی اور غائب کا صیغہ ذکر کیا مقصود نبی کریم ﷺ کی شان کا اظہار تھا یہ نہیں فرمایا: عبست وتولیت پھر انس پیدا کرنے کے لیے خطاب کا صیغہ ذکر کیا اور فرمایا: وَمَا يُدْرِيْكَ۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی

وَ مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ کس چیز نے آپ ﷺ کو آگاہ کیا ممکن ہے ابن مکتوم اس چیز کے ذریعے جس کی انہوں نے تم سے استدعا کی کہ وہ آپ ﷺ سے قرآن ودین کی تعلیم سیکھیں وہ اپنے دین میں طبیعت کی زیادتی اور اپنے آپ سے جہالت کی تاریکی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لَعَلَّهٗ کی ضمیر کافر کے لیے ہو یعنی جب آپ ﷺ نے یہ طمع کیا کہ وہ اسلام قبول کر کے پاکیزہ ہو جائے یا وہ نصیحت حاصل کرے اور یہ نصیحت اسے قبول حق تک لے جائے آپ ﷺ کو کس نے آگاہ کر دیا کہ آپ ﷺ نے جو طمع کی ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔حمزہ نے اسے اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ پر محمول کیا ہے یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر عَبَسَ وَ تَوَلّٰىٓ ۝ دلالت کرتا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی اان جاءہ أعرض عنہ وتولی جب ہمزہ استفہام کی صورت میں قراءت کی جائے گی تو اس وقت تَوَلّٰى پر وقف ہوگا اور جب استفہام کے بغیر قراءت کی جائے تو اس پر وقف نہیں کیا جائے گا۔یہ عام قراء کی قراءت ہے۔

### دیگر مقامات عتاب

**مسئلہ نمبر 6**۔عتاب میں اس آیت کی مثل سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ (الانعام:52) جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں ان کو دور نہ کرو۔اسی طرح سورۂ کہف میں ہے وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (کہف:28) اور اس قسم کی جو دوسری آیات ہیں۔واللہ اعلم۔

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ یا جو آپ ﷺ کہتے تو وہ اس سے نصیحت حاصل کرتا اور نصیحت اسے نفع دیتی۔عام لوگوں کی قراءت فتنفعه کے عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اس کا عطف يَزَّكّٰى پر ہے۔عاصم، ابن ابی اسحاق اور عیسیٰ نے اسے فتنفعه عین کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ سلمی اور زر بن حبیش کی قراءت ہے یہ لعل کا جواب ہے کیونکہ یہ (لعل) غیر موجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ (غافر) پھر فرمایا: فَاَطَّلِعَ۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَ هُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝

"لیکن جو پرواہ نہیں کرتا آپ اس کی طرف تو توجہ کرتے ہیں۔اور آپ پر کوئی ضرر نہیں اگر وہ نہ سدھرے۔اور جو آپ کے پاس آیا ہے دوڑتا ہوا اور وہ ڈر بھی رہا تھا تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں"۔

جو خوشحال وغنی ہے آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کی بات توجہ سے سنتے ہیں۔تَصَدّٰى کا معنی توجہ سے بات سننا ہے؛ راعی نے کہا:

تصدّٰی لوضاح کأنّ جبینه		سراج الدّجی یحنی إلیه الأساوِرُ

وہ وضاح کے سامنے آیا گویا اس کی پیشانی تاریکیوں کا چراغ ہے بڑے بڑے سردار اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اس کی اصل تصدد ہے جو صدٌ سے مشتق ہے یہ وہ چیز ہوتی ہے جو تیرے سامنے آئے اور تیرے بالمقابل ہو جائے کہا جاتا ہے: داری صدد دارہ۔میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے، اسے ظرف کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ایک قول یہ کیا گیا

ہے: یہ صدی سے مشتق ہے جس کا معنی پیاس ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس غنی کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے ہیں جس طرح پیاسا پانی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مصاداۃ کا معنی بالمقابل ہونا ہے۔ عام قراء کی قراءت تصدی صاد کی تخفیف کے ساتھ ہے تخفیف کے لیے دوسری تاء کو حذف کر دیا گیا۔ نافع اور ابن محیصن نے ادغام کی صورت میں صاد کو مشدد پڑھا ہے۔

یہ کافر ہدایت نہ پاتے، ایمان نہ لاتے تب بھی آپ پر کوئی حرج نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف رسول ہیں آپ کے ذمہ صرف پیغام حق پہنچانا ہے۔

رہا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے لیے علم کا طالب ہے وہ تیزی کرتے ہوئے آیا جب کہ وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رخ انور پھیر لیتے ہیں اور کسی اور کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ تَلَهّٰى اصل میں تتلهى تھا یوں جملہ بولا جاتا ہے: لهيتُ عن الشئِ ألهى میں نے اس سے اعراض کرنے کے لیے بناوٹی مشغول ہوا۔ تَلَهّٰى کا معنی تغافل ہے۔ لهيت عنه وتلتهيت عنه دونوں کا معنی ایک ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

"ایسا نہ چاہیے یہ تو نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے۔ یہ ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو معزز ہیں جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں، ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے ہیں جو بڑے بزرگ اور نیکوکار ہیں"۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ كَلَّآ یہ ردع اور زجر کا کلمہ ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کے ساتھ رویہ اپنایا ہے معاملہ ایسا نہیں یعنی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غنی کی طرف متوجہ ہوں اور مومن فقیر سے اعراض کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو رویہ ظاہر ہوا وہ ترک اولیٰ کے ضمن میں آتا ہے جس طرح پہلے یہ بحث گزر چکی ہے اگر اسے گناہ صغیرہ پر محمول کیا جائے تو یہ بھی بعید نہیں؛ یہ قشیری کا قول ہے۔ اس صورت میں كَلَّآ سے ابتداء کی جائے جو حقا کے معنی میں ہو۔ اِنَّهَا میں ضمیر سے مراد سورت اور قرآن کی آیات ہیں۔ تَذْكِرَةٌ سے مراد نصیحت ہے یعنی مخلوق کے لیے نصیحت۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ جو چاہے قرآن سے نصیحت حاصل کرے۔ جرجانی نے کہا: اِنَّهَا میں ضمیر قرآن کے لیے ہے قرآن کا لفظ مذکر ہے مگر جب قرآن کو تذکرہ بنا دیا تو ضمیر تَذْكِرَةٌ کے اعتبار سے ذکر کی اگر ضمیر مذکر ذکر کی جاتی تو یہ بھی جائز تھا جس طرح ایک اور موقع پر فرمایا: كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ (المدثر) خبردار وہ نصیحت ہے۔ جو چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے وہ یہ ارشاد ہے فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ یعنی وہ اس کو یاد کرنے والا ہوا سے بھولنے والا نہ ہو، یہاں ضمیر کو مذکر ذکر کیا کیونکہ تذکرہ ذکر اور وعظ کے معنی میں ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں چاہتا ہے اس کی طرف الہام فرما دیتا ہے۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ صُحُفٍ صحیفہ کی جمع ہے وہ صحیفے اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے محترم ہیں؛ یہ سدی کا قول ہے۔ طبری نے

کہا: یہ دین میں مکرم ہیں کیونکہ ان میں علم اور حکمتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مکرم اس لیے ہیں کیونکہ انہیں معزز فرشتے لاتے ہیں یا اس لیے کیونکہ یہ لوح محفوظ ہے نازل ہونے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس لیے معزز ہیں کیونکہ یہ کریم کی جانب سے نازل ہوئے کیونکہ کتاب کی شرافت کتاب والے کی بزرگی سے ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد انبیاء کی کتب ہیں اس کی دلیل اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۝ (الاعلیٰ) ہے۔

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ الله تعالیٰ کے ہاں ان کی شان بڑی بلند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ الله تعالیٰ کے ہاں بلند ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ساتویں آسمان میں بلند ہیں؛ یہ یحییٰ بن سلام کا نقطہ نظر ہے۔ طبری نے کہا: ان کا ذکر اور قدر بلند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ شبہ اور تناقض سے بلند ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا: وہ ہر میل سے پاک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس سے محفوظ ہیں کہ کفار اس کو پائیں؛ یہی سدی کے قول کا معنی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ اس سے پاک ہیں کہ کفار پر نازل ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ قرآن فرشتوں کے لیے صحیفوں میں ثبت کر دیا گیا ہے وہ انہیں پڑھتے ہیں وہ صحیفے مکرم، بلند اور پاکیزہ ہیں۔

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ سَفَرَةٍ سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں الله تعالیٰ نے اپنے اور رسولوں کے درمیان سفیر بنایا ہے وہ نیک ہیں وہ معصیت سے آلودہ نہیں۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: وہ صحیفہ پاکیزہ ہیں اسے بھی پاک بنا دیتے ہیں جو ان سفرہ کا حامل بنے۔ سفرہ کا معنی کاتب بھی ہے مجاہد نے بھی یہ کہا ہے: اس سے مراد وہ معزز فرشتے ہیں جو نامہ اعمال میں بندوں کے افعال لکھتے ہیں۔ اس کی واحد سافر ہے جس طرح کاتب کی جمع کتبہ ہے کہا جاتا ہے: سفرت یعنی میں نے لکھا کتاب کو سَفر کہتے ہیں اس کی جمع اسفار آتی ہے۔ زجاج نے کہا: کتاب کو سفر کہتے ہیں اور کاتب کو سافر کہتے ہیں کیونکہ اس کا معنی ہے کہ وہ ایک چیز کو واضح کرتا ہے اور وضاحت کرتا ہے جملہ بولا جاتا ہے: اسفر الصبح جب صبح روشن ہو جائے۔ سفرت المرأة جب وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دے اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سفرت بین القوم أسفر سفارة یعنی میں نے ان کے درمیان مصالحت کرائی؛ یہی قول فراء نے کیا ہے اور یہ شعر پڑھا:

فما أدعُ السِّفارةَ بين قومي　　ولا أمشِي بغِشٍّ إن مَشَيْتُ

میں اپنی قوم میں مصالحت کے فریضہ کو نہ چھوڑوں گا اگر میں اس کام کے لیے چلا تو دھوکہ سے نہ چلوں گا۔

السفیر سے مراد رسول اور قوم میں مصلح ہے اس کی جمع سفراء آتی ہے جس طرح فقیہ کی جمع فقہاء آتی ہے عبرانی زبان میں کاتبوں کو سفراء کہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: یہاں سَفَرَةٍ سے مراد قراء ہیں کیونکہ وہ کتابیں پڑھتے ہیں ان سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی طرح بھی قول مروی ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ تھے لیکن اس آیت میں وہ مراد نہیں اور اس آیت سے جو مراد ہیں ان کے قریب بھی نہیں بلکہ جب یہ لفظ مطلق بولا جائے تو اس وقت صرف ملائکہ مراد ہوں گے ان کے علاوہ کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں جب اس آیت سے مراد ان کے علاوہ ہوں ان کے ساتھ یہ اس میں

شامل نہیں۔ صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی قرآن حکیم کی قراءت کرتا ہے جبکہ وہ حافظ ہو وہ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ کے ساتھ ہوگا۔ وہ آدمی جو اس کی قراءت کرتا ہے اور اس کے لیے تگ و دو کرتا ہے جبکہ یہ امر اس پر مشکل ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں''۔ متفق علیہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ اپنے رب پر کریم ہیں؛ یہ کلبی کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ معاصی سے بالا ہیں وہ اپنے آپ کو نافرمانیوں سے بلند رکھتے ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كِرَامٍ کی یہ وضاحت نقل کی ہے وہ فرشتے اس سے بالا ہیں کہ جب خاوند اپنی بیوی کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرے یا قضائے حاجت کے لیے پردہ کھولے تو وہ اس بندے کے ساتھ ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ دوسروں کے منافع کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ بار کی جمع ہے جس طرح كَفَرَة، کافر کی جمع ہے سَحَرَة، ساحر کی جمع ہے۔ فجرہ، فاجر کی جمع ہے برّ اور بار جب وہ سچ کا اہل ہو۔ اس سے بر فلان فی یمینہ فلاں اپنی قسم میں سچا ہے فلاں یبر خالقہ ویتبررہ فلاں اپنے خالق کی اطاعت کرتا ہے۔ بَرَرَةٍ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں، اپنے اعمال میں اللہ تعالیٰ کے لیے سچے ہیں سورۂ واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ (واقعہ) وہ قرآن حکیم ہے محفوظ کتاب میں ہے اسے پاکیزہ لوگ ہی چھوتے ہیں۔ وہی اس سورت میں كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ ہے۔

**قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾**

''غارت ہو (منکر) انسان وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔ ایک بوند سے، اسے پیدا کیا پھر اس کی ہر چیز اندازہ سے بنائی پھر (زندگی کی) راہ اس پر آسان کردی پھر اسے موت دی اور اسے قبر میں پہنچادیا، پھر جب چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کر دے گا۔ یقیناً وہ بجا نہ لایا جو اللہ نے اسے حکم دیا تھا''۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ قُتِلَ لعن کے معنی میں ہے یعنی اس پر لعنت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسے عذاب دیا جائے۔ انسان سے مراد کافر ہے۔ اعمش نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے: قرآن میں جہاں بھی قُتِلَ الْاِنْسَانُ کے الفاظ ہیں اس سے مراد کافر ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ عتبہ بن ابی لہب کے حق میں نازل ہوئی، وہ ایمان لایا تھا جب سورۂ نجم نازل ہوئی تو وہ مرتد ہو گیا تھا اس نے کہا تھا: میں تمام قرآن پر ایمان لایا سوائے سورۃ النجم کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیات نازل کیں یعنی عتبہ پر لعنت ہو کیونکہ اس نے قرآن کا انکار کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں بددعا کی: اللّٰھم سَلِّطْ علیہ کلبكَ أسدَ الغاضرۃ اے اللہ! اس پر غاضرہ کا شیر مسلط کر دے۔ وہ اس کے تھوڑے عرصہ بعد شام کی طرف تجارت کے لیے گیا جب وہ غاضرہ کے مقام پر پہنچا تو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یاد آگئی جو لوگ اس کے ساتھ تھے ان سے اس نے کہا: اگر اس نے صبح زندہ انداز میں کی تو ان کے لیے ہزار دینار ہوں گے،

ان ساتھیوں نے اسے درمیان میں رکھا اور اپنا سامان اس کے اردگرد رکھ دیا وہ اس حالت میں تھے کہ ایک شیر آیا جب وہ سامان کے قریب پہنچا تو اس نے چھلانگ لگائی تو وہ عتبہ کے اوپر پہنچ گیا اور اسے پھاڑ دیا اس کے باپ نے اس پر آہ و زاری کی اور رو یا اور کہا: محمد ﷺ نے جو بات بھی کی وہ پوری ہوئی۔

ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مَآ اَكْفَرَهٗ کا معنی ہے کس چیز نے اس کو کفر پر برانگیختہ کیا؟ ایک قول یہ کیا گیا: ما تعجبیہ ہے عربوں کی عادت ہے جب وہ کسی چیز سے متعجب ہوتے تو کہتے: قاتله الله ما أحسنه، أخزاه الله ما أظلمه۔ اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے وہ کتنا حسین ہے، اللہ تعالیٰ اسے رسوا کرے وہ کتنا ظالم ہے۔ معنی یہ ہوگا جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس کے بعد بھی انسان کفر کرے تو اس پر تعجب کا اظہار کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی نعمتوں پر کتنی ناشکری کرنے والا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کتنا احسان کیا ہے۔ یہ بھی تعجب کے اظہار کے لیے ہے۔ ابن جریج نے کہا: وہ کتنا ہی شدید کافر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما استفہامیہ ہے یعنی وہ کون سی چیز ہے جو اسے کفر کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ یہ استفہام توبیخ کے لیے ہے ما تعجب کا احتمال رکھتا ہے اور اسی کے معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے پس یہ استفہامیہ ہوگا۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کافر کو کس چیز سے پیدا کیا ہے کہ وہ تکبر کا اظہار کرتا ہے؟ یعنی اس کی خلقت پر تعجب کا اظہار کرو۔ تھوڑے سے پانی سے جو حقیر ہے، جامد ہے تو وہ اپنے بارے میں کس وجہ سے مغالطہ کا شکار ہوتا ہے؟ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ آدمی جو بول کے راستہ دو دفعہ نکلا وہ کیسے تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی ماں کے پیٹ میں مقدر کیا۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ اس کے ہاتھوں، اس کے پاؤں، اس کی آنکھوں، تمام اعضاء، حسن، بدصورتی، لمبا، چھوٹا، بدبخت اور سعادت مند ہونے کو مقدر کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَقَدَّرَهٗ کا معنی ہے اسے کامل بنایا جس طرح ارشاد فرمایا: اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ (کہف) کیا تو اس کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا اور فرمایا: الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ (الانفطار: 7) جس نے تجھے پیدا کیا اور درست بنایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے اس کے کئی مراحل بنائے ایک حالت سے دوسری حالت، پہلے نطفہ پھر علقہ پھر اس کی خلقت کو مکمل کر لیا۔

ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ عطا، قتادہ، سدی اور مقاتل نے کہا: ماں کے پیٹ سے نکلنے کو آسان کر دیا۔ مجاہد نے کہا: اس کے لیے خیر اور شر کے راستہ کو واضح کر دیا، اس کی دلیل اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ (الانسان: 3) ہم نے اس کی راستہ کی طرف راہنمائی کی۔ وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ﴿۱۰﴾ (البلد) ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے: یہ حضرت حسن بصری، عطا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: شقاوت اور سعادت کا راستہ۔ ابن زید نے کہا: اسلام کا راستہ۔ ابو بکر بن طاہر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے اس چیز کو آسان کر دیا جس کے لیے اسے

پیدا کیا تھا اور اس پر اسے قدرت دے دی، اس پر دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: اعملوا فکل میسر لما خلق له عمل کرتے جاؤ ہر ایک کے لیے اسی امر کو آسان کر دیا جائے گا جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ یعنی اس کے لیے قبر بنائی تا کہ اس میں چھپایا جائے۔ یہ حکم اس کی تکریم کے لیے دیا اسے ان چیزوں میں سے نہیں بنایا جن کو زمین پر پھینک دیا جاتا ہے جسے پرندے اور درندے کھاتے ہیں؛ یہ فراء نے کہا: ابو عبیدہ نے کہا: اقبرہ کا معنی ہے اس کے لیے قبر بنائی اور حکم دیا کہ اسے قبر میں دفن کیا جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا: جب عمر بن ہبیرہ نے صالح بن عبد الرحمن کو قتل کیا تو بنو تمیم نے کہا جبکہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے: اقبرنا صالحا تو جواب میں کہا: دونکموہ خود ہی یہ ذمہ داری ادا کر لو کہا: اقبرہ، قبرہ نہیں کہا کیونکہ قبرہ اسے کہتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے دفن کرے یہ جملہ بولا جاتا ہے: قبرت المیت جب تو اسے دفن کرے، أقبرہ اللہ جب اسے اس طرح بنا دے کہ اسے دفن کیا جائے اور اس کے لیے قبر بنائی جائے عرب کہتے ہیں: بترت ذنب البعیر میں نے اونٹ کی دنب کاٹی۔ أبترہ اللہ اللہ تعالیٰ نے اسے دم بریدہ کر دیا۔ عقبت قرن الثور میں نے بیل کا سینگ کاٹا۔ أعقبہ اللہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے سینگ کر دیا۔ طردت فلانا میں اسے دھتکارا۔ اللہ اطردہ اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارا ہوا بنا دیا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ جب چاہے گا موت کے بعد زندہ کر دے، عام قراء کی قراءت أنشرہ ہے۔ ابو حیوہ نے نافع اور شعیب بن ابی حمزہ سے شاء نشرہ نقل کی ہے یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: انشرہ اللہ المیت ونشرہ۔ اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کر دیا۔ اعشیٰ نے کہا:

حتّى يقولَ الناسُ مما رأوا يا عَجَبًا لِلميّتِ الناشِرِ

لوگوں نے جو دیکھا اس کی وجہ سے وہ کہیں اس میت پر تعجب ہے جو اٹھنے والا ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ مجاہد اور قتادہ نے کہا: کسی نے بھی اس کا حق ادا نہ کیا جو اسے حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: اس کا معنی ہے اس نے اس وعدہ کو پورا نہیں کیا جو اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکال کر اس سے لیا گیا تھا۔ پھر کہا گیا: كَلَّا یہ جھڑکنے کے لیے ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح کافر کہتا ہے کیونکہ کافر کو جب دوبارہ اٹھنے کی خبر دی جائے گی تو وہ کہے گا: اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میرے لیے اس کے ہاں اچھا ٹھکانہ ہوگا۔ بعض اوقات وہ کہے گا: مجھے جو حکم دیا گیا تھا میں نے اس کا حق ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہرگز نہیں اس نے آج تک کوئی چیز پوری نہیں کی بلکہ وہ میرے ساتھ کفر کرنے والا تھا اور میرے رسول کا انکار کرنے والا تھا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ درست نہیں کہ اس نے حق ادا نہیں کیا، یعنی اسے جو حکم دیا گیا تھا اس پر عمل نہیں کیا۔ لما میں ما کلام کا سہارا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (آل عمران: 159) عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ (مومنون) فَبِمَا اور عَمَّا میں ما کی یہی حیثیت ہے۔ امام ابن فورک نے کہا: معنی ہے یقینا اللہ تعالیٰ نے کفار کو ایمان کا جو حکم دیا اس کا فیصلہ نہ کیا تھا بلکہ اس چیز کا حکم دیا جس کو مقدر نہ کیا تھا۔ ابن انباری نے کہا: كَلَّا پر وقف قبیح ہے امرہ اور نشرہ پر وقف عمدہ ہے

اس صورت میں کلّا، حق کے معنی میں ہوگا۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

''پھر انسان غور سے دیکھے اپنی غذا کو، بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور (طرح طرح کے) پھل اور گھاس، سامان زیست ہے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے''۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے آغاز کا ذکر کیا پھر اسے جو رزق دیا گیا اس کا ذکر کیا کہ انسان دیکھے تو سہی اللہ تعالیٰ نے اس کا کھانا کیسے پیدا کیا یہ نظر دل کی نظر ہے کہ وہ فکر کرے یعنی وہ غور تو کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کھانے کو کیسے پیدا کیا جو اس کی زندگی کا سہارا ہے اور اس کے لیے کیسے زندگی کے اسباب کو بنایا تاکہ وہ آخرت کی تیاری کرے۔ حضرت حسن بصری اور مجاہد سے مروی ہے دونوں نے کہا: کہ وہ اپنے کھانے اور قضائے حاجت کی طرف دیکھے۔ ابن ابی خیثمہ نے ضحاک بن سفیان کلابی سے روایت نقل کی ہے کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے ضحاک! تیرا کھانا کیا ہے؟'' میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم گوشت اور دودھ۔ فرمایا: ''پھر وہ کیا ہو جاتا ہے؟'' میں نے عرض کی: وہی جسے آپ جانتے ہیں فرمایا: ''انسان سے جو نکلتا ہے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ساتھ اس کی مثال بیان کی ہے''۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''انسان کے کھانے کو دنیا کی مثال بنا دیا گیا اگرچہ وہ اسے لذیذ بنانے کے لیے مصالحہ ڈالے اور اسے نمکین بنائے دیکھو تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے''۔ ابو الولید نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا وہ بیت الخلا میں داخل ہوتا ہے تو اس کے جسم سے جو چیز نکلتی ہے اسے دیکھتا ہے فرمایا: ایک فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور اسے کہتا ہے: دیکھو تو جس چیز میں بخل کیا کرتا تھا اس کا انجام کیا ہوا ہے (1)۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ عام قراء کی قراءت اِنَّا کی صورت میں ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے کوفیوں اور رومیوں نے یعقوب سے روایت کی ہے کہ انا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ محل جر میں ہے کیونکہ یہ طعام سے بدل ہے گویا یوں کلام کی گئی ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ اس قراءت میں طَعَامِهٖ پر وقف کرنا اچھا نہیں اس طرح جب آپ اسے محل رفع میں رکھیں اور ھو ضمیر مضمر مانیں کیونکہ رفع کی صورت میں بھی طعام کی وضاحت کرے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کیونکہ ہم نے پانی برسایا اس کے ذریعے کھانا نکالا یعنی یہ اس طرح تھا۔ حسین بن علی نے اسے انی پڑھا ہے جو کیف کے معنی میں ہے جس نے اس قراءت کو اپنایا ہے اس نے طَعَامِهٖ پر وقف تام کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: انی، این کے معنی میں ہے اس وقت یہ وجوہ سے کنایہ ہوگا معنی ہوگا جس صورت میں ہم نے پانی برسایا۔ کمیت نے کہا: أَنّٰى وَمِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 439

أین آبكَ الطَّرَبُ کیسے اور کہاں سے تجھے تک نشاط پہنچی؟

صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ یعنی ہم نے بارش کو نازل کیا۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ ہم نے زمین کو نباتات سے پھاڑا پھر ہم نے اس میں گندم، جو وغیرہ جن چیزوں کو کاٹا جاتا ہے اور ذخیرہ کیا جاتا ہے ان کو اگایا جو قت (ایک دانا جو صحراء میں ہوتا ہے لوگ اسے کوٹ کر کھاتے ہیں) اور چارہ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اسے قضب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کے ظہور کے بعد اسے بار بار کاٹا جاتا ہے۔ قتبی اور ثعلب نے کہا: اہل قت کو قضب کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد تر کھجوریں ہیں کیونکہ انہیں کھجور کے درخت سے کاٹا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے عنب کا ذکر کیا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد فصفصہ یہ ترقت ہوتا ہے۔ خلیل نے کہا: قضب سے مراد تر فصفصہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ فسفسہ ہے جب وہ خشک ہو جائے تو وہ قتّ ہوتا ہے کہا: قضب کا اطلاق درخت کی ٹہنیوں پر ہوتا ہے جنہیں کاٹا جاتا ہے تا کہ اس سے تیر یا کمانیں بنائی جائیں۔ یہ بھی قول کیا جاتا ہے: قضب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جنہیں کاٹا جاتا ہے جس طرح قت، کراث وغیرہ اسی طرح ساری سبزیاں جنہیں کاٹا جاتا ہے اس کی جڑیں اگتی ہیں۔ صحاح میں ہے: قضبہ اور قضب سے مراد سبزیاں ہیں وہ فارسی زبان میں اسفست ہے اور وہ جگہ جہاں سبزیاں اگتی ہیں۔

وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآىِٕقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ زیتون، زیتون کا درخت ہے۔ نَخْلًا سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ حَدَآىِٕقَ سے مراد باغات ہیں جس کا واحد حدیقہ ہے۔ کلبی نے کہا: کھجور اور درختوں میں سے جس کی چاردیواری ہو اسے حدیقہ کہتے ہیں اگر چاردیواری نہ ہو تو اسے حدیقہ نہیں کہتے۔ غلب سے مراد جس کے درخت موٹے ہوں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: شجرۃ غلباء شیر کو بھی اغلب کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردن موٹی ہوتی ہے وہ کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مکمل طور پر متوجہ ہوتا ہے۔ عجاج نے کہا:

مازِلتُ یوم البیَنْ ألوِی صَلَبِی والرأسَ حتی صِرتُ مِثْلَ الأغلب

جدائی کے روز میں لگاتار اپنی پشت اور سر کو موڑتا رہا یہاں تک میں شیر کی طرح ہو گیا۔

حدیقہ غلباء اسے کہتے ہیں جو گھنا ہو اسی طرح حدائق غلب ہے اغلولب العشب اسے کہتے ہیں جب جڑی بوٹیاں ایک دوسرے میں داخل ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: الغُلب، أغلب اور غلباء کی جمع ہے اس سے مراد موٹے درخت ہیں۔ آپ سے ہی یہ مروی ہے: اس سے مراد لمبے درخت ہیں۔ قتادہ اور ابن زید نے کہا: غلب سے مراد کھجور کے اچھے درخت ہیں۔ ابن زید اور عکرمہ سے مروی ہے: موٹے تنوں والوں کو کہتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: جن کی شاخیں باہم پیوست ہوں۔

وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ جسے لوگ کھاتے ہیں جیسے درختوں کے پھل جس طرح انجیر، اخروٹ وغیرہ۔ اب سے مراد ایسی گھاس جسے جانور کھاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری نے کہا: اب ان چیزوں کو کہتے ہیں جنہیں زمین اگاتی ہے لوگ اسے نہیں کھاتے۔ جسے انسان کھاتے ہیں اسے حصید کہتے ہیں اسی معنی میں شاعر کا قول ہے جو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا:

لَہ دعوۃ میمونۃ ریحُھا الصَّبا     بھا یُنْبِتُ اللہ الحصیدۃ والأبَّا

آپ کی دعوت مبارک ہے اس کی خوشبو باد صبا جیسی ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ حصیدہ اور اب اگاتا ہے''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کو اب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کا قصد کیا جاتا ہے اور اسے کاٹنے کے لیے اس کی طرف جایا جاتا ہے اب اور ام دونوں ہم معنی ہیں۔ شاعر نے کہا:

جِذمنا قیسٌ ونجدٌ دارنا     ولنا الأبُّ بِہِ والمَکْرَعُ

ہماری اصل (جد اعلیٰ) قیس ہے اور نجد ہمارا ملک ہے وہاں ہمارے لیے بہترین گھاس اور عمدہ پانی ہے۔

ضحاک نے کہا: اب اس چیز کو کہتے ہیں جو روئے زمین پر اگے، ابورزین نے بھی اسی طرح کہا ہے: اس سے مراد نباتات ہے اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلالت کرتا ہے: اب سے مراد وہ چیز ہے جسے زمین اگاتی ہے جسے لوگ اور چوپائے کھاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن ابی طلحہ کہتے ہیں: اب سے مراد تازہ پھل ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد خاص طور پر انجیر ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَمَا لَھُمْ مَرْتَعٌ لِلسَّوا     م والا بُّ عندَھم یُقْدَرُ

ان کے ہاں چوپاؤں کے لیے چراگاہیں نہیں اور خوراک بھی ان کے پاس کم ہے۔

کلبی نے کہا: پھلوں کے بغیر ہر نبات مراد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَاكِهَةً سے مراد تازہ پھل اور اب سے مراد خشک پھل ہیں۔ ابراہیم تیمی نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فَاكِهَةً اور اب کی تفسیر پوچھی گئی فرمایا: کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے گی جب میں کتاب اللہ کی تفسیر میں ایسی بات کروں جو میں جانتا ہی نہ ہوں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا پھر فرمایا: ان سب کو تو ہم نے پہچان لیا یہ اب کیا ہے؟ پھر آپ نے اپنا عصا اٹھایا جو آپ کے ہاتھ میں تھا فرمایا: اللہ کی قسم! یہ تو تکلف ہے۔ اے ابن ام عمر! تجھ پر کیا حرج ہوگا اگر تو نہیں جانتا کہ اب کیا ہے؟ پھر فرمایا: اس کتاب سے جو چیز تمہارے لیے واضح ہے اس کی پیروی کرو اور جو واضح نہ ہو اس کو چھوڑ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''سات چیزوں سے تمہیں پیدا کیا گیا، سات چیزوں سے تمہیں رزق دیا گیا، سات اعضا پر اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرو''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات چیزوں سے پیدا کیا گیا سے یہ مراد لیا ہے نطفہ، علقہ، مضغہ، الآیۃ، سات چیزوں سے رزق دیا گیا سے یہ مراد لیا ہم نے اس میں دانا اور انگور اگایا اور پھل الآیۃ، پھر کہا: ابا یہ چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے یہ انسان کا رزق نہیں یہ جانور کے لیے خاص ہے۔

**مَّتَاعًا لَّكُمْ** یہ مفعول مطلق کے طور پر منصوب ہے برائے تاکید ہے کیونکہ ان تمام چیزوں کا اگانا تمام حیوانات کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے قبروں سے مردوں کو اٹھانے کے لیے بیان فرمائی جس طرح کھیتیاں جبکہ وہ پہلے ختم ہو چکی تھیں جس کی وضاحت کئی مواقع پر گزر چکی ہے اس میں اس احسان کا بھی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر انعام

فرمایا۔ یہ بھی کئی مواقع پر گزر چکا ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

''پھر جب کان بہرا کرنے والا شور اٹھے گا، اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے۔ ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کر دے گی۔ کتنے ہی چہرے اس دن (نور ایمان سے) چمک رہے ہوں گے ہنستے ہوئے خوش وخرم۔ اور کئی منہ اس دن غبار آلود ہوں گے ان پر کالک لگی ہوگی۔ یہی وہ کافر(و) فاجر لوگ ہوں گے''۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ جب اس زندگی کے امر کا ذکر کیا تو آخرت کے امر کا ذکر کیا تاکہ وہ اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسانات کیے ہیں اسے صرف کر کے زادراہ تیار کریں۔ صاخه سے مراد چیخ ہے جس سے قیامت برپا ہوگی یہاں اس سے مراد نفخہ ثانیہ ہے جو کانوں کو بہرا کر دے گی وہ کوئی اور آواز نہیں سنیں گے مگر جس چیز کے ساتھ انہیں زندہ ہونے کی دعوت دی جائے گی۔ کئی مفسرین نے ذکر کیا کان اس کی طرف متوجہ ہوں گے یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: اصاخ الی کذا۔ یعنی اسے سنا اسی معنی میں ایک حدیث طیبہ ہے: ''یہ جانور جمعہ کے روز کان لگا کر سنتا ہے اسے قیامت کا ڈر ہوتا ہے مگر جن اور انسان کے''(1)۔ شاعر نے کہا:

يُصِيخُ لِلنَّبْأَةِ أَسْماعَهُ إِصاخَةَ الْمُنْشِدِ لِلْمُنْشِدِ

وہ خبر کو غور سے سنتا ہے جس طرح ایک شاعر دوسرے شاعر کو غور سے سنتا ہے۔

ایک عالم نے کہا: یہ قدماء کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے طور پر معنی لیا گیا ہے۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے تو اس کا مقتضا پہلا قول ہے۔ خلیل نے کہا: صاخه ایسی چیخ ہے جو کانوں کو بہرہ بنا دے گی۔ لغت میں اصل معنی سختی سے تھپڑ مارنا یا دروازہ بند کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ صخه بالحجر سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اسے پتھر مارے۔ راجز نے کہا:

يا جارتي هل لك أن تجالدي جلادة كالصك بالجلامد

اے میری پڑوسن! کیا تو مجھے زمین پر ایسا پٹکے گی جس طرح پتھر کو پھینکا جاتا ہے۔

اس معنی میں عربوں کا قول ہے: صختهم الصاخة وباتتهم البائنة اس سے مراد بڑی مصیبت ہے۔ طبری نے کہا: میرا خیال ہے یہ صخ فلان فلانا سے ماخوذ ہے جب وہ اسے بہرہ کر دے۔ ابن عربی نے کہا: صاخه اسے کہتے ہیں جو بہرے

1۔ سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب الجمعة، باب فضل يوم الجمعة، حدیث نمبر 882، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پن کو لازم کر دے جب کہ وہ سنانے والی تھی۔ یہ فصاحت کا بہترین اسلوب ہے یہاں تک ایک آدمی نے کہا:

أَصَمَّ بِكَ النَّاعِي وَإِنْ كَانَ أَسْمَعَا

موت کی خبر دینے والے نے تجھے بہرہ کر دیا اگرچہ وہ سنانے والا تھا۔

اللہ کی قسم! قیامت کا صیحہ آواز سنانے والا ہے جو دنیا سے بہرہ کر دے گا اور امور آخرت کو سنائے گا۔

**یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ۙ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ ۙ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ ؕ** اس دن صاخہ آئے گی تو آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا یعنی بھائی کے ساتھ دوستی کرنے اور گفتگو کرنے سے دور بھاگے گا کیونکہ اس کے لیے وہ فارغ نہیں ہوگا کیونکہ وہ اپنے بارے میں مصروف ہوگا جس طرح بعد میں فرمایا: اس دن ہر آدمی کو ایسا کام ہوگا جو اسے دوسری چیزوں سے غافل کر دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اس سے جو مطالبہ کر سکتے تھے اور باہم جو حقوق موجود تھے اس وجہ سے ان سے دور بھاگے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس لیے دور بھاگے گا تا کہ جس شدت سے وہ اب ہے وہ اسے دیکھ نہ لیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ان سے اس لیے دور بھاگے گا کیونکہ وہ جانتا ہوگا کہ وہ انہیں کچھ نفع نہیں دے سکتا جس طرح فرمایا: **یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَیْـًٔا** (الدخان: 41) اس روز کوئی دوست کسی دوست کو کچھ نفع نہ دے گا۔ عبداللہ بن طاہر ابہری نے کہا: وہ ان سے اس لیے بھاگے گا کیونکہ اس پر یہ امر واضح ہو چکا ہوگا کہ وہ عاجز ہیں اور ان کے پاس کوئی حیلہ نہیں، وہ اس کی طرف بھاگے جو اس سے غم اور دکھ دور کر سکے گا۔ اگر یہ امر اس پر ظاہر ہو چکا ہوتا تو وہ اپنے رب کے سوا کسی چیز پر اعتماد نہ کرے۔ صَاحِبَتِهٖ سے مراد اس کی بیوی ہے اور بَنِیْهِ سے مراد اس کی اولاد ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ قابیل اپنے بھائی ہابیل سے دور بھاگے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ماں سے دور بھاگیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے دور بھاگیں گے، تو حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے سے دور بھاگیں گے، حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیوی سے دور بھاگیں گے حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹے کی لاش سے دور بھاگیں گے۔ (1)

حضرت حسن بصری نے کہا: قیامت کے روز سب سے پہلے جو اپنے باپ سے دور بھاگے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، سب سے پہلے جو اپنے بیٹے سے دور بھاگے گا وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، سب سے پہلے جو اپنی بیوی سے دور بھاگے گا وہ حضرت لوط علیہ السلام ہیں۔ علماء کی رائے تھی یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ان کا یہ فرار اپنے بچاؤ کے لیے ہوگا۔

**لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ؕ** صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول

1۔ ایسے اقوال پر تعجب ہوتا ہے جب وہ دنیا میں ان ہستیوں سے تعلق قائم کرنے پر راضی ہی نہیں تھے تو وہ پھر کیسے مطالبہ کریں گے اور انبیاء کو ان سے بھاگنے کی کیا ضرورت جبکہ انہوں نے تبلیغ میں، حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی آیت کے عموم کا مصداق خاص بیان کرنا قرائن کی صورت میں تو درست ہو سکتا ہے یہاں کوئی قرینہ بھی نہیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت تو بڑے تعجب کا باعث ہے آپ کی والدہ ماجدہ کا وصال ہو چکا تھا جبکہ محققین نے آپ کی والدہ ماجدہ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے انکار کو درست تسلیم نہیں کیا۔

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور ختنہ کے بغیر اٹھائے جائیں گے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مرد اور عورت سب جبکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے؟ فرمایا: ''اے عائشہ! معاملہ اس سے بڑا سخت ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں''۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ اٹھایا جائے گا''۔ ایک عورت نے عرض کی: کیا ہم میں سے بعض ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھتے ہوں گے؟ فرمایا: ''اے فلانہ! ہر کسی کو اس روز اپنی پڑی ہوگی''۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ عام قراء کی قراءت غین معجمہ کے ساتھ ہے ہر آدمی ایسی حالت میں ہوگا جو اسے رشتہ داروں سے غافل کر دے گی۔ ابن محیصن اور حمید نے یَعْنِیه پڑھا ہے یعنی اس کا امر اسے دوسروں سے لاتعلق کر دے گا۔ قتبی نے کہا: یُغْنِیْهِ کا معنی ہے وہ اسے پھیر دے گا اور اسے اپنی قرابت سے روک دے گا یہ جملہ کہا جاتا ہے: اغن عنی وجھك اپنے چہرے کو مجھ سے پھیر لے۔ اغن عن السفیه بے وقوف سے دور ہو جا۔ خناف نے کہا:

سَیُغْنِیك حرب بنِي مالِكٍ عن الفُحْش والجهلِ فی المَحفِل

بنی مالک سے جنگ تجھے مجلس میں فحش گوئی اور جہالت سے روک دے گی۔

وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ کچھ چہرے چمکدار اور روشن ہوں گے انہیں اپنی کامیابی اور مقدر نعمتوں کا علم ہو چکا ہوگا۔ یہ مومنوں کے چہرے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں جس کرامت سے نوازا ہوگا اس کی وجہ سے خوش وخرم ہوں گے۔ عطا خراسانی نے کہا: وہ طویل عرصہ تک اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوتے رہے اس وجہ سے وہ روشن ہوں گے۔ ابونعیم نے اس کا ذکر کیا۔ ضحاک نے کہا: وضو کے آثار کی وجہ سے وہ روشن ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: راتوں کو عبادت کرنے کی وجہ سے وہ روشن ہوں گے۔ حدیث طیبہ میں ہے: ''جس کی رات کی نماز زیادہ ہو جاتی ہے دن کے وقت اس کا چہرہ حسین ہو جاتا ہے''(2) یہ جملہ بولا جاتا ہے: أسفر الصبح جب صبح خوب روشن ہو جائے۔

وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ غَبَرَةٌ سے مراد غبار اور دھواں ہے ترھق کا معنی چھا جانا ہے قَتَرَةٌ کا معنی ہے گرہن اور سیاہی؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے: ''ذلت اور سختی''۔ کلام عرب میں قتر سے مراد غبار ہے یہ قترۃ کی جمع ہے؛ ابوعبید سے یہی مروی ہے۔ فرزدق نے یہ شعر پڑھا:

مُتَوَّجٌ بِرداء الملكِ یَتْبعه مَوْجٌ تری فوقه الرایات والقَتَرا

وہ بادشاہ کی چادر کو تاج بنائے ہوئے ہے اس کے پیچھے موج ہے تو اس کے اوپر جھنڈے اور غبار دیکھے گا۔

خبر میں ہے: ''جب قیامت کے روز چوپاؤں کو مٹی بنا دیا جائے گا تو اس مٹی کو کافروں کے مونہوں پر ڈال دیا جائے گا''۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ عبس، حدیث نمبر 3255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب ما جاء فی قیام اللیل، حدیث نمبر 1322، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زید بن اسلم نے کہا: قترہ اس مٹی کو کہتے ہیں جو آسمان کی طرف بلند ہو اور غَبَرَةٌ اس مٹی کو کہتے ہیں جو زمین کی طرف آئے، غبار اور غَبَرَةٌ ایک ہی چیز ہے۔

**أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ** ۝ ۔ کفرہ، کافر کی جمع ہے۔ فجرہ، فاجر کی جمع ہے اس سے مراد وہ جھوٹا ہے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد فاسق ہے کیونکہ فجر فجور اس وقت کہتے ہیں جب وہ فسق کرے اور فجر اس وقت کہتے ہیں جب وہ جھوٹ بولے اس کا اصل معنی مائل ہونا ہے، فاجر سے مراد مائل ہونے والا اس کی وضاحت اور گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ وحدہ۔

# سورۃ التکویر

﴿ اٰیاتھا ۲۹ ﴾ ﴿ ۸۱ سورۃ التکویر مکیۃ ۷ ﴾ ﴿ رکوعھا ۱ ﴾

یہ سورت تمام علماء کے نزدیک مکی ہے۔ اس کی انتیس آیات ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسے یہ بات خوش کرے کہ وہ قیامت کے روز مجھے دیکھے تو وہ سورۂ کورت، سورۂ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ اور سورۂ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ پڑھا کرے'' (1)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝۸ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۱ وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲ وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ ۝۱۴

''(یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑوں کو اکھیڑ دیا جائے گا اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور جب وحشی جانور یکجا کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی اور جب زندہ درگور کی ہوئی (بچی) سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال ادھیڑی جائے گی اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب کر دی جائے گی (تو اس دن) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے''۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تکویر سے مراد اسے عرش میں داخل کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی اس کی روشنی کا چلے جانا ہے؛ یہی قتادہ اور مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے اسے بے نور کر دیا جائے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: اسے لپیٹا جائے گا جس طرح پگڑی کو لپیٹا جاتا ہے اسے لپیٹ دیا جائے گا اور اسے مٹا دیا جائے گا۔ ربیع بن خثیم نے کہا: كُوِّرَتْ کا معنی ہے اسے پھینک دیا جائے گا

1۔ جامع ترمذی کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ اذا الشمس کورت، حدیث نمبر 3256، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسی معنی میں ہے کورتہ فتکور میں نے اسے گرایا تو وہ گر گیا۔
میں کہتا ہوں: تکویر کا اصل معنی جمع کرنا ہے یہ کار العمامۃ علی رأسہ سے ماخوذ ہے اس نے اپنے سر پر پگڑی کو جمع کیا۔ اسے جمع کیا جائے گا اور روشنی کو مٹا دیا جائے گا پھر اسے سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔
ابو صالح سے مروی ہے: کُوِّرَتْ کا معنی ہے اسے اوندھا گرا دیا جائے گا۔
وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ جب ستارے گر جائیں گے اور بکھر جائیں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا: وہ گر جائیں گے جس طرح عقاب گر پڑتا ہے۔ عجاج شکرہ کا وصف بیان کرتا ہے:

أبصر خربان فضاء فانكدر

شکرہ نے کھلی فضا دیکھی تو وہ نیچے گر گیا۔
ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس روز آسمان میں کوئی ستارہ باقی نہیں بچے گا مگر وہ گر جائے گا یہاں تک ساتویں زمین والے اس وجہ سے خوفزدہ ہو جائیں گے جو اس زمین کو مصیبت پہنچی اور اوپر والی زمینوں کو مصیبت آئی''۔
ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ معنی ہے وہ گر جائیں گے، اس کی وجہ یہ ہے قندیلیں آسمان اور زمین کے درمیان نور کی زنجیروں سے لٹکی ہوئی ہیں وہ زنجیریں نوری فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جب پہلے صور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمان میں جو کوئی ہوگا مر جائے گا وہ ستارے ٹوٹ گریں گے اور فرشتوں کے ہاتھوں سے زنجیریں گر جائیں گی کیونکہ جو اسے پکڑے ہوئے تھا وہ مر گیا ہوگا۔ یہ بھی احتمال موجود ہے ان ستاروں کے ٹوٹ گرنے سے مراد اس کے آثار کا مٹ جانا ہے۔ ستاروں کو نجوم اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ آسمان میں اپنی روشنی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: انْكَدَرَتْ کا معنی ہے بدل جانا، ان کی روشنی باقی نہ رہے گی کیونکہ وہ اپنی جگہ پر نہیں رہیں گے۔ معنی قریب قریب ہے۔
وَ اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ۝ جب پہاڑوں کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا اور ہوا میں چلایا جائے گا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً (کہف: 47) جس روز پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور آپ زمین کو عیاں دیکھیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ان کے چلنے سے مراد پتھر کی حیثیت سے بدل جانا ہے تو وہ مجتمع مٹی کی طرح ہو جائیں گے یعنی وہ بہنے والی ریت ہو جائیں گے اور وہ دھنکی ہوئی اون ہو جائیں گے، وہ بکھرے ہوئے ذرات ہو جائیں گے، وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے اس سراب کی طرح جو کچھ بھی چیز نہیں۔ زمین کھلا میدان ہو جانے کی اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اونچ نیچ نہیں دیکھیں گے۔ یہ بحث اس کے علاوہ کئی مواقع پر موجود ہے۔ الحمد للہ۔
وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ عشار سے مراد حاملہ اونٹنیاں ہیں عشار کا واحد عشراء ہے یعنی وہ اونٹنیاں جن کے حمل کو دس ماہ ہو چکے ہوں۔ پھر اس کا یہی نام رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بچے کو جنم دے اور بچہ جننے کے بعد اس کا یہی نام رہتا ہے عربوں

کی عادت ہے کہ وہ چیز کو پہلے والے نام سے یاد کرتے ہیں اگر چہ اس پر وہ وقت گزر چکا ہو ایک آدمی اپنے گھوڑے کو کہتا ہے جبکہ پانچ سال کی عمر پوری کرنے والا ہو: هاتوا مُهری، قربوا مُهری۔ مہر کا معنی بچھیرا ہوتا ہے اسے یہ نام سابقہ اسم کی وجہ سے دیتے ہیں۔ عنترہ نے کہا:

لا تذکری مُهری وما أطعمتُه

تو میرے گھوڑے کا ذکر نہ کر اور جو میں نے اسے کھلایا ہے اس کا ذکر نہ کر۔

مزید یہ کہا:

حَمَلْتُ مُهْرِی وسْطها فمضاها

میں اپنے گھوڑے کے درمیان اور اس کے سینہ پر سوار ہوا۔

یہاں عشار کا خصوصاً ذکر کیا گیا کیونکہ عربوں کے ہاں یہ سب سے معزز چیز ہے اس کے مالک قیامت کے سوا اس کو نہیں چھوڑتے یہ ضرب المثل کے طور پر جملہ بولا جاتا ہے کیونکہ قیامت کے روز دس ماہ کی گابھن اونٹنی نہ ہوگی۔ لیکن اس سے ضرب المثل کا ارادہ کیا کہ قیامت کے دن کا خوف ایسا ہوگا کہ اگر کسی کی دس ماہ کی گابھن اونٹنی ہو تو وہ اسے چھوڑ دے گا اور اپنی پریشانی میں مصروف ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جب وہ اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھیں گے، وحشی جانوروں اور چوپاؤں کو دیکھیں گے تو ان میں دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بھی ہوں گی جو ان کے نفیس ترین اموال تھے وہ ان کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے اور ان اونٹنیوں کا معاملہ کسی پر اہمیت کا حامل نہیں ہوگا۔ عربوں کو عشار کے معاملہ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے کیونکہ عربوں کی اکثر زندگی اونٹوں کے متعلق ہی ہوتی ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ عُطِّلَتْ کا معنی ہے اس کے مالک اسے چھوڑ دیں گے کیونکہ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی۔ اعشی نے کہا:

هو الواهِبُ المأةَ المصطفا ۃ إما مَخاضًا وإما عِشارًا

وہ چنی ہوئی اونٹنیاں ہبہ کرنے والا ہے ابتدائی دنوں کی حاملہ ہوں یا دس ماہ کی حاملہ ہوں۔

یوں کہا جاتا ہے: ناقة عشراء، ناقتان عشراوان، نوق عشار وعشراوات۔ یعنی تانیث کے ہمزہ کو واؤ سے بدل دیتے ہیں۔ یہ جملہ کہتے ہیں: وقد عشرت الناقة تعشیرا وہ دس ماہ کی گابھن ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عشار کا معنی ایسا بادل ہے جو پانی سے خالی ہو وہ بارش نہ برسائے۔ عرب بادل کو حاملہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسے گھر ہیں جو معطل ہوں اور جب کوئی رہائش نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسی زمین ہے جس کو کاشت کرنے سے چھوڑ دیا گیا ہو اسے کاشت نہ کیا جاتا ہو۔ پہلا معنی زیادہ مشہور ہے اس پر اکثر لوگوں کا نقطہ نظر ہے۔

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے۔ حشر کا معنی جمع کرنا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: حشر کا معنی موت ہے۔ عکرمہ نے ان سے یہ روایت کیا ہے کہ حشر سے مراد جنوں اور انسانوں کے علاوہ کی موت ہے کیونکہ یہ دونوں قیامت کے روز پورا پورا حق لیں گے۔ حضرت ابن

عباس سے مروی ہے: ہر شی کو دوبارہ اٹھایا جائے گا یہاں تک کہ مکھیوں کو بھی دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قیامت کے روز وحشی جانوروں کو جمع کیا جائے گا یہاں تک کہ ان سے ایک دوسرے کا قصاص لیا جائے گا سینگ والے جانور سے بے سینگے جانور کا بدلہ لیا جائے گا۔ پھر انہیں کہا جائے گا: مٹی ہو جاؤ، تو وہ مر جائیں گے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے جو کچھ روایت کیا ہے یہ اس سے زیادہ صحیح ہے۔ ہم نے اس کا ذکر مفصل طور پر پہلے کیا ہے۔ سورۂ انعام میں بھی اس کا کچھ ذکر گزرا ہے۔ جب وحشی جانوروں کی یہ حالت ہے انسانوں کا کیا حال ہوگا؟ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آج صحراؤں میں لوگوں سے الگ تھلگ رہنے اور ان سے دور بھاگنے کے باوجود قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی وجہ سے وہ لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے؛ یہ معنی حضرت ابی بن کعب نے بیان کیا ہے۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ جب سمندروں کو پانی سے بھر دیا جائے گا عرب کہتے ہیں: سجرتُ الحوضَ أسجرہ سجرا جب تو اسے بھر دے لغت میں ساجر اور مسجور کا معنی بھرا ہوا ہونا ہے۔ ربیع بن خیثم نے روایت نقل کی ہے کہ سُجِّرَتْ کا معنی بہنا اور بھر جانا ہے؛ یہ کلبی، مقاتل، حسن اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ ابن ابی زمنین نے کہا: سُجِّرَتْ کا معنی ہے بھر جانا اس کے بعد وہ ایک دوسرے کی طرف بہہ پڑیں گے اور وہ سب ایک چیز بن جائیں گے؛ یہی حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میٹھے سمندر کو نمکین اور نمکین کو میٹھے کی طرف چھوڑا جائے گا یہاں تک کہ وہ بھر جائے گا۔ ضحاک اور مجاہد سے مروی ہے: انہیں کھول دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ایک سمندر بن جائے گا۔ قشیری نے کہا: اس کی صورت یہ ہوگی اللہ تعالیٰ اس پردے کو ہٹا دے گا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے: بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ۝ (الرحمٰن) ان کے درمیان آڑ ہے وہ ایک دوسرے سے تجاوز نہیں کرتے۔ جب وہ آڑ ختم کر دی جائے گی تو سمندروں کا پانی کھل جائے گا وہ تمام زمین پر پھیل جائے گا اور سب ایک سمندر بن جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ جہنمیوں کی گرمی کی وجہ سے ایک سمندر بن جائے گا۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابن حیان سے مروی ہے: وہ خشک ہو جائیں گے یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ قشیری نے کہا: یہ سجرت التنور سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو تندور کو گرم کرے۔ جب اس پر آگ کو مسلط کیا جائے گا تو اس سے رطوبت ختم ہو جائے گی اس وقت پہاڑوں کو چلایا جائے گا سمندر اور تمام زمین ہموار میدان بن جائے گا کہ پہاڑوں کی مٹی سے سمندروں کی گہرائی کو بھر دیا جائے گا۔ نحاس نے کہا: اقوال میں اتفاق ہے پہلے وہ ایک دوسرے کی طرف بہیں گے پھر آگ بنا دیئے جائیں گے پھر خشک ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں: اس وقت پہاڑ چلائے جائیں گے جس طرح قشیری نے ذکر کیا؛ ابن زید، شمر، عطیہ، سفیان، وہب، حضرت ابی، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی نقطہ نظر ہے۔ ضحاک نے اسے روایت کیا ہے: انہیں جلایا جائے گا تو وہ آگ ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ سورج، چاند اور ستاروں کو سمندر میں پھینک دے گا پھر اللہ تعالیٰ ان پر دبور ہوا چلائے گا وہ اس میں ہوا پھونکے گی تو وہ آگ ہو جائیں گے۔ ایک حدیث میں بھی اسی طرح ہے "اللہ تعالیٰ سورج، چاند اور ستاروں کو حکم دے گا تو وہ سمندر میں گر پڑیں گے پھر اللہ تعالیٰ دبور ہوا کو بھیجے گا وہ انہیں آگ کی

صورت میں بھڑکا دے گی یہی وہ بڑی آگ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کفار کو سزا دے گا''۔ قشیری نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سُجِّرَتْ کی جو تفسیر اوقدت سے کی ہے یہ احتمال موجود ہے کہ جہنم سمندر کی گہرائیوں میں ہو دنیا کا نظام چلانے کے لیے آج اسے روشن نہیں کیا گیا جب دنیا ختم ہو جائے گی تو سب آگ بن جائیں گے جس میں اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو داخل کرے گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ سمندر کے نیچے آگ ہو پھر اللہ تعالیٰ تمام سمندروں کو روشن کر دے گا تو یہ سب آگ بن جائیں گے حدیث میں ہے: البحرُ نارٌ من نارٍ سمندر آگوں میں سے ایک آگ ہے۔

معاویہ بن سعید نے کہا: بحر روم زمین کا درمیان ہے اس کے نیچے تانبے کے بند کنویں ہیں جنہیں قیامت کے روز آگ کی صورت میں بھڑکا دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سورج سمندر میں گرایا جائے گا تو سورج کی گرمی سے سمندر آگ بن جائیں گے پھر اس میں جو کچھ ہے اس کے بارے میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ قیامت سے پہلے ہو اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ایک ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ قیامت کے روز ہو ان آیات کے بعد جو کچھ ہے وہ قیامت کے روز ہوگا۔

میں کہتا ہوں: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے سمندر کے پانی سے وضو نہیں کیا جائے گا کیونکہ جہنم کا ایک طبق ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: چھ آیات قیامت کے وقوع سے قبل کی ہیں اس اثنا میں کہ لوگ بازاروں میں ہوں گے کہ سورج کی روشنی چلی جائے گی، ستارے ظاہر ہو جائیں گے وہ متحیر و دہشت زدہ ہو جائیں گے وہ اس حال میں دیکھ رہے ہوں گے کہ ستارے ٹوٹ گریں گے وہ اس حال میں ہوں گے کہ پہاڑ زمین پر گر پڑیں گے زمین میں حرکت برپا ہوگی اور زلزلہ واقع ہوگا اور آگ لگ جائے گی تو وہ بکھرے ذرات ہو جائیں گے۔ انسان جنوں کی جانب اور جن انسانوں کی جانب بھاگیں گے۔ عام جانور، وحشی جانور، کیڑے مکوڑے اور پرندے خلط ملط ہو جائیں گے بعض بعض میں موجزن ہو جائیں گے مابعد آیت کا یہی مفہوم ہے۔

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ پھر جن انسانوں کو کہیں گے: ہم تمہارے پاس خبر لائے ہیں، وہ سمندر کی طرف جائیں گے تو وہ بھڑکی ہوئی آگ ہوگی۔ وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ زمین ساتویں زمین تک پھٹ جائے گی اور آسمان ساتویں آسمان تک پھٹ جائے گا وہ اس حالت میں ہوں گے کہ ہوا آئے گی وہ سب کو ہلاک کر دے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ سُجِّرَتْ کا معنی ہے اس کا پانی سرخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ خون کی طرح ہو جائے گا یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: عین سجراء سرخ آنکھ۔ ابن کثیر نے اسے سُجِرت پڑھا ہے ابو عمرو نے بھی اسی طرح پڑھا ہے یہ اس کی حالت کے بارے میں ایک دفعہ کی خبر ہے باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے اس میں اسے بار بار خبر دی گئی ہے۔

وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ نعمان بن بشیر نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا معنی ہے ہر آدمی کو اس جماعت کے ساتھ ملا دیا جائے گا جو اس جیسا عمل کیا کرتے تھے''۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: فاجر کو فاجر کے ساتھ اور صالح کو صالح کے ساتھ ملا دیا جائے گا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس وقت ہوگا جب لوگ تین

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 527

جماعتیں ہوں گے سابقون ایک جماعت ہوں گے، اصحاب یمین ایک جماعت ہوں گے اور اصحاب شمال ایک جماعت ہوں گے۔ انہیں سے ایک قول یہ بھی مروی ہے: مومنوں کے نفوس کو حور عین کے ساتھ ملایا جائے گا(1)، کافروں کو شیاطین کے ساتھ ملایا جائے گا یہی صورتحال منافقوں کی ہوگی۔ ان سے ایک قول یہ بھی منقول ہے: ہر ایک جنتی اور جہنمی کو اس کی مثل کے ساتھ ملادیا جائے گا جو اعلانیہ طاعت کرتا تھا اس کو اس کی مثل کے ساتھ، درمیانے کو اس کی مثل کے ساتھ، نافرمان کو اس کی مثل کے ساتھ ملادیا جائے گا۔ تزویج کا معنی یہ ہے کہ ایک شی کو اس کی مثل کے ساتھ ملادیا جائے۔ معنی یہ ہوگا جب نفوس کو جنت اور دوزخ میں اس کی مثل کے ساتھ ملادیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر ایک کو اسی بادشاہ یا حاکم کے ساتھ ملادیا جائے گا جس کے ساتھ وہ دنیا میں رہتا تھا جس طرح ارشاد فرمایا: اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (الصافات: 22) ظالموں اور ان کی مثل کو جمع کرو۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: انہیں ان کے اعمال کے مشابہ جوڑے بنادیا جائے گا وہاں حقیقت میں کوئی جوڑا نہیں۔ اصحاب یمین ایک جوڑا ہیں، اصحاب شمال ایک جوڑا ہیں، سابقون ایک جوڑا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ ظالموں میں ان کی امثال کو جمع کردو۔ عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے روحوں کو جسموں کے ساتھ ملادیا جائے گا یعنی روحوں کو جسموں کی طرف پھیر دیا جائے گا(2)۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا: ہر ایک کو اس کی جماعت کے ساتھ لاحق کردیا جائے گا یہودی کو یہودی کے ساتھ، نصاریٰ کو نصاریٰ کے ساتھ اور مجوسیوں کو مجوسیوں کے ساتھ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کیا کرتا تھا اسے اس کے ساتھ ملادیا جائے گا(3)۔ منافقین کو منافقین کے ساتھ ملادیا جائے گا اور مومنوں کو مومنوں کے ساتھ ملادیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: گمراہ کو اس کے ساتھ ملادیا جائے گا جس نے اسے گمراہ کیا ہوگا وہ شیطان ہو یا انسان ہو قدرے مشترک بغض اور عداوت ہوگی۔ مطیع کو اس آدمی کے ساتھ ملادیا جائے گا جس نے اسے طاعت کی طرف بلایا وہ نبی ہو یا مومن ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ ملادیا جائے گا ان اعمال کے اس کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے تزویج کا نام دیا ہے۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۙ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۚ موءودۃ مقتولہ سے مراد وہ بچی ہے جس کو زندہ دفن کردیا گیا ہو اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس پر مٹی ڈالی جاتی ہے تو وہ مٹی اسے دبا لیتی ہے تو وہ بچی مرجاتی ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا (البقرہ: 255) آسمانوں وزمین کی حفاظت اسے بوجھل نہیں کرتی۔ متمم بن نویرہ نے کہا(4):

مَوْءُودَةٌ مَقْبُورَةٌ فِي مَفَازَةٍ

وہ جنگل میں مدفون ومقبور ہے۔

وہ بچیوں کی دو وجہوں سے زندہ درگور کیا کرتے تھے: (۱) وہ کہتے: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں وہ اپنی بیٹیوں کو اس کے ساتھ ملادیتے (۲) انہیں یا تو تنگ دستی کا خوف رہتا تھا یا گرفتار ہوجانے اور غلامی کا خوف ہوتا۔ سورۂ نحل میں اَمْ یَدُسُّهٗ

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 527
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 214
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 260
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 214

فِي التُّرَابِ (نحل:59) میں یہ بحث مکمل گزر چکی ہے۔ اشراف ایسا نہ کیا کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اس سے روکتے تھے یہاں تک کہ فرزدق نے اس پر فخر کیا اور کہا۔

ومِنّا الذى منعَ الوائِداتِ فأحيا الوئِيد فلم يُوأدِ(1)

ہم میں سے وہ لوگ ہو گزرے ہیں جو زندہ درگور کرنے والیوں کو روکتے تھے پس اس نے زندہ درگور کی جانے والی کو زندگی عطا کی اور اسے زندہ درگور نہ کیا۔

فرزدق کی مراد اس کا دادا ہے جس کا نام صعصعہ تھا وہ بچیوں کو ان کے والدین سے خرید لیتا اسلام آیا تو اس نے ستر بچیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا تھا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: دور جاہلیت میں ایک عورت پر جب وضع حمل کا وقت آتا تو وہ ایک گڑھا کھودتی اور اس گڑھے کے کنارے بچہ جنتی۔ اگر وہ بچی ہوتی تو اسے گڑھے میں پھینک دیتی اور اس پر مٹی ڈال دیتی اگر بچہ جنتی تو اسے روک لیتی (2)۔

قتادہ نے کہا: دور جاہلیت میں ایک آدمی اپنی بیٹی کو قتل کرتا اور اپنے کتے کو کھلا دیتا اللہ تعالیٰ نے اس پر انہیں عتاب کیا اور اس ارشاد کے ساتھ انہیں دھمکی دی (3)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: قیس بن عاصم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی: یارسول اللہ! میں نے دور جاہلیت میں آٹھ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا فرمایا: ''ہر ایک کی جانب سے ایک غلام آزاد کر دے''۔ عرض کی: یارسول اللہ! میں تو اونٹوں والا ہوں۔ فرمایا: ''اگر چاہے تو ہر ایک کی جانب سے ایک اونٹ کی قربانی دے دے''۔ اس بچی سے سوال کرنے میں حکمت یہ ہے کہ قاتل کو شرمندہ کیا جائے جس طرح جب بچے کو مارا جائے تو بچے سے پوچھا جائے: تجھے کیوں مارا گیا تیرا گناہ کیا تھا؟ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ قاتل کو شرمندہ کرے کیونکہ اس بچی کو بغیر گناہ کے قتل کیا گیا تھا (4)۔ ابن اسلم نے کہا کہ کس گناہ میں تجھے مارا گیا وہ اس بچی کو مارا کرتے تھے۔ ایک اہل علم نے سُئِلَتْ کا معنی طلبت کیا ہے گویا یہ ارادہ کیا کہ جس طرح مقتول کے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کے قصاص کا مطالبہ کیا جائے گا یہ اس طرح ہے جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝ (الاحزاب) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ گویا ان سے مطالبہ کیا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا: تمہاری اولادیں کہاں ہیں؟ ضحاک اور ابوضحا نے جابر بن زید اور ابوصالح سے روایت نقل کی ہے کہ بچی اپنے باپ سے چمٹ جائے گی وہ پوچھے گی: کس گناہ کی پاداش میں تو نے مجھے قتل کیا؟ تو باپ کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے آپ اسے واذا الموءودة سألت پڑھتے (5)۔ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں فرمایا: ''وہ عورت جو اپنے بچے کو قتل کرتی تھی قیامت کے روز آئے گی اس کا بچہ اس کے پستان سے چمٹا ہوگا جب کہ اپنے خون میں لت پت ہوگا وہ عرض کرے گا: اے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 214 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 528 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 215
4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 260 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 214

میرے رب! یہ میری ماں ہے اس نے مجھے قتل کیا ہے''۔ پہلا قول جمہور کا نقطہ نظر ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (المائدہ: 116) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا۔ کیونکہ یہ عمل گناہ کے بغیر صحیح نہیں وہاں کون سا گناہ تھا جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ کوئی گناہ نہیں تھا تو یہ امتحان میں بہت بڑھ کر ہوگا اور قاتل کے خلاف بہت بڑی دلیل ہوگی۔ واللہ اعلم۔

اسے قُتِلَتْ بھی پڑھا گیا ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ مشرکوں کے بچے عذاب میں مبتلا نہیں کیے جائیں گے اور عذاب کا استحقاق گناہ کے بغیر نہیں ہوتا۔

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۞ انہیں کھول دیا جائے گا جبکہ وہ پہلے لپٹے ہوئے تھے اس سے مراد وہ صحیفے ہیں جو فرشتے لکھتے رہے جن میں ان لوگوں کے اچھے برے اعمال درج ہوں گے جن کو موت کے موقع پر لپیٹ دیا جائے گا اور قیامت کے روز انہیں پھیلا دیا جائے گا ہر انسان اپنے صحیفے پر کھڑا ہوگا اس میں جو کچھ ہوگا وہ اسے جانتا ہوگا وہ کہے گا: اس کتاب کو کیا ہوا یہ کوئی چھوٹا بڑا عمل نہیں چھوڑتی مگر اس نے اسے شمار کر رکھا ہے۔ مرثد بن وداعہ نے روایت نقل کی ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو عرش کے نیچے سے صحیفے اڑیں گے مومن کا صحیفہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اس کا ذکر فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۞ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۞ (الحاقہ) تک ہے کافر کا صحیفہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اس کا ذکر فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ۙ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ۞ (الواقعہ) میں ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو ننگے پاؤں اور ننگے بدن اٹھایا جائے گا میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! عورتوں کا کیا حال ہوگا؟ فرمایا: ''اے ام سلمہ! لوگوں کو غافل کر دیا جائے گا''۔ میں نے عرض کیا: کس نے انہیں اس سے غافل کیا؟ فرمایا: ''صحیفوں کے پھیلنے نے جن میں ذرہ اور رائی کے برابر اعمال لکھے ہوں گے'' اس کا ذکر ابوثوار عدوی کے قول جو سورۂ سبحانہ میں ہے ہو چکا ہے ان کا دو دفعہ کھلنا ہے اور ایک دفعہ لپٹنا ہے اے ابن آدم! جس میں تجھے مہلت دی گئی ہے وہ تیرا پھیلایا گیا صحیفہ ہے اس میں جو جی چاہے املاء کرا جب تو مر جائے گا تو اسے لپیٹ دیا جائے گا جب تجھے دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اسے پھیلا دیا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۞ (الاسراء) اپنی کتاب پڑھ آج تیرے لیے وہی کافی ہے۔ مقاتل نے کہا: جب کوئی آدمی فوت ہوتا ہے تو اس کا نامہ عمل لپیٹ دیا جاتا ہے اور جب قیامت کا دن ہوتا ہے تو اسے پھیلا دیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب آپ اس آیت کو پڑھتے تو فرماتے: اے انسان! معاملہ تیرے سپرد کر دیا گیا ہے۔ نافع، ابن عامر، عاصم اور ابو عمرو نے اسے نُشِرَت پڑھا ہے حجت قائم کرنے کے لیے صرف ایک دفعہ پھیلایا جائے گا باقی قراء نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ نشر (پھیلانا) کئی دفعہ ہوگا۔ نافرمانی کو تنبیہ اور مطیع کو بشارت میں مبالغہ کے لیے ایسا ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انسان اور گواہ فرشتوں کی جانب سے عمل بار بار ہونے کی وجہ سے فعل کو مشدد ذکر کیا جائے گا۔

وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۞ کشط سے مراد یہ ہے جو چیز کسی کے ساتھ سختی سے چمٹی ہوئی ہو اس کو کھینچ لینا۔ آسمان سے چمڑا اس طرح ادھیڑ لیا جائے گا جس طرح مینڈھے اور دوسرے جانوروں سے چمڑا اتار لیا جاتا ہے۔ قشط بھی اس میں ایک لغت

ہے حضرت عبداللہ کی قراءت میں اذا السماء قشطت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: کشطت البعیر کشطا میں نے اس کے چمڑے کو اتارا سلحتہ نہیں کہا جاتا کیونکہ عرب اونٹ کے بارے میں کشطتہ اور جلدتہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ انکشط کا معنی ہے چلا گیا آسمان کو اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے گا جس طرح پردہ کو اس سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اسے لپیٹ دیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (الانبیاء: 104) اس روز ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جس طرح سجل کتابوں کو لپیٹ دیتی ہے؛ گویا معنی ہے چمڑے کو اتار دیا جائے گا اور لپیٹ دیا جائے گا۔

وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾ جب جہنم کو روشن کیا جائے گا کفار کے لیے دہکایا جائے گا اور اس کے گرم کرنے میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: سعرت النار، اسعرتہا عام قراء کی قراءت تخفیف کے ساتھ ہے جو سعیر سے مشتق ہے۔ نافع، ابن ذکوان اور رویس نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اسے بار بار روشن کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: جہنم کو اللہ کا غضب اور انسانوں کی خطائیں اسے بھڑکائیں گی۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آگ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا تو وہ سرخ ہوگئی پھر اسے ایک ہزار تک جلایا گیا تو وہ سفید ہوگئی پھر اسے ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا تو وہ سیاہ ہوگئی وہ سیاہ تاریک ہے وہ موقوف ہے''۔

وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ جنت متقین کے قریب کر دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: جنتیوں کو جنت کے قریب کیا جائے گا وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید کہا کرتے تھے: اسے قریب کیا جائے گا۔ زلفی کلام عرب میں قربت کے معنی میں ہے۔ تزلف فلان یعنی فلاں قریب ہوگیا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ نفس جان لے گا جو اس نے اچھا اور برا عمل کیا ہوگا یہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿۱﴾ اور اس کے مابعد کا جواب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی لیے یہ گفتگو ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے: دونوں نے ان آیات کو پڑھا جب عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ تک پہنچے۔ دونوں نے کہا: اس مقصد کے لیے یہ قصہ چلایا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا جب سورج بے نور ہو جائے گا اور یہ امور ہو جائیں گے تو نفس اپنے اعمال کو جان لے گا۔ صحیحین میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوگا وہ اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو وہ اپنے اعمال پائے گا وہ اپنی بائیں طرف دیکھے گا تو وہ اپنے اعمال دیکھے گا پس آگ اس کا استقبال کرے گی جو آدمی یہ طاقت رکھے کہ وہ آگ سے بچے خواہ وہ کھجور کے ایک حصہ کے ساتھ تو وہ ایسا کرے''۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ قسم ہے جو عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ پر واقع ہے(1)۔ جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: جب زید بھاگا تو عمرو بھی بھاگ گیا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن زید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے(2): اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿۱﴾ سے لے کر وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ تک بارہ چیزیں ہیں چھ دنیا میں اور

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 216	2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 215

چھ آخرت میں ہوں گی۔ میں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے قول سے پہلی چھ کی وضاحت کر دی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾

''پھر میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے تاروں کی (اور قسم کھاتا ہوں) سیدھے چلنے والے، رکے رہنے والے تاروں کی اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگے اور صبح کی جب وہ سانس لے کہ یہ (قرآن) ایک معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول ہے جو قوت والا ہے مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے (سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے۔ اور تمہارا یہ ساتھی کوئی مجنون تو نہیں''۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ لا زائد ہے یعنی میں قسم اٹھاتا ہوں جس طرح یہ بات گزر چکی ہے پانچ بڑے ستارے مراد ہیں زحل، مشتری، عطارد، مریخ اور زہرہ۔ جس طرح مفسرین نے ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (1)۔ تمام ستاروں سے صرف انہیں کا خصوصا ذکر کرنا دو وجوہ سے (2) ہے (1) یہ سورج کے بالمقابل ہوتے ہیں؛ یہ بکر بن عبداللہ مزنی نے کہا (۲) یہ کہکشاں کو طے کرتے ہیں (3)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد ستارے ہیں جو دن کے وقت چھپ جاتے ہیں؛ حضرت علی شیر خدا سے بھی مروی ہے فرمایا: اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو دن کو چھپ جاتے ہیں اور رات کو ظاہر ہوتے ہیں اور غروب کے وقت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ مخفی ہوتے ہیں تو وہ دکھائی نہیں دیتے۔ صحاح میں ہے: خنس سے مراد تمام ستارے ہیں کیونکہ وہ غائب ہونے کے ساتھ پیچھے ہو جاتے ہیں یا دن کے وقت پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس سے مراد سیارات ہیں وہ ستارے نہیں جو ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں۔ فراء نے ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ان سے پانچ ستارے مراد ہیں زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد کیونکہ وہ اپنی گزرگاہ میں پیچھے ہو جاتے ہے اور چھپ جاتے ہیں جس طرح ہرن مغار میں چھپ جاتا ہے مغار سے مراد وہ ٹھکانہ ہے جو وہ شاخوں سے بنالیتا ہے۔ یہ قول بھی کیا جاتا ہے: انہیں خنس اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں کیونکہ ان سے مراد وہ ستارے ہیں جو متحیر ہوتے ہیں جو لوٹتے ہیں اور ٹھہرتے ہیں۔ یوں جملہ بولا جاتا ہے: خَنَسَ عنه يَخْنُس خنوسا پیچھے ہٹ جانا۔ أخنسه غيره۔ جب اسے پیچھے کیا اور اس سے آگے گزر گیا۔ خنس ناک کا چہرے سے پیچھے ہونا جبکہ سرے سے کچھ بلند ہو۔ اس طرح یہ لفظ بولا جاتا ہے: الرجل أخنس، المرأة خنساء، البقر كلها خنس۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد وحشی گائیں ہیں (4)۔ ہشیم نے زکریا سے وہ ابو اسحاق سے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 216　2۔ ایضاً
3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 261　4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 216

وہ ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل سے روایت نقل کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا: تم عرب قوم ہو یہ خنس کیا ہوتا ہے؟ میں نے جواب دیا: وحشی گائے۔ کہا: میری رائے بھی یہی ہے؛ یہی حضرت جابر اور ابراہیم کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحشی گائیوں کی قسم اٹھائی۔ ان سے حضرت عکرمہ نے روایت نقل کی ہے کہ خنس سے مراد گائے اور کنس سے مراد ہرن ہیں جب وہ انسان کو دیکھتے ہیں تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں، سکڑتے ہیں اور اپنے ٹھکانے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خنس جو ناک میں ہوتا ہے اس سے مراد ناک کے سرے کا پیچھے ہونا اور بانسے کا چھوٹا ہونا۔ گائے اور ہرن کے ناک اسی طرح چپکے ہوتے ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انہیں ستاروں پر محمول کیا جائے کیونکہ اس کے بعد رات اور صبح کا ذکر ہے ستاروں کا ذکر اس کے زیادہ مناسب ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم اٹھائے وہ حیوان ہو، جماد ہو اگرچہ اس کی حکمت کی وجہ کا علم نہ ہو۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ سے یہ مروی ہے جبکہ دونوں صحابی ہیں اور امام نخعی سے مروی ہے کہ اس سے مراد وحشی گائے ہے۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد ہرن ہیں (1)۔ حجاج بن منذر نے کہا: میں نے جابر بن زید سے الجوار الکنس کے بارے میں پوچھا فرمایا: ہرن اور گائے۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ اس سے مراد ستارے ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد فرشتے ہیں؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا (2)۔ کنس کا معنی غائب ہے یہ کناس سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وحشی جانور کا وہ ٹھکانہ ہے جس میں وہ چھپ جاتا ہے۔

اوس بن حجر نے کہا:

أَلم تر أَنَّ الله أَنزلَ مُزْنَهُ وعُفْرُ الظباءِ فی الکِناسِ تَقَمَّعُ (3)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بارش کو نازل کیا جبکہ ہرنوں میں سے عفر (ایک قسم کا ہرن) اپنے ٹھکانے میں سر ہلا رہا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کنوس کا معنی ہے اپنے اپنے ٹھکانوں میں پناہ لینا۔ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں وحشی جانور اور ہرن پناہ لیتے ہیں۔

کنس یہ کانس اور کانسہ کی جمع ہے اسی طرح خنس، خانس اور خانسہ کی جمع ہے۔ جواری یہ جاریہ کی جمع ہے یہ جری یجری سے مشتق ہے۔

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۞ فراء نے کہا: مفسرین نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ عَسْعَسَ کا معنی پیٹھ پھیرنا ہے، جوہری نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا: وہ اپنے پہلے حصہ کے قریب ہو گئی اور تاریک ہو گئی۔ اسی طرح جب بادل زمین کے قریب ہوتا ہے تو تاریک ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا: وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ کا معنی ہے قسم ہے رات کی جب وہ اپنی تاریکی کے ساتھ پلٹ جائے؛ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ ان دونوں سے، حضرت حسن

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 216 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 217

بصری سے اور دوسرے علماء سے یہ بھی مروی ہے: جب وہ اپنی تاریکی کے ساتھ آ رہی ہو۔ زید بن اسلم نے کہا: عَسْعَسَ کا معنی جانا ہے۔ فراء نے کہا: عرب کہتے ہیں عسعس و سعسع جب اس سے تھوڑی سی تاریکی رہ جائے۔ خلیل اور دوسرے علماء نے کہا: عسعس اللیل جب وہ تاریکی آئے یا واپس پلٹے۔ مبرد نے کہا: اضداد میں سے ہے دونوں معانی ایک کی طرف لوٹتے ہیں۔ رات کے اول حصہ میں تاریکی کا شروع ہونا اور اس کے آخری حصہ میں اس کا پلٹنا۔ علقمہ بن قرط نے کہا:

حتى إذا الصبحُ لها تنفسا وانجابَ عنها ليلُها وعَسْعَسَا(1)

یہاں تک کہ صبح نے اس کے لیے سانس لی اور اس کی رات اس سے چھٹی اور پلٹی۔

ماوردی نے کہا: عس کا اصل معنی بھر جانا ہے اسی وجہ سے بڑے پیالے کو عُسّ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اندر موجود چیز سے بھرا ہوتا ہے اس لفظ کا اطلاق رات کے آنے پر ہوتا ہے کیونکہ اس کے بھرنے کی ابتدا ہوتی ہے اس کا اطلاق اس کے پلٹنے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس کے بھرنے کی انتہا ہوتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی اس کا بھرنا مکمل ہوتا ہے۔

جہاں تک امراء القیس کا یہ قول ہے: أَلِمَّا على الربعِ القديم بِعَسْعَسَا۔ اس میں عسعس جگہ کا نام ہے۔

عَسْعَسَ ایک آدمی کا نام بھی ہے؛ رجز نے کہا:

عَسْعَسَ نِعْمَ الفتی تبیاہ عسعس کتنا اچھا نوجوان ہے جس پر تو اعتماد کرتا ہے۔

بھیڑیے کو عسعس، عسعاس اور عساس کہتے ہیں کیونکہ وہ رات کو تلاش کرتا ہے۔

قنافذ (گندگی والا کیڑا) کو عسعاس کہتے ہیں کیونکہ یہ رات کے وقت آتا جاتا ہے۔

ابوعمرو نے کہا: تعسعس کا معنی سونگھنا ہے اور یہ مصرعہ پڑھا:

كمنخر الذئبِ إذا تَعَسْعَسَا

بھیڑیے کے نتھنے کی طرح جب وہ سونگھے۔

تعسعس کا معنی رات کے وقت شکار تلاش کرنا بھی ہوتا ہے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝ صبح کی قسم جب وہ پھیل جائے یہاں تک کہ روشن دن بن جائے۔ دن جب خوب چڑھ جائے تو کہتے ہیں: تَنَفَّسَ اسی طرح موج جب پانی باہر پھینکے۔ تَنَفَّسَ کا معنی ہوا کا پیٹ سے نکلنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِذَا تَنَفَّسَ کا معنی ہے جب وہ پھٹے۔ اسی سے تنفس القدس کا لفظ استعمال ہوتا ہے جب وہ ٹوٹ جائے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ یہ جواب قسم ہے اور رسول کریم سے مراد جبریل امین ہیں؛ یہی حضرت حسن، ضحاک اور قتادہ نے کہا(2): معنی یہ ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجے گئے کا قول ہے جو رسول، اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہے۔ یہاں کلام کو جبریل کی طرف مضاف کیا پھر اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس کی نفی کر دی: تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الواقعہ) تا کہ اہل تحقیق کو معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں کلام اللہ کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ رسول سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے(3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 217 2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 218 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 444

ذِیْ قُوَّۃٍ جس نے رسول سے مراد جبریل امین لی ہے آپ کی قوت تو ظاہر ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ان کی قوت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے قوم لوط کی بستیوں کو پروں کے قوادم سے اکھاڑ دیا تھا۔

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ۝۲۱ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے مرتبہ والے ہیں۔ حضرت ابو صالح سے مروی ہے کہ وہ ستر خیموں (دروازوں) میں بغیر اجازت داخل ہوتے ہیں ان کی آسمانوں میں اطاعت کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے فرشتے حضرت جبریل امین کی اطاعت کرتے ہیں جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر لے گئے تو حضرت جبریل امین نے رضوان فرشتہ جو جنت کے خازن تھے سے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دروازہ کھول دو، اس نے دروازہ کھول دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اور جنت میں جو نعمتیں تھیں انہیں دیکھا آپ نے جہنم کے داروغے سے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جہنم کا دروازہ کھول دو یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ لیں۔ اس نے اس کی اطاعت کی اور دروازہ کھول دیا(1)۔

حضرت جبریل اس وحی کے بارے میں امین ہیں جس وحی کو لے کر وہ آتے ہیں۔ جس نے ان الفاظ کا مصداق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بنایا ہے تو اس وقت ذِیْ قُوَّۃٍ کا معنی ہے رسالت کی تبلیغ میں قوی ہیں۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی اطاعت کرتا ہے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں یہاں تک کہ ان کے قول میں تہمت لگائی جائی۔ یہ جواب قسم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کو اس صورت میں دیکھیں جس صورت میں وہ اپنے رب کے پاس ہوتے ہیں۔ حضرت جبریل امین نے عرض کی: اس میں میرا اختیار نہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت دی۔ جبریل امین آپ کے پاس آئے جبکہ آفاق کو بھرا ہوا تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہوگئی۔ مشرکوں نے کہا: وہ تو مجنون ہے تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین کو ان کی صورت پر دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ڈر گئے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح وارد ہوئے جس کا ان کے ارادہ میں احتمال تک نہ تھا تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝۲۳ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ ۝۲۴ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ۝۲۵ فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝۲۶ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۲۷ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ ۝۲۸ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲۹

''اور بلاشبہ اس نے اس قاصد کو دیکھا روشن کنارے پر۔ اور یہ نبی غیب بتانے میں ذرا بخیل نہیں۔ اور یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا قول نہیں، پھر تم (منہ اٹھائے) کدھر چلے جا رہے ہو۔ نہیں ہے یہ مگر نصیحت سب اہل جہان کے لیے (لیکن ہدایت وہی پاتا ہے) جو تم میں سے سیدھی راہ چلنا چاہے۔ اور تم نہیں چاہ سکتے بجز اس

1۔ زاد المسیر، جلد 9، صفحہ 43

کے کہ اللہ چاہے جو رب العالمین ہے''۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا جن کے چھ سو پر ہیں یعنی مشرق کی جانب سورج کے ہونے کی جگہ۔ کیونکہ یہ افق جب سورج اس سے طلوع ہوتا ہے تو وہ افق روشن ہو جاتا ہے۔ یعنی اس جہت میں اشیاء کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: افق مبین سے مراد آسمان کی اطراف ہیں (1)۔

شاعر نے کہا:

أَخَذْنَا بِآفَاقِ السَّمَاءِ عَلَيْكُمُ ... لَنَا قَمَرَاهَا وَالنُّجُومُ الطَّوَالِعُ

ہم نے تمہارے خلاف آسمان کی اطراف کو اپنی گرفت میں لے لیا ہمارے لیے اس کے دو چاند ہیں اور روشن ستارے۔

ماوردی نے کہا: اس تاویل کی بنا پر اس میں تین قول ہیں (۱) رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین کو آسمان کے مشرقی افق میں دیکھا؛ یہ سفیان کا قول ہے (۲) آسمان کے مغربی افق میں دیکھا؛ یہ ابن شجرہ نے بیان کیا ہے (۳) اجیاد کی جانب دیکھا، یہ مکہ مکرمہ کا مشرق ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے (2)۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جبریل امین سے فرمایا: ''میں پسند کرتا ہوں کہ میں تجھے ایسی صورت میں دیکھوں جس میں تو آسمان میں ہوتا ہے''۔ حضرت جبریل امین نے کہا: آپ اس پر قدرت نہ رکھیں گے؟ فرمایا: ''کیوں نہیں''۔ عرض کی: آپ کہاں چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لیے وہ صورت بناؤں؟ فرمایا: ''ابطح میں''۔ عرض کی: وہ تو مجھے احاطہ نہیں کر سکتی۔ فرمایا: ''منیٰ میں''۔ عرض کی: وہ میرے لیے کافی نہیں۔ فرمایا: ''عرفات میں''۔ عرض کی: وہ اس قابل ہے کہ مجھے احاطہ میں لے لے۔ حضرت جبریل امین نے ان سے وعدہ کر لیا۔ نبی کریم ﷺ وقت مقررہ پر تشریف لے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عرفات کے پہاڑوں سے جھنکار کے ساتھ آئے جبکہ انہوں نے مشرق و مغرب کو بھرا ہوا تھا ان کا سر آسمان میں تھا اور دونوں قدم زمین میں تھے جب نبی کریم ﷺ نے انہیں دیکھا تو بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔ حضرت جبریل امین نے سابقہ صورت اپنائی اور آپ کو سینے سے لگایا اور کہا: اے محمد! ﷺ خوف نہ کھائیے آپ ﷺ کا کیا حال ہوتا اگر آپ حضرت اسرافیل کو دیکھتے جبکہ ان کا سر تخت کے نیچے اور ان کے قدم ساتویں زمین تک پہنچے ہوئے ہوتے عرش ان کے کندھے پر ہوتا۔ بعض اوقات وہ اللہ کے خوف سے کمزور ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک چڑیا کی صورت میں ہوتے ہیں یہاں تک کہ تیرے رب کے عرش کو اس کی عظمت ہی اٹھائے ہوئے ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے افق مبین پر اپنے رب کو دیکھا؛ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے (3)۔ سورۃ النجم میں یہ بحث مکمل گزر چکی ہے۔ اسے وہاں سے غور سے پڑھ لے۔

الْمُبِيْنِ میں دو قول ہیں ان میں سے ایک افق کی صفت ہے؛ یہ ربیع کا قول ہے۔

دوسرا یہ ہے: یہ اس کی صفت ہے جس کو انہوں نے دیکھا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی کی قراءت میں ظنین ہے یعنی ان پر کوئی تہمت نہیں۔ ظنہ کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 218 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 530 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 218

معنی تہمت ہے؛ شاعر نے کہا:

أما و كتاب اللهِ لا عن شناءةٍ هُجِرتُ ولكِنّ الظنِينَ ظَنِينُ

خبردار کتاب اللہ کی قسم! مجھے کسی دشمن کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا مگر متہم متہم ہوتا ہے۔

ابو عبید نے اسے اختیار کیا ہے کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کو بخیل قرار نہیں دیا بلکہ آپ ﷺ کو جھٹلایا کیونکہ عربوں کا کلام یوں ہوتا ہے: ما هو بكذا۔ وہ ماهو على كذا نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں: ما أنت على هذا بمتهم۔ باقی قراء نے اسے بضنين پڑھا ہے یعنی آپ ﷺ بخیل نہیں ہیں۔ یوں باب چلایا جاتا ہے ضننت بالشئ أضن ضنا فهو ضنين۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: جو آپ ﷺ کو علم دیا گیا ہے اس میں تم پر بخل نہیں کرتے بلکہ وہ مخلوقات کو اللہ کا کلام اور اس کے احکام سکھاتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

أَجود بمكنونِ الحديثِ وإنّنِي بِسِرّك عمن سألنِي لضَنِينُ

میں سربستہ رازوں کے بارے میں سخاوت کرنے والا ہوں اور میں تیرے راز کے بارے میں بخل کرنے والا ہوں اس سے جو کوئی اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرے۔

**الْغَيْبِ** سے مراد قرآن حکیم اور آسمان کی خبریں ہے پھر یہ حضرت محمد ﷺ کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جبریل علیہ السلام کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بظنين کا معنی کمزور ہے؛ فراء اور مبرد نے یہ بیان کیا ہے یہ کہا جاتا ہے: رجل ظنين یعنی کمزور آدمی۔ بئر ظنون جب اس میں پانی کم ہو۔

ظنون سے مراد ایسا قرض ہے جس کے بارے میں پتہ نہ ہو کیا لینے والا ادا کرے گا یا نہیں؟ اسی معنی میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی ایسے آدمی کے بارے میں گفتگو ہے جس کے دین ظنون تھے: اگر سچا ہے تو جب اپنے قرض پر قبضہ کرے گا تو گزشتہ عرصہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ ظنون سے مراد ایسا آدمی ہے جس کے اخلاق برے ہوں۔ یہ مشترک لفظ ہے۔

**وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾** یعنی قرآن ایسے آدمی کا قول نہیں جو ملعون ہو جس طرح قریش کا کہنا ہے۔ عطا نے کہا: اس سے مراد شیطان ابیض ہے جو نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جبریل کی صورت میں آتا تھا تاکہ آپ ﷺ کو آزمائش میں ڈال دے۔

**فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾** قتادہ نے کہا: اس سے مراد ہے(1) تم اس قول سے اور اس کی اطاعت سے کہاں بھٹکے جا رہے ہو؟ معمر نے قتادہ سے یہی روایت کی ہے یعنی تم میری کتاب اور اطاعت سے کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ زجاج نے کہا: جو راستہ میں نے تمہارے لیے واضح کیا ہے اس کو چھوڑ کر تم کون سے زیادہ واضح راستہ پر چلو گے(2)؟ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: این تذهب کا معنی ہے الی این تذهب فراء نے عربوں سے روایت نقل کی ہے: ذهبت شام، خرجت العراق، انطلقت السوق سب میں الی مراد ہے کہا: ہم نے ان تین افعال میں سنا ہے۔ بنی عقیل میں سے ایک نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 219　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 530

وأيّ الأرضِ تذهبُ بالصباحِ يعني إلى أيّ الأرض تذهبُ بالصباحِ

یہاں الی محذوف ہے۔ جنید نے کہا: وہ اس آیت کو دوسری آیت سے ثابت کرتے ہیں۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ (الحجر:21) اور نہیں کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے ہیں (بھرے پڑے) کون سے راستے پر تم چلتے ہو جو اس راستہ سے زیادہ واضح ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے واضح کیا ہے؛ یہ زجاج کے قول کا معنی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ یعنی قرآن عالمین کے لیے نصیحت اور تنبیہ ہے اِنْ، ما کے معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم سراپا نصیحت ہیں۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ تم میں سے جو چاہے حق کی اتباع کرے اور قائم رہے۔ حضرت ابو ہریرہ اور سلیمان بن موسیٰ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو جہل نے کہا معاملہ ہمارے سپرد ہے چاہیں تو استقامت کا مظاہرہ کریں چاہیں تو استقامت کا مظاہرہ نہ کریں۔ یہی قدر ہے اور ابو جہل قدریہ کا رئیس ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾ اس امر کو واضح کیا بندہ کوئی بھلائی کا کام نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہوتا ہے اور کوئی برائی نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! عربوں نے اسلام نہ چاہا یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اسے چاہا(1)۔ وہب بن منبہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر جو کتابیں نازل کی ہیں ان میں شامی کتب میں میں نے پڑھا: جس نے مشیئت کو اپنی طرف منسوب کیا اس نے کفر کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام:111) اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرتے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یونس:100) کسی نفس کو اختیار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (القصص:56) جسے ہدایت دینا آپ پسند کرتے ہیں آپ اسے ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کے حق میں چاہتا ہے۔ اس معنی میں یہ آیات کثیر ہیں اس طرح احادیث بھی بہت زیادہ ہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے ہدایت دی اور کفر کے وسیلہ سے گمراہ کیا جس طرح پہلے کئی مواقع پر گزر چکا ہے۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 262

# سورۃ الانفطار

آیاتہا ۱۹ ۸۲ سورۃ الانفطار مکیۃ ۸۲ رکوعہا ۱

تمام علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس کی انیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾

''جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر بہنے لگیں گے اور جب قبریں زیر و زبر کر دی جائیں گی (اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا''۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ جب آسمان اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھٹ جائے گا تاکہ فرشتے اتریں۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ (الفرقان) جس روز آسمان بادل کی صورت میں پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے پھٹ جائے گا۔ فطر کا معنی پھاڑنا ہے یوں جملہ بولا جاتا ہے: فطرتُه فانفطرَ میں نے اسے پھاڑا تو وہ پھٹ گیا۔ اس معنی میں فطرنا البعیر ہے ھو بعیر فاطر۔ ایسا اونٹ جس کی ناب نکل آئی ہے تفطر الشیٔ شئی پھٹ گئی۔ سیف فطار جس میں پھٹنیں ہوں۔

عنترہ نے کہا:

وسیفی کالعقیقۃ وھو کمعی سلاحی لا أفلّ ولا فُطارا

میری تلوار چمکدار ہے وہ میری ساتھی ہے میرے اسلحہ میں نہ دندانے ہیں نہ پھٹنیں۔

یہ بحث پہلے کئی دفعہ گزر چکی ہے۔

وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ ٹوٹ گریں گے یوں جملہ بولا جاتا ہے: نثرت الشیٔ أنثرہ نثرا فانتثر میں نے اسے گرایا تو وہ گر گیا۔ اس کا اسم نثار ہے نثارا سے کہتے ہیں جو کسی شئی سے گرے دُرِّ منثر کثرت کی وجہ سے اسے مشدد پڑھا۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ سمندروں کو ایک دوسرے کی طرف کھول دیا جائے گا تو وہ ایک سمندر بن جائے گا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ان کا پانی جاتا رہے گا اور وہ خشک ہو جائیں گے (1) اس کی وجہ یہ ہے پہلے وہ ایک جگہ کھڑا اور مجتمع ہو گا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 263

جب انہیں کھولا جائے گا تو وہ بکھر جائے گا اور اس کا پانی ختم ہو جائے گا: یہ تمام امور قیامت سے پہلے ہوں گے۔

وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝ جب قبروں کو الٹ دیا جائے گا اور اس میں جو مردے ہیں انہیں زندہ کر کے نکالا جائے گا یہ جملہ بولا جاتا ہے: بعثرت المتاع میں نے سامان کو الٹ پلٹ کر دیا۔ بعثرت الحوض و بحثرته جب تو اسے گرا دے اور اس کے نیچے والا حصہ اوپر کر دے۔ ایک قوم نے کہا جن میں سے فراء بھی ہے: معنی ہے زمین میں جو سونا اور چاندی ہوگی اسے نکال دے گی یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ زمین اپنا سونا اور چاندی باہر نکال دے گی (1)۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ۝ اس روز انسان کو وہ کچھ بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا یا پیچھے چھوڑا۔ یہ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ کا جواب ہے کیونکہ یہ حضرت بصری کے قول کے مطابق قسم ہے جو عَلِمَتْ نَفْسٌ پر واقع ہو رہی ہے یعنی جب قیامت کی نشانیوں میں سے یہ امور ظاہر ہوں گے تو ہر نفس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کو جان لے گا کیونکہ اس کے بعد کا عمل اسے کوئی نفع نہیں دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہ اشیاء متحقق ہو جائیں گی تو قیامت برپا ہو جائے گی تو ہر نفس نے جو کچھ کیا ہوگا اس پر اس کا محاسبہ ہوگا اور اس کی کتاب اس کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دی جائے گی تو اس کے پڑھنے کے موقع پر اسے اپنے تمام اعمال یاد آ جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ خبر ہے قسم نہیں۔ یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۝

"اے انسان! کس چیز نے تجھے دھوکے میں رکھا اپنے رب کریم کے بارے میں جس نے تجھے پیدا کیا پھر تیرے (اعضاء کو) درست کیا پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا (الغرض) جس شکل میں چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔ یہ سچ ہے بلکہ تم جھٹلاتے ہو روز جزا کو"۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ دوبارہ اٹھائے جانے کا جس نے انکار کیا انہیں خطاب فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انسان سے یہاں مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد ابی بن خلف ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ابو الاشد بن کلدہ کے حق میں نازل ہوئی (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ سے مراد ہے کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈالا یہاں تک کہ تو نے کفر کیا اس ذات کے ساتھ جو تجھ سے درگزر فرمانے والی ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ شیطان جو انسان پر مسلط ہوتا ہے اس نے اسے دھوکے میں ڈالا (4)۔ حضرت حسن بصری نے کہا: خبیث شیطان نے اسے دھوکے میں ڈالا (5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے بے وقوف اور جاہل بنا دیا (6)۔ حضرت حسن بصری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی روایت نقل کی ہے غالب حنفی نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کیا فرمایا: اسے جہالت نے دھوکے میں ڈالا۔ صالح بن مسمار نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 221
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 263
6۔ ایضاً

آیت کی تلاوت کی تو فرمایا: ''اس کی جہالت نے اسے دھوکے میں ڈالا''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (الاحزاب) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی معافی نے اسے دھوکے میں ڈالا کیونکہ پہلے جرم پر ہی اس سزا نہ دی (1)۔ ابراہیم بن اشعث نے کہا فضیل بن عیاض سے کہا گیا: اگر اللہ تعالیٰ تجھے قیامت کے روز اپنے سامنے کھڑا کرے اور تجھ سے فرمائے: تیرے کریم رب کے بارے میں تجھے کس نے دھوکہ میں ڈالا (2)؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ جواب دیا: میں کہوں گا تیرے حجابات نے مجھے دھوکہ میں ڈالا کیونکہ یہی ستار ہے۔

ابن سماک نے اسے یوں نظم کیا ہے فرمایا:

یاکاتمَ الذنب أما تستحیی واللهُ فی الخَلْوۃ ثانیكَ

غَرَّكَ من ربك إمهالُه وسَتْرُہُ طولَ مَساويكَ

اے گناہوں کو چھپانے والے! کیا تو حیا نہیں کرتا جبکہ خلوت میں اللہ تیرا ثانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل اور اس کی پردہ پوشی نے تجھے تیرے گناہوں کے بارے میں دھوکہ میں ڈالے رکھا۔

حضرت ذوالنون مصری نے کہا: پردہ کے نیچے کتنے ہی مغرور ہیں جبکہ انہیں شعور نہیں۔

حضرت علی شیر خدا کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے ایک غلام کو کئی بار بلایا اس نے کوئی جواب نہ دیا دیکھا تو وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا پوچھا: کیا وجہ ہے تو نے مجھے جواب نہیں دیا؟ اس نے عرض کی: مجھے آپ کے حلم پر اعتماد تھا اور آپ کی سزا سے میں امن میں تھا۔ حضرت علی شیر خدا نے اس کے جواب کو پسند کیا اور اسے آزاد کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں: اس کا معنی ہے کس چیز نے تجھے دھوکہ میں ڈالا یہاں تک کہ جو چیز تم پر واجب تھی اس کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تم میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ تنہائی میں ملے گا اور پوچھے گا: اے ابن آدم! کس چیز نے تجھے میرے بارے میں دھوکہ میں ڈالا۔ اے ابن آدم! جو تجھے علم تھا اس کے بارے میں تو نے کیا عمل کیا؟ اے انسان! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا۔

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ ایک نطفہ سے تیری خلقت کو مقدر کیا، تجھے تیری ماں کے پیٹ میں درست کیا، تیرے لیے دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں اور باقی اعضاء بنائے، تجھے معتدل اور مناسب ڈھانچے والا بنایا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھذا شئ معدل یہ چیز موزوں ہے۔ یہی عام قراء کی قراءت ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ فراء نے کہا: ابو عبید کہا کرتے تھے اس تعبیر پر اللہ تعالیٰ کا فرمان لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین) دلالت کرتا ہے ہم نے انسان کو حسین پیکر میں بنایا۔ کوفہ کے قراء، عاصم، حمزہ اور کسائی نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی جس صورت میں چاہا اسے پھیر دیا خوبصورت، بدصورت، لمبا، چھوٹا۔ موسیٰ بن علی بن ابی رباح لخمی نے اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب نطفہ رحم میں قرار پکڑ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نطفہ کے اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان جو جو نسب ہوتا ہے اسے حاضر کرتا ہے کیا تو نے اس آیت کو نہیں پڑھا فِيْۤ اَيِّ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 532
2۔ ایضاً

صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ ''یعنی تیرے اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان جو صورتیں تھیں ان میں سے جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا''(1)۔

عکرمہ اور ابو صالح نے کہا: اگر انسان کی صورت میں چاہا، اگر گدھے کی صورت میں چاہا، اگر بندر کی صورت میں چاہا اور اگر خنزیر کی صورت میں چاہا۔ مکحول نے کہا: اگر مذکر چاہا تو مذکر اگر مونث چاہا تو مونث۔

مجاہد نے کہا: باپ یا ماں یا چچا یا ماموں یا کسی اور میں سے جس صورت میں چاہا تجھے بنایا۔ فی حرف جار رَكَّبَكَ کے متعلق ہے عدلت کے متعلق نہیں یہ اس کی قراءت میں ہے جس نے اس میں تخفیف کے ساتھ قراءت کی کیونکہ تو کہتا ہے: عدلت الی کذا تو یہ نہیں کہتا: عدلت فی کذا اسی وجہ سے فراء نے تخفیف سے منع کیا ہے کیونکہ انہوں نے فی حرف جار کو عدلت کے متعلق کیا ہے۔ ما کے بارے میں جائز ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہو کلام یوں ہو فی أی صورۃ شاء رکبك۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاء شرطیہ ہو کلام یوں ہوگی إن شاء رکبك اگر چاہے تو تجھے انسان کی صورت کے علاوہ کسی اور صورت میں جیسے بندر، گدھے اور خنزیر کی صورت میں بنادے۔ پس فاء شرط و جزا کے معنی میں ہوگا یعنی جس صورت میں ترکیب دینا چاہے گا ترکیب دے گا۔

كَلَّا بَلۡ تُكَذِّبُوۡنَ بِالدِّيۡنِ ۝ یہ بھی جائز ہے کہ كَلَّا حق کے معنی میں ہو تو اس سے کلام کا آغاز ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لا کے معنی میں ہو پھر معنی بنے گا معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو کہ تم غیر اللہ کی عبادت میں حق پر ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ ۝ دلالت کرتا ہے؛ فراء بھی یہی کہتا ہے۔ معنی یہ ہوگا بات اس طرح نہیں جس طرح تجھے دھوکے میں رکھا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو کہ دوبارہ اٹھانا نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جھڑکنے کے معنی میں ہے یعنی تم اللہ تعالیٰ کے حکم اور کرم سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات میں تفکر چھوڑ دو۔

ابن انباری نے کہا: الدین اور رَكَّبَكَ پر وقف عمدہ ہے اور كَلَّا پر عطف قبیح ہے۔

بَلۡ تُكَذِّبُوۡنَ بِالدِّيۡنِ ۝ اے اہل مکہ تم حساب کو جھٹلاتے ہو بَلۡ ماقبل شی کی نفی اور دوسری چیز کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے ان کا دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار یہ تو معلوم تھا اگرچہ اس سورت میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۝ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝

''حالانکہ تم پر (نگراں) فرشتے مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو''۔

یعنی فرشتوں میں نگہبان ہیں وہ بڑے معزز ہیں یہ اسی طرح ہے جس طرح یہ فرمایا: كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝ (عبس) معزز، نیک ہیں۔

یہاں تین مسائل ہیں:

---

1۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 548-547، حدیث 4695

## کراماً کاتبین کس حالت میں بندے سے جدا ہوتے ہیں

**مسئلہ نمبر 1**۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے "کراماً کاتبین کی عزت کیا کرو وہ دو حالتوں کے سوا تم سے الگ نہیں ہوتے (۱) قضائے حاجت (۲) حقوق زوجیت جب تم میں سے کوئی ایک غسل کرے تو وہ دیوار یا کسی چیز سے پردہ کرے یا اس کا بھائی اس کا پردہ کرے" حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: فرشتہ بندہ سے رخ پھیرے رہتا ہے جب تک اس کی شرمگاہ ننگی ہو۔ روایت بیان کی گئی ہے: "بندہ جب حمام میں بغیر چادر کے داخل ہوتا ہے تو دو فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں"۔

## کیا کافروں پر بھی فرشتے مقرر ہیں؟

**مسئلہ نمبر 2**۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کافروں پر بھی فرشتے ہوتے ہیں یا نہیں۔ بعض نے کہا: نہیں ہوتے کیونکہ ان کا امر ظاہر ہوتا ہے اور عمل بھی ایک ہی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ** (الرحمن) مجرموں کو ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان پر حفظہ ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۙ۝۹ وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۙ۝۱۱ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲** ایک اور جگہ فرمایا: **وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ** (حاقہ:25) رہا وہ شخص جس کو نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ فرمایا: **وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝۱۰** (الانشقاق) رہا وہ شخص جس کو اس کا نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا گیا اس کی خبر دی کہ کفار کے لیے بھی کاتب ہوں گے اور ان پر نگہبان ہوں گے۔ اگر یہ سوال کیا جائے: جو فرشتہ اس کے دائیں کندھے پر ہے وہ کیا چیز لکھے گا جبکہ اس کی تو کوئی نیکی نہیں؟ اسے جواب دیا جائے گا: جو بائیں کندھے پر فرشتہ ہے وہ اپنے ساتھی کی اجازت سے لکھے گا پس وہ اس پر گواہ ہوگا اگرچہ وہ خود نہیں لکھے گا۔

## فرشتے کو انسان کی نیکی اور برائی کے ارادے کا کیسے پتہ چلتا ہے؟

**مسئلہ نمبر 3**۔ سفیان سے پوچھا گیا: فرشتوں کو کیسے علم ہوتا ہے کہ بندے نے نیکی یا برائی کا ارادہ کیا ہے؟ کہا: جب بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس سے کستوری کی خوشبو پاتے ہیں اور جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس سے بدبو پاتے ہیں سورۂ ق میں **مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ۝۱۸** (ق) کے ضمن میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔ علماء نے قضائے حاجت اور حقوق زوجیت کے وقت گفتگو کو مکروہ جانا ہے کیونکہ اس وقت فرشتے بندے سے الگ ہوتے ہیں اس بارے میں گفتگو سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے: تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز ان پر مخفی نہیں ہوتی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے ظاہر اعمال کو جانتے ہیں جو تمہارے دلوں کی باتیں ہیں انہیں نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

**اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝۱۳ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝۱۴ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۝۱۵**

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 6، صفحہ 264

وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآىِٕبِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

"بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے۔ اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے۔ داخل ہوں گے اس میں قیامت کے روز اور وہ اس سے غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور آپ کو کیا علم کہ روز جزا کیا ہے، پھر آپ کو کیا علم کہ روز جزا کیا ہے۔ (یہ وہ دن ہوگا) جس روز کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور سارا حکم اس روز الله ہی کا ہوگا"۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿ یہ اسی طرح تقسیم ہے جس طرح یہ تقسیم ہے فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴿ (الشوریٰ) ایک جماعت جنت میں ہوگی اور ایک جماعت جہنم میں ہوگی۔ اسی طرح اس ارشاد میں فرمایا: يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿ (الروم) فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:26)

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿ انہیں جہنم کی لپک اور گرمی پہنچے گی يَوْمَ الدِّيْنِ سے مراد یوم جزا ہے اس کا ذکر مکرر کیا تا کہ اس کی عظمت شان کا اظہار ہو جس طرح اس ارشاد میں ہے: اَلْقَارِعَةُ ﴿ مَا الْقَارِعَةُ ﴿ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿ (قارعہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: قرآن حکیم نے جہاں بھی وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ کا ذکر ہے الله تعالیٰ نے ان امور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا اور قرآن حکیم میں جہاں بھی و ما یدریك کے الفاظ ہیں تو وہ امور آپ سے مخفی رکھے گئے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ ابن کثیر اور ابو عمرو نے يَوْمَ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ يَوْمُ الدِّيْنِ سے بدل ہے یا اسے پہلے یوم کی طرف لوٹا دیا گیا ہے تو اس صورت میں یہ يَوْمُ الدِّيْنِ کی صفت ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو ضمیر کی وجہ سے مرفوع ہو (یعنی مبتدا اور خبر ہو) باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ ہے تو رفع کے محل میں مگر نصب اس لیے دی گئی ہے کیونکہ یہ مبنی ہے اور مضاف ہے جس طرح تو کہتا ہے: اعجبنی یوم یقوم زید۔ مبرد نے کہا:

مِنْ أَيِّ يَوْمَيَّ مِنَ الموتِ أَفِرْ ... أَ يومَ لم يُقْدَرَ أَم يومَ قُدِرْ

میں موت کے کون سے دن سے بھاگوں کیا اس دن سے جو مقدر نہیں یا جو مقدر کیا گیا ہے۔

دوسرے دونوں یوم کے الفاظ پہلے دونوں یوم کے الفاظ سے بدل ہیں مگر لفظ میں منصوب اس لیے ہیں کیونکہ دونوں جملہ کی طرف مضاف ہیں؛ یہ فراء اور زجاج کا پسندیدہ مسلک ہے۔ ایک قوم نے کہا: دوسرا یوم منسوب ہے گویا یہ فرمایا: فی یوم لا تملك نفس لنفس شیا۔ ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ ان کا معنی یہ ہے ان ھذہ الاشیاء تکون یوم یا اس کا یہ معنی ہے یدانون یوم کیونکہ لفظ دین اس پر دلالت کرتا ہے۔ اذ کرکی وجہ سے منصوب ہے

وَ الْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿ اس میں کوئی الله تعالیٰ سے جھگڑا نہیں کرے گا جس طرح یہ فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿ (غافر) آج کس کی بادشاہت ہے الله واحد وقہار کی۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (غافر:17) آج ہر نفس کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

# سورۃ المطففین

آیاتہا ۳۶ | ۸۳ سورۃ المطففین مکیۃ ۸۶ | رکوعہا ۱

حضرت ابن مسعود، ضحاک اور مقاتل کے قول کے مطابق یہ مکی ہے (1) اور حضرت حسن بصری اور عکرمہ کے قول کے مطابق مدنی ہے۔ اس کی چھتیس آیات ہیں۔

مقاتل نے کہا: یہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: آٹھ آیات کے علاوہ یہ مدنی ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا سے آخر تک آیات مکی ہیں۔ کلبی اور حضرت جابر بن زید نے کہا: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾ۖ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾

"بربادی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، جب وہ لوگوں سے ناپ تول کرتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو (ان کو) نقصان پہنچاتے ہیں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

## آیت کا شان نزول

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو وہ بہت ہی برا کیل کرنے والے لوگ تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا تو انہوں نے اپنے کیل کو اچھا کر لیا (2)۔ فراء نے کہا: وہ آج تک سب سے اچھا کیل کرنے والے تھے (3)۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے کہا: یہ وہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے۔ یہ انہیں کے بارے میں حکم ہے جب وہ خریدتے تو راجح کیل کے ساتھ لیتے جب وہ بیچتے تو کیل اور وزن میں کمی کرتے جب یہ سورت نازل ہوئی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 225

2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 534۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب التوقی فی الکیل والوزن، حدیث نمبر 2213، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 225

تو وہ رک گئے۔ وہ آج تک تمام لوگوں سے اچھے کیل کرنے والے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: یہ ایک آدمی کے بارے میں آیات نازل ہوئیں جو ابوجہینہ کے نام سے معروف تھا (1) اس کا نام عمرو تھا اس کے دو صاع تھے وہ ایک صاع سے لیتا اور دوسرے صاع سے دیتا؛ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

## ویل سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَيْلٌ یعنی آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ جہنم میں ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ بہے گی یعنی وہ لوگ جو اپنے کیل اور وزن میں کمی کرتے ہیں ان کے لیے یہ عذاب ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مطفف سے مراد وہ شخص ہے جو ایسا آدمی اجرت پر لاتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ وہ کیل میں ظلم کرے گا تو اس مزدور کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔ دوسرے علماء نے کہا: تطفیف، کیل، وزن، وضو، نماز اور حدیث میں ہوتی ہے۔ موطا میں امام مالک نے ارشاد فرمایا: ہر شئی میں وفا اور تطفیف ہے۔ سالم بن ابی جعد سے مروی ہے کہ نماز کا بھی معیار ہے جو اس کے حقوق پورے کرے (2) وہ اس کے حق میں ہے اور جس نے کمی کی تو تم جان لو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝۔

## مطفف کی تشریح

**مسئلہ نمبر 3**۔ اہل لغت نے کہا: مطفف، طفیف سے ماخوذ ہے جس کا معنی قلیل ہے۔ مطفف اسے کہتے ہیں جو حق دار کے حق میں کیل اور وزن کے ذریعے کمی کرے۔ زجاج نے کہا: یہ کام کرنے والے کو مطفف کہتے ہیں کیونکہ وہ اس پیمانہ اور ترازو کے ساتھ تھوڑی سی چیز ہی چوری کرتا ہے۔ یہ طف الشئی سے ماخوذ ہے جو اس شئی کی جانب ہوتی ہے۔ یہ لفظ بولا جاتا ہے: طِفاف المكوك، طَفاف المكوك جو اس کے کناروں کو بھر دے اس طرح لفظ بولا جاتا ہے: طف المكوك و طففه۔ حدیث طیبہ میں ہے كلكم بنو آدم طف الصاع لم تملؤه۔ معنی یہ ہے تم ایک دوسرے کے قریب ہو تمہیں ایک دوسرے پر تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت نہیں۔ طفاف اور طفافه سے مراد ہے جو پیمانہ سے بڑھ کر ہو۔ اناء طفاف جب اس کا بھرنا کنارے تک پہنچ جائے تو اس سے یہ فعل ماخوذ کرتا ہے أطففت۔ تطفیف سے مراد ہے پیمانہ میں کمی کرنا وہ یہ کہ کناروں تک نہ بھرا جائے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ادهقت الكأس الى اصبارها یعنی میں نے کنارے تک پیالے کو بھر دیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گھڑ دوڑ کا ذکر کیا: میں اس روز شاہسوار تھا میں لوگوں پر سبقت لے گیا یہاں تک طفف بی الفرس مسجد بنی زریق میرا گھوڑا مسجد بنی زریق کے برابر ہوا چاہتا تھا۔

## مطفف کی اصل حقیقت کیا ہے؟

**مسئلہ نمبر 4**۔ مطفف اسے کہتے جو کیل اور وزن میں کمی کرتا ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے وہ پورا پورا حق نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 449 2۔ ایضاً

دیتا۔ ابن قاسم نے ابن مالک سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ کی قراءت کی فرمایا: نہ ناپ تول میں کمی کرو نہ ہی ملاوٹ کرو بلکہ پلڑے کو چھوڑ دو اور اس پر کوئی چیز بہاؤ یہاں تک کہ جب وہ پورا ہو جائے تو اپنے ہاتھ کو کھلا چھوڑ دو اور اسے نہ روکو۔ عبدالملک بن ماجشون نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے کناروں پر ہاتھ مارنے سے منع کیا اور فرمایا: ''برکت تو اس کی چوٹی میں ہے'' کہا مجھے خبر پہنچی ہے کہ فرعون کا پیمانہ لوہے کا تھا۔

الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ فراء نے کہا: یہاں عَلَى، من کے معنی میں ہے(1) یہ جملہ بولا جاتا ہے: اکتلت منك یعنی میں نے تجھ سے پورا پورا حق لے لیا، یہ جملہ بولا جاتا ہے: اکتلت ما علیك جو حق تجھ پر لازم تھا میں نے وہ پورا پورا لے لیا ہے۔ زجاج نے کہا: جب وہ لوگوں سے کیل کرتے ہیں تو ان کے خلاف کیل پورا لیتے ہیں (2)۔ معنی یہ ہوگا جب حق لیتے ہیں تو زیادتی سے لیتے ہیں۔ جب دوسروں کو دیں یا ان کے لیے وزن کریں تو اس میں کمی کرتے ہیں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہ لوگوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ طبری نے کہا: یہاں علی، عند کے معنی میں ہے۔

وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝

اس میں دو مسئلے ہیں:

## کیل اور وزن سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ یعنی جب دوسروں کے لیے کیل اور وزن کرتے ہیں تو یہاں سے لام حذف کر دیا گیا ہے فعل براہ راست مفعول کی طرف متعدی ہے اور اس نے اسے نصب دی ہے اس کی مثل نصحتك اور نصحت لك ہے۔ أمرتك به اور أمرتكه ہے؛ یہ اخفش اور فراء نے بات کہی۔ فراء نے کہا: میں نے ایک بدوی عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا جب لوگ واپس لوٹ جائیں گے تو ہم تاجر کے پاس آئیں گے جو آنے والے موسم حج تک ایک مد، دو مد کیل کر کے دے دے گا۔ یہ اہل حجاز اور ان کے مجاور بنو قیس کی لغت ہے۔

زجاج نے کہا: کالوا اور وزنوا پر وقف کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ اس کے ساتھ ھم ضمیر ملی ہو۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس ضمیر کو تاکید بناتے ہیں اور کالوا اور وزنوا پر وقف کرتے ہیں۔ پہلا نقطہ نظر پسندیدہ ہے کیونکہ فعل اور ضمیر مل کر ایک حرف ہے؛ یہ کسائی کا قول ہے۔ ابو عبید نے کہا: عیسیٰ بن عمر نے انہیں دو حرف قرار دیا اور کالوا اور وزنوا پر وقف کرتا اور ھم یخسرون سے نئی کلام شروع کرتا(3)۔ میرا خیال ہے حمزہ کی قراءت بھی اسی طرح ہے۔ ابو عبید نے کہا: پسندیدہ بات یہ ہے کہ دونوں ایک کلمہ ہوں(4) اس کی دو وجہیں ہیں (۱) خط، اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے اسے الف کے بغیر لکھا ہے اگر یہ دونوں الگ الگ کلمے ہوتے تو کالوا اور وزنوا الف کے ساتھ لکھے جاتے (۲) یہ جملہ کہا جاتا ہے: کلتك، وزنتك یہ کلت لك اور وزنت لك کے معنی میں ہے یہ عربی کلام ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: صدتك و صدت لك میں نے تیرے لیے شکار کیا۔ کسبتك،

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 226
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 535
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 226
4۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 535

کسبت لك میں نے تیرے لیے کسب کیا۔ اسی طرح شکرتك اور نصحتك ہے اسی طرح کی دوسری مثالیں ہیں۔

**یُخْسِرُوْنَ** کا معنی ہے وہ کمی کرتے ہیں عرب کہتے ہیں: أخسرتُ المیزان، خسرتُه میں نے اس میں کمی۔ عام قرأت کے مطابق **ھم** ضمیر منصوب ہے اور الناس کی طرف لوٹ رہی ہیں تقدیر کلام یہ ہوگی واذا کالوا الناس أو وزنوھم یخسرون اس میں دو وجہیں ہیں (۱) یہ ارادہ کیا جائے کالوا لھم او وزنوا لھم حرف جار کو حذف کیا گیا اور فعل کو مفعول کے ساتھ ملا دیا جس طرح کہا: ولقد جنیتك اکموا وعساقلا اس سے مراد جنیت لك ہے (۲) مضاف کو حذف مانا جائے اور مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام رکھا جائے مضاف، مکیل اور موزون ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اے عجمیو! تم دو امور کے ذمہ دار بنے ہوان دونوں کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہوئے جو تم سے پہلے تھے کیل اور وزن۔ عجمیوں کو خاص کیا کیونکہ یہ کیل اور وزن دونوں کو جمع کرتے ہیں دونوں حرموں میں یہ الگ الگ ہیں اہل مکہ وزن کیا کرتے تھے اور اہل مدینہ کیل کیا کرتے تھے۔ دوسری قراءت میں **ھم** ضمیر مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے جب وہ لوگوں کے لیے کیل اور وزن کرتے ہیں تو وہ کمی کرتے ہیں یہ تعبیر صحیح نہیں کیونکہ پہلی ضمیر تو لغو ہو جاتی ہے یہ تعبیر اس وقت درست ہوگی اگر اس کے بعد یہ کلام ہوتی واذا کالوھم ینقصون أو وزنوا ھم یخسرون۔

## کیل و وزن میں کمی کی سزا

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ''پانچ سزائیں پانچ اعمال کے بدلے میں ہیں، کوئی قوم بدعہدی کا ارتکاب نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر فیصلہ نہیں کرتے مگر ان میں فقر عام ہو جاتا ہے، ان میں بے حیائی عام نہیں ہوتی مگر ان میں طاعون پھیل جاتا ہے، وہ کیل میں کمی نہیں کرتے مگر ان سے نباتات کو روک لیا جاتا ہے اور قحط سالی سے انہیں پکڑ لیا جاتا ہے، وہ زکوۃ کو نہیں روکتے مگر اللہ تعالیٰ ان سے بارش کو روک لیتا ہے''۔ اسے ابوبکر بزار اور حضرت مالک بن انس نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔ مالک بن دینار نے کہا: میں اپنے پڑوسی کے پاس گیا جس کی موت کا وقت قریب تھا وہ کہنے لگا: آگ کے دو پہاڑ، آگ کے دو پہاڑ۔ میں نے کہا: تو کیا کہتا ہے؟ کیا تو ہذیان کہتا ہے؟ اس نے کہا: اے ابویحییٰ میرے پاس دو پیمانے تھے میں ایک کے ساتھ دیتا اور دوسرے سے لیا کرتا تھا میں اٹھا یہاں تک کہ میں ایک کو دوسرے کے ساتھ مارنے لگا یہاں تک کہ میں نے دونوں کو توڑ دیا اس نے کہا: اے ابویحییٰ! جب تو نے ایک کو دوسرے سے مارا تو وہ اور بڑھتا گیا وہ اسی تکلیف کی وجہ سے مر گیا۔

عکرمہ نے کہا: میں کیل اور وزن کرنے والے کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جہنم میں ہوگا۔ اصمعی نے کہا: میں نے ایک بدو عورت سے سنا وہ کہہ رہی تھی تو اس سے مروت کو تلاش کر جس کی مروت مکیال کے سروں میں ہو اور اس سے مروت کو تلاش نہ کر جس کی مروت ترازو کی زبان میں ہو؛ یہی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ عبد خیر نے کہا: حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جبکہ وہ زعفران کا وزن کر رہا تھا اور ان کو تول رہا تھا تو حضرت علی شیر خدا نے اس کے

ترازو کو الٹ دیا پھر فرمایا: انصاف سے وزن کرو پھر اس کے بعد جو چاہو زائد دے دو۔ گویا پہلے اسے برابری کا حکم دیا تا کہ اس کا عادی ہو جائے اور واجب کو نفل سے الگ کرے۔ نافع نے کہا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تاجر کے پاس سے گزرتے فرماتے: اللہ سے ڈرو اور ناپ تول پورا کرو بے شک ناپ تول میں کمی کرنے والے کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ پسینہ ان کے کانوں کے نصف تک پہنچ رہا ہوگا۔ یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ آئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر جا چکے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سباع بن عرفہ کو مدینہ طیبہ پر نائب بنایا ہوا تھا حضرت ابو ہریرہ نے کہا: ہم نے ان کو صبح کی نماز میں پایا انہوں نے پہلی رکعت میں کٓھٰیٰعٓصٓ اور دوسری رکعت میں وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ﴿۱﴾ کو پڑھا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اپنی نماز میں کہتا ہوں ابوفلاں کے لیے ہلاکت ہو اس کے دو پیمانے تھے جب کسی سے کوئی چیز لیتا تو پوری لیتا اور جب کسی کو کیل کر کے دیتا تو ناقص کے ساتھ دیتا۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴﴾ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۵﴾ یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶﴾

”کیا وہ (اتنا) خیال بھی نہیں کرتے کہ انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا ایک بڑے دن کے لیے جس دن لوگ (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہوں گے پروردگار عالم کے سامنے“۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴﴾ وہ ناپ تول میں کمی کرنے پر جس جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان پر تعجب اور انکار کا ذکر ہے گویا وہ سوچتے تک نہیں اور نہ ہی گمان کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا۔ یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے یعنی کیا انہیں یقین نہیں اگر انہیں دوبارہ اٹھنے کا یقین ہوتا تو وہ کیل اور وزن میں کمی نہ کرتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ظن تردد کے معنی میں ہے یعنی اگر وہ یقین نہیں رکھتے تو انہوں نے گمان کیوں نہ کیا یہاں تک کہ وہ تدبر کرتے اور زیادہ محتاط چیز کو اپناتے۔

لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۵﴾ اس کی شان عظیم ہے اس سے مراد یوم قیامت ہے۔

یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶﴾ اس کے بارے میں چار مسائل ہیں:

## یوم کی اعرابی حیثیت

**مسئلہ نمبر 1**۔ یوم میں عامل فعل مضمر ہے جس پر مَّبۡعُوۡثُوۡنَ فعل دلالت کرتا ہے معنی ہے انہیں اٹھایا جائے گا جس روز لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یَّوۡمَ، لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ سے بدل ہو یہ مبنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ محل جر میں ہے کیونکہ اسے غیر منصرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ظرف کی حیثیت سے منصوب ہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: اقم الی یوم یخرج فلاں یہ یوم کو نصب دے گا اگر اسم کی طرف مضاف کریں تو اسی وقت اسے جر دیتے ہیں وہ کہتے ہیں: اقم الی یوم خروج فلان۔ ایک قول یہ کیا گیا

ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یہ ہے انھم مبعوثون یوم یقوم الناس لرب العالمین لیوم عظیم۔

## ناپ و تول میں کمی گناہ کبیرہ ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ عبدالملک بن مروان کے بارے میں مروی ہے کہ ایک بدو نے اسے کہا: مطففین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے تو نے اس کے بارے میں سن لیا ہے اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مطففین کے بارے میں یہ سخت وعید متوجہ ہوئی جس کے بارے میں تو نے سن لیا ہے تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے جبکہ تو مسلمانوں کے اموال بغیر کیل اور وزن کے لے لیتا ہے؟ اس انکار، تعجب، کلمہ ظن، یوم کی عظیم صفت ذکر کرنا یا لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے اس دن عاجزی کے ساتھ کھڑے ہونا اور اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین ذکر کرنے میں اس گناہ کی عظمت کے بیان میں بلیغ بیان ہے اور ناپ تول میں کمی کرنے کے بڑے گناہ ہونے کا بیان ہے۔ اس طرح جس میں اس قسم کا ظلم ہو، انصاف کو ترک کیا جائے، عدل و انصاف نہ کیا جائے خواہ یہ صورت لینے میں ہو یا دینے میں ہو بلکہ ہر قول و عمل کی یہی صورت ہوگی۔

## ناپ و تول میں کمی کرنے والے کی سزا

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان تین آیات کو پڑھا تو رونے لگے یہاں تک گر پڑے اور مابعد کی قراءت کرنے سے رک گئے پھر کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اس روز لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کا پسینہ ان کے گھٹنوں تک پہنچے گا، ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جن کے کولہوں تک پسینہ پہنچے گا، ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جن کے سینہ تک پسینہ پہنچے گا، ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جن کے کانوں تک پسینہ پہنچے گا یہاں تک کہ ان میں سے ایک اس میں یوں غائب ہو جائے گا جس طرح مینڈک پانی میں غائب ہو جاتا ہے''۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے: وہ تین سو سال تک اس میں کھڑے رہیں گے۔ کہا: مومنوں کے لیے ایک فرض نماز کے برابر آسان ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: لوگ اس روز رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے یہاں تک ان میں سے کوئی پسینہ میں کھڑا ہوگا جو اس کے کانوں کے نصف تک پہنچے گا (1)۔ ان سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سو سال تک کھڑا رہے گا'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بشیر غفاری سے فرمایا: ''تو اس دن کیا کرے گا جس میں لوگ رب العالمین کے لیے تین سو سال تک کھڑے رہیں گے نہ ان کے پاس کوئی خبر آئے گی اور نہ ہی کوئی حکم دیا جائے گا'' (2)۔ حضرت بشیر نے عرض کی: اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جس سے مدد طلب کی جائے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی کہ مومن کے معاملہ میں تخفیف کی جائے گی یہاں تک کہ وہ وقت اس فرض نماز سے بھی خفیف ہوگا جو وہ دنیا میں نماز پڑھتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمھا، صفۃ یوم القیامۃ، جلد 2، صفحہ 384
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 226

تھا۔ یہ حدیث سأل سائل میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مومنوں کے اوپر ان کی فرض نماز سے بھی آسان ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مقام مومن پر سورج کے ڈھلنے جیسا ہوگا، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یونس) خبردار بے شک اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ پھر ان کی صفت اس طرح بیان کی: الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ (یونس) جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور سخاوت سے ہمیں ان میں سے شامل کر دے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: النَّاسُ سے مراد حضرت جبریل امین ہیں جو رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے (1)۔ یہ قول حقیقت سے بہت ہی دور ہے کیونکہ ہم نے اس بارے میں روایات ذکر کی ہیں جو صحیح ہیں۔ تیرے لیے وہ احادیث کافی ہیں جو صحیح مسلم، صحیح بخاری اور ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے ان میں سے کوئی ایسا ہوگا جس کا پسینہ اس کے نصف کانوں تک پہنچے گا'' (☆)۔ پھر کہا گیا: یہ قیام وہ ہے جس روز لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ آخرت میں کھڑے ہوں گے بندوں کے ان حقوق کو ادا کرنے کے لیے جو دنیا میں ان کے ذمہ لازم تھے (2)۔ یزید رشک نے کہا: وہ فیصلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہوں گے (3)۔

## لوگوں کے کھڑا ہونے کی شرعی حیثیت

**مسئلہ نمبر 4**۔ رب العالمین کے لیے قیام تو اس کی عظمت اور حق کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا جہاں تک لوگوں کا ایک دوسرے کے لیے کھڑے ہونے کا تعلق ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کچھ نے تو اس کو جائز قرار دیا ہے اور کچھ نے اس سے منع کیا ہے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لیے اٹھے تھے اور ان سے معانقہ کیا تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن مالک کے لیے اس روز اٹھے تھے جس روز ان کی توبہ قبول ہوئی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا تھا جب حضرت سعد بن معاذ انصار کے سامنے آئے تھے: ''اپنے سردار کے لیے اٹھو''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''جسے یہ بات خوش کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے'' (4)۔

یہ آدمی کی حالت اور نیت کی طرف لوٹتا ہے اگر وہ انتظار کرے اور اپنے لیے قیام کا اعتقاد رکھے تو یہ ممنوع ہے۔ اگر یہ خوشی کے اظہار اور صلہ رحمی کے لیے ہے تو یہ جائز ہے اور اسباب کے ساتھ خاص ہے جس طرح سفر سے آنا۔

سورۂ یوسف کے آخر میں کچھ بحث گزر چکی ہے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 227　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 226

4۔ جامع ترمذی، کتاب الادب، ماجاء فی کراهية قيام الرجل للرجل، جلد 2، صفحہ 100

☆ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ ویل للمطففین، حدیث نمبر 3259، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿10﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۗ﴿11﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ﴿12﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿13﴾

''یہ حق ہے کہ بدکاروں کا نامۂ عمل سجین میں ہوگا۔ اور تمہیں کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو جھٹلاتے ہیں روز جزا کو۔ اور نہیں جھٹلایا کرتا مگر وہی جو حد سے گزرنے والا گناہ گار ہے، جب پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں''۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾ لغت عرب کے علماء کی ایک جماعت نے کہا: كَلَّآ جھڑکنا اور تنبیہ ہے اس طرز عمل پر جو وہ کیل اور وزن میں جو وہ طرز عمل اپنائے ہوئے ہیں اور آخرت کی جو تکذیب کرتے ہیں یہ کوئی قابل قدر بات نہیں انہیں یہ عمل چھوڑ دینا چاہیے۔ كَلَّآ یہ ردع اور زجر کا کلمہ ہے پھر نئی کلام شرع کی فرمایا: اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ۔

حضرت حسن بصری نے کہا: كَلَّآ کا معنی حق ہے (1)۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ كَلَّآ کا معنی ہے کیا تم تصدیق نہیں کرتے اس صورت میں لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ پر وقف ہوگا۔ مقاتل کی تفسیر میں ہے: ان اعمال الفجار۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ فجار کی روحیں اور اعمال سِجِّيْنٍ میں ہیں۔

ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سِجِّيْنٍ ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے اسے الٹا جاتا ہے اور تاجروں کی کتاب اس کے نیچے رکھی جاتی ہے (2)؛ اس کی مثل حضرت ابن عباس، قتادہ، سعید بن جبیر، مقاتل اور کعب سے مروی ہے۔ کعب نے کہا: اس کے نیچے کفار کی روحیں ہیں جو ابلیس کے رخسار کے نیچے ہیں (3)۔ کعب سے یہ بھی مروی ہے: سجین سیاہ چٹان ہے جو ساتویں آسمان کے نیچے ہے اس میں ہر شیطان کا نام لکھا ہوا ہے تو کفار کے نفوس وہاں پائے گا۔ سعید بن جبیر نے کہا: سجین ابلیس کے رخسار کے نیچے ہے (4)۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: یہ زمین کے نیچے سیاہ پتھر ہے جس میں کفار کی روحوں کے نام لکھے جاتے ہیں (5)۔ عطا خراسانی نے کہا: یہ سب سے نچلی ساتویں زمین ہے اس میں ابلیس اور اس کی ذریت ہے (6)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کافر کے پاس موت حاضر ہوتی ہے اور اللہ کے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اس کافر سے بغض سے اور ان کے اس کافر کے بغض کی وجہ سے یہ طاقت نہیں رکھتے کہ وہ اس کی موت کو موخر کریں یا اس کی موت کو جلدی لائیں یہاں تک کہ اس کی گھڑی آجائے۔ جب اس کی گھڑی آجاتی ہے تو اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں اور اسے عذاب کے فرشتوں کی طرف بلند کرتے ہیں وہ فرشتے اسے وہ کچھ دکھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ فرشتے اسے بری جزا دکھائیں پھر اسے ساتویں زمین کی طرف نیچے لے جاتے ہیں یہی سجین ہے یہی ابلیس کی ہلاکت کی انتہا ہے وہ اس میں اس کی کتاب کو ثبت کر دیتے ہیں۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 265 | 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 228 | 3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 451 | 5۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 228 | 6۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 536

کعب الاحبار سے اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت مروی ہے کہ جب فاجر کی روح قبض کی جاتی ہے اسے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے آسمان اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں پھر اسے زمین کی طرف اتارا جاتا ہے تو زمین اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اسے ساتویں زمین میں داخل کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے سجین تک پہنچا دیا جاتا ہے یہی ابلیس کا رخسار ہے، اس کے لیے سجین سے شیطان کے رخسار کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا جاتا ہے اس پر کوئی چیز لکھی جاتی ہے اور ابلیس کے رخسار کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: سجین ساتویں زمین میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ضرب المثل ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو رد کر دیتا ہے جن کے بارے میں ان کا گمان تھا کہ وہ انہیں نفع دیں گے۔ مجاہد نے کہا: معنی یہ ہے ان کا عمل جو ساتویں زمین کے نیچے ہے اس میں سے کوئی چیز اوپر نہ آئے گی۔ کہا: سجین ساتویں زمین میں ایک چٹان ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ "سجین جہنم میں ایک گڑھا (کنواں) ہے جو کھلا ہوا ہے" (1) سورۂ فلق میں فرمایا: یہ ایک ایسا گڑھا ہے جو اوپر سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ سب سے نچلی زمین میں ایک گڑھا ہے (2)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سجین ساتویں زمین کا نچلا حصہ ہے"۔ عکرمہ نے کہا: سجین نقصان اور گمراہی ہے جس طرح جس کی قدر و منزلت ختم ہو جائے (3) تو کہتے ہیں: قد زلق بالحضیض۔ ابو عبیدہ، اخفش اور زجاج نے کہا: لَفِيْ سِجِّيْنٍ کا معنی ہے قید میں اور سخت تنگی میں یہ فعیل کا وزن ہے اور سجن سے مشتق ہے جس طرح فسیق اور شریب کہتے ہیں۔

معنی یہ ہوگا ان کی کتاب قید میں ہے۔ اسے ان کی منزل کی خساست پر دلیل بنایا گیا ہے یا اس لیے کہ اسے اعراض اور دور کرنے کے محل سے زجر اور زلت کے محل پر جا اترتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اصل میں سجیل تھا اس کا لام، نون سے بدل دیا گیا ہے یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: سجین ساتویں زمین میں ہے اور سجیل ساتویں آسمان میں ہے (4)۔ قشیری نے کہا: سجین یہ سافلین میں ایک جگہ ہے جہاں ان لوگوں کی کتاب کو دفن کیا جائے گا جس طرح مسجون ہوتا ہے یہ ان کے اعمال کی جنائت پر دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حقارت پر دلیل بنائی ہے اس وجہ سے کتاب الابرار میں فرمایا: يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۞

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۞ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۞ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یہ وہ چیز نہیں جسے تو اور تیری امت جانتے ہیں پھر اس کی تفسیر بیان کی یہ لکھی ہوئی ہے جس طرح کپڑے میں کوئی چیز رقم ہو اسے نہ بھلایا جاتا ہے اور نہ ہی مٹایا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: مرقوم کا معنی مکتوب ہے (5)۔ اس کے لیے انسان لکھ دیئے گئے ہیں نہ ان میں کوئی اضافہ ہوگا اور نہ ان میں سے کوئی کم کیا جائے گا۔ ضحاک نے کہا: مرقوم کا معنی ہے جس پر مہر لگی ہوگی (6)۔ یہ حمیر کی لغت میں ہے رقم کا اصل معنی کتابت ہے؛ شاعر نے کہا:

سأرقم في الماء القراح إليكم　　علی بعدكم إن كان للماء راقم

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 228　　2۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 118　　3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 227

4۔ ایضاً　　5۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 228　　6۔ ایضاً

میں خالص پانی میں تمہاری طرف دوری کے ہوتے ہوئے لکھوں گا اگر پانی پر کوئی لکھنے والا ہوتا۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس امر پر دلالت کرے کہ سجین عربی زبان کا لفظ نہیں جس طرح اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ میں کوئی ایسی دلیل نہیں کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں بلکہ یہ سجین کے امر کی تعظیم ہے کتاب کے مقدمہ میں یہ بات گزر چکی ہے۔ الحمدللہ قرآن حکیم میں کوئی غیر عربی نہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ یعنی قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے لیے سختی اور عذاب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے امر کو بیان فرمایا جو حساب، جزا اور لوگوں کے درمیان فیصلہ والے دن کو جھٹلاتے ہیں اس کی وہی تکذیب کرتا ہے جو فاجر ہے، حق سے انحراف کرنے والا ہے، مخلوقات کے ساتھ معاملات کرنے میں مخلوق پر ظلم کرنے والا ہے اور اپنی ذات پر بھی ظلم کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ کا امر ترک کرنے میں وہ گناہگار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ، ابوجہل اور اس کے ہمنواؤں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ عام قراءت تتلی ہے۔ ابوحیوۃ، ابوسماک، اشہب عقیلی اور سلمی کی قراءت إذا یتلی ہے۔ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ سے مراد ان کی جھوٹی باتیں ہیں جن کو انہوں نے لکھا اور مزین کیا اس کا واحد أسطورۃ اور اسطارہ ہے۔

كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

"نہیں نہیں درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔ یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا۔ پھر وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے۔ پھر (ان سے) کہا جائے گا: یہی وہ (جہنم) ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّا یہ ردع اور جھڑکنے کے لیے ہے یعنی یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں نہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی حقا ہے یعنی یقیناً ان کے دلوں پر زنگ چڑھ چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ترمذی شریف میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ "بندہ جب خطا کرتا ہے اس کے دل میں سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے جب وہ اس گناہ کو چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اگر وہ دوبارہ ایسا کرے تو اس میں اضافہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے دل پر غالب آ جاتا ہے بس وہی زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے" (1)۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے: یہ گناہ پر گناہ ہے یہاں تک کہ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے (2)۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ زنگ ہے گناہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے وہ پھر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 169-168۔ ایضاً، حدیث 3257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 221

گناہ کرتا ہے گناہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے یہاں تک کہ گناہ اس کے دل کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: یہ اس آیت کی طرح ہے جو سورۂ بقرہ میں ہے بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً (البقرہ: 81) اس کی مثل فراء سے مروی ہے کہا: ان کی نافرمانیاں اور گناہ زیادہ ہو گئے تو اس چیز نے ان کے دلوں کو احاطہ میں لے لیا یہی ان پر زنگ ہے۔ مجاہد سے بھی یہ مروی ہے: دل ہتھیلی کی مانند ہے اور اپنی ہتھیلی کو بلند کیا جب بندہ گناہ کرتا ہے تو وہ بند ہو جاتی ہے اور اپنی انگلی کو بند کر لیا اور جب وہ ایک اور گناہ کرتا ہے تو وہ بند ہوتی ہے اور ایک اور کو بند کیا یہاں تک کہ اپنی تمام انگلیوں کو بند کیا یہاں تک کہ اس کے دل میں مہر لگا دی جاتی ہے۔ کہا: علماء کی رائے ہے یہی زنگ ہے پھر اس آیت کریمہ کی تلاوت کی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ بکر بن عبداللہ نے کہا: بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سوئی کے چوبھے جیسا داغ بن جاتا ہے پھر جب وہ دوبارہ گناہ کرتا ہے تو پھر اسی طرح ہو جاتا ہے پھر جب گناہ بڑھ جاتے ہیں تو دل چھنی جیسا ہو جاتا ہے وہ کسی چیز کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اور نہ اس میں کوئی صالحیت ثبت رہتی ہے۔ اس بارے میں ہم نے سورۂ بقرہ میں گفتگو کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ اخبار سے مزین ہے اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

عبدالغنی بن سعید نے موسیٰ بن عبدالرحمن سے وہ ابن جریج سے وہ عطا سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح موسیٰ نے مقاتل سے وہ ضحاک سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسی چیز روایت کرتے ہیں جس کی صحت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے: اس سے مراد وہ موزہ نما جوتا ہے جو دونوں رانوں، پنڈلی اور قدم پر ہوتا ہے یہی جنگ میں پہنا جاتا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ وسوسہ ہے جو انسان کے دل پر کھٹکتا ہے اس تعبیر کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

جہاں تک عام اہل تفسیر کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک اس کی مراد وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہے یہی اہل لغت کا نقطہ نظر ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ران علی قلبه ذنبه یَرِین رَیْنًا و رُیُوْنًا۔ یعنی دل پر زنگ کا غالب آنا۔ ابوعبیدہ نے کہا: ران کا معنی غالب آنا ہے۔ ابوعبید نے کہا: جو چیز تجھ پر غالب آ جائے تو اس کے لیے ران بك رانك اور ران علیك کا لفظ استعمال کرنا جائز ہوتا ہے؛ شاعر نے کہا

وکَمْ رانَ من ذنبٍ علی قلب فاجِرٍ(1)　　کتنے ہی گناہ ہیں جو فاجر کے دل پر غالب آئے۔

رانت الخمر علی عقله شراب اس کی عقل پر غالب آ گئی۔

ران علیه النعاس اونگھ اس پر غالب آ گئی۔

اس معنی میں اسیفع جہنیہ کے بارے میں حضرت عمر کا قول ہے: فاصبح قد رِیْنَ به۔ یعنی اس نے صبح کی کہ قرضے اس پر غالب آ گئے تھے جب کہ وہ قرض لیا کرتا؛ اس معنی میں ابوزبید کا شعر ہے وہ ایک کا وصف بیان کرتا ہے جس نے شراب پی یہاں تک کہ شراب نشہ کے ذریعے غالب آ گئی:

ثم لما راه رانت بهِ الخمرُ　　وأَنْ لا تَرِینَهْ باتقاءِ(2)

---

1۔ [illegible]، جلد 6، صفحہ 229　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 451

پھر جب اسے دیکھا کہ شراب اس پر غالب آچکی ہے اور تقویٰ کے ذریعے غالب نہیں آئے گی۔
اس کا قول ہے: رانت بہ الخمر جس کا معنی ہے شراب اس کی عقل اور دل پر غالب آگئی۔ بغوی نے کہا: قد ارانَ القوم فھم مُرِینون اس سے مراد ہے اس قوم کے مویشی ہلاک ہو گئے اور وہ کمزور ہو گئے۔ یہ ایسا امر ہے جوان پر غالب آ گیا وہ اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ابوزید نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے قد رِین بالرجل رینا جب کوئی آدمی ایسی مصیبت میں جا گرے جس سے نکلنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو اور نہ ہی اسے برداشت کر سکے۔ ابو معاذ نحوی نے کہا: رین سے مراد ہے اس کا دل گناہوں سے سیاہ ہو جائے۔ طبع کا مطلب ہے کہ دل پر مہر لگا دی جائے یہ رین سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اقفال، طبع سے بھی شدید ہے۔ زجاج نے کہا: رین سے مراد وہ زنگ ہے جو دل کو ڈھانپ لیتا ہے جس طرح باریک بادل ہوتا ہے اس کی مثل غین ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: غِینَ علی قلبہ یعنی اسے ڈھانپ لیا گیا۔ غین سے مراد گھنے درخت ہیں، اس کا واحد غیناء ہے یعنی سرسبز، جس کے پتے بہت زیادہ ہوں، ٹہنیاں ایک دوسرے میں پیوست ہوں۔ فراء کا قول گزر چکا ہے کہ اس سے مراد گناہوں کا دلوں کو احاطہ میں لے لینا۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ان کے دلوں کو ڈھانپ لیا۔ یہی قول صحیح ہے۔ ان شاء اللہ۔

حمزہ، کسائی، اعمش، ابوبکر اور مفضل نے رَانَ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل کا فاء کلمہ راء ہے اور عین کلمہ الف ہے جو یاء سے بدلا ہوا ہے اس وجہ سے اس میں امالہ اچھا ہے۔ جس نے فتحہ دیا تو وہ اپنے اصل پر ہے کیونکہ فعل کا فاء کلمہ مفتوح ہے جس طرح کال، باع، وغیرہ۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے حفص نے بَلْ پر وقف کیا پھر رَانَ سے ابتدا کی وقف کرتے ہوئے وہ لام کو واضح کرتا ہے، سکتہ کے لیے نہیں۔

**كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝** یہ حق ہے کہ اس روز کفار کو ان کے رب سے روک دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ **كَلَّآ** بھی جھڑکنے کے لیے ہے یعنی بات اس طرح نہیں جس طرح وہ کہتے ہیں بلکہ انہیں ان کے رب سے روک لیا جائے گا۔ زجاج نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اگر یہ بات اس طرح نہ ہوتی تو اس میں کچھ فائدہ نہ ہوتا اور نہ ہی کفار کے لیے اس میں خست کا بیان ہوتا (1)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ (الواقعۃ: 23) اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے جو اپنے رب کا دیدار کر رہے ہوں گے۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ مومن اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور کفار اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔ حضرت مالک بن انس نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: جب اللہ تعالیٰ نے کفار کو اپنے دیدار سے محروم رکھا انہوں نے دیدار نہ کیا تو اپنے اولیاء کے لیے ظاہر نہ ہوا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے رب کا دیدار کر لیا (2)۔ امام شافعی نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کی وجہ سے ایک قوم سے حجاب فرمایا تو یہ چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ایک قوم خوشنودگی کی صورت میں اپنے رب کا دیدار کرے گی (3)۔ پھر کہا: اللہ کی قسم! اگر محمد بن ادریس کو اس امر کا یقین نہ ہوتا کہ وہ اپنے رب کا دیدار کرے گا تو وہ دنیا میں اس کی عبادت نہ کرتا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 222    2۔ ایضاً    3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 452

حسین بن فضل نے کہا: جب دنیا میں انہیں نور توحید سے حجاب میں رکھا تو آخرت میں انہیں رؤیت سے محروم رکھے گا(1)۔ مجاہد نے لَّمَحْجُوْبُوْنَ کی یہ وضاحت کی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ عزت اور رحمت سے محروم رکھے گا۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا، انہیں پاکیزہ نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ پہلی تعبیر ہی جمہور کا نقطہ نظر ہے کہ انہیں دیدار سے محروم رکھا جائے گا وہ اس کا دیدار نہ کریں گے۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ وہ اس میں ہی رہیں گے اس سے باہر نہ نکلیں گے فرمایا: جب بھی ان کے چمڑے پک جائیں گے ہم ان کے چمڑے بدل دیں گے فرمایا: اور جب کبھی وہ آگ ٹھنڈی ہوگی ہم اس کو مزید بھڑکا دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جحیم جہنم کا چوتھا دروازہ ہے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ پھر جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے: یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم اللہ کے رسولوں کو دنیا میں جھٹلایا کرتے تھے۔

كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

"یہ حق ہے نیکوکاروں کا صحیفہ عمل علیین میں ہوگا۔ اور تمہیں کیا خبر کہ علیون کیا ہے۔ یہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے (حفاظت کے لیے) دیکھتے رہتے ہیں اسے مقربین"۔

كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ كَلَّاۤ یہ حقا کے معنی میں ہے اور وقف تُكَذِّبُوْنَ پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بات اس طرح نہیں جس طرح وہ کہتے ہیں اور نہ ہی بات اس طرح ہے جس طرح انہوں نے گمان کیا بلکہ ان کی کتاب سجین میں ہے اور مومنین کی کتاب علیین میں ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس عذاب پر ایمان نہیں لائیں گے جس میں وہ داخل ہوں گے پھر نئی کلام شروع کی اور فرمایا کہ ابرار کی کتاب اس کے مرتبہ کے مطابق علیین میں بلند کر دی گئی ہے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: علیین سے مراد جنت ہے(3)۔ ان سے یہ بھی منقول ہے: ان کے اعمال کتاب اللہ میں ہیں جو آسمان میں ہے۔ ضحاک، مجاہد اور قتادہ نے کہا: یعنی ساتویں آسمان میں جس میں مومنوں کی روحیں ہیں(4)۔ ابن اجلح نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد سدرۃ المنتہیٰ ہے اللہ تعالیٰ کے امور میں سے ہر چیز یہاں آکر رک جاتی ہے اس سے آگے تجاوز نہیں کرتی(5) وہ کہتے ہیں: اے میرے رب! تیرا فلاں بندہ ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں ان سے زیادہ جانتا ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے کتاب آئی ہے جس پر عذاب سے امن کی مہر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے۔

کعب الاحبار سے مروی ہے: مومن کی روح جب قبض کی جاتی ہے اسے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں فرشتے خوشخبری دیتے ہوئے اسے وصول کرتے ہیں پھر اسے لے کر نکلتے ہیں

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 538 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 229 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

یہاں تک کہ وہ عرش تک جا پہنچتے ہیں ان کے لیے تخت کے نیچے سے ایک ورقہ نکلتا ہے اس کے اوپر تحریر کیا جاتا ہے اور اس میں یہ مہر لگائی جاتی ہے کہ قیامت کے روز اس کے لیے نجات ہے اور مقرب اس پر گواہی دیں گے۔ قتادہ نے یہ بھی کہا: فی علیین سے مراد ساتویں آسمان کے اوپر اور عرش کے دائیں پائے کے پاس ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عِلِّيُّوْنَ ساتویں آسمان میں عرش کے نیچے ہے'' (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس سے مراد وہ لوح ہے، جو سبز زبرجد کی ہے، عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ ان کے اعمال اس میں لکھے ہوئے ہیں (2)۔

فراء نے کہا: عِلِّيُّوْنَ سے مراد بلندی کے بعد بلندی ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عِلِّيُّوْنَ سے مراد بلندترین مکان ہے (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایسی بلندی جو کئی گنا بلندیوں میں ہو، گویا اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس وجہ سے اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ طبری کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ فراء نے کہا: یہ ایسا اسم ہے جو جمع کے وزن پر بنایا گیا ہے اس کا لفظی طور پر کوئی واحد نہیں جس طرح عشرون، ثلاثون۔ عرب جب جمع بناتے ہیں اور اس کے واحد کا کوئی صیغہ نہ ہو اور نہ ہی اس کا کوئی تثنیہ ہو تو وہ مذکر و مونث دونوں میں نون لگاتے ہیں۔ طبری کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔

زجاج نے کہا: اس اسم کا اعراب جمع کے اعراب کی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے: ھذہ قنسرون، رأیت قنسرین۔

یونس نحوی نے کہا: اس کا واحد علی اور علیۃ ہے۔ ابو الفتح نے کہا: علیین، علی کی جمع ہے یہ علو سے فعیل کا وزن ہے طریقہ تو یہ تھا کہ علیۃ ہوتا جس طرح انہوں نے غرفہ کے لیے علیۃ کا لفظ ذکر کیا کیونکہ یہ علو سے مشتق ہے جب علیۃ سے تاء کو حذف کیا اس کے عوض میں واؤ نون جمع کے لیے ذکر کیا جس طرح وہ ارضین میں کہتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عِلِّيِّيْنَ یہ ملائکہ کی صفت ہے کیونکہ وہی ملاء اعلیٰ ہیں جس طرح کہا جاتا ہے: فلان فی بنی فلان یعنی فلاں آدمی فلاں میں سے ہے یا ان کے ہاں رہتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ''اہل علیین اتنی دور سے جنتیوں کو دیکھیں گے جب اہل علیین میں سے کوئی جنتیوں پر جھانکے گا تو اس کے چہرے کے نور سے جنت روشن ہو جائے گی جنتی کہیں گے: وہ نور کیا ہے؟ تو کہا جائے گا: اہل علیین جو اہل طاعت اور صدق ہیں ان میں سے ایک آدمی نے جھانکا ہے جس طرح روشن ستارے کو آسمان کے افق میں دیکھا جاتا ہے'' (5) یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے عِلِّيِّيْنَ بلند جگہ کا نام ہے کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عِلِّيِّيْنَ روایت نقل کی ہے کہ خبر دی گئی ہے کہ ان کے اعمال اور ارواح چوتھے آسمان میں ہوں گے۔

**وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝** اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کس چیز نے بتایا کہ عِلِّيُّوْنَ کیا ہے؟ یہ سوالیہ انداز اس کے مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لیے ہے پھر اس کی تفسیر بیان کی۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 452
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 538
3۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 222
4۔ ایضاً
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، باب الحروف والقرأت، جلد 2، صفحہ 198

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ یہ علیین کی تفسیر نہیں بلکہ عِلِّيُّوْنَ پر کلام مکمل ہو جاتی ہے (1) پھر ابتدا کی اور فرمایا: كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یعنی ابرار کی کتاب رقم شدہ کتاب ہے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ فرشتے بندے کے عمل کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں وہ اس کا استقبال کرتے ہیں جب وہ اسے لے کر وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی طرف وحی کرتا ہے: تم میرے بندے پر محافظ تھے اور میں اس کے دل پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اس نے میرے لیے اپنے عمل کو خالص نہیں کیا اسے سجین میں رکھ لو۔ ہر آسمان کے مقرب فرشتے ابرار کے عمل پر گواہی دیں گے۔ وہب اور ابن اسحاق نے کہا: یہاں مقربون سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں جب مومن نیکی کا عمل کرتا ہے تو فرشتے صحیفہ کو اوپر اٹھاتے ہیں اس کا نور ہوتا ہے جو آسمانوں میں چمکتا ہے جس طرح زمین میں سورج کا نور چمکتا ہے یہاں تک کہ وہ اسرافیل تک اسے پہنچا دیں گے وہ اس صحیفہ پر مہر لگا دے گا اور لکھے گا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ ان کی کتابت کی وہ گواہی دے گا۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

"بے شک نیکوکار راحت اور آرام میں ہوں گے، پلنگوں پر بیٹھے مناظر جنت کا نظارہ کر رہے ہوں گے، آپ پہچان لیں گے ان کے چہروں پر راحتوں کی شگفتگی۔ انہیں پلائی جائے گی سربمہر خالص شراب اس کی مہر کستوری کی ہوگی اس کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے۔ اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی یہ وہ چشمہ ہے جس سے صرف مقربین پئیں گے"۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ ابرار سے مراد اہل صدق اور اہل طاعت ہیں۔ نَعِيْمٍ سے مراد نعمت ہے نعمت جب نون کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی تنعیم ہوتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: نَعَّمَهُ الله ناعمه الله فتنعم۔ امراة مُنَعَّمَةٌ، مناعمة۔ نیک لوگ جنتوں میں لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ ارائك سے مراد خیموں میں پلنگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عزتیں مقرر کی ہوئی ہیں انہیں دیکھ رہے ہوں گے؛ یہ عکرمہ، ابن عباس اور مجاہد کا نقطہ نظر ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ جہنمیوں کو دیکھیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ اپنے دشمنوں کو جہنم میں دیکھیں گے (2)؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے فضل و احسانات کے پلنگوں پر ہوں گے جو اس کے چہرے اور جلال و مرتبہ کو دیکھ رہے ہوں گے۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ نَضْرَةَ سے مراد رونق اور نور ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: نضر النبات جب وہ کلیاں نکالے۔ عام قراءت تعرف ہے اور نضرہ منصوب ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ پہچان لیں گے۔ ابو جعفر بن قعقاع، یعقوب، شیبہ اور ابن ابی اسحاق نے تُعرف پڑھا ہے۔ یہ مجہول کا صیغہ ہے، نضرہ مرفوع ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 538
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 453

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ انہیں ایسی شراب سے پلایا جائے گا جس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوگی؛ یہ اخفش اور زجاج کا قول ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد صاف شراب ہے(2)۔ صحاح میں ہے: رَّحِيْقٍ سے مراد عمدہ شراب ہے معنی ایک ہی ہے۔ خلیل نے کہا: اس سے مراد سب سے صاف اور عمدہ شراب ہے۔ مقاتل اور دوسرے علماء نے کہا: اس سے مراد اعلیٰ، سفید اور ملاوٹ سے صاف شراب ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

يَسْقون مَنْ وَرَدَ البريصَ عليهمُ بَرَدَى يُصَفَّق بالرحيق السلسلِ(3)

جو آدمی بریص کے مقام پر ان کے پاس وارد ہوتا ہے وہ اسے بردی کا پانی پلاتے ہیں جس میں خالص شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔

مَّخْتُوْمٍ ۞ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ مجاہد نے کہا: آخری گھونٹ جس پر وہ اسے ختم کرے گا وہ کستوری ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب وہ شراب پئیں گے تو پیالہ میں جو کچھ ہوگا وہ ختم ہو جائے گا تو اس کا اختتام کستوری کے خاتمہ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: وہ اس کے بعد کستوری کا ذائقہ پائیں گے؛ اس کی مثل سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی کا قول ہے دونوں نے کہا: خِتٰمُهٗ سے مراد اس کے ذائقہ کا آخر ہے۔ یہ تعبیر اچھی ہے کیونکہ مشروبات میں عام معمول یہ ہے کہ اس کے آخر میں گدلا پن ہوتا ہے۔ جنتی لوگوں کے مشروب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کے آخر میں خوشبو کستوری کی خوشبو ہوگی۔

مسروق نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مَّخْتُوْمٍ کا معنی ملا ہوا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَّخْتُوْمٍ کا معنی یہ ہے اس کو اس چیز میں محفوظ کر دیا گیا ہے کہ اسے کوئی مس کرنے والا مس کرے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ابرار جیسا ہو۔ حضرت علی، علقمہ، شقیق، ضحاک، طاؤس اور کسائی نے اسے خاتمۃ پڑھا ہے یہی علقمہ کا قول ہے کیا تو نے عورت کو نہیں دیکھا جو عطار کو کہتی ہے: اجعل خاتمہ مسکا یہاں بھی وہ خِتٰمُهٗ سے مراد آخر لیتے ہیں خِتٰمُهٗ اور ختام دونوں معنی میں قریب قریب ہیں مگر خاتم اسم ہے اور ختام مصدر ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ صحاح میں ہے: ختام سے مراد وہ مٹی ہے جس کے ساتھ مہر لگائی جاتی ہے؛ مجاہد اور ابن زید نے یہی کہا ہے یعنی مٹی کی جگہ اس پر کستوری کی مہر لگائی گئی ہے۔ مہدوی نے یہی حکایت بیان کی ہے۔ اعمش نے کہا: وأبرزها وعليها ختم میں اسے کھولتا ہوں تو اس پر مہر لگی مٹی ہوتی ہے جس طرح نقض، منقوض کے معنی میں ہوتا ہے اور قبض، مقبوض کے معنی میں ہوتا ہے۔ ابن مبارک اور ابن وہب نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جب کہ الفاظ ابن وہب کے ہیں: ختامہ مسك کا معنی ہے اس میں کستوری کی آمیزش ہوتی ہے اس سے مراد وہ مہر نہیں جس کے ساتھ مہر لگائی جاتی ہے کیا تو اپنی عورتوں میں سے کسی کو نہیں دیکھتا اس میں فلاں فلاں خوشبو کی آمیزش ہے اس میں کستوری کی آمیزش ہوگی کہا: اس سے مراد وہ سفید شراب ہے جو چاندی کی طرح ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ آخری مشروب کو ملاتے ہیں اگر اہل دنیا سے کوئی آدمی اپنا ہاتھ اس میں داخل کرے پھر اس سے باہر نکالے تو کوئی ذی روح شئی باقی نہ رہے مگر اس کی خوشبو پائے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 223 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 230 3۔ ایضاً

حضرت ابی بن کعب نے روایت نقل کی کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! یہ رَّحِيقٍ مَّخْتُوْمٍ کیا ہے؟ فرمایا: ''شراب کے تالاب''۔ ایک قول یہ کیا گیا: برتنوں میں مہر لگی ہوگی یہ اس سے مختلف ہے جو نہروں میں چلتی ہے۔

وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۞ ہم نے جنت کی جو صفت ذکر کی ہے اس میں رغبت رکھنے والوں کو رغبت رکھنی چاہیے یوں باب چلایا جاتا ہے نَفَسْتُ علیه الشئ أَنْفِسه نفاسة یعنی میں نے اس کے بارے میں بخل سے کام لیا اور میں نے یہ پسند نہ کیا کہ وہ چیز اس کی طرف جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فی، الی کے معنی میں ہے یعنی عمل میں جلدی کرنے والوں کو اس کی طرف جلدی کرنی چاہیے اس کی مثل یہ ارشاد ہے: لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۞ (الصافات) اس کی مثل عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۞ اس خالص شراب میں تسنیم کی آمیزش ہے۔ تسنیم وہ شراب ہے جو اوپر سے ان کی طرف انڈیلی جائے گی۔ یہ جنت میں سب سے اعلیٰ شراب ہے۔ تسنیم کا لغت میں معنی بلند ہونا ہے یہ چشمے کا پانی ہے جو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے اس سے سنام البعیر ہے یہ بدن سے بلند ہوتی ہے اس طرح تسنیم القبور کا لفظ استعمال ہوتا ہے کہان نما قبر۔ حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ تسنیم جنت میں ایک چشمہ ہے جس کا خالص پانی مقرب لوگ پئیں گے (1)۔ اور اصحاب یمین کے جاموں میں اس میں سے کچھ چیز ملائی جائے گی تو وہ مشروب عمدہ اور خوشبودار ہو جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۞ کے بارے میں فرمایا: یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدہ: 17) کوئی نفس نہیں جانتا جو ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تسنیم ایسا چشمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا میں چلتا ہوگا۔ وہ جنتیوں کے برتنوں میں اس قدر پڑے گا جس قدر ان میں گنجائش ہوگی جب برتن بھر جائے گا تو پانی رک جائے گا اس میں سے قطرہ بھر پانی زمین پر نہیں گرے گا۔ وہ پانی طلب کرنے کے محتاج نہ ہوں گے؛ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ ابن زید نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے وہ ایک چشمہ ہے جو عرش کے نیچے سے نکلتا ہے۔ حضرت حسن بصری کی مراسیل میں اسی طرح ہے۔ ہم نے اس کا ذکر سورۃ الانسان میں کیا ہے۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۞ اسے خالص جنت عدن کے مکین پئیں گے یہ جنتیوں میں سے سب سے فضلیت والے ہیں جب کہ دوسروں کو اس کا آمیزہ ملے گا۔ عَيْنًا یہ بطور مدح منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: یہ تسنیم ہے بطور حال منصوب ہے تسنیم معرفہ ہے اس کا کوئی اشتقاق معروف نہیں اگر تو اسے مصدر بنائے اور سنام سے مشتق مانے تو عینا اس کی وجہ سے منصوب ہوگا کیونکہ یہ اس کا مفعول بہ ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۞ يَّتِيْمًا (البلد) میں یتیما مفعول بہ کی وجہ سے منصوب ہے؛ یہ فراء کا قول ہے کہ عینا، تسنیم کی وجہ سے منصوب ہے۔ اخفش کے نزدیک یہ یسقون کی وجہ سے منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہوگی یسقون عینا أو من عین۔ مبرد کے نزدیک اعنی فعل کی وجہ سے بطور مدح منصوب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۞ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 231	2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 540

يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَ إِذَا انْقَلَبُوْٓا إِلٰٓى أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَ إِذَا رَأَوْهُمْ
قَالُوْٓا إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ
مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

''جولوگ جرم کیا کرتے تھے وہ اہل ایمان پر ہنسا کرتے تھے۔ اور جب ان کے قریب سے گزرتے تو آپس میں آنکھیں مارا کرتے۔ اور جب اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹتے تو دل لگیاں کرتے واپس آتے، اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے: یقیناً یہ لوگ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اہل ایمان پر محافظ بنا کر تو نہیں بھیجے گئے تھے پس آج مومنین کفار پر ہنس رہے ہیں (عروسی) پلنگوں پر بیٹھے (کفار کی خستہ حالی کو) دیکھ رہے ہیں۔ کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے''۔

إِنَّ الَّذِيْنَ أَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَ إِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾ کفار دنیا میں مومنوں کے ساتھ جو مذاق کیا کرتے تھے اس کا ذکر ہے مراد قریش کے مشرک رؤساء ہیں کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد ولید بن مغیرہ، عقبہ بن ابی معیط، عاص بن وائل، اسود بن عبد یغوث، عاص بن ہشام، ابوجہل اور نضر بن حارث ہے۔ یہی لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ حضرت عمار، حضرت خباب، حضرت صہیب اور حضرت بلال کا مذاق اڑایا کرتے تھے (1) جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کے لیے ان کے پاس سے گزرتے؛ وہ ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کیا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اسلام کی وجہ سے انہیں عار دلاتے اور ان پر عیب لگایا کرتے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: غمزت الشئ بیدی میں نے اس چیز کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تو مجھے اپنے ہاتھ سے دباتے تو میں اپنا پاؤں سمیٹ لیتی۔ یہ سورۂ نساء میں گزر چکا ہے۔

غمزته بعینی میں نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا، اس پر عیب لگایا۔ وما فی فلان غمزۃ اس میں کوئی عیب نہیں۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی جو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو منافقوں نے ان کا مذاق اڑایا اور ان پر ٹھٹھا کیا۔

وَ إِذَا انْقَلَبُوْٓا إِلٰٓى أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ جب وہ اپنے اہل اور ساتھیوں کی طرف لوٹتے تو خوش خوش لوٹتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس کفر پر وہ ہیں اس پر خوشی کا اظہار کرتے اور مومنوں کے ذکر سے لطف اندوز ہوتے (2)۔ ابن قعقاع، حفص، اعرج اور سلمی نے کہا: فکھین الف کے بغیر ہے جب کہ باقی قراء نے اسے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے طَمِع، طامِع، حذِر، حاذِر۔ سورۃ الدخان میں یہ گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الفکہ کا معنی

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 224 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 232

ہے حد درجہ حریص اور تکبر کرنے والا اور الفاکہ کا معنی ہے لطف اندوز ہونے والا۔

وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ جب یہ کفار رسول الله صلی الله علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھتے تو کہتے: یہ رسول الله صلی الله علیہ وسلم کی اتباع میں گمراہ ہو گئے ہیں۔

وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝ انہیں مومنوں کے اعمال کا محافظ، ان کے احوال پر نگران اور ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ۝ یعنی قیامت کے روز حضور صلی الله علیہ وسلم پر ایمان لانے والے کفار پر ہنسیں گے جس طرح کفار دنیا میں ان پر ہنسا کرتے تھے۔ اس کی مثل سورۃ المومنین میں گزر چکی ہے۔

ابن مبارک نے یہ ذکر کیا ہے کہ محمد بن بشار نے قتادہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہا: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کعب کہا کرتے تھے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک روشن دان ہے جب مومن ارادہ کرے گا(1) کہ دنیا میں جو اس کا دشمن تھا اس کو دیکھے تو وہ اس روشن دان سے جھانکے گا۔ الله تعالیٰ نے ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا: فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ (الصافات) اس پر جھانکا تو اسے جہنم میں دیکھا۔ کہا: یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے جھانکا تو قوم کی کھوپڑیوں کو کھولتے ہوئے دیکھا۔ ابن مبارک نے یہ بھی ذکر کیا ہے کلبی نے ابو صالح سے الله تعالیٰ کے فرمان اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:15) الله تعالیٰ انہیں ان کے استہزاء کی سزا دیتا ہے، کے بارے میں روایت نقل کی کہ جہنمی جہنم میں ہوں گے تو انہیں کہا جائے گا: باہر نکلو تو ان کے لیے جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے جب وہ دیکھیں گے کہ دروازے کھول دیئے گئے ہیں تو وہ نکلنے کے لیے ان دروازوں کی طرف بڑھیں گے جب کہ مومن پلنگوں پر بیٹھے ہوں گے جب وہ دروازے تک پہنچیں گے تو ان پر دروازے بند کر دیئے جائیں گے الله تعالیٰ کے فرمان: اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کا یہی مصداق ہے۔ جب ان کے لیے دروازے بند کر دیئے جائیں گے تو ان پر مومن ہنسیں گے۔ الله کے اس فرمان: فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ۝ کا یہی مصداق ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ یہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں پہلے گزر چکا ہے هَلْ ثُوِّبَ کا معنی ہے جب کفار کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا تو دنیا میں جو وہ مومنوں کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے کیا اس کا انہیں بدلہ دے دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ یَنْظُرُوْنَ کے متعلق ہے وہ دیکھیں گے کیا کفار کو بدلہ دے دیا گیا ہے(2)؟ هَلْ کا معنی تقریر ہو گا اس کا محل یَنْظُرُوْنَ کے ساتھ نصب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جملہ مستانفہ ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں قول مضمر ہے معنی ہو گا مومن ایک دوسرے کو کہیں گے: کیا کفار کو بدلہ دے دیا گیا: یہ ثَابَ، یَثُوْبُ سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا ہے ثواب اسے کہتے ہیں جو بندے کے عمل کے عوض بندے کی طرف لوٹتا ہے اس کا استعمال خیر اور شر دونوں معنوں میں ہوتا ہے۔

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 541 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 232

# سورۃ الانشقاق

آیاتہا ۲۵ ۸۴ سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ ۸۳ رکوعہا ۱

تمام کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس کی پچیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۞

"(یاد کرو) جب آسمان پھٹ جائے گا اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہو جائے گی اور کان لگا کر سنے گی اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے"۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۞ جب آسمان بادلوں کی صورت میں پھٹ جائے گا۔ غمام، سفید بادل کی مثل ہے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی مثل روایت نقل کی ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آسمان کہکشاں سے پھٹے گا کہا: کہکشاں آسمان کا دروازہ ہے، یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے (1)۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۞ وہ اپنے رب کا حکم سنے گا اور سننا اس پر لازم ہے (2)؛ یہی معنی حضرت ابن عباس، مجاہد اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا: مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ كَاَذَنِهٖ لِنَبِيٍّ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ (3)۔ اللہ تعالیٰ کسی شئی کو توجہ سے نہیں سنتا جیسے وہ اس نبی کی آواز کو سنتا ہے جو قرآن کریم کو خوبصورت لہجہ میں پڑھ رہا ہوتا ہے۔

شاعر نے کہا:

صُمٌّ إذا سمعوا خيرًا ذُكِرتُ به ... وإن ذُكِرتُ بِسُوءٍ عندهم أَذِنُوا

وہ بہرے ہیں جب کسی اچھی بات کو سنیں گے جس کے ساتھ میرا ذکر کیا جاتا ہو اگر ان کے ہاں میرا برا ذکر کیا جائے تو وہ توجہ سے بات سنتے ہیں۔

قعنب بن ام صاحب نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 233
2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 234-233
3۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن وما یتعلق بہ استحباب تحسین الصوت بالقرآن، جلد 1، صفحہ 268

اِنْ یاْذَنُوا رِیبةً طاروا بها فرحا    وما هُمْ أُذِنوا من صالحٍ دَفَنُوا

اگر وہ شک والی بات سنیں تو خوشی سے اسے لے اڑتے ہیں اور جو وہ اچھائی کی بات سنیں تو اسے دفن کر دیتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو پھٹ جانے کا حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ حکم سننا لازم کر دیا ہے۔ ضحاک نے کہا: حُقَّتْ کا معنی ہے اس نے اطاعت کی۔ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کرے کیونکہ یہ اس کی مخلوق ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان محقوق بکذا۔ فلاں پر یہ لازم ہے۔ آسمان کے اطاعت کرنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آسمان کے بارے میں جس کا ارادہ کیا وہ اس سے روکنے والا نہیں آسمان میں زندگی کا پیدا کرنا کوئی بعید نہیں یہاں تک کہ وہ اطاعت کرے اور حکم بجالائے۔ قتادہ نے کہا: اس پر لازم تھا کہ وہ اس حکم کو بجالاتا (1)۔ اسی معنی میں کثیر کا قول ہے۔

فإن تكن العُتْبَى فأهلًا و مَرْحبًا    وحُقَّتْ لها العُتْبَى لدينا وقَلَّتِ(2)

اگر رضامندی ہے تو خوش آمدید ہمارے ہاں اس کے لیے رضامندی لازم ہے اور وہ بلند ہے۔

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۝ زمین کو بچھا دیا جائے گا اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا (3)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تُمَدّ مَدَّ الأديم اسے چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا کیونکہ چمڑے کو جب پھیلایا جاتا ہے تو اس میں جو سلوٹ ہوتی ہے وہ زائل ہو جاتی ہے وہ لمبا ہو جاتا ہے اور ہموار ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کی وسعت کو اتنا اتنا وسیع کر دیا جائے گا کیونکہ مخلوقات کے حساب کے لیے اس پر وقوف کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ مخلوقات کی زیادتی کی وجہ سے ایک انسان کے لیے صرف ایک قدم کی جگہ ہوتی ہے۔ سورۂ ابراہیم میں یہ بات گزر چکی ہے کہ زمین کو دوسری زمین میں بدل دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق وہی ساہرہ ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ۝ وہ اپنے مردوں کو نکال دے گی اور ان سے خالی ہو جائے گی۔ ابن جبیر نے کہا: اس کے بطن میں جو مردے ہوں گے انہیں باہر پھینک دے گی اور اس کے اوپر جو زندہ ہوں گے ان سے خالی ہو جائے گی (4)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے بطن میں جو خزانہ اور معدنیات ہوں گی ان کو باہر پھینک دے گی اور ان سے خالی ہو جائے گی یعنی ان کا پیٹ خالی ہو جائے گا اس کے پیٹ میں کوئی چیز نہ ہوگی (5)۔ یہ امر کے عظیم ہونے کی خبر دے رہی ہے جس طرح مصیبت کے وقت حاملہ حمل کو گرا دیتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے اوپر جو پہاڑ اور سمندر ہیں ان سے خالی ہو جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں جو چیز ودیعت رکھی گئی تھی اس کو پھینک دے گی (6) اور جو چیز اس میں محفوظ کی گئی تھی اس سے خالی ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زندہ اور مردہ بندوں کو اس میں ودیعت رکھا تھا۔ اور اس کے شہروں کو مزارعت اور روزی کے لیے محفوظ رکھا تھا۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 234    2۔ ایضاً
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، فتنۃ الدجال وخروج عیسیٰ بن مریم، جلد 2، صفحہ 309
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 235    5۔ ایضاً    6۔ ایضاً

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝ وہ مردوں کو باہر پھینکنے میں اپنے رب کا حکم سنے گی اور اللہ تعالیٰ کا حکم سننا اس کا حق ہے۔ اذا کے جواب میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: اَذِنَتْ ہے واؤ زائدہ ہے اسی طرح اَلْقَتْ ہے۔ ابن انباری نے کہا: ایک مفسر نے کہا اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ کا جواب اَذِنَتْ ہے اور گمان یہ کیا کہ واؤ زائدہ ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ سب واؤ کو زائد ذکر نہیں کرتے مگر جب وہ حتی، اذا کے ساتھ استعمال ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (زمر: 71) وہ جب اس کے پاس آئیں گے تو کھول دیئے جائیں گے اس کے دروازے تیزی کے ساتھ، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ (الصافات) جب دونوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ اس کا معنی ہے ہم نے اسے ندا کی۔ واؤ ان دو کے علاوہ زائد نہیں ہوتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب مضمر ہے گویا کلام یوں کی گئی ہے اذا السماء انشقت یایھا الانسان إنك کادح۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا جواب وہ ہے جس پر فملاقیہ دلالت کرتا ہے تقدیر کلام یوں ہوگی اذا السماء انشقت فیایھا الانسان إنك کادح۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یوں ہے یا أیھا الإنسان إنك کادح إلی ربك کدحا فملاقیہ إذا السماء انشقت؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ اس سے یہ قول بھی مروی ہے: اس کا جواب فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۝ ہے۔ یہی کسائی کا قول ہے تقدیر کلام یہ ہوگی إذا السماء انشقت فمن أوتی کتاب بیمینه فحکمه کذا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: اس بارے میں جو گفتگو کی گئی ہے یہ ان میں سے سب سے صحیح اور حسن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ کلام اس معنی میں ہے اذکر اذا السماء انشقت۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب محذوف ہے کیونکہ مخاطبین اسے جانتے تھے یعنی جب یہ چیزیں ہو جائیں گی تو دوبارہ اٹھانے کی تکذیب کرنے والے اپنی گمراہی اور گھاٹے کو جان جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کی جانب سے قیامت کے وقت کے بارے میں سوال گزر چکا تھا تو انہیں کہا گیا: جب اس کی علامات ظاہر ہو جائیں گی تو قیامت برپا ہو جائے گی تو تم نے اپنے جھٹلانے کے انجام کو دیکھ لیا، قرآن ایک آیت کی طرح ہے کیونکہ اس کا بعض بعض پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ قسم ہے(1)، جبکہ جمہور کا نقطہ نظر ان کے خلاف ہے کیونکہ یہ خبر ہے قسم نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝ وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝

"اے انسان! تو محنت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک پس تیری ملاقات اس سے ہو کر رہتی ہے۔ پس جس کو دیا گیا اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں تو اس سے حساب آسانی سے لیا جائے گا اور واپس لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں"۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا۔ انسان سے مراد جنس ہے(2) مراد یہ ہے اے بنی آدم! سعید نے قتادہ سے یہی روایت نقل کی ہے: اے ابن آدم! تیری کاوش کمزور ہے جو یہ طاقت رکھتا ہو کہ اس کی کدو کاوش اللہ تعالیٰ کی طاعت

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 270
2۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 456

میں ہو تو وہ ایسا کرے امور کو بجالانے کی طاقت نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد مخصوص فرد ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد اسود بن عبد الاسد ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: ابی بن خلف ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: تمام کفار ہیں اے کافر! تو عمل کرنے والا ہے، کلام عرب میں کدح سے مراد عمل اور کسب ہے۔ ابن مقبل نے کہا (1):

وما الدهرُ إلّا تارتانِ فمِنهما　　أموت وأخرى أبتغي العيش أكدح

زمانہ نہیں ہے مگر دو ساعتیں ان میں سے ایک میں میں مر رہا ہوتا ہوں اور دوسرے میں تگ ودو کر رہا ہوتا ہوں۔

دوسرے شاعر نے کہا

ومَضَتْ بشاشةُ كلّ عيشٍ صالِحٍ　　وبقِيتُ أكدح لِلحياةِ وأنْصِب

ہر اچھی زندگی کی بشاشت گزر گئی اور زندگی کے لیے تگ ودو کر رہا ہوں اور تھک رہا ہوں۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رَبِّكَ كَدْحًا کا معنی ہے تو لوٹنے والا ہے یعنی اپنے رب کی طرف ہر صورت لوٹنے والا ہے۔ یعنی اپنے رب سے ملاقات کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے عمل سے ملنے والا ہے۔ قتبی نے کہا: تو اپنی زندگی میں اپنے رب کی ملاقات کے لیے تھکنے والا ہے۔ ملاقات سے مراد ہے تو اپنے رب کو اپنے عمل کے ساتھ ملے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تو اپنے عمل کی کتاب کو ملے گا کیونکہ عمل تو ختم ہو چکا۔ اسی وجہ سے فرمایا: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اس میں کوئی مناقشہ نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں اس طرح مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز جس کا محاسبہ کیا جائے گا اس کو عذاب دیا جائے گا'' (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ فرمایا: ''وہ حساب نہیں وہ تو پیشی ہے قیامت کے روز جس کے حساب پر مناقشہ ہوا اسے عذاب دیا جائے گا'' (3)۔ اسے امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے: کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اھل سے مراد جنت میں حور عین ہیں۔ مَسْرُوْرًا سے مراد خوش ٹھنڈی آنکھ والا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ آیت ابو سلمہ بن عبد الاسد کے بارے میں نازل ہوئی (4)، یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس اہل کی طرف جو دنیا میں اس کے اہل تھے تاکہ انہیں اپنی نجات اور سلامتی کے بارے میں بتائے۔ پہلا قول قتادہ کا ہے (5) یعنی ان اہل کی طرف لوٹے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں تیار کیا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 227　2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، اثبات الحساب، جلد 2، صفحہ 387

3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 457۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورة اذا السماء انشقت، حدیث نمبر 3260، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 236　5۔ ایضاً

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ﴿۱۵﴾

''اور جس (بدنصیب) کو اس کا نامہ عمل پس پشت دیا گیا تو وہ چلائے گا ہائے موت، ہائے موت، اور داخل ہو گا بھڑکتی آگ میں۔ بے شک وہ (دنیا میں) اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم رہا کرتا تھا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ وہ (اللہ کے حضور) لوٹ کر نہیں جائے گا۔ کیوں نہیں، اس کا رب اسے خوب دیکھ رہا تھا''۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا ﴿۱۲﴾ یہ آیت اسود بن عبدالاسد کے بارے میں نازل ہوئی جو ابوسلمہ کا بھائی تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے پھر یہ ہر مومن اور کافر کے بارے میں عام ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: وہ اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھائے گا تا کہ وہ اپنی کتاب لے تو فرشتہ اسے کھینچے گا اور اس کا دایاں ہاتھ الگ کر دے گا تو وہ اپنی کتاب بائیں ہاتھ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے لے گا۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا: اس کے سینے کی ہڈیاں اور پسلیاں پھاڑ دی جائیں گی پھر اس کا ہاتھ داخل کیا جائے گا اور اس کی پیٹھ کے پیچھے سے نکالا جائے گا تو وہ اپنی کتاب اسی طرح لے گا۔ وہ ہلاکت کو پکارے گا اور کہے گا: یا ویلاہ یا ثبوراہ۔ وہ جہنم میں داخل ہو گا یہاں تک کہ اس کی گرمی کو تاپے گا۔ حرم کے قاریوں ابن عامر اور کسائی نے اسے یصلّی پڑھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ (الحاقہ) پھر اسے جہنم میں داخل کر دو۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ ﴿۹۴﴾ (الواقعہ) باقی قراء نے یَصْلٰى پڑھا ہے یہ فعل لازم ہے متعدی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۶۳﴾ (الصافات) مگر اسے جو تاپنے والا ہے بھڑکتی آگ کو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ (الاعلیٰ) وہ بڑی آگ میں داخل ہو گا۔ فرمایا: ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ ﴿۱۶﴾ (المطففین) پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ اس کی تیسری قراءت بھی ہے جسے ابان نے عاصم سے، خارجہ نے نافع سے اور اسماعیل مکی نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے وہ یُصْلٰى ہے جس طرح سَیُصْلَوْنَ ہے اسی طرح سورۃ الغاشیہ میں ہے اسے تُصْلٰى نارًا بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں یعنی صلی، أصلی۔ جس طرح نَزَّلَ اور أَنْزَلَ ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ وہ دنیا میں خوش وخرم تھا۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کی صفت دنیا میں خوف رکھنے والے، غمگین، رونے والے اور شفقت کرنے والوں سے بیان کی جبکہ آخرت میں ان کی صفت نعیم اور سرور سے کی اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا: اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ (طور) ہم بھی اس سے پہلے اپنے اہل خانہ میں (اپنے انجام کے بارے میں) سہمے رہتے تھے سو بڑا احسان فرمایا ہے اللہ نے ہم پر اور بچا لیا ہے ہمیں گرم لو کے عذاب سے۔ اور جہنمیوں کی دنیا میں صفت سرور، ہنسنے اور لطف اندوزی سے کی۔ فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ (انشقاق) وہ اپنے اہل میں خوش وخرم تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ اسے زندہ کر کے ہرگز دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا کہ اس کا محاسبہ کیا جاتا پھر اس کو ثواب دیا

جائے یا سزا دی جائے۔ یوں باب ذکر کیا جاتا ہے حَارَیَحُوْرُ جب وہ لوٹے۔ لبید نے کہا:

وما المرء إلا كالشهاب وضوئِهِ　　یحورُ رَمادا بعد إذا هو ساطِعُ(1)

انسان نہیں ہے مگر ایک شہاب ثاقب اور اس کی روشنی کی مانند پہلے وہ روشن ہوتا ہے پھر خاکستر ہو جاتا ہے۔

عکرمہ اور داؤد بن ابی ہند نے کہا: یَحُوْرُ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی لوٹنا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دو کلمے متفق ہو جائیں کیونکہ دونوں کلمہ اشتقاق ہیں اس سے الخبز الحواری ہے کیونکہ یہ روٹی سفید ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نہیں جانتا تھا کہ حواری کیا ہے(2)؟ یہاں تک کہ میں نے بدوی عورت کو سنا جو اپنی بیٹی کو بلا رہی تھی۔ حوری یعنی میری طرف لوٹ آ۔ قوم عرب میں حور کا معنی لوٹنا ہے اس معنی میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: اللّٰھمّ إنی أعوذبك من الحور بعد الکور(3) اے اللہ! میں زیادتی کے بعد کمی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اسی طرح لفظ حور ہے ضرب المثل ہے: حور فی محارق نقصان در نقصان۔ یہ اس آدمی کے بارے میں بولا جاتا ہے جس کا معاملہ ادبار کا شکار ہو۔ شاعر نے کہا:

والذم یبقی وزاد القوم فی حُوْرِ

مذمت باقی رہتی ہے اور قوم نقصان میں بڑھ جاتی ہے۔

حور یہ تیرے اس قول سے اسم ہے: طَحَنَتِ الطَّاحِنَۃُ فما أحارت شیئا۔ آٹا پیسنے والی نے دانے پیسے اور آٹے میں کچھ اضافہ نہ کیا۔ حور کا معنی ہلاکت بھی ہے راجز نے کہا:

فی بئرِ لاحُوْرٍ سَرَی ولا شَعَر

ابوعبیدہ نے کہا: یہ اصل میں بئر حور ہے اور لا زائد ہے یعنی ہلاکت والا کنواں۔

بعد الکون کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں جس کا معنی ہے امر کے مکمل ہونے کے بعد اس کا منتشر ہونا۔ معمر سے الحور بعد الکون کے بارے میں پوچھا گیا انہوں نے کہا: اس سے مراد الکنتی ہے۔ عبدالرزاق نے ان سے پوچھا: الکُنتی کیا چیز ہے؟ فرمایا: ایک آدمی پہلے صالح ہوتا ہے پھر برا ہو جاتا ہے۔ ابوعمرو نے کہا: جب ایک آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے کنتی کہتے ہیں گویا اسے اس کے قول کی طرف منسوب کیا گیا۔ کنتُ فی شبابی کذا۔ شاعر نے کہا:

فأصبحت كُنتيا وأصبحت عاجِنا　　وشرُّ خِصال المرءِ كُنْتُ وعاجِنُ

میں کنتی ہو گیا ہوں اور میں عاجن ہو گیا ہوں اور انسان کی خصلتوں میں سے سب سے بری کنتی اور عاجن ہونا ہے۔

عجن الرجل کا معنی ہے جب ایک آدمی اٹھے تو تکبر کی وجہ سے زمین پر سہارا لے۔ ابن اعرابی نے کہا: کنتی سے مراد وہ آدمی ہے جو کہتا ہے: میں جوان تھا، میں بہادر تھا(4)۔ کانی اسے کہتے ہیں جو یہ کہتا ہے: میرے پاس مال تھا میں ہبہ کیا کرتا تھا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 236　　2۔ الکشاف، جلد 4، صفحہ 727

3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 458۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب ما یدعو بہ الرجل اذا سافر، صفحہ 286

4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 236

میرے پاس گھوڑے تھے اور میں سوار ہوا کرتا تھا۔

بَلٰىۤ ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا۟ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح اس نے گمان کیا بلکہ وہ ضرور ہماری طرف لوٹے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق سے پہلے بھی اسے دیکھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا لوٹنا اس کی طرف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیوں نہیں وہ ضرور لوٹے گا پھر جملہ نئے سرے سے شروع کیا(1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق سے لے کر اس کے دوبارہ اٹھائے جانے تک اسے دیکھ رہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کے حق میں جو شقاوت اور سعادت مقدر ہو چکی ہے اس کو جانتا ہے۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ۝ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ۝ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ۝ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝

”پس میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہیں اور چاند جب وہ ماہ کامل بن جائے تمہیں (بتدریج) زینہ بہ زینہ چڑھنا ہے۔ پس انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے، اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے“۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ۝ معنی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں لا نافیہ صلہ (زائدہ) ہے شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو سورج کے غروب ہونے کے وقت ہوتی ہے یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہوتا ہے۔ اشہب، عبداللہ بن حکم، یحییٰ بن یحییٰ اور دوسرے کثیر علماء نے امام مالک سے یہ قول نقل کیا ہے: شفق سے مراد مغرب میں سرخی ہے جب سرخی ختم ہو جاتی ہے تو مغرب کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور عشاء کی نماز واجب ہو جاتی ہے(2)۔ ابن وہب سے مروی ہے کہ مجھے کئی علماء نے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت شداد بن اوس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے یہ خبر دی کہ ان کے نزدیک شفق سے مراد سرخی ہے؛ امام مالک بن انس نے یہی کہا ہے۔ ابن وہب کے علاوہ کئی علماء نے صحابہ یعنی حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت انس رضی اللہ عنہم، قتادہ، ابن مسیب، طاؤس، عبداللہ بن دینار اور زہری سے یہی قول نقل کیا ہے۔ فقہاء میں سے اوزاعی، امام مالک، امام شافعی، امام ابو یوسف، ابو ثور، ابو عبید، امام احمد اور اسحاق سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد سفیدی ہے؛ یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز، اوزاعی اور امام ابو حنیفہ سے بھی ایک روایت سے مروی ہے۔ اسد بن عمرو نے روایت کی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے: اس سے مراد سفیدی ہے۔ پہلا قول پسندیدہ ہے کیونکہ اکثر صحابہ، تابعین اور فقہاء کی یہی رائے ہے۔ کیونکہ کلام عرب کے شواہد، اشتقاق اور سنت اس کی شہادت دیتے ہیں۔ فراء نے کہا: میں نے ایک عرب کو کہتے ہوئے سنا جو اس کپڑے کے بارے میں کہہ رہا تھا جس پر رنگ تھا: گویا وہ شفق ہے جب کہ وہ کپڑا سرخ تھا(3)۔ یہ اس کے سرخ ہونے کا شاہد ہے۔ شاعر نے کہا:

واحمر اللون کمحمز الشفق　　وہ سرخ رنگ والا ہے جس طرح شفق سرخ ہوتی ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 229　　2۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 727　　3۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 229

سرخ گیرو کو شفق کہتے ہیں۔ صحاح میں ہے: شفق سے مراد سورج کی بقیہ روشنی اور سرخی ہے جو رات کے پہلے حصہ میں ہوتی ہے اور عتمہ (عشاء) کے قریب ہوتی ہے۔ خلیل نے کہا: شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو سورج کے غروب ہونے سے لے کر عشاء کے وقت تک رہتی ہے جب وہ چلی جائے تو کہتے ہیں: غاب الشفق۔ پھر کہا گیا ہے: اس کا اصل معنی نرمی ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے: شئ شفق اس کی نرمی کی وجہ سے اس میں کوئی مضبوطی نہیں۔ اشفق علیہ اس کا دل اس پر نرم ہو گیا۔ شفقت، اشفاق سے ایک اسم ہے۔ اس سے مراد دل کی نرمی ہے۔ اسی طرح شفق ہے؛ شاعر نے کہا:

تھوَی حَیاتِی وأھوی موتھا شَفَقًا

وہ میری زندگی کی خواہش کرتی ہے اور میں شفقت کی وجہ سے اس کی موت کی خواہش کرتا ہوں۔

شفق سے مراد سورج کی باقی ماندہ روشنی اور سرخی ہے، گویا وہ نرمی سورج کی روشنی سے ہے(1)۔ حکماء نے کہا: سفیدی اصلاً غیب نہیں ہوتی۔ خلیل نے کہا: میں اسکندریہ کے مینارہ پر چڑھا میں نے سفیدی کو دیکھا تو میں نے اسے ایک افق سے دوسرے افق میں مضطرب دیکھا میں نے اسے غائب ہوتے ہوئے نہیں پایا۔ ابن ابی اویس نے کہا: میں نے اسے طلوع فجر تک پھیلتا ہوا پایا۔ ہمارے علماء نے کہا: جب اس کا وقت محدود نہیں تو اس کا اعتبار ساقط ہو جائے گا۔

سنن ابی داؤد میں نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ میں عشاء کے وقت کو تم سے زیادہ جانتا ہوں نبی کریم ﷺ عشاء کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب تیسری رات کا چاند غروب ہو جاتا تھا یہ اس وقت کی حد ہے پھر حکم اسم کے اول جز کے ساتھ متعلق ہوتا ہے(2)۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے گا کہ آپ کا یہ دعویٰ فجر اول کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں: فجر اول کے ساتھ نماز اور روزے کا حکم متعلق نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی وضاحت اپنے ارشاد اور عمل سے بیان فرمائی: ولیس الفجر أن تقول ھکذا، فرفع یدہ إلی فوق، ولکن الفجر أن تقول ھکذا وبسطھا۔ فجر یہ نہیں کہ تو کہے اس طرح اور اپنا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھایا بلکہ اس طرح ہے اور اپنے ہاتھ کو پھیلایا۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں روزوں والی آیت میں گزر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کا کوئی معنی نہیں۔ مجاہد نے کہا: شفق سے مراد تمام دن ہے(3)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ عکرمہ نے کہا: دن کا باقی ماندہ حصہ(4)۔ شفق سے مراد ردی چیز بھی ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: عطاء مشفق تھوڑا عطیہ۔ کمیت نے کہا:

ملك أغر مِن الملوك تحلَّبتْ للسائلين يداہ غيرَ مُشَفِقِ

وہ بادشاہوں میں سے روشن چہرے والا بادشاہ ہے اس کے ہاتھ سائلین کے لیے دوہتے یعنی کوئی کمی نہیں کرتے۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ جس کو جمع کرے اور لپیٹے۔ اس کا اصل معنی بادشاہ کا غضب ہے اس کا دبدبہ ہے اگر یہ رحمت کے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 237

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب وقت العشاء الاخرۃ، جلد 1، صفحہ 60۔ ایضاً، حدیث نمبر 355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 458 4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 237

دروازے سے بندوں کی طرف نہ آتی تو بندے اس کے آنے کو برداشت نہ کر سکتے لیکن یہ رات رحمت کے دروازے سے نکلی تو اس کے ساتھ مل گئی تو مخلوق اس کی طرف سکونت پذیر ہوئی پھر لوگ متفرق ہوئے، ایک دوسرے سے لپٹے اور منقبض ہوئے اور ہر ایک اپنے ٹھکانہ کی طرف لوٹ آیا تو اس کی ہولناکی سے خوفزدہ ہو کر اس میں سکون پالیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (القصص: 73) اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو بنایا تاکہ اس میں سکون حاصل کرو۔ اور فرمایا: وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (الجاثیہ: 12) تاکہ تم دن کے وقت اس کا فضل تلاش کرو۔ رات اس چیز کو جمع کرتی ہے جو دن کے وقت اپنی مصروفیات میں منتشر ہوتے ہیں؛ یہی حضرت ابن عباس، مجاہد، مقاتل اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن حارث برجمی نے کہا:

فإني وإياكُم وشوقًا إليكُم كقابِضٍ ماءً لم تَسِقْه أناملُهُ

بے شک میں، تم اور تمہارے ساتھ اشتیاق اسی طرح ہے جس طرح ایک آدمی پانی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جس پانی کو اس کی انگلیاں جمع نہیں کرتیں۔

وہ کہتا: اس کے ہاتھ میں اس سے کچھ بھی نہیں جس طرح اس آدمی کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا جو ہاتھ میں پانی روکتا ہے جب رات پہاڑوں، درختوں، سمندروں اور زمین کو ڈھانپ لیتی ہے تو ہر چیز اس کے لیے جمع ہو گئی تو تحقیق رات نے ان چیزوں کو جمع کر لیا۔ وَسَقَ کا معنی ہے تیرا ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا تو کہتا ہے: وسقته أسقه وسقا اس لیے جو کھانا کثیر ہو مجتمع ہو اسے بھی وسق کہتے ہی یہ ساٹھ صاع ہوتا ہے طعام موسق، جمع شدہ کھانا۔ ابل مستوسقة، مجتمع اونٹ۔ راجز نے کہا:

إنَّ لَنا قَلائِصًا حقائِقا مُسْتَوسِقاتٍ لو يَجِدْنَ سائِقا(1)

ہماری حقہ اونٹنیاں ہیں وہ جمع ہیں کاش! وہ کوئی ہانکنے والا پاتیں۔

عکرمہ نے کہا: وَمَا وَسَقَ سے مراد ہے جس چیز کو ہانک کر ایسی جگہ لے جاتے جہاں وہ پناہ لیتا ہے۔ وَسَقَ دھتکار نے کے معنی میں ہے اس وجہ سے اونٹوں، بھیڑ، بکریوں اور گدھوں میں سے جنہیں ہانک کرلے جایا جارہا ہو انہیں وسیقہ کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

كما قافَ آثارَ الوسِيقةِ قائِفُ

جس طرح قیافہ شناس جانوروں کے نشانات کو دیکھ کر پیچھے چلا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وَمَا وَسَقَ کا معنی ہے جو کسی چیز کو چھپالے۔ اور آپ سے ہی یہ بھی مروی ہے: جو چیز تو کسی پر لادے۔ جس چیز کو تو نے کسی پر لادا: فقد وسقته عرب کہتے ہیں: لا افعله ما وسقت عيني الماء۔ میں اس وقت تک ایسا نہیں کروں گا جب تک میری آنکھ آنسو اٹھائے ہوئے ہے۔

وَسَقَتِ الناقة تَسِقُ وَسَقًا وہ حاملہ ہوئی اور اپنی رحم کو پانی پر بند کر دیا۔ اس کے لیے یہ جملہ بولا جاتا ہے: هی ناقة

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 229

داسق، ھی نوق داسق، جس طرح نائم کی جمع نیام آتی ہے اور صاحب کی جمع صحاب آتی ہے۔ بشر بن ابی حازم نے کہا:

أَلُظُّ بِهِنَّ یحدوهُنَّ حتی تبنیتِ الحِیالُ مِنَ الوِساقِ

شعر میں وساق اسی معنی میں ہے۔

مواسیق بھی اسی طرح ہے أوسقتُ البعیر میں نے اس پر بوجھ لادا۔ أوسَقَتِ النخلۃُ اس کا پھل زیادہ ہو گیا۔ ضحاک اور مقاتل بن سلیمان نے کہا: وہ تاریکی کی وجہ سے بوجھل ہو گئی۔ مقاتل نے کہا: وہ ستاروں والی ہو گئی۔ قشیری نے کہا: حمل کا معنی ملانا اور جمع کرنا ہے، رات اپنی تاریکی کے ساتھ ہر شئی کو ڈھانپ لیتی ہے جب اس نے ہر چیز کو ڈھانپ لیا تو انہیں جمع کر لیا۔ یہ قسم تمام مخلوقات کی قسم ہے کیونکہ رات ان سب کو جامع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الحاقہ) میں قسم اٹھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔

ابن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے اس میں جو عمل کیا جائے یعنی تہجد اور سحری کے وقت استغفار (1)۔ شاعر نے کہا:

دیومًا ترانا صالحین وتارۃً تقومُ بِنَا کالواسِقِ السُّلَّبِ

کسی دن تو ہمیں دیکھتا ہے کہ ہم صالح ہیں اور کبھی تو ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تہجد گزار کمر کسنے والے کی طرح۔

یہاں واسق سے مراد عامل ہے یعنی عمل کرنے کی طرح۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ یعنی چاند کی قسم جب وہ چاند مکمل ہو جائے؛ مجتمع ہو جائے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اتَّسَقَ کا معنی ہے جب وہ بھر جائے اور مجتمع ہو جائے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا معنی ہے درست ہو جائے (2)۔ قتادہ نے کہا: جب وہ گھومے۔ فراء نے کہا: اتساقہ کا معنی ہے اس کا بھر جانا اور چودھویں کی رات اس کا مکمل ہو جانا۔ یہ وَسَقَ سے افتعال کا وزن ہے جس کا معنی جمع کرنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: میں نے اسے جمع کیا تو وہ جمع ہو گئے، جس طرح یہ کہا جاتا ہے: وصلتہ فاتصل یہ جملہ کہا جاتا ہے: امر فلان متسق فلاں کا معاملہ درست اور منظم ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: اتسق الشئ جب وہ پے در پے آئے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ ابو عمرو، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابو العالیہ، مسروق، ابو وائل، مجاہد، نخعی، شعبی، ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے اسے لترکبن باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایک حال کے بعد دوسرے حال پر چڑھیں گے؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (3)۔ امام شعبی نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایک آسمان کے بعد دوسرے آسمان، ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ اور ایک رتبہ کے بعد دوسرے رتبہ پر اللہ تعالیٰ کے قرب میں چڑھیں گے۔

حضرت ابن مسعود نے کہا: آپ ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں آسمان پر چڑھیں گے یعنی وہ حالات جن کی صفت اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے یعنی آسمان کا پھٹنا، اس کا لپیٹا جانا، اس کا کبھی مہل کی طرح ہو جانا، کبھی تیل کی طرح ہو جانا۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 237
2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 238
3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 459

ابراہیم نے عبدالاعلی سے طبقاعن طبق کی یہ تعبیر نقل کی ہے آسمان ایک حال کے بعد دوسرے حال میں بدل جائے گا
تیل کی طرح سرخ ہو جائے گا، وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اے انسان! تو ایک حالت
کے بعد دوسری حالت پر چڑھے گا وہ یہ کہ تو نطفہ ہوگا، پھر جما ہوا خون ہوگا پھر گوشت کا لوتھڑا ہوگا، پھر زندہ، پھر مردہ، پھر غنی،
فقیر۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ میں انسان مذکور کو خطاب ہے الْاِنْسَانُ اسم جنس ہے اس کا معنی الناس
(لوگ) ہے باقی قراء نے اسے لترکبن پڑھا ہے خطاب الناس کو ہے؛ ابوعبید اور ابو حاتم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ کہا: الناس سے
مراد لینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لینے سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس آیت سے قبل یہ ذکر کیا گیا ہے جس کو کتاب اس
کے دائیں ہاتھ میں دی گئی اور جس کو کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں دی گئی، یعنی تم قیامت کی سختیوں میں ایک حالت کے بعد
دوسری حالت میں چڑھو گے یا تم اپنے سے ماقبل لوگوں کے طریقہ پر چلو گے جو وہ انبیاء کو جھٹلانے اور انبیاء پر اختلاف کرنے
کے اعتبار سے اپنایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: سب ہی مراد ہے اس بارے میں احادیث وارد ہیں۔ ابونعیم حافظ نے جعفر بن محمد بن علی سے وہ حضرت
جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے
لیے انسان کو پیدا کیا ہے اس سے انسان غفلت میں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں جب وہ کسی انسان کو پیدا
کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتے سے فرماتا ہے: اس کا رزق، اس کا اثر (جہاں جہاں سفر کرے گا) اور اس کی موت کا وقت لکھ
دے اور یہ بھی لکھ دے کہ وہ بد بخت ہے یا سعادت مند ہے پھر یہ فرشتہ چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایک اور فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس
کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ سمجھ بوجھ کے قابل ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ دو فرشتے بھیجتا ہے جو اس کی اچھائیاں اور
برائیاں لکھتے ہیں جب موت آجاتی ہے تو وہ دونوں فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں پھر ملک الموت آتا ہے وہ اس کی روح کو قبض
کرتا ہے جب اسے اس کی قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے پھر ملک الموت چلا جاتا ہے
پھر اس کے پاس قبر والے دو فرشتے آتے ہیں جو اس کا امتحان لیتے ہیں پھر یہ دونوں اوپر چلے جاتے ہیں۔ جب قیامت قائم
ہوگی تو اس پر نیکیوں اور برائیوں والا فرشتہ نازل ہوگا۔ دونوں وہ کتاب کھولیں گے جو اس کے گلے میں بندھی ہوگی پھر دونوں
اس کے ساتھ حاضر ہوں گے ایک اس کے پیچھے ہوگا اور دوسرا گواہ ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا
فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۞ (ق) تو اس سے غافل تھا ہم نے تجھ سے پردے کو چاک کر دیا آج
تیری نظر بڑی تیز ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر چڑھو گے'' (1)۔ پھر نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إن قدامكم أمرا عظيما فاستعينوا بالله العظيم تمہارے سامنے عظیم امر ہے، اللہ عظیم سے مدد
طلب کرو۔ یہ حدیث کئی احوال پر مشتمل ہے جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں۔ اس کی پیدائش سے لیکر اس کے دوبارہ اٹھائے
جانے تک۔ سب ایک شدت کے بعد دوسری شدت ہے، زندگی ہے پھر موت ہے پھر دوبارہ اٹھایا جانا ہے پھر جزا ہے ان میں

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 564، حدیث نمبر 1052/3914، کتاب التفسیر، اذا السماء انشقت

سے ہر ایک میں شدائد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لتركبن سنن من قبلكم شبرًا بشبر و ذراعًا بذراع حتى لو دخلوا جحر ضب لدخلتموه قالوا يا رسول الله اليهود والنصارى؟ قال فَمَنْ، خرجه البخاری (1)۔ تم ضرور بضرور متقدمین کے طبقہ پر قدم بقدم چلو گے یہاں تک وہ اگر گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے۔ صحابہ نے عرض کی: یہود و نصاریٰ؟ فرمایا: تو پھر اور کون؟ امام بخاری نے اسے روایت کیا ہے۔ جہاں تک مفسرین کے اقوال کا تعلق ہے تو عکرمہ نے کہا: ایک حالت کے بعد دوسری حالت، دودھ پینے کی حالت کے بعد دودھ چھڑانا اور نوجوانی کے بعد بڑھاپا (2)۔ شاعر نے کہا:

كَذٰلِكَ المرءُ إِن يُنْسَأَلَهُ أَجَلٌ     يَرْكَب على طَبَقٍ مِنْ بَعدِهِ طَبَقُ (3)

اسی طرح انسان اگر اسے مہلت دی گئی ہے تو ایک طبق کے بعد دوسرے طبق پر سوار ہوتا ہے۔

مکحول سے مروی ہے: ہر بیس سال میں تم ایسا امر پاتے ہو‍ں پر تم پہلے نہ تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: ایک امر کے بعد دوسرا امر، تنگدستی کے بعد خوشحالی، خوشحالی کے بعد تنگدستی، فقر کے بعد غنا، غنا کے بعد فقر، بیماری کے بعد صحت، صحت کے بعد بیماری (4)۔

سعید بن جبیر نے کہا: ایک منزل کے بعد دوسری منزل (5)۔ ایک قوم دنیا میں کمزور تھی وہ آخرت میں بلند ہو گئے۔ ایک قوم دنیا میں بلند تھی تو وہ آخرت میں پست ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: منزل کے بعد دوسری منزل، ایک طبق کے بعد دوسرا طبق اس کی وجہ یہ ہے جب وہ صالحیت میں ہو تو اسے یہ صالحیت اوپر والے مرتبہ کی طرف بلاتی ہے اور جو آدمی فساد پر ہو تو یہ فساد اسے اوپر والے فساد کی طرف بلاتا ہے کیونکہ یہ چیز اپنی مثل کی طرف چلتی ہے۔ ابن زید نے کہا: تم ضرور دنیا کے طبق سے آخرت کے طبق کی طرف جاؤ گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد شدائد اور ہولناکیاں ہیں موت پھر دوبارہ اٹھایا جانا، پھر پیشی (6)۔

عرب اس آدمی کے بارے میں کہتے ہیں جو کسی مصیبت میں جا پڑتا ہے: وقع فی بنات طبق، وقع فی احدیٰ بنات طبق۔ اسی سے ایک قول یہ بھی ہے: بڑی مصیبت ام طبق اور احدی بنات طبق ہے۔ اس کا اصل معنی سانپ ہے کیونکہ سانپ کو ام طبق کہتے ہیں کیونکہ وہ سمٹ جاتا ہے۔ لغت میں طبق حالت کو کہتے ہیں جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ اقرع بن حابس تمیمی نے کہا:

وساقني طَبَقٌ منه إلى طَبَقِ (7)

مجھے ایک حالت دوسری حالت کی طرف ہانک کر لے گئی۔

یہ اس عالم کے حادث ہونے اور صانع کے اثبات پر واضح دلیل ہے۔ حکماء نے کہا: جو آج ایک حالت پر ہو اور کل دوسری

---

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 545   2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 238   3۔ ایضاً   4۔ ایضاً

5۔ ایضاً   6۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 230   7۔ ایضاً

حالت پر ہو تو وہ جان لے کہ اس کا انجام کسی اور امر پر ہوگا۔ ابوبکر وراق سے پوچھا گیا: اس عالم کے صانع پر کیا دلیل ہے؟ اس نے جواب دیا: حالات کا بدلنا، قوی کا کمزور ہو جانا، ارکان کا ضعیف ہو جانا، نیت کا مغلوب ہو جانا اور عزیمت کا منسوخ ہو جانا۔ یہ جملہ بھی بولا جاتا ہے: ہمارے پاس لوگوں اور ٹڈیوں کا طبق آیا یعنی جماعت آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا ایک شعر ہے(1):

تُنْقَلُ مِن صالبٍ إلى رَحِمٍ إذا مضى عالَمٌ بدا طَبَقُ

آپ کو پشت سے رحم کی طرف منتقل کیا جاتا رہا جب ایک عالم گزر گیا تو دوسرا طبق یعنی جماعت ظاہر ہوگئی۔

یعنی لوگوں کی ایک جماعت زمین کا طبق ہوگئی یعنی اس نے اسے بھر دیا۔ طبق کا یہ معنی بھی ہے نرم ہڈی جو دو مہروں کے درمیان ہوتی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مضی طبق من اللیل، طبق من النهار۔ رات کا بڑا حصہ گزر گیا۔ طبق کی جمع اطباق ہے یہ مشترک ہے اسے لترکبن بھی پڑھتے ہیں یہ نفس کو خطاب ہے اسے لیرکبن بھی پڑھا گیا ہے اس وقت ضمیر انسان کی طرف لوٹے گی۔ عن طبق محل نصب میں ہے کیونکہ یہ طبقا کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہوگی طبقا مجاوزا لطبق یا یہ لترکبن میں جو ضمیر ہے اس سے عن طبق حال ہے تقدیر کلام یہ ہوگی لترکبن طبقا مجاوزین لطبق أو مجاوزا أو مجاوزۃ۔

**فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝** یعنی کون سی چیز انہیں ایمان سے روکتی ہے جب کہ ان کے لیے آیات واضح ہوگئیں اور دلائل قائم ہو گئے۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ تعجب ہے ان پر تعجب کرو کہ وہ ان آیات کے ہوتے ہوئے ایمان ترک کر رہے ہیں۔

**وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝** یعنی وہ نماز نہیں پڑھتے۔ صحیح میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو پڑھا تو اس میں سجدہ کیا جب اس سے فارغ ہوئے تو دوسرے ساتھیوں کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سجدہ کیا تھا۔ امام مالک نے ارشاد فرمایا: یہ لازمی سجدوں میں سے نہیں کیونکہ اس کا معنی ہے وہ یقین نہیں رکھتے اور اس کے واجبات پر عمل نہیں کرتے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ یہ آیت لازمی سجدوں میں سے ہے(2) یہ مدنیوں کی روایت ہے اس میں قرآن وسنت کی تائید ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب میں لوگوں کو امامت کراتا ہوں تو میں اس کی قراءت کو ترک کر دیتا ہوں(3) کیونکہ اگر میں سجدہ کروں گا تو وہ اس کا انکار کریں گے اگر میں ترک کروں گا تو یہ میری جانب سے تقصیر ہوگی اس وجہ سے میں اجتناب کرتا ہوں مگر جب میں اکیلے نماز پڑھوں۔ یہ صادق وامین کے قول کی تصدیق وتحقیق ہے کہ معروف منکر بن جائے اور منکر معروف بن جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا تھا: لولا حِدْثان قومك بالكفر لهدمتُ البيت ولرددته على قواعد إبراهيم اگر تیری قوم کا کفر کا دور قریب نہ ہوتا تو میں بیت اللہ شریف کو گرا دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کر دیتا۔

ہمارے شیخ ابوبکر فہری رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین (ہاتھ اٹھانا) کیا کرتے تھے۔ یہ امام مالک، امام شافعی کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 459 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1911 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1912-1911

مذہب ہے اور شیعہ بھی اسی طرح کرتے ہیں ایک روز وہ میرے پاس سرحد پر ابن شواء کی چھاؤنی میں تشریف لائے یہی میری تدریس کی جگہ تھی ظہر کا وقت تھا، وہ مذکورہ چھاؤنی کی مسجد میں داخل ہوئے اگلی صف میں ہو گئے اور میں ان کے پیچھے سمندر پر لگائے گئے تختوں پر بیٹھا ہوا تھا [illegible] میری صف میں ابوثمنہ رئیس البحر اور اس کا کمانڈر تھا جبکہ وہ چند ساتھیوں کے ساتھ نماز کا انتظار کر رہے تھے اور بندرگاہ کے نیچے جہازوں پر نظر رکھے ہوئے تھے جب شیخ نے رکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھایا تو ابوثمنہ اور اس کے ساتھیوں نے کہا: اس مشرقی کو نہیں دیکھتے یہ کیسے ہماری مسجد میں داخل ہو گیا؟ اس کی طرف اٹھو، اسے قتل کر دو اور سمندر میں پھینک دو تمہیں کوئی بھی نہ دیکھے۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا میں نے کہا: یہ طرطوشی موجودہ دور کا فقیہ ہے۔ انہوں نے مجھے کہا: اس نے اپنے ہاتھ کیوں اٹھائے ہیں؟ میں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے جو اہل مدینہ نے آپ سے روایت کیا ہے۔ میں انہیں ٹھنڈا کرنے لگا اور خاموش کرانے لگا یہاں تک کہ وہ نماز سے فارغ ہو گئے میں ان کے ساتھ چھاؤنی میں اپنے مسکن کی طرف گیا تو انہوں نے میرے چہرے کی رنگت کو بدلے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اسے عجیب جانا۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا میں نے انہیں تمام بات بتا دی وہ مسکرائے اور فرماتے: میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوتا کہ میں ایک سنت کے احیاء کی وجہ سے قتل کیا جاتا؟ میں نے عرض کی: یہ آپ کے لیے حلال نہیں کیونکہ آپ ایسے لوگوں کے درمیان ہیں اگر آپ اس پر قائم رہے تو یہ آپ پر حملہ کر دیں گے ممکن ہے آپ کا خون رائیگاں چلا جائے۔ انہوں نے کہا: اس بات کو چھوڑو اور کوئی دوسری بات کرو۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

''بلکہ یہ کفار اسے (الٹا) جھٹلاتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو ان (کے دلوں) میں بھرا ہوا ہے پس آپ انہیں خوشخبری سنائیں دردناک عذاب کی البتہ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہوگا''۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ بلکہ کافر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جو وہ پیغام حق لائے ہیں اس کو جھٹلاتے ہیں۔ مقاتل نے کہا: آیت بنی عمرو بن عمیر کے بارے میں نازل ہوئی یہ چار افراد تھے ان میں سے دو مسلمان ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ سب کفار کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جو وہ اپنے دلوں میں تکذیب چھپائے ہوئے ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ اپنے افعال چھپاتے ہیں (1)۔ ابن زید نے کہا: وہ اچھے اور برے اعمال جمع کرتے ہیں (2)۔ یہ وعاء سے ماخوذ ہے۔ وعاء اسے کہتے ہیں کہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو جمع کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: أوعيت الزاد والمتاع جب تو زاد راہ اور سامان کو برتن میں رکھ لے۔ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 239
2۔ ایضاً

الخير أبقى وإن طال الزمانُ بهِ والشرُّ أخبث ما أوعيت مِن زادِ

اچھائی باقی رہنے والی ہے اگر چہ زمانہ طویل ہو جائے اور برائی براترین زاد ہے جو تو جمع کرے۔

وعاء کا معنی ہے جس کی وہ حفاظت کرے۔ تو کہتا ہے: وعيت الحديث أعيه وعيًا میں نے بات کو یاد کیا اسی سے ہے أذن واعية یاد رکھنے والے کان۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ انہوں نے جو تکذیب کی اس پر ان کے لیے ایسا عذاب ہے جو دردناک ہے یعنی اسے بشارت کی جگہ رکھ لو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۝ یہ مستثنیٰ منقطع ہے گویا فرمایا: لیکن جنہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت دے کر تصدیق کی اور نیک اعمال کیے یعنی فرائض ادا کیے۔ ان کے لیے ایسا اجر ہے جس سے نہ کوئی کمی ہوگی نہ ہی وہ ختم ہوگا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: مننت الحبل جب تو اسے کاٹ دے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۝ کے بارے میں پوچھا فرمایا: وہ ختم ہونے والا نہ ہوگا۔ پوچھا گیا: عرب اس معنی کو پہچانتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ اخو یشکر اس معنی کی وضاحت کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

فترى خلفهنَّ مِنْ سُرعةِ الرَّجْعِ مَنِينًا كأنّه أهباءُ(1)

تیزی سے پلٹنے کی وجہ سے تو ان کے پیچھے غبار پائے گا گویا باریک ذرات ہیں۔

مبرد نے کہا: منین کا معنی غبار ہے کیونکہ یہ غبار اپنے مابعد کو قطع کر لیتا ہے ہر کمزور منین اور منون ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کا معنی ہے ان پر اس کی وجہ سے کوئی احسان نہیں جتلایا جائے گا۔ اہل علم میں سے چند لوگوں نے کہا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یہ استثنا نہیں یہ واؤ کے معنی میں ہے گویا کہا: اور جو ایمان لائے۔ اس بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 459

# سورة البروج

آیاتہا ۲۲ ۸۵ سورۃ البروج مکیۃ ۲۷ رکوعہا ۱

بالاتفاق مکی ہے۔ اس کی بائیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝

''قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے''۔

یہ قسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے۔ بروج میں چار قول ہیں:

(۱) ستاروں والا (1)؛ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔

(۲) محلات؛ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: یہ آسمان میں محلات ہیں (2)۔ مجاہد نے کہا: ایسے برج جن میں نگہبان ہوتے ہیں۔

(۳) اچھی صورت والا؛ یہ منہال بن عمرو کا قول ہے۔

(۴) منازل والا (3)؛ یہ ابوعبیدہ اور یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ یہ بارہ برج ہیں یہ ستاروں، چاند اور سورج کی منازل ہیں۔ چاند ایک برج میں دو دن اور ایک تہائی دن چلتا رہتا ہے۔ یہ اٹھائیس دن ہو جاتے ہیں پھر دو راتیں وہ چھپ جاتا ہے اور سورج ہر برج میں ایک ماہ تک چلتا رہتا ہے وہ برج یہ ہیں حمل، ثور، جوزاء، سرطان، الاسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ کلام عرب میں بروج سے مراد محلات ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء:78) اگرچہ تم مضبوط محلات میں ہو۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝

''اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور حاضر ہونے والے دن کی اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوں گے''۔

یوم موعود سے مراد وہ دن ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ دوسری قسم ہے یہ یوم قیامت ہے۔ علماء کی تاویل میں کوئی اختلاف نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آسمان اور زمین والوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ اس میں جمع ہوں۔

شاہد اور مشہود کی تعبیر میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ شاہد سے مراد یوم جمعہ ہے اور مشہود سے مراد یوم عرفہ ہے (4)؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 240 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 241

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ "یوم موعود سے مراد یوم قیامت (1)۔ یوم مشہود سے مراد یوم عرفہ، اور شَاهِدٍ سے مراد یوم جمعہ ہے"۔ ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں اسے نقل کیا ہے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے ہم اسے موسیٰ بن عبیدہ کے سوا نہیں جانتے اور موسیٰ بن عبیدہ کو حدیث میں ضعیف قرار دیا جاتا ہے اسے یحییٰ بن سعید اور دوسرے علماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ شعبہ، سفیان ثوری اور دوسرے ائمہ نے اس سے روایات نقل کی ہیں۔ قشیری نے کہا: یوم جمعہ ہر عمل کرنے والے پر گواہی دے گا جو اس نے اس دن عمل کیا۔

میں کہتا ہوں: سارے دن اس طرح ہیں۔ ہر دن شاہد ہے، ہر رات شاہد ہے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابونعیم حافظ نے معاویہ بن قرہ سے نقل کی ہے وہ معقل بن یسار سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: لیس من یوم یأتی علی العبد إلا ینادی فیه: یابن آدم أنا خَلْق جدید وأنا فیما تعمل علیك شهید، فاعمل فی خیرا أشهد لك به غدا، فإنی لو قد مضیتُ لم ترنی أبدا ویقول اللیل مثلَ ذلك (☆)۔

جو دن بھی بندے پر آتا ہے وہ اس میں ندا کرتا ہے: اے ابن آدم! میں تازہ مخلوق ہوں جو کچھ تو اس میں کرے گا میں تجھ پر گواہ ہوں مجھ میں اچھا عمل کر میں کل تیرے حق میں گواہی دوں گا اگر میں گزر گیا تو مجھے کبھی بھی نہ دیکھ سکے گا رات بھی اسی طرح کہتی ہے۔ معاویہ کی یہ روایت غریب ہے۔ زیدعمی ان سے روایت کرنے میں متفرد ہے میں اس سند کے علاوہ اس روایت کو مرفوع نہیں دیکھتا۔

قشیری نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ شاہد سے مراد یوم اضحیٰ ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: شاہد سے مراد یوم ترویہ ہے اور مشہود سے مراد یوم عرفہ ہے (2)۔ اسرائیل نے ابو اسحاق سے وہ حارث سے وہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مشہود سے مراد یوم قیامت ہے (3) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝ (ہود) یہ وہ دن ہے جس دن اکٹھے کیے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: اس وجہ سے شاہد کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے (4)۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر سے بھی یہی مروی ہے اس کی وضاحت ان آیات میں ہے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (النساء) اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے۔ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً (الانعام: 19) بتاؤ کون سی چیز شہادت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ (الانعام: 19) فرما دیجئے: اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (5)؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، بطور دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت نقل کی فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 169 2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 233 3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 461
4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 241 5۔ ایضاً ☆۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 2، صفحہ 303-304

مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا۟ (النساء) تو کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے۔ اور حضرت حسین نے یہ آیت بطور دلیل پڑھی يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا۟ (الاحزاب) اے نبی! ہم نے آپ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

میں کہتا ہوں میں خود بطور دلیل یہ آیت پڑھتا ہوں وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ:143)

ایک قول یہ کیا گیا ہے: انبیاء اپنی امتوں پر گواہی دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ (النساء:41) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم ہیں(2) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (المائدہ: 117) جب تک میں ان میں رہا میں ان پر گواہ تھا۔ مشہود سے مراد آپ کی امت ہے۔ حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب سے مروی ہے: شاہد سے مراد انسان ہے(3) اس کی دلیل كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۟ (الاسراء) آج تجھ پر تیرا نفس ہی محاسب کافی ہے۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد اعضاء ہیں اس کی دلیل یہ آیت ہے يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۟ (النور) اس روز ان پر ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ حسین بن فضل نے کہا: شاہد یہ امت ہے اور مشہود باقی امتیں ہیں(4)۔ اس کی وضاحت یوں ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ:143) اس لیے ہم نے آپ کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔ ایک قول یہ کیا گیا: شاہد سے مراد حفظہ فرشتے ہیں اور مشہود سے مراد انسان ہیں(5)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد راتیں اور دن ہیں اس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں۔

میں کہتا ہوں: مال مالک کے خلاف گواہی دے گا، زمین اس کے بارے میں گواہی دے گی جو اس پر عمل کیا گیا۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: إن هذا المال خَضِرٌ حُلْوٌ ونِعْمَ صاحبُ المسلم هو لمن أعطى منه المسكين واليتيم وابن السبيل وانه من يأخذه بغير حق كان كالذي يأكل ولا يَشْبَعُ ويكون عليه شهيدا يوم القيامة یہ مال سرسبز اور میٹھا ہے اس کا مالک مسلمان کتنا اچھا ہے جو اس مال سے مسکین، یتیم اور مسافر کو دیتا ہے یا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی اسے بغیر حق کے لیتا ہے اس کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، یہ قیامت کے روز اس کے خلاف گواہ ہوگا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۟ (الزلزال) اس روز وہ اپنی خبریں بیان کرے گی۔ پوچھا: کیا تم جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اس کی خبریں یہ ہیں کہ یہ ہر مرد اور عورت پر گواہی دے گی جو اس پر عمل کیا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 241　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 461　5۔ زاد المسیر، جلد 5، صفحہ 234

گیا وہ کہے گی: یہ یہ عمل کیا گیا''۔ فرمایا: ''یہی اس کی خبریں ہیں'' (٭)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔
ایک قول یہ کیا گیا: شاہد سے مراد مخلوق ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی اور مشہود سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مشہود سے مراد یوم جمعہ ہے جس طرح حضرت ابو درداء نے روایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اکثروا علیّ من الصلوۃ یوم الجمعۃ فإنہ یوم مشھود شَہِدَ ہُ الملائکۃ (1) جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود پڑھو کیونکہ یہ یوم مشہود ہے اس میں ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔ اسے ابن ماجہ اور دوسرے محدثین نے ذکر کیا۔
میں کہتا ہوں: اس اعتبار سے یوم عرفہ مشہود ہے کیونکہ ملائکہ اس روز حاضر ہوتے ہیں اور اللہ کی رحمت اس میں نازل ہوتی ہے اسی طرح یوم النحر بھی ہے۔ ابو بکر عطار نے کہا: شاہد سے مراد حجر اسود ہے (2) جس آدمی نے صدق، اخلاص اور یقین کے ساتھ اسے مس کیا اس کے حق میں یہ گواہی دے گا اور مشہود سے مراد حاجی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: شاہد سے مراد انبیاء اور مشہود سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (3) اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ … وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝ (آل عمران) یاد کرو اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ لیا جو میں نے تمہیں کتاب اور حکمت دی … میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ۝ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۝

''مارے گئے خائی کھودنے والے (جس میں) آگ تھی بڑے ایندھن والی جب وہ اس (کے کنارہ) پر بیٹھے تھے اور وہ جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ سلوک کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے''۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۝ ان پر لعنت کی گئی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: قرآن حکیم میں جہاں بھی قُتِلَ کے الفاظ ہیں اس کا معنی لُعِنَ ہے۔ فراء کے قول کے مطابق یہ جواب قسم ہے (4) اس میں لام مضمر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا۝ (الشمس) پھر فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۝ (الشمس) اصل میں یہ لقد افلح تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی اصحاب اخدود پر لعنت ہے قسم ہے برجوں والے آسمان کی: یہ ابو حاتم سجستانی نے کہا۔ ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ کسی کہنے والے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کہے: واللہ قام زید اس کا معنی یہ ہو قام زید واللہ۔ ایک قوم نے کہا: جواب قسم اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۝ ہے یہ قبیح ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان گفتگو طویل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب قسم اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب قسم محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہے والسماء ذات البروج لتبعثن؟ یہ ابن انباری کا اختیار ہے۔ الْاُخْدُوْدِ کا معنی زمین میں بڑا اور طویل گڑھا ہے جس طرح خندق ہوتی

1۔ سنن ابن ماجہ، ما جاء فی الجنائز، ذکر وفاتہ و دفنہ، صفحہ 119۔ ایضاً، حدیث نمبر 1626، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 234 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 241
٭۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ اذا زلزلت، حدیث نمبر 3276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اس کی جمع اخادید آتی ہے اس سے لفظ خد ہے جہاں آنسو بہتے ہیں اسی سے مخدۃ کا لفظ ہے کیونکہ رخسار اس پر رکھا جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تَخدّد وجہ الرجل۔ جب زخم کی وجہ سے اس میں گڑھے پڑ جائیں۔ طرفہ نے کہا:

ووجهٌ كَأنّ الشمسَ حلتْ رداءها علیه نقیُّ اللونِ لم يَتَخَدَّدِ

وہ ایسا چہرہ ہے گویا سورج نے اپنی چادر اوڑھا دی ہے اس کا رنگ صاف ہے اس پر گڑھے نہیں۔

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ النَّارِ، الْاُخْدُوْدِ سے بدل ہے یہ بدل اشتمال ہے عام قراءت وقود میں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے جس کا معنی ایندھن ہے۔ قتادہ، ابورجاء اور نصر بن عاصم نے واؤ کے ضمہ کے ساتھ مصدر کی صورت میں پڑھا ہے یعنی شعلوں والی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوگوں کے بدنوں کو جلانے والی۔ ابن اشہب، عقیلی، ابوسمال عدوی اور ابن سمقیع نے النَّارِ ذَاتِ دونوں کو مرفوع پڑھا ہے یعنی اسے ایسی آگ نے جلا دیا جو ایندھن والی ہے۔

اِذْ هُمْ عَلَیْهَا قُعُوْدٌ ۝ یعنی وہ لوگ جنہوں نے خندقوں کو کھودا تھا اس پر بیٹھے تھے ان میں مومنوں کو پھینکتے تھے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا عرصہ تھا یہ نجران کے لوگ تھے ان کے بارے میں مختلف واقعات ہیں۔ معنی قریب قریب ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت صہیب سے مروی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم سے قبل کے دور میں ایک بادشاہ تھا اس کا ایک جادوگر تھا جب وہ بوڑھا ہو گیا اس نے بادشاہ سے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں میرے پاس ایک بچہ بھیج دو جسے میں جادو سکھا دوں۔ بادشاہ نے اس کے پاس ایک بچہ بھیج دیا تا کہ وہ اسے علم سکھائے جس راستہ سے وہ جاتا اس کے راستہ میں ایک راہب رہتا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھتا، اس کی گفتگو سنتا اور خوش ہوتا جب وہ بچہ ساحر کے پاس آتا تو راہب کے پاس سے گزرتا اور اس کے پاس بیٹھ جاتا جب وہ بچہ ساحر کے پاس آتا تو وہ اسے مارتا۔ بچے نے اس کی شکایت راہب سے کی راہب نے کہا: جب تجھے ساحر سے خوف آئے تو کہہ دینا: میرے اہل نے مجھے روک لیا تھا۔ جب تجھے گھر والوں سے ڈر ہو تو کہہ دینا: مجھے جادوگر نے روک لیا تھا۔ وہ اس طرح آتا جاتا تھا کہ اس کا گزر ایک جانور کے پاس سے ہوا جس نے لوگوں کو روک رکھا تھا اس نے کہا: آج مجھے اس کا علم ہو جائے گا کہ جادوگر افضل ہے یا راہب افضل ہے؟ اس نے ایک پتھر اٹھایا اس نے یوں دعا کی: اے اللہ! اگر راہب کا معاملہ تیری بارگاہ میں جادوگر کے امر سے زیادہ محبوب ہے تو اس جانور کو مار ڈال یہاں تک کہ لوگ گزر سکیں اس بچے نے وہ پتھر اسے مارا اور اسے قتل کر دیا اور لوگ چلے گئے وہ راہب کے پاس آیا اور اسے تمام واقعہ بتایا راہب نے اسے کہا: اے بیٹے! آج تم مجھ سے افضل ہو تیرا معاملہ وہاں تک پہنچ گیا ہے جو میں دیکھتا ہوں۔ تجھے آزمایا جائے گا اگر تجھے آزمائش میں ڈالا جائے تو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا وہ بچہ مادر زاد اندھوں، برص کے مریضوں کو درست کر دیتا اور لوگوں سے تمام بیماریوں کو دور کر دیتا۔ بادشاہ کے درباری نے اس بارے میں سنا جو نابینا ہو چکا تھا وہ بہت سے ہدایا لایا اور کہا: اگر تو مجھے درست کر دے تو میں تیرے لیے یہ مال جمع کروں گا۔ اس بچے نے کہا: میں تو کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا تو اللہ دیتا ہے۔ اگر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا وہ تجھے شفا دے دے گا وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، قصة أصحاب الاخدود والساحر والراهب والغلام، جلد 2، صفحہ 415

لے آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دے دی۔ وہ بادشاہ کے پاس آیا اور اس کے پاس بیٹھا جس طرح پہلے اس کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کس نے تیری نظر لوٹائی؟ اس نے کہا: میرے رب نے۔ بادشاہ نے پوچھا: تیرا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے؟ درباری نے کہا: میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ بادشاہ نے اسے پکڑ لیا وہ اسے لگاتار عذاب دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے غلام کے بارے میں راہنمائی کی۔ اس بچے کو لایا گیا بادشاہ نے اس سے پوچھا: اے بیٹے! کیا تو جادو کے ذریعے اس مقام تک پہنچ گیا ہے جس کے ذریعے تو مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفا دیتا ہے اور تو یہ یہ کرتا ہے؟ اس نے کہا: میں تو کسی کو شفا نہیں دیتا شفا تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ بادشاہ نے بچے کو پکڑ لیا وہ اس کو لگاتار عذاب دیتا رہا یہاں تک کہ بچے نے اسے راہب کے بارے میں بتا دیا اس راہب کو لایا گیا اسے کہا گیا: اپنے دین سے ارتداد اختیار کر لو اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا بادشاہ نے آری منگوائی اس نے آری راہب کے سر کے درمیان رکھی اسے دو ٹکڑے کیا یہاں تک کہ وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ پھر بادشاہ کے مصاحب کو لایا گیا اسے کہا گیا: اپنے دین سے پھر جاؤ۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے آری اس کے سر کی مانگ میں رکھوائی اسے دو ٹکڑے کیا تو وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ پھر بچے کو لایا گیا اسے کہا گیا: اپنے دین سے پھر جا اس نے انکار کر دیا اس نے بچہ اپنے چند ساتھیوں کے حوالے کیا اور کہا: اسے فلاں فلاں پہاڑ کی طرف لے جاؤ اسے پہاڑ پر چڑھا دو جب تم اس کی چوٹی پر پہنچ جاؤ اگر وہ اپنے دین سے پھر جائے تو بہتر ورنہ اسے اس چوٹی سے نیچے گرا دو۔ وہ اسے لے گئے اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھایا تو بچے نے یہ دعا مانگی: اے اللہ! میری جانب سے تو انہیں کافی ہو جا جو بھی تو چاہے۔ پہاڑ ان کے ساتھ لرزنے لگا وہ نیچے گر گئے وہ پیدل بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: تیرے ساتھیوں کا کیا ہوا؟ بچے نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ انہیں میری طرف سے کافی ہو گیا۔ اس نے اسے اپنے ساتھیوں کے حوالے کیا اور کہا: اس لے جاؤ اور اسے کشتی میں سوار کرو کشتی کو سمندر کے درمیان لے جاؤ اگر وہ اپنے دین سے لوٹ آئے تو ٹھیک ورنہ اسے سمندر میں پھینک دو لوگ اسے لے کر گئے اس نے دعا مانگی: اے اللہ! جو تو چاہتا ہے میری طرف سے انہیں کافی ہو جا۔ کشتی ٹوٹ گئی وہ غرق ہو گئے وہ پیدل بادشاہ کے پاس آیا۔ بادشاہ نے اسے کہا: تیرے ساتھیوں نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ انہیں میری جانب سے کافی ہو گیا اس نے بادشاہ سے کہا: تو مجھے قتل نہیں کر سکتا یہاں تک کہ تو وہ کرے جو میں تجھے کہوں۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ بچے نے کہا: تو لوگوں کو کھلے میدان میں جمع کرے، مجھے سولی پر لٹکائے پھر میرے ترکش سے ایک تیر نکالے پھر تیر قوس پر چڑھائے پھر کہے: اللہ جو غلام کا رب ہے اس کے نام سے پھر تو وہ تیر مجھے مارے اگر تو ایسا کرے تو تو مجھے قتل کر دے گا۔ بادشاہ نے لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا اور بچے کو سولی پر لٹکایا پھر اس نے بچے کے ترکش سے تیر لیا پھر تیر کمان پر چڑھایا پھر کہا: اللہ جو اس بچے کا رب ہے اس کے نام سے پھر تیر پھینکا تیر اس کی کنپٹی میں لگا اس بچے نے اپنا ہاتھ تیر کی جگہ اپنی کنپٹی پر رکھا اور مر گیا لوگوں نے کہا: ہم بچے کے رب پر ایمان لے آئے، ہم بچے کے رب پر ایمان لائے، ہم بچے کے رب پر ایمان لائے۔ بادشاہ کے پاس کوئی آیا اس نے کہا: بتاؤ تو کس چیز سے ڈرتا تھا؟ اللہ کی قسم! تیرا ڈر تجھے آ پہنچا۔ لوگ ایمان لا چکے ہیں اس نے گلیوں کے سروں پر خندقیں کھودنے کا حکم دیا خندقیں کھود دی گئیں اور ان میں آگ روشن کر دی گئی بادشاہ نے کہا: جو آدمی اپنے

دین سے نہ پھرے اسے اس میں جلا دو یا اسے کہا: اس میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے اسی طرح کیا یہاں تک کہ ایک عورت آئی اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا وہ اس میں داخل ہونے سے ہچکچائی۔ بچے نے اسے کہا: اے ماں! صبر کر کیونکہ تو حق پر ہے"۔ امام ترمذی نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں "بچے کے راستہ میں عبادت گاہ میں ایک راہب رہتا تھا" معمر نے کہا: میرا خیال ہے ان دنوں میں گرجا گھروں میں اطاعت گزار رہتے تھے اس میں یہ تصریح بھی ہے کہ جس جانور نے لوگوں کو روک رکھا تھا وہ شیر تھا اور یہ بھی ذکر ہے کہ بچے کو دفن کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسے نکالا گیا تو اس کی کنپٹی پر ہاتھ تھا جس طرح اس نے اس وقت رکھا تھا جب اسے قتل کیا گیا۔ اور کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے (☆)۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نجران کا ایک بادشاہ تھا اس کی رعیت میں ایک آدمی تھا جس کا ایک بچہ تھا اس نے اس بچے کو ساحر کے پاس بھیجا تاکہ اسے یہ جادو سکھائے اس نوجوان کا راستہ راہب کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا وہ انجیل پڑھا کرتا تھا۔ بچہ راہب سے جو سنتا وہ اسے خوش کرتا بچہ راہب کے دین میں داخل ہو گیا۔ ایک دن وہ آیا تو ایک بڑا سانپ تھا جس نے لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا اس بچے نے ایک پتھر اٹھایا اور کہا: اس اللہ کے نام سے جو آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان جو ہے اس کا رب ہے اور اس جانور کو مار ڈالا اور سابقہ واقعہ کی طرح واقعہ ذکر کیا۔ جب بادشاہ نے اسے تیر مارا اور اسے قتل کر دیا تو اس کی مملکت کے لوگوں نے کہا: کوئی معبود نہیں مگر عبداللہ بن ثامر کا معبود۔ عبداللہ بن ثامر اس بچے کا نام تھا۔ بادشاہ ناراض ہو گیا اس نے حکم دیا خندقیں کھودی گئیں ان میں لکڑیاں اور آگ جمع کی گئی اور مملکت کے لوگ ان خندقوں پر لائے گئے جس نے توحید سے رجوع کر لیا اس نے اسے چھوڑ دیا اور جو اپنے دین پر ثابت قدم رہا اسے آگ میں ڈال دیا۔ ایک دودھ پلانے والی عورت لائی گئی اسے کہا گیا: اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ بصورت دیگر ہم تجھے اور تیرے بچے کو آگ میں پھینک دیں گے وہ عورت ڈر گئی اور ارتداد کا ارادہ کیا دودھ پیتے بچے نے اسے کہا: اے ماں! جس دین پر تو ہے اس پر ثابت قدم رہ۔ یہ آگ بجھنے والی ہے۔ لوگوں نے اس عورت اور اس کے بیٹے کو آگ میں ڈال دیا۔

ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آگ خندقوں سے بلند ہوئی وہ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں پر چالیس ہاتھ اوپر اٹھی اور انہیں جلا دیا۔ ضحاک نے کہا: یہ نصرانی لوگ تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے چالیس سال قبل یمن میں رہتے تھے (1) انہیں یوسف بن شراحیل بن تبع حمیری نے پکڑ لیا (2) یہ اسی سے کچھ اوپر افراد تھے ان کے لیے اس نے خندقیں کھدوائیں اور انہیں آگ میں جلا دیا؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے۔

ثعلبی نے ان سے یہ بیان کیا کہ اصحاب اخدود بنی اسرائیل میں سے تھے (3) انہوں نے کچھ مرد اور عورتیں پکڑ لیں ان یہودیوں نے ان کے لیے خندقیں کھودیں اور ان میں آگ جلائی پھر مومنوں کو ان پر کھڑا کیا انہیں کہا گیا: تم اپنے نئے دین کا

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 242	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

☆ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ البروج، حدیث نمبر 3263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انکار کرو یا تمہیں آگ میں ڈال دیا جائے۔ علماء کا خیال ہے وہ حضرت دانیال اور آپ کے صحابہ تھے؛ یہ عطیہ عوفی کا قول ہے اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک بادشاہ نے شراب پی اور اپنی بہن سے اپنی خواہش پوری کی (1) اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنی رعیت میں اسے قانون بنا دے۔ رعایا نے اس کی بات قبول نہ کی اس کی بہن نے اسے مشورہ دیا کہ وہ لوگوں کو خطبہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے بہنوں کے ساتھ نکاح کو حلال کر دیا ہے پھر بھی اس کی بات نہ سنی گئی اس بہن نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ان لوگوں کے لیے خندقیں کھدوائے اور جو یہ بات ماننے سے انکار کرے اس کو ان خندقوں میں ڈال دیا جائے۔ اس بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ یہ بھی کہا: ان کے باقی ماندہ لوگ اپنی بہنوں سے عقد نکاح کرتے ہیں وہ مجوسی ہیں جبکہ پہلے یہ اہل کتاب تھے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ اصحاب اخدود کا سبب یہ تھا کہ ایک نبی کو اللہ تعالیٰ نے حبشہ کی طرف بھیجا کچھ لوگوں نے اس نبی کی اطاعت کی اس کی قوم نے ان لوگوں کے لیے خندقیں کھودیں جس نے اس نبی کی اتباع کی اسے خندق میں پھینک دیا گیا ایک عورت لائی گئی جس کا ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا وہ عورت گھبرائی اس بچے نے ماں سے کہا: اے ماں! آگے بڑھ اور نہ گھبرا۔

ابوب نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ تیری قوم سجستان کے لوگ تھے کلبی نے کہا: یہ نجران کے نصاریٰ تھے وہاں ان لوگوں نے مومنوں کو پکڑ لیا اور سات خندقیں کھودیں ہر خندق کی لمبائی چالیس ہاتھ تھی اور اس کی چوڑائی بارہ ہاتھ تھی پھر ان خندقوں میں مٹی کا تیل اور ایندھن پھینکا پھر لوگوں کو ان خندقوں پر کھڑا کیا جس نے بات نہ مانی اسے اس خندق میں پھینک دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نصاریٰ کی ایک قوم تھی یہ قسطنطین کے دور میں قسطنطنیہ میں رہتے تھے۔ مقاتل نے کہا: اصحاب اخدود تین گروہ ہو گزرے ہیں ایک نجران میں، دوسرے شام میں اور آخری فارس میں۔ جو شام میں تھا وہ انطیانوس رومی تھا جو فارس میں تھا وہ بخت نصر تھا جو عرب علاقہ میں تھا وہ یوسف بن ذی نواس تھا جو فارس اور شام میں تھا اس کے بارے میں قرآن نازل نہیں ہوا جس کے بارے میں قرآن نازل ہوا وہ نجران میں تھا اس کی وجہ یہ بنی کہ دو مسلمان آدمی تھے ان میں سے ایک تہامہ میں تھا اور دوسرا نجران میں تھا ان میں سے ایک نے اپنے آپ کو مزدوری پر لگایا وہ عمل کرتا اور انجیل پڑھتا مستاجر کی بیٹی نے انجیل کی قراءت میں ایک نور دیکھا اور اپنے باپ کو بتایا وہ مسلمان ہو گیا ان مسلمانوں کی تعداد ستاسی ہو گئی۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ہوا۔ یوسف بن ذی نواس بن تبع حمیری نے ان کے لیے خندقیں کھدوائیں انہیں کفر اختیار کرنے کو کہا جس نے کفر سے انکار کیا اسے آگ میں ڈال دیا اور کہا: جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین سے ارتداد نہ کیا اسے نہ پھینکا گیا ایک عورت تھی جس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا (2) جو ابھی گفتگو نہیں کرتا تھا وہ عورت واپس لوٹ آئی اس کے بیٹے نے اسے کہا: اے میری ماں! میں تیرے سامنے ایسی آگ دیکھتا ہوں جو کبھی سرد نہ ہوگی ان دونوں نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا اللہ تعالیٰ نے اس عورت اور اس کے بیٹے کو جنت میں

1۔ زاد المسیر، جلد 4، صفحہ 235 2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 551

داخل کر دیا اس ایک روز میں ستر آدمیوں کو خندقوں میں ڈالا گیا۔

ابن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے پیروکاروں میں سے ایک آدمی تھا جسے قیمیون کہا جاتا وہ ایک نیک، مجتہد، زاہد اور مستجاب الدعوات تھا وہ بستیوں میں گھومتا پھرتا رہتا تھا کسی بستی میں ابھی اس کی پہچان نہ ہوئی مگر وہ وہاں سے چلا جاتا وہ مستری تھا اور مٹی سے گھر بناتا۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا: اہل نجران مشرک تھے وہ بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے نجران کے قریب ان کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات میں ایک جادوگر رہتا تھا وہ نجران کے لوگوں کے بچوں کو جادو کی تعلیم دیتا جب وہ قیمیون فروکش ہوا اس نے نجران اور ساحر کے بستی کے درمیان اپنا خیمہ لگا لیا نجران کے لوگ اپنے بچے اس جادوگر کے پاس تعلیم کے لیے بھیجتے تھے ثامر نے عبداللہ بن ثامر کو اس جادوگر کے پاس بھیجا وہ نجران کے لوگوں کے بچوں کے ساتھ ہوتا تھا عبداللہ جب اس خیمہ والے کے پاس سے گزرتا تو اس کی نماز اور عبادت سے متعجب ہوتا وہ اس کے پاس بیٹھنے لگا اور اس کی بات سننے لگا یہاں تک کہ وہ اسلام لے آیا اس بچے نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا اور اس کی عبادت کی اور اس راہب سے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم پوچھنے لگا راہب اسے تعلیم دیتا مگر اسم اعظم کو اس سے مخفی رکھا اور کہا: اے بھتیجے! تو اس کو برداشت نہیں کر سکتا میں تیرے بارے میں ڈرتا ہوں کہ تو اس سے کمزور ہے۔ اس بچے کا باپ یہی گمان کرتا تھا کہ اس کا بیٹا جادوگر کے پاس جاتا ہے جس طرح دوسرے بچے جاتے ہیں جب عبداللہ نے یہ دیکھا کہ اس کا راہب اللہ تعالیٰ کا اسم بتانے میں بخیل ہے تو اس نے تیر اکٹھے کیے پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے جو بھی اسماء سیکھے تھے ان میں سے کوئی بھی نہ چھوڑا مگر ایک ایک تیر پر ایک ایک نام لکھا یہاں تک کہ جب سب کا شمار کر لیا تو اس کے لیے آگ روشن کی پھر اس آگ میں ایک ایک تیر پھینکنے لگا یہاں تک کہ جب اسم اعظم کا مرحلہ آیا اس آگ میں وہ تیر پھینکا وہ تیر اچھلا یہاں تک کہ وہ آگ سے نکل آیا اور اس تیر کو آگ نے کچھ نقصان نہیں پہنچایا تھا اس بچے نے اس تیر کو پکڑا اور اس راہب کے پاس گیا اسے بتایا کہ اس نے اسم اعظم کو جان لیا ہے جس کو راہب نے اس پر چھپایا تھا راہب نے پوچھا: وہ اسم کون سا ہے؟ بچے نے بتایا: یہ یہ۔ پوچھا: تو نے کیسے اسے جانا؟ تو بچے نے جو عمل کیا تھا اس کے بارے میں بتایا۔ راہب نے اسے کہا: اے بھتیجے! تو نے صحیح جانا ہے اسے اپنے تک محدود رکھنا میرا خیال نہیں کہ تو ایسا کرے گا۔ عبداللہ بن ثامر جب بھی نجران جاتا وہ کسی بھی آدمی کو دیکھتا جسے کوئی تکلیف ہوتی تو اسے کہتا: اے عبداللہ! کیا تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتا ہے میرے دین میں داخل ہوتا ہے تو میں تیرے حق میں دعا کروں گا تو تو جس بیماری میں مبتلا ہے اس سے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتا: ہاں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا اور اسلام قبول کر لیتا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تو اس بندے کو شفا ہو جاتی یہاں تک کہ نجران میں کوئی ایسا نہ رہا جس کو کوئی تکلیف ہوئی وہ اس بچے کے پاس آیا اس نے اس کے حق میں دعا کی تو اسے عافیت ہو گئی یہاں تک کہ اس کا معاملہ اس کے بادشاہ تک جا پہنچا بادشاہ نے اس بچے کو بلایا اس سے پوچھا: تو نے میری بستی کو میرے خلاف کر دیا ہے، تو نے میرے دین اور میرے آباء کے دین کی مخالفت کی ہے تو میں تجھے ضرور عبرت کی مثال بنا دوں گا۔ بچے نے کہا: تو اس پر قادر نہیں بادشاہ نے اسے اونچے پہاڑ کی طرف بھیجا اسے اس کی

چوٹی سے نیچے پھینکا جاتا وہ زمین پر گرتا جبکہ اسے کچھ تکلیف نہ ہوتی وہ اسے نجران کے پانیوں کی طرف بھیجتا اس میں کوئی چیز نہ پھینکی جاتی مگر وہ ہلاک ہو جاتی اسے ان میں پھینکا جاتا وہ باہر نکلتا جب کہ اسے کوئی ضرر نہ ہوتا جب بچہ اس پر غالب آ گیا تو عبداللہ نے بادشاہ سے کہا: اللہ کی قسم! تو میرے قتل پر قادر نہیں ہوگا یہاں تک کہ تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرے اور اس پر ایمان لائے جس پر میں ایمان لایا ہوں اگر تو نے ایسا کیا تو تجھے مجھ پر غلبہ حاصل ہو جائے گا اور تو مجھے قتل کر دے گا اس بادشاہ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا اور اس کی گواہی دی پھر ایک چھڑی بچے کو ماری جس نے بچے کو تھوڑا سا زخمی کیا جو بڑا نہ تھا اور اس بچے کو مار ڈالا اور بادشاہ بھی اسی جگہ مر گیا نجران کے لوگ عبداللہ بن ثامر کے دین اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو پیغام لائے تھے اس پر اکٹھے ہو گئے پھر انہیں بھی وہ آزمائش آئی جو ان کے ہم دین لوگوں کو آزمائش آئی تھی اسی وجہ سے نجران میں عیسائیت مضبوط ہوئی۔

ذونواس یہودی جو بنو حمیر سے اپنے لشکر لے کر ان کی طرف چلا انہیں یہودیت کی طرف دعوت دی اور انہیں یہودیت اور قتل کے درمیان اختیار دیا لوگوں نے قتل کو ترجیح دی۔ ذونواس نے ان کے لیے خندقیں کھدوائیں ان میں آگ جلائی اور تلوار کے ساتھ انہیں قتل کیا اور عبرت کا نشان بنایا یہاں تک کہ ان میں سے بیس ہزار افراد کو قتل کیا۔

وہب نے کہا: جب اریاط یمن پر غالب آیا تو ذونواس بھاگ کھڑا ہوا وہ اپنے گھوڑے کے ساتھ سمندر میں داخل ہو گیا اور اس میں غرق ہو گیا۔ ابن اسحاق نے کہا: ذونواس کا نام زرعہ بن تبان اسعد حمیری تھا اس کا نام یوسف بھی تھا اس کے بالوں کی مینڈھیاں تھیں جو لہراتی رہتیں اس وجہ سے اس کا نام ذونواس ہوا اس نے اہل نجران کے ساتھ یہ سلوک کیا ان میں سے ایک آدمی جس کا نام دوس بن ثعلبان تھا بچ نکلا حبشہ والے اس کا انتقام لینے کے لیے آئے وہ یمن کے مالک بن گئے اور ذونواس سمندر میں ہلاک ہوا جس میں اس نے اپنے آپ کو ڈالا تھا اس کے بارے میں عمرو بن معدیکرب کہتا ہے:

أَتُوعِدُنِی كَأَنَّكَ ذُو رُعَيْنٍ بِأَنْعَمِ عِيشَةٍ أَوْ ذُو نُوَاسِ

کیا تو مجھے دھمکی دیتا ہے گویا تو اچھی زندگی میں ذورعین ہے یا ذونواس ہے۔

ذورعین، حمیر کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا رعین اس کا ایک قلعہ تھا یہ بادشاہ حرث بن عمرو بن حمیر بن سبا کا بیٹا تھا۔

**مسئلہ:** ہمارے علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس امت کے مومنوں کو بتایا جو ان سے قبل موحدین نے مصائب برداشت کیے اس کے ساتھ مومنوں کو مانوس کرنا تھا نبی کریم ﷺ نے مومنوں کے سامنے بچے کا واقعہ ذکر کیا تا کہ انہیں جو دکھ اور مشکلات آتی ہیں ان پر صبر کریں اور اس بچے کی طرح صبر کریں جو اس نے صبر کیا، حق میں پختگی اپنائی، اس کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہا، دعوت حق کے اظہار میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا چھوٹی عمر ہونے کے باوجود بے شمار لوگوں کو دین میں داخل کیا اور عظیم صبر کا اظہار کیا۔ اسی طرح راہب نے حق کو مضبوطی سے پکڑے رکھا یہاں تک کہ اسے آری سے چیر دیا گیا اس کے باوجود اس نے صبر کیا اس طرح بے شمار لوگ جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لائے، ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو انہوں نے آگ میں پھینکے جانے پر صبر کیا اور وہ دین سے مرتد نہ ہوئے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے نزدیک یہ حکم منسوخ

ہے (1) جس طرح پہلے سورۃ النحل میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نزدیک یہ منسوخ نہیں بے شک وہ آدمی جس کا نفس قوی ہو اس کا دین مضبوط ہو اس کا صبر کرنا اولی ہے الله تعالیٰ نے حضرت لقمان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے کہا: یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ (لقمان) میرے پیارے بچے! نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو، نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: انّ من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر (2) سب سے بڑا جہاد ظالم حاکم کے سامنے حق کلمہ کہنا ہے۔ اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

محمد بن سنجر (ابن سنجر) نے حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ میں رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرایا کرتی تھی کہ ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: مجھے وصیت کیجئے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تشرك بالله شيأ وان قطعت أو حرقت بالنار (3) تو الله تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا اگرچہ تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا تجھے آگ میں جلا دیا جائے۔

ہمارے علماء نے کہا: بہت سے صحابہ کرام کو قتل، سولی، سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا انہوں نے صبر کیا اور وہ کسی چیز کی طرف متوجہ نہ ہوئے تیرے لیے حضرت عاصم، حضرت خبیب اور ان کے ساتھیوں کا قصہ کافی ہے اسی طرح انہوں نے جو جنگیں، امتحانات، قتل، قید، جلانا اور دوسری آزمائشیں دیکھیں سورۃ النحل میں یہ بات گزر چکی ہے جو آدمی قوت رکھتا ہے اس کے بارے میں اس پر اجماع ہے وہاں اس پر غور کر لے۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۝ ان کفار کے لیے الله تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی بددعا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ ان مومنین کے قتل کی خبر دی جا رہی ہے کہ وہ آگ کے ذریعے قتل کیے گئے پھر بھی انہوں نے صبر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ان ظالموں کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے کیونکہ یہ روایت کی گئی ہے کہ ان مومنوں کے آگ میں گرنے سے پہلے ان کی روحیں قبض کر لی گئیں تھیں اور خندقوں سے آگ نکلی تھی اور جو لوگ کناروں پر بیٹھے تھے انہیں جلا دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: مومن تو نجات پا گئے تھے اور آگ نے کناروں پر بیٹھے لوگوں کو جلا دیا تھا؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ عَلَیْهَا کا معنی عندها ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عَلَیْهَا سے مراد ہے اس آگ کے قریب جو خندقوں کے کنارے تھے وہ مراد ہے؛ جس طرح شاعر نے کہا:

وبات على النار الندى والمحلّق یہاں على النار سے مراد اس کے قریب ہے۔

1۔ احکام القرآن ابن العربی، جلد 4، صفحہ 1916

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر، جلد 2، صفحہ 40

سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر، حدیث نمبر 4000، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 24، صفحہ 479

اذ میں عامل قُتِلَ ہے یعنی اس وقت ان پر لعنت کی گئی۔

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۝ شُهُوْدٌ سے مراد حضور ہے یعنی کفار حاضر تھے۔ وہ مومنوں پر کفر کو پیش کرتے تھے جو ارتداد سے انکار کرتا اسے آگ میں پھینک دیتے تھے۔ یہ ان کے دل کی سختی اور اس میں انتہائی تنگ وہ دور کرنے کی صفت بیان کی جارہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: علی، مع کے معنی میں ہے یعنی مومنوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا تھا اس پر گواہ تھے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝

''اور انہیں ناپسند کیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لاتے تھے اللہ پر جو سب پر غالب، سب خوبیوں والا ہے جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے''۔

ابو حیوہ نے نَقِمُوْا پڑھا ہے یعنی قاف کے نیچے کسرہ ہے جبکہ فصیح فتحہ ہے سورۃ البراۃ میں اس بارے میں گفتگو ہو چکی ہے یعنی بادشاہ اور اس کے ساتھی ان لوگوں سے جن کو انہوں نے آگ میں جلایا تھا کسی بات پر ناراض نہ ہوتے تھے مگر یہ کہ ان لوگوں نے اللہ جو غالب اور ہر حال میں محمود ہے کی تصدیق کی۔ اس اللہ کا زمین و آسمان میں کوئی شریک اور مقابل نہیں وہ اپنی مخلوقات کے اعمال سے آگاہ ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ۝

''بے شک جن لوگوں نے ایذا دی مومن مردوں اور مومن عورتوں کو پھر توبہ بھی نہ کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں یہی بڑی کامیابی ہے''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جنہوں نے مومنوں کو آگ میں جلایا عرب کہتے ہیں: فتن فلان الدرھم والدینار جب اسے بھٹی میں داخل کیا تاکہ اس کی عمدگی کو جانے۔ اس طرح یہ لفظ کہا جاتا ہے: دینار مفتون درا ہم و دنانیر بنانے والے کو فتان کہتے ہیں اسی طرح شیطان کو فتان کہتے ہیں۔ ورق فتین ایسی چاندی جس میں کھوٹ جلا دیا گیا ہو۔ حرہ کو فتین کہتے ہیں گویا اس سرزمین نے آگ کے ساتھ پتھروں کو جلا دیا۔ یہ نام ان پتھروں کے سیاہ ہونے کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ۝ انہوں نے اپنے قبیح اعمال پر توبہ نہ کی جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس

بادشاہ اور اس کی قوم کے لیے اس بچے کے ہاتھ پر آیات اور بینات کو ظاہر فرمایا۔ ان کے لیے ان کے کفر پر جہنم کا عذاب ہے اور دنیا میں اس کے لیے جلانے کا عذاب ہے کیونکہ انہوں نے مومنوں کو آگ کے عذاب میں جلایا۔ اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل ہو چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے لیے آخرت میں عذاب ہے جو ان کے کفر کے عذاب سے زائد ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے مومنوں کو آگ میں جلایا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے ان کے لیے عذاب ہے اور ان کے لیے جہنم حریق کا عذاب ہے۔ حریق جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس طرح سعیر کیونکہ جہنم کے کئی گڑھے اور اس کی انواع ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ نام ہیں گویا جہنم میں انہیں زمہریر کے ساتھ عذاب دیا جائے گا پھر انہیں عذاب حریق کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ پہلا ٹھنڈک کا عذاب ہے اور دوسرا گرمی کا عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝ یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس کی تصدیق کی، اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں جن کا پانی بدبودار نہیں ہوتا ایسے دودھ کی نہریں رواں ہیں جن کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا، ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت کا باعث ہیں اور صاف و شفاف شہد کی نہریں ہیں۔ یہ ایسی کامیابی ہے جس کی مثل کامیابی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۝۱۳ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝۱۵ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۶

''بے شک آپ کے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ بے شک وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہی بہت بخشنے والا ہے بہت محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے بڑی شان والا، کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے''۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ جب وہ جابروں اور ظالموں کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝ (ہود) اور یوں ہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو دراں حالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں بے شک اس کی پکڑ دردناک اور سخت ہوتی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مبرد نے کہا: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ یہ جواب قسم ہے معنی یہ ہوگا قسم ہے برجوں والے آسمان کی تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے درمیان میں جو بھی کلام ہے وہ جملہ معترضہ ہے اور قسم کی تاکید کے لیے ذکر ہوا ہے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں یہی بات ذکر کی ہے۔ پکڑ کی شدت کے ساتھ جو صفت ذکر کی گئی ہے قسم اس کے بارے میں واقع ہو رہی ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ۝ اکثر علماء کی رائے ہے وہی مخلوقات کو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ انہیں اٹھائے گا۔ عکرمہ نے کہا: کفار نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔

حضرت ابن عباس نے کہا وہ دنیا میں انہیں آگ میں جلائے جانے کا عذاب دے گا پھر آخرت میں دوبارہ عذاب دے گا یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔

**وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ** ﴿۱۴﴾ وہ اپنے مومن بندوں کے گناہوں کو چھپانے والا ہے وہ انہیں ذلیل و رسوا نہیں کرے گا، وہ اپنے اولیاء سے محبت کرنے والا ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس بنیمنہ سے روایت نقل کی ہے: وہ اس طرح محبت کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے لیے خوشخبری اور محبت کو پسند کرتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ودود کا معنی ہے اپنے دوستوں سے مغفرت کے ساتھ دوستی کرتا ہے (1)۔ مجاہد نے کہا: اپنے دوستوں سے محبت کرنے والا یہ مفعول بمعنی فاعل ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے رحم فرمانے والا۔ مبرد نے اسماعیل بن اسحاق قاضی سے روایت نقل کی ہے کہ ودود اسے کہتے ہیں جس کی اولاد نہ (2) ہو۔

اور شاعر کا یہ شعر پڑھا:

وأركبُ في الروع عُرْيانةً ذلولَ الجناح لَقاحا و ودُودَا (3)

میں جنگ میں ایسے گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں جس کے بال نہیں وہ مطیع ہے اس کی اولاد نہیں۔

ودود کا معنی ہے جس کی اولاد نہ ہو کہ جس کی طرف وہ مشتاق ہو۔ آیت کا معنی یہ ہوگا وہ اپنے بندوں کی بخشش کرتا ہے اس کی کوئی اولاد نہیں کہ اس بچے کی وجہ سے انہیں بخشے یہ اس لیے ہے تاکہ وہ مغفرت کے ساتھ فضل و احسان فرمانے والا ہو اس میں کسی جز کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں ودود، مودود کے معنی میں ہے جس طرح رکوب اور حلوب ہے یعنی اسے اس کے صالح بندے محبت کرتے ہیں۔

**ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ** ﴿۱۵﴾ عاصم کے علاوہ کوفہ کے قراء نے اسے ذی پڑھا ہے کیونکہ یہ عرش کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لربک کی صفت ہے معنی یہ ہوگا تیرے باعظمت رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ یہاں موصوف صفت میں جدائی صفت بننے میں مانع نہیں کیونکہ تشدید میں یہ صفت کے قائم مقام ہے۔ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ ذو کی صفت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے؛ یہ ابو عبید اور ابو حاتم کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ مجد سے مراد کرم اور فضل میں انتہا کو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس صفت کے ساتھ موصوف ہے۔

اگرچہ سورۃ المومنون کے آخر میں عرش کی صفت بھی کرم کے ساتھ لگائی گئی ہے عرب کہتے ہیں: فی کل شجرنار و استمجد المرخُ العفار ہر درخت میں آگ ہے مرخ (درخت) عفار (ایک درخت) ان میں سے بڑھ کر ہیں۔ یہاں تک کہ ان دونوں سے آگ روشن کی جاتی ہے۔ **ذُو الْعَرْشِ** کا معنی ہے ملک اور مملکت والا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان علی سریر ملکہ فلاں اپنے ملک کے تخت پر ہے اگرچہ وہ تخت پر نہ بیٹھا ہو۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ثُل عرشہ یعنی اس کی حکومت چلی گئی۔ اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے خصوصاً کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں وضاحت گزر چکی ہے۔

**فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ** ﴿۱۶﴾ وہ چیز جس کا ارادہ کرے وہ اس پر ممتنع نہیں؛ یہ زمخشری کا نقطہ نظر ہے (4) یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یہاں **فَعَّالٌ** کا لفظ ذکر کیا ہے کیونکہ جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اور افعال کرتا ہے وہ کثیر ہوتے ہیں۔ فراء نے کہا: **فَعَّالٌ** کو تکرار اور

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 553 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 243 3۔ ایضاً 4۔ الکشاف، جلد 4، صفحہ 733

استیناف کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے کیونکہ یہ نکرہ محضہ ہے۔ طبری نے کہا: فَعَّالٌ کو رفع دیا گیا ہے جبکہ وہ نکرہ محضہ ہے کیونکہ یہ اعراب میں الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ کے اعراب کے تابع ہے۔ ابو سفر (سعید ہمدانی) سے مروی ہے کہا: کچھ صحابہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے انہوں نے کہا: کیا ہم آپ کے لیے طبیب کو نہ بلائیں؟ فرمایا: اس نے مجھے دیکھا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: اس نے آپ کو کیا کہا ہے؟ جواب دیا: اس نے فرمایا میں جس کا ارادہ کرلوں اس کو کر گزرنے والا ہوں۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ ﴿۱۹﴾

''کیا پہنچی ہے آپ کے پاس لشکروں کی خبر (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی بلکہ یہ کفار کو جھٹلانے میں مصروف ہیں''۔

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کافر جماعتوں کی خبر پہنچی ہے جنہوں نے انبیاء کو جھٹلایا اس کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانوس کیا جارہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے پھر ان جماعتوں کی وضاحت کی اور فرمایا: فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ۔ یہ دونوں الْجُنُوْدِ سے بدل ہیں معنی اس کا یہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہچان لیا ہے جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا بلکہ یہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے ہیں جس طرح پہلے لوگوں کا طریقہ تھا۔ فرعون اور ثمود کو خاص کیا گیا کیونکہ قوم ثمود عرب علاقوں میں سے تھی اور ان کا قصہ مشہور و معروف تھا اگرچہ یہ لوگ متقدمین میں شمار ہوتے تھے۔ فرعون کا معاملہ اہل کتاب اور دوسرے لوگوں کے ہاں بھی معروف تھا وہ ہلاک ہونے والوں میں سے متاخرین تھے ان دونوں کے ذریعے ہلاکت میں ان کی مثل پر دلالت کی۔

وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِیْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

'' حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے بلکہ وہ شرف والا قرآن ہے ایسی لوح میں لکھا ہے جو محفوظ ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ان پر ایسا عذاب نازل فرمائے جو اس نے فرعون پر نازل کیا تھا۔ محاط بہ محصور کی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں آگاہ ہے اس لیے وہ ان کو جزا عطا فرمائے گا بلکہ قرآن حکیم شرف، کرم اور برکت میں انتہا کو پہنچنے والا ہے لوگوں کو دین و دنیا کے احکام میں جو اس کی احتیاج ہے اس کا بیان ہے یہ اس طرح نہیں جس طرح مشرکین کا گمان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مَّجِیْدٌ کا معنی ہے وہ غیر مخلوق ہے وہ لوح میں لکھا ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس چیز سے محفوظ ہے کہ شیاطین اس تک پہنچ سکیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ ام الکتاب ہے اس سے قرآن اور دوسری کتب لکھی گئی ہیں (1)۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ لوح سرخ یاقوت کی ہے اس کا اوپر والا حصہ عرش سے باندھا گیا ہے اور اس کا نیچے والا حصہ فرشتے کی گود میں ہے جسے ماطریون کہتے ہیں اس کی کتاب نور ہے اس کا قلم نور ہے اللہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 554

تعالیٰ اس میں ہر روز تین سو ساٹھ دفعہ دیکھتا ہے اس کی نظروں میں سے کوئی نظر نہیں ہوتی مگر وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

حضرت انس بن مالک اور مجاہد نے کہا: لوح محفوظ جس کا ذکر الله تعالیٰ نے کیا ہے وہ حضرت اسرافیل کی پیشانی میں ہے(1)۔ مقاتل نے کہا: لوح محفوظ عرش کی دائیں جانب ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لوح محفوظ وہ ہے جس میں خلق و خلیقہ کی مختلف اصناف ہیں، ان کے احوال کا بیان ہے، ان کی مدتوں، رزقوں اور اعمال کا ذکر ہے جو ان میں فیصلے نافذ ہوتے ہیں اور ان کے امور کے انجام کا ذکر ہے وہ ام الکتاب ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الله تعالیٰ نے لوح محفوظ میں سب سے پہلے جو چیز لکھی وہ یہ تھی اِنِّی اَنَا اللّٰہ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اَنَا محمد رسولی۔

جس نے میرے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کیا، میری آزمائش پر صبر کیا میری نعمتوں پر شکر ادا کیا میں اسے صدیق لکھ دوں گا، اسے صدیقین کے ساتھ اٹھاؤں گا۔ جس نے میرے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، میری آزمائش پر صبر نہ کیا میری نعمتوں پر شکر ادا نہ کیا تو وہ میرے سوا کوئی معبود بنالے۔ حجاج نے حضرت محمد بن حنفیہ کی طرف دھمکی آمیز خط لکھا حضرت ابن حنفیہ نے اسے جواب دیا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ الله تعالیٰ کی ہر روز تین سو ساٹھ نظریں لوح محفوظ میں ہوتی ہیں وہ عزت دیتا ہے، وہ ذلیل کرتا ہے، وہ آزماتا ہے، وہ خوش کرتا ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے شاید ان میں سے ایک نظر نے تجھے تیرے بارے میں مشغول کر دیا ہے تو اس کے ساتھ مشغول رہتا ہے اور فارغ نہیں ہوتا۔

ایک مفسر نے کہا: لوح ایک ایسی چیز ہے جو فرشتوں کے لیے ظاہر ہوتی ہے وہ اسے پڑھتے ہیں(3)۔ ابن محیصن اور ابو حیوہ نے اسے قُرْاٰنُ مَّجِیْدٍ اضافت کی صورت میں پڑھا ہے یعنی قرآن رب مجید نافع نے اسے محفوظٌ پڑھا ہے کہ یہ قرآن کی صفت ہے بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح میں محفوظ ہے جبکہ باقی قراء نے اسے لوح کی صفت بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے قراء اس بات پر متفق ہیں کہ لوح کا لام مفتوح ہے مگر جو یحییٰ بن یعمر سے ایک روایت مروی ہے اس میں لوح کے لام پر ضمہ ہے یعنی وہ چمکتا ہے وہ نور، بلندی اور شرف والا ہے۔ زمخشری نے کہا: لوح سے مراد ہوا ہے یعنی وہ ہوا جو ساتوں آسمان سے اوپر ہے(4) جس میں لوح ہے صحاح میں ہے: لَاحَ الشئی یَلُوْحُ لَوْحًا یعنی وہ چیز چمکی۔ لاحہ السفر اسے تبدیل کر دیا۔ لَوْحًا وَلُوَاحًا وہ پیاسا ہوا۔ الالتاح کا معنی بھی یہی ہے۔ لوح کا معنی کندھا اور ہر چوڑی ہڈی کو کہتے ہیں لوح سے مراد وہ چیز ہے جس میں لکھا جاتا ہے لوح جب ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ ہوا ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہوتی ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 463
2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 554
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 244
4۔ الکشاف، جلد 4، صفحہ 733

# سورۃ الطارق

آیاتہا ۱۷ ۸۶ سورۃ الطارق مکیۃ ۳۶ رکوعہا ۱

یہ سورت مکی ہے۔ اس کی ستائیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾

''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور آپ کو کیا معلوم یہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ایک تارا نہایت تاباں''۔

یہاں دو قسمیں ہیں السَّمَآءِ ایک قسم ہے اور الطَّارِقِ دوسری قسم ہے الطَّارِقِ سے مراد ستارہ ہے اللہ تعالیٰ نے وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ میں اس کی وضاحت کی۔ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ زحل ستارہ ہے یہ ایسا ستارہ ہے جو ساتویں آسمان میں ہوتا ہے(1) اس کا ذکر محمد بن حسن (2) نے اپنی تفسیر میں کیا ہے اور اس کے بارے میں کئی روایات ذکر کیں اللہ تعالیٰ ہی اس کی صحت کے بارے میں زیادہ آگاہ ہے۔

ابن زید نے کہا: اس سے مراد ثریا ہے ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد زحل ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد جدی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت علی شیر خدا اور فراء سے مروی ہے کہ نجم ثاقب سے مراد ساتویں آسمان میں ایک ستارہ ہے اس ساتویں آسمان میں اس ستارے کے سوا کوئی ستارہ نہیں جب ستارے آسمان میں اپنی اپنی جگہ لے لیتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ نیچے آتا ہے اور ان کے ساتھ ہوتا ہے پھر ساتویں آسمان کی طرف لوٹ جاتا ہے یہ زحل ستارہ ہے یہ نیچے آتا ہے تو طارق ہوتا ہے جب اوپر جاتا ہے تب زحل ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: ثقب الطائر جب پرندہ بلند ہو۔ ابو طالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو ایک ستارہ نیچے آیا اس نے زمین کو نور سے بھر دیا ابو طالب گھبرا گئے تو یہ آیت نازل ہوئی وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی روایت کی ہے: قسم ہے آسمان کی اور اس کی جو اس میں داخل ہے۔ حضرت ابن عباس اور عطا سے یہ مروی ہے: الثَّاقِبُ سے مراد وہ ستارہ ہے جو شیاطین کو مارا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ تمام ستاروں میں عام ہے کیونکہ اس کا طلوع رات کے وقت ہوتا ہے اور جو تیرے پاس رات کے وقت آئے وہ طارق ہے۔ شاعر نے کہا:

أَلم ترياني كلما جئت طارقا وجدت بها طيبا وإن لم تَطَيَّبِ

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 246 2۔ شاید اس سے مراد ابو بکر عطار د ہے جن کا نام محمد بن حسین بن مقسم ہے۔

کیا تم دونوں نے مجھے نہیں دیکھا میں جب بھی رات کے وقت اس کے پاس آیا تو اس کے ہاں خوشبو پائی اگرچہ اس نے خوشبو نہیں لگائی تھی۔

طارق سے مراد ستارہ ہے۔ یہ اسم جنس ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ رات کے وقت ظاہر ہوتا ہے اس معنی میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے منع کیا کہ مسافر رات کے وقت گھر آئے تا کہ عورت اپنے بال صاف کر لے اور بالوں میں کنگھی کر لے۔ عرب ہر ایسے قاصد کو طارق کہتے ہیں جو رات کے وقت آتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: طارق فلان یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ رات کے وقت آئے۔ اس کا باب یوں چلتا ہے طَرق یَطرُقُ طُرُوقا فھو طارِقٌ۔

ابن رومی نے کہا:

یا راقدَ اللیل مسرورا بأوّلِه إنّ الحوادث قد یطرُقن أسحارا

اے رات کے وقت سونے والے اس کے پہلے حصہ پر خوش ہونے والے بے شک حوادثات بعض اوقات سحری کے وقت آجاتے ہیں۔

لا تفرحَنّ بلیل طاب أوّله فرب آخرِ لیلٍ أجّج النارا

اس رات پر خوش نہ ہو جس کا پہلا حصہ اچھا ہو بعض راتوں کے آخر آگ کو بھڑکا دیتے ہیں۔

صحاح میں طارق سے مراد ایسا ستارہ ہے جسے صبح کا ستارہ کہتے ہیں؛ اسی معنی میں ہند کا شعر ہے:

نحنُ بناتِ طارقٍ نمشی علی النمارقِ

ہم اس کی بیٹیاں ہیں جو شرف میں ستارے کی مانند ہے اور ہم عمدہ قالینوں پر چلتی ہیں۔

ماوردی نے کہا: طرق کا اصل معنی کھٹکھٹانا ہے(1) اس معنی میں مطرقہ ہے۔ رات کے وقت آنے والے کو طارق کہتے ہیں کیونکہ جب وہ پہنچتا ہے تو اسے کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ تو کبھی دن کے وقت بھی ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: أتیتک الیوم طَرقتین میں تیرے پاس آج دو دفعہ آیا۔ اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أعوذ بك من شرِّ طوارقِ اللیل والنهار إلّا طارقا یطرق بخیر یا رحمٰن (2) میں رات اور دن کے وقت آنے والوں کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں مگر ایسے آنے والے سے جو بھلائی لائے اے رحمٰن۔ جریر نے طروق کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

طَرَقتُكَ صائدةُ القلوب ولیس ذا حین الزیارة فارجعی بسلامِ

دلوں کو شکار کرنے والی تیرے پاس آئی جبکہ وہ زیارت کے وقت نہیں تھا پس تو سلامتی کے ساتھ لوٹ جا۔

ثاقب سے مراد روشن ہے(3)۔ اس معنی میں شہاب ثاقب ہے۔ باب یوں چلایا جاتا ہے ثَقُبَ یَثقُبُ ثُقُوبا وثَقابةً۔ جب وہ روشن ہو ثقوبہ اس کی روشنی۔ عرب کہتے ہیں: أَثقِب نارك اپنی آگ روشن کرے۔ شاعر نے کہا:

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 245 2۔ موطا امام مالک، کتاب الشعر، باب ما یؤمر به من التعوذ عند النوم وغیرہ، صفحہ 722

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 246

أذاعَ به في النّاسِ حتیٰ كأنّه بعلياءَ نارٌ أوقدتْ بثقُوبِ

وہ اس کے ذریعے لوگوں میں مشہور ہو گیا یہاں تک کہ گویا وہ بلند جگہ پر آگ ہے جسے لکڑیوں کے ساتھ روشن کیا گیا ہے۔

ثقوب سے مراد وہ باریک لکڑیاں ہیں جن کے ساتھ آگ روشن کی جاتی ہے۔ مجاہد نے کہا: ثاقب سے مراد روشن ہے۔ قشیری نے کہا: عمومی رائے یہ ہے کہ طارق اور ثاقب اسم جنس ہے اس سے عمومی معنی مراد لیا جاتا ہے جس طرح ہم نے مجاہد سے ذکر کیا ہے۔

وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝ مقسم بہ کی عظمت شان کو بیان کرنے کے لیے اسے ذکر کیا گیا ہے۔ سفیان نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ کے الفاظ ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اس بارے میں آگاہ کر دیا اور جہاں بھی ومایدریك فرمایا اس کے بارے میں آگاہ نہیں کیا۔

اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ۝

''کوئی شخص ایسا نہیں جس پر کوئی محافظ نہ ہو''۔

قتادہ نے کہا حَافِظٌ سے مراد حفظہ ہیں جو تیرے رزق، تیرے عمل اور تیری اجل کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد اس کا قرین ہے (1) جو اس کے اچھے برے عمل کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ جواب قسم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جواب اِنَّهٗ عَلٰی رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ہے۔ امام ترمذی کے قول کے مطابق: یہاں قائل محمد بن علی ہے۔ ان مثقلہ سے مخففہ ہے اور ما تاکید یہ ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اِن کلّ نفسٍ لَعَلَيۡهَا حَافِظ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی یہ ہے کوئی نفس نہیں مگر اس پر ایک نگہبان ہے جو آفات سے اسے محفوظ رکھتا ہے یہاں تک کہ اس کے حق میں جو مقدر ہوتا ہے اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے محافظ ہے وہ اس نفس کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ اس نفس کو مقادیر کے سپرد کر دیتا ہے؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ ابو امامہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وُكِّل بالمؤمن مائة وستون ملكا يُذَبُّون عنه مالم يقدر عليه۔ من ذلك البصر، سبعة أملاك يُذُبون عنه كما يذب عن قصعة العسل الذباب۔ ولووُكل العبد إلى نفسه طرفة عين لا ختطفته الشياطين ہر مومن کے لیے ایک سو ساٹھ فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو اس سے ان چیزوں کو دور کرتے رہتے ہیں جو ان کے حق میں مقدر نہیں ہوتیں۔ لمحہ بھر میں سات فرشتے اس کا دفاع کر رہے ہوتے ہیں جس طرح شہد کے پیالے سے مکھیوں کو دور کیا جاتا ہے اگر انسان کو پلک جھپکنے کے عرصہ میں اس کے سپرد کر دیا جائے تو شیاطین اس کو اچک لیں۔

ابن عامر، عاصم اور حمزہ کی قراءت میں لما ہے یعنی کوئی نفس نہیں مگر اس پر ایک نگہبان ہے۔ یہ ہذیل کی لغت ہے ان کا قائل کہتا ہے: نَشَدتُك لما قمتُ میں نے تجھے بلایا جب میں کھڑا ہوا۔ باقی قراء نے اسے لما پڑھا ہے کہ یہ زائدہ ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 246

اللهِ (رعد: 11) انسان کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حَافِظٌ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اگر نفس کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میسر نہ ہوتی تو وہ باقی نہ رہتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: حَافِظٌ اس کا عقل ہے جو اسے اس کی مصلحتوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اسے تکلیف دہ امور سے روکتا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: عقل اور دوسری چیزیں وسائل ہیں حقیقت میں حافظ اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا (یوسف: 64) اللہ تعالیٰ بہتر نگہبان ہے اور فرمایا: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ (الانبیاء: 42) آپ پوچھیے: (اے منکرو!) کون ہے جو نگہبانی کر سکتا ہے تمہاری رات بھر اور دن بھر خدائے رحمٰن سے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝

''سو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے پیدا کیا گیا ہے اچھلتے پانی سے، جو (مرد و زن کی) پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ بے شک وہ اس کو پھر واپس لانے پر قادر ہے''۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ انسان سے مراد ابن آدم ہے اس کا ماقبل سے اتصال یہ ہے کہ انسان کو اپنے امر کی ابتدا کی طرف دیکھنے کا خصوصی حکم ہے یہاں تک کہ اسے علم ہو جائے جس ذات نے اسے پہلی دفعہ پیدا کیا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے اور اس کو بدلہ دینے پر قادر ہے پس وہ اعادہ اور جزاء کے دن کے لیے عمل کرے اور وہ اپنے محافظ پر کوئی ایسی چیز املاء نہ کرائے مگر جو اسے انجام کار خوش کرے۔ مِمَّ خُلِقَ یہ استفہام ہے معنی ہے اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا پھر فرمایا: خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ اس سے مراد مادہ منویہ ہے۔ دفق کا معنی پانی بہانا ہے۔ دفقتُ الماءَ أدْفُقُه دَفْقًا میں نے اسے بہایا تو وہ بہایا گیا ہو گیا۔ جس طرح سِرٌّ کاتم کا معنی ہے سِرٌّ مکتوم چھپایا گیا راز، کیونکہ یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: دُفِقَ الماءُ فعل مجہول ہے اور الماء اس کا نائب الفاعل ہے یہ نہیں کہتے: دَفَقَ الماء یہ جملہ بولتے ہیں: دفق الله روحه جب اس کے لیے موت کی دعا کی جائے۔ فراء اور اخفش نے کہا: مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ سے مراد ہے ایسا پانی جو رحم میں ٹپکایا گیا۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے من ماء ذی اندفاق جس طرح یہ کہا جاتا ہے: دارع، فارس اور نابل۔ یہ ذو فرس، ذو درع اور ذو نبل کے معنی میں ہے؛ یہ سیبویہ کا نقطہ نظر ہے یعنی اسم فاعل کا وزن نسبت کے معنی میں ہے۔ الدافق سے مراد وہ پانی ہے جو قوت کی شدت کے ساتھ ٹپکے۔ اس سے مراد وہ پانی ہے جو مرد اور عورت کے پانی کا آمیزہ ہو، کیونکہ انسان ان دونوں پانیوں سے پیدا ہوتا ہے لیکن ان کے باہم ملنے کی وجہ سے ایک پانی بنا دیا گیا ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے چکناہٹ والا۔

يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۝ يَّخْرُجُ کی ھو ضمیر سے مراد پانی ہے۔ صلب سے مراد پشت ہے اس میں چار لغتیں ہیں صُلْب، صُلُب، صَلَب اور صَالِب۔ پہلی دو کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ اس معنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 246

قول ہے: تُنْقَلُ مِنْ صَالِبٍ اِلٰى رَحِمٍ تجھے پشت سے رحم کی طرف نقل کیا جاتا رہا۔

ترائب سے مراد سینہ ہے اس کا واحد تریبہ ہے یہ سینے کی وہ جگہ ہے جہاں ہار ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

مهفهفة بيضاء غيرُ مُفاضةٍ ترائبُها مصقولةٌ كالسَّجَنْجَلِ

وہ تھوڑے گوشت والی سفید رنگت والی، ڈھیلے پیٹ والی نہیں اس کے سینے کی ہڈیاں یوں صیقل شدہ ہیں جیسے سونے کا پانی۔

صلب مرد کی اور ترائب عورت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ترائب سے مراد ہار لٹکانے کی جگہ ہے(1)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد پستانوں کے درمیان کی جگہ ہے۔ عکرمہ نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ ترائب المرأۃ سے مراد دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور دونوں آنکھیں ہیں (2)؛ ضحاک نے بھی یہ کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد گردن ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد کندھوں اور سینے کے درمیان کی جگہ ہے(3)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد سینہ ہے(4)۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ہنسلی کی ہڈیاں۔ ابن جبیر نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ترائب سے مراد اس جانب کی چار پسلیاں ہیں۔ زجاج نے کہا: ترائب سے مراد سینے کی دائیں جانب کی چار پسلیاں ہیں اور چار پسلیاں بائیں جانب کی ہیں (5)۔ معمر بن ابی حبیبہ مدنی نے کہا: ترائب سے مراد دل کا نچوڑ ہے اس سے بچہ ہوتا ہے(6) کلام عرب میں مشہور یہ ہے کہ اس سے مراد سینے اور نحر کی ہڈیاں ہیں؛ درید بن صمہ نے کہا:

فإن تدبروا نأخذكم في ظهوركم وإن تقبلوا نأخذكم في الترائب(7)

اگر تم پیٹھ پھیرو تو ہم تمہاری پشتوں پر وار کریں گے اور اگر تم سامنا کرو تو ہم تمہارے سینوں کی ہڈیوں پر وار کریں گے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

والزعفرانُ على ترائبِها شرِق به اللبات والنحرُ(8)

زعفران اس کے سینے کی ہڈیوں پر ہے جس سے قلادہ اور نحر کی جگہ بھری ہوئی ہے۔

عکرمہ نے کہا: ترائب سے مراد سینہ ہے، پھر یہ شعر پڑھا:

نظامُ درٍ على ترائبها

موتیوں کا ہار اس کے سینے پر ہے۔

ذو رمہ نے کہا:

ضَرَجْن البرود عن ترائب حُرّة

ضرجن کا معنی ہے انہوں نے پھاڑا۔ اس میں ضرحن بھی مروی ہے یعنی انہوں نے پھینکا۔ صحاح میں ہے: تریبہ، ترائب کا واحد ہے یہ سینے کی ہڈیاں ہیں جو ہنسلی اور شندوہ کے درمیان ہوتی ہیں۔

جوہری کے علاوہ دوسرے علماء سے یہ مروی ہے کہ شندوہ مرد کا وہی عضو ہے جو عورت کا پستان ہوتا ہے۔ اصمعی نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 247 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

شند وہ یہ پستان کے گاڑھنے کی جگہ ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اس سے مراد وہ گوشت ہے جو پستان کے ارد گرد ہوتا ہے۔

تفسیر میں ہے: مرد کے پانی سے پیدا ہوتا ہے جو اس کی پشت یعنی ہڈی اور پٹھے سے نکلتا ہے اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے جو اس کے سینے کی ہڈیوں یعنی گوشت اور خون سے نکلتا ہے؛ یہ اعمش کا قول ہے سورۂ آل عمران میں ایک مرفوع حدیث گزر چکی ہے اور سورۃ الحجرات آیت 13 میں اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مرد کا پانی دماغ سے نازل ہوتا ہے پھر خصیتین میں جمع ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: مِنۢ بَیْنِ الصُّلْبِ کے معارض نہیں؛ کیونکہ اگر یہ دماغ سے اترتا ہے تو ریڑھ کی ہڈی اور سینے سے گزر کر ہی آتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے یہ مرد کی ریڑھ کی ہڈی اور عورت کے سینے کی ہڈیوں میں سے نکلتا ہے۔ فراء نے کہا: اس کی مثل عربوں سے منقول ہے اس وجہ سے مِنۢ بَیْنِ الصُّلْبِ کا معنی یہ ہوگا ریڑھ کی ہڈی سے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ مرد کی ریڑھ کی ہڈی اور مرد کے سینے کی ہڈیوں سے عورت کی ریڑھ کی ہڈی اور اس کے سینے کی ہڈیوں سے نکلتا ہے۔ پھر ہم جانتے ہیں کہ نطفہ بدن کے تمام اجزاء سے جنم لیتا ہے اس وجہ سے بچہ اکثر اپنے والدین کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہی حکمت ہے کہ مادہ منویہ کے نکلنے کی صورت میں تمام بدن کو دھویا جاتا ہے اور جو زیادہ جماع کرتا ہے اس کی پشت اور ریڑھ کی ہڈی میں درد ہوتا ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی پشت اس پانی سے خالی ہوتی ہے جس کو وہ پہلے روکے ہوئے تھی۔ اسماعیل نے اہل مکہ سے الصُّلُبِ کو لام کے ضمہ کے ساتھ نقل کیا ہے؛ عیسیٰ ثقفی سے بھی یہی مروی ہے۔ مہدوی نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ جس نے یہ کہا کہ منی مرد کی پیٹھ اور اس کی سینے کی ہڈیوں سے نکلتی ہے تو اس صورت میں یَخْرُجُ کی ضمیر پانی کے لیے ہوگی۔ جس نے یہ کہا کہ مرد کی ریڑھ کی ہڈی اور عورت کے سینے کی ہڈیوں سے نکلتا ہے تو اس صورت میں ضمیر انسان کے لیے ہوگی۔ اسے الصلب بھی پڑھا گیا ہے۔ اس میں چار لغتیں ہیں۔ صُلْب، صُلُب، صَلَب اور صَالِب۔ عجاج نے کہا: فی صَلَبٍ مثلِ العِنانِ المؤدَمِ۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہے:

تُنْقَلُ من صَالِبٍ اِلٰی رَحِمٍ

تجھے ریڑھ کی ہڈی سے رحم کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ اشعار مشہور و معروف ہیں۔

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ مجاہد اور ضحاک نے اس طرح کہا ہے۔ ان دونوں سے یہ بھی مروی ہے: اس کا معنی ہے وہ پانی کو ریڑھ کی ہڈی میں لوٹانے پر قادر ہے؛ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ ضحاک سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو پانی کی طرف لوٹانے پر قادر ہے جس طرح وہ پہلے تھا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی ہے وہ انسان کو بڑھاپے سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی طرف لوٹانے پر قادر ہے(1)۔ مہدوی سے اسی طرح مروی ہے۔ ماوردی اور ثعلبی نے کہا: بچپنے کی طرف اور بچپنے سے نطفہ کی طرف لوٹانے پر قادر ہے(2)۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، حسن بصری اور عکرمہ نے یہ بھی کہا: وہ انسان کو موت کے بعد لوٹانے پر قادر ہے(3)؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ قول سب سے قوی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 247　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآىِٕرُ ﴿۹﴾ (الطارق) جس روز راز افشاں کر دیئے جائیں گے۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ آخرت میں دوبارہ اٹھانے کے بعد وہ دنیا کی طرف لوٹانے پر قادر ہے کیونکہ کفار آخرت میں اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ انہیں دنیا میں بھیجے۔

## یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآىِٕرُ ﴿۹﴾

''یاد کرو اس دن کو جب راز افشا کر دیئے جائیں گے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

### لغوی تشریح

**مسئلہ نمبر 1**۔ یوم میں عامل کون ہے؟ جس نے یہ معنی کیا ہے وہ انسان کو دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے ان کے نزدیک اس کا عامل لَقَادِرٌ ہے رَجْعِهٖ کا لفظ اس میں عامل نہیں کیونکہ صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر حائل ہے۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ میں جو دوسرے اقوال میں ان کے نزدیک یَوْمَ میں عامل فعل مضمر ہے لَقَادِرٌ اس میں عامل نہیں کیونکہ یوم سے مراد دنیا میں ہے۔

تُبْلَى کا معنی ہے امتحان اور آزمائش لی جائے گی؛ ابوالغول طہوی نے کہا:

ولا تَبْلَى بَسالَتُهُمْ وانْ هُمْ صَلُوا بالْحَرْبِ حِيْنًا بعدَ حِيْنِ

ان کی شجاعت نہ پہچانی گئی اگرچہ وہ جنگ میں لحہ بہ لحہ داخل ہوئے۔

اسے تَبلَى بسالتهم روایت کیا گیا ہے جس نے اسے تُبلى روایت کیا ہے اس نے اس کا معنی امتحان لینا کیا ہے اس روایت کی صورت میں اس کا معنی کراہت ہوگا۔ گویا یہ کہا: اس میں ان کی ناپسندیدگی نہ پہچانی گئی۔ اور تُبلى تُعرف کے معنی میں ہے؛ راجز نے کہا:

قد كنتَ قبلَ اليوم تَزْدَرِيني فاليومَ أبلُوكَ وتَبْتَلِيني

تو آج سے قبل میری ہتک کیا کرتا تھا آج میں تجھے پہچانوں گا اور تو مجھے پہچانے گا۔

جس نے اسے تَبلى روایت کیا ہے معنی یہ ہوگا وہ جنگ سے کمزور نہیں پڑتے اگرچہ ان پر جنگ کئی بار واقع ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سخت مشکلات انسان پر بار بار واقع ہوں تو اسے کمزور کر دیتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کے مخفی اسرار عیاں اور ظاہر کر دیئے جائیں گے۔ اس سے مراد ہر وہ اچھائی یا برائی ہے(1) جسے انسان پوشیدہ رکھتا ہے اور ایمان و کفر میں سے جسے پوشیدہ رکھتا ہے اسے ظاہر کر دیا جائے گا، جس طرح احوص نے کہا:

سَيَبْقَى لها لى مُضْمَرَ القلب والحَشَا سريرةُ وُدٍّ يوم تُبْلَى السَّرائِرُ(2)

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 248

2۔ ایضاً

اس کے لیے دل اور پیٹ میں اس وقت تک مخفی محبت رہے گی جس روز راز عیاں کر دیئے جائیں گے۔

## سرائر سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 2۔** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ائتمن الله تعالى خلقه على أربع: على الصلاة والصوم والزكاة والغسل وهي السرائر التي يختبر الله عزوجل يوم القيمة۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (انسانوں) کو چار چیزوں پر امین بنایا ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور غسل یہی وہ راز ہے جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز افشا کرے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثلاث من حافظ عليها فهو ولي الله حقا ومن اختانهن فهو عدو الله حقا: الصلاة والصوم والغسل من الجنابة تین چیزیں ایسی ہیں جس نے ان پر دوام اختیار کیا تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اور جس نے ان تینوں چیزوں میں خیانت کی وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے نماز، روزہ اور جنابت کا غسل؛ ثعلبی نے یہ ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''امانتیں تین ہیں نماز، روزہ اور جنابت (1)۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نماز پر امین بنایا ہے اگر چاہے تو کہے میں نے نماز پڑھی ہے جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو روزے پر امین بنایا ہے اگر چاہے تو کہے میں نے روزہ رکھا ہے جب کہ اس نے روزہ نہ رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جنابت پر امین بنایا ہے اگر چاہے تو کہے میں نے غسل کر لیا ہے جبکہ اس نے غسل نہ کیا ہو چاہو تو یہ آیت پڑھو یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۞ یہ ثعلبی نے عطا سے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے اشہب سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے ان سے اللہ تعالیٰ کے فرمان یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۞ کے بارے میں پوچھا اور کہا: کیا آپ کو یہ بات پہنچی ہے کہ وضو بھی رازوں میں سے ایک راز ہے؟ فرمایا: لوگ جو کہتے ہیں ان میں سے یہ بات مجھے بھی پہنچی ہے جہاں تک حدیث جسے میں بیان کرتا ہوں اس میں یہ چیز نہیں۔ نماز رازوں میں سے ایک راز ہے، روزہ رازوں میں سے ایک راز ہے اگر چاہے تو کہے میں نے نماز پڑھی ہے جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی تھی رازوں میں سے وہ چیز بھی ہے جو دلوں میں ہے جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ بندوں کو جزا دیتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا شہید کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں مگر امانت، وضو امانت میں سے ہے، نماز اور زکوٰۃ امانت میں سے ہیں، ودیعت امانت میں سے ہے۔ ان سب میں سے شدید ودیعت ہے قیامت والے دن ودیعت کو اس کے لیے ایک مثالی شکل میں ظاہر کیا جائے گا اور اس ودیعت کو جہنم کی گہرائی میں ڈال دیا جائے گا پھر اسے کہا جائے گا: اس ودیعت کو نکالو، وہ اس کے پیچھے جائے گا اور اسے اپنی گردن میں رکھ لے گا جب اسے امید ہو گی کہ وہ اس سے نکل جائے گا تو وہ ودیعت اس سے پھسل جائے گی وہ پھر اس کے پیچھے جائے گا یہ سلسلہ کئی زمانوں تک جاری رہے گا۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: امانت میں سے یہ بھی ہے کہ عورت۔ اشہب نے کہا: مجھے سفیان نے کہا حیض اور حمل میں۔ اگر وہ کہے: مجھے حیض نہیں آیا، کہا: میں حاملہ ہوں، تو اس کی تصدیق کی جائے گی جب تک وہ کوئی ایسی چیز نہ لائے جس کے بارے میں معروف ہو کہ وہ جھوٹی ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے ''جنابت کا غسل امانت ہے''۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 248

قیامت کے روز ہر مخفی راز کو ظاہر کر دے گا کچھ ان میں سے چہروں میں زینت ہوں گے اور کچھ ان میں سے چہروں میں عیب ہوں گے۔ الله تعالیٰ ہر شئی کو جاننے والا ہے لیکن فرشتوں اور مومنوں کی علامات ظاہر ہیں۔

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ لَا نَاصِرٍ ۝

''پس نہ خود اس میں زور ہوگا اور نہ کوئی (دوسرا) مددگار ہوگا''۔

انسان میں کوئی قوت نہ ہوگی جو اس کو محفوظ رکھے اور نہ ہی مددگار ہوگا جو اس کی اس معاملہ میں مدد کرے جو اس پر مصیبت نازل ہوئی ہے۔

عکرمہ سے اس کی تفسیر میں یہ قول مروی ہے: ان سے مراد بادشاہ ہیں جن میں قیامت کے روز نہ ایسی طاقت ہوگی جس کے ذریعے وہ اپنا دفاع کر سکیں اور نہ ایسا مددگار ہوگا جو ان کی مدد کرے۔ سفیان نے کہا: قوۃ سے مراد قبیلہ ہے اور ناصر سے مراد حلیف ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ سے مراد ہے کہ اس کے بدن میں کوئی قوت نہیں (2) اور نَاصِرٍ سے مراد ہے کہ کوئی اور مددگار نہیں جس کے ذریعے وہ الله تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے۔ قتادہ کے قول کا بھی یہی مقصود ہے۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ۝

''قسم ہے آسمان کی جس سے بارش برستی ہے اور زمین کی جو (بارش سے) پھٹ جاتی ہے بلاشبہ یہ قرآن قول فیصل ہے اور یہ ہنسی مذاق نہیں ہے۔ یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں''۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ قسم ہے آسمان کی جو بارش والا ہے (3) ہر سال بارش کے بعد بارش لاتا ہے؛ عام مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اہل لغت نے یہ کہا ہے: الرَّجْعِ کا معنی بارش ہے۔ انہوں نے عمدہ چیز چننے والے کے لیے شعر کہا وہ ایسی تلوار کی صفت بیان کرتا ہے جس کو اس نے پانی سے تشبیہ دی:

أبیضُ کالرجعِ رَسُوبٌ إذا ما ثاخ فی مُحْتَفَلٍ یَخْتَلِی

سفید رنگت والی تلوار بارش کی مانند ہے جسم میں گہرائی تک جانے والی ہے جب وہ دھنس جائے جسم کے موٹے حصے میں جبکہ وہ اسے کاٹ رہی ہو۔

ثاخت قدمہ فی الوحل تثوخ و تثیخ قدم کیچڑ میں غائب ہو گیا۔

خلیل نے کہا: رجع کا معنی بارش ہے۔ رجع کا معنی زمین کی نباتات بھی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذَاتِ الرَّجْعِ سے مراد نفع والا۔ بارش کو اوب بھی کہتے ہیں جس طرح اسے رجع کہتے ہیں۔ شاعر نے شعر میں اوب سے مراد بارش لی ہے:

رَبَّاءُ شَمَّاءُ لایأوِی لِقُلَّتِها إلّا السحابُ والا الأوبُ والسَّبَلُ

عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: سورج، چاند اور ستارے، آسمان میں لوٹتے ہیں ایک طرف سے طلوع ہوتے ہیں اور دوسری

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 248 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً

طرف میں غائب ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد فرشتوں والا ہے کیونکہ وہ بندوں کے اعمال لے کر آسمان کی طرف لوٹتے ہیں(1)۔ یہ قسم ہے۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ یہ ایک قسم ہے۔ یعنی زمین، نباتات، درختوں، پھلوں اور نہروں سے پھٹتی ہے اس کی مثال ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ (عبس) پھر ہم نے زمین کو پھاڑا۔ صدع کا معنی پھاڑنا ہے کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتی ہے پس زمین اس کے ساتھ پھٹ جاتی ہے گویا کلام یوں کی گئی ہے: قسم ہے زمین کی جو نباتات والی ہے، کیونکہ نباتات زمین کو پھاڑتے والی ہے۔ مجاہد نے کہا: قسم ہے زمین کی جو راتوں والی ہے جسے پیدل چلنے والے پھاڑتے ہیں (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ کھیتی والی ہے کیونکہ کھیتی اسے پھاڑتی ہے(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مردوں والی ہے کیونکہ دوبارہ اٹھانے کے لیے ان مردوں سے اسے پھاڑا جائے گا(4)۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ یہ جواب قسم ہے یعنی قرآن حق اور باطل میں فرق کرتا ہے(5)۔ کتاب کے مقدمہ میں یہ گزر چکا ہے جسے حارث نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''یہ ایسی کتاب ہے جس میں پہلوں کی خبریں ہیں اور مابعد کا حکم ہے، یہ فیصلہ کن ہے، ان میں سے کوئی بھی ہنسی مذاق نہیں۔ جبار میں سے جس نے بھی اسے ترک کیا اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا جس نے کسی اور میں ہدایت کو چاہا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا''۔ ایک قول یہ کیا گیا: لَقَوْلٌ فَصْلٌ سے مراد اس سورت میں جو وعید گزر رہی (6) وہ ہے اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآىِٕرُ ۝

وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ یعنی قرآن حکیم باطل اور کھیل نہیں۔ ہزل بامقصد کی ضد ہے۔ یوں اس کا باب چلتا ہے هَزَلَ، يَهْزِلُ۔ کمیت نے کہا: یُجَدُّ بنا فی کلِّ یومٍ و نَهزِلُ ہر روز ہمارے ساتھ بامقصد بات کی جاتی ہے جب کہ ہم ہنسی مذاق کرتے ہیں۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ اللہ کے دشمن، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ساتھ مکر و فریب کرتے ہیں اور میں ان کے مکر کی انہیں جزا دیتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں غزوۂ بدر کے موقع پر قتل اور قید کی صورت میں دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کید اللہ سے مراد ان کے ساتھ استدراج ہے جسے وہ نہ جانتے تھے۔ سورۂ بقرہ میں اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:15) کے ضمن میں اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

''پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں''۔

یعنی کفار کو مہلت دیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی جلد ہلاکت کا سوال نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں جو تدبیر فرماتا ہے اس پر راضی ہو جائیں، پھر یہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) مشرکوں کو جہاں پاؤ ان کو قتل کر دو؛

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 248
2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 249
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً

سے منسوخ ہوگئی۔

اَمْهِلْهُمْ یہ تاکید ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح نزل اور أنزل کا معنی ایک ہے أمهله یعنی اسے مہلت دیجئے۔ اس کا اسم مهلة ہے استمهال کا معنی الاستنظار ہے۔ تمهل فی أمره یعنی اس امر میں آہستگی کا رویہ اپنایا۔ اتمهل اتمهلال۔ اعتدال کا مظاہرہ کیا۔ اس کا معنی سکون اور شگفتگی بھی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مهلا یا فلان، اے فلاں! نرمی اور سکون سے کام لو۔

رُوَيْدًا کا معنی قریب ہے؛ یہ حضرت ابن عباس کا نقطہ نظر ہے (1)۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی قلیل ہے (2) تقدیر کلام یہ ہوگی أمهلهم إمهالا قليلا۔ کلام عرب میں الروید یہ رود کی تصغیر ہے؛ ابوعبید نے یہی کہا ہے؛ یہ شعر پڑھا:

كأنها ثَمِلٌ يمشِي على رُودِ    گویا وہ شراب سے مخمور ہے اور نرمی سے چل رہا ہے۔

رُوَيْدًا کی تفسیر آہستگی ہے۔

رویدك کا معنی ہے تو نرمی کر کیونکہ کاف اس وقت داخل ہوتا ہے جب یہ افعل کے معنی میں ہو، دال کو نصب اجتماع ساکنین کی وجہ سے ہے اس کو نصب مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ہے یہ اسم مصغر ہے اور مامور بہ ہے کیونکہ یہ ارواد کی ترخیم کی تصغیر ہے۔ یہ أَرْوَدَ، يُرْوِدُ کا مصدر ہے اس کی چار صورتیں ہیں: اسم مفعل، صفت، حال اور مصدر۔ اس کا اسم جیسے روید عمرا یعنی عمرو کو مہلت دو۔ صفت جیسے ساروا سیرا رویدا۔ وہ آہستہ چلے حال جیسے سار القوم رویدا جب یہ معرفہ کے ساتھ استعمال ہو تو زید اس کا حال ہوتا ہے۔ مصدر جیسے روید عمرو، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَضَرْبَ الرِّقَابِ (محمد: 4) یہ سب اقوال جوہری کے ہیں۔ آیت میں ان وجوہ میں سے یہ مصدر کی صفت ہوسکتا ہے یعنی امهال رویدا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو یعنی امهلهم غير مستعجل لهم العذاب۔ انہیں مہلت دیجئے عذاب میں جلدی نہ کیجئے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 250    2۔ ایضاً

# سورۂ اعلیٰ

آیاتها ۱۹ ۸۷ سورۃ الاعلیٰ مکیۃ ۸ رکوعها ۱

جمہور کے قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ مدنی ہے۔ اس کی انیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۝۱

''(اے حبیب!) آپ پاکی بیان کریں اپنے رب کے نام کی''

قاری کے لیے مستحب یہ ہے کہ جب وہ اس آیت کو پڑھے تو اس کے بعد وہ سبحان ربی الاعلیٰ کہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی نقطہ نظر ہے جن کا ذکر بعد میں ہو رہا ہے۔ جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کو حزقیائیل کہتے ہیں جس کے اٹھارہ ہزار پر ہیں ایک پر سے دوسرے پر کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اس کے دل میں خیال آیا کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ تو تمام عرش کو دیکھے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اتنے ہی پروں کا اضافہ کیا۔ اس کے چھتیس ہزار پر ہو گئے ایک پر سے دوسرے پر کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی: اے فرشتے! تو اڑ، وہ بیس ہزار سال تک اڑتا رہا تو وہ عرش کے پائیوں میں سے ایک پائے تک نہ پہنچ سکا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے پروں اور قوت میں اضافہ کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ اڑے وہ تیس ہزار سال تک مزید اڑتا رہا تو وہ بھی نہ پہنچ سکا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی: اے فرشتے! اگر تو اپنی قوت اور پروں کے ساتھ صور پھونکنے تک اڑتا رہے تب بھی میرے عرش کے پائے تک نہ پہنچ سکے۔ فرشتے نے کہا: سبحان ربی الاعلیٰ۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اجعلوھا فی سُجُودِکم تم اسے اپنے سجدہ میں رکھ لو؛ ثعلبی نے یہ روایت اپنی کتاب العرائس میں ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی نے کہا کہ اس آیت کا معنی ہے: اپنے بلند و برتر رب کی عظمت بیان کیجئے (1)۔ اسم صلہ زائد ہے مقصود مسمی کی عظمت بیان کرنا ہے جس طرح لبید نے کہا:

إلی الحولِ ثم اسمُ السلامِ علیکما (2)

ایک سال تک روتی رہو پھر تمہیں امن و سکون آئے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اپنے رب کی، بری بات اور ملحد جو کچھ اس کے بارے میں کہتے ہیں اس سے پاکی بیان کرو۔ طبری نے یہ ذکر کیا ہے کہ معنی ہے: اپنے رب کی اس بات سے پاکی بیان کرو (3) کہ تو یہ نام کسی اور کے لیے منتخب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 251 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے رب کے نام اور اس کے ذکر کو پاک کرو اس طرح کہ تو اس کا ذکر کرے تو خشوع کا اظہار کرنے والا اور تعظیم بجالانے والا ہو۔ اس کا ذکر محترم ہے۔ علماء نے اسم کو تسمیہ کے معنی میں لیا ہے، اولیٰ یہ ہے کہ اسم، مسمی کے معنی میں ہو۔ نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: تو علی اسم اللہ نہ کہہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام ہی اعلیٰ ہے۔

ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ معنی ہے اپنے بزرگ و برتر رب کے حکم سے نماز ادا کرو کہا: تو یہ کہے سُبحان رَبِّیَ الأعلیٰ۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابو موسیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جب وہ اس سورت کی قراءت کا آغاز کرتے تو وہ کہتے: سبحان ربی الأعلیٰ تا کہ اس امر کی اطاعت ہو جائے جو اس سورت کے آغاز میں ہے(1) اس لیے قراءت میں ان کی اقتدا کرنا پسندیدہ ہے اس لیے نہیں کہ سُبحان رَبِّیَ الأعلیٰ قرآن حکیم کا حصہ ہے جس طرح بعض کج رو لوگ کہتے ہیں(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابی کی قراءت میں ہے سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی یہی پڑھا کرتے تھے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ۔(3)

ابو بکر او رانباری نے کہا: مجھے محمد بن شہر یار نے انہوں نے حسین بن اسود سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی حماد سے انہوں نے عیسیٰ بن عمر سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی شیر خدا نے نماز میں اس سورت کو پڑھا تو کہا: سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ جب نماز ختم ہوئی تو ان سے عرض کی گئی: اے امیر المومنین! کیا آپ قرآن میں اضافہ کرتے ہیں؟ پوچھا: وہ کیا؟ لوگوں نے کہا: سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ۔ فرمایا: تمہیں ایک چیز کا حکم دیا گیا پس میں نے وہ کہا ہے۔

عقبہ بن عامر جہنی سے مروی ہے: جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے تم اپنے سجدہ میں رکھ لو''(4) یہ سب دلائل اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اسم سے مراد مسمی ہے کیونکہ انہوں نے یہ نہیں کہا: سبحان اِسم رَبِّیَ الأعلیٰ۔

ایک قول یہ کیا گیا: سب سے پہلے جس نے سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ کہا وہ حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین سے فرمایا: ''جس آدمی نے نماز یا غیر نماز میں سبحان رَبِّیَ الأعلیٰ کہا اس کا ثواب کیا ہے؟'' حضرت جبرئیل امین نے عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جو مومن مرد یا مومن عورت سجدہ میں یا غیر سجدہ میں کہے تو یہ کلمہ اس کے میزان میں عرش، کرسی اور دنیا کے پہاڑوں سے بڑھ کر بھاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندے نے سچ کہا ہے میں سب چیزوں پر غالب ہوں اور مجھ پر کوئی چیز غالب نہیں اے میرے فرشتو! گواہ رہو میں نے اسے بخش دیا ہے اور اسے جنت میں داخل کر دیا ہے جب ایسا بندہ فوت ہوتا ہے تو حضرت میکائیل ہر روز اس کی زیارت کرتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا تو اسے اپنے

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 252 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، کتاب الأذکار، فصل فی ادب التلاوۃ، جلد 2، صفحہ 321، 4129

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، ما یقول الرجل فی رکوعہ و سجودہ، جلد 1، صفحہ 126۔ ایضاً، حدیث نمبر 736، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب التسبیح فی الرکوع والسجود، حدیث نمبر 876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پروں پر بٹھائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کریں گے۔ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! اس کے حق میں میری سفارش قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے اس کے بارے میں تیری شفاعت قبول کی اسے جنت کی طرف لے جا۔

حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے اپنے برتر رب کے لیے نماز پڑھ (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ساتھ نماز پڑھو نہ کہ مشرکین کی طرح نماز پڑھو جو سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اپنے رب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی آواز کو بلند کیجئے۔ جریر نے کہا:

قَبَّحَ اللہ وُجوہ تغلِبَ کلّما　سَبَّحَ الحجیجُ وکَبّروا تکبرا

اللہ تعالیٰ تغلب کے وجوہ کو رسوا کرے جب بھی حاجی اس کے ذکر کے ساتھ آواز بلند کریں اور تکبیر کہیں۔

**الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ﴿۵﴾**

''جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر (ظاہری و باطنی قوتیں دے کر) درست کیا اور جس نے (ہر چیز کا) اندازہ مقرر کیا پھر اسے راہ دکھائی اور جس نے زمین سے چارا نکالا پھر اس کو بنا دیا کوڑا سیاہی مائل''۔

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ تسویہ کا معنی سورۃ الانفطار اور دوسری صورتوں میں گزر چکا ہے یعنی جو بنایا اس کو درست بنایا اس کی تخلیق میں کوئی بھدا پن نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اس کی قد و قامت کو مناسب بنایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جو پیدا کیا اس کو حسین بنایا۔ ضحاک نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا تو ان کی خاقت کو مناسب کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آباء کی پشتوں میں پیدا کیا اور ماؤں کے رحموں میں درست کیا (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اجسام کو بنایا اور ذہنوں کو درست کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انسان کو بنایا اور اسے مکلف بنانے کے لیے تیار کیا۔

وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۙ حضرت علی شیر خدا، سلمی اور کسائی نے اسے قَدَرَ پڑھا ہے جب کہ باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی ہر ایک شکل مقدر کی اور اس کو تیار کیا اور اس کی راہنمائی کی۔ مجاہد نے کہا: شقاوت اور سعادت کو مقدر کیا اور ہدایت اور گمراہی کی طرف راہنمائی کی (3)۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ انسان کی ہدایت اور سعادت کی طرف راہنمائی کی اور چوپاؤں کی چراگاہوں کی طرف راہنمائی کی۔ ایک قول یہ کیا: ان کے رزق کو مقدر کیا اگر وہ انسان تھے تو ان کی معاش کی طرف ان کی راہنمائی کی اور اگر چوپائے تھے تو ان کی چراگاہوں کی طرف ان کی راہنمائی کی۔ حضرت ابن عباس، سدی، مقاتل اور کلبی نے فهدی کے بارے میں یہ قول کیا ہے کہ مخلوق کو پہچان کرائی گئی کہ مذکر، مونث کے پاس کیسے آئے جس طرح سورۂ طہٰ میں اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۙ کے ضمن میں بیان فرمائی۔ یعنی مذکر کی مونث کی طرف راہنمائی کی۔ عطا نے کہا: ہر جانور کے لیے وہ بنایا جو اس کے لیے مناسب تھا اور اس کی اس چیز کی طرف راہنمائی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اشیاء میں منافع کو پیدا کیا اور انسان کی راہنمائی کی کہ وہ کس طرح ان منافع کو حاصل کریں۔ ایک

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 279　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 252　3۔ ایضاً

قول یہ کیا گیا ہے: ہر حیوان کے لیے اس چیز کو مقدر کیا جو اس کے لیے موزوں تھا اور اس کی اس طرح راہنمائی کی اور اس سے نفع اٹھانے کا طریقہ بتایا۔

حکایت بیان کی جاتی ہے کہ سانپ کی عمر جب ایک ہزار سال ہو جاتی ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے الہام کرتا ہے کہ وہ تر سمار کے پتوں کے ساتھ اپنی آنکھ کو ملے تو اس کی نظر اس کی طرف لوٹ آئے گی بعض اوقات وہ خشک علاقہ میں ہوتا ہے اس کے اور ریف کے درمیان کئی دنوں کی مسافت ہوتی ہے وہ اس مسافت کو طوالت اور اندھا ہونے کے باوجود طے کرتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی باغ میں سمار کے درخت تک جا پہنچتا ہے وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرتا اس کے ساتھ اپنی آنکھ رگڑتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی آنکھ نور والی ہو جاتی ہے۔

انسان کی جو اس کی مصالح کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے اور اس کے حوائج کی طرف جو راہنمائی کی جاتی ہے وہ کسی حد و شمار میں نہیں وہ غذاؤں سے متعلق ہو، دواؤں سے متعلق ہو، دنیا کے معاملات سے ہو یا دین کے معاملات میں سے ہو۔ چوپاؤں، پرندوں اور حشرات الارض کے الہامات کا باب بہت وسیع و عریض ہے کسی بیان کرنے والا کا وصف اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ فسبحان رَبِّیَ الأعلیٰ۔

سدی نے کہا: جنین کے لیے رحم میں نو ماہ کی مدت کو مقدر کیا کچھ کم اور کچھ زائد پھر رحم سے نکلنے کا طریقہ بنایا۔ فراء نے کہا: یعنی مقدر کیا پس ہدایت دی اور گمراہ کیا۔ ان دو چیزوں میں سے ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ اس کا معنی ہو ایمان کی طرف دعوت دی جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الشوری) بے شک آپ راہ مستقیم کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ اور سب کو ایمان کی طرف دعوت دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے افعال کے ذریعہ اپنی توحید پر راہنمائی کی اور اپنے عالم اور قادر ہونے کی راہنمائی کی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے دال کو مشدد پڑھا ہے تو وہ اسے تقدیر سے مانتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان) اور ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ لگایا۔ اور جس نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تو احتمال موجود ہے کہ وہ تقدیر سے ہو اور دونوں کا معنی ایک ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ قدرت اور ملک کے معنی میں ہو، یعنی وہ اشیاء کا مالک ہے اور جس کے بارے میں اسے ہدایت دی۔

میں کہتا ہوں: میں نے اپنے ایک شیخ سے سنا وہ کہتے: الذی خلق فسوی وقدر فھدی یہ علو کی تفسیر ہے جو تمام مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کے جلال کے مناسب ہے۔

وَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ جس نے نباتات اور سبز گھاس نکالی۔ شاعر نے کہا:

وقد ینبتُ المرعَی علی دِمَنِ الثَّری (1)

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 252

بعض اوقات کھیتی کو بروالی زمین پر پیدا ہو جاتی ہے۔

**فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى** ۝ غُثَآءً سے مراد وہ چیز ہے جسے سیلاب وادی کی اطراف پر پھینک دیتا ہے وہ گھاس ہو، نباتات ہو یا چھوٹے چھوٹے ریزے ہوں، اسی طرح جب یہ لفظ مشدد استعمال ہو۔ اس کی جمع اغثاء آتی ہے۔ قتادہ نے کہا: غُثَآءً سے مراد خشک چیز ہے سبزی اور گھاس جب ٹکڑے ٹکڑے اور خشک ہو جائے تو اسے غُثَآءً کہتے ہیں، جس طرح کہا:

کَاَنَّ طَمِیَّةَ الْمُجَیْمِرِ غُدْوَةً　　من السَّیْلِ والْاَغْثاء فَلْکَةُ مِغْزَلِ

گویا مجیمر کا پہاڑ اس صبح سیلاب اور گھاس پھوس کی وجہ سے چرخے کا دھکڑا تھا۔

اہل لغت نے یہ حکایت بیان کی ہے: غثا الوادی وجفا اسی طرح پانی ہے جب اس پر جھاگ اور چھوٹے چھوٹے ذرات غالب آ جائیں جن سے نفع نہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ احوی کا معنی سیاہ ہے یعنی نباتات زیادہ سبز ہونے کی وجہ سے سیاہی مائل ہوتی ہیں جس طرح ایک چیز سیاہ ہوتی ہے۔ حوۃ کا معنی سیاہ ہے۔

صحاح میں ہے: حوۃ کا معنی ہونٹ کا گندم گو ہونا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل أحوی، إمرأة حوّاء، وقد حویت۔ بعیر أحوی۔ جب اس کی سبزی میں سیاہی اور زردی مل جائے۔ احوی کی تصغیر أُحیوآتی ہے یہ اس کی لغت کے مطابق ہے جو أسیود کہتا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے: یہ جائز ہے کہ اَحْوٰى، الْمَرْعٰى سے حال ہو اس کا معنی ہوگا اس کے انتہائی سرسبز ہونے کی وجہ سے اسے سیاہی مائل سمجھا جاتا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی أخرج المرعی أحوی فجعله غثاء یہ جملہ بولا جاتا ہے: حوی النبت؛ یہ کسائی نے بیان کیا ہے اور کہا:

وغَیْثٍ من الوسْمِیِّ حُوٍّ تِلاعُه

موسم بہار کی پہلی بارش کی وجہ سے اس کے ٹیلے سیاہ ہیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ اَحْوٰى، غُثَآءً کی صفت ہو۔ اس کا معنی ہوگا وہ سرسبز و شاداب ہونے کے بعد اس طرح ہو گئی۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کے جلنے اور پرانا ہونے کی وجہ سے سیاہ بنا دیا۔ تر چیز جب خشک ہو جاتی ہے تو وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ عبدالرحمن بن زید نے کہا: اس نے سبز چراگاہ نکالی، پھر جب خشک ہوئی تو اس کے جلنے کی وجہ سے سیاہ ہو گئی اور غُثَآءً بن گئی جسے ہوائیں اور سیلاب کا پانی بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ ضرب المثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے بیان فرمائی ہے کیونکہ دنیا تر و تازگی کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

**سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى ۝ وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝**

”ہم خود آپ کو پڑھائیں گے پس آپ اسے نہ بھولیں گے بجز اس کے جو اللہ چاہے، بے شک وہ جانتا ہے ظاہر کو اور جو چھپی ہوتی ہے۔ اور ہم سہل بنا دیں گے آپ کے لیے اس آسان (شریعت) پر عمل“۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم تجھے قرآن پڑھائیں گے اور تجھے تعلیم دیں گے اور آپ نہ بھولیں گے یعنی آپ یاد رکھیں گے؛ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بشارت ہے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی کہ اس نے اسے واضح نشانی عطا فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جبرئیل امین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بھی پڑھتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں نہ لکھنا سیکھا اور نہ پڑھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد رکھتے ہیں اور اسے بھولتے نہیں۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول جانے کے ڈر سے اسے یاد کیا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا: میں تجھے اس کی جانب سے کافی ہوں۔ مجاہد اور کلبی نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب جبریل امین وحی لاتے ابھی جبریل امین آیت کے آخر سے فارغ نہ ہوتے یہاں تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیت کا ابتدائی حصہ پڑھتے اس خوف سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بھول ہی نہ جائیں تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہ بھولیں گے میں اس کی جانب سے تجھے کافی ہوں۔ اس تعبیر کی بنا پر جو قول فراء نے کیا ہے استثناء کی صورت یہ ہوگی۔ الا ماشاء اللہ۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بھولیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (ہود: 107) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان وزمین موجود رہیں مگر جب تیرا رب چاہے۔ اور وہ ایسا نہیں چاہے گا۔

کلام عربی میں بھی یوں بات کی جاتی ہے: لأعطيتك كلّ ما سألت إلا ما شئتُ میں تجھے ضرور عطا کروں گا جو تو مجھ سے سوال کرے گا مگر جو میں چاہوں۔ یعنی جو تو سوال کرے گا میں تجھے ضرور دوں گا مگر جو میں روکنا چاہوں گا جب کہ نیت یہ ہو کہ وہ اس سے کوئی چیز نہ روکے گا۔ قسموں میں یہی طریقہ مروج ہے ان میں سے کسی چیز کی استثناء کی جاتی ہے جبکہ قسم اٹھانے والے کی نیت ہوتی ہے کہ وہ اس کو مکمل کرے گا۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد نہ بھولے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوا مگر جو اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی چیز نہ بھولتے مگر جو اللہ تعالیٰ چاہتا۔ ان اقوال کی بنا پر یہ قول کیا گیا ہے: مگر جو اللہ چاہے کہ بھولیں۔ مگر اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہ بھولے۔ ایک قول یہ کیا گیا: مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ بھولیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد میں یاد آ جاتا تھا جب بھی آپ بھولتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد آ جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلی طور پر نہ بھولا کرتے تھے۔ ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں ایک آیت کو چھوڑ دیا حضرت ابی نے گمان کیا کہ وہ منسوخ ہو گئی ہے حضرت ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں بھول گیا تھا''۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نسیان سے مشتق ہے معنی یہ ہوگا مگر جو اللہ تعالیٰ تجھے بھلانا چاہے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ یہ نسخ کے معنی میں ہے پھر معنی یہ ہوگا مگر جو اللہ تعالیٰ منسوخ کر دے۔ استثناء بھی نسخ کی ایک صورت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نسیان کا معنی ترک کرنا ہے معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ تجھے محفوظ رکھے گا کہ آپ کسی عمل کو ترک کریں مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ آپ اسے ترک کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا۔ یہ عمل کا نسخ ہوگا اور پہلا معنی قراءت کے نسخ کے بارے میں

ہوگا۔ فرغانی نے کہا: جنید بغدادی کی مجلس میں ایک صاحب علم آتا اور ابن کیسان نحوی بھی آتا تھا وہ ایک جلیل القدر انسان تھے ایک دن ابن کیسان نے کہا: اے ابا القاسم! آپ اللہ تعالیٰ کے فرمان سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے جلدی جواب دیا گویا ان سے پہلے کئی دفعہ سوال ہو چکا تھا: اس پر عمل کرنا نہیں بھولتے۔ ابن کیسان نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے منہ کو سلامت رکھے تجھ جیسے آدمی کی گفتگو سے اپنی رائے سے پھرا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں لا نفی کے لیے ہے نہی کے لیے نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لا نہی کے لیے ہے فعل کے آخر میں یاء اس لیے ثابت ہے کیونکہ آیات کے سرے اس طرح ہیں معنی یہ ہوگا اس کی قراءت اور تکرار سے غافل نہ ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بھول جائیں مگر جو اللہ تعالیٰ اسے بھلا دے اس کی وجہ یہ ہو کہ کسی مصلحت کے تحت اس کی تلاوت منسوخ کر دی۔

پہلا نقطہ نظر پسندیدہ ہے کیونکہ نہی سے استثناء نہیں ہوگی مگر وہ موقت اور معلوم ہوتی ہے دوسری وجہ یہ ہے یاء تمام مصاحف میں موجود ہے اس پر قراء کا اتفاق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے مگر اللہ تعالیٰ جس کے نازل کرنے کو مؤخر کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اسے غُثَآءً اَحْوٰى بنا دیا مگر جسے انسان اور حیوان کھا لیں کیونکہ وہ چیز اس طرح نہیں ہوتی۔

**اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا یَخْفٰى ﴿۷﴾** جھر سے مراد اعلانیہ قول اور عمل ہے اور یَخْفٰى سے مراد رات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد ہے جو تیرے دل اور نفس میں مخفی ہے۔ محمد بن حاتم نے کہا: اللہ تعالیٰ صدقہ کے اظہار اور اس کے اخفاء کو جانتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جھر سے مراد ہے جو تو نے اپنے سینے میں قرآن کو محفوظ کیا ہے (1) اور مَا یَخْفٰى سے مراد ہے جو تیرے سینے سے مٹا دیا گیا ہے۔

**وَ نُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰى ﴿۸﴾** اس کا عطف سَنُقْرِئُكَ پر ہے اور اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا یَخْفٰى درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ یسریٰ کا معنی ہے آسان راستہ۔ یہ بھلائی کا عمل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم تجھے اچھا عمل کرنے کی توفیق دیں گے (2)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یسریٰ سے مراد جنت ہے (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم تجھے شریعت یسریٰ کی توفیق دیں گے اس سے مراد حَنِیْفِیَّه سَمْحَة سَهْلَة ہے ایسی شریعت جس میں یہ صلاحیتیں موجود ہیں؛ یہ ضحاک نے معنی بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم آپ پر وحی کو آسان کر دیں گے یہاں تک کہ آپ یاد کر لیں گے اور اس پر عمل کر لیں گے۔

## فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿۹﴾

"پس آپ نصیحت کرتے رہیے اگر نصیحت فائدہ مند ہو"۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی قوم کو قرآن کے ذریعے نصیحت کرتے رہیں اگر نصیحت نفع دے۔ یونس نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے: یہ مومن کے لیے نصیحت اور کافر کے خلاف دلیل ہے (4)۔ حضرت ابن عباس کہا کرتے تھے: یہ میرے دوستوں کو نفع دیتی ہے اور میرے دشمنوں کو نفع نہیں دیتی۔ جرجانی نے کہا: نصیحت کرنا واجب ہے اگرچہ وہ نفع نہ دے اس

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 253 2۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 254 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 279

کا معنی یہ ہے نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دے یا نصیحت نفع نہ دے تو کلام میں حذف ہے جس طرح ارشاد ہے: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) پائجامے تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مخصوص افراد کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان، ما کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ نصیحت کریں جب تک نصیحت نفع دے تو ان، ما مصدریہ کے معنی میں ہوگا (1) شرط کے معنی میں نہیں کیونکہ نصیحت ہر حال میں نفع دینے والی ہے۔ ابن شجرہ نے کہا: بعض علماء عربیہ نے کہا ان، اذ کے معنی میں ہے یعنی جب وہ نفع دے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران) تمہیں غالب ہو جب تم مومن ہو۔ یہاں بھی اِنْ، اذ کے معنی میں ہے یعنی تم غالب ہو جب تم مومن ہو۔ ان کے غالب آنے کی خبر نہیں دی گئی مگر ایمان لانے کے بعد وہ غالب ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اِنْ، قد کے معنی میں ہے۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝

''سمجھ جائے گا جس کے دل میں (خدا کا) خوف ہوگا''۔

جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے وہ نصیحت حاصل کرے گا۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابن ام مکتوم کے حق میں نازل ہوئی۔ ماوردی نے کہا: جو آدمی اس سے امید رکھتا ہے وہ بھی نصیحت حاصل کرتا ہے مگر ڈرنے والے کا نصیحت حاصل کرنا امید رکھنے والے کے نصیحت حاصل کرنے سے زیادہ بلیغ ہے (2)۔ اس وجہ سے یہاں تذکرہ کو خشیت کے ساتھ معلق کیا ہے رجا کے ساتھ معلق نہیں کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے آپ وعظ و نصیحت ہر کسی کو کریں اگرچہ وعظ اسے نفع دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے لیکن تجھے دعوت کا ثواب تو مل جائے گا؛ یہ قشیری نے بیان کیا ہے۔

وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ۝

''اور دور رہے گا اس سے بدبخت جو (بالآخر) بڑی آگ میں داخل ہوگا، پھر نہ وہ وہاں مرے گا اور نہ جیے گا''۔

وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں بدبخت ہے وہ نصیحت سے اجتناب کرے گا اور اس سے دور رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئیں۔

کبریٰ سے مراد بڑی آگ ہے، یہ جہنم کے طبقوں میں سے سب سے نچلا طبقہ ہے؛ یہ فراء نے کہا۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے (3): کبریٰ سے مراد جہنم کی آگ ہے اور صغریٰ سے مراد دنیا کی آگ ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔

وہ نہ مرے گا کہ عذاب سے آرام پائے اور نہ ایسی زندگی پائے گا جو اسے نفع دے، جس طرح شاعر نے کہا:

أَلا ما لِنَفْسٍ لا تَمُوتُ فَيَنْقَضِي عَنَاهَا وَلا تَحْيَا حَيَاةً لَهَا طَعْمُ (4)

خبردار! نفس کے لیے موت نہ ہوگی کہ اس کی مشقت ختم ہو جائے اور نہ اس کے لیے ایسی زندگی ہے جس کے لیے کھانا ہو۔

سورۃ النساء، اور دوسری سورت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ مومنوں میں سے موحد جب جہنم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 254 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 280 4۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 255

میں داخل ہوں گے۔ فراء کے قول کے مطابق: یہ نار صغریٰ ہوگی وہ اس میں جل جائیں گے اور اس سے مر جائیں گے یہاں تک کہ ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی؛ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بد بخت لوگ اپنی بد بختی میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ وعید بد بخت ترین کے لیے ہے اگر کوئی شقی ہوگا تو اس رتبہ کو نہ پہنچے گا۔

## قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝

''بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

### تزکّی سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1۔** قَدْ اَفْلَحَ جس نے ایمان کے ذریعے شرک سے پاکیزگی حاصل کی اس نے جنت میں بقا کو پا لیا(1)؛ حضرت حضرت ابن عباس، عطا اور عکرمہ کا قول ہے، حضرت حسن بصری اور ربیع نے کہا: جس کا عمل بڑھنے والا تھا اس نے کامیابی حاصل کی (2)۔ معمر نے قتادہ سے ذکر کیا ہے: جس نے اچھے عمل سے ذریعے تزکیہ کیا۔ ان سے، عطا سے اور ابو العالیہ سے مروی ہے: یہ حکم صدقہ فطر کے بارے میں نازل ہوا۔

ابن سیرین نے کہا: وہ نکلا اور صدقہ فطر کی ادائیگی کے بعد نماز ادا کی۔ عکرمہ نے کہا: آدمی کہا کرتا تھا میں صدقہ فطر اپنی نماز سے پہلے ادا کرتا ہوں۔ سفیان نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ اَفْلَحَ۔

حضرت ابو سعید اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ صدقہ فطر اور نماز عید کے متعلق ہے۔ ابو العالیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور کہا: اہل مدینہ اس سے اور پانی پلانے سے بہتر کوئی صدقہ خیال نہ کرتے تھے۔ کثیر بن عبد اللہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى سے مراد ہے جس نے صدقہ فطر دیا، وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى سے مراد ہے جس نے عید کی نماز پڑھی''۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا: جس نے راستے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور نماز عید پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے تمام اموال کی زکوٰۃ دی؛ یہ ابو الاحوص اور عطا کا نقطہ نظر ہے۔ ابن جریج نے روایت نقل کی ہے کہ میں نے عطا سے کہا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى صدقہ فطر کے لیے ہے؟ فرمایا: یہ تمام تر صدقات کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اعمال کی زکوٰۃ ہے، اموال کی زکوٰۃ مراد نہیں یعنی اس نے اپنے اعمال کو ریا کاری اور کوتاہی سے پاک کیا کیونکہ اکثر مال کے بارے میں کہا جاتا ہے: اس نے زکوٰۃ دی پاکیزہ نہ ہوا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى کا معنی ہے جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور انداد کا قلادہ اپنے گلے سے اتار پھینکا اور یہ گواہی دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تَزَكّٰى کا معنی ہے جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا۔ عطا نے ان سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان کے حق میں نازل ہوئی کہ مدینہ طیبہ میں ایک منافق تھا اس کا مدینہ طیبہ میں ایک کھجور کا درخت تھا جو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 255 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 280

ایک انصاری کے گھر میں جھکا ہوا تھا جب ہوا چلتی تو کچی اور پکی کھجوریں انصاری کے گھر میں گر جاتیں۔ وہ انصاری اور اس کے گھر والے ان کو کھاتے منافق نے اس انصاری سے جھگڑا کیا اس صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کو بلا بھیجا جب کہ اس کا نفاق ظاہر نہ تھا فرمایا: ''تیرے انصاری بھائی نے ذکر کیا ہے کہ تیری کچی اور پکی کھجوریں اس کے گھر میں گرتی ہیں جنہیں وہ اور اس کے گھر والے کھاتے ہیں کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ میں اس کھجور کے بدلے جنت میں تجھے کھجور کا درخت دے دوں؟'' اس منافق نے کہا: میں موجودہ مال کو موخر مال کے بدلے میں بیچ دوں میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ علماء نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس ایک کھجور کے بدلے کھجوروں کا ایک باغ عطا فرمایا تو آپ کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی اور منافق کے بارے میں وَ یَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَی ﴿۱۱﴾ نازل ہوئی۔ ضحاک نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

## صدقۂ فطر مراد لینے کی صورت میں تاویل

**مسئلہ نمبر 2**۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں صدقہ فطر کی بحث مکمل کر دی ہے یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے مکہ مکرمہ میں نہ عید تھی نہ صدقہ فطر تھا۔ قشیری نے کہا: یہ کوئی بعید نہیں کہ اس آدمی کی تعریف کی گئی ہو جو زمانہ مستقبل میں فطر اور صلاۃ عید کا امر بجالانے والا تھا۔

## اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر اور نماز پڑھنے سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ﴿۱۵﴾ اس نے اپنے رب کا ذکر کیا۔ عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہا: ارادہ یہ کیا ہے کہ اس کے معاد اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے موقف کا ذکر کرے پس اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اس کی نماز پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: نماز کے شروع میں تکبیر کہہ کر اس کے رب کا نام ذکر کیا کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر منعقد نہیں ہوتی۔ وہ یہ قول ہے اللہ اکبر اس وجہ سے شروع میں تکبیر کے واجب ہونے کا استدلال کیا جاتا ہے اور یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ نماز کا جز نہیں کیونکہ نماز کا اس پر عطف کیا گیا ہے، اس میں اس آدمی کے لیے دلیل موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر نام کے ساتھ نماز شروع کرنا جائز ہے۔ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں اس بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ عید کی تکبیرات ہیں۔ ضحاک نے کہا: عید گاہ کے راستہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اس نے نماز عید پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ وہ نماز کے وقت دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، اس کے عتاب سے ڈرے، اس کے ثواب کی امید رکھے تا کہ نماز کے پورے پورے حقوق ادا کرے اور اس میں خشوع وخضوع کرے جیسا اس کا خوف اور اس کی امید ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ ہر سورت کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے کرے اور نماز پڑھے اور ذکر کرے۔ ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں اكْرَمْتَنِي فَزُرْتَنِي، زُرْتَنِي فَاَكْرَمْتَنِي۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 255

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ فرض نماز کے بارے میں ہے وہ پانچ نمازیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد دعا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی ضروریات کے بارے میں دعا کی۔ ایک قول یہ کیا: اس سے مراد عید کی نماز ہے؛ یہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابن عمر اور دوسرے علماء کی رائے ہے(1)، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد نفلی نماز پڑھے؛ یہ ابوالاحوص کا نقطہ نظر ہے، عطا کے قول کا مقتضا بھی یہی ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کی کوئی نماز نہیں۔

## بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞

''البتہ تم لوگ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو''۔

یہ عام قراء کی قراءت ہے اس کی تصدیق حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی کرتی ہے بل أنتم توثرون۔ ابوعمرو اور نصر بن عاصم نے اسے بل یؤثرون یاء کے ساتھ پڑھا ہے تقدیر کلام یہ ہے بل یوثرون الأشقون الحیاۃ الدنیا پہلی تعبیر کی صورت میں معنی یہ ہوگا بلکہ اے مسلمانو! تم دنیا کی کثرت چاہتے ہو تاکہ تم زیادہ ثواب حاصل کر سکو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی اور پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے؟ کیونکہ دنیا حاضر ہے اس کی پاکیزگیاں، اس کا کھانا، اس کا مشروب، اس کی لذت اور رونقیں جلدی نصیب ہوتی ہیں جب کہ آخرت ہم سے غائب ہے پس ہم نے دنیا کو لے لیا اور آخرت کو ترک کر دیا۔

ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ ایک سفر میں تھے جبکہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور دنیا کا ذکر کر رہے تھے حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا: اے انس! ان لوگوں میں سے ہر ایک اپنی جان کے ساتھ چمڑے کو کاٹ کر رکھ دے گا آؤ ہم اپنے رب کا ذکر کریں پھر کہا: اے انس! کس چیز نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روک لیا ہے؟ میں نے کہا: دنیا اور شہوات نے۔ فرمایا: نہیں دنیا کو پہلے لیا گیا ہے اور آخرت کو غائب کر دیا گیا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر یہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتے تو نہ کسی چیز کو اس کا ہم پلہ قرار دیتے اور نہ ہی شکایت کرتے۔

## وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۞

''حالانکہ آخرت کہیں بہتر ہے اس سے اور باقی رہنے والی ہے''۔

دار آخرت یعنی جنت افضل ہے اور دنیا کے مقابلہ میں دائمی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما الدنیا فی الآخرۃ إلا کما یضع أحدکم إصبعہ فی الیم فلینظر بما یرجع دنیا آخرت کے مقابلہ میں اس قدر ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک اپنی انگلی سمندر میں رکھے تو وہ دیکھے انگلی کیا چیز لے کر آتی ہے۔ یہ روایت بھی گزری ہے۔ مالک بن دینار نے کہا: اگر دنیا سونے کی ہوتی جو ختم ہو جاتا ہے اور آخرت ٹھیکری کی ہوتی جو باقی رہتی ہے تو ضروری ہے کہ باقی رہنے والی ٹھیکری کو فانی ہونے پر ترجیح دی جائے۔ فرمایا: تو پھر کیا حال ہے جب کہ آخرت سونے کی ہے جو باقی رہنے والی ہے اور دنیا ٹھیکری کی ہے جو فنا ہونے والی ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 255

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾

''یقیناً یہ (سب کچھ) اگلے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں''۔

قتادہ اور ابن زید نے کہا: اسم اشارہ سے مراد وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۷﴾ ہے دونوں نے کہا: جس طرح تم سنتے ہو اللہ تعالیٰ کی کتب میں تواتر سے یہ بات آتی ہے کہ آخرت دنیا کے مقابلہ میں بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

حضرت حسن بصری نے کہا کہ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تمام کتب ہیں (1)۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ سے لے کر آخر تک ہے۔ یہ تعبیر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے ہے جو ابھی آ رہی ہے۔ ضحاک نے کہا کہ یہ قرآن پہلی کتابوں میں ہے۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾ سے مراد وہ کتابیں ہیں جو ان پر نازل ہوئیں ان سے یہ مراد نہیں کہ بعینہ یہی الفاظ ان صحیفوں میں تھے بلکہ مقصود معنی ہے یعنی اس کلام کا معنی ان صحیفوں میں تھا۔ آجری نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صحف ابراہیم سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''وہ سب امثال تھیں اے بادشاہ جس نے تسلط جمایا ہوا ہے آزمائش میں مبتلا ہے اور دھوکہ میں ڈالا گیا ہے میں نے تجھے اس لیے دنیا میں نہیں بھیجا کہ تو دنیا کو ایک دوسرے کے اوپر جمع کرے بلکہ میں نے تجھے اس لیے بھیجا ہے کہ تو مظلوم کی دعا کو مجھ سے لوٹائے میں اس کی دعا کو نہیں لوٹاؤں گا اگرچہ وہ کافر کے منہ سے نکلے اس سے مراد امثال تھیں عقل مند پر لازم ہے کہ اس کی تین گھڑیاں ہوں۔ ایک گھڑی میں وہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کرے، ایک ساعت ایسی ہو جس میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی صنعت میں غور و فکر کرے، ایک ساعت ایسی ہو جس میں وہ اپنے کھانے پینے کا اہتمام کرے۔ دانشمند پر لازم ہے کہ وہ تین چیزوں کے سوا کسی کے لیے سفر نہ کرے آخرت کے لیے زادِراہ، زندگی کو بہتر بنانے کے لیے، حلال چیز میں لذت پانے کے لیے۔ دانشمند پر یہ بھی لازم ہے وہ اپنے زمانہ پر نظر رکھتا ہو، اپنی حالت کی طرف متوجہ ہو اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو۔ جو آدمی زبان کو بھی اپنے اعمال میں شمار کرتا ہے تو اس کی گفتگو کم ہو جاتی ہے مگر جو اس کے لیے معاون ہو''۔

میں نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے کیا ہیں؟ فرمایا: ''سب عبرت آموز باتیں تھیں۔ میں تعجب کا اظہار کرتا ہوں اس آدمی پر جو موت کا یقین رکھتا ہے کہ وہ کیسے خوش رہتا ہے، میں تعجب کا اظہار کرتا ہوں اس آدمی پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے تو وہ کیسے تھکتا ہے؟ اور میں تعجب کا اظہار کرتا ہوں کہ جو دنیا اور اس کے تغیر کو دیکھتا ہے کہ وہ کیسے اس پر مطمئن ہو جاتا ہے؟ میں متعجب ہوتا ہوں اس آدمی پر جو حساب پر یقین رکھتا ہے پھر وہ عمل نہیں کرتا''۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے بارے میں جو کچھ تھا کیا اس میں سے ہمارے پاس بھی کچھ ہے؟ فرمایا: ''ہاں ابوذر پڑھو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾''۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 280

# سورۃ الغاشیہ

﴿ آیاتہا ۲۶ ﴾ ﴿ ۸۸ سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۶۸ ﴾ ﴿ رکوعہا ۱ ﴾

تمام کے قول میں مکی ہے۔اس کی چھبیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

## هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝

''کیا آپ کو پہنچی ہے چھا جانے والی آفت کی خبر''۔

هَلْ، قد کے معنی میں ہے(1) جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر:1) یقیناً انسان پر ایک ایسا وقت گزرا ہے؛ یہ قطرب کا قول ہے معنی یہ ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً آپ کے پاس قیامت کی خبر آ چکی ہے جو اپنی ہولناکیوں کے ساتھ مخلوقات پر چھا جائے گی؛ یہ اکثر مفسرین کا نقطہ نظر ہے۔سعید بن جبیر اور محمد بن کعب نے کہا: الْغَاشِیَةِ سے مراد آگ ہے جو کفار کے مونہوں تک جا پہنچے گی(2)؛ یہ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اس کی دلیل وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ (ابراہیم) آگ ان کے چہروں پر چھا جائے گی۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: مخلوقات پر چھا جائے گی۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد نفخہ ثانیہ ہے جو دوبارہ اٹھائے جانے کے لیے پھونکا جائے گا کیونکہ وہ تمام مخلوقات پر غالب آ جائے گا(3)۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: غاشیہ سے مراد جہنمی ہیں جو اس پر چھا جائیں گے اور اس میں داخل ہو جائیں گے۔ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ هَلْ اَتٰىكَ کا معنی ہے یہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ تھا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو پتہ تھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس طرح یہاں مذکور ہے اس تفصیل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے معلوم نہ تھا۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور استفہام کلام ذکر کی گئی ہے اس کا معنی ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک غاشیہ کی خبر نہیں پہنچی تھی تو اب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ چکی ہے؛ یہ کلبی کے قول کا معنی ہے(4)۔

## وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝

''کتنے ہی چہرے اس دن ذلیل وخوار ہوں گے مشقت میں مبتلا تھکے ماندے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کی خبر نہیں پہنچی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں آگاہ کر دیا۔یَّوْمَىٕذٍ سے مراد یوم قیامت ہے(5)۔سفیان نے کہا: خاشعة سے مراد عذاب کے ساتھ ذلیل کرنا ہے ہر کمزور پست ہمت عاجزی کرنے والا ہوتا ہے۔یہ جملہ بولا جاتا ہے: خَشَعَ فی صلاتہ جب اس نے نماز میں سر جھکایا اور

1۔تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 257 2۔ایضاً 3۔ایضاً 4۔ایضاً 5۔ایضاً، جلد 6، صفحہ 258

عاجزی کا اظہار کیا۔ خشع الصوت آواز پست ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (طٰہٰ:108) اللہ تعالیٰ کے حضور آوازیں پست ہیں۔ وجوہ (چہروں) سے مراد اصحاب وجوہ ہیں۔ قتادہ اور ابن زید نے کہا: آگ میں عاجز و ذلیل ہوں گی (1)۔ اس سے مراد تمام کفار کے وجوہ ہیں؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد یہود و نصاریٰ کی وجوہ ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

وہ دنیا میں تھکے ماندے ہوں گے کیونکہ دار آخرت عمل کا مکان نہیں۔ معنی یہ ہوگا وہ دنیا میں مشقت میں مبتلا، تھکے ماندے ہوں گے وہ آخرت میں ذلیل و رسوا ہوں گے۔ علماء لغت نے کہا: جب ایک آدمی لگا تار مصروف کار رہے تو کہتے ہیں: عَمِلَ الرجلُ عَمَلًا وہ بادل جو لگا تار چمکتا رہے اسے کہتے ہیں: عَمِل السحابُ عملًا، ذاسحابٌ عمِلٌ۔ ہذلی نے کہا: حتی شَآها کلیلٌ مَوْهِنًا عمِلٌ لگا تار کمزور بجلی رات کے ایک حصہ تک اسے ہانکتی رہی۔

نَّاصِبَةٌ تھکے ماندے۔ نَصِبَ یَنْصَبُ نَصَبًا کا معنی ہے وہ تھک گیا أنصبه غیرہ۔ اسے کسی دوسرے نے تھکا دیا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور کفر میں تھکایا جیسے بت پرست اور اہل کتاب میں سے راہب وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ان سے کسی چیز کو قبول نہیں فرماتا مگر جو اس کے لیے خالص ہوتا ہے۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد ہے دنیا میں اس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے تکبر کیا اللہ تعالیٰ نے اسے جہنم میں کام میں لگا دیا اور اسے تھکایا کہ وہ بھاری بیڑیاں کھینچتے ہیں، طوق اٹھائے ہوئے ہیں وہ میدان محشر میں ننگے پاؤں کھڑے ہیں جس میں ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ کلبی نے کہا: انہیں منہ کے بل جہنم میں گھسیٹا جائے گا۔ ان سے اور دوسرے علماء سے یہ بھی مروی ہے: جہنم میں انہیں لوہے کے پہاڑ پر چڑھنے کا مکلف بنایا جائے گا تو وہ بیڑیوں اور طوقوں اور آگ میں داخل ہونے کی وجہ سے جو مشقت اٹھاتے ہیں اس سے زیادہ وہ تھکیں گے وہ آگ میں یوں دھنس جائیں گے جس طرح اونٹ کیچڑ میں دھنس جاتا ہے، وہ آگ کے پہاڑ پر چڑھیں گے اور اس سے نیچے اتریں گے اس کے علاوہ انہیں عذاب کا سامنا کرنا ہوگا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔ ابن محیصن، عیسیٰ، حمید نے اور عبید نے شبل سے وہ ابن کثیر سے نَّاصِبَةٌ روایت کرتے ہیں کیونکہ یہ حال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے بطور مذمت منصوب پڑھا گیا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے صفت کے اعتبار سے منصوب پڑھا ہے یا مبتدا مضمر ہے تو وقف خَاشِعَةٌ پر ہوگا۔ جس نے اسے آخرت پر تعبیر کیا ہے اس کے لیے جائز ہے کہ یہ وجوہ سے خبر کے بعد خبر ہو اس صورت میں خَاشِعَةٌ پر وقف نہ کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے دنیا میں مصروف کار، آخرت میں تھکے ماندے اور ذلیل ہوں گے۔ عکرمہ اور سدی نے کہا: دنیا میں وہ نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔ سعید بن جبیر اور زید بن اسلم نے کہا: وہ راہب ہیں جو گرجا گھروں میں رہتے تھے؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ضحاک کی روایت بھی پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے: جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام آئے تو ایک بوڑھا (متقهل) پراگندہ حال راہب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 258

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو آپ رونے لگے اس نے پوچھا: اے امیر المومنین! کس چیز نے آپ کو رلایا ہے؟ فرمایا: اس مسکین نے ایک امر کو طلب کیا تو اسے نہ پایا، ایک امید کی تو اس میں غلطی کی اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کی وُجُوْهٌ

**یَوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ**۔(1)

کسائی نے کہا: تقھل کا معنی برا حال ہے۔ رجل متقھل جس کا چمڑا خشک اور برا حال ہو جس طرح متقحل ہے۔ ابو عمرو نے کہا: تقھل کا معنی ضرورت کی شکایت کرنا ہے اور یہ شعر پڑھا:

لَعْوًا إِذَا لاقيتُه تقھّلَا

جب میں اسے ملا تو اس کا اخلاق برا اور حال بھی برا تھا۔

القھل کا معنی احسان کی ناشکری کرنا ہے۔ قد قَهَلَ يَقْهَلُ قَهْلًا جب اس نے بری تعریف کی۔ أقھل الرجل ایسے امر کا تکلف کیا جو اس کے نفس کو عیب دار بناتا ہے اور اس کی ذات کو آلودہ کر دیتا ہے۔ انقھل کا معنی ہے کمزور ہونا اور گر جانا؛ یہ جوہری کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: اس سے مراد اہل حروراء ہیں یعنی وہ خارجی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کے بارے میں ذکر کیا ہے فرمایا: تحقرون صلاتکم مع صلاتھم و صیامکم مع صیامھم وأعمالکم مع أعمالھم یَمْرُقُون من الدین کما یَمْرُق السھمُ من الرَّمِیَّة۔ تم اپنی نمازیں ان کی نمازوں کے مقابلہ میں، اپنے روزے ان کے روزوں کے مقابلہ میں، اپنے اعمال ان کے اعمال کے مقابلہ میں حقیر جانو گے وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے (☆)۔

**تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ**

''داخل ہوں گے دہکتی ہوئی آگ میں''۔

ان چہروں کو آگ کی تپش اور لپک پہنچے گی۔ حَامِيَةً سے مراد سخت گرم ہے یعنی اسے طویل مدت تک روشن کیا گیا اور جلایا گیا۔ اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: حَمِیَ النھار حَمِی التنور حمیًا یعنی اس کی گرمی شدید ہو گی۔ کسائی نے کہا: اشتد حمی الشمس و حموھا کا معنی ایک ہی ہے۔ ابو عمرو، ابو بکر اور یعقوب نے ضمہ کے ساتھ تُصلی پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اسے تَصلی بھی پڑھا گیا ہے اس بارے میں گفتگو اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ میں پہلے گزر چکی ہے۔ ماوردی نے کہا: اگر یہ کہا جائے اس کی صفت حَمْی سے لگانے کی کیا وجہ ہے جبکہ آگ تو گرم ہی ہوتی ہے (2) جب کہ یہ تو اس کے احوال میں سے کم حالت ہے تو اس ناقص صفت کے ساتھ مبالغہ کی کیا وجہ ہے؟ تو جواب دیا جائے گا: حامیہ سے مراد یہاں چار وجوہ سے مختلف ہے:

(۱) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ گرم ہو گی یہ دنیا کی آگ جیسی نہ ہو گی کہ جس کی گرمائش بجھانے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) حَامِيَةً سے مراد یہ ہے کہ یہ ممنوعات کے ارتکاب کی محفوظ چراگاہ ہے اور محارم کی پامالی کی محفوظ جگہ ہے جس طرح نبی

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 282-281 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 258

☆ صحیح بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین باب من ترک قتال الخوارج

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنّ لِکلّ ملك حِمَی وإنّ حمی الله محارمه ومن یرتع حول الحمی یوشك أن یقع فیه ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں جو آدمی چراگاہ کے اردگرد چرتا ہے ممکن ہے کہ وہ اس میں جا واقع ہو۔

(۳) وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھتی ہے کہ کوئی اس کو چھو سکے یا اس کو مس کرنے کا قصد کرے جس طرح شیر اپنی کچھار کی حفاظت کرتا ہے؛ اس کی مثل نابغہ کا شعر ہے۔

تعدو الذئاب علی من لا کلاب له　　وتتقی صَولَۃَ المستأسِدِ الحامِی

بھیڑیئے اس پر حملہ کرتے ہیں جس کے کتے نہیں ہوتے اور شیر دل حفاظت کرنے والے کے حملہ سے بچتے ہیں۔

(۴) وہ غضبناک ہے انتقام کی شدت میں مبالغہ کرنے والی ہے اس سے کسی شئی یا ذات کا گرم ہونا مراد نہیں جس طرح کہا جاتا ہے: قد حمی فلان جب وہ انتقام کے ارادہ سے غضبناک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کے ساتھ اس معنی کو واضح کیا۔ فرمایا: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (ملک: 8) قریب ہے غصہ سے پھٹ جائے۔

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝

''انہیں پلایا جائے گا کھولتے ہوئے چشمہ سے''۔

الآنی سے مراد وہ چیز ہے جس کی گرمی انتہا کو پہنچ جائے۔ یہ ایناء سے مشتق ہے جس کا معنی تاخیر ہے، اس معنی میں ہے آنیت و آذیت تو دیر سے آیا اور تو نے اذیت دی۔ آناہ یُؤنیہ ایناء اسے گرم کیا، اسے روکا اور اسے موخر کیا۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝ (الرحمٰن) وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔ مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ کا معنی تفاسیر میں یہ کیا گیا ہے: اس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اگر اس کا قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر گرے تو وہ پگھل جائیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اٰنِيَةٍ سے مراد ہے اس کی گرمی اپنے کمال کو آ پہنچی ہے جب سے اسے تخلیق کیا گیا ہے اس پر جہنم کو بھڑکایا گیا ہے ان جہنمیوں کو اس کی طرف پیاسا ہانکا جائے گا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ اپنی گرمی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے اور اس کے پینے کا وقت آچکا ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝

''انہیں کوئی کھانا نہ ملے گا بجز خاردار جھاڑ کے''۔

لَهُمْ کی ضمیر سے مراد جہنمی ہیں۔ جب پہلے ان کے مشروب کا ذکر کیا اب ان کے کھانے کا ذکر کیا۔ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ضَرِيْعٍ ایک ایسی جڑی بوٹی ہے جس کے کانٹے ہوتے ہیں جو زمین کے ساتھ لگی ہوتی ہے جب تک وہ تر ہو تو اسے شبرق کہتے ہیں جب وہ خشک ہو جائے تو اسے ضریع کہتے ہیں کوئی جانور اور چوپایہ اس کے قریب نہیں جاتا اور نہ ہی اسے کھاتا ہے، وہ قاتل زہر ہے یہ سب سے خبیث اور برا کھانا ہے؛ عام مفسرین کی یہی رائے ہے مگر ضحاک کی رائے مختلف ہے۔ اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جسے سمندر باہر پھینکتا ہے جسے ضریع کہتے ہیں یہ انسانوں کی

بجائے حیوانوں کی خوراک ہے جب اونٹ اسے کھائیں تو سیر نہیں ہوتے اور کمزوری کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ صحیح وہی ہے جو جمہور کا نقطہ نظر ہے کہ یہ ایک بوٹی ہے۔ ہذلی نے کہا: اور اونٹوں اور ان کی بری چراگاہ کا ذکر کیا:

وحُبِسْنَ فی هَزْمِ الضَّرِيع فكلُّها حَدْباءُ دامِيةُ اليدين حَرُودُ

انہیں تو نے پھوٹے ضریع پر روک دیا گیا ہے سب کی پشت کی ہڈیاں ظاہر ہیں ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے اور دودھ دوہنے سے انکاری ہیں۔

خلیل نے کہا: ضریع سبز بوٹی ہوتی ہے بدبودار ہوتی ہے سمندر جسے پھینکتا ہے۔ والبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: یہ آگ کا درخت ہے اگر یہ دنیا میں ہوتا تو زمین اور اس پر جو کچھ ہے سب کو جلا دیتا۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ پتھر ہے (1)؛ یہی بات عکرمہ نے کہی، زیادہ غالب یہی ہے کہ یہ کانٹے دار درخت ہے جیسے دنیا میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے: ''ضریع ایسی چیز ہے جو جہنم میں ہوگی جو کانٹے کے مشابہ ہے مصبر سے زیادہ کڑوی ہوگی، مردار سے زیادہ بدبودار ہوگی، آگ سے زیادہ گرم ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ضَرِیْع رکھا ہے''۔

خالد بن زیاد نے کہا: میں نے متوکل بن حمدان سے سنا جب کہ ان سے آیت کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا انہوں نے جواب دیا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ضریع جہنم کی آگ کا ایک درخت ہے اس کا پھل پیپ اور خون ہوگا وہ مصبر سے زیادہ کڑوا ہوگا یہ ان کا کھانا ہوگا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ عذاب میں سے ان چیزوں میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے (2)۔ ابن کیسان نے کہا: یہ ایسا کھانا ہے جس کے پاس وہ گڑگڑائیں گے، ذلیل و رسوا ہوں گے اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ و زاری کریں گے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کا کھانے والا اس کو ناپسند کرنے اور اس کی سختی کے باعث آہ و زاری کرے گا کہ اس عذاب سے اسے بری کر دیا جائے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا: یہ ضارع سے مشتق ہے جس کا معنی ذلیل ہے یعنی ذو ضراعة ذلت والا۔ حضرت حسن بصری سے یہ مروی ہے: یہی زقوم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جہنم میں ایک وادی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ (الحاقہ) آج اس کا یہاں کوئی دوست نہیں اس کا کوئی کھانا نہیں مگر غسلین۔ یہاں فرمایا: اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ یہ غسلین کے علاوہ کھانا ہے دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جہنم کے کئی درجے ہیں ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کا کھانا زقوم ہے ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا کھانا غسلین ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا کھانا ضریع ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا مشروب حمیم ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا مشروب پیپ ہے۔ کلبی نے کہا: ضریع ایسے درجے میں ہے جس میں کوئی اور نہیں زقوم ایک اور درجہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں آیتوں کو دو حالتوں پر محمول کیا جائے جس طرح ارشاد فرمایا: يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۙ (الرحمٰن) وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان۔ قتبی نے کہا: یہ جائز ہے کہ ضریع اور زقوم جہنم کی دو جڑی بوٹیاں ہوں یا دونوں کا جوہر ایسی چیز ہو جسے آگ نہیں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 259

2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 282

کھاتی۔ اسی طرح آگ زنجیریں، اس کے طوق، اس کے بچھو اور اس کے سانپ ہیں اگر یہ اس طرح ہوتے جس طرح ہم جانتے ہیں تو وہ آگ پر باقی نہ رہتے۔ کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں موجود ہم سے غائب پر ہماری راہنمائی کی اس چیز کی مدد سے جو ہمارے پاس حاضر ہے آسمان کی دلالت متفق ہے اور معانی مختلف ہیں۔ اس طرح جنت میں جو بھی درخت اور بستر ہیں زیادہ مناسب قول وہ ہے جو قتبی کا قول ہے کہ جو چیز کافروں کو جہنم میں ہمیشہ رکھتی ہے تا کہ ان پر عذاب دائمی ہو وہی چیز نباتات اور زقوم کے درخت کو آگ میں باقی رکھتی ہے تا کہ اس کے ذریعے کفار کو عذاب دے۔ بعض علماء کا خیال ہے ضریع بعینہ آگ میں نہیں اگتا اور نہ ہی وہ اسے کھاتے ہیں۔ ضریع چوپاؤں کی خوراک ہے یہ لوگوں کی خوراک نہیں جب اونٹ اسے کھائیں تو سیر نہیں ہوتے اور کمزوری کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ اس سے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ ایسی چیز سے روزی حاصل کرتے ہیں جو ان کو سیر نہیں کرتی ضریع کا ذکر بطور ضرب المثل کیا ہے کہ انہیں بھوک کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا جس طرح اسے تکلیف دی جاتی ہے جسے ضریع کھلایا جائے۔

ترمذی حکیم نے کہا: یہ قول کرنے والے کی جانب سے مریض نظر وفکر ہے اور حقیر تامل ہے گویا یہ اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں متحیر ہیں وہ ذات پاک جس نے اس مٹی میں ضریع کو اگایا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ دہکتی آگ میں اس ضریع کو اگائے۔ اللہ تعالیٰ نے سرسبز وشاداب درخت سے ہمارے لیے آگ بنائی نہ آگ اس درخت کو جلاتی ہے اور نہ درخت میں پانی کی رطوبت آگ کو بجھاتی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ (یاسین) وہ ذات پاک جس نے تمہارے لیے شاداب درخت سے آگ بنائی پس جس سے تم آگ روشن کرتے ہو، جس طرح یہ بات کی گئی جب یہ آیت وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ (الاسراء: 97) ہم انہیں قیامت کے روز ان کے مونہوں کے بل اٹھائیں گے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ اپنے مونہوں کے بل کیسے چلیں گے؟ فرمایا: وہ ذات جس نے انہیں ان کے پاؤں کے بل چلایا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ انہیں منہ کے بل چلائے۔ اس جیسی مثال میں سوائے دل کے ضعیف کے کوئی متحیر نہیں یا کیا ہم نے خبر نہیں دے دی جب بھی جلدیں پک جائیں گی تو ان کی جلدیں کسی اور چیز سے بدل دیں گے، اسی طرح فرمایا: سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (ابراہیم: 50) اور فرمایا: اِنَّ لَدَیْنَاۤ اَنْكَالًا (المزمل: 12) یعنی ہمارے پاس بیڑیاں ہیں۔ ذاغصته کا معنی ہے کانٹوں والا۔ ان پر عذاب ان اشیاء کی وجہ سے مختلف ہوگا۔

لَّا یُسْمِنُ وَ لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ ۝

''جو نہ فربہ کرے گا نہ بھوک دور کرے گا''۔

یعنی ضریع کو کھانے والا موٹا نہیں ہوگا۔ جو کانٹے کھاتا ہے وہ کیسے موٹا ہوگا؟ مفسرین نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا: ہمارے اونٹ تو ضریع کھا کر موٹے ہو جاتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی: انہوں نے جھوٹ بولا کیونکہ اونٹ اسے اس وقت کھاتا ہے جب وہ تر ہو جب وہ خشک ہو جائے تو اسے نہیں کھاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان پر اس کا معاملہ مشتبہ ہو گیا انہوں نے اسے گمان کیا یہ بھی دوسری نفع مند جڑی بوٹیوں کی طرح ہے، کیونکہ مضارعة کا معنی مشابہت ہے انہوں نے

اسے پایا کہ وہ نہ اسے موٹا کرتی ہے اور نہ ہی بھوک مٹاتی ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾

''کتنے ہی چہرے اس دن بارونق ہوں گے اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے عالیشان جنت میں''۔

یہاں نَّاعِمَةٌ نسبت کے معنی میں ہے یعنی ذات نعمة یہ مومنوں کے چہرے ہوں گے انہوں نے اپنے امر اور اپنے عمل صالح کا انجام دیکھا تو وہ خوش ہو گئے جب انہیں اپنے عمل کے بدلے جنت دی جائے گی تو وہ ناراض ہو جائیں گے، اس کا مجازی معنی یہ ہوگا: انہوں نے جو عمل کیا ہوگا اس پر وہ راضی ہوگا۔ یہاں واؤ مضمر ہے معنی ہے۔ ووجوہ یومئذ واؤ مضمر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اور متقدم وجوہ کے درمیان فاصلہ ہے وجوہ سے مراد نفوس (ذاتیں) ہیں۔

وہ بلند جنت میں ہوں گے کیونکہ یہ آسمانوں سے بھی اوپر ہے جس طرح یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قدر و منزلت میں بلند ہیں کیونکہ ان میں وہ کچھ ہے جس کی نفوس خواہش کرتے ہیں اور آنکھیں لذت حاصل کرتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿۱۱﴾

''نہ سنیں گے وہاں کوئی لغوبات''۔

کوئی ایسی گفتگو نہیں سنیں گے جو ان کے مقام سے فروتر ہو اور ناپسندیدہ ہو کہا: لَاغِيَةً لغو اور لغلسب کا ایک ہی معنی ہے۔ کہا: عن اللغا و رفث التکلم لغوبات اور بے حیائی کی باتوں سے۔

فراء اور اخفش نے کہا: اس میں تو کوئی لغو کلمہ نہیں سنے گا۔ اس کی مراد میں چھ وجوہ ہیں:

(۱) اس میں جھوٹ، بہتان اور اللہ تعالیٰ کا انکار نہ سنیں گے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے۔

(۲) نہ باطل اور نہ گناہ کی کوئی بات سنیں گے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

(۳) اس سے مراد گالی ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔

(۴) وہ معصیت کے بارے میں نہ سنیں گے؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

(۵) کسی قسم اٹھانے والے کے بارے میں نہ سنا جائے گا کہ وہ جھوٹی قسم اٹھاتا ہے؛ یہ فراء کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: جنت میں کسی آدمی کے بارے میں نہیں سنا جائے گا کہ وہ سچی یا جھوٹی قسم اٹھاتا ہے۔

(۶) ان کی گفتگو میں کوئی لغو کلمہ نہیں سنا جائے گا کیونکہ جنتی صرف حکمت کی بات کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جن دائمی نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں؛ یہ بھی فراء کا قول ہے۔ یہ سب سے اچھا قول ہے کیونکہ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے سب کو عام ہے۔

ابو عمرو اور ابن کثیر نے اسے لا یسمع پڑھا ہے کہ یہ نائب الفاعل ہے اسی طرح نافع نے بھی بات کی ہے مگر یہ تاء مضموم کے ساتھ ہے، کیونکہ لاغیۃ اسم مونث ہے فعل کو اس کی وجہ سے مونث ذکر کیا گیا ہے۔ جس نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے

اس کے نزدیک وجہ یہ ہے کہ فعل اور فاعل کے درمیان جار مجرور ہے، باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور مفتوح پڑھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وجوہ کی طرف منسوب ہے معنی یہ بنے گا اس میں وجوہ کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّ زَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿۱۶﴾

''اس میں چشمہ جاری ہوگا۔ اس میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوں گے، اور ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے، اور گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے، اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے''۔

اس میں اچھلتے پانیوں والے جاری چشمے ہوں گے اور مختلف قسم کے لذیذ مشروبات ان کی زمین پر بغیر کسی کھائی کے جاری ہوں گے۔ سورۃ الانسان میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس میں چشمے ہوں گے۔ عَيْنٌ، عیون کے معنی میں ہے۔ واللہ اعلم۔

اس میں بلند پلنگ ہوں گے۔ روایت بیان کی گئی ہے: اس کی بلندی اس قدر ہوگی جتنی آسمان اور زمین کے درمیان ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کا ولی اپنے اردگرد اپنے ملک کو دیکھ سکے۔

اس میں لوٹے اور برتن ہوں گے۔ ابریق اسے کہتے ہیں جس کا دستہ اور سنت ہوتی ہے۔ کوب ایسے برتن کو کہتے ہیں جس کا دستہ اور سنت نہیں ہوتی۔ سورۂ زخرف اور دوسری سورتوں میں یہ گزر چکا ہے۔

تکیے ہوں گے نمارق کی واحد نمرقۃ ہے وہ ایک دوسرے کے پہلو میں ہوں گے؛ شاعر نے کہا:

وإنا لنُجرِی الکاس بین شُروبنا وبینَ أبی قابوسَ فَوقَ النَّمارقِ

بے شک ہم بھرا ہوا جام اپنی باری اور ابو قابوس کے درمیان تکیوں پر چلاتے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

کُھولٌ وشبانٌ حِسانٌ وجوھُھُم علی سُرُرٍ مَصفوفۃ و نمارقِ

پکی عمر کے اور جوان جن کے چہرے حسین ہیں وہ صف در صف پلنگوں اور تکیوں پر ہیں۔

صحاح میں ہے: النمرق اور النمرقۃ دونوں سے مراد چھوٹا تکیہ ہے اسی طرح نمرقۃ بھی ایک لغت ہے یعقوب نے اس کی حکایت بیان کی ہے۔ بعض اوقات کجاوے کے اوپر جو چٹائی سی رکھی جاتی ہے اسے نُمرقۃ کہتے ہیں؛ یہ ابو عبید سے مروی ہے۔

ابو عبید نے کہا: زَرَابِيُّ سے مراد قالین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: زرابی ان چٹائیوں کو کہتے ہیں جن کا رواں نرم ہوتا ہے۔ اس کا واحد زربیۃ ہے۔ کلبی اور فراء نے کہا مَبْثُوثَةٌ کا معنی پھیلائی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ایک دوسرے کے اوپر ہوں گی؛ یہ عکرمہ نے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بہت زیادہ۔ ایک قول کیا گیا: مجالس میں متفرق؛ یہ قتبی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: آخری معنی زیادہ صحیح ہے وہ قالین بہت زیادہ اور الگ الگ جگہ پر ہوں گی۔ اس معنی میں وَ بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (البقرہ: 164) کا لفظ ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: ہمیں احمد بن حسین نے انہیں حسین بن عرفہ نے انہیں عمار بن محمد نے روایت نقل کی ہے کہ میں نے منصور بن معتمر کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ پڑھی اس

میں وَّ زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝ پڑھا یعنی اس میں بچھے قالین ہوں گے جن میں ٹیک لگائے ہوئے خوش وخرم ہوں گے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۝

''کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے''۔

مفسرین نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے جنت و دوزخ کے اہل کا ذکر کیا تو کفار اس پر متعجب ہوئے انہوں نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنی صنعت اور قدرت کا ذکر کیا اور یہ ذکر کیا کہ وہ ہر چیز پر اس طرح قادر ہے جس طرح اس نے حیوانات، آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ پھر پہلے اونٹ کا ذکر کیا کیونکہ عربوں میں یہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور انہوں نے ہاتھیوں کو نہیں دیکھا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم مخلوق پر متنبہ کیا اللہ تعالیٰ اسے ایک چھوٹے سے بچے کے لیے مسخر کر دیا ہے جو اس کی مہار پکڑ لیتا ہے اسے بٹھاتا ہے اور اٹھاتا ہے وہ اس کے اوپر سامان لاد دیتا ہے جب کہ وہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے وہ بھاری وزن کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے یہ وصف کسی اور جاندار میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ایک عظیم چیز دکھائی جو اس کی مخلوقات میں سے ایک چھوٹی سی چیز کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کی توحید اور عظیم قدرت پر راہنمائی کرتی ہے۔

ایک حکیم کے بارے میں حکایت بیان کی گئی ہے۔ اس کے سامنے اونٹ اور اس کی عجیب وغریب تخلیق کے بارے میں ذکر کیا گیا جبکہ وہ ایسے علاقے میں پیدا ہوا تھا جہاں اونٹ نہیں ہوتے تھے۔ اس نے غور کیا اور کہا: ممکن ہے اس کی گردن لمبی ہو اور جب اللہ تعالیٰ نے اسے خشکی کی کشتیاں بنایا تو اسے پیاس برداشت کرنے پر صابر بنا دیا یہاں تک کہ وہ دس دن سے زائد پیاسا رہ سکتا ہے اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ جنگلوں صحراؤں میں ہر شئی کو چر لیتا ہے جسے دوسرے جانور نہیں چرتے (1)۔

ایک قول یہ کیا گیا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے بلند پلنگوں کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا: ہم اس پر کیسے چڑھیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا اور یہ واضح کیا کہ اونٹ بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ ان پر بوجھ لادا جاتا ہے پھر وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اس طرح وہ پلنگ نیچے ہو جاتے ہیں پھر بلند ہو جاتے ہیں؛ اس معنی کی وضاحت قتادہ، مقاتل اور دوسرے علماء نے کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ابل سے مراد بادل کے عظیم ٹکڑے ہیں؛ یہ مبرد نے کہا: ثعلبی نے کہا: ابل کا یہاں معنی بادل کیا گیا ہے ہم نے ائمہ کی کتابوں میں اس کی کوئی اصل نہیں دیکھی۔

میں کہتا ہوں: اصمعی ابو سعید عبد الملک بن قریب نے ذکر کیا ابو عمرو نے کہا: جس نے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۝ میں الْاِبِلِ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا اس نے اس سے مراد اونٹ لیا ہے کیونکہ یہ چار ٹانگوں والا ہے وہ بیٹھتا ہے تو اس پر بوجھ لادا جاتا ہے جب کہ دوسرے جانوروں پر اس وقت بوجھ لادا جاتا ہے جب وہ کھڑے ہوتے ہیں۔ جس نے الْاِبِلِ کو لام شدد کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اس سے مراد بادل لیا ہے جو پانی اور بارش اٹھاتا ہے۔

ماوردی نے کہا: ابل میں دو توجیہیں ہیں: (1) دونوں سے زیادہ نمایاں اور مشہور ہے وہ یہ ہے کہ یہ چوپایا ہے (۲) یہ

1۔ الکشاف، جلد 4، صفحہ 247

بادل ہے۔ اگر اس سے مراد بادل ہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور تمام مخلوقات کے منافع عام پر دال ہے۔ اگر مراد چوپاؤں میں سے اونٹ ہیں تو کیونکہ اونٹ تمام حیوانات سے زیادہ منافع کو جامع ہے کیونکہ حیوانات کی چار قسمیں ہیں (۱) دودھ دینے والے (۲) سواری والے (۳) کھائے جانے والے (۴) بار برداری کے کام آنے والے۔ اونٹ ان چاروں کو جامع ہے۔ اس میں نعمت عام ہے اور اس میں قدرت زیادہ مکمل ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کا خصوصاً ذکر کیا ہے کیونکہ یہ گٹھلی اور رقت (صحرائی دانہ) کھاتا ہے اور دودھ دیتا ہے۔ حضرت حسن بصری سے اس کے بارے میں پوچھا گیا اور کہا: ہاتھی عجوبہ ہونے میں بڑھ کر ہے؟ فرمایا: عرب کا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا پھر وہ خنزیر کی طرح ہے اس کا گوشت نہیں کھایا جاتا اس کی پیٹھ پر سوار نہیں ہوا جاتا اور اس کا دودھ نہیں دوہا جاتا۔ قاضی شریح کہا کرتے تھے: ہمیں کناسہ (کوفہ کی منڈی) کی طرف لے چلو تا کہ ہم اونٹ کو دیکھیں کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا۔ الْإِبِلِ کے لفظ میں کوئی واحد نہیں یہ مونث ہے کیونکہ اسم جمع کے لفظوں میں کوئی واحد نہیں ہوتا جب اسم جمع غیر انسانوں کے لیے استعمال ہو تو اس میں تانیث لازمی ہوتی ہے جب تو اس کو مصغر بنائے تو اس پر ھا داخل کرے گا تو تو کہے گا: ابیلۃ اغنیمۃ وغیرہ بعض اوقات اِبِل کو ابْل پڑھتے ہیں اس کی جمع آبال آتی ہے۔

**وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾**

''اور آسمانوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے۔ اور زمین کی طرف کہ اسے کیسے بچھایا گیا ہے''۔

یعنی آسمان کو بغیر ستونوں کے زمین سے بلند کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسے بلند کیا گیا کہ اسے کوئی چیز نہیں پہنچتی۔

پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے زمین پر نصب کر دیا گیا ہے کہ وہ زائل نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ بنی کہ جب زمین کو پھیلایا گیا تو وہ ایک طرف جھکنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اسے پہاڑوں کے ذریعے قائم کر دیا، جس طرح فرمایا: وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ (الانبیاء: 31) اور ہم نے بنا دیئے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ تا کہ زمین لرزتی نہ رہے ان کے ساتھ۔

زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اسے پھیلا دیا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے ان تمام افعال کو واحد متکلم ماضی کا صیغہ پڑھا اور ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ محمد بن سمیقع اور ابوالعالیہ بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔ مفعول بہ محذوف ہے معنی ہے میں نے اسے پیدا کیا اس طرح باقی ماندہ افعال ہیں۔

حضرت حسن بصری، ابوحیوہ اور ابورجاء نے اسے سُطِّحت پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے اس طرح پڑھا مگر طاء میں تخفیف کی ابل کو پہلے ذکر کیا اگر کسی اور چیز کو پہلے ذکر کیا تو جائز ہے۔ قشیری نے کہا: یہ ایسی چیز نہیں جس میں کسی قسم کی حکمت کا مطالبہ کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عربوں کے حق میں یہ لوگوں کے سب سے قریب ہے کیونکہ ان کے ہاں اونٹ بہت

زیادہ ہوتے ہیں اور اونٹ کے بارے میں یہ لوگوں کی بنسبت زیادہ جانتے ہیں نیز اونٹوں کے فوائد دوسرے حیوانات کی بنسبت بہت زیادہ ہیں اس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کا دودھ پیا جاتا ہے، یہ بار برداری اور سواری کے قابل ہے، لمبی مسافتیں اس پر طے کی جاتی ہیں، یہ پیاس پر صبر کر سکتا ہے، چارہ کم کھاتا ہے، بہت زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے، عربوں کا سب سے قیمتی مال ہے عرب اونٹوں پر تنہا سفر کرتے ہیں جبکہ وہ لوگوں سے وحشت محسوس کرتے تھے وہ اپنی سواری میں دیکھتا پھر اس کی نظر آسمان کی طرف چلی جاتی پھر زمین کی طرف چلی جاتی اس وجہ سے انہیں ان چیزوں میں غور و فکر کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ مختار اور قادر صانع پر واضح ترین دلیل ہے۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾
فَيُعَذِّبُهُ ٱللَّهُ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

"پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں مگر جس نے روگردانی کی اور کفر کیا تو اللہ اس کو سخت عذاب دے گا۔ بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے"۔

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نصیحت کیجئے اور انہیں خبردار کیجئے آپ تو محض نصیحت کرنے والے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر مسلط نہیں کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قتل کر دیں پھر اسے جہاد والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ ہارون اعور نے اسے بمسیطر پڑھا ہے اسی طرح الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ (طور) پڑھا ہے۔ یہ بنو تمیم کی لغت ہے۔ صحاح میں ہے: مسیطر اور مصیطر کا معنی ہے جو کسی پر مسلط ہو، تاکہ اس پر نگاہ رکھے، اس کے احوال کا جائزہ لے اور اس کے عمل کو لکھے اصل میں یہ سطر سے مشتق ہے کیونکہ سطر کا معنی ہے کہ وہ تجاوز نہ کرے کیونکہ کتاب مسطر ہے جو ایسا کرتا ہے وہ مُسَطِر اور مُسَيطِر ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: سیطرت علینا تو نے ہم پر تسلط پالیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ یعنی اس کو پچھاڑ دیا۔

إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ یہ مستثنیٰ منقطع ہے لیکن جو وعظ اور تذکیر سے روگردانی کرے عذاب اکبر سے مراد جہنم ہے جس کا عذاب دائمی ہے یہاں آخرت کے عذاب کے لیے اکبر کا لفظ ذکر کیا کیونکہ دنیا میں انہیں بھوک، قحط، قید اور قتل کی سزا دی گئی اس تاویل کی دلیل حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ فَإِنَّهُ يُعَذِّبُهُ الله۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مستثنیٰ متصل ہے معنی یہ ہوگا آپ مسلط نہیں ہیں مگر ان لوگوں پر جنہوں نے اعراض کیا اور کفر کا ارتکاب کیا۔ آپ ان پر جہاد کے ذریعے مسلط ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں عذاب اکبر کا عذاب دے گا۔ اس تعبیر کی بنا پر آیت میں کوئی نسخ نہیں۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے ارتداد اختیار کیا تھا آپ نے تین دن تک اس سے توبہ کا مطالبہ کیا تو وہ اسلام کی طرف واپس نہ لوٹا آپ نے اس کی گردن اڑا دی اور یہ آیت تلاوت کی: إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے اسے آلا پڑھا ہے اس سے مراد نئی کلام کا آغاز اور تنبیہ ہے۔ جس طرح امرء القیس کا قول ہے:

اَلَا رُبَّ یومٍ لَکَ مِنْھُنَّ صَالِحٍ

خبردار! تیرے لیے ان کے کئی اچھے دن ہیں۔

مَنْ اس تعبیر کی بنا پر شرط کا معنی دے گا اس کا جواب فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ ہے فاء کے بعد مبتدا مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فھو یُعَذِّبُہُ اللہ کیونکہ اگر جواب کا ارادہ فعل سے ہوتا جو فاء کے بعد ہے تو کلام یوں ہوگا إلّا من تولی و کفر یُعَذِّبہ اللہ۔

موت کے بعد ان کا رجوع ہماری طرف ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: آب، یَئُوبُ جس کا معنی لوٹنا ہے؛ عبید نے کہا:

وکُلُّ ذی غَیْبَۃٍ یَئُوبُ وغائب الموتِ لا یَئُوبُ

ہر غائب لوٹ آتا ہے موت کا غائب ہونے والا نہیں لوٹتا۔

ابوجعفر نے ایابھم پڑھا۔ ابو حاتم نے کہا: تشدید جائز نہیں اگر یہ جائز ہوتا تو پھر صیام اور قیام میں بھی جائز ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہی ہے۔ زمخشری نے کہا: ابوجعفر مدنی نے ایابھم پڑھا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ فیعال کا وزن ہے ایب کا مصدر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ ایاب ہے یا یہ اصل میں أوّاب ہے فَعّال کا وزن ہے جو اوب سے مشتق ہے پھر ایواب بنا جس طرح دیوان اصل میں دوّان تھا پھر اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا گیا ہے جو سید کے ساتھ کیا گیا۔

# سورۃ الفجر

آیاتہا ۳۰ ۸۹ سورۃ الفجر مکیۃ ۱۰ رکوعہا ۱

یہ مکی ہے۔ اس کی تیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

**وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾**

''قسم اس صبح کی اور ان (مقدس) دس راتوں کی''۔

اللہ تعالیٰ نے فجر کی قسم اٹھائی، یہاں پانچ قسمیں ہیں فجر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے کہ یہاں فجر سے مراد ہر روز دن سے ظلمت کا چھٹ جانا ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا، ابن زبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد تمام دن ہے اس کو فجر سے تعبیر کیا کیونکہ یہ دن کا پہلا جز ہوتا ہے۔ ابن محیصن نے عطیہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں: اس سے مراد محرم کے دن کی فجر ہے۔ قتادہ نے بھی اس کی مثل کہا ہے کہ یہ محرم کے پہلے دن کی فجر ہے۔ اس سے سال شروع ہوتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ صبح کی نماز ہے۔ ابن جریج نے عطا سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ فجر سے مراد یوم نحر کی صبح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے لیے اس سے پہلی رات بنائی ہے مگر یوم نحر۔ اس کے لیے صرف پہلی یا بعد والی رات نہیں بنائی کیونکہ یوم عرفہ کی دو راتیں ہیں۔ اس کے قبل والی رات اور اس کے بعد والی رات۔ جس نے یوم عرفہ کے بعد والی رات میں طلوع فجر تک مقام عرفات میں وقوف کو پالیا تو اس نے حج کو پالیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: فجر سے مراد مزدلفہ کے دن فجر کا پھوٹنا ہے۔ محمد بن کعب قرظی سے مروی ہے کہ فجر سے مراد دس دنوں کے آخری دن کی فجر ہے، جب تو مزدلفہ سے روانہ ہو۔ ضحاک نے کہا: ذی الحجہ کی فجر مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنوں کو اس کے ساتھ ملایا ہے ارشاد فرمایا: **وَلَیَالٍ عَشۡرٍ** یعنی ذی الحجہ کی دس راتیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مسروق نے کہا: اس سے وہ دس راتیں مراد ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: **وَاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ** (الاعراف: 142) اور ہم نے انہیں دس کے ساتھ مکمل کر دیا۔ یہ سال کے افضل ترین دن ہیں۔

ابوزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾** کہا: اس سے مراد دسویں ذی الحجہ کی فجر ہے'' اس قول کی بنیاد پر یہ دس راتیں ہیں کیونکہ یوم نحر کی رات بھی اس میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے خاص کیا کہ اسے اس آدمی کے لیے وقوف کا وقت بنا دیا جس نے یوم عرفہ کو وقوف نہ پایا تھا اسے نکرہ

ذکر کیا ہے اسے معرف ذکر نہیں کیا کیونکہ اسے غیر پر فضیلت حاصل ہے اگر اسے معرفہ ذکر کیا جاتا تو یہ اس فضیلت کی حامل نہ ہوتی جو فضیلت نکرہ میں ہوتی ہے تو جن چیزوں کی قسم اٹھائی گئی ہے ان میں سے اسے نکرہ ذکر کیا کیونکہ اس میں وہ فضیلت ہے جو غیر میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ رمضان شریف کی آخری دس راتیں ہیں؛ یہ ضحاک نے کہا: حضرت ابن عباس، یمان اور طبری نے کہا: یہ محرم کا پہلا عشرہ ہے جس کا دسواں یوم عاشوراء ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ وہ اضافت کی صورت میں یہ پڑھتے وَلَيَالِ عَشْرٍ اس سے ان کی مراد دس دنوں کی راتیں ہیں۔

## وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝

''اور قسم ہے جفت اور طاق راتوں کی''۔

شفع سے مراد دو اور وتر سے مراد فرد ہے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حضرت عمران بن حصین سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''شفع اور وتر سے مراد نماز ہے نمازوں میں سے کچھ جفت ہیں اور کچھ طاق ہیں'' (1)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ سے مراد صبح اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ وتر سے مراد یوم عرفہ اور شفع سے مراد یوم نحر ہے''۔ یہ حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا قول ہے؛ نحاس نے اسے پسند کیا ہے۔ کہا: ابوزبیر کی حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی جو حدیث ہے یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ یہ اسناد کے اعتبار سے عمران بن حصین کی حدیث سے سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ یوم عرفہ وتر ہے کیونکہ وہ نواں ہے اور یوم نحر شفع ہے کیونکہ وہ دسواں ہے۔ حضرت ابو ایوب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''شفع سے مراد یوم عرفہ اور یوم نحر ہے اور وتر سے مراد یوم نحر کی رات ہے'' مجاہد اور حضرت ابن عباس نے بھی یہی کہا: شفع سے مراد اس کی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝ (النبا) اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا بنایا۔ وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مجاہد سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کسی سے روایت کرتے ہیں؟ کہا: ہاں۔ حضرت ابو سعید خدری سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، اس کی مثل محمد بن سیرین، مسروق، ابو صالح اور قتادہ سے مروی ہے کہا: شفع سے مراد مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات: 49) ہم نے ہر شئی کے جوڑے بنائے۔ کفر و ایمان، شقاوت و سعادت، ہدایت و گمراہی، نور و ظلمت، رات و دن، گرمی و سردی، سورج و چاند، موسم گرما، موسم سرما، آسمان و زمین، جن و انسان اور وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (اخلاص) کہہ دیجئے: وہ اللہ ایک ہے وہ بے نیاز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شفع سے مراد صبح کی نماز اور وتر سے مراد مغرب کی نماز ہے''۔ ربیع بن انس اور ابو العالیہ نے کہا: اس سے مراد مغرب کی نماز ہے شفع سے مراد دو رکعتیں اور وتر سے مراد تیسری رکعت ہے۔ حضرت ابن زبیر نے کہا: شفع سے مراد منیٰ کے دو دن ہیں

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الفجر، حدیث نمبر 3265، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گیارہویں اور بارہویں اور تیرہویں کا دن وتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرہ:203) جو دو دنوں میں جلدی واپس چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو اس سے تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ ضحاک نے کہا: شفع سے مراد ذی الحجہ کے دس دن ہیں اور وتر سے مراد منیٰ کے تین دن ہیں؛ یہ عطا کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے شفع اور وتر سے مراد آدم و حوا ہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تنہا تھے تو انہیں ان کی بیوی کی وجہ سے جفت بنا دیا گیا پس وہ طاق کے بعد جفت بن گئے؛ اسے ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے۔ قشیری نے اسے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: ایک روایت میں ہے شفع سے مراد حضرت آدم و حوا ہیں اور وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شفع اور وتر سے مراد مخلوق ہیں کیونکہ مخلوق جفت بھی ہے اور طاق بھی ہے گویا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی قسم اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ اپنے اسماء اور صفات کی قسم اٹھاتا ہے کیونکہ وہ انہیں جانتا ہے وہ اپنے افعال کی قسم اٹھاتا ہے کیونکہ وہ ان پر قادر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰىٓ ۙ (اللیل) اور جو دوسرے مذکر مونث پیدا کیے۔ وہ اپنے مفعولوں کی قسم اٹھاتا ہے اس کی صنعت میں عجائب ہیں، جس طرح فرمایا: وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۙ (الشمس:1) وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۙ (الشمس) وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ (الطارق) ایک قول یہ کیا گیا ہے: شفع سے مراد جنت کے درجات ہیں جو آٹھ ہیں وتر سے مراد جہنم کے گڑھے ہیں کیونکہ وہ سات ہیں: یہ حسین بن فضل کا قول ہے گویا جنت اور آگ کی قسم اٹھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا: شفع سے مراد صفا اور مروہ ہے اور وتر سے مراد کعبہ ہے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: شفع سے مراد دن اور راتیں ہیں اور وتر سے مراد وہ دن ہے جس کے بعد کوئی رات نہ ہو۔ یہ یوم قیامت ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے شفع سے مراد بھی وہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ:7) تین افراد میں سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ چوتھا ہوتا ہے۔ ابو بکر وراق نے کہا: شفع سے مراد مخلوقات کے اوصاف کا تضاد ہے عزت، ذلت، قدرت، عجز، قوت، ضعف، علم، جہالت، زندگی، موت، بینائی، اندھاپن، سماعت، بہراپن، گفتگو، گونگاپن اور وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں وہاں عزت تو ہے ذلت نہیں، قدرت تو ہے عجز نہیں، قوت تو ہے ضعف نہیں، علم تو ہے جہالت نہیں، زندگی تو ہے موت نہیں، بینائی تو ہے اندھاپن نہیں، گفتگو تو ہے گونگاپن نہیں، سماعت تو ہے بہرہ پن نہیں وغیرہ۔

حضرت حسن بصری نے کہا: شفع اور وتر سے مراد تمام اعداد ہیں کیونکہ کوئی بھی عدد ان سے خالی نہیں پس یہ حساب کی قسم اٹھانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: شفع سے مراد مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کی مسجد ہے یہ دونوں حرم ہیں وتر سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شفع سے مراد حج اور عمرہ کو ملاتا ہے یا حج کے ساتھ عمرہ سے لطف اندوز ہوتا ہے یعنی حج قران اور حج تمتع۔ وتر سے مراد حج مفرد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: شفع سے مراد حیوان ہے کیونکہ وہ مذکر و مونث ہوتا ہے وتر سے مراد جماد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ شفع سے مراد ہے جو چیز بڑھتی ہے اور وتر سے مراد ہے جو چیز نہیں بڑھتی۔ اس کے لیے بھی کئی اقوال ہیں۔ حضرت ابن مسعود، آپ کے اصحاب، کسائی، حمزہ اور خلف نے وِتر پڑھا ہے جب کہ باقی قراء نے وَتر پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ صحاح میں ہے: وِتر سے مراد فرد ہے اور وَتر سے مراد کینہ اور عداوت

ہے، یہ اہل عالیہ کی لغت ہے جہاں تک اہل حجاز کی لغت کا تعلق ہے وہ ان سے متضاد ہے جہاں تک بنو تمیم کا تعلق ہے دونوں میں کسرہ دیتے ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۞ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۞

''اور رات کی جب گزرنے لگے۔ یقیناً اس میں قسم ہے عقل مند کے لیے''۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ یہ پانچویں قسم ہے پہلے دس خاص راتوں کی قسم اٹھائی اب عام رات کی قسم اٹھائی۔ یسر کا معنی ہے جس میں چلا جاتا ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: لیل نائم، نہار صائم۔ شاعر نے کہا:

لَقَدْ لُمْتِنَا يا أُمَّ غَيلان في السُّرى ونِمْتِ وما ليلُ المطِيّ بنائِم

اے ام غیلان! تو نے رات کے چلنے میں ہماری ملامت کی تو خود سوگئی اور سواری کی رات نہ سوئی۔

اس معنی میں ہے: بل مکر اللیل و النہار (السباء: 34) یہ اکثر علماء معانی کا نقطہ نظر ہے؛ یہی قتبی اور اخفش کا قول ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یسر کا معنی ہے وہ چلا اور گیا۔ قتادہ اور ابو العالیہ نے کہا: معنی ہے آیا اور متوجہ ہوا۔ ابراہیم سے مروی ہے: جب وہ قائم ہوگئی۔ عکرمہ، کلبی، مجاہد اور محمد بن کعب نے کہا: الَّيْلِ سے مراد خاص کر مزدلفہ کی رات ہے کیونکہ اس رات میں لوگ خصوصاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد لیلۃ القدر ہے کیونکہ رحمت اس میں سرایت کر جاتی ہے اور یہ ثواب کی زیادتی کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام راتوں کا ارادہ کیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہی بات زیادہ نمایاں ہے جس طرح پہلے گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابن کثیر، ابن محیصن اور یعقوب نے یسری پڑھا ہے دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا جس طرح اصل قاعدہ ہے کیونکہ یہ مجزوم نہیں اس میں یاء ثابت ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے وصل کی صورت میں اسے ثابت رکھا ہے اور وقف کی صورت میں اسے حذف کیا ہے اور کسائی سے مروی ہے ابو عبید نے کہا: کسائی ایک دفعہ مصحف کی اتباع میں وصل کی صورت میں یاء کو ثبت کرنے کا کہا کرتے اور وقف میں حذف کا کہا کرتے پھر دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کرنے کا قول کیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے؛ یہی اہل شام اور کوفہ کے قراء کی قراءت ہے اور ابو عبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے وہ خط کی اتباع کرتے ہیں کیونکہ وہ مصحف میں بغیر یاء کے ہے۔ خلیل نے کہا: اس سے یاء ساقط ہوگی کیونکہ یہ آیات کے سرے ہیں۔ فراء نے کہا: عرب کبھی یاء کو حذف کر دیتے ہیں اور ماقبل کے کسرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

كَفَّاكَ كَفٌّ ما تُلِيقُ دِرْهَمًا جُودا وأخرى تعطِ بالسَّيف الدِّما

تیرے لیے وہ ہاتھ کافی ہے جو سخاوت کے طور پر درہم دیتا ہے اور دوسری دفعہ تلوار کے ذریعے قصاص دیتا ہے۔

اس شعر میں تعط محل استدلال ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان مایلیق درھما من جودہ فلاں آدمی اپنی سخاوت میں درہم کو نہیں روکتا اور نہ اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ مورج نے کہا: میں نے اخفش سے یسر میں یاء کے اسقاط کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

میں تجھے کوئی جواب نہ دوں گا یہاں تک کہ تو میرے دروازے پر ایک سال رات گزارے تو میں نے اس کے دروازے پر ایک سال گزارا تو انہوں نے کہا: اللیل لا یسری وانما یسری فیہ۔ رات نہیں چلتی بلکہ اس میں چلا جاتا ہے، اسے اصل سے پھیرا گیا ہے جس کو تو اس کی جہت سے پھیرے گا تو اس کو اس کے اعراب سے گھٹا دے گا۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی طرف نہیں دیکھتا: وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (مریم) اسے بغیۃ نہیں کہا کیونکہ اسے باغیۃ سے پھیرا گیا ہے۔ زمخشری نے کہا: یسری کی یاء درمیان کلام میں حذف ہو جاتی کیونکہ حرف کسرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے جہاں تک وقف کا تعلق ہے تو اسے کسرہ کے ساتھ حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمام اسماء قسم کے ساتھ مجرور ہیں۔ جواب محذوف ہے وہ لَيُعَذِّبُنَّ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِى الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ (الفجر) ابن انباری نے کہا: جواب اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ہے۔ مقاتل نے کہا: یہاں هَلْ، اِنَّ کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ان فی ذلك قسما لذی حجر، پس یہاں هَلْ جواب قسم کے محل میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس استفہام کے باب سے ہے جس کا معنی پختہ کرنا ہوتا ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے: اَلَمْ اُنْعِمْ علیك یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو نے انعام کیا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اس کی تاکید ہوتی ہے جس کے ساتھ قسم اٹھائی جائے یا جس پر قسم اٹھائی جائے معنی یہ ہوگا بلکہ دانشمند کے لیے اس میں کفایت ہے۔ اس صورت میں جواب اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ہے یا وہ مضمر محذوف ہے اور لِّذِىْ حِجْرٍ کا معنی ہے دانش و عقل والا۔

وکیفَ یرجی أنْ تَتُوبَ وانّما یُرجی من الفتیانِ مَنْ کان ذا حِجْر

تجھ سے توبہ کی امید کیسے کی جا سکتی ہے نوجوانوں میں سے دانشمند سے ایسی امید کی جا سکتی ہے۔

عام مفسرین نے اسی طرح کہا ہے مگر ابو مالک نے کہا: لِّذِىْ حِجْرٍ کا معنی ہے لوگوں میں سے پردہ والے کے لیے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: حلم والے کے لیے، پردہ والے کے لیے۔ سب عقل کے معنی میں ہیں۔ حِجْرٍ کا اصل معنی روکنا ہوتا ہے جو اپنے نفس کا مالک ہو اور اسے روکے اسے کہتے ہیں: ذو حجر۔ اس معنی میں حِجْرٍ ہے کیونکہ وہ اپنی سختی کی وجہ سے محفوظ ہوتا ہے اس معنی میں حجر الحاکم علی فلان حاکم نے فلاں کو تصرف سے روک دیا اس وجہ سے حَجرۃ کو حُجرۃ کہتے ہیں کیونکہ اس کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کمرہ کی وجہ سے محفوظ ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: عرب کہتے ہیں انہ لذو حجر جب وہ نفس پر غالب اور ضابط ہو گویا اس نے یہ حجرتُ علی الرجلِ سے اخذ کیا ہے۔

## اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝

”کیا آپ نے ملاحظہ نہ کیا کہ آپ کے رب نے کیا کیا عاد، ارم کے ساتھ جو اونچے ستونوں والے تھے“۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ، رَبُّكَ سے مراد تیرا مالک اور تیرا خالق ہے۔ عام قراءت عادٍ ہے۔ حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ نے بعادِ ارمَ کی صورت میں پڑھا ہے۔ جس نے مضاف، مضاف الیہ نہیں بنایا اس نے اِرَمَ کو

اس کا نام بتایا ہے اور غیر منصرف قرار دیا ہے کیونکہ اس نے عاد کو ان کے رب کا نام اور ارم کو قبیلہ کا نام قرار دیا ہے اور ارم کو اس کا بدل یا عطف بیان بنایا ہے جس نے اسے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اسے ان کی ماں کا لفظ یا ان کے شہر کا نام قرار دیا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی بعاد أهل ارم۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) یہ منصرف نہیں ہوگا خواہ وہ قبیلہ کا نام ہو یا علاقہ ہو کیونکہ تعریف اور تانیث کا خاصہ موجود ہے۔ عام قراءت اِرَمَ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت حسن بصری سے بعاد اِرَمَ ہے کہ دونوں اسم مفتوح ہیں۔ اسے بعاد ارم پڑھا گیا ہے یعنی راء کو ساکن اور تخفیف کے ساتھ پڑھا گیا ہے جس طرح بود قکم پڑھا گیا ہے اسے بعاد اِرَمِ ذات العماد اس صورت میں اِرَمَ کو ذات العماد کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے اِرَمَ علم ہے مراد ہوگا عاد کے ساتھ جو اس علم والے ہیں اسے بعاد ارم ذات العماد بھی پڑھا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ستونوں والے کو بوسیدہ بنا دیا ہے۔ مجاہد، ضحاک اور قتادہ نے آرَم پڑھا ہے۔ مجاہد نے کہا: جس نے اسے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے انہیں آرام کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کا معنی اعلام ہے اس کا واحد آرَم ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے ای والفجر و کذا و کذا ان ربك لبالمرصاد الم تر۔ یعنی قسم ہے فجر کی اس کی بے شک تیرا رب تاڑ رہا ہے کیا تو نے اسے نہیں دیکھا کیا تیرا وہ علم جو اس بارے میں ہے کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا ہے تجھے نہیں روکتا یہ دیکھنا دل کا دیکھنا ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مراد عام ہے۔ عاد اور ثمود کا امر مشہور تھا کیونکہ یہ عرب علاقوں میں تھے اور جو ثمود آج بھی موجود ہیں۔ فرعون کے معاملہ کو وہ اپنے پڑوسی اہل کتاب سے سنا کرتے تھے اس کے بارے میں اخبار مشہور ہیں اور فرعون کا ملک عرب علاقہ کے ساتھ متصل ہے۔ سورۂ بروج میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ عاد سے مراد قوم عاد ہے۔ شہر بن حوشب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ قوم عاد کا ایک آدمی پتھر سے دروازے کا ایک پٹ بناتا۔ اگر اس امت کے پانچ سو آدمی جمع ہو جائیں تو اس کو نہ اٹھا سکیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک زمین میں اپنا قدم داخل کرنا چاہتا تو اس میں داخل کر دیتا۔ اِرَمَ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سام بن نوح ہے؛ یہ حضرت ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ ابن اسحاق سے یہ بھی مروی ہے کہ عاد، ارم کا بیٹا تھا۔ اس تعبیر کی صورت میں ارم، عاد کا باپ ہوگا نسب یوں ہوگا عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح۔ پہلے قول کی صورت میں یہ عاد کا دادا ہے۔ حضرت ابن اسحاق نے کہا: سام بن نوح کی اولاد میں سے عمالقہ، فراعنہ، جبابرہ اور سرکش اور نافرمان بادشاہ ہوئے۔ مجاہد نے کہا: اِرَمَ امتوں میں سے ایک امت ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اِرَمَ کا معنی قدیمی ہے؛ یہ ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی قوی ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ عاد کا قبیلہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دو عاد قومیں گزری ہیں پہلی عاد ارم تھے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۝ (النجم) اس نے پہلی عاد کو ہلاک کیا۔ بعد والی کو عاد کا نام دیا گیا ہے جس کا نسب یہ تھا عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح جس طرح بنی ہاشم کو ہاشم کہتے ہیں پھر ان میں سے پہلوں کو عاد اولی اور ارم کہتے ہیں ان کو یہ نام ان کے جد اعلیٰ کی وجہ سے دیا گیا اور بعد والوں کو عاد اخیرہ کا نام دیا گیا۔ ابن رقیات نے کہا:

مَجْدًا تلِيدًا بناهٗ أوّلُهُمْ أدرك عادا وقبلَه إرَمَا

پرانی بزرگی جسے ان کے بزرگوں نے بنایا تھا انہوں نے عاد اور ان سے قبل ارم کو پالیا۔

معمر نے کہا: ارم پر عاد اور ثمود (1) جمع ہوتے جس طرح یہ کہا جاتا: عاد ارم، ثمود ارم۔ قبائل ارم کی طرف منسوب ہوتے۔

ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝ علاء کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ان میں سے ایک آدمی کا قد پانچ سو ہاتھ ہوتا اور ان میں سے چھوٹے قد والا تین سو ہاتھ لمبا ہوتا اس کا یہ ہاتھ اپنے ہاتھ کے برابر ہوتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ ان میں سے لمبا آدمی ستر ہاتھ کا ہوتا۔ ابن عربی نے کہا: یہ قول باطل ہے کیونکہ صحیح میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ان کی لمبائی ہوا میں (قد) ساٹھ ہاتھ تھی لگاتار مخلوق میں کمی آ رہی ہے''۔ قتادہ نے گمان کیا: ان کے آدمی کا قد بارہ ہاتھ ہوتا۔ ابو عبیدہ نے کہا: ذَاتِ الْعِمَادِ سے مراد ہے لمبے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل مُعَمَّد جب وہ لمبا ہو۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے اس کی مثل مروی ہے۔ قتادہ سے یہ بھی مروی ہے: وہ قوم کے سردار تھے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان عَمِيْدُ القوم و عَمُودهم یعنی وہ ان کا سردار ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا وہ گھاس کے حصول کے لیے اپنے گھر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے تھے وہ خیموں اور ستونوں والے تھے وہ بارش اور گھاس کی طلب میں رہتے پھر اپنے گھروں کو پلٹ آتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذَاتِ الْعِمَادِ سے مراد بلند عمارتوں والے ہیں جو ستونوں پر بنائی جاتیں وہ ستون بناتے اور ان پر محلات بناتے۔ ذَاتِ الْعِمَادِ سے مراد ہے عمارتوں کو ستونوں کے ذریعے پختہ کرنا۔ صحاح میں ہے: عماد سے مراد بلند عمارت ہے، اسے مذکر اور مونث تسلیم کیا جاتا ہے۔

عمرو بن کلثوم نے کہا:

ونحن إذا عمادُ الحيّ خَرّتْ على الأحْفاضِ نَمْنَعُ مَنْ يَلِينَا

اور ہم جب قبیلہ کی بلند عمارات سامان پر آ گریں تو ہم ان لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں جو ہمارے پڑوس میں ہوتے ہیں۔

عماد کا واحد عمادۃ ہے فلان طویلُ العماد جب اس کا مکان ملاقاتی کے لیے جانا پہچانا ہو۔ احفاض یہ حفض کی جمع ہے اس سے مراد گھر کا سامان ہے جب اسے لادنے کے لیے تیار کیا جائے یعنی وہ سامان پر گر پڑیں۔ اس شعر کو عن الأحفاض بھی روایت کیا گیا ہے یعنی وہ سامان ان اونٹوں سے گر پڑا جن پر گھر کا سامان لادا گیا تھا۔ ضحاک نے کہا: ذَاتِ الْعِمَادِ سے مراد ہے قوت والا۔ یہ قوۃ الأعمدۃ سے ماخوذ ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (فصلت: 15) انہوں نے کہا: ہم میں سے کون قوی ہے؟ عوف نے خالد ربعی سے روایت نقل کی ہے کہ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ سے مراد ہے دمشق؛ یہ عکرمہ اور سعید مقبری کا قول ہے اسے ابن وہب اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: اس سے مراد اسکندریہ ہے۔

الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝

1۔ اس کی کتابت تو عاد ثمود ہے لیکن سیاق کلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ ثمود ارم ہو۔ مترجم

''نہیں پیدا کیا گیا جن کا مثل (دنیا کے) ملکوں میں''۔

مِثْلُهَا کی ضمیر قبیلہ کی طرف لوٹتی ہے یعنی اس قبیلہ جیسا شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا یعنی قوت، مضبوطی، بڑے جسم اور لمبے قد میں؛ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء سے یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت میں التی لم یخلق مثلھم فی البلاد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ضمیر مدینہ کی طرف لوٹتی ہے۔ پہلا زیادہ نمایاں اور اسی پر اکثر علماء کا اتفاق ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ جس نے اِرَمَ کو شہر تسلیم کیا ہے اس نے حذف کو مقدر کیا ہے پھر معنی یہ ہوگا تیرے رب نے عاد ارم کے شہر کے ساتھ کیا کیا؟ اس تعبیر کی صورت میں ارم مونث معرفہ ہوگا۔ ابن عربی نے یہ رائے اپنائی ہے کہ اس سے مراد دمشق ہے کیونکہ شہروں میں اس جیسا شہر کوئی نہیں پھر اس کی تعریف کی کہ اس میں بہت زیادہ پانی اور اس کی اچھائیاں ہیں۔

پھر کہا: اسکندریہ میں بڑے عجائب ہیں اگر منارہ کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی کیونکہ یہ ظاہر اور باطن میں ستونوں پر بنا ہوا ہے لیکن اس کی کئی امثلہ موجود ہیں جہاں تک دمشق کا تعلق ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔ معن نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ اسکندریہ میں ایک مکتوب پایا گیا یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں یہ تحریر ہے: میں شداد بن عاد ہوں جس نے عمارتوں کو بلند کیا میں نے انہیں اس وقت بنایا ہے جب بڑھاپا اور موت نہیں۔ امام مالک نے کہا: ان پر سو سال گزر جاتا تو وہ اس میں کوئی جنازہ نہ دیکھتے۔ ثور بن زید سے یہ مذکور ہے کہ اس نے کہا: میں شداد بن عاد ہوں، میں نے عمارات کو بلند کیا، میں وہ ہوں جس نے اپنے بازوؤں سے وادی کے بطن کو بند کر دیا تھا، وہ میں ہوں جس نے سات ہاتھوں پر خزانہ دبا دیا ہے اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی امت نہ نکالے گی۔ ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ عاد کے دو بیٹے تھے شداد اور شدید۔ دونوں بادشاہ ہوئے اور بڑے جابر بادشاہ ہوئے پھر شدید مر گیا اور شداد کے لیے حکومت خالص ہوگئی وہ پوری دنیا کا بادشاہ ہوا تمام چھوٹے بادشاہ اس کے باجگزار ہوئے اس نے جنت کا ذکر سنا اس نے کہا: اس کی مثل میرے لیے بناؤ۔ عدن کے ایک صحراء میں ارم تین سو سالوں میں بنایا گیا اس کی عمر نو سو سال تھی یہ بڑا شہر تھا اس کے محلات سونے اور چاندی کے تھے اس کے ستون زبرجد و یاقوت کے تھے اس میں مختلف قسم کے درخت اور جاری نہریں تھیں۔ جب وہ باغ مکمل ہوگیا تو وہ عمائدین مملکت کے ساتھ اس کی طرف چلا۔ جب وہ ایک دن اور رات کی مسافت پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ایک چیخ ان پر بھیجی تو وہ ہلاک ہوگئے (1)۔

عبداللہ بن قلابہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے اونٹوں کی تلاش میں نکلے تو اس باغ تک جا پہنچے وہاں سے جو چیز اٹھانا ممکن تھی وہ اٹھائی اس کی خبر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک جا پہنچی۔ حضرت امیر معاویہ نے انہیں طلب کیا اور عبداللہ نے تمام واقعہ بیان کیا حضرت امیر معاویہ نے کعب الاحبار کی طرف پیغام بھیجا اور اس سے اس بارے میں پوچھا انہوں نے جواب دیا: یہ ارم ذات العماد ہے مسلمانوں میں سے ایک آدمی آپ کے دور میں اس میں داخل ہوگا، جس کا رنگ سرخ، قد چھوٹا ہوگا اس کے آبرو پر تل ہوگا اور اس کی پشت پر ایک تل ہوگا وہ اپنے اونٹوں کی تلاش میں نکلے گا پھر متوجہ ہوا تو ابن قلابہ کو دیکھا کہا: اللہ کی

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 250

قسم! یہ وہی آدمی ہے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عاد کی عمارات جو ستونوں کی وجہ سے معروف ہیں ان کی مثل نہیں بنائی گئیں کنایہ عماد کی وجہ سے ہے اس تعبیر کی صورت میں عماد، عَمَد کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ارم کا معنی ہلاکت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أَرِمَ بنو فلاں بنو فلاں ہلاک ہو گئے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: اَرَمَ ذَاتَ الْعِمَادِ انہیں ہلاک کر دیا اور ریزہ ریزہ کر دیا۔

وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝

''اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے کاٹا تھا چٹانوں کو وادی میں''۔

ثمود، حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے جَابُوْا کا معنی ہے انہوں نے کاٹا اسی معنی میں فلان يُجُوبُ البلاد ہے فلاں شہروں کو طے کرتا ہے۔ قمیص کی جیب کو یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اسے بھی کاٹا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا جب کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت عبداللہ بن زبیر نے اس کے حق میں ساٹھ وسق کا پروانہ لکھ دیا جو وہ کوفہ سے لے سکتا تھا تو اس نے کہا:

راحت رَوَاحا قَلُوصِي وهي حامدة ... آلَ الزُّبَيرِ ولم تَعْدِل بهم أَحدًا

میری اونٹنی واپس پلٹی جب کہ وہ آل زبیر کی تعریف کر رہی تھی وہ کسی کو بھی ان کا ہم پلہ قرار نہیں دے رہی تھی۔

راحتْ بستينَ وَسْقًا فی حَقِيبتها ... ما حَمَلَتْ حَمْلَها الأَدْنَى ولا السَّدَدَا

وہ لوٹی جب کہ اس کے تھیلے میں ساٹھ وسق ہیں نہ اس نے ادنی بوجھ اٹھایا اور نہ درست بوجھ اٹھایا تھا۔

ما إنْ رأيتُ قَلُوصًا قبلها حملت ... ستِينَ وَسْقًا ولا جابت به بلدا

میں نے اس سے قبل کوئی اونٹنی نہیں دیکھی جس نے ساٹھ وسق اٹھائے ہوں اور نہ ہی اس کے ساتھ شہروں کو قطع کیا ہو۔

یہاں جابت کا معنی قطع کرنا ہے۔ مفسرین نے کہا: سب سے پہلے جس نے پتھروں کو کاٹا، تصویریں بنائیں اور سنگ مرمر تراشا وہ قوم ثمود ہی تھی، انہوں نے شہروں میں سے ایک ہزار سات سو شہر بنائے سب پتھر کے بنے ہوئے تھے بڑے چھوٹے گھروں میں سے انہوں نے ستائیس لاکھ گھر بنائے سب پتھر کے تھے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝ (الحجر) یعنی اور وہ کھود کر بنایا کرتے تھے پہاڑوں کو اپنے گھر (اور) وہ بے خوف وخطر رہا کرتے تھے۔ وہ اپنی قوت کے باعث چٹانیں نکالتے، پہاڑوں میں نقب لگاتے اور انہیں اپنے گھر بنا لیتے۔

وادی سے مراد وادی قری ہے؛ یہ محمد بن اسحاق کا نقطہ نظر ہے۔ ابو اشہب نے ابونضرہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ تبوک کے موقع پر وادی ثمود میں تشریف لائے جب کہ آپ سرخ گھوڑے پر تشریف فرما تھے فرمایا: ''تم جلدی چلو کیونکہ تم ایک ملعون وادی میں ہو'' (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: پہاڑوں کے بیچ میں وادی تھی وہ ان پہاڑوں میں کمرے گھر اور حوض بناتے تھے۔ پہاڑوں یا ٹیلوں کے درمیان جو کھلی جگہ پانی کی گزرگاہ ہو اسے وادی کہتے ہیں۔

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 250
2۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 269

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾

''اور (کیا کیا) فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا''۔

ذِي الْأَوْتَادِ سے مراد چھوٹے بڑے لشکر اور جمعیتیں جو اس کے ملک کی تقویت کا باعث ہوتی تھیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ لوگوں کو میخوں کے ساتھ عذاب دیا کرتا تھا اور انہیں ان کے ساتھ باندھے رکھتا یہاں تک کہ وہ مر جاتے، یہ سب اس کی جانب سے سرکشی اور جبر کے طور پر ہوتا تھا اس نے اپنی بیوی حضرت آسیہ اور اپنی بیٹی کی کنگی کرنے والی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا تھا، جیسا سورۂ تحریم کے آخر میں گزرا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: اس کے پاس ایک چٹان تھی جس کو چرخیوں کے ذریعے اوپر اٹھایا جاتا پھر انسان پکڑا جاتا اس میں لوہے کے کیل گاڑے جاتے پھر اس پر وہ پتھر چھوڑ دیا جاتا جو اسے کچل کے رکھ دیتا۔ سورۂ ص میں اوتاد کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی و شافی ہے۔ الحمد للہ۔

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾

''جنہوں نے سرکشی کی تھی (اپنے اپنے) ملکوں میں، پھر ان میں بکثرت فساد برپا کر دیا کرتے تھے، پس آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا''۔

الَّذِينَ سے مراد قوم عاد، قوم ثمود اور قوم فرعون ہے انہوں نے سرکشی کی اور ظلم و عدوان میں حد سے تجاوز کیا اور وہ ظلم اور اذیت میں بہت آگے بڑھ گئے۔ الَّذِينَ طَغَوْا کے بارے میں بہترین توجیہ یہ ہے کہ یہ مذمت کے طور پر محل نصب میں ہو۔ یہ بھی جائز کہ یہ محل رفع میں ہو تقدیر کلام یہ ہو گی هم الذين طغوا یا مذکورہ قوموں یعنی عاد، ثمود اور فرعون کی صفت کے طور پر مجرور ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب انڈیل دیا اور پھینک دیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: صبّ على فلان خلقه۔ فلاں نے مجھ پر خلقت پھینک دی۔ نابغہ نے کہا:

فَصبَّ عليه الله أحْسَنَ صَنْعِه وكان له بين البرية ناصرا

اللہ تعالیٰ نے اس پر بہترین احسان کیا مخلوقات میں وہ اس کا مددگار تھا۔

سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ سے مراد عذاب کا حصہ ہے۔ ایک قول یہ بھی کیا جاتا ہے: اس سے مراد سخت عذاب ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سوط سے مراد وہ چیز ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ عذاب دیا جاتا ہے ان میں سے آخری حد ہے؛ شاعر نے کہا:

ألم تَرَ أنّ الله أظهرَ دِينه وصبَّ على الكفارِ سَوْطَ عَذابِ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کیا اور کفار پر عذاب نازل کیا۔

فراء نے کہا: یہ ایسا کلمہ ہے جسے عرب ہر قسم کے عذاب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اصل اس کا معنی ہے کہ سوط وہ عذاب ہے جس کے ساتھ انہیں عذاب دیا جاتا ہے پس ہر کسی کے لیے عذاب جاری ہو گیا، کیونکہ اس میں ان کے لیے انتہاء درجے کا عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے ایسا عذاب ہو گا جو گوشت اور خون کے ساتھ خلط ملط ہو جائے گا۔ یہ عربوں کے

اس قول سے ماخوذ ہے: سَاطَهٗ يَسُوطُهٗ سَوْطًا یعنی اس کے ساتھ خلط ملط ہو گیا اس سے اسم فاعل کا صیغہ سائط ہے السوط سے مراد ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مل جانا۔ اس سے مسواط ہے وہ گھوڑا جو چابک کے بغیر نہ چلے۔ ساطه یعنی اسے ملا دیا اس سے اسم فاعل کا صیغہ سائط ہے اکثر طور پر یہ جملہ بولا جاتا ہے: سوّط فلان أموره۔ فلاں نے اپنے امور کو خلط ملط کر دیا ہے۔

ابو زید نے کہا: یہ جملہ بولا جاتا ہے أموالهم سَوِيطَةٌ بَينهم ان کے اموال آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ یعقوب نے اس سے یہ حکایت بیان کی ہے۔ زجاج نے کہا: ان کے سوط جس کے ساتھ ان کو مارا اسے عذاب بنا دیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ساط دابته يسوطها۔ اسے سوط کے ساتھ مارا۔ عمرو بن عبید سے مروی ہے: حضرت حسن بصری جب اس آیت تک پہنچتے تو فرماتے: اللہ تعالیٰ کے ہاں بے شمار کوڑے ہیں ان میں سے ایک کوڑے کے ساتھ انہیں پکڑ لیا۔ قتادہ نے کہا: ہر شئی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ عذاب دے وہ عذاب کا کوڑا ہے۔

## اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

''بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے''۔

وہ انسان کے ہر عمل کی تاک میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے اس عمل کے بدلے میں بدلہ دیتا ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے راستہ پر ہے کوئی اسے مفقود نہیں پاتا۔ مرصد اور مرصاد کا معنی راستہ ہے۔ سورۂ براءۃ میں یہ گزر چکا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ جہنم کے اوپر سات پل ہیں پہلے پل کے پاس انسان سے ایمان کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر وہ اسے مکمل لے آیا تو وہ دوسرے پل کی طرف چلا جائے گا پھر اس سے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر وہ انہیں بجا لایا تھا تو وہ تیسرے پل کی طرف چلا جائے گا پھر اس سے زکوۃ کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر وہ اسے بجا لایا تھا تو چوتھے پل کی طرف چلا جائے گا پھر اس سے رمضان شریف کے روزوں کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر وہ اسے بجا لایا تھا تو وہ پانچویں پل کی طرف چلا جائے گا پھر اس سے حج اور عمرہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اگر وہ ان دونوں کو بجا لایا تھا تو چھٹے پل کی طرف چلا جائے گا پھر اس سے صلہ رحمی کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر وہ اسے بھی بجا لایا تھا تو وہ ساتویں پل کی طرف چلا جائے گا۔ پھر اس سے مظالم کے بارے میں پوچھا جائے گا ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: اگر کسی کا کوئی حق ہو تو آئے تو اس سے لوگوں کا قصاص لیا جائے گا اور لوگوں سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ کا یہی معنی ہے۔ ثوری نے کہا: لَبِالْمِرْصَادِ سے مراد جہنم ہے جس پر تین پل ہیں ایک پل میں رحم ہے، ایک پل میں امانت ہے اور ایک پل میں اللہ تعالیٰ جلوہ افروز ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کی حکمت، ارادہ اور امر ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لَبِالْمِرْصَادِ سے مراد ہے: وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے وہ ان کے اقوال اور سرگوشیاں سنتا ہے اور ان کے اعمال اور اسرار کو جانتا ہے وہ ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ ایک عرب کے بارے میں مروی ہے: اسے کہا گیا تیرا رب کہاں ہے؟ اس نے کہا: تاڑ میں۔

عمرو بن عبید سے مروی ہے کہ اس نے یہ سورت منصور کے پاس پڑھی یہاں تک کہ وہ اس آیت تک پہنچا تو کہا: اے ابو جعفر! تیرا رب تیری تاڑ میں ہے۔ زمخشری نے کہا: اس ندا میں روئے سخن اس کی طرف پھیرا کیونکہ یہ بھی ان میں سے ایک تھا جن جابروں کو اس کے ساتھ دھمکی دی گئی تھی۔ اللہ کے قبضہ میں ہی سب بھلائیاں ہیں۔

أیّ أسدٍ فراس کان بین یدیہ ؟ اس کے سامنے کون چیر نے پھاڑنے والا شیر ہے۔

یَدُقّ الظَّلَمَة بإنکارہ وہ اپنے انکار کے ساتھ ظالموں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

ویقمع أهل الأهواء والبدع باحتجاجه وہ اپنی دلیل کے ساتھ بدعتوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے (1)۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ۚ

”مگر انسان (بھی عجیب شئی ہے) کہ جب آزماتا ہے اس کا رب یعنی اس کو عزت دیتا ہے اور اس پر انعام فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب اسے (یوں) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا“۔

الْاِنْسَانُ سے مراد کافر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد عتبہ بن ربیعہ اور ابو حذیفہ بن مغیرہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد امیہ بن خلف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد ابی بن خلف ہے۔

جب اسے نعمت دی تو آزمائش میں ڈالا اور امتحان لیا۔ اِذَا مَا میں ما زائدہ ہے مال دے کر اسے عزت دی اور وسعتیں بخش کر اسے نعمتوں سے نوازا اور وہ اس کے ساتھ خوش ہوتا ہے مگر اس کی حمد نہیں کرتا اور جب اسے فقر کے ساتھ آزماتا ہے اور اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلت عطا کی ہے۔ یہ کافر کی صفت ہے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کے نزدیک کرامت اور ذلت دنیا دی مال کی کمی اور زیادتی کے ساتھ ہوتی ہے جہاں تک مومن کا تعلق ہے اس کے نزدیک کرامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طاعت اور توفیق سے نوازتا ہے اور آخرت کے حصہ کی طرف لے جاتا ہے اگر اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں وسعت عطا فرمائے تو وہ اس کی حمد کرتا ہے اور شکر بجالاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: دونوں آیتیں ہر کافر کی صفتیں ہیں مسلمانوں میں سے کثیر لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو عطا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کرامت اور فضیلت کی وجہ سے ہے بعض اوقات وہ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ کہتا ہے: اگر میں اس کا مستحق نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ مجھے یہ عطا نہ کرتا۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ اس پر مال کی کمی کر دیتا ہے تو وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بے قدری کی وجہ سے ہے۔ عام قراءت فقدر ہے یعنی دال پر شد نہیں۔ ابن عامر نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ پسندیدہ تخفیف ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الطلاق: 7) اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا۔ ابو عمرو نے کہا: قدر کا معنی کمی کرنا۔ اور قدّر کا معنی ہے اتنا دینا جو اسے کفایت کر

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 251

جائے۔اگر اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا تو وہ یہ نہ کہتا: رَبِّیۡۤ اَهَانَنِ۔

أهل حرمین اور ابو عمرو نے رَبِّیۡ یاء کے فتحہ کے ساتھ دونوں جگہ پڑھا ہے باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بزی، ابن محیصن اور یعقوب نے اَکۡرَمَنِ، اور اَهَانَنِ کی یاء کو دونوں حالتوں میں ثابت رکھا ہے کیونکہ یہ اسم ہے اسے حذف نہیں کیا جاتا۔ مدنیوں نے وصل میں ثابت رکھا ہے اور وقف میں ثابت نہیں رکھا وہ مصحف کی اتباع کرتے ہیں۔ ابو عمرو فصل میں ثابت یا حذف میں اختیار دیا ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور وقف کی صورت میں حذف کو اپنایا ہے وجہ مصحف کے خط کا لحاظ ہے۔ باقی قراء نے اسے حذف کیا ہے کیونکہ دونوں جگہ یہ یاء کے بغیر آئے ہیں سنت یہی ہے کہ مصحف کے خط کی مخالفت نہ کی جائے کیونکہ یہ صحابہ کا اجماع ہے۔

**كَلَّا بَلۡ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾**

''ایسا نہیں ہے بلکہ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ تم ترغیب دیتے ہو مسکین کو کھانا کھلانے کی اور چٹ کر جاتے ہو میراث کا سارا مال اور دولت سے حد درجہ محبت کرتے ہو''۔

**كَلَّا** یہ روکنے کے لیے ہے یعنی معاملہ ایسا نہیں جیسا گمان کیا جا رہا ہے اور مال و دولت کی کثرت اس کے فضل کی علامت نہیں اور نہ ہی فقر و تنگ دستی اس کی طرف سے ذلت و رسوائی ہے بے شک فقر و غنا تو میری تقدیر ہے۔ فراء نے کہا: یہاں **كَلَّا** اس معنی میں ہے کہ بندہ کے لیے نہیں چاہیے کہ وہ اس طرح ہو بلکہ غنا اور فقر دونوں صورتوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: كَلَّا إِنِّي لا أكرم من أكرمت بكثرة الدنيا ولا أهين من أهنت بقلتها إنما أكرم من أكرمت بطاعتي وأهين من أهنت بمعصيتي (1) ہرگز نہیں جسے میں عزت دیتا ہوں میں اسے مال کی کثرت کے ذریعے عزت نہیں دیتا اور جسے میں ذلیل کرتا ہوں میں اسے مال کی کمی کے ساتھ ذلت نہیں دیتا میں جسے عزت دیتا ہوں اپنی طاعت کے ساتھ عزت دیتا ہوں اور جسے ذلیل کرتا ہوں اپنی معصیت کے ساتھ ذلت دیتا ہوں۔

**بَلۡ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ ﴿۱۷﴾** جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ان امور کی خبر دی جا رہی ہے کہ یتیم کو میراث نہیں دیتے تھے اسراف کر کے اس کا مال کھا جاتے اور جلدی جلدی مال کھا جاتے کہ وہ بڑا نہ ہو جائے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے یکرمون، یحضون، یاکلون اور یحبون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ انسان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس سے مراد جنس ہے اسے جمع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے باقی قراء نے چاروں صیغوں کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب کے صیغے ہیں گویا انہیں یہ بات زجر و توبیخ کے لیے کی۔ یتیم کے اکرام کو ترک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے حق نہ دینا اور اس کا مال کھا جانا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ قدامہ بن مظعون کے حق میں آیات نازل ہوئیں جو امیہ بن خلف کی گود میں یتیم تھا۔

**وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ﴿۱۸﴾** وہ اپنے گھر والوں کو حکم نہیں دیتے کہ جو یتیم ان کے پاس آئے وہ اسے کھلا دیا

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 377

کریں۔ کوفیوں نے اسے ولا تخاضون پڑھا ہے یعنی تاء مفتوحہ، حاء اور الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ ایک دوسرے کو برانگیختہ نہیں کرتے۔ اصل میں یہ تتحاضون تھا ایک تاء کو حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے؛ یہ ابوعبید کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ ابراہیم اور شیزری نے کسائی اور سلمی سے روایت نقل کی ہے کہ تخاضون تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ حض سے تفاعلون کے وزن پر ہے اس کا معنی برانگیختہ کرنا ہے۔

وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ تراث سے مراد یتیموں کی میراث ہے اس کی اصل وارث ہے یہ وراثت سے مشتق ہے جس طرح تجاہ، تخمہ، تکأہ اور تؤدہ ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ لَمًّا کا معنی ہے شدیدا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَمًّا کا معنی ہے سب کا سب۔ یہ عربوں کے اس قول سے لیا گیا ہے: لَمَمْتُ الطعام لمّا جب تو سب کا سب کھا جائے؛ یہ حضرت حسن بصری اور ابوعبیدہ کا نقطہ نظر ہے۔ کلام عرب میں لم کا معنی جمع کرنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: لممت الشئ ألمه لما جب تو اسے جمع کرے اس معنی میں کہا جاتا ہے: لم الله شعثه اس کے جو امور متفرق تھے ان کو جمع کر لیا۔ نابغہ نے کہا:

وَلَسْتَ بِمُسْتَبْقٍ أَخًا لَا تَلُمُّهُ عَلَى شَعَثٍ أَيُّ الرِّجَالِ الْمُهَذَّبِ

تو ایسے بھائی کو باقی رکھنے والا نہیں جسے تو پراگندگی کی حالت میں اپنے ساتھ جمع نہیں کرتا بتاؤ تو سہی کون سا آدمی مہذب ہے۔

مرناق طائی، علقمہ بن سیف کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

لَأَحَبَّنِي حُبَّ الصَّبِيِّ وَلَمَّنِي لَمَّ الهُدِيِّ إِلَى الكَرِيمِ المَاجِدِ

اس نے مجھ سے بچے کی محبت جیسی محبت کی اور مجھے یوں اپنے ساتھ جمع کیا جیسے شب زفاف کو دلہن کریم آدمی کے ساتھ جمع ہوتی ہے۔

لیث نے کہا: لم کا معنی سختی سے جمع کرنا ہے، اس سے حجر ملموم ہے اور کتیبة ملمومة ہے کھانے والا ثرید کو جمع کرتا ہے، اسے لقمہ بناتا ہے پھر کھاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے وہ پھانکتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: وہ اپنا اور دوسروں کا حصہ کھا جاتا ہے۔ حطیہ نے کہا:

اذا كانَ لَمّاً يُتْبِعُ الذَمَّ رَبَّه

جب اپنا اور غیر کا حصہ جمع کرنے والا ہوگا تو یہ عمل ایسا کرنے والے کو مذمت تو لازم کرے گا۔

یعنی وہ اپنے اور دوسروں کے حصہ کو کھانے میں جمع کرتے ہیں۔ ابن زید نے کہا: یعنی جب وہ اپنا مال کھاتا ہے تو غیر کے مال کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور اسے کھا جاتا ہے، وہ سوچ و بچار بھی نہیں کرتا وہ خبیث اور پاکیزہ سب کھا جاتا ہے۔ کہا: مشرک عورتوں اور بچوں کو ورثہ نہ دیا کرتے تھے بلکہ اپنی میراث ان کی میراث کے ساتھ ملا کر کھا جایا کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: میت نے ظلم سے جو مال جمع کیا ہوتا تھا وہ اسے کھا جاتے جب کہ انہیں سب کچھ علم ہوتا وہ کھانے میں حلال و حرام کو جمع کر لیتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وارث کی مذمت کی جارہی ہو جو آسان طریقہ سے مال لے لیتا ہے جبکہ اس میں اس کا

پسینہ بھی نہیں بہتا وہ اس کے خرچ کرنے میں اسراف سے کام لیتا ہے اور کھلا، کھا جاتا ہے جبکہ وہ ہر خواہش کو جمع کرنے والا ہوتا ہے وہ چیز کھانے سے تعلق رکھتی ہو، مشروبات ہوں یا پھل۔ جس طرح باطل وارث کرتے ہیں۔

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ جَمًّا سے مراد ہے کثیر۔ یعنی حلال و حرام۔ جم کا معنی کثیر ہے جس طرح یہ جملہ بولتے ہیں: جَمَّ الشیٔ یَجِمُّ جُمُوْمًا فھو جَمٌّ، جَامٌّ۔ اس معنی میں جَمَّ الماء فی الحوض ہے۔ جب پانی جمع ہو جائے اور کثیر ہو جائے؛ شاعر نے کہا:

اِنْ تَغْفِرِ اللّٰھُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وأیُّ عبدٍ لَکَ لا أَلَمَّا

اے اللہ! اگر بخشتا ہے تو سب کو بخش دے اور تیرا کون سا بندہ ہے جس نے غلطی نہیں کی۔

جمہ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ جموما ایسے کنویں کو کہتے ہیں جہاں بہت زیادہ پانی جمع ہو۔ جموم مصدر ہے یوں باب ذکر کیا جاتا ہے جَمَّ الماء یَجِمّ جُمُوْمًا جب وہ کنویں میں بہت زیادہ ہو جاتے جبکہ اس میں جو کچھ پانی تھا نکال لیا گیا تھا۔

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝۲۱

''یقیناً جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا''۔

یہ مناسب نہیں کہ معاملہ اس طرح ہو۔ یہ ان لوگوں کا رد کیا جا رہا ہے جو وہ دنیا پر منہ کے بل گرے ہوتے ہیں اور اس پر جمع ہیں، کیونکہ جس نے اس طرح کیا جس دن زمین ریزہ ریزہ ہوگی وہ اس روز شرمندہ ہوں گے جب کہ شرمندگی کچھ نفع نہ دے گی۔ دک بمعنی توڑنا اور باریک کرنا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے یعنی زمین پر زلزلہ برپا ہوگا تو وہ ایک دوسرے کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

مبرد نے کہا: معنی ہے وہ پست ہو جائے گی اور اس کی بلندی ختم ہو جائے گی جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: ناقۃ دکاء جس کی کہان نہ ہو اس کی جمع دُکّ آتی ہے اس بارے میں گفتگو سورۃ الاعراف اور سورۃ الحاقہ میں گزر چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں: دکّ الشیٔ یعنی اس کو گرا دیا گیا، جس طرح کسی نے کہا:

ھل غیر غارٍ دَکَّ غارًا فانھدم کیا کثیر جماعت کے علاوہ کثیر جماعت کو کسی نے گرایا ہو تو وہ گر گئی ہو۔

دَكًّا دَكًّا یعنی یکے بعد دیگرے، اس میں زلزلہ برپا ہوا، اس کے بعض نے بعض کو توڑ دیا ہو پس زمین پر جو کچھ بھی ہوگا وہ ٹوٹ جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہاڑوں کو گرایا جائے گا یہاں تک کہ وہ برابر ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بچھنے میں برابر ہو جائیں گے۔ دک کا معنی ہے زمین میں سے بلند جگہ کو پھسلانے کے ساتھ پست کرنا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے قول کا بھی یہی معنی ہے کہ زمین کو چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا۔

وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲ وَ جِایْٓءَ یَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىِٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝۲۳

''اور جب آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔ اور (سامنے) لائی جائے گی اس دن جہنم، اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی لیکن اسے سمجھنے کا کیا فائدہ''۔

یہاں رَبُّكَ سے مراد تیرے رب کا امر اور اس کا فیصلہ ہے؛ یہی حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ یہ کلام اس اسلوب سے تعلق رکھتی ہے جس میں مضاف حذف ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان کے پاس ان کا رب عظیم آیات لایا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (البقرہ:210) کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں۔ اس آیت میں فِيْ ظُلَلٍ، بظلل کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیات کے آنے کو اس کا آنا بنا دیا گیا ہے مقصود ان آیات کی عظمت شان بیان کرنا ہے۔ اس معنی میں حدیث میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یا ابن آدم مرضتُ فلم تَعُدْنِی واستسقَیْتُكَ فلم تسقنی واستطعمتك فلم تطعمنی(1) اے انسان! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہ کی، میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا اور میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہ کھلایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وَّجَآءَ رَبُّكَ کا مفہوم یہ ہے آج تمام شبہات زائل ہو گئے تمام معارف ضرور یہ ہو گئے جس طرح جس چیز میں شک کیا جا رہا ہو وہ آجائے تو اس کے بارے میں جتنے شکوک و شبہات ہوتے ہیں وہ زائل ہو جاتے ہیں۔ اشارہ کی زبان میں گفتگو کرنے والے کہتے ہیں: اس کی قدرت ظاہر ہوئی اور ہر چیز پر چھا گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جس کی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونے کی صفت بیان نہیں کی جاتی۔ اس ذات کے لیے یہ انتقال کیسے تصور کیا جا سکتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مکان ہے اور نہ ہی اس کے لیے وقت ہے، نہ اس پر کوئی وقت جاری ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی زمان جاری ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی شئی پر وقت کا جاری ہونا اس سے اوقات کا فوت ہونا ہے اور جس سے کوئی شئی فوت ہو جائے وہ عاجز ہوتا ہے۔

اور فرشتے صف در صف ہوں گے۔ اس روز جہنم لائی جائے گی۔ حضرت ابن مسعود اور مقاتل نے کہا: جہنم کو ستر ہزار لگاموں کے ساتھ کھینچا جا رہا ہوگا ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے اس میں جوش اور چنگھاڑ ہوگی یہاں تک کہ اسے عرش کی بائیں جانب کھڑا کر دیا جائے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس روز جہنم کو لایا جائے گا جس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے وہ اس جہنم کو کھینچ رہے ہوں گے''۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا رنگ بدل گیا اور آپ کے چہرہ سے یہ عیاں ہونے لگا یہاں تک کہ صحابہ کرام پر یہ بڑا شاق گزرنے لگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جبریل امین نے مجھے یہ آیات پڑھ کر سنائیں''۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیف یجاء بھا؟ یا رسول اللہ! اس جہنم کو کیسے لایا جائے گا؟ فرمایا: اسے لایا جائے گا جب کہ ستر ہزار لگاموں کے ساتھ اسے کھینچا جا رہا ہوگا ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے وہ ایک دفعہ بدکے گی تو اسے چھوڑ دیا جائے گا تو وہ تمام مخلوقات کو جلا دے پھر جہنم میرے سامنے آئے گی تو وہ کہے گی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھے آپ سے کیا سروکار اللہ تعالیٰ نے تیرا گوشت مجھ پر حرام کر دیا ہے؟ کوئی نفس نہیں بچے گا مگر وہ کہہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر، باب فضل عیادۃ المریض

رہا ہوگا: نفسی نفسی مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمار ہے ہوں گے: رَبِّ أُمتی رَبِّ أُمتی (1)۔

اس روز انسان نصیحت حاصل کرے گا اور وہ توبہ کرے گا۔ یہاں انسان سے مراد کافر ہے یا جس کے اکثر مقاصد دنیا سے متعلق تھے۔اب اس کے لیے کہاں سے نصیحت اور توبہ ہے جب کہ اس نے دنیا میں کوتاہی سے کام لیا تھا۔ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس کے لیے کہاں سے نصیحت یا نفع ہے۔ یہاں مضاف کا مقدر ہونا ضروری ہے ورنہ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ اور وَ اَنّٰی لَهُ الذِّكْرٰى میں منافات ہوگی؛ یہ زمخشری کا نقطہ نظر ہے۔

**يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۝۲۴**

''(اس دن) کہے گا: کاش! میں نے کچھ آگے بھیجا ہوتا اپنی (اس) زندگی کے لیے''۔

لِحَيَاتِيْ میں لام، فی کے معنی میں ہے۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: میں نے اپنی زندگی کے لیے اچھا عمل بھیجا ہوتا یعنی ایسی زندگی کے لیے جس میں موت نہ ہو۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: اہل نار کی زندگی کوئی مبارک نہ ہوگی گویا ان کے لیے کوئی زندگی نہیں معنی اس کا یہ ہے ہائے کاش! میں نے اس آگ سے بچاؤ کے لیے کوئی بھلائی بھیجی ہوتی تو میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جن کے لیے مبارک زندگی ہوتی۔

**فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۝۲۵ وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ۝۲۶**

''پس اس دن اللہ کے عذاب کی طرح نہ کوئی عذاب دے سکے گا اور نہ اس کے باندھنے کی طرح کوئی باندھ سکے گا''۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب جیسا کوئی عذاب نہ دے گا اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا۔ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری کا قول ہے، کسائی نے دونوں افعال لَا يُعَذِّبُ اور لَا يُوْثِقُ کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس روز کافر کو جیسا عذاب دے گا اس طرح کسی کو عذاب نہیں دیا جار ہا ہوگا اور جیسا کافر کو جکڑا گیا ہو گا ایسا کسی کو نہ جکڑا گیا ہوگا۔اس سے مراد ابلیس ہے کیونکہ اس امر پر دلیل قائم ہے کہ اس کے جرموں کی وجہ سے لوگوں میں سے سب سے زیادہ عذاب اسے دیا جار ہا ہوگا پھر کلام کو مطلق رکھا گیا کیونکہ ساتھ والی آیات مطلق ہیں۔ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا مصداق امیہ بن خلف ہے؛ یہ قول فراء نے کیا ہے جیسا عذاب اس کافر کو دیا جار ہا ہے ایسا عذاب کسی کو بھی نہیں دیا جائے گا اور جیسا اسے زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا جائے گا ایسا کسی کو نہیں جکڑا جائے گا کیونکہ وہ کفر اور عناد میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی جگہ کسی کو عذاب نہ دیا جائے گا اور نہ ہی کسی سے فدیہ لیا جائے گا عذاب، تعذیب کے معنی میں ہے اور وثاق، ایثاق کے معنی میں ہے۔اس معنی میں شاعر کا قول ہے

وبَعْدَ عَطَائِكَ الْمِائَةَ الرِّتَاعا

یہاں الرتاع، ارتاع کے معنی میں ہے۔یعنی ایسا آدمی جو کافر نہیں اسے کافر جیسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔ابو عبید اور ابو

1۔الوسیط، الواحدی، جلد 4، صفحہ 458-459

حاتم نے ذال اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے ضمیر کافر کے لیے ہوگی کیونکہ یہی معروف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب جیسا کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ ابوقلابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاء اور ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ ابوعمرو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ابوعلی نے کہا: یہ جائز ہے کہ ضمیر کافر کے لیے ہو کیونکہ ایک جماعت کی قراءت یہی ہے، یعنی کوئی کسی کو ایسا عذاب نہیں دے گا جس طرح اس کافر کو عذاب دیا جا رہا ہے پس عَذَابَہٗ اور وَثَاقَہٗ کی ضمیر کافر کے لیے ہوگی احد سے مراد فرشتے ہوں گے جو جہنمیوں کو عذاب دینے کے ذمہ دار ہیں۔

**یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾**

''اے نفس مطمئن! واپس چلو اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی (اور) وہ تجھ سے راضی۔ پس شامل ہو جاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جاؤ جنت میں''۔

جب اس آدمی کی حالت کا ذکر کیا جس کا مقصود دنیا تھی اس نے اللہ تعالیٰ پر غنی کرنے اور تنگی دینے پر تہمت لگائی تھی اب اس آدمی کی حالت کا ذکر کیا جس کا نفس اللہ تعالیٰ سے مطمئن تھا اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور اس پر بھروسہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے لیے ایک قول ہے۔ نفس مطمئنہ سے مراد سکون پانے والا اور یقین رکھنے والا نفس ہے جس نے یقین کیا کہ اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے اور اس کے سامنے تواضع کا اظہار کیا؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ثواب پر مطمئن ہے۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے: اس سے مراد نفس مؤمنہ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس سے مراد ایمان اور یقین رکھنے والا نفس ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی نفس ہے جو یہ جانتا ہے کہ جو چیز اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے وہ اس کو کبھی بھی نہیں پائے گا اور جس کو اس نے پایا ہے وہ اس کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن پانے والا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے یا أیھا النفس الآمنة المطمئنة۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد وہ نفس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو وعدہ کیا اس پر یقین رکھتے ہوئے عمل کیا۔ ابن کیسان نے کہا: یہاں مطمئنہ سے مراد مخلص نفس ہے اس سے مراد نفس عارضہ ہے جو پلک جھپکنے کے برابر صبر نہیں کر سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتا ہے اس کی وضاحت یوں ہے: **اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ** (الرعد:28) جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایمان پر مطمئن اور دوبارہ اٹھائے جانے اور ثواب کی تصدیق کرنے والا۔

ابن زید نے کہا: وہ مطمئن ہیں کیونکہ موت کے وقت دوبارہ اٹھائے جانے اور محشر کے دن انہیں جنت کی بشارت دی جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت نقل کی کہ اس سے مراد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نفس ہے صحیح بات یہ

ہے کہ یہ ہر مومن، مخلص اور اطاعت شعار نفس میں حکم عام ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ کیا کہ وہ اپنے مومن بندے کی روح کو قبض کرے تو وہ نفس اللہ تعالیٰ سے مطمئن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس نفس سے مطمئن ہوتا ہے (1)۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: جب مومن فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور ان دونوں کے ساتھ جنت سے تحفہ بھی بھیجتا ہے دونوں اسے کہتے ہیں: اے نفس مطمئنہ سَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً نکلو روح و ایمان کی طرف نکلو اپنے رب کی طرف، نکلو جو تم سے راضی ہے نہ کہ تم سے ناراض ہے تو وہ کستوری کی پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ نکلتا ہے جو کسی کی ناک نے روح زمین پر پائی تھی۔ حدیث کا ذکر کیا۔

سعید بن زید (جبیر) نے کہا: ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ آیت پڑھی یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۞ حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ کتنا اچھا کلام ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فرشتہ تجھے بھی کہے گا: اے ابوبکر!'' (2)۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال طائف میں ہوا تو ایک ایسا پرندہ آیا جس شکل وصورت کا کبھی پرندہ نہ دیکھا گیا تھا وہ آپ کے جنازہ میں داخل ہو گیا پھر اسے باہر نکلتے ہوئے نہ دیکھا گیا جب آپ کو دفن کیا گیا تو قبر کے کنارے اسی آیت کو تلاوت کیا گیا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ کس نے اسے تلاوت کیا ہے (3)۔

ضحاک نے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی جب آپ نے بئر رومہ کو وقف کیا تھا (4)۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ حضرت خبیب بن عدی کے حق میں نازل ہوئی جنہیں اہل مکہ نے سولی پر لٹکایا تھا انہوں نے آپ کا چہرہ مدینہ کی طرف کیا تو اللہ تعالیٰ نے چہرہ مکہ مکرمہ کی طرف کر دیا۔ واللہ اعلم۔

اِلٰى سَبِّكِ سے مراد اپنے صاحب اور اپنے جسم کی طرف لوٹ جا؛ یہ حضرت ابن عباس، عکرمہ اور عطا کا قول ہے؛ طبری نے اسے پسند کیا۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس کی قراءت ہے فادخلی فی عبدی علی التوحید اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حکم دے گا کہ وہ جسموں کی طرف لوٹ جائیں۔ حضرت ابن مسعود کی قراءت یہ ہے فی جسد عبدی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اپنے رب کے ثواب اور کرامت کی طرف لوٹ جا۔ حضرت ابو صالح نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جا۔ موت کے وقت اسے کہا جائے گا: میرے بندوں کے جسموں میں داخل ہو جاؤ۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ قیامت کے روز ہوگا؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ جنت ہی دار خلود ہے، نیک لوگوں کا مسکن ہے اور صالحین، اخیار کا گھر ہے۔ فِیْ عِبٰدِیْ سے مراد ہے میرے بندوں میں سے صالحین میں شامل ہو جاؤ جس طرح فرمایا: لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ ۞ (العنکبوت) ہم انہیں ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔ اخفش نے کہا: فِیْ عِبٰدِیْ کا معنی ہے میری جماعت میں۔ معنی ایک ہی ہے یعنی ان کی لڑی میں پرو جا اور ان کے ساتھ میری جنت میں داخل ہو جا۔

---

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 272
2۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 396
3۔ طبرانی، الکبیر، 10581
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 350

# سورۃ البلد

آیاتہا ۲۰ ۹۰ سورۃ البلد مکیۃ ۳۵ رکوعہا ۱

تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور اس کی بیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾

''میں قسم کھاتا ہوں اس شہر ( مکہ ) کی''۔

یہ جائز ہے کہ لَاۤ زائدہ ہو جس طرح لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ (القیامۃ) میں روز قیامت کی قسم اٹھاتا ہوں؛ یہ اخفش کا قول ہے یعنی میں قسم اٹھاتا ہوں، کیونکہ ارشاد فرمایا ہے: بِہٰذَا الۡبَلَدِ جبکہ پہلے شہر کی قسم اٹھائی وھذا البلد الامین یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کی قسم کا انکار کرے جب کہ اس کی قسم اٹھائی ہو۔ شاعر نے کہا:

تَذَکَّرتُ لیلی فاعترتنی صبابۃ وکاد صمیم القلبِ لا یَتَقَطَّعُ

میں نے لیلیٰ کو یاد کیا تو مجھے عشق نے آلیا قریب تھا کہ صمیم قلب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

شعر میں حرف لا صلہ (زائد) ہے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُکَ (الاعراف:12) کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ اس پر دلیل سورۂ ص میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا مَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ (ص:75)

حضرت حسن بصری، اعمش اور ابن کثیر نے لا قسم پڑھا ہے لام کے بعد الف ذکر نہیں کیا گویا لا قسم میں لام کے بعد الف اقسم کا ہے اخفش نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ یہ الا کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قسم کی نفی نہیں بلکہ یہ تو عربوں کے قول کے مطابق ہے: لا واللہ لا فعلت کذا، لا واللہ ما کان کذا، لا واللہ لا فعلن کذا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ صحیح نفی ہے معنی یہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے نکل جائیں گے تو میں اس شہر کی قسم نہیں اٹھاؤں گا؛ یہ مکی نے حکایت بیان کی ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہی روایت نقل کی ہے کہا: لَاۤ ان پر رد کرنے کے لیے ہے؛ یہ ابن عربی کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے کیونکہ اس نے کہا: جس نے یہ کہا ہے کہ یہ رد ہے تو وہ ایسا قول ہے جس کا رد نہیں کیونکہ اس کے ساتھ معنی صحیح ہوتا ہے اور لفظ و مراد دونوں متمکن ہیں یہ اس آدمی کا رد ہے جو موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتا ہے پھر قسم کا آغاز کیا (1)۔

قشیری نے کہا: یہ اس چیز کا رد ہے کہ اس سورت میں مذکور انسان جو دنیا سے دھوکہ میں مبتلا ہے اس کا رو بنے، یعنی معاملہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1921

اس طرح نہیں جس طرح وہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی قادر نہ ہوگا پھر قسم کا آغاز ہوگا۔ اَلْبَلَدِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے تمام علماء کا اس پر اجماع ہے یعنی میں اس بلد حرام کی قسم اٹھاتا ہوں جس میں آپ موجود ہیں کیونکہ تجھے عزتوں سے نوازنا میرے ذمہ کرم پر ہے اور اس سے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ واسطی نے کہا: ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اس شہر کی قسم اٹھاتے ہیں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ٹھہر کر شرف بخشا اور وصال کے بعد برکت عطا کر کے شرف بخشا اس سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ تمام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

## وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ۝

''دراں حالیکہ آپ بس رہے ہیں اس شہر میں''۔

یعنی مستقبل میں، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ۝ (الزمر) کلام عرب میں اس کی مثالیں عام ہیں۔ جس سے تو عزت اور عطیہ کا وعدہ کرتا ہے اسے تو کہتا ہے: أنت مکرم مجلو اللہ تعالیٰ کے کلام میں بھی یہ عام ہے کیونکہ اس کے نزدیک آنے والے احوال موجود احوال کی طرح ہیں تیرے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ یہ استقبال کے لیے ہے اور حال کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کرنا محال ہے کیونکہ یہ سورت بالاتفاق فتح مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ منصور نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: وَ اَنْتَ حِلٌّ یعنی تو نے اس میں جو کیا ہے وہ آپ کے لیے حلال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح کہا: جس روز آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے آپ کے لیے حلال کر دیا گیا تھا کہ جس کو چاہیں قتل کر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل، مقیس بن صبابہ وغیرہ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہاں کسی کو قتل کرے۔

سدی نے کہا: معنی ہے جو آدمی آپ سے قتال کرے اسے قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ دن کی کچھ گھڑیوں میں آپ کے لیے قتال کو حلال کیا گیا پھر تا قیامت اسے حرام کر دیا گیا۔ وہ فتح مکہ کے دن ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ اللہ حَرَّمَ مَكَّةَ يومَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ والأرض فهي حَرامٌ إلى أن تقومَ الساعةُ فلم تَحِلَّ لِأَحَدٍ قبلي ولا تَحِلّ لِأحدٍ من بعدي ولم تَحِلَّ لي إلَّا ساعةً من نهارٍ۔(1)

اللہ تعالیٰ نے جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا مکہ مکرمہ کو حرمت والا بنایا یہ حرام ہی رہے گا یہاں تک کہ قیامت برپا ہوگی مجھ سے قبل یہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوا میرے بعد یہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوگا اور میرے لیے یہ دن کی کچھ ساعتوں میں حلال کیا گیا۔

سورۃ المائدہ میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ابن زید نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی حلال نہ تھا یعنی کسی سے تعرض نہ کیا جاتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں مقیم ہیں اور وہ آپ کا محل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا آپ اس

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 2353

میں احسان کرنے والے ہیں میں تجھ سے اس میں راضی ہوں۔ اہل لغت نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے: رجلٌ حِلٌّ، حَلَالٌ و مُحِلّ، رجل حَرَام و حِرم۔ قتادہ نے کہا: آپ یہاں حلال کام کرنے والے ہیں آپ گناہگار نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثنا ہے یعنی آپ اس شہر میں ایسی چیز کا ارتکاب کرنے والے نہیں جس کا ارتکاب آپ کے لیے حرام ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیت کا حق پہنچانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں کی طرح نہیں جو اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔ یعنی میں اس معظم گھر کی قسم اٹھاتا ہوں جس کی حرمت کو آپ پہچانتے ہیں آپ اس میں مقیم ہیں، اس کی تعظیم بجالانے والے ہیں، جو چیز آپ پر حرام ہے اس کا ارتکاب کرنے والے نہیں۔ شرحبیل بن سعد نے کہا: آپ اس شہر میں حلال ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ کو حرام سمجھتے ہیں کہ یہاں کسی شکار کو قتل کریں یا کسی درخت کو کاٹیں اس کے باوجود تیرے یہاں سے نکالنے اور آپ کے قتل کے درپے ہونے کو حلال جانتے ہیں۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳

''اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اولاد کی''۔

مجاہد، قتادہ، ضحاک، حسن بصری اور ابو صالح نے کہا: وَوَالِدٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور وَّمَا وَلَدَ سے مراد جو ان کی اولاد ہوئی۔ ان کی قسم اٹھائی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں سے سب سے عجیب ہے کیونکہ اس انسان میں بولنے، بیان کرنے اور تدبیر کی صلاحیت موجود ہے۔ ان میں انبیاء اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی صالح اولاد کی قسم ہے گویا غیر صالح لوگ چوپائے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: والد سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مَا وَلَدَ سے مراد آپ کی ذریت ہے؛ یہ ابو عمران جولانی کا قول ہے۔ پھر یہ احتمال ہے کہ تمام اولاد مراد ہے یا اولاد میں سے مسلمان مراد ہیں۔ فراء نے کہا: مَا لوگوں کے لیے بھی درست ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَا طَابَ لَكُمْ (النساء: 3) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى ۝۳ (اللیل) وہی مذکر و مونث کا خالق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ما مابعد سے مل کر مصدر کے حکم میں ہے مراد والد اور اس کی ولادت کی قسم، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ (الشمس)

عکرمہ اور سعید بن جبیر نے کہا: وَالِدٍ سے مراد جس کی اولاد ہو اور مَا وَلَدَ سے مراد بانجھ ہے جس کی اولاد نہ ہو؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اس صورت میں ما نافیہ ہے۔ یہ بعید ہے اسم موصول کو مضمر ماننے کے بغیر یہ صحیح نہیں تقدیر کلام یہ بنتی ہے ووالد والذی ما ولد یہ بصریوں کے نزدیک جائز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہر والد اور مولود کو عام ہے؛ یہ عطیہ عوفی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے؛ یہ طبری کا پسندیدہ مسلک ہے۔ ماوردی نے کہا(1): یہ احتمال موجود ہے کہ وَلَدَ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہو اور مَا وَلَدَ سے مراد آپ کی امت ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے: إنما أنا لكم بمنزلة الوالد أعلمكم میری تمہارے لیے حیثیت والد

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 275

کی سی ہے میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔ پہلے آپ کے شہر کی قسم اٹھائی پھر آپ کی اور آپ کی امت کی قسم اٹھائی مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت میں مبالغہ کا اظہار ہے۔

## لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝

"بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں (زندگی بسر کرنے کے لیے) پیدا کیا"۔

یہاں پر قسم ختم ہوگئی تھی یہ آیت جواب قسم ہے! اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ اپنی مخلوقات کی تعظیم کے لیے جس کی چاہے قسم اٹھائے جس طرح پہلے گزر چکا ہے یہاں انسان سے مراد ابن آدم ہے کَبَد کا معنی شدت اور تھکاوٹ ہے یہ مُكَابَدَةُ الدُّنْيَا سے مشتق ہے کَبَد کا اصل معنی شدت ہے اس سے ایک جملہ بولا جاتا ہے: تکبد اللبن دودھ گاڑھا ہو گیا، سخت ہو گیا؛ اسی سے کبد (جگر) ہے کیونکہ یہ بھی خون ہوتا ہے جو گاڑھا اور سخت ہو جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: کابدت ھذا الأمر میں نے اس امر کی سختی کو برداشت کیا؛ لبید نے کہا:

يا عينُ هَلَّا بكيتِ أربدَ إذ　قُمْنا وقام الخصومُ في كَبَدِ

اے آنکھ! تو اربد کے مقام پر کیوں نہ روئی جب ہم اور جھگڑا کرنے والے مشقت میں کھڑے ہوئے۔

حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری نے کہا: فِیْ كَبَدٍ کا معنی ہے سختی اور تھکاوٹ میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: شدت میں، یعنی حمل، ولادت، دودھ پلانا، دانتوں کا نکلنا وغیرہ۔ عکرمہ نے آپ سے ہی یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں سیدھا ہوتا ہے۔ كَبَد کا معنی استواء اور استقامت ہے۔ یہ خلقت میں انسان پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں کسی جاندار کو پیدا نہیں کیا مگر وہ اپنے منہ کے بل اوندھا ہوتا ہے صرف انسان کا معاملہ مختلف ہے، کیونکہ وہ سیدھا ہوتا ہے؛ یہ مجاہد، نخعی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: ماں کے پیٹ میں اس کا سر سیدھا کھڑا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اسے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے تو اس کے سر کو اس کی ماں کی ٹانگوں کی طرف کر دیتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: وہ دنیا اور آخرت کے مصائب اور تکالیف برداشت کرتا ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: وہ خوشحالی کے دور میں شکر کو کام میں لاتا ہے اور تنگدستی کے دور میں صبر کو کام میں لاتا ہے کیونکہ وہ ان دونوں سے خالی نہیں ہوتا؛ اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ یمان نے کہا: اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اتنی مشقت برداشت کرتی ہو جیسی مشقت انسان برداشت کرتا ہے جب کہ یہ مخلوقات میں سے کمزور ترین ہے (1)۔ ہمارے علماء کہتے ہیں: سب سے پہلے جس مشقت کو وہ برداشت کرتا ہے وہ اس کی ناف کا کٹنا ہے پھر گہوارہ میں ڈالنے کے لیے اس پر جو کپڑے لپیٹ دیئے جاتے ہیں وہ تنگی اور تھکاوٹ کو برداشت کرتا ہے وہ دودھ پینے کی مشقت کو برداشت کرتا ہے اگر یہ چیز اسے نہ ملے تو فوت ہو جائے پھر دانتوں کے اگنے اور زبان کو حرکت دینے کی تکلیف برداشت کرتا ہے پھر وہ دودھ چھڑانے کی تکلیف کا سامنا کرتا ہے جو اس کے لیے طمانچے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے پھر وہ ختنہ کرانے دردوں اور غموں کا سامنا کرتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 488

ہے پھر وہ معلم اور اس کی سختی، مودب اور اس کے رویہ اور استاد اور اس کی ہیبت کا سامنا کرتا ہے پھر وہ شادی کی مصروفیت اور اس میں جلدی کا سامنا کرتا ہے پھر وہ اولاد، خادموں اور لشکروں کے معاملات میں جا پڑتا ہے پھر وہ گھروں اور محلات کے بنانے میں لگ جاتا ہے پھر بڑھاپے، گھٹنوں اور قوموں کے ضعف کا سامنا کرتا ہے ایسے ایسے مصائب دیکھتا ہے جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایسے دکھ دیکھتا ہے جن کا عرصہ بڑا طویل ہوتا ہے جیسے سر درد، داڑھوں کا درد، آشوب چشم، قرض کا غم، دانت اور کان کا درد، اسی طرح وہ مال اور نفس میں امتحانات کا سامنا کرتا ہے جس طرح مار پیٹ اور قید۔ کوئی دن اس پر نہیں گزرتا مگر وہ اس میں شدت کو برداشت کرتا ہے پھر اس کے بعد موت کا مرحلہ ہوتا ہے، پھر فرشتہ کے سوالات ہوتے ہیں، قبر کا دیکھنا اور اس کی تاریکی، دوبارہ اٹھانا اور اللہ تعالیٰ پر پیشی، یہاں تک وہ قرار پذیر ہو جاتا ہے یا تو یہ جنت میں جا کر ٹھہرتا ہے یا دوزخ میں ٹھکانہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ اگر یہ انسان کے بس میں ہوتا تو وہ ان مصائب کو کبھی برداشت نہ کرتا۔ یہ سب چیزیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کا کوئی خالق ہے اس نے ان احوال کا اس پر فیصلہ کیا ہے پس انسان کو چاہیے کہ اس ذات کے حکم کی پیروی کرے۔

ابن زید نے کہا: یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں فِيْ كَبَدٍ سے مراد آسمان کا درمیان ہے(1)۔ کلبی نے کہا: یہ حکم بنی جمح کے بارے میں نازل ہوا جسے ابوالاشدین کہتے ہیں، وہ عکاظی چمڑا لیتا اسے اپنے قدموں کے نیچے بچھاتا وہ کہتا: جس نے مجھے اس سے گرا دیا اس کے لیے یہ انعام ہے۔ اس چمڑے کو دس آدمی کھینچتے یہاں تک کہ وہ چمڑا پھٹ جاتا اور اس کے قدم اپنی جگہ سے نہ ہلتے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں سے تھا اس کے بارے میں یہ نازل ہوا: اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ یعنی وہ اپنی قوت کی بنا پر یہ گمان کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: فِيْ كَبَدٍ کا معنی ہے قوی، وہ قریش میں سب سے طاقتور اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ رکانہ بن ہاشم بن مطلب اسی طرح تھا وہ طاقت اور قوت میں مثال تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: فِيْ كَبَدٍ کا معنی ہے وہ دل کا جری اور سخت ہے جب کہ اس کی خلقت کمزور اور مادہ حقیر ہے۔ ابن عطا نے کہا: وہ ظلمت و جہالت میں ہے۔ ترمذی نے کہا: جو با مقصد کام ہیں ان کو ضائع کرنے والا ہے اور جو بے مقصد امور ہیں ان میں مصروف رہنے والا ہے۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝

''کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا، کہتا ہے: میں نے ڈھیروں مال فنا کر دیا۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے دو آنکھیں اور ایک کان اور دو ہونٹ''۔

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا نہیں دے گا وہ کہتا ہے: میں نے کثیر مال خرچ کر دیا۔ کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے سب اعمال کو جانتا ہے وہ اس بات میں جھوٹا ہے کہ وہ کہتا ہے: میں نے مال خرچ کیا

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 276

ہے جب کہ اس نے مال خرچ نہیں کیا ہوتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بندے کو کھڑا کیا جائے گا اسے کہا جائے گا: میں نے تجھے جو رزق دیا تھا اس کا تو نے کیا کیا۔ وہ کہے گا: میں نے اس کو خرچ کیا اور اس کی زکوٰۃ ادا کی۔ اسے کہا جائے گا: گویا تو نے یہ کیا تا کہ کہا جائے کہ وہ بڑا سخی ہے تو وہ تو کہا جا چکا۔ پھر اسے آگ میں ڈالنے کا حکم دے دیا جائے گا (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابو الاشدین کہا کرتا تھا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے جب کہ وہ جھوٹا تھا۔ مقاتل نے کہا: یہ حارث بن عامر بن نوفل کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے گناہ کیا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ کفارہ ادا کرے۔ اس نے کہا: میں جب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہوا ہوں میرا مال تو کفارات اور نقصانات میں خرچ ہو گیا ہے۔ اس کا یہ قول اس چیز کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس نے جو مال خرچ کیا تھا وہ اس کو کثیر جانتا تھا تو یہ اس کی جانب سے سرکشی ہوگی یا بطور افسوس کیا ہو تو اس کی جانب سے شرمندگی ہوگی۔

ابو جعفر نے لُبَّدا پڑھا ہے کیونکہ یہ لابد کی جمع ہے جس طرح راکع کی جمع رُكَّع، ساجد کی جمع سجّدَ اور شاھد کی جمع شُھَّد آتی ہے۔ مجاہد اور حمید نے باء کو مضموم اور لام کو بغیر شد کے پڑھا ہے۔ اس وقت یہ لبود کی جمع ہوگی۔ باقی قراء نے لام کے ضمہ اور اس کے کسرہ اور باء کو فتحہ غیر مشدد پڑھا ہے اس وقت یہ لُبدۃ اور لِبدۃ کی جمع ہوگی اس سے مراد وہ چیز ہے جو تہہ در تہہ ہے مراد کثرت کا اظہار ہے۔ سورۃ الجن میں اس بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ دونوں جگہ ایَحْسُبُ پڑھا کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: معنی یہ بنتا ہے وہ کہتا ہے میں نے بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے جو اس کے متعلق میرا محاسبہ کرے گا مجھے چھوڑ دو کہ میں بھی اس کا محاسبہ کروں کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے محاسبہ پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر نعمتوں کو شمار کیا۔

کیا ہم نے اس کے لیے آنکھیں نہیں بنائیں جن کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، زبان نہیں بنائی جس کے ساتھ وہ بولتا ہے، ہونٹ نہیں بنائے جن کے ساتھ وہ دانتوں کو چھپاتا ہے اس کا معنی یہ ہے ہم نے یہ کہا اور ہم اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ ہم اسے دوبارہ اٹھائیں اور اس نے جو عمل کیا ہم اس کو شمار کریں۔ ابو حازم نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے انسان! اگر زبان ان معاملات میں تجھ سے نزاع کرے جو میں نے تجھ پر حرام کیے ہیں تو میں نے تیری دو طبق (دو ہونٹ) سے مدد کی ہے ان کو بند کر دے، اگر تیری آنکھ تجھ سے ایسے امور میں جھگڑا کرے جو میں نے تجھ پر حرام کیے ہیں تو میں نے تیری دو طبق (یعنی دو چھپروہ) سے تیری مدد کی ہے ان کو بند کر لے، اگر تیری شرمگاہ تیرے ساتھ ان معاملات میں جھگڑا کرے جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر حرام کیے ہیں تو اس کے خلاف میں نے دو طبق سے تیری مدد کی ہے تو انہیں بند کر دے'' (2)۔ الشفۃ اصل میں شفھۃ تھا اس سے ہاء کو حذف کر دیا گیا اس کی تصغیر شفیھۃ آتی ہے اس کی جمع شفاہ ہے یہ جملہ

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 8277

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 489

بولا جاتا ہے: شفھات، شفوات، ھاء زیادہ موزوں ہے اور واؤ عام ہے جس طرح سنوات میں واؤ عام آتی ہے۔ ازہری نے کہا: وصل کی صورت میں ھذہ شفة کہتے ہیں اور شفہ بھی کہتے ہیں یعنی یہ لفظ تاء اور ھاء دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں تجھے متوجہ کرتی ہیں کہ تو ان کا شکر بجالائے۔

## وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾

''اور ہم نے دکھا دیں اسے دونوں نمایاں راہیں''۔

النَّجْدَيْنِ سے مراد دوراستے ہیں بھلائی اور برائی کا راستہ یعنی ہم نے ان دونوں کو اس کے لیے بیان کر دیا ہے جو ہم نے اس کی طرف رسول بھیجے ہیں۔ نجد اس راستہ کو کہتے ہیں جو بلندی کی طرف جاتا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور دوسرے علماء کی رائے ہے۔ قتادہ نے کہا: ہمارے لیے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا کرتے تھے: یأیھا الناس ھما النجدان، نجدُ الخیر و نجدُ الشرّ فلم نجعل نجدَ الشرّ أحبَّ إلیك من نجدِ الخیر (1)۔ اے لوگو! وہ دونوں راستے ہیں بھلائی کا راستہ اور برائی کا راستہ ہم نے شر کے راستہ کو خیر کے راستہ سے تیرے لیے زیادہ محبوب نہیں بنایا۔ عکرمہ سے یہ مروی ہے: نجدان سے مراد دو پستان ہیں؛ یہ سعید بن مسیب اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: یہ دونوں بچے کی زندگی اور رزق کے لیے دو راستوں کی طرح ہیں۔ نجد کا معنی بلندی ہے اس کی جمع نجود آتی ہے اس وجہ سے نجد کے علاقہ کو نجد کہتے ہیں کیونکہ وہ تہامہ کے زیریں ہونے کی بنسبت بلند ہے۔ پس نجدان دو بلند راستے ہیں۔

## فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾

''پھر وہ داخل نہیں ہوا عمل خیر کی (دشوار) گھاٹی میں''۔

وہ مال جس کے بارے میں وہ گمان رکھتا ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت میں خرچ کیا ہے اس نے وہ مال اقتحام عقبہ میں کیوں خرچ نہ کیا کہ وہ امن پاتا۔ اقتحام کا معنی اپنے کو بغیر سوچے سمجھے کسی چیز میں پھینک دینا اس سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: قحم فی الأمر قحوما یعنی اس نے بغیر سوچے سمجھے اپنے آپ کو اس میں پھینک دیا۔ قَحَمَ الفرسُ فارسَه تَقْحِيمًا علی وجھه۔ یعنی گھوڑے نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ تقحیم النفس فی الشئ کا معنی ہے اس کا بغیر سوچے سمجھے اپنے آپ کو کسی چیز میں داخل کرنا۔ القحمة سے مراد ہلاکت اور سخت سال ہے۔ أصابت الأعراب القحمة۔ جب انہیں قحط نے آ لیا تو وہ اس میں داخل ہو گئے۔ قحم سے مراد مشکل راستہ ہے۔ فراء اور زجاج نے کہا: ایک دفعہ حرف لا داخل کیا گیا ہے جب کہ عرب ایسے موقع پر کم ہی لا اکیلا داخل کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ دوسری کلام میں اس کا اعادہ کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰی ﴿۳۱﴾** (القیامہ) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ **وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱﴾** (البقرہ) نہ ان پر خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہاں اسے مفرد ذکر کیا ہے کیونکہ کلام کا آخر اس کے معنی پر

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 418

دلالت کرتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تکریر کے قائم مقام ہو گویا یوں فرمایا: فلا اقتحم العقبة ولا آمن۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دعا کے قائم مقام ہے جس طرح کسی کا قول ہے: لَا نَجَا وَلَا سَلِمَ۔

سفیان بن عیینہ نے کہا: ہر وہ شئی جس کے بارے میں فرمایا وَمَآ اَدْرٰىكَ (القدر: 2) اس کے بارے میں آپ کو آگاہ کر دیا اور ہر وہ شے جس کے بارے میں فرمایا: وَمَا يُدْرِيْكَ (الاحزاب: 63) اس کے بارے میں آپ کو خبر نہ دی۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۝ کا معنی ہے وہ عقبہ میں داخل نہیں ہوا۔

جس طرح زہیر کا قول ہے:

فلا هُوَ أبداها ولم يَتَقَدَّمِ یہ فلم يبدها ولم يتقدم کے معنی میں ہے۔ مبرد اور ابو علی نے اسی طرح کہا: لا، لم کے معنی میں ہے۔ امام بخاری نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے: فلم يقتحم العقبة في الدنيا یعنی دنیا میں وہ عقبہ میں داخل نہیں ہوا تو اسے تکرار کی ضرورت نہیں۔ ہر عقبہ اور اس پر سوار ہونے کی وضاحت کی اور فرمایا: غلام کو آزاد کرنا اور یہ کرنا اور یہ کرنا۔ اور مالی عبادتوں کی وضاحت کی۔ ابن زید اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: کلام کا معنی وہ استفہام ہے جو انکار کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی أفلا إقتحم العقبة أو هلا إقتحم العقبة اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اس نے غلام آزاد کرنے میں بھوکوں کو کھانا کھلانے میں اپنا مال کیوں خرچ نہ کیا تاکہ اس کے ذریعے عقبہ سے گزر جاتا تو یہ صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں مال خرچ کرنے سے بہتر ہوتی۔ پھر ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اقتحام عقبہ یہاں ضرب المثل ہے معنی یہ ہوگا کیا اس نے بڑے بڑے امور کو برداشت کیا ہے جو اس نے اپنے رب کی اطاعت میں مال خرچ کرنے کی صورت میں تھے اور اس پر ایمان لانے کی صورت میں تھے۔ یہ تعبیر اس آدمی کے قول کے مناسب ہوگی جو فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۝ کو دعا پر محمول کرتا ہے یعنی جس نے اپنا مال اس صورت میں خرچ نہ کیا اس نے نہ نجات پائی اور نہ ہی وہ سلامت رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بڑے گناہوں، ان کے بوجھ اور شدت کو عقبہ سے تشبیہ دی گئی ہے جب وہ غلام آزاد کرے اور اچھے عمل کرے تو اس کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو عقبہ میں داخل ہو۔ اس سے مراد وہ گناہ ہیں جو اسے نقصان پہنچاتے ہیں، اسے اذیت دیتے ہیں اور مشقت میں ڈالتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ عقبہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے۔ ابو رجاء سے مروی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ عقبہ اس پر سات ہزار سال تک انسان چڑھتا رہے گا اور اس سے اترنے میں بھی اسے سات ہزار سال لگیں گے۔ حضرت حسن اور قتادہ نے کہا: یہ آگ میں سخت مشکل راستہ ہے جو پل سے پہلے ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ۔ مجاہد، ضحاک اور کلبی نے کہا: اس سے مراد وہ پل ہے جو جہنم پر ڈالا گیا ہے جو تلوار سے تیز ہے اس کی مسافت تین ہزار سال ہے اس میں نرم جگہ، بلند اور پست جگہیں ہیں۔ مومن پر یہ اتنے وقت کے لیے ہے جتنا عصر سے عشاء کا وقت ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مومن اتنے وقت کے لیے اس میں داخل ہوگا جتنا وقت فرض نماز کا ہوتا ہے۔

حضرت ابو درداء سے مروی ہے انہوں نے کہا: ہمارے سامنے عقبہ ہے اس میں سے سب سے نجات پانے والا ہوگا وہ جس کا سامان سب سے کم ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جہنم بذات خود عقبہ ہے۔ ابو رجاء نے حضرت حسن بصری سے روایت

نقل کی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے جس مسلمان نے کسی غلام کو آزاد کیا تو یہ جہنم سے آزادی کا فدیہ بن جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے ایک غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ ہر عضو کے بدلے میں اس کے عضو کو آزادی دے دے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من أعتق رقبة أعتق الله بكلِّ عضوٍ منها عضوًا من أعضائه من النّار حتّٰى فَرْجهُ بِفَرْجِه(1) جس نے کوئی غلام آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے میں اس کا عضو جہنم سے آزاد کر دے گا یہاں تک کہ شرمگاہ کے بدلے شرمگاہ۔

ترمذی شریف میں حضرت ابوامامہ اور دوسرے صحابہ سے یہ روایت مروی ہے کہ جس مسلمان نے کسی مسلمان مرد کو آزاد کیا یہ وہ غلام جہنم سے اس کی رستگاری کا باعث ہو جائے گا۔ غلام کا ہر جز مالک کے ہر جز کے بدلے میں ہو جائے گا اور جس مسلمان عورت نے مسلمان لونڈی کو آزاد کیا تو وہ لونڈی جہنم سے اس کی آزادی کا باعث ہو گی، ہر عضو دوسرے کے عضو کا بدلہ ہو جائے گا۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے(2)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عقبہ سے مراد پیشی کی ہولناکی سے اسے چھٹکارا دینا ہے۔ قتادہ اور کعب نے کہا: یہ پل سے پہلے آگ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! یہ شدید گھاٹی ہے انسان کا اپنے نفس، اپنی خواہش اور اپنے دشمن شیطان کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ کسی نے یہ شعر کہے:

إنّي بُلِيتُ بأربعٍ يَرْمِينَنِي　　بالنَّبْلِ قد نَصَبوا عليّ شِراكا

مجھے چار چیزوں کے ساتھ آزمایا گیا ہے جو مجھ پر تیر مار رہی ہیں اور انہوں نے مجھ پر اپنے تسمے باندھ رکھے ہیں۔

إبليسُ و الدّنيا ونفسي والهوىٰ　　من أين أرجو بينهن فكاكا

ابلیس، دنیا، میرا نفس اور خواہش میں ان کے درمیان سے کیسے چھٹکارے کی امید رکھوں۔

يا ربِّ ساعدني بعفوٍ إنّني　　أصبحت لا أرجو لهن سِوا كا

اے میرے رب! میری مدد فرما مجھے معاف کر کے میں، تیرے سوا ان کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔

## وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾

''اور آپ کیا سمجھیں کہ وہ گھاٹی کیا ہے''۔

اس کلام میں حذف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وما ادراك ما اقتحام العقبة یہ دین کے امر کو لازم پکڑنے کی عظمت بیان کرنا ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عقبہ سے آگاہ ہو جائیں۔ قشیری نے کہا: عقبہ کو عقبہ جہنم پر محمول کرنا بہت ہی بعید ہے کیونکہ دنیا میں کوئی آدمی بھی عقبہ جہنم میں داخل نہیں ہوا مگر اس صورت میں کہ اسے اس امر پر محمول کیا جائے کہ مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کیوں تیار نہیں کیا کہ اس کے لیے قیامت کے روز عقبہ جہنم میں داخل ہونا ممکن ہوتا۔ امام

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 9441

2۔ جامع ترمذی، کتاب النذور والایمان، باب ماجاء فی فضل من اعتق، حدیث نمبر 1467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بخاری نے مجاہد کا قول پسند کیا ہے کہ وہ دنیا میں عقبہ میں داخل نہیں ہوا۔ ابن عربی نے کہا: یہ قول اس لیے اختیار کیا کیونکہ دوسری آیت میں یہ فرمایا: وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؁ تیسری آیت میں فرمایا: فَكُّ رَقَبَةٍ ؁ چوتھی آیت میں فرمایا: اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ ؁ پھر پانچویں آیت میں فرمایا: يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ؁ چھٹی آیت میں فرمایا: اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؁ یہ اعمال تو دنیا میں ہوں گے معنی یہ ہوگا دنیا میں وہ ایسے امور نہیں لایا جو آخرت میں عقبہ میں داخل ہونے کو اس کے لیے آسان بنا دیتا۔

## فَكُّ رَقَبَةٍ ؁

''وہ (غلامی سے) گردن چھڑانا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

### فَكُّ رَقَبَةٍ کی تشریح

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ؁ کا معنی ہے اسے قید سے آزاد کرنا۔ ایک قول ہے: اسے غلامی سے آزاد کرنا۔ حدیث میں ہے: ''فک رقبة کا معنی ہے تو اس کی قیمت میں اس کی مدد کرے'' پھر حضرت براء کی حدیث ہے سورۂ براء میں پہلے گزر چکا ہے فَكُّ سے مراد قید کو کھول دینا ہے اور غلامی بھی ایک قید ہے غلام کو رقبہ کہتے ہیں کیونکہ وہ غلامی کے ساتھ اس قیدی کی طرح ہے جس کی گردن میں رسی بندھی ہوئی ہو۔ اس کی آزادی کو فَكُّ کا نام دیا جس طرح تو قیدی کو قید سے آزاد کرے تو اسے فک سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت حسان نے کہا:

كَمۡ مِنۡ أَسِيرٍ فَكَكۡنَاهُ بِلَا ثَمَنٍ

کتنے ہی قیدی ہیں جن کو ہم نے قیمت کے بغیر آزاد کیا۔

عقبہ بن عامر جہنی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا تو یہ اس کے جہنم سے آزاد ہونے کا فدیہ ہو جائے گا''(1)۔ ماوردی نے کہا: دوسرا احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ ارادہ کیا ہو کہ یہ اس نے گناہوں سے اجتناب کر کے اور اچھے اعمال کر کے اپنی گردن کو آزاد کر دیا اور نفس کو خلاصی عطا کر دی۔ حدیث اس تاویل کے مانع نہیں یہ زیادہ صحیح ہے۔

### کافر کے بجائے مسلمان غلام کو آزاد کرنا

**مسئلہ نمبر 2**۔ اصبغ نے کہا: کافر غلام جو زیادہ قیمت والا ہو وہ آزادی میں اس غلام سے افضل ہے جو مومن ہو اور کم قیمت والا ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جب کہ آپ سے پوچھا گیا تھا: کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ فرمایا: ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور مالکوں کے نزدیک اچھا ہو''۔ ابن عربی نے کہا: اس حدیث میں مراد مسلمان غلام ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے مسلمان کو آزاد کیا، جس نے مومن غلام کو آزاد کیا''۔

اصبغ نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ غلط ہے اس نے صرف مال کی کمی کی طرف دیکھا ہے جب کہ غلام کو عبادت کے لیے آزاد

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 17326، 17357۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 279

کرنا اور توحید کے لیے فارغ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

## غلام آزاد کرنا صدقہ کرنے سے افضل ہے

**مسئلہ نمبر 3**۔ آزاد کرنا اور صدقہ کرنا بہترین عمل ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ سے مروی ہے: آزادی صدقہ سے افضل ہے جب کہ صاحبین کے نزدیک صدقہ افضل ہے۔ آیت کریمہ امام ابوحنیفہ کے قول پر زیادہ دلالت کرتی ہے کیونکہ آزادی کو صدقہ پر مقدم کیا ہے۔ امام شعبی سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کہاں مال خرچ کرے وہ قریبی رشتہ داروں کو دے یا غلام آزاد کرے؟ فرمایا: غلام آزاد کرنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا عضو جہنم سے آزاد کر دے گا'' (1)۔

أَوْ إِطْعَٰمٌ فِى يَوْمٍ ذِى مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾

''یا کھانا کھلانا ہے بھوک کے دن (قحط سالی) میں یتیم کو جو رشتہ دار ہے یا خاک نشین مسکین کو''۔

مَسْغَبَةٍ کا معنی ہے بھوک۔ سغب کا معنی بھوک ہے اور ساغب بھوکے کو کہتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں قراءت کی ذا مسغبة ابوعبید نے یہ شعر پڑھا:

فَلَوْكُنْتُ جارا یا بن قَیْسِ بن عاصمٍ     لَمَا بِتَّ شَبْعَانًا و جارُك ساغِبًا

اے ابن قیس بن عاصم! اگر تو جوار کا حق ادا کرتا تو تو سیر ہو کر اور تیرا پڑوسی بھوکا رات نہ گزارتا۔

کھانا کھلانا فضیلت ہے جب بھوک ہو تو یہ بہت ہی افضل ہے۔ امام نخعی نے اس ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ایسے دن میں کھانا کھلانا جس میں کھانا نادر و نایاب ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: مِنْ مُوجِباتِ الرَّحمة اِطعامُ المسلمِ السغبان (2) رحمت کے موجبات میں سے یہ بھی ہے کہ بھوکے مسلمان کو کھانا کھلایا جائے۔ مقربة کا معنی قرابت ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان ذو قرابة و ذو مقربتی اللہ تعالیٰ تجھے تعلیم ارشاد فرماتا ہے کہ قریبی رشتہ دار پر صدقہ کرنا غیر قریبی رشتہ دار پر صدقہ کرنے سے افضل ہے، جس طرح ایسے یتیم پر صدقہ کرنا جس کا کوئی کفیل نہ ہو اس یتیم پر صدقہ کرنے سے افضل ہے جس کا کوئی نہ کوئی کفیل ہو۔ اہل لغت کہتے ہیں: اس کے ضعف کی وجہ سے یتیم کہا گیا یہ جملہ بولا جاتا ہے: یَتِمَ الرجلُ یُتْمًا جب وہ کمزور ہو۔ علماء نے یہ ذکر کیا ہے: لوگوں میں یتیم تو باپ کی جانب سے ہوتا ہے اور چوپاؤں میں ماں کی جانب سے ہوتا ہے سورۂ بقرہ میں مکمل بحث گزر چکی ہے۔ بعض علماء لغت نے کہا: یتیم اسے کہتے ہیں جس کے والدین فوت ہو جائیں؛ قیس بن ملوح نے کہا:

إلَى اللهِ أشكو فقدَ لَيْلَى كما شَكا     إلى اللهِ فقدَ الوالِدَيْن يَتِيمُ

لیلیٰ کے گم ہونے پر اللہ کی بارگاہ میں شکایت کرتا ہوں جس طرح یتیم والدین کے فوت ہو جانے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتا ہے۔

---

1۔ الکشاف، جلد 4، صفحہ 256

2۔ بیہقی، الشعب، حدیث نمبر 3363

ذَا مَتْرَبَةٍ سے مراد ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یہاں تک کہ گویا وہ فقر کی وجہ سے مٹی سے مل گیا ہے جس کی جائے پناہ مٹی کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو راستہ میں پڑا ہو جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جسے نہ لباس اور نہ ہی کوئی اور چیز مٹی سے بچاتی ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد عیالدار ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد مقروض ہے۔ ابو سنان نے کہا: اپاہج مراد ہے۔ ابن جبیر نے کہا: اس سے مراد ہے جس کا کوئی بھی نہ ہو۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد ایسا فساد ہے جو وطن سے بہت ہی دور ہو۔ ابو حامد خارزنجی نے کہا: یہاں مَتْرَبَةٍ سے مراد ہے برا حال۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ترب، جب وہ محتاج ہو؛ ہذلی نے کہا:

وَكُنّا إذا ما الضَّيْفُ حَلَّ بأرْضِنا سَفَكْنَا دِماءَ البُدْنِ في تُرْبَةِ الحالِ

جب کوئی مہمان ہمارے علاقے میں اترتا ہے تو ہم تنگدستی کے عالم میں بھی اونٹوں کو ذبح کر دیتے ہیں۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے اسے فك پڑھا ہے کہ یہ فعل ماضی کا صیغہ ہے رقبۃ کو نصب دی کیونکہ یہ مفعول بہ ہے اور اطعم اسے بھی فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ کلام فَكُّ اور اِطْعٰمٌ کے زیادہ مناسب ہے باقی قراء نے اسے فكُّ پڑھا ہے کیونکہ یہ فككت کا مصدر ہے۔ رقبۃ یہ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور اطعام باب افعال کا مصدر اور مرفوع پڑھا گیا ہے؛ ابو عبید اور ابو حاتم نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ یہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ کی تفسیر ہے پھر اس کی وضاحت کی اور فرمایا: فك رقبة أو اطعام، اقتحام العقبة کا معنی بھی ہے غلام آزاد کرنا اور کھانا کھلانا۔ جس نے اسے منصوب پڑھا ہے تو اس نے معنی پر محمول کیا ہے۔

ولا فكّ رقبة ولا إطعم في يوم ذا مسغبة تو اس کے لیے عقبہ سے گزرنا کیسے ممکن ہوگا۔ ابو الحسن اور رجاء نے کہا: ذا مسغبة منصوب ہے کیونکہ یہ اطعام کا مفعول ہے یعنی وہ بھوکے کو کھانا کھلاتے ہیں اور یتیما اس سے بدل ہے جب کہ باقی قراء نے ذِيْ مَسْغَبَةٍ پڑھا ہے جو يَوْمٍ کی صفت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ نصب کی قراءت جار مجرور کے محل کی صفت کے طور پر ہو، کیونکہ فِيْ يَوْمٍ کا قول ظرف ہے جس کا محل نصب ہے تو یہ معنی کے اعتبار سے اس کی صفت ہے لفظ کے اعتبار سے صفت نہیں۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

”پھر وہ جو ایمان والوں سے ہو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں صبر کی اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں رحمت کی۔ یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں۔ اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا وہ لوگ بائیں ہاتھ والے ہیں۔ ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی“۔

یعنی جس نے غلام کو آزاد کیا یا بھوک والے دن کھانا کھلایا تو وہ عقبہ میں داخل نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جائے گا جنہوں نے تصدیق کی، کیونکہ طاعات کے قبول ہونے کی شرط اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے انفاق کے بعد ایمان کچھ

نفع نہ دے گا بلکہ ضروری ہے کہ طاعت ایمان کے ساتھ ملی ہوئی ہو، اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ (التوبہ:54) اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کیا کرتا تھا، کھانا کھلایا کرتا تھا، قیدیوں کو چھڑاتا تھا، غلاموں کو آزاد کیا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اونٹ پر کسی کو سوار کرتا تھا کیا یہ امور اسے نفع دیں گے؟ فرمایا: نہیں اس نے کسی دن بھی یہ نہیں کہا: اے میرے رب! اور جزا میری خطا کو معاف کر دے (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا مطلب و معنی یہ ہے کہ اس نے یہ اعمال کیے ہوں جب کہ وہ مومن ہو پھر وہ وفات تک ایمان پر قائم رہا ہو، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ (طٰہٰ) اور میں بخشنے والا ہوں اسے جو تائب ہوا، ایمان لایا اور نیک عمل کیے پھر ہدایت یافتہ ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی یہ ہے پھر وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ان کے لیے نافع ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے یہ عبادات اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے کیں پھر وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا۔ حضرت حکیم بن حزام نے اسلام لانے کے بعد عرض کی: یا رسول اللہ! ہم دور جاہلیت میں کچھ اعمال کرتے اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے کیا وہ ہمارے لیے نفع مند ہوں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سابقہ دور میں تو نے جو بھلائی کی اس وجہ سے تو مسلمان ہوا'' (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ثُمَّ، واؤ کے معنی میں ہے معنی یہ ہوگا غلام کو آزاد کرنے والا، بھوک میں کھانا کھلانے والا ایمان لانے والوں میں سے ہے۔

انہوں نے ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کی طاعت، معاصی سے صبر اور انہیں جو مصیبت اور آزمائش پہنچی اس پر ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور مخلوقات پر رحم کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو انہوں نے یتیم اور مسکین پر رحم کیا۔ یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں یعنی جن کو ان کی کتاب ان کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی۔ محمد بن کعب قرظی اور دوسرے علماء نے کہا: یحییٰ بن سلام نے کہا کیونکہ وہ اپنی ذاتوں کے لیے یمن و برکت ہیں۔ ابن زید نے کہا: کیونکہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں پہلو سے لیے گئے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کیونکہ ان کا مقام دائیں جانب ہوگا؛ یہ میمون بن مہران نے کہا۔

جنہوں نے قرآن کا انکار کیا وہ اصحاب مشامہ ہیں وہ اپنی کتابیں اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑنے والے ہوں گے؛ یہ محمد بن کعب اور یحییٰ بن سلام نے کہا، کیونکہ وہ اپنی ذاتوں کے لیے بدبخت ہیں۔ ابن زید نے کہا: کیونکہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بائیں پہلو سے لیے گئے ہیں۔ میمون نے کہا: ان کا مقام بائیں جانب ہوگا۔

میں کہتا ہوں: ان تمام اقوال کا جامع یہ قول ہے کہ اصحاب میمنہ اصحاب جنت ہیں اور اصحاب مشامہ اصحاب نار ہیں اللہ

---

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 24621
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 15318

تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۞ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۞ (الواقعہ)
وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۞ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۞ (واقعہ) اور اس کی مثل جو آیات ہیں۔ مُّؤْصَدَةٌ کا
معنی ہے بند؛ شاعر نے کہا:

تَحِنُّ إلى أجبال مَكَّةَ ناقَتِي ومِنْ دُونِهَا أبوابُ صنعاءَ مُوْصَدَة

میری اونٹنی مکہ کے پہاڑوں کی مشتاق ہے اور اس کے پیچھے صنعاء کے دروازے اس کے لیے بند ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مُّؤْصَدَةٌ کا معنی مبہم ہے یہ معلوم نہیں کہ اس میں کیا داخل ہے اہل لغت کہتے ہیں: أوصدتُ الباب وآصدته یعنی میں نے دروازے کو بند کر دیا۔ جس نے أوصَدْتُ کہا تو اس کے نزدیک اس کا اسم وصاد آتا ہے جس نے آصدته کہا تو پھر اسم اصاد آتا ہے۔ ابو عمرو، حفص، حمزہ، یعقوب اور شیزری نے کسائی سے مُّؤْصَدَةٌ یہاں بھی اور سورۃ الہمزہ میں بھی ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابو بکر بن عیاش سے مروی ہے کہ ہمارے امام تھے وہ مُّؤْصَدَةٌ میں ہمزہ پڑھا کرتے تھے تو میں خواہش کرتا کہ جب میں سنوں تو اپنے کانوں کو بند کرلوں۔

# سورۃ الشّمس

﴿ آیاتہا ۱۵ ﴾ ﴿ ۹۱ سورۃ الشمس مکیۃ ۲۶ ﴾ ﴿ رکوعہا ۱ ﴾

اس کے مکی ہونے میں اتفاق ہے۔ یہ پندرہ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا ۝۱

''قسم ہے آفتاب کی اور دھوپ کی''۔

مجاہد نے کہا: وَضُحٰىهَا سے مراد اس کی روشنی اور اس کا چمکنا ہے۔ یہ دوسری قسم ہے۔ ضحی کو شمس کی طرف مضاف کیا کیونکہ یہ سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہی واقع ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کی رونق۔ سدی نے کہا: اس کی گرمی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وَضُحٰىهَا کا معنی ہے اس میں روشنی روک دی اسے گرم بنا دیا۔ یزیدی نے کہا: اس سے مراد اس کا پھیلنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مخلوقات میں سے جو چیزیں ظاہر و عیاں ہوتی ہیں تو قسم سورج اور زمین کی تمام مخلوقات کی ہوگی؛ یہ ماوردی نے کہا(1): ضحا مونث ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ارتفعت الضُحی، ضَحًا، ضحوۃ سے اوپر ہوتا ہے کبھی اسے مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ جس نے اسے مونث قرار دیا ہے وہ اسے ضحوۃ کی جمع قرار دیتا ہے جس نے اسے مذکر گردانا ہے وہ اسے فعل کے وزن پر اسم قرار دیتا ہے جس طرح صُرَد اور نُغَر ہے یہ ظرف ہے جس طرح سَحَر، تو کہتا ہے: لقیتہٗ ضُحًا وضَحًا جب تو اس کے ساتھ اپنے دن کی ضحا مراد لے گا تو تو اسے تنوین نہیں دے گا۔ فراء نے کہا: ضحا سے مراد دن ہے جس طرح قتادہ کا قول ہے عربوں کے ہاں جو چیز معروف ہے کہ ضحا اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج طلوع ہوا اور اس سے تھوڑا بعد کا وقت۔ جب دن اس سے زیادہ بلند ہو جائے تو اسے ضحاء کہتے ہیں جس نے الضحا کو پورا دن قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی سارا دن رہتی ہے۔ جس نے کہا: اس سے مراد سورج کی روشنی اور اس کی گرمی ہے تو سورج کا نور، سورج کی گرمی کے ساتھ ہی ہوتا ہے جس نے ضحی سے مراد سورج کی گرمی لی ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے وَلَا تَضۡحٰی ۝۱۱۹ (طٰہٰ) یعنی گرمی تجھے تکلیف نہ دے۔ مبرد نے کہا: ضحا اصل میں ضح ہے اس سے مراد سورج کا نور ہے الف دوسری حاء سے بدلا ہوا ہے، تو کہتا ہے: ضحوۃ، ضحوات علماء نے کہا: ضحوۃ میں واؤ حاء سے بدلی ہوئی ہے ضحا میں الف واؤ سے بدلا ہوا ہے۔ ابوہیثم نے کہا: ضح سایہ کی نقیض ہے یہ روئے زمین پر سورج کا نور ہے اس کی اصل ضحا ہے عربوں نے حاء کے سکون کے ساتھ یاء کو ثقیل جانا اور اسے الف سے بدل دیا۔

---

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 281

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۞

''اور قسم ہے ماہتاب کی جب وہ (غروب) آفتاب کے بعد آوے''۔

یعنی وہ سورج کے پیچھے آئے یہ اس وجہ سے ہوتا ہے جب سورج غروب ہوتا ہے تو چاند دکھائی دیتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: تلوت فلانا جب تو اس کی پیروی کرے۔ قتادہ نے کہا: یہ ہلال کی رات منظر ہوتا ہے جب سورج غروب ہوتا ہے تو چاند دکھائی دیتا ہے۔ ابن زید نے کہا: جب مہینے کے نصف میں سورج غروب ہوتا ہے تو چاند طلوع کر کے اس کا پیچھا کرتا ہے اور مہینے کے آخر میں اس کے غروب کے پیچھے ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: تَلٰىهَا کا معنی ہے اس سے حصہ لیتا ہے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ چاند سورج کی روشنی اخذ کرتا ہے۔ ایک قوم نے کہا: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا کا معنی ہے جب وہ پورا ہو جائے تو چاند روشنی اور نور میں سورج کی مثل ہو جاتا ہے؛ یہ زجاج کا قول ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۞

''اور قسم ہے دن کی جب وہ آفتاب کو روشن کر دے''۔

یعنی اس سے پردہ ہٹا دے۔ ایک قوم کی یہ رائے ہے: جب وہ تاریکی کو دور کر دے اگرچہ ظلمت کا پہلے ذکر نہیں ہوا جس طرح تو کہتا ہے: أضحت غدا اتنا باردۃ اس سے تو یہ ارادہ کرتا ہے کہ ہمارا کھانا ٹھنڈا ہو گیا؛ یہ فراء، کلبی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ایک قوم کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ جَلّٰىهَا میں ضمیر سورج کے لیے ہے معنی اس کا یہ ہوگا اس کی روشنی سے اس کا جسم عیاں ہو جاتا ہے؛ اس معنی میں قیس بن خطیم کا قول ہے:

تَجَلَّتْ لَنَا كَالشَّمْسِ تحتَ غَمامةٍ بدا حاجبٌ منها و ضَنَّت بحاجِبِ

وہ ہمارے لیے یوں ظاہر ہوئی جس طرح سورج بادل سے ظاہر ہوتا ہے اس کا ایک آبرو ظاہر ہوا اور ایک چھپا ہوا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: زمین میں جتنے بھی حیوانات تھے سب کو ظاہر کر دیا یہاں تک کہ وہ ظاہر ہو گئے کیونکہ رات کے وقت وہ چیزیں چھپ جاتی ہیں اور دن کے وقت وہ ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زمین کو روشن کر دے اگرچہ ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۞ (ص)

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۞

''اور رات کی جب وہ اسے چھپا لے''۔

یعنی سورج کو ڈھانپ لے یعنی جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی روشنی کو رات ختم کر دیتی ہے؛ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ تاریکیوں کے ساتھ دنیا کو ڈھانپ لیتی ہے تو آفاق تاریک ہو جاتے ہیں، ضمیر ایسے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے جو پہلے مذکور نہیں۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۞

''اور قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی''۔

قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی جس طرح فرمایا: بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ (یاسین: 27) میرے رب کے بخشنے کے ساتھ؛ یہ قتادہ کا قول ہے؛ مبرد نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے قسم ہے اس کی جس نے اس کو بنایا؛ یہ حضرت حسن بصری اور مجاہد کا قول ہے یہی طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے یعنی جس نے اسے پیدا کیا اور اسے بلند کیا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اہل حجاز سے یہ منقول ہے کہ سبحان ما سبحتك لہٗ کا معنی ہے پاک ہے وہ ذات جس کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر چیز۔

## وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝۶

''اور زمین کی اور اس کو بچھانے والے کی''۔

قسم ہے زمین کی اور اس کے ہموار کرنے کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مَا، من کے معنی میں ہے جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یعنی جس نے اس کو پھیلایا۔ عام مفسرین کی یہی رائے ہے کہ اس کا معنی وہی ہے جو دحاھا کا ہے۔ حضرت حسن بصری، مجاہد اور دوسرے علماء کی رائے یہ ہے: طَحٰهَا اور دحاھا کا معنی ایک ہی ہے یعنی ہر جانب اسے پھیلا دیا۔ طحو کا معنی پھیلانا ہے طَحَا، طَحْوًا اور طَحَی، یَطْحِی، طَحْیًا دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ طَحَیْتُ میں پہلو کے بل لیٹا؛ یہ ابو عمرو سے مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: طحاھا کا معنی ہے اسے تقسیم کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اسے پیدا کیا؛ شاعر نے کہا:

وما تَدْرِی جَذِیمة من طَحَاھا ولا مَنْ ساکِنُ العرش الرَّفِیعِ

جذیمہ نہیں جانتی کہ اسے کس نے پیدا کیا اور نہ اسے یہ پتہ ہے کہ عرش رفیع کا رہنے والا کون ہے۔

ماوردی نے کہا: اس بارے میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد نباتات، چشمے اور خزانے ہوں کیونکہ جو زمین پر پیدا کیے گئے ہیں یہ ان کی حیات کا سبب ہیں (1)۔ بعض عربوں کی قسموں میں یوں کہا جاتا ہے: لا والقمر الطاحی یعنی وہ چاند جو جھانکنے والا روشن اور بلند ہے۔ ابو عمرو نے کہا: طحا الرجلُ جب وہ زمین میں دور چلا جائے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما ادری أین طحا؟ میں نہیں جانتا وہ کہاں چلا گیا؟ یہ جملہ بولا جاتا ہے: طَحَابِہٖ قَلْبُہٗ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب ہر چیز اسے بہالے جائے۔ علقمہ نے کہا:

طَحَابِكَ قَلْبٌ فی الحِسانِ طَرُوبُ بُعَیْدُ الشَّبابِ عَصْرَ حانَ مَشِیبُ

شعر میں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔

## وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷

''اور قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی''۔

اس میں مَا مصدریہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مَا، من کے معنی میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نفس کے بارے

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 273

میں دو قول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہر نفس مراد ہے۔ سوی کا معنی تیار کرنا ہے۔ مجاہد نے کہا: سَوّٰىهَا کا معنی ہے اس کی خلقت کو درست کیا اور اسے معتدل بنایا۔ یہ تمام اسماء قسم کے طور پر مجرور ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم اٹھائی کیونکہ اس میں اس کی صنعت کے عجائب ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

**فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ﴿۸﴾**

''پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو''۔

یعنی اسے پہچان کرا دی، ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے یعنی اسے فجور اور تقویٰ کے راستہ کی پہچان کرا دی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد نے یہ بھی کہا: اسے طاعت اور معصیت کی پہچان کرا دی۔ محمد بن کعب سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں سے کسی کے ساتھ بھلائی کی امید کرتا ہے تو اس کے دل میں بھلائی کا الہام کرتا ہے تو وہ اس پر عمل کرتا ہے اور جب اس کے بارے میں برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو برائی کا الہام کرتا ہے تو وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ فراء نے کہا: فَاَلْهَمَهَا کا معنی ہے اسے خیر اور شر کے راستہ کی پہچان کرا دی جس طرح فرمایا: وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ (البلد) ہم نے اسے دونوں راستوں کی پہچان کرا دی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مومن متقی کو تقویٰ کا الہام کیا اور فاجر کو فجور کا الہام کیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس کے لیے فجور اور تقویٰ کو واضح کر دیا۔ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی تو یوں دعا کی اللهم آتِ نَفْسِی تَقْوَاهَا وزَكِّهَا أنت خيرُ من زَكَّاها أنت وليُّها و مولاها اے اللہ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما اسے پاک کر دے تو بہترین پاک کرنے والا ہے تو ہی اس کا ولی اور آقا ہے۔

جویبر نے ضحاک سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو اپنی آواز کو بلند کرتے پھر دعا کرتے: اللهم آتِ نَفْسِی تَقْوَاهَا أنت وليُّها و مولاها وأنتَ خيرُ مَنْ زَكَّاها (1) اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما تو اس کا ولی اور اس کا آقا ہے اور تو اسے بہترین پاک کرنے والا ہے۔

صحیح مسلم میں ابو الاسود دؤلی سے مروی ہے کہ مجھے عمران بن حصین نے کہا: مجھے بتایئے جو لوگ آج عمل کر رہے ہیں اور تگ و دو کر رہے ہیں کیا یہ ایسی شئی ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس پر تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے یا جو ان کا نبی ان کے پاس لایا ہے اور ان پر حجت قائم ہوئی ہے اس پر زمانہ آئندہ میں عمل کرنے والے ہیں؟ میں نے کہا: بلکہ یہ ایسی شئی ہے جس کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس نے کہا: کیا یہ ظلم نہیں۔ کہا: میں اس بات سے سخت خوفزدہ ہوا اور میں نے کہا: ہر شئی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی بلکہ لوگوں سے باز پرس کی جائے گی۔ انہوں نے مجھے کہا: اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے جو میں نے تجھ سے سوال کیا ہے اس سے میں نے کسی چیز کا سوال نہیں کیا تھا مگر اس چیز کا کہ تیرا امتحان لوں۔ مزینہ کے دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! بتایئے لوگ جو

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 284

آج عمل کرتے ہیں اور جس کے بارے میں تگ و دو کرتے ہیں کیا یہ ایسی چیز ہے جس کا ان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے تقدیر ان پر سبقت لے جا چکی ہے یا ان کا نبی جو ان کے پاس لایا ہے اور ان پر حجت قائم ہو چکی ہے اس بارے میں وہ زمانہ آئندہ میں جمع کرنے والے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور ان میں نافذ ہو چکا ہے اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ''(1) فجور اور تقوی دونوں مصدر ہیں مفعول بہ کے قائم مقام ہیں۔

## قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

''یقیناً فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا''۔

یہ جواب قسم ہے اور لقد افلح کے معنی میں ہے۔ زجاج نے کہا: لام اس لیے حذف ہوا کیونکہ کلام طویل ہو چکی تھی پس اس کا طویل ہونا ہی اس کا عوض بن گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جواب محذوف ہے سورج کی قسم، اس کی قسم اور اس کی قسم تمہیں ضرور اٹھایا جائے گا۔ زمخشری نے کہا: اللہ تعالیٰ اہل مکہ پر ایسا عذاب مسلط کرے گا کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا جس طرح اس نے قوم ثمود پر عذاب کو مسلط کیا کیونکہ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ ایسی کلام ہے جو پہلی کلام کے تابع ہے کیونکہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ بطور استطراد مذکور ہے۔ یہ جواب قسم نہیں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بغیر حذف کے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اس کا معنی یہ ہے تحقیق جس نے نفس کا تذکیہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا جس نے اس کو دبا دیا وہ خائب و خاسر ہو گیا قسم ہے سورج اور اس کی روشنی کی۔

اَفْلَحَ کا معنی کامیاب ہونا مَنْ زَكّٰىهَا اللہ تعالیٰ نے طاعت کے ساتھ جس کے نفس کو پاک کیا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ یعنی وہ نفس خسارہ میں ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کی وجہ سے دبا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ نفس خائب و خاسر ہوا جس کو اس نے گمراہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جس نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اچھے اعمال کے ساتھ پاکیزہ کیا وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کو معاصی میں دبایا وہ خائب و خاسر ہو گیا؛ یہ قتادہ اور دوسرے علماء کی رائے ہے: زکاۃ کا اصل معنی بڑھنا اور زیادتی ہے اس معنی میں زکا الزرع ہے جس سے اس کی پیداوار بڑھ جائے اس معنی میں قاضی کا گواہ کا تزکیہ کرنا ہے کیونکہ قاضی اسے عادل قرار دے کر اور اچھے ذکر کے ساتھ اس کا مرتبہ بلند کر دیتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں یہ معنی مکمل گزر چکا ہے۔ نیکی کرنے والا اور نیکی کے اعمال کی طرف جلدی کرنے والا اپنے نفس کو بلند کیا کرتا تھا عربوں میں سے سخی لوگ ٹیلوں اور بلند مقامات پر فروکش ہوتے تھے تاکہ ضرورت مندوں کے لیے ان کا مکان مشتہر ہو اور وہ مسافروں کے لیے آگ روشن کیا کرتے تھے اور کمینے لوگ غاروں، اطراف اور زیریں علاقوں میں پڑاؤ ڈالتے تاکہ ضرورت مندوں سے ان کا مکان مخفی رہے کم مروت رکھنے والا شخصیت کو چھپانے والا، معاصی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: دَسّٰىهَا کا معنی ہے اس کو گمراہ کرنا۔ شاعر نے کہا:

1۔ مسند امام احمد بن حنبل حدیث 19936

وأَنْتَ الذِي دَسَّيتَ عَمْرا فأصبحتْ حلائلُه من أَرَامِلَ ضُيَّعا

تو وہ ہے جس نے عمر قبیلہ کو برباد کیا تو اس کی عورتیں بیوہ اور ضائع ہو گئیں۔

اہل لغت نے کہا: اصل دسس ہے جو تدسیس سے مشتق ہے اس کا معنی کسی شیٔ کو دوسری شیٔ میں چھپانا ہے اس کی سین یاء میں بدل دی گئی، جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: قصیت أظفاری اصل میں قصصت اظفاری تھا۔ اس کی مثل تقفض ہے اب تقفض پڑھتے ہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کا معنی ہے اس نے اپنے نفس کو صالحین کی جماعت میں چھپایا جب کہ وہ ان میں سے نہ تھا تو وہ خائب و خاسر ہو گیا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿١١﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾

"جھٹلایا قوم ثمود نے (اپنے پیغمبروں کو) اپنی سرکشی کے باعث، جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں سے ایک بڑا بدبخت تو کہا انہیں الله کے رسول نے کہ (خبردار رہنا) الله کی اونٹنی اور اس کے پانی کے باری سے۔ پھر بھی انہوں نے جھٹلایا رسول کو اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، پس ہلاک کر دیا انہیں ان کے رب نے ان کے گناہ (عظیم) کے باعث اور سب کو پیوند خاک کر دیا"۔

طغوی سے مراد طغیانی ہے اس کا معنی نافرمانی میں حد سے نکل جانا ہے؛ یہ مجاہد، قتادہ اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: طغوی سے مراد وہ عذاب ہے جس کی انہیں دھمکی دی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: جو عذاب ان پر آیا تھا اس کا نام طغوی تھا، کیونکہ عذاب ان پر سرکش ہو گیا تھا۔ محمد بن کعب نے کہا: طغواھا کا معنی ہے سب کے سب۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر ہے اس طریقہ پر اسے اس لیے لایا گیا ہے کیونکہ آیات کے سروں کے اعتبار سے یہ زیادہ موافق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کی اصل طَغیاھا ہے مگر جب فعلی اسمی ہو تو اس کی یاء کو واؤ سے بدل دیتے ہیں تا کہ اسم اور وصف کے درمیان فرق کیا جائے۔ عام قراءت طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

حضرت حسن بصری، جحدری اور حماد بن سلمہ نے اسے طاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جس طرح رُجعیٰ، حُسنیٰ ہے یہ مصادر میں ان دونوں کے مشابہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔

جب اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے لیے ان میں سے بدبخت ترین اٹھا اس کا نام قدار بن سالف تھا اس کے بارے میں گفتگو سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے کیا وہ ایک فرد تھا یا جماعت تھی؟ بخاری شریف میں حضرت عبدالله بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اور اونٹنی اور اس کی کونچیں کاٹنے کا ذکر کیا۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب اس کی کونچیں کاٹنے کے لیے ایک ایسا آدمی اٹھا جو عزیز، جابر اپنے خاندان میں طاقتور تھا جس طرح ابو زمعہ ہے"(1) اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 16222

ضحاک نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا تو جانتا ہے کہ پہلے لوگوں میں سے سب سے بدبخت کون تھا؟'' میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا'' پوچھا: ''کیا تو جانتا ہے کہ بعد والوں میں کون بدبخت ترین ہے؟'' میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں: فرمایا: ''تجھے شہید کرنے والا'' (1)۔

رسول اللہ سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں لفظ ناقة، تحذیر کے قاعدہ کے مطابق منصوب ہے جس طرح تو کہتا ہے: الاسد الاسد، الصبی الصبی، الحذار الحذار۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹنے سے بچو۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ تعالیٰ کی اونٹنی سے بچو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (الاعراف) یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے جس میں تمہارے لیے نشانی ہے اسے چھوڑے رکھو اللہ تعالیٰ کی زمین میں چرتی پھرے اسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کہ تمہیں عذاب الیم اپنی گرفت میں لے لے۔

اس کی باری سے بھی بچو۔ سورۃ الشعراء میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ الحمد للہ۔ سورۃ اقتربت الساعة میں یہ بحث گزر چکی ہے جب انہوں نے اونٹنی کا مطالبہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اسے چٹان سے نکالا اور ان کے کنویں سے ایک دن کی باری ان کے لیے مختص فرما دی اور ایک دن کی باری اس اونٹنی کے لیے معین کر دی۔ یہ انداز ان کے لیے بڑا شاق گزرا۔

انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی اس بات میں تکذیب کی اگر تم نے اس کو زخمی کیا تو تمہیں عذاب دیا جائے گا۔ بدبخت ترین انسان نے اس کی کونچیں کاٹ دیں اس عمل کو ان سب کی طرف منسوب کیا کیونکہ تمام اس کے عمل سے راضی تھے۔ قتادہ نے کہا: ہمارے سامنے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ اس نے اس کی کونچیں نہ کاٹیں یہاں تک کہ ان کے چھوٹے، بڑے، مذکر اور مونث نے اس کی موافقت نہ کی۔ فراء نے کہا: دو آدمیوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں۔ عرب کہتے ہیں: هذان افضل الناس، هذان خیرُ الناس، هذه المرأة أشقى الناس یعنی اسم تفضیل مذکر کا صیغہ ہی استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے تثنیہ کا ذکر نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے گناہ یعنی کفر، تکذیب اور کونچیں کاٹنے کے باعث ان پر عذاب کو برابر کر دیا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے ان کے رب نے ان کے گناہ کے باعث انہیں تباہ و برباد کر دیا (2)۔ فراء نے کہا: دمدم کا معنی ہے زلزلہ برپا کرنا۔ دمدمه کی حقیقت یہ ہے عذاب کو کئی گنا کرنا اور اس کو بار بار لانا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: دممت علی الشیٔ میں نے اس پر بند کر دیا۔ دَمَمَ علیه القبرَ اس پر قبر کو بند کر دیا۔ ناقة مدمومة ایسی اونٹنی جس پر چربی چڑھی ہوئی ہو جب تو نے بار بار بند کیا تو تو نے کہا: دمدمت۔ دمدمه کا معنی ہے جڑ ختم کرتے ہوئے ہلاک کرنا، یہ مورج کا قول ہے۔ صحاح میں ہے: دمدمت الشی جب تو اسے زمین کے ساتھ لٹکا دے۔ دمدم الله علیهم اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا: یہ قشیری کا نقطہ نظر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: دمدمتُ علی

1۔ مسند امام احمد، فضائل صحابہ، حدیث نمبر 953

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 494

المیتَ التراب میں نے میت پر مٹی ڈال دی۔ دمدم علیھم انہیں ہلاک کر دیا اور انہیں مٹی کے نیچے کر دیا۔
ان پر زمین کو برابر کر دیا۔ پہلی تعبیر کی صورت میں معنی ہوگا: ان پر دمدمہ اور ہلاکت کو برابر کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صیحہ نے انہیں ہلاک کر دیا تھا وہ ان میں سے چھوٹے اور بڑے تک جا پہنچی۔ ابن انباری نے کہا: دمدم کا معنی ہے غضبنا ک ہوا۔ دمدمہ ایسی گفتگو کو کہتے ہیں جو انسان کو پریشان کرتی ہے۔ ایک لغوی نے کہا: دمدمہ کا معنی ادامہ ہے عرب کہتے ہیں: ناقۃ مدمومۃ یعنی موٹی اونٹنی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فسواھا میں ھاء ضمیر سے مراد عذاب کے نازل کرنے میں امت کو برابر کر دیا، ان کے چھوٹے، بڑے، پست، معزز، مذکر اور مونث سب اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ حضرت ابن زبیر نے اسے فَدَفدَمَ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہے اُمْتُقِعَ لونہٗ، اُنْتُقِعَ لونہٗ۔

## وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝

''اور کوئی نہیں ڈر اللہ کو ان کے (تباہ کن) انجام کا''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا جب کہ اسے یہ کوئی خوف نہیں تھا کہ کس کی جانب سے عذاب کا ردعمل پہنچے گا۔
حضرت ابن عباس، قتادہ، حضرت حسن بصری اور مجاہد کا قول ہے: عُقْبٰهَا میں جو ضمیر ہے فعلۃ (عمل) کی طرف لوٹ رہی ہے جس طرح اس جملہ میں ہے: من اغتَسَلَ یومَ الجمعۃ فَبِهَا ونِعمَتْ (1) جس نے جمعہ کے روز غسل کیا اس نے بہت اچھا عمل کیا یہاں بھی ھاء ضمیر سے مراد فعلۃ اور خصلۃ ہے۔ ضحاک، سدی اور کلبی نے کہا: یہ ضمیر عاقر کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی وہ آدمی جس نے کونچیں کاٹ دی تھیں وہ اپنے کیے کے انجام سے نہ ڈرا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اس کی تقدیر یہ بنے گی اذ انبعثَ أشقاھا ولا یخاف عُقباھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: اللہ کے رسول حضرت صالح علیہ السلام کو اپنی قوم کی ہلاکت کا کوئی خوف نہ تھا اور نہ ہی یہ ڈر تھا کہ ان کے عذاب کا ضرر ان کی طرف عود کر آئے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبردار کیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو ہلاک کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات عطا فرمائی تھی۔
نافع اور ابن عامر نے فلا پڑھا ہے یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس صورت میں کلام پہلے معنی کی طرف لوٹتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت سے نہیں ڈرتا جب کہ باقی قراء نے اسے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دوسرے معنی سے زیادہ مناسب ہے یعنی کافر اپنے کیے کے انجام سے نہیں ڈرتا۔ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے دونوں نے کہا: امام مالک نے اپنے دادا کا مصحف نکالا ان کا خیال تھا یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں انہوں نے لکھا تھا جب مصاحف لکھے گئے تھے ان میں وَلَا يَخَافُ تھا اہل مکہ اور عراقیوں کے مصاحف میں بھی واؤ کے ساتھ ولا یخاف ہے، ابو عبید اور ابو حاتم نے ان کے مصاحف کی بنا پر اس کو اختیار کیا۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الرخصۃ فی ترک الغسل یوم الجمعۃ، حدیث نمبر 300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ اللیل

آیاتہا ۲۱ ۹۲ سورۃ اللیل مکیۃ ۹ رکوعہا ۱

یہ مکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ مدنی ہے۔ اس کی اکیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾ وَ النَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾

"قسم ہے رات کی جب وہ ہر چیز پر چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب چمک اٹھے اور اس کی قسم جس نے پیدا کیا نر اور مادہ کو بے شک تمہاری کوششیں مختلف نوعیت کی ہیں"۔

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ﴿۱﴾ قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔ فعل کا مفعول ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کا مفعول معلوم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا مفعول بہ النَّھَار (دن) ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا مفعول بہ الارض (زمین) ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا مفعول بہ الخلائق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس نے ہر شئی کو اپنی تاریکی سے ڈھانپ لیا۔ سعید نے قتادہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور اور ظلمت کو پیدا کیا پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا۔ اس نے تاریکی کو سخت سیاہ اور نور کو انتہائی روشن بنا دیا۔

وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ قسم ہے دن کی جب وہ منکشف وظاہر ہو جائے اور اپنی روشنی کے ساتھ رات کی تاریکی سے جدا ہو جائے۔

وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤی ﴿۳﴾ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کا معنی ہے جس نے مذکر اور مونث کو پیدا کیا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم اٹھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا: مذکر اور مونث پیدا کرنے کی قسم۔ یہاں مَا مصدریہ ہے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ اہل مکہ رعد (کڑک) کے بارے میں کہتے ہیں: سبحان ما سبحت لہ تو ما، من کے معنی میں ہے؛ یہ ابو عبید اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے وما خَلَقَ مِنَ الذَّکَرِ والانثٰی تو من مضمر ہوگا تو قسم اہل طاعت یعنی انبیاء و اولیاء کی ہوگی۔ تو یہ قسم ان کی تکریم اور تعظیم کے لیے ہوگی۔ ابو عبید نے کہا: مَا، من کے معنی میں ہے اسی طرح ان آیات میں بھی مَا، من کے معنی میں ہے: وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰہَا ۪ۙ﴿۵﴾ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا طَحٰہَا ۪ۙ﴿۶﴾ وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا ﴿۷﴾ (الشمس)

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 458

حضرت ابن مسعود بڑھتے سے مروی ہے: وہ یوں قراءت کرتے والنھار إذا تجلی والذکرِ والأنثی اور ما خلق کو گرا دیتے۔ صحیح مسلم میں علقمہ سے مروی ہے: ہم شام آئے اور ہمارے پاس حضرت ابودرداء آئے فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو مجھ پر حضرت عبداللہ کی قراءت پڑھے؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: تو نے حضرت عبداللہ کو یہ آیت وَ الَّیْلِ إِذَا یَغْشٰی ۝ کیسے پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ کہا: میں نے انہیں واللَّیلِ إذا یَغشَی والذکرِ والأنثی پڑھتے ہوئے سنا ہے، کہا: اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح پڑھتے ہوئے سنا ہے لیکن یہ لوگ ارادہ رکھتے ہیں کہ میں پڑھوں وَ مَا خَلَقَ میں ان کی موافقت نہیں کروں گا۔ ابو بکر انباری نے کہا: محمد بن یحییٰ مروزی، محمد سے وہ ابواحمد زبیری سے وہ اسرائیل سے وہ ابو اسحاق سے وہ عبدالرحمن بن یزید سے وہ حضرت عبداللہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اِنِّی أَنَا الرّزاق ذُو القوۃ المتین (1) پڑھ کر سنایا ہے ابو بکر نے کہا: ان دونوں حدیثوں میں سے ہر ایک مردود ہے کیونکہ اجماع ان کے خلاف ہے حمزہ اور عاصم حضرت عبداللہ بن مسعود بڑھتے سے وہ روایت نقل کرتے ہیں جس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے ایسی دو سندوں پر انحصار کرنا جو اجماع کے موافق ہوں، اس سے بہتر ہے کہ کسی ایک ایسی سند کو اپنایا جائے اجماع امت جس کی مخالفت کرے۔ جو حکم ایک روایت پر مبنی ہو جب وہ جماعت کی ایسی روایت کے مقابل آجائے جو اس کی مخالفت کر رہی ہو تو جماعت کی روایت کو لینا یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ ایک روایت میں نسیان اور غفلت کا امکان موجود ہے۔

اگر حضرت ابودرداء کی حدیث صحیح ہو اور اس کی سند مقبول و معروف ہو پھر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی شیر خدا اور دوسرے صحابہ اس کی مخالفت کرتے ہوں تو اس پر عمل کرنا مناسب ہے جسے جماعت نے روایت کیا ہے جو ایک تنہا روایت کرتا ہے اس کو چھوڑنا مناسب ہے جسے جلدی نسیان ہو سکتا ہے جب کہ جماعت اور تمام ملت کے لیے ایسا نہیں ہوتا۔

مذکر اور مونث میں دو قول ہیں:

(۱) اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور کلبی کا قول ہے۔

(۲) انسانوں اور مخلوقات میں سے جو مذکر اور مونث ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کو مذکر و مونث کی صورت میں پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مذکر و مونث انسانوں میں سے ہیں چوپاؤں میں سے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و ولدیت میں یہی خاص ہیں۔

**إِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی ۝** یہ جواب قسم ہے معنی ہے تمہارا عمل مختلف ہے۔ عکرمہ اور دوسرے مفسرین نے کہا: سعی کا معنی عمل ہے کوئی اپنے نفس کو بچانے میں لگا ہوا ہے اور کوئی اسے ہلاک کرنے میں مصروف ہے اس پر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: النَّاسُ غادِیَانِ فمبتاعٌ نفسہ فمعتِقھا وبائعٌ نفسہ فموبِقھا (2) لوگ دو طرح صبح کرتے ہیں اپنے نفس کو خریدنے والا اور اسے آزاد کرنے والا ہوتا ہے، اپنے نفس کو بیچنے والا اسے ہلاک کرنے والا ہوتا ہے۔ شتی، شتیت کی جمع

---

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف القراءۃ، حدیث نمبر 3479، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 22902

ہے جس طرح مریض کی جمع مرضٰی آتی ہے۔ مختلف کو بھی شتی کہہ دیتے ہیں کیونکہ اس کا بعض بعض سے دور ہوتا ہے یعنی تیرا عمل ایک دوسرے سے دور ہے کیونکہ اس کا بعض گمراہی ہے اور بعض ہدایت ہے یعنی تم میں سے کچھ مومن و نیک ہیں، کافر و فاجر ہیں، مطیع و عاصی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لَشَتّٰى سے مراد ہے جس کے اجزاء مختلف ہوں۔ ان میں سے بعض کو جنت کا ثواب ملے گا اور کچھ کو جہنم کا عقاب ملے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اخلاق مختلف ہیں تم میں سے کچھ رحم دل اور کچھ سخت دل ہیں، کچھ بردبار اور کچھ طیش والے ہیں، کچھ سخی اور کچھ بخیل ہیں اور اس کی مثل دوسرے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿١٠﴾

"پھر جس نے (راہ خدا میں) اپنا مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لیے آسان راہ۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لیے مشکل راہ"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

## اس آیت کا مصداق اور عطا کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿٥﴾ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس آیت کا مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں؛ عام مفسرین نے بھی یہی کہا ہے۔ عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق مسلمان بوڑھے مرد اور عورتوں کو آزاد کیا کرتے تھے تو ان کے والد حضرت ابوقحافہ نے ان سے کہا: اے بیٹے! کاش تم قوی و طاقتور غلام آزاد کرتے جو تیرا دفاع کرتے اور تیرے ساتھ کھڑے ہوتے؟ حضرت ابوبکر صدیق نے کہا: اے میرے ابا جان! میں ارادہ کرتا ہوں جو ارادہ کرتا ہوں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اَعْطٰى کا معنی ہے خرچ کیا اور اتَّقٰى کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا سے بچا۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿٦﴾ حسنیٰ سے مراد ہے کہ بندہ جو عطا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بدلہ عطا کرتا ہے اس کی تصدیق کی۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "ما مِنْ یومٍ یصبح العباد فیه إلّا و مَلَكان ینزلان فیقول أحدهما: اللّهمّ أعط منفقا خلفا ویقول الآخر اللّهم أعط ممسكا تلفا (2) کوئی دن نہیں ہوتا جس میں لوگ صبح کرتے ہیں مگر دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! روکنے والے کو بربادی دے"۔

حضرت ابودرداء سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کسی دن کا سورج غروب نہیں ہوتا مگر اس کے پہلو میں دو فرشتے اعلان کرتے ہیں جس اعلان کو اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سنتی ہے مگر جن و انس: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 466　2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 8054

بدلہ عطا فرما اور روکنے والے کو بربادی دے''۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم نازل فرمایا۔

علماء تفسیر نے فرمایا: مَنۡ اَعۡطٰی سے مراد ہے تنگ دستوں کو مال عطا کیا۔ قتادہ نے کہا: اس بندے پر اللہ تعالیٰ کا جو حق تھا وہ عطا کیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا: دل سے سچی بات کہی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی سے مراد ہے اس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تصدیق کی؛ یہ ضحاک، سلمی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مجاہد نے کہا: حسنیٰ سے مراد جنت ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَ زِيَادَةٌ (یونس:26) قتادہ نے کہا: حسنیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کا وعدہ جو اس نے بندے سے بدلہ دینے کا کیا ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد نماز، زکوٰۃ اور روزہ ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس سے مراد عطا کا بدلہ ہے؛ یہی طبری کا پسندیدہ مسلک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ سب کے معانی قریب قریب ہیں، کیونکہ سب معانی اسی ثواب کی طرف لوٹتے ہیں جو جنت ہے۔

## تنگی کو آسانی میں بدلنے کی وضاحت

**مسئلہ نمبر 2۔** فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى ؕ ہم اسے خیر اور صلاح کے اسباب کی طرف ہدایت دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کے لیے ان اسباب کو بجالانا آسان ہو جاتا ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: یسریٰ سے مراد جنت ہے۔ صحیحین اور ترمذی میں حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے: ہم بقیع میں جنازہ میں تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک لکڑی تھی جس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کو کرید رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر آسمان کی طرف بلند کیا۔ فرمایا: ''ہر نفس کے داخل ہونے کی جگہ کو لکھ دیا گیا ہے''۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم اپنے کیے پر بھروسہ نہ کریں؟ جو سعادت مند ہوگا تو وہ سعادت کا کام کرے گا اور جو بد بخت ہوگا تو وہ بد بختوں والا کام کرے گا۔ فرمایا: ''بلکہ تم عمل کرو ہر ایک کو توفیق دی گئی ہے جو سعادت مند ہوتا ہے تو اسے سعادت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور جو بد بخت ہوتا ہے تو اسے بد بختی کے عمل کا موقع دیا جاتا ہے پھر پڑھا: جس نے مال عطا کیا، تقویٰ اختیار کیا اور حسنیٰ کی تصدیق کی تو ہم اسے آسان عمل کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا، غنی بنا اور حسنیٰ کی تکذیب کی تو ہم اسے عسریٰ کا موقع دیں گے''(1)۔ الفاظ ترمذی کے ہیں: اس حدیث کے بارے میں ارشاد فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ دونو جوانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا عمل ایسی چیز ہے جس کے بارے میں قلم خشک ہو چکے ہیں اور تقدیر جاری ہو چکی ہے؟ یا عمل ایسی چیز ہے جس کا فیصلہ بعد میں ہونا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلکہ یہ ایسا عمل ہے جس کے بارے میں قلم خشک ہو چکے ہیں اور تقدیر جاری ہو چکی ہے'' دونوں نے عرض کی: ''پھر عمل کس لیے؟ فرمایا: عمل کرو ہر ایک کو ایسے عمل کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے'' دونوں نے کہا: اب ہم کوشش کریں گے اور ہم عمل کریں گے (2)۔

---

1۔ جامع ترمذی کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ اللیل اذا یغشی، حدیث نمبر 3267، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 473

عسری کو آسان کرنے کا مفہوم اور صورتیں

**مسئلہ نمبر 3۔** وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۙ۝۸ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ۝۹ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ۝۱۰ یعنی جس نے اپنے پاس موجود مال میں بخل کیا اور مال خرچ نہ کیا۔ اس کی وضاحت اور دنیا میں اس کے پھل کے میں بارے میں گفتگو سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے اور آخرت میں اس کا ٹھکانا آگ ہوگا جس طرح اس آیت میں ہے۔ ضحاک نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے میں اس کے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے درمیان حائل ہو جاؤں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ امیہ بن خلف کے حق میں نازل ہوئی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس کا معنی ہے جس نے مال میں بخل کیا اور سب سے غنی بنا اور بدلہ کو جھٹلایا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ حسنیٰ سے مراد جنت ہے۔ ایک دوسری سند سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حسنیٰ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ہم اس کا راستہ شر کے لیے آسان کر دیتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عسریٰ سے مراد جہنم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم اس پر خیر اور صلاح کے اسباب مشکل کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کو بجالانا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فرشتہ صبح و شام ندا کرتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا کرنا اور روکنے والے کو بربادی دینا۔ اسے حضرت ابو درداء نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ:** علماء نے کہا: اس آیت نیز اس ارشاد وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۳ (البقرہ) اور اس ارشاد: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً (البقرہ: 274) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سخاوت مکارم اخلاق میں سے ہے اور بخل رذیل اخلاق میں سے ہے سخی وہ نہیں جو ایسی جگہ مال دے جو مال دینے کا محل نہ ہو اور بخیل وہ نہیں جو روکنے کی جگہ سے مال روک لے بلکہ سخی وہ ہے جو عطا کی جگہ مال عطا کرے اور بخیل وہ ہے جو عطیہ کی جگہ روک لے ہر وہ آدمی جو عطا کرنے کے ساتھ اجر اور حمد کا مستحق بنتا ہے وہ جواد ہے اور ہر وہ آدمی جو مال روکنے کے ساتھ مذمت اور عتاب کا مستحق بنتا ہے تو وہ بخیل ہے اور جو عطا کے ساتھ اجر اور حمد کا مستحق نہیں بنتا بلکہ وہ مذمت کا مستحق بنتا ہے تو وہ سخی نہیں بلکہ اسراف کرنے والا اور مذموم ہے یہ ان اسراف کرنے والوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے شیاطین کے بھائی قرار دیا ہے اور ان پر محرومی کو لازم کیا ہے۔ جو آدمی مال روکنے کی وجہ سے عقاب اور مذمت کا مستحق نہیں بنتا وہ حمد کا مستحق ہوتا ہے تو وہ ہدایت یافتہ ہے یہ وہی لوگ ہیں جو حسن تدبیر اور اچھی رائے کے ساتھ دوسروں کے اموال برقرار رہنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4۔** فراء نے کہا: ایک معترض کہتا ہے یہ کیسے ارشاد فرمایا: فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى کیا تنگی میں کوئی آسانی ہے؟ تو جواب میں کہا جاتا ہے: یہ ارشاد بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے قائم مقام ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۲۱ (آل عمران) بشارت اصل میں خوشی عطا کرنے والے امر پر ہوتی ہے جب ان دو کلاموں میں یہ جمع کر دیا گیا کہ یہ خیر ہے اور یہ شر ہے تو دونوں میں آسانی آ گئی۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ کے فرمان فَسَنُیَسِّرُهٗ کا معنی ہے ہم اسے تیار کریں گے۔ عرب کہتے ہیں: قد سیرت الغنم یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ بچہ جن دے یا جننے کے لیے تیار ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

هما سيدان يزعمان وإنما يسوادانِنا أن يَنمِتْ غَنماهما(1)

وہ دونوں سردار ہیں وہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ریوڑ بچے جننے کے لیے تیار ہیں جب کہ وہ دونوں ہماری سرداری کرتے ہیں۔

وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰىؕ۝۱۱ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى۝ۖ۱۲ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى۝۱۳

''اس کے کسی کام نہ آئے گا اس کا مال جب وہ ہلاکت (کے گڑھے) میں گرے گا۔ بے شک ہمارے ذمہ (کرم پر) ہے راہنمائی کرنا۔ یقیناً آخرت اور دنیا کے ہم ہی مالک ہیں''۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى۝ تَرَدّٰی کا معنی ہے ہلاک ہونا یہ جملہ بولا جاتا ہے: رَدِیَ الرجلُ یَرْدَی رَدیً جب وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

صرفت الهوی عنهن من خشیة الردی

میں نے ہلاکت کے خوف سے ان سے محبت کو پھیر لیا۔

ابو صالح اور زید بن اسلم نے کہا: اِذَا تَرَدّٰی کا معنی ہے جب جہنم میں گرے، اس معنی میں متردیہ ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: رَدِیَ فی البئر وتردّی جب وہ کنویں میں گر گیا یا وہ پہاڑ سے نیچے گر گیا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ما أدری أین رَدِیَ؟ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا۔ مَا کے بارے میں احتمال ہے کہ وہ نافیہ ہے۔ یعنی مال اسے کچھ نفع نہ دے گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ استفہامیہ ہو اس کا معنی توبیخ ہے یعنی جب وہ ہلاک ہو گا اور جہنم میں گر جائے گا تو اسے کون سی چیز نفع دے گی؟

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى۝ یعنی ہمارے ذمہ کرم پر ہے کہ ہم گمراہی کے راستہ سے ہدایت کے راستہ کو جدا کر دیں پس ہدایت سے مراد احکام کا بیان ہو گا؛ یہ زجاج کا نقطہ نظر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے حلال و حرام اور طاعت و معصیت کا بیان؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: جو ہدایت کی راہ پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اس کو راستہ دکھانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ (النحل: 9) وہ کہتا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کا ارادہ کیا وہ سیدھے راستے پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے ہمارے قبضہ قدرت میں ہے ہدایت دینا اور گمراہ کرنا۔ اور اضلال کو ترک کر دیا گیا ذکر نہیں کیا گیا، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں صرف خیر کا ذکر کیا گیا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران: 26) بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (یاسین: 83) جس طرح فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) جب کہ وہ سردی سے بھی بچاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہمارے ذمہ کرم پر ہے اسے ہدایت کا بدلہ دینا جسے ہم نے ہدایت سے نوازا۔

آخرۃ سے مراد جنت ہے اور اولیٰ سے مراد دنیا ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے یعنی دنیا و آخرت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد دنیا و آخرت کا

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 3، صفحہ 271

ثواب ہے، یہ اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (النساء: 134) جس نے ان دونوں چیزوں کو ان کے مالکوں کے علاوہ غیر سے طلب کیا تو اس نے غلط راستہ کا انتخاب کیا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾

"پس میں نے خبردار کر دیا ہے تمہیں ایک بھڑکتی آگ سے۔ اس میں نہیں جلے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے (نبی کریم کو) جھٹلایا اور (آپ سے) روگردانی کی"۔

میں نے تمہیں ڈرایا ایک ایسی آگ سے جو شعلہ زن ہے اور روشن ہے تَلَظّٰى اصل میں تتلظی تھا؛ یہ عبید بن عمیر، یحییٰ بن یعمر اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے اس کی گرمی کو نہیں پائے گا مگر ایسا بدبخت جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور ایمان سے اعراض کیا۔ مکحول نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہر کوئی جنت میں داخل ہوگا مگر جس نے اس کا انکار کیا۔ مکحول نے پوچھا: اے ابو ہریرہ وہ کون ہے جو جنت میں داخل ہونے سے انکار کرتا ہے؟ فرمایا: جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ امام مالک نے کہا: ہمیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مغرب کی نماز پڑھائی تو وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴿۱﴾ کی قراءت کی جب وہ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ تک پہنچے تو رونے لگے تو رونے کی وجہ سے اسے آگے نہ پڑھ سکے، اسے چھوڑ دیا اور دوسری سورت پڑھی۔ فراء نے کہا: اِلَّا الْاَشْقَى سے مراد ہے مگر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں شقی ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ لا یصلاھا إلا الأشقی سے مراد امیہ بن خلف اور اس جیسے دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا۔ قتادہ نے کہا: جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جھٹلایا اور اللہ تعالیٰ کی طاعت سے روگردانی کی۔ فراء نے کہا: اس سے مراد جس نے ظاہری رد سے نہیں جھٹلایا تھا بلکہ جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کو بجا لانے میں کوتاہی کی اسے تکذیب قرار دیا گیا، جس طرح تو کہتا ہے: لقی فلان العدّ وفکذب جب وہ انکار کرے اور اس کی اتباع سے پھر جائے۔ کہا: میں نے ابو ثروان کو یہ کہتے ہوئے سنا: إن بَنِي نُمَيْر ليس لِجدّهم مكذوبة۔ مراد ہے جب وہ دشمنوں سے ملتے ہیں تو قتال کو سچ کر دکھاتے ہیں اور رجوع نہیں کرتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿۲﴾ (الواقعہ) یعنی وہ حق ہے۔ میں نے سلم بن حسن کو کہتے ہوئے سنا کہا میں نے ابو اسحاق زجاج کو کہتے ہوئے سنا: یہ آیت مرجئہ (1) کی بڑی دلیل ہے ان کا گمان ہے کہ جہنم میں کافر کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا۔ یہ آگ ہے جس کی یہ صفت ذکر کی گئی ہے کہ اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا مگر وہ جو جھٹلائے اور اعراض کرے جہنمیوں کی کئی منازل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ منافقین آگ کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے جس کو عذاب کی جنس کی دھمکی دی ہے تو اس

---

1۔ مرجئہ مسلمانوں میں سے ایک فرقہ رہا ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے نافرمانی کوئی نقصان نہیں دیتی جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے طاعت نفع نہیں دیتی۔ انہیں نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے معاصی پر عذاب کو مؤخر کر دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مرجئہ سے مراد ایسی جماعت ہے جو یہ کہتے ہیں ایمان عمل کے بغیر صرف قول ہے گویا انہوں نے قول کو اولیت دی عمل کو مؤخر کر دیا۔

کے بارے میں جائز ہے کہ اسے عذاب دیا جائے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:48) اگر ایسے فرد کو عذاب نہ دیا جاتا ہوتا جس نے شرک نہ کیا ہوتا تو اس کلام وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ کا کوئی فائدہ نہ ہوتا اور یہ ایسی کلام ہوتی جس کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

زمخشری نے کہا: آیت مشرکوں میں سے عظیم اور مومنوں میں سے عظیم کی حالتوں میں موازنہ کے لیے وارد ہوئی ہے اور یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ ان دونوں کی متناقض صفات میں مبالغہ سے کام لیا جائے، تو یہ فرمایا گیا: الْاَشْقَى اسے صَلی کے ساتھ مختص کیا گیا گویا جہنم پیدا اس کے لیے کی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اتقی کو جنت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے گویا جنت اس کے لیے پیدا کی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اشقی سے مراد ابوجہل اور امیہ بن خلف ہے اور اتقی سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

## وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾

"اور دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیز گار جو دیتا ہے اپنا مال اپنے (دل) کو پاک کرنے کے لیے"۔

یعنی اس جہنم سے وہ آدمی دور ہوگا جو متقی اور ڈرنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْاَتْقَى سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں جنہیں جہنم میں داخل ہونے سے دور رکھا جائے گا۔ پھر الْاَتْقَى کی صفت ذکر کی جو مال اس لیے دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پاکیزہ ہو جائے وہ اس سے ریاکاری اور شہرت کا طالب نہیں بلکہ وہ صدقہ کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہو۔ بعض علماء معانی نے کہا کہ الْاَتْقَى اور الْاَشْقَى سے مراد متقی اور شقی ہے جس طرح طرفہ کا قول ہے:

تمنّى رجال أن أموت وان أمت فتلك سبيل لست فيها بأوحدِ

کچھ لوگوں نے تمنا کی کہ میں مرجاؤں اگر میں مر گیا تو وہ ایسا راستہ ہے جس میں میں اکیلا نہیں۔

یہاں أوحد، واحد اور وحید کے معنی میں ہے افعل کا صیغہ فعیل کی جگہ رکھا جاتا ہے جس طرح ان کے قول: اللہ اکبر میں اکبر، کبیر کے معنی میں ہے اسی طرح وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم:27) میں اھون، ھین کے معنی میں ہے۔

## وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

"اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو بجز اس کے کہ وہ اپنے برتر پروردگار کی خوشنودگی کا طلب گار ہے اور وہ ضرور (اس سے) خوش ہوگا"۔

وہ اس لیے صدقہ نہیں کرتا کہ وہ کسی احسان کا بدلہ چکائے وہ تو اپنے عظیم رب کی رضا چاہتا ہے۔ وہ جزا پر ضرور راضی ہوگا۔ عطا اور ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ مشرکوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذیتیں دیں اور حضرت بلال احد احد کہتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو ارشاد فرمایا: "احد تجھے نجات دے گا"۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے ابابکر! حضرت بلال کو اللہ تعالیٰ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ بھانپ گئے اور اپنے گھر چلے گئے سونے کا ایک رطل لیا اور اسے امیہ بن خلف کے پاس لے گئے۔ اس سے پوچھا: کیا تو بلال کو میرے ہاتھ بیچتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت بلال کو خرید لیا اور اسے آزاد کر دیا۔ مشرکوں نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق نے بلال کو آزاد نہیں کیا مگر اس لیے کہ حضرت بلال کا حضرت ابوبکر صدیق پر کوئی احسان ہوگا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی یعنی کسی کا حضرت ابوبکر صدیق پر کوئی احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دیا جاتا بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے بزرگ و برتر رب کی رضا کے لیے کیا ہے(1)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے امیہ بن خلف اور ابی بن خلف سے حضرت بلال کو ایک غلام اور دس اوقیہ میں خریدا اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ (اللیل) تمہاری کاوشیں مختلف ہیں۔

سعید بن مسیب نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے جب حضرت ابوبکر صدیق نے امیہ بن خلف سے کہا: کیا تو بلال کو میرے ہاتھ میں بیچتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں اسے نسطاس کے بدلے میں بیچتا ہوں۔ نسطاس حضرت ابوبکر صدیق کا غلام تھا جس کے پاس دس ہزار دینار، غلام، لونڈیاں اور مویشی تھے وہ مشرک تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اسے مسلمان ہونے پر برانگیختہ کیا کہ وہ اسلام قبول کرے تو جتنا مال اس کے قبضہ میں ہے سب اس کا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے نسطاس حضرت بلال کے بدلے میں بیچ دیا۔ مشرکوں نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت بلال کے ساتھ یہ معاملہ کسی احسان کی وجہ سے کیا ہے جو حضرت بلال نے ان پر کیا ہوگا تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اِلَّا ابْتِغَآءَ یہ مستثنیٰ منقطع ہے اس وجہ سے اسے نصب دی گئی ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے: ما فی الدار أحدٌ إلا حمارًا رفع بھی جائز ہے یحییٰ بن وثاب نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اِلَّا ابْتِغَآءُ وَجْهِ رَبِّهٖ یہ اس کی لغت کے مطابق ہے جو مستثنیٰ میں رفع جائز سمجھتا ہے، جس طرح شاعر کا ایک شعر ہے:

وبلدۃٍ لیس بها أنیسُ　إلا الیعافیرُ وإلا العِیسُ

یہ ایسا شہر ہے جہاں کوئی انس کرنے والا نہیں مگر ہرن کے بچے اور اونٹ۔

قرآن حکیم میں ہے: مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ (النساء: 66) یہاں بھی مستثنیٰ مرفوع ہے۔ الْاَعْلٰى اس رب کی صفات ہیں جو علو کی صفات کا مستحق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهٖ معنی کے اعتبار سے مفعول لہ ہو، کیونکہ کلام کا معنی یہ ہے وہ اپنا مال نہیں دیتا مگر اپنے رب کی رضا چاہنے کے لیے نہ کہ کسی انعام کا بدلہ چکانے کے لیے۔

اللہ تعالیٰ اسے جنت میں وہ بدلہ عطا کرے گا جو اسے راضی کر دے گا، یعنی اللہ تعالیٰ اسے خرچ سے کئی گناہ عطا کرے گا۔

ابوحیان تیمی اپنے باپ سے وہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رَحِمَ اللهُ أبابكر زَوَّجَنِی ابنتَه وحَمَلَنِی إلی دارِ الهجرة وأعتق بلالًا من ماله (2) اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق پر رحم کرے اس نے اپنی بیٹی میرے عقد نکاح میں دی، مجھے دار ہجرت کی طرف لے گئے اور اپنے مال سے حضرت بلال کو آزاد کیا۔ جب

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 488

2۔ جامع ترمذی، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث نمبر 3647، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت بلال کو خریدا تو حضرت بلال نے آپ سے کہا: کیا آپ نے مجھے اپنے کام کے لیے خریدا ہے یا اللہ تعالیٰ کے لیے خریدا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے۔ حضرت بلال نے کہا: مجھے اللہ تعالیٰ کے لیے چھوڑ دو تو حضرت ابوبکر صدیق نے اسے آزاد کر دیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: حضرت ابوبکر صدیق ہمارے سردار ہیں انہوں نے ہمارے سردار حضرت بلال کو آزاد کیا۔

عطا نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ سورت حضرت ابودحداح کے حق میں نازل ہوئی۔ وجہ وہ کھجور بنی جو انہوں نے اپنے باغ کے بدلے میں خریدی تھی۔ ثعلبی نے عطا سے یہ ذکر کیا ہے۔

قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک کھجور دس کھجوروں کے بدلے میں خریدی گئی تھی اور اس آدمی کا ذکر نہ کیا۔ عطا نے کہا: ایک انصاری کا کھجور کا ایک درخت تھا اس کی پکی کھجوریں اس کے پڑوس کے گھر میں گرتی تھیں اس کے بچے انہیں کھا لیتے تھے کھجور کے مالک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو اس درخت کو جنت کے ایک درخت کے بدلے بیچتا ہے؟'' مالک نے انکار کر دیا وہ آدمی باہر نکلا تو اسے حضرت ابودحداح نے کہا: کیا تیری یہ رائے ہے کہ تو وہ کھجور حسنیٰ کے بدلے بیچ یہ آپ کا ایک باغ تھا اس آدمی نے کہا وہ کھجور آپ کی ہے حضرت ابودحداح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: یارسول اللہ! وہ کھجور مجھ سے جنت کی کھجور کے عوض خرید لیجئے۔ فرمایا: ''ہاں۔ اس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے!'' فرمایا: یارسول اللہ! وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری کے پڑوسی کو بلایا اور فرمایا: وہ کھجور کا درخت لے لو''۔ تو یہ سورت حضرت ابودحداح کے باغ اور اس کھجور والے کے حق میں نازل ہوئی۔ یعنی مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۝ سے مراد حضرت ابوالدحداح، الحسنیٰ سے مراد ثواب، یسریٰ سے مراد جنت ہے مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى سے مراد انصاری، حسنیٰ سے مراد ثواب اور عسریٰ سے مراد جہنم ہے۔ تردیٰ سے مراد ہلاک ہونا ہے الْاَشْقَى سے مراد وہ خزرجی ہے وہ منافق تھا وہ نفاق پر ہی مرا الْاَتْقَى سے مراد ابودحداح ہے مَالَهٗ سے مراد اس کے کھجور کے ثمن میں جو مال خرچ کیا۔ کسی کا حضرت ابودحداح پر کوئی احسان نہیں تھا جس کا وہ بدلہ چکانا چاہتے جب اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرے گا تو ضرور راضی ہوگا (1)۔ اکثر علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ سورت حضرت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسرے علماء کی یہی رائے ہے۔ ہم نے حضرت ابودحداح کا واقعہ سورۂ بقرہ میں مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ:245) کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 495

# سورۃ الضحیٰ

﴿ اٰیاتھا ۱۱ ﴾ ﴿ ۹۳ سُوْرَۃُ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ ۱۱ ﴾ ﴿ رکوعھا ۱ ﴾

یہ سورت مکی ہے سب کا اس پر اتفاق ہے۔ اس کی گیارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝

''قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے، نہ آپ کے رب نے اس کو چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہوا''۔

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ الضُّحٰی کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے اس سے مراد دن ہے کیونکہ اس کے مقابل اللیل ہے اور سورت اعراف میں ہے اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآىِٕمُوْنَ ۝ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ (اعراف) کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب انہیں رات کو پہنچے جب کہ وہ سوئے ہوئے ہوں یا بستیوں والے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب دن کو پہنچے جب کہ وہ سوئے ہوئے ہوں یا بستیوں والے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب دن کو پہنچے جب کہ وہ کھیل کود میں مصروف ہوں۔ قتادہ، مقاتل اور امام جعفر صادق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس چاشت کے وقت کی قسم اٹھائی جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی اور معراج کی رات کی قسم اٹھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ گھڑی ہے جس میں جادوگر سجدہ میں گر گئے تھے اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝ (طٰہٰ) اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں۔ علماء معانی نے اس سے اور اس کی مثل آیات میں یہ کہا: اس میں اضمار ہے تقدیر کلام یہ ہے و رَبّ الضحی۔ سَجٰی کا معنی ہے پرسکون ہو جانا؛ یہ قول قتادہ، مجاہد، ابن زید اور عکرمہ نے کیا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: لیلة ساجية یعنی پرسکون رات۔ آنکھ کو بھی ساجية کہتے ہیں جب اس کی ایک جانب پرسکون ہو جائے۔ جب رات پرسکون ہو جائے تو کہتے ہیں: سَجَا اللَّيْلُ يَسْجُو سَجْوًا جب سمندر پرسکون ہو جائے تو کہتے ہیں: سَجَا الْبَحْرُ۔ اعشی نے کہا:

فما ذنبنا أن جاش بحر ابن عمكم وبحرك ساج ما يوارِي الدعامِصا

ہمارا کیا گناہ ہے کہ تمہارے چچا زاد کا سمندر موجزن ہے اور تمہارا سمندر پرسکون ہے وہ چھوٹے سیاہ کیڑوں کو بھی چھپائے ہوئے نہیں۔

ضحاک نے کہا: سَجٰی کا معنی ہے اس نے ہر چیز کو ڈھانپ لیا۔ اصمعی نے کہا: سجو اللیل کا معنی ہے رات کا دن کو ڈھانپ لینا۔ ان دونوں کی مثل ہے آدمی کو کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس نے تاریکی کے ساتھ ڈھانپ لیا؛ یہ حضرت ابن عباس نے کہا: ان سے یہ بھی مروی ہے: جب وہ چلی جائے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: جب وہ تاریک ہو جائے۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے: جب وہ متوجہ ہو۔ قتادہ سے بھی یہ مروی ہے ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا کہ سَجٰی کا معنی ہے جب وہ قرار پکڑ لے۔ لغت میں پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ سَجٰی کا معنی پر سکون ہونا یعنی لوگ اس میں پر سکون ہو گئے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: نہار صائم، لیل قائم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کے ساکن ہونے کا معنی ہے اس کی تاریکی قرار پذیر ہو گئی۔ ایک قول یہ بھی کیا جاتا ہے: وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۙ یعنی اللہ کے وہ بندے جو چاشت کے وقت میں اس کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جب رات تاریک ہو جاتی ہے تو اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ قول بھی کیا جاتا ہے کہ ضحی سے مراد وہ نور ہے جو عارفین کے دلوں میں دن کی طرح ہے اور وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۙ سے مراد وہ تاریکی ہے جو کافروں کے دلوں میں رات کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کی قسم اٹھائی۔

**مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ** یہ جواب قسم ہے۔ جبریل امین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں کچھ دیر لگا دی تو مشرکین نے کہا: اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو گیا ہے اور اسے چھوڑ دیا ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریج نے کہا: بارہ دن تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی رکی رہی۔ حضرت ابن عباس نے کہا: پندرہ دن تک وحی رکی رہی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پچیس دن تک وحی رکی رہی۔ مقاتل نے کہا: چالیس دن تک وحی رکی رہی تو مشرکوں نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے اور ان سے ناراض ہو گیا ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر ہوتا تو پے در پے اس پر اترتا رہتا جس طرح ان سے قبل جو انبیاء تھے ان کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہا۔

بخاری میں حضرت جندب بن سفیان سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوئی تو آپ نے دو یا تین راتیں قیام نہ کیا تو ایک عورت آئی اس نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں امید کرتی ہوں کہ تیرا شیطان تجھے چھوڑ گیا ہے میں نے دو یا تین راتوں سے اسے تیرے قریب نہیں دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔

ترمذی شریف میں جندب بجلی سے روایت مروی ہے کہ میں ایک غار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ کی انگلی زخمی ہو گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نہیں مگر ایک انگلی ہے زخمی ہو گئی ہے اور اللہ کی راہ میں تو نے ملاقات نہ کی''۔ کہا: جبریل امین نے آپ کی خدمت میں آنے میں دیر کی تو مشرکوں نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ امام ترمذی نے فلم یقُمْ لیلتین أو ثلاثًا کا ذکر نہیں۔ امام ترمذی نے اسے ساقط کر دیا اور امام بخاری نے اسے ذکر کیا اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ ان میں سے صحیح ترین ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ثعلبی نے حضرت جندب بن سفیان بجلی سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک انگلی پر کوئی پتھر لگا

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ والضحی، حدیث نمبر 3268، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو وہ زخمی ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو محض ایک انگلی ہے جو زخمی ہوگئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں تو نے ملاقات نہیں کی''۔ آپ نے دو یا تین دن رات کو قیام نہ کیا تو ابولہب کی بیوی ام جمیل نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: میرا خیال ہے تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے، میں نے اسے دو یا تین دن تیرے قریب نہیں دیکھا تو یہ سورت نازل ہوئی۔

ابی عمران جونی سے مروی ہے کہ حضرت جبریل امین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے میں دیر کی یہاں تک کہ آپ پر یہ معاملہ بڑا شاق گزرا جبریل امین حاضر ہوئے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ پر اپنی پیشانی رکھے دعا مانگ رہے تھے۔ حضرت جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں کے درمیان کریدا اور یہ آیات نازل کیں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝۔

حضرت خولہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خادمہ تھیں نے کہا کہ کتے کا ایک بچہ گھر میں داخل ہوا وہ چارپائی کے نیچے داخل ہوا اور مر گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند دن رکے رہے کہ آپ پر وحی نازل نہیں ہوتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''اے خولہ! میرے گھر میں کیا ہوا ہے؟ کیا وجہ ہے جبریل امین میرے پاس نہیں آتے'' حضرت خولہ نے کہا: میں نے کہا میں نے عرض کی کاش! میں گھر کو تیار کرتی اور اسے صاف کرتی۔ میں جھاڑو کے ساتھ چارپائی کے نیچے جھکی تو کیا دیکھتی ہوں وہاں ایک مردہ پلا پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے اٹھایا اور گھر کے پیچھے پھینک دیا۔ اللہ کے نبی تشریف لائے جب کہ ان کے جبڑے کانپ رہے تھے جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے خولہ! مجھے چادر اوڑھا دو'' تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرما دیا۔ جب جبریل امین آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے لیٹ آنے کی وجہ پوچھی تو جبریل امین نے عرض کی: کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے کہ ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح، ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے بارے میں پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں کل تجھے اس بارے میں بتاؤں گا'' اور ان شاء اللہ کے الفاظ نہ کہے: وحی کچھ عرصہ کے لیے رک گئی یہاں تک کہ جبریل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (کہف) آپ کسی چیز کے بارے میں یہ نہ کہیں کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ پھر آپ نے اس چیز کے بارے میں خبر دی جو آپ سے پوچھا گیا۔ اسی قصہ کے متعلق مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ نازل ہوئی۔

ایک قول یہ کیا گیا: مسلمانوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا وجہ ہے آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی؟ فرمایا: ''مجھ پر وحی کیسے نازل ہو جب کہ تم انگلیوں کے درمیان جمع ہونے والی میل کی جگہ کو صاف نہیں کرتے، تم اپنے ناخن نہیں کاٹتے اور اپنی مونچھیں نہیں کاٹتے''۔ تو جبریل امین یہ سورت لے کر نازل ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو نہیں آیا یہاں تک کہ میں تیرا مشتاق ہو گیا''۔ حضرت جبریل امین نے کہا: میں آپ کا بہت زیادہ مشتاق تھا لیکن میں ایک حکم کیا گیا غلام ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (مریم:64)(1) ہم تیرے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے وَدَّعَكَ تشدید کے ساتھ ہے یہ عام لوگوں کی قراءت ہے یہ تودیع سے مشتق ہے یہ اس طرح تھی جس طرح جدا ہونے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2181

والا الوداع کہتا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ان دونوں نے ودعك پڑھا ہے اس کا معنی تجھے چھوڑ دیا ہے۔ شاعر نے کہا:

وثم وَدَعْنا آلَ عمرو و عامر فرائسَ أطراف المثقفة السُمْرِ

اور پھر ہم نے آل عمرو اور عامر کو گندم گوں نیزوں کے اطراف کا شکار بنا کر چھوڑ دیا۔

اس کا استعمال قلیل ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: هويدع كذا وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ مبرد محمد بن یزید نے کہا: وہ بہت ہی کم کہتے ہیں وَدَعَ، وَذَرَ کیونکہ واؤ جب مقدم ہو تو وہ ضعیف ہوتی ہے اور ترک کی وجہ سے وہ اس سے مستغنی ہوتے ہیں۔

**وَ مَاقَلٰى** جب سے تیرے رب نے تجھے محبوب بنایا ہے تجھ سے ناراض نہیں ہوا۔ کاف ضمیر کو یہاں ترک کر دیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے۔ القلی کا معنی بغض ہے اگر تو مصدر میں قاف کو زبر دے گا تو اس کے آخر میں الف ممدودہ پڑھے گا۔ تو کہے گا: قلاہ یَقْلِیه قلًى وقَلاءً جس طرح تو کہتا ہے: قَرَيْتُ الضَّيْفَ أَقْرِيه قِرًى و قَراءً۔ مضارع میں اس کا صیغہ یَقْلَاہُ یہ بنو طی کی لغت ہے۔ ثعلب نے یہ شعر پڑھا: أيام أمِّ الغَمْرِ لا نَقْلاها ہم ام غمر کے دنوں سے بغض نہیں رکھتے۔ نقلی کا معنی ہے ہم بغض رکھتے ہیں:

امرء القیس نے کہا:

ولستُ بمقلیّ الخِلال ولا قالٍ

میں دوستوں کے ہاں مبغوض نہیں اور نہ ہی میں ناراض ہونے والا ہوں۔

آیت کا معنی ہے تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ ہی تجھ سے ناراض ہوا۔ یہاں قلی میں کاف ضمیر کو ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (الاحزاب: 35) یہاں بھی مفعول حذف ہے اصل کلام یوں ہے والذاکرات للہ۔

**وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝**

"اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے۔ اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے"۔

سلمہ نے ابو اسحاق سے روایت نقل کی ہے کہ آیت کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف لوٹنے پر جو میرے پاس موجود ہے وہ اس سے بہتر ہے جو میں نے تجھے دنیا میں کرامت سے نوازا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر جن ممالک کو فتح کرنے والا تھا خواب میں وہ ممالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے تو اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے تو جبریل امین یہ دونوں آیات لے کر نازل ہوئے۔

ابن اسحاق نے کہا: دنیا میں فتح و کامرانی اور آخرت میں ثواب۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد حوض اور شفاعت ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے: سفید موتی کے ایک ہزار محل جس کی مٹی کستوری کی ہوگی۔ امام اوزاعی نے اسے

مرفوع نقل کیا ہے۔ کہا: مجھے اسماعیل بن عبید اللہ نے انہوں نے علی بن عبد اللہ بن عباس سے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ ممالک خواب میں دکھائے گئے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر فتح کیے جانے والے تھے تو اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیات کو نازل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنت میں ایک ہزار محل عطا فرمائے جن کی مٹی خوشبو کی ہوگی۔ ہر محل میں اتنی بیویاں اور خدام ہوں گے جن کی آپ خواہش کریں گے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر راضی ہوں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت میں سے کوئی جہنم میں داخل نہ ہو۔ سدی نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ تمام مومنوں میں شفاعت ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میری امت میں میری شفاعت قبول فرماتا جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے ارشاد فرمائے گا: اے محمد! تو راضی ہے، تو میں عرض کروں گا: اے میرے رب! میں راضی ہوں''۔

صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تلاوت کی: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم) جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو غفور رحیم ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی تلاوت کی: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ: 118) اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور یوں التجا کی: اللّٰھمّ أمّتي أمّتي اے اللہ! میری امت کو بخش دے اور رو دیئے اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم دیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ جبکہ تیرا رب خوب جانتا ہے اس سے سوال کرو کون سی چیز تجھے رلاتی ہے؟ حضرت جبریل امین آئے پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل امین سے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ ان سے کہو اللہ تعالیٰ تمہیں ارشاد فرماتا ہے: ہم تجھے تیری امت کے بارے میں راضی کریں گے اور تجھے ناراض نہیں کریں گے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اہل عراق سے فرمایا: تم یہ کہتے ہو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے سب سے امید والی آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: 53) کہہ دیجئے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ انہوں نے کہا: ہم تو یہی کہتے ہیں فرمایا: لیکن ہم اہل بیت یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے امید والی آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''پھر تو اللہ کی قسم! میں راضی نہیں ہوں گا جب کہ میری امت میں سے ایک بھی جہنم میں ہوگا'' (1)۔

## اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝

''کیا اس نے نہیں پایا آپ کو یتیم پھر (اپنی آغوش رحمت میں) جگہ دی''۔

اللہ تعالیٰ نے ان احسانات کا شمار کیا ہے جو اس نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیے فرمایا: کیا تجھے یتیم نہیں پایا یعنی تیرا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 494

باپ نہیں تھا تیرا باپ فوت ہو چکا تھا تو تیرے لیے ٹھکانہ بنا دیا تو اس کے ہاں یعنی اپنے چچا ابو طالب کے ہاں پناہ لیتا اس نے تیری کفالت کی۔ امام جعفر بن محمد صادق سے پوچھا گیا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے والدین سے کیوں یتیم کیا گیا؟ انہوں نے فرمایا: تاکہ مخلوق کا ان پر کوئی حق نہ ہو۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے درۃ یتیمۃ یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب وہ بے مثال ہو۔ تو آیت کا معنی یہ ہوگا: کیا تجھے شرف میں یکتا نہیں پایا کہ تیری کوئی مثال نہیں پس الله تعالیٰ نے تجھے اصحاب کی پناہ میں دے دیا جو تیری حفاظت کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احاطہ کیے رہتے ہیں۔

## وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝

''اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا''۔

یعنی تیرے بارے میں نبوت کا جو ارادہ کیا گیا اس سے تجھے غافل پایا پس تیری راہنمائی کی۔ یہاں ضلال غفلت کے معنی میں ہے جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ۝ (طٰہٰ) یعنی میرا رب غافل نہیں اور نہ ہی وہ بھولتا ہے۔ اور اپنے نبی کے حق میں ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف) اور آپ اس سے قبل غافلوں میں سے تھے۔ ایک قوم نے کہا: ضَآلًّا سے مراد آپ قرآن اور شرائع کو نہ جانتے تھے پس الله تعالیٰ نے آپ کو قرآن اور اسلام کے احکام کی طرف ہدایت دی، یہ ضحاک، شہر بن حوشب اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ الله تعالیٰ کے فرمان: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ (شوریٰ: 52) کا یہی معنی و مفہوم ہے۔ ایک قوم کا یہ کہنا ہے: تجھے گمراہ قوم میں پایا تو الله تعالیٰ نے آپ کے وسیلہ سے انہیں ہدایت سے نوازا؛ یہ فراء اور کلبی کا قول ہے۔ سدی سے بھی اس کی مثل مروی ہے کہ تیری قوم کو گمراہی میں پایا پس ان کی راہنمائی کرنے کے ساتھ تجھے ہدایت سے نوازا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کو ہجرت سے ناواقف پایا تو آپ کی ہجرت کی طرف راہنمائی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب آپ سے اصحاب کہف ذی القرنین اور روح کے بارے میں سوال کیا گیا تو تجھے استثناء کرنے سے بھولنے والا پایا تو الله تعالیٰ نے تجھے یاد دلا دیا جس طرح الله تعالیٰ کا فرمان ہے: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا (البقرہ: 282) ان دونوں میں سے ایک بھول جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تجھے قبلہ کا طالب پایا گیا تو تیری اس طرف راہنمائی کر دی، اس کی وضاحت الله تعالیٰ کے اس فرمان: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) میں ہے۔ ضلال، طلب کرنے کے معنی میں ہوگا کیونکہ بھٹکنے والا طالب ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اس سے تجھے حیران پایا پس تیری اس طرف راہنمائی کی۔ تو ضلال، متحیر ہونے کے معنی میں ہوگا کیونکہ گمراہ متحیر ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تجھے تیری قوم میں ضائع ہونے والا پایا پس اس نے تیری اس طرف راہنمائی کی۔ تو اس صورت میں ضلال، ضیاع کے معنی میں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: تجھے ہدایت سے محبت کرنے والا پایا تو تیری اس طرف راہنمائی کی۔ تو ضلال محبت کے معنی میں ہوگا۔ اس معنی میں الله تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝ (یوسف) انہوں نے کہا: الله کی قسم! بے شک آپ تو قدیم محبت میں مبتلا ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: آپ کو مکہ کی گھاٹیوں میں گم پایا اور تجھے ہدایت دی اور تیرے دادا عبدالمطلب کی طرف لوٹا دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھوٹے تھے کہ مکہ کی گھاٹیوں میں گم ہو گئے ابو جہل نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے ریوڑوں سے واپس آ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب کی طرف واپس لوٹا دیا (1)۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر احسان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن کے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دادا کی طرف لوٹا دیا۔

سعید بن جبیر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا کے ساتھ ایک سفر میں نکلے ابلیس نے تاریک رات میں اونٹنی کی مہار پکڑ لی اور راستہ سے دور کر دیا حضرت جبریل امین آئے اور ابلیس کو ایک پھونک ماری جس سے ابلیس ہند کے علاقہ میں جا پڑا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قافلہ کی طرف لوٹا دیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ پر احسان کیا (2)۔

کعب نے کہا: جب حضرت حلیمہ دودھ پلانے کا حق ادا کر چکیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لائیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عبد المطلب کی طرف واپس کریں تو حضرت حلیمہ نے کعبہ کے دروازہ کے پاس سنا: اے مکہ کی وادی! تجھے مبارک ہو آج تیری طرف نور دین، رونق اور جمال واپس کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا: میں نے بچے کو رکھ دیا تا کہ میں اپنے کپڑے درست کروں تو میں نے شدید دھاکہ سنا میں متوجہ ہوئی تو میں نے بچے کو نہ پایا۔ میں نے کہا: اے لوگو! بچہ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے کوئی چیز نہیں دیکھی۔ میں بلند آواز سے چیخی: وامحمداہ۔ کیا دیکھتی ہوں ایک بوڑھا شیخ ہے اپنے عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہے اس نے کہا: بڑے بت کے پاس جاؤ اگر اس نے یہ چاہا کہ بچہ تیری طرف لوٹا دے تو ایسا کر گزرے گا۔ پھر شیخ نے بت کے گرد چکر لگایا اس کے سر کو بوسہ دیا اور کہا: اے میرے رب! تیرے احسانات ہمیشہ قریش پر رہے ہیں یہ سعدیہ گمان کرتی ہے کہ اس کا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے تو بچہ اسے لوٹا دے تو ہبل بت منہ کے بل گر گیا دوسرے بت بھی گر گئے۔ انہوں نے کہا: اے شیخ! ہم سے دور ہو جا ہماری ہلاکت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر ہوگی۔ بوڑھے نے اپنا عصا پھینک دیا اور کانپنے لگا اور کہا: تیرے بیٹے کا ایک رب ہے وہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔ تو اسے تھوڑی دور تک تلاش کر قریش حضرت عبد المطلب کے پاس جمع ہو گئے اور تمام مقامات سے اسے تلاش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ پایا۔ حضرت عبد المطلب نے کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آرزو کی کہ اسے واپس کر دے اور کہا:

يا ربِّ رُدَّ ولدی محمدًا أُرْدُدْه ربی واتخذ عندی یدا
یا ربِّ إن محمدٌ لم یُوجَدا فشمل قومی کلهم تبدّدا

اے میرے رب! میرے بیٹے محمد کو واپس کر دو میرے رب اسے واپس کر دو اور مجھ پر احسان کر اے میرے رب! اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ پایا گیا تو میری قوم کی جمعیت بکھر جائے گی۔

انہوں نے ایک ندا کرنے والے کو سنا جو آسمان سے ندا کر رہا تھا: اے لوگو! شور و غل نہ کرو بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک رب ہے نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے گا اور نہ ہی اسے ضائع کرے گا۔ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہامہ کی وادی میں سمر کے درخت کے پاس ہیں۔ حضرت عبد المطلب اور ورقہ بن نوفل چلے کیا دیکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے نیچے کھڑے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 499
2۔ ایضاً

ہیں اور ٹہنیوں اور پتوں سے کھیل رہے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کو معراج کی رات کو بھولا ہوا پایا جب حضرت جبریل امین آپ سے الگ ہوئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ نہ جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ساق عرش کی طرف تیری راہنمائی کی۔

ابوبکر وراق اور دوسرے علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے آپ اپنے چچا سے محبت کرتے تھے تو تیری اپنے رب کی محبت کی طرف راہنمائی کی۔ بسام بن عبداللہ نے کہا: آپ اپنی ذات سے ناآشنا تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جانتے تھے کہ آپ کیا ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی ذات اور حال سے آگاہ کر دیا۔ جنیدی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بیان میں متحیر پایا تو آپ کو بیان کی تعلیم دی۔ اس کی وضاحت اس ارشاد میں ہے: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) تا کہ آپ لوگوں کے لیے بیان کریں جوان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل: 64) جس میں انہوں نے اختلاف کیا ان کے لیے اس کی وضاحت کریں۔

علماء متکلمین میں سے ایک نے کہا: جب عرب صحرا میں کوئی درخت تنہا دیکھتے جس کے ساتھ کوئی درخت نہ ہوتا تو اسے ضالہ کا نام دیتے۔ اس کے ذریعے راستہ کی طرف راہنمائی حاصل کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا یعنی کوئی آپ کے دین پر نہیں تو یکتا ہے تیرے ساتھ کوئی بھی نہیں میں نے تیرے ذریعے مخلوق کو اپنی طرف ہدایت دی۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام اقوال اچھے ہیں ان میں سے کچھ معنوی ہیں اور کچھ حسی ہیں آخری قول مجھے سب سے پسند ہے، کیونکہ یہ تمام اقوال معنویہ کو جامع ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: قوم جس حال پر تھی آپ بھی اسی طرح تھے ظاہر حال میں آپ ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے تھے جہاں تک شرک کا تعلق ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ آپ چالیس سال تک قوم کے عام معمول کی زندگی پر رہے۔ کلبی اور سدی نے کہا: یہ آیت اپنے ظاہر پر ہے یعنی آپ ہدایت پر نہ تھے اور آپ کی قوم بھی ہدایت پر نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی (1)۔ یہ قول اور اس کا رد سورۂ شوریٰ میں گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے آپ کو مشرکوں میں گم پایا تو آپ کو ان سے ممتاز کر دیا جس طرح یہ جملہ ہے: ضل الماء فی اللبن پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ اس معنی میں ہے اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ: 10) یعنی دفن کرنے کے وقت جب ہم مٹی سے مل جائیں گے یہاں تک کہ ہم اس سے الگ نہ ہوں گے۔ حضرت حسن بصری کی قراءت میں ہے وَوَجَدَكَ ضَآلٌّ فَهَدٰى تجھے ایک گمراہ نے پالیا تو وہ تیری وجہ سے ہدایت پا گیا۔ یہ قراءت تفسیر کے انداز میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے تیری قوم تیری طرف نہیں آتی تھی وہ تیری قدر کو نہیں پہچانتے تھے تو اس نے مسلمانوں کی تیری طرف راہنمائی کی یہاں تک کہ وہ تجھ پر ایمان لے آئے۔

1۔ سدی اور کلبی کا قول کسی طرح بھی درست نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو کجا کسی بھی نبی کی طرف کفر کی نسبت کرنا صحیح نہیں کیونکہ انبیاء کے لیے اعلان نبوت سے قبل کبائر اور صغائر سے عصمت ثابت ہے۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞

''اور اس نے آپ کو حاجت مند پایا تو غنی کر دیا''۔

یعنی فقیر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال نہ تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غنی کر دیا۔ یہ کہا جاتا ہے: عَالَ الرجلُ يَعِيلُ عَيْلَةً جب وہ محتاج ہو۔ احیحہ بن جلاح نے کہا:

فما يَدْرِی الفقيرُ متى غِنَاه وما يدْرِی الغنِی متى يَعِيل

فقیر نہیں جانتا کہ اس کی غنا کب ہوگی اور غنی نہیں جانتا کہ کب وہ محتاج ہو جائے گا۔

مقاتل نے کہا: فرضّاك بما أعطاك من الرزق جو تجھے رزق دیا اس کے ساتھ تجھے راضی کر دیا۔ کلبی نے کہا: رزق کے ساتھ تجھے قانع بنا دیا۔ ابن عساکر نے کہا: تجھے نفس کا فقیر پایا تو تیرے دل کو غنی کر دیا۔ اخفش نے کہا: تجھے عیال دار پایا اس کی دلیل فاغنی ہے اس معنی میں جریر کا قول ہے:

اللهُ أنزلَ فی الكتاب فريضةً لابن السبيل وللفقير العائل

اللہ تعالیٰ نے کتاب میں مسافر اور عیال دار فقیر کے لیے حصہ نازل کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تجھے دلائل اور براہین سے فقیر پایا تو تجھے ان کے ساتھ غنی کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تجھے فتوحات کے ساتھ غنی کر دیا اور کفار کے مال تجھے بطور فئی عطا کر دیئے۔ قشیری نے کہا: اس قول میں سوال کی گنجائش ہے کیونکہ سورت مکی ہے اور جہاد مدینہ طیبہ میں فرض ہوا۔

عام قراءت عَآئِلًا ہے۔ ابن سمیقع نے اسے عيّلا پڑھا ہے جس طرح طیّب اور هیّن کا لفظ ہے۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۞ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۞ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۞

''پس کسی یتیم پر سختی نہ کیجئے اور جو مانگنے آئے اس کو مت جھڑکیے اور اپنے رب (کریم) کی نعمتوں کا ذکر فرمایا کیجئے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

### تَقْهَرْ کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۞ اس پر ظلم کے ساتھ تسلط نہ جمائیں اس کا حق اس کو دے دیں اور اپنے یتیمی کے دور کو یاد کریں، یہ اخفش کا قول ہے۔ یہ دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ مجاہد سے یہ مروی ہے کہ معنی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حقیر نہ جانیں۔

نخعی، اشہب اور عقیلی نے کہا: تکہر کاف کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اسی طرح ہے اس بنا پر یہ احتمال موجود ہے کہ اس پر ظلم کرنے اور مال لینے کے ذریعے تسلط جمانے سے نہی ہے۔ یتیم کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی

ذات کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ اس کے معاملہ میں سختی کی کیونکہ ظالم پر سخت سزا مرتب کی جاتی ہے۔ عرب کاف کی جگہ قاف اکثر استعمال کرتے ہیں۔

نحاس نے کہا: یہ غلط ہے کھرتا اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس پر سختی کرے۔ معاویہ بن حکم سلمی کی حدیث صحیح مسلم میں ہے جب انہوں نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ نماز میں گفتگو کی تو اس وقت انہوں نے کہا تھا: میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر نہ اس سے قبل کوئی معلم دیکھا اور نہ اس کے بعد کوئی معلم دیکھا جو آپ سے بہتر تعلیم دینے والا ہو۔ اللہ کی قسم! نہ آپ نے مجھ پر سختی کی، نہ مجھے مارا اور نہ ہی مجھے گالیاں دیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: قھر کا معنی غلبہ ہے کھر کا معنی جھڑکنا ہے۔

## یتیم پر مہربانی کرنے کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 2**۔ یہ آیت یتیم پر مہربانی کرنے، اس کے ساتھ نیکی کرنے اور اس پر احسان کرنے پر دلالت کرتی ہے یہاں تک کہ قتادہ نے کہا: یتیم کے لیے رحیم باپ کی طرح ہو جا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں دل کی سختی کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تو نرمی کا ارادہ رکھتا ہے تو یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر''۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا ان دو کی طرح ہیں'' اور سبابہ اور وسطی کے ساتھ اشارہ کیا(1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''یتیم جب روتا ہے تو اس کے رونے کی وجہ سے رحمن کا عرش لرز جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: اے میرے فرشتو! کس نے اس یتیم کو رلایا ہے جس کے باپ کو میں نے مٹی میں دبا دیا تھا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! تو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! جس نے اسے خاموش کر دیا اور اسے راضی کیا اس پر گواہ ہو جاؤ میں اسے قیامت کے روز راضی کروں گا''۔ حضرت ابن عمر جب کسی یتیم کو دیکھتے تو اس کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے اور اسے کوئی نہ کوئی چیز دیا کرتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ ضَمَّ یتیمًا فکان فی نفقتہ و کفاہ مؤنتہ کان لہ حجابًا من النارِ یومَ القیٰمۃِ و من مَسَحَ برأس یتیمٍ کان لہ بِکُلِّ شعرۃٍ حسنۃ (2)۔ جس نے یتیم کو اپنے ساتھ ملایا وہ یتیم اس کے خرچہ میں شامل تھا اور وہ آدمی اس کی ضروریات پوری کرتا ہو تو وہ یتیم قیامت کے روز آگ سے حجاب ہوگا۔ جس نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے لیے ہر بال کے بدلے نیکی ہوگی۔ اکثم بن صیفی نے کہا: بے وقعت چار ہیں چغل خور، جھوٹ بولنے والا، مقروض، یتیم۔

## سائل اور اس کے ساتھ پیش آنے کا طریقہ

**مسئلہ نمبر 3**۔ وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ سائل کو نہ جھڑکیں یہ مسائل کے بارے میں سخت بات کرنے سے نہی

1۔ سنن ابن ماجہ 2۔ اخرجہ ابن عدی، جلد 3، صفحہ 1097، ان کی سند میں سلیمان بن عمرو نخعی ہے جس پر وضع کی تہمت ہے۔

ہے بلکہ اسے تھوڑا مال دے کر یا اچھا جواب دے کہ واپس کر دو؛ یہ قتادہ اور دوسرے علماء نے قول کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب سائل سوال کرے تو تم میں سے کسی کو اسے عطا کرنے سے کوئی چیز نہ روکے اگرچہ وہ عطا کرنے والا سائل کے ہاتھوں میں دو سونے کے کنگن دیکھے'' حضرت ابراہیم بن ادہم نے کہا: سائلین کتنے اچھے لوگ ہیں جو ہمارا زاد راہ آخرت کے لیے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ابراہیم نخعی نے کہا: سائل آخرت کا ڈاکیا ہے وہ تمہارے دروازے پر آتا ہے وہ کہتا ہے: کیا تم اپنے اہل کے لیے کوئی چیز بھیجنا چاہتے ہو؟

روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے سائل کو تھوڑا مال دے کر یا اچھا جواب دے کر واپس کر دو بے شک وہ تمہارے پاس آتا ہے جو نہ انسانوں میں سے ہوتا ہے اور نہ جنوں میں سے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو عطا کیا ہے اس میں تمہارا کیا رویہ ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں سائل سے مراد وہ ہے جو دین کے بارے میں سوال کرتا ہے یعنی اسے آپ سختی سے نہ جھڑکیں، اسے نرمی سے جواب دیں؛ یہ سفیان کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: جو آدمی دین کے بارے میں سوال کرے تو اس کا جواب عالم پر فرض کفایہ ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح نیکی کا سوال کرنے والے کو عطا کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ حدیث کا علم رکھنے والوں کو دیکھتے تو ان کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے اور کہتے: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوبو! خوش آمدید۔ ابو ہارون عبدی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ہم حضرت ابو سعید خدری کے پاس آئے تو وہ کہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مستحق افراد کو خوش آمدید۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگ تمہاری اتباع کرنے والے ہیں، لوگ تمہارے پاس زمین کی اطراف سے آئیں گے وہ دین سیکھنا چاہتے ہوں گے جب وہ تمہارے پاس آئیں تو انہیں بھلائی کی وصیت کرو'' (1)۔ ایک روایت میں ہے: ''مشرق کی جانب سے تمہارے پاس لوگ آئیں گے'' (2)۔

الْيَتِيْمَ اور السَّآىِٕلَ اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جو اس کے بعد ہے منصوب کا حق تو یہ ہے کہ وہ فاء کے بعد ہوتا تقدیر کلام یوں ہے مهما یکن من شئ فلا تقھر الیتیم ولا تنھر السائل۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے سوال کیا میں پسند کرتا ہوں کہ میں نے وہ سوال نہ کیا ہوتا میں نے عرض کی: اے میرے رب! تو نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا، تو نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی، تو نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، تو نے فلاں فلاں کو یہ چیز دی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کیا میں نے تجھے یتیم نہیں پایا تو تجھے پناہ دی، کیا میں نے تجھے غافل نہیں پایا تو تجھے ہدایت دی، کیا میں نے تجھے عیالدار نہیں پایا تو تجھے غنی کر دیا، کیا میں نے تیرے سینے کو کھلا نہیں کر دیا، کیا میں نے تجھے وہ چیز عطا نہ کی جو اس سے قبل کسی کو نہ دی تھی (سورۂ بقرہ کی آخری آیات) کیا میں نے تجھے خلیل نہیں بنایا جس طرح میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا؟ میں نے

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی الاستیصاء، حدیث نمبر 2574، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی الاستیصاء، حدیث نمبر 2575، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرض کی: کیوں نہیں اے میرے رب!''(1)۔

## اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنا اور اس کے طریقے

**مسئلہ نمبر 4۔** وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ اللہ تعالیٰ نے تم پر جو نعمتیں کی ہیں شکر اور ثنا کے ذریعے انہیں عام کر۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر اور ان کا اعتراف یہ بھی شکر ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ سے مراد ہے قرآن۔ ان سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے یعنی جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے ہے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جب تو بھلائی پائے تو اچھا عمل کرے تو اپنے قابل اعتماد بھائیوں میں اس کا ذکر کر۔ عمرو ابن میمون سے مروی ہے: جب کوئی آدمی اپنے ان بھائیوں سے ملے جو اس پر اعتماد کرتے ہوں تو وہ اسے کہے: اللہ تعالیٰ نے اسے گزشتہ رات اتنی اتنی نماز پڑھنے کی توفیق دی۔ ابو فراس عبداللہ بن غالب جب صبح کرتے تو یہ کہتے: اللہ تعالیٰ نے گزشتہ رات میرے حصہ میں یہ یہ مقدر کیا میں نے اتنا قرآن حکیم پڑھا، میں نے اتنی نماز پڑھی، میں نے اتنا اللہ کا ذکر کیا اور میں نے یہ عمل کیا۔ ہم نے ان سے کہا: اے ابو فراس! آپ جیسے آدمی تو یہ بات نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ جب کہ تم یہ کہتے ہو: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر نہ کر۔ اس کی مثل ایوب سختیانی اور ابو رجاء عطاردی سے مروی ہے حضرت بکر بن عبداللہ مزنی نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من أُعطِیَ خیرًا فلم یُرَعلیه سمی بغیض اللہ معادیا لنعم اللہ''(2) جس کو خیر سے نوازا گیا اور اس پر وہ خیر نہ دیکھی گئی تو اسے اللہ تعالیٰ کا مبغوض اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے دشمنی رکھنے والا کہا جائے گا۔

شعبی نے حضرت نعمان بن بشیر سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قلیل کا شکر یہ ادا نہ کیا اس نے کثیر کا شکر یہ ادا نہیں کیا۔ جس نے لوگوں کا شکر یہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر یہ ادا نہ کیا، نعمتوں کا اظہار شکر ہے، ذکر کو ترک کرنا کفر ہے، جماعت رحمت ہے اور فرقت عذاب ہے''(3)۔ نسائی نے حضرت مالک بن نضلہ جشمی سے روایت نقل کی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بوسیدہ، کپڑوں میں دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس مال ہے''؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، یا رسول اللہ! ہر قسم کا مال ہے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ تجھے مال عطا کرے تو اس کا اثر تجھ پر دکھائی دیا جانا چاہیے''۔ حضرت ابو سعید خدری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ فرمایا: إنّ اللہ جَمِیلٌ یُحِبُّ الجمالَ ویحب أن یری أثر نعمتِه علیٰ عبدِہ''(4) اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے اور وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے احسان کا اثر اس کے بندے پر دکھائی دے۔

**فصل:** بزی کی ابن کثیر سے روایت ہے کہ قاری اللہ اکبر کہے۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے حضرت ابی بن

1۔ طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر 12289

2۔ ابن ابی الدنیا فی العیال، صفحہ 384

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، حدیث نمبر 4177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3789

کعب سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب سورۃ الضحیٰ کے آخر تک پہنچتے تو دو سورتوں کے درمیان تکبیر کہتے یہاں تک کہ قرآن حکیم ختم کرتے سورت کے اختتام کو اپنی تکبیر کے ساتھ نہ ملاتے بلکہ دونوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ کرتے گویا اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہ آئی تو مشرکوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا: اس کے صاحب نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے ناراض ہو گیا ہے تو یہ سورت نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر کے الفاظ کہے۔

مجاہد نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس پر پڑھا تو آپ نے مجھے تکبیر کا حکم دیا اور مجھے حضرت ابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی۔ باقی کی قراءت میں تکبیر نہ کہتے کیونکہ یہ قرآن میں زیادتی کا ذریعہ ہے۔

میں کہتا ہوں: قرآن نقل متواتر سے ثابت ہے اس کی سورتیں، آیات اور حروف سب نقل متواتر سے ثابت ہیں نہ اس میں زیادتی ہے اور نہ کمی ہے تکبیر اس بنا پر قرآن نہیں جب بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ جو مصحف کے خط میں مصحف میں لکھے ہوئے ہونے کے باوجود قرآن نہیں تو تکبیر کیسے قرآن ہو گی جب کہ وہ لکھی ہوئی بھی نہیں؟ یہ اخبار احاد کی وجہ سے سنت ہے ابن کثیر نے اسے مستحب قرار دیا ہے اسے واجب قرار نہیں دیا جس نے اسے ترک کیا اس نے غلطی کی۔

حاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حافظ نے بخاری اور مسلم کی شرائط پر مستدرک میں حدیث ذکر کی ہے، ہمیں ابو یحییٰ محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن یزید سے جو قاری تھے مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کے امام تھے وہ ابو عبداللہ محمد بن علی بن زید صائغ سے وہ احمد بن محمد بن قاسم بن ابی بزہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے عکرمہ بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا میں نے اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین پر قرآن حکیم سنایا جب وہ وَالضُّحٰی ۝ تک پہنچا تو انہوں نے مجھے کہا: تو ہر سورت کے اختتام پر اللہ اکبر کہہ۔ میں نے عبداللہ بن کثیر کو قرآن حکیم سنایا جب میں وَالضُّحٰی ۝ تک پہنچا تو انہوں نے کہا: ختم کرنے تک تکبیر کہہ انہیں عبداللہ بن کثیر نے خبر دی کہ انہوں نے مجاہد کو پڑھ کر سنایا اور مجاہد نے انہیں خبر دی کہ حضرت ابن عباس نے انہیں اس امر کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ حضرت ابی بن کعب نے انہیں اس امر کا حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس چیز کا حکم دیا۔ یہ حدیث صحیح ہے شیخین نے اسے نقل نہیں کیا (1)۔

1۔ مستدرک للحاکم، جلد 3، صفحہ 307

# سورۃ الم نشرح

ایاتہا ۸ ۔ ۹۴ سورۃ الانشراح مکیۃ ۱۲ ۔ رکوعہا ۱

تمام کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس کی آٹھ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱

''کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا''۔

شرح صدر سے مراد اس کا کھولنا ہے یعنی کیا ہم نے آپ کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول نہیں دیا۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کے دل کو نرم نہیں کر دیا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا سینہ کو کھولا جاتا ہے؟ فرمایا: ''ہاں اسے کھولا جاتا ہے''۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا اس کی کوئی نشانی ہے؟ فرمایا: ''ہاں دنیا (دھوکہ کے گھر) سے پہلو تہی اور آخرت (دار خلود) کی طرف رجوع اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری'' یہ معنی سورۃ الزمر میں آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر: 22) میں گزر چکا ہے۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ کا معنی ہے حکمتوں اور علم سے اسے بھر دیا گیا۔ صحیح (1) میں حضرت انس بن مالک سے وہ اپنی قوم کے ایک فرد حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس اثناء میں کہ میں نیند اور بیداری کی حالت میں بیت اللہ شریف کے پاس تھا کہ میں نے ایک کہنے والے کو سنا: میں تین میں سے ایک تھا میرے پاس سونے کا ایک ٹب لایا گیا جس میں زمزم کا پانی تھا میرا سینہ فلاں سے فلاں جگہ تک کھولا گیا۔ قتادہ نے کہا: میں نے کہا اس سے کیا مراد ہے؟ کہا: میرے بطن کے نیچے سے، کہا: میرا دل نکالا گیا میرے دل کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا پھر اسے اس جگہ رکھ دیا گیا پھر اسے ایمان اور حکمت کے ساتھ بھر دیا گیا'' (2)۔ حدیث میں قصہ موجود ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ میرے پاس دو فرشتے ایک پرندے کی صورت میں آئے جن کے ساتھ پانی اور برف تھی ان میں سے ایک نے میرے سینے کو چیرا اور دوسرے نے اپنی چونچ کے ساتھ اسے کھولا اور اسے دھویا۔ ایک اور حدیث میں ہے ''جاءنی ملك فشق عن قلبي فاستخرج منه غدرة وقال: قلبك وكيع وعيناك بصيرتان وأذناك سميعتان

1۔ یہ ترمذی کی روایت کتاب التفسیر میں ہے۔ مترجم

2۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الم نشرح، حدیث 3269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أنت محمد رسول الله لسانك صادق ونفسك مطمئنة وخلقك قُثَم وأنت قيم (1)۔ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اس نے میرے دل کو چیرا اس سے دل نکالا اور کہا: تیرا دل مضبوط ہے تیری آنکھیں روشن ہیں، تیرے کان سننے والے ہیں تو محمد رسول اللہ ہے تیری زبان سچ بولنے والی ہے، تیرا نفس مطمئن ہے، تیرے اخلاق جامع ہیں اور تو امور کا نگران ہے''۔ اہل لغت نے کہا: وکیع کا معنی ہے جو چیز اس میں رکھی جائے اس کی حفاظت کرنے والا، یہ لفظ بولا جاتا ہے: سقاء وکیع یعنی ایسا مشکیزہ جو مضبوط ہو جو کچھ اس میں رکھا جائے اس کی حفاظت کرنے والا ہو اسی طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: واستوكعت معدته۔ اس کا معدہ مضبوط ہے قثم کا معنی جامع ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: رجل قثوم للخير۔ ایسا آدمی جو بھلائی کا جامع ہو۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ کا معنی ہے یقیناً ہم نے اسے کھول دیا ہے اس پر دلیل اس کا معطوف وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝ یہ تاویل پر عطف ہے تنزیل پر نہیں کیونکہ اگر یہ تنزیل پر عطف ہوتا تو کلام یوں ہوتی ونضع عنك وزرك یعنی عطف معنی کے اعتبار سے ہے لفظ وصیغہ کے اعتبار سے نہیں۔ یہ چیز اس معنی پر دال ہے اَلَمۡ نَشۡرَحۡ کا معنی قد شرحنا ہے حرف لم نافیہ ہے اور استفہام میں بھی نفی کا تصور موجود ہوتا ہے جب دونوں اکٹھے ہو گئے تو تحقیق کی طرف لوٹ گئے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ ۝ (التین) اس کا معنی ہے اللہ احکم الحاکمین ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبۡدَهٗ (الزمر: 36) کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں۔ اس کی مثل جریر کا شعر ہے جس میں وہ عبد الملک بن مروان کی مدح کرتا ہے:

ألستم خير من ركب المطايا

یقیناً تم سواریوں پر سوار ہونے والوں میں سے بہترین ہو۔

وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝

''اور ہم نے اتار دیا ہے آپ سے آپ کا بوجھ جس نے بوجھل کر دیا تھا آپ کی پیٹھ کو''۔

وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝ ہم نے آپ سے گناہ کو اتار دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وحللنا وحططنا بھی پڑھا ہے حضرت ابن مسعود نے اسے وحللنا عنك وقرك پڑھا ہے یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لِيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح: 2) ایک قول یہ کیا گیا ہے: نبوت سے قبل جو کچھ تھا اس کو آپ سے دور کر دیا۔ وزر کا معنی گناہ ہے معنی یہ ہوگا دور جاہلیت کے جن معمولات میں آپ عمل پیرا تھے ان کو آپ سے دور کر دیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر معمولات زندگی اپنی قوم جیسے تھے اگرچہ آپ نے کسی بت کی کبھی بھی عبادت نہ کی۔ قتادہ، حسن بصری اور ضحاک نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اعمال تھے جنہوں نے آپ کو بوجھل کر رکھا تھا اللہ تعالیٰ نے ان سب کو آپ کے لیے بخش دیا (2)۔

الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝ اس نے اتنا بوجھل کر دیا یہاں تک اس کی آواز سنائی دی گئی۔ اہل لغت کہتے ہیں: انقض الحمل ظهر الناقة یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو بوجھ کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آواز سنے اسی طرح تو کجاوے کی

1۔ دارمی، صفحہ 53

2۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 493

آواز سنے۔ جمیل نے کہا:

وحتی تداعت بالنقیض حبالہ　　وھمّت بَوانِی زَوْرِہٖ أن تَحَطَّمَا

یہاں تک کہ اس کی رسیوں نے آواز نکالنے کی دعوت دی اور اس کے سینے کی ہڈیوں نے ٹوٹنے کا ارادہ کیا۔

بَوانِی زورہ کا معنی ہے اس کے سینے کی ہڈیاں۔ وزر سے مراد بھاری بوجھ ہے۔ محاسبی نے کہا: اعمال کا وہ بوجھ جسے اللہ تعالیٰ اگر معاف نہ کرتا جس نے آپ کی کمر کو بوجھل کر رکھا تھا اور کمزور کر دیا تھا۔

انبیاء کے خلاف اولی اعمال کو اس بوجھ سے بیان کیا ہے جب کہ وہ سب بخش دیئے گئے ہیں کیونکہ انبیاء ان کو بہت اہمیت دیتے ہیں ان پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں اور ان پر حسرت کرتے ہیں۔

سدی نے کہا: ہم نے آپ سے بوجھ کو اتار دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں وحططنا عنك وقرك ہے جس کا معنی یہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ سے دور جاہلیت کے اعمال کا بوجھ اتار دیا ہے۔ حسین بن فضل نے کہا: یعنی جو اعمال خطا یا نسیان کی وجہ سے صادر ہوئے ان کا بوجھ اتار دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آپ کی امت کے گناہ بخش دیئے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ان میں مشغول رہتا۔

عبد العزیز بن یحییٰ اور ابو عبیدہ نے کہا: ہم نے نبوت اور اس کی بجا آوری کی ذمہ داریاں آپ کے لیے ہلکی کر دیں یہاں تک کہ وہ آپ پر کچھ بوجھ کا باعث نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ابتدا میں وحی آپ پر ثقیل ہوتی یہاں تک کہ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ آپ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دیں کہ جبریل امین حاضر ہوئے اور اپنا دیدار کرایا اور عقل کی تبدیلی کا جو اندیشہ تھا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زائل کر دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجھ اٹھانے سے محفوظ رکھا اور نبوت سے قبل آپ کو چالیس سال تک آلودگیوں سے محفوظ رکھا یہاں تک کہ آپ پر وحی نازل ہوئی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آلودگیوں سے پاک تھے (1)۔

## وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

''اور ہم نے بلند کر دیا آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو''۔

مجاہد نے کہا: یعنی آذان میں آپ کا نام بلند کیا۔ اس بارے میں حضرت حسان بن ثابت کے اشعار ہیں:

وضمّ الإله اسم النبیّ إلی اسمه　　إذا قال فی الخمس المؤذن أشهدُ

اللہ تعالیٰ نے نبی کا نام اپنے نام سے ملا دیا ہے جب پانچ آذانوں میں موذن اشھد کہتا ہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتا ہے: میرا ذکر نہیں کیا گیا مگر تیرا میرے ساتھ ذکر کیا گیا آذان میں، اقامت میں، تشہد میں، جمعہ کے روز منبر پر، عید الفطر کے دن، عید الاضحیٰ کے دن، ایام تشریق میں، عرفہ کے دن، جمروں کے قریب، صفا اور مروہ پر، نکاح کے خطبہ میں اور مشرق و مغرب میں۔ اگر ایک بندہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 502

تعالیٰ کی عبادت کرے، جنت، دوزخ اور ہر شئی کی تصدیق کرے اور اس بات کی گواہی نہ دے کہ حضرت محمد مصطفیٰ اللہ کے رسول ہیں تو وہ کسی چیز سے نفع نہیں اٹھائے گا اور وہ کافر ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے، ہم نے آپ سے پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی کتابوں میں آپ کا ذکر کیا، ہم نے انہیں آپ کے بارے بشارت دینے کا حکم دیا کوئی دین نہیں مگر آپ کا دین اس پر غالب آ کر رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم نے آسمانوں میں فرشتوں کے ہاں آپ کے ذکر کو بلند کر دیا اور زمین میں مومنوں کے ہاں آپ کے ذکر کو بلند کر دیا اور ہم آخرت میں آپ کا ذکر بلند کریں گے کہ ہم آپ کو مقام محمود اور باعزت درجات عطا کریں گے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۭ۝۶

''یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے''۔

بے شک تنگی اور سختی کے ساتھ آسانی یعنی وسعت اور غنا ہے پھر اسی ارشاد کو مکرر ذکر کیا۔ ایک قوم نے کہا: یہ تکرار کلام کی تاکید ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: ارم ارم، پھینکو پھینکو۔ إعجل إعجل جلدی کرو، جلدی کرو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ (التکاثر) ہرگز نہیں عنقریب تم جان لو گے پھر ہرگز نہیں عنقریب تم جان لو گے۔ اس کی مثال جواب کے تکرار میں ہے بلی، بلی، لا، لا یہ اطناب اور مبالغہ کے لیے ہے؛ یہ فراء کا قول ہے اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

هَممتُ بِنفسِيَ بعضَ الهمومِ فأولَى لنفسِيَ أولَى لها

میں نے اپنے بارے میں ایسے امور کا ارادہ کیا جو میرے لیے ہلاکت کا باعث تھے جو ہلاکت کا باعث تھے۔

ایک قوم کا نقطہ نظر ہے کہ عربوں کی عادت ہے جب وہ کسی معرف بلام اسم کو ذکر کریں پھر اسے دوبارہ لائیں تو اس سے مراد پہلے والی ذات ہوتی ہے اگر وہ نکرہ ذکر کریں پھر اسے دوبارہ ذکر کریں تو دوسرا پہلے کا غیر ہوتا ہے یہاں آسانیاں دو ہیں تاکہ امید کے لیے زیادہ قوی ہو اور صبر پر زیادہ برانگیختہ کرنے والا ہو؛ یہ ثعلب کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے ایک تنگی پیدا کی ہے اور دو آسانیاں پیدا کی ہیں ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ سے اس صورت کی فضیلت میں ایک حدیث ہے لن يغلب عسر يسرين(1) ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آئے گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر تنگی پتھر میں ہو تو آسانی اسے تلاش کر لے گی یہاں تک کہ اس پر داخل ہو جائے گی ایک تنگی دو آسانیوں پر کبھی غالب نہیں آئے گی۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے حضرت عمر بن خطاب کی طرف خط لکھا جس میں رومیوں کے لشکروں کا ذکر کیا اور ان سے جو خوف محسوس ہو رہا تھا اس کا ذکر کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف خط لکھا: اما بعد جب بھی بندہ مومن پر کسی جگہ سختی آتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے بعد آسانی پیدا فرما دیتا ہے، بے شک ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 495

ارشاد فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران) اے ایمان والو! تم صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لیے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔

ایک قوم نے کہا ان میں سے جرجانی بھی ہے: یہ ایسا قول ہے جس میں اعتراض کی گنجائش ہے اگر اس استدلال کو تسلیم کیا جائے تو ضروری ہوگا کہ جب ایک آدمی کہے: إنّ مع الفارس سيف، إنّ مع الفارس سيفٌ کہ سوار ایک ہو اور تلواریں دو ہوں۔ جو بات صحیح ہے وہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا جب کہ آپ کم مال رکھنے والے تھے مشرکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر و تنگدستی کی عار دلائی یہاں تک کہ انہوں نے کہا: ہم آپ کے لیے مال جمع کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہوئے اور خیال یہ کیا کہ ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر کی وجہ سے آپ کی تکذیب کی ہے پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت دی اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو نعمتیں کی تھیں ان کا شمار کیا۔ اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ غنا کا وعدہ کیا: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ یعنی انہوں نے فقر کی وجہ سے جو عار دلائی ہے وہ آپ کو غمگین نہ کرے بے شک اس تنگی کے ساتھ جلدی یعنی دنیا میں آسانی ملنے والی ہے تو جو وعدہ آپ سے کیا تھا اسے پورا کر دیا آپ کا وصال نہ ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حجاز اور یمن کے علاقہ کو فتح کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال میں وسعت عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کو دو سو اونٹ عطا فرماتے تھے اور عمدہ عطیات دیا کرتے تھے اور اپنے اہل کے لیے سال بھر کے نفقہ کا انتظار فرماتے تھے یہ سب فضل و احسان دنیا سے متعلق تھا اگرچہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اس میں آپ کی امت کے بعض افراد بھی داخل ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

پھر آخرت کے دوسرے فضل کا آغاز فرمایا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلاسا دینا ہے اس کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ یہ ایک اور چیز ہے اس کے ابتدا پر دلیل حروف عطف فاء، واؤ وغیرہ سے خالی ہونا ہے جو عطف پر دلالت کرتے ہیں یہ تمام مومنین کے لیے عام وعدہ ہے کوئی بھی اس سے خارج نہیں یعنی دنیا میں مومنوں کے لیے تنگی کے ساتھ آخرت میں لامحالہ آسانی ہوگی۔ بعض اوقات دنیا اور آخرت کی آسانی جمع ہو جائے گی۔ حدیث طیبہ میں جو ہے لن يغلب عسرٌ يسرين سے مراد ہے ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آئے گی۔ اگر غالب آئے بھی تو ایک پر غالب آئے گی وہ دنیا کی آسانی ہے جہاں تک آخرت کی آسانی کا تعلق ہے وہ ہر صورت ہو کر رہے گی، اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی یا یہ کہا جائے گا کہ عسر سے مراد اہل مکہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے نکالنا ہے اور یسر سے مراد فتح مکہ کے روز دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں عزت و شرف کے ساتھ داخل ہونا ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

"پس جب آپ (فرائض نبوت سے) فارغ ہوں تو (حسب معمول) ریاضت میں لگ جائیں اور اپنے رب

کی طرف راغب ہو جائیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## فَرَغْتَ اور فَانْصَبْ کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَاِذَا فَرَغْتَ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: جب آپ نماز سے فارغ ہو جائیں تو دعا میں مبالغہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال کریں (1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آپ فرائض سے فارغ ہوں تو رات کے قیام میں مصروف ہو جائیں (2)۔ کلبی نے کہا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کی تبلیغ سے فارغ ہوں تو اپنے لیے مومنین اور مومنات کے لیے استغفار کریں۔ حسن اور قتادہ نے کہا: جب اپنے دشمن کے ساتھ جہاد سے فارغ ہوں تو اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو جائیں۔ مجاہد سے مروی ہے: جب دنیا سے فارغ ہوں تو اپنی نماز میں شروع ہو جائیں اس کی مثل حضرت حسن بصری سے مروی ہے۔ حضرت جنید نے کہا: جب مخلوق کے معاملہ سے فارغ ہوں تو حق کی عبادت میں کوشش کیجئے۔ ابن عربی نے کہا: جس نے اس آیت فَانْصَبْ کو صاد کے کسرہ اور ابتدا میں ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا تو وہ بدعتی ہے انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے امام کو معین کیجئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہو۔ یہ قراءت میں باطل ہے، معنی میں باطل ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا۔ بعض جہلاء نے اسے فانصبّ پڑھا ہے معنی ہے جب تو جہاد سے فارغ ہو تو اپنے شہر کی طرف لوٹنے میں جلدی کیجئے، یہ بھی قراءت کے اعتبار سے باطل ہے کیونکہ اجماع کے خلاف ہے لیکن اس کا معنی صحیح ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: السفرُ قطعةٌ من العذاب يمنع أحد كم نومه، طعامه وشرابه فإذا قضى أحد كم نهمته فليعجل الرجوع الى أهله (3) سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے وہ تمہیں نیند، کھانے اور مشروب سے روک دیتا ہے جب تم میں سے کوئی اپنی حاجت سے فارغ ہو تو وہ اپنے گھر کی طرف لوٹنے میں جلدی کرے۔ لوگوں میں از روئے عذاب کے سب سے سخت اور از روئے ٹھکانہ کے سب سے برا وہ ہوگا جو صحیح معنی لے اور اپنی جانب سے اس پر قراءت یا حدیث سوار کر دے وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والا ہے، اس کے رسول پر جھوٹ بولنے والا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔

مہدوی نے کہا: ابو جعفر منصور سے مروی ہے کہ اس نے اَلَمْ نَشْرَحَ حاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ بعید ہے۔ کبھی اس کی تاویل نون خفیفہ کے ساتھ کی جاتی ہے پھر وقف میں نون کو الف سے بدل دیا پھر فصل کو وقف پر محمول کیا۔ پھر الف کو حذف کر دیا گیا۔ اس پر بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

اِضْرِبَ عنك الهمومَ طارِقَها ضربك بالسوط قَوْنَسَ الفَرَسِ

یہاں اضرب کو اِضْرِبَنْ مراد لیا ہے۔ ابو سمال سے مروی ہے: فاذا فرِغت یعنی راء کے نیچے کسرہ ہے یہ بھی اس میں لغت ہے اسے فَرَغِبْ بھی پڑھا گیا ہے یعنی لوگوں کو اس امر کی طرف رغبت دلایئے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

---

1۔ النکت والعیون، جلد 6، صفحہ 297 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 503 3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7225

## مسجد میں کھیلنا اور اس کے احکام

**مسئلہ نمبر 2**۔ ابن عربی نے کہا: شریح سے یہ بات مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو عید کے روز کھیل رہے تھے شریح نے کہا: شارع نے اس کا تو حکم نہیں دیا۔ اس میں (ان کے قول میں) اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ حبشی عید کے روز مسجد نبوی میں ڈھال اور برچھا کے ساتھ کھیلا کرتے تھے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں دیکھ رہے ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں حضرت عائشہ صدیقہ کے ہاں داخل ہوئے جب کہ ان کے ہاں انصار کی بچیوں میں سے دو بچیاں گا رہی تھیں حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں شیطان کی مزمور (گیت) ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوبکر! ان دونوں کو چھوڑ دو کیونکہ یہ یوم عید ہے''۔ اس میں اعمال کو کوشش سے برا کہنا لازم نہیں آتا بلکہ یہ مخلوق کے لیے مکروہ ہے۔

# سورۃ التین

﴿ایاتہا ۸﴾ ﴿۹۵ سورۃ التین مکیۃ ۲۸﴾ ﴿رکوعہا ۱﴾

اکثر علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا: یہ مدنی ہے۔ اس کی آٹھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## تین اور زیتون سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، مجاہد، ابراہیم نخعی، عطا بن ابی رباح، جابر بن زید، مقاتل اور کلبی نے کہا: اس سے مراد وہ انجیر ہے جسے تم کھاتے ہو اور تمہارا وہ زیتون ہے جس سے تم تیل نچوڑتے ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ شَجَرَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّہۡنِ وَ صِبۡغٍ لِّلۡاٰکِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾ (المومن) نیز پیدا کیا ایک درخت طور سینا میں وہ اگتا ہے تیل لیے ہوئے اور سالن لیے ہوئے کھانے والوں کے لیے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں انجیر کی ٹوکری پیش کی گئی فرمایا: ''کھاؤ'' اور خود بھی اس سے کھایا پھر فرمایا: ''اگر میں کہتا کوئی پھل جنت سے اترا ہے تو میں اسے ہی کہتا کیونکہ جنت کے پھل بغیر گٹھلی کے ہوں گے، اسے کھاؤ یہ بواسیر کو ختم کرتا ہے اور جوڑوں کے درد کے لیے نفع مند ہے'' (1)۔

حضرت معاذ سے مروی ہے کہ انہوں نے زیتون کی تر شاخ سے مسواک کیا اور کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''زیتون کا مسواک کتنا اچھا مسواک ہے، یہ مبارک درخت ہے، یہ منہ کو پاکیزہ بناتا ہے، یہ دانتوں کے میل کو دور کر دیتا ہے، یہ میرا اور مجھ سے قبل انبیاء کا مسواک ہے'' (2)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے: تین سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی مسجد ہے جو جودی پہاڑ پر بنائی گئی اور زیتون سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔ ضحاک نے کہا: تین مسجد حرام ہے اور زیتون مسجد اقصیٰ ہے۔ ابن زید نے کہا: تین دمشق کی مسجد ہے اور زیتون بیت المقدس کی مسجد ہے۔ قتادہ نے کہا: تین وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق کا شہر ہے اور زیتون وہ پہاڑ ہے جس پر بیت المقدس ہے۔ محمد بن کعب نے کہا: تین اصحاب کہف کی مسجد ہے اور زیتون ایلیاء کی مسجد ہے۔ کعب الاحبار، قتادہ،

1۔ الاتحاف، جلد 4، صفحہ 268
2۔ ایضاً

عکرمہ اور ابن زید نے کہا: تین دمشق کی مسجد ہے اور زیتون بیت المقدس کی مسجد ہے؛ یہ طبری کا پسندیدہ نقطہ نظر ہے۔ فراء نے کہا: میں نے ایک شامی کو کہتے ہوئے سنا: تین سے مراد وہ پہاڑ ہے جو حلوان سے ہمدان کے درمیان ہے۔ زیتون سے مراد شام کے پہاڑ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں شام کے پہاڑ ہیں۔ جن کو طور زتینا اور طور تینا کہتے ہیں ان دونوں کو یہ نام دیا گیا کیونکہ یہ دونوں پہاڑ ان دونوں کو اگاتے ہیں؛ ابومکین نے عکرمہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہا: تین اور زیتون شام کے دو پہاڑ ہیں۔ نابغہ نے کہا: اتین التین عن عرض وہ تین میں ایک جانب سے آئیں۔ تین ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مضاف حذف ہو تقدیر کلام یہ ہے منابت التین والزیتون۔ لیکن قرآن حکیم کے الفاظ سے اس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ اس کے قول میں کوئی دلیل ہے جو اس کے خلاف کو جائز نہیں گردانتا؛ یہ نحاس کا قول ہے۔

## تین کے ساتھ قسم اٹھانے کی وجہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ ان اقوال میں سے صحیح پہلا قول ہے کیونکہ یہی حقیقت ہے حقیقت سے مجاز کی طرف بغیر دلیل کے نہیں پھرا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے تین کی قسم اٹھائی کیونکہ وہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کا پردہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

**یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ** (الاعراف:22) چپانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے۔

وہ انجیر کا پتہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اٹھائی تاکہ اس میں موجود بڑے احسان کی وضاحت کرے کیونکہ اس کا منظر بڑا خوبصورت ہے، عمدہ خوشبو والا، اس کا توڑنا آسان اور چبانے کے قابل ہے۔ اس کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

انظر الی التین فی الغصون ضُحًی ممزق الجِلد مائل العُنُقِ
کانه ربّ نِعمةٍ سُلِبت فعاد بعد الجدید فی الخَلَقِ
أصغر مافی النهود آکبره لکِنْ یُنَادَی علیه فی الطُّرُقِ

چاشت کے وقت ٹہنیوں میں انجیر کی طرف دیکھو اس کی جلد پھٹی ہوئی ہے اور گردن جھکی ہوئی ہے گویا وہ ایسی نعمت والا ہے جس کو سلب کر لیا گیا ہے پس وہ مخلوق میں جدت کے ساتھ لوٹ آیا، جسامت میں جو سب سے چھوٹا ہے وہ قدر و منزلت میں سب سے بڑا ہے لیکن راستے میں اس پر ندا دی جاتی ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

التین یعتدِل عندی کل فاکهة إذا أنثنی مائلا فی غصنه الزاهی
مُغَنَّش الوجه قد سالت حلاوته کأنه راکع مِن خشیة اللهِ

میرے نزدیک انجیر ہر پھل کے ہم پلہ ہے جب وہ چمکدار ٹہنی میں جھکتے ہوئے دہرا ہو جاتا ہے اس کے چہرے پر نشانات ہیں میں نے اس کی حلاوت کا پوچھا گویا وہ اللہ کے ڈر سے رکوع میں ہے۔

زیتون کی قسم اٹھائی کیونکہ اس کے ساتھ حضرت ابراہیم کی مثال بیان کی گئی ہے۔

**یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ** (النور:35) اسے زیتون کے مبارک درخت سے جلایا جاتا ہے۔ یہ شام اور

مغرب کے اکثر لوگوں کا سالن ہے۔ اس کو بطور سالن استعمال کرتے ہیں اور سالن میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ چراغ جلاتے ہیں پیٹ کی بیماریوں اور زخموں کا اس کے ساتھ علاج کرتے ہیں۔ اس میں بہت زیادہ منافع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كلوا الزيت وادهنوا به فانه من شجرة مباركة اس کا تیل کھاؤ اس سے تیل لگاؤ بے شک یہ مبارک درخت سے ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو سورۃ المومنون میں گزر چکی ہے۔

## انجیر میں زکوٰۃ کے لازم ہونے کے بارے میں اختلاف

**مسئلہ نمبر 3**۔ ابن عربی نے کہا: ہم نے اس (انجیر) میں زکوٰۃ (عشر) کو واجب کیا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے اور اس احسان کو عظیم قرار دیا ہے، ساتھ ہی یہ خوراک ہے جو ذخیرہ کی جاسکتی ہے۔ بہت سے علماء نے اس میں عشر لازم کرنے سے انحراف کیا ہے وہ اصل میں والیوں کے ظلم سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ وہ زکوٰۃ کے اموال میں ظلم کرتے ہیں وہ اسے چٹی کے طور پر وصول کرتے ہیں جس کے بارے میں صادق امین صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار کیا ہے۔ علماء نے اسے ناپسند کیا کہ وہ ایک اور مال تک ان کے لیے راہ بنا دیں جس میں وہ ظلم و ستم کریں لیکن بندے کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے انعام پر حق ادا کر کے گناہ سے بچے۔ امام شافعی نے اس علت یا کسی اور وجہ سے یہ ارشاد فرمایا: زیتون میں کوئی زکوٰۃ (عشر) نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ دونوں میں زکوٰۃ (عشر) ہے۔

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝

''اور قسم ہے طور سینا کی''۔

ابن ابی نجیح نے مجاہد سے طُوْر کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ طور ایک پہاڑ ہے۔ اور سِيْنِيْنَ سریانی زبان میں مبارک کو کہتے ہیں۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ طور پہاڑ ہے اور سِيْنِيْنَ کا معنی ہے خوبصورت۔ قتادہ نے کہا: سِيْنِيْنَ سے مراد مبارک خوبصورت ہے۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا کی تھی۔ مقاتل اور کلبی نے کہا: سِيْنِيْنَ ہر اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس میں پھل دار درخت ہو۔ یہ نبط کی لغت میں سِيْنِيْنَ اور سیناء ہے۔ عمرو بن میمون نے کہا: میں نے مکہ مکرمہ میں حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ آپ نے اس سورت کی تلاوت کی اور طور سيناء پڑھا کہا: حضرت عبد اللہ کی قراءت میں یہ اسی طرح ہے بیت اللہ شریف کی تعظیم کے لیے اپنی آواز کو بلند کیا۔ دوسری رکعت میں سورۃ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ اور لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ پڑھیں دونوں کو جمع کیا؛ اسے ابن انباری نے ذکر کیا۔ نحاس نے کہا: عبد اللہ کی قراءت میں سِيناء ہے۔ اور عمرو بن میمون کی حدیث میں سَيناء ہے۔ ابوعلی نے کہا: سِيْنِيْنَ فعليل کا وزن ہے لام مکرر ہے جو اس کلمہ میں نون ہے جس طرح زحليل میں حرف مکرر ہے ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں قدم جمانا ممکن نہ ہو۔ كرديدة کھجور کا ایک ڈھیر خنديد طویل کو کہتے ہیں سِيْنِيْنَ بھی منصرف نہیں جس طرح سیناء منصرف نہیں کیونکہ یہ بقعہ یا ارض کا نام ہے اگر اسے مکان، منزل کا نام مانا جائے یا یہ مذکر کا اسم ہو تو یہ منصرف ہوتا ہے، کیونکہ مذکر اسم کو مذکر کا نام دیا گیا ہے۔ اس پہاڑ کی قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ یہ شام اور ارض مقدسہ میں

ہے اللہ تعالیٰ نے دونوں میں برکت رکھ دی ہے جس طرح فرمایا: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (الاسراء: 1) مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے۔

وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۙ

''اور اس امن والے شہر ( مکہ مکرمہ ) کی''۔

اس سے مراد مکہ ہے اسے امین نام دیا کیونکہ وہ امن دینے والا ہے جس طرح ارشاد فرمایا: اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا (العنکبوت: 67) ہم نے حرم کو امن والا بنا دیا، امین، آمن کے معنی میں ہے؛ یہ فراء کا قول ہے شاعر نے کہا:

أَلَمْ تَعْلَمِی یا أَسْمُ وَیْحَكِ أَنَّنِی حَلَفْتُ یَمِینًا لا أَخُونُ أَمِینِی

اے اسماء! تو نہیں جانتی تجھ پر افسوس میں نے قسم اٹھائی ہے میں اپنی قسم میں خیانت نہیں کرتا۔

یہاں امین، آمن کے معنی میں ہے اس سے اس نے استدلال کیا ہے جو یہ قول کرتا ہے کہ تین سے مراد دمشق ہے، زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دمشق کے پہاڑ کی قسم اٹھائی کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اترنے کی جگہ ہے اور بیت المقدس کی قسم اٹھائی کیونکہ وہ انبیاء کا مقام ہے اور مکہ مکرمہ کی قسم اٹھائی کیونکہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آثار ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۟ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ

''بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ( عقل وشکل کے اعتبار سے ) بہترین اعتدال پر پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## انسان سے مراد اور انسان کا حسن وجمال

**مسئلہ نمبر 1**۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ جواب قسم ہے۔ انسان سے مراد کافر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد کلدہ بن اسید ہے۔ اس تعبیر کی صورت میں یہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار کرنے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے۔ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ سے مراد اس کا اعتدال اور سیدھی قامت ہے؛ عام مفسرین کی یہی رائے ہے۔ اس کی تعبیر میں جتنے بھی قول کیے گئے ہیں سب سے اچھا یہی ہے کیونکہ ہر چیز کو اس حالت میں پیدا کیا گیا ہے کہ وہ منہ کے بل جھکا ہوا ہے جب کہ یہ سیدھا ہے اس کی فصیح وبلیغ زبان، ہاتھ اور انگلیاں ہیں جن کے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔ ابوبکر بن طاہر نے کہا: معنی ہے عقل سے مزین، امر کو بجالانے والا تمیز کے ساتھ ہدایت یافتہ، سیدھے قد والا اور اپنے کھانے کی چیز اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے۔ ابن عربی کا قول ہے: انسان سے زیادہ حسین اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ، عالم،

قادر، ارادہ رکھنے والا، گفتگو کرنے والا، سننے والا، دیکھنے والا، تدبیر کرنے والا اور حکیم بنایا ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات ہیں۔ بعض علماء نے یہی تعبیر کی ہے اس کی وضاحت نبی کریم ﷺ کے اس فرمان میں ہے: ان اللہ خلق آدم علی صورتہ (1) یعنی انسان کو ان صفات پر پیدا کیا جن کا ذکر ہم نے پہلے کیا ہے ایک روایت میں علی صورۃ الرحمن کے الفاظ ہیں اللہ تعالیٰ کی معین صورت کیسے ہوسکتی ہے پس صرف صفات ہی باقی رہ گئیں۔

ہمیں مبارک بن عبدالجبار ازدی نے خبر دی کہ ہمیں قاضی ابوالقاسم علی بن ابی علی قاضی محسن نے اپنے باپ سے خبر دی کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کیا کرتا تھا ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا: اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہیں تو تجھے طلاقیں۔ اس کی بیوی اٹھی اور اس سے پردہ میں چلی گئی اور کہا: تو نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ عیسیٰ نے بڑی مشکل سے رات گزاری جب صبح ہوئی تو وہ منصور خلیفہ کے گھر گیا اور تمام واقعہ بتایا اور منصور کے ساتھ بڑی آہ وزاری کی۔ منصور نے فقہاء کو بلایا اور ان سے فتویٰ طلب کیا جو بھی فقہاء موجود تھے سب نے کہا: اسے طلاق ہو چکی ہے مگر امام اعظم ابو حنیفہ کا ایک شاگرد خاموش تھا منصور خلیفہ نے اس سے پوچھا: تو کیوں خاموش ہے؟ اس نے اس سورت کی تلاوت کی اور کہا: اے امیر المومنین! انسان سب چیزوں سے زیادہ خوبصورت ہے کوئی چیز اس سے زیادہ خوبصورت نہیں۔ منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ سے کہا: بات وہی ہے جو اس نے کہی اپنی بیوی کے پاس جا اور ابوجعفر نے اس کی بیوی کی طرف پیغام بھیجا اپنے خاوند کی اطاعت کر، اس کی نافرمانی نہ کر اس نے تجھے طلاق نہیں دی (2)۔

یہ واقعہ تیری راہنمائی کرتا ہے کہ انسان ظاہر و باطن کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے زیادہ حسین ہے شکل وصورت میں جمال ہے، عمدہ بناوٹ ہے، سر میں جو کچھ ہے، سینہ جن چیزوں کو جمع کیے ہوئے ہے، پیٹ جن چیزوں پر مشتمل ہے، شرمگاہ جن چیزوں کو لپیٹے ہوئے ہے، ہاتھ اور جن کو وہ پکڑے ہیں، پاؤں اور جن کو وہ اٹھائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے فلاسفہ کا قول ہے کہ انسان عالم اصغر ہے کیونکہ مخلوقات میں جو کچھ ہے وہ سب ایک انسان میں جمع کر دیا گیا ہے۔

## انسان کے اتنا حسین و جمال ہونے کے باوجود اس کو اسفل السافلین کی طرف لوٹانے کا سبب

**مسئلہ نمبر 2۔** ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ پھر ہم نے انسان کو حقیر ترین عمر کی طرف لوٹا دیا وہ جوانی کے بعد بڑھاپا، قوت کے بعد ضعف ہے یہاں تک کہ آدمی بچے کی طرح پہلی حالت میں چلا جاتا ہے؛ یہ ضحاک، کلبی اور دوسرے علماء نے کہا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے: اس کا معنی ہے پھر ہم نے کافر کو آگ کی طرف لوٹا دیا؛ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اسے ان جلیل القدر صفات سے متصف کیا جن سے انسان مرکب ہے تو اس نے سرکشی کی یہاں تک کہ اس نے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (النازعات) میں تمہارا بڑا رب ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے ان چیزوں کو جانا اور جب کہ بندہ اپنی جانب سے فیصلہ کر رہا ہے اسے اسفل سافلین کی طرف پھیر دیا اس طرح کہ اسے گندگی سے بھرا ہوا نجاست سے لتھڑا ہوا بنا دیا یہاں تک کہ جب وہ اپنے امر کو دیکھے گا تو وہ اپنی حیثیت کی طرف لوٹ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 8171
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1940

آئے گا۔ عبداللہ نے اسے اسفل السافلین پڑھا ہے کہا: اسفل سافلین جمع ہے کیونکہ انسان جمع کے معنی میں ہے اگر اسفل سافل ہوتا تو بھی جائز تھا کیونکہ انسان کا لفظ واحد ہے تو کہتا ہے: هذا افضل قائم تو یہ نہیں کہتا: افضل قائمین کیونکہ تو ایک کے لیے ضمیر مضمر کر رہا ہے اگر ایک مضمر نہ ہوتو اس کا اسم واحد اور جمع دونوں کے ساتھ لوٹ سکتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر) جو سچ لایا اور جس نے تصدیق کی وہی متقین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ (الشوریٰ:48) بے شک ہم جب انسان کو اپنی جانب سے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ خوش ہوتا ہے اور اگر اسے مصیبت پہنچے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کا معنی ہے ہم نے اسے گمراہی کی طرف لوٹا دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر) انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے تو انہیں گمراہی کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ جس نے یہ کہا کہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ سے مراد آگ ہے اس کے نزدیک یہ مستثنیٰ متصل ہے اور جس نے کہا: اس سے مراد بڑھاپا ہے تو اس نے کہا: اس سے مراد مستثنیٰ منقطع ہے۔

## اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

''بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے''۔

ان کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی اور ان کی برائیاں مٹا دی جائے گی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں بڑھاپے نے آلیا تو بڑھاپے میں انہوں نے جو عمل کیے ان پر ان کا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

ضحاک نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے: بندہ جب جوانی میں بہت زیادہ نمازیں پڑھتا ہے زیادہ روزے رکھتا ہے اور صدقات دیتا ہے پھر جوانی میں جو اعمال کیا کرتا تھا ان سے کمزور ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ان اعمال کا اجر دیتا رہتا ہے جو وہ جوانی میں کیا کرتا تھا(1) حدیث طیبہ میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا سافر العبدُ أو مَرِضَ كتب الله له مثل ما كان يعمل مقيما صحيحا(2) بندہ جب سفر کرتا ہے یا مریض ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حق میں وہی اعمال لکھتا رہتا ہے جو حالت اقامت اور حالت صحت میں عمل کیا کرتا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے نہ ان کی عقل خراب ہوتی ہے اور نہ وہ بوڑھے عاجز ہوتے ہیں جو عالم و عامل تھا اس کی عقل نہیں جاتی۔ عاصم احول نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے: جو آدمی قرآن حکیم پڑھتا ہے اسے ارذل عمر کی طرف نہیں لوٹایا جاتا حضرت ابن عمر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے فرمایا: طُوبَى لِمَنْ طَالَ عمرُه و حَسُنَ عملُه(3) اس آدمی کے لیے مبارک ہو جس کی عمر طویل ہوئی اور عمل اچھا ہوا۔ یہ روایت کی گئی ہے: بندہ مومن جب فوت

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 518 2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 19679 3۔ ایضاً، حدیث نمبر 17680

ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے دو فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ قیامت کے دن تک اس کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس مومن کے حق میں اجر لکھا جاتا رہے گا۔

ان خوش نصیبوں کے لیے عمل کے بغیر اجر ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ایسا اجر ہوگا جو ختم نہ ہوگا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۞

''پس کون جھٹلا سکتا ہے آپ کو اس کے بعد جزا وسزا کے معاملہ میں''۔

خطاب کافر کو ہے مقصود اسے شرمندہ کرنا اور الزام حجت ہے اے انسان! جب تو نے پہچان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے احسن تقویم میں پیدا کیا، وہ تجھے ارذل عمر کی طرف لوٹائے گا اور تجھے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرے گا تو وہ کون سی چیز ہے جو تجھے دوبارہ اٹھانے اور جزا کو جھٹلانے پر برانگیختہ کرتی ہے جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے اس بارے میں آگاہ کیا؟ ایک قول یہ کیا گیا تھا کہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یعنی یقین رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ آیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ احکم الحاکمین ہے؛ یہی معنی قتادہ سے بھی منقول ہے۔ قتادہ اور فراء نے کہا: معنی ہے اے رسول! اس بیان کے بعد کون جزا کے بارے میں تجھے جھٹلاتا ہے؛ یہ طبری کا نقطہ نظر ہے۔ گویا فرمایا: کون اس پر قادر ہے یعنی انسان کو پیدا کرنے کی ہماری قوت کے ظاہر ہونے کے باوجود کون ثواب، عقاب، دین اور جزا کے بارے میں تجھے جھٹلائے۔ شاعر نے کہا:

دِنَّا تميما كما كانَتْ أوائلُنا دانَتْ أوائلهُمْ في سالف الزمنِ

ہم نے تمیم کو بدلہ دیا جس طرح ہمارے آباؤ اجداد نے گزشتہ زمانہ میں ان کے آباء کو بدلہ دیا۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۞

''کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم''۔

اس نے جو بھی چیز پیدا کی اس کی صنعت میں کیا وہ سب سے محکم حاکم نہیں؟ ایک قول یہ کیا گیا: حق کا فیصلہ کرنے اور مخلوق میں عدل کرنے کے اعتبار سے احکم الحاکمین نہیں؟ اس میں کلام مقدر ہے کہ کفار میں سے جو صانع قدیم کا اعتراف کرتے ہیں ان کی طرف روئے سخن ہے استفہام کا ہمزہ جب حرف نفی پر داخل ہو جب کہ کلام میں آگاہی کا معنی موجود ہو تو وہ کلام مثبت ہو جاتی ہے جس طرح کہا: اَلستُمْ خیرُ مَنْ رکِبَ المطایا جو لوگ سواریوں پر سوار ہوئے ان میں سے تم یقیناً بہترین ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ دونوں آیات آیت سیف سے منسوخ ہو گئی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ثابت ہیں کیونکہ دونوں کے درمیان منافات نہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم جب یہ آیت اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۞ پڑھتے تو کہتے: بلی کیوں نہیں میں اس پر گواہ ہوں۔ تو یہ کہنا مستحب ہے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: جو یہ سورت پڑھے تو کہے: بلى وأنا على ذلك من الشاهدين (1)۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب مقدار الرکوع والسجود، حدیث نمبر 753، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ العلق

آیاتھا ۱۹ ۔ ۹۶ سورۃ العلق مکیۃ ۱ ۔ رکوعھا ۱

یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق قرآن حکیم کی سورتوں میں سے سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس کی انیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱

"آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایا"۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے: سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جب کہ آپ غار حرا پر قیام فرما تھے انہوں نے اس سورت کی پانچ آیات کی تعلیم دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سب سے پہلے سورۃ المدثر نازل ہوئی؛ یہ حضرت جابر بن عبداللہ کا قول ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، یہ ابو میسرہ ہمدانی کا قول ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (الانعام: 151) فرما دیجئے: آؤ میں تم پر تلاوت کروں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کیا ہے (1)۔ صحیح پہلا قول ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچی خوابیں آتیں پھر ایک فرشتہ آیا اس نے کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ ۔

حضرت عائشہ صدیقہ سے صحیحین میں یہ روایت منقول ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے آغاز میں حالت نیند میں آپ پر سچے خواب آتے آپ خواب نہ دیکھتے مگر وہ اس طرح واضح ہوتے جیسے صبح ہوتی ہے پھر آپ کو خلوت محبوب ہونے لگی تو آپ غار حرا میں خلوت گزین ہونے لگے آپ گھر لوٹنے سے پہلے کئی دن عبادت کرتے رہتے تھے اور ان کے لیے زاد راہ بھی لے جایا کرتے تھے پھر آپ خدیجہ الکبریٰ کی طرف لوٹتے تو اس کی مثل زاد راہ لے جاتے یہاں تک کہ حق ان پر اچانک عیاں ہوا جب کہ آپ غار حرا میں تھے ایک فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: اِقْرَاْ (پڑھو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما انا بقاری (میں پڑھنے والا نہیں) فرمایا: "اس فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے مشقت ہوئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اس نے کہا: اِقْرَاْ میں نے کہا: ما انا بقاری اس نے مجھے پکڑا اور مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی پھر مجھے چھوڑ دیا پھر کہا: اِقْرَاْ میں نے کہا: ما انا بقاری اس نے مجھے پکڑا اور تیسری دفعہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1942

تکلیف پہنچی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا پھر اس فرشتے نے کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ مکمل حدیث ذکر کی (1)۔

ابورجاء عطاردی نے کہا: حضرت ابوموسیٰ اشعری ہماری اس مسجد (مسجد نمرہ) میں ہمارے پاس تشریف لاتے ہمیں حلقہ میں بٹھاتے اور ہمیں قرآن پڑھاتے گویا میں انہیں دو سفید کپڑوں میں دیکھ رہا ہوں۔ ان سے ہی میں نے یہ سورت لی ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ؕ یہ وہ پہلی سورت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ وہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی اس کے بعد نٓ وَالْقَلَمِ اس کے بعد یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ؕ اور اس کے بعد وَالضُّحٰى ؕ نازل ہوئی؛ یہ ماوردی نے ذکر کیا۔

زہری سے مروی ہے کہ پہلی سورت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ سے مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ تک نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ غمگین ہوئے آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے حضرت جبریل امین ان کے پاس آتے تو آپ سے کہا: آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہ کی طرف واپس لوٹے اور کہا: دثّرونی وصبوا علیّ ماءً باردًا مجھے چادر اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی انڈیلو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ؕ۔ (2)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کا معنی ہے قرآن حکیم میں سے جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اپنے رب کے نام سے شروع کرتے ہوئے پڑھیے وہ یہ کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ شریف پڑھیے بِاسْمِ رَبِّكَ میں باء کا محل حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: باء، علی کے معنی میں ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی إقرأ علی أسم ربك یوں جملہ بولا جاتا ہے: فعل كذا باسم الله، فعل كذا علی إسم الله۔ اس نے اللہ کے نام سے شروع کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اس تعبیر کی صورت میں مقصود محذوف ہے یعنی قرآن پڑھو اور اللہ کے نام سے شروع کرو۔ ایک قوم کا کہنا ہے: اسم ربك سے مراد قرآن ہے پس وہ کہتا ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ مراد ہے إقرا إسم ربك باء زائدہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ (المومنون: 20) یہاں بھی باء زائدہ ہے جس طرح شاعر نے کہا:

سُودُ المحَاجِرِ لا یَقْرَأنَ بِالسُّوَرِ

یہاں بھی شاعر نے لا یقرأن السور مراد لیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کا معنی ہے اس کے نام کا ذکر کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ قراءت کا آغاز اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کریں۔

## خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ

''پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے''۔

الْاِنْسَانَ سے مراد ابن آدم ہے عَلَقٍ سے مراد خون ہے یہ علقة کی جمع ہے علقہ سے مراد جامد خون ہے جب وہ چلے تو اسے مسفوح کہتے ہیں یہاں عَلَقٍ فرمایا اور جمع کا صیغہ ذکر کیا کیونکہ الْاِنْسَانَ سے مراد بھی جمع ہے سب کے سب نطفہ کے بعد

---

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 25959

2۔ تفسیر الکشاف، جلد 4، صفحہ 180

عَلَق سے پیدا کیے گئے العلقہ تر خون کا ایک حصہ ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہ اپنی رطوبت کی وجہ سے ہر اس چیز کے ساتھ چمٹ جاتا ہے جو اس پر گزرتی ہے جب وہ خشک ہو جائے تو وہ علقہ نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

ترکناہ یخر علی یدیہ یمج علیهما عَلَق الوَتِینِ

ہم نے اسے یوں چھوڑا وہ اس کے سامنے منہ کے بل گرتا ہے شہ رگ اس پر خون کی کلی کرتی ہے۔

انسان کا خصوصاً ذکر کیا مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ارادہ کیا کہ اس پر جو احسان کیا ہے اس کی قدر و منزلت کو بیان کرے اس طرح کہ اسے حقیر جمے ہوئے خون سے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ مکمل انسان، عقل مند اور امتیاز کرنے والا ہو گیا۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝

''پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے''۔

اِقْرَاْ یہ تاکید کے لیے ہے کلام مکمل ہوئی پھر نئے سرے سے کلام کو شروع کیا اور فرمایا: وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ یہاں الْاَكْرَمُ کریم کے معنی میں ہے۔ کلبی نے کہا: معنی ہے بندوں کے جاہلانہ طرز عمل پر حلم کرتا ہے انہیں جلدی سزا نہیں دیتا۔ پہلا معنی معنوی طور پر زیادہ مناسب ہے کیونکہ جب جو نعمتیں پہلے ہوئیں ان کا ذکر کیا تو ان کے وسیلہ سے اپنے کرم پر دلالت کی۔ ایک قول یہ کیا گیا: اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ کا معنی ہے اے محمد! پڑھیے جب کہ آپ کا رب تیری مدد کرے گا اور تجھے سمجھا دے گا اگر چہ آپ پڑھے ہوئے نہیں اور الْاَكْرَمُ کا معنی ہے وہ بندوں کی جہالتوں سے درگزر فرمانے والا ہے۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

''جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## قلم علم اور دین کو محفوظ رکھنے اور منتقل کرنے کا ذریعہ

**مسئلہ نمبر 1**۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ خط و کتابت کی تعلیم دی یعنی انسان کو قلم کے ساتھ خط کی تعلیم دی۔ سعید نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے: قلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے عظیم نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو دین قائم نہ ہوتا اور زندگی درست نہ ہوتی (1) یہ اللہ تعالیٰ کے کمال کرم پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا اور انہیں جہالت کی ظلمت سے علم کے نور کی طرف نکالا اور علم کتابت کی فضیلت پر آگاہ کیا کیونکہ اس میں ایسے عظیم منافع ہیں جس کا احاطہ اس ذات کے سوا کوئی نہیں کر سکتا نہ علوم مدون ہوئے، نہ حکمتیں مقید ہوئیں، نہ پہلے لوگوں کی خبریں اور مقالات ضبط ہوئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابیں محفوظ ہوئیں مگر کتابت کے ذریعے ہی یہ سب کچھ ہوا۔ اگر یہ ایسا نہ ہوتا تو دین و دنیا کے امور

---

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 527

درست نہ ہوتے۔ اسے قلم اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اسے کاٹا جاتا ہے اس معنی میں تقلیم الظفر ہے جس کا معنی ناخن کاٹنا ہے۔
ایک شاعر نے قلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

فكأنه والحِبْرُ يخضِبُ رأسَهُ شيخٌ لوصل خَرِيدةٍ يتصَنَّعُ
لِمَ لا أُلَاحظه بعين جَلالة وبه إلى الله الصحائفُ ترفعُ

گویا وہ قلم جب کہ روشنائی اس کے سر کو رنگین کرتی ہے ایک بوڑھا شخص ہے جو دوشیزہ کو پانے کے لیے تصنع کرتا ہے میں اس قلم کو شرف کی آنکھ سے کیوں نہ دیکھوں، جب کہ اس کے ذریعے صحائف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند کیے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم جو بات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنوں کیا میں اسے لکھ لیا کروں؟ فرمایا: ''ہاں لکھو بے شک اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے تعلیم دی''۔ مجاہد نے ابوعمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار چیزیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیں پھر باقی تمام چیزوں کے لیے فرمایا: کن ہو جا تو وہ ہر چیز ہو گئی (۱) قلم (۲) عرش (۳) جنت عدن (۴) اور حضرت آدم علیہ السلام۔

جس کو قلم کے ساتھ تعلیم دی اس کے بارے میں تین قول ہیں: (۱) حضرت آدم علیہ السلام کیونکہ وہ سب سے پہلے فرد ہیں جس نے لکھا؛ یہ کعب اور الاحبار کا قول ہے۔

(۲) وہ حضرت ادریس علیہ السلام ہیں یہ سب سے پہلے کاتب ہیں؛ یہ ضحاک کا قول ہے۔

(۳) جس نے بھی قلم کے ساتھ لکھا وہ اس میں داخل ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے ہی یہ فن جانا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کر کے جو نعمت کی اور اس کو تعلیم دے کر جو نعمت کی سب کو جمع کر دیا تا کہ اس پر اپنی نعمت کو مکمل کرے۔

## قلم نے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو لکھا

**مسئلہ نمبر 2**۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ثابت ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں لکھا جب وہ کتاب عرش کے اوپر اس کے پاس تھی: میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اسے فرمایا: لکھو تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا اس نے لکھ دیا(1) جب کہ وہ عرش کے اوپر ذکر میں اس کے پاس تھا''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح میں حدیث مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جب نطفہ پر بیالیس دن گزر جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس کی تصویر بناتا ہے، اس کے کان، آنکھ، جلد، گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے پھر وہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! کیا یہ مذکر ہے یا مونث؟ تو تیرا رب جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے پھر فرشتہ عرض کرتا ہے: اے میرے رب! اس کی اجل؟ تو تیرا رب جو چاہتا ہے فرماتا ہے، فرشتہ وہ لکھ لیتا ہے، پھر فرشتہ عرض کرتا ہے: اس کا رزق؟ تیرا رب جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے، پھر فرشتہ اپنے ہاتھ میں صحیفہ لے کر نکل جاتا ہے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر، حدیث نمبر 4078، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسے جو حکم دیا گیا ہوتا ہے اس میں نہ اضافہ کرتا ہے اور نہ کمی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ (الانفطار)''۔

ہمارے علماء نے فرمایا اصل میں تین قلم ہیں:۔

(۱) قلم اول، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور اسے لکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

(۲) فرشتوں کی قلمیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دے دیں جن کے ساتھ وہ تصادیر، کوائن اور اعمال لکھتے ہیں۔

(۳) لوگوں کی قلمیں، اللہ تعالیٰ نے یہ لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیں جن کے ساتھ وہ اپنی کلام لکھتے ہیں اور ان کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں کتابت میں بہت زیادہ فضائل ہیں کتابت، بیان کا حصہ ہے بیان ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ آدمی کو خاص کیا گیا ہے۔

## عربوں کا سب سے کم لکھنا اور بالخصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ لکھنے، پڑھنے میں حکمت

**مسئلہ نمبر 3**۔ ہمارے علماء نے کہا: عرب لوگوں میں سے سب سے کم لکھنا جانتے تھے عربوں میں سے سب سے کم اس کی پہچان رکھنے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے اس لیے دور کر دیا گیا تھا تاکہ یہ امر آپ کے معجزہ کو سب سے زیادہ ثابت کرنے والا اور آپ کی حجت میں سب سے قوی ہو (1)۔ سورۂ عنکبوت میں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے۔

حماد بن سلمہ، زبیر بن عبد السلام سے انہوں نے ایوب بن عبد اللہ فہری سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو اور نہ ہی انہیں لکھنا سکھاؤ''۔

ہمارے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے لوگوں کو خبردار کیا کیونکہ جب بالا خانوں میں رکھا جائے گا تو وہ مردوں کی طرف جھانکیں گی نہ اس میں ان کے لیے پاکدامنی رہے گی اور نہ ہی پردہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتیں یہاں تک وہ مردوں کی طرف جھانکتی ہیں تو فتنہ و آزمائش جنم لیتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبردار کیا کہ وہ ان کے لیے بالا خانے نہ بنائیں جو ان کے فتنہ کا ذریعہ ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عورتوں کے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ مرد انہیں نہ دیکھیں'' اور وہ مردوں کو نہ دیکھیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے تو اس کا اشتیاق مرد میں ہے مرد میں شہوت پیدا کی گئی ہے اور عورت کو اس کے لیے سکون بنا دیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے بارے میں امن میں نہیں، اسی طرح لکھنے کی تعلیم ہے بعض اوقات یہ فتنہ کا سبب ہوتا ہے اس کی صورت یہ ہے جب اسے لکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے تو وہ اسے خط لکھتی ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے کتابت بھی آنکھوں میں سے ایک آنکھ ہے اس کے ذریعے حاضر، غائب کو دیکھتا ہے خط ہاتھ کے آثار میں سے ہے۔ اس لکھائی میں مافی الضمیر کی تعبیر ہوتی ہے جب کہ زبان کے ساتھ نہیں بولا جاتا۔ یہ زبان سے بھی زیادہ بلیغ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پسند کیا کہ ان سے فتنہ کے اسباب منقطع ہو جائیں تاکہ ان کی عصمت باقی رہے اور ان کے دل پاک رہیں۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1944

## عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝

''اسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے اسے ہر شئی کے ناموں کا علم سکھایا جس طرح قرآن حکیم میں آیا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ: 31) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء کا علم سکھایا۔ کوئی چیز باقی نہ بچی مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر لغت میں اس کا نام سکھا دیا حضرت آدم علیہ السلام نے وہ نام فرشتوں کو بتا دیئے جس طرح آپ کو بتائے گئے تھے۔ اس طرح ان کی فضیلت ظاہر ہوگئی، ان کی قدر واضح ہوگئی اور ان کی نبوت ثابت ہوئی، ملائکہ پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور حضرت آدم علیہ السلام کا غلبہ قائم ہوگیا فرشتوں نے حکم کی اطاعت کی کیونکہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے شرف کو دیکھ لیا تھا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جلالت کا نظارہ کر لیا تھا اور عظیم امر کو سن لیا تھا پھر یہی چیز ان کی اولاد میں اگلوں سے پچھلوں میں اور ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتی رہی۔ یہ بحث سورۃ البقرہ میں مکمل گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں الْاِنْسَانَ سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: 113) آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اس تعبیر کی بنا پر علمك سے مراد آنے والے وقت کا علم ہے کیونکہ یہ تو ان آیات میں سے ہے جو ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ انسان عام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا (النحل: 78) اللہ نے ہی تمہیں تمہاری ماں کے پیٹوں سے نکالا جب کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔

## كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

''ہاں ہاں بے شک انسان سرکشی کرنے لگتا ہے اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں سے لے کر سورت کے آخر تک آیات ابوجہل کے حق میں نازل ہوئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: تمام سورت ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی جس نے نبی کریم ﷺ کو نماز سے منع کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھیں اور یہ سورت پڑھی۔ اس تاویل کی بنا پر یہ سورت ان سورتوں میں سے نہ ہوئی جو ابتدا میں نازل ہوئیں۔ یہ بھی جائز ہے اس کی پہلی پانچ آیات سب سے پہلے نازل ہوئی ہوں پھر باقی آیات ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی ہوں اور نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہو کہ انہیں سورت کے پہلے حصہ کے ساتھ ملا لیں، کیونکہ سورتوں کی ترکیب و تالیف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرہ: 281) اس دن سے بچو جس میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا، آخر میں نازل ہوا، پھر اسے ان آیات کے ساتھ ملا دیا گیا جو طویل عرصہ پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

یہاں كَلَّاۤ، حقا کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے قبل کوئی چیز نہیں۔ یہاں الْاِنْسَانَ سے مراد ابوجہل ہے۔ طغیان سے مراد

نافرمانی میں حد سے آگے بڑھنا ہے اَنْ رَّاٰہُ کی تقدیر کلام یہ ہے لان رای نفسه استغنی یعنی وہ صاحب مال اور صاحب ثروت ہو گیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو قول ابو صالح نے ان سے نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی اور مشرکوں نے اسے سنا تو ابو جہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے کہا: اے محمد! تو گمان کرتا ہے جو آدمی غنی ہو جاتا ہے وہ سرکش ہو جاتا ہے تو ہمارے لیے مکہ کے پہاڑ سونا بنا اور ممکن ہے ہم اسے لیں پھر ہم سرکش ہو جائیں، ہم اپنے دین کو چھوڑ دیں اور آپ کے دین کی پیروی کریں۔ حضرت جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں انہیں اختیار دیں اگر وہ چاہیں تو ہم ان کے ساتھ وہ معاملہ کریں گے جو وہ چاہتے ہیں اگر انہوں نے اطاعت اختیار نہ کی تو ہم ان کے ساتھ وہ معاملہ کریں گے جو ہم نے مائدہ والوں کے ساتھ کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہو گیا کہ وہ قبول نہ کریں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے رک گئے تا کہ معاملہ ان پر باقی رہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ اپنے قبیلہ، انصار و اعوان کی وجہ سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتا ہے تو اَنْ رَّاٰہُ میں لام محذوف ہو گیا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: انكم لتطغون ان رأيتم غنا کہ تم سرکشی کرتے ہو کیونکہ تم اپنے آپ کو غنی خیال کرتے ہو۔ فراء نے کہا: یہاں رأى نفسه نہیں کہا جس طرح قتل نفسه کہا کیونکہ رای ان افعال میں سے ہے جو اسم و خبر کا ارادہ رکھتے ہے جس طرح ظن اور حسبان ہے اس میں ایک مفعول پر اقتصار نہیں ہوتا۔ عرب نفس کے لفظ کو گرا دیتے ہیں۔ اسی جنس سے تو یہ قول کرتا ہے: رأيتُني، حسبتُني۔

مجاہد، حمید اور حنبل نے ابن کثیر سے أن رأه استغنى کو ہمزہ کے قصر کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ باقی قراء نے رآہ کو مد کے ساتھ پڑھا ہے یہی پسندیدہ ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿٨﴾

”یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے“۔

یعنی جس کے مذکورہ اوصاف ہیں اس کا لوٹنا تیرے رب کی طرف ہے تو ہم اسے بدلہ دیں گے۔ رجعی، مرجع اور رجوع سب مصادر ہیں یوں باب چلایا جاتا ہے رَجَعَ اليه رجوعا، مَرْجِعا رُجْعٰی یہ فُعْلٰی کے وزن پر ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ﴿٩﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴿١٠﴾

”(اے حبیب!) آپ نے دیکھا اسے جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے“۔

الَّذِيْ يَنْهٰى ﴿٩﴾ سے مراد ابو جہل ہے عَبْدًا سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کیونکہ ابو جہل نے کہا: اگر میں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میں اس کی گردن روند دوں گا؛ یہ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے نازل کیا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا: کلام میں حذف ہے معنی یہ ہے کیا

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 8831

نماز سے روکنے والا سزا سے امن میں ہے؟

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾

''بھلا دیکھیے تو اگر وہ ہدایت پر ہوتا یا پرہیزگاری کا حکم دیتا تو (اس کے لیے کتنا بہتر ہوتا)''۔

اے ابوجہل! بتاؤ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت (ہدایت) پر ہوں تو کیا تقویٰ اور نماز سے روکنے والا ہلاک ہونے والا نہ ہوگا۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾

''آپ نے دیکھ لیا اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ کیا نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ (اسے) دیکھ رہا ہے''۔

یعنی ابوجہل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جھٹلایا اور ایمان سے اعراض کیا۔ فراء نے کہا: معنی ہے جو نماز پڑھتا ہے وہ ہدایت پر ہوتا ہے تقویٰ کا حکم دینے والا ہو جب کہ منع کرنے والا جھٹلانے والا اور ذکر سے اعراض کرنے والا ہو تو یہ کتنا ہی عجیب ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اس پر ہلاکت ہو کیا ابوجہل نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اس کے فعل کو جانتا ہے تو یہ تقریر و توبیخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اَرَءَيْتَ، پہلے کا بدل ہے اور اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى خبر ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾

''خبردار! اگر وہ (اپنی روش سے) باز نہ آیا تو ہم ضرور (اسے) گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بالوں سے وہ پیشانی جو جھوٹی (اور) خطاکار ہے''۔

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر ابوجہل اس سے نہ رکا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑیں گے اور اسے ذلیل و رسوا کریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہم قیامت کے روز اس کی پیشانی پکڑیں گے، اسے اس کے قدموں کے ساتھ لپیٹ دیا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ (الرحمن) اسے پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑا جائے گا۔ آیت اگر ابوجہل کے حق میں ہو تو یہ لوگوں کے لیے نصیحت ہوگی اور جو طاعت سے خود رکتا ہے اور لوگوں کو روکتا ہے اس کے لیے دھمکی ہے۔ اہل لغت کہتے ہیں: سفعت بالشئ جب تو اس پر قبضہ کر لے اور سختی سے اپنی طرف کھینچے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: سَفَعَ بناصیۃِ فَرَسِہ جب اس نے اپنے گھوڑے کو سختی سے کھینچا۔ شاعر کا شعر ہے:

قومٌ إذا كَثُرَ الصياح رأيتهمْ مِنْ بَيْنِ مُلْجِمٍ مُهْرِهِ أو سافِعِ

وہ ایسی قوم ہیں جب چیخ و پکار زیادہ ہو جائے تو تو انہیں دیکھے گا ان میں سے کوئی اپنے گھوڑے کو لگام دے رہا ہے اور کوئی اسے سختی کے ساتھ کھینچ رہا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سَفَعَتِہ النّارُ والشَّمس سے ماخوذ ہے جب سورج کی تمازت اس کے چہرے کو سیاہی مائل کر دے۔

نَاصِيَةٍ سے مراد سر کے اگلے حصے کے بال ہیں۔ بعض اوقات اس سے پوری ذات مراد لی جاتی ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھذہ ناصیۃ مبارکۃ اس سے مراد پورا انسان ہے۔ یہاں ناصیہ کا خصوصاً ذکر کیا گیا ہے کیونکہ عربوں کی عادت ہے جب

وہ کسی کو ذلیل و رسوا کرنا چاہیں تو اس کے سر کے اگلے بالوں کو پکڑ لیتے۔ مبرد نے کہا: سفع کا معنی سختی کے ساتھ کھینچنا ہے یعنی ہم اسے پیشانی کے بالوں کو پکڑ کر آگ کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سفع کا معنی مارنا ہے یعنی ہم اس کے منہ پر طمانچہ ماریں گے۔ سب کا معنی قریب قریب ہے، یعنی پکڑنے کے ساتھ اسے مارا جائے گا پھر اسے جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جائے گا پھر بدل کے طور پر نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ فرمایا یعنی ابوجہل کی نَاصِيَةٍ قول میں جھوٹی اور عمل میں گناہ کرنے والی ہے۔ اور گناہ کرنے والے کو سزا بھی دی جاتی ہے اور اسے پکڑا جاتا ہے جب کہ خطا کرنے والے کا مواخذہ نہیں ہوتا نَاصِيَةٍ کی صفت كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ سے لگانا اس طرح ہے جس طرح وجوہ کی صفت ناظرہ سے لگائی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (قیامہ) وہ اپنے رب کو دیکھنے والے ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نَاصِيَةٍ والا جھوٹا اور گناہ گار ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: نہارُہ صائمٌ، لیلُہ قائمٌ یعنی وہ دن کو روزہ رکھنے والا اور رات کو قیام کرنے والا ہے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝

''پس وہ بلا لے اپنے ہم نشینوں کو (اپنی مدد کے لیے) ہم بھی جہنم کے فرشتوں کو بلائیں گے''۔

یعنی وہ اپنے ہم مجلس اور قبیلہ والوں کو بلا کر ان سے مدد لے ہم بھی سخت مضبوط فرشتوں کو بلالیں گے؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا واحد زبنیۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اصل میں یہ زبانی تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ اسم جمع ہے جس طرح ابابیل اور عبادید اسم جمع ہے۔ قتادہ نے کہا: کلام عرب میں اس کا معنی سپاہی ہے یہ زبن سے ماخوذ ہے جس کا معنی دھکیلنا ہے۔ اسی سے خرید و فروخت میں ایک قسم مزابنہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انہیں زبانیہ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اپنے پاؤں سے اسی طرح عمل کریں گے جس طرح وہ اپنے ہاتھوں سے عمل کرتے ہیں۔ ابولیث سمرقندی نے یہ حکایت بیان کی ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی اور لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝ تک پہنچے تو ابوجہل نے کہا: میں اپنی قوم کو بلاؤں گا جو تیرے رب سے میرا دفاع کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ جس نے اس سے زبانیہ کا ذکر سنا تو ڈر کر واپس لوٹ گیا اسے کہا تھا: تو اس سے ڈر گیا، اس نے کہا: نہیں بلکہ میں نے اس کے پاس شہسوار دیکھا جو زبانیہ کے ساتھ مجھے دھمکا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا زبانیہ کیا ہے وہ شہسوار میری طرف جھکا تو مجھے ڈر ہوا کہ وہ مجھے کھا ہی نہ جائے۔ احادیث میں ہے: زبانیہ کے سر آسمان میں اور ان کے پاؤں زمین میں ہوں گے وہ کفار کو جہنم میں دھکیل دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ ازروئے جسامت کے فرشتوں سے بڑے ہوں گے اور ازروئے پکڑ کے ان سے زیادہ سخت ہوں گے عرب یہ نام اسے دیا کرتے تھے جو ازروئے پکڑ کے شدید ہوتا تھا۔ شاعر نے کہا:

زَبَانِيَةٌ غُلْبٌ عِظَامٌ حلومُها

وہ موٹی گردنوں والے ہیں عظیم عقل والے ہیں۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابوجہل نے کہا: اگر میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میں اس کی گردن روند دوں گا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر وہ ایسا کرتا تو فرشتے اسے

آنکھوں کے سامنے پکڑ لیتے'' (1)۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابو جہل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا جب کہ آپ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے تجھے ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سخت رویہ اپنایا۔ ابو جہل نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مجھے کس چیز کی دھمکی دیتا ہے اللہ کی قسم میں اس وادی میں سب سے زیادہ حمایتیوں والا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا: فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کی قسم! اگر وہ اپنے حمایتیوں کو بلاتا تو عذاب کے داروغے اسے اسی وقت پکڑ لیتے (2)۔ امام ترمذی نے اس کی ہم معنی روایات نقل کی ہیں۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ کلام عرب میں نادی اس مجلس کو کہتے ہیں جس میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں یعنی جمع ہوتے ہیں مراد مجلس والے ہیں۔

جس طرح جریر نے کہا: لَهُمْ مَجلِسٌ صُهْبُ السِّبَالِ أَذِلَّةٌ یہاں مجلس سے مراد اہل مجلس ہیں۔ زہیر نے کہا: وفيهمْ مقاماتٌ حِسانٌ وُجُوهُهم۔ اس میں مقامات سے مراد اس جگہ میں کھڑے ہونے والے ہیں۔ ایک اور نے کہا: واستَبَّ بعدَكَ يا كُلَيْبُ المجلِسُ یہاں بھی مجلس سے مراد اہل مجلس ہے۔ اس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے جب تو اس کے پاس بیٹھے: ناديتُ الرجلَ أناديه۔

زہیر نے کہا: وجارُ البيتِ والرجلُ المنادِي یہاں بھی المنادی سے مراد مجلس میں بیٹھنے والا ہے۔

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝

''ہاں ہاں اس کی ایک نہ سنیے (اے حبیب!) سجدہ کیجئے اور (ہم سے اور) قریب ہو جائیے''۔

یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح ابو جہل گمان کرتا ہے ابو جہل تمہیں جو نماز ترک کرنے کے بارے میں کہتا ہے اس میں اس کی اطاعت نہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھیے اور طاعت و عبادت کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ معنی ہے جب تو سجدہ کرے تو دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیجئے۔ عطا نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أقرب ما يكون العبدُ من ربه وأحبه إليه جبهته في الأرض ساجداً لله (3) بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور اس کی بارگاہ میں سب سے محبوب ہوتا ہے جب اس کی پیشانی زمین میں ہو جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کر رہا ہو۔

ہمارے علماء نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ سجدہ کی حالت عبودیت اور ذلت کی انتہا ہے اللہ تعالیٰ کے لیے انتہا اور جس کی عزت ہے اس کے لیے اتنی عزت ہے جس کی کوئی مقدار نہیں۔ اے انسان! جب بھی تو اس کی اس صفت (اپنے آپ کو عزیز سمجھنا) سے دور ہوگا تو اس کی جنت کے قریب ہوگا اور اس کے گھر میں اس کے جوار رحمت کے قریب ہوگا۔ حدیث صحیح میں ہے

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ اقرا، حدیث نمبر 3271، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3272

3۔ مستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 690

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جہاں تک رکوع کا تعلق ہے اس میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو جہاں تک سجدے کا تعلق ہے تو دعا میں کوشش کرو کیونکہ وہ اس لائق ہے کہ وہ تمہارے حق میں قبول کی جائے''۔ جس نے یہ شعر کہا بہت اچھا کہا:

وإذا تذللتِ الرقاب تواضُعًا　منا إليك فعزُها في ذُلِّها

جب ہماری گردنیں تیری بارگاہ میں تواضع کرتے ہوئے جھک جائیں تو ان کی عزت ان کی عاجزی میں ہے۔

زید بن اسلم نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کیجئے۔ اے ابوجہل! تو آگ کے قریب ہو جا۔

وَ اسْجُدْ یہ سجود سے مشتق ہے۔ یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد نماز میں سجدہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سورت میں تلاوت کا سجدہ ہو۔ ابن عربی نے کہا: ظاہر یہ ہے اس سے مراد نماز کا سجدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ۝ كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۝ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ۝ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ۝۔(1)

اگر ایسا نہ ہوتا تو امام مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث سے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت نہ ہوتا انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ کے ساتھ دو سجدے کیے۔ یہ اس امر پر نص ہے کہ مراد سجدہ تلاوت ہے۔

ابن وہب، حماد بن زید سے وہ عاصم بن بہدلہ سے وہ زر بن حبیش سے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ لازمی سجدہ تلاوت چار ہیں۔ الم، حم تنزیل من الرحمن الرحیم، النجم اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ ابن عربی نے کہا: یہ اگر صحیح ہے تو اس پر سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ بھی لازم ہوگا اگرچہ وہ رکوع کے ساتھ ملا ہوا ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہوگا رکوع کے موقع پر رکوع کرو اور سجدہ کے موقع پر سجدہ کرو۔

ابن نافع اور مطرف نے کہا: امام مالک اس سورت کے اختتام پر خاص طور پر خود سجدہ کیا کرتے تھے۔ ابن وہب اس سجدہ کو بھی لازمی سجدہ خیال کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ہم حضرت مالک بن انس کی روایت نقل کر چکے ہیں جو ربیع بن ابی عبد الرحمن سے وہ نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے کہا: ''اے معاذ! اسے لکھو'' حضرت معاذ نے لوح، قلم اور دوات لی تو حضرت معاذ نے اسے لکھا جب وہ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ۝ پر پہنچے تو لوح نے سجدہ کیا، قلم نے سجدہ کیا اور دوات نے سجدہ کیا وہ کہہ رہے تھے: اے اللہ! اس کے ساتھ ذکر کو بلند کر، اے اللہ! اس کے ساتھ بوجھ اتار دے، اے اللہ! اس کے ذریعے گناہ بخش دے۔ حضرت معاذ نے کہا: میں نے سجدہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو حضور نے بھی سجدہ کیا۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1948

# سورۃ القدر

آیاتہا ۵ ۹۷ سورۃ القدر مکیۃ ۲۵ رکوعہا ۱

یہ اکثر مفسرین کے نزدیک مدنی ہے، یہ ثعلبی نے ذکر کیا۔ ماوردی نے اس کے برعکس ذکر کیا ہے۔ میں نے کہا: یہ ضحاک کے قول کے مطابق مدنی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ واقدی نے کہا: یہ وہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے شب قدر میں''۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر غائب سے مراد قرآن حکیم ہے اگرچہ اس صورت میں اس کا ذکر نہیں ہوا کیونکہ معنی معلوم ہے پورے کا پورا قرآن حکیم ایک سورت کی طرح ہے ارشاد فرمایا: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ:185) رمضان شریف کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ ارشاد فرمایا: حٰمٓ ۝ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان) حاء، میم کتاب مبین کی قسم! ہم نے اسے مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

شعبی نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے اس کے نازل کرنے کو لیلۃ القدر میں شروع کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بلکہ جبریل امین نے لیلۃ القدر میں ایک ہی بار اسے نازل کیا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بیت العزت کی طرف۔ حضرت جبریل امین نے اسے سفرہ پر املاء کرایا پھر جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرتے رہے۔ اس کے آغاز اور اختتام کے درمیان تئیس سال کا عرصہ تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: سورۂ بقرہ میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ قرآن حکیم رمضان شریف کے مہینہ میں، لیلۃ القدر میں، لیلۃ مبارکہ میں ایک ہی بار اللہ تعالیٰ کے پاس سے لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں سفرہ کراما کاتبین پر نازل ہوا۔ سفرہ کراما کاتبین نے حضرت جبریل امین پر بیس سالوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ جبریل امین بیس سالوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے لاتے رہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ سب باطل ہے، حضرت جبریل امین اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی جبریل امین اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی واسطہ ہے۔

مجاہد نے کہا: لَيْلَةِ الْقَدْرِ سے مراد حکم کی رات ہے، اس کا معنی تقدیر کی رات بھی ہے۔ اس رات کو لیلۃ القدر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات میں جو امر چاہتا ہے مقدر فرماتا ہے یعنی اگلے سال تک معاملات کی تقدیر فرماتا ہے، یعنی

موت، رزق وغیرہ۔ پھر اسے مدبرات امر کے سپرد کر دیتا ہے وہ چار فرشتے ہیں حضرت اسرافیل، حضرت میکائیل، حضرت عزرائیل اور حضرت جبریل علیہم السلام۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے: سال میں جو کچھ ہوتا ہے اسے ام الکتاب سے لکھ لیا جاتا ہے رزق، بارش، زندگی اور موت یہاں تک کہ جو لوگ حج کریں گے۔ عکرمہ نے کہا: لیلۃ القدر میں بیت اللہ شریف کا حج کرنے والے کا نام اور ان کے آباء کے نام لکھے جاتے ہیں ان میں سے کوئی رہتا نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی زائل ہوتا ہے؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ سورۃ الدخان کے آغاز میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو فیصلہ فرماتا ہے اور لیلۃ القدر کو ان کے متعلقہ افراد کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ رات بڑی عظمت، شان اور شرف والی ہے جس طرح ان کا قول ہے: لفلان قدر یعنی اس کا بڑا مقام و مرتبہ ہے؛ یہ زہری اور دوسرے علماء کی رائے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس رات میں طاعات کی عظیم قدر و منزلت ہوتی ہے اور عظیم ثواب ہوتا ہے۔

ابو بکر وراق نے کہا: اس رات کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ جس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی جب وہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو وہ قدر و منزلت والا ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں قدر و شان والی کتاب، عظمت و رفعت والے رسول اور شان والی امت پر نازل کی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں قدر و منزلت والے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں خیر، برکت اور مغفرت نازل ہوتی ہے۔ سہل نے کہا: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس رات میں مومنین کے حق میں رحمت کو مقدر کیا۔ خلیل نے کہا: کیونکہ اس رات زمین فرشتوں کی وجہ سے تنگ پڑ جاتی ہے (1) جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الطلاق: 7) جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا۔

**وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۞ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ۞**

''اور آپ کچھ جانتے ہیں کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے''۔

فراء نے کہا: قرآن حکیم میں جہاں بھی وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ کے الفاظ ہیں (2) اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا گیا ہے اور جہاں کہیں وما یدریك کے الفاظ ہیں اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ نہیں کیا گیا؛ یہی سفیان کا قول ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

لیلۃ القدر کی فضیلت کو بیان کیا، زمانہ کی فضیلت ان فضائل کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس میں واقع ہوتے ہیں اس رات میں اس خیر کثیر کی تقسیم کی جاتی ہے جس کی مثل ہزار مہینوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ واللہ اعلم

اکثر مفسرین نے کہا: اس ایک رات میں عمل ان ہزار مہینوں کے اعمال سے بہتر ہے جن میں لیلۃ القدر نہ ہو (3)۔ ابو

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 296-295　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 313　　3۔ ایضاً

العالیہ نے کہا: لیلۃ القدر ان ہزار مہینوں سے بہتر ہے جن میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہزار مہینوں سے مراد سارا زمانہ ہے کیونکہ عرب ہزار کا لفظ اشیاء کی انتہا کو بیان کرنے کے لیے ذکر کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ:96) یعنی وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زمانہ گزشتہ میں کوئی آدمی اس وقت تک عابد نہ کہلاتا جب تک وہ ہزار ماہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرتا۔ یہ تراسی سال اور چار ماہ کا عرصہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں سے بہتر بنا دی جس میں وہ لوگ عبادت کیا کرتے تھے۔

ابوبکر وراق نے کہا: حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت پانچ سو ماہ تھی اور ذوالقرنین کی حکومت پانچ سو مہینے تھی دونوں کی حکومت ایک ہزار مہینے ہوگئی اللہ تعالیٰ نے اس ایک رات کے عمل کو جو اس رات کو پائے ان دونوں کی حکومتوں سے بہتر بنا دیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر کیا جس نے ایک ہزار ماہ تک جہاد کیا تھا مسلمان اس پر متعجب ہوئے تو یہ آیات نازل ہوئیں (1) یعنی ایک رات ان ہزار مہینوں سے افضل ہے جن میں اس آدمی نے جہاد کیا تھا؛ اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

وہب بن منبہ نے کہا: وہ آدمی مسلمان تھا اس کی ماں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ نذر مانی تھی وہ ایسی بستی میں رہتا تھا جو بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے وہ ان کے قریب ہی رہتا اس نے اکیلے ہی جہاد کرنا شروع کر دیا وہ قتل کرتا، گرفتار کرتا اور جہاد کرتا وہ ان کے ساتھ اونٹ کے جبڑے سے جہاد کیا کرتا تھا جب وہ ان سے جنگ کرتا اور وہ اس کے ساتھ جنگ کرتے اور اسے پیاس لگتی تو دونوں جبڑوں کے درمیان سے میٹھا پانی نکلتا جسے وہ پی لیتا، اسے بطش کی قوت دی گئی تھی، اسے لوہا وغیرہ کوئی درد نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا نام شمسون تھا۔

کعب الاحبار نے کہا: وہ آدمی بنی اسرائیل کا ایک بادشاہ تھا اس نے کوئی اچھا کام کیا اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی کی طرف وحی کی: فلاں کو کہو وہ کوئی آرزو کرے۔ اس نے یہ عرض کی: اے میرے رب! میں آرزو کرتا ہوں کہ میں اپنے مال، اولاد اور جان کے ساتھ جہاد کروں، اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہزار بچے دیئے وہ اپنے مال کے ساتھ لشکر میں بچے کو تیار کرتا اور اسے مجاہد کے طور پر اللہ کی راہ میں بھیج دیتا وہ ایک ماہ تک اسی طرح رہتا وہ بچہ شہید ہو جاتا پھر وہ دوسرے کو لشکر میں تیار کرتا اس کا ہر بچہ ایک ماہ میں قتل ہو جاتا وہ بادشاہ اس کے ساتھ ساتھ رات کو عبادت کرتا اور دن کو روزے رکھا کرتا اس کے ہزار بچے ہزار ماہ میں شہید ہو گئے پھر وہ خود آگے بڑھا اس نے جہاد کیا اور شہید کر دیا گیا۔ لوگوں نے کہا: کوئی آدمی بھی اس بادشاہ کے مقام و مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔ یعنی یہ ایک رات اس بادشاہ کے ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس نے عبادت کرتے ہوئے، روزے رکھتے ہوئے نفس، مال اور اولاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے گزارے۔

حضرت علی شیر خدا اور حضرت عروہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے چار آدمیوں کا ذکر کیا فرمایا: ''انہوں نے اسی سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور آنکھ جھپکنے کے برابر اس کی نافرمانی نہ کی'' (2)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ایوب،

---

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 237

2۔ تفسیر درمنثور، جلد 6، صفحہ 629

حضرت زکریا، حضرت حزقیل بن عجوز اور حضرت یوشع بن نون کا ذکر کیا نبی کریم ﷺ کے صحابہ اس سے متعجب ہوئے۔ حضرت جبرئیل امین تشریف لائے عرض کی: اے محمد! ﷺ آپ ﷺ کی امت ان لوگوں کی اسی سال تک عبادت سے متعجب ہوئی جنہوں نے آنکھ جھپکنے کے برابر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اس سے بہتر چیز نازل فرمائی ہے پھر اس سورت کو پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ اس سے بہت خوش ہوئے۔

امام مالک نے موطا میں ابن قاسم اور دوسرے علماء سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا جس پر مجھے اعتماد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سابقہ امتوں کی عمریں دکھائی گئیں گویا آپ نے اپنی امت کی عمروں کو قلیل جانا اور یہ خیال کیا کہ یہ لوگ عمل کی اس سطح تک نہ پہنچ پائیں گے جہاں دوسری امتوں کے لوگ اپنی لمبی عمروں کی وجہ سے پہنچے تھے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لیلۃ القدر سے نوازا اور اسے ہزار مہینوں سے بہتر بنایا۔

ترمذی میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی امیہ کو آپ ﷺ کے منبر پر خواب میں دکھایا گیا تو یہ چیز آپ ﷺ کو بری لگی تو اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ (کوثر) کوثر سے مراد جنت میں نہر ہے اور یہ سورت نازل ہوئی (2) یعنی بنو امیہ آپ کے بعد ایک ہزار ماہ تک حاکم رہیں گے۔ قاسم بن فضل حدانی نے کہا: ہم نے ان کے دور حکومت کو شمار کیا تو وہ ایک ہزار مہینے تھا نہ ایک دن زائد اور نہ ایک دن کم۔ کہا یہ حدیث غریب ہے۔

## تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝

''اترتے ہیں فرشتے اور روح (القدس) اس میں اپنے رب کے حکم سے ہر امر (خیر) کے لیے''۔

یعنی فرشتے ہر آسمان سے، سدرۃ المنتہیٰ سے اور جبریل امین کے مسکن سے اس کے وسط پر اترتے ہیں پھر وہ زمین کی طرف اترتے ہیں اور فجر کے طلوع ہونے تک لوگوں کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ سے یہی مراد ہے۔ روح سے مراد جبریل امین ہے۔ قشیری نے بیان کیا ہے کہ روح ملائکہ کی ایک صنف ہے جنہیں باقی پر نگہبان بنایا گیا ہے ملائکہ انہیں نہیں دیکھ سکتے جس طرح ہم فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مقاتل نے کہا: یہ ملائکہ میں سے معزز ترین اور اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ملائکہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے لشکر ہیں۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کی ہے۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا اور قشیری نے حکایت بیان کی ہے کہ یہ قول کیا گیا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک صنف ہے جو کھانا کھاتے ہیں، ان کے ہاتھ اور پاؤں ہوتے ہیں وہ ملائکہ نہیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: روح ایک عظیم مخلوق ہے وہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے اور ملائکہ تمام ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے روح سے مراد رحمت ہے جبریل امین اس رات فرشتوں کے ساتھ اس کے مستحق افراد پر اترتے ہیں (4) اس کی دلیل يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (النحل: 2) یہاں روح سے مراد رحمت ہے۔

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصیام، لیلۃ القدر، صفحہ 260
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، لیلۃ القدر، جلد 2، صفحہ 171
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 313
4۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 314

فِيهَا میں ضمیر سے مراد لیلۃ القدر ہے اذن سے مراد امر ہے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سے مراد بکل امر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اگلے سال تک کے لیے جو امر مقدر کیا اور فیصلہ کیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (الرعد: 11) یہاں بھی مِنْ باء کے معنی میں ہے۔ عام قراءت تتنزل ہے مگر بزی نے تاء کو مشدد قرار دیا ہے۔ طلحہ بن مصرف اور ابن سمیقع نے فعل مجہول کی بنا پر تاء پر ضمہ پڑھا ہے۔ حضرت علی شیر خدا، عکرمہ اور کلبی نے اسے من کل امرئ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس کا معنی ہے ہر فرشتہ (1)۔ کلبی نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت جبریل امین فرشتوں کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور ہر مسلمان کو سلام پیش کرتے ہیں۔ یہاں من، علی کے معنی میں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا كان ليلةُ القدرِ نزَلَ جبريلُ في كبكبةٍ من الملائكةِ يُصلّون و يسلِمُون على كلِّ عبدٍ قائمٍ أو قاعدٍ يذكرُ الله تعالىٰ (2) جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبریل امین ملائکہ کی ایک جماعت میں اترتے ہیں وہ ہر اس بندے پر درود و سلام پیش کرتے ہیں جو کھڑے یا بیٹھے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوتا ہے۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

”یہ سراسر (امن و) سلامتی ہے یہ رہتی ہے طلوع فجر تک“۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلام کی تکمیل سلام پر ہوتی ہے؛ یہ نافع اور دوسرے علماء سے مروی ہے یعنی لیلۃ القدر سراپا سلامت اور خیر ہے اس میں کوئی شر نہیں۔ مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے مراد طلوع فجر ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اس رات میں سلامتی ہی مقدر فرماتا ہے باقی راتوں میں آزمائش اور سلامتی دونوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ اس سے سلامت ہے کہ اس رات میں کوئی شیطان مومن مرد یا مومن عورت میں موثر ہو سکے؛ مجاہد نے بھی اس طرح کہا ہے: یہ سلامتی والی رات ہے شیطان اس میں طاقت نہیں رکھتا کہ اس میں کوئی برا عمل کرے (3)۔ ایک مرفوع روایت بھی اس بارے میں ہے۔ امام شعبی نے کہا: اس سے مراد ہے کہ فرشتے اہل مساجد کو سلام پیش کرتے ہیں یہ سلسلہ سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر صادق کے طلوع ہونے تک رہتا ہے وہ جس مومن کے پاس سے گزرتے ہیں وہ کہتے ہیں: السلام علیك اے مومن! ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے فرشتے ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: سلام هی کا معنی خیر ہی خیر ہے (4)۔ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ کسائی اور ابن محیصن نے اسے مطلع پڑھا ہے مصدر میں لام کا فتحہ اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں۔ فعل، یفعل میں فتحہ اصل ہے جس طرح مقتل، مخرج۔ ایسے ابواب میں کسرہ شاذ ہے، جس طرح مشرق، مغرب، جنت، منسک، محشر، مسقط اور مجزر۔ ان سب میں فتحہ اور کسرہ دونوں حکایت کیے گئے ہیں اور شرط یہ ہے کہ اس سے مراد مصدر ہو نہ کہ اسم۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 314

2۔ مشکوٰۃ المصابیح، لیلۃ القدر، صفحہ 182

3۔ ماوردی، جلد 6، صفحہ 314

4۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 300

یہاں تین مسائل ہیں:

## لیلۃ القدر کون سی رات ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ لیلۃ القدر کی تعیین میں اختلاف ہے، جس کے بارے میں اکثر علماء کی رائے ہے: وہ ستائیسویں کی رات ہے کیونکہ حضرت ذر بن حبیش کا نقطہ نظر ہے کہ میں نے حضرت ابی بن کعب سے کہا: آپ کے بھائی حضرت ابن مسعود کہتے ہیں جو پورا سال قیام کرتا ہے وہ لیلۃ القدر کو پالیتا ہے(1)۔ تو حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمن کو بخشے تحقیق وہ جانتا ہے کہ یہ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے اور وہ ستائیسویں رات ہوتی ہے لیکن انہوں نے ارادہ کیا کہ لوگ بھروسہ ہی نہ کرلیں۔ پھر انہوں نے بغیر استثناء کے قسم اٹھائی وہ ستائیسویں کی رات ہے میں نے پوچھا: اے ابا منذر! آپ کس وجہ سے یہ بات کرتے ہیں؟ جواب دیا: اس نشانی کی وجہ سے جس کی خبر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی یا اس علامت کی وجہ سے کہ اس روز سورج بغیر شعاع کے طلوع ہوگا۔ یہ رات سارے سال کی بجائے رمضان شریف کے مہینے میں ہوتی ہے: یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے علماء کی رائے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ سال کی تمام راتوں میں ہوتی ہے۔ جس نے اپنی بیوی کی طلاق یا اپنے غلام کی آزادی کو لیلۃ القدر کے ساتھ مشروط کیا تو اسے طلاق یا آزادی واقع نہ ہوگی مگر جب اس دن سے ایک سال گزر جائے گا کیونکہ شک کی بنا پر طلاق واقع نہیں کی جائے گی۔ اور اس کا اختصاص کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں اور طلاق سال کے گزرے بغیر واقع ہونا مناسب نہیں، اس طرح آزادی قسم وغیرہ ہیں۔

حضرت ابن مسعود نے کہا: جو سارا سال قیام کرے تو وہ اسے پالے گا یہ چیز حضرت ابن عمر کو پہنچی تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمن پر رحم فرمائے خبردار! وہ خوب جانتا ہے کہ یہ رات رمضان شریف کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے لیکن انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ لوگ اس ایک رات پر بھروسہ نہ کریں۔ امام ابوحنیفہ اس قول کی طرف گئے ہیں: یہ سال بھر میں ایک رات ہوتی ہے۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ لیلۃ القدر اٹھالی گئی یہ صرف ایک موقع ہے جب کہ صحیح یہ ہے کہ یہ باقی ہے۔

حضرت ابن مسعود سے یہ قول بھی مروی ہے کہ جب وہ سال کے ایک دن میں ہوتی ہے تو اگلے سال وہ کسی اور دن میں ہوگی۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر ہے کہ وہ ہر سال رمضان میں ہوتی ہے۔ پھر یہ قول کیا گیا کہ ہر مہینے کی پہلی رات ہوتی ہے؛ یہ ابو رزین عقیلی کا قول ہے۔ حسن بصری، ابن اسحاق اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: یہ رمضان شریف کی سترہویں رات ہوتی ہے یہ وہی رات ہے جس کے اگلے روز غزوۂ بدر ہوا تھا گویا انہوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (الانفال: 41) یہ سترہویں رات تھی۔ ایک قول یہ کہا گیا: یہ انیسویں کی رات ہے صحیح و مشہور یہ ہے کہ رمضان شریف کے آخری عشرہ کی رات تھی؛ یہ امام مالک، امام شافعی، اوزاعی، ابوذر اور امام احمد کا نقطہ نظر ہے۔

ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: یہ اکیسویں کی رات ہے۔ امام شافعی کا جھکاؤ اسی طرف ہے اس کی دلیل مٹی اور پانی والی روایت

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، لیلۃ القدر، جلد 2، صفحہ 171۔ ایضاً، حدیث نمبر 3274، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے یہ روایت حضرت ابوسعید خدری نے روایت کی؛ اسے امام مالک اور دوسرے علماء نے نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ تیسویں کی رات ہے جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے روایت کیا کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے لیلۃ القدر دیکھی جب کہ رمضان کے سات دن باقی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں دیکھتا ہوں تمہاری خوابیں تیئسویں پر متفق ہوگئی ہیں جو آدمی مہینے کے کسی رات قیام کرنا چاہے تو وہ تیئسویں کی رات قیام کرے''۔ معمر نے کہا: حضرت ایوب تیئسویں کی رات غسل کیا کرتے تھے اور خوشبو لگاتے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے دیکھا کہ اس کی صبح پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں'' (1)۔ عبداللہ بن انیس نے کہا: میں نے آپ کو تیئسویں کی رات کی صبح میں پانی اور مٹی میں دیکھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پچیسویں کی رات ہے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے آخری راتوں میں تلاش کرو جب نو دن باقی ہوں، سات دن باقی ہوں اور پانچ دن باقی ہوں'' (2)۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے کہا: نو سے مراد اکیسویں کی رات ہے، سات سے مراد تیئسویں کی رات ہے اور پانچ سے مراد پچیسویں کی رات ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ستائیسویں کی رات ہے اس کی دلیل گزر چکی ہے؛ یہ حضرت علی شیر خدا، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ اور حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آدمی لیلۃ القدر کی تلاش میں ہے تو وہ اسے ستائیسویں کی رات میں تلاش کرے'' (3)۔ ابوبکر وراق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کی راتوں کو اس سورت کے کلمات پر تقسیم کر دیا ہے جب ستائیسویں کلمہ تک پہنچا تو فرمایا: ھی۔ دوسری دلیل یہ ہے لیلۃ القدر کے لفظ کو مکرر ذکر کیا اسے تین دفعہ ذکر کیا ہے یہ نو حرف ہیں تو مجموعی ستائیس ہو جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ انتیسویں کی رات ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''لیلۃ القدر انتیسویں یا ستائیسویں کی رات ہے اس رات میں فرشتے کنکریوں کی مقدار میں ہوتے ہیں''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جفت راتوں میں ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: میں بیس سال تک چوبیسویں رات کے سورج کو تاڑتا رہا تو میں نے اسے دیکھا کہ وہ سفید طلوع ہوتا ہے، اس کی کوئی شعاع نہیں ہوتی کیونکہ اس رات بہت زیادہ انوار ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پورے سال میں مستور ہوتی ہے تاکہ انسان تمام سال راتوں کو زندہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اسے رمضان شریف کے تمام مہینے میں مخفی رکھا تاکہ وہ رمضان شریف کی راتوں میں عمل اور عبادت میں کوشاں رہیں تاکہ اسے پالیں جس طرح نمازوں میں سے درمیانی نماز کو، اسماء حسنیٰ میں سے اسم اعظم کو، جمعہ کی ساعتوں میں سے قبولیت کی گھڑی کو، نافرمانیوں میں غضب کو، طاعات میں رضا کو، اوقات میں قیام قیامت کو، بندوں میں سے صالح

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، لیلۃ القدر والحث علی طلبہا، جلد 1، صفحہ 370

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصیام، لیلۃ القدر، جلد 1، صفحہ 271۔

سنن ابی داؤد، کتاب الدعوات، باب فی من قال لیلۃ احدی وعشرین، حدیث نمبر 1175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عمر، جلد 2، صفحہ 27

بندوں کو اور اپنی رحمت و حکمت کو مخفی رکھا۔

## لیلۃ القدر کی علامات

**مسئلہ نمبر 2**۔ اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے سورج اس کی صبح سفید طلوع ہوتا ہے اس کی کوئی شعاع نہیں ہوتی۔ حضرت حسن بصری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا: إنّ من أماراتها أنها ليلةٌ سمحةٌ بلجة لا حارة ولا باردة تطلع الشمس صبيحتها ليس لها شعاع اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ رات نہ گرم اور نہ ٹھنڈی اس کی صبح سورج طلوع ہوتا ہے جس کی شعاع نہیں ہوتی۔ عبید بن عمیر نے کہا: میں ستائیسویں رات کو سمندر میں تھا میں نے اس کا پانی لیا تو میں نے اسے میٹھا خوشگوار پایا۔

## شب قدر کے فضائل

**مسئلہ نمبر 3**۔ اس کے فضائل۔ تیرے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا کافی ہے۔

صحیحین میں ہے: من قامَ ليلةَ القدرِ إيمانًا واحتسابًا غَفَرَ الله له ما تقدَّمَ من ذَنْبِه (1) جس نے لیلۃ القدر کو ایمان کی حالت اور ثواب کے ارادہ سے عبادت کی اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ گناہ بخش دیتا ہے؛ اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو وہ فرشتے نازل ہوتے ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ کے مکین ہوتے ہیں ان میں حضرت جبریل امین ہوتے ہیں ان کے ساتھ جھنڈے ہوتے ہیں ان میں سے ایک جھنڈا میری قبر پر، ایک جھنڈا بیت المقدس پر، ایک جھنڈا مسجد حرام پر، ایک جھنڈا طور سینا پر لگا دیا جاتا ہے وہ کسی مومن مرد اور عورت کو نہیں چھوڑتے مگر وہ اسے سلام کرتے ہیں مگر جو ہمیشہ شراب نوشی کرتا ہے، خنزیر کھاتا ہے اور زعفران میں لتھڑا رہتا ہے“۔

حدیث طیبہ میں ہے: ”شیطان اس رات میں نہیں نکلتا یہاں تک کہ اس کی فجر روشن ہو جاتی ہے، وہ طاقت نہیں رکھتا کہ کسی کو فتنہ میں اور فساد میں ڈالے اور اس میں کسی جادوگر کا جادو اثر نہیں کرتا“۔

امام شعبی نے کہا: اس کی رات اس کے دن کی طرح ہے اس کا دن اس کی رات کی طرح ہے۔ فراء نے کہا: اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر میں سعادت اور نعمتوں کو مقدر کرتا ہے اور باقی راتوں میں آزمائشوں اور مصائب کو مقدر کرتا ہے۔ ضحاک کا اس بارے میں قول پہلے گزر چکا ہے۔ اس قسم کی بات اپنی جانب سے نہیں کہی جاتی یہ مرفوع ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

سعید بن مسیب سے موطا میں قول منقول ہے: جس نے لیلۃ القدر کو عشاء کی نماز پڑھی تو اس نے اس رات میں حصہ لے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصیام، لیلۃ القدر، جلد 1، صفحہ 270

لیا۔ اس قسم کی چیز رائے سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

عبید اللہ بن عامر بن ربیعہ نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من صلّى صلاةَ المغربِ والعشاءِ الآخرِ من ليلة القدرِ في جماعةٍ فقد أخذ بحظِهِ من ليلةِ القدرِ جس نے لیلۃ القدر کو مغرب اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو اس نے لیلۃ القدر کا بڑا حصہ لے لیا۔ ثعلبی نے اسے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر میں لیلۃ القدر کو پالوں تو میں کیا دعا کروں۔ فرمایا: تو کہہ اللّٰھمّ إنّك عفوٌ تُحِبُّ العفوَ فاعفُ عَنِّي (1) اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے معاف کرنے کو پسند کرتا ہے مجھے معاف کر دے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، الدعاء بالعفو والعافیۃ، صفحہ 282

جامع ترمذی، باب ما جاء فی عقد التسبیح، حدیث نمبر 3435، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۂ لم یکن

آیاتہا ۸ ۹۸ سورۃ البینۃ مدنیۃ ۱۰۰ رکوعہا ۱

یحییٰ بن سلام کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور کی رائے کے مطابق یہ سورت مدنی ہے۔ اس کی نو آیات ہیں (2)۔ اس کی فضیلت میں ایک ایسی روایت ملی ہے جو صحیح نہیں ہم نے اسے محمد بن عبداللہ حضرمی سے روایت کیا ہے کہ مجھے ابوعبدالرحمن بن نمیر نے کہا: ابی الہیثم خشاب کی طرف جاؤ اس سے وہ روایت لکھو کیونکہ اس نے روایت لکھی ہوئی ہے وہ اس کی طرف گئے تو انہوں نے کہا ہمیں مالک بن انس نے یحییٰ بن سعید سے وہ سعید بن مسیب سے وہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر لوگ جانتے ہوتے کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ میں کیا ہے تو وہ اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دیتے اور اس کی تعلیم حاصل کرتے بنوخزاعہ کے ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس میں کیا وجہ ہے؟ فرمایا: اسے کبھی بھی منافق نہیں پڑھے گا اور نہ ہی کوئی ایسا بندہ پڑھے گا جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہو۔ اللہ کی قسم! ملائکہ مقربین اسے لگاتار پڑھ رہے ہیں جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس کی قراءت میں وقفہ نہیں کرتے اور کوئی بندہ اسے نہیں پڑھتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتے بھیج دیتا ہے جو اس کے دین و دنیا کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کرتے ہیں''۔ حضرمی نے کہا: میں ابوعبدالرحمن بن نمیر کے پاس آیا میں نے یہ روایت اس پر پیش کی تو انہوں نے کہا: اس کی مشقت ہمارے لیے کافی ہے دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹنا۔

اسحاق بن بشرہ کاہلی نے مالک بن انس سے وہ یحییٰ بن سعید سے وہ ابن مسیب سے وہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: اگر لوگ اسے جانتے جو لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں ہے تو وہ اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دیتے اور اسے سیکھتے۔ روایت باطل ہے صحیح روایت وہ ہے (3) جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سورت پڑھ کر سناؤں'' حضرت ابی بن کعب نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میرا نام لیا؟ فرمایا: ہاں، تو حضرت ابی رونے لگے۔

میں کہتا ہوں: اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے اس میں یہ تعبیر ہے من الفقہ قراءۃ العالم علی المتعلم۔ بعض نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب کو سورت سنائی تاکہ لوگوں کو تواضع کی تعلیم دیں تاکہ کوئی بھی اپنے سے کم مرتبہ سے سیکھنے اور اس پر پڑھنے کو ناپسند نہ کرے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 301
2۔ ہمارے صحیفے میں آٹھ آیات ہیں۔
3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ المنفکون، جلد 2، صفحہ 741

ایک قول یہ کیا گیا: حضرت ابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت جلد اخذ کیا کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنانے کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ حضرت ابی آپ کے الفاظ لے اور جیسے سنا اسے پڑھے اور دوسروں کو سکھائے، اس میں حضرت ابی کے لیے بہت بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ حضرت ابی کو قرآن سنائے۔

ابو بکر انباری نے کہا ہمیں احمد بن ہیثم بن خالد نے علی بن جعد سے وہ عکرمہ سے وہ عاصم سے وہ زر بن حبیش سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ابن ابی کی قراءت میں یہ چیز بھی موجود ہے: انسان کو اگر ایک مال کی ایک وادی دی جائے تو وہ دوسری وادی کی تلاش کرتا ہے اگر اسے مال کی دو وادیاں دی جائیں تو وہ تیسری کی تلاش کرتا ہے انسان کے پیٹ کو مٹی ہی بھر سکتی ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے کرم فرماتا ہے۔ عکرمہ نے کہا: عاصم نے مجھے اس سورت کی تیس آیات سنائیں یہ بھی ان میں سے تھیں۔

ابو بکر نے کہا: یہ اہل علم کے نزدیک باطل ہے، کیونکہ ابن کثیر اور ابو عمرو کی قرائتیں حضرت ابی بن کعب کے ساتھ متصل ہیں دونوں کی قراءت میں یہ چیز سورۂ لَمْ يَكُنِ میں موجود نہیں، حدیث طیبہ میں یہ معروف ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے رب العالمین کی جانب سے قرآن میں اس کی حکایت نہیں بیان کرتے تھے۔ یہ دونوں اکٹھے جب اسے بیان کریں تو یہ اجماع ہے۔ یہ قراءت اس سے زیادہ مضبوط ہے جسے ایک آدمی بیان کرتا ہے جو جماعت کے مذہب کے خلاف ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾

''جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین (کفر سے) الگ ہونے والے نہ تھے جب تک کہ نہ آئے ان کے پاس ایک روشن دلیل (یعنی) ایک رسول کی طرف سے جو انہیں پڑھ کر سنائے پاک صحیفے جن میں لکھی ہوں سچی اور درست باتیں''۔

عام قراءت یہی ہے اور مصحف کا خط بھی ایسا ہی ہے۔ حضرت ابن مسعود اسے لم یکن المشرکون واھل الکتاب پڑھتے یہ قراءت تفسیر کے طریقہ پر ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ بیان وضاحت کے انداز میں تو جائز ہے لیکن تلاوت میں جائز نہیں (1)۔ صحیح روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فطلقوھنَّ لِقُبُلِ عدَّتِھن قراءت ثابت ہے مگر یہ بھی تفسیر کے طور پر ہے کیونکہ تلاوت وہ ہے جو مصحف کے خط میں ہے۔

اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں الْمُشْرِكِيْنَ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف اہل کتاب پر ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد وہ یہودی ہیں جو یثرب میں تھے وہ بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع تھے۔ مشرکین سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1969

مراد جو مکہ مکرمہ اور اس کے اردگرد رہتے تھے اور مدینہ طیبہ اور اس کے اردگرد رہتے تھے یہ مشرکین مکہ تھے۔
وہ کفر کو چھوڑنے والے اور اس سے اعراض کرنے والے نہ تھے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: انتہا سے مراد انتہا تک پہنچنا ہے یعنی وہ اپنی عمروں کی انتہا تک پہنچنے والے نہیں اور مرنے والے نہیں یہاں تک کہ ان کے پاس بینہ پہنچ جائے۔ اس تعبیر کی بنا پر انفکاک، انتہا کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مُنْفَكِّيْنَ سے مراد زائل ہونے والے ہیں یعنی ان کی مدت ختم ہونے والی نہیں یہاں تک کہ رسول ان کے پاس آ جائیں۔
عرب کہتے ہیں: ما انفككتُ أفعل كذا یعنی میں لگا تار ایسا کرتا رہا۔ وما انفك فلان قائمًا وہ لگا تار کھڑا رہا۔ فک کا اصل معنی کھولنا ہے اس معنی میں فك الكتاب (کتاب کھولنا) فك الخلخال (پازیب کھولنا) اور فك السالم ہے طرفہ نے کہا:

فآليتُ لا ينفكُ كَشْحِي بِطَانَةً لِعَضْبٍ رقيق الشَّفْرَتَيْنِ مُهَنَّدِ

میں نے قسم اٹھائی میرا پہلو اس کاٹ دار تلوار کا بطانہ رہے گا جس کی دھار بڑی باریک ہے اسے ہند میں بنایا گیا۔
ذو رمہ نے کہا:

حَرَاجِيجُ مَاتَنْفَكُّ إِلَّا مُنَاخَةً عَلى الخَسْفِ أَوْنَرْمِي بِهَا بَلَدًا قفرا

وہ لمبی پتلی کمر والی اونٹنیاں ہیں انہیں ہمیشہ بغیر چارہ کے بٹھایا جاتا ہے یا ہم انہیں چٹیل شہروں میں لے جاتے ہیں۔
اس سے اس نے یہ ارادہ کیا ہے وہ ہمیشہ بٹھائی جاتی ہیں الا کا لفظ شعر میں زائد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مُنْفَكِّيْنَ بارحین کے معنی میں ہے یعنی وہ اس طرح رہیں گے کہ وہ دنیا نہیں چھوڑیں گے یہاں تک کہ ان پر بینہ آ جائے۔ ابن کیسان نے کہا: اہل کتاب اپنی کتابوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کو چھوڑنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ آپ کو مبعوث کیا گیا۔ جب آپ کو مبعوث کیا گیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کیا اور اس سے انکار کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ:89) جب آپ ان کے پاس تشریف لے آئے تو انہوں نے پہچانا، آپ کا انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا: وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (البینۃ:4) اہل کتاب نے تفرقہ نہ کیا۔ اس تاویل پر یہ ارشاد بھی ہے: وَالْمُشْرِكِيْنَ یعنی یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نازیبا باتیں نہیں کرتے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر دیا گیا ہے کیونکہ پہلے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امین کہتے تھے یہاں تک کہ آپ کی زبان پر بینہ آ گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی طرف مبعوث کیا گیا تو اس وقت انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی۔
ایک لغوی نے کہا: مُنْفَكِّيْنَ کا معنی ہلاک ہونے والے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: انفك صلا المرأة عند الولادة یعنی وہ جدا ہو جائے اور آپس میں نہ ملے تو وہ ہلاک ہو جائے۔ معنی یہ ہے انہیں عذاب نہ دیا گیا اور وہ ہلاک نہ ہوئے مگر اس وقت جب رسولوں کو بھیجا گیا اور کتابیں نازل کر کے حجت تمام کر دی گئی تو وہ اس وقت ہلاک ہوئے۔
کچھ لوگوں نے مشرکین کے بارے میں یہ کہا: اس سے مراد اہل کتاب ہیں کیونکہ یہودیوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا عزیر بن اللہ اور نصاریٰ میں سے کچھ نے کہا: عيسىٰ هو الله کچھ نے کہا: هو ابن الله ان میں سے کچھ نے کہا: ثالث ثلاثة، نعوذ باللہ۔

ایک قول یہ کیا گیا: اہل کتاب مومن تھے پھر انہوں نے اپنے انبیاء کا انکار کیا مشرک فطرت سلیمہ پر پیدا کیے گئے جب بالغ ہوئے تو انہوں نے انکار کیا؛ اسی وجہ سے فرمایا: وَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشرکون یہ اہل کتاب کی بھی صفت ہے کیونکہ انہوں نے بھی اپنی کتاب سے فائدہ نہیں اٹھایا اور توحید کو ترک کیا نصاری تثلیث کے قائل ہیں، عام یہودی تشبیہ کے قائل ہیں جب کہ یہ سب شرک ہے یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: جاءنی العقلاء و الظرفاء جب کہ تو ان اقوام کی ذاتوں کا ارادہ کرتا ہے اور تو ان کی صفت دو امور سے لگاتا ہے۔ معنی یہ ہوگا اہل کتاب مشرکوں میں سے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں کفر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر ہے معنی یہ بنے گا یہود و نصاری (جو اہل کتاب تھے) میں سے جنہوں نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ چھوڑنے والے نہیں اور مشرک جو عربوں اور غیر عربوں (جو اہل کتاب میں سے نہیں) وہ چھوڑنے والے نہیں۔ قشیری نے کہا: اس میں بعد ہے کیونکہ اس کا ظاہر معنی یہ بنتا ہے حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کیونکہ یہی رسول یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو یہ کہنا بہت ہی بعید بات ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا وہ چھوڑنے والے نہیں یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آگئے۔ مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے اس کلام سے یہ ارادہ کیا جنہوں نے اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا اگرچہ وہ اس سے قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم بجالانے والے تھے اس کفر سے رکنے والے تھے یہاں تک اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف مبعوث کرے، ان کے لیے آیات کو بیان کرے تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے۔

اعمش اور ابراہیم نے المشرکون کو مرفوع پڑھا ہے اس کا عطف الذین پر ہے جب کہ پہلی قراءت واضح ہے کیونکہ رفع پڑھا جائے تو اس میں دو قسمیں بنتی ہیں گویا وہ دونوں اہل کتاب کے علاوہ ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ کا معنی ہے حتی اتتھم یعنی ان کے پاس آ گئی الْبَيِّنَةُ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو بھیجا گیا، زجاج نے کہا: رَسُوْلٌ یہ الْبَيِّنَةُ سے بدل ہے۔ فراء نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہیں کیونکہ الْبَيِّنَةُ کا لفظ کبھی مذکر کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے تو یہ جملہ کہا جاتا ہے: بَيِّنَتِي فلان حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود کی قراءت میں رسولا منصوب ہے۔ یتلو یعنی وہ پڑھتا ہے اس کا باب یوں چلتا ہے تَلَا يَتْلُوْ تِلَاوَةً، صحفا یہ صحیفہ کی جمع ہے صحیفہ اسے کہتے ہیں جس میں لکھا جاتا ہے۔

مُّطَهَّرَةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ صحیفے جھوٹ، شک، نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ قتادہ نے کہا: باطل سے پاک ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جھوٹ، شبہات اور کفر سے پاک ہیں۔ سب کا معنی ایک ہی ہے۔ صحیفے مکتوب میں سے جسے اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں اسے وہ پڑھتے ہیں اس معنی پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے وہ اسے زبانی پڑھا کرتے تھے کتاب سے نہیں پڑھا کرتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے تھے اور نہ پڑھا کرتے تھے۔ مُّطَهَّرَةً یہ صحف کی صفت ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝

(العبس) معزز صحیفوں میں جو ذیشان ہیں پاکیزہ ہیں۔ مُّطَهَّرَةً یہ ظاہراً صحف کی صفت ہے اور یہ قرآن کی بھی صفت ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مناسب یہی ہے کہ اسے پاک لوگ ہی مس کریں، جس طرح سورۃ الواقعہ میں فرمایا جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے مراد وہ صحیفے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ام الکتاب میں ہیں۔ اسی میں سے ان چیزوں کو لکھا گیا جو انبیاء پر کتابیں وحی کی گئیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾ (البروج) بلکہ وہ قرآن مجید ہے لوح محفوظ میں ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: پاکیزہ صحیفے آسمان میں ہیں (1)۔ قَيِّمَةٌ کا معنی سیدھی، درست اور محکم ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: قَامَ يَقُوْمُ جب وہ سیدھا اور صحیح ہو جائے۔ بعض علماء نے کہا: صحیفے ہی کتابیں ہیں تو پھر یہ کس طرح فرمایا: صحیفوں میں جن میں کتابیں ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے: یہاں کتب سے مراد احکام ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ (المجادلۃ: 21) اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ میں ضرور غالب آؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تمہارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا''۔ پھر رجم کا فیصلہ کیا جب کہ رجم کا ذکر کتاب اللہ میں موجود نہیں۔ اس کا معنی ہے میں تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ شاعر نے کہا:

وما ذاك قال اللهُ إذ هو يَكْتُبُ

یہاں بھی یکتب فیصلہ کرنے کے معنی میں ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: كُتُبٌ قَيِّمَةٌ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ اسے کُتُب کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ بیان کی بہت سی انواع پر مشتمل ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿٤﴾

''اور نہیں بٹے فرقوں میں اہل کتاب مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان کے پاس روشن دلیل''۔

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہودی و نصاریٰ ہیں اہل کتاب کے لیے تفریق کا خصوصاً ذکر کیا دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ وہ بھی کافروں کے ساتھ جمع ہیں الگ اس لیے ذکر کیا کیونکہ انہیں اپنے بارے میں گمان ہے کہ انہیں علم حاصل ہے۔ جب انہوں نے افتراق کیا ہے تو ان کا غیر جس کے پاس کتاب ہی نہیں وہ اس وصف میں زیادہ داخل ہوگا۔

الْبَيِّنَةُ سے مراد واضح دلیل ہے، اس سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے یعنی قرآن حکیم نعت ہونے کے وصف میں ان کتابوں کے موافق ہے جو کتابیں ان کے پاس ہیں اس کی وجہ یہ ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت پر متفق تھے جب آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے کچھ سرکشی و حسد کی وجہ سے کافر ہو گئے اور کچھ ایمان لے آئے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَ مَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: 14) وہ فرقوں میں نہ بٹے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا انہوں نے یہ باہم حسد کی وجہ سے کیا۔

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 308

ایک قول یہ کیا گیا: اَلْبَیِّنَةُ سے مراد وہ بیان ہے جو ان کی کتابوں میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نبی مرسل ہیں۔ علماء نے کہا: سورت کے آغاز سے قَیِّمَةٌ تک ان لوگوں کے بارے میں حکم ہے جو اہل کتاب اور مشرکین میں سے ایمان لائے اور مَا تَفَرَّقَ اس میں ان اہل کتاب کے بارے میں حکم ہے جو دلائل کے قائم ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائے۔

وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ ؕ۝۵

''حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر اور قائم کرتے رہیں نماز اور ادا کرتے رہیں زکوٰۃ اور یہی نہایت سچا دین ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## تورات وانجیل میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان

**مسئلہ نمبر 1**۔ ان کفار کو تورات اور انجیل میں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار کریں۔ لِیَعْبُدُ میں لام، اَنْ کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ (النساء:26) یہاں بھی لام، اَنْ کے معنی میں ہے۔ اس طرح ان آیات میں بھی لام، اَنْ کے معنی میں ہے: یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ (الصف:8) اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام) حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں الّا أن یعبدوا اللہ ہے۔

الدِّیْنَ سے مراد عبادت ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ (الزمر) اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ عبادات میں نیت ضروری ہے کیونکہ اخلاص دل کا عمل ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کو طلب کیا جاتا ہے۔

## حنیف کا معنی ومفہوم

**مسئلہ نمبر 2**۔ حُنَفَآءَ سے مراد ہے تمام دوسرے دینوں کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل ہونے والے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: حُنَفَآءَ سے مراد ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حنیف سے مراد ہے جو ختنہ کرائے اور حج کرے؛ یہی سعید بن جبیر کا قول ہے اہل لغت کہتے ہیں: تحنف إلی الإسلامِ کا معنی ہے وہ اسلام کی طرف مائل ہو گیا۔

## الْقَیِّمَةِ کا معنی ومفہوم

**مسئلہ نمبر 3**۔ وہ نماز کو اس کے اوقات میں، اس کی حدود کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ کو اس کے محل میں دیتے ہیں۔ یہ دین جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے یہی دین مستقیم ہے۔ زجاج نے کہا: یہ **ملت مستقیمہ** کا دین ہے(1) **الْقَیِّمَةِ** موصوف

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 302

محذوف کی نعت ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے: یہ اس امت کا دین ہے جو حق کو قائم کرنے والی ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت میں ذلك الدین القیِّمُ ہے۔ خلیل نے کہا: القَيِّمَةِ، القیم کی جمع ہے۔ القَیِّم اور القائِم دونوں ایک ہیں۔ فراء نے کہا: دین کو الْقَیِّمَةِ کی طرف مضاف کیا جب کہ یہ اس کی صفت ہے کیونکہ الفاظ مختلف ہیں۔ ان سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ شئی کی اپنی ذات کی طرف اضافت سے متعلق ہے اس میں ھاء مدح اور مبالغہ کے لیے داخل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھاء ضمیر الملۃ اور الشریعۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ محمد بن اشعث طالقانی نے کہا: یہاں الْقَیِّمَةِ سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے اور دین اس کی طرف مضاف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ ۙ أُولَٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝

”بے شک کفر کیا جنہوں نے اہل کتاب سے (وہ) اور مشرکین آتش جہنم میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں۔ (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں“۔

الْمُشْرِكِينَ کا عطف الَّذِينَ اسم موصول پر ہے یا یہ مجرور ہے اور اس کا عطف أَهْلِ پر ہے۔

نافع اور ابن ذکوان نے دونوں مواقع پر البریۃ کو ہمزہ کے ساتھ اپنے اصل پر پڑھا ہے(1) یہ عربوں کے اس قول سے ہے: برأ الله الخلقَ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا، اللہ تعالیٰ کے لیے باری کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا معنی خالق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا (الحدید: 22) اسے پیدا کرنے سے قبل۔ جب کہ باقی نے ہمزہ کے بغیر اور یاء کو مشدد پڑھا ہے یہ یاء ہمزہ کے عوض میں ہے۔ فراء نے کہا: اگر بریہ کا لفظ بَرَی سے مشتق ہو جس کا معنی مٹی ہے تو اس کی اصل ہمزہ کے بغیر ہوگی۔ تو کہے گا: براہُ الله یَبْرُؤُہُ بَرْءًا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔

قشیری نے کہا: جس نے کہا بریہ، بری سے مشتق ہے جس کا معنی مٹی ہے تو وہ یہ بھی کہے گا: ملائکہ اس لفظ کے تحت داخل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: الْبَرِيَّةِ یہ بریتُ القلمَ سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اسے مقدر کیا تو اس میں ملائکہ داخل ہوں گے لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس سے یہ واجب ہوگا کہ جو اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھے وہ غلطی پر ہے۔

شَرُّ الْبَرِيَّةِ کا معنی ہے مخلوقات میں سے سب سے برا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ عموم پر دلالت کر رہا ہے۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے: اس سے مراد ہے وہ ان لوگوں میں سے سب سے برے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَٰلَمِينَ ۝ (البقرہ) میں نے تمہیں تمام عالموں پر فضیلت دی۔ یعنی تمہارے زمانے کے عالمین پر فضیلت دی۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ کافر قوموں میں ایسے لوگ بھی ہوں جو ان سے بھی برے ہوں، جس طرح

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 303

فرعون، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا۔ اسی طرح خیر البریۃ بھی یا تو عموم کے معنی میں ہوگا یا اس دور کے لوگوں سے سب سے بہتر ہوں گے۔ جنہوں نے اس لفظ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس سے انسانوں کو فرشتوں پر فضیلت کا استدلال کیا ہے اس بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مومن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بعض ان ملائکہ سے فضیلت رکھتا ہے جو اس کی بارگاہ میں حاضر ہیں (1)۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝

''ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشگی کی جنتیں ہیں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ ان میں تا ابد رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی، یہ (سعادت) اس کو ملتی ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے''۔

جزا سے مراد ثواب ہے، رب سے مراد خالق و مالک ہے، جَنّٰتُ سے مراد باغات ہیں، عَدْنٍ کا معنی ٹھہرنا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں: جَنّٰتُ عَدْنٍ سے مراد درمیانی باغات ہیں تو کہتا ہے: عدَنَ بالمکانِ وہ مقیم ہوا۔ معدنُ الشیٔ سے مراد اس کا مرکز و مستقر ہے۔ اعشی نے یہی معنی لیا۔

وان يُسْتَضَافُوا إلى حُكْمِه يُضَافُوا إلى رَاجِحٍ قَدْ عَدَنْ

اگر انہیں اس کے فیصلہ کی طرف مائل کیا جائے تو انہیں اپنے راجح امر کی طرف مائل کیا گیا ہے جو مرکز و محور ہے۔

وہ نہ وہاں سے کوچ کریں گے اور نہ ہی مریں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر راضی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے بدلہ سے راضی۔ یہ جنت اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرا اور معاصی سے رکا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب المسلمون فی ذمۃ اللہ، حدیث نمبر 3936، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

# سورۃ الزلزلۃ

آیاتہا ۸ ﴿۹۹ سورۃ الزلزال مدنیۃ ۹۳﴾ رکوعہا ۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ کے قول میں یہ سورت مدنی ہے۔ حضرت ابن مسعود، عطا اور جابر کے قول میں مکی ہے(1)۔ اس کی آٹھ آیات ہیں۔

علماء نے کہا: اس سورت کے فضائل بہت زیادہ ہیں اور یہ عظیم چیزوں پر مشتمل ہے۔ امام ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۃ الزلزلہ پڑھی تو اس کے لیے نصف قرآن کے مساوی ہوگی، جس نے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ پڑھی تو یہ اس کے لیے ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہو جائے گی، جس نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ پڑھی، یہ سورت اس کے لیے ایک تہائی قرآن کے برابر ہو جائے گی''۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس بارے میں حضرت ابن عباس سے روایت مروی ہے(2)، حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے چار مرتبہ سورۂ زلزلۃ پڑھی تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے پورا قرآن حکیم پڑھا''۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے: جب سورۂ اِذَا زُلْزِلَتِ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رونے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لولا أنكم تخطئون وتذنبون و يغفر الله لكم لَخَلَق أمةً يخطئون ويذنبونَ ويغفر لهم أنه هو الغفورُ الرحيم(3) اگر تم خطا اور گناہ نہ کرو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں نہ بخشے تو اللہ تعالیٰ ایسی امت پیدا فرمائے گا جو خطا اور گناہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخشے گا بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝

''جب تھرتھرانے لگے گی زمین پوری شدت سے''۔

یعنی زمین اپنی جڑ سے حرکت کرنے لگے گی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت نقل کی ہے وہ کہا کرتے تھے: نفخہ اولی کے موقع پر اللہ تعالیٰ اسے حرکت دے گا؛ یہ مجاہد کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ (النازعات) پھر اس میں دوبارہ زلزلہ برپا ہوگا تو وہ اپنے مردوں کو باہر نکال دے گی۔ یہ مردے ہی اس کے اثقال ہیں۔ مصدر کا ذکر تاکید کے لیے ہے۔ پھر فعل کو زمین کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس طرح تیرا قول

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 304
2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی اذا زلزلت، حدیث نمبر 2818-2819، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 568

ہے: لأعطينك عطيتك اس میں یہ عطیتی لك ہے اس طرح کرنا بہت اچھا ہے تا کہ بعد والی آیات کے سروں کے موافق ہو جائے۔ عام قراءت زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ زلزل سے مشتق ہے۔ جحدری اور عیسیٰ بن عمر نے اسے زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) یہ بھی مصدر ہے جس طرح وسواس، قلقال، جرجار۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: زاء کے کسرہ کے ساتھ مصدر ہے اور فتحہ کے ساتھ اسم ہے۔

## وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝

''اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو''۔

ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا: جب مردہ زمین میں ہو تو اس کے لیے ثقل لها کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور جب مردہ اس کے اوپر ہو تو اس کے لیے ثقل علیها کا لفظ بولتے ہیں۔ جب کہ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے اَثْقَالَهَا کا معنی اپنے مردے کیا ہے (2)۔ زمین دوسرے نفخہ کے موقع پر اسے نکال دے گی۔ انہیں سے یہ بھی مروی ہے: جن اور انس کو ثقلان کہتے ہیں۔ خنساء نے کہا:

أبعد ابنِ عمرٍو من آل الشَّرِيد حلَّتْ به الأرضُ أثقالَهَا

وہ کہتی ہے جب عمرو کو دفن کر دیا گیا تو وہ اپنے شرف اور سرداری کی وجہ سے اہل قبور کے لیے زیور بن گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مردے باہر نکال دے گی۔

ایک عالم نے کہا: عرب کہا کرتے تھے جب کوئی آدمی خون بہانے والا ہوتا ہے تو وہ روئے زمین پر بوجھ ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے تو روئے زمین سے اس کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اَثْقَالَهَا سے مراد اس کے خزانے ہیں، اس معنی میں حدیث طیبہ ہے: تقئ الأرض أفلاذ كبدِهَا أمثال الأسطوان من الذهب والفضة (3) زمین اپنے جگر کے ٹکڑے قے کر دے گی جو سونے اور چاندی کے ستونوں جیسے ہوں گے۔

## وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝

''اور انسان (حیران ہو کر) کہے گا: اسے کیا ہو گیا ہے''۔

الْاِنْسَانُ سے مراد کافر ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: اس سے مراد اسود بن عبد الاسد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ہر وہ انسان ہے جو قیامت کے واقع ہونے پر نفخہ اولیٰ کے وقت اس کا مشاہدہ کرے گا، وہ مومن ہو یا کافر ہو۔ یہ اس کا قول ہے جس نے اسے دنیا میں قیامت کی علامات شمار کیا ہے، کیونکہ سب لوگ قیامت کی ابتداء کے بارے میں اسے علامت نہیں جانتے یہاں تک وہ اس کے عموم کو پہچانیں اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ جس نے کہا کہ انسان سے مراد کافر ہے اس نے اس سے قیامت کا زلزلہ مراد لیا ہے کیونکہ مومن اس کا اعتراف کرتا ہے مومن اس کے بارے میں سوال نہیں کریں گے جب کہ کافر اس کا انکار کرتا ہے اس وجہ سے وہ اس بارے میں سوال

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 304		2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 305		3۔ تفسیر درمنثور، جلد 6، صفحہ 645

کرتا ہے۔ مَالَهَا کا معنی ہے کس وجہ سے اس میں زلزلہ برپا ہوا؟ ایک قول یہ کیا گیا: کس وجہ سے اس نے اپنے بوجھ نکال دیئے، یہ کلمہ تعجب ہے یعنی کس وجہ سے اس میں زلزلہ برپا ہوا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نفخہ اولیٰ کے بعد مردوں کو زندہ کرے پھر زمین حرکت کرے اور مردوں کو باہر نکال دے جب کہ انہوں نے زلزلہ، مردوں سے زمین کے پھٹنے کو دیکھا ہو تو وہ ہولناکی کی وجہ سے کہہ اٹھیں: مَالَهَا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۗ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۗ

''اس روز وہ بیان کر دے گی اپنے سارے حالات کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا۔ اس روز پلٹ کر آئیں گے لوگ گروہ در گروہ تا کہ انہیں دکھا دیئے جائیں ان کے اعمال''۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا، يَوْمَئِذٍ، اِذَا زُلْزِلَتِ کی ظرف ہے اور منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تُحَدِّثُ کی وجہ سے منصوب ہے اس کا معنی ہے زمین پر جو کچھ اچھا یا برا عمل کیا گیا اس روز اس کی خبر دے گی۔ پھر کہا گیا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قول ہے اور قول یہ کیا گیا: یہ انسان کے قول کی حکایت ہے، یعنی متعجب ہو کر کہے گا: اس زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اپنی خبریں بیان کر رہی ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا پوچھا: ''کیا تم جانتے ہو اس کی اخبار کیا ہیں؟'' صحابہ نے عرض کی: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اس کی اخبار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت کے بارے میں اس عمل پر گواہی دے گی جو اس پر کیا گیا۔ وہ کہے گی: ''فلاں فلاں دن یہ عمل کیا گیا''۔ فرمایا: ''یہ یہ اس کی خبریں ہیں''۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

ماوردی نے کہا: اس میں تین قول ہیں:

(۱) بندے اس پر جو عمل کرتے رہے اس کے بارے میں وہ خبر دے گی؛ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ یہ اس کا قول ہے جس نے یہ گمان کیا کہ یہ قیامت کا زلزلہ ہے۔

(۲) وہ جو بوجھ نکالے گی وہ اس کا خبر دینا ہے؛ یہ یحییٰ بن سلام کا قول ہے یہ اس کا قول ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ یہ قیامت کی علامات کا زلزلہ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں وہ حدیث ہے جسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اذا كان أجل العبد بأرض أوثبته الحاجة إليها حتى إذا بلغ أقصى أثره قبضه الله فتقول الأرض يوم القيامة رب هذا ما استودعتني (2) جب کسی بندے کی موت کسی زمین میں مقدر ہوتی ہے تو کوئی حاجت اسے وہاں تیزی سے لے جاتی ہے جب وہ اس کی آخری حد تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو قبض کر لیتا ہے قیامت کے دن زمین کہے گی: اے میرے رب!

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 171۔ ایضاً، حدیث نمبر 3276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، ذکر الموت والاستعداد لہ، صفحہ 325۔ ایضاً، حدیث نمبر 4252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ وہ ہے جو تو نے میرے پاس ودیعت کے طور پر رکھا تھا۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

(۳) جب انسان پوچھے گا کہ اسے کیا ہوا ہے تو وہ قیامت کے برپا ہونے کی خبر دے گی؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے زمین خبر دے گی کہ دنیا کا معاملہ ختم ہو چکا ہے اور آخرت کا امر آ چکا ہے یہ ان کے سوال کے موقع پر زمین کی جانب سے جواب ہوگا اور کافر کے لیے وعید اور مومن کے لیے تنبیہ ہوگی۔ اس کے خبر دینے کے متعلق تین قول ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اسے حیوان ناطق بنا دے گا تو وہ گفتگو کرے گی۔

(۲) اللہ تعالیٰ اس میں کلام کو پیدا فرمائے گا(1)۔

(۳) اس کی جانب سے ایسا بیان ہوگا جو کلام کے قائم مقام ہوگا۔ طبری نے کہا: وہ اپنی خبریں تھرتھراہٹ، زلزلہ اور مردوں کو باہر نکالنے کے ساتھ واضح کرے گی کہ وہ یہ خبریں اس الہام کی وجہ سے دے رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے کیا ہے۔ عرب لام کو الی کی جگہ رکھتے ہیں۔ عجاج زمین کی صفت کرتے ہوئے کہتا ہے:

اوْحَی لها القَرار فاستقرّتْ وشَدَّها بالرّاسيات الثُّبَّتِ (2)

اس کی طرف قرار کا الہام کیا تو وہ قرار پکڑ گئی اور اسے مضبوط رسیوں کے ساتھ باندھ دیا، اس میں لها، الیها کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اَوْحٰى لَهَا کا معنی ہے اسے حکم دیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا: اَوْحٰى لَهَا کا معنی ہے اسے کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اسے مسخر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے جس روز زلزلہ برپا ہوگا اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی، زمین اپنی خبریں دے گی کہ اس پر جو کچھ طاعات اور معاصی کی گئیں اور اس پر جو خیر و شر کیا گیا؛ یہ ثوری اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۞ اَشْتَاتًا کا معنی جماعتیں ہیں یہ شت کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: حساب کے میدان سے لوگ اٹھیں گے ایک فریق دائیں جانب کو اپنائے گی جو جنت کی طرف راستہ جائے گا۔ ایک جماعت بائیں جانب کو اپنائے گی جو جہنم کی طرف راستہ جاتا ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۞ (الروم) يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ۞ (الروم) ایک قول یہ کیا گیا ہے: حساب سے فارغ ہونے کے بعد حساب سے لوٹیں گے۔

اَشْتَاتًا کا معنی ہے جماعتیں، جماعتیں۔ اَعْمَالَهُمْ سے پہلے ثواب کا لفظ محذوف ہے یہ اس طرح ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما من أحد يوم القيامة إلا ويلوم نفسه فان كان محسنا فيقول لم لا أزددت إحسانا وإن كان غير ذلك يقول لم لا نزعت عن المعاصي (3) قیامت کے روز ہر کوئی اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہوگا اگر وہ اچھائی کرنے والا ہوگا تو وہ کہے گا: میں نے اچھائی زیادہ کیوں نہ کی، اگر معاملہ کوئی اور ہوا تو وہ کہے گا: تو میں معاصی سے کیوں نہ بچا۔ یہ صورتحال ثواب اور عقاب کے معاینہ کے وقت ہوگی۔

---

1۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 322 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 305 3۔ تفسیر ابی اللیث، جلد 3، صفحہ 500

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف ہوں گے اہل ایمان علیحدہ ہوں گے اور ہر دین کے پیروکار علیحدہ ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ لوٹنا دوبارا اٹھنے کے وقت ہو گا وہ قبروں سے گروہ در گروہ لوٹیں گے اور انہیں حساب کے میدان کی طرف لے جایا جائے گا تا کہ وہ اپنے اعمال اپنی کتابوں میں دیکھ سکیں یا اپنے اعمال کی جزا دیکھ سکیں، گویا وہ قبروں پر وارد ہوئے ان میں انہیں دفن کیا گیا پھر وہ ان سے لوٹے۔ وارد کا معنی آنے والا اور صادر کا معنی لوٹنے والا ہے۔ وہ زمین کے مختلف اطراف سے اٹھائے جائیں گے۔ پہلے قول کے مطابق اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی، وہ اپنی خبریں بیان کرے گی کہ اس کے رب نے اس کی طرف الہام کیا تا کہ وہ اپنے اعمال دیکھیں درمیان میں یہ جملہ یَوْمَىٕذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا معترضہ ہے۔ یعنی وہ حساب کے میدان سے جدا جدا لوٹیں گے۔ عام قرأت لیُرَوْا ہے معنی ہو گا اللہ تعالیٰ ان کے اعمال دکھائے۔ حسن بصری، زہری، قتادہ، اعرج، نصر بن عاصم اور طلحہ نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

**فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝**

''پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ (بھی) اسے دیکھ لے گا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## قیامت کے دن خیر و شر کو دیکھنے کے اعتبار سے مومن و کافر کا فرق

**مسئلہ نمبر 1۔** فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: کافروں میں سے جو رائی کے دانہ کے برابر اچھا عمل کرے گا وہ اس کی جزا دنیا میں دیکھ لے گا، آخرت میں اسے کوئی ثواب نہیں دیا جائے گا اور جس نے رائی کے دانہ برابر برائی کی اسے آخرت میں سزا دی جائے گی ساتھ ساتھ اسے شرک کی سزا بھی دی جائے گی۔ مومنین میں سے جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کی سزا دنیا میں دیکھ لے گا جب وہ مرے گا تو آخرت میں اسے سزا نہیں دی جائے گی اور اس سے درگزر کر لیا جائے گا۔ اگر اس نے رائی کے دانہ برابر بھلائی کا عمل کیا ہو گا تو وہ اس سے قبول کیا جائے گا اور آخرت میں اسے کئی گنا ثواب دیا جائے گا۔ ایک حدیث میں ہے ''ذرہ کا کوئی وزن نہیں ہوتا''۔ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے عمل سے غافل نہیں وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء: 40) اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ وہاں ذرہ کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے اور اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔

اہل لغت میں سے بعض علماء نے یہ کہا ہے: ذر یہ ہے آدمی اپنا ہاتھ زمین پر مارے تو اس کے ساتھ جو مٹی لگ جائے اسے ذر کہتے ہیں؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے: جب تو اپنا ہاتھ زمین پر رکھے اور اسے اٹھائے تو مٹی میں سے جو اس کے ساتھ لگ جاتی ہے وہ ذرہ ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: کافروں میں سے جو آدمی ذرہ برابر نیکی کرتا ہے وہ اس کا ثواب

دنیا میں دیکھ لیتا ہے (1) یعنی اپنی ذات میں، اپنے اہل میں اور اپنی اولاد میں یہاں تک کہ وہ دنیا سے نکلتا ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی خیر نہیں ہوتی۔ مومنوں میں سے جو کوئی برا عمل کرتا ہے وہ دنیا میں اس کی سزا دیکھ لیتا ہے اپنی ذات میں، اپنے مال میں، اپنی اولاد میں اور اپنے اہل میں یہاں تک کہ وہ دنیا سے نکلتا ہے جب کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی برائی نہیں ہوتی اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو ثقہ علماء نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے: یہ آیت نبی کریم پر نازل ہوئی جب کہ حضرت ابوبکر صدیق کھانا کھا رہے تھے (2) تو انہوں نے کھانا چھوڑ دیا عرض کی: یا رسول اللہ! ہم اچھا یا برا جو عمل کرتے ہیں وہ ہمیں دکھایا جائے گا؟ فرمایا: ما رأیت مما تکرہ فھو مثاقیل ذر الشر ویدخر لکم مثاقیل ذر الخیر حتی تعطوہ یوم القیمۃ جو تو ناپسندیدہ چیزیں دیکھتا ہے یہ وہی ذرہ برابر برائیاں ہیں اور ذرہ برابر اچھائیاں تمہارے حق میں ذخیرہ کرلی جائیں گی یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ تمہیں دے دی جائیں گی۔

ابوادریس نے کہا: اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ (الشوریٰ) جو تمہیں مصیبت پہنچی ہے وہ ان اعمال کا بدلہ ہے جو تم نے کیے اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہ بخش دیتا ہے۔

مقاتل نے کہا: یہ آیات دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئیں کیونکہ یہ آیت نازل ہوئی وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ (الدہر: 8) کھانا کھلاتے ہیں اسے پسند کرتے ہوئے۔ ان میں سے ایک کے پاس سائل آتا تو وہ ایک کھجور، کھانے کا ٹکڑا اور اخروٹ وغیرہ دینا ناپسند کرتا اور دوسرا چھوٹے سے گناہ کے بارے میں سستی کرتا جس طرح جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور نظر کرنا۔ میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے کبائر پر جہنم کا وعدہ کیا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ انہیں تھوڑی سی نیکی میں رغبت دلائی جائے کہ اسے بدلہ دیا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ زیادہ ہو جائیں اور انہیں تھوڑے سے گناہ پر خبردار کرے کیونکہ ان کے بارے میں بھی امکان ہے کہ وہ زیادہ ہو جائیں؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ چھوٹا سا گناہ قیامت کے روز گناہگار کی آنکھ میں پہاڑوں سے بڑا ہوگا اور اس کی تمام اچھائیاں اس کی آنکھ میں ہر شئی سے چھوٹی ہوں گی۔

### اچھائی کا بدلہ اچھائی اور برائی کا بدلہ برائی

**مسئلہ نمبر 2**۔ عام قراءت یَرَہٗ ہے۔ جحدری، سلمی، عیسیٰ بن عمر اور ابان نے اسے یُرَہٗ پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے دکھائے گا۔ پہلا پسندیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا (آل عمران: 30) اس روز ہر نفس اسے حاضر پائے گا جو اس نے اچھا عمل کیا ہوگا۔ ہشام نے دونوں مواقع پر ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ کسائی نے اسے ابوبکر، ابوحیوہ اور مغیرہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ یعقوب، زہری، جحدری اور شیبہ نے اس میں اختلاس (3) کیا ہے۔ باقی قراء نے اسے اشباع کی صورت میں پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کی جزا دیکھے گا۔ کیونکہ اس کا عمل گزر چکا اور معدوم ہو چکا تو وہ دکھائی نہیں دے گا۔ علماء نے اس بارے میں اشعار ذکر کیے:

---

1۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 324 2۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 324

3۔ یہ تجوید کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے قاری جب حرکت کو پر نہ پڑھے۔

إنْ من يَعْتَدِي ويَكْسِبُ إثْماً وَزْنَ مثقالِ ذَرَّة سَيَرَاهُ

جو آدمی ذرہ برابر حد سے تجاوز کرتا ہے اور گناہ کرتا ہے تو وہ اس کو دیکھے گا۔

ويُجَازَى بفعله الشَّرّ شَرّا وبفعل الجميلِ أيضا جَزَاهُ

اسے برائی کا بدلہ برائی سے اور اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دیا جائے گا۔

هكذا قوله تبارك رَبِّي لي إذا زُلزلت وجَل ثَنَاهُ

میرے رب کا ارشاد ہے سورۂ اذا زلزلت میں اسی طرح ہے۔

## قرآن حکیم کی جامع ترین آیات

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قرآن حکیم میں یہ محکم ترین آیت ہے اور انہوں نے سچ کہا۔ علماء اس آیت کے عموم پر متفق ہیں خواہ انہوں نے اس کے عموم کا قول کیا ہو یا نہ کیا ہو، کعب الاحبار نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دو آیتیں نازل فرمائیں جنہوں نے تورات، انجیل، زبور اور صحائف میں جو کچھ تعلیمات ہیں سب کو جمع کر لیا ہے وہ یہ ہیں **فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝** شیخ ابو مدین نے اس آیت کے بارے میں کہا: وہ مآل سے پہلے حال میں اچھائی کا بدلہ دیکھ لے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو جامعہ فاذہ کہا کرتے تھے جس طرح صحیح میں ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کے بارے میں پوچھا گیا اور آپ نے خچروں کے بارے میں خاموشی اختیار کی دونوں میں جواب ایک ہی ہے (1)، کیونکہ خچر اور گدھوں پر سوار ہو کر نہ حملہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بھاگا جا سکتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں میں دائمی اجر اور جاری ثواب کا ذکر کیا تو سائل نے گدھوں کے بارے میں پوچھا کیونکہ ان دنوں ان کے پاس خچر نہیں ہوتے تھے حجاز کے علاقہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر دلدل کے سوا کوئی خچر داخل نہیں ہوا تھا جو خچر مقوقس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عموم آیت سے فتوی دیا تھا۔ ''بے شک حمار میں کثیر ذرات کا وزن ہے'' یہ ابن عربی کا قول ہے۔

موطا میں ایک روایت ہے: ایک مسکین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کھانا طلب کیا جب کہ ان کے سامنے انگور موجود تھا آپ نے ایک انسان سے کہا: اس سے ایک دانا لو اسے دے دو۔ وہ آدمی اس دانے کو دیکھنے لگا اور متعجب ہونے لگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے پوچھا: کیا تو تعجب کا اظہار کرتا ہے تو اس دانے میں کتنے مثقال ذرہ دیکھتا ہے؟

حضرت سعد بن وقاص سے مروی ہے کہ آپ نے دو کھجوریں صدقہ کیں تو سائل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت سعد نے سائل سے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہم سے ذرہ برابر قبول فرما لیتا ہے جب کہ دو کھجوروں میں بہت سے ذرات کے وزن ہوتے ہیں۔

مطلب بن حنطب نے روایت نقل کی ہے کہ ایک بدو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا اس نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا ذرہ کے وزن برابر۔ فرمایا: ''ہاں''۔ بدو نے کہا: واسوأتاہ اس نے یہ کلمہ بار بار کہا پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1972

چلا گیا نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: لقد دخل قلب الأعرابی الإیمان بدو کے دل میں ایمان داخل ہو گیا۔

حضرت حسن بصری نے کہا: فرزدق کا چچا حضرت صعصعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب اس نے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ آیت سنی تو اس نے کہا: اب مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں اس کے علاوہ قرآن نہ سنوں (1)۔ یہ میرے لیے کافی ہے، نصیحت ختم ہو چکی؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا۔ ماوردی کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت صعصعہ بن ناجیہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (2) تا کہ قرآن سنے تو نبی کریم ﷺ نے اسے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو صعصعہ نے کہا: میرے لیے کافی ہے میرے لیے کافی ہے اگر میں ذرہ برابر برائی کروں گا تو اسے دیکھ لوں گا۔

معمر نے زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی: مجھے وہ کچھ سکھایئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا ہے۔ حضور ﷺ نے اسے ایک آدمی کے پاس بھیجا جو اسے تعلیم دے تو اس نے اسے سورۂ اِذَا زُلْزِلَتِ کی تعلیم دی یہاں تک کہ وہ اس آیت تک پہنچا تو اس نے کہا: میرے لیے کافی ہے تو نبی کریم ﷺ کو خبر دی گئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دعوه فإنه قد فقه اسے چھوڑ دو وہ فقیہ ہو چکا ہے۔ یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ خَيْرًا يَّرَهٗ کو موخر کیا تو اسے کہا گیا تو نے تقدیم و تاخیر کر دی ہے۔ تو اس نے کہا:

خذا بطن هرشى(3) أو قفاها فإنه كلا جانبي هرشى لهن طريق

تم دونوں ہرشی کے بطن سے یا اس کے قفا کو اپناؤ ہرشی کے دونوں جانب اس تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

---

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 309 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 321

3۔ جحفہ کے قریب مکہ کے راستہ میں ایک ثنیہ ہے جہاں سے سمندر دکھائی دیتا ہے اس کے دو راستے ہیں جس راستہ سے بھی چلو انسان وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

# سورة العادیات

آیاتها ۱۱ ۱۰۰ سورۃ العٰدیٰت مکیۃ ۱۴ رکوعها ۱

حضرت ابن مسعود، حضرت جابر، حضرت حسن بصری، عکرمہ اور قتادہ کے نزدیک یہ سورت مکی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس، حضرت انس، امام مالک اور قتادہ کے نزدیک یہ سورت مدنی ہے(2)۔ اس کی گیارہ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾

”قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں پھر پتھروں سے آگ نکالتے ہیں سم مار کر“۔

وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے ہیں؛ عام مفسرین اور اہل لغت نے یہی کہا ہے وہ اللہ کی راہ میں دوڑتے ہیں اور آواز نکالتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: جب وہ دوڑتے ہیں تو وہ آواز نکالتے ہیں۔ فراء نے کہا: ضبح گھوڑوں کے سانسوں کی آواز ہے جب وہ دوڑ رہے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جانوروں میں سے گھوڑے، کتے اور لومڑی کے علاوہ کوئی بھی چیز دوڑتے وقت آواز نہیں نکالتی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ان کے منہ پر کوئی چیز چڑھا دی جاتی ہے تا کہ وہ ہنہنا نہ سکے کہ دشمن اس کے بارے میں آگاہ ہو جائے اس حالت میں قوت کے ساتھ سانس لیتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم اٹھائی (3) یٰسٓ ﴿۱﴾ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ﴿۲﴾ (یاسین) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم اٹھائی لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ (الحجر) اللہ تعالیٰ نے آپ کے گھوڑوں، ان کے ہنہنانے، ان کے غبار اور پتھروں سے ان کے سموں سے چنگاری نکالنے کی قسم اٹھائی اور ارشاد فرمایا: وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾۔

عنترہ نے کہا:

والخیل تعلم حین تضبَحُ　فی حیاضِ الموْتِ ضَبْحَا

گھوڑے جانتے ہیں جب وہ موت کے حوضوں میں آواز نکالتے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لستُ بالتُّبَّعِ الیمانِی إنْ لَمْ　تَضْبَحِ الخیلُ فی سَوادِ العِرَاقِ

میں تبع یمانی نہیں اگر گھوڑے سواد عراق میں آوازیں نہ نکالیں۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 307　2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 308　3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1973

اہل لغت نے کہا: ضبح اور ضباح یہ لومڑیوں کے لیے وضع کیے گئے ہیں مجازاً گھوڑوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ عربوں کے قول سے ماخوذ ہے: ضَبَحَتْهُ النَّارُ جب آگ اس کے رنگ کو تبدیل کر دے اور اس میں مبالغہ نہ کرے۔ شاعر نے کہا:

فَلَمَّا أَنْ تَلَهْوَجْنَا شِوَاءً بِهِ اللَّهَبَانُ مَقهورًا ضَبِيحًا

انضبح لونه: جب وہ تھوڑا اسا سیاہی مائل ہو جائے اس نے کہا۔

عُلِّقْتُهَا قَبْلَ انضِبَاحِ لَوْنِي میں نے اسے اپنا رنگ بدلنے سے پہلے ہی چاٹ لیا۔ یہ حیوانات آواز نکالتے ہیں جب ان کا حال گھبراہٹ، تھکاوٹ اور لالچ کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ ضَبْحًا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے: والعادیات تضبحُ ضَبْحًا، الضبح کا معنی راکھ بھی ہے۔ بصریوں نے کہا: ضَبْحًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ مصدر ہے جو حال کی جگہ واقع ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الضبح اور الضبع دونوں ایک جیسے ہیں جس کا معنی دوڑنا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الضبح والضبع کا معنی دوڑنا اور چلنا ہے۔ مبرد نے اسی طرح کہا ہے ضبح سے مراد دوڑنے میں بازوں کو لمبا کرنا ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی کنانہ کے لوگوں کی طرف ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا تو اس کے خبر آنے میں دیر ہو گئی رسول اللہ ﷺ نے ان پر حضرت منذر بن عمرو انصاری کو عامل بنایا تھا وہ ایک نقیب تھے منافقوں نے کہا: وہ شہید ہو گئے ہیں یہ سورت اس لیے نازل ہوئی تا کہ نبی کریم ﷺ کو ان کی سلامتی کی خبر دی جائے اور یہ بشارت دی جائے کہ انہوں نے اس قوم پر حملہ کیا تھا جس کی طرف انہیں بھیجا گیا تھا۔

جن علماء نے یہ کہا کہ عادیات سے مراد گھوڑے ہیں ان میں حضرت ابن عباس، حضرت انس، حضرت حسن بصری اور مجاہد ہیں۔ خیل سے مراد وہ گھوڑے ہیں جن پر سوار ہو کر مومن حملہ کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے: مَنْ لم یعرِفْ حُرْمَةَ فَرَسِ الغازِی فَفِیه شعبةٌ من النفاقِ جس نے غازی کے گھوڑے کی حرمت کو نہ پہچانا تو اس میں نفاق کا کچھ حصہ ہے۔

ایک دوسرا قول ہے کہ الْعٰدِیٰتِ سے مراد اونٹ ہیں۔ مسلم نے کہا: میں نے عکرمہ سے اس بارے میں جھگڑا کیا۔ عکرمہ نے کہا حضرت ابن عباس نے کہا اس سے مراد گھوڑے ہیں (1)۔ میں نے کہا: حضرت علی شیر خدا نے کہا اس سے مراد حج میں دوڑنے والے اونٹ ہیں (2)، میرے آقا تیرے آقا سے زیادہ جانتا ہے۔ امام شعبی نے کہا: حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس نے الْعٰدِیٰتِ کی تعبیر میں جھگڑا کیا۔ حضرت علی شیر خدا نے کہا: اس سے مراد وہ اونٹ ہیں جو حج کے موقع پر دوڑتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس سے مراد گھوڑے ہیں کیا آپ نہیں دیکھتے ان کی یہ صفت ذکر کی گئی ہے فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا۝ اپنے کھروں کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں۔ کیا اونٹ آواز نکالتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا: بات اس طرح نہیں جس طرح تو نے کہی تو نے غزوۂ بدر کے موقع پر ہمیں دیکھا ہمارے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا مگر مقداد کا گھوڑا تھا جسے ابلق کہتے اور مرثد بن ابی مرثد کا گھوڑا تھا پھر حضرت علی شیر خدا نے حضرت ابن عباس سے کہا: کیا تو لوگوں کو ایسی بات کا فتویٰ دیتا ہے جس کا

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 307 2۔ ایضاً

تجھے علم ہی نہیں اللہ کی قسم! یہ اسلام کا پہلا غزوہ تھا اور ہمارے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے ایک گھوڑا حضرت مقداد کا تھا اور ایک گھوڑا حضرت زبیر کا تھا تو جمع کا صیغہ وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے مراد اونٹ ہیں جو عرفہ سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے عرفہ آتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف رجوع کر لیا؛ یہی قول حضرت ابن مسعود، عبید بن عمیر، محمد بن کعب اور سدی کا ہے۔ اس معنی میں حضرت صفیہ بنت عبد المطلب کا قول ہے:

فلا والعادیاتِ غداة جَمْع بأیدیها إذا سَطَع الغُبار

قسم ہے ان اونٹوں کی جو مزدلفہ کی صبح جس کے پاؤں سے غبار اڑتا ہے۔

یہاں اس سے مراد اونٹ ہیں ان کو الْعٰدِیٰتِ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ عدو سے مشتق ہے یہ تیز چلتے وقت قدموں کا دور دور رکھنا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

رأی صاحبی فی العادیاتِ نَجِیبةً وأمثالَها فی الواضعاتِ القوامِسِ

میرے ساتھی نے دوڑنے والی اونٹنیوں میں عمدہ اونٹنی کو دیکھا اس کی مثل مضبوط اونٹنی میں ہوتی ہے۔

جس نے کہا: الْعٰدِیٰتِ سے مراد اونٹ ہیں تو اس کے نزدیک ضَبْحًا، ضبعا کے معنی میں ہے اس میں حاء، عین سے بدلی ہوئی ہے، کیونکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے: ضبعت الابل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ چلتے وقت اپنی گردنوں کو لمبا کریں۔ مبرد نے کہا: ضبع سے مراد چلتے وقت بازوؤں کو لمبا کرتا ہے۔ ضبح یہ گھوڑوں کے بارے میں زیادہ استعمال ہوتا ہے اور ضبع اونٹوں میں استعمال ہوتا ہے بعض اوقات حاء کو عین سے بدل دیا جاتا ہے۔ ابو صالح نے کہا: گھوڑوں میں جب آواز نکالنے کا مفہوم ہو تو اسے حمحمہ کہتے ہیں اونٹوں میں ہو تو اسے تنفس کہتے ہیں۔ عطا نے کہا: چوپاؤں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو دوڑتے وقت آواز نکالتی ہو مگر گھوڑا، لومڑی اور کتا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اہل لغت کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے کہ عرب کہتے ہیں: ضبح الثعلب۔ تو بہ نے کہا:

تَسَلَّمْتُ تسلیمَ البشاشةِ أو زَقَا إلیها صَدًى من جانب القبرِ ضابحُ

میں بشاشت کا سلام پیش کرتا یا قبر کی جانب سے ایک چیخنے والا اس کو صدا لگاتا۔

زَقَا الصدی یَزْقُو زَقَاءً کا معنی ہے وہ چیخا۔ کلِّ زاقٍ صائحٌ ہر زاقی چیخنے والا ہے زقیۃ کا معنی چیخ ہے۔

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۝ عکرمہ، عطا اور ضحاک نے کہا: اس سے مراد گھوڑے ہیں جو اپنے کھروں کے ساتھ آگ نکالتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: انہوں نے اپنے کھروں کے ساتھ غبار اڑایا۔ یہ قول ان اقوال کے خلاف ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ وہ آگ نکالتے ہیں اور جو یہ کہا گیا ہے کہ وہ اونٹوں کے بارے میں ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ جہاد اور حج میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد اونٹ ہیں جو سنگریزوں کو روندتے ہیں اور اس سے آگ نکلتی ہے۔ قدح کا اصل معنی نکالنا ہے۔ اس معنی میں یہ جملہ بولا جاتا ہے: قدحتُ العین جب تو اس سے فاسد پانی نکالے۔ واقتدحتُ بالزند جب تو زند سے آگ

نکالے۔ اِقتدحتُ المرق۔ جب تو شوربہ نکالے۔ رَکِیٌ قدوحٌ ایسا کنواں جس سے ہاتھوں کے ساتھ پانی نکالا جائے۔ قدیح اسے کہتے ہیں جو ہنڈیا کے نیچے رہ جاتا ہے اور اسے مشقت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ مِقدحہ جس کے ساتھ آگ نکالی جاتی ہے۔ القداحہ، القداح وہ پتھر جو آگ کو روشن کرتا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: وَرَی الزند یرِی وَرْیًا۔ جب اس کی آگ نکلے۔ اس میں ایک اور لغت بھی ہے: وَرِی مضارع کا صیغہ دونوں میں یَرِیْ ہے سورۂ واقعہ میں یہ بات گزر چکی ہے قَدْحًا اسی وجہ سے منصوب ہے جس وجہ سے ضَبْحًا منصوب ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیات گھوڑوں کے متعلق ہیں لیکن ایراء کا معنی پھر یہ ہوگا کہ وہ اپنے مالکوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان جنگ کو بھڑکاتے ہیں اسی وجہ سے جب جنگ زوروں پر ہوتی ہے تو کہتے ہیں: حَمِیَ الوَطِیسُ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدہ: 64) جب کبھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے؛ یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے مردوں کا جنگ میں خفیہ تدبیر کرنا (1)؛ یہ مجاہد اور زید بن اسلم کا قول ہے، عرب کہتے ہیں جب وہ اپنے ساتھی کے ساتھ خفیہ تدبیر کرنا چاہے: واللہ لأمکرنّ بك ثم لأورِیَنّ لك۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوہ میں شریک ہوتے ہیں اور اپنی ضرورت اور کھانے کے لیے آگ کو روشن کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد مجاہدین کی آگ ہے جب ان کی آگ زیادہ ہوتی ہے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو بھی دشمن کے قریب جا کر پڑاؤ ڈالتا تو بہت زیادہ آگ جلاتے تاکہ دشمن ان کی تعداد زیادہ سمجھے یہ ان کی قسم اٹھانا ہے۔

محمد بن کعب نے کہا: اس سے مراد وہ آگ ہے جس کے پاس جمع ہوا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد لوگوں کے افکار ہیں جو مکر و دھوکہ کی آگ کو روشن کرتے ہیں۔ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد لوگوں کی زبانیں ہیں جو گفتگو کے ذریعے آگ روشن کر دیتی ہیں یعنی دلائل قائم کرنا، حق واضح کرنا اور باطل کو باطل کر دینا۔ ابن جریج نے بعض لوگوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امر اور عمل میں کامیابی عطا کرنے والی چیزیں اسی طرح ہیں جس طرح جب زند آگ روشنی کرے تو اس کے لیے نجاح الزند کا لفظ استعمال کیا جائے۔

میں کہتا ہوں: یہ اقوال مجاز ہیں۔ اسی معنی میں ان کا قول ہے: فلان یُورِی زِناد الضلالۃ پہلی تعبیر حقیقت ہے گھوڑے جب سختی سے دوڑتے ہیں تو وہ اپنے کھروں کے ساتھ آگ نکال لیتے ہیں۔ مقاتل نے کہا: عرب اس آگ کو نار ابی حباحب کہتے ہیں۔ ابو حباحب دور جاہلیت میں مصر کا ایک شیخ تھا بہت ہی بخیل تھا وہ روٹی پکانے اور دوسرے کاموں کے لیے آگ روشن نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ لوگ سو جاتے تھے وہ تھوڑی سی آگ روشن کرتا جو کبھی روشن ہوتی اور کبھی بجھ جاتی۔ اگر کوئی آدمی بیدار ہو جاتا تو وہ اس آگ کو بجھا دیتا یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ کوئی اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو عربوں نے اس آگ کو اس کی

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 308

آگ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ اس سے بھی کوئی نفع حاصل نہیں کیا جاسکتا؛ اس طرح جب تلوار خود پر پڑے تو آگ نکالتی ہے تو اسے بھی وہی نام دیتے ہیں۔ نابغہ نے کہا:

ولا عیبَ فیهم غیرَ أنَّ سُیوفَهم بهنّ فلولٌ من قِراعِ الكتائبِ

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں لشکروں کے باہم ملنے سے کند ہو جاتی ہیں۔

تَقُدُّ السَّلُوقِيَّ المضاعَفَ نَسْجُهُ وتُوقِدُ بالصُّفَّاحِ نارَ الحُبَاحِبِ

وہ سلوقی ذرہ کو کاٹ دیتی ہیں جس کی بنائی دہری ہوتی ہے اور چوڑے پتھر پر پڑیں تو حباحب کی آگ روشن کرتی ہیں۔

## فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝

''پھر اچانک حملہ کرتے ہیں صبح کے وقت''۔

گھوڑے صبح کے وقت دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے: جب وہ حملہ کا ارادہ کرتے تو رات کو چلتے اور صبح تک دشمن کے پاس پہنچ جاتے کیونکہ وہ وقت لوگوں کی غفلت کا ہوتا ہے اس معنی میں فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ (الصافات) جن کو ڈرایا جاتا ہے ان کی صبح بہت ہی بری ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: غالب ہونے کی وجہ سے انہوں نے دن کے وقت حملہ کیا، اس صورت میں صُبْحًا کا معنی علانیہ ہوگا۔ اسے صبح کے ظہور کے ساتھ تشبیہ دی۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد اونٹ ہیں جو اپنے سواروں کو یوم نحر کے دن مزدلفہ سے منیٰ لے جاتے ہیں، سنت یہ ہے کہ صبح ہونے پر ہی روانہ ہوا جائے؛ یہ قرطبی کا قول ہے۔ اغارہ کا معنی تیز چلنا ہوگا اس میں ان کا قول ہے: أَشْرِقْ ثَبِيرُ كَيْمَا نُغِيرُ اے ثبیر! (پہاڑ) روشن ہو کہ ہم چلیں۔

## فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝

''پھر اس سے گرد و غبار اڑاتے ہیں''۔

نَقْعًا کا معنی غبار ہے یعنی گھوڑے جہاں حملہ کرتے ہیں اس جگہ تیز دوڑنے کی وجہ سے غبار اڑاتے ہیں۔ حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

عدِمتُ بُنَيَّتِي إن لم تَرَوْها تُثِيرُ النَّقْعَ من كَنَفَيْ كَداءِ

میں اپنی بیٹی کو نہ پاؤں اگر تم گھوڑے کو نہ دیکھو کہ وہ کداء پہاڑ کے اطراف میں غبار اڑا رہا ہے۔

بِهٖ میں جو ضمیر ہے مکان یا موضع کی طرف لوٹ رہی ہے جہاں وہ حملہ واقع ہوا جب حقیقت حال معلوم ہو تو ضمیر ذکر کرنا جائز ہے اگرچہ اس کا پہلے صراحۃ ذکر نہ بھی ہوا ہو، جس طرح ارشاد فرمایا: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ (ص) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضمیر سے مراد، دوڑنا ہے جب کہ دوڑنے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نقع سے مراد مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان کا علاقہ ہے؛ یہ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وادی کا راستہ ہے شاید یہ ضمیر اس غبار کی طرف لوٹ رہی ہے جو غبار اس جگہ سے اڑتا ہے۔ صحاح میں ہے: نقع سے مراد غبار ہے اس کی جمع نقاع ہے نقع سے

مراد پانی روکنے کی جگہ ہے اس طرح اس پانی کو بھی کہتے ہیں جو کنویں میں جمع ہو جاتا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور نے کنویں کے پانی کو روکنے سے منع کیا ہے۔ نقع اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی جمع کیا جاتا ہے اس کی جمع نقاع اور انقع آتی ہے جس طرح بحر کی جمع بحار اور ابحر آتی ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض اوقات نقع کا معنی آواز بلند کرنا ہے، اس معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جب ان سے کہا گیا کہ عورتیں جمع ہیں وہ حضرت خالد بن ولید پر رو رہی ہیں تو آپ نے پوچھا: بنی مغیرہ کی عورتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے آنسو بہا رہی ہیں جب کہ وہ ابوسلیمان کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں نہ کوئی آواز ہے اور نہ شور ہے۔ ابوعبید نے کہا: نقع کا معنی آواز بلند کرنا ہے۔ اس معنی پر میں نے اہل علم میں سے اکثر علماء کو دیکھا ہے۔ اس معنی میں لبید کا قول ہے:

فمتی ینقَعْ صُراخٌ صادِق یُحْلِبوها ذاتَ جَرْس وزَجَل

جب سچی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ اس جنگ کے لیے جرس وزجل والی چیزوں کو جمع کرتے ہیں۔

ینقَعْ صراخٌ کا معنی ہے آواز کا بلند ہونا۔ کسائی نے کہا: حضرت عمر کا ارشاد نقع ولا لقلقۃ۔ نقع کا معنی کھانا یعنی ماتم میں۔ اس معنی میں یہ جملہ بولا جاتا ہے: نقعتُ أنقَعُ نَقْعا۔ ابوعبید نے کہا: ذھب بالنقع إلی النَّقِیعۃ۔ کسائی کے علاوہ دوسرے علماء کے نزدیک نقیعہ سے مراد سفر سے واپسی پر کھانا پکانا ہے ماتم میں کھانا پکانا نہیں۔ بعض علماء نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے النقع سے یہ مراد لیا تھا سر پر مٹی ڈالنا۔ یہ معنی اس طرف جاتا ہے کہ نقع سے مراد غبار ہے۔ میرا گمان نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرف گئے ہوں اور نہ آپ کو ان سے یہ خوف تھا۔ آپ کو یہ خوف کیسے ہو سکتا تھا جب کہ ان کے لیے یہ عمل ناپسند کر رہے تھے۔ فرمایا: یَسْفِکْنَ من دموعھن وھُنّ جلوس بعض نے کہا: نقع سے مراد گریبان پھاڑنا ہے۔ یہ ایسا معنی ہے جسے میں نہیں جانتا۔ اس حدیث میں میرے نزدیک نقع سے مراد شدید آواز ہے جہاں تک لقلقہ کا تعلق ہے تو اس کا معنی سخت آواز ہے میں نے اس میں کوئی اختلاف نہیں سنا۔ ابوحیوہ نے فاثرن پڑھا ہے یعنی اس کے آثار دکھائے جس نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ اثار سے مشتق ہے جب وہ حرکت دے اس معنی میں وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ ہے (الروم: 9) انہوں نے زمین کو حرکت دی۔

## فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝

''پھر اسی وقت (دشمن کے) لشکر میں گھس جاتے ہیں''۔

جَمْعًا یہ وسطن کا مفعول بہ ہے وہ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں کے وسط میں جا پہنچتے ہیں یعنی اس جمعیت میں جا پہنچتے ہیں جس پر وہ حملہ کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: یعنی وہ مزدلفہ میں جا پہنچتے ہیں (1)۔ اسے جَمْعًا کا نام دیا کیونکہ لوگ اس میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: وَسَطْتُ القومَ أَسِطُھم وَسْطًا وسِطَۃً یعنی میں ان کے درمیان جا پہنچا۔ حضرت علی شیر خدا نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ فوسطن یہ قتادہ، حضرت ابن مسعود اور ابورجاء کی لغت ہے۔ دونوں لغتوں کا ایک ہی معنی ہے یہ جملہ

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 308

بولا جاتا ہے: وَسَّطْتُ القومَ توَسَّطْتُهُمْ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: مشدد پڑھیں تو معنی ہے دشمن کے لشکر کو دو حصوں میں کر دیتے ہیں۔ تخفیف کے ساتھ پڑھیں تو معنی ہے ان کے وسط میں جا پہنچتے ہیں۔ دونوں کا معنی ایک ہی بنتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۞

"بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر گزار ہے"۔

یہ جواب قسم ہے، یعنی انسان کو ناشکری پر پیدا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: لَكَنُوْدٌ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والا؛ حضرت حسن بصری نے بھی یہی کہا، کہا: وہ مصائب کو یاد کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے؛ شاعر نے اس چیز کو لیا اور نظم میں پرو دیا:

یاأیها　الظالمُ　فی　فِعْلِهِ　　والظُّلْم　مردود　علی　مَنْ　ظَلَمْ
إلی　متی　أَنْتَ　وحَتَّی　متی　　تشکو　المُصیباتِ　وتنسی　النعم

اے اپنے عمل میں ظلم کرنے والے جب کہ ظلم ظالم پر لوٹا دیا جاتا ہے، کب تک تو مصائب کی شکایت کرتا رہے گا اور نعمتوں کو بھول جائے گا۔

حضرت ابو امامہ باہلی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الکنودُ هو الذی یأکلُ وحدَهُ ویمنَعُ رِفْدَهُ ویضرِبُ عَبْدَهُ، کنود اسے کہتے ہیں جو تنہا کھانا کھاتا ہے، عطیہ نہیں دیتا اور اپنے غلام کو مارتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ألا أُنَبِّئُكُمْ بشرارِكُم؟ قالوا بَلَی یا رسولَ اللہ! قَالَ مَن نَزَلَ وحدَهُ ومنعَ رِفْدَهُ وَجَلَدَ عَبْدَهُ کیا میں تمہیں سب سے برے آدمی کے بارے میں آگاہ نہ کروں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: جو تنہا پڑاؤ ڈالے، عطیہ نہ دے اور اپنے غلام کو مارے۔ دونوں روایات حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں نقل کی ہیں (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کنود کا لفظ کندہ اور حضر موت کی زبان میں نافرمانی کو کہتے ہیں ربیعہ اور مضر کی زبان میں ناشکرے کو کہتے ہیں، کنانہ کی زبان میں بخیل بری خصلت والے کو کہتے ہیں؛ یہ مقاتل کا نقطہ نظر ہے۔ شاعر نے کہا:

کَنُود　لِنَعماء　الرجالِ　ومَنْ　یکن　　کَنُودًا　لنعماء　الرجل　یُبَعَّدِ

وہ لوگوں کے احسانات کی ناشکری کرنے والا ہے اور جو لوگوں کے احسانات کی ناشکری کرنے والا ہو اسے دور کر دیا جاتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ جو تھوڑے احسان پر ناشکری کرے اور زیادہ پر ناشکری نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو حق کا انکار کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کندہ کو کندہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے باپ کا انکار کیا تھا۔ ابراہیم بن ہرمہ شاعر نے کہا:

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 267

دعِ البخلاءَ إن شمخُوا وصَدُّوا وذِكرَى بُخْلِ غانيةٍ كَنودِ

بخیلوں کو چھوڑ دو اگر وہ بخل کریں اور مال روک لیں اور شادی شدہ ناشکری عورت کے بخل کے ذکر کو چھوڑ و۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: کنود، کند سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے گویا وہ اسے کاٹتا ہے جسے ملنا چاہیے یعنی شکر۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: کند الحبل جب وہ رسی کو کاٹ دے۔ اعشیٰ نے کہا:

أَمِيطِي تُمِيطِي بِصُلْبِ الفؤادِ وَصُولِ حِبالٍ وكَنَّادِها

تو چلی جا تو مضبوط دل والے سے دور ہو گی جو رشتوں کو جوڑنا بھی جانتا ہے اور انہیں توڑنا بھی جانتا ہے۔

یہ کاٹنے پر دلالت کرتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: كَنَدَ يَكْنِدُ كُنودا یعنی اس نے نعمت کا انکار کیا۔ ناشکری کرنے والے کو کنود کہتے ہیں اسی طرح ناشکری عورت کو کنود کہتے ہیں اور کند بھی اس کی مثل ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

أحدِثْ لها تُحدِثْ لوصلك إنها كُنُدٌ لوصلِ الزائرِ المعتادِ

اس کے لیے نیا تعلق قائم کر وہ تیرے لیے نیا تعلق قائم کرے گی وہ پرانے ملاقاتی کے تعلق سے انکاری ہے۔

حضرت ابن عباس نے کہا: یہاں انسان سے مراد کافر ہے (1) یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وہ بہت زیادہ کفر کرنے والا ہے۔ اس معنی میں ارض کنود ہے ایسی زمین کو کہتے ہیں جو کوئی شئی نہ اگائے۔ ضحاک نے کہا: یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی (2)۔ مبرد نے کہا: کنود اسے کہتے ہیں جو حق دینے سے انکار کرے اور سابقہ شعر ہی ذکر کیا۔

ابو بکر واسطی نے کہا: کنود اسے کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانیوں میں خرچ کرے۔ ابو بکر وراق نے کہا: کنود اسے کہتے ہیں جو نعمت کو اپنی جانب سے اور اپنے دوستوں کی جانب سے خیال کرتا ہے۔ ترمذی نے کہا: جو نعمت کو دیکھتا ہے منعم کو نہیں دیکھتا۔ ذوالنون مصری نے کہا: ھلوع أو کنود اسے کہتے ہیں جب اسے تکلیف پہنچے تو بہت زیادہ جزع و فزع کرتا ہے جب بھلائی پہنچے تو احسان نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: بہت زیادہ کینہ رکھنے والا اور حسد کرنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا: جو اس کی قدر و منزلت سے ناواقف ہو، حکمت کی باتوں میں سے یہ ہے جو اس کی قدر و منزلت سے ناواقف ہے وہ اس کے پردے کو چاک کر دیتا ہے۔

میں نے کہا: یہ تمام اقوال ناشکری اور انکار کی طرف لوٹتے ہیں نبی کریم ﷺ نے کنود کے معنی کی وضاحت مذموم خصائل اور ناپسندیدہ احوال سے کی ہے، اگر یہ درست ہے تو اس بارے میں جتنے بھی اقوال کیے گئے ہیں ان سب سے یہ اعلیٰ ہے اور کسی کے لیے بھی گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔

وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝

''اور وہ اس پر (خود) گواہ ہے''۔

اللہ تعالیٰ انسان کے اس عمل پر گواہ ہے؛ منصور نے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے؛ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے (3)؛ یہ

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 309　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور محمد بن کعب نے کہا: انسان اپنے اعمال پر خود گواہ ہے؛ مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ؕ۝۸

"اور بلاشبہ وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے"۔

اِنَّهٗ کی ضمیر سے مراد انسان ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ خیر سے مراد مال ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: اِنْ تَرَكَ خَیْرًا (البقرہ: 180) ہے۔ اگر وہ مال چھوڑے۔ عدی نے کہا:

ماذَا تُرَجِّي النفوسُ من طلبِ الخَيْرِ وحُبُّ الحياةِ كارِبُها

نفوس مال کی طلب سے کس چیز کی امید رکھتے ہیں جب کہ زندگی کی محبت ان پر بہت شدید ہے۔

وہ مال کی محبت میں بہت ہی قوی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَشَدِیْدٌ سے مراد بخیل ہے بخیل کو شدید اور متشدد کہتے ہیں (1)۔ طرفہ نے کہا:

أَرَى الموتَ يعتامُ الكِرامَ ويَصْطَفِي عَقِيلَةَ مالِ الفاحِشِ المُتَشَدِّدِ(2)

میں موت کو دیکھتا ہوں وہ معزز ترین کو پسند کرتی ہے اور بخیل کے عمدہ مال کو منتخب کرتی ہے۔

یہ جملہ بولا جاتا ہے: اعتامہ واعتماہ یعنی اسے پسند کرلیا، چن لیا۔ فاحش کا معنی بخیل ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ: 268) وہ تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے۔ ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مال کو خیر کہا ہے ممکن ہے وہ شر اور حرام ہو لیکن لوگ اسے خیر کہتے ہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے خیر کہا ہے اور جہاد کو سوء قرار دیا ہے فرمایا: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (آل عمران: 174) وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل سے پلٹے۔ انہیں جہاد کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ جہاد کو سوء کہنا یہ عام لوگوں کے نام رکھنے کے اعتبار سے ہے۔ فراء نے کہا: نظم آیت کا تقاضا تھا کہ یوں کلام ہوتی وانہ لشدید الحب للخیر جب حب کا ذکر پہلے ہو چکا تو فرمایا: شدید آخر سے حب کا ذکر حذف کر دیا کیونکہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اور آیات کے سروں کی رعایت کی وجہ سے بھی ایسا کیا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراہیم: 18)

اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۙ۝۹ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۝۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ۠۝۱۱

"کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے اور ظاہر کر دیا جائے گا جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے یقیناً ان کا رب ان سے اس روز خوب باخبر ہوگا"۔

کیا انسان نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے اسے الٹ دیا جائے گا اور ان میں جو کچھ ہے اسے نکال لیا جائے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: بعثرت المتاع یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو سامان کے نیچے والے حصہ کو اوپر کر دے۔ محمد بن کعب سے

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 309 2۔ ایضاً

مروی ہے کہا: یہ اس وقت ہوگا جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ فراء نے کہا: میں نے بنی اسد کے بعض بدوؤں کو پڑھتے ہوئے سنا بحثر یعنی عین کی جگہ حاء کو پڑھا؛ ماوردی نے حضرت ابن مسعود سے یہی روایت کیا ہے(1)۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔

سینوں میں جو کچھ بھلائی اور شر میں سے ہوگا اسے الگ الگ کر دیا جائے گا۔ مفسرین نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: حُصِّلَ کا معنی ہے ظاہر کر دیا جائے گا(2)۔ عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم نے وَحَصَلَ پڑھا ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔

ان کا رب ان کے بارے میں اس روز خوب باخبر ہوگا اس پر کوئی چیز مخفی نہ ہوگی۔ وہ ان کے بارے میں اس روز اور اس کے علاوہ بھی جاننے والا ہے، بلکہ اس کا معنی ہے وہ اس دن ان کو جزا دے گا۔ اِذَا میں عامل بُعْثِرَ ہے اس میں یعلم عامل نہیں کیونکہ انسان سے اس وقت علم کا ارادہ نہیں کیا گیا بے شک دنیا میں اس سے علم کا ارادہ کیا گیا ہے اس میں خبیر عامل نہیں کیونکہ ان کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا یَوْمَئِذٍ میں عامل خبیر ہے اگرچہ درمیان میں لام فاصلہ ہے کیونکہ لام کا محل ابتدا ہے یہاں لام کو خبر پر داخل کیا گیا ہے کیونکہ مبتدا پر ان داخل ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ حجاج اس سورت کو منبر پر پڑھتا تا کہ لوگوں کو جہاد پر ابھارے تو اس کی زبان پر غلطی سے ان آ گیا تو اس نے اس کا ازالہ خبیر پڑھ کر کیا اگر لام نہ ہوتا تو یہ مفتوح ہوتا۔ کیونکہ یہ علم کا فعل اس پر واقع ہو رہا ہے یعنی یہ اس کا مفعول بن رہا ہے۔ ابو اسحاق نے اسے انّ اور خبیر پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 326 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 310

# سورة القارعة

﴿ اٰیاتہا ۱۱ ﴾ ﴿ ۱۰۱ سُوۡرَۃُ الۡقَارِعَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۳۰ ﴾ ﴿ رکوعہا ۱ ﴾

تمام قراء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے(1)۔اس کی دس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلۡقَارِعَۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡقَارِعَۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡقَارِعَۃُ ؕ﴿۳﴾

''(دل ہلا دینے والی) کڑک، یہ (زہرہ گداز) کڑک کیا ہے؟ اور آپ کو کیا معلوم کہ یہ کڑک کیا ہے''۔

قارعہ سے مراد قیامت ہے؛ عام مفسرین نے یہی کہا ہے۔اس نام کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ مخلوقات کو اپنی ہولنا کیوں کے ساتھ کھٹکھٹائے گی۔اہل لغت کہتے ہیں: عرب کہتے ہیں قرعتھُمُ القارعۃُ وفقرتھم الفاقِرۃُ یہ جملے اس وقت کہے جاتے ہیں جب ان پر کوئی عظیم مصیبت آپڑے؛ ابن احمر اور دوسرے شاعر نے یہی معنی لیا ہے:

وقارعۃٍ مِنَ الأیامِ لَولَا سبیلھم لزاحت عنك حِینا

مَتَی تَقْرَعْ بمَروتِکم(2) نَسُؤکُمْ ولم تُوقَدْ لَنَا فی القِدْرِ نَارُ(3)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا تُصِیۡبُہُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَۃٌ (الرعد: 31)

مَا الۡقَارِعَۃُ یہ جملہ استفہامیہ ہے یعنی قارعۃ کیا چیز ہے اسی طرح وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡقَارِعَۃُ ﴿۳﴾ جملہ استفہامیہ ہے یہ تعظیم اور عظمت شان بیان کرنے کے لیے ہے، جس طرح ارشاد فرمایا: اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ﴿۳﴾ (سورۃ الحاقہ)

یَوۡمَ یَکُوۡنُ النَّاسُ کَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۙ﴿۴﴾

''جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے''۔

یَوۡمَ یہ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہوگی: تکون القارعۃُ یومَ یکون النّاس کالفراش المبثوث قتادہ نے کہا: فراش سے مراد وہ پتنگ ہے جو آگ اور دیئے میں گرتا ہے اس کا واحد فراشہ ہے؛ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔فراء نے کہا: اس سے مراد مچھر وغیرہ ہے اسی معنی میں مکڑی ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھوأ طیشُ من فراشۃ وہ پتنگ سے بھی زیادہ بے عقل ہے۔ایک شاعر نے کہا:

---

1۔ہمارے صحیفے میں گیارہ آیات ہیں۔ 2۔مروۃ سے مراد وہ پتھر ہے جس سے آگ جلائی جاتی ہے۔

3۔تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 327

وقد کان أقوام رددت قُلُوبَهُمْ إليهم وكانوا كالفراشِ من الجَهْلِ

وہ ایسے لوگ تھے تو نے جن کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دیا جب کہ وہ جہالت کی وجہ سے پتنگوں کی مانند تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مثلی و مَثَلُكُم كمثل رجل أوقد نارا فجعل الجنادِبُ والفَرَاشُ يَقَعْنَ فيها وهو يَذُبُّهُنَّ وأنا آخذ بِحُجَزِكم عن النّارِ وأنتم تَفَلَّتُونَ مِنْ يَدِي۔ "میری اور تمہاری مثال اس آدمی جیسی ہے جو آگ روشن کرے تو ٹڈیاں اور پتنگ اس میں گرنے لگیں جب کہ وہ انہیں روک رہا ہو میں تمہیں کمروں سے پکڑ کر جہنم میں گرنے سے روک رہا ہو جب کہ تم میرے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہو"(1)۔

اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مبثوث کا معنی متفرق ہے ایک اور جگہ فرمایا كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ﴿﴾ (القمر) گویا وہ منتشر مکڑیاں ہیں۔ پہلے ان کی حالت کو فراش سے تشبیہ دی جن کی کوئی سمت نہیں ہوتی جو ہر سمت سرگرداں ہوتے ہیں پھر وہ ٹڈی دل کی طرح ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی کوئی سمت ہوتی ہے جس کا وہ قصد کر رہا ہوتا ہے۔ مبثوث کا معنی متفرق اور منتشر ہے۔ یہاں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے لمبثوث مذکر کا صیغہ ذکر کیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ﴿﴾ (القمر) اگر المبثوثہ کا لفظ ہوتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہوتا: أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿﴾ (الحاقہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فراء نے (2) کہا: كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ اسی طرح ہے غوغا الجراد (3) ہوتا ہے وہ ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں یہی حال لوگوں کا ہوگا جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا وہ ایک دوسرے میں گردش کر رہے ہوں گے۔

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ﴿٥﴾

"اور پہاڑ رنگ برنگی دھنکی ہوئی اون کی مانند ہوں گے"۔

ایسی اون جسے ہاتھ سے دھنکا جائے، یعنی پہاڑ باریک ذرات ہو جائیں گے اور اپنی جگہ چھوڑ دیں گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر فرمایا: هَبَاءً مُّنبَثًّا ﴿﴾ (الواقعہ) اہل لغت کہتے ہیں: العہن سے مراد رنگ دار اون ہے۔ سورۃ سأل سائل میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ﴿٨﴾ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

"پھر جس کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہ دل پسند عیش (و مسرت) میں ہوگا اور جس کے (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ ہاویہ کیا ہے۔ ایک دہکتی ہوئی آگ"۔

میزان کے بارے میں گفتگو سورۂ اعراف، کہف اور انبیاء میں گزر چکی ہے اس کا پلڑا اور لسان (4) ہوگی جس میں ان

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، شفقتہ علی امتہ، جلد 2، صفحہ 248
2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 311
3۔ ایسے کیڑے اور ٹڈی جن کے پر نکل آئے ہوں۔
4۔ ترازو کا وہ حصہ جو تولنے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

صحیفوں کا وزن کیا جائے گا جن میں نیکیاں اور برائیاں لکھی ہوں گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ایک ترازو ہے جو حضرت جبریل علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا وہ انسانوں کے اعمال کا وزن کریں گے۔ اس ایک ترازو کو جمع کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کیا اور موازین کہا جس طرح یہ کہا: لکل حادثة لها میزان ہر حادثہ کے لیے ایک ترازو ہے۔ ہم اس سے قبل بحث میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ہم نے اس کا ذکر کتاب ''تذکرہ'' میں کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: موازین سے مراد حجج اور دلائل ہیں؛ یہ قول عبدالعزیز بن یحییٰ کا ہے (1) اس نے شاعر کے قول سے استدلال کیا ہے۔

قد كُنتُ قبلَ لقائكم ذا مِرّةٍ عِندِي لكُلِّ مخاصِمٍ ميزانُهُ

میں تمہاری ملاقات سے قبل طاقتور تھا میرے پاس ہر جھگڑا کرنے والے کے لیے دلائل موجود تھے۔

عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ کا معنی ہے ایسی زندگی جو پسندیدہ ہو جس پر زندگی گزارنے والا راضی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ سے مراد یہ ہے ایسی زندگی جو راضی کرنے والی ہو۔ اس سے مراد نرم اور اطاعت شعار ہے۔ فعل عِيْشَةٍ کی طرف منصوب ہے کیونکہ اس زندگی نے ہی رضا عطا کی ہے، جس کا معنی نرمی اور اطاعت ہے۔ عِيْشَةٍ ایسا کلمہ جو جنت میں موجود تمام نعمتوں کو جامع ہے جو خوش اور راضی کرنے والی ہیں، جس طرح الفرش المرفوعة ہے ان کی اونچائی ایک سو سال کی مسافت جتنی ہے جب الله کا ولی اس کے قریب ہوتا ہے تو وہ پلنگ پست ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جنتی اس پر بیٹھ جاتا ہے پھر وہ اپنی اصلی حالت میں بلند ہو جاتا ہے جس طرح درخت کی شاخیں ہیں، اسی طرح ان کی بلندی ہوتی ہے جب الله تعالیٰ کا ولی اس کا پھل چاہتا ہے تو وہ شاخیں جھک جاتی ہیں یہاں تک کہ الله کا ولی بیٹھے یا کھڑے اس پھل کو لے لیتا ہے الله تعالیٰ کے فرمان: قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝ (الحاقہ) کا یہی معنی ہے۔ جہاں کہیں وہ چلے گا یا وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگا تو نہر اس کے ساتھ چلے گی جہاں وہ چاہے گا بلندی کی جانب یا پستی کی جانب۔ اس بارے میں الله تعالیٰ کا فرمان: يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝ (الانسان) حدیث طیبہ میں ہے ''وہ اپنی چھڑی کے ساتھ اشارہ کرے گا تو وہ پانی بغیر کسی نالی کے چلا آئے گا جہاں وہ چاہے گا محلات اور مجالس میں'' (2)۔ یہ سب اشیا ایسی زندگی ہیں جو اپنی جانب سے خوشنودگی عطا کریں گی۔ یہ رضا کا عمل کرنے والی ہیں۔ یہ خوشدلی سے اطاعت کریں گی۔

هَاوِيَةٌ ۝ سے مراد جہنم ہے اس کو ام کا نام دیا کیونکہ وہ اس کی اسی طرح پناہ لے گا جس طرح وہ اپنی ماں کی پناہ لے گا؛ یہ ابن زید کا قول ہے (3)۔ اسی معنی میں امیہ بن ابی صلت کا قول ہے:

فالأرضُ مَعْقِلنا وكانتْ أُمَّنا فيها مَقابِرُنا وفيها نُولَدُ

زمین میں ہمارے پڑاؤ کی جگہ اور جائے پناہ ہے اس میں ہماری قبریں ہیں اسی میں ہماری پیدائش ہوئی۔

جہنم کو ہاویہ کا نام دیا کیونکہ وہ اس میں گرتا جائے گا جب کہ اس میں بہت زیادہ گہرائی ہے۔ یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ہاویہ جہنم کے سب سے نچلے دروازے کا نام ہے۔ قتادہ نے کہا: فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ کا معنی ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ عکرمہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 328 2۔ نوادر الاصول، صفحہ 339 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 329

نے کہا: اس کو یہ نام اس لیے دیا کیونکہ وہ اس میں اپنے سر کے بل گرے گا۔ اخفش نے کہا: امه سے مراد ہے اس کی قرار گاہ۔ معنی قریب قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

يا عمرُو لو نالتك أرماحُنا كنتَ لمن تهوِي به الهاوِيَة

اے عمرو! اگر ہمارے نیزے تجھ تک جا پہنچیں تو تو اس آدمی کی طرح ہو جائے گا جسے ہاویہ پناہ دیتی ہے۔

یہاں ہاویہ کا معنی مھواۃ ہے۔ تو کہتا ہے: ھَوَتْ أمه فھی ھاویة یعنی اس پر رو رہی ہے۔ کعب بن اسد غنوی نے کہا:

هَوَتْ أمه ما يبعثُ الصبحُ غاديا وماذا يؤدِّي الليلُ حين يَئُوبُ

مَهْوَی اور مَهْوَاۃ دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ ہے اس کی مثل تمہاری القومُ فی المَهْوَاۃ، جب وہ ایک دوسرے کے پیچھے گر پڑے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ﴿۱۰﴾ اصل میں ماھی تھا آخری ھا سکتہ کے لیے داخل ہوئی۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور ابن محیصن نے وصل میں ھاء سکتہ کے بغیر پڑھی ہے (2) ماھی اور اس پر وقف کیا ہے اس کی وضاحت سورۃ الحاقہ میں گزر چکی ہے۔

نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ سخت گرم۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نارُکم هذِه يُوقَد ابن آدم جزء من سبعينَ جزأ من حرِّ جَهَنَّم تمہاری یہ آگ جسے انسان جلاتا ہے یہ جہنم کی آگ کا سترھواں حصہ ہے (3)۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو کافی ہے۔ فرمایا: ''جہنم کی آگ کو اس دنیا کی آگ پر بہتر گنا فضیلت دی گئی ہے ہر ایک اس کی مثل گرم ہوگی'' حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: بے شک پلڑا بھاری ہوگا جس کا پلڑا بھاری ہوگا کیونکہ اس میں حق رکھا گیا ہے جس پلڑے میں حق ہو اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ بھاری ہو۔ بے شک پلڑا ہلکا ہوگا جس کا پلڑا ہلکا ہوگا کیونکہ اس میں باطل رکھا گیا ہے اور جس پلڑے میں باطل ہو اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ ہلکا ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ''مردے اپنے پاس آنے والے ایک آدمی سے اس آدمی کے بارے میں سوال کریں گے جو اس سے قبل فوت ہو چکا ہوگا وہ بتائے گا وہ تو مجھ سے پہلے مر گیا تھا کیا وہ تمہارے پاس نہیں آیا؟ وہ مردے کہیں گے: اللہ کی قسم! نہیں۔ تو وہ کہے گا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اسے امه ھاویہ کی طرف لے جایا گیا وہ کتنی ہی بری الام ہے وہ کتنی ہی بری المربیہ ہے'' ہم نے اس کا مکمل ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں کیا ہے۔ الحمد للہ۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 329 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 312

3۔ صحیح مسلم، کتاب الجھنم، الجنة وصفة نعيمها، جلد 2، صفحہ 381

# سورۃ التکاثر

آیاتہا ۸ ۱۰۲ سورۃ التکاثر مکیۃ ۱۶ رکوعہا ۱

تمام مفسرین کے قول میں یہ سورت مکی ہے۔ امام بخاری نے اسے مدنی کہا ہے۔ اس کی آٹھ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں الله کے نام سے جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۭ

"غافل رکھا تمہیں زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس نے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

## لغوی تشریح اور شان نزول

**مسئلہ نمبر 1۔** اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ تمہیں غافل کر دیا۔ فَأَلْهَيْتُهَا عن ذِي تَمائم مُغْيَل میں نے اسے مکمل سال کے بچے جو دودھ پیتا تھا سے غافل کر دیا۔ آیت کا معنی یہ ہے مال اور تعداد کی کثرت پر فخر و مباہات نے تمہیں الله تعالیٰ کی طاعت سے غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم مر گئے اور قبروں میں دفن کر دیئے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اَلْهٰىكُمُ کا معنی ہے تمہیں بھلا دیا۔ التَّكَاثُرُ یعنی اموال اور اولاد کی کثرت پر فخر کرنا(1)؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: قبائل پر فخر کرنا(2)۔ ضحاک نے کہا: معاش اور تجارت پر فخر نے تمہیں غافل کر دیا(3)۔ یہ جملہ کہا جاتا ہے: لَهِيْتُ عن كذا، اَلْهَى لَهْيًا ولَهْيَانا جب تو اسے بھول جائے، اسے ترک کر دے اور اس سے اعراض کرے۔ اَلْهَاه اسے غافل کر دے۔ لَهَّاهُ بہ تَلْهِيَةً اسے مشغول کر دیا۔ تکاثر کا معنی کثرت میں مقابلہ کرنا۔ مقاتل، قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: یہ یہودیوں کے حق میں بات نازل ہوئی۔ جب انہوں نے کہا: ہم بنی فلاں سے زیادہ ہیں۔ بنی فلاں، بنی فلاں سے زیادہ نہیں انہیں اس چیز نے غافل کر دیا یہاں تک کہ وہ گمراہی میں مر گئے۔ ابن زید نے کہا: یہ انصار کے ایک خاندان کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس، مقاتل اور کلبی نے کہا: یہ قریش کے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بنو عبد مناف اور بنو سہم تھے۔ انہوں نے دور اسلام میں سرداروں اور اشراف کے اعتبار سے باہم گنتی کی اور فخر و مباہات کیا۔ ہر ایک خاندان نے کہا: ہم سے ایک زیادہ سردار رکھتا ہے، غلبہ رکھتا ہے، تعداد زیادہ رکھتا ہے اور پناہ دینے والا زیادہ رکھتا ہے تو بنو عبد مناف، بنو سہم پر غالب آ گئے پھر انہوں نے مردوں کا شمار کیا تو بنو سہم ان پر غالب رہے۔ تو یہ آیات نازل ہوئیں کہ تم نے زندوں کے ساتھ باہم کثرت کا مقابلہ کیا تو تم راضی نہ ہوئے یہاں تک کہ تم مردوں کے ساتھ فخر کرنے تک جا پہنچے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 313 2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 314 3۔ ایضاً

سعید نے قتادہ سے یہ روایت نقل کی ہے وہ کہا کرتے تھے: ہم بنی فلاں سے زیادہ ہیں، ہم بنی فلاں سے زیادہ تعداد والے ہیں۔ ان میں سے ہر روز کوئی نہ کوئی کم ہوتا رہا اللہ کی قسم! وہ اسی طرح رہے، یہاں تک کہ وہ سارے کے سارے اہل قبور میں سے ہو گئے۔ عمرو بن دینار سے مروی ہے: انہوں نے قسم اٹھائی کہ یہ تاجروں کے بارے میں نازل ہوئی۔ شیبان نے قتادہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں: جو اقوال ذکر کیے گئے ہیں آیت انہیں اور غیر کو بھی عام ہے۔ صحیح مسلم میں مطرف سے مروی ہے وہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ رہے تھے فرمایا انسان کہتا ہے مالِي مالِي وهل لَكَ يا ابنَ آدمَ من مالِكَ إلّا ما أكلتَ فأفنيتَ أو لبِستَ فأبليتَ أو تصدّقتَ فأمضيتَ وما سوى ذلكَ فذاهبٌ وتاركُهُ لِلنَّاس (1) میرا مال، میرا مال اے انسان! تیرا مال نہیں مگر جو تو نے کھالیا تو نے اسے فنا کر دیا یا پہن لیا تو نے اسے بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر دیا تو آگے بھیج دیا اس کے سوا سب جانے والا ہے اور اسے لوگوں کے لیے چھوڑنے والا ہے۔

بخاری نے ابن شہاب سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو أن لِابنِ آدمَ واديًا من ذهبٍ لَأحَبَّ أن يكون له واديانِ ولن يملأَ فاهُ إلّا التراب ويتوب الله على من تاب (2) اگر انسان کی سونے کی ایک وادی ہو تو وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی دو وادیاں ہوں مٹی کے سوا کوئی چیز اس کا منہ نہیں بھر سکتی اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے نظر رحمت فرماتا ہے۔

ثابت نے انس سے انہوں نے حضرت ابی سے یہ قول نقل کیا ہے: ہم اسے قرآن کا حصہ خیال کرتے ہیں یہاں تک کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ سورت نازل ہوئی۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح اور عمدہ نص ہے اہل تفسیر سے غائب رہی وہ خود بھی جاہل رہے اور دوسروں کو بھی جہالت میں رکھا اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے جس نے اس کی مجھے معرفت نصیب فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سورت پڑھی فرمایا: ''تکاثر اموال کا مطلب ہے ناحق اسے جمع کرنا، اس کے حق کو روک لینا اور برتنوں میں اسے باندھ کر رکھنا''۔

## زیارت مقابر کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 2۔** حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ یہاں تک کہ تمہیں موت آ پہنچی تو تم قبروں میں زائر کی طرح ہو گئے تم ان سے لوٹو گے جس طرح زائر اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے وہ گھر جنت ہو یا جہنم ہو۔ جو آدمی فوت ہو جاتا ہے اس کے لیے یہ جملہ بولتے ہیں: قد زارَ قبرَهُ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے تعداد کی کثرت پر باہم فخر نے تمہیں غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے مردوں کو شمار

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 407

2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، من یتقی من فتنۃ المال، جلد 2، صفحہ 953

کیا۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ وعید ہے یعنی تم دنیا کے مفاخر میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کرنے لگے تو اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو گا وہ تم ضرور دیکھو گے۔

## مقابر کی لغوی تشریح

**مسئلہ نمبر 3**۔ مقابر، مقبرَۃ اور مقبُرۃ کی جمع ہے جس کا معنی قبریں ہیں۔ شاعر نے کہا:

أَرَى أهلَ القُصُور إذا أُمِيتُوا بَنَوْا فوق المقابر بالصُّخورِ
أَبَوْا اِلَّا مُباهاةً و فَخْرًا على الفقراءِ حتّى فى القُبورِ

میں محلات والوں کو دیکھتا ہوں جب وہ مرتے ہیں تو وہ قبروں پر بڑے بڑے پتھر لگاتے ہیں۔ انہوں نے یہ عمل فقراء پر فخر و مباہات کے لیے کیا یہاں قبروں میں بھی یہی طرز عمل اپنایا۔

ایک شاعر نے کہا:

لكلّ أناسٍ مَقْبَرَ بِفِناءهم فَهُمْ يَنْقُصُونَ والقُبورُ تَزِيدُ

تمام انسانوں کے لیے ان کے اپنے اپنے میدانوں میں قبرستان ہیں لوگ کم ہو رہے ہیں اور قبریں زیادہ ہو رہی ہیں۔

ابو سعید مقبری کے لیے دونوں طرح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مَقْبَرِی اور مَقْبُرِی۔ وہ قبرستان میں رہا کرتے تھے۔ قَبَرت المیتَ أقبِرُہ، أقبُرُہ قبرا یعنی میں نے اسے دفن کیا۔ أقبرتہ یعنی میں نے اسے دفن کرنے کا حکم دیا۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ عبس میں گزر چکی ہے۔

## زیارت قبور کی شرعی حیثیت اور اس کے فوائد

**مسئلہ نمبر 4**۔ قرآن حکیم میں مقابر کا ذکر صرف اس سورت میں ہوا ہے قبروں کی زیارت سخت دل والے کے لیے زبردست دوا ہے کیونکہ یہ عمل موت اور آخرت کی یاد دلاتا ہے یہ چیز انسان کی امیدیں کم رکھنے، دنیا میں زہد اختیار کرنے اور اس میں رغبت کی کمی پر برانگیختہ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: کنتُ نَهيتُكم عن زيارةِ القبورِ فزُوروا القبورَ فانها تزهد فی الدنیا وتُذَكِّرِ الآخرةَ(1) میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا اب قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ چیز دنیا میں زہد پیدا کرتی ہے اور موت کی یاد دلاتی ہے؛ اسے حضرت ابن مسعود نے روایت کیا ابن ماجہ نے اسے نقل کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے۔ ''یہ آخرت کی یاد دلاتی ہے''(2)۔ ترمذی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''یہ آخرت کی یاد دلاتی ہے''(3)۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں میں لعنت کی ہے کہا: اس باب میں حضرت ابن عباس اور حضرت حسان بن ثابت سے روایت مروی ہے۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، زیارۃ القبور، صفحہ 114 2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 314

3۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، ماجاء فی الرخصۃ فی زیارۃ القبور، جلد 2، صفحہ 329۔ ایضاً، حدیث نمبر 974، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عورتوں پر لعنت والا حکم اس سے قبل کا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کی رخصت دی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دی تو اس رخصت میں مرد اور عورتیں شامل ہو گئیں۔ بعض علماء نے کہا: عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت اس لیے مکروہ ہے کیونکہ وہ کم صبر والی اور زیادہ جزع فزع کرنے والی ہوتی ہیں۔

## عورتوں کے لیے زیارت قبور کا حکم

میں کہتا ہوں: مردوں کے لیے قبروں پر جانا جائز ہے، یہ متفق علیہ حکم ہے۔ عورتوں کے بارے میں مختلف فیہ ہے۔ جہاں تک نوجوان بچیوں کا تعلق ہے ان کے لیے باہر نکلنا حرام ہے جہاں تک گھروں میں بیٹھ رہنے والی عورتوں یعنی جن کی عمر ڈھل چکی ہو ان کے لیے مباح اور جائز سب کے لیے ہے یہ اس وقت ہو گا جب وہ مردوں سے الگ ہو کر نکلیں اس میں ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہیں اس تاویل کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد زوروا القبور عام ہو گا جہاں تک ایسی جگہ یا وقت کا تعلق ہے جس جگہ مردوں اور عورتوں کے جمع ہونے سے فتنہ کا خوف ہو تو پھر حلال اور جائز نہیں۔ اس اثنا میں کہ ایک آدمی نکلتا ہے اس کا مقصود عبرت ہوتا ہے تو اس کی نظر کسی عورت پر جا پڑتی ہے تو وہ فتنہ میں جا پڑتا ہے اور اس کے برعکس بھی صورتحال ہو سکتی ہے کہ مرد اور عورت میں سے ایک گناہ گار ہو گا ماجور نہیں ہو گا۔

## دل کے علاج کا نسخہ اور زیارت قبول کے وقت کیا نیت اور ارادہ ہو تو یہ عمل نفع بخش بنتا ہے

**مسئلہ نمبر 5**۔ علماء نے کہا: جو آدمی اپنے دل کا علاج کرنا چاہتا ہے اور ظلم و قہر کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنے رب کی طاعت کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ لذات کو ختم کرنے والی، جماعتوں کو جدا کرنے والی، بیٹوں اور بیٹیوں کو یتیم کرنے والی کا ذکر کثرت سے کرے جو لوگ موت و حیات کی کشمکش میں ہیں ان کی ملاقات پر مواظبت اختیار کرے اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت میں ہمیشگی اختیار کرے۔ یہ تین امور ہیں جس آدمی کا دل سخت ہو، گناہ اس کو اپنی گرفت میں لے چکا ہو تو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اس سے مدد لے اور شیطان اور اس کے دوستوں کے فتنوں کے خلاف ان سے مدد لے اگر موت کا ذکر کثرت سے کرنے سے اس نے فائدہ اٹھا لیا اور اس کے دل کی سختی چھٹ گئی تو یہی اس کا مقصود ہے اگر اس پر دل کا میل بڑھ گیا اور گناہ کے اسباب مستحکم ہو گئے تو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا لوگوں کے پاس جانا اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرنا ان گناہوں کو دور کرنے میں وہاں تک پہنچ سکتا ہے جہاں تک پہلی صورت نہ پہنچ پائی تھی۔ کیونکہ موت کا ذکر دل کے لیے ایک خبر ہے جس کی طرف اس کا ٹھکانہ ہے اور یہ اسے خبردار کرنے کے قائم مقام ہے۔ جو آدمی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اس کے پاس جانا اور مسلمانوں میں سے جو کوئی مر چکا ہے اس کی قبر کی زیارت کرنا یہ آنکھوں سے مشاہدہ ہے اس وجہ سے دوسری صورت پہلی سے زیادہ موثر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لیس الخبر کالمعاینۃ خبر آنکھوں دیکھی چیز جیسی نہیں ہوتی۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ جو لوگ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے حال سے عبرت حاصل کرنا ہر وقت ممکن نہیں ہوتا جو آدمی اپنے دل کا علاج کرنا چاہتا ہے اس کا علاج بعض اوقات ایک لمحہ میں نہیں ہو پاتا، جہاں تک زیارت قبور کا تعلق ہے تو اس کا وجود یعنی اثر بہت

تیز ہوتا ہے اوران سے نفع حاصل کرنا زیادہ مناسب اور موزوں ہوتا ہے۔ جو آدمی قبروں کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے اس کے لیے مناسب یہ ہے وہ اس کے آداب اپنائے، آتے وقت اس کا دل حاضر ہو اس کے پیش نظر صرف قبر کی زیارت نہ ہو کیونکہ یہ تو صرف اس کی ایسی حالت ہے جس میں حیوان بھی اس کے ساتھ شریک ہیں ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں، بلکہ اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے فاسد دل کی اصلاح ہونی چاہیے۔ یا میت کو نفع پہچانے کا ارادہ ہونا چاہیے جو زیارت کرنے والا اس کے پاس قرآن پڑھے گا، دعا کرے گا، قبروں کے اوپر چلنے اور ان پر بیٹھنے سے اجتناب کرے جب قبرستان میں داخل ہو تو وہ انہیں سلام کرے جب وہ اپنے میت کی قبر تک پہنچے جسے وہ پہچانتا ہے تو اسے بھی سلام کرے اور اس کے چہرے کی جانب سے آئے کیونکہ وہ اس کی زیارت میں اس طرح ہے جس طرح وہ زندہ حالت میں اس سے مخاطب تھا اگر زندہ حالت میں اس سے خطاب کرتا تو آداب یہی ہوتے کہ اس کے چہرے کے بالمقابل ہوتا یہاں بھی اسی طرح ہے پھر جو مٹی کے نیچے جا چکا ہے اپنے گھر والوں اور احباب سے الگ ہو چکا ہے اس سے عبرت حاصل کرنے کے بعد کہ اس میت نے چھوٹے بڑے لشکروں کی قیادت کی ہوگی، ساتھیوں اور قبائل سے مقابلہ کیا ہوگا اموال اور ذخائر کو جمع کیا ہوگا تو اسے موت ایسے وقت میں آ پہنچی کہ اسے گمان تک نہ تھا ایسی ہولناکی میں موت آئی جس کا اسے کوئی انتظار نہ تھا تو زیارت کرنے والے کو اس بھائی کی حالت میں غور کرنا چاہیے جو گزر چکا ہے اور ان ساتھیوں میں شامل ہو چکا ہے جنہوں نے امیدوں کو پایا اور اموال کو جمع کیا کہ ان کی آرزوئیں کیسے ختم ہوگئیں، ان کے اموال نے انہیں کوئی نفع نہ دیا، مٹی نے ان کے چہروں کے محاسن کو مٹا دیا اور قبروں میں ان کے اجزاء بکھر گئے، ان کے بعد ان کی بیویاں بیوہ ہوگئیں، ان کی اولادیں یتیم ہوگئیں، دوسروں نے ان کے عمدہ اموال کو تقسیم کرلیا تا کہ اسے ان کا مقاصد میں گھومنا پھرنا، حصول مطالب میں ان کا حرص، اسباب کے حصول میں ان کا دھوکہ اور جوانی اور صحت کی طرف ان کا میلان سب کو یاد کر سکے اور یہ بھی جان سکے کہ اس کا لہو ولعب کی طرف میلان ان کے میلان اور غفلت کی طرح ہے جس کے سامنے خوفناک موت اور تیز ہلاکت ہے یقیناً وہ اس طرف جا رہا ہے جس طرف وہ گئے تھے اسے اپنے دل میں اس آدمی کے ذکر کو یاد کرنا چاہیے جو اپنی اغراض میں متردد تھا کہ اس کے پاؤں کیسے ٹوٹ گئے، وہ اپنے دوستوں کو دیکھ کر لذت حاصل کرتا تھا جب کہ اب اس کی آنکھیں بہہ چکی ہیں، وہ اپنی قوت گویائی کی بلاغت سے حملہ کیا کرتا تھا جب کہ کیڑے اس کی زبان کو کھا گئے ہیں، وہ لوگوں کی موت پر ہنسا کرتا تھا جب کہ مٹی نے اس کے دانتوں کو بوسیدہ کر دیا ہے، وہ یقین کرلے کہ اس کا حال اس کے حال جیسا ہوگا اور اس کا انجام اس کے انجام جیسا ہوگا۔ اس یاد اور عبرت کی وجہ سے اس سے تمام دنیوی غیرتیں زائل ہو جائیں گی اور وہ اخروی اعمال پر متوجہ ہوگا۔ وہ دنیا میں زہد اختیار کرے گا اپنے رب کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوگا اس کا دل نرم ہو جائے گا اور اعضاء میں خشوع واقع ہو جائے گا۔

**كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝**

"ہاں ہاں تم جلد جان لو گے پھر ہاں ہاں تمہیں (اپنی کوششوں کا انجام) جلد معلوم ہو جائے گا"۔

فراء نے کہا: كَلَّا سے مراد یہ ہے معاملہ اس طرح نہیں جس باہم فخر اور کثرت پر تم ہو تم عنقریب اس کا انجام جان لو گے،

یہاں وعید پر وعید ہے؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں کلام میں جو تکرار ہے وہ تاکید اور تغلیظ کے طریقہ پر ہو؛ یہ فراء کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قبر میں جو تم پر عذاب آئے گا اس کو تم جان لو گے پھر آخرت میں تم پر جو عذاب آئے گا اس کو تم جان لو گے۔ پہلی کلام قبر کے عذاب کے بارے میں ہے اور دوسری کلام آخرت کے عذاب کے بارے میں ہے۔ تو یہ تکرار دو حالتوں کے بارے میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ آنکھ سے دیکھنے کے بارے میں ہے کہ جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی وہ حق ہے ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت ہوگا کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا وہ سچ ہے۔ زر بن حبیش نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم عذاب قبر میں شک کرتے تھے یہاں تک کہ یہ سورت نازل ہوئی (1)، تو اللہ تعالیٰ کے فرمان: کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ سے مراد ہے تم قبروں میں دیکھ لو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ سے مراد ہے جب موت تم پر واقع ہوگی اور فرشتے تمہاری روحیں نکالنے کے لیے تمہارے پاس آئیں گے۔

ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ جب تم قبروں میں داخل ہو گے اور تمہارے پاس منکر و نکیر آئیں گے۔ سوال کی ہولناکی تمہیں اپنی گرفت میں لے لے گی اور جواب تم سے ختم ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ سورت عذاب قبر کے بارے میں قول کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے کہ اس پر ایمان واجب ہے، اس کی تصدیق لازم ہے جیسے نبی صادق و امین نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر میں مکلف بندے کی طرف زندگی لوٹا کر زندہ کر دیتا ہے، عقل کی جس صفت پر اس نے زندگی بسر کی تھی اتنا عقل اسے عطا فرماتا ہے تا کہ جو اس سے سوال کیا جا رہا ہے اس کی اسے سمجھ ہو، اس کا وہ جواب دے سکے، اس کے رب کی جانب سے جو اسے چیز مل رہی ہے اس کا ادراک کر سکے اور قبر میں اس کے لیے جو کرامت اور ذلت مقدر کی گئی ہے اس کو جان سکے؛ یہ اہل سنت کا مذہب ہے جس پر اہل اسلام کی جماعت قائم ہے ہم نے ''التذکرہ'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ دوبارہ اٹھانے کا وقت ہوگا کہ تم جان لو گے کہ جو تمہیں کہا جاتا تھا کہ تم کو اٹھایا جائے گا ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ قیامت میں ہوگا کہ تم جان لو گے کہ تمہیں جو کچھ کہا جاتا تھا کہ تمہیں عذاب دیا جائے گا۔ یہ سورت قیامت کے احوال یعنی دوبارہ اٹھانا، میدان محشر میں جمع کرنا، سوال کرنا، پیشی ہونا وغیرہ دوسرے احوال اور نزاع سب کو شامل ہے جس طرح ہم نے کتاب ''التذکرہ'' میں مردوں کے احوال اور آخرت کے امور پر گفتگو کی ہے۔ ضحاک نے کہا: کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ کا مصداق کفار ہیں ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ کا مصداق مومن ہیں، اس طرح وہ اسے پڑھا کرتے تھے پہلی آیت تاء کے ساتھ اور دوسری آیت یاء کے ساتھ۔

## کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ ۝

''ہاں ہاں اگر تم (اس انجام کو) یقینی طور سے جانتے (تو ایسا ہرگز نہ کرتے)''۔

کَلَّا کے لفظ کو مکرر ذکر کیا یہ زجر اور تنبیہ ہے کیونکہ ہر ایک کے بعد ایک اور چیز کا ذکر کیا گویا فرمایا: تم ایسا نہ کرو بے شک تم شرمندہ ہو گے، تم ایسا نہ کرو بے شک تم عقاب کے مستحق ہو گے۔ علم کی یقین کی طرف جو نسبت ہے وہ اس طرح ہے جس طرح

1۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الہاکم التکاثر، حدیث نمبر 3278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرمایا: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ (الواقعہ) ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہاں یقین کا معنی موت ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد دوبارہ اٹھانا ہے کیونکہ جب وہ متحقق ہو جائے گا تو شک زائل ہو جائے گا۔ یعنی اگر دوبارہ اٹھائے جانے کو جان لیتے۔ لو کا جواب محذوف ہے یعنی اگر تم آج بعث کو جان لیتے جسے تم اس وقت جانو گے جب صور پھونکا جائے گا اور تمہارے جسموں سے لحدیں شق ہو جائیں گی تو تمہارا حشر کیسا ہوگا؟ تو یہ چیز دنیا میں کثرت پر فخر کرنے سے تمہیں غافل کر دے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے صحائف اڑیں گے تو تم یقینی طور پر جان لو گے کہ کون شقی ہے اور کون سعید ہے؟۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان تینوں مواقع پر كَلَّا، الا کے معنی میں ہے؛ یہ ابن ابی حاتم کا قول ہے۔ فراء نے کہا: یہ حقا کے معنی میں ہے۔ اس بارے میں گفتگو مفصل گزر چکی ہے۔

## لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝

"تم دیکھ کر رہو گے دوزخ کو پھر آخرت میں تم دوزخ کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے"۔

یہ ایک اور وعید ہے۔ یہ کلام اس بنا پر ہے کہ قسم محذوف ہے یعنی تم آخرت میں ضرور دیکھو گے۔ یہ خطاب ان کفار کو ہے جن کے لیے جہنم لازم ہو چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم عام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (سورۂ مریم: 71) یہ کفار کے لیے گھر ہے اور مومن کے لیے گزرگاہ ہے۔ صحیح میں ہے: "ان میں سے پہلا بجلی کی سی تیزی سے پھر ہوا کی سی تیزی سے پھر پرندے کی سی تیزی سے گزرے گا" (1)۔ سورۂ مریم میں یہ بحث گزر چکی ہے۔ کسائی اور ابن عامر نے اسے لَتُرَوُنَّ پڑھا ہے یہ أریته الشئ سے مشتق ہے یعنی تمہیں اس کی طرف اٹھایا جائے گا اور تمہیں وہ دکھائی جائے گی تاء کے فتحہ کے ساتھ یہ عام قراء کی قراءت ہے۔ یعنی تم دور ہونے کے باوجود اپنی آنکھوں سے جہنم کو دیکھو گے پھر تم اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کی خبر ہے یعنی یہ دائمی اور متصل روایت ہے اس بنا پر خطاب کفار کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ کا معنی ہے تم دنیا میں آج اس امر کو علم یقین سے جان لیتے جو آگے ہونے والا ہے جس کی تمہارے سامنے صفت بیان کی گئی ہے کہ تم ضرور اپنے دل کی آنکھوں سے اسے دیکھو گے، کیونکہ علم یقین تجھے جہنم کو تیرے دل کی آنکھوں سے دکھائے گا وہ یہ ہے تیرے لیے قیامت کے مراحل اور اس کی قطع مسافت تیرے لیے عیاں ہو گی۔ پھر معاینہ کے وقت سر کی آنکھوں سے دیکھے گا تو تو اسے یقیناً دیکھ لے گا وہ تیری آنکھ سے غائب نہیں ہو گی پھر سوال اور پیشی کے وقت تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

## ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝

"پھر ضرور پوچھا جائے گا تم سے اس دن جملہ نعمتوں کے بارے میں"۔

امام مسلم نے اپنی صحیح (2) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن یا ایک رات باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما موجود ہیں پوچھا: "تمہیں اس وقت کس چیز نے گھروں

1۔ صحیح بخاری، باب وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ، جلد 2، صفحہ 1107 2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 177-176

سے نکالا؟'' دونوں نے عرض کی: یارسول اللہ! بھوک نے۔ فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! مجھے بھی اس چیز نے گھر سے نکالا ہے جس نے تمہیں نکالا ہے دونوں اٹھو، دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے گھر آئے تو وہ گھر پر نہیں تھا جب اس کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس نے خوش آمدید کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: ''فلاں کہاں ہے؟'' اس نے عرض کی: وہ ہمارے لیے میٹھا پانی لینے گیا ہوا ہے، اسی اثنا میں وہ انصاری بھی پہنچ جاتا ہے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں صحابہ کو دیکھا پھر گویا ہوا: الحمدللہ آج مجھ سے بڑھ کر کوئی عزت والے مہمانوں والا نہیں۔ وہ گیا تو کھجور کا ایک خوشہ ان کے پاس لے آیا۔ عرض کی: اسے کھاؤ اور چھری لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دودھ دینے والے جانور کو ذبح نہ کرنا''۔ اس انصاری نے جانور ذبح کیا تو انہوں نے اس بکری اور اس خوشے سے کھانا کھایا اور پانی پیا۔ جب یہ حضرات خوب سیر ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم سے اس دن کی نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا، تمہیں تمہارے گھروں سے بھوک نے نکالا پھر تم نہ لوٹے یہاں تک کہ تمہیں اس نعمت نے آلیا''۔

اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اس میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں: ھذا والذی نفسی بیدہ من النعیم الذی تسألون عنہ یوم القیامۃ ظلّ باردٌ ورطبٌ طیبٌ وماء باردٌ (1) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں قیامت کے روز تم سے پوچھا جائے گا۔ ٹھنڈا سایہ، عمدہ تر کھجوریں اور ٹھنڈا پانی اور اس انصاری کی کنیت ذکر کی اور کہا: ابوہیثم بن تیہان اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔

میں کہتا ہوں: اس انصاری کا نام مالک بن تیہان تھا اس کی کنیت ابوہیثم تھی اس واقعہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن رواحہ اشعار کہتے ہیں اور ابوہیثم بن تیہان کی مدح کرتے ہیں:

فَلَمْ أَرَ کالاسلامِ عِزًا لِأُمَّةٍ ولا مِثْلَ أضیافِ الإراشی مَعْشَرَا

میں نے کسی قوم کے لیے اسلام جیسی کوئی عزت نہیں دیکھی اور نہ میں نے اراشی کے مہمانوں جیسی کوئی جماعت دیکھی ہے۔

نبیٌّ و صِدِّیقٌ و فاروقُ أُمَّةٍ وخیرُ بنی حوّاء فرعا و عُنْصُرا

نبی، صدیق اور امت کا فاروق، بنی حواء میں سے عنصر کے اعتبار سے سب سے بہتر۔

فوافَوا لِمیقاتٍ وقَدْرِ قَضیۃٍ وکان قضاء اللہ قَدْرا مُقَدَّرَا

انہوں نے وعدہ و پیمان کا حق ادا کیا۔ اللہ کا فیصلہ ہو کر رہنے والا ہے۔

إلی رجلٍ نَجْدٍ یُباری بِجودِہِ شُموسَ الضُّحَی جودا و مجدا و مَفخَرا

نجد کے ایک معزز آدمی کی طرف جو اپنی سخاوت، بزرگی اور فخر میں چاشت کے سورجوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

وفارِسِ خلقِ اللہ فی کل غارۃٍ إذا لبِس القومُ الحدیدَ المُسَمَّرَا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، ما جاء فی معیشۃ أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 512

یہ غزوہ میں اللہ کی مخلوق کا شاہسوار ہے جب قوم گندمگوں نیزے زیب تن کر لیں۔

فَقَدَّی وَ حیا ثم أَدْنَیٰ قِراهُمُ    فلَمْ یَقْرِهِمْ إِلَّا سَمِینا مُتَمَرَّا

اس نے جانور ذبح کیا اسے تیار کیا پھر ضیافت ان کی خدمت میں پیش کی اس نے ان کی خدمت میں کھانا پیش نہیں کیا مگر موٹے موٹے ٹکڑے۔

ابو نعیم حافظ نے ابو عسیب سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق کے ہاں تشریف لے گئے انہیں بلایا تو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر کے ہاں تشریف لے گئے انہیں بلایا وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ کے مالک سے فرمایا: ''ہمیں بسر (کھجور) کھلاؤ'' وہ ایک خوشہ لے آیا اور اسے رکھ دیا سب نے کھایا پھر آپ نے پانی طلب کیا اور اسے پیا۔ پھر فرمایا: ''تم سے قیامت کے روز اس بارے میں پوچھا جائے گا'' کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ خوشہ لیا اسے زمین پر مارا یہاں تک کہ وہ بسر کھجوریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بکھر گئیں عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے قیامت کے روز اس کے بارے میں پوچھا جائے گا؟ فرمایا: ''ہاں مگر تین۔ وہ ٹکڑا جس کے ساتھ وہ اپنی بھوک مٹاتا ہے یا کپڑا جس کے ساتھ اپنی شرمگاہ ڈھانپتا ہے یا ایسی بل (گھر) جس میں وہ سردی اور گرمی میں پناہ لیتا ہے''۔

وہ نعمت جس کے بارے میں سوال ہوگا علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے اس کے بارے میں دس قول ہیں:

(۱) امن و صحت؛ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے(1) (۲) صحت و فراغت؛ یہ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: نعمتان مغبونٌ فیهما کثیر من الناس الصحة و الفراغ دو ایسی نعمتیں ہیں جن میں اکثر لوگ خسارے میں رہتے ہیں صحت اور فراغت (۳) قوت سماعت اور قوت بصارت کے حواس کے ساتھ ادراک (2)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿۳۶﴾ (اسراء) کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

صحیح میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید سے مروی ہے دونوں نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز ایک بندے کو لایا جائے گا تو اسے کہا جائے گا: کیا میں نے تجھے کان، آنکھ، مال اور اولاد نہیں دی تھی؟

اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس بارے میں کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۴) کھانے اور پینے والی چیزیں جن سے لذت حاصل کی جاتی ہے(3)؛ یہ حضرت جابر بن عبد اللہ کا قول ہے اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے۔

(۵) اس سے مراد دوپہر اور شام کا کھانا ہے(4)؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 314    2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 332    3۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 315    4۔ ایضاً

(٦) یہ مکحول شامی کا قول ہے، اس سے مراد پیٹ بھر کر کھانا، ٹھنڈا پانی، گھروں کے سائے، اچھا اخلاق اور نیند کی لذت ہے۔ زید بن اسلم نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس سے مراد پیٹ بھر کر کھانا ہے'' (1)۔ ماوردی نے کہا: یہ سوال کافر اور مومن کو عام ہے مگر مومن کا سوال یہ بشارت ہے کہ اس کے لیے دنیا اور آخرت کی نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں اور کافر سے سوال سے اس امر کے ساتھ جھنجھوڑنا ہے کہ اس نے دنیا کی نعمتوں کے مقابل کفر اور معصیت کو اپنایا۔ ایک قوم کا خیال ہے: یہ سوال ہر نعمت کے بارے میں ہوگا اور کفار کے حق میں ہوگا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بتایئے وہ کھانا جو میں نے آپ ﷺ کے ساتھ ابوہیثم بن تیہان کے گھر میں کھایا تھا جو کی روٹی، گوشت، آدھ پکی کھجور اور میٹھے پانی پر مشتمل تھا کیا اس بارے میں آپ ﷺ ہمارے متعلق خوف کھاتے ہیں کہ یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے متعلق ہم سے باز پرس ہوگی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ کفار کے لیے ہے'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی هَلْ نُجٰزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ۝ (سبا) یہ قشیری ابونصر نے ذکر کیا ہے دونوں روایات میں تطبیق یوں ہے کہ ہر کسی سے سوال کیا جائے گا تاہم کفار سے سوال انہیں شرمندہ کرنا ہے کیونکہ اس نے شکر کو ترک کیا اور مومن سے سوال اسے عزت بخشنا ہے کیونکہ وہ شکر بجالایا تھا یہ ہر نعمت کے بارے میں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ بہت اچھا قول ہے کیونکہ لفظ عام ہے؛ فریابی نے یہ ذکر کیا۔ ورقاء، ابن ابی نجیح سے وہ مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں یہ قول نقل کرتے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو لذت دنیا سے تعلق رکھتی ہو۔ ابواحوص، عبداللہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے پر اپنی نعمتوں کو شمار کرے گا یہاں تک کہ اس پر یہ بھی شمار کرے گا تو نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں تیرا فلاں عورت سے نکاح کر دوں اللہ تعالیٰ اس عورت کا نام ذکر کرے گا تو میں نے تیری اس سے شادی کر دی'' (☆)۔

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم سے کس نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا ہمیں تو پانی اور کھجور میسر ہے، دشمن سامنے حاضر ہے اور ہماری تلواریں ہمارے کندھوں پر ہیں؟ فرمایا: ''ایسا ضرور ہوگا'' (2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ أَوَّلَ مَا يُسْأَلُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّهُ يُقَالُ لَهُ أَلَمْ نُصِحَّ لَكَ جِسْمَكَ وَنُرْوِيكَ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (☆) قیامت کے روز سب سے پہلے انسان سے جس چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ یہ ہوگا: کیا ہم نے تیرے جسم کو صحت مند نہیں رکھا تھا اور تجھے ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو بلائے گا اسے اپنے سامنے کھڑا کرے گا اس سے اس جاہ وحشمت کے بارے میں سوال

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 332 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 172-171۔ ایضاً، حدیث 3280-3279، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆۔ شعب بیہقی حدیث نمبر 4611-4610

☆۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ الہاکم التکاثر، حدیث نمبر 3281، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرے گا جس طرح اس سے اس کے مال کے بارے میں سوال کرے گا"۔ جاہ وحشمت یقیناً دنیاوی نعمتوں میں سے ایک ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس نعمت سے مراد بدن کی صحت اور عمدہ طبیعت ہے۔ یہ ساتواں قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ امن و عافیت کے ساتھ نیند ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: جو چیز بھوک مٹائے اور ستر عورت کا اہتمام کرے جب کہ وہ کھانا ایسا ہو جو حلق سے مشکل سے اترے اور لباس کھردرا ہو قیامت کے روز اس کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی بلکہ اس سے ایسی چیزوں کے بارے میں باز پرس ہوگی جو لذت کا باعث ہوں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں سکونت عطا کی اور فرمایا: تیرے لیے یہاں یہ انعام ہے کہ تجھے نہ بھوک لگے اور نہ ہی تو بے پردہ ہوگا تو اس میں پیاسا نہ ہوگا اور نہ تجھے گرمی لگے گی (سورہ طٰہٰ: 119-118) یہ چار چیزیں ہیں (۱) جس کے ساتھ بھوک مٹائی جاتی ہے (۲) جس کے ساتھ پیاس ختم کی جاتی ہے (۳) جس کی مدد سے گرمی سے بچا جاتا ہے اور جس کے ساتھ پردہ کیا جاتا ہے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے مطلق تھیں ان کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے لیے کوئی حساب و کتاب نہ تھا کیونکہ اس کے بغیر آپ کے لیے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: اس کی مثل قشیری ابو نصر نے ذکر کیا انہوں نے کہا: بندے سے ایسے لباس کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہ چھپاتا ہے، ایسا کھانا جس کے ساتھ وہ اپنی کمر سیدھی کرتا ہے، ایسا مکان جو اسے سردی اور گرمی سے بچاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ماخوذ ہے لیس لِابنِ آدم حقٌّ فی سوی ھذہ الخصال بیتٌ یسکنُہٗ و ثوبٌ یُوارِی عورتہ وجلف الخبزِ والماء(1) ابن آدم کا ان چیزوں کے علاوہ میں کوئی حق نہیں ایسا گھر جس میں وہ رہتا ہے، ایسا کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو ڈھانپتا ہے، خشک روٹی کا ٹکڑا اور پانی۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔ نضر بن شمیل نے کہا: خشک روٹی کا ٹکڑا جس کے ساتھ سالن نہ ہو۔ محمد بن کعب نے کہا: نعیم سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہم پر انعام فرمایا ہے(2) قرآن حکیم میں ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران: 164) تحقیق اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے رسول بھیجا۔

حضرت حسن بصری اور مفضل نے کہا: اس سے مراد ہے شرعی احکام میں نرمی اور قرآن حکیم کو آسان بنا دینا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (القمر) اور بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت پذیری کے لیے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔

میں کہتا ہوں: یہ سب نعمتیں ہیں بندے سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا کیا اس نے شکر کیا یا ناشکری کی، پہلے اقوال ظاہر و باہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، ماجاء فی الزھد فی الدنیا، جلد 2، صفحہ 509۔ ایضاً، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 315

# سورۃ العصر

آیاتہا ۳ ۱۰۳ سورۃ العصر مکیۃ ۱۳ رکوعہا ۱

یہ سورت مکی ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ مدنی ہے (1)؛ حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔ اس کی تین آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝۱

"قسم ہے زمانہ کی"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

عصر کا معنی اور مراد

**مسئلہ نمبر 1**۔ عصر سے مراد دھر (زمانہ) ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے (2)۔ عصر دہر کی طرح ہے۔ شاعر نے کہا:

سبیلُ الھَوَیٰ وَعْرٌ وبحرُ الھوی غَمْرٌ ویَوْمُ الھَوَیٰ شَھْر وشَھْرُ الھَوَیٰ دَھْرُ

محبت کا راستہ پر پیچ ہے محبت کا سمندر گہرا ہے محبت کا دن مہینہ برابر ہوتا ہے اور محبت کا مہینہ زمانہ برابر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم اٹھائی کیونکہ اس میں احوال کے تصرف اور تبدل پر تنبیہ ہے اور اس میں صانع پر دلالت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: عصر سے مراد رات اور دن ہے؛ حمید بن ثور نے کہا:

ولَنْ یَلْبَثَ العَصْرَانِ یَوْمٌ ولَیْلَۃٌ إذا طَلَبا أَنْ یُدْرِکا ما تَیَمَّمَا

عصران یعنی دن اور رات نہیں رکیں گے جب وہ اپنے مقصود کو پانے کا مطالبہ کر دیں۔

عصران سے مراد صبح اور شام ہے۔ شاعر نے کہا:

وأَمْطُلُہ العَصْرین حتی یَمَلَّنِی ویرضی بِنِصْفِ الدَّیْنِ والأَنْفُ رَاغِمُ

میں اس کے ساتھ صبح و شام ٹال مٹول سے کام لیتا ہوں یہاں تک کہ مجھ سے اکتا جاتا ہے وہ مجبور ہو کر نصف قرض لینے پر راضی ہو جاتا ہے۔

وہ کہتا ہے: جب وہ دن کے پہلے پہر میرے پاس آتا ہے تو اس کے ساتھ پچھلے پہر کا وعدہ کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد عشی ہے وہ سورج کے زوال سے لے کر اس کے غروب ہونے کا وقت ہے؛ یہ حضرت حسن بصری اور قتادہ کا

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 316 2۔ ایضاً

نقطہ نظر ہے: اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

تَرَوَّحْ بِنَا يا عمرُو قد قَصُرَ العَصْرُ وفی الرَّوْحَةِ الأُولَى الغنيمة والأَجْرُ(1)

اے عمرو! ہمیں لے چلو وقت تھوڑا رہ گیا ہے پہلی روانگی میں غنیمت اور اجر ہے۔

قتادہ سے یہ بھی مروی ہے: عصر سے مراد دن کی ساعتوں میں سے آخری ساعت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے عصر کی نماز کی قسم اٹھائی یہی درمیانی نماز ہے کیونکہ یہ نمازوں میں سے افضل نماز ہے(2)؛ یہ مقاتل کا قول ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: اذِّن للعصر یعنی نماز عصر کے لیے آذان دی گئی۔ صُلِّيَتْ للعصر عصر کی نماز پڑھی گئی۔ حدیث صحیح میں ہے الصلاۃ الوسطی سے مراد عصر کی نماز ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی قسم اٹھائی کیونکہ اس میں نبوت کی تجدید ہوئی اس وجہ سے یہ زمانہ فضیلت رکھتا ہے اس کی قسم اٹھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے زمانہ کے رب کی قسم!۔

## اگر کوئی عصر کے لفظ کو قسم میں ذکر کرے تو کتنا وقت مراد ہوگا؟

**مسئلہ نمبر 2۔** امام مالک نے فرمایا: جس نے یہ قسم اٹھائی لو یُكَلِّمه عصرًا تو وہ اس سے ایک سال تک بات نہ کرے۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک نے قسم اٹھانے والے کی قسم کو سال پر محمول کیا جب کہ اس نے لفظ عصر کا ذکر کیا تھا کیونکہ اس کی تعبیر میں جو قول کیے جاتے ہیں یہ ان میں سے لمبے عرصے پر محیط ہے۔ یہ تعبیر ان کے اس اصول پر مبنی ہے کہ قسموں میں سختی کی جائے۔

امام شافعی نے کہا: وہ ایک ساعت نہ بولا تو قسم پوری کرنے والا ہوگا مگر جب اس کی کوئی نیت ہو۔ میں بھی یہی کہتا ہوں مگر جب وہ عربی ہو تو اس سے کہا جائے گا: تو نے کیا ارادہ کیا تھا؟ جب اس نے ایسی تعبیر کی کلام جس کا احتمال رکھتی تھی تو اسے قبول کر لیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ بہت ہی قلیل ہو۔ یہ تعبیر کہ قسم کو اس پر محمول کیا جائے گا جو اس نے تفسیر کی یہ بھی امام مالک کے مذہب کے موافق ہے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝

"یقیناً ہر انسان خسارے میں ہے"۔

یہ جواب قسم ہے اور انسان سے مراد کافر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے جو حضرت ابو صالح سے مروی ہے۔ ضحاک نے ان سے روایت نقل کی کہ اس سے مراد مشرکین کی ایک جماعت ہے ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبد المطلب اور اسود بن عبد یغوث۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انسان سے مراد جنس انسان ہے، خسر سے مراد خسارہ ہے۔ اخفش نے کہا: اس سے مراد ہلاکت ہے۔ فراء نے کہا: اس سے مراد سزا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝ (الطلاق) ان کے امر کا انجام عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی شر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی نقص ہے۔ معنی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 333 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 316

سب کا قریب قریب ہے۔ سلام سے مروی ہے کہ عصر یہ صاد کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اعرج، طلحہ اور عیسیٰ نے خُسُر پڑھا ہے یہی ہارون نے ابو بکر سے وہ عاصم سے روایت نقل کرتے ہیں دونوں کی دلیل حرکات میں دوسرے حرف کی اتباع ہے یوں لفظ ذکر کیا جاتا ہے خُسُر اور خُسْر جس طرح عُسُر اور عُسْر۔ حضرت علی شیر خدا یوں پڑھا کرتے تھے: وَالْعَصْرِ وَ نَوَائِبَ الدَّهْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اس روایت میں الی آخر الدھر کے الفاظ بھی ہیں۔

ابراہیم نے کہا: انسان جب اپنی زندگی میں بوڑھا ہو جاتا ہے (1) تو وہ نقصان، کمزوری اور پہلی حالت میں پلٹنے والا ہو جاتا ہے مگر مومنوں کا معاملہ مختلف ہے ان کے حق میں ان اعمال کا اجر لکھا جاتا رہتا ہے جو وہ جوانی کے عالم میں کیا کرتے تھے اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ (التین) اور کہا: ہماری قراءت میں وانّہ لَفِی آخِرِ الدَّھْرِ ہے جب کہ صحیح وہ ہے جس پر ائمہ اور مصاحف ہیں جس نے مصحف عثمانی کی مخالفت کی اس کا رد کتاب کے مقدمہ میں ہو چکا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو قرآن میں تلاوت کیا جا سکے۔ اسے وہاں غور سے پڑھ لیجئے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

''بجز ان (خوش نصیبوں) کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے نیز ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے رہے''۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یہ الْاِنْسَانَ سے مستثنیٰ ہے کیونکہ صحیح قول کے مطابق وہ الناس کے معنی میں ہے۔ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے مراد انہوں نے فرائض ادا کیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عصر کی نماز پڑھی پھر میں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! اس کی تفسیر کیا ہے؟ فرمایا: ''وَالْعَصْرِ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسم ہے تمہارے رب نے دن کے آخر کی قسم اٹھائی، انسان سے مراد ابو جہل ہے الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد حضرت ابو بکر ہیں''۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے مراد حضرت عمر ہیں وَ تَوَاصَوْا سے مراد حضرت عثمان ہیں اور وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سے مراد حضرت علی شیر خدا ہیں۔ حضرت ابن عباس نے منبر پر بیٹھ کر اس طرح خطبہ دیا تھا۔

تَوَاصَوْا کا معنی ہے انہوں نے باہم محبت کی، انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کی اور ایک دوسرے کو برانگیختہ کیا۔ الحق سے مراد توحید ہے؛ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ قتادہ نے کہا: حق سے مراد قرآن ہے۔ سدی نے کہا: یہاں حق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

وہ باہم اللہ تعالیٰ کی طاعت اور معاصی پر صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 317

# سورۃ الہمزۃ

آیاتہا ۹ ۱۰۴ سورۃ الھمزۃ مکیۃ ۳۲ رکوعہا ۱

یہ سورت مکی ہے سب کا اتفاق ہے۔ اس کی نو آیات ہیں۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۟ ۙ

''ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لیے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرتا ہے''۔

وَيْلٌ کے بارے میں وضاحت کئی مواقع پر گزر چکی ہے اس کا معنی رسوائی، عذاب اور ہلاکت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جہنم میں ایک وادی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد چغل خور، دوستوں کے درمیان فساد برپاد کرنے والے، پاکباز لوگوں پر عیب لگانے والے ہیں۔ اس تاویل کی بنا پر دونوں کا معنی ایک ہی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شِرَارُ عباد اللهِ تَعَالَى المَشَّاءُونَ بالنَّمِيمَةِ المُفْسِدونُ بين الأَحِبَّةِ الباغُونَ لِلبراء العيب (☆) اللہ کے بندوں میں سے سب سے برے چغل خور، دوستوں میں فساد برپا کرنے والے اور پاک باز لوگوں پر عیب لگانے والے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ الهمزة سے مراد چغل خور اللمزة سے مراد عیب لگانے والے ہیں (1)۔ ابو العالیہ، حضرت حسن بصری، مجاہد اور عطا بن ابی رباح نے کہا: الهمزة سے مراد ہے جو غیبت کرتا ہے (2) اور لوگوں کے سامنے ان پر طعن و تشنیع کرتا ہے اور اللمزة سے مراد ہے جب آدمی موجود نہ ہو تو پیٹھ کے پیچھے اس کی غیبت کرتا ہے؛ اس معنی میں حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے:

هَمَزْتُكَ فَاخْتَضَعْتَ بِذُلِّ نفس بِقافِيَةٍ تَأَجَّجُ كَالشُّوَاظِ (3)

میں نے تیری ایسے اشعار کے ساتھ غیبت کی جو شعلہ کی طرح بھڑک رہا تھا تو تو اپنے نفس کی ذلت کے ساتھ پست ہو گیا۔

نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (التوبہ: 58) ان میں سے کچھ وہ ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں۔ مقاتل نے اس کلام کے مخالف گفتگو کی ہے کہ هُمَزَةٍ اسے کہتے ہیں جو عدم موجودگی میں غیبت کرتا ہے اور لُمَزَةٍ اسے کہتے ہیں جو سامنے عیب جوئی کرتا ہے۔ قتادہ اور مجاہد نے کہا: هُمَزَةٍ اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے اخلاق کے بارے میں طعن کرتا ہے (4) اور لُمَزَةٍ اسے کہتے ہیں جو ان کے نسب

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 319 — 2۔ ایضاً — 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 2336

4۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 319 — ☆ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 217

میں طعن کرتا ہے۔

ابن زید نے کہا: ھامزا سے کہتے ہیں جو ہاتھ سے لوگوں کو اذیت دیتا ہے اور انہیں مارتا ہے (1) اور **لُمَزَۃ** اسے کہتے ہیں جو زبان سے انہیں اذیت دیتا ہے اور انہیں عیب لگاتا ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: جو زبان سے اذیت دیتا ہے (2) اسے **هُمَزَۃ** کہتے ہیں اور جو آنکھ سے اذیت دیتا ہے اسے **لُمَزَۃ** کہتے ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: **هُمَزَۃ** اسے کہتے ہیں جو اپنے ہم مجلس افراد کو برے الفاظ کے ساتھ اذیت دیتا ہے اور **لُمَزَۃ** اسے کہتے ہیں جو اپنی نظریں اپنے ساتھی پر گاڑھ دیتا ہے اور اپنے سر، اپنی آنکھوں اور اپنے آبروؤں سے اشارہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ کہا: دونوں برابر ہیں۔ وہ چغل خور اور انسان پر طعن کرنے والا ہے جب وہ غائب ہو جائے۔ زیاد اعاجم نے کہا۔

تُدْلِی بِوُدِّی إِذَا لَا قَيْتِنِی كَذِبًا     وإِنْ أُغَيَّبْ فَأَنْتَ الهامِزُ اللُّمَزَةْ

جب تو مجھ سے ملاقات کرتا ہے تو جھوٹ کے عالم میں میری محبت کا وسیلہ پکڑتا ہے اور اگر میں غائب ہوں تو تو چغل خور اور طعن کرنے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إِذَا لَقِيتُكَ عن سُخْطٍ تُكَاشِرُنِی     وإِنْ تَغَيَّبْتُ كنتُ الهامِزَ اللُّمَزَةْ(3)

جب میں تجھے ملتا ہوں تو تو ناراضگی کی وجہ سے دانت نکالتا ہے اور جب میں غائب ہوتا ہوں تو تو چغل خور اور طعن کرنے والا ہوتا ہے۔

الشحط کا معنی بعد ہے اور **هُمَزَۃ** ایسا اسم ہے جو مبالغہ کے لیے وضع کیا گیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: **سُخَرَة، ضُحَكَة** جو مذاق کرتا ہے اور لوگوں کو ہنساتا ہے۔ ابو جعفر محمد بن علی اور اعرج نے **هُمْزَۃ** اور **لُمْزَۃ** میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اگر یہ دونوں سے قراءت ثابت ہو تو یہ اسم مفعول کے معنی میں ہوگا۔ یہ وہ آدمی ہوتا ہے جو لوگوں کے سامنے آتا ہے تو لوگ اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں، اس پر ہنستے ہیں اور وہ انہیں غیبت پر برانگیختہ کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابووائل، نخعی اور اعمش نے اسے ویل للھمزۃ اللمزۃ پڑھا ہے ھمز کا اصل معنی توڑنا، کسی شئی کو سختی سے کاٹنا ہے۔ اس معنی میں ھمز الحرف ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: ھمزتُ راسہ میں نے اس کے سر کو توڑ دیا۔ ھمزتُ الجوز بکفی میں نے ہتھیلی سے اخروٹ توڑا، ایک بدو نے کہا: أتَهمزُ الفارۃ؟ کیا بلی ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔ تو اس نے کہا: اسے بلی ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔ صحاح میں جو جملہ مذکور ہے وہ یہ ہے ایک بدو سے کہا گیا: اتھمز الفارۃ؟ تو اس نے کہا: اسے بلی ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے۔ پہلا قول ثعلبی کا ہے یہ اس امر پر دال ہے کہ بلی کو ھمزۃ کہتے ہیں۔ عجاج نے کہا:

وَمَنْ هَمَزْنَا رَاسَهٗ تَهَشَّمَا

جس کے سر کو ہم توڑیں تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 319     2۔ ایضاً     3۔ ایضاً

ایک قول یہ کیا گیا ہے: ھمزاور لمزکا اصل معنی دھکیلنا اور مارنا ہے: لَمَزَهُ يَلْمِزُهُ لَمْزًا جب وہ اسے مارے اور دھکے دے اس طرح ھَمَزَهُ ہے جب وہ اسے دھکے دے اور اسے مارے۔ راجز نے کہا:

وَمَنْ هَمَزْنَاهُ عِزَّهُ تَبَرْكَعَا　　علی اسْتِهِ زَوْبَعَةً أَوْ زَوْبَعَا

جس کی عزت کو ہم پھاڑ دیں تو وہ اپنی سرین کے بل بگولہ کی صورت میں یا حقیر ہو کر جا گرتا ہے۔

برکعة کا معنی ہے چار اعضاء پر کھڑا ہونا برکعه فتبرکع میں نے اسے گرایا تو وہ اپنی سرین کے بل گر گیا۔ یہ صحاح میں کہا: آیت کریمہ اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئی جو ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ وہ لوگوں کی غیبت کرتا تھا اور ان کی عیب جوئی کرتا تھا وہ موجود ہوتے یا غائب ہوتے۔ ابن جریج نے کہا: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبت کرتا اور سامنے بدگوئی کیا کرتا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت ابی بن خلف کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ جمیل بن عامر ثقفی کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ بغیر تخصیص کے عموم کے لیے ہے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ کسی کے ساتھ بھی خاص نہیں بلکہ یہ ہر کسی کے لیے ہے جس کی یہ صفت ہے۔ فراء نے کہا: یہ جائز ہے کہ عام ذکر کیا جائے اور خاص کا قصد کیا جائے ایک کا قصد کیا جب کوئی یہ کہے: لا أزورك أبدا تو تو کہتا ہے: من لم یزرنی فلست بزائرہ یعنی وہ صرف قائل کا ارادہ کرتا ہے یعنی من عموم پر دلالت کرتا ہے ہر کوئی مراد ہونا چاہیے مگر وہ صرف اس فرد کا ارادہ کرتا ہے جس نے یہ بات کہی تھی۔

## الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ

"جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا"۔

اس نے حادثات زمانہ کے لیے تیار کر کے رکھا۔ جس طرح کَرُمَ (1) اور اکرم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے اس کی مقدار کو شمار کیا؛ یہ سدی کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: اس نے اپنے وارث کے لیے اپنا مال تیار کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس نے عدد اور کثرت پر فخر کیا۔ مقصود طاعت میں مال خرچ کرنے سے روکنے پر مذمت کرنا ہے جس طرح فرمایا: مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ (ق:25) اور فرمایا وَ جَمَعَ فَاَوْعٰی ﴿۱۸﴾ (المعارج) عام قراءت جمع ہے۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اسے میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ابو عبید نے وعدّدہ کی وجہ سے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

حضرت حسن بصری، نصر بن عاصم اور ابو العالیہ نے جمع اور عددہ پڑھا ہے (2) اور تضعیف کا اظہار کیا یعنی اس میں ادغام نہیں کیا، کیونکہ اس کی اصول عدّہ ہے۔ یہ بعید ہے کیونکہ مصحف میں دو دالوں کے ساتھ واقع ہے شعر میں بھی اس کی مثل واقع ہے جب انہوں نے ہم جنس حروف میں اظہار کیا تو اس میں تخفیف کا کہا:

مَهْلًا أُمامةُ قد جَرَّبْتِ من خُلُقِي　　إِنِّي أَجودُ لِأَقْوامٍ وإنْ ضَنِنُوا

اے امامہ! ٹھہر جا تو نے میرے اخلاق کا تجربہ کر لیا ہے میں لوگوں کے لیے سخاوت کرتا ہوں اگرچہ وہ بخل کریں۔

1۔ گویا حضرت مفسر کے نزدیک عددہ یہ غدۃ سے ماخوذ ہے اور عددہ کا معنی اعدہ کیا ہے۔

2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 320

محل استدلال ضَنِنُوا ہے۔

یہاں شاعر نے ارادہ کیا انہوں نے بخل کیا تو ہم جنس حروف کو الگ الگ ذکر کیا لیکن شعر ضرورت کی جگہ ہے۔ مہدوی نے کہا: جس نے وعدّدہ میں تخفیف کی ہے تو یہ المال پر معطوف ہوگا پھر ترجمہ ہوگا وجمع عددہ اس نے سامان کو جمع کیا ہم جنس کو ظاہر کرنے کی صورت میں یہ عدد کلمہ فعل نہیں ہوگا کیونکہ یہ صرف شعر میں استعمال ہوگا۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۚ﴿۴﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾

''وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔ ہرگز نہیں وہ یقیناً حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ حطمہ کیا ہے؟۔ وہ اللہ کی آگ ہے خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک جا پہنچے گی''۔

وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اسے زندہ رکھے گا وہ مرے گا نہیں؛ یہ سدی نے کہا: عکرمہ نے کہا: معنی ہے مال اس کی عمر میں اضافہ کر دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جو وقت گزر چکا ہے اسے زندہ کر دے گا۔ یہ ماضی کا صیغہ ہے جو مستقبل کے معنی میں ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: هَلَكَ واللہ فلان ودخل النار اللہ کی قسم! فلاں ہلاک ہو گیا اور آگ میں داخل ہو گیا۔

كَلَّا کا لفظ اس لیے ذکر کیا گیا کہ کافر نے جو وہم کیا اس کا رد کرنا مقصود ہے یعنی وہ ہمیشہ نہیں رہے گا اور اس کا مال باقی نہیں رہے گا۔ كَلَّا کے بارے میں گفتگو مکمل گزر چکی ہے۔ عمر بن عبداللہ جو غفرہ کے غلام تھے نے کہا: جب تو اللہ تعالیٰ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنے كَلَّا تو وہ یہ ارشاد فرماتا ہے تو نے جھوٹ بولا۔

لَيُنْۢبَذَنَّ یعنی انہیں پھینک دیا جائے گا۔ حضرت حسن بصری، محمد بن کعب، نصر بن عاصم، مجاہد، حمید اور ابن محیصن نے پڑھا (1) لینبذان یعنی تثنیہ کا صیغہ پڑھا تو اس سے مراد وہ اور اس کا مال ہے۔ حضرت حسن بصری سے یہ بھی مروی ہے: لَيُنْبَذُنه یعنی اس کا مال پھینکا جائے گا۔ ان سے نون کے ساتھ جمع کا صیغہ بھی منقول ہے لننبذنه یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ مال دار کو پھینکے گا۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: لَيُنْبَذُنَّ یعنی همزة، لمزة، مال اور اس کے جمع کرنے والے سب کو جہنم میں پھینکا جائے گا۔ حطمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی آگ ہے۔ اسے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ جو چیز بھی اس میں پھینکی جاتی ہے اسے وہ توڑ دیتی ہے اور ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ راجز نے کہا:

إِنَّا حَطَمْنَا بِالْقَضِيبِ مُصْعَبَا يَوْمَ كَسَرْنَا أَنْفَهُ لِيَغْضَبَا (2)

ہم نے کھجور کی شاخ کے ساتھ مصعب کو مارا جس روز ہم نے اس کی ناک توڑی تاکہ وہ غضبناک ہو۔

حطمہ جہنم کے طبقات میں سے چھٹا طبقہ ہے؛ ماوردی نے اسے کلبی سے حکایت بیان کی ہے۔ قشیری نے ان سے یہ روایت نقل کی: حطمہ سے مراد آگ کے گڑھوں میں سے دوسرا گڑھا ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ چوتھا گڑھا ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 320
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 337

وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ۝ حطمہ کی عظمت شان کو بیان کرنے کے لیے استفہامیہ انداز میں کلام ذکر کی۔ پھر اس کی تفسیر بیان کی کہ یہ کیا ہے۔ فرمایا: نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۝ جس کو ہزار سال، ہزار سال اور ہزار سال بھڑکایا گیا۔ یہ ٹھنڈی ہونے والی نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے نافرمانوں کے لیے تیار کیا۔

الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـئِدَةِ ۝ محمد بن کعب نے کہا: ان کے جسموں میں جو کچھ ہوگا آگ اسے کھا جائے گی یہاں تک کہ جب ان کے دلوں تک پہنچے گی تو انہیں پھر پیدا کر دیا جائے گا وہ انہیں پھر کھانے لگے گی۔ خالد بن ابی عمران نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے: إنّ النّار تأكل أهلها حتى إذا طلعت على أفئدتهم إنتهت ثم إذا صَدَرُوا تعود آگ جہنمیوں کو کھائے گی یہاں تک کہ جب وہ آگ ان کے دلوں تک پہنچے گی تو وہ رک جائے گی پھر جب انہیں پیدا کیا جائے گا تو آگ لوٹ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہی معنی ہے: نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۝ الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـئِدَةِ ۝ یہاں دلوں کو خاص کر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ دکھ جب دل تک جا پہنچتا ہے تو وہ مریض مر جاتا ہے یعنی وہ میت کی حالت والوں میں سے ہے جب کہ وہ مرتے نہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰى ۝ (طٰہٰ) اس میں نہ وہ مرے گا اور نہ زندہ ہوگا۔ یعنی وہ زندہ ہیں مگر مردوں کے حکم میں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـئِدَةِ ۝ کا معنی ہے وہ آگ جانتی ہے کہ عذاب کی جس مقدار کے وہ مستحق ہیں یہ جملہ بولا جاتا ہے: اطّلعَ فلانٌ علیٰ كَذا یعنی فلاں اس پر مطلع ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تَدۡعُوۡا مَنۡ اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ (المعارج) وہ اسے کھینچ لیتی ہے جو پیٹھ پھیرتا ہے اور روگردانی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذَا رَاَتۡهُمۡ مِّنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ سَمِعُوۡا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيۡرًا ۝ (الفرقان) جب وہ آگ انہیں دور سے دیکھے گی تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا۔

اس آگ کی ان چیزوں سے صفت بیان کی گئی ہے تو یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کی علم سے صفت بیان کی جائے۔

## اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝ فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

”بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی (اس کے شعلے) لمبے لمبے ستونوں کی صورت میں ہوں گے“۔

مُّؤۡصَدَةٌ کا معنی ہے مطبقہ یعنی تہہ در تہہ ہوگی (1)؛ یہ حضرت حسن بصری اور ضحاک کا نقطہ نظر ہے سورۃ البلد میں اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ قریش کی لغت کے مطابق اس کا معنی مغلقہ ہے یعنی بند کر دی جائے گی وہ کہتے ہیں: آصدتُ الباب جب تو دروازے کو بند کر دے؛ یہ مجاہد کا قول ہے؛ اس معنی میں عبید اللہ بن قیس رقیات کا قول ہے:

إنّ فی القَصْرِ لَو دَخَلنَا غزَالًا مُصْفَقًا مُوصَدًا عليهِ الحِجابُ

کاش! ہم داخل ہوتے بے شک محل میں ایک ہرن ہے جس پر حجاب ڈال دیا گیا ہے۔

فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ میں فی، باء کے معنی میں ہے یعنی اسے لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ جکڑ دیا گیا ہے؛ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے آپ کی قراءت میں بِعَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 5، صفحہ 320

ہے ''پھر اللہ تعالیٰ ان پر فرشتے بھیجے گا جن کے ساتھ آگ کے کواڑ، آگ کے کیل اور آگ کے ہی ستون ہوں گے وہ ان پر ان کواڑوں کو بند کر دیں گے، ان پر کیل لگا دیں گے اور ان ستونوں کے ساتھ انہیں باندھ دیا جائے گا کوئی سوراخ باقی نہیں رہے گا جس میں سے راحت داخل ہو سکے اور غم خارج ہو سکے اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر انہیں بھول جائے گا جنتی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جہنمی اس کے بعد کبھی بھی مدد طلب نہ کر سکیں گے، گفتگو ختم ہو جائے گی ان کی گفتگو چیخ و پکار ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ کا یہی مفہوم ہے''۔ قتادہ نے کہا: عَمَدٍ کے ساتھ انہیں عذاب دیا جائے گا: طبری نے اسے اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ سے مراد ان کے گردنوں میں طوق ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں (1)؛ یہ ابو صالح نے کہا۔ قشیری نے کہا کہ عمد سے مراد کواڑوں کے کیل ہیں جو جہنمیوں پر بند کر دیئے جائیں گے اور ان پر کیل لگا دیئے جائیں گے یہاں تک ان کا غم اور گرمی جہنمیوں پر ہی لوٹے گی۔ تو ان پر کسی قسم کی راحت داخل نہیں ہو گی۔

ایک قول یہ کیا گیا: جہنم کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں گے جب کہ وہ بیڑیوں اور لمبے طوقوں میں جکڑے ہوں گے یہ چھوٹوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کے عذاب اور آلام میں انہیں اس کے ساتھ مارا جائے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: معنی ہے لمبا زمانہ جو ختم نہ ہو۔ فراء نے کہا: عَمَد اور عُمُد دونوں عمود کی جمع ہیں جس طرح أدیم کی جمع اَدَم اور اُدُم اور افیق کی جمع اَفَق اور اُفُق آتی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: عَمَد عماد کی جمع ہے، جس طرح اهاب کی جمع اُهُب اور اَهَب ہے۔ ابو عبیدہ نے عَمَد کو پسند کیا ہے اسی طرح ابو حاتم کی رائے ہے وہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (الرعد: 2) اس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے جن کو تم دیکھو۔

اس آیت میں علماء نے عَمَد پر اتفاق کیا ہے۔ جوہری نے کہا: العمود سے مراد گھر کے ستون ہوتے ہیں اس کی جمع قلت اعمد ہے جمع کثرت عُمُد اور عَمَد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس لفظ عمد کو دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: عمود ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو لمبی ہو خواہ وہ لکڑی کی ہو یا لوہے کی ہو یہ تعمیر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح عماد کی حیثیت ہوتی ہے جس طرح جملہ بولتے ہیں: عمدتُ الشیئ فانعمَدَ میں نے اسے عماد کے ذریعے سیدھا کیا جس پر اس کا انحصار تھا۔ اعمدتہ یعنی میں نے اس کے نیچے ستون (سہارا والی چیز) بنائی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 320

# سورة الفيل

(آياتها ۵) (۱۰۵ سُوۡرَةُ الۡفِيۡلِ مَكِّيَّةٌ ۱۹) (ركوعها ۱)

علماء کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔ اس کی پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

**اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ۝**

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

## استفہام سے مراد تقریر ہے

**مسئلہ نمبر1۔** اَلَمۡ تَرَ یعنی کیا آپ کو خبر نہیں دی گئی؟ ایک قول یہ کیا گیا: کیا آپ علم نہیں رکھتے (1)؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا؟ لفظ (ہمزہ) تو استفہام کا ہے معنی تقریر کا دے رہا ہے خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لیکن حکم عام ہے یعنی کیا آپ کو علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا یعنی یقینا تمہیں علم ہے اور جہاں میں نے تم پر احسان کیا تھا اس جگہ کو تم جانتے ہو۔ تو تمہیں کیا ہو گیا ہے تم ایمان نہیں رکھتے۔ كَيۡفَ محل نصب میں ہے اس کا عامل فعل ہے اَلَمۡ تَرَ نہیں کیونکہ اس میں استفہام کا معنی موجود ہے۔

## فیل کی لغوی تشریح

**مسئلہ نمبر2۔** بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ فیل (ہاتھی) ایک معروف جانور ہے اس کی جمع أفیال، فُیول اور فِیلہ آتی ہے۔ ابن سکیت نے کہا: تو افیلۃ نہ کہہ اس کی مونث فیلۃ ہے اس کے مالک سوار کو فَیّال کہتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا: یہ جائز ہے کہ فیل کا اصل وزن فُعل ہو تو یا کی وجہ سے اسے کسرہ دیا جائے گا، جس طرح کہا جاتا ہے: أبیَض، بِیض۔ اخفش نے کہا کہ فُعل کو فِعل بنانا یہ واحد کے صیغہ میں نہیں ہوتا یہ صرف جمع کے صیغہ میں ہوتا ہے۔ ایک جملہ بولا جاتا ہے: رجل فیل الرأی ایسا آدمی جس کی رائے کمزور ہو اس کی جمع افیال ہے اسی طرح رجل فال ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کی رائے کمزور ہو اور فہم و فراست میں خطا کرنے والا ہو۔ اس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فال الرأی یَفِیلُ فُیُولَۃ اسی طرح فیل رأیۃ تفییلا اس نے اپنی رائے کو کمزور کیا فھو فَیِّل الرأی۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 321

اصحاب فیل کا واقعہ

**مسئلہ نمبر** 3۔ اصحاب فیل کا واقعہ۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ ابرہہ نے صنعا میں قلیس بنایا یہ ایک گرجا تھا روئے زمین پر اس زمانہ میں اس کی مثل کوئی چیز نہ دیکھی گئی اور وہ نصرانی تھا پھر اس نے نجاشی کو خط لکھا: اے بادشاہ! میں نے تیرے لیے گرجا بنایا ہے جو بادشاہ آپ سے پہلے گزرے ہیں ان کے لیے ایسا گرجا نہیں بنایا گیا تھا میں اس سلسلہ کو اس وقت تک ختم نہ کروں گا یہاں تک کہ میں عربوں کے حج کو اس طرف پھیر دوں۔ جب عربوں کو ابرہہ کے خط کا پتہ چلا جو اس نے نجاشی کی طرف لکھا تھا تو نسأة (1) کا ایک آدمی اس پر غضبناک ہو گیا وہ اپنے گھر سے چلا اور گرجا میں آیا وہاں قضائے حاجت کی پھر وہاں سے نکلا اور اپنے علاقہ میں چلا گیا۔ اس کے بارے میں ابرہہ کو آگاہ کیا گیا۔ اس نے پوچھا: یہ کس نے کیا ہے؟ اسے بتایا گیا: یہ کام بیت اللہ شریف سے عقیدت رکھنے والوں میں سے ایک نے کیا ہے وہ بیت اللہ جو مکہ مکرمہ میں ہے جس کی طرف حج کرتے ہیں جب اس نے تیرے قول کو سنا کہ میں عربوں کے حج کو اس کی طرف پھیر دوں گا وہ آدمی غضبناک ہو گیا وہ آیا اور اس نے پاخانہ کر دیا یعنی یہ جگہ اس کے اہل نہیں۔ یہ بات سن کر ابرہہ غضبناک ہوا اور قسم اٹھائی وہ بیت اللہ کی طرف جائے گا اور اس کو گرا دے گا۔ اس نے ایک آدمی بنو کنانہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ بنو کنانہ کو اس گرجا کے حج کی دعوت دے، بنو کنانہ نے اس آدمی کو قتل کر دیا اس قتل نے ابرہہ کے غصہ میں اور اضافہ کیا پھر اس نے حبشیوں کو حکم دیا تو انہوں نے حملہ کی تیاری کی پھر وہ چلا اور ہاتھیوں کو بھی ساتھ لیا عربوں نے اس بارے میں سنا تو انہوں نے اس امر کو عظیم جانا اور اس وجہ سے گھبرائے اور یہ خیال کیا کہ اس کے خلاف جنگ کرنا ہم پر فرض ہے جب انہوں نے یہ سنا تھا کہ یہ بیت اللہ شریف کو گرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اہل یمن کے معززین اور اس کے بادشاہوں میں سے ایک آدمی ذونفر اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوا اس نے اپنی قوم کو دعوت دی اور عربوں میں سے جو بھی ابرہہ سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھا اور بیت اللہ شریف کے دفاع کے لیے تیار تھا سب کو دعوت دی کیونکہ ابرہہ بیت اللہ شریف کو گرانا چاہتا تھا اور اسے برباد کرنا چاہتا تھا تو اس کی آواز پر لبیک کہا جس نے بھی کہا۔ پھر وہ ذونفر ابرہہ کے بالمقابل آیا اس سے جنگ کی ذونفر اور اس کے ساتھیوں کو شکست ہوئی۔ ذونفر پکڑا گیا تو اسے ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا جب ابرہہ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو ذونفر نے اسے کہا: اے بادشاہ! مجھے قتل نہ کر ممکن ہے میرا تیرے ساتھ باقی رہنا تیرے حق میں میرے قتل سے بہتر ہو۔ ابرہہ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ ترک کیا اور اپنے ہاں قید کر دیا ابرہہ ایک بردبار آدمی تھا۔ پھر ابرہہ اپنے راستہ پر چلتا رہا جس مقصد کے لیے وہ نکلا تھا اس کا ارادہ کرتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ خثعم کے علاقہ میں تھا تو نفیل بن حبیب خثعمی اپنے دو قبیلوں شہران اور ناہس اور اپنے پیروکار عرب قبائل کے ساتھ سامنے آ گیا۔ ابرہہ سے جنگ کی اور ابرہہ نے اسے شکست دے دی نفیل کو پکڑ لیا گیا۔ اسے ابرہہ کے پاس لایا گیا جب ابرہہ نے نفیل کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو نفیل نے کہا: اے بادشاہ! مجھے قتل نہ کر میں عرب علاقے میں تیرا رہنما بنتا ہوں یہ میرے دونوں ہاتھ

1۔ النسأة ان لوگوں کو کہتے جو دور جاہلیت میں عربوں پر مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کا فیصلہ کیا کرتے تھے جس کے بارے میں قرآن میں بھی یہ حکم ہے۔ بے شک مہینے کو آگے پیچھے کرنا کفر میں زیادتی ہے۔

میرے دونوں قبیلوں شہران اور ناہس کی جانب سے حکم سننے اور طاعت کرنے پر تیری بیعت کرتے ہیں۔ اس نے نفیل کو چھوڑ دیا اور اسے ساتھ لے لیا تا کہ وہ راہنمائی کرے یہاں تک کہ ابرہہ جب طائف پہنچا تو مسعود بن معتب بنو ثقیف کے چند لوگوں کے ساتھ نکلا انہوں نے ابرہہ سے کہا: اے بادشاہ! ہم تیرے غلام ہیں، تیرے حکم سننے والے اور تیرے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں ہمارا تیرے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہمارا یہ گھر یعنی لات وہ گھر نہیں جس کا تو ارادہ کرتا ہے جس گھر کا تو ارادہ رکھتا ہے وہ مکہ مکرمہ میں ہے، ہم تیرے ساتھ وہ آدمی بھیج دیتے ہیں جو تیری راہنمائی کرے گا۔ ابرہہ نے ان سے درگزر کیا اور ابرہہ کے ساتھ ابورغال کو بھیج دیا یہاں تک کہ اسے مغمس کے ہاں ٹھہرایا جب اسے وہاں پڑاؤ کروایا تو ابورغال مرگیا عرب اس کی قبر پر پتھر مارتے ہیں مغمس میں یہ وہی قبر ہے جس پر لوگ پتھر مارتے ہیں۔ اس بارے میں شاعر کہتا ہے:

وأرجُمُ قبرَهٗ فی کلِّ عامٍ کرجْمِ الناس قبر أبی رِغالِ

میں ہر سال اس کی قبر پر پتھر مارتا ہوں جس طرح لوگ ابورغال کی قبر پر پتھر مارتے ہیں۔

جب ابرہہ مغمس میں ٹھہرا تو اس نے ایک حبشی کو ایک گھڑسوار دستے کے ساتھ بھیجا جس کو اسود بن مقصود کہتے وہ مکہ مکرمہ پہنچا تو اس نے اہل تہامہ یعنی قریش اور دوسرے لوگوں کے اموال ہانک لیے اور اس مال میں حضرت عبد المطلب بن ہاشم کے دو سو اونٹ بھی پائے۔ ان دنوں وہ قریش کے بزرگ اور سردار تھے۔ قریش، کنانہ، ہذیل اور جو لوگ حرم میں تھے انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ ابرہہ کا مقابلہ کریں پھر انہیں علم ہو گیا وہ ابرہہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو انہوں نے اس کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابرہہ نے حناطہ حمیری کو مکہ مکرمہ بھیجا اسے کہا: اس شہر کے سردار اور معزز آدمی کے بارے میں سوال کر پھر اسے کہہ: بادشاہ کہتا ہے میں تمہارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا میں تو اس گھر کو گرانے آیا ہوں اگر تم جنگ کرنے کے لیے میرے سامنے نہیں آؤ گے تو تمہارے خونوں سے ہولی کھیلنے میں مجھے کوئی غرض نہیں اگر وہ مجھ سے جنگ نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے میرے پاس لے آنا۔ جب حناطہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو اس نے قریش کے سردار اور معزز آدمی کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا وہ عبد المطلب بن ہاشم ہے وہ حضرت عبد المطلب بن ہاشم کے پاس آیا اور ابرہہ نے اسے جو پیغام دیا تھا وہ پیغام آپ کو دے دیا۔ عبد المطلب نے اسے کہا: اللہ کی قسم! ہم جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہمارے اندر اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے یہ بیت اللہ الحرام ہے اور اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم کا گھر ہے اگر اللہ تعالیٰ ابرہہ سے اس کا دفاع کرے تو یہ اس کا حرم اور اس کا گھر ہے اگر وہ اس کے لیے حلال کر دے تو اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو اس کا دفاع کرنے کی کوئی طاقت نہیں۔ حناطہ نے اسے کہا: اس کے پاس چلیے بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ میں تجھے اس کے پاس لے چلوں۔ حضرت عبد المطلب اس کے ساتھ گئے جب کہ کچھ بیٹے بھی آپ کے ساتھ تھے یہاں تک کہ لشکر میں پہنچے انہوں نے ذی نفر کے بارے میں پوچھا جو حضرت عبد المطلب کا دوست تھا حضرت عبد المطلب اس کے پاس گئے جب کہ وہ ابرہہ کی قید میں تھا اسے فرمایا: اے ذونفر! جو مصیبت ہم پر آئی ہے کیا اس سے بچاؤ کی صورت بھی ہے تو ذونفر نے کہا: ایک آدمی جو بادشاہ کی قید میں ہے وہ کیا فائدہ دے سکتا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ بادشاہ اسے صبح قتل کر دے یا شام قتل کر دے، جو مصیبت تم پر پہنچی ہے اس بارے میں تو تمہیں

کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا مگر انیس جو ہاتھی کا سائس ہے وہ میرا دوست ہے میں اس کی طرف پیغام بھیجتا ہوں میں اسے تیرے بارے میں تاکیدی بات کرتا ہوں اور تیرے حق کو اس پر عظیم گردانتا ہوں اور میں اس سے سوال کرتا ہوں کہ وہ بادشاہ سے تیری ملاقات کی اجازت مانگے تو جو مناسب سمجھے اس سے بات کر لینا اگر اسے کچھ اختیار ہوا تو وہ تیرے بارے میں سفارش کرے گا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا: یہ میرے لیے کافی ہے۔ ذونفر نے انیس کی طرف پیغام بھیجا ذونفر نے انیس سے کہا: عبدالمطلب قریش کے سردار ہیں، مکہ مکرمہ کے چشمہ کے مالک ہیں، میدانی علاقہ میں لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر وحشی جانوروں کو کھانا کھلاتے ہیں، بادشاہ نے ان کے دوسو اونٹ پکڑ لیے ہیں انہیں ملاقات کی اجازت لے دیں اور جتنی طاقت رکھتے ہو اتنا انہیں نفع پہنچائیں۔ انیس نے کہا: میں ایسا کروں گا۔ انیس نے ابرہہ سے گفتگو کی انیس نے کہا: اے بادشاہ! قریش کا سردار تیرے دروازے پر موجود ہے جو تجھ سے ملاقات کی اجازت چاہتا ہے وہ مکہ مکرمہ کے چشمہ کا مالک ہے، وہ میدانی علاقوں میں لوگوں کو کھانا کھلاتا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر وحشی جانوروں کو کھانا کھلاتا ہے اسے اندر آنے کی اجازت دیجئے تا کہ وہ آپ سے اپنی حاجت بیان کر سکے۔ ابرہہ نے آپ کو اجازت دے دی۔

حضرت عبدالمطلب بڑے وجیہ، عظیم اور خوبصورت آدمی تھے جب ابرہہ نے آپ کو دیکھا تو انہیں بڑا ذیشان جانا اور انہیں نیچے بٹھانے سے ماورا سمجھا ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور اپنے قالین پر بیٹھ گیا اور حضرت عبدالمطلب کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ پھر اس نے اپنے ترجمان سے کہا: انہیں کہو یہ اپنی حاجت کا ذکر کرے تو ترجمان نے حضرت عبدالمطلب سے یہ بات کہی حضرت عبدالمطلب نے کہا میری حاجت یہ ہے کہ بادشاہ میرے وہ دوسو اونٹ واپس کر دے جو اس نے پکڑ رکھے ہیں۔ جب ترجمان نے ابرہہ کو یہ بات بتائی تو ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا: اسے کہو جب میں نے تجھے دیکھا تھا تو نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا، جب تو نے گفتگو کی تو میرے ہاں تیرا وہ وقار باقی نہ رہا۔ کیا تو مجھ سے ان دوسو اونٹوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو میں نے پکڑ لیے ہیں جب کہ تو اس گھر کو چھوڑ رہا ہے جو تیرا اور تیرے آباء کا دین ہے اور میں اس گھر کو گرانے کے لیے آیا ہوں۔ تو اس کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا: میں تو صرف اونٹوں کا مالک ہوں بے شک اس گھر کا بھی ایک رب ہے جو اس کی حفاظت کر لے گا۔ ابرہہ نے ان کے اونٹ واپس کر دیئے۔ حضرت عبدالمطلب قریش کی طرف واپس چلے گئے۔ انہیں تمام واقعہ بتایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ مکہ مکرمہ سے نکل جائیں اور پہاڑوں کی چوٹیوں میں چھپ جائیں کیونکہ انہیں دشمن کے لشکر کی جانب سے اذیت کا خوف تھا۔ پھر حضرت عبدالمطلب اٹھے بیت اللہ شریف کے دروازہ کا حلقہ پکڑا اور ان کے ساتھ قریش کی ایک جماعت بھی کھڑی ہوئی وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے اور ابرہہ اور اس کے لشکر کے خلاف مدد کے طالب تھے۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا: جب کہ وہ بیت اللہ شریف کے دروازے کا حلقہ پکڑے ہوئے تھے:

لَاهُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حِلَالَكْ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ وَمِحَالُهُمْ عَدْوًا مِحَالَكْ

إنْ يَدْخلوا البلد الحرا م فأمرْ ما بَدَالَكْ

"اے اللہ! بندہ اپنے کجاوے کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے حرم کے باسیوں کی حفاظت فرما۔ ان کی صلیب اور ان کا مکر زمانہ قریب میں تیری تدبیر پر غالب نہ آجائے۔ اگر وہ بلد حرام میں داخل ہوں تو جو مناسب سمجھے ان کے ساتھ معاملہ کر۔

فأمرْ ما بَدَالَكْ سے مراد ہے ایسی چیز جو تجھے مناسب لگے اور وہ ایسی چیز ہے جو ہمارے بارے میں نہیں کیا کرتا تھا۔ حلال، حل کی جمع ہے اور محال کا معنی قوت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب حضرت عبدالمطلب نے بیت اللہ شریف کے دروازے کا حلقہ پکڑا تو کہا:

يا ربِّ لا أرْجو لَهُمْ سِواكا يا ربِّ فامنعْ منهُم حِماكْ

إنَّ عدوّ البيت مَنْ عاداكْ إنّهُمْ لم يقهروا قُواكا

اے میرے رب! میں تیرے سوا ان کے بارے میں کسی سے کوئی امید نہیں کرتا اے میرے رب! ان سے اپنی چراگاہ کی حفاظت فرما، بے شک تیرے گھر کا دشمن تجھ سے دشمنی کرنے والا ہے وہ تیری طاقت پر غالب نہیں آسکتے۔

عکرمہ بن عامر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار بن قصی نے کہا:

لاهُمَّ أخزِ الأسودَ بن مقصود الآخِذَ الهَجْمَةَ فيها التَّقْلِيدْ

بين حِراءٍ وثَبِيرٍ فالبِيدْ يحبسها وهي أولات التطريدْ

فضمها الى طماطِمٍ سُودْ قَدْ أجمَعُوا ألّا يكون مَعْبُودْ

ويهدموا البيتَ الحرامَ المَعْمُودْ والمَرْوَتَينِ والمَشَاعِرَ السُّودْ

أخفِرهُ يا ربِّ وأنت محمود

اے اللہ! اسود بن مقصود کو ذلیل و رسوا کر جس نے سو کے قریب اونٹوں کو پکڑ لیا جن کے گلوں میں قلادے تھے، وہ حرا، ثبیر کے درمیان تھے کھلے میدان نے انہیں محبوس کر رکھا تھا وہ پے در پے آنے والے ہیں۔ اس نے ان اونٹوں کو کالے عجمی کافر کے سپرد کر دیا انہوں نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ کوئی معبود نہ ہو اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ بیت حرام کو گرا دیں جس کا قصد کیا جاتا ہے وہ صفا و مروہ کے آثار مٹا دیں اور حجر اسود کو مٹا دیں اے میرے رب! اس کے عزم کو خاک میں ملا دے بے شک تو محمود ہے۔

ابن اسحاق نے کہا: پھر حضرت عبدالمطلب نے بیت اللہ شریف کے دروازے کا حلقہ چھوڑ دیا پھر وہ اور آپ کے ساتھی قریشی پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف چلے گئے وہاں انہوں نے پناہ لی اور انتظار کرنے لگے کہ ابرہہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر کیا کرتا ہے؟ جب ابرہہ نے صبح کی تو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی کو تیار کیا اپنے لشکر کو صف آرا کیا ہاتھی کا نام محمود تھا اور ابرہہ بیت اللہ شریف کو گرانے کا قصد کرنے والا تھا پھر یمن جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ جب انہوں نے مکہ مکرمہ کی طرف ہاتھی کو لے جانا چاہا تو نفیل بن حبیب آگے بڑھا یہاں تک کہ وہ ہاتھی کے پہلو میں جا کھڑا ہوا پھر اس کا کان پکڑا اسے کہا: اے محمود! بیٹھ جا جہاں سے آیا تھا اس کی طرف لوٹ جا کیونکہ تو اللہ تعالیٰ کے حرمت والے شہر میں ہے پھر اس کا کان چھوڑ

دیا ہاتھی بیٹھ گیا نفیل بن حبیب دوڑتا ہوا نکل گیا یہاں تک کہ وہ پہاڑ پر چڑھ گیا انہوں نے ہاتھی کو اٹھانے کے لیے مارا تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا انہوں نے اس کے سر میں کلہاڑا مارا تا کہ وہ اٹھے تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا انہوں نے اس کے پیٹ میں ایسے عصا مارے جس کے سرے مڑے ہوئے تھے انہوں نے اسے لہولہان کر دیا تا کہ وہ اٹھے تو اس نے پھر بھی انکار کر دیا انہوں نے اس کا منہ یمن کی طرف کیا تو وہ دوڑ پڑا انہوں نے اس کا منہ شام کی طرف کیا تو پھر بھی اس نے اسی طرح کیا تو وہ دوڑ پڑا انہوں نے اس کا منہ مشرق کی طرف کیا تو اس نے اس طرح کیا انہوں نے اس کا منہ مکہ مکرمہ کی طرف کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی جانب سے ان پر پرندے بھیجے جو خطاطیف (1) اور بلسان (2) جیسے تھے ہر پرندے کے ساتھ تین پتھر تھے ایک پتھر اس کی چونچ میں تھا دو پتھر اس کے پاؤں میں تھے جو چنے اور مسور کی دال کے درمیان تھے لشکر والوں میں سے جسے بھی وہ پہنچتا وہ ہلاک ہو جاتا وہ سب کو نہ لگے وہ بھاگتے ہوئے نکلے وہ اس راستہ پر جلدی جلدی جا رہے تھے جس سے وہ آئے تھے وہ نفیل بن حبیب کے بارے میں پوچھ رہے تھے تا کہ یمن کے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرے اللہ تعالیٰ نے جو عذاب ان پر نازل کیا تھا جب نفیل نے وہ دیکھا تو کہا:

أَيْنَ المَفَرُّ والإِلَهُ الطَّالِبُ والأَشْرَمُ المغلوبُ لَيْسَ الغالبُ

اب بھاگنے کے لیے کہاں جگہ ہے جب کہ اللہ تعالیٰ تلاش میں ہوا شرم مغلوب ہے وہ غالب نہیں۔

اس نے یہ بھی کہا:

حَمِدْتُ الله إذا أبصرتُ طَيْرًا وخِفت حِجَارة تُلْقَى علينا

فكلُّ القومِ يسأل عن نُفَيلٍ كأنَّ عَلَيَّ لِلْحُبْشَانِ دَيْنَا

جب میں نے پرندوں کو دیکھا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی وہ ان پتھروں سے ڈر رہا تھا جو ہم پر پھینکے جا رہے تھے تمام نفیل کے بارے میں پوچھ رہے تھے گویا حبشیوں کا مجھ پر کوئی قرض تھا۔

وہ ہر راستہ پر گرتے پڑتے نکل پڑے، وہ ہر میدانی جگہ میں مرتے جا رہے تھے ابرہہ کے جسم میں بیماری لگ گئی وہ اسے لے کر نکل پڑے اس سے پورا پورا گر رہا تھا جب بھی اس سے پورا بھر حصہ گرتا اس سے پیپ نمودار ہوتی اور خون اور پیپ پھوٹ پڑتی یہاں تک کہ وہ اسے صنعاء لے آئے وہ پرندے کے ایک چوزے کی طرح تھا اسے اس وقت موت واقع نہ ہوئی یہاں تک کہ اس کے دل کی جگہ سے اس کا سینہ پھٹ گیا۔ اسی طرح علماء نے گمان کیا ہے۔

کلبی اور مقاتل بن سلیمان (ہر ایک دوسرے سے کچھ کم و بیش نقل کرتا ہے) نے کہا: ابرہہ کے حملہ کا سبب یہ تھا کہ قریش کے کچھ لوگ نجاشی کے ملک کی طرف تاجر کی حیثیت سے نکلے تو وہ سمندر کے کنارے عیسائیوں کے ایک کلیسا کے پاس اترے جسے نصاریٰ ہیکل کہتے انہوں نے کھانا پکانے کے لیے آگ جلائی اس آگ کو اسی طرح چھوڑ دیا اور کوچ کیا آگ پر تیز ہوا چلی تو اس کلیسا پر آگ بھڑکا دی جس سے وہ جل گیا۔ خبر دینے والا نجاشی کے پاس آیا اور اسے واقعہ سنایا وہ غصہ سے بھڑک اٹھا اس

---

1۔ لمبے بازوؤں والا اور چھوٹے پاؤں والا سیاہ رنگ کا پرندہ۔

2۔ چڑیا سے بڑا پرندہ بعض مکمل کالے اور بعض چتکبرے ہوتے ہیں۔

کے پاس ابرہہ بن صباح، حجر بن شرحبیل اور ابو یکسوم کندیون آئے اور ضمانت اٹھائی کہ وہ کعبہ کو جلائیں گے اور اہل مکہ کو قیدی بنا کر لائیں گے۔ نجاشی بادشاہ تھا اور ابرہہ امیر لشکر تھا ابو یکسوم بادشاہ کا ہم پیالہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ اس کا وزیر تھا اور حجر بن شرحبیل اس کے قائدین میں سے ایک تھا(1)۔ مجاہد نے کہا: ابو یکسوم ہی ابرہہ تھا۔ وہ سب چلے ان کے ساتھ ہاتھی تھا۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ ہاتھی ایک ہی تھا۔ ضحاک نے کہا: آٹھ ہاتھی تھے۔ وہ ذی مجاز کے مقام پر اترے اور مکہ کے جانور ہانک لیے جن میں حضرت عبدالمطلب کے اونٹ بھی تھے چرواہا خبردار کرنے کے لیے آیا وہ صفا پر چڑھا اور بلند آواز سے اعلان کیا وا صباحاہ۔ پھر لوگوں کو لشکر اور ہاتھیوں کے آنے کی خبر دی۔ حضرت عبدالمطلب نکلے اور ابرہہ کے پاس گئے اور اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ نجاشی کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نجاشی بھی ان کے ساتھ تھا، اکثر علماء کی رائے ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہیں تھا اہل مکہ نے پرندے دیکھے جو سمندر کی جانب سے آئے تھے حضرت عبدالمطلب نے کہا: یہ پرندے ہمارے علاقہ میں اجنبی ہیں نہ یہ نجد، نہ یہ حجاز اور نہ ہی تہامہ کے علاقہ کے ہیں یہ تو شہد کی مکھیوں کے امیر کی طرح ہیں۔ ان کی چونچوں اور پاؤں میں پتھر تھے جب وہ ابرہہ کے لشکر کے پاس آئے تو ان پتھروں کو ان پر پھینکا تو وہ ہلاک ہو گئے۔

عطا بن رباح نے کہا: پرندے پچھلے پہر آئے انہوں نے رات گزاری پھر اگلے دن ان پر صبح کی اور ان پر پتھر پھینکے۔ کلبی نے کہا: ان کی چونچوں میں ایسی ٹھیکری تھی جو ناخن پر رکھ کر پھینکی جا سکتی ہے یہ جھنڈ کے جھنڈ آئے ایک پرندہ تھا جو ان کی قیادت کر رہا تھا جس کی چونچ سرخ اور سیاہ، گردن لمبی تھی جب وہ لشکر کے پاس پہنچے تو اپنی چونچوں میں موجود چیز کو نیچے والے افراد پر پھینکا ہر پتھر پر مقتول کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا: ہر پتھر پر لکھا ہوا تھا جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وہ نجات پا گیا اور جس نے اس کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا پھر جہاں سے وہ پرندے آئے تھے اس کی طرف لوٹ گئے۔ عوفی نے کہا: میں نے حضرت ابو سعید خدری سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: مکہ مکرمہ کے کبوتر انہیں میں سے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: پتھر ان میں سے کسی کے خود پر پڑتا تو اسے پھاڑ دیتا پھر وہ اس کے دماغ میں لگتا وہ ہاتھی اور جانوروں کو پھاڑ دیتا اور سختی سے گرنے کی وجہ سے زمین میں غائب ہو جاتا۔ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار افراد کا تھا ان کے امیر کے سوا کوئی واپس نہ لوٹا۔ وہ لوٹا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی جماعت تھی جب انہوں نے اپنے مشاہدہ کو لوگوں پر بیان کیا تو وہ بھی ہلاک ہو گئے۔

واقدی نے کہا: ابرہہ اس نجاشی کا دادا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہوا ابرہہ ہی اشرم ہے اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اس کی ارباط کے ساتھ جنگ ہوئی تھی یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف چلے پھر ان دونوں کا اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ دونوں باہم مقابلہ کریں گے جو بھی غالب آ گیا حکومت اس کی ہو گی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی ارباط بڑا موٹا تازہ بھاری بھرکم انسان تھا اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا جب کہ ابرہہ چھوٹے قد اور گھٹے جسم والا تھا بردبار اور نصرانیت میں بڑا پختہ تھا اس نے ابرہہ کے سر پر وار کیا جو اس کی پیشانی پر لگا جس نے اس کی آنکھ، ناک، پیشانی اور

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 322

ہونٹ کو زخمی کر دیا اسی وجہ سے اسے اشرم کہتے ہیں عتودہ نے ارياط پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا حبشہ کی حکومت ابرہہ کے ہاتھ آ گئی نجاشی غضبناک ہو گیا اس نے قسم اٹھائی کہ وہ ابرہہ کی پیشانی کے بالوں کو کاٹے گا اور اس کے ممالک کو روند ڈالے گا ابرہہ نے اپنے بال کاٹے اور اپنے علاقہ کی مٹی سے ایک توشہ دن بھرا اور دونوں چیزیں نجاشی کی طرف بھیج دیں اور کہا: وہ بھی تیرا غلام تھا اور میں بھی تیرا غلام ہوں میں حبشہ کے معاملات چلا رہا ہوں میں نے اپنی پیشانی کے بالوں کو کاٹا ہے اور اپنے ملک کی مٹی بھی تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو اسے روندے اور اپنی قسم پور کرے۔ اس طرح نجاشی اس پر راضی ہو گیا پھر ابرہہ نے صنعاء میں ایک کنیسہ بنایا تاکہ عرب کے حاجیوں کو اس کی طرف پھیر دے۔

عام الفیل اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت

**مسئلہ نمبر 4**۔ مقاتل نے کہا: عام الفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے (1)۔ کلبی اور عبید بن عمیر نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے تیئس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ صحیح روایت وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ فرمایا: ''میں عام الفیل کو پیدا ہوا''۔ ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ یوم الفیل فرمایا۔ ماوردی نے اپنی تفسیر میں یہ کہا۔ اور کتاب ''اعلام النبوۃ'' میں کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ اصحاب الفیل کے واقعہ کے پچاس دن بعد آپ کی ولادت ہوئی تھی یہ رومیوں کے مہینوں کے فروری کے مہینے کے موافق بنتا ہے اور ہرمز بن انوشیروان کے بارہویں سال کے موافق بنتا ہے۔

ابو جعفر طبری نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت نوشیروان بادشاہ کو بیالیس سال گزر جانے پر ہوئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت آمنہ نے محرم کے عاشوراء کے روز سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحم میں لیا اور رمضان شریف کے بارہ دن گزر چکے تھے کہ پیر کے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی آپ کے حمل کی مدت آٹھ ماہ اور دو دن تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت محرم کے مہینے کے یوم عاشوراء کے دن ہوئی تھی، اسے ابن شاہین ابو حفص نے یوم عاشوراء کے فضائل میں بیان کیا۔ ابن عربی نے کہا: ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام الفیل کو پیدا ہوئے (2)۔ حضرت قیس بن مخرمہ نے کہا: میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہاتھی والے سال میں پیدا ہوئے (3)۔ لوگوں نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: آدمی کی مروت میں سے ہے کہ وہ اپنی عمر کے بارے میں نہ بتائے کیونکہ اگر وہ چھوٹا ہوگا تو لوگ اس کو حقیر جانیں گے اگر وہ بڑا ہوگا تو اسے بوڑھا خیال کریں گے۔ یہ ضعیف قول ہے کیونکہ امام مالک سے یہ توقع نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر بتائیں اور اپنی عمر کو پوشیدہ کریں جب کہ جن علماء کی اقتدا کی جاتی ہے ان میں سے یہ عظیم ہیں۔

عبد الملک بن مروان نے حضرت عتاب بن اسید سے کہا: تو بڑا ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ تو اس نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 338	2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1980

3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب ما جاء فی میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 3552، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ سے ابتدا میں بڑے ہیں اور میں عمر میں ان سے زیادہ ہوں۔ نبی کریم ﷺ عام الفیل کو پیدا ہوئے جب کہ میں نے ہاتھی کے سائس اور اس کے قائد کو اندھا اور اپاہج دیکھا ہے وہ دونوں لوگوں سے کھانا طلب کرتے تھے۔ ایک قاضی سے کہا گیا: تیری عمر کتنی ہے؟ اس نے جواب دیا: جب نبی کریم ﷺ نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ کا والی بنایا تو اس وقت اس کی عمر بیس سال سے کم تھی۔

### اصحاف فیل کا واقعہ معجزہ نبی ﷺ

**مسئلہ نمبر 5۔** ہمارے علماء نے کہا: ہاتھی والا قصہ معجزات نبوی میں سے ہے اگرچہ یہ آپ ﷺ کی پیدائش اور چیلنج سے قبل ہوا کیونکہ یہ واقعہ آپ کے امر کی تاکید اور آپ کی شان کی تمہید تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس سورت کی تلاوت کی تو اس وقت مکہ مکرمہ میں بے شمار لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا اسی وجہ سے فرمایا: اَلَمْ تَرَ مکہ مکرمہ میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا مگر اس نے ہاتھی کی قیادت کرنے والے اور اس کے ہانکنے والے کو اندھا دیکھا جو لوگوں سے سوال کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے چھوٹی عمر کے باوجود یہ کہا: میں نے ہاتھی کے قائد اور اس کے سائس (ہانکنے والے) کو اندھا دیکھا جو لوگوں سے کھانا مانگتے تھے۔ ابو صالح نے کہا: میں نے حضرت ام ہانی جو ابو طالب کی بیٹی تھیں کے گھر میں ان پتھروں کے تقریباً دو قفیز دیکھے جو سیاہ تھے اور سرخ لکیریں ان پر موجود تھیں۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝

''کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے مکروفریب کو ناکام نہیں بنا دیا۔

تضلیل کا معنی باطل کرنا اور ضائع کرنا ہے کیونکہ ہاتھی والوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ قریش کو قتل کریں گے اور انہیں گرفتار کریں گے اور بیت اللہ شریف کے بارے میں انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اسے برباد کر دیں گے۔ حضرت عبد المطلب سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ کو بھیجا کہ وہ دیکھے کہ انہوں نے پرندوں سے کیا پایا ہے تو حضرت عبد اللہ کیا دیکھتے ہیں کہ سب لوگ ٹکڑے ٹکڑے پڑے ہیں وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے ان کی ران سے کپڑا ہٹا ہوا تھا جب انہیں ان کے والد نے دیکھا تو فرمایا: میرا یہ بیٹا عربوں میں سے شاہسوار ہے اس نے ران سے کپڑا نہیں ہٹایا مگر بشارت دینے کی وجہ سے یا ڈرانے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ جب وہ مجلس کے قریب ہوئے کہ وہ اپنی آواز لوگوں کو سنا سکتے تھے لوگوں نے پوچھا: پیچھے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو فرمایا: سب لوگ ہلاک ہو گئے۔ حضرت عبد المطلب اور ان کے ساتھی نکلے انہوں نے ابرہہ کے لشکر میں مرنے والے لوگوں کا سامان لے لیا بنی عبد المطلب کے اموال اسی وجہ سے بنے اور اسی مال کی وجہ سے حضرت عبد المطلب کی سرداری (1) مکمل ہوئی کیونکہ سونے اور چاندی میں سے جو چاہا اٹھا لیا پھر اہل مکہ نکلے اور ان لشکریوں کا سامان لوٹا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عبد المطلب نے دو گڑھے کھود کر ان کو سونے اور جواہرات سے بھر دیا پھر ابو مسعود ثقفی سے کہا جو حضرت

---

1۔ یہ تعبیر پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے ایک طرف تو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ پہلے قریش کے سردار تھے جو چشمہ کے مالک تھے لوگوں اور جانوروں کو کھانا اور خوراک دیتے اور دوسری طرف ابرہہ کے لشکر کے اموال کی وجہ سے سرداری مکمل ہوئی۔ مترجم

عبدالمطلب کا دوست تھا۔ ان دونوں میں سے جو چاہو لے لے پھر لوگوں نے حبشیوں کے اموال کو لیا یہاں تک کہ ان کے ہاں جگہیں کم پڑ گئیں حضرت عبدالمطلب نے اس موقع پر کہا۔

أَنْتَ مَنَعْتَ الحُبُش والأفيالا وقد رَعَوْا بمكّة الأجبالا

وقد خشِينا منهم القتالا وكلّ أمرلهم مِعْضَالا

شكرا وحمدا لك ذا الجلالا

اے اللہ! تو نے حبشیوں اور ہاتھیوں کو روکا جب کہ انہوں نے تو مکہ مکرمہ میں پہاڑوں کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا ہم تو ان کے ساتھ جنگ کرنے سے ڈرے اور ان کی جانب سے ہر مشکل امر سے ڈرے۔ اے رب ذوالجلال! تیرا شکر ہے اور تیرے لیے حمد ہے۔

ابن اسحاق نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو مکہ مکرمہ سے واپس کر دیا تو عربوں نے قریش کو بڑی عظمت دی انہوں نے کہا: یہ اللہ والے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب سے قتال کیا اور ان کے دشمن کی مؤنت سے انہیں کافی ہو گئے۔ عبداللہ بن عمر ابن مخزوم نے اصحاب فیل کے قصہ میں کہا:

أَنْتَ الجليلُ ربَّنَا لم تُدنِس أَنْتَ حبستَ الفِيل بالمُغَمِّس

من بعد ماهَمّ بشئٍ مُبْلِس حبسته فى هيئة المُكَرْكَس

ومالهم من فرج ومنفس

اے ہمارے رب! تو جلیل الشان ہے تو کمزوری سے آلودہ نہیں تو نے مغمس کے مقام پر ہاتھیوں کو روک لیا کہ بعد اس کے کہ اس نے تکلیف دہ شر کا ارادہ کیا تھا تو نے اسے اوندھے منہ روک لیا۔ ان کے لیے کوئی آسانی اور راحت والی چیز نہ تھی۔

وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ﴿۳﴾

''اور (وہ یوں کہ) بھیج دیئے ان پر ہر سمت سے پرندے ڈاروں کے ڈار''۔

سعید بن جبیر نے کہا: ہر آسمان کے پرندے تھے اس سے قبل اور نہ اس کے بعد اس قسم کے کوئی پرندے دیکھے گئے۔ جو یبر نے ضحاک سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''وہ ایسے پرندے تھے جو آسمان اور زمین کے درمیان گھونسلے بناتے اور بچے دیتے تھے'' (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی سونڈیں تھیں جس طرح ہاتھی کی سونڈ ہوتی ہے اور ان کے پنجے کتے کے پنجوں جیسے تھے (2)۔ عکرمہ نے کہا: وہ سبز پرندے تھے جو سمندر سے نکلے تھے ان کے سر درندوں کے سر جیسے تھے اس جیسے پرندے نہ اس سے قبل دیکھے گئے اور نہ اس کے بعد دیکھے گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: وہ پرندے خطاطیف (3) کے زیادہ مشابہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ وطاویط کے زیادہ مشابہ تھے وہ سرخ و سفید تھے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 323 2۔ ایضاً 3۔ آنکس کی طرح ایک قسم کا ٹیڑھا لوہا جس کے ساتھ کسی چیز کو اچک لیا جاتا ہے۔

سعید بن جبیر سے یہ بھی قول مروی ہے: یہ سبز پرندے تھے جن کی زرد چونچیں تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ سفید تھے۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ سیاہ سمندری پرندے تھے ان کی چونچوں اور ناخنوں میں پتھر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ نادر و نایاب عنقاء تھے جن کی ضرب الامثال ذکر کی جاتی ہیں۔ عکرمہ نے کہا: ابابیل کا معنی مجتمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی پے در پے ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے تھے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے مختلف جدا جدا۔ کچھ ادھر سے آتے یہاں سے وہاں تک؛ یہ حضرت ابن مسعود، ابن زید اور اخفش کا نقطہ نظر ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سب اقوال متفق ہیں اس کا حقیقی معنی تو یہ ہے وہ بڑی بڑی جماعتیں تھیں۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے: فلان یؤبل علی فلان۔ فلاں اس پر عظیم ہوتا ہے اور کثیر ہوتا ہے یہ ابل سے مشتق ہے أبابیل کے واحد میں اختلاف ہے۔ جوہری نے کہا: اخفش کہتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: جاءت إبلك أبابيل تیرے اونٹ تھوڑے تھوڑے آئے اور طَيْرًا اَبَابِيْلَ ٹولیوں کی صورت میں پرندے آئے۔ کہا: یہ کثرت کے معنی میں آتا ہے یہ ایسی جمع ہے جس کا کوئی واحد نہیں۔ بعض نے کہا: اس کا واحد ابول ہے جس طرح عجول۔ بعض یعنی مبرد نے کہا: اس کا واحد ابیل ہے جسے سکین ہوتا ہے۔ کہا: میں نے عربوں کو نہیں پایا کہ وہ اس کا واحد جانتے ہوں مگر صحاح میں ہے کہ وہ اس کا واحد جانتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا واحد ابال ہے رؤبہ بن عجاج نے اس کی جمع کے بارے میں کہا:

ولعبت طيرٌ بِهِمْ أبابيلْ     فصُيِّرُوا مِثْلَ كَعَصْفٍ مَأكُولْ

پرندوں کے جھنڈ ان کے ساتھ کھیلے تو انہیں کھاتے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا گیا۔

اعشی نے کہا:

طَرِيقٌ و جَبَّارٌ رِواءٌ أُصولُهُ     عَليهِ أبابيلٌ من الطَّيْرِ تَنْعَبُ

راستہ اور کھجور کا لمبا درخت جس کی جڑوں کو سیراب کیا گیا ہے جس پر پرندوں کے جھنڈ آوازیں لگا رہے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تَراهُمْ إلى الداعي سِرَاعا كأنَّهُمْ     أبابيلُ طَيْرٌ تَحْتَ دَجْنٍ مُسَخَّنِ

تو انہیں دیکھے گا کہ وہ داعی کی جانب تیزی سے جا رہے ہیں گویا وہ پرندوں کے جھنڈ ہیں جو تکلیف دہ تاریکی کے نیچے ہیں۔

فراء نے کہا: اس کا لفظوں میں واحد نہیں (1) رؤاسی جو ثقہ ہے نے گمان کیا کہ انہوں نے اس کے واحد کے بارے میں سنا کہ اس کا واحد اباله ہے۔ فراء نے اباله بیان کیا ہے کہا: میں نے ایک عرب سے سنا وہ کہتا ہے ضغث علی ابالة اس سے وہ شادابی پر مراد لیتے ہیں۔ کہا: اگر کوئی کہنے والا یہ کہے ایبال تو یہ درست ہوتا جس طرح دینار کی جمع دنانیر آتی ہے۔ اسحاق بن عبد اللہ بن حارث بن نوفل نے کہا: ابابیل یہ ابل مؤبلہ سے ماخوذ ہے یعنی ٹکڑیاں ٹکڑیاں، ریوڑ۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 324

''جو برساتے تھے ان پر کنکر کی پتھریاں''۔

صحاح میں یہ وضاحت ہے: حجارۃ بن سجیل علماء نے کہا: مٹی سے بنے پتھر جن کو جہنم کی آگ سے پکایا گیا تھا ان میں لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ ۝ مُّسَوَّمَةً (الذاریات) تا کہ ہم برسائیں ان پر گارے کے بنے ہوئے پتھر (کھنگر)۔

عبدالرحمن بن ابزی نے کہا: مِّنْ سِجِّيلٍ کا معنی ہے آسمان سے نازل ہوئے یہ وہ پتھر تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر نازل ہوتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جہنم سے آتے تھے یہی سجین ہے پھر لام کو نون سے بدل دیا، جس طرح اصیلان اصل میں اصیلال تھا۔ ابن مقبل نے کہا:

ضَرْبًا تَوَاصَتْ بِهِ الأَبْطَالُ سِجِّينَا

اس مصرعہ میں سجین، سجیل تھا۔

زجاج نے کہا: مِّنْ سِجِّيلٍ کا معنی ہے جو ان کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ اس کے ساتھ انہیں عذاب دیا جائے گا یہ سجل سے مشتق ہے۔ سورۂ ہود میں سجیل کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ عکرمہ نے کہا: وہ پرندے ان پتھروں کو پھینکتے جو ان کے پاس ہوتے تھے ان میں سے جسے وہ پتھر لگتا تو اس کی وجہ سے اس کے جسم میں ایسا چیچک کا دانہ نکلتا جیسا پہلے نہیں دیکھا گیا ہوتا تھا وہ پتھر چنے کے برابر اور مسور سے بڑا ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پتھر جب ان میں سے کسی کو لگتا تو اس کے چمڑے میں آبلہ سا بنتا یہ چیچک کا آغاز ہوتا۔ عام قراءت ترمیھم ہے کیونکہ پرندوں کی جماعت مونث ہے۔ اعرج اور طلحہ نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے معنی ہوگا اللہ تعالیٰ ان کی طرف پھینکتا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: 17) بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مذکر کی صورت میں ضمیر طیر کی طرف لوٹ رہی ہو کیونکہ لفظ طیر تانیث کی علامت سے خالی ہے کیونکہ یہ مونث غیر حقیقی ہے۔

## فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝

''پس بناڈالا ان کو جیسے کھایا ہوا بھوسہ''۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو کھیتی کے ان پتوں کی طرح بنا دیا جن کو چوپاؤں نے کھالیا اور انہیں نیچے کی جانب سے پھینک دیا ان کے جوڑوں کے ٹوٹ جانے کو ان کے اجزاء کے بکھر جانے سے تشبیہ دی، یہی معنی ابن زید اور دوسرے علماء سے مروی ہے۔ سورۂ رحمٰن میں عصف کے بارے میں قول گزر چکا ہے۔ جو چیز اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد کھیتی کے پتے ہیں وہ علقمہ کا قول ہے:

تَسْقِي مَذَانِبَ قَدْ مَالَتْ عَصِيفَتُهَا حُدُورُهَا من أَتِيِّ الماءِ مَطْمُوم

رؤبہ بن عجاج نے کہا:

وَمَسَّهُمْ مَا مَسَّ أَصْحَابَ الفِيلْ تَرْمِيهِمْ حِجَارَةٌ مِنْ سِجِّيلْ

وَلَعِمتُ طَيْرٌ بِهِمْ أَبابِيلُ فَصُيِّروا مِثْلَ كَعَصْفٍ مَأْكُولُ

انہیں وہ مصیبت پہنچی جو اصحاب فیل کو پہنچی تھی ان پر مٹی سے بنے پتھر گر رہے تھے ان سے پرندوں کے جھنڈ کھیلتے تو انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا دیا گیا۔

عصف جمع ہے اس کا واحد عصفہ، عصافہ اور عصیفہ ہے کَعَصْفٍ میں جو کاف لایا گیا ہے یہ تشبیہ کے لیے ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) ماکول کا معنی ہے جس کا دانہ کھایا گیا ہو۔ جس طرح یہ جملہ کیا جاتا ہے: فلان حَسَنٌ ای فلانٌ حَسَنٌ وجهه۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ سے مراد گندم کا چھلکا ہے یعنی وہ غلاف جس میں گندم کا دانہ ہوتا ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے: پتھر ان میں سے ایک پر گرتا تو اس کے پیٹ میں جو کچھ ہوتا وہ نکل جاتا تو وہ اسی طرح باقی رہ جاتا جس طرح گندم کا چھلکا ہو جب اس سے گندم نکل جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب پرندوں نے پتھر پھینکے تو اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیج دیا جس نے پتھروں کو مارا اور ان کی سختی میں اضافہ کر دیا۔ وہ پتھر کسی پر نہ گرتا مگر وہ ہلاک ہو جاتا۔ بنو کندہ کے ایک فرد کے سوا ان میں سے کوئی بھی نہ بچا اس نے کہا:

فَإِنَّكِ لَوْ رَأَيْتِ وَلَمْ تَرِيه لدى جنب المُغَمَّس مالَقِينا

اگر تو دیکھتی اور تو اسے نہ دیکھے مغمس کے پہلو میں جو ہمیں مصیبت پہنچی۔

خَشِيتُ الله إذ قد بَث طَيْرا وظِلّ سحابةٍ مَرت عَلَيْنَا

میں اللہ تعالیٰ سے ڈرا جب اس نے پرندوں کو پھیلا دیا اور بادل کا سایہ جب ہمارے اوپر سے گزرا۔

وباتت كلها تدعو بِحَقٍ كأن لها على الحُبْشَانِ دَيْنَا

سب نے صدق دل سے دعا کرتے ہوئے رات گزاری گویا پرندوں میں سے ہر ایک کا حبشیوں پر قرض تھا۔

ایک روایت یہ کی گئی ہے کہ وہ پتھر تمام کو نہیں لگے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے جس کو چاہا تھا اسے لگے تھے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ ان کا امیر اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت واپس لوٹی تھی جب انہوں نے اس امر کی خبر دی جو انہوں نے حالات و واقعات دیکھے تھے تو سب ہلاک ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ابن اسحاق نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو مکہ مکرمہ سے لوٹایا تھا تو عربوں نے قریش کو بڑی عزت دینا شروع کی اور کہا: یہ اللہ والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب سے قتال کیا اور ان کے دشمن کی مصیبت کے لیے کافی ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لیے انعام تھا۔

# سورۃ القریش

(آیاتھا ۴) (۱۰۶ سورۃ قریش مکیۃ ۲۹) (رکوعھا ۱)

جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے (1)۔ اور ضحاک وکلبی کے نزدیک مدنی ہے۔ اس کی چار آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ

''اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں الفت پیدا کر دی''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ سورت معنی میں ماقبل سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے اصحاب فیل کو ہلاک کیا تا کہ قریش باہم الفت کرنے لگیں یا باہم متفق ہو جائیں یا قریش امن میں ہو جائیں اور اپنے دونوں سفروں سے مانوس ہو جائیں۔ جنہوں نے دونوں سورتوں کو ایک سورت شمار کیا ہے وہ حضرت ابی بن کعب ہیں، ان کے مصحف میں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: ہمارا ایک امام تھا جو دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا وہ ان دونوں کو اکٹھا پڑھا کرتا تھا۔ عمرو بن میمون اودی نے کہا: ہم نے مغرب کی نماز حضرت عمر بن خطاب کے پیچھے پڑھی تو انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ التین کی تلاوت کی اور دوسری میں اَلَمْ تَرَ كَیْفَ اور لِاِیْلٰفِ قریش پڑھی۔ فراء نے کہا: یہ سورت پہلی سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہے (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کے سامنے اپنی اس عظیم نعمت کا ذکر کیا جو اس نے حبشہ کے ساتھ وہ سلوک کر کے کی تھی پھر فرمایا: ہم نے یہ اصحاب فیل کے ساتھ اس لیے کیا تا کہ قریش پر احسان ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش اپنی تجارت کے لیے نکلتے دور جاہلیت میں نہ ان پر کوئی حملہ کیا جاتا اور نہ بری نیت سے ان کے قریب ہوا جاتا۔ لوگ کہتے: وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے خادم ہیں یہاں تک کہ ہاتھی والا آیا تا کہ کعبہ کو گرائے، اس کے پتھر اٹھا لے جائے اور ان کے ساتھ یمن میں گھر بنائے لوگ جس کا حج کیا کریں اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمت کو یاد دلایا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ اس لیے کیا تا کہ قریش اس سفر سے مانوس ہوں اور ان پر حملہ کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے؛ مجاہد کا یہی قول ہے۔ اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت نقل کی ہے اس کا یہی معنی ہے (3)؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ احمد بن شعیب، عمرو بن علی سے وہ عامر بن ابراہیم سے۔ جو لوگوں میں سے اچھا اور قابل اعتماد تھا۔ وہ خطاب بن جعفر بن ابی مغیرہ سے وہ اپنے باپ جعفر سے وہ سعید بن جبیر سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اس کا معنی ہے قریش پر میرا احسان یہ ہے کہ انہیں موسم سرما اور موسم گرما میں سفر میں مانوس کر دیا۔ کہا: وہ مکہ مکرمہ میں موسم سرما

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 325 | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 327

گزارتے اور طائف میں موسم گرما گزارا کرتے تھے۔ اس تاویل کی بنا پر آیات کے سروں پر وقف کرنا جائز ہے اگرچہ کلام مکمل نہیں جس طرح سورت کے درمیان اس کی وضاحت کریں گے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ ماقبل کے ساتھ متصل نہیں کیونکہ دونوں سورتوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ ہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ پہلی سورت ختم ہو چکی ہے اور دوسری شروع ہو چکی ہے اور لام فَلْيَعْبُدُوْا کے متعلق ہے یعنی ان لوگوں کو اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے کیونکہ انہیں خوراک کے حصول کے لیے موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے مانوس کر دیا۔ خلیل نے اس طرح کہا کہ یہ متصل نہیں گویا فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قریش کو مانوس کیا پس انہیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے؛ یہ کسائی اور اخفش نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا کہ لام، الی کے معنی میں ہے ابن عامر نے اسے لالٓاف قریش پڑھا ہے(1) یعنی یہ کلمہ ہمزہ کے ساتھ اس میں یاء کے بغیر اختلاس کا قاعدہ جاری ہوا ہے۔ ابوجعفر اور اعرج نے اسے لیلاف پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے بغیر مقصود تخفیف تھا۔ باقی قراء نے لایلاف پڑھا ہے یاء کے ساتھ جبکہ اس سے پہلے ہمزہ ہے اس میں اشباع کا قاعدہ جاری کیا ہے۔ یہ آلفت، أولف، ایلاف ہے۔ شاعر نے کہا:

المُنْعِمِین إذا النجوم تغیرتْ والظاعنینَ لرحلةِ الإیلافِ

جب ستارے متغیر ہو جاتے ہیں تو وہ انعام کرنے والے ہیں اور ایلاف کے سفر کا ارادہ کرنے والے ہیں۔

یوں باب چلایا جاتا ہے: أَلِفتهٗ إِلفا وإِلافا۔ ابوجعفر نے اسے لِإِلفِ بھی پڑھا ہے۔ شاعر نے دونوں لفظوں کو جمع کر دیا ہے:

زَعَمْتُمْ انّ إِخْوَتَكُمْ قُرَيْشٌ لهم إلف وليس لكم إلاف

تم گمان کرتے ہو کہ تمہارے بھائی قریش ہیں ان کے لیے الف اور تمہارے لیے ایلاف ہے"۔

جوہری نے کہا: یوں جملہ ذکر کیا جاتا ہے فلانٌ قد ألف هذا الموضع يألفه ألفا، آلفه إياه غیرہ۔ یوں بھی کہا جاتا ہے: ألفتِ الموضع أولفه إيلافا، اسی طرح ہے آلف الموضع أولفه مُوالفة وإلافا۔ پس باب افعال اور باب مفاعلہ کی ماضی کی صورت ایک ہی طرح کی ہے۔ عکرمہ نے اسے لیالف پڑھا ہے۔ مصحف ابن مسعود میں اسی طرح ہے۔ لام امر کو فتحہ دینا یہ بھی ایک لغت ہے جسے ابن مجاہد اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ عکرمہ اس آدمی پر عیب لگاتے جو لِإیلاف پڑھتا بعض اہل مکہ نے ألاف قریش پڑھا اور ابو طالب کے قول سے استشہاد کیا جو ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تاکیدی وصیت کرتے ہیں:

فلَا تَتْرُكَنْه ماحيِيَت لِمُعْظِم وكنْ رجلا ذا نَجْدَةٍ وعفافِ

تذود العِدا عن عُصْبة هاشمية إلافُهم في النّاس خيرُ إلَافِ

جب تک تو زندہ ہے تو عظمت شان کی خاطر تو اسے نہ چھوڑ اور شرف و پاکدامنی والا آدمی بن جا، ہاشمی جماعت سے دشمنی کو دور کر ان کی محبت لوگوں میں بہترین محبت ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 629

جہاں تک قریش کا تعلق ہے وہ بنونضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر ہیں۔ نضر کی اولاد میں سے جو بھی شخص ہے وہ قریشی ہے، بنو کنانہ اور اس سے اوپر کے افراد کو قریش نہیں کہتے۔ بعض اوقات وہ قریشی کہتے ہیں یہی قیاس ہے۔ شاعر نے کہا:

بکلّ قُرَیشِیٍّ علیه مَهابة

ہر قریشی پر ہیبت وجلال ہے۔

اگر تو قریش سے حی مراد لے تو تو اسے منصرف قرار دے گا اور اگر اس سے قبیلہ مراد لے تو اسے غیر منصرف قرار دے گا۔ شاعر نے کہا:

وكَفَى قُرَيشَ المُعْضِلاتِ وسادَها

اس مصرعہ میں قریش میں قاعدہ جاری ہو رہا ہے۔

قُرَیْش کا معنی اکتساب ہے تقرشوا کا معنی ہے وہ جمع ہوئے جب کہ وہ حرم کے علاوہ جگہوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قصی بن کلاب نے انہیں حرم میں جمع کر دیا یہاں تک کہ قریش نے اسے اپنا مسکن بنالیا۔ شاعر نے کہا:

أبونا قُصَیٌّ کان یُدْعَی مُجَمِّعًا — به جمع الله القبائلَ من فِهرِ

ہمارا باپ قصی تھا جسے مجمع کہا جاتا اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فہر قبائل کو جمع کر دیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ قریش، بنو فہر بن مالک بن نضر ہیں جو فہر کی اولاد نہیں وہ قریشی نہیں جب کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت مروی ہے: إنا ولد النضر بن كنانه لا نقفو أُمنا ولا ننتفی من أبينا(1) ہم نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں ہم اپنی ماؤں پر تہمت نہیں لگاتے اور ہم اپنے آباء سے نسب کی نفی نہیں کرتے۔ حضرت واثلہ بن اسقع نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنّ الله اصطفى كِنانة من ولد إسماعيل واصطفى من بنى كِنانة قريشا واصطفى من قريش بنى هاشم واصطفانى من بنى هاشم(2) اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے بنو کنانہ کو چنا، بنو کنانہ میں سے قریش کو چنا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چنا۔ یہ حدیث صحیح اور ثابت ہے اسے امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے علماء نے نقل کیا ہے۔ انہیں قریش نام دینے میں کئی اقوال ہیں:

(۱) وہ جدا جدا ہونے کے بعد جمع ہوئے تھے اور تقرش کا معنی جمع ہونا اور ملنا ہے۔ ابو جلدہ یشکری نے کہا:

إخوةٌ قَرَّشُوا الذنوبَ علینا — فی حدیثٍ من دهرهم وقدیم

وہ ایسے بھائی ہیں جنہوں نے قریب زمانہ اور قدیم زمانہ میں بھی ہمارے خلاف گناہوں کو جمع کیا۔

(۲) وہ تاجر لوگ تھے وہ اپنی کمائی سے کھاتے تھے۔ اور تقرش کا معنی کمانا ہے اس کا باب یوں چلاتے ہیں قَرَشَ، یَقْرُشُ،

---

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب من نفی رجلا من قبیلته، حدیث نمبر 2601، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد 2، صفحہ 245

قرشا یہ اس وقت کہتے ہیں جب وہ مال کمائے اور جمع کرے۔ فراء نے کہا: اسی وجہ سے انہیں قریش کہا گیا۔
(۳) وہ حاجیوں کی ضروریات کی جستجو کرتے اور ان کی ضرورت کو پورا کرتے۔ قریش کا معنی تفتیش کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

أیّھا الشامتُ المقرش عنا عند عمرو فھلْ لہ إبقاء

اے ہماری تکلیف پر خوش ہونے والے اور ہمارے بارے میں عمرو کے ہاں تفتیش کرنے والے کیا اس نے ہمیشہ رہنا ہے۔

(۴) روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت امیر معاویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ قریش کو قریش کیوں کہا گیا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: سمندر میں ایک طاقتور جانور ہے جس کو قرش کہتے ہیں جو خود تو دوسروں کو کھا جاتا ہے مگر اسے نہیں کھایا جاتا، وہ خود غالب آجاتا ہے کوئی اس پر غالب نہیں آتا اور تبع کے اشعار پڑھے:

و قریش ھی التی تسکن البحر بھا سمیت قریش قریشا

تاکل الرث والسمین ولا تت رك فیھا لذی جنا حین ریشا

ھکذا فی البلاد حیّ قُریش یأکلون البلاد أکلا کمیشا

ولھم آخر الزمانِ نبیٌّ یکثر القتل فیھم والخُموشا

قریش وہ جانور ہے جو سمندر میں رہتا ہے اسی کی مناسبت سے قریش کو قریش کا نام دیا گیا وہ کمزور اور موٹے کو کھا جاتا ہے اور وہ اس سمندر میں دو پروں والے کو بھی نہیں چھوڑتا ملکوں میں اسی طرح قریش قبیلہ ہے وہ ملکوں کو اس طرح تیزی سے کھا جاتا ہے ان میں آخر زمانہ میں نبی ہوگا، ان میں بہت زیادہ قتل اور زخم ہوں گے۔

اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝

''الفت تجارتی سفر کی جاڑے اور گرمی (کے موسم) میں''۔

مجاہد اور حمید نے اسے إلْفِھم پڑھا ہے یعنی لام ساکن ہے اور یاء کے بغیر ہے ابن کثیر سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حضرت اسماء نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الفھم پڑھتے ہوئے سنا۔ حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء سے بھی یہ قراءت مروی ہے۔ ابو جعفر اور ولید جو اہل شام سے تعلق رکھتے ہیں اور ابو حیوۃ نے الافھم پڑھا ہے یعنی ہمزہ میں اختلاس کا قاعدہ جاری کیا اور یا نہیں ہے۔ ابو بکر نے عاصم سے ائلافھم دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے پہلا ہمزہ مکسور ہے اور دوسرا ساکن ہے۔ دو کلموں میں دو ہمزوں کو جمع کرنا شاذ ہے باقی قراء نے ایلافھم مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی پسندیدہ ہے یہ پہلے ایلاف سے بدل ہے مقصود وضاحت ہے یہ آلف کا مصدر ہے جب تو اسے الفت کرنے والا بنا دے۔ آلف، اِلفا۔ جس طرح اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے یعنی وہ موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے مانوس ہوئے۔ فرمایا: ان پر موسم سرما اور موسم گرما کا سفر شاق نہیں یہ قریش پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے احسان ہے۔ ہروی اور دوسرے علماء نے کہا: اصحاب ایلاف چار تھے ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل یہ سب بنو عبد مناف تھے۔ جہاں تک حضرت ہاشم کا تعلق ہے اس نے شام کے

بادشاہ سے معاہدہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی شام کی طرف تجارت امن میں ہوئی تھی ان کے بھائی عبدشمس تھے انہوں نے حبشہ والوں سے معاہدہ کیا تھا۔ مطلب نے یمن والوں سے معاہدہ کیا تھا اور نوفل نے فارس والوں سے معاہدہ کیا تھا۔ یؤلف کا معنی پناہ دینا بھی ہے انہیں بھائیوں کو پناہ دینے والے بھی کہتے۔ قریش کے تاجران بھائیوں کے معاہدہ کی وجہ سے مختلف شہروں کی طرف آیا جایا کرتے تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جاتا۔ ازہری نے کہا: ایلاف اجارہ کو خفارہ سے تشبیہ دینا۔ اجارہ کا معنی مدد کرنا اور حمایت کرنا ہے اور خفارہ کا معنی امان ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: آلف یؤلف یہ اس وقت کہتے ہیں جب اس نے بوجھ اٹھانے والے اونٹوں کو امان دے کر مدد کی۔ حمائل، حمولہ کی جمع ہے کہا: اس کا معنی ہے کہ قریش حرم کے رہائشی تھے ان کے لیے کوئی کھیتی اور جانور نہ تھے وہ موسم سرما اور موسم گرما میں امن سے تجارت کو جاتے تھے جب کہ ان کے اردگرد لوگوں سے مال چھین لیا جاتا تھا۔ جب کوئی آدمی ان کے سامنے رکاوٹ بنتا تو یہ کہتے: ہم الله کے حرم والے ہیں تو لوگ ان کا راستہ چھوڑ دیتے۔

ابوالحسین احمد بن فارس بن ذکریا نے اپنی تفسیر میں کہا سعید بن محمد، بکر بن سہیل دمیاطی سے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ موسم سرما اور موسم گرما میں انہیں سفر سے مانوس کر دیا۔ اس کی صورت یہ بنی کہ قریش میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تو وہ اور اس کے گھر والے ایک معروف جگہ کی طرف جاتے اپنے اوپر ایک خیمہ لگاتے تو وہ مر جاتے یہاں تک کہ عمرو بن عبد مناف کا زمانہ آیا وہ اپنے زمانے کا سردار تھا اس کا ایک بیٹا تھا جس کو اسد کہتے اس کا بنی مخزوم میں ایک ہم عمر تھا جس سے اسد محبت کرتا اور اسی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اس ساتھی نے اسد سے کہا: ہم کل اعتفاد کریں گے۔ ابن فارس نے کہا: اس روایت میں یہ ایسا لفظ ہے جس کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ یہ دال کے ساتھ ہے یا راء کے ساتھ ہے اگر یہ راء کے ساتھ ہے تو شاید عفر سے ہو جس کا معنی مٹی ہے اگر وہ دال کے ساتھ ہو تو میں اس کا معنی نہیں جانتا جو میں گمان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس خیمہ کی طرف جائیں گے اور ایک ایک کر کے مر جائیں گے اسد اپنی ماں کے پاس روتے ہوئے گیا اور اس کے ہم عمر ساتھی نے جو کچھ کہا تھا اس کا ذکر کیا تو اسد کی والدہ نے ان لوگوں کی طرف آٹا اور چربی بھیجی جس کی مدد سے انہوں نے چند دن گزارے پھر اس کا ساتھی آیا کہا: ہم کل اعتفاد کریں گے تو اسد اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے گیا اور اپنے ساتھی کی بات بتائی یہ بات عمرو بن عبد مناف پر شاق گزری۔ وہ قریش کی مجلس میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے سارے قریش ان کی اطاعت کرتے تھے عمرو نے کہا: تم نے ایک ایسا کام شروع کر رکھا ہے جس کے ذریعے تم کم ہوتے جا رہے ہو اور عرب بڑھتے جا رہے ہیں تم بے یار و مددگار ہو رہے ہو جب کہ عرب غالب ہو رہے ہیں تم الله کے حرم والے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے سب سے معزز ہو لوگ تمہارے تابع ہیں ممکن ہے یہ اعتفاد تم پر غالب آ جائے۔ انہوں نے کہا: ہم تیری اتباع کریں گے۔ عمرو نے کہا: اس آدمی سے آغاز کرو یعنی اسد کے ہم عمر کے والد سے۔ اسے اعتفاد سے غنی کر دو۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اونٹ ذبح کیا بھیڑ بکریاں ذبح کیں پھر ثرید بنایا اور لوگوں کو کھلایا تو اس کا نام ہاشم پڑ گیا۔ اس کے بارے میں شاعر نے کہا:

عمرو الذی ھشم الثرید لقومہ

عمرو وہی ہے جس نے اپنی قوم کے لیے ثرید تیار کیا۔

پھر اس نے تمام خاندانوں کو دو تجارتی سفروں پر جمع کیا موسم سرما میں یمن کی طرف اور موسم گرما میں شام کی طرف۔ غنی نے جو نفع کمایا اسے اپنے اور فقیر کے درمیان تقسیم کیا یہاں تک کہ ان کا فقیر غنی ہو گیا۔ اسلام آیا تو وہ اس معاشرتی ادب پر تھے عربوں میں سے کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو مال اور عزت میں قریش سے بڑھ کر ہو اس معنی میں شاعر کا قول ہے:

والخالطون فقیرھم بغنیھم حتی یصیر فقیرھم کالکافی

وہ اپنے فقیر کو اپنے غنی کے ساتھ ملانے والے ہیں یہاں تک کہ ان کا فقیر کفایت کرنے والے کی طرح ہو جاتا ہے۔

عرب اس طرح تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو اپنا رسول بنا کر بھیج دیا تو ارشاد فرمایا پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ہاشم کے عمل کے واسطے سے بھوک میں کھانا کھلایا اور عربوں کے بڑھنے اور قریش کے کم ہونے کے خوف سے نجات عطا فرمائی۔

رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ ۞ میں رِحۡلَةَ کا لفظ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے تقدیر کلام یوں ہو گی إرتحالھم رحلة، یا ایلافھم اس میں عامل ہے یا ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اگر تو اسے محل رفع میں رکھے جب کہ معنی یہ ہو ھما رحلة الشتاء والصیف تو یہ بھی جائز ہے۔ جب کہ پہلی تعبیر زیادہ مناسب ہے رِحۡلَةَ سے مراد سفر کرنا ہے۔ دو سفروں میں سے ایک سفر موسم سرما میں یمن کی طرف ہوتا کیونکہ یمن کا علاقہ گرم ہے اور دوسرا سفر موسم سرما میں شام کی طرف ہوتا کیونکہ وہ سرد علاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے: وہ موسم سرما مکہ مکرمہ میں گزارتے تھے کیونکہ یہ علاقہ گرم تھا اور موسم سرما طائف میں گزارتے تھے کیونکہ اس کی آب و ہوا بہت اچھی تھی (1)۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ ایک قوم کے لیے گرم علاقہ ہو جس کے ذریعے وہ موسم سرما کی سردی کو دور کر سکے اور ایک سرد علاقہ ہو جس کے ذریعے وہ موسم گرما کی گرمی دور کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس نعمت کا ذکر کیا۔ شاعر نے کہا:

تَشۡتِی بمکة نَعۡمَةَ ومَصِیفُھا بالطائفِ

وہ آسودگی سے مکہ مکرمہ میں موسم سرما گزارتی ہے اور اس کا موسم گرما طائف میں گزرتا ہے۔

یہاں چار مسائل ہیں:

## قرأت وقف اور عدم وقف کی صورت میں

**مسئلہ نمبر 1**۔ قاضی ابو بکر بن عربی اور دوسرے علماء نے یہ پسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان لِإِيلَٰفِ یہ ماقبل فعل کے متعلق ہے (2) اسے مابعد کے متعلق کرنا جائز نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَلۡيَعۡبُدُواْ رَبَّ هَٰذَا ٱلۡبَيۡتِ ۞ کہا: جب یہ امر ثابت ہے کہ یہ دوسری سورت کے ساتھ متعلق ہے جب کہ نئی کلام کے ساتھ، بیان کے نئے شروع کرنے اور بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ کے لکھنے سے اس سے تعلق ختم کر دیا گیا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کلام کے مکمل ہونے سے قبل بھی

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 327
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1981

قراء کے لیے وقف کرنا جائز ہے وہ مقامات جہاں قراء وقف کرتے ہیں یہ ایسی چیز نہیں جس کو انہوں نے شرعی طریقہ سے اخذ کیا ہے بلکہ اصل میں وہ طلباء کو معانی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جب وہ اسے جان لیتے تو جہاں چاہیں وقف کر لیں جہاں تک سانس کے ٹوٹنے پر وقف کرنے کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں جب تجھے اس قسم کا عارضہ لاحق ہو تو ماقبل حصہ کا اعادہ نہ کر بلکہ وہاں سے ہی شروع کر لے جہاں تیری سانس ٹوٹی تھی اس بارے میں یہ میری رائے ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر کسی حال میں کوئی دلیل نہیں لیکن میں کلام کے مکمل ہونے پر وقف پر اعتماد کرتا ہوں کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے باہر جانا بھی مجھے ناپسند ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کے صحیح ہونے پر دلیل نبی کریم ﷺ کی قراءت ہے کہ آپ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پر وقف کرتے پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ پر وقف کرتے یہ کتاب کے مقدمہ میں بات گزر چکی ہے۔ مسلمانوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ پر وقف کوئی قبیح نہیں۔ تو اسے کیسے قبیح کہا جا سکتا ہے جب کہ اسے پہلی رکعت میں پڑھا جاتا ہے اور بعد والی سورت کو بعد والی رکعت میں پڑھا جاتا ہے تو قراءت کے قطع ہونے کے ساتھ ساتھ درمیان میں کئی ارکان بھی آجاتے ہیں کسی عالم نے اسے مکروہ نہیں جانا۔ اس میں کوئی علت نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ آیت کی انتہا ہے اس پر قیاس یہ ہے کہ آیات کے اختتام پر وقف کرنا کوئی ممتنع نہیں خواہ کلام مکمل ہو اور غرض ختم ہو یا کلام مکمل نہ ہو اور غرض ختم نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے آیات کے سرے منظوم کلام کی زینت اور زیور ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو منظوم، منثور سے واضح نہ ہو اس میں کوئی خفا نہیں کہ منظوم کلام بہت ہی حسین ہوتی ہے تو اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فواصل، منظوم کلام کے محاسن میں سے ہوتے ہیں جس نے فواصل (آیات کے سرے) پر وقف کر کے ان کا اظہار کیا تو اس نے کلام کے محاسن کو ظاہر کیا اور وقف کو ترک کرنا ان محاسن کو مخفی کرتا ہے اور منثور کلام کو منظوم کلام کے مشابہ کرتا ہے یہ پڑھی جانے والی کلام کے حق میں خلل ڈالنا ہے۔

شتاء کا معنی و مفہوم

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مالک نے کہا: شتاء سے مراد نصف سال اور صیف سے مراد نصف سال ہے میں ربیعہ بن ابی عبد الرحمن اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ دیکھتا رہا کہ وہ اپنی پگڑیوں کو نہیں اتارتے تھے مگر جب ثریا طلوع ہوتی یہ بشنس کا انیسواں دن ہے یہ رومیوں یا ایرانیوں کے مہینوں کی تعداد کے مطابق پچیسواں دن ہے ثریا کے طلوع ہونے سے میری مراد ہے کہ جب ٹیکس وصول کرنے والے نکل پڑتے ہیں اور لوگ اپنے مویشیوں کو اپنے اپنے چشموں کی طرف لے کر چل پڑتے ہیں اور ثریا کے طلوع ہونے سے مراد موسم گرما کا آغاز اور موسم سرما کا اختتام ہے یہ ایسا نقطۂ نظر ہے جس میں ان کے ساتھیوں میں کوئی اختلاف نہیں صرف اشہب نے ان سے ایک قول یہ نقل کیا ہے: جب هقعه (1) گر پڑے تو رات کم ہو جاتی ہے ثریا کے طلوع کو موسم گرما کا آغاز بنایا گیا ہے تو ضروری ہے کہ پورے سال میں اس کا حصہ چھ ماہ ہوں۔ پھر موسم گرما کے چلے جانے کے بعد موسم سرما کے چھ ماہ آجاتے ہیں۔ محمد بن حکم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو یہ قسم اٹھاتا ہے کہ وہ فلاں آدمی سے گفتگو نہیں کرے گا

1۔ وہ تین روشن ستارے جو ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ موسم سرما آجائے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس سے گفتگو نہ کرے یہاں تک کہ ہاتور (1) کے سترہ دن گزر جائیں اگر اس نے کہا کہ وہ اس سے بات نہیں کرے گا یہاں تک کہ موسم گرما داخل ہو جائے تو وہ اس سے بات نہ کرے یہاں تک کہ بشنس کے انیس دن گزر جائیں، کیونکہ اگر تو منازل کا حساب لگائے جیسے کہ وہ ہیں یعنی تیرہ راتیں ایک منزل کی ہیں تو تو جان لے گا کہ ہاتور کے انیس دن گزر جانے پر اس کی منازل ختم نہیں ہوتیں مگر جب کہ بشنس کے انیس دن داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

## زمانہ کی اقسام

**مسئلہ نمبر 3**۔ ایک قوم نے کہا زمانہ کی چار قسمیں ہیں (۱) موسم سرما (۲) موسم بہار (۳) موسم گرما (۴) موسم خزاں۔ ایک قوم کا نقطہ نظر ہے وہ موسم سرما، موسم گرما، موسم قیظ اور موسم خریف (خزاں) ہے۔ امام مالک نے جو کہا وہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ان کا تیسرا نہیں بنایا۔

## دو زمانوں میں دو مقامات پر وقت گزارنا

**مسئلہ نمبر 4**۔ جب اللہ تعالیٰ نے قریش پر دو سفروں یعنی موسم سرما اور موسم گرما کے سفروں کے ساتھ احسان فرمایا جس طرح یہ پہلے گزرا ہے تو اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ایک آدمی کا دو زمانوں میں دو مقامات پر وقت گزارنا جائز ہے۔ یہ زمانہ میں ان کا حال دوسرے کی بنسبت زیادہ نعمت کا باعث ہوگا، جس طرح موسم سرما میں مجلس بحری (سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا کی جگہ) میں بیٹھنا اور موسم سرما میں مجلس قبلی (شمال کی جانب سے چلنے والی ہوا کی گزرگاہ) میں بیٹھنا اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے روشن دان وغیرہ بنانا اور گرمی حاصل کرنے کے لیے گدے وغیرہ استعمال کرنا۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝

"پس چاہیے کہ وہ عبادت کیا کریں اس خانہ (کعبہ) کے رب کی"۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی عبادت کرنے اور وحدانیت کا پرچار کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس نے انہیں دو سفر کرنے کی محبت سے نوازا۔ فعل کے اوپر فاء اس لیے داخل ہوئی ہے کیونکہ کلام میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے معنی یہ بنے گا اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں اگر تم باقی نعمتوں کی وجہ سے اس کی عبادت نہیں کرتے تو اس ایک نعمت کی وجہ سے اس کی عبادت کرو جو ظاہر نعمت ہے۔ یہاں بیت سے مراد کعبہ ہے ان کے سامنے اپنا یہ تعارف کرواتا کہ وہ اس بیت کا رب ہے اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) ان کے بت تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے آپ کو ممتاز کیا۔

(۲) کیونکہ بیت اللہ شریف کی وجہ سے انہیں تمام عربوں پر فضیلت عطا کی گئی تھی تو انہیں اپنا احسان جتلانے کے لیے ان کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے رب کعبہ کی عبادت سے مانوس ہو جائیں جس طرح وہ دونوں سفروں سے مانوس ہیں۔ عکرمہ نے کہا: قریش بصری کی طرف سفر کرنے سے مانوس تھے اور یمن کی طرف سفر کرنے سے

1۔ مغربی علاقہ کی زبان کا لفظ ہے جس طرح مارچ ہے۔

مانوس تھے تو انہیں کہا گیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں ٹھہریں اور اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ موسم سرما کا سفر یمن کی طرف اور موسم گرما کا سفر شام کی طرف ہوتا تھا۔

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

''جس نے انہیں رزق دے کر فاقہ سے نجات بخشی اور امن عطا فرمایا انہیں (فتنہ و) خوف سے''۔

مِّنْ جُوْعٍ سے مراد ہے بھوک کے بعد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ نعمت قریش کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی وجہ سے نصیب ہوئی آپ نے یہ دعا کی تھی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (البقرہ:126) اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنادے اور اس کے مکینوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔

ابن زید نے کہا: عرب ایک دوسرے پر غارت گری مچاتے بعض بعض کو قید کر لیتے حرم کی وجہ سے قریش اس آفت سے محفوظ تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (القصص:57) ایک قول یہ کیا گیا ہے: موسم سرما اور موسم گرما میں ان پر سفر بڑا شاق گزرا تو اللہ تعالیٰ نے اہل حبشہ کے دلوں میں یہ ڈال دیا کہ وہ کھانا کشتیوں کے ذریعے ان تک پہنچائیں تو انہوں نے اس طرح کھانا ان تک پہنچایا۔ قریش ان سے خوفزدہ ہوئے کہ وہ ان سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں تو قریش اپنا دفاع کرنے کے لیے ان کی طرف نکلے تو کیا دیکھا کہ وہ ان کے لیے کھانا لائے ہیں اور ان کی خوراک کے ذریعے ان کی مدد کی۔ اہل مکہ جدہ اونٹوں اور گدھوں کو لے جاتے اور کھانا خرید لیتے یہ دو راتوں کی مسافت پر تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس اطعام سے مراد یہ ہے جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں بددعا کی اور یوں عرض کی: اللّٰھم اجعلھا علیھم سنین کسنی یوسف (1) تو قحط شدید ہو گیا انہوں نے کہا: اے محمد! ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے بے شک ہم ایمان رکھنے والے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تو یمن کے علاقے تبالہ اور جرش سرسبز و شاداب ہو گئے اور انہوں نے کھانا مکہ مکرمہ تک پہنچایا تو مکہ مکرمہ کے لوگ بھی آسودہ ہو گئے۔

ضحاک، ربیع، شریک اور سفیان نے کہا کہ خوف سے مراد کوڑھ کا مرض ہے ان کے شہر میں کوڑھ کا مرض کسی کو لاحق نہیں ہوتا۔ اعمش نے کہا: اس کا معنی ہے کہ انہیں حبشیوں سے امن دیا جب کہ ان کے ساتھ ہاتھی بھی تھا۔ حضرت علی شیر خدا کی طرف ایک قول یہ منسوب ہے کہ اس کا معنی ہے خلافت ان میں رہے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا: سفر کی محبت نے انہیں بادشاہوں سے غنی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ لفظ عام ہے۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7260

# سورة الماعون

(آیاتہا ۷) (۱۰۷ سورۃ الماعون مکیۃ ۱۷) (رکوعہا ۱)

یہ سورت مکی ہے(1)؛ یہ عطا، حضرت جابر اور حضرت ابن عباس کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے اور حضرت ابن عباس کے دوسرے قول کے مطابق یہ مدنی ہے؛ یہ قتادہ اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ اس کی سات آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۠

"کیا آپ نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے (روز) جزا کو۔ پس یہی وہ (بدبخت) ہے جو دھکے دے کر نکالتا ہے یتیم کو اور نہ ہی برانگیختہ کرتا ہے (دوسروں کو) کہ غریب کو کھانا کھلائیں۔ پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں وہ جو ریاکاری کرتے ہیں اور (مانگے بھی) نہیں دیتے روزمرہ استعمال کی چیز"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

## شان نزول

**مسئلہ نمبر 1**۔ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ یہاں دین سے مراد آخرت میں جزا اور حساب ہے سورۂ فاتحہ میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ اَرَءَیۡتَ میں دوسرے ہمزہ کو ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ اَرَءَیۡتَ، رَیۡتَ نہیں پڑھا جاتا۔ لیکن ہمزہ استفہام نے دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل کر تسہیل پیدا کی ہے۔ زجاج نے ذکر کیا ہے: اس کلام میں حذف ہے معنی ہے بتاؤ تو جو آدمی روز جزا کو جھٹلاتا ہے کیا وہ درست ہے یا غلطی پر ہے؟ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی اس میں اختلاف ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت عاص بن وائل سہمی کے حق میں نازل ہوئی؛ یہ کلبی اور مقاتل نے کہا۔ ضحاک نے ان سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت دو منافقوں کے حق میں نازل ہوئی۔ سدی نے کہا: یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ابو جہل کے حق میں نازل ہوئی۔ ضحاک نے کہا: یہ عمرو بن عائذ کے حق میں نازل ہوئی (3)۔ ابن جریج نے کہا: یہ حضرت ابوسفیان کے حق میں نازل ہوئی (4) وہ ہر ہفتہ اونٹ ذبح کیا کرتا تھا ایک یتیم نے اس سے کوئی چیز طلب کی تو ابوسفیان نے اسے اپنے ڈنڈے سے مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 328　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

یَدُعُّ کا معنی دھکے دیتا ہے جس طرح ارشاد فرمایا: یُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؐ (الطور) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ معنی ہے وہ یتیم کو حق دینے کی بجائے اسے دھکے دیتا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس پر ظلم و زیادتی کرتا ہے معنی قریب قریب ہے۔ سورۃ النساء میں پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت میں سے کچھ بھی نہیں دیا کرتے تھے وہ کہتے تھے: مال اس کے لیے جائز ہے جو نیزے چلاتا ہے اور تلوار سے وار کرتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: من ضمّ یتیما من المسلمین حتّٰی یستغنی فقد وجب له الجنّة (1) جس نے کسی یتیم کو اپنے ساتھ ملایا یہاں تک کہ وہ غنی ہو گیا تو اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ یہ معنی کئی مواقع پر گزر چکا ہے۔

بخل کی وجہ سے مسکین کو نہ دینا قابل مذمت ہے

**مسئلہ نمبر 2**۔ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ؐ وہ بخل اور جزا کو جھٹلانے کی وجہ سے مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم نہیں دیتا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: وَ لَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ؐ (الحاقہ) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ یہ مذمت عام نہیں کہ یہ اسے بھی شامل ہو جس نے عاجز ہوتے ہوئے اسے ترک کیا ہو بلکہ وہ تو بخل کرتے ہیں اور اپنے بارے میں عذر خواہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ (یٰس: 47) کیا ہم اسے کھلائیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں کھلاتا۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور مذمت بھی انہیں کی طرف متوجہ ہوئی۔ کلام کا معنی یہ بنے گا اگر قادر ہوں تو ایسا نہیں کرتے اگر تنگ دست ہوں تو برانگیختہ نہیں کرتے۔

کن نمازیوں کی ہلاکت ہے؟

**مسئلہ نمبر 3**۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ ان کے لیے عذاب ہے۔ پہلے بھی کئی مواقع پر یہ بحث گزر چکی ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے: نہ اس سے مراد وہ نمازی ہے اگر وہ نماز پڑھے تو وہ ثواب کی امید نہ رکھے اگر اسے چھوڑ دے تو اس پر عقاب کا خوف نہ ہو۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نمازوں کو ان کے اوقات سے موخر کرتے ہیں۔ مغیرہ نے ابراہیم سے یہ قول نقل کیا ہے: وہ وقت ضائع کرنے کے ساتھ لا پرواہی کرتے ہیں۔ ابو العالیہ سے مروی ہے: وہ نمازوں کو ان کے اوقات میں نہیں پڑھتے اور ان کے رکوع و سجود کو مکمل نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (مریم: 59) ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو نماز کو ضائع کریں گے۔ جیسے اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ابراہیم سے مروی ہے: اس سے مراد وہ ہے جو سجدہ کرتا ہے تو اپنے سر کو اس طرح کھڑا کر لیتا ہے متوجہ ہوتے ہوئے۔ قطرب نے کہا: وہ نہ قراءت کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں سَاهُوْنَ کی جگہ لاهون کا لفظ ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: سستی کرتے ہوئے جو نماز میں اس کے وقت سے تاخیر

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 19025

کرتے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس سے مراد منافق ہیں جو مخفی حالت میں نماز ترک کرتے ہیں اور علانیہ اس کو پڑھتے ہیں جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۝ اس چیز پر دال ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے؛ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر کلام ہوتی فی صلاتھم ساھون تو یہ مومنین کے حق میں ہوتی۔ عطا نے کہا: الحمد للہ۔ اس نے عَنْ صَلَاتِهِمْ فرمایا ہے فی صلاتھم نہیں فرمایا۔ زمخشری نے کہا: اگر تو پوچھے عَنْ صَلَاتِهِمْ اور فی صلاتھم میں کیا فرق ہے؟ تو میں کہوں گا: عَنْ کا معنی ہے وہ نماز سے غفلت کرتے ہیں وہ اسے ترک کرتے ہیں اس کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ یہ منافقوں کا اور مسلمانوں میں شاطر فاسقوں کا طرز عمل ہے اور فی کا معنی ہے کہ سہو نماز میں انہیں لاحق ہو جاتا ہے خواہ شیطان کی جانب سے وسوسہ ہو یا ذہن کسی طرف متوجہ ہو جائے یہ ایسی صورت ہے کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز میں سہو واقع ہوا کسی اور کی کیا حیثیت ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے اپنی کتابوں میں سجدہ سہو کے ابواب شامل کیے ہیں۔

ابن عربی نے کہا: سہو سے سلامت رہنا محال ہے (2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اپنی نماز میں بھولے وہ آدمی جو اپنی نماز میں نہیں بھولتا تو وہ ایسا آدمی ہے جو اس میں تدبر نہیں کرتا، اس کی قراءت کو نہیں سمجھتا اس کا مقصود صرف اس کی تعداد میں ہوا کرتا ہے یہ ایسا آدمی ہے جو چھلکا تو کھا لیتا ہے اور مغز پھینک دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس لیے بھولتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے بڑی ذات میں غور و فکر کر رہے ہوتے تھے یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس لیے بھولتے ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شیطان کے وساوس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں جب شیطان نمازی کو یہ کہے: فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو جن کو وہ پہلے یاد نہیں کرتا یہاں تک کہ آدمی بھٹک جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی۔

## ریا اور اس کی حقیقت

**مسئلہ نمبر 4**۔ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۝ وہ لوگوں کو دکھاتا ہے کہ وہ طاعت کے طور پر نماز پڑھتا ہے جب کہ وہ تقیہ کے طور پر نماز پڑھ رہا تھا جس طرح فاسق کرتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ وہ عبادت کی غرض سے نماز پڑھ رہا تھا حالانکہ وہ اس لیے نماز پڑھ رہا تھا تا کہ اسے یہ کہا جائے کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ ریا کی حقیقت یہ ہے دنیا میں جو کچھ ہے اسے عبادت کے ذریعے طلب کرنا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں مقام و مرتبہ کی طلب کرنا۔ (۱) اس کا ابتدائی مرحلہ اچھی شہرت ہے اس کے ذریعے جاہ و ثنا چاہتا ہے (۲) چھوٹے اور کھردرے کپڑوں کے ذریعے ریا تا کہ اس کے ذریعے وہ دنیا میں زہد حاصل کرے (۳) زبان سے ریا کہ دنیاداروں پر ناراضگی کا اظہار کرے اور جو وہ خیر و طاعت کو چھوڑتا ہے اس پر تاسف کا اظہار کرے اور وعظ کرے (۴) نماز اور صدقہ کو ظاہر کرنا یا اچھے انداز میں نماز پڑھنا تا کہ لوگ دیکھیں۔ اس کی بحث بڑی طویل ہے یہ چیز اس پر دلیل ہے؛ ابن عربی نے یہی کہا ہے (3)۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 633 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1983 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 1984-1983

میں کہتا ہوں: سورۃ النساء، ہود اور کہف کے آخر میں ریا، اس کے احکام اور اس کی حقیقت کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ جو کافی وشافی ہے۔ الحمدللہ۔

## فرائض میں اظہار ریا نہیں بلکہ نوافل کا اظہار ریا ہے

**مسئلہ نمبر 5**۔ اگر عمل فرض ہو تو اسے اعلانیہ کرنے کے ساتھ بندہ ریا کرنے والا نہیں ہوتا کیونکہ فرائض کے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ ان کا اعلان کرے اور ان کی تشہیر کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ولا غمۃ فی فرائض اللہ(1) اللہ تعالیٰ کے فرائض میں کوئی اخفا نہیں، کیونکہ یہ اسلام کی علامات اور دین کے شعائر ہیں۔ اس کا تارک مذمت اور ناراضگی کا مستحق بنتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان اعمال کے اظہار کے ساتھ تہمت کو دور کیا جائے۔ اگر وہ اعمال نفلی ہیں تو پھر ان کا حق یہ ہے کہ ان میں اخفا کیا جائے کیونکہ ان کے ترک کی وجہ سے نہ ملامت کی جاتی ہے اور نہ ہی مذمت کی جاتی ہے اگر وہ ان کو اس لیے ظاہر کرتا ہے تا کہ اس کی اقتدا کی جائے تو یہ اچھا ہوگا۔ ریا اس وقت ہوگا جب عمل ظاہر کرنے سے مقصد یہ ہو کہ آنکھیں دیکھیں اور صالحیت کے حوالے سے اس کی تعریف کی جائے۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ اس نے ایک آدمی کو سجدہ شکر کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے سجدہ لمبا کیا تو اس نے کہا: اگر تیرے گھر میں یہ عمل ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے یہ بات اس لیے کی تھی کیونکہ اس میں ریا اور شہرت کی علامت تھی۔ سورۃ البقرہ میں یہ معنی گزر چکا ہے اور کئی مواقع پر بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ ماعون میں دس اقوال ہیں۔

## اموال کی زکوٰۃ

(۱) اس سے مراد ان کے اموال کی زکوٰۃ ہے؛ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے(2)؛ امام مالک نے بھی یہی کہا ہے: اس سے مراد منافق ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ ابو بکر بن عبد العزیز نے امام مالک سے روایت نقل کی ہے کہا: منافق جب نماز پڑھتا ہے تو ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھتا ہے اگر نماز اس سے فوت ہو جاتی ہے تو اس پر کسی شرمندگی کا اظہار نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے وہ اسے روک لیتا ہے، زید بن اسلم نے کہا: اگر نماز بھی ان کے لیے مخفی ہوتی جس طرح زکوٰۃ ان کے لیے مخفی ہے تو وہ اسے نہ پڑھتے۔

## مال

(۲) ماعون سے مراد مال ہے؛ یہ قریش کی لغت ہے؛ یہ ابن شہاب اور سعید بن مسیب کا نقطہ نظر ہے۔

## تمام منافع

(۳) یہ ایسا اسم ہے جو گھر کے تمام منافع کو جامع ہے جس طرح کلہاڑا، ہنڈیا، آگ اور اس جیسی چیزیں؛ یہ حضرت ابن مسعود کا

---

1۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 290 2۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 330

قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے اعمش نے کہا: بأجود منه بماعونه وہ اپنے گھر کے سامان کے ساتھ زیادہ سخاوت کرنے والا ہے۔

## جاہلیت میں مراد منفعت اور اسلام میں طاعت اور زکوٰۃ

(۴) زجاج، ابوعبید اور مبرد نے کہا: دور جاہلیت میں ماعون اسے کہتے جس میں کوئی منفعت ہوتی جیسے کلہاڑا، ہنڈیا، ڈول، پیالہ خواہ اس میں تھوڑی منفعت ہوتی یا زیادہ منفعت ہوتی (1)۔ انہوں نے اس بارے میں اعمش کے اشعار پڑھے علماء نے کہا: اسلام میں ماعون سے مراد طاعت اور زکوٰۃ ہے اور ایک چرواہے کے اشعار پڑھے:

أَخَلِيفَةَ الرَّحْمٰنِ إِنَّا مَعْشَرٌ حُنَفَاءُ نَسْجُدُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا
عَرَبٌ نَرَى لِلّٰهِ مِنْ أَمْوَالِنَا حَقَّ الزكاةِ مُنَزَّلًا تَنْزِيلًا
قَوْمٌ على الإسلامِ لَمَّا يَمْنَعُوا ماعُونَهُمْ ويُضَيِّعُوا التهليلا

اے رحمٰن کے خلیفہ! ہم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے باطل کو چھوڑ کر حق کو اپنا لیا ہے، ہم صبح و شام سجدہ کرتے ہیں، ہم عرب ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اموال میں زکوٰۃ کا حق لازمی سمجھتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، جب وہ زکوٰۃ و اطاعت سے رکتے ہیں اور لا الہ الا اللہ کو ضائع کرتے ہیں۔

ان اشعار سے ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے۔

## ادھار چیز

(۵) ماعون سے مراد ادھار چیز ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے۔

## ہر نیکی

(۶) ہر نیکی مراد ہے جو لوگ باہم ایک دوسرے سے کرتے ہیں (2)؛ یہ محمد بن کعب اور کلبی کا قول ہے۔

## پانی اور گھاس

(۷) اس سے مراد پانی اور گھاس ہے۔

## پانی

(۸) صرف پانی مراد ہے۔ فراء نے کہا: میں نے ایک بدو کو کہتے ہوئے سنا وہ ماعون سے مراد پانی لے رہا تھا۔ اس بارے میں نے یہ مصرع سنایا:

يَمُجُّ صَبِيرُهُ الماعونَ صَبًّا

اس کا بادل موسلادھار پانی برسا رہا تھا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 330
2۔ ایضاً

حق کو روکنا

(۹) اس نے حق روکا؛ یہ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے۔

منافع میں سے تھوڑی سی چیز

(۱۰) اموال کے منافع میں سے تھوڑی سی چیز۔ یہ معن سے ماخوذ ہے جس کا معنی قلیل ہے؛ یہ طبری اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔

قطرب نے کہا: ماعون کا اصل معنی قلت ہے معن سے مراد تھوڑی چیز ہے عرب کہتے ہیں: ماله سعنة ولا معنة نہ اس کے پاس زیادہ نہ کم۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ، صدقہ اور اس جیسی چیزوں کو ماعون قرار دیا کیونکہ یہ کثیر میں سے تھوڑی چیز ہوتی ہے لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ماعون کی اصل معونة ہے الف، ھاء کے عوض میں ہے؛ یہ جوہری نے بیان کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: ماعون یہ اعان، یعین سے مفعول کا وزن ہے۔ عون سے مراد ایسی امداد ہے جو قوت، آلات اور امر کے اسباب میسرہ کے ساتھ ہو۔

طاعت وانقیاد

(۱۱) اس سے مراد طاعت وانقیاد ہے۔ اخفش نے فصیح اعرابی سے یہ قول نقل کیا ہے: اگر ہم اترے تو میں تیری اونٹنی کے ساتھ ایسا معاملہ کروں گا تو وہ اونٹنی تجھے اختیار عطا کرے گی (1)۔

راجز نے کہا:

مَتَى تصادِفْهُنّ فی الْبرِینِ یَخْضعن أو یُعطِین بالماعون

جب تو انہیں ان حلقوں سے پکڑے گا جو ان کے ناک میں ہیں تو وہ عاجزی کریں گی یا تیری اطاعت کریں گی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس کا روکنا حلال نہیں ہوتا جس طرح پانی، نمک اور آگ، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ کون سی چیز ہے جس کا روکنا حلال نہیں؟ فرمایا: ''پانی، آگ اور نمک'' (2)۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو پانی ہوا، یہ آگ اور نمک کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: ''اے عائشہ! جس نے آگ دی گویا اس نے وہ تمام کھانا صدقہ کیا جو اس آگ کے ساتھ پکایا گیا، جس نے نمک دیا گویا اس نے وہ تمام کھانا صدقہ کیا جس کے ساتھ اس کھانے کو لذیذ بنایا گیا، جہاں پانی پایا جاتا ہے وہاں اس نے ایک دفعہ پانی پلایا گویا اس نے ساٹھ غلام آزاد کیے اور جس نے وہاں پانی پلایا جہاں پانی نہیں ملتا تو گویا اس نے ایک نفس کو زندہ کیا اور جس نے ایک نفس کو زندگی دی (اس کو مرنے سے بچایا) تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا''۔ یہ روایت ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے اور ابن ماجہ نے اسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1984

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث، صفحہ 180۔ ایضاً، حدیث نمبر 2464، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ بارہواں قول ہے۔ ماوردی نے کہا: یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد ایسی معرفت ہے جس کا کرنا آسان ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ذی شان بنا دیا (1)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ عکرمہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام تھے سے کہا گیا: جس نے اپنے سامان میں سے کوئی چیز دینے سے انکار کیا اس کے لیے ہلاکت ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں بلکہ جس نے تین چیزوں کو جمع کیا اس کے لیے ہلاکت ہے (۱) نماز کو ترک کرنا (۲) ریاکاری کرنا اور (۳) ضرورت کی چیزوں میں بخل کرنا۔

میں کہتا ہوں: منافقین کے بارے میں اس آیت کا ہونا زیادہ مناسب اور موزوں ہے کیونکہ انہوں نے تینوں اوصاف کو جمع کیا، نماز ترک کرنا، ریاکاری کرنا اور مال میں بخل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (النساء) جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کے لیے دکھلاوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے مگر تھوڑا سا ذکر کرتے ہیں۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ (توبہ) وہ مال خرچ نہیں کرتے مگر ناپسند کرتے ہوئے۔ یہ ان کے احوال ہیں اور یہ بہت ہی بعید ہے کہ کسی سچے مسلمان سے یہ افعال صادر ہوں۔ اگر ان میں سے کچھ پایا جائے تو اسے کچھ توبیخ (شرمندگی) بھی لاحق ہوگی۔ یہ ماعون کو روکنے کی بنا پر ہوگی جب وہ متعین ہو جائے جس طرح نماز جب مومن اس کو ترک کرے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ روکنا مروت میں قبیح روکنا ہوگا جب کہ ضرورت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 353

# سورة الکوثر

﴿ ایاتہا ۳ ﴾ ﴿ ۱۰۸ سورۃ الکوثر مکیۃ ۱۵ ﴾ ﴿ رکوعہا ۱ ﴾

یہ سورت مکی ہے (1)؛ یہ حضرت ابن عباس، کلبی اور مقاتل کا قول ہے جب کہ حضرت حسن بصری، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ کے قول میں یہ مدنی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّاۤ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾

''بے شک ہم نے آپ کو (جو کچھ عطا کیا) بے حد وحساب عطا کیا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

## کوثر سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ اِنَّاۤ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ یہ عام قراءت ہے۔ حضرت حسن بصری اور طلحہ بن مصرف نے اسے أَنْطَیْنَاكَ پڑھا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے یہ بھی عطا میں ایک لغت ہے جیسے أنطیتہ، أعطیتہ، الکوثر یہ کثرت سے فوعل کا وزن ہے جس طرح نفل سے نوفل کا لفظ ہے اور جهر سے جوهر ہے عرب ہر ایسی چیز جو عدد، قدر اور قدر ومنزلت میں کثیر ہو اسے کوثر کہتے ہیں۔ سفیان نے کہا: ایک بوڑھی سے کہا گیا جس کا بیٹا سفر سے لوٹا تھا بم آب أبنك تیرا بیٹا کس کے ساتھ لوٹا؟ عورت نے کہا: بکوثر یعنی کثیر مال کے ساتھ لوٹا۔ مردوں میں سے کوثر اسے کہتے ہیں جو سردار، زیادہ مال والا ہو۔ کمیت نے کہا:

وأنتَ کثیرٌ یابنَ مَرْوانَ طَیِّبٌ　　وکان أبوك ابنُ العقائِلِ کَوْثرا

''اے ابن مروان! تو کثیر طیب ہے تیرا باپ سرداروں کا بیٹا اور کوثر تھا''۔

کوثر سے مراد جس کے ساتھی اور حمایتی بہت زیادہ ہوں۔ غبار میں سے کوثر سے مراد کثیر ہے۔ قد تکوثر جب وہ کثیر ہو۔ شاعر نے کہا:

وقد ثارَ نقعُ الموتِ حتی تکَوْثَرَ

موت کا غبار اڑا یہاں تک کہ وہ بہت زیادہ ہو گیا۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 331

## سرکار دو عالم ﷺ کو عطا کردہ کوثر

**مسئلہ نمبر 2**۔ نبی کریم ﷺ کو جو کوثر عطا کیا گیا علماء تاویل نے اس کے سولہ قول ذکر کیے ہیں۔

(۱) یہ جنت میں ایک نہر ہے؛ امام بخاری نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ امام ترمذی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ہم نے اس کا ذکر کتاب ''تذکرہ'' میں کیا ہے (1)۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوثر جنت میں ایک نہر ہے اس کے کنارے سونے کے، اس کے راستے موتیوں اور یاقوت کے، اس کی مٹی کستوری سے زیادہ خوشبودار، اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سفید ہے'' یہ حدیث حسن صحیح ہے (☆)۔

(۲) یہ موقف میں نبی کریم ﷺ کا حوض ہے؛ یہ عطا کا قول ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی اثنا میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کو ہلکی سی نیند آئی پھر آپ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے؟ فرمایا: ''مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے تو آپ نے پڑھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ '' پھر پوچھا: ''کیا تم جانتے ہو کوثر کیا ہے؟'' ہم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ''وہ ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس پر خیر کثیر ہے وہ ایک حوض ہے قیامت کے روز میری امت اس پر وارد ہوگی اس کے برتن ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں ان میں سے ایک آدمی کو الگ کر لیا جائے گا میں کہوں گا: وہ میری امت میں سے ہے تو کہا جائے گا: آپ ﷺ نہیں جانتے اس نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا'' (2)۔

میدان محشر میں حوض کے بارے میں کثیر روایات ہیں ہم نے ان کا ذکر کتاب ''تذکرہ'' میں کیا ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر خلفاء اربعہ ہوں گے جس نے ان میں سے کسی ایک سے بھی بغض رکھا دوسرا اسے نہیں پلائے گا۔ ہم نے اسی کتاب میں ان کا ذکر کیا ہے جن کو وہاں سے دور کر دیا جائے گا جو اس پر آ گا ہی چاہتا ہے وہاں سے وہ پڑھ لے۔ پھر یہ جائز ہے کہ اس نہر اور حوض کو کوثر کہا جائے کیونکہ وہاں حضرت محمد ﷺ کی امت میں سے وارد ہونے والے اور پینے والے کثیر ہوں گے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ اس میں خیر کثیر اور کثیر پانی ہوگا۔

(۳) کوثر سے مراد نبوت اور کتاب ہے (3)۔

(۴) حضرت عکرمہ کا قول ہے: اس سے مراد قرآن ہے (4)؛ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

(۵) اس سے اسلام مراد ہے؛ یہ مغیرہ نے بیان کیا ہے۔

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ کوثر، جلد 2، صفحہ 172
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب حجۃ من قال لا یجھر بالبسملۃ، جلد 1، صفحہ 172
3۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 332
4۔ ایضاً

☆ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الکوثر، حدیث نمبر 3284، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۶) قرآن کو آسان بنا دینا اور احکام میں تخفیف رکھنا؛ یہ حسین بن فضل کا قول ہے۔

(۷) صحابہ، امت اور حمایتیوں کی کثرت مراد ہے(1)؛ یہ ابوبکر بن عیاش اور یمان بن رباب کا قول ہے۔

(۸) اس سے مراد ایثار ہے؛ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔

(۹) اس سے مراد رفعت ذکر ہے؛ یہ ماوردی نے بیان کیا ہے۔

(۱۰) یہ تیرے دل میں نور ہے جس نے تیری میری طرف راہنمائی کی اور میرے سوا ہر چیز سے تجھے الگ کر دیا۔

(۱۱) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد شفاعت ہے۔

(۱۲) ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد معجزات ہیں جنہوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہی انہیں ان کے ذریعہ ہدایت دی گئی؛ اسے ثعلبی نے بیان کیا ہے۔

(۱۳) ہلال بن یساف نے کہا: اس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔

(۱۴، ۱۵) ایک قول یہ کیا: اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد دین میں سمجھ بوجھ ہے۔ ابن اسحاق نے کہا اس سے مراد عظیم امر ہے۔

اور لبید کا شعر ذکر کیا:

وصاحب مَلْحوبٍ فُجِعْنا بفقدِهِ وعِندَ الرَّدَاعِ بيت آخرَ كَوْثَر

ملحوب (چشمہ) کے مالک کی موت پر ہم پر اچانک مصیبت آن پڑی جب کہ رداع (چشمہ) کے پاس ایک اور عظیم گھرانہ ہے۔

میں کہتا ہوں: ان تمام اقوال میں سے صحیح ترین پہلا اور دوسرا قول ہے کیونکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور کوثر کے بارے میں نص ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو سنا جو حوض کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے فرمایا: میرا خیال نہیں تھا کہ میں اتنا عرصہ زندہ رہوں گا یہاں تک کہ میں تمہارے جیسے آدمیوں کو دیکھوں گا جو حوض کے بارے میں جھگڑا کریں گے میں اپنے پیچھے ایسی بوڑھی عورتیں چھوڑ کر آیا ہوں ان میں سے کسی نے نماز نہیں پڑھی مگر اس نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض سے سیراب کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

ياصاحبَ الحوضِ مَنْ يُدَانِيكَا وأنتَ حقًّا حبيبُ بارِيكَا

اے حوض کے مالک! کون تیرے قریب پھٹک سکتا ہے تو یقیناً اپنے خالق کا محبوب ہے۔

حوض کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے زیادہ عطا فرمایا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝

''پس آپ نماز پڑھا کریں اپنے رب کے لیے اور قربانی دیں (اسی کی خاطر)''۔

---

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 332

اس میں پانچ مسائل ہیں:

## نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟ اور قربانی سے کیا مراد ہے؟

**مسئلہ نمبر 1**۔ فَصَلِّ جو نماز آپ ﷺ پر فرض کی گئی ہے اس کو قائم کریں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ قتادہ، عطا اور عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے قربانی کے دن عید کی نماز پڑھیں اور اپنی قربانیوں کو ذبح کریں (1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی کریم ﷺ پہلے قربانی کو ذبح کرتے پھر نماز ادا فرماتے تو آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے نماز پڑھیں پھر قربانی کریں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: صبح کی فرض نماز مزدلفہ میں پڑھیں اور منیٰ میں جانور ذبح کریں۔ حضرت سعید بن جبیر نے یہ بھی کہا: یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم ﷺ کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ نماز ادا کریں، جانور کو ذبح کریں اور واپس چلے جائیں تو حضور ﷺ نے اسی طرح کیا۔

ابن عربی نے کہا: جس نے کہا اللہ تعالیٰ کے فرمان فَصَلِّ سے مراد پانچ نمازیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عبادات کا رکن، اسلام کی بنیاد اور دین کا عظیم اصول ہے۔ جس نے کہا: اس سے مراد مزدلفہ میں صبح کی نماز ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حکم نحر کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہ اسی دن ہوتا ہے اور اسی روز قربانی دینے سے پہلے اس نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں اس نماز کا خصوصاً اس لیے ذکر کیا کیونکہ یہ قربانی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے کہا اس سے مراد نماز عید ہے تو یہ مکہ مکرمہ کے علاوہ ہوگی کیونکہ اجماع یہی ہے کہ مکہ مکرمہ میں عید قربانی نہیں ہوتی یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حکایت بیان کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے انہوں نے فرمایا: جس نے اس بارے میں کوئی روایت نہیں سنی اس کی تعبیر کے حوالے سے جو چیز میرے دل میں راسخ ہے کہ اس سے مراد یوم نحر کے روز نماز ہے اور قربانی بعد میں ہوگی۔

حضرت علی شیر خدا اور حضرت محمد بن کعب نے کہا: اس کا معنی ہے نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر نحر (جس جگہ سے اونٹ ذبح کیا جاتا ہے) کے بالمقابل رکھو (2)؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تکبیر کہتے وقت ہاتھ نحر تک اٹھائے جائیں۔ جعفر بن علی سے بھی اسی طرح مروی ہے انہوں نے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: جب تکبیر تحریمہ کہے تو وہ اپنے ہاتھ نحر تک اٹھائے (3)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل امین سے کہا: ''یہ نحیرہ کیا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے؟'' حضرت جبریل امین نے کہا: یہ کوئی قربانی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو یہ حکم دیتا ہے کہ جب تو نماز کے لیے تکبیر تحریمہ کہے تو تکبیر کہتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے اسی طرح جب تو رکوع سے سر کو اٹھائے اور جب تو سجدہ کرے کیونکہ یہ ہماری اور ان

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 332 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1987 3۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 397

فرشتوں کی نماز ہے جو ساتویں آسمان میں ہیں ہر شئی کی زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے موقع پر ہاتھ اٹھانا (1) ہے"۔

ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قربانی کرتے وقت قبلہ رو ہو جائیں؛ یہی فراء کلبی اور ابواحوص کا قول ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

أبا حكم ما أَنتَ عَمُّ مُجالِدٍ وسَيِّدُ أهلِ الأبْطَحِ المُتَنَاحِرِ

اے ابوحکم! تو مجالد کا چچا اور اہل ابطح جو بالمقابل ہیں ان کا سردار نہیں۔

فراء نے کہا: میں نے ایک عربی کو کہتے ہوئے سنا منازِلُنا تَتَنَاحَرُ ہمارے گھر ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔ هذا بنحر هذا یہ اس کے بالمقابل ہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: اس کا معنی ہے آدمی کا حالت نماز میں محراب کے سامنے کھڑا ہونا۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: منازلُهُمْ تَتَنَاحَر ان کے گھر ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ عطا سے مروی ہے: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ بیٹھنے کی حالت میں دو سجدوں کے درمیان سیدھا ہو یہاں تک کہ اس کا نحر (سینے کے اوپر والا حصہ) ظاہر ہو۔ سلیمان تیمی نے کہا: دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو نحر تک اٹھاؤ۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فَصَلِّ کا معنی ہے اس کی عبادت کرو (2)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا: اس کا معنی ہے جو لوگ غیر اللہ کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور غیر اللہ کے لیے جانور قربان کرتے ہیں جب کہ ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا ہے آپ کی نماز اور قربانی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہونی چاہیے۔

ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا اپنے رب کی عبادت کیجئے اس کے لیے جانور قربانی کیجئے آپ کا عمل کسی کے لیے بھی نہیں ہونا چاہیے مگر اس کے لیے جس نے تجھے کوثر کے ساتھ خاص کیا اور مناسب یہی ہے کہ تمام اعمال کوثر کی اس خصوصیت کے ہم پلہ ہوں (3)۔ اس سے مراد خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہے یا اس سے مراد وہ نہر ہے جس کی مٹی کستوری کی ہے، اس کے برتنوں کی تعداد آسمان کے ستاروں کی مثل ہے رہا یہ معاملہ کہ کوثر یوم نحر کی نماز، ایک مینڈھے، گائے یا اونٹ کی قربانی کی مثل ہو جائے تو یہ تقدیر و تدبیر میں بہت ہی بعید ہے اور ثواب کا عبادت کے موازن ہونا بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

## قربانی اور اس کا وقت

**مسئلہ نمبر 2**۔ قربانی، اس کی فضیلت اور اس کے وقت کے بارے میں گفتگو سورۃ الصافات میں گزر چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں سورۂ حج میں بھی ہم نے اس کے تمام احکامات بیان کر دیئے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: عجیب و غریب بات یہ ہے کہ امام شافعی نے کہا: جس نے نماز سے قبل قربانی کر دی تو اس کے لیے یہ جائز ہے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں

1۔ امام شافعی وغیرہ ایسی روایات سے استدلال کرتے ہیں اور ان مواقع پر ہاتھ اٹھانے کا حکم دیتے ہیں جب کہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے مقلدین تکبیر اولی کے وقت ہاتھ اٹھانے کا معمول رکھتے ہیں شرح معانی الآثار جلد اول امام طحاوی نے اس پر مفصل بحث کی ہے اور دلائل نقلیہ اور عقلیہ سے امام اعظم ابوحنیفہ کا نقطۂ نظر راجح قرار دیا ہے۔

2۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 399

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1988

ارشاد فرماتا ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اللہ تعالیٰ نے قربانی سے پہلے نماز سے کلام کو شروع فرمایا(1)۔ بخاری اور دوسری کتب میں حضرت براء بن عازب سے روایت مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہم اپنے اس روز میں سب سے پہلے نماز پڑھیں گے پھر ہم لوٹیں گے اور جانور قربانی کریں گے جس نے اس طرح کیا تو اس نے ہماری عبادت کو پالیا اور جس نے اس سے پہلے جانور ذبح کر دیا تو وہ گوشت ہے جو اس نے اپنے اہل کو بھیجا قربانی میں سے یہ کچھ بھی نہیں''۔ جب کہ امام شافعی کے اصحاب آپ سے اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں یہ موافقت کتنی ہی اچھی ہے۔

## وَانْحَرْ کی تشریح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی روشنی میں

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے کہ وَانْحَرْ کا معنی ہے کہ نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے ہمارے علماء کے اس بارے میں تین قول ہیں جو باہم مختلف ہیں:

(۱) فرض اور نفل میں ہاتھ نہ رکھے کیونکہ اس کا تعلق سہارا لینے سے ہے فرض میں اس طرح کرنا جائز نہیں اور نفل میں مستحب نہیں (۲) فرض نماز میں ایسا نہ کرے اور نفل میں بطور استعانت کے کرے کیونکہ یہ رخصت کا موقع ہوتا ہے (۳) فرض اور نفل دونوں صورتوں میں ہاتھ باندھے یہی صحیح ہے کیونکہ یہ امر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا یہ حضرت وائل بن حجر اور دوسرے صحابہ سے ثابت ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہی امام مالک، امام احمد اور اسحاق نے کہا یہی امام شافعی سے منقول ہے اصحاب الرائے نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے ایک جماعت نے ہاتھ چھوڑنے کی رائے قائم کی ہے جن سے ہم نے یہ قول روایت کیا ہے ان میں ابن منذر، حضرت حسن بصری اور ابراہیم نخعی ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک سے بھی مروی ہے۔ ابن عبد اللہ نے کہا: ہاتھوں کو چھوڑنا اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا یہ سب نماز کا طریقہ ہے۔

## نماز میں ہاتھ باندھنے کا مقام

**مسئلہ نمبر 4**۔ جہاں ہاتھ رکھے جائیں گے اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سینے پر رکھے (2)۔ سعید بن جبیر اور امام احمد بن حنبل نے کہا: ناف کے اوپر اور کہا: اگر ناف کے نیچے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ ایک جماعت نے کہا: ناف کے نیچے؛ یہ حضرت علی شیر خدا، حضرت ابو ہریرہ، امام نخعی (3) اور ابو مجلز سے مروی ہے؛ یہی قول سفیان ثوری اور اسحاق کا بھی ہے۔

## رفع یدین کے بارے میں پایا جانے والا اختلاف

**مسئلہ نمبر 5**۔ تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع اور سجود سے اٹھتے وقت تکبیر کہتے وقت ہاتھ اٹھانے میں اختلاف ہے۔

---

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1990
2۔ تفسیر طبری، ج 30، صفحہ 396
3۔ سنن ابی داؤد، باب وضع الیمنی علی الیسری فی الصلاۃ، حدیث نمبر 645-646، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دار قطنی نے اسے حمید سے انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں داخل ہوتے، جب رکوع کرتے، رکوع اور سجود سے جب سر اٹھاتے تو اپنے ہاتھوں کو اٹھایا کرتے تھے۔ حمید سے مرفوع روایت صرف عبدالوہاب ثقفی نے کی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت انس کا فعل ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ وہ دونوں کندھوں کے برابر ہو جاتے پھر آپ تکبیر کہتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی عمل رکوع کے لیے تکبیر کہتے ہوئے کرتے اور رکوع سے سر کو اٹھاتے وقت بھی اسی طرح کرتے تھے اور کہتے: سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ جب سجدہ سے سر کو اٹھاتے تو ایسا نہ کیا کرتے تھے۔ ابن منذر نے کہا: یہ لیث بن سعد، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابن ثور کا قول ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے یہی قول نقل کیا ہے۔ میں بھی یہ کہتا ہوں کیونکہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے: نمازی جب نماز شروع کرے گا تو وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھائے گا اور باقی مقامات پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا؛ یہ سفیان ثوری اور اصحاب الرائے کا نقطہ نظر ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک کا یہی مشہور مذہب ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی رائے یہی ہے اسے دار قطنی نے اسحاق بن ابی اسرائیل سے روایت کیا ہے (1) کہا ہمیں محمد بن جابر نے حماد بن ابراہیم سے وہ علقمہ سے وہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وہ نماز کے شروع میں پہلی تکبیر کے علاوہ اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ اسحاق نے کہا: ہم تمام نماز میں اسی پر عمل کرتے ہیں۔ دار قطنی نے کہا: محمد بن جابر، حماد سے روایت کرنے میں اکیلا ہے جب کہ وہ ضعیف ہے، حماد نے ابراہیم سے روایت نقل کی حماد کے علاوہ جو راوی ہیں انہوں نے ابراہیم سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ یہ حضرت عبداللہ کا فعل ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نہیں یہی صحیح ہے۔

یزید بن ابی زیاد، عبدالرحمن بن ابی لیلی سے وہ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ نے نماز شروع کی تو اپنے ہاتھوں کو اٹھایا یہاں تک کہ انہیں اپنے دونوں کانوں کے برابر کر دیا پھر ایسا نہ کیا یہاں تک کہ نماز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو گئے۔ دار قطنی نے کہا: یزید نے اپنی آخری عمر ثم لم یعد کی تلقین کی تو انہوں نے اس تلقین کو قبول کیا جب کہ اس میں اختلاط واقع ہو گیا۔ امام مالک سے مروی ہے: آپ نماز میں کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ ابن قاسم نے کہا: میں نے انہیں تکبیر تحریمہ کے وقت بھی ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا کہا: میرے لیے یہی محبوب ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت بھی ہاتھ اٹھانے کے عمل کو ترک کر دیا جائے۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

''یقیناً آپ کا جو دشمن ہے وہی بے نام ونشان ہو گا''۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بغض رکھنے والا ہے وہ بے نام ونشان ہونے والا ہے۔ وہ عاص بن وائل ہے۔ وہ آدمی جس کے

---

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 295

بیٹے اور بیٹیاں ہوتیں پھر بیٹے مر جاتے اور بیٹیاں باقی رہ جاتیں تو عرب اسے ابتر کہتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عاص بن وائل نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑے گفتگو کر رہا تھا تو قریش کے سرداروں نے اسے کہا: تو کس کے ساتھ کھڑا تھا؟ اس نے جواب دیا اس ابتر کے ساتھ۔ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ فوت ہو چکے تھے وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یعنی اس کا ذکر دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے ختم ہو جائے گا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ دور جاہلیت میں جب کسی کا بیٹا فوت ہو جاتا تو کہتے: فلاں دم بریدہ ہو گیا۔ جب حضرت ابراہیم جو رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے تھے فوت ہوئے تو ابو جہل اپنے ساتھیوں کی طرف نکلا تو اس نے کہا: بتر محمد تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا یعنی ابو جہل ابتر ہے۔

شمر بن عطیہ نے کہا: اس سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قریش اس آدمی کے بارے میں کہا کرتے تھے جس کی مذکر اولاد فوت ہو جاتی ہے: قد بتر فلان جب رسول اللہ ﷺ کے ایک بیٹے حضرت قاسم مکہ مکرمہ میں اور ایک بیٹے حضرت ابراہیم مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے تو کفار نے کہا: بتر محمد (1)۔ اب ہے کوئی ایسا آدمی جوان کے بعد ان کے معاملات چلائے گا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی؛ یہ سدی اور ابن یزید نے کہا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ قریش کا جواب تھا جب انہوں نے کعب بن اشرف سے کہا جب وہ مکہ مکرمہ آیا: ہم حاجیوں کو پانی پلانے والے، بیت اللہ کے خادم، اس کے دربان اور لشکر کشی کے وقت جھنڈے والے ہیں جب کہ تو اہل مدینہ کا سردار ہے کیا ہم بہتر ہے یا وہ صُنَیبر اور اُبَیتر بہتر ہے؟ کعب نے کہا: بلکہ تم بہتر ہو تو کعب کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (سورۃ النساء آیت 51) کیا آپ نہیں دیکھتے انہیں جنہیں کتاب میں سے حصہ دیا گیا وہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور قریش کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ یہ حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا نقطہ نظر ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول کی طرف وحی کی اور قریش کو ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ابتر منا محمد یعنی اس نے ہماری مخالفت کی اور ہم سے الگ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو خبر دی کہ وہ دم بریدہ ہیں؛ یہی قول عکرمہ اور شہر بن حوشب نے کیا ہے۔

اہل لغت نے کہا: انسانوں میں سے ابتر اسے کہتے ہیں جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور چوپاؤں میں سے اسے کہتے ہیں جس کی دم نہ ہو اور ہر ایسا امر جس کا اثر خیر میں سے ختم ہو جائے تو اسے ابتر کہتے ہیں۔ بتر کا معنی کاٹنا ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: بترتُ الشیٔ بترًا میں نے اسے مکمل ہونے سے پہلے کاٹ دیا۔ انبتار کا معنی انقطاع ہے باتر سے مراد کاٹ دار تلوار ہے ابتر سے مراد جس کی دم کٹی ہو۔ اس معنی میں تو کہتا ہے: بَتِرَ يَبْتَرُ بَتْرًا حدیث طیبہ میں ہے ما هذه البتیراء، خطب زید

1۔ یہ روایت توکل نظر ہے کیونکہ ابو جہل تو غزوہ بدر میں مارا گیا تھا جو سن دو ہجری میں ہوا تھا اور حضرت ابراہیم کی ولادت حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے ہوئی تھی جو مقوقس شاہ مصر نے بھیجی تھی۔ حضرت ابراہیم کا سن وصال 10 ہجری ذکر کیا گیا ہے۔ مترجم

خطبتہ البتراء اس کے خطبہ کے بارے میں یہ جملہ اس لیے بولا جاتا ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف نہ پڑھا۔ ابن سکیت نے کہا: الابتران سے مراد گدھا اور غلام ہے انہیں ابترین اس لیے کہتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں بھلائی کم ہوتی ہے۔ قد ابترہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے ابتر بنا دیا۔ یہ بھی لفظ بولا جاتا ہے: رجل أباترایسا آدمی جو اپنی رحم کو قطع کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

لَئِيمٌ نَزَتْ فِي أَنْفِهِ خُنْزُوَانَةٌ     علی قَطْعِ ذِي الْقُرْبَى أَحَذُّ أُبَاتِرُ

وہ کمینہ ہے اس کی ناک میں تکبر کے قطرات ٹپکائے گئے ہیں وہ قریبی لوگوں سے تعلق قطع کرنے والا ہے۔

بتریہ یہ زیدیہ کا ایک فرقہ ہے یہ لوگ مغیرہ بن سعد کی طرف منسوب ہیں جس کا لقب ابتر تھا جہاں تک صنبور کا تعلق ہے یہ ایک مشترک لفظ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایک ایسی کھجور ہے جو الگ تھلگ ہوتی ہے جس کا نیچے والا حصہ پتلا ہوتا ہے اور اس کا چھلکا اترا ہوا ہوتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: صَنْبَرَ أسفلُ النخلة ایک قول یہ کیا جاتا ہے: اس سے مراد ایسا آدمی ہوتا ہے جو تنہا ہو اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ کوئی بھائی ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد خاص طور پر حوض کے پانی کے بہنے کی جگہ کو کہتے ہیں، ابو عبید نے یہی بیان کیا ہے اور یہ شعر پڑھا:

مابین صُنْبورٍ إلی الإزاءِ

''صنبور (1) اور ازاء (2) کے درمیان''۔

صنبور اس نڑ کو کہتے ہیں جو برتن میں ہو خواہ وہ برتن لوہے کا ہو یا سکے کا ہو اس سے پانی پیا جاتا ہے۔ ان سب اقوال کو جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ 2۔ دونوں کا معنی پانی بہنے کی جگہ۔

# سورۃ الکافرون

آیاتہا ٦ ۔ ١٠٩ سورۃ الکٰفرون مکیۃ ١٨ ۔ رکوعہا ١

حضرت ابن مسعود، حضرت حسن بصری اور عکرمہ کے قول میں یہ مکی ہے (1) اور حضرت ابن عباس کے ایک قول، قتادہ اور ضحاک کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ اس کی چھ آیات ہیں۔

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے: یہ سورت قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے (☆)۔

کتاب الرد لابی بکر الانباری میں ہے ہمیں عبداللہ بن ناجیہ نے خبر دی کہ ہمیں یوسف نے انہوں نے قعنبی اور ابونعیم سے وہ موسیٰ بن وردان سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہے (2)۔ اسے حضرت انس سے موقوفاً نقل کیا ہے۔ حافظ ابومحمد عبدالغنی بن سعید نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی اور قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ کی قراءت کی پھر فرمایا: ''میں نے قرآن کا ایک تہائی اور ایک چوتھائی پڑھا ہے''۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے جبیر کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ جب تو سفر کے لیے نکلے تو تو شکل وصورت میں اپنے ساتھیوں سے زیادہ حسین ہو اور زاد راہ میں سب سے بڑھ کر ہو؟'' میں نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''ان پانچ سورتوں کو پڑھو یعنی قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ کے شروع سے لے کر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ تک۔ اور قراءت کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کر''۔ کہا: اللہ کی قسم! میرے پاس مال زیادہ نہیں ہوتا تھا جب میں سفر کرتا تو سب سے پراگندہ حال میرا ہوتا اور سب سے کم زاد راہ میرا ہوتا۔ جب سے میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا تو سب سے اچھا حال میرا ہوتا اور سب سے زیادہ زاد راہ میرے پاس ہوتا یہاں تک کہ میں اپنے سفر سے واپس لوٹ آتا۔

فروہ بن نوفل اشجعی نے کہا: ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ فرمایا: ''سوتے وقت قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ پڑھا کرو بے شک یہ شرک سے چھٹکارا ہے'' (3) اسے ابوبکر انباری اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن حکیم میں ابلیس کو غضبناک کرنے والی اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کیونکہ یہ سورت توحید اور شرک سے براءت ہے۔ اصمعی نے کہا: قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ کو مقشقشتان کہا جاتا یعنی یہ دونوں نفاق سے بری کر دیتی ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: جس طرح تارکول جلد کی خشکی کو دور کرتی ہے اور اسے صحیح کر دیتی

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 334 — 2۔ جامع ترمذی، کتاب الفضائل، ماجاء فی اذا زلزلت، جلد 2، صفحہ 113

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 333۔ ایضاً، حدیث نمبر 4396، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ جامع ترمذی، باب ماجاء فی اذا زلزلت، حدیث نمبر 2818، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ ابن سکیت نے کہا: زخم اور چیچک کا چھالا جب خشک ہو جائے اور اوپر سے چھلکا اتر جائے اور اونٹ کی خارش جب خشک ہو جائے تو اس وقت یہ جملہ بولتے ہیں: قد توسّف جلدُہ، تقشّر جلدہ، تقشقش جلدہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ﴿۵﴾

''آپ فرمادیجئے: اے کافرو! میں پرستش نہیں کیا کرتا (ان بتوں کی) جن کی تم پرستش کرتے ہو اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو اس (خدا) کی جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں اور نہ ہی میں کبھی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم پوجا کیا کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں''۔

ابن اسحاق اور دوسرے علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سورت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے انہوں نے کہا: اے محمد! آؤ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت کرو جس کی ہم عبادت کرتے ہیں، ہم اور تم سب اپنے امر میں شریک ہو جاتے ہیں اگر وہ چیز جو تم لائے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو ہمارے پاس ہے تو ہم نے اس میں تمہارے ساتھ شرکت کر لی اور ہم نے اس سے اپنا حصہ لے لیا اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہارے پاس ہے تو تم ہمارے معاملہ میں شریک ہو جاؤ گے اور اس میں سے اپنا حصہ لے لو گے تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔

ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی اگر تم معبودوں میں سے کسی کو ہاتھ لگا لیتے یا اس کا بوسہ لے لیتے تو ہم تمہاری تصدیق کرتے حضرت جبریل امین، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ سورت لائے تو مشرکین مکہ ان سے مایوس ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو بھی اذیتیں دیں۔

الۡکٰفِرُوۡنَ پر جو الف لام ہے اس سے مراد معین افراد ہیں اگرچہ اس کی صفت ہونے کی بنا پر یہ جنس کے لیے ہیں کیونکہ اس میں ان لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہی تھا کہ وہ کفر پر مریں گے تو یہ وہ خاص ہے جو عام لفظ کے ساتھ واقع ہوا ہے اس کی مثل ماوردی سے مروی ہے (1) کہ یہ کلام جواب کے طور پر واقع ہوئی اور کافروں سے مراد معین لوگ ہیں تمام کافر مراد نہیں کیونکہ کافروں میں سے کچھ ایمان لے آئے تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور ان میں سے کچھ ایسے تھے جو کفر پر مرے یا اس پر قتل ہوئے۔ وہی لوگ اس خطاب کے مخاطب ہیں اور ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابوبکر انباری نے کہا: جس نے قرآن حکیم میں طعن کیا ہے اس نے اس میں یوں قراءت کی ہے قل للذین کفروا، لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ اس نے یہ گمان کیا کہ یہی درست ہے جب کہ یہ کہنا رب العالمین پر افتراء ہے، اس سورت کے معنی کو کمزور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 6، صفحہ 357

کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کا قصد کیا ہے اس کو باطل کرنا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا نبی مشرکین کو اس گھٹیا خطاب کے ساتھ مخاطب کر کے اور ان پر وہ بات لازم کر کے جس سے ہر صاحب عقل و دانش نفرت کرتا ہے، مشرکین کو ذلیل و رسوا کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس باطل لفظ کا وہ دعوی کرتا ہے ہماری قراءت معنی میں اس پر مشتمل ہے اور اس معنی میں اضافہ کرتی ہے جو ان کے ہاں ان کے باطل اور تحریف میں نہیں پس ہماری قراءت کا معنی ہے کافروں کو کہہ دیجئے: اے کافرو! اس کی صحت پر دلیل یہ قول ہے کہ جب کوئی بدو اپنے مخاطب سے کہتا ہے: قُلْ لزيدٍ اِقبل الينا اس کا معنی ہے زید سے کہو: اے زید! ہماری طرف متوجہ ہو۔ لہٰذا ہماری قراءت اس پورے معنی پر واقع ہوئی جو ان کے پاس ہے اور ان کی باطل قراءت سے حسین ترین لفظ اور بلیغ ترین معنی ساقط ہو گیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی مجلس میں ان پر اعتماد رکھتے تھے (☆) اور انہیں کہتے: يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اے کفار! جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ وہ اس بات سے ناراض ہوں گے کہ انہیں کفر کی طرف منسوب کیا جائے اور انہیں کفار کے زمرہ میں شامل کر دیا جائے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس امر سے محفوظ و مامون رہے کہ کوئی ہاتھ آپ کی طرف بڑھے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی جانب سے اذیت پہنچے جس نے قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی قراءت نہیں کی جس طرح اللہ تعالیٰ نے آیت کو نازل فرمایا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک آیت کو ساقط کر دیا۔ اہل اسلام کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اس جیسے عمل کی طرف جلدی نہیں کرتے اور اپنے نبی کے بارے میں یہ قصد نہیں کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان فضائل کو الگ کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے ہیں اور جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف یاب فرمایا ہے۔

جہاں تک اس میں تکرار کا تعلق ہے تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان کی طمع کو ختم کرنے کے لیے یہ برائے تاکید کلام ذکر کی گئی ہے جس طرح تو کہتا ہے: واللہ لا أفعل کذا ثم واللہ لا أفعلہ اکثر علماء معانی نے کہا: قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور عربوں کے اسلوب کلام میں تکرار بھی ہے مقصود تاکید اور بات کو سمجھنا ہے، جس طرح ان کے اسلوب میں اختصار بھی ہے مقصود تخفیف و ایجاز ہوا کرتا ہے کیونکہ خطیب اور متکلم کا ایک شئی سے دوسری شئی کی طرف نکلنا اس سے بہتر ہے کہ کسی ایک جگہ ٹھہرا رہا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (الرحمٰن) وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (المرسلات) كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ (الواقعہ) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الم نشرح) سب تاکید کے لیے ہے۔ بعض اوقات قائل یہ کہتا ہے: ارمِ ارمِ، اعجل اعجل اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فلا اذن ثم لا آذن إنما فاطمۃُ بضعۃ منی (1) اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

جس طرح شعراء نے اپنے کلاموں میں تکرار سے کام لیا ہے:

هلا سَأَلت جموعَ كِندة يومَ ولّوْا أَيْنَ أَيْنَا

تو نے کندہ کے لشکروں سے اس روز کیوں نہ پوچھا جب وہ بھاگ کھڑے ہوئے تھے کہاں، کہاں جا رہے ہو۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا، جلد 2، صفحہ 290

☆ بعض نسخوں میں لا یعتمد ہے یعنی اعتماد نہیں رکھتے تھے۔

ایک اور شاعر نے کہ:

یا لَبَكْرٍ أَنْشِرُوا لِي كُلَيْبًا     يالَبَكْرٍ أَيْنَ أَيْنَ الفِرَارُ

اے بنو بکر! میرے لیے کلیب کو زندہ کر دو اے بنو بکر! کہاں کہاں بھاگے جا رہے ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا علقمةُ یا علقمةُ یا علقمةُ     خیرَ تمیم کلِّها وأکرَمَهْ

اے علقمہ، اے علقمہ، اے علقمہ، اے تمام تمیم سے بہترین اور ان میں سے معزز ترین۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا أَقرعُ بنَ حابسٍ یا أَقرعُ     إنَّكَ إنْ يُصرَعْ أَخوكَ تُصرَعُ

اے اقرع بن حابس! اے اقرع اگر تیرے بھائی کو مارا جاتا ہے تو تجھے مارا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

أَلَايا اسلَمِي ثم اسلَمِي ثُمَّتَ اسْلَمِي     ثَلَاثَ تَحِيَّاتٍ وإنْ لم تَكَلَّمَ

تو سلامت رہ، تو سلامت رہ پھر تو سلامت رہ تجھے تین سلام ہوں اگرچہ تو کلام نہ کرے۔

اس کی مثل بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اسلوب ان کے قول کے مطابق ہے: تَعْبُدُ الهتنا ونعبدُ إلٰهَكَ ثم تعبد آلهتنا ونعبدُ إلٰهَكَ ثم تعبد آلهتنا ونعبدُ إلٰهَكَ ہم یہی اصول ہمیشہ کے لیے اپنائیں گے یعنی ایک ایک سال یہ سلسلہ چلے گا۔ تو انہوں نے جو قول کیا تھا اس کی ضد کے ساتھ انہیں جواب دیا گیا۔ یعنی یہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا ہم تجھے اتنا مال دیں گے جس کے باعث تم مکہ کے سب سے غنی بن جاؤ گے، جس سے تم چاہتے ہو ہم تیری شادی اس سے کر دیتے ہیں، ہم تیرے پیچھے پیچھے چلیں گے اور تم ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے رک جاؤ اگر تم ایسا نہ کرو تو ہم تمہارے سامنے ایک تجویز رکھتے ہیں جس میں ہمارے اور تمہارے لیے بھلائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم ایک سال تک ہمارے معبودوں لات وعزیٰ کی عبادت کرو اور ہم ایک سال تک تمہارے معبود کی عبادت کریں گے تو یہ سورت نازل ہوئی لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ میں تکرار اس وجہ سے تھا کیونکہ قوم نے اپنی گفتگو ان پر بار بار دہرائی تھی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تغلیظ کے لیے کلام کو مکرر ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تقدیر کلام یوں ہے لا أعبد الساعة ما تعبدون ولا أنتم عابدون الساعة ما أعبد یعنی میں اس وقت ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس وقت اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ پھر فرمایا: میں مستقبل میں اس کی عبادت کرنے والا نہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم مستقبل میں اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرنے والا ہوں؛ یہ اخفش اور مبرد کا نقطہ نظر ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے جب وہ ایک بت سے رک جاتے تو اسے چھوڑ دیتے پھر اپنی خواہش نفس کی بنا پر ایک اور بت اپنا لیتے جب وہ ایک پتھر کے پاس سے گزرتے جو انہیں اچھا لگتا تو پہلے کو پھینک دیتے اور دوسرے کو اٹھا لیتے اور اس کی تعظیم کرتے اسے نصب کرتے تاکہ عبادت کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ انہیں فرما دیں: جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو میں آج ان بتوں کی عبادت نہیں کرتا جو تمہارے سامنے موجود ہیں پھر فرمایا: اور تم اس کی عبادت کرنے والے نہیں جن کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس بت کی عبادت کرتے ہو جس کو تم نے اپنا معبود بنا لیا ہے وہ اس وقت تمہارے پاس ہے اور میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں جن کی تم پہلے عبادت کرتے تھے اور اب انہیں چھوڑ دیا اور اب تم ان کی طرف متوجہ ہو چکے ہو اور تم اس کی عبادت کرنے والے نہیں جس کی میں عبادت کرتا ہوں کیونکہ میں تو اپنے اللہ کی عبادت کرنے والا ہوں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ زمانہ مستقبل کے متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ ان چیزوں کی عبادت کے بارے میں جن کی وہ زمانہ ماضی میں عبادت کیا کرتے تھے پھر فرمایا: وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ یہ لفظ تکرار ہے معنی کا تکرار نہیں کیونکہ تقابل تو اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ کلام یوں ہوتی ولا أنتم عابدون ما عبدت تو عبدت کے لفظ سے اَعْبُدُ کی طرف عدول کیا گیا ہے مقصود اس امر کا شعور دلانا ہے کہ جب ایک ذات کی ماضی میں عبادت کی گئی وہ وہی ذات ہے جس کی زمانہ مستقبل میں عبادت کی جائے گی جب کہ ماضی اور مضارع کا صیغہ ایک دوسرے کی جگہ واقع ہوتے رہتے ہیں یہ اسلوب اللہ تعالیٰ کی اخبار میں اکثر واقع ہوتا ہے۔

مَآ اَعْبُدُ فرمایا من اعبد نہیں فرمایا تاکہ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ کے مقابل ہو جاتا جب کہ وہ چیزیں بت ہیں ان میں ماہی مناسب ہے من مناسب نہیں پس پہلے کو دوسرے پر محمول کیا گیا ہے تاکہ کلام میں مقابلہ ہو جائے اور منافات واقع نہ ہو بعض اوقات ما کا لفظ ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے اس معنی میں عربوں کا قول ہے: سبحان ما سخر کن لنا اس مثال میں ما، من کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: آیات کا معنی اور اس کی تقدیر یہ ہے اے کافرو! میں ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس لیے کہ تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور تم نے بتوں کو معبود بنا کر رکھا ہے۔ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو تو تم جھوٹے ہو کیونکہ تم مشرک ہوتے ہوئے اس کی عبادت کرتے ہو تو میں تمہاری عبادت کی مثل عبادت نہیں کروں گا تو پھر ما مصدریہ ہے اسی طرح وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ میں ما مصدریہ ہے معنی ہوگا اور تم میری عبادت کی طرح عبادت نہیں کرتے جو کہ توحید ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

”تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین“۔

اس میں تہدید کا معنی ہے یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (القصص:55) اگر تم اپنے دین پر راضی ہو تو ہم اپنے دین سے راضی ہیں۔ یہ قتال کے حکم سے قبل کا حکم ہے اسے آیت سیف سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ پوری آیت منسوخ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس میں سے کوئی چیز بھی منسوخ نہیں کیونکہ یہ خبر ہے اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ کا معنی ہے تمہارے لیے تمہارے دین کی جزا اور میرے لیے میرے دین کی جزا ہے۔ ان کے دین کو دین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اسی کا اعتقاد رکھا تھا اور اس سے اپنی وابستگی کی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمہارے لیے تمہاری جزا اور میرے لیے میری جزا ہے کیونکہ دین کا معنی جزا ہے۔ نافع نے ولی دین میں یاء کو فتحہ دی ہے اور بزی نے ابن کثیر سے اسی طرح روایت کی ہے جب کہ ان سے اختلاف مروی ہے۔ ہشام نے ابن عامر سے اور احفص نے عاصم سے اسی طرح نقل کیا ہے دین میں دونوں حالتوں میں نصر بن عاصم، سلام اور یعقوب نے یاء کو ثابت رکھا ہے انہوں نے کہا: یہ بھی ایک اسم ہے جس طرح دِيْنُكُمْ میں کاف ہے اور قمت میں تاء ہے جب کہ باقی قراء نے یاء کے بغیر پڑھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ (سورۃ الشعراء) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (آل عمران) اس کی مثل دوسری آیات ہیں ان میں کسرہ پر اکتفاء کیا گیا ہے اور مصحف کے خط کی اتباع کی گئی ہے کیونکہ اس میں یہ یاء کے بغیر واقع ہے۔

# سورۃ النصر

آیاتہا ۳ ۔ ۱۱۰ سورۃ النصر مدنیۃ ۱۱۴ ۔ رکوعہا ۱

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے۔ اسے سورۃ تودیع بھی کہتے ہیں۔ اس کی تین آیات ہیں۔ یہ وہ آخری سورت ہے جو اکٹھی نازل ہوئی (1)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور صحیح مسلم میں مروی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝

''جب اللہ کی مدد آپہنچے اور فتح (نصیب ہو جائے)''۔

نَصْرُ کا معنی مدد ہے یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: قد نصر الغیث الأرض بارش نے نباتات کے اگانے میں زمین کی مدد کی جب کہ وہ قحط کا شکار تھی شاعر نے کہا:

إذا انسلخ الشهر الحرام فوَدِّعي بلادَ تميم وانصُرِي أرضَ عامِرِ

جب شہر حرام گزر جائے تو تمیم کے علاقوں کو الوداع کہہ دے اور عامر کے علاقہ کی مدد کر۔

اس سے اسم نصرۃ ہے استنصرہ علی عدوہ اس نے دشمن کے خلاف اس سے مدد طلب کی۔ تناصروا انہوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ پھر یہ قول کیا گیا ہے: اس مدد سے مراد قریش کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد ہے (2)؛ یہ طبری کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: کافروں میں سے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قتال کیا اس کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی کیونکہ مدد کا انجام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ظاہر ہوا جہاں تک فتح کا تعلق ہے اس سے مراد فتح مکہ ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، مجاہد اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے: اس سے مراد شہروں اور محلات کی فتح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد تمام شہروں کی فتح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد علوم کی نوازش ہے۔ یہاں اِذَا، قد کے معنی میں ہے معنی ہوگا یقیناً جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپہنچی کیونکہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی ہو جب مدد آئے گی۔

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

''اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو کہ وہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج''۔

یہاں النَّاسَ سے مراد عرب اور دوسرے لوگ ہیں اور اَفْوَاجًا سے مراد جماعتیں ہیں یعنی ایک جماعت کے بعد دوسری

1۔ زاد المسیر، جلد 8، صفحہ 336 2۔ تفسیر طبری، جز 30، صفحہ 405

جماعت۔ اس کی وجہ یہ بنی جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو عربوں نے کہا: جب حضرت محمد ﷺ نے اہل حرم پر فتح حاصل کر لی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حرم کو اصحاب فیل سے پناہ دی تھی تو تمہارے اندر ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت نہیں تو وہ جماعت در جماعت اسلام قبول کرنے لگے۔ ضحاک نے کہا: امت سے مراد چالیس آدمی ہیں۔ عکرمہ اور مقاتل نے کہا: یہاں الناس سے مراد اہل یمن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یمن سے سات سو افراد مسلمان اور اطاعت شعار بن کر آئے تھے۔ ان میں سے بعض اذانیں دے رہے تھے، بعض قرآن پڑھ رہے تھے اور بعض لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ رہے تھے نبی کریم ﷺ خوش ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رونے لگے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ کی قراءت کی اہل یمن آ گئے ان کے دل نرم، طبیعتیں ملائم، خشیت بہت زیادہ تھی تو وہ جماعت در جماعت اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں وہ دلوں کے کمزور اور رقیق ہیں فقہ یمانی ہے اور حکمت یمانیہ ہے'' (1)۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انی لأجِدُ نفس ربکم من قبل الیمن (2) اس ارشاد کے دو معانی ہو سکتے ہیں (1) نفس سے مراد کشادگی ہے کیونکہ وہ جماعت در جماعت اسلام میں داخل ہوں گے (۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے اہل یمن کے ذریعے مصیبت کو دور کر دیا وہ انصار ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''لوگ اللہ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہوئے یہ عنقریب جماعت در جماعت نکلیں گے'' (3) یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی کے الفاظ ہیں ابو عمار نے کہا مجھے جابر نے بیان کیا ہے کہا: مجھ سے حضرت جابر نے لوگوں کے حالات کے بارے میں سوال کیا، میں نے آپ کو لوگوں کے اختلاف اور افتراق کے بارے میں بتایا تو وہ رونے لگے وہ کہتے میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: إن النَّاس دَخَلوا في دين اللهِ أفواجًا ويخرجون من دين الله أفواجًا (4) لوگ اللہ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہوئے اور وہ عنقریب اللہ کے دین سے جماعت در جماعت نکلیں گے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

''تو (اس وقت) اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجئے اور (اپنی امت کے لیے) اس سے مغفرت طلب کیجئے، بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے''۔

جب تو نماز پڑھے تو اسے کثرت سے پڑھو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: سبح کا معنی ہے تو نماز پڑھ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بِحَمْدِ رَبِّكَ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تجھے جو کامیابی اور فتح دی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی تسبیح بیان کیجئے۔ وَاسْتَغْفِرْهُ یعنی اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فَسَبِّحْ کا معنی ہے اس کی پاکی

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 7202
2۔ ایضاً، حدیث 10978
3۔ النکت والعیون، جلد 5، صفحہ 360
4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 14696

بیان کیجئے یعنی اللہ تعالیٰ کی ان چیزوں سے پاکی بیان کیجئے جو اس کے لیے جائز نہیں ساتھ ہی ساتھ اس کا شکر بجالائیں اور اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے ہوئے اس سے مغفرت طلب کریں۔ پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔

ائمہ نے حدیث روایت کی ہے جب کہ الفاظ بخاری کے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ** کے نازل ہونے کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہا: سبحانَكَ رَبَّنَا وبحمدِكَ اللّٰھمّ اغفِرۡلِی اے ہمارے رب! تو پاک ہے ہم تیری حمد کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے بخش دے (1)۔

صحیح کے علاوہ ایک روایت میں ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا آپ کھڑے نہ ہوتے، نہ بیٹھتے، نہ آتے اور نہ جاتے مگر یہ الفاظ کہتے: سبحانَ اللهِ وبحَمۡدِہ أستغفِرُ الله وأتوبُ إليه (2) فرمایا: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اس سورت کی آخر تک تلاوت کی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کے نزول کے بعد بڑی کوشش کی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم مبارک میں سوجن آ گئی جسم کمزور ہو گیا، مسکراہٹ کم ہو گئی اور رونا زیادہ ہو گیا۔ عکرمہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے امور میں کبھی بھی اتنی مشقت نہیں اٹھائی جتنی کوشش آپ نے اس سورت کے نزول کے بعد کی۔ مقاتل نے کہا: جب اس آیت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ پر پڑھا جن میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے تو وہ سب بہت ہی خوش ہوئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما رونے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''اے چچا جان! تجھے کس چیز نے رلایا ہے؟'' (3) عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے وصال کی خبر دی گئی ہے فرمایا: ''بات اسی طرح ہے جس طرح تو کہتا ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد ساٹھ دن تک زندہ رہے جن میں آپ کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

ایک قول یہ کیا گیا: یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت عمر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما رونے لگے دونوں سے کہا گیا: یہ تو خوشی کا دن ہے۔ دونوں نے کہا: بلکہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم دونوں نے سچ کہا ہے مجھے میری موت کی خبر دی گئی ہے''۔

بخاری شریف اور دوسری کتب میں حضرت ابن عباس سے مروی یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بدری صحابہ کرام اور مجھے ملاقات کی اجازت دیتے تو بدری صحابہ میں سے کوئی اس پر ناراض ہوا انہوں نے کہا: آپ اس نوجوان کو ہمارے ساتھ ملاقات کی اجازت دیتے ہیں جب کہ ہمارے بیٹے ان کی عمر کے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اس کا سبب تم جانتے ہو۔ ایک دن آپ نے ان کو اجازت دی اور مجھے بھی ان کے ساتھ اجازت دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس سورت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 742 2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، سورۂ عصر، جلد 2، صفحہ 742

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 645

کریں اور اس کی بارگاہ میں توبہ کریں۔ حضرت عمر نے پوچھا: اے ابن عباس! تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: بات اس طرح نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کے وصال کی خبر دی ہے فرمایا: اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ یہ آپ کے وصال کی علامت ہے پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے بخشش طلب کرو بے شک وہ تواب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم مجھے اس کے بارے میں ملامت کرتے ہو۔ بخاری میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس سے وہی جانتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں مجھ سے سوال کیا کرتے تھے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ سے پوچھتے ہیں جب کہ اس کی مثل ہمارے بیٹے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی وجہ وہی ہے جو ہم جانتے ہیں۔ انہوں نے ان سے اس آیت اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا وقت ہے میں اسے جانتا ہوں اور آخر تک سورت پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! اس آیت کا وہی مفہوم جانتا ہوں جو تو جانتا ہے۔ کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے: وہ کیا چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بخشتا تھا یہاں تک کہ آپ کو استغفار کا حکم دیا گیا؟ تو اسے جواب دیا جائے گا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعا میں یہ التجا کیا کرتے تھے رَبِّ اغۡفِرۡلِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ وَجَھۡلِیۡ وَاِسۡرَافِیۡ فِیۡ أمرِی کله وأنت أعلم به منِّي (1)۔ اے میرے رب! میری خطا، میری ناواقفی، میری تمام معاملات میں میرے اسراف کو بخش دے اور تو میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

اللّٰھم اغفرلِی خَطئِی وعَمْدِی جھلِی وھزلِی وکلّ ذلك عندِی اے اللہ! میرے غیر ارادی، میرے ارادی، میری ناواقفی اور میری غفلت کو بخش دے یہ سب میرے ہاں ہیں۔ اللّٰھم اغفرلِی مَا قدّمتُ وما أخّرتُ وما أعلنتُ وما أسررتُ أنت المُقدِّمُ وأنتَ المُؤخِّرُ اِنّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِیْر اے میرے اللہ! میرے وہ اعمال جو میں نے پہلے کیے اور جو اعمال میں نے بعد میں کیے، جو میں نے اعلانیہ کیے اور جو میں نے پوشیدہ کیے سب کو بخش دے تو ہی مقدم اور موخر ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو ان نعمتوں کے مقابلہ میں حق ادا نہ کرنے والا خیال کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیں اور ان نعمتوں کے حقوق بجا نہ لے آنے کو قصور خیال کرتے تھے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ کلام اس معنی میں ہو اسی ذات کے ساتھ وابستہ رہنے والے ہو جاؤ، سوال کرنے والے اور رغبت رکھنے والے ہو جاؤ، حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کو دیکھ کر آہ وزاری کرنے والے ہو جاؤ تاکہ اعمال کی رؤیت تک یہ سلسلہ منقطع نہ ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: استغفار، امر تعبدی ہے اس کا بجالانا ضروری ہے یہ مغفرت کے لیے نہیں بلکہ أمر تعبدی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لیے تنبیہ ہے تاکہ وہ بے خوف نہ ہو جائیں اور استغفار کو ترک نہ کر دیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: اپنی امت کے لیے مغفرت طلب کریں۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا وہ تسبیح کرنے والوں اور استغفار کرنے والوں پر کرم نوازی فرمانے والا ہے اور ان پر رحم فرمانے والا ہے وہ

---

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت، جلد 2، صفحہ 946

ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں انہیں استغفار کا حکم دیا جاتا ہے تو غیر کے بارے میں کیا گمان ہوگا۔

امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ جملہ اپنی زبان پر لاتے تھے: سبحانَ اللهِ وبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللهَ وأتوبُ إليه حضرت عائشہ نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں آپ کو اکثر یہ پڑھتے ہوئے سنتی ہوں سبحانَ اللهِ وبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللهَ وأتوبُ إليه (1) فرمایا: میرے رب نے مجھے خبر دی میں اپنی امت میں ایک علامت دیکھوں گا جب میں اسے دیکھوں تو میں یہ کلمات بہت زیادہ کہوں سبحانَ اللهِ وبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللهَ وأتوبُ إليه تحقیق میں نے اسے دیکھ لیا ہے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ سورت حج الوداع کے موقع پر منیٰ میں نازل ہوئی پھر یہ آیت نازل ہوئی اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ: 3) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے بعد اسی دن تک اس دنیا میں رہے پھر کلالہ سورۂ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پچاس دن اس ظاہری زندگی میں رہے پھر لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 129) نازل ہوئی اس کے بعد آپ پینتیس دن تک زندہ رہے پھر اس کے بعد وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللهِ (البقرہ: 281) نازل ہوئی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکیس دن زندہ رہے۔ مقاتل نے کہا: صرف سات دن۔ اس کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں جن کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

1۔ شعب الایمان، کتاب تعظیم القرآن، فی فضائل السور والایات، جلد 2، صفحہ 501

# سورۂ تبت

آیاتہا ۵ | ۱۱۱ سورۃ اللھب مکیۃ ۱ | رکوعہا ۱

سب علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس کی پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾

''ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہو گیا''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## شان نزول

**مسئلہ نمبر 1۔** تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ صحیحین اور دوسری کتب احادیث میں موجود ہے جب کہ الفاظ مسلم شریف کے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جب یہ آیت کریمہ وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿﴾ (الشعراء) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے یہاں تک کہ صفا پہاڑی پر چڑھے اور بلند آواز سے کہا: یا صباحاہ! لوگوں نے پوچھا: یہ اعلان کرنے والا کون ہے؟ لوگوں نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اکٹھے ہو گئے فرمایا: ''اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اے بنی عبد مناف اور بنی عبد المطلب'' تو وہ آپ کے قریب جمع ہو گئے فرمایا: ''مجھے بتاؤ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ ایک گھڑ سوار دستہ اس پہاڑ کے پیچھے سے نکلے گا کیا تم میری تصدیق کرو گے؟'' سب نے کہا: ہمیں آپ کے جھوٹ کا کوئی تجربہ نہیں۔ فرمایا: ''میں تمہیں آنے والے شدید عذاب کے بارے میں خبردار کرنے والا ہوں''۔ ابولہب نے کہا: تو ہلاک ہو (نعوذ باللہ) تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تو یہ سورت نازل ہوئی۔ اعمش نے سورت کے اختتام تک اسی طرح قراءت کی ہے۔ حمیدی اور دوسرے علماء نے زیادہ ذکر کیا ہے جب اس کی بیوی نے سنا کہ اس کے خاوند اور اس کے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی جب کہ آپ کعبہ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو سلب کر لیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیکھ سکی وہ صرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھ رہی تھی اس نے کہا: اے ابو بکر! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تیرا ساتھی میری ہجو کرتا ہے اللہ کی قسم! اگر میں اس کو پاتی تو میں یہ پتھر اس کے منہ پر مارتی اللہ کی قسم! میں شاعرہ ہوں:

---

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من مات علی الکفر فھو فی النار، جلد 1، صفحہ 114

مُذَمَّمًا عَصَيْنَاهُ وَاَمْرَهُ اَبَيْنَاهُ وَدِيْنَهُ قَلَيْنَا

ہم نے مذمم کی نافرمانی کی، اس کے حکم کا ہم نے انکار کیا اور اس کے دین کو ہم نے مبغوض رکھا۔

پھر وہ چلی گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ دیکھتے نہیں تھے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا؟ فرمایا: ''اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مجھ سے روک لیا تھا'' (1)۔ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذمم کہتے تھے وہ آپ کو اس نام سے گالی دیا کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ''کیا تم تعجب کا اظہار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے مشرکین کی اذیتوں کو مجھ سے دور کر دیا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور اس کی ہجو کرتے ہیں جب کہ میں تو محمد ہوں''۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو عبدالرحمن بن زید نے حکایت کی ہے کہ ابولہب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: اے محمد! اگر میں تجھ پر ایمان لاؤں تو مجھے کیا عطا کیا جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو مسلمانوں کو عطا کیا جائے گا''۔ اس نے کہا: مجھے ان پر کوئی فضیلت نہ ہوگی؟ فرمایا: ''تو کیا چیز چاہتا ہے؟'' اس نے کہا: اس دین کی تباہی کہ میں اور یہ لوگ برابر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا: تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۔

ایک تیسرا قول ہے جسے عبدالرحمن بن کیسان نے بیان کیا ہے کہ جب کوئی وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ابولہب ان کے پاس جاتا وہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتے وہ اس سے کہتے: تو ہماری بنسبت ان کے بارے میں زیادہ آگاہ ہے۔ ابولہب انہیں کہتا: وہ کذاب اور ساحر ہے۔ وہ لوگ ملاقات کیے بغیر واپس چلے جاتے۔ ایک وفد آیا تو اس نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو پہلے وفدوں کے ساتھ کرتا تھا انہوں نے کہا: ہم واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ ہم اسے دیکھ لیں اور اس کی بات سن لیں۔ ابولہب نے انہیں کہا: ہم لگاتار اس کا علاج کرتے رہے تو اس کے لیے ہلاکت و بربادی ہے۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو اس وجہ سے آپ پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ابولہب نے ارادہ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مارے تو اللہ تعالیٰ نے ابولہب کو اس سے روک دیا اور اس سورت کو نازل فرمایا۔

**تَبَّتْ** کا معنی ہے اس نے نقصان اٹھایا؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی ہے وہ خائب و خاسر ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ گمراہ ہوا؛ یہ عطا کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ ہلاک ہوا؛ یہ ابن جبیر کا قول ہے یمان بن رئاب نے کہا: وہ ہر خیر سے خالی ہو گیا۔ اصمعی نے ابو عمرو بن علاء سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو لوگوں نے ایک آواز سنی کہنے والا کہہ رہا تھا:

لَقَدْ خَلَّوْكَ وَانْصَرَفُوا فَمَا آبُوا وَلَا رَجَعُوا
وَلَمْ يُوفُوا بِنَذْرِهِمْ فَيَا تَبًّا لِمَا صَنَعُوا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 4، صفحہ 1993

انہوں نے تجھے تنہا چھوڑ دیا اور خود چلے گئے اور نہ لوٹے۔ انہوں نے اپنی نذر کو پورا نہ کیا انہوں نے جو کچھ کیا اس پر ہلاکت ہے۔

تباب (ہلاکت) کو دونوں ہاتھوں کے لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ اکثر عمل انہیں دو کے ساتھ ہوتا ہے یعنی دونوں ہاتھ خسارے میں رہے اور وہ خود خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یدین سے مراد اس کی ذات ہے، نفس کو ید کے ساتھ بھی تعبیر کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ (الحج:10) تو نے جو آگے بھیجا اس کے بدلے۔ یہ کلام عرب کا واضح اسلوب ہے کل کو بعض کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: أصابته یدُ الدھر ویدُ الرزایا والمنایا یعنی اسے مصیبت پہنچی۔ شاعر نے کہا:

لَمَّا اَكَبَّتْ یَدُ الرَّزَایا عَلَیْهِ نَادٰی اَلَا مُجِیرُ

جب مصائب اس پر منہ کے بل گر پڑے تو اس نے ندا کی ہے: کوئی پناہ دینے والا۔

وَّ تَبَّ فراء نے کہا پہلے تَبَّتْ دعا ہے اور دوسرا خبر ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اور وہ ہلاک ہو گیا۔ حضرت عبداللہ اور حضرت ابی کی قراءت میں وقد تَبَّ ہے۔

ابولہب کا نام عبدالعزی تھا وہ حضرت عبدالمطلب کا بیٹا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اس کی بیوی عوراء ام جمیل تھی جو حضرت ابوسفیان بن حرب کی بہن تھی دونوں میاں بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت دشمنی رکھتے تھے۔ طارق بن عبداللہ محاربی نے کہا میں ذی مجاز کی منڈی میں تھا کہ اچانک میں ایک ایسے انسان کے پاس پہنچتا ہوں جو کہہ رہا ہے: اے لوگو! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تم فلاح پا جاؤ گے" (1) اور اس کے پیچھے ایک آدمی ہے جو اسے پتھر مار رہا ہے اس نے اس شخصیت کی پنڈلیوں اور ایڑیوں کو زخمی کر دیا ہے اور کہہ رہا ہے: اے لوگو! یہ جھوٹا ہے تم اس کی تصدیق نہ کرنا۔ میں نے پوچھا: یہ دعوت دینے والی شخصیت کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ نبی ہیں یہ ان کا چچا ابولہب ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ آپ جھوٹے ہیں۔

عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی کہ ابولہب نے کہا: (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر جادو کر دیا ہے بے شک ہم میں سے ایک پورا بکرا کھا جاتا تھا اور دودھ کا بڑا پیالہ پی جاتا تھا اور وہ سیر نہیں ہوتا تھا جب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہیں ایک ران کھلا کر سیر کر دیا ہے اور دودھ کے ایک پیالے سے تمہیں سیراب کر دیا ہے۔

عبدالعزیٰ کو ابولہب کہنے کی وجہ

**مسئلہ نمبر 2۔** اَبِیْ لَهَبٍ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کے حسن اور روشن چہرے کی وجہ سے اسے ابولہب نام دیا گیا ہے۔ ایک قوم کا گمان ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ کافر کا ذکر کنایہ کرنا درست ہے۔ یہ قول باطل ہے۔ علماء کے نزدیک چار وجوہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ابولہب کے ساتھ کیا ہے۔

---

1۔ المعجم الکبیر الطبرانی، جلد 30، صفحہ 343، حدیث 806

(۱) اس کا نام عبدالعزیٰ تھا عزیٰ ایک بت تھا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بت کی طرف عبودیت کی نسبت نہیں کی۔
(۲) وہ اپنے نام کی بجائے کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی کنیت کے ساتھ وضاحت کی۔
(۳) اسم کنیت سے معزز ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معزز نام سے کم درجہ کے نام کی طرف اتارا جب کہ اس کے بارے میں خبر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ان کے ناموں سے یاد کیا اور ان میں سے کسی کی بھی کنیت ذکر نہ کی۔ یہ اسلوب تیری اس امر کے متعلق راہنمائی کرتا ہے کہ اسم کنیت سے فضیلت رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس کی کنیت ذکر نہیں کی جاتی اگرچہ یہ اس کے ظہور اور بیان کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف کنیت کی نسبت محال ہوتی ہے کیونکہ وہ کنیت سے پاک ہے۔
(۴) اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ اس کی نسبت کو ثابت کرے کہ وہ اسے جہنم میں ڈالے گا تو وہ جہنم کا باپ ہے تا کہ اس نسبت کو ثابت کیا جائے اور اس نے اپنے حق میں جس فال کو اختیار کیا ہے اس کو نافذ کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا نام ہی اس کی کنیت تھی اس کے گھر والے اسے ابولہب ہی کہتے، کیونکہ اس کا چہرہ روشن اور خوبصورت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس امر سے پھیر دیا کہ اسے کہیں: ابو النور، ابو الضیاء۔ جو محبوب اور مکروہ کے درمیان مشترک ہے اور ان کی زبانوں پر یہ جاری کر دیا کہ اسے ابولہب کی طرف منسوب کریں جو صرف مکروہ و مذموم کے ساتھ خاص ہے۔ جو آگ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے یوں ثابت کیا کہ اس جہنم کو اس کا ٹھکانہ بنا دیا۔

مجاہد، حمید، ابن کثیر اور ابن محیصن نے اسے ابی لھب پڑھا ہے اور ذَاتَ لَهَبٍ میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کیونکہ اس میں انہوں نے آیات کے سروں کی رعایت کی ہے۔

## ابولہب کا دوزخ میں جانا پہلے ہی لکھا جا چکا تھا

**مسئلہ نمبر 3**۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا تو اسے فرمایا جو ہونے والا ہے اسے لکھ تو جو لکھا گیا اس میں تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ بھی تھا، منصور نے حضرت حسن بصری سے تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کے بارے میں پوچھا: کیا یہ ام الکتاب میں تھا؟ کیا: ابولہب یہ طاقت رکھتا تھا کہ وہ آگ میں داخل نہ ہو؟ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ کی قسم! وہ طاقت نہیں رکھتا تھا کہ اس میں داخل نہ ہو۔ اللہ کی کتاب میں ابولہب اور اس کے والدین کی تخلیق سے پہلے ہی موجود تھا، اس کی تائید حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قول بھی کرتا ہے جو انہوں نے حضرت آدم سے کیا تھا: تو وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، تجھ میں اپنی روح پھونکی، تجھے اپنی جنت میں سکونت عطا کی، اپنے فرشتوں سے تجھے اپنا سجدہ کروایا پھر تو نے لوگوں کو خائب و خاسر کر دیا اور انہیں جنت سے نکال باہر کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: تو وہی موسیٰ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ چن لیا، تجھے تورات دی تو مجھے ایسے امر پر ملامت کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں اس سے قبل لکھ لیا تھا جب کہ آسمانوں اور زمینوں کو تخلیق نہیں فرمایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے''۔ یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

ہمام نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: تو کتنا عرصہ پاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے پہلے تورات کو لکھ دیا تھا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: دو ہزار سال پہلے۔ فرمایا: کیا تو نے تورات میں یہ پایا ہے وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ (طٰہٰ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا تو مجھے ایسے امر پر ملامت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے دو ہزار سال پہلے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اسے کروں گا تو حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے (1)۔ طاؤس، ابن ہرمز اور اعرج نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے: چالیس سال پہلے اسے لکھا۔

مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ﴿۲﴾

''کوئی فائدہ نہ پہنچایا اسے اس کے مال نے اور جو اس نے کمایا''۔

اس نے جو مال جمع کیا اور اس نے جو جاہ و حشمت کمائی انہوں نے اللہ تعالیٰ کا عذاب دور کرنے میں اس کی کوئی مدد نہ کی۔ مجاہد نے مالہ سے مراد اولاد لی ہے کیونکہ آدمی کی اولاد اس کی کمائی ہوتی ہے۔ اعمش نے اسے وما اکتسب پڑھا ہے اور اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ ابو الطفیل نے کہا: ابولہب کی اولاد جھگڑا کرنے کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئی انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اٹھے تا کہ ان کے درمیان رکاوٹ بنیں تو ان میں سے ایک نے آپ کو دھکا دیا تو آپ نیچے گر پڑے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما غصے ہو گئے فرمایا: اخرجوا عنی الکسب الخبیث۔ اے خبیث اولاد! تم میرے پاس سے نکل جاؤ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''انسان جس چیز کو کھاتا ہے اس میں سے پاکیزہ ترین وہ کھانا ہے جو اس کی کمائی سے ہو اور بے شک اس کی اولاد اس کی کمائی ہے'' (2)۔ اسے حضرت ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قبیلہ کو جہنم کی آگ سے ڈرایا تو ابولہب نے کہا: میرا بھتیجا! جو کہتا ہے اگر وہ حق ہے تو میں اپنی ذات بچانے کے لیے اپنے مال اور اولاد کا فدیہ دے دوں گا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ﴿۲﴾۔

مَاۤ اَغْنٰى میں جو مَا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ نافیہ ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ استفہامیہ ہو۔ یعنی وہ کون سی چیز ہو گی جو اسے نفع دے گی۔ دوسرا مَا اس کے بارے میں جائز ہے کہ وہ الذی کے معنی میں ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل کے ساتھ مل کر مصدر کے حکم میں ہو یعنی اس کے مال اور کمائی نے اسے کچھ نفع نہ دیا۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿۳﴾

''عنقریب وہ جھونکا جائے گا شعلوں والی آگ میں''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام، جلد 2، صفحہ 1023-1022

2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 645

لَهَبٍ کا معنی اشتعال اور تلہب ہے سورۃ المرسلات میں اس بارے میں قول گزر چکا ہے عام قراءت سیصلی ہے۔ ابو رجاء اور اعمش نے اسے یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے محبوب نے اسماعیل سے وہ ابن کثیر سے یہی روایت کرتے ہیں اور حسین نے ابو بکر سے وہ عاصم سے بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصری سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اشہب عقیلی، ابو سمال عدوی اور محمد بن سمیقع نے سیُصَلّیٰ پڑھا ہے اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اسے داخل کرے گا اس معنی میں یہ ارشاد ہے: وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ (الواقعہ) دوسری قراءت اصلاء سے ماخوذ ہے یعنی یصلیه اللہ اللہ تعالیٰ اسے داخل کرے گا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی معنی میں ہے فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا (النساء: 30) پہلی قراءت ہی پسندیدہ ہے کیونکہ تمام قراء کا اس پر اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ (الصافات) اس معنی میں دلالت کرتا ہے۔

وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿۴﴾

''اور اس کی جورو بھی بدبخت ایندھن اٹھانے والی''۔

وَّامْرَاَتُهٗ سے مراد ام جمیل ہے۔ ابن عربی نے کہا: وہ کانی ام قبیح ہے وہ کانی تھی۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی نے کہا: وہ لوگوں کے درمیان چغل خوری کیا کرتی تھی۔ عرب کہتے: فلاں یَحْطِبُ علی فلان، فلاں فلاں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

إنّ بنی الأدْرَمِ حَمّالو الحَطَبْ هُمُ الوُشاةُ فی الرِّضَا وفی الغَضَبْ

عَلَیهِمُ اللَّعْنَةُ تَتْرَی والحَرَبْ

بے شک بنی ادرم فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے والے ہیں وہ خوشی اور ناراضگی میں چغل خوری کرتے ہیں ان پر لگاتار لعنت اور ڈاکہ ہو۔ شاعر نے کہا:

ولَمْ تَمْشِ بینَ الحیِّ بالحَطَبِ الرطْبِ

یعنی تو چغل خوری نہ کر۔

یہاں ایندھن کو تر ذکر کیا گیا ہے تاکہ دھویں پر دلالت کرے جو شر میں زیادتی پر دال ہے۔ اکثم بن صیفی نے اپنے بیٹوں سے کہا: چغل خوری سے بچو بے شک یہ روشن آگ ہے چغل خور ایک لمحہ میں وہ کر جاتا ہے جو جادوگر ایک ماہ میں نہیں کرتا۔ ایک شاعر نے اسی مفہوم کو لیا اور یہ شعر کہا:

إنَّ النمیمةَ نارٌ وَیْك مُحْرِقَةٌ فَفِرَّ عَنْها وجانِبْ مَنْ تَعاطَاهَا

بے شک چغل خوری جلا دینے والی آگ ہے تو اس سے دور بھاگ اور جو تیرے پاس اسے لائے اس سے پہلوتہی کر۔

اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے: کینہ کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان ثابت ہے: لایدخلُ الجنّةَ نمامٌ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ذو الوَجْهَینِ لا یکونُ عندَ اللهِ وَجِیهًا (1) چغل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم النمیمۃ، جلد 1، صفحہ 70

خور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: من شَرِّ النَّاسِ ذوالوجهين الذی یَأتِی هٰؤلاءِ بِوَجْهٍ وهولاءِ بِوَجْهٍ(1) لوگوں میں سے سب سے برا دورخا ہوتا ہے جو ان لوگوں کے پاس ایک رخ سے اور دوسرے لوگوں کے پاس دوسرے رخ سے آتا ہے۔

کعب الاحبار نے کہا: بنو اسرائیل کو قحط نے آلیا حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر تین دفعہ آبادی سے باہر نکلے تاکہ بارش کے لیے دعا کریں مگر ان پر بارش نہ ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میرے اللہ! یہ تیرے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی: میں تیری اور جو لوگ تیرے ساتھ ہیں ان کی دعا قبول نہیں کروں گا کیونکہ ان میں ایک چغل خور ہے اس نے چغل خوری پر اصرار کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! وہ کون ہے ہم اسے اپنے درمیان سے نکال دیتے ہیں؟ فرمایا: اے موسیٰ! میں تجھے چغل خوری سے منع کروں اور خود چغل خور بن جاؤں۔ ان سب نے توبہ کی تو ان پر بارش کی گئی (2)۔ چغل خوری گناہ کبیرہ میں سے ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں یہاں تک کہ حضرت فضیل بن عیاض نے کہا: تین چیزیں ایسی ہیں جو عمل صالح کو گرا دیتی ہیں، روزے دار کا روزہ توڑ دیتی ہیں اور وضو کو توڑ دیتی ہیں: غیبت، چغل خوری اور جھوٹ۔

عطا بن سائب نے کہا: میں نے امام شعبی کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ذکر کیا لا یدخُلُ الجَنَّةَ سافكُ دمٍ ولا مشاءٌ بنَمِيمَةٍ ولا تاجرٌ يربي جنت میں خون بہانے والے، چغل خور اور سود لینے والا تاجر داخل نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کی: اے ابو عمرو! چغل خور، قاتل اور سود خور کے ساتھ مل گیا ہے؟ فرمایا: خونوں کو نہیں بہایا جاتا، مالوں کو نہیں چھینا جاتا اور بڑے بڑے فتنے واقع نہیں ہوتے مگر چغل خوری کی وجہ سے ہی ایسا ہوتا ہے۔

قتادہ اور دوسرے علماء نے کہا: وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فقر کا عار دلاتی پھر مال زیادہ ہونے کے باوجود وہ اپنی پشت پر لکڑیاں اٹھاتی کیونکہ وہ بہت بخیل تھی اسے بخل پر عار دلائی گئی ہے۔

ابن زید اور ضحاک نے کہا: وہ کانٹے اٹھالاتی اور رات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے صحابہ کے راستہ میں بکھیر دیتی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ربیع نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان پر یوں چلا کرتے جس طرح ریشم پر چلا جاتا ہے۔ مرہ ہمدانی نے کہا: ام جمیل ہر روز کانٹوں کا گٹھا اٹھالاتی اور مسلمانوں کے راستہ میں پھینک دیتی اسی اثنا میں کہ وہ ایک روز گٹھا اٹھائے ہوئے تھی کہ وہ تھک گئی وہ ایک پتھر پر بیٹھی تاکہ آرام کرے فرشتہ نے پیچھے سے کھینچا تو اسے ہلاک کر دیا۔

سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد خطاؤں اور گناہوں کو اٹھانے والی ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: فلان يَحْتَطِبُ عَلَى ظَهْرِهِ یعنی وہ گناہگار ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (الانعام: 31) وہ اپنے گناہ اپنے پشتوں پر اٹھائے ہوں گے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الرؤیا، باب ذم الوجهين والتحريم فعله، جلد 2، صفحہ 325

2۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حجاج آدم و موسیٰ علیهما السلام، جلد 2، صفحہ 1024-1023

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ جہنم میں گٹھا اٹھائے ہوئے ہوگی۔ یہ حقیقت سے بہت ہی بعید بات ہے۔ عام قراءت حمالۃ ہے کہ یہ خبر ہے اور امراتہ اس کا مبتدا ہے اور فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۞ یہ حَمَّالَةَ میں موجود ضمیر سے حال ہے یا دوسری خبر ہے یا حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، امْرَاَتُهٗ کی صفت ہے اس کی خبر فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۞ ہے اس صورت میں ذَاتَ لَهَبٍ پر وقف ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ امْرَاَتُهٗ کا عطف سَیَصْلٰی کی ضمیر پر ہو تو اس صورت میں ذَاتَ لَهَبٍ پر وقف ہوگا وقف وَّامْرَاَتُهٗ پر ہوگا۔ اور حَمَّالَةَ الْحَطَبِ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ عاصم نے حمالةَ الحطب یعنی منصوب پڑھا ہے یہ بطور ذمت منصوب ہے گویا وہ اس صفت میں مشہور تھی صفت مذمت کے لیے آئی ہے یہ تخصیص کے لیے نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا (الاحزاب: 61) محل استدلال ملعونین ہے۔ ابوقلابہ نے حاملة الحطب پڑھا ہے۔

## فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۞

"اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی"۔

جِیْدِهَا سے مراد گردن ہے امراء القیس نے کہا:

وجِيدٍ كجِيدِ الرِّيمِ لَيْسَ بفاحِشٍ إِذَا هِيَ نَصَّتْهُ وَلَا بِمُعَطَّلِ

کتنی ہی گردنیں ہیں جو ہرن کی گردن کی طرح ہیں وہ بدصورت نہیں جب وہ گردن کو اٹھائے جب کہ اس کی گردن میں کوئی زیور نہیں۔

مَّسَدٍ کا معنی چھال ہے نابغہ نے کہا:

مَقْذُوفَةٍ بِدَخِيسِ النَّحْضِ بازِلُها لهُ صَرِيفٌ صَرِيفُ القَعْوِ بالمَسَدِ

شعر میں مسد سے مراد چھال ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

يا مَسَدَ الخُوصِ تَعَوَّذْ مِنِّيْ إِنْ كُنْتُ لَدْنًا لَيِّنًا فَإِنِّيْ
ماشِئْتَ مِنْ أَشْمَطَ مُقْسَئِنِّ

بعض اوقات یہ اس اونٹ کے چمڑے یا اس کے بالوں کی بنی ہوتی ہے۔

جِیْد کی جمع أجیاد اور مسد کی جمع امساد ہوتی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ اون کی رسی ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ درخت سے بنی ہوئی رسیاں ہوتی ہیں جو درخت یمن میں اگتا ہے جسے مسد کہتے ہیں اسے بانا جاتا ہے۔ ضحاک اور دوسرے علماء نے کہا: یہ دنیا میں ہوگا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر کا طعنہ دیا کرتی تھی جب کہ خود چھال کی رسی میں لکڑیاں باندھتی جسے وہ اپنی گردن میں ڈال لیتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رسی کے ساتھ اس کے گلے کو پھانس دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ آخرت میں اس کے گلے میں آگ کی رسی ہوگی۔

ابوصالح کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول مروی ہے: فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد ہے ایک

ایسی زنجیر ہوگی جس کی لمبائی ستر گز ہوگی؛ یہ مجاہد اور عروہ بن زبیر نے کہا: وہ زنجیر اس کے منہ میں داخل ہوگی اور اس کے نچلے حصے سے نکلے گی، باقی ماندہ اس کی گردن پر لپیٹ دی جائے گی۔

قتادہ نے کہا: حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد ہے ودع کا ہار، ودع سفید گھونگا ہے جو سمندر سے نکلتا ہے جو چھوٹا اور بڑا ہونے میں مختلف ہوتا ہے شاعر نے کہا:

والحِلم حِلْمُ صَبِيٍ يَمْرِثُ الوَدَعَهْ

حلم تو بچے کا حلم ہے جو گھونگے کو چوستا رہتا ہے۔

ودع کی جمع ودعات آتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اس کی گردن میں گھونگھوں کا ہار تھا۔ سعید بن مسیب نے کہا: اس کا موتیوں کا عمدہ ہار تھا۔ اس نے کہا: لات و عزیٰ کی قسم! میں اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ضرور خرچ کروں گا۔ قیامت کے روز یہی اس کے گلے میں عذاب ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ رسوائی کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے حق میں جو شقاوت مقدر ہو چکی تھی وہ ایمان کو چھوڑ کر اس کے ساتھ یوں بندھی ہوئی تھی جس طرح اس کے گلے میں چھال کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ مَسَد کا معنی باٹنا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: مَسَدَ حَبْلَهٗ يَمْسِدُهٗ مَسْدًا یعنی اس نے اسے عمدہ طریقہ سے باٹا۔ شاعر نے کہا:

يَمْسُدُ أَعْلَى لحيهِ ويأْرِمُهُ

یہ کہتا ہے چارہ اس گدھے کی پشت کو قوی کرتا ہے اور مضبوط بناتا ہے۔

دابة ممسودة الخلق اس جانور کو کہتے ہیں جب اس کے جوڑ بڑے مضبوط ہوں۔ شاعر نے کہا:

ومَسَدٍ أُمِرَّ مِنْ أَيَانِقِ صُهْبٍ عتاقٍ ذاتِ مُخٍّ زاهِقِ

لَسْنَ بِأَنْيابٍ ولاحَقَائِقِ

فراء نے کہا: وہ مرفوع ہے شعر میں اکفاء ہے وہ کہتا ہے: بل مُخهن مكتنِز اسے مبتدا کی حیثیت میں رفع دیا گیا ہے۔ کہا: یہ ارادہ کرنا جائز نہیں ولا ضعاف زاهق مخهن جس طرح تیرا یہ کہنا جائز نہیں: مررتُ برجل أبوهٗ قائم۔ دوسرے نے کہا: یہاں زاہق، ذاہب (جانے والا) کے معنی میں ہے گویا کہا: ولا ضعاف مخهن پھر زاہق کو ضعاف کی طرف پھیرا۔ رجل ممسود اسے کہتے ہیں جس کا جسم بٹا ہوا ہو، اس طرح یہ لفظ بولا جاتا ہے: جاريةٌ حسنة المَسد والعصبِ والجلالِ والإرم وهي ممسودةٌ، معصوبةٌ، مجدولةٌ، مأروقةٌ، مساد فعال کا وزن ہے۔ یہ مساب میں ایک لغت ہے اس سے مراد شہد کا مشکیزہ ہے اور گھی کا مشکیزہ ہے۔ یہ سب گفتگو جوہری نے کی ہے۔ اس نقطہ نظر پر اعتراض کیا گیا اور کہا گیا: اگر وہ رسی وہ تھی جس کے ساتھ وہ لکڑیوں کا گٹھا بنایا کرتی تھی تو وہ آگ میں کیسے باقی رہے گی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا: اللہ تعالیٰ اسے ہر دفعہ نیا کرنے پر قادر ہے جب بھی وہ جلے گی۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے آگ میں رہنے کا حکم اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ وفات تک کفر پر باقی رہی جب دونوں کفر پر ہی مرے تو ان دونوں کے بارے میں خبر دینا سچا ہو گیا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کے گلے کو رسی سے گھونٹ دیا اور واقعہ بدر کے سات دن بعد اللہ تعالیٰ نے ابولہب کو پھوڑا کا مرض لگا یا جب کہ ام فضل نے اسے زخمی کیا تھا اس کی وجہ یہ بنی جب حیسمان مکہ آیا تا کہ بدر کی خبر سنائے ابولہب نے اسے کہا: مجھے لوگوں کی خبر سناؤ اس نے کہا: ہاں۔ اللہ کی قسم! ہم قوم (مسلمانوں) سے ملے ہم نے اپنے پہلوان ان کو عطا کر دیئے وہ مسلمان جہاں سے چاہتے ہمارے اسلحے اتار لیتے اس کے باوجود میں نے کسی انسان کو چھوا تک نہیں ہم ایسے سفید رنگت والے لوگوں سے ملے جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اللہ کی قسم! وہ ہم میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑ رہے تھے وہ کہہ رہا تھا: ما تبقی شیأ۔

ابورافع نے کہا: میں حضرت عباس کا غلام تھا اور میں زمزم کے صفہ میں تیروں کی لکڑیاں چھیل رہا تھا میرے پاس حضرت ام الفضل بیٹھی ہوئی تھی ہمیں جو خبر پہنچی تھی اس نے ہمیں خوش کیا تھا میں نے خیمہ کی رسیوں کو اٹھایا اور کہا: اللہ کی قسم! وہ فرشتے تھے ابولہب نے ہاتھ اٹھایا اس نے میرے چہرے پر تھپڑ مارا میں اس پر جھپٹ پڑا میں ایک کمزور آدمی تھا اس نے مجھے اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا اور مجھے مارتے ہوئے میرے سینے پر بیٹھ گیا۔ حضرت ام الفضل خیمہ کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی کی طرف بڑھیں اور وہ ایک کو لیتی ہیں اور کہتی ہیں: تو نے اس کو اس لیے کمزور جانا کہ اس کا آقا موجود نہیں اور اس کے سر پر اس ستون کو مارا اور عجیب سا زخم اس کے سر کو پھاڑ دیتا ہے وہ ذلیل ہو کر اپنے قدم گھسیٹتے ہوئے چلا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پھوڑے کا مرض لگا دیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے، تین دن تک اسے دفن نہیں کیا جاتا یہاں تک کہ وہ بدبودار ہو جاتا ہے پھر اس کے بچوں نے اسے دور سے ہی پانی سے نہلایا اس کی وجہ اس پھوڑے کا خوف تھا قریش اس سے اس طرح بچتے تھے جس طرح طاعون سے بچتے تھے۔ پھر اسے مکہ کے بالائی علاقہ میں لے گئے اسے ایک دیوار کے ساتھ رکھا اور اس پر پتھر رکھ دیئے۔

# سورۃ الاخلاص

آیاتہا ۴ ۱۱۲ سورۃ الاخلاص مکیۃ ۲۲ رکوعہا ۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری، عطا، عکرمہ اور جابر نے کہا، یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول، قتادہ، ضحاک اور سدی نے کہا: یہ سورت مدنی ہے اس کی چار آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ② لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ③ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④

''(اے حبیب!) فرما دیجئے وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ صمد ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے''۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ① وہ واحد طاق ہے اس کے کوئی مشابہ نہیں، کوئی اس کی مثل نہیں، اس کی بیوی نہیں، اس کا کوئی بچہ نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ احد اصل میں وحد تھا اس کی واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ اس معنی میں نابغہ کا قول ہے: بذِی الجَلِیلِ علیٰ مُسْتَأنِسٍ وَحَدِ جلیل ایک بوٹی ہے جو کمزور اور چھوٹی سی ہوتی ہے اور ذوالجلیل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں وہ بوٹی ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں واحد اور احد میں فرق گزر چکا ہے ''کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔ اَحَدٌ مرفوع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے ھو احد۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس کا معنی ہے قل الأمر والشان اللہ أحد۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اَحَدٌ یہ لفظ اللہ سے بدل ہے۔ ایک جماعت نے اسے أحدُ اللہ تنوین کے بغیر پڑھا ہے مقصود خفت کا طلب کرنا اور دو ساکنوں کے اجتماع سے دور بھاگنا ہے اس ضمن میں شاعر کا قول ہے: ولا ذاکرَ اللہ إلا قلیلاً یہاں بھی ذاکر پر ایک زبر اسی تاویل میں ہے۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ② حاجات میں جس کا قصد کیا جاتا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے کہ جس کا حاجات میں قصد کیا جاتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ۝ (النحل) پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہو۔ اہل لغت نے کہا: الصَّمَدُ سے مراد وہ سردار ہے کہ حادثات اور ضروریات میں جس کا قصد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أَلَا بَكَّرَ النَّاعِي بِخَيْرِ بَنِي أَسَدْ　　بعمرِو بن مَسْعُودٍ و بالسيدِ الصَّمَدْ

خبردار موت! کی خبر دینے والے نے بنی اسد کے بہترین آدمی یعنی عمرو بن مسعود اور ایسے سردار کی موت کی خبر دی جس کا

ضروریات میں قصد کیا جاتا ہے۔

ایک قوم نے کہا: الصَّمَدُ سے مراد ہمیشہ اور باقی رہنے والا ہے جو ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: الصَّمَدُ کی تفسیر مابعد کلام ہے جو لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: الصَّمَدُ سے مراد جو نہ کسی کو جنتا ہے اور نہ ہی اسے جنا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز عنقریب مرجائے گی اور جو چیز مرے گی اس کی میراث تقسیم ہوگی۔

حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو وائل شقیق بن سلمہ اور سفیان نے کہا: الصَّمَدُ سے مراد وہ سردار ہے جس کی سرداری انتہاء کو پہنچی ہوئی ہو۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

عَلَوْتُهُ بِحُسَامٍ ثُمَّ قُلْتُ لَهُ     خُذْهَا حُذَيْفَ فَأَنْتَ السَّيِّدُ الصَّمَدُ

میں نے اس پر تلوار کو اٹھایا پھر میں نے اسے کہا: اے حذیفہ! یہ لو تو سردار تھا جس پر سرداری ختم ہوگئی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ ہر کسی سے مستغنی ہے اور ہر کوئی اس کا محتاج ہے۔ سدی نے کہا: وہ ہر مرغوب میں مقصود ہے اور مصائب میں اسی سے مدد مانگی جاتی ہے۔ حضرت حسن بن فضل نے کہا: وہ ذات ہے جو چاہے کرتی ہے اور جو ارادہ کرے اس کا حکم دیتی ہے۔ مقاتل نے کہا: وہ کامل ہے اس میں کوئی عیب نہیں اس معنی میں زبرقان کا یہ شعر ہے:

سِيرُوا جَمِيعًا بِنِصْفِ اللَّيْلِ وَاعْتَمِدُوا     وَلَا رَهِينَةَ إِلَّا سَيِّدٌ صَمَدُ

میں کہتا ہوں: یہ اقوال ایسے ہیں جن کو "کتاب الاسنیٰ" میں صمد کی وضاحت میں ذکر کیے ہیں ان میں سے صحیح جس کی اشتقاق گواہی دیتا ہے وہ پہلا قول ہے؛ اسے خطابی نے ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جسے اپنی رحمتوں سے دور کر دیا ہے اسے ذلیل ورسوا کیا ہے، جہنم کو جس کا ٹھکانہ بنایا ہے اس نے اس سورت میں سے بعض الفاظ کو ساقط کر دیا ہے اور نماز میں یہ پڑھا اللہ الواحد الصمد جبکہ لوگ اس کو سنتے ہیں اس نے قُلْ هُوَ کو گرادیا اور گمان یہ کیا کہ یہ قرآن کا حصہ نہیں اور اَحَدٌ کے لفظ کو بدل دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہی صحیح ہے۔ جس پر لوگ ہیں وہ باطل اور محال ہے اس نے آیت کا معنی باطل کر دیا کیونکہ علماء تفسیر نے کہا: یہ آیت اہل شرک کے جواب میں نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا تھا: ہمارے سامنے اپنے رب کی صفت بیان کیجئے کیا وہ سونے کا ہے، تانبے کا ہے یا پیتل کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ ارشاد فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ هُوَ میں رد کے محل اور جواب کے مکان پر دلالت ہے۔ جب یہ لفظ نہ رہے تو آیت کا معنی باطل ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر اختراع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ثابت ہو جائے گی۔

امام ترمذی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہمارے سامنے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۞ الصَّمَدُ وہ ہوتا ہے جو نہ کسی کو جنے اور نہ اسے جنا گیا ہو کیونکہ جسے جنا جاتا ہے وہ مر ہی جاتا ہے اور جو چیز مرتی ہے اس کا وارث بنا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نہ موت آئے گی اور نہ اس کا کوئی وارث بنے گا (1)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اخلاص، جلد 2، صفحہ 172۔ ایضاً، حدیث نمبر 3287، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۠ نہ اس کا کوئی مشابہ ہے اور نہ مساوی ہے، اس کی مثل کوئی بھی نہیں۔ حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا: ہمارے سامنے اپنے رب کا نسب بیان کیجئے۔ تو جبریل امین اس سورت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور اس کی مثل ذکر کیا اس میں حضرت ابی بن کعب کا ذکر نہیں یہ صحیح ترین ہے؛ یہ ترمذی کا قول ہے (☆)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے الفاظ کا اثبات ہے اور صمد کی تفسیر ہے۔ یہ گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ عکرمہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: لَمْ يَلِدْ اس نے کسی کو نہ جنا جس طرح حضرت مریم نے جنا اور انہیں نہ جنا گیا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کو جنا گیا۔ یہ نصاریٰ اور جنہوں نے حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا قرار دیا ان کا رد ہے۔

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یعنی کوئی اس کا مثل نہیں اس میں اعرابی اعتبار سے تقدیم و تاخیر ہے۔ اس میں کان کی خبر کو اس کے اسم پر مقدم کیا گیا ہے تا کہ آیات کے اواخر ایک ہی نظم پر باقی رہیں اسے كُفُوًا اور كُفْوًا پڑھا گیا ہے سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے کہ ہر وہ اسم جو تین حرف رکھتا ہو اس کا پہلا حرف مضموم ہو اس کے عین کلمہ میں ضمہ اور سکون جائز ہے مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (الزخرف: 15) میں ایسا کرنا جائز نہیں اس علت کی وجہ سے جو پہلے گزر چکی ہے۔ حفص نے كُفُوًا کو فاء کے ضمہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں فصیح ہیں۔

وہ احادیث جو اس سورت کی فضیلت میں وارد ہیں۔

اس میں تین مسائل ہیں:

## سورۂ اخلاص کی فضیلت

**مسئلہ نمبر 1**۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سورت کو بار بار پڑھتے ہوئے سنا جب صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس آدمی کا ذکر کیا وہ آدمی اس کے عمل کو قلیل خیال کر رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے'' (1)۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی اس سے عاجز ہے کہ وہ ایک رات میں تہائی قرآن کی تلاوت کرے؟'' (2) تو یہ امر صحابہ کرام پر شاق گزرا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کوئی اس کی کیسے طاقت رکھ سکتا ہے؟ فرمایا: ''اللہ الواحد الصمد (3) ایک تہائی قرآن ہے''۔ امام مسلم نے ابو درداء سے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔

---

1۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 2، صفحہ 750

2۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 2، صفحہ 113

3۔ یہ سورۂ اخلاص سے کنایہ ہے۔

☆ جامع ترمذی، فضائل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، حدیث نمبر 3288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جمع ہو جاؤ میں تم پر قرآن کا ایک تہائی تلاوت کرتا ہوں'' تو لوگ جمع ہو گئے جب جمع ہو گئے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو انہوں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تلاوت کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لے گئے اور ہم میں سے بعض نے بعض سے کہا: میرا خیال ہے آسمان سے کوئی خبر آئی ہے تو اس نے آپ کو گھر میں داخل کر دیا ہے پھر آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے تمہیں کہا تھا میں تم پر ایک تہائی قرآن کی تلاوت کروں گا خبردار! یہ سورت ایک تہائی کے ہم پلہ ہے'' (1)۔ بعض علماء نے کہا: یہ سورت اس نام کی وجہ سے ایک تہائی قرآن کے برابر ہے جو الصَّمَدُ ہے کیونکہ یہ نام کسی اور سورت میں موجود نہیں اسی طرح اَحَدٌ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: قرآن حکیم تین اجزاء میں نازل ہوا۔ اس کے ایک تہائی احکام ہیں، ایک تہائی وعدو وعید ہیں اور ایک تہائی اسماء وصفات ہیں۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ایک تہائی کو جامع ہے وہ اسماو صفات ہیں۔ صحیح مسلم میں جو حدیث ہے وہ اس چیز پر دال ہے۔ حضرت ابو درداء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو قرآن کے اجزاء کا ایک جز بنا دیا ہے'' (2)۔ یہ نص ہے اسی وجہ سے اسے سورۂ اخلاص کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

## سورۂ اخلاص کے ساتھ محبت کرتے ہوئے امام کا اس کی تلاوت کرنا

**مسئلہ نمبر 2**۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک چھوٹے لشکر میں روانہ کیا وہ اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھایا کرتا تھا اور قراءت کا اختتام سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پر کیا کرتا تھا۔ جب وہ صحابہ واپس آئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے پوچھو وہ کس وجہ سے یہ کام کیا کرتا تھا؟'' صحابہ نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا: یہ سورت رحمٰن کی صفت ہے میں اسے پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے بتا دو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے''۔

امام ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک انصاری مسجد قبا میں ان کو نماز پڑھایا کرتا تھا اس کا آغاز قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سے کرتا یہاں تک کہ اس سے فارغ ہوتا پھر اس کے ساتھ کوئی دوسری سورت پڑھتا وہ ہر رکعت میں ایسا کیا کرتا تھا اس کے ساتھیوں نے اس سے گفتگو کی انہوں نے اس سے کہا: تو یہ سورت پڑھتا ہے پھر تو نہیں دیکھتا کہ یہ چیز تیرے لیے کافی ہے یہاں تک کہ تو کوئی اور سورت پڑھتا ہے یا تو اسی سورت کو پڑھا کر یا اسے چھوڑ دے اور کوئی اور سورت پڑھ لیا کر؟ اس نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے میں اسے چھوڑنے والا نہیں اگر تم پسند کرو کہ میں اس کے ساتھ تمہاری امامت کراؤں تو میں ایسا کروں گا اگر تم ناپسند کرو تو میں تمہاری امامت کرنا چھوڑ دوں گا (3)۔ وہ سب اسے اپنے سے افضل خیال کرتے تھے اور یہ ناپسند کرتے تھے کہ کوئی اور ان کی امامت کرائے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو صحابہ

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 2، صفحہ 115

2۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 1، صفحہ 271

3۔ جامع ترمذی، فضل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 2، صفحہ 114-113

نے سب خبر عرض کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''اے فلاں! تیرے ساتھی تجھے جو کہتے ہیں اس سے تمہیں کیا چیز روکتی ہے اور تجھے کیا چیز اس امر پر برانگیختہ کرتی ہے کہ تو یہی پڑھے؟'' اس نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اسے پسند کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس کی محبت تجھے جنت میں داخل کردے گی''۔ کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔

ابن عربی نے کہا: یہ اس امر پر دلیل ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورت کا تکرار جائز ہے۔ میں نے اسباط کے مقام پر اٹھائیس اماموں میں سے ایک امام دیکھا جو ترکوں کو رمضان شریف میں نماز تراویح پڑھایا کرتا تھا وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھا کرتا تھا یہاں تک کہ تراویح مکمل کر دیتا مقصود ان پر تخفیف اور اس کی فضیلت میں رغبت تھی۔ رمضان میں قرآن حکیم کا ختم سنت نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: مساجد میں قرآن حکیم کا ختم سنت نہیں۔

## سورۂ اخلاص کے مخصوص وظیفہ کا ثواب

**مسئلہ نمبر 3**۔ امام ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سنا جو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تلاوت کر رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''واجب ہوگئی'' (1)۔ میں نے پوچھا: کیا واجب ہوگئی؟ فرمایا: ''جنت''۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام ترمذی نے کہا: محمد بن مرزوق نے حاتم بن میمون ابو سہیل سے وہ ثابت بنانی سے وہ حضرت ابن بن مالک سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''جس نے ہر روز دو سو دفعہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تلاوت کی تو اس سے پچاس سالوں کے گناہ بخش دیئے گئے مگر یہ کہ اس پر قرض ہو'' (2)۔ اسی سند سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''جو آدمی بستر پر سونے کا ارادہ کرے تو دائیں پہلو پر سوئے پھر سو دفعہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے میرے بندے! اپنی دائیں جانب سے جنت میں داخل ہو جا'' (3)۔ کہا: یہ حدیث ثابت کی حدیث جو حضرت انس سے مروی ہے اس سے غریب ہے۔ مسند ابو محمد دارمی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے پچاس دفعہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی تو اس کے پچاس سال کے گناہ بخش دیئے گئے'' (4)۔

کہا: عبداللہ بن یزید نے حیوہ سے وہ ابو عقیل سے وہ حضرت سعید بن مسیب سے روایت نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے فرمایا: ''جس نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ دس مرتبہ پڑھا اس کے لیے جنت میں محل بنا دیا جائے گا، جس نے بیس دفعہ اس کو پڑھا اس کے لیے جنت میں دو محل بنا دیئے جائیں گے، جس نے اسے تیس دفعہ پڑھا اس کے لیے جنت میں تین محل بنا دیئے جائیں گے'' (5)۔ حضرت عمر بن خطاب نے عرض کی: یارسول اللہ! پھر تو ہم اپنے محلات کو زیادہ کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس سے بہت ہی وسیع ہے''۔

---

1۔ جامع ترمذی، فضل القرآن، فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، جلد 2، صفحہ 113 2۔ ایضاً۔ جلد 2، صفحہ 213 3۔ ایضاً

4۔ کتاب المغنی عن حمل الاسفار للعراقی، صفحہ 178 5۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، جلد 7، صفحہ 304، حدیث 11537

ابو محمد نے کہا: ابو عقیل، زہرہ بن معبد ہے علماء کا خیال ہے وہ ابدالوں میں سے تھے۔

ابو نعیم حافظ نے ابو العلاء یزید بن عبداللہ بن شخیر سے مروی حدیث نقل کی ہے انہوں نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا من قرأ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فی مرضه الذی یموتُ فیه لم یُفْتَنْ فی قبره و أمِن من ضغطةِ القبر وحملته الملائكة یوم القیمة بأكفها حتی تجیزه من الصراط إلی الجنة جس نے مرض موت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ کی تلاوت کی تو وہ قبر میں فتنہ میں مبتلا نہیں ہوگا (1)۔ قبر کے جھٹکے سے امن میں ہوگا قیامت کے روز فرشتے اسے اپنی ہتھیلیوں پر اٹھائیں گے یہاں تک کہ اسے پل صراط سے گزار کر جنت تک پہنچا دیں گے۔ کہا: یہ حدیث غریب ہے نصر بن حماد بجلی اس کی روایت کرنے میں اکیلا ہے۔

ابو بکر احمد بن علی بن ثابت حافظ نے عیسیٰ بن ابی فاطمہ رازی سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے مالک بن انس کو کہتے ہوئے سنا: جب ناقوس بجایا جائے گا تو رحمٰن کا غصہ شدید ہو جائے گا فرشتے اتریں گے وہ زمین کی اطراف کو پکڑ لیں گے وہ لگاتار یہ پڑھیں گے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یہاں تک کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

محمد بن خالد جندی، امام مالک سے وہ نافع سے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا اس نے چار رکعات پڑھیں وہ ہر رکعت میں ایک دفعہ سورۂ فاتحہ اور پچاس دفعہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتا ہے کہ یہ چار رکعات میں دو سو دفعہ ہو جاتا ہے وہ نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ جنت میں اپنی منزل دیکھ لے گا یا اسے اس کی منزل دکھائی جائے گی''۔

ابو عمرو جو حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کے غلام تھے وہ حضرت جریر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو پڑھا تو اس گھر کے مکینوں اور ان کے پڑوسیوں سے فقر دور ہو جاتا ہے'' (2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے ایک دفعہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی اس پر برکت نازل کی جاتی ہے، جو اسے دو دفعہ پڑھے تو اس پر اور اس کے اہل پر برکت نازل کی جاتی ہے، جو اسے تین دفعہ پڑھے تو اس پر اور اس کے تمام پڑوسیوں پر برکت نازل کی جاتی ہے، جو اسے بارہ دفعہ پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں بارہ محل بنا دیتا ہے فرشتے کہتے ہیں: ہمارے ساتھ چلو ہم اپنے بھائی کے محلات دیکھیں اگر وہ اسے سو دفعہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے پچاس سالوں کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے سوائے خون ریزی اور اموال لینے کے۔ اگر وہ اسے چار سو دفعہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے ایک سو سال کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، اگر وہ اسے ایک ہزار تک پڑھے تو وہ نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ جنت میں اپنا مکان دیکھ لے گا یا اسے مکان دکھایا جائے گا''۔

سہل بن سعد ساعدی سے مروی ہے: ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں فقر اور تنگ دستی کی شکایت کی

1۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، جلد 7، صفحہ 305، حدیث 11538 2۔ ایضاً، جلد 10، صفحہ 179، حدیث 17075

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''جب تو گھر میں داخل ہو اگر اس میں کوئی ہو تو اسے سلام کرو اگر کوئی بھی نہ ہو تو مجھ پر سلام پیش کرو اور ایک دفعہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی قراءت کرو'' اس آدمی نے اسی طرح کیا اللہ تعالیٰ نے اسے وافر رزق دیا یہاں تک کہ اس نے اپنے پڑوسیوں کو مال عطا کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم تبوک کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو سورج سفید طلوع ہوا اس کی شعاع اور نور تھا زمانہ گزشتہ میں میں نے کبھی بھی اسے نہیں دیکھا تھا حضرت جبریل امین آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اے جبریل! کیا وجہ ہے میں نے سورج کو سفید شعاع کے ساتھ طلوع ہوتے ہوئے دیکھا ہے زمانہ گزشتہ میں، میں نے اسے کبھی اس طرح طلوع ہوتے ہوئے نہیں دیکھا؟ حضرت جبریل امین نے عرض کی: اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مدینہ طیبہ میں معاویہ بن معاویہ لیثی فوت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتے بھیجے ہیں جو اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کس وجہ سے؟ حضرت جبریل نے کہا: وہ دن میں، رات میں، چلتے ہوئے، کھڑے اور بیٹھے ہوئے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا کرتے تھے، یا رسول اللہ! کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زمین کو سمیٹ دوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز جنازہ پڑھیں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ آئے (1)؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا۔ واللہ اعلم۔

1۔ دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 5 صفحہ 245

# سورۃ الفلق

آیاتہا ۵ ۱۱۳ سورۃ الفلق مکیۃ ۲۰ رکوعہا ۱

یہ سورت مکی ہے؛ یہ حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور جابر کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس کے ایک قول میں اور قتادہ کے قول میں یہ مدنی ہے۔ اس کی پانچ آیات ہیں۔ اس سورت، سورۃ الناس اور سورۃ اخلاص کے ساتھ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دم کیا کرتے تھے جب یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ معوذتین کو مقشقشتان بھی کہا جاتا ہے یعنی یہ دونوں نفاق سے پاک کر دیتی ہیں۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت ابن مسعود نے گمان کیا: یہ دعا ہے جس کے ذریعے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جادو سے الله تعالیٰ کی پناہ چاہی اور یہ قرآن میں سے نہیں مگر حضرت ابن مسعود کی اجماع صحابہ اور اہل بیت نے مخالفت کی۔

ابن عتیبہ نے کہا: حضرت عبدالله بن مسعود نے معوذتین کو اپنے مصحف میں نہ لکھا کیونکہ وہ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کرتے تھے کہ آپ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو ان دونوں کے ساتھ دم کیا کرتے تھے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ دونوں بھی اس کے قائم مقام ہیں أعیذ کما بکلمات الله التامة من کل شیطانٍ وھامّةٍ ومن کلّ عینٍ لامّةٍ (1)۔

ابوبکر انباری نے کہا: یہ بات ابن قتیبہ پر رد کر دی جائے گی کیونکہ یہ دونوں سورتیں رب العالمین کا کلام ہیں جو تمام مخلوقات کو عاجز کرنے والا ہے اور أعیذ کما بکلماتِ الله التامّة انسان کا کلام ہے اور اس کا انسان کا کلام ہونا واضح ہے۔ خالق کا کلام جو خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے معجزہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایسی حجت ہے جو تمام کفار پر قائم ہے یہ لوگوں کے کلام کے ساتھ خلط ملط نہیں ہو سکتی خصوصاً حضرت عبدالله بن مسعود جو فصیح اللسان، لغت کے عالم، کلام کی اجناس سے آگاہ اور قول کے مختلف فنوں سے آشنا ہیں ان پر یہ معاملہ ملتبس نہیں ہو سکتا۔

بعض علماء نے کہا: حضرت عبدالله بن مسعود نے معوذتین کو مصحف میں نہیں لکھا کیونکہ انہیں ان کے نسیان سے امن تھا انہوں نے ان دونوں کو تو مصحف سے ساقط کیا جب کہ یہ دونوں انہیں یاد تھیں جس طرح انہوں نے مصحف سے فاتحۃ الکتاب کو ساقط کر دیا کیونکہ اس کے حفظ اور اس کے اتقان کے بارے میں ان کے متعلق شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس قول کو اس کے قائل پر رد کر دیا جائے گا اور ایسے قول کرنے والے کے خلاف اس دلیل سے استدلال کیا جائے گا کہ انہوں نے اپنے مصحف میں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۞، اِنَّاۤ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۞، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ کو لکھا یہ سورتیں بھی معوذتین کے قائم مقام ہیں کیونکہ یہ بھی طویل نہیں ان کو بہت تیزی سے یاد کیا جا سکتا ہے، ان کے بھول جانے سے بھی امن ہے، سب فاتحۃ الکتاب

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطب، ماجاء فی الرقیۃ المعوذتین، جلد 2، صفحہ 27

سے مختلف ہیں کیونکہ سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی ہر رکعت کے بارے میں یہی طریقہ ہے کہ ہر رکعت میں پہلے اسے پڑھا جائے اور بعد میں کسی اور کی قراءت کی جائے۔ سورۂ فاتحہ کو مصحف سے ساقط کرنا جب کہ اس کے حفظ کے باقی رہنے کے بارے میں اعتماد ہو یہ سورۂ فاتحہ کے بارے میں توضیح ہے باقی سورتیں ایسی نہیں جو اس کے قائم مقام ہوں اور نہ اس کے راستہ پر چلا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اس کی بحث گزر چکی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

''آپ عرض کیجئے: میں پناہ لیتا ہوں صبح کے پروردگار کی ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا اور (خصوصاً) رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے اور ان کے شر سے جو پھونکیں مارتی ہیں گرہوں میں اور (میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

## سورۂ فلق کا وظیفہ

**مسئلہ نمبر 1**۔ امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر رکھ دیا میں نے عرض کی: مجھے سورۂ ہود پڑھائیے مجھے سورۂ یوسف پڑھائیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تو کوئی چیز نہیں پڑھے گا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں **قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ﴿۱﴾** سے بڑھ کر فضیلت کی حامل ہو'' (1)۔

ان سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے: اسی اثنا میں کہ جحفہ اور ابواء کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ ہمیں سخت تاریک آندھی نے آلیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ﴿۱﴾** اور **اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾** کے ساتھ دعا کرنے لگے (2) اور فرمانے لگے: ''اے عقبہ! ان کے ساتھ پناہ چاہو کوئی پناہ چاہنے والا ان کی مثل سے پناہ نہیں چاہتا''۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے (☆☆)۔

امام نسائی نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: ہمیں ہلکی بارش اور تاریکی نے آلیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھانے کے لیے باہر تشریف لائے (3) فرمایا: ''**قُلۡ**'' میں نے عرض کیا: میں کیا کہوں؟ فرمایا: جب تو شام کرے تو **قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾** اور معوذتین پڑھا کر جب تو صبح کرے تو اس وقت ان کی تلاوت کیا کر یہ تجھے ہر شی کے لیے کافی ہو جائیں گے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ، صفحہ 312
2۔ شعب الایمان، تعظیم القرآن، فضائل السور والآیات، جلد 2، صفحہ 512-511
3۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ، جلد 2، صفحہ 311
☆☆ سنن ابی داود، باب فی المعوذتین، حدیث نمبر 1251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت عقبہ بن عامر جہنی نے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قُلْ" میں نے عرض کیا: میں کیا کہوں؟ فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں کی تلاوت کی (1)۔ پھر فرمایا: "لوگوں نے ان جیسی سے پناہ نہ چاہی ہوگی" یا فرمایا: "لوگ ان جیسی سے پناہ نہیں چاہتے"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ یہ دو سورتیں ہیں۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی تکلیف ہوتی تو آپ ﷺ معوذتین کو اپنے اوپر پڑھتے اور پھونک مارتے جب آپ ﷺ کی تکلیف بڑھ گئی تو میں آپ ﷺ پر پڑھا کرتی تھی اور آپ ﷺ کے اطراف کو چھوتی تاکہ ہاتھ کی برکت حاصل کروں۔ نفث ایسی پھونک ہے جس میں تھوک کی آمیزش نہ ہو (2)۔

## سورۂ فلق اور سورۂ ناس سے جادو کے اثر کا خاتمہ

**مسئلہ نمبر 2**۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ثابت ہے کہ بنی زریق کے ایک یہودی نے آپ ﷺ پر جادو کیا جسے لبید بن اعصم کہتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو خیال گزرا یہ آپ نے فعل کیا ہے جب کہ وہ فعل نہ کیا ہوتا (3)۔ آپ ﷺ اسی طرح رہے جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ اسی طرح رہیں۔ غیر صحیح میں یہ عرصہ منقول ہے کہ وہ ایک سال کا عرصہ ہے پھر فرمایا: "اے عائشہ! مجھے محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فیصلہ سنا دیا ہے جو میں نے فیصلہ چاہا تھا میرے پاس دو فرشتے آئے ان میں سے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے قدموں کے پاس بیٹھ گیا وہ فرشتہ جو میرے سر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے اس فرشتہ سے کہا جو میرے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ان کو کیا ہو گیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پوچھا: کس نے ان پر جادو کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن اعصم نے۔ پوچھا: کس میں کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: کنگھی، بالوں اور نرگابھے پر جو بال ہوتے ہیں اس میں جادو کیا جسے ذی اروان کے کنویں میں اس پتھر کے نیچے رکھا گیا ہے جس پر کھڑے ہو کر پانی نکالا جاتا ہے آپ اس کنویں پر آئے اور اس کو نکالا"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے عائشہ! کیا تجھے پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری بیماری کے بارے میں بتادیا ہے" (4) پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو بھیجا انہوں نے اس کے پانی کو نکالا گویا اس میں مہندی کو بھگو یا گیا ہو۔ پھر انہوں نے اس پتھر کو اٹھایا جو راعوفہ تھا یہ وہ پتھر ہوتا ہے جو کنویں کے نیچے رکھا جاتا ہے جس پر ڈول بھرنے والا کھڑا ہوتا ہے انہوں نے گابھے پر موجود بالوں کے گچھے کو نکالا تو اس میں انسان کے بال تھے، کنگھی کے دندانے، اس میں ایک کمان کی تانت تھی جس میں گیارہ گرہیں تھیں جن میں سوئیوں کو

1۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ، جلد 2، صفحہ 311
2۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، فضل المعوذتین، جلد 2، صفحہ 750
3۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الشرك والسحر من الموبقات، جلد 2، صفحہ 858
4۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطب والمرض والرقی، جلد 2، صفحہ 219

چھپا یا گیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان دو سورتوں کو نازل فرمایا یہ گیارہ آیات ہیں جو ان گرہوں کے برابر ہیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ان دونوں کے ساتھ دم کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی ایک آیت پڑھتے تو ایک گرہ کھلتی جاتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ آسودگی پاتے یہاں تک کہ آخری گرہ بھی کھل گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یوں ہوگئی گویا آپ کو بندوں سے آزاد کر دیا گیا ہو۔

کہا: حضرت جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دم کرنے لگے وہ کہتے: میں اللہ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں ہر ایسی چیز سے جو آپ کو تکلیف دے، ہر حاسد اور آنکھ کے شر سے اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفا دے (1)۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم اس خبیث کو قتل نہ کر دیں؟ فرمایا: ''جہاں تک میرا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا عطا کر دی ہے اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ میں لوگوں میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاؤں''۔ قشیری نے اپنی تفسیر میں کہا: صحاح میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا یہودیوں نے اس تک رسائی حاصل کی وہ لگاتار اس کے ساتھ رابطہ میں رہے یہاں تک کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال حاصل کر لیے (مشاطہ ایسے بالوں کو کہتے ہیں جو کنگھی کرتے وقت گرتے ہیں) اس نے آپ کی کنگھی کے چند دندانے بھی حاصل کر لیے اور یہودیوں کو دے دیئے انہوں نے انہیں میں جادو کیا۔ جس نے جادو کرنے کی ذمہ داری لی تھی وہ لبید بن اعصم یہودی تھا اور پھر اسی طرح واقعہ ذکر کیا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3**۔ سورۂ بقرہ میں جادو، اس کی حقیقت، اس وجہ سے جو تکالیف اور مفاسد جنم لیتے ہیں اور جادوگر کا حکم سب گزر چکے ہیں۔ ان کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

## فلق کا معنی و مراد

**مسئلہ نمبر 4**۔ فلق کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ جہنم میں قید خانہ ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: ہر جہنم میں ایک کمرہ ہے جب اسے کھولا جاتا ہے تو جہنمی اس کی گرمی کی وجہ سے چیخ پڑتے ہیں۔ حبلی ابو عبدالرحمٰن نے کہا: یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ کلبی نے کہا: یہ جہنم کی ایک وادی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: یہ جہنم میں ایک درخت ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ جہنم میں ایک کنواں ہے۔ نحاس نے کہا: زمین میں سے جو حصہ پست ہو اسے فلق کہتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنا پر یہ (آخری) قول صحیح ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، قرظی اور ابن زید نے کہا: فلق کا معنی صبح ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ عرب کہتے ہیں: ھو أبین من فَلَقِ الصُّبْحِ و فَرَقِ الصبح وہ صبح کے پھوٹنے سے بھی زیادہ واضح ہے۔ شاعر نے کہا:

یالیلۃ لم أنمھا بِتُّ مُرْتَفِقًا أَرْعَی النجومَ إلی أَنْ نَوَّرَ الفَلَقُ

ہائے وہ رات جو میں سو نہ سکا جسے میں نے کہنی پر ٹیک لگاتے ہوئے گزارا ہے میں انجم شماری کرتا رہا یہاں تک کہ صبح روشن ہوگئی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: فلق سے مراد پہاڑ اور چٹانیں ہیں جو پانیوں کی وجہ سے پھٹ جاتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے:

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 2، صفحہ 213

اس سے مراد پہاڑوں اور چٹانوں کے درمیان شگاف ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے پھٹ جاتی ہیں۔ زہیر نے کہا:

مازِلْتَ أَرْمُقُهُمْ حَتّٰى إِذَا هَبَطَتْ    أَيدِي الرِّكَابِ بِهِمْ مِنْ رَاكِسٍ فَلَقَا

راکس سے مراد وادی کا بطن ہے اسی طرح نابغہ کے قول میں ہے:

أَتَانِي وَدُونِي رَاكِسٌ فَالضَّوَاجِعُ

راکس سے مراد ھادی بھی ہے ہادی سے مراد وہ بیل ہے جو کھلیان کے درمیان ہوتا ہے فصل کاٹتے وقت دوسرے بیل اس پر گھومتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد رحم ہے جو حیوان کی پیدائش پر کھل جاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: فلق سے مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ جس چیز کو بھی پیدا فرماتا ہے اس کی پیدائش کے وقت جو چیز بھی پھٹتی ہے اسے فلق کہتے ہیں، وہ حیوان ہو، صبح ہو، دانا ہو یا گٹھلی ہو، وہ نباتات میں سے ہو یا کسی اور چیز سے ہو؛ یہ حضرت حسن بصری اور دوسرے علماء کا نقطہ نظر ہے۔ ضحاک نے کہا: الْفَلَقِ سے مراد تمام مخلوق ہے۔ کہا:

وَسْوَسَ يَدْعُو مُخْلِصًا رَبَّ الْفَلَقْ    سِرًّا وَقَدْ أَوَّنَ تَأْوِينَ الْعُقُقْ

اس نے رب فلق کے حضور راز داری سے اخلاص کے ساتھ دعا کی جب کہ وہ کھانے پینے سے یوں پیٹ بھر چکا تھا جس طرح وہ حاملہ جانور پیٹ بھرے ہوئے ہوتا ہے جس کی ولادت کا وقت قریب ہو۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی تائید اشتقاق بھی کرتا ہے کیونکہ فلق کا معنی شق ہے جس طرح کہا جاتا ہے: فَلَقْتِ الشئ فلقا۔ میں نے اسے پھاڑا تفلیق اس کی مثل ہے، جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے: فَلَقته فانفلق و تَفَلَّق میں نے اسے پھاڑا تو وہ پھٹ گیا۔ ہر وہ چیز جو کسی اور چیز کے اوپر سے پھٹے خواہ وہ حیوان ہو، صبح ہو، دانا ہو، گٹھلی ہو یا پانی ہو پھٹنے والی چیز کو فلق کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَالِقُ الْإِصْبَاحِ (الانعام:96) صبح کو پھاڑنے والا۔ فرمایا: فالق الحب والنوی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا۔ ذو رمہ وحشی بیل کی صفت بیان کرتا ہے:

حَتّٰى إِذَا مَا انْجَلَى عَنْ وَجْهِهِ فَلَقٌ

یہاں تک کہ جب اس کے چہرے سے صبح روشن ہوتی ہے۔

یہاں فلق سے مراد بعینہٖ صبح ہے۔ فلق کا معنی دو ٹیلوں کے درمیان پست زمین بھی ہے۔ اس کی جمع فلقان آتی ہے جس طرح خلق اور خلقان ہے۔ بعض وہ کہتے ہیں: کان ذلك بفالق كذا و كذا۔ اس سے مراد وہ پست زمین ہے جو دو ٹیلوں کے درمیان ہو۔ فلق کا معنی قید خانہ کا شکنجہ بھی ہے جہاں تک فلق کا تعلق ہے اس کا معنی بڑی مصیبت اور عجیب امر ہے تو کہتا ہے: أفلق الرجلُ وافْتَلَقَ، شاعرٌ مفلقٌ وقد جاء بالفلق۔ وہ بڑی مصیبت لایا فلق کا معنی ایسی شاخ ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہو اور اس سے دو کمانیں بنائی گئی ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کو فلق کہتے ہیں عربوں کا قول ہے: جاء بعلق فلق۔ اس سے مراد بڑی مصیبت ہے اسے عمر کے قائم مقام نہیں رکھا گیا۔ اس سے یہ جملہ بولا جاتا ہے: أعلقت و أفلقت یعنی میں بڑی مصیبت لایا۔ مریفتلق فی عدوه وہ اپنی شدت کی وجہ سے اپنے دشمن میں عجیب وغریب مصائب لایا۔

مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۞ ایک قول یہ کیا گیا: مَا خَلَقَ سے مراد ابلیس اور اس کی اولاد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد جہنم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ عام ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو بھی چیز پیدا کی ہے ان میں سے ہر ذی شر کے شر سے۔

غاسق اور وقب کا معنی ومفہوم

**مسئلہ نمبر 5**۔ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۞ غَاسِقٍ کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد رات ہے۔ غسق سے مراد رات کی تاریکی کا ابتدائی حصہ ہے۔ اسی معنی میں کہا جاتا ہے: غَسَقَ اللَّيْلُ يَغْسِقُ یعنی رات تاریک ہو گئی۔ ابن قیس رقیات نے کہا:

اِنَّ هٰذَا اللیلَ قد غَسقَا واشْتکَیْتُ الهَمَّ والأَرَقَا

یہ رات تاریک ہو چکی ہے اور میں نے غم اور بے خوابی کی شکایت کی۔ ایک اور شاعر نے کہا:

یا طیفَ هندٍ لَقَدْ أَبْقَیْتَ لِی أَرَقَا إِذْ جِئْتَنَا طارِقًا واللیلُ قَدْ غَسقَا

اے ہند کے خواب! تو نے میرے لیے بے خوابی چھوڑی ہے جب تو ہمارے پاس رات کے مہمان کے طور پر آیا جب کہ رات تاریک ہو چکی تھی۔

یہ حضرت ابن عباس، ضحاک، قتادہ، سدی اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر وقب کا معنی تاریک ہونا ہے؛ یہی حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی داخل ہونا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی جانا ہے۔ یمان بن رئاب نے کہا: اس کا معنی ساکن ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس کا معنی نازل ہونا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: وقب العذاب علی الکافرین عذاب کافروں پر نازل ہوا۔ ایک شاعر نے کہا:

وَقَبَ العذابُ علیهم فکأنَّهُمْ لَحِقَتْهُمْ نارُ السَّمُومِ فأُحْصِدُوا

ان پر عذاب واقع ہوا گویا انہیں زہریلی آگ لاحق ہوئی تو انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔

زجاج نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا اللیل غاسق کیونکہ وہ دن سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ غاسق کا معنی ٹھنڈا ہے اور غسق کا معنی ٹھنڈک ہے کیونکہ رات کے وقت درندے اپنی کچھاروں سے باہر آ جاتے ہیں، زہریلے کیڑے، اپنی بلوں سے باہر آ جاتے ہیں اور شریر لوگ شر وفساد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا: غَاسِقٍ سے مراد ثریا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ غروب ہوتی ہے تو بیماریاں کثرت سے واقع ہوتی ہیں اور جب وہ طلوع ہوتی ہے تو بیماریاں اٹھ جاتی ہیں؛ یہ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا: ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد سورج ہے جب وہ غروب ہو جائے؛ یہ ابن شہاب کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اس سے مراد چاند ہے۔ قتبی نے کہا اذا وَقَبَ الْقَمَرُ جب اسے گرہن لگ جائے۔ ہر وہ چیز جو سیاہ ہو تو اس کے لیے غسق کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: اِذَا وَقَبَ کا معنی ہے جب وہ غائب ہو جائے۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ترمذی شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو کیونکہ

جب یہ غائب ہو جاتا ہے تو یہی غاسق ہے" (1)۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے ابن اعرابی سے اس حدیث کی تاویل میں فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ جادوگر چاند کے غروب ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور یہ شعر پڑھا:

أَراحَنِي اللهُ مِنْ أَشياءَ أَكرهُها	منها العجوزُ ومنها الكلبُ والقمرُ
هذا يبوحُ وهذا يُستضاءُ به	وهذه ضِمْرِزٌ قَوّامَةُ السَّحَرِ

اللہ تعالیٰ نے مجھے ان چیزوں سے راحت دی ہے جن کو میں ناپسند کرتا ہوں، ان میں سے بوڑھی عورت ہے، ان میں سے کتا اور چاند ہے یہ ظاہر ہوتا ہے، اس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، یہ موٹی عورت ہے جو جادو کرنے والی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: غَاسِقٍ سے مراد ایسا سانپ ہے جو ڈسے۔ غاسق سے مراد اس کی داڑھ ہے کیونکہ زہر اسی سے بہتا ہے۔ وقب نابھا سے مراد ہے جب اس کی داڑھ اس جاندار کے جسم میں داخل ہو جائے جس کو اس نے ڈسا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ہر حملہ آور چیز جو نقصان دہ ہو خواہ کوئی بھی ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: فسقت القرحة۔ جب اس کی پیپ بہے۔

## نَفّٰثٰت کا معنی کا و مراد

**مسئلہ نمبر 6**۔ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۝ النَّفّٰثٰتِ سے مراد وہ جادوگر عورتیں ہیں جو دھاگوں کی گرہوں میں تھتکارتی ہیں جب ان پر دم کرتی ہیں۔ نفخ کو تشبیہ دی گئی اس آدمی کے ساتھ جو دم کرتا ہے۔ متمم بن نویرہ نے کہا:

نَفَثْتَ فی الخیط شَبِیهَ الرُّقَی	مِن خشیة الجِنّةِ والحاسِدِ

تو نے جنوں اور حاسد کے ڈر سے دھاگے میں تعویذ کی مثل تھتکارا۔ عنترہ نے کہا:

فإنْ يَبْرَأْ فَلَمْ أَنْفُثْ عَلَيهِ	وإِنْ يُفْقَدْ فَحُقَّ لَهُ الفُقُودُ

اگر وہ صحیح ہو جائے تو میں اس پر نہیں تھتکاروں گا اور اگر وہ مفقود ہو جائے تو مفقود ہونا اس کو زیبا ہے۔

## قرآن کے تعویز کا شرعی حکم

**مسئلہ نمبر 7**۔ امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے گرہ لگائی پھر اس میں تھتکارا تو اس نے جادو کیا جس نے جادو کیا اس نے شرک کیا جس نے کوئی چیز لٹکائی (2) تو اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا" (3) بعض نے کہا: میں ضحاک کی خدمت میں حاضر ہوا انہیں بڑی تکلیف تھی میں نے کہا: اے ابو محمد! کیا میں تجھے دم نہ کروں؟ جواب دیا: کیوں نہیں لیکن تھتکارنا نہیں، تو میں نے انہیں معوذتین کے ساتھ دم کیا۔

ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے کہا قرآن پڑھ کر پھونک ماری جائے گی یا اس کے ساتھ تھتکارا جائے گا؟ فرمایا: اس

---

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ معوذتین، جلد 2، صفحہ 172۔ ایضاً، حدیث نمبر 3288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شارحین نے اس کی تعبیر یہ کی ہے جو دور جاہلیت کے تعویذ کرتا ہے اس کا یہ حکم ہے اور جو قرآن اور اسماء الٰہیہ سے تعویذ کرتا ہے وہ اس حکم سے خارج ہے۔

3۔ سنن نسائی، المحاربۃ السحرۃ، جلد 2، صفحہ 171

میں سے کوئی چیز بھی نہیں بلکہ تو اسے اس طرح پڑھے گا۔ پھر بعد میں کہا: اگر چاہے تو تھتھکار لے۔

امام محمد بن سیرین سے اس تعویذ کے بارے میں پوچھا گیا جس میں تھتھکارا جاتا ہے؟ فرمایا: میں تو اس میں کچھ حرج نہیں پاتا۔ جس میں علماء اختلاف کریں تو ان میں فیصلہ کرنے والی چیز سنت ہو گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تعویذ میں تھتھکارا کرتے تھے (1)؛ اسے ائمہ نے ذکر کیا ہے میں نے اسے سورت کے آغاز میں اور سبحان کی وضاحت میں ذکر کیا ہے۔

حضرت محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس کا ہاتھ جل گیا اس کی ماں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی آپ اس کو تھتھکارنے لگے اور کوئی کلام پڑھنے لگے ان کا خیال ہے وہ اس کلام کو یاد نہ رکھ سکے۔ محمد بن اشعث نے کہا: مجھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں لایا گیا جب کہ میری آنکھوں میں تکلیف تھی انہوں نے مجھے دم کیا اور تھتھکارا (☆)۔

عکرمہ سے جو یہ قول مروی ہے کہ دم کرنے والے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ تھتھکارے گویا وہ اس طرف اس لیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گرہوں میں تھتھکارنے والوں کو ان میں شمار کیا ہے جن سے پناہ مانگی جاتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ دم نہیں ہونا چاہیے۔ بات اس طرح نہیں کیونکہ جب گرہوں میں تھتھکارنا مذموم ہے تو یہ لازم نہیں آتا کہ گرہوں کے بغیر تھتھکارنا بھی مذموم ہو، کیونکہ گرہوں میں تھتھکارنے سے مراد ایسا جادو ہے جو روحوں کو تکلیف دیتا ہے جب کہ یہ تھتھکارنا تو بدنوں کی اصلاح کے لیے ہے اس لیے جو چیز نفع دیتی ہے اسے نقصان دہ چیز پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جہاں تک عکرمہ کا یہ کہنا ہے کہ ہاتھ پھیلانا مکروہ ہے تو یہ قول خلاف سنت ہے۔ حضرت علی شیر خدا کا فرمان ہے: میں بیمار ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے میں کہہ رہا تھا: اے میرے اللہ! اگر میری موت کا وقت آ چکا ہے تو مجھے راحت عطا کر اگر ابھی وہ وقت دور ہے تو مجھے شفا دے اور مجھے عافیت عطا کر (2)، اگر یہ آزمائش ہے تو مجھے صبر عطا کر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو نے کیسی بات کہی؟'' میں نے وہ بات دہرا دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ مجھ پر پھیرا۔ پھر فرمایا: ''اے اللہ! اسے شفا دے'' وہ درد پھر مجھے کبھی نہ ہوا۔

عبداللہ بن عمرو، عبدالرحمٰن بن سابط، عیسیٰ بن عمرو اور رویس نے یعقوب سے نافثات نقل کیا ہے یہ فاعلات کا وزن ہے۔

عبداللہ بن قاسم جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام تھے سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ کچھ عورتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر گیارہ گرہوں پر جادو کیا (3)۔ اللہ تعالیٰ نے معوذتین کو نازل فرمایا جس میں گیارہ آیات ہیں۔ ابن زید نے کہا: وہ عورتیں یہودی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: وہ لبید بن اعصم کی بیٹیاں تھیں۔

### حسد اور رشک

**مسئلہ نمبر 8۔** وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ۝ سورۃ النساء میں حسد کی بحث گزر چکی ہے اس کا مطلب یہ ہے اگر حاسد کو ایسی نعمت میسر نہیں ہوتی تو محسود سے اس نعمت کے زوال کی تمنا کرتا ہے۔ **منافسہ** (رشک) کا معنی ہے اس جیسی نعمت

---

1۔ شعب الایمان، تعظیم القرآن، فضائل السور والآیات، جلد 2، صفحہ 513

2۔ الطبقات الکبری، جلد 2، صفحہ 215

3۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 538

☆ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 7، صفحہ 44

کی آرزو کرتا ہے اگر چہ وہ زائل نہ ہو۔ پس حسد مذموم برائی ہے منافسہ مباح ہے یہی رشک ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے''(1) صحیحین میں ہے: لاحسد إلّا فی اثنتین (2) دو آدمیوں کے سوا کسی میں رشک نہیں ہونا چاہیے۔ سورۃ النساء میں یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الحمدللہ۔

میں کہتا ہوں: علماء نے کہا حاسد نقصان نہیں دیتا مگر جب اس کا حسد فعل یا قول سے ظاہر ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد اسے محسود کو تکلیف دینے پر برانگیختہ کرتا ہے وہ محسود کے گناہوں کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کی لغزشوں کا طالب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا حسدت فلا تبغ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ حسد وہ پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی اور پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ زمین میں اس کی نافرمانی کی گئی۔ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، قابیل نے حضرت ہابیل سے حسد کیا۔ حاسد ایسا فرد ہے جس پر ناراضگی کی جاتی ہے، اس سے بغض رکھا جاتا ہے، اسے رحمت سے دھتکارا جاتا ہے اور نوازشات سے دور رکھا جاتا ہے۔ جس نے کہا کتنا ہی اچھا کہا:

قل للحسود إذا تنفَّس طَعْنَةً　　یاظالمًا　　وكأنّه　　مَظْلُومُ

حاسد سے طعنہ کے طور پر کہہ دو جب وہ سانس لے۔ اے ظالم! گو یا وہ مظلوم ہے۔

## ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے خواہ وہ خیر ہو یا شر

**مسئلہ نمبر 9**۔ یہ سورت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ شر کا بھی خالق ہے اور اس نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر شئی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے۔ اور فرمایا: مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ اس کا خاتمہ حسد پر کیا مقصود اس کی عظمت اور زیادہ نقصانات پر آگاہ کرنا ہے حاسد اللہ تعالیٰ کی نعمت کا دشمن ہے۔ ایک حکیم نے کہا: حاسد نے پانچ وجوہ سے اپنے رب کو دعوت مبارزت دی: (۱) اس نے ہر اس نعمت سے بغض کیا جو کسی اور پر ظاہر ہوئی (۲) وہ اپنے رب کی تقسیم پر ناراض ہوا۔ گو یا حاسد یہ کہتا ہے: یہ تقسیم کیوں کی گئی؟ (۳) اس نے اللہ تعالیٰ کے فعل کی مخالفت کی، یعنی اللہ تعالیٰ تو جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر بخل کرتا ہے (۴) اس نے اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو بے یارومددگار چھوڑ دیا وہ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں بے یارومددگار چھوڑا جائے اور ان سے نعمت زائل ہو جائے (۵) اس نے اللہ کے دشمن ابلیس کی مدد کی۔ ایک قول یہ کیا گیا: حاسد مجلس میں شرمندہ ہوتا ہے اور ملائکہ سے بغض اور لعنت پاتا ہے وہ تنہائی میں خوف اور غم پاتا ہے، آخرت میں حزن اور جلنا پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بعد اور ناراضگی کے بغیر کچھ نہیں پاتا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین افراد ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہوتی حرام خور، زیادہ رغبت کرنے والا، جس کے دل میں مسلمانوں کے لیے کینہ یا حسد ہو''(3)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

---

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 538　　2۔ جامع ترمذی، البر والصلۃ، ما جاء فی الحسد، جلد 2، صفحہ 15

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعا، باب فی الادعیۃ، جلد 2، صفحہ 350

# سورۃ الناس

آیاتہا ٦ ۔ ١١٤ سورۃ الناس مکیۃ ٢١ ۔ رکوعہا ١

یہ بھی سورۂ فلق کی طرح ہے کیونکہ یہ معوذتین میں سے ایک ہے۔ امام ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر جہنی سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل کی ہیں جن کی مثل کو نہیں دیکھا گیا۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ ''(1)۔

امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے، اسے امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝

''(اے حبیب!) عرض کیجئے: میں پناہ لیتا ہوں انسانوں کے پروردگار کی، سب انسانوں کے بادشاہ کی، سب انسانوں کے معبود کی''۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ رب سے مراد لوگوں کے مالک اور ان کے امور کی اصلاح کرنے والا ہے۔ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ رب الناس ہے حالانکہ وہ تمام مخلوق کا رب ہے اس کی دو وجہیں ہیں: (١) کیونکہ انسان بڑے باعظمت ہیں انسانوں کے ذکر سے یہ بتایا کہ وہ انسانوں کا بھی رب ہے اگرچہ وہ بڑے عظیم ہیں (٢) ان کے شر سے پناہ چاہنے کا حکم ہے ان کے ذکر سے یہ بتایا کہ انسانوں کے شر سے اللہ تعالیٰ ہی پناہ دیتا ہے۔

مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ لوگوں میں بادشاہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ یہ ذکر کرتا ہے کہ وہ ان بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کی عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا معبود اور الہ ہے اور اس سے پناہ طلب کرنی چاہیے اور اس کی پناہ لینی چاہیے نہ کہ دوسرے بادشاہوں اور عظماء کی پناہ لینی چاہیے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

''بار بار وسوسہ ڈالنے والے بار بار پسپا ہونے والے کے شر سے''۔

یعنی شیطان کے شر سے۔ معنی ہے وسواس والے کے شر سے۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا؛ یہ فراء کا قول ہے۔ وسواس واؤ کے فتحہ کے ساتھ اسم کے معنی میں ہے یعنی وسوسہ کرنے والا۔ اور واؤ کے کسرہ کے ساتھ یہ مصدر ہے اس سے مراد وسوسہ ہے اسی طرح زَلزال اور زِلزال ہے وسوسہ سے مراد دل کی بات ہے۔ یوں اس کا باب ذکر کیا جاتا ہے **وسوست الیہ نفسہ**

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، باب ماجاء فی المعوذتین، جلد 2، صفحہ 114

وَسوسۃ و وِسوسۃ شکاری اور کتوں کی آہٹ اور زیورات کی آوازوں کو وسواس کہتے ہیں۔

اعشی نے کہا:

تسمع للحلی وَسْواساإذا انصرفت

جب وہ واپس جاتی ہے تو تو زیورات کی ہلکی آواز کو سنتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: وسواس خناس ابلیس کے بیٹے کو کہتے ہیں وہ اسے حضرت حواء کے پاس لے آیا اور اسے اس کے سامنے رکھا اور کہا: اس کی کفالت کیجئے۔ حضرت آدم علیہ السلام تشریف لائے پوچھا: اے حواء! یہ کیا ہے؟ حضرت حواء نے کہا: ہمارا دشمن یہ لایا ہے اس نے مجھ سے کہا: اس کی کفالت کیجئے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: میں نے تجھے کہا نہیں تھا اس کی کسی بات میں اطاعت نہ کریں اس نے ہمیں دھوکہ میں ڈالا یہاں تک کہ ہم معصیت میں واقع ہو گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام بچے کی طرف بڑھے اس کے چار ٹکڑے کیے اور ہر چوتھائی حصہ کو ایک درخت کے ساتھ لٹکا یا وجہ اس پر ناراضگی وغصہ تھا ابلیس آیا اس نے پوچھا: اے حواء! میرا بیٹا کہاں ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا حضرت حواء نے اس کو بیان کر دیا۔ ابلیس نے کہا: اے خناس۔ وہ زندہ ہو گیا اور ابلیس کو جواب دیا ابلیس اسے لے کر حضرت حواء کے پاس لایا اور کہا: اس کی کفالت کیجئے حضرت آدم یہ السلام آئے اور اس بچے کو آگ کے ساتھ جلا دیا اور اس کی راکھ کو سمندر میں ڈال دیا۔ ابلیس آیا اس نے پوچھا: اے حواء! میرا بیٹا کہاں ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ بتا دیا۔ ابلیس سمندر کی طرف گیا کہا: اے خناس! وہ زندہ ہو گیا اور آواز پر لبیک کہی وہ تیسری دفعہ اسے حضرت حواء کے پاس لایا اور کہا: اس کی کفالت کرنا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے دیکھ لیا اسے ذبح کیا اور اسے بھونا پھر دونوں نے اسے کھایا۔ ابلیس آیا اس نے حضرت حواء سے پوچھا: حضرت حواء نے اسے سب بتا دیا اس نے کہا: اے خناس! وہ زندہ ہو گیا اور اس کی آواز پر لبیک کہی اور ابلیس اسے حضرت آدم اور حضرت حواء کے پیٹ سے لے آیا ابلیس نے کہا: اس چیز کا میں نے ارادہ کیا تھا حضرت آدم علیہ السلام کے سینہ میں ہی تیرا مسکن ہے وہ انسان کے دل کو لقمہ بنائے رکھتا ہے جب تک انسان غافل رہتا ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے وہ اس کے دل کو پھینک دیتا ہے اور ابلیس پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ واقعہ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں وہب بن منبہ کی سند سے نقل کیا ہے میں اسے صحیح گمان نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس کی صفت خناس سے لگائی گئی ہے کیونکہ یہ بہت زیادہ چھپا رہتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۞ (التکویر) اس سے مراد ستارے ہیں جو ظاہر ہونے کے بعد چھپ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے یہ جملہ بولا جاتا ہے: خَنَسْتُهُ فَخَنَسَ میں نے اسے پیچھے کیا تو وہ پیچھے ہو گیا۔ أخنسته کا معنی بھی یہی ہے اسی معنی میں ابوالعلاء حضرمی کا قول ہے:

وإنْ دَحَسُوا بالشَّرِ فاعْفُ تکرما　　　وإنْ خَنَسُوا عندَ الحدیث فلا تَسَلْ

اگر وہ شر کے ذریعے فساد برپا کریں تو ازروئے بزرگی انہیں معاف کر دیں اور اگر وہ گفتگو کے وقت پیچھے ہٹ جائیں تو

آپ ان کی باز پرس نہ کریں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنّ الشیطانَ واضعٌ خَطْمہ علی قلب ابن آدم فإذا ذکر اللہَ خَنَس وإذا نَسِیَ اللہ التقم قلبہ فوسوس (1) شیطان اپنی ناک انسان کے دل پر رکھے ہوئے ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جائے تو اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے اور اس میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ جب بندے (2) کا ذکر کرتا ہے تو شیطان اس کے دل سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چلا جاتا ہے اور جب بندہ غافل ہوتا ہے تو اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے تو اسے آرزو بھی دلاتا ہے۔ ابراہیم تیمی نے کہا: وسوسہ ڈالنے والا اپنے عمل کا آغاز وضو سے کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: اسے خناس اس لیے کہتے ہیں کیونکہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو وہ شیطان لوٹ آتا ہے۔ خنس کا معنی لوٹنا ہے اس شعر میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے:

وصاحبِ یَمْتَعِسُ إمتِعاسا یزدادُ إن حَیَّیْتَہُ خِناسا

ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ الْوَسْوَاسِ ۬ۙ الْخَنَّاسِ میں دو توجیہیں ہیں: (۱) وہ وسوسہ کے ذریعے ہدایت سے پھیرنے والا ہے (۲) وہ وسوسہ کے ذریعے یقین سے لوٹانے والا ہے۔

## الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ۝۵

''جو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے لوگوں کے دلوں میں''۔

مقاتل نے کہا: شیطان خنزیر کی صورت میں ہوتا ہے وہ انسان میں یوں دوڑتا ہے جس طرح رگوں میں خون دوڑتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس امر پر تسلط عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مقصود ہے۔

صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ''شیطان انسان میں خون کے دوڑنے کی طرح دوڑتا ہے'' (3) مقاتل نے جو کہا یہ حدیث اسے صحیح ثابت کرتی ہے۔ شہر بن حوشب نے ابوثعلبہ خشنی سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ وہ مجھے شیطان دکھائے اور ابن آدم جو اس کا مکان ہے وہ مجھے دکھائے میں نے اسے دیکھا اس کے ہاتھ انسان کے ہاتھوں میں ہیں اس کے پاؤں انسان کے پاؤں میں ہیں، اس کے راستے انسان کے جسم میں ہیں مگر اس کی ناک ہے جو کتے کی ناک کی طرح ہے انسان جب بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموش ہوتا ہے تو شیطان اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ابوثعلبہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے مطابق شیطان انسان کے جسم میں منتشر ہوتا ہے اور انسان کے ہر عضو میں اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

---

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 2، صفحہ 373، حدیث 2217

2۔ مسودہ میں یہ لفظ اللہ اسم جلالت پر پیش اور لفظ العبد پر زبر موجود ہے اس لیے یہ ترجمہ کیا گیا۔

3۔ شعب الایمان، فی تحریم أعراض الدنیا، جلد 5، صفحہ 322

عبد الرحمن بن اسود اور ایک اور تابعی سے مروی ہے جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے: میں بدکاری سے امن میں نہیں ہوں اور مجھے کوئی اطمینان نہیں کہ شیطان اس کی شرمگاہ میں داخل ہو جائے اور اس میں کیل ٹھونک دے۔ یہ قول تجھے متنبہ کرتا ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں منتشر ہوتا ہے۔ مقاتل کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ اس کے وسوسہ سے مراد یہ ہے وہ مخفی کلام کے ذریعے اپنی طاقت کی طرف بلاتا ہے آواز سنے بغیر اس کا مفہوم اس کے دل تک جا پہنچتا ہے۔

## مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝

''خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے''۔

یہ بتایا کہ وسوسہ ڈالنے والا کبھی لوگوں میں سے ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: یہ دونوں شیطان ہیں جہاں تک جنوں کے شیطان کا تعلق ہے وہ لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے جہاں تک انسانوں کے شیطان کا تعلق ہے وہ علانیہ اس کے پاس آتا ہے۔ قتادہ نے کہا: جنوں میں سے شیاطین ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے شیاطین ہوتے ہیں انسانوں اور جنوں کے شیاطین سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی سے کہا: کیا تو نے انسانوں اور جنوں کے شیاطین سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی ہے؟ اس نے پوچھا: کیا انسانوں میں سے بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ فرمایا: ہاں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (الانعام: 112) (1) اسی طرح ہم نے بنایا ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن۔ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہاں ناس سے مراد جن ہیں انہیں ناس اس طرح نام دیا گیا ہے جس طرح انہیں رجال قرار دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) اس طرح انہیں قوم اور نفر کا نام بھی دیا۔ اس تعبیر کی بنا پر النَّاسِ کا عطف الْجِنَّةِ پر ہے یہاں تکرار الفاظ کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ایک عرب سے یہ ذکر کیا گیا اس نے کہا جب کہ وہ ایک واقعہ بیان کر رہا تھا: جاء قوم من الجن فوقفوا فقیل من انتم؟ فقالوا ناس من الجن جنوں کی ایک قوم آئی وہ آ کر کھڑی ہو گئی ان سے پوچھا گیا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم جنوں میں سے ناس ہیں؛ یہی فراء کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: وسواس سے مراد شیطان ہے اور مِنَ الْجِنَّةِ یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ وہ جنوں میں سے ہیں اور الناس کا عطف الوسواس پر ہے معنی یہ ہو گا کہہ دیجئے: میں وسواس کے شر سے لوگوں کے رب کی پناہ چاہتا ہوں جو جنوں میں سے ہے اور لوگوں کے شر سے بھی پناہ چاہتا ہوں۔ اسی وجہ سے مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انسانوں اور جنوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے۔ جنة یہ جنی کی جمع ہے جس طرح انس اور انسی کہا جاتا ہے ھاء جماعت کی تانیث کے لیے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ابلیس جنوں کے سینوں میں یوں وسوسہ اندازی کرتا ہے جس طرح لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اس تعبیر کی بنا پر فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ تمام کے لیے عام ہے اور مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اس کا بیان ہے جو اس کے سینے میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 540

ہے: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ کا معنی وہ وسوسہ ہے جو جنوں اور لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے۔ یہ حدیث نفس ہے نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا إنّ الله عزّوجلّ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي عما حدثت به أنفسها مالم تعمل أو تتكلم به (1) اللہ تعالیٰ نے میری امت کے اس فعل سے درگزر فرمایا ہے جو اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے مطابق عمل نہ کرے یا اس کے مطابق گفتگو نہ کرے؛ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مراد بہتر جانتا ہے۔

الحمدللہ آج مورخہ 31 مئی 2007ء بروز جمعرات بعداز نماز ظہر اس جز کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں نیازمندانہ التجا ہے کہ وہ اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے طفیل مجھ ناچیز پر اپنی توفیقات ونوازشات کا سلسلہ جاری رکھے جس طرح اس نے پہلے ہمت عطا فرمائی آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کا حوصلہ عطا فرمائے میرے اساتذہ قبلہ محمد خان نوری مدظلہ، قبلہ ملک عطا محمد صاب مدظلہ کو صحت وسلامتی سے رکھے اور قبلہ قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ میرے والدین پر کرم نوازی فرمائے۔

محمد بوستان عفی عنہ

1۔ صحیح مسلم، سورۃ الناس، جلد 2، صفحہ 1034-1033

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

# ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی

بھیرہ شریف

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر دُرِّ منثور 6 جلد

زیورطباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے

## ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

# ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی

بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

# تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز